مفرور

از

اقلیم علیم

حصہ اول

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

ایک کیمیاگر کی داستانِ شوق جو مقصد کی تلاش میں دربدر پھرتا رہا

مفرور

پہلا حصّہ

راوی : صفدر علی

مصنف : ایم اے قلیم علیم

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

مشہور مصنف اقلیم علیم جو آج کل سسپنس ڈائجسٹ میں مقبول سلسلہ "موت کے سوداگر" لکھ رہے ہیں۔ قبل ازیں جاسوسی ڈائجسٹ میں ایک سلسلے وار کہانی "مفرور" لکھ چکے ہیں۔ "مفرور" نے اپنی اشاعت کے دور میں جو مقبولیت حاصل کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ طویل سلسلہ صرف اشاعت کے دوران ہی جاسوسی ڈائجسٹ کے قارئین کی بھرپور توجہ کا مرکز نہیں رہا بلکہ آج بھی بے شمار لوگ تمنائی ہیں کہ "مفرور" یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کی جائے تاکہ وہ اسے تسلسل کے ساتھ دوبارہ پڑھ سکیں اس سلسلے میں ہمیں جس قدر خطوط اب تک موصول ہو چکے ہیں اتنے اس سے قبل کسی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں نہیں ملے۔

یہ ایک اعزاز ہے مفرور کے مصنف اقلیم علیم کے لیے کہ انہوں نے ایک ایسی دلچسپ کہانی تخلیق کی جو اپنے منطقی انجام کو پہنچنے کے چار سال بعد بھی قارئین کے ذہنوں میں محفوظ ہے اور باعث افتخار ہے ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے لیے کہ اس نے اپنے قارئین کے لیے ایک ایسی کہانی شائع کی جسے وہ دوبارہ پڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بہت کم تحریریں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دوبارہ یا سہ بارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور جو ایسی ہوتی ہیں وہ یقیناً مصنف کی بہترین تخلیقات میں شمار کی جاتی ہیں۔ اگر بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو دنیا کے بڑے سے بڑے مصنف کی زندگی بھر کی تخلیقات میں گنتی کی چند ہی کہانیاں یا افسانے ایسے ملیں گے جو اسے فن کی بلندیوں تک پہنچا کر امر بنا دیتے ہیں۔ بلاشبہ "مفرور" اقلیم علیم کی ایسی ہی صدابہار تخلیق ہے۔

قارئین کے ڈھیروں خطوط اور بے پناہ اصرار کے پیشِ نظر ادارہ کتابیات پبلی کیشنز نے مفرور کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ طویل سلسلہ چھ حصوں پر محیط ہے۔

اس کے علاوہ یہ ادارہ ایک اور مقبول سلسلہ "صدیوں کا بیٹا" بھی شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ جو مفرور کے بعد آپ تک پہنچ جائے گا۔

ناشر

اقلیم علیم

وہ دونوں میرے سامنے مجرمانہ انداز میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ اور ٹانگوں میں واضح طور پر لرزش نمایاں تھی

میں نے ٹہلتے ٹہلتے سخت طیش کے عالم میں سگریٹ قیمتی قالین پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا اور مٹھیاں بھینچ کر ان کی طرف گھوم گیا۔

"تم کو میں نے کس بات کے لئے ملازم رکھا ہے تمہیں شراب اور لڑکیوں سے ہی فرصت نہیں جو اپنی ذمہ داریاں پوری کرو ... میں .... میں تم کو گولی مار دوں گا۔" میں غصیلی آواز میں دھاڑا۔

"صاحب ہمارے آدمیوں میں ہی کوئی مخبری کر رہا ہے"۔ ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔ "ڈیوٹی اسٹاف ہر بار ہماری مٹھی میں ہوتا ہے۔ مال کے بارے میں پوری پوری رازداری برتی جاتی ہے۔ لانچ لگنے سے ایک گھنٹے پہلے تک کسی کو علم نہیں ہوتا کہ مال کہاں آنے والا ہے۔ ہم بروقت ......"

"بکواس مت کرو۔" میں خود پر قابو نہ پا سکا اور اس کا گریبان پکڑ کر اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ "اتنی رازداری کے باوجود اسپیشل اسکواڈ ہر بار کامیاب چھاپے مار رہا ہے۔ اسی مہینے میں آج تیسری بار مال پکڑا گیا ہے۔ آٹھ لاکھ معمولی رقم نہیں ہوتی۔ لیکن تم ..... تمہیں کیا معلوم .... اگر تم نے اپنی زندگی اور عزت داؤ پر لگا کر کبھی محنت سے پیسہ کمایا ہوتا تو تمہیں معلوم ہوتا۔ میں یہاں مال پھینک بھی دیتا تو تیس لاکھ کہیں نہیں گئے تھے۔"

"ہمیں اس بھاری نقصان کا پورا احساس ہے جناب۔" وہی شخص روہانسی آواز بولا۔

"میرا پیسہ کہاں جا رہا ہے۔ میں کسٹم والوں پر ہر ماہ ہزاروں روپے خرچ کر رہا ہوں۔ غیر ملکی شراب، کپڑے، سگریٹیں، ریڈیو گرام، قالین ۔۔۔ یہ سب کہاں جاتے ہیں؟ لعنت ہو تم پر کہ تم اتنا پیسہ خرچ کر کے بھی ان کو قابو میں نہیں کر سکتے۔ یہ لو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر ان کے منہ پر ماری۔ "یہ لو اور چند دنوں کے لئے شہر سے باہر دفع ہو جاؤ۔ میں خود دیکھوں گا کہ کون گڑبڑ کرتا ہے۔"

انہوں نے وہ روپے اٹھائے اور دبے قدموں وہاں سے کھسک گئے۔

میں شکست خوردہ انداز میں صوفے پر گر پڑا۔

یہ کیا ہو رہا تھا اور کیوں ہو رہا تھا؟ میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

میں ۵۶ء سے اپنا کاروبار چلا رہا تھا جب ۵۸ء میں مارشل لاء لگا اور لوگوں نے سمندر کو غیر ملکی مال سے بھر دیا اس وقت بھی میرے سارے اڈے قائم رہے۔ مال آتا رہا اور شہر کے بازاروں میں یوں کانوں کان پھیلتا رہا کہ کسی کو ... بھنک بھی نہ مل سکی کہ مال کہاں سے آتا اور کہاں جاتا ہے۔ میرے ہم پیشہ ہمیشہ میرے مقدر پر رشک کیا کرتے تھے کیونکہ اتنے طویل عرصے میں ایک بار بھی میرا مال نہیں پکڑا گیا تھا۔ مکران اور ابراہیم حیدری کے ویران ساحلی علاقے میری تمام سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ خشک مچھلی کے بدبودار انبار کے نیچے چھپا ہوا سارا مال ہر بار اطمینان کے ساتھ ٹرکوں میں شہر آ جاتا تھا اور کوئی بھی سرکاری افسر بدبو کے اس انبار کے قریب آنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میرا سونے منگوانے کا طریقہ بھی منفرد تھا۔ میرے ایک

خاص آدمی نے غیر ملکی منڈیوں سے باقاعدہ رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ذریعے میری فرم کے نام موٹر گاڑیوں کے پرزے آیا کرتے تھے۔ بظاہر یہ تمام پرزے لوہے اور پیتل وغیرہ کے ہوتے تھے۔ لیکن دراصل یہ سب سونے کے پرزے ہوتے تھے جن پر مہارت کے ساتھ رنگ لگا دیا جاتا تھا اور یوں باقاعدہ امپورٹ لائسنس کے تحت میں ملک میں سستے داموں سونا منگوا رہا تھا۔ لیکن پچھلے ڈیڑھ ماہ سے مجھے اپنی ان تمام کامیابیوں پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا۔ کراچی کے ویران نواحی ساحلوں پر یکے بعد دیگرے کسٹم کے خاص دستوں نے تین کامیاب چھاپے مار کر سارا مال پکڑ لیا تھا۔ پچھلی دو مرتبہ تو لانچ بچ کر رات کے اندھیرے میں فرار ہو گئی لیکن اس مرتبہ لانچ بھی پکڑی گئی تھی۔ آدمی سمندر میں کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے کسٹم میں اپنے ایک پرانے نمک خوار کو ٹیلی فون کیا۔ وہ بے چارہ خود مجھ سے ملنے کے لئے بے چین ہوا جا رہا تھا۔ اس تیسرے چھاپے نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔ اور اب اسے اپنا وہ ماہانہ انعام خطرے میں نظر آنے لگا تھا جو میں محفوظ کاروبار کی ضمانت کے طور پر اسے اور اس کے ساتھیوں کو دیتا تھا۔

بہر حال اس کی ایک بات سے مجھے خاصی تسلی ہوئی۔ اس کے بیان کے مطابق آئندہ ہفتے محکمے کے ان لوگوں کی فہرست جاری کی جانے والی تھی جنہیں اعلیٰ کارکردگی پر انعامات و اعزازات وغیرہ دیئے جانے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس فہرست کے آ جانے کے بعد میں بڑی آسانی کے ساتھ اس کالی بھیڑ کے بارے میں اندازہ لگا سکتا تھا جو میری پے در پے ناکامیوں کا سبب بن رہی تھی۔

میں نے گھنٹی بجا کر اپنی اینگلو انڈین ملازمہ سوزی کو خواب گاہ میں بلایا۔ وہ چنچل لڑکی ہونٹوں پر سدا بہار مسکراہٹ لئے میرے سامنے آ پہنچی اور میرا بگڑا ہوا موڈ دیکھتے ہی سنجیدہ ہو گئی۔

اپنے پیشے کے رموز میں بہت اچھی طرح جانتا تھا اور کبھی بھی اپنے گرد و پیش میں غیر ضروری لوگوں کی موجودگی پسند نہیں کرتا تھا۔ میرے دفتر میں کل سات نفوس ملازم تھے۔ یہ سب میرے اعتماد کے آدمی تھے اور یہ اعتماد میں نے بھاری ماہانہ مشاہرے پر خریدا ہوا تھا۔ ان کے کام یوں تو متعین تھے لیکن درحقیقت ان میں نہ کوئی دوسروں سے کم تر تھا نہ برتر۔۔۔ وہ سب میرے اشاروں کے غلام تھے۔ میرے گھر کی دیکھ بھال میرے گروہ کی آٹھویں شخصیت، سوزی مامور تھی۔ کھانے پکانے سے لے کر مکان کی صفائی تک سب کام اسی کے ذمے تھے اور میری عدم موجودگی میں وہ میری سیکرٹری کی حیثیت سے تمام ٹیلی فون ذمے داری کے ساتھ وصول کرتی تھی۔۔۔!

میرے وسیع کاروبار کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات سوزی کو ہی حاصل تھیں اور شاید وہی میرے مزاج سے بھی بہتر طور پر آشنا تھی۔

میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی سوزی کی مسکراہٹ کافور ہو گئی اور وہ نرم آواز میں بولی "یس سر۔"

"میں کلب جا رہا ہوں۔ سیف میں سے ساحل کے سارے کاغذات نکال کر تلف کر دو۔ وہ لانچ آج مال سمیت پکڑی گئی ہے۔ اس کا رجسٹریشن عبدالمجید کے فرضی نام پر ہے۔ سیف کے پچھلے خانے میں فائل نمبر ٹو ڈی فور میں ساحل کے ہی کاغذات ہیں۔ چیک کر کے جلا دینا۔"

سوزی نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے پہنچا

"سر آپ آج کل بہت پریشان رہتے ہیں۔ آپ کی یہ پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔" وہ میری ٹائی سے کھیلتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں بولی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں سب ٹھیک کروں گا۔" میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر کہا۔

سوزی نے پھاٹک پر مجھے خدا حافظ کہا اور اس کے اندر چلے جانے کے بعد میں نے کار آگے بڑھا دی۔

ڈیفنس سوسائٹی کی خاموش اور باوقار سڑکوں سے گزرتا میں دانستہ کورنگی روڈ پر آیا کیونکہ یہاں ویران اور تاریک قطعات پر رات میں اکثر کسٹم پارٹیاں کورنگی کریک سے آنے والے ٹرکوں کی گھات میں رہتی تھیں۔ اور میں ہمیشہ ان کی کمین گاہوں کو نظر میں رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

کالے پل اور ڈرگ روڈ سے گزرتا میں صدر کے بارونق علاقے میں داخل ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں کلب جا پہنچا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی ستار سیٹھ کارڈ برج ٹیبل پر پھینک کر تیر کی طرح میری طرف آیا اور میرا بازو تھام کر بے چینی کے ساتھ مجھے کھلے لان میں لیتا چلا گیا۔

"سنا ہے آج تمہارا لانچ کسٹم نے قابو کر لیا؟" وہ بری طرح ہانپتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"کس سے سنا ہے۔؟" میں چونک کر اسے گھورنے لگا۔

"ارے یار اچھلتا کیوں ہے۔" وہ میرا بازو دباتے ہوئے بولا "میرے ساتھ والی میز پر کسٹم افسر برج کھیل رہے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک اپنے ساتھیوں کو بتا رہا تھا کہ اس نے آج شام ساحل نامی ایک لانچ ابراہیم حیدری سے دو میل آگے پکڑی ہے۔ اس میں آٹھ دس لاکھ کا غیر ملکی سامان بھرا ہوا ہے۔ میں تو ساحل کا نام سنتے ہی چونک پڑا۔ اب مجھے پتہ تھا کہ وہ تمہاری لانچ ہے۔"

"اوہ۔" میں نے غصے کے عالم میں جبڑے بھینچ لئے۔ "تو وہ یہیں موجود ہے۔ ذرا مجھے اس کی صورت دکھا دو۔"

میرے لہجے پر ستار سیٹھ چونک پڑا۔ "ارے صفدر بھائی، اتنی گرمی نہ کھاؤ یار۔ بزنس میں یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے میرے ساتھ بھی بار بار ایسا ہوتا تھا مگر اب میں کھلا سودا کرتا ہوں۔ پیسہ تو پانچ فیصد کم ملتا ہے مگر اپنا سالا کوئی رسک نہیں ہوتا سارا انتظام بیوپاری خود کرتا ہے۔"

اور حقیقت یہ ہے کہ اب میں خود بھی کھلے سودے کے بارے میں سوچ رہا تھا گو اس میں نفع قدرے کم تھا مگر یہ طریقہ میرے لئے محفوظ تھا۔ میں مال آنے سے پہلے ہی کسی مقامی پارٹی سے پوری لاٹ کا سودا کر لیتا۔ پھر میری لانچ کھلے سمندر میں یہ سارا مال پارٹی کی اپنی لانچ میں منتقل کر دیتی اور اسی کے ساتھ میری رقم پکی ہو جاتی۔ ایسے سودوں کی بھی کچھ شرائط ہوا کرتی ہیں۔ اگر مال میری لانچ پر پکڑا جائے تو پورا نقصان مجھے اٹھانا پڑے گا۔ اگر مال بیوپاری کی لانچ پر چڑھاتے ہوئے چھاپہ پڑ جائے تو دونوں کو آدھا نقصان اٹھانا پڑتا اور ایک بار سارا مال پارٹی کی لانچ پر پہنچنے کے بعد سارا رسک اسی کا ہوتا تھا۔

"ہاں ستار سیٹھ۔ اب مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے پُرفکر لہجے میں کہا۔

"سچ پوچھو تو پورے شہر میں تمہارا مال پکڑے جانے کا سب سے زیادہ افسوس ہم کو ہوا ہے۔ کو ذرا بھی پتہ ہوتا کہ اس بار گلف کی منڈی سے ساری دوائیں تم نے سمیٹی ہیں تو میں ہر قیمت پر یہ سودا کر لیتا اور اپنی ذمہ داری پر یہ مال اتروا تا۔ ملک میں آدھی فیکٹریاں بند پڑی ہیں۔ مال کی کھپت زیادہ ہے، تیاری کم ہے۔ امپورٹ لائسنس تو خوش قسمتوں کو ہی ملتا ہے۔ وہ سارا زور لگا کر بھی سپلائی پوری نہیں کر سکتے۔ آج کل تو آدمی دوا کے بغیر مر بھی نہیں سکتا۔ اس لائن میں بڑا چانس ہے۔ ذرا ہنگامے ختم ہوئے تو یہ چانس بھی جاتا رہے گا۔ اس وقت تو میرے ہاتھ میں لمبی پارٹیاں ہیں۔ ان کی پسند کی دوائیں جس قدر چاہو لے آؤ اور فوراً پیسے لے لو۔"

"اب میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔" میں تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ذرا اندر چل کر اس افسر کی منہ دکھائی کرا دو۔ میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کا مخبر کون ہے۔"

ستار سیٹھ نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور برآمدے سے گزر کر ہال میں داخل ہو گیا۔

اس نوجوان اور خوش مزاج کسٹم افسر سے بلیئرڈ روم میں تعارف ہو ہی گیا۔ گو میں نے اسے وہاں پہلی بار دیکھا تھا لیکن مجھے پتہ چلا کہ وہ پچھلے کئی سالوں سے کلب کا باقاعدہ ممبر ہے اور مہینے میں ایک آدھ بار وہاں ضرور آتا ہے۔

اس کو اپنی تازہ کامیابی کی اس قدر خوشی تھی کہ کافی پیتے ہوئے اس نے خود ہی اسمگلروں وغیرہ کی باتیں چھیڑ دیں اور میں اس کی گفتگو میں گہری دلچسپی لینے لگا۔

"آپ لوگوں کا کام بھی جان جوکھم کا ہوتا ہے۔" میں نے اس کے دماغ میں ہوا بھرنے کی نیت سے کہا۔ "اخباروں میں یہ سب اتنا دلچسپ اور سنسنی خیز معلوم ہوتا ہے کہ ہم جیسے عام لوگ آپ لوگوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگتے ہیں۔۔۔ اسمگلروں کے منصوبے کا سراغ لگانا، پھر انہیں ناکام بنانا واقعی مشکل کام ہوتا ہوگا۔"

اس نے سگریٹ سلگا کر مسکراتے ہوئے کہا: "مشکل تو ضرور ہوتا ہے مگر ذرا سی ذہانت سارے راستے صاف کر دیتی ہے۔ ہم لوگوں کو بھی الہام نہیں ہوتا۔ ذرا سی محنت کرنی پڑتی ہے۔ پھر مجرموں ہی کا کوئی آدمی ٹوٹ کر ہمارا مخبر بن جاتا ہے۔ ورنہ ہماری کامیابی تو خواب بن کر رہ جاتے۔"

"مجرموں کے آدمی ہی مخبر ہوتے ہیں۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "نہیں جناب، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ ان کے آقا انہیں بھاری تنخواہیں دیتے ہوں گے۔ آخر ان کا کیا مفاد ہے کہ وہ آپ سے آملیں۔"

"مفاد ہوتا تو نہیں مگر پیدا کیا جاتا ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "مثلاً آج ہی کا ایک کیس لیجئے۔ ذرا سی جستجو سے آٹھ نو لاکھ کی اسمگل کی ہوئی دوائیں پکڑی گئیں۔"

وہ میری توقع کے برخلاف خود ہی موضوع پر آ گیا تھا۔ میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا اور میں چہرے پر دلچسپی کے آثار پیدا کئے اس کی طرف جھک گیا۔

"گوٹھ ابراہیم حیدری سے آگے ہڈی مل کے قریب ایک شخص رہتا ہے جسے ایک بار پولیس نے شراب رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا تھا۔ تحقیقاتی افسر میرا دوست تھا۔ جب یہ بات میرے علم میں آئی تو مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اس کا کسی اسمگلر سے تعلق نہ ہو کیونکہ ان اطراف میں اکثر غیر قانونی مال لادا اتارا جاتا ہے۔ اس افسر نے تفتیش ناکافی ثبوت کی بنا پر ختم کر دی۔ یہ میرے ہی مشورے پر کیا گیا۔ پھر میں نے ایک آدمی اس کی خفیہ نگرانی پر لگا دیا جس کے نتیجے میں گیارھویں روز ہی کافی مال پکڑا گیا۔ لانچ آدمیوں سمیت غائب ہو گئی۔ مجھے علم تھا کہ وہ شخص بھی چھاپے کے وقت مال اتارنے میں شریک تھا اس لئے میں نے اگلے ہی روز اسے جا لیا اور اسے بتایا کہ وہ چھاپہ اس کی وجہ سے کامیاب ہوا۔ پہلے تو وہ مزاحمت کرتا رہا پھر میں نے ترپ کا پتہ استعمال کیا کہ اگر وہ مخبر نہ بنا تو میں اخباروں میں اس کی تصویر چھپوا دوں گا کہ پچھلے روز کا چھاپہ اس کی مخبری کی وجہ سے کامیاب ہوا۔ یہ حربہ ایسا زود اثر

تھا کہ اس کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ اس اخباری تشہیر کے نتیجے میں اس کا نادیدہ آقا اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش ضرور کرتا۔ پھر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ کئی سال سے اس گروہ کی کشتیوں سے معقول معاوضے پر مال اتار رہا تھا لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ کس کے لئے کام کر رہا ہے۔ وہ صرف کشتی کے عملے سے واقف ہے۔ وہی لوگ اسے لے جاتے ہیں اور کام پورا ہونے پر معاوضہ دے کر لوٹا دیتے ہیں۔ اس کی مخبری پر آج میں نے تیسرا کامیاب چھاپہ مارا۔ مجرم پھر صاف نکل گئے لیکن بوٹ پکڑی گئی ہے اور اب جلد ہی اس گروہ کا سرغنہ میری مٹھی میں ہوگا۔"

"واقعی یہ صرف ذہانت کا کھیل ہے۔" میں نے اپنے غصے اور جوش کو دباتے ہوئے تعریفی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ورنہ اسے ولایتی شراب رکھنے کے جرم میں تھوڑی سی سزا ہوتی اور بس۔"

پھر جب فلش کا دور شروع ہوا تو چند ابتدائی ہاتھ جیتنے کے بعد میں اس سے دانستہ ہارنے لگا۔ اس کے ذریعے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان پر وہ واقعی انعام کا مستحق تھا۔

کلب سے میں رات کے ایک بجے گھر پہنچا۔ سوزی ڈرائنگ روم میں میری منتظر تھی میں اس کی طرف توجہ دیئے بغیر فون کی طرف بڑھ گیا اور اپنی فرم کے ایک آدمی کے نمبر ڈائل کرنے لگا

دوسری جانب سے ایک نیند میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی۔

"سکندر۔ میں حکومت بول رہا ہوں۔" میں نے کوڈ میں کہا۔

"یس سر۔" بولنے والے کا خمار یک بیک کافور ہو گیا۔

"پیٹن پچھلے کئی سالوں سے بڑی مل کے قریب سے ایک خلاصی لاتا ہے۔ جسے ۔ سٹم بیک میل کرکے ہمارے خلاف استعمال کر رہی ہے۔ اسے فوری طور پر کسی لانچ سے عدن روانہ کر دو۔ اب اس کا یہاں رہنا خطرناک ہے۔"

"یس سر۔" میرے مخاطب نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سوزی کی طرف بڑھ گیا۔

٭٭٭

یہ تھا میرا کاروبار۔ جس میں نہ آمدنی کی کوئی حد تھی نہ خرچ کا حساب، دولت میرے اشاروں کی غلام تھی اور حالات میری مرضی کے تابع۔ کام کی خالص مجرمانہ نوعیت کے باوجود میں نے کبھی اپنے ہاتھ انسانی خون سے آلودہ نہیں کئے کیونکہ بنیادی طور پر میں کشت و خون کے خلاف تھا۔ گو میرے تمام آدمی ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ لیکن وہ سب میری سخت پالیسی سے بخوبی واقف تھے کہ انتہائی مجبوری کے سوا کبھی گولی نہ چلائی جائے اور کئی برس گزر جانے کے باوجود آج تک کبھی خون خرابے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

رہے میرے مشاغل تو وہ بھی میرے کاروبار سے ہم آہنگ تھے۔

ریس اور قمار بازی کا میں شیدائی تھا اور ہر روز اپنی دولت کے زور پر شہر کے حسین چہروں کی ہمنشینی خریدتا رہتا تھا۔ اور جب شباب قریب ہو، سپردگی پر آمادہ ہو، انسان پر گناہ کی لذت پوری طرح حاوی ہو تو ان لمحات کو طول دینے کے لئے شراب لازمی ہو جاتی ہے اور میں ہر کام میں اس کے لوازم پورے کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

میں نے سنا تھا اور ہزاروں بار سنا تھا کہ شراب، شباب اور جوا انسان کی بربادی کے سب سے بڑے تین اسباب ہیں لیکن میں نے برسوں سے یہ شغل اپنائے ہوئے تھے اور مجھے ایسے راس آئے کہ میری صحت قابلِ رشک اور مالی حالت ناقابلِ یقین حد تک مستحکم تھی۔

میں زندگی کی ان خطرناک راہوں پر کیسے نکلا۔ یہ بھی میری اصل کہانی کا ایک متعلقہ باب ہے۔

میں ایک تجارت پیشہ گھرانے کا فرد اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا میرے والد صاحب موٹر کاروں کے فاضل پرزوں کی قانونی درآمد کیا کرتے تھے اور لاہور میں ان کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔

گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کے سبب بے جا لاڈ پیار نے میری عادتوں پر خاصا گہرا اثر ڈالا تھا۔ پیسے کے معاملے میں والدین بڑے فراخ دل تھے اور اسی کی بنا پر اسکول میں میرا واسطہ کچھ بدقماش لڑکوں سے پڑ گیا اور جب میں اسکول سے نکل کر کالج کی آزاد فضاؤں میں داخل ہوا تو میں اپنے ہم سنوں سے کہیں زیادہ گھاگ اور تجربہ کار تھا۔

فلم بینی، سگریٹ نوشی، جوا اور آوارہ گردی میری فطرت کے لازمی جزو بن چکے تھے میرے پاس پیسے کی فراوانی دیکھ کر کالج میں دو ایسے دوست مل گئے جو بڑے حوصلوں کے مالک تھے۔ ان کی ترغیب پر اٹھارہ سال کی عمر میں پہلی بار میں نے شراب کا ذائقہ چکھا۔ موسمِ گرما کی ایک خوشگوار شام میں نے شالامار باغ کے وسیع سبزہ زار پر، درختوں کے ایک دور افتادہ کنج میں ان کے ساتھ پہلی بوتل خالی کی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ بیئر پینے کے بعد مجھ پر ہلکا ہلکا سا سرور چھانے لگا۔ مگر میں حیرت انگیز طور پر خود کو ہوش میں محسوس کر رہا تھا۔ جب ہم وہاں سے چلے تو میں نے دیکھا کہ میرے دونوں ساتھی لہرا لہرا کر عجیب زاویوں سے چل رہے ہیں۔

"تم دونوں سیدھے کیوں نہیں چلتے؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ان کو ڈانٹا۔

اکبر ہنس دیا۔ "یار ہم سیدھے ہی تو چل رہے ہیں، تجھ کو شاید چڑھ رہی ہے۔"

"نہیں۔" میں وہیں رک کر غصیلے انداز میں غرایا۔ "مجھے بالکل نشہ نہیں ہے۔ تم دونوں ٹیڑھے میڑھے چل کر مجھے بتانا چاہتے ہو کہ مجھ کو چڑھ رہی ہے۔"

انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اکبر بولا۔ "ہم دانستہ ٹیڑھے نہیں چل رہے، ہمیں نشہ ہو رہا ہے۔"

میں زور سے ہنس پڑا پھر میں نے راستے میں اور لوگوں کو بھی اسی طرح لہراتے دیکھا اور میرے دوستوں نے بتایا کہ وہ سب پئے ہوئے ہیں۔

واپسی میں اندھیرا پھیل چلا تھا۔ ہم نے تانگہ بادشاہی مسجد کے قریب ہی چھوڑ دیا۔ ہوا کی لہروں کے دوش پر آنے والی پائل اور طبلے کی جھنکار سن کر میں قدرے جھجکا۔

"کہیں کوئی جاننے والا دیکھ نہ لے۔" میں نے ان دونوں پر اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"کوئی نہیں دیکھتا۔" وہ مجھے آگے دھکیلتے ہوئے بولے۔ "اس بازار میں بھلا تمہارے جاننے والوں کا کیا کام۔"

بات معقول اور ترغیب انگیز تھی۔ میرے بہکے ہوئے قدم ایک بالاخانے کی دہلیز پر جا پہنچے۔ وہاں مجرا چل رہا تھا۔ ایک سبک اندام اور خوبرو تتلی رنگ برنگ اور کشش انگیز لباس پہنے طبلے کی تھاپ پر مچل مچل کر تھرک رہی تھی۔ اس نے میرے بیٹھتے ہی ایک ادا کے ساتھ میرے سامنے یوں جھک کر انگڑائی لی کہ اس کے گرم گرم سانس اور نرم نرم بال میرے رخساروں کو چھوتے گذر گئے میرا چہرہ دہک اٹھا میں نے کئی بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف اچھال دیئے۔

میری فیاضی کا اثر حسبِ توقع ہوا۔ مجرا میری ذات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ دوسرے تماشائی اپنی انا پر یہ تازیانے زیادہ دیر نہ سہہ سکے اور جب آخری شخص بھی باہر نکل گیا تو ایک شخص نے چلمن ہٹا کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے ایک بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کو دیکھا پھر جونہی رقاصہ میرے نزدیک آئی میں نے اسے کھینچ لیا (در) سازوں نے تڑپ کر دم توڑ دیا

اس کے بعد میں ہر وقت شراب میں کھویا رہنے لگا۔ وہسکی کا نپ ہمیشہ میری جیب میں رہتا۔ سارے بالاخانے میری فیاضی سے مانوس ہوتے چلے گئے اور میں تیزی کے ساتھ اس رنگین دنیا میں غرق ہونے لگا۔

میرے بڑھتے ہوئے اخراجات نے والد صاحب کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ کئی بار انہوں نے مجھے سمجھانا چاہا لیکن میں انہیں نظرانداز کرتا۔ پھر ایک مشہور ہوٹل میں اکبر کے ذریعے میری ملاقات گلنار سے ہوئی اور میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ستواں ناک نقشہ، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، صحت کی چمک اور سرخی لئے شہابی رنگت، لمبی لمبی سیاہ زلفیں، بڑی بڑی خوابناک مگر بے نیاز آنکھیں، گداز بدن اور متناسب اعضاء، دراز قامت، فیاضانہ مسکراہٹ کیا تھا جو اس کشمیرن میں نہیں تھا۔ میں اپنی زندگی میں حسن کا اتنا بھرپور اور جاندار پیکر پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اور وہ ہنس ہنس کر معصومانہ انداز میں میری حوصلہ افزائی کرتی رہی۔

پھر میں اس سے بے تکلف ہوتا چلا گیا۔ لیکن گلنار نے کبھی ایک حد سے تجاوز کی اجازت نہ دی۔ ہر روز ہم بڑے ہوٹلوں اور تفریحی مقامات پر ملتے، گھنٹوں باتیں کرتے، وہ دبے دبے لفظوں میں کچھ فرمائشیں کرتی اور میں اس کو موم کرنے کی خاطر اس کے سارے ناز اٹھاتا رہا۔

گلنار نے مجھ سے کبھی اپنے خاندانی پس منظر کا تذکرہ نہیں کیا نہ ہی میں نے یہ موضوع چھیڑا۔ اکبر سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ کسی ڈاکٹر کی بیٹی ہے۔ اس کی ماں کشمیرن اور باپ مقامی تھا۔ گلنار سے ملاقات کے بعد اکبر اور اس کے ساتھی ــــ دونوں ہی مجھ سے دور ہوتے چلے گئے۔ کہاں تو دن رات ہمارا ساتھ رہتا تھا یا اب دنوں ایک دوسرے سے نہ ملتے اور میں تو گلنار کے پیچھے ایسا دیوانہ تھا کہ ان تبدیلیوں پر کبھی غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

اور ایک روز میرے گھر والوں نے انکشاف کیا کہ وہ میری تمام حرکتوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ والد صاحب نے سخت الفاظ میں تنبیہ کی اور میرے جیب خرچ کو بہت زیادہ محدود کر دیا۔

ادھر گلنار کی فرمائشیں بڑھتی جا رہی تھیں میری دانست میں پورا معاملہ ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکا تھا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ گلنار کی تسخیر اب چند ہی دن کی بات نظر آنے لگی تھی۔

بدقسمتی سے ان ہی دنوں گلنار کی سالگرہ آپڑی۔ وہ یہ تقریب باقاعدہ نہیں مناتی تھی مگر فلیٹیز میں ایک سالگرہ کی دعوت دیکھ کر اس نے کہا کہ لوگ نجانے ایسی فضول تقریبات پر کیوں خرچ کرتے ہیں میں نے فخر کے ساتھ کہا کہ میں اس کی سالگرہ اس سے بھی زیادہ شان و شوکت سے منا سکتا ہوں۔ اس کے چہرے پر شوق کی سرخی آکر گذر گئی مگر اس نے پارٹی سے انکار کر دیا۔ پھر میں نے مصر ہو کر اس سے سالگرہ کی تاریخ معلوم کر ہی لی۔ اور اس

کی خوشنودی کے لئے کہا کہ پارٹی پر وہ رضامند نہیں تو نہ سہی، مگر میں اسے ایک یادگار تحفہ ضرور دوں گا۔

عورت اور خاص طور پر خوبصورت محبوبہ کے سامنے آدمی کس قدر اندھا اور بے وقوف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ میں اس سے یادگار تحفے کا وعدہ تو کر چکا تھا مگر گھر والے مجھ سے بدظن تھے۔ کسی سے رقم ملنے کی امید نہیں تھی۔ میں نے اپنی ماں کو سمجھایا مگر وہ کٹر شوہر پرست خاتون تھیں۔ انہوں نے والد صاحب کی مرضی کے بغیر کوئی بھی پیسہ دینے سے انکار کر دیا۔

سالگرہ سے ایک دن پہلے تک کوئی صورت نہیں بن سکی۔ آخر شام کے وقت میں ایک فیصلہ کر کے دکان پر جا پہنچا۔ وہاں میرے بڑے بھائی موجود تھے۔ پہلے تو میں نے دونوں ملازموں کو کام کے بہانے رخصت کیا پھر بھائی جان سے تین ہزار روپے مانگے۔ انہوں نے دوٹوک الفاظ میں انکار کر دیا۔

ان کے آمرانہ انداز پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ دکان ان کی نہیں میرے والد صاحب کی تھی اور اس پر ہمارا برابر کا حق تھا۔ وہ کون ہوتے تھے مجھے منع کرنے والے۔!

"بھائی جان، میں کہتا ہوں پیسے دو۔" میں نے آنکھیں نکال کر کہا۔

میرے اس رویّے پر وہ ٹپٹا گئے۔ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ میں اس حد تک بڑھ جاؤں گا۔ وہ اپنی گلو خلاصی کے لئے نرم لہجے میں بولے۔ "ابا سے بات کر لو۔ اس وقت یہاں اتنی رقم نہیں ہے۔"

میں نے بڑھ کر تجوری کا پٹ کھول ڈالا۔ سامنے ہی نوٹوں کی کئی گڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بھائی جان کو کچھ سمجھنے کا موقع دیئے بغیر میں نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی تجوری سے نکال لی۔

اسی وقت ابا جی بھی آ پہنچے اور صورتحال سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولے "کیا ہو رہا ہے صفدر؟"

"مجھے رقم درکار تھی۔ بھائی جان نے انکار کیا تو میں نے خود تجوری سے نکال لی۔" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔

ابا جی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ یہ سنتے ہی ان کا پارہ چڑھ گیا "حرام خور — تیری یہ مجال، رکھ دے وہ رقم واپس تجوری میں — میرا پیسہ اس لئے نہیں ہے کہ تو اس سے شراب اور بازاری عورتیں خریدتا پھرے۔"

میں نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے ابا جی کو گھورا اور کچھ کہے بغیر ان سے راستہ کاٹ کر باہر جانے لگا۔

غصے سے ان کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔ بدن پر رعشہ سا طاری ہو گیا اور انہوں نے پوری قوت سے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ "میں تجھے عاق کر دوں گا۔ تجھ میں ذرا شرم حیا....."

میں نے انہیں بات پوری کرنے کا موقع دیئے بغیر پوری قوت سے میز پر دھکیل دیا۔ وہ کراہ کر پیچھے گرے اور میں رقم سمیت تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

اس رات گلنار کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میرا ذہن بوجھل تھا دکان میں جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا تھا لیکن اس میں بیشتر غلطی ابا جی کی ہی تھی۔ اگر وہ اندازہ کر چکے تھے کہ میں بھائی جان سے رقم کے لئے الجھ رہا ہوں تو انہیں اندر آنے کے بجائے کہیں اور نکل جانا تھا۔ انہوں نے خود ہی تشدد اور تحقیر کر کے مجھے کھلی بغاوت پر اکسایا تھا۔

حسب معمول رات دو بجے میں گھر پہنچا تو چوکیدار نے پھاٹک کھولنے کے بجائے ذیلی کھڑکی سے آ کر بتایا کہ ابا جی پر بلڈ پریشر کا شدید دورہ پڑا ہے اور ان کا سخت حکم ہے کہ مجھے کسی قیمت پر بھی گھر میں نہ گھسنے دیا جائے

"دروازہ کھولو۔ ورنہ میں گاڑی چڑھا کر پھاٹک گرا دوں گا۔" میں جھنجھلا کر بولا۔

"نہیں صاحب۔" وہ اٹل اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "ہم بڑا صاحب اور بیگم صاحب کی خلاف ورزی کر کے اپنی روزی حرام نہیں کرے گا ——— خدا حافظ۔"

وہ میری گالیوں پر کان دھرے بغیر اندر جا گھسا اور ذیلی کھڑکی مقفل کر لی۔

ایک معمولی ملازم میری یوں تحقیر کرے۔ یہ بات مجھے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ میں نے پھاٹک گرانے کی نیت سے گاڑی آگے بڑھائی پھر ایک خیال کے تحت انجن بند کر کے کافی دیر تک مسلسل ہارن بجاتا چلا گیا۔ جب اس پر بھی صبر نہ آیا تو اتر کر گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اور اسی وقت ہٹائی جب ذیلی کھڑکی سے ماں چوکیدار کے ساتھ غصّے میں بپھری ہوئی باہر آئیں۔

انہوں نے آتے ہی میرے منہ پر تھپڑ مارا اور روتے ہوئے بولیں۔

"چلا جا یہاں سے ـــ اب اس گھر میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تو نے آج اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اللہ ان کو سلامت رکھے، میں تجھ جیسے اپنی کوکھ کے دس کیڑے ان پر قربان کر دوں گی۔ جا چلا جا یہاں سے۔"

غصے میں کچھ اور نہ کر سکا تو ان کے بازو پکڑ کر انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔

"میں اب بچہ نہیں ہوں۔ جو سالے گھر کے ملازم قدم قدم پر میرا پیچھا کرتے ہیں۔ میں ابا ہوں اور اب کبھی تمہیں اپنی صورت نہ دکھاؤں گا۔"

"تیری وجہ سے اس وقت وہ جس حال میں پڑے ہیں اس کے بعد یہاں کوئی تیرا روادار نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے اور میرے سینے پر گھونسے مارنے لگیں۔

میں طیش کے عالم میں گاڑی میں آیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس وقت میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ مزنگ سے گذرتے ہوئے اکبر کے گھر رات گذارنے کا خیال کیا لیکن میری طبیعت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ جس گھر میں کبھی میں نے قدم ہی نہیں رکھا آج وہاں رات بسر کروں۔

وہ پوری رات میں نے لارنس گارڈن میں گذار دی۔ صبح میں ایک ہوٹل میں ناشتہ کرنے پہنچا تو سرسری نظریں دوڑاتے ہوئے اخبار میں ایک عاق نامے پر نظر پڑی جو جلی حروف میں پہلے صفحے پر چھپا ہوا تھا۔ ابا جی نے اس اشتہار میں مجھ سے اپنے مکمل قطع تعلق کے ساتھ ہی مجھے ہر چیز سے عاق کر دیا تھا۔

اس وقت مجھے پہلی بار ہلکا سا احساس ہوا کہ جو کچھ ہوا غلط ہوا، مگر میرے دل میں اب بھی یہی خیال جاگزیں تھا کہ ان واقعات میں میرا قصور نہیں ہے ساری غلطی ابا جی کی ہے۔

دوپہر کو میں نے رنگ محل میں سے ایک صرّاف سے گلنار کے لئے ایک نہایت حسین اور نازک سا لاکٹ خریدا پھر وہیں سے ابا جی کے ایک دوست کی حیثیت میں گھر میں ٹیلی فون کیا۔

دوسری جانب سے کسی بھرائی ہوئی نسوانی آواز نے فون ریسیو کیا اور ابا جی کا نام سنتے ہی ادھر سے تقریباً ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا گیا کہ بلڈ پریشر کی وجہ سے ان کی دماغی شریان پھٹ گئی اور وہ صبح انتقال کر گئے۔ سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں خود کو ابا جی کا قاتل محسوس کرنے لگا۔

مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کس طرح گھر پہنچا مگر وہاں پھاٹک پر ہی دونوں بھائیوں نے دھکے دے دے کر مجھے باہر نکال دیا۔ ابا جی کی آخری وصیت تھی کہ مجھے گھر میں قدم نہ رکھنے دیا جائے نہ ان کے جنازے میں شریک ہونے دیا جائے۔

اور یہاں میری بے فکری اور خوش نصیبی کا پہلا باب بند ہو گیا۔

میں گاڑی میں سیدھا ہوٹل پہنچا اور وہاں شراب سے دل بہلانے لگا۔!

شام کو جب گلنار بنی سنوری وہاں پہنچی تو میں شراب کے نشے میں غرق ہو کر اپنی ساری پریشانیاں فراموش کر چکا تھا۔ میں نے دو نئے پیمانے بھر کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے گلے میں لاکٹ ڈال کر گرمجوشی سے اس کے ہاتھ دبائے۔ پھر میں نے اس کا جامِ صحت تجویز کیا۔ پیمانے ٹکرائے اور تلخ سیال ہمارے معدوں میں اتر گیا۔

اس روز گلنار نے بڑی حیل و حجت کے بعد شراب کو ہاتھ لگایا تھا ورنہ میرے اصرار کے باوجود اس نے کبھی ایک بوند بھی نہیں چکھی تھی۔ ہاں آخری بار وعدہ کیا تھا کہ اپنی سالگرہ پر محض میری خوشی کی خاطر وہ شراب چکھ لے گی اور اس نے اپنا یہ وعدہ پورا کر دیا تھا۔

جب رات کے سائے پھیلنے لگے اور مجھ پر شراب کا خمار گہرا ہونے لگا تو گلنار بھرے ہوٹل میں میری تشنہ دست درازیوں سے بوکھلا سی گئی۔ میں اسے اپنی باہنوں میں سمیٹ لینے کے لئے بے چین تھا۔ آخر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم ہوٹل کے وسیع سبزہ زار کے ایک نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھے جہاں کسی کی نظر پہنچنے کا امکان نہیں تھا۔

گلنار میرے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آ رہی تھی۔ اس کے رویّے نے میری بے بسی کو رقّت میں تبدیل کر دیا اور میں نے اس کے شانے سے سر ٹکا کر اسے اپنی پوری کہانی سنا ڈالی۔

میری کہانی سن کر وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔ پہلے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پوری رات میرے ساتھ گزارے گی۔ یا اب وہ اٹھنے کے لئے مضطرب تھی۔ اس وقت میں نشے میں تھا۔ اس لئے اس تبدیلی کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔ اور وہ آخرکار اپنے ڈیڈی کی پریشانی کا عذر کر کے اٹھ ہی گئی۔

میں لڑکھڑاتا ہوا اس کے ساتھ باہر تک آیا اور اسے اس کے گھر تک پہنچانے کی پیش کش کی جسے اس نے خوبصورتی سے ایک مشورے میں ٹال دیا۔

"جان اس وقت تم پریشان ہو۔ جو رقم تمہارے پاس ہے وہ زیادہ دیر ساتھ نہیں دے سکتی۔ تم شہر میں بھٹکنے کے بجائے اسی وقت اکبر کے پاس چلے جاؤ، وہ تمہیں کوئی بہتر مشورہ دے سکے گا۔"

بہرحال وہ چلی گئی اور میں سیدھا اکبر کے پاس جا پہنچا۔ اگر میں ہوش میں ہوتا تو کبھی اس تنگ و تاریک اور سال خوردہ مکان میں قدم نہ رکھتا۔ اکبر بھی اپنے دروازے پر مجھے موجود پا کر ہکا بکا رہ گیا۔

"آج سے پہلے میں تمہارے بلانے پر بھی اس گھر میں نہ آیا مگر آج کی یہ رات میں ساتھ بسر کروں گا۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اکبر نے میرے سارے حالات سننے کے بعد مجھے فوراً ہی کراچی چلے آنے کا مشورہ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لاہور میں میری ساکھ بیاجی کے نام سے تھی اور عاق نامے کے بعد میرے لئے کوئی بھی کاروبار اس شہر میں محال ہے اور مجھے رقم ضائع کئے بغیر کراچی پہنچ کر کوئی دھندا شروع کر دینا چاہیئے تھا۔

اگلے روز میں لاہور سے دل برداشتہ ہو کر کراچی روانہ ہو گیا چلنے سے پہلے میں نے اپنی کار بھی گیارہ ہزار روپے میں ایک دلال کو فروخت کر دی اس طرح میرے پاس کم وبیش پندرہ ہزار روپیہ ہو گیا۔

کراچی بلند و بالا عمارتوں، چمکتی کاروں اور روشنیوں کا ایک مفرور شہر ثابت ہوا سٹی اسٹیشن سے باہر آتے ہی میرے دل میں اس شہر کی عظمت کی دھاک بیٹھ گئی۔

میں تین دن تک رقم سینے سے لگائے خالی الذہنی کے عالم میں اس شہر کی خاک چھانتا رہا اور چوتھے روز اخبار پڑھتے ہوئے مجھے ایک کاروبار سوجھ ہی گیا۔

اگلے دو دن میں نے صراف بازار میں بے انتہا مصروفیت میں گزارے۔ تیسرا دن کباڑی کے گندے اور سستے ہوٹلوں میں زیر زمین کاروبار کرنے والوں سے بات چیت کرتے گزرا اور کراچی پہنچنے کے گیارہویں دن میں ابراہیم حیدری کے دور افتادہ اور ویران ساحل سے ایک لانچ میں غیر قانونی طور پر بحرین روانہ ہو گیا۔

اس سفر سے میری واپسی بائیس دن میں ہوئی۔ میں مجرمانہ احساس کے ساتھ ساحل پر اترا اور لانچ والوں کی فراہم کی ہوئی پک اپ کے ذریعے دوسرے غیر قانونی مسافروں کے ساتھ کچے راستوں سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگلے روز مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ صرف ایک مہینے کی محنت اور تھوڑی سی دشواریوں کے بعد میری رقم تین گنا ہو چکی تھی۔

یہ میری نئی زندگی کی ابتدا تھی۔

تین چار ہی پھیروں میں میری قسمت بدل گئی۔ میں نے ایک بہترین کار خریدی، چھوٹا سا مگر خوشنما مکان بھی لے لیا اور اس لائن کے سودے لینے والے بیشتر تاجر میرے شناسا ہو گئے۔ میں ان دنوں دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ لاہور والے واقعی عقلمند ہیں ـــــ وہاں کراچی کو روپے پیسے کا شہر کہتے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ یہاں پیسہ کمانا پیسہ خرچ کرنے سے بھی آسان ثابت ہو رہا ہے۔

لیکن خوش فہمی کا یہ دور چند ماہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ میں بالکل آزادانہ طور پر اپنا مال بیچتا تھا۔ یہ بات میرے دوسرے ہم پیشہ لوگوں کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے باہمی معاہدوں کے ذریعے منڈی کے نرخ مقرر کئے ہوئے تھے اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں کئی گنا نفع لینے کے باوجود ان سے کہیں سستا مال فراہم کر رہا ہوں۔

ایک روز چند خوفناک صورتوں والے غنڈے بولٹن مارکیٹ کے بھرے پڑے علاقے سے ریوالور کی خفیہ نوک پر مجھے یوں لیا رکے گئے کہ کسی کو بھی صورتِ حال کا اندازہ نہ ہو سکا۔

وہاں ایک ہوٹل کے عقبی حصے میں ایک شہرۂ آفاق اسمگلر سے پہلی بار میرا سامنا ہوا۔ وہ چٹائیوں کے سائبان تلے چارپائی پر بیٹھا ٹھرا پی رہا تھا۔

لانے والوں نے مجھے اس کے سامنے دھکیل دیا اور ایک بولا۔ "دادا ـــ یہی ہے وہ خانہ خراب کا بچہ جس نے صراف کا بھاؤ بگاڑا ہوا ہے۔"

اس نے ٹھرے کا گھونٹ بھر کر قہربار نظروں سے مجھے گھورا۔ "کیوں ٹے ـ کیا تمہارا آگے پیچھے کوئی رونے مرنے والا نہیں ہے جو ہمارا دھندا خراب کرتا ہے؟"

اس وقت نہ جانے کہاں سے میرے دل میں بے خوفی اُمڈ آئی میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے اس ہستی سے اسی کے لہجے میں سوال کیا۔ "تم ہمارے کو اپنا دوست سمجھتا ہے یا دشمن؟"

"اڑے ـ تم بھائی ہے ـ کالا دھندا کرنے والا سب بھائی ہے۔"

وہ خوش دلانہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "ابھی تم لائن میں نیا ہے اس لئے سناتا ہوں کہ تم بھی مال بناؤ، ہم بھی مال بنائے ۔۔۔ اگر تم دام گرا کر ابھی ہمارا کھوٹی کرے گا تو ہمارا آدمی صراف میں تمہارا گھسنا بند کر دے گا۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں ان داموں پر بھی کئی گنا نفع لیتا ہوں۔ اور میں کنٹرول سے کم دام نہیں لوں گا تو یہ پچھلے کا مال لے گا کون" میں اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ "تم کئی گنا نفع لیتا ہے کیا تمہارا سارا آدمی مفت کام کرتا ہے۔ یا تم اکیلا ہی ہیرا پھیری کرتا ہے"

اب اس کی بات میری سمجھ میں آئی اور میں نے پہلی بار جھوٹ کا سہارا لیا۔ "میں اپنے آدمیوں کو اتنا دیتا ہوں کہ وہ مر کر بھی میرے وفادار رہیں گے اور اس شہر میں میرے ذرا سے اشارے پر قیامت مچا دیں گے۔ مگر میں لڑنا نہیں چاہتا۔ تم شریف آدمی ہو۔ مارکیٹ کے دام بتا دو۔ آئندہ اس سے ایک پیسہ کم پر بھی مال نہیں بکے گا۔ یہ مرد کا وعدہ ہے۔"

میری اس جرأت اور بے خوفی کو اُس نے بہت پسند کیا اور داموں پر گفتگو کے بعد بڑے احترام کے ساتھ وہاں سے لوٹا دیا گیا۔

اس واقعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ باقاعدہ گروہ بنائے بغیر میں اس لائن میں زیادہ اوپر نہیں اُٹھ سکتا۔ اگر ایک بار یہ پرانے پاپی میرے پیچھے لگ گئے تو مجھے رنگے ہاتھوں پکڑوا سکتے ہیں، بے یار و مددگار سمجھ کر ٹھکانے لگا سکتے ہیں یا دھونس اور دھاندلی کے ذریعے میرا ناطقہ بند کر سکتے ہیں۔ میں جھوٹ کے سہارے اُن کے سامنے زیادہ دن اپنا بھرم نہ رکھ سکوں گا۔

یوں میں نے روشنیوں اور ہنگاموں کے اس شہر میں بہت احتیاط کے ساتھ اپنے گروہ کی تشکیل شروع کی اور آہستہ آہستہ میں نے کاروباری ساکھ والے ادارے قائم کر لئے جن کی آڑ میں بڑے پیمانے پر غیر قانونی درآمد و برآمد ہونے لگی۔ جوں جوں میرا گروہ پھیلتا گیا میرے نفع کی شرح گرنے لگی۔ گو مجموعی آمدنی لاکھوں میں ہوتی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے حریفوں نے بھاؤ قائم رکھنے کا جو نظام بنایا ہے وہ زندہ رہنے اور لوگوں کا منہ بند رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

مجھے اس تمام چکر میں خود کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ میں اعلیٰ ترین سماجی محفلوں میں ممتاز حیثیت میں شرکت کرتا، عمائدین شہر سے گہرے مراسم تھے۔ بہت سے سرکاری ملازم میرے کاروبار سے چشم پوشی کا لگا بندھا معاوضہ پاتے تھے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ اُن کی پشت پر میری ہی شخصیت ۔ ۔ ۔ رہا ہے۔

جیسے جیسے میری آمدنی بڑھتی گئی اکبر کی صحبت میں سیکھے ہوئے شوق رنگ جمانے لگے۔ شراب کے بغیر میرا زندہ رہنا محال نظر آنے لگا میرے ذہن پر ہمیشہ سرور کی ایک ہلکی سی لہر سوار رہتی تھی۔ شہر کے آزاد خیال گھرانوں کے ساتھ میرے مراسم اتنے گہرے تھے کہ تفریح گاہوں میں ہمیشہ دو چار لڑکیاں میرے ہمراہ ہوتیں شوقِ آوارگی کی تسکین کی خاطر شہر کے معزز قحبہ خانے میرے لئے چشم براہ ہوتے۔ ور میں ہر نئے جسم اور نئے روپ کا پہلا خریدار بنتے ہوئے عجیب سی لذت محسوس کرتا تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر مجھے ریس اور جوئے سے والہانہ دلبستگی تھی۔ میں ایک ایک نشست میں پچاس ساٹھ ہزار روپے ادھر سے اُدھر کر دیتا تھا۔ میں خطرناک اور جارحانہ انداز میں اسٹیک بڑھاتا تھا کہ اوسط درجے کے جواری میرا سامنا کرنے سے ہی گھبراتے تھے۔ بے نامی کامی جواری تو میرے سامنے آکر بھی اکثر پسینوں میں نہا جاتے۔

کسٹم والوں کے تین کامیاب چھاپوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا ہر میں میرے لئے کام کرنے والے صرف آٹھ آدمی میری شخصیت کے اصل روپ سے واقف تھے اور ان کے ذریعے جو لوگ میرے کام آتے انہیں کچھ علم نہ ہوتا تھا کہ اُن کا آقا کون ہے۔ شہر کے بیوپاری میرے بارے میں صرف اتنا جانتے تھے کہ میرے پاس کہیں سے غیر قانونی مال آتا ہے جو میں شاید کمیشن پر منڈی میں پھیلا دیتا ہوں۔

کسٹم افسر سے اطلاع ملتے پر میں نے اپنے آدمی سکندر کو پہلے یہ ہدایت دی تھی کہ وہ بندرگاہ کے قریب رہنے والے خلاصی کو جلد از جلد ملک سے باہر روانہ کر دے لیکن بعد میں مجھے اپنا یہ اقدام احمقانہ محسوس ہوا۔ وہ خلاصی میری بوٹ اور ایک دو کرائے کے آدمیوں سے واقف تھا اور یہ سب میری ذات اور میرے خاص گرگوں سے بھی قطعی آشنا نہیں تھے۔ ایسی صورت میں اتنا ہی کافی تھا کہ آئندہ اس خلاصی کو استعمال نہ کیا جائے لہٰذا میں نے اسے باہر بھجوانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ساحل کشتی کا معاملہ جب تک چلتا رہا میں نے احتیاط جاری رکھی کسٹم والے بھاگ دوڑ کے باوجود بھی ساحل کے مالک کا سراغ نہ لگا سکے اور یہ معاملہ سرد خانے کی زینت بن گیا۔

تین ماہ کے مسلسل جمود میں حالات کا دھارا مسلسل میرے خلاف ہی رہا۔ میں جوئے میں لمبی لمبی رقمیں ہارتا رہا۔ آمدنی کے ذرائع مسدود تھے۔ اسٹاف اور دفتر کی بھاری تنخواہیں باقاعدگی سے دی جا رہی تھیں۔

ساحل کا معاملہ دب جانے کے نویں روز خلیج کے علاقے سے میں نے ایک بڑی کھیپ منگوائی۔ اور پرانے فیصلے کے تحت پورے مال کا کھلا سودا کیا۔ اس کے تحت گہرے سمندر میں مال میری کشتی سے بیوپاری کی بوٹ میں لادے جانے کے بعد میرا رسک ختم ہو جاتا تھا۔

جہاں تک معاہدے کا تعلق تھا یہ سودا بخوبی مکمل ہو گیا۔ مگر بیوپاری کی کشتی ساحلی علاقے کے قریب گشتی پولیس کی نظروں میں آ گئی اور دھر لی گئی بیوپاری اتنے بڑے نقصان کو نہ سہہ سکا اور بدعہدی پر اُتر آیا۔ میں نے کئی بااثر افراد کو درمیان میں ڈالا لیکن اس سے ایک پیسہ بھی وصول نہ کر سکا۔

آنے والے دن میرے لئے کٹھن تھے۔ بار بار میرا مال پکڑا جانے لگا میں ہر وقت پریشان اور کھویا کھویا رہنے لگا۔ عام حالات میں کبھی مجھے تنہائی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب میں خود کو اس بھنور میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرنے لگا میرے ساتوں آدمی میرے جانثار تھے لیکن میرے اور اُن کے درمیان رتبے کی خلیج اس بُری طرح حائل تھی کہ میں اپنے مسائل پر اُن سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ رہ گئی سونی ـ تو وہ میری سیکرٹری بھی تھی اور داشتہ بھی۔ میں نے جس بنا پر اُس کو اپنے قرب کے لئے منتخب کیا وہ اس کی کم عقلی اور وفاداری تھی۔ وہ ہر وقت میرا خیال رکھتی ـ اُس کی موٹی عقل کے لئے میرے نازک مسائل ناقابلِ فہم تھے۔

ایسے میں کئی بار شدت کے ساتھ گلنار مجھے یاد آئی۔ لاہور سے آنے کے بعد مجھے نہ اس کی کوئی خبر ملی اور نہ ہی میں اس سے کسی طرح رابطہ قائم

کرسکا۔ یہ میری کھلی حماقت ہی تھی کہ طویل عرصے تک اُس سے قریبی تعلقات رکھنے کے باوجود میں اُس کے پتے سے ناواقف تھا، نہ ایک کے سوا اس سے ملاقات کا کوئی ذریعہ میرے سامنے تھا۔ ایک بار میں نے موہوم سی اُمید کے سہارے اکبر کو خط بھی لکھا لیکن وہ ڈاک خانے کی مہر کے ساتھ واپس آگیا جس سے اسی قدر معلوم ہوسکا کہ وہ پُرانا گھر چھوڑ چکا ہے۔

ان دنوں بس شراب مجھے سکون بخشتی تھی میرے اس رفیق نے کبھی مجھے دھوکا نہ دیا۔ اس کے ہر جام میں لذّت اور سکون کی ایک نئی دنیا میری منتظر رہتی تھی۔ ریس اور قمار بازی کے سدابہار شوق میری جھنجھلاہٹ کا سبب بنتے جارہے تھے۔ میری ذہنی حالت شاید ایسی ابتر تھی کہ ہر کھیل میں شکست میرا مقدر رہتی۔ ریس میں میرے منتخب کئے ہوئے گھوڑے ہمیشہ آخری نمبر پر رہتے یا ریس کے دوران ـــ زخمی ہوکر بھڑک جاتے۔

ایک روز میرے گھر پر جوئے کی مرگرم محفل جمی ہوئی تھی سوزی مستعدی کے ساتھ میرے مہمانوں کو شراب فراہم کررہی تھی اور میں مدّمقابل سے ہر بازی ہارتا جارہا تھا۔ چوتھی بازی پر میرے شریک نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس میں اب مزید ہارنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی!

"تم میرے ساتھی رہو گے!" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "ہار میری ہوگی اور جیت میں تم میرے برابر کے شریک ہوگے۔"

ان شرائط پر کسی کو بھی کھیلنے سے انکار نہ ہوتا۔

برج کا اگلا گیم شروع ہوا۔ سات بازیاں کھیلی گئیں لیکن کوئی فریق گیم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اور جب وہ منحوس ٹیلیفون آیا تو میں پچھلی بازی ہار چکا تھا۔ اس ہاتھ میں میری کال قائم ہوئی تھی۔ تمام کارڈ یقین دلا رہے تھے کہ اس بار گیم میرا ہے۔ میں ساتواں ہاتھ لے رہا تھا کہ اچانک گھنٹی بجی۔ سوزی نے فون اُٹھایا اور فوراً ہی گھبرائی ہوئی میری طرف آئی۔

"سر اہم کال ہے۔"

اس کا لہجہ بدشگونی کا مظہر تھا۔ میں نے ہاتھ ادھورا چھوڑا۔ اور تیزی سے فون کی طرف لپکا۔

دوسری طرف سے سکندر بول رہا تھا "سر بازی اُلٹ گئی۔ کسٹم والوں کو موٹر پارٹس کی تازہ کھیپ پر شبہ ہوگیا ہے اور کسٹم فورس نے کلکٹر کی نگرانی میں آفس کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔"

"دفتر میں کوئی ایسی دستاویز تو نہیں جس سے میری نشاندہی ہوسکے!" میں نے اپنی عرق آلود پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"سارا ریکارڈ وہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "ہم سب سخت خطرے میں گھر چکے ہیں۔"

"فرم کو بھول جاؤ۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا " او پہلی فرصت میں شہر سے نکل جاؤ۔ میرے اور تم سب کے بچاؤ کے لئے یہ ناگزیر ہوگیا ہے!"

"او کے سر!"

سلسلہ منقطع کرکے میں ٹیبل پر واپس آیا۔ سب لوگ میری بہ... ہوئی رنگت دیکھ کر پریشان تھے۔

"یہ آخری اور فیصلہ کن ہاتھ ہے!" میں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے اُن سے کہا "میں اس وقت نقد ادائیگی نہیں کرسکوں گا۔ یہ ہاتھ ہار گیا تو میرا یہ مکان پورے ساز و سامان سمیت فاتح ٹیم کی ملکیت ہو... حریف ٹیم اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے چہرے دمک اُٹھے۔ میرا آخر نا قابلِ یقین تھا۔ میرے مکان کی مالیت کسی طرح تین لاکھ... کم نہیں تھی جبکہ اس وقت تک میں صرف ساٹھ ہزار ہار رہا تھا۔

اب ایک بازی پر میری قسمت کا دارومدار تھا۔ ستر اسّی ہزا... کی جیت یا سجے سجائے مکان سے محرومی!

میرے کارڈ بہترین تھے جیت یقینی نظر آرہی تھی لیکن... نے فاش غلطی کرتے ہوئے ساتویں ہاتھ میں چال ڈمی کو دے دی اور جب... نے ڈمی کے کھلے ہوئے کارڈز پر نظر ڈالی تو میرا دل کھوپڑی میں دھمکنے لگا... اس ہاتھ میں کنٹریکٹ نہ بنا سکا۔ آٹھ ہاتھ باآسانی بن گئے۔ مگر اس کے بو... فورڈا ئمنڈز کا کنٹریکٹ نہ بنا سکا۔

جیتنے والے کرسیوں سے اچھل پڑے۔ میں نے شکست خو... انداز میں شراب کا آخری جام پیا۔ تجوری سے ساری رقم سمیٹ کر ایک سو... میں بھری اور ایک سادہ کاغذ پر تحریر کے ذریعے اس مکان سے جیتنے والوں... حق میں دست بردار ہوکر باہر آگیا۔

کار میں سوزی میرے پہلو میں موجود تھی۔ جیتنے والوں... ازراہِ ہمدردی ولایتی وہسکی کی چند بوتلیں ساتھ لانے کی اجازت... جو آواز کے ...... ساتھ ڈیش بورڈ کے نچلے خانے میں ڈھک...

کلفٹن برج اترنے کے بعد میں نے ویران اور... چوراہے پر کار روکی، سگریٹ کی ناکافی روشنی میں سوٹ کیس سے د... کے نئے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر سوزی کو تھمائیں اور اسے کار سے... کے لئے کہا۔

"میں ...... میں چلی جاؤں!" وہ حیرت سے ہکلاتے ہوئے...

"میں کہاں جاؤں گی سر؟"

میں تلخ انداز میں ہنسا اور بے رحمانہ لہجے میں بولا۔ "میں اب لکھ پتی نہیں رہا سوزی۔ تمہارا بوجھ میرے لئے اُٹھانا مشکل ہوگا۔ وہ فون سکندر کا تھا۔ آج کسٹم والوں نے دفتر پر چھاپا مارا ہے۔ اس وقت تک وہ وہاں رنگ کھرچ کر ان درآمد کئے ہوئے آٹو پارٹس کی اصلیت جان چکے ہوں گے جو دراصل سونے کے ڈھلے ہوئے ہیں۔ میرا کاروبار تباہ ہوگیا۔ مکان میں جوئے میں ہار گیا۔ اب سوٹ کیس کے چند ہزار روپے ہی میری کل پونجی ہیں میں نے سکندر سے کہہ دیا تھا کہ وہ لوگ روپوش ہوکر اپنی جان بچائیں۔ تم بھی آج رات کسی ہوٹل میں گذار کر اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ یہ بھول جانا کہ تم کبھی میری ملازم بھی تھیں ورنہ بدبختی تمہیں سرکاری مہمان خانے کی بے رحم سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے گی۔ جاؤ، اچھی بچی! اُتر جاؤ۔ تمہاری خدمات کو میں کبھی بھلا نہ سکوں گا۔"

وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری کہانی سنتی رہی جب میں نے آخری بار اُس کا رخسار تھپتھپایا تو وہ ہلکی سی چیخ مار کر میرے سینے سے آلگی۔ اور اس طرح بلک کر رو پڑی جیسے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے وہ خود کو یتیم محسوس کر رہی ہو!

میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اُسے دلاسہ دیا اور وہ بدنصیب لڑکی سات سال کی طویل رفاقت کے بعد کلفٹن برج کے اس ویران اور خوابیدہ چوراہے پر میری کار سے اُتر گئی۔ میں نے ہاتھ لہراتے ہوئے کار فریرہال کی طرف بڑھادی۔ اگلی پولیس پوسٹ پر پہنچ کر میں نے سر گھمایا تو تاروں کی مدھم چھاؤں میں ایک تاریک نسوانی ہیولا وہاں موجود تھا جہاں سوزی مجھ سے جُدا ہوئی تھی۔ میں اس وقت خود کو بے بس اور تنہا محسوس کررہا تھا میرے وجود پر بے وزنی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ ذہن میں بے نام سا سناٹا گونج رہا تھا!

کئی بار میں شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے سامنے سے گزرا لیکن گرفتاری کے خوف سے کہیں کا رُخ نہ کرسکا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس میری تلاش میں شہر کا ایک ایک کونہ سونگھتی پھر رہی ہوگی۔

میں گھنٹوں تک شہر میں بے مقصد گھومتا رہا۔ کوئنز روڈ پر ایک جگہ میں نے کار روکی اور پُرانی نمبر پلیٹ اُتار کر جھاڑیوں میں پھینک دی۔ اور کار میں موجود جعلی نمبر پلیٹیں لگالیں۔ اب کم از کم کار کے نمبروں کے سہارے پولیس مجھے تلاش نہیں کرسکتی تھی اور میں اپنی بدنصیبی کی یہ رات نسبتاً سکون سے گزار سکتا تھا۔

آخر کار میں نے وہ رات ایرپورٹ پر گزارنے کا ارادہ کیا۔ وہ منگل کی رات تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس رات ایرپورٹ پر بین الاقوامی پروازوں کا خاصا ہجوم رہتا ہے۔ میں اپنی کار کہیں بھی پارک کرکے وہ پوری رات باآسانی لوگوں کے ہجوم میں گزار سکتا تھا۔

جوں ہی میں اسٹار گیٹ پر پہنچا، معاً میری نگاہ پولیس کی بھاری جمعیت اور رُکی ہوئی گاڑیوں پر پڑی۔ پولیس ایرپورٹ کی ناکہ بندی کرچکی تھی اور ادھر جانے والی ہر کار کی تلاشی لی جارہی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ کار کی انڈیکیٹر لائٹ بند کی اور سیدھا ہائی وے پر ہولیا لیکن کوئی پولیس افسر میری یہ مشکوک حرکت دیکھ چکا تھا۔ اُس نے مجھے رکنے کے لئے زور سے وِسل بجائی۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے اور میں نے کار کی تمام روشنیاں گل کرکے رفتار بڑھادی! چند ہی ثانیوں میں مجھے عقب میں کئی روشنیاں اپنی طرف بڑھتی نظر آئیں۔ ساتھ ہی پولیس کی کار کا تیز سائرن میرے منتشر اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگا۔

میری کار کا جاندار انجن اس وقت پوری طرح میری مدد کر رہا تھا میرے لئے ایسی سنسنی خیز صورتِ حال سے دوچار ہونے کا وہ پہلا موقع تھا میں سڑک کی ناہمواری کی پرواہ کئے بغیر تیزی کے ساتھ بڑھتا رہا! ملیر ہالٹ کے نزدیک مجھے ریلوے کراسنگ کا پھاٹک بند نظر آیا۔ ایک ڈیزل انجن تیز شور مچاتا دھیمے دھیمے مین لائن سے لوکل ٹرین ٹریک کی طرف جارہا تھا۔ میں نے بریکوں پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اپنی کار ماڈل کالونی کو جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ کافی آگے نکلنے کے بعد میں نے پولیس کار کے سائرن کا شور سنا اور عقبی آئینے میں کئی روشنیاں بھی چمکتی نظر آئیں۔ میں برق رفتاری کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔ پھر میں نے کینٹونمنٹ ایریا میں داخل ہونے سے پہلے صرف ہیڈلائٹس روشن کرلیں تاکہ وہاں کے گشتی دستے کو کسی شبہ کا موقع نہ مل سکے!

اب میرے اعصاب پر شدید کھچاؤ طاری تھا۔ پیچھے پولیس تھی اور آگے والے سائرن کے شور سے مشکوک ہوکر مجھے روک سکتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں میرا رُخ اس راستے کی طرف تھا جس سے گزر کر میں سینی ٹوریم اور پھر یونیورسٹی روڈ جا نکلتا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ ابھی تک کسی نے میرا راستہ نہیں روکا تھا!

پھر میں کینٹونمنٹ ایریا کے آخری حصے پر جا پہنچا۔ پولیس سائرن کا شور اب بہت دور گونج رہا تھا۔ ہوسکتا ہے میرے ہی خوفزدہ ذہن کا وہم ہو اور پولیس والے کینٹونمنٹ ایریا میں پوری قوت سے

سائرن بجاتے رہنے کی جرأت نہ کرسکے ہوں اور خاموشی سے میرا تعاقب کررہے ہوں۔

چیک پوسٹ پر ایک سنتری میرے قریب آیا۔ میں نے یہاں جھوٹ کا سہارا لیا اور اُسے بتایا کہ دن کے وقت میں میجر فلاں کے پاس آیا تھا اور یونیورسٹی کیمپس میں میری رہائش ہے۔ جہاں میری بیوی سخت بیمار ہے۔ اُس کا فون ملنے پر میں جلدی کے خیال سے اس طرف سے یونیورسٹی واپس جارہا ہوں۔ پھر میں اُدھر سے صاف نکل گیا۔

اپنے پیشے کی ضروریات کے تحت میں شہر کے چپے چپے سے واقف تھا جب میں کنٹری کلب روڈ پر آیا تو پولیس کی جمعیت نہ جانے کہاں رہ چکی تھی۔ اس زمانے میں کنٹری کلب والے سے صرف جیل روڈ ہی کی طرف نکلا جاسکتا تھا۔ لیاقت آباد اور فیڈرل بی ایریا کو اس سڑک سے ملانے والے پُل تعمیر نہیں ہوئے تھے جب کہ میں شہر سے حتی الامکان دُور ہی رہنا چاہتا تھا۔ میں نے سبزی منڈی سے ذرا پہلے ٹرکوں کے بنائے ہوئے کچے راستے پر گاڑی ڈال دی۔ ایک قدیم گوٹھ، چند باغات اور کچھ زندی سے گزرنے کے بعد میں دوبارہ سڑک پر آ نکلا۔ یہ فیڈرل بی ایریا کی ایک متوسط آبادی تھی میرے لئے اب یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ میں کدھر جاؤں۔ میری کار کے ناکام تعاقب کے بعد وائرلیس کی مدد سے شاید پولیس کی مہم اور بھی سرگرم ہوچکی تھی۔ ان حالات میں دانستہ کوئی خطرہ مول لینا ناعاقبت اندیشی تھی جس کا میں متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

آخر کار میں نے منگھو پیر کا رُخ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیاقت آباد اور ناظم آباد کی ویران سڑکوں پر کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی اور میں مل ایریا اور پٹھان کالونی والی ندی سے ہوکر خوابیدہ پہاڑیوں کے دامن میں پھیلی ہوئی شفاف سڑک پر آگیا۔ میرا ارادہ تو گندھک ملے گرم پانی کے چشمے پر پناہ لینے کا تھا لیکن میں راستے ہی میں درختوں سے گھرے اس تالاب پر رُک گیا جہاں کئی پُرانے مگرمچھ پلے ہوئے ہیں۔

اس وقت رات اپنے آخری سانسوں پر تھی۔ مختصر سی بستی کے مکین گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور قانون کے محافظ بھی۔ شاید پولیس چوکی میں سو رہے تھے۔ ان بیچاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ایک مفرور مجرم ادھر کا رُخ کرسکتا ہے!

چند آوارہ کتوں نے ہیڈ لیمپس کی روشنی پڑنے پر کسلمندی کے ساتھ دبی دبی احتجاجی غراہٹوں کے ساتھ میرا استقبال کیا اور انجن بند ہونے کے بعد وہ دوبارہ سو گئے۔ میں نے اپنی کار ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں وہ سڑک سے نہیں دیکھی جاسکتی تھی! کار کے دروازے مقفل کرکے میں شراب کی ایک بوتل لئے مڑا تو اچانک ایک ہاتھ سختی کے ساتھ میرے داہنے کندھے پر جم گیا۔ میں نے بمشکل اپنی چیخ ضبط کی اور اچھل کر گھوما تو بوسیدہ گدڑی میں ملبوس ایک دراز قامت، باریش اور قوی شخص کو اپنے مقابل موجود پایا۔ اپنے خوف پر قابو پاتے ہی میں نے سخت لہجے میں اُس سے سوال کیا۔

"کیا بات ہے؟"

"بات!" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھے رکھے زور سے ہنسا اور اندھیرے میں اُس کے سفید سفید دانتوں کی قطاریں چمک اُٹھیں "تیری آواز کیوں کانپ رہی ہے؟"

"میری آواز؟" میں اُس کے ہنسنے پر بوکھلا گیا "میری آواز تو نہیں کانپ رہی"

"تیری پیشانی پر مقدر کی سیاہی چمک رہی ہے!" وہ سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں بولا "قانون سے فرار ہونے والے ایک نہ ایک دن تھک کر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔"

اس کا لہجہ اتنا اٹل اور پُراعتماد تھا کہ میری مزاحمت دم توڑ گئی اور میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ مجذوب اور درویش صفت لوگوں سے میں لاشعوری طور پر بہت زیادہ متاثر تھا۔ گو میں خود کبھی اس اوہام پرستی کا شکار نہیں ہوا تھا لیکن میں بہت سے ایسے لوگوں سے واقف تھا جو فقیروں کی ہدایت پر ریس اور سٹے کے سہارے راتوں رات لکھ پتی بن چکے تھے۔

"تیرے سانسوں سے شراب کی بو آ رہی ہے" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا "اگر تو نادیدہ عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو مقدس حدود سے باہر ہی رہنا ہوگا"

"نادیدہ عذاب!" میں نے آہستہ سے دہرایا۔

"ہاں۔ اِس دنیا میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو گناہگار آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں مگر یاد رکھ کہ ہر وہ چیز جس کے بارے میں انسان سوچ سکتا ہے موجود ہے، مگر اُسے دیکھنے کے لئے ریاض درکار ہوتا ہے!"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے پلٹا مگر میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا "بابا ___ مجھے کوئی ایسی طاقت عطا کردو جس کے ذریعے میں ہر خواہش پوری کرسکوں.... میں.... میں زندگی کا تعاقب کرتے کرتے بہت تھک گیا ہوں اور اب کسی گمنام گوشے میں روپوش ہوکر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"تیرا باطن میرے سامنے کُھلی کتاب ہے۔ میں پاپیوں کو کبھی فیض نہیں پہنچاتا۔" یہ کہہ کر اُس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر درختوں کی اوٹ میں مڑ گیا۔

چند ثانیے تو میں ہکا بکا کھڑا رہا پھر اُس کے روپوش ہوتے ہی آگے بڑھا لیکن درختوں کے اُس طرف میدان میں دُور دُور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا اور درویش پُراسرار طریقے پر نہ جانے کہاں روپوش ہوگیا تھا۔

رات کے باقی ماندہ لمحات میں نے ان اطراف کی خاک چھانتے ہوئے گزار دیئے میرے ذہن میں رہ رہ کر اس درویش کی بات سر اُبھار رہی تھی "انسان جس چیز کے بارے میں سوچتا ہے وہ موجود ہے۔"

جن، بھوت پریت، بدرُوحیں۔ انسان اُن میں سے ہر ایک کے بارے میں سوچتا ہے اور اُن کی موجودگی بے شمار انسانوں کے تجربات سے ثابت ہے لیکن اکثریت اُن کو نہیں دیکھ پاتی۔ کوہ قاف کی پریاں، سلیمانی ٹوپی، عنقا۔ یہ سب یقیناً موجود ہی ہوں گے ورنہ انسان اُن کے بارے میں کیوں سوچتا، اُن سے متعلق کہانیاں اور روایتیں کیوں جنم لیتیں۔ عمر عیار کی طلسماتی زنبیل بھی ضرور ہوگی۔ پھر اُن سب کے علاوہ بے شمار معجزے اور معجزاتی چیزیں ایسی ہیں جن کا ہونا مقدس اور آسمانی کتابوں سے ثابت ہے۔ مگر ہر کس و ناکس ان کے وجود سے لاعلم ہے۔

اور میرے ذہن میں بچپن سے پارس پتھر اور کیمیا کی کہانیاں موجود تھیں۔ یہ تصوّرات میرے لاشعور کی گہرائیوں میں ایسے پیوست تھے کہ میں کسی بھی مرحلے پر اُن کو فراموش نہیں کرسکا۔ مجھے احساس رہا کہ یہ موجود ہیں۔ کہاں اور کیسے ___؟ یہ مجھے علم نہیں تھا!

اور میں نے بارہا ایسی پُراسرار اور غیر مرئی قوتوں کے بارے میں بھی سوچا تھا جن کی تسخیر کے بعد ہر اس کام کی انجام دہی پر قادر ہو جس کے بارے میں میں خواہش کرتا۔

میرے فرار کی وہ پہلی رات ان ہی خیالات میں گزر گئی۔ اسی دوران میں میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اب کار کو سینے سے لگائے پھرنا خطرناک ہے۔ اس کی وجہ سے میں کہیں بھی رنگے ہاتھوں پکڑا جاسکتا تھا۔ میں نے کار میں سے نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس نکالا، دروازے مقفل کرکے چابیاں ایک طرف پھینکیں اور منہ اندھیرے لی مارکیٹ جانے والی پہلی بس میں بیٹھ گیا بس میں سفر کرتے ہوئے میری دانست میں کوئی ایسا خطرہ درپیش نہیں تھا جس کی بنا پر مجھے تشویش ہو۔

بس سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی لی مارکیٹ جا پہنچی وہاں مضافات سے آنے والی بسوں سے دودھ کے برتن، سبزی کے بورے اور ٹوکرے وغیرہ اُتارے جارہے تھے۔ میں نے کراچی کی زندگی کا یہ پہلو اس روز پہلی بار دیکھا اور کافی دیر تک دیکھتا رہا اور پھر ٹرامے لائن سے گذر کر لی مارکیٹ کے عقبی حصے کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہاں ایک سستے سے ہوٹل کی طرف میرے قدم خود بخود اُٹھ گئے۔ وہاں بسوں کا عملہ، گدھا گاڑی بان اور اسی قماش کے دوسرے لوگ دھواں اُگلتی چائے کی پیالیاں اپنے معدوں میں انڈیل کر خود کو نئے دن کی جدوجہد کے لئے تیار کررہے تھے! ایک طرف مٹی کے تیل کے چولہے پر تازہ تازہ پوریاں بن رہی تھیں جن کی بو سے میری بھوک جاگ اُٹھی!

میں ہوٹل میں جا بیٹھا۔ آس پاس کی کئی میزوں پر لمبے لمبے بالوں اور عجیب و غریب لباس والے ہپی لڑکے لڑکیاں بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے بعض سفید فام میز پر سر رکھے یوں اونگھ یا سو رہے تھے جیسے پچھلی شب اُنھوں نے اسی مختصر سی میز پر گزاری ہو۔ دوسرے قدرے ہشاش بشاش نظر آرہے تھے!

میرے آرڈر پر ہوٹل کے ملازم نے پوریوں اور چائے پر مشتمل ناشتہ میز پر سجادیا۔ ابھی میں نے پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ پے در پے بُری چیخوں کی آواز سُنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر میز سے اٹھا تو ہوٹل کی ایک میز پر اونگھتی ہوئی سفید فام ہپّی لڑکی اچھل اچھل کر کرب کے عالم میں یوں چیخ رہی تھی جیسے کوئی اُسے ذبح کئے دے رہا ہو۔ اُس کی ادھ کھلی آنکھوں میں بے نام سی ویرانی ناچ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں زندگی کی چمک نام کو نہ تھی۔ معاً ہوٹل کا مالک کاؤنٹر سے نکل کر دانت پیستا ہوا اس کی طرف لپکا۔ لڑکی نے اسے دیکھتے ہی اپنے بائیں شانے سے مردانہ بش شرٹ کی آستین سرکائی اور اپنا بازو اس کے سامنے پھیلا دیا۔ ہوٹل کے مالک نے فحش گالیاں دے کر اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکا اور اُسے بے دردی سے کھینچتا ہوا ہوٹل سے باہر لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے لڑکی کو زور سے دھکا دیا اور وہ چیختی ہوئی زمین پر گر گئی۔

لڑکی کے ساتھی سفید فام ہپّی خاموشی اور لاتعلقی کے ساتھ یہ سارا کھیل دیکھتے رہے۔

یہ قصہ میری سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ بظاہر ہوٹل کے مالک کا رویّہ جارحانہ تھا اور وہ لڑکی مظلوم لگ رہی تھی نہ جانے اس بیچاری کو کیا تکلیف لاحق تھی لیکن ہوٹل والے نے کوئی باز پرس کئے بغیر اُسے باہر نکال پھینکا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں ناشتہ چھوڑ کر باہر پڑی ہوئی لڑکی

کے قریب پہنچا۔ وہ تقریباً نزع اور بے ہوشی کے عالم میں نیچے پڑی کراہ رہی تھی اور اُس کے گرد کئی تماشائی جمع ہو گئے تھے! میں نے آہستگی سے لڑکی کا شانہ ہلایا لیکن اُس کی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا۔ میرا ہمدردانہ رویّہ دیکھ کر ایک ہپی لڑکا تیزی کے ساتھ میری طرف آیا اور ہاتھ پھیلا کر بے باکانہ انداز میں بولا "چیرٹی ۔ چیرٹی فار ہر لائف ۔"

میں اس کی بات سمجھ نہ سکا۔ آخر لڑکی کی زندگی کے لئے وہ خیرات کیوں مانگ رہا تھا۔

"اسے کیا بیماری ہے؟" میں نے شستہ انگریزی میں اُس سے سوال کیا۔

"خیرات دینی ہے تو دو۔ بحث نہ کرو، بس یہ تھوڑی ہی دیر کی مہمان ہے۔" وہ منہ بنا کر رکھائی سے بولا۔

میں نے پانچ روپے کا نوٹ اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا جسے دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے پھرتی کے ساتھ لڑکی کو اپنی باہوں پر اُٹھایا اور ہوٹل کے مالک کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوٹل کے عقبی حصّے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں ایک دروازے پر بڑے بڑے حروف میں پرائیویٹ لکھا ہوا تھا۔ اپنے فطری تجسس کے تحت میں بھی اس لڑکے کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہاں ایک چارپائی اور چند کرسیوں کے قریب ہی چھوٹی سی الماری بھی موجود تھی۔ ہپی نے بے ہوش لڑکی کو چارپائی پر لٹا دیا۔ اسی وقت ہوٹل والا بھی زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا وہاں آیا۔ لڑکے نے جھٹ پانچ کا نوٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ہوٹل والے نے دو روپے اسے لوٹا دیئے اور الماری کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ سے بولا "صاحب اس حرامزادی سے بولو اب ادھر سے دفع ہو جائے۔ ادھر مر گئی تو پولیس بلاوجہ اپنا دھندا خراب کرے گی!"

"آخر اسے مرض کیا ہے؟" میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

"ہوگا کیا" وہ ایک بوتل سے کوئی سیال شیشے کی سرنج میں کھینچتا ہوا بولا "یہ سب مفت خورے ہیں۔ سالوں کو دن میں مارفیا کے تین انجکشن نہ ملیں تو سسک سسک کر مر جائیں گے مگر پیسہ ایک نہیں کھتے"

اب معاملہ میری سمجھ میں آیا۔ ہوٹل والے نے بڑی بے دلی سے لڑکی کے بازو میں سرنج کی سوئی اتار دی اور سارا سیال اس کی رگوں میں پہنچا دیا۔ میں نے قریب سے دیکھا کہ لڑکی کے پورے بازو پر سوئیوں کے بے شمار ننھے ننھے داغ نمایاں ہیں۔

ہوٹل والا لاپروایانہ انداز میں الماری مقفل کر کے واپس لوٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور بالکل چاق و چوبند چارپائی سے اُتر کھڑی ہوئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ذرا دیر پہلے نزع کے عالم میں سسک رہی تھی۔

"ان صاحب نے تمہارے لئے پانچ روپے کی خیرات دی تھی!" ہپی لڑکے نے ایمانداری سے باقی ماندہ دو روپے اس لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے میرے بارے میں کہا۔ لڑکی کے چہرے پر اس وقت زندگی کی بھرپور چمک نمایاں تھی۔ اُس نے بڑی بڑی آنکھوں سے احسانمندی کے ساتھ مجھے دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی "کیا آپ مزید ایک روپے میں مجھے خریدنا پسند کریں گے تاکہ میں دوپہر میں دوسرا انجکشن لے کر آج کا دن سکون سے گزار سکوں!"

میں نے حیرت اور ملامت بھری نظروں سے اس جسم فروش نوجوان لڑکی کو گھورا اور مزید ایک روپیہ اُس کو دے کر باہر آگیا جہاں ناشتہ میرا منتظر تھا۔

وہ لڑکی اس کمرے سے ٹہلتی ہوئی باہر آئی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اُسے دوبارہ وہاں بیٹھتے دیکھ کر ہوٹل والا خطرناک تیوروں کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔ اسی وقت لڑکی نے تین روپے چٹکی میں دبا کر اُسے دکھائے اور وہ سر جھکا کر واپس کاؤنٹر پر چلا گیا۔

ناشتے کے دوران میں نے دیکھا کہ بشیر ہپی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اُمید بھری نگاہوں سے بار بار میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ اُن سے گلو خلاصی کے لئے میں نے اُن کی طرف توجہ دینی ترک کر دی۔ ناشتہ ختم کیا اور پیسے ادا کر کے باہر آگیا۔

میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس سوٹ کیس کو کہیں محفوظ کرنا تھا جس میں میری کل پونجی موجود تھی۔ اُس کی وجہ سے میں پولیس کی نظروں میں مشکوک ہو سکتا تھا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ میں کراچی سے باہر نہ جاؤں اور یہیں رہتے ہوئے خود کو پولیس کی دستبرد سے بچاؤں۔

لی مارکیٹ کے قرب و جوار میں گھومتے ہوئے آخر کار مجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ میں نے بازار سے سلے سلائے کرتے پاجاموں کے کئی جوڑے خرید کر ایک نئے سوٹ کیس میں ڈالے اور ایک گھٹیا سے ہوٹل میں جا پہنچا۔ کمرے کا کرایہ پانچ روپے روزانہ تھا۔ اس گندے کمرے میں شاید عام حالات میں تھوکنا بھی پسند نہ کرتا لیکن اب میں وہاں رہنے پر مجبور تھا۔ پولیس یا میرے شناسا سوچ بھی نہ سکتے ہوں گے کہ میں کسی ایسی جگہ پناہ لوں گا۔

نہا دھو کر میں نے لباس تبدیل کیا اور ملازم سے تازہ اخبار منگوایا۔ پہلے ہی صفحے پر جلی سرخیوں میں کسٹم والوں کے کامیاب چھاپے

خبر تھی۔ سمندر شہر سے فرار کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور پولیس کو توقع تھی کہ وہ بہت جلد اس بین الاقوامی گروہ کے سرغنے تک جا پہنچے گی۔ تفتیش کے سلسلے میں پولیس پوری رازداری سے کام لے رہی تھی اور اخبار والوں نے اپنے طور پر سونا اسمگل کرنے کے اس نرالے طریقے پر دل کھول کر قیاس آرائیاں کی تھیں اور کسٹم والوں پر بھی کھلی تنقید کی تھی جن کے ہاتھوں سے غیر قانونی سونا گزر کر ملک میں آتا رہا۔

بین الاقوامی گروہ کی ترکیب پڑھ کر میں بے اختیار مسکرا اُٹھا۔ مجھے اس بات پر فخر کا احساس ہوا کہ میری ذہنی صلاحیتوں نے پولیس کو غلط راستے پر ڈالا ہوا تھا۔ اسی خبر کے نیچے ایک اور بھی متعلقہ سرخی تھی۔ ایئرپورٹ سے ایک مشکوک کار کے تعاقب اور پھر فرار کی سنسنی خیز کہانی۔ پولیس نے مفرور کار کے بارے میں کسی قسم کی رائے زنی سے انکار کیا تھا!

شام کے وقت میں سادہ شیشوں کی عینک اور ٹوپی لگا کر کرتے پاجامے میں ہوٹل سے باہر نکلا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں میری حرکات و سکنات ہوٹل والوں کو میرے متعلق شبہ میں مبتلا نہ کر دیں۔

میں گیارہ دن تک اس غلیظ ہوٹل میں مقیم رہا۔ اس دوران میں میرے چہرے پر خشخشی داڑھی بھی اُگ آئی تھی اور میری شناخت بظاہر ناممکن ہو کر رہ گئی تھی۔ میں دن بھر ہوٹل سے باہر رہتا تھا اور رات میں خاموشی سے اپنے کمرے میں سو جاتا تھا۔ شراب اور جوئے کی عادتوں نے اس عرصے میں مجھے بہت پریشان کیا۔ شراب تو خیر میں باہر ہی پیتا تھا لیکن اپنے معیار کا جوا کھیلنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔

اس دوران میں تین مرتبہ میں منگھو پیر بھی گیا لیکن اس گدڑی پوش فقیر کا کہیں سراغ نہ مل سکا جو مجھے فرار کی پہلی رات وہاں ملا تھا۔ بارھویں دن اخبار میں میرے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر تھی۔ پولیس نے میرے فرار کے اگلے ہی روز منگھو پیر کے علاقے سے جعلی نمبر والی کار برآمد کر لی تھی اور اب اس کا خیال تھا کہ مبینہ سرغنہ ملک سے فرار ہو چکا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور سوچا کہ اب مجھے اپنی بدلی ہوئی وضع قطع آزمانی چاہیے۔ اس بارے میں میں نے ستار سیٹھ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں اُن کی فرم سائکھ نیپیر روڈ پر واقع تھی۔ میں نے ہوٹل سے اُتر کر بولٹن مارکیٹ جانے والی ٹرام پکڑی اور ذرا ہی دیر میں ڈینسو ہال جا اُترا۔ میں نے مخالف سمت کی فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے ستار سیٹھ کی فرم پر نظر ڈالی۔

میں نے ایک بار پھر اپنے اقدام کے بارے میں سوچا۔ اوّل تو مجھے توقع ہی نہیں تھی کہ وہ مجھے پہچان لے گا اور وہ پہچان بھی لیتا تو پولیس کو باخبر کرنے کی کمینگی ہرگز نہ کرتا۔ میں آفس میں داخل ہوا تو ایک سیلزمین میری طرف متوجہ ہوا لیکن میں اندرونی حصے میں ستار سیٹھ کی میز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

"السلام علیکم!" میں نے اُس کے سامنے رک کر بلند آواز میں کہا۔ اُس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے چونک کر نظریں اُٹھائیں اور سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے بہترین قسم کے ڈور لاک کی ایک بڑی تعداد درکار ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ وہ جس انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے چہرے پر کوئی خاص بات دیکھ چکا ہے اور اب اپنا حافظہ کرید رہا ہے!

"تشریف رکھئے!" اُس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا "آپ کو کتنی تعداد کی ضرورت ہے؟"

"ساٹھ درجن کے قریب!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"آیئے اوپر کیبن میں چلیں!" اُس نے اچانک اُٹھتے ہوئے کہا اور مجھے اُس کی تقلید کرنی پڑی۔

وہ کیبن ستار سیٹھ کی آرام گاہ تھا جہاں وہ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کیا کرتا تھا۔ وہاں بڑا فرشی قالین بچھا ہوا تھا جس پر کئی تپائیاں اور ڈیسک رکھے ہوئے تھے۔ ستار سیٹھ نے ایک ملازم کو کچھ تالوں کے نمونے لانے کی ہدایت کی اور خود غیر ارادی طور پر ایک ڈیسک سے تاشوں کی گڈی نکال کر پتّوں کو اوپر نیچے کرنے لگا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"کیا آپ کوئٹہ تالے کہیں سپلائی کرتے ہیں؟" ستار کے چہرے سے اب الجھن دُور ہو چکی تھی۔

"نہیں مجھے کوئٹے میں سرکاری دفاتر کی تعمیر کا ایک بڑا ٹھیکہ ملا ہوا ہے۔ یہ سارے تالے اسی سلسلے میں درکار ہیں۔" میں نے رک رک کر کہا۔

"ہول سیل میں آپ کے معیار کا ایک تالا اکیس بائیس روپے سے کم نہیں ملے گا۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

پھر کئی قسم کے تالے سامنے آگئے اور ہم اُن کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ باتوں ہی باتوں میں ستار سیٹھ نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی تاشوں کی گڈی قالین پر سیدھی رکھ دی۔ ہماری گفتگو جاری رہی لیکن میرا ذہن تاش کی گڈی میں الجھا ہوا تھا۔ وہاں سب سے اوپر چڑیا کا غلام میرا منہ چڑا رہا تھا۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ گڈی اُٹھاؤں مگر کسی خیال کے تحت باز ہی رہا۔

پھر ستار سیٹھ ایک تالے کا اسٹاک دیکھنے کے لئے کچھ کاغذات کی طرف متوجہ ہوا میں نے اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ گڈی اٹھالی اور سرسری انداز میں اُس کا جائزہ لیتے ہوئے حکم کی بیگم سب سے اوپر کر کے وہ گڈی اسی طرح واپس قالین پر رکھ دی۔ گڈی رکھ کر میں نے سر اوپر اُٹھایا تو ستار سیٹھ کو اپنی جانب نگراں دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔ شاید وہ شروع ہی سے میری بے چینی نوٹ کر رہا تھا اور اسٹاک چیک کرنے کے بہانے اُس نے خود مجھے موقع فراہم کیا تھا!

میں نے اپنی کمزوری پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا میرے سارے شناسا اس بات سے واقف تھے کہ میں شعوری اور لاشعوری طور پر ہمیشہ بند گڈی میں حکم کی بیگم سب سے نیچے لگانے کا عادی ہوں اور ستار سیٹھ نے شاید میرے بارے میں اپنے شبہ کی تصدیق کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا!

میں نے سوچا کہ اب وہ زور کا قہقہہ لگا کر بتائے گا کہ وہ مجھے پہچان چکا ہے مگر کئی سیکنڈ تک میری طرف دیکھنے کے بعد وہ پھر تالوں کے موضوع پر آ گیا۔ اُس کے ناقابلِ فہم رویئے نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا نہ جانے اس خبیث کے کیا منصوبے تھے؟ یہ بات تو کافی حد تک یقینی تھی کہ وہ مجھے پہچان چکا ہے۔ میں نے جلدی جلدی ساری بات ختم کی اور وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا جب سے مجھے اس کی جانب سے شبہ ہوا تھا میں جلد از جلد اس کے دفتر سے نکل جانا چاہتا تھا جو مجھے اپنے لئے چوہے دان ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔

اوپر والے کیبن سے نکلتے ہوئے ستار سیٹھ میرے قریب آیا اور شانے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا "صفدر بھائی یہ سالا حکم کا بیگم تم کو مروائے گا۔ اور آج تو تم ادھر آیا آئندہ نہ آنا۔ سارے شہر کا پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ کیا فائدہ تمہارے ساتھ ہم سالا بھی مارا جائے گا۔ آجکل ویسے ہی دھندا مندا ہے!"

میں نے پلٹ کر قہر بار نظروں سے اُسے گھورا "تو مجھے دیکھتے ہی تمہیں شبہ ہو گیا تھا؟"

"شک تو پڑا تھا۔ پر حکم کی بیگم نہ ہوتی تو کوئی مائی کا لال تم کو نہیں پہچان سکتا تھا۔!" وہ تعریفی لہجے میں بولا "ابھی یہ بولو کہ کام کیا تھا دو چار سو کا ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں!"

کاروبار کے مندے کا تذکرہ سنتے ہی میں سمجھ چکا تھا کہ وہ میری آمد کو کیش کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس سے کچھ رقم لینے آیا ہوں اور اسی اندیشے کے پیشِ نظر اُس نے میرے بولنے سے قبل اپنی دانست میں ہوشیاری کرتے ہوئے دو چار سو کی پیشکش کر ڈالی تھی۔

"صفدر کے دن ضرور بگڑ گئے ہیں ستار سیٹھ، مگر وہ بھکاری نہیں ہے!" میں زہریلے لہجے میں کہہ کر سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ ستار سیٹھ کا منہ نوچ ڈالوں لیکن اس وقت کوئی ایسی حرکت خودکشی کے مترادف تھی۔ میں خاموشی سے اُس کی دکان سے باہر آیا اور غصّہ میں کھولتا گیا۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ شہر کی ہنگامہ خیز زندگی دھندلکوں میں ڈوب چلی تھی۔ ستار سیٹھ کے رویّے نے طبیعت ایسی بدمزہ کر دی تھی کہ میں سیدھا ہپیوں والے ہوٹل کی طرف ہو لیا۔ وہاں آ کر ایک تبدیلی نظر آئی۔ وہ کمسن ہپی لڑکے گاہکوں کو سامان پہنچا رہے تھے مجھے یقین تھا کہ ہوٹل والے نے مارفیا اور دو وقت کھانے کے عوض اُن کے جملہ حقوق خرید لئے ہوں گے۔ ان دونوں کے علاوہ آج ہوٹل میں کوئی لڑکی موجود نہیں تھی۔ میں کچھ دیر تک ایک خالی میز پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ ریکارڈنگ کا تیز شور میری سماعت سے بالا ہی بالا گزر رہا تھا اور میں بس یہ سوچ رہا تھا کہ ستار سیٹھ سے اُس کے تحقیر آمیز رویّے کا انتقام کس طرح لوں!

مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک سفید فام، خوبرو اور جوان لڑکی رنگ برنگ لباس پہنے تقریباً دوڑتی ہوئی کاؤنٹر پر آئی۔ اُس کا سارا بدن پسینوں میں ڈوبا ہوا تھا اور چہرہ یرقان کے کسی مریض کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس لڑکی نے مٹھی میں دبے ہوئے چند روپے کاؤنٹر پر ڈالے اور ہوٹل والا کھڑکی کے ساتھ اُسے لے کر عقبی حصّے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ لڑکی بالکل پُرسکون اور نارمل حالت میں باہر آئی اور ہوٹل سے نکل گئی۔ میں نے بھی کاؤنٹر پر جا کر جلدی سے پیسے دیئے اور اُس کے تعاقب میں ہو لیا۔ لی مارکیٹ کے تانگہ اسٹینڈ کے قریب آ کر میں اُس کے قریب جا پہنچا اور اُس کے پہلو بہ پہلو چلنے لگا۔ اُس نے بھی ایک بار بے نیازی سے میری طرف دیکھا اور لاتعلقی کے انداز میں آگے بڑھتی رہی۔

"آج کی رات کیا تم میرا مہمان بننا پسند کرو گی؟" میں نے شستہ انگریزی میں اُس سے سرگوشی کی۔

جواب میں اُس کا ردِ عمل حوصلہ افزا نہیں تھا۔ اُس نے رُک کر بس آپ تانے کے لئے مجھے گھورا پھر پوری قوت سے میرے منہ پر طمانچہ رسید کرتے ہوئے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میرے اوسان خطا ہو گئے میں نے بھاگنا چاہا لیکن اس بے باک لڑکی نے میرا گریبان پکڑ لیا اور دیکھتے دیکھتے ہمارے گرد بے شمار راہگیر جمع ہو گئے۔ وہ لڑکی وہاں کھڑی غلیظ ترین انگریزی گالیاں ایجاد کرتی رہی۔ تماشائی مجھ پر بے رحمانہ فقرے بازی کر رہے تھے اور میرا بس نہ چلتا تھا ورنہ میں زمین میں دھنس جاتا۔

یہ تماشہ چند منٹ ہی جاری رہا۔ دو پولیس والے بھیڑ چیرتے وسط میں آئے اور کوئی پوچھ گچھ کئے بغیر ایک نے میری گردن دبوچی اور دوسرے نے پیٹ میں دو تین گھونسے لگائے۔

تماشائیوں میں سے ہی ایک ترجمان بھی پیدا ہو گیا جس کے ذریعے لڑکی نے پولیس والوں کو بتایا کہ میں اُسے اغوا کر کے اس کی عصمت دری کی نیت رکھتا تھا۔

گواہی کے نام سے ترجمان سمیت ساری بھیڑ کھسک گئی اور پولیس والے مجھے پکڑ کر تھانے کی طرف لے چلے۔ وہ لڑکی بھی اُن کے ساتھ ہی تھی۔

پورے شہر کی پولیس کو کامیابی کے ساتھ دو ہفتے تک ڈاج دینے کے بعد میں خود ہی اپنی شامت کو دعوت دے بیٹھا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں چھان بین کے نتیجے میں پولیس میری اصلیت سے آگاہ نہ ہو جائے۔ میں نے راستے میں گڑگڑا کر ان دونوں کو معقول رشوت کی پیشکش کی جس پر اُن میں سے ایک کا رویّہ قدرے نرم ہوا لیکن دوسرا اخلاقیات کا کوئی مبلغ معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے میرا گریبان کئی بار اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ میرا دم سینے میں گھٹنے لگا، اور میں نے زبان بند کر کے خود کو حالات کے حوالے کر دیا

وہ میری زندگی کا تلخ تجربہ تھا۔ میں خود کو ان کے تحقیر آمیز رویّے سے بچاتے ہوئے بغیر مزاحمت کئے اُن کے ہمراہ تھانے کی طرف جا رہا تھا لیکن وہ دونوں سپاہی بدفام ہپی لڑکی پر اپنی غیرت مندی کا اظہار کرنے کے لئے کبھی مجھے دھمکی دے رہے تھے کبھی مجھے گالیوں سے نواز رہے تھے۔ وہ ہپی لڑکی ان دونوں کی گھٹیا حرکات کا کوئی اثر لئے بغیر ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے راہگیر چند ثانیوں کے لئے رُک کر تماشہ دیکھتے۔ پھر چلتے چلتے ہوئے تبصرے کرتے یا چست فقرے کستے اور آگے نکل جاتے۔

اپنی اس ذلت پر میرا خون کسی آتش فشاں لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت ان دونوں سپاہیوں کے ٹکڑے اُڑا کر انہیں غیر انسانی سلوک کا مزا چکھاؤں لیکن میں کچھ نہ کر سکا۔ میری زندگی میں پہلی بار کسی نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا مگر میں بے بس تھا۔

آخر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے ندامت بھرے لہجے میں اس ہپی کو مخاطب کیا۔

اُس نے حقارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور روکھے لہجے میں بولی۔ "کیا بات ہے؟"

"جو کچھ ہوا اُس پر مجھے سخت افسوس ہے"

"خاموش چلتا ہے یا ابھی زبان کے ٹکڑے جھاڑوں" ایک سپاہی نے میری گردن پر ہاتھ مارتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

اس بار میں ضبط نہ کر سکا چلتے چلتے میرے قدم زمین میں گڑ گئے اور میں قہر بار نظروں سے باری باری ان دونوں کو گھورنے لگا۔

شاید میرا رویّہ اُن کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ ایک دم بوکھلائے ہوئے نظر آنے لگے اور دوسرا سپاہی جلدی سے بولا "اگر اب لڑکی سے بدتمیزی کی تو.....!" اُس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ میرا اور اُس کا آپس کا معاملہ ہے" میں غرّایا "تم دونوں مجھے بات کرنے سے نہیں روک سکتے۔ یہ لڑکی شکایت کرے تو تم جو چاہو میرے ساتھ کر سکتے ہو"

وہ کچھ نہ بولے اور میں خود بخود آگے بڑھنے لگا۔

"تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر مجھے بھی افسوس ہے!" کچھ دیر کے سکوت کے بعد لڑکی نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"تم غور کرو تو اس میں میرا قصور نہیں ہے" میرے لہجے میں اب بھی پشیمانی نمایاں تھی "اس ہوٹل میں آنے والی تم جیسی بہت سی لڑکیاں چند سکوں کے عوض اپنا جسم فروخت کرنے پر تُلی رہتی ہیں تاکہ انہیں مقررہ وقت پر مارفیا کا انجکشن میسر آ سکے"

"پولیس والوں کے سلوک سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمہاری پہلی غلطی نہیں ہے۔ وہ شاید تم جیسے عادی مجرم کو خوب جانتے ہیں اور میں عادی مجرموں سے سخت نفرت کرتی ہوں خاص طور پر اخلاقی مجرموں سے!"

وہ نشہ باز ذلیل ہپی لڑکی مجھے اخلاقیات کا درس دے رہی تھی جی تو یہ چاہا کہ پہلے اس سے مارفیا کے استعمال کا اخلاقی جواز دریافت کروں پھر سرِعام اسے برہنہ کر ڈالوں!

"یہ تو وحشی ہیں!" میں نے صاف ستھری انگریزی میں گفتگو برقرار رکھی۔ "تمہاری چمڑی سفید ہے اور میں اُن کا ہم نسل ہوں، یہ محض اپنی آبائی غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے تمہاری شکایت پر ایک چار سالہ معصوم بچّے کے ساتھ بھی یہی سلوک کر سکتے ہیں جو میرے ساتھ ہو رہا ہے"

وہ جواب میں کچھ نہ بولی

دونوں سپاہیوں کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ میری ہڈیاں سُرمہ کر دیتے۔ بس وہ رہ رہ کر مجھے گھورے جا رہے تھے میری تمام گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اس لئے مفہوم تو اُن کے پلّے نہ پڑ سکا مگر انہیں میرا اس لڑکی سے بولنا یوں گراں گزر رہا تھا جیسے وہ ان کی مشترکہ محبوبہ اور میں ان کا رقیب ہوں۔

"خاتون! میں عزت دار آدمی ہوں۔ اندازے کی ذرا سی غلطی کی بنا پر تم سے گستاخی کر بیٹھا۔ میں صدق دلی سے معذرت خواہ ہوں، یہ معاملہ یہیں رفع دفع کر دو تھانے میں پہنچنے کے بعد یہ میری مٹی اس طرح پلید کریں گے کہ تم دیکھ پاؤ تو مجھ پر رحم

کھاؤگی۔"

"نہیں!" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں سر جھٹک کر کہا۔ "تم صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے ہو، تمہاری گفتگو سے مکاری ٹپک رہی ہے۔ میں ہرگز معاف نہیں کر سکتی!"

اُس کا دیّہ حوصلہ شکن تھا۔ مجھے قیدخانے کی بے رحم سلاخیں ہی اپنا مستقبل بنتی نظر آ رہی تھیں۔ پولیس مجھ سے میرے ماضی اور حال کے بارے میں تشدد آمیز پوچھ گچھ کرے گی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی گوشت پوست کا ہی انسان ہوں کب تک اس تشدد کو برداشت کر سکوں گا۔ وہ میری نشاندہی پر لیار کیٹ کے ہوٹل میں میرے کمرے کی تلاشی لیں گے تو انہیں نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس مل جائیگا اس کے بعد میں اپنے ماضی کو کسی قیمت پر نہیں چھپا سکوں گا۔

میں ان ہی خیالات میں کھویا تھانے جا پہنچا۔ وہاں شرم و حجاب سے عاری سفید فام لڑکی کے دیدار کے لئے عملے کے لوگ جمع ہونے لگے اور میں ان کی نفرتوں کا نشانہ بنتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ تھانے کا انچارج علاقے کے گشت پر گیا ہوا ہے۔ اُس کی جگہ ایک اے ایس آئی نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ دونوں سپاہی وہیں رہ گئے اور اے ایس آئی نے مجھے اس لڑکی سمیت ایک تنگ سے کمرے میں پہنچا دیا جہاں ایک بوسیدہ میز اور بنچ موجود تھی۔

اے ایس آئی نے لڑکی کو بنچ پر بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ متذبذب نظر آنے لگی اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی اور بولی "میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ مجھے کسی کا انتظار کرنا ہے۔"

اے ایس آئی کے سخت گیر چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بھونڈی انگریزی میں بولا "انچارج صاحب بس آتے ہی ہوں گے۔ دراصل اُن کی اجازت کے بغیر کوئی ایف آئی آر نہیں بنتی۔"

لڑکی چہرے پر ناگواری کے آثار لئے بنچ پر بیٹھ گئی۔

"کیوں بے۔ ڈاڑھی رکھ کر لونڈیوں کو چھیڑتا ہے!" اے ایس آئی میرے پیٹ میں مکا مارتے ہوئے تیز اور درشت لہجے میں بولا۔

"میں معزز آدمی ہوں.... اسے میری طرف سے غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے بے بسی کے ساتھ کہا۔

"ہاں معزز آدمی تمہارا نام پتہ کیا ہے؟" وہ بوسیدہ میز کے سرے پر بیٹھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ اُس نے پہلے ہی سوال میں میری دکھتی رگ پکڑ لی تھی اور میرے بدن سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میں چند ثانئے خاموش رہا پھر نپے تلے پُراعتماد لہجے میں بولا "میں کل ہی لاہور سے آیا ہوں۔"

"وہاں کدھر رہتا ہے؟" اُس نے اس بار پنجابی میں پوچھا۔

میں نے بلا توقف اکبر کا رنگ والا پتہ دہرا دیا جہاں وہ کسی زمانے میں رہتا تھا۔ وہ خاموش ہو کر ہتی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا جو بار بار گھڑی دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑتا جا رہا تھا۔ اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔

"آپ کا نام کیا ہے مس؟" انسپکٹر نے آخر کار لڑکی سے بات کرنے کا بہانہ تلاش کر ہی لیا۔

"جیکولین... مس جیکولین اسمتھ!" وہ مضطربانہ انداز میں پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

"آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟" اے ایس آئی غیر متعلقہ گفتگو پر راغب نظر آ رہا تھا۔

"برطانیہ سے" وہ بے زاری کے ساتھ بولی۔

"مجھے برطانیہ کے لوگ بہت پسند ہیں۔ ان جیسے امن پسند اور ستھرے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ میرے والد صاحب بھی انڈین پولیس فورس میں تھے۔ انھیں اپنے افسر کی لڑکی بہت پسند تھی پھر ان دونوں نے شادی کر لی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میرے سوتیلے نانا کا تبادلہ رنگون ہوا تو میری سوتیلی ماں اُن کے ساتھ چلی گئیں میرے والد صاحب کو اس جُدائی کا بہت صدمہ ہوا پھر انھوں نے میری ماں سے شادی کر لی۔ سُنا ہے میری سوتیلی ماں آج کل برمنگھم میں ایک بہت بڑا ریستوران چلا رہی ہیں۔ اُن کا نام میریانہ تھا۔ مگر میرے والد صاحب ہمیشہ میری کہہ کر اُن کا...... !"

"آفیسر پلیز۔ !" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بنچ سے اُٹھ گئی "مجھے بہت ضروری کام ہے اور میں اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رک سکتی۔"

"اوہ!" وہ بوکھلا کر میز سے اُتر گیا "آپ اپنا بیان قلم بند کرا دیں اور اپنا پتہ دے دیں۔ ضرورت ہوئی تو میں خود آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نہیں۔ مجھے اس وقت شاید غلط فہمی ہوئی تھی۔ مجھے اس شخص سے کوئی شکایت نہیں ہے!" وہ پولیس کے صبر آزما طریقہ کار سے اُکتا گئی تھی کہ قصہ ہی نمٹانے پر تُلی ہوئی تھی۔

خوشی سے میرا دل بلّیوں اچھل پڑا "دیکھا انسپکٹر صاحب میں نہ کہتا تھا۔"

"بک بک نہ کر!" وہ جھلا کر پنجابی میں بولا پھر لڑکی سے مخاطب ہو گیا۔

"آپ کو آئندہ کوئی زحمت نہ ہوگی۔ بس ایک بار بیان دے دیں۔ ہم خود ہی اس بدمعاش سے اقبالِ جرم کرا لیں گے۔"

"آپ تو اقبالِ جرم ضرور کرا لیں گے مگر یہ شخص بے قصور ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی پھر میرے قریب آگئی "مسٹر مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی آیئے میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔"

اُس کا سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور زرد چہرہ پسینے میں نہایا جا رہا تھا۔

وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر اُسے روکتا ہی رہ گیا لیکن اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور تیزی کے ساتھ تھانے سے باہر نکلتی چلی آئی۔

"میں نے تمہارے ساتھ جو شریفانہ رویّہ اختیار کیا ہے، مجھے اُمید ہے کہ

اُس کا صلہ اچھا ہی دو گے۔ اس وقت مجھے ایک مددگار کی ضرورت ہے۔ فوراً ٹیکسی روکو۔"

میرے دل میں اس لڑکی کے لئے بے پناہ عزت کا جذبہ اُمڈ آیا جس نے مجھے موت کے منہ میں دھکیل کر خود ہی باہر نکالا تھا۔

میں نے اشارے سے ٹیکسی رکی۔ وہ دروازہ کھول کر عقبی سیٹ پر جا گری اسی کے پہلو میں جا بیٹھا۔

لڑکی نے ہانپتے ہوئے اپنے ہوٹل کا نام لیا۔

"صاحب نیچے اُترو۔ ہم اُدھر نہیں جائے گا۔" ڈرائیور سر گھما کر بولا۔

"میٹر سے روپیہ زیادہ لے لینا۔ اس لڑکی کی طبیعت بہت خراب ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا

"ہمارا ابھی طبیعت خراب ہے۔ نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ چلنا ہے تو چلو مگر ہم پہلے کھڈہ سے اپنا کام کرے گا۔"

اس وقت سواری ملنا دشوار تھی۔ میں اُس کی شرط پر راضی ہو گیا اور اس نے تیزی کے ساتھ ٹیکسی کھڈہ کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھسا دی۔

یہ سفر ذرا ہی دیر جاری رہا اور ٹیکسی فٹ پاتھ پر بنے ہوئے ایک گندے ہوٹل کے سامنے جا رکی جہاں فٹ پاتھ کے سہارے بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور چند ملازم دوڑ دوڑ کر ڈرائیوروں کے آرڈر پورے کر رہے تھے!

ٹیکسی ڈرائیور نے انجن بند کر کے کھڑکی سے سر نکالا اور قریب سے گزرتے ہوئے بیرے کو بلا کر کہا "جلدی سے ایک ڈبل چائے لاؤ۔ ادھر پاسنجر کا طبیعت خراب ہے۔"

"یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اس سے کہو جلدی چلے، ذرا بھی دیر ہوئی تو میں ...دوجہ ہوٹل میں تماشا بن جاؤں گی۔" وہ لڑکی پریشان لہجے میں بولی۔

"ڈرائیور نشہ باز ہے، وہ نشہ پورا کئے بغیر یہاں سے نہیں ہلے گا۔"

"اوہ" وہ پہلو بدل کر مضطربانہ لہجے میں بولی "وہ کتنا وقت لے گا۔ نشہ خود ٹوٹ رہا ہے۔ اگر مجھے ذرا دیر اور مارفیا نہ مل سکی تو میں کسی کیچوے سے بھی بدتر ہو جاؤں گی۔"

میں نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ اُسی وقت بیرا والا کھولتے ہوئے ...ے نما سیال کی پیالی لے آیا۔

"واہ رے۔ مزا آ گیا" ڈرائیور بے صبری کے ساتھ پہلا گھونٹ لیکر بڑبڑایا۔

"یار چائے تو تم کہیں بھی پی سکتے تھے!" میں چڑ کر بولا۔

"یہ اسپیشل چائے ہے صاب۔ تم بھی پیو اور اپنی میم کو بھی دو۔ اس میں پوست کا ڈوڈا اُبالا ہوا ہے" وہ سرور میں آ کر کہنے لگا۔ "ادھر تو ہر خانہ خراب ہوٹل والا تم کو پوست کا چائے پلاتا ہے۔ مگر اصلی مال پورے کراچی میں تین جگہ ملتا ہے۔ ادھر بھی یا گرومندر۔ تمہارا ہوٹل سے واپس آنے تک تو ہم کلٹی ہو جاتا!"

میں خاموش ہو گیا۔

ڈرائیور نے چائے ختم کر کے پیالی میں اٹھنی ڈالی اور اُسے فٹ پاتھ پر رکھ کر ٹیکسی آگے بڑھاتا چلا گیا۔

ٹیکسی سے اُتر کر وہ لڑکی مجھے ساتھ لئے اتنی تیزی سے ہوٹل کی طرف لپکی جیسے ملک الموت اُس کے تعاقب میں ہو۔ اُس نے بمشکل اپنے کمرے کا تالا کھولا اور اندر گھستے ہی بستر پر جا گری۔

اُس کی حالت اس وقت بہت ابتر تھی۔ سارا جسم پسینوں میں نہایا ہوا سانس بے ترتیبی سے آ رہا تھا اور ہاتھ پیروں پر رعشہ سا طاری تھا۔

"اس میں... اس میں مارفیا کی شیشی اور سرنج موجود ہے!" وہ اپنا پرس میری طرف پھینک کر پھنسی پھنسی آواز میں بولی "مجھے فوراً دس سی سی کا انجکشن چاہیئے۔"

میں نے پرس کھول کر سرنج اور شیشی نکالی اور حیران نظروں سے اُس کا جائزہ لینے لگا۔

"جلدی کرو سُور کے بچے!" وہ ہذیانی انداز میں چیخی "میرا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔" اُس کی آواز سے شدید نقاہت نمایاں تھی۔

وہ اپنی صورت سے اس وقت برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اُس نے ذرا ہی دیر قبل مجھ پر ایک احسان بھی کیا تھا مگر وہ تھی خوبصورت.... اُس نے ...لی مارکیٹ میں میری پیشکش ٹھکرا کر میری اَنا کو ٹھیس پہنچائی تھی اور اب وہ میرے رحم و کرم پر تھی۔

وہ سانس ضرور لے رہی تھی۔ مگر اُس کا بدن کسی بے جان کھلونے کی طرح میرے رحم و کرم پر تھا۔ میرا یہ قیاس درست ہی ثابت ہوا کہ وہ پارسا ہرگز نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ دوسری ہپی لڑکیوں کے برعکس اُس نے اپنی عصمت فروشی کے کچھ معیار مقرر کئے ہوں۔ اپنی تشنگی دُور کرنے کے بعد میں نے شیشی سے سرنج میں سیال اُتارا اور اُس کے بائیں بازو میں انجکشن لگا دیا۔ جہاں سوئیوں کے بہت سے باریک اور سیاہ نشان نمایاں تھے۔

اس سے قبل کہ وہ ہوش میں آ کر ہنگامہ کھڑا کرتی میں ہوٹل سے روانہ ہو گیا میرے جسم اور ذہن پر ایک عجیب سی آسودگی چھائی ہوئی تھی۔

رات دھیمے دھیمے بیت رہی تھی۔ میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔ نیچے ہی کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ بستر پر لیٹا تو نیند کا دُور دُور پتہ نہیں تھا میرے ذہن میں رہ رہ کر عجیب سے اوہام سر اُبھار رہے تھے۔ موجودہ انداز میں کچھ دن تو میں قانون سے فرار حاصل کر سکتا تھا مگر پوری زندگی اس طرح بسر کرنی ناممکن تھی۔ اگلے روز میں ہوٹل کو خیرباد کہنے کا اٹل فیصلہ کر چکا تھا۔ اخبار میں مختصر اشتہارات دیکھنے شروع کئے اور مجھے چند کارآمد اشتہارات نظر آ ہی گئے۔ دو مناسب مکان کرائے پر دستیاب تھے لیکن میں نے اُن سے پہلے تیسرے پتے پر رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ سہولتوں کے اعتبار سے وہ جگہ زیادہ ہی بہتر تھی۔

میں دوپہر سے پہلے بچلر زہاؤز جا پہنچا۔ طارق روڈ کے قریب ہی

دو منزلہ عمارت پر مشتمل یہ ہاسٹل مسز چیپل نامی کوئی عیسائی بیوہ چلاتی تھی اور اخبار میں اسی نے اشتہار دیا تھا۔

پھاٹک پر چوکیدار نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور پھر مجھے اندر لیتا چلا گیا۔ برآمدے میں دو نوجوان آرام کرسیوں پر دراز اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک مشرقِ وسطیٰ کے کسی عرب ملک کا باشندہ لگ رہا تھا دوسرا کوئی لاابالی سا مقامی نوجوان تھا۔ مجھے دیکھ کر ان دونوں نے سرگوشی میں ایک دوسرے سے کچھ کہا پھر وہ مہذب انداز میں مسکرانے لگے۔ میں اُن کے قریب سے گزرا تو وہ دونوں مجھ سے لاتعلق نظر آنے لگے۔

مجھے کشادہ ڈرائنگ رُوم میں بٹھا کر چوکیدار مسز چیپل کو اطلاع کرنے چلا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو وہ بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ پورے فرش پر دبیز بناوٹ کا خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا جو نیا نہ ہونے کے باوجود بہت اچھی حالت میں تھا۔ دو صوفہ سیٹ، چند آرام کرسیاں، ایک ریڈیوگرام اور بہت سی آرائشی چیزوں نے مل کر بڑا ابھرپور تاثر قائم کیا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم سے ملحق کھانے کا کمرہ تھا جہاں بارہ آدمیوں کی بڑی سی میز بچھی ہوئی تھی جس پر تازہ پھولوں کے دو گلدستے سجے ہوئے تھے۔

مسز چیپل کے آنے سے پہلے ہی ایک ملازم اسکواش کا گلاس لے آیا اور وہ گلاس خالی ہونے سے پہلے مالکِ مکان باوقار انداز میں چلتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ اس بوڑھی پر نظر پڑتے ہی میں تعظیمی انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سر کی خفیف سی جنبش اور خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا اور میرے قریب ہی آ بیٹھی۔

"شاید میں مسز چیپل ہی سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔" میں نے گفتگو شروع کی "مجھے امیر علی کہتے ہیں۔" میں نے دانستہ اپنا اصل نام ... مناسب نہیں سمجھا۔

"ہاں۔ مجھے چوکیدار سے معلوم ہوا کہ آپ بیچلرز ہاؤز میں پے اِنگ گیسٹ کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں۔" بوڑھی اپنے لب و لہجہ سے بڑی ملنسار اور صلح جو لگ رہی تھی۔ اس میں وہ چڑچڑا پن نام کو بھی نہ تھا جو اس کی عمر والے دوسرے لوگوں میں اکثر قابلِ برداشت حد تک پایا جاتا ہے۔

"جی ہاں!"

"یہاں نچلی منزل پر چار بیڈ روم ہیں جن میں اس وقت تین لوگ رہتے ہیں۔ اوپری منزل پر چار کمرے ہیں۔ تین میرے پاس ہیں جن میں ہم ماں بیٹیاں رہتی ہیں۔ ہر بیڈ روم کے ساتھ باتھ روم ملحق ہے۔ ڈرائنگ اور ڈائننگ روم نچلی منزل پر ہیں اور یہ سب لوگ مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بیڈ روم کا کرایہ دو سو روپے ہے۔ وہاں آپ کو ضرورت کی ہر چیز ملے گی۔ ناشتے، لنچ، ڈنر اور شام کی چائے کے اخراجات سات سو روپے ہیں جو بہرحال آپ کو ادا کرنے ہوں گے۔" مسز چیپل نے اپنی شرائط بتانی شروع کر دیں۔ "آپ کو پوری آزادی ہو گی کہ ساتھی کرائے داروں کی رضامندی سے آپ میری جائیداد کو نقصان پہنچائے بغیر جو چاہیں کریں۔ جس شخص سے دوسروں کو شکایات ہونے لگتی ہیں ایک ماہ کا نوٹس دے کر اُسے ... کہہ دیتی ہوں۔ میرے اور میری دونوں لڑکیوں کے ذاتی امور پر اعتراض کا کوئی حق نہیں ہوتا اور میں اپنے معزز کرایہ داروں سے بجا طور پر

یہ توقع رکھتی ہوں کہ وہ مجھ کمزور بیوہ سے کوئی ناجائز مفاد حاصل نہیں کریں گے...... ہاں آپ شراب تو نہیں پیتے ؟"

اُس نے آخری سوال اس قدر غیر متوقع طور پر کیا کہ غیر ارادی طور پر میری گردن اثبات میں ہل گئی۔ میں نے دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیجی مگر مسز چیپل کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر مجھے کام بنتا نظر آنے لگا۔

"یہ خوشی کی بات ہے۔" وہ کہہ رہی تھی "دراصل بعض لوگ براہِ راست یہ شرط سننا پسند نہیں کرتے اس لئے میں دوسری طرح یہ بات پوچھتی ہوں۔ میں خود شراب کی رسیا ہوں اور نہیں چاہتی کہ کوئی پارسا کرائے دار یہاں آ بسے اور بعد میں میری شراب نوشی اُسے رُوحانی کرب میں مبتلا کر دے۔"

"شاید دوسرے کرائے دار بھی ......!"

اُس نے میری بات درمیان ہی سے اُچک لی "ہاں ہاں۔ وہ سب شراب سے دلچسپی رکھتے ہیں میرے کرائے دار باذوق اور سوشل لوگ ہیں۔ بیچلرز ہاؤز کی یہ روایت رہی ہے کہ نئے مہمان کو اُس کی آمد کی پہلی رات میری جانب سے پارٹی دی جاتی ہے تاکہ وہ دوسرے کرائے داروں سے متعارف ہو سکے۔"

"کرائے وغیرہ کی شرائط ؟"

"میں لوگوں پر زیادہ بار نہیں ڈالتی۔ بس آپ ایک ماہ کے نو سو روپے ایڈوانس دیتے رہیں۔ میری طمانیت کے لئے اتنا ہی کافی ہے!" وہ فراخ دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"کیا آپ مجھے مکان دکھائیں گی ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ضرور!" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

مکان کی نچلی منزل بلاشبہ مسز چیپل کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھی۔ ایک ایک چیز سے سلیقے اور نفاست کا اظہار ہو رہا تھا۔ اوپری منزل کے زینے ختم ہوتے ہی راہداری میں خالی کمرہ واقع تھا۔ خوبصورت اور آرام دہ مسہری، ڈریسنگ ٹیبل، سائڈ ٹیبل، تین کرسیاں اور ایک وارڈ روب۔ یہ اُس کمرے کی کل کائنات تھی۔ کھڑکیوں اور دروازے پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیوار پر ایک بہت سی پینٹنگ آویزاں تھی اور شراب کی دو خالی بوتلوں سے منی پلانٹ کی ساخیں ... کمرے کے گرد دلکش انداز میں بالہ بنا رہی تھیں۔

"آج سے میں آپ کا مہمان ہوں!" میں نے مسکراتی آواز میں کہا اور جیب سے نو سو روپے نکال کر اُس کے حوالے کر دیئے۔

پھر وہ مجھے لے کر راہداری سے ہوتی ہوئی اوپری منزل کے برآمدے میں آئی جسے صوفے وغیرہ ڈال کر نشست گاہ کا رُوپ دیا ہوا تھا۔ باقی ماندہ تینوں خوابگاہوں کے دروازے اسی وسیع برآمدے میں کھلتے تھے۔

"جولیا تو باہر گئی ہوئی ہے، میں اپنی چھوٹی لڑکی سے آپ کا تعارف ابھی کرائے دیتی ہوں۔" وہ سارے نوٹ اپنے بلاؤز میں اڑستے ہوئے بولی۔ پھر اُس نے ہیلن کو آواز دی۔

"آئی ممی!" کسی طرف سے سُریلی آواز اُبھری۔

فوراً ہی ایک خوابگاہ کا دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک بیحد خوبصورت اور شوخ سی لڑکی سانولے سلونے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتی برآمد ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک سی گئی، دو تین بار معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں اور دھیمی آواز میں بولی "گڈ مارننگ!"

"مارننگ!" اُسے دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوا جا رہا تھا۔

"بیٹی یہ ہمارے نئے مہمان مسٹر امیر علی ہیں اور یہ میری چھوٹی بچی ہیلن ہے۔" مسز چیپل بزرگانہ لہجہ میں بولی۔

"آپ یہاں کب شفٹ ہو رہے ہیں ؟" وہ خوشی سے کھنکتے لہجہ میں بولی۔

"آج شام سے پہلے!" میں اُسے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

مسز چیپل پھاٹک تک مجھے چھوڑنے آئی۔ نیچے والے دونوں کرائے دار شاید اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے اپنا حساب بیباق کیا اور مختصر سا سامان لیکر ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی بیچلرز ہاؤز جا پہنچا۔ نیچے والے تینوں کمرے اس وقت مقفل تھے میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو دونوں ماں بیٹی ایک ملازم سے کمرہ ٹھیک کرا رہی تھیں جو پہلے بھی اچھی خاصی حالت میں تھا۔

"اوہ۔ آپ بہت جلدی آگئے!" مسز چیپل ہنس کر بولی "میں نے سوچا کہ آپ کے کمرے کی سجاوٹ کا انداز ذرا تبدیل کرا دوں!"

"ضرور ضرور!" میں نے کہا "دراصل میرا سامان اسٹیشن پر ہی تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس شہر میں آتے ہی آپ جیسی میزبانوں سے ملاقات ہو گئی۔"

"کیا آپ باہر سے آئے ہیں ؟"

"ہاں میں لاہور کے کاروباری ہنگاموں سے اُکتا کر آرام کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بیچلرز ہاؤس سے بہتر جگہ ملنی محال تھی۔"

اِس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ ہیلن اپنی ماں سے نظریں بچا کر بار بار دلچسپی سے میری شخصیت کا معنی خیز سا جائزہ لے رہی ہے۔

شام کے پانچ بجے مسز چیپل خود ہی چائے لئے میرے کمرے میں آ پہنچی۔ "میں اپنے پُرانے مہمانوں کو آج رات ذرا چونکا دینا چاہتی ہوں۔ وہ اب تک تمہاری آمد سے لاعلم ہیں۔"

بڑھیا خاصی زندہ دل تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ذرا آزاد خیال بھی ہو۔ تاکہ میں ہیلن سے راہ و رسم بڑھا سکوں۔

اس رات کی پارٹی بہت شاندار تھی۔ ہیلن اس وقت کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہی تھی اور جولیا ــــــــ اُسے دیکھ کر میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ان دونوں بہنوں میں سے کسے کس پر ترجیح دوں۔

فاروق ایک فلسطینی مسلمان تھا جو سرکاری وظیفے پر ... کالج میں زیرِ تعلیم تھا ... بخت خان بھی طالب علم تھا۔ وہ مردان کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ فاروق کا ہم جماعت اور خاصا خوش مزاج تھا۔ تیسرا بنگالی لڑکا سعید چوہدری تھا جو ایک ایر لائنز سے وابستہ تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ تینوں ہی ان لڑکیوں میں بے تحاشا دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ہیلن اُن میں سے کسی کی طرف بھی راغب نہ تھی۔ جبکہ جولیا فلسطینی طالبعلم فاروق کو شاید پسند کرتی تھی لیکن وہ سب ہی مسز چیپل سے مرعوب نظر آ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بوڑھی اپنی تمام تر آزاد خیالی کے باوجود لڑکیوں کو ایک مناسب حد سے تجاوز کی اجازت دینے کی عادی نہیں ہے اور شاید تینوں کرائے دار بھی مسز چیپل کی اس سخت گیری سے واقف تھے۔

ریڈیوگرام دھیمے سُروں میں موسیقی بکھیر رہا۔ کھانے کے بعد مشروبات کا دور چلا۔ گیارہ بجے کے بعد مسز چیپل اپنی لڑکیوں کو ساتھ لے کر لڑکھڑاتی ہوئی اوپر چلی گئی اور ہم چاروں ڈرائنگ رُوم میں رہ گئے۔

... کی موجودگی کے باعث وہ تینوں مسز چیپل اور اُس کی لڑکیوں کے بارے میں محتاط گفتگو کر رہے تھے۔ شاید یہ اُن کا محبوب ترین موضوع تھا۔

جب ان تینوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں برج بھی کھیلتا ہوں تو سعید چوہدری اپنے کمرے سے تاش کی دو سربند گڈیاں لے آیا۔ اگلے دن اتوار تھا اور وہ یہ رات ہنستے کھیلتے گزارنی چاہتے تھے۔

... اور شراب کا دور چلتا رہا۔ ہلکا ہلکا سا سرور چڑھنے لگا تو گفتگو بے باکانہ ... ہوتی گئی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ سالی مسز چیپل تو کبھی جوان ہی نہیں تھی!" سعید چوہدری اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"یہ کسی چرچ میں راہبہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔" یہ جملہ جواں بخت تھا۔

"اس بوڑھی چڑیل کی پارسائی کھلا فراڈ ہے۔" فاروق تیز لہجے میں بولا "تم سب یہاں دیر سے ہو، بتاؤ کہ ہم سب اس کی لڑکیوں پر کتنا پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ اُس نے محض ہنگامے فساد اور بدنامی سے بچنے کے لئے ہم لوگوں پر اپنی پارسائی کا بھرم رکھا ہوا ہے ورنہ وہ یہاں رہنے والے ہر شخص سے واقف ہے۔"

"نہیں نہیں۔ یہ اس پر سراسر الزام ہے!" سعید چوہدری نے احتجاج کیا "ایسا ہوتا تو وہ اوپر والے کمرے سے سلطان کو کیوں نکالتی۔ وہ تو ہیلن پر بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا تھا۔"

"مسز چیپل اسی وقت تک چھوٹ دیتی ہے جب تک پانی سر سے گزرنے کا خدشہ ہو۔" فاروق نئی چال چلتے ہوئے بولا "سلطان کو تو واقعی اس تیلی سے عشق ہو گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ ہیلن سے شادی پر مُصر تھا اور اُسے فرار پر اُکسا رہا تھا وہ بھلا کسی ایسے آدمی کو کیوں رہنے دیتی جو اُس کی روزی کا ایک دروازہ بند کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ کیا خبر کہ وہ کسی دن مایوس ہو کر ہنگامہ ہی کھڑا کر دیتا۔"

"کچھ بھی ہو لیکن وہ لڑکیاں اپنی ماں سے بہت ڈرتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں ... چند دن میں ہی سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔" فاروق

بزرگانہ شان سے بولا۔

"اگلی باری فاروق ہی کی ہے۔ یہ بے چارہ تو جولیا کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کرتا ہے۔" جہان بخت خان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اور یہاں آئے دن جولیا کے نت نئے ملاقاتی آتے رہتے ہیں جو اُس کی خوابگاہ میں گھسے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں پھر اندھیرے میں منہ چھپا کر چلے جاتے ہیں۔ بڑھیا کسی کو مستقل گاہک نہیں بناتی بس یہی اُس کی کامیابی کا راز ہے!"

"ہاں۔ دو چار بار تو ہمارا اغیار ان لڑکیوں کے کردار تک جا پہنچا ہے اور اُس کے بعد۔۔!" سعید چوہدری خاموش ہو کر مسکرایا "ہمارے سامنے بڑھیا انھیں باہر سے لوٹا دیتی ہے!"

"تم میرے شبہات کا مذاق اُڑا رہے ہو" فاروق ناراض ہو گیا۔

"میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور مسز جمیل سے زیادہ خبیث عورت میری نظروں سے نہیں گذری۔"

اس بحث نے اتنا طول کھینچا کہ فاروق خفا ہو کر اُٹھ گیا اور جاتے جاتے طنزیہ لہجے میں بولا "ہاں ہاں تم اُس کی حمایت نہیں کرو گے تو کیا انکل سام آئیں گے آخر کو وہ تمہاری ہی ہم وطن ہے؟"

اس کے بعد آئے دن ہماری محفلیں جمنے لگیں۔ وہ تینوں ہی بے لوث اور دوست پرور نوجوان تھے۔ اس دوران میں مسز جمیل اور اُس کی لڑکیوں کے طور طریقے مشکوک تو نظر آئے لیکن اتنے نہیں کہ کھُل کر کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔

جولیا کے ساتھ فاروق کا معاشقہ عروج پر تھا اور وہ ہر روز خبر سُناتا تھا کہ بس چند ہی دن میں وہ اپنی محبوبہ کو لے کر ایسا رفوچکر ہو گا کہ بڑھیا ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔

میں بیچلرز ہاؤز کی مختصر سی دنیا میں کچھ ایسا کھو یا کہ اپنی ساری پریشانیاں بھُلا بیٹھا۔ برج کے کھیل میں میری اور فاروق کی پارٹنر شپ ایسی جمی تھی کہ وہ میرے بغیر کھیلتا ہی نہ تھا۔

پھر ایک روز وہ مجھے زبردستی کلب لے گیا۔ اُس کی زبانی میری غائبانہ تعریفیں سُن سُن کر بہت سے کھلاڑیوں کو مجھ سے ملنے کا شوق ہو گیا تھا۔

کلب میں پہنچتے ہی میرے بدن میں خوف کی سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہاں میرے کئی شناسا موجود تھے۔ جب وہ لاتعلقانہ انداز میں میرے قریب سے گذر گئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ داڑھی مونچھوں اور بغیر فریم کی عینک نے میرا حلیہ اس حد تک بدل دیا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے صفدر علی کی حیثیت سے نہ پہچان سکے گی۔

برج روم میں ہمارے بیٹھتے ہی کافی تماشائی ارد گرد آ کھڑے ہوئے۔ مخالف ٹیم نے کارڈ بانٹنے شروع کئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر دوسری گڈی اُٹھائی حکم کی بیگم سب سے نیچے لگائی اور یک بیک یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ارد گرد نظر دوڑائی اور میری روح فنا ہو گئی۔

حکم کی بیگم دیکھی جا چکی تھی۔ میرے کالے دھندے کے آٹھ رازدار ساتھیوں میں سے ایک نہ جانے کب اس بھیڑ میں آ شامل ہوا تھا اُس کی پُر اعتماد نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

حکم کی بیگم اپنا کام دکھا چکی تھی۔

بڈنگ ہوئی مگر میرا ذہن ابھی تک خلا میں معلق تھا۔ کوشش کے باوجود میں اپنی نگاہوں کو بار بار اس طرف اُٹھنے سے نہ روک سکا جدھر مجھے پہچاننے والا موجود تھا۔

بڈنگ کا سلسلہ فاروق پر ختم ہوا۔ میں ڈمی ہو گیا۔ اُس نے جونہی میرے کھلے ہوئے کارڈز پر نظر ڈالی، اُس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ تماشائیوں میں سے اکا دکا افراد کے منہ سے تحیر بھری آوازیں اُبھریں۔ میں فاروق کو بُری طرح پھنسا چکا تھا۔

میں نے پھر ادھر دیکھا۔ سلمان ابھی تک میری پشت پر موجود تھا اور اور اسے دیکھ دیکھ کر میرے اعصاب میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا اور میں ساتھیوں سے معذرت کر کے میز سے اُٹھا اور سلمان کا بازو تھام کر اسے برج روم سے باہر کھلے لان میں ایک ویران گوشے میں لیتا چلا گیا۔

"کیا بات ہے سلمان۔ تم مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا کیوں رہے تھے!" میں نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

"سر دراصل میں قدرت کی ستم ظریفی پر مسکرا رہا تھا۔" وہ اُداس لہجے میں بولا۔ "اگر اس گڈی میں حکم کی بیگم نہ ہوتی تو میرے فرشتے بھی آپ کو نہ پہچان پاتے۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ سکندر کہاں ہے؟" میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"سکندر پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "انھوں نے اس پر تشدد کی انتہا کر دی مگر اُس نے زبان نہ کھولی اور جب اُس کی جان کے لالے پڑ گئے تو انھوں نے اسے رہا کر دیا۔ وہ ایک فٹ پاتھ پر سسک سسک کر مر گیا۔ اُس کی بیوی بچے اب فاقہ کشی کر رہے ہیں۔"

"اوہ۔ یہ بہت بُرا ہوا۔" یہ خبر میرے لئے واقعی دلگیر ثابت ہوئی "اُس کے دونوں بچوں کا مستقبل تاریک ہو گیا جن کی خاطر وہ ہر کھرا کھوٹا کام کر رہا تھا۔"

"پولیس کو فرم سے سارا ریکارڈ مل گیا تھا۔ سکندر ہی نے ہم سب کو اس چھاپے کی اطلاع دی تھی۔ مگر وہ ایئر پورٹ پر پکڑا گیا۔ وہ آخر تک اسی بیان پر ڈٹا رہا کہ سونے کے ڈھلے ہوئے موٹر پارٹس سے فرم کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب کسی ایجنٹ کی کارگذاری ہے کیونکہ ہم سربند پیٹیاں اپنے ڈیلرز کو بھیج دیتے ہیں۔"

"میں نے اپنی دونوں جیبیں خالی کر دیں۔" لو۔ اُس کی جواں سال بیوہ کو یہ حقیر نذرانہ پہنچا دینا۔ میں زندگی بھر تم لوگوں کی خدمات کو فراموش نہ کر سکوں گا۔"

اُس نے رقم لے لی اور ڈرتے ڈرتے بولا "سر ایک بات کہوں؟"

"سر نہیں۔ اب ہمارا وہ تعلق ختم ہو گیا۔ ماضی کا صفدر اب امیر علی بن چکا ہے، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" اُس کے مؤدبانہ رویئے نے میرے دل پر چوٹ سی لگائی۔

"اپنے لئے نہ سہی۔ میرے اور دوسرے ساتھیوں کی خاطر خدا کے لئے آپ تاش سے دُور ہی رہیں حکم کی بیگم ہم سب کو لے ڈوبے گی۔ پولیس کو بھی کہیں سے بھنک مل چکی ہے کہ آپ حکم کی بیگم نیچے لگانے کے عادی ہیں اور اس کلب کی عمارت میں اس وقت بھی کئی کسٹم اور پولیس آفیسر موجود ہیں!"

میں اس کی بات سمجھ گیا اور زہریلے انداز میں ہنستے ہوئے بولا "میں سکندر سے کم نہیں ہوں سلمان۔ حکم کی بیگم میرے لئے جال بن سکتی ہے، تمہارے لئے نہیں۔ پولیس میری زبان سے کچھ نہ اگلوا سکے گی چاہے مجھے بھی کسی فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی مرنا پڑے۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ ہم چند ثانیوں تک خاموشی سے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے رہے پھر میں اُسے ہکا بکا چھوڑ کر تیزی کے ساتھ نکاسی کے راستے کی طرف ہو لیا۔

جوں ہی ٹیکسی کمرشل ایریا میں داخل ہوئی میرے خیالات کا سلسلہ یکلخت ٹوٹ گیا۔ بیچلرز ہاؤز پولیس کے محاصرے میں تھا!

"ڈرائیور گاڑی موڑ لو۔ میں کلب میں اپنا پرس بھول آیا ہوں!" میں نے جلدی سے کہا۔ ٹیکسی واپس رواں ہو گئی۔

میں دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیجنے لگا۔ میری جیب میں چند آنوں کے سوا اب کچھ بھی نہ تھا۔ ساری رقم میں سلمان کو دے چکا تھا۔ میری کل پونجی بیچلرز ہاؤز میں پڑی ہوئی تھی اور وہاں اب پولیس قابض تھی۔

یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ فاروق کلب میں مل گیا۔ وہ میری تلاش میں کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح چکراتا پھر رہا تھا۔ اُسے کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر ہی میں نے اُس سے دس کا نوٹ لیا۔ باہر آ کر ٹیکسی کو روانہ کیا اور اُس کا ہاتھ تھام کر فٹ پاتھ پر ایک طرف چل دیا۔

"کدھر لئے جا رہے ہو؟" وہ جھلّا کر بولا۔

"تمہارا شُبہ درست تھا پیارے!" میں خود پر جبر کرتے ہوئے خوشدلانہ لہجے میں بولا۔ "بیچلرز ہاؤز پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے!"

"اوہ۔" اُس کے منہ سے طویل سی کراہ نکلی "جولیا بھی پکڑی گئی ہو گی فرار کے نام سے ہی اُس کا دم نکلتا تھا روز بہانے کر کے ٹال جاتی تھی۔ چلو اچھا ہے۔ اب پولیس والے مزے کریں گے!"

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ اپنی محبوبہ کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے۔"

"کیسی محبوبہ مائی ڈیر!" وہ تلخ لہجے میں بولا "وہ تو بس وقتی بہلاوا تھی۔ مجھے افسوس تو اس کافی گرائنڈر کا ہے جو پرسوں ہی میری ماں نے مجھے بھیجا تھا۔"

"تو کیا اب بیچلرز ہاؤز جانے کا ارادہ نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"توبہ کرو۔" وہ جلدی سے بولا "سفارتخانے کو بھنک بھی مل گئی کہ میں وہاں مقیم تھا تو سارا وظیفہ وغیرہ بند ہو جائے گا۔ یوں تو کراچی میں نہ جانے کتنے فلاش ہوں گے!"

"جہان بخت بھانڈا پھوڑ دے گا؟"

"وہ مخلص دوست ہے۔ اسے میری اس کمزوری کا علم ہے وہ دانستہ کبھی نقصان نہ پہنچائے گا۔۔۔ اور یہ ضروری بھی تو نہیں کہ مسز جمیل ہی پکڑی گئی ہو۔ وہ بڑی چالاک عورت ہے!"

"تو وہ بنگالی چھوکرا اسمگلر ہو گا۔" میں نے لاپرائی سے کہا "میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں پولیس دیکھی ہے۔"

"بیچلرز ہاؤز اور اُس کے مکینوں پر لعنت بھیجو۔ آؤ یہ رات ہم ہاسٹل میں گزاریں گے۔ وہاں میرے کئی دوست ہیں۔ صبح کے اخبار سے سب معلوم ہو جائے گا۔"

دوسرے دن کا اخبار دیکھ کر فاروق کی باچھیں کھل گئیں۔ مسز جمیل اور اُس کی دونوں لڑکیاں مہمان خانے کی آڑ میں عصمت فروشی کا اڈہ چلانے کے جُرم میں گرفتار کر لی گئی تھیں۔ جہان بخت اور سعید بیانات کے بعد رہا کر دیئے گئے بیچلرز ہاؤز کو پولیس نے سیل کر دیا تھا!

خوشی کی بات یہ تھی کہ پوری خبر میں کہیں بھی میرا یا فاروق کا نام نہیں آیا تھا اور میں اس کی وجہ بھی خوب سمجھ رہا تھا۔ پولیس نے چھاپے کے بعد اس عمارت کی تلاشی بھی یقیناً لی ہو گی اور اس مہم میں میری ساری رقم اُن کے ہاتھ لگ گئی ہو گی۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ رقم جس انداز میں بریف کیس میں رکھی گئی تھی اس سے انھیں اس کے جائز ہونے پر شبہ ہو گیا ہو، ساتھ ہی نیت بھی خراب ہو گئی ہو۔ اب اگر وہ میرا فرضی نام درمیان میں لاتے تو امکان تھا کہ میں

کسی مرحلے پر نمودار ہو کر خود کو اس خطیر رقم کا جائز حقدار ثابت کر دیتا۔ اس لئے انھوں نے سرے سے میرا نام ہی غائب کر دیا۔ اب میں اُن سے رابطہ قائم نہ کرتا تو وہ رقم ہضم کر جاتے اور جو میں پولیس کے پاس جا پہنچتا تو سب سے پہلے وہ اس رقم کے حصول کا ذریعہ دریافت کرتے۔ میرا معاملہ صاف ہوتا تو لے دے کے رقم لوٹا دیتے ورنہ میں جیل کی ہوا کھاتا اور وہ رقم کے وجود سے ہی انکار کر دیتے!

میرے لئے اب اس رقم کو بھول جانا ہی بہتر تھا۔

میرے جسم پر ابھی تک پچھلی رات والا بیش قیمت سوٹ موجود تھا۔ لیکن جیبیں بالکل خالی تھیں۔ میرے پاس اب دستی گھڑی، آستینوں کے طلائی بٹن یا طلائی ٹائی پن کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے بیچ کر میں اپنی گزر بسر کر سکتا۔ فاروق کتنا بھی فراخ دل سہی لیکن وہ غیر ملکی تھا اور میرے اچھے وقت کا دوست بھی۔ میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ اگر لندن نہ سہی تو ... والا معاملہ تھا۔ جب میں چند ہزار سے ... کر کے تھوڑے ہی دنوں میں لکھ پتی بن سکتا تھا تو اب بھی میری ... بار آور ہو سکتی تھیں اور اس مرتبہ مجھے اپنی مہم کسی حقوق ... شروع کرنی تھی تاکہ میں کچھ رقم پس انداز کر سکوں۔

مجھے رہ رہ کر حکم کی بیگم پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر میرے ساتھ وہ کمزوری نہ ہوتی تو نہ میں سلمان کو دیکھتا نہ وہ مجھے پہچانتا۔ اور میری جیب کے چند ہزار روپے صاف بچ جاتے۔ بہرحال اب بھی مجھے اس رقم کا زیادہ افسوس نہیں تھا۔ وہ میرے ایک جانثار کی بیوہ ہی کے کام آئی تھی۔

فاروق سے میں اسی دن الگ ہو گیا۔ اب مسئلہ کچھ رقم کے حصول کا تھا۔ میں نے گھڑی سے پہلے بٹن اور ٹائی پن کو فروخت کرنے کا ارادہ کیا لیکن دن کا چور صراف بازار کی راہ میں حائل رہا۔ صرافے والے مجھے بڑے بیوپاری کی حیثیت سے جانتے تھے کیا معلوم کہ حلیے کی تبدیلی کے باوجود کوئی پہچان ہی لیتا۔

میں نے آرام باغ کے اسٹاپ سے ۸۰ نمبر بس پکڑی جو ان دنوں ویسٹ وہارف سے فیڈرل ایریا تک جاتی تھی اور تھوڑی ہی دیر میں لیاقت آباد جا پہنچا۔ ہاسٹل سے روانہ ہونے سے قبل ہی میں نے ٹائی کھول کر کوٹ کی جیب میں اڑس لی تھی۔ کوٹ کندھے پر پڑا ہوا تھا۔ رات کو سونے کی وجہ سے لباس شکن آلود ہو رہا تھا اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ میں متمول طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ دو تین دکانوں کے چکر کاٹنے کے بعد ٹائی پن اور بٹن پانچ سو سترہ روپے میں فروخت ہو گئے۔ میں نے رقم جیب میں ڈالی اور چہل قدمی کرتا آگے ہو لیا۔

ان دنوں لیاقت آباد میں دوہری سڑک نہیں بنی تھی اور فردوس سینما کے سامنے پھیلا ہوا میدان عطائیوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا جہاں وہ مجمع لگا کر نہ جانے کیا کیا فروخت کرتے رہتے تھے۔

میں سینما کے سامنے سے گزرا تو میری نظر ایک بوڑھے شخص پر پڑی جس کے لمبے لمبے سفید بال شانوں تک لہرا رہے تھے۔ دوسرے مجمع بازوں کے برعکس وہ پُرسکون انداز میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم اس کی طرف اُٹھ گئے اور میں وہاں رُک کر اس کی فٹ پاتھی دکان کا جائزہ لینے لگا۔ ٹین کے بے شمار ڈبوں میں ریٹھے، خشک ارنڈ کے بیج اور بے شمار جڑی بوٹیاں قرینے سے سجی ہوئی تھیں اور وہ گدی پر بیٹھا سر جھکائے ہاون دستہ میں کوئی چیز کوٹ رہا تھا۔ اس کے عقب میں ٹین کا ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر جلی حروف میں "ستر سالہ نیپالی سنیاسی باوا" لکھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے بابا؟" میں نے اس کا انہماک ختم کرنے کی نیت سے ایک بوٹی اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

اُس کے ہاتھ رُک گئے اور اُس نے قدرے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے میری دخل اندازی اُسے ناگوار گزری ہو۔ پھر بولا "جہاں سے اُٹھایا ہے وہیں رکھ دے۔ میں کسی مرض کی دوا نہیں بیچتا۔"

"مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔" میں اُس کی بات سے چڑ گیا "میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ یہاں کیا ڈھکوسلا چل رہا ہے۔"

"ڈھکوسلا!" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا "تو ہر ایک کو جعل ساز سمجھتا ہے۔ بس بھاندرناس کی کسر ہے ورنہ میں تجھے بتاتا کہ میں کون ہوں۔"

"میں ایسے کئی سنیاسیوں کے چکر میں پھنس کر بڑی رقم گنوا چکا ہوں بابا۔" یک بیک میرا لہجہ نرم ہو گیا۔

اُس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر شاید اُسے میرے جھوٹ پر یقین آ گیا "سنیاسیوں سے تیرا کیا کام ہے؟"

"کیمیا۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

اس بوڑھے کے چہرے پر چمک سی کوند گئی اور وہ چند ثانیے قبل کی تلخ کلامی بالکل بھول گیا "کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے یا وقت اور پیسہ برباد کرتا رہا ہے؟"

"جمع پونجی، جائیداد، کاروبار سب گنوا چکا ہوں مگر......"

"شش۔" بوڑھا جلدی سے بولا "یہ جگہ ایسی باتوں کے لئے نہیں ہے۔" پھر اُس نے جلدی سے سارا سامان سمیٹا اور گٹھری کمر پر لاد کر سینما سے ملحق مارشل ایریا کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہو لیا۔

اس وقت میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا اور مجھے ... والے درویش کی بات سچ ثابت ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اگر یہ سنیاسی کیمیا کا راز پا چکا تھا اور سونا بنا چکا تھا تو میرے بھی وارے کے نیارے ہو چکے تھے۔ میں نے اب تک جو کچھ کھویا تھا اُسے حاصل کرنا ذرا سی دیر کی بات تھی۔

ایک بوسیدہ سی کوٹھری کے دروازے پر جا کر وہ رُکا اور قفل کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ کوٹھری دس فٹ لمبی اور تقریباً اتنی ہی چوڑی رہی ہو گی۔ فرش پر جا بجا جڑی بوٹیوں وغیرہ کے ... لگے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں کشید کرنے والا چھوٹا سا آلہ رکھا ہوا تھا اور کوٹھری ... عجیب سی جلی سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس سنیاسی نے ... کمر سے گٹھری اُتاری اور بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ ... بند کر لیا۔

"تو نے کتنی کامیابی حاصل کر لی ہے؟" بوڑھے سنیاسی نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

"کامیابی کیسی۔ مجھے تو آج تک کوئی مخلص آدمی ہی نہیں مل سکا۔"

"لیکن میں نے سونا بنا لیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے ایک ڈلی نکال کر میری طرف بڑھائی۔

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ بالکل سونا ہی تھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ ابھی بھاندرناس کی کسر ہے۔" میں نے اُسے یاد دلایا۔

"اب بھی یہی کہہ رہا ہوں۔" وہ حسرت بھری آواز میں بولا "میں دو بار یہ ڈلی بازار لے گیا مگر کام نہ بن سکا۔ ایک بار تو جیل جاتے جاتے بچا۔ دراصل اس کا وزن اور رنگ تو بالکل سونے کا سا ہے۔ مگر اس میں ذرا سی سختی رہ جاتی ہے اور اُسے کسوٹی لگاتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ سونا نہیں ہے۔ کاش مجھے کہیں سے بھاندرناس مل جائے تو میں دیکھوں کہ کون سی کسوٹی میرے بنائے ہوئے سونے کو پکڑتی ہے۔"

"بھاندرناس کیا چیز ہوتی ہے اور کہاں ملتی ہے؟" میں نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"بھاندرناس ایک جڑیلا پہاڑی پودا ہوتا ہے۔" سنیاسی نے کہا۔ "اور یہ کہاں ملتا ہے کسی کو نہیں معلوم۔ کیمیا کی کتابوں میں لکھا ہے کہ بلند پہاڑوں کی سخت چٹانوں میں پیدا ہوتا ہے۔ پہلے چار مہینوں میں چٹانوں سے اوپر تین یا پانچ جامنی رنگ کے گول پتے آتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اوپر نہیں بڑھتا۔ اُس کی صرف ایک ہی سیدھی جڑ ہوتی ہے جو پتھروں اور چٹانوں میں اُترتی اور موٹی ہوتی جاتی ہے۔ تین چار سال میں یہ سخت اور موٹی جڑ ارد گرد کی چٹانوں میں دراڑ ڈال کر انھیں گرا دیتی ہے اور خود بھی ڈھلانوں پر آ گرتی ہے ورنہ اسے کھود کر نکالنا انسانی بس سے باہر ہے۔"

"یہ ہمالیہ کے پہاڑوں پر تو ضرور ہوتی ہو گی!" میں نے اس عجیب و غریب بوٹی کی کہانی سُن کر پوچھا۔

"ملتی ضرور ہو گی لیکن کوئی اس تک پہنچ نہیں سکا۔" وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "کئی سنیاسی تو ان ہی پہاڑوں میں بھٹک کر مر چکے ہیں دراصل بھاندرناس کا پودا چٹان سے صرف چار انچ اوپر رہتا ہے اور بہت سے لوگوں کو اس کی پہچان بھی نہیں ہوتی۔ جب جڑ پہاڑ توڑ کر ڈھلانوں میں گرتی ہے تو پتے وغیرہ ٹوٹ جاتے ہیں اور کوئی بھی اُسے بوٹی نہیں سمجھ سکتا کیونکہ اُس کی جڑ کئی کئی من وزنی ہوتی ہے۔ تیس سال تک میں خود نیپال کے جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا رہا ہوں۔ پرانے قصوں سے کچھ کچھ پتہ چلتا ہے کہ بھاندرناس ان ہی اطراف میں پائی جاتی ہے۔"

"جب وہ بوٹی تمہیں ملی ہی نہیں تو اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ اُس کی مدد سے اصلی سونا بنا سکو گے؟" میں نے اُس سے سوال کیا۔

اُس نے خاموش رہ کر چمکتی ہوئی ٹٹولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر بولا "میں جس نسخے پر چل رہا ہوں وہ آخر تک بالکل ٹھیک نتائج دے رہا ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ بھاندرناس کی تاثیر بھی ٹھیک ہی ہو گی۔" یہ کہتے کہتے اُس پر کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے دوہرا ہو گیا۔

میں اس صورتِ حال سے خاصا پریشان ہو گیا۔ کئی منٹ بعد اُس کی حالت قدرے بہتر ہوئی اور وہ نڈھال ہو کر چٹائی پر ہی لیٹ گیا۔

"کیا بات ہے بابا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ سب کیمیا کی کرامات ہیں.... تیزابوں اور دھاتوں کے زہریلے بخارات میرے پھیپھڑے ناکارہ کر چکے ہیں اب صرف اس آس پر جی رہا ہوں کہ کامیابی حاصل ہو جائے تو پیسے کی پرواہ کئے بغیر اپنا علاج کراؤں گا اور نئی زندگی حاصل کروں گا۔" وہ رُک رُک کر بولا۔

"اس قدر بے سروسامانی اور مفلسی کے عالم میں تم کیمیاگری کے اخراجات کہاں سے پورے کرتے ہو؟" میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"اسی کے لئے سنیاسی کا روپ دھارا ہوا ہے۔ میرے پاس دو چار چٹکلے ہیں جن کے سہارے میرے تین چار گاہک بندھ گئے ہیں، اُن کے سوا میں کسی کا علاج معالجہ نہیں کرتا۔ یہ کسی کو بھی نہیں معلوم کہ مجھے کیمیا کا بھی خبط ہے!"

"اس لبستی کے تین چار گاہکوں سے بھلا کیا گزارا ہوتا ہو گا؟"

"یہاں والے تو اپنی محنت کی کمائی ضائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ تو نے وہاں جتنے مجمع باز دیکھے وہ سارے دن کی چیخ پکار اور فریب کے باوجود آٹھ دس روپے سے زیادہ نہیں کما سکتے۔ مگر میرے گاہک وہ ہیں جو چمکیلی گاڑیوں میں ادھر سے گزرتے ہیں۔ عام زندگی میں شاید وہ مجھے دیکھتے ہی منہ پر رومال رکھ لیں۔ مگر سورج ڈھلنے کے بعد وہ چوروں کی طرح میرے ویران ٹھکانے پر آتے ہیں اور دس بیس روپے دے کر چند چٹکلے لے جاتے ہیں۔ وہ ایسی جگہوں سے دُور بھاگتے ہیں جہاں اُن کے پہچان لئے جانے کا خطرہ ہو۔ ان ہی کی سہولت کے لئے میں ایک گوشے میں اکیلا بیٹھا رہتا ہوں۔"

اس بوڑھے سنیاسی سے میری یہ ملاقات اتنی دلچسپ اور سنسنی خیز تھی کہ میرے ذہن سے پولیس کا خوف، مسز جمیل کے رنگین بیچلرز ہاؤس کی یاد اور اپنی بدنصیبی کا احساس۔ سب کچھ محو ہو گیا۔ اس بوڑھے نے میرے جھوٹ پر اعتبار کرتے ہوئے جس طرح اپنی ساری کہانی میرے سامنے دہرا دی تھی اُس پر میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔

گو مجھے پولیس سے چھپتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے تھے اور میں منڈی کے حالات سے بھی ناواقف تھا مگر اتنا یقین ضرور تھا کہ میں اب بھی بازار میں جا نکلوں تو وہی بات اور وہی دھاک ہو گی۔

"سنو بابا۔ تم دس بیس سیر سونے کی اینٹیں ڈھال کر مجھے دو میں اُسے کسوٹی لگائے بغیر بیچ دوں گا۔ ہم دونوں اب مل جل کر کام کریں گے اور ہمارے دلدر دور ہو جائیں گے!"

"نقلی سونا۔ تو بیچ دے گا؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اعتماد سے کہا۔

"لیکن اس ننھی سی کوٹھری میں بیک وقت اتنا سونا بنانا مشکل ہے۔" سنیاسی جوشیلی آواز میں بولا۔

"کیا جگہ کم ہے؟"

"نہیں۔ تانبے کا کشتہ تیار کرنے کے لئے زبردست آگ کی ضرورت ہوگی تانبے کو صحیح طریقے پر جلانا ہی اس کام کی بنیاد ہے!" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"تو آہستہ آہستہ یہ کام شروع کرو جب دس بیس سیر سونا جمع ہو جائے گا تو اُسے بیچ دیں گے!"

کچھ دیر مشوروں کے بعد وہ اس کام پر راضی ہوگیا۔ غیر متوقع طور پر راستہ مل جانے پر رہ رہ کر میرے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

اگلے روز ہم نے سب سے پہلے کیسرہ بازار کا رُخ کیا اور وہاں سے خالص تانبے کی دس سیر سلاخیں لے آئے۔ پھر اس سنیاسی نے دروازہ بند کر کے نہایت رازداری کے ساتھ چھوٹی سی کٹھالی میں ایک پاؤ تانبہ تول کر ڈالا پھر کئی میلی شیشیوں اور مرتبانوں میں سے مختلف محلولوں کے پندرہ قطرے اس میں ٹپکائے اور آہنی اسٹینڈ پر کٹھالی رکھ کر نیچے آگ روشن کر دی۔ چند منٹ بعد اس کٹھالی میں پڑے ہوئے محلولوں میں سے سخت بدبودار دھواں اُٹھنا شروع ہوگیا۔ ذرا ہی دیر میں اس دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا اور حالت غیر ہونے لگی۔

جب مجھ پر دھانس چڑھنے لگی تو بوڑھے نے لپک کر آگ تیز کر دی اور جلدی سے بولا۔ "بس دو تین منٹ کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہوگا۔"

اور ہوا بھی یہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ دھوئیں کے ہرے معدوم ہوتے گئے۔ کٹھالی کا رنگ سُرخ ہوگیا اور میرا ہاتھ کھٹی کے پہیے پر تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

شام کو سنیاسی تھوڑی دیر کے لئے اپنے دھندے پر گیا اور جلد ہی لوٹ آیا۔ اُس نے اپنے گاہکوں سے آئندہ چار روز کیلئے جان چھڑالی تھی۔

وہ بھٹی دہکتی رہی۔ تانبے کی سلاخ جل جل کر اپنا نکھار کھوتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں باری باری بھٹی کا ننھا سا پنکھا گھما رہے تھے جس کی ہلکی ہلکی گھوں گھوں کی آواز رات کے گہرے سناٹے میں خاصی گونج رہی تھی۔ دھوئیں کی نکاسی کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کوٹھری میں سخت حبس تھا اور گرمی بھی حد سے زیادہ ہی تھی۔

رات کے آخری پہر میں کٹھالی میں پڑا ہوا تانبے کی سلاخ کا ٹکڑا دھواں دینے لگا۔ وہ میرے قریب بیٹھا بڑے غور سے کٹھالی کو گھور رہا تھا۔ یہ مرحلہ آتے ہی اُس نے آگ سرد کر دی اور تانبے کا وہ سیاہ ٹکڑا ایک چمٹے سے پکڑ کر آہستگی سے چینی مٹی کے ایک مرتبان میں ڈال دیا جس میں پہلے سے پارہ موجود تھا۔

گرم گرم تانبہ جب پارے میں ڈوبا تو چند ہلکے ہلکے ترانے ہوئے زہریلے دھوئیں کا ایک کثیف بادل [illegible] مرتبان سے خارج ہوا اور بوڑھے نے اُس کا منہ فوراً ہی بند کر دیا۔

"[illegible] ہو جاؤ۔ کم از کم چوبیس گھنٹے میں سفید رنگ آئے گا۔" اُس نے تھکی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

میں کمرے سے زہریلی گیسیں خارج کرنے کی نیت سے دروازہ کھول کر سگریٹ کے بہانے باہر نکلا اور دس منٹ بعد واپس آیا تو کوٹھری کی فضا کافی حد تک صاف ہو چکی تھی۔

تیسرے روز میری عدم موجودگی میں اُس نے پارے کے مرتبان سے جلے ہوئے تانبے کا وہ ٹکڑا نکالا۔ اس بدوضع اور سیاہ ڈھیلے پر چاندی جیسا چمکیلا رُوپ آ چکا تھا۔

جمال نامی بوڑھے سنیاسی نے مجھے بتایا کہ جلے ہوئے تانبے کا یہ رُوپ کیمیا والوں کی زبان میں "سفید سونا" کہلاتا ہے اور لوگ عام طور پر سفید سونا بڑے آرام سے تیار کر لیتے ہیں مگر اس کے بعد اُسے رنگنا اور آخری تاؤ دے کر سونے کی سی نرماہٹ لانا بڑا دشوار کام ہے۔"

اُس نے شیشے کے ایک گلاس میں ناپ کر ایک بے رنگ محلول ڈالا اور سفید سونا اُس میں ڈال دیا۔ پورے تین منٹ کے انتظار کے بعد اُس نے گلاس میں گلابی رنگ کے تین قطرے ٹپکائے اور گلاس سے ایسی بُو والا دُھواں اٹھنا شروع ہوگیا جو عام طور پر قلعی گروں کے نوسادر جلاتے وقت پیدا ہوتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر گزری کہ گلاس خالی رہ گیا۔ اُس کی تہہ میں سفید سونے کی جگہ سُرخ رنگ کا ڈھیلا نظر آ رہا تھا۔ سفید سونے کو رنگنے کا مرحلہ تین مرتبہ میں مکمل ہوگیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سونا نہیں ہے۔

اب اُسے نرم کرنے کا آخری مرحلہ درپیش تھا۔ بوڑھے جمال نے بھٹی میں تیچ کے کوئلوں کی تہہ جما کر احتیاط سے وہ طلائی ڈھیلا اس پر رکھا اور بھٹی میں اوپر تک کوئلے بھر کر بھٹی روشن کر دی۔ دھیمی آنچ پر وہ عمل جاری رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد کوئلے دم توڑ گئے تو جمال نے بھٹی کے منہ پر ایک آہنی توا ڈھک دیا تاکہ وہ ٹکڑا بھٹی میں ہی سرد ہو کر نرم ہو سکے۔

"جب یہ اس طرح نرم ہو جاتا ہے تو بھاندرناس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے اُس سے دریافت کیا۔

"نرم تو ضرور ہو جاتا ہے مگر اتنا نہیں جتنا سونا ہوتا ہے۔ کوئلوں کے تاؤ کے بعد بھاندرناس کی بھٹی تیار کر کے اس میں دس منٹ کی آنچ بھی دے دو تو یہ سونا اصل سے زیادہ اصل ہوگا۔" وہ اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے فاتحانہ لہجے میں بولا۔

اس طرح تیسرے دن سونا تیار ہوگیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم نے ابتدا میں صرف آدھ سیر تانبا کٹھالی میں ڈالا تھا۔ مگر بار بار جلانے کے باوجود جو سونا تیار ہوا اُس کا وزن پورے اٹھاون تولے تین ماشہ تھا۔

"یہ وزن کہاں سے بڑھ گیا بابا؟" میں نے تولنے کے بعد حیرت سے پوچھا

"بڑھا کہاں ہے۔ یہ تو آدھے سے بھی کم رہ گیا ہے!" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"کیسے؟" اُس کی بات میں بالکل نہ سمجھ سکا۔

"لوگوں نے واقعی تجھے بے وقوف بنایا ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسا "کیمیا کے بارے میں تیری معلومات تو بالکل ہی ناکارہ ہیں۔ کالے تانبے کو رنگنے میں پارہ بھی استعمال ہوا تھا۔ یہ دھات سب سے بھاری اور موذی ہوتی ہے۔ اسی سے

تانبے کی ماہیت سونے میں بدلنی شروع ہوتی ہے۔ کیمیا بھی دھاتوں کا آواگون ہے۔ اس میں ایک ہی دھات کو بار بار مارا اور جلایا جاتا ہے۔ جس طرح انسان عمر کے ساتھ ساتھ پختہ اور سمجھ دار ہوتا جاتا ہے اسی طرح دھاتیں بھی اس عمل سے گذرتی ہیں۔ پیتل کا سیسہ اور ہیرا دونوں ایک ہی ہیں بس عمر کا فرق ہے۔ ایک زمین کے اوپری پرت سے نکلتا ہے دوسرا زمین کے کھولتے ہوئے سینے سے آتا ہے۔ ہم لوگ یہی عمل اپنی بھٹیوں میں کرتے ہیں۔ تانبے کو جلا کر خاک کرنا پھر اسے پارے سے نئی زندگی دینا، یہ سب آواگون ہی تو ہے!"

اُس کی یہ ٹھوس باتیں پُراثر ضرور تھیں لیکن میری سمجھ میں نہ آسکیں۔ ہاں اتنا ضرور اندازہ ہوگیا کہ جمال نے یہ کامیابی زبردست مطالعے کے بعد ہی حاصل کی ہوگی۔

ہم دونوں تین مہینے تک اس تنگ و تاریک کوٹھری میں چپکے چپکے کیمیا گری کرتے رہے۔ جمال نے مجھ پر کافی سے زیادہ اعتماد کیا اور اس دوران میں مجھے کیمیا گری کے بیشتر طریقوں میں طاق کر دیا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں ناتجربہ کاری کی بنا پر مقدار میں گڑبڑ کر گیا یا کوئی محلول ڈالنا بھول گیا اور بنا بنایا تاؤ برباد ہوگیا۔ ایسے موقعوں پر تھوڑی دیر کے لئے اس پر دیوانگی سی طاری ہو جاتی۔ وہ مجھے بے تحاشا گالیاں دیتا۔ تھپڑ اور مکّے برساتا اور میں خاموشی سے یہ سب سہہ لیتا۔ اور جب اُس کا یہ دورہ ختم ہوتا تو اُس کا رویہ پھر مشفقانہ ہو جاتا۔

میں نے آس پاس کی کوٹھریوں میں رہنے والوں سے بھی رسمی تعلقات پیدا کئے ہوئے تھے تاکہ میرے بارے میں اشتباہ آمیز سرگوشیاں شروع نہ ہو سکیں۔ وہ لوگ جمال کو محض ایک سنکی بوڑھا سمجھتے تھے جو میری عقیدت سے فائدہ اُٹھا کر مجھ سے ملازموں کا سا سلوک کر رہا تھا۔

اب ہمارے پاس بیس سیر کے قریب نقلی سونا جمع ہو چکا تھا جمال سنیاسی اپنا کام پورا کر چکا تھا اور اس مال کو مجھے ٹھکانے لگانا تھا۔ اس دوران میرے دو سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ تقریباً تین سو روپے میری جیب میں موجود تھے۔ باقی سارا خرچ جمال نے اپنے گاہکوں سے پورا کیا تھا۔

سونے کو اینٹوں میں ڈھالنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا تھا کیونکہ اُسے گلانے کے لئے بڑی اور طاقتور بھٹی کی ضرورت تھی جو لگانا [illegible] بس سے باہر تھا۔

سنیاسی بابا نے اپنا سارا ساز و سامان سمیٹ کر دو صندوقوں میں مقفل کیا۔ میں بازار سے ٹین کا ایک مضبوط ٹرنک لایا جس میں گھاس لگا کر سارا سونا احتیاط سے جما دیا۔ کوٹھری کا کرایہ وغیرہ بھی بے باق کر دیا گیا۔

شام کے سات بجے ہم نے ایک ٹیکسی میں تینوں صندوق بار کئے اور فردوس سنیما کی بھری پُری نواحی گلیوں سے روانہ ہوگئے۔

جمال بابا کو اُس کے دونوں صندوقوں سمیت میں نے تین ہٹی کے پُل کے کنارے پر بنی ہوئی جھونپڑیوں کے نزدیک اُتارا تاکہ وہ وہاں کسی کے شک و شبہ کا شکار ہوئے بغیر میرا انتظار کر سکے اور نقلی سونا لے کر خود بہادر آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔

پولیس کی فہرست پر میرا نام ایک مفرور اور بدنام اسمگلر کی حیثیت سے موجود ضرور تھا لیکن اُس کے پاس میری شناخت کا کوئی ٹھوس ذریعہ موجود نہیں تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ نقلی سونے کا یہ سودا اپنے موجودہ داڑھی والے حلیے ہی میں طے کروں گا پھر داڑھی صاف کرا دوں گا۔ بڑی بڑی مونچھوں کا اضافہ اور لمبے لمبے بال میری شخصیت کو چھپانے کے لئے پھر بھی کافی ہوتے!

سیٹھ غلام علی اس وقت مکان پر ہی موجود تھا۔ وہ باہر آیا تو مجھے مطلق نہ پہچان سکا۔

"میں صفدر علی ہوں سیٹھ!" میں نے آہستہ سے کہا اور وہ بے ساختہ اُچھل پڑا۔

"ارے یار تم ادھر کراچی میں ہی ہے۔ ہم تو سمجھا تھا تم ملک سے نکل گیا ہے۔"

"باتیں پھر ہوں گی ٹیکسی میں ڈل کی پیٹی پڑی ہے، پہلے اسے اندر اٹھواؤ۔" دو ملازموں نے وہ پیٹی غلام علی کی خوابگاہ میں پہنچا دی۔

یہ خبیث وہی شخص تھا جس نے ساحل والے کیس کے بعد ایک کھلے سودے میں کسٹم ریڈ ہو جانے کے بعد بدعہدی کرتے ہوئے مجھے ایک پائی بھی ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت غلام علی کی اس حرکت سے مجھے سخت مالی اور ذہنی صدمہ پہنچا تھا لیکن میں نے مصلحتاً اس سے تعلقات نہیں بگاڑے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کالا دھندا کرتا رہا تو کسی نہ کسی دن میں بھی اسے زک پہنچا کر اپنا انتقام لے لوں گا۔ اور اب وہ مبارک ساعت آ چکی تھی۔

"کیا ہے اس میں؟" دروازے وغیرہ مقفل کرنے کے بعد اُس نے پُرتجسس آواز میں پوچھا۔

میں نے اطمینان سے چابی اُس کی طرف بڑھا دی "اس میں بیس سیر گیارہ تولہ پانسے کا سونا ہے۔ اب تک میں چھوٹا موٹا کام کر رہا تھا۔ لیکن کئی مہینوں بعد آج بڑی کھیپ منگوانے کی ہمت کی ہے۔"

جیسا کہ مجھے پورا یقین تھا اُس نے صندوق کھول کر سونے پر ایک نظر ڈالی اور اُسے مقفل کر کے میری مدد سے پلنگ کے نیچے سرکا دیا۔

"ایک سو اٹھارہ کا بھاؤ؟" اُس نے خالص کاروباری انداز میں پوچھا۔ وہ وزن اور معیار کے بارے میں ہمیشہ میری بات پر بھروسہ کرتا تھا مگر داموں میں اُلٹ پھیر اُس کی عادت تھی۔

"یار ایک سو اکیس تو میں نے پرسوں ہی گنی کا سونا دیا ہے۔"

"ابھی تم پھر سے یہ مال لے کر سیدھا ادھر آیا ہے۔ بس ایک سو بیس سے نہ پیسہ کم نہ پیسہ زیادہ!" وہ دمکتی رگ ہاتھ میں آتے ہی بولا۔

"چلو۔ حساب کرو!" میں نے اُچھلتے ہوئے دل کے ساتھ مگر نیم دلانہ لہجے میں کہا۔

اُس نے جھٹ پٹ زبانی حساب کیا۔ کل رقم ایک لاکھ ترانوے ہزار تین سو بیس روپے بنی۔ اُس نے خوابگاہ میں موجود آہنی سیف کھول کر بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور ایک لاکھ ترانوے ہزار روپے میرے سامنے ڈھیر کر دیئے۔

" اور تین سو بیس ؟ " میں نے پوچھا۔

" ارے یار اتنا بڑا بیوپاری ہو کر چھوٹی بات کرتا ہے !" وہ میرے شانے پر ہاتھ مار کر فراخ دلانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ " اس سے میں آج شام کا خرچہ نکالوں گا۔"

تین ماہ کے شب و روز اور چند ہزار کے خرچ کے بعد ملنے والی رقم میرے لئے بہت کافی تھی۔ میں نے ساری رقم بریف کیس میں ڈالی اور سیٹھ غلام علی سے رخصت ہو گیا۔

راستے میں مجھے عجیب سی دوہری مسرت ہو رہی تھی۔ میں نقلی سونا مناسب داموں پر فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور غلام علی سے اپنا انتقام بھی لے لیا تھا۔

بہادر آباد سے پہلے میں صدر پہنچا۔ ایک دکان پر جا کر داڑھی صاف کرائی اور تین ہٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں جمال بڑی بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ مجھے پہلی نظر میں وہ نہ پہچان سکا۔

" مبارک ہو بابا " میں نے قریب پہنچ کر کہا تو وہ چونک پڑا۔

" کیا ہوا ؟ "

" سونا ٹھکانے لگ گیا ' اب ہمارے پاس بہت رقم ہے۔"

" اور داڑھی کیا ہوئی ؟ "

" وہ صاف کرا دی۔ صبح جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں نے اُسے نقلی سونا بیچا ہے تو وہ پاگل کُتے کی طرح مجھے ڈھونڈتا پھرے گا۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

" اور جو اُس نے پولیس کو تیرے پیچھے لگا دیا ؟ " وہ میرے قریب آکر سہمی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں بولا۔

" وہ پولیس کے پاس گیا تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پولیس اُس سے سونے کا حساب اور رسید طلب کرے گی وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ اپنی گردن پھنسائے۔ ہاں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح کانوں کان سارے پاکستان میں پھیل جائے گی اور کوئی سُنار کسوٹی کے بغیر سونے کو ہاتھ نہ لگائے گا۔"

" اب کیا ارادہ ہے ؟ " اس شخص کو مجھ پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُس نے مجھ سے رقم کی بابت پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔

" جعلی سونا ہم نے پہلی اور آخری بار کامیابی سے بیچ دیا ہے " میں نے اُس سے کہا " کوئی دوسری کوشش ہمیں سخت مصیبت میں ڈال دے گی۔ اس لئے آج کی رات تو جیسے تیسے بسر کرو۔ کل صبح ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ میں اب کچھ دن لاہور میں گذارنا چاہتا ہوں۔"

" اب کہاں سر چھپائیں گے۔ شہر چھوڑنا ہی ہے تو ابھی نکل چلو۔ کوئی نہ کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔"

کچھ ہم نے معمولی جڑی بوٹیوں اور ڈبوں سے بھرا ہوا چوبی صندوق وہیں چھوڑا کیمیاگری والا صندوق لے کر ریلوے اسٹیشن جا پہنچے۔

ہمارے حلیے اس قابل نہ تھے کہ اوّل درجے کے ٹکٹ خریدے جاتے۔ لوگ بلاوجہ ہمیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ میں نے دوسرے درجے کے ٹکٹ لئے اور آخری ٹرین سے لاہور روانہ ہو گئے۔

" تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میرے پاس کتنی رقم ہے " راستے میں موقع پا کر میں نے جمالی سے کہا۔

" پوچھ کر کیا کرنا۔ مل جل کر ہی خرچ کریں گے ' لے آیا ہو گا دس بیس ہزار " اُس نے کمال بے نیازی کے ساتھ کہا اور میرا جی چاہا کہ اُس کی سادہ لوحی پر اپنا سر پیٹ لوں۔

" دو لاکھ میں صرف سات ہزار کم ہیں !"

" ہیں " اس کی آواز طول کھینچتی چلی گئی اور آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

" تمہاری صحت بہت خراب ہے۔ میں تمہیں علاج کے لئے مری چھوڑ دوں گا ہفتے میں ایک آدھ بار خیر خبر بھی لیتا رہوں گا۔ اس کے بعد بھاندر ناس کا کھوج نکالیں گے۔"

" بھاندر ناس کا کھوج لگانا ہے تو ڈھاکہ جانا ہو گا "

" کیوں ؟ "

" ایک بات میں نے تجھ سے اب تک چھپائی تھی۔ میں برسوں نیپال میں رہا ہوں۔ وہاں کے کئی کیمیاگروں سے میری خط و کتابت ہے لیکن وہ لوگ اب بھٹک کر پارس پتھر کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں مجھے ان ہی سے پتہ چلا تھا کہ آج کل نیپال میں آنند نام کا بڑا شہرہ ہے اور لوگ اُسے رشی یا اوتار سمجھتے ہیں۔ وہ سال میں ایک بار پورے بدن میں منوں وزنی لوہے کی زنجیریں ڈال کر آہنی چمٹا بجاتا ہری رام۔ ہری کرشنا کے نعرے مارتا پہاڑوں پر جا چڑھتا ہے اور جب کئی مہینوں بعد وہ واپس لوٹتا ہے تو اُس کی ساری زنجیریں سونے کی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی کٹیا میں جانے سے پہلے ساری زنجیریں اُتار کر بے نیازی سے پھینک دیتا ہے اور لوگ اُن کی ایک ایک کڑی لوٹ لے جاتے ہیں۔ اس لوٹ مار میں دوبار وہاں خون خرابہ ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان پہاڑوں میں پارس پتھر تو خیر کیا بھاندر ناس کی جڑیں ضرور ہوں گی۔ انند رام دو مہینے بعد پھر پہاڑوں میں جانے والا ہے۔ ہمیں اس وقت تک وہاں پہنچ کر اس کا پیچھا کرنا چاہیئے۔"

یہ تفصیل سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اُس نے اتنی بڑی اور اہم خبر مجھ سے چھپائی تھی۔ بہرحال اب تو ہم ٹرین میں سوار ہی تھے۔ جمال کی حالت بھی ابتر تھی۔ میں خود تین مہینے کی کیمیاگری کے بعد اپنے سینے میں تیزابی بخارات کا رچاؤ محسوس کر رہا تھا اس لئے چند دن آرام کر کے ہی اس نئی مہم پر روانہ ہونا بہتر تھا۔

لاہور پہنچ کر میں نے ایک ہوٹل میں نئے فرضی نام مسلم سے دوہرے بستر کا کمرہ لیا۔ بازار سے نئے لباس خریدے۔ کرتے شلوار میں چاند جیسی زلفوں والا سنیاسی بہت گمبھیر شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔

رات گذار کر ہم نے مری کی تیاری شروع کر دی۔ کیمیا کے سامان والا چوبی صندوق اسی کمرے میں چھوڑا۔ رقم کا بریف کیس ساتھ لیا اور ریل کار سے پنڈی روانہ ہو گئے۔

پنڈی میں ایک ماہر ڈاکٹر سے مل کر جمال کے بارے میں مشورہ کیا۔ اُس نے میرے خیال کی تائید کی اور دوا دینے کے ساتھ ہی کچھ دن مری میں قیام کا بھی مشورہ دیا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ جمال کو ٹی بی ہو چکی ہے۔ ہاں سال چھ مہینے عدم توجہی جاری رہتی تو شاید وہ مرحلہ بھی آ جاتا۔

مری میں کمرہ بہت مشکل سے ملا کیونکہ وہاں سیاحوں کی بھرمار تھی۔ ۔۔۔

نے جمال کو دس ہزار روپے دیئے لیکن اُس نے وہ رقم مجھے لوٹا دی۔

" بس دو تین ہزار کافی ہوں گے۔ باقی رقم احتیاط سے رکھ لے کام آئے گی !" اُس نے کہا تھا۔

تین ہزار اُسے دے کر باقی رقم میں نے رکھ لی اور واپس لاہور لوٹ آیا۔

اب میرا ارادہ اپنے گھر والوں کی خیر خبر لینے کا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہاں جانے کیا حالات ہوں۔ لہٰذا اس سے پہلے کم از کم اپنے بازار کا بھی رنگ دیکھ لیا جائے۔

سرِ شام میں اس بازار میں پہنچا۔ طبلوں کی تھاپ پر پائل کی دھیمی دھیمی جھنکار باذوق لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ میں یوں ہی سرسری انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ ــــــــ اچانک ایک سائبان کے نیچے سے ایک نوجوان میری طرف لپکا اور آہستہ سے بولا۔ " بابو مال چاہیئے !"

آواز شناسا سی تھی۔ میں نے سر اُٹھایا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک ہی میرے سر پر وزنی لٹھ دے مارا ہو !

میں بس اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

آواز بلکہ وہ چہرہ بھی میرا شناسا سا تھا !

وہ میرے کالج کے زمانے کا دوست اکبر تھا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کرتے شلوار میں ملبوس سائبان کے نیچے کھڑا بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا اور اس کے چہرے پر بے حیائی کی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

اکبر کو میں نے آٹھ سال کے طویل عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ مگر پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان گیا۔ کنپٹیوں پر پھیلتی ہوئی سفیدی سے قطع نظر وہ جوں کا توں تھا۔ اسے یوں گندے بازار میں جسموں کے بیوپار میں مبتلا دیکھ کر مجھے سخت ذہنی صدمہ ہوا اور میں چند ثانیے تک کچھ کہے بغیر بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ !

مجھے یوں ہکا بکا دیکھ کر وہ داہنی آنکھ دبا کر بولا " بہترین مال ہے سیٹھ، سوچتا کیا ہے ۔۔۔ آج کی رات کوئی مقدر والا ہی اس کا ہمنشین بن سکے گا۔!"

میری بدلی ہوئی وضع قطع، لمبی مونچھوں اور بڑے بڑے بالوں کی وجہ سے اکبر مجھے بالکل نہ پہچان سکا تھا۔ آٹھ برس میں وہ جوں کا توں ضرور تھا مگر میری ہیئت کافی بدل چکی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنی اصلیت سے آگاہ نہ ہونے دوں گا۔ اس بدبخت پر نظر پڑتے ہی مجھے گلنار یاد آ گئی تھی مگر میں نے اپنے نفس پر قابو پا ہی لیا۔ " مال کدھر ہے ؟ " میں نے اس کے قریب ہو کر سوال کیا۔

" یہیں ہے۔ کشمیرن چھوکری ہے مہینے میں ایک بار سودا کرتی ہے اور آج اس کی بولی کا دن ہے۔ دو ہزار وہ لے گی، سو روپے میرے !" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

کشمیرن کا لفظ میرے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح گرا۔ گلنار بھی کشمیر سے ہی تعلق رکھتی تھی اور اکبر کے ذریعے میرا اُس سے تعارف ہوا تھا۔ پھر اکبر درمیان سے ہٹ گیا اور وہ میرے دل و دماغ پر چھاتی چلی گئی اس دور میں میں نے نہ جانے کن کن نازنینوں کے قرب سے اپنی زندگی میں رنگوں کی دھنک بکھیری تھی ۔ مگر گلنار ۔۔۔ وہ تو بس بجلی تھی ۔ میں نے بے شمار شامیں اس کے ساتھ گزاریں ۔ اس کو بے شمار تحفے دیئے، اس کی ہر خواہش کو پورا کیا ' حد تو یہ ہے کہ محض اس کی خاطر میں نے اپنے والد صاحب کی شان میں ایسی گستاخی کی جس کا صدمہ ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا اور میرے گھر والوں نے مجھے دھتکار دیا۔

میرا ذہن خلاؤں میں اُڑنے لگا اور میں نے بلا عذر اس کی شرائط مان لیں۔ میں جلد از جلد اس کشمیرن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اکبر کے ساتھ چلتا میں تھوڑی ہی دیر میں بازارِ حُسن سے ملحق گلی کے ایک کُشادہ مکان میں جا پہنچا جس کی آرائش سے مکینوں کے ستھرے ذوق اور آسودہ حالی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہاں نہ روایتی بالاخانوں کے ساز تھے، نہ سازندے نہ چلمن تھی نہ دعوت انگیز نظارے !

اکبر نے مجھے اسی کمرے میں ایک صوفے پر بٹھایا اپنے کمیشن کے سو روپے وصول کر کے پھرتی کے ساتھ جیب میں اُڑسے اور مسکرا کر بلند آواز میں بولی کہہ کر کسی کو پکارا۔

چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی ' نفیس کامدار ساڑی میں ملبوس دراز قامت ' متناسب بدن اور بڑی تیز لڑکی اس کمرے میں بے حجابانہ گھستی چلی آئی۔ اس کے ہونٹوں پر فراخدلانہ مسکراہٹ رقصاں تھی اور بڑی بڑی آنکھیں دعوت قرب دے رہی تھیں۔

اکبر کے بعد وہ میرے لئے دوسرا شدید ذہنی صدمہ تھی۔ اپنی محبت کو ایک بیسوا کے روپ میں دیکھ کر مجھ پر کیا کچھ نہ بیت گئی ' صدمہ، غصہ، بے بسی، نفرت ' یہ ساری ہی کیفیتیں لمحہ بہ لمحہ گزر گئیں اور آخر ان سب نے مل کر انتقام کا بھیانک روپ دھار لیا۔

یہی وہ آبرو باختہ لڑکی تھی جس کا فریب کھا کر میں نے گھر بار، ماں باپ بھائیوں ۔۔۔ سب کو چھوڑا۔ اس وقت میری نظروں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن اب سارا کھیل میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ گلنار کسی ڈاکٹر کی بیٹی ہرگز نہ تھی۔ اکبر میرا ساتھی تھا اور دوست ہوتے ہوئے وہ مجھ سے دولت نہیں سمیٹ سکتا تھا اس لئے وہ گلنار کو درمیان میں لایا ' پھر خود الگ ہو گیا۔ وہ مجھے لوٹتی رہی۔ اکبر پس منظر میں رہ کر اس سے اپنا حصہ وصول کرتا رہا اور جب میں مفلس ہو گیا تو اکبر نے مجھے لاہور سے کراچی کی ترغیبِ ہجرت دی ' اور خود گلنار کو ۔۔۔ اسے نہیں بلکہ اس کے حسن اور شباب کو سرِ بازار لا کھڑا کیا

" ساری بات طے ہو چکی ہے بولی !" اکبر گلنار سے کہہ رہا تھا۔ " تم مہمان کو اندر لے جاؤ، میں یہیں کسی صوفے پر سو جاؤں گا۔"

" جی سرکار !" گلنار بالکل میرے پہلو میں آ بیٹھی۔ " بندی کے لئے کیا حکم ہے !"

میں نے سخت طیش کے عالم میں اس پر ایک نظر ڈالی" چہرہ دہک رہا ہے۔ آنکھیں چمک رہی ہیں!" اکبر میری بدلتی ہوئی کیفیت کا غلط مفہوم سمجھ کر بولا۔" یونہی انہیں لے جاؤ اور آرام کرو۔!"

گلنار نے جھک کر ایک ادا سے میرا ہاتھ تھام لیا اور دروازے کی طرف چلدی۔ ایک مختصر سی راہداری عبور کر کے ہم ایک پُر تکلف خوابگاہ میں داخل ہوگئے جہاں سنگھار میز اور مسہری کے علاوہ مختلف قسم کی شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی ایک الماری بھی موجود تھی۔

میرے وجود میں آگ بھڑک اٹھی اور اس وقت میں نے اچانک محسوس کیا کہ مجھے گلنار سے کبھی محبت نہیں رہی۔ میں ہر لڑکی کو خریدتا رہا' لیکن اس کے دام نہ لگا سکا اور یہ تشنگی مجھے اس کے ساتھ لگائے رہی۔ ہوس کی اس کار فرمائی کو میں محبت سمجھ بیٹھا تھا مگر اب وہ دام لگوا کر یوں میری آغوش میں آگری تو اس کی ساری کشش دم توڑ گئی۔ اب میرے لئے اس کا کوئی نام نہ تھا۔ بس وہ ایک لڑکی تھی' جوان اور خوبصورت لڑکی۔ آوارہ اور چالاک لڑکی۔!

پھر خوابگاہ کی سبز روشنی گناہ کی تاریکی میں ڈھل گئی۔ وقت کی تمیز ختم ہوگئی اور میں گلنار کے روئیں روئیں سے اپنی رقم کا خراج وصول کرنے لگا۔ گناہ میں لذت ضرور ہے مگر صرف وقتی۔ رات کے آخری پہر تک میرا دل اس فتنہ انگیز لڑکی سے بھر چکا تھا۔ میں نے آہستگی سے پہلو بدلا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے رخسار سہلانے لگا۔ میرے ہاتھوں پر ہلکی سی لرزش چھائی ہوئی تھی اور وہ آنکھیں موندے چت لیٹی تھی۔!

چند منٹ یوں ہی گزرے اور میرے دونوں ہاتھ اس کے نرم نرم رخساروں سے پھسل کر اس کی گردن پر جم گئے۔ اُس نے چیخنا چاہا مگر میری بے رحم انگلیاں اس کے حلقوم کے گرد تنگ حلقہ بنا چکی تھیں۔ ہاں اس کا بدن پوری آزادی کے ساتھ تڑپا!

میں وحشیانہ انداز میں اس کا گلا گھونٹتا رہا۔ وہ آواز نکالے بغیر تڑپ تڑپ کر ساکت ہوگئی۔ مگر میں نے پھر بھی احتیاط کا دامن نہ چھوڑا۔ جب اس میں زندگی کی آخری رمق تک ختم ہوگئی تو میں اُسے چھوڑ کر بستر سے اتر آیا۔ تاریکی کے باعث میں مرنے کے بعد اس ہرجائی اور بدچلن لڑکی کی صورت نہ دیکھ سکا۔ قتل سرزد ہونے کے بعد مجھ پر اضطراب اور خوف کی ملی جلی کیفیات طاری ہو چلی تھیں۔ میں روشنی کرنے کی ہمت نہ کر سکا اور چوروں کی طرح دبے پاؤں گلنار کی خوابگاہ سے باہر آگیا۔

اکبر کی ایک بُری عادت اس وقت میرے لئے اطمینان اور رہنمائی کا سبب بنی۔ ڈرائنگ روم سے ابھرنے والا خراٹوں کا تیز شور مجھے ایکبار پھر خونریزی پر اکسا رہا تھا۔ اکبر نے دوست بنکر مجھ سے دغا کی تھی اور صرف مالی ہی نہیں بلکہ رُوحانی نقصان بھی پہنچایا تھا۔ گلنار کو بدی کی راہ پر لگانے میں شاید اسی کا ہاتھ کار فرما تھا۔

میں دبے قدموں اس کے سر پر جا پہنچا۔ گلنار کے قتل کے بارے میں وہ واحد گواہ تھا جو میری نشاندہی کر سکتا تھا اور اب اس کا زندہ رہنا میرے لئے نقصان دہ تھا۔

پھر جوں ہی میرے ہاتھ اس کی شہ رگ پر جمے وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوگیا۔ میں پھرتی کے ساتھ اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے نیچے دبالئے تاکہ وہ میری مہلک گرفت سے نجات نہ حاصل کر سکے۔!

"تت... تم کون ہو۔" وہ بھنسی بھنسی آواز میں خوفزدہ ہوکر بولا

"مجھے پہچان لے اکبر تاکہ مرنے کے بعد تجھے افسوس نہ ہو کہ ایک اجنبی کا شکار رہا۔ میں صفدر ہوں صفدر۔ جس کی محبوبہ سے اب تک تو پیشہ کراتا رہا ہے۔"

"وہ... وہ... اب... مم... میری بیوی ہے صفدر!"

اس سے آگے اس کی آواز حلق کی ہی گہرائی میں دم توڑ گئی۔

وہ جسمانی طور پر کسی طرح مجھ سے کمتر نہیں تھا اور ایک بار بھی اسے سنبھلنے کا موقع مل جاتا تو اور کچھ ہوتا نہ ہوتا مگر میں ضرور دھر لیا جاتا۔ بس غنیمت یہ ہوا کہ جب میں نے وار کیا تو وہ سویا ہوا تھا اور جب اسے ہوش آیا تو میں پوری طرح اس پر قادر تھا۔ اس کی رہی سہی قوت جان کے خوف میں تحلیل ہوگئی۔ اور ذرا ہی دیر میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا!

میرے نام کے ساتھ اب اسمگلر اور مفرور کے ساتھ ہی قاتل کا بھی اضافہ ہو چکا تھا!۔ دونوں لاشوں کو وہاں چھوڑ کر میں پھرتی اور احتیاط کے ساتھ مکان سے باہر آیا۔ غصہ تیزی کے ساتھ معدوم ہو چکا تھا' انتقام کی آگ لہو سے سرد ہو چکی تھی اور اب مجھ پر اعصابی تناؤ طاری ہونے لگا تھا جو اتنے بڑے معرکے کے بعد یقینی تھا۔ کم و بیش دو لاکھ کی خطیر رقم میرے پاس موجود تھی جو میں نے نقلی سونا فروخت کر کے کراچی کے سیٹھ غلام علی مرچنٹ سے حاصل کی تھی۔

رات اپنے آخری سانسوں پر تھی اس لئے میں نے گھر جانے کا ارادہ صبح تک کے لئے ملتوی کر دیا اور خود کوپر روڈ کی طرف چل دیا۔ جہاں کے ایک مکان میں غیر قانونی طور پر خفیہ جوا خانہ کھلا ہوا تھا مجھے توقع تھی کہ آٹھ برس گزرنے کے بعد بھی اس کاروبار میں فرق نہ آیا ہوگا!

طویل مدت تک جوئے سے کنارہ کش رہنے کے بعد میں وہاں پہنچا تو ہر میز پر کھیل پورے زور و شور سے ہو رہا تھا۔ میں نے پھاٹک سے داخل ہونے کے بعد طویل راہداری کے وسط میں درختوں کی اوٹ میں رک کر بریف کیس میں بھری ہوئی نوٹوں کی گڈیوں میں سے چند جیب میں ڈال لی تھیں تاکہ وہ بھاری رقم کسی کی نظر میں نہ آسکے۔!

کچھ دیر تک میں مختلف میزوں پر ہونے والے کھیل کا جائزہ لیتا رہا۔ وہاں ہر طرف اونچے اسٹیک چل رہے تھے اور تمام جواری سلفی روک کے اتنے انہماک سے کھیل میں ڈوبے ہوئے تھے جیسے وہ کوئی عبادت کر رہے ہوں!

دس پندرہ منٹ بعد فلش کی ایک پارٹی میں مجھے جگہ مل گئی۔ کارڈ تقسیم ہوئے۔ تین راؤنڈ تک بلائنڈ چلتی رہی۔ پانچویں میں ایک پیک ہوا۔ اگلے میں دوسرا پیک ہوا اور میرے سامنے صرف ایک حریف رہ گیا۔ میرے پاس ایک اکا اور دو بادشاہ تھے۔ میں بھرپور انداز میں ڈبل کرتا رہا اور وہ بھی مدافعانہ انداز میں جما رہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہال میں سنسنی پھیل گئی۔ کئی میزوں سے لوگ اپنا کھیل چھوڑ کر ہمارے گرد جمع ہوگئے۔!

میرے حریف کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے مگر وہ ہار ماننے پر تیار نہیں تھا۔ آخر میں نے ہی اس کے کارڈز شو کرائے۔ وہاں تین اِکے تھے۔ اس نے بے صبری کے ساتھ ساری رقم اپنے آگے سمیٹ لی۔

صبح کے سات بجے تک میں اسی زور شور سے کھیلتا رہا اور ہارتا رہا۔ جب میری جیب میں صرف چند سو روپے رہ گئے تو میں شکست خوردہ انداز میں میز سے اُٹھ گیا۔ چند ہی قدم چلا تھا کہ اپنا بریف کیس یاد آیا۔ میں میز کی طرف واپس پلٹا تو دل دھک سے رہ گیا۔ میرا بیگ وہاں موجود نہیں تھا۔!

میں نے پاگلوں کی طرح پورا ہال چھان مارا لیکن بیگ نظر نہ آیا' جوئے خانے کے منتظمین سے اس سیاہ چرمی بیگ کے بارے میں پوچھا لیکن وہ بھی لاعلم تھے۔ آخر میں دل ہی دل میں اپنے مقدر کو کوستا اس عمارت سے کھلی فضا میں نکل آیا۔

شاید میرا ستارہ ابھی تک گردش میں تھا۔ میں نے اپنے نام کو داؤ پر لگا کر بمشکل جو رقم حاصل کی تھی وہ یوں ہاتھ سے نکل گئی جبکہ میرے پاس صرف چند سو روپے رہ گئے تھے اور بھائیوں کی تلاش میں ڈھاکہ پھر نیپال کا سفر خاصا مہنگا ثابت ہو سکتا تھا۔

کوپر روڈ سے ٹیکسی پکڑ کر میں گھر کی طرف روانہ ہوا اور بے اختیار مجھے اپنا وہ وقت یاد آگیا جب میں نے اپنے پیدا کئے ہوئے حالات کے تحت اپنا شہر چھوڑا تھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے میں پھاٹک پر پہنچا تو میرے قدم ٹھٹھک گئے۔ پھاٹک پر وحید قاضی کے نام کی تختی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ شاید میرے گھر والے یہ مکان کرائے وغیرہ پر دے کر کہیں اور جا بسے تھے۔!

میں نے ان کا موجودہ پتہ معلوم کرنے کی غرض سے گھنٹی بجائی تو ایک چوکیدار آیا جس کے ذریعے میں وحید قاضی تک پہنچا۔ اُس نے بتایا کہ وہ میرے بھائیوں سطوت علی اور مظہر علی سے قطعی نا آشنا ہے۔ اُس نے دو سال قبل وہ مکان کسی اور شخص سے خریدا تھا۔

اس ناکامی کے بعد میں نے ان کی مزید تلاش کا ارادہ ترک کر دیا اور فوراً ہی اسٹیشن جا پہنچا تاکہ پہلی ٹرین سے پنڈی پھر مری پہنچ سکوں۔ شام کو میں مری پہنچا تو بوڑھا کیمیا گر جمال مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"حیرانگی کی ضرورت نہیں بابا۔" میں تھکی ہوئی شکست خوردہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔" بدنصیبی ہر جگہ میرا تعاقب کر رہی ہے۔"

"کیا ہوا۔؟" وہ پُر تجسس لہجے میں بولا۔

"ساری رقم چوری ہوگئی۔ بس جیب کے چند سو روپے بچے ہیں۔" میں نے کہا۔" میں وہ بیگ ٹیکسی ہی میں بھول کر اتر گیا اور کافی تلاش کے باوجود اس ٹیکسی کا سراغ نہ مل سکا کیونکہ میرے پاس اس کا نمبر نہیں تھا!"

"یہ بُرا ہوا۔" اس کے لہجے سے تاسف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اتنی بڑی رقم ہاتھ آکر نکل گئی۔ مگر خیر اس پیسے سے میرا دل خوش بھی نہیں تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ چوری اور فریب کا پیسہ تھا۔" وہ دھیمی اور پُر جوش آواز میں بولا۔

"کیمیا کے بعد کیا ہم جائز پیسہ حاصل کر سکیں گے؟"

"کیوں نہیں۔" وہ تیز لہجے میں بولا" کیمیا ایک فن ہے۔ سنگتراش ایک بے ڈول اور بے وقعت پتھر پر محنت کر کے اسے سنوارتا اور نکھارتا ہے پھر اُس کی من مانی قیمت وصول کرتا ہے اسی طرح کیمیا گر سستے تانبے کو مہنگے سونے میں ڈھال کر بیچتا ہے۔ نقلی سونا بیچ کر حاصل کی ہوئی رقم ناجائز تھی۔ ہاں سونا کسوٹی کی پرکھ کے بعد بیچو تو اس رقم سے مجھے سچی خوشی ہوگی۔"

"خیر۔ جو ہوا سو ہوا' اب کیا کرنا چاہیئے۔؟"

"شاید میرا علاج ابھی میرے مقدر میں نہیں ہے۔ جو رقم تم مجھے دے گئے تھے وہ میرے پاس جوں کی توں موجود ہے۔ اب پہلی فرصت میں ڈھاکہ چلنے کی تیاری کرو۔"

میں خود بھی دل سے یہی منصوبہ لے کر اس کے پاس پہنچا تھا۔ اُس نے خود پیشکش کر کے میرا کام کافی آسان کر دیا تھا۔ مری میں جمال کا قیام ایک ہی دن رہا اور ہم وہاں سے واپس روانہ ہوگئے۔ اس دوران میں میں نے اخبارات میں گلنار اور اس کے شوہر اکبر کے بہیمانہ قتل کی خبر پڑھی۔ یہ بات پہلے سے پولیس کے ریکارڈ پر تھی کہ نکھٹو اور بے روزگار اکبر اپنی بیوی کی آمدنی کے سہارے آسودگی کے دن بسر کر رہا ہے۔ گلنار پیسے کے معاملے میں اکبر کے ساتھ بہت سخت تھی شاید اسی لئے وہ گاہکوں سے اپنا کمیشن الگ وصول کرتا تھا!

بے ضمیری اور بے حیائی کا یہ مظاہرہ میرے لئے انوکھا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ایسے بے غیرت جوڑے کا مر جانا ہی زیادہ بہتر تھا اور قدرت نے اس اچھے کام کے لئے میرا انتخاب کیا تھا۔

ہم نے لاہور سے اسی شام ڈھاکہ کے لئے ہوائی جہاز کی دو نشستیں حاصل کیں اور رات میں مشرقی صوبے کے دارالحکومت جا پہنچے۔ ان دنوں ڈھاکہ کا رنگ ہی کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ نسلی اور لسانی تعصبات دھیمے دھیمے سر اُبھار رہے تھے مگر نفرت کا وہ زہر ابھی عام آدمیوں میں نہیں پھیلا تھا۔ بنگالی اور غیر بنگالی مزدور شانہ بشانہ کام کرتے تھے' یہ سوچے بغیر کہ کون کہاں پیدا ہوا اور کیوں پیدا ہوا۔؟

محمد پور ڈھاکہ میں غیر بنگالیوں کی سب سے بڑی بستی ہے۔ جمال نے مجھے بتلایا کہ اس کا طیب نامی ایک مدراسی دوست وہیں رہتا ہے اور اس نے اپنی ساری عمر کیمیاگری یا بھاندر ناس کی تلاش میں گزاری ہے۔

پہلے مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ محمد پور کتنی بڑی بستی ہوگی۔ وہاں پہنچا تو ساری امیدوں پر پانی پھرتا نظر آنے لگا۔ محمد پور تو انسانوں کا ایک اتھاہ سمندر تھا۔ دیوار سے دیوار ملے ہوئے چھوٹے بڑے مکانوں کی اس گنجان بستی میں محض نام کے سہارے کسی کا سراغ لگا لینا معجزہ ہی نظر آتا تھا۔

کچھ دیر تک بے مقصد ان گلیوں میں گھومتے رہنے کے بعد میں ایک پرچون فروش بوڑھے کی دوکان پر جا پہنچا جہاں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔

"کہاں سے آئے ہو بابو۔؟" بوڑھے نے طیب کا نام سن کر پوچھا۔

"کراچی سے۔" میں نے کہا۔

اُس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر آ کر گزر گیا۔ "کس کام سے آئے ہو؟" اس کی جرح سے میں چڑ گیا۔ "کام ہی ہے۔ تمہیں ٹھکانہ معلوم ہے اُس کا۔؟"

"بڑی دور دور سے لوگ اس کی تلاش میں آتے ہیں بابو۔ مگر وہ مدراسی اپنا راز سینے ہی میں لے کر جائے گا۔" وہ میری بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولا۔

"کیسا راز؟" اس بار جمال نے زبان کھولی۔

"انجان نہ بنو۔" وہ تیز سرگوشیانہ آواز میں بولا۔ "کیا تم اس کے پاس کیمیا کا راز جاننے کے لئے نہیں آئے ہو۔؟"

"ہاں آئے ہیں۔ پھر۔؟" میں اُس سے جلد از جلد جان چھڑانی چاہ رہا تھا۔

"محمد پور کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ طیب مدراسی سونا بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔" وہ جوشیلی آواز میں بولا۔ "مگر اس کا مقدر خراب ہے، جب اس نے سونا تیار کر لیا تو ہلنے جلنے تک سے معذور ہو گیا۔ اب وہ اسی آس پر جی رہا ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور صحت یاب ہوگا اور منوں سونا تیار کرے گا۔"

"لیکن وہ رہتا کہاں ہے؟"

"اسی بستی میں رہتا ہے۔ تم سیدھے چلے جاؤ۔ آگے داہنے ہاتھ پر مسجد آئے گی اس کے ساتھ والی گلی میں بائیں سے تیسرا یا چوتھا مکان اسی کا ہے۔ اس کے دروازوں کا رنگ کالا ہے۔"

طیب مدراسی کا پتہ معلوم ہو جانے کے بعد میں نے وہاں رک کر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور جمال کو ہمراہ لے کر اس پرچون فروش کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیا۔ وہ مکان کیا ایک کال کوٹھری سی تھی۔ جس میں طیب ایک بوسیدہ چارپائی پر نیم بیہوشی کے عالم میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔!

دوپہر کا وقت ہونے کے باوجود اس تنگ کوٹھری میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ ایک طرف بہت سے خانوں والی ایک خالی چوبی الماری بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ جس کے نیچے بہت سی بوتلیں وغیرہ ٹوٹی پڑی تھیں۔ فرش پر بہت سے مرتبان اور ڈبے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور کوٹھری کے تاریکی میں ڈوبے غمناک گوشوں سے صحت مند چوہوں کی بھاگ دوڑ کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

"طیب!" جمال بابا اس کے قریب جا کر تقریباً لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

اس کا بدن کسمسایا پھر شاید اس نے بولنے کی کوشش کی، لیکن اسی وقت اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ ہولناک خشک کھڑکھڑاہٹ سُن کر میں سر سے پیر تک لرز اٹھا۔ جمال نے اس زندہ استخوانی ڈھانچے کو سہارا دینے اور سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ کئی منٹ تک اس کربناک عذاب میں مبتلا رہا۔ اس کے چہرے کی ساری وریدیں جلد پر اُبھر آئی تھیں اور آنکھوں سے عجیب سی وحشت ٹپکنے لگی تھی۔

جب اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بے مقصد چند ننگی گالیاں بکیں، پھر بولا۔ "اس زندگی میں اب مزا نہیں رہا۔ نہ جانے میرے خواب کب پورے ہوں گے۔!"

"میں نے سُنا ہے تو سونا بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" جمال براہ راست سوال پر اتر آیا۔

اُس نے پھر ایک گالی بکی اور غصیلی آواز میں بولا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں۔ ایک چھوکرا میرے ساتھ رہتا تھا اور میں کوٹنے پیسنے کے عوض اسے دو روپے روز دیتا تھا۔ نمونے کی ڈلی مجھے آزمانے کا موقع ہی نہیں مل سکا جیسے ہی وہ تیار ہوئی میں بیمار پڑ گیا اور وہ ولد الحرام ڈلی اُڑا لے گیا۔ صرف یہی نہیں، اُس نے وہ ڈلی کسوٹی لگوا کر بڑے آرام سے بازار میں بیچ دی اور پورے محمد پور میں مجھے بدنام کر دیا کہ میں سونا بناتا ہوں۔ اب آئے دن اس نسخے کی تلاش میں دو چار آدمی یہاں آ کر مجھے تنگ کرتے رہتے ہیں۔"

"تیرا کیا خیال ہے؟" جمال نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا واقعی سونا تیار ہو گیا تھا؟"

طیب تیز نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ "شاید تو بھی اِسی کھوج میں آیا ہے۔؟"

"ہاں۔" جمال اطمینان سے بولا۔ "لیکن تیرے نسخے کی کھوج میں نہیں۔ یہاں پہنچنے سے پہلے مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ تو سونا تیار کر چکا ہے۔"

"جب تک اس نسخے سے میں پورا پورا فائدہ نہ اُٹھا لوں، کسی کو اس کی ہوا نہ لگنے دوں گا۔ ایسی چیز کا کیا فائدہ جس سے آدمی کو خود فیض نہ پہنچے۔" طیب بیزاری کے آخری مرحلے پر نظر آتا تھا۔

"تیری بات تو ٹھیک ہے مگر میں تجھ سے صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ نیپال کا کون سا علاقہ کارآمد ہے!" جمال نے آہستہ سے کہا۔

طیب پر ان الفاظ کا حیرت ناک اثر ہوا اور وہ اُسے پھٹی

پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اس کے چہرے سے شکست خوردگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا تو اتنا آگے جا چکا ہے!" کئی ثانیوں کے سکوت کے بعد طیب کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں بس تاؤ کی کسر رہ جاتی ہے!" جمال اعتماد کے ساتھ بولا۔ "بھاندر ناس مل جائے تو سمجھ لے کہ سونا تیار ہے۔"

بھاندر ناس کا لفظ سنتے ہی چارپائی پر دراز طیب نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا اور تقریباً کراہتے ہوئے بولا۔ "تو تجھے اس بوٹی کا نام بھی معلوم ہے۔!"

"بس میں جلد از جلد اپنا تجربہ مکمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تو برسوں آگ اور زہریلے مادوں میں سر کھپاتا رہا۔ سفید سونا بن جاتا ہے اسے رنگنے کا طریقہ بھی اب آسان ہو گیا ہے مگر مہینوں کے تاؤ کے بعد بھی سونے کی نرمی نہیں آتی، کئی برس پہلے میرے ایک دوست نے مجھے تیمر جیسی سخت لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبہ تحفے میں دیا تھا، جب میں لکڑی رگڑتے اور گھیں کا تاؤ دینے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا تو اوٹ پٹانگ تجربے کرنا شروع کر دیئے۔ کبھی شیشے کی بوتلوں میں کچے سونے کو تاؤ دیتا کبھی لوہے کے خول چڑھا کر سرخ کرتا۔ پھر ایک دن میں نے کچا سونا اس عجیب لکڑی کے ڈبے میں ڈال کر بھٹی میں جھونک دیا اور تو یقین نہیں کرے گا کہ تین دن بعد میں نے وہ ڈلا راکھ سے نکالا تو وہ سونا بن چکا تھا۔ پھر میں بیمار پڑ گیا اور وہ ڈلا نہ بیچ سکا مگر میرا ملازم وہ سونا چُرا لے گیا۔ میں نے اپنے نیپالی دوست کو خط لکھا تو اس نے جواب میں ایک عجیب کہانی لکھی۔" وہ سوچ میں ڈوبی اور افسردہ سی آواز میں بولا۔

جمال کچھ دیر اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا مگر طیب پر جب اسی طرح خاموشی چھائی رہی تو اُس نے اس سکوت کو توڑا۔ "ہاں کیا کہانی تھی وہ۔؟"

"اس نے لکھا کہ وہ صندوق جس لکڑی کا بنایا گیا وہ بھاندر ناس کہلاتی ہے اور نیپال کے دشوار گزار پہاڑوں پر پائی جاتی ہے۔ نیپال میں وہ لکڑی بہت مہنگی تصور کی جاتی ہے کیونکہ اوّل تو بھاندر ناس تک رسائی ہی مشکل ہے۔ کوئی پہنچ بھی جائے تو اس پودے کا...... پجاریوں کی نظر سے بچانا ناممکن ہے۔ اگر بھولے سے بھی بھاندر ناس پر کسی اجنبی کا سایہ پڑ جائے تو وہ آناً فاناً میں اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ بھاندر ناس کی بے حرمتی ہے۔"

"وہ قبیلہ کہاں ہے۔ بھاندر ناس کہاں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔؟" جمال یہ تفصیل سنتے ہی بے چین ہو گیا۔

"اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" طیب بولا۔ "بھاندر ناس کوئی درخت نہیں ہوتا۔ اس کی تلاش بہت مشکل کام ہے، یہ درخت بہت سخت جان اور جڑیلا پہاڑی پودا ہے جو موٹی اور لمبی جڑ کی صورت میں برسوں چٹانوں میں اترتا رہتا ہے اور ایک دن چٹانوں میں شگاف ڈال کر کھائیوں میں جا گرتا ہے۔ زمین کے اوپر پہلے چند مہینوں میں بس دو چار جامنی پتے آتے ہیں اور اس کے بعد یہ اوپر کی طرف نہیں بڑھتا۔!"

"تیرے اس نیپالی دوست کا کیا پتہ ہے؟" جمال نے پوچھا۔ "وہ اس مہم میں یقیناً ہماری مدد کر سکے گا۔ ورنہ ہم تو ان پہاڑوں میں بھٹکتے ہی رہ جائیں گے!"

"نہیں!" طیب اچانک غضبناک آواز میں بولا۔ "تو فریبی ہے، بھاندر ناس میری دریافت ہے اور سب سے پہلے میں وہ بوٹی حاصل کروں گا!"

"کیوں پاگل ہو رہا ہے طیب!" جمال نرم لہجے میں بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاندر ناس میں میرا اور تیرا برابر کا حصہ ہوگا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" طیب ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "میں اب سارا کھیل سمجھ گیا۔ تو نے ہی اس چھوکرے کو میرے ہاں چوری پر اکسایا تھا۔ تو نے دوست بن کر مجھے دغا دی ہے، جب تجھے پتہ چل گیا کہ میں سونا بنا چکا ہوں تو تو ہمدردی کا لبادہ اوڑھے یہاں آ پہنچا۔ اب تیری سزا موت ہے، صرف اور صرف موت!" اتنا کہہ کر اس مدقوق بوڑھے نے اپنے سرہانے سے ایک چمکیلا خنجر نکالا اور اس سے پہلے کہ ہم دونوں اپنی مدافعت کے بارے میں سوچ سکیں، اس کا ہاتھ حرکت میں آیا، جمال کے بائیں پہلو سے خون کی دھاریں اُبل پڑیں اور وہ ایک تیز ہچکی لے کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میرا جی تو یہ چاہا کہ طیب کو زندہ درگور کر دوں لیکن میرے لئے اب وہاں رُکنا خطرناک تھا۔ جمال دم توڑ چکا تھا اور میں خود مفرور، اشتہاری مجرم تھا۔ میرے لئے اب پہلا کام اپنی حفاظت تھا۔ پولیس کی گرفت سے بچنے کے بعد میں طیب سے کسی بھی وقت انتقام لے سکتا تھا۔!

میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ سب سوچا، اور تیزی کے ساتھ اس کوٹھری سے نکل گیا۔ جمال کا قتل اتنی خاموشی کے ساتھ سرزد ہوا تھا کہ باہر سے کسی کو اس خونریزی کا شبہ تک نہ ہو سکا تھا۔ کوٹھری سے نکل کر میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا، پھر تقریباً دوڑتا ہوا اس بستی سے نکلنے لگا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے پھرتی کے ساتھ حساب چکایا اور کیمیاگری کے ساز و سامان سے بھرا صندوق لے کر وہاں سے نکل کھڑا ہوا، مجھے پورا یقین تھا کہ اور کوئی نہیں تو محمد پور کا باتونی پرچون فروش ضرور اس معاملے میں میرا ذکر کرے گا اور اس نئے شہر میں، میں زیادہ دن خود کو پولیس کی عقابی نظروں سے محفوظ نہ رکھ سکوں گا۔

بڑی جانگسل بھاگ دوڑ کے بعد میں مغربی گھاٹ پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں سے پٹنہ کے لئے اس روز کی آخری موٹر بوٹ روانہ ہو رہی تھی۔!

موٹر بوٹ میں مفلوک الحال مسافروں کا اتنا ہجوم تھا کہ میں اس بھیڑ میں گم ہو کر رہ گیا۔ بے شمار رنگ دھڑنگ بچے، مرغیوں کے ڈربے

ممیاتی ہوئی بکریاں، سب جمنا کے بہتے پانی سے مل کر عجب سماں باندھا ہوا تھا۔ راستے میں موٹر بوٹ تین چار دریائی گھاٹوں پر رکی کئی مسافر اترے اور کئی نئے افراد شریک سفر ہوئے اور جب بوٹ آخری گھاٹ سے پٹنہ کی طرف روانہ ہوئی تو دریا کے وسط میں پہنچتے ہی انجن میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی اور وہ چند دبی دبی غراہٹوں کے بعد خاموش ہوگیا۔

مسافروں میں دبی دبی بے چین سرگوشیاں شروع ہوگئیں، گو میں بنگالی زبان سے ناآشنا تھا مگر اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ انہیں اپنی جانوں سے زیادہ مرغیوں، بکریوں اور مال واسباب کی فکر تھی۔!

اس وقت رات کا اندھیرا پھیل چلا تھا اور چند اردو بولنے والے دبی زبان میں دریائی قزاقوں کی جانب سے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے، جو ایسے بدنصیب مسافروں کو بے رحمی سے لوٹ لیتے تھے۔! اور ذرا ہی دیر میں ان سارے اندیشوں کی تصدیق ہوگئی۔

وہ لٹیرے تعداد میں تین تھے اور خودکار ریوالوروں سے مسلح! کشتی کے عملے کو باندھ کر بے بس کر دینے کے بعد وہ چہروں پر کپڑے لپیٹے انجن روم سے باہر آئے تو فضا دہشت زدہ انسانی چیخوں سے لرز اٹھی۔ جن مسافروں کے ساتھ کوئی مال اسباب نہیں تھا اور تیراک بھی تھے وہ صورتحال کا اندازہ کرتے ہی چھپاک سے دریا میں کود گئے۔ باقی مسافروں میں وہ ہڑبونگ مچی کہ موٹر بوٹ گہرے پانی میں کسی تنکے کی طرح لرزنے لگی۔ انسانی چیخ وپکار سے وحشت زدہ ہو کر بکریاں اور مرغیاں بھی گلے پھاڑنے لگی تھیں۔!

"خاموش!" ان لٹیروں میں سے ایک فضا میں گولی چلا کر دہاڑا "اب جس کی آواز سنائی دی اس کا بھیجہ اڑا دیا جائے گا۔" وہ اتنی صاف اردو بول رہے تھے کوئی بھی شخص ان کے غیر بنگالی ہونے کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا، انسان تو خاموش ہوگئے۔ لیکن دوسرے مسافروں کا شور جاری رہا۔!

"جس کے پاس کچھ رقم یا زیور ہے، خاموشی سے ہمارے حوالے کر دے ورنہ ابھی اس کی لاش تڑپتی نظر آئے گی۔"

ان میں سے ایک شخص مسافروں سے لوٹ کا مال وصول کرنے لگا۔ دوسرا لڑکیوں کے ایک غول میں جا گھسا اور ان سے دست درازی کرنے لگا۔

"نکالو ۔۔ کیا ہے تمہارے پاس؟" میری دستی گھڑی چھیننے کے بعد سامان جمع کرنے والا غرایا۔

"تم ۔۔!" اس کی آواز پہچانتے ہی میرے منہ سے نکلا۔ وہ سو فیصدی محمد پور کے پرچون فروش کی آواز تھی۔

"تو پہچان ہی لیا تو نے مجھ کو!" وہ دانت پیس کر بولا۔

اسی وقت کسی جانب سے ایک لانچ کا شور سنائی دیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک تاریک لانچ اس مسافر کشتی کے ساتھ آ لگی۔ لوٹ کا سارا مال کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس لانچ پر پہنچا دیا گیا۔ ریوالور کی نال پر مجھے بھی موٹر بوٹ سے اتار لیا گیا، جب مجھے یقین ہوگیا کہ پہچانے جانے کے بعد وہ باتونی بڈھا مجھے نہیں چھوڑے گا تو میں نے التجا کی کہ میرا صندوق بھی ساتھ ہی اتار لیا جائے اور یہ درخواست قبول کر لی گئی۔

"موٹر بوٹ کے ملاح انجن روم میں بندھے پڑے ہیں۔" لانچ پر سے ایک لٹیرا چیخ کر مظلوم مسافروں کو بتانے لگا۔ "تم ذلیل بنگالیوں نے اگر ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو ہم بوٹ کا پیندا چھلنی کر کے تم سب جہنم رسید کر دیں گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ انھیں آزاد کر کے تم لوگ اپنی راہ لو۔"

اور لٹیروں کی لانچ تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگی۔ کچھ دیر تک میں اکیلا رہا۔ شاید ڈاکو تعاقب وغیرہ کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ جب وہ محفوظ حدود میں نکل آئے تو کیبن روشنی میں نہا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد محمد پور کا پرچون فروش بوڑھا بغیر نقاب کے میرے سامنے آپہنچا۔!

"تم ۔۔۔ تم ناپاک لٹیرے ۔۔۔"

وہ مکارانہ انداز میں ہنسا۔ اس وقت وہ اپنے پہلے روپ کے برعکس بہت چالاک اور شاطر نظر آرہا تھا۔ "سن چھوکرے ۔ پولیس میرا بیان لے چکی ہے اور اسے اب تیرے جیسے کے قاتل کی تلاش ہے جس نے طیب کی کوٹھڑی میں ایک بوڑھے کو مارا اور طیب بھی اس حادثے کی دہشت سے چل بسا ۔ تیری آزادی اب صرف میرے ہاتھ ہے۔"

"میں نے جمال کو نہیں مارا ۔۔۔ اسے طیب نے خنجر مارا تھا۔"

"مارا ہوگا ۔۔" وہ لاپروائی سے بولا "مجھے اس سے بحث نہیں کہ تو قاتل ہے یا نہیں ۔۔ بات صرف اتنی ہے کہ حالات تیرے خلاف ہیں اور تجھے میری مرضی پر چلنا ہوگا۔"

"اگر پولیس کو واقعی میری تلاش ہے تو وہ جلد یا بدیر مجھ تک پہنچ ہی جائے گی۔!"

"ضرور پہنچے گی ۔۔" وہ عیارانہ انداز میں بولا "اور اگر میں تجھے مقتول کے ساتھی کی حیثیت سے پہچاننے سے انکار کر دوں، تو کوئی طاقت تجھے مجرم قرار نہیں دے سکتی ۔!"

"آخر تو مجھ سے چاہتا کیا ہے ۔۔؟" میں الجھن میں پڑ گیا۔

"میرے ستارے اچھے تھے کہ میں تیرہ راہ پر لگ گیا" مجھے سپر ڈالتے دیکھ کر وہ لاپروایانہ لہجے میں بولا۔ "میں نے طیب مدراسی کی کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی کے گرنے کی آواز سنی، پھر میں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو تجھے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ میں نے فوراً اپنا ایک گرگا تیرے پیچھے لگا دیا اور جب تو گھاٹ سے روانہ ہوا تو میں پولیس کو بیان دینے کے بعد ایک منصوبے کے تحت تیرا ہمسفر بن چکا تھا۔ اب تجھے ہمارے مشن کے لئے کام کرنا ہے۔!"

"کیسا مشن؟" میں نے پوچھا۔

"تو غیر مقامی ہے اس لئے بہاری آبادی کو بنگالیوں کے خلاف بھڑکانا تیرے لئے آسان ہوگا۔" وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا۔ اپنی تمام تر مجبوری کے باوجود یہ سن کر میرے تن میں آگ لگ گئی۔

"مسلمان ہو کر بھائی کو بھائی سے لڑواتے تمہیں شرم نہیں آتی!"

"کون مسلمان اور کیسے بھائی" وہ زور سے ہنسا۔

"کیا بات ہے چندر سین؟" اس کا قہقہہ سن کر باہر سے کسی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" چندر سین اونچی آواز میں بولا "یہ سالا بھی مجھے مسلمان سمجھ رہا ہے!" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ "میں یہاں بدیسی ضرور ہوں مگر میری ہمدردیاں مقامیوں کے ساتھ ہیں، بہاری ان کو چھوت اور نیچ سمجھتے ہیں اور یہ مقامی خود بھی مغرب والوں کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھل کر تحریک چلانے سے ڈرتے ہیں"

"یہ سب بکواس ہے!"

"ایک دن تو خود دیکھ لے گا کہ یہ حقیقت ہے۔" وہ بولا "یہ بکواس ہو یا حقیقت، تجھے اپنی آزادی اور زندگی کی خاطر میری ہر بات ماننی ہوگی۔"

"یہ سچ بھی ہو تو یوں نفرتوں کا زہر سینچ کر تم مقامیوں کی کیا خدمت کرنا چاہتے ہو۔؟" میں نے تلخ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"دشمنی۔ ہم ان دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اس کشتی کے سارے مسافر اب یہی سوچیں گے کہ انہیں، بہاریوں نے لوٹا ہے اور یہ نفرت بڑھتے بڑھتے ایک روز اس خطے میں خانہ جنگی کا مہیب روپ دھار لے گی۔ یہ دھرتی خون مانگتی ہے، انسانوں کا خون ۔۔ اور جب اس کا چپہ چپہ لہو کی سرخی میں ڈوب جائے گا۔ تو اس کے افق سے ایک نیا سورج ابھرے گا، امیدوں کا سورج، آزادی کا سورج ۔ تو خود بتا کیا یہ لوگ ہر بات کے لئے ہزار میل دور بسنے والوں کے محتاج نہیں ہیں۔ کیا آزادی اسی کا نام ہے۔؟"

میں کچھ اس بری طرح حالات کا شکار ہوا تھا کہ وقتی طور پر اس سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا اور میری رضامندی پر اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔

پٹنہ سے چند میل پیچھے ہی ان لوگوں نے ایک خفیہ اڈہ قائم کیا ہوا تھا۔ مجھے وہاں لے جایا گیا تو میں ان کی تنظیم دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"ہماری سرگرمیوں کے بڑے مرکز سرحدی آبادیوں میں ہیں۔" وہاں پہنچنے کے بعد چندر سین نے مجھ سے کہا "یہاں سے ایک محافظ تمہیں دیناج پور لے جائے گا۔ وہاں تمہیں شرما کی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔ اس علاقے کی تنظیم کا سربراہ وہی ہے!"

اس مرکز میں چندر سین کے ساتھ میں نے ایک دن گزارا اور ان لوگوں کی سرگرمیاں دیکھ کر میرے دل پر ان کا خوف چھاتا چلا گیا۔ وہ بہت مربوط طریقے پر کام کرنے کے عادی تھے اور مجھ جیسے نئے لوگوں پر ان کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی تھی کہ انھیں ایسے افراد کی ذرا سی بھی نقل وحرکت کے بارے میں فوراً اطلاع مل جاتی تھی۔

اگلے روز مجھے ایک جیپ میں دیناج پور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میرے ساتھ ڈرائیور اور محافظ کے طور پر جو شخص تھا وہ بہت ہی کم سخن اور گھنا معلوم ہوتا تھا۔ دیناج پور کا شرما ایک لمبا تڑنگا نوجوان ثابت ہوا، جو مخاطب کے ذہن کو پڑھ لینے کی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک معلوم ہوتا تھا اس نے میرے بارے میں میرے محافظ کے لائے ہوئے چند کاغذات کا سرسری مطالعہ کر کے اسے رخصت کر دیا اور مجھ سے دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"تم پر قتل کا الزام ہے اور قانون کی نگاہوں میں تم پھانسی کے مستحق ہو۔ اگر تم نے ہماری رعایت سے ذرا بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی بے دریغ ختم کر دیئے جاؤ گے اور ایک قاتل کی موت پر کسی کو زیادہ دکھ نہ ہوگا۔"

میں خاموشی سے اس کی ہدایات سنتا رہا۔ وہ لوگ خود پس پشت رہ کر سارا کام مقامی آبادی سے لیا کرتے تھے ۔۔ میرے لئے ایک ہفتے تک آرام ہی آرام تھا۔ سارا دن میں شہر میں گھومتا پھرتا، شرما مجھے خرچ کے لئے ہر روز معقول رقم دیتا تھا۔ جب رات کو میں اس سے ملتا تو وہ مجھے میری سرگرمیوں کی ذرا ذرا سی تفصیل بتاتا۔ شاید اس طرح وہ مجھ پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہاتھ بہت دراز ہیں۔!

اگلے ہفتے مجھے ایک جیپ مل گئی۔ شرما خود میرے ہمراہ سرحدی علاقوں میں گیا اور مجھے ان مقامات کے بارے میں بتایا جن سے میرا واسطہ پڑ سکتا تھا۔ یہاں میری ملاقات دونوں جانب کے کچھ ایسے سرحدی محافظوں سے بھی ہوئی جو شرما کے ہی ٹکڑوں پر پلتے تھے۔!

میں اس صورت حال پر سخت پریشان تھا، میرے ذہن پر بس ایک ہی دھن چھائی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیپال جا پہنچوں اور بھاندرناس کا کھوج لگاؤں۔ چندر سین نے کیمیا گری کا سارا سامان ضائع کر دیا تھا اور اب مجھے نئے سرے سے جدوجہد کرنا تھی، لیکن حالات سخت ناساز تھے اور میری ذرا سی بھی جرأت جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔!

مجھے پہلا کام یہ ملا کہ کسی نامعلوم چیز کی بوریوں سے لدا ہوا ٹرک دیناج پور کی ایک منڈی سے سرحد پار پہنچاؤں۔ یہ کام مجھے تنہا سرانجام دینا تھا۔ منزل کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ سرحد پار مجھے کسی ایسے شخص کی ہدایات پر عمل کرنا تھا جو مجھ سے مل کر کالے گلاب کا حوالہ دے۔

راستوں کے بارے میں شرما کی ہدایات سننے کے بعد میں اسٹیرنگ پر جا بیٹھا۔ گو میں اس سے پہلے آٹھ برس تک اسمگلنگ کا کاروبار کرتا رہا تھا لیکن میں نے کبھی اتنا خوف محسوس نہیں کیا جو اس وقت پریشان کر رہا تھا۔ مجھے

پورا یقین تھا کہ ٹرک پر اناج لدا ہوا ہے جس کی ملک میں پہلے ہی قلت ہے! ٹرک ناہموار راستوں پر رواں دواں تھا اور میرا ذہن خلا میں اڑ رہا تھا۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ ٹرک میرے قبضے میں تھا، میں جدھر چاہتا فرار ہو سکتا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے ایک تدبیر سوجھ گئی۔

اس وقت میں ایک نیم پختہ قصباتی سڑک پر جا رہا تھا۔ میں نے ٹرک کو چند زوردار جھٹکے دیئے جس کے نتیجے میں انجن سے عجیب و غریب آوازیں پیدا ہوئی تھیں اور میں نے اچانک انجن بند کر دیا تاکہ کوئی میری نگرانی پر مامور ہو تو یہی سمجھے کہ ٹرک خراب ہو گیا ہے۔!

وہ ایک ویران سی جگہ تھی۔ میں انجن کا بونٹ اٹھا کر اس پر جھک گیا اور کل پرزوں کی مصنوعی دیکھ بھال کرتے کرتے ریڈی ایٹر کا ڈرین کھول دیا اور خود دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ریڈی ایٹر خالی ہونے کے بعد میں نے پلگ لگایا اور انجن سے ہٹ کر اسٹیئرنگ پر آ بیٹھا۔ پہلی ہی کوشش میں ٹرک اسٹارٹ ہو گیا۔

اس بار میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ انجن آگ ہونے لگا۔ اس میں سے آنے والی آوازیں بھی بدل چکی تھیں مگر میں بے رحمی سے اسے چلاتا ہی رہا۔

پھر انجن نے جھٹکے لینے شروع کئے اور بمشکل ایک منٹ میں ٹرک رک کر کھڑا ہو گیا مجھے بخوبی علم تھا کہ انجن سیز ہو چکا ہے اور اب ٹرک کو ایک قدم بھی آگے لے جانا محال ہے مگر میں نے اتر کر بونٹ دوبارہ اونچا کر دیا۔ انجن سے آگ نکل رہی تھی۔!

ادھر ادھر دو چار ہاتھ مارنے کے بعد میں نے ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھولا تاکہ اپنے نادیدہ نگرانوں کو مشکوک حرکتوں کا خیال نہ آئے اور ٹرک کی چابی جیب میں ڈال کر خالی ڈبا لئے بظاہر پانی کی تلاش میں پیچھے کی طرف چل دیا کیونکہ چند ہی فرلانگ پیچھے میں نے آخری بستی دیکھی تھی۔!

میں چوکنا ہو کر آگے بڑھتا رہا۔ پھر کھلا میدان بھی آ گیا لیکن وہاں دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہیں تھا۔ آخر میں نے وہ ڈبہ دور پھینکا اور تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا قریبی جنگلات کی طرف ہو لیا۔ آزادی کی خوشی اور ناگہانی اندیشوں سے میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

جنگل میں گھسنے کے بعد بھی میرے قدم نہ رکے اور میں تیزی کے ساتھ دوڑتا رہا۔ ایک جگہ معاً میری ٹانگوں میں کوئی چیز الجھی اور میں چیختا ہوا منہ کے بل زمین پر گھسٹتا چلا گیا۔

اور جب میں زمین سے اٹھا تو میرے عقب میں مضبوط جسم اور سفاک چہرے والا ایک ریوالور بردار شخص موجود تھا۔ "نت... تم کون ہو؟" اسے دیکھ کر میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔

"کالا گلاب!" وہ زہر خند کے ساتھ بولا۔ "جنگل میں کہاں فرار ہو رہا تھا۔؟"

"فرار۔ نہیں تو۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے پاس صرف چند منٹ کی مہلت تھی اس کے بعد یا تو وہ مجھے ختم ہی کر دیتا یا بے بس کر کے اپنا قیدی بنا لے جاتا جس کی اس جیسے آدمی سے کم ہی توقع تھی۔ میرے جواب میں وہ کچھ نہ بولا اور میری چھٹی حس خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ شاید وہ فائر کرنے ہی والا تھا۔

میں گھگھیا کر سرعت سے اس کی طرف یوں لپکا جیسے اس کے پیر پکڑ کر معافی مانگنے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر وہ بلا کا چالاک تھا۔ وہ مجھے رکنے کا حکم دیتا ہوا ایک طرف سرکا اور مجھ پر ایک بے آواز فائر جھونک مارا۔!

میں کسی ایسے ناگہانی وار کے لئے تیار تھا۔ ایک طرف گر کر خود کو بچا گیا اور اس سے قبل کہ وہ نشانہ لے کر مجھ پر دوسرا فائر کر سکے، میں اس پر ٹوٹ پڑا۔

اس کے ریوالور سے گولی ضرور چلی مگر اس کا رخ آسمان کی جانب تھا۔ جوں ہی میں اسے دبوچے زمین پر ڈھیر ہوا اس کے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ اس جدوجہد میں ریوالور بھی اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔

میں نے اس کی ناک پر بھرپور ٹکر رسید کی اور میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخا۔ اس شدید ضرب کے نتیجے میں اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور اس کا چہرہ خون میں نہا گیا تھا۔ مگر وہ بھی بالکل ہی بودا نہیں تھا۔ چوٹ کھا کر وہ اس قدر مشتعل ہوا کہ مجھے اپنے سینے سے دور اچھال پھینکا اور میرے سنبھلتے سنبھلتے اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی آ گئی۔

میرے بائیں شانے پر وہ لکڑی پڑی اور مجھے پورے بازو میں آگ بھرتی محسوس ہوئی۔ اس نے دوبارہ میرے سر کا نشانہ لیا اور میں نے اس بار لکڑی کا دوسرا سرا مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس نے دو تین تیز جھٹکے دے کر وہ لکڑی چھیننے کی کوشش کی لیکن بے سود، پھر ہم دونوں وحشیوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھ گئے۔!

طاقت اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے وہ مجھ سے برتر ضرور تھا اور شاید اسے بھی اس بات کا بہت زیادہ احساس تھا جبکہ مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ میں اسے رگیدتا ہوا ایک درخت تک لے گیا۔ جب اسے خطرے کا احساس ہوا تو وقت گزر چکا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تنے کی جڑ سے اس کا ریوالور اٹھایا اور بے دریغ اس کی کنپٹی پر پے در پے دو گولیاں چلا دیں۔ اس کا سارا بدن خون میں نہا گیا اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ میں اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ اور اپنے چہرے سے اس کے ناپاک خون کی چھینٹیں صاف کرنے لگا۔

وہ تڑپ تڑپ کر تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈا ہو گیا۔!

میں نے اس کا ریوالور اپنی جیب میں رکھا۔ اس میں اب بھی دو گولیاں موجود تھیں جو میرے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ پھر میں اس کی لاش کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ میری تمام کوششیں بے سود ہی ثابت ہوئیں۔ اس کی جیبوں سے صرف کرنسی نوٹ، چند نسوانی تصویریں اور ایک شکاری چاقو کے علاوہ کوئی ایسی چیز برآمد نہ ہو سکی جس سے اس کے نام یا شخصیت کا سراغ ملتا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کسی سواری پر شروع ہی سے میرا تعاقب کرتا رہا ہے اور یہ خیال اس وقت صحیح ثابت ہو گیا جب ذرا سی کوشش کے بعد جنگل کے تنگ اور دشوار گزار راستوں پر کام آنے والی ایک جیپ مجھے نظر آئی۔ اس جیپ کا استعمال میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا مگر اب اس کے سوا کوئی اور صورت بھی نہیں تھی۔ مجھے اس مقام سے جلد از جلد فرار ہو جانا تھا۔!

چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور جنگل ہی میں اسے آگے کی طرف لیتا چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی موت زیادہ دیر تک راز نہ رہ سکے گی، ٹرک اور اس کی لاش جلد ہی دریافت کر لی جائے گی۔ پھر اس کے ساتھی میری تلاش میں اس علاقے کا چپہ چپہ چھان ماریں گے اور بالآخر وہ جیپ دریافت ہو گی۔ اس صورتحال کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ اسی جیپ میں سرحد عبور کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر پہلی فرصت میں جیپ سے جس قدر دور ممکن ہو، نکلا جائے۔

میں محض اندازے اور شرما کی ہدایات کے سہارے جیپ کو آگے بڑھاتا رہا اور جب شام کا دھندلکا گہرا ہونے لگا تو میں جیپ کو جنگل کے سرحد تک جانے والی سڑک پر لے آیا البتہ اس کی روشنیاں گل ہی رکھیں۔ تقریباً نو بجے سامنے سرحدی چیک پوسٹ کی روشنیاں نظر آئیں اور میں بہ تقدیر ہو کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

چوکی کے سامنے سڑک پر رکاوٹی زنجیر بندھی ہوئی تھی، جیسے ہی میں نے جیپ روکی ایک سنتری تیزی سے میری طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا میں نے نیم تاریکی میں باہر جھک کر تیز سرگوشی میں کالا گلاب کہا اور وہ جہاں تھا وہیں سے واپس لوٹ گیا۔!

راستے کی زنجیر ہٹا دی گئی اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ سرحد پار کر گیا۔ کالا گلاب ایک جگہ کام دکھا چکا تھا۔ مگر ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ اس چوکی سے چند سو گز آگے خاردار تاروں کی سرحدی نشانیاں موجود تھیں اور کچا راستہ ایک طرف گھوما ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیپ اسی سمت گھما دی۔ تھوڑی دیر بعد میری جیپ دوسری چوکی کے سامنے رکی ہوئی تھی!

چارپائی سے اٹھ کر ایک سرحدی محافظ ٹارچ چمکاتا میری طرف آنے لگا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہاں بھی کالا گلاب کہا مگر وہ نہیں رکا۔ جیپ کے قریب آ کر اس نے میرے چہرے پر ٹارچ کی تیز روشنی ڈالی، پھر اشتباہ آمیز لہجے میں بولا۔

"تم کون ہو۔ یہ جیپ تو انل صاحب کی ہے، وہ کہاں ہیں؟"

میری پیشانی پر سرد قطرے ابھر آئے! میں اس وقت بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

میرے بدن کے تمام مساموں کے دہانے کھل چکے تھے، اس دراز قامت سنتری کی ٹارچ کی روشنی مسلسل میرے چہرے پر چمک رہی تھی اور اس کا اندھیرے میں پوشیدہ ہیولا پوری طرح مستعد نظر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے سے لٹکتی خودکار رائفل مجھے احتیاط پر مجبور کر رہی تھی اور جیپ کا غراتا ہوا انجن اس مصیبت سے نجات پا کر واپس اپنی سرحد کی طرف فرار پر اکسا رہا تھا!

"انل صاحب کدھر ہے؟" خاموشی کے طویل ہوتے ہوئے لمحات کو اس نے اپنی کرخت آواز سے برہم کر دیا۔

میں نے حلق میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگلی پھر اپنی آواز میں رعب پیدا کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "کیا انل صاحب تمہاری مرضی کے پابند ہیں؟"

سنتری میرے ان الفاظ پر کچھ چونکا شاید اسے یاد آ گیا کہ وہ انل کا نمک خوار ہے انل اس کا نہیں۔ پھر بولا "صاحب یہ کام ایسے ہی ہیں۔ ہمیں ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ انل صاحب نے آج پہلی بار اپنی جیپ کسی کو دی۔ ورنہ وہ کبھی چند گھنٹوں سے زیادہ سرحد پار نہیں رکے ہیں!"

اس کا ردعمل دیکھ کر میرے اوسان بحال ہوئے اور میں نے شان سے کہا "تمہارا کام صرف حکم کی تعمیل ہے، آنکھیں بند اور کان کھلے رکھو۔"

"آئندہ خیال رکھوں گا صاحب!" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "ذرا ایک بیڑی ہو گی آپ کے پاس؟"

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"بیڑی تو نہیں ہے لو یہ پیکٹ رکھ لو۔"

اچانک ٹارچ کی روشنی معدوم ہو گئی میرا ہاتھ بڑھا کا بڑھا رہ گیا اور اندھیرے سے اس سنتری کی سرد تحکمانہ آواز ابھری "ہاتھ اٹھا کر جیپ سے نیچے آ جاؤ!"

میں نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا تو رائفل کی نال اندھیرے میں میرے سینے کی جانب اٹھی ہوئی تھی "یہ کیا بے ہودگی ہے؟" میں نے مصنوعی غصیلی آواز میں کہا لیکن اپنے لہجے کی لرزش پر پوری طرح قابو نہ پا سکا۔

"ہم آنکھیں کھلی نہ رکھیں تو تم جیسے دھوکے باز ہمارے سینے پر مونگ دلیں۔ انل صاحب کے آدمی اس سرحد کے سنتریوں سے مٹی تک کا لین دین نہیں کر سکتے۔ اگر تم ان ہی کے آدمی ہوتے تو مجھے ہرگز سگریٹ نہ دیتے اور صوبہ دار سے میری شکایت کرتے! چلو اترو نیچے!"

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اس طرح آگے کی طرف جھکا جیسے جیپ سے اترنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور پھرتی سے جیپ کو گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دیا۔

جیپ نے ایک ہی جھٹکے میں بانس کی سرحدی رکاوٹ کو توڑ دیا اور میں دوسری جانب نکلتا چلا گیا۔ اس وقت مجھے روکنے والے سنتری نے گالی بکتے ہوئے رائفل سے فائر کیا، گولی جیپ کے ہڈ میں سوراخ کرتی دائیں جانب سے نکل گئی۔

پھر شاید جوکی میں سویا ہوا تھا جو راستہ رکاوٹ سے جیپ کے ٹکرانے اور رائفل چلنے کا شور سن کر بیدار ہو گیا۔ رات کا خوابناک سناٹا رائفل کے پے درپے نغموں سے گونج اٹھا پچھلے ٹائر زبردست دھماکوں کے ساتھ پھٹے، جیپ بری طرح اچھلی اور قابو سے باہر ہو کر سڑک کی داہنی ڈھلان میں پھیلے گھنے جنگلات میں دور تک گھستی چلی گئی۔ ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ نے ونڈ شیلڈ کو چکنا چور کر دیا۔ شیشے کے کئی ٹکڑے تیر کی طرح میرے بدن میں پیوست ہو گئے کئی شاخیں ہڈ کو پھاڑتی میرے بدن سے ٹکرائیں اور میں چلتی جیپ سے جھاڑیوں میں جاگرا۔ میں جہاں گرا تھا چند ثانیوں تک وہیں بے سدھ پڑا رہا۔ سرحدی محافظوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کا شور لحظہ بہ لحظہ قریب آتا جا رہا تھا پھر پھر ایک تیز دھماکا سنائی دیا۔ شاید جیپ کسی درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی

میں اس وقت خطرناک صورتحال سے دوچار تھا۔ وہ سنتری کسی بھی لمحے مجھے پکڑ سکتے تھے۔ میں اپنے زخموں کی تکلیف بھول کر آہستگی سے جھاڑیوں سے اٹھا اور تیزی کے ساتھ بائیں جانب ہولیا میری حتی الامکان کوشش یہ تھی کہ میرے چلنے سے کوئی آواز پیدا نہ ہو۔

میں جان کے خوف سے کافی دیر تک تاریک اور گھنے جنگل کے دشوار گزار راستوں پر ٹھوکریں کھاتا رہا۔ محافظوں کی آوازیں میرے اردگرد ہی سنائی دے رہی تھیں۔ جب بھی ان کی کوئی آواز ذرا قریب سے ابھرتی، میں خاموشی سے کسی کنج میں دبک جاتا اور پہلا موقع ملتے ہی وہاں سے آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا!

میں اپنے جسم کے کئی حصوں پر تازہ تازہ خون کی چپچپاہٹ محسوس کر رہا تھا لیکن تکلیف کا احساس نہ جانے لاشعور کی کن گہرائیوں میں جا سویا تھا۔ میرا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا، دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا! اعصاب پر خوفزدگی کا تناؤ چھایا ہوا تھا اور میری جدوجہد جاری تھی۔ تقریباً دو گھنٹہ کی روح فرسا آنکھ مچولی کے بعد میں ان غراتے ہوئے مسلح سنتری کے حصار سے نکلنے میں کامیاب ہو سکا۔ اب ان کی آوازیں میرے عقب میں رہ گئی تھیں صبح کا اجالا پھیلنے تک میں اسی جنگل میں ٹھٹھرتا رہا اور جب پہلی کرنوں کی روشنی نمودار ہوئی تو میں نے خود کو کھیتوں کے ایک طویل سلسلے کے قریب موجود پایا۔

میں اپنی دانست میں پڑوسی ملک کی سرحد میں بہت اندر موجود تھا اور میری عافیت اسی میں تھی کہ کسی مصروف علاقے کا رُخ کرنے سے پیشتر کچھ روز روپوشی کی زندگی بسر کروں اور موقع پا کر پہلی فرصت میں لمبی مونچھوں اور دراز بالوں سے چھٹکارا حاصل کر لوں! اس طرح مجھے امید تھی کہ مجھے دیکھنے والے سرحدی محافظ بھی پہلی نظر میں شناخت نہ کر پائیں گے!

اس وقت ہر طرف خوابناک سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نسیم سحری کے خوشگوار جھونکوں سے کھیتوں میں سبزہ زار لہلہا رہے تھے۔ وہاں ابھی کسی آدم زاد کا وجود نہیں تھا لیکن کسی نواحی بستی میں مویشیوں کے ڈکارنے کی طویل آوازیں ابھرتی سنائی دے رہی تھیں!

میں حوصلہ کر کے چوکنے انداز میں ان کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ اور اندازے کی بنا پر آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے مویشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں! تھوڑی ہی دیر میں میرا دل خوشی سے اچھل پڑا طویل عرصہ بعد قدرت مجھ پر مہربان ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کھیتوں سے گھرے ہوئے ایک میدانی قطعہ پر چند جھونپڑوں پر مشتمل مختصر سی آبادی میرے سامنے تھی جہاں کے مکین آہستہ آہستہ خود کو کاروبار زندگی سے نمٹنے کے لئے تیار کر رہے تھے!

اس دریافت کے بعد میں تیزی سے جنگل ہی میں لوٹ آیا اور قریب میں نے درختوں کی اوٹ سے کھیتوں کا جائزہ لیا۔ وہاں کئی آدمی کھیتوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے میں چوپایوں کی طرح چلتا ہوا اپنی کمین گاہ سے نکل پڑا کیوں کہ اب بھوک کی شدت میرے لئے ناقابل برداشت ہو چلی تھی۔ تھوڑی سی محنت کے بعد میں درخت سے لٹکا ہوا ایک ناشتہ دان چوری کرنے میں کامیاب ہو گیا پہلے تو مجھے خیال آیا کہ برتن خالی کر کے وہیں ڈال دوں مگر یہ مناسب نہ تھا۔ برتن غائب ہونے کی صورت میں کسانوں کا دھیان کسی چور کی طرف جاتا لیکن خالی برتن ملنے پر ان کے لئے یہ سمجھ لینا دشوار نہ ہوتا کہ محفوظ جنگلات میں کوئی بھوکا اجنبی روپوش ہے۔ اور اگر وہ لوگ اپنے یہ شبہات میری تلاش میں سرگرداں سرحدی محافظوں تک پہنچا دیتے تو وہ کسی قیمت پر مجھے اس جنگل سے فرار نہ ہونے دیتے!

میں نے سات طویل دن اور راتیں اسی جنگل میں روپوش رہ کر گزاریں۔ کھانے کے برتن چوری ہونے کی دو ابتدائی وارداتوں کے بعد کسانوں نے اپنے ناشتہ دان ساتھ رکھنے شروع کر دیئے تھے لہٰذا مجھے خوراک کی فراہمی کے لئے رات کی تاریکی میں اُن کی آبادی میں بھی گھسنا پڑا اور یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں غذا کے ساتھ وہاں سے ایک استرا اور ٹوٹا ہوا آئینہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا! پھر میں نے اپنی مونچھیں اور سر کے بال صاف کر کے زمین میں دفن کر دیئے۔

آٹھویں روز میں چند درختوں کی آڑ میں زمین پر لیٹا سستا رہا تھا کہ اچانک میری چھٹی حس نے قریب ہی کسی کی موجودگی کا احساس دلایا میں ہڑبڑا کر اٹھا تو میرے قریب ایک خوبصورت سی لڑکی موجود تھی اس کے پتلے پتلے، سلگتے ہونٹوں پر گہرا تبسم رچا ہوا تھا اور چمکیلی نگاہیں میرے ذرد چہرے پر مرکوز تھیں!

"کون ہو تم؟" میں نے تیزی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

وہ کچھ کہے بغیر دلچسپی کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی۔

میں اس کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے تذبذب میں پڑ گیا۔ "تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

"بستی والے بھی کتنے بے وقوف ہیں،" اس لڑکی کی سریلی آواز ابھری۔ "کہتے تھے کوئی شریر لڑکا کھانا چوری کرتا ہے۔ مگر مجھے تو پہلے سے ہی شبہ تھا کہ کوئی ادھر چھپا ہوا ہے!"

میں تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکا اور اپنے ہاتھ اس کی گردن پر رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم نے میری موجودگی کے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی کہا تو تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

چند سیکنڈ کے لئے تو وہ ہراساں ہو گئی پھر جلد ہی اس کے چہرے پر اعتماد کھیلنے لگا۔ "تم مجھے نہیں مار سکتے، مارنے والے ہوتے تو یوں بستی سے صرف کھانا چوری نہ کرتے!"

اس لڑکی کا انداز دوستانہ تھا اور میں نے اس کی دوستی کو قبول کر لیا۔ اس نے صبح کے وقت مجھے درختوں کے درمیان سے گزرتے دیکھا تھا اور اسی وقت سے میری کھوج میں تھی اور آخر کار مجھ تک آ پہنچی تھی۔

اس پستہ قامت مگر حسین لڑکی کا نام راکھی تھا۔ اس کے بیان کے مطابق بستی میں ایک ہی خاندان کے لوگ آباد تھے اور یہ آبادی سرحد سے صرف آٹھ میل اندر واقع تھی۔ وہ خود بھی ایڈونچر کی دلدادہ نظر آتی تھی اور میرے بارے میں بہت کچھ جان لینا چاہتی تھی میں نے اُسے بتایا کہ میں سرحد پار کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں جہاں کے زمیندار نے میرا گھر لوٹ لیا اور میری جان کا دشمن ہو گیا کیونکہ میں نے اُسے گاؤں کی ایک لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی ناپاک کوشش کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور اب میں اس کے خوف سے جان بچا کر سرحد پار آ گیا تھا!

"تو تم چوروں کی طرح جنگل میں کیوں رہ رہے ہو؟" راکھی نے اشتیاق بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"بغیر اجازت سرحد پار کرنا جرم ہے۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا اور محافظوں کو خبر کر دی تو میں جیل میں نظر آؤں گا۔"

"مگر تم بتلاتے ہی کیوں ہو کہ سرحد پار سے آئے ہو؟"

"پھر کیا بتاؤں۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔" میں نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی نیت سے کہا۔

"اوہ۔" اس نے لاپرواہانہ انداز میں اپنا سر جھٹکا۔ "لعنت بھیجو سب پر۔ میں تمہیں اپنے چاچا کی زمینوں پر پہنچا دیتی ہوں۔ وہاں برسوں سے ایک جھونپڑی خالی پڑی ہے اور کوئی اُدھر کا رخ بھی نہیں کرتا بس تم آرام سے وہاں رہنا۔"

"اور کھاؤں گا کہاں سے؟"

"چوری کرنا۔" وہ یہ کہہ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میرے وجود میں سرور کی ایک لہر سی دوڑ گئی صنفِ نازک کو کافی دنوں بعد اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا! "تمہیں اب چوری کی نیت سے بستی کا رخ نہ کرنا۔ وہ سب چور کی تلاش میں ہیں اور تم کسی کے ہاتھ لگ گئے تو سب مل کر ہڈیاں توڑ ڈالیں گے!" وہ کہہ رہی تھی۔

"لیکن میں بھوکا تو نہیں رہ سکتا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"بھوکا رہنے کو کون کہتا تھا۔" میری کم عقلی پر وہ چڑ گئی۔ "تمہارا کھانا میں پہنچا دیا کروں گی!"

پھر وہ مجھے جنگل کے ایک طویل راستے سے چکر دے کر اپنے چاچا کی زمینوں پر لے گئی۔ وہ جھونپڑی میرے لئے واقعی محفوظ نظر آتی تھی۔ اس کے اطراف میں بغیر کاشت کی ہوئی وسیع زمین پھیلی ہوئی تھی جس پر بے تحاشا گھاس اُگی ہوئی تھی!

"کبھی کبھار لڑکے بکریاں چرانے ادھر آ نکلتے ہیں۔ تم بس ان کا خیال رکھنا۔" اس نے مجھے متوقع خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا پھر وہ کچھ دیر بعد واپس لوٹ گئی۔

راکھی بہت پُرخلوص، معصوم اور پاکیزہ سی لڑکی تھی۔ اس نے بہت جلد میرے دل میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ وہ ہر روز دن چڑھے میرے لئے دودھ، تازہ سبزیاں اور کھانا لے کر آتی تھی اور کچھ دیر کی باتوں کے بعد واپس لوٹ جاتی! وہ اس ویرانے میں بلاجھجک اعتماد کے ساتھ میرے پاس چلی آتی تھی جہاں دور دور تک کوئی میری مدد کرنے والا نہ تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اُسے مجھ سے زیادہ خود پر بھروسہ ہو۔ ایک آدھ بار اس سے باتیں کرتے ہوئے میری ذہنی رو بہکی بھی تھی مگر اس کا رویہ کبھی بھی ترغیب آمیز نہیں رہا۔ شاید وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس تعلق کی بنا پر وہ مجھے کوئی ناجائز فائدہ حاصل نہیں کرنے دیگی

اس دوران میں میرا ذہن مسلسل بھاندرناس ہی میں الجھا رہا۔ میرے موجودہ مصائب کا سبب وہی ہوئی تھی۔ جب تک جمال بابا ساتھ رہا مجھے عجیب سی تقویت کا احساس رہتا تھا اور اب میں خود کو اس مہم میں تنہا تنہا محسوس کر رہا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ آ پڑی کہ کیمیاگری کا سارا اسباب حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر تلف ہو چکا تھا اور مجھے از سر نو ہر چیز حاصل کرنی تھی۔ اور میں اس بارے میں جتنا سوچتا تھا اسی قدر طیب مدراسی سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ اس کی کمینگی اور خود غرضی نہ صرف جمال کے خون کا باعث بنی بلکہ خود اُسے بھی لے ڈوبی۔ ورنہ وہ ذرا بھی تعاون کرتا تو نہ صرف خود سونا بنا لیتا بلکہ میرے اور جمال بابا کے بھی وارے نیارے ہو جاتے! اب ایک طرف بھاندرناس کی تلاش کی مہم درپیش تھی، دوسری طرف راکھی کو الوداع کہنے کے خیال ہی سے مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ اگر میں کسی طرح بہلا پھسلا کر اُسے اپنے ساتھ فرار پر آمادہ کر بھی لیتا تو اُسے ساتھ لئے پھرنا میرے لئے ناممکن تھا۔

ایک روز وہ اچانک ہی غائب ہو گئی میں سارا دن ایک ایک آہٹ پر کان جمائے بیٹھا رہا لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ مجھے اس کی جانب سے تشویش لاحق ہونے لگی ادھر پیٹ کا مسئلہ بھی درپیش تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ رات کی سیاہی میں راکھی کے گھر سے ہی کھانے پینے کا کچھ سامان چراؤں گا۔

سہ پہر کے وقت میں جھونپڑی میں چٹائی پر لیٹا ہوا تھا کہ اچانک دس بارہ آدمی ڈنڈے اور بانس سنبھالے اندر گھس آئے اور گالیاں بکتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ایک دو ہوتے تو میں مقابلے کی کوشش بھی کرتا لیکن یہ ناگہانی مصیبت تو باجماعت نازل ہوئی تھی۔ میری چیخ پکار نے ان پر ذرا بھی اثر نہ کیا اور وہ لاتوں، گھونسوں اور ڈنڈوں سے حسب توفیق میری تواضع کرتے رہے۔ اور جب میں نڈھال ہو کر گر پڑا تو ان کے ہاتھ رک گئے مگر خون آشام نظریں میرے زخمی بدن میں شگاف ڈالے دے رہی تھیں۔

میں زمین پر پڑا سسکتا اور کراہتا رہا اور وہ بے رحمانہ لاتعلقی کے ساتھ میرے سر پر مسلط رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔ آخر میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ فضا میں کسی جیپ کے انجن کا شور سنائی دیا۔ جو تیزی کے ساتھ قریب آتا جا رہا تھا۔ جیپ جھونپڑی کے دروازے کے عین سامنے آکر رکی اور اس میں سے تین مسلح، باوردی سرحدی محافظ نیچے اتر کر اندر گھس آئے۔ ان کے ساتھ ہی دو نوجوان دیہاتی بھی تھے۔ شاید وہی لوگ محافظوں کو اس مقام تک لائے تھے!

ان میں سے ایک جو وردی پر لگے ہوئے نشانات سے کوئی جے سی او لگ رہا تھا، میرے قریب آیا۔ اپنے جوتے کی نوک سے میرا دبکا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر غور سے دیکھا اور ڈنڈے بردار دیہاتیوں کی طرف متوجہ ہوگیا جو اسے ساری تفصیل سنانے کے لئے بے چین تھے۔

ان کے بیان سے یہ انکشاف ہوا کہ راکھی بے چاری پچھلے روز سے سخت بخار میں مبتلا تھی اور آج صبح ہذیان کے عالم میں وہ میرا راز افشا کر بیٹھی۔ بخار کی اس شدت میں بھی میری بھوک کا خیال اس کے ذہن پر چھایا رہا۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ چاچا کی جھونپڑی میں وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ بیچارہ دو روز سے بھوکا ہے کئی بار اس نے میں جا رہی ہوں، میں کھانا لے جا رہی ہوں، کی تکرار کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش بھی کی تو گھر والے اس کے ہذیان پر توجہ دینے پر مجبور ہوگئے۔

دو آدمیوں نے چوری چھپے اس جھونپڑی کا چکر لگایا تو وہاں مجھے پایا۔ جھونپڑی میں ایک اجنبی کی موجودگی کی خبر پاتے ہی راکھی کے گھر والے سخت مشتعل ہوگئے۔ سب سے پہلے دو آدمی سرحدی چوکی کی طرف دوڑائے گئے پھر دل کھول کر راکھی کی مرمت کی گئی۔ اس کے بعد سارے مرد ڈنڈے سنبھال کر میری طرف ہو لئے۔ ان کے بیانات سننے کے بعد مجھے جیپ کی پچھلی نشست پر ڈال دیا گیا اور جیپ ناہموار کچے راستوں پر اچھلتی، تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگی۔

تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد جیپ چند پختہ مکانات پر مشتمل ایک ایسے مقام پر جا پہنچی جہاں ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ یہاں ایک کیپٹن اپنی کمپنی کی پوری نفری سمیت میرا منتظر تھا۔ سپاہیوں نے میرے بازو پر تھام کر بے دردی کے ساتھ مجھے ایک اسٹریچر پر ڈالا اور عمارت میں لیتے چلے گئے!

پہلے سے موجود ایک شخص نے فرسٹ ایڈ بکس لے کر میری مرہم پٹی کرنی چاہی لیکن کیپٹن نے سختی کے ساتھ اسے روک دیا۔ "پہلے اس کے چہرے سے خون اور مٹی کے دھبے صاف کر دو!"

چہرے کے زخموں پر اسپرٹ مرچوں کی طرح لگی اور بے اختیار میری چیخیں نکل گئیں۔ چہرہ صاف ہونے کے بعد کیپٹن نے کسی سے کہا۔ "وقوعہ والی رات بارڈر پوسٹ نمبر بلو فور پر جو آدمی تھے ان سب کو حاضر کرو!"

چند ہی منٹ بعد سات سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ اپنے وزنی جوتوں کے ساتھ مارچ کرتا اس کشادہ ہال میں آپہنچا، نہ ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں، نہ سروں پر ٹوپیاں۔ شاید وہ لوگ کسی وجہ سے زیرِ عتاب تھے۔

کیپٹن کے حکم پر ان میں سے ایک ایک آدمی باری کے مطابق میرے پاس آتا اور میرا چہرہ اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد واپس قطار میں چلا جاتا۔ چوتھے سنتری پر نظر پڑتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ وہی شخص تھا جس سے سرحد پر سب سے پہلے میری جھڑپ ہوئی تھی اور اسی نے مجھ سے بیڑی کی فرمائش کر کے مجھ پر رائفل کی نال سیدھی کی تھی۔ وہ قریب آیا تو اس کا چہرہ سپاٹ ہی تھا یعنی وہ پہلی نظر میں مجھے نہ پہچان سکا تھا۔ پھر اس نے مجھے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ دوسرے سپاہیوں کے برعکس جب اسے کئی منٹ گزر گئے اور وہ مجھے دیکھتا ہی رہا تو اچانک کیپٹن کی کرخت آواز گونجی۔ "کرن سنگھ۔"

"یس سر!" وہ ایڑیاں فرش پر مار کر سیدھا ہوگیا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر میری عقل خراب ہے!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا

"مجھے معلوم ہے۔" کیپٹن بدستور اسی کرخت اور تحکمانہ آواز میں بولا۔ "کوئی اور بات؟"

"یس سر" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں ایک بات بتانی تو بھول گیا تھا۔ اس رات اس کے چہرے پر مونچھیں بھی تھیں۔!"

"واٹ؟" کیپٹن پنجوں کے بل اچک کر اور مٹھیاں بھینچ کر چیخا۔

"یس سر!" کرن سنگھ کی آواز اور نحیف ہوگئی۔ "یہ وہی آدمی ہے مگر اس نے مونچھیں اور بال مونڈ دیئے ہیں!"

"میجر صاحب،" کیپٹن مڑ کر اپنے نائب حوالدار میجر سے بولا جو اس کی آواز سنتے ہی اٹینشن ہو چکا تھا۔ "کرن سنگھ کو تین دن گارڈ روم۔!"

اس کے حکم پر سب لوگ پھرتی کے ساتھ کھسک گئے۔ صرف فرسٹ ایڈ والا شخص اپنی جگہ پر کیپٹن کے اشارے کا منتظر رہا۔

کیپٹن غضب ناک انداز میں دانت پیستا آہستہ آہستہ میرے قریب آیا پھر اس نے میری ناک پوری قوت سے اپنی چٹکی میں دبا کر میرا چہرہ اوپر اٹھا دیا میں تکلیف سے تڑپ کر دہرا ہوگیا۔ مجھے یوں تڑپتے دیکھ کر اس بدماغ شخص نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا اور میری ناک چھوڑ دی۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

"امیر علی!" میں نے اس کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لئے جلدی سے اپنا وہ نام دہرا دیا جس سے میں چندر سین اور شوبھا وغیرہ سے متعارف تھا۔

"مگر چہرے سے غریب بلکہ فقیر لگتا ہے!" کیپٹن نے قہقہہ لگا کر داد طلب نگاہوں سے کمانڈر کی طرف دیکھا اور وہ اس بھونڈے مذاق پر خوشامدانہ انداز میں دانت چمکا کر رہ گیا۔

"کس یونٹ سے تعلق ہے تیرا؟" قہقہہ ختم ہوتے ہی وہ مشینی انداز میں اس قدر سنجیدہ ہوگیا جیسے اسے مسکرائے ہفتوں گزر گئے ہوں۔

"یونٹ... کسی یونٹ سے نہیں!" میں بری طرح بوکھلا گیا۔

"میرے سامنے مردے بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں گدھے!" وہ خصیلی آواز میں دہاڑا۔ "میرے پاس کوئی فرضی کہانی نہیں چلے گی۔"

"تت... تم چندر سین سے معلوم کر سکتے ہو۔ میں اپنی مرضی سے ...ں نہیں ہوا تھا! اسی نے مجبور کیا تھا۔ میرا فوج سے کوئی تعلق نہیں میں ...س شہری ہوں۔ ایک عام سا شہری!" میں نے گھگھیا کر اسے اپنی بات کا ...ین دلانا چاہا۔

"چندر سین الو کا پٹھا ہے! اس کے ٹروپ میں سارے گدھے ہیں۔ ...کیس میرے علم میں ہے۔ تو نے اس خوبصورتی سے اسے بے وقوف بنایا ... وہ تجھے حالات کے جنگل میں پھنسا ایک مجبور شہری سمجھ بیٹھا۔ حالانکہ تجھے ...را منصوبہ سبوتاژ کرنے کے لئے سازش کے تحت اس تک پہنچایا گیا تھا۔" اتنا ...ہ کر اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور پھر بولا۔ "اس وقت پانچ بجے ...ں۔ سات بجے تک مجھے ایک ایک لفظ سچ چاہیے ورنہ در و دیوار بھی تیرے ...نجام پر لرز اٹھیں گے۔"

وہ خاموش ہو کر کسی آدم خور بھیڑیئے کی طرح میری طرف ...گھورتا رہا پھر کمپاؤنڈر سے بولا۔ "اس کے زخموں کی ڈریسنگ کر دو۔ اگر سات ...بجے تک اس کی عقل واپس نہ آئی تو میں اس کے لئے پورا فیلڈ میڈیکل یونٹ ...یہاں بلاؤں گا۔ اسے اذیت پہنچاؤں گا، علاج کروں گا اور پھر سسکاؤں گا۔ ...ورا سے سچ بولنا ہی پڑے گا۔"

وہ مٹھیاں بھینچے واپس پلٹا اور کسی زلزلے کی طرح باہر ...نکلتا چلا گیا۔ کمپاؤنڈر چند ثانیوں تک سانس روکے اپنی جگہ پر کھڑا رہا ...پھر بکس اٹھائے میرے قریب آگیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "شاید تمہارا ...تعلق ان نئے یونٹوں سے ہے جو مشرقی پاکستان کے حالات پر قابو پانے کے ...لئے یہاں بھیجے گئے ہیں۔"

مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کرنا پڑا۔ کیونکہ اس وقت ...وہ میرا مسیحا تھا۔ ذرا سی تلخ کلامی اسے بے دردی پر اکسا سکتی تھی۔

"یہ بالکل سچ ہے کہ میرا فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ میرے زخموں کو صاف کرتے ہوئے بے اعتباری سے مسکرا... "کیپٹن بھاٹیہ تمہارا ایک ایک جوڑ الگ کرا دے گا۔ تھرڈ ڈگری کے ان ...طریقوں سے واقف ہے جو اس نے دوسری جنگِ عظیم میں نازی کیمپ میں ...برداشت کئے تھے۔"

"نہ جانے وہ میری بات پر کیسے یقین کرے گا۔" میں نے ...بسی سے کہا۔

"اگر تم سویلین ہوتے تو چندر سین ہی سے الجھ پڑتے مگر تم کو ...ل پر مامور کیا گیا تھا اور تم اس سے نچلے درجے کے کسی آدمی پر ہاتھ ڈالنا ...چاہتے تھے۔ میجر انل کے قتل پر نیچے سے اوپر تک کھلبلی مچ گئی ہے۔ ...بہت اہم آدمی تھا۔"

میں خاموش رہا۔ اس سے بحث بیکار تھی۔ میں نے اس خبیث ...کی جو جھلکیاں دیکھیں، وہ مجھے کوئی ایسی کہانی تراشنے پر مجبور کر رہی ...تھی جو اس کے لئے قابلِ قبول ہو لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ میں فوجی اصطلاحات ...یونٹوں وغیرہ کی تقسیم کے نظام سے بالکل لاعلم تھا۔ اب اگر کوئی الٹی سیدھی

بات کہہ بیٹھتا تو بھاٹیہ فوراً پکڑ لیتا کیونکہ وہ لاکھ دشمن سہی مگر مخبروں کے ذریعے اس کو بہت کچھ معلوم رہا ہوگا اور وہ میری ہر بات کو اپنی ان معلومات کی روشنی میں ہی جانچنے لگا۔

فوج کے بارے میں میری معلومات اس قدر ناقص تھیں کہ مجھے کور، ڈویژن، رجمنٹ، بریگیڈ اور کمپنی کا فرق بھی معلوم نہ تھا۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ کس درجے کا افسر کہاں کمانڈر ہو سکتا ہے؟ ان حالات میں کوئی افسانہ تراشنا بھی محال تھا۔

میرے زخموں کی ڈریسنگ کرنے کے بعد وہ بھی واپس لوٹ گیا اور میں اس کمرے میں تنہا رہ گیا۔ زخموں سے میرا بدن چور چور ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آنے والے روح فرسا لمحات کا میں کب تک مقابلہ کر سکوں گا۔

اسی ادھیڑ بن میں میں لنگڑاتا ہوا اس کمرے کے دروازے پر پہنچا لیکن وہاں دو مسلح محافظ موجود تھے۔ ان کی خشمناک نگاہوں نے مجھے فوراً ہی اندر لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

ٹھیک سات بجے کیپٹن بھاٹیہ ملک الموت کی طرح وہاں آپہنچا۔ اس کی چال میں اس وقت خاصا ٹھہراؤ تھا اور چہرے سے سخت گیری مترشح تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے ایک ایک لفظ اگلوانے کا عزم کر کے ہی پہنچا ہے۔

"شروع ہو جا۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی کرخت آواز میں کہا۔

"میں نے تمہیں جو کچھ بتایا وہ بالکل سچ ہے۔"

"بکواس۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر درندوں کی غرایا۔

"اگر تم حقائق کو بکواس سمجھتے ہو تو مجھے بتاؤ کہ میں کیا بیان دوں۔ تم یقین کرو کہ تمہارے افسرانِ بالا کے سامنے بھی میں اسی پر مصر رہوں گا۔" میرے لہجے سے بے بسی نمایاں تھی۔

وہ ہونٹ بھینچے میرے قریب آیا اور میرے سر پر پوری قوت سے ایک گھونسہ رسید کیا۔ "ہوش میں رہ کر بات کر۔۔۔۔ تو اس وقت کسی ٹٹ پونجیے سے نہیں کیپٹن بھاٹیہ سے مخاطب ہے۔"

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

"ہری اپ۔" وہ غرایا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میں نے ٹرک چھوڑ کر جنگل میں فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہاں انل صاحب سے میرا ٹکراؤ ہوا اور میں انہیں زیر کر کے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔" میں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

اس نے چیخ کر باہر کھڑے محافظوں کو طلب کیا۔ ان دونوں نے مجھے نیچے گرا کر میرے دونوں ٹخنوں پر رسّی کے مضبوط پھندے ڈالے اور ان رسّیوں کے دوسرے سرے چھت سے لٹکے ہوئے آہنی کڑوں میں باندھنے لگے۔ چند ہی منٹ میں مجھے چھت سے اس طرح الٹا لٹکایا جا چکا تھا کہ میرے دونوں پیر پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر الگ الگ کڑوں سے بندھے ہوئے تھے۔

پھر بھاٹیہ نے ریت سے بھری ہوئی ایک بوری منگوائی جو میری جڑی ہوئی ٹانگوں کے درمیان رکھ دی گئی اور میں اذیت سے بے چین ہو گیا۔

"اسے سونگ دو۔" بھاٹیہ نے کہا۔

ان دونوں سپاہیوں نے میرے ہاتھ تھام کر مجھے کچھ دُور کھینچا اور ایک دم ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اب میں خلا میں معلق تیزی سے جھول رہا تھا۔ میرے لئے ایذا رسانی کا یہ تجربہ بالکل انوکھا تھا۔ ذرا ہی دیر میں میری حالت ابتر ہو گئی۔ مجھے اپنے دونوں ٹخنے جوڑوں سے اکھڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں بھاٹیہ نے اپنے لئے شراب کی بوتل منگوائی تھی اور... لاپروائی کے ساتھ اس سے شغل کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے ٹخنے اپنی جگہ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ سارا بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا اور زور پڑنے کے باعث زخموں سے ایک بار پھر تازہ خون جاری ہو گیا تھا۔

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ بھاٹیہ کی مرضی کے مطابق جب تک میں پاک فوج سے تعلق کا جھوٹا اعتراف نہ کروں میری نجات ناممکن ہے۔

میری کراہوں اور چیخوں پر بھاٹیہ دل کھول کر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو دوسروں کو اذیّت میں دیکھ کر روحانی تسکین حاصل کرتے ہیں۔

"میرا ——— میرا تعلق ساتویں اسپیشل یونٹ سے ہے۔" آخرکار میں نے جھوٹ بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"گڈ۔" بھاٹیہ نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔ "یونٹ کا او سی کون ہے۔؟"

"ایک لمحے کے لئے میں اس سوال پر چکرا گیا۔ پھر فوراً ہی خیال آیا کہ وہ شاید آفیسر کمانڈنگ کے بارے میں دریافت کر رہا ہے اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دوسرا تیر چلا دیا۔ "میجر معین الحق۔"

"یونٹ کا ہیڈکوارٹر۔"

"پاربتی پور۔" مشینی انداز میں میرے منہ سے نکل گیا۔

"بکواس۔" بھاٹیہ بوتل پھینک کر غصّے میں کھڑا ہو گیا۔ "پاربتی پور پر میرے آدمیوں کا پورا پورا کنٹرول ہے۔ وہاں دشمن کا کوئی یونٹ نہیں ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم ——— تم بھیڑیئے ہو۔" میں پوری قوّت سے چیخ پڑا۔ "میرا فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

بھاٹیہ نے بڑھ کر پوری قوّت سے میرے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ پھر شاید مجھ پر چیخوں کا دورہ پڑ گیا اور میں چیختے چیختے بیہوش ہو گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر موجود پایا۔ میرے قریب ہی آرمی کا ایک باوردی ڈاکٹر موجود تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ میں نے بستر سے اٹھنا چاہا لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں ہلنے جلنے تک سے معذور ہو چکا ہوں۔ میرے دونوں ٹخنے سوجے ہوئے تھے اور ان میں درد کی ناقابلِ بیان ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

"اب تم کیا محسوس کر رہے ہو۔؟" ڈاکٹر نے میری جلتی ہوئی پیشانی پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔

"صرف زندہ ہوں۔" میرے ہونٹوں سے نقاہت آلود آواز اُبھری۔

"بہتر ہو گا کہ تم اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو ورنہ کیپٹن کے ہاتھوں تم موت کی آرزو کرنے کے باوجود نہ مر سکو گے۔"

"آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے پہلی بار کچھ تقویت سی محسوس کی۔ "میں آپ کو اپنی پوری کہانی سنانے پر تیار ہوں۔ آپ لوگ اپنے وسائل سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اگر ایک لفظ بھی غلط نکلے تو میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔"

"ایسی صورت میں مَیں کوشش کروں گا کہ تمہارے بیان کی تصدیق ہونے تک تمہیں کیپٹن بھاٹیہ کے تشدد سے بچا سکوں۔"

اور میں نے دھیمی آواز میں اسے اپنی کہانی سنانی شروع کی جس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں تھا۔ وہ ڈاکٹر حیرت اور دلچسپی کے ساتھ یہ مجرمانہ زندگی اور کیمیاگری کے افسانے سنتا رہا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اسے میری کہانی پر یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ میرے بیان کے خاص خاص نکات وہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جا رہا تھا اور جب میں راکھی کے چاچا کے جھونپڑے سے اپنی گرفتاری کے واقعے پر بیان ختم کر چکا تو وہ مجھے تسلی دیتا ہوا کرسی سے اُٹھ گیا۔

"تمہارے بیان کی تصدیق میں چند دن لگ جائیں گے۔ اُمید ہے کہ اس عرصے میں تمہارے زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔" وہ یہ کہہ کر لوٹ گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد کیپٹن بھاٹیہ اس کمرے میں آیا۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں اور چہرہ وفورِ جوش سے سرخ تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ رازدارانہ انداز میں میرے بستر پر ہی آ بیٹھا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم کیمیاگر ہو؟"

"میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میرا ایک ایک لفظ سچ ہے۔" اسے سر پر مسلّط پا کر ایک بار پھر میری نبضیں ڈوب چلی تھیں۔

"اگر تمہاری کہانی واقعی درست ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارا بہترین دوست ثابت ہو سکوں گا۔" اس وقت بھاٹیہ کوئی اور ہی مختلف شخص معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی سخت گیری اور بے رحمی نہ جانے کہاں جا سوئی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کا منہ تکتا رہا۔

"ایک زمانے میں مجھے بھی کیمیاگری کا جنون رہا ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "جن دنوں میری پوسٹنگ نیپال کی سرحد پر تھی، میں نے بھی کئی سنیاسیوں سے بھاندر ناس کا تذکرہ سنا تھا۔ وہ بوٹی کھٹمنڈو کے شمال مغرب میں انا پورنا کے قرب و جوار میں کہیں ملتی ہے۔ میرے پاس بھی کیمیاگری کے کئی راز موجود ہیں لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں کبھی ان پر تجربے نہ کر سکا۔"

یہ سُن کر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھل پڑا۔ کیپٹن بھاٹیہ کے رویّے کی تبدیلی میرے لئے کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔

"اگر تم پہلے ہی بتا دیتے کہ تم کیمیاگری کے چکر میں ہو تو شاید اس تشدد کی نوبت ہی نہ آتی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میں جلد از جلد نیپال پہنچنا چاہتا تھا مگر چندر سین نے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا۔ ایسی صورت میں میرے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ پہلی فرصت میں اس سے نجات حاصل کروں۔ تم یقین کرو کہ تمہاری سرحد پر آنے تک مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ میرے ہاتھوں جنگل میں ہلاک ہونے والا میجر انل ہے۔" میں نے کہا۔

"جو ہوا سو ہوا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تین چار دن میں ہم تمہارے بیان کی تصدیق کر لیں گے۔ پھر بھاندر ناس کی تلاش میں میرا تمہارا ساتھ ہو گا۔"

"تم ——— تم میرا ساتھ دو گے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بالکل۔" وہ مکارانہ انداز میں مسکرایا۔ "اس کاروبار میں ہم دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔"

"مگر تمہیں آرمی سے ریلیز بھی مل سکے گا؟" میں بدلے ہوئے حالات میں اپنی ساری تکلیف کو بھول چکا تھا اور مجھے عجیب سی خوشی ہو رہی تھی۔

"لعنت بھیجو آرمی پر۔" وہ نیچی آواز میں بولا۔ "مجھے تو اب ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ ہم کرائے کے فوجی ہیں، ملک کسی کا ٹوٹے گا۔ حکومت کسی کو ملے گی اور خون ہم بہا رہے ہیں۔ بس لوٹ مار میں جو کچھ ہاتھ لگ گیا وہ ہمارا انعام ہو گا۔"

عمر اور تجربے کے اعتبار سے وہ کافی سینئر افسر نظر آتا تھا۔ مجھے اس کے خیالات پر سخت حیرت ہوئی۔ "تم تو آرمی پر لعنت بھیجتے ہو مگر آرمی تمہیں کب چھوڑے گی۔"

"ہماری جو حکمتِ عملی چل رہی ہے اس کے پیشِ نظر دو تین سال پہلے کچھ ہوتا نظر نہیں آتا اور میں سن ستر اکہتر تک یہیں جھک مارتا رہوں گا۔ میری لغت میں مایوسی کا لفظ ہی نہیں ہے۔ ذرا تمہارے بیان کی تصدیق ہو جائے تو سارا منصوبہ سمجھا دوں گا!"

وہ کافی دیر تک میرے پاس بیٹھا دوستانہ انداز میں باتیں کرتا رہا۔ اس کی فیاضی کے طفیل مجھے دو پیگ وہسکی بھی مل گئی جس نے ان حالات میں مجھے خاصا سہارا دیا۔

میری انکوائری کا جواب آنے میں خلافِ توقع کافی دن لگ گئے۔ اس دوران میں وہاں میری خوب دیکھ بھال ہوتی رہی۔ کھانے پینے اور آرام کی سہولتوں میں کوئی کمی نہ تھی اس لئے میرے سارے زخم تیزی کے ساتھ مندمل ہونے لگے۔ کیپٹن بھاٹیہ رات میں میرے پاس آ جاتا تھا اور تاش کھیلتے ہوئے بے تکان بولتا رہتا تھا۔ اس کے پاس موضوعات کی کوئی کمی نہ تھی بس سُننے والا درکار تھا۔

وہ عورت، شراب اور تاش کا رسیا تھا اور میرے بھی کم و بیش یہی مشاغل تھے۔ شراب وہ پلاتا تھا۔ عورتوں کے قصّے نہ اس کے پاس کم تھے نہ میں اس سے ہیٹا تھا۔ ہاں تاش کے کھیل میں وہ مجھ سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

ایک روز یونہی راکھی کا قصہ نکل آیا تو وہ بولا۔ "اگر وہ واپس جا کر ہمیں بدنام نہ کرے تو باز پرس کے بہانے اسے بلائے لیتے ہیں۔ رات بھر عیش کریں گے۔ صبح وہ گھر واپس پہنچا دی جائے گی۔"

"نہیں ———" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم نے اسے نہیں دیکھا میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔ وہ مر جائے گی مگر بے عزتی گوارہ نہیں کرے گی۔"

"یہ سب کتابوں کی باتیں ہیں۔" وہ سرور میں آ کر بولا۔ "عورت کو شیشے میں اتارنا ایک فن ہے۔ پھر وہ تمہاری ہے۔"

"خیر ——— وہ میری محسن ہے۔ میری گذارش ہے کہ تم اس کو بھول جاؤ۔" میں نے بحث سے گریز کرتے ہوئے کہا تھا اور اس کے بعد بھاٹیہ نے کبھی راکھی کے بارے میں مجھ سے بات نہ کی۔

اس چوکی پر متعین سارے فوجی میری اور بھاٹیہ کی مصالحت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ گو انہیں صحیح پس منظر کا علم نہ تھا۔ لیکن پھر بھی چوکی کی حدود میں میری نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ میں انہیں اپنی جانب سے شبہات میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ کچھ بھی ہو، وہ دن اتنے اچھے نہیں تو بُرے بھی نہیں تھے۔ اور مجھے ان کے درمیان کسی معزز قیدی کا درجہ حاصل تھا۔

انیسویں دوپہر بھاٹیہ میرے ہی پاس تھا کہ انٹرکام پر سگنلز کے ذریعے کسی شخص نے اسے کسی پیغام کی اطلاع دی اور وہ پھرتی سے وہاں سے چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ پیغام ڈی کوڈ کر کے آیا تو بہت خوش تھا۔ آتے ہی بولا۔ "ہم دونوں کے ستارے اچھے ہیں۔ تمہارے بیان کی حرف بحرف تصدیق ہو گئی ہے۔"

زندگی میں شاید کبھی مجھے اتنی خوشی نہ ہوئی ہو گی جو اس وقت ہوئی۔ "اب میرا کیا ہو گا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"فیصلہ تو اوپر ہی سے آئے گا مگر اس کا سارا دارومدار اب میری رپورٹ پر ہی ہو گا۔" وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"میں تم سے وعدہ......"

اس نے میری بات درمیان ہی سے اُچک لی اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "بس اب باقی باتیں رات کو ہوں گی لیکن مجھے کچھ اور بھی

ضروری کام ہیں۔"

اس خبر کے ساتھ ہی میری رہی سہی تشویش بھی زائل ہوگئی اور میں بے چینی کے ساتھ آنے والی رات کا انتظار کرنے لگا۔ رات آٹھ بجے کے قریب بھاٹیہ میرے پاس آیا اور بولا "میں نے آدھی رپورٹ تیار کرلی ہے کل ہی روانہ کردوں گا۔"

"اگر تم کسی طرح مجھے رہائی دلادو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میرے بنائے ہوئے سونے میں تمہارا برابر کا حصہ ہوگا۔" میں خوشامدانہ لہجے میں بولا

وہ مکارانہ انداز میں زیرلب مسکرایا۔ "میں کھری بات کرتا ہوں دوست ـــــ دراصل دولت اور عورت کے معاملے میں کسی پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ بھانڈرناس کی تلاش میں میں تمہارا شریکِ سفر ہونگا۔"

"میں تمہارا منتظر رہوں گا۔" میں بے چینی کے ساتھ بولا۔

"تم پر میجر انل کے قتل کا الزام ثابت ہے۔ تم خود اس کا اعتراف کرچکے ہو۔" وہ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "میں اسے غلط فہمی کا کیس بنانے جارہا ہوں۔ تمہارا اور انل کا ٹکراؤ اس قدر غیر متوقع طور پر ہوا کہ جب تک وہ تم کو اپنا شناختی نشان بناتا، تم اس پر فائر کرچکے تھے۔ انل کی لاش سرحد پار ہی دفن کی گئی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوا جو کوئی جدوجہد یا زخموں کے نشانات دیکھ کر میری اس رپورٹ کو چیلنج کرسکے۔"

"اس طرح تو میں مارا جاؤں گا۔"

"نہیں ـــــ اس کے بعد دو صورتیں ہیں۔ اگر میں تمہیں فوجی قید میں رکھنے کی سفارش کروں تو تمہیں نہ جانے کہاں رکھا جائے۔ اگر تم وہاں سے فرار ہوگئے تو میں پاتال میں بھی تم تک نہ پہنچ سکوں گا۔ دوسری صورت میں اعلیٰ فوجی حکام تمہیں دو تین سال کے لئے کسی سویلین جیل میں بھیج دیں گے۔ تم وہاں میرا انتظار کروگے اور میں کسی بھی سرحدی جھڑپ میں فرار ہوجاؤں گا۔ میرے ساتھی یہی سمجھیں گے کہ میں دشمن کے ہاتھوں قید ہوگیا یا مارا گیا۔ پھر میں تمہیں جیل سے رہا کراؤں گا اور ہم دونوں نیپال کا سفر کریں گے۔"

"میں سول قید کے مقابلے میں فوجی کیمپ کو زیادہ پسند کروں گا۔" میں نے اس کا منصوبہ سن کر جلدی سے کہا۔

"وہاں ایک اور بھی مشکل ہوگی۔ میں فرار کے بعد تمہیں سول قید سے باآسانی نکال لوں گا لیکن فوجی حکام کو دھوکا دینا میرے لئے ناممکن ہوگا۔" بھاٹیہ اس وقت بہت زیادہ سمجھداری کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس وقت وہ کسی اجڈ فوجی کے بجائے سلجھے ہوئے دماغ کا آدمی لگ رہا تھا۔

"جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔" آخر کار میں نے اپنا معاملہ اسی پر چھوڑ دیا۔ "میں اگر زندہ رہا تو بھانڈرناس ضرور حاصل کروں گا۔"

ہیڈکوارٹر سے میرے بارے میں دو ہی دن بعد احکام آگئے۔ کیپٹن بھاٹیہ کا قیاس درست ثابت ہوا تھا۔ مجھے دو سال کی مدت پٹنہ کے جیل میں گزارنی تھی۔

اس ویران کیمپ میں میری آخری رات یادگار تھی۔ کیپٹن بھاٹیہ نے ساری رات مجھے ولایتی شراب پلائی اور میرے ساتھ تاش کھیلتا رہا۔ اگلی صبح میری آنکھوں پر فوجی دستور کے مطابق پٹی باندھ دی گئی اور میں جیپ کے ذریعے کسی نامعلوم سمت بھیج دیا گیا۔

یہ دشوار گزار سفر شام کے وقت ایک اُجاڑ سے قصباتی اسٹیشن پر ختم ہوا۔ یہاں پہلے سے تین فوجی میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ پٹنہ ریلوے اسٹیشن سے ایک بند لاری کے عقبی حصے میں مجھے لے جایا گیا اور جب میں لاری سے اترا تو سامنے ہی جیل کی عمارت پر ترنگا لہرا رہا تھا۔

پٹنہ جیل کا وارڈن ہرمن سرکار نامی کوئی دوغلا یہودی تھا۔ اس کا باپ ہندو اور ماں یہودن تھی۔ وہ اپنی سخت گیری اور بدزبانی کی وجہ سے سارے قیدیوں کے لئے ہوا بنا ہوا تھا۔ کچھ کاغذات کے تبادلے اور ... دستاویزات پر دستخط لینے کے بعد فوجی چلے گئے اور میں ہرمن سرکار کی تحویل میں آگیا۔

میری تصاویر کیپٹن بھاٹیہ نے ہی ریکارڈ کے ساتھ بھیجی تھیں۔ ہرمن نے ازسرنو میری تمام انگلیوں کے نشانات لئے اور میں جیل بھیج دیا گیا۔

اگلی روز صبح چھ بجے جیل کا تیز سائرن بجا اور سارے قیدی بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی اپنی بیرکوں کے سامنے قطار بند ہونے لگے۔ حاضری کے کام پر مامور سینئر قیدی سب کو چیک کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وارڈن معائنے پر آیا اور اسے پوری حاضری کی اطلاع دے دی گئی۔

ابتدا میں میری ڈیوٹی صفائی پر لگائی گئی۔ نام سے تو یہ کام بڑا آسان معلوم ہوا لیکن جب اس کی حقیقت سامنے آئی تو مزا آگیا۔ روزانہ منوں وزنی مٹی مجھے سر پر لاد کر اِدھر سے اُدھر کرنی پڑتی تھیں۔ کبھی کارخانوں میں سامان کے ڈھیر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پڑتے۔ صفائی تو دراصل ایک بہانہ تھا ورنہ وہ کام قلی گیری کا ہی تھا۔

دو ہفتے اسی کڑی مشقت میں گزر گئے۔ جیل میں میرے چند ساتھی بھی پیدا ہوچکے تھے جو عرصہ دراز سے ہرمن سرکار کا عذاب سہتے چلے آرہے تھے۔ ایک روز دو آدمیوں نے قسمیں لینے کے بعد مجھ سے فرار کی ایک کوشش کے سلسلے میں مدد طلب کی۔

وہ کافی دنوں سے منصوبہ بنا رہے تھے لیکن ان کی ڈیوٹی ہرمن کے بنگلے کے لان پر تھی جہاں سے فرار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح انہیں صفائی کے کام پر لگا دیا جائے، لیکن کوئی صورت نہ بن سکی اور اب مجبور ہوکر انہوں نے میرا انتخاب کیا تھا۔ ان میں سے ایک سات برس سے جیل میں تھا۔ دوسرے کو ڈھائی تین سال ہوچلے تھے۔ وہ دونوں قتل کے الزام میں چودہ چودہ سال کی سزا کاٹ رہے تھے۔

"ہم باہر کی دنیا دیکھنے کو ترس گئے ہیں.... ہمارا پورا منصوبہ تیار ہے بس تم تعاون کرو تو ایک مہینے بعد ہم کھلی فضاؤں میں ہوں گے۔" ان میں ایک نے کہا۔

اس وقت ہم لنگرخانے کے سامنے موجود تھے جہاں بہت سے قیدیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں نے انہیں وہاں کوئی جواب نہیں دیا اور انہیں ساتھ لے کر جیل کے وسط میں بنے ہوئے دقیانوسی طرز کے لان پر آگیا۔

"میں خود بے گناہ یہاں آ پھنسا ہوں۔" میں نے ان کا اعتماد جیتنے کی نیت سے کہا۔ "مگر قانون اندھا ہے اور میں اب جرم کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ اگر کامیابی کا ذرا بھی یقین ہو تو تم فرار کی کوشش میں مجھے پیش پیش پاؤ گے۔"

"ہمارے منصوبے کا سارا انحصار تم پر ہی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔"

جیل میں وقتاً فوقتاً ہونے والی توسیع کے نتیجے میں گندے پانی کی نکاسی کا نظام جواب دینے لگا تھا جس کے حل کے لئے تین سال پیشتر پورے جیل میں نکاسی کا نظام قائم کیا گیا تھا اور وہ لوگ اسی راہ سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ ساری نالیاں جیل کے عقبی حصے میں مل جاتی تھیں اور اس مقام پر لوہے کا ایک مین ہول لگا ہوا تھا جس میں ہر وقت مضبوط تالا لگا رہتا تھا۔ اس جگہ سے یہ سب نالیاں ایک بڑے نالے کی صورت میں جیل کی عقبی دیوار کے متوازی دس پندرہ گز چلنے کے بعد جیل سے باہر گھوم جاتی تھیں اور وہاں لوہے کا مضبوط جنگلا لگا ہوا تھا جس میں سے بمشکل انسانی ہاتھ ہی دوسری طرف نکل سکتا تھا۔ کچھ دور جاکر یہ نالہ شہر کے بڑے نالے سے جا ملتا تھا۔ اور اس دہانے پر بھی لوہے کا ویسا ہی مضبوط جنگلا موجود تھا اور احتیاط کے پیشِ نظر اس دہانے پر ہر وقت دو سنتری پہرے پر موجود رہتے تھے۔ ان کی چوکی جیل سے باہر شہر کے نالے پر ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں سے وہ ہر وقت جنگلے کی نگرانی کرسکتے تھے۔

میرا کام یہ تھا کہ صفائی کے بہانے یا کسی اور طرح ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے وہ چابی ان کو لادوں تاکہ وہ ورکشاپ میں کام کرنے والے تیسرے ساتھی کی مدد سے اس کی نقل تیار کرسکیں۔ پھر ہم لوگ........ چوری چھپے اس مین ہول سے گٹر میں اتر کر لوہے کے جنگلے کاٹتے اور بجائے دہانے سے فرار ہونے کے جیل کے عقب میں نالے کی چھت توڑ کر فرار ہوجاتے۔ منصوبہ بہت جامع تھا اور بظاہر اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی لیکن چابی کا حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ وہ چابی ہر وقت وارڈن کے قبضہ میں رہتی تھی اور وہ اپنی ہی نگرانی میں اس نالے کی صفائی کراتا تھا!

اگلے روز سے میں نے پھٹے پرانے کپڑے اور بڑھئی خانے کا کوڑا ایک ایسی مقررہ جگہ پر جمع کرنا شروع کردیا جہاں زیادہ دیکھ بھال نہیں کی جاتی تھی۔ ہم تینوں روزانہ کم ازکم ایک بار ضرور ملاقات کرتے تھے اور وہ میرے کام کی رفتار پر اطمینان کا اظہار کرتے تھے۔

تین ہفتوں میں ہم آئندہ اقدام کے لئے تیار ہوچکے تھے لیکن اس مرحلہ پر منصوبہ کی ایک خامی ہمارے سامنے آئی۔ پروگرام یہ تھا کہ مقررہ وقت پر جب ہرمن سرکار جیل کی سالانہ دعوت میں شریک ہو تو اس کے کھانے میں کوئی زہر... کرکے اسے ہوا دال دیا جائے اور اگلے ہی دن جیل کے سارے گٹر بند کردیئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ ہرمن سرکار چابی کسی نہ کسی کو دینے پر مجبور ہوجاتا لیکن صفائی کے کام میں سب سات آٹھ آدمی اور بھی تھے۔ ان میں سے اکثر کی سزاؤں کی لمبی مدت ابھی باقی تھی، جب کہ چھٹا آدمی صرف دو ماہ بعد رہا کیا جانے والا تھا۔

اب اگر ہرمن سرکار مین ہول کی چابی مجھے دیتا تو کام بہت آسان ہوجاتا۔ ان پانچوں میں سے کسی کو ملتی تو میں عین وقت پر اسے منصوبے میں شریک کرکے کچھ دیر کے لئے چابی حاصل کرلیتا اور ان پانچوں سے تعاون کی پوری امید تھی کیونکہ ان کی بڑی سزا ابھی باقی تھی۔ ہاں اگر چابی چھٹے آدمی کو ملتی تو وہ ہرگز تعاون نہ کرتا۔ وہ یوں بھی دو ماہ بعد رہا ہونے والا تھا لہٰذا اسے کیا ضرورت تھی کہ فرار کی کسی غیر یقینی کوشش کا خطرہ مول لے۔ لیکن ہم نے اس کا بھی حل تلاش کر ہی لیا۔

سالانہ دعوت سے ایک ہفتے پہلے ان دونوں نے اپنا کام دکھانا شروع کیا۔ دن میں جب ساری بیرکیں خالی ہوتیں تو وہ احتیاط کے ساتھ وہاں کے گٹر بند کردیتے اور شام کو قیدیوں کی واپسی سے قبل گٹر سے کپڑا وغیرہ واپس نکال لیتے۔ اگرچہ گٹر بند ہونے کا راز معلوم نہ ہوسکے جب قیدی بیرکوں میں واپس آتے تو ... پانی وہاں پھیلا ہوا ملتا۔ اس طرح روزانہ دو تین بیرکوں سے شکایات ملنے لگیں۔ صفائی والے نالیوں کی دیکھ بھال کرتے تو وہاں کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ بعد گٹر بند ہونے کی شکایات اتنی بڑھیں کہ قیدیوں میں بے چینی پھیلنے لگی۔ ہرمن سرکار کا خیال تھا کہ قیدی بے احتیاطی کرتے ہیں اور بڑی بڑی چیزیں گٹر میں بہادیتے ہیں جس کے نتیجے میں بڑے نالے کی آہنی جالیاں بند ہوچکی ہیں۔ تھوڑا پانی استعمال ہو تو وہ رس رس کر باہر نکل جاتا ہے لیکن پانی کے زیادہ خرچ کی صورت میں گٹر ابلنے لگتے ہیں۔ ہرمن سرکار نے چاہا کہ سالانہ دعوت سے پہلے ہی مین لائن صاف ہوجائے لیکن وہ کام لمبا تھا۔ اور کوئی بھی قیدی جیل کی اس واحد تقریب کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا لہٰذا یہ معاملہ دعوت کے اگلے روز پر ملتوی کردیا گیا۔

دعوت والے روز ـــ منصوبے کے دونوں شریک انتظامی امور میں سرگرمی کے ساتھ شریک نظر آئے تو مجھے ان کے جوڑ توڑ کی داد دینی پڑی۔ وہ زیادہ تر ان ہی میزوں کے گرد منڈلا رہے تھے جہاں جیل کے حکام کے بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ چند چھوٹی چھوٹی غیر دلچسپ تقریروں کے بعد کھانے کا دور چلا اور وہ دونوں ہرمن سرکار کی خدمت پر مامور نظر آنے لگا۔ تقریب میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔ بجز اس کے کہ ہرمن سرکار اختتام سے ذرا پہلے ہی وہاں سے اٹھ گیا۔

خوش و خرم قیدی اپنی بیرکوں میں واپس پہنچے تو ہر طرف گٹر بند پڑے ہوئے تھے۔ دراصل منصوبے کے چوتھے شریک نے قیدیوں کی غیر موجودگی میں زیادہ سے زیادہ لائنوں میں کپڑے ٹھونس دیئے تھے اور اس بار انہیں واپس نہیں نکالا گیا تھا کیونکہ بڑے نالے کی جالیاں بند ہوجانے کے مفروضہ کے پیشِ نظر اب کوئی بھی چھوٹی لائنوں کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اس حکمت عملی کا دوسرا

فائدہ یہ تھا کہ اگر ہرمن سرکار بیماری کے پیش نظر صفائی کا کام ملتوی کرنا چاہے تو پورے نظام کی بگڑی ہوئی حالت اسے التوا کا موقع نہ دے۔ اگلے روز ایک بات توقع کے خلاف ہوئی۔ چابی ہم لوگوں کے بجائے محافظ دستے کے ایک صوبہ دار کو دی گئی اور وہ قیدیوں کو لے کر مین ہول پر جا پہنچا۔ یہاں میں نے اپنی پھرتی دکھائی اور اس سے چابی لے کر تالا کھول ڈالا اور چابی تالے ہی میں لگا کر ایک طرف رکھ دی۔ پھر جب ڈھکنا اٹھایا جانے لگا تو میں نے دانستہ چابی کھلے گٹر میں پھینک دی لیکن اس طرح کہ کسی کو بھی مجھ پر شبہ نہ ہو سکا۔ یہ سانحہ ہوتے ہی صوبہ دار کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے

بیدردی سے میرے دو تین ہاتھ بھی جھاڑ دیئے۔ گو یہ واقعہ معمولی نوعیت کا تھا اور تالا بآسانی تبدیل کیا جا سکتا تھا لیکن صوبہ دار ہرمن سرکار کے غتاب سے نہ بچ پاتا۔ صفائی وغیرہ کا سارا پروگرام التوا میں پڑ گیا اور سب لوگ چابی کی تلاش میں اتار دیئے گئے۔ صوبہ دار کی کوشش تھی کہ ہرمن کے علم میں آئے بغیر یہ معاملہ نمٹ جائے تو اچھا ہے۔ اس پر اتنی شدید بوکھلاہٹ طاری تھی کہ وہ خود بھی وردی اتار کر گندے نالے میں اتر گیا جہاں اندر کی بیشتر نالیاں بند ہونے کے باعث بہاؤ تو ضرور کم تھا لیکن کیچڑ کے انبار لگے ہوئے تھے جس میں چابی کی تلاش آسان نہیں تھی۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تالا ان دونوں تک پہنچا دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ دو پہر کے بعد وہ تمام نالیوں میں سے پھٹے پرانے کپڑے نکال دیں! اس سے آگے بس مقدر ہی یاور تھا جو تالا واپس آنے تک سب لوگ زور شور سے چابی کی تلاش میں لگے ہوئے تھے! اب تک میں سب لوگوں کو بہکا کر چابی گرنے کے اصل مقام سے دور بھٹکا رہا تھا لیکن تالا واپس آنے کے بعد میں نے صحیح جگہ پر تلاش شروع کی اور چند ہی منٹ میں چابی میرے ہاتھ آ گئی اور صوبہ دار اطمینان کا سانس لیتا باہر آ گیا۔

دراصل اس چابی کا ملنا خود ہمارے منصوبے کی تکمیل کے لئے ضروری تھا۔ وہ نہ ملتی تو صوبہ دار کو بھٹکارا لگ پڑتی۔ تالا بھی بدل جاتا اور ہماری ساری اسکیم دھری کی دھری رہ جاتی۔ دو پہر کے کھانے کے بعد ہم جالیوں کے جائزہ کے لئے اندر گھسے اور خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔ باقی قیدیوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن کوئی منہ سے کچھ نہ بولا۔ جالیوں کے درمیان اتنا زیادہ کوڑا نہیں تھا۔ ہم لوگ وہ صاف کر کے باہر نکل ہی رہے تھے کہ بتدریج مین لائن میں گندا پانی آنا شروع ہو گیا۔ شاید میرے ساتھیوں نے بیرکیں خالی ہوتے ہی نالیوں کے دہانوں سے کپڑا نکالنا شروع کر دیا تھا۔

اگلے تین دن سنسنی خیز سکوت میں گزرے۔ اس دوران ہم نے ورکشاپ سے لوہا کاٹنے والی آری۔ اس کے تین فاضل بلیڈ اور ایک کدال چوری کر کے چھپالی اور تن بہ تقدیر ہو کر آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیل کا قالین بننے کا کارخانہ مشرقی حصے میں واقع تھا جہاں سے ہمارے فرار میں استعمال ہونے والی گٹر لائن بہت دور واقع تھی اور ہم پورے عملے کو اس طرف الجھا کر بآسانی اپنے منصوبے کے آخری حصے پر عمل کر سکتے تھے۔ پھر ایک روز رات گئے قالین کے کارخانے میں آگ بھڑک اٹھی اور پورے جیل میں سیٹیوں اور سائرن کے شور سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہم تینوں سامان لے کر مین ہول پر پہنچے تو وہاں سناٹا پڑا ہوا تھا اور منصوبے کا چوتھا شریک جالی سمیٹ جھاڑیوں میں دبکا ہمارا منتظر تھا!

تالا کھولنے سے پہلے ہم نے مین ہول کے دہانے پر متعین سنتریوں کو دھوکا دینے کے لئے ایک رسی جیل کی فصیل سے دوسری طرف پھینک دی۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ اندر کا عملہ اب کئی گھنٹے تک ادھر توجہ نہیں دے سکے گا۔ رہے باہر والے تو وہ تعداد میں صرف دو ہیں اس لئے طویل چکر کاٹ کر جیل میں آنے کے بجائے دیوار کے سہارے رک کر فصیل پھاندنے کی کوشش کرنے والے قیدیوں کا انتظار کریں گے۔ منصوبہ میں یہ تبدیلی ہم نے آہنی جنگلے کی خستہ حالت کے پیش نظر کی تھی۔ زنگ کے باعث آہنی سلاخیں بہت کمزور ہو چکی تھیں اور نالے کی چھت توڑنے کے بجائے دہانے کا جنگلا کاٹنا زیادہ آسان ہوتا۔ دیوار پر رسی ڈالنے کے بعد ہم نے مین ہول کا تالا کھول کر ڈھکن اٹھایا اور یکے بعد دیگرے اندر گھپ اندھیرے میں کود گئے۔ سب سے آخر میں ہمارا ورکشاپ والا ساتھی اندر آیا۔ اس نے تالا اس ترکیب سے کنڈے میں پھنسایا تھا کہ بادی النظر میں کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔

مین ہول کا ڈھکنا بھی اس نے اترتے ہوئے اپنے سر پر سہار کر بند کر دیا تھا۔

ڈھکنا بند ہوتے ہی تعفن اور اندھیرے کے باعث ہمارا دم گھٹنے لگا لیکن ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ پہلے جنگلے میں ایک ایک انچ موٹی گول آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں جو زنگ کے باعث نچلی جڑ میں بالکل کمزور ہو چکی تھیں۔ انھیں کاٹنے کے بجائے ہم نے کدال پھنسا کر زور لگایا تو پندرہ بیس منٹ میں ہی ہم چار سلاخیں توڑ کر انہیں موڑنے میں کامیاب ہو گئے اور یکے بعد دیگرے جنگلے کے بعد والی ڈھلان پر آ گئے۔ موڑ گھومنے کے بعد ہم جوں جوں آگے بڑھتے گئے ہمیں تازہ ہوا کا احساس ہونے لگا جو شہر کے بڑے نالے میں ملنے والے دہانے سے آ رہی تھی! اس دہانے پر چیک پوسٹ کی سرچ لائٹ سے آنے والی روشنی پڑ رہی تھی لہٰذا ہم تین آدمی پیچھے ہی نالے کی دیوار سے چپک گئے اور ایک شخص بہت احتیاط سے دہانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس نے واپس آ کر خوش خبری سنائی کہ نالے کے پار والی چیک پوسٹ پر بالکل سناٹا ہے اور وہاں لگی ہوئی اوسط درجہ کی سرچ لائٹ کا رخ بھی دہانے کے بجائے اسی جانب ہے جدھر ہم لوگ رسی لٹکا کر آئے تھے۔ پھر ہم چاروں تیزی کے ساتھ آگے بڑھے۔ یہاں بھی آہنی سلاخوں کی حالت کچھ بہتر نہیں تھی۔

بمشکل نصف گھنٹے میں وہ سلاخیں توڑ کر ہم نالے میں اتر گئے اور دیوار سے چپکے تیز رفتاری کے ساتھ...... ایک طرف دوڑنے لگے۔ فرار کا آخری مرحلہ بھی کامیابی سے نمٹ گیا تھا۔ ہم نالے ہی نالے میں دوڑتے چند فرلانگ دور آ گئے اور پھر نالے سے باہر کھلے میدان میں نکل آئے! اب ہم کو سب سے بڑی فکر جیل کے لباس سے چھٹکارا پانے کے بارے میں تھی۔ ایک مرتبہ ہمیں لباس میسر آ جاتا تو ہم پہلی فرصت میں پٹنہ شہر سے دور اپنی اپنی راہوں پر چلے جاتے۔

”ہم جیل سے باہر آ چکے ہیں۔ یہاں تک ہمارا مقصد ایک تھا اب نصیب ہمارے ساتھ ہیں۔ راہیں جدا جدا ہیں!“ ہمارے ایک ساتھی نے کہا۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ دوسرے نے پوچھا

”اگر لباس کی فکر میں ہم ساتھ رہے تو کسی ایک کی بدنصیبی چاروں کو ڈبو دے گی بہتر ہو گا کہ ہم الگ الگ ہو جائیں!“ وہ بولا۔

بات معقول تھی چاروں مفرور پرجوش طریقے پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے اور پھر رات کے اندھیرے میں مختلف سمتوں میں چل پڑے۔ میرے لئے اب ایک نئی مصیبت تھی۔ یہ شہر میرے لئے اجنبی تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ میرے عقب میں جیل واقع ہے۔ اس کے سوا نہ شہر کے راستے معلوم تھے نہ آبادی کے بارے میں معلومات تھیں میں نے اپنی قمیص اتار کر وہیں پھینکی اور آگے چل پڑا۔

تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک ویران فٹ پاتھ پر کوئی بھکاری سوتا ہوا نظر آیا۔ اس کی کمر سے ایک گٹھڑی بندھی ہوئی تھی۔ میرے پاس لوہا کاٹنے والی آری کا بلیڈ موجود تھا۔ میں نے بہت احتیاط سے وہ گٹھڑی رسی سے کاٹ لی اور اسے لے کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ ایک جگہ موقع پا کر میں نے وہ گٹھڑی کھولی تو اس میں چند پرانے کپڑے دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا۔ میں نے پاجامہ اتار کر ایک پھٹی پرانی دھوتی پہنی، پاجامہ وہیں ایک طرف پھینک دیا اور مجذوبوں کے انداز میں ایک طرف چل پڑا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پٹنہ شہر سے نکلنے تک گونگا مجذوب بنا رہوں گا تاکہ زبان کی بنا پر کوئی مجھ پر شبہ نہ کر سکے۔

میں اپنی سوچ میں گم چلا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں کیپٹن بھابھا کا خیال بار بار ابھار رہا تھا وہ کیمیاگری کا دیوانہ جب آرمی سے فرار ہو کر پٹنہ جیل آیا گا تو میرے فرار کی خبر سن کر نہ جانے اس پر کیا گزرے گی!

معاً ایک تیز آواز نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا اور میرے قدم رک کر رہ گئے۔

وہ واضح طور پر کسی ریلوے انجن کی تیز سیٹی کی آواز تھی۔ اس آواز سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے اسٹیشن کی سمت کا یقین کر لیا! اور پھر تیزی کے ساتھ ادھر ہی بڑھنے لگا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے انجن کی سیٹی کی آواز فضا کا سکوت توڑتی رہی اور میری رہنمائی کرتی رہی۔ اور آخر کار میں بوگیوں اور انجنوں وغیرہ کی نقل و حرکت کی آواز بھی سننے لگا۔ اسٹیشن پر ہر طرف گہری خوابناک خاموشی مسلط تھی۔ ٹکٹ گھر بھی بند ہو رہے تھے۔ اور جنگلے دار کھڑکیوں کے عقب میں دو تین کلرک اپنی اونچی کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی سیمنٹ بنچوں پر گداگر اور قلی بے فکری سے یوں سو رہے تھے جیسے اپنے گھروں میں آرام دہ بستر پر دراز ہوں اور ان ہی کے آس پاس آوارہ کتے اپنی بھوک مٹانے کے لئے کچھ سونگھتے پھر رہے تھے۔

چمکتی ہوئی ریل کی پٹڑیوں پر پلیٹ فارم سے کافی دور ایک تاریک مسافر گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور اس سے ذرا ادھر ریلوے کا عملہ ایک مال گاڑی کے ڈبے جوڑنے میں مصروف تھا۔ بھاپ سے چلنے والا سیاہ انجن آسیبی انداز میں چیختا بار بار پٹری بدل رہا تھا گارڈ اپنی لالٹین لہرا لہرا کر ڈرائیور کی رہنمائی کر رہا تھا۔ بظاہر یوں لگ رہا تھا جیسے یہ مال گاڑی رات ہی میں کسی وقت روانہ ہو جائے گی۔

میں بے تعلقانہ انداز میں ٹہلتا ہوا پلیٹ فارم کے ایک تاریک حصہ کی طرف نکل گیا اور سیڑھیوں کے قریب ہی اس طرح دراز ہو گیا کہ مال گاڑی پر نظر رکھ سکوں مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ جیل سے چار قیدیوں کے فرار کی خبر زیادہ دیر راز نہ رہ سکے گی۔ جیل کے عقبی نالے پر متعین سنتری اتنے بیوقوف نہیں رہے ہوں گے کہ ساری رات جیل کی فصیل سے لٹکتی ہوئی رسی کے پاس گزار دیں اور جب وہ اپنی چوکی پر واپس جاتے تو گندے پانی کی نکاسی کے نالے کی ٹوٹی تڑی آہنی سلاخیں انہیں ساری کہانی سمجھا دیتیں۔ قیدیوں کی حاضری ہوتی، اور سب کو علم ہو جاتا کہ چار قیدی غائب ہو چکے ہیں۔

ان حالات میں ریلوے اسٹیشن اور شہر سے نکاسی کے دوسرے راستے سب سے خطرناک بن جاتے، پولیس سب سے پہلے ان ہی مقامات کی ناکہ بندی کرتی۔ لہٰذا میرے لئے بہتر یہی تھا کہ جلد از جلد اسٹیشن سے بہت دور نکل جاؤں۔

مال گاڑی کے ڈبے جوڑے جانے کا عمل اتنا سست تھا کہ میرے اعصاب پر اضطراب کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اگر میں اسی طرح قسمت پر شاکر وہاں پڑا رہتا تو کسی بھی لمحے دھر لئے جانے کا قوی امکان تھا۔

پلیٹ فارم پر لگی ہوئی بڑی گھڑی اس وقت سوا دو بجا رہی تھی میں نے زمین پر پڑے پڑے ہوشیاری سے گردوپیش کا جائزہ لیا اور اٹھ کر تیزی کے ساتھ آگے ہو لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پلیٹ فارم ختم ہو گیا اور میں گھور اندھیرے میں آؤٹر سگنل کے قریب جا پہنچا۔ یہاں میں ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکا پھر کسی چوپائے کی طرح ہاتھ پیروں پر چلتا ریل کی پٹڑیاں عبور کرنے لگا۔ دوسری سمت میں پہنچ جانے کے بعد میں دوبارہ اسی طرف ہو لیا۔ جہاں مال گاڑی کے ڈبے جوڑے جا رہے تھے۔ میری دانست میں پلیٹ فارم کی مخالف سمت سے کسی بوگی میں سوار ہونے کے بہتر امکانات موجود تھے اور ایک مرتبہ کسی بوگی میں گھس جانے کے بعد میں پوری طرح محفوظ تھا۔

میں اندھیرے اور دھندلائے ہوئے اجالے میں ڈوبتا ابھرتا گارڈ والے ڈبے کے سامنے پہنچا پھر مال گاڑی کے متوازی آگے بڑھنے لگا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں میری ہراسید مایوسی میں بدل گئی۔ اس مال گاڑی میں بند بوگیاں یا سیال لے جانے والے ٹینکر تھے جو مقفل رہتے ہیں۔ کوئی ایسی کھلی ہوئی بوگی نہیں تھی جو میرے لئے کمین گاہ کا کام کرتی۔

اب انتظار کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی۔ میں ریلوے لائن کے اس پار جھاڑیوں کے عقب میں اس طرح بیٹھ گیا کہ اتفاقاً کوئی ادھر آ بھی نکلے تو اسے مجھ پر شبہ نہ ہو۔ پونے تین بجے مال گاڑی میں انجن بھی جوڑ دیا گیا۔ ریلوے کے عملے میں کچھ پھرتی عود کر آئی۔ چیکنگ کا آخری مرحلہ تیزی کے ساتھ طے پا گیا۔

انجن نے ایک تیز سیٹی دی اس کے جواب میں پلیٹ فارم کی جانب سے گارڈ نے مخصوص انداز میں وسل دی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ مال گاڑی آہستہ آہستہ آگے سرکنے لگی۔ میں پھرتی کے ساتھ اٹھا اور پٹڑیاں عبور کرتا مال گاڑی کے بالکل قریب جا پہنچا اور ڈبوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ اور اس سے قبل کہ مال گاڑی کی رفتار تیز ہو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دو بوگیوں کے درمیانی جوڑ پر سوار ہونے کی کوشش کی اور پھسل کر پہیوں کے نیچے آنے سے بال بال بچا۔ اسی وقت انجن نے پھر وسل دی۔

مال گاڑی کو ایک تیز دھچکا لگا اور رفتار یک بیک تیز ہونے لگی۔ میں اسی جگہ سانس روک کے اپنے قدم جمانے کی کوشش کرتا رہا۔

مال گاڑی اب یکساں رفتار سے آگے بڑھی جارہی تھی اور میں تیزی کے ساتھ آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں اس وقت جس حالت میں مال گاڑی پر سوار تھا۔ وہ قطعی محفوظ نہیں تھی۔ اگر مال گاڑی کسی اسٹیشن سے گزرتی یا دورانِ سفر ہی دن طلوع ہو جاتا تو میرا دیکھ لیا جانا یقینی امر تھا۔ میں بہت دیر کی سوچ بچار کے بعد آخر ایک فیصلہ پر پہنچ ہی گیا۔

جہاں میں کھڑا ہوا تھا، وہاں بوگی کی چادروں کے سرے اس طرح مڑے گئے تھے کہ میں ان کا سہارا لیکر بوگی کی چھت پر سوار ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا، اور چھت پر پہنچنے کے بعد کچھ دیر تک اپنے اوسان بحال کرتا رہا۔ ایک ثانیہ کے لئے مجھے خیال آیا کہ مزید جدوجہد کے بجائے اپنا سفر چھت پر ہی جاری رکھوں لیکن اس میں بھی وہی قباحت تھی کہ میرا دیکھ لیا جانا یقینی امر تھا۔

پھر میں احتیاط اور پھرتی کے ساتھ بوگیوں کی چھتیں طے کرتا مال گاڑی کے پچھلے سرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کوششوں میں ایک دو جگہ ایسے مقام بھی آئے کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اور موت سامنے نظر آنے لگی۔ لیکن میں کسی نہ کسی طرح گارڈ کے ڈبے پر پہنچ ہی گیا۔

یہاں میں نے کوئی آواز یا آہٹ پیدا کئے بغیر پیٹ کے بل چھت پر لیٹ کر نیچے کی سن گن لینے کی کوشش کی مگر وہاں آہنی پٹڑیوں پر پہیوں کے شور کے سوا ہر آواز مفقود تھی۔ شاید گارڈ روانگی کے بعد اپنے ڈبے میں اونگھ گیا تھا۔

میں آہستگی سے آگے سرکا اور کسی چیتے کی سی پھرتی سے اس ڈبے کے برآمدے نما حصے میں کود گیا۔

میرے قدم ٹکنے سے پہلے ہی ڈبے میں پھیلی گھور تاریکی میں سے کوئی وردی پوش سایہ اچھلا اور غراتا ہوا مجھ سے لپٹ پڑا۔

میرے لئے یہ صورتحال روح فرسا تھی۔ گارڈ نہ صرف پوری طرح چوکنا بلکہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور بھی تھا۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور پیر جما کر اسے چلتی گاڑی سے نیچے پھینکنے کی کوشش کرنے لگا۔

ہم دونوں زبان سے ایک بھی لفظ نکالے بغیر ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے کہ میرا داؤں چل گیا۔ جوں ہی میرا گھٹنا اس کے پیٹ پر پڑا وہ ایک کریہہ آواز نکال کر پیچھے الٹ گیا۔ اسی وقت انجن نے پے در پے کئی بار سیٹیاں بجائیں اور یک بیک مال گاڑی کی رفتار سست پڑنے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن یا سگنل آنے والا تھا۔

اس سے پیشتر کہ گارڈ سنبھل کر مجھ پر وار کر سکے میں تیزی سے اندر کی طرف لپکا مگر اس تک پہنچنے سے قبل ہی میرے قدم فرش پر پڑے ہوئے کسی ساکت جسم سے ٹکرائے اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔

گارڈ کے ڈبے میں کسی تیسرے بے ہوش فریق کی موجودگی میرے لئے حیرتناک تھی۔ مگر میری یہ حیرت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ کیونکہ میرا وردی پوش دشمن بدلی ہوئی صورتحال سے فائدہ اٹھا چکا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھے نیچے پڑے ہوئے تھے۔ تیسرا فریق ہم دونوں کے نیچے دبا ہونے کے باوجود بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

"تت ... تو کون ہے؟" مقابلہ فیصلہ کن نہ ہوتے دیکھ کر وردی پوش حریف گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

اس کی آواز سنتے ہی میں چونک پڑا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا "شیکھر تم!"

"اوہ — !" اس نے ایک طویل سانس لی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

"کیا تم نے گارڈ کو مار دیا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"پتہ نہیں!" وہ لاپروائی سے بولا "میں نے تو بے ہوش کرنے کی کوشش کی تھی ہو سکتا ہے کہ مر ہی گیا ہو"۔

"تم اس ڈبے میں کیسے آگئے ۔ ؟"

"ہم چاروں الگ ہوئے تو میں نے اسٹیشن کا ہی رخ کیا تھا اور ڈبہ میں آچھپا۔ مال گاڑی چلنے تک کسی نے بھی ادھر توجہ نہیں دی۔ پھر گاڑی اسٹیشن سے نکلی تو میں نے اسے بے ہوش کر کے وردی ہتھیا لی، مجھے پتہ ہوتا کہ یہ مر چکا ہے تو ہی میں پھینک دیتا" شیکھر نے کہا۔

شیکھر کے استفسار پر میں نے بھی اسے اپنی کہانی سنائی جس پر ہنس دیا "بڑے وقت پر ہم نے ایک دوسرے کو پہچانا ورنہ ایک نہ ایک چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا گیا ہوتا"۔

"یہ باتیں چھوڑو اور بچاؤ کی فکر کرو!" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "میرے لئے یہ سارے علاقے اجنبی ہیں۔ ذرا دیکھو کہ اب ہم کس جگہ ہیں اور گاڑی کہاں رک رہی ہے؟"

بریکوں کے شور میں ہم نے باہر کی طرف جھانکا۔ تھوڑے فاصلے پر سگنل کی مدھم سی روشنی تھی اور اس سے آگے بہت سے ننھے ننھے روشن نقطے نظر آرہے تھے۔

"ہم شاید دیناپور کے آس پاس ہیں!" شیکھر بڑبڑایا "گارڈ کو بے ہوش کرنے کی کوشش میں اس کی لالٹین بھی ٹوٹ گئی۔ اور اب ہمارا اس مال گاڑی پر رکنا خطرناک ہے"۔

"گاڑی رکنے سے پہلے ہی اتر جاؤ" میں نے کہا۔

اور گارڈ کی برہنہ لاش وہیں چھوڑ کر ہم دونوں رینگتی ہوئی مال گاڑی سے پٹڑیوں کے درمیان کود گئے۔ یہاں دور دور تک گہرا سناٹا تھا اور کسی مداخلت کا خطرہ نہیں تھا۔

"اب پھر ہماری راہیں جدا ہیں دوست!" شیکھر نے پٹڑیاں عبور کرتے ہوئے کہا "تم فیصلہ کر لو کہ کس طرف جانا ہے پٹڑیوں کی دائیں جانب یا بائیں جانب"

شیکھر قتل ہی کے الزام میں پٹنہ جیل میں سزا بھگت رہا تھا اور فرار کے فوراً بعد ہی وہ ایک اور قتل کا ارتکاب کر بیٹھا تھا۔ قانون کی نظروں میں وہ خطرناک تھا۔ مگر میرے لئے وہ محسن ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی مدد سے میں بآسانی ہندوستان سے نکل سکتا تھا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو شیکھر" میں نے دبی زبان میں اس سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ میری طرف گھوم پڑا۔

"ہم الگ تو ہو ہی چکے تھے مگر قسمت نے ہمیں پھر یکجا کر دیا!" دھیمے لہجہ میں کہنا شروع کیا "اب تم صرف مفرور ہی نہیں قاتل بھی ہو، دوسرے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم دونوں ہندوستان سے نیپال کی طرف نکل جانے کی کوشش کریں"

چند ثانیوں تک وہ خاموش رہا پھر وفورِ جذبات سے تھراتی ہوئی آواز میں بولا "مگر مجھ پر اس زمانہ کے کچھ قرض بھی واجب ہیں جب تک انہیں نہ چکا دوں میں سکھ کی نیند نہیں سو سکتا"۔

"بہت دکھی معلوم ہوتے ہو ۔ ؟"

"ہاں ۔ شاید تم سچ کہتے ہو" اس نے ایک سرد سانس لے کر تلخ لہجہ میں کہا "میں اپنی اندھی ماں، بہن، بہنوئی اور ان کے سات بچوں کا واحد کفیل تھا دوست میرا بہنوئی سدا کا جواری اور شرابی تھا۔ مگر میری بہن اس سے دل ہار گئی تھی! ان دنوں میں کمسن تھا اس لئے یہ شادی ہو گئی۔ اور جب مجھے ہوش آیا تو وہ جواری میری بہن کا سارا جہیز ختم کر چکا تھا۔ مجھ پر اچانک ذمہ داری آپڑی اور میں گناہ کی راہوں پر نکل گیا۔ میرا کام اسمگلنگ تھا، میری آمدنی ان سب کے پیٹ تو بھر سکتی تھی لیکن جواری کی جیبیں بھرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا اور ایک روز اس نے میری بہن کو عصمت فروشی پر مجبور کیا تو وہ گھر آگئی۔ یہ بات مجھ سے چھپائی گئی مگر چھپ نہ سکی اور میں نے اس بے ضمیر شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر تین برس جیل میں بند مقدمہ زور آتا رہا۔ پھر مجھے چودہ سال کی سزا ہو گئی اور ...... اور تم جانتے ہو کہ اپنی بہن کو جس غلاظت سے بچانے کے لئے میں نے اپنے ہاتھوں میں لہو کی سرخی رچائی وہ آج اسی غلاظت سے آلودہ ہے ... وہ بیوہ بن چکی ہے میرے دوست! کیونکہ اس کی ایک اندھی ماں، سات بھوک سے بلکتے بچے ہیں۔ اس کی مجبوریاں بجا مگر میں بھی اپنے ضمیر کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ یہ میرا عہد تھا کہ میں اپنی بہن اور اس کی مجبوریوں کو اپنے ہاتھوں ہلاک کروں گا۔ پھر میں پھانسی کے تختے پر بھی اطمینان سے چڑھ جاؤں گا — تم کہتے ہو کہ مجھ پر دو خون سوار ہیں مجھے جان بچانے کے لئے بھاگ جانا چاہیئے۔ مگر سن لو کہ میں جیل سے زندگی کے لئے نہیں اپنا عہد پورا کرنے کے لئے فرار ہوا تھا۔ میں اپنی بہن کو، اس کی چار بچیوں کو اور اپنی اندھی ماں کو ہلاک کر کے پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ پھر میرے تین بھانجے آزادی اور آوارگی کی فضا میں پروان چڑھیں گے، لوگوں کی پگڑیاں اچھالیں گے۔ جرم و گناہ کے بازار سجائیں گے اور اس دن میری آتما نرک میں بھی دیوانہ وار ناچ اٹھے گی۔ اسی روز میرا انتقام پورا ہو گا۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شیکھر کی زندگی اس قدر ستم رسیدہ ہے۔ اس کا ساتھ تو شاید مجھے بھی لے ڈوبتا۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

"ٹھیک ہے دوست!" میں نے کہا "تمہاری مجبوریاں تمہارے ساتھ ہیں۔ میری راہ ان چمکتی آہنی پٹڑیوں کی داہنی جانب ہے!"

میں نے اندھیرے میں غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ شاید ہونٹ بھینچے مجھے گھور رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔

"الوداع شیکھر!" میں نے کہا اور تیزی کے ساتھ ڈھلان اترنے لگا کچھ دور جا کر میں نے پیچھے دیکھا تو وہ بدنصیب قاتل ابھی تک اسی جگہ کھڑا ہوا تھا۔

"صفدر!" اچانک عقب سے شیکھر نے مجھے آواز دی۔

میں نے پیچھے گھوما تو دیکھا کہ وہ تیزی سے میری طرف چلا آرہا ہے۔

"میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے صفدر — تم ٹھیک ہی کہتے تھے!" قریب آکر وہ بولا۔

"کیا!"

"ابھی فرار اور قتل کے واقعات تازہ ہیں، ہر طرف ہماری تلاش جاری ہو گی۔ فی الحال کچھ عرصہ تک روپوشی ہی بہتر ہے۔ اگر میں پھر دھر لیا گیا تو میری ساری محنت رائیگاں جائے گی اور میں اپنی خون کی پیاس بجھائے بغیر دوبارہ آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاؤں گا"۔

یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ میرے لئے اس کے عہد سے زیادہ اہم بات ہندوستان سے فرار تھی اور اس کا نیا فیصلہ میرے عزائم میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

صبح کا اجالا پھیلنے تک ہم دونوں ریلوے لائن سے بہت دور دریائے گنگا کے کنارے جا پہنچے۔ یہاں خوراک کی کوئی کمی نہیں تھی اور ہم کئی دن تک روپوش رہ سکتے تھے

اس دوران میں مجھے شیکھر کی کئی نئی خصوصیات کا علم ہوا۔ وہ بے پناہ قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ اور جو بات ایک مرتبہ اس کے ذہن میں آجائے وہ اسے کر ہی گزرتا تھا۔ ہم دونوں نے پہلی فرصت میں اپنے لئے لباس کا بندوبست کیا اور شیکھر نے گارڈ کی وردی گڑھا کھود کر زمین میں دفن کر دی۔

فرار کے پانچویں روز ہم کسی نہ کسی طرح گنگا کے اس پار چھپرہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پٹنہ کے مقابلہ میں یہ شہر بہت پسماندہ اور چھوٹا تھا مگر یہاں ہمارے لئے سب سے بڑا مسئلہ کچھ رقم کی فراہمی کا تھا۔ تاکہ ہم مقامیوں کے شک و شبہ سے بالاتر ہو کر چند دن گزار سکیں۔ شیکھر کو مال گاڑی کے گارڈ کی جیب سے جو بیس پچیس روپے ملے تھے وہ لباس وغیرہ حاصل کرنے میں صرف ہو چکے تھے۔

پہلے دن ہم چھپرہ میں بے مقصد آوارہ گردی کرتے رہے مگر شام ہوئی تو عقدہ کھلا کہ شیکھر بلاوجہ وقت نہیں گزار رہا تھا۔ اس دوران میں وہ ایک ایسی دکان کا انتخاب کر چکا تھا جہاں رات کو نقب زنی کر کے ہم معقول رقم حاصل کر سکتے تھے۔

شام کو سات بجے تک چھپرہ کے بازاروں کی رونق بستیوں میں سمٹ چکی تھی۔ ہم دونوں ایک مرتبہ پھر ویران بازار سے گزرے۔ وہ دوکان بھی بند ہو چکی تھی اور اب وہاں اکا دکا راہگیروں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

وقت گزاری کے لئے ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ یہاں داڑھی وغیرہ مونڈ دینے کے بعد ہماری شناخت کا کوئی امکان نہیں رہ گیا تھا۔ اسٹیشن سے پتہ چلا کہ رات ساڑھے دس بجے وہاں سے آخری پسنجر ٹرین گزرتی ہے جو بنارس سے آکر مظفر پور پر ختم ہوتی ہے۔

ہمارے منصوبے کے لئے یہ وقت بہت مناسب تھا۔ ساڑھے نو بجے ہم پانچویں مرتبہ چھپرہ کے بڑے بازار میں پہنچے۔ اس وقت دور دور تک کسی کا پتہ نہیں تھا جو ہماری راہ میں حائل ہوتا۔ یہاں شیکھر نے چند تاروں کی مدد سے نقب زنی کا وہ کمال دکھایا کہ میں حیران رہ گیا۔

تالا کھول لینے کے بعد وہ اندر گھس گیا اور میں دروازے میں تالا پھنسا کر بے تعلقانہ انداز میں آگے کی طرف چل دیا۔ بازار کے آخری نکڑ پر جا کر میں واپس لوٹا اور باہر سے شیکھر کو آواز دی "بہت مال ہاتھ لگا ہے، جلدی دروازہ کھولو!" وہ اندر سے

چند سیکنڈ بعد شیکھر ایک وزنی تھیلا سنبھالے باہر نکل آیا ہم نے دوکان کا دروازہ بند کر کے تالا پھنسایا اور تیزی کے ساتھ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

"کئی ہزار روپے نقد اور بہت سے تیار لباس لے آیا ہوں" شیکھر

کہہ رہا تھا: تجوری میں سونے کے بہت سے زیور بھی تھے لیکن وہ میں نے چھوڑ دیئے۔

" زیور چھوڑ دیئے !" میں قدرے حیرت اور غصے کے ساتھ بولا۔

" ہاں ۔ ہمارے یہاں سونا رکھنا یا اس کی خرید و فروخت کرنا قانوناً ممنوع ہے"۔ وہ بولا: مگر یہ سالا شاید چوری چھپے سونے کا لین دین کرتا ہے اگر میں لے آتا تو انہیں بیچنا مصیبت بن جاتا اور ہمیں کسی ایسے خطرے سے بچنا ہی چاہیئے"۔

اس کی بات معقول تھی اس لئے میں خاموش ہو گیا۔

ہم اسٹیشن پر پہنچے تو دس بج رہے تھے۔ ہم نے دوسرے درجے کے دو ٹکٹ لئے اور پلیٹ فارم پر آ گئے۔ یہاں میں نے بک اسٹال پر ایک رسالہ دیکھا جس کے سرورق پر ہی چند چونکا دینے والی سیاسی سرخیاں تھیں۔ ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ بے اختیار مجھے انڈین آرمی کا کیپٹن بھاٹیہ یاد آ گیا۔ جب وہ بچارہ آرمی سے فرار ہو کر پٹنہ جیل پہنچے گا تو یہ جان کر اسے کس قدر دکھ ہو گا کہ میں اس کا انتظار کئے بغیر فرار ہو چکا ہوں"۔

ٹرین آئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ڈبہ بالکل ہی خالی تھا۔ ٹرین چلنے کے بعد ہم نے چوری کے تھیلے میں سے ساری رقم نکالی جو چار ہزار دو سو گیارہ روپے تھی۔ شیکھر نے دو ہزار مجھے دے کر باقی رقم اپنی جیب میں اڑس لی ریڈی میڈ کپڑوں کی پیکنگ وغیرہ پھاڑ کر کپڑے دوبارہ تھیلے میں جمائے اور بڑے اطمینان سے منزل کا انتظار کرنے لگے۔

" صفدر ایک بات بتا یار !" کچھ دیر بعد شیکھر نے موڈ میں آ کر کہا۔

" پوچھ ۔ ایک نہیں دو باتیں پوچھ !" میں ہنسا۔

" تجھے معلوم ہے کہ میں جیل میں قتل کی سزا بھگت رہا تھا۔ مگر میں جیل سے یہاں تک تیرے ساتھ ہونے کے باوجود تیرے ماضی سے لاعلم ہوں"۔

" میرا ماضی !" میں آہستہ سے بولا۔ درد کی ایک ٹیس میرے دل میں اٹھی اور گذرے ہوئے واقعات کسی فلم کی طرح میرے ذہن سے گزرنے لگے۔ بھرا پرا کنبہ، باعزت کاروبار، آزاد تعلیمی زندگی ۔۔ یہ میری زندگی کا پہلا دور تھا۔ پھر شراب، جوا عیاشی اور اسمگلنگ نے میری زندگی کو ایک نیا بہروپ دیا۔ جہاں میرے ایک اشارے پر لاکھوں کا فیصلہ ہو جاتا تھا اور شہر کی ہر آزاد خیال لڑکی میری باہوں میں چند لمحے گذارنے کو خوش نصیبی کی معراج سمجھتی تھی۔ پھر سیہ بختی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ پولیس شکاری کتوں کی طرح ہر ٹھکانے پر میری بو سونگھتی پھر رہی تھی۔ اور میں مفرور تھا۔ پھر میں نے اکبر اور اپنی محبوبہ گلنار کو قتل کیا۔ پھر اڈل کو قتل کیا اور پے در پے فرار ہوتا رہا۔ اس لحاظ سے شیکھر مجھ سے کمتر تھا اس نے دو قتل کئے میں تین خون کر چکا تھا۔ وہ صرف ایک بار جیل سے فرار ہوا۔ اور میری اب تک کی زندگی سراسر فرار تھی۔ پولیس سے فرار، حقیقتوں سے فرار، قانون سے فرار، کیپٹن بھاٹیہ سے فرار، جیل سے فرار، اور اب میں ہندوستان سے فرار چاہتا تھا۔

" کیا سوچ رہا ہے صفدر ؟" مجھے خاموش پا کر شیکھر نے ٹوکا۔

" شاید تجھے یاد ہو کہ جیل سے بھاگنے کا منصوبہ بناتے وقت میں نے کہا تھا کہ میں اندھے قانون کا شکار ہو کر بے گناہ جیل میں آ پھنسا ہوں"! میں نے کہا۔

" ہاں ۔ یاد تو پڑتا ہے !"

" میرا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے"۔ میں نے اپنی فرضی کہانی کی ابتدا کی اور شیکھر ایکدم چونک پڑا۔

" مگر تو بول چال سے تو بنگالی نہیں لگتا"۔

" یہی میری بدنصیبی ہے۔ تیرے ملک کے بے شمار ہرکارے مشرقی پاکستان میں مقامی اور غیر مقامی کا تعصب ابھارنے کے مشن پر کام کر رہے ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت سی محب وطن تنظیمیں بھی کام کر رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک تنظیم کے لئے کام کرتے ہوئے میں نے تیرے ہم وطنوں کے کئی منصوبے ناکام بنائے جس پر جھلا کر انہوں نے مجھے اغوا کر لیا۔ ایک سرحدی چوکی پر مجھ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ تاکہ میں اپنی وفاداریاں بدل دوں۔ جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو مجھے جیل کے جہنم میں جھونک دیا گیا۔ بس یہی میرا ماضی ہے"۔

" یہ سراسر ظلم ہے"۔ وہ جوشیلی آواز میں بولا: میں سیاست تو نہیں جانتا ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے ملکوں میں ایسی کارروائیاں شرمناک ہیں!"

ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرین حاجی پور کے اسٹیشن پر رکی تو شیکھر تھیلا لیکر اٹھ گیا: "بس یہیں اتر جاؤ"! میری استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں اس نے کہا

" مگر ہمارے ٹکٹ تو مظفر پور تک کے ہیں!" میں نے کہا مگر دل ہی دل میں میں اس کی عیاری سمجھ رہا تھا۔

" تو بھی اناڑی ہے یار ۔۔!" وہ بولا: "کبھی کسی کو اپنی منزل کی خبر نہیں دینی چاہیئے"!

وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ اسمگلنگ کا کاروبار کرتے ہوئے میرے کسی کارندے کو آخری لمحوں تک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مال کہاں سے اٹھانا ہے اور کہاں پہنچانا ہے۔

اسٹیشن پر اتر کر ہم پھاٹک سے باہر نہیں نکلے کیونکہ۔ وہاں کے ٹکٹ چیکر کو شبہ میں ڈال سکتے تھے۔ اس لئے ٹرین روانہ ہونے کے بعد ہم کچے پلیٹ فارم کا چکر کاٹ کر باہر آ گئے۔ یہاں صرف ایک ہی تانگہ موجود تھا۔ اس نے ذرا ہی دیر میں کالے خاں کی سرائے پر پہنچا دیا جو اتنی آرام دہ تو نہیں تھی لیکن صفائی ستھرائی قابل تعریف تھی۔

سونے سے قبل ہم دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمیں جیل سے فرار ہوئے گیارہ دن ہو چکے تھے۔ شیکھر کی دانست میں اب خطرہ ٹل چکا تھا وہ پہلی فرصت میں واپس روانہ ہونا چاہتا تھا تاکہ اپنا انتقام پورا کر سکے۔ اس کے پاس دو ہزار روپے سے زائد رقم موجود تھی۔ اور اسے پورا یقین تھا کہ چھپرہ کی ڈکیتی کے سلسلے میں وہ بالکل محفوظ ہے۔ لہٰذا اب وقت ضائع کرنا بے وقوفی کے مترادف تھا۔ میں بڑی مشکل سے اسے مزید چند دن رکنے پر آمادہ کر سکا۔ دراصل ایک مقامی کا ساتھ میرے لئے بہت تقویت کا باعث تھا۔ اسی لئے مجھے بتایا کہ موتی ہاری سے آگے کا سفر میرے لئے آسان ہو گا۔ لہٰذا وہ مجھے ریل کے ذریعہ موتی ہاری پہنچا کر واپس لوٹ آئے گا جہاں سے میں لاری کے ذریعہ نیپال کی جانب روانہ ہو سکتا تھا۔

حاجی پور میں ہم نے دو دن گزارے۔ یہ بستی پٹنہ سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ پٹنہ گنگا کے جنوب میں ہے اور یہ شہر دریا کے شمالی کنارے پر واقع ہے لہٰذا یہاں ہمیں اپنے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ جیل سے ہمارے فرار کے بعد پولیس نے تمام دریائی اور خشک راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ حاجی پور میں بھی پولیس کے کئی دستے مامور رہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

مال گاڑی سے گارڈ کی برہنہ لاش ملنے کے بعد پولیس نے ہم دونوں کے بارے میں یہ رائے

…تم کی کہ ہم اس وردی کی مدد سے صوبہ بہار سے نکل گئے ہیں لہٰذا ان نواح میں ہماری تلاش کی مہم ترک کی جا چکی تھی۔ ان بے چاروں کو شبہ تک نہ ہوا ہو گا کہ ہم ان ہی کے …س پاس منڈلا رہے ہیں۔

تیسرے روز ہم حاجی پور سے موتی ہاری کے لئے روانہ ہوئے۔ ٹرین …سنیفا ہپی جوڑوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ شیکھر نے بتایا کہ ان کے ساتھ مل کر میں …سالی سرحد عبور کر سکوں گا۔

اس سے پیشتر کراچی میں ایک بار ہپیوں سے واسطہ پڑا تھا۔ اور …جانتا تھا کہ ان کی کوئی اخلاقی قدریں نہیں ہیں۔ دراصل اخلاقی اقدار سے کھلی بغاوت …ہپی ازم کہلاتی تھی۔ پھر بھی مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے میں نے چند ہپیوں …تعارف حاصل کر لیا۔

تعارف بھی کیا۔ بس میں ایک لڑکی کو دیکھ کر مسکرایا جواب میں اس …مجھے ٹھکا مارا اور قریب ہی آ بیٹھی۔

" آج موسم کچھ اچھا ہے"۔ میں نے روایتی انداز میں گفتگو کا آغاز …تے ہوئے خود کو بالکل چغد محسوس کیا۔

اپنی خوشحالی کے دور میں میرا بیشتر وقت عورتوں کی قربت میں گزرتا …فا اور میں انہیں شیشہ میں اتارنے کے فن میں طاق تھا جس سے میں ایک دفعہ بات کر لیتا …میری اسیر ہو جاتی تھی۔ گلنار کے سوا مجھے کوئی ایسی لڑکی یاد نہیں تھی جس نے میری آرزو رد …حترازانہ کیا ہو۔ لیکن اب میں اس ماحول سے رشتہ توڑ چکا تھا۔ میری حالت اپنے غول سے …چھڑے ہوئے کسی ایسے جانور کی طرح تھی جو ساتھیوں کے غم میں اپنی بولی تک بھول چکا ہو۔

وہ ہپی لڑکی ناز و ادا سے عاری تھی، دوستی پر مائل تھی مگر میں اس سے …ت کرنے میں بھی مشکل محسوس کر رہا تھا۔ موضوع ملا تھا نہ الفاظ۔

" شاید اچھا ہو۔ مگر میں اس ٹرین میں بلا ٹکٹ سفر کر رہی ہوں"۔ لہجے …ے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے میں میری ہمدردی چاہتی ہے۔

" تنہا ہو ۔۔!" میں نے پوچھا۔

" اتنے لوگوں میں بھی تم مجھے تنہا کہتے ہو"۔ وہ ڈبے کے دوسرے …مسافروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر بولی۔

" میرا مطلب ہے ۔۔ تمہارا کوئی ساتھی !"

" تم جو ہو !" وہ جارحانہ انداز میں میرے قریب کھسک آئی۔

" اگر یہ لائن پر آ جائے تو میں مظفر پور ہی اتر جاؤں گا"۔ شیکھر …ے مسکرا کر کہا۔

" یہ کون ہے ؟" اس لڑکی نے مجھ سے شیکھر کے بارے میں پوچھا۔

" یہ میرا بڑا بھائی ہے"۔

" اوہ ۔۔ تم اسی لئے مجھ سے ڈر رہے ہو۔ تم مشرقی لوگ ! اس …دو مانٹک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر خوف کھاتے ہو !"

" یہ خوف نہیں ۔ احترام ہے !"

" عجیب ہو تم لوگ"۔ وہ اپنے فلسفے پر آ گئی: "تمہاری یہی خود فریبی …اری پسماندگی کا سبب ہے۔ تم اس خوف کو کبھی محبت کہتے ہو، کبھی احترام ۔ کبھی …یت کبھی چاہت !"

" تم کہاں سے آ رہی ہو ۔۔؟" میں نے موضوع بدلنے کے لئے اس خوبصورت مگر گمراہ تتلی سے پوچھا۔

" بنارس سے ۔ اوہ !" اس نے گہرا سانس لیکر اپنی نیلی نیلی آنکھیں موند لیں: "کس قدر خوبصورت شہر ہے۔ مندروں کا شہر، گنجے سروں اور پیلی دھوتیوں والے پادری مجھے بڑے پراسرار لگتے ہیں"۔

" وہ پادری نہیں پنڈت کہلاتے ہیں"۔ میں نے اس کی تصحیح کی،

" تمہارا وطن کیا ہے ؟"

" اس وقت یہ ٹرین میرا وطن ہے، چند دن بعد کٹھمنڈو میرا وطن ہو گا۔ میں جہاں جاتی ہوں وہی جگہ میرا وطن بن جاتی ہے !"

" ماں باپ کے بارے میں کیا خیال ہے ؟" میں نے طنزیہ لہجہ میں پوچھا

" کس کے ؟" اس نے بے اختیار سوال کیا۔

" تمہارے !" یہ کہتے ہوئے میں زیر لب مسکرا دیا: "باپ کے بارے میں تمہیں شاید معلوم نہ ہو، ماں کا وطن تو معلوم ہو گا !"

" نہیں ۔ میرا باپ سوئڈش ہے، ماں فرنچ !" پتہ نہیں یہ اس کی مکاری تھی یا معصومیت کہ وہ میرا چبھتا ہوا سوال ٹال گئی۔

" صفدر !" اچانک شیکھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "میں نے کئی برس جیل کی خشک اور باشقت زندگی جھیلی ہے۔ اور اب پہلی بار ذہن میں عورت کے خیال نے سر ابھارا ہے"۔ وہ اردو میں کہہ رہا تھا: "یہ بہت فیاض لگتی ہے اور اس سے فیض حاصل نہ کرنا گناہ ہے۔ میں تیرے ساتھ موتی ہاری تو کیا جہنم تک بھی چلنے کو تیار ہوں !"

" یہ کون سی زبان بول رہا ہے ؟" اس لڑکی نے پوچھا۔

" اپنی مادری زبان میں تمہارے حسن کی تعریف کر رہا ہے !" میں نے کہا

وہ نہ شرمائی نہ لجائی۔ زور سے ہنسی اور بولی "نہ عورت حسین ہوتی ہے نہ مرد خوبرو ۔ یہ تو دل کا بہلاوا ہے ۔ عورت بس عورت ہوتی ہے جس کی چند ضرورتوں میں ایک کا نام مرد بھی ہے۔ اسی طرح عورت بھی مرد کی ایک ضرورت ہے بالکل غذا کی طرح !"

" مگر غذا کبھی تو لذیذ یا بے مزہ ہوتی ہے"۔ میں نے اسے چھیڑا۔

" ہاں یہی بات عورت کے لئے بھی ٹھیک ہے۔ گو مجھے آملیٹ بہت پسند ہے ہو سکتا ہے تمہیں اس سے نفرت ہو، اس لئے ضروری نہیں کہ ہر مرد میرے بارے میں تمہارے بھائی کی رائے سے متفق ہو !" وہ مجھ سے ہار ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔

" تمہارا نام کیا ہے ؟"

" ڈینی سالومن !"

" کیا تم واقعی بلا ٹکٹ سفر کر رہی ہو ؟"

" نہیں ۔ میرا ٹکٹ تمہارے پاس ہو گا"۔ اس نے اطمینان سے کہا۔

اس کے انداز پر میری کھوپڑی گھوم گئی: "مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہارے لئے یہ دردِ سر مول لوں"۔

" یہ سب شروع ہی سے مجھے بھوکے بھیڑیوں کی طرح گھور رہے ہیں"۔ وہ لڑکی کے دوسرے مسافروں کے بارے میں بولی: "تم صورت سے ذرا شائستہ معلوم ہوتے تو ادھر آ گئی ۔ انکار کرو گے تو ان ہی میں سے کسی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ سب اتنے احمق اور گدھے ہیں کہ میری ایک دلنواز مسکراہٹ پر چلتی ٹرین سے کھڑکی سے کود سکتے

ہیں۔ جرمانہ سمیت ٹکٹ بنوانا تو بہت ہی معمولی بات ہے!"

"فی الحال ہم موتی ہاری جا رہے ہیں وہاں سے میں بھی نیپال ہی جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی پروگرام سمجھو۔" وہ جلدی سے بولی: "میں تو سیاحت کے ارادے سے نیپال جا رہی ہوں۔ سنا تھا ٹرین نیپال میں بیرگنج تک لے جاتی ہے۔"

"ضرور لے جاتی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم موتی ہاری بس میں جائیں گے"

اسی اثنا میں ٹکٹ چیکر ہم لوگوں تک آ پہنچا۔ شیکھر نے دو ٹکٹ اور کچھ رقم اس کی طرف بڑھا دی۔ "تیسرا ٹکٹ سوار ہوتے وقت کہیں گر گیا ہے۔"

چیکر نے خاموشی سے تیسرا ٹکٹ بنا دیا اور آگے بڑھ گیا۔

"ذرا میں جوزف کو بتا دوں کہ میں اس طرف ہوں۔" وہ اچانک اٹھتے ہوئے بولی

"جوزف کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دوست ہے میرا۔" وہ یہ کہہ کر تیزی سے بوگی کے عقبی حصے کی طرف بڑھتی چلی گئی اور میرا جی چاہا کہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لوں۔

چند ہی ثانیوں بعد وہ واپس آتی نظر آئی اور باتھ روم میں جا گھسی جہاں سے وہ کئی منٹ بعد میرے پاس آئی۔

وہ میرے قریب بیٹھی تو میں چونک پڑا "تم چرس پی کر آئی ہو۔۔؟"

"ہاں۔" اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی چمکیلی آنکھوں میں نشہ کے سرخ سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ "کیا تم نہیں پیتے۔؟"

"میں کچھ کہے بغیر تیز نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

"بے وقوفوں کی طرح مجھے کیا گھور رہے ہو۔" وہ آہستہ سے بولی: "چرس پینا کوئی اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے۔"

"جرم نہیں ہے تو سب کے سامنے پینے کے بجائے باتھ روم میں کیوں گئی تھیں۔؟" میرا لہجہ تلخ تھا۔

"تم تو اس طرح چراغ پا ہو رہے ہو جیسے میں تمہاری بیوی ہوں۔ اور ہماری طرف تو بیوی سے بھی لوگ اس طرح پیش آنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولی۔

"ان کی اسی کم ہمتی نے تمہارے سینے کے بند کھول دیئے ہیں"

"دیکھو مسٹر ....." وہ کچھ کہتے کہتے ایک ثانیے کے لئے رکی اور پوچھا "کیا نام ہے تمہارا۔؟"

"صفدر....."

"ہاں تو مسٹر صفدر ـــــ یہ احمقانہ باتیں چھوڑ دو۔ اگر تم یہ ناصحانہ انداز ترک کرو تو ہمارا وقت اچھا گذر سکے گا۔ ورنہ موتی ہاری پہنچ کر میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گی۔"

اس کے بعد میں نے ڈینی سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں اس سے بے تکلفی پیدا کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتا رہا۔

ڈینی ایک معزز یورپی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی مگر ہپی ازم کے دلکش نعروں کا فریب کھا کر گھر بار سے اپنا ناطہ توڑ چکی تھی۔ اسی دو... میں اس نے ہندوستانی موسیقار روی شنکر کے دو تین میوزک کنسر... دیکھے اور اس کے دلکش سروں کی تخلیق کرنے والے فنکار کا وطن... دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھی۔ وہ بمبئی، متھرا اور بنارس وغیرہ گھو... کے بعد نیپال جا رہی تھی۔ کیونکہ ہندوستان آکر اس نے نیپال کی پر... فضاؤں کی بے شمار داستانیں سُنی تھیں اور وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ہما... گود میں بسی یہ وادی اگر اسے راس آسکی تو وہ اپنے ماضی کو بھول... وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔

موتی ہاری ایک مختصر سا پہاڑی قصبہ ہے جہاں ہر طر... سرسبز اور گھنے جنگلات بکھرے ہوئے ہیں۔ وہاں اترتے ہی میں... محسوس کیا کہ وہاں ہپیوں کی خاصی بہتات ہے۔ گلیوں اور سڑکوں پر عجی... عزیب حلیوں کے نوجوان جوڑے یوں پھر رہے تھے جیسے اپنے گھر... مقامی بھی ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے تھے۔ جس کا مقصد... کہ یہ بھیڑ بھاڑ ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ وہ اسکے عادی...

موتی ہاری کے اسٹیشن پر میں نے پہلی بار ڈینی کے دو... جوزف کو دیکھا۔ اس کی عمر بمشکل چوبیس برس رہی ہوگی۔ سنہرے ف... عینک کے پیچھے چمکتی، اس کی آنکھوں میں دلکش سی سادگی بلکہ... رچی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے ملائم بال نسوانی انداز میں اس کے شانوں پر... ہوئے تھے اور اس نے شاید اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے... خمدار مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔

مگر اس کی آواز سن کر مجھے خاصی کوفت ہوئی۔ جوزف کی کی نرم و نازک شخصیت کے برعکس بڑی کرخت تھی۔ یوں لگ... جیسے کوئی کوئل اچانک کوّے کی طرح بولنے لگے۔

ڈینی اور جوزف تو شاید موتی ہاری کی گلیوں ہی... کا ارادہ رکھتے تھے۔ جب میں نے انہیں اپنے ہمراہ شہر کی سرائے... کی دعوت دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

موتی ہاری کی کوئی سرائے نہ مجھے پسند آئی نہ شیکھ... آخر ہم نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں دوہرے بستروں... کمرے حاصل کر لیئے۔

"ڈینی کا اور میرا ایک ہی کمرہ ہوگا۔" موقع پا کر شیکھر... میرے کان میں سرگوشی کی۔

"جوزف ہرگز نہ مانے گا۔"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ورنہ میں تو... خاطر سرد اوں چلنے کو تیار ہوں۔" شیکھر کے تیور فیصلہ کن... ہم چاروں پہلے ایک ہی کمرے میں پہنچے۔ جوزف... کمر سے لٹکا ہوا تھیلا اتار کر اس میں کچھ ٹٹولا۔ پھر مایوسانہ اندا... ہلانے لگا۔

"کیا کوئی چیز گم ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ـــ چرس بھری ہوئی سگریٹوں کا ایک پیکٹ ہمارے پاس تھا۔ یہ شاید راستے میں ان کی راکھ تک پی گیا ہے۔" ڈینی اسے قہر بار نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔

"یہی بات ہے ہنی۔" جوزف منہ لٹکا کر بولا: "کیا تمہارے دوست اس سلسلے میں ہماری مدد نہیں کریں گے۔؟"

معاً میرے ذہن میں لی مارکیٹ کے ہوٹل کے واقعات تازہ ہو گئے۔ مجھے وہ لڑکا یاد آیا جس نے مارفیا کی طلب میں سسکتی ہوئی اپنی ہمراہی کے لئے ہاتھ پھیلا کر مجھ سے خیرات طلب کی تھی۔ وہ ہپی لڑکی یاد آئی جس نے نشہ آور انجکشن کے لئے چند روپے حاصل کرنے کی غرض سے مجھے اپنا جسم فروخت کرنے کی پیش کش کی تھی۔ میں نے شیکھر کی طرف دیکھا۔ اس کی بھوکی نگاہیں ڈینی کے بدن میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔

"آؤ ـــ میں تمہارے نشہ کا بندوبست کرتا ہوں۔" میں نے جوزف کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا: "ڈینی اسی کمرے میں میرے دوست کے ساتھ رہے گی۔ ہم دونوں دوسرے کمرے میں سوئیں گے۔"

خلافِ توقع جوزف کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ "تم بہت اچھے آدمی ہو۔ ڈینی عصمت فروش نہیں ہے لیکن تمہارے حسنِ سلوک نے ہمارے دل جیت لئے ہیں۔ اگر تمہارا دوست چاہے تو آج کی رات میری جانب سے اسے ڈینی پر پورا تصرّف حاصل رہے گا۔ ہم دوستوں کے دوست اور دشمن کے دشمن ہیں۔ آؤ چلیں۔"

میں نے ڈینی کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل پُرسکون نظر آ رہی تھی۔

"عیش کر پیارے۔" میں نے شیکھر سے کہا: "یہ چھوکرا ہم سے بہت متاثر ہے اور آج رات کے لئے اس نے ڈینی تجھے سونپ دی ہے۔"

اگلی صبح ڈینی کی حالت قابلِ دید تھی۔ شیکھر نے بڑی بے رحمی سے اسے پامال کیا تھا اور ڈینی کا چہرہ بے شمار نشانات کے باوجود کھلا پڑ رہا تھا۔ جوزف اپنے نشے میں اتنا مگن تھا کہ اسے دنیا و مافیہا کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔

برسوں کی قیدِ بامشقت نے شیکھر کو عورت کے معاملے میں خونخوار درندہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ڈینی کی ذات میں ایسا گم ہوا کہ اپنا عہد تک فراموش کر بیٹھا۔ ڈینی بھی اس کے ساتھ خوش نظر آتی تھی۔ رہا جوزف تو اسے میں چوری کے مال سے پابندی کے ساتھ نشہ فراہم کر رہا تھا لہٰذا اس کے لئے یہ بات بالکل بے معنی تھی کہ وہ اس وقت ہندوستان میں ہے یا نیپال میں ـــــ ہاں مجھے جلد از جلد سرحد عبور کرنے کی فکر تھی۔ شیکھر اور ڈینی کے تعلقات اب اتنے استوار ہو چکے تھے کہ میری فراخ دلی حسد میں بدلتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف بھاندر ناس کی مہم بھی ہر وقت ذہن پر سوار تھی۔ مجھے اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق کھٹمنڈو سے پہاڑوں کی سمت روانہ ہونے والے رشی تک پہنچنے کے لئے بہت قلیل مدت رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں، میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کا تعاقب کر کے میں بھاندر ناس کا سراغ پا لوں گا۔

اور سب سے زیادہ فکر مجھے کیپٹن بھاٹیہ کی جانب سے تھی۔ نہ جانے اس خبیث کو کب آرمی سے فرار کا موقع مل جائے۔ وہ کچھ اس قسم کا آدمی تھا کہ میرے پٹنہ جیل سے فرار کی خبر پا کر پاگل بھی ہو جاتا تو تعجب نہ ہوتا۔ اسے میری زبانی علم ہو ہی چکا تھا کہ میں بھاندر ناس کی تلاش میں نیپال جانا چاہتا ہوں لہٰذا میرے فرار کا علم ہوتے ہی وہ مختصر ترین راستے سے اپنا پورا رخ کرتا۔ میری حتی الامکان یہی کوشش تھی کہ ہندوستان کی سرحد میں میرا بھاٹیہ سے سامنا نہ ہو ورنہ وہ میرے لئے بڑی مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ ہاں نیپال میں اسے مجھ پر کسی بھی قسم کی بالادستی حاصل نہ ہوتی۔

میرا بیشتر وقت موتی ہاری کے بدنام علاقوں میں گذرا۔ میں وہاں کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو مجھے معاوضہ لے کر بحفاظت سرحد عبور کرا سکے۔ تیسرے روز موقع پا کر میں نے شیکھر سے بات کی۔ اس وقت ڈینی سو رہی تھی اور جوزف اپنے کمرے میں ستار بجانے کی کوشش کر رہا تھا

"ضرور جا یار۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" وہ میری بات سن کر بولا۔

"مگر ڈینی تجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ شاید وہ ابھی سفر پر آمادہ نہ ہو۔" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ اب کہیں نہیں جاتی پیارے۔" شیکھر داہنی آنکھ دبا کر بولا: "شاید تجھے یہ سن کر حیرت ہو کہ وہ چرس سے بھی توبہ کر چکی ہے۔" اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

"اس نے چرس چھوڑ دی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ـ اور وہ جوزف کی صورت تک سے بیزار ہو چکی ہے۔ وہ سالا عورت کے معاملے میں کسی کیچوے سے بھی بدتر ہے۔ ڈینی کو سہارا دینے کے بجائے وہ اس پر اتنا انحصار کرتا ہے کہ ڈینی کو کسی ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔" شیکھر موج میں آ کر کہہ رہا تھا۔ "مجھ سے مل کر ڈینی کو یک بیک احساس ہوا ہے کہ وہ آوارگی، سیاحت اور منشیات کے سہارے جو سکون تلاش کرتی رہی ہے وہ اسے ایک چاہنے والے مرد کی مضبوط باہوں میں ہی مل سکتا ہے۔"

"تجھے تو انگریزی کے چند لفظ بھی نہیں آتے۔ اس سے اتنی باتیں کیسے ہو گئیں۔؟" میں اس کی باتوں پر یقین نہ کر سکا۔

"دل کے معاملوں میں زبان کچھ نہیں کرتی۔ میں نے بڑے باتونی مردوں کو اپنی محبوب کے سامنے ہکلاتے دیکھا ہے۔ اور میں تجھے بتاؤں کہ وہ اب جوزف کے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"جوزف کسی قیمت پر اس سے دست بردار نہیں ہوگا۔"

"وہ کیوں دست بردار ہونے لگا۔ ڈینی تو خود اس کے لئے معقول آمدنی کا ذریعہ ہے۔ وہ اب تک نت نئے انداز میں اپنا جسم بیچ کر اس حرام خور کو روٹی اور نشہ فراہم کرتی رہی ہے۔" شیکھر کا لہجہ تلخ

اور طنز آمیز تھا۔

"تو تیرا کیا ارادہ ہے۔؟"

"سامنے کی بات ہے۔ میں اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہوں۔ وہ تو یہاں تک کہتی ہے کہ جوزف اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اڑا رہا تو اسے اپنے اغوا کے الزام میں گرفتار کرا دے گی مگر میں اس کی نوبت ہی نہ آنے دوں گا کیونکہ میں خود پولیس سے چھپا پھر رہا ہوں۔ موقع ملتے ہی خاموشی سے اسے اُڑا لے جاؤں گا اور جوزف کے فرشتے بھی اس تک نہ پہنچ سکیں گے۔"

"تو اپنا معاملہ خود سمجھ سکتا ہے۔ مگر میری دانست میں وہ لڑکی تیرے قابل نہیں ہے۔"

"کیا بک رہا ہے صفدر۔" یک بیک شیکھر آپے سے باہر ہو گیا۔ اسکے بگڑتے تیور دیکھ کر میں نے نرم لہجے میں معذرت کی اور اس سے مزید کوئی بات کئے بغیر باہر آ گیا۔

میں ساری رات اپنے منصوبے پر غور کرتا رہا۔ ڈینی جیسی آوارہ لڑکی ساتھ ہونے کی صورت میں مجھے سرحدی چوکیوں میں خاصی مراعات مل سکتی تھیں اور میں نے اسی نقطۂ نظر سے اب تک ڈینی کو ساتھ لگائے رکھا تھا بلکہ شیکھر نے خود دورانِ سفر کچھ ایسی ہی بات کی تھی لیکن اب صورتحال بدل چکی تھی اور مجھے بدلے ہوئے حالات کے مدِنظر کوئی نیا منصوبہ بنانا تھا۔

اگلی صبح جوزف حسب معمول ڈینی کی مزاج پرسی کے لئے نکلا تو کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ پھر مجھے ہوٹل میں کچھ ہنگامہ سا اُبھرتا سنائی دیا۔ میں نیچے پہنچا تو جوزف نے ہوٹل کے مختصر سے ہال میں چیخ چیخ کر فساد کی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ وہ مالک سمیت ہوٹل کے تمام عملے کو ذومعنی گالیوں سے نواز رہا تھا۔ اور وہ لوگ ہکا بکا اس کا منہ تک رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ہوٹل کا مالک تیزی سے میری طرف آیا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کل رات مس ڈینی آپ کے دوست کے ساتھ ہوٹل چھوڑ چکی ہیں۔ وہ دونوں بہت خوش اور ذرا جلدی میں تھے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس لڑکی کو اغوا نہیں کیا گیا، وہ جہاں بھی گئی ہے اپنی مرضی سے گئی ہے۔ مگر جوزف بضد ہے کہ ڈینی اسے مطلع کئے بغیر کہیں نہیں جا سکتی۔ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ آپ اسے سمجھایئے ورنہ میں پولیس کی مدد لینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی جوزف کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے میرا گریبان پکڑ لیا اور ایک ہی سانس میں کئی نادرالوجود گالیاں دینے کے بعد چیخا۔ "میرے ساتھ سازش کی گئی ہے۔ میں برباد ہو گیا۔ تمہارا ساتھی ڈینی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔"

"ہوش میں آؤ جوزف ـــــ ڈینی دودھ پیتی بچی نہیں تھی جسے بھرے پرے ہوٹل سے کوئی زبردستی لے جا سکے۔" میں نے اس کے شانے پوری قوت سے جھنجھوڑ ڈالے۔

"بالکل..... میں بھی یہی کہہ رہا تھا۔" ہوٹل والا جلدی سے بولا۔

میرے تیور دیکھ کر جوزف اچانک سنبھل گیا۔ "وہ کہاں چلی گئی..... مسٹر صفدر وہ کہاں چلی گئی۔؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" میں اس کا بازو پکڑ کر اسے کمرے میں لے آیا اور دروازہ اندر سے مقفل کر کے اس کی طرف گھوما۔

وہ بزدل تو تھا ہی۔ میرا جارحانہ رویہ دیکھ کر بری طرح خائف ہو گیا اور میں دل ہی دل میں شیکھر پر لعنت بھیج رہا تھا۔ مجھے اس سے خودغرضی اور کمینگی کی توقع نہیں تھی۔ مجھ سے پہلی ہی جھڑپ کے بعد وہ کوئی خطرہ مول لئے بغیر ڈینی سمیت صاف نکل گیا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ عورت کے معاملے میں انسان کس حد تک گر سکتا ہے۔

"تت..... تم مجھے اس کمرے میں بند کر کے ہراساں نہیں کر سکتے۔" جوزف ہکلاتے ہوئے بولا۔

"میں اس کمرے میں تمہاری قبر بھی بنا سکتا ہوں۔" میں سرد لہجے میں بولا۔ "لیکن یہ اسی وقت ہو گا جب تم میری ٹکر پر آؤ۔"

"کیا مطلب۔؟" وہ پھر بُری طرح ہکلایا۔

"مطلب یہ کہ میرا ساتھی بہت ذلیل اور کمینہ تھا لیکن ڈینی بھی اس سے کم نہیں تھی۔ ڈینی نے تمہیں لاعلم رکھا اور میرا ساتھی مجھے دھوکہ دے گیا۔ وہ دونوں ہم سے بچ کر فرار ہوئے ہیں۔ اگر تم نے اس وضاحت کے بعد بھی اس معاملے میں مجھے ملوث کرنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ آخری اقدام تک کر گزروں گا۔" میں نے سرد اور بے رحمانہ لہجے میں کہا۔

"ڈینی کے بغیر میں یہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔ میری ساری رقم اسی کے پاس تھی۔"

"رقم۔" میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ تیر گئی۔ "صاف کیوں نہیں کہتے کہ ڈینی تمہارے لئے جیتا جاگتا خزانہ تھی۔ بلکہ سادہ چیک کہو۔ جب اور جہاں چاہا کیش کرا لیا۔"

وہ چند سیکنڈ تک مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ "میرا سارا خرچ وہی اٹھاتی تھی۔ اور اب نیپال تک تم میرا بوجھ اٹھاؤ گے۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں۔؟"

وہ پہلی بار ہنسا۔ "تم انکار نہیں کر سکو گے۔ یہ نہ سمجھو کہ چرس کے نشے میں میں کان اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔"

"کیا مطلب۔؟" اب میرے چونکنے کی باری تھی۔

"میں نے ابھی ہال میں دیکھا تھا کہ جب ہوٹل والے نے پولیس سے مدد لینے کی دھمکی دی تو چند سیکنڈ کے لئے تمہارا رنگ فق ہو گیا تھا۔" وہ مسکرا مسکرا کر کہنے لگا۔ اس کی ساری کاہلی اس وقت مکاری میں بدل چکی تھی۔ "تم نہ ہپی ہو اور نہ قانونی طور پر سرحد عبور کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں کئی بار ڈینی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ تم یہ جاننے کے لئے بے چین تھے کہ ہم لوگ بغیر پاسپورٹ ساری دنیا کیسے دیکھ آئے اور اب نیپال میں کیسے

داخل ہوں گے..... اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ تم سے کوئی بڑا جرم سرزد ہوا ہے اور تم قانون سے فرار ہو کر سرحد پار جا رہے ہو۔ جب تک تم نے ہی میں پوری کہانی پولیس تک پہنچا دوں گا۔ ڈینی ملے یا نہ ملے، تمہاری زندگی ضرور عذاب بن جائے گی۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں کی پولیس مغربی ملکوں کی طرح مہذب نہیں ہے۔"

وہ نہ صرف خود پر قابو پا چکا تھا بلکہ مجھ پر کامیاب وار بھی کر چکا تھا۔ میں نے خون کا گھونٹ پیتے ہوئے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں اپنی دانست میں شاطر اسمگلر اور کامیاب قانون شکن تھا لہٰذا کسی ہم پلہ شخص سے زک اُٹھائی ہوتی تو رنج نہ ہوتا لیکن اس ہپی چھوکرے نے جس طرح میری دکھتی رگ پر ہاتھ ڈالا تھا وہ تجربہ میرے لئے نیا تھا۔ میں نے مصلحت کے پیشِ نظر اس سے دوستی ضرور کر لی تھی مگر یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ موقع ملتے ہی اسے چالاکی پر یادگار سبق دوں گا۔

اگلا دن بھی بے مقصد بھٹکتے گزر گیا۔ جوزف کو شاید مجھ پر کسی طرح اعتماد نہیں تھا۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ لگا رہتا تھا۔ ایک آدھ بار میں جھلا کر اس سے اُلجھ بھی پڑا لیکن اس نے کہا کہ وہ کسی معاملے میں دخل نہیں دیتا تو ساتھ لگے رہنے میں کیا حرج ہے۔ بات معقول تھی۔ لہٰذا مجھے یہ نگرانی بھی برداشت کرنی پڑی۔

سرِشام ہم دونوں واپس لوٹ رہے تھے تو کسی جانب سے ایک خطرناک صورت والا ایک لحیم شحیم شخص نمودار ہوا اور جوزف کے قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "نیپال۔؟"

ہم دونوں چلتے چلتے رک گئے۔

"کیا یہ نیپال جانا چاہتا ہے۔؟" اس اجڈ شخص نے اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"جانا تو چاہتا ہے مگر سرحد عبور کرنے کا مسئلہ ہے۔" میں نے بھی سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"اکیلا ہے یا کوئی لونڈیا بھی ہے۔؟" وہ مجھ سے یوں بات کر رہا تھا جیسے مجھے جوزف کا ملازم سمجھ رہا ہو۔

"صرف ہم دونوں ہیں۔"

"ایمانداری سے میرا ایک کام کرنے کا وعدہ کرو تو کل ہی بات ہو سکتی ہے۔" وہ آنکھ دبا کر بولا۔

"کوئی کالا دھندا۔؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میری بات پر بُرا سا منہ بنایا۔ "ایک گاڑی ادھر جانی ہے۔"

"خالی یا کچھ مال کے ساتھ۔؟"

"معلوم ہوتا ہے پُرانا پاپی ہے۔" وہ ـــــ بڑبڑایا۔ "شک نہ کر، گاڑی جھاڑ لینا۔ ایک پُرانی ڈاج اسٹیشن ویگن ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ ادھر واپسی کا ارادہ ہے۔؟"

"نہیں۔" میں نے اس کے لہجے سے قیاس کر کے اسکے حسب منشا جواب دیا۔

"تو ابھی میرے ساتھ چل کر تصویریں بنوا لو۔ کل پاسپورٹ تیار ملے گا۔ تم لوگ چاند ہوٹل کے کمرہ نمبر تین ہی میں ٹھہرے ہوئے ہو۔"

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ گویا یہ ملاقات اتفاقیہ نہیں تھی بلکہ ہمارے بارے میں پوری چھان بین کے بعد یوں رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں برسوں اس میدان کا کھلاڑی رہا تھا اور خوب جانتا تھا کہ اس شخص کی پیش کش واقعی اتنی سیدھی نہیں ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔"

"تم تو شاید ہمارا شجرہ تک چھان چکے ہو۔؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"دراصل وہ گاڑی ایک ریاست کے جلاوطن والی کی آبائی ملکیت ہے۔ وہ خود نیپال میں ہے اور حکومت کے عتاب سے بچنے کے لئے یہاں سے فرار ہوا ہے۔ ہم نے وہ گاڑی حاصل کر کے اس تک پہنچانے کا سودا کیا ہے۔ میں یہاں پولیس کی نظروں میں ہوں۔ خود گاڑی لے جانے کی کوشش کی تو دھر لیا جاؤں گا۔ تمہیں سرحد پار کرنے کے لئے کاغذ درکار ہیں اور مجھے آدمی ـــــ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ نیپال میں بیرگنج پہنچتے ہی ایک شخص تم سے ملے گا۔ اس کی شناخت کے بعد تمہیں گاڑی اس کے حوالے کر دینی ہے۔ ساتھ ہی اپنے پاسپورٹ بھی!" اس نے کہا۔

"یعنی ہم جعلی کاغذات پر سرحد عبور کریں گے؟"

"لیکن وہ اتنی مہارت سے تیار ہوں گے کہ کوئی شبہ تک نہ کر سکے گا"

پھر وہ ہم دونوں کو پیچ در پیچ گلیوں سے ایک تنگ سی دکان میں لے گیا جہاں ایک دقیانوسی کیمرے سمیت ایک بوڑھا شخص موجود تھا جس نے باری باری میری اور جوزف کی تصویریں اتار لیں!

"اب تم جاؤ۔ صبح نو بجے چوک پر پہنچ جانا۔"

راستے میں میں نے جوزف کو ساری تفصیل سنائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ خطرناک صورت والے کی کہانی گو ہر اعتبار سے مکمل تھی مگر میرا دل بھی اُسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا!

اگلے روز صبح نو بجے وہ شخص سیاہ رنگ کی ڈاج اسٹیشن ویگن سمیت چوک پر ہمارا منتظر تھا۔ گاڑی بڑی محنت سے چمکائی گئی تھی لیکن ساخت کے اعتبار سے وہ دوسری جنگِ عظیم کی ہی یادگار لگ رہی تھی۔

گاڑی ہی میں اس نے جعلی پاسپورٹ وغیرہ ہمارے حوالے کئے۔ میری تصویر والا پاسپورٹ کسی موہن لال کے نام سے تھا اور جوزف کی تصویر کے نیچے البرٹ سونیو لکھا ہوا تھا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے دوست؟"

"میرا نام نہ جاننا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ تم لوگ بیرگنج پہنچ کر رائل ہوٹل میں اس وقت تک ٹھہرو گے جب تک میرا آدمی خود تمہارے پاس نہیں

آتا۔ وہ گاڑی کے ذریعہ خود تم تک پہنچے گا۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ تم سے ملنے پر سفید ہاتھی کی کھال طلب کرے گا۔" وہ ہم دونوں کی جانب سے بہت زیادہ مطمئن نظر آرہا تھا۔

بستی کے واحد پیٹرول پمپ پر اس نے ٹنکی بھروائی، اگلے پچھلے پہیوں کی ہوا چیک کی، فاضل پہیئے کو چیک کیا اور دو سو روپے چابی سمیت جوزف کی طرف بڑھا دیئے۔

"آج کل سرحد پر ذرا سختی کی جا رہی ہے، وہاں ٹھنڈے دل سے کام لینا۔" وہ اجنبی کہہ رہا تھا۔ "تیل پانی سب ٹھیک ہے، راستہ میں وقت بالکل نہ ضائع کرنا۔ ٹائر پنکچر ہو جائے تو بنوانے کی ضرورت نہیں، بدل کر بڑھتے رہنا۔"

جوزف نے انجن اسٹارٹ کیا، میں نے ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہا اور اسٹیشن ویگن تیز رفتاری کے ساتھ پختہ سڑک پر آئے ہوئی۔ موتی ہاری کی آبادی ذرا ہی دیر میں پیچھے رہ گئی اور ہم پُر پیچ تنگ سی پہاڑی سڑک کی ڈھلوان چڑھنے لگے۔ کار کا انجن خاصا جاندار تھا، ہمیں امید ہو چلی تھی کہ شب ہم سرحد پار ضرور پہنچ جائیں گے۔

گاڑی چکر دار ویران سڑک پر بڑھی جا رہی تھی۔ رہ رہ کر مجھے خیال آرہا تھا کہ جوزف نے ڈینی کے فرار پر مجھے بہت بھونڈے طریقہ پر بلیک میل کیا۔ کئی مرتبہ میں نے سوچا کہ ہمیں ویرانے میں گاڑی روک کر اُسے موت کے گھاٹ اتار دوں لیکن مصلحتاً اس خیال کو خیرباد کہنا پڑا۔ وہ کتنا بھی بدطینت اور مکار سہی مگر بُرے لمحات میں ہم ایک کشتی میں سوار ہوتے اور وہ ہر حال میں میرا معاون ثابت ہوتا۔ میرا یہی استدلال اُسے راستے میں چھوڑ کر گاڑی سمیت فرار ہونے کی راہ میں حائل رہا!

دوپہر میں جوزف نے اسٹیرنگ میرے حوالے کر دیا اور خود اپنے چرمی بیگ سے خور و نوش کی چیزیں نکالنے لگا۔ میں پہلے ہی شکم سیر ہو چکا تھا اس لئے ڈرائیونگ میں ذرا دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک پر دور دور تک ٹریفک کا کوئی نشان نہیں تھا جسے دیکھ کر موڑ یا ڈھلان وغیرہ کا اندازہ ہو سکے اور اس لاعلمی کی بنا پر گاڑی کئی مرتبہ گہری کھائیوں میں جاتے جاتے بچی تھی۔

جوں جوں شام قریب آتی جا رہی تھی میری بے چین نظریں کسی آبادی کی تلاش میں دور دور جا رہی تھیں۔ موتی ہاری سے نکلنے کے بعد ہمیں صرف ایک چھوٹی سی بستی ملی تھی یا راستہ میں مخالف سمت سے آنے والی دو جیپیں نظر آئی تھیں ورنہ تاحد نظر سنگلاخ چٹانیں یا خود رو جنگل بکھرا ہوا تھا۔ جوں جوں ہم بلندی پر پہنچ رہے تھے خطرناک موڑ بڑھتے جا رہے تھے۔ ہر بیس پچیس گز کے بعد سڑک اچانک کوئی نیا زاویہ اختیار کر لیتی تھی اس لئے میں نے رفتار بہت سست رکھی ہوئی تھی۔ سورج غروب ہونے سے ذرا دیر پہلے جوزف نے ایک بلند ٹیلے پر کوئی بچہ بیٹھا دیکھا اور ایک دم چیخ پڑا۔ "یہاں ضرور کوئی آبادی معلوم ہوتی ہے۔" یہ بڑی خطرناک جگہ تھی۔ ہمارے بائیں طرف کھڑی پہاڑی دیوار تھی اور داہنی طرف اتھاہ کھڈ۔ گاڑی پارک کرنے کی صورت میں یہ خدشہ بھی تھا کہ کوئی دوسری گاڑی ٹکر نہ مار دے اس لئے میں نے گاڑی روک کر جوزف کو اتارا تاکہ وہ اوپر جا کر بچے کو روکے اور خود گاڑی آگے لیتا چلا گیا تاکہ کسی مناسب جگہ اُسے روک سکوں!

کافی آگے جانے کے بعد بائیں طرف گاڑی سڑک سے اتارنے کی جگہ نظر آئی میں نے اسٹیشن ویگن وہیں روک دی اور دروازے مقفل کر کے واپس چل دیا۔ جوزف اس سرخ و سفید بچے کو سڑک پر ہی لے آیا تھا اور میری طرف چلا آرہا تھا۔ "یہ سالا مجھے کوئی عجوبہ سمجھ رہا ہے!" اس نے مجھے دیکھ کر دور ہی سے ہانک لگائی۔

وہ بچہ قریب آیا تو میں نے اس کے گال تھپتھپائے اور پیار سے پوچھا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟"

"وہ..... ادھر!" لڑکا پہاڑوں پر اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں جہاں بیٹھا تھا وہاں سے میرا گاؤں نظر آتا ہے!" اس نے پہاڑی زبان میں کہا۔

"چلو!" میں نے اُس سے کہا

وہ بچہ کسی بندر کی سی پھرتی کے ساتھ نکیلے پتھروں اور چٹانوں پر قدم جماتا پل بھر میں اوپر جا پہنچا اور ہم کافی دیر کی محنت کے بعد وہاں پہنچ سکے۔ جوزف کو ہانپتا دیکھ کر اس کی معصوم آنکھیں چمک اٹھیں اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر ہنس پڑا۔

میں نے وہاں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن کہیں بھی کسی بستی کے آثار نظر نہ آئے۔ وہاں ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ بکھرے تھے۔ "تمھاری بستی کدھر ہے بیٹے؟" میں نے اس بچے سے پوچھا لیکن وہ بدستور منہ دبائے ہنستا ہی رہا۔

"کیا بات ہے۔ کیوں ہنسے جا رہے ہو؟" میں نے قدرے سخت لہجہ میں اسے ڈانٹا۔

"یہ..... یہ..... اس کی مونچھیں کسی چوہے کی دم کی طرح بل ہیں۔" وہ بمشکل کہہ سکا۔

میں نے جوزف کی طرف دیکھا تو اپنی مسکراہٹ بھی نہ روک سکا۔ منہ پھاڑے کسی بیل کی طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور ہر سانس کے ساتھ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے نیچے لٹکتی ہوئی مہمل مونچھیں پھڑپھڑا کر رہ جاتیں۔ دفعتاً کسی جانب سے تین آدمی ابھرے اور ہمیں حرکت کرنے کا موقع دیئے بغیر گھیرے میں لے لیا۔ وہ بچہ بھی اچھل کر اُن کے پاس جا پہنچا۔ اس کی ہنسی یک بیک ختم ہو چکی تھی!

"یہ کیا مصیبت ہے؟" جوزف پوری قوت سے چیخا۔

"خاموش!" ان میں سے ایک نے اپنی رائفل کی نال جوزف کی طرف اٹھا دی۔ اس کے ہمراہی تیز دھار کلہاڑیوں سے مسلح تھے!

"تم کون ہو۔ اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم بلاوجہ خون خرابا نہیں کرتے" رائفل والا تیز آواز میں بولا۔ "خاموشی سے ساری نقدی اور قیمتی چیزیں ہمارے حوالے کر دو اور رفو چکر ہو جاؤ۔"

وہ حلیوں سے ہی قزاق لگ رہے تھے لہٰذا اس حکم پر مجھے زیادہ تعجب نہیں ہوا ہاں اس بات کی حیرت ضرور تھی کہ انھوں نے بچے کے ذریعے پریشان حال مسافروں کو پھانسنے کا کس قدر موثر نفسیاتی حربہ اختیار کیا تھا۔

"ہم لوگ غریب سیاح ہیں۔ تمھیں سو پچاس روپے کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں ملے گا۔" میں نے مضبوط لہجہ میں کہا۔

رائفل والے کے اشارے پر ان میں سے ایک بڑھا اور ذرا ہی دیر میں اس نے میری کمر پر ایک دوپٹے کے ذریعے بندھے ہوئے سترہ سو روپے نکال لئے۔ میرے بعد وہ جوزف کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس گمنام محسن کے دیئے ہوئے وہی دو سو روپے تھے!

"یہ دو سو روپے تو چھوڑ دو۔" میں گھگھیایا۔ "ہمیں نیپال تک پہنچنا ہے اور اس رقم کے سوا پیٹرول تک کے لئے دھیلی نہیں ہے۔"

وہ رائفل والا نے خاموش کھڑا رہا۔ ان کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ انہیں کسی کی آمد کا انتظار ہے تھوڑی دیر بعد نیچے سڑک والی سمت سے ایک اور شخص ان میں آشامل ہوا۔

"گاڑی میں یہ طنبورہ اور کھانے کا سامان ہے!" اس نے رائفل والے کو رپورٹ دی۔ جوزف کا ستار اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔

"ان کو دو سو روپے واپس کر دو!" رائفل والے نے اپنے آدمی سے کہا اور مجھے دو سو روپے واپس دے دیئے گئے

"اب نیچے اتر جاؤ اور اِدھر سے دفع ہو جاؤ!" یہ نادر شاہی حکم ملتے لئے تھا۔

"تم نے رقم تو چھین ہی لی ہے۔ ہمارے ساتھ ایک مہربانی کر دو!" میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔ اُسے خاموش پا کر مجھے ہمت ہوئی اور میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "رات سر پر آچکی ہے یہ راستہ ہمارے لئے نیا اور بے حد خطرناک ہے اگر تم رات بھر کے لئے ہمیں سایہ مہیا کر سکو تو بڑا احسان ہوگا۔"

"جان کی سلامتی چاہتے ہو تو سورج ڈھلنے سے پہلے ہمارا علاقہ چھوڑ دو۔ ورنہ یہ خونی پہاڑ تمہیں بھی چاٹ جائیں گے!" اس نے تیز لہجہ میں کہا۔

میں نے اس کی بہت خوشامدیں کیں لیکن بے سود۔ ہمیں وہاں سے روانہ ہونا ہی پڑا۔ انھوں نے کھانے پینے کا سامان چھوڑ دیا تھا۔ جوزف کا ستار ہمارے سامنے ہی اس مجرم زادے کے حوالے کر دیا گیا تھا جس نے ہمیں فریب دے کر ان کے جال میں پھانسا تھا!

"کس قدر چالاک تھا وہ بچہ!" راستہ میں جوزف بولا

"عمر میں میں تم سے بہت بڑا ہوں، تم اس بچہ سے بہت بڑے ہو مگر ہم تینوں کی ذہنی عمر ایک ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "بس چند برس اور ٹھہرو پھر بچے ماں کے پیٹ سے مجرم بن کر پیدا ہوں گے اور ہمارا تمھارا مقابلہ کریں گے۔"

"یہ سب مفروضات ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "دس سال کی لڑکی لاکھ زور لگا لے کبھی ساس نہیں بن سکتی۔ میرے لئے تو اس بچہ سے مقابلہ کا تصور ہی توہین آمیز ہے!"

وہ پوری شب تھکا دینے والے سفر میں گزری۔ ہم نے فاصلہ تو اتنا زیادہ طے نہیں کیا تھا مگر مہیب چکر دار راستوں کے سبب سست رفتاری اختیار کرنی پڑی تھی۔ ڈرائیونگ کرتے کرتے ہم دونوں کے شانے بھاری ہو گئے تھے اور اب یہی تمنا تھی کہ جلد از جلد ہم سرحدی چوکی پر جا پہنچیں۔

اور دوپہر کے وقت ہم ہندوستان کی آخری سرحدی آبادی رکسول جا پہنچے۔ وہاں شاید اِسی وقت ٹرین بھی پہنچی تھی اس لئے پورا شہر بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا جن میں اکثریت سفید فام ہپی جوڑوں کی تھی۔

شہر سے گزر کر ہم چیک پوسٹ پر پہنچے تو خلافِ توقع سرسری دیکھ بھال کے بعد ہندوستانی افسر ہم سے مطمئن ہو گئے اور ہم پوسٹ سے گزر کر نیپالی چوکی کی طرف بڑھنے لگے!

اس طرف ہم سے پہلے ایک جیپ موجود تھی جس میں چار نفوس سوار تھے اور کسی مسئلہ پر نیپالی عملہ سے تیز آواز میں بحث کر رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ انہیں نمٹا کر وہ ہماری طرف آئیں گے لیکن ایک سنتری نے ہمیں گاڑی آگے نکالنے کا اشارہ دیا اور ہم آہنی زنجیر کے قریب جا رکے!

نیپالی افسر نے باری باری ہم دونوں کے پاسپورٹ دیکھے، ناقدانہ نظروں سے ہمیں باقاعدہ گھورا پھر پاسپورٹ اپنے کسی ساتھی کے پاس لے گیا۔ وہ دونوں وہاں کھڑے ہماری طرف دیکھ دیکھ کر کچھ باتیں کرتے رہے پھر اس راز و نیاز میں دو نیپالی اور شامل ہو گئے۔ کئی منٹ تک وہ چاروں ہمارے پاسپورٹوں کی کسی چیز پر بحث کرتے رہے پھر ایک ساتھ ہماری طرف آئے۔

میں جوزف سمیت گاڑی سے اتر آیا۔

"تم نے یہ انڈین پاسپورٹ کب حاصل کیا تھا؟" ایک نیپالی نے شستہ انگریزی میں جوزف سے سوال کیا۔

اس نے کوئی لفظ کہے بغیر بے نیازی کے ساتھ میری طرف اشارہ کر دیا۔ میں ایسی سخت باز پُرس کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے بُری طرح بوکھلا گیا۔ اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو راستہ ہی میں سارے اندراجات حفظ کر لیے ہوتے۔

"مسٹر بینیسٹھ.....!" یہ کہتے کہتے میں نے نیپالیوں کے تیوروں سے اپنے بیان میں کسی بڑی غلطی کا احساس کر کے فوراً پینترا بدلا۔ "نہیں نہیں۔ شاید تریسٹھ یا اڑسٹھ میں!"

"ایک بار پھر سوچ لیں!" اسی افسر نے پُراعتماد لہجہ میں کہا۔

"میں نے اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا اور پیشانی مسلتے ہوئے کہا "مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں نے پاسپورٹ اپنے ایجنٹ سے بنوائے تھے!"

اس کی آنکھیں یوں چمک اٹھیں جیسے اسے اپنے شبہات کی تائید میں کوئی اور نکتہ مل گیا ہو۔ "کیا دونوں پاسپورٹ ایک ہی ایجنٹ سے بنوائے تھے؟"

"مجھے کچھ علم نہیں... میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں طویل سفر سے تھکا ہوا ہوں!" میں نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا۔

"دیکھئے جناب" اس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ "ان میں ایک پاسپورٹ دہلی سے جاری ہوا ہے اور دوسرا [illegible] سے۔ دونوں کی اجرائی سن ستاون اور اکسٹھ میں ہوئی ہے۔ گو ان کی تجدید کرائی جاتی رہی ہے لیکن ہمیں یہ

تصویریں شبہ میں مبتلا کر رہی ہیں۔ پاسپورٹ کی کتابوں کے مقابلہ میں تصویریں نئی معلوم ہوتی ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان تصویروں میں آپ کے بدن کے اوپری حصوں پر بالکل اسی ڈیزائن کا لباس نظر آ رہا ہے جو آپ اس وقت پہنے ہوئے ہیں البتہ رنگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لہٰذا آپ خود کو فوری طور پر حراست میں سمجھیں! اگر بعد میں ہمارے شبہات غلط ثابت ہوئے تو ہم معذرت کے ساتھ آپ کو رہا کر دیں گے۔"

ہم دونوں کو اچانک سانپ سونگھ گیا۔ دو مسلح سنتری ہمارے قریب آ کھڑے ہوئے۔ پھر ہمارے ہی سامنے اسٹیشن ویگن کی تلاشی شروع ہوئی تلاشی لینے والوں میں ایک شخص خاصا اکھڑ تھا اس نے نشستوں کے عقب میں گھس کر ادھر ادھر جھانکنا شروع کیا پھر عقبی شیشہ سے فاضل ٹائر باہر پھینک دیا۔

ٹائر گرتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے واضح طور پر ٹائر کے اندر کسی سخت سی چیز کے اچھلنے کی آواز سنی تھی۔

"اس میں کیا ہے؟" وہ اکھڑ افسر ہمارے قریب آ کر غرایا۔

"ہمیں کچھ پتہ نہیں۔" میں نے اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس کی۔ "ہم نے یہ اسٹیشن ویگن موتی ہاری سے کرایہ پر حاصل کی تھی۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر ٹائر کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر بولا۔ "یہ خاص قسم کا ٹائر ہے جس میں ٹیوب نہیں ہوتی پھر اس کے اندر کیا گھسا ہوا ہے؟"

"مجھے کچھ علم نہیں!"

اس نے جھلا کر ٹائر کی ہوا خارج کر دی اور اس پر چڑھ گیا پھر کئی افسروں نے بڑھ کر پھولے ہوئے ٹائر کو دیکھا۔ ٹائر میں کوئی سخت چیز موجود تھی! یہ خبر آناً فاناً پوری چوکی پر پھیل گئی۔ ہم دونوں رائفلوں کی زد پر لے لئے گئے اور ایک سپاہی اپنی سنگین سے وہ ٹائر پھاڑنے لگا۔

مجھ سمیت ہر شخص دم بخود کسی سنسنی خیز انکشاف کا منتظر تھا۔

کچھ دیر کی کوششوں کے بعد ٹائر رم سے الگ کر دیا گیا اور نائیلون کے تھیلے میں بند کوئی وزنی چیز باہر آ گئی۔ اس تھیلے کی موٹائی اتنی تھی کہ وہ باآسانی ٹائر میں سما سکتا تھا۔ اس کی پوری لمبائی بڑی ہنر کے ساتھ رم کے گرد جمائی گئی تھی۔ اس طرح ٹائر میں ہر طرف یکساں وزن تھا اور اسے استعمال کرنے کی صورت میں اسٹیئرنگ کا توازن بگڑنے کا احتمال نہیں تھا۔

"کیا ہے اس میں؟" وہی اکھڑ نیپالی اس بار میرے پیٹ میں مکہ مار کر دہاڑا۔

میں اس وقت بری طرح پھنس چکا تھا۔ جی تو چاہا کہ اسے بے تحاشا گالیاں سناؤں مگر آخری کوشش ابھی باقی تھی۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہ سب اس سفید سور کا کیا دھرا ہے میں تو اس کا تنخواہ دار ملازم ہوں" میں نے ساری مصیبت جوزف پر ڈال دی۔

"کیا ہے اس میں؟" اب وہ جوزف پر گرجا۔ اس بار اس نے انگریزی کا سہارا لیا تھا۔

"کھول کر دیکھو تاکہ مجھے بھی پتہ چلے کہ یہ کالا آنا کیا دھندا کرتا ہے"

جوزف نے سپاٹ لہجہ میں مچکر بالے میں کہا۔

"پھاڑ دو یہ تھیلا بھی!" اس نے سنگین بردار سپاہی کو حکم دیا۔

وہ آگے بڑھا اور پھرتی کے ساتھ تھیلے میں سوراخ کرکے اسے چیرتا چلا گیا اور مجھ سمیت ہر ایک کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

نائیلون

کے تھیلے میں بھری ہوئی چرس نیچے بکھر چکی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا ناچنے لگا تھا۔ جوزف مجھے یوں نفرت بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا جیسے اس کی دانست میں اس ہیر پھیر کی ساری ذمہ داری میری ہی ہو۔

پھر اسٹیشن ویگن کے سارے ٹائر کاٹ دیئے گئے اور چرس کے مزید چھ تھیلے برآمد ہو گئے اب سارا کھیل میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا مجھے اور جوزف کو لاعلمی میں چرس کی اسمگلنگ کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اسٹیشن ویگن اور اس کے جلا وطن مالک کی کہانی فرضی تھی بات صرف اتنی تھی کہ ہم اسٹیشن ویگن نیپال پہنچاتے جہاں ٹائروں سے چرس نکالنے کے بعد گاڑی پھر ہندوستان بھیج دی جاتی۔ مجرموں نے وہ مخصوص گاڑی صرف اس لیے استعمال کی تھی کہ مسافر کاروں میں اس کے ٹائر سب سے بڑے اور تعداد میں چھ تھے۔ مجرموں نے پچھلے ایکسل پر دونوں طرف دو دو پہیے ہونے کا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

چوکی پر فوراً ہی چرس کی ساری مقدار تول لی گئی، اس کا مشیر نامہ تیار ہوا اور ہم دونوں کو ہتھکڑیاں لگا کر ایک مسلح دستہ کے ساتھ بند لاری میں کسی جانب روانہ کر دیا گیا۔ وہ ادھڑے ہوئے ٹائروں پر وہیں کھڑی رہی۔

گاڑی سخت جھٹکے کھاتی تیزی کے ساتھ کسی گمنام منزل کی جانب رواں تھی۔ اس گاڑی کے تین حصے تھے۔ ایک تو اگلا حصہ تھا جہاں ڈرائیور کے ساتھ ہی مزید دو آدمیوں کے لئے نشستیں تھیں۔ وسطی حصہ پنجرہ نما تھا جس میں آہنی چادریں اور جالیاں استعمال کی گئی تھیں۔ ڈرائیور کے عقب میں شفاف شیشہ لگا ہوا تھا جس پر وسطی حصے کی جانب ایک مضبوط آہنی جالی لگائی گئی تھی تاکہ ڈرائیور اور اس کے ساتھی عقبی آئینہ میں قیدیوں کو دیکھ رہیں اور قیدی شیشہ نہ توڑ سکیں۔ وسطی حصہ کا مہیب جنگلے دار آہنی دروازہ تیسرے میں کھلتا تھا جہاں بنچوں پر چھ مسلح محافظ براجمان تھے۔ ہم دونوں کو چونکہ ایسی ہتھکڑیاں لگ گئی تھیں جن کا ایک سرا میرے ہاتھوں پر منتقل تھا اور دوسرا جوزف کے ہاتھوں پر بندھا تھا۔ ہمیں وسطی حصہ میں ہانکنے کے بعد نیپالی کسٹم پولیس کے سپاہی اطمینان سے باہر بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی تھیں اور ہر آواز ان تک پہنچ سکتی تھی لہٰذا ہم نے اپنی خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ ہاں جوزف رہ رہ کر پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

سنگلاخ اور پرپیچ پہاڑی راستوں پر وہ گاڑی مہیب آوازیں پیدا کرتی بڑھ رہی تھی۔ سپاہیوں کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ سفر خاصا طویل ثابت ہوگا۔

"یو سن آف اے بچ" اچانک جوزف دانت پیس کر غرایا۔ "تم کالے لوگ ہوتے ہی دھوکے باز ہو۔ بتاتے کچھ ہو، اور کرتے کچھ ہو۔"

سخت غصے کے باوجود مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "سفید سور کی اولاد اپنی چونچ بند رکھو۔ یہ دھونگ تمہیں مصیبت سے نہیں بچا سکتا۔"

"خاموش بیٹھو ـــ کیا بکواس شروع کر دی تم دونوں نے!" آخری حصے

... تقریباً چیختی ہوئی آواز انجن کے بے پناہ شور پر چھا گئی۔ ... سپاہی نے اردو زبان استعمال کی تھی جو جوزف کے پلے نہ پڑ سکی۔ اس سے قبل کہ ... کچھ بکواس شروع کرتا، میں بول پڑا۔ "یہ لڑنے کا موقع نہیں ہے برخوردار۔ معلوم ہے ... ہی کیا کہہ رہا ہے؟"

اس کی استفسار طلب نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہیں۔

"وہ بتا رہا ہے کہ ہم نے شور مچایا تو وہ ہمیں ذبح کر کے لاشیں کسی کھڈ میں پھینک ... ۔ وہ ہمیں قید کر کے خاص طور پر نہیں لے جا رہے۔ ان کے سفر کا مقصد اور منزل کچھ ... ہے ہم تو محض اتفاقاً ان کے حوالے کر دیئے گئے ورنہ سرحد ہی پر مار دیئے گئے ہوتے" ... نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں اشتباہ آمیز تشویش لہرانے لگی اور وہ آہستہ سے بولا۔ "مگر ... تو کوئی مختصر سی بات کہی تھی۔"

"یہ زبان کا فرق ہے۔ نیپالی زبان میں بہت زیادہ اختصار پایا جاتا ہے!"

"تم دھوکے باز ہو۔" وہ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا ... ہمارا ساتھی ڈینی کو صاف لے اڑا اور میں تمہارے چکر میں آ پھنسا۔ ان حرام زادوں نے ... تمام پیکٹ چھین لیے ہیں، میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے مگر میرے پاس ایک سگریٹ تک نہیں ہے!"

"اگر تمہیں کافی دیر سگریٹ نہ ملے تو کیا ہوگا؟" میں نے یونہی کہا۔

"مجھے سگریٹ سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے صرف چرس کا نشہ درکار ہے" وہ ٹوٹ گیا ... ابھی ہوش و حواس کھو بیٹھوں گا۔"

"بے ہوشی میں یہ طویل سفر اچھا کٹے گا۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ یہ گاڑی نہ ہوتی تو ہم سرحد پر ہی مار دیئے گئے ہوتے ـــ کیا یہ ... سچ ہے؟" اس نے الجھن آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"بالکل سچ ـــ نیپالی اسمگلروں اور خاص طور پر منشیات کے اسمگلروں سے ... رعایت نہیں کرتے۔ دو تولہ چرس بھی سرحد پار لانے کی کوشش سزائے موت کا موجب ... ہے جبکہ اس گاڑی سے تو بھاری مقدار میں چرس برآمد ہوئی ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ نیپال میں چرس عام ہوتی جا رہی ہے!" وہ ابھی تک ... بات پر یقین نہیں کر سکا تھا۔

"حکومت اسی چیز سے تو پریشان ہو کر انتہائی اقدامات کا سہارا لے رہی ہے" ... یہ دلیل شاید اس کے حلق سے اتر گئی کیونکہ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا اور اپنا سر دونوں ... کے درمیان دبا کر گھٹنے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

نیپالی سپاہی آپس میں باتیں کرتے کرتے جنگلے دار دروازے کے اس پار سے ... کی طرح ہماری طرف دیکھتے اور پھر گپ شپ میں مصروف ہو جاتے۔

شام ڈھلنے کا پھیلنے سے ذرا ہی دیر قبل لاری کی رفتار تیز ہو گئی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ اندھیرا پھیلنے سے قبل کسی خاص مقام پر پہنچنا چاہتے ہوں اور ہوا بھی یونہی ... اور ڈھلوان راستوں کو عبور کرتی وہ لاری آخرکار کسی پسماندہ سی بستی میں داخل ہو گئی ... دھندلا سا اندھیرا پہاڑوں کے درمیان گہری وادی کی فضا کو خوابناک بنا رہا تھا ـــ ... مانے کچے پکے مکانات بے ترتیبی کے ساتھ اونچی نیچی ڈھلانوں پر دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ اکا دکا مکانوں کی چمنیوں سے اٹھتا سرمئی دھواں آسیبی ہیولوں کا روپ دھارتا کسلمندی کے ساتھ بلندی کی جانب اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ راستے میں دکانوں وغیرہ پر متمند لیکن مسرت زدہ مقامیوں نے باہر سے آنے والی پولیس لاری کو بڑی حیران نظروں سے دیکھا۔

جوزف حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس آبادی پر نظریں دوڑا رہا تھا اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر تازگی رقصاں تھی جیسے اسے عنقریب کوئی من پسند چیز ملنے والی ہو۔

"ناقابل یقین ..... ناقابل یقین!" اچانک وہ خود ہی خود بڑبڑانے لگا ـــ "یورپ والے مر کر بھی یقین نہیں کر سکتے کہ ہمالیہ کی گود میں مشرقی لوگ اس قدر فسوں خیز اور پراسرار ماحول میں زندگی بسر کرتے ہوں گے۔"

"ہم اس وقت سیاحوں والی بس میں نہیں، قیدیوں والی بند لاری میں ہیں۔" میں نے آہستہ سے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"لوگ کہتے ہیں کہ ان وادیوں میں آنے والے یہاں بھیک مانگ کر گزارا کرنا گوارا کر لیتے ہیں۔ لیکن ٹرکر مغرب کی تہذیب کی خبر نہیں لیتے،" وہ میری بات سنی ان سنی کر کے اپنی ہی دھن میں کہہ رہا تھا۔ "انہیں کیا معلوم کہ یہاں کیا طلسم خوابیدہ ہیں، روئے زمین پر اگر کوئی جنت ہے تو یہی ہے۔"

"جنت!" میں آہستہ سے ہنسا۔ "پتھروں اور بھوکوں سے بھری ہوئی جنت ـــ ذرا توقف کرو، جب حوالات میں کمر پر بید برسائے جائیں گے اور کرکری روٹی چبانی پڑے گی تو اس جنت کی کچھ ہی حقیقتیں دریافت ہوں گی!"

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میری ہنسی کی آواز سن کر عقبی حصے سے ایک سپاہی غصیلی آواز میں غرایا۔ "یہ گدھے کی طرح کیوں رینک رہا ہے، خاموش بیٹھو ورنہ بندوق کی نال حلق میں ٹھونس دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہماری سخت جان، بند لاری ایک تنگ موڑ پر گھوم کر سالخوردہ سی عمارت کے احاطہ میں جا رکی جہاں اکا دکا وردی پوش سپاہیوں کی آمدورفت جاری تھی۔

لاری رکتے ہی دستے کا انچارج اگلی سیٹ سے اتر کر ہمارے محافظوں کی طرف آیا اور جلدی جلدی انہیں کچھ ہدایات دے کر واپس لوٹ گیا۔

میں اترنے کے لئے تیار ہو چکا تھا لیکن کئی منٹ گزر گئے اور کسی نے دروازہ نہ کھولا تو میں بھی تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دستے کا انچارج ایک پولیس افسر کے ہمراہ واپس آیا۔ چند ثانیوں تک وہ دونوں نیچی آواز میں مشورہ کرتے رہے پھر دروازہ کا تالا کھول کر ہمیں اس حالت میں نیچے اتار لیا گیا کہ ہم چاروں طرف سے سپاہیوں کے نرغے میں تھے۔

پھر وہ سب ہم دونوں کو نرغے میں لئے عمارت کی طرف بڑھنے لگے اور تنگ سی ایک راہداری سے گزر کر گندے سے کمرے میں جا پہنچے۔

یہاں ہم دونوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اس دوران میں وہ دونوں نیپالی پولیس افسر نیواڑی زبان میں کچھ گفتگو کرتے رہے پھر مجھے لانے والے دستے کا انچارج درشت لہجے میں مجھ سے بولا۔ "جاؤ تم دونوں کا مقدر اچھا ہے اگر یہاں ضمانت کی

خبر نہ ملتی تو تمہارے جوڑ جوڑ کو ہلا کر رکھ دیتا ۔۔ وہ ڈلج اس ایک مہینے میں تیسری بار سرحد پار کر رہی تھی۔ نہ جانے تمہارے ساتھی پہلے کتنی چرس ادھر پہنچا چکے ہیں!"

اس کے لہجے میں شکست خوردگی کی تلخی اور جھلاہٹ رچی ہوئی تھی مگر ضمانت کی خبر سن کر مجھ پر تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نئی جگہ پر نہ جانے وہ کون نادیدہ محسن تھا جو مجھے عذاب کی قید سے صاف بچا گیا تھا۔

"منہ کیا دیکھ رہا ہے ۔ دفع ہو یہاں سے!" مجھے ہکا بکا دیکھ کر وہ دہاڑا۔

"مجھے صرف اتنا بتا دو کہ ہماری ضمانت کس نے کرائی ہے؟" میں نے گڑگڑا کر کہا

"مذاق کرتا ہے" اس نے لپک کر میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ غصے سے اس کی دہشتناک آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑی تھیں اور وہ آپے سے باہر نظر آرہا تھا۔

تھپڑ پڑتے ہی میں تلملا کر رہ گیا۔ یہ میری شامت ہی تھی کہ وہ میرے سیدھے سادے سوال کو اپنا مضحکہ سمجھ بیٹھا تھا۔

پھر اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر بڑی مہارت سے زمین پر گرا دیا اور پے در پے میری پسلیوں میں گھونسے مارنے لگا۔

"کرن سنگھ ۔ کرن سنگھ! یہ کیا کر رہے ہو، حوالاتیوں کی ضمانت ہو چکی ہے"۔ دوسرا افسر اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

"دیکھ لی ضمانت،" وہ ہاتھ روکے بغیر ہانپتے ہوئے غرایا۔ "قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں، مجھے بھی ایسے ماں کے خصموں کو سیدھا کرنے کے گر آتے ہیں"

دوسرے افسر نے اضطراری طور پر اسے میرے اوپر سے کھینچنا چاہا مگر وہ کسی غضبناک بھیڑیئے کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ "بازپرس ہوتی ہے تو ہوا کرے ۔ کہہ دوں گا کہ ضمانت کی خبر دیر سے ملی!"

اس نے تابڑ توڑ وار کر کے چند ہی سیکنڈ میں میرے اوسان خطا کر دیئے اور میں اپنے جسم کے نازک حصوں کو اس کی وحشیانہ ضربوں سے بچانے کی ناکام کوششیں کرنے لگا۔

"مارو ۔ اس نابکار کو وہ چار چوٹ کی مار مارو کہ آئندہ کسی سادہ لوح غیر ملکی کے ساتھ فریب کرنے کی ہمت نہ کر سکے ۔!" جوزف شیر ہو کر انگریزی میں ہرزہ سرائی کر رہا تھا۔

آخر کرن سنگھ نے مزید دو گھونسے میرے جبڑوں پر لگا دیئے اور ہانپتا ہوا الگ ہٹ گیا۔ اس آخری وار نے میرا چہرہ لہولہان کر دیا تھا اور شاید داہنی آنکھ پر بھی فوراً ہی ورم آگیا تھا۔

"اسے گھسیٹ کر باہر پھینک دو۔" کرن سنگھ شاید اپنے ماتحتوں سے کہہ رہا تھا۔

چند سپاہیوں نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ جوزف اب لاتعلقانہ انداز میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب سپاہی مجھے باہر لے جانے لگے تو کرن سنگھ نے جوزف پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اردو میں دہاڑا ۔۔۔ دفع ہو جا یہاں سے خبیث کی اولاد ورنہ ابھی تیری بھی چمڑی گرا دوں گا۔ وہ شاید انگریزی سے نابلد تھا۔

زبان کتنی ہی اجنبی کیوں نہ ہو لیکن مصیبت کے لمحات میں انسان کی چھٹی حس بہت تیزی سے کام کرنے لگتی ہے۔ جوزف فوراً ہی سمجھ گیا کہ ان لوگوں کی نیت اس کے بارے میں بھی اچھی نہیں ہے اور اس نے وہاں سے روانگی میں ذرا بھی تاخیر کی تو کرن سنگھ مار مار کر اس کا بھرتہ

بھجادے گا!

وہ لپک کر میرے قریب آیا اور مجھے سہارا دیتے ہوئے دبی زبان میں بولا "افسوس ہے دوست۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں!"

میں کراہتا اور لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ اس منحوس عمارت سے باہر آگیا۔

"یہ سب کیا ہوا ۔ آخر ہمیں رہا کیوں کر دیا گیا؟" باہر آکر جوزف نے الجھن میں مجھ سے دریافت کیا۔

"میری حالت دیکھ رہا ہے؟" میں اس پر برس پڑا "اس وقت مجھے آرام کی ضرورت ہے"

"آرام!" وہ پرخیال انداز میں بڑبڑایا۔ پھر یک بیک کھل اٹھا "ہمارے پاس کچھ رقم موجود ہے اور میں نے گھنے جنگلوں اور بلند برفانی پہاڑوں کے درمیان گھری بستی میں داخل ہوتے ہی ایک ہوٹل دیکھا تھا۔ ہمیں وہ جگہ تلاش کرنی ہوگی"۔

مجھے اس پر بے حد غصہ آیا اگر اس کا چہرہ لہولہان اور ایک آنکھ ورم آلود نہ ہوتی تو میں اس سے اس بستی کے حسن کے بارے میں ضرور گفتگو کرتا لیکن اس وقت صورت حال تھوڑی سی تلاش کے بعد ہم ایک پہاڑی ڈھلان پر بنے ہوئے سستے سے ایک ہوٹل تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

ہوٹل پر موجود لوگوں نے میرے تازہ زخموں کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ ہمارے پیچھے وہاں آنے والا ایک شخص تو سیدھا ہمارے پاس ہی آپہنچا اور ہم دونوں کے بیٹھنے سے قبل ہی اونچی آواز میں ہوٹل والے سے بولا۔

"فوراً دو چائے لے آ ۔۔ تیز اور گرم"۔

میں نے ادھ کھلی جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ صورت سے بھلا آدمی نہیں لگتا تھا۔ چہرے پر گہرے زخموں کے کئی پرانے نشانات اس کی سفاکی کا اظہار کر رہے تھے۔

جوزف نے چائے آنے سے قبل ہی مگ میں پانی لا کر میرے زخم صاف کئے اور وہ اجنبی لاتعلقانہ انداز میں یہ سب دیکھتا رہا۔

چائے کے چند گرم گرم گھونٹ لینے کے بعد میں نے زبان کھولی "تم کون ہو؟"

"دوست!" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا "سفید ہاتھی کی کھال لینے والا"

یہ سنتے ہی میں تقریباً اچھل پڑا اور مجھے موتی ہاری کا وہ فربہ شخص یاد آگیا جس نے جعلی کاغذات پر پوشیدہ چرس کے ساتھ ہمارے سفر کا بندوبست کیا تھا۔

"تو تم ہی وہ شخص ہو جس تک ہمیں وہ ڈلج اشٹیشن ویگن پہنچانی تھی"۔ میں نے ایک گہرا سانس لے کر نیچی آواز میں کہا۔

"وہ نہیں ۔ اس کا ہرکارہ!" وہ جلدی سے بولا "نیپال کی سرائے کی یہ بستی اتنی مہنگی نہیں ہے" فقرہ مکمل ہونے تک اس کی مٹھی سے سو سو کے کڑکڑاتے نوٹ میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد وہ ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں نہیں رکا۔ اس کے جاتے ہی اور اس کے دو تین تجسس کا شکار ہماری طرف آئے۔

"اپنے اس گورے ساتھی کی وجہ سے میری یہ درگت بنی" ان کے استفسار پر میں نے ان سے کہا "یہ مشرقی عورتوں سے بات کرنے کے ڈھنگ سے ناواقف تھا

ورت مقامی لڑکی کو دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔ اس حرکت پر لڑکی کا باپ آپے سے باہر ہو گیا اور جب میں نے بیچ بچاؤ کرانا چاہا تو اس نے گورے کو چھوڑ کر دل کی ساری بھڑاس مجھ پر نکال لی"

کچھ دیر وہاں بیٹھ کر میں نے حواس درست کئے۔ ہوٹل میں موجود لوگ میرے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آرہے تھے مگر مجھے ان کا بولنا تک ناگوار لگ رہا تھا۔ اس وقت میری حالت ابتر تھی کہ مجھے تنہائی میں ہی سکون مل سکتا تھا۔

"رات کہاں بسر کرنی ہے؟" کچھ دیر بعد جوزف نے پوچھا۔

میں نے اس ہوٹل کے مالک کو اشارے سے اپنی طرف بلایا وہ بیچارہ اس وقت ہماری ہی طرف متوجہ تھا۔ فوراً ہی لپک کر آگے بڑھ آیا۔

"ہم دونوں سیاح ہیں۔ بھارت سے آرہے ہیں اور کھٹمنڈو کا ارادہ ہے" میں نے تھکی ہوئی آواز میں اس سے کہا "اس شہر میں شب بسری کیلئے کوئی سستا ٹھکانہ بھی مل سکے گا!"

"اسی ڈھلان پر پگڈنڈی سے اترتے جاؤ تو کچھ دور پر سرائے مل جائے گا۔ وہاں سرائے ہے، شاید کوئی جگہ مل ہی جائے"۔ یہ کہتے کہتے اسے کچھ اور بھی یاد آگیا ۔ "سرائے کے برابر ہی میں ایک جراح رہتا ہے وہ تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر دے گا"

اس ہوٹل کا بل ادا کر کے ہم شام کے گہرے ہوتے ہوئے دھندلکے میں پہاڑی سے نیچے اترنے لگے جس پر کافی نیچے روشنی کے بہت سے دھبے نظر آرہے تھے۔

میرا ذہن اس وقت اس پراسرار شخص میں الجھا ہوا تھا جو ذرا ہی دیر قبل سفید ہاتھی کی کھال کے حوالے کے ساتھ مجھ سے ملا تھا۔ گو ہم لوگ بیرگنج سے کافی دور نکل آئے تھے پھر بھی وہ ہم تک آپہنچا تھا۔ شاید اسے علم ہو گیا تھا کہ ڈلج اشٹیشن ویگن چرس سمیت پکڑی جا چکی ہے اور اس کے مسافر حراست میں لئے جا چکے ہیں اور یوں وہ ہمارا پیچھا کرتا ہوا ہم تک آپہنچا۔ اس نے جس انداز میں اپنے کسی آقا کا حوالہ دیا تھا اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم دونوں اسمگلروں کے کسی منظم گروہ کا شکار ہوئے ہیں جو اب بآسانی ہمارا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ پھر مجھے اپنی ضمانت کا خیال آیا۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے۔ چرس جیسے غیر قانونی کاروبار میں ملوث لوگوں سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ موتی ہاری سے روانگی سے نیپال میں گرفتاری تک میں ان لوگوں کے بارے میں بالکل لاعلم تھا اور نہ ان کی نشاندہی کر سکتا تھا۔ پھر میری اور جوزف کی ضمانت کرا کے انہیں خود کو بے نقاب کرنے کی کیا ضرورت آپڑی تھی جبکہ مال ضبط ہو چکا تھا اور گاڑی بھی سرکاری تحویل میں لی جا چکی تھی۔

اسی ادھیڑبن میں ہم وادی میں جا اترے۔ جوزف پر ماحول اور فضا نے عجیب سی وارفتگی طاری کر دی تھی اور وہ سیٹی پر مختلف دھنیں بجا رہا تھا۔ اگر میں اس وقت زخمی نہ ہوتا تو یقیناً اس کا ساتھ دیتا لیکن موجودہ حالت میں اس کی ایک ایک حرکت مجھ پر گراں گزر رہی تھی۔

وہ سرائے ایسٹ انڈین ریلوے کے کسی تیسرے درجے کے مسافر خانے سے مشابہ تھی۔ کچی پتھریلی زمین کا وسیع حصہ چٹائیوں سے گھیر کر اوپر چھپر بنا دیا گیا تھا اور اندر تین قطاروں میں بان کی پرانی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان میں بیشتر خالی نہیں تھیں بلکہ ان پر سفید فام اور ملی جلی نسل کے آوارہ منش ہپیوں کی خاصی تعداد تھی اور اندر چرس کا دھواں رچا ہوا تھا۔ ایک آدھ گوشے سے دیسی شراب کے بھبکے بھی اٹھ رہے تھے ۔ اور یہ سارے مشاغل اعلانیہ ہو رہے تھے۔

سرائے میں خالی چارپائی کا کرایہ چار آنے فی شب اور بستر سمیت آٹھ آنے تھا۔ مگر مجھے زخمی دیکھ کر سرائے والا اکھڑ گیا۔ "میں غلط دھندے نہیں کرتا اور آج تک میری چھت کے نیچے پولیس کے قدم نہیں آئے ہیں۔ تم پتہ نہیں کہاں فساد کر کے آتے ہو۔ اگر تمہارے پیچھے پولیس یہاں آپہنچی ...."

میں نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی "ہم مجرم نہیں سیاح ہیں۔ اگر میرا گورا ساتھی ایک مقامی لڑکی سے بدتمیزی نہ کرتا اور میں بیچ بچاؤ میں نہ پڑتا تو لڑکی کا باپ مجھے یوں زخمی نہ کرتا۔ یہ پولیس کا چکر نہیں ہے معاملہ اسی وقت رفع دفع ہو گیا تھا"

میری بات پر وہ تذبذب میں پڑ گیا "تم زخمی ہو اور تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میری سرائے میں یہ بدمست ہی ساری رات اودھم مچاتے رہیں گے اور تم سو نہ سکو گے۔ رات باہر ہی کہیں بسر کر لو تو بہتر ہے .....!"

"اس ہمدردی کا شکریہ!" میں تلخ لہجے میں بولا "اگر تم اسی قدر بزدل اور کم ہمت ہو تو دو چارپائیاں میرے ساتھ فروخت کر دو میں یہ رات کھلے آسمان کے نیچے بسر کر لوں گا"

وہ بزدل ضرور تھا مگر اس میں اتنا کھلا اعتراف کرنے کی ہمت نہ تھی بولا "میں تو تمہارے فائدے کی بات ہی کہہ رہا تھا رہنا چاہتے ہو تو یہیں رہو"۔

میں نے اسے پیشگی کرایہ کاٹنے کے لئے سو روپے کا نوٹ دیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا اپنے کسی گاہک کے پاس اتنا بڑا نوٹ دیکھنا اس کے لئے شاید غیر معمولی بات تھی۔

"ایک روپیہ کرائے کا، ابھی ہم کھانا بھی کھائیں گے اور ذرا برابر سے جراح کو بلا دو صبح حساب کر کے رقم واپس لے لوں گا" میں نے کہا۔

"آؤ میں بستر دکھا دوں"۔! وہ یہ کہتا ہوا اندر بڑھا۔

میں جوزف کی طرف پلٹا تو وہ غائب تھا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو وہ ایک سفید فام ہپی کے بستر پر بیٹھا لگاتار چرس کے کش لگائے جا رہا تھا۔ کافی دیر بعد نشہ میسر آنے کے سبب وہ ایک ہی سانس میں پوری سگریٹ پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری نظروں کے تعاقب میں سرائے والے نے بھی اسے دیکھا اور مسکرا کر بولا "میرے یہاں کھلی چرس کے علاوہ تیار سگریٹوں کے پیکٹ بھی ملتے ہیں اور دیسی شراب بھی"۔

میں کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔

وہ بستر کیا تھے بس ایک میلی سی دری، سخت اور پتلا تکیہ اور اوڑھنے کے لئے گدڑی کی بنی ہوئی ایک سوتی چادر ہر بستر کی سہمت لگائی گئی تھی۔ سرائے والا تو جراح اور کھانے کا انتظام کرنے چلا گیا اور میں جوزف کے پاس جا پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ خبیث خوش دلی کے ساتھ چہکا "نیپال میں گھسنے کے بعد میں نے پہلی بار یہ مزا چکھا ہے۔ خالص چرس تو شاید یہاں کے سوا کہیں نصیب نہیں ہے۔ تم پیو گے"

اس کے میزبان نے جھلا کر ادھ جلی سگریٹ اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ سے جھپٹ لی

"یہ یتیم خانہ نہیں ہے کہ ہر لاوارث اسی بستر پر آکر اپنا شوق پورا کرے!"

میں نے کبھی چرس نوشی نہیں کی تھی مگر اس کا جارحانہ رویہ دیکھ کر جی چاہا کہ یک لخت

اس کے کئی سگریٹ پھونک ڈالوں مگر اسی وقت جوزف اٹھ گیا اور بات ٹل گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں سرائے والا آ پہنچا۔ کھانے کے علاوہ جراح بھی ساتھ تھا۔ اس نے مرہم پٹی کے ساتھ ہی کئی جوڑوں کو ہلایا جلایا، اور میری آدھی تکلیف اسی وقت رفع ہو گئی۔ پتہ چلا کہ کرن سنگھ نے میرے دو تین جوڑ بھی کھسکا دیئے تھے۔

مرہم پٹی اور کھانے کے بعد میں نے جوزف کے لئے چرس اور اپنے لئے دیسی شراب طلب کی۔ آس پاس کی چارپائیوں پر پڑے مفلوک الحال ہپی یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے قلاشوں کی بھیڑ میں شاہ خرچ رئیس زادے آ پہنچے ہوں۔

دیسی شراب اس وقت میرے لئے امرت ثابت ہوئی۔ ہر گھونٹ میں سرور تھا۔ میرے ذہن پر چھایا ہوا تکلیف کا ہر احساس اس سرور میں ڈوبتا چلا گیا اور مجھے وہ گندی سرائے جنت نظر آنے لگی۔ سرائے والا سو کا نوٹ دیکھ کر حریص ہو گیا تھا۔ اور میری چارپائی پر بیٹھا میری خریدی ہوئی شراب پی رہا تھا۔

”بس ایک لڑکی اور تاش — تیری جنت میں ان دو چیزوں کی کمی ہے!“ میں نے ترنگ میں آ کر سرائے والے کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”تاش!“ اس کی باچھیں کھل گئیں ”ابھی لایا — دیسی ایک روپے اور ولایتی تین روپے کی گڈی ہے۔“

”شراب دیسی اور تاش ولایتی اچھے ہوتے ہیں۔“ میں نے اپنا جام خالی کرتے ہوئے کہا۔

جوزف اپنا نشہ مل جانے کے بعد وسیع سرائے میں کسی طرف نکل گیا تھا۔ سرائے والا تاش لینے چلا گیا اور میں لالٹین کی یرقان زدہ روشنی میں گنگنانے لگا۔

تاش آتے، میں نے گڈی کھولی، لاشعوری طور پر سارے پتے دری پر پھیلائے اور حکم کی بیگم اٹھا کر گڈی میں سب سے اوپر لگانے ہی والا تھا کہ اچانک میرا ہاتھ کانپ گیا ذہن پر انجانا خوف چھا گیا اور آنکھیں بھر پلنا احساس کے ساتھ گردوپیش کا جائزہ لینے لگیں معاً مجھے ہوش آیا کہ میں اب نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان سے باہر ہوں اور یہاں حکم کی بیگم کا راز جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں نے وہ پتہ سب سے اوپر رکھا اور کارڈ بانٹنے شروع کر دیئے۔

پتے پھیلتے رہے۔ آنوں کا کھیل اب روپوں میں بدل چکا تھا کئی چارپائیوں سے تماشائی اٹھ اٹھ کر ہمارے پاس آ پہنچے۔ ان کی نگاہوں میں شوق اور حسرت کا عجیب امتزاج تھا۔ وہ سب جوئے کے شوقین نظر آتے تھے لیکن مفلسی راستہ روکتی تھی۔

سرائے والے چالیس روپے سے زیادہ ہارنے کی ہمت نہ کر سکا اور کھیل ختم ہو گیا۔

رات دھیمے دھیمے رینگ رہی تھی۔ پھوس کے چھپر کے نیچے ابھی تک چرس کی ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی کہیں کہیں ابھی بھی چرس نوشی جاری تھی۔ لالٹینوں کی مدھم روشنی میں ابھرتی کھانسی کی آوازیں، بے ہنگم خراٹے، چارپائیوں کی چرچراہٹ میرے مخمور ذہن پر آوارگی طاری کر رہی تھی۔ اور سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

نہ جانے وہ کیا احساس تھا جس نے مجھے بیدار کر دیا اور نیم غنودگی کے اسی عالم میں مجھے محسوس ہوا کہ میرے بستر پر کوئی اور بھی موجود ہے۔ کوئی نرم و نازک سا دہکتا ہوا وجود جو میرے سینے سے لپٹا ہوا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا کسی نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا

”شور نہ کرنا!“ میرے کانوں میں گولی نسوانی سرگوشی ابھری ”اکیلے میں کوئی بھی دو فریق باہمی رضامندی سے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔“

”تم کون ہو۔!“

”میں ایک مفلس سیاح ہوں“ وہی سرگوشیانہ آواز ابھری ”میں نے تمہیں ... سے کسی لڑکی کی خواہش ظاہر کرتے سنا تھا!“

وہ خاصی ہوشیار لڑکی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اس کا جائزہ لیا بکھرے اخروٹی رنگت کے بال، چمکیلی سحر انگیز آنکھیں کشش انگیز چہرہ اور چادر کے نیچے چھپا ہوا بدن میرے لئے دعوت انگیز تھا ”میں کوئی سرمایہ دار نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے سرائے والے سے جوئے میں کافی رقم جیتی ہے۔ مجھے دس پانچ بھی تو کافی ہیں!“

یہ سودا بہت سستا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر سرائے کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ کھانسنے اور پہلو بدلنے کی آوازیں تک مفقود ہو چکی تھیں۔

”وہ سب نشے میں دھت بے ہوش پڑے ہیں ان کی فکر نہ کرو۔“ وہ جلدی سے ... ایک ثانیہ کے لئے میں جھجکا۔ انسانی اور حیوانی جبلتوں میں پیکار ہوئی اور ... کا ہاتھ تھامے دبے پاؤں بستر سے اتر گیا۔ ”باہر کی فضا زیادہ حسین ہے!“

رات کے گھور اندھیرے میں نہائی وہ حسین — وادی اس وقت ... لگ رہی تھی۔ ہر طرف لامتناہی سکوت پھیلا ہوا تھا۔ بیکراں اندھیرے میں کہیں کہیں ننھی روشنیاں لرزاں تھیں۔ ڈھلانوں پر اوپر کی طرف اٹھتے ہوئے بے ترتیب کچے مکان کسی شہر کا سماں باندھ رہے تھے۔ چند ثانیوں تک میں طلسم خیز فضا کے فسوں میں ڈوبا رہا ... میرے سینے سے آ لگی۔ رات کے قدم سست پڑ گئے۔ تنفس تیز سے تیز تر ہونے لگے وادی کی ظلمتوں میں نفسانی خواہشات کا مہیب دیوتا انسانیت کے دامن پر حملہ آور ... اسے تار تار کر دیا۔ یہ نیا داغ نہ تھا، پرانے داغوں میں بس ایک اضافہ تھا۔

صبح میں اپنی چارپائی پر بیٹھا جوزف کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا کہ ایک تنومند نوجوان میرے پاس آیا اور بغیر کسی تمہید کے اکھڑ لہجہ میں بولا ”رات تم نے ... دی تھی؟“

”رقم .... کس کو؟“ میں نے سٹپٹا کر پوچھا۔

”رینا ٹے کو؟“ وہ تیز لہجہ میں بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے۔ اپنی صفائی کی نیت سے بولا ”میں نے اسے نہیں ورغلایا تھا، وہ خود میرے پاس آئی تھی!“

”مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ خود آئی یا تم نے زبردستی کی“ وہ بے ... ساتھ بولا ”بس یہ بتاؤ کہ تم نے اسے کتنے پیسے دیئے تھے!“

اسی وقت رات والی لڑکی اس قوی ہیکل ہپی کے عقب میں آ موجود ... احتجاج آمیز لہجے میں بولی ”تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ رات میں نے صرف تین ... کمائے تھے!“

وہ غرا کر اس کی طرف پلٹا ”تم آ ہی پہنچیں!“

اب میں سارا معاملہ سمجھ چکا تھا۔ لڑکی نے اپنے ساتھی کو دس کے تین بتائے ...

وہ مجھ سے اصل رقم دریافت کرنے آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا ”میں نے تو تین روپے ہی دیئے تھے، تم چاہو تو مزید دو روپے دے سکتا ہوں۔ یہ لڑکی اس کی مستحق ہے۔“

”لاؤ — !“ لڑکی کے بجائے اس شخص نے ہاتھ پھیلا دیا۔

اپنے جھوٹ کی پردہ داری پر اس ہپی لڑکی کی آنکھوں میں ممنونیت جھلک رہی تھی میں نے بلا توقف دو روپے اس کے ساتھی کے حوالے کر دیئے۔

ناشتے وغیرہ سے نمٹ کر میں نے سرائے والے سے حساب صاف کیا اور جوزف کے ہمراہ باہر نکل پڑا۔

”پچھلی رات تم نے اس لڑکی کے ساتھ گزاری تھی؟“ باہر آ کر جوزف نے پوچھا۔

”ہاں — وہ خود ہی آئی تھی!“

”تمہارے پاس جو رقم ہے اس میں سے آدھی میری ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم یہ حساب صاف کر دو۔“

”تمہیں رقم سے کوئی مطلب نہ ہونا چاہیئے۔“ میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

”ڈینی سالومن اور شیکھر کے فرار کے بعد ہمارا معاہدہ ہوا تھا کہ نیپال تک میں تمہارے اخراجات پورے کروں گا اور آج ہمیں یہاں آئے دوسرا دن ہے لہٰذا اب تم اپنی راہ لو۔“

وہ رک گیا اور ہونٹ بھینچ کر مجھے گھورنے لگا ”اس ننگے بھوکے شہر میں مجھے بھیک بھی نہ مل سکے گی!“

”کسی لڑکی سے یارانہ گانٹھو۔“ میں نے لاپروائی سے کہا اور آگے چل دیا۔

وہ کچھ کہے بغیر میرے ساتھ ہو لیا۔ میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا راستہ طے کر رہا تھا۔

”تم مجھے پچاس روپے دے دو۔ اس کے بعد میرا تمہارا تعلق ختم!“ کچھ دیر بعد جوزف نے کہا۔ میں نے اس تجویز پر غور کیا۔ اس مستقل جنجال سے نجات پانے کا یہ راستہ آسان تھا۔ میں نے گن کر پچاس روپے اس کے حوالے کئے اور ہم دونوں مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد اپنی اپنی راہ پر ہو لئے۔

کرن سنگھ کے تشدد کے نشانات خاصے گہرے تھے۔ میرے لئے فوری طور پر آگے کا سفر جاری رکھنا خاصا مشکل تھا اس لئے میں سمرا ہی میں رکا رہا۔ وہ شہر سادہ اور فطری طرز زندگی کے باوجود بہت حسین تھا۔ یہاں کے لوگ بھی سادہ لوح تھے۔ سب اپنے حال میں مگن رہنے کے عادی تھے۔

میں تین دن تک اسی جراح کے زیر علاج رہا۔ قیام بھی اسی سرائے میں رہا۔ ایک آدھ بار جوزف سے سامنا ہوا، وہ اپنی ہی نسل کے چند لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا تھا جو مالی اعتبار سے آسودہ نہ سہی خود کفیل ضرور تھا۔

چوتھے روز سر شام مجھے سرائے والے کی جانب سے ایک بند رقعہ ملا۔ میں نے پرچہ کھولا تو اس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ میں اپنے ساتھی سمیت رات آٹھ بجے ہل پوائنٹ پر ملوں۔ عبارت کے نیچے نہ کسی کا نام تھا اور نہ دستخط، میں سرائے والے کے پاس پہنچا تو اس نے بتلایا کہ ایک دراز قامت شخص اسے وہ پرچہ دے گیا تھا۔

میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ نہ جانے وہ کون تھا اور مجھے کیوں بلا رہا تھا۔ میں نے مشورے کے لئے جوزف کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ وہ دوپہر کی بس سے آگے روانہ ہو چکا ہے۔ اس کا نیا گروپ بھی شہر چھوڑ چکا تھا۔

میں تشویش اور تجسس میں مبتلا ٹھیک آٹھ بجے ہل پوائنٹ پر جا پہنچا۔ وہ جگہ بالکل ویران تھی۔ دور دور کسی آدم زاد کا پتہ نہیں تھا۔ بلند و بالا درختوں کے سائے میں گہری تاریکی کا راج تھا اور کہیں کہیں سے اکا دکا جھینگروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

مجھے وہاں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ درختوں کی اوٹ سے ایک سایہ میری طرف آتا نظر آیا۔ میں اس کے خدوخال تو نہ دیکھ سکا لیکن جثے سے وہ قوی ہیکل اور دراز قامت لگ رہا تھا۔

میرے قریب آ کر وہ رک گیا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں بلور کی طرح چمک رہی تھیں اور جب اس نے بولنے کے لئے منہ کھولا تو سفید سفید دانتوں کی قطار بھی نمایاں ہو گئی

”وقت کی پابندی بہت اچھی بات ہے“ وہ سپاٹ لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

”تم کون ہو؟ اور یہاں بلانے کا کیا مقصد ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”سفید ہاتھی کی کھال والے کا ہرکارہ —!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا ”تمہیں آج رات ہی کچھ مال لے کر موتی ہاری روانہ ہونا ہے!“

”موتی ہاری!“ میں چونک پڑا ”نہیں میں اب سرحد کے اس پار نہیں جاؤں گا تم لوگوں سے میرا معاہدہ بس اس ڈاج اسٹیشن دیگن تک محدود تھا۔ اب میں ایسے کسی کام میں گردن نہیں پھنسا سکتا!“

وہ آہستہ سے بے رحمانہ انداز میں ہنسا ”یہ نہ بھولو صفدر کہ تم اب بھی ہم لوگوں کے ہی رحم و کرم پر آزادی کے سانس لے رہے ہو۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”نہیں — میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے!“

”ہم لوگوں نے ہی تمہاری ضمانت کرائی ہے اور تم نے ہمارے کام سے انکار کیا تو ایک ہی اشارے پر ہم تمہیں آہنی سلاخوں کے عقب میں پہنچا دیں گے۔“

”اوہ!“ میں ایک طویل سانس لے کر بولا ”نہ جانے میں کہاں آ پھنسا ہوں! مجھ سے اچھا تو جوزف ہی رہا جو خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل گیا۔“

”وہ کہیں نہیں جا سکتا، جب تک وہ نیپال میں ہے ہمارے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہے!“ اس کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

”ایک بار گرفتاری کے بعد میرا سرحد عبور کرنا ناممکن ہے!“ میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”سرحد پر ہمارا مال کبھی نہیں روکا جاتا۔ کرن سنگھ نیا آیا تھا اسے اپنی اصول پرستی کی قیمت کے طور پر ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں ... اگر تم اب بھی اندازہ نہ کر سکو کہ تمہارا واسطہ کن لوگوں سے ہے تو مجھے تمہارے انجام پر افسوس تک نہ ہو گا۔“

”اب میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں، میری قسمت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں بھارت کی پولیس اور ایک فوجی افسر کیپٹن بھاٹیہ سے فرار ہو کر ادھر پہنچا ہوں۔ وہ لوگ اب بھی میری تلاش میں ہوں گے اور میں دوبارہ قید ہونا نہیں چاہتا۔ نیپال میں تم مجھ سے جو کام چاہو لے سکتے ہو۔“

اس بات پر وہ شخص کچھ چونکا۔ اس کے استفسار پر جب میں نے اسے اپنے نیپال آنے کا پس منظر بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"میرے مقابلے میں جوزف اس کام کے لئے بہتر رہے گا۔" اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر میں نے زبان کھولی۔

"میں جا رہا ہوں لیکن تم نے کہیں بھی ہمارے بارے میں زبان کھولی تو وہ تمہاری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے، یہ ضرور یاد رکھنا۔" اتنا کہہ کر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

میں اپنی سوچوں میں کھویا سرائے کی طرف ہو لیا۔

مجھے سمرا میں آئے چار دن ہو رہے تھے۔ زخم وغیرہ مندمل ہو چلے تھے۔ لہٰذا اب میں اگلے سفر کے لئے تیار تھا۔ جن جرائم پیشہ لوگوں سے میرا واسطہ پڑ گیا تھا ان سے نجات کی بھی یہی صورت تھی کہ میں جلد از جلد پہاڑوں کے دامن میں پھیلی کسی گمنام آبادی میں روپوش ہو جاؤں اور وہیں سے اس رشی تک پہنچنے کی کوئی صورت نکالوں جو موسم بہار کی ابتدا میں پورے جسم پر آہنی زنجیریں لپیٹے ہرے راما ہرے کرشنا کے نعرے لگاتا فلک بوس پہاڑوں میں گم ہو جاتا ہے اور جب وہ کئی ماہ بعد پہاڑوں سے شہر میں اترتا ہے تو ساری زنجیریں سونے میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہیں۔

بھاندر ناس تک پہنچنے کے لئے مجھے جلد از جلد اس رشی کا سراغ نکالنا تھا۔ دوسری طرف مجھے ہر آن کیپٹن بھاٹیہ کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ کسی بھی لمحہ انڈین آرمی سے فرار ہو کر میرے تعاقب میں نیپال آ سکتا تھا اور میرے لئے دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔

میں نے بہت رازدارانہ طریقے سے اپنی روانگی کا پروگرام تیار کیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت بیر گنج سے آنے والی لاری سمرا سے مسافر اٹھاتی املیکھ گنج کے راستے کھٹمنڈو روانہ ہونے والی تھی۔

میں سارا دن لاری اڈے سے دور دور ہی گھومتا رہا تاکہ کوئی میری نگرانی بھی کر رہا ہو تو میرے عزائم سے آگاہ نہ ہو سکے۔ بارہ بجے کے قریب میں ویران پہاڑی راستوں پر جا نکلا۔ جہاں مقامی چرواہے پہاڑی ڈھلانوں پر اگی خودرو گھاس پر اپنے مویشی چرا رہے تھے۔

کئی میل کا چکر کاٹنے کے بعد جب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میری نگرانی نہیں کی جا رہی ہے تو میں تیزی کے ساتھ اڈے کی طرف ہو لیا۔ وہاں بھانت بھانت کے لوگ بے چینی کے ساتھ لاری کے منتظر تھے۔ میں ان سب سے بچتا بچاتا ایک حمام میں داخل ہوا اور لاری کے بارے میں نائی کو ہدایات دے کر نہانے گھس گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک میں غسل کرتا رہا پھر نائی نے دستک دے کر لاری پہنچنے کی اطلاع دی اور میں جلدی جلدی لباس پہن کر باہر آ گیا۔

لاری کے بیشتر مسافر مقامی ہی تھے جو زیادہ تر سمرا سے سوار ہوئے تھے۔ پوری بس میں آٹھ سفید فام ہپی لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔ مجھے پچھلے حصے میں ان ہپیوں کے درمیان ہی جگہ ملی اور میں خود کو چھپانے کی نیت سے اگلی نشست کی پشت گاہ پر سر ٹکا کر اونگھنے لگا تاکہ کوئی میرا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

ڈرائیور وغیرہ کھانے سے فارغ ہوئے تو لاری کا انجن اسٹارٹ کیا۔ کنڈکٹر نے بس پر نظر ڈالی پوری جگہ بھر چکی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو اشارہ دیا اور لاری آہستہ آہستہ وہاں سے سرکنے لگی۔

کچھ دیر تک سمرا کے پرپیچ، اونچے نیچے راستوں پر گھومنے کے بعد لاری شہر کی حدود سے باہر نکل آئی اور سرسبز جنگلات کے درمیان پختہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

سڑک کے قرب و جوار میں مویشی چرانے والی عورتیں بس کا شور سن کر جلدی جلدی اپنے ریوڑ سڑک سے دور ہانک رہی تھیں۔

جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی، جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ پہاڑوں کے سینے کو تراش کر تعمیر کی ہوئی پختہ سڑک چکر کھاتی اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی تھی۔ کئی جگہ تو اتنی کھڑی ڈھلانیں تھیں کہ بس کا انجن بھی تھکا محسوس ہونے لگتا لیکن ڈرائیور مہارت کے ساتھ گیئر بدل بدل کر لاری کو اوپر کی طرف رینگنے پر مجبور کرتا رہا۔ سڑک کی ایک جانب گہری کھائیوں میں اس قدر گھنے جنگل تھے کہ سبزے میں چھپی زمین ہی نظر نہ آتی تھی یہ جنگل ترائیوں سے اٹھتے سامنے والے پہاڑوں کی چوٹیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری جانب سنگلاخ بھوری چٹانیں تھیں جن کے جوڑوں میں دراڑیں ڈال کر بے رنگ اور بدوضع خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بے اختیار بھاندر ناس کا خیال آ گیا کیمیاگری کی جان۔ وہ بوٹی بھی اسی طرح دراڑوں میں اگتی ہے اور چند جامنی رنگ کے پتے پھوٹنے کے بعد اس کی سخت جڑیں پہاڑوں کے سینے میں اترتی اور پھولتی جاتی ہیں یہاں تک کہ پہاڑ کا سینہ شق ہو جاتا ہے اور وہ یک شاخہ جڑ لڑھک کر وادیوں میں جا گرتی ہے۔ ان ہی خیالوں میں کھوئے کھوئے سامنے نظر ڈالی تو ہمالا کی برف پوش چوٹیاں بادلوں کے اس پار نکلتی نظر آئیں۔ کینچن جنگا، مکالو، ایورسٹ، ہمال چولی، انا پورنا، کے جدامجد ہمالا کی برف میں نہائی چوٹیاں جہاں سال کے بارہ مہینے نقرئی رنگ میلا رہتا ہے اور جہاں سے دریا [illegible] سوتے پھوٹتے ہیں میری منزل ان ہی پہاڑوں میں تھی۔ کھٹمنڈو کے رشی کے تعاقب [illegible] میرے سامنے ایک اور بھی راستہ تھا۔ کھٹمنڈو سے شمال مغرب میں چھتیس ہزار فٹ بلند انا پورنا کے پہاڑی سلسلے میں بھاندر ناس کے پجاری بستے تھے وہاں سے مجھے اپنے گوہر مراد کا سراغ مل سکتا تھا اگر یہ راستہ کیپٹن بھاٹیہ کو بھی معلوم تھا۔

"میں مر جاؤں گی نک، میری حالت بہت ابتر ہوتی جا رہی ہے!" ایک نقاہت زدہ نسوانی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

وہ میرے برابر والی نشست پر دو نوجوانوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں پر ہول ویرانی کا راج تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے یوں اپنا سینہ بھینچا ہوا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

"پچھلے اسٹاپ پر اتنا رش تھا کہ مجھے موقع نہ مل سکا اور چلتی گاڑی میں جھٹکوں کے باعث سرنج کی سوئی گہری اتر کر ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ بس اگلے اسٹاپ تک صبر کرو۔ وہ یقیناً کوئی چھوٹا موٹا گاؤں ہو گا۔" اس کا ساتھی اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

انجکشن اور لڑکی۔ معاً مجھے لی مارکیٹ پر ٹکرانے والی وہ ہپی لڑکی جیکولین اسمتھ یاد آ گئی جو شب بسری کی دعوت پر مجھ سے الجھ پڑی تھی پھر مارفیا کی طلب میں اس کی حالت اتنی غیر ہوئی کہ میں نے اسی کے کمرے میں اس کو پامال کر ڈالا اور وہ اف تک نہ کر سکی۔

میری نگاہیں دور تک بکھرے ہوئے قدرت کے فیاضانہ شاہکاروں پر جمی ہوئی تھیں اور کان ان تینوں کی طرف۔ اس لڑکی کی حالت لحظہ بہ لحظہ غیر ہوتی جا رہی تھی اور اب وہ ہولے ہولے کراہ بھی رہی تھی۔ ایک دو مقامی مسافروں نے سرد مہری سے اس کی طرف دیکھا اور منہ موڑ لیا۔

کچھ دیر بعد اس لڑکی نے بھنچی بھنچی آواز میں ہلکی سی چیخ ماری اور اپنے ساتھیوں پر گر کر عالم میں کانپنے لگی جیسے سردی سے بخار چڑھ گیا ہو۔

اس کی چیخ ابھرتے ہی پوری بس میں سنسنی پھیل گئی۔ پل بھر کے لئے اسٹیئرنگ پر ڈرائیور کا ہاتھ بہکا اور اس نے گالیاں دیتے ہوئے فوراً ہی گاڑی سنبھال لی۔ لڑکی کا ایک ساتھی اشاروں اور بے ربط انگریزی جملوں کے سہارے مسافروں کو اطمینان دلانے لگا۔

"بس روکو... بس روکو، چڑھائیوں کی وجہ سے ایک لڑکی کی حالت بگڑ رہی ہے۔" اچانک ایک معمر مقامی زور سے چلایا۔

"بس نہیں رکے گی۔" ڈرائیور جھلا کر بولا "یہ اس راستہ کی سب سے لمبی اور خطرناک چڑھائی ہے، ایک دفعہ بس رک گئی تو اپنی طاقت سے اوپر نہ جا سکے گی!"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے!" ایک ہپی خود بخود انگریزی میں بڑبڑاتا اپنے میلے سے چرمی تھیلے میں کچھ ٹٹولنے لگا۔

چند ہی سیکنڈ بعد اس کے ہاتھ میں ہیتھیڈرین کی شیشی اور ایک سرنج نظر آ رہی تھی۔ اس نے یہ سرنج صاف کرنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی نہ سوئی کی۔ بس شیشی سے بے رنگ سیال سرنج میں منتقل کیا اور تشنج کے عالم میں کانپتی ہوئی لڑکی کے برہنہ بازو میں سوئی پیوست کر دی۔ لڑکی نے کراہتے کراہتے ہلکی سی سسکی لی اور سرنج کا سیال اس کی شریانوں میں اترنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس لڑکی میں چونچالی آ گئی۔ اور وہ اس طرح سیدھی ہو بیٹھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مقامی مسافر آپس میں سر جوڑ کر اس صورتحال پر سرگوشیاں کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ حقارت آمیز نظروں سے ان تینوں کو بھی دیکھتے جا رہے تھے۔

چار بجے کے قریب لاری ایک چھوٹے سے گاؤں پر رکی۔ تین مسافر اترے، کنڈکٹر نے سرکاری کارندے سے ڈاک کا سربند تھیلا لے کر کسی کاغذ پر دستخط کئے اور لاری روانہ ہو گئی۔

راستہ میں کئی اور پہاڑی گاؤں آئے اور اندھیرا پھیلنے سے قبل لاری املیکھ گنج پہنچی۔ انجن بند کر دیا گیا اور مسافر اپنا اپنا سامان لے کر اترنے لگے۔ بس کا عملہ بھی ڈاک کے تھیلے چھانٹ کر الگ کرنے لگا۔

میں اپنی ہی جگہ بیٹھا رہا جب بس بالکل خالی ہو گئی تو لاری کا کلینر میری طرف آیا۔ "کیا رات اسی سیٹ پر گزارنی ہے!"

"میں نے کھٹمنڈو کا ٹکٹ لیا ہے..... کیا یہ بس آگے نہیں جائے گی؟" میں نے پوچھا۔

"آگے بہت خطرناک راستہ ہے۔ رات میں ادھر مسافر لاریاں نہیں جاتیں صرف مال بردار ٹرک چلتے ہیں۔ رات گزارنے کے لئے اسی شہر میں ٹھکانا ڈھونڈ لو صبح چھ بجے لاری یہاں سے نکلے گی۔" اس نے کہا۔

میں بس سے اتر آیا۔

املیکھ گنج میں ان دنوں بھی روشنی کا مناسب انتظام تھا۔ فضا میں سمرا کے مقابلے میں خاصی خنکی تھی۔ مگر رات کھلے آسمان تلے گزاری جا سکتی تھی۔ سارے مسافر پکے مسافر خانوں میں جا گھسے تھے۔ سارے ہپی ایک جگہ جمع تھے اور شاید ابھی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ کدھر کا رخ کریں۔ میں بھی ان ہی میں شامل ہو گیا۔

"تم مقامی ہو؟" ایک نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

"کہہ سکتے ہو!" میں نے کہا۔

"یہاں کی زبان ہمارے لئے اجنبی ہے۔" ایک لڑکی کہنے لگی۔ "اگر شب بسری کے لئے اس اسٹاپ کے قریب ہی تم کسی پبلک پارک تک ہماری رہنمائی کر سکو تو بڑا احسان ہو گا۔"

"سرائے میں کیوں نہیں چلے جاتے، چند آنوں میں چارپائی مل جائے گی۔"

"ہم بستر کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں، منشیات کے بغیر نہیں۔" وہ بولی۔ "اگر ہم سارا پیسہ ان خرافات پر ضائع کر دیں تو ذرا ہی دیر میں جولی کی حالت کو پہنچ جائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرائی جو بس میں ایک مسئلہ بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ "پھر یہ مقامی نشہ کو اچھا نہیں سمجھتے۔ سرائے کے مقابلے میں کسی کھلی جگہ ہم خود کو زیادہ آزاد محسوس کریں گے!"

"ٹھہرو۔ میں کسی جگہ سے اپنے لئے نشہ کا بندوبست کر لوں پھر کہیں چلتے ہیں" میں یہ کہہ کر دکانوں کی طرف بڑھا۔ نک بھی لپک کر میرے ساتھ ہو لیا۔

میں نے ایک دکان سے دیسی شراب کی بوتل خریدی، جو خلاف توقع سستی مل گئی پیسے ادا کرنے کے لئے میں نے نامعلوم محسن کی دی ہوئی رقم نکالی تو نک کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"میں اس وقت بالکل قلاش ہوں اگر تم مجھے تھوڑی سی چرس خرید دو تو بڑا احسان ہو گا۔" اس نے خوشامدانہ لہجے میں التجا کی۔

شراب اور چرس خریدنے کے بعد میں نے اسی دکاندار سے ایک پارک کا پتہ حاصل کیا اور اپنی ٹولی میں آ ملا۔

وہ پارک کیا بس ایک بڑا سا میدان تھا جس میں گھاس کے دو تین بڑے بڑے قطعات تھے۔ دو چار جگہ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ہاں اونچے درخت بکثرت پھیلے ہوئے تھے۔ نک اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ٹہلتا ہوا ایک طرف نکل گیا اور باقی لوگ گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں نے شراب کی بوتل کھولی اور شغل شروع کر دیا۔

لڑکیاں اونچی آواز میں گانے لگیں۔ ذرا ہی دیر میں نک اپنے ساتھیوں سمیت لوٹ آیا۔ اس نے ایک سگریٹ سے تین چوتھائی کے قریب تمباکو نکالا اور چرس کی ٹکیہ ماچس کی تیلی کے سرے پر لگا کر دوسری تیلی سے گرم کرنے لگا۔ تیلی جل جانے کے بعد اس نے نرم ٹکیہ تمباکو میں ملا کر چٹکی سے مسلنی شروع کی اور تمباکو دوبارہ سگریٹ میں بھر لیا۔ پہلا کش لیتے وقت اس کے چہرے پر ایسا لازوال اطمینان اور سکون جھلک رہا تھا جیسے اس نے ان لمحوں میں اپنی زندگی کی معراج پا لی ہو۔

ان میں دو لڑکیاں مارفیا کی عادی تھیں۔ جولی تو راستہ ہی میں ہیتھیڈرین لے چکی تھی۔ دو بجے تک سب لوگ اپنا کوٹہ پورا کر چکے تھے۔ میں نے آخری گھونٹ لے کر خالی بوتل زمین پر سے لڑھکا دی اور وہ سب بوجھل انداز میں ہنس پڑے۔ جیسے ہنسنا ان کے اعصاب پر گراں گزرا ہو۔

پھر سب وہیں دراز ہو گئے۔ میرے قریب ہی ایک لڑکی چت لیٹی ہوئی تھی، چند ثانیوں بعد اس نے میری طرف کروٹ لی۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرا دیا۔

نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہوا تو سورج سر پر چمک رہا تھا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کچھ دور ایک آوارہ کتا دیسی شراب

کی ٹوٹی ہوئی بوتل کو پھیپھڑوں کی پوری قوت سے سونگھ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو دائیں بازو میں ٹیس سی اٹھی۔

آستین الٹی تو ایک ننھا سا سرخ دھبہ بازو پر نمایاں تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولیں اور دل دھک سے رہ گیا۔ خبیث ہپیوں کی وہ جماعت میری ساری رقم لے اُڑی تھی۔ جو کم و بیش دو سو روپے تھے۔

میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ انہوں نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ شراب کے سُرور میں میری آنکھ لگی تو انہوں نے میرے بازو میں مارفیا یا میتھیڈرین کی خاصی مقدار داخل کی اور ساری رقم لے اڑے۔ یہ اسی انجکشن کا اثر تھا کہ میں اتنا دن چڑھے تک بے خبر سوتا رہا۔

میں ایک مرتبہ پھر قلاش ہو چکا تھا۔ وہ ہپی بس کا ٹکٹ میری جیب میں ہی چھوڑ گئے تھے لیکن اب وہ بیکار تھا۔ میں کچھ دیر تک پارک میں بیٹھا اس چوٹ پر تاؤ کھاتا رہا۔ ہپی جوڑوں کے بارے میں یہاں ہر آن میری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لڑکیاں شرم و حیا اور آبرو کے تصور سے عاری، مرد اناسے محروم، منشیات، چوری، جُوئے اور ڈکیتی کے عادی۔ مختصر الفاظ میں وہ باعزت معاشرے کی تمام اقدار سے باغی تھے۔

لیکن یہ وقت میرے لئے ہپی ازم کے فلسفہ پر غور کرنے کا نہیں تھا میں پارک سے نکلا اور لاری اڈے کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچا تو لوگوں میں ہیجان پایا۔ وہ کسی حادثے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں اس گفتگو میں دلچسپی لئے بغیر اڈے کے منشی کے پاس پہنچا جو ایک بوسیدہ میز کرسی لگائے لاریوں کی آمد و روانگی کے اوقات نوٹ کرتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ کچھ لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔

میں گفتگو ختم ہونے کے انتظار میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور اسی وقت مجھے پتہ چلا کہ صبح وہاں سے روانہ ہونے والی بس راستہ میں کسی حادثہ کا شکار ہو گئی ہے۔ یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ شاید میرے ستارے ہی اچھے تھے۔ جو میں پارک میں بے ہوش پڑا رہا۔ ورنہ ان خوفناک راستوں پر کسی حادثے کا مطلب صرف ہلاکت ہی ہو سکتا ہے۔

ان لوگوں کی گفتگو سے پتہ چلا کہ صبح روانہ ہونے والی بس کو آٹھ بجے اگلے گاؤں پہنچ کر کسیوں کی چند بوریاں اتارنی تھیں۔ جب دس بجے تک لاری وہاں نہ پہنچی تو ایک سرکاری جیپ املیکہ گنج روانہ ہوئی۔ راستے میں کہیں بھی بس کا سراغ نہیں ملا۔ اور وہ جیپ یہاں آ پہنچی اس کا یہی مطلب تھا کہ لاری کسی گہرے کھڈ میں گر چکی ہے۔ اور حادثے میں کوئی بھی مسافر اس قابل نہیں کہ واپس آ کر حادثے کی اطلاع دے سکے۔ یہ خبر پاتے ہی میرے آنے سے ذرا دیر قبل مقامیوں کی کئی پیدل جماعتیں بدنصیب بس کی تلاش میں نکل پڑی تھیں۔

اس اطلاع کے بعد میری باز پرس بے سود تھی۔ لاریوں کے اڈے سے اس وقت بھی لوگوں کی ٹولیاں جا رہی تھیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔

سڑک کے بجائے پہاڑی پگڈنڈیوں کو عبور کرتے ہوئے وہ لوگ تیزی سے راستہ طے کر رہے تھے کہ چند میل کی مسافت کے بعد سامنے سے چند آدمی دوڑتے نظر آئے۔ انہوں نے ہانپتے ہوئے اطلاع دی کہ ٹھاکر نامی ایک ویران گاؤں کے قریب وہ بس کھڈ میں پڑی ہوئی ہے۔ دور دور تک مسافروں کی مسخ شدہ لاشیں اور مال و اسباب بکھرا ہوا ہے کچھ لوگ زخمیوں کی تلاش میں ہیں۔ اور انہیں شہر سے مدد لانے کے لئے دوڑایا گیا ہے۔

یہ خبر ملتے ہی جانے والے خطرناک پہاڑی راستوں پر بندروں کی سی پھرتی سے دوڑتے نیچے اترنے لگے۔ درختوں اور جھاڑیوں سے گھنے جنگلوں کو عبور کرتے وہ لوگ سب سے پہلے اس خون آشام وادی میں جا پہنچے۔ لاری کا پچکا ہوا سوختہ ڈھانچہ جنگل میں پڑا تھا۔ ٹنکی میں آگ لگنے کے سبب آس پاس کے سرسبز درخت بھی جھلس گئے تھے۔ درختوں کی شاخوں پر اور زمین پر دور دور تک انسانی اعضاء وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے سر اٹھایا تو اس وادی سے کم از کم دو ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ورکار سڑک کی طرح رینگتی نظر آئی۔ میں لرز کر رہ گیا۔ اتنی بلندی سے لاری گرنے کے بعد زندہ بچ جانا یقیناً معجزہ ہی قرار پاتا۔

زخمیوں کی تلاش میں لوگ چاروں طرف پھیلتے گئے۔ پہلے سے موجود لوگ ڈھانچہ الٹ پلٹ کر دیکھ چکے تھے کہ اس میں پھنسنے والا کوئی بھی مسافر زندہ نہیں بچا۔ میں بھی جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک درخت کی شاخ پر جھولتے ہوئے خون آلود انسانی جسم پر پڑی۔ میں قریب پہنچا تو وہ سفید فام ہپی تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی نبضیں ٹٹولیں تو وہاں مدھم سی جنبش محسوس ہوئی۔ اس کا بدن ابھی تک گرم تھا مگر سر خون میں نہایا ہوا تھا۔

میں نے چلا کر لوگوں کو ادھر بلانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اچانک مجھے اپنی رقم یاد آئی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اس کی جیبیں ٹٹولیں اور پتلون کی عقبی جیب سے چرمی پرس نکال لیا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ چند تصویروں کے ساتھ میری رقم جوں کی توں اس پرس میں موجود تھی۔ پل بھر کے لئے اس مہلک حادثہ کی یاد بھی میرے ذہن سے محو ہو گئی۔

میں نے وہ پرس اپنی جیب میں ڈالا اور مدد کے لئے چیخنے لگا۔ ذرا سی دیر میں بھیڑ لگ گئی اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ نک کو درخت سے اتار کر زمین پر ڈال دیا۔ اس وقت تک قرب و جوار سے دو زخمی اور مل چکے تھے۔ مگر وہ بھی بے ہوش ہی تھے۔ ان تینوں کی ابتر حالت کے پیشِ نظر فوری طبی امداد نہایت ضروری تھی لیکن کھڑی ڈھلانوں میں عبور کر کے زخمیوں کو سڑک تک پھر وہاں سے کسی سواری کے ذریعہ شہر لے جانا انسانی بس سے باہر تھا۔ لے دے کے واحد راستہ یہی تھا کہ مختصر ترین کچی پگڈنڈیوں سے انہیں شہر لے جایا جائے۔

درختوں کی شاخوں اور مسافروں کے بکھرے ہوئے بستروں کی چادروں سے ہنگامی طور پر اسٹریچر تیار کئے گئے اور زخمیوں کو ان پر ڈال کر شہر روانہ کر دیا گیا۔ ان تینوں کے روانہ ہونے کے کچھ وقفہ بعد ہی فضا میں ایک امدادی ہیلی کاپٹر کا شور سنائی دیا۔ اور لوگ ہاتھ لہرا لہرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ ہیلی کاپٹر نے وادی کا ایک چکر لگایا پھر تیزی سے نیچے آ کر درختوں سے دس پندرہ فٹ کی بلندی پر فضا میں معلق ہو گیا۔ شاید اس کے پائلٹ کو وادی میں پھیلے گھنے جنگل میں لینڈ کرنے کے لئے کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آئی تھی۔

وادی میں گونجتا ہیلی کاپٹر کا شور کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا۔ ڈھلانوں سے اوپر سڑک کے کنارے کئی گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ شاید ہیلی کاپٹر کے ساتھ پورا امدادی کارواں بدنصیب بس کی تلاش میں نکلا تھا اور ہیلی کاپٹر کو وادی میں نیچے جاتا دیکھ کر سڑک کے کنارے رک گیا تھا۔

ہیلی کاپٹر سے نائیلون کی مضبوط رسی کا پھندا لٹکا دیا گیا جس میں امدادی ایک شخص جھول رہا تھا۔ اس نے زمین پر کودتے ہی زخمیوں کی حالت دیکھی پھر ...

مزید چار زخمی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سڑک پر کھڑی امدادی گاڑیوں تک پہنچا دیئے گئے، کیونکہ ہیلی کاپٹر بہت چھوٹا تھا اور جگہ کی تنگی کے سبب بیک وقت چار زخمیوں کو وہاں سے لے جانا محال تھا۔ تین زخمی گاڑیوں سے گئے۔ چوتھے کو لے کر ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتا اس طرف بڑھ گیا جدھر لوگ عارضی اسٹریچروں پر زخمی لے جا رہے تھے۔

بس کے تیس مسافروں اور عملے کے تین آدمیوں میں سے صرف سات افراد بچ سکے۔ جائے حادثہ پر چھبیس لاشیں اور ان کے اعضا گننے کے بعد جب یہ یقین ہو گیا کہ اب کوئی زخمی وہاں نہیں رہا تو لوگ سامان کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے یکجا کرنے لگے۔

لاری کا یہ حادثہ واقعی بہت ہی جانکاہ تھا۔ املیکہ گنج میں قیامت کا سا سماں تھا۔ عورتیں اور مرد روتے پیٹتے جائے حادثہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ املیکہ گنج کی آبادی اتنی قلیل اور گنجان تھی کہ ہر فرد کسی نہ کسی طرح دوسرے کا رشتہ دار تھا۔

مجھے اس مہلک حادثہ کا افسوس ضرور تھا مگر اپنی رقم دستیاب ہونے کی بے پایاں خوشی اس افسوس پر حاوی تھی۔ رقم مل جانے کے بعد میں جلد از جلد اس شہر کی سوگوار فضا سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اسی سوچ بچار میں میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ میں اپنی دانست میں سمرا سے خفیہ طریقے سے فرار ہوا تھا مگر منشیات کی اسمگلنگ کا کام کرنے والے وسیع ذرائع کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ ان کے لئے میرا سراغ پا لینا مشکل نہیں تھا۔ میں سمرا سے نکلا تو داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ اس گروہ کے ارکان بھی مجھے اس صورت میں پہچان سکتے تھے۔ جب ان کو بس کے حادثہ کی خبر ملتی اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ میں اسی بس سے بھاگا ہوں تو وہ فرض کر لیتے کہ میں بھی مرنے والوں میں شامل رہا ہوں گا۔ ان کے اس مفروضہ کے بعد میں کچھ روز روپوش رہتے ہوئے دوبارہ داڑھی مونچھیں رکھ کر اپنی وضع قطع بدل لیتا تو میں کسی خطرہ کے بغیر آزادانہ گھوم پھر سکتا تھا۔

خاصی سوچ بچار کے بعد مجھے یہ صورت قابلِ عمل نظر آئی اور میں نے املیکہ گنج ہی میں روپوش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد میں نے اپنا حلیہ آوارہ گرد بھکاریوں جیسا بنا لیا تاکہ مجھے گھومتا دیکھ کر کوئی شبہات کا شکار نہ ہو جائے۔ سارا دن میں غیر معروف راستوں اور گلیوں میں بھٹکتا رہتا اور رات میں ویسی شب لے کر اسی پارک میں پڑ جاتا جہاں پہلی رات ہپیوں نے مجھے بے ہوش کر کے لوٹا تھا۔

تیرھویں دن میرے چہرے پر اتنے بال اُگ آئے تھے کہ بادی النظر میں میرا پہچان لیا جانا محال تھا۔ میں نے ایک جگہ داڑھی مونچھیں ستھرے انداز میں ترشوائیں۔ وہیں سے معلوم ہوا کہ دوپہر میں کھٹمنڈو جانے والی بس ادھر سے گزرے گی۔

املیکہ گنج سے کھٹمنڈو کا فاصلہ زیادہ تو نہیں تھا مگر خطرناک پہاڑی راستوں کی وجہ سے سست رفتاری تاخیر کا سبب بنی۔ تازہ حادثہ کی وجہ سے ڈرائیور زیادہ ہی محتاط تھا، پھر بھی وہ بس ڈاک لیتی سامان اتارتی چڑھاتی شام ڈھلے کھٹمنڈو میں داخل ہو گئی۔ اونچی سڑک پر سے پگوڈا کی وضع کے کئی کئی منزلہ مکانات پر مشتمل قدیم شہر نظر آ رہا تھا جو اونچی نیچی پہاڑی ڈھلانوں پر بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا۔

بس کے آخری اسٹاپ پر میں اتر گیا۔ کھٹمنڈو میری توقعات سے کہیں مختلف شہر تھا۔ یہاں جدید وضع کے مغربی ملبوسات میں مقامی مرد اور عورتوں کے ساتھ ہی آوارہ گرد ہپی نوجوانوں کے غول کے غول نظر آ رہے تھے۔ دوسری طرف روایات اور قدامت پرست لوگوں کے بھی انبوہ موجود تھے۔ بازاروں میں مقامی اور غیر ملکی اشیاء ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ برطانوی کپڑا، فرانس کی خوشبویات، امریکی سگریٹیں، لکھنوی کرتے، افغانی طرّے سب ہی کچھ تھا۔

میں کھوئے کھوئے انداز میں ایک طرف چلتا رہا۔ بازار کی رونق آہستہ آہستہ ماند پڑتی جا رہی تھی، پھر میں بازار سے آبادی میں آ پہنچا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں دور دیہ مکانات ناکافی سرکاری روشنی میں قرونِ اولیٰ کے پُراسرار معبدوں کا سماں باندھ رہے تھے۔

اچانک میری نظر دیوار پر چسپاں ایک بڑے سے اشتہار پر پڑی۔ جو کھٹمنڈو میں جشنِ بہار کے بارے میں تھا۔ اشتہار کے مطابق یہ میلہ تین دن سے جاری تھا اور رات گئے تک وہاں داخلے کی اجازت تھی۔ میں پورا اشتہار پڑھ کر واپس بازار کی طرف ہو لیا۔

اونچے نیچے راستوں سے گزر کر آخر کار میں میلہ کی جگہ جا ہی پہنچا۔ روشنیوں سے وہاں کی فضا بقعۂ نور بنی ہوئی تھی، اونچی آواز میں ہندوستانی گانوں اور مغربی موسیقی کے اتنے ریکارڈ بیک وقت بج رہے تھے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ سجے ہوئے گیٹ سے بے شمار مقامی اور غیر ملکی میلہ میں آ جا رہے تھے۔

اندر عجیب سماں تھا، خورد و نوش، کھیل کود اور خرید و فروخت کے اسٹال ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ جہاں مشرقی روایات اور مغربی تہذیب کا سنگم موجود تھا۔ ایک طرف بہت سے ہپی LOVE IS GOD (محبت خدا ہے) گاتے بری طرح ناچ رہے تھے اور ان کے گرد تماشائیوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔

ذرا اور آگے بڑھا تو ریکارڈنگ کے شور پر حاوی آہنی چمٹے کی جھنکار سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔

اس آواز کا تعاقب کرتا میں بازار کے عقب میں دیوار کے قریب جا پہنچا۔ روشنیوں کے ہجوم میں وہ گلیارہ تاریک پڑا ہوا تھا۔ میلہ کا ملا جلا شور یہاں بھی پوری شدت سے گونج رہا تھا۔ مگر یہاں ایک سحر انگیز شخصیت موجود تھی۔ زرد رنگ کی دھوتی میں ملبوس ایک دبلا پتلا شخص آہنی کڑے اور چمٹا بجا بجا کر آفاقی ترنم کے ساتھ ہندی میں کوئی گیت گا رہا تھا اور اس کے گرد بے شمار ہپی عقیدت کے انداز میں براجمان تھے۔

فضا سے پڑنے والی روشنی کے انعکاس میں اس یوگی کے ہاتھوں کی انگلیوں میں متعدد انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ بدن سے آہنی زنجیروں کی ایک زرہ سی جھول رہی تھی لمبی لمبی جٹائیں شانوں پر لہرا رہی تھیں، اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں میں عجیب سی چمک کوند رہی تھی۔ کبھی وہ چمٹے کے دونوں پھل بجاتا، کبھی دستہ اپنے آہنی کڑوں پر مار کر سُر بیدار کرتا اور کبھی جھوم جھوم کر اپنے استخوانی ڈھانچے سے لپٹی آہنی زنجیروں سے ترنم بکھیرتا وہ گا رہا تھا اور رقص کر رہا تھا۔ اس کے پرستار سانس روکے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، فضا چرس کے دھوئیں سے بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان تمام راندۂ درگاہ سفید فاموں کی روحیں جسموں کا ساتھ چھوڑ کر چرس کے کثیف دھوئیں کی صورت میں تحلیل ہو رہی ہوں۔

لکڑی کے کھڑاؤں زمین پر بج رہے تھے، زنجیریں ہل رہی تھیں گلے میں پڑی پتھروں کی وزنی مالائیں اس کے بدن پر جھول رہی تھیں، اور وہ وجد کے سے عالم میں ... کرشنا کے درد انگیز نعروں کے درمیان کوئی الہامی ہندی گیت گا رہا تھا

وہ جب بھی گیت کا بند پورا کرنے کے بعد جھٹکے کے ساتھ ہرے راما کرشنا کا نعرہ لگاتا تو بھنگ، چرس اور حشیش کے عادی سفید فاموں کی روحوں کا کرب ان کی آوازوں میں سمٹ آتا اور وہ ہم آہنگ ہو کر اس پراسرار رشی کا ساتھ دینے لگتے۔

یہ تماشا اتنا عجیب اور تاثر انگیز تھا کہ میں وہیں جم کر رہ گیا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے اس عالم میں صدیاں بیت گئی ہوں۔ اچانک رشی کا آہنی چمٹا تیز جھنکار کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور سروں کا آہنگ بدمست بھیڑ سے باہر آنے لگا۔

اب وہ سب سے آگے گاتا بجاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں سارے ہپی عقیدت سے سر جھکائے سینوں پر ہاتھ باندھے چل رہے تھے۔ ہندی نہ جاننے کے باوجود بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کے چہروں پر رقت کے زلزلے لرزاں تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے رشی کی خود ساختہ موسیقی اور الہامی گیتوں سے ان سب کو اپنی ذات اور کائنات کا عرفان حاصل ہو رہا ہو۔

حسین و جمیل، بے پروا، مختصر پوش لڑکیوں اور لاابالی نوجوانوں کا یہ گم بدا جلوس کٹھمنڈو کی سڑکوں سے گزرتا رہا۔ رات ہو جانے کے باوجود بازاروں میں ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے تھے۔ وہ رشی جلوس کی رہبری کے ساتھ ساتھ ہاتھ لہرا لہرا کر تماشائیوں کو آشیرباد دیتا جا رہا تھا۔

پھر رات کے اندھیرے میں وہ جلوس آبادی سے نکل کر ویران ڈھلانوں پر آ پہنچا۔ وہ رشی تاریکی کے باوجود بڑے اعتماد سے ان لوگوں کو صاف ستھرے راستوں پر لئے جا رہا تھا۔ یہ رنگ دیکھ کر میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہی وہ رشی ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔

اس عجیب و غریب سفر کا اختتام آبادی سے کافی دور پہاڑیوں سے گھری ایک وادی میں ہوا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند پیٹرومکس لیمپ جل رہے تھے۔ رشی نے رک کر اپنے مقلدوں کو دیکھا پھر وہ کسی بندر کی سی پھرتی کے ساتھ فضا میں کئی گز اوپر اچھلا لوہے سے لوہا ٹکرایا، وحشیانہ جھنکار ابھری اور رشی کی آواز کے ساتھ دم توڑ گئی سازو آواز کا طلسم یک بیک بکھر چکا تھا۔

سارے ہپی سسکاریاں بھرتے، سیٹیاں بجاتے پہاڑوں سے گھری اس وادی میں پھیلنے لگے اور وہ رشی خانقاہ نما پہاڑی غار میں داخل ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ پھر ایک لڑکی کے پاس جا پہنچا جو چٹان پر تنہا بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔

"یہ نغمہ منش موسیقار کون ہے؟" میں نے براہ راست بات شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"واٹ؟" وہ غصیلی آواز میں حلق کے بل بولی۔ "یہ ہپیوں کا نجات دہندہ ہے اس کا احترام کرو ورنہ یہاں تمہاری بوٹیاں بھی نہ مل سکیں گی۔"

"معاف کرنا۔ میں یہاں اجنبی سیاح ہوں!" میں معذرت آمیز لہجہ میں بولا "تم لوگوں کے اس نجات دہندہ کا نام کیا ہے؟"

"انندرام — مہارشی انندرام — یہ ہمارا الپ ہے، ہمارے دل اس کی تعلیمات سے منور ہیں، یہ ہر آن ہمیں سکون اور راحت کی نوید دیتا ہے۔ پراسرار قوتیں اس کی تابع ہیں جن کے ذریعہ وہ ہمیں ہر قسم کا نشہ فراہم کرتا ہے۔ اگر اس شہر میں یہ لوپ نہ ہو تو یہاں کے ہپی یتیم ہو جائیں گے اجنبی سیاح!" وہ ایک ہی سانس اور جذباتی لہجہ میں کہتی چلی گئی۔

"تم سچ کہتی ہو — میں خود بھی اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونا چاہتا ہوں!"

"جاؤ — وہ امن اور سچائی چاہنے والا پیغامبر ہے، وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا۔"

میں زمین پر پڑے ہپیوں کے درمیان سے گزرتا انندرام کی خانقاہ کی طرف ہو لیا۔ وادی اس وقت ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ چیخوں، سسکاریوں، سیٹیوں اور قہقہوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو دیسی لوپ کے مقلدین نے چھیڑا ہوا تھا۔

غار کے دروازے پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا وہاں پیٹرومکس کی روشنی میں انندرام آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھا تھا۔ سرخ انگاروں کی طرح دہکتی نگاہیں سامنے کھڑی ہوئی ایک لڑکی کے چہرہ پر مرکوز تھیں۔ لڑکی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا آنکھوں میں نیند کا بوجھل پن تیر رہا تھا۔ اور چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

"تو سو رہی ہے ... تو سو رہی ہے!" انندرام گمبھیر آواز میں اس مقامی لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

"میں سو رہی ہوں!" اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی سنائی دی۔

"تو میرے چیلوں میں شامل نہیں ہو سکتی۔ کوئی مقامی میرا چیلا نہیں بن سکتا۔ جس دن مقامی میری راہ پر ہو لئے اس دن یہاں والے انندرام کی بوٹیاں اڑا ڈالیں گے ..... تو مجھے اور میری تعلیمات کو بھول جائے گی، تیرا گھر، تیرے ماں باپ تیرے منتظر ہیں، جا اسی وقت یہاں سے لوٹ جا!" انندرام کی آواز کرخت اور تحکمانہ تھی وہ بات اس لڑکی سے کر رہا تھا لیکن تھکن کا احساس مجھے ہو رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ سرار سخت آہنی سلاخ کی طرح میرے ذہن میں پیوست ہوا جا رہا تھا۔

وہ لڑکی خوابناک انداز میں چلتی ہوئی اس غار سے باہر نکل گئی۔

"تو کون ہے؟" اب انندرام کی شعلہ بار ابلی ہوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ مسمریزم کا زبردست عامل ہے اس لئے نظریں ملائے بغیر آہستہ سے بولا "تمہارا ایک خادم رشی جی!"

"نہیں نہیں" وہ زور سے بولا "جس روز میں نے یہ راستہ کھولا اس شہر کے گلی کوچوں میں خون بہہ جائے گا۔ میرا بس ایک ہی کالا چیلا ہے اور وہ بھی دربدر کی ٹھوکریں کھاتا یہاں تک پہنچا ہے اس پر رحم کھانے کے بعد میں نے عہد کیا ہے کہ اب کسی کو قبول نہ کروں گا۔"

"رشی جی — مجھ پر رحم کرو!" میں گڑگڑایا۔

انندرام نے فضا میں مکا لہرایا، آہنی کڑے آپس میں ٹکرائے اور وہ بولا "اس سنسار میں کوئی رحم دل نہیں، ہم سب بھیڑیئے ہیں بزدل بھیڑیئے خود کو رحم دل کہتے ہیں، خونخوار بھیڑیئے بہادر کہلاتے ہیں۔ چلا جا تو بھی یہاں سے چلا جا ورنہ میرے چیلے تجھے اٹھا کر باہر پھینک دیں گے"۔ انندرام کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی غار کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا شخص میری طرف پلٹا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

ابھی تک وہ میری طرف پشت کئے بھنگ گھوٹ رہا تھا لہٰذا میں اسے نہ پہچان سکا تھا مگر اب وہ میرے مقابل کھڑا خشمناک انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔

یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ انڈین آرمی کے کیپٹن بھاٹیہ سے اس قدر ڈرامائی انداز میں سامنا ہو گا۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا! انندرام خاموش تھا اور بھاٹیہ میری طرف آ رہا تھا۔

پیٹرومکس

کی تیز روشنی میں مہارشی انندرام کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے پل بھر کے لئے اس کی طرف دیکھا اور پھر کیپٹن بھاٹیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ انڈین آرمی کا وہ تندخو اور بد دماغ افسر اس وقت رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس کی بے رحم آنکھوں میں نشہ کے سرخ سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور تیور خطرناک تھے مگر یہ دیکھ کر مجھے بہت زیادہ سکون حاصل ہوا کہ اس کی نگاہوں میں میرے لئے شناسائی نہ تھی!

داڑھی اور مونچھیں اس انداز میں میرے خدوخال کا جزو بنی تھیں کہ بیچارہ بھاٹیہ مجھے نہ پہچان سکا تھا۔

"باہر نکل جا — دور ہو جا یہاں سے!" اچانک بھاٹیہ ہاتھ اٹھا کر غرایا "مہارشی کسی مقامی کو اپنا چیلا نہیں بناتے۔ جس دن ان کے چیلوں کے غول میں کالی چمڑی نظر آئی، شہروں میں بسنے والے عقیدت اور احترام کو بھول کر اس خانقاہ پر آ پڑیں گے!"

"مم .... مگر تیری چمڑی بھی تو کالی ہی ہے!" میں نے کوشش کر کے بدلی ہوئی آواز میں اپنی زبان کھولی اور بھاٹیہ ایک دم بدک گیا۔

وہ دونوں مٹھیاں بھینچتا میری طرف لپکا مگر انندرام نے سرد اور تحکمانہ آواز میں اسے روک دیا "یہ سچ کہتا ہے بھاٹیہ ... سچ پر بدکنا دنیاداروں کی خاصیت ہوتی ہے اور ہم دنیا کو تج کر اپنے نفس کو مارنے کے لئے پہاڑوں اور جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں۔ سچ کا برا ماننا ہمارا کام نہیں ہے۔ اب دو ہی راستے ہیں۔ میں اسے بھی اپنا چیلا بنا لوں یا تجھے یہاں سے نکال دوں!"

انندرام کی بات سن کر بھاٹیہ کا سارا غصہ کافور ہو گیا اور وہ پریشان سا نظر آنے لگا "رشی جی کا حکم سر آنکھوں پر ... تو یہ بھی تمہارا چیلا ہو جائے گا؟"

انندرام نے اچانک پوری قوت سے اپنا آہنی چمٹا بجایا اور میں چونک کر اچھل پڑا کیونکہ اس وقت میں اپنے اصل حریف بھاٹیہ کی طرف متوجہ تھا "تو کون ہے؟" انندرام مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"میں لاوارث اور تنہا ہوں رشی جی!" میں اس سے نظریں ملائے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "اس دنیا نے مجھے اتنے دکھ پہنچائے ہیں کہ اب باقی عمر تمہارے چرنوں میں گزار دینی چاہتا ہوں!"

"کہاں سے آیا ہے؟"

"میرا ماضی بڑا دردناک ہے رشی جی!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا "میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں اپنا ماضی بھول کر نئی زندگی شروع کرنے کی نیت سے تمہارے پاس آیا ہوں!"

"ہوں!" انندرام نے ایک طویل ہنکارا بھرا "تو بہت سادہ دل اور دکھی ہے یا اول درجہ کا مکار۔ مگر جو لوگ سنسار کو تیاگ کر اپنی آتما کی شانتی کے لئے ویرانوں میں آ پڑے ہوں، کوئی مکاری بھلا ان کا کیا بگاڑے گی!" میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا اور میں بولا "رشی جی مجھے جھوٹا نہ کہو، میں بڑی آس لے کر تمہارے پاس آیا ہوں!"

"جا — یہ رات باہر بسر کر، ان کھلی فضاؤں میں سانس لینے والے میرے سب چیلے آزاد اور معصوم پرندے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ کو سمجھنے کی کوشش کر، تیرے مقدر کا فیصلہ کل ہو گا!"

میں نے ممنونیت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور الٹے قدموں چلتا اس پرنشاط پہاڑی خانقاہ سے باہر آ گیا۔ یہاں کھلے آسمان کے نیچے زندگی کا ایک نیا روپ بکھرا ہوا تھا۔ صورتوں سے وہ سب انسان لگتے تھے لیکن ان کی حرکتیں آزاد پرندوں جیسی تھیں بلکہ معصوم اور خوش رنگ پرندے تھے جن کے نوخیز اور حسین چہروں پر عجیب سی چمک کوند رہی تھی اور ان معصوم پرندوں کے گرد نفس کی آگ میں جھلستے ہوئے درندے طواف کر رہے تھے بے ہودگی، درندگی، کیف، نشاط اور سرور کی اس دنیا میں سب کچھ تھا اور وافر تھا بس ایک ہی چیز کی کمی تھی — اور وہ تھی حیا! اس جنس کو بڑے اہتمام کے ساتھ یہاں نایاب کر دیا گیا تھا۔

وہ رات میں نے پہاڑیوں سے گھری اس وادی میں گزاری۔ تنہا نہیں، اخروٹی بالوں، گوری رنگت، گداز بدن، بھرے بھرے رخساروں، ستواں ناک، روشن آنکھوں اور رسیلے ہونٹوں والی میگی براؤن کے ساتھ گزاری وہاں کوئی کسی کا دعویدار نہیں تھا اور سب ایک دوسرے کے دعویدار تھے۔ میگی براؤن ایک پتھر کے سہارے ٹیک لگائے چرس پیتی، گنگنا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تشنگی کی آگ سلگ رہی تھی اور بوسیدہ لباس سے جھانکتا جوان بدن کسی سے خراج تحسین کا طلبگار تھا۔ میں اس کے پاس رکا تو وہ مسکرائی۔ حوصلہ پا کر میں وہیں بیٹھ گیا اور اس سے قبل کہ میں بات چھیڑتا وہ کسی تمہید یا تکلف کے بغیر میری باہوں میں آ گری۔

جب لذت کی تمام تر ساعتیں بیت گئیں تو میں نے خود کو جذبات کے ایک لامتناہی خلا میں معلق پایا میرے سامنے وہی میگی براؤن تھی، اس کے ہونٹوں پر اب بھی ارمان انگیز مسکراہٹ رچی ہوئی تھی مگر وہ مجھے کسی مصری مقبرہ کی حنوط شدہ ممی لگ رہی تھی، جذبوں کی نزاکت اور زندگی سے یکسر عاری، بے جان ممی!

میں وہاں سے اٹھ گیا۔ باقی رات اس وادیٔ گناہ میں آوارہ گردی کرتے گزری۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں نشہ میں بدمست ہو کر زمین پر بچھے چیتھڑوں پر گہری نیند سو رہے تھے۔ جو بیدار تھے وہ مصروف تھے۔ کھلے میدان میں ان کی حیا سوز آزادیاں اور ننگی مصروفیتیں عروج پر تھیں۔ فضا آوارہ اور لڑکھڑاتے ہوئے بے روح قہقہوں سے گونج رہی تھی، ہوائیں نشہ آور سگریٹوں کی تیز بو سے بوجھل تھیں، ہر طرف دوشیزگی کے رنگیلے، چمکیلے پیکر اپنی تشنہ تمناؤں اور بے کیف لذتوں کا سہارا ڈھونڈنے

کے لئے توانا بازوؤں کا لذت انگیز لمس محسوس کرتے اور سو نگھتے پھر رہے تھے بعض چہروں کی تازگی اور معصومیت رحم انگیز تھی میں چونکہ اپنی تمام وحشتیں میگی براؤن پر تمام کر چکا تھا اس لئے اب میری نگاہوں میں خود غرضی نہیں تھی کہیں کہیں تو میرا جی چاہا کہ نشہ سے ماؤف اور نفس کے غلام معصوم چہروں کی لازوال چمک کو غلاظتوں میں آلودہ ہونے سے بچا لوں لیکن طلب انگیز سسکیوں اور لذت آمیز سرگوشیوں میں یہ بڑا کٹھن کام تھا۔

وہ نہ جانے کس کس کے لخت ہائے جگر تھے، کن معززین کے قرۃ العین تھے، کیسی پُر نور پیشانیوں کی چمک تھے لیکن اب تو وہ سب نفس کے اسیر تھے شیطانی قوتیں بدی دبدکاری کا روپ دھارے تاریک آسمان کے نیچے طاغوتی انداز میں رقص کناں تھیں۔

وہ رات ـــــ گناہ کی ہر رات کی طرح بہت طویل تھی۔ میں خود بھی کوئی پارسا یا مصلح نہیں تھا میرے ہاتھ انسانی خون سے آلودہ تھے میں قانون اور سماج کی بہت سی مسلمہ اقدار کا باغی تھا، قانون کے محافظوں کا مفرور تھا اور میں نے اپنے اچھے دنوں میں نہ جانے کتنی آبروؤں کو پامال کیا تھا لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ انسان اور نفسِ انسانی کی تذلیل کا ایسا اندوہناک تصور تک میرے لئے محال تھا جو میں اندرام کی خانقاہ سے باہر پہاڑی وادی میں دیکھ رہا تھا۔

جانوروں اور وحشیوں کے غول میں میری وہ رات گزر گئی سپیدۂ سحری نمودار ہوا تو وہاں پٹرومکس لیمپوں کا ہلکا سا شور تھا یا خراٹوں کا ناگوار آہنگ وہ سب تھک ہار کر سو چکے تھے!

پھر ان یکساں آوازوں میں لوہے کی ہلکی ہلکی جھنکار سنائی دی۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو اندرام کا ہیولا خانقاہ سے نکل کر ایک طرف جاتا ہوا نظر آیا۔

میرے قدم غیر ارادی طور پر اندرام کے تعاقب میں اٹھ گئے اس کے بدن پر اس وقت بھی وہی زرد دھوتی، وہی آہنی زرہ، وہی سنگی مالائیں نظر آ رہی تھیں جو میں اسے پہنے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دور ہی سے آہنی چمٹا بھی نظر آ رہا تھا مگر اس وقت وہ اسے بجا نہیں رہا تھا۔ پتھریلی زمین پر اس کے چوبی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کی آوازیں پیدا کر رہے تھے اور وہ اونچے نیچے راستوں سے گزرتا شہر کی طرف جا رہا تھا۔

میں ملگجے پن کا فائدہ اٹھا کر ـــــ اس سے مناسب فاصلہ پر دبے قدموں چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ پہاڑی پگڈنڈیوں سے شہر کے شبنم آلود راستوں پر نکل آیا۔ آبادی پر خوابناک اور گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ قرب و جوار میں کہیں کہیں سے آوارہ کتوں کی ایک آدھ نندا سی آواز ابھرتی اور پھر پر ہول سکوت میں ڈوب جاتی۔

اندرام شہر کے اس علاقہ میں تھا جہاں آسودہ حال لوگوں کی آبادی نظر آ رہی تھی یہاں رستہ اتنا صاف تھا کہ مجھے خود کو چھپائے رکھ... کے لئے اندرام سے کافی فاصلہ برقرار رکھنا پڑا۔ آخر وہ ایک موڑ پر گھو... گیا۔ جتنی دیر میں میں وہاں تک پہنچا اندرام کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ... ہونقوں کی طرح اس موڑ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ آس پاس چ... مکانوں کے بند پھاٹک میرا منہ چڑا رہے تھے۔ ان کے سوا وہاں کوئی ای... نہیں تھی جہاں وہ پراسرار رشی روپوش ہو سکتا۔

میرے لئے اب وہاں رکنا بے سود تھا اس لئے میں واپ... لوٹنے لگا۔

وہ سارا دن میں نے کھٹمنڈو میں۔ آوارہ گردی کرتے گزا... اس دوران ـــ مجھے اندرام کے بارے میں بہت سی عجیب و غریب... معلوم ہوئیں وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا تھ... برسوں پہلے کھٹمنڈو کے باسیوں نے جنوبی ڈھلانوں پر کسی رشی کی آمد... خبر سنی جو بہت سی نادیدہ قوتوں کا مالک تھا جنوبی ڈھلانوں سے آنے... عقیدت میں سرشار لہجے میں بتاتے تھے کہ اس رشی کی دعاؤں سے با... سہاگنوں کی گودمیں بچوں کی قلقاریاں گونجنے لگتی ہیں۔ اس کی ابلی ہو... شعلوں کی طرح دہکتی نگاہوں میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ اس سے نظ... چار کرنے والے کا دماغ مفلوج ہو کر رہ جاتا اور ایسے لمحوں میں اندر... اسے جو بھی بھاشن دیتا، وہ شخص نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس پر عمل کر... پر مجبور پاتا۔ نچلی وادیوں سے ہر آنے والا اندرام کے بارے میں ایسی... پراسرار کہانیاں ساتھ لاتا کہ کھٹمنڈو والوں کے دل و دماغ میں اس... کا احترام جاگزیں ہوتا چلا گیا۔ پھر ایک برس بعد وہ ڈھلانوں کو طے کرتا... قیام کرتا کھٹمنڈو پہنچا یہاں کے لوگ اس سے خوف میں ڈوبی عقیدت... اظہار کرنے پر مجبور ہو گئے!

وہ خود کو مہارشی کہا کرتا تھا۔ وہاں کے رہنے والے تو ہم پر... اپنی ضروریات کے لئے اس کی خوشبوؤں میں ڈوبی پہاڑی خانقاہ میں... تو وہ پورے غور سے ان کی بات سنتا اور محبت سے پیش آتا۔ اور جڑ... بوٹیوں کی مدد سے ان کا کامیاب علاج کیا کرتا۔ شروع شروع میں بعض... حلقوں میں یہ سرگوشیاں گشت کرتی تھیں کہ اندرام کسی دیوتا کا او... یا بھگت ہے انسانوں کے... بانٹنے کے لئے اس وادی میں آیا ہے۔ ... سال گزر گئے اور اندرام کے خلاف کوئی بات نہ سنی گئی لیکن اگلے بر... موسم بہار میں جب باہر کی دنیا سے آنے والے نوجوان سیاحوں کا تا... بندھا اور اندرام انہیں گھیر گھیر کر اپنی پراسرار تعلیمات کی طرف راغب کر... لگا تو لوگ ذرا چونکے پھر اندرام نے ان سفید فام سیاحوں پر نہ جانے کیا... جادو کیا کہ ان کے ہجوم اندرام کی خوشبوؤں میں ڈوبی پہاڑی خانقاہ پر ج... ہو کر آہنی چمٹوں اور کانسی کی تھالیوں کو بجا بجا کر ہرے راما ہرے کرشنا کے نعر... مارنے لگے۔

ان واقعات پر لوگوں میں بے چینی پھیلنے لگی نجی محفلوں میں دبے لفظوں میں اندرام پر تنقید کی جانے لگی بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے اندرام کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک کوندنے لگتی ہے۔ مقامی عورتوں پر مشرقی ماحول کے باعث اس کا سحر کام نہ کرتا تھا جبکہ غیر ملکی سیاحوں میں نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کی کثرت ہوتی ہے اور ان ہی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے اندرام نے یہ سوانگ رچایا ہے۔ وہ سفید چمڑی والی ان نوخیز دوشیزاؤں کے گداز بدن سے حسن کی رعنائیاں نچوڑنے کا شوقین ہے لیکن لوگوں کو اندرام کے خلاف کہیں سے کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ دوسری طرف عوام کی بڑی تعداد اس کی پراسرار قوتوں سے متاثر تھی لہذا اس کی مخالفت کبھی بھی زور نہ پکڑ سکی ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب سفید فاموں کے گھس آنے کے بعد مقامی اپنی ضروریات کے لئے اس کی خانقاہ کا رخ نہ کرتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں میں اندرام کی ترغیبات رنگ دکھانے لگیں کھٹمنڈو کے گلی کوچوں میں لڑکھڑاتے ہوئے بدمست لڑکے لڑکیوں کے جوڑے نظر آنے لگے۔ ان سفید فاموں کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوتے، داڑھیاں بے ترتیبی سے سینوں پر لہرایا کرتیں، لباس بے ہنگم ہوتے، بعض تو نیم عریاں ہی نظر آتے۔ نفاست اور غسل سے انہیں نفرت تھی، نہ مستقل ٹھکانہ تھا نہ روزگار ـــــ آتشِ شکم سرد کرنے کے لئے بھیک مانگ لیتے اور جہاں جی چاہتا پڑ کر سو جاتے۔ انہیں نہ جانے کہاں سے بدبودار دھوئیں والی سگریٹیں ملتی تھیں۔ وہ سارا سارا دن ان سگریٹوں کے کش پر کش اڑاتے پہاڑوں اور وادیوں میں بے مقصد گھومتے رہتے۔ ان کی ہمراہی لڑکیاں معمولی رقم یا چند روغنی روٹیوں کے عوض کسی بھی مقامی کی آہنی آغوش میں جا گرتیں۔ ان کے بکھرے ہوئے بال نشہ میں ڈوبی پیاسی آنکھیں، جا بجا پھٹے اور ڈھلکے ہوئے لباس سے جھانکتے ہوئے نقرئی بدن کا کساؤ ان کے فاقوں اور ضرورتوں کا سہارا ہوتا۔ اندرام ان کا پوپ تھا۔ وہ اس کو دیوانگی کی حد تک پوجتے تھے۔ خود کو فخریہ اس کا چیلا کہتے اور پہاڑی پگڈنڈیوں اور بازاروں میں غول در غول نامانوس لہجہ میں مقامیوں کے مقدس اشلوک اور بھجن گاتے پھرتے تھے۔

بعض سفید فام لڑکیوں کی معصومیت اور رسوائی پر ترس کھا کر مقامی معززین نے انہیں ملازمتوں کی پیشکش کی جسے انہوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ان کا فلسفہ تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس پر ہر ایک کا برابر کا حق ہے اور یہ حق حاصل کرنے کے لئے محنت اور مزدوری ضروری نہیں ہے!

اندرام موسمِ بہار کے خاتمہ پر اپنی خانقاہ سے لمبے سفر پر نکلتا تھا۔ سنگلاخ چٹانوں پر آہنی زنجیریں پہنے، سنگ و آہن کی جھنکار بکھیرتا وہ گمنام راستوں پر نکل پڑتا۔ کئی ماہ تک اس کا کچھ سراغ نہ ملتا تھا۔ جب واپس آتا تو اس کے بدن سے جھولتی آہنی زنجیریں سونے میں بدل چکی ہوتی تھیں۔ قلاّشی میں گھرے سفید فام ہپیوں کا انبوہ کھٹمنڈو سے باہر اس کا استقبال کرتا اور وہ روایتی دورے سے واپسی پر گاتے بجاتے خستہ حال ہپیوں کے ہجوم میں شہر کے چوک پر آتا اور سونے کی زنجیروں کی کڑیاں توڑ کر فضا میں اچھال دیتا اور لوگ ایک ایک کڑی لوٹ کر لے جاتے۔ شہر کے سنجیدہ لوگ اس جلوس کو تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے جبکہ نوجوان اور بچے شوق کے ساتھ پورے سال اس رنگا رنگ جلوس کے منتظر رہتے۔

ان سب پراسرار، مشکوک اور الجھی ہوئی باتوں کے باوجود سمجھدار مقامی باشندوں کو اندرام کی ایک بات بہت پسند تھی۔ اس کے سفید فام چیلوں کی آزادی سے متاثر ہو کر بہت سے پڑھے لکھے مقامی نوجوانوں تک نے اپنے گھروں اور روایات سے بغاوت کر کے اندرام کا چیلا بننا چاہا تاکہ وہ بھی اس آزاد زندگی کے مزے لوٹ سکیں، سفید چمڑی والی حسین لڑکیوں کی ہم نشینی کا شرف حاصل کر سکیں اور ان عجیب بُو والی سگریٹوں کا ذائقہ دریافت کر سکیں جو اندرام کے چیلے کسی قیمت پر مقامیوں کو نہیں دیتے تھے اور جن کے بارے میں سنا جاتا تھا کہ ان کے چند ہی کش ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کرا دیتے ہیں لیکن اندرام نے کبھی ان مقامی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور بری طرح پھٹکار کر انہیں اپنے پاس سے بھگا دیا۔ اس کی دہکتی ہوئی سرخ آنکھیں اپنے حلقوں سے ابلنے لگتیں۔ وہ ان کی جانب گھورتا تو انہیں اپنے بدن میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوتیں۔ ایسے مواقع پر اندرام غضبناک لہجہ میں مغلظات کی بوچھاڑ کر دیتا اور اس کے دھتکارے ہوئے مقامی نوجوان سر جھکا کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے لیکن لوگوں کو تشویش یہ تھی کہ اندرام کب تک ان پر قابو پا سکے گا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک دن ان کی بستیوں کے لڑکے لڑکیاں بھی سفید فاموں کی طرح کانسی کے طوق اور پتھر کی مالائیں گلے میں ڈال کر چمٹے بجاتی گھروں سے نکل پڑیں گی اور ہمالا کی گود میں بسی ان مشرقی آبادیوں کو بھی آوارگی کی لہر آ دبوچے گی۔

گو اندرام کے چیلے کسی قیمت پر مقامیوں کو چرس فراہم نہیں کرتے تھے لیکن یہ جنس اب آہستہ آہستہ کھلے بازار میں بھی آتی جا رہی تھی۔

میرے لئے ان تمام باتوں میں صرف دو چیزیں کارآمد تھیں۔ اندرام جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا اور شہر سے طویل روپوشی کے دوران وہ اپنے بدن سے جھولتی تمام آہنی زنجیروں کو سونے میں بدل لیتا تھا۔ ان تفصیلات کے بعد یہ بھی یقینی نظر آ رہا تھا کہ اندرام آسانی کے ساتھ مجھے اپنے غول میں شامل نہیں کرے گا۔ بھاٹیہ نہ جانے کس طرح اس خبیث کو شیشہ میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کراچی کے بوڑھے کیمیا گر جمال بابا نے بھی مرنے سے قبل کئی بار مجھ سے اندرام کا تذکرہ کیا تھا۔ جمال اور طیب مدراسی، دونوں ہی

کا خیال تھا کہ بھاندر ناس نیپالی سرحدوں پر ۔ انا پورنا کی ترائیوں میں کہیں ملتی ہے جبکہ بیشتر سیناسی اندرام کی وجہ سے فریب کا شکار ہو چکے تھے ۔ وہ لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ان سنگلاخ پہاڑوں میں کہیں نہ کہیں پارس پتھر موجود ہے جس کے لمس سے اندرام کی آہنی زنجیریں سونے میں بدل جاتی ہیں اور اب میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔ اگر اندرام بھاندر ناس تک پہنچ چکا تھا تو تانبہ سے سونے میں تبدیلی تک دھاتوں کا ایک طویل آواگون ہوتا ہے جس میں لوہے، تانبے یا کسی بھی بنیادی دھات کو کئی بار گلانا اور جلانا پڑتا ہے ۔ ایسی صورت میں آہنی زنجیروں کا بالکل اسی حالت میں قائم رہنا مشکل تھا ۔ اب دو ہی باتیں ممکن تھیں ۔ یا تو اندرام سنیاسیوں کو دھوکہ دینے کے لئے روپوشی کے دوران میں اپنی تمام زنجیریں گلا کر سونے کے ڈھیلے بناتا ہے پھر ان سے دوبارہ زنجیروں کی کڑیاں تیار کرتا ہے یا وہ زنجیریں پارس پتھر کے ذریعہ سونے میں بدلتا ہے ۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ بھاندر ناس کا سراغ ملے یا پارس پتھر کا ـــــ میں تو بس سونا بنانا چاہتا تھا ، ایسا سونا جو ہر کسوٹی پر پورا اترے اور اس کا کھوج لگانے کے لیے اندرام کا سہارا بہت ضروری تھا ۔

یہ بات تو طے تھی کہ کیپٹن بھاٹیہ اندرام کے ساتھ ہی سفر پر نکلنے کی سر توڑ کوشش کرے گا لیکن مجھے امید نہیں تھی

کہ مہارشی اس پر راضی ہو جائے گا ۔ دوسری طرف بھاٹیہ اس پر اصل مقصد بھی ظاہر نہیں کر سکتا تھا ورنہ اندرام اسے دھتکار دیتا ۔ لہٰذا اب مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اندرام جب سفر پر روانہ ہوگا تو دو آدمی الگ الگ اس کے تعاقب میں ہوں گے !

سرِ شام میں میلہ کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک دو قوی ہیکل آدمیوں نے مجھے آلیا ۔ ان کے بشروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مار دھاڑ سے بھی گریز نہیں کریں گے ۔

" خاموشی سے سیدھے چلتے رہو ورنہ یہیں ٹھنڈے نظر آؤ گے !" ان میں سے ایک نے اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور کی نال ابھارتے ہوئے کہا ۔

" تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو ؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا ۔

" ابھی پتہ چل جائے گا ۔"

وہ دونوں مجھے اپنے درمیان لئے آگے بڑھتے رہے ۔ تنگ و تاریک گلیوں سے گزر کر آخر کار ہم آبادی سے باہر آ گئے ۔ اب ان کا رخ ایک ایسی عمارت کی جانب تھا جس کے قرب و جوار میں پہاڑیاں ہی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں !

پتھر سے بنی ہوئی اس سالخوردہ عمارت پر باہر و یرانی برس رہی تھی ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے وہاں کسی ذی روح کا گزر ہوا ہو لیکن اندر داخل ہوتے ہی یہ تاثر باطل ہو جاتا تھا ۔ گرد و غبار سے صاف راہداری طے کر کے وہ دونوں ایک کمرے میں جا پہنچے جہاں چند کرسیاں ایک میز کے گرد موجود تھیں ۔

عمارت میں داخل ہونے کے بعد ان دونوں نے اپنے ریوالور نکال لئے تھے ۔

" اگر ہم یہاں تمہیں ذبح بھی کر دیں تو تمہاری آواز کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گی !" کرسیاں سنبھالنے کے بعد ایک بولا ۔

" مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے . . . . . میں تو اس شہر میں اجنبی ہوں ؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔

" ہم یہی جاننا چاہتے ہیں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو . . . یہاں جھوٹ بالکل نہیں چلے گا ۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی یہاں آنے والا ہے وہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرے گا !"

" میں . . . !" بولتے بولتے ـــــ میری آواز حلق میں پھنسنے لگی ۔ وہ دونوں صورت ہی سے اچھے آدمی نہیں لگ رہے تھے اور میں نیپال میں داخل ہونے کے بعد منشیات کے اسمگلروں سے بمشکل اپنی جان بچا سکا تھا ۔ اگر ان دونوں کا تعلق سفید ہاتھی کی کھال والے گروہ سے ہی تھا تو میں ایک بار پھر ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور میں نے لاری والے حادثہ کے بعد اپنی وضع قطع بدلنے کا جو اقدام کیا تھا وہ بالکل ہی رائیگاں جاتا لہٰذا اس وقت کوئی جھوٹ ہی مناسب تھا لیکن مشکل یہ آ پڑی تھی کہ پورا نیپال میرے لئے اجنبی تھا ۔ میں خود کو کسی بھی شہر سے متعلق بتاتا تو دو چار ہی سوالوں میں میرا جھوٹ پکڑ لیتے ۔

" میں اس شہر میں اجنبی ہوں " میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے ملک کے بجائے شہر کا . . . . لفظ استعمال کیا " میرا نام علی حسن ہے یہاں صرف مہارشی اندرام کی قوتوں کے کرشمے دیکھنے آیا ہوں !"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں اپنے سروں کو جنبش دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولے ۔ میں شدید الجھن اور ذہنی کوفت کے عالم میں ان کے منہ تکتا رہا ۔

چند منٹ بعد اس یک منزلہ عمارت کے کسی دور افتادہ حصہ سے قدموں . . . . . . کی چاپ ابھرتی سنائی دی جو لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی ۔ میں بے چینی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا اور وہ میری بے بسی پر بے رحمانہ انداز میں زیرِ لب مسکرانے لگے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی اس چاپ کے منتظر رہے ہوں ۔

پھر پُرشور آواز کے ساتھ اس کمرے کا دروازہ کھلا اور خطرناک چہرے والا ایک دراز قامت شخص دندناتا ہوا اندر گھس آیا ۔ اس کے کٹے پھٹے شناسا سا چہرے کو پہچانتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ۔

شخص تھا جو سمرا کی کوتوالی سے میری اور جوزف کی ضمانت پر رہائی کے بعد سفید ہاتھی کی کھال کے حوالے سے ہم دونوں سے ملا تھا ۔ اسی خبیث نے مجھے سمرا میں گزر بسر کے لئے تین سو روپے دئے تھے اور شاید وہی میرا امین بھی تھا ۔

" کیا کہتا ہے یہ ؟" اس نے اکھڑے ہوئے لہجہ میں اپنے دونوں چیلوں سے پوچھا ۔

" اڑنے کی کوشش کر رہا ہے !" ان میں سے ایک مضحکہ اڑانے والے لہجہ میں بولا " خود کو یتیم اور مسکین ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے !"

" کیوں بے ـــــ کرن سنگھ کی مار بھول گیا ؟" خطرناک صورت والا اس بار میری طرف متوجہ تھا " تیری داڑھی مونچھیں پیشانی کا زخم اور آنکھوں کی بناوٹ نہیں چھپا سکتیں ـــــ بول ، کیا تیرا نام صفدر نہیں ہے ؟"

اس کا لہجہ پر اعتماد تھا ۔ اگر میں اب بھی انکار کرتا تو وہ میری ہڈیاں صاف کرا سکتا تھا لہٰذا میں نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا ۔

اس نے فوراً ہی ایک خونخوار سا قہقہہ لگایا " سالا سمجھتا تھا کہ لبی تباہ ہونے کے بعد حلیہ بدل کر امیر خان کو جل دے سکے گا ۔ اب تیرے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے اور کٹھمنڈو میں چھپنے والا کوئی اجنبی زیادہ دیر میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا !"

اتنی دیر میں میں خود پر قابو پا چکا تھا ۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا " میں تم کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا ۔ میں نے پہلے بھی تمہارے کسی ساتھی کو بتایا تھا کہ میں اپنے دشمنوں سے چھپتا چھپاتا سرحد پار آیا ہوں ۔ اپنی جان کی حفاظت کے لئے مجھے یہ سوانگ بھرنا پڑا ہے !"

" تم دونوں باہر ٹھہرو " امیر خان نے مجھے لانے والوں سے ایسے لہجہ میں کہا جس سے اس کی برتری کا اظہار ہوتا تھا ۔ وہ دونوں خاموشی سے کمرے سے نکل گئے ۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا جیب سے نئی سگریٹ نکال کر سلگائی پھر میرے چہرے پر نظریں جما کر بولا " تو نے سمرا میں کہا تھا کہ انڈین پولیس تیری تلاش میں ہے اور آرمی کا کوئی افسر بھی تیرا دشمن ہے !"

اس کا لہجہ تائید طلب تھا ۔ میں نے اپنے سر کو اقرار میں جنبش دی !

" اور تو نیپال کی سرحدوں میں ہمارے لئے ہر کام کرنے کو تیار ہے ؟"

" ہاں " میں نے بھینچی بھینچی آواز میں کہا

میری حالت پر وہ آہستہ سے ہنسا اور دھیمی آواز میں بولا " نیپال میں منشیات کے تمام قانونی اور غیر قانونی ٹھیکے ہمارے پاس ہیں ۔ یوں سمجھ لے کہ اعلیٰ شراب سے چرس تک ہماری اجارہ داری ہے اور تجھے اس دھندے میں ہمارا ساتھ دینا ہوگا ۔ ہمیں تیرے بارے میں موتی ہاری سے اچھی رپورٹ ملی تھی اسی لئے تجھے ضمانت پر رہا کرا دیا گیا تھا مگر اب اتنی بات معلوم ہو جانے کے بعد تیری زندگی کا معاملہ پیدا ہو گیا ہے ۔ ہم اپنے جانثاروں کے لئے موت کے دہانے تک میں کود پڑتے ہیں مگر بزدلوں اور باغیوں کو کتے کی موت مارتے ہیں ہمارے باغیوں کی ناقابلِ شناخت لاشیں پہاڑی ڈھلانوں پر ملتی ہیں جو کسی شناخت اور ثبوت کے نہ ہونے کی بنا پر لاوارث قرار دے دی جاتی ہیں اور کیس فائلوں کے انبار میں گم ہو جاتا ہے !"

زندگی اور موت کے موضوع پر یوں دو بدو اس کی اٹل باتیں سن کر مجھے جھرجھری آ گئی ۔ اس کا مقصد ضرورت سے زیادہ واضح تھا ۔ میں اس گروہ کا ساتھ دوں یا ناگہانی موت کے لئے تیار ہو جاؤں !

کیپٹن بھاٹیہ انڈین آرمی سے فرار ہو کر اندرام تک آ پہنچا تھا اور وہ پیرا اسرار مہارشی چند ہی دنوں بعد لمبے

اس سفر پر نکلنے والا تھا جس کی کہانیاں سن سن کر میں نیپال تک پہنچا تھا ۔ بھاندر ناس یا پارس پتھر تک رسائی کا وہ نادر موقع تھا لیکن دوسری طرف زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو چکا تھا ۔ میرے ذہن میں کئی منٹ تک کشمکش جاری رہی ۔ امیر خان دلچسپی کے ساتھ میرے چہرے پر نظریں جمائے دھوئیں کے مرغولے اڑاتا رہا ۔ آخر مجھ میں سویا ہوا پرانا صفدر علی جاگ اٹھا جو اسمگلر تھا ، شرابی تھا ، جواری تھا اور عیاش تھا ۔ ! بھاندر ناس اور پارس میری زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں تھے ۔ ہاں میں امیر خان کے ساتھ ایک جوا کھیل رہا تھا ۔ بازی جیت جاتا تو اسے جل دے کر کبھی نہ کبھی انا پورنا کا رخ کر ہی لیتا جہاں میرے خواب میرے منتظر تھے اور بازی ہار کر میں کچھ بھی نہ ہارتا ۔ بھاندر ناس نہ ملتی ، پارس نہ ملتا تو کیا تھا میں اسمگلروں کی زندگی سے خوب واقف تھا ۔ وہ کہیں بستے ہوں کسی نسل سے ہوں کسی قوم سے ہوں ان کے گن یکساں ہوتے ہیں ۔ مجھے یقین تھا کہ امیر خان سے دوستی کر کے میں اور کچھ نہیں تو اپنا وہ کھویا ہوا اعتماد ضرور پا لوں گا جس کے بغیر میں ایک حقیر چوہے کی طرح فرار کی زندگی بسر کر رہا تھا !

میرے ہونٹوں پر ابھرتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر امیر خان کا چہرہ کھل اٹھا اور میں نے پہلی بار برابری کے احساس کے ساتھ اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا ۔

" مجھے تمہارا ساتھ منظور ہے دوست !"

میرا یہ اعتماد اور یک بیک بدلا ہوا رویہ دیکھ کر امیر خان چونکا مگر میں اسی وقت یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جب مقدر نے ایک بار پھر پرانے پیشے میں لا پھینکا ہے تو میں از سرِ نو کام نہیں کروں گا بلکہ ایک اسمگلر کی حیثیت سے میں اسی جگہ سے ابتدا کروں گا جہاں یہ سلسلہ منقطع ہوا تھا ۔ اب مجھے امیر خان یا اس کے ساتھیوں سے اپنے ماضی کا وہ پہلو نہیں چھپانا تھا جس کی بدولت میرے یہاں دولت ، شباب اور شراب کی ہر وقت ریل پیل رہتی تھی ۔

" تو خاصا عقلمند ہے !" امیر خان گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا ۔

"وقت کی بات ہے دوست!" میرا اعتماد اب خود بخود بحال ہو چلا تھا
"برے دن آنے سے پہلے میں خود ایک بڑا اسمگلر تھا۔ میں چھوٹا موٹا کام نہیں کرتا تھا بلکہ پانی کا مال لمبی کھیپوں میں منگواتا تھا۔ اور جب برے دن آئے تو جوئے کی میز پر آخری پونجی تک ہار کر میں بدن کے کپڑوں سے سڑک پر آ گیا۔ تم دیکھو گے کہ اس لائن میں میرا کام کیا ہے!"

"پانی کا مال!" اس نے آہستہ سے دہرایا "کیا منگواتا تھا سمندر پار سے؟"

"سونا، قیمتی دوائیں، کپڑا، خوشبویات۔۔۔ کیا چیز تھی جو میں نے نہ منگوائی" ایام رفتہ کے تصور میں مجھے ہلکا سا جوش آ گیا اور میں بھرائی ہوئی جذباتی آواز میں بولا "ایک دور وہ تھا میرے دوست کہ کالے دھندے کے بیوپاری پاکستان کے دل کراچی میں مجھے سمندری بادشاہ کہا کرتے تھے!"

"خیر خیر۔۔۔ بہت جلد پتہ چل جائے گا۔" وہ بظاہر بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ میں اس کے بشرے سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ میری باتوں سے خاصا متاثر ہوا ہے!

"تم لوگوں کے درمیان میری کیا حیثیت ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"جو سب سے آخر میں آنے والے کی ہوتی ہے" اس کا لہجہ اس بار واجبی سا تھا "اور ہاں اگلے احکام آنے تک تیرا قیام اسی عمارت میں رہے گا۔"

امیر خان اس کے بعد عمارت سے باہر چلا گیا اور وہ دونوں میرے پاس آ گئے۔ اس بار میرے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ تھا۔ کچھ دیر تک وہ میرے اغوا کے بارے میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے پھر مجھے اس عمارت کی سیر کرانے لگے!

باہر سے ویران اور خستہ حال نظر آنے والی وہ ایک منزلہ عمارت میرے لئے خاصی حیرت کا باعث تھی اس میں ایک بہت وسیع زیر زمین تہہ خانہ بھی تھا جو اس وقت گو ویران تھا لیکن وہاں اوسط درجے کے پر تکلف جوئے خانے اور بار کے تمام لوازمات موجود تھے۔ مغربی طرز کے بار کے عقب میں کئی اونچی اونچی الماریاں قیمتی شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک حصہ میں تاش کے کھیلوں کے لئے صندل کی بنی ہوئی دس بارہ میزیں اور کرسیاں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ دوسرے حصے میں بیش قیمت بلیرڈ ٹیبل غلاف میں چھپی ہوئی تھی۔

"کیا یہ کلب ہمیشہ ویران ہی رہتا ہے؟" میں نے اُن سے پوچھا۔

"ہفتہ میں پانچ دن یہاں ہمارا تصرف رہتا ہے۔ ہر جمعرات اور ہفتہ کو اعلیٰ سرکاری حکام اور معززین یہاں جمع ہوتے ہیں اور صبح ہونے تک یہاں لاکھوں کا لین دین ہو جاتا ہے!"

تہہ خانے کی سیر کے بعد ہم تینوں اوپر آ گئے۔ اس منزل پر ایک کشادہ ہال کے علاوہ سات کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے میں قرینے کے ساتھ بستر اور مسہریاں وغیرہ موجود تھیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ یہ کمرے گروہ کے ارکان کے کام آتے ہیں جو سارا دن دھندے میں مصروف رہنے کے بعد رات گئے اس ٹھکانے پر لوٹتے ہیں ان ہی میں تین بستروں والے ایک کمرے میں میری بسری تھی

رات دس بجے کے قریب اس عمارت میں گروہ کے ارکان کی آمد شروع ہوئی۔ پہلے سے موجود دو آدمیوں کے علاوہ نو افراد اور آئے۔ ان میں سے تین کے ساتھ سفید فام تیتی لڑکیاں تھیں جو نشے کی زیادتی کے باعث اپنے قدموں پر چلنے کے قابل بھی نہیں تھیں۔

سب لوگوں سے سرسری طور پر میرا تعارف ہوتا رہا۔ آنے والوں میں امیر خان شامل نہیں تھا۔ جب تمام آدمی آ گئے تو عمارت کا صدر دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔

اس چھت کے نیچے میری پہلی رات بڑی بے چینی سے گزری۔ دونوں ساتھی تو بستر پر دراز ہوتے ہی یوں بے سدھ ہو کر سو گئے جیسے انہیں قیامت تک سونا نصیب نہ ہو گا۔ مگر میرے کان عمارت کے مختلف حصوں سے آنے والی نسوانی سرگوشیوں اور سسکاریوں پر لگے رہے۔

اگلی صبح شب بیداری کی وجہ سے میرا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ سب لوگ ہال میں پہنچے تو تینوں سفید فام لڑکیاں اور انہیں لانے والے موجود نہیں میری بے چینی بھانپ کر ان میں سے ایک بولا "وہ اپنے ٹھکانے پر جا چکی ہیں!"

میں خفت آمیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا "شاید آوارہ گرد ہیں"

"ہاں۔۔۔ اس سالے انند رام نے نہ جانے ان پر کیا جادو کیا ہوا ہے کہ دو گولیوں کے عوض وہ ہر چیز کا سودا کرنے کو تیار رہتی ہیں!"

اس نے جس انداز میں انند رام کا تذکرہ کیا اس سے کم از کم میرے ذہن سے ایک الجھن دور ہو گئی جو اغوا کے بعد سے مسلسل مجھے ستا رہی تھی۔ مجھے انند رام کا تعاقب کرنے کے بعد اغوا کیا گیا تھا لہٰذا مجھے شبہ تھا کہ ان اسمگلروں کا تعلق کسی طرح اس بدمعاش رشی سے ہے لیکن اب یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ انند رام ان کا

اس کے بعد تین دن تک میں ایک جیپ میں گروہ کے ایک کارندے کے ساتھ مختلف ٹھکانوں پر آتا جاتا رہا۔ اس دوران میں امیر خان مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ ساتھی سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ امیر خان گروہ میں شاید رتبہ کا مالک ہے۔ کوئی بھی کارندہ گروہ کے سرغنہ سے واقف نہیں تھا۔ اس کے احکام امیر خان کے ذریعے نیچے والوں تک پہنچتے تھے!

سرغنہ کے بارے میں اس پر اسرار انکشاف نے مجھے الجھا دیا۔ زیر زمین دنیا میں بڑے مجرم عام طور پر پس پردہ ہی رہتے ہیں لیکن اس بارے میں مجھے شبہ تک نہ تھا کہ یہ اس قدر وسیع پیمانے پر منظم ہو گا۔

چوتھے دن امیر خان جگدیش نامی ایک منشیات فروش کے ساتھ آیا اور مجھے بتایا کہ اب وہ جیپ مستقل طور پر میرے ہی پاس رہے گی۔ ساتھ ہی مجھے میرے فرائض کے بارے میں آگاہ کیا اور معاوضہ کے طور پر دو ہزار روپے کے بڑے نوٹ میرے حوالے کر دیئے۔

"آئندہ ہدایات ملنے تک تمہارا قیام زیرو پوائنٹ پر رہے گا۔ گروہ کے کسی آدمی سے اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو نہیں کرو گے!" اس نے کہا "تمہارے پاس دو آدمی کل رپورٹ کریں گے!"

زیرو پوائنٹ ویران پہاڑیوں کے درمیان واقع وہی عمارت کہلاتی تھی جہاں میں اب تک رہتا آیا تھا۔ امیر خان نے جس انداز میں مجھے ہدایت کی اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس نے مجھ پر کچھ زیادہ ہی اعتماد کیا ہے "ان دو ساتھیوں کے بارے میں" میں نے پوچھا "وہ دونوں مجھ سے کہاں ملیں گے اور ان پر کس حد تک اعتماد کر سکتا ہوں؟"

"وہ دونوں پرانے آدمی ہیں لیکن ان میں تنظیمی صلاحیتیں نہیں ہیں۔ وہ بہترین وفادار ماتحت ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے سرکل میں کیسے چلتے ہیں!"

میں اس کے بعد امیر خان سے رخصت ہو گیا۔ وہ جمعرات کا دن تھا اور گروہ میں میری شمولیت کے بعد اس رات زیرو پوائنٹ پر پہلی بار جوئے کی محفل گرم ہونے والی تھی۔ میری جیب میں امیر خان کے دیئے ہوئے دو ہزار روپے موجود تھے۔ اور میں مقدر آزمائی کا فیصلہ کر چکا تھا۔

دوسری طرف میرے ذہن میں کیپٹن بھاٹیہ کی جانب سے خلش تھی۔ مجھے پچھلے دنوں کی آوارہ گردی کے دوران پتہ چلا تھا کہ مہارشی انند رام دو چار ہی دنوں میں اپنے سالانہ سفر پر نکلنے والا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بھاٹیہ بھی ہر قیمت پر اس کے ساتھ جانے کی کوشش کریگا اور انند رام اس پر راضی نہ ہوا تو وہ خفیہ طور پر اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کریگا۔ میں نے سوچا کہ کسی طرح بھاٹیہ کو اس حد تک معذور کر دوں کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہے لیکن فی الحال ایسا کوئی اقدام میرے لئے دشواریوں کا باعث بن سکتا تھا۔ یہ درست تھا کہ امیر خان نے مجھ پر اعتماد کر لیا تھا لیکن میں ایسے دھندوں سے خوب واقف تھا۔ اس نے بظاہر تو مجھے چھوٹ دی تھی لیکن پوشیدہ طور پر میری نگرانی ضرور کی جا رہی تھی شاید وہ یہ بات پسند نہ کرتا کہ میں خود کو غیر ضروری طور پر لڑائی جھگڑے میں ملوث کر کے اس کے لئے دشواریاں پیدا کروں۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ بھاٹیہ کو فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے!

بھاٹیہ سے میری جو بات ہوئی تھی اس سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اُسے اب تک کیمیا سے صرف زبانی حد تک دلچسپی رہی ہے۔ اس کے پاس سونا بنانے کے کئی نسخے محفوظ بھی تھے لیکن اس نے ابھی تک ان پر عملی کام نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں اگر وہ بھاندرناس کا سراغ پا بھی لیتا تو میری یا کسی دوسرے کیمیاگر کی مدد کے بغیر سونا تیار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

زیرو پوائنٹ پر مجھ سمیت بارہ افراد رہا کرتے تھے جن میں سے چار۔۔۔ کا تعلق جوئے خانے کی دیکھ بھال اور انتظام سے تھا۔ وہی لوگ زیرو پوائنٹ کے محافظ بھی تھے۔ اس شام میں زیرو پوائنٹ پر پہنچا تو کلب کے منیجر نے رشک آمیز لہجہ میں مجھے باقاعدہ ذمہ داریاں ملنے پر مبارکباد دی۔ اس سے پتہ چلا کہ میری شمولیت کے نتیجہ میں زیرو پوائنٹ میں مقیم بقیہ سات افراد نامعلوم مقامات کی طرف روانہ کر دیئے گئے تھے جبکہ ان کا سارا کام مجھے اور میرے آنے والے دو ماتحتوں کو سنبھالنا تھا۔

زیرو پوائنٹ پر آٹھ بجے سے گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ آنے والے کلب کے باقاعدہ ارکان تھے۔ ان کے علاوہ دو اجنبی جوڑے بھی آئے لیکن اُن کے پاس اس روز کے لئے خاص دعوت نامے تھے۔ امیر خان بذات خود زیرو پوائنٹ پر پہنچا ہوا تھا اور مہمانوں کے استقبال کے بہانے ایک ایک شخص کی کڑی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔ یہ احتیاط شاید اس لئے کی جا رہی تھی کہ کوئی کالی بھیڑ اندر نہ پہنچ پائے۔

نو بجے زیرو پوائنٹ کا صدر دروازہ اندر سے مقفل کر دیا گیا۔ تہہ خانے میں اس وقت ہلکی پھلکی موسیقی کے ریکارڈ دھیمے سروں میں گونج رہے تھے۔ ہر طرف شراب اور سگریٹوں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ آنے والوں میں بیشتر جوڑے تھے۔ ایک آدھ ہی تنہا مہمان تھا جو باقی لوگوں میں گھل مل گیا تھا۔

امیر خان جب تہہ خانے میں اترا تو سب سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں اس وقت کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح میزوں کے درمیان چکرا تا پھر رہا تھا تاکہ ذرا بھی موقع ملے تو خود کو کسی پارٹی میں شامل کر لوں۔ مجھے دیکھتے ہی امیر خان کے تیور سخت ہو گئے اور وہ سیڑھیوں پر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ میں اس وقت اسی کی طرف متوجہ تھا لیکن اس نے مجھے کوئی اشارہ کئے بغیر سرو کرنے والے۔۔۔۔۔ ایک آدمی کو کچھ ہدایات دیں اور خود واپس لوٹ گیا۔

وہ شخص تیر کی طرح میری طرف آیا اور سرگوشیانہ آواز میں بولا "جاؤ۔۔۔ امیر دادا اوپر بلا رہا ہے۔ اس وقت اس کا موڈ بہت بگڑا ہوا ہے!"

میں آہستہ آہستہ اوپر کی طرف چل دیا۔

امیر خان بڑے ہال میں کسی زخمی بھیڑیئے کی طرح ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑا "کیوں بے۔۔۔ کیا بھوکوں مرنے کا ارادہ ہے جو نیچے جا پہنچا ہے!"

اس کا لہجہ واضح طور پر توہین آمیز تھا لیکن میرے لئے بدکنا مناسب نہ تھا کیونکہ میں ابھی تک اپنا کوئی کارنامہ پیش نہ کر سکا تھا اس لئے مسکراتے ہوئے بولا "فکر نہ کرو۔۔۔ اگر میں ہار گیا تو بھوکا مر جاؤں گا مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا"

"بڑا ناز ہے تجھے اپنے کھیل پر!" وہ تلخ لہجہ میں غرایا "نیچے ایسے ایسے شاطر جمع ہیں کہ پلک جھپکتے میں اپنا کام دکھا جاتے ہیں"

"ایسا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے" میرا لہجہ اب بھی نرم ہی تھا "میری جیت میں آدھا حصہ تمہارا ہو گا۔ مجھے خود بھی چالاک حریفوں کے سامنے شارپنگ کے کمال دکھانے میں مزہ آتا ہے!"

"ہوں!" اس نے غرا کر زمین پر پیر مارا "اتنا یاد رہے کہ مجھے ہنگاموں سے سخت نفرت ہے اور ہارا ہوا جواری زخمی شیر ہوتا ہے۔ ہنگاموں سے بچنے کے لئے ہی یہاں زیادہ تر جوڑے مدعو کئے جاتے ہیں کیونکہ عورتوں کے سامنے مرد ذرا مہذب رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنا بتا دوں کہ تیری وجہ سے کسی تلخی نے جنم لیا تو میں خود گردن میں ہاتھ دے کر تجھے باہر پھینک دوں گا"

"میں خود ایسا موقع نہ آنے دوں گا۔ آج مدتوں بعد تو مجھے اپنے معیار کا کھیل کھیلنے کا موقع ملا ہے!" میں نے اس کی شرط منظور کرتے ہوئے کہا۔

پھر پہلے میں تہہ خانے میں پہنچا چند منٹ بعد امیر خان بھی نیچے ہی آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ایک میز کا انتخاب کر ہی لیا۔ وہاں دونوں پارٹیوں کے سامنے نوٹوں کے ڈھیر موجود تھے اور یہاں شارپنگ کے علاوہ ایک اور بھی کمال سامنے آیا۔ ایک فریق کے ساتھ والی خوبرو عورت جو شاید اس کی بیوی ہی تھی حریف کی کرسی کے پیچھے بڑے ناز کے ساتھ بیٹھی اس کے کارڈز دیکھ رہی تھی ساتھ ہی انگلیوں اور ہاتھوں کے اشاروں سے غیر محسوس طریقہ سے

اپنے شوہر کو حریف کے کارڈز سے باخبر کرتی جا رہی تھی۔ میں تو خود ان تمام مرحلوں سے گزرا ہوا تھا اس لئے پہلی ہی نظر میں صورت حال بھانپ گیا۔ ایک آدھ تماشائی کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی عورت کی معنی خیز حرکتوں کا مفہوم سمجھ رہا ہے۔ لیکن جب ہارنے والا ہی اس عورت کو خود سے اس قدر قریب پا کر اپنی عقل کھو بیٹھا تھا اور نہایت اطمینان سے لمبی رقمیں ہارے جا رہا تھا تو بھلا کوئی دخل اندازی کیوں کرتا۔

رات کے دو بجے تک میں صرف تماشا دیکھتا رہا۔ ہر طرف کھیل عروج پر تھا۔ ہارنے والے بے تحاشا شراب پی رہے تھے، سگریٹوں کا دھواں اڑا رہے تھے' ان کے چہرے پسینوں میں شرابور ہو رہے تھے' ہاتھوں پر رعشہ سا طاری ہو چلا تھا مگر وہ کھیلے جا رہے تھے۔ جیتنے والوں کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے اور وہ بات بے بات قہقہے لگائے جا رہے تھے۔

بازیاں ہوتی رہیں۔ رقمیں پھیلتی اور سمٹتی رہیں۔ آخر دو بجے میری منتخب کی ہوئی میز پر جگہ نکل آئی۔ عورت کا شکار قلاش ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور وہ عورت مسرت سے سرشار اپنے شوہر کی جیتی ہوئی رقم سمیٹنے لگی۔

اسی وقت مجھے امیر خان اس میز کی طرف آتا نظر آیا۔ شاید جیتنے والوں کو جیبیں جھاڑنے پر مجبور کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مگر میرے لئے اب صبر کرنا محال تھا۔ میری بے چین انگلیاں اپنا کمال دکھانے کے لئے بے چین تھیں۔ میں نے امیر خان سے نظریں چرائیں اور اس کے آنے سے قبل جیتنے والے کے سامنے جم گیا۔

"شاندار جیت مبارک ہو!" میں نے بیٹھتے ہی پرجوش لہجے میں کہا۔ "مجھے صفدر کہتے ہیں۔ آپ کا بے داغ کھیل دیکھ کر میں خود پر قابو نہ پا سکا۔ اچھے حریفوں سے ہار کر بھی مجھے دلی مسرت ہوتی ہے!"

عورت نے حیرت سے بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مرد کے چہرے پر غرور آمیز مسکراہٹ نظر آئی اور اس نے سرد مہری سے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا

"پرشوتم لعل"

اس کی سرد مہری کے باوجود میں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ کارڈز اٹھائے اور سیدھا کر کے ایک بار سامنے پھیلایا۔ وہ بالکل نئی گڈی تھی۔ جوکر الگ کرنے کے بعد میں نے حکم کی بیگم سب سے اوپر لگائی' بغیر کسی خوف کے اور دل ہی دل میں اپنی اس غیر ارادی حرکت پر مسکرا دیا۔

میرے ہاتھوں پہلی ڈیل ہوئی۔ امیر خان میرے بالکل سامنے' میرے حریف کی پشت پر کھڑا ہوا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اشارہ بازی کے لئے وہاں نہیں گیا ہے بلکہ سامنے آ کر وہ کارڈز بانٹنے کے دوران میری انگلیوں پر نظر رکھنی چاہتا ہے

تاش بانٹتے بانٹتے میں نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ امیر خان کا چہرہ ایک ثانیہ کے لئے دھواں ہو گیا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی بھی میری حرکت نوٹ نہ کر سکا تھا اور مجھے دل ہی دل میں امیر خان کی عقابی نظروں کا اعتراف کرنا پڑا۔ بہت کم لوگ میرے کمالات کو پکڑ پاتے تھے اور امیر خان ان میں سے ایک تھا۔

کھیل شروع ہو چکا تھا۔ بازی چھ سو روپے سے اوپر جا چکی تھی۔ اپنے حریف کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بڑے کارڈز دیئے تھے جو ایمانداری سے میرے پاس آنے تھے۔ نتیجہ حسب توقع نکلا۔ پہلی بازی میں ہارا اور وہ جیت گیا۔ اس کے چہرے کی سرخی اور گہری ہو گئی مگر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ ادھر امیر خان بھی میری حکمت عملی سمجھ چکا تھا اور اس کے چہرے سے دبا دبا جوش عیاں ہو رہا تھا۔

ماہر اور پیشہ ور کھلاڑیوں کی طرح میں نے یکے بعد دیگرے تین بازیاں ہاریں اور میری پونجی دو ہزار سے صرف چند سو روپے رہ گئی۔ میرے حریف کو خود پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہو چکا تھا اور وہ بڑھ چڑھ کر بازی لگا رہا تھا۔ اب میرے سنبھلنے کی باری تھی!

چوتھی بازی میں وہ ہارا تو اسے ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے آگے رکھے ہوئے نوٹوں کے انبار میرے سامنے منتقل ہونے لگے۔ اس نے یکے بعد دیگرے بہترین روسی وہسکی کے تین ڈبل پیگ اپنے معدے میں انڈیلے۔ اس کی بیوی اضطراب کے عالم میں میرے عقب میں آ کھڑی ہوئی مگر میں اس سے ہوشیار تھا۔ وہ کارڈز دیکھنے کے لئے میرے اوپر جھکی پڑ رہی تھی اور میں بار بار کرسی سرکا کر خود کو اس کے وار سے بچا رہا تھا۔ ہارنے والے کی پرامید نظریں بار بار اپنی بیوی کی جانب اٹھتیں اور کوئی جواب نہ پا کر مایوسی کے عالم میں کارڈز پر جم جاتیں!

صبح کے پانچ بجنے سے قبل وہ باون پتے اپنا فیصلہ صادر کر چکے تھے۔ اس چار پانچ بازیاں ہارنے کے بعد ہر ڈیل پر نئی اور سربند گڈیاں لیں لیکن اپنا مقدر نہ بدل سکا۔ اس کا مقدر تو میری انگلیوں میں پوشیدہ تھا جنہیں بدلنا اس کے بس سے باہر تھا۔

ساری رقم ہارنے کے بعد کلب کے دستور کے مطابق اس نے میرے آگے سے دو سو روپے اٹھائے اور اپنی بیوی کے ساتھ بوجھل قدموں سے لڑکھڑاتا نیم تاریک گوشے میں پڑے ان صوفوں کی طرف چل دیا جہاں پہلے سے کئی ہارے ہوئے جواری موجود تھے۔ کراچی کے معزز قمار خانوں کی طرح زیرو پوائنٹ کا بھی دستور یہی تھا کہ ہر پوری رات کا بل وہی شخص ادا کرتا تھا جو آخر میں جیت کر اٹھا ہو۔ کھیل ادھورا رہنے کی صورت میں ہر فریق اپنا اپنا بل ادا کرتا تھا۔ میں نے اس ضمن میں گیارہ سو روپے کے قریب رقم ادا کی جو آتشیں سیال کی صورت میں معدوں میں اتر چکی تھی! میں نے حساب کیا تو میری اس رات کی خالص جیت اکیس ہزار روپے سے اوپر تھی!

وقت کم رہ گیا تھا اس لئے میں نے مزید کھیلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور جب چھ بجے شراب کے نشہ میں دھت' ہارے ہوئے جواری اور جیتتے ہوئے شہسوار لڑکھڑاتے ہوئے تہہ خانے سے نکلنے لگے تو میں بھی ساری رقم سنبھال کر اپنے کمرے میں آ گیا

مجھے یقین تھا کہ نیچے سے فرصت پا کر امیر خان سیدھا میرے ہی پاس آئے گا اور ہوا بھی یوں ہی۔ کچھ دیر بعد وہ خود مسرت سے سرشار میرے پاس آیا اور مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ "کیا کام دکھایا ہے تو نے میرے یار! دل خوش کر دیا!"

"میری جیت میں آدھا حصہ تمہارا ہے!" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ تمام رقم تیری ہے ۔۔۔ اس بار یہ جوا تیرا شوق تھا۔ آئندہ تیرا پیشہ ہو گا۔ تیرے پاس کافی رقم موجود ہے۔ صبح ہوتے ہی تو زیرو پوائنٹ چھوڑ دے۔ یہاں آنے والوں کو اگر شبہ ہو گیا کہ تیرا تعلق کسی نہ کسی طرح کلب کی انتظامیہ سے ہے تو یہ کلب ویران ہو جائے گا۔ اب تو ہم سے الگ رہ کر شہر ہی سے سارا کام چلائے گا۔" خوشی سے اس کا لہجہ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ "اور آئندہ سے تو ہفتہ میں دو دن کلب آ کر جوا کھیلا کرے گا۔ جیت میں ایک چوتھائی تیرا حصہ ہو گا۔ تین چوتھائی رقم گروہ کی ملکیت ہو گی جس کی باقاعدہ رسید تجھے کلب کے منیجر سے ملا کرے گی۔"

"اگر ہمارا سربراہ میری ضروریات پوری کرتا ہے تو میں جیت کی پوری رقم سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔" میں نے فیاضانہ پیشکش کی۔

"نہیں ہمارے معاملات جذباتی سطح پر نہیں چلتے اور اصول شکنی کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو بات میں نے طے کر دی وہ بہت معقول ہے!"

امیر خان کے چلے جانے کے بعد کلب کے چاروں آدمی میرے پاس آئے وہ پرشوتم لعل کے مقابلہ میں میری کارگزاری سے بہت مرعوب تھے۔ ان کی مبارکباد کے جواب میں میں نے انہیں ایک ہزار روپیہ فی کس دیا اور اجالا پھیلنے سے پہلے زیرو پوائنٹ کو خیرباد کہہ دیا۔

شہر میں کرائے کے مکان کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن میں نے نئی پیشہ ورانہ مصروفیات کے مدنظر بارونق علاقہ کے بجائے ایک دور افتادہ آبادی کو ترجیح دی جہاں میری وقت بے وقت مصروفیات کسی کی نظر میں آنے کا امکان نہ تھا۔

نئے آراستہ مکان میں آ کر بے اختیار میرا دل بھاری ہو گیا۔ مجھے کراچی کی فیشن ایبل بستی کا وہ بھرا پرا مکان یاد آیا۔ جسے ہار کر میں سڑکوں پر نکل آیا تھا' کلفٹن برج سے نیچے کا وہ ویران چوراہا یاد آیا جہاں میں نے آخری شکست کے بعد اپنی خوبرو سکریٹری سوزی کو الوداع کہا تھا۔ پھر میں مقدر کی ستم ظریفیوں پر افسردہ انداز میں مسکرا دیا۔

جس پیشہ سے میں ذلیل و خوار ہو کر نکلا' آہستہ آہستہ دوبارہ اسی طرف جا رہا تھا۔ اسمگلنگ' جوا' شراب اور شباب ۔ میرے پیدائشی شوق پھر مجھے پکار رہے تھے۔ بے سروسامانی کے عالم میں جب میں کراچی سے فرار ہوا تو در بدر کی خاک چھانتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں دوبارہ اس پیشے کا رخ کر سکوں گا۔ جہاں پیسہ کے بغیر باعزت موت بھی مشکل ہے لیکن وقت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا اور میں پرانا کھیل نئے انداز میں کھیلنے جا رہا تھا؟

اس روز دوپہر کے وقت میں رائل ہوٹل میں تنہا بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو دو خوش پوش افراد میری طرف بڑھتے نظر آئے۔ ان کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایسے لباس کے عادی نہیں ہیں اور انہیں مجبوری کی بنا پر یہ وضع قطع اختیار کرنی پڑی ہے۔

میرے قریب آ کر وہ رک گئے اور ان میں سے ایک قدرے خم ہو کر مؤدبانہ لہجہ میں بولا۔

"ہمیں آپ کے پاس حاضری کا حکم ملا ہے!"

"تم سے یہاں چلے آنے کو کس نے کہا تھا؟" میں ان دونوں کو گھورتے ہوئے غصیلی آواز میں بولا اور اسی وقت ہوٹل کے دروازے پر مجھے امیر خان کا چہرہ نظر آیا۔ اور میں کھانا ادھورا چھوڑ کر ایک بڑا نوٹ ڈش کے نیچے دبا تا تیزی سے باہر آ گیا کیونکہ امیر خان اس وقت خاصا بدحواس سا نظر آ رہا تھا اور اس کی پریشانی یقیناً بلاسبب نہیں تھی!

امیر خان نے کچھ کہے بغیر میرا ہاتھ تھاما اور مجھے ساتھ لیتا چلا گیا۔ اس کی جیپ میں پہلے سے دو آدمی موجود تھے اور پچھلے حصے میں خودکار رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔!

"تم دونوں اسلحہ لے کر صفدر کی جیپ میں ہمارے پیچھے آؤ۔"

امیر خان نے یہ کہتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے تیزی کے ساتھ آگے لیتا چلا گیا۔ میرے پاس آنے والے دونوں نو وارد بھی اس دوران میں جیپ میں سوار ہو چکے تھے۔!

"کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان ہو؟" میں نے اس کی غیر محتاط ڈرائیونگ اور اس کے شکن آلود چہرے پر رائے زنی کی۔

امیر خان کے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان امڈ پڑا" میں اس ذلیل کو کھٹمنڈو کی سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر ماروں گا۔ نمک حراموں سے نمٹنا مجھے خوب آتا ہے!"

میں دم بخود رہ گیا۔ اسے مزید چھیڑنا مناسب نہ تھا!

"تو تیار ہے نا؟۔ شاید کشت و خون کی نوبت بھی آ جائے!"

اچانک امیر خان نے بدلے ہوئے خونخوار لہجہ میں کہا اور میں کانپ کر رہ گیا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے اس وقت خون کی بو آ رہی تھی اور وہ بھیڑا ہوا بھیڑیا لگ رہا تھا۔

میں نے عقبی حصہ سے ایک رائفل اٹھائی' میگزین چیک کیا اور رائفل پہلو میں کھڑی کر لی" میں تمہارے ساتھ جہنم میں کودنے کو بھی تیار ہوں!"

"پرشوتم لعل!" اس نے دانت پیس کر کہا اور غیر ارادی طور پر جیپ کی رفتار تیز کر دی۔" اس کی آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔ سالا پارسا بنتا ہے رشوت کے نام سے رام رام کرتا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کمینہ ہے۔ بے شرم اپنی بیوی کی کمائی کھاتا ہے۔ جوئے میں شارپنگ کے ساتھ ساتھ بیوی کے ذریعہ بھی بے ایمانی کرتا ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں زور زور سے بڑبڑ لئے جا رہا تھا۔" پچھلے چند مہینوں میں میرے کلب سے اس نے کم از کم ڈیڑھ لاکھ روپیہ جیتا ہے۔ میں دانستہ اسے جیتنے اور بے ایمانی کرنے کے مواقع دیتا رہا کیونکہ میرے پاس اس کی نیچ حرکتوں کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ اس کے منہ کو خون لگا ہوا ہے۔ جب تک جیتتا رہا ہمارے دھندے سے چشم پوشی کرتا رہا اور رات بیس بائیس ہزار کی ہار نہ سہہ سکا جس میں اس کے کل چھ ہزار روپے تھے۔ اگر رات ہی مجھے یقین ہوتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے کر گزرے گا تو اس کی لاش تک زیرو پوائنٹ سے باہر نہ جا پاتی ۔۔۔ خیر ۔۔۔ خیر میں اب اسے دیکھوں گا!"

میں چند ثانیوں تک خاموش رہا۔ امیر خان کی جیپ کسی بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح تیزی کے ساتھ ناہموار پہاڑی راستوں پر آبادی سے باہر دوڑی جا رہی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گرد و غبار کے بادل میں میری جیپ بھی چلی آ رہی تھی!

"پرشوتم لعل سے کیا کمینگی سرزد ہوئی ہے استاد؟" بوجھل سکوت کے بعد میں نے دبی زبان میں اس سے پوچھ ہی لیا۔

اس نے دکھتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا۔

"اس نے ہارنے کے بعد رات ہی مجھ سے کہا تھا کہ صبح نو بجے تک اسے ہاری ہوئی رقم بنگلہ پہ واپس مل جانی چاہیئے ورنہ وہ ہمارے ٹھکانے پر ریڈ کرلے گا۔ اس وقت وہ نشہ میں بری طرح دھت تھا۔ میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور ہنس کر ٹال گیا لیکن وہ حرامزادہ تھوڑی ہی دیر قبل مسلح پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ ان پہاڑیوں کو گھیرے میں لے چکا ہے جہاں غاروں میں لاکھوں روپے کا مال پوشیدہ ہے۔!"

اب ساری بات واضح ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جن راستوں پر امیرخان کی جیپ جا رہی تھی گو وہ ویران تھے مگر وہاں ٹائروں کے بہت سے نشانات گڈمڈ تھے جس کا مطلب تھا کہ گروہ کے آدمی اس راستے کو بکثرت استعمال کرتے رہے ہیں۔ اور پولیس کی گاڑیاں بھی شاید اسی راستے سے گئی تھیں۔

تقریباً نصف گھنٹہ کے سفر کے بعد امیرخان نے جیپ دو پہاڑیوں کے درمیان داخل کر دی اور دوسری طرف پہنچنے کے بعد انجن بند کر دیا۔ دوسری جیپ بھی پل بھر میں وہیں آر کی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ باہر والے راستے سے ان جیپوں کا دیکھ لیا جانا ناممکنات میں سے تھا!

ہم چھ آدمیوں نے امیرخان کی جیپ سے رائفلیں سنبھالیں اور میگزین کے وزنی تھیلے کندھوں پر لاد کر اس کے پیچھے پیچھے پہاڑیوں پر چڑھنے لگے۔

ہمارے سفر کا یہ حصہ خاصا کٹھن تھا۔ میں ایسی مہمات کا عادی نہ ہونے کے سبب جلد ہی ہانپ گیا۔ امیرخان کسی تازہ دم چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ رک رک کر ممکنہ کمین گاہوں میں پولیس کے مخبروں کو بھی تلاش کرتا جا رہا تھا جن کا وہاں کوئی وجود نہیں تھا!

تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک ایسی چوٹی پر جا پہنچے جس کی دوسری جانب پیالے نما وادی میں پولیس کے تین دیوہیکل ٹرک ایک سرکاری جیپ سمیت موجود تھے دس بارہ پولیس والوں کی مسلح جمعیت چار آدمیوں کو بندوقوں کی نال پر کور کئے کھڑی تھی۔ ان چاروں کے ہاتھ بلند تھے اور وہ خاصے سراسیمہ نظر آرہے تھے۔ ہم کچھ دیر تک سینوں کے بل چوٹی پر لیٹے وادی میں ہونے والی کارروائیوں کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر امیرخان کی ہدایت پر زمین سے چپکے چاروں طرف پھیلنے لگے۔

وادی میں پرشوتم لعل پولیس افسر کی وردی میں موجود ساری کارروائی کی نگرانی کر رہا تھا۔ بہت سے پولیس والے پہاڑی غاروں میں سے بے شمار چھوٹے بڑے سربند چوبی کریٹ لا لا کر باہر جمع کر رہے تھے جن میں یقیناً ...پر اسمگل کی ہوئی دیگر اشیاء کے ساتھ منشیات کی بھی بھاری مقدار رہی ہوگی۔

میں نے ایسی جگہ سنبھالی ہوئی تھی جہاں سے پرشوتم لعل کا داہنا پہلو میری زد میں تھا اور میں رائفل کی نال سیدھی کئے امیرخان کے پہلے فائر کا منتظر تھا!

کئی منٹ تک فضا میں موت کا بوجھل سکوت چھایا رہا۔ پھر پہاڑیاں رائفل کے ہولناک فائر سے لرز اٹھیں۔ امیرخان نے کم از کم دو سپاہیوں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔

یہ اشارہ پاتے ہی بیک وقت مزید پانچ رائفلیں گونجیں اور ... میں خاک و خون کی برسات کر گئیں۔ میرے فائر نے نہ جانے کس کس کو ڈھیر ... مگر پرشوتم لعل زمین پر گر کر خود کو بچا گیا۔

امیرخان کے زیرِ حراست ساتھی مہلت پاتے ہی نہ جانے کدھر ... بھاگے تھے۔ پولیس کے تمام عملہ میں سخت افراتفری اور چیخ پکار مچ گئی۔ وہ ... ٹرکوں کی آڑ لیتے غاروں میں گھس جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن چوطرفہ ... فائرنگ نے ان کی نجات کی تمام راہیں مسدود کی ہوئی تھیں۔

اسی وقت ایک ٹرک حرکت میں آیا اور میری گولی ونڈشیلڈ کے ٹکڑے ... اڑاتی ڈرائیور کا کام تمام کر گئی۔ پھر ایک اور معجزہ رونما ہوا۔ وادی ہی میں پولیس ... فائر کھول دیا گیا۔ شاید پولیس کی حراست سے بچنے والے چاروں افراد اپنے ... پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے!

کئی منٹ تک پولیس والے اندھا دھند فائرنگ کرتے رہے پھر ... عقل آئی کہ اصل حملہ اونچی پہاڑیوں سے کیا گیا ہے لہٰذا انہوں نے ہوائی فائرنگ شرو... کر دی جو ہمارے لئے بالکل بے ضرر ثابت ہو رہی تھی۔ جبکہ ہمارا ایک ایک کارتوس پورا کام دکھا رہا تھا!

پھر اوپر دو رائفلیں خاموش ہو گئیں۔ میں نے سامنے والی پہاڑی سے ... کو رائفل سنبھالے تیزی سے نیچے جاتے دیکھا۔ وہ چوپایوں کی طرح پھرتی سے نیچے رینگ رہا تھا آخر ایک جگہ وہ میری نظروں سے معدوم ہو گیا۔

پولیس کے ساتھ تواتر کے ساتھ نصف گھنٹہ تک فائرنگ ہوتی ... دو ٹرک شاید ناکارہ ہو چکے تھے۔ کیونکہ زخمی اور بچ جانے والے تمام سپاہی ... ٹرک میں سوار ہو کر آندھی کی سی رفتار سے اس وادی سے نکل گئے جہاں ان پر ... سے موت کا حملہ ہو رہا تھا!

نیچے سے جوابی فائرنگ کا سلسلہ ختم ہونے پر اوپر بھی خاموشی چھا... لیکن ہم میں سے کوئی سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا۔ پھر مجھے نیچے امیرخان نظر آیا۔ خون میں نہایا ہوا تھا اور پرشوتم لعل کو گریبان سے کھینچتا ہوا وسط میں لا رہا تھا۔

ہمارے نیچے پہنچنے سے قبل ہی پولیس سے نجات پانے والے چاروں ... بھی کمین گاہوں سے نکل آئے تھے۔ وادی میں نو پولیس والے بے سدھ خون میں ... پڑے ہوئے تھے۔ ان میں صرف دو زخمی تھے باقی سات ہر منزل سے گزر چکے تھے ...

پرشوتم لعل کی حالت بہت ابتر تھی۔ اس کی داہنی ران میں آیا ... آیا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے لئے کھڑا ہونا بھی محال تھا اس کے علاوہ امیرخا... کے آہنی گھونسوں نے اس کا لہولہان چہرہ سجا کر رکھ دیا تھا۔ ویسے امیرخان کا بھی با... شانہ بری طرح زخمی تھا جس سے ابھی تک خون کی بوندیں گر رہی تھیں اور زمین ... رہی تھیں۔

اس وادی میں امیرخان کے آدمیوں کا ایک ٹرک صحیح سالم موجود تھا ... سامان کسی نہ کسی طرح اس میں لاد گیا۔ شناخت کے تمام نشانات تلف کئے گئے اور ...

... مسلح آدمیوں سمیت تیزی کے ساتھ کسی گمنام منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ امیرخان میری مدد سے زخمی پرشوتم کو سنبھالتا پہاڑی پر واپس لوٹنے ... زخمی اور مردہ سپاہی اسی حالت میں چھوڑ دیئے گئے تھے۔

ہم اس تنگ وادی میں پہنچے جہاں جیپیں چھوڑی گئی تھیں تو ٹرک سے ... والا ایک شخص پہلے سے یہاں موجود تھا۔ شاید ٹرک والے فرار ہوتے ہوئے اسے وہاں ... گئے تھے!

امیرخان نے بے رحمی کے ساتھ رائفل کے کندے سے پرشوتم کی کنپٹی پر ضرب ... اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔

اپنے قیدی کے ہمراہ روانہ ہوتے ہوئے امیرخان نے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے ... کیا اور دونوں جیپیں برق رفتاری کے ساتھ ایک نئے راستے پر روانہ ہو گئیں۔

سہ پہر کے قریب ہم پہاڑوں کے درمیان واقع کسی عظیم الشان قدیم ... کے کھنڈرات میں جا پہنچے۔ یہاں امیرخان نے اپنے شکاری چاقو کی نوک سے گرد آلود ... پر جمی ہوئی ایک بڑی سی سل کے اطراف سے مٹی صاف کی اور زور لگا کر وہ سل ... ایک طرف کھسکا دی جیسے وہ کسی سرکنے والے میکنیزم سے وابستہ رہی ہو۔ اب ہمارے ... نے ایک تہہ خانے کی سیڑھیاں موجود تھیں۔

ہم تینوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ بے ہوش پرشوتم کو تہہ خانے میں پہنچا... تہہ خانے میں اوسط درجہ کا ضروری ساز و سامان موجود تھا۔ ایک طرف موم بتیوں کے کئی ... موجود تھے اور تہہ خانے کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عمارت مسمار ہو جانے کے بعد ... وقتاً فوقتاً انسانی استعمال میں آتا رہا ہے!

مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ اس بار میں جن ہاتھوں میں پھنسا ہوں وہ ناقابلِ یقین حد تک بے رحم اور دراز ہیں!

فرسٹ ایڈ کے ادھورے سامان سے امیرخان کا زخم صاف کیا گیا تو پتہ چلا زخم گہرا نہیں ہے بلکہ گولی شانہ کی کھال ادھیڑتی گزر گئی ہے۔ ڈریسنگ کے بعد امیرخان نے وہیں موجود نیا لباس تبدیل کیا اور مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"یہاں پانی کی کمی ہے ذرا الماری میں سے واڈکا کی ایک بوتل اور تین گلاس ... لاؤ۔"

میں نے فوراً ہدایت کی تعمیل کی۔ وہ الماری دو تین اعلیٰ اقسام کی شرابوں سے بھری ہوئی تھی!

"اب وہ بھی آتی ہی ہوگی!" وہسکی کا پہلا گھونٹ لے کر امیرخان نے اپنی برسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے استفسار طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

"تتلی — میں اس چالاک تتلی کی بات کر رہا ہوں جو اکثر پرشوتم کی جیت کا باعث بنی تھی۔"

"اوہ!" میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"اس کا یہاں آنا بہت ضروری تھا۔" امیرخان اپنا زخم بھول کر سرور میں آتا جا رہا تھا۔ "پولیس ہیڈ کوارٹر میں کسی کو علم نہیں تھا کہ پولیس کمشنر اتنی بھاری مسلح جمعیت لے کر کہاں اور کس اطلاع کی بنیاد پر چھاپہ مارنے جا رہا ہے۔ ہاں پرشوتم کی گمشدگی کے بعد اس کی بیوی دوسرے حکام کو پچھلی رات کے قصے کی خبر دے سکتی تھی مگر اب وہ بھی یہاں ہوگی! مگر بھاگنے والے سپاہی تو بتا سکتے ہیں کہ چھاپہ ہمارے ٹھکانے پر مارا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میرے کھیل اتنے کچے نہیں ہوتے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ہمارا ٹھکانا ہے۔ پرشوتم کو تو اتفاقاً اس کا سراغ مل گیا تھا اور وہ اپنی زبان بند رکھنے کی قیمت کے طور پر مجھ سے زیرو پوائنٹ کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا ورنہ میں تو دس بیس ہزار میں قصہ نمٹانے کو تیار تھا! اور اب مال ہٹا دیئے جانے کے بعد کوئی طاقت اس اڈہ سے ہمارا تعلق ثابت نہیں کر سکتی۔"

"میں تمہاری منصوبہ بندی اور ہنگامی تدابیر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"میرا کام صرف منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ ہمارا سربراہ بہت باخبر رہتا ہے۔ چھاپے کی اطلاع کے ساتھ ہی جوابی کارروائی کا منصوبہ اسی نے بنایا تھا۔ اس خیال میں بھی نہ رہنا کہ اس کی مرضی کے بغیر میں یا کوئی دوسرا رکن کوئی اہم کارروائی کر سکتا ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"وہ یقیناً زبردست دماغ کا مالک ہے۔ میرے دل میں اس سے ملاقات کی تمنا جاگ اٹھی ہے۔"

"تم اس سے ملو گے؟" وہ ہنس دیا۔ "میں اس کا معتمد ہونے کے باوجود آج تک اسے نہ دیکھ سکا۔ وہ تو بس ایک خیال ہے۔ ہر جگہ ہے اور کہیں بھی نہیں ہوتا!"

اسی وقت پرشوتم نے کراہ کر پہلو بدلا۔

"اس کے زخموں پر تھوڑی سی شراب ڈال دے سیٹھی!" امیرخان نے پرشور قہقہہ لگا کر اپنے ساتھی سے کہا۔ "سالا جلدی ہوش میں آجائے گا۔"

سیٹھی نے کسی زرخرید غلام کی طرح امیرخان کی ہدایت پر عمل کیا اور پرشوتم نے واقعی تڑپ کر آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ پیر پھینکتا فرش سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"سور کے بچو... ھم... میں کہاں ہوں؟" زخموں کی سوزش سے بےچین ہو کر وہ پوری قوت سے چیخ پڑا۔

امیرخان نے سفاکانہ انداز میں اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا اور تلخ لہجے میں بولا۔

"نیچی آواز میں بات کرو پرشوتم صاحب' اس وقت تم اپنے دفتر میں نہیں امیرخان کے روبرو ہو!"

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے امیرخان کی طرف دیکھا اور تکلیف سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا

"تو یہ بازی بھی تمہاری ہی رہی... میں سمجھوتہ کے لئے تیار ہوں!"

"سمجھوتہ!" تہہ خانہ کی محدود فضا میں امیرخان کے طویل وحشیانہ

قہقہہ کی گونج نے میرے اعصاب تک کو ہلا کر رکھ دیا۔

"پولیس کمشنر صاحب آپ اتنے مجبور کب سے ہو گئے!"

پرشوتم نے کراہ کر پہلو بدلا اور نقاہت زدہ آواز میں بولا۔

"میرا مقصد تم سے ٹکراؤ نہیں تھا۔ میں دباؤ کے ذریعہ تمہیں بلیک میل کرنا چاہ رہا تھا۔"

"ضرور بلیک میل کرو!" امیر خان بوتل سے شراب انڈیلتے ہوئے لاپرواہی کے انداز میں بولا۔

"شاید تمہاری شرائط ہمارے لئے قابل قبول ہوں!"

"میں مذاق نہیں کر رہا کتے کے بچے!" وہ بے بسی کے ساتھ پوری قوت سے چیخا مگر امیر خان کے بھرپور تھپیڑ کی وجہ سے باقی الفاظ اس کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔

"اف... میں کس مشکل میں پھنس گیا" وہ روہانسی آواز میں بولا۔

"کم از کم میرے زخموں کی ڈریسنگ تو کرا دو، میرے بدن میں آگ سی لگ رہی ہے!" اذیت کے باعث وہ بار بار بے چین ہو کر پہلو بدل رہا تھا۔

"آگ تو میرے بدن میں بھی لگ رہی ہے!" امیر خان کا لہجہ یک بیک بے رحمانہ ہو گیا" جی چاہتا ہے کہ تیرے بدن کے چیتھڑے اڑا ڈالوں!"

"مجھے رہا کر دو۔ مجھے رہا کر دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے ہونٹ بالکل سی لوں گا" آہستہ آہستہ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

"سیٹھی۔ یہ حرامزادہ میرا نشہ خراب کر رہا ہے۔ اسے خاموش کر دے!"

امیر خان بیزاری کے عالم میں بولا۔

پرشوتم نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر سیٹھی نے اتنی قوت سے اس کی کنپٹیاں دبائیں کہ پل بھر میں وہ کسی بے جان کیچوے کی طرح فرش پر ڈھلک گیا۔

امیر خان بوتل لئے میرے قریب سرک آیا اور ہم تینوں گمبھیر خاموشی میں خالص شراب سے شغل کرنے لگے۔ سیٹھی شاید نیٹ پینے کا عادی نہ تھا۔ اسے ایک دو بار کھانسی کا دورہ پڑا اور امیر خان نے غصیلے انداز میں اس کا گلاس چھین کر فرش پر دے مارا!

بوتل خالی ہو جانے پر امیر خان بھاری آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر خطرناک انداز میں مسکرایا۔

"اس الماری سے گڈی لے آ برخوردار۔ ذرا میں بھی تیری شارپنگ دیکھوں!"

میں الماری سے سربند گڈی لے آیا۔ سیٹھی نے شمعدان قریب کھسکا لیا اور میری انگلیاں حکم کی بیگم تلاش کرنے لگیں۔

"ذرا ہوش میں رہ کر پتے بانٹنا۔ میں نے ہیرا پھیری پکڑ لی تو بے دریغ تھپڑ ماروں گا۔" امیر خان نے تادیبی لہجہ میں کہا۔

میں مسکرا دیا" اور تمہاری چالبازی پکڑ لوں تو؟"

"میں پتے نہیں بانٹوں گا" وہ مکارانہ انداز میں مسکرایا۔

"یہ معاہدہ یک طرفہ ہے، دس پتی ہوگی"

میں نے ایک طویل سانس لیا اور تیزی کے ساتھ پتے بانٹنے لگا۔ ... نے کارڈ اٹھائے تو میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"کیا ہے بے؟" امیر خان نے آنکھیں پھاڑیں۔

"تمہارے ہاتھ کی مورتیں گنواؤں؟" میں نے کہا۔

"کیا؟" اس نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

"چڑی کا غلام اور اینٹ کا بادشاہ!" میں نے فاتحانہ لہجہ...

امیر خان نے غصہ کے عالم میں پتے فرش پر دے مارے ... تین بار ایسا ہی ہوا تو امیر خان کے چہرے پر حیرت کی پرچھا... ناچنے لگیں۔

"تُو تو میرا ہے میرا۔۔۔ قسم پروردگار کی میں نے ایسا ... تک نہیں دیکھا۔!"

"آہستہ آہستہ تمہیں بھی سکھا دوں گا" میں نے کہا۔

"دوست، امیر خان ساتھیوں کے منبر پر ڈاکہ نہیں مارتا تجھے مبارک ہو، میرے لئے اپنے ہی کام بہت ہیں۔!"

اسی وقت باہر سے کسی جیپ کے انجن کی غراہٹ سنائی ... ہوتی سنائی دی اور امیر خان "آ گئے" کا نعرہ مارتا تیزی سے سیڑھیوں ... لپکا۔ غیر ارادی طور پر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تاکہ آنے والوں کا ... کر سکوں۔

باہر شام کا دھندلکا پھیل چلا تھا۔ امیر خان باہر نکلا تو ا... سے سرسراتی ہوئی سرگوشیانہ آواز ابھری" باس"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ امیر خان کے قدم تو گویا ... کر رہ گئے تھے۔ میں نے سامنے دیکھا تو ایک دراز قامت سایہ کسی بے ... ہیولے کو داہنے کندھے پر لادے کھنڈرات کو عبور کرتا بے تکان ... چلا آ رہا تھا۔ اس کی مٹیالے رنگ کی جیپ کی اڑائی ہوئی گرد ابھی تک ... میں موجود تھی!

وہ دراز قامت سایہ بے جان نسوانی ہیولے کو ... پر لادے ہمارے قریب آ گیا۔

"باس۔ آج آپ؟" امیر خان کے منہ سے تحیر زدہ سی آواز...

وہ دراز قامت سیاہ رنگ کے ڈھیلے لباس میں ملبوس تھا ... اس کا چہرہ ایک نقاب کی اوٹ میں پوشیدہ تھا مگر یہ واضح تھا کہ وہ اکہ... اور بے پناہ قوت کا مالک ہے۔ اس کے شانے پر لدی ہوئی عورت کا چہرہ ... کی پشت پر جھول رہا تھا۔ عورت کے بدن پر نیلے رنگ کا اسکرٹ موجود تھا ... پڑی ہوئی بے شمار شکنیں بتا رہی تھیں کہ ہمارا باس اسے بے ہوشی کی ... میں جیپ کے عقبی حصہ میں ڈال کر لایا ہے!

اس سے پہلے کہ میں زبان کھولتا، اس نے میری طرف سر گھمایا اور نقاب کے دو سوراخوں کے عقب سے چمکدار پتلیاں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے ہماری نگاہیں چار ہوئیں مگر میں ان کی تاب نہ لا سکا اور نظریں جھکا لیں۔

"صفدر علی!" آنے والے نے پہلی بار بھرائی ہوئی آواز میں زبان کھولی: "میں اپنی تنظیم میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں!" اس نے صاف ستھری اردو میں کہا۔

"شش... شکریہ باس!" میں اس سے اس قدر مرعوب ہو گیا تھا کہ بس ہکلا کر رہ گیا۔

اسی وقت امیر خان نے بڑھ کر باس کے شانے سے لڑکی کو سنبھالنا چاہا لیکن وہ خوابناک بھاری آواز میں دھیمے سے مسکرا دیا: "اسے چھوڑ دو امیر خان۔ شاید آج ہی میں اس چالاک لڑکی کو تمہارا انعام قرار دے سکوں، تم نے پورے منصوبے پر بہت کامیابی سے عمل کیا ہے!"

پھر امیر خان کی رہنمائی میں باس اور میں اس تہہ خانے میں جا پہنچے یہاں سیٹھی زیادہ شراب پی جانے کے باعث کرسی پر بیٹھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر موم شمعوں کو گھور رہا تھا۔ اس کے قریب ہی قالین پر پرشوتم لعل بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

باس نے اس عورت کو آہستگی سے قالین پر ڈال دیا۔ اور اب میں نے دیکھا کہ وہ بہت ہی محتاط شخص ہے۔ اس کے ہاتھوں پر بیش قیمت باریک دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ شاید وہ کہیں بھی اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑنے کا عادی نہیں تھا۔

سیٹھی نے جوں ہی سیاہ نقاب پوش کو دیکھا بوکھلا کر کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر فرش پر ہی الٹ گیا۔ اس کے منہ سے ایسی دبی دبی خوفزدہ آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی سردی کھایا ہوا کتے کا پلا بول رہا ہو!

"امیر خان!" اچانک نقاب پوش کی خوابناک اور بھاری آواز ابھری" سیٹھی کو باہر میری جیپ میں پہنچا دو ورنہ یہ دہشت سے یہیں مر جائے گا!"

امیر خان کے بڑھنے سے قبل ہی سیٹھی بوکھلائے انداز میں سیڑھیوں کی جانب دوڑ پڑا۔ تنظیم کے سربراہ کی موجودگی کا یقین ہوتے ہی اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

"یہ باون پتے کیسے بکھرے ہوئے ہیں امیر خان؟" نقاب پوش اطمینان کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اس... اس کا کھیل دیکھ رہا تھا باس!" امیر خان خوف زدہ اور بوکھلائی ہوئی آواز میں ہکلاتے ہوئے بولا۔

اس نے جلد نما دستانے اتارے بغیر جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگائی اور چھت پر نظریں جما کر پرخیال انداز میں پے در پے گہرے کش لینے لگا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں ہم لوگوں کی موجودگی کو یک بیک فراموش کر بیٹھا ہو۔

ہم دونوں مجرموں کی طرح نظریں جھکائے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے چور نظروں سے قالین پر بے ہوش پڑی ہوئی عورت کی طرف دیکھا نیلے اسکرٹ سے نیچے دمکتی سرخ و سفید ٹانگیں ساکت تھیں۔ ایک پیر میں نیلے رنگ کی سینڈل موجود تھا۔ دوسرا سینڈل شاید کہیں رہ گیا تھا۔ اس کا کھلے گریبان والا بلاؤز اس کی روشن خیالی کی عکاسی کر رہا تھا۔ خوبصورتی سے انگریزی وضع کے ترشے ہوئے بال، کشادہ پیشانی، غزالی آنکھیں، ستواں ناک، کھلتا ہوا گلابی چہرہ، سلگتے ہوئے بھرے بھرے ہونٹ اور نچلے ہونٹ کے داہنے گوشے پر بڑا سا تل اس قتالۂ عالم کو بآسانی ملکۂ حسن کا خطاب دلوا سکتا تھا۔ میری نظریں خدوخال سے الجھتی بلاؤز کے گریبان پر آ جمیں۔ تہہ خانے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا اور اس سکوت میں میری سانسوں کی آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے زیرو پوائنٹ میں جوئے کی پہلی رات بھی اسے دیکھا تھا لیکن اس وقت میں اس پر مائل نہ ہو سکا تھا اور اس وقت مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ جوئے کی کسی چالاک حریف کو سامنے پاکر عورت کے حسن کے معاملے میں بے حس سے ہو جاتے ہیں

"صفدر!" تہہ خانے کی محدود فضا میں اچانک بھرائی ہوئی فیصلہ کن آواز ابھری اور میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ نقاب پوش کی جلتی ہوئی آنکھیں سیاہ سوراخوں کے عقب سے میری طرف نگراں تھیں۔ موم شمعوں کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں وہ آنکھیں کسی آسیب کا پرتو لگ رہی تھیں " تم جس مقصد سے بھی نیپال میں گھسے ہو اب اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ گے۔ اب تنظیم تمہاری زندگی ہو گی۔ میرے آدمیوں کے لئے یہ اعتماد اور عزت کی معراج ہے کہ کوئی دو بدو مجھ سے ہم کلام ہو سکے۔ تنظیم میں میرے بعد امیر خان کا درجہ بلند ہے اور آج سے امیر خان کے بعد تم میرے معتمد ہو گے لیکن یہ یاد رکھنا کہ تنظیم کے غدار کتوں کی موت مارے جاتے ہیں!"

"میں خود کو اس عزت افزائی کا اہل ثابت کر دوں گا باس!" میں نے اپنی آواز میں ہلکی سی لرزش محسوس کی!

"تنظیم کے مقاصد اور طریقہ کار سے آہستہ آہستہ تم خود واقف ہو جاؤ گے" وہ بھرائی ہوئی آواز کسی برفانی نیزے کی طرح میرے دماغ میں پیوست ہوتی جا رہی تھی " فی الحال تمہاری سرگرمیاں زیرو پوائنٹ اور شہر تک محدود رہیں گی۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم ماضی میں ایک بڑے اسمگلر رہے ہو اور تمہاری بے رحم انگلیاں دشمنوں کو ابدی نیند سلانے کا خوب تجربہ رکھتی ہیں لیکن میں تمہیں پھر تنبیہ کرتا ہوں کہ اب نیپال میں تنظیم کی خدمت کے سوا تمہارا کوئی اور مقصد نہ ہو گا۔"

"میں محفوظ اور آزاد زندگی کی تلاش میں نیپال کی سرحدوں میں داخل ہوا تھا۔" میں نے اس سے نگاہیں چار کئے بغیر کہا" یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے نہ صرف مجھے سہارا دیا بلکہ مجھ پر اعتماد بھی کیا۔"

"صفدر!" وہ دبلا پتلا نقاب پوش غیض کے عالم میں دہاڑتا ہوا کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کا لہجہ کسی بھرے ہوئے بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہ تھا۔ اس کے لہجے میں رچی ہوئی غنودگی نہ جانے کہاں جا سوئی تھی۔ میں اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر گھبرا گیا!

"غداری کی سزا موت ہے اور جھوٹ غداری کا پہلا دروازہ ہے!" وہ میرے مقابل آ کر اسی غصیلی آواز میں بولا۔

میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میری نگاہوں کے سامنے تاریکی کے گنجان دائرے ناچنے لگے۔ دل کی دھڑکن یک بیک تیز ہوگئی۔ پنڈلیاں اچانک بے جان ہونے لگیں اور مجھے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا بھی دشوار نظر آنے لگا۔ وہ نہ جانے میری کس بات کو جھوٹ سمجھ بیٹھا تھا۔

مجھے خاموش پاکر وہ پھر گرجا: "میرے ہاتھ بہت دراز ہیں صفدر۔ میں جانتا ہوں کہ تو ایک اہم مقصد کے تحت یہاں آیا تھا۔ تجھ پر اعتماد کرنے سے قبل میں کیپٹن بھاٹیہ تک پہنچ چکا تھا!" پھر وہ تلخ استہزائیہ انداز میں ہنسا: "کیمیا۔ یہ کاہلوں کا کھیل ہے جو کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ زندگی بھر خوابوں کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ پھر وقت انھیں تھکا تھکا کر، سسکا سسکا کر بے موت مار دیتا ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ اسمگلنگ میں ناکامی کے بعد تو کیمیا کے سراغ میں یہاں آیا تھا؟"

اب اس سے کچھ چھپانا بے سود تھا۔ وہ میرے بارے میں شاید سب کچھ جان چکا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور بے جان سی آواز میں بولا: "میں نے دانستہ جھوٹ نہیں بولا تھا۔ کیمیا کا تذکرہ غیر اہم جان کر نظر انداز کر گیا تھا!"

"یہ تیری پہلی بھول تھی!" وہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر پُرسکون آواز میں بولا: "میں اسے معاف کرتا ہوں لیکن دوسری بھول تیرے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے، میں اپنے آدمیوں کے ہر شوق اور دلچسپی سے باخبر رہنا پسند کرتا ہوں تاکہ ان کی کوئی کمزوری میرے لئے پھندا نہ بن سکے!"

"آئندہ میں احتیاط کروں گا!" میری آواز بھرائی ہوئی اور بے جان تھی: "میں جس زندگی کا عادی ہوں وہ بغیر پیسے بسر کرنی ناممکن تھی۔ مفلسی کے عالم ہی میں مجھے کیمیا کا سہارا ملا اور بھاندرناس کی تلاش میں نکل پڑا۔ لیکن تنظیم میں شمولیت کے بعد کیمیا میرے لئے بے معنی ہے!" یہ کہتے ہوئے میرا ذہن اس پراسرار شخصیت میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ میرے ماضی سے واقف ہو چکا تھا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھ پر یہ بھی واضح کر چکا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں ہونے والی خونریزی سے بھی واقف ہے۔ شاید بھاٹیہ نے اُسے میجر انل کے قتل کے ساتھ ہی دوسرے واقعات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"بھاندرناس کے لئے نہ جانے کتنے لوگ اس شہر سے اندرام کے تعاقب میں نکلے اور انھیں ہمالہ کی برفانی وادیاں یوں نگل گئیں کہ آج تک کسی کی لاش کا بھی سُراغ نہ مل سکا۔ اندرام سُوّر کا بچّہ ہے۔ ہمارا اس سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ چرس کا خریدار ہے۔ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ میرے آدمی بھکاریوں کی طرح اس کی خانقاہ پر منڈلاتے نظر آئیں!" نقاب پوش پھر کرسی پر جا بیٹھا اور قدرے غصیلی مگر دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

اسی وقت قالین پر پڑی ہوئی لڑکی نے کراہ کر پہلو بدلا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"صفدر۔ اسے ہوش میں لاؤ!" اس بار وہ مجھ سے مخاطب ہوا تو لہجہ میں وہی خوابناک بھرّاہٹ تھی، معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی مجھ پر برس رہا تھا۔

میں نے بڑھ کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھا تاکہ اس کے حلق میں ہسکی کے چند قطرے ٹپکا سکوں کہ اُس نے مجھے ٹوک دیا: "یوں نہیں۔ اس لڑکی کو اپنے حُسن پر بڑا ناز تھا، اُس کے بدن سے تمام کپڑے الگ کر دو تاکہ وہ ہوش میں آکر اپنی اصلیت جان سکے!" اس کے لہجے میں نہ ہیجان تھا نہ لذّت پسندی۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ مجھے شمپین کی بوتل سے لیبل اتارنے کا حکم دے رہا ہو!

صورت حال ایسی ہنسی خیز نہ ہوتی تو میں پوری زندہ دلی کے ساتھ یہ کام سرانجام دیتا لیکن اس وقت تو وہ دُبلا پتلا سیاہ پوش میرے اعصاب پر سوار تھا۔ میرے ہاتھ لڑکی کے لباس سے اُلجھ رہے تھے۔ نظروں کے سامنے توبہ شکن منظر طلوع ہوتا جا رہا تھا لیکن اس وقت وہ لڑکی میرے لئے پتھر کے کسی بے جان مجسّمے سے مختلف نہیں تھی۔

میں نے مشینی انداز میں اپنا کام پورا کر دیا۔ وہ کسمساتی رہی لیکن آنکھیں نہ کھول سکی۔

"امیر خان! کام شروع کرو" وہی بھرّائی ہوئی خوابناک آواز اُبھری۔

امیر خان نے ایک الماری کے خانے سے طاقتور عدسوں والا کیمرہ نکالا۔ موم بتیوں کی روشنی میں برہنہ تن لڑکی کو مخصوص زاویئے سے فوکس کیا پھر فلش لائٹ کی پن ساکٹ میں لگا کر فلش چیک کیا۔ چکا چوند سے میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ نقاب پوش بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

دو تصویریں لینے کے بعد امیر خان نے کیمرہ کندھے سے لٹکا لیا اور لڑکی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا جو بار بار پہلو بدل رہی تھی۔

اُس نے کہنی کے بل اُٹھتے ہوئے کراہ کر آنکھیں کھولیں [illegible] کی گہری سُرخی کا رچاؤ موجود تھا۔ اُس نے اندھوں کی طرح دو تین بار پلکیں جھپکائیں پھر نقاب پوش پر نظریں پڑتے ہی ایک سُریلی چیخ مار کر فرشی قالین سے اُٹھ گئی۔

"آواز نیچی رکھو لیلاوتی!" نقاب پوش زہریلے لہجے میں بولا: "تمہارا شوہر پرشوتم لعل تھک ہار کر گہری نیند سویا ہوا ہے!"

معاً لڑکی کو اپنی حالت کا احساس ہوا لیکن اس کے سنبھلنے سے قبل امیر خان کا کیمرہ ایک بار پھر روشنی بکھیر کر اُس کا عکس سمیٹ چکا تھا۔

"تم کون ہو سُوّر کے بچو! میرے کپڑے کہاں ہیں؟" لیلاوتی روہانسی آواز میں چیخی۔

"ایک معزز افسر کی بیوی ہو کر بازاری عورتوں کی طرح گالیاں بکتے تمہیں شرم آنی چاہیئے لیلاوتی!" نقاب پوش کا لہجہ تلوار کی سی کاٹ لئے ہوئے تھا۔ پھر وہ ہم دونوں سے مخاطب ہوگیا: "ایک معزز خاتون کو ایسی شرمناک حالت میں دیکھنا تم دونوں کو زیب نہیں دیتا۔ جاؤ باہر ٹھہرو، مجھے اس سے کچھ حساب بیباق کرنا ہے!"

ہم دونوں فوراً ہی تہہ خانے سے باہر کھنڈرات میں نکل آئے جہاں شام کا دھندلکا تیزی کے ساتھ رات کی گناہ افروز تاریکی میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر نقاب پوش کی جیپ موجود تھی اور اس کے بونٹ پر ایک سایہ بیٹھا ہوا تھا!

اچانک تہہ خانے سے لیلاوتی کی پے در پے ہذیانی چیخوں کی آوازیں اُبھریں پھر دھما چوکڑی سُنائی دی۔ شاید تہہ خانے میں مزاحمت کی جنگ چھڑ چکی تھی۔

میں شدید اعصابی بے چینی کا شکار ہونے لگا۔ میرا ذہن ابھی تک تہہ خانے کی طرف لگا ہوا تھا مگر امیر خان بالکل پُرسکون نظر آرہا تھا۔

"کیوں پریشان ہو رہا ہے یار!" امیر خان اچانک میرے شانے پر ہاتھ مار کر ہنسا: "وہ تھوڑی دیر میں چلا جائے گا۔ پھر وہ ہماری ملکیت ہوگی!" میں خفت آمیز انداز میں ہنس دیا: "ن... نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اُس کے وسائل کتنے لامحدود ہیں۔ میں نے جس بات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا، اُس کے نزدیک وہ اہم ترین نکتہ تھا!"

"وہ لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیئے کی طرح سفاک ہے۔" امیر خان سنجیدگی سے بولا: "اس نے تجھ پر بہت زیادہ اعتماد کر لیا ہے اور اب آنے والے دن تیرے لئے بڑے دشوار ہوں گے۔ وہ تیرے بارے میں اپنا کافی اطمینان کر چکا ہے مگر اب وہ ہر آن سائے کی طرح تیرا پیچھا کرے گا۔ جب وہ تیرے ردِّعمل سے بھی مطمئن ہو جائے گا تو تجھے کھلی چھوٹ ہوگی!"

"آخر وہ بھاٹیہ تک کیسے جا پہنچا؟"

وہ نخوت آمیز انداز میں ہنسا: "تجھے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا برخوردار۔ نیپال میں کوئی اجنبی زیادہ دیر ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ وہ مکّار اعظم رشی آج صبح اپنے سالانہ سفر پر نکل چکا ہے اور بھاٹیہ خفیہ طور پر اُس کے تعاقب میں لگا ہوا ہے!"

تہہ خانے سے آنے والی آوازیں اب ختم ہو چکی تھیں شاید وہاں کوئی سمجھوتہ ہو چکا تھا۔

پھر ہم ٹہلتے ہوئے جیپ تک جا پہنچے۔ سیٹھی ابھی تک بدحواس نظر آرہا تھا: "دادا... اب میرا کیا ہوگا، وہ ناراض تو نہیں ہے؟"

امیر خان نے بزرگانہ انداز میں اُس کی گردن پر ہاتھ مارا: "ابے وہ بہت عظیم آدمی ہے۔ تجھ جیسے لوگوں کے بارے میں سوچ کر وہ اپنی صلاحیتوں کی توہین نہیں کر سکتا!"

اس تحقیر آمیز انداز پر سیٹھی نے بالکل بُرا نہ مانا بلکہ اطمینان کا سانس لیا کہ وہ کم از کم اس خونخوار شخص کے عتاب سے محفوظ ہے: "یار دادا۔ میں نے تو آج تک باس کا نام ہی سُنا تھا مگر آج اُسے دیکھ کر تو میرے طوطے اُڑ گئے، بہت خطرناک آدمی ہے وہ بھی!"

"بس بس۔ اس کے بارے میں زیادہ سوچو تو دماغ کا ہیضہ ہو جائے گا" امیر خان منہ بنا کر بولا۔

پھر ہم دونوں خاموشی سے جیپ میں جا بیٹھے۔ امیر خان ترنگ میں آکر کچھ گنگنا رہا تھا۔ میرا ذہن کافی دیر تک تہہ خانے میں اُلجھا رہا پھر میری ذہنی رَو اندرام کی طرف بھٹک گئی۔ میں جس مقصد کی خاطر یہ صعوبتیں جھیلتا

دشوار گزار پہاڑوں میں پہنچا تھا۔ عین موقع پر اُس سے جبراً دستبردار ہونا پڑ گیا تھا۔ میں بنیادی طور پر آزاد فطرت تھا۔ میں نے کبھی کسی کا اقتدار نہیں مانا تھا اپنے باپ اور بڑے بھائی کے جائز اقتدار سے بغاوت کر کے میں نے گھر بار چھوڑا مگر قسمت نے ایک بار پھر مجھے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ میرے لئے پولیس کی قید اور نئے سرغنہ کی ماتحتی میں تھوڑا ہی فرق تھا۔ محدود فضا اور مشقت آمیز زندگی نے بس نیا رُوپ دھار لیا تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا جیسے پورا نیپال میرے لئے ایک کھلی جیل بن چکا ہے، میرا ہر فعل اس نقاب پوش کی مرضی کا تابع ہوتا، گو آرام، عیاشی اور دولت کے وسائل موجود تھے مگر غلامی کے احساس کے ساتھ ہر لذت بے کیف تھی۔

نہ جانے میں کیا کیا سوچتا رہا۔ پھر اچانک تاروں بھرے آسمان کے نیچے کھنڈرات میں کسی نے سر اُبھار کر بھرّائی ہوئی غنودہ آواز میں امیر خان کو پکارا۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو نقاب پوش سیڑھیوں پر موجود تھا۔

"نیچے جاؤ۔ وہ تم دونوں کی منتظر ہے!" اُس نے بھرّائی ہوئی سپاٹ آواز میں کہا: "وہ جوان اور خوبصورت ہے اور زندگی سے بہت پیار کرتی ہے۔ پرشوتم کے ساتھ وہ ایک خاموش سمجھوتے کے تحت گزارا کر رہی ہے اور وہ اس کے قدم چاٹنے پر مجبور نظر آتا ہے۔ لیلاوتی کی تصاویر کا رول مجھے دے دو۔ اور صبح ہونے سے پہلے ان دونوں کو شہر پہنچا دو۔ پرشوتم کو ہوش میں

نہ آنے دینا۔ اُسے پتہ نہیں چلنا چاہیئے کہ لیلا وتی کے ساتھ کیا گزری ہے۔ وہ لڑکی سمجھ دار ہے۔ خود ہی پرشوتم کو خاموش رہنے پر آمادہ کرلے گی۔ ہمیں پولیس میں ایک مضبوط مہرے کی ضرورت ہے اور اب ہم لیلا وتی کے ذریعہ پرشوتم سے کام لیں گے!"

امیر خان نے کیمرے سے رول لے کر نقاب پوش کے حوالے کر دیا۔ وہ پُرسکون انداز میں جیپ کی طرف ہولیا اور ہم دونوں تہ خانے میں اُترنے لگے۔

لیلا وتی نے دلنواز مگر قدرے تلخ مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ پورا لباس پہنے فاتحانہ شان سے کرسی پر دراز تھی۔ قریب ہی تپائی پر شراب کی بوتل دو گلاسوں سمیت موجود تھی۔ گو اُس کی حالت گزرے ہوئے لمحوں کی داستان سُنا رہی تھی مگر لیلا وتی کے بُشرے پر ذرا بھی ملال نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نقاب پوش سے سب کچھ ہار کر بھی بازی جیت گئی ہو۔

"شاید اُس نے تم دونوں کو بتا دیا ہوگا" لیلا وتی سگریٹ کا ہلکا سا دھواں اُڑاتے ہوئے بولی: "میں اب لوٹ کا مال نہیں بلکہ سمجھوتے کی ایک اہم فریق ہوں۔ اب لٹیروں کی طرح مجھ پر ٹوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوگا وہی جو تمہارے ذہنوں میں ہے مگر ہم مہذب دوستوں کی طرح پیش آئیں گے۔ آؤ میں تمہارے لئے جام تیار کردوں۔"

میں آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ لیلا وتی کسی خوفزدہ لڑکی کے بجائے اس وقت بھرپور عورت نظر آرہی تھی جو بہرحال میں مردوں کو اپنے اشاروں پر نچانے کا اختیار رکھتی ہے۔

وہ ایک ادا کے ساتھ اٹھی، الماری سے تیسرا گلاس نکالا اور کرسی پر واپس آکر تین گلاس تیار کرلئے۔ سائفن سے گلاسوں میں سوڈے کی دھار مارتے ہوئے ایک نظر اُس نے اپنے بے ہوش شوہر کے سوجے ہوئے لہولہان چہرے پر ڈالی۔ اذیت کی ایک ہلکی سی پرچھائیں اُس کے چہرے پر آکر گزر گئی۔

اور جب مومی شمعوں کی روشنی میں تین گلاس ٹکرائے تو اسی وقت باہر جیپ کے انجن کی تیز غراہٹ سُنائی دی جو فوراً ہی دُور ہوتی چلی گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد لیلا وتی نے خود کو ایسی حالت میں پایا تھا کہ ذہنی صدمے کے باعث کسی طرف توجہ نہ دے سکی مگر اب اُس کی نظروں میں میرے لئے شناسائی رقصاں تھی۔

"زیرو پوائنٹ پر تم میرے سائے تک سے بھڑک رہے تھے اور اب..."

لیلا وتی نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اُس وقت میں صرف پیشہ ور جواری تھا اور اب فقط تمہارا پروانہ" میں نے کہا۔

"مجھے اسی رات شبہ ہوگیا تھا کہ تمہاری امیر خان سے ملی بھگت ہے!" وہ شراب کا تلخ گھونٹ لے کر ہنستے ہوئے بولی۔

"پرشوتم سے جوئے میں میری رقابت تھی اور اب تمہارے معاملے میں بھی وہ میرا رقیب ہوگا" میں نے اُس کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔ "... رکھنے والی لڑکیوں سے دوستی کر کے مجھے بہت زیادہ آسودگی کا احساس..."

"اب تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں تم لوگوں سے دوستی رکھنے پر..." وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"کیوں؟" امیر خان نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ مجھے بتا گیا ہے کہ ہدایات کی خلاف ورزی کی صورت میں میری قدِ آدم تصویریں کٹھمنڈو کے گلی کوچوں میں پھیلا دی جائیں گی" اُس کے لہجے میں شکست کا احساس نمایاں تھا۔

"مجھے اُمید ہے کہ تم یہ نوبت نہ آنے دوگی!"

رات دھیمے دھیمے رینگ رہی تھی۔ شراب کا سرور لحظہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ لیلا وتی پینے کی شوقین تھی اور جب اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی تو امیر خان نے اسے اپنی باہوں میں سنبھال لیا۔ میری کنپٹیاں جیسے... میں اُس سے جونیئر تھا۔

سیٹھی نے وہ پوری رات کھلے آسمان تلے گزاری۔ وہ ... سے عاری، پشتینی غلام معلوم ہوتا تھا جیسے شاید امیر خان کی ہدایات کے لئے ہی پیدا کیا گیا تھا۔ جب میں لیلا وتی کو بازوؤں میں سنبھالے زخمی پرشوتم کے بے ہوش جسم کو کندھے پر لادے باہر پہنچا تو سیٹھی کے چہرے پر یوں سکون چھایا رہا جیسے یہ سب اُس کی توقع کے مطابق ہورہا ہو۔

میں دونوں قیدیوں کے ساتھ امیر خان والی جیپ پر... امیر خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سیٹھی تہ خانے کے دہانے پر... میری جیپ میں آبیٹھا۔

رات اپنے آخری سانسوں پر تھی۔ دونوں جیپیں پُرہول... میں غراتی، اُچھلتی شہر کی طرف بڑھی جارہی تھیں۔ اس وقت ہمارے شہری حدود میں داخل ہونا مخدوش تھا کیونکہ تازہ ترین خونریزی... پولیس شکاری کتوں کی طرح ہر طرف مجرموں کی بُو سونگھتی پھر رہی کی... لیلا وتی سے بات کرنے کے بعد طے کیا گیا کہ اُسے اور پرشوتم کو کٹھمنڈو... میں ایک گاؤں میں واقع پرشوتم کی دیہی قیام گاہ پر چھوڑ دیا جائے... دنوں ویران تھی۔

انھیں وہاں چھوڑ کر ہم روانہ ہونے لگے تو میری اور لیلا... کی نظریں چار ہوئیں اور میں نے اُس کی آنکھوں میں دعوت انگیز رقصاں دیکھی۔ میرے لئے اس چمک کا مفہوم نا آشنا نہ تھا۔ میں سر... سی جنبش کے ساتھ باہر آگیا۔

زیرو پوائنٹ پر گروہ کے وہ دونوں آدمی ہمارے منتظر... جنھوں نے اسی روز میرے ماتحتوں کے طور پر رائل ہوٹل میں... دی تھی!

"پولیس نے آج شہر میں ہر طرف چھاپے مارے ہیں۔ رات آٹھ بجے تک بیالیس آدمی پکڑے گئے جن میں ہمارا ابھی ایک آدمی ہے!" ایک نے ہمیں بتایا۔

"پولیس کس لائن پر کام کر رہی ہے؟" امیر خان نے سوال کیا۔

"سب لوگ بُری طرح بوکھلائے ہوئے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ پولیس کمشنر نے کس اطلاع کی بنیاد پر چھاپہ مارا تھا۔ پولیس کے سات جوان مرے ہیں۔ پانچ بُری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ ہر طرف پرشوتم لعل کی تلاش جاری ہے۔ اس کی بیوی لیلا وتی صبح خریداری کے لئے نکلی تھی مگر اب وہ لاپتہ ہے۔ اس کی کار صدر بازار میں کھڑی ہوئی ملی ہے۔ اُس کا پچھلا ایک ٹائر پنکچر تھا۔"

"خوب!" اس بار میں نے تعریفی لہجے میں کہا: "تم دونوں خوب جارہے ہو!"

"ہمارا کون سا آدمی پولیس کی حراست میں ہے؟" امیر خان نے پوچھا۔

"چندر سین۔ جو بڑے مندر کے پاس ٹھیکہ چلاتا ہے۔"

میں اب بُری طرح تھکان محسوس کر رہا تھا۔ سارا دن ہنگامہ آرائی کی نذر ہوا اور رات عیاشی میں بسر ہوئی لہٰذا اعصاب پر نیند طاری تھی۔ امیر خان اور سیٹھی کو ان دونوں کے پاس چھوڑ کر میں ایک کمرے میں جاکر جوتوں سمیت بستر پر دراز ہوگیا۔

بارہ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو امیر خان جاچکا تھا مگر دونوں آدمی وہیں موجود تھے۔ میں نے انھیں ساتھ لیا، زیرو پوائنٹ کو مقفل کرکے جیپ میں شہر روانہ ہوگیا۔

شہر میں ہر طرف سنسنی اور ویرانی کا راج تھا۔ پولیس کی گاڑیاں کثرت کے ساتھ سڑکوں پر گھوم رہی تھیں۔ جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں اس ہولناک خونریزی کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہی تھیں۔ میں یہ سب دیکھتا اطمینان سے آگے بڑھتا رہا۔ ایک جگہ ان دونوں کو اُتار کر دو مقامی اخبار خریدے اور میں اپنے نئے کرائے کے مکان کی طرف ہولیا۔

مقفل پھاٹک کھول کر میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ پھاٹک اندر سے بند کیا اور برآمدے ہی میں رُک کر جلدی جلدی اخبار پڑھ ڈالے۔

دونوں مقامی اخبار اس واقعے سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک اخبار صبح کا تھا اور دوسرا خصوصی ضمیمہ تھا۔ اس میں لیلا وتی اور پرشوتم کی تصاویر کے ساتھ اُن کی بازیافت کی تفصیلی خبر تھی!

ضمیمے کے مطابق پرشوتم کو کسی نامعلوم شخص نے فون پر نواحی پہاڑیوں میں غیر قانونی مال کے ذخائر کی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مال ایسے بارسوخ شخص کی ملکیت ہے جس کے تنخواہ دار مخبر پولیس میں بھی موجود ہیں۔ لہٰذا پرشوتم نے فوری طور پر انتہائی رازداری کے ساتھ مسلح چھاپے کی تیاری کی مگر مجرموں سے شدید تصادم ہوا جس میں وہ اپنی داہنی ران پر زخم آنے کے باعث حواس کھو بیٹھا۔ اس عالم میں کئی مجرموں نے گھیر کر اُسے بُری طرح زدوکوب کیا جن کی شناخت پر وہ اپنی ابتر حالت کے باعث توجہ نہ دے سکا۔ پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔ آنکھ کھلی تو وہ نہایت خستہ حالت میں اپنے مضافاتی مکان پر لیلا وتی کے ساتھ موجود تھا!

اور لیلا وتی کا بیان پڑھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ اُس نے اتنی مربوط کہانی گھڑی تھی کہ ایک ثانئے کے لئے مجھے وہ بھی اپنے ہی گروہ کی کارندہ معلوم ہونے لگی۔ وہ اپنے بیان کے مطابق ہیکم ٹریڈرز میں میک اَپ کے سامان کی خریداری کر رہی تھی کہ دوکان ہی کے فون پر اسے پرشوتم کی آواز میں پیغام ملا کہ وہ کسی بھی تذکرہ کے بغیر فوراً مضافاتی قیام گاہ پر پہنچے۔ وہ خود وہاں اس کا منتظر ہے۔ دوکاندار نے خود اس فون کی تصدیق کی۔ لیلا وتی کے بیان کے مطابق یہ پیغام غیر معمولی نہیں تھا۔ پرشوتم اُس کو اکثر اسی طرح متحیر کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ وہ دوکان سے نکلی تو اُس کی کار کا ایک دہیل ناکارہ ہوچکا تھا۔ اُس نے فوراً ہی ایک ٹیکسی پکڑی اور مضافاتی مکان پر جا پہنچی جو کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر پہنچی تو ٹیکسی ڈرائیور منہ پر نقاب باندھے دبے قدموں اُس کے پیچھے اندر جاگھسا اور اچانک اُسے مغلوب کر لیا۔ پھر ریوالور کی نوک پر اُس نے لیلا وتی سے یہ دریافت کیا کہ پرشوتم کو مال کی خبر کس طرح ملی۔ تب دھمکیوں اور تشدد کے بعد اسے یقین ہوگیا کہ لیلا وتی خبر کے ذریعے سے لاعلم ہے تو وہ اُسے بے ہوش کرکے شاید وہاں سے رُوپوش ہوگیا۔ وہ ہوش میں آئی تو ٹیکسی ڈرائیور کا کہیں پتہ نہیں تھا اور پرشوتم لعل نہایت خستگی کے عالم میں اس کے قریب ہی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

تنظیم کے سربراہ کی ترکیب واقعی کارگر رہی تھی۔ لیلا وتی نے پرشوتم لعل کو زبان بند رکھنے اور ایک فرضی کہانی تراشنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اب پرشوتم لعل کے لئے بڑی دشواریاں کھڑی ہوجائیں گی۔ سات سرکاری ملازمین کی ہلاکت اور پانچ کا بُری طرح زخمی ہونا معمولی واقعہ نہیں تھا جس سے اعلیٰ حکام یوں چشم پوشی اختیار کرلیتے۔ پرشوتم لعل لاکھ پولیس کمشنر ہی مگر وہ بھی کسی کا جواب دہ تھا۔ مگر مجھے ایک بات پر حیرت تھی۔ یہ معمولی سی بات تنظیم کے سربراہ نے کیوں نہیں سوچی تھی کہ اتنے بڑے پیمانے پر قتل و خونریزی ہونے کے بعد بھی پرشوتم صاف بچ سکے گا یا نہیں!

میرے دونوں معاونوں میں ایک کا نام بالی اور دوسرے کا گپتا تھا۔ میں نے بالی کو مکان کی نگہبانی کے لئے چھوڑا اور شام کے وقت گپتا کو ساتھ لے کر شہر کی طرف چل دیا۔

کافی دیر کی تلاش کے بعد میں امیر خان کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوہی گیا۔ وہ گریسی نامی ایک مقامی عیسائی کے شراب خانے میں دو لڑکیوں کو لئے بیٹھا تھا جن کی وضع قطع تو ہپیوں ہی جیسی تھی مگر اُن کے طور طریقوں اور لباس

سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی مفلسی کی آخری سرحدوں پر نہیں پہنچی ہیں۔
امیر خان ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اُن سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
میرے داخل ہوتے ہی بوڑھے گریسی نے کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر میرا استقبال کیا۔

"آج کی سیل کیسی ہے؟" میں نے دبی دبی آواز میں اس سے پوچھا۔

"اس ہفتہ زیادہ مال کی کھپت کا امکان ہے.....!"

"بس بس اتنا کافی ہے!" میں نے ہاتھ اُٹھا کر اس باتونی بڈھے کو خاموش کر دیا۔ "تم اپنا دھندا دیکھو، میں امیر خان سے ملنے آیا ہوں!"

امیر خان مجھے دیکھ کر ایک ثانئے کے لئے یوں خاموش ہو گیا جیسے میری وہاں آمد اُسے پسند نہ آئی ہو۔ پھر بالکل بے تکلفانہ انداز میں بولا "کدھر گھوم رہے ہو پرنس؟"

میں نے دیکھا کہ پرنس کا لفظ سنتے ہی وہ دونوں لڑکیاں پورے انہماک سے میری طرف متوجہ ہو گئیں جیسے میں اُن کے لئے عجوبہ رہا ہوں۔ اُن کے بشروں سے حیرت نمایاں تھی۔

امیر خان نے نہ جانے کیوں مجھے پرنس کہہ کر پکارا تھا۔ یہ خطاب سنتے ہی میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ کالج کے زمانے میں ضمیر فروش اکبر اور دوسرے دوست مجھے شاہ خرچیوں کی بنا پر بے تکلفی سے پرنس ہی کہا کرتے تھے۔

"میں تمہاری ہی تلاش میں تھا۔" میں اُداس لہجے میں یہ کہتے ہوئے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"کیا... یہ اسی ریاست کا شہزادہ ہے؟" ایک لڑکی نے حیرت کے ساتھ امیر خان سے سوال کیا جو شاید اس کے پلّے نہ پڑ سکا اور وہ کھونڈے انداز میں ہنسنے لگا۔

"مجھے.....صف... سرور کہتے ہیں!" میں نے فوری خیال کے تحت انھیں اپنا اصل نام بتانا مناسب نہ سمجھا۔

"پرنس سرور؟" ایک لڑکی نے تائید طلب لہجہ میں سوال کیا۔

"یوں ہی سمجھ لو!" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"میں نے تو سُنا تھا کہ مشرقی شہزادے عام آدمیوں سے کافی مختلف ہوتے ہیں!" دوسری لڑکی کو میری عام سی وضع قطع پر مایوسی ہوئی تھی۔

"مختلف!" میں زور سے ہنسا۔ "شہزادے بھی عام آدمی ہی ہوتے ہیں۔ کیا تم شہزادوں کے سر پر سینگ اُگے ہونے کی توقع رکھتی ہو؟"

اچانک امیر خان کھنکھار کر اُردو میں بولا "برخوردار اگر کوئی خاص بات نہیں ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ سالیاں نشے سے دور ہی بھاگتی ہیں، ذرا مشکل سے قابو میں آئیں گی، تم میرا کام نہ بگاڑ دو!"

"میں جا رہا ہوں۔ صرف یہ بتا دو کہ آج رات کا کیا پروگرام ہے؟"

"آج رات۔؟" اُس نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا پھر اُسے فوراً ہی یاد آ گیا کہ آج ہفتہ ہے اور رات میں زیرو پوائنٹ پر محفل جمنے والی ہے۔ جلدی سے بولا "آج اِدھر کچھ نہیں ہوگا۔ تم واپس جا کر آرام کرو۔ میں خود کسی طرف آؤں گا۔"

میں لڑکیوں پر فیاضانہ مسکراہٹ نثار کرتا گریسی کے شراب خانے سے لوٹ آیا۔

گپتا ایک نئی خبر کے ساتھ جیپ میں میرا منتظر تھا۔

"ابھی اپنا ایک آدمی امیر خان کا پیغام لایا تھا۔" وہ جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے سہمی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں بولا۔ "باس کا حکم ہے کہ تم ایک دو روز تک اپنے مکان تک محدود رہو حالات سُدھرنے پر تمہیں اگلی ہدایات ملیں گی۔"

میں نے بازار سے اسکاچ کی دو بوتلیں اور تاش خریدے پھر مضافاتی قیامگاہ کی طرف ہو لیا۔

اگلی صبح میرے لئے نہایت سنسنی خیز خبر کے ساتھ طلوع ہوئی۔ بازار سے لائے ہوئے اخبارات میں پرشوتم لعل کی خودکشی کی خبر شہ سرخیوں کی زینت بنی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے سرکاری ریوالور سے اپنی بیوی لیلاوتی کو ہلاک کر کے خودکشی کر لی تھی۔ اخبارات کے مطابق پرشوتم لعل کی ران سے گولی نکالنے کے بعد اُسے گھر پر ہی منتقل کر دیا گیا تھا۔ گھریلو ملازمین کے بیان کے مطابق وہ لیلاوتی سے خلافِ معمول بدظن نظر آ رہا تھا۔ رات میں جب وہ اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے تو اچانک عمارت میں سے پہلے دو فائروں کی آواز کے ساتھ ہی لیلاوتی کی لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔ پھر چند ثانیوں کے وقفے سے تیسرا فائر ہوا اور سکوت چھا گیا۔ ملازمین دہشت کے باعث اس وقت کوارٹرز سے نہ نکلے جب تک پھاٹک پر سوئے ہوئے دو مسلح سنتری ان تک نہ پہنچے۔

پرشوتم لعل کی خوابگاہ میں لیلاوتی کی خون میں نہائی ہوئی لاش کے سینے پر دل کے مقام پر گولیوں کے دو زخم پائے گئے تھے۔ پرشوتم کے داہنے ہاتھ میں اس کا ریوالور دبا ہوا تھا۔ شاید اُس نے بیوی کو ہلاک کرنے کے بعد کنپٹی پر فائر کر کے خود کو ہلاک کیا تھا۔

کمرے میں نہ جدوجہد کی علامات پائی گئیں۔ نہ ہی وہاں کسی کی آمد کی شہادت مل سکی۔ رہی سہی کسر خوابگاہ کی تلاشی نے پوری کر دی۔ آہنی تجوری میں پرشوتم لعل کے نجی کاغذات میں پولیس کو چند ایسی اہم دستاویزات ملی تھیں جن سے اس واردات کا پس منظر سامنے آتا تھا۔ پولیس نے ان دستاویزات کو انتہائی خفیہ رکھا تھا۔

میں نے کئی بار یہ خبر پڑھ ڈالی۔ میرے ذہن میں، وہ گولیسہ ... کی الوداعی مسکراہٹ سر اُبھار رہی تھی جس میں دعوت چھلک رہی تھی اور میرے ذہن میں یہ بات کسی طرح نہیں سما رہی تھی کہ پرشوتم لعل نے لیلاوتی کو قتل کر کے خودکشی کی ہوگی لیکن اخبارات میں اس دوہرے خون کے بارے میں کسی دوسرے امکان کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں تھا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ اگر یہ قتل کی واردات تھی تو مجرم یا مجرموں نے نہایت کامیابی کے ساتھ اسے خودکشی کا رنگ دے دیا تھا۔

اس واقعہ کے نتیجے میں امیر خان اور پورا گروہ ہر طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ پرشوتم اور لیلا، سارے خونیں ڈرامے کے گواہ تھے اُن کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد اب کوئی نہ رہا تھا جو پولیس کو کھٹمنڈو کی نواحی پہاڑیوں میں کھیلی جانے والی خون کی ہولی کا اصل پس منظر بتاتا۔

دوپہر میں امیر خان آیا۔ اس کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔

"اخبار دیکھ لیا تو نے؟" اُس نے آتے ہی کہا۔

"اخبار تو پڑھ لیا لیکن یہ قصہ میرے حلق سے نہیں اُتر رہا!"

"ارے۔ قدرت خود ہمارا ساتھ دے رہی ہے!" وہ جوشیلی آواز میں بولا۔ "خس کم جہاں پاک۔ اگر مجھے شبہ بھی ہوتا کہ وہ سالا واقعی ہمارے ٹھکانے پر چڑھ دوڑے گا تو اُس کی ہاری ہوئی رقم اسے واپس ہی کر دیتا۔ ہم لوگ بلا وجہ سرکاری اداروں سے ٹکرانے سے گریز کرتے ہیں!"

"لیکن پرشوتم خودکشی کرنے والوں میں سے نہیں معلوم ہوتا تھا امیر خان!"

"پیارے۔ مرد عورت کی خاطر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ پولیس کو پرشوتم لعل کے نجی کاغذات میں لیلاوتی کی رنگین برہنہ تصاویر ملی ہیں!"

"لیلاوتی کی تصاویر!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

وہ اپنی داہنی آنکھ دبا کر ہنسا۔ "لیلاوتی رنگین مزاج تھی اور اُس کی تصویروں کی بنیاد پر کوئی پرشوتم لعل کو بلیک میل کر رہا تھا۔ آخر پرشوتم نے کسی نہ کسی طرح بلیک میلر کا سراغ پا لیا اور اپنی اطلاع کو ریکارڈ پر لائے بغیر بھاری نفری لے کر بلیک میلر کے ٹھکانے پر جا پہنچا۔ جہاں غیر متوقع طور پر اُسے شدید مزاحمت اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ بلیک میلر کو تصاویر کی اشاعت سے روکنے کے لئے پرشوتم نے اس چھاپے کے بارے میں اپنے افسران کو ایک فرضی کہانی سُنائی۔ گھر پہنچنے کے بعد اُس نے لیلاوتی پر لعن طعن کی ہوگی کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ سرکاری عملے کا بھاری جانی اتلاف درگزر نہیں کیا جائے گا۔ صحت یابی کے بعد محکمۂ داخلہ دفتری کارروائیاں پوری کئے بغیر غیر ذمہ دارانہ چھاپہ مارنے پر اُس سے بازپرس کرتا پھر شاید وہ معطل بھی کر دیا جاتا۔ لیلاوتی اپنے شوہر کے منہ سے آوارگی کا طعنہ سُن کر برانگیختہ ہوئی ہوگی اور پرشوتم نے طیش میں آ کر اُسے ہلاک کر کے خودکشی کر لی۔"

میں امیر خان کی کہانی کا ایک ایک لفظ غور سے سُن رہا تھا۔ "یہ تو وہ نتائج ہیں دوست جو پولیس واقعات کی روشنی میں اخذ کرے گی، یہ بتاؤ اصل واقعہ کیا ہے؟"

"ہمارا پیارا باس بھی نادر الوجود ذہن کا مالک ہے!" امیر خان ٹانگیں پھیلا کر بولا۔ "اُس نے جو پلان بنایا تھا اس پر اپنی مرضی کے مطابق شروع سے آخر تک عمل کیا۔ اگر پرشوتم اور لیلاوتی کو تہہ خانے ہی میں ہلاک کر دیا جاتا تو اُن کی روپوشی پر پولیس پورے نیپال کو تہہ و بالا کر دیتی۔ لاش مل جاتی پھر بھی پولیس کی سرگرم تفتیش سے ہر وقت خطرہ لاحق رہتا۔ اُس نے شروع ہی سے لیلاوتی کو یہ تاثر دیا کہ وہ ان دونوں کو زندہ رکھ کر پرشوتم سے کچھ کام لینا چاہتا ہے اور لیلاوتی اپنی برہنہ تصاویر کی وجہ سے اُس سے کبھی بغاوت نہ کر سکے گی۔ سچ پوچھو تو ان دونوں نے جس وقت پولیس کو پہاڑی معرکے کے بارے میں فرضی داستان سنائی وہ اسی وقت اپنی موت کو آواز دے چکے تھے۔ ہمارا باس اس طرح واقعات کو حسبِ مرضی موڑ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ادھر پرشوتم کے اندھا دھند چھاپے پر محکمہ داخلہ بہت برہم تھا۔ اُس کے صحت یاب ہوتے ہی ایسی کڑی بازپرس ہوتی کہ وہ حقیقت اُگلنے پر مجبور ہو جاتا۔ اُس کی ملازمت کٹنی جاتی اور ہماری گردنیں بھی پھنس جاتیں۔ لہٰذا کل رات ہی میں چھپ کر پرشوتم کے مکان میں جا پہنچا۔ اپنے ریوالور کی زد پر اُس سے چابیاں حاصل کیں، لیلاوتی کی رنگین برہنہ تصاویر اُس کے نجی کاغذات میں رکھیں اور تجوری سے اُس کا اپنا ریوالور نکال کر پہلے لیلاوتی کو پھر اُسے ہلاک کیا اور اُس کے بے جان ہاتھ میں ریوالور تھما کر خاموشی سے فرار ہو گیا!"

"لیکن پولیس کی تفتیش سے تو اب بھی جان بچنی محال ہے!" میں دل ہی دل میں اُس مکارانہ منصوبے کی داد دیتا ہوا بولا۔

"وہ تو ضرور ہوگی، مگر اب اس کا دوسرا رُخ ہوگا۔ وہ دونوں نامعلوم مجرموں کے ہاتھ سے مارے جاتے تو پولیس اسمگلروں کے کسی گروہ کی کھوج میں لگ جاتی مگر اب ان دونوں سے کسی کو ہمدردی نہیں رہی ہے۔ پولیس کچھ عرصے تک کسی بلیک میلر کی تلاش میں سر کھپاتی رہے گی پھر کیس فائلوں میں دفن ہو جائے گا!" وہ نہایت پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ "ہر ایک لیلاوتی کی آوارگی کو اس خونریزی کا سبب قرار دے گا!"

"اس چھاپے میں پرشوتم کے ساتھ حصہ لینے والوں کے بیانات کو تم بھول رہے ہو۔" میں نے اُسے یاد دلایا۔

"باس ہر طرف نظر رکھتا ہے پیارے!" امیر خان بے نیازی سے ہنسا۔ "وہ کیس کو اس سے زیادہ مسخ نہیں کر سکتا تھا۔ پرشوتم کے زندہ بچ جانے والے ماتحتوں کے بیان غیر اہم ہوں گے۔ انھوں نے پہاڑیوں میں جو کچھ دیکھا یا بھگتا وہ اس سے آگے پیچھے کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے وہ چار آدمی جو پولیس کی نظروں میں آ گئے تھے وہ کل رات ہی سرحد کی طرف نکل چکے ہیں اور اب وہ کئی سال تک سرحد پار رہ کر ہمارے لئے کام کریں گے۔ جب وہ بدلی ہوئی وضع قطع میں یہاں لوٹیں گے تو لوگ پرشوتم اور اس کی بدنصیبی کی داستان کو فراموش کر چکے ہونگے اور پرشوتم کے ماتحتوں کے بیانات کو بدلنا تو ہمارے اختیار سے باہر کی بات ہے۔"

بات معقول تھی لہٰذا میں خاموش ہو کر شراب کا پیگ تیار کرنے لگا۔

"تو کل شام گریسی کے بار میں کیوں آیا تھا؟" اچانک امیر خان نے پوچھا۔

"مجھے ان دونوں کو چھوڑ دینے میں خطرہ نظر آرہا تھا، اسی سلسلے میں کچھ بات کرنے گیا تھا۔" میں نے شرمندگی کے احساس کے ساتھ کہا: "مجھے کیا معلوم تھا کہ ان دونوں کو وقتی مصلحت کی خاطر زندہ چھوڑا گیا تھا!"

"باس ہم سب سے زیادہ عقلمند ہے صفدر علی!" وہ شراب کا جام لہراتے ہوئے بولا: "مجھے خود تیرے آنے تک منصوبے کے سرپیر کی خبر نہیں تھی۔ دوپہر میں باس کا صرف اتنا پیغام ملا تھا کہ میں احتیاطاً ایک دو ایسے افراد کا بندوبست رکھوں جو ضرورت پڑنے پر میری قیام گاہ پر ساری رات میری عدم موجودگی کی گواہی دے سکیں۔ میں کنٹال مقامی لڑکیوں کو لے جاتا تو وہ صبح تک بھول چکی ہوتیں کہ پچھلی رات انھوں نے کس کے ساتھ اور کہاں گزاری ہے مگر وہ دونوں کل ہی جہاز سے نیپال پہنچی تھیں اور ان کے لئے کھٹمنڈو کی پہلی رات کو بھولنا ناممکن ہوگا۔ میں نے انھیں گیارہ بجے تک زبردستی شراب پلائی اور ان کی لاعلمی میں گھنٹہ میں صبح کے چار بجا دیئے اور مختلف طریقوں سے وہ وقت ان کو ذہن نشین کرا دیا۔ جب وہ سوگئیں تو میں پرشوتم کی طرف نکلا اور تین بجے اپنا کام ختم کرکے لوٹ آیا۔ گھنٹہ کا وقت درست کرکے میں نے سوا چار بجے انھیں بیدار کردیا۔ اب وہ قسم کھا کر بیان دے سکتی ہیں کہ وہ پندرہ منٹ کے لئے سوئی تھیں اس مدت کے علاوہ ساری رات انھوں نے مجھے اپنے رُوبرو پایا ہے!"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"پہلے مجھے بھی یہ بات احمقانہ معلوم ہوئی تھی جس دن تو رسب سمجھنے لگے گا، ہمارا باس بن جائے گا۔" وہ باس کی منصوبہ بندی سے بہت متاثر تھا۔ "یہ صرف احتیاطی تدبیر تھی تاکہ ان دونوں کا کام تمام کرنے کے بعد فرار ہوتے ہوئے کوئی مسلح سنتری یا ان کا گھریلو ملازم اگر میری جھلک دیکھ لیتا تو میں ان گواہوں کے بیان کی روشنی میں صاف بچ سکتا تھا۔ پندرہ منٹ کے قلیل وقفے میں قتل تو دور کی بات ہے میرے مکان سے پرشوتم کے یہاں پہنچنا بھی ناممکن ہے!"

باس کی کھوپڑی میں واقعی کوئی غیرانسانی ذہن موجود تھا ورنہ اتنی ہمہ گیر اور محتاط منصوبہ بندی کسی ایک شخص کے لئے ناممکنات میں سے تھی۔

"میرے بارے میں کوئی نئی ہدایت؟"

"فی الحال گھر ہی میں رہو!" امیر خان بولا۔

"ہاں۔ یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ جب میں گریسی کے بار میں تھا تو کوئی شخص گپتا کو میرے بارے میں باس کا ایسا ہی پیغام دے گیا تھا۔" میں نے کہا

"یہ معمولات میں شامل ہے، تمہیں کہیں بھی کوئی نیا حکم مل سکتا ہے۔"

"گویا تمہارے کہنے کے مطابق میری نگرانی کی جارہی ہے!" میرے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"کسی ایک آدمی کی خاطر تنظیم کا طریقہ کار تو نہیں بدلا جا سکتا۔"

اس بارے میں امیر خان کا جواب دوٹوک تھا۔

پھر اُسی کی خواہش پر میں نے بالی اور گپتا کو بھی اندر [illegible] برج کھیلنے لگے۔ میرا ذہن پے در پے واقعات میں اس بُری طرح اُلجھا [illegible] کہ میں توجہ سے نہ کھیل سکا۔ دو تین ہی ڈیل میں امیر خان نے اندازہ [illegible] میں کھیلنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ وہ بازی سمیٹ کر رخصت ہوگیا۔

اگلے پانچ روز میرے لئے تقریباً قید میں گزرے۔ بیسا[illegible] سے اخبارات و رسائل لا دیتے تھے اور میرا بیشتر وقت مطالعہ میں [illegible] اس دوران میں پولیس کی تفتیش بالکل ان ہی خطوط پر جاری رہی [illegible] باس کے ذہن میں تھے۔ پولیس پوری شدومد سے اس فرضی بلیک میلر [illegible] میں سرگرداں رہی جس کا ہوّا ہمارے باس نے کھڑا کیا تھا۔ شہر کے [illegible] مشتبہ افراد گرفتار کئے گئے تشدد کے دور چلے مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آسکا [illegible] جلی سرخیاں چھوٹی چھوٹی خبروں میں بدل گئیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا [illegible] سرد خانے کی نذر ہونے والا ہے۔

کراچی میں اپنے عروج کے زمانے میں میں لاکھوں کا مال [illegible] رہا۔ اس دوران میں بارہا میرا واسطہ غیرملکی تنظیموں سے بھی پڑا۔ زیر [illegible] زمین دنیا، بنکاک کے خونی ٹولے اور رسوائے زمانہ امریکی سنڈیکیٹ [illegible] نے امریکہ میں ہلچل مچائی ہوئی ہے۔ یہ سب بے حد مضبوط اور خود مختار گر[وہ] میں نے ایک بار مافیا کے سرگرم رکن جوکو لمبو کے ذریعہ سات لاکھ کی مالیت [illegible] پاکستان سے بھاری داموں پر برآمد کی تھی جس کے جواب میں مافیا ہی [illegible] ذمہ دار شخص جوزف برونشی نے بیروت سے فحش اطالوی لٹریچر کی ایک [illegible] مجھے بھیجی تھی جس میں میرے دارے کے نیارے ہوگئے تھے۔ مجھے خوب علم [illegible] میں ہر گروہ اور تنظیم کی پولیس اور ایسے انسدادی اداروں سے باقاعدہ [illegible] ہوتی ہے۔ خود میں نے اپنے لئے راہ ہموار کرنے کی خاطر کتنوں کا منہ بند [illegible] اس نیپالی تنظیم کا تو انداز ہی نرالا تھا۔ سربراہ کی شخصیت سے ہر فرد لاعل[م] تو یوں لگتا تھا جیسے امیر خان بھی اسی لاعلمی کا شکار ہو۔ زیرزمین دنیا [illegible] طریقہ خاصا نادر اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اوّل تو جرائم میں جتھے بند[ی] اعتماد کی بنا پر ہوتی ہے اور جہاں اعتماد ہو وہاں اتنی سخت رازداری [illegible] نہیں رہتی کہ سرغنہ خود کو گمنام رکھے۔ دوسری طرف کوئی بھی شخص باسانی [illegible] راستے سے ہٹا کر اس کی جگہ سنبھال سکتا تھا۔ امیر خان گروہ کے سا[رے معاملات] سے واقف تھا اور اگر کسی مرحلہ پر وہ خود سربراہ کی جگہ سنبھال لیتا تو [کسی کو] کانوں کان پتہ نہ چلتا۔

اس قسم کی جرائم پیشہ بڑی تنظیموں کے سربراہوں کے نام کھلے ہوتے ہیں۔ ان کے سائے تک سے لوگ تھراتے ہیں اور اپنی حفاظت کے [لئے وہ] عملی کام سے خود دُور رہتے ہیں۔ سارا کام ماتحت چلاتے ہیں۔ حتیٰ [الامکان] کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے خلاف کوئی ثبوت نہ چھوڑیں۔ صرف اسی

میں انھیں اپنی منصوبہ بندیوں اور کارروائیوں کا بھرپور معاوضہ حاصل ہوتا ہے مگر ہمارا سربراہ نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر خود کو راز بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ میں اس موضوع پر جتنا بھی سوچتا گیا اسی قدر الجھن بڑھتی چلی گئی۔

چھٹے روز مجھے آزادی مل گئی۔ میں نے سب سے پہلے تمام اڈوں کا دورہ کیا۔ شہری ٹھیکوں پر دیسی منشیات کی کھپت یک دم بہت بڑھ گئی تھی، کیونکہ چھارشی انند رام حسب معمول سنگ و آہن کی جھنکار بکھیرتا پہاڑی کی ادویات کے اس پُراسرار سفر پر نکل جاتا تھا جس کے راز جاننے کے لئے میں نیپال تک پہنچا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد آوارہ گرد ہپیوں کے غلیظ چہروں پر عجیب سی تیمی پھیلنے لگی تھی۔ انند رام کی خانقاہ سے چرس وغیرہ کی فراہمی منقطع ہو جانے کے بعد انھوں نے شہری اڈوں کا رخ کرلیا تھا۔ سڑکوں اور گلیوں میں بکھرے بالوں، بےترتیب لباس، بھوکی آنکھوں اور ننگی خواہشات کے یہ آوارہ بگولے در غول منڈلاتے نظر آرہے تھے۔ میں غیرارادی طور پر انند رام کی پہاڑی خانقاہ کی طرف بھی گیا۔ وہ وادی اب بالکل ویران پڑی ہوئی تھی۔ انند رام کی خانقاہ کے دہانے پر بھی تختوں کا دروازہ مقفل نظر آیا۔

اس وادی سے لوٹتے ہوئے میرے دل میں ایک بے نام سی خلش تھی، رہ رہ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں ایک بار بھی اندر ناس حاصل کرکے اپنے ہاتھوں سے سونا تیار کروں مگر موجودہ حالات میں میرے لئے یہ بات ناممکنات میں سے تھی!

میں نے دوپہر کا کھانا ایک ہوٹل ہی میں کھایا۔ وہاں سے نکلا تو فٹ پاتھ پر ایک نرم و نازک سا ہاتھ اپنے سامنے دراز پایا۔

"چیریٹی پلیز!" آواز نسوانی اور کشش انگیز تھی۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا!

دراز قامت، گوری رنگت، سنہری ریشمی زلفیں، خوابناک سی اداسے لپٹی ہوئی گہری سیاہ آنکھیں، کتابی چہرہ، گداز بدن، بھرے بھرے سلگتے ہونٹ اور میرے سامنے پھیلا ہوا خوبصورت ہاتھ ــــ میں اس شاہکار کو دیکھتا ہی رہ گیا!

مجھے یوں گھورتا دیکھ کر اس نے معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں اور بے حجابانہ لہجے میں اپنا سوال دہرایا "چیریٹی پلیز!" اس کے لہجے میں نہ ندامت تھی نہ شرمندگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھ سے خیرات طلب کرنا اس کا پیدائشی حق ہو میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرا دیا اور اس کا پھیلا ہوا ہاتھ تھام کر بولا: "تم خیرات طلب کرتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں!"

"کیوں؟" وہ بالکل پُرسکون رہی۔

"تم تو خود اس قابل ہو کر لوگ تمہارے قدموں میں دل رکھ کر تم سے حُسن کی خیرات طلب کریں!" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی؟" میں سمجھ نہ سکا کہ وہ طنز کر رہی ہے یا سادگی کی بنا پر یہیں مخاطب ہوئی ہے۔

"میں نے حقیقت ظاہر کی ہے مس......!"

"یوجین!" اُس نے رواداری میں اپنا نام بتایا۔ پھر اداس لہجے میں بولی: "تم شاید کھانا کھا کر نکل رہے ہو مگر میں صبح سے حشیش کیلئے ترس رہی ہوں!"

"مجھ سے حشیش کا سودا کرلو!" میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

وہ میرا مقصد نہ سمجھ سکی اور بھنّا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا: "پیسے ہوتے تو تم سے کیوں سودا کرتی، کسی کے بھی منہ پر رقم پھینک کر حشیش لے آتی!"

"مگر بعض سودے رقم کے بغیر بھی ہوتے ہیں... بارٹر سسٹم!"

یک بیک اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دیسے بھی مگر وہ میرا مقصد بخوبی پاچکی تھی: "مجھے تم یہاں کے لوگوں سے مختلف نظر آتے ہو۔ آدمی میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیئے کہ وہ کھل کر اپنی نیت کا اظہار کرسکے۔ تم پہلے آدمی ہو جس نے مجھ سے کاروباری انداز میں بات کی ہے ورنہ یہاں تو ہر مرد پہلی ہی نظر میں محبت کا دم بھرنے لگتا ہے۔ جب تک ہم آغوشی نصیب نہ ہو، لڑکی کے پیچھے کتے کی طرح دُم ہلاتا پھرتا ہے اور جب چند نشاط آمیز لمحوں کی تنہائی میں اُسے اپنے حیوانی جذبوں کی تسکین ہو جاتی ہے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر بھاگ نکلتا ہے!"

"میں نہ تمہارا عاشق ہوں نہ محبوب! اچھی چیزوں سے رغبت رکھتا ہوں اور اپنی پسند کو ہر دام پر خرید لیتا ہوں!"

"پہلے کہیں سے حشیش حاصل کرو، اس کے بعد ممکن ہو تو کسی گوشۂ تنہائی میں چلو!"

میں نے اُسے جیپ میں اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ ایک اڈے سے اپنے لئے رم کی بوتل اور اُس کے لئے حشیش خریدی اور گرین ہاؤز کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ان دنوں میرا قیام تھا۔

بالی اور گپتا نے میرے ساتھ وارد ہونے والی قیامت کو کسی ہیجان کے بغیر دیکھا۔ وہ اس قدر فرماں بردار تھے کہ میرے سائے تک کو تعظیم دینے پر تلے رہتے تھے۔ پھر یوجین تو ایک خوبرو لڑکی تھی۔

حشیش کی خوراک ملتے ہی یوجین کی زندہ دلی پوری طرح اُبھر آئی۔ وہ نہایت روشن خیال اور بذلہ سنج لڑکی تھی۔ میں نے کئی گھنٹے تک اس کے ساتھ بہترین وقت گزارا۔ شام کے وقت کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ پھر بالی کی آواز سنائی دی۔ وہ امیر خان کی آمد کی اطلاع لایا تھا۔

میں لباس درست کرکے یوجین سمیت باہر آگیا۔

"خوب!" امیر خان اسے دیکھتے ہی بولا: "انتخاب اچھا ہے!"

"بس وقتی بہلاوا ہے!" میں نے کہا پھر گپتا سے بولا: "اس لڑکی کو میری جیپ میں شہر پہنچا دو، راستے میں زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں!"

یوجین سگریٹ کا دھواں اُڑاتی گپتا کے ساتھ چلی۔

"برخوردار تیرے اچھے دن شروع ہو گئے ہیں!" تخلیہ ہو جانے پر امیر خان بزرگانہ انداز میں بولا۔

"کیا کوئی نئی خبر لائے ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں ۔" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ "گروہ میں خطرناک اور وفادار لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ہمارے آدمی باس کے اشارے پر وہ سب کر گزرنے پر آمادہ رہتے ہیں جو اُن کے بس میں ہو لیکن بدقسمتی سے اُن کی بھاری تعداد اَن پڑھ ہے۔ ہمارے درمیان تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کم ہے اور تیرا شمار ان ہی میں ہوتا ہے۔"

میں دلچسپی کے ساتھ اُس کی بات سن رہا تھا۔ وہ سگریٹ سلگانے کے لئے خاموش ہوا تو میری بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ نہ جانے کیا حکم لایا تھا!

"پہاڑیوں میں پرشوتم لعل کے آدمیوں سے جو معرکہ ہوا تھا اس میں ہمارے چار آدمی پولیس کی نظروں میں آ گئے تھے۔ اُن میں ایک ہماری برونز آرٹ فیکٹری کے منیجر کا رشتے دار تھا۔ باس نے احتیاطاً منیجر کو فیکٹری سے الگ کر کے سرحد پار روانہ کر دیا ہے۔ اس وقت یہاں تو ہی پڑھا لکھا ہے۔ لہٰذا کل سے تجھے وقتی طور پر اس فیکٹری کے منیجر کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں۔ کام تسلی بخش رہا تو یہ جگہ پکی بھی ہو سکتی ہے ورنہ پھر بھیڑ بکریوں میں پڑ جائے گا۔" وہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔

"برونز آرٹ فیکٹری۔ تو کیا باس کوئی صنعتکار ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کیا نہیں ہے!" امیر خان زور سے ہنسا۔ "آہستہ آہستہ تجھے اس کی شخصیت کے نت نئے روپ معلوم ہوں گے، پھر بھی وہ تیرے لئے اجنبی ہو گا۔"

"فیکٹری میں میرا کیا کام ہو گا؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ "آج تک اس قسم کی ذمہ داریوں سے میرا واسطہ نہیں پڑا ہے!"

"کوئی نیا کام نہیں ہے۔ وہاں سے بھی منشیات کی اسمگلنگ ہوتی ہے۔"

"فیکٹری سے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں وہ فیکٹری مقامی تنظیم سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ ستر آدمیوں کا عملہ بھاری مولڈنگ اور کاسٹنگ مشینوں پر سیسہ، کانسی اور برونز کے کھوکھلے بُت ڈھالتا ہے جو بھاری تعداد میں امریکہ اور یورپی ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں۔ ان ستر آدمیوں کو بھی علم نہیں کہ وہاں برآمد کی آڑ میں کیا ہو رہا ہے۔ صرف پیکنگ کے شعبے میں ہمارے سات خاص آدمی کام کرتے ہیں اور اس شعبے میں ان کے علاوہ چڑیا کا بچہ تک پر نہیں مار سکتا۔ دھات کے کھوکھلے مجسموں کو پیٹیوں میں بند کرنے سے پہلے وہ ساتوں ان بتوں میں منشیات بھر دیتے ہیں اور یوں ہمارا مال بیرونی منڈیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تیرا کام اس خفیہ دھندے کی نگرانی کرنا ہو گا۔ دوسرے کاموں کے لئے تم ماتحت عملے پر اعتماد کر سکتے ہو۔"

یہ سن کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ایسے کام کا مجھے تجربہ تھا۔ میں نے کراچی میں طویل قیام کے دوران خلیج کے ملکوں سے بارہا ڈھلے ہوئے پرزوں میں سونا منگوایا تھا۔ وہ لوگ سونے کے پرزے ڈھال کر ان پر کھوٹا سا حفاظتی رنگ پھیر دیتے ہیں جو دوسرے آہنی پرزوں پر بھی لگایا جاتا تھا! اس طرح میں کسٹم والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاری رقم کمایا کرتا رہا تھا اور اب نیپال سے منشیات کی برآمد میں کم و بیش ان ہی طریقوں پر عمل کرنا تھا۔

امیر خان نے جیب سے ایک سربند لفافہ نکال کر میرے حوالے کیا۔ اُس پر میرا نام اور پتہ درج تھا۔ میں نے لفافہ کھولا تو برونز آرٹ فیکٹری کا اُبھرے ہوئے حروف والا لیٹر پیڈ نظر آیا۔ اُس پر کسی فرضی انٹرویو کے حوالے سے میری منیجر کی حیثیت سے تقرری کی شرائط درج تھیں۔ نیچے نرائن داس نامی منیجنگ ڈائریکٹر کے بہت بڑے دستخط موجود تھے!

"یہ نرائن داس کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تنظیم کا بنیادی اصول ڈسپلن ہے صفدر!" وہ بدلے ہوئے لہجے میں غرایا۔ "سینئر لوگوں کے سامنے سوال کرنے کے بجائے حکم سننے کی کوشش کیا کر۔"

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ امیر خان کی ساری خوشدلی اور مسرت رفو چکر ہو چکی تھی اور اس وقت وہ اپنے تیوروں سے میرا آقا نظر آ رہا تھا۔

"مجھے ہدایات کہاں سے ملیں گی؟" میں نے سر جھکا کر پوچھا۔

"تیرا قیام فیکٹری کے احاطے میں بنے ہوئے بنگلے میں رہے گا۔ ہدایات بنگلے کے فون پر ہی ملیں گی۔ پیغام دینے والا تجھے انجل کے نام سے مخاطب کرے گا۔ اور تو اپنی شناخت کے طور پر اُسے ڈی ون کہہ کر مخاطب کرے گا۔" امیر خان نے سپاٹ اور سرد لہجے میں کہا۔

"وہاں میں کس طرح چارج لوں گا... وہ لوگ تو میرے لئے بالکل اجنبی ہوں گے!" میں نے جھجکتے ہوئے سوال کر ہی ڈالا۔

"لوگوں کو معلوم ہے کہ کل نیا منیجر چارج لینے والا ہے۔ صبح نو بجے ایک لینڈ روور یہاں پہنچے گی۔ تجھے اسی گاڑی سے روانہ ہونا ہے۔ لیبر خود سمجھ لے گی کہ تو کون ہے!" یہ کہہ کر امیر خان اُٹھ گیا۔

وہ ساری رات میں نے الجھن میں کاٹی۔ امیر خان اور اُس کا نادیدہ باس آہستہ آہستہ میرے گرد اپنا جال مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ مجھے قلیل سی مدت میں اتنے اعتماد میں لے لیا گیا تھا کہ میں گروہ سے کسی قیمت پر الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اگر میں ایسا کوئی یک طرفہ فیصلہ کر بھی لیتا تو وہ یقیناً میری زندگی کا آخری فیصلہ ہوتا۔ جو لوگ شہر کے پولیس کمشنر کو بے رحمی سے ہلاک کر کے شہر میں آزاد دندناتے پھر رہے تھے اُن کے لئے ایک بے گھر بے در اجنبی کو ٹھکانے لگانا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

اب میرا ہر سانس ان لوگوں کا غلام تھا۔ اختیار اور پیسہ ضرور تھا لیکن آزادی سلب ہو چکی تھی۔ آزاد پنچھی کے پر تراش کر اُسے رازوں کے قفس میں ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میری بدنصیبی کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب ڈیپی سالومن کے فرار کے بعد میں جوزف کے ہمراہ ہندوستان کے سرحدی قصبے موتی ہاری میں بھٹک رہا تھا اور ایک بدمعاش سے پرانی ڈاج اسٹیشن ویگن سرحد پار پہنچانے کے عوض جعلی سفری کاغذات کا سودا کیا تھا۔

اگر میں اس شخص کے جال میں دھنسا ہوتا تو میرے حالات یکسر مختلف ہوتے۔ اس وقت مجھے احساس ہو رہا تھا کہ بسا اوقات انسان کی ذرا سی لغزش اس کے لئے کتنا بڑا جال بن جاتی ہے۔

اگلے روز مقررہ وقت پر جیپ آ پہنچی جسے ایک ادھیڑ عمر مقامی چلا رہا تھا۔ میں نے ایک سوٹ کیس پر مشتمل اپنا کل اسباب سنبھالا اور وہ مکان مالی اور چوکیدار کی تحویل میں دے کر جیپ میں سوار ہو گیا۔

نیا کام میرے لئے غیر متوقع تھا اور بظاہر سنسنی خیز نظر آ رہا تھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میں جن لوگوں میں جا رہا ہوں وہ کس قماش کے ہیں۔ فیکٹری کے تمام مزدوروں کے لئے میں فیکٹری منیجر ہوتا اور پیکنگ شاپ کے سات آدمیوں کے لئے اسمگلنگ کا نگراں۔ روپ بہروپ اور ذمہ داری خاصی کڑی تھی۔

برونز آرٹ فیکٹری کھٹمنڈو سے باہر خاصے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور اُس کے آس پاس خودرو جھاڑیوں سے بھرے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ فیکٹری کے چوکیدار نے جیپ دیکھتے ہی ایڑیاں ملا کر فوجی طرز کا سلام کیا۔ میں نے آسودگی کے ساتھ سر کو خفیف سی جنبش دی اور ڈرائیور جیپ اندر لیتا چلا گیا۔

فیکٹری کے انتظامی دفاتر کے قریب دس پندرہ آدمی میری آمد کے منتظر تھے۔ انہوں نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اُن میں ایک خوبرو اور سبک اندام سی لڑکی بھی موجود تھی۔ اُس کا نام لونا مارٹن تھا اور وہ میری سیکریٹری تھی۔ اُس نے نہایت ادب کے ساتھ وہاں موجود لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں دفتری عملہ بھی تھا اور فیکٹری کے مختلف شعبوں کے سپروائزر بھی موجود تھے۔ سب سے آخر میں شفاف کھوپڑی، کرخت تیوروں، گٹھیلے جسم اور پستہ قامت والے ایک ادھیڑ عمر کے گورکھے سے میرا تعارف ہوا۔ وہ پیکنگ شاپ کا انچارج جگدیو سنگھ تھا! مجھ سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی جسے میں کوئی معنی نہ پہنا سکا۔

میرا دفتر نہایت پُرتکلف تھا۔ فرش پر قالین۔ تین طرف لمبے پردے، وسط میں وزنی آبنوسی میز اور اُس کے عقب میں میری گردش کرنے والی کرسی موجود تھی۔ میز کی دوسری جانب آبنوس ہی کی چھ آرام دہ کرسیاں ملاقاتیوں کے لئے رکھی ہوئی تھیں۔ دفتر سے ایک دروازہ براہ راست بیرونی برآمدے میں نکلتا تھا دوسرا راستہ سیکریٹری کے ملحقہ کمرے سے ہوتا ہوا کوریڈور میں پہنچاتا تھا۔

فیکٹری میں سے آنے والی پُرشور آوازوں کے درمیان کچھ دیر تک میں اُن لوگوں سے رسمی باتیں کرتا رہا۔ پھر میز کرسی سنبھالنے سے قبل ان کے ہمراہ فیکٹری کے معائنے پر نکل گیا۔

فونڈری، مولڈنگ، مشیننگ، پنچ فٹنگ، ڈائی کاسٹنگ، فنشنگ اور کوالٹی کنٹرول کے شعبوں میں بھی بھاری مشینوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جن پر مزدور جانفشانی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کوالٹی کنٹرول کے شعبے میں اس وقت کانسی اور پیتل کے ڈھلے ہوئے گوتم بدھ کے کھوکھلے مجسمے موجود تھے جنہیں باری باری جانچا جا رہا تھا۔ ایک طرف مسترد کئے ہوئے مجسموں کا انبار سمیٹا جا رہا تھا اس شعبے میں ایک بہت بڑے شوکیس میں برصغیر کے بہت سے دیومالائی کرداروں اور شخصیتوں کے مجسموں کے نمونے قرینے سے سجے ہوئے تھے جن میں چھ انچ سے ڈھائی تین فٹ اونچے مختلف بت موجود تھے۔

مزدوروں نے دبی دبی مسرت کے ساتھ میرا استقبال کیا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب سختی کے ساتھ ڈسپلن کے پابند رکھے گئے ہیں اور یہ بات میرے لئے اُمید افزا تھی ورنہ بے لگام مزدوروں کو سنبھالنا میرے لئے بہت بڑا مسئلہ بن جاتا۔

کام کے طریقوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا آخر کار میں کارخانے سے باہر آ گیا اور گھاس کا ایک سرسبز تختہ عبور کر کے اونچی دیواروں والے ایک شیڈ کی طرف ہو لیا۔ یہاں میرے ساتھ صرف تین نفوس تھے۔ باقی لوگ خود بخود ہی فیکٹری میں رُک گئے تھے۔ ان میں جگدیو سنگھ میری رہنمائی کر رہا تھا۔ لونا مارٹن اور سیکیورٹی افسر یہ دونوں میرے ہمراہ تھے۔

پیکنگ شاپ میں داخل ہوتے وقت سیکیورٹی افسر بولا۔ "سر اس شعبے کے بارے میں اب تک انتظامیہ سخت اصولوں کی پابند رہی ہے۔ جگدیو سنگھ اور آپ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص یہاں داخلہ کا مجاز نہیں ہے کیونکہ اس مرحلے میں مجسمے بہت قیمتی ہوتے ہیں اور مالی منفعت کی خاطر کوئی بھی ان کی چوری پر آمادہ ہو سکتا ہے!"

جگدیو سنگھ نے بزرگانہ انداز میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

پیکنگ شاپ میں اس وقت چھ قوی الجثہ نیپالی گورکھے صفائی میں مصروف تھے۔ ہماری آہٹ پاتے ہی وہ سارا کام چھوڑ کر مودب ہو گئے۔

اس وقت وہاں کوالٹی کنٹرول کے شعبے سے آئی ہوئی چار آہنی ٹرالیاں موجود تھیں جن پر کانسی کے چمکتے ہوئے کرشنا کے کھوکھلے مجسمے سجے ہوئے تھے جنہیں پلاسٹک کی تھیلیوں میں سیل کر کے پہلے گتے کے ڈبوں میں پیک کیا جاتا تھا پھر یہ ڈبے لکڑی کی پیٹیوں میں بند کر کے لوہے کی پٹیوں سے محفوظ کر دیئے جاتے اور پیٹیاں ہوائی اڈے روانہ کرنے کے لئے تیار ہوتیں۔

پیکنگ شاپ میں بڑھئی خانے کے تمام اوزار اور دیگر لوازمات موجود تھے۔ میں نے اچھی طرح گھوم پھر کر اس شعبے کا جائزہ لیا اور وہاں بھی میں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ کر سکا۔ وہ ساتوں اپنے کام میں بہت ماہر اور محتاط تھے۔ کسی بات سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہاں کوئی غیر معمولی کام ہوتا ہے۔

دوپہر کے وقت میں فیکٹری کے احاطے سے ملحق اپنی نئی رہائش گاہ میں پہنچا۔ وہاں ضرورت اور آرام کی ہر چیز قرینے سے موجود تھی۔ خانساماں کھانا تیار کر چکا تھا۔ دوسرے ملازم نے دانت نکال کر مجھے پرنام کیا۔ وہ بیک وقت مالی اور چوکیدار کا کام کرتا تھا۔

میں نے گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لیا۔ یہاں میری خوابگاہ میں دو فون موجود تھے۔ ایک کا تعلق فیکٹری کے اندرونی نظام مواصلات سے تھا۔ دوسرا بیرونی کالز کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں لپک کر خوابگاہ میں پہنچا۔ میرے اندر گھستے ہی خود کار دروازہ بند ہو گیا۔ بیرونی ٹیلیفون کی گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔

"ہیلو انجل!" میرے ریسیور اُٹھاتے ہی دوسری جانب سے بھرائی

ہوئی خوابناک آواز ابھری جو میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔

"یس باس!" میں بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

دوسری جانب سے ایک خونخوار غراہٹ کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے بے جان ریسیور کو دیکھا جیسے اُس میں آسیب حلول کر گیا ہو۔ پھر اسے کریڈل پر رکھ دیا۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنی پیشانی پر گیا تو وہ عرق آلود تھی۔

اس وقت میرا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے اس خوفناک غراہٹ کا کیا مطلب تھا۔ ظاہر ہے باس نے مجھے صرف غراہٹ سُنانے کے لئے فون نہیں کیا تھا۔ پھر آخر اُس کے یوں اچانک سلسلہ منقطع کرنے کا کیا سبب تھا۔

بوڑھا خانساماں بہت گھاگ آدمی تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی تاڑ گیا کہ ٹیلیفون میرے لئے ناخوشگوار ثابت ہوا ہے۔ فوراً خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "سرکار کچھ شوق فرمائیں گے؟"

"وہسکی اگر ہے تو لے آؤ!"

دوسرے پیگ میں میرے اوسان ذرا بحال ہوئے تو میں فکرمندی کے بوجھل احساس کے ساتھ واپس فیکٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔

دن کا باقی حصہ میں نے اپنی سکریٹری لونا مارٹن کی مدد سے فائلوں اور ریکارڈ کے تفصیلی معائنے میں گزارا۔ وہ لڑکی ملازمت کے گُر سے خوب واقف تھی۔ مجھ سے اتنے قریب ہو کر فائلیں نکال رہی تھی کہ اُس کے گداز بدن سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی بھینی بھینی مہکار مجھے پریشان کئے دے رہی تھی۔ مگر میں اس ناخوشگوار ٹیلیفون کے بعد ذہنی طور پر ایسی کسی صورتِ حال سے بہرہ ور ہونے کے قابل نہ رہا تھا۔

دفتر کا وقت ختم ہونے پر لونا مارٹن اٹھی تو اُس کے ترکش کا آخری تیر دلنواز مسکراہٹ بن کر اُس کے یاقوتی لبوں پر اُبھر آیا۔ "سر ۔۔۔ کیا میں جا سکتی ہوں؟"

میں نے خالی الذہنی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا "ہاں۔ آج کے لئے اتنا ہی کام کافی ہے۔ تم جا سکتی ہو!"

میرے جواب پر شاید اسے کچھ مایوسی ہوئی اور وہ پرس لہراتی، کھٹ کھٹ کرتی دفتر سے نکل گئی۔ میں اُس کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک دفتر ہی میں بیٹھا رہا۔ چوکیدار کے قدموں کی آہٹ کے سوا فیکٹری سے اُبھرنے والا ہر شور شام کے ڈھلتے ڈھلتے سایوں میں دم توڑ چکا تھا۔ میں تھکے ہارے انداز میں ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے دفتر سے نکلا اور جیپ میں مختصر سا فاصلہ طے کر کے گھر جا پہنچا۔

غسل کرنے اور لباس بدلنے کی نیت سے خوابگاہ میں پہنچا تو اچانک میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔

جگدیو سنگھ لمبے پھل والا چمکدار شکاری چاقو سنبھالے خوابگاہ میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر براجمان تھا اور اُس کی چمکیلی آنکھیں میری طرف مرکوز تھیں۔

میں نے بے اختیار لوٹنا چاہا لیکن جگدیو سنگھ کی سرد آواز نے میرے قدم پکڑ لئے "آج منگل ہے اور منگل کی شام دونوں کی چھٹی ہوتی ہے سر ۔۔۔ اس وقت ہم دونوں کے کوئی نہیں ہے!"

میرا دل بے اختیار اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھے باہر کا ملازم نظر نہ آیا تھا۔ اور جگدیو کا لہجہ ۔۔۔! میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا تھا یا تحکم، سرکشی تھی یا فرمانبرداری!

اگر وہ سچ ہی کہہ رہا تھا تو میں اس وقت خطرے میں تھا۔ ذہنی طور پر پراگندہ تھا، وہ پُرسکون ۔۔۔ جسمانی طور پر [illegible] شہ زور ۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے پاس اس کے شکاری بے رحم پھل کا کوئی توڑ نہیں تھا!

کو یہاں مامور کرتے ہوئے اُس دن کا اہتمام اسی لئے کیا گیا تھا کہ منگل کی شام میں میرے ساتھ اہم گفتگو کر سکیں!" جگدیو کی تیز دھار پر انگلی پھیرتا کرسی سے اُٹھا۔

"لیکن تم میری اجازت کے بغیر یہاں کیسے گھسے؟" اس کا لہجہ

میں نے قدرے جارحانہ انداز اپنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جگدیو حکم کا غلام ہے سر!" وہ سر کو خم دے کر ادب سے بولا "باس کی جانب سے براہِ راست حکم ملا تھا کہ میں آپ کی پہلی تنبیہ تک۔۔۔"

"پہلی تنبیہ!" میں الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"ہاں ۔۔۔!" وہ دھیمی آواز میں بولا "باس نے سنا دیا کیا تھا اور آپ اسے مخاطب کرتے ہوئے ہدایات بھول بیٹھے تھے!"

معاً میرے ذہن کے دریچے کھل گئے ۔۔۔ مجھے علم ہو گیا کہ خطرناک غراہٹ کے ساتھ یک بیک فون کا سلسلہ کیوں منقطع کر دیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ باس فون پر مجھے ایگل کہہ کر مخاطب کرے گا اور میں اُسے ڈی ون کہہ کر پکاروں گا۔ مگر میں یہ ہدایت فراموش کر بیٹھا تھا اور اس نے غصّے میں فون کا سلسلہ ہی منقطع کر دیا تھا!

"مگر تم یہاں چاقو کھولے کیوں بیٹھے تھے؟" میں نے کے بعد پوچھا۔

"عام حالات میں، میں آپ کا غلام ہوں!" وہ چاقو بند کر کے ڈالتے ہوئے بولا "مگر باس کے حکم پر یہاں آنے والا کتے کا کوئی حال آپ سے بدتر ہو گا اور آپ اس کی اتھارٹی ماننے پر مجبور ہوں گے۔ جو کچھ کیا اس کے لئے میں آپ کو نہیں ڈی ون کو جواب دہ ہوں ۔۔۔ ہاں بعد میں پھر آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔۔۔!"

جگدیو سنگھ کے رویّے نے میری خود سر طبیعت میں خاصی کر دی تھی ۔۔۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ برونز آرٹ فیکٹری میں منیجر کا چارج سنبھالتے ہی مجھے اپنے ماتحت کے ہاتھوں یوں ذلت اٹھانی پڑے گی۔

کچھ دیر تک کمرے کی فضا پر بوجھل خاموشی مسلط رہی جسے میں نے ہی توڑا۔ "آج تمہارے شعبے کی کیا کارکردگی رہی ہے۔۔۔!"

جگدیو مشینی انداز میں بولنے لگا جیسے ایک ایک لفظ حفظ کر کے آیا ہو "کل بیس پونڈ کوکین ہمارے پاس پہنچی تھی، جس کے لئے ہمارے پاس دو آرڈر موجود تھے۔ سترہ پونڈ ہم نے گنیش اور شیواجی کے کھوکھلے مجسموں میں بھر دی۔ برمنگھم کی ایسٹرن امیکس نامی فرم کے ایسے اسّی مجسموں کا آرڈر ہمارے پاس موجود تھا۔ وہ کھیپ ایئرپورٹ بھجوا دی گئی ہے۔ باقی تیرہ پونڈ رہ جاتی ہے، لیکن کوالٹی کنٹرول سیکشن سے تین مجسمے کم آئے تھے۔ لہٰذا یہ کام کل صبح شروع ہو کر شام سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے، یہ آپ ہی سے معلوم ہو سکے گا۔"

"ٹھیک ہے ۔۔۔ تم جا سکتے ہو!" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "کل لنچ کے بعد تم میرے دفتر میں آؤ گے!"

"اوکے سر!" اس نے کہا اور مستعدی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نئے حالات میرے لئے ابتدا ہی میں غیر متوقع ثابت ہو رہے تھے۔ یہ عجب اختیار تھا کہ معتوب ہونے کی صورت میں میرا ہی ایک ماتحت میری بے آبروئی پر مامور کیا گیا تھا، گو اس تمام کارروائی میں جگدیو سنگھ کا کوئی قصور نہ تھا، وہ بیچارہ تو صرف ڈی ون کا ہرکارہ تھا مگر اس وقت میری جذباتی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ بس چلتا تو جگدیو سنگھ کے ٹکڑے اڑا دیتا!

میں بستر پر دراز سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ مگر ذہنی سکون نصیب نہ ہو سکا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی، مگر نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔

پھر اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں غیر ارادی طور پر بستر میں یوں اچھل پڑا جیسے میری پشت میں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے لپک کر ایکسٹینشن ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے باس کی جانی پہچانی خوابناک آواز اُبھری۔ وہ بھرّائے ہوئے مخصوص لہجے میں مجھے ایگل کہہ رہا تھا۔۔۔!

اس آواز میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ میری ساری جھلاہٹ یک بیک کافور ہو گئی اور میں نے لہجے میں مضبوطی پیدا کرتے ہوئے اُسے ڈی ون کہہ کر پکارا ۔۔۔ ریسیور میں اس کے ہنسنے کی خونخوار سی آواز اُبھری۔

"مجھے یقین تھا کہ جگدیو سے ملاقات کے بعد تم آج کی رات نہ سو سکے ہو گے۔ میری ہدایات سے انحراف کرنے والوں کو بڑے اذیت ناک تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر آئندہ تم سے یہی غلطی دوبارہ سرزد ہوئی تو کھٹمنڈو کے کسی معروف بازار میں کوئی بھکاری بھی پھٹے ہوئے جوتے سے تمہاری مرمت کر سکتا ہے!"

یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میری سماعت میں اترتے چلے گئے اور میں خود پر قابو پاتے ہوئے ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "سوری ۔۔۔ آئندہ ایسی غلطی کا اعادہ نہیں ہو گا۔"

"گڈ!" اس بار لہجہ تحسین آمیز تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری قوتِ برداشت کی تعریف کر رہا ہو "عام حالات میں تمہارا رتبہ بہت بلند ہے، میں اسے پسند نہیں کروں گا کہ کسی ناخوشگوار موقعے پر مجھے ایک مرتبہ پھر تمہارے کسی ماتحت کو براہِ راست احکام دینے پڑیں ۔۔۔ جگدیو اسے بھول چکا ہو گا۔ تم بھی وہ واقعہ بھول جاؤ!"

"میں بھول چکا ہوں جناب!" میں نے اپنے دل میں بھڑکتے ہوئے نفرت کے لاوے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اب ماضی سے تمہارا رشتہ ٹوٹ چکا ہے ۔۔۔ خاندان اور اس سے متعلقہ افراد آئندہ تمہارے لئے اجنبی ہوں گے ۔۔۔" توقف کے بعد وہ پھر بولا "آج پیکنگ شاپ میں کیا خاص کام ہوا ہے۔"

میں نے جگدیو سے ملنے والی معلومات اسی کے حوالے سے دہرا دیں۔

"گڈ۔" وہ بولا "تمہیں اپنی میز کی تیسری مقفل دراز میں ایک اہم فائل ملے گی، اس کا مطالعہ کرنے کے بعد تم سارا طریقہ کار سمجھ جاؤ گے، اس فائل کو پڑھنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے جلا کر تلف کر دینا ۔۔۔ یہ کام بہت ضروری ہے۔۔۔!"

"بہتر سر۔۔۔!" میں جلدی سے بولا "کیا میں ایک سوال کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

"پوچھو۔۔۔!"

"میں لونا مارٹن پر کتنا اعتماد کر سکتا ہوں؟"

"جتنا منیجر کی حیثیت میں ضروری سمجھو!" وہ خوابناک آواز سنائی دی "یہ یاد رہے کہ وہ پیکنگ شاپ کے معاملات سے لاتعلق ہے، جگدیو اور اس کے چھ آدمیوں کے سوا کسی کو ادھر کی بھنک نہیں ملنی چاہیئے۔!"

"میں سمجھتا ہوں جناب!"

"کل صبح نو بجے ایک ٹرک پر کچھ مال فیکٹری پہنچ رہا ہے۔ ٹرک کے چیسز کے ساتھ ایک چوبی صندوق بندھا ہوا ہو گا۔ پیکنگ شاپ کے عملے سے وہ بکس کھلوا لینا۔ بکس کا وزن کرنے کے بعد اس کی کچی رسید ٹرک ڈرائیور کو دے دینا ۔۔۔ شاید تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"جی، میں سمجھ گیا!" میں جلدی سے بولا۔ اسی کے ساتھ لائن بھی بے جان ہو گئی۔!

وہ رات میں نے سخت اُلجھن اور بے چینی کے عالم میں گزاری۔ میں اس بارے میں جتنا سوچتا رہا اُلجھتا چلا گیا۔ یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ اس منظم اور بارسوخ گروہ سے گلو خلاصی کا تصور بھی محال ہے، شاید کوئی معجزہ ہی اس چکر سے نکال لیتا تو میں آزاد ہوتا ورنہ یہ نئی قید مجھے اپنا اٹل مستقبل بنتی نظر آ رہی تھی۔ اسی سوچ بچار میں یہاں تک غور کرنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے اب طویل منصوبہ بندی کے ذریعے گروہ میں قدم جمانے چاہئیں۔ اور کسی سازش کے ذریعے خود کو ڈی

دن کے مقام پر پہنچا نا چاہئیے، اس کے لئے اس پُراسرار سرغنہ کا خاتمہ بہت ضروری تھا۔ اگر میں یہ کام انجام دے سکتا تو کسی کو کان کان بھی پتہ نہ چلتا کہ ان کا اصل سربراہ مارا جا چکا ہے اور اس کی جگہ صفدر علی ان پر حکمراں ہے!

اگلی صبح دفتر پہنچا تو لونا مارٹن میں انقلابی تبدیلیاں محسوس کیں۔

وہ خوبرو اور سبک اندام لڑکی تھی اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ پہلے روز میں محض ذہنی پراگندگی کے باعث اُس کے حوصلہ افزا بلکہ دعوت آمیز رویہ کا مثبت جواب دے سکا تھا۔ ورنہ عام حالات میں میرے اندر کا صفدر علی تو اس کے چرنوں میں سر رکھ دیتا۔ اب یہ اس کی کم فہمی تھی یا میری خوش بختی کہ میرے سرد مہرانہ رویہ سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کی مسکان وار کے وار مجھ پر کاری نہ رہے اور آج وہ اپنی دانست میں پوری طرح مسلح ہو کر آئی تھی۔ بغیر آستینوں کے گلابی بلاؤز اور گھٹنوں سے قدرے اونچے اسکرٹ میں اُس کا گداز بدن یوں چھلکا پڑ رہا تھا، جیسے شباب کے اس پیکر کو پُرشوق نگاہوں سے محفوظ رکھنے میں لباس ناکام ہوا جا رہا ہو۔ اُس کے لباس میں گو عریانی یا بازاری پن نہیں تھا لیکن میری شوریدہ نظروں کو رہ رہ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ لونا جیسی لڑکی کے لئے وہ معقول لباس ناکافی ہے۔ اور اس پر میک اپ کا ہلکا سا امتزاج! رخسار اُس کے یوں بھی گلابی تھے لیکن غازہ کے ہلکے سے پچ نے اُس کے چہرے پر انتہنی لپک پیدا کر دی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑے انداز سے مسکرا کر اُٹھی، اور سر کو خم دے کر مجھے سلام کیا۔ میں تو پہلے ہی ٹھٹھک کر رک گیا تھا، وہ میری مسکراتی ہوئی تیز نظروں کی تاب نہ لاسکی اور لوکھلاہٹ کے عالم میں اپنی میز کی درازیں ٹٹولنے لگی۔

اپنی میز کی تیسری مقفل دراز میں نے کھولی تو اس میں آج ایک ایسی فائل موجود تھی جو کل شام تک وہاں نہیں تھی۔ میں نے لونا مارٹن کو ہدایت کی کہ آج لنچ تک میں بہت مصروف ہوں لہٰذا کسی بھی ملاقاتی کو میرے پاس نہ بھیجا جائے!

اس فائل میں فیکٹری کے برآمدی کاروبار کے بارے میں اہم معلومات موجود تھیں، لندن، روم اور پیرس میں فیکٹری کے نمائندوں کے باضابطہ دفاتر تھے، وہ نمائندے اپنے اپنے حلقوں سے مجسّموں کے آرڈر حاصل کر کے فیکٹری کو روانہ کرتے تھے، اسی کے ساتھ خفیہ حروف اور الفاظ کے ذریعے مختلف منشیات کی ضرورت سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ مال تیار ہو جانے پر منشیات کی مطلوبہ مقدار کھوکھلے مجسّموں میں بھر کر سیل کر دی جاتی۔ جن آرڈرز کے ساتھ منشیات درکار نہ ہوتیں، اُن میں کوئی ہیرا پھیری نہ کی جاتی اور سارا مال فضائی کمپنیوں کے ذریعے متعلقہ نمائندے کو روانہ کر دیا جاتا۔ نمائندوں کے ذریعے برآمد کا بظاہر یہ بہانہ تھا کہ راستے میں مال کی ٹوٹ پھوٹ کا بار ہمارے خریداروں پر نہ پڑے بلکہ ہمارے نمائندے صحیح اور صاف ستھرا، معیاری مال بیرونی خریداروں تک پہنچائیں، لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مال پہنچتے ہی ہمارے وہ نمائندے مجسّموں میں سے منشیات نکال کر بھاری داموں پر غیر ملکی مارکیٹ میں پھیلا دیتے اور مجسّمے اصل اور جائز خریداروں تک پہنچا دیئے جاتے۔

فیکٹری منیجر کی حیثیت سے یہ میری ذمہ داری تھی کہ جوں ہی باہر سے منشیات کا کوئی آرڈر موصول ہو میں ڈی ون کو اس کی مقدار اور معیار سے آگاہ کروں، ساتھ ہی یہ بھی بتاؤں کہ اس ایجنٹ کو مجسّموں کی جس کھیپ کے ساتھ وہ غیر قانونی مال روانہ کرنا ہے وہ کھیپ کب تک تیار ہو کر پیکنگ شاپ تک پہنچ گی۔ یوں مجسّموں کی پیکنگ سے ایک روز قبل ڈی ون کسی نہ کسی طرح منشیات کی مطلوبہ مقدار رازدارانہ طور پر پیکنگ شاپ پہنچا دیتا۔ اس مال کے لانے والے کو فیکٹری کے حسابات سے ایک پیسہ بھی ادا نہ کیا جاتا تھا بلکہ وزن کی ایک کچی رسید دے دی جاتی تھی جس کی بنیاد پر ڈی ون براہِ راست یہ پہلو سنبھالتا تھا۔ اسی طرح غیر ملکی نمائندے منشیات کے بدلے کوئی رقم فیکٹری کو نہیں بھیجتے تھے۔ مال کی برآمد کے نتیجے میں برونز آرٹ فیکٹری کو بنکوں کے ذریعے صرف مجسّموں کی رقم وصول ہوتی تھی، منشیات کی فروخت سے حاصل ہونے والی بھاری رقوم کہاں جاتی تھیں، اس کے بارے میں فائل خاموش تھی۔

میں کئی گھنٹے تک اس اہم فائل کے مطالعے میں کھویا رہا۔ ڈی ون نہایت محتاط طریقے پر برونز آرٹ فیکٹری کو منشیات کی غیر قانونی اسمگلنگ کیلئے استعمال کر رہا تھا۔ جب میں موتی ہاری میں اس گروہ کے چنگل میں پھنسا تھا تو یہ غنڈوں اور جرائم پیشہ لوگوں کا ایک لامحدود ٹولہ نظر آیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس تنظیم کے نت نئے پہلو میرے سامنے آتے جا رہے تھے، لاکھوں کے سرمایہ سے قائم شدہ ایک فیکٹری کی آڑ میں یوں بین الاقوامی پیمانے پر کالا دھندا کرنا کسی معمولی گروہ کے بس کی بات نہیں تھی ... اب تک کے تجربات سے صاف ظاہر تھا کہ اس قدر پھیلے ہوئے غیر قانونی کاروبار کی پشت پر صرف ایک ہی ذہن کارفرما تھا!

اس فائل میں ساری معلومات سادہ کاغذات پر ٹائپ کی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ڈی ون کی ہدایات کے مطابق اس فائل کو تلف کرنے کے بجائے اپنے پاس محفوظ رکھوں، لیکن اس کے وسائل سے مجھے بھی خوف آنے لگا تھا وہ کسی بھی وقت اس سے آگاہ ہو سکتا تھا اور اس نافرمانی کی سزا کے تصور نے ہی میرے ان باغیانہ خیالات کو پسپا کر دیا!

برونز آرٹ فیکٹری کے قانونی اور غیر قانونی دھندے جلد ہی میری سمجھ میں آ گئے اور میں نے پہلے ہفتے کے اختتام سے قبل ہی مختلف پیداواری شعبوں کے سلسلے میں ہدایات جاری کرنی شروع کر دیں۔ اس دوران میں لونا مارٹن میرے بہت قریب آتی جا رہی تھی۔ جگدیو کا رویہ حکم کے غلام جیسا تھا اس نے پہلے روز والے قصہ کو شاید بالکل ہی بھلا دیا تھا لیکن میں اپنی اس توہین کو فراموش نہ کر سکا تھا، جب بھی جگدیو سے میرا سامنا ہوتا، اشتعال کی ایک لہر میرے وجود میں دوڑ جاتی۔

اس دوران میں دو تین بار ڈی ون نے بھی فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ کسی بدروح کی طرح فیکٹری کے پل پل کے حالات سے بخوبی واقف

وہ شاید منگل ہی کی شام تھی۔ میں دفتر سے نکلا تو لونا مارٹن خلافِ معمول فائلوں کا انبار میز پر ڈھیر کئے بیٹھی تھی، چہرے پر وہی سدا بہار تازگی رقصاں تھی جو مجھے بار بار اُس کی جانب متوجہ ہو جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

"ہیلو لونا ... کیا آج دیر تک بیٹھنے کا ارادہ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یس سر!" وہ قاتل مسکراہٹ نثار کرتی ہوئی سیدھی ہو گئی اور شکن آلود اسکرٹ سیدھا کرنے لگی "آج اکاؤنٹ والے بھی اوور ٹائم کر رہے ہیں۔ آڈٹ کے لئے حسابات تیار ہو رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اپنا رکا ہوا کام بھی نمٹا لوں، ورنہ دفتر میں تنہا بیٹھنے سے تو مجھے ہول آتا ہے ...!"

اس وقت میرے آس پاس کوئی موجود نہ تھا، بس قریب میں واقع اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ سے ملی جلی انسانی اور مشینی آوازیں اُبھر رہی تھیں، حسن اور تنہائی کے اس امتزاج نے گناہ کو ترغیب دی اور میرے ہونٹوں پر بھی جوابی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "اکاؤنٹ والوں کا کام کئی دن دیر تک چلے گا۔ اپنا کام پھر کبھی نمٹا لینا!"

میری خاموشی پر لحظہ بھر تو وہ یوں میری جانب نگراں رہی، جیسے میری زبان سے کچھ اور بھی سُننے کی متمنی ہو، مگر میری خاموشی کو طویل ہوتے دیکھ کر اس کے تر و تازہ چہرے پر ہلکا سا اضمحلال اُگر گزر گیا اور وہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔ "بہتر سر ...!"

میں نے محسوس کیا کہ اس نے میرے مشورے کا غلط مفہوم لیا ہے، وہ یہ سمجھی تھی کہ میں اُسے اوور ٹائم کرنے سے روک رہا ہوں، جب کہ میرا منشاء کچھ اور ہی تھا، میں نے اُس کی میز کے قریب جا کر نرم آواز میں کہا "مجھے تمہارے اوور ٹائم پر کوئی اعتراض نہیں ہے لونا! منگل کو میرے ملازمین شام میں چھٹی کرتے ہیں اور میں بنگلے پر تنہا ہوتا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر تم میرے ساتھ چل کر میرے لئے چائے تیار کر سکو ... میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے بنگلے کی فضا پر کسی نسوانی آواز کا کیا اثر پڑتا ہے!"

اُس کی آنکھیں روشن دیوں کی طرح چمک اُٹھیں۔ ساری پژمردگی مسرت میں ڈھل گئی اور وہ بے یقینی کے عالم میں بولی "اوہ ... واقعی سر؟ کیا آپ واقعی مجھے اس قابل سمجھتے ہیں؟" اُس نے یہ کہتے ہوئے اس قدر معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں کہ میں خود کو بمشکل اسے بانہوں میں سمیٹنے سے روک سکا!

جیپ میں وہ مختصر سا فاصلہ خاموشی کے ساتھ طے ہوا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے بے تکلفی کے ساتھ اُس کے شانے پر ہاتھ مارا "تم چائے تیار کرو۔ میں فریش ہو کر ابھی آتا ہوں۔" اور میں اپنا کوٹ صوفے پر اچھالتا خواب گاہ کی طرف ہو لیا۔

میں نے جاتے جاتے محسوس کیا کہ میری یہ اچانک بے تکلفی اس کے لئے خوشگوار حیرانگی کا باعث بنی ہے ... اس نے ایک ادا کے ساتھ سر کو جھٹکا اور کچن کی طرف ہو لی!

نہاتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے سوزی یاد آ گئی۔ وہ میری سیکریٹری، مونس، غمخوار، داشتہ سب ہی کچھ تھی، کوئی باضابطہ جذباتی رشتہ نہ ہونے کے باوجود وہ میرے مشکل لمحات میں بہترین رفیق ثابت ہوتی۔ کراچی میں وہ برسوں میرے ساتھ رہی اور اپنے وفا شعار رویہ سے مجھے کبھی بیوی کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا، اور جب میں جوئے میں آخری پونجی ہار کر پولیس سے بچنے کے لئے فرار ہوا تو میں نے کلفٹن کے ایک نیم تاریک چوراہے پر اچانک ہی اسے الوداع کہا تھا اور تاروں کی چھاؤں میں ... اسے سسکتا بلکتا چھوڑ کر اپنی نامعلوم منزلوں کی طرف ہو لیا تھا اور اب یہ لڑکی لونا مارٹن مجھے کچھ اسی کی یاد تازہ کرتی نظر آ رہی تھی۔ لونا کی طبیعت میں ٹھہراؤ کے بجائے شوخی رچی ہوئی تھی، لیکن پھر بھی میری گھاگ نظریں اس میں وہ صلاحیتیں دیکھ رہی تھیں جو پُرسکون زندگی کو ترسے ہوئے ایک مصروف شخص کو چند لمحوں کے لئے آسودگی کی لازوال نعمت بخش سکتے تھے!

میں نہانے کے بعد گاؤن کی ڈوری باندھتا باہر آیا تو وہ میری آہٹ پا کر باورچی خانے سے چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے باہر نکلی۔ میں اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم ہی میں جا بیٹھا۔

"سر آپ ..." چائے بناتے ہوئے اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تکلف ختم ... اب ہم دفتر سے باہر ہیں اور دوستی کے سوا ہر رشتہ ختم ہو چکا ہے ...!"

اُس نے نظریں اُٹھا کر میری جانب دیکھا، جیسے میرے الفاظ کے وزن کا اندازہ کر رہی ہو۔ پھر آہستہ سے بولی "یہ آپ کی عنایت ہے ورنہ میرے اور آپ کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہے جسے نظر انداز کرنے کی جرأت شاید مجھے مہنگی بھی پڑ سکتی ہے!"

اُس کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ شوخ اور الّھڑ لونا کے الفاظ نہیں تھے بلکہ اس کی آواز میں کوئی ستم رسیدہ سی لڑکی بول رہی تھی! "تم یک بیک سنجیدہ کیوں ہو گئیں؟"

اس نے بڑی بڑی آنکھیں میری طرف اُٹھائیں تو وہاں آنسو تیر رہے تھے "سر میں نے عورت ہونے کے باوجود خود کو کبھی اتنا مجبور اور بے بس محسوس نہیں کیا جتنا میں ان دنوں محسوس کر رہی ہوں۔"

میں اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اس لڑکی کے بارے میں میرا رنگین سپنا بکھرتا جا رہا تھا۔ میں اس کو ایک خوبرو تتلی سمجھ کر اس کے تعاقب میں نکلا تھا، اس نے خود دفتری کاموں کے دوران اپنے دعوت آمیز رویے سے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ فلرٹ ہے، لیکن اس شوخ اور چنچل نار میں تو کوئی دکھی عورت چھپی معلوم ہو رہی تھی!

"لونا ... تم جیسی ہنستی مسکراتی لڑکی کی آنکھوں میں یہ آنسو زیب نہیں دیتے۔" میں نے اپنے دل میں اُس کے لئے ہمدردی کے جذبات محسوس کرتے ہوئے

کہا۔ اگر میں تمہارے دُکھ بٹا سکا تو یہ میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہوگی۔

اس نے پرس سے رومال نکال کر نم آنکھیں صاف کیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں ہمیشہ ... بول کر خود کو فریب دیتی رہی ہوں۔ میں نے محض وقتی بہلاووں کے لئے آپ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کی گھٹیا کوششیں کی تھیں لیکن آج مجھے اپنے وجود پر ندامت کا احساس ہو رہا ہے، نہ جانے کیوں میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ سے کوئی بات نہ چھپا سکوں گی!"

میں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں مدتوں سے نازک انسانی جذبوں سے عاری زندگی گزارتا چلا آ رہا تھا۔ مجھے کبھی احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ انسانی زندگی میں ان رشتوں کا کیا دلکش کردار ہوتا ہے۔ میں نے پہلی محبت گلنار سے کی تھی، مگر جب میں نے اُسے اپنے بے ضمیر دوست اکبر کی بیوی اور بازارِ حسن کی ایک مہنگی جنس کے روپ میں دیکھا تو اسے قتل کر بیٹھا۔ اس کے بعد میرے نزدیک عورت کی کوئی وقعت نہیں رہی، بس ہر عورت کے دام ہوا کرتے تھے۔ ان میں کوئی مہنگی تھی، کوئی سستی۔ مگر اس لڑکی لونا مارٹن نے تو جیسے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا!

"تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو کھل کر کہہ ڈالو۔ مجھے تم اپنا ہمدرد پاؤ گی؟"

اور اس نے رو رو کر مجھے جو کہانی سُنائی وہ بہت دردناک تھی، وہ ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئی مگر چار برس کی عمر میں ہی باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور چند ماہ کے بعد اس کی جوان سال ماں نے ایک اور نوجوان میں دلچسپی لینی شروع کر دی جو آوارگی کے ہر روپ سے عشق کرتا تھا اور ایک روز ان دونوں نے شادی بھی کر لی۔ لونا کے ساتھ سوتیلے باپ کا رویّہ ناقابلِ فہم حد تک الجھا ہوا تھا۔ وہ اس سے معنی خیز فقروں میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ لونا نے اس گھر میں اپنا لڑکپن کرب اور مفلسی کے عالم میں گزارا، اس کا باپ فطری طور پر کاہل تھا۔ ایک دفتر میں کلرک کی حیثیت سے اس کی جو کچھ آمدنی ہوتی وہ اُسے شراب اور جوئے میں اُڑا دیتا۔ جب لونا کی ماں اُس سے اخراجات طلب کرتی تو وہ... بیدردی کے ساتھ اس کی ٹھکائی کیا کرتا۔ رفتہ رفتہ لونا کی ماں نے اس سے امید رکھنی چھوڑ دی اور خود ملازمت کرنے لگی مگر اس کا شوہر اپنی آمدنی اُڑانے کے بعد لونا کی ماں سے بھی خاصی رقم اینٹھ لیتا تھا۔ اس کے ساتھ ہر وقت اس کے قرض خواہ گھر کے چکر کاٹتے رہتے تھے۔

اور جب لونا نے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا تو اس کے بے ضمیر سوتیلے باپ کو اس کے روپ میں دولت کی دیوی رقص کناں نظر آئی۔ وہ لونا کو ہی آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا مگر یہاں ماں کی مامتا خونخوار تیوروں کے ساتھ اس کے مقابل آگئی۔ آخر کار لونا گناہ کی راہ سے تو بچ گئی لیکن اسے ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا گیا!

گزشتہ ایک سال سے اس کی ماں سخت علیل تھی۔ باپ مدت قبل ملازمت سے نکالا جا چکا تھا۔ لونا کی آمدنی اتنی ضرور تھی کہ وہ سہ نفری کنبہ بڑی بے فکری کے ساتھ اپنے دن گزار سکتا تھا مگر اس کے سوتیلے باپ کی عادتوں نے ان ماں بیٹی سے ذہنی سکون چھین لیا تھا۔ بیوی کو چھوڑ کر اب وہ لونا کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور اسے زیادہ سے زیادہ رقم کمانے پر مجبور کرتا تھا!

اس نے سسکتے ہوئے مجھے بتایا کہ اب تک وہ خود کو بہت مشکل سے گناہ کی دلدل سے بچا سکی ہے۔ اس کا باپ بھی صاحبِ فراش ہو کر بستر پر پڑا ہوا ہے، شراب ابھی تک اس کے اعصاب پر سوار ہے اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے لونا ہنس بول کر اپنے ساتھیوں سے کچھ نہ کچھ مالی فائدے اُٹھاتی رہتی ہے۔ اس نے محض اس نیت سے مجھ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تھے کہ شاید خود کو محفوظ رکھتے ہوئے وہ میری ہمدردیاں جیت کر تنخواہ وغیرہ میں کچھ اضافہ کرا سکے، لیکن میرے رویّہ نے اسے خود سے شرمسار کر دیا اور وہ میرے سامنے حقیقت کا اظہار کر بیٹھی۔

"تم وہ گھر کیوں نہیں چھوڑ دیتیں جہاں ایک بے غیرت شخص ہر وقت تمہارا مول چکانے پر تلا ہوا ہے۔!" اُس کی ساری بات سُن کر میں نے کہا۔

"وہ گھر چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گی.... میرا کوئی بھی تو سہارا نہیں ہے۔"

"تم شادی کر سکتی ہو۔ تم جیسی لڑکی کے لئے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔؟"

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں... مگر میری ماں کے تجربات نے میرے ذہن میں شادی کے تصور ہی سے دہشت بٹھا دی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح فریب کا شکار ہو جاؤں! پھر شادی کے بعد میری ماں کا کیا ہوگا۔ میرا ہونے والا شوہر ایک بوڑھی اور مستقل مریض عورت کا بوجھ کیوں اُٹھائے گا۔؟ میں کسی طرح اپنے سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔!"

میں نے محسوس کیا کہ لونا مارٹن بڑی معصوم سی لڑکی ہے۔ اپنی زندگی سنوارنے کے لئے اس کے سامنے بہت سی راہیں کھلی ہوئی تھیں مگر ماں کے ساتھ ساتھ اسے اپنے سوتیلے باپ سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سے تمام تر نفرت اور کراہت کے باوجود وہ لاشعوری طور پر اسے سہارا دینا چاہتی تھی۔ اُسے یہ گوارہ نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں اُس کا باپ، خواہ وہ سوتیلا ہی ہو، لاوارثوں کی طرح شہر کی فٹ پاتھ یا کسی خیراتی اسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنے آخری سانس پورے کرے!

"اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں تمہارے کام آ سکتا ہوں!" میں نے اسے پیشکش کی "میں تنہا ہوں۔ اخراجات محدود ہیں اور میں اپنی آمدنی کا خاصا حصّہ اسی قسم کے فلاحی کاموں میں لگاتا رہتا ہوں۔ اگر میں مالی طور پر تمہیں سہارا دے سکا تو میرے لئے خوشی کی بات ہوگی۔"

"اوہ سر... آپ فرشتہ ہیں!" اس کی آواز ایک بار پھر بھرّا گئی۔ "خود غرضی کے اس دور میں بھلا کون یہ سب سوچتا ہے۔!"

اس روز وہ کافی دیر تک میرے ساتھ رہی، پھر میں بنگلہ مقفل کر کے اُسے اپنی ہی جیپ میں لے کر شہر کی طرف چل دیا۔ میں تو اُسے گھر کے اندر چھوڑنا چاہتا تھا لیکن اُس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اُسے گھر سے دور ہی چھوڑ دوں۔ میں نے بھی اصرار کر کے اس کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا اور اسے متوسط درجے کی ایک آبادی میں اتار کر واپس ہو لیا۔

ذہن پر عجیب سی ویرانی مسلط تھی۔ میں بے خیالی کے عالم میں جیپ ادھر اُدھر دوڑاتا شہر کے بارونق علاقے میں جا نکلا!

اِس شہر میں نوجوان اور خوبصورت ہپّی لڑکیوں کی گناہ پذیر سرگرمیاں سورج غروب ہوتے ہی زور پکڑ جاتی ہیں، فٹ پاتھوں پر، تنگ گلیوں میں اندھیرے گوشوں میں نسوانی جسموں کو سکّوں کی کھنک میں تولا جا رہا تھا۔ میں یہ سب دیکھتا ایک بڑے شراب خانے کے سامنے جا رکا۔ جیپ بند کر کے شراب خانے کی طرف بڑھا تو کئی لڑکیوں کی امید بھری، سوالیہ نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ مہاتما شیو اندرام خود تو سرِ فلک پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں روپوش ہو چکا تھا، لیکن اُس کے گمراہ چیلوں کے ٹولے شہر کی اخلاقی اقدار پر دیدہ دلیری کے ساتھ شب خون مارتے پھر رہے تھے!

میں شراب خانے میں بیٹھا کچھ دیر تک بلیک ہارس سے شغل کرتا رہا۔ نو بجے کے قریب میں نے بل ادا کر کے کاؤنٹر چھوڑ دیا۔ شراب کا سرور اب ذہن میں عورت کی طلب کو اُبھار رہا تھا۔ ساتھ ہی رہ رہ کر لونا کی تصویر ذہن میں گھوم رہی تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اُسے فٹ پاتھ کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔

شراب خانے سے چند سو گز آگے ایک سائبان کے نیچے سے ایک نسوانی ہیولا نمودار ہو کر اچانک جیپ کی طرف آیا۔ میں نے بریک لگا دیئے!

وہ لڑکی قبول صورت اور جوان تھی۔ میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ اچھل کر میرے پہلو والی سیٹ پر یوں آ بیٹھی جیسے اُس سے میری پرانی شناسائی رہی ہو۔

"مجھے کچھ رقم دو تاکہ میرے ساتھی سکون کے ساتھ رات گزار سکیں!" اُس نے سائبان کے نیچے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے کچھ سفید فام لڑکے لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کتنی رقم چاہیئے۔؟" میں نے مُسکرا کر پوچھا۔

"پانچ دس روپے!" وہ لاپرواہی سے بولی۔

میں نے پرس سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اُس نے میرے ہاتھ سے نوٹ جھپٹ کر مسرت بھری آواز میں کیٹی کہہ کر کسی کو پکارا! جواب میں سائبان کے نیچے سے سُنہرے بالوں والی ایک سبک اندام اور بے حد حسین لڑکی لپک کر جیپ کی طرف آئی۔

"تم لوگ یہ پیسے رکھو... میں صبح چرچ کے سامنے پہنچوں گی!" اُس نے دس کا نوٹ کیٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

کیٹی لوٹ ہی رہی تھی کہ میں نے اُسے پکارا۔ "ٹھہرو۔!"

وہ مڑ کر کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں میرا منہ تکنے لگی۔

"تم بُرا نہ مانو تو میں کیٹی کو لے جانا پسند کروں گا!" میں نے اپنے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی سے کہا۔

"لے جاؤ، لے جاؤ!" وہ جیپ سے اُترتے ہوئے لاپرواہانہ لہجے میں بولی "مگر وہ تھوڑی ہی دیر میں کسی کتیا سے بھی بدتر ہو جائے گی!"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں اپنا کوٹہ پورا کر چکی ہوں۔ مگر کیٹی کو دس بجے تک مارفیا کا انجکشن نہ ملا تو وہ پاگلوں کی طرح چیخنے اور ناچنے لگے گی۔!"

"اوہ۔ تو اسے رہنے دو!" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ گستاخ لڑکی زور سے ہنسی "ڈرو نہیں... یہ ابھی بے ضرر ہے راستے سے اس کے لئے مارفیا کی شیشی خرید لینا، سرنج اس کے پرس میں موجود ہے یہ خود لگا لے گی۔ اس کے بعد تم اس کا جو بھی حشر کرو، یہ اُف تک نہ کرے گی!"

اس نے جلدی سے کیٹی کو دھکا دیا اور وہ جیپ میں آ بیٹھی اور میں نے ایک طویل سانس لے کر جیپ کو آگے بڑھا دیا۔!

ایک شبینہ میڈیکل اسٹور سے میں نے مارفیا خریدی۔ دوکاندار جیپ میں کیٹی کو دیکھ کر صورتِ حال سمجھ چکا تھا، اس لئے مجھے شیشی دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ میں نے خفت آمیز انداز میں سر کو جنبش دی اور تیزی سے باہر آ گیا۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو اس وقت سوا نو بج رہے تھے۔ مجھے اس وقت یہ گھبراہٹ تھی کہ جلد از جلد بنگلے پر پہنچ کر دس بجے سے پہلے کیٹی کو انجکشن دیدوں اگر راستے ہی میں دس بج جاتے تو وہ اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔!

میں تالا کھولنے کے بعد کیٹی کو خوابگاہ میں لیتا چلا گیا، اس نے میرے ہاتھ سے شیشی لے کر اپنے پرس سے گندی سی سرنج نکالی، اس کے سرے پر سوئی لگائی اور شیشی کا سارا سیّال سرنج میں کھینچ لیا۔ میں نے اس سے سرنج لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا، لیکن اس نے مجھے منع کر دیا "تم فکر نہ کرو، میں یہ کام خود ہی سرانجام دے لوں گی!"

سرنج سے ہوا کے بلبلے خارج کرنے کے بعد اُس نے اپنے برہنہ بائیں شانے میں سوئی داخل کی اور داہنے انگوٹھے کی مدد سے آہستہ آہستہ وہ نشہ آور سیّال اپنی شریانوں میں پہنچا دیا۔

سرنج خالی ہونے کے بعد اس کے چہرے پر گہرا سکون پھیل گیا۔

"تم بہت شریف آدمی ہو اور تم کیا، سارے ہی مشرقی شریف ہوتے ہیں۔ کسی جوان اور بے سہارا عورت کو تکلیف میں دیکھ کر اُن کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ اس کی ذرا سی توجہ حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ لُٹا سکتے ہیں۔!"

"کیا تم مجھ پر طنز کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟" میں نے مصنوعی طور پر غصّے میں پوچھا۔

"اوہ... نہیں نہیں" وہ جلدی سے بولی۔ "میں نسلاً سویڈش ہوں۔ وہاں کے تقریباً سارے ہی مرد ورنسے ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ وہ دن بدن عورت سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں، حتیٰ کہ!! ضروریات کے لئے بھی وہ اپنی صنف کو خود کفیل سمجھنے لگے ہیں۔ شاید حسینۂ عالم بھی وہاں کسی معروف چوراہے پر کھڑی ہو جائے تو بمشکل چند ہی مردوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے گی، جب کہ تم لوگ ابھی تک عورت کو اپنی ضرورت سمجھتے ہو۔"

"بڑی بددل ہو سویڈش مردوں سے!" میں ہنسا۔

"مرد فطری طور پر بھیڑیا ہے، جب تک اس کو کسی عورت کا پیار بھرا ساتھ نہ ملے اس میں محبت، ہمدردی اور تہذیب کے جراثیم پیدا نہیں ہوسکتے۔" وہ بے باکانہ انداز میں بولی۔ "اور میرے بہت سے ہم وطن عورت کے سائے تک سے بھاگتے ہیں!"

"اور عورت کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے اُسے چھیڑا۔

"میں سمجھی نہیں۔!"

"عورت فطری اعتبار سے کیا ہے اور مرد کی اس کے لئے کیا اہمیت ہے؟" میں نے کہا۔

"عورت نام ہی نرمی، محبت اور تہذیب کا ہے۔ رہا مرد تو عورت کے لئے وہ اتنا اہم نہیں ہے۔ عورت کو کسی بچے کی پرورش میں بھی وہی سکون اور لازوال ذہنی آسودگی ملتی ہے جو مرد اپنی دانست میں اسے ہم آغوش کرکے بخشتا ہے۔!"

"یہ تو تم فرائڈ کی تھیوری کو مسخ کرکے پیش کررہی ہو!"

"یہ میرے تجربات کا نچوڑ ہے... اس بات کو تم یوں سمجھ لو کہ دنیا کے اسی فیصد سے زیادہ مرد شادی شدہ ہونے کے باوجود دوسری عورتوں اور بالاخانوں کا تعاقب کرتے ہیں۔ کیونکہ عورت اُن کی بہت بڑی اور ناگزیر ضرورت ہے، لیکن ایسی عورتوں کا تناسب بہت کم ہے جو مردوں کا پیچھا کرتی ہوں۔ آج تک کہیں ایسے باضابطہ بازارِ حسن نہ کھل سکے جہاں مرد بیٹھتے ہوں!"

"پھر تم میرے پاس کیوں آئی ہو۔؟"

"میں نہیں آئی۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اس وقت تمہاری ..... ضرورت صرف اور صرف عورت ہی پوری کرسکتی ہے۔ جبکہ میری ضرورت معمولی رقم تھی جس کے لئے میں اگر چوری کرلیتی تو تمہاری ضرورت نہ رہ جاتی۔ میری ضرورت ثانوی درجہ رکھتی ہے اور تمہاری طلب بنیادی ہے۔"

"یہ تو تمہاری کٹھ حجتی ہے!" میں لاجواب ہوکر بولا۔

"جس مقصد سے مجھے یہاں لائے ہو وہ پورا کرو، مجھ سے بحث کرکے تم نہ جیت سکوگے۔ میں نے انسانی نفسیات کے جنسی پہلو پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ پھر ساری ڈگریاں جلاکر بازاروں میں نکل آئی، کیونکہ اس مقام پر مجھے ہر چیز ڈھکوسلہ نظر آنے لگی تھی!"

میں نے اُس کا مشورہ مان لیا۔ "اگر تم نہالو تو پھر ہم آرام کریں گے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ ایکدم گھبراگئی۔ "پانی سے مجھے وحشت ہوتی ہے اور سارا نشہ برباد ہوجاتا ہے!"

ایسی چرب زبان لڑکی میں نے پہلی بار ہی دیکھی تھی جو اپنی بحث کے حق میں مضبوط دلائل بھی رکھتی ہو!۔

میں لباس وغیرہ تبدیل کرنے کیلئے باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھوکر چند منٹ بعد باہر آیا تو کیٹی غائب تھی۔ میں نے اُسے آوازیں دیں۔ لیکن بے سود! پھر اچانک میری نظر سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ میں نے دیکھا تو اس پر جلدی جلدی میں چند سطریں گھسیٹی گئی تھیں۔

"میں تمہارے پرس سے رقم لے جارہی ہوں۔ انگلش... رقم کا شکریہ! میری ضرورت پوری ہوگئی۔ اب تم ساری رات ... دُھنتے رہو اور مان لو کہ تمہاری ضرورت عورت ہی پوری کرسکتی ... صرف عورت!"

وہ میری جیبی ڈائری سے پھاڑا ہوا ایک ورق تھا اور تحریر کیلئے بھی شاید میرا ہی قلم استعمال کیا گیا تھا۔ اس چوٹ پر میری کھوپڑی ... میں نے جلدی سے اپنے پرس کا جائزہ لیا۔ رقم کے سوا ہر چیز جوں کی توں ... تھی۔ مجھے رقم کا تو کوئی ملال نہ تھا مگر ایک لڑکی کے ہاتھوں یوں ... اور پھر محروم سی رات گزارنے کی سخت جھلاہٹ تھی!

میں تیزی کے ساتھ باہر نکلا، لیکن ہر طرف ویرانی کا راج تھا ... میں گونجنے والی جھینگروں کی تیز آوازیں میری بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھیں ... میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا خواب گاہ میں آیا اور دھیمی روشنی کا بلب ... بستر پر دراز ہوگیا۔ شراب کا سرور تباہ ہوچکا تھا اور کیٹی کا خیال بار بار ... آرہا تھا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس بحث کے نتیجے میں اپنی بات ثابت کرنے کیلئے اِس حد تک جاسکے گی تو اس کمبخت سے اس موضوع پر ایک سیکنڈ ... بات نہ کرتا۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ اپنی بات عملی ثبوت ... ساتھ مجھ پر واضح کرچکی تھی۔

میں بستر پر کروٹیں بدلتا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا کہ ... میں اچانک آہٹ سی سُنائی دی۔ میں ہڑبڑاکر اُٹھا تو کیٹی کا کھنکتا ہوا ق... سُنائی دیا۔ میں نے بیڈ سوئچ آن کردیا۔

دروازے میں کیٹی کھڑی بے تحاشا ہنسے جارہی تھی ...

وہ انتہائی عجیب بلکہ ناقابلِ فہم لڑکی تھی۔ مجھے اس پر بے انتہا غصہ بھی آ... مجھے مسلسل اُلو بنائے جارہی ہے

"مان گئے نا میری بات!" وہ میرے قریب آکر بستر پر گرتے ...

"کہاں تھیں تم؟"

"برابر والے کمرے میں! میں جسم فروش ضرور ہوں مگر چور نہیں!"

"یہی رفتار رہی تو بہت جلد کامیاب ڈاکے بھی مارنے لگوگی!" ... زبردستی ہنستے ہوئے کہا۔ میں سنجیدگی اختیار کرکے اُسے اپنا مذاق اڑانے ... مزید موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ "میں نے تو اپنی رقم پر صبر کرلیا تھا...!"

"مگر میرے فرار پر صبر آیا ہوگا۔" وہ پرس سے رقم نکال کر مجھے ... ہوئے بولی۔ "تم نے یہ نہ سوچا کہ آتنی رات گئے۔ یہاں سے فرار ہوکر میں ... کیسے پہنچ سکوں گی!"

"یہ تم رکھ لو۔" میں نے رقم اُسی کو لوٹادی۔ "تمہارے لئے شہر ... نہ پہنچنا برابر ہی تھا۔ تم یہ رات جنگل ہی میں بسر کرلیتیں!"

"میں نے سُنا ہے کہ ان مضافات میں خطرناک جنگلی جانور کثرت پائے جاتے ہیں۔" وہ پھریری سی لیکر میرے اور قریب سرک آئی۔

"تو کیا ہوا۔ مرد تمہاری بنیادی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہ رات میرے بجائے کسی گیدڑ، بھیڑیئے یا جنگلی سور کے ساتھ بھی بسر کرسکتی تھیں!"

"چلو مان لیتی ہوں کہ تم آج کی رات میرے لئے ناگزیر ہو!" وہ بے حیائی سے کھلکھلاکر ہنس پڑی "مرد اپنی برتری کا طلسم بکھرتا کبھی نہیں برداشت کرسکتا!"

کیٹی اپنے رنگین فلسفے کے باوجود بڑی دلکش ساتھی تھی۔ اُس نے اپنی دلربا اداؤں سے ذرا ہی دیر میں میری ناراضگی رفع کردی اور میں نے رات کے باقی لمحات اس کے وجود میں کھوکر گزار دیئے۔!

اگلے روز میں دفتر پہنچا تو لونا مارٹن میں واضح تبدیلی محسوس کی۔ اُس کی ساری شوخی باوقار رویہ میں بدل چکی تھی۔ میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں رکھتا کہ میں فطری اعتبار سے عورتوں کا رسیا تھا اور اس صنف کے لئے تفریح کے سوا کسی قسم کے خیالات نہیں رکھتا تھا، لیکن اب لونا مارٹن کے بارے میں مجھے اپنے خیالات میں بڑی تبدیلی آتی محسوس ہورہی تھی۔

اسی روز دفتر میں مجھے خیال آیا کہ نرائن داس کا کھوج نکالنا چاہیئے جس کے دستخط میرے تقرر نامہ پر برونز آرٹ فیکٹری کے منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت میں ثبت تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ٹیلیفون ڈائرکٹری نکالی اور مجھے فیکٹری کے نام کے نیچے ہی نرائن داس کا گھریلو پتہ اور ٹیلیفون نمبر نظر آگئے اور مجھے اپنی اب تک کی حماقت پر افسوس ہونے لگا۔

اگر مجھے اس گروہ کے چنگل سے نجات پانی ہی تھی تو سب سے پہلے مجھے اندازہ لگانا تھا کہ بغاوت یا فرار کے بعد میرے تحفظ کے کیا امکانات ہیں اور یہ امکانات اسی وقت پوری طرح واضح ہوسکتے تھے جب گروہ کی اعلیٰ قیادت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلیتا۔ ابھی تک امیر خان سے اوپر میری کہیں رسائی نہ تھی۔ اور امیر خان خود اعتراف کرتا تھا کہ وہ تنظیم کا ایک اوسط درجہ کا رکن ہے اس لئے امیر خان کی شخصیت کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنا حماقت کے مترادف ہوتا۔ باس کو میں نے دیکھا ضرور تھا، لیکن اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ برونز آرٹ فیکٹری میں اُس نے ڈی ون کے طور پر جس طرح اپنے تسلط کا اظہار کیا تھا اُس سے تو خاصی حوصلہ شکنی ہوتی تھی۔ وہ فیکٹری کے بارے میں ضرورت سے زیادہ باخبر تھا اور مجھے کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں تک میرا پیچھا کرسکتا ہے۔!

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے لنچ سے تھوڑی دیر پہلے فون پر... نرائن داس کے نمبر ڈائل کئے۔ پہلی ہی گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اُٹھالیا گیا اور کسی نے بھاری مردانہ آواز میں ہلو کہا۔

"کیا نرائن داس صاحب موجود ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کون بول رہا ہے؟"

"میں ان کا ایک دوست بول رہا ہوں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "مجھے ارجن سنگھ کہتے ہیں!"

دوسری طرف ایک ثانیئے کے لئے خاموشی چھاگئی۔ پھر پوچھا گیا "آپ اُن سے آخری بار کب ملے تھے۔؟" لہجہ نرم اور شریفانہ تھا۔

"میں ان سے چند ماہ قبل ملا تھا۔" میں نے لہجے میں مصنوعی ناگواری پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تو تم سراسر جھوٹے اور بدمعاش ہو!" دوسری طرف سے درشت لہجے میں اتنا کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا گیا۔ میں نے بھی ریسیور کریڈل میں ڈال دیا۔

ٹیلی فون پر میری گفتگو توقع سے زیادہ اہم ثابت ہوئی تھی۔ میں نے تو محض نقطۂ آغاز کے طور پر نرائن داس کے مکان پر ٹیلی فون کیا تھا۔ یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ گفتگو اس قدر سنسنی خیز ثابت ہوگی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ نرائن داس کی ذات سے کچھ نہ کچھ ایسی اہم کڑیاں وابستہ ہیں جو تنظیم کے سرغنہ پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈال سکتی ہیں۔!

اس شام لونا مارٹن میرے ساتھ پھر نکلنے پر گئی۔ اُس سے باتوں کے دوران میں بھی کئی بار مجھے نرائن داس کا خیال آیا۔ ایک بار یہ بھی سوچا کہ اس معاملے میں لونا کو رازدار بناؤں لیکن میں ہمت نہ کرسکا۔ اگر یہ راز ذرا بھی افشا ہوجاتا تو میری موت نہایت دردناک ہوتی، جبکہ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اپنے لئے... اور شاید لونا کے لئے بھی! اس پیاری لڑکی کے بارے میں میرے احساسات تیزی کے ساتھ جذباتی رُخ اختیار کرتے جارہے تھے۔

اس رات میں لونا کو چھوڑنے پھر شہر گیا۔ واپسی میں اِدھر اُدھر گشت کرتا رہا۔ نرائن داس کی اقامت گاہ آنند بھون کا رُخ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر ہمارے باس کا اس عمارت سے ذرا بھی تعلق تھا تو میرے اُدھر جانے کی خبر اسے میری طرف سے مشکوک کردیتی!

کئی گھنٹوں کی آوارہ گردی کے بعد ایک ہوٹل سے مجھے تھوڑی سی معلومات حاصل ہوگئیں جو میری دانست میں بہت اہم تھیں۔ میں نے ہوٹل کے استقبالیہ کلرک کو بتایا کہ "میں شہر میں ایک اجنبی سیاح ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ نرائن داس نامی کوئی مقامی فرد ایک بہت بڑی مجسمہ ساز فیکٹری کا مالک ہے۔ میں اُس سے مل کر فیکٹری کی مصنوعات دیکھنی چاہتا ہوں۔"

"بے سود ہے جناب!" کلرک نے مایوسی سے جواب دیا "نرائن داس ایک فاترالعقل شخص ہے اور برسوں سے وہ آنند بھون ہی میں مقید ہے اس کی جواں سال بیوی یہ پسند نہیں کرتی کہ وہ بھرے پُرے مقامات پر اور تفریح گاہوں میں اپنے پاگل شوہر کی مجنونانہ حرکات کی وجہ سے لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بنے!"

"اوہ تو وہ پاگل فیکٹری کیسے چلا رہا ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"مقدروں کے کھیل ہیں جناب۔" کلرک حسرت کے ساتھ بولا۔ "یہاں ہوشمند روٹیوں کو ترستے ہیں اور دیوانے لکھ پتی ہیں۔ چند برس پہلے کی

ہی بات ہے کہ نرائن داس چیتھڑوں میں ملبوس شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا بچے اس کے پیچھے تالیاں بجاتے تھے۔ پھر اچانک اس کا چچا آنند لعل دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ نرائن داس اس کا واحد وارث تھا۔ اُسے کسی نہ کسی طرح آنند بھون تو پہنچا دیا گیا مگر پاگل پن کی وجہ سے قانونی طور پر آنند لعل کا ورثہ اسے منتقل نہ کیا جا سکا۔ پھر سننے میں آیا کہ اس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی۔ نرائن داس کے متولی کے طور پر اس کی بیوی نے فیکٹری، سرمایہ اور جائداد اپنے نام کرالی اور اب شاید وہی سارے کاروبار کی براہِ راست نگران ہے۔"

میں اُسے دس روپے کا ایک نوٹ دے کر باہر آ گیا۔! اب میری سمجھ میں آ چکا تھا کہ چند ماہ قبل نرائن داس سے ملنے والی بات پر آنند بھون والے کیوں برہم ہو گئے تھے۔!

بہرحال سرا میرے ہاتھ آ چکا تھا اور میں دوسرا پانسہ پھینکنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے ایک ڈاکخانے کے پبلک بوتھ سے پھر آنند بھون کے نمبر ملائے۔ سلسلہ مل جانے پر بدلی ہوئی آواز میں مسز نرائن داس سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"کیا کام ہے؟" دوسری جانب سے بھرائی ہوئی خوابناک آواز سنائی دی اور میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔ یہ وہی آواز تھی جو میں مختلف مواقع پر سنتا رہا اور اسی آواز والے کو میں ڈی ون کہہ کر مخاطب کرتا رہا تھا۔

اس وقت میں نے فوری طور سوچا کہ اس شخص کو بھی بوکھلا دینا چاہیے مگر میں اسے ڈی ون، سفید ہاتھی کی کھال یا کسی ایسے اشارے کی بنیاد پر چونس نہیں دے سکتا تھا جو وہ میرے ساتھ رابطے میں استعمال کرتا تھا کیونکہ ایسی صورت میں میں مشکوک ہو سکتا تھا۔ مجھے اتنا تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہ دو آدمیوں کے لئے ایک ہی اشارہ استعمال نہیں کرتا!

"چلو وہ نہیں بات کر سکتی تو تم کان کھول کر سن لو کہ میں پرشوتم لعل کی خودکشی کا راز جانتا ہوں اور اپنی اطلاعات کسی بھی وقت پولیس تک پہنچا سکتا ہوں!" میں نے اسی بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" اس کی آواز میں کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔

"تم خوب جانتے ہو کہ یہ بکواس نہیں حقیقت ہے!"

"میں کچھ نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو، پھر بھی اپنا مقصد بیان کرو۔"

"مجھے فوری طور پر پچاس ہزار روپے درکار ہیں۔!"

"کیا تم مجھے اسی وقت مل سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں ہنس پڑا۔ "اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھ سے تم اتنی آسانی سے چھٹکارا نہیں پا سکو گے۔ اگر کل دوپہر دو بجے تک مجھے رقم نہ ملی تو نتائج کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی!"

دوسری طرف ایک ثانیہ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ بولا: "رقم تمہیں کہاں اور کیسے بھیجی جائے گی۔؟"

"صدر بازار کے مشرقی سرے پر ایک کوڑا گھر ہے۔ رقم بریف کیس میں بھر کر اسے پرانے کپڑوں میں لپیٹو اور اسے کوڑے گھر میں ڈلوا دو!"

"اگر وہ رقم وہاں سے کوئی اور نکال لے گیا۔؟"

"اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ بریف کیس وہاں ڈالتے کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے!" اتنا کہہ کر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

ڈی ون نے جس قدر پُرسکون انداز میں مجھ سے یہ معاملہ طے کیا تھا اس سے میرے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا کہ میرے لئے اس بریف کیس تک پہنچنے کی کوئی بھی کوشش میرے لئے جان لیوا بن سکتی تھی۔ وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ اپنے کسی حریف کے سامنے یوں آسانی سے ہتھیار ڈال دے۔

دوسرے روز میں دفتر ہی میں مصروف رہا۔ شام کا وقت بنگلے میں محدود رہ کر گزارا۔ تیسری صبح فیکٹری آنے والے ایک ہولناک خبر لائے جسے سن کر میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔!

کوڑے گھر سے صفائی کرتے ہوئے سرکاری عملے کے ایک شخص کو چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک چرمی بریف کیس ملا تھا جسے کھولتے ہی ایک زبردست دھماکے سے پورا علاقہ لرز اٹھا۔ بریف کیس کھولنے والے کے بدن کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ تیرہ افراد زخمی ہوئے اور آس پاس کی چند عمارتوں کو بھی نقصان پہنچا۔

ڈی ون نے یقینی طور پر اس بریف کیس میں کوئی ایسا طاقتور خودکار بم رکھا ہوگا جس کا نظام بریف کیس کھلتے ہی کام کر جاتا اور اس طرح ڈی ون نے اپنی دانست میں اپنے حریف سے چھٹکارا پانے کا بہترین اور یقینی انتظام کیا تھا!

دو دن میں موقع کی تلاش میں رہا۔ اِس بار میں جگدیو کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ نہ صرف ڈی ون کا خاص آدمی تھا بلکہ اس سے میری چپقلش بھی تھی۔ اُسے ٹھکانے لگا کر نہ صرف میں ڈی ون کو ہراساں کر سکتا تھا بلکہ اپنے جذبۂ انتقام کو بھی تسکین پہنچا سکتا تھا۔

اگلے روز میں نے چھٹی سے چند منٹ قبل جگدیو کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ فیکٹری میں چھٹی ہونے کے بعد وہ گھر جانے کے بجائے فیکٹری کے باہر جھاڑیوں میں روپوش رہے کیوں کہ میں اُس کی مدد سے ایک اہم کام سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی اُسے یہ ہدایت بھی کر دی کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو کہ مجھ سے اس کی کیا بات ہوئی ہے۔!

جب مجھے یقین ہو گیا کہ فیکٹری خالی ہو چکی ہے تو میں دفتر سے نکلا، چابیاں چوکیدار کے حوالے کیں اور جیپ لے کر شہر والی سڑک پر ہو لیا۔ چند فرلانگ دُور نکلتے ہی پروگرام کے مطابق میں نے ہاتھ بڑھا کر جیپ روک دی۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد جگدیو باہر آ گیا۔ اسے ساتھ

[لے] کر میں نے جیپ ویران راستوں پر ڈال دی۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ جگدیو [کی] چیپ پر الجھن ناچ رہی ہے۔ مگر وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ایک تنگ سے درہ میں پہنچ کر میں نے جیپ روک کر اس کا انجن [بند] کر دیا اور جگدیو سے کہا کہ وہ درہ کی دوسری جانب کا جائزہ لے۔ وہ [جیپ] کر جیسے ہی سامنے پہنچا میں نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور جگدیو کی کمر میں پے در پے [خوف]ناک دھماکوں میں دم توڑ گئیں۔

میں جیپ سے اُتر کر اس وقت تک نیچے کھڑا رہا جب تک جگدیو نے [پتھ]روں پر تڑپ تڑپ کر دم نہ توڑ دیا۔

اگلے روز خلافِ معمول صبح سویرے مجھے بنگلہ پر ہی ڈی ون کا [فون] موصول ہوا۔ وہ گھبرایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ "آج کسی نامعلوم شخص [نے] جگدیو کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس شہر میں ہمارا کوئی گمنام دشمن پیدا [ہو] چکا ہے۔ جگدیو کی ہلاکت کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص بروز آرٹ [فیکٹ]ری کے اصل دھندے سے باخبر ہو چکا ہے، لہٰذا فوری طور پر وہاں سے [تمام] ارا منشکوک سامان تلف کرا دو۔ اگلی ہدایات تک۔ بس صاف ستھرے [مال کی] کھال روانہ کرتے رہو!"

اتنا کہہ کر اُس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور میرے ہونٹوں پر تلخ [س]ی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اِن دنوں قسمت مجھ پر مہربان نظر آ رہی تھی، جو مجھے [اتن]ی آسانی سے ڈی ون کا سراغ مل گیا اور وہ میرے ایک دو حربوں ہی میں [بُر]ی طرح بوکھلا گیا، ورنہ اس سے قبل تو ڈی ون ایک ڈراؤنے خواب کی طرح [می]رے اعصاب پر مسلط تھا اور میں اس سے نجات پانے کی آخری اُمید تک [چھ]وڑ چکا تھا۔! اس دوران میں لونا مارٹن میرے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ وہ [اک]ثر بیشتر شام میں میرے پاس رُک جاتی تھی اور میں اس کی رفاقت میں اپنی [س]اری الجھنیں بھول جاتا تھا مگر میں نے اپنی خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں [اب]ھی تک اسے لاعلم ہی رکھا تھا۔ جگدیو کے قتل کی خبر پڑھ کر اس نے بتایا کہ [و]ہ اس گورکھے کو ہمیشہ سے سخت ناپسند کرتی تھی، کیونکہ وہ عجیب سے احساسِ [کمت]ری کا شکار تھا بلکہ لونا کا تو خیال تھا کہ وہ بہت ہی بدطینت شخص تھا۔ [اس] کے طور طریقوں سے کسی جرائم پیشہ شخص کی بو آتی تھی۔!

میں اس وقت تک جو کچھ کر چکا تھا اُس میں کسی قسم کی منصوبہ [بند]ی کو دخل نہیں تھا، بس وقتی ارادوں کے تحت ڈی ون کو بوکھلانے کی [کو]شش کرتا رہا، لیکن میرا اصل مقصد اس گروہ سے نجات حاصل کرنا تھا۔ [او]ر اس میں کامیابی کی ابھی تک کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔

میں اس رات بستر پر دراز بہت دیر تک سوچ بچار کرتا رہا۔ [لیک]ن کوئی صورت بنتی نظر نہ آئی۔ میرے حق میں سب سے مضر بات یہی تھی کہ میں [بال]کل تنہا تھا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ایک منظم گروہ سے ٹکر لینا [می]رے لئے محال تھا۔ بغیر ثبوت کے پولیس سے رجوع کرنا کھلی حماقت تھی!

آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ شہر میں ہی روپوشی اختیار کر لوں اور کچھ دن اسی طرح چھپے رہنے کے بعد انا پورنا کے پہاڑی سلسلوں میں اپنی منزل کی جانب چل پڑوں، جہاں سے بھاند ناس حاصل کرنے کے بعد میں اپنے وطن لوٹ سکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے لونا مارٹن کو ٹٹولا۔ وہ ابھی تک کھل کر اعتراف تو نہ کر سکی تھی لیکن اس کے دل میں میری محبت جگہ پا چکی تھی۔ اُس سے آخری ملاقات میں کئی بار میرا دل چاہا کہ اُسے بتا دوں کہ میں اب اُس سے رخصت ہو رہا ہوں۔ لیکن زبان نہ کھل سکی۔!

آخری رات میں نے اپنے چند جوڑے اور رقم سمیٹی اور بنگلے سے نکل پڑا، وہ منگل کی رات تھی۔ دونوں ملازم چھٹی پر تھے اس لئے میں انہیں کچھ بتانے کی زحمت میں پڑے بغیر جیپ لے کر وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ شہر میں آ کر میں نے ایک دوکان سے خورد و نوش کا کچھ سامان خریدا اور جیپ وہیں چھوڑ کر نچلے درجے کی ایک آبادی کی طرف ہو لیا۔

مجھے اپنی تلاش میں جلد ہی کامیابی حاصل ہو گئی اور میں ایک عسرت زدہ ٹیکسی ڈرائیور کے دروازے پر جا پہنچا جو بھاری بخشش کے عوض مجھے راتوں رات کھٹمنڈو سے شمال میں ایک گاؤں تک پہنچانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔!

دشوار گزار پہاڑی راستوں پر رات کا سفر بہت خطرناک ہوتا ہے لیکن ڈرائیور احتیاط اور مہارت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں وہ مجھے ان علاقوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہا لیکن مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال نہ کیا شاید وہ میرے بارے میں اپنے طور پر کوئی رائے قائم کر چکا تھا۔

صبح تین بجے اس نے ٹیکسی ایک چھوٹے سے گاؤں میں تختوں، پھونس اور مٹی سے بنے ہوئے ایک مکان پر روک دی۔ کئی دستکوں کے بعد ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور لالٹین کی ناکافی روشنی میں چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہم دونوں کا جائزہ لینے لگی۔

"اماں تیرے لئے گاہک لایا ہوں؟" ڈرائیور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "دو تین دن یہاں رہ کر اسے کہیں آگے روانہ ہونا ہے۔!"

یہ سن کر اس بوڑھی کی باچھیں کھل گئیں اور وہ ہم دونوں کو اندر لے گئی۔ مکان اندر سے صاف ستھرا تھا۔ بوڑھی کا اپنا بستر زمین پر تھا اور ایک طرف دو چوبی تخت موجود تھے جن میں سے ایک پر شاید میرا بستر جمنے والا تھا سب سے پہلے اُس نے چائے تیار کی۔ ڈرائیور اپنی پیالی ختم کر کے اُٹھ گیا۔ میں نے اسے رقم دیتے ہوئے ایک بار پھر رازداری کی ہدایت کی اور وہ مجھے اطمینان دلاتا واپس ہو لیا۔

چھوٹی سی پہاڑی ندی کے کنارے واقع وہ گاؤں بہت پُرسکون تھا۔ میں نے اس بوڑھی عورت سے کہا کہ وہ غیر ضروری طور پر میری وہاں آمد کی تشہیر نہ کرے۔ مجھ سے ملنے والی رقم اس کے لئے اتنی کافی تھی کہ وہ مجھ سے اس رازداری کے بارے میں کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی۔

اس گاؤں کی زندگی اندھیرا پھیلنے سے قبل ہی مکانوں تک محدود ہو جاتی تھی۔ میں سارا دن اسی جھونپڑے نما مکان میں محدود رہتا اور رات میں ندی کے کنارے جا بیٹھتا یا سبزیوں کے چھوٹے چھوٹے زرعی قطعات کی سیر کر لیتا۔ اس دوران میں، میں خود کو ایک کٹھن پہاڑی سفر کے لیے تیار کر چکا تھا۔!

"ماں۔۔۔ ان علاقوں میں بھاندر ناس تو بہت ملتی ہوگی!" ایک رات موقع پا کر میں نے اس سے بات چھیڑی۔

"یہاں کہاں بیٹا!" وہ حسرت بھری آواز میں بولی" وہ تو ناپور کی ترائیوں میں ملتی ہے اور خوش نصیب ہی اس جڑی بوٹی تک پہنچ پاتے ہیں!"

"میں نے سُنا ہے کہ کچھ جنگلی قبائل اس بوٹی کی پوجا کرتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ میں بچپن سے سنتی آئی ہوں کہ وہ بڑے خونخوار اور وحشی لوگ ہیں۔ اس بوٹی پر کسی غیر کا سایہ تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اول تو ان علاقوں میں پہنچنا ہی دشوار ہے اور کوئی پہنچ بھی جائے تو اس کے لئے ان قبائلیوں سے جتنا دشوار ہے۔" وہ پُرخیال انداز میں یہ کہتے کہتے چونک پڑی۔ "کہیں تو اسی بوٹی کی تلاش میں تو نہیں بھٹک رہا ہے؟"

"ارے نہیں ماں!" میں نے بوڑھی کا بازو دبا کر کہا اور اسی وقت میرے کانوں میں کسی جیپ کے انجن کی غراہٹ سُنائی دی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔

میں چند ثانیوں تک وہ آواز سنتا رہا، پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس گاؤں میں کسی کے پاس جیپ تو کیا رہنے کو مناسب مکان تک نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جیپ کے انجن کا وہ شور خطرہ کی گھنٹی کے مترادف تھا۔ "تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔" میں نے بوڑھی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "میرے دشمن آ رہے ہیں، وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

اور بوڑھی خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ میں نے داہنے ہاتھ میں ریوالور دبایا، بائیں میں اپنا مختصر سا سوٹ کیس سنبھالا اور جھونپڑے سے نکل کر قریب ہی درختوں کے ایک جھنڈ کی اوٹ میں ہو گیا۔ اندر چوہے کی طرح مارے جانے سے بہتر تھا کہ کھلے آسمان کے نیچے مقابلہ کیا جاتا۔!

گاؤں کی طرف آنے والی کچی سڑک پر دو گاڑیوں کے روشن ہیڈ لیمپس نظر آ رہے تھے۔ وہ گاڑیاں کچے راستے پر اچھلتی کودتی تیزی سے اسی طرف آ رہی تھیں۔۔۔ تھوڑی دیر میں وہ گاڑیاں اس مکان کے سامنے آ رکیں۔ آگے وہی ٹیکسی تھی جس میں چند روز قبل میں یہاں پہنچا تھا۔ پیچھے ایک جیپ تھی۔

گاڑیاں رکتے ہی سات مسلح آدمی تیزی کے ساتھ نیچے اترے۔ ان میں امیر خان پیش پیش تھا۔ مجھے وہاں پہنچانے والا ڈرائیور ایک طرف سہما کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ جگہ جگہ سے سوجا ہوا تھا اور اس کی حالت سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے غش کھا کر نیچے گر پڑے گا۔ شاید میرا سراغ پانے کے لئے امیر خان نے اس پر کافی تشدد کیا تھا!

"اندر کون ہے۔۔۔ باہر آؤ۔!" اچانک امیر خان نے نیم پختہ مکان کے دروازے پر لات مار کر غضبناک آواز میں کہا اور میں نے اپنے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔ فضا یک بیک بوجھل ہو گئی۔ وہ اندر سے کسی جواب کے منتظر تھے اور میں انہیں اپنی زد پر لئے کمین گاہ میں تھا۔! دونوں گاڑیوں کے انجن بند کئے جا چکے تھے لیکن انہیں اس طرح چھوڑا گیا تھا کہ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنیاں مکان پر پڑ رہی تھیں۔

چند ثانیوں کے انتظار کے بعد امیر خان نے اپنے قریب کھڑے ایک شخص سے کہا "چل بے۔۔۔ اندر جا کر دیکھ۔۔۔ وہاں کون کون ہے"۔ وہ شخص دانقل سیدھی کئے دروازے کی طرف بڑھا، پہلے رک کر اندر کی سن گن لیتا رہا۔ پھر اندر جا گھسا۔ "یہاں کوئی نہیں ہے" اندر ہی سے چیخ کر کہا اور امیر خان ٹارچ روشن کر کے مغلظات بکتا ہوا اندر گھستا چلا گیا۔

ادھر وہ لوگ اپنی تلاش میں مصروف تھے، ادھر میرے ذہن میں خیالات کی آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میرے خودکار پستول کا چیمبر بھرا ہوا تھا۔ لیکن وہ لوگ اتنے بودے نہیں تھے کہ سات گولیاں ان ساتوں کا ہی خاتمہ کر دیتیں یا انہیں ناکارہ بنا دیتیں۔ بمشکل دو تین آدمی میرا شکار بنتے۔ پھر ان کی باقی نفری اشتعال میں آ کر مقابلے پر جم جاتی جبکہ سات گولیوں کے بعد میں غیر مسلح ہوتا۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ مجھ پر قابو پا لیتے اور میں تنظیم کی دوہری نفرت کا شکار ہو جاتا کیونکہ ایسی صورت میں نہ صرف میں ان کا مجرم ہوتا بلکہ ان کے دو چار ساتھیوں کا خون بھی میرے سر آتا۔

جوں جوں میں سوچتا رہا، میرا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا اور آخر میری انگلی پستول کے ٹریگر سے ہٹ گئی۔ اس وقت امیر خان اپنے ہمراہیوں کی ناکام تلاشی کے بعد جھلایا ہوا باہر آ رہا تھا۔!

"تلاش کرو۔۔۔ وہ خنزیر کی اولاد آس پاس ہی کہیں چھپا ہوگا" وہ غصے میں آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ "برابر کے مکانوں میں بھی تلاش کرو۔ بڑھیا سے اس کے بارے میں صحیح اطلاع مل سکے گی۔"

"ٹھہرو امیر خان!" میں نے اچانک بلند آواز میں کہا۔

میری آواز سنتے ہی وہ سب بُری طرح بھڑکے، پھر جو جہاں تھا، سنبھلنے بیٹھنے کے بل وہیں زمین پر گر گیا اور رینگتا ہوا گاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ "میں آپس میں خون خرابہ پسند نہیں کرتا، اس لئے میں خود کو تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں دونوں ہاتھ بلند کئے جھنڈ سے ان کے سامنے نکل آیا۔

"کوئی فائر نہ کرے!" امیر خان نے دھاڑ کر اپنے آدمیوں سے کہا، پھر مجھ سے بولا "پستول اپنے ہاتھ سے پھینک دے، اگر کوئی مکاری کرنے کی تو میں بے دریغ تیرا بھیجہ اُڑا دوں گا۔"

میں نے جلدی سے وہ پستول زمین پر پھینک دیا۔ پل بھر میں وہ سب میرے گرد سمٹ آئے۔ ایک شخص نے میری جامہ تلاشی لینے کی کوشش کی لیکن امیر خان نے میری فرمانبرداری ظاہر کرتے ہوئے میری جامہ تلاشی لینے کی کوشش کی لیکن امیر خان نے سخت اشتعال کے باوجود اُسے بُری طرح دھتکار دیا "دُور ہٹ جا، اب یہ تیرے درجے کا آدمی نہیں ہے، اس کی جامہ تلاشی میں خود لوں گا۔"

"میرے پاس اب کچھ نہیں ہے!" میں شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ وہ دہکتی ہوئی سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر دھیمی مگر تلخ آواز میں بولا۔ "میں یقین کئے لیتا ہوں۔ مگر تیری طرف سے ذرا بھی چالاکی کا مظاہرہ کیا گیا تو میں ان میں سے کسی کو تیرے خلاف ہتھیار اٹھانے سے نہ روک سکوں گا۔"

"یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔!" میں نے کہا۔

اتنے شور و غل کے باوجود آبادی پر ابھی تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید سارے مکین بے نام دہشت کے زیر اثر اپنے مکانوں میں دُبکے ہوئے تھے۔ امیر خان کے حکم پر وہ سب دونوں گاڑیوں میں سوار ہونے لگے۔ مجھے امیر خان نے جیپ میں اپنے برابر میں بٹھا لیا۔!

سارے راستے امیر خان نے مجھ سے ایک مرتبہ بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی اور مہارت کے ساتھ ان پہاڑی راستوں پر جیپ دوڑاتا رہا۔ جب ہم کھٹمنڈو شہر میں داخل ہوئے تو اس وقت صبح کے چار بجنے والے تھے اور میں راستے کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر اپنے دفاع کے لئے ایک مربوط اور مضبوط کہانی تراش چکا تھا!

آدمیوں کو مختلف ٹھکانوں پر اتارنے کے بعد میں امیر خان کے ساتھ جیپ میں تنہا رہ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں گاڑی زیرو پوائنٹ پر جا پہنچی۔ یہاں کا دروازہ غیر مقفل تھا، لیکن اندر سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ امیر خان مجھے ساتھ لئے اندر داخل ہوا اور وسطی کمرے میں پہنچتے ہی میرے حواس گم ہو گئے۔ اکہرے جسم والا دراز قامت نقاب پوش نہایت اطمینان سے ایک کرسی میں دراز خوشبودار سگار کے دھوئیں سے مرغولے بنا رہا تھا۔!

"کہاں سے ہاتھ آیا۔؟" نقاب پوش نے ہمارے گھستے ہی اپنی مخصوص خوابناک آواز میں امیر خان سے سوال کیا۔

"یہ ایک قریبی گاؤں میں روپوش تھا۔ مگر ہمارے وہاں پہنچتے ہی اس نے بلا مزاحمت خود کو ہمارے حوالے کر دیا۔" امیر خان نے نپی تلی آواز میں کہا۔

"راستے میں اس سے کوئی باز پُرس کی گئی۔؟"

"نہیں جناب۔۔۔ میں بھلا حکم سے سرتابی کیسے کر سکتا تھا!" امیر خان ہونٹ خود کو اس کا پشتینی غلام ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

"تم باہر ٹھہرو!" نقاب پوش فیصلہ کُن انداز میں کرسی سے اُٹھ گیا۔ پھر اُس نے سگار فرش پر پھینک کر سیاہ جوتے کی ایڑی سے مسلا اور اپنے پہلو سے ایک ریوالور نکال لیا۔ وہ چند سیکنڈ تک اپنی جگہ کھڑا امیر خان کے چلے جانے کا منتظر رہا۔ جب اُس کے قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو وہ سیاہ پوش میری طرف مخاطب ہوا۔

"تمہیں علم ہے کہ تنظیم سے بغاوت کر کے تم کتنے بڑے جرم کے مرتکب ہوئے ہو؟" اُس نے چُبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ فرار میرا ایک اضطراری فعل تھا اور اب میں نے بلا مقابلہ ہتھیار ڈال کر اپنی اس غلطی کے ازالہ کی ایک کوشش کی ہے!" میں نے اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے اپنی مفروضہ کہانی کی بنیاد ڈالی۔

"کیا تمہیں میری ذات اور تنظیم کے وسائل پر بھروسہ نہیں رہا؟" وہ تیز لہجے میں غرایا۔

"بھروسہ نہ ہوتا تو میں لڑ کر اسی گاؤں میں مر چکا ہوتا، یہاں تک نہ آتا۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ان حالات میں وہی قدم اٹھاتا جو میں نے فرار کی صورت میں اُٹھایا۔!"

"سب سے پہلے میں وہ حالات جاننا چاہتا ہوں جو تم نے مجھ سے چھپائے رکھے!"

اور میں نے اُس کے سامنے اپنی مفروضہ کہانی، نہایت سنسنی خیز انداز میں چھیڑ دی۔

زیرو پوائنٹ

اس ویرانے میں تنہا عمارت تھی۔ وہاں اس وقت میں پوری طرح ڈی۔ دن کے رحم و کرم پر تھا وہ میری طرف سے ذرا بھی مشکوک ہو جاتا تو اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے اعشاریہ دو دو کے ریوالور کی ایک ہی گولی میرے مقدر کا فیصلہ کر دیتی۔ تنظیم کا دوسرا اہم شخص اس کمرے سے باہر موجود تھا اور وہ دونوں مل کر اگر مجھے ذبح بھی کر ڈالتے تو ان ویرانوں میں میری آواز سننے والا کوئی نہ ہوتا!

"کہانی!" مجھے خاموش پا کر سیاہ پوش نے اپنی مخصوص بھرّائی ہوئی آواز میں مجھے ٹوکا۔ ساتھ ہی ریوالور کی مہیب سیاہ نال کو بے رحمانہ انداز میں جنبش دی!

"میں پہلے بھی تنظیم کا وفادار تھا اور اب بھی بغاوت کی کوئی نیت نہ تھی۔" میں نے اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے نپی تلی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اگر میری نیت بغاوت کی ہوتی تو میں تنظیم کے دشمنوں سے جا ملتا جن کے وسائل شاید مجھے پناہ دے سکتے۔"

"سنو۔" وہ میری بات کاٹ کر غرایا۔ "اگر تمہارا اشارہ پولیس کی طرف ہے تو وہاں ہمارے کسی غدار کو امان نہ مل سکے گی۔ پولیس اتنی بارسوخ ہوتی تو بہ رشوتم لعل اور لیلا وتی کا دوہرا قتل یوں ہمارے مفادات کے تحفظ کا ذریعہ نہ بنتا۔ کسی سفاک بلیک میلر کی ناکام تلاش کے بعد وہ قصہ سرد خانے کی زینت بن چکا ہے!"

"نہیں۔۔۔" میں نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی بات کر رہا ہوں جس نے آپ کو بھی فکرمند کیا ہوا ہے اور جس کے خوف سے فیکٹری میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑ گئیں۔"

"اوہ۔۔۔!" وہ غصے میں بولا۔ "میں نے تمہیں اس لئے جگدیو کے

قتل کے بارے میں اپنے شبہات سے آگاہ نہیں کیا کہ تم بزدلوں کی طرح شہر چھوڑ بھاگو۔"

"آپ سے بات ہو جانے کے بعد مجھے کوئی خوف نہ تھا۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بات جاری رکھی۔ "آپ کے فون کے بعد اسی رات کسی گمنام شخص نے ٹیلیفون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ تنظیم کے معاملات سے بہت زیادہ باخبر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ پرشوتم لعل کے قتل کی اصل کہانی سے واقف ہے۔ ساتھ ہی فیکٹری کی آڑ میں ہونے والی منشیات کی مختلف کھیپ طریقہ کار سے بھی وہ باخبر ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کو آپ کی شخصیت کا پورا علم ہے اور اس نے رازداری کی قیمت کے طور پر آپ سے فی الحال پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا تھا مگر آپ نے رقم کے بجائے ایک بریف کیس میں بم بند کر کے مقررہ مقام پر ڈال دیئے تاکہ بریف کیس کھولتے ہی اس کے ٹکڑے اڑ جائیں جس کے جواب میں اس نے جگدیو کو ہلاک کر دیا۔ اس نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ آپ کو بتائے بغیر فیکٹری کے غیر قانونی کاروبار سے متعلق کچھ تفصیلات اسے مہیا کروں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کبھی اس کی اجازت نہ دیں گے اور حکم عدولی کی صورت میں مجھے اس سے اپنی جان کا خطرہ تھا کیونکہ جگدیو سنگھ کا حشر میرے سامنے تھا لہٰذا میں نے خاموشی کے ساتھ فرار ہی میں اپنی عافیت دیکھی اور راتوں رات خاموشی سے شہر چھوڑ دیا۔"

میری بات پوری ہونے پر سیاہ پوش کسی زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارا۔ "وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے گا۔ میری راہ پر لگنے والوں کا انجام بڑا عبرت ناک ہوتا ہے!" اور اسی کے ساتھ اس نے ادھورا سگار فرش پر پھینک کر یوں ایڑی سے مسلا جیسے اپنے گمنام حریف کو قدموں تلے روند رہا ہو۔

"میں اپنی بزدلی پر نادم ہوں جناب!" میں نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر کہا۔ "مگر آپ کا وہ دشمن اس قدر بھرپور انداز میں میرے سامنے آیا کہ میرا ردعمل قطعی فطری تھا۔ میں نے اپنی کشتی جلا کر تنظیم میں شمولیت اختیار کی ہے اور میرا ایک ایک سانس آپ کا تابع ہے!" یہ کہتے ہوئے میں دل ہی دل میں اس کی جھلاہٹ اور اضطراب پر عجیب سا سکون محسوس کر رہا تھا۔ بالکل کسی فتح مند سالار کی طرح جو دشمن کی منتشر اور بے حال ٹکڑیوں پر آخری کاری وار لگانے کو تیار ہو!

"وہ کوئی بھی ہو بہت جلد میرے ہاتھوں کسی بزدل چوہے کی طرح مارا جائے گا۔ تمہیں اس سے کسی خوف کی ضرورت نہیں۔ تم میری آئندہ ہدایات تک بدستور روزنر آرٹ فیکٹری کے منیجر کے طور پر کام کرتے رہو گے اور وہ گمنام شخص تمہیں جو کچھ بھی ہدایات دے اسے مجھ تک پہنچا دیا کرو۔"

"بہت بہتر۔ مگر میں آپ سے رابطہ کس طرح قائم رکھوں گا؟"

"یہ غیر ضروری ہے۔ میں خود ہی تم سے رابطہ رکھوں گا۔" وہ ابھی تک اپنی جھلاہٹ پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"اگر اب وہ مجھ سے اپنی مطلوبہ معلومات کا مطالبہ کرے تو میں اسے کیا جواب دوں؟" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد سوال کیا۔

"تمہاری غیر موجودگی میں ایسا سارا ریکارڈ فیکٹری ... ہے اور اب تا اطلاع ثانی وہاں پر کوئی غیر قانونی کام نہیں ہو گا ... پر اپنی مجبوری کا اظہار کر سکتے ہو اور اگر وہ تم سے محض یادداشت ... معلومات فراہم کرنے کو کہے تو تم جو چاہو کہہ سکتے ہو۔ یادداشت کے ... سے بھول چوک بھی ہو سکتی ہے!" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے جھوٹی معلومات فراہم کرنے کی ... ہے۔ ابھی تک میری اداکاری مکمل اور بہت کامیاب تھی۔ ڈی ... بھی شبہ نہ ہو سکا تھا کہ میں ہی پس پردہ رہ کر اس کے حریف کا کردار ... گروہ کے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر اگر تم اس کا ... تو مجھے خوشی ہو گی۔" چلنے سے پہلے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "... تم خود عقلمند ہو۔ شاید مجھے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں اپنی ذمہ داریوں سے خوب واقف ہوں جناب ..." میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس نے اپنی آخری ہدایت ... کھیلنے کا پورا پورا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اب سے چند دن قبل ... بھی نہ سکتا تھا کہ اس خوفناک شخصیت کو میں اتنے آرام سے شیشے میں ... کامیاب ہو سکوں گا!

"تھوڑی دیر میں سورج طلوع ہونے والا ہے اس ... یہیں آرام کرو!" یہ کہتے ہوئے وہ سیاہ پوش تیزی کے ساتھ وہاں ... اس سے قبل کہ امیر خان واپس آتا میں نے زمین پر ... سگار کے دو ٹکڑوں میں سے ایک اٹھا کر جلدی سے جیب میں ڈال ... بو اتنی منفرد اور مخصوص تھی کہ میں محض اسی کی بنا پر کہیں بھی ... کر سکتا تھا لیکن سگار کا نام جان لینے کے بعد اس کے امکانات اور ... اس سلسلے میں یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ سگار بازار میں کھلے بندوں ...

امیر خان نے وہاں آنے کے بعد میری گمشدگی کے ... لفظ نہ کہا۔ ہاں وہ تنظیم کے گمنام دشمن کے بارے میں اپنے زریں خیا... بلند اظہار ضرور کرتا رہا۔

"میں نے سنا ہے کہ وہ باس کا سراغ بھی پا چکا ہے کیو... لئے اتنی بڑی کامیابی حاصل کر لینا ناممکن معلوم ہوتا ہے!" میں نے ... سے بھٹکانے کے لئے کہا۔

"ہاں... آں!" وہ تیزی سے بولا۔ "مقامیوں میں ... نہیں ہے کہ وہ ہمارے منہ آ سکیں یہ ضرور ہے کہ اس شخص نے اہم ... اپنا آلہ کار بنا لیا ہو!"

"تو یہاں کے جرائم پیشہ افراد سے کچھ اگلوا لینا اتنا ..."

وہ تلخ انداز میں ہنسا۔ "مجھے سبق نہ دے رہے ہو ...

... دوران میں جھک نہیں مار تا رہا ہوں شہر کے سارے مشکوک افراد سے کڑی باز پرس ... جا چکی ہے۔ شہر کے کئی غنڈے عمر بھر کے لئے معذور کئے جا چکے ہیں لیکن پھر بھی ... میں کوئی سراغ نہ مل سکا۔ وہ جو کوئی بھی ہے انتہائی چالاک ہے اور خود کو تاریکی میں ... چھپائے ہوئے ہے ورنہ اب تک اس کا کام ہی تمام ہو چکا ہوتا۔

"روزنر آرٹ فیکٹری کے بارے میں اس کی اطلاعات پھر جگدیو کے قتل ... سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ باخبر ہے اور اس کا زیادہ دن آزاد رہنا ... خطرناک ہے!"

"مقدر کے کھیل ہیں۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "ورنہ پچاس ہزار کے ... میں اس کے چیتھڑے بھی کسی کو نہ مل پاتے۔"

سرکاری کوٹھے گھر پر بریف کیس میں پھٹنے والے بم کا خیال آتے ہی ... ثانیے کے لئے میں لرز اٹھا اگر میں اس موقعے پر ہوشیاری سے کام نہ لیتا تو اس ... وقت یوں باتیں بنانے کو زندہ نہ ہوتا۔

اجالا پھیلنے پر میں فیکٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔ چار دن کی ... غیر حاضری کے بعد مجھے دیکھ کر دونوں گھریلو ملازمین نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ شاید ان کی تربیت اسی طرح کی گئی تھی کہ وہ انسانی جذبات سے عاری زندہ مشینوں کی طرح متحرک رہ کر ایسی زندگی گزاریں جس میں ... حیرت کا عنصر ہو نہ مسرت کا اظہار!

فیکٹری میں میری غیر حاضری ... کو کافی محسوس کیا گیا کیونکہ فیکٹری کے ... ملازمین تنظیم سے وابستہ نہ ... تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ چند کاروباری ... معاہدوں کے سلسلے میں مجھے اچانک ... ہندوستان جانا پڑ گیا تھا۔ اور وہ لوگ ... اس عذر سے مطمئن ہو گئے۔ ... لونا کے حسین چہرے پر شبہات کی پرچھائیاں ... نمایاں تھیں۔ وہ شاید ... میری عدم موجودگی کا سبب اتنا معمولی ہے! ... چند ... دفتری ملاقاتوں کے بعد فرصت نصیب ہوئی تو ... کہنے سے میرے دفتر میں آ پہنچی اور بغیر کچھ کہے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہیلو لونا!" میں نے خوشدلی سے کہا۔ "تمہاری ماں کی طبیعت کیسی ہے؟"

"آپ کی غیر حاضری کے پہلے ہی روز اس کا انتقال ہو گیا۔" وہ آنسو ... روکنے کی کوشش کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"اوہ — یہ تو بہت برا ہوا!" میں نے دلی افسوس کے ساتھ کہا۔

"وہ جو زندگی گزار رہی تھی اس سے بہتر یہی تھا۔" وہ اپنی انگلیوں ... کو گھورتے ہوئے بولی۔ "اس نے میرے مستقبل کی خاطر بڑی قربانیاں ... دیں مگر میں اس کے لئے کچھ بھی نہ کر سکی۔"

"تم عقلمند لڑکی ہو۔ صبر اور ہمت سے کام لو۔ ہر ایک کی زندگی میں ... ایسے مقام آتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

کچھ دیر تک میرے دفتر کی فضا پر بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ ... اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں آج آپ سے کچھ اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور ضرور!" میں نے کرسی آگے کھینچ لی۔

"اس وقت میں خود کو آپ کی سیکریٹری محسوس کرتی ہوں۔ اگر آپ دفتر کے بعد مجھے تھوڑا سا وقت ..." اس نے جذباتی آواز میں کہنا شروع کیا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دفتر کے بعد تم میرے ساتھ چلنا۔"

اس کے بعد وہ ایک ثانیہ کے لئے بھی وہاں نہ رکی اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

میں نے دن میں کئی بار سوچا کہ وہ مجھ سے کس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہے لیکن کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکا۔ گو افسری اور ماتحتی کے علاوہ ہم دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بھی قائم ہو چکا تھا لیکن یہ تعلق ان سرحدوں تک نہیں پہنچا تھا جہاں سے عہد و پیماں کی کہانیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

شام کو فیکٹری سے بنگلہ جاتے ہوئے وہ میری جیپ میں موجود تھی۔ خاموش اور فکرمند سی! میں نے ایک آدھ بار اسے چھیڑا بھی لیکن وہ ذہنی طور پر غیر حاضر تھی!

لباس وغیرہ تبدیل کر کے میں برآمدہ میں ہی آ بیٹھا۔ لونا مارتھا تھکے تھکے انداز میں آرام کرسی میں آنکھیں موندے دراز تھی۔ میری آہٹ پا کر ہڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"شاید تم تھکی ہوئی ہو۔ منہ ہاتھ دھو لو تو سکون محسوس کرو گی۔"

"نہیں — میں ٹھیک ہوں!"

"شاید کسی اہم مسئلے نے تمہیں پریشان کیا ہوا ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میرے نزدیک تو واقعی اہم ہے۔ نہ جانے آپ اس بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اوہ — تو پھر کہہ بھی ڈالو! کیا بات ہے؟"

"آپ میرے باس ہیں اور مجھے آپ سے اس قسم کی باتوں کا کوئی حق نہیں — مگر آپ اسے میری گستاخی نہ سمجھیں تو میں ایک سوال ضرور کروں گی!"

"سنو لونا!" میں اس کی طرف جھک آیا۔ "دفتر کے بعد ہم نے اس جگہ شامیں ایک ساتھ گزاری ہیں اور تم جانتی ہو کہ ہمارے تعلقات اس حد تک رسمی نہیں ہیں۔ تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر تم مجھ سے ناراض ہو۔ لہٰذا تمہارے کسی بھی سوال کا جواب دے کر مجھے خوشی ہو گی۔"

وہ چند ثانیوں تک تذبذب کا شکار رہی پھر بولی۔ "آپ نے فیکٹری سے غیر حاضری کا جو عذر پیش کیا ہے کیا وہ درست ہے؟"

"کسی حد تک!" میں نے جواب دیا۔ "لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لئے کہ میں اسی شام آپ کے ساتھ تھی لیکن اس وقت تک آپ کا کہیں جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا پھر چند ہی گھنٹوں میں یہ پروگرام کیسے بن گیا؟"

"میں تم سے ذکر کرنا بھول گیا تھا لونا!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

شاید وہ میرے منہ سے یہی سننے کی منتظر تھی، اپنا منہ دونوں

ہتھیلیوں میں چھپا کر سسک پڑی "میں جانتی تھی ... میں آپ کے اعتماد کی اہل نہیں ہوں۔ میں نے جو سوچا وہ خواب تھا۔ جو چاہا وہ سراب تھا۔ بھلا میں آپ پر کیا حق رکھتی ہوں۔ ملازم آقا سے ذاتی رعایتیں تو طلب کر سکتا ہے مگر سینوں کی خیرات کا وہ کبھی مستحق نہیں ہوتا۔"

"لونا... لونا... کیوں رو رہی ہو" میں اس کے یوں رو پڑنے پر پریشان ہو گیا "میرا مقصد تمھاری دل آزاری ہرگز نہ تھا۔ تمہیں یہ جاننے کا پورا حق تھا۔ مگر... مگر میری بھی چند مجبوریاں ہیں۔ میرے بھی چند راز ہیں اور ان کا سینے میں محفوظ رہنا ہی بہتر ہے۔"

اس نے بھیگی ہوئی پلکیں اٹھائیں اور سرخ سرخ نگاہیں میرے چہرے پر جما دیں "میں بہت دن سے محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کسی الجھن میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کے ذہنی کرب کو جاننے کے باوجود لاچار تھی اور جب آپ یک بیک روپوش ہو گئے تو مجھ پر قیامت گزر گئی۔ میں اپنی ماں کے ماتم میں اتنا نہ روئی جتنا آپ کی شفقت نے رلایا ہے۔ میں ترشے ہوئے کسی خوبصورت اور قیمتی پتھر کی طرح اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ میں اپنی بدنصیبی سے سمجھوتہ کر چکی تھی اور اب... اب آپ نے زندگی کا احساس دلایا ہے تو میں آپ سے اپنی زندگی کی بھی طلب کرتی ہوں!"

اس کے دوٹوک الفاظ سن کر چند سیکنڈ کے لیے میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اس بھولی بھالی لڑکی سے مجھے ایسے جرأت مندانہ اظہار کی توقع نہ تھی! اس کی جانب سے میرے دل میں محبت کا ایک ہلکا سا احساس ضرور موجود تھا مگر وہ اتنی شدت اختیار نہ کر سکا تھا کہ میں والہانہ انداز میں اس سے محبت کا اظہار کر بیٹھتا مگر اس کا رویہ شاید ٹھیک ہی تھا۔ ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اسے اچانک ہی احساس ہوا ہو گا کہ وہ جوان ہے اور تنہا رہ گئی ہے اور ان حالات میں اس نے جو کچھ کیا وہ اس کی حساس طبیعت کا لازمی نتیجہ تھا!

"میں تم سے خوب واقف ہوں لونا اور تمہیں پسند بھی کرتا ہوں۔ مگر میری ذات تمھارے لیے شاید ابھی تک ایک پہیلی ہے اور یہ جانے بوجھے بغیر تم میری طرف ہاتھ بڑھا رہی ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھاری توقعات کو ٹھیس پہنچے!"

"میرے لیے آپ وہ ہیں جو نظر آتے ہیں۔ جن باتوں کو آپ راز رکھنا چاہتے ہیں، میں انہیں کریدنا بھی نہیں چاہتی!"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میرا باطن میرے ظاہر کا یکسر تضاد ہے تو؟"

"میرے لیے یہ تضاد بے معنی ہے۔ میں نے صفدر علی کو چاہا ہے۔ برونز آرٹ فیکٹری کے منیجر کو نہیں!" وہ عزم کے ساتھ بولی "مجھے سہارا دیں یا دھتکار دیں یہ آپ کے اختیار میں ہے!"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جو زبان سے کہہ رہی تھی وہی اس کے بشرہ پر تحریر تھا اور یک بیک میرے دل کے تار لرز اٹھے "اس شہر میں عورت کا حصول بہت سہل ہے لونا لیکن عورت کی محبت مجھ جیسے اجنبیوں کے لیے عنقا ہے۔ میں تمھارے خیالات کی قدر کرتا ہوں لیکن میں ابھی تک تذبذب کا شکار تھا۔ میں تمہیں کبھی اپنی بیوی کے روپ میں دیکھتا تھا اور کبھی ننھی منی معصوم سی بچی نظر آتیں جسے گود میں لے کر تھپک تھپک... آج مجھے اندازہ ہوا کہ تم عورت ہی نہیں بلکہ پوری شخصیت کی خود... پہلے ضرور آزاد ہوتی ہے مگر شادی کے بعد شوہر ہی کو اپنا محور... ہے۔ محبوب کو شوہر کا درجہ نہیں دے دیتی اور تم نے شادی سے... دیا ہے۔ میری نگاہیں مستقبل کی وہ روشن تصویر دیکھ رہی ہیں... کھلے دل سے اقرار کرتا ہوں کہ آج سے پہلے بے شمار لڑکیاں... مرکز رہیں۔ میں ان سے کھیلتا رہا لیکن آج کے بعد تمھارا پیار... میں اپنے اس جذبے کو کبھی داغدار نہ ہونے دوں گا!"

"آپ... آپ!" اس کے ہونٹوں کے گوشے کانپ... اٹک گئے۔

پھر چائے پیتے ہوئے اس نے اپنے پرس میں سے... طلائی انگوٹھی نکال کر مجھے دی ساتھ ہی زہریلی خواب آور... بھی دکھائی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا

وہ ایک ادا کے ساتھ مسکرا دی "اگر میں دونوں... ٹھکرا دیتے تو انگوٹھی پرس میں ہی رہتی اور میں یہ ساری گولیاں... میں پھریری سی لے کر رہ گیا۔ میرے چند الفاظ... لیے کتنے اہم تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے کئی خون کیے مگر کسی... اگر لونا میرے انکار کا شکار ہو جاتی تو اس لہو کا داغ مجھے...

میں نے لونا مارٹن کو سمجھا دیا کہ فی الحال میں ایک... ہوں لہٰذا شادی کا پروگرام کچھ عرصے کے لیے التوا میں رکھا... کسی کو بھی اس راز میں شریک نہ کیا جائے اور وہ سب... پر جاتی رہے۔ اس نے میرے کام کی نوعیت جاننی چاہی مگر یہ نہ کیا جو اس کی وفاشعاری کا کھلا اظہار تھا!

اگلے روز شام میں ڈی ون نے مجھے فون کیا... کہا کہ وہ گمنام شخص میرے فرار سے پوری طرح باخبر تھا اور... کہاں سے اور کن حالات میں گرفتار کیا گیا۔

"وہ کیا چاہتا تھا؟" ڈی ون نے بدلی ہوئی...

"زیرو پوائنٹ کی عمارت بھی اس کی نظر میں...!

امیر خان کا تعاقب کرتا شاید وہاں تک پہنچا تھا۔" میں نے... ہوئے کہا "اس نے مجھ سے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا اور میں... کے خوف سے میری غیر موجودگی میں سارا متعلقہ ریکارڈ تلف... یادداشت کے سہارے کچھ بتانے کی پیش کش کی جسے اس نے... کسی ڈفر کے حافظہ پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

"اور اب؟"

"اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں کل دوپہر میں اشار ہوٹل کی ساتویں... پہنچ کر روں اور ٹھیک دو بجے وہاں سے اٹھ جاؤں!" میں نے ایک فوری... بزدلی... ان کے تک لیا۔

"وہ بہت مکار معلوم ہوتا ہے" فون پر بھرائی ہوئی سرد آواز ابھری... تک اس کی شخصیت ہمارے سامنے نہیں آ جاتی اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل... لہٰذا اب میں اسے یہی تاثر دینا چاہتا ہوں کہ میری تنظیم اس سے خائف ہے۔ اس... اپنے اوپر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کے سبب وہ کوئی نہ کوئی لغزش کر گزرے... اور یہ میرا ہاتھ اس کی شہ رگ پر ہو گا۔ تم اس کی ہدایت کے مطابق اشار ہوٹل... وہ جاؤ گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کی کوئی بات مجھ تک پہنچا دینے ہوا ہی... وہ ان حربوں سے مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے!"

"میں آپ کے حکم پر عمل کروں گا جناب!"

اور اسی شام میں نے بدلی ہوئی آواز میں گریسی کے شراب خانے... فون کیا۔ گریسی نے حسب توقع فوراً ہی امیر خان کو بلا لیا۔

"تم سب خارش زدہ کتوں کی طرح سڑکوں پر مارے جاؤ گے۔ اگر تمھارے... نے میری شرائط تسلیم نہ کیں تو میں اس کے نام کے ساتھ ان سیاہ کارناموں... ظاہر کر دوں گا جو وہ سرانجام دیتا رہا ہے!" یہ کہہ کر میں نے جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے یہ تو پتہ چل چکا تھا کہ تنظیم کا سربراہ آنند بھون میں مقیم ہے لیکن ابھی تک اس کی شخصیت سے لاعلم تھا۔ آنند بھون پہنچنا میرے لیے اب ناگزیر تھا اس طرح میں اس نابکار کو ہلاک کر کے آزادی حاصل کر سکتا تھا جو میرے اعصاب پر سوار تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے آنند بھون فون کیا۔ دوسری جانب سے آواز والی کسی عورت نے فون ریسیو کیا۔

"مسز نرائن داس؟" میں نے بدلی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"یس!" اس کی آواز میں قدرے بے زاری رچی ہوئی تھی۔

"میں تمھارے اس پردہ نشین سورما سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو کوشش کے باوجود مجھ سے چھٹکارا نہ پا سکا۔"

"تت... تم کون ہو؟" اس کی خوفزدہ آواز میں ہکلاہٹ نمایاں تھی۔

"اس کا ایک پرانا دوست۔ تم مجھے برڈی بھی کہہ سکتی ہو!"

دوسری طرف سکوت چھا گیا۔ چند ثانیوں کے بعد فون پر وہی بھرائی آواز سنائی دی!

"سنو دوست۔ اگر میں اس قدر بزدل اور کم عقل ہوتا کہ تمھارے... ایک سے مارا جاتا تو کبھی تمھارے مقابل آنے کی کوشش نہ کرتا۔"

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں" اس نے جلدی سے میری بات کاٹ دی "... فضول کو بھول جاؤ۔ میں کچھ اہم بات کرنی چاہتا ہوں!"

"میں دو تین دن بہت مصروف ہوں اور تمہیں اپنی قوت کا احساس دلانے کے لیے چاہتا ہوں کہ اس دوران میں امیر خان اور صفدر علی آنند بھون میں مقیم رہیں۔ انھیں سامنے پا کر تم کسی لمحے میرے خیال سے غافل نہ رہ سکو گے"

"یہ میرے لیے ناقابلِ قبول ہے!"

"ٹھیک ہے۔ پھر وہ دونوں بھی بہت جلد جگد یو کے ٹھکانے جا لیں گے!" میں نے سخت لہجے میں کہا جس پر وہ جلدی سے بول پڑا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ مخاصمت کے بجائے تم سمجھوتہ کی راہ اختیار کرو؟"

"ممکن تھا" میں نے زور دے کر کہا "پچاس ہزار کا مطالبہ اسی راہ کا پہلا قدم تھا مگر تم نے میری قوت کے بارے میں غلط اندازہ قائم کیا!"

"میں وہ رقم ادا کرنے کو تیار ہوں!"

میں بھاری اور تلخ آواز میں ہنسا "کیا میرے بجائے پھر کسی بیگناہ کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں یہ میرا وعدہ ہے، اس بار کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔"

"رقم کے لیے میں صرف تمھارا ہی محتاج نہیں۔ اسی شہر میں میرے اور بھی وسائل ہیں۔ فی الحال مجھے رقم کی ضرورت نہیں۔ ہاں کل شام تک وہ دونوں آنند بھون نہ پہنچے تو جہنم پہنچا دیے جائیں گے!"

"میں محض تمھارا اعتماد حاصل کرنے کے لیے یہ شرط قبول کیے لیتا ہوں!"

"تعاون کا شکریہ!" میں نے زہریلے قہقہے کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔ اگلے روز میں نے اشار ہوٹل ہی میں لنچ کیا اور ٹھیک دو بجے ساتویں میز چھوڑ دی۔ باہر نکلا تو امیر خان فٹ پاتھ کے سہارے جیپ لیے موجود تھا۔

"تم یہاں؟" میں نے اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو۔ ہم دونوں اسی وقت آنند بھون چل رہے ہیں!" اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"آنند بھون۔ وہاں کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"میں کسی روز تیری گردن توڑ دوں گا صفدر" وہ مجھے گھورتے ہوئے غرایا "باس کے حکم پر کسی سوال کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔"

"اوہ۔" میں طویل سانس لے کر بولا "میں سمجھا تھا کہ یہ تمھارا اپنا کوئی پروگرام ہے!"

آنند بھون کئی ایکڑ کے وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے باغات سے گھری ایک عمارت کا نام تھا۔ اندر جاتے ہوئے ہمیں محافظوں نے دو جگہ روکا اور امیر خان انہیں مطمئن کرنے کے بعد جیپ آگے لیتا چلا گیا۔ جب ہم دوسری چوکی سے آگے بڑھے تو یہاں رائفل سے مسلح پست قامت، گٹھے ہوئے جسموں والے چاق و چوبند نیپالی گورکھے پہرہ دیتے نظر آئے۔ آنند بھون حفاظتی انتظامات اور رقبہ کے اعتبار سے کسی والیٔ ریاست کی قیام گاہ معلوم ہوتی تھی۔ جہاں چڑیا کا بچہ بھی اجازت کے بغیر پر نہ مار سکتا تھا!

وسیع و عریض پورٹیکو میں ایک شخص ہمارا منتظر تھا۔ اس نے خوشدلی سے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ اس کا نام سہنا تھا اور وہ عمارت کے جملہ انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ ہم دونوں اس کے ہمراہ اونچے برآمدہ سے گزر ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بغلی راہداری سے ایک ادھیڑ عمر شخص مضحکہ خیز لباس پہنے ہماری طرف آیا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک جمی ہوئی تھی اور شانے سے ایک گن جھول رہی تھی..... کوٹ کی دونوں جیبوں میں کچھ پھولدار پودے جڑوں سمیت ٹھنسے ہوئے تھے۔

سہنا ہم سے آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ مضحکہ خیز بوڑھا اس کی نظر بچا کر بچوں کی سی پھرتی سے ہماری طرف آیا اور یک بیک ہذیانی قہقہہ لگا کر پاگلوں کی طرح میرے گلے میں جھول گیا۔

اس کا قہقہہ اور میری بوکھلائی ہوئی چیخیں سُن کر سہنا تیزی سے واپس پلٹا۔ اس کی آنکھوں سے اس وقت عجیب سی بے رحمی مترشح تھی۔ وہ اس بوڑھے کو گھورتے ہوئے کسی سانپ کی طرح پھنکارا "سیٹھ صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

سہنا پر نظر پڑتے ہی وہ شخص ایک دم بوکھلا گیا اور مجھے چھوڑ کر چھلانگیں مارتا ایک طرف بھاگتا چلا گیا۔ وہ سہنا سے بہت زیادہ خائف نظر آتا تھا!

"ہم سب ان ہی کے ملازم ہیں" اس کے بھاگ جانے پر سہنا مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں بولا "یہ سیٹھ نرائن تھے۔ اگر ان کی بیگم صاحبہ معاملات کی دیکھ بھال نہ کریں تو دو ہی دن میں اس عمارت میں الّو بولنے لگیں!"

سہنا نے بتایا کہ ہم دونوں کو آنند بھون کے صفائی کے عملے کا نگراں مقرر کیا گیا ہے۔ ہماری رہائش کے لئے آنند بھون کے وسیع عقبی باغات کے پار ایک دو منزلہ عمارت میں کمرے مخصوص تھے جہاں عمارت کے کافی ملازمین مقیم تھے باقی عملہ روز صبح شہر سے آتا اور شام میں واپس لوٹ جاتا!

آنند بھون کا ماحول عجیب پراسرار سا تھا۔ سہنا یا کسی اور کو اس بات پر بالکل بھی حیرت نہ ہوئی کہ صفائی کے عملے پر مامور کئے جانے والے افراد نہ صرف آسودہ حال تھے بلکہ اپنی جیب میں دہاں تک آئے تھے۔ اندر ملازمین کی خاصی تعداد مامور تھی۔ مگر وہ سب ایک دوسرے سے یوں لاتعلق نظر آرہے تھے۔ جیسے غیر ضروری مصروفیات پر انھیں پھانسی بھی دی جاسکتی ہو۔ ہر طرف عجیب سی گھٹن کا سماں تھا!

سہنا کافی دیر تک ہمیں اپنی ذمہ داریاں سمجھاتا اور عمارت میں گھماتا رہا۔ جب ذرا تنہائی نصیب ہوئی تو امیر خان بول ہی پڑا "یار یہ جگہ تو پاگل خانہ نظر آتی ہے میں تو یہاں گھٹ کر مر جاؤں گا۔"

"مجبوری ہے پیارے!" میں مسکرایا "ویسے میرے لئے تو زیادہ فرق نہیں پڑا۔"

"وہ کیوں؟"

"شاید برونز آرٹ فیکٹری میں میرے تقرر کے کاغذات پر بھی اسی پاگل بڈھے کے دستخط تھے!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ یہی نرائن داس اس فیکٹری کا مالک ہے۔"

"شاید باس کسی لمبے چکر میں ہے!"

امیر خاں مجھے گھور کر رہ گیا میرے اس تبصرہ پر اظہار رائے زنی نہ کی۔

ہم دونوں نے باہمی طور پر طے کر لیا کہ امیر خان عملہ اور روشوں وغیرہ کی صفائی کا کام سنبھالے گا تاکہ اندر کے [illegible] پا سکے۔ میں اس سے جونیئر تھا لہٰذا اس کی ہدایت پر مجھے ناچار عمارت صفائی کی ذمہ داری قبول کرنی پڑی۔ ویسے میں دل ہی دل میں خوش تھا۔ عمارت کے اندر رہ کر میں اپنے مقاصد [illegible]

اگلے روز میں نے اپنے ماتحت بائیس افراد کو ان کے [illegible] خود رہائشی کمروں کی صفائی کرنے والی جماعت کے ساتھ ہو لیا۔ راستے ہی میں میری نظر ایک جوان اور خوبرو [illegible] ایک بیش قیمت ساری میں ملبوس تھی۔ وہ دو ملازموں کو [illegible] وہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ میں ادھر سے گزرا تو اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔

"ادھر آؤ۔ تم کون ہو؟" اس نے تحکمانہ آواز [illegible] میرے ساتھ آنے والی جماعت تیزی سے آگے [illegible] عورت کی طرف بڑھ گیا جو میرے اندازے کے مطابق نرائن دا[س] [illegible]

"میں اس گھر کا نیا نمک خوار ہوں بیگم صاحبہ..!" میں نے تندخو لڑکی کے سامنے سر کو خم دے کر کہا۔

اس نے ناقدانہ نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ [illegible] "دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"سہنا صاحب نے اسے عمارت سے باہر کی صفائی [illegible] میرے ذمہ اندر کی صفائی ہے!" میں نے چور نظروں سے [illegible]

"دفع ہو جاؤ یہاں سے!" وہ پہلے سے موجود ملاز[موں] [illegible] اس وقت تک خاموش رہی جب تک وہ دونوں اس [illegible] "یہاں ہوش میں رہ کر کام کرنا ہوگا۔" وہ ان کے چلے جانے [پر] [illegible] "ایسے تو تجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی!" میں نے یقین [دلایا]

"یہ لو۔" اس نے چابیوں کا ایک گچھا پرس سے نکا[ل کر] دیا "یہ خوابگاہ کی چابیاں ہیں۔ صفائی کے بعد دروازے مقفل [کر دینا] یہ یاد رہے کہ سیٹھ صاحب ذہنی بیمار ضرور ہیں لیکن میں یہ کبھی برداشت [نہیں کروں گی کہ] کوئی ملازم میرے پتی کے ساتھ گستاخی کرے!"

"میں اپنا مقام جانتا ہوں بیگم صاحبہ!"

پھر وہ چلی گئی اور میں چابیاں لے کر اپنے عملہ [illegible]

میں مختلف کمروں کی صفائی کے دوران میں اپنے عملہ سے اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا پھر مقفل خوابگاہ کا نمبر آیا۔ یہاں ہال کے بائیں جانب خوابگاہوں کا سلسلہ تھا ان میں سب سے پہلا طویل راہداری میں داہنی جانب خوابگاہوں کا سلسلہ تھا ان میں سب سے پہلا [illegible] ہنا کا تھا۔ اندر کی بے ترتیبی کسی مجرّد اور لاپرواہ شخص کے روایتی رویہ کی [غما]زی کر رہی تھی۔ سہنا سے نرائن داس جس طرح خوفزدہ ہو کر بھاگا تھا اس کی بنا پر اس پر کسی حد تک ڈی دن ہونے کا شبہ تھا لیکن اس کی خوابگاہ میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی جو میرے شبہ کو تقویت دیتی! اس کا ایش ٹرے سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑوں اور راکھ سے بھرا ہوا تھا جبکہ ڈی دن میرے مشاہدے کے مطابق بیش قیمت امریکی سگار پیتا تھا! اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ بعد میں میرے ذہن میں آیا! میں نے جب دوسری بار آنند بھون فون کیا تھا تو اُسے ڈی دن ہی نے [ریسی]و کیا تھا لیکن میں نے محض اس کی بھرّائی ہوئی آواز کی بنا پر پہچانا تھا۔ [اس کا] مطلب یہ تھا کہ ڈی دن تنظیم کے ارکان سے بدلی ہوئی آواز میں بات کرتا [تھا] بلکہ اس کی اصل آواز اور لہجہ وہی تھا اور اب میں اس سے دوچار [ہونے] کی صورت میں براہ راست اُسے پہچان لیتا۔

گیارانی کی خوابگاہ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ درمیانہ طبقہ [سے تعل]ق رکھنے والی کسی خوبصورت دوشیزہ کو اگر کوئی لکھ پتی شوہر میسر آجائے تو [آ]رائش کے ضروری اور غیر ضروری سامان کا ذخیرہ کوئی غیر معمولی بات [نہیں] ہوتی۔ گیارانی کی خوابگاہ بھی میک اپ کے بیش قیمت سامان اور معیاری [ملبوسا]ت سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی خوابگاہ کا ایک دروازہ بغلی کمرے میں [کھلت]ا تھا جہاں اس کا پاگل شوہر نرائن داس رہتا تھا۔

نرائن داس کے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل پر کئی پتھر رکھے ہوئے تھے۔ [عما]رت دیواروں میں طریقے سے کیلیں گاڑ کر برگد، پیپل اور دوسرے درختوں [کی شاخیں] میں لٹکائی گئی تھیں۔ سنگ مرمر کا ایک ٹیبل لیمپ چھت میں لگے ہوئے [ہُک] سے لٹکا ہوا تھا۔

"یہ سب شاخیں وغیرہ اتار کر پھینک دو، خشک پتوں سے یہاں [گندگی] پھیلتی ہوگی۔" میں نے ایک ملازم سے کہا

میری ہدایت پر وہ جھجکتے جھجکتے بولا "بڑے سرکار اپنی چیزوں کا [ہٹا]نا پسند نہیں کرتے جناب!"

"دیواروں پر نئی شاخیں لٹکا دیں گے!" میں نے کہا

اور اسی وقت مسہری کے نیچے کوئی قلقاری مار کر ہنسا میں بری طرح [چونک] پڑا۔ پھر دیکھا کہ نرائن داس داہنے ہاتھ کا انگوٹھا چوستا مسہری کے نیچے [سے جھا]نک رہا ہے!

"تم سب دیوار کے ساتھ ایک قطار میں میں کھڑے ہو جاؤ!" اس نے کہا [میں نے] دوسروں کو اس کی ہدایت کی تعمیل کرتے دیکھ کر میں بھی دیوار سے

"تم میں گانا کس کو آتا ہے؟" اس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ وہ سب بے چارگی کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

وہ کچھ دیر تک جواب کا منتظر رہا پھر بے چارگی کے ساتھ بولا "کوئی نہیں گا سکتا۔ میرے یہ تمام درخت سوکھ رہے ہیں۔ کئی برس سے یہاں برسات نہیں ہوئی۔ شاید کوئی ملہار گائے تو یہاں بارش ہو جائے۔ میرے درختوں پر بہار آجائے!" اس کے لہجے میں بلا کا سوز تھا۔ اور آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو رخسار پر ڈھلک آئے تھے!

"آپ حکم دیں تو ہم کسی کو تلاش کریں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا

"[illegible] شاید کوئی [illegible] جائے۔"

اور یہ سن کر سب باہر نکل گئے

جب ہم آخری کمرے پر پہنچے تو اسی وقت اندر سے ایک دبلا پتلا، دراز قامت اور سنجیدہ شخص باہر نکل کر ایک طرف جاتا نظر آیا۔ اس نے بس ایک نظر میری طرف دیکھا اور ان نگاہوں میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب میرا لاشعوری خوف ہو کیونکہ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں ایک سلگتا ہوا سگار دبا ہوا تھا جس کی بُو میرے لئے نئی نہ تھی!

ایش ٹرے میں کئی ادھ جلے سگار پڑے ہوئے تھے اور کمرہ دھوئیں کی لطیف بُو سے رچا ہوا تھا۔ میرا دل خوشی سے اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ سب بالکل اسی ساخت کے امریکی سگار تھے جو ڈی دن نے زیرو پوائنٹ پر پھینکے تھے!

"یہ کمرہ کس کا ہے؟" کام کے دوران میں نے حسب معمول ایک شخص سے پوچھا۔

"وجے کمار صاحب کا کمرہ ہے۔ بیگم صاحبہ کے سکریٹری ہیں۔ بہت کم گو اور شریف طبیعت کے ہیں!" وہ بولا

"اوہ۔ یہ وہی صاحب تھے جن کی آواز بھرّائی ہوئی ہے!" میں نے رسمی انداز میں کہا۔

"ہاں صاحب!" وہ بولا "یہ کئی برس سے یہاں نوکر ہیں۔ ایک روز کسی بات پر غصہ ہو کر بڑے سرکار نے انہیں گرا کر ان کا نرخرا دبوچ لیا تھا! اگر بیگم صاحبہ نہ آجاتیں تو بے چارے مر ہی گئے ہوتے۔ اسی دن سے ان کی آواز خراب ہے۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر بولتے بھی بہت کم ہیں!"

اب سارا معاملہ کسی حد تک میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔ الجھی ہوئی کہانی کے اسرار آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے۔ کم از کم ایک بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ وجے کمار ہی تنظیم کا سربراہ تھا۔ اس کے علاوہ کہانی کا اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ ایک بار نرائن داس نے وجے کمار کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی!

بظاہر یہ سارا قصہ کچھ یوں نظر آتا تھا کہ وجے کمار چند برس قبل شہر میں غنڈوں کی ٹولی کا سرغنہ رہا ہوگا پھر نرائن داس کے چچا آنند لعل کی موت پر فوری طور پر اس کے مکار ذہن میں ایک منصوبہ آیا اور اس نے کسی نہ کسی طرح

گیتا رانی اور نرائن داس کی شادی کرادی۔ وجے کمار خود زبردست ذہنی صلاحیتوں کا مالک تھا پھر نرائن داس کی دولت پر گیتا رانی کو اختیار حاصل ہوجانے سے اسے مالی وسائل بھی میسر آگئے اور اس نے اپنی زیر زمین تنظیم کی جڑیں دور تک پھیلا دیں اور خود گمنام رہ کر اپنے ماتحتوں پر اس طرح حکمرانی کرنے لگا کہ وہ اس کے نام تک سے لرزتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے بالا ہی بالا برونز آرٹ فیکٹری کو بھی منشیات کی غیر قانونی تجارت میں ملوث کردیا۔ دوسری طرف نرائن داس مجھے نفسیاتی مریض نظر آتا تھا۔ ممکن ہے کہ عام حالات میں وہ سوچتا سمجھتا ہو لیکن کسی دورہ کے زیر اثر وقتی طور پر مخبوط الحواس ہوجاتا ہو۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسے وجے کمار اور گیتا رانی کی ملی بھگت کی کوئی سن گن مل گئی ہو یا اس نے ان دونوں کے تعلقات میں کوئی اخلاقی خرابی دریافت کرلی ہو اور اشتعال کے عالم میں وجے کمار کے خاتمے پر تل گیا ہو۔ پھر گیتا رانی کی دخل اندازی پر اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑ گیا ہو جیسا کہ جوان بیویوں کے عمر رسیدہ شوہروں کو عموماً کرنا پڑ جاتا ہے۔

میں تنظیم کی جڑ تک پہنچ چکا تھا اور اب وجے کمار کے خاتمے کے بعد تنظیم کے اجزا منتشر ہوجاتے۔ اسے ٹھکانے لگانے کے بعد میرے سامنے دو راستے تھے۔ اول تو یہ کہ خود وجے کمار کی جگہ لے لوں اس نے خود کو اس قدر پُراسرار بنایا ہوا تھا کہ کسی کو بھی اس تبدیلی کا شبہ نہ ہو پاتا مگر اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ میں گروہ کے طریقۂ کار سے پوری طرح واقف نہ تھا نہ ہی مجھے یہ علم تھا کہ اس قدر وسیع غیر قانونی دھندوں سے حاصل ہونے والے مالی مفادات کس طرح وجے کمار تک پہنچتے ہیں۔ اس مجبوری کے پیش نظر دوسرا راستہ نجات اور آزادی کا راستہ تھا۔ میں اس گروہ کا شیرازہ بکھیر کر نہایت اطمینان سے اناپورنا کا رخ کرسکتا تھا۔

وجے کمار کے منظم اور بے انتہا طاقتور گروہ کے مقابلے میں میں نے تن تنہا جو کامیابی حاصل کی تھی اس پر مجھے بجا طور پر بہت فخر تھا اور مجھے یوں نظر آنے لگا کہ میں چند ہی دن میں اس جال سے نجات حاصل کرکے کھاندرناس کی تلاش میں اپنے مشن پر نکل سکوں گا!

دوسرے روز دوپہر کے وقت مجھے فرصت ملی تو میں سہنا سے اجازت لے کر آنند بھون سے شہر روانہ ہوگیا۔ امیر خان بھی اس پاگل خانے کی فضا سے سخت بدحواس تھا لہٰذا وہ بھی میرے ہی ساتھ ہولیا ان چند دنوں میں دوبارہ وہ نرائن داس کی دیوانگی کا شکار ہوا تھا اور دونوں بار نرائن داس نے درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخوں سے اس کی خاصی مرمت کی تھی۔

امیر خان کی عیاشیوں کے لیے گریسی کا شراب خانہ ہی کافی تھا اسے وہاں ولایتی شراب اور بدیسی شباب باآسانی میسر آسکتا تھا لہٰذا اسے وہاں اتار کر میں آگے نکل گیا۔ پہلے میرا ارادہ لونا مارٹن سے ملنے کا تھا لیکن میں نے اس آزادی کا بہتر استعمال مناسب سمجھا!

ایک پبلک بوتھ سے آنند بھون فون کیا تو کسی عورت نے فون ریسیو کیا۔ اس کے لہجے کا غرور اعلان کررہا تھا کہ وہ نرائن داس کی بیوی ہے۔

"میں وجے کمار سے بات کرنا چاہتا ہوں!" میں نے ... میں کہا۔

"اوہ۔ برڈی!" وہ مجھے اپنے دشمن کے روپ میں ... وقت یہاں نہیں ہے۔ تم مجھے پیغام دے سکتے ہو!"

"میرے کچھ اصول ہیں گیتا رانی!" میں نے لہجے میں ... کہا۔ "جو عورتیں اپنے شوہروں سے فریب کرتی ہیں میں ان پر بھی ..."

"یہ میرا ذاتی فعل ہے!" وہ برہم لہجے میں بولی "تم یہ ... جو ایک پاگل کی بیوی کہلا کر گوارا کرتی ہوں ..."

"میرا پیشہ ہی لوگوں کے ذاتی بلکہ خفیہ مشاغل ... میں وجے کمار کو ایک بہت اہم خبر دینا چاہتا تھا۔ اگر وہ ... بھی بیکار نہیں ہوں!"

"ٹھہرو۔ میں اسے بلاتی ہوں!"

چند منٹ بعد فون پر وجے کمار کی ... آواز ابھری ہوئی۔

"تم نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے وجے!"

میں نے کہا۔ "میں نے امیر خان اور صفدر کو آنند بھون ... بھیجا تھا میری مرضی کے خلاف بھوکے کتوں کی طرح شہر میں ... رہے ہیں میں نے ابھی صرف صفدر علی کو زخمی کیا ہے ... اگر اب وہ شہر میں نظر آئے تو میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔"

"لیکن میں انہیں زیادہ عرصے اپنے ..."

"اس لیے کہ وہ تمہاری آواز پہچانتے ہیں!" میں نے کہا۔ "اور اگر آنند بھون میں انھوں نے تمہاری آواز سن لی تو گے.... وجے! اگر تم آواز بدلنے پر قادر بھی ہوتے تو میں ... نام بتا کر سارا طلسم بکھیر سکتا تھا!"

"لیکن میں تم سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں!"

"فی الحال اپنے مقدر کا انتظار کرو ... کو آنند بھون سے رخصت کرسکتے ہو!" میں نے یہ کہہ کر سلسلہ ...

میرے پاس اپنا خودکار ریوالور موجود تھا ... آگے بڑھانے کے لیے کچھ قربانی دینی تھی۔ میں جیپ ایک ... گیا اور دل پر جبر کرکے اپنے ہاتھوں بائیں شانے پر اس طرح ... کا اوپری حصہ ادھیڑتی جیب کے پار سے آر پار گزر گئی۔

ریوالور جیب میں رکھ کر میں نے اپنے زخم پر ... جیپ کو واپس شہر کی طرف لے چلا۔ گو زخم معمولی نوعیت کا تھا ... والی ٹیس خاصی شدید تھی مگر خود کو شبہات سے بالاتر رکھنے ... ضروری تھا!

گریسی کے شراب خانے کے دربان نے اندر امیر خان کو میرے زخمی ہونے ... پہنچائی تو وہ گھبرایا ہوا باہر آیا اور میری قمیص خون میں تر دیکھ کر بوکھلا گیا۔

"... یہ کیسے ہوا؟"

"کوئی نادیدہ گولی" میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جو کھوپڑی ... کے شانے کو ادھیڑتی گزر گئی۔ میں بہت مشکل سے جیپ یہاں تک لایا ہوں ... فوری طبی امداد کی ضرورت ہے!"

امیر خان کے منہ سے خالص شیمپین کے تیز بھبکے اٹھ رہے تھے مگر وہ بلا ... پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ مجھے پہلو میں بٹھا کر اس نے جیپ اسٹارٹ کی ... اسی دیر میں ایک میڈیکل اسٹور جا پہنچا۔ اسٹور کا مالک امیر خان کا شناسا تھا ... نے عقبی حصے میں لے جاکر میرا زخم صاف کیا اور جتنی دیر میں اس نے زخم کی ... کی، امیر خان میرے لیے نیا لباس لے آیا۔

خون آلود لباس ایک تھیلی میں ڈال کر میں نے نیا لباس زیب تن ... امیر خان کے ہمراہ واپس آنند بھون کی طرف روانہ ہوگیا۔ خون آلود لباس ... ہم نے راستے میں گندے پانی کے ایک کھلے نالے میں پھینک دی۔

آنند بھون میں ہماری غیر حاضری کی وجہ سے زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ ... ظوں کی ٹولیاں کچھ زیادہ ہی چاق و چوبند تھیں اور سہنا بذات خود باہر ... کی بے چینی سے ہمارا منتظر تھا!

"تم لوگوں کی غیر حاضری کی وجہ سے آج میری سخت بے عزتی کی گئی ہے ... ہی دیر قبل تمہاری تلاش میں تین گاڑیاں شہر کی طرف روانہ کی گئی ہیں" ... باغات کے درمیان پختہ سڑک پر سفر کے دوران سہنا نے کہا۔

غالباً وجے کمار نے میرے فون کے بعد اسے سخت لعن طعن کی ہوگی۔ ... آنند بھون کے اندرونی انتظامات اور چھٹی وغیرہ کی منظوری اسی کی ذمہ داری ... سہنا سے اپنے زخم کے بارے میں میں کچھ نہ بتایا۔ امیر خان نے تو بالکل ہی چپ ... سادھ لی تھی۔

عمارت کے دیو برآمدے میں پہنچ کر سہنا رک گیا۔ "اندر جاؤ... بیگم ... بہت برہم ہیں اور بڑے کمرے میں تم دونوں کی منتظر ہیں!"

اس کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک ... دوسرے کی طرف دیکھا اور امیر خان دھیمی آواز میں بولا۔ "خدا خیر کرے۔ آج پاگل ... خانے کی فضا کچھ خراب نظر آتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم پر قاتلانہ حملہ تنظیم کے گمنام ... سربراہ کی طرف سے ہوا ہے۔ شاید اس نے آج ادھر بھی کوئی وار کیا ہے!"

"آخر ہم یک بیک اس عمارت کے مکینوں کے لیے اتنے اہم کیسے ہوگئے؟" ... استفسار کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں حیرت ظاہر کی۔

"وہ باس کو زک پہنچانے پر تلا ہوا ہے!" امیر خان نے اپنی رائے ظاہر کی ... "معلوم ہو گیا ہے کہ باس نے کسی خاص مقصد کے تحت ہمیں یہاں بھیجا ہے ... لہٰذا ایک طرف تم پر قاتلانہ حملہ کیا اور ہوسکتا ہے ساتھ ہی آنند بھون والوں کو بھی ہماری اصلیت سے باخبر کردیا ہو!"

"اگر ایسا ہے پیارے! تو ہم چوہے دان میں پھنستے جارہے ہیں!"

"آگے خوابگاہوں کی طرف جانے والے راستہ پر سات مسلح سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں سنبھالے پہرے پر موجود تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ اس وقت ہم دونوں کے سوا ہر ایک کے لیے اس طرف جانے کی سخت ممانعت ہے۔ یہ انتظامات میرے لیے سخت حیرت ناک تھے!

اس راستے سے گزر کر ہم بڑے کمرے میں پہنچے تو امیر خان کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ مگر مجھے اتنی حیرت نہ ہوئی۔

کمرے کے وسط میں تنظیم کا سربراہ اپنے مخصوص چست سیاہ لباس میں موجود تھا۔

"تم زخمی ہوکر آئے ہو صفدر علی؟" ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اپنے سربراہ کے منہ سے تازہ ترین حادثے کے بارے میں سن کر امیر خان کا منہ ہونقوں کی طرح کھل گیا۔ میں نے بھی بظاہر حیرت کا اظہار کیا مگر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں جناب۔ میرا بایاں شانہ زخمی ہے۔ مقدر ہی تھا جو نادیدہ دشمن کا نشانہ خطا ہوگیا۔!"

"بس کل شام تک کی بات ہے!" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا "میں نے تم دونوں کو ایک خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا تھا اور کل شام کے بعد تمہاری یہاں کوئی ضرورت نہ ہوگی۔!"

"لل... لیکن سر!" امیر خان خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ڈرو نہیں امیر خان!" نقاب پوش بھرائی ہوئی آواز میں ہنسا۔ "مجھے معلوم ہے کہ باہر محافظوں کا سخت پہرہ ہے۔ گیتا رانی میرا ہر حکم ماننے پر مجبور ہے۔ میری ہی خواہش پر اس نے یہاں کی ناکہ بندی کرائی ہے تاکہ کوئی غیر متعلق فرد میرا کھیل نہ بگاڑ سکے... آؤ میں تمہیں تماشا دکھاؤں!"

ہم دونوں نقاب پوش کے ہمراہ گیتا رانی کی خواب گاہ میں داخل ہوئے دروازہ خلاف معمول غیر مقفل تھا اور اندر کوئی موجود نہ تھا۔ نقاب پوش نے بستر پر پڑا ہوا چرمی بریف کیس کھولا۔ اندر بڑے نوٹوں کی گڈیاں سلیقے سے جمی ہوئی تھیں۔ اس نے آسودہ انداز میں سر ہلایا اور بریف کیس بند کردیا۔

"ہوسکتا ہے میں کسی وقت ہندوستان روانہ ہوجاؤں میرے آدمیوں کے لیے وہاں کچھ کاروباری دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں جنہیں دور کرنے کے لیے میری وہاں موجودگی ضروری ہے۔ میری عدم موجودگی میں ساری ہدایات میرا جانشین جاری کرے گا۔ تم لوگوں سے رابطہ قائم کرتے ہوئے وہ اپنی شناخت کے طور پر سبز گلاب کا حوالہ دے گا۔ یہ خیال رہے کہ وہ بہت تند خو اور سخت گیر آدمی ہے۔ اسے میری عدم موجودگی میں تم لوگوں سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے!"

"ہم خیال رکھیں گے جناب!" میں نے کہا۔

پھر اس نے خواب گاہ سے ملحق باتھ روم کے دروازے کا قفل کھولا اور اندر گیتا رانی باتھ ٹب کے کنارے پر بیٹھی نظر آئی، دہشت سے اُس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا!۔

"اس رقم کے لئے شکریہ مادام!" سیاہ پوش چرمی بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں جا رہا ہوں اور کل غروبِ آفتاب کے بعد میرے یہ دونوں آدمی بھی یہ جگہ چھوڑ دیں گے!"

وہ کچھ نہ بولی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتی رہی۔

"تم دونوں جاؤ اور محافظوں کو بڑی بیگم کا حکم سُنا دو کہ اب اندر کسی پہرے کی ضرورت نہیں رہی ہے!" وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔

امیر خان جھجکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "اور آپ سر؟"

وہ آہستہ سے ہنسا "میری فکر نہ کرو۔ اس خواب گاہ سے ایک خفیہ راستہ مجھے باہر پھیلے ہوئے گھنے باغات میں پہنچا دے گا۔"

ہم دونوں مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئے۔

محافظوں تک ہدایات پہنچانے کے بعد ہم دونوں باہر نکل آئے۔ امیر خان تو سیدھا اپنے فلیٹ کی طرف ہو لیا۔ مگر میں اپنے زخم کے لئے فرسٹ ایڈ کا سامان لینے کے بہانے دوبارہ عمارت کی طرف چل دیا۔

سہنا اسی عمارت میں مقیم تھا مگر میں سیدھا اس کی طرف جانے کے بجائے بڑے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہاں اچانک میری نظر نرائن داس پر پڑی۔ اُس کی پشت میری جانب تھی اور وہ سیڑھیوں پر بچھے ہوئے قالین کو اُٹھا کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔

اپنے جائزے سے مطمئن ہو کر نرائن داس سیدھا ہوا تو اُس کا چہرہ دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ اس وقت وہ کسی پاگل کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا، اس کے جبڑے اتنی سختی سے بھنچے ہوئے تھے کہ وریدیں تک جلد پر اُبھر آئی تھیں اور آنکھوں میں خون کی سُرخی رچی ہوئی تھی!

وہ کچھ دیر تک ان سیڑھیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک طرف چل دیا۔ میرے لئے بھی زیادہ دیر وہاں رُکنا مخدوش تھا لہٰذا میں سہنا کی طرف چل دیا۔

سہنا نے فرسٹ ایڈ بکس دیتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا تو میں نے اُسے بتایا کہ میری ران میں ایک معمولی سا زخم آ گیا ہے، اُس نے خود مرہم پٹی کی پیشکش کی تو میں نے اُسے ٹال دیا۔ اُس وقت وہ ذہنی طور پر خاصا پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اِس لئے مجھے باتوں میں اُلجھا لیا۔ میں خود بھی اتنی جلدی وہاں سے جانے کے موڈ میں نہ تھا اس لئے رُک گیا۔ مجھے سب سے بڑی خلش اس بات کی تھی کہ آخر وجے کو آنند بھون میں نقاب پوش کا روپ اختیار کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔۔!

ایک گھنٹے بعد جب میں بکس سنبھالے وہاں سے نکل رہا تھا تو اندر سے گھٹی گھٹی خوفزدہ چیخیں سُنائی دیں۔ میں تیزی کے ساتھ زینوں کی طرف دوڑ پڑا۔ ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ وہ چیخیں ایک ہچکی پر ٹوٹ گئیں۔ پھر سیڑھیوں پر کسی وزنی چیز کے لڑھکنے کی آواز... میں زینوں والے ہال میں پہنچا تو ایک سایہ زینوں سے ... دکھائی دیا۔ نیچے وجے کمار کا بے جان جسم پڑا ہوا تھا۔!

وجے کمار کی ہلاکت کی خبر آناً فاناً میں ہر طرف پھیل گئی ... سمیت سب لوگ وہاں آنے شروع ہو گئے۔ سیڑھیوں سے قالین ... اور وجے کے بدن پر کہیں بھی زخم کا نشان نہیں تھا۔ بظاہر یوں لگتا ... سیڑھیوں سے گر کر کسی اندرونی چوٹ کے سبب ہلاک ہوا ہے مگر ... تھا کہ اس کے سیڑھیوں سے لڑھکنے سے قبل وہ کسی جدوجہد میں مبتلا ... گرنے سے قبل ہی دم توڑ چکا تھا۔ مگر میں نے اس بارے میں زبان بند ... کے قتل نے میرے اعصاب پر خاصا ناخوشگوار اثر ڈالا تھا۔

اس حادثے کے بعد میرے وہاں رُکے رہنے کا جواز ... میں نے فرسٹ ایڈ بکس ایک خدمت گار کے ذریعہ سہنا کے کمرے ... پھر آنند بھون میں مقیم نرائن داس کا خصوصی معالج بھی بلوا لیا گیا۔ ... معائنے کے بعد بتایا کہ وجے کمار کی موت گردن ٹوٹنے کے سبب ... ہے۔ اس کی دانست میں وجے سیڑھیوں سے شاید سر کے بل گرا ...

مگر اصل کہانی کا شاہد میں تھا۔ وجے حادثے کا شکار ... اسے ہلاک کیا گیا تھا اور قاتل ابھی تک اوپری منزل پر موجود تھا ... پر چھریرے بدن والے مقتول سے بہت زیادہ طاقتور رہا ہوگا ... موقع پا کر سیڑھیوں سے اوپر اسے دبوچ لیا ہوگا اور وجے کی بے ... اسے اس کی گردن توڑ کر ختم کرنے اور پھر بے جان لاش کو سیڑھیوں ... میں کوئی دشواری پیش نہ آئی ہوگی۔

اسی وقت زینوں کے اوپری سرے پر نرائن داس نظر ... ایر گن سنبھالے اس وقت بالکل بے ضرر نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ... ایک جھماکا ہوا اور میں لرز کر رہ گیا۔

وجے کے قتل سے تھوڑی ہی دیر قبل نرائن داس ... میں سیڑھیوں پر کچھ کرتا پھر رہا تھا اگر وہی وجے کا قاتل تھا تو یقینی طور ... منصوبہ اس کے ذہن میں تھا اور وہ اُس وقت سیڑھیوں کا جائزہ ... کی طمانیت حاصل کر رہا تھا کہ قتل کے بعد وہ لوگوں کو حادثہ کا ... تک کامیاب ہو سکے گا!

پھر مجھے وجے کی وہ گفتگو یاد آئی جو اس نے نقاب ... میرے اور امیر خان کے سامنے کی تھی۔ میں نے اس گفتگو پر جتنا غور ... چلا گیا۔۔!

وجے کے قتل کے بعد معاملات نے ایک بالکل ...

... اب تک جو حالات سامنے آئے اُن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وجے زیرِ زمین ... کے غیر قانونی دھندوں کا تنہا ذمہ دار ہے لیکن اب یہ اندازہ ہوتا ... تنظیم اور اس کے خود کسی کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ جب اس کے آقا نے یہ دیکھا کہ ... وجے خود کسی کے اشاروں پر ... بیرونی دشمن نے وجے کو پہچان لیا ہے اور اس کی وجہ سے تنظیم کو ... ایک ... ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس نے وجے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ... مارنے سے قبل اُس کے آقا نے اختیارات خود سنبھالنے کے لئے ایک ڈرامہ ... بے خبر وجے نے آنند بھون میں مجھے اور امیر خان کو اپنی ... پایا اور اپنی موت سے بے خبر ... حاضری کے مکان سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد وجے کی ذات بے مصرف ہو چکی ... اس کے نامعلوم آقا نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ اب وہ سبز گلاب کے ... ان الفاظ کے ذریعے امیر خان کے توسط سے کسی کو بھی احکام پہنچا سکتا تھا ... امیر خان یہی سمجھتا رہتا کہ ڈی ون لمبے سفر پر گیا ہوا ہے۔!

اور اس ضمن میں نرائن داس کا کردار بہت زیادہ مشکوک ہو گیا تھا ... ظاہر ہے پاگل بوڑھے میں ایسی کوئی صلاحیت نظر نہ آتی تھی کہ وہ اعلیٰ درجے ... منصوبہ بندی کر سکے مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وجے کا قاتل وہ ... حالات کے پیشِ نظر تنظیم کی پشت پر بھی اُسی کا ذہن کارفرما ہونا چاہیئے تھا۔ ... ضمن میں گیتا رانی کی مکارانہ اداکاری بھی خاصی اہم تھی۔ میں بڑی کے ... اس عورت سے یہ اعتراف کروا چکا تھا کہ وہ وجے کی غیر قانونی مصروفیات ... رازداں ہے مگر میرے اور امیر خان کے سامنے جب وجے نے اس کا مقفل ... دم کھولا تو وہ دہشت زدگی کی اتنی کامیاب اداکاری کر رہی تھی جیسے اسے ... سے واقعی اپنی زندگی کا خطرہ لاحق رہا ہو۔

ایک بات بہرحال طے تھی۔ وجے کا قاتل اور تنظیم کا اعلیٰ دماغ ... بھی تھا، آنند بھون سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ اب میں یہاں رہ کر صفدر علی ... طور پر بھی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ہاں باہر نکلنے کے بعد بڑی کی حیثیت میں ... کم از کم گیتا رانی کے چھکے چھڑا سکتا تھا! یہ امر ابھی تک فیصلہ طلب تھا کہ گیتا ... محض وجے کی ہی رازداں تھی یا تنظیم کے اصل سربراہ سے بھی قرب رکھتی ... اگر اسے علم تھا کہ میرے اور امیر خان کے سامنے آخری اداکاری کے بعد ... قتل کیا جانے والا ہے تو وہ خود بھی کسی قاتل سے کم نہ تھی۔!

آنند بھون کے مکینوں پر وہ رات بہت بھاری گزری۔ بدمعاش ... وجے کمار نے وہاں اس قدر شریفانہ روپ دھارا ہوا تھا کہ اس کی موت پر ہر ... شخص دل گرفتہ تھا۔ گیتا رانی بھی سخت ملول تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ... اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پوری عمارت میں نرائن داس ... ہی ایسا شخص تھا جو اس واقعہ سے بے پرواہ اپنی دُھن میں مست نظر آ رہا تھا۔

میرے لئے یہ موقع غنیمت تھا۔ ڈسپلن کی پابندی ختم ہو چکی تھی ... لہٰذا میں موقع پا کر وہاں سے کھسک لیا اور خواب گاہوں والی راہداری کی طرف ... لیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ نرائن داس اگر صحیح الدماغ شخص ہے تو اُس کی خواب گاہ کی تلاشی کے دوران مجھے کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور مل سکے گی جس سے اس کے مقاصد سامنے آ سکیں گے۔

چابیاں میرے پاس موجود ہی تھیں۔ وہ راہداری بالکل ویران پڑی تھی لہٰذا میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر تالا کھول کر اندر جا گھسا۔ اندر سے دروازہ مقفل کرنے کے بعد میں اپنے سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

کمرے میں ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وحشت آمیز بے ترتیبی نمایاں تھی، لیکن دیواروں پر لگی درختوں کی ننگی ٹہنیاں یا بھونڈی تصاویر میری دلچسپی کا مرکز نہ تھیں۔ میں نے سب سے پہلے مسہری سے چادر سرکا کر نیچے کا جائزہ لیا مگر وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر مردانہ استعمال کی قیمتی خوشبویات اور دیگر اشیاء موجود تھیں۔ اسی کے پہلو میں ایک دیوار گیر چوبی الماری تھی۔ میں نے اُس کے دستے پر زور ڈالا مگر وہ مقفل تھی۔ میں اسے کھولنے کی کوششوں میں مصروف تھا کہ معاً مجھے کچھ آہٹیں سُنائی دیں اور میں چونک پڑا۔

اس راہداری کی چاروں خواب گاہیں اس انداز میں تعمیر کی گئی تھیں، کہ میری دانست میں اونچی سے اونچی آواز بھی موٹی دیواروں کو عبور نہ کر سکتی تھی البتہ گیتا اور نرائن داس کی ساؤنڈ پروف خواب گاہوں کو ملانے والا دروازہ معمولی نوعیت کا تھا لہٰذا میرا پہلا خیال یہی تھا کہ کوئی گیتا رانی کی خوابگاہ میں داخل ہوا ہے۔ پھر قدموں کی چاپ نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی اور میں دبے قدموں درمیانی دروازے کے قریب اس طرح دیوار سے جا لگا کہ کوئی اچانک وہ دروازہ کھول دے تو میں پٹ کی آڑ میں چھپا رہوں، گو میرا یہ اقدام بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر میں کوئی سراغ پانے کی کوشش میں اب ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو چکا تھا!

قدموں کی آہٹیں معدوم ہونے کے بعد اس جانب چند ثانیوں تک سکوت چھایا رہا۔ پھر گیتا رانی کی سخت اور تحکم آمیز آواز اُبھری۔ "وجے کی موت کے کیا اسباب ہیں؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" یہ واضح طور پر نرائن داس کی آواز تھی۔ لہجہ اٹل اور فیصلہ کن تھا۔ کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ کسی پاگل کی آواز ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے بس اتنا ہی معلوم ہے کہ سیڑھیوں سے قالین پھسلا اور وہ سر کے بل گرا۔ گردن ٹوٹنے کے بعد اس کا بچنا شاید معجزہ ہی ہوتا!"

"نری!" گیتا کی آواز میں التجا اور دھمکی دونوں عناصر نمایاں تھے "تم درندے ہو، میں خوب جانتی ہوں کہ تم ہی نے اسے راستے سے ہٹایا ہے۔ جب تمہارے حکم پر اُس نے امیر خان اور صفدر کے سامنے ڈرامہ کھیلا، میں اُسی وقت سمجھ گئی تھی کہ تمہاری نیت میں فتور ہے!"

"بکواس مت کرو گیتا!" وہ غرّایا "سب کچھ بھول جاؤ، بس یہ یاد رکھو کہ وہ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہوا ہے۔ وہ اس اُلو کے پٹھے، بڑی کی

نظروں میں آچکا تھا اور کسی بھی وقت وہ مجھے بھی ملوث کر لیتا ۔ وجے کی موت کے بعد بڑی اندھوں کی طرح بھٹکتا رہ جائے گا !"

"میں تم سے ہر وقت خائف رہنے لگی ہوں نری !" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی ۔" جس وقت تم پاگل کے روپ میں ہنگامہ کرتے پھرتے ہو تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم کیا ہو ۔ مگر ۔۔۔ مگر مجھے تم اس روپ میں بھی خونخوار لگتے ہو !"

"میں نے تمہیں دوبارہ وجے کے ساتھ دیکھا گیتا ۔" وہ بھاری اور سرد لہجے میں بولا ۔" میں نے ایک بار صرف تنبیہ پر اکتفا کیا اور دوبارہ اگر تم راہ میں نہ آتیں تو وہ میرے ہاتھوں مر چکا ہوتا ۔ میں بوڑھا ضرور ہوں مگر اس مفلس نوجوان سے زیادہ عقل رکھتا ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے ۔ مگر اب تک صرف اس لئے درگزر کرتا رہا کہ اس کے ذریعے میں اپنا ایک مشن پورا کر رہا تھا ۔ وہ تمہیں تو دغا ہی رہا تھا مگر اب اس کی ذات سے میرے مشن کو بھی خطرہ درپیش تھا ' لہٰذا اس کا راہ سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا ۔ اب تنظیم ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے ۔ میں اپنا مشن خود آگے بڑھاؤں گا ۔ !"

"مشن مشن !" گیتا تیزی سے بولی ۔" میں تمہاری زبان سے یہ لفظ سنتے سنتے عاجز آ چکی ہوں ۔ نہ جانے یہ کیسا مشن ہے کہ تم اپنی جائز آمدنی کا ایک بڑا حصہ غیر قانونی کاموں میں صرف کر رہے ہو ۔ تمہاری ذات ہر وقت خطرے میں گھری ہوئی ہے !"

"کیسا خطرہ گیتا ؟" وہ تلخ انداز میں ہنسا " کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ ایک ذہنی معذور یہ کھیل کھیل رہا ہے ۔ مجھے خطرہ نہیں ہے ۔ اگر تم بغاوت کر دو تو شاید میں پھنس جاؤں ورنہ مجھے اپنی محرومیوں کا انتقام لینے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔"

"تم جب پاگلوں کی طرح کھٹمنڈو کی سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرتے تھے ' اس وقت میں اور موجودہ زندگی میں تمہارے لئے کیا فرق ہے ؟" وہ خاصی پریشان تھی ۔

"آج تم نے پوچھا ہے تو میں ضرور بتاؤں گا ۔۔۔ پہلے مجھے اپنی الماری سے مارٹینی کا ایک پیگ دو !"

کچھ دیر مختلف آوازیں آتی رہیں ' پھر نرائن داس کی آسودہ آواز ابھری ۔

"تم جانتی ہو کہ انند لعل میرا چچا تھا ۔ لکھ پتی اور لاولد بڈھا !" وہ حقارت سے ہنسا ۔ "وہ یہ سوچ سوچ کر پیسہ جمع کرتا رہا کہ اس کی ذات موت سے مستثنیٰ ہے ۔ میں قلاشی کے عالم میں بارہا اس کے در پر گیا اور دھتکارا گیا ۔ اس نے مجھے اپنے یہاں ملازمت تک دینے سے انکار کر دیا اور میں فٹ پاتھ پر نکل آیا ۔ میرے لئے اس شہر کا ہر باسی انند لعل تھا ۔ لوگ بھیک دینے سے بھی کتراتے تھے ۔ پھر میں نے دیوانگی کا روپ دھار لیا ۔۔ اس طرح لوگوں کی ہمدردیاں میری جھولی میں چند سکے پہنچا دیتی تھیں اور جب انند لعل مرا تو اس کی کوئی وصیت نہ تھی ' جسے اپنے نہ مرنے کا یقین ہو وہ وصیت کیوں لکھے ۔۔۔ اور یوں میں اس کا تنہا وارث قرار پایا ۔ لیکن اس وقت تک اپنے تلخ تجربات کے باعث مجھے سرمائے سے ' عالیشان عمارتوں سے ' اس بے رحم معاشرے سے نفرت ہو چکی تھی ۔ شاید تم نفسیاتی مریض سمجھو گیتا ' مگر یہ میرے حقیقی جذبات تھے ۔ وراثت ملتے ہی میں نے ایک منصوبہ بنایا ۔ معاشرے کی بربادی اور گناہوں کی ترویج کا منصوبہ ۔ !" وہ آہستہ سے ہنسا ۔۔۔ "تم اس شہر میں بدیسی طوائف وجے تمہارا بھائی ۔۔۔ چونکو نہیں گیتا ' یہ میرا تجربہ ہے کہ ہر طوائف ' ہر دلال شفیق بھائی کا درجہ رکھتا ہے اور تم بھی اسے بھائی ہی کہتی تھیں ' دونوں کو اپنا رازداں بنایا ۔ شادی ہوئی اور میرے دل کی مراد پوری ہو گئی ۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ تم طوائف سے بیوی کے درجے پر آ گئیں تو تمہارے لئے وجے بھائی کی جگہ محبوب بن گیا ۔ تم جانتی ہو کہ مختلف جائز ذرائع سے بھاری آمدنی ہے اور میں غیر ممالک کو منشیات بھجوا کر بھی بھاری منافع کماتا ہوں مگر میری آمدنی کا بڑا حصہ یہاں برائیاں پھیلانے میں صرف ہوتا ہے ۔ قحبہ خانوں میں رشوت کے طور پر اعلیٰ سرکاری افسروں سے میرے آدمی ملتے ہیں ۔ میں مقامی اڈوں کے ذریعہ غریب سے بھی کم داموں پر شراب وافر فراہم کرتا ہوں ۔ یہی نہیں ' میرے کاروبار کا جال دور دور تک پھیلا ہوا ہے ۔ لوگوں کے اخلاق بگاڑ کر ان کی رسوم کی دھجیاں اڑا کر مجھے سکون ملتا ہے ۔ تم نے مہارشی انند رام کا نام سنا ہو ۔ وہ اس صدی کا سب سے بڑا رشی ہے ۔ وہ مجھے نہیں جانتا مگر میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں ۔ اس کے ذریعے میں ان وادیوں میں زہر پھیلا رہا ہوں ۔ آوارگی اور بے حیائی بڑھتی جاتی ہے میرے زخم خوردہ جذبوں کو تسکین ملتی ہے ۔ میرا مشن مکمل ہو گا جب یہ وادیاں کھلے قحبہ خانوں میں بدل جائیں گی ' جب اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل جائے گا ۔۔۔ اور تم جانتی ہو گیتا رانی ! !! میں کپڑے پھاڑ کر پاگلوں کی طرح چلاتا ہوا سڑکوں پر نکل جاؤں گا اور بتاؤں گا کہ یہ سب میرا کارنامہ ہے ۔ تم ایک آدمی کو بے بس اور حقیر ' ذلت ' رسوائی اور بھوک کا طوق اس کے گلے میں ڈال دینے والا ' وہی ایک ذلیل و بے مایہ شخص وسائل پر قادر ہو کر کیا کر گزر رہا ہے ' میری انا کی تسکین کا دن ہو گا ۔" وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہو گیا ۔ رہی فرق کی بات تو فٹ پاتھوں پر بھیک مانگتے ہوئے مجھے ہر وقت ذلت اور بے بسی کا احساس ستاتا تھا ۔ میں ان کتوں سے بھی بدتر تھا جو مٹانے کے لئے کہیں سے روٹی کا ٹکڑا یا گوشت کا لوتھڑا لے بھاگتے ہیں ۔ اب مجھے آسودگی اور برتری کا ایسا لازوال احساس حاصل ہے جو تمہارے لئے محال ہے !"

"تم واقعی پاگل ہو ' وحشی ہو نری !" وہ خوفزدہ آواز میں بولی ۔" ایک کے ساتھ ہوتا آیا ہے ' ہمیشہ ہوتا آیا ہے ۔ اگر تم پر ایک بد وقت آیا ہے تو آج تم ہر نعمت سے مالامال ہو ۔ !"

"مفلس کی جوانی سے بڑا عذاب کوئی نہیں گیتا ۔" اس کی ہنسی کاٹ تھی ۔" میں نے زندگی کا بہترین دور در بدر کی ٹھوکریں کھا کر گزارا ۔ عمر کے اس دور میں میں جسم تو خرید سکتا ہوں ' کسی کی محبت نہیں جیت سکتا ! سب ملا تو کس کام کا ۔"

"مم ۔۔۔ مگر میں تو تم سے محبت کرتی ہوں نری !" وہ ہکلاتے ہوئے بولی ۔

وہ بے رحم انداز میں ہنسا ۔" تمہاری ہکلاہٹ سے سب عیاں ہے ' تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو چھپ چھپ کر وجے کی آغوش نہ گرماتیں ۔ مگر اب مجھے کوئی شکایت نہیں ہے ' یہ سب زندگی کے حقائق ہیں اور میں ان تلخ حقیقتوں کو بڑی فراخ دلی سے قبول کر چکا ہوں ۔"

دوسری جانب چند ثانیوں کے لئے بوجھل سا سکوت چھا گیا ۔ میرے لئے یہ گفتگو بے انتہا لرزہ خیز تھی ۔ نرائن داس بلاشبہ بدترین ذہنی مریض تھا ' مگر اس کے ساتھ بلا کا مکار بھی ۔ میرے نزدیک ایسے لوگ موذی مجرم قرار دیئے جانے کے مستحق ہوتے ہیں ' جو ذاتی ناانصافیوں کا انتقام پورے انسانی معاشرے سے لینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ !

"ویسے ہم دونوں کا حساب برابر ہی ہے ۔" اس سکوت کو نرائن داس نے توڑا ۔" تم جانتی ہو کہ تمہارا شوہر ذہین اور صحیح الدماغ ہے مگر معاشرے کے سامنے تم نے پاگل کی بیوی کہلانا گوارہ کیا اور میرے اس احسان کا بدلہ تھا کہ میں نے تم کو کوٹھے سے اس کوٹھی میں لا بٹھایا ۔ یہ مول تول ہر جگہ ہوتے ہیں اور ہمارا ابھی یہ سودا برا نہیں رہا ۔ میں وجے کے ذریعے اپنا کام نکالتا رہا ' تم اپنا دل بہلاتی رہیں اور جب اس کی ذات ہمارے لئے متنازعہ بنی تو وہ راہ سے ہٹ گیا ۔ !"

"وہ مر چکا ۔ اب یہ طعنے بے کار ہیں ۔" گیتا بولی ۔" مگر ایک بات غور سے سن لو ۔ وجے تمہاری بساط کا ایک مہرہ تھا ۔ اس کی پشت پر تمہارا ذہن کارفرما تھا اور اس کے ہاتھ کئی انسانوں کے لہو سے آلودہ تھے ۔ تم نے وجے کے ذریعے جن کارندوں کو اپنی راہ پر لگایا وہ اب کبھی جائز روزی کا راستہ اختیار نہیں کریں گے ۔ لہٰذا تم براہِ راست ملوث ہونے کا خیال ترک کر دو اور اپنے گرگوں کو آزادانہ سرگرمیوں کی چھوٹ دے دو ۔ وہ خود ہی تمہارا مشن آگے بڑھاتے رہیں گے ۔"

"میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں گیتا ۔ یہ نہ بھولو کہ ابھی مجھے بڑی سے بڑی ... نمٹنا ہے !"

"تم خود کہہ رہے تھے کہ وجے کی موت کے بعد وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہ جائے گا ۔"

"وہ تمہیں بلیک میل کرے گا ۔ میرے آدمی اس کی نظر میں ہیں ' جب تک سرگرمیاں جاری رہیں گی تو وہ پھر تمہارا رخ کرے گا ۔ وہ میرے لئے بہت خطرناک ہے گیتا ۔ وہ کبھی بھی میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دے گا اور اسے ہٹانے کے بعد میری راہ بالکل صاف ہو گی ۔ !"

"یہ تمہاری ضد ہے نری ۔" وہ ہتھیار ڈالنے والے لہجے میں بولی ۔" اب میرا مقدر تمہارے فیصلوں سے ہی وابستہ ہے ۔ !"

ان دونوں کی گفتگو اب اختتام پر تھی ۔ میں نرائن داس کی خوابگاہ کا قفل کھول کر باہر نکلنے کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ وہ دونوں آہٹ سن کر فوراً ہی ادھر کا رخ کرتے اور میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ۔ میں نے اس بارے میں بس چند ہی سیکنڈ تک سوچا اور پھرتی کے ساتھ نرائن داس کی مسہری کے نیچے جا گھسا ' کناروں سے فرش تک لٹکتی ہوئی چادر نے مجھے بخوبی چھپا لیا تھا !

میں کئی منٹ تک مسہری کے نیچے قالین پر لیٹا رہا ۔ پھر درمیانی دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز ہوئی اور دبیز قالین پر قدموں کی ہلکی سی دھمک گونجنے لگی ۔ میں سانس لینے میں بھی احتیاط کرنے لگا کہ کہیں آنے والے کو کمرے میں میری موجودگی کا شبہ نہ ہو جائے ۔

"تم باہر جاؤ ۔ وجے کی لاش وہاں سے ہٹوانے کا بندوبست کرو !" نرائن داس نے اچانک اپنے ہی کمرے سے آواز لگائی ۔

"ادھر ہی جا رہی ہوں ۔ !" جواب آیا ۔

میں نے نرائن داس کی نقل و حرکت کا اندازہ لگانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا ۔ میرے اپنے سانسوں کی ہلکی ہلکی آواز کے سوا وہاں گہرا سکوت طاری تھا !

ذرا دیر بعد برابر والی خواب گاہ کا دروازہ کھلنے ' پھر بند ہونے کی آواز آئی ۔ شاید گیتا رانی اپنے خونی شوہر کی ہدایت پر باہر چلی گئی تھی ۔

"مسہری کے نیچے کون ہے ۔ باہر آؤ ' میرے ہاتھ میں تھری ایٹ کلیبر کا ریوالور موجود ہے !" اچانک کمرے کے سناٹے میں نرائن داس کی سرد ' تحکمانہ آواز گونجی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ۔ !

نرائن داس

ایک خونی اور مکار بوڑھا اس کمرے میں ریوالور سمیت موجود تھا اور میری کمین گاہ سے واقف ہو چکا تھا! اس کی للکار میرے لئے اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھی کہ چند ثانیوں کے لئے میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ مکارِ اعظم میری موجودگی سے کیونکر واقف ہوا اور اب مجھے موجودہ حالات میں اس سے نمٹنے کے لئے کیا راہ اختیار کرنی چاہیئے۔

"باہر آؤ ۔ !" اس بار نرائن داس کی آواز زیادہ سُرد اور تحکم آمیز تھی۔ "یہ آخری وارننگ ہے ورنہ میں مسہری سے باہر جھانکتے ہوئے جوتے کے چیتھڑے اڑا ڈالوں گا"۔

"میں نکل رہا ہوں" میں نے پژمردہ آواز میں کہا اور دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیجنے لگا۔ اگر میں ذرا سی احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ جائزہ لے لیتا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ کمرے میں داخل ہونے والے کی نظر میں نہ آسکے تو اس وقت میں یوں کسی بزدل چوہے کی طرح نہ پکڑا جاتا۔

میں بے چون و چرا مسہری کے نیچے سے نکل آیا۔

"دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو" نرائن داس کے چہرے پر اس وقت بے رحمانہ چمک کوندر ہی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے سیاہ ریوالور کی بھیانک نال میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور اس نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اگر وہ تمام گولیاں بھی میرے جسم میں اتار دیتا تو کمرے سے باہر والوں کو کچھ علم نہ ہو پاتا۔

"تمہاری اس پھولی ہوئی جیب میں کیا ہے؟" نرائن داس نے ریوالور کی نال کی جنبش سے میری پتلون کی داہنی جیب کی طرف اشارہ کیا

معاً میرا جی چاہا کہ اپنے بال نوچ کر سر دیوار پر دے ماروں۔ اس نیم پاگل بڈھے نے اس قدر ڈرامائی انداز میں مجھے للکارا تھا کہ میں جیب میں موجود ریوالور تک کو بھول بیٹھا۔ اگر میرے حواس ذرا بھی بحال ہوتے تو میں اسے کسی نہ کسی طرح دھوکہ دے کر اپنے قابو میں کر سکتا تھا لیکن اب میرے لئے سب راستے مسدود ہو چکے تھے۔ بازی اسی کے ہاتھ میں تھی!

"ریوالور!" میں نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ گرانے کی کوشش ہی کی تھی کہ وہ گرجا۔

"خبردار ۔ جو اس جیب کو ہاتھ لگایا۔ پتلون کے بٹن کھول کر اسے یہیں اتار دو، اور عقبی دیوار سے منہ لگا کر کھڑے ہو جاؤ"!

میرے چہرے پر شاید اس نے احتجاج کی پرچھائیاں پڑھ لیں اور ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔

کھٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ نال سے ایک شعلہ لپکا، اور میرے قدموں کے قریب فرش کا خاصا حصہ ادھڑ گیا۔ ساتھ ہی میں بھی ہلکی سی چیخ مار کر پیچھے اچھل گیا۔

"جلدی .... جلدی کرو!" نرائن داس غرایا۔ [illegible] تمہارے سینے پر ہو گا"۔

میں نے خود کو اس کی کسی دیوانگی سے محفوظ رکھنے [illegible] تعمیل ہی میں عافیت سمجھی اور پتلون اسی جگہ چھوڑ کر آہستہ آہ[illegible] کے قریب جا پہنچا۔ اب وہ میری پشت پر تھا اور یقینی طور پر [illegible] نہیں تھا۔ پتلون اتارنے کے دوران بھی وہ ایک لحظہ کے لئے [illegible] سے غافل نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر کے صبر آزما سکوت کے بعد نرائن داس [illegible] ابھری: "گڈ ۔ اب تم واپس آکر پتلون پہن سکتے ہو!"

میں پلٹا تو وہ اب پھر پرانی جگہ پر کھڑا ہوا تھا [illegible] کی جیب سے نکل کر اس کے بائیں ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا اور [illegible] وہی منحوس، ہیبتناک ریوالور چمک رہا تھا جس سے چند ثانیوں [illegible] فائر کر چکا تھا۔

میں نے پتلون پہن لی تو دیکھا کہ نرائن داس کے [illegible] زہر خند پھیلا ہوا ہے۔ شاید وہ میرے غیر مسلح ہو جانے کے [illegible] ہو گیا تھا۔

"کہانی .... اب اپنی کہانی شروع کرو صفدر [illegible] اب بھی سرد اور نپی تلی تھی "تم شاید میری اور گیتارانی کی سا[illegible] ہو، لہٰذا اب یہ بھی کان کھول کر سن لو کہ میں جس مشن کو لیکر چل[illegible] لئے اعلیٰ ترین دماغ کی ضرورت ہے اور میں ایسے ہی ذہن کا مالک [illegible] کمروں کی چابیاں تمہارے پاس ہیں اور مجھے یقین ہے کہ کسی [illegible] محفوظ رہنے کے لئے اندر گھسنے کے بعد تم نے اسی چابی سے در[illegible] کر دیا ہو گا جس سے تالا کھول کر اندر گھسے تھے"! پھر وہ ذر[illegible] میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ میں اس وقت نہ بھی آتا تو تم چپ [illegible] تھے۔ یہ تالے بہت ہی مخصوص ساخت رکھتے ہیں۔ تمہاری چابی [illegible] آکر مقفل تو کیا جا سکتا ہے لیکن کھولنا ناممکن ہے۔ اندر سے تا[illegible] لئے ایک دوسری چابی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسی مخصو[illegible] خواب گاہ کا مکین اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ کہانی! [illegible] اپنی چابیاں نکال کر میرے بیان کی تائید کر دو تاکہ تمہیں اندا[illegible] حقیقتاً کیا ہوں!"

میں اپنی ہی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔

"چلو!" یک بیک وہ غصیلی آواز میں دہاڑا [illegible] مجھے اندیشہ تھا کہ میں اب بھی تذبذب میں مبتلا [illegible] مجھ پر فائر کر بیٹھے گا۔ لہٰذا اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازے [illegible]

اور کئی ناکام کوششوں کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے جو کچھ کہا وہ درست ہی ہے۔

"اگر میرے ہی ٹکڑوں پر پروردہ کتے یوں کھلے بندوں مجھے زک دے سکیں تو یہ میرے لئے خودکشی کر لینے کا مقام ہو گا"۔ وہ مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے غصیلی آواز میں بولا: "اب مختصر ترین الفاظ میں اپنی یہاں موجودگی کا جواز پیش کرو"!

"مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے، مجھ سے نادانستگی میں بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے جناب!" میں نے نظریں جھکا کر اسے اپنی مجبوریوں کا تاثر دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ تنظیم کا باس درجے ہے اور اس کی پشت پر اصل ذہن آپ کا ہے اسی لئے میں برڈی کی دھمکی میں آکر یہ حرکت کر گزرا!"

"برڈی!" وہ حقارت سے غرایا: "میں اسے مسل دوں گا۔ وہ اس طرح کیا چاہتا تھا!"

"وہ اس وقت شاید اسی عمارت کے کسی حصے میں ہے"۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ ڈالا: "شہر سے یہاں واپسی پر نامعلوم طریقے سے ایک کاغذ میری جیب میں آپہنچا۔ جو یہاں آنے تک ہرگز میرے پاس نہیں تھا اس پر کسی نے جلدی میں ہدایات لکھی تھیں کہ میں آپ کی خوابگاہ کی تلاشی لوں اور خوابگاہ کو ابتر حالت میں چھوڑ کر باہر نکل جاؤں۔ نیچے برڈی کے دستخط تھے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر وہ کاغذ ایک نالی میں پھینک دیا۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ میں برڈی کی اس ہدایت کے سلسلے میں تنظیم کے سربراہ سے کس طرح ہدایت حاصل کر سکوں گا۔ پھر یہ سوچ کر کہ ایک بظاہر نیم پاگل شخص کی خوابگاہ میں گڑبڑ پھیلانے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے، میں یہاں آگھسا چند ہی منٹ بعد برابر والی خوابگاہ کا دروازہ کھلا تو میں نے اپنا کام شروع کرنے کا ارادہ ترک کر کے آپ کی گفتگو سننے کی کوشش شروع کر دی"!

"اوہ ۔ اگر وہ کاغذ اسی عمارت میں تم تک پہنچایا گیا ہے تو برڈی یقیناً کسی نہ کسی طرح یہاں آگھسا ہے۔ وہ میری توقعات سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے اور شاید اسے مجھ پر شبہ بھی ہو چکا ہے"۔ وہ کسی زخم خوردہ بھیڑیے کی طرح غرانے لگا: "میری خوابگاہ میں ابتری پھیلا کر وہ شاید قریب سے میرے ردِعمل کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا، اسے دیکھ لوں گا"!

اس پر میرا وار چل گیا تھا۔ دل ہی دل میں مجھے اپنی کامیابی کی کافی خوشی تھی مگر اپنے بشرے پر میں نے کسی ایسے شخص کے سے تاثرات پیدا کرنے کی کوشش کی جو رنگے ہاتھوں چوری کرتے پکڑا گیا ہو اور نرائن داس کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہا۔

"اس نے تمہیں چارہ بنا کر مجھے پھانسنے کی کوشش کی"۔ وہ کچھ دیر کے سکوت کے بعد بولا: "اب میں یہ چال اسے واپس لوٹاؤں گا"۔

"میں آپ کے حکم کا غلام ہوں سر!"

"تم اتنے فرمانبردار نہیں ہو صفدر علی جتنے نظر آتے ہو مجھے یقین ہے کہ کیمیاگری اور بھاندر ناس کا خبط ابھی تک تمہارے ذہن پر سوار ہے۔ مگر یہ سن لو کہ اپنے باغیوں کے ساتھ میرا رویہ بہت ظالمانہ ہوتا ہے۔ اگر تم نے موجودہ حالات کی پیچیدگی سے فائدہ اٹھانے کی ذرا بھی کوشش کی تو یہ سودا تمہیں اپنے لہو کے داموں چکانا پڑے گا .... شاید تم میری بات سمجھ رہے ہو!"

"میں نے آج تک تنظیم کو اپنی ذات سے شبہ کا موقع نہیں دیا سر!" میرے لہجے میں دبا دبا سا احتجاج قدرتی طور پر ابھر آیا۔

"ایک بار برڈی کے خوف سے تم تنظیم سے فرار ہوئے، دوسری بار اس کی دہشت نے تمہیں میری خوابگاہ میں گھس پڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور اب میں تمہیں مزید کوئی وارننگ دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس بار تمہیں راہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ میرے لئے خوفزدہ کارکن سے بڑا خطرہ کوئی نہیں ہو سکتا اور تمہارے اعصاب پر برڈی کی ہیبت طاری ہے"! وہ سرد آواز میں بولا۔

"مجھے اپنی غلطیاں تسلیم ہیں سر!" میرا لہجہ پژمردہ تھا۔ مگر اس کی تادیب سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں "میں آپ کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنے کی پوری کوشش کروں گا"۔

اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور مجھے درمیانی دروازہ کھول کر گیتارانی کی خوابگاہ میں داخل ہونے کی ہدایت کی۔

میرا ریوالور اس نے اپنی بائیں جیب میں رکھ دیا تھا جبکہ اس کا داہنا ہاتھ اس کے مہیب ریوالور سمیت جیب میں موجود تھا اور پتلون کی پھولی ہوئی جیب پر نال کا ابھار کسی بھی لمحہ میری جانب آگ اور پگھلا ہوا سیسہ اگل سکتا تھا۔

اس نے گیتا کی خواب گاہ میں ایک دیوار گیر خوبصورت چوبی الماری کے قریب جا کر بائیں ہاتھ سے ہندسوں والے قفل کے ڈائل کو کسی خاص ترتیب سے گردش دی اور پٹ کھلنے کے بجائے، کسی خودکار مشینی نظام کے تحت وہ دیوہیکل الماری ہلکی سی آواز کے ساتھ آگے کھسک آئی اور الماری کے عقب میں دیوار میں ایک راستہ پیدا ہو گیا۔

"چلو"۔ اس نے ایک طرف کھسک کر مجھے اس تاریک خلا میں داخل ہونے کا حکم دیا۔

بے اختیار میرا دل اچھلنے لگا۔ نرائن داس ابھی تک پوری رازداری کے ساتھ اپنے مجرمانہ مشن کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اس نے اپنے گرد حالات و واقعات کا ایک ایسا مضبوط قلعہ تعمیر کیا ہوا تھا کہ اس کی ذات ہر خطرے سے محفوظ تھی۔ مگر اب میں اس کا راز جان چکا تھا۔ اس کی

پوری کوشش یہ ہوتی کہ پہلی فرصت میں مجھ سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ مجھے شبہ تھا کہ چوبی الماری کے عقب میں نمودار ہونے والا تاریک خلا کسی تہہ خانے کا خفیہ راستہ ہے اور میرے اس پار پہنچتے ہی نراتن داس بے دریغ مجھے ختم کروے گا اور الماری کو دوبارہ اس کی جگہ پر لانے کے بعد اسے نہ میری لاش کی فکر ہوتی نہ ہی راز افشا ہونے کا خوف رہتا۔

میرا تردد دیکھ کر وہ ہنسا: "آگے بڑھو احمق آدمی ..... یہ کوئی چوہے دان نہیں ہے!"

اور اسی کے ساتھ اس نے الماری کے بغلی فریم میں نصب کوئی بٹن دبایا۔ چٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ وہ تاریک خلا روشنی میں نہا گئی اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس خلا کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی میرے تمام اندیشوں کی تردید ہوگئی۔ وہ کسی تہہ خانے کا راستہ رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر خونریزی کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس چوکور سرنگ کا صاف ستھرا فرش ڈھلان کی صورت میں کافی دور تک چلا گیا تھا۔ راستہ میں دو جگہ مناسب روشنی والے برقی قمقمے جھلملا رہے تھے۔

میرے اندر پہنچتے ہی نراتن داس بھی پھرتی کے ساتھ اس طرف آگیا اور میری لاعلمی میں اس نے نہ جانے کیا کیا کہ چوبی الماری نے اس خلا کو دوبارہ یوں بند کر دیا کہ ہم دونوں طرف سے اس چوکور سرنگ میں محبوس ہو گئے۔

"یہ راستہ میرے ذہن کی تخلیق ہے!" بند سرنگ میں اس کی تعریف طلب آواز ابھری: "کوئی وہم بھی نہیں کرسکتا کہ الماری کی پشت پر کوئی چور راستہ ہے اور اب میں تمہیں اپنی زیرزمین دنیا کی سیر کراؤں گا؟"

"بلاشبہ یہ راستہ بہت محفوظ ہے۔"

سرنگ کی محدود فضا ہمارے قدموں کی چاپ سے گونجتی رہی نراتن داس میرے پیچھے چلا آرہا تھا اور اس کا داہنا ہاتھ ابھی تک ایک لحظہ کے لیے بھی جیب سے باہر نہیں آیا تھا لیکن میں اتنا احمق نہ تھا جو اس وقت کوئی حرکت کرنے کی کوشش کرتا۔ اوّل تو اس مسلح مکارِ اعظم کو زیر کرنا یا دھوکہ دینا ہی محال تھا اور اگر میری ایسی کوشش بارآور بھی ہوتی تو وہ سرنگ میرا مقبرہ ہی بن جاتی۔ نراتن داس کی خوابگاہ میں داخلے کے دوسرے حفاظتی نظام کا تجربہ میرے ذہن میں تازہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں چوبی الماری کو اس کی جگہ سے سرکانے میں کسی قیمت پر کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ سرنگ کے دوسرے دہانے پر کیا تھا۔ یہ میرے علم میں نہیں تھا لہٰذا میں زندہ درگور ہونے کی کسی رضاکارانہ کوشش کا قطعی حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ فی الحال میں نے خود کو حالات کے دھارے پر ہی چھوڑ دیا تھا۔

وہ چوکور ڈھلان دار سرنگ شیطان کی آنت کی طرح طویل تھی اور آگے جاکر ایک طرف گھوم گئی تھی۔ اس موڑ کے بعد بھی روشنی کا انتظام موجود تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں نراتن داس کے ہمراہ اس وقت سطح سے زیرزمین پہنچ چکا تھا۔ اور شاید آنند بھون کی اصل عمارت کے نیچے سے نکل چکا تھا کیونکہ موڑ کے بعد فرش کا ڈھلان ختم ہوچکا تھا اور نراتن داس کی خوابگاہ عمارت کے سرے پر بنے ہوئے ایک بڑے کمرے کے بعد اور ہم اب تک جتنا فاصلہ طے کرچکے تھے وہ اس بڑے کمرے کے عرض سے کہیں زیادہ تھا۔

کچھ دیر بعد سرنگ کے بند دہانے پر اس سفر کا اختتام ہوا۔

"اب تم پوری طرح ہوش میں رہو گے!" نراتن داس رک کر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "اس بند راستے کے اس پار میرا ایک گونگا اور ملازم موجود ہے۔ وہ میرا معتمدِ خاص ہے مگر وہ بھی مجھے پاگل ہی سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے میری حماقتوں کا کھلے بندوں اظہار کرتے ہیں جبکہ یہ میری ہر حرکت کو سینے میں محفوظ رکھتا ہے۔ وہ ہمیں راستہ روشنی دکھائے گا اور میں بظاہر مجنونانہ حرکتیں کرتا ساتھ ساتھ چلوں گا اور تمہاری ذرا سی لغزش پر میرا ریوالور چل جائے گا!"

میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ بڈھا اس قدر پراسرار اور عیار تھا کہ آہستہ آہستہ اس کا خوف میرے ذہن پر غالب آتا جا رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد تھا جب میرے اور امیر خاں کے سامنے سہانا نے اسے سخت لہجہ میں ڈانٹا تو وہ اس بری طرح خوفزدہ ہوکر وہاں سے بھاگا کہ مجھے بھی اس کی بے چارگی پر رحم آیا تھا۔ مگر اب کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ شخص عملی زندگی میں اس قدر بے ضرر اور مظلوم بہروپ دھارے رہتا ہوگا۔

ہمارے سامنے اب ربڑ جیسی ساخت کا مگر ٹھوس اور سخت دروازہ حائل تھا۔ نراتن داس نے آگے بڑھ کر چھت میں بظاہر نظر نہ آنے والے سیمنٹ کے ایک مختصر اور چوکور حصے کو اوپر کی طرف دبایا اور وہ سیاہ دروازہ ہلکی آواز کے ساتھ داہنی جانب سرکتا چلا گیا۔

دروازہ ہٹتے ہی بدبو کا ایک تیز بھبکا سرنگ کے دہانے سے اندر داخل ہوا۔ اس قسم کی بدبو تالابوں وغیرہ کے کنارے عام طور پر پائی جاتی ہے۔ پھر نراتن داس نے اچانک ایک زوردار قلقاری ماری اور مجھے بے رحمی کے ساتھ آگے دھکیل دیا۔ بے خیالی کے باعث میں اپنے ہی زور میں آگے کی طرف لڑکھڑایا۔ اور دوسری جانب اگر کوئی مضبوط ہاتھ مجھے نہ تھام لیتا تو یقیناً میرا چہرہ فرش سے ٹکرا کر لہولہان ہوگیا ہوتا۔

مجھے تھامنے والے نے نیم تاریکی میں مجھے سیدھا کیا اور اسی وقت وہ حصہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ یہاں ایک بلند اور ہلکی ٹرالی پر بیٹری سے منسلک طاقتور سرچ لائٹ موجود تھی۔ نراتن داس بالکل بے وقوفوں کی طرح اس کے گرد ناچ رہا تھا، ساتھ ہی اس کے حلق سے بے معنی غراہٹیں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ بار بار بندروں کی طرح اچھل کود بھی کر رہا تھا۔

نراتن داس سے پھسلتی میری نظر اس شخص پر گئی جو چوکور سرنگ کا دہانہ دوبارہ بند کر رہا تھا۔ وہ اوسط قامت مگر مضبوط بدن کا مالک تھا اور اس وقت اس کی پشت میری جانب تھی۔ پھر اس بدبو کا راز بھی راز نہ رہا۔ چوکور سرنگ سے نراتن داس نے مجھے جہاں دھکیلا تھا، وہ ساخت کے اعتبار سے کوئی پختہ برساتی نالہ معلوم ہو رہا تھا۔ جو تین فٹ چوڑا اور چھ فٹ اونچا تھا پختہ فرش کے وسط میں کئی انچ چوڑی گہری سی نالی بنی ہوئی تھی اور اس میں بھیجے جیسے گدلا پانی بہہ رہا تھا۔ تہہ میں سبز کائی کی موٹی تہیں اور آبی گھاس نظر آرہی تھی۔ نالے کا باقی فرش گو خشک تھا مگر فرش اور دیواروں پر جابجا سیلن پائی جاتی تھی۔

اسی وقت نالے میں ایک گھٹی گھٹی بے چین سی غراہٹ ابھری میں اچھل کر مڑا تو ایک عجیب ہیبتناک چہرہ سامنے پایا۔ زردی مائل کرخت چہرے پر درندگی اور وحشت نمایاں تھی، وہ چوکور سرنگ کا دہانہ بند کر چکا تھا۔ اور اب نراتن داس کسی ضدی بچے کی طرح اس کے پیٹ پر گھونسے برسا رہا تھا۔ ہر گھونسے پر اس خونخوار مخلوق کے حلق سے وہی غراہٹ ابھرتی اور نراتن داس خوش ہوکر پھر گھونسہ رسید کر دیتا۔ وہ دونوں اس وقت مجھ سے لاتعلق نظر آرہے تھے۔ ایک خاص بات میں نے یہ دیکھی کہ چہرے کی درندگی کے باوجود اس شخص کی نگاہوں میں کربناک نرماہٹ رچی ہوئی تھی اور وہ بڑے دکھی انداز میں اپنے آقا کی دیوانگی دیکھ رہا تھا۔ اس کی چمکدار آنکھوں سے محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے اس کا کوئی ننھا سا بچہ اس کے سامنے کھیل رہا ہو۔!

مگر میں نے سوچا کہ وہ اپنے کھیل میں مست ہیں، میں قید خانے سے نکل کر برساتی نالے میں آچکا ہوں۔ اگر کسی طرح روشنی گل کر دی جائے تو میں کہیں نہ کہیں اس نالے سے باہر نکل ہی جاؤں گا۔ میرے لئے نجات کا یہ زرین موقع تھا۔

اور اس سے قبل کہ میں ٹرالی پر نصب بیٹری اور سرچ لائٹ کی طرف قدم بڑھاتا اس گونگے اور بہرے غلام نے جھٹ جس کے سہارے شاید خطرہ بھانپ لیا۔ اس نے بڑھ کر کسی ننھے سے بچے کی طرح نراتن داس کے دونوں ہاتھ تھامے اور اسے ساتھ لیتا میرے اور ٹرالی کے درمیان حائل ہوگیا وہ خونخوار اور بھبوکی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ آنکھوں کی نرماہٹ نہ جانے کہاں جا سوئی تھی۔

اس کی حلقوں سے ابلتی ہوئی دہشتناک آنکھوں نے میرے دل کی دھڑکن تیز کردی۔ پھر وہ غرایا اور سر سے ٹرالی کی طرف اشارہ کر کے حلق سے ایسی غراہٹیں بلند کرنے لگا جو دبی دبی غصیلی چیخوں سے بڑی حد تک مشابہ تھیں۔

چند ثانیوں تک میری عقل کام نہ کرسکی کہ میں اس کا غصہ کس طرح کافور کروں۔ پھر میں نے جلدی سے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

یہ حرکت کارگر رہی۔ شاید وہ میرا مفہوم سمجھ گیا تھا کیونکہ فوراً ہی اس کی بے معنی آوازیں حلق میں معدوم ہوگئیں۔

اس گونگے غلام نے نراتن داس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور وہ کسی بچے کی طرح خوشی کے عالم میں سر کے بل کھڑا ہوگیا۔ اور اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ادھر سے ادھر مٹکنے لگا۔ اس وقت وہ کوئی ماہر بازی گر نظر آرہا تھا اور اس کا غلام اس کی حرکتوں سے لاتعلق صرف میری نگرانی کر رہا تھا۔

آخر نراتن داس کے معتمد ملازم نے اشارے سے مجھے ایک طرف بڑھنے کی ہدایت کی۔ پھر شفقت سے اپنے آقا کے سر پر ہاتھ پھیر کر بے معنی آوازوں میں اس سے کچھ التجا کی اور نراتن داس کسی پیدائشی پاگل کی طرح یک بیک اس قدر سنجیدہ ہوگیا کہ اس کی یہ سنجیدگی بھی مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔

پھر اس خادم کی بتائی ہوئی سمت میں زیرزمین سفر شروع ہوگیا نراتن داس نے بڑھ کر میرے شانہ سے شانہ ملا لیا اور فوجی انداز میں مارچ کا حکم دے کر آگے چل پڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ خادم روشنی کی ٹرالی چلاتا ہمارے عقب میں آرہا تھا۔

نراتن داس اکڑ اکڑ کر قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ ساتھ ہی اسکے ہونٹوں سے فوجی بینڈ کی مضحکہ انگیز نقلیں ابھر رہی تھیں اور میں حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ مقدر نے مجھے ایک ایسے ستم ظریف کے ہاتھوں میں دے دیا تھا جو خود پاگل بن کر سب کو پاگل کر دینے پر تلا ہوا تھا۔

راستہ میں دو تین جگہ آنند بھون کے مختلف مقامات سے آنے والے چھوٹے نالوں کے دہانے اس بڑے برساتی نالے میں ملتے نظر آئے مگر یہ سفر بڑے نالے ہی میں جاری رہا۔

اس دوران میں میرا ذہن مسلسل کام کرتا رہا۔ نراتن داس نے نہایت چالاکی سے کام لیتے ہوئے گیتارانی کی خواب گاہ کو اس زیرزمین بھول بھلیاں سے ملایا تھا اور یقینی طور پر اس چوکور سرنگ کی تعمیر کے لئے اس نے وجے ہی کو آلۂ کار بنایا ہوگا۔ جو خوابگاہ کو نالے سے ملاتی تھی اوّل تو اس چوکور سرنگ کا فرش بہت زیادہ ڈھلوان تھا پھر ربر نما چیز سے بنا ہوا دروازہ یوں اس دہانے پر جم جاتا تھا کہ مان سون میں پانی نالے سے اس سرنگ میں نہیں جاسکتا تھا۔ نراتن داس نے شاید اپنے بچاؤ ہی کے لئے وہ راستہ گیتارانی کی خواب گاہ سے نکلوایا تھا۔ اگر کسی وقت اس چور راستے کا راز فاش ہوجاتا تو گیتا ہی تمام تر شبہات کا نشانہ بنتی، نراتن داس پاگل بن کر بچ نکلتا۔

میں ان ہی خیالات میں کھویا چلا جا رہا تھا کہ اچانک رک جانا پڑا

"ہالٹ!"، یہ نراین داس کی تیز آواز تھی جو میرے قدموں کی زنجیر بن گئی۔

میں نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ بہت زیادہ چوکنا بلکہ وحشت زدہ نظر آنے لگا تھا اور اس نے اپنا سائلینسر چڑھایا ہوا ریوالور بھی نکال لیا تھا۔

"خاموش، خاموش"۔ قدرے توقف کے بعد وہ خوف آور سرگوشیانہ انداز میں بولا" ہم اب دشمن کے علاقہ میں ہیں۔ یہ جنگ اسی کے دروازوں پر لڑی جائے گی!"

میں سیلن زدہ تہہ خانے کی دیوار سے جا چپکا۔ نہ جانے وہ خبطی اب کیا عزائم رکھتا تھا۔ مجھے ڈر تو یہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا جس کا خوفناک دہانہ کسی سانپ کے بے چین پھن کی طرح ادھر اُدھر گردش کر رہا تھا۔ اس کی انگلی ٹرائگر پر موجود تھی اور خفیف سے اشارہ پر بھی گولی چل سکتی تھی۔

نراین داس کا قوی الجثہ ملازم شاید یہ جانتا تھا کہ اس وقت اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے روشنی والی ٹرالی کنارے سے کھڑی کی اور بڑھ کر نالے کی چھت پر دونوں ہتھیلیاں جمادیں اور اس وقت میں نے دیکھا کہ ہم لوگ ایک مین ہول کے نیچے کھڑے ہیں۔ اس شخص نے تھوڑی سی کوشش کے بعد مین ہول کا ڈھکن اٹھا کر باہر ایک طرف الٹ دیا اور اس خلا سے باہر تاروں بھرا آسمان نظر آنے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم کھلی فضا میں نکلنے والے تھے۔

اس ملازم نے ٹٹول کر کناروں پر ہاتھ جمائے اور کسی بندر کی طرح جھولتا ہوا اس کا بدن خلا سے باہر نکل گیا۔

"ہم اس وقت دشمن کے علاقہ میں ہیں!"، نراین داس نے ہذیانی انداز میں یہ کہہ کر بے رحمانہ انداز میں قہقہہ لگایا" چلو اب تم باہر نکلو!"

باہر نکلنے کا عمل میرے لئے خاصا دشوار تھا۔ اسی کوشش میں میری کہنیاں بری طرح زخمی ہو گئیں۔ یہ جگہ جہاں میں موجود تھا کسی خود رو جنگل کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ بلند و بالا درختوں کے باعث میں اصل عمارت کا بھی تعین نہ کر سکا۔ مگر مجھے ایک بات کا پورالیقین تھا کہ ہم ابھی تک آنند بھون ہی میں موجود ہیں۔ کیونکہ میرے قیاس کے مطابق اس نالے کا اخراج کھلی ہوئی پہاڑی ڈھلانوں پر ہوتا ہوگا۔ اور ہم باہر نکلتے تو جنگل کے بجائے پہاڑیوں پر ہی ہوتے۔

نراین داس باہر آ گیا تو اس کا غلام پھرتی سے واپس نالے میں کود گیا۔ نراین داس کے حکم پر میں نے مین ہول کا آہنی ڈھکن بند کیا اور بے چون چرا اس کے ساتھ ہو لیا۔

"یہ کسی وقت آنند بھون کے لہلہاتے باغ تھے"۔ جھینگروں کے تیز شور کے درمیان وہ بولا" لیکن اب یہ خود رو جنگل کا روپ دھار چکے ہیں۔ پھلدار درختوں کو جنگلی بیلیں نگل گئیں۔ پھولوں کو سورج کی تپش نے جھلسا دیا۔ کس قدر رومان انگیز ہے یہ پر ہول ویرانی!"

"یس سر!" میں نے اس کی تلخ آواز کے جواب میں کہا۔ میرا ذہن تازہ ہوا پا کر بیدار ہو چلا تھا۔ میں موقع کا منتظر تھا مگر اس کا بے آواز ریوالور میرے حوصلے پست کئے دے رہا تھا۔

گھور اندھیرے میں خشک پتوں کو کچلتے ہوئے وہ مجھے کسی طرف لئے جا رہا تھا۔ پھر اچانک میرے مقدر نے یاوری کی۔ وہ ایک درخت کی جھولتی شاخوں سے بچنے کے لئے قدرے نیچے جھکا اور غفلت کا وہ ایک لمحہ میرے لئے فیصلہ کن بن گیا۔

میں نے پھرتی سے اس کی دائیں کلائی دبوچ لی۔ وہ کسی زخمی بھیڑیئے کی طرح غرا کر سنبھلا مگر میں نے کلائی مروڑ کر اسے زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ مگر جوں ہی میں نے ریوالور پر ہاتھ ڈالا وہ مغلظات بکتے ہوئے پوری قوت سے تڑپا اور اس کا سر میرے پیٹ میں آ لگا۔

میری تیز چیخ کوشش کے باوجود نہ دب سکی اور میں اس کی کلائی تھامے تھامے نیچے گر گیا۔ اور اسی وقت دور سے کوئی کڑکدار آواز ابھری

"ادھر کون ہے؟"

پوچھنے والا شاید آنند بھون کا کوئی مسلح محافظ تھا کیونکہ اس نے فوراً ہی تیز سیٹی کی آواز سنی پھر کافی فاصلے پر بھاری قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ ان اطراف میں موجود مسلح محافظوں کی ٹولیاں دوڑتی ہوئی جنگل میں آ رہی تھیں۔

ہم دونوں زمین پر ایک دوسرے سے زور آزما تھے۔ نراین داس بوڑھا ضرور تھا مگر اس کے قویٰ قابل رشک حد تک مضبوط تھے وہ زخمی بھیڑیئے کی طرح غرا غرا کر مجھ پر وار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار اسے گرا کر اس کے سینہ پر سوار ہونے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریوالور کا دستہ اب بھی اس کی گرفت میں تھا اور وہ دفاعی جنگ لڑ رہا تھا میں نے پوری قوت سے اس کے چہرے پر ٹکر رسید کی اور وہ بدحواس ہو کر بلبلا اٹھا۔

قدموں کی دھمک لحظہ بہ لحظہ قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ تاریک جھاڑیوں میں روشن لکیریں تیرتی پھر رہی تھیں۔ محافظ جائے واردات کو سونگھتے پھر رہے تھے اور میں کسی بھی لمحہ مغلوب ہو سکتا تھا۔ اس سے قبل کہ نراین داس اپنے حواس بحال کرتا۔ میرا بایاں ہاتھ مضبوطی سے اس کے دہانے پر جم چکا تھا! اور ریوالور کی جدوجہد آخری خاموش مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

محافظوں کے زور زور سے بولنے اور وارننگ دینے کی آوازیں مجھے بے چین کئے دے رہی تھیں۔ اعصاب پر سنسنی چھاتی جا رہی تھی۔ کنپٹیوں میں دھمک رہا تھا۔ بدن پسینوں میں نہا گیا تھا کیونکہ شکست میری نظر آ رہی تھی، نراین داس نہ سہی اس کے نمک خوار مجھے کسی بھی لمحہ زد میں لے کر گولیوں سے چھلنی کر سکتے تھے۔ ان کے فربہ اندام گٹھیلے جسم، شہ زور تیور، رائفلوں کے دہانے سب ہی میرے دماغ پر چھائے جا رہے تھے۔

اس وقت میں اس بری طرح نروس ہو چکا تھا کہ نراین داس پر پوری طرح حاوی ہونے کے باوجود اس سے ریوالور چھیننا میرے لئے قیامت ہو گیا۔ ادھر نراین داس اپنی قوتِ ارادی کے سہارے بازی الٹنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

پھر اچانک وہ ویران جنگل رائفل کے نغمہ سے گونج اٹھا۔ آنے والوں میں سے کسی نے للکار کر ہوائی فائر کیا تھا۔ یہ فائر میرے لئے تازیانہ ثابت ہوا میں نے پوری قوت صرف کر کے ریوالور چھین ہی لیا۔ اور اس کے منہ سے بایاں ہاتھ ہٹا کر ریوالور کی نال اس کے دہانے میں ٹھونس دی جو چیخنے کے لئے کھلا تھا اس کے حلق سے کچھ عجیب و غریب دہشت زدہ اور رحم طلب آوازیں ابھریں آنکھوں میں موت کی دھندلاہٹ ناچنے لگی مگر میرے لئے یہ وقت اس صورتحال سے لطف اندوز ہونے کا نہ تھا۔ میں نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ کھٹ کی ایک آواز ابھری دم توڑتی ہوئی آخری غراہٹ کے ساتھ میرے نیچے اس کا بدن کانپ کر مڑ تڑ گیا۔

اسی وقت بہت قریب سے چند آوازیں ابھریں پھر روشنی میرے بہت قریب رینگنے لگی۔ میں نے فوراً ہی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔

ان میں چند جھاڑیاں خاردار تھیں۔ میری آواز موت کے خوف سے حلق ہی میں دم توڑ گئی۔ اس وقت میری حالت کیا تھی، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس صورت حال سے گزر چکا ہو۔ میجر انل سے دو بدو مقابلہ اور پٹنہ جیل سے سنسنی خیز فرار کے دوران میں بھی میری کبھی یہ کیفیت نہ ہوئی تھی۔ ادھر نراین داس کی آخری ہچکی سے وہ لوگ شاید صحیح مقام کا تعین کر چکے تھے۔ ان کا دائرہ لمحہ بہ لمحہ میرے اور نراین داس کی لاش کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کوندا اور دوسرے ہی لمحہ میں متحرک روشنیوں سے خود کو بچاتے ہوئے بے آواز اس درخت پر چڑھنے لگا جس کے سایہ میں وہ جھاڑیاں واقع تھیں۔ ذرا ہی دیر میں میں اوپر پہنچ چکا تھا یہاں میں نے کوئی آواز پیدا کئے بغیر خود کو گھنی شاخوں اور پتوں میں اس طرح چھپایا کہ سرسری جائزہ کی نیت سے ڈالی جانے والی کوئی روشنی میرا سراغ نہ پا سکے۔

صرف چند سیکنڈ گذرے اور بیک وقت اٹھارا بیس محافظ رائفلیں سیدھی کئے نراین داس کی لاش کے قریب جا پہنچے۔

"ارے یہ تو لاش ہے!"

"یہ کون ہے؟"

بیک وقت کئی متحیر آوازیں ابھریں۔ ان میں کوئی بھی نہ متاسف تھا نہ خوفزدہ! آس پاس سے ان میں اور بھی آدمی ملتے جا رہے تھے ان سب کے جسموں پر چست خاکی وردیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ میرے لئے ان کی یہ حیرت متوقع تھی۔ نراین داس کے حلق سے گزر کر بھیجا اڑا دینے والی اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کی گولی نے شاید اس کا چہرہ بھی مسخ کر ڈالا تھا!

ان میں سے ایک نے لاش کو الٹ پلٹ کر پہچان ہی لیا: "ارے یہ تو اپنا سنکی سیٹھ معلوم ہوتا ہے!"

"تلاش کرو... قاتل ابھی نکل نہ پایا ہوگا"۔ ان میں سے کسی نے تحکم آمیز آواز میں کہا اور وہ ساری بھیڑ روشنیاں چمکاتی مختلف سمتوں میں پھیلنے لگی ان کی تعداد کسی بھی طرح پچاس سے کم نہیں تھی اور شاید وہ سب ہی پیشہ ور لڑاکے تھے۔

"سالے کا یہی حشر ہونا تھا" وہاں رک جانے والے تین آدمیوں میں سے ایک بولا" اس کے مقدر ہی میں کتے کی موت لکھی ہوئی تھی!"

"قسمت کے کھیل ہیں!"، دوسری تلخ آواز ابھری" سینکڑوں ہوش مند اس پاگل کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور تھے۔!"

"ہوتے ہوں گے!" پہلی آواز میں بیزاری نمایاں تھی" میں تو اندر والوں کے سامنے اس سے نرمی برت لیتا تھا۔ تنہائی میں اس بری طرح پھٹکارتا تھا کہ آخر یہ میری صورت ہی سے بھاگنے لگا تھا"۔

"پتہ نہیں آج کی رات یہاں اور کیا ہونے والا ہے"۔ تیسری آواز قدرے بھاری تھی" اندر وجے صاحب سیڑھیوں سے گر کر مر گیا اب یہ مارا گیا"۔

"کچھ گھپلا معلوم ہوتا ہے"۔ دوسری آواز بدستور تلخ تھی۔" وجے اور بڑی بیگم کے بارے میں کیا کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ اپنے آدمی کے پاگل پن سے...!"

"بس زبان بند رکھ مہیندر" کسی نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی" یہ مت بھول کہ اس کے خوشامدی اسے پل پل کی خبر پہنچاتے ہیں... خبردار جو اب بڑی بیگم کے بارے میں یوں بے احتیاطی سے زبان کھولی"۔

"بڑی بیگم"۔ ان تینوں میں سے کسی نے لذت آمیز لہجہ میں دہرایا، پھر ہنس دیا۔

"تو یہیں رک... ہم دونوں جا کر بڑی بیگم کو خبر کرتے ہیں"۔ ایک آواز ابھری، پھر دو سائے وہاں سے ٹارچیں چمکاتے روانہ ہو گئے۔ تیسرا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگانے لگا تیلی کے سرخ شعلہ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ چھریرے بدن کا ادھیڑ عمر شخص ہے اور پھر تیلی کا شعلہ معدوم ہو گیا۔

میں سانس روکے، بے حس و حرکت اپنی کمین گاہ میں دبکا بیٹھا تھا۔ ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ گیتا وہاں کس حد تک

بدنام تھی۔ اور نرائن داس کی مکاری کی تو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے، وہ اپنے ادنیٰ ملازموں سے اپنی تحقیر کراتا۔ ان سے بظاہر خوف زدہ رہتا۔ یوں اس کے پاگل پن کے سینکڑوں گواہ پیدا ہو چکے تھے۔ یہ میں بھی جانتا تھا کہ دنیا کا کوئی علم اسے ہوشمند قرار نہیں دے سکتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اداکاری ایک قسم کے پاگل پن کی کرتا تھا جبکہ درحقیقت وہ ایک دوسری دیوانگی بلکہ جنون میں مبتلا تھا۔ ملازموں کو صرف اپنی تنخواہوں سے غرض تھی۔ ان میں نہ اپنے آقاؤں کی عزت تھی نہ ہمدردی!

نرائن داس کے قاتل کی تلاش میں نکلنے والے محافظوں کی ٹولیاں جنگل میں دور تک پھیل چکی تھیں۔ ہولک دوش پر آنے والی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری کمین گاہ کے اردگرد خاصا بڑا حصہ ان سے پاک ہو چکا ہے۔ گیتا ان کے لئے خبر لے جانے والے بھی کافی دور نکل چکے تھے اور میں تو گویا اسی جگہ قید ہو کر رہ گیا تھا۔

نرائن داس سے چھینا ہوا ریوالور ابھی تک میرے پاس موجود تھا۔ شاید اس کے چیمبر میں کئی گولیاں بھی موجود تھیں۔ مگر وہ ان لاتعداد محافظوں سے مجھے کب تک محفوظ رکھ سکتی تھیں۔

میری کوئی بھی کوشش بارآور ہونے کے لئے وہ مناسب ترین وقت تھا۔ رات اپنے آخری سانسوں پر تھی، خونی محافظوں کی یلغار اندھیرے میں دور تک بھٹک رہی تھی۔ نیچے صرف ایک نافل دشمن موجود تھا جو درخت کے تنے کے سہارے ٹیک لگائے بے فکری سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اگر میں یہ موقع گنوا دیتا تو ذرا ہی دیر میں نیچے ایک ہجوم جمع ہو جاتا۔ نرائن داس کی لاش اٹھائے جانے سے قبل شاید زبردست روشنی کا انتظام بھی کیا جاتا اور سورج طلوع ہونے کے بعد میرا دیکھ لیا جانا یقینی امر ہوتا۔

میں نے کچھ دیر اپنے منصوبے پر غور کیا۔ سارا دار و مدار صرف نشانے کی سچائی پر تھا۔ اگر میرے بے آواز ریوالور سے نکلی ہوئی گولی براہ راست نیچے والے کے دل یا کھوپڑی پر پڑتی تو وہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر ڈھیر ہو جاتا۔ نشانہ ذرا بھی خطا ہوتا تو میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ پہلی ہی گولی کا یوں کارگر ہونا کوئی آسان بات نہ تھی۔ مگر دوسری صورت بھی مجھے قید کی راہ دکھا رہی تھی۔ لہٰذا میں نے سنبھل کر اپنی پوزیشن بدل لی۔

میرا شکار کچھ اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ میرے لئے اسکے دل کا نشانہ لینا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ زخمی ہو کر بھی میرے لئے اسی قدر خطرناک تھا جتنا صاف بچ کر، لہٰذا میں نے اس کی کھوپڑی پر وار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اس میں خطرہ کم تھا اور سگریٹ کا چمکیلا روشن سرا میرے لئے بہت مددگار ہوتا۔

میں نے ریوالور سنبھالا اس کی طرف شست لی۔ اس نے پہلا کش لیا تو میں نے نال کی سیدھ کا اندازہ کیا اور چند ثانیوں بعد اس کا دوسرا کش زندگی کا آخری کش تھا۔ بے آواز فائر نے اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے اڑا دیئے تھے!

میں جلدی جلدی درخت سے نیچے آیا۔ اس کے بے جان بدن سے کپڑے اتارے اور اپنا لباس خاکی وردی سے تبدیل کر کے رائفل اور ٹارچ سنبھال لی۔ احتیاطاً کپڑوں کی پوٹلی ساتھ ہی لے لی۔ اگر راہ میں کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو اسے اندھیرے میں کہیں اچھال دیتا۔ ورنہ اسے ساتھ ہی لے جاتا۔

کچھ دور تو میں چوروں کی طرح دبے قدموں چلتا رہا۔ اب میں ترتیب وار میں بہت سی آوازیں اور متحرک روشن نقطے دیکھ رہا تھا۔ سارے محافظ جنگل میں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ میں ان سے بچتا رہا، پھر ایک جگہ میں نے بھی ٹارچ روشن کر لی۔ بے آواز ریوالور جیب میں تھا اور رائفل ہاتھ میں فاضل کارتوسوں کی پیٹی بھی میرے ہی قبضہ میں تھی۔

میں ان ہی کی طرح روشنی ادھر ادھر ڈالتا آگے بڑھتا رہا، مگر خلاف توقع کافی دیر تک کامیابی کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اسی کوشش میں میں جنگل کے درمیان سے گزرتی ہوئی نیم پختہ روش پر آ گیا۔

یہاں بھی کافی فاصلہ سے تین محافظ گمنام قاتل کی تلاش میں سرگرداں نظر آئے۔ پھر اچانک ہی میری نظر ایک مین ہول پر پڑی میرا دل بے اختیار اچھل پڑا اور میں نے ٹارچ بجھا دی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے مین ہول کا ڈھکن جھاڑیوں میں ڈال دیا تاکہ اس طرف کوئی فوری طور پر متوجہ نہ ہو سکے۔ اور خود بے دھڑک اندر کود گیا۔

اندر کی زمین نرم اور گیلی تھی۔ ٹارچ روشن کی تو پتہ چلا کہ میں کسی ذیلی نالہ میں آ کودا ہوں۔ میرے لئے یہ بات پریشان کن نہ تھی کیونکہ تمام چھوٹے نالے آخر کار اسی برساتی نالے سے ملتے تھے جو نرائن داس کے لئے چور راستہ کا کام دیتا تھا۔

برساتی پانی کے بہاؤ سے اس کچے فرش والے نالے میں قدرتی ڈھلان بنی ہوئی تھی جس کی بنا پر مجھے سمت کا تعین کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی اور میں جلد ہی پختہ نالے تک جا پہنچا۔ یہاں مجھے غور سے فرش میں بنی ہوئی نالی میں بہنے والے پانی کا جائزہ لینا پڑا۔ ڈھلان کے اندازہ کے بعد میں بگٹٹ نکاسی کے راستہ کی طرف ہو لیا۔

رائفل میرے شانے سے جھول رہی تھی۔ کپڑوں کی پوٹلی کارتوسوں کی چرمی پیٹی سے باندھ لی تھی۔ بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھی اور داہنے میں وہی بے آواز ریوالور جو اب تک دو نازک موقعوں پر میری مدد کر چکا تھا۔ اس طرح میں نے نرائن داس کے اس گونگے اور بہرے معتمد سے نمٹنے کا پورا بندوبست کیا ہوا تھا جس سے اسی راستہ میں کہیں بھی مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔

میں پورے حوصلہ کے ساتھ بھاگتا رہا۔ اس گونگے اور بہرے کو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ وہ اتنا شہزور تھا کہ اس نے ناگہانی حالات کے مقابلے کے لئے طاقت کے علاوہ کسی قسم کے اسلحہ پر بھروسہ کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ بے خبری میں مجھے نہیں مار سکتا تھا جبکہ میں اس کی آہٹ پاتے ہی اسے ٹھکانے لگانے کی قوت اور صلاحیت رکھتا تھا۔

نالہ میرے قدموں کے شور سے گونج رہا تھا کہ اچانک اس کی سیلن زدہ تاریک فضا میں ایک غضبناک غراہٹ سنائی دی۔ غیر ارادی طور پر میرے اعصاب بھڑکے مگر میں نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ اور ٹارچ روشن کر دی۔ ساتھ ہی میرے قدم بھی رک گئے۔

نالے میں طاری ہو جانے والے اس اچانک سناٹے میں وہ کریہہ صورت شخص میرے سامنے موجود تھا۔ مگر اس وقت میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں نے اپنا ریوالور والا ہاتھ ٹارچ کے عقب میں اندھیرے ہی میں چھپایا ہوا تھا۔

وہ بے وقوف چند ثانیوں تک اپنی تاریک ٹرالی کے پاس کھڑا مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر نتھنوں اور حلق سے کراہت انگیز آوازیں نکالتا میری طرف دوڑ پڑا۔

اس وقت ایک ثانیہ کے لئے مجھے وہم ہوا کہ کہیں ریوالور خالی نہ ہو گیا ہو اور میرے مساموں سے ٹھنڈے پسینے پھوٹ پڑے۔ پے در پے بدلتے ہوئے حالات میں مجھے اتنی مہلت ہی کہاں ملی تھی جو یہ سب دیکھتا۔ ادھر وہ مسٹنڈا اتنی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا کہ میں ریوالور پھینک کر رائفل سنبھالتا تو اسے سیدھا کرنے کا موقع ملنا ناممکن تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر میری انگلی چل گئی۔ ٹریگر دبا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ ایک شعلہ لپکا۔ اور وہ عفریت دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے منہ کے بل فرش پر گر پڑا! اور بری طرح چیخنے لگا۔

اس کے پیٹ پر آنے والا زخم اتنا کاری تھا کہ اس سے فوری طور پر مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے ریوالور کا چیمبر چیک کیا اس میں صرف دو گولیاں باقی تھیں۔ یہ دو بے آواز گولیاں ابھی میرے لئے بہت اہم تھیں انہیں میں اپنے کسی قریب المرگ دشمن پر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ رائفل کا زبردست دھماکہ میری تلاش میں سرگرداں محافظوں کو میرے تعاقب کی راہ پر ڈال سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ٹارچ روشن کر کے فرش پر رکھی اور رائفل کی نال تھام کر اس کے سر پر کندے کی پے در پے دو شدید ضربیں لگائیں۔ ذرا ہی دیر میں وہ دم توڑ گیا۔

یہ میری راہ کا آخری روڑا تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ آج اندھبن میں میری اس خون آشام شب کا کوئی کردار زندہ نہیں رہ گیا تھا میں نہایت خفیہ طریقہ پر نرائن داس کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے پکڑا اپنے معتمد کی مدد سے مجھے باہر لایا اور اب نہ صرف وہ دونوں بلکہ ایک اور شخص بھی میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

جب میں اس زیر زمین برساتی نالے سے کھلی فضا میں آیا تو کھٹمنڈو کی وہ رات اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔ تاروں کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور میں اندھبون کے احاطہ کی بلند و بالا دیواروں سے باہر کئی سو فٹ دور بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر کھڑا ہوا تھا۔

رائفل، فاضل کارتوس اور خون آلود خاکی وردی۔ یہ چیزیں نہ صرف اب میرے لئے غیر ضروری تھیں بلکہ میرے تمام کئے دھرے پر پانی پھیرنے کا باعث بن سکتی تھیں لہٰذا میں نے رائفل ان لوڈ کر کے گہری ڈھلانوں میں اچھالی، کارتوس دور دور بکھیرے اور وردی کے بجائے اپنا لباس پہن کر وہاں سے چل پڑا۔

زندگی کے ان دشوار ترین لمحات کو جھیلنے کے بعد میں خود کو روئے زمین کا سب سے بڑا فاتح سمجھ رہا تھا۔ میں نے تنہا ایک بے حد منظم گروہ کی بنیادوں کو اس طرح نیست و نابود کیا تھا کہ اب اس کی منتشر کڑیاں کسی طرح یکجا نہیں ہو سکتی تھیں۔ وجے اور نرائن داس جو اس خطۂ زمین کے دو مکروہ ترین انسانی کردار تھے میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے اور میں مجرموں کی اس قید سے نجات پا چکا تھا جو میری آزاد فطرت کو زنگ آلود کر رہی تھی۔ گھر، دیس، بدیس، جیل اور پھر مجرموں کی قید۔ اب تک میں ہر جگہ سے فرار ہوتا آیا تھا۔ میرا ہر فرار اپنی جگہ مکمل تھا اور یوں اب میں ایک پیشہ ور مفرور بن چکا تھا۔ کسی بھی زنداں کی سلاخیں میرے بال و پر کی صلاحیتیں نہ چھین سکی تھیں اور اب میں ایک بار پھر آزاد تھا۔

اور آزادی کے اس سرور میں یک بیک اس ٹیس کے باعث خلل پڑا۔ جو بائیں شانہ پر لپنے ہی لگائے ہوئے زخم میں ابھری تھی پچھلی شام وجے کو بربڑی سے خائف کرنے کے لئے میں نے اپنے زخمی ہونے کا جو کھیل رچایا تھا وہ کامیاب ضرور رہا مگر اس طویل بھاگ دوڑ نے وہ زخم ہرا کر دیا تھا۔ میں نے رک کر ٹارچ کی روشنی میں شانہ کا جائزہ لیا تو وہاں خون کی نمی موجود تھی!

مہم سر ہونے کے بعد تھکن سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا، مگر میں ان ویرانوں میں نہ ٹھہر سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اندھبون کے محافظ کھلے ہوئے مین ہول میں اتریں گے پھر گونگے اور بہرے وحشی کی لاش پا کر وہ ان پہاڑیوں میں پھیل جائیں گے۔ مجھے جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا تھا جہاں میں پوری طرح محفوظ ہوں!

اس خونی کھیل کا انعام، نرائن داس کا بے آواز ریوالور میرے پاس موجود تھا۔ اس کے ہونے سے میرے دل کو بڑی ڈھارس تھی۔ قدرے اجالا پھیلنے پر ٹارچ میں نے پتھروں سے کچل کر ایک طرف پھینک دی تھی۔ اور جب آسمان کے مشرقی گوشوں پر سرخی پھیلنے لگی تو میں نے خود کو ایک ایسی مضافاتی پگڈنڈی پر پایا جہاں سے قدیم طرز

کے مکانوں کے اونچے اونچے نکیلے کلس نمایاں نظر آ رہے تھے۔ کھٹمنڈو کی آبادی اب میرے سامنے تھی!

اس شہر میں کاروبارِ زندگی کا آغاز طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ذرا سی کوشش کے بعد مجھے سواری مل گئی۔ باتھ رکشا والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا کیونکہ شانے کے زخم کے باعث میری قمیص پر خون کا دھبہ آ چکا تھا۔

رکشا نے تھوڑی ہی دیر میں مجھے گریسی کے شراب خانہ کے سامنے پہنچا دیا۔ شراب خانے کے آہنی دروازوں پر وزنی تالے جھول رہے تھے۔ گریسی دو بجے سے رات گئے تک شراب خانہ کھلا رکھتا تھا۔ اور عقب میں واقع اپنے مکان میں دن چڑھے تک سوتا رہتا تھا۔

رکشا والے کو رخصت کر کے میں شراب خانہ کی عقبی گلی میں پہنچا اور دروازہ پر زور زور سے دستک دی۔ ایسے اوقات میں میرا اس سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا مگر مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ پارسی بوڑھا گھوڑے بیچ کر سوتا ہوگا۔ تقریباً گیارھویں پُرشور دستک پر اندر سے گریسی کی خواب آلود جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ شاید وہ بڑبڑاتا ہوا دروازہ کی طرف آ رہا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے غرا کر پوچھا۔

"صفدر علی!" میں نے سکون سے کہا۔ "دروازہ کھولو، مجھے بہت اہم کام ہے۔"

چند ثانیوں بعد دروازہ کھلا تو وہ سرخ سرخ آنکھیں جھپکاتا سلیپنگ گاؤن میں میرے سامنے موجود تھا۔

"میں گھر پر کام کی بات نہیں کرتا، یہ میرے سونے کا وقت ہے" وہ ناگوار لہجہ میں بولا۔

"کام نہیں۔ میں ایک ذاتی ضرورت سے آیا ہوں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے تیز لہجہ میں کہا اور اس کا نیند کا خمار یک بیک کافور ہو گیا۔

"اوہ ذاتی ضرورت ہے۔" وہ بے تکے انداز میں ہنسا۔ "تو پھر باہر کیوں کھڑے ہو، اندر آ جاؤ، یہ تمہارا اپنا گھر ہے!"

"ارے کیا تم زخمی ہو؟" میرے اندر داخل ہوتے ہوئے اس کی نگاہ میری قمیص کے خون آلود شانے پر پڑ گئی۔

"معمولی سا زخم ہے۔" میں سرسری لہجہ میں بولا۔ "اور مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں یہ خون آلود قمیص میرے لئے دشواریاں پیدا کر سکتی ہے۔ لہٰذا مجھے ایک معقول لباس کی ضرورت ہے!"

گریسی بہت گھاگ شخص تھا۔ زخم دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ وہ گولی کا نشان ہے اور تشویشناک لہجہ میں بولا۔ "شکر ہے کہ گولی جلد پھاڑتی ہوئی نکل ہے ورنہ ہڈی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی.... اور، اور یہ کیسے زخم ہیں شاید کسی لمبے ٹکراؤ سے بچ کر نکلے ہو؟" آخری فقرے اس نے میری کہنی اور کلائی کی چھلی ہوئی جلد کا جائزہ لیتے ہوئے کہے تھے۔

"یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔" میں نے لاپروائی سے اس کی بات ٹال دی۔ "تم ذرا جلدی سے میرے زخموں کی ڈریسنگ کر دو۔ میرے پاس بہت کم وقت ہے۔"!

ڈریسنگ کے بعد میں نے گریسی ہی کا ایک جوڑا پہنا۔ میری اور اس کی قامت و جسامت میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ لہٰذا اس کا لباس مجھ پر بالکل فٹ آیا۔

"میری یہاں آمد کے بارے میں تم اپنی زبان بند رکھو گے۔" میں نے تیار ہونے کے بعد گریسی سے کہا۔ "شام کے وقت شاید امیر خان ادھر آ نکلے تو اسے یہ پیغام دے دینا کہ میں رات آٹھ بجے شراب خانے پر پہنچوں گا۔"

وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دے کر رہ گیا۔

میری جیب میں نرائن داس سے چھینا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا بھاری ریوالور دو گولیوں سمیت موجود تھا۔ میں گریسی کے مکان سے نکلا اور شہر کی گلیوں میں جا چھپا جہاں کاروبارِ زندگی میں کافی تیزی آ چکی تھی۔

تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد ایک گھٹیا سے ہوٹل میں امیر خان کا خاص گرگا بالی مجھے مل ہی گیا۔ اس کی جیپ ہوٹل کے باہر موجود تھی۔ وہ میرا اشارہ پاتے ہی تیر کی طرح باہر آیا۔ کچھ عرصے تک وہ خود میرے ساتھ رہ چکا تھا اور گروہ میں میری حیثیت سے واقف تھا۔

"جیپ کی چابی؟" میں نے اس سے براہِ راست پوچھا

اس نے فوراً ہی چابی میرے حوالے کر دی۔

ٹھیک نو بجے میں اسی جیپ میں برونز آرٹ فیکٹری جا پہنچا۔ نرائن داس کی موت کی خبر ابھی وہاں تک نہیں پہنچی تھی اور سب لوگ معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

لونا مارٹن نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں گہری مسکراہٹ سے اس کے سلام کا جواب دیتا اپنے دفتر میں جا پہنچا۔ چند ہی سیکنڈ بعد لونا بھی وہاں آ پہنچی۔

"میں بہت جلدی میں ہوں لونا، خیال رکھنا کہ کوئی میرے کمرے میں نہ آنے پائے۔" میں نے کہا

"آ... آپ دو دن سے...؟"

اس نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات اڑا دی۔ "لونا پلیز مجھے تمھاری پریشانی اور جذبات کا پورا احترام ہے، میں اپنے کاموں سے نمٹ کر ایک ایک بات کا جواب دوں گا۔"

وہ ایک ثانیے کے لئے جھجکی پھر تیر کی طرح میرے کمرے سے نکل گئی۔

دفتر کا دروازہ اندر سے بولٹ کر کے میں نے انند بھون کا نمبر ملایا۔ رابطہ قائم ہو جانے پر میں نے بدلی ہوئی آواز میں آپریٹر سے سہنا کا نمبر مانگا۔

آپریٹر نے کچھ دیر بعد جواب دیا کہ سہنا اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔

"امیر خان سے ملاؤ۔ وہ انند بھون کے نئے ملازمین میں شامل ہے۔" میں نے اس سے کہا

امیر خان کی آواز ابھری تو اس میں تردد نمایاں تھا۔

"سبز گلاب۔" میں نے بدلی ہوئی بھاری آواز میں کہا۔

"اوہ سر!" اس کی آواز یک بیک مضطربانہ ہو گئی۔ "انند بھون کے حالات بہت بگڑے.....!"

"شٹ اپ!" میں نے بری طرح اسے پھٹکار دیا۔ "میں تم لوگوں کے لئے نیا ضرور ہوں مگر لاعلم نہیں۔ تم شام کے بجائے اسی وقت انند بھون چھوڑ دو اور اگلے حکم کا انتظار کرو!"

"یس سر"

میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر میں نے گھنٹی بجا کر لونا مارٹن کو طلب کیا وہ پنسل اور پیڈ سنبھالے میرے قریب والی کرسی پر آ بیٹھی۔

"تم اسی وقت فیکٹری سے استعفیٰ دے رہی ہو!" میں نے اس سے کہا

اس نے بڑی بڑی حیران نظروں سے میری طرف دیکھا مگر میرے اس نادر شاہی حکم کا کوئی سبب دریافت نہ کیا بلکہ بولی "استعفیٰ دینے کی کیا وجہ بیان کروں سر؟"

"مبہم۔ ناگزیر ذاتی اسباب!"

اور جب میں اس کا استعفیٰ منظور کر چکا تو اکاؤنٹنٹ نے میرے ہی کمرے میں اس کا حساب بے باق کر دیا۔

"تم نے مجھ سے استعفیٰ دلوانے کا سبب نہیں پوچھا؟" اس کے تنہا رہ جانے پر میں مسکرا کر بولا۔

"پوچھنا غیر ضروری تھا" وہ نظریں جھکا کر بولی "آپ مجھے قبول کر چکے ہیں اور شاید یہ پسند نہیں کرتے کہ اب میں ملازمت کرتی رہوں۔ آپ کا ہر حکم میرا مقدر ہے"

"وفاشعار بیوی!" میں نے آہستہ سے اس کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔ "تمھارے پاس اس وقت معقول رقم ہے۔ اب تم گھر جانے کے بجائے رائل ہوٹل میں ٹھہرو گی۔ میں کسی بھی وقت وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

گیارہ بجے فیکٹری میں افواہ اڑی کہ فیکٹری کے نیم پاگل مالک نرائن داس نے خودکشی کر لی۔ اس افواہ پر میں نے ماتحتوں کے سامنے خاصی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

اس بار میں نے انند بھون فون کیا تو اصل آواز برقرار رکھی اور آپریٹر سے کہا۔ "میں برونز آرٹ فیکٹری کا منیجر صفدر علی بول رہا ہوں مجھے فوراً کسی ذمہ دار شخص سے بات کرنی ہے!"

چند منٹ بعد گیتا رانی سے میری بات ہوئی۔

"سیٹھ صاحب خیریت سے ہیں بیگم صاحبہ؟" میں نے پوچھا

"تم... صفدر علی، تم تو کل شام تک انند بھون میں تھے؟" وہ حیرت کے باعث اپنا بھرم قائم نہ رکھ سکی۔ اور اعتراف کر ہی لیا کہ وہ میری اصلیت سے باخبر تھی!

"میں اوپر والوں کے حکم کا غلام ہوں بیگم صاحبہ اور اسی بات کی تنخواہ پاتا ہوں۔ جب حکم ملا انند بھون جا پہنچا اور پھر ہدایت ملتے ہی وہ جگہ چھوڑ دی۔" میرا لہجہ تابعداری کا مظہر تھا۔

"فیکٹری بند کر دو۔ سیٹھ صاحب نے خودکشی کر لی ہے!" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"خودکشی... سیٹھ صاحب نے خودکشی کر لی ہے؟" میں نے مصنوعی حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ انھوں نے ذہنی توازن کی خرابی کی بھاری قیمت ادا کی ہے، میں تنہا رہ گئی ہوں۔ مجھے اس وقت کسی سچے ہمدرد کی ضرورت ہے!" اس کی آواز میں اس بار پریشانی نمایاں تھی۔

"میں نے پہلی بار انند بھون فون کرنے کی جسارت کی ہے بیگم صاحبہ! میں آپ کا خادم ضرور ہوں، حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں۔ ہمسری یا دلجوئی میرے لئے کٹھن ہوگی۔!"

میرا یہ عذر شاید اسے ناگوار گزرا۔ "اپنی ذہنی سطح سے اوپر اٹھنا تم لوگوں کے لئے بہت مشکل ہے، میں اپنے مسائل خود بھی سلجھا سکتی ہوں!"

یہ کہہ کر اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فیکٹری میں افواہ کی تصدیق اور چھٹی کا اعلان کر دیا اور خود بھی وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اب میرے سامنے آزادی کے دو راستے تھے!

خفیہ تنظیم کے دو اعلیٰ ترین دماغ وجے اور نرائن داس راہ سے ہٹ چکے تھے اور تنظیم کے وجود سے بس گیتا ہی قدرے واقف تھی اور یہ بات اس کی بساط سے باہر تھی کہ نرائن داس کی مجرمانہ سرگرمیوں اور اس کے پروردہ سرکش غنڈوں کی سرپرستی کو جاری رکھ سکے۔ دوسری طرف امیر خان سمیت تنظیم کے جملہ ارکان اصل کھیل سے لاعلم تھے۔ سبز گلاب کے حوالے سے میں امیر خان کو ہدایات دے ہی چکا تھا اور اب میں چاہتا تو بڑی آسانی سے تنظیم کا سربراہ بن سکتا تھا۔ مگر اس میں میرے لئے سراسر نقصان ہی تھا۔ نرائن داس تو اپنے زخم خوردہ جذبوں اور افلاس زدہ ماضی کا حساب چکانے کے لئے بھاری مالی وسائل کے سہارے معاشرہ میں برائیاں پھیلا رہا تھا۔ تنظیم اس کے مالی منفعت کا نہیں بلکہ نقصان کا راستہ تھی۔ اب اگر میں اس کی جگہ سنبھالتا تو بھلا مجھے کیا ملتا اور اگر میں تنظیم پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد خسارہ کو نفع میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا تو اس میں مجھے کافی وقت لگ جاتا کیونکہ میں تنظیم کی جڑوں تک تو پہنچ چکا تھا لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ مال کے حصول اور رقم کے لین دین میں کیا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ خاموشی کے ساتھ ان جرائم پیشہ لوگوں سے

کنارہ کش ہو جاؤں اور بھاندرنا اس کی تلاش میں نکل پڑوں۔

فیکٹری سے میں جیپ میں رائل ہوٹل پہنچا۔ کاؤنٹر سے لونا مارٹن کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور فوراً ہی کمرہ نمبر سترہ پر جا پہنچا۔

گو لنچ کا وقت ہو چکا تھا مگر لونا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ گئی شاید اُسے میری جلد واپسی کی توقع نہیں تھی۔ لونا مجھ سے بہت کچھ پوچھنے کے لئے بے چین تھی اس نے پے درپے کئی سوالات کئے اور میں خاموشی کے ساتھ اپنے داہنے ہاتھ میں پڑی اس طلائی انگوٹھی سے کھیلتا رہا جو لونا مارٹن نے مجھے دی تھی!

[illegible] سے بتایا کہ میں دانستہ طور پر کچھ جرائم پیشہ لوگوں کے جال میں پھنس گیا تھا اور [illegible] مجھے اپنا مستقبل جیل کی آہنی سلاخوں کے عقب میں نظر آتا تھا جب تک میں تنہا تھا مجھے ان حالات سے اتنی پریشانی نہیں تھی لیکن جب لونا سے جذباتی رشتہ استوار ہوا تو مجھے ان کے چنگل سے نجات کی راہ تلاش کرنی پڑی۔

”مجھے کئی بار شبہ ہوا کہ آپ شدید ذہنی الجھنوں سے دوچار ہیں مگر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی“ اس نے مسکرا کر کہا۔

میں اس کے قریب کھسک آیا ”خیر اب میں ان سے چھٹکارہ حاصل کر چکا ہوں۔ میں اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں بھی کچھ سوچ چکا ہے“

”اس سے پہلے ایک بات بتائیں“ اس نے بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر غور سے میری طرف دیکھا ”کہیں اس سارے مجرمانہ کھیل کا تعلق برونزآرٹ فیکٹری سے تو نہیں تھا؟“

اس سوال پر میں چونک پڑا ”یہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو؟“

”فیکٹری کی پیکنگ شاپ ہمیشہ سے مشکوک سمجھی جاتی رہی ہے“ وہ بولی ”سارے ہی ملازمین اس جانب سے شبہات کا شکار رہتے پھر جگدیو کا قتل اور باہر سے آنے والے وہ ٹرک جو رازداری کے ساتھ کچھ مال پیکنگ شاپ میں اتارتے تھے!“

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا ”تمہارے اندیشے کسی حد تک درست ہیں!“

”مجھے ہوٹل میں ٹھہرانے میں کیا مصلحت تھی؟“ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اس نے پوچھا۔

”چند دوٹوک باتوں کے لئے یہ ضروری تھا۔ میں تمہارے مکان سے لاعلم ہوں پھر تمہارے سوتیلے باپ کے سامنے آ کر میں تمہیں کسی دشواری میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا!“

”کیسی دشواریاں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا

”تمہارا باپ معذور ہے اور بری عادتوں کے روگ میں مبتلا ہے۔ اس کے جملہ وسائل تمہاری آمدنی تک ہی محدود تھے، کیا وہ یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ تم اسے تنہا چھوڑ کر میرے ساتھ نکل چلو؟“

وہ کوئی جواب دیئے بغیر میری طرف دیکھتی رہی جیسے اس ضمن میں میری زبان سے کچھ اور تفصیلات سننے کی منتظر ہو۔

”دراصل میرے لئے اب اس شہر میں رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے“ میں نے اپنی بات کی وضاحت کی ”میں جن لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہتا ہوں وہ ہر جگہ میرے آڑے آئیں گے اور پھر... شاید تمہیں علم نہیں لیکن میرے نیپال آنے کا کچھ مقصد تھا اور اب میں جلد از جلد وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہوں!“

”آپ مجھے ہر جگہ ساتھ پائیں گے“ وہ پُرخیال لہجے میں بولی ”مگر میرے لئے صرف ایک مسئلہ ہے۔ میرا باپ بہت برا آدمی ہے مگر میں نے اس کی طویل رفاقت میں ہمیشہ اس کی خبرگیری کی ہے۔ شراب نوشی نے اسے کسی مصرف کا نہیں رکھا۔ میرے بعد وہ فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے گا اور ایک روز اسی شہر کی گلیوں میں سسک سسک کر دم توڑ دے گا، اگر آپ اسی شہر میں رہ کر اپنا مقصد حاصل کر سکیں تو میں اس کی بھی دیکھ بھال کر سکوں گی۔ وہ اب تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہے!“

”ایک مقصد اتنا سہل نہیں ہے لونا“ میں نے اسے سمجھایا ”روانگی سے پہلے تم کو سب کچھ معلوم ہونا چاہیئے۔ دراصل میں سنگلاخ اور برفانی پہاڑی وادیوں میں ایک دشوار سفر پر نکلنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اور تمہارے خوشحال مستقبل کے لئے یہ مہم ناگزیر ہے۔ میں خود ابھی اپنی منزل سے ناواقف ہوں لیکن اتنا یقین ہے کہ اناپورنا کا علاقہ میری تلاش کا مرکز بنے گا“ میں نے ایک ثانیہ کے لئے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے پھر دھیمی آواز میں بولا ”ہماری ان مجبوریوں کا بس ایک ہی حل ہے۔ میں اپنی مہم پر نکلتا ہوں تم اسی شہر میں ٹھہرو۔ اگر میں واپس لوٹ سکا تو ہم دونوں یکجا ہو جائیں گے!“

وہ اچانک میرے سینے میں سر چھپا کر بلک پڑی ”میں نے ایک طویل زندگی تنہائیوں کے عذاب میں گزاری ہے اب میں تھک چکی ہوں۔ مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں اپنے باپ کو چھوڑ سکتی ہوں لیکن آپ کے بغیر رہنا میرے لئے ناممکن ہے!“

”ٹھنڈے دل سے سوچ لو لونا!“ میں اس کے بدن کی مہکار کا نشہ محسوس کرتے ہوئے بولا ”اتنے بڑے فیصلے جذبات کی رو میں نہیں کئے جاتے۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں اپنے اس فیصلے پر افسوس ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا“

”یہ میرا اٹل فیصلہ ہے“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی ”اگر آپ مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو ضرور جائیں۔ پھر مجھے اس سہل زندگی سے کوئی نہ روک سکے گا جس کی نوید ان وادیوں میں مہارشی اندرام دیتا پھرتا ہے میں اس کے پروردہ گمراہ نوجوانوں کے غول میں جا ملوں گی۔ میں اس طویل جدوجہد سے اکتا چکی ہوں۔ ننگے جذبوں اور کھوکی نگاہوں سے خود کو محفوظ رکھنا مجھ تنہا اور بے سہارا لڑکی کے لئے ناممکن ہوتا جا رہا ہے“

اس کی دوٹوک باتیں سن کر میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ بے سہارا لڑکی واقعی بہت دکھی تھی۔ میں نے اس سے کہا ”تم سفر کی تیاری کرو۔ ہم دو چار روز میں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے.... اور ہاں تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج شام ہمیں باہر چلنا ہے!“

”آج شام...؟ کیا کوئی ضروری کام ہے؟“ اس نے پوچھا

”ہاں بہت ضروری!“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر میں بازار چلا گیا۔ واپسی میں میرے پاس ایک خوبصورت جوڑا موجود تھا۔ لونا کے لئے یہ میری محبت کا پہلا تحفہ تھا۔

اس شام لونا نے بڑے ارمان سے وہی گلابی اسکرٹ اور بلاؤز زیب تن کیا.... میک اپ کی ہلکی سی تہہ نے اس کے خدوخال کے تیکھے پن کو حد سے زیادہ ابھار دیا تھا اور میں دل ہی دل میں آنے والے لمحوں کا تصور کر کے خوش ہو رہا تھا!

غروب آفتاب سے کافی دیر قبل میں لونا کو جیپ میں لے کر کھٹمنڈو کے اسلامک مشن جا پہنچا۔ جیپ سے اترتے ہوئے لونا کے چہرے پر عجیب سے رنگ آ رہے تھے۔ شاید وہ کچھ پوچھنا بھی چاہتی تھی مگر میری شوخ، معنی خیز، مسکراہٹ نے اُسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔

اسلامک مشن کے سربراہ نے ہمیں بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا اور جب میں نے وہاں آمد کا مدعا بیان کیا تو لونا کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

جتنی دیر میں مشن والے ضروری کاغذات فراہم کرتے میں نے ایک بیش قیمت انگوٹھی لونا کی انگلی میں پہنا دی۔ اس نے شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ہوٹل سے نکلنے تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ میں اسے کہاں اور کس مقصد سے لئے جا رہا ہوں!

”مذہب کے بارے میں تمہیں اختیار ہے لونا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا“ میں نے اس پر واضح کیا۔

”میرا مذہب“ وہ تلخ لہجے میں بولی ”میرا کوئی مذہب نہیں ہے۔ اپنے باپ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر میں نن بننے کے لئے مقامی گرجا گھر کے راہب اعظم کے پاس گئی تھی ”تزکیہ نفس اور دینداری کے سات روز گزارنے کے بعد ایک رات میں ان سب سے متنفر ہو گئی“ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر وہ یک بیک غصے میں آ گئی ”اس رات گرجا کی عمارت میں ایک مجرد اور نوجوان راہب نے اپنا تقدس کا پیرہن اتار کر ایک ہوسناک بھیڑیئے کا روپ دھار لیا۔ میں بمشکل وہاں سے بھاگ سکی اور اس کے بعد کبھی عبادت کی نیت سے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ میں عیسائی گھرانے میں ضرور پیدا ہوئی مگر اب آپ کا مذہب میرا ایمان ہے!“

”واقعی تم نے بڑے دکھ سہے ہیں لونا!“ میں اپنے جذباتی ابال پر قابو پا کر بولا ”اس راہب کا نام کیا تھا؟“

”جوزف... یہ کئی برس کی بات ہے۔ وہ فادر جوزف کہلاتا تھا اور ان دنوں وہ جذام گھر کا مہمان ہے کچھ دن پہلے میں خیرات کی رقم دینے جذام گھر گئی تھی تو وہ کمر وہ حالت میں وہاں رینگتا نظر آیا تھا!“

”چلو وہ خود ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا“ یہ اطلاع میرے لئے خاصی سکون بخش ثابت ہوئی۔

پھر اسلامک مشن کے سربراہ کے ہاتھ پر لونا مارٹن مسلمان ہوئی میری خواہش پر اس کا اسلامی نام بھی لونا ہی رہا۔ اور مشن کے عملے کی شہادت میں وہ مجھ سے رشتہ ازدواج میں منسلک کر دی گئی اور جب میں لونا صفدر کو بانہوں میں سنبھالے مشن کی عمارت سے باہر نکلا تو مغربی افق پر لونا کے چہرے کی سرخی شفق بن کر کھل رہی تھی!

رائل ہوٹل میں اسی شام ہم دوہرے بستر والے کمرہ میں منتقل ہو گئے لونا کے چہرے پر لازوال مسرتیں رقص کناں تھیں۔ شاید وہ سوچ بھی نہ سکی ہو گی کہ باعزت زندگی اتنی آسانی سے اس کو اپنی پناہ میں لے لے گی۔

”دوشیزگی کی یہ آخری شام تمہاری ہے لونا“ میں نے کمرہ میں پہنچ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ”میں اس وقت باہر جا رہا ہوں۔ رات دس بجے سے پہلے لوٹ آؤں گا اور تم پر، تمہارے پیکر پر اپنے تمام دعوؤں سمیت آؤں گا“

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ آنے والے لمحات کے تصور سے اس کی آواز میں خمار تیرنے لگا تھا۔

”بہت ضروری کام ہے لونا...!“ میں نے نرمی سے کہا اور اس نے اجازت دے دی۔

رائل ہوٹل سے گریسی کے شراب خانے کی مسافت [illegible]ٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ راستے میں کئی جگہ اُجلے اُجلے نسوانی پیکر میری راہ میں [illegible] ہوئے مگر میرے لئے یہ آبروباختہ رنگین لڑکیاں اپنی ساری کشش کھو چکی تھیں میں جیپ سے اترا تو شراب خانے کے قریب ہی ایک نیم تاریک گوشے سے ایک لڑکی تیر کی طرح میری طرف آئی۔

”کیا میں اس رات کے لئے تمہاری شریک بن سکتی ہوں؟“ اس نے سپاٹ لہجے اور شستہ الفاظ میں مجھ سے سوال کیا۔

میں اسے ایک طرف دھکیل کر بار میں داخل ہو گیا۔

امیر خان اضطراب کے عالم میں میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”تو اتنے دنوں سے کہاں غائب ہو گیا تھا“ جیپ چلتے ہی اس نے سوال کیا۔

”سبز گلاب نے“ میں نے کہا ”اس کے حکم ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے وہاں سے لوٹ آنے کا حکم دیا تھا اور آج میں فیکٹری میں تھا وہاں وہ جو حادثے کا شکار ہوا، پھر رات گئے نراتن داس نے ویران جنگل میں خودکشی کر لی اور آج صبح سبز گلاب نے مجھے بھی وہاں سے ہٹ جانے

کا حکم دے دیا۔" وہ ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔

زائن داس کے قتل کو خودکشی کا رنگ دینے میں گیتارانی کا ہی ہاتھ معلوم ہوتا تھا اس طرح وہ بہت سی قانونی موشگافیوں سے اپنا دامن بچا گئی تھی دولت کے سہارے وہ بآسانی تحقیقاتی افسران کو بھی اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

"یہ خبریں مجھے بھی مل چکی ہیں۔ شہر میں ہر طرف زائن داس کی خودکشی کے چرچے ہو رہے ہیں!" میں نے کہا

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" امیر خان نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد چبھتے ہوئے لہجے میں کہا

"تازہ ترین ہدایات حاصل کرنے کے لئے!" میں نے سرسری لہجے میں کہا

اس نے بے مقصد ایک ننگی گالی دی اور غصیلے لہجے میں بولا۔" نیا سربراہ بہت بد دماغ معلوم ہوتا ہے۔ آج اس نے مجھے بری طرح پھٹکارا ہے۔"

"پہلے بھی ہمیں انعام نہیں ملتے تھے!" میں نے کہا

"مگر پرانا سربراہ ہمیشہ میری عزت کرتا رہا ہے!" وہ غرایا

"اپنا اپنا انداز ہے۔ نیا سربراہ شاید عزت افزائی کے منفی طریقوں پر یقین رکھتا ہو!" میں روانی میں کہہ گیا۔

"پرانے سربراہ کی آخری ہدایات کے بس دو گواہ ہیں صفدر علی۔!" اچانک وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا

"ہوں!" یہ کہہ کر میں نے اندھیرے میں اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"نئے سربراہ کو راستے سے ہٹا کر ہم دونوں پوری تنظیم پر قابض ہو سکتے ہیں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں امیر خان۔ یہ بہت مشکل ہوگا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "مجھے تم ہمیشہ وفاداری کا سبق دیتے رہے ہو۔ اب تمہاری زبان سے یہ بات عجیب سی لگتی ہے!"

"اس میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ ہم اس کے کاموں کے ساتھ ہی اپنے آدمیوں سے دوسرے کام بھی لیں گے اس طرح آہستہ آہستہ ہماری گرفت مضبوط ہو جائے گی۔"

"نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

اچانک امیر خان ہذیانی انداز میں زور سے ہنس پڑا اور میرا ہاتھ اسٹیرنگ پر بہک گیا۔ اگر وہ سڑک ویران نہ ہوتی تو یقیناً کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا!

"بہت چالاک ہے تو صفدر علی... مگر میں تجھے دیکھ لوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔" مجھے شک ہے کہ تو تنظیم سے غداری کے رجحانات کا مالک ہے!"

میں نے پوری قوت سے بریک لگا کر جیپ کنارے سے روک دی اور اسی وقت کسی ریوالور کی سرد سی نال میری گردن سے آ لگی!

"**خبردار** صفدر علی... اگر تو نے اس وقت ذرا بھی حرکت کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا۔" امیر خان میری گردن پر ریوالور کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے غرایا۔

"تنظیم سے غداری کا الزام لگا کر تم نے میری ان تمام قربانیوں کی توہین کی ہے جو میں اب تک دیتا آیا ہوں، میں اسی وقت اس الزام کا جواب جاننا چاہتا ہوں!" میرا لہجہ بے حد تلخ اور جارحانہ تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ امیر خان اتنی آسانی سے مجھ پر فائر نہ کر سکے گا۔

"ہوش میں رہ کر جیپ اسٹارٹ کرو۔ زیرو پوائنٹ پر میں کچھ دو ٹوک باتیں کرنی چاہتا ہوں!" امیر خان کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"اس بے ہودہ کھلونے کو دور رکھو!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "میں اسی صورت میں توجہ سے جیپ ڈرائیو کر سکتا ہوں!"

ریوالور کی بے رحم نال میری گردن سے ہٹ گئی اور میں نے جیپ گیر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔

رات کے سناٹے میں جیپ کے انجن کا تیز شور آسیبی غراہٹوں کی طرح گونج رہا تھا۔ امیر خان میرے پہلو میں خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اب میں اس سے ہونے والی گفتگو کے متوقع پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ مجھ سے کس موضوع پر بات کرنی چاہتا تھا؟

ویران پہاڑوں کی آغوش میں زیرو پوائنٹ کی عمارت اندھیرے میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ عمارت کے اندر کہیں بھی روشنی کی رمق نہیں تھی اور گرد و جوار میں سناٹے کا راج تھا۔ جیپ کا انجن بند ہونے پر وہاں عجیب ہولناک سا سناٹا چھا گیا۔ اس سے قبل کہ میں انجن بند کر کے پہلو بدلتا، امیر خان اچھل کر جیپ سے نیچے اتر چکا تھا اور ریوالور ایک مرتبہ پھر اس کے داہنے ہاتھ میں آ چکا تھا گو اس کی نال جھکی ہوئی تھی لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ پلک جھپکنے سے بھی کم عرصے میں اسے مجھ پر آزما سکتا ہے۔

اسے دیکھ کر میں تلخ انداز میں ہنس دیا۔" نہ جانے تمہارے دل میں میری طرف سے کیا کدورت سما گئی ہے یار"

"باتوں میں الجھانے کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں" وہ غرایا۔" جب تک میں تجھ سے کھل کر بات نہ کروں میرا اعتماد بحال ہونا مشکل ہے۔"

"خوب!" میں جیپ سے اترتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔" تو گویا تم مجھے اپنا قیدی بنا کر یہاں لائے ہو؟"

اس نے میرے طنز پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ اس نے چابی میری طرف اچھالی اور خود میرے پیچھے چلنے لگا۔ میں نے قفل کھولا اور تاریک راہداری میں داخل ہو گیا۔ میں کئی قدم بڑھ گیا مگر اس کے قدموں کی چاپ نہ سنائی دی۔

"کہاں رک گئے؟" میں پلٹ کر تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ دل میں ہلکا سا خوف ہونے کے باوجود میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں اس سے قطعی خائف نہیں ہوں۔ اسی وقت اچانک تیز کھٹکا ہوا۔ میں تیر کی طرح واپس لوٹا مگر مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ امیر خان نے عمارت کا دروازہ بند کر کے باہر سے بولٹ کر دیا تھا۔

"امیر خان۔ یہ کیا مذاق ہے؟" میں غصے اور جھلاہٹ کے ساتھ اونچی آواز میں بولا۔

"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔" باہر سے امیر خان کی سرد آواز ابھری۔" اس دروازے کے سوا تم کسی راستے سے نہیں نکل سکو گے لہذا بہتر یہی ہے کہ سکون کے ساتھ اندر موجود رہو!"

میں نے پوری قوت سے دروازہ پیٹا لیکن جواب نہ آیا پھر سناٹے میں جیپ کے انجن کا شور ابھرا۔ میں کنجی اگنیشن ہی میں چھوڑ آیا تھا اور امیر خان اب میری غفلت کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ جیپ کے انجن کا شور آہستہ آہستہ دور ہوتا سنائی دے رہا تھا!

مجھ پر جھلاہٹ کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ کافی دیر تک میرا ذہن کام ہی نہ کر سکا۔ پھر آہستہ آہستہ میرے ذہن سے غصے کی دھند چھٹی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں چند متوقع خطرات سے دوچار ہوں۔ امیر خان نے راستے میں پہلے مجھے تنظیم کے سربراہ سے غداری کی ترغیب دی اور جب میرے محتاط بلکہ فیصلہ کن جواب سے اسے مایوسی ہوئی تو اس نے کھلے الفاظ میں مجھ پر تنظیم سے غداری کے رجحانات کا الزام عائد کر دیا۔ اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ میری تمام تر احتیاط کے باوجود امیر خان میری جانب سے مشکوک ہو چکا تھا ورنہ وہ یوں دو بدو مجھ سے ٹکرانے کی ہمت نہ کرتا۔ عام حالات میں اس کیلئے سربراہ کی ہدایات کے بغیر آزادانہ طور پر اتنا بڑا قدم اٹھانا ناممکن تھا۔

امیر خان کی دانست میں تنظیم ابھی تک موجود تھی۔ سربراہ بدلا ضرور تھا مگر موجود تھا۔ یہ راز صرف میں ہی جانتا تھا کہ تنظیم اپنے تمام تر وسائل کے باوجود سربراہ کے بغیر منتشر جرائم پیشہ افراد کے غیر موثر گروہ میں بدل چکی ہے۔ زائن داس کی موت کے بعد اب اس فتنہ کے سر ابھارنے کا کوئی امکان نہ تھا جو معاشرتی خرابیوں سے قطع نظر میری آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

میں نے عمارت کے ایک اندرونی کمرے میں روشنی کی اور حسب توقع مجھے وہاں شراب کی چند بوتلیں نظر آ گئیں۔ میں کرسی پر دراز ہو کر شراب سے شغل کرنے لگا۔ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ امیر خان کی واپسی کا انتظار کروں۔

میں یہ جانتا تھا کہ زیرو پوائنٹ سے کسی بیرونی مدد کے بغیر میرا نکلنا محال ہے۔ میں وہاں گلا پھاڑ پھاڑ کر مر جاتا مگر اس ویرانے میں میری آواز سننے والا کوئی بھی ذی روح موجود نہ ہوتا۔ دوسری طرف امیر خان شاید میرے بارے میں کسی نہ کسی طرح تنظیم کے سربراہ سے ہدایات لینے گیا تھا! اپنے طور پر اس نے مجھے قیدی تو بنا لیا تھا لیکن اس سے آگے کوئی قدم اٹھانے کی اس میں جرات نہیں تھی میرے قیاس کے مطابق سربراہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد امیر خان کو میری ہی طرف واپس آنا تھا اور اس کی آمد پر مجھے نجات کی کوئی راہ نکالنی تھی۔

پھر میں نے اضطراری طور پر گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے میں یک بیک مضطرب ہو گیا۔ لونا کی یاد میرے دل میں جاگ اٹھی۔ میری وہ نو بیاہتا بیوی شب عروسی کے انتظار میں ہوٹل کے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ میں اس سے ساڑھے دس بجے تک واپسی کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ نہ جانے اس تاخیر پر وہ کیا سوچ رہی ہوگی؟ میں اسے اپنے موجودہ حالات کے بارے میں مختصر طور پر کافی باتیں بتا چکا تھا وہ جانتی تھی کہ میں کچھ مقامی جرائم پیشہ لوگوں سے نبرد آزما ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر معمولی تاخیر سے گھبرا کر وہ میری تلاش میں ہوٹل سے نکل پڑے اور نئی مشکلات میں گھر جائے۔

طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد بارہ بجے کے قریب باہر سے کسی جیپ کا شور سنائی دیا اور میں روشنی گل کر کے تیزی کے ساتھ نکاسی والے دروازے پر جا پہنچا جسے امیر خان باہر سے بند کر کے گیا تھا۔

جیپ کا انجن بند ہونے کے بعد قدموں کی چاپ ابھری پھر کسی نے باہر سے دروازہ کھول دیا ساتھ ہی کسی طاقتور ٹارچ کی روشنی کھلے ہوئے دروازے میں سے میرے چہرے پر پڑی۔

چند ثانیوں تک میں اس چکاچوند کے باعث کچھ نہ دیکھ سکا پھر امیر خان کی سپاٹ آواز ابھری۔" زیادہ ہوشیاری کی ضرورت نہیں، میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور بھی موجود ہے!"

"یہ کیا بیہودگی ہے؟" میں جھلا کر چیخا۔" میرے چہرے سے یہ روشنی ہٹا۔ میں تمہیں پھاڑ نہیں کھاؤں گا۔"

"اندر چلو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری کام ہے۔!" اس نے روشنی فرش پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس وقت بہت ضروری کام ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ بات تم بعد میں کر لو۔" میں نے اپنی کھوپڑی پر قابو پاتے ہوئے مصالحانہ لہجے میں کہا۔

"تنظیم کے معاملات ہر حال میں افضل ہیں۔ اندر چلو!"

ناچار مجھے عمارت میں واپس جانا پڑا۔ روشنی کرنے کے بعد ہم دونوں ایک کمرے میں جا رکے۔ امیر خان نے ٹارچ بجھالی تھی مگر ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

"تنظیم کا نیا سربراہ سخت گیر اور بے رحم ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن میں پوری طرح اس کا وفادار ہوں!"

"یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔" اور تم نے مجھے یہاں کس لئے قید کیا تھا؟"

"نئے سربراہ سے تمہاری آخری بار کب بات ہوئی تھی؟" اس نے میرے

سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کل ۔ انند بھون میں ہی مجھے اس کا فون ملا تھا اور میں نے وہ عمارت فوری طور پر چھوڑ دی تھی۔"

"اس کے بعد آج اس نے مجھے انند بھون چھوڑنے کا حکم دیا۔ وہ وہاں پیش آنے والے تمام حالات سے باخبر معلوم ہوتا تھا۔"

"اگر وہ اتنا باخبر ہے تو اس کے لیے ہم پر برتری قائم رکھنا دشوار ہو جائے!" میں نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔ "آخر تم ان باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہو؟"

"اس آخری گفتگو کے بعد حالات کا رخ بہت تیزی سے تبدیل ہوا ہے مگر میں اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

"اور شاید اس ذلت کبھی مجھے یہاں بند کر کے تم میرے بارے میں اس سے ہدایات لینے گئے تھے!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سامنے کی بات ہے!" وہ خشک لہجے میں بولا "مگر اس بار بھی مجھے ناکامی ہوئی... اب مجھے پورا اختیار ہے کہ میں اپنے طور پر تم سے بازپرس کر سکوں!"

"کیسی بازپرس؟" میں نے برہمی کا اظہار کیا

"سکون سے برخوردار ۔ سکون سے بات کرو!" وہ ریوالور فضا میں لہرا کر بولا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نرائن داس کی موت کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"اس نے خودکشی کر لی ہے۔ فیکٹری میں مجھے یہی اطلاع ملی تھی!"

"اور اگر میں کہوں کہ اسے قتل کیا گیا ہے!" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا

"آخر اس کی بیوی کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی میں نے خود گیتا رانی سے فون پر اس امر کی تصدیق کی تھی اور اس نے بتایا کہ نرائن داس نے خودکشی کی ہے!"

"یہی بات اہم ہے۔" وہ جلدی سے بولا "تم انند بھون سے کس وقت روانہ ہوئے؟"

"تم سے الگ ہونے کے تقریباً نصف گھنٹے بعد ہی مجھے فون موصول ہوا تھا"

"بکواس!" وہ غضب ناک لہجے میں غرایا "میں پوری طرح تصدیق کر چکا ہوں کہ اس رات انند بھون میں تمہارا کوئی فون نہیں آیا تھا۔"

"اس کی تصدیق تم کو نئے سربراہ سے کرنی چاہیے۔ تمہارے ناقابل اعتبار ذرائع معلومات کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔" میں نے بھرپور اعتماد سے کہا

"خیر ۔ میں اس سے تصدیق ضرور کروں گا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "مگر تو کان کھول کر سن لے کہ تصدیق ہونے تک تو اس عمارت سے نہ جا سکے گا۔"

"کیوں؟"

"میں اصولاً تیری کسی بات کا جواب دینے کا پابند نہیں کر اتنا ضرور بتلا دوں کہ نرائن داس نے خودکشی نہیں کی اسے قتل کیا گیا ہے۔" وہ اس انکشاف پر میرا تاثر لینا چاہ رہا تھا۔

"قتل ۔" میں حیرت سے تقریباً اچھل پڑا اور بے اعتباری سے ہنستے ہوئے بولا "اس عمارت میں مسلح محافظوں کی فوج کی فوج ہوتے ہوئے بھلا یہ کیسے ممکن ہے"

"یہ حقیقت ہے۔" امیر خان بولا "قاتل نے اس کے دہانے میں ریوالور کی نال ٹھونس کر فائر کیا تھا اور بھیجہ اڑ جانے کے باعث نرائن داس نے وہیں دم توڑ دیا۔ قاتل زمین دوز برساتی نالے کے ذریعے انند بھون سے فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ محافظوں نے ان اطراف کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن قاتل کا کہیں سراغ نہ مل سکا پھر گیتا رانی کی ہدایت پر سب لوگ قاتل کو بھول گئے۔ اب انند بھون کا ہر مکین خودکشی کی کہانی سنا رہا ہے!"

"تمہیں یہ راز کیسے معلوم ہوا؟"

"وجے کی ہلاکت کے بعد تو میرے ساتھ واپس لوٹنے کے بجائے وہیں رک گیا تھا جب رات گئے تک تیری واپسی نہ ہوئی تو میں تیری تلاش میں نکلا اس وقت ہر طرف پورے زور و شور سے نامعلوم قاتل کی تلاش جاری تھی پھر اچانک گیتا رانی کا حکم آیا کہ قاتل کی تلاش احمقانہ ہے۔ سیٹھ نرائن داس نے دیوانگی کے زیر اثر خودکشی کی ہے اور ساری تلاش موقوف ہو گئی۔"

"اس چکر میں میرا نام کہاں آتا ہے جو تم میری جانب سے مشکوک ہو گئے ہو؟"

"میرے ساتھ واپسی کے بجائے تیرا وہاں رکنا، نرائن داس کا قتل، قاتل کا فرار پھر اسی وقت تیرا وہاں سے غائب ہو جانا۔ یہ واقعات ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں!"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں سہنا سے فرسٹ ایڈ کا سامان لینے کے لیے وہاں رکا تھا۔" میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کرنی چاہی۔

"سہنا نے مجھے بتایا کہ وہ سامان تو نے اسی وقت اسے واپس بھجوا دیا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا "میں محسوس کرتا ہوں کہ تو نے سربراہ کی ہدایات سے تجاوز کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا اب تو اسی عمارت میں مقید رہے گا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز بکثرت موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ کل تک میں سربراہ سے تیرے بارے میں ہدایات لے کر تجھے آخری فیصلہ سنا سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے" میں تلخ لہجے میں بولا "تمہاری ہٹ دھرمی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں!"

امیر خان ریوالور کی نال سے اپنی پنڈلی کھجاتے ہوئے بولا "اگر سربراہ کا فیصلہ تمہارے حق میں ہوا تو میں تم سے معافی مانگنے میں بالکل نہ جھجکوں گا۔"

سربراہ تو میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا لہٰذا امیر خان کبھی بھی اس سے میرے بارے میں ہدایات حاصل نہ کر سکتا تھا جب کہ میرے لیے اس قید میں چند گھنٹے گزارنا بھی محال تھا۔ پونا میری منتظر تھی اور اب میں جلد از جلد اسے ساتھ لے کر انا پورنا کی ترائیوں کی طرف نکلنے کا عزم رکھتا تھا۔

ریوالور کی نال سے پنڈلی سہلاتے ہوئے امیر خان ایک لحظے کے لیے میری طرف سے غافل ہوا اور میں فوراً ہی فیصلہ کر کے اس پر ٹوٹ پڑا۔

میرا یہ حملہ امیر خان کے لیے غیر متوقع تھا بوکھلاہٹ میں اس کے ریوالور سے گولی چل گئی اور وہ حلق سے بے معنی آوازیں نکالتا ہوا میرے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کی پنڈلی میں سوراخ کرتی آر پار ہو گئی تھی۔

اس نے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی نال میری پسلیوں کی طرف گھمانی چاہی مگر میں نے اپنے بائیں گھٹنے سے اس کے بازو پر آہنی شدید ضرب لگائی کرب وہ تکلیف سے تڑپ اٹھا مگر ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں موجود تھا اس نے مجھے اپنے سینے سے اچھال پھینکنے کی جان توڑ کوشش کی مگر میں جونک کی طرح اس سے لپٹا رہا پھر میں نے پوری قوت سے اس کی ناک پر ٹکر ماری اور سینے سے اتر کر اس کی داہنی کلائی دونوں ہاتھوں سے مروڑنے لگا تاکہ کسی طرح ریوالور اس کی گرفت سے نکل سکے!

امیر خان نے چیختے اور کراہتے ہوئے اچانک میرے سینے پر لات ماری اور میں بری طرح کرسی سے الجھ کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ امیر خان لنگڑاتا ہوا فرش سے اٹھا اور میں نے دہشت کے عالم میں لیٹے ہی لیٹے ایک کرسی ٹانگوں سے اس پر اچھال دی۔ امیر خان بے تحاشا گالیاں بکتا ہوا دوبارہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس بار مجھے اپنی جیب سے اعشاریہ تین آٹھ کا وہ بے آواز ریوالور نکالنے کی مہلت مل گئی جو میں نے انند بھون میں نرائن داس سے چھینا تھا اس کے چیمبر میں ابھی تک دو کارآمد گولیاں موجود تھیں جو امیر خان کو راہ سے ہٹانے کے لیے بہت کافی تھیں۔

"ریوالور پھینک دو امیر خان!" میں نے گونجیلی تحکمانہ آواز میں کہا "میرے ہاتھ میں تین آٹھ کا ریوالور موجود ہے!"

امیر خان مغلظات بکتا میری طرف گھوما اور ریوالور کے جیب دہانے پر نظر پڑتے ہی میرے حکم کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔

"تمہاری یہاں آمد کی اطلاع کس کس کو ہے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا

"کک ... بہت سے لوگوں کو!" وہ اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر بولا۔

اس کی چالاکی پر میں زہریلے انداز میں ہنس دیا۔ وہ میرے سوال کا مقصد سمجھ کر دانستہ جھوٹ بول رہا تھا تاکہ مجھے کسی انتہائی اقدام سے روک سکے!

"یہ تنظیم کی بدنصیبی تھی امیر خان کہ مجھے اس میں شامل کیا گیا۔" میں ریوالور کی نال اٹھاتے ہوئے بولا "پہلے وجے تمہارا سربراہ تھا اور وہ اپنے آقا نرائن داس کے ہاتھوں مارا گیا اور نرائن داس میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ تمہارا خیال درست تھا دوست کہ نرائن داس کا قتل اور میری روپوشی محض اتفاقات نہیں تھے۔ اور آج تم کو انند بھون سے واپسی کا حکم دینے والا بھی میں خود تھا کیونکہ تنظیم یتیم ہو چکی ہے۔ اب کوئی کسی کو ہدایات نہ دے گا۔"

"تم... تم... تت ... تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟" امیر خان کی آنکھوں کی پتلیاں دہشت کے باعث پھیل چکی تھیں اور وہ زمین پر پڑا میرے ریوالور کو گھورے جا رہا تھا۔

"اس لیے کہ تمہاری روح سکون کے ساتھ پرواز کر سکے میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد تمہاری روح بھی خلش کا شکار رہے۔ شاید تم زندہ رہتے مگر مجھ سے ٹکرا کر تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے اور میں یہ دعوت قبول کرتا ہوں"

"نہیں ۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں صفدر، میں تمہارا ساتھ دوں گا تم مجھے اپنا غلام پاؤ گے ۔ خدا کے لیے یہ ریوالور جیب میں رکھ لو۔"

"زخم خوردہ دشمن سے زیادہ خطرناک کوئی نہیں ہوتا دوست" میں نے ریوالور کی نال کو جنبش دی "مجھے بس ایک بات کا افسوس رہے گا کہ تمہاری بے گور و کفن لاش اسی عمارت میں سڑ جائے گی اور کسی کو علم نہ ہو سکے گا کہ تم کہاں گئے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر ریوالور سے اگلنے والے شعلے نے اسے مہلت نہ دی۔ گولی اس کی پسلیاں توڑ کر دل میں پیوست ہو گئی اور وہ آخری ہچکی لے کر ساکت ہو گیا۔ اس کے زخموں سے بہنے والا خون فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

میں بہت تیزی کے ساتھ زیرو پوائنٹ سے باہر آیا۔ دروازہ بند کر کے باہر سے مقفل کیا اور پھر امیر خان کی جیپ میں واپس روانہ ہو گیا۔

اس جیپ میں شہر جانا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ کوئی شناسا مجھے اس میں دیکھ لیتا تو امیر خان کی گمشدگی کے سلسلے میں سب سے زیادہ شبہات میری ذات پر ہی آتے لہٰذا شہری حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے جیپ ایک ایسی جگہ چھوڑ دی جہاں اس کی موجودگی ہفتوں تک کسی کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کراتی۔ زیرو پوائنٹ کی واحد چابی میں نے پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے ایک گہری کھائی میں پھینک دی تھی۔

جیپ چھوڑنے کے بعد میں پیدل ہی رائل ہوٹل کی طرف ہو لیا۔

رائل ہوٹل کے باہر ایک پولیس کار موجود پا کر میرا دل تیزی سے دھڑکا مگر میں نے خود کو دلاسا دیا کہ میری کسی بھی مجرمانہ کارگزاری کی بھنک ابھی تک پولیس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی لہٰذا یہ چھاپہ کسی اور سلسلے میں ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے بہتر سمجھا کہ اندر جانے سے پیشتر اپنی جیب کو نرائن داس سے چھینے ہوئے بے آواز ریوالور کے بوجھ سے آزاد کر لوں کیونکہ ایسی چیزیں قانون کے محافظوں کی نظروں سے ذرا مشکل ہی سے بچتی ہیں۔ اگر کسی کو مجھ پر شبہ ہو جاتا تو جامہ تلاشی کے بعد میں ناگہانی مارا جاتا کیونکہ میرے پاس آتشیں اسلحے کی موجودگی کا کوئی قانونی جواز نہ ہوتا۔

میں نے ہوٹل سے ذرا دور وہ خونی ریوالور ایک گٹر میں پھینک دیا اور خود ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر ویران ہال کے سرے پر کاؤنٹر کے گرد بیٹھے ہوئے باوردی پولیس افسران پر پڑی۔ ہوٹل کا عمر رسیدہ منیجر بھی ان کے ساتھ موجود تھا اور وہ سب کسی مشروب سے شغل کر رہے تھے مجھ پر نظر پڑتے ہی منیجر نے آہستہ سے پولیس افسران سے کچھ کہا اور وہ چونک کر

اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے۔ ان کی چبھتی ہوئی نگاہیں واضح طور پر مجھ پر مرکوز تھیں۔ انسپکٹر کے عہدے کا ایک افسر اپنی بیلٹ سے ریوالور بھی نکال چکا تھا۔ اس کے تیوروں سے صاف ظاہر تھا کہ میرے کسی نادیدہ ردِ عمل کی صورت میں وہ بلا سوچے سمجھے اسے استعمال کر گزرے گا۔

ان غیر متوقع حالات میں مجھ پر پریشانی کا طاری ہونا قطعی فطری اور ناگزیر امر تھا کیونکہ میرے لئے نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ بن چکا تھا۔ واپس مڑتا تو غیر ضروری دھما چوکڑی ہوتی اور بالآخر وہ مجھے زیر کر ہی لیتے۔ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے چہرے پر بحالی کے آثار قائم رکھنے کی کوشش کی اور کاؤنٹر کی طرف بڑھتا رہا۔ ساتھ ہی مجھے لونا کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔ اگر پولیس میری تلاش میں تھی تو اس نے یقینی طور پر لونا کو ضرور پریشان کیا ہوگا۔

"صفدر علی؟" میرے قریب پہنچنے پر انسپکٹر نے تائید طلب لہجے میں مجھ سے سوال کیا

…ے حیرت کے ساتھ اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

…س وقت حراست میں ہو!" اس نے یہ کہہ کر اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا اور دو … ی پھرتی کے ساتھ میرے عقب میں پہنچ گئے۔

"اگر مجھے معاملے کی نوعیت کا ذرا بھی علم ہوتا جناب تو میں کبھی ان لوگوں کو ہوٹل میں نہ گھسنے دیتا۔" بوڑھا منیجر روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا "اب اخبار اس قصے کی سرخیاں لگائیں گے میرے ہوٹل کا نام اچھالا جائے گا اور شرفا ادھر کا رُخ کرنا چھوڑ دیں گے!"

انسپکٹر نے پلٹ کر اسے گھورا اور وہ بوکھلا کر خاموش ہو گیا۔

"مجھے کس جرم میں حراست میں لیا جا رہا ہے انسپکٹر؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"یہ بھی مجھ ہی کو بتانا پڑے گا؟" وہ زہریلے لہجے میں بولا "تو سنو کہ تمہیں ایک عیسائی لڑکی لونا مارٹن کو اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔"

"لونا مارٹن!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "وہ میری قانونی بیوی ہے انسپکٹر۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ اب لونا صفدر بن چکی ہے؟"

"تمہارے کہنے سے حقائق نہیں بدل سکتے مسٹر صفدر!" وہ تلخ لہجے میں بولا "اگر ہم بروقت کارروائی کر کے لڑکی کو برآمد نہ کرتے تو شہر میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس علاقے کی مسلمان اور عیسائی آبادی میں ابھی تک سخت کشیدگی پھیلی ہوئی ہے!"

"لونا کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں انسپکٹر۔"

"وہ اپنے باپ کے حوالے کی جا چکی ہے۔ آج رات نو بجے اس نے بہت سے عیسائی نوجوانوں کے ساتھ کوتوالی کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ اسے کسی طرح اطلاع مل چکی تھی لڑکی اس ہوٹل میں مقیم ہے لہٰذا ہم نے اس کی رپورٹ پر فوری کارروائی کی اور لونا کو یہاں سے برآمد کر لیا۔ اور اب تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں ہوٹل کے منیجر اور … ملازمین کی موجودگی میں تمہارا ابتدائی بیان قلمبند کروں گا۔"

یہ سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ … بات میرے … گمان میں بھی نہ تھی کہ لونا مارٹن یوں مجھ سے چھین لی جائے گی۔ … تو یقینی بات ہے … کہ شہر کی فضا کو تکدر سے بچانے کے لئے پولیس نے اسے زبردستی مارٹن کے حوالے کیا ہوگا لیکن تعجب خیز بات یہ تھی کہ ہماری اس رازدارانہ شادی کی خبر اس بوڑھے کو کیسے ملی جو مہینوں سے بستر پر معذور پڑا تھا!

جو کچھ بھی تھا مگر غنیمت یہی تھا کہ ابھی تک پولیس والوں کا رویہ … ساتھ بہت معقول تھا اور میں ان سے غیر ضروری طور پر الجھ کر اپنے لئے دشواریاں پیدا کرنی نہیں چاہتا تھا لہٰذا بغیر چون و چرا کئے وہیں ایک کرسی پر گر گیا۔

پولیس کی اس جماعت میں ہندوستانی منشیوں کی روایتی وضع قطع والا ایک نیپالی محرر بھی شامل تھا وہ انسپکٹر کی زبان سے بیان کا لفظ سنتے … ناک پر عینک اور داہنی ران پر فائل جما کر ہمہ تن گوش بن چکا تھا۔

"تمہارا پورا نام اور مستقل پتہ؟" انسپکٹر نے اسکواش کا گلاس خالی کرتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

"صفدر علی۔ منیجر برونز آرٹ فیکٹری۔"

…برونز آرٹ فیکٹری کا نام سنتے ہی وہ چونک پڑا "تت … تم وہاں منیجر ہو؟"

اس کی بوکھلاہٹ میرے لئے قدرے امید افزا نظر آئی۔ شاید فیکٹری کے بارسوخ مالکان ہی کی وجہ سے میرے ساتھ کچھ رعایت کر جاتا۔ میں نے لہجے میں بحالی پیدا کرتے ہوئے کہا "ہاں۔ اور میری مستقل رہائش فیکٹری سے ملحق بنگلے میں ہے!"

"لونا کا باپ شاید اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کی سوتیلی لڑکی اپنے باس پر فریفتہ ہے!" وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا پھر بلند آواز میں سوال کیا "تم کتنے عرصے سے وہاں ملازم ہو؟"

"کئی ماہ سے۔" میں نے مبہم جواب دیتے ہوئے جلدی سے بات آگے بڑھادی "لونا آج صبح تک اس فیکٹری میں میری سکرٹری تھی۔ وہ بہت ہی سادہ دل اور مظلوم لڑکی ہے! اس نے بہت جلد میرے دل میں اپنا مقام پیدا کر لیا پھر آج صبح اس نے میرے ایما پر فیکٹری سے استعفیٰ دے دیا۔ آج شام ہم دونوں نے اسلامک مشن میں شادی کی۔ اس سے قبل وہ برضا و رغبت مسلمان ہوئی اور ہم شب عروسی منانے کے لئے پارک ہوٹل میں ٹھہرے تھے!"

"تمہارے پاس اس شادی کا کیا ثبوت ہے؟"

"نکاح نامہ اور دوسری دستاویزات اوپر میرے کمرے میں موجود ہیں!" میں نے پُرسکون لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

"فی الحال تمہارا کمرہ سیل کیا جا چکا ہے تاکہ ضروری شہادتیں محفوظ رہ …

…ہیں اب تم عدالت میں جانے سے قبل ذمہ دار افسران کی موجودگی میں ہی … یہ باں … آسکو گے۔"

"جناب" اچانک بوڑھا منیجر تھکی ہوئی آواز میں کراہا "اگر میرا ہوٹل … بدنامی کے مزید اثرات سے محفوظ رہ سکے تو یہ میری ذات پر بڑا کرم ہوگا۔ … میں اسی وقت کمرے سے ان صاحب کا سامان نکلوا کر اپنی گاڑی میں کوتوالی پہنچائے دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ سوج کی روشنی میں چند باوردی سرکاری اہلکار میرے ہوٹل کے ایک کمرے کی نگرانی پر مامور رہیں۔ اس طرح دوسرے مکینوں میں خوف و ہراس پیدا ہوگا اور … وہ ہمارا ہیم خانہ چھوڑ جائیں گے!" السبعہ سے … منطوب … ہوتے ہوئے بولا

"جی؟ … جی … بالکل یہی بات ہے جناب۔" بوڑھے نے اس کی خفگی … ٹالنے کے بغیر خوشامدانہ انداز میں دانت نکال دیئے۔

اسی وقت انسپکٹر کے کسی ماتحت نے پشت سے منیجر … ہوٹل کے ایک دو افراد حصے میں … جہاں سے … کی آوازیں … بھی آ رہی تھیں۔

میرے بیان … … ران ہی وہ دونوں واپس آ گئے اور … محرر کے لکھے ہوئے بیان کی نقلوں پر دستخط کر رہا تھا تو انسپکٹر اپنے آدمیوں کو ہوٹل کے کمرے سے میرا سارا سامان کوتوالی لے جانے کی ہدایات دے رہا تھا۔

دنیا کے ہر خطے کی طرح وہاں کی پولیس میں بھی راشی عناصر کی موجودگی بدلے ہوئے حالات سے عیاں تھی مگر مجھے امید نہ تھی کہ انسپکٹر میری کسی پیشکش کو قبول کر لے گا کیونکہ یہ سارا معاملہ مجھے اس کی بساط سے اونچا نظر آ رہا تھا۔ میرے تمام تر احتجاج کے باوجود انسپکٹر مجھے حراست میں کوتوالی لے جانے پر مصر رہا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس کے اس اقدام سے میری نام نہاد معزز حیثیت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ جب میں نے تنگ آ کر اسے ہتک وغیرہ کے الفاظ کا مفہوم سمجھانا چاہا تو وہ یک بیک تپ کر اکھڑ گیا۔ عزت دار لوگوں کے بارے میں چند گستاخانہ بلکہ فحش الفاظ ادا کئے اور میری پسلیوں میں ریوالور کے دستے سے ٹھوکر مار مار کر مجھے نکاسی کے راستے کی طرف دھکیلنے لگا۔

آدھی رات گئے شہر خوابناک سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوتوالی کی قدیم وضع کی عمارت کے باہر یرقان زدہ روشنیاں اونگھ رہی تھیں۔ کوتوالی کے قرب و جوار میں شام کے ہنگامے کے کچھ آثار موجود تھے ہر طرف چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے جو شاید لونا کی بازیابی کا مطالبہ کرنے والوں نے کوتوالی پر برسائے تھے۔ ساتھ ہی خچروں پر سوار بندوق بردار مسلح سپاہی نپی تلی سست رفتار سے علاقے میں گشت کر رہے تھے!

عمارت میں جلد ہی میرا سامنا کوتوالی انچارج سے ہوا۔ میں نے اسے اور اس نے مجھے دیکھا اور نظروں کی سرد جنگ چھڑ گئی۔ اس کی نگاہوں میں تلخی اور نفرت کی آگ سلگ اٹھی تھی اور میرا دل بے اختیار ….

ڈوبنے لگا۔ کیونکہ نہ وہ میرے لئے اجنبی تھا نہ میں اس کے لئے نیا تھا۔ حالات قدرے مختلف تھے۔ مگر وہ اس بار بھی حاکم تھا اور میں اس بار بھی مجرم!

وہ نیپالی پولیس فورس کا افسر کرن سنگھ تھا جو نیپالی سرحدی چوکی پر ڈراج اسٹیشن ویگن کے ذریعہ چرس کی اسمگلنگ کے الزام میں میری اور سفید فام ہپی جوزف کی گرفتاری کے بعد ہمیں لے کر سمرا کی آبادی میں پہنچا تھا وہاں ہماری لاعلمی میں زیر زمین تنظیم کے کسی رکن نے ہماری ضمانت کا بندوبست کر لیا تھا اس خبر سے کرن سنگھ کو اس قدر مایوسی ہوئی کہ ذرا سی بات پر وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا اور مار مار کر میرا چہرہ لہولہان کر دیا تھا۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ اس وقت بھی میں بغیر داڑھی کے گرفتار ہوا تھا اور اب بھی اسی حلیہ میں تھا ایسی صورت میں بھلا ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی کیسے رہ سکتے تھے!

کرن سنگھ کی وردی پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ وردی سمیت بستر پر پہلو بدلتا رہا ہو۔ اور اس کے چہرے پر بھی تقریباً اسی قدر شکنیں موجود تھیں وہ دونوں انگوٹھے اپنی پتلون … بیلٹ میں اڑائے ہونٹ بھینچے مجھے گھورتا رہا۔

"کیا آپ مجرم کو پہچانتے ہیں کرن سنگھ جی؟" مجھے لانے والے انسپکٹر نے چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ اب صحیح ہاتھوں میں آیا ہے!" وہ اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے ہنکارا "کئی مہینے پہلے میں سرحدی چوکی پر اپنے دستے کے ساتھ کسٹم والوں کی مدد کے لئے تعینات تھا تو یہ سالا ایک چھ پہیوں والی اسٹیشن ویگن میں جعلی کاغذات پر بیر گنج سے رکسول ہوتا ہوا نیپال میں گھسا تھا مگر سالے کی چالبازی دھری کی دھری رہ گئی۔ گاڑی کے سائلنسر اور ٹائروں میں چرس کے تھیلے چھپے ہوئے تھے اور یہ کسی موہن لعل کے پرانے پاسپورٹ پر اپنی نئی تصویر لگا کر آیا تھا۔ میں اسے اور اس کے گورے ساتھی کو لیکر سمرا کے تھانہ میں پہنچا تو وہاں ان دونوں کی پہلے ہی ضمانت ہو چکی تھی۔ کئی روز بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس مقدمہ میں یہ اب بھی مطلوب ہوگا۔"

"مگر یہ تو کہتا ہے کہ برونز آرٹ فیکٹری کا منیجر ہوں!" وہ سخت نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔

کرن سنگھ نے اپنی روایتی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند ناقابلِ عمل گرہی گالیاں بلند آواز میں تصنیف کیں اور لاپروایانہ شان سے بولا "اب دیکھتا ہوں اسے میرے چنگل سے کون مائی کا لال نکالتا ہے۔ لڑکی اپنے ورثاء کو واپس مل چکی ہے اسے حوالات میں ڈال دو۔ صبح دیکھیں گے کہ یہ کہاں کا منیجر ہے!" یہ کہہ کر وہ پرشور آواز میں ہنس پڑا۔ وہاں موجود انسپکٹر اور سپاہیوں نے بھی خوشامدانہ انداز میں اس بیوقوف کے مضحکہ خیز قہقہہ کا ساتھ دیا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مقدر کے بے رحم ہاتھوں نے میرے گرد مصائب کا جال بُن دیا ہے۔ میں ایک چکر سے نکلنے نہ پاتا تھا کہ کوئی دوسری

دشواری سامنے آجاتی۔ میں نے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور گٹر میں پھینک کر لاشعوری طور پر خود کو ایک بڑے خطرے سے بچایا تھا لیکن اس موڑ پر کرن سنگھ سامنے آگیا اور میری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس بار جیل کی مشقت آمیز زندگی ایک بار پھر میرا مقدر بنتی نظر آرہی تھی۔ پٹنہ جیل کی یادیں ابھی تازہ ہی تھیں کہ یہ نئی صورتِ حال سامنے آگئی۔

"چل بے ۔۔۔ سُنا نہیں تونے!" ایک سپاہی نے میری کمر پر ڈنڈا مار کر تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

میں پھر کر اس کی طرف پلٹا اور نتیجہ میں شانہ پر انسپکٹر کا گھونسہ پڑا۔

"چوری اور سینہ زوری کرتا ہے اگر اب کسی پر غرایا تو زخرا پھاڑ ڈالوں گا۔"

میں دل ہی دل میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

کوتوالی کی تیرہ و تاریک حوالات اور وہاں گزاری ہوئی وہ رات میں زندگی بھر کبھی نہ بھول سکوں گا۔ وہ گھوڑوں کے اصطبل کی طرح نیچی چھت والا ایک کافی لمبا مستطیل ہال تھا جس میں چھ چھ فٹ کے فاصلے پر فرش سے چوبی چھت تک مضبوط آہنی سلاخیں اس طرح کھڑی کی گئی تھیں کہ وہ ہال آٹھ حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ صرف دونوں سِروں پر واقع کوٹھریوں میں دو جانب پختہ دیواریں تھیں ورنہ تمام درمیانی حصوں میں صرف عقب میں دیوار تھی باقی ہر طرف آہنی جنگلے لگے ہوئے تھے۔ داخلہ کے لئے بھی سلاخ دار دروازہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔

ان تمام ہی کوٹھریوں میں اس وقت گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ فضا میں ناقابلِ برداشت بدبو بسی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں پہنچانے والے سپاہیوں کے قدموں کی چاپ پر کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی پھر چند ثانیوں کے لئے جلنے والی ٹارچ کی روشنی میں، میں نے کہیں کہیں انسانی جسم گٹھڑیوں کی صورت میں فرش پر پڑے ہوئے دیکھے جب وہ سنتری دروازہ مقفل کر کے لوٹ گئے تو میں نے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر اس کال کوٹھری کا جائزہ لیا۔ اس کا فرش نہ صرف کچا بلکہ نمناک بھی تھا۔ ایک طرف پھٹے ہوئے تعفن زدہ کمبل کے چند ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جو سردی کا احساس مٹانے کے لئے قطعاً ناکافی تھے۔ فضا میں بے شمار مچھروں کا گونجیلا آہنگ آسیبی تسلسل کے ساتھ گونج رہا تھا۔

میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ مقدر کی ستم ظریفیوں پر بے اختیار میرا دل بھر آیا تھا۔

گلنار ۔۔ جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا۔ وہ حالات کے تیز و تند دھارے کے سامنے اپنا وہ بہروپ قائم نہ رکھ سکی جس پر میں فریفتہ تھا۔ میں نے اسے معصوم دوشیزہ سمجھ کر چاہا مگر آخر کار وہ مجھے بالاخانے کی جنس نظر آئی اور لاہور کے بازارِ حُسن میں میرے ہاتھ اس کے لہو سے آلودہ ہوگئے۔ اور اب ۔۔ میں نے لونا کو چاہا۔ دل کے بجائے میں نے عقل سے فیصلہ کیا کہ وہ میری زندگی کے خزاں آلود گوشوں کو گل رنگ بنا دے گی۔ اور جب میں راہ کا آخری پتھر ہٹا کر زیرِ ولپائنٹ سے اپنی شبِ عروسی اور رائل ہوٹل کے رومان پرور، خواب گاہ کا تصور ذہن میں سجائے واپس لوٹا تو تقدیر میرے منصوبوں پر خندہ زن تھی۔ میں وہ رات سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں لب دوشیزہ لونا کی آغوش اور پھولوں کی سیج میں گزارنے کے بجائے اس متعفن حوالات میں بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ انسان حالات کے سامنے کس قدر بے بس ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے خوب ہو رہا تھا۔

میں نہ جانے کتنی دیر ان ہی خیالات میں کھویا رہا۔ پھر ایک لمبا سانس لے کر فرش سے اٹھ گیا۔

اسی وقت برابر والی کوٹھری سے کسی کی نرم اور دھیمی آواز ابھری۔

"کیا اِدھر کوئی ہے؟" زبان انگریزی اور لہجہ عامیانہ تھا۔

"ہاں ۔ ایک بدنصیب آج کی رات تمہارا ہمنشین ہے۔" میں افسردہ لہجے میں یہ کہہ کر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا آواز والی سمت میں بڑھا۔

"تمہارے پاس سگریٹ ہے؟"

اس آواز نے میری رہنمائی کی اور میں اس کے قریب جا پہنچا۔ ہمارے درمیان آہنی سلاخیں حائل تھیں جن کے درمیان سے ہاتھ بآسانی دوسری طرف گزر سکتا تھا۔!

"سگریٹ ضرور ہے مگر ماچس چھین لی گئی ہے کہ کہیں میں بیزاری کے عالم میں یہاں آگ نہ لگا دوں۔" میں نے سلاخوں کے اس پار اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

آواز کے لوچ نے مجھے جو تاثر دیا وہ درست ہی نکلا۔ اس کا بدن سبک مگر گداز تھا۔ کھلے ہوئے لمبے بال شانوں سے نیچے تک لہرا رہے تھے۔

اس نے اپنے شانوں پر میرا ہاتھ محسوس کر کے کوئی تعرض نہ کیا۔ میں نے آہستگی سے اس کا بازو دبایا اور تقریباً سرگوشیانہ آواز میں کہا "تم یہاں کس جرم کی پاداش میں موجود ہو؟"

"جنس!" آواز نرم اور شرم سے عاری تھی "مشرق میں سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ یہ لوگ جنس کو شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں، مجھے پولیس نے ایک مصنوعی گاہک کے ذریعہ پھانسا ہے!"

"کیا تم بھی غیر ملکی ہی ہو؟"

"نہیں میں مقامی ہوں۔"

"دوسری طرف بھی مقامی مجرم ہیں مگر وہ تو انگریزی سے نابلد ہیں۔"

"کم نصیب ہیں وہ۔" میں نے آواز دھیمی ہی رکھی مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں دوسرے حوالاتی بیدار ہو کر ہماری تنہائی میں مخل نہ ہوں۔ "اگر وہ انگریزی سے آشنا ہوتے تو شاید تمہاری دلچسپی میری طرف مبذول نہ ہوتی۔"

حوالات کی بوجھل فضا میں مچھروں کی بھنبھناہٹ پر حاوی ہی نفرتی ہنسی گونجی۔

"اپنا بستر اِدھر ہی لے آؤ۔ میری نیند پوری ہو چکی ہے۔ باتیں کر کے باقی ماندہ رات آرام سے بسر کر سکیں گے!" اس نے تجویز پیش کی۔

"بستر!" میں استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "وہ غلیظ چیتھڑوں کا بنا ہے۔ شاید تمہارے حُسن سے مرعوب ہو کر انہوں نے تمہیں بہتر بستر دیا ہو!"

"جس جرم کی محض نیت کرنے پر مجھے گرفتار کیا گیا ہے وہی جرم کرنے پر مجھے دوبار مجبور کیا جا چکا ہے مگر یہاں کا انچارج بہت ہی خود غرض شخص ہے اب میں مجھے ذرا بھی رعایت دینے کو تیار نہیں ہے!"

میں وہیں سلاخوں سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی اپنا نام نہاد بستر اسی طرف سرکا لیا۔ ان مایوس کن حالات میں اسے قریب پا کر یک بیک میرا دورانِ خون تیز ہو گیا تھا۔ کنپٹیوں میں انگارے سے چٹخنے لگے تھے۔ اور درمیانی سلاخیں اب مجھے ناقابلِ برداشت نظر آرہی تھیں۔

"تم کس ملک سے تعلق رکھتی ہو؟" میں نے بھاری اور محبت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"میں سویڈن سے آیا ہوں!" جواب ملا۔

"آیا ہوں!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "یعنی یعنی ۔۔۔۔۔!"

"ہاں ہاں ۔۔ میں لڑکا ہی ہوں۔ ایلین بک ہارٹ کہتے ہیں مجھے!" وہ قدرے ناگواری کے ساتھ بولا۔

میرا دورانِ خون یک بیک سست ہو گیا۔ ذہن اور کنپٹیوں پر برف جمنے لگی اور مُنہ کا ذائقہ اچانک ہی تلخ ہو گیا اور میں غصے سے تقریباً ہکلاتے ہوئے غرایا "تم ۔ تم ۔ سن آف اے بیچ، مجھ سے عشق لڑانے کی کوشش کر رہے تھے"۔

"کیا تم کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو؟" اس نے طنزیہ آواز میں پوچھا۔

میرے مُنہ سے اُردو اور انگریزی کی ملی جلی گالیوں کا ایک طوفان امڈ پڑا غصہ کے باعث مجھ پر دائمی دیوانگی طاری ہو گئی اور میں پوری قوت سے چیخنے لگا۔

اسی وقت باہر سے سنتریوں کی گھبرائی ہوئی خوابناک آوازیں اور بھاری جوتوں کی تیز دھمک سنائی دی اور دو مسلح سپاہی پلکیں جھپکاتے اِدھر آپہنچے۔

ان کی تیز ٹارچوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ میرا پڑوسی چودہ پندرہ برس کا منحنی سا پستہ قامت سفید فام لڑکا ہی ہے ابھی اس کی مسیں بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں مگر سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے وہ نفرت بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔!

ایلین بک ہارٹ کو تاریکی کے باعث میں لڑکی سمجھ بیٹھا تو اس میں فی الحقیقت اس بے چارے کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ اپنے ملک کے بگڑے ہوئے معاشرہ کا شکار ہو کر مسلمہ جنسی اقدار سے منحرف ہو گیا تھا اور اس کے نزدیک کسی آبرو باختہ لڑکی کی طرح اسے بھی مناسب معاوضہ دے کر جنسی تلذذ کا ذریعہ بنایا جا سکتا تھا اور وہ میری گرمجوشی سے یہی سمجھا ہو گا کہ کوتوالی کے انچارج کرن سنگھ کی طرح میں بھی اس پر ڈورے ڈال رہا ہوں۔ بات صرف اتنی تھی کہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی اور اس بے ہودہ زبان میں تکلم اور تخاطب کے سارے صیغے ایسے ہیں جن سے جنس کا سراغ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے اور میں گھور تاریکی کے باعث ان انگریزی صیغوں کا شکار ہو کر اسے لڑکی سمجھ بیٹھا اور جوں ہی اسے میری غلط فہمی کا علم ہوا اس نے بات صاف کر دی۔ مگر اس وقت تو غصے اور جھلاہٹ کے باعث میری عقل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ میں پوری قوت سے چیخ چیخ کر ایلین بک ہارٹ پر برسے جا رہا تھا۔ میری چیخ پکار پر حوالات میں سوئے ہوئے سب قیدی بیدار ہو گئے تھے۔ اور ایک دوسرے سے صورتِ حال دریافت کرنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔!

سنتریوں کی آمد اور ڈانٹ بھی مجھ پر بے اثر رہی بلکہ میں آہنی سلاخوں سے ہاتھ نکال کر ایلین بک ہارٹ پر جھپٹا تو اس کی ساری برہمی کافور ہو گئی۔ اور وہ خوفزدہ انداز میں محفوظ فاصلہ پر جا کر کھڑا ہو گیا تاکہ جسمانی تشدد سے محفوظ رہ سکے۔

"یہ سالا انگریزی میں کیا بکواس کر رہا ہے؟" ایک سنتری نے بے زاری کے عالم میں اپنے نیم خواندہ ساتھی سے پوچھا لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔

ان دونوں نے بیک وقت مجھ پر برسنا شروع کر دیا جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو ان میں سے ایک نے دروازہ کی سلاخوں میں سے رائفل کا کندہ میری پنڈلی پر مارا۔ میں نے اشتعال کے عالم میں تڑپ کر اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔

بندوق ہاتھ سے نکلتے ہی وہ دونوں حواس باختہ ہو گئے اور ایلین بک ہارٹ بھی گھٹی گھٹی آواز میں مدد کے لئے چیختا ہوا ایک کونے میں جا گھسا میں نے بندوق کی نالی اٹھا کر سنتریوں کو للکارا "دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ جان سے مار دوں گا میں تم سب سے نمٹنا خوب جانتا ہوں"۔

وہ دونوں تو وہاں سے سرپٹ ہو لئے اور میں نے بندوق ایلین کی طرف سیدھی کر لی مگر ایلین کہاں ۔ سنتریوں کے جاتے ہی وہاں اندھیرا چھا گیا تھا اور وہ نہ جانے کس گوشہ میں جا دبکا تھا۔

اسی وقت اندھیرے میں ایلین کے گھگھیا کر رونے کی آواز آئی وہ بین کرتے ہوئے مجھ سے جان کی بھیک مانگ رہا تھا۔

ان بدبو زدہ کوٹھریوں میں اس کے رونے سے صورتِ حال کچھ ایسی گھمبیر ہو گئی تھی کہ میرا غصہ سرد پڑنے لگا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب بندوق چھینے

پر مجھے کرن سنگھ کی کڑی سزاؤں کا نشانہ بننے پڑے گا لہٰذا میں نے اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے کے لئے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بندوق دروازہ کی سلاخوں میں سے راہداری میں ڈال دی۔

ایلین ابھی تک مسلسل روئے جا رہا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا۔ شاید اسے علم نہیں تھا کہ میں بندوق باہر ڈال چکا ہوں۔ لہٰذا میری پھٹکار سنتے ہی وہ یکلخت خاموش ہو گیا اور وہاں اندھیرے میں ایک بار پھر صرف مچھروں کا شور باقی رہ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں راہداری میں روشنی آتی نظر آئی ساتھ ہی بہت سے بھاری قدموں کی دھمک بھی سنائی دے رہی تھی۔ اور کرن سنگھ اونچی آواز میں حوالاتیوں کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالتا سنائی دے رہا تھا۔

پھر شاید آنے والوں کو راہداری میں پڑی بندوق بھی نظر آ گئی اور کرن سنگھ کی غصیلی آواز گونجی "کیوں بے ماں کے خصم — تیری بندوق تو وہ پڑی ہے کیا نیند میں حوالاتی کا شور سن کر ڈر گیا تھا جو بندوق یہاں چھوڑ بھاگا اور کوتوالی میں اودھم مچا دیا کہ ایک حوالاتی نے تیری بندوق چھین لی ہے — اٹھا سالے جا کر وہ بندوق!"

وہ بری طرح بھاگتا ہوا آیا جیسے اسے شبہ ہو کہ ذرا بھی تاخیر ہوئی تو کوئی اور بندوق لے بھاگے گا۔ اور جب وہ اس کا جائزہ لے رہا تھا تو کرن سنگھ سلیپنگ سوٹ پہنے دس بارہ مسلح سپاہیوں کے ساتھ آ پہنچا اس کا ریوالور ہاتھ میں دبا ہوا تھا شاید بوکھلاہٹ میں وہ گشت کرنے والوں کو بھی ساتھ ہی لیتا آیا تھا کیونکہ خچر سوار سنتریوں کی وردیاں ممتاز نظر آ رہی تھیں

"کیوں بے — کیوں اودھم مچا رہا تھا؟" کرن سنگھ میری کوٹھری کے سامنے رک کر سرد اور غصیلی آواز میں بولا۔

"یہ بار بار مجھے چرس کے لئے تنگ کر رہا تھا میرے لئے لیٹے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔" میں نے ایلین بک ہارٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

خوب!" کرن سنگھ نے وہیں کھڑے کھڑے ایلین کو گھورا اور طنزیہ لہجے میں اپنے ماتحتوں سے بولا "نکالو اس مردود کو مار، میں ابھی کرتا ہوں اس کی چرس کا بندوبست!

کرن سنگھ کی آنکھوں میں یک بیک پیدا ہونے والی چمک سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرا اودھم بھول چکا ہے اس کی تمام تر توجہ اب ایلین پر مرکوز تھی۔

وہ ساری بھیڑ ایلین سمیت وہاں سے رخصت ہو گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اگلی صبح خلافِ توقع مجھ سے سرسری بازپرس کی گئی۔ میں نے کرن سنگھ کو بتایا کہ سمرا میں پولیس سے ضمانت پر نجات دلانے والے لوگ میرے لئے اجنبی تھے

رہائی کے بعد ان میں سے ایک نے مجھے اطمینان دلایا کہ میرا مقدمہ ختم کرا دیا جائے گا میں جلد از جلد کسی طرف نکل جاؤں۔ اپنے ضامن کے اس دعوے اور شریے پر شک میرے لئے کوئی وجہ نہیں تھی وہ لوگ بارسوخ اور مقامی تھے جبکہ میں بے سہارا اور اجنبی۔ میں پہلی فرصت میں وہاں سے نکل بھاگا۔ پھر کھٹمنڈو میں قسمت نے یاوری کی اور محض تعلیم کی بنا پر مجھے برونسز آرٹ فیکٹری میں منیجر کی جگہ مل گئی۔

"فیکٹری کے مالکان سے تمہارے کیسے مراسم ہیں؟" کرن سنگھ نے اس مقام پر سوال کیا اور اسی نکتے سے میرے لئے پیچیدگیوں کی ابتدا ہو گئی۔

"انتہائی واجبی!" میں نے محتاط جواب دیا۔ "مجھے ملازم رکھنے والا شخص وجے کمار تھا مگر تقرر نامے پر سیٹھ نرائن داس کے دستخط تھے۔" یہ میں نے اس لئے بولا کہ وجے اب پولیس کے سامنے میری کسی بات کی تردید کے لئے زندہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس وقت مجھے سیٹھ صاحب کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ ان کا ذہن خراب ہے اور ان کی جانب سے وجے کمار ہی سارے معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔"

"فیکٹری کے معاملات میں تمہیں ہدایات کہاں سے ملتی ہیں؟"

"دوسرے تمام امور میں مجھے مکمل اختیارات حاصل تھے صرف اہم مسائل پر مجھے وجے سے ہدایات لینی پڑتی تھیں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ کل رات وجے ایک حادثے میں مر گیا اور نرائن داس نے خودکشی کر لی ہے۔"

"آج صبح فیکٹری ہی میں مجھے یہ اطلاعات ملی تھیں!"

اسی روز گیارہ بجے کے قریب مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا لونا بھی عدالت میں موجود تھی۔ احاطے میں اس کا باپ بہت سے مقامی عیسائیوں سمیت موجود تھا۔

لونا کی آنکھیں سرخ اور ورم آلود تھیں جیسے وہ ساری رات روتی رہی ہو۔ وہ کمرۂ عدالت میں سب سے اگلی قطار میں موجود تھی۔

میرے خلاف عائد کی جانے والی فردِ جرم میں چار الزام تھے اول نیپال کی سرحد میں غیر قانونی طور پر منشیات کی اسمگلنگ، دوئم جعلی کاغذات پر سرحد عبور کرنے کی کوشش۔ سوئم ضمانت کے بعد پولیس سے روپوشی اختیار کرنا۔ اور ایک مقامی عیسائی دوشیزہ کا اغوا۔

ابتدائی تین الزامات ٹھوس تھے اور میں ان کے بارے میں وہی کچھ کہہ سکا جو کرن سنگھ کو بتا چکا تھا۔ البتہ لونا کے معاملے میں اپنی بے گناہی پر میں نے پورا زورِ بیان صرف کر دیا۔ کٹہرے میں بیان دیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ابتدائی تین الزامات کے بارے میں میرا تقریباً اقبالی بیان سن کر لونا کو افسوس کے بجائے کچھ حیرت سی ہوئی۔ شاید اسے توقع رہی ہو کہ میں استغاثہ کی مزاحمت کروں گا۔

عدالت میں لونا کا بیان سنسنی خیز ثابت ہوا۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اپنے معذور سوتیلے باپ کے گھناؤنے کردار سے پردہ اٹھایا تو وہ وہاں رکنے کی ہمت نہ کر سکا۔ لونا رائل ہوٹل سے پولیس کے دباؤ کے تحت روانہ ہوتے ہوئے نکاح کے کاغذات بھی ساتھ ہی لے گئی تھی۔ وہ کاغذات اس نے عدالت کے سامنے پیش کر دیئے اور بتایا کہ اس کو کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ اس کا بدکردار باپ جھوٹ اور فریب کے سہارے اسے اپنے چنگل میں دبائے رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کی مدد سے اپنی مالی ضروریات پوری کرتا رہے!

کافی سوچ بچار کے بعد قانونی نکتہ یہ اٹھا کہ ابتدائی تین الزامات کا تعلق ایک پرانے جرم سے ہے جو اس عدالت کے دائرۂ کار سے باہر واقع ہوا۔ لہٰذا یہ مقدمہ سمرا کی عدالت میں منتقل کر دیا گیا۔ اس مقدمے کی ابتدائی سماعت تک کے لئے مجھے پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اغوا کے مقدمے کا فیصلہ فی الفور صادر کر دیا گیا۔ مجھے باعزت بری کر دیا گیا اور لونا کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت دے دی گئی۔

عدالت برخواست ہونے پر کرن سنگھ نے مجھے لونا سے ملنے کی اجازت دے دی۔ میرے سامنے آتے ہی وہ بیچاری بلک کر رو پڑی۔ میں نے اسے کافی تسلی دی تو وہ اعتدال پر آئی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے ایک محلے دار نے اسے اور مجھے اسلامک مشن میں جاتے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ سمجھ گیا کہ لونا ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ جب شادی کی رسوم کے بعد ہم دونوں رائل ہوٹل گئے تو اس نے ہمارا تعاقب کیا۔ اس کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ محلے میں جا کر اس نے لونا کے باپ مارٹن کو سارا قصہ سنا دیا۔ اس پر وہاں بہت سوچ بچار ہوا۔ جوشیلے عیسائی نوجوانوں نے لونا کے اس اقدام کو شدید بے عزتی سمجھا اور وہ مارٹن کو لے کر کوتوالی جا پہنچے۔ انہوں نے وہاں لونا کی بازیابی کے مطالبے کے ساتھ ہی اشتعال انگیز فرقہ وارانہ نعرے بازی بھی کی اور لونا کو ساتھ لئے بغیر وہاں سے نہ ہٹے۔

اب لونا کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ پناہ کا تھا۔ اس کے ہم مذہب تو اس کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ وہ شہر میں کہیں بھی تنہا رہنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اول تو اسے اپنی آبرو کی حفاظت کرنا محال ہوتا دوئم مارٹن کے شرپسند شوریدہ گیر اس سے انتقام لینے کے لئے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے میرے جیل میں ہوتے ہوئے وہ بھرے شہر میں تنہا اور بے سہارا رہ جاتی۔!

"تم شہر کے کسی گمنام ہوٹل میں چند دن گزار لو لونا پھر میں تم سے آ ملوں گا۔"

"یہ ناممکن ہے... عدالت میں میرے بیان کے بعد وہ ہر قیمت پر مجھے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے کھٹمنڈو کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ وہ بہت جلد مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

واقعی یہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا اور جب بات یہاں تک آ گئی تو اب مجھے بھی خطرہ مول لینا ہی تھا۔ پورے شہر میں صرف گریسی ہی ایسا آدمی تھا جس پر اپنی بیوی کے معاملے میں میں بھروسہ کر سکتا تھا۔ میں نے اسے گریسی کے بار کا پتہ بتاتے ہوئے کہا "تم اس کے پاس چلی جاؤ اور اسے ساری صورتِ حال سمجھا دو اور اسے میرا پیغام دینا کہ میری واپسی تک وہ میرے دو آدمیوں گیتا اور بالی کو تمہاری حفاظت پر مامور کر دے۔ وہ دونوں اکثر گریسی کے پاس آتے رہتے ہیں اور تمہیں اپنی مالکن ہی سمجھیں گے!"

"آپ نہیں جانتے... کچھ نہیں جانتے!" وہ بے بسی کے ساتھ رو پڑی۔ "یہ صرف میں ہی جانتی ہوں کہ ایک تنہا اور بے سہارا لڑکی کبھی کسی مرد کے لئے باعثِ احترام نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگ آپ کے سامنے جو بھی ہوں مگر جب انہیں یہ معلوم ہو گا کہ آپ حوالات میں ہیں تو ان کا رویہ میرے ساتھ ہمدردانہ نہیں ہو گا۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ میں — اپنوں میں لوٹ جاؤں اور ان کے فیصلے کے سامنے سر جھکا کر محرومی کی موت کو گلے سے لگا لوں!"

اسی وقت کرن سنگھ اپنے دوستوں سے گفتگو کر کے نمٹ گیا اور کرخت آواز میں بولا "چل بے! اب اپنی جورو کا پیچھا چھوڑے گا یا مقدر کو روئے جائے گا۔"

میں نے اس سے کچھ دیر کی مہلت اور مانگی مگر وہ طیش میں آ گیا اور مجھے اسی مرحلے پر لونا کو روتا چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑ گیا۔

لونا نے عدالت میں میرے خلاف عائد کئے جانے والے بقیہ تین جرائم کے بارے میں نہ مجھے لعن طعن کی نہ ہی اس موضوع کو چھیڑا۔ یہ بات اس کے کردار کی عظمت کی عکاس تھی۔ میں جہاں تک اس کے مزاج کو سمجھ سکا اس کی بنا پر میرا خیال تھا کہ وہ مر کر بھی اپنوں میں واپس نہ جائے گی۔

حوالات کی کوٹھری اب ایک بار پھر میرا مقدر بن گئی۔ اس سے پہلے کرن سنگھ نے انسپکٹر سے جو گفتگو کی اس کی بنا پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ جلد

ہی مجھے سمر ابھجوانے کا بندوبست کرے گا۔

دن کی روشنی حوالات میں دھندلائی ہوئی سی تھی۔ ایلن بک ہارٹ نے تلخ نظروں سے میرا خیر مقدم کیا۔ اور جب سنتری مجھے بند کر کے چلے گئے تو وہ عادت سے مجبور ہو کر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

"رات تم کو کیا ہو گیا تھا۔؟"

"پہلے تو میرا جی نہ چاہا کہ اس قابلِ نفرت چھوکرے سے گفتگو کروں۔ مگر پھر ذہنی پریشانیوں سے چند ثانیوں کے فرار کی خاطر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔" ہم ابھی ترقی کی اس منزل پر نہیں پہنچے جہاں ہم جنسوں سے محبت کی کھلی چھوٹ مل جاتی ہے!"

"بکواس!" وہ ڈھٹائی سے بولا۔" جانتے ہو پچھلی رات کا باقی حصہ میں نے کرن سنگھ کی خواب گاہ میں ایک قالین پر سو کر گزارا ہے!"

"استثنےٰ ہر جگہ ہوتا ہے۔ تمہارے ملک میں بھی ایک آدھ فی صد لوگ جنسِ مخالف کی طرف میلان رکھتے ہوں گے!" میں نے اس پر گہرا طنز کیا۔

"ہمارے یہاں آبادی میں اضافہ کی شرح خاصی بلند ہے۔" وہ صفائی پیش کرنے لگا" دراصل ہم لوگ لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ اپنے فطری رجحانات کو معاشرتی رسوم کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھاتے اور ہمیں اس پر فخر ہے!"

"میری دانست میں تو تمہیں اپنے ملک کی نمایندگی کا کوئی حق نہیں۔ تم جیسے آوارہ منش ہی تو سرحدوں سے ماورا یا آفاقی وطن کا تصور رکھتے ہیں!"

"کرن سنگھ بالکل الو کا چرخا ہے۔" اس نے بات کا رخ پھر موڑ دیا۔

"اخلاقی جرأت سے یکسر عاری! جانتے ہو رات اس نے کیا کیا؟"

"کیا اب بھی کچھ بتانے کی ضرورت رہ گئی ہے!" میرا لہجہ تلخ تھا۔

"میرا معاملہ بالکل سیدھا ہے میں اسے اقبالی بیان دے چکا ہوں۔ مگر وہ حوالات میں میرے قیام کو طول دینے کی نیت سے مجھے عدالت میں پیش نہیں کر رہا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہاں سے مجھے فی الفور سزا نہ بھی ہوئی تو پولیس لاک اپ کے بجائے مجھے جیل بھیج دیا جائے گا۔" وہ ایک لحظہ کے لئے رک کر ہنسا پھر بولا۔" کل رات مجھے یہاں سے لے جانے کے بعد اس نے بے رحمی کے ساتھ میرے منہ پر کئی تھپڑ مارے، پھر بار بار ہنستے ہوئے اپنے ماتحتوں کو کچھ حکم دیا اور انہوں نے میرے ہاتھ پیر باندھ کر کرن سنگھ کی خواب گاہ سے ملحق باتھ روم میں ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیا اور جب وہاں کوئی نہ رہا تو کرن سنگھ نے خود مجھے اس عذاب سے نجات دلائی!"

شام تک میں اس سے بحث مباحثے میں الجھا رہا کہ چھ بجے کے قریب ایک سپاہی میری کوٹھری پر آیا۔" تیری عورت ملنے آئی ہے! انچارج صاحب اسے یہیں لا رہے ہیں۔!"

اس خبر نے یک بیک مجھے مضطرب کر دیا۔ نہ جانے وہ کس مجبوری کے تحت وہاں آ پہنچی تھی۔ چند ثانیوں کے بعد کرن سنگھ کے بجائے ایک سپاہی لونا کو لئے اس عفونت زدہ منحوس قید خانہ کی طرف آیا۔

"آپ ایسی جگہ سرتاج۔؟" اس کی آواز فورِ غم سے رندھ...

"یہ مقدرات ہیں لونا۔" میں سوگوار سی مسکراہٹ کے...

"ثروت و اختیار کے دن نہ رہے تو مصائب کی یہ گھڑیاں بھی ٹل... گی۔ تم بتاؤ کیسے آئی ہو اور کہاں ٹھہری ہو؟"

"میں گریسی کے پاس گئی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی...

یہودی بہت مکار ہے۔ پہلے تو آپ کا نام سن کر احترام سے پیش... جوں ہی میں نے اسے بتایا کہ آپ کن دشواریوں سے دوچار ہیں تو اس... یک بیک آنکھیں پھیر لیں اور بولا کہ وہ ایسے لوگوں سے اپنے سارے تعلق... کے بارے میں بھول جانے کا عادی ہے جو قانون کی گرفت میں آ چکے ہوں...

"اس نے کہا!" میں نے توہین کے شدید احساس کے ساتھ... میں کہا۔

"غصہ بے سود ہے سرتاج۔ یہ میں نے صرف اس لئے بتایا... لوگوں کے بارے میں اپنی رائے مفروضوں پر قائم نہ کریں... عدالت... کے بعد میں آپ کی رہائی کی تدابیر ہی سوچتی رہی ہوں، اور شاید مجھے... کامیابی بھی ہوئی ہے!"

"کیسی کامیابی... کیا کوئی ضمانت پر تیار ہو گیا ہے...؟"

بمشکل اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔" وہ فخر کے ساتھ بولی" مگر... انحصار آپ کے فیصلے پر ہے۔" وہ سرگوشیانہ آواز میں بولی۔ تاکہ قریب... ہوا سپاہی کچھ نہ سن سکے۔!

"اس وقت اپنی رہائی کے سوا مجھے کسی بات کی فکر نہیں ہے... میں جلد از جلد آزاد فضاؤں میں سانس لینا چاہتا ہوں!"

"میں نے آنند بھون فون کیا تھا اور نرائن داس کی جوان... بیوہ سے بات کی تھی۔" وہ دبے دبے پُرجوش لہجے میں بولی" مجھے آپ نے اشاروں کنایوں میں یہ تو بتا چکے تھے کہ بروننز آرٹ فیکٹری کی آڑ میں کچھ غیر قانونی کام ہوتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ گرفتار کئے جا چکے ہیں اور اگر... سورج طلوع ہونے سے قبل رہائی نصیب نہ ہوئی تو فیکٹری اور اس کے... کو بھی قانون کے سامنے جوابدہی پر مجبور کر دیں گے۔!"

"پھر... پھر وہ کیا بولی۔؟" میں نے جوشیلی آواز میں پوچھا۔

"پہلے تو وہ برہم ہوئی اور یہ جاننا چاہا کہ میں کون ہوں میں نے اس سے کہا کہ میں محض پیغام رساں ہوں۔ صفدر علی کا پیغام دے رہی... اپنا برا بھلا دیکھ کر فیصلہ وہ خود کر سکتی ہے۔ اس پر وہ نرم پڑ گئی اور... وہ اپنے کسی آدمی کو توالی بھیجے گی۔ میں آپ کو یہی بتانے آئی تھی تاکہ آپ... لاعلمی کے باعث منصوبہ ناکام نہ ہو سکے۔ آنند بھون کے مکین اگر چاہیں... کو تختہ دار سے بھی اتروا سکتے ہیں۔ آپ کیلئے یہ میری پہلی اور آخری کوشش...

"خدا اس منصوبے کو کامیاب کرے لونا!" فرطِ ممنونیت سے میری... بھر آگئی۔" تمہارے حوصلے نے تو مردوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ یہ میری خوش... ہے کہ تم میری شریک حیات ہو!"

"...میں جا رہی ہوں۔ یہ رات ہپیوں کے کسی غول میں بسر کروں گی... لوگ کے پیاسے سوچ بھی نہ سکیں گے کہ میں کسی فٹ پاتھ پر شب بسری... کروں گی!"

"رہائی کے بعد میں تم کو کہاں تلاش کروں گا لونا؟"

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں، ہاں اس شہر سے نہ جاؤں گی۔ یہ... وعدہ ہے!" اس نے کہا اور تیزی کے ساتھ واپسی کیلئے مڑ گئی مگر میں... کی آنکھوں کے گوشوں میں تیرتی نمی دیکھ چکا تھا۔

رات نو بجے کے قریب میری طلبی ہوئی۔ میں کرن سنگھ کے کمرے... پہنچا تو وہاں آنند بھون کا منتظم سنہا موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا... میں نے چہرے پر کرختگی ہی طاری رکھی۔ وجے کی موت کے بعد اسی کی ذات ایسی تھی جس پر گیتارانی کسی حد تک اعتماد کر سکتی تھی۔

"آپ حوالاتی سے بات کر لیں، میں جا رہا ہوں؟" کرن سنگھ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔" مگر اس سے ذرا ہوشیار ہی رہیں۔ کل رات اس نے ...ہنگامہ کیا تھا۔ ذرا بھی گڑبڑ کرے تو آواز دے لیجئے گا۔ میرے مسلح آدمی دروازے پر ہی موجود رہیں گے!"

کرن سنگھ کے چلے جانے پر ہم دونوں چند ثانیوں تک ہم رتبہ حریفوں کی طرح ایک دوسرے کی نظروں میں دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہی سکوت توڑا۔" کیا خبر لائے ہو سنہا؟"

"مالکن یہ جاننا چاہتی ہیں کہ تم نے بغاوت آمیز دھمکی کی جرأت کیوں کر کی؟"

"سوال معقول ہے!" میں نے اعتماد سے سر ہلا کر کہا۔" مجھے ایک سگریٹ دو تو میں سکون سے بات جاری رکھ سکوں گا۔"

اس نے پیکٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ ہتھکڑیاں لگے ہونے کے سبب سنہا نے ہی میری سگریٹ جلائی اور میں اس کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔" وجے اور نرائن داس کی موت تک تم آنند بھون کے ایک وفادار ملازم تھے۔ کوئی بات کرنے سے قبل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم خود گیتارانی کے کتنے معتمد ہو!"

"یہ کس طرح ممکن ہے۔؟" وہ مسکرایا۔

"گیتارانی یہ سمجھتی ہے کہ میں عقل سے محروم ایک بے ضرر اور لاعلم شخص ہوں۔ مگر میں وہ سب جانتا ہوں جو وجے اور نرائن کی موت کا سبب بنا۔ فیکٹری کے کاروبار کی نوعیت تو بہر حال میرے لئے کوئی راز ہی نہیں ہے۔ اب تم کوئی ایسی بات بتاؤ جو مجھے مطمئن کر سکے کہ تم گیتارانی کے رازداں ہو!"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" وہ پُرسکون تھا۔

"سنو سنہا!" میں سگریٹ کے پے در پے کئی کش لے کر بولا" میں بنیادی طور پر نمک حرام نہیں ہوں۔ مگر اب میں ماضی کے کچھ واقعات کی بنا پر اس بری طرح قانون کے شکنجے میں پھنسا ہوں کہ مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ ماضی کے ان واقعات میں آنند بھون کے مکین ہی پسِ پردہ کارفرما تھے.....!"

"تمہارا اشارہ چرس کی اسمگلنگ کے واقعہ کی طرف ہے؟"

اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہو سکتا ہے کرن سنگھ تمہیں وہ واقعہ بتا چکا ہو۔! تو میں کہہ رہا تھا کہ ان حالات میں میرے حلقۂ اثر میں صرف گیتارانی ہی ایسی ہستی ہے جو مجھے ان دشواریوں سے بچا سکتی ہے۔ مگر وہ میرے معاملات میں کیوں دلچسپی لینے لگی جب کہ اس کی دانست میں میں فیکٹری غیر قانونی کاروبار کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اور ان دنوں تو وہ کاروبار بھی بند ہی ہے اور اس کا انکشاف کرنے کے بعد منیجر کے طور پر میں خود مزید پریشانی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ لہٰذا بہتر طریقہ وہی ہے جو میں نے اختیار کیا۔ اب اگر تم گیتارانی کے معتمد نہیں ہو تو اس کے اہم ترین رازوں کا اظہار تمہارے سامنے نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ میری آڑ میں کسی اور کو بھی گیتارانی کے خلاف بلیک میلنگ کا مواد مل جائے!"

"گڈ۔!" میری بات پوری ہونے پر سنہا تحسین آمیز لہجے میں بولا۔" مگر تمہاری ہی دلیل کے مطابق مجھ پر بھی احتیاط لازم ہے۔ لہٰذا میں اس نکتے سے ابتدا کرتا ہوں جو فیکٹری منیجر ہونے باعث تم ضرور جانتے ہو گے۔!"

"ہاں یہ بہتر ہوگا۔!"

"فیکٹری سے دھات کے کھوکھلے مجسموں میں منشیات کی بھاری مقدار غیر ممالک کو برآمد کی جاتی رہی ہے اور یہ بات تمہارے علاوہ پیکنگ شاپ کے چھ افراد کو معلوم تھی جن میں سے ایک کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"میری ہدایات کا ذریعہ؟" میں نے سوال کیا۔

"ڈی ون" وہ اب بہت زیادہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"تو تم یہاں تک جانتے ہو!" سنہا کے منہ سے بے اختیار ایک طویل سانس آزاد ہو گیا۔ پھر وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا" وہ مر چکا ہے!"

"بیان درست کرو سنہا۔ وہ ایک مصنوعی حادثے کے ذریعے قتل کیا گیا تھا۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ اور اب یہ بتاؤ کہ تنظیم کا اصل سربراہ دیوانہ تھا یا صحیح الدماغ؟

کرن سنگھ کے دفتر میں اس وقت خاصی خنکی رچی ہوئی تھی مگر میرے آخری سوال پر سنہا کی پیشانی پر پسینہ کی موٹی موٹی شفاف بوندیں چمکنے لگیں اور وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

کئی سیکنڈ تک وہاں گہرا سکوت طاری رہا اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور میں فتح مندانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اسے گھور رہا تھا۔

ہم دونوں اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ میں اپنی کمزوریوں کی بنا پر قانون کی بے رحم گرفت میں پھنسا ہوا تھا جبکہ سنہا اپنے آقاؤں کی مجرمانہ سرگرمیوں کے باعث میرے چنگل میں آپھنسا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ لونا کی یہ تدبیر ضرور کارگر رہے گی۔ اندھبون کے مکین اپنے رازوں کے تحفظ کی خاطر ہر قیمت پر مجھے بچانے کی کوشش کرینگے۔

"بس اتنا ہی کافی ہے۔" آخر سنہا تھکی تھکی آواز میں بولا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو سنہا!" میں نے نرم اور دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے ہونٹ بھینچ کر مجھے گھورا پھر بولا۔ "وہ دیوانہ بنا ہوا تھا مگر بلا کا ذہین تھا!"

"میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ تم خوب جانتے ہو ورنہ یہاں تک نہ آتے۔" میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "اور اگر نہیں جانتے تو آخری بار کان کھول کر سن لو کہ صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل میں آزادی چاہتا ہوں۔"

"یعنی ضمانت؟" اس نے سوال کیا۔

میں دھیمے سے ہنس دیا۔ "احمقانہ باتیں نہ کرو سنہا میں اس قید سے مکمل نجات چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ضمانت کے بعد میں آزادانہ نقل و حرکت نہیں کر سکوں گا اور اگر شہر چھوڑ کر بھاگنا بھی چاہا تو یہ سمجھ لینا کہ میرا ضامن قانونی دشواریوں میں پڑ جائے گا۔"

"تم اس شہر سے کہاں جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔ "تمہاری فیکٹری کی ملازمت برقرار ہے۔ فی الحال ضمانت کرا کے باعزت زندگی گزارتے رہو۔ ہم ہر قیمت پر تمہیں بری کرا لیں گے۔"

میں بے اختیار دھیمے سے ہنس دیا۔ "کیا تم مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے ہو سنہا؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولا۔

"تم یہ جانتے ہو کہ مجھے اندھبون کے مکینوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ باتیں معلوم ہیں اور میں یہ جانتا ہوں کہ ان کے لئے اپنے مفادات کی حفاظت کی خاطر انسانی خون بہانا معمولی بات ہے میں نہیں چاہتا کہ ضمانت پر رہا ہو کر تم لوگوں کی آسان دسترس میں رہوں پھر کسی دن کسی گمنام گولی میرے مقدر کا فیصلہ کر دے۔ اس طرح فی الحال مجھے رہا کرا کے میرا منہ بند کر دو گے اور میری موت کے بعد تمہیں میرے ... ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی ... نہیں سنہا میں اتنا احمق ..."

"یہ تمہارا وہم ہے!" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "تمہارا ... کے ریکارڈ پر آچکا ہے اور اب تمہاری رہائی کی دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں ... یا پھر کوتوالی کے عملہ کی ساز باز سے فرار ... فرار کی صورت میں ... دن محفوظ نہ رہ سکو گے۔ پولیس کو ہر قیمت تمہاری تلاش شروع کرنی ..."

"میں یہ کب کہتا ہوں دوست!" میں نے اس کے ... مسکرا کر کہا۔ "ضمانت سے مجھے پورا اتفاق ہے مگر یہ مشورہ میرے لئے ... نہیں کہ میں رہائی کے بعد برونز آرٹ فیکٹری کا ملازم رہوں اور ... ساتھ تم کسی بھی وقت مجھ پر ہاتھ ڈال سکو۔"

"تم بہت چالاک ہو صفدر!" وہ بولا۔ "تمہارا منشا میری سمجھ میں آرہا ہے۔ تمہیں رہائی کے بعد کچھ وقت درکار ہے اگر تم ... سے فرار ہوتے ہو تو رشوت وصول کرنے کے باوجود کرن سنگھ کو زیادہ ... چند گھنٹوں بعد تمہیں اشتہاری مجرم قرار دے کر تلاش کی مہم شروع کرنی ہوگی ... تمہاری گرفتاری یقینی ہے کیونکہ کرن سنگھ اپنے تمام عملے کو تو یہ بتا نہ ... تمہاری تلاش کی مہم محض ایک فریب ہے، اور ضمانت پر رہا ہونے کے بعد ... وقت تک کی چھوٹ ہوگی جب تک سمراٹ کی عدالت سے پیشی کا سمن جاری ... ہوتا۔ یہ مدت کئی دن بلکہ کئی ہفتے بھی ہو سکتی ہے اور میرا قیاس ہے کہ تمہیں ... میں کچھ اہم کام ہے جسے نمٹانے کے لئے آزادی کے بعد تمہیں کچھ مہلت ... ہے ... بولو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"اس موضوع پر میں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ اب وقت ضائع ... بلکہ میری ضمانت کا بندوبست کرو۔!" میں تلخ لہجہ میں بولا۔ "اگر یہ کرن ... بیچ میں نہ آمرا ہوتا تو گڑے مردے نہ اکھیڑے جاتے اور میں اس ... آزاد ہو جاتا!"

"مجھے یقین ہے کہ ضمانت کے بعد تم اپنی زبان بند رکھو گے ..."

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ انتہائی مجبوری اور بے بسی کے ... میں مجھے بلیک میلنگ کا یہ حربہ استعمال کرنا پڑا ورنہ عام حالات میں اند... کا ہر راز میرا اپنا راز ہے۔"

"گڈ۔" وہ تحسین آمیز لہجہ میں بولا۔

"سگریٹ اور ماچس میری جیب میں ڈال دو۔" میں نے ... سے کہا اور اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری اس درخواست ... پورا کر دیا۔

پھر اس نے سپاہیوں کو بلایا۔ وہ ہتھکڑیاں تھام کر مجھ ...

... سنہا شاید کرن سنگھ کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔

"تمہیں کیوں بلایا گیا تھا؟" جب سپاہی مجھے حوالات میں بند ... کر چلے گئے تو ایلین بک ہارٹ درمیانی جنگلے کے قریب آکر مجھ سے بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اس طلبی کے بارے میں؟" میں نے چبھتے ہوئے ... پوچھا۔

وہ بے حیائی کے ساتھ ہنس دیا۔ "میرے ذاتی تجربہ کی بنا پر ... سنگھ کی طلبی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔" وہ ایک ہی پر زور دیتے ہوئے ... "مگر میرا خیال ہے کہ تم جیسے اکھڑ اور جھگڑالو شخص سے وہ بھی گھبراتا ہی ... ممکن ہے تمہارا کوئی ملاقاتی آیا ہو؟"

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے فرش پر بیٹھتے ہوئے ... "میرا ایک اہم ملاقاتی یہاں موجود ہے!"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کس جرم میں یہاں قید کئے گئے ...!" میری اعتدال آمیز گفتگو سے حوصلہ پا کر ایلین بک ہارٹ دفع الوقتی ... لئے گفتگو کو طول دینے لگا۔

"مجھ پر نیپال میں غیر قانونی داخلہ کا الزام ہے۔"

"اوہ — تو تم بھی غیر ملکی ہو۔" وہ حیرت سے بولا۔ "مگر کل تو تم ... رہا تھا کہ تم مقامی ہی ہو!"

"رنگ کے اعتبار سے مقامی سمجھو مگر میں سرحد پار سے آیا ہوں۔"

"یعنی تم انڈین ہو؟" اس نے استفسار طلب لہجہ میں پوچھا۔

جی تو چاہا کہ اس سے جان چھڑانے کے لئے ہاں کہہ دوں مگر غیر ... ری طور پر زبان چل پڑی۔ "میں پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"اوہ۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ "شاید مظالم ... تنگ آکر مشرقی پاکستان سے کلکتہ میں داخل ہوئے ہوگے — ادھر تو تم ... بانگلہ دیش کی جدوجہد کر رہے ہو، تمہارے ساتھ اور بھی بے شمار خستہ حال ... گزیں آئے ہوں گے ... !"

"شٹ اپ!" میں نے تلخ لہجہ میں اس کی بات کاٹ دی مجھے ... اختیار سیر زائل اور اس کے وہ ہرکارے یاد آگئے جو مشرقی پاکستان کے مقامی ... بندوں میں منظم طریقہ پر غیر مقامیوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا رہے ... میں نے حقارت کے ساتھ بک ہارٹ سے کہا۔ "تم آوارہ گرد جنس زدہ ... کیا جانو کہ دنیا کے اس سرے پر سازشوں کے کیا جال بن رہے ہیں۔"

"یہی تمہاری غلط فہمی ہے دوست!" وہ میرے اشتعال پر ... مسکرایا۔ "میں نے باقاعدہ پاسپورٹ پر بائیس یورپی اور ایشیائی ممالک کی ... سیاحت کی ہے اور پچھلے چھ ماہ میں ہر جگہ، جہاں بھارتی سفارتخانے موجود ... مشرقی پاکستان کے بارے میں مقامی اور بین الاقوامی زبانوں میں ... بے شمار تصویری کتابچے موجود پائے ہیں۔ قحط زدہ، افلاس سے بے حال پناہ گزینوں اور ننگے بھوکے یتیم بچوں کی تصویریں دیکھی ہیں جنہیں سرحد عبور کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور ان شہروں میں عالیشان پاکستانی سفارت خانے بھی موجود ہیں مگر ان کی جانب سے تردید میں ایک بھی سطر، کوئی بھی کتابچہ حاصل نہ کر سکا۔"

"یہ سب سازش ہے۔" میں غرایا۔ "وہ تصویریں بہار، آسام اور مغربی بنگال کے قحط زدہ خاندانوں کی ہیں۔ یہ پاکستان کے خلاف گھناؤنا پروپیگنڈہ ہے!"

"تو آخر تمہارے اہل کاروں کی خاموشی کیا معنی رکھتی ہے۔ عالمی رائے عامہ ان کے خلاف ہوتی جارہی ہے۔ اگر یہ سچ نہ ہوتا تو وہ خاموش کیوں رہتے۔"

"میں خود ڈھاکہ اور جیسور سے ہوتا ہوا ادھر آیا ہوں اگر وہاں بیرونی مداخلت نہ ہو تو یہ شہر بھی کراچی ہی کی طرح پر سکون ہوں۔"

"اوہ — تم کراچی سے آئے ہو؟" وہ چونک کر بولا۔

میں نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"عجیب شہر ہے وہ بھی!" بک ہارٹ گہرا سانس لیکر بولا۔

میں نے موضوع بدلنے پر اطمینان کا سانس لیا اور اس سے پوچھا۔ "کراچی سے تمہاری کچھ یادیں وابستہ معلوم ہوتی ہیں۔"

"وہاں میں نے تین دن میں چار سو ڈالر کمائے تھے اور یہاں آنے تک وہی رقم میرا ساتھ دیتی رہی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آگے میری مٹی پلید ہوگی تو میں وہیں ڈیرے ڈال دیتا۔"

"کوئی ناپاک دھندا؟" میں نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"میرے دوست صورت سے پارسا تو تم بھی نہیں لگتے۔" وہ میرے طنز کا اثر لئے بغیر ہنسا۔ "چوروں کی طرح سرحدیں عبور کرنے والے معزز اور امن پسند نہیں ہوتے!"

"مگر میں نے جو کچھ کیا اپنی انا اور مردانگی کے خلاف نہیں کیا۔"

"سوچنے کا انداز ہے اپنا اپنا۔" وہ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔ "یہ احتیاط تو میں بھی رکھتا آیا ہوں!"

میں جواب میں کچھ نہ بولا۔ اندھیرے میں کچھ دیر خاموشی کا راج رہا پھر بک ہارٹ کی زبان میں ہی خارش پیدا ہوئی اور وہ نرم آواز میں بولا۔ "کیا خفا ہو گئے؟"

"اپنی چونچ بند ہی رکھو تو بہتر ہے!"

"وہ کراچی والا قصہ نہیں سنو گے؟" اس کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔

میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ اس سے زیادہ بے شرم اور ڈھیٹ شخص ابھی تک میری نظروں سے نہ گزرا تھا اور یہ میری شامت ہی تھی کہ

میں اس پر اپنی انگریزی سے واقفیت کا اظہار کر بیٹھا۔ میں نے اکھڑے ہوئے لہجہ میں کہا "بکو... اندھیرے میں جھک مارنے سے بہتر ہے کہ تم بولتے رہو"۔

"تم کبھی کراچی کے تقریباً قلب میں واقع ہوٹلوں میں گئے ہو، جہاں گرماگرم فلور شو ہوتے ہیں؟" اس نے تمہید کے طور پر مجھ سے سوال کیا۔

"مجھ سے سوال جواب کرنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنی کہانی سنانی ہے تو سناؤ لو مجھے اعتراض نہ ہوگا"۔ میں نے روکھے لہجہ میں کہا۔

"جب تمہیں دلچسپی ہی نہیں ہے تو چھوڑو"۔ اسکا لہجہ بلا سا تھا اسی وقت باہر کسی ٹارچ کی روشنی رینگتی نظر آئی پھر دو آدمیوں کے قریب آنے کی آہٹیں سنائی دیں۔

آہٹیں قریب آکر تھم گئیں اور کرن سنگھ کی کھردری آواز ابھری "لو جی اچھی طرح اپنے قیدی کی مزاج پرسی کر لو۔ میں ذرا اس چھوکرے کو دیکھ لوں"۔ آخری فقرہ یقیناً بک ہارٹ کے ہی بارے میں تھا۔

میں نے کرن سنگھ کے رویّہ کی تبدیلی واضح طور پر محسوس کر لی تھی جب تھوڑی دیر قبل اس نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا تو وہ سنہا سے بہت زیادہ ادب اور احترام سے پیش آ رہا تھا لیکن اس وقت وہ اس سے کسی بے تکلف دوست کی طرح بات کر رہا تھا! شاید ان میں کوئی بات 'غیر قانونی' طے پا چکی تھی۔

کرن سنگھ سفید فام ہپی کی کوٹھری کے سامنے پہنچ کر اس سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں فقرے بازی کرنے لگا۔ اور مجھے سنہا نے دوسرے گوشے میں بلا لیا تاکہ ہماری آوازیں کرن سنگھ کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ ہمارے درمیان آہنی سلاخیں بدستور حائل تھیں۔

"میں کل تمہاری ضمانت کا بندوبست کر لوں گا"۔ سنہا کا لہجہ سرگوشیانہ تھا۔

"سورج طلوع ہونے سے قبل!" میں نے اندھیرے میں چمکتی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے فیصلہ کن مگر دھیمے لہجہ میں کہا۔ "اگر مجھے سلاخوں کے عقب سے باہر آنے میں دیر ہوئی تو میں وہ کر گذروں گا جس سے تم بخوبی واقف ہو چکے ہو"۔

"بکواس مت کرو"۔ وہ کسی بھیڑیئے کی طرح غرایا۔ اس کی دانتوں کی دونوں سفید قطاریں کھلے ہوئے ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہی تھیں اور وہ اس وقت یکسر بدلا ہوا نظر آ رہا تھا "میرے یہاں چلے آنے کا یہ مطلب نہ سمجھو کہ ہم تمہارے سامنے بے بس ہیں۔ تمہاری موت حوالات میں بھی واقع ہو سکتی ہے اور پولیس سرجن اپنی رپورٹ میں اسے خودکشی قرار دے گا"۔

میرا دل اچانک کنپٹیوں میں دھمکنے لگا۔ مجھے اس سے ایسے جارحانہ رویّہ کی توقع نہیں تھی۔ وہ یقینی طور پر یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ کرن سنگھ معقول رشوت کے عوض اس کی مرضی کے مطابق کچھ بھی کر گزرے گا اور یہ بات میرے لئے خطرناک تھی۔ حوالات میں تو پھر بھی شاید کرن سنگھ کو ایسے کسی انتہائی اقدام کے نتائج کے بارے میں سوچنا ... ضمانت پر رہائی کے بعد کوتوالی سے کھلی فضا میں آتے ہی اگر ... کوئی میرا کام تمام کر جاتی تو ان میں سے کسی کا کچھ نہ بگڑتا۔ کچھ دنوں ... کی تلاش کی۔ نام نہاد مہم سرگرمی سے جاری رہتی اور ناکامی کے بعد سرد خانے ... کرن سنگھ سے گفتگو کے بعد سنہا یقینی طور پر یہ دونوں پہلو جانچ چکا ... ہر قیمت پر مجھے خاموش کرنا تھا۔ ضمانت سے پہلے یا بعد۔ اس کا ... رویّہ پر تھا میری پیشانی پر پسینے کے سرد قطرے ابھر آئے۔ لونا ... کے لئے جو چال چلی تھی وہ خطرناک ثابت ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"لہٰذا جو میں کہہ رہا ہوں اسی پر عمل کرو!" سنہا اسی لہجہ ... تھا "رات کے دس بجے دنیا میں کوئی عدالت کھلی نہیں ہوتی۔ ... ایسا ضامن بھی تلاش کرنا ہے جو تمہاری روپوشی کے بعد مشکلات کا ... ہو۔ دوپہر تک تمہاری ضمانت کے کاغذات تیار ہو جائیں گے اور تم ... شام تک رہا کر لئے جاؤ گے۔ یہ میرا وعدہ ہے!"

"میں اندھا جوا کھیلنے کا عادی نہیں سنہا!" میں ... تا ہوا پلٹتے ہوئے کہا تاکہ وہ مجھے بالکل ہی بودا نہ سمجھ بیٹھے۔ "حوالات ... باہر میرے بھی کچھ لوگ موجود ہیں جن کے ہاتھ تمہارے گریبان تک ... ہیں۔ وہ لڑکی جس نے انند بھون فون کیا تھا ایک ایک بات ... ہے اور مجھے ذرا بھی گزند پہنچا تو وہ سارے حقائق قدِ آدم اشتہار ... کی صورت میں نیپال کے گلی کوچوں میں نظر آئیں گے .... غالباً ... سمجھ رہے ہو گے کہ میرا اشارہ کدھر ہے"۔

"وہ لڑکی میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگی صفدر!" ... لہجہ اب بھی سرد، اٹل اور بے رحم تھا "میں کرن سنگھ سے ایک ... معلوم کر چکا ہوں، تم لونا مارٹن کے چکر میں پکڑے گئے تھے اور آج ... ایک لڑکی تم سے ملنے یہاں آئی تھی۔ مجھے پورا شبہ ہے کہ وہ لونا مارٹن ... وہ جو کوئی بھی رہی ہو، انند بھون فون کرنے کے بعد تمہیں اطلاع ... ہو گی۔ لونا کی تصویر برونز آرٹ فیکٹری کے ریکارڈ سے بآسانی مل ... اور کرن سنگھ کی شناخت کے بعد مجھے علم ہو جائے گا کہ فون کرنے والی ... تھی یا کوئی اور — پھر!" وہ ایک ثانیہ کے لئے خاموش ہوا ... حوالات کی آہنی سلاخیں تھامیں اور دبی دبی آواز میں بولا "اند ... وہ مسلح محافظ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی بھاری تنخواہیں پاتے ہیں ... ایسے گورکھے بھی ہیں جو قبر کی مٹی سونگھ کر بتا سکتے ہیں کہ وہاں کس کا ... دفن ہے۔ وہ اس لڑکی کو تحت الثریٰ سے بھی کھینچ نکالیں گے ... میں یہ سب نہیں چاہتا"۔ اس کا لہجہ یک بیک نرم پڑ گیا۔ "مجھے صرف ... تک کی مہلت درکار ہے پھر تم آزاد ہو گے ....!"

"... میرے لئے یہ تمام دھمکیاں بے سود ہیں"۔ میں اس کی ٹھوس ... ہوں پر اپنی تشویش کو چھپاتے ہوئے بولا "بازی میرے ہی ہاتھ ہے۔ صبح ... بھی میں کل شام تک انتظار کر لوں گا مگر اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمہ داری صرف اور صرف تم پر ہوگی"۔

"بس کل شام — یہ میرا وعدہ ہے"۔! وہ جذبات سے عاری ... آواز میں بولا اور حوالات کی آہنی سلاخوں کے سامنے سے ہٹ گیا۔

کرن سنگھ اس سے بے خبر ایلن بک ہارٹ سے کچھ بات کر رہا تھا ... سنہا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑا اور وہ دونوں آپس میں سرگوشیاں کرتے وہاں سے چلے گئے۔

راہداری اب پھر ویران اور تاریک پڑی ہوئی تھی اور فضا ... مچھروں کے تیز شور سے گونج رہی تھی۔ سیلن زدہ کچے فرش پر چوہوں کے دھر ... بھاگنے کی آوازیں ایک بار پھر سنائی دینے لگی تھیں۔

"تمہارا ملاقاتی واقعی کوئی اہم شخص معلوم ہوتا تھا!" کچھ دیر ... سکوت کے بعد ایلن نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔

"ہاں، میرے لئے تو واقعی بہت اہم تھا!" میں نے سرسری انداز ... میں کہا۔

"وہ کرن سنگھ کے لئے بھی اہم ہی تھا دوست!" وہ آہستہ سے ... ہنسا "ورنہ وہ خبیث اسے خود لے کر اتنی رات گئے یہاں نہ آتا۔ بداخلاقی میں شاید کرن سنگھ کا ثانی پیدا ہی نہ ہوا ہو گا"۔

"کم از کم تم پر تو وہ مہربان ہے"۔

"لعنت ہے ایسی مہربانی پر!" وہ تلخ لہجہ میں بولا "لورین تین ... بار مجھ سے ملنے آچکی ہے لیکن ہر بار اس کو باہر ہی سے لوٹا دیا گیا۔ گرفتاری کے بعد ... سے اس کی صورت دیکھنے کو ترس گیا ہوں!"

"کیا وہ اتنی ہی خوبصورت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جو اسے دیکھتا ہے بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے"۔ وہ ہنس کر بولا۔ "مگر جنسِ مخالف میں تمہارے لئے کیا کشش ہے، پتھر کا تراشا ہوا ... نہ دیکھا ایک لڑکی دیکھ لی"۔

"مجھے اس کے جسم سے نہیں فن سے محبت ہے"۔

"اوہ۔ تو فنکار بھی ہے وہ لڑکی؟" میں نے حیرت سے کہا

"ہاں۔ وہ گٹار بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی"۔ وہ فخر کے ساتھ بولا "مہارشی انندرام نے بارہا فرمائش کر کے لورین سے گٹار پر دھنیں سنی ہیں ... بطور خاص کئی ہندی دھنیں تیار کرائی ہیں"۔

"تو تم انندرام کے پیروکار ہو!"

"ہاں — آسان اور فطری زندگی گذارنا ہمارا مقصد ہے اور وہ ... کا پرچار کرتا ہے۔ ہپی ازم کے مقابلہ میں اس کی تعلیمات کہیں زیادہ آفاقی ہیں"۔

"آسان اور فطری زندگی"۔ میں نے آہستہ سے دہرایا پھر اس سے پوچھا "اس میں تو شبہ نہیں کہ تمہاری زندگی بہت آسان ہے۔ کتوں اور بلیوں کی طرح جہاں جی چاہا پڑ گئے، جو ملا کھا لیا مگر تم غیر فطری عادات کا شکار ہو گیا۔ انندرام تمہیں اس سے نہیں روکتا؟"

"غیر فطری عادات؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"میرا اشارہ تمہاری جنسی مصروفیات کی طرف تھا"۔ مجھے وضاحت کرنی پڑ گئی۔

"اوہ — یہ سب تمہارے مفروضے ہیں"۔ وہ لاپروائی سے بولا "جو پسند ہو اور دل میں آئے آدمی وہی کچھ کر گذرے تو یہ قطعی فطری ہو گا"۔

"یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی"۔ میں نے کہا۔

"یوں سمجھو کہ تمہارے معاشرے میں بے شمار لوگ برہنہ تن نازنینوں کو دیکھنا پسند کرتے ہیں مگر بھرے مجمع میں کوئی لڑکی کپڑے اتار دے تو سب اسے آوارہ کہیں گے۔ اس کی برہنگی کا تذکرہ ناپسندیدگی کے الفاظ میں کریں گے یہ طریقہ غیر فطری ہے۔ اصولاً تو انہیں لڑکی پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسانے چاہئیں مگر معاشرتی اقدار سے مجبور ہو کر وہ اس پر سطحی تنقید کریں گے"۔

"یہ وہی کچھ ہے جو پتھر کے دور میں ہوتا رہا"۔

"نہیں۔ اس سے یکسر مختلف ہے"۔ وہ دلائل پر آگیا "اس دور میں انسان نے تصویر کا ایک ہی رخ دیکھا تھا۔ وہ کپڑے سے ناآشنا تھا لہٰذا برہنہ رہتا تھا۔ کاشتکاری کے لفظ سے واقف نہیں تھا۔ لہٰذا جنگلی پھل کھاتا تھا مگر اب انسان ترقی کے ایک ایسے مرحلہ میں ہے جہاں تصویر کا ہر رخ واضح ہو چکا ہے اب اگر کوئی شخص باقاعدہ تجزیہ کے بعد فیصلہ کر لے کہ برہنگی بہتر ہے یا کاشت کے بکھیڑوں کے بجائے خودرو پھلوں پر گزارہ کرنا بہتر اور آسان ہے تو اس کا مقابلہ پتھر کے دور کے پسماندہ اور عقل سے بے بہرہ دوپاؤں والے مویشیوں سے کیوں کر کیا جا سکتا ہے یہ تو کھلی زیادتی ہے"۔

"لورین بھی ہپی ہی ہے؟" اس کی بے مغز گفتگو سے بور ہو کر میں نے لڑکی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"یقیناً۔ وہ کراچی سے میرے ساتھ ہے"۔ بک ہارٹ فخر سے بولا۔ "اور شاید کبھی بھی میرا ساتھ نہ چھوڑے گی میں تو تمہیں اس کا قصہ سنا رہا تھا مگر تم نے دلچسپی ہی نہ لی"۔

"کیا وہ تمہاری بیوی ہے؟"

"بیوی!" اس نے حقارت سے دہرایا "ہمارے درمیان صرف ذہنی ہم آہنگی ہے دیگر ضروریات کی تکمیل کے لئے وہ آزاد اور خودمختار ہے۔ اگر میں نے کبھی اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا تو کسی لڑکی کو بیوی بنانے کے بجائے ایک صحتمند گائے خرید کر اسے ساتھ لئے

پھروں گا۔" پھر لہجہ بدل کر بولا۔ "مویشیوں اور انسانوں میں بڑا فرق ہے مسٹر صفدر ہم ان کے کسی جوڑے کو تو عمر بھر کے لئے ایک اصطبل میں ساتھ باندھ سکتے ہیں مگر انسانوں کے ساتھ یہ ظلم ہے میں صرف مرد ہی نہیں عورت کے بارے میں بھی یہی خیالات رکھتا ہوں۔"

"اپنے خیالات تم اپنی نادرالوجود کھوپڑی میں محفوظ رکھو اور مجھے سونے دو"، میں یک بیک بھنا گیا۔ "اگر اب مجھے اپنا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کی تو ایسی کی تیسی کر دوں گا۔"

"لورین کا وہ کراچی والا قصہ بھی نہیں سنو گے ---؟" اس کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔ "نہیں" میں غصیلی آواز میں غرایا۔ "بکواس بند کرو۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔

میں اس رات پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ دوسرے قیدی نہایت سکون سے گہری نیند سو رہے تھے جیسے وہ ان ہی عفونت زدہ تاریک کوٹھڑیوں کے لئے پیدا کئے گئے ہوں۔ ایلین بک ہارٹ بھی ذرا ہی دیر میں گہری نیند سو چکا تھا۔

مجھے ساری رات رہ رہ کر سنہا کی دھمکیوں کا خیال آتا رہا میں انندبھون کے بہت سے رازوں سے واقف تھا اور گیتارانی میرے بارے میں یہ سوچ سکتی تھی کہ میں کسی بھی وقت اسے دوبارہ بلیک میل کرنے کی کوشش کروں گا! ایسی صورت میں وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے نجات پانے کا فیصلہ کر لیتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ سنہا کے لئے یہ سارا کام بڑا آسان تھا۔ ضمانت پر رہائی کے بعد وہ کرائے کے قاتلوں کے ذریعے مجھے باآسانی راہ سے ہٹا سکتا تھا۔ رہ جاتی لونا۔ تو اس کی تصویر کی شناخت کے بعد وہ اسے بھی تلاش کر سکتا تھا۔

لونا کا خیال آتے ہی میں بے چین ہو گیا۔ نہ جانے وہ بدنصیب سہمی ہوئی لڑکی کہاں، اور کس حال میں ہو گی جب تک وہ مجھ سے دور رہی گھر اور ملازمت دونوں جگہ سکون حاصل رہا لیکن مجھ سے شادی کی پہلی ہی رات اسے اپنے ہم مذہب نوجوانوں کی شوریدہ سری کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اب ایک طرف اس کے ہم مذہب اس کے لہو کے پیاسے تھے کیونکہ اس نے ایک مسلمان سے شادی کر کے، اسلام قبول کر کے ان کی مذہبی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی تو دوسری طرف سنہا کے ہرکارے ہر طرف اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ ایک بیک میرا دل کانپ اٹھا۔ وہ بدنصیب سہاگن زندگی اور موت کی ایک ہولناک جدوجہد میں مصروف تھی۔ اور میں آہنی سلاخوں کا بے بس قیدی۔

اگلا دن طلوع ہوا۔ حوالات کے دوسرے قیدی مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں کہیں لے جائے جانے لگے۔ ان ہی میں بک ہارٹ بھی تھا اب میں وہاں تنہا رہ گیا تھا۔

وہ دن صدیوں طویل تھا --- لمحے گزرنے کا نام نہ لیتے تھے خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ پیشی کے لئے لے جائے جانے والے قیدی واپس لائے گئے تو ان میں ایلین بک ہارٹ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بے ذائقہ پتلی دال اور کرکری روٹی پر مشتمل رات کا کھانا کھا کر مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ سنہا یا اس کے کسی نمائندے کا نام و نشان نہیں تھا۔

نو بجے کے قریب ایک سپاہی حوالات کی طرف آیا اور دروازے کا قفل کھولنے لگا۔ بے اختیار میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔!

دروازہ کھولنے کے بعد سپاہی نے میری ہتھکڑیاں تھامیں اور دفاتر کی جانب لے چلا۔ وہاں کرن سنگھ ایک پستہ قامت، ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ موجود تھا اور اس کے سامنے میز پر کچھ عدالتی کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔

"ہتھکڑیاں کھول دو!" کرن سنگھ کی آواز گونجی سپاہی نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی۔

"معاف کرنا صفدر بھائی --- مجھے کافی دیر ہو گئی۔" پستہ قد ادھیڑ عمر شخص ہکلاتے ہوئے جلدی جلدی بولا اور میں اپنے اس نامعلوم ہمدرد کو دھیمے سے مسکرا دیا۔

"تمہاری ضمانت ضرور ہو گئی ہے مگر جمعرات کو صبح نو اور گیارہ کے درمیان تمہیں کوتوالی میں حاضری دینی ہو گی!" کرن سنگھ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"بہتر جناب!" میں نے سر جھکا کر کہا ابھی جمعرات آنے میں پورے تین دن تھے۔! اس نے چند کاغذات پر میرے دستخط لئے، ضامن کے دستخط کرائے اور مجھے مژدہ سنا دیا کہ اب میں آزاد ہوں۔ میری وہ چیزیں بھی اس نے میرے حوالے کر دیں جو گرفتاری کے وقت اس نے مجھ سے لے لی تھیں!

میں سر جھکائے اس کے دفتر سے نکل گیا۔ میرا ضامن تیز تیز قدموں سے چلتا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ کوتوالی کے وسیع اور نیم تاریک احاطے میں وہ مجھے آ لیا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔ "تم میرے لئے اجنبی ہو صفدر بھائی۔" اس کے لہجے میں ہکلاہٹ کا عنصر بدستور شامل تھا۔ "مگر میں نے اپنے کچھ شناساؤں کی سفارش پر تمہاری ضمانت کرائی ہے مجھے یقین ہے کہ یہ کام میرے لئے دشواریوں کا سبب نہیں بنے گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے سر اس کی جانب گھما کر آہستہ سے پوچھا۔

"جوگیندر ناتھ ---!"

"تمہاری دشواریوں سے باخبر ہوں۔ تم بے فکر رہو!" میں نے اس سے کہا۔

پھر ہم خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ احاطے میں ایک طرف اس کی کار موجود تھی --- وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا اور میں احاطے سے نکل کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔

میں لونا کے بارے میں سوچتا ہوا آہستہ آہستہ آگے چلا جا رہا تھا۔ اس علاقے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ آبادی پر بھی عجیب خوابناک خاموشی

مسلط تھی کہ اچانک عقب سے کسی جیپ کے انجن کا تیز شور سنائی دیا اور میرے سامنے پھیلی ہوئی سیاہ سڑک روشنی میں نہا گئی۔

اسی وقت میری چھٹی حس نے خطرے کا نعرہ بلند کیا۔ گو کوتوالی سے نکلتے ہوئے میں نے پھاٹک کے سامنے تاریکی میں ایک جیپ کھڑی ہوئی دیکھی تھی جس میں دو تاریک ہیولے موجود تھے۔ اس وقت تو میں نے جیپ کی موجودگی کو کوئی اہمیت نہ دی مگر اب اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ جیپ وہاں میری نگرانی پر مامور کی گئی تھی اور اس میں موجود افراد کسی نہ کسی طرح میرے دشمن تھے اور اب آنے والی جیپ کوتوالی ہی کی جانب سے آ رہی تھی لہٰذا میں حفظِ ماتقدم کے طور پر تیزی کے ساتھ آگے دوڑ پڑا تاکہ جیپ کے گزرنے تک چند قدم کے فاصلے پر واقع درخت کے تنے کی اوٹ میں پناہ لے سکوں۔!

مجھے بھاگتے دیکھ کر جیپ والے میرا ارادہ بھانپ گئے، جیپ کے انجن کا شور یک بیک اور تیز ہو گیا۔ ہیڈ لیمپس کی چکا چوند کر دینے والی روشنیاں عقب سے بالکل میرے سر پر آ پہنچیں اور جب میں نے درخت کے تنے کی آڑ لینے کے لئے آخری چھلانگ لگائی تو عین اسی وقت پیچھے سے فائر ہوا اگر خوش قسمتی سے میرا پیر پھسل نہ جاتا تو بائیں شانہ کی جلد ادھیڑنے والی گولی دل ہی میں اتری ہوتی۔ میں ہلکی سی چیخ مار کر نیچے گرا اور پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا درخت کے تنے اور ایک قد آدم دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ اس وقت تک جیپ بالکل قریب آ پہنچی تھی۔ درخت سے چند گز دور حملہ آوروں نے پوری قوت سے بریک لگائے سڑک پر جیپ کے ٹائر بری طرح چیخ اٹھے اور جیپ لہراتی ہوئی فٹ پاتھ کے کنارے سے آ لگی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا مگر روشنیاں گل کی جا چکی تھیں، جیپ رکتے ہی ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سے ایک دراز قد، قوی ہیکل سایہ کود کر نیچے اترا اس کے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی نال درخت کے تنے کی جانب اٹھی ہوئی تھی اور وہ خود بھی اسی طرف آ رہا تھا۔!

میرے بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل چکے تھے۔ درخت اور احاطے کی دیوار کے درمیان میں زیادہ دیر اس قوی ہیکل، مسلح حملہ آور سے نہ بچ سکتا تھا اور اگر وہاں سے نکل کر بھاگتا تو کھلی جگہ میں اس کو نشانے کی زیادہ آزادی ہوتی۔ میرے لئے حیرت ناک بات یہ تھی کہ ایک فائر کی گونج ابھرنے کے باوجود وہاں بدستور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ورنہ قرب و جوار کے رہنے والوں کی آمد ہی حملہ آوروں کو بوکھلانے کے لئے کافی ہوتی!

میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ساری صورتحال کا جائزہ لیا اور غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ احاطے کی دیوار کی طرف اٹھ گئے، میں نے انگلیاں دیوار کی کگر پر جمائیں اور میرا بدن اس کی گرفت کے سہارے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ حملہ آور نے بھاگتے بھاگتے مجھ پر فائر کیا۔ گولی نے دیوار ادھیڑ ڈالی۔ اتنی دیر میں، میں دیوار سے اندر کود چکا تھا۔ میرے کودتے کودتے اس نے ایک اور فائر کیا مگر اس وقت تک میں اس کی زد سے نکل چکا تھا۔

اس احاطے میں ہر طرف مختلف قسم کی گاڑیوں کے ناکارہ ڈھانچے بکھرے ہوئے تھے اور بظاہر وہاں کسی ذی روح کا پتہ نہیں تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے وہ بے مصرف مشینی ہیولے اس وقت آسیبی سماں باندھ رہے تھے، ایک لحظے کے لئے میں نے سوچا کہ وہیں چھپ جاؤں مگر فوراً ہی میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔

میرا تعاقب کرنے والا جو کوئی بھی تھا ہر قیمت پر مجھے ٹھکانے لگانے پر تلا ہوا تھا۔ کئی کوششیں ناکام ہونے کے بعد اب وہ کسی بھی لمحے اندر کود سکتا تھا۔ اور اگر وہ اپنی مدد کے لئے اپنے ساتھی کو بھی اندر بلا لیتا تو میں ان کے خلاف اپنا مؤثر دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس احاطے میں پوری قوت سے اس دیوار کی مخالف سمت میں دوڑ پڑا جد ھر سے میں اندر کودا تھا کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کی دوسری طرف کچھ دور تک میدان پھیلا ہوا تھا۔ جس کے اختتام پر ایک اور قد آدم دیوار نظر آ رہی تھی۔ اس دیوار میں داہنی جانب ایک بڑا سا آہنی پھاٹک تھا جو اس وقت یقیناً مقفل رہا ہو گا --- میں نے پھاٹک آزمانے اور وقت ضائع کرنے کا خطرہ مول لئے بغیر احاطے تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ اختیار کیا اور ذرا ہی دیر میں اس پار کود گیا۔

یہ حصہ نسبتاً خاصا روشن تھا۔ رات گزر جانے کے باعث سڑک پر دور تک کسی کا پتہ نہیں تھا۔ ادھر آنے کے بعد مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ حملہ آوروں نے مجھے ٹھکانے لگانے کے لئے اس علاقے کا انتخاب کیوں کیا۔ یہاں ایک بھی رہائشی مکان نہیں تھا۔ بیشتر علاقہ دفاتر اور بڑے بڑے صنعتی گوداموں پر مشتمل تھا۔ اب مجھے جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا کیونکہ مجھے احاطے میں موجود نہ پا کر مجرم دوسری طرف بھی آ سکتے تھے!

میں دوڑ کر سڑک عبور کر رہا تھا کہ ایک قریبی گلی میں جیپ کا شور سنائی دیا۔ شاید حملہ آور اس احاطے کی نوعیت اور ساخت سے بخوبی واقف تھے لہٰذا ان کا ایک آدمی میری تلاش میں اندر کودا ہو گا اور دوسرا وقت ضائع کرنے کے بجائے جیپ لیکر دوسری طرف آ رہا تھا تاکہ مجھے ہر طرف سے گھیرا جا سکے۔

میں پوری قوت صرف کرنے کے باوجود خود کو موڑ پر گھومتی ہوئی جیپ کی تیز روشنی کی زد سے نہ بچا سکا۔ چلتی جیپ سے کوئی اونچی آواز میں چیخا۔ پھر جیپ روک دی گئی۔ اس بار اس کا انجن بھی بند کر دیا گیا تھا اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نیچے کود کر میری طرف آ رہا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہ بھی نہتا نہ ہو گا جب کہ میرے غیر مسلح ہونے کے بارے میں ان دونوں کو پورا یقین تھا میں ابھی ابھی ضمانت پر رہا ہو کر کوتوالی سے نکلا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ سپاہیوں نے مجھے مسلح نہ رہنے دیا ہو گا۔

اس وقت مجھے بے اختیار وہ خاموش ریوالور یاد آیا جو میں نے انندبھون میں نرائن داس سے چھینا تھا۔ اس نے کئی نازک مرحلوں پر میری مدد کی تھی۔ حتیٰ کہ

امیر خان سے جان چھڑانے کے لئے بھی مجھے وہی خونی ریوالور استعمال کرنا پڑا تھا اور آخر میں نے خود ہی اسے ایک گٹر میں پھینک دیا تھا۔!

آنے والے نے ایک ثانیہ کے لئے رک کر مجھ پر فائر کیا اور میں چکرا کر سڑک پر گر گیا۔ گولی حالانکہ دور ہی سے گزری تھی مگر میرے لئے اب مکاری کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ میں نے گرتے ہوئے اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے دبا لیا تھا اور آنکھوں کی جھری بنا کر آنے والے کو دیکھ رہا تھا اس وقت میرا دل کسی لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اگر اسے میری مکاری کا ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو اس کی انگلی کی ایک ہی جنبش میرا کام تمام کر دیتی۔ مجھے گرتے دیکھ کر اس کے بھاگنے کی وحشیانہ رفتار قدرے اعتدال پر آئی اور آخرکار وہ میرے بے حس و حرکت جسم سے تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ اس طرف روشنی ناکافی ہونے کی بنا پر اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ میں مر چکا ہوں یا زخم کے باعث صرف بیہوش ہوا ہوں۔ اس نے ایک دو بار ریوالور کی نال میرے ساکت بدن کی جانب سیدھی کی اور میں لرز اٹھا آخر اس نے ریوالور اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ بیہوشی اور موت دونوں ہی صورتوں میں اس کے لئے بے ضرر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آیا اور ٹھوکر سے میرا چہرہ سیدھا کرنے لگا۔ میں نے سانس روک کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس موقع کا انتظار کرنے لگا جب اس کا پیر میرے ہاتھوں کی براہِ راست زد میں آئے۔!

میری گردن گھمانے کے بعد اس قوی ہیکل شخص نے میری پسلیوں میں جوتے کی نوک پھنسا کر میرا بدن بھی سیدھا کرنا چاہا اور میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی ٹانگ پکڑ کر اس بری طرح مروڑی کہ وہ کسی زخمی درندے کی طرح غراتا ہوا منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔ اس کی ٹانگ بدستور میری گرفت میں تھی۔

میں نے اس کی ٹانگ کو ایک اور شدید جھٹکا دیا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے اس کی بیلٹ سے ریوالور کھینچ لیا۔ اس کے بعد میرا کام بہت آسان تھا۔ میں نے اس کی پشت سے بائیں پہلو پر پسلیوں کے درمیان فائر کیا اور اس نے ایک تیز ہچکی لے کر دم توڑ دیا۔

میں نے اس کے ہولے ہولے کانپتے ہوئے بدن پر موجود خون آلود لباس کی تلاشی لی اور جلد ہی جیپ کی چابیاں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیپ کے ذریعے میں جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل سکتا تھا!

اس بے جان لاش کو چھوڑ کر میں جیپ کی طرف ہو لیا۔ جیپ اسٹارٹ کی تو مرنے والے کے دوسرے ساتھی کی کھوپڑی ناکارہ گاڑیوں کے احاطے کی دیوار کے عقب سے طلوع ہوتی نظر آئی۔ اب میرے پاس ایک بھرا ہوا ریوالور موجود تھا اور میرے حواس بھی ایک فتح کے بعد بحال ہو چکے تھے۔ میں جیپ کو آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔!

دوسرا شخص اب سڑک پر آ چکا تھا اور جیپ ہی کی طرف نگراں تھا۔ میں نے ہیڈ لیمپس روشن کر لیئے تھے تاکہ چکا چوند کے باعث وہ اپنے ساتھی کے بجائے کسی اور کی موجودگی نہ دیکھ سکے۔!

اس سے چند گز دور میں نے جیپ کی رفتار سست کر لی ... پیر بریک پر رکھ دیا تاکہ اسے آخری لمحہ تک میرے عزائم کا اندازہ نہ ہو ... ہاتھ لہرا لہرا کر کچھ کہہ رہا تھا مگر اس کی آواز مجھے نہ سنائی دی۔ جب گاڑی ... دس بارہ فٹ دور رہ گئی تو میں نے اچانک داہنا پیر ایکسیلیٹر پر ... اسی کے ساتھ بائیں پاؤں نے کلچ کو آزاد کر دیا۔ گاڑی کا انجن ... جیپ کسی درندے کی طرح غرا کر آگے کو لپکی۔ اس نے چیختے ہوئے ... وسط میں بھاگ کر خود کو بچانا چاہا مگر میں اس کے ردِ عمل کے لئے تیار ... اسٹیئرنگ کو ہلکا سا گھمایا! ایک شدید دھماکے کے ساتھ جیپ کو ... اس بد نصیب کی ہولناک چیخیں رات کے سناٹے میں گونجیں اور ... جیپ کے بمپر اور سڑک کے درمیان پھنسا پہیوں کے ذریعے کافی دور تک ... چلا گیا اس کی چیخیں چند ہی سیکنڈ میں دم توڑ چکی تھیں۔

میں نے کچھ دور جا کر جیپ روک دی۔ انجن بند کر کے چابی ... ہی میں چھوڑی اور نیچے اتر آیا۔ میرے گمنام دشمن کی خون میں لتھڑی ... لاش جیپ کے نچلے حصے میں پھنسی ہوئی تھی۔

میں نے اس معرکے میں ہاتھ آیا ہوا ریوالور جیب میں ... اور آگے ہو لیا۔ یہ دو لاشیں سنہا کی کمینگی کا نہایت مناسب انعام تھیں ... ساتھ اب مجھے جلد از جلد یہ شہر چھوڑ دینا تھا۔ اس شکست کے بعد ... تلاش میں اپنے تمام تر وسائل حرکت میں لے آتا۔ دوسری طرف میں لونا ... اس شہر کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لہٰذا اب اس کی تلاش ہر کام پر مقدم تھی۔

لونا واقعی ایک عظیم اور قابلِ پرستش لڑکی تھی۔ وہ ... ظالم اور سوتیلے باپ کی زیادتیوں کا شکار ہوتی رہی۔ وہ حالات کی ... پستی رہی اور اپنے سوتیلے باپ کو شراب اور جوئے کے لئے ... فراہم کرتی رہی کہ اس کی آبرو کا نکھار ماند نہ پڑنے پائے۔ ... سے تمام تر ظلم اور ستم کے باوجود اسے جذباتی لگاؤ تھا۔ سوتیلا ہی ... اس کا باپ تھا۔ اور وہ آخر تک ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار ... تھی کہ وہ خود مجھ سے وابستہ ہو جائے اور سعدور مارٹن کٹمنڈو کی ... پر سسک سسک کر دم توڑ دے ... وہ لڑکی برونز آرٹ فیکٹری ... ٹکرائی تو شروع میں مجھے آوارہ منش نظر آئی، ان آبرو باختہ لڑکیوں ... جو کاکل و رخسار اور ناز و ادا کے جلوے لٹا لٹا کر رقم کے انبار سمیٹتی ... میں بھی محض حیوانی جذبوں کی یلغار میں کھو کر اس کی مسکراہٹوں کا جواب ... مگر جب وہ میرے قریب آئی اور مجھے اس کے حالات کا علم ہوا تو اس ... کی عظمت کے سامنے میرا سر خم ہو گیا، اس کی سیج سے کلیاں چرانے ... دم توڑ گیا! اپنے افسوسناک پس منظر کے ساتھ وہ بہت معصوم ... اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل محبت کے جذبے سے معمور تھا، تھی ... بشرطیکہ کوئی بے غرض اور قابلِ اعتماد شخص اس کی طرف پیش دستی کرے، اس کی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ ہوسناک عزائم سے بھرپور ہوتی، تیوروں میں ذلت و گناہ کے عفریت انگڑائیاں لیتے نظر آتے اور وہ اپنی قبائے عصمت لوالہاتشام پنجوں سے بچانے کے لئے اپنی ذات کے خول میں دبک جاتی اور اس وقت تک میں ذہنی اور جسمانی آوارگیوں کا ہر روپ دیکھ چکا تھا میں نے گلنار کو چاہا تھا جو درحقیقت گندے بازاروں کی ایک گراں جنس تھی اور اپنے آشنا اکبر کی مدد سے میری جیبیں صاف کرنے کی نیت سے میری راہ پر لگ گئی تھی اسے ہلاک کرنے کے بعد میرے فریب خوردہ جذبوں کی پیاس اور بڑھ چکی تھی۔ میرے لاشعور کو کسی ایسے خوبرو پیکر کی تلاش تھی جو میری تھکا دینے والی صبر آزما جدوجہد میں خلوص اور وفا کے ہر معیار پر پورا اترے اور یوں میں نے لونا کو اور اس نے مجھے قبول کر لیا۔ اس نے مجھے پانے کے لئے اتنی بڑی قربانی دی کہ اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہا، اپنے معاشرے سے کنارہ کیا مگر میں حالات کے دھارے میں ایسا بے بس تھا کہ اسے شبِ عروسی کی وہ مسرتیں بھی نہ دے سکا جن کے انتظار میں وہ برسوں سے زندہ تھی!

میں اس بار اتنی بری طرح قانون کی گرفت میں آیا تھا کہ گلو خلاصی ناممکن نظر آ رہی تھی مگر لونا کی جرأت نے اسے ممکن بنا دیا۔ انند بھون کے لیکن مجھے رہا کرانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میرے رہا ہوتے ہی انہوں نے اپنی دانست میں میری ہلاکت کا جامع منصوبہ بنا لیا تھا۔ مگر اب میں زندہ تھا اپنے دشمنوں کے ایک مہلک وار سے بچ چکا تھا اور وہ بے آسرا و تنہا لڑکی اپنے پرانے ہم مذہب لوگوں کے خونیں انتقام سے بچنے کے لئے نہ جانے شہر کے کن تاریک و گمنام گوشوں میں چھپی پھر رہی تھی۔ اس کا وعدہ۔ آخری وعدہ ابھی تک میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ حالات میں مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے نمناک آنکھوں کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں جو کچھ کہا تھا وہ رہ رہ کر میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

”میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ہاں اس شہر سے نہ جاؤں گی، یہ میرا وعدہ ہے!“ اس وعدے کو آج دوسرا دن تھا!

میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اب میری بیوی بن چکی تھی اور میرے لئے یہ ممکن نہ رہا تھا کہ میں انند بھون والوں کے کسی متوقع نئے وار سے بچنے کے لئے لونا صفدر کو بے یار و مددگار چھوڑ کر شہر سے نکل جاؤں!

میں تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا کہ ایک فٹ پاتھ پر کئی غیر ملکی ہپیوں کا اجتماع نظر آیا اور میرے قدم غیر ارادی طور پر اسی طرف بڑھ گئے۔ وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں میلے اور شکستہ لباسوں میں فٹ پاتھ پر دراز تھے، ان میں سے ایک لڑکا ایک مشہور امریکی گانا گانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھی لڑکھڑائی ہوئی آواز میں داد دے دے کر اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔!

میں ان کے پاس جا کر رک گیا، میری بے چین نظروں نے ان کا جائزہ لیا لیکن لونا کا ہنستا مسکراتا چہرہ تہذیب کے باغیوں کے اس جھنڈ میں کہیں نہ تھا۔

”سنو!“ اچانک میں نے بلند آواز میں انہیں مخاطب کیا۔

گانے والے کی بے ہنگم آواز حلق میں گھٹ گئی بیک وقت کئی چہرے ناگواری کے بوجھل احساس کے ساتھ میری جانب گھومے اور ایک دراز قامت دبلی پتلی لڑکی نے بگڑی ہوئی انگریزی میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔؟“

مجھے اچانک خیال آیا کہ لونا نے وہ رات ہپیوں کے کسی غول میں بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جبکہ میں ہپیوں کے تمام ٹھکانوں سے ناواقف تھا۔ اس ضمن میں زمین پر اوندھے ہوئے ان نیم وحشیوں سے کسی مدد کی توقع فضول تھی۔ ہاں اگر میرے حوالاتی ساتھی ایلین بک ہارٹ کی گٹار نواز دوست لورین کا پتہ چل جاتا تو شاید وہ بک ہارٹ کا حوالہ دینے پر مدد کو تیار ہو جاتی اور ایلین بک ہارٹ نے جن الفاظ میں اس کے گٹار بجانے کی تعریف کی تھی اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہپیوں میں خاصی مقبول ہو گی اور اس کا سراغ بآسانی مل سکتا ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے پوچھا۔ ”لورین نامی گٹار بجانے والی اس وقت کہاں مل سکے گی۔!“

”لورین!“ ان میں سے ایک لڑکی اچھل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور تلخ لہجے میں بولی۔ ”وہ کتیا ہے۔ گٹار کیا بجا لیتی ہے، دماغ آسمان پر پہنچا ہے میں اس سے آدھی رقم میں یہ رات تمہارے ساتھ گزارنے پر تیار ہوں۔ خوش نہ ہو تو ایک پیسہ نہ دینا۔!“

دوسرے ہپی اب ہم دونوں سے لاتعلق نظر آنے لگے تھے گلوکار کی پھٹی پھٹی آواز ایک بار پھر سناٹے کا سینہ مجروح کرنے لگی تھی، ایک لڑکی اوندھی ہو کر سگریٹ جلا رہی تھی جس کے تمباکو کے دھوئیں میں چرس کی مخصوص بو نمایاں تھی۔!

”مجھے رات کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں!“ میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”دراصل مجھے لورین کے ایک بوائے فرینڈ سے ضروری کام ہے۔“

”بکواس۔ بکواس!“ وہ لا پروائی سے فضا میں ہاتھ لہرا کر بے اعتباری سے بولی۔ ”تم لوگ صرف خوبصورت چہروں کے شیدائی ہو، میری طرف دیکھو مجھ میں کیا برائی ہے۔ اندھی ہوں؟ لنگڑی ہوں؟ حاملہ ہوں؟ آخر مجھ میں کیا کمی ہے پھر معاوضہ بھی نصف۔“

میرا جی چاہا کہ اس کے چہرے پر ایک بھرپور گھونسہ رسید کر دوں۔ پھر اسے بتاؤں کہ اس کی کھوپڑی میں بھیجے کا قحط واقع ہوا ہے لہٰذا وہ مفت

میں بھی مہنگی ہے مگر املیکھ گنج میں ہپیوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں مالی زک اٹھا کر مجھے تجربہ ہو چکا تھا کہ ہپی مجرمانہ کارروائیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اندھا تعاون کرتے ہیں لہٰذا میں مٹھیاں بھینچ کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔!

میں چند ہی قدم بڑھا تھا کہ وہ لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور آگے آ کر میرے راستے میں حائل ہو گئی "مسیح کا واسطہ! مجھے یوں نہ ٹھکراؤ، میری ساتھی لڑکیاں کل کے لئے معقول پیسے کما چکی ہیں اور میں بالکل قلاش ہوں لورین کا بس نام ہی نام ہے، اس پر پیسہ برباد نہ کرو، مجھے صرف دو تین روپے درکار ہیں وہ دے کر تم مجھے ساری رات کے لئے خرید سکتے ہو!" میرے چہرے پر اپنی التجا کا کوئی اثر نہ دیکھ کر اس کی آواز میں یاسیت ابھر آئی "مال زیادہ اور گاہک کم ہوں تو ہر چیز کی یہی ناقدری ہوتی ہے، نہ جانے ساری دنیا کے ہپی سیاح اس وادی میں کیوں مرنے چلے آتے ہیں۔"

"سنو لڑکی!" میں نے مضبوطی سے اس کا شانہ تھام کر کہا "مجھے تمہاری معاشیات اور جنس سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر تم مجھے لورین تک پہنچا دو تو میں تمہیں دو کے بجائے پانچ روپے دوں گا۔!"

"سچ!" اس نے خوشی اور بے اعتباری سے میری طرف دیکھا۔

میں نے پانچ روپے کا نوٹ چٹکی میں دبا کر اس کے چہرے کے سامنے نچایا۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک پیدا ہوئی اور وہ میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی۔

"کھٹمنڈو چوک میں اونچے اونچے بانسوں پر لہراتے جھنڈوں سے گھرا جو بدھوں کا اسٹوپا واقع ہے، وہ عام طور پر اسی کے عقب میں رہتی ہے، مگر رات کے وقت وہ ایک عمارت کے شکستہ کھنڈرات میں سوتی ہے، جہاں ہپیوں کا سب سے بڑا کیمپ ہے!" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "وہ جگہ رات میں عموماً مخدوش ہوتی ہے۔"

میں نے اس کی معلومات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مخدوش ہوتی ہے تو ہوا کرے۔!

یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ میں اس سے باتیں کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ وہ خاموش رہی۔ وہ اپنے اکلوتے گاہک کو ناراض کر کے پانچ روپے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

بدھ طرزِ تعمیر کے اونچے اونچے کئی منزلہ چوبی مکانات سے گھری تنگ اور نیم تاریک گلیوں سے گزرتے گزرتے آخر نصف گھنٹے بعد ہم آبادی کے عقب میں واقع ایک وسیع پتھریلے میدان کے قریب پہنچ گئے۔ اس ناہموار میدان کی دوسری جانب قدیم عمارتوں کے سیاہ کھنڈرات نظر آ رہے تھے۔ وہاں اِکا دُکا مقامات پر روشنی سی نظر آ رہی تھی۔ ساتھ ہی ہولکے دوش پر کچھ ملی جلی انسانی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

"ذرا یہاں سنبھل کر چلنا۔" میدان میں داخل ہوتے ہوئے اس لڑکی نے کسی مقامی گائیڈ کی طرح پیشہ ورانہ اعتماد کے ساتھ کہا۔ "یہاں زہریلی جھاڑیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں پہاڑی بچھو بکثرت پائے جاتے ہیں اور اپنی تنہائی میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔!"

"کیا ہمیں ان ہی کھنڈرات میں جانا ہے؟" میں نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں — یہ اس شہر میں ہپیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔" ساتھ ہی وہ سوال کر بیٹھی۔ "تمہارا رنگ ضرور گندمی ہے مگر مقامی نہیں معلوم ہوتے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اس شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ قلاش ہپیوں کا سب سے بڑا ٹھکانا کہاں ہے اور لورین کو بھی بے شمار مقامی اچھی طرح جانتے ہیں مگر تم نے صرف پتہ معلوم کرنے کے لئے مجھے پانچ روپے دیئے ہیں!" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"میں آج ہی بڈگاؤں سے آیا ہوں!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ —!" وہ حیرت سے بولی "تم اس پراسرار شہر میں رہتے ہو؟ میں ایک مرتبہ اس قدیم شہر میں جا چکی ہوں۔ وہاں کی آبادی کم ہے مگر مقامی بہت پُراسرار سے ہیں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ہر آن یہ دھڑکا رہتا ہے کہ وہ کسی معجزہ کا اظہار نہ کر بیٹھیں۔!"

میں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی کیونکہ میں نے کبھی بڈگاؤں کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ ہاں یہ ضرور معلوم تھا کہ نیپالی تاریخ کے تین قدیم شہروں میں ایک بڈگاؤں ہے اور کھٹمنڈو سے جنوب مشرق کی طرف جانے والی ایک پہاڑی سڑک اسی شہر پر ختم ہوتی ہے۔!"

وہ عظیم الشان کھنڈرات کئی ایکڑ کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی باقیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن بے حال اور لاوارث آثاروں پر ہیں اس خطے کے کسی مطلق العنان حکمران کا محل یا قلعہ رہا ہو گا۔ مگر ملبے کے ڈھیر میں بدل چکا تھا۔ ہپیوں نے جا بجا پہاڑی پتھروں کی اور منڈیریں بنا کر اپنے عارضی "مکان" بنائے ہوئے تھے۔ سر پر کھلا آسمان ہونے کے باوجود کھنڈرات کی فضا بوجھل اور غلیظ محسوس ہو رہی تھی۔ دور دور تک بے شمار ہپی بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے، کچھ سوئے تھے اور کچھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کھنڈرات کے آخری سرے پر دو موم بتیاں روشن تھیں جن کی بھڑکتی ہوئی زرد لہریں اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ زمین سے چند انچ اور بعض جگہ چند فٹ اوپر وقفے وقفے سے ننھے ننھے روشن نقطے جگنوؤں کی طرح چمکتے اور ماند پڑتے رکا دکا ہپی اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے!

"یہاں کسی سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بیک وقت کئی چاقوؤں کے تیز پھل تمہارے بدن میں اتر جائیں گے اور لاش صبح ہونے سے پہلے میں دفن کر دی جائے گی!" اچانک میرے داہنے شانے کے قریب میرے ساتھ آنے والی لڑکی کی سرگوشی ابھری "بظاہر یہ سب لاابالی اور بے ضرر لگتے ہیں مگر اپنے معاملات میں نہایت منظم ہیں۔ ان کھنڈرات کا کوئی راز باہر نہیں نکلتا۔!"

میں پھر بری طرح لرز کر رہ گیا۔ داہنا ہاتھ جیب میں ڈال کر ریوالور کے آہنی دستے کی ٹھنڈک محسوس کی اور زمین پر پڑے ہوئے ہپیوں سے بچتا بچاتا آگے بڑھتا رہا۔ مجھے وہم ہو چلا تھا کہ میں جدال و قتال اور ہنگاموں سے جتنا بچنا چاہ رہا تھا، مقدر اسی شدت سے مجھے ایسے مہلک حالات کی طرف دھکیل رہا تھا۔!

وہ لڑکی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک انسانی ہیولے کو دیکھتی آگے بڑھتی رہی تھی۔ جب ہمیں وہاں بھٹکتے کافی دیر گزر گئی تو وہ رک کر بولی۔ "شاید لورین سو چکی ہے ورنہ اس کے گٹار کی آواز دور ہی سے ہماری رہنمائی کرتی۔ اب اندھیرے میں یوں بھٹکنا بے سود ہے، کسی سے پوچھ لیتے ہیں!"

"پوچھو — تم ہی کسی سے پوچھو!" میں نے کہا۔

"لورین اس وقت کہاں ملے گی!" لڑکی نے قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک جوڑے سے سوال کیا۔

اس سے قبل کہ وہ دونوں کوئی جواب دیتے۔ مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک لڑکھڑاتی ہوئی بھاری مردانہ آواز ابھری۔

"میں بتاتا ہوں۔!"

میں تیزی سے پلٹا اور دم بخود رہ گیا۔ ایک قوی ہیکل، خطرناک صورت والا دراز قد ہپی چمڑے کی پھٹی ہوئی جیکٹ اور جین پہنے میرے سر پر موجود تھا۔ اندھیرے میں اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے شکاری چاقو کا لمبا پھل نمایاں طور پر چمک رہا تھا۔!

میں نے کھنڈرات میں بھٹکتے ہوئے ایک دو بار اس کو اپنے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا مگر اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شروع ہی سے ہمارے تعاقب میں تھا!

اس ساڑھے چھ فٹ دیو نے چمکدار سیاہ آنکھوں سے مجھے گھورا، پھر سرد اور بے رحم آواز میں بولا۔ "جیب میں جو کچھ ہے نکال دو ورنہ میرا چاقو" ہنستے ہوئے اس نے آٹھ انچی لمبے چمکدار پھل کو بوسہ دیا۔ "تمہاری آنتیں باہر نکال دے گا!"

معاً میرا جی چاہا کہ جیبیں جھاڑنے کے بہانے ریوالور نکال کر اس خبیث کو مہلت دیئے بغیر اس کی ساتویں اور آٹھویں پسلی کے درمیان بائیں پہلو میں ایک خوبصورت سا سوراخ بنا دوں لیکن میری رہنما مجھے اس بارے میں پہلے ہی تنبیہ کر چکی تھی۔ میں اُسے تو بآسانی مار سکتا تھا۔ مگر کھنڈرات میں پھیلے ہوئے ٹڈی دل سے بچ نکلنا میرے لئے محال تھا! رات میں اس جگہ کے مخدوش ہونے کا مفہوم اسی وقت میری سمجھ میں آ سکا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے۔" میری ساتھی تنک کر اس سے بولی "تم میرے گاہک کے ساتھ لوٹ مار نہیں کر سکتے۔ یہ سراسر ظلم ہے۔!"

اس نے بائیں ہاتھ سے لڑکی کی ٹھوڑی تھام کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور دبی دبی لیے رحمانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ "گاہک ہوتا تو کسی تاریک اور پُرسکون کمرے میں ہوتا..." پھر وہ یک بیک مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "سنا نہیں تم نے، جیبیں خالی کرو۔!"

"غصہ نہ کرو دوست!" میں زبردستی مسکراتے ہوئے بولا اسی کے ساتھ اپنا ریوالور جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا" یہ بھرا ہوا ہے مگر میں تمہارا دشمن نہیں، رقم بھی نکال دوں گا۔"

ریوالور دیکھتے ہی وہ بُری طرح بدکا۔ چاقو والا ہاتھ سر سے بلند ہو گیا اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ میں ریوالور اس پر سیدھا کرنے کے بجائے ہتھیلی پر رکھ کر اسے پیش کر رہا ہوں تو اس کا چاقو والا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اور اس نے جلدی سے میری ہتھیلی پر سے ریوالور اٹھا لیا جیسے اسے شبہ رہا ہو کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں، میں اس پر فائر جھونک دوں گا۔ آس پاس موجود ہپی تماشائیوں کی طرح ہمارے گرد اکھٹے ہو گئے!

میں نے اپنی جیبوں سے رقم نکال کر اطمینان سے اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ایک نظر نوٹوں کی گڈی کو دیکھا اور چرمی جیکٹ کی جیب میں اڑس لیا۔ اب وہ کبھی مجھے اور کبھی میری ہمراہی لڑکی کو گھور رہا تھا جیسے ہم دونوں کوئی عجوبہ ہوں۔

"میں نے تمہارے حکم کی تعمیل کی، اب میرا ریوالور مجھے واپس دیدو۔" میں نے اس سے کہا۔

"نہیں — یہ ناممکن ہے۔!" اس نے ریوالور جین کی بیلٹ میں ٹھونس لیا۔

"تو پھر رقم واپس کر دو!" میں نے لہجہ بدستور مصالحانہ رکھا "تاکہ میں بازار سے کوئی اور ہتھیار خرید سکوں، یہ میرے لئے بہت ضروری ہے اور اس رقم کے بعد میں بالکل مفلس ہوں۔!"

وہ چند سکنڈ تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا "تم نے بھرا ہوا ریوالور ہونے کے باوجود مجھ پر فائر نہ کر کے دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ رقم واپس لے لو — یہ تو میں کسی اور سے بھی چھین سکتا ہوں لیکن یہاں اسلحہ ذرا مشکل سے ہاتھ آتا ہے!"

اس نے گڈی میری طرف بڑھائی اور میں نے وہ رقم دوبارہ جیب میں ڈال کر اس سے کہا۔ "اچھا اب اتنی مہربانی اور کرو کہ لورین کا پتہ بتا دو —!"

"کیا کام ہے اس سے؟"

"مجھے اس سے ذاتی مدد درکار ہے۔!"

"اس کی موجودگی میں آدھی رات کے بعد بھی یہ ویرانہ گٹار کے لاہوتی آہنگ سے گونجتا رہتا ہے — وہ آج شام سے ادھر نہیں آئی۔!"

"پھر کہاں مل سکے گی وہ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"سنا ہے اس کا دوست ایلن بک ہارٹ چھ دن بعد آج ہی

رہا ہو کر آیا ہے۔ لورین اسی کے ساتھ کسی سستے ہوٹل میں ہوگی۔ ان چھ دنوں میں اس نے کچھ رقم جوڑی تھی!"

ایڈونچر اور کشت و خون کے شائق تماشائیوں کو اس ڈرامے کے نئے موڑ نے مایوس کر دیا تھا اور وہ سب ہم سے لاتعلق ہو کر اپنی جھگیوں پر جا بیٹھے تھے۔

"یہ بہت برا ہوا۔" میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "اب میں لونا کو کہاں تلاش کروں۔۔؟"

"تمہیں کیا کام تھا لورین سے؟" دیو ہیکل ہپی نے پھر سوال کیا۔

"میری ایک دوست ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے دو روز سے شہر کی بستیوں میں چھپتی پھر رہی ہے۔ مجھے دراصل اسی کی تلاش ہے اور اس سلسلے میں مجھے لورین سے مدد ملنے کی توقع تھی!" میں نے نپے تلے الفاظ میں اسے اپنے مسئلے سے آگاہ کیا۔

"مقامی لڑکی ہے؟" اس نے اس بار ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔ لونا نام ہے اس کا۔" میں نے پُرامید لہجے میں جلدی سے کہا۔

"نام سے مجھے غرض نہیں۔" وہ روکھے لہجے میں بولا۔ "میں ایک ایسی لڑکی سے واقف ضرور ہوں جو اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے کل سے ہماری پناہ میں آئی ہوئی ہے اور اس کا شوہر حوالات میں بند ہے!"

اس کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔

"ہاں ہاں وہی لڑکی ۔۔۔ میں اس کا شوہر ہوں اور مجھے چند گھنٹے قبل ہی حوالات سے رہائی نصیب ہوئی ہے۔!"

اس نے اشتباہ آمیز نظروں سے مجھے گھورا اور کہا۔ "مگر ابھی تو تم نے بتایا کہ وہ تمہاری دوست ہے ۔۔ اب بیوی کیسے بن گئی۔!"

"احتیاط ۔۔ صرف احتیاط میرے دوست!" میں خوشی اور جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نہ صرف اس سے واقف ہو بلکہ وہ تمہاری ہی پناہ میں ہے ۔۔ دراصل دو روز قبل ہی ہماری شادی ہوئی ہے ورنہ اس وقت تک ہم صرف دوست تھے۔"

"اس کا ثبوت؟" اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

"اگر وہ مجھے اپنا شوہر تسلیم نہ کرے تو تم بلا تامل اپنے چاقو کا پھل میرے سینے میں اتار دینا۔" میں نے بے جھجک اس کو پیشکش کی۔

"ہاں یہ تو کرنا ہی ہوگا۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "اس نے ہمیں اپنی حفاظت کا بھاری معاوضہ دیا ہے اور اگر تم نے اُسے ذرا سا بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا کہ میں صرف آواز پر چاقو پھینکتا ہوں اور میرا کوئی وار آج تک خالی نہیں گیا۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ خلاف توقع حاصل ہونے والی اس کامیابی نے مجھے دیوانہ سا کر دیا تھا۔ میں جلد از جلد لونا تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس قوی ہیکل ہپی کے بے لاگ رویے سے مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ان لوگوں نے لونا کی سخت حفاظت کی ہوگی۔ ساتھ ہی مجھے حیرت بھی تھی کہ آخر لونا کو ہپیوں کے اس خطرناک گروہ کا علم کیوں کر ہوا اور اس نے کس طرح ان سے رابطہ قائم کر کے محفوظ پناہ گاہ حاصل کی!

ہم دونوں اپنی باتوں میں اس لڑکی کو نظر انداز کر چکے تھے جو مجھے اس کیمپ تک لائی تھی ۔ اس گفتگو سے شاید وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ میرا کام بن چکا ہے اور اب اس کی مزید ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ اسے نظر انداز کر کے ہم دونوں نے قدم اٹھاتے ہی تھے کہ وہ روہانسی آواز میں مجھ سے بولی۔ "میرے پیسے۔۔؟"

میں پلٹا اور جیب سے دس کا نوٹ نکال کر اُسے تھما دیا۔

اسی وقت قوی ہیکل ہپی اس کی طرف پلٹا اور چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ کر نیچی اور بے رحمانہ آواز میں بولا۔ "یہ ساری گفتگو بھول جاؤ، اگر لڑکی کے بارے میں کہیں زبان کھولی تو یہ سینے کے پار اتار دیا جائے گا۔!"

"مجھے کچھ معلوم نہیں ۔۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی، کسی سے نہیں کہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ تقریباً رو پڑی، اس کی آنکھوں میں موت کی دہشت سمٹ آئی تھی۔ پتلیاں پھیل چکی تھیں اور تنفس کی رفتار یک بیک کئی گنا بڑھ گئی تھی۔!

وہ سکڑی سہمی، سسکیاں بھرتی وہاں سے چل دی، قوی ہیکل ہپی مجھے ہمراہ لے کر کھنڈرات کے ایک ایسے حصے میں پہنچا جہاں دس بارہ گز کے دائرے میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔!

"اب کیا بات ہے؟" میں نے اس کی گھورتی ہوئی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اب میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔!" وہ ہونٹ بھینچ کر بولا "تمہیں اس لڑکی کے دوست یا شوہر کی حیثیت میں خود کو منوانا ہوگا اب میں اپنا اطمینان کئے بغیر تمہیں وہاں ہرگز نہ لے جاؤں گا!"

"آخر کیوں؟" میرے لہجے میں احتجاج تھا۔

"اس لئے کہ اس لڑکی سے کئے ہوتے سودے کی پابندی کی خاطر کل بڈ نے ایک مقامی کو یہاں ہلاک کیا تھا۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "وہ مسلح نیپالی اس لڑکی کی تصویر لئے یہاں پہنچا تھا اور لوگوں سے دریافت کرتا پھر رہا تھا کہ وہ لڑکی یہاں تو نہیں دیکھی گئی ہے۔ یہ اطلاع جونہی بڈ کو پہنچی وہ خود کو اس کے پاس پہنچا اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ شخص لڑکی کا دشمن ہے، اُس نے اُس کا بھیجہ اڑا دیا۔"

یہ اطلاع میرے لئے سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سہانے برونز آرٹ فیکٹری کے ریکارڈ سے لونا کی تصویر حاصل کر لی تھی اور کرن سنگھ سے اس کی شناخت کرانے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا کہ میں نے لونا کے ساتھ مل کر گیتا رانی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے ۔۔ پھر ایک طرف اس نے مجھے ضمانت پر رہائی کے بہانے ہلاکت کے جال میں پھانسنا چاہا اور دوسری طرف اپنے معتمد ساتھیوں کو لونا کی تصویر کی نقلیں دے کر شہر میں پھیلا دیا۔ اُس نے ہم دونوں کے خاتمے کی مکمل اور بے عیب منصوبہ بندی کی تھی۔!

جبکہ لونا صرف اپنے پرانے ہم مذہب جنونیوں کے انتقام سے بچنے کے لئے ان ہپیوں کی پناہ میں آئی تھی۔ اسے علم بھی نہ ہوگا کہ اب اس کے زیادہ خطرناک دشمن پیدا ہو چکے ہیں جن کے نزدیک انسانی لہو کی ہولی کھیلنا پرندوں کے شکار جیسا ایک تفریحی شغل تھا!

"لڑکی کو بڈ نے اس قتل سے لاعلم رکھا ہے تاکہ وہ ہراساں نہ ہو۔ وہ اپنے سرپرستوں کے مفاد اور ذہنی سکون کا پورا خیال رکھتا ہے۔" قوی ہیکل ہپی کہہ رہا تھا۔ "اب اگر میں تمہیں وہاں لے گیا اور لڑکی نے تمہیں فراڈ قرار دیا تو بڈ کو لڑکی کے سامنے ہی تمہارا کام تمام کرنا پڑے گا اور مجھے بھی اس کے عتاب کا شکار ہونا پڑے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ میں اپنا مکمل اطمینان کر لوں۔"

میں چند ثانیوں کے لئے سوچ میں پڑ گیا پھر سوال کیا۔ "اس مقامی کی لاش کا کیا بنا؟"

"وہ جس جیپ میں یہاں آیا تھا، لاش اسی میں ڈال کر جیپ ایک اتھاہ کھڈ میں گرا دی اب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی ہڈیوں کے ان ریزوں سے کچھ نہ معلوم کر سکے گی اگر کبھی وہ جلا ہوا ڈھانچہ دریافت ہوا تو لوگ اس کی موت کو حادثہ کا نتیجہ ہی سمجھیں گے!" وہ کہتے کہتے ایک دم چونکا اور مجھ سے سوال کیا۔ "مگر تم اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"لڑکی کی تصویر کیا لاش کے ساتھ ہی تھی؟ اگر وہ تصویر موجود ہو اور تم ایلن بک ہارٹ کی گواہی تسلیم کر لو تو میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ حوالات میں مجھ سے ملنے آئی تھی!"

"بڈ اتنا احمق نہیں ہے!" وہ سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ "تصویر جلا کر تلف کر دی گئی تھی!"

"یہ بڈ کون ہے؟" میں اس کی شخصیت کے بارے میں اپنے تجسس کو نہ چھپا سکا۔

"وہ ہزاروں آنکھوں اور شیطانی دماغ کا مالک ہے۔ اس کے نام سے سارے ہپیوں کی روح فنا ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا۔!"

"تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں خود اسے سمجھا لوں گا۔" میں نے کہا

"تصویر کے بغیر بھی ایلن بک ہارٹ کی گواہی کافی ہوتی مگر اسے تلاش کرنا آسان نہ ہوگا۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔

"میں غیر مسلح اور تنہا ہوں۔ تمہارے غول میں آ کر میں کس طرح لڑکی کو نقصان پہنچا سکوں گا اور جب مجھے جھوٹ ثابت ہونے پر اپنی موت کا یقین ہو تو آخر میں جان پر کھیل کر ایسی حماقت کیوں کروں گا!" میں نے اسے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر ایک بار پھر سمجھانا چاہا۔

"چلو۔ مجھے تھوڑا سا خطرہ مول لینا ہی ہوگا، مگر میری ہدایات یاد رہیں!" وہ کچھ دیر سکوت کے بعد بولا۔

وہ تاریک کھنڈرات میں میری رہنمائی کرنے لگا۔ وہ راستے میں ہپیوں پر فقرے چست کرتا کسی کھلنڈرے نوجوان کی طرح بڑھا جا رہا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ چرمی جیکٹ کی جیب میں چھپا ہوا تھا اور اس ہاتھ کی گرفت کھلے ہوئے چاقو کے دستے پر بہت مضبوط تھی۔

کچھ دیر بعد وہ کھنڈرات کے تقریباً وسط میں واقع ایک نیم منہدم کمرے کے قریب جا رکا۔ اس کمرہ کی دو دیواریں اصل حالت میں موجود تھیں باقی دو نیم منہدم دیواروں پر پتھر جما جما کر اس ملبہ کو کمرہ کا روپ دیا گیا تھا اونچی نیچی دیواروں پر چھت کا صرف ایک تہائی حصہ سالم دیواروں پر موجود تھا۔

"ہیلو بڈ!" مجھے لانے والے قوی ہیکل ہپی نے شیشم کے مضبوط دروازے پر گھونسہ مار کر اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آواز سن کر قرب و جوار میں مقیم ہپی ذرا چونکے ان کے ساکت جسموں پر اضطراب کی ہلکی سی لرزش طاری ہوئی پھر وہ دم سادھ کر اپنے اپنے رخ پر لیٹ گئے!

"ہو از دیر؟" اندر سے ایک سرد سی غراہٹ ابھری اور آواز میں تجربہ کی پختگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی معلوم ہو رہی تھی!

"جو کنگ!" قوی ہیکل ہپی نے شاید اپنا نام بتایا۔

اندر ہلکا سا کھٹکا ہوا اور دروازہ کے دونوں پٹ تیزی کے ساتھ کھل گئے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے کمرہ کی باقی ماندہ پختہ چھت اور گری ہوئی چھت کی جگہ تاروں بھرا آسمان جگمگاتا نظر آ رہا تھا۔ ان کے پس منظر میں دروازے کے وسط میں کنگ سے زیادہ قوی الجثہ اور اسی کا ہم قامت ایک ٹھوس انسانی ہیولا موجود تھا۔ اس کی کمر سے بندھی ہوئی چرمی بیلٹ کے دونوں طرف ہولسٹرز سے دو ریوالور جھول رہے تھے اور اس کے انگوٹھے بیلٹ کے اگلے حصے میں پھنسے ہوئے تھے۔ جسم کا سارا زور بائیں ٹانگ پر تھا۔ داہنی ٹانگ قدرے خم کھائی ہوئی تھی۔ چہرے پر پھیلے ہوئے کشادہ جبڑوں اور تیز چمکیلی آنکھوں کے سوا داہنے رخسار پر کسی پرانے زخم کا نشان تھا جو ٹھوڑی سے شروع ہو کر داہنے کان سے آگے تک بالوں میں چلا گیا تھا اس کے کان کا نچلا حصہ بھی غائب تھا!

"یہ شخص ابھی مجھے مشتبہ حالت میں کیمپ میں گھومتا ہوا ملا ہے!" کنگ نے میرے شانے تھام کر مجھے اس ہیولے کے قریب دھکیل دیا "اسے لڑکی کا شوہر ہونے کا دعویٰ ہے!"

گوشت اور ہڈیوں کے اس غیر متحرک انبار میں سے ایک طویل ہنکار بلند ہوئی پھر اس نے غراہٹ نما آواز میں سوال کیا "مسلح تھا یہ اجنبی؟"

"ہاں بڈ!" کنگ جلدی سے بولا "مگر اس نے خود ہی اپنا بھرا ہوا ریوالور میرے حوالے کر دیا۔ کہتا ہے کہ چند گھنٹے قبل پولیس کی حراست سے آزاد ہوا ہے!"

"اسے اندر لے آؤ!" بڈ غرایا اور اندر مڑ گیا۔

میں کنگ کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تو بڈ ایک مومی شمع روشن کر رہا تھا۔ اس کے پلٹنے سے قبل ہی کنگ نے بھاری دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ کر دیا!

"مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ تم نے کوئی شکار پکڑا ہے!" بڈ بھیانک آواز میں ہنستے ہوئے لکڑی کی ایک بھونڈی سی کرسی میں بیٹھتے ہوئے بولا "اسی لئے میں نیچے جانے کے بجائے تمہارا منتظر تھا!"

کنگ اس سے خائف نظر آنے کے باوجود زور سے ہنسا اور بولا "شکار کیا — بس ریوالور ملا ہے۔ رقم میں نے اسے واپس کر دی ہے۔ تم جانتے ہو، میں بہادر حریفوں کی بڑی قدر کرتا ہوں!"

"تم گندے سور کی اولاد" بڈ بزرگانہ بے تکلفی سے ہنستے ہوئے بولا "کسی دن میری ہی طرح اپنے کسی بہادر دشمن کے ہاتھوں زک اٹھاؤ گے!" وہ خاصا فراخ دل معلوم ہو رہا تھا۔

"کہو تو لڑکی کو نیچے سے بلاؤں؟" کنگ نے پوچھا۔

"ہاں —!" بڈ یک بیک سنجیدہ ہو گیا "اگر یہ اس کا شوہر ہی ہے تو بہتر ہوگا کہ روشنی طلوع ہونے سے قبل یہ دونوں یہاں سے نکل جائیں ورنہ پھر اگلی رات کا انتظار کرنا ہوگا۔ یہ لوگ بدترین صورتحال میں گھرے نظر آتے ہیں!" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "بیٹھ جاؤ!"

میں ایک چوبی صندوق پر بیٹھ گیا۔ بڈ کی تیز نظریں مومی شمع اور تاروں کی ناکافی روشنی میں میرے وجود میں پیوست ہونے لگیں اور میں بوکھلا کر اس کمرے کا جائزہ لینے لگا!

وہ کمرہ اتنا وسیع نہیں تو مختصر بھی نہ تھا۔ دیواروں کے اندر سے بھی وہی ساخت تھی جو باہر نظر آتی تھی۔ ہاں اندر آنے کے بعد چھت کے کافی حصے سے جھانکتا ہوا آسمان عجیب سا لگتا تھا۔ کمرہ میں لکڑی کے چار صندوق پڑے ہوئے تھے۔ ایک پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ دو کو ملا کر دیوان کی شکل دی گئی تھی اور ان پر نمدہ کی چادر پھیلا کر اس قابل بنا لیا گیا تھا کہ ایک آدمی اس پر بآسانی دراز ہو سکے۔ چوتھے صندوق پر جو نسبتاً خاصا بڑا تھا، مومی شمع موجود تھی۔ اسی کے قریب ایک آئل اسٹو، المونیم کی دو چھوٹی پتیلیاں، ایک آدھ پلیٹ، دو میلی پیالیاں اور چند ڈبے موجود تھے۔ وہ کرسی جس پر بڈ براجمان تھا، شاید وہیں تختوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ یہ اس کمرہ کی کل کائنات تھی۔ بے ترتیبی کے اعتبار سے وہ کمرہ خانہ بدوش ہپیوں کی ایک مثالی عارضی قیام گاہ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک ایسی منظم اور طاقتور تنظیم کا سرغنہ اس بے سروسامانی کے عالم میں کیونکر زندگی بسر کرتا ہوگا!

اسی وقت کمرے کی فضا میں ملی جلی خوشبوؤں کا ایک جھونکا آیا اور میں چونک پڑا۔ چند قیمتی شرابوں اور امریکی سگار کی بو میں فوراً پہچان چکا تھا۔ مڑ کر دیکھا تو کنگ دبے قدموں فرش میں پیدا ہو جانے والے ایک نیم روشن خلا میں اتر رہا تھا۔ پتھر کی ایک بڑی سی سل اس خلا کے قریب فرش پر رکھی ہوئی تھی!

میری حیرت پر بڈ اس طرح ہنسا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنے بزرگوں کی بے ساختہ حماقتوں پر قہقہہ لگاتا ہے اور غراتی ہوئی آواز میں بولا "صدیوں پہلے کے معماروں نے وہ سل اس طرح لگائی ہے کہ تہہ خانہ بند ہونے کے بعد اس فرش پر کسی جوڑ کا احساس تک نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے اسے اتفاقاً دریافت کیا تھا اور اب میرے آدمیوں کے سوا کوئی یہ راز نہیں کھول سکتا۔ اس کمرہ کے مقابلے میں وہ زیریں دنیا بڑی پرآسائش ہے۔ میں نے تمہاری بیوی کے آرام کا پورا خیال رکھا ہے!"

"میں تمہارا ممنون ہوں بڈ — کھلی فضا میں وہ چند گھنٹوں بھی اپنے دشمنوں کی عقابی نظروں سے نہ چھپ سکتی!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ ایک کاروباری معاہدہ تھا!" بڈ نے مومی شمع کی لو سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تین دن اور تین راتوں کے تحفظ کے لئے میں نے اس سے دس ہزار طلب کئے تھے۔ شاید تمہیں اندازہ نہ ہو کہ کسی کو قتل کرنا اس کی جان کی حفاظت سے بدرجہا آسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے گمنام دشمنوں سے بچتی بچاتی نہ جانے کس طرح یہاں پہنچی تھی۔ اس کے پاس کل سات ہزار نو سو گیارہ روپے تھے۔ وہ بینکوں سے اپنی ساری پونجی نکال کر میرے پاس آئی تھی۔ مجھے رقم ملی اور اسے تحفظ —! یہ میری امان میں اس کی دوسری رات ہے۔ کل رات میں اسے اور روکتا پھر میرا معاہدہ ختم ہو جاتا اور وہ سورج غروب ہونے سے قبل بحفاظت کسی بھی ایسے قریبی مقام پر پہنچا دی جاتی جہاں کی وہ خواہش ظاہر کرتی!"

"خدا کا شکر ہے کہ میں بروقت آپہنچا!" میرے الفاظ، لونا کی افتاد سن کر حلق میں پھنسنے لگے تھے۔ کٹے ہوئے کان اور زخم خوردہ چہرے والا وہ مجرم مجھے یک بیک قابلِ محبت نظر آنے لگا تھا!

"بڈ کہاں ہے وہ لڑکی؟" اچانک کمرے میں کنگ کی بوکھلائی ہوئی آواز گونجی۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں تہہ خانے سے باہر آ رہا تھا!

"لڑکی نہیں ہے —؟ کیا بک رہا ہے تو؟" بڈ غصے سے غراتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا اور جھپٹ کر تہہ خانے کے کھلے ہوئے دہانے کی طرف بڑھا —!

میری آنکھوں کے سامنے اچانک روشن نقطوں کی دھند گردش کرنے لگی۔ نبضیں سست پڑ گئیں اور مایوسی سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ لونا اس محفوظ تہہ خانے سے کہاں غائب ہو گئی تھی؟

بڈ کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ بے مقصد ننگی گالیاں بکتا، دیوانہ پیر پٹکتا جنون کے عالم میں تہہ خانے میں اتر رہا تھا۔

لونا کوئی ننھی سی سوئی تو نہ تھی کہ کنگ کو نظر نہ آتی اور اب بڈ اسے ڈھونڈ نکالتا۔ میں سخت مایوسی کے عالم میں صندوق سے اٹھا تو میری ٹانگیں واضح طور پر کانپ رہی تھیں۔ میں تہہ خانے کے دہانے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ کنگ دونوں ہاتھ اٹھا کر میرے سامنے آ گیا۔

"اس طرف جانے کی ضرورت نہیں!" وہ سرد لہجے میں بولا "ہم نے اس کی حفاظت کی جان توڑ کوشش کی اور اب اگر وہ وہاں نہیں ہے تو اس میں ہماری کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ چند منٹ بعد بڈ تم کو اپنی ساری معلومات سے آگاہ کر دے گا۔ تم یہیں بیٹھو!"

"مگر اس نے تمہیں حفاظت کا خطیر معاوضہ دیا تھا!" میں غصے اور مایوسی کے عالم میں بولا۔

"درست ہے!" اس نے سر ہلا کر اقرار کیا "اور ہم اس کی بازیابی میں تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے۔ بڈ کو عہد شکنی سے سخت نفرت ہے!"

میں نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا اور اپنے شکستہ اعصاب کو تقویت پہنچانے کی نیت سے دوبارہ اسی صندوق پر بیٹھ گیا۔ تہہ خانے سے ابھی تک بڈ کی گالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

لڑکی

"لڑکی کو اپنے کن دشمنوں سے جان کا خطرہ تھا؟" کنگ نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے نظریں اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی چرمی جیکٹ کی جیبوں میں کوئی چیز تلاش کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی "دراصل مجھ سے شادی کرنے کی خاطر اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا" میں اسے بتانے لگا "اس بات پر شہر کی عیسائی آبادی میں سخت اشتعال پھیل گیا۔ اس کے سوتیلے باپ نے میرے خلاف اس کے اغوا کے الزام میں شکایت درج کرا دی مگر لڑکی نے بیان دیا کہ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے اور اپنی مرضی سے مسلمان ہوئی ہے۔ اب وہ سب اس کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں وہ ان ہی سے بچنے کے لئے تم لوگوں کی پناہ میں آئی تھی!"

"مگر جو نیپالی اس کی تصویر لئے یہاں آیا تھا اور بڈ کے ہاتھوں مارا گیا وہ تو بتا رہا تھا کہ لونا ملٹن ایک فرم میں لمبا غبن کر کے فرار ہوئی ہے!" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"یہ بکواس ہے!" میں جلدی سے بولا "وہ لوگ اس کے نئے دشمن ہیں اور شہر میں بہت زیادہ رسوخ کے مالک ہیں۔ اتفاقیہ طور پر لونا کو ان کے بہت سے ایسے راز معلوم ہو گئے ہیں جن کی تشہیر نہ صرف انہیں رسوا کر دے گی بلکہ وہ سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں گے!"

"تم ان لوگوں سے واقف ہو —؟" کنگ نے پوچھا۔

"ہاں — مگر ان تک رسائی اتنی آسان نہ ہوگی! ان کی رہائش گاہ اندھ بھون پر کسی قلعہ کی طرح مسلح محافظوں کی فوج ہر وقت مامور رہتی ہے!"

"بڈ کے سامنے یہ نہ کہہ دینا" وہ ہمدردانہ لہجہ میں بولا "اس کے نزدیک دنیا کا کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ وہ کسی بدروح کی طرح ہر جگہ جا پہنچتا ہے!"

"تو کیا وہ لونا کی بازیابی کے لئے اس حد تک جا سکتا ہے؟"

"ہاں! پیشہ ورانہ ایمانداری بڑی چیز ہوتی ہے۔ اسی شہرت کی بنا پر لوگ آنکھیں بند کر کے اپنے کاموں کے لئے بڈ کے پاس چلے آتے ہیں۔ لڑکی کو برآمد کئے بغیر وہ چین سے نہ بیٹھے گا!"

اسی وقت نیچے، تہہ خانے سے بڈ کی تیز غراہٹ سنائی دی پھر وہ اونچی آواز میں وہیں سے چیخا "کنگ... احمق کی اولاد! یہ رہی لڑکی!"

"سچ بڈ — کہاں چھپی ہوئی تھی وہ؟" کنگ نے وہیں بیٹھے بیٹھے مسرت بھری آواز میں پوچھا۔

بڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور چند ہی ثانیوں بعد وہ لونا کے ہمراہ تہہ خانہ سے باہر آ گیا۔

"لونا!" میں دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔ شاید بڈ نے اسے میرے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا تھا کیونکہ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ میں نے بے اختیار اسے اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔

بڈ معنی خیز انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بزرگانہ انداز میں یہ جذباتی منظر دیکھ رہا تھا۔ کنگ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا ہوا تھا!

"خدا کا شکر ہے کہ آپ کو قید سے رہائی مل گئی، میرے لئے تو یہ خیال ہی اذیت ناک تھا کہ آپ محض میری وجہ سے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیئے گئے"

"نہیں لونا!" میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا رخسار تھپتھپا کر کہا "اس میں بھلا تمہارا کیا قصور تھا۔ یہ میرا ماضی تھا جو زندگی کے ہر موڑ پر میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں ماضی سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن میری پیشانی کے بدنما داغ ہر جگہ نمایاں ہو جاتے ہیں —!"

"نہیں جان، نہیں!" اس نے کسی ضدی بچے کی طرح میرے بازو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لئے: "اگر میرا سوتیلا باپ اپنی مجبوریوں سے اندھا ہو کر آپ کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج نہ کراتا تو پولیس آپ تک پہنچ ہی نہ پاتی پھر نہ کرن سنگھ سے سامنا ہوتا نہ ماضی سے نقاب الٹتی۔"

یہ بات اس نے محبت اور خلوص کے جذبے میں ڈوب کر کہی تھی لیکن اس کے آخری فقرہ پر میرا دل اُداس ہو گیا اور میں پست لہجہ میں بولا: "میں خود غرض اور فریبی ہوں لونا — مجھے خود ہی اپنے ماضی کی ہر کہانی تمہارے سامنے دہرا دینی چاہیئے تھی۔ مگر میں نے اسے راز رکھا ..... !"

"نہیں!" وہ یک بیک میرے سینے سے الگ ہو گئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اٹل لہجہ میں بولی: "مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں، آپ کا ماضی میرا ماضی ہے۔ پتہ نہیں آپ کن مجبوریوں کے تحت ان حالات سے دوچار ہوئے۔ یہ موضوع اب کبھی نہ چھیڑا جائے گا اس کا آپ عہد کریں۔"

اس کے خاموش ہوتے ہی مجھ سے پیشتر ٹڈ ایک قدم لونا کی طرف بڑھا اور حسب عادت اپنے جسم کا سارا زور بائیں ٹانگ پر ڈال کر بولا: "تم دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ اس کی طرف سے میں ابھی تک مطمئن نہیں ہوں۔ نہ ہی میں اُردو زبان پر عبور رکھتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور سمجھ گیا ہوں کہ اب تم دونوں مدت سے بچھڑے ہوئے روایتی عاشق و معشوق کی طرح بے وقوفانہ جذباتی باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ لہٰذا اب یہ بکواس ختم کرو۔" اس کے لہجہ میں بزرگانہ شگفتگی رچی ہوئی تھی اور وہ قواعد سے آزاد بازاری انگریزی الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ "اور مجھے بتاؤ کہ تم دونوں کیا چاہتے ہو۔ اب تمہارا اگلا پروگرام کیا ہے؟" اس کے بھرے بھرے نیلاہٹ مائل سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ داہنے رخسار سے کان کے عقب تک پھیلا ہوا نشان بھی اس کے بائیں کا ہی حصہ نظر آ رہا تھا جس کے باعث اس کا چہرہ بھیانک معلوم ہونے لگا تھا!

"ٹڈ — تم بہت بدصورت اور خطرناک ہو لیکن تمہاری عظمت کا مجھے کھلے دل سے اعتراف ہے۔ میرے خدا! ایک خوبرو اور نوجوان لڑکی جو یکہ و تنہا بھی ہو، جنس اور پیٹ کی تسکین کے لئے آزادی کے پرستاروں کے غول میں ہر طرح محفوظ ہے، خدا کی قسم یہ بالکل ناقابلِ یقین بات معلوم ہوتی ہے۔ بالکل ہی نئی دنیا کی کہانی!"

اس کی مسکراہٹ یک بیک معدوم ہو گئی۔ اس نے داہنے کان کا کٹا ہوا نچلا حصہ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان دبا کر ہولے ہولے سہلایا اور اپنی کرخت آواز میں بولا: "اگر یہ خوشامد ہے تو تم جہنم میں جاؤ۔ اور اگر تم نے یہ بات ایمانداری سے کہی ہے تو اب میں بخشش کا حقدار بن چکا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں ٹڈ —!" میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے جھلاتے ہوئے انداز میں زیرِ زبان کچھ کلمات ادا کئے جو نہایت غیر شائستہ تھے پھر کننگ کو آنکھ مار کر بولا: "یہ بے چارہ شاید ابھی آسمان سے پھینکا گیا ہے۔ جو بخشش کا مطلب نہیں سمجھتا، اسے بتاؤ کہ میں کیا کہہ رہا تھا!"

"دیکھو مسٹر!" وہ ٹڈ اچھل کر میرے سامنے آ گیا: "لڑکی نے اپنے تحفظ کا معاوضہ مبلغ سات ہزار نو سو گیارہ روپے ادا کیا اور اب قانونی طور پر ہم کل کی رات گزر جانے تک اسے تحفظ دینے کے پابند ہیں۔ مگر ٹڈ کی کارکردگی سے تم اگر بہت زیادہ متاثر اور خوش نظر آتے ہو لہٰذا تمہیں اس کو بخشش دینی چاہیئے!"

میں سمجھ نہ سکا کہ وہ میرا مضحکہ اڑا رہا ہے یا سنجیدہ ہے خاص طور پر اس نے جس طرح اپنی "قانونی" پابندی کا ذکر کیا وہ عجیب تھا میں نے محتاط لہجہ میں کہا: "قانونی طور پر تو تمہاری ذرہ بھر بھی ذمہ داری نہیں ہے کننگ۔"

"اوہ — میں ریاست کے قانون کی بات نہیں کر رہا!" وہ ہاتھ فضا میں لہرا کر بولا: "ہمارا اپنا بھی ایک قانون ہے جو ہر ملک میں اور ہر گاہک کے ساتھ ایک ہی ہوا کرتا ہے!"

"بخشش میں تم کیا چاہتے ہو — جو کچھ میرے بس میں ہو گا میں ضرور کروں گا۔" میں نے لونا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے کر مسکرا دی۔

"بس میں تو ہے!" کننگ مکارانہ انداز میں مسکرایا۔

"ایڈیٹ!" ٹڈ پھر چیخ کر دہاڑا: "کیا پہیلیاں بجھا رہا ہے!" کننگ ایک دم بوکھلا گیا۔ اور جلدی سے مجھ سے بولا: "تمہاری جیب میں جو رقم موجود ہے وہ تم ٹڈ کو انعام میں دے سکتے ہو۔ وہی رقم جو میں نے تمہارے شریفانہ رویہ سے متاثر ہو کر تمہیں واپس لوٹا دی تھی۔"

"مگر میں پھر قلاش ہو جاؤں گا۔"

"وہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے!" اس بار ٹڈ کھانس کر بولا۔

"بہر حال۔ میں تمہارا حق نہیں ماروں گا۔" میں نے یہ کہہ کر جیب سے رقم نکالی اور دو سو روپے رکھ کر باقی گڈی ٹڈ کی طرف بڑھا دی۔

اس نے کسی بھی طرح تشکر کا اظہار کئے بغیر وہ رقم لے کر اپنی جیب میں ڈال لی جیسے میں نے اس کا کوئی پرانا قرض واپس کیا ہو —!

"اور اب!" ٹڈ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا: "رات کے سوا دو بج رہے ہیں، جہاں تک میں تم دونوں کے معاملات سمجھا ہوں تم خطرناک اور بے رحم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہو۔ شاید دن کی روشنی میں باہر نکل کر تم زندہ بھی نہ رہ سکو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ٹھیک ہے، تم بات پوری کرو!" میں نے کہا۔

"لہٰذا یہاں سے رات کے اندھیرے میں روانگی ہی بہتر رہے گی اگر تم چاہو تو میں اسی وقت تم دونوں کی کسی طرف روانگی کا بندوبست کر سکتا ہوں ورنہ کل رات تو بہر صورت تمہیں جانا ہو گا کیونکہ اب تم دونوں قلاش ہو چکے ہو، اور چوتھی رات کے تحفظ کا معاوضہ ادا کرنا تمہارے بس ... ۔"

ایک لمحہ کے لئے میری اور لونا کی نظریں چار ہوئیں اور میں نے اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی۔ تحفظ اور قدرے بے فکری کی یہ آخری رات ضائع کر لی جاتی تو نہ ہوتا۔ میں نے چند ثانیے کی خاموشی کے بعد ٹڈ سے کہا: "میرا ارادہ کل رات یہاں سے روانگی کا ہے مگر یہ رات میں کہاں بسر کروں گا؟"

"لڑکی تمہیں پہچان چکی ہے اور اب اگر وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔" اس نے نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

"ہم دونوں ازدواجی رشتہ میں منسلک ہیں ٹڈ!" لونا نے نرم لہجہ میں اسے یاد دلایا۔

"مگر یہ یاد رہے کہ میں اس چہار دیواری میں کوئی گڑبڑ پسند نہیں کرتا۔ مجھے امید ہے کہ تم دونوں اپنی مفلسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میرے خلاف کوئی سازش نہیں کرو گے ... اگر ... اگر ایسا ہوا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہولسٹروں سے وزنی ریوالور نکال لئے: "تو میں بے دریغ تمہیں ہلاک کر دوں گا۔"

"نہیں ٹڈ!" میں جلدی سے بولا: "ہم اتنے ناسپاس نہیں ہیں پھر موجودہ حالات میں ہم تمہارے تحفظ اور تعاون کے بغیر تو اس شہر سے زندہ باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"گڈ!" اس نے دونوں ریوالور ہولسٹروں میں اڑس لئے اور ہم دونوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے تہہ خانے کے راستے کی طرف مڑ گیا۔

سیڑھیوں پر لونا سب سے آگے، میں درمیان میں اور ٹڈ پیچھے تھا۔ سیڑھیاں کافی کشادہ اور گہری تھیں۔ کننگ اوپر ہی رک گیا تھا۔ اس نے ہم لوگوں کے اترنے کے بعد تہہ خانے کا دہانہ بند کر دیا تھا!

تقریباً تیس فٹ گہرائی میں اترنے کے بعد ہم تہہ خانے کے فرش پر پہنچے اور میں حیرت سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی چھت بمشکل دس فٹ بلندی پر ہو گی۔ ہم لوگ اس وقت ایک کشادہ راہداری میں موجود تھے جس کی دونوں جانب چار وسیع کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ راہداری کے آخری سرے پر ٹھوس دیوار تھی جس پر کسی قیمتی لکڑی سے تراشا ہوا شیر کا ایک مجسمہ نصب تھا! دیواروں پر موم شمعیں بھی آویزاں تھیں۔

"آؤ!" ٹڈ نے راہداری کی داہنی جانب پہلے کمرہ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "یہ میرا کمرہ ہے۔ اس سمیت پورا تہہ خانہ اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ نکاسی کا راستہ کھلا ہو تو تہہ خانے میں سانس لینے کی آواز بھی اوپر سنائی دیتی ہے مگر اسے بند کرنے کے بعد کوئی اونچی سے اونچی آواز بھی باہر نہیں سنی جا سکتی!"

"یہ تہہ خانہ فنِ تعمیر کا شاہکار معلوم ہوتا ہے!" میں نے نقوش و نگار سے مزین در و دیوار کی نفاست کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود یہ حصہ استدادِ زمانہ سے پوری طرح محفوظ ہے ورنہ یہ بھی کھنڈرات میں بدل چکا ہوتا —!"

ٹڈ کا کمرہ ہر طرح کے سامانِ تعیش سے آراستہ تھا۔ بستر اور صندلی دیوان تو شاید تہہ خانے کے ساتھ ہی دریافت ہوئے ہوں گے مگر دیگر سامان بعد میں جمع کیا گیا تھا۔ کمرہ صندل کی لکڑی کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا!

ٹڈ نے الماری سے واڈ — ۶۹ کی سربند بوتل نکالی اور فخر آمیز لہجہ میں بولا: "یہ شراب نیپال میں نایاب ہے۔ مگر مجھے اس کے سوا کوئی وسکی پسند نہیں ہے۔"

اس نے تین گلاس نکالے تھے کہ لونا جلدی سے بولی: "ٹڈ میں نہیں پیتی!"

"شوہر سے ملنے کی خوشی میں بھی نہیں؟" وہ اس کی طرف پلٹا۔

"نہیں، شکریہ!" لونا دھیمی آواز میں بولی۔

وہ دونوں گلاسوں میں شراب ڈال کر میری طرف آیا اور ایک گلاس مجھے دے کر بولا: "اپنے ذوق کے مطابق سوڈا خود ملا لو! الماری میں مائنعن اور سوڈا موجود ہے!"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں، میں نیٹ پیتا ہوں!" میں نے جلدی سے کہا۔ لونا میری طرف دیکھ کر محبت سے مسکرا دی۔ شاید وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ میری ہر پسند اور عادت کو خندہ پیشانی سے قبول کرے گی!

"اب بتاؤ کہ کل رات تم کدھر جانا چاہتے ہو تاکہ میں انتظام کر سکوں۔" وہ شراب کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ مہارشی اندرام ہر سال بہار کے اختتام پر کدھر جاتا ہے؟" میں نے چند ثانیوں کی پُرفکر خاموشی کے بعد اس سے سوال کیا۔

ٹڈ نے اس سوال پر بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور تمسخر آمیز لہجہ میں بولا: "وہ چھلاوہ ہے مائی ڈیر چھلاوہ! شہر سے باہر نکلتے ہی پہاڑوں میں ایسا گم ہوتا ہے کہ کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سونا بنانے کا نسخہ حاصل کرنے کے خبط میں بہت سے لوگوں نے اس کا تعاقب کیا مگر ناکام ہی رہے!"

مجھے توقع نہیں تھی کہ میرے استفسار پر ٹڈ یوں کھل کر میرا مضحکہ اڑائے گا لہٰذا میں سٹپٹا گیا اور بوکھلائے ہوئے لہجہ میں بولا: "یہ بات نہیں میں دراصل انا پورنا کی طرف جانا چاہتا ہوں اور مہارشی بھی شاید اسی طرف نکلتا ہے۔ میں صرف اس کا راستہ جاننا چاہتا تھا تاکہ پہاڑی سفر کی صعوبتوں کو کم از کم کر سکوں!"

"فکر کی کوئی بات نہیں، وہ چند ہی دنوں میں پھر اپنے سالانہ سفر پر نکلنے والا ہے۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ نواکوٹ میں ضرور دیکھا جاتا ہے۔ تم اسی شہر میں روپوش رہ کر اس کی آمد کا انتظار کر سکتے ہو، جب وہ آگے سفر کرے تو اس کا پیچھا کرنا!"

"یہ اطلاع میرے لئے سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ شہر سے رابطہ منقطع

ہونے کے باعث مجھے علم ہی نہیں تھا کہ اندرام کھٹمنڈو میں موجود ہے اور چند ہی روز میں اپنے سفر پر نکلنے والا ہے میں نے اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے بڈ سے پوچھا "لزاکوٹ کس طرف واقع ہے؟"

"یہاں سے شمال مغرب میں چالیس پچاس میل کی مسافت پر دریا کے کنارے ایک قصبہ ہے!"

"مگر مجھے وہاں اندرام کی آمد کی اطلاع کیسے مل سکے گی؟"

"وہ بہت سی پراسرار قوتوں کا مالک ضرور ہے مگر رنگین مزاج بھی ہے۔ اس کے چیلوں کی ایک مخصوص جماعت ہر سال لزاکوٹ تک اس کے ساتھ جاتی ہے۔ اس عیاش سادھو کی روایت ہے کہ ہر برس اس جماعت میں نئے اور نوخیز نسوانی پیکر شامل ہوتے ہیں۔ وہ راستہ میں اپنے سارے ارمان پورے کرتا ہے پھر اپنی ان نئی محبوباؤں کو لزاکوٹ میں الوداع کہہ کر آگے نکل جاتا ہے۔ اس جلوس کے پہنچنے سے گھنٹوں قبل لزاکوٹ میں ہلچل سی مچ جاتی ہے کیونکہ اندرام کے آگے بڑھ جانے کے بعد وہ لڑکیاں کچھ دن نواکوٹ والوں کو حسن کے جلووں کے نیاز بخشتی ہیں پھر کھٹمنڈو لوٹ آتی ہیں!"

"حیرت کی بات ہے کہ تم اندرام کو کیسے برداشت کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ تمہارے ساتھی ہپیوں کو ورغلاتا رہتا ہے۔"

بڈ وسکی کا گلاس خالی کرکے ہنسا "اس کی اور میری لائن الگ الگ ہے۔ وہ بھاری معاوضوں پر شہر کے رؤسا کو غیر ملکی لڑکیاں فراہم کرتا ہے۔ پھر اس رقم سے ہپیوں میں مفت منشیات تقسیم کرتا ہے تاکہ وہ اس کے گرد جمع رہیں اور وہ ان میں سے اپنے شکار چھانٹتا رہے اور میں مردوں کا کام کرتا ہوں۔ خود کو خطرات میں ڈالنے کا معاوضہ لیتا ہوں اور اس پیسہ سے عیش کرتا ہوں۔ یہ لوگ جو کھنڈرات میں پھیلے ہوئے ہیں محض جماعی زندگی گزارنے اور سکون کی نیت سے یہاں آتے ہیں کیونکہ یہاں کوئی انہیں ہراساں نہیں کرتا۔ میرے آدمی ان کے تحفظ کا خیال کرتے ہیں اور یوں وہ سب میرے بے قاعدہ گروہ میں شامل سمجھے جاسکتے ہیں۔ میرا اور اندرام کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔"

"خیر وہ تمہارا اپنا معاملہ ہے ہم دونوں کل رات نواکوٹ ہی جائیں گے مگر یہ خبر راز ہی رہنی چاہیئے!" میں نے بڈ سے کہا۔

"اگر تم نے دوبارہ رازداری کے بارے میں کوئی ایسی ہلکی بات کہی تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔" بڈ اپنی جگہ سے اٹھ کر غرایا۔ "اگر شبہ تھا تو یہاں جھک مارنے کیوں آئے تھے؟"

"نہیں بڈ ــ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔" لونا جلدی سے اس کے سامنے آگئی۔ "صفدر تم پر اعتماد کرتے ہیں مگر دیکھو نا ذہنی انتشار میں آدمی عجیب بے یقینی کا شکار ہوجاتا ہے!"

"جاؤ اپنے کمرہ میں!" وہ ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

میں لونا کا ہاتھ تھام کر دروازہ تک پہنچا ہی تھا کہ بڈ کی غراہٹ ابھری "ٹھہرو!"

میں پلٹا تو وہ الماری کے قریب موجود تھا اس نے وہسکی یا واڈکا کا ایک نپ (NIP) میری طرف اچھال دیا۔ "یہ تم دونوں کو میری جانب سے شب عروسی کا تحفہ ہے!"

میں نے بڑھ کر وہ شیشی لپک لی اور اس کا شکریہ ادا کرکے باہر نکل گیا۔ لونا کا کمرہ بڈ کے کمرے سے ملحق تھا۔ وہاں بھی نفاست اور آرائش کا اعلیٰ معیار نظر آیا۔ کمرہ میں دو دیوار گیر موی شمعیں روشن تھیں لیکن اس کے باوجود وہاں دھوئیں یا گھٹن کا کوئی احساس نہیں تھا۔ نہ ہی وہ سیلن موجود تھی جو عام طور پر تہہ خانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ لونا نے بتایا کہ وہاں ہوا کی آمد و رفت کے لئے بہترین نظام موجود ہے لیکن بڈ تمام تر کوششوں کے باوجود اس کا سراغ نہ پاسکا۔ کمرہ سے ملحق غسل خانہ میں پانی اور نکاسی کا مکمل انتظام تھا مگر اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں پانی کسی ٹینک سے آتا ہوگا جسے اصل معماروں نے سائفن یا ایسے ہی کسی دوسرے قابل اعتماد ذریعہ سے کہیں کہیں سے ملایا ہوگا لہذا صدیاں گزر جانے کے باوجود تہہ خانہ کے نلوں میں تازہ پانی میسر تھا۔ نکاس کا مسئلہ نسبتاً سہل نظر آتا تھا۔ ساری زیر زمین نالیوں کو اگر کسی کنوئیں سے ملا دیا جائے تو پانی بلا کسی رکاوٹ کے وہاں گر سکتا ہے!

"میری ذات سے تمہیں بہت تکلیف پہنچی ہے لونا!" میں نے کمرہ میں پہنچنے کے بعد اس سے کہا۔ "تمہارا کردار بے داغ اور عظیم ہے میں شاید زندگی بھر تمہارے ان احسانات کا بدلہ نہ چکا سکوں جو ان چند دنوں میں تم نے مجھ پر کئے ہیں!"

"صفدر!" وہ میرے قریب کھسکتے ہوئے بولی۔ "آپ تعلیمیافتہ ہیں ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں میں نے صرف اپنا فرض پورا کیا ہے۔"

"بڈ کے لئے تم نے وہ رقم کہاں سے حاصل کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ واقعی مشکل کام تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں پہلے سے اس بات سے واقف تھی کہ شہر میں ہپیوں کا ایک ایسا مضبوط گروہ کام کرتا ہے جو بھاری معاوضہ لیکر ہر کام کر گزرتا ہے۔ کوتوالی میں آپ سے بات ہونے کے بعد میں باہر آئی تو ایک جگہ فادر فرانسس سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے ساتھ بستی کے دو عیسائی افراد بھی تھے۔ ان تینوں نے ہر طرح سمجھایا، ڈرایا، دھمکایا کسی عیسائی نوجوان سے شادی کرانے کی پیشکش کی مگر میں ان کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ فادر فرانسس نے آخر میں کہا کہ عیسائی نوجوان ہر قیمت پر مجھے مار ڈالنا چاہتے تھے مگر وہ لوگ انہیں سمجھا کر میری تلاش میں نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مجھے ساتھ لیجانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ میرے مسلسل انکار پر فادر اور اس کے ساتھی برہم ہوگئے اور مجھے دھمکیاں دیں کہ اب دنیا کی کوئی قوت مجھے درد ناک موت سے نہ بچاسکے گی۔ آخر کار میں نے ان کھنڈرات میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ خیال تھا کہ یہاں سے مجھے کسی نہ کسی طرح اس گروہ کا سراغ مل سکے گا میں نے اس موضوع پر کئی لوگوں سے بات کی۔ یہ خبر شاید بڈ تک پہنچ گئی اور اس کا ایک ہرکارہ مجھ سے ملے

تقریباً بیس منٹ میں آبادی پیچھے رہ گئی۔ اور میں آنے والے خطرات کے بارے میں سوچنے لگا۔ کھٹمنڈو جیسے دشوار گزار شہر سے نکاسی کی راہیں مسدود کرنا وجے کے لئے کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ شہر سے فرار کے صرف دو ہی زمینی راستے تھے جن پر اپنے آدمی لگا کر وہ بے فکر ہوسکتا تھا۔ تیسری راہ کسی جہاز کے ذریعہ اختیار کی جاسکتی تھی اور ایئر پورٹ پر محض ایک دو ہی آدمی نگرانی کے لئے کافی ہوتے!

جیپ کو شہری حدود سے نکلے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ سامنے سڑک کے عین وسط میں دو افراد ہاتھ کے اشارے کرتے نظر آئے ان کے جسموں پر نیپالی پولیس فورس کی وردیاں نظر آرہی تھیں۔

بڈ کے حلق سے غراہٹوں کی صورت میں چند مغلظ گالیاں برآمد ہوئیں اور جیپ کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ ساتھ ہی وہ گھومے بغیر بولا "جیپ رکنے سے قبل تم دونوں نشستوں کے درمیان چھپ جاؤ، ان پولیس والوں کو مطمئن کرنا مجھے خوب آتا ہے۔!"

اب وہ دونوں تھوڑی ہی دور رہ گئے تھے اور ہیڈ لیمپس کی روشنیاں براہ راست ان کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ میں لونا سمیت تیزی کے ساتھ پائیدان میں دبک گیا جیپ کی رفتار کم ہونے لگی اور آخر کار بالکل ہی رک گئی البتہ انجن اسٹارٹ رہا۔

"تم کدھر جارہے ہو؟" سڑک پر وزنی جوتوں کی دھمک کے ساتھ ہی ایک مقامی آواز ابھری اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ آواز میرے لئے اجنبی نہ تھی۔ اندھبون میں نرائن داس کے قتل کی رات میں خودرو جنگل میں وہ آواز سن چکا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وجے نے اندھبون کے دو خونی محافظوں کو جعلی سرکاری وردیاں پہنا کر اس راستہ کی نگرانی کا بندوبست کیا تھا۔ بظاہر بڈ اس صورت حال سے لاعلم تھا مگر میرے لئے بھی یہ بات ناممکن تھی کہ اب میں بڈ کو ہوشیار کرتا!

"ہم ہنٹنگ کے لئے جارہے ہیں!" بڈ بگڑی ہوئی اردو میں بولا جو مقامیوں کے لئے کوئی اجنبی زبان نہیں تھی۔ وہ خود بھی اکثر اردو ہی بولتے تھے۔

اسی وقت ایک طاقتور سرچ لائٹ کی روشنی عقبی حصے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے چہروں پر پڑی اور وہی مقامی آواز ابھری۔ "ہینڈز! تم ذرا پیچھے جھانک لے۔"

وزنی قدموں کی دھمک جیپ کے عقبی حصے کی طرف آنے لگی میرے اعصاب پر ناقابل برداشت تناؤ طاری ہونے لگا اس جیپ کے عقبی حصہ کی نشستیں بنچوں کی صورت میں اگلی نشستوں سے عموداً لگی ہوئی تھیں۔ اور میں لونا کے ہمراہ ان دونوں بنچوں کے درمیان دبکا ہوا تھا اگر آنے والا کمزور بینائی کا مالک بھی ہوتا تو اسے پچھلا دروازہ کھولتے ہی ہم نظر آجاتے اور شاید معرکہ کی ابتدا اسی کے ہاتھوں ہوتی!

اس شخص کے پہنچنے سے قبل ہی میں نے عقبی حصہ میں بیٹھے ہوئے بڈ کے ایک ساتھی کے ہاتھ سے اسٹین گن چھین لی۔ وہ بدک کر نیچے جھکا، مگر میں نے اس کی پنڈلی دبا کر اسے تسلی دی اور وہ شاید صورت حال کی نزاکت بھانپ کر سیدھا ہوگیا۔

اتنی دیر میں عقبی دروازہ کھولا جاچکا تھا جونہی مجھے وہ رائفل بردار تاریک ہیولا نظر آیا میں نے اسٹین گن کی نال اس کے سینہ کی طرف اٹھائی اور اس کی ٹارچ روشن ہوتے ہی میں نے اسے گولیوں کی باڑھ پر لیا۔ نرنے والا تو کوئی آواز پیدا کئے بغیر سڑک پر گر گیا مگر اس کا ساتھی بری طرح چیخا جیپ کے اگلے حصے میں ذرا بے چینی سی محسوس ہوئی اس وقت تک میں سیدھا ہوچکا تھا۔

پولیس کی جعلی وردی میں ملبوس دوسرا نیپالی ابھی اپنی رائفل کی نال سیدھی بھی نہ کر پایا تھا کہ بڈ کا ریوالور چلا، گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ رائفل پھینک کر بری طرح چیخ پڑا، میں نے اسے مزید مہلت دیئے بغیر بڈ کے عقب سے اس پر اسٹین گن کی گولیوں کی باڑھ ماری اور وہ بھی ٹھنڈا ہوگیا۔

ابھی باقی لوگ ہکا بکا تھے کہ قریبی پہاڑیوں سے بیک وقت کئی رائفلیں چلیں مگر سب ہی گولیاں جیپ کی باڈی میں گھس گئیں اسی وقت کسی نے میرے ہاتھ سے اسٹین گن چھین لی۔

بڈ نے پھرتی سے جیپ کی روشنیاں گل کردیں اور چیخا "لڑکی کو نشستوں کے درمیان چھوڑ کر نیچے اتر پڑو۔ بائیں جانب کی پہاڑیوں میں وہ لوگ موجود ہیں!"

"پولیس سے ٹکرانے کی کیا ضرورت تھی!" میرے اترتے ہی بڈ غصہ سے پھٹ پڑا۔ "سور کا بچہ! بلاوجہ پریشانی پیدا کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"بڈ! وہ نقلی وردیوں میں تھے۔ میں ایک کی آواز پہچان گیا تھا اسے نہ مارتا تو وہ ٹارچ روشن کرتے ہی سب کو باڑھ پر رکھ لیتا۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" بڈ کے منہ سے تیز سیٹی کی طرح آواز نکلی۔ "پھر تو یہ اچھا ہی ہوا۔ ہم لوگ ان کے ساتھیوں کی نظروں میں آچکے ہیں مگر ان کی پوزیشن سے ہم لاعلم ہیں!"

اسی وقت پہاڑیوں سے پھر کئی فائر ہوئے مگر اندھیرے کے باعث سب گولیاں محفوظ فاصلوں پر گریں اس کے بعد تواتر سے فائرنگ ہونے لگی۔ بڈ کی جماعت بالکل خاموش بیٹھی تھی اور وہ خود آوازوں کی بنا

پر ان کی تعداد اور کمین گاہوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہاں رکے رہنا بے سود بلکہ خطرناک ہے ٹڈ۔ تیزی سے جیپ آگے نکال لے چلو"۔ میں نے صبر آزما انتظار سے تنگ آ کر کہا۔

"جیپ کون ڈرائیو کرے گا؟"، وہ کسی بھیڑیئے کی طرح غرایا۔ "ونڈ شیلڈ کی طرف سے آنے والی ایک گولی بھی ڈرائیور کے لئے کاری ہو گی"۔

"یہ خطرہ میں مول لینے کو تیار ہوں!"، میں نے بے خوفی سے کہا۔

"بے سود ہے، بے سود ہے!"، وہ اضطراری لہجہ میں بولا۔ "تم اس راستہ سے ناواقف ہو، اس مقام سے چند سو گز آگے ایک خطرناک موڑ ہے اسی وجہ سے انہوں نے اس مقام کا انتخاب کیا ہے۔ جیسے ہی تم نے اسکی آواز پہچانی تھی، ہم آگے نکل جاتے تو شاید راستہ صاف ملتا لیکن اپنی بے مقصد فائرنگ میں الجھا کر وہ اتنی مہلت حاصل کر چکے ہیں کہ ان کے آدمیوں نے موڑ پر پتھروں وغیرہ کی رکاوٹیں لگا کر ہمارے بڑھنے کی راہ مسدود کر دی ہو گی"۔

"مگر ٹڈ ـ یہاں رکنا خطرناک ہے!"، اس کا ایک ساتھی بولا "وہ لوگ بلندی پر ہیں ہم نشیب میں ہیں پھر وہ تعداد میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ اگر انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرنا شروع کر دیا تو ہم بے موت مارے جائیں گے، آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو"۔

"سب لوگ پیچھے جاؤ، میں جیپ آگے بڑھاتا ہوں"۔ اس نے جلدی سے کہا اور میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ لینڈ روور کے عقبی حصے میں جا پہنچا۔ اسی وقت ٹڈ نے اپنے ریوالور کے دستے سے ونڈ شیلڈ کا شیشہ توڑ دیا تاکہ گولیوں یا تاروں کے انعکاس کے سبب جیپ کی صحیح پوزیشن کا اندازہ نہ ہو سکے۔ شیشہ توڑنے کے بعد وہ اچھل کر سیٹ پر بیٹھا اور ہیڈ لیمپس روشن کئے بغیر جیپ پوری رفتار سے آگے بڑھا دی۔ سب لوگ ایک دوسرے کے اوپر نشستوں کی درمیانی جگہ میں دبک گئے۔

ٹڈ کا یہ اقدام اس کی بے خوفی اور جرأت کا مظہر ضرور تھا، مگر جیپ کے حرکت میں آتے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ وحشیانہ حرکت ہے۔ اگر کوئی گولی ٹڈ کو زخمی کر دیتی یا ٹائر ہی ڈالتی تو سب لوگ جیپ سمیت کسی شدید مہلک حادثہ کا شکار ہو سکتے تھے ... بہرحال اب تو جو ہو گیا تھا اس کے نتائج بھگتنے ہی تھے!

پہاڑیوں سے فائرنگ میں شدت آ گئی تھی۔ اکا دکا گولیاں جیپ پر بھی پڑ رہی تھیں۔ پھر جیپ ایک موڑ گھومنے لگی۔ اسی دوران میں جیپ کو تدرے ہلکا کرتے ہوئے ٹڈ چیخا: "سونی! سامنے کئی آدمی ہیں ـ فائر!"

یہ حکم پاتے ہی ٹڈ کے چار ساتھیوں میں سے ایک اسٹین گن لے کر تدرے سیدھا ہوا۔ میں نے بھی سر اوپر اٹھایا تاکہ نئی صورتحال کا جائزہ لے سکوں۔ ٹڈ کا قیاس سو فیصدی درست تھا۔ سڑک پر چند سو گز دور بڑے بڑے پتھر لڑھکائے جا چکے تھے اور چند متحرک انسانی ہیولے ایک آخری چٹان کو سڑک پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سونی نے اسٹین گن کی نال ٹڈ کے برابر والی نشست کی پشت گاہ پر رکھی اور ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ میں سے آگے فائرنگ شروع کر دی فضا میں کئی کربناک چیخیں گونجیں۔ تین سائے لڑکھڑا کر سڑک پر گرے پھر وہاں کوئی نہ رہا۔

جیپ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی رہی پھر ایک شدید دھچکا لگا۔ لونا کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اسی کے ساتھ جیپ لہراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ چند ہی سیکنڈ میں ٹڈ کی آواز گونجی "نکل گئے۔ ہم رکاوٹ عبور کر گئے"۔

سب لوگ تیزی کے ساتھ سیدھے ہو گئے۔ ٹڈ نے جیپ کے ٹکر سے پتھروں کے درمیان راستہ بنا لیا تھا اور اب جیپ صاف سڑک پر تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی!

سب لوگ نشستوں پر بیٹھ ہی رہے تھے کہ ٹڈ بولا "یہ راستہ خطرناک ہے ٹکر کے باعث ہیڈ لیمپس ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ایک آدمی آگے آ جائے اور ڈیش بورڈ کے نچلے خانہ سے سرچ لائٹ نکال کر راستہ دکھائے تاکہ میں یکسوئی سے ڈرائیو کر سکوں!"

ایک آدمی جلدی سے آگے پہنچ گیا اور ونڈ شیلڈ کے ٹوٹے ہوئے شیشہ میں سے روشنی کی طاقتور شعاعیں سڑک پر پھیل گئیں۔

دجے کے آدمیوں کو ہمارے مقابلہ میں شدید زک اٹھانی پڑی تھی مگر ابھی وہ ہار نہیں مانے تھے۔ تاریک پہاڑیوں کے درمیان سے دو گاڑیاں نکل کر سڑک پر ہمارے تعاقب میں چلی آ رہی تھیں۔ ٹڈ عقب نما آئینہ میں شاید انہیں دیکھ چکا تھا کیونکہ ان کے ہیڈ لیمپس پوری طرح روشن تھے۔

ان کے ہیڈ لیمپس کے درمیانی فاصلہ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ولیز جیپیں ہیں جن کے ٹڈ کینوس کے ہوتے ہیں جبکہ ہماری لینڈ روور میں ہر طرف آہنی چادروں کا حصار تھا۔ شاید ٹڈ بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہا تھا کیونکہ میرے بولنے سے قبل ہی اس نے تعاقب کرنے والوں پر فائرنگ کا حکم دے دیا۔

پچھلی جیپ کافی فاصلہ پر تھی لیکن ان لوگوں کو شاید اسٹین گن کی مار کا اندازہ نہیں تھا جب مختلف زاویوں سے تین اسٹین گنز چلیں تو جیپ کی اگلی روشنیاں تباہ ہو گئیں، ٹائر خوفناک دھماکوں سے پھٹ گئے۔ کئی ملی جلی انسانی چیخیں ابھریں اور مجرموں کی دوسری جیپ کی روشنی میں وہ ناکارہ گاڑی داہنی جانب ایک گہرے کھڈ میں لڑھک گئی۔

چند ثانیوں کے لئے مجرموں کی دوسری جیپ وہاں رکی، شاید حادثہ کا شکار ہونے والی گاڑی کے مسافروں کی مدد کے لئے کچھ آدمی اترے اور اس بار وہ زیادہ فاصلے سے ہمارے تعاقب میں ہو لی۔

ٹڈ کی ہدایت پر اس جیپ پر بھی کئی مرتبہ باڑھ ماری گئی لیکن وہ ہم سے بہت پیچھے تھی۔

انجن کا درجہ حرارت ظاہر کرنے والی سوئی موسم خشک ہونے کے باوجود سرخ پٹی کو چھو رہی تھی۔ بانٹ سے بھاپ کے بادل اٹھ اٹھ کر جیپ میں آ رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ لینڈ روور کا ریڈی ایٹر پتھروں سے ٹکرا کر پھٹ چکا ہے اور پانی کے بغیر جیپ زیادہ دیر نہ چل سکے گی۔ انجن کی ہموار آواز آہستہ آہستہ بدلتی جا رہی تھی۔ سوئی سرخ پٹی کی طرف بڑھی پھر میٹر کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ بھاپ کے بادل تیزی سے اٹھنے لگے۔ انجن سے عجیب سی بو اٹھنے لگی مگر ٹڈ جبڑے بھینچے گاڑی چلاتا رہا آخر کار انجن نے چند تیز جھٹکے لئے اور جیپ رک گئی اس کا انجن سیز ہو چکا تھا۔

ہم لوگ نیچے اتر ہی رہے تھے کہ تعاقب میں آنے والی جیپ سے رائفلوں کے کئی فائر ہوئے۔ ہم میں سے دو آدمی چیخے، ایک آواز ٹڈ کے کسی ساتھی کی تھی، جس کا بازو زخمی ہوا تھا، دوسری چیخ لونا کی تھی وہ خون میں نہائی میری باہوں میں آ گری اور اس کا بدن تشنج کے عالم میں کانپنے لگا۔ ٹڈ اس کی آواز سنتے ہی سرچ لائٹ سنبھال کر پیچھے لپکا۔ اس وقت تک لونا کا بدن بے جان ہو کر میرے ہاتھوں میں جھول چکا تھا۔ رائفل کے فائر نے اس کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔

تعاقب میں آنے والوں کی جیپ دور ہی رک چکی تھی اور اسکی روشنیاں بھی گل تھیں۔ ٹڈ نے جوں ہی سرچ لائٹ روشن کی ادھر سے پھر فائر ہوئے اور سنسناتی ہوئی گولیاں ہمارے قریب سے گزر گئیں۔ ٹڈ نے سرچ لائٹ فوراً ہی بجھا دی اور سب لوگ پیٹ کے بل سڑک پر گر گئے۔ میں نے لونا کی لاش آہستگی سے سڑک پر ڈال دی۔

سڑک پر پیٹ اور کہنیوں کے بل رینگتا اور ٹٹولتا ہوا میں ٹڈ تک جا پہنچا اور اس کا بازو تھام کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "وہ مر گئی ٹڈ ـ وہ مر گئی ـ!"

"ہاں صفدر وہ مر گئی" ٹڈ جذبات سے عاری سرد آواز میں بولا "میں نے پوری ایمانداری سے اس کی حفاظت کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تم اس بات کے گواہ ہو"!

"تم نے مجھ سے زیادہ اس کی حفاظت کی ٹڈ"۔ میری آواز فرطِ جذبات سے رندھنے لگی "مگر اس کا مقدر اپنا فیصلہ صادر کر چکا تھا"

"اب میں انند بھون کے مکینوں سے انتقام لوں گا۔ ہاں میں لونا کے خون کا انتقام لوں گا"۔

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں"۔ ٹڈ کا لہجہ اب بھی سرد اور جذبات سے عاری تھا "ہر انسان مرنے کے لئے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مگر لونا میری پناہ میں ماری گئی ہے یہ میری کاروباری توہین ہے اور میں اس کا حساب ضرور چکاؤں گا۔ آگ کے فلک بوس شعلے انند بھون اور اس کے مکینوں کو جلد ہی چاٹیں گے یہ میرا فیصلہ ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا"۔

"میں اس مقصد میں پوری طرح تمہارا ساتھ دوں گا"۔

"میرے اپنے وسائل ہیں۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تم میرے لئے ایک غیر متعلق فریق ہو۔ میرا معاہدہ لونا سے تھا وہ ماری گئی بس اب میں کٹھمنڈو واپس جاؤں گا۔ تم اپنی راہ کا انتخاب کرنے کے لئے آزاد ہو!"

"میری مدد نہیں کرو گے؟"

"معاوضہ کے بغیر نہیں!"، اس کا لہجہ اٹل تھا "لونا سے سات آٹھ ہزار لیکر درحقیقت مجھے نقصان ہی ہوا ہے۔ اگر یہ جیپ چوری کی نہ ہوتی تو یہ سیدھا سادا پچاس ہزار کا نقصان تھا!"

اسی وقت تعاقب کرنے والوں کی طرف سے پھر فائرنگ ہوئی اور سب لوگ ٹڈ کی ہدایت پر بائیں طرف کی پہاڑیوں میں رینگنے لگے۔ میں بھی جانکنی کے عالم میں ان کے ہمراہ تھا۔ لونا کی لاش سڑک پر جیپ کے پاس پڑی ہوئی تھی ـ بے گور و کفن!

جب ہم سڑک سے ہٹ کر کھردری پہاڑی ڈھلان پر پہنچے تو ٹڈ رک گیا۔ مجرموں کی جانب سے اب بھی تواتر کے ساتھ فائرنگ ہو رہی تھی اور وہ تاریک ویرانہ رائفلوں کے شور سے گونج رہا تھا۔

"ٹڈ۔ تم اسے یوں لاوارث چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے!"، اس کے رکتے ہی میں اس کے مقابل جا پہنچا اور زہریلے لہجہ میں کہنے لگا "وہ مر ضرور گئی ہے اور اگر تم اسے نواکوٹ نہیں پہنچا سکے تو کم از کم اس کی لاش شہر واپس لے جانی ہو گی"۔

"میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کرو صفدر!" وہ کسی زخمی بھیڑیئے کی طرح غرایا۔ "ایک بے جان لاش کو میں ساتھ لٹکائے نہیں پھر سکتا!"

"تمہیں ہر قیمت پر وہ لاش کٹھمنڈو پہنچانی ہو گی!" میں ضد پر اتر آیا۔

"اگر تمہیں لونا سے اتنی ہی محبت تھی تو جاؤ اور اس کی لاش کو کندھے پر ڈال کر کٹھمنڈو کی طرف دوڑنا شروع کر دو تاکہ حملہ آور تمہیں بھی جلد از جلد اس کے پاس پہنچا دیں"۔ وہ تلخ لہجہ میں بولا۔

"ٹڈ ـ خدا کے لئے!" میں گڑگڑایا۔

وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہوا پھر خلافِ توقع نرم لہجہ میں بولا "اب خاموشی سے سارا کھیل دیکھتے رہو، اگر میرا منصوبہ کامیاب رہا تو میں اس کی لاش بھی اٹھا لے جاؤں گا"۔

"میں تمہارے الفاظ پر اعتماد کرتا ہوں!" میں نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا۔

پھر ٹڈ نے اپنا ایک آدمی وہیں چھوڑ دیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ ایک محدود دائرہ میں دوڑ دوڑ کر جگہ بدلتا رہے اور ہر نئی پوزیشن سے دشمن پر اسٹین گن کی جوابی فائرنگ کرتا رہے تاکہ ایک طرف تو وہ آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکیں اور دوسری جانب اسی مغالطہ میں رہیں کہ ٹڈ کی پوری جمعیت کسی خاص بنا پر اسی جگہ رک کر جیپ کی حفاظت کر رہی ہے۔

اس بندوبست کے بعد ٹڈ میرے اور اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ چوپایوں کی طرح تیزی سے پہاڑیوں پر چڑھنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد نیچے سے اسٹین گن کی خوفناک آواز گونجی اور وقفہ وقفہ سے اس کا شور حریف کی رائفلوں کی گونج پر غالب آنے لگا۔

پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد ہم لوگ تیزی سے واپس دوڑنے لگے۔ اس بار بھی چوپایوں کا سا انداز اختیار کیا گیا تھا تاکہ دشمن ہمارے ہیولے دیکھ بھی لے تو شبہات کا شکار ہو جائے۔

تقریباً بیس منٹ کی جان لیوا جدوجہد کے بعد ہم پہاڑیوں پر عین اس جگہ جا پہنچے جہاں ٹرک کے کنارے دشمن کی جماعت سینوں کے بل لیٹی رائفلیں چلا رہی تھی۔ ٹڈ اور اس کے ساتھی بلندی پر ٹیلیوں اور پتھروں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ یہاں سے وہ سب ان کی براہِ راست زد میں تھے! وہ تعداد میں صرف چار تھے مگر اس تواتر کے ساتھ رائفلیں بار بار لوڈ کر کے فائر کر رہے تھے کہ دس بارہ آدمیوں کی جماعت کا شبہ ہوتا تھا۔

"پہلے ہی راؤنڈ میں ان کا صفایا ہونا ضروری ہے۔ جیپ کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچے۔" ٹڈ نے سرد اور بے رحمانہ آواز میں اپنے تینوں ساتھیوں کو ہدایت دی۔

اسٹین گنز کے آتشیں شور میں ان لوگوں کی کربناک چیخیں ابھریں اور جب گنز خاموش ہوئیں تو وہ چاروں دم توڑ چکے تھے۔ ٹڈ کے ساتھیوں نے بڑی مہارت سے جیپ کو بچاتے ہوئے ان کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ میں کسی تنویم زدہ مریض کی طرح ٹڈ کی طرف گھوما تو میرا بایاں شانہ ایک اسٹین گن کی نال سے لگ گیا اور میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ نال گرم ہو رہی تھی، اور اس میں سے ابھی تک جلتے ہوئے بارود کا ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔

شاید لینڈ روور کے پاس رکنے والا ٹڈ کا ساتھی فائرنگ اور انسانی چیخوں کی بنا پر ساری صورت حال سمجھ چکا تھا کیونکہ اس نے بھی فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔

ٹڈ گمبھیر خاموشی میں پہاڑیوں سے نیچے اترا اور ان چاروں لاشوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جیپ میں جا گھسا۔ اس کے ساتھی خون آلود رائفلیں اور کارآمد کارتوسوں کی پیٹیاں سمیٹنے لگے۔

جیپ اسٹارٹ کرنے سے پہلے ٹڈ نے داہنے ہاتھ کی ایک [...] اپنے دہانہ میں ڈال کر کیساں وقفوں سے تین بار تیز سیٹی بجائی۔ اس کے [...] ہوتے ہی کسی جانب سے ویسا ہی جوابی سگنل آیا۔ پہاڑیوں میں آواز کی بازگشت [...] پھیلنے سے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ آواز کدھر سے آئی ہے!

"اب ٹھیک ہے، ورنہ وہ احمق جیپ کو دیکھتے ہی اسٹین گن [...] ٹریگر دبا دیتا۔" ٹڈ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

جیپ آگے لینڈ روور کے پاس جا رکی۔ وہاں ٹڈ کا چوتھا ساتھی بے فکری کے ساتھ ٹرک پر دراز چرس پی رہا تھا۔ ہیڈ لیمپس کی تیز روشنیاں سامنے آتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس کی خون آلود آستین دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ [...] کے ہمراہ زخمی ہونے والا وہی تھا۔

"ٹڈ از گریٹ!" جیپ رکتے ہی وہ زخمی نیر کی طرح ہماری طرف [...] آیا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"لڑکی کی لاش بھی جیپ میں ڈال لو۔" ٹڈ کی آواز میں احساس [...] ہلکا سا تاسف ابھر آیا تھا۔ "اسے ہم شہر واپس لے جائیں گے!"

میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جیپ سے کود چکا تھا۔

لونا کی خون میں نہائی لاش اس ویران پہاڑی ٹرک پر پہلو کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر کا داہنا حصہ بالکل غائب ہو چکا تھا۔ چہرہ بھی شناخت کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس وفاشعار اور باکردار لڑکی کا انجام نہایت لرزہ خیز تھا۔ اس کے سامنے پہنچتے ہی ندامت سے میرا سر جھک گیا اور آنکھوں کے سامنے نمی کی چادر سی لرزنے لگی۔

وہ ایک رات کی دلہن تھی جسے عروسی جوڑا تو نصیب نہ ہوا [...] مقدر نے اسے اپنے ہی لہو کا سرخ پیرہن فراہم کر دیا تھا۔ وہ جب تک تنہا [...] ماحول کی غلاظتوں کے خلاف مردانہ وار جہاد کرتی رہی، زندگی اس کا ساتھ دیتی رہی لیکن جب اس جدوجہد سے اکتا کر ازدواجی زندگی کا سہارا لیا [...] دردناک موت نے اسے آ لیا۔ اس وقت میں خود کو اس کا قاتل سمجھ رہا تھا۔ اگر میرا ماضی داغدار نہ ہوتا تو نہ میں قانون کے بے رحم جنگل میں پھنستا، نہ لونا میری رہائی کی کوششیں کرتے ہوئے انڈر ورلڈ کے مکینوں کی نگاہ میں آتی۔ اس نے میری آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کر دی تھی۔

ٹڈ سر جھکائے سوگوارانہ انداز میں لاش اٹھائے جانے کا منظر دیکھتا رہا۔ لونا کا بے جان جسم جیپ کے پچھلے حصہ میں ڈال دیا گیا۔ باقی لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے لئے جگہ بنائی اور جیپ کھٹمنڈو کی طرف واپس روانہ ہو [...] جیپ میں گہری خاموشی تھی اور لونا کی ناگہانی موت پر سب دل گرفتہ نظر آتے [...] چوری کی لینڈ روور جہاں بند ہوئی تھی اسی جگہ چھوڑ دی گئی۔

آگے چار حملہ آوروں کی جلتی لاشیں دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ کھٹمنڈو سے نواکوٹ کے راستے پر سورج غروب ہونے کے بعد عام طور پر بالکل سناٹا ہوتا تھا۔ لہذا صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل اس ہولناک تصادم کی خبریں شہر پہنچنے کی کوئی امید نہ تھی۔

پھر جیپ کی روشنیوں میں ٹرک پر تین آدمی نظر آئے۔ بائیں جانب کی گہری کھائیوں سے دھویں کے کثیف بادل اٹھ رہے تھے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں بجروں کی ایک جیپ اپنے سواروں سمیت اسٹین گنز کا نشانہ بن کر گہری کھائیوں میں جا گری تھی۔ اس کا ڈھانچہ شاید ابھی تک جل رہا تھا اور وہ تینوں دوسری جیپ آنے جانے والے افراد معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اسی غلط فہمی میں تھے کہ ان کے ساتھی ہمیں ٹھکانے لگا کر لوٹ رہے ہیں۔ گو جیپ ان ہی کی تھی مگر سوار بدل چکے تھے۔

ان کے قریب پہنچ کر ٹڈ نے تیزی سے بریک لگائے اور اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ نیچے اتر کر ان تینوں کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ ابھی تک نئی صورتِ حال سے لاعلم تھے۔ پھر جب ہیڈ لائٹس کی روشنی میں انہوں نے اپنے مقامی ساتھیوں کے بجائے تین خونخوار سفید فاموں کو دیکھا تو ان کے لئے فرار کی ہر راہ مسدود ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے ٹڈ نے ان میں سے ایک کے منہ پر بھرپور گھونسہ رسید کیا اور اس کے لڑکھڑاتے ہی اس کی کمر پر اتنی بھرپور لات رسید کی کہ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور بائیں جانب کی مہیب گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ اس کی آوازوں کی آسیبی بازگشت رہ رہ کر دیر تک اس ویرانہ میں پرہول سماں باندھتی رہی۔ ابھی اس کی چیخیں تھمی بھی نہ تھیں کہ باقی دونوں آدمیوں کو بھی ٹڈ اور اس کے ہمراہیوں نے پہلے کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ چیخوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہزاروں فٹ گہری کھڑی ڈھلانوں پر لڑھکتے تیزی سے موت کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ ایسی خونریزی میں نے عمر میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ پرشوتم لعل والے قضیہ میں بھی کافی خونریزی ہوئی تھی۔ لیکن ٹڈ نے سفاکی اور بربریت کے ہر معیار کو مات کر دیا تھا۔

ٹڈ ٹرک کے کنارے پر جا کر کھائی کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ساتھیوں کے ہمراہ میں بھی جیپ سے اتر آیا اور ادھر جھانکتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گرنے والی جیپ اس قدر گہرائی میں جل رہی تھی کہ ٹرک کے کنارے سے وہ چند سلگتے ہوئے کوئلوں کا ایک ننھا سا ڈھیر نظر آ رہی تھی اور ڈھلانوں پر کئی اطراف میں حرکت نظر آ رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ نیچے لڑھکنے والے ہیولوں میں کتنے بے جان چٹانیں ہیں اور موت کے مسافر کس طرف ہیں، البتہ ان کی دہشت ناک چیخوں کی دم توڑتی ہوئی گونج اس گھاٹی کے ہر پتھر سے ابھر رہی تھی۔

جب ہم کھٹمنڈو کی آبادی میں داخل ہوئے تو ہر سو خوابیدہ سناٹے کا طلسم گونج رہا تھا۔ پہاڑی بلندیوں اور نشیبی میدانوں میں بکھرے اونچے نیچے چوبی مکانات اور ان کی کھڑکیوں سے آتی [...] روشنیاں صدیوں پرانے کسی ویران معبد کا سماں باندھ رہی تھیں جہاں ہر طرف حنوط شدہ لاشوں کی آنکھوں کی ویران پتلیاں چمک رہی ہوں!

"ہم لڑکی کی لاش کو شہر میں زیادہ دیر لئے نہیں گھوم سکتے... اسے کہاں پہنچانا ہے؟" طویل سکوت کے بعد ٹڈ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں..." میرا لہجہ گلوگیر تھا۔ "میں اسے کسی ویران سڑک پر لاوارث نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اب میں تمہیں بھی مجبور نہیں کرتا، جو چاہو کر سکتے ہو...!"

"یہ جیپ ہمارے لئے خطرات کا باعث بن سکتی ہے۔" ٹڈ بولا۔ "لہذا اسے لاش سمیت یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس وقت ساڑھے تین بجے ہیں، سورج طلوع ہونے تک ہم کسی فٹ پاتھ پر پڑاؤ کریں گے!"

"مگر جیپ قیمتی اسلحہ سے بھری ہوئی ہے ٹڈ!" ایک ہپی بولا۔ "خودکار رائفلیں اور ان کا میگزین ہمیں مفت ملا ہے، اسے چھوڑنا مناسب نہیں۔"

ٹڈ نے بریک لگاتے لگاتے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ آج میرا دماغ بھی چل گیا ہے۔ اسلحہ ہم کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے!"

"اور ٹڈ دن کے اجالے میں فٹ پاتھ پر میری موجودگی موت کا بہانہ ثابت ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تم جہنم میں جاؤ۔" ٹڈ سپاٹ لہجہ میں بولا۔ "میں تمہیں بلاوجہ ساتھ لئے گھوم رہا ہوں، تمہاری وجہ سے لڑکی ماری گئی۔ یہ ہمارا مقدر ہے کہ ہماری تعداد پوری ہے ورنہ ہم چوہے دان میں پھنس چکے تھے۔"

"مجھے گالیاں دو، ذلیل کرو، تھپڑ مارو ٹڈ۔ یہ میری بدنصیبی کی رات ہے جو تم جیسا اعلیٰ ظرف انسان بھی مجھ پر رحم نہیں کھاتا۔ میں کسی ہمدردی اور رعایت کا مستحق نہیں ہوں!"

ٹڈ کچھ نہ بولا۔ جیپ ایک مرتبہ پھر آبادی سے نکل کر ویرانوں کا رخ کر رہی تھی!

"اسلحہ کھنڈرات تک پہنچانا دشوار ہے۔" کچھ دیر بعد وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "راستہ میں پولیس سے سامنا ہو گیا تو کیا ہوگا!"

اچانک میرے ذہن میں ایک تجویز آئی اور میں ٹڈ کی طرف مخاطب ہو گیا۔ "بتاؤ۔ میں کتنا معاوضہ دے کر تمہاری ہمدردیاں خرید سکتا ہوں!"

اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا۔ "جب تک میں اسلحہ محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ نکال لوں میں کوئی نیا معاہدہ نہیں کروں گا اور تمہارے پاس رہا کیا ہے؟"

"میں تمہیں اسلحہ چھپانے کا ٹھکانہ بتاتا ہوں تم میری مدد کا وعدہ کرو۔" میں نے اس کی تحقیر کی پرواہ کئے بغیر کہا۔

"جس کے پاس خود سر چھپانے کی جگہ نہ ہو وہ مجھے کیا مشورہ دے گا۔" وہ زہریلی آواز میں ہنسا۔

"وہ ایک ویران اور لاوارث پہاڑی عمارت ہے بڈ۔ جہاں دور دور کسی ذی روح کا گزر نہیں۔ وہ عمارت مقفل ہے اور اندر چار پانچ دن سے اس کے مالک کی لاش سڑ رہی ہے۔ تم فی الحال مجھے وہاں چھوڑ دو اور اسلحہ بھی وہیں اتار دو ... ایک دو روز میں تم بآسانی اسلحہ وہاں سے نکال سکتے ہو مگر اس کے عوض تمہیں مجھ کو کسی نہ کسی طرح اندرام سے پیشتر لونا کوٹ پہنچانا ہو گا!" اس وقت پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ لونا ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ چکی ہے میں زندگی کے ایک محاذ پر بری طرح ہار چکا تھا۔ اور جلد یا بدیر مجھے یہ حقیقت تسلیم کرنی ہی تھی تو کیوں نہ میں اندرام کا تعاقب کر کے بھاندر ناس کی تلاش کی مہم جاری رکھوں۔ فی الوقت میرے سامنے یہی ایک مقصد رہ گیا تھا۔ ورنہ میں زمانہ کا ٹھکرایا ہوا، قانون کا مفرور ایک ایسا معاشرتی مجرم تھا جسے اب جینے کا کوئی حق نہ رہ گیا تھا۔

"کیا کھٹمنڈو میں واقعی کوئی ایسی جگہ بھی ہے؟" بڈ نے تمسخر آمیز لہجے میں پوچھا!

"ہاں!" میں اپنے لہجہ میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا: "وعدہ کرو کہ اگر وہ جگہ تمہارے معیار کے مطابق ہوئی اور تمہارا اسلحہ وہاں محفوظ رہا تو تم میری مدد کرو گے!"

میرے اعتماد نے بڈ کو سنجیدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا: "اگر وہ ایسی ہی جگہ ہے تو مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ اسلحہ محفوظ ہو جائے تو میں جیپ کہیں بھی چھوڑ سکتا ہوں!"

معاہدہ طے پا چکا تھا لہٰذا میں زیرو پوائنٹ جانے والے مختصر ترین راستہ کی طرف اس کی رہنمائی کرنے لگا جہاں امیر خاں کا بے جان جسم کئی دن سے سڑ رہا تھا۔

نصف گھنٹہ سے بھی کم عرصہ میں جیپ پہاڑیوں سے گھری اس یک و تنہا عمارت پر جا پہنچی۔

اس کا محل وقوع دیکھتے ہی بڈ مسرت سے اچھل پڑا: "اگر واقعی اس عمارت کا کوئی دعوے دار نہیں ہے تو یہ ہمارے لئے بہترین جگہ ثابت ہو گی۔"

اس دریافت کی خوشی میں چند ثانیوں کے لئے وہ لوگ بھول گئے کہ جیپ میں ان کے ہمراہ ایک تازہ لاش بھی ہے جس کے لئے وہ سب ہی غمگین تھے۔

زیرو پوائنٹ کی عمارت آبادی سے اتنی دور واقع تھی کہ بڈ نے نہایت اطمینان سے تالے کے سوراخ پر اپنے ایک ریوالور کی نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ زبردست دھماکے کے ساتھ مضبوط تالے کے ٹکڑے اڑ گئے اور بڈ نے دروازے کے پٹ کھول دیئے۔

دروازہ کھلتے ہی اندر سے تعفن کی ایک شدید لہر آئی اور سب لوگ کئی قدم پیچھے ہٹ گئے!

"اس بدبو میں تم یہاں کیسے رہ سکو گے؟" بڈ نے کھلی کھڑکی [illegible] آتے ہوئے پوچھا۔

"اندر قیمتی شرابوں کا بھاری ذخیرہ موجود ہے۔ میں لاش کی باقیات کو شراب چھڑک کر نذرِ آتش کر دوں گا اور کونہ کونہ میں شراب چھڑکوں گا پھر یہاں کوئی بدبو نہ رہے گی۔" میں نے جواب دیا۔

بڈ کی ہدایت پر اس کے آدمی جیپ سے اسلحہ اتار اتار کر عمارت کی راہداری میں ڈھیر کرنے لگے اور وہ میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

"ہو سکتا ہے کہ آج کے معرکہ کے بعد شہر میں پولیس بہت زیادہ سرگرم ہو جائے اور میں کئی دن تک یہاں سے اسلحہ نکالنے میں کامیاب ہو سکوں۔ ایسی صورت میں تمہیں خوراک وغیرہ کی ضرورت تو پیش آئے گی، میں اس کا جاتے ہی انتظام کر دوں گا۔" وہ اب دوستانہ لہجہ میں بات کر رہا تھا۔

"تمہیں فکر کی ضرورت نہیں ۔۔ اس عمارت میں کئی مہینوں تک کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو گی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو میں اب تنہا واپس جاؤں گا میرے چاروں آدمی بھی تمہارے ساتھ یہیں رہیں گے!" وہ جلدی سے بولا۔

"میری نگرانی کے لئے یا اسلحہ کی حفاظت کے لئے؟" میرا لہجہ یکا یک تلخ ہو گیا۔

"یو سن آف اے بچ!" وہ دانت پیس کر غرایا: "میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا!"

"اگر ہو بھی تو میرے لئے فرق نہیں پڑتا!" میں لاپروائی سے بولا: "ان کے یہاں ہونے سے مجھے تنہائی سے نجات ملے گی۔ شاید یوں ہی میں لونا کا غم ہلکا کر سکوں۔"

"اب وہ مر چکی ہے!" بڈ میرے شانہ پر ہاتھ مار کر بولا: "اسے بھول جاؤ ورنہ تمہارے دشمن تمہیں بھی جہنم واصل کرنے میں تاخیر نہیں کریں گے!"

"مجھے مشورے نہ دو بڈ!" میں دکھ بھرے لہجہ میں بولا: "جاؤ اور کچھ دیر کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، ہاں! لونا کی لاش کسی ایسی جگہ چھوڑنا جہاں سے اس کے سوتیلے باپ کو خبر مل سکے۔ عیسائیوں کے قبرستان میں ہی سہی۔ اگر اسے مرنے کے بعد دو گز زمین میسر آ گئی تو مجھے قدرے سکون مل سکے گا۔"

"اوکے!" اس نے جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے میری طرف ہاتھ لہرایا اور اپنے ساتھیوں سے بولا: "تم یہیں صفدر کے ساتھ رہو گے میں پہلی فرصت میں ادھر آؤں گا۔"

وہ جیپ میں سوار ہوا اور لونا کی لاش سمیت وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میری رہنمائی میں بڈ کے ہمراہیوں نے داخلی دروازہ اندر سے بند کیا اور سرچ لائٹ کی روشنی میں اندر جا پہنچے۔ سرچ لائٹ بڈ نے ہمارے پاس ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ واپسی میں روشنی نہ ہونے کے باوجود وہ بآسانی وہاں سے جیپ نکال لے جائے گا۔

زیرو پوائنٹ میں امیر خاں کی لاش اسی کمرہ میں موجود تھی جہاں وہ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کی لاش پھول چکی تھی، خدوخال مسخ ہو چکے تھے مگر اس حالت میں بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا کہ اس کی داہنی پنڈلی اور سینے میں ریوالوروں کی دو گولیاں اتاری گئی ہوں گی۔ کمرہ کے فرش پر دور تک خون کی کائی دبیز خشک تہہ جمی ہوئی تھی اور اس پر چیونٹیاں اور دوسرے مردہ خور حشرات الارض امیر خاں کی لاش کے گرد گھوم رہے تھے۔ ان کے غول کے غول لاش کی آنکھوں، دہانہ اور دونوں زخموں سے چمٹے ہوئے تھے۔

"اسے کس نے مارا تھا؟" ایک ہپی نے مجھ سے سوال کیا۔

میرے لئے تعفن اور گھٹن کے باعث وہاں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ان سب کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور تہہ خانہ والے راستہ کی طرف ہو لیا۔

تہہ خانہ کی سیڑھیاں اترنے پر جب وہاں سرچ لائٹ کی روشنی پڑی تو وہ چاروں اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار عجیب عجیب آوازیں نکالتے ہوئے عقب میں ہی دیوار گیر الماریوں کی طرف دوڑ پڑے جہاں مختلف اقسام کی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

"ورندگی کی ضرورت نہیں۔" میں اونچی آواز میں بولا: "اس لاش کا بندوبست کرنے سے پہلے کوئی شراب کا قطرہ تک نہیں چکھے گا۔"

"صفدر ٹھیک کہہ رہا ہے گیری!" سونی اپنے ساتھی کے ہاتھ سے بوتل چھینتے ہوئے بولا: "پہلے لاش ٹھکانے لگاؤ پھر شراب پی کر آرام کریں گے!"

شراب کی دس بوتلیں لے کر ہم لوگ واپس اوپر آئے۔ میرا خیال تھا کہ لاش باہر برآمدہ میں لے جا کر جلائی جائے، لیکن ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ لاش اسی جگہ جلائی جائے تاکہ خون کے دھبے بھی جل جائیں یوں کام آسان رہے گا اور شعلوں کا انعکاس بھی کمرہ ہی میں محدود رہے گا۔

امیر خاں کی ہیبتناک لاش پر شراب کی ساری بوتلیں خالی کر دی گئیں البتہ یہ احتیاط رکھی کہ شراب باہر یا کسی چوکھٹ تک نہ پہنچنے پائے پھر ماچس کی ایک تیلی جلا کر ادھر اچھال دی گئی۔

الکحل کے آتش گیر بخارات نے فوراً آگ پکڑ لی اور کمرہ میں شعلے بھڑکنے لگے۔ امیر خاں ۔۔ جس کا ماضی جرائم، تشدد اور قتل و غارت گری کے انسانوں سے بھرا ہوا تھا جس کے نام سے بڑے بڑے شہہ زور اور سرکش مجرم پناہ مانگتے تھے۔ کھٹمنڈو کا وہ ہیرو اس وقت بے بسی سے آگ میں جل رہا تھا وہ عبرت کے عجیب لمحات تھے۔ رہ رہ کر میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ جاتی تھیں۔ ایک آدھ مرتبہ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جرائم اور گناہوں کی اس چتا میں میرا وجود بھی پگھل رہا ہے۔ کیونکہ میں بھی کوئی پارسا نہیں تھا۔ میرا اعمال نامہ بھی داغوں سے بھرپور تھا۔

وہ چاروں پتہ نہیں کب اس شمشان سے نکل گئے مگر میں سکتہ کے عالم میں وہیں کھڑا رہا شعلے بھڑکتے رہے۔ بال تو پہلے ہی گل چکے تھے۔ کھال سے اتر کر شعلے ہڈیوں کو چاٹنے لگے تو آہستہ آہستہ اس سیاہ ڈھانچہ پر تناؤ چھانے لگا آخر ہڈیاں کڑکڑائیں اور وہ ڈھانچہ یک بیک ایک پہلو پر مڑ گیا۔

یہ منظر اس قدر دہشتناک تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے امیر خاں آگ سے نکل کر میری طرف لپکنے والا ہے اور ابھی میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ شعلوں میں جا گھسے گا کیونکہ میں بہت سے جرائم میں اس کا ساتھی اور معاون تھا!

رات کے آسیبی اندھیرے میں ہیبت سے میں چیخ پڑا اور ہذیانی آوازیں نکالتا باہر کی طرف بھاگ لیا۔

اس کے بعد مجھے بس اتنا یاد ہے کہ چند لوگوں نے مضبوطی سے مجھے جکڑ لیا اور مجھ پر پے در پے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میری نگاہوں کے سامنے دھند ناچ رہی تھی، میں اندازہ نہ کر سکا کہ مجھے پکڑنے والوں کی تعداد کیا ہے اور وہ کون ہیں۔!

"میں بے گناہ ہوں ... میں نے کوئی جرم نہیں کیا، مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو!" ان آوازوں کے ساتھ ہی میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے زبان میں گویائی کی قوت نہ رہی اور ذہن میں یک بیک عجیب سا فرحت آمیز سناٹا گونجنے لگا۔ بے ہوشی کا سناٹا۔

اور جب میں دوبارہ ہوش میں آیا تو میرے گرد ڈبڈ کے وہ چاروں ساتھی موجود تھے جنہیں وہ میرے ہمراہ زیرو پوائنٹ پر چھوڑ گیا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟" میں نے لیٹے ہی لیٹے نقاہت بھری آواز میں پوچھا

"اسی عمارت میں جہاں ڈبڈ ہمیں چھوڑ گیا تھا!"

دفعتاً مجھ پر خفت سی طاری ہونے لگی اور میں تیزی کے ساتھ اٹھ گیا۔ لونا کی جلتی ہوئی لاش نے راستے کے پُرہول اور ویران سناٹے میں میرے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور میں دہشت سے ہذیان بکتا وہاں سے بھاگ پڑا تھا مگر عمارت سے باہر آنے سے قبل ہی ان چاروں نے مجھے روک لیا اور اب ہم سب زیرو پوائنٹ کے خوبصورت تہہ خانے میں تھے۔ وہ چاروں آسودہ انداز میں اپنی اپنی پسند کی شراب سے شغل کر رہے تھے۔!

"اوپر والی لاش کا کیا ہوا؟" میں نے ان سے سوال کیا۔

"سب کچھ تمہارے منصوبے کے مطابق ہوا" گیری بولا: "لاش کی جلی ہوئی ہڈیاں چورا کر کے ہم نے باہر پھینک دی ہیں۔ اور اب اوپر ذرا بھی تعفن نہیں رہا ہے۔"

میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ گھڑی کی سوئیاں آٹھ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ کے باعث میں شدید تکان محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاروں خورد و نوش سے فارغ ہو چکے تھے لہٰذا میں نے بھی کلب کی پیٹیوں سے اپنی آتشِ شکم سرد کی، اور بیش قیمت فرشی قالین پر ہی دراز ہو گیا۔

زیرو پوائنٹ پر ہمیں اسی طرح چار روز گزر گئے۔ کھانا، شراب اور تاش، یہ ہمارے جاں مشاغل تھے جو بیداری کے دوران میں ہمارا ساتھ دیتے۔ زیادہ دل گھبراتا تو شام کے وقت عمارت سے باہر سنگلاخ اور ویران میدانوں میں چہل قدمی کر لیتے۔ چونکہ ان اطراف کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات مجھے حاصل تھیں۔ لہٰذا انہوں نے مجھے اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا اور میرے ہر مشورے کو بلاحیل و حجت تسلیم کر لیتے تھے۔

زیرو پوائنٹ پر رہتے ہوئے شہر سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں تھا اس لئے اس گوشۂ عافیت سے نکلنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ سنہا کے آدمیوں سے مسلح تصادم میں جو خونریزی ہوئی تھی اس کے نتیجے میں شہر میں امن و امان کے ذمہ داروں کا سرگرم ہونا ضروری تھا۔ نہ جانے ڈبڈ کہاں اور کس حال میں تھا لونا کی لاش کا کیا ہوا ہو گا؟ مہارشی انند رام کب تک لزاکوٹ کی جانب روانہ ہو گا؟ کیا میں اس کا تعاقب کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا؟ یہ اور ایسے ہی بے شمار دوسرے سوالات ہر وقت مجھے پریشان کئے رہتے تھے!

ڈبڈ کے ساتھیوں کو اس پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ اس کی طویل غیر حاضری پر بھی مطمئن تھے۔ انہیں یقین تھا کہ فضا سازگار ہوتے ہی ڈبڈ ان کی خبر لے گا لہٰذا پریشانی بے سود تھی۔

پانچویں شام ویرانے میں کسی جیپ کے انجن کا ہلکا ہلکا شور ابھرا اور سب لوگ چونک کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"شاید ڈبڈ آ رہا ہے!" ان میں سے ایک نے کہا۔

"آنے والا کوئی بھی ہو!" میں نے ان سے کہا "گر احتیاط لازم ہے۔ دو آدمی رائفلیں لے کر باہر سے عمارت کو کور کرو۔ تین آدمی اندر رہیں گے اگر وہ ڈبڈ ہی ہوا تو ہم اسے پہچان لیں گے۔"

میری تجویز معقول تھی دو آدمی رائفلیں سنبھال کر باہر نکل گئے اور میں نے دوسرے آدمیوں کے ساتھ کھڑکیوں کے عقب میں مورچہ سنبھال لیا۔ جیپ کا شور آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا!

چند منٹ گزرے کہ وہ آواز بتدریج بہت قریب آ گئی اور زیرو پوائنٹ کے گرد پھیلے ہوئے ٹیلوں کی اوٹ سے ڈبڈ کی ایک کھلی جیپ نمودار ہوئی۔ اسٹیئرنگ پر موجود ہیولا شام کے دھندلکے میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اندر والوں نے عمارت کا دروازہ کھول دیا۔ اور باہر والے لپک کر چلتی ہوئی جیپ پر سوار ہو گئے۔

"تو تم لوگ یہاں اب تک محفوظ ہو!" ڈبڈ جیپ کا انجن بند کر کے نیچے اترتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ بے نظیر جگہ ہے ڈبڈ!" گیری پرجوش لہجے میں بولا: "تہہ خانہ شراب اور کھانے پینے کے سامان سے بھرا ہوا ہے، شاید اسی عمارت میں کوئی کاسینو چلایا جا رہا ہے!"

"کاسینو کی حد تک بات درست ہے!" میں ڈبڈ کے سامنے آ گیا: "مگر شراب صرف باذوق لوگوں کے لئے ہے!"

"کیا مطلب؟" ڈبڈ حیرت سے غرایا۔

"جو لوگ یہ نہ جانتے ہوں کہ کس شراب میں کیا ملایا جاتا ہے وہ اس چھت کے نیچے نوشی کا حق نہیں رکھتے!" میں ڈبڈ کی غراہٹ کا اثر لئے بغیر بے خوفی سے بولا۔

"بکواس مت کرو صفدر!" سونی نے تیکھے لہجے میں مجھے مخاطب کیا: "ڈبڈ کے ایک اشارے پر اس عمارت میں موجود ساری شراب گندی نالی میں بہا دی جائے گی۔"

"میرے نزدیک گندی نالیوں اور اناڑی شرابی کے معدے میں کوئی فرق نہیں ہے!" میں نے ڈبڈ کو غیر جانبدار پا کر کہا۔

"اوہ۔ آج ایک کالا احمق ہمیں آدابِ نوشی سکھا رہا ہے!" سونی کا لہجہ زہریلا تھا۔

"مجھے معلوم ہے مجھے معلوم ہے!" ڈبڈ ہاتھ اٹھا کر ہنستے ہوئے بولا: "آپس میں جھگڑے کی ضرورت نہیں ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے

"سفید گیدڑ" میں نے سونی سے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تم مرد کی بات کرتے ہو اتنا تو مشرقی عورتیں بھی جانتی ہیں کہ واڈ کا میں سوڈا نہیں ملایا جاتا"۔

"بکواس!" ڈبڈ کو یک بیک طرارہ آ گیا: "مشرقی عورت اور شراب! وہ تو اس لطیف سیال کو جہنم سے درآمد کیا ہوا کوئی شیطانی نسخہ سمجھتی ہیں۔ وہ کیا جانیں شراب کی رمز!"

"اونچی آواز میں بول کر تم مجھے دھونس میں نہیں لے سکتے ڈبڈ!" میرے ذہن کی خلش مجھے بات بڑھانے پر اکسا رہی تھی "تم نے کھنڈرات والے تہہ خانے میں دنیا کی بہترین شرابوں کا شوقین ہونے کا دعویٰ کیا تھا پھر خود ہی مجھے واڈ کا میں حسبِ مرضی سوڈا ملانے کا مشورہ دیا تھا"۔۔

"میں نے تم مشرقیوں کو برانڈی میں کوکا کولا ملا کر پیتے دیکھا ہے" وہ غصے میں دہاڑا: "اور اکثر اناڑی تیزی کم کرنے کے لئے واڈ کا میں سوڈا ملا لیتے ہیں۔ میں نے اسی خیال سے تمہیں مشورہ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم پرانے پاپی ہو اور پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاؤ گے۔۔۔ اور لو پتے میاں ۔۔ تم کسی ایک عورت کا نام نہیں بتا سکتے جو شرابوں پر اتھارٹی کہلانے کی مستحق ہو۔ آخر تم نے ایسی توہین آمیز بات کہنے کی جسارت کیسے کی"

"اس لئے مائی ڈیئر ڈبڈ کہ میں ایسا نام بتا سکتا ہوں" میں نے نرم لہجے میں کہا: "بیگم نسیم کی کاک ٹیل پارٹیوں میں شرکت کو لوگ ایک اعزاز سمجھتے ہیں وہ نہ صرف روایتی نسخوں سے واقف ہے بلکہ اس نے ذائقہ اور سرور کی خاطر نت نئے تجربے کئے ہیں، وہ خبط کی حد تک اس موضوع سے دلچسپی رکھتی ہے"۔

"اس شہر میں!" ڈبڈ کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی۔

"ہاں اسی شہر میں۔ ماڈل ٹاؤن میں وہ معزز ترین شخصیت سمجھی جاتی ہے!"

"خیر۔ اگر ایسا ہے تو میں ضرور اس کی کسی پارٹی میں شرکت کروں گا"۔ ڈبڈ بات ختم کرنے کے موڈ میں تھا!

"لیکن یہ خیال رہے کہ وہ اپنے سے کم رتبہ لوگوں سے براہِ راست بات کرنا بھی کسرِ شان سمجھتی ہے!" میں نے اس بار ہنستے ہوئے کہا۔

"ڈبڈ سے زیادہ خوددار آدمی شاید روئے زمین پر نہ ہو گا"۔ وہ جھاگ پھلا کر بولا: "وہ کتنی بھی خودسر ہو مگر مجھے مدعو کرنے پر وہ خود کو مجبور پائے گی!" یہ کہتے ہوئے ڈبڈ نے گرمجوشی سے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ اور کھلکھلا کر ہنس دیا۔ وہ بہت جلد غصے میں آ جانے والا آدمی ضرور تھا مگر بنیادی طور پر صاف دل اور فراخ دل۔

"میں نے یہ چار دن یہاں نہایت تشویش، اور بے چینی میں گزارے ہیں۔ میں تو سمجھا کہ تم شاید ہم لوگوں کو بالکل ہی بھول چکے ہو!" میں نے اس کے ہمراہ عمارت میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "مجھے لونا کی لاش کی بھی بہت فکر تھی"۔

"اور میں اس لاش کی جانب سے فکرمند تھا جو تم لوگوں سے پہلے یہاں مقیم تھی"۔ ڈبڈ نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا: "کیا تم لوگ اس سے چھٹکارا حاصل کر چکے ہو!"

"اوہ بالکل۔!" اس بار گیری بولا: "اس متعفن لاش کی موجودگی میں تو یہاں رہنا ناممکن تھا۔ صفدر کی تجویز ضرورت سے زیادہ کارگر رہی!"

"ہاں تمہارے لئے ایک خبر ہے صفدر!" اچانک ڈبڈ چونک کر بولا۔

"وہ کیا؟"

"ایک شخص نے تمہارا کھوج نکالنے کے لئے مجھے بیس ہزار کی خطیر رقم کی پیش کش کی ہے!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہم .... مگر تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو!" یہ انکشاف میرے اعصاب پر بم کی طرح گرا۔

"ہاں یہی وعدہ میری راہ کی زنجیر بن گیا۔ ورنہ بیس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی!" وہ مسکرایا! "وہ تمہیں زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں پکڑنا چاہتے ہیں"۔

"مجھے یقین تھا ڈبڈ کہ تم اپنے عہد پر قائم رہو گے" میں نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ تم نے میرے آدمیوں اور اسلحہ کے لئے خفیہ ٹھکانا فراہم کیا۔ اور اب میں تمہیں بحفاظت لزاکوٹ پہنچانے کا پابند ہوں"۔

ڈبڈ کی زبانی مجھے بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ سنہا کے آدمیوں سے خونریز تصادم کے بعد شہر کی پولیس کو سخت تشویش تھی۔ کیونکہ گہری کھائیوں اور سڑک سے ملنے والی لاشوں کا کوئی وارث ہی سامنے نہ آیا تھا۔ ان حالات میں پولیس کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ البتہ ان متعدد لاوارث لاشوں کی دستیابی پر شہر میں ہراس اور سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی اور سرِ شام ہی سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں۔ دوسری طرف ڈبڈ نے سنہا کے آدمیوں سے چھینی ہوئی جیپ لونا کی لاش سمیت شہر کے ایک کاروباری علاقے میں چھوڑ دی تھی۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہونے پر جب وہاں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی تو کسی راہگیر نے عقبی نشست پر لاش کی موجودگی دریافت کی۔ معاملہ چونکہ قتل جیسے سنگین جرم کا تھا لہٰذا کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ پولیس کو مطلع کرتا۔ آخر کار ٹریفک کے ایک سپاہی نے یہ خبر کوتوالی پہنچائی پھر لاش موقع سے ہٹائے جانے سے قبل کسی عیسائی تماشائی نے لاش پہچان لی اور مشتعل عیسائیوں کا ہجوم وہاں آ پہنچا۔ وہ لوگ میرا نام لے کر مجھے لونا کا قاتل قرار دے رہے تھے۔ اور میری گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے پوسٹ مارٹم کے بعد شام کو لونا کی لاش اس کے ورثاء کے حوالے کر دی گئی اور پولیس پوری سرگرمی سے میری تلاش میں لگ گئی۔ مجھے مفرور قرار دے دیا گیا تھا میری ضامن بھی شہر سے لاپتہ ہو گیا تھا۔

لونا کی تدفین تک کسٹمنڈو کی نواحی پہاڑی شاہراہ سے لاشوں، خالی کارتوسوں اور کھڈ میں جلی ہوئی جیپ کے ڈھانچے کی دریافت کی سنسنی خیز خبریں شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھیں۔ اور شہری زندگی کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا کیونکہ اس شہر میں شاذ و نادر ہی اکادکا قتل کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ گو بظاہر لونا کے قتل اور شاہراہ سے ملنے والی لاشوں میں کوئی تعلق نہ تھا مگر شہری ان دونوں واقعات کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

پھر رات سے پہلے پولیس نے چند ایسی باتیں دریافت کیں جن سے شہریوں کے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ شاہراہ سے ملنے والی تباہ حال لینڈ روور کے بارے میں شہر کے ایک تھانہ میں پچھلی رات کی چوری کی رپورٹ موجود تھی مگر باقی دو جیپوں کا کوئی دعویدار نہ تھا۔ پھر جلے ہوئے ڈھانچے سے پولیس کو چیسسز کے نمبر ملے، لونا کی لاش کے ساتھ موجود جیپ کے نمبر بھی موجود تھے لہٰذا رجسٹریشن آفس کے ریکارڈ سے دونوں گاڑیوں کے مالک کا سراغ مل گیا اور پولیس کی ایک جمعیت انند بھون جا پہنچی۔ گیتارانی اپنے مشیرِ خاص سنہا کے ہمراہ پولیس افسران سے ملی۔ سنہا نے یہ تو اقرار کر لیا کہ وہ دونوں جیپیں انند بھون سے متعلق تھیں لیکن اس امر سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ ان گاڑیوں کو وہاں سے کون، کس مقصد کے لئے اور کب لے گیا تھا! پھر انند بھون کے سیکیورٹی کمانڈر اور دیگر عملے سے بازپرس ہوئی لیکن نہ ان باتوں کا کوئی جواب مل سکا نہ کوئی نئی بات سامنے آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سب نواحی شاہراہ پر ہلاک ہونے والوں کو یکسر فراموش کر چکے ہوں، ناکامیوں اور رائے عامہ کے خوف سے رات گئے پولیس نے وسیع پیمانے پر پورے شہر میں چھاپے مارے اور سارے حوالات مشتبہ افراد سے بھر گئے۔ ٹِڈ آزادی سے کھلی فضا میں دندناتا رہا!

اب ایک طرف پولیس پوری تندہی سے میری تلاش میں مصروف تھی تو دوسری طرف سنہا کے نمک خوار شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ لونا کے قتل کا شاہراہ والے تصادم سے تعلق قائم ہو جانے کے بعد شہریوں کے لئے میرا نام ہوا بن گیا تھا۔ ہر ایک کو یہ خدشہ تھا کہ جب تک صفدر جیسا خطرناک قاتل آزاد پھر رہا ہے شہر میں کسی کی جان محفوظ نہیں ہے۔

"میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا ٹِڈ! کہ ایک روز میرا نام لوگوں کے لئے دہشت کی علامت بن جائے گا۔" میں ساری کہانی سن کر طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"اس وقت فضا ایسی ہے کہ اگر چند منچلے آدمی شہر کے کسی بھرے پرے بازار میں کھڑے ہو کر تمہارے نام کا نعرہ لگائیں تو لوگ دکانیں اور تجوریاں کھلی چھوڑ کر بھاگ نکلیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تمہارے نام پر اس وقت بڑے کامیاب ڈاکے پڑ سکتے ہیں۔"

"اور میں بے چارہ تمہارے رحم و کرم پر اس ویرانے میں دبکا پڑا ہوں!" میں تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"فکر نہ کرو۔ تم آج رات ہر قیمت پر نواکوٹ پہنچا دیئے جاؤ گے پھر میں تمہاری طرف سے بری الذمہ ہو جاؤں گا۔" وہ میرا شانہ تھپتھپا کر

"میرے بارے میں نواکوٹ کی پولیس کو تو خاص طور پر ہوشیار کر دیا گیا ہو گا، ایسا نہ ہو کہ میں وہاں پہنچتے ہی دھر لیا جاؤں!" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"میں اس کا بندوبست کر چکا ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس وقت تمہاری گرفتاری میرے مفاد کے بھی خلاف ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم پر بہت سنگین فردِ جرم عائد کی گئی ہے۔ پولیس تمہاری زبان کھلوانے کے لئے بھیانک ترین حربے بھی اختیار کر سکتی ہے اور تم مجبور ہو کر سب کچھ اگل دو گے پھر میرا ٹھکانہ بھی پسِ زنداں ہی ہو گا!"

"یہ تمہاری بھول ہے ٹِڈ!" میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں بولا۔ "میں مر جاؤں گا مگر میری زبان پر تمہارا نام تک نہ آئے گا۔ میں دوست اور دشمن کو خوب جانتا ہوں!"

"مجھے تمہاری نیت پر شبہ نہیں صفدر۔" وہ نرمی سے بولا "مگر اذیت موت سے کہیں زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اگر وہ زندگی پر ہی اتر آئے تو تمہارا رواں رواں بول پڑے گا۔"

"خیر۔ یہ وقت ہی بتائے گا۔"

"تم ایک بار شہر سے نکل جاؤ تو میں انند بھون والوں سے اپنی کاروباری رقابت کا بھرپور انتقام لوں گا۔ وہ عمارت اس زمین پر درندگی اور سازشوں کی ایک ناپاک علامت ہے۔"

"گویا اس بارے میں تم سنجیدہ ہو؟"

"بہت زیادہ!" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "تم بھیڑیوں کی خصلت سے تو واقف ہو نا۔؟ ان کے غول میں کوئی ساتھی مر جائے تو وہ طویل رفاقت کو بھول کر اسے چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ انند بھون والوں کا کردار بالکل وہی ہے۔ ان کے حکم پر ان کے جاں نثار اپنی جانوں پر کھیل گئے اور وہ لوگ انہیں یوں بھول چکے ہیں جیسے وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ میرے معیار سے بھی یہ کمینگی کی انتہا ہے۔"

"دوسرے لوگ تو ان کے حکم کے غلام ہیں۔" میں نے کہا۔ "اصل خبیث صرف دو ہیں۔ گیتارانی اور اس کا دستِ راست، سنہا!"

"وہ تو خیر بچ ہی نہ سکیں گے!" وہ اس سلسلے میں بڑا پُراعتماد تھا۔ "جہاں قانون ناکام ہو جاتا ہے وہاں سے ٹِڈ کی عملداری شروع ہو جاتی ہے۔ میں ہمیشہ صرف پیسے کے لئے ہی نہیں، کچھ اصولوں کی خاطر بھی کام کرتا ہوں۔"

ٹِڈ کی ان سیدھی اور سچی باتوں نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

"اب یہ بتاؤ کہ آج کی رات میں نواکوٹ کیسے پہنچ سکوں گا؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے شہر کے واحد ایرو کلب کے ذریعہ تمہیں باہر نکالنے کا انتظام کیا ہے۔" ٹِڈ میری طرف جھک کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

یہ سنتے ہی میں چونک پڑا۔ "یہ ناممکن ہے ٹِڈ۔ اگر ایک بار میں ایرو کلب کی حدود میں داخل ہو گیا تو شاید پھر کبھی آزادی کا سانس نہ لے سکوں گا!"

"وہ کیوں؟" ٹِڈ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"اس لئے کہ ایرو کلب انند بھون کے خبطی مالک نرائن داس کا بنایا ہوا ہے اور اس کے بعد وہ ادارہ پوری طرح گیتارانی بلکہ سنہا کے تحت ہے ..... نہیں ٹِڈ میں ادھر کا رخ کرنے کی بھی حماقت نہیں کروں گا۔ سنہا کا کوئی نہ کوئی آدمی مجھے وہاں بھی پہچان لے گا۔"

"مجھے یہ سب معلوم ہے۔" ٹِڈ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "مگر ایرو کلب کا چیف پائلٹ جو لوگوں کو تربیتی پروازوں پر لے جاتا ہے میرا احسان مند ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ایرو کلب کا تربیتی طیارہ سورج غروب ہونے کے بعد پرواز نہیں کرتا۔ مگر صرف میری وجہ سے پائلٹ سنگھ آج رات دو بجے نواکوٹ جانے پر راضی ہو گیا ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ مجھے ایک رازدارانہ مشن پر نواکوٹ جانا ہے۔ اسے آخری لمحے تک پتہ نہ ہونے پائے گا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی پرواز کرے گا۔"

"یہ ناممکن نظر آتا ہے۔" میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "طیارے کی پرواز کا راز رہنا مشکل ہے۔!"

"رات کو ایرو کلب کے ہوائی اڈے پر اجیت کے علاوہ ایک آدمی اور دوسرا کنٹرول روم کا ریڈیو آپریٹر ہوتا ہے، وہ دونوں اجیت کے آدمی ہیں کیونکہ ان کی مدد سے وہ ایرو کلب کے ذریعہ بہت سے غیرقانونی کام کرتا رہتا ہے۔ چار نشستوں والے تربیتی طیارے میں یہاں سے نواکوٹ کا سفر بمشکل ایک گھنٹے کا ہو گا۔ نواکوٹ میں ایرو کلب والوں کا ایک ایئر فیلڈ ہے۔ وہاں بھی دو تین ہی آدمی ہوں گے۔ اجیت طیارہ ایئر فیلڈ کے ایسے حصے میں لے جا کر روکے گا کہ تم طیارے سے کود کر با آسانی قریب کی جھاڑیوں میں روپوش ہو سکو گے اور اجیت وہاں کوئی مفروضہ بہانہ کر کے فوراً ہی لوٹ آئے گا۔"

"کچھ بھی ہو ٹِڈ۔ ایرو کلب مجھے مخدوش نظر آتا ہے، مگر میں تم پر اعتبار کی وجہ سے اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگانے کو تیار ہوں۔"

"اس کے سوا کوئی راستہ نہیں صفدر۔ پولیس کی جانب سے شہر اور ایئرپورٹ کی سخت ناکہ بندی ہے اور تم انند رام کے نکلنے تک یہیں چھپے رہو گے۔"

"وہ کب جا رہا ہے؟"

"آج شام اس کی روایتی جماعت بڑی شان و شوکت کے ساتھ رخصت کی گئی ہے۔ وہ کل کسی بھی وقت نواکوٹ میں ہو گا۔" ٹِڈ نے بتایا اور میں اس کے پروگرام سے متفق ہو گیا۔

پھر رات کے ایک بجے تک ٹِڈ زیرِ ولپمنٹ کی عمارت میں مقیم رہا۔ اس کے بعد اپنے آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر اس نے مجھے ہمراہ لیا اور جیپ میں نئے سنسنی خیز سفر پر روانہ ہو گیا۔ میں راستے میں کسی متوقع چیکنگ سے بچنے کے لئے عقبی نشست کے نیچے دبکا رہا۔

کافی دیر کے طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد جیپ ایک ویرانے میں جا رکی جہاں تاریکی میں جھینگروں اور مینڈکوں کا تیز شور کانوں کو پھاڑے دے رہا تھا۔

"تم اتر کر یہیں چھپ جاؤ۔" ٹِڈ نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "طیارہ ٹیکسی کرتے ہوئے جیسے ہی ادھر آ کر رکے تم کاک پٹ کے عقبی دروازے سے اندر چڑھ آنا!"

میں نے دیکھا کہ جیپ کی روشنیاں گل تھیں اور خاردار تاروں کی باڑھ کے پیچھے ایرو کلب کا مختصر سا ایئر فیلڈ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جہاز کے واحد ہینگر کی دیواروں پر اکادکا خوابناک سی روشنیاں موجود تھیں، اور اس سے کافی آگے کنٹرول ٹاور کی دو منزلہ عمارت کی چند کھڑکیاں روشن تھیں۔ شاید وہ عمارت دوہرے مقاصد کے لئے استعمال کی جاتی تھی اوپر کنٹرول ٹاور اور نیچے دفاتر وغیرہ رہے ہوں گے کیونکہ اس کے علاوہ دور دور تک کسی عمارت کے آثار نظر نہ آتے تھے!

مجھے اتارنے کے بعد ٹِڈ نے جیپ گھمائی اور ایک طویل راستہ طے کرنے کے بعد اس نے ہیڈ لیمپس روشن کر دیئے۔ پھر جیپ دوڑتی ہوئی ایئر فیلڈ میں داخل ہوئی اور ذرا ہی دیر میں عمارت کے سامنے جا رکی۔

میں تاروں کے درمیان سے گزر کر ایئر فیلڈ کی سمت جا پہنچا اور پختہ رن وے کے ساتھ اگی ہوئی اونچی خود رو جھاڑیوں میں دبک کر آنے والے لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہینگر کا دروازہ کھلتا نظر آیا اور دو لوگ مختصر سے تربیتی طیارے کو باہر کھلی فضا میں دھکیل لائے اور جب کنٹرول ٹاور پر کچھ روشنیاں جلنے کے بعد نقل و حرکت کے آثار نمودار ہوئے تو یکے بعد دیگرے جہاز کے دونوں انجن اسٹارٹ کر دیئے گئے۔ سناٹے میں ان انجنوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا۔ پھر جہاز کے اگلے حصے سے روشنی کی ایک تیز لکیر اندھیرے میں دور تک پھیل گئی۔ گراؤنڈ مین اسی روشنی میں جہاز کے سامنے کھڑا کچھ اشارے کر رہا تھا!

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے اگلے اقدام کے لئے تیار تھا۔

اچانک ٹربوپروپ انجنوں کا شور تیز سیٹیوں کی طرح گونجنے لگا اور طیارہ حرکت میں آگیا۔ رن وے کا ایک مختصر سا چکر لگا کر طیارہ میری طرف آنے لگا۔ روشنی اب براہ راست میری جانب تھی اور میں سانس روکے جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا۔ باڑھ کے متوازی رینگتا ہوا جہاز مجھ سے کچھ آگے جا کر رک گیا۔ ساتھ ہی ڈبر کی آواز ابھری۔ وہ حلق پھاڑ کر مجھے بلا رہا تھا۔

جہاز آگے نکل جانے کے باعث میں اب تاریکی میں تھا۔ لہذا اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے دوڑ پڑا۔ ڈبر دروازہ کھولے تاریکی میں میرا منتظر تھا۔ پنکھوں سے آنے والی تیز ہوا مجھے پوری قوت سے پیچھے دھکیل رہی تھی اور میرے لئے قدم سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ آخر اوپر سے ڈبر نے میرے ہاتھ تھام کر سہارا دیا اور میں اچھل کر جہاز کے کیبن میں جا پہنچا۔

ڈبر نے دروازہ بند کیا تو انجنوں کا شور قدرے کم ہو گیا مگر میرے کانوں میں وہ تیز گونج ابھی تک موجود تھی۔ جہاز کے پائلٹ نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھا اور ڈبر نے ہاتھ کے اشارے سے جہاز کو بڑھانے کی ہدایت دی اور سامنے کنٹرول پینل سے لٹکا ہوا ہیڈ فون میری طرف بڑھا دیا۔

ڈبر نے پائلٹ کے برابر والی نشست سنبھال لی اور میں پائلٹ کے عقب میں بیٹھ کر حفاظتی بیلٹ باندھنے لگا۔ ڈبر کے عقب میں چوتھی نشست خالی تھی۔

ڈبر نے ہاتھ بڑھا کر پینل کا ایک سوئچ گھمایا اور مجھے ہیڈ فون میں گونجتے ہوئے پرسکون سناٹے میں اس کی سخت آواز سنائی دی۔ "جب کنٹرول سے ہمارا رابطہ ہو تو اپنی زبان بند رکھنا۔ فضا میں بلند ہونے کے بعد میں یہ رابطہ اپنی طرف سے ختم کر دوں گا۔"

"اوکے!" میں نے کہا۔ ظاہر ہے اس کی یہ ہدایت میرے ہی لئے تھی۔

ڈبر نے دوبارہ وہی سوئچ گھمایا اور میرے ہیڈ فون پر کنٹرول ٹاور والے کی آواز آنے لگی۔ پھر وقفے وقفے سے پائلٹ اور کنٹرول کے کوڈ ورڈز سنائی دینے لگے۔

میرے لئے کسی ہلکے پھلکے تربیتی طیارے میں پرواز کا وہ پہلا موقع تھا۔ جہاز کے زمین سے اٹھتے ہی ایسے ہچکولے محسوس ہوئے کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

مطلوبہ بلندی پر پہنچ کر طیارہ سیدھا ہوا تو میرے اعصاب کو قدرے سکون ملا۔ ساتھ ہی پائلٹ نے کنٹرول کی کسی ہدایت کے جواب میں اوور اینڈ آل کہہ کر سوئچ آف کر دیا اور ریڈیائی شور کی لہریں یک بیک معدوم ہو گئیں۔

"ڈبل! تم نے مجھ پر اعتماد نہ کر کے مجھے دلی تکلیف پہنچائی ..."
ہیڈ فون پر چیف پائلٹ کی آواز میں گہرا تاسف نمایاں تھا۔

"یہ میرا ایک پرانا سرپرست ہے اجیت!" ڈبر ... تھی۔ اور تم جانتے ہو کہ میں کاروباری معاملوں میں اپنے سرپرست کی خواہش کا پورا پورا احترام کرتا ہوں!"

"مگر یہ ہے کون؟" اجیت نے سوال کیا۔

"وہ ہماری آوازیں سن رہا ہے۔ مناسب سمجھے گا تو خود ہی بتائے گا۔"

"ڈبر۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اتنی احتیاط ..." میں نے اس کے پہلو میں ٹہوکا دیتے ہوئے مسکرانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری محتاط روی سے ڈبر کو تمہارے سامنے شرمندہ ... مجھے براج سنگھ کہتے ہیں۔"

"شرمندگی کیسی براج!" چیف پائلٹ ہنسا ... "تو میں شاید زندگی بھر نہ اتار سکوں۔ یہ معاوضہ ضرور لیتا ہے لیکن ... کاروباری انداز، اخلاق اور معیار اتنا بلند ہے کہ یہ دل موہ لیتا ہے ... سے کوئی شکایت نہیں ہے اور تم بھی اپنے بارے میں نہ بتاؤ تو میں ... نہیں کروں گا۔"

"میرے کچھ آدمی لوکھارا سے نواکوٹ کے راستے ... آرہے ہیں۔" میں کھنکھار کر بولا۔ "پروگرام کے مطابق آج رات ... رک کر صبح سویرے کھٹمنڈو روانہ ہو جائیں گے اور شہر میں پولیس کی ... سے تم واقف ہی ہو۔ میرے آدمی لاعلمی کی بنا پر مال سمیت دھر لئے ... گے اور میں برباد ہو جاؤں گا۔ میرے حریفوں نے میری ہر راہ مسدود کر ... ہے اور ان کے حربوں سے بچنے کے لئے میں تمہارے طیارے سے ... جا رہا ہوں تاکہ اپنے آدمیوں کو وہیں روک کر مال ٹھکانے لگا سکوں۔"

"یہ تو تم نے مجھے بھی نہیں بتایا تھا براج!" ڈبر بولا۔

"اس وقت بات دوسری تھی۔ اب میں آزاد فضا میں ... ہم تینوں ایک کشتی میں سوار ہیں اور میں جانتا ہوں کہ اب کوئی ... نہ روک سکے گا۔"

"مال کیا ہے؟" اجیت کے لہجے میں تجسس تھا ... ٹھکانے لگانے میں میں تمہاری مدد کر سکوں!"

"تم کچھ نہ کر سکو گے اجیت۔ اس کھیپ پر تو سنہا ... رکھتے گھبرا رہا ہے!" میں نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ ... میرے الفاظ سن کر اجیت بری طرح چونکا۔ ... گردن گھما کر کاک پٹ میں پھیلی ہوئی کنٹرول پینل کی ننھی ننھی روشنیوں ... مدھم انعکاس میں میری طرف یوں گھورنے لگا جیسے میری بینائی ...

... بھی میرے اس سفید جھوٹ پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کے ... حیرت اور الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ شاید وہ سمجھ نہیں سکا تھا ... نے اجیت کو غیر ضروری طور پر سنہا کا حوالہ کیوں دیا!

"... تم سنہا سے واقف ہو؟" اجیت نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ اور میں جانتا ہوں کہ اننت بھون کے مکینوں نے ایئر کلب ... مقاصد کے لئے خریدا تھا۔ کیا یہ درست نہیں کہ سنہا سے پہلے وجے ... ہلایا ان تھا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے!" ہیڈ فون میں اجیت کی تھکی ہوئی ... ابھری۔ اب وہ اپنی نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ "کہیں ... نہیں کہ تمہاری مدد کر کے میں نے اپنی شامت کو دعوت دی ہو!"

"نہیں سنہا میرا گہرا دوست ہے۔" میں نے ڈبر کے پہلو ... چرمی ہولسٹر میں جھولتے ہوئے اعشاریہ چار پانچ کے وزنی ریوالور ... جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر پھر بھی رازداری ضروری ہے وہ یہ بات پسند ... نہیں کرے گا کہ اس کے تنخواہ دار دوسروں کے لئے رازدارانہ خدمات انجام دیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اجیت کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ہیڈ فون پر یک بیک گہرا سکوت طاری ہو گیا اور میں بغلی کھڑکی ... نیچے پھیلی ہمالا کی وادیوں کا جائزہ لینے لگا۔

تربیتی طیارہ کافی بلندی پر تیز ہواؤں میں ہچکولے کھاتا آگے جا رہا تھا۔ نیچے تاحدِ نظر اونچی نیچی پہاڑی چوٹیاں اور وادیاں سیاہی ... بھورے دھبوں کی صورت میں بکھری ہوئی تھیں اور ان پر اگا ہوا سبزہ ... گہرے سیاہ داغوں کی طرح تاروں کی چھاؤں میں پھیلا ہوا تھا۔ کہیں ... ٹمٹماتی روشنیوں کے چند نقطے پہاڑوں کی گود میں آباد ننھے منے ... بستیوں کی موجودگی کی خبر دے رہے تھے ... اور سامنے ... بہت دور ... کی طرح بہت سے ننھے منے روشن نقطے جھلملا رہے تھے اور جہاز ... بہ لحظہ ان سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا!

"سامنے نظر آنے والی روشنیاں نواکوٹ کی ہیں ...... اب ... رابطہ ضروری ہے، تم دونوں خاموش رہنا میں ریڈیو آن کرنے جا رہا ... ہوں۔" اجیت کی گمبھیر آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

ہیڈ فون کے ریسیور میں سوئچ کی کلک کی ہلکی سی آواز آئی ... ریڈیائی لہروں کا تیز شور گونجنے لگا۔ میں نے اس بار سوئچ پر اجیت ... انگلیوں کی حرکت کو گہری نظر سے دیکھا۔ اب میں بوقتِ ضرورت خود ... طیارہ کا کنٹرول سے رابطہ ختم کر سکتا تھا۔

نواکوٹ ایئر فیلڈ کے کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم ہو جانے ... دو طرفہ ہدایات و پیغامات کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ وہ لوگ اتنی رات گئے ... غیر متوقع طیارے کے استقبال کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے اجیت کو فوری طور پر کلیئر کا سگنل نہ مل سکا اور طیارہ روشن نقطوں کے وسیع ہجوم کے اوپر دائرے کی شکل میں طویل چکر کاٹنے لگا۔

چند منٹ بعد جوں ہی کنٹرول سے کلیئر کا سگنل آیا طیارہ خوابیدہ بستی پر چکر کاٹتا تیزی سے نیچے آنے لگا۔ ساتھ ہی آبادی سے کافی دور ایک تاریک ویرانے میں ... ایئر فیلڈ کے کنٹرول ٹاور کی جلتی بجھتی مخصوص روشنی بھی نمایاں ہو گئی۔ طیارہ تیزی کے ساتھ اسی سمت میں نیچے جا رہا تھا مگر رن وے پر روشنیاں نہ ہونے کے سبب اجیت بہت زیادہ محتاط تھا۔

طیارہ جب لینڈنگ پوزیشن میں تیزی سے نیچے کی طرف چلا تو اس کی تیز سرچ لائٹ کی روشنی پختہ رن وے کے بجائے خطرناک حد تک ناہموار پہاڑی ڈھلانوں پر پڑی۔ اجیت نے ماہرانہ چابکدستی سے طیارے کا رخ بائیں جانب تبدیل کیا اور اس بار ونڈ شیلڈ کے اس پار رن وے چمکتا نظر آیا۔

کنٹرول ٹاور کی جانب سے اوکے کا اشارہ ملا اور اجیت نے طیارے کے لینڈنگ گیئر کھول دیئے چند ہی سیکنڈ میں وہ تربیتی طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔

میں نے لینڈنگ کا جھٹکا محسوس کرتے ہی پھرتی کے ساتھ اپنی حفاظتی بیلٹ کھول دی اور نشست سے اٹھ کر اچانک کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کرنے والا سوئچ آف کر دیا اور اس سے پہلے کہ اجیت میری اس بے جا عجلت پر احتجاج کرتا میں نے نرم آواز میں کہا: "پروگرام کے آخری حصے پر عمل کرو اجیت! میں نہیں چاہتا کہ کنٹرول ٹاور والے کو جہاز میں کسی گڑبڑ کا شبہ ہو۔"

وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ جہاز کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی رن وے پر کنٹرول ٹاور کے سامنے ایک شخص سرخ شیشوں والی بڑی سی روشن لالٹین زمین پر رکھے دونوں ہاتھوں سے پائلٹ کو اشارے کر رہا تھا۔ اچانک طیارے کا رخ بدلا اور وہ داہنی جانب پھیلے ہوئے پہاڑی جنگل کی سمت بڑھنے لگا۔

"خدا حافظ دوست!" طیارہ رن وے کے کنارے پر پہنچ کر رکنے ہی والا تھا کہ ڈبر نے مڑ کر مجھے الوداع کہا۔ کاک پٹ میں پھیلی ہوئی نیم تاریکی میں اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔

جوں ہی طیارہ رکا، میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ڈبر کے ایک چرمی ہولسٹر سے اعشاریہ چار پانچ کا مہیب پستول نکال لیا اور اس سے قبل کہ وہ مجھ پر جھپٹے، میں نے پستول کی نال اجیت کی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ہیڈ فون کے ساتھ ہی اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے۔ میں نے ہیڈ فون اتار کر ایک طرف پھینکا اور انجنوں کا کان پھاڑنے والا شور سنائی دینے لگا۔ میں نے دروازہ کھول کر پختہ رن وے پر چھلانگ لگا دی اور باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ اسی وقت انجنوں کے شور میں ایک اور وزنی دھمک

سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو تاریکی میں ایک طویل قامت اور قوی الجثہ انسانی ہیولا شور مچاتا میرے تعاقب میں چلا آرہا تھا!

طیارے کے انجنوں کے تیز شور میں رہ رہ کر گونجنے والی وہ جھلائی ہوئی انسانی آواز میرے لئے اجنبی نہ تھی۔ شاید میرے اس اچانک اقدام سے بڈ بھی بوکھلا گیا تھا اور جہاز سے کود کر میرے پیچھے ہو لیا تھا۔

بچتہ رن وے سے اتر کر میں تاریک اور خطرناک پہاڑی جنگل میں گھس پڑا۔ اس وقت میرے ذہن پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی کو یہ علم نہ ہو سکے کہ اس پرواز سے اجیت اور بڈ کے سوا کوئی تیسرا شخص بھی نواکوٹ پہنچا ہے۔ اجیت میرے اس خفیہ سفر کا راز کھولنے کو زندہ ہی نہ رہا تھا اور بڈ سے مجھے امید نہ تھی کہ وہ اس بارے میں کسی کے سامنے زبان کھولے گا۔

میں جھاڑیوں میں گھسنے کے بعد چند ہی قدم آگے بڑھا ہوں گا کہ مجھے ان دیکھے خطرات کا اندازہ ہو گیا اور میں سانس روکے جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ وہ جنگل خطرناک حد تک ناہموار پہاڑی ڈھلانوں پر محیط تھا اور میری ذرا سی بھی لغزش مجھے ہزاروں فٹ گہری کھائیوں میں پہنچانے کا سبب بن سکتی تھی۔

اسی اثناء میں زمین پر روشنی کی ایک پتلی سی لکیر رینگتی نظر آئی۔ بڈ بے تحاشا گالیاں بکتا مجھے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

"میں ادھر موجود ہوں بڈ!" میں نے ہانپتے ہوئے اسے مخاطب کیا پنسل ٹارچ کی روشنی میری آواز پر فوراً ہی میری جانب گھوم گئی اور چند ہی سیکنڈ میں بڈ میرے قریب آ پہنچا۔ اس کا پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے وہ ریوالور میرے ہاتھ سے چھینا۔ پھر سخت طیش کے عالم میں غرایا "تم سے بڑا خنزیر کا تخم آج تک روئے زمین پر پیدا نہ ہوا ہو گا.... آخر اس بے چارے نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو اسے مار ڈالا؟"

"کیا اتنا کافی نہیں کہ وہ سنہا کا آدمی تھا اور تم نے اس سے انتقام لینے کا عہد کیا ہوا ہے؟" میں نے ٹھہری ہوئی نرم آواز میں کہا۔

"لیکن اس وقت وہ سنہا کا آدمی نہیں تھا۔ محض میرے مراسم کی بنیاد پر وہ اتنا بڑا خطرہ مول لیکر تمہیں یہاں لایا تھا، تم نے میرے ایک دوست کا خون کیا ہے!"

"تم میرے چار دوستوں کا خون کر لینا.. لیکن اس وقت ہمیں جلد از جلد ایئر فیلڈ سے دور نکلنے کی تدبیر کر لینی چاہیے ورنہ ہم بے موت مارے جائیں گے!"

"جہنم میں گئے تم اور تمہارے دوست۔ تم شروع سے ہی میرے لئے مشکلات پیدا کرتے آرہے ہو۔" وہ غصے کے عالم میں کسی بھیڑیئے کی طرح غرایا۔

"ٹھیک ہے۔ تم یہاں رک کر غصے میں ناچتے رہو۔ میں اندھیرے میں بھی راستہ تلاش کر سکتا ہوں؟" میں یہ کہہ کر آگے جانے کے لئے مڑ گیا۔

میں چند ہی قدم بڑھا تھا کہ بڈ اونچی آواز میں بولا

"ٹھہرو —— اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں ——" اس کا لہجہ شدید ذہنی الجھنوں کا مظہر تھا۔

"اگر غصہ اتر گیا ہو تو فی الحال راستہ تلاش کرنے میں میری مدد کرو" میں نے اسے دعوت دی۔

"تم اس قضیے میں ہر طرح محفوظ ہو مگر کھٹمنڈو میں ایروکلب کے لوگوں نے مجھے اچھی طرح دیکھا ہے۔ گفتگو کے دوران میں انہیں میرا نام بھی معلوم ہو گیا اور اب اجیت کا قتل پولیس کیس بنے گا اور پھندا میری ہی گردن میں ہو گا۔ ہے، پولیس میری راہ پر لگ جائے گی۔" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا ہے کہ ریوالور کے دستے سے تمہاری کھوپڑی توڑ کر لاش یہیں کہیں میں خاموشی سے تاریک اور خطرناک ڈھلان دار جنگلات میں حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اپنے تحفظ کی آخری کوششوں میں بڈ کا فراموش کر دیا تھا اور اب ذرا سی بھی کوتاہی کی وجہ سے وہ بڑی مشکلات ہو سکتا تھا!

"کیا تمہارا کھٹمنڈو واپس جانا ضروری ہے؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے دو تین ثقیل گالیاں بکیں پھر بولا۔ "میں اپنی برسوں کو یوں ہی تج دوں محض تمہاری خاطر! میں نے اس شہر میں برسوں چیدہ چیدہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا، شہر کے زیر زمین حلقوں میں قائم کی، میں اتنی آسانی سے یہ سب نہیں چھوڑ سکتا!

"مگر میرے بارے میں تم سنہا کا ایک کھلا آفر رد کر چکے ہو علم ہو گا کہ اجیت کے قتل میں تمہارا نام بھی ملوث ہے تو وہ تمہیں کے لئے اپنے سارے وسائل وقف کر دے گا!"

"میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا ہوں" بڈ اضطراری انداز میں میرے لئے کسی بھی طرح فوراً اپنے شہر پہنچنا ممکن ہوتا تو میں ایروکلب کے ملازمین کو بھی ٹھکانے لگا دیتا، پھر کسی کو علم نہ ہوتا کہ اجیت نے رات میں پرواز کیوں کی اور جہاز میں اس کے ہمراہ کون تھا!"

"اچھا دوست!" میں ایک طویل سانس لیکر بولا "تم نے میری مدد کی ہے اور اب میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ شاید مقدر ساتھ دے جائے!"

"تم... تم میرے لئے کیا کر سکو گے؟" اس کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

"جلد از جلد شہر پہنچنے کی کوشش کرو، میرے خیال میں پیدل پہنچنے میں بہت وقت لگے گی کیونکہ ایئر فیلڈ شہر سے بہت دور ہے۔ کوئی گاڑی حاصل کر کے فوراً ہی کھٹمنڈو روانہ ہو جاؤ۔ اگر بروقت تم ایروکلب جا پہنچے تو با آسانی اپنے خلاف شہادتوں کو ختم کر سکو گے؟" میں نے کہا۔

"اور اگر پولیس پہلے سے وہاں موجود ہوئی؟"

"تو کوئی بات نہیں —— پولیس پہلے ہی میری تلاش میں ہے۔ تم بلا دھڑک کہہ سکتے ہو —— ایک بھرپور کہانی تمہاری گردن صاف بچا سکتی ہے۔"

"کہو۔" اس مرتبہ بڈ کی آواز میں مسرت نمایاں تھی "اب میں ساری ذمہ داری اجیت پر ہی ڈال دوں گا۔ وہ کھٹمنڈو سے نواکوٹ تک سفر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دوران سفر کسی متوقع خطرے سے تحفظ کیلئے معقول معاوضے پر میری خدمات حاصل کیں اور میں راضی ہو گیا۔ ایروکلب سے روانہ ہوتے ہوئے.. کے قریب تاریکی میں طیارہ روک کر اجیت نے کسی گمنام شخص کو از راہ طیارے میں سوار کرایا۔ اسے دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ وہ ایک خطرناک قاتل صفدر تھا۔ میں سارے راستے پوری طرح چوکنا رہا —— لیکن جب میں طیارہ رن وے کے بجائے تاریک جنگل کے کنارے رکا تو اس مفرور نے اچانک میرے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اجیت کو ہلاک کر دیا۔ پھر اس نے مجھ پر فائر کرنا چاہا مگر اس وقت تک میں ہوشیار ہو چکا تھا، دوسرے فائر سے پہلے میں نے اس سے پستول چھین لیا اور وہ بوکھلا کر طیارے سے کود کر گھنے جنگل میں روپوش ہو گیا۔ میں طبی امداد کی نیت سے اجیت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ وہ ہر مدد سے بے نیاز ہو چکا ہے، میں طیارے سے کود کر قاتل کے تعاقب میں جنگل میں گھس پڑا، لیکن اس کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ چونکہ اس واردات میں فائر میرے پستول سے ہوا تھا لہٰذا میں گھبراہٹ میں وہاں سے ایک گاڑی چرا کر کھٹمنڈو بھاگ نکلا تا کہ جائے واردات سے میں اپنی عدم موجودگی ثابت کر سکوں۔"

"گڈ —— بہت شاندار کہانی ہے —— اگر تم بروقت ایروکلب کے ان دو ملازمین تک پہنچ سکے تو یہ کہانی تمہارا ساتھ دے گی۔ جرمانہ اور ایک دو ماہ سے زیادہ سزا کوئی عدالت نہ دے سکے گی۔"

"سال چھ مہینے کی قید بھی میرے لئے خاص اہمیت نہیں رکھتی، اتنا عرصہ تو پلک جھپکتے میں گزر جاتا ہے۔" وہ نواکوٹ پہنچنے کے بعد پہلی بار کھل کے ہنسا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں جنگلات سے کھلے میدان میں نکل آئے۔ ایئر فیلڈ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ بڈ کو وہاں سے شہر کی سمت کا تعین کرنے میں دشواری نہ ہوئی اور شہری حدود میں داخل ہونے پر ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے تو معاً میرے ذہن میں ایک نیا خیال کوندے کی طرح لپکا۔ بڈ محسن نہ تھا لیکن ایک بے خوف قاتل بھی! اس نے بے لوث طریقے سے میری کوئی مدد نہیں کی تھی۔ لونا سے اس نے اپنی خدمات کا من مانا معاوضہ لیا تھا۔ مجھے اس کا وہ سرد مہرانہ بلکہ معاندانہ رویہ یاد آیا جو اس نے لونا کے مرتے وقت میرے ساتھ اختیار کیا تھا۔ اگر میں زیرو پوائنٹ تک اس کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ کسی بھی قیمت پر میری مدد کرنے کو تیار نہ تھا —— وہ ایک خالص کاروباری ذہنیت کا مالک تھا!

اور میں اپنی محبت ہما لو کی ان بے رحم وادیوں میں ہار چکا تھا۔ لونا جیسی معصوم اور پیاری لڑکی کی جدائی کا داغ ابھی تک میرے دل میں تازہ تھا اور اب اس داغ کو اپنے سینے پر سجائے میں اسی سرزمین پر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ قانون، حالات اور حریف میری جان کے دشمن تھے اور میں یکہ و تنہا ان سب محاذوں پر معرکہ آرا تھا۔ یہ ایسی خوفناک جنگ تھی کہ اس میں سب کچھ جائز تھا، مجھے ہر قیمت پر اپنی جان بچانی تھی خواہ اس کے لئے کوئی بھی قدم ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے!

میں نے ایک نظر بڈ کے دیو ہیکل سراپا پر ڈالی۔ اپنی پھٹی ہوئی چرمی جیکٹ اور جین میں وہ کسی دیوزاد کی طرح لگ رہا تھا اور اس کے دونوں ہولسٹرز سے اعشاریہ چار پانچ کے مہیب ہتھیاروں کے سیاہ دستے جھانک رہے تھے۔ میری پوری کوشش تھی کہ میرے چہرے کے تاثرات میرے عزائم کا بھانڈا نہ پھوڑ سکیں اور میں نے جذبات سے عاری سپاٹ آواز میں بڈ سے کہا۔

"الوداع میرے دوست، شاید اس لمحے کے بعد ہم کبھی نہ مل سکیں لیکن میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے میں دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔ بڈ نے اپنی دوستانہ آغوش میرے لئے وا کر دی۔ وہ قدرے جھکا اور میں تقریباً اس کے سینے سے جا لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ دوستانہ گرمجوشی سے میرے گرد حمائل ہو گئے اور میرے دونوں ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے ریوالوروں کے دستوں پر جا پڑے!

بڈ ایک خرانٹ مجرم تھا، جو ہر دم اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔ اس سے قبل کہ ریوالور ہولسٹرز سے باہر آتے اس نے پوری قوت سے مجھے اپنے بازوؤں کی بے رحمانہ گرفت میں دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے دبی دبی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ جیسے کوئی بھیڑیا اپنے طاقتور حریف کو زیر کرنے کے بعد غراتا ہے، میرے اعصاب چند ثانیوں کے لئے سن ہو گئے کیونکہ مجھے کسی بھی لمحے اپنی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔ چند سیکنڈ اسی سنسنی کے عالم میں گزر گئے۔ بڈ کی گرفت لحظہ بہ لحظہ تنگ ہو رہی تھی اور اب موت سامنے تھی —— اس کی یا میری، یہ فیصلہ ابھی آنے والے لمحوں کے ہاتھ تھا۔

اپنی موت کی دہشت ذہن میں ناچتے ہی بڈ کی اذیت ناک گرفت اور اعصابی سکتہ کا احساس میرے ذہن سے یکلخت کافور ہو گیا اور میں نے ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہولسٹرز سے ریوالور کھینچ لینے چاہے۔ ایک ریوالور میرے اور بڈ کے جسم کے درمیان آجانے کے سبب ہولسٹر میں پھنس کر رہ گیا مگر میرے بائیں ہاتھ میں دوسرا ریوالور آچکا تھا۔ میں نے ذرا بھی وقت ضائع کئے بغیر اس کی نال بڈ کے پیٹ میں اڑا کر فائر کر دیا۔ ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ بڈ کے حلق سے چیخ نکلی، ایک ثانیہ کے لئے اس کی گرفت کمزور ہوئی اور میں نے اس بار اس کی داہنی پسلیوں میں گولی اتار دی اور دوسرا ریوالور بھی میرے ہاتھ میں آگیا۔

"صف... در!" اس کے حلق سے قہر اور اذیت میں ڈوبی چیخ نکلی اور اس کی ساری قوت اس کے بازوؤں میں سمٹ آئی۔

اس کے زخموں سے پانی کی طرح بہنے والے گرم گرم خون کی لکیریں میرے جسم پر بھی بہہ رہی تھیں، اس کے بازو ٹھوس آہنی زنجیروں کی طرح میرے بدن کے گرد کسے ہوئے تھے، میرا سانس سینے میں گھٹنے لگا، آنکھوں کے سامنے دھند سی ناچنے لگی اور میں نے اس کی داہنی بغل میں تیسری گولی پیوست کر دی۔!

میرا یہ وار کاری رہا۔ بڈ کے ہاتھ بے جان کیچووں کی طرح میرے بدن سے پھسل گئے اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور قہر کے جہنم سلگ رہے تھے۔ مظلومیت یا رحم طلبی کے آثار اس کے بشرہ پر دور دور تک نہ تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔ پھر اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کے دل کا نشانہ لے کر اس پر چوتھا فائر کر دیا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور وہ منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر خاک و خون میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

گو اس وقت ہم آبادی میں داخل نہیں ہوئے تھے مگر چند سو گز دور مکانوں میں اعشاریہ چار پانچ کے دھماکوں کی آوازیں ضرور سنی گئی ہوں گی لہٰذا وہاں میرا رُکنا خطرناک تھا۔ ادھر بڈ کا بدن ساکت ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دل میں گولی اترتے ہی ختم ہو گیا ہوتا لیکن اس کا بدن تو رہ رہ کر ادھر ادھر اچھل رہا تھا۔!

میں نے وہ جگہ چھوڑنے سے قبل بڈ کی کھوپڑی پر پانچواں فائر کر دیا، اور اسے وہیں تڑپتا چھوڑ کر پوری قوت سے ایک طرف دوڑ پڑا۔ اس کے دونوں ریوالور میرے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے اور بدن پسینوں میں شرابور تھا۔! ابیت کو ختم کرنے میں نے جس رازداری کا منصوبہ بنایا تھا وہ بڈ کے لہو کا خراج لئے بغیر مکمل نہ ہو سکا تھا اور اب کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ایروکلب کے تربیتی طیارے نے رات کے وقت ایک غیر معمولی خطرناک پرواز کیوں کی اور ان دونوں کو مارنے والا کون تھا۔ اگر کوئی قیاس کر بھی لیتا تو اس کی تصدیق کرنے والا کوئی فرد زندہ نہیں رہا تھا۔!

تھوڑی دیر کے بعد ہی میں آبادی سے کافی دور پھیلے سنگلاخ اور بنجر پہاڑی سلسلوں میں جا پہنچا۔ یہاں تا حدِ نظر چٹانوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا جہاں میں بآسانی وہ رات بسر کر سکتا تھا۔

میرے سامنے اب فوری مسئلہ خون آلود کپڑوں سے نجات پانے کا تھا۔ وہ رات سرد تو نہیں تھی مگر خنک ضرور تھی اور ان کپڑوں کو ضائع کر کے برہنہ تن وہ خنکی جھیلنا مشکل تھا۔ آبادی کا رُخ کرنے میں بہت سے خطرات پوشیدہ تھے۔ لہٰذا میں نے کسی ایک جگہ بیٹھ کر وقت گزارنے کے بجائے کسی جوہڑ وغیرہ کی تلاش کو ترجیح دی تاکہ اپنے ان ہی کپڑوں کو دھو کر سکھا سکوں۔ وہ چند گھنٹے میں کسی درخت وغیرہ پر بیٹھ کر گزار سکتا تھا۔!

میں نے اپنی اس مہم کی ابتدا ایک بلند پہاڑی کے انتخاب سے کی، اس پر چڑھ کر میں گرد و نواح میں کافی دور تک نگاہیں دوڑا سکتا تھا اور اگر کہیں بھی پانی موجود ہوتا تو تاروں کے انعکاس میں اس کی مرتعش سطح بآسانی مجھے نظر آجاتی۔!

میں نے اوپر پہنچ کر یوں ہی ایک سمت میں نگاہیں اٹھائیں اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اس دن میرے مقدر کا ستارہ عروج پر تھا۔ مرتعش سطح کیا وہاں تو گاتا گنگناتا تیز و تند دھارا چمک رہا تھا۔ میں پہاڑی سے اُتر کر تیزی کے ساتھ اسی جانب چل دیا۔

وہ خطہ بے حد حسین اور سکوت آور تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ دریا کا پاٹ پہاڑی پتھروں اور چٹانوں کے درمیان کہیں کم اور کہیں زیادہ تھا۔ کناروں پر سرسبز درخت پانی میں جھکے پڑ رہے تھے۔ میں نے وہاں کپڑے اتارے اور بہتے پانی میں دھوئے اور پتھروں کے نیچے دبا کر ایک طرف رکھ دیئے اور خود ٹھنڈے اور فرحت بخش پانی سے منہ دھو کر ایک دراڑ میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سورج کی قرمزی شعاعوں کا الاؤ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس وقت میرے لباس میں ہلکی ہلکی نمی باقی تھی۔ سورج طلوع ہونے کے بعد فضا کی خنکی بھی دم توڑ چکی تھی لہٰذا میں نے اپنے کپڑے پہن لئے۔ دو وزنی پستولوں کو چھپانا بہت ضروری تھا۔ میں ریوالور سنبھال کر دریا کے کنارے آگے چل دیا۔

میں اپنے خیالات میں گم چلا جا رہا تھا کہ میری نظر سبز رنگ کے کپڑے پر پڑی جو کناروں کے پتھروں میں الجھا تیزی سے آگے بہہ جانے کو تھا۔ میرے لئے اس ویرانے میں کسی انسانی لباس کی موجودگی بہت زیادہ حیرت انگیز تھی۔ لہٰذا میں تیزی سے آگے لپکا اور اتھلے پانی میں اتر کر وہ کپڑا نکال لیا۔ وہ گہرے سبز رنگ کا ایک خوشنما اسکرٹ تھا جس کے دامن سے عجیب و غریب الفاظ پر مشتمل ایک بیل کڑھی ہوئی تھی۔ میں امن آزادی اور نخوت کے نعروں پر مشتمل ایسے ملبوسات بارہا دیکھ چکا تھا لہٰذا یہ اندازہ لگانا دشوار ثابت نہ ہوا کہ وہ اسکرٹ دریا برد ہونے سے قبل کسی ہپی لڑکی کی ستر پوشی کے کام آتا رہا ہوگا۔ اسکرٹ کے اوپری حصے پر لگی ہوئی بیلٹ ظاہر کر رہی تھی کہ اسے زیب تن کرنے والی کی کمر خاصی نازک رہی ہوگی۔!

میں اس وقت دھارے کی مخالف سمت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نئی دریافت کے دو ہی نتائج ہو سکتے تھے۔ اول یہ کہ آگے کہیں لبِ دریا کوئی خوش باش جماعت مقیم ہے اور اسی میں سے کسی لڑکی کا یہ زیر جامہ کسی وجہ کے باعث دریا میں بہہ گیا۔ دوسرا نکتہ ذرا سنگین تھا مگر قرینِ قیاس تھا۔ کوئی بھی جنونی کسی لڑکی کو ورغلا کر لبِ دریا لایا، اپنے سفلی جذبات کی تسکین کی، لڑکی کو ہلاک کر کے اس کی لاش اور اس کے بدن سے نوچے ہوئے کپڑے دریا برد کر دیئے۔ لاش وزنی ہونے کے سبب تہ نشین ہو گئی اور اسکرٹ سطح پر بہتا رہا۔

صورتحال جو بھی رہی ہو میرے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔ میں نے ریوالور اسکرٹ میں لپیٹ لئے اور خود تیز رفتاری سے آگے چل پڑا۔ تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اچانک ہوا کے دوش پر مجھے انسانی آوازیں سنائی دیں۔ اور میں چوکنا ہو کر آگے بڑھنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے لبِ دریا کچھ مقامی مرد مختلف کاموں میں مصروف نظر آئے۔ میں فوراً ہی ایک ایسی چٹان کی اوٹ میں ہو گیا جہاں میں خود کو ان کی نظروں سے بچاتے ہوئے ان کا جائزہ لے سکتا تھا!

وہ تعداد میں کل گیارہ تھے۔ ان میں چھ مزدوروں جیسے خستہ لباس دیہاتی تھے۔ دو خوش پوش اور باثروت مقامیوں کی نگرانی اور احکامات پر وہ مزدور کام کر رہے تھے اور ان ہی کے درمیان تین سفید فام، دراز قد اور سبک اندام سی لڑکیاں تھیں۔ ان کی سرگرمیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کو یہاں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ وہ لوگ شاید سورج طلوع ہونے کے بعد ادھر پہنچے تھے۔!

چند ہی منٹ کے بعد وہ مزدور ٹیلوں کی اوٹ سے چھولداریاں، بنڈل اور بانس وغیرہ اُٹھا کر لاتے نظر آئے۔ شاید اس طرف کوئی گاڑی کھڑی ہوگی۔ آثار سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی پڑاؤ ہونے والا ہو۔ سفید فام لڑکیوں کی وہاں موجودگی میرے لئے تعجب خیز تھی مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں اس جماعت کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہ کر سکا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ٹیلوں وغیرہ کے عقب میں جا کر میں ان سے اتنے قریب ہو جاؤں کہ ان تمام کارروائیوں کا مطلب واضح ہو سکے۔

چٹانیں اور ٹیلے عبور کرنے کے بعد دریا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ زمین پر تا حدِ نظر گھاس اور پھولدار پودوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ میں احتیاط کے ساتھ آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ دو سو گز آگے بڑھنے کے بعد میں دو چٹانوں کی ایک درمیانی دراڑ میں داخل ہو گیا جو میری توقع کے برعکس بہت مختصر ثابت ہوئی۔ چالیس فٹ کے فاصلے پر دراڑ کا دوسرا سرا نظر آ رہا تھا اور اس جانب دھوپ کی روشنی میں دریا کا پانی چمک رہا تھا۔!

اگلے سرے پر پہنچنے سے پہلے ہی میرے کانوں میں بہت قریب کی آوازیں آئیں اور میں سانس روک کر چٹان سے چپک گیا۔ اسکرٹ میں لپٹا ہوا ایک ریوالور میں نے پھرتی سے نکال لیا۔ اسی حالت میں کئی منٹ گزر گئے لیکن مجھے کوئی آہٹ نہ سنائی دی تو میں دبے قدموں دراڑ کے دہانے تک جا پہنچا اور یہ دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ جگہ گیارہ نفری جماعت سے خطرناک حد تک قریب ہونے کے باوجود زیادہ محفوظ تھی اور یہاں سے میں ان کا جائزہ لینے کے ساتھ ہی ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ واضح طور پر سن سکتا تھا۔

چٹانوں اور پہاڑیوں کے ایک کٹاؤ دار موڑ پر ایک پک اپ موجود تھی جس کے پچھلے حصے سے سامان اتار کر لبِ دریا ہموار زمین پر جمع کیا جا رہا تھا۔ تینوں سفید فام لڑکیاں نوجوان اور حسین تھیں۔ دو لڑکیوں کا لباس جینز تھا جبکہ تیسری نے اسکرٹ کی جگہ ایک سفید چادر اپنے جسم سے باندھی ہوئی تھی۔ مجھے دریا میں بہتے ہوئے ملنے والا سبز اسکرٹ غالباً اسی سبک اندام اور خوبرو دوشیزہ کا تھا! دونوں خوش پوش مقامی افراد ان لڑکیوں ہی کے گرد منڈلاتے پھر رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ مزدوروں کو بھی ہنکا دیتے تھے۔!

میں واپس اسی دراڑ میں لوٹ آیا۔ ایک ریوالور اسکرٹ میں لپیٹ کر پتھروں کے درمیان چھپا دیا اور بھرا ہوا پستول میں نے قمیض کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا۔

دریا کے قریب اس جگہ تین چھولداریاں کھڑی ہو چکی تھیں۔ ایک خوش پوش شخص تمام مزدوروں کو ہمراہ لے کر پک اپ میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دوسرا آدمی ان لڑکیوں کے ہمراہ سب سے بڑی چھولداری میں موجود تھا اور وہاں سے ان سب کے زور زور سے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔!

میدان صاف پا کر میں تیزی سے اپنی کمین گاہ سے نکلا اور بڑی چھولداری کے عقب میں جا پہنچا۔ ترپالوں میں ہوا کے لئے بنے ہوئے ایک سوراخ سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ تینوں لڑکیاں بڑے لاپروایانہ انداز میں چرس پی رہی تھیں۔ خوش پوش مقامی شراب سے شغل کر رہا تھا۔ ان کے درمیان کسی واقعے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ اس مرد کا نام چرن سنگھ ہے، وہ جس طرح لڑکیوں کے سامنے ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خوبصورت لڑکیوں کا رسیا ہے۔ دوسرا شخص جو مزدوروں کو چھوڑنے گیا تھا اس کا نام کرشن کمار تھا اور وہ چرن سنگھ کا دوست تھا۔ وہ دونوں مہارشی اندر رام کے معتقد تھے اور اس کا قافلہ روانہ ہونے کی اطلاع پا کر مہارشی کے قیام.. کا بندوبست کرنے ادھر آئے تھے۔ انتظار اور تنہائی کی کوفت سے نجات پانے کے لئے انھوں نے ان تینوں لڑکیوں کو ساتھ لے لیا تھا!

کچھ دیر بعد ان میں سے ایک لڑکی باہر آنے کے لئے اٹھی تو میں ہوشیار ہو گیا۔ وہ بڑی چھولداری سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چٹانوں کی طرف جا رہی تھی۔ جب وہ ایک پتھر کی اوٹ میں غائب ہو گئی تو میں تیزی سے اپنی جگہ سے نکلا اور اسی طرف ہو لیا۔

میں اس طرف پہنچا تو وہ لڑکی زمین سے اٹھ رہی تھی اور اس کی پشت میری جانب تھی۔ جوں ہی وہ اپنا اسکرٹ درست کرنے لگی میں چیتے کی سی عیاری سے اس کے سر پر پہنچا اور اسے کوئی آواز نکالنے کا موقع دیئے بغیر اس کے دہانے پر اپنا بایاں ہاتھ پوری قوت سے جما دیا اور داہنے ہاتھ میں دبا ہوا پستول اس کے چہرے کے سامنے لے جا کر لہرایا۔

"اگر ہاتھ پیر چلانے یا شور مچانے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گا مجھے تم سے کچھ خاص کام ہے، اس کے بعد تم آزاد ہو گی۔!"

میری دھمکی سنتے ہی اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ریوالور دیکھ کر آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں اور وہ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگی۔!

میں نے اس کے دہانے سے ہاتھ ہٹا دیا۔

"تم کون ہو؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"تمہارے حسن کا ایک پرستار! میں کئی گھنٹے سے تمہیں دیکھ دیکھ کر

باگل ہوا جا رہا تھا، غنیمت ہے کہ تم خود ہی ادھر آ نکلیں ۔"

"اس بیہودگی کی کیا ضرورت تھی!" وہ میرے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ۔ اس کے اوسان کافی حد تک بحال ہو چکے تھے ۔!

"مشرقی لڑکیاں کسی غیر مرد کو قریب پا کر خوفزدہ ہو جاتی ہیں، مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھے دیکھ کر تم بھی چیخنا شروع نہ کر دو اور میرے سارے ارمان دم توڑ جائیں!"

میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے دراڑ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا ۔

"میری ہر رات نئے مرد کے ساتھ بسر ہوتی ہے!" وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ مسکرائی "نواکوٹ کے مقامی مرد اتنے فراخدل ہیں کہ یہاں کوئی خوبصورت لڑکی بھوکوں نہیں مر سکتی ۔"

"مگر میں تمہیں کوئی معاوضہ نہ دے سکوں گا ۔"

"میں ہپی بننے سے پہلے عیسائی تھی اور چیریٹی بھی دیتی رہتی تھی ۔" وہ داہنی آنکھ دبا کر مسکرائی ۔ "مجھے یہاں لانے والوں نے اتنا معاوضہ دیا ہے کہ ایک دو مہینے شاید چین سے بسر کر سکوں ۔!"

"سنہری بالوں والی لڑکی کیا بدھ مت سے تعلق رکھتی ہے؟" میں نے

"کیوں ۔؟" اس نے حیرت سے بڑی بڑی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں ۔

"اس کا لباس کچھ ایسا ہی ہے ۔"

وہ ترنم ریز آواز میں ہنسی "چرن سنگھ نہانے کا شوقین ہے ۔ ہم لوگ پک اپ آنے سے پہلے اس کی کار میں یہاں آ گئے تھے ۔۔ وہ اس لڑکی کو ساتھ لے کر دریا میں نہانے اترا اور اس بیچاری کا اسکرٹ دریا میں بہہ گیا ۔ وہ بمشکل دریا سے باہر آئی اور پک اپ آنے پر اسے ایک چادر دے دی گئی ۔!"

"تو دوسری کار کہاں ہے؟" دراڑ عبور کرنے کے بعد میں ایک سایہ دار جگہ بیٹھتے ہوئے بولا ۔

"راستہ خراب ہونے کے باعث وہ دور ہی کھڑی کر دی تھی!"

"تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو ۔۔؟"

"ہمارا پوپ آج یہاں آنے والا ہے، سورج غروب ہونے سے قبل کسی بھی وقت یہ ویرانہ ہرے راما ہرے کرشنا کے مقدس نعروں سے گونجنے لگے گا ۔"

"شاید تم انندرام کی بات کر رہی ہو ۔؟"

"انندرام!" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ بھینچ کر ایک لذت میں ڈوبی ہوئی سسکاری لی اور بولی ۔ "اس کے ساتھ حسین اور نوخیز لڑکیوں کا ایک جلوس بھی آ رہا ہے ۔۔ وہ تین راتیں یہاں بسر کرے گا ۔ پھر نہایت خاموشی کے ساتھ سب کو چھوڑ کر آگے اپنے سالانہ سفر پر نکل جائے گا ۔ ۔ ۔ کون جانے ان تین راتوں میں چند لمحوں کے لئے وہ میرا بھی انتخاب کرے !"

"اور تمہیں لانے والوں کا کیا ہو گا؟"

"یہ نواکوٹ کے بگڑے دل رئیس ہیں خوبصورت لڑکیوں کے شکاری! خود کو انندرام کا معتقد کہتے ہیں ۔ لیکن اس کے قیام کا بندوبست کرنے کے بہانے اپنا الو سیدھا کرنے کے چکر میں ہیں ۔ جب انندرام چلا جائے گا تو یہ تمام لڑکیوں کو اپنے خرچ پر یہیں رکھیں گے ۔ جب عیاشیوں سے دل بھر جائے گا اکھاڑ کر لے جائیں گے اور لڑکیاں نواکوٹ کے گلی کوچوں میں بکھر جائیں گی! وہ دونوں پچھلے کئی سال سے ایسا کرتے آ رہے ہیں ۔"

"میری طویل غیر حاضری انہیں پریشان نہ کر دے!" وہ پھر آنکھیں ڈال کر مسکرائی ۔

"فکر نہ کرو!" میری آواز پر جذبوں کا تمام خمار طاری ہو چکا تھا ۔ "تیز دھارے سے اس لڑکی کا اسکرٹ میں نے نکال لیا تھا ۔ ترانے دیکھ رہے جانا اور بتانا کہ اچانک تمہاری نظر اسکرٹ پر پڑی اور تم کنارے اس کا پیچھا کرتی دور تک چلی گئیں ۔!"

"اور تمہارے بارے میں نہ بتاؤں؟" اس کا لہجہ شوخ تھا ۔

"اگر مجھے اس بات کا شبہ بھی ہو گیا تو یہ یاد رکھنا کہ ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اپنا نشانہ خود تلاش کر لیتی ہے ۔!"

"تم مجھ پہ گولی چلا سکو گے؟" وہ نابکار لڑکی کھکھی قہقہہ ۔

"میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے ٹکڑے اٹھا سکتا ہوں ۔!"

بندھن یک بیک ٹوٹ گیا ۔

دوسری ہپی اور آوارہ گرد لڑکیوں کے برعکس وہ بڑی بھرپور ۔ اس کی رفاقت میں گزارے ہوئے وہ چند لمحے یادگار تھے ۔!

اور جب وہ مجھ سے سبز اسکرٹ لیکر رخصت ہوئی تو اس کا آسودہ سی چمک تھی اور اپنے تجربہ کی بناء پر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اپنے ساتھیوں کو میری موجودگی سے باخبر نہ کرے گی ۔!

"تم نواکوٹ ہی میں رہتے ہو؟" جاتے جاتے اس نے پوچھا ۔

"اگر تم وہاں سے چوری کر کے کچھ خوراک اور شراب کی ایک بوتل تو میں یہیں رہ سکتا ہوں!" میں نے گرمجوشی سے اس کا شانہ دبایا ۔

"شام سے پہلے انندرام آ جائے گا پھر کسی کو کسی کا ہوش نہ رہے گا یہ چیزیں پہنچا دوں گی ۔۔ مگر رات کے گھور اندھیرے میں، میں تمہیں کہاں تلاش کروں گی؟"

"تم ادھر آنے کے لئے اسی دراڑ کا راستہ اختیار کرنا!" میں نے کہا "میں خود تم سے آ ملوں گا ۔ اگر سگریٹیں مل جائیں تو وہ بھی لیتی آنا ۔"

"ناممکن!" وہ جلدی سے بولی ۔ "نشہ تو بڑی چیز ہے یہ نشے کے عالم میں بھی اپنی سگریٹوں کی بھرپور حفاظت کرتے ہیں ۔ ان کی ہر نعمت ہیچ ہے!"

"میں چرس نہیں پیتا اچھی لڑکی!" میں نے نرمی سے اس کا شانہ ۔ "مجھے سادہ سگریٹیں درکار ہیں اور کچھ نہیں ۔!"

"وہ میں لے آؤں گی!" اس نے وعدہ کیا اور ہاتھ لہرا کر دراڑ میں داخل ہو گئی!۔۔

اس لڑکی کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا ۔ اس نے اپنی غیر حاضری کا جو بھی جواز پیش کیا ہو، کم از کم میرے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کیا تھا ۔ سبز اسکرٹ دوبارہ لڑکی کے بدن پر جا چکا تھا ۔

کرشن کمار مزدوروں کو چھوڑ کر پک اپ میں واپس آ چکا تھا اور جب سائے دراز ہونے لگے تو وہ پانچوں خیمے سے نکل کر تھڑوں پر آ بیٹھے ۔ کرشن کمار اور چرن سنگھ تہذیب اور اخلاق کی ہر پابندی سے بے نیاز ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ ناشائستہ مذاق میں مصروف تھے ۔!

پھر اچانک میرے کانوں میں ہلکی ہلکی آوازیں آئیں ۔۔ اس وقت میں ایک پہاڑی پر بے فکری کے ساتھ چت لیٹا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا ۔ میں نے وہیں سے آس پاس کا جائزہ لیا اور آخر کار ۔ دور تک پھیلی ویران چٹانوں کے درمیان مجھے رنگ برنگے غیر واضح متحرک ہیولے نظر آنے لگے ۔!

تھوڑی ہی دیر میں وہ ہیولے بھی واضح ہو گئے اور آوازیں بھی ۔

حسن جمال کا ایک بے لگام اور رنگا رنگ انبوہ تھا جو بیخودی و سرمستی کے عالم میں ہاتھ پیر اچھالتا، ناچتا اور مستانہ نعرے لگاتا مہارشی انندرام کے پیچھے چلا آ رہا تھا ۔ ان کے رنگا رنگ کپڑے اور حسین چہرے سفر کے باعث دھول میں اٹے ہوئے تھے ۔ سب لڑکیاں سفید فام اور برہنہ پا تھیں اور پنڈت انندرام کے لاہوتی بھجن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر وقفہ وقفہ سے ہرے کرشنا ہرے رام کے نعرے لگا رہی تھیں ۔

اور بدمعاش ہری رام!

وہ ان سب سے آگے تھا ۔ اس کے پورے بدن پر زرد رنگ کی ایک مختصر سی لنگوٹی کے سوا کوئی لباس نہ تھا ۔ سر، چہرہ، بدن اور بھنووں تک کے سارے بال منڈے ہوئے تھے ۔ بدن پر زرد رنگ کی مٹی سے ہندووانی علامتیں اور بوٹیاں بنی ہوئی تھیں ۔ چہرے پر تیز اور شوخ رنگوں کے گہرے نقوش تھے ۔ پیشانی کے وسط میں آنکھ بنا ہوا تھا ۔ گلے میں بلا مبالغہ چھوٹی بڑی سینکڑوں پتھریلی مالائیں جھول رہی تھیں، ان میں بعض تو اتنی لمبی تھیں کہ اس کے گھٹنوں کو چھو رہی تھیں ۔ پورے بدن پر آہنی زنجیریں شانوں اور پہلوؤں سے گزار کر ٹخنوں سے اوپر اس طرح بندھی ہوئی تھیں کہ انھوں نے زرہ کی سی صورت اختیار کر لی تھی ۔ دونوں ہاتھوں میں وزنی آہنی کڑے پڑے ہوئے تھے اور داہنے ہاتھ میں ایک بہت لمبا آہنی چمٹا دبا ہوا تھا ۔ وہ اس ویرانے میں آواز کے تمام تر سوز کے ساتھ بھجن الاپ رہا تھا ۔ آہنی چمٹے کے کھیل سے پیدا ہونے والی آوازیں ترنم سے ہم آہنگ تھیں ۔ کبھی وہ چمٹے کے دستے کو آہنی کڑوں سے مار کر ترنم برقرار رکھنے کے لئے مزید اکرتا اور کبھی اس کا پورا وجود کئی سیکنڈ کے لئے اس شدت سے کانپتا کہ زنجیروں کی ایک ایک کڑی کی آواز انندرام کے بھجن سے ہم آہنگ ہوتی ۔ ۔ ۔ وہ بنا اپنی داسیوں کی طرح برہنہ پا تھا ۔ جب وہ عقیدت میں ڈوبی آوازیں ہر بند کے خاتمے پر ہرے کرشنا ہرے رام کا کرب آمیز نعرہ مارتا تو اس کا وجود زمین سے کئی فٹ اوپر اچھل پڑتا اور زنجیروں کی کڑیوں، مالاؤں کے پتھروں، آہنی کڑوں اور چمٹے کے کھیل سے ایک ایسا مہیب مگر یک جان آہنگ ابھرتا

اور... رواں کانپ اٹھتا۔!

مہارشی انند رام کی سحر انگیز آواز اور موسیقی سن کر چند منٹ کیلئے تو میں ششدر ہو کر رہ گیا۔ میں ہندی سے اتنا واقف نہ تھا کہ اس کا ایک ایک بول سمجھ پاتا مگر انند رام نے اس وقت ساز و آواز کا جو سماں باندھا ہوا تھا وہ بلاشبہ روح کے تاروں کو چھیڑ دیتا تھا۔!

بیس پچیس حسین و جمیل نازک اندام سرو قامت اور زہرہ شکن ہپی لڑکیوں کا یہ طائفہ عجیب وحشیانہ رفتار سے پتھر، چٹانیں اور ٹیلے عبور کرتا دریا کی طرف چلا آ رہا تھا۔!

پھر اچانک دریا کی سمت سے ان پانچوں نے مل کر پوری قوت سے ہرے کرشنا ہرے رام کا نعرہ مارا اور انند رام کی لاہوتی آواز کا تعاقب ... کے استقبال کو لپکے۔

ان پانچوں کو سامنے پا کر انند رام نے آخری بار طویل نعرہ مارا اور نغمگی کی ... ختم ہو گئی۔ ایک سحر سا تھا جو ٹوٹ گیا مگر اس کے ساتھ آنے والی لڑکیاں ابھی تک اس سحر میں بری طرح گرفتار تھیں۔ وہ اپنے آزار میں مبتلا آوارہ روحوں کی طرح اچھل اچھل کر وارفتگی کے عالم میں، وحشیانہ آوازوں میں مسلسل ہرے کرشنا ہرے رام کے نعرے لگانے لگی تھیں۔!

وہ اس وقت مشرقی سرزمین پر ضرور تھیں مگر ان کا اپنا وطن مغرب تھا... وہ مشرق کے ایک نام نہاد روحانی پیشوا کے آدرش سے متاثر تھیں لیکن ان کا طرزِ اظہار مغربی ہی تھا۔ وہ اچھل رہی تھیں، ناچ رہی تھیں مگر ان کے قدم تیز رقص کے انداز میں پڑ رہے تھے۔ مجھے بے اختیار کراچی کے ... ہوٹلوں میں نئے سال کے استقبال میں منعقد ہونے والی رقص کی وہ شب بیدار محفلیں یاد آ گئیں جن میں جوڑے وحشیانہ مغربی موسیقی کا ساتھ دیتے نہیں تھکتے۔ پھر رات کے بارہ بجے جب چند ثانیوں کے لئے ساری روشنیاں گل کر دی جاتی ہیں، گرجوں کے گھنٹے گنگنانے لگتے ہیں، ساحل پر جہازوں کے ہوٹر پوری قوت سے چیخ اٹھتے ہیں تو رقص گاہ کی فضا نیک ترین تمناؤں کے بلند آہنگ اظہار اور بدترین گناہوں کی بے آواز آرزو سے دہک اٹھتی ہے اور جب روشنیاں جل اٹھتی ہیں تو ہنستے مسکراتے جوڑے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ناچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔!

چرن سنگھ اور کرشن کمار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس بدمعاش اور پراسرار رشی کے قدم چھوئے، تینوں لڑکیوں نے بھی ان کی تقلید کی پھر انند رام نے نہ جانے ان ناچتی اچھلتی لڑکیوں سے کیا کہا کہ مشینی انداز میں وہ سب یک بیک ساکت ہو گئیں اور چند ہی ثانیوں میں ان کے چہروں کی تازگی اور شگفتگی تکان میں ڈھل گئی۔ چمکتی جگمگاتی آنکھوں میں بے رونقی سی تیر گئی۔ حسن کی چکا چوند بھی کچھ ماند نظر آنے لگی تھی!

چھولداریوں تک چند سو گز کا فاصلہ خاموشی کے ساتھ چرن اور کرشن کی رہنمائی میں طے ہوا۔ انند رام بڑی چھولداری میں جا گھسا تھا اس کے ہمراہ وہ پانچوں بھی تھے۔ باقی تمام لڑکیاں چھوٹے خیموں میں چلی گئیں۔

چند منٹ پہلے تک جو فضا شور اور ہنگامے سے گونج رہی تھی اب اکتاہٹ آمیز سکوت طاری تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس پہاڑی ... لگا۔! اس وقت ہر طرف شام کا سرمئی دھندلکا پھیل چلا تھا۔ ... ٹھکانے سے دوسرا ریوالور بھی لے لیا۔ اسی وقت مجھے فضا میں ... بوجھل سی بو تیرتی محسوس ہوئی اور میں طویل سانس لیکر رہ گیا۔ چھولداریوں میں اس وقت شاید باجماعت چرس پی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے ادھر سکوت طاری تھا۔!

جب سورج غروب ہو گیا تو وہاں اتنا گہرا اندھیرا پھیل گیا کہ ... قدم دور کی چیز بھی نظر نہ آتی تھی۔ دن کی روشنی میں میں اس دراڑ کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ ہر قسم کے حشرات الارض سے پاک تھی۔ لہٰذا میں وہیں لیٹ گیا۔! پچھلی پوری رات بھاگ دوڑ میں گزری تھی۔ بڈ کے ہمراہ زیر زمین ... سے ایئر کلب پھر نواکوٹ ایئر فیلڈ سے فرار کے بعد میں نے ایک پل آرام نہیں کیا تھا لہٰذا لیٹتے ہی ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے بھی نیند کی اس شدید لہر سے مقابلے کی کوشش نہ کی کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ انند رام اب کم از کم تین راتیں اسی جگہ بسر کرے گا۔ پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی!

نہ جانے وہ خواب تھا یا حقیقت۔! میں نے ایک بہت تیز نسوانی چیخ کی آواز سنی اور ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ چند ثانیوں تک میں اسی جگہ بیٹھا رہا پھر تجسس اور تحفظ کے پیشِ نظر دراڑ سے دریا کی سمت بڑھنے لگا۔ نظر... وہ کیسی چیخ تھی جو دوبارہ نہ سنائی دی۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ چھولداریوں میں بھی زندگی کے آثار مفقود تھے۔ وہ لوگ بھی شاید سفر کی تکان سے نڈھال ہو کر گہری نیند سو رہے تھے!۔

میں ابھی دراڑ کے دہانے پر ہی تھا کہ چھولداریوں کے قریب تاریکی میں ایک مدھم سا انسانی ہیولا حرکت کرتا نظر آیا۔ میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے اور میں نے بے اختیار دونوں ریوالور نکال لئے!

میں دراڑ کے دہانے پر پوری طرح تیار کھڑا ہوا تھا۔ وہ انسانی ہیولا چھولداریوں سے میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میں اس اچانک واقعے کی وجہ سے غنودگی کی لہر سے نجات پا چکا تھا اور میرے حواس پوری طرح کام کرنے لگے تھے۔ آخر کار میں نے اس ہیولے کو پہچان لیا۔ میرے ہاتھوں میں دبے ریوالوروں کے دہانے نیچے جھک گئے۔

تھوڑی دیر میں وہ لڑکی میرے روبرو آ پہنچی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا جھول رہا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لیکر تھیلا میرے حوالے کر دیا۔

"اس میں گوشت اور خشک مچھلی کے کچھ سربند ڈبے، کھانے ... ہے پھر ایک تھرموس، کافی کا ڈبہ اور سگریٹیں موجود ہیں۔ تم کفایت ... تو دو تین روز بڑی آسانی سے گزار سکتے ہو۔"

"ان سب چیزوں کا شکریہ۔!" میں نے اس کی پیشانی چوم کر کہا "... تو بتاؤ کہ ابھی چھولداریوں کی طرف سے اٹھنے والی تیز نسوانی چیخ ... تھی۔؟"

"نسوانی چیخ؟" اس نے حیرت سے پوچھا "ادھر تو بہت دیر سے سناٹا چھایا ہوا ہے۔"

"تو وہ میرا وہم رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"آج رات انند رام خلافِ معمول اپنی چھولداری میں بالکل تنہا ہے ... نے پردے مضبوطی سے بند کئے ہوئے ہیں اور اندر کسی مرگھٹ کا سا سناٹا چھایا ہوا ہے ورنہ آج رات تو یہاں وہ اودھم ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی۔" اس نے دراڑ میں میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لعنت بھیجو اس پر۔" میں نے انند رام کی طرف سے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے دیسی پوپ اور اس کی مصروفیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ایک بات پوچھوں!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد دراڑ میں لڑکی کی مدھم سی آواز ابھری۔

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ یک بیک میرا دل دھڑک اٹھا مگر میں نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے فراخ دلی کے ساتھ کہا۔

"ضرور پوچھو۔!"

"تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"علی شیر۔!" میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام دہرا دیا۔

بے اختیار اس کے منہ سے ایک طویل سانس آزاد ہو گیا اور وہ بولی "... بڈ شہر سے چند ناقابلِ یقین خبریں لیکر آیا ہے۔"

"کیا ان خبروں کا میرے نام سے کوئی تعلق تھا۔" میں نے ... کر پوچھا۔

"ہاں۔ کسی حد تک...!"

"... رات کھٹمنڈو سے ایک تربیتی طیارہ خلافِ معمول نواکوٹ ایئر فیلڈ ... آیا تھا۔ طیارہ رن وے کے آخری حصے پر تاریکی میں رکا اور گراؤنڈ مین کے اشاروں کے باوجود نہ وہاں سے ہلا نہ اس کے انجن بند کئے گئے۔ گراؤنڈ مین طویل انتظار کے بعد ڈرتے ڈرتے طیارے تک پہنچا اور سیڑھی کے ذریعے کھڑکی سے کاک پٹ میں جھانکا تو اندر پائلٹ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ کسی نے اسے پستول سے ہلاک کیا تھا۔ پھر دن میں شہر کے نواح میں کھٹمنڈو کے سب سے بڑے گروہ بند ہپی بڈ کی لاش ملی۔ اسے بھی پستول ہی سے مارا گیا تھا۔ بڈ کے نام سے لوگ کانپا کرتے تھے۔ پولیس کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکی کہ بڈ نواکوٹ کیسے آیا ہوا اسے کس نے ہلاک کیا۔!"

"لیکن اس قضیئے میں میرا نام کہاں آتا ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"مہارشی انند رام نے یہ قصہ سننے کے بعد بتایا کہ اسے صفدر نامی ایک جلا وطن اسمگلر پر شبہ ہے جو نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا نیپال آ پہنچا ہے۔ ان دنوں وہ نیپال کا ہوا بنا ہوا ہے اور مجرموں کی بعض زیر زمین تنظیمیں اس کے خون کی پیاسی ہو رہی ہیں۔..."

میں یہ سنکر کانپ اٹھا۔ انند رام واقعی مسئلے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ مگر اس لڑکی کو کسی شبہے کا موقع نہ دینے کی نیت سے میں کھوکھلی آواز میں زور سے ہنسا۔ "تو تم مجھے ہی صفدر علی سمجھ رہی تھیں۔ عورتیں واقعی کم عقل ہونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔!"

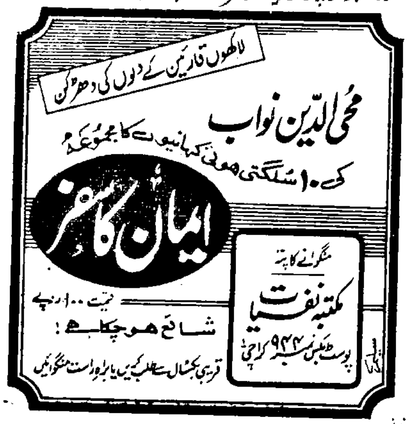
"یقین تو مجھے بھی نہ تھا۔" وہ میری پسلیوں میں کہنی مار کر بولی۔ "مگر تم جن پراسرار حالات میں مجھ سے ٹکرائے، ان کی بنا پر معمولی سا شبہ ہوا تھا۔ پھر تمہارے پاس پستول بھی موجود تھا!"

"مجھ جیسی زندگی بسر کرنے والا کوئی بھی شخص نہتا مرنا پسند نہیں کرتا۔"

وہ مزید کچھ دیر میرے پاس رکی رہی۔ آدھی رات گئے میرے پاس آنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ اسے میری ضروریات کا احساس تھا بلکہ وہ ... کسی ... طلب سے بے چین ہو کر میرے پاس آئی تھی۔ اس کی زبانی حالات کا علم ہونے کے بعد میرے مزاج کی ساری رنگینی دہشت اور خوف میں گم ہو چکی تھی مگر میں نے اس کا دل توڑنا مناسب سمجھا۔

جب وہ چھولداریوں کی طرف لوٹی تو میں دراڑ کے دہانے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔!

اس رات کے باقی لمحات میں نے سخت اضطراب اور ذہنی اذیت کے عالم میں گزارے اور جب صبح کا اولین دھندلکا اس حسین وادی میں نمودار ہوا تو چھولداریوں کی طرف سے اچانک مہارشی انند رام کی کرخت در...



بلند آہنگ آواز گونجی ۔ وہ بار بار ہرے رام ہرے رام کا نعرۂ مستانہ لگا رہا تھا۔!

میں دراڑ کے دہانے پر ایسی جگہ آ جما جہاں سے میں محفوظ رہتے ہوئے سارا منظر دیکھ سکتا تھا۔

مہارشی اندرام اپنی بڑی چھولداری کے باہر کھلی فضا میں کھڑا ہوا تھا مالائیں اور زنجیریں بدستور اس کے استخوانی ڈھانچے پر جھول رہی تھیں۔ اس کے گرد خوبصورت سفید فام لڑکیاں عقیدت کے ساتھ سینے پر ہاتھ باندھے داسیوں کی طرح کھڑی تھیں۔ اندرام کے نعروں سے درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے چونک چونک کر خوفزدہ آوازیں نکال رہے تھے۔ ندی کا شفاف پانی ننھے منے پتھروں سے الجھتا بے آواز بہا جا رہا تھا۔!

اندرام نے پھر آہستہ آہستہ اپنے آہنی کڑوں اور چمٹے کے باہمی ٹکراؤ سے سُر جگانے کی کوشش کی اور جب اس آہنی جھنکار نے ایک سُر کی صورت اختیار کر لی تو اس نے آفاقی آہنگ میں ایک بھجن الاپنا شروع کر دیا۔

یہ اس وادی میں نئی صبح کا ظہور تھا۔ سورج طلوع ہونے تک اندرام بھجن اور مقدس اشلوک پڑھتا رہا اور سورج طلوع ہونے پر وہ زمین پر آلتی پالتی مار کر سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے حلقہ بند ہو گئیں۔ چرن سنگھ اور کرشن کمار کا کہیں پتہ نہیں تھا۔!

دوپہر کے قریب سورج سر پر آنے سے قبل اندرام نے اپنی عبادت ختم کی ہی تھی کہ وہ ویرانہ کسی طاقتور جیپ کے انجن کے شور سے گونج اٹھا میرے ساتھ ہی اندرام اور اس کی ساتھی لڑکیاں بھی بُری طرح چونکی تھیں ذرا ہی دیر میں پولیس کی ایک جماعت وہاں آ پہنچی۔

میں خطرہ بھانپتے ہی خورد و نوش کے سامان کا تھیلا سنبھال کر اس دراڑ سے عقبی میدان میں نکلتا چلا گیا۔ شاید وہ لوگ بڈ اور راجیت پال کے قاتل کی تلاش میں اس طرف آئے تھے۔!

پولیس پارٹی کو شاید وہاں کوئی کارآمد سراغ نہ مل سکا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اپنی نئی کمین گاہ میں جیپ کے انجن کا دُور ہوتا ہوا شور سُنا اور اطمینان کا سانس لے کر دراڑ کی طرف واپس چلدیا۔

شام کے وقت پہاڑی ندی کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں اندرام نے ایک عجیب تقریب سجائی۔ وسط میں خشک لکڑیوں کا دھیما سا الاؤ روشن کیا گیا۔ اس کے گرد ساری لڑکیاں حلقہ زن تھیں۔ کرشن کمار اور چرن سنگھ الاؤ کو روشن رکھنے میں کوشاں تھے۔ پھر اندرام گیروے رنگ کی دھوتی اور اپنے سنگی و آہنی زیورات کے ساتھ وہاں آیا۔

اس نے باری باری تمام لڑکیوں کے رخسار چوم کر انھیں کچھ دُعائیں دیں اور الاؤ کے قریب جا پہنچا اور ٹھوکر مار کر دہکتے ہوئے انگارے دُور تک بکھیر دیئے اور برہنہ پا اُن پر ٹہلنے لگا۔ اس کے گمبھیر چہرے پر لازوال سکون پھیلا ہوا تھا۔

"ہرے رام۔۔۔!" انگاروں پر ٹہلتے ٹہلتے اندرام چیخا۔

سب لڑکیوں نے ہم آواز ہو کر یہی نعرہ دُہرایا۔

"ہرے کرشنا ہرے رام۔۔۔!" اندرام نے پورے جسم کو لرزا کر اور تیر کی مالاؤں سے جھنکار پیدا کی اور وہ ویرانہ اس وحشیانہ موسیقی سے گونج اٹھا۔!

اندرام خود ساختہ سازوں کے ماورائی آہنگ پر دھیمے دھیمے انداز میں گا رہا تھا اور انگاروں پر رقص کناں تھا۔ اس کی معتقد سفید ہپی لڑکیاں تالیاں بجا بجا کر والہانہ انداز میں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اندرام کی آواز، زنجیروں اور چمٹے کا شور اور تالیوں کی آواز تیز ہوتی گئی اور اندرام کے قدم بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دہکتے انگاروں پر پڑنے لگے۔ لڑکیاں بھی سرور میں آ کر ناچنے لگی تھیں اور وہاں ایسا سماں بندھ گیا کہ میں خود کو اس ماحول کا ایک جزو سمجھنے لگا۔

شام کے سائے تیزی سے دراز ہوتے گئے۔ پھر ناہموار سنگلاخ پہاڑوں کے اس پار کسی گمنام وادی میں جا سویا۔ بسیرا کرنے والے پرندے اپنے نشیمنوں کی سکون پرور آغوش کی تلاش میں ندی کے کنارے پر آئے لیکن وہاں پھیلے شور و غل سے پریشان ہو کر دُکھی آوازیں نکالتے جنگل کی سمت پرواز کر گئے۔ اندھیرا گہرا تھا۔ زمین پر پھیلے ہوئے انگارے ننھے ساکن نکتوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ان کا دھیما دھیما دکھتا الاؤ سفید سفید نسوانی پنڈلیوں کو کشش انگیز بنا رہا تھا۔ پھر میں نے وہاں عجیب تماشا دیکھا۔ اندرام اب تک آنکھیں موندے گا رہا تھا۔ پھر اس نے یکبیک آنکھیں کھول دیں۔ ناچتے ناچتے جب اس کا چہرہ میرے سامنے آیا تو میں سر سے پیر تک لرز گیا۔ اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں ڈھیلے حلقوں سے باہر اُبلتے محسوس ہو رہے تھے اور اندھیرے میں وہ دہکتے انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اندرام نے جب اپنی شعلہ بار آنکھیں نیچے کیں تو اس کے سامنے پڑے ہوئے نیم جاں انگارے اتنی تیزی سے دہک کر ان کے اوپر ہلکے ہلکے شعلوں کی لپک نظر آنے لگی۔ پھر جوں جوں وہ اپنا رُخ بدلتا جا رہا تھا اسی طرح وہ تیز آنچ بھی دائرے کی شکل میں اس کے گرد گھوم رہی تھی۔ نہ جانے اندرام کی آنکھوں میں وہ کیا مقناطیسی سحر پوشیدہ تھا کہ انگارے بھڑک رہے تھے۔ آشفتہ سر ہپی لڑکیوں نے اپنے پوپ کا یہ کرشمہ دیکھا تو سندر داسیوں کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر مہارشی کے سامنے جھکتی چلی گئیں۔ چرن سنگھ اور کرشن کمار کے بدن کانپ رہے تھے اور وہ اندرام کے سامنے سجدے میں گرے ہوئے تھے۔!

اندرام مزید کچھ دیر اسی طرح ناچتا رہا پھر یکبیک اس کے قدم رک گئے، آواز دم توڑ گئی اور گونجتے ویرانے میں غیر فطری سا سناٹا چھا گیا۔ اندرام بے آواز قدموں سے چلتا انگاروں سے زمین پر اتر آیا۔ اس کے نیچے آتے ہی تمام لڑکیاں تیزی سے اس کی طرف لپکیں اور والہانہ انداز میں اس کے بدن سے لپٹ کر اس گنجے، بدصورت، نحیف و نزار اور کریہہ رشی پر بوسوں کی بھرمار کر دی۔!

اندرام ان کی سرگرمیوں پر اپنا سکون برقرار نہ رکھ سکا اس نے بآواز ایک گہرا سانس لیکر ان سب کو اپنی باہوں میں سمیٹ لینا چاہا مگر وہ لاکھ پُراسرار اور باقوت سہی مگر اس کی دسترس اتنی وسیع نہ تھی۔ اس نے اپنی گرفت میں آئی ہوئی لڑکیوں کو چند ہی ثانیوں بعد چھوڑ دیا اور اپنی چھولداری کی طرف چلدیا۔

اس دوران میں چرن سنگھ اور کرشن کمار بھی اپنا اپنا شکار چن چکے تھے۔ اندرام کے چھولداری میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں حسنِ بے لگام کے اس انبوہ میں گھر گئے۔ وہ راجہ اندر کی طرح سندر، بانکی، سجیلی ناریوں کے غول میں گھرے ہوئے تھے مگر ان کی توجہات اپنے مخصوص نشانوں پر مرکوز تھیں!۔

پھر وہ دونوں بھی اپنی ساتھیوں کو لے کر تاریکی میں کسی طرف نکل گئے باقی لڑکیاں کھلے آسمان تلے ان رنگین لمحات میں تنہا رہ گئیں۔ اُن کی تعداد کافی تھی مگر پھر بھی وہ تنہا تھیں۔ اُن کی مسرت کا کوئی سامان نہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ اندرام کی قناعت کی تلقین پر یقین رکھتی تھیں۔ ان کے لبوں میں نشہ آور سگریٹیں آ گئیں۔ دبے دبے جذبات کی طرح چند شعلے لپکے اور فضا میں دھوئیں کی ملگجی لکیریں تیرنے لگیں۔

میں دراڑ میں ایک چٹان کے سہارے اپنی پشت ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں سب کچھ سہی مگر ایک انسان ہی تھا جو اپنے جذبوں کی بے پناہ قوت کے سامنے کسی حقیر کیڑے کی طرح بے بس ہوتا ہے۔ میرے وجود میں حیوانیت کا جوالامکھی دہک رہا تھا مگر میں مجبور تھا۔!

اچانک دراڑ کے دہانے کے قریب ہلکی سی آہٹ سُنائی دی اور میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

"شیر علی۔!" تاریکی میں ایک مانوس سرگوشی اُبھری اور میں کسی عیار چیتے کی طرح دبے قدموں دراڑ کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔

آنے والی میری موجودگی کی رازداں وہی ہپی لڑکی تھی جس کے لمس سے میں دو بار خوب آشنا ہو چکا تھا!

مجھے سامنے پاتے ہی وہ تیزی سے دراڑ میں گھس آئی۔

"مجھے افسوس ہے کہ اندرام نے آج کی رات تمہیں منتخب نہیں کیا!" وہ سرگوشی کی۔ "شاید آنے والی رات تمہارا مقدر یاوری کر جائے۔!"

"مجھے اس کی پرواہ نہیں!" وہ میرے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے بولی "اور آنے والی رات بھلا کس نے دیکھی ہے، وہ آج ہی رات خلافِ توقع گمنام راستوں پر نکل جائے گا۔"

"آج رات۔!" میں نے چونک کر اسے اپنے سے الگ کر دیا۔

"ہاں آج رات۔۔۔ جہنم میں جائے وہ، آؤ ہم بھی اس رات کا جشن منائیں۔!"

میں اس سے اندرام کے پروگرام کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہتا تھا مگر وہ اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اگر میں اس کے مطالبے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اسی وقت ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتی اور شاید میری موجودگی کا راز بھی افشا ہو جاتا۔!

میں نے فوری طور پر اپنے اہم ترین مقصد کو پس پشت ڈال دیا اور خود کو اس لڑکی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اور جب اسے اپنے وجود کی نسوانی وحشت سے نجات ملی تو وہ ذہنی و جسمانی طور پر تھکن سے چور ہو چکی تھی!

"اندرام آج کیوں جا رہا ہے ہنی!" میں نے اس سے پوچھا۔

"آج دوپہر میں پولیس ادھر آئی تھی۔ شاید تم نے بھی دیکھا ہو؟"

"نہیں۔۔۔ دوپہر کے وقت میں ندی میں غسل کرنے کی نیت سے کافی آگے نکل گیا تھا۔" میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔

"اندرام غیر ملکی ہپیوں میں بہت زیادہ مقبول ہے اور اس کے ساتھ آنے والی لڑکیاں کٹھمنڈو سے آ رہی ہیں۔ پولیس بڈ کے قتل کے سلسلے میں کوئی سراغ پانے کی کوشش میں یہاں تک آئی تھی اور انھوں نے اندرام سے کافی دیر تک سوالات بھی کئے تھے۔"

"کوئی نتیجہ۔۔؟"

"نتیجہ کیا رہتا۔۔۔ وہ لوگ تو چلے گئے اور اب اندرام یہاں مزید رُکنا نہیں چاہتا۔ اسے اندیشہ ہے کہ پولیس بڈ کے قتل کے سلسلے میں اسے بھی ملوث کرنے کی کوشش کرے گی۔"

"وہ کیوں؟" یہ اطلاع میرے لئے حیران کن تھی۔

"مقامی لوگ اندرام کی باغیانہ تعلیمات سے سخت متنفر ہیں اور اس امر سے حکام بھی واقف ہیں ہو سکتا ہے کہ اندرام سے نپٹنے کے لئے وہ اس بہانے کی آڑ لیں۔!"

بات معقول تھی لہٰذا میں خاموش ہو گیا۔!

جب وہ میرے پاس سے لوٹ کر گئی تو میں نے خورد و نوش کے تھیلے میں ہی دونوں ریوالور ٹھونسے۔۔۔ اور اپنی کمین گاہ سے نکل گیا۔

چھولداریوں کے باہر دُور دُور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا لیکن

اندر سے آنے والی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ رات وہاں خرمستی ہی میں بسر ہوگی۔

میں بہت احتیاط کے ساتھ دبے قدموں اندرام کی بڑی چھولداری کے عقب میں پہنچا اور کافی تلاش کے بعد ترپال کے ایک سوراخ کے ذریعے اندر جھانکنے میں کامیاب ہوگیا۔

اندر ایک چوبی تپائی پر ایک سایہ بے خبر سو رہا تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ وہ اندرام نہیں ہو سکتا۔ پھر میں نے دوسرے رُخ سے بھی چھولداری میں جھانکا، لیکن وہاں اس خبیث مہارشی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔!

اس وقت مجھ پر شدید جھلاہٹ سوار تھی۔ لڑکی کی ضد کے باعث میں نے کافی وقت ضائع کر دیا تھا اور میری تمام محنت کے باوجود رشی مجھے جل دے کر صاف نکل گیا تھا۔

میں نے چھولداری سے ہٹ کر اطراف و جوانب میں نگاہ ڈالی مگر دُور دُور تک درختوں کے ساکت ہیولوں کے سوا کسی کا وجود نہ تھا۔

میں کچھ دیر تک اسی جگہ کھڑا یہ سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ مجھے اتنا تو یقین تھا کہ اندرام کے سفر کی سمت کے بارے میں چرن سنگھ اور کرشن کمار سے کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکے گا۔!

پھر میں نے باری باری بقیہ دو چھولداریوں میں جھانکا۔ ایک میں تمام ہپی لڑکیاں زمین پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھیں، دوسری چھولداری میں وہ دونوں وحشی اپنی متوقع سرگرمیوں میں مصروف تھے۔!

میں اس وقت سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں دونوں ریوالوروں کی زد پر ان سب کو للکاروں گا اور خونریزی کی پرواہ کئے بغیر چرن یا کرشن سے اندرام کے بارے میں معلوم کروں گا۔ مگر عین اس وقت جب میں چھولداری کے سرے پر تھا' اس کا پردہ ہلا اور اگلے ہی لمحے میں کرشن کمار باہر آگیا۔ میرے لئے سنہری موقع تھا جب قسمت ساتھ دے تو انسان کو بڑے خطرات سے گریز کرنا چاہیئے۔ لہٰذا میں دوبارہ آڑ میں ہوگیا۔!

کرشن کمار ہاتھ میں ایک جگ لئے شاید پانی لینے ندی کی طرف ہولیا۔ میں بھی پوری احتیاط سے اس کے پیچھے چل پڑا۔

جب کرشن کمار جگ بھرنے کے لئے ندی کے کنارے بیٹھا تو میں نے پیچھے سے جا کر اس کا منہ پوری قوت سے اپنی ہتھیلی سے دبوچ لیا' اور ریوالور کی وزنی نال سے اس کے رخسار کی ہڈی پر ضرب لگا کر دھیمی آواز میں غرایا۔

"اگر ذرا بھی شور کرنے کی کوشش کی تو بھیجہ اڑا دوں گا۔"

اس دھمکی کے بعد میں نے اس کے دہانے سے ہاتھ ہٹا دیا۔!

"تت ۔۔۔ تم کون ہو؟" پُر ہول تاریکی میں خود کو موت سے دوچار پا کر کرشن کمار کی گھگھی بندھ گئی۔

"صفدر علی ۔۔۔ بڈ کا قاتل!" میں نے سرد اور سفاکانہ لہجے میں کہا۔

"تت ۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟" وہ ہکلایا۔

"اندرام کس طرف گیا ہے؟"

"وہ بڑی چھولداری میں ہے۔"

"وہ وہاں نہیں ہے۔" میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "مجھے بتاؤ کہ اسے کس سمت میں سفر کرنا تھا ۔۔۔ میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔"

"وہ ندی کے اس پار ستیا وادی کے ویران غاروں کی طرف گیا ہے۔" وہ ندی کے دوسرے کنارے پر پھیلے ہوئے گھنے جنگلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"کیا وہ ندی میں تیر کر گیا ہوگا۔؟" میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ آگے ندی کا پاٹ بہت کم ہے۔ وہاں شہتیروں کا پل بنا ہوا ہے۔" وہ شمال کی طرف سر اٹھا کر بولا۔ اس کے لہجے میں سچائی کی بو ضرور تھی مگر میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔

"اٹھو ۔۔۔ اندرام کے ملنے تک تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ اگر مجھے بھٹکانے کی کوشش کی تو میں بے دریغ مار ڈالوں گا۔" میں نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ ڈری ڈری آواز میں بولا۔ "اس وقت ادھر کا رُخ کرنا بھی خطرناک ہے ۔۔۔ ایک دو میل آگے گھنے جنگل گیدڑ اور سور بھرے ہوئے ہیں۔ تم بھی ادھر نہ جاؤ' بے موت مارے جاؤ گے!" وہ زمین سے اٹھا تو اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

"اور اندرام خودکشی کرنے ادھر گیا ہے۔!" میں نے جھلاہٹ میں اس کی کمر پر ٹھوکر ماری۔

"وہ اوتار ہے ۔۔۔ اس کی نظروں میں عجیب طلسم ہے' وہ جسے نظر بھر کر دیکھ لیتا ہے وہ اس کا تابع ہو جاتا ہے' تمہارا ریوالور کب تک تمہارا ساتھ دے گا۔۔۔ اگر ہم پر گیدڑوں کا کوئی غول آ پڑا تو دو چار مریں گے اور باقی مشتعل ہو کر ہمارے ٹکڑے اڑا دیں گے۔"

"تیزی سے چلو ۔۔۔ اگر جان پیاری ہے تو اس جنگل میں گھسنے سے پہلے ہی مجھے اندرام تک پہنچا دو ۔۔۔ ورنہ میرا اور تمہارا حشر ایک ہی ہوگا!"

اور وہ چون و چرا کئے بغیر میرے آگے ہو لیا۔!

ندی کے کنارے کنارے وہ شمال کی سمت میں میری رہنمائی کرتا رہا۔ خوف سے اس کا برا حال تھا۔ بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔ پیر ڈالتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا ۔۔۔ کئی بار وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل نیچے بھی گرا مگر فوراً ہی اٹھ کر

آگے چل پڑا۔ اسے میری جانب سے ہر لمحہ کسی انتہائی اقدام کا خطرہ تھا!

"تم وہی صفدر علی ہو جس نے کھٹمنڈو میں کئی خون کئے تھے؟" کافی دیر تک خاموش چلتے رہنے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"ہاں ۔۔۔ اور اس تعداد میں کسی بھی لمحہ ایک کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے!" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

"بھگوان کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔!" وہ تقریباً رو دیا۔ "میرے لئے چلنا بھی مشکل ہو رہا ہے!"

"اندرام ستیا وادی کے غاروں کی طرف کیوں گیا ہے۔؟"

"بھگوان جانے ۔۔۔ وہ ہر برس ہی جاتا ہے ۔۔۔ مگر اس کی اصل منزل کسی کو معلوم نہیں!"

"وہ اس بار تین دن کے بجائے ایک ہی دن میں یہاں سے کیوں بھاگ نکلا؟"

"وہ بڑی شکتیوں کا مالک ہے' شاید اسے معلوم ہو چکا تھا کہ تم اس کا پیچھا کر رہے ہو۔ مگر ہم گناہگار ان اوتاروں کی باتیں کیا جانیں!"

حتی الامکان تیز رفتاری سے چلتے ہوئے ہم جلد ہی اس مقام پر جا پہنچے جہاں ندی کا پاٹ اٹھارہ بیس فٹ رہ گیا تھا مگر بہتے پانی کے شور سے پتہ چل رہا تھا کہ یہاں ندی کی گہرائی بہت زیادہ ہے' ایک مقام پر چند دیو ہیکل شہتیروں کو کناروں پر جما کر ندی عبور کرنے کا راستہ بنا لیا گیا تھا۔ اس سے گزر کر ہم دوسرے کنارے پہنچے اور اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔!

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم اس دشوار گزار اور تاریک جنگل میں بڑھتے رہے۔ پھر اچانک میرے کانوں میں آہنی زنجیروں کی ہلکی ہلکی سی آواز آئی جیسے کوئی ڈھیلی ڈھالی زرہ پہنے پیدل چلا جا رہا ہو۔!

"مہارشی' مہارشی قریب ہی ہیں!" کرشن کمار وہ آواز سنتے ہی رُک گیا۔

"اور آگے ۔۔۔" میں نے اسے دھکا دیا۔ "جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے تم واپس نہیں جا سکو گے۔"

ہماری رفتار تیز تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ آوازیں اتنی واضح ہو گئیں کہ کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ ساتھ ہی اندرام کے گنگنانے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ شاید وہ اپنے گرد و پیش سے بے پرواہ اپنی موج میں ڈوبا آگے بڑھا جا رہا تھا!

پہلے میں نے سوچا کہ کرشن کمار کو وہیں ختم کر دوں مگر اس میں اندیشہ تھا کہ ریوالور کا شور یا گلا گھونٹنے کی صورت میں کرشن کمار کی چیخ و پکار سے اندرام چوکنا ہو جاتا اور میرا کام مشکل ہو جاتا۔ اتنی دیر میں مجھے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ کرشن کمار انتہائی کا بزدل اور ڈرپوک ہے اور ذرا بھی خطرہ مول لینا پسند نہیں کرے گا۔

"بس اب تم یہیں سے لوٹ جاؤ!" میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں اسے حکم دیا۔ "اگر ذرا سی بھی بدمعاشی کی تو پاتال میں بھی نہ چھوڑوں گا۔"

وہ ایک ثانیہ کے لئے بھی رُکے بغیر واپس مڑا۔ اور تقریباً دوڑتا ہوا واپس ہولیا۔!

میں ریوالور بدست آہنی زنجیروں کی آواز پر اندرام کے تعاقب میں بڑھتا رہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فضا میں گیدڑوں کی نحوست بھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے ایک آدھ آواز ابھرتی' پھر ان کا غول کا غول رونے لگتا۔ یہ آوازیں گو کافی دُور کی تھیں مگر میرا اندازہ تھا کہ سفر اگر کسی رفتار سے جاری رہا تو ایک آدھ گھنٹے بعد میں اس خطرناک علاقے میں جا پہنچوں گا۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تاکہ اندرام سے قریب ہی رہوں اور زنجیروں کی آواز کی بجائے اپنی نگاہ سے اس کا تعاقب کروں۔ اگر جنگلی درندوں کے شور میں اندرام کی مالاؤں کی آواز دب جاتی تو میں ایک بار پھر بے یار و مددگار رہ جاتا۔ مجھے ستیا وادی کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ ایک بار اندرام کو کھو دینے کے بعد میرے لئے فوراً لوٹ کی واپسی یا جنگلوں میں بھٹکنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا!

اندرام کے گنگنانے کی آواز ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ وہ عجب بے خوف آدمی تھا کہ اس قدر کٹھن اور پُر خطر راستے پر رات کے پُر ہول اندھیرے میں یوں بے دھڑک چلا جا رہا تھا۔ میرے لئے تنہا اس سفر کا تصور بھی لرزہ خیز ہوتا۔ مگر اب مجھے یہ آس تھی کہ مجھ سے آگے ایک اور آدمی اور راستہ کا راہی ہے!

کچھ ہی دیر بعد میری تگ و دو رنگ لائی۔ خودرو جھاڑیوں' درختوں اور جنگلی بیلوں کے درمیان اندرام کا تاریک ہیولا یکساں رفتار سے آگے بڑھتا نظر آیا۔!

جنگلی گیدڑ اور سور اب قرب و جوار میں بول رہے تھے۔ ان کی پُر ہول آوازوں نے پورا جنگل سر پر اٹھا رکھا تھا۔ آنے والے نامعلوم مگر مہیب خطرات کے تصور سے میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ مجھے اب تک توقع تھی کہ شاید اندرام بھیانک جنگلات سے پہلے کہیں رکے گا لیکن وہ خبیث تو کسی بدروح کی طرح گھنے جنگلات میں گھستا ہی جا رہا تھا۔ اسے اپنی ذات پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا مگر میرے لئے کسی مافوق الفطرت یا پُراسرار تحفظ کا خیال ہی احمقانہ تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے آگے بڑھنے سے کیوں کر روکا جائے۔!

پھر چلتے چلتے اچانک انند رام نے چمٹا بجانا شروع کردیا اور زور زور سے ہرے کرشنا ہرے رام الاپنے لگا۔ یہ آوازیں خوابناک سناٹے میں دور تک گونجتی چلی گئیں۔ گیدڑوں کا شور یک بیک تیز ہوگیا۔ ساتھ ہی جنگل میں درندوں کے ادھر اُدھر بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔

شدید خنکی کے باوجود اس وقت میرا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا مگر انند رام کی تازہ ترین حرکتوں کی وجہ سے میرے اعصاب قدرے بحال ہوئے۔ انند رام بلاشبہ ان جنگلی درندوں کی نفسیات سے خوب واقف تھا۔ ایسے جانور شور وغل سے خوفزدہ ہوکر بھاگ نکلتے ہیں۔ اگر وہ خاموشی سے چلتا رہتا تو یقیناً کہیں نہ کہیں لقمۂ اجل بن گیا ہوتا۔ لیکن اپنی ذات اور تجربے پر اعتماد کے باعث اب وہ ہر طرح محفوظ تھا اور اس کا یہی تجربہ اس کے اندھے معتقدین کے لئے روحانی قوتوں کا کرشمہ قرار پاتا۔

میرے اور انند رام کے درمیان بمشکل پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ انند رام پوری قوت سے شور وغل مچاتا آگے بڑھا جارہا تھا۔ آخرکار ہم جنگل کے ایسے حصے میں جا پہنچے جہاں جانوروں کی آوازیں نہایت قریب سے سنائی دے رہی تھیں۔ اندھیرے میں ان کی بڑی بڑی متوحش نگاہیں چمکتیں پھر وہ خوفزدہ آوازیں نکالتے کسی طرف بھاگ جاتے، ایک مرتبہ کوئی طاقتور درندہ بھڑک کر میری داہنی طرف کی جھاڑی سے نکلا اور پوری قوت سے مجھ سے ٹکراتا آگے نکلتا چلا گیا۔ میں اچھل کر ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرایا۔ اس وقت میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ ضبط کی۔ جب میں اٹھا تو میرے تھیلے کا سامان منہ بندھا ہونے کے سبب محفوظ رہ گیا تھا، ورنہ اس آفتِ ناگہانی میں میری یہ ساری پونجی بکھر کر رہ جاتی۔

وہ گھنا جنگل شیطان کی آنت کی طرح وسیع تھا۔ پوری رات میں اسی خوف آور ماحول میں انند رام کا تعاقب کرتا رہا اور وہ خبیث بڈھا کسی نہ تھکنے والی بدروح کی طرح چیختا، گاتا، چمٹا بجاتا آگے بڑھتا رہا۔۔۔ ستیا وادی کے ویران غاروں کی طرف۔۔!

خدا خدا کرکے آسمان پر سپیدی کے کچھ آثار نمودار ہوئے۔ جنگلی جانوروں کا شور ماند پڑنے لگا اور میں نے انند رام سے فاصلہ کچھ زیادہ کرلیا۔

سورج طلوع ہونے کے بعد ہم جنگل کی حدود سے نکلنے لگے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ انند رام کا تعاقب کرنے والے کامیابی سے کیوں ہمکنار نہ ہوسکے۔ یہ تو میں سن چکا تھا کہ انند رام ہر برس نواکوٹ سے آگے کے سفر پر کسی اندھیری رات ہی میں نکلتا ہے۔ پھر بھلا اس خوفناک جنگل میں کس کا پتہ تھا جو خونخوار غراہٹوں کے سامنے اپنی چیخوں پر قابو پاسکے۔ اور یوں انند رام ہمیشہ پوری بے فکری سے اس جنگل کے پار جا نکلتا تھا اور اس کا پیچھا کرنے والے یا تو راستے سے ہی لوٹ جاتے یا جنگلی درندوں کا لقمہ بن کر رہ جاتے۔

دوپہر تک جنگل پیچھے رہ گیا۔ اب میرا کام بہت کٹھن تھا۔ سامنے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے بھرا ایک میدان پھیلا ہوا تھا جس کے پس منظر میں سربفلک چوٹیاں چمک رہی تھیں، اس میدان میں خود کو انند رام کی عقابی نظروں سے بچانا بہت مشکل کام تھا۔!

وہ بے تکان چلا جارہا تھا اور میں اس کے پیچھے تھا کہ اچانک وہ پیچھے پلٹ پڑا۔ میں جس حالت میں تھا اسی طرح کھڑا رہ گیا۔

"صفدر۔۔" تپتے ہوئے ویرانے میں اس خبیث کی آواز گونجی۔ "آخر تو میرے پیچھے یہاں تک آ ہی پہنچا ہے۔!" اس کے بشرے سے ظاہر تھا کہ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان چکا ہے۔!

"رشی جی۔۔!" میں نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے سوانگ ہی مناسب سمجھا۔ "میں نے کیمیا کی خاطر اپنا گھر بار اجاڑا ہے، سکھ چین لٹایا ہے۔ مگر تمہاری مدد کے بغیر یہ سب بیکار ہے۔!"

"اپنا گھر بار اجاڑا ہے یا دوسروں کا۔" وہ پھنکارا "جب جاپ میرے پاس تھا اور تو میری ہمدردی جیتنے میرے پاس آیا تھا اسی وقت میں نے جان لیا تھا کہ تجھ سے بڑا موذی روئے زمین پر پیدا نہ ہوا ہوگا۔ تو نے ان گل رنگ وادیوں میں انسانی لہو کا بیوپار کیا۔ اپنے محسنوں پر دار بلڈ کو ٹھکانے لگایا اور اب میرے سامنے مسکین بن رہا ہے۔"

"میں راستے کی ہر رکاوٹ کو گراتا تمہارے پیچھے آیا ہوں رشی جی۔ مجھے مایوس نہ کرو۔!" میں نے اپنے لہجے میں لوچ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میں چہروں سے دل کا حال جان لیتا ہوں مورکھ!" وہ چند قدم آگے بڑھ کر غرایا "میں جانتا ہوں کہ جب مجھ سے تیرا کام نکل جائے گا تو میں بھی تیرے وار سے نہ بچ سکوں گا۔"

"اگر تم یہ کہتے ہو تو تمہارا علم جھوٹا ہے!" مجھے اس الزام پر طیش آگیا تھا۔

"خاموش!" انند رام چمٹا لہرا کر چیخا۔ "لوٹ جا اسی جگہ سے ورنہ برباد کردوں گا۔!"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ معاً میرے ذہن پر سرور کی ہلکی سی دھند چھانے لگی۔۔۔ پوری کائنات انند رام کی دہکتی آنکھوں میں سمٹتی جارہی تھی۔۔۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر مجھے گھور رہا تھا اور مجھ پر غنودگی طاری ہورہی تھی۔

معاً مجھے خیال آیا کہ انند رام تنویم کا ماہرِ اعظم ہے۔ اس سے نگاہیں چار کرنے والے اس کے سامنے کسی حقیر چوہے کی طرح بے بس ہوجاتے ہیں۔ وہ مجھے باتوں میں لگا کر تنویمی کیفیت میں لانا چاہتا ہے اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو میں کیمیا، بھاندر ناس، اناپورنا کی وادیوں اور خود اپنے وجود کو بھی بھول جاؤں گا، انند رام مجھے سوتا چھوڑ کر کہیں روپوش ہوجائے گا اور جب میرے حواس بحال ہوں گے تو مجھے صرف وہی یاد ہوگا جو انند رام چاہے گا۔

اس وقت تک میرے حواس قدرے مفلوج ضرور ہوئے تھے مگر قوتِ ارادی بیدار تھی۔ میں نے قوتِ ارادی سے کام لے کر نظریں جھکالیں اور چند ہی ثانیوں میں ذہن سے ساری دھند صاف ہوگئی۔!

اسی وقت انند رام نے اپنا وزنی آہنی چمٹا کسی نیزے کی طرح میرے سینے پر اچھالا لیکن میں اس کی آہنی مالاؤں کی جھنکار سن کر قبل از وقت سنبھل چکا تھا، چمٹے کے پھل زمین میں دھنستے چلے گئے اور میں نے پھرتی کے ساتھ اپنے تھیلے کا منہ کھول کر پستول نکال لیا۔

"انند رام۔۔ اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔" میں نے اس پر پستول سیدھا کرلیا مگر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریز کرتا رہا۔

"مرد ہے تو نظریں چار کرکے بات کر۔۔۔ پھر دیکھتا ہوں کہ کیا ہوگا۔" وہ میری مکاری بھانپ کر تیز لہجے میں بولا۔

"اب شعبدے نہیں طاقت کام کرے گی دیسی پوپ!" میں تلخ لہجے میں بولا "منشیات کا عادی بنا کر بتوں پر حکم چلانا دوسری بات ہے۔ یہ حربہ صفدر علی پر کام نہیں کرے گا۔!"

"ان پہاڑوں میں کیا نہیں ہے!" انند رام غیر متوقع طور پر پرسکون ہوگیا۔ "اناپورنا کی وادیوں میں بھاندر ناس ہے جس کا تاؤ دیئے بغیر کیمیا کا نکھار نہیں آتا، دھول گری کی برفانی جھیلوں کے کنارے پارس پتھر ہے جس کا لمس لوہے کو کندن بنادیتا ہے، جا اور یہ سب ڈھونڈ لا۔ انند رام نے آج تک طاقت کی غلامی نہیں کی، وہ تجھ جیسے چھوکرے سے کیا دبے گا۔"

"میں تجھے مفلوج کرکے یہاں سسکنے کو پھینک دوں گا، تو موت کو ترسے گا مگر موت تجھ سے دور بھاگے گی۔۔۔ اس بار تیرا ٹکراؤ مجھ سے ہے انند رام مجھ سے!"

انند رام نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تو مجھے مار بھی نہیں سکتا صفدر۔۔۔ تجھے بھاندر ناس کا سراغ چاہیئے اور تجھے دنیا میں کوئی نہ ملے گا جو قسم کھا کر کہے کہ اس نے بھاندر ناس دیکھی ہے، نتوں کے حساب سے دیکھی ہے۔!"

"میں جانتا ہوں کہ تیری منزل وہی وادیاں ہیں۔۔ تو لوگوں کو ستیا وادی کے ویران غاروں کا فریب دیتا رہا ہے۔۔ اگر تو یوں مجھے نہ دیکھ لیتا تو میں تیری منزل تک جا پہنچتا اور خود ہی بھاندر ناس تلاش کرلیتا۔"

"خود ہی تلاش کرلیتا۔۔!" اس نے استہزائیہ انداز میں دہرایا۔ "بھاندر ناس جس سرزمین پر اگتی ہے وہاں آدمخور برفانی قبیلے حکمران ہیں اور اگر اس جڑی بوٹی پر کسی اجنبی کا سایہ بھی پڑجائے تو اسے فلک بوس الاؤ میں ڈال دیا جاتا ہے، وہ بوٹی اُن کے نزدیک اتنی مقدس ہے کہ وہ ایسے اجنبی کا گوشت کھانا بھی حرام سمجھتے ہیں۔"

"میں ہر قیمت پر وہ بوٹی حاصل کرکے رہوں گا!"

"میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہوں، تیرا دعویٰ ہے کہ وہاں پہنچ کر تو خود بھاندر ناس تلاش کرے گا تو چل یوں ہی سہی، مجھے اعتراض نہیں!"

"یہ مرد کا عہد ہے؟"

"انند رام جھوٹ نہیں بولتا۔۔۔ اور تو نے میرے ساتھ چالبازی کی تو یاد رکھ کہ تو ان ہی وادیوں میں سر پھوڑ کر مر جائے گا۔"

میرے پستول کی نال نیچے جھک گئی۔ "تیری اس وعدے پر رضامندی ہی مجھے کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔"

"میں صاف کہتا ہوں کہ میں ہمت کا قدردان ہوں۔ تو یہاں تک پہنچا تو میں تجھے ستیا وادی بھی لئے چلتا ہوں، لیکن یہ پھر بتادوں کہ تو بھاندر ناس خود کبھی نہ پاسکے گا۔"

"یہ میرا مقدر ہوگا۔۔۔ اگر میری موت اناپورنا کی وادیوں میں ہی لکھی ہے تو آکر رہے گی۔"

اور یوں جبار شی انند رام سے میرا معاہدہ ہوگیا۔ اُس نے شروع ہی میں مجھے خبردار کردیا کہ ستیا وادی کا سفر طویل اور صعوبتوں سے پُر ہے، پہاڑوں کے سینے میں پینے کو ٹھنڈا پانی تو مل سکے گا لیکن کھانے کے لئے کچھ میسر نہ ہوگا لہٰذا میں خوراک کی طرف سے بہت زیادہ محتاط ہوگیا۔ انند رام کے پاس اس سفر کے لئے زادِ راہ کے طور پر کچھ بھی نہ تھا۔ اس بارے میں میں نے اس سے پوچھا تو وہ ہنس دیا اور مجھے بتایا کہ وہ بغیر کھائے پئے اکیس روز تک چاق و چوبند رہ سکتا ہے۔!

گیارہ دن تک یہ سفر جاری رہا۔ دشوار گزار اور جان لیوا پہاڑی ڈھلانیں، گھنے جنگلات، بظاہر ٹھوس نظر آنے والے دلدلی قطعات ہماری راہ میں حائل ہوئے مگر انند رام کی رفتار یکساں رہی۔۔۔ میں نے اُسے کھاتے دیکھا نہ پیتے۔۔ اس کی جسمانی حالت بھی جوں کی توں تھی اور وہ دن رات سفر جاری رکھنے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن پہلی دو راتیں گزرنے پر میری حالت سخت ابتر ہونے لگی۔ پیروں پر ورم آگیا۔۔۔ اعصابی قوت بری طرح۔۔۔ اضمحلال کا شکار ہوگئی، آنکھوں میں بے خوابی کے باعث سوزش اور ورم کی شکایات پیدا ہوگئیں۔۔۔ شدید خواہش کے باوجود میں سونے کی ہمت نہ کرسکا۔ ہر آن مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں انند رام سوتے میں میرا کام تمام نہ کردے یا مجھے چھوڑ کر فرار نہ ہوجائے۔ ہاں ہر دو چار گھنٹے بعد میرے ہی ایماء پر وہ کہیں رک جاتا۔ ہم بیٹھ کر ذرا آرام کرتے، پھر آگے چل دیتے۔!

جب تیسری رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے لئے ایک قدم بڑھانا بھی دشوار ہونے لگا، میں نے بے بسی کے ساتھ انندرام سے منزل کا پتہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ گھاٹیاں اترنے چڑھنے کی وجہ سے ابھی طویل سفر باقی ہے۔

"انندرام! تم عہد شکنی تو نہیں کروگے!" کچھ دُور چلنے کے بعد میں نے لرزتی آواز میں اس سے پوچھا۔

"میں تجھے ستیاوادی تک پہنچانے کا پابند ہوں۔!"

"میں یہ رات سوکر بسر کرنی چاہتا ہوں۔!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

اس نے میرے پہلو میں آکر میری پشت تھپکی اور بولا "تیری حالت میں کل ہی سے خراب دیکھ رہا ہوں۔ خود سونے کا مشورہ دیتا تو تو مجھے بدنیت سمجھتا۔۔۔ آرام سے سوجا، صبح تو مجھے اپنے قریب ہی پائے گا۔"

میں اسی جگہ زمین پر دراز ہوگیا۔ انندرام تھوڑی دور ایک چٹان سے اپنی پشت ٹکا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔۔۔ موت اور ناکامی کے خوف سے کئی گھنٹے میں سو نہ سکا۔ انندرام کو آزمانے کے لئے بظاہر زور زور سے خراٹے لیتا رہا، لیکن ادھ کھلی نظریں اسی پر جمی رہیں مگر وہ تو ایک بے حس و حرکت اکڑوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اسی حالت میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہو۔۔۔ پھر آخرکار میری آنکھ لگ گئی۔!

اگلی صبح میں بیدار ہوا تو انندرام میرے قریب ہی موجود تھا!

"تم واقعی عظیم ہو انندرام!" میں نے پہلی بار اس خبیث کے لئے اپنے دل میں جذبۂ تشکر جاگتا محسوس کیا۔

"ہم سنسار کو تیاگ کر بن باس لینے والے لوگ ہیں صفدر۔۔۔ ہم پاپ میں پڑجائیں تو سارے جہان کی بدی ہم پر ختم ہے اور پن کمانے پر آئیں تو کوئی سامنا نہیں کرسکتا، جس دن ہماری زبان پر جھوٹ آیا۔۔ ہماری ساری تپسیائیں برباد ہوجائیں گی، زندگی بھر کا ریاض بیکار ہوجائے گا۔"

"جب تمہارا دل اتنا صاف ہے تو مجھ پر رحم کیوں نہیں کھاتے رشی؟"

"بھاندرناس تک پہنچا دوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"نہیں۔۔!" اس کا لہجہ اٹل تھا۔ "یہی میرا عہد ہے میں کسی کو خود سے بھاندرناس تک نہ لے جاؤں گا۔۔۔ ستیاوادی کے لئے بھی میں یوں تیار ہوا کہ تجھ میں بلا کی لگن ہے ورنہ میں نے اپنی ذات پر ایسا ٹھوس اور قابلِ نفرت خول منڈھا ہوا ہے کہ اس میں سے گزر کر کوئی میرے دل کے قریب نہیں آسکتا۔"

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ انندرام بھی دکھی ہے... وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے ایک قابلِ نفرت سانچے میں ڈھال دیا ہے ورنہ دراصل وہ اتنا بُرا نہیں ہے۔!"

دن میں سفر اور رات میں قیام کرتے ہم گیارہویں دن ایک عظیم الشان مگر پُرہول پہاڑی گھاٹی میں داخل ہوئے جس کی تمام چٹانیں گہری سُرمئی یا سیاہ تھیں۔۔۔ انندرام نے بتایا کہ میلوں طویل یہ وادی ہی ستیاوادی کہلاتی ہے جس کے مہیب غاروں میں صدیوں قبل دیوی دیوتاؤں کے مسکن تھے، پھر جب اس سرزمین پر ہندو دیومالا کی سب سے بڑی جنگ لڑی گئی تو ستیاوادی کے مکینوں پر آسمان سے قہر کی تیز بجلیاں برسائی گئیں جن سے جل کر وادی کا ایک ایک پتھر سیاہ ہوگیا۔!

"مگر تم سینکڑوں میل کا سفر طے کرکے، صعوبتیں جھیلتے یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے پہلی بار اس سے براہِ راست سوال کرلیا۔

"یہ پوچھ کہ میں یہاں سے جاتا کیوں ہوں!" انندرام کے لہجے میں عجیب سی تڑپ تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی رشی جی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بات یہی ہے صفدر۔۔۔ اس وادی میں برسوں سے میری اکلوتی بیٹی رہتی ہے!" انندرام کی آواز یک بیک بھرّا گئی۔

میں نے حیرت سے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پتھر جیسا کٹھور دل رکھنے والا شخص کچھ کمزور پہلو بھی رکھتا تھا۔۔۔ پھر اس کی زبان سے اس کی بیٹی کا ذکر تو کسی بم کی طرح میری سماعت پر گرا۔

"تمہاری بیٹی۔۔؟" میں نے ہکلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں میری بیٹی۔۔۔!" یک بیک اس کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ غصے سے کانپتی آواز میں بولا۔ "میں نے بنارس کے بدمعاش پنڈتوں سے بچا کر اسے یہاں پالا پوسا ہے اور تمہیں ستیاوادی پہنچانے کے بعد اب میں آزاد ہوں۔ اگر تم نے میری بیٹی کے ساتھ کوئی بھی غلط حرکت کی تو میں تمہارا نرخرا چیر ڈالوں گا۔"

میں نے اس کی بات تو سُن لی، لیکن مفہوم نہ سمجھ سکا۔ اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے میں نے مزید استفسار بھی نہ کیا اور اس کے ساتھ سیاہ چٹانوں سے گھاٹی میں اترتا رہا۔!

گھاٹی کی تہہ میں کھڑی ڈھلانوں پر انسانی ہاتھوں سے دیوی دیوتاؤں کی دیوہیکل مورتیں مہارت کے ساتھ ابھاری گئی تھیں اور تقریباً سب ہی ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی تھیں۔ مورتوں کے نقوش استدادِ زمانہ سے خاصے بگڑ چکے تھے اور اپنی صدیوں پرانی تاریخ سُنا رہے تھے۔ ان ہی چٹانوں کے درمیان غاروں کے بہت اونچے اونچے اور ایسے کشادہ دہانے تھے کہ ان میں سے ہاتھی بھی بآسانی گزر سکتے تھے!

انندرام سر جھکائے آگے بڑھتا رہا۔ گھاٹی کے وسط میں چند فٹ چوڑے نالے کی صورت میں بہتا ہوا تیز پانی میری توجہ کا مرکز تھا میں اس آبی لکیر پر نظریں جمائے انندرام کے پیچھے چل رہا تھا!

ایک غار کے سامنے انندرام چند ثانیوں کے لئے رکا۔ پھر اندر گھستا چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔۔۔ اندر کی دیواریں بھی بالکل سیاہ تھیں۔!

غار اندر سے بہت کشادہ اور گہرا تھا۔ ایک طرف پتھروں کے چبوترے پر پیال بچھا کر بستر بنایا گیا تھا۔ اس کے قریب ہی مٹی کے بھونڈے برتن موجود تھے جو شاید اسی جگہ بنائے گئے تھے!

"بیٹھ جاؤ صفدر!" انندرام کی بھرّائی ہوئی آواز غار میں گونجی۔ "دیکھو یہاں انندرام کی بیٹی کا گھر ہے۔۔۔ جو اس وادی سے باہر بدی کا ہرکارہ مشہور ہے!"

"رشی جی۔۔۔ یہاں آکر تو میں سب کچھ بھول گیا ہوں!" میں پیال والے چبوترے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری بیٹی کہاں ہے۔۔۔ وہ یہاں کیوں رہتی ہے۔۔؟"

"سنو گے؟" اس نے دُکھ بھری آواز میں سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔ شاید اسی طرح میں تمہاری شخصیت کا راز پالوں۔۔!"

"میں بنارس کا رہنے والا ہوں۔۔۔" وہ کرب آلود لہجے میں بولا۔۔۔ "مندروں کا شہر بنارس!۔۔۔ میری بیوی دو لڑکیاں چھوڑ کر مری تھی۔ چھوٹی کو کوئی درندہ صفت آدمی چھ برس ہی کی عمر میں اٹھالے گیا۔ دوسری میرے پاس رہ گئی مجھے اس سے والہانہ محبت تھی اور میں نے اپنی زندگی اسی کے لئے وقف کی ہوئی تھی اور رکشہ کھینچ کر میں اس کا ہر ارمان پورا کیا کرتا تھا۔ شروع ہی سے میں بہت مذہبی آدمی تھا اور میری لڑکی پوجا پاٹ کے لئے اکثر مندر جایا کرتی تھی وہاں ایک بدمعاش پجاری نے اُسے بھنگ اور چرس پلانی شروع کردی، پھر ایک روز میری بچی روتی لڑکھڑاتی رات گئے گھر آئی۔ اس وقت اس کی عمر بارہ برس بھی نہیں ہوئی تھی مگر مندر کے پجاری نے اس پر ظلم ڈھایا اور تین آدمیوں نے اسے بھنگ پلا کر اپنے دلوں کی سیاہی اُس کی روشن پیشانی پر مل دی۔۔۔ میں غم و غصے میں پاگل ہوگیا۔۔۔ میں نے اُسی رات مندر کی دیوار پھاند کر وہاں سوئے ہوئے پانچ پنڈتوں اور پجاریوں کا خون کیا اور اپنی بچی کو چھاتی سے لگا کر شہر سے نکل گیا۔۔۔ اس وقت میرے جنون کا یہ عالم تھا کہ میں نے سات شہروں میں تیرہ پجاریوں کا خون کیا۔ پولیس میرا پیچھا کررہی تھی اور میں بھاگ رہا تھا۔۔۔ شہروں اور ویرانوں سے بھاگتے بھاگتے آخر میں یہاں آپہنچا۔۔۔ یہاں ہم دونوں بالکل محفوظ تھے۔ کئی مہینے میں یہاں ٹھہرا رہا۔ لیکن میرے سینے میں دہکتا جوالا مکھی مجھے دوبارہ شہروں کا رُخ کرنے پر اکسا رہا تھا۔" اس کی آواز میں ماضی کا غیظ و غضب کوندنے لگا تھا۔ "اور آخر میں اسے یہاں چھوڑ کر پھر شہروں میں جا پہنچا۔ وہاں میں نے اس بار رشی کا روپ دھارا۔ شاگردی کرکے کچھ علم حاصل کئے اور پھر میں اپنا انتقام لینے نکل پڑا۔۔۔ میں نے نگر نگر بدی اور بدکاری کے دیپ روشن کئے مگر میرے انتقام کی آگ کبھی سرد نہ ہوئی۔ میں نے دیسی عورتوں کو کبھی راہ سے نہ بھٹکایا۔ کیونکہ میری ایک بچی مجھ سے بچھڑی ہوئی تھی۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں میرے انتقام کی آگ اس کے دامن کو بھی نہ خاک کردے۔ میں جہاں پہنچا میں نے بدیسی لڑکیوں کے ذریعہ گناہ عام کیا، انھیں بھنگ، چرس اور حشیش پلا پلا کر میں اپنی بیٹی کا انتقام لیتا رہا اور وہ اس وادی میں پروان چڑھتی رہی۔۔۔ میں جہاں بھی رہا، ہر برس ایک پُراسرار سفر کا سوانگ رچا کر اس سے ملنے یہاں آتا رہا.... یہ کہانی تیس برس سے یوں ہی چل رہی ہے مگر میرے سینے کی آگ آج تک ٹھنڈی نہیں پڑسکی۔ جس دن میرا دل ٹھنڈا ہوگیا میں خود بھی یہیں ستیاوادی میں اپنی بیٹی کے پاس رہ جاؤں گا۔"

انندرام کی یہ کہانی اس قدر غیر متوقع اور سنسنی خیز تھی کہ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"وہ ان پہاڑوں کی ملکہ ہے!" انندرام جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "وہ خود ہی یہاں پلی بڑھی ہے۔ اس میں بلا کا اعتماد ہے۔۔۔ وہ باہر کی دُنیا کو بھول چکی ہے۔ کیونکہ میں اس قابلِ نفرت دنیا سے کبھی اس کے لئے کوئی چیز نہیں لاتا...... یہ ناقابلِ گزر پہاڑ اس کی آبرو کے امین ہیں۔!"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"وہ جہاں بھی ہو، مجھے اس پر اعتماد ہے۔" انندرام کے لہجے میں پیار کی ٹھنڈک رچی ہوئی تھی۔

میں نے مزید چھ دن وہاں بسر کیے۔ طویل سفر کے باعث میری حالت بہت ابتر تھی، لہٰذا میں دن میں ایک دوبار گھاٹی کی تہہ میں بہنے والے سرد پانی سے غسل کرتا اور گہری نیند سوجاتا۔ انندرام قرب و جوار کے جنگلات سے پھل توڑ لاتا تھا۔ اس نے بھی میری دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کا شفیقانہ رویہ دیکھ کر اکثر مجھے اپنے سابقہ رویہ پر افسوس ہونے لگتا تھا۔!

جب میں بیدار ہوتا تو انندرام محبت میں ڈوب کر مجھے اپنی بیٹی کے قصے سُناتا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنی بیٹی کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ میں نے ایکبار اس سے پوچھا کہ اس کی بیٹی کب تک وہاں آئے گی تو اس نے بتایا کہ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے، جب چاہے آجائے گی۔

"اور تم اس کا انتظار کروگے؟"

"سچ پوچھو تو مجھے تمہارے جانے کا انتظار ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"وہ کیوں۔؟"

"تم جاؤ تو میں طویل مدت لوں گا۔ اسے تم حبسِ دم بھی کہہ سکتے ہو۔ میں اپنا سانس نالی کے ذریعہ دماغ میں مقید کر دوں گا۔ اس وقت میں جس حال میں ہوں گا تین مہینے تک کسی مردے کی طرح اسی حالت میں رہوں گا۔ میری بیٹی آ کر مجھے دیکھے گی تو میرے جاگنے کا انتظار کرے گی۔ روز میرے بدن سے گرد جھاڑ کر گیلے کپڑے سے مالش کرے گی اور جب میں اٹھوں گا تو میرے بدن میں نئی طاقت اور نئی زندگی ہو گی۔!"

"تم حبسِ دم کیسے کر لیتے ہو؟"

"یہ مدتوں کا ریاض ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ذرا بھی غلطی ہو جائے تو دماغ کی تمام شریانیں پھٹ جاتی ہیں۔ اور موت واقع ہو جاتی ہے!"

"تمہاری باتیں سن سن کر مجھے تمہاری بیٹی سے ملنے کی آرزو ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، اگر زندگی رہی اور راستہ مل سکا تو واپسی میں ادھر ضرور آؤں گا۔"

اگلی صبح آنند رام نے بڑے تپاک سے مجھے رخصت کیا۔ چلتے چلتے میں نے اس سے ایک بار پھر بھاندرناس کا سراغ دریافت کرنا چاہا لیکن اس نے زبان کھولنے سے انکار کر دیا۔

ستیا وادی سے میں اسی روز نکل گیا۔ مگر پھر پندرہ روز تک بے مقصد پہاڑوں میں ٹکریں مارتا رہا۔ آنند رام مجھے اناپورنا کی سمت بتا چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں اس سمت میں اپنا سفر جاری رکھ سکوں گا لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ یکساں پہاڑوں اور گھاٹیوں میں سمت کا تعین اس قدر آسان نہ تھا۔ سینکڑوں پُرپیچ راستوں سے گزر کر جب میں نئی جگہ پہنچتا تو سمت کا ہر شعور جواب دے جاتا۔!

تیسرے روز مجھے ایک سرسبز ڈھلان پر چند پہاڑی خچر چرتے ہوئے نظر آئے اور میں غیر ارادی طور پر ان کی طرف ہو لیا۔ قریب جانے پر میں نے ان میں سے ایک کے گلے میں بٹی ہوئی رسی پڑی دیکھی تو قرب و جوار میں کسی آبادی کی امید پر دل دھڑک اٹھا۔

ان خچروں کے مالک کے انتظار میں میں ایک چٹان کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پر جا بیٹھا۔ تھیلے میں سگرٹوں کا کچھ ذخیرہ ابھی تک موجود تھا، لہٰذا میں نے ایک سگریٹ سلگا لی۔

اچانک میری پشت پر واقع ڈھلان سے ایک پتھر لڑھک کر چٹان کے اس ٹکڑے پر گرا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پتھر گرنے کی آواز یوں تھی جیسے وہ چٹان پر نہیں بلکہ کسی سخت لکڑی پر گرا ہو۔!

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ چٹان نما چیز ہی میرا گوہرِ مقصود ہے۔ میں نے ایک اور پتھر سے اسے بجا کر دیکھا تو وہ لکڑی ہی نکلی بلکہ اس کے اوپری پرت پر ریشوں کے نشانات بھی نظر آ گئے اور میرا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔

بھاندرناس۔۔۔ جس کی تلاش میں میں نہ جانے کن کن حالات سے دوچار ہوا تھا، یوں غیر متوقع طور پر مل گئی تھی کہ میں اس پر بیٹھا ہوا تھا اور اسے چٹان سمجھ رہا تھا۔!

میں نے اس پہاڑی جڑ کا جائزہ لیا تو وہ بے حد سخت اور مضبوط تھی۔ اس وزنی ٹکڑے کو کسی تیز دھار کلہاڑی کے بغیر کاٹنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں ابھی اسی جائزے میں مصروف تھا کہ اچانک کسی جانب سے تیز شور سنائی دیا۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہونے کی وجہ سے سمت کا اندازہ نہ ہو سکا جب میں نے نظریں گھمائیں تو داہنی جانب والے پہاڑ کی چوٹی سے بے شمار تندرست و توانا قبائلی شور مچاتے نیچے آتے نظر آئے۔ ان کے جسموں کی رنگت زردی مائل سفید تھی اور جسموں پر پہاڑی جانوروں کی کھالیں نظر آ رہی تھیں۔

درندوں کے کسی بھڑکے ہوئے غول کی طرح وہ تیزی سے نیچے آئے۔ پھر بھاندرناس کے اس ٹکڑے کو بوسے دینے شروع کر دیئے۔ لگتا تھا مجھ پر پڑنے والی نظروں میں میرے لئے نفرت جھانک رہی تھی۔!

معاً مجھے آنند رام کے الفاظ یاد آئے۔۔۔ اس نے بتایا تھا کہ بھاندرناس آدم خور قبیلوں کی حدود میں پائی جاتی ہے جو اسے پوجتے ہیں اور اگر اس نایاب لکڑی پر کسی اجنبی کا سایہ بھی پڑ جائے تو اس اجنبی کو زندہ جلا دیا جاتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنے تھیلے میں سے بڑے جتن سے چھپایا ہوا پستول نکالا اور سوچے سمجھے بغیر ایک ہوائی فائر کر دیا۔

پہاڑوں سے گھرے اس خطے میں دھماکے کی آواز اتنی مہیب اور طویل تھی کہ میں بھی چونک پڑا۔ دھماکے کی بازگشت دور تک یوں گونجتی چلی گئی جیسے کوئی پلاٹون وقفہ وقفہ سے فائر کر رہی ہو۔ بھاندرناس کے پجاریوں پر اس فائر کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا۔۔۔ وہ چیختے چلاتے اور گرتے پڑتے بندروں کی سی پھرتی کے ساتھ ڈھلان پر جا چڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔!

وقتی طور پر تو میں نے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ان کی یہ روپوشی عارضی ہے۔۔۔ بھاندرناس کا علاقہ دریافت ہو چکا تھا لہٰذا اب سب سے پہلا مسئلہ اپنی سلامتی کا تھا۔ میں اپنا تھیلا سنبھال کر تیزی کے ساتھ ایک ڈھلان پر چڑھنے لگا۔

میں ابھی وہ نصف ڈھلان بھی طے نہ کر پایا تھا کہ اوپر بے شمار قبائلی چہرے نظر آئے اور میرے سنبھلنے سے قبل ہی انہوں نے مجھ پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ میں گرتا پڑتا بمشکل تمام نیچے تک آ سکا۔ پھر بھی کمر پر پڑنے والے دو تین پتھروں نے طبیعت صاف کر دی!

نیچے پہنچنے کے بعد اب جو میں نے سر اٹھایا تو چاروں طرف اونچی جگہوں پر بے شمار قبائلی موجود تھے اور شور و غل سے پوری وادی سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ ابھی ان سب کو بیک وقت پتھراؤ کا خیال نہیں آیا تھا ورنہ میں بُری طرح سنگسار ہو کر رہ جاتا۔

میں نے پستول کا اثر دیکھنے کے لئے اس کی سیاہ نال ایک پہاڑی کی طرف اٹھائی اور قبائلیوں کی پوری دیوار تیزی سے پیچھے سرکتی چلی گئی۔ یہی بہت غنیمت تھا ورنہ دونوں پستولوں میں کل چار یا پانچ گولیاں زیادہ دیر تک میرا دفاع نہیں کر سکتی تھیں!

میں نے تھیلے سے دوسرا پستول بھی نکال لیا اور دونوں نالوں سے قبائلیوں کو خوفزدہ کرتے ہوئے اپنے لئے کوئی راہ تلاش کرنے لگا۔!

ایک پہاڑی کا انتخاب کرنے کے بعد میں دوڑتا ہوا اس طرف ہو لیا۔ قبائلی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتے رہے اور میں پیش قدمی کرتا رہا۔ پھر اچانک انہیں ہوش آیا کہ کوئی دھماکہ یا نقصان ہوئے بغیر وہ پسپا ہوئے جا رہے ہیں تو وہ اپنی جگہ ڈٹ گئے۔!

میں نے دو تین مرتبہ پستول لہرائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، آخر میں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر اس بار ان کے غول پر براہِ راست ایک فائر کر دیا۔!

ہجوم میں سے بے شمار دہشت زدہ چیخیں بلند ہوئیں۔ ایک شخص تڑپ کر نیچے گرا اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ بھاگنے والوں نے درندوں کی طرح زخمی کے بدن کو جیب بھاڑ ڈالا اور جس کے ہاتھ جو بھی ٹکڑا آیا وہ لے بھاگا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جو وحشی اپنے ساتھیوں کے حق میں ایسے سفاک ہوں وہ بھلا کسی اجنبی کے ساتھ کیا کچھ نہ کر گزریں گے!

ڈھلان چڑھنے کے بعد میرے سامنے ایک مسطح میدان پھیلا ہوا تھا۔ آس پاس کی چوٹیوں پر موجود سارے قبائلی بگٹٹ ایک ہی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ لہٰذا انہیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر میں بھی ان کے تعاقب میں ہو لیا۔ اس طرح میں کم از کم ان کی آبادی ضرور دیکھ سکتا تھا!

وہ لوگ بھاگنے میں اس قدر برق رفتار تھے کہ آناً فاناً مجھ سے بہت دور نکل گئے مگر میں نے بھی ہمت نہ ہاری۔!

اس بھاگ دوڑ کا اختتام پتھر سے بنے ہوئے بے شمار مکانات پر مشتمل ایک آبادی پر ہوا۔ میں آبادی سے چالیس پچاس گز دور ہی رک گیا۔ وہ لوگ مکانوں کی آڑ میں چھپے بُری طرح چیخ رہے تھے۔۔۔ اُن کے لئے پستول جیسا ہلاک ہتھیار نیا تجربہ تھا اور وہ اس کی مار سے حد درجہ خائف نظر آتے تھے۔

میں نے دونوں چیمبر دیکھے۔۔۔ ایک پستول بالکل خالی تھا۔ دوسرے میں صرف تین گولیاں رہ گئی تھیں۔۔۔ اس وقت شدت سے مجھے احساس ہوا کہ بڈھے کے جسم میں پانچ گولیاں اتار کر زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی تھی۔ اگر اس وقت میں نے چار گولیاں بچالی ہوتیں تو یہاں وہ میرے لئے بہت زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔!

میرے پاس اسلحہ کم اور دشمن کی نفری غیر محدود تھی۔ ایسی صورتحال میں طویل مقابلہ میرے لئے سراسر نقصان دہ ہوتا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اس قدر خوفزدہ کر دوں کہ سنبھلنا مشکل ہو جائے۔۔۔ مجھے اتنا تو یقین تھا کہ ان تین گولیوں کے سہارے میں بآسانی ان کی بستی میں گھس سکتا ہوں۔ اگر وہاں سے مجھے ان کا کچھ دقیانوسی اسلحہ ہی مل جاتا تو میں کوئی صورت نکال سکتا تھا!

میں نے بستی کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ مکانوں کی اوٹ سے پتھروں کا ایک بادل اُڑتا ہوا میری جانب آیا مگر میں بوکھلاہٹ میں پھینکے ہوئے ان پتھروں سے صاف بچ گیا۔ آگے کی طرف دوڑتے ہوئے جب میں نے ان کی ایک ٹکڑی کو آڑ سے نکل کر جگہ بدلتے دیکھا تو بے دریغ ایک اور فائر کر دیا۔ بے شمار چیخوں میں ایک چیخ سب پر حاوی تھی۔!

اور جب میں پہلے مکان کے قریب سے گزرا تو مجھے ایک لمحے کے لئے خوف سا محسوس ہوا کہ کہیں کوئی قبائلی مجھے زیر کرنے کے لئے آڑ میں دبکا بیٹھا ہو مگر اگلے ہی لمحے میں یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔۔۔ وہ اس قدر کم عقل اور خوفزدہ تھے کہ سیدھی اور دو بدو جنگ کے سوا کسی حربے سے واقف نہ تھے۔!

آبادی کا وہ حصہ، جہاں میں گھسا تھا ویران پڑا ہوا تھا، سارے قبائلی آبادی کے آخری سرے پر جا کر رکے تھے۔!

میں نے بستی میں ایک لحظہ کے لئے رک کر مکانات کا جائزہ لیا پھر ایک سب سے اونچے مکان میں جا گھسا۔ مکان کیا، وہ بس ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں چند تھوڑی سی چیزیں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ ایک دیوار پر ایک چوبی دستے والی برہنہ شمشیر چمک رہی تھی۔۔۔ میں نے آگے بڑھ کر دیوار سے وہ بدوضع تلوار اتاری اور چند ہی سیکنڈ بعد دوبارہ آبادی کے وسط میں نکل آیا۔

آبادی کے دوسرے سرے پر موجود ہجوم کی نظروں کے سامنے آنے کے بعد میں نے ایک ہاتھ سے پستول اور دوسرے سے تلوار بلند کی تو وہ سب چیخنے کے بجائے کچھ کہتے ہوئے زمین پر سجدے میں گر گئے۔!

اُن

آدم خور ہمالیائی قبائلیوں کا یہ ردِعمل میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ میرے داہنے ہاتھ میں بڈ سے چھینا ہوا اعشاریہ چار پانچ کا مہیب، سیاہ پستول تھا اور بائیں ہاتھ میں چوبی دستے والی بھونڈی مگر چمکیلی تلوار دبی ہوئی تھی اور وہ تمام آدمخور بستی سے باہر، آخری سرے پر سجدے میں پڑے ہوئے تھے!

چند ثانیوں کے لئے میری تمام ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں اور میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ان پسماندہ اور خونخوار جنگلیوں کی اس خوفزدگی سے کیونکر فائدہ اٹھاؤں۔

پہاڑی جانوروں کی ایال دار وزنی کھالوں سے ڈھکے ہوئے زردی مائل سفید جسموں کی قطار کی قطار سنگلاخ پہاڑوں پر سربسجود تھی۔ ساتھ ہی وہ خوفزدہ آوازوں میں کچھ ناقابلِ فہم کلمات بھی ادا کر رہے تھے۔ بھاندرناس کی سرزمین کے سفاک باسیوں کو اپنے سامنے یوں خاک بسر دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا لیکن میں اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ میری جرأت سے خائف ہوئے ہیں یا میرے ہاتھ میں برہنہ شمشیر دیکھ کر بوکھلائے ہیں۔ ایک بات بہرحال طے تھی کہ وہ میرے سامنے سپر ڈال چکے تھے اور اب ان کے آئندہ رویے کا تمام تر انحصار میرے برتاؤ پر تھا!

"تمہارا سردار کون ہے؟" میں نے پوری قوت سے چیخ کر سوال کیا۔

چند سجدہ ریز پیشانیاں مجبوری اور بےبسی کے عالم میں پتھریلی زمین سے اٹھیں اور ان پر جھکی آنکھیں امید کے ساتھ میری طرف نگراں ہو گئیں!

"اٹھو۔" یہ جاننے کے باوجود کہ میری زبان ان وحشیوں کے لئے اجنبی ہے میں تلوار لہرا کر پوری قوت سے چیخا۔

میری بات تو ان میں سے کسی کے پلے نہ پڑی مگر میرا اشارہ وہ بخوبی سمجھ گئے۔ سب سے پہلے آگے والے زمین سے اٹھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب سجدے سے اٹھ گئے۔ اس ہجوم میں اشتعال اور جارحیت کے بجائے اب سپردگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ سب مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ سینوں پر بندھے ہوئے تھے!

میں نے ایک بار پھر ریوالور کے چیمبر کا جائزہ لیا۔ وہاں دو گولیاں ابھی تک موجود تھیں۔ ہجوم کی حالت دیکھ کر مجھے ان کی طرف بڑھنے کا حوصلہ ہوا۔ انہیں آگے بلانا یوں مناسب نہ سمجھا کہ کہیں افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ان میں سے کچھ لوگ چھپ کر مجھ پر کوئی مہلک وار نہ کر ڈالیں۔

پہاڑی پتھروں سے بنے ہوئے بےہنگم اور نیچی چھتوں والے بےشمار مکانات کے درمیان سے گزر کر میں ان کی طرف ہو لیا!

اس ہجوم سے دس پندرہ گز دور میرے قدم خودبخود رک گئے۔ ابھی تک مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بس ان کے ساتھ آنکھ مچولی سی ہوتی رہی تھی مگر اب جو میں ان کے قریب پہنچا تو یک بیک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے!

گو اس وقت وہ خاموش اور سہمے سہمے سے کھڑے ہوئے تھے مگر ان کے چوڑے چکلے پہاڑی بستروں سے عجیب سی وحشت ٹپک رہی تھی۔ بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں سے خون کی سی پیاس ہویدا تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کمزور رسیوں سے بندھے ہوئے بدمست ہاتھیوں کے کسی غول کے روبرو جا پہنچا ہوں۔ اس وقت پہلی بار مجھے اپنی حماقت کا اندازہ ہوا۔ اگر وہ ذرا بھی چالاک ہوتے تو میرے قریب پہنچتے ہی ایکا ایکی مجھ پر دھاوا بول دیتے۔ کند دھار والی بھونڈی تلوار دو چار کو زخمی کرتی، ریوالور کی دو گولیاں اس انبوہ میں شاید دو آدمی کم کر دیتیں۔ مگر پھر وہ باآسانی میرے بدن کے ٹکڑے اڑا ڈالتے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ان آدم خور قبائلیوں کے تیز اور چمکیلے دانت اپنے بدن میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے اور میں بےاختیار ایک جھرجھری لے کر رہ گیا!

مہارشی انند رام کی سنائی ہوئی کہانیاں میرے شعور کے پردے پر ابھرنے لگیں جو اس وقت سیاہ پتھروں والی گہری وادی کے ایک غار میں حبسِ دم کئے کسی بےجان لوتھڑے کی طرح طویل نیند لے رہا تھا۔ اس پُراسرار دکھی انسان سے بچھڑ کر میں خلافِ امید بہت جلد بھاندرناس تک آ پہنچا تھا۔ یہ وہ بوٹی تھی جس کے تذکرے مجھے افسانے معلوم ہوتے تھے، جس کی تلاش میں نہ جانے کتنے کیمیاگر پہاڑوں اور جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر بےبسی اور گمنامی کی موت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ مگر میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ اس کا لمس محسوس کر چکا تھا۔ بھاندرناس کے پجاری جو اس پر کسی اجنبی کا سایہ تک برداشت نہ کرتے تھے اور جو باہر کی دنیا میں آدم خور برفانی قبائل گنے جاتے تھے، اس وقت میرے سامنے مسکین اور بےبس بنے کھڑے تھے!

میں ان چمکتی ہوئی، لہو کی پیاسی نگاہوں سے چند گز دور رک گیا۔ اس وقت بےیقینی اور سنسنی کے باعث میرا دل کھوپڑی میں دھمک رہا تھا اور دورانِ خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا، زبان خشک ہو کر منہ میں اینٹھی جا رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے میرے دہانے میں لعاب بنانے والے غدودوں نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

میں نے اپنے سامنے قدرے ڈھلان پر موجود آدم خور قبائلیوں کے ہجوم پر نظر دوڑائی اور یک بیک ایک نئی حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی۔ ڈیڑھ دو سو نفوس کے اس انبوہ میں سب تندرست اور جوان عمر کے مرد تھے۔ ان کے درمیان کوئی بھی عمر رسیدہ فرد موجود تھا نہ کوئی کم سن بچہ اور صنفِ نازک کا تو وہاں دور دور تک سایہ بھی نہیں تھا!

میرے لئے عورتوں کی غیر موجودگی سخت حیرت کا باعث تھی میں ان کی آبادی میں سے گزر کر ان تک پہنچا تھا مگر آبادی میں مجھے کسی ذی روح کا سراغ

نہیں ملا تھا۔ پھر آخر ان کی عورتیں کہاں تھیں۔ ایک ثانیہ کے لئے مجھے یہ بھی گمان ہوا کہ شاید یہ لوگ اپنی حیوانی جبلت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنے کمزور ساتھیوں کو ہلاک کر کے کھا گئے ہوں۔ ایسی صورت میں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا نہ پایا جانا قدرتی امر تھا مگر یہ خیال مجھے فوراً ہی ترک کر دینا پڑا۔ کیمیاگری کی متعلقہ کتابوں میں بھاندرناس کے پجاری قبائل کے تذکرے صدیوں پرانے تھے اور اگر یہ لوگ اسی طرح اپنی عورتوں کو کھا جانے کے عادی ہوتے تو صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بستی اور آبادی بھی نیست و نابود ہو چکی ہوتی۔ اس قبیلے کا صدیوں سے یوں ہی برقرار رہنا اس امر کا ثبوت تھا کہ ان میں افزائشِ نسل کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے!

میرے خیالات کا سلسلہ ایک کریہہ اور بلند آواز نے توڑ دیا۔ میں نے بھڑک کر اپنا ریوالور سیدھا کیا ہی تھا کہ میری نظر اس تندرست قبائلی پر پڑی جس کے شانوں پر ایک ریچھ کی کھال پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا سامنے کا حصہ بالکل کھلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ لوگ شرم و حیا اور ستر پوشی کی خاطر نہیں بلکہ صرف موسمی سختیوں سے تحفظ کے لئے جانوروں کی کھالیں استعمال کرنے کے عادی ہیں!

ریچھ کی کھال والا شخص اپنے باقی ساتھیوں سے چند قدم آگے بڑھ کر اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھائے شاید اپنی زبان میں زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔

"خاموش!" میں ہونٹوں پر ریوالور کی نال رکھ کر زور سے چیخا۔

وہ میری بات تو نہ سمجھا مگر نال کا اشارہ شاید اس کے لئے قابلِ فہم تھا کیونکہ وہ مشینی انداز میں اچانک خاموش ہو گیا اور حکم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا!

میں نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ ریوالور کی نال اس کے سینے کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر یوں زلزلے کے آثار ناچ رہے تھے جیسے چند ہی ثانیوں میں وہ کسی کند چھری سے ذبح کیا جانے والا ہو!

میں نے اشاروں کی مدد سے اس سے سردار کے بارے میں معلوم کرنا چاہا مگر کامیابی نہ ہو سکی وہ بونقوں کی طرح میرے سامنے کھڑا اپنے سر کو نفی کے انداز میں جنبش دیتا رہا۔

اس وقت فضا میں شام کا ہلکا ہلکا سا دھندلکا پھیل چلا تھا۔ چاروں طرف نظر آنے والی برفانی چوٹیوں پر پڑنے والی سورج کی ترچھی شعاعوں کا انعکاس عجیب سماں باندھ رہا تھا اور میں اس ہجوم کو سامنے پا کر اعصابی طور پر کافی خائف تھا!

میں نے اشاروں کی مدد سے بمشکل ان سب کو واپس بستی میں لوٹ جانے کا حکم دیا اور ریچھ کی کھال والے کو اپنے ساتھ روک لیا۔

وہ سب حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ قطار بند ہو گئے اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ میرے سامنے سے گزر کر بستی میں داخل ہونے لگے! ریچھ کی کھال والا قبائلی یوں روک لئے جانے پر خاصا خوفزدہ اور بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا مگر مجھے یہ یقین تھا کہ وہ میری ہدایت کے برعکس فرار ہونے کی کوشش نہ کرے گا کیونکہ بظاہر وہ لوگ ہر زبردست کے سامنے سر خم کر دینے کے عادی معلوم ہوتے تھے اور میں اپنے پستول کی بنا پر شاید خود کو ان سے برتر ثابت کر چکا تھا!

جب وہ سب بستی میں لوٹ گئے تو میں نے اسے ہمراہ لیا اور آبادی سے دور جانے لگا۔ پہاڑی ڈھلانوں اور چکر دار پگڈنڈیوں پر اترتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک ایسی نشیبی وادی میں جا پہنچے جہاں پہاڑوں کی چوٹیوں سے پگھلنے والی نقرئی برف جھاگ اڑاتے، یخ بستہ پانی کی صورت میں پہاڑی نالے میں بہہ رہی تھی!

میں نے بہت کوشش کی کہ اشاروں کی زبان میں اس قبائلی سے وہاں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں مگر وہ اس قدر کوڑھ مغز ثابت ہوا کہ میرے تمام اشاروں کے جواب میں بےوقوفوں کی طرح مسکراتا رہا ممکن ہے کہ وہ مجھے دیوانہ سمجھ رہا ہو!

ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے بےشرمی کا سہارا لیا اور حتی الامکان واضح علامتوں اور اشاروں کے ذریعے اس قبیلے کی عورتوں کے بارے میں دریافت کیا تو وہ یکایک مضطرب سا ہو گیا اور پُرجوش طور پر مغربی سمت میں ہاتھ اٹھا کر حلق سے بےمعنی آوازیں نکالنے لگا۔

میں جلد از جلد اس بستی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی چاہتا تھا اس لئے اسے فوراً اسی سمت میں رہنمائی کرنے کا اشارہ کیا۔ میری ہدایت پر شاید اسے کچھ مایوسی ہوئی مگر وہ پھر بھی نیم دلانہ انداز میں فوراً آگے چل پڑا۔

ہمالا کی وہ وادیاں جتنی حسین تھیں اسی قدر مہیب بھی۔ چکر دار اور تقریباً کھڑی ڈھلانوں پر وہ شخص کسی پیدائشی بندر کی سی پھرتی سے بڑھ رہا تھا جبکہ میری رفتار بہت سست تھی۔ وہ تھوڑی دور چلتا پھر رک کر میرے آجانے کا انتظار کرنے لگتا۔ تھوڑی ہی دیر میں میرا سانس پھول گیا۔ سینہ کسی لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور جی یہ چاہتا تھا کہ اس وزنی تلوار کو کسی گہری کھائی میں پھینک دوں لیکن میں اس اقدام کی ہمت نہ کر سکا۔ پستول کی دو گولیاں ختم ہونے کے بعد وہ تلوار ہی میرے کام آسکتی تھی۔

دھندلکا تیزی کے ساتھ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ شخص تو اب بھی سفر جاری رکھنے پر آمادہ تھا۔ مگر میرے لئے ان دیکھے راستوں پر تاریکی میں بڑھنا موت کی دہلیز پر دستک دینے کے مترادف تھا لہٰذا میں ایک مناسب مقام پر ایک غار کے قریب رک گیا۔

قبائلی کو میں نے غار کے دہانے میں جانے کی ہدایت کی اور خود سرد ہواؤں کے رُخ سے بچ کر ایک چٹان کی اوٹ میں اس طرح بیٹھ گیا کہ غار کا دہانہ

میری نظر میں رہے!

سیتا وادی میں انند رام سے جدا ہونے کے بعد میری گذشتہ دو راتیں کھلے آسمان تلے بسر ہوئی تھیں، مگر یہ رات بڑی کٹھن تھی۔ گو ان برفانی وادیوں میں ابھی سردی کا موسم شروع نہیں ہوا تھا لیکن میدانی علاقوں اور شہروں کے پُرتکلف ماحول میں رہنے والوں کے لئے برف پوش چوٹیوں سے ٹکرا کر آنے والی ہوائیں اس وقت بھی ناقابلِ برداشت تھیں۔

ٹھنڈ کا اثر سب سے پہلے میرے کانوں پر ہوا۔ میں نے اپنی قمیص کا کالر کھڑا کر کے اپنی گردن اس میں دبکانی چاہی مگر سرد ہواؤں سے نجات نہ مل سکی۔ سردی کی لہر آہستہ آہستہ میرے وجود میں سرایت کرتی جا رہی تھی، پھر اچانک مجھے ریچھ کی اس کھال کا خیال آیا جو میرے قیدی کے بدن پر موجود تھی میں نے غار کے دہانے پر پہنچ کر اسے آواز دی مگر اپنی آواز کی طویل بازگشت کے سوا وہاں کوئی آواز نہ سنائی دی۔ وقفہ وقفہ سے میں نے تین بار اسے پکارا مگر گہرا سکوت چھایا رہا۔

نواکوٹ میں انند رام کے کیمپ سے ہی ایک لڑکی نے مجھے سگریٹ اور ماچس لا کر میرے حوالے کی تھیں میں انہیں بہت احتیاط سے استعمال کرتا آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب بھی میری جیب میں ماچس کے کئی بکس موجود تھے۔ میں نے تلوار بغل میں دبا کر اکڑی ہوئی انگلیوں سے ایک تیلی روشن کی، گھور اندھیرے میں شعلہ لپکتے ہی غار میں روشنی پھیل گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ قبائلی تیمز بلی زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے!

میں نے ماچس کی مزید دو تیلیاں ضائع کیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بولنے کی صلاحیت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکا ہے۔ اس کا بدن نیلا پڑا ہوا تھا۔ نہ سینے میں سانس کے آثار باقی تھے نہ نبض چل رہی تھی، شاید وہ بے خبری میں کسی زہریلے سانپ یا پہاڑی بچھو کا شکار ہو چکا تھا میں نے وحشت کے عالم میں اس کی لاش سے ریچھ کی کھال الگ کی اور جلدی سے غار سے نکل آیا!

وہ رات قیامت کی رات تھی۔ میری آنکھوں میں دور دور نیند کا پتہ نہیں تھا۔ سارا بدن کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، اعصاب پر ناقابلِ بیان تناؤ طاری تھا اور کان کسی بھی سرسراہٹ کو سننے کے لئے مستعد تھے کئی بار مجھے وہم بھی ہوا کہ میرے آس پاس زمین پر کوئی کیڑا رینگ رہا ہے اور میں نے اچھل کر فوراً ہی اپنی جگہ تبدیل کر لی۔ میں بے خبری میں حشرات الارض کے کسی مہلک وار کا نشانہ بننے کے خطرے سے بہت زیادہ بدکا ہوا تھا!

خدا خدا کر کے کوہ نوردی کی وہ طویل ترین شب بیت ہی گئی۔ رات کو گھور تاریکی میں روشنی کے جگنو سے چمکنے لگے پھر آہستہ آہستہ میں ظلمات کے اس اتھاہ سمندر سے نکلنے لگا۔ اس خطے میں دھندلکا پھیلنے اور پوری طرح روشنی نمودار ہونے کے درمیان غیر معمولی طویل وقفہ تھا!

میرے چاروں طرف بھوری بے آب و گیاہ چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سے دور ہمالیہ کی سربلند برف پوش چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ رات کی بھاگ دوڑ میں پڑ کر میں یہ بھول چکا تھا کہ آدم خور قبیلے سے وہاں تک میں کس سمت سے آیا تھا۔ میرا رہبر ناگہانی موت مارا گیا تھا۔ نہ جانے وہ مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔ میں ایک بار پھر راہ بھٹک گیا تھا مگر مجھے پورا یقین تھا کہ اس قبیلے کا سراغ گم کرنے کے باوجود میں ان وادیوں میں کہیں نہ کہیں بھاندر ناس کا سراغ پا ہی لوں گا۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا نام لیا اور ایک طرف چل پڑا۔ پھر سفر جاری رہا اور میں ان گھاٹیوں میں چین سے نہ بیٹھا۔ ایک جگہ دل میں آئی کہ اس بھونڈی اور وزنی تلوار کو کسی کھائی میں پھینک دوں لیکن اس وقت میرے پاس وہ واحد ہتھیار تھا جس پر میں بڑی حد تک بھروسہ کر سکتا تھا۔ اپنے بچاؤ کے علاوہ میں بھاندر ناس کی ٹھوس وزنی جڑ کاٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لہٰذا میں نے لمبی گھاس کی رسی بٹ کر اس تلوار سے باندھی اور اسے کندھے سے لٹکا لیا۔

میں تین روز تک ان پہاڑی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا لیکن آبادی تو کجا کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ مل سکا۔ بھاندر ناس کے دھوکے میں دو تین جگہ میں نے ٹھوس چٹانوں پر تلوار کی دھار بھی آزما ڈالی مگر نتیجہ بے سود رہا۔ بھاندر ناس دوبارہ مجھے کہیں نظر نہ آ سکی۔ ادھر مسلسل تکان اور ان دیکھے خطرات کے اعصابی تناؤ نے مجھے بہت زیادہ بدحال کر دیا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ میں مزید چند دن یوں ہی بھوکا پیاسا ان بے رحم پہاڑوں سے ٹکراتا رہا تو جلد ہی ہلنے سے بھی معذور ہو کر رہ جاؤں گا۔ اس کے بعد کا تصور ہی روح فرسا تھا۔ تنہائی اور معذوری کی کربناک موت کا سامنا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا!

وہ رات میں نے ایک چشمے کے قریب بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سورج ڈوبا، چاند طلوع ہوا پھر آدھی رات بھی بیت گئی اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زرد چاندنی میں نہلائے ننگے پتھروں اور خاموش چٹانوں کو گھورتا رہا پھر نہ جانے کب نیند میرے اعصاب پر غالب آ گئی!

سوتے ہوئے میں عجیب عجیب خواب دیکھتا رہا۔ کبھی آدم خور جنگلی اپنے درندوں جیسے دانت چمکاتے مجھے اپنے نرغے میں لے کر رقص کناں ہوتے کبھی میرا جسم نیزوں کی انی پر فضا میں اچھالا جاتا۔ پھر ایسے ہی ایک بھیانک خواب کے دوران میں کسی نے میرے پیٹ میں نیزے کی تپتی ہوئی انی اتار دی اور ایک تیز چیخ کے ساتھ میں ہڑبڑا کر بیدار ہوا!

میرے کانوں میں ابھی تک غیر انسانی آوازیں گونج رہی تھیں ساتھ ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے بدن پر خاردار جھاڑیاں برسائی جا رہی ہوں۔ چند ثانیوں تک تو میں دہشت زدہ سا زمین پر ہی پڑا رہا اور جب حواس ذرا بحال ہوئے تو پھیکی چاندنی میں میں نے دیکھا کہ وہ خواب نہیں تھا بلکہ درحقیقت میں ایک بڑی افتاد میں پڑ چکا تھا!!

سیاہ پہاڑی لنگوروں کا ایک بہت بڑا غول کہیں سے اس وادی میں در آیا تھا۔ ان کی کریہہ چیخوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا اور وہ دندناتے ہوئے میرے جسم پر سے گزر رہے تھے۔ ان کے پنجے میری جلد میں جھاڑیوں کی طرح چبھ رہے تھے!

صورتحال کا صحیح اندازہ ہوتے ہی میں بوکھلا کر زمین سے اٹھ گیا اور داہنا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھایا تو دل دھک سے رہ گیا۔ تلوار نہ میرے شانے پر تھی نہ زمین پر اس کا پتہ تھا۔ ادھر لنگور اس قدر گستاخ اور بدتمیز واقع ہوئے تھے میرے گرد حلقہ بند ہو کر عجیب مضحکانہ آوازیں نکال رہے تھے اور ان میں سے کئی تو بڑھ بڑھ کر میرے سینے تک اچھل رہے تھے۔ اچانک اس غول کے عقب سے ایک بہت بڑا لنگور غراتا اور اچھلتا ہوا میری طرف لپکا اور میرے سنبھلنے سے قبل ہی میرے بدن سے ریچھ کی کھال جھپٹ کر ایک طرف لے گیا!

ان کے تابڑ توڑ حملوں نے مجھے بری طرح حواس باختہ کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے پہلو میں ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ لنگور شاید میرا ریوالور بھی چھین کر کہیں پھینک چکے تھے اور اب میں ان کی یلغار کے سامنے بالکل تنہا رہ گیا تھا!

پھر اچانک ایک طرف چٹانوں کی اوٹ سے کسی لنگور کی سی تیز آواز ابھری پھر کسی کے قدموں کی ہلکی سی دھمک دور ہوتی چلی گئی۔ اس آواز میں نجانے کیا تاثیر تھی کہ لنگوروں کا دائرہ میرے گرد نیم دائرہ کی صورت اختیار کر گیا اور وہ سب نہایت خونخوار اور جارحانہ انداز میں میری طرف جھپٹنے لگے۔ میں نے لاتوں اور گھونسوں کے ذریعے انہیں خود سے دور رکھنا چاہا مگر کب تک؟ ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ میرے بدن سے ریچھ کی کھال غائب ہو چکی تھی پتلون اور قمیص کے بھی چیتھڑے اڑتے جا رہے تھے اور ان کے تیز پنجے میرے جسم کے برہنہ حصوں پر لمبی لمبی خراشیں ڈال رہے تھے۔

چند ہی سیکنڈ میں میرے لئے وہاں کھڑا رہنا ناممکن ہو گیا اور میں پلٹ کر ان کے درمیان سے ایک طرف بھاگ پڑا جدھر لنگور موجود نہیں تھے! چاند کی زرد روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے بھاگنے میں خاصی مدد ملی ورنہ میں رات کے اندھیرے میں کسی اندھی کھائی میں ہی جا گرا ہوتا۔ سردی کا احساس میرے دل سے یکسر مٹ چکا تھا۔ نقاہت اور تکان نہ جانے یک بیک کہاں غائب ہو گئی تھی اور پیروں میں تو بے پناہ توانائی سمٹ آئی تھی۔ میری بس ایک ہی کوشش تھی کہ ان لنگوروں سے جلد از جلد نجات حاصل کی جائے۔ مگر وہ مردود کسی ویران شمشان میں بھٹکتی ہوئی بدروحوں کی طرح چلاتے اور غراتے تین سمتوں سے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ ان کی ایک ٹکڑی میرے عقب میں تھی، دو ٹولیاں دائیں بائیں دوڑ رہی تھیں جب وہ ایک پہلو سے مجھ پر جھپٹتے تو میں اپنی سمت قدرے بدلنے پر مجبور ہو جاتا اور پھر ان کے درمیان دوڑنے لگتا۔ میرا پورا بدن پسینوں میں شرابور ہو رہا تھا اور اس آفتِ ناگہانی کو سر سے ٹلتا نہ پا کر اب میری ہمت بھی جواب دینے لگی تھی!

بھاندر ناس کی تلاش میں نکلنے والا بے جگر صفدر علی انسان، اس کے بنائے ہوئے قانون، معاشرہ اور سرحدوں اور زندان کی ساری رکاوٹوں کو توڑتا، انند رام جیسے گھاگ اور شاطر کو رام کر کے اپنی منزل کا سراغ پا چکا تھا۔ صفدر علی نے آدم خور اور سفاک قبائلیوں کے ایک بڑے ہجوم کو اپنے سامنے کیچوے سے بھی بدتر بنا کر رکھ دیا تھا مگر اب وہ رات کے اس خنک طلسم میں بستے لنگوروں کے سامنے بے بس تھا.... مجبور تھا!

نہ جانے ڈھلانوں اور چڑھائیوں پر یہ بھاگ دوڑ کتنی دیر تک جاری رہی۔ میرے ذہن سے زماں اور مکاں کا ہر احساس فنا ہو چکا تھا بس میری ایک ہی کوشش تھی کہ سیاہ لنگوروں کے اس بدمست انبوہ سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لوں۔ ادھر وہ نابکار ہاتھ آئی ہوئی تفریح سے دست بردار ہونے پر بالکل بھی آمادہ نہ تھے!

پھر میں ان سے بچنے کے لئے ایک دور تک پھیلی ہوئی ڈھلان سے اتر رہا تھا کہ میری نظر کچھ بلند اور وسیع و عریض ہیولوں پر پڑی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے امید بھری نظریں ادھر جمائیں اور خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔

وہ واضح طور پر کسی بڑی عمارت کا خاکہ تھا اور یہ جگہ میرے لئے ان لنگوروں سے نجات کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی۔ مجھے اب اس بات کی بھی پرواہ نہیں رہ گئی تھی کہ لنگوروں سے بچاؤ کی فکر میں کہیں دوبارہ آدم خوروں کے چنگل میں نہ جا پھنسوں۔ لنگور جیسے حقیر اور کریہہ جانور کے ہاتھوں مارے جانے کا تصور میرے لئے سخت شرمناک اور توہین آمیز تھا۔ جب کہ آدم خوروں کا نشانہ بننا اس تحقیر آمیز ہلاکت سے کہیں بہتر تھا!

ڈھلان کے پیچ و خم طے کرنے کے بعد میں سیدھا بانده کر اس عمارت کی طرف ہو لیا جو لحظہ بہ لحظہ واضح تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اب لنگوروں نے دباؤ ڈال کر مجھے سمت بدلنے پر مجبور کیا تو میں سلیٰ سے سپر نہ ڈالوں گا مگر وہ ذہنی طور پر مجھ سے اتنے افضل نہ تھے کہ ایسی حکمتِ عملی اختیار کر سکتے!

وہ عمارت زمین کے ایک مسطح اور وسیع حصے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بلندی کسی طرح بیس فٹ سے کم نہ تھی۔ تعمیر میں پہاڑی پتھر نہایت فراخدلی سے استعمال کئے گئے تھے۔ سامنے والی دیوار میں کم از کم دس فٹ چوڑا اور تقریباً اسی قدر اونچا خلا تھا۔ اس خلا کے اوپر دیوار کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے بہت موٹی اور بے ہنگم سی چیز کے دو ستون کھڑے کئے گئے تھے!

میں رکے بغیر پوری رفتار سے اندر گھستا چلا گیا۔ لنگور بھی آپس میں لڑتے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے میرے تعاقب میں تھے!

چند ہی ثانیوں بعد میں نے خود کو ایک بڑے سے ہال میں موجود پایا۔ جس کے اوپر کھلا آسمان چمک رہا تھا اور فرش پر چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں گھستے ہی حیرت سے میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے... لنگوروں کا شور اچانک دم توڑ چکا تھا اور وہ پر سکون انداز میں اس کھلی چھت والے ہال میں بھرتے جا رہے تھے۔ وہاں اب ان کے چلنے کی سرسراہٹیں یا میرے سانس لینے کی تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں!

سر پر تاروں بھرا آسمان دیکھ کر مجھے بے اختیار کھنڈو کے وہ صدیوں پرانے کھنڈرات یاد آ گئے جہاں میں عجیب و غریب حالات میں بڈ کے روبرو پہنچایا گیا تھا۔ بڈ کی کمین گاہ کھنڈرات کے ایک نیم شکستہ کمرے پر مشتمل تھی جس کی نصف چھت امتدادِ زمانہ کے باعث بیٹھ چکی تھی اور وہاں سے نیلگوں آسمان صاف نظر آتا تھا۔

وہاں گھسنے پر میرے اچانک حیران رہ جانے کی وجہ نہ اس ہال اور بڈ کی کمین گاہ کی مماثلت تھی نہ لنگوروں کی حیرت انگیز خاموشی بلکہ اس حیرت کا باعث وہ حسین دوشیزہ تھی جو ہال کے داخلی دروازے کے قریب ہی پتھروں کے چبوترے پر عجب تمکنت کے ساتھ پہلے سے موجود مسکرا رہی تھی۔ اس کے بدن پر بے نیازانہ انداز میں کسی جانور کی ایک ایال دار کھال پڑی ہوئی تھی

چبوترے پر اس کے پہلو میں پڑی ہوئی ریچھ کی کھال میں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ وہ کھال میں ملے مرنے والے آدم خور قبائلی کی لاش سے اتاری تھی، اور کچھ دیر قبل ایک قد آور لنگور اسے میرے بدن سے لے بھاگا تھا۔ کھال کے قریب ہی میرا اعشاریہ چار پانچ کا سیاہ اور وزنی پستول پڑا ہوا تھا اور بھونڈی تلوار کا چوبی دستہ لڑکی کے داہنے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ تلوار کی نوک اس نے ہال کے پتھریلے فرش پر جمائی ہوئی تھی اور پلکیں جھپکائے بغیر مجھے ایسی نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی، جیسے میری وہاں آمد اس کے لئے متوقع رہی ہو۔!

میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا۔ یہ بلا مبالغہ حقیقت تھی۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ پے درپے مصائب کے باعث میں ذہنی طور پر لنگوروں سے بھی بدتر ہو کر رہ گیا ہوں۔ ساری بھاگ دوڑ میں مجھے یہ وہم رہا کہ میں اپنی مرضی سے بھاگ رہا ہوں جبکہ لنگور منظم طریقے پر مجھے اسی عمارت کی طرف ہانک رہے تھے اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔!

"بنانا شی تو بو۔۔۔!" لڑکی کے لبوں کو جنبش ہوئی اور فضا میں ترنم سا بکھر گیا۔ الفاظ اجنبی، زبان نامانوس مگر لہجہ ہمت افزا تھا اور جب وہ خاموش ہوئی تو اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ کی مٹھاس اور گہری... ہو چکی تھی۔!

میں نے مایوسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "ان بے رحم وادیوں میں، میں مظلوم اور اجنبی ہوں دوشیزہ۔ کاش تو میری زبان سمجھ پاتی۔!"

میرے الفاظ پر ایک ثانیے کے لئے وہ چونکی پھر اس کے لبوں پر وہی لازوال مسکراہٹ ناچنے لگی جس کا سحر میرے اعصاب میں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہا تھا۔

اس نے اسی اجنبی زبان میں ایک مختصر سا فقرہ ادا کیا۔ سارے لنگور بالکل خاموشی اور سکون کے ساتھ اس وسیع ہال کے کچے اور پتھریلے فرش پر بیٹھے اپنے بدن کھجا رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پیدائشی گونگے ہوں۔!

میرے لئے وہ سماں بڑا عجیب تھا۔ سارے لنگور سنجیدہ درباریوں کی طرح اس ہال میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ لڑکی کے سامنے بہیکراں کی جو حالت ہوئی وہ ناقابلِ اعتبار تھی۔ وہ سب اس کے اشاروں کے غلام نظر آتے تھے۔ اور اس ماحول میں وہ لڑکی ان لنگوروں کی ملکہ نظر آ رہی تھی۔!

چند ثانیوں کے سکوت کے بعد لڑکی کے حلق سے کسی لنگور کی سی ہلکی ہلکی مگر نپی تلی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ وہاں موجود لنگور اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو گئے اور اس کے خاموش ہوتے ہی فضا ان لنگوروں کی تیز چیخوں سے گونج اٹھی۔۔۔ وہ مسرت کے عالم میں قلابازیاں کھاتے ایک دوسرے کا بدن نوچ رہے تھے۔ اور اسی وارفتگی کے عالم میں وہ آہستہ آہستہ ہال سے باہر نکلنے لگے۔!

میں نے بوکھلا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اگر ان گمنام وادیوں کے بجائے جدید تہذیب کے کسی مستند مرکز میں ہوتی تو اولین فرصت میں حسینۂ عالم قرار دے دی جاتی۔۔۔۔ وہ زہد شکن لڑکی مستانہ نظروں سے میری طرف نگراں تھی اور اشارے سے مجھے اپنے قریب بلا رہی تھی!

دھڑکتے دل، چڑھتی ہوئی سانسوں اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ میں آہستہ آہستہ پتھریلے چبوترے کی طرف بڑھا تو یک بیک میرا وجود جل اٹھا۔ پہلو کے مقابلے میں وہ سامنے سے ہزار گنا زیادہ حسین نظر آ رہی تھی کیونکہ ایال دار کھال اس نے بھی ستر پوشی کے لئے نہیں بلکہ سرد ہواؤں سے بچاؤ یا شاید آرائش کے لئے شانوں پر ڈالی ہوئی تھی۔

میرے قریب پہنچنے پر اس نے ایک بار پھر اسی اجنبی زبان میں مجھ سے کوئی سوال کیا اور میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکتا رہا۔

ایک بار میرے جی میں آئی کہ اس کے حسن اور حسن کے لاپروایانہ بلکہ بے حجابانہ اظہار سے متاثر ہوئے بغیر اسے قابو کر کے اس سے تلوار چھین لوں، ساتھ ہی پستول بھی اٹھا لوں مگر یہ سوچ کر ہمت نہ کر سکا کہ بے شمار سیاہ لنگور اس کے تابع ہیں، تھوڑے فاصلے سے ان کا بے پناہ شور و غل ابھی تک سنائی دے رہا تھا اور لڑکی کے ذرا سے اشارے پر وہ میرے

ٹکڑے اڑا سکتے تھے۔ میرے لئے اب اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ لنگوروں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا اس میں لڑکی کے احکام کا دخل تھا۔ تلوار، پستول اور کھال لڑکی کے قبضے میں دیکھ لینے کے باوجود کوئی دوسری رائے قائم کرنا سب سے بڑی حماقت تھی۔

لڑکی نے تلوار اسی پتھریلے چبوترے پر رکھی اور میرا ہاتھ تھام کر ہال سے نکاسی کے راستہ کی طرف چل پڑی۔ میں بھی کوئی تعرض کئے بغیر اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کے نرم نرم حرارت آفریں ہاتھ کا لمس مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانے پر اکسا رہا تھا لیکن میں کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پاتا رہا۔

ابھی تک میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ تھا اور بظاہر وہ ان سیاہ اور بدصورت لنگوروں کے درمیان تنہا رہتی تھی لہٰذا جلد یا بدیر اسے میری طرف ملتفت ہونا ہی تھا۔ ان حالات میں جلد بازی نہ صرف اس کی برہمی کا باعث بن جاتی بلکہ شاید میرے لئے ناقابلِ برداشت دشواریاں بھی پیدا ہو جاتیں۔ میں وسیع احاطے میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے اس عمارت کی ساخت کا اندازہ ہو گیا۔ احاطہ کی دیواریں صرف تین جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ عقب میں بہت اونچی کھڑی پہاڑی ڈھلان قدرتی دیوار کی صورت میں موجود تھی۔ اس احاطے میں ہال سے ملحق چند کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ان کی پشت پر سینکڑوں لنگور اودھم مچاتے اپنی لمبی لمبی دموں کے ذریعے زناٹے دار آواز کے ساتھ عقبی پہاڑی کی طرف سنگباری کر رہے تھے۔ میں یہ سنتا تو آیا تھا کہ لنگور پتھر وغیرہ مارنے کے لئے اپنی لمبی اور نکیلی دم کو گوپھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں مگر اس کا عملی مظاہرہ دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

آسمان پر اب تارے ماند پڑنے لگے تھے اور ہوائیں نسیم سحری کی لطیف مہک رچنے لگی تھی۔ مگر میں اس قدر غیر یقینی بلکہ خطرناک حالات سے دوچار تھا کہ اس تبدیلی سے محظوظ نہ ہو سکا۔ ادھر شور مچاتے اور سنگباری کرتے ہوئے لنگور اس لڑکی کی موجودگی کو محسوس کرتے ہی اپنی ساری مصروفیات ترک کر چکے تھے۔ وہ مجھے ہمراہ لے کر عقبی پہاڑی کے دامن میں بنے پتھروں کے ایک حجرے کی طرف لے جا رہی تھی۔ قریب جا کر مجھے پتہ چلا کہ وہ کوئی گہرا کنواں تھا اور اس میں دیوار کے ساتھ ساتھ چکر دار پتھریلا زینہ نیچے تاریکی میں گم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

لڑکی نے وہاں رک کر اشاروں کی مدد سے بدقت تمام مجھ پر واضح کیا کہ اگر میں نے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھایا تو وہ کنواں ہی میرا مقدر بنے گا۔

اس کے بعد لڑکی نے مجھے تنہا ہی چھوڑ دیا اور خود تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ایک طرف غائب ہو گئی۔ اس کے جاتے ہی لنگوروں کی بدمستیاں دوبارہ شروع ہو گئیں۔

اجالا پھیلنے پر وہ لڑکی مجھے تلاش کرتی دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں جنگلی پھلوں سے بھرا ہوا مٹی کا ایک برتن تھا۔ اس نے وہ برتن میرے حوالے کیا۔ میں طویل بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ میں نے وہیں فرش پر بیٹھ کر پھل کھانے شروع کر دیئے۔ وہ کچھ دیر شاید ذرا کھڑی میری بے صبری سے لطف اندوز ہوتی رہی پھر نہ جانے کب واپس لوٹ گئی۔

اس کے چلے جانے کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب لنگوروں کی ایک ٹولی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ دو تین جونک بن کر میرے بدن کو بھنبھوڑنے لگے اور باقی لنگور سارے پھل لے بھاگے۔ پھل صاف ہوتے ہی مجھ سے لپٹے ہوئے لنگور بھی اپنے ساتھیوں میں جا ملے۔

میرے لئے یہ تجربہ خاصا تلخ تھا اور حالات بتا رہے تھے کہ مجھے خود کو ایسے واقعات کا عادی بنانا ہو گا ورنہ یہ منحوس اور بدطینت مخلوق میری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دے گی۔

میں دوپہر تک اس فراق میں رہا کہ کسی طرح دوبارہ اس ہال میں گھس سکوں جہاں لڑکی نے میرے ہتھیار چھوڑے تھے مگر ہر بار اپنے آس پاس چند لنگوروں کو منڈلاتے دیکھ کر ارادہ ترک کرنا پڑا۔

دوپہر کے بعد اس احاطے میں اچانک سناٹا سا پھیل گیا۔ شاید سارے لنگور کہیں نکل گئے تھے۔ ان کے اکا دکا ساتھی کہیں پڑے سستا رہے تھے۔ میرے لئے یہ موقع بڑا غنیمت تھا۔ میں چوروں کی طرح چھپتا ہوا اس ہال میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ پستول، کھال اور تلوار بدستور پتھریلے چبوترے پر موجود تھیں۔ لڑکی کی مخاصمت مول لئے بغیر میں یہ چیزیں کسی ایسی جگہ چھپا سکتا تھا جہاں سے بوقتِ ضرورت انہیں حاصل کر سکوں۔ میں جونہی اس طرف لپکا، اچانک کوئی سخت سی چیز زناٹے کے ساتھ میری کھوپڑی کے عقبی حصے پر پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ میں ہلکی سی چیخ مار کر پلٹا تو بیس فٹ اونچی دیوار پر ایک قد آور لنگور موجود تھا۔ اور ایک اور پتھر کے گرد اپنی دم کو بل دے کر دوسرے وار کی تیاری کر رہا تھا۔

میں گھبرا کر بے اختیار اس ہال سے باہر بھاگ نکلا۔

اس واقعے کے بعد لنگوروں سے میری روح فنا ہونے لگی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی خوبرو سی دوشیزہ ان بیہودہ جانوروں کو اس حد تک سدھا سکتی ہے کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں۔ یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اس چار دیواری میں لڑکی کی مرضی کے خلاف میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں ایک دور افتادہ حصے میں ڈھلتے سورج کی سکون پرور کرنوں کے سامنے جا بیٹھا تاکہ آنے والی رات کے لئے خود کو تیار کر سکوں۔

وہیں بیٹھے بیٹھے میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی اور

میں کھُردری زمین پر ہی دراز ہوگیا۔ اس وقت وہ پتھر بھی میرے لئے روئی کے نرم نرم گالے ثابت ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

میرے آرام کا یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ سوتے ہوئے میرے داہنے کان میں کوئی کیڑا گھُس گیا تھا اور تکلیف سے بے چین ہو کر میری آنکھ کھُل گئی۔ ہڑبڑا کر کان پر ہاتھ مارا تو کیڑے کے بجائے ایک لنگور کی دُم کا نکیلا سرا ہاتھ میں آیا۔ غصّے سے میرا خون کھول اٹھا۔ ادھر وہ لنگور میری گرفت سے دُم چھُڑانے کے لئے خوفزدہ چیخیں مارنے لگا مگر میں نیند میں خلل پڑنے کے باعث غصّے سے اندھا ہو چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں دُم تھام کر اس لنگور کو فضا میں گردش دی۔ پورا احاطہ اس کی چیخوں سے گونج اٹھا مگر میں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر اس لنگور کو پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ دھماکے کے ساتھ ہی اس کی آخری دہشت زدہ سی چیخ نکلی اور وہ مُردہ لوتھڑے کی طرح زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

اس کی چیخیں سُن کر ہر طرف سے لنگور امڈنے شروع ہوگئے ان کی چیخیں بے حد غضبناک تھیں۔ اپنے ایک ساتھی کا حشر دیکھ کر وہ میرے قریب آنے کی ہمت تو نہیں کر سکے مگر دُور ہی سے دمُوں کی مدد سے مجھ پر شدید پتھراؤ شروع کر دیا۔

بیک وقت جسم کے کئی حصّوں پر اتنی شدید ضربات آئیں کہ میں کسی ایک طرف توجّہ نہ دے سکا۔ ادھر سامنے سے وہ لڑکی بدحواسی کے عالم میں بھاگی آ رہی تھی۔ مجھے مشتعل لنگوروں کے نرغے میں دیکھ کر اس نے دُور ہی سے آواز لگائی۔ سارے لنگور اس کی طرف دوڑ پڑے۔ کچھ اس کے سر اور کندھوں پر سوار ہو کر شور مچانے لگے۔

وہ لڑکی مجھے نفرت آمیز انداز میں گھُورتی ہوئی سیدھی مُردہ لنگور کی طرف گئی لیکن اس میں تو زندگی کی رمق تک باقی نہ تھی۔ اس کو دیکھنے کے بعد وہ تیر کی طرح میری طرف آئی۔ اس کی غصّے سے اُبلتی ہوئی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ اس نے غرّاتے ہوئے پوری قوت سے میرے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ اس کا یہ اقدام میرے لئے حیرتناک تھا۔ میں کئی قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ اس وقت پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پہاڑی حسینہ کس قدر شہ زور ہے۔

غصّے کے عالم میں میرے منہ سے اس لڑکی کے لئے کئی ننگی ننگی گالیاں برآمد ہوئیں مگر میں نے اپنے تحفّظ کے پیشِ نظر عملی اقدام سے گریز ہی کیا۔ میرے جسم پر تازہ ترین پتھراؤ سے پیدا ہونے والے زخموں سے خون کی لکیریں بہہ نکلی تھیں۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے خون میں نہائی ہوئی داہنی پنڈلی اس کے سامنے کر دی۔

"ستا گادو بانگا۔" لڑکی نے حقارت اور تیزی سے کہا اور مجھے عقبی پہاڑی کی طرف دھکّے دینے لگی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ اس نے مجھے اندھے کنوئیں میں اترنے کا اشارہ کیا اور محفوظ فاصلے سے میرے پیچھے آنے لگی اس کے سارے لنگور باہر ہی تھے۔

"تجھے بھی اچھی طرح نہ روندا تو میرا نام نہیں۔" سیڑھیاں اترتے ہوئے میں اونچی آواز میں بڑبڑایا۔

اسی وقت پیچھے سے میری کمر پر ایک بھرپور لات پڑی اور میں چیختا ہوا سیڑھیوں سے پھسل کر سیدھا گہرائی کی طرف ہو لیا۔

لیکن میرا یہ سفر ایک لمحے سے بھی کم طویل تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی میرا بدن سخت زمین سے جا ٹکرایا۔ میرے سامنے ہی کنوئیں کی دیوار میں ایک کٹا ہُوا دار کوٹھری تھی جس کے اندر ایک مشعل تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ فضا میں سخت بدبو رچی ہوئی تھی اور مشعل کی روشنی میں اس کوٹھری کے فرش پر ایک استخوانی پنجر اور تین خشک کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں جو سب کی سب انسانی نظر آتی تھیں۔

اسی وقت وہ خونخوار خوبرو لڑکی بھی سیڑھیاں طے کر کے نیچے آ پہنچی۔

"یہ خشک پنجر میرے باپ کا ہے!" اس کی آواز میں قہر کے کوندے لپک رہے تھے!

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سر پر وزنی ہتھوڑے مارا ہو۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی صاف اور رواں اُردو بولتی ہوگی اور اب تک تو وہ خود کو اُردو سے نابلد ہی ظاہر کرتی رہی تھی۔

اس وقت خوشی، حیرت، مسرّت اور دہشت کے ملے جلے اثرات نے میرے ذہن کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ بیک وقت بے شمار سوالات نے ذہن پر یلغار کر دی تھی۔

تہذیب کے مراکز سے سینکڑوں میل دُور اسے یہ مہذب زبان کس نے سکھائی؟ وہ کون تھی اور ان سنگلاخ ویرانوں میں کیا کر رہی تھی۔ وہ اپنے مردہ باپ سے اس قدر نالاں کیوں تھی؟ ابھی تک میرے سامنے میری زبان سے ناواقفیت کی اداکاری کیوں کر رہی تھی؟ اگر وہ مہذب دنیا میں رہ چکی ہے تو انسانوں سے نفرت اور حیوانوں سے محبّت کا کیا راز ہے؟

سوالات بے شمار تھے! اس کے منہ سے اپنی زبان سُن کر بے اختیار جی چاہا کہ اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لوں! اس اجنبی ماحول، بے رحم سرزمین اور خونی فضا میں وہ واحد ذی روح تھی جو میرے مسائل کو سُن اور سمجھ سکتی تھی مگر اس وقت وہ بھوکی شیرنی کی طرح دہاڑ رہی تھی! اس کا حُسن غصّے کی کرختگی میں ڈوب گیا تھا۔ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا!

"تت..... تم میری زبان جانتی ہو؟" میں اس سوال کو اپنی زبان پر آنے سے نہ روک سکا اور حیرت کے ساتھ اس سے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں ــــ اور یہ سُن لے کہ اس سرزمین پر مجھے روندنے والا ابھی پیدا نہ ہوگا۔ میں ان پہاڑوں کی پیداوار ہوں اور میرے سینے میں پتھر ہی دھڑکتا ہے..... یہ تیری پہلی اور آخری غلطی تھی جو میں معاف کرتی ہوں۔ اگر اب تُو نے میرے کسی پالتو کے ساتھ سختی برتی تو ان خشک اور بے جان ڈھانچوں میں ایک کا اضافہ یقینی ہے۔"

"مگر وہ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ وہ میرا کان اپنی دُم سے کرید رہا تھا۔" میں نے اصل واقعہ بیان کرتے ہوئے خود کو انتہا درجے کا احمق محسوس کیا۔

"یہ سب معصوم ہیں۔" وہ اس وقت جذبات کی روانی میں ڈوبی ہوئی تھی "یہ انسانوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ آخر مجھے کیوں نہیں ستاتے؟ تیرے ہی دشمن کیوں ہیں؟"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ تمہارے دوست ہیں تمہارے سوا اور کسی کے نہیں۔" یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ میری زبان اور میرا مدعا خوب سمجھ سکتی ہے مجھ میں بحث کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں ہر قیمت اس کی ہمدردیاں جیتنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"اس لنگور کو قتل کرنے تک تو میرا دشمن تو نہ تھا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"میں خود کو تمہارا قیدی محسوس کرتا ہوں۔ ان پہاڑوں میں بھٹکنا کوئی جُرم تو نہیں ہے آخر تم نے مجھے کیوں گھیرا تھا؟"

"بھٹکنا جُرم نہیں ہے۔" وہ غرّائی اور حقارت کے ساتھ خشک انسانی پنجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "یہ بھی ایک چوٹی سر کرنے آیا تھا، ان وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔ میری ماں انسانوں میں رہی تھی، اس کی عقل ظلومیت کے فریب میں آگئی۔ اس نے بھٹکنے والوں کی رہبری کی اور پہلی ہی رات یہ بھیڑیا بن کر میری ماں کی عزّت کو نگل گیا۔ اگر اپنی ولدیت پہ مجھے اختیار ہوتا تو کسی خارش زدہ لنگور کی اولاد کہلانا پسند کرتی مگر اس کے تخم سے پیدا نہ ہوتی!"

"دردناک!" اس کی کہانی سن کر مجھے واقعی صدمہ سا ہوا "تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"وہ جہاں ہے سکھ سے ہے، خبردار جو اس کا نام دوبارہ لیا۔" وہ آنکھیں نکال کر غرّائی۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ میں تنہا یہاں بھٹکنے کے بجائے تمہارے ساتھ رہ سکوں؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

اس نے گہری نظروں سے میری طرف گھُورا، پھر بولی "تو کون ہے اور اس علاقے میں کیا کر رہا ہے؟"

"میں کھٹمنڈو سے آیا ہوں اور ان پہاڑوں میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔"

"کھٹمنڈو ــــ کیا کسی جگہ کا نام ہے؟" اس نے معصومانہ حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ کیا تم نے ان پہاڑوں سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی؟"

"نہیں۔ میں یہیں پیدا ہوئی اور یہیں بڑھی ہوں۔" باہر کی دنیا کے ذکر پر اس کے چہرے سے کسی شوق یا تجسّس کا اظہار نہیں ہوا تھا "مگر آدم خوروں کی مقدّس تلوار کس طرح تیرے ہاتھ لگ گئی؟"

"مقدّس تلوار؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔

"ہاں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو کوئی اس تلوار پر قابض ہو جائے وہ روئے زمین کا طاقتور ترین شخص ہوتا ہے اور وہ چوہوں کی طرح اس کی برتری تسلیم کر لیتے ہیں!"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا! ان کی شکست کو میں ابھی تک اپنے پستول کا کارنامہ سمجھتا آ رہا تھا۔ لڑکی کی زبانی مجھے پہلی بار علم ہوا کہ وہ میرا نہیں اس بھونڈی تلوار کا کارنامہ تھا جو میں نے محض ایک ہتھیار کے طور پر ان کی بستی کے سب سے بڑے مکان سے ہتھیائی تھی۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم یہاں سے کسی بہتر جگہ چلیں، میں تمہیں لفظ بہ لفظ اپنی کہانی سنا دوں گا۔" میں نے پنجر اور کھوپڑیوں والی کوٹھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے بڑھنے کا اشارہ کیا اور میں چکردار سیڑھیاں طے کرتا اُوپر جانے لگا۔

وہ اس احاطے میں بنے ہوئے پہاڑی پتھروں کی دیواروں والے ایک کمرے میں رہتی تھی جس کی چھت پھوس وغیرہ سے ڈالی گئی تھی۔ کمرے میں مٹی کے بنے ہوئے برتن قرینے سے ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں کئی گرم کھالیں پڑی ہوئی تھیں جو شاید سردیوں میں استعمال کی جاتی ہوں گی۔ قریب ہی جنگلی پھلوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا جن کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔

"برسوں سے یہ میرا گھر ہے۔" لڑکی وہاں پہنچنے کے بعد بولی۔ غصّے کی کیفیت ختم ہو جانے کے بعد اس کے حسین خدوخال کی رعنائیاں ایکبار پھر جاگ اٹھی تھیں۔ ہونٹوں پر وہی سحر انگیز مسکراہٹ رقصاں تھی جو میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں زندگی کے دیپ روشن تھے جن پر گھنیری پلکیں سایہ فگن تھیں۔ سیب جیسی سُرخ رنگت کے بھرے بھرے رخسار اور ان پر جھولتی سُرخ رنگ کی آوارہ زلفیں، دراز قامت، گداز سراپا، تجاہلِ عُریانی اور کوہستانوں کی روایتی چونچالی نے اس لڑکی کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔

"میری ماں نے مجھے انسانوں سے نفرت کرنا سکھائی ہے، اس کا دلگداز قصّہ میں تم کو سُنا ہی چکی ہوں۔ وہ بھی میری طرح ان پہاڑی لنگوروں میں رہتی آئی ہے۔ ان اطراف میں جو قبیلے رہتے ہیں وہ بیشتر آدم خور ہیں۔ وہاں مردوں کو ناقابلِ تصوّر برتری حاصل ہے۔ عورتیں کھلے آسمان تلے میدانوں میں رہتی ہیں جن کے گرد بستیوں کا دوہرا حصار ہوتا ہے اور ان دونوں حصاروں کے درمیان خونخوار درندوں کے بھوکے پیاسے غول قید رہتے ہیں۔ اگر کوئی بھی عورت فرار ہونا چاہے تو ان درندوں کا لقمہ بن جاتی ہے۔ مہینے میں ایکبار پورے چاند کی رات کے اجالے میں درندوں کے رکھوالے اس دوہرے حصار

میں جال باندھ کر راستہ بناتے ہیں پھر قبیلے کے مرد وحشی درندوں کی طرح دندناتے عورتوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت صرف مرد کی عیاشی اور بچے جننے کیلیے ہی پیدا کی گئی ہے! اس رات وہاں قیامت کا سماں ہوتا ہے۔" لڑکی سادہ اور شکستہ سی زبان میں کہے جارہی تھی۔ "اور صبح سے پہلے وہ سب لوٹ جاتے ہیں۔ عورتیں اسی کھلے میدان میں بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ لڑکے بلوغت کی عمر کو پہنچنے پر باہر نکال لیے جاتے ہیں۔ لڑکیاں ستم جھیلنے کے لیے وہیں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ میری ماں نے پہلے ان ہی قبائل میں پناہ لینی چاہی لیکن یہ ذلت اسے کسی طور گوارا نہیں تھی اور آخر اس کو حیوانوں میں پناہ لینی پڑی۔ وہ جب چاہتی ہے لنگوروں کا لشکر لیکر آدمخور قبیلوں پر جا چڑھتی ہے اور وہ سراسیمہ ہو کر گھاٹیوں اور غاروں میں جا چھپتے ہیں۔ وہ لوگ بھاندر ناس کے پجاری ہیں اور میری ماں کو اس کا عذاب کہتے ہیں۔"

"بڑی عجیب کہانی ہے تمھاری۔" میں گہری محویت سے چونک کر بولا۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے ان ویران پہاڑوں میں اردو کیسے سیکھی ہے؟"

"یہ میری ماں کی زبان ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "اس نے مجھے مقامی قبیلوں کی بولیاں سکھائیں، لنگوروں کی بظاہر بے معنی آوازوں کا مفہوم سمجھایا اور اسی نے مجھے اردو بھی سکھائی۔"

"تمھاری ذات پر تمھاری ماں کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ مجھے بار بار اسے دیکھنے کی آرزو ہو رہی ہے!" میں نے کہا۔

"میری ماں کی عزت لوٹنے والے سمندر پار کے سفید فام تھے۔ یہاں سے آئے دن مہم جو ٹولیاں اناپورنا کی بلند چوٹیوں کی طرف جانے کیلیے گذرتی رہتی ہیں مگر ہم کسی سے تعرض نہیں کرتے کیونکہ ان کے پاس جادوئی ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی اس بات کو پسند نہ کرے گی کہ میں باہر کی دنیا سے آنے والے ایک اجنبی مرد کو یہاں پناہ دوں!"

"پھر تم نے مجھے پکڑا کیوں تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"میں اپنے لنگوروں کے ساتھ سیر کو نکلی تھی کہ تجھ پر نظر پڑی اور میں نے تجھے ستانے کی ٹھان لی۔ میرا ارادہ تھا کہ تجھے خوب پریشان کرنے کے بعد مار ڈالوں گی مگر جب میں نے تیری زبان سے اردو سنی تو میری دلچسپی جاگ اٹھی! اپنی ماں کے علاوہ میں نے صرف تجھے اس زبان سے آشنا پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تو اب تک زندہ نظر آرہا ہے۔"

"تم یقین کرو لڑکی کہ میں تمھارا دوست ہوں....!"

میں نے اسے سمجھانا چاہا لیکن اس نے حقارت سے میری بات کاٹ دی۔ "ہونہہ ـــ مرد کسی عورت کا دوست نہیں ہو سکتا۔"

"میری کہانی سن کر تم کو شاید مجھ سے کچھ ہمدردی ہو جائے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیمی آواز میں کہا۔

"ہر مرد پہلے مظلوم بن کر عورت کا قرب حاصل کرتا ہے پھر اس کے لیے سب سے بڑا ظالم بن جاتا ہے۔" اس کا لہجہ ٹھوس اور جذبات عاری تھا۔ "میں تیرے بارے میں جاننا ضرور چاہتی ہوں مگر یہ خیال تو مجھے الو نہ بنا سکے گا۔"

"میں ایک کیمیاگر ہوں۔" میں نے محتاط الفاظ میں بات چھیڑی۔ "اور بھاندر ناس کی تلاش میں اندرام نامی ایک رشی کے سیتا وادی تک پہنچا تھا۔" میں غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا لیکن وہ اندرام یا سیتا وادی کے نام پر ذرا بھی نہ چونکی اور میرے ذہن میں سر ابھارنے والے اندیشے بلبلوں کی طرح بیٹھ گئے۔

"اس سے آگے اندرام بھی میری رہنمائی نہ کر سکا۔" میں نے بات جاری رکھی۔ "اور میں خود بھاندر ناس کی تلاش میں نکل پڑا...."

اس سے آگے پیش آنے والے تمام واقعات میں نے لفظ بلفظ اسے سنا دیے۔

"پہلے تو وہ صرف میری ماں اور اس کے لنگوروں سے خوفزدہ تھے مگر اب ان کی مقدس تلوار میرے قبضے میں آچکی ہے۔ مجھے یقین ہے اب میری ماں ان پر حکمراں ہوگی۔ وہ لوگ بالکل بھیڑیے ہیں انسانی گوشت سے اتنی رغبت رکھتے ہیں کہ اپنے مُردے تک کھا جاتے ہیں۔" ان الفاظ پر اچانک وہ منظر یاد آگیا جب آدمخور میرے ہاتھوں زخمی ہونے والے ایک ساتھی کے بدن کے ٹکڑے نوچ کر لے بھاگے تھے اور کراہت سے میرا سر چکرانے لگا۔

"ان کی دانست میں کمزور اور بوڑھوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔" لڑکی بتا رہی تھی۔ "جب بھی کوئی بیمار پڑتا ہے تو وہ اس کی تیمارداری کے بجائے ایک بڑا جشن مناتے ہیں اور اسے ذبح کر کے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ تو نے ان میں کوئی عمر رسیدہ یا بیمار شخص نہ دیکھا ہوگا!"

یہ سن کر میرے بدن کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ یہ میرا مقدر ہی تھا جو میں اس قدر سفاک لوگوں کے نرغے سے زندہ سلامت نکل آیا۔ چونکہ میں نے ان کی مقدس بوٹی بھاندر ناس کو چھو لیا تھا، لہٰذا وہ مجھے ذبح بھی نہ کرتے۔ اندرام کے بقول بھڑکتا ہوا روشن الاؤ ایسے لوگوں کا منتظر رہتا تھا اور زندہ جلنے کی اذیت ذبح ہونے سے کئی ہزار گنا زیادہ ہوتی۔

"اچھی لڑکی ـــ مجھے تم سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ یقین کرو کہ میں تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا۔ تم میری اتنی مدد کرو کہ بھاندر ناس کی معقول مقدار حاصل کر سکوں، پھر میں ان پہاڑوں سے نکل جاؤں گا اور کبھی ادھر کا رخ نہ کروں گا۔ بھاندر ناس کے بجائے اگر دھول گری کی جھیلوں تک لیجا سکو تو یہ تمھارا بڑا احسان ہوگا۔"

"دھول گری میں تجھے کیا کام ہے؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر خود ہی بولی۔ "تو شاید وہ پتھر حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کی دھات کو زر کر دیتا ہے!"

"تم جانتی ہو.... تم یہ سب جانتی ہو!" میں اس کے معنی خیز الفاظ سن کر بے چین ہو گیا۔ وہ یقیناً لوہے کے سونے میں بدلنے کا تذکرہ کر رہی تھی۔

"جو کچھ ان پہاڑوں میں ہے، میں وہ سب جانتی ہوں!" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "مگر دھول گری کے راستے بہت بھیانک ہیں۔ راستے میں دھواں اگلتی سفید دلدلیں ہیں جن کا سینہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ان پر قدم رکھنے والا کوئی ذی روح چند ثانیوں سے زیادہ سطح زمین پر نہیں رہ سکا۔ ڈھلانوں پر اس قدر گھنے جنگلات ہیں کہ شاید آج تک سورج کی کوئی کرن زمین پر نہ پڑ سکی ہو گی مگر میں یوں بھی اپنی ماں کی اجازت کے بغیر تیری کوئی مدد نہ کر سکوں گی!"

"مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو۔" میں پُرجوش لہجے میں بولا۔ "میں اس کے قدم چوم لوں گا جس کی کوکھ سے تم نے جنم لیا ہے۔ میں اسے منا لوں گا، اسے آمادہ کر لوں گا۔"

"بہت مشکل ہے، وہ شاید ہی تیری بات مانے۔ پھر مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں کہ وہ اپنی خانقاہ پر ہو گی یا نہیں۔" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ آہستہ آہستہ اس کا رویہ میرے ساتھ دوستانہ ہوتا جا رہا تھا۔

"خانقاہ؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "وہ وہاں کیا کرتی ہے؟"

"وہ برف میں لپٹی چوٹیوں کے قریب ایک پہاڑی خانقاہ میں دن رات عبادت کرتی رہتی ہے اور جب وہ زندگی کی یکسانیت سے اکتا جاتی ہے تو کئی کئی مہینوں کے لیے گھومنے نکل پڑتی ہے!"

"بڑی عجیب بات ہے، آخر تم دونوں یکجا کیوں نہیں رہتیں؟"

"یہاں کی زندگی ذرا آسان اور دلچسپ ہے اور میری ماں یہاں رہنے کو تیار نہیں، وہ یکسوئی سے عبادت کرنا چاہتی ہے۔ وہ جن برفانی وادیوں میں رہتی ہے، وہاں کی زندگی بہت سخت اور خطرناک ہے۔ ہر وقت نادیدہ خطرات کا دھڑکا لگا رہتا ہے!"

"تو پھر بھاندر ناس تک میری رہنمائی کرو!" میں نے اس سے التجا کی۔

"یہ بھی تقریباً محال ہے!"

"مقدس تلوار تمھارے قبضے میں ہے اور تم ان سے بزور اپنی ہر بات منوا سکتی ہو!" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"وہ میری ہر بات مان لیں گے مگر مجھے کسی قیمت پر بھاندر ناس کے قریب نہ جانے دیں گے۔ جس دن میں نے یہ جسارت کی وہ اپنی تباہی و بربادی کی پرواہ کیے بغیر مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور میں زندہ جلا دی جاؤں گی۔ وہ اس مقدس بوٹی کے معاملے میں بہت جذباتی اور حساس ہیں اور محض اس کی وجہ سے ان کی عورتیں ذلت کا عذاب جھیل رہی ہیں۔"

"ان کی عورتیں؟"

"ہاں!" وہ بولی۔ "یہ کہانی برس ہا برس پرانی ہے۔ ان دنوں ان پہاڑوں میں آئے دن آتش فشاں پھٹتے رہتے تھے اور زلزلے بھی بکثرت آتے تھے جن کے سبب ان قبائلیوں کو بے پناہ جانی اور مالی نقصان اٹھانے پڑتے تھے! انھوں نے لاکھ جتن کر ڈالے مگر یہ آفات نہ ٹل سکیں، پھر ان کے کچھ کاہنوں نے ساری ذمے داری عورتوں پر ڈال دی۔ عورتوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ ہر چاند میں کم از کم ایک بار وہ کسی قیمت پر اپنی پاکیزگی برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ کاہنوں کا خیال تھا کہ عورتیں اسی حالت میں بھاندر ناس کی پوجا کرتی ہیں، اسے چومتی ہیں اور اسے غسل دیتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ساری عورتوں کو وسیع احاطے میں قید کر دیا گیا۔ اب یہ اتفاق تھا یا ان کے عقائد کی مضبوطی کہ اس کے بعد قدرتی آفات کا سلسلہ معدوم ہونے کی حد تک کم ہو گیا اور یوں ذلت کی قید عورتوں کا مقدر بن گئی!"

"مگر بھاندر ناس پر میں تو بیٹھ چکا تھا، یہ ان سب نے بھی دیکھا تھا پھر مقدس تلوار میرے قبضے میں آتے ہی ان کا اشتعال خوف میں کیسے بدل گیا؟"

"تلوار کی وجہ سے وہ وقتی طور پر ضرور دب گئے مگر تو نے وہاں نہ رک کر بڑی عقلمندی کی۔ وہ دھوکے سے کسی بھی وقت تجھے ہلاک کر دیتے اور اب بھی وہ چین سے نہ بیٹھے ہوں گے، ان کے کھوجی تیری تلاش میں ان پہاڑوں کا چپہ چپہ چھان ماریں گے اور تیری بو کے سہارے ایک نہ ایک دن تجھے آلیں گے!"

"یعنی میں ان سے اب بھی محفوظ نہیں ہوں!" میں گھبرا کر بولا۔

"میرے لنگور ان کو یہاں تو پھٹکنے بھی نہ دیں گے!" وہ مسکرائی اور اس بار اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میرے سامنے گوشت پوست سے بنی، احساسات کی مالک ایک حسین و جوان لڑکی موجود ہے!

"افسوس کہ بھاندر ناس کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اس قدر مجبور ہوں۔ کاش میں اسے چوری کر کے ہی یہاں سے نکل سکتا!" میں نے حسرت کے ساتھ کہا۔

"یہ چوری زیادہ دیر پوشیدہ نہ رہ سکے گی اور وہ کئی دن بعد بھی تیری کھوج میں نکلے تو بہت جلد تجھے پکڑ لیں گے۔ تیرے لیے یہ راہیں کٹھن ہیں لیکن وہ ناقابل یقین تیزی کے ساتھ ان مہلک راستوں پر سفر کرتے ہیں۔ بھاندر ناس کا خیال ترک ہی کر دے تو بہتر ہے!"

"اس کی یہی صورت ہے کہ تم مجھے دھول گری کی جھیلوں تک پہنچانے کا وعدہ کرو!" اس کے دوستانہ رویے کے باعث میرا حوصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"اپنی ماں کی اجازت کے بغیر میں یہاں سے کہیں نہ جا سکوں گی!" اس کا لہجہ اٹل تھا۔

"میں تمھاری ماں کے حضور جانے کو تیار ہوں!"

اس نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا، پھر سپاٹ لہجے میں بولی "آج کی رات یہاں بسر کرلے، کل صبح ہم بلندیوں کی طرف چل پڑیں گے!"

لڑکی نے شب بسری کے لیے دو گرم کھالیں مجھے دے دیں۔ لنگوروں کے لائے ہوئے پھلوں سے ہم دونوں نے آتشِ شکم سرد کی اس دوران میں رہ رہ کر میری نظریں لڑکی کے جسم کے ان ممنوعہ حصوں کی طرف اٹھتی رہیں جو لاپروائی سے کندھے پر ڈالی ہوئی کھال میں سے جھانک رہے تھے۔

باہر احاطے میں لنگوروں کا شور و غل جاری تھا۔ میں لڑکی سے تھوڑی دور ایک کھال زمین پر بچھا کر لیٹ گیا، دوسری کھال اوپر سے اوڑھ لی۔

"تیرا نام کیا ہے؟" اچانک اس کمرے کے اندر لڑکی کی آواز گونجی۔

"صفدر!" میں نے اس کی طرف کروٹ لے کر کہا "اور تمھارا کیا نام ہے؟"

"میری ماں مجھے سیتا کہتی ہے!" وہ بولی پھر اچانک خیال کے زیرِ اثر بولی "کیا تجھے مجھ سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے؟"

"جب سے تم نے میری زبان میں بات کرنی شروع کی ہے، میرا ڈر بہت کم ہوگیا ہے!" میں نے سچی بات چھپانی مناسب نہ سمجھی۔

"پھر اتنی دور کیوں لیٹا ہوا ہے؟"

اچانک میری کنپٹیاں پھٹنے لگیں اور میں رک رک کر بولا "تمھارے قریب میں سکھ کی نیند نہ سو سکوں گا مجھے یہیں رہنے دو!"

"کیوں؟" اس نے میری طرف آتے ہوئے سوال کیا۔

"اس لیے.... اس لیے کہ تمھارا لباس ناکافی ہے، تم خوبصورت عورت ہو اور میں تھکا ہارا، پراگندہ خاطر مرد!"

وہ میرے قریب ہی زمین پر دراز ہوگئی "ایک بات بتا صفدر!" اس نے پرشوق لہجے میں پوچھا "باہر کی دنیا سے آنے والا تو پہلا مرد ہے جس سے میں نے دوبدو بات کی ہے مگر یہاں سے گزرنے والے بہت سے قافلوں کا دور تک چھپ کر تعاقب کیا ہے۔ آخر تمھارے جسموں میں کیا عیب ہیں جنھیں تم لوگ بڑی احتیاط سے چھپاتے ہو، چہرے کے سوا میں نے کسی کے بدن کا کوئی حصہ کھلا ہوا نہیں دیکھا اور تیرا لباس بھی عجیب سا ہے!"

"ہم عریانی کو معیوب سمجھتے ہیں سیتا!" میں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "ہماری اقدار تم سے بہت مختلف ہیں!"

"میری ماں بتاتی ہے کہ وہ شہروں میں رہی ہے۔ وہ لوگ درندے ہوتے ہیں، خود غرض درندے، مگر مجھے تجھ میں ایسی کوئی خرابی نظر نہیں آتی میں ماں سے پوچھوں گی کہ تو ایسا کیوں ہے!"

میں دھیمے سے ہنس دیا۔ میری آنکھوں میں شرارے سے کوندنے لگے تھے۔

سادہ اور معصومانہ باتیں کرتے کرتے وہ میرے قریب ہی سوگئی۔

مگر میں اپنے وجود کے جہنم میں سلگتا رہا۔ مشعل کی دھیمی اور آسیبی روشنی میں بے حجاب میرے پہلو میں تھا اور میں کانٹوں پر مچل رہا تھا۔ رات کی سردی تیر کی سی کاٹ تھی مگر میرے لیے یہ یخ بستگی بے معنی ہوچکی تھی۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا اور اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے چمڑے کے چابک سے بے رحمی سے مجھے گھنٹوں پیٹا ہو۔ میں بار بار دوسری طرف کروٹ لے کر آنکھیں موندنے کی کوشش کرتا مگر ہنستی مسکراتی سیتا اپنے بدن سے کھال ہٹا کر چشمِ تصور کے سامنے آکھڑی ہوتی!

یہ میرے لیے کڑی آزمائش کی رات تھی سیتا معصوم اپنی فتنہ انگیز رعنائیوں سے بے خبر تھی مگر میں اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ ... تھا۔ میرے وجود میں لڑکیوں کا شکار کھیلنے والا ... صفدر علی بار بار اٹھتا مگر مجھے سیتا کی اہمیت کا پورا احساس تھا اگر میں اس کی بے حرمتی کر دیتا تو میری بساط الٹ جاتی اور میں بڑی بری موت کا شکار ہوتا!

اگلی صبح میرے لیے حیوانی جذبوں کی یلغار سے نجات کا پیغام لے کر طلوع ہوئی۔ سیتا بھی بیدار ہو کر میری تلاش میں باہر نکل آئی۔

"ارے تیری آنکھیں تو سرخ اور ورم آلود ہیں۔ کیا تو رات بھر جاگتا رہا... ہے؟" اس کے لہجے میں معصومانہ حیرت رچی ہوئی تھی۔

میرا جی چاہا کہ اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اس کی پسلیاں توڑ ڈالوں مگر میں اس ستم گر سے یہ سلوک نہ کرسکا اور ایک معقول سا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔

ناشتہ بھی جنگلی پھلوں پر مشتمل تھا۔ اس سے فارغ ہو کر سیتا باہر میں آئی اور حلق سے لنگوروں جیسی آوازیں نکالنے لگی۔ آناً فاناً میں میدان سیاہ اور کریہہ لنگوروں سے بھر گیا۔ وہ سب خاموشی کے ساتھ اس کی بے معنی آوازیں سن رہے تھے!

جب وہ خاموش ہوئی تو لنگوروں کے شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ سیتا انھیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی، آخر وہ میری طرف جھک کر زور سے کان میں بولی "یہ میری روانگی پر سخت ناخوش ہیں جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے صرف ایک بار ماں سے ملنے کی خاطر ان سے جدا ہوں ورنہ ہمیشہ ماں ہی ادھر آتی رہی ہے!"

کافی دیر بعد ہم وہاں سے بمشکل نکل سکے۔ ایک قدآور لنگور کودتا ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پر ہلال نما ایک چھوٹا سا داغ بنا ہوا تھا جس کی بنا پر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لنگور تھا جو پہلے معرکے میں سیتا کے اشارے پر میرے بدن سے ریچھ کی کھال اتار کر لے بھاگا تھا!

"یہاں سے اس خانقاہ کی مسافت کتنی ہے؟" میں نے سیتا سے پوچھا۔

"میں تنہا تو تین دن میں پہنچ سکتی ہوں۔ تیرے ساتھ چھ سات دن لگیں گے!"

"کیا ہم بھوکے پیاسے یہ سفر جاری رکھ سکیں گے؟"

"یہ لنگور اسی لیے ہمارے ساتھ ہے!" وہ ہنس کر بولی۔

"تمھارا مطلب ہے کہ ہم اس کا گوشت کھائیں گے؟" میں نے چند ثانیوں تک اس کی بات کا مفہوم سمجھنے کی ناکام کوشش کے بعد پوچھا۔

"ہاں — ذرا تلخ ہوگا شکم پری تو ہو ہی جائے گی" وہ میری پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

راستے بھر وہ مجھ سے اپنی ماں کی اور اپنی باتیں کرتی رہی جو میرے لیے بالکل ناقابلِ یقین تھیں۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے ذرا دیر پہلے سیتا نے لنگور کو کچھ اشارہ کیا اور وہ طویل زقندیں لگاتا، چیخیں مارتا چند ہی ثانیوں میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

"یہ کہاں گیا ہے؟"

"بس دیکھتا جا!" وہ پھر ہنس پڑی۔

ہمارا سفر جاری رہا، تقریباً نصف گھنٹے بعد عقب میں اسی لنگور کی چیخیں سنائی دیں۔ میں بوکھلا کر پیچھے مڑا تو حیران رہ گیا۔ وہ نہ جانے کہاں سے بہت سارے تازہ تازہ جنگلی پھل لے آیا تھا۔

"اب سمجھے!" وہ میرے بازو میں چٹکی لے کر بولی "ان پہاڑوں میں لنگور سب سے تیز رفتار جانور ہے۔ یہ ہمارے لیے ہر قیمت پر رسد فراہم کرتا رہے گا۔ یہ ہوا سونگھ کر پتہ چلا لیتے ہیں کہ پھلوں کے درخت کس طرف واقع ہیں!"

"اور اگر یہ زہریلے ہوئے؟" میں نے ٹماٹر نما سرخ پھل دانتوں سے کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"تجھے شاید کبھی لنگوروں سے واسطہ نہیں پڑا!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "ان جنگلی جانوروں میں بڑی عجیب خوبیاں ہیں۔ زہریلے پھلوں کی پہچان تو یہ دور ہی سے پہچان لیتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو اب تک سارے جنگل لاشوں سے پٹے ہوتے اور کوئی جانور زندہ نہ ملتا۔"

جب تک راستوں پر ہماری نگاہیں کام کرتی رہیں سفر جاری رہا۔ ... نہ صرف سیتا ہی ایک طرفہ طور پر مجھے متاثر کیے جا رہی تھی لیکن شب بسری کے لیے ایک غار میں پڑاؤ کرتے ہی میں نے بھی شہروں کی کہانیاں شروع کر دیں۔

آگ اگلتے ہتھیاروں، فلک بوس عمارتوں، مشینی سواریوں اور مواصلاتی رابطوں کے بارے میں سن سن کر اس کی آواز فرطِ جوش سے کانپنے لگی اور جب میں نے اسے ہوائی جہاز کے بارے میں بتایا تو اس نے بے اختیار میرے شانے پکڑ کر مجھے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

"تو جھوٹا ہے، مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ بھلا آدمی کیسے ہوا میں اڑ سکتا ہے!"

"آدمی نہیں، چیل کی طرح کی ایک بہت بڑی مشین ہوا میں اڑتی ہے۔ اس کے پیٹ میں کئی کئی سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں اور وہ سینکڑوں میل کے فاصلے تھوڑی ہی دیر میں طے کرلیتی ہے!" میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے سمجھانا چاہا۔

"اگر وہ مشین ہو تو ہم ایک ہی دن میں ماں کے پاس پہنچ سکتے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ایک دن کیا بس ذرا سی دیر لگے گی۔"

"تو ایسی اڑنے والی مشین بنا سکتا ہے؟"

"نہیں۔ اس کے لیے دوسری بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے!"

"تو جو چیز مانگے گا میں تجھے مہیا کروں گی، میرے لیے ایک ایسی مشین بنا دے جس میں تین چار آدمی پرندوں کی طرح اڑ سکیں!" اس کی آواز میں خوشامد امڈ آئی تھی۔

"میں نہیں بنا سکتا سیتا۔" میں نے بے چارگی سے کہا "سینکڑوں آدمی اور مشینیں دن رات کام کرتی ہیں تو کئی مہینوں میں ایک ایسی مشین تیار ہوتی ہے!"

"مہینہ کتنا ہوتا ہے؟"

"ایک چاند سے دوسرے چاند کی درمیانی مدت ایک مہینہ ہوتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"پھر تو بہت وقت لگتا ہے۔" اس کی آواز میں مایوسی امڈ آئی۔ "آدم خور قبائلی تو نرے بے وقوف ہیں۔ اگر میں ماں کے ساتھ مل کر تیری مدد کروں تو بھی ہم تین آدمی کیا کرسکیں گے؟"

"تم دل چھوٹا نہ کرو سیتا۔" میں نے پہلی بار خود کو اس کے سامنے برتر محسوس کیا "اگر تم ماں سے میرے ساتھ چلنے کی اجازت لے لو تو میں تمھیں اڑن مشینوں کی خوب سیر کراؤں گا۔"

"وہ کبھی نہ جانے دے گی۔" سیتا کی مایوسی اور گہری ہوگئی۔ "اس کے سامنے یہ ذکر بھی نہ کرنا، وہ سمجھے گی کہ میں تیرے ساتھ بھاگنے کا منصوبہ بنا رہی ہوں!"

"تم اس سے چھپ کر میرے ساتھ چلو!" میں نے موقع پا کر اسے شہہ دی۔

"میں واپس کیسے آؤں گی؟" اس نے جلدی سے پوچھا پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی بول پڑی "تو اسی مشین میں مجھے واپس پہنچائے گا نا؟"

"ہاں!" میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اقرار کر لیا۔

وہ بہت دیر تک مجھ سے کرید کرید کر شہروں کے بارے میں سوال کرتی رہی تھی اور میں اس کی عقل کے مطابق اسے جواب دیتا رہا۔

وہ تو خیر ایک پہاڑن تھی جس نے کبھی شہروں کی صورت نہ دیکھی تھی مگر میں تہذیب یافتہ معاشرہ کا ایک فرد ہونے کے باوجود اس دُور افتادہ اور پسماندہ ماحول میں سائنسی ترقیوں کے تذکروں پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ شہروں میں رہتے ہوئے میں نے انسانوں کی ماہ نوردی کی خبروں پر بھی کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن ہمالیہ کی وادیوں میں یہ قصے مجھے محض وہم اور خواب محسوس ہو رہے تھے۔

وہ میرے امتحان کی دوسری شب تھی لیکن تاریکی نے اس امتحان کی شدت کو کم کر دیا تھا۔ سفر کی تکان کے باعث میں تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند سو گیا۔

تیز چیخیں رات کے آخری حصے میں میری بیداری کا سبب بنیں۔ آنکھیں کھولنے کے بعد کئی سیکنڈ تک تو میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ چیخیں میرے کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ تھیں لیکن کسی لنگور کی دہشت زدہ چیخوں سے پوری وادی اب بھی گونج رہی تھی۔

میری چھٹی حس اچانک بیدار ہو گئی۔ لنگور کی چیخیں کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ تھیں۔ میں نے پھرتی سے اپنا بدن سمیٹا اور سیتا کو آواز دی لیکن جواب ندارد۔

پھر میں نے غار کی خاموشی میں اندازے سے پورا فرش ٹٹول لیا مگر سیتا وہاں نہ تھی۔ اسے موجود نہ پا کر میرے ہاتھ پیر پھول گئے اور میں افراتفری کے عالم میں غار سے نکل آیا۔

پھر چاند کی مدھم روشنی میں مجھے قریب کی ایک چٹان پر ایک انسانی ہیولا کھڑا نظر آیا۔ اس کے نزدیک ہی وہ قد آور لنگور اچھل اچھل کر بری طرح چیخ رہا تھا۔

"سیتا!" میں نے اس سائے کو آواز دی۔

اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا پھر سیتا کی آواز سنائی دی "اچھا ہوا کہ تو بیدار ہو گیا۔ بھاندرناس کے پجاری آخرکار تیری بو سونگھتے یہاں تک آ ہی پہنچے ہیں۔ اگر میرا لنگور بروقت مجھے ہوشیار کر کے چیخنا شروع نہ کر دیتا تو یہ آدم خور غار میں گھس کر ہمیں مار چکے ہوتے۔"

میں سنبھلتا ہوا تیزی سے اس چٹان تک جا پہنچا جہاں سیتا کھڑی ہوئی تھی۔ نیچے نگاہ ڈالی تو کم از کم تین سو فٹ گہری وا[دی میں] چاند کی پھیکی روشنی میں چار انسانی سائے نظر آئے۔

"یہ اب کیا چاہتے ہیں؟" میں نے نیچے جھانکتے ہوئے [پوچھا۔]

"بہت باتیں ہوئی ہیں۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ مقدس [تلوار میرے] قبضے میں آ چکی ہے مگر یہ تجھے لیے بغیر ٹلنے کو تیار نہیں۔ کہتے ہیں کہ [اگر] انہیں مقدس تلوار دکھا دوں گی تو یہ مجھے اپنا آقا مان لیں گے مگر [ان] کی بے حرمتی کرنے والے اجنبی کو کسی قیمت پر نہ بخشیں گے۔" سیتا [نے کہا۔] "کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

اسی وقت نیچے سے ایک آدم خور زور زور سے [چیخا۔] وہ خاموش ہوا تو سیتا مجھ سے مخاطب ہو گئی "کہہ [رہا ہے کہ] ہم جانوں پر کھیل جائیں گے مگر اجنبی کو ان پہاڑوں سے زندہ [نہ جانے دیں] گے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں [ہے۔] ان سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے؟"

"یہ لنگور کس کام آئے گا؟" میں نے اسے یاد دلایا "[وہ نیچے] میں ہیں اور ہم بلندی پر!"

اسی وقت سیتا کے حلق سے لنگور جیسی ایک تیز چیخ [نکلی۔] اس کی آواز کی بازگشت ڈوبنے سے قبل ہی ایک پتھر زناٹے کے سا[تھ] پہلے آدم خور کی چیخ بہت مہیب تھی۔ وہ تیورا کر نیچے گر[ا] کی کراہ تک نہ سنائی دی۔ اس کے تینوں ساتھی بوکھلا کر ادھر اُدھر [بھاگے۔ لنگور] نے سیتا کے ساتھ مل کر وزنی پتھر نیچے لڑھکانے شروع کر دیے۔ اور وا[دی] دھماکوں سے گونج اٹھا۔ دوسری طرف وہ لنگور بھاگنے والوں کا [پیچھا] کر اپنی دم کی مدد سے ان پر مہلک پتھراؤ کر رہا تھا۔

بھاگنے والوں میں سے ایک میری لڑھکائی ہوئی چٹان [تلے] پس کر بری طرح مارا گیا۔ تیسرا لنگور کے پتھر کا نشانہ بنا۔ چوتھا شاید کسی [کھوہ] میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔

نیچے میدان صاف پا کر لنگور نے اب پتھر فضا میں ا[چھالنے] شروع کر دیے تھے۔ اس طرح شاید وہ معرکہ جیتنے پر اپنی خوشی کا اظہار کر [رہا تھا۔] "ان میں سے ایک بچ نکلا ہے!" سیتا کی آواز سے فکر کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ہمیں نیچے اتر کر اسے تلاش [کرنا ہوگا۔] اگر وہ فرار ہو گیا تو جلد ہی پورے قبیلے کو ساتھ لے کر لوٹے گا۔ ایک [بار ہمارا] سراغ پانے کے بعد یہ چین سے نہ بیٹھیں گے!"

"تیری بات درست ہے۔" سیتا نے کہا۔ اور ا[پنے لنگور کے] ساتھ نیچے اترنے لگی۔

نیچے پہنچ کر ہمارے اندازوں کی تصدیق ہو گئی۔ دو [آدم خوروں] کے سروں میں لنگور کے پھینکے ہوئے پتھر اس بری طرح [لگے تھے کہ ان] کی کھوپڑیاں پاش پاش ہو گئی تھیں۔ تیسرے کا بدن چٹان کے نیچے دب کر سرمہ ہو گیا تھا۔ چوتھے کا دور دور پتہ نہیں تھا۔

ہم لوگوں نے اس گھاٹی کی ایک ایک دراڑ چھان ماری لیکن [اس کا] کوئی سراغ نہ مل سکا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے زمین [کھا گئی] ہو۔ اجالا پھیلنے کے بعد تک ہم اس کی تلاش میں مصروف رہے پھر [اپنی] منزل کی جانب چل پڑے۔

اس حادثہ کے بعد سیتا سفر کی رفتار تیز رکھنے پر مصر تھی۔ اس کا [خیال] تھا کہ آدم خوروں کے پورے قبیلے کی آمد سے قبل ہمیں اس کی ماں کی خانقاہ [تک پہنچ] جانا چاہیے اور میں خود پر جبر کرنے کے باوجود اس کی رفتار کا ساتھ دینے [سے] قاصر تھا۔

آخر اس نے تجویز پیش کی کہ میں اس کے کندھے پر سوار ہو جاؤں [اس] طرح وہ پوری رفتار سے تو نہ چل پاتی مگر سفر کی اوسط رفتار کئی گنا بڑھ [جاتی] لیکن میرے لیے یہ تصور بڑا ہی شرمناک تھا کہ میں مرد ہوتے ہوئے ایک [عورت] کے شانوں پر لٹک کر سفر کروں۔ اس میں ایک دوسری قباحت [یہ] بھی تھی کہ سیتا کے جسم کا لمس مجھے کسی نہ کسی مرحلے پر اندھا کر دیتا اور میں وہ [سب] گزرتا جس سے ابھی تک خود کو بمشکل روکتا آ رہا تھا۔

جب سیتا نے اپنی تجویز پر حد سے زیادہ اصرار کیا تو میں نے واشگاف الفاظ میں اس سے کہہ دیا کہ اب وہ میری سلامتی کی ذمہ دار نہیں۔ اگر میں آدم خوروں کے نرغے میں پھنس جاؤں تو وہ بلا تردد مجھے چھوڑ کر نکل سکتی ہے۔

شب و روز ڈھلتے رہے۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ میرے لیے ہر [راستہ] اور ہر گھاٹی یکساں تھی مگر سیتا کو ان بھول بھلیوں کا قابلِ رشک شعور تھا۔ وہ قبل از وقت راستے کی نشانیوں کے بارے میں مجھے بتاتی [تھی] اور آخرکار اس کی باتیں سچ ثابت ہوتی رہیں۔ سیتا کا پر وردہ قد آور لنگور ہمارے اس پرخطر سفر کا ہیرو تھا۔ وہ ہمارے لیے نہ جانے کہاں کہاں سے پھل لا کر ہماری توانائی بحال کرتا رہا۔ یہ علاقہ پانی کے معاملے میں بجد فیاض تھا۔ [دور] دور سیاہ چوٹیوں سے پگھلنے والی برف جا بجا پہاڑی جھرنوں اور نالوں کی صورت میں رواں نظر آ رہی تھی۔

چھٹے روز دوپہر کے قریب ہم پتھر کی طرح جمی ہوئی شفاف برف پر جا پہنچے جس سے منعکس ہونے والی سورج کی کرنیں آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔ اب ہم ایسی بلندی پر آ چکے تھے کہ مجھے سانس لینے میں معمولی سی دقت ہونے لگی تھی۔ چند سو گز چلنے کے بعد سینہ کسی دھونکنی کی طرح چلنے لگتا اور سیتا کو رک کر میرے سانس کی بحالی کا انتظار کرنا پڑتا۔ مسلسل برف پر چلنے کے باعث پیروں کی جلد سوجنے لگی تھی۔ برف اس قدر سخت اور چکنی تھی کہ ذرا سی بے احتیاطی پر پیر پھسل جاتا تھا۔

شاید وہ سیاہ لنگور بھی ایسے موسم کا عادی نہ تھا۔ اس کی ساری شوخی رخصت ہو چکی تھی۔ اور اس پر بار بار چھینکوں کے شدید دورے پڑ رہے تھے۔ اس کی ابتر حالت دیکھ کر میں نے دونوں کھالیں مضبوطی سے اپنے سینے کے گرد لپیٹ لی تھیں۔ کیونکہ یہاں ٹھنڈ کا معمولی سا حملہ بھی نمونیہ پر ہی منتج ہوتا جس کا علاج محال تھا۔

آدم خور قبائلیوں سے ٹکراؤ کے بعد راستے میں ہمیں اس قدر صعوبتیں پیش آئیں کہ میں ان کے خطرے سے اب تقریباً بے نیاز ہو چکا تھا۔

"ابھی ہم خانقاہ سے کتنی دور ہیں سیتا؟" میں نے ایک جگہ ستاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"ہماری رفتار بہت سست ہے۔ اگر اسی طرح چلتے رہے تو ابھی دو دن اور لگیں گے۔" اس کی آواز میں تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔

"کیا تم میری وجہ سے پریشان ہو؟" میں نے اس کا فکرمند چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

"تیری طرف سے نہیں میں آدم خوروں کے بارے میں پریشان ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"میں ان کی فطرت سے خوب واقف ہوں۔ جو شخص بچ کر بھاگا تھا اس کے ہمراہ وہ کئی دن پہلے ہمارا راستہ روک سکتے تھے۔ مگر وہ بہت چالاک ہیں۔ اگر میرا اندیشہ درست ہے تو اب وہ کسی بھی لمحے ہمیں للکار سکتے ہیں۔"

"تمہاری دانست میں وہ ہمارے تعاقب میں ہیں؟" میں نے یہ سوال کرتے ہوئے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑتی محسوس کی۔

"شاید!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کھل کر بات کرو سیتا، شاید میں کوئی معقول مشورہ دے سکوں!" میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی محسوس کی۔

"وہ میرے لنگوروں سے بہت ڈرتے ہیں اور یہ جان چکے ہیں کہ اس سفر میں کم از کم ایک لنگور میرے ساتھ ہے۔ لہٰذا وہ خاموشی سے ہمارا پیچھا کر رہے ہوں گے۔ ہماری سمت سے وہ اندازہ کر چکے ہوں گے کہ ہم برفانی میدانوں میں ضرور داخل ہوں گے۔ اب اول تو میرے لنگور کی حالت ابتر ہے۔ دوسرے یہاں دور دور تک پتھر نایاب ہے برف کی سخت اور موٹی تہہ کو توڑے بغیر ہم ایک کنکر بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ وہ شاید اسی موقع کے منتظر ہوں۔"

اس کی پوری بات سن کر میں لرز اٹھا۔ اس کی عمر ان ہی علاقوں میں گزری تھی۔ وہ آدم خوروں کی مزاج شناس تھی۔ اور اگر اب اسے تشویش تھی تو بالکل بجا تھی۔

"میری وجہ سے وہ تمہیں تو کوئی گزند نہ پہنچائیں گے؟" میں نے ڈرتے دل کے ساتھ اس سے سوال کیا۔ اس کا لنگور اس وقت

بھی بری طرح چھینک رہا تھا۔ غیر برفانی پہاڑوں کے اس جانور کے لئے یہ موسم واقعی سخت ناساز تھا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" وہ شوخ لڑکی اس وقت بالکل بدلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ "اگر ہم مقدس تلوار ساتھ لے آتے تو شاید کوئی تدبیر ہو بھی سکتی تھی۔"

سارا دن ہم رینگ رینگ کر آگے بڑھتے رہے۔ میرے سینے میں اب شدید دکھن ہو رہی تھی۔ شام کے قریب اچانک سیتا بری طرح خوفزدہ نظر آنے لگی۔ وہ سکتے کے عالم میں برفیلی زمین پر کسی چیز کو گھورے جا رہی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے خوفزدہ دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے سیتا؟" میں ہانپتا ہوا جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"میری ماں۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہے؟" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کی نگاہیں برف پر بنے ہوئے ایک غیر معمولی حد تک بڑے پیر کے گہرے نشان پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"برفانی آدمی کے قدموں کے نشان!" وہ تیز سرگوشیانہ آواز میں بولی۔ "یہ بن مانس کی طرح کا کم از کم گیارہ فٹ بلند وحشی ہوتا ہے جو آدمی کی طرح دو پیروں پر چلتا ہے۔ سارے بدن پر بہت لمبے لمبے سفید بال ہوتے ہیں اور اس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ انسان کی ٹانگیں پکڑ کر اسے دو حصوں میں چیر سکتا ہے۔"

"کیا یہ ان اطراف میں کبھی کبھار ہی آتا ہے؟" اس کی حیرت کے پیش نظر میں نے سوال کیا ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دریافت پر میرا دل دہل اٹھا تھا!

پہاڑی چوٹیوں کو سر کرنے والی مہمات کے ارکان نے واپسی پر اکثر برفانی انسان کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور یہ تفصیلات بے حد لرزہ خیز تھیں۔ کئی بار لوگ محض اسے پکڑنے کی خاطر بھرپور تیاریوں کے ساتھ تیس ہزار فٹ کی بلندیوں تک گئے مگر اس کی جھلک تک نہ دیکھ سکے سادی کہانیاں بس اس کے قدموں کے نشانات کے گرد گھومتی تھیں جن کی تصاویر سنسنی خیز عنوانات کے ساتھ ساری دنیا میں چھپی تھیں۔ پھر کسی نے ایک مشکوک تصویر بھی اخبارات کو فراہم کی جو برفانی پس منظر میں کسی قوی الجثہ اور قدرے کُبڑے شخص کے دھندلائے ہوئے پیکر کی تھی۔ تصویر میں صرف اس کی پشت نمایاں تھی اور اس کے مطابق اس کا قد زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ ہو سکتا تھا۔ مگر اس تصویر کو بھی لوگوں نے مستند نہ مانا بلکہ اسے سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک ناکام طریقہ قرار دیا مگر اب اس افسانوی کردار کی موجودگی کا پہلا ثبوت میرے سامنے تھا!

"یہ اتنی کم بلندی پر کبھی نہیں آتا۔" سیتا کہہ رہی تھی۔ "...

یہاں تک اتر آیا ہے تو اب خانقاہ ویران ملے گی... میری ماں اس کا لقمہ بن چکی ہوگی۔" آخر میں اس کی آواز بھرا گئی۔

"خدا نے چاہا تو وہ زندہ ہوگی سیتا!" میں نے ... اسے دلاسا دیا۔

اس نے اپنی نیلی آنکھیں میری طرف اٹھائیں تو ان ... لرزاں تھے "صفدر — میری ماں مر گئی تو میں تنہا رہ جاؤں گی۔"

وہ بلک کر میرے سینے سے آلگی اور میں نے پوری گر... اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ ایک ثانیے کے لئے اس کی ماں کے ... دل میں احسان مندی کا جذبہ بیدار ہوا کہ محض اس کی موت کے ... سیتا کسی پکے ہوئے پھل کی طرح میری باہوں میں آگری۔ میرا ... خود بخود ... ہو گئی مگر پھر ضمیر اس حیوانی ... پر غالب آگیا اور ... شانوں پر میری گرفت نرم پڑ گئی۔

اور ٹھیک اسی وقت لنگور نے اچانک چیخنا شروع کر دیا! ... تڑپ کر میری باہوں سے نکل گئی۔ میں گھبرا کر پلٹا تو فرشتے کوچ کر گئے ... پھلوں والے لمبے لمبے بھالے ہاتھوں میں سنبھالے چرم پوش آدم خور ... جم غفیر برفیلی زمین پر ہماری طرف آرہا تھا۔

"یو ہاہا شیری مانا!" سیتا ان کی طرف منہ کر کے کسی ... کی طرح دہاڑی اس کے الفاظ میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ ان کے بڑھتے ... وہیں جم کر رہ گئے۔ نیزوں کی چمکیلی انیاں بھی نیچے جھکتی چلی گئیں۔ یہ ... اس قدر خوشگوار تھا کہ بے اختیار مجھے اپنی خوش نصیبی پر رشک آ... کہاں تو میں ابھی تک مایوسیوں اور خطرات میں گھرا ہوا تھا کہاں ... میرے سینے سے آلگی اور اب خود سر آدم خور بھی اس کے رعب میں آگئے ... حملہ آوروں کے غول میں سے ایک شخص نے اپنا نیزہ ... گاڑ دیا اور اپنے بدن پر پڑی کھال درست کرتا تنہا سیتا کی طرف آنے ... سیتا کے قریب رک کر اس نے سر کو قدرے خم کیا مجھ ... نظروں سے گھورا پھر سیتا کے ساتھ اپنی مادری زبان میں کچھ گفتگو ... ان کے اجنبی مکالمے میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ میں خا... سے کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ لنگور بھی موقع شناس تھا۔ اور سیتا کے قد... بیٹھا فلسفیانہ انداز میں اپنا کان کرید رہا تھا۔

ان دونوں کی گفتگو خاصی طویل ثابت ہوئی۔ ایک ... بار لہجوں میں کچھ تندی بھی پیدا ہوئی مگر پھر گفتگو پرسکون ہو گئی۔ ... اس سے بات ختم کرنے کے بعد سیتا میری طرف مخاط...

"اب وہی ہوگا جس پر تو رضامند ہوگا۔ یہ تیری گرفتاری کا مطالبہ ... ہیں یا خونریز جنگ کی دھمکی!"

یک بیک میری ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی اور میں ... لہجے میں بولا۔ "جنگ کا نتیجہ تو صاف ظاہر ہے اگر میں خود کو زندہ ...

حوالے کر دوں تو میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا اور تمہیں کیا رعایت ملے گی؟"

"انہوں نے میری بیشتر شرائط مان لی ہیں۔ تجھے قیدی بنانے کے بعد یہ ہمارے ساتھ خانقاہ تک چلیں گے تاکہ میں اپنی ماں کی خیر خبر لے سکوں۔ وہ زندہ ہوئی تو میں اس کے مشورے پر عمل کروں گی۔ اگر وہ مر چکی ہوگی تو میں تیرے ساتھ واپس چلوں گی۔ اپنی بستی میں پہنچ کر یہ لوگ حسب روایت تجھے آگ میں زندہ جلا دیں گے۔"

"اگر تم میرے جلنے کا منظر دیکھنے پر آمادہ ہو تو مجھے یہ سمجھوتہ منظور ہے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"یہ میری تجویز نہیں تھی۔ وہ اس سے کم کسی بات پر آمادہ نہیں تھے۔" سیتا میرا شانہ تھپک کر بولی۔ "وہ ہم پر براہ راست حملہ بھی کر دیتے تو ہم مارے جاتے مگر وہ تجھے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ تاکہ صدیوں پرانی رسم کے مطابق تیری چتا جلا سکیں اور محض اسی وجہ سے وہ مجھے رعایت دینے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ اگر تجھے یہ پسند نہیں تو میں ان سے مقابلے میں پیش پیش ہوں گی۔ میرے بعد ہی یہ تجھ پر وار کر سکیں گے۔" اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہی کر بھی گزرے گی۔

میں نے سیتا سے کچھ کہے بغیر اپنے دونوں ہاتھ سامنے کھڑے قبائلی کی طرف بڑھا دیئے۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کا لشکر پوری قوت سے نعرے لگانے لگا اور لنگور بھی گھبرا کر بری طرح چیخنے لگا۔

پھر کسی جنگلی بیل سے میرے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے سیتا اب ایک لمحے کو بھی مجھ سے الگ ہونے کو تیار نہ تھی۔ جنگلیوں نے ہم دونوں کو اپنے نرغے میں لیا اور سیتا کی بتائی ہوئی سمت پر آگے چل پڑے۔

"میرے اندیشے درست ہی نکلے۔ یہ قبائلی ان معاملات میں بہت عقلمند ہیں!" سیتا میرے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میری تو دعا ہے کہ اس وقت کہیں سے برفانی انسان نکلے اور ان سب کے جسموں کو چیر ڈالے۔" میں نے سخت مایوسی کے عالم میں کہا۔

"ہمارا حشر بھی ان سے مختلف تو نہ ہوگا۔" وہ بولی۔ "آگ میں زندہ جلنا اور برفانی انسان کے ہاتھوں مرنا ایک ہی بات ہے۔ میرے مقدر کا فیصلہ تو صادر ہو چکا۔ ہاں تمہارا مستقبل ابھی غیر یقینی ہے۔"

"ہم اکٹھے جئیں گے اور ساتھ مریں گے صفدر ... تجھے ... میری ماں نے مردوں کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا ... ہو سکتا ہے اس کا تجربہ ہو، مگر میرا تجربہ مختلف ہے۔"

میں نے دھندلکے میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا پھر طویل سانس لے کر بولا۔ "اب میں سکون سے مر سکوں گا سیتا۔ تمہارا دل جیتنا میری سب سے بڑی آرزو بن گیا تھا!"

"میں نے خود پر بمشکل قابو پایا ہے صفدر!" وہ واشگاف الفاظ میں کہہ بیٹھی۔ "جس رات میں پہلی بار تیرے نزدیک سوئی تھی اسی رات مجھے اندازہ ہوا کہ مرد عورت کی کتنی بڑی ضرورت ہے۔ میں اپنی ماں سے مشورہ کئے بغیر اس کا اقرار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر زندگی اور موت کے اس دوراہے پر یہ جھوٹا بھرم میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔"

میری آزادی سلب ہو چکی تھی۔ موت نوشتہ دیوار بن چکی تھی لیکن دل کے نہاں خانے میں مسرتوں کے وہ شگوفے چٹک رہے تھے کہ میں خود کو فضاؤں میں تیرتا محسوس کر رہا تھا۔

ہماری مسلسل باتوں سے اس لشکر کا سالار کچھ بدک گیا۔ اس نے سیتا سے گفتگو کی اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ ہم دونوں کو الگ کرنا چاہتا ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ہم فرار کا کوئی منصوبہ تیار نہ کر لیں یہ حکم ناخوشگوار تھا لیکن اٹل بھی۔ ہم دونوں دو مختلف ٹکڑیوں کے ساتھ بانٹ دیئے گئے۔

رات کو پڑاؤ میں بھی اس بات کا خاص اہتمام رکھا گیا کہ سیتا

میرے قریب نہ آسکے۔ ہمارے معاملے میں وہ لوگ ضرورت سے زیادہ حساس نظر آرہے تھے۔

سیتا کے اندازے کے عین مطابق روانگی کے آٹھویں روز خانقاہ کے آثار نظر آنے لگے۔ چمکیلی برف کی زمین پر پہاڑی پتھروں سے بنی ہوئی وہ خانقاہ بدھوں کے کسی قدیم اسٹوپا سے مشابہ تھی۔ اس کے کلس اور برجیاں دوپہر کے اجالے میں دور ہی سے چمک رہی تھیں۔

یہاں سیتا کی درخواست پر مجھے اور اس کو سب سے آگے چلنے کی اجازت دیدی گئی۔ نیزہ بردار آدمخوروں کا لشکر ہماری پشت پر تھا۔

اچانک سیتا نے دور ہی سے ماں کا نعرہ مارا اور قرب و جوار کی ساری برفانی چوٹیاں ماں ماں کی تکرار کرنے لگیں۔ پھر ہر سو دل اڑانے والا سکوت چھا گیا۔ سیتا کی نظریں برفیلی زمین پر ناچ رہی تھیں۔

پھر اسے پیر کا ایک بہت بڑا نشان نظر آہی گیا۔ یہ ہو بہو پہلے نشان سے مشابہ تھا۔ اس کے بعد تو وہاں ایسے بے شمار نشانات نمایاں تھے۔

سیتا نے خاموش اور درد بھری نظروں سے میری طرف دیکھا میں اس سے نظریں چار نہ کرسکا۔ اور اپنا سر جھکا لیا۔

پھر ہم اس خانقاہ میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی رام اور سیتا کی قدِ آدم پتھریلی مورتیاں ایستادہ تھیں۔ ان کی حالت سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ بعد میں نہیں لائی گئیں بلکہ خانقاہ کے ساتھ ہی تراشی گئی ہوں گی۔ اندر کوئی بھی نہ تھا۔ خانقاہ ویران پڑی ہوئی تھی۔ سیتا نے تڑپ کر ماں کو پکارا اور ایک مرتبہ پھر وہ آواز دور تک گونجتی چلی گئی مگر اس کا جواب کسی نے نہ دیا۔

خانقاہ کے آس پاس برفانی انسان کے قدموں کے بے شمار نشانات تھے۔ جیسے وہ کافی دیر وہاں گھومتا رہا ہو۔ پھر یہ نشانات ایک ڈھلان سے دور تک نیچے اترتے چلے گئے تھے۔ اسی کے قریب اس کے آنے کے نشانات بھی تھے۔ سیتا کرب و اندوہ سے نڈھال ہو رہی تھی اس نے نشانات کے تعاقب میں اسی ڈھلان میں اترنا چاہا مگر قبائلیوں کے سالار نے مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔

برفانی انسان کے قدموں کے نشانات دیکھ کر وہ سب بھی صورتِ حال کا اندازہ لگا چکے تھے۔ ان کے بشروں سے سراسیمگی ہویدا تھی اور وہ جلد از جلد وہاں سے واپس بھاگ نکلنا چاہتے تھے۔ مگر سیتا سالار کی گرفت میں مچل رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی تلاش میں ان نشانات کا تعاقب کرنا چاہتی تھی!

ابھی یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ فضا میں ایک مہیب اور مختصر سی چیخ ابھری اور سب لوگ دہشت سے چیختے، ایک دوسرے پر گرتے پڑتے خانقاہ سے واپس دوڑ پڑے۔ اس حالت میں بھی وہ مجھے اور سیتا کو ساتھ لینا نہ بھولے تھے!

وھاں

تاحدِ نظر ٹھوس اور شفاف برفانی ملبہ پھیلی ہوئی تھیں یا پھر اس برف پوش ذیم

کہیں کہیں اونچے درختوں کی ننگی ٹہنیاں اور دیوہیکل تنے ابھرے ہوئے صدیوں قدیم ان خزاں رسیدہ درختوں پر دور دور تک برگ و بار کا نام نہ تھا

وہ آدمخور قبائلی خوف اور دہشت کے عالم میں چکنی برفانی پھسلتے، زخمی ہوتے ایک طرف بھاگتے جارہے تھے اور کریہہ آوازیں بلند تھے۔ مجھے اور سیتا کو انھوں نے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا!

چند منٹ کے توقف کے بعد وہی دہشتناک اور مختصر ایک بار پھر ان برف زاروں میں گونج اٹھی۔ بھاگنے والوں کے حواس بگڑ وہ بے تحاشہ داہنی سمت خطرناک ڈھلانوں کی طرف گھوم گئے کیونکہ اس آواز کی سمت واضح ہوگئی تھی اور اگر وہ سیدھے بڑھتے رہتے تو ذرا ہی دیر میں ناگہانی آفت سے دوچار ہو بیٹھتے، جس کا اعلان وہ چیخ دوبارہ کرچکی تھی۔

بھاگنے والے ڈھلانوں پر جمی ہوئی برف کی گہری پرت میں نیزوں کی انیاں گاڑتے، اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے نہایت تیز رفتاری سے اترتے جارہے تھے۔ ان اطراف میں بے شمار چٹانیں اور غار بکھرے ہوئے وہ غالباً اپنے دشمن سے پناہ لینے کی خاطر جلد از جلد ان غاروں تک پہنچنا چاہ پھر اچانک ایک قبائلی کا اندازہ غلط ہوا، نیزے کی انی برف میں اترنے کے بجا اچٹ گئی اور وہ اپنا توازن کھو کر بھیانک چیخوں کے ساتھ نیچے لڑھکتا چلا گ کی دہشتناک چیخیں چند ہی منٹ میں دم توڑ گئیں، ساتھ ہی اس کا بدن ایک ...طرح لڑھکتا ہوا ہماری نظروں سے روپوش ہوگیا۔ چند سیکنڈ بعد نیچے سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ غالباً اس کی لاش کسی گہری وادی میں جاگری تھی۔

سیتا نیزے کے بغیر بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ قد آور سیاہ لنگو چیخیں مارتا اس کے ساتھ ساتھ زقندیں لگا رہا تھا مگر میرے لیے قدم جمانا مح ہو رہا تھا۔ ہر لحظہ مجھے اپنا حشر مرنے والے قبائلی جیسا ہوتا نظر آرہا تھا مگر وہ سب دہشت کے باوجود میری جان کی حفاظت پر تلے ہوئے تھے۔ اپنے عقیدے مطابق وہ ہر قیمت پر مجھے زندہ نذرِ آتش کرنا چاہتے تھے انھیں یہ بات کسی قیمت گوارا نہ تھی کہ میں یہیں کسی ڈھلان سے لڑھک کر ہلاک ہوجاؤں اور وہ مقدس بھاندرنا کی توہین کرنے والے سے اپنا ذاتی انتقام لینے سے محروم ہونے ساتھ ہی نادیدہ آسمانی مصائب کا شکار رہیں!

تیسری بار وہ آسیبی چیخ قدرے نزدیک سنائی دی۔ ان سب بھیڑیوں کے بدکے ہوئے غول کی طرح ایک بار پھر یک بیک سمت تبدیل کر لی اسی کے ساتھ سیتا بھاگتے بھاگتے چیخنے لگی۔

"یہ...... یہ برفانی انسان کی چیخیں ہیں صفدر۔ اگر تو اس قبضے میں آگیا تو دنیا کی کوئی طاقت تجھے دردناک موت سے نہ بچا سکے گی!"

برفانی انسان — ! یہ سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے بستر...

...برفانی درندے کے افسانوں کا مطالعہ بہت دلچسپ شغل محسوس ہوتا تھا لیکن ...سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہوں!

یہ بھاگ دوڑ یوں ہی جاری رہی۔ کافی طویل وقفہ گزرنے کے باوجود ...برفانی انسان کی نئی چیخ نہ سنائی دی مگر میرا دل انجانے اندیشوں سے لرز رہا تھا! اس ...کے ساتھ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ میں جوں ہی ایک بڑے تودے کی اوٹ ...نکلا میرے اوسان خطا ہوگئے۔ سارے قبائلی ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ...واپس پلٹے تھے جیسے سامنے فرشتۂ اجل ان کا منتظر ہو!

اور وہ منظر تھا بھی اسی قدر خوفناک!

تودے کے پیچھے، مجھ سے چند فٹ دور ایک ہولناک بلا اس ...زدہ غول کی گھات میں موجود تھی۔ جس برفانی انسان کی کہانیاں مہذب دنیا ...اور دلچسپی کا سبب بنی ہوئی تھیں وہ زندہ سلامت میرے سامنے موجود تھا۔

اس کا قد مجھ سے کم از کم دوگنا تھا مگر وہ اس قدر لحیم شحیم تھا کہ جسمانی ...پھیلاؤ کے اعتبار سے میرے سامنے کسی دیو کی طرح نظر آرہا تھا۔ سیتا کے بیان کے مطابق وہ آدمیوں کی طرح دو خمدار ٹانگوں پر قدرے آگے کی جانب جھکا کھڑا تھا اس کا سارا بدن لمبے لمبے سفید بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پیشانی اور چہرے پر بھی ایسے ہی ...زم بال اگے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو بڑی بڑی دہشتناک آنکھیں چمک رہی ...تھیں ...رخساروں کی ابھرتی ہوئی ہڈی کی سرخی مائل سفید جلد نظر آرہی تھی۔ ہاتھوں اور ...پاؤں پر بھی بال ہی بال اُگے ہوئے تھے انگلیوں کے آخری سروں پر عقاب کی ...سے مشابہ مڑے ہوئے سخت ناخن نمایاں تھے!

اس عفریت پر نظر پڑتے ہی میری زبان گنگ ہوگئی، دل یک بیک ...اچھل کر حلق میں آنے لگا اور قدم کچھ اس طرح زمین پر گڑ کر رہ گئے کہ چند ثانیوں تک ...اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکا! اس اثنا میں میرے پیچھے آنے والے قبائلی دوڑتے ...ہوئے مجھ سے آگے نکلے چلے گئے اور جب ان کی نگاہ اس برفانی عفریت پر ...پڑی تو نجات کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ برفانی انسان ایک مہیب چنگھاڑ کے ساتھ ...آگے بڑھا۔ ایک آدمخور اس کے پیروں کے نیچے بری طرح کچلا گیا۔ باقی لوگوں کی ...بھیڑ میں سے اس نے دو دہشت زدہ اور چیختے ہوئے قبائلیوں کو کھلونوں کی ...طرح اپنے ہاتھوں میں اوپر اٹھا لیا۔

پھر اس نے ان دونوں کو اپنے چہرے کے قریب لے جاکر دلچسپی ...سے ان کا جائزہ لیا اور یک بیک، پوری قوت سے ان دونوں کو ایک دوسرے ...سے ٹکرا دیا۔ ان کی چیخوں سے برف پوش وادیاں دہل اٹھیں۔ میں اس وقت تک ...اپنے حواس قدرے بحال کرچکا تھا۔ میں پلٹ کر بھاگا تو ایک وزنی دھماکے کے ساتھ ...لہراتا اور چیختا ہوا لہولہان لوتھڑا میرے قریب گرا۔ میں نے ہڑبڑا کر اس پر ...نظر ڈالی تو کانپ اٹھا۔ یہ ان دونوں میں سے ایک بدنصیب تھا جنھیں برفانی ...انسان نے پکڑا تھا! اسی کے ساتھ غیر ارادی طور پر میری نظریں پیچھے کی طرف اٹھ گئیں۔ ...برفانی انسان نے دونوں ہاتھوں میں اپنے شکار کی ایک ایک ٹانگ دبوچی ہوئی تھی۔

وہ خلا میں الٹا معلق بری طرح تڑپ رہا تھا اور برفانی انسان کے ہاتھ آہستہ آہستہ پھیلتے جارہے تھے۔ شاید وہ اس آدمخور کو دو حصوں میں چیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سیتا اپنے چہیتے لنگور سمیت نہ جانے کہاں جا چھپی تھی! اس وقت آدمخوروں کو کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ ان کے سروں پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح برفانی انسان کے چنگل سے بچ نکلیں۔ دہشت اور سراسیمگی کے اس عالم میں وہ مقدس بھاندرنا کی توہین کرنے والے اپنے اجنبی قیدی کو بھی فراموش کرچکے تھے! اس وقت اگر میں چاہتا تو نہایت سکون سے کسی طرف فرار ہوسکتا تھا لیکن برفانی انسان کا خوف مجھے اپنے ہم نسلوں کے سہارے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ آدمخور اور غیر مہذب ہی سہی لیکن میرے جیسے انسان تھے۔ برفانی انسان کے مقابلے میں میرا اور ان کا خوف مشترک تھا اور یہی خوف مجھے ان کے ساتھ رہنے پر اکسا رہا تھا۔ اگر میں اس پُرہول برفانی ویرانے میں ان سے بچھڑ جاتا تو مجھے یقین تھا کہ میں کبھی ان برف زاروں سے نہ نکل سکوں گا میرے لیے ہر چوٹی اور ہر سمت یکساں تھی! اس منطقے میں میرے لیے کوئی راہ شناسا نہ تھی۔ اگر میں ان کا ساتھ چھوڑ دیتا تو زندگی بھر ان ہی اطراف میں بھٹکتا رہتا تاآنکہ برفانی انسان مجھے اپنا نشانہ بنا لیتا یا اس سے قبل ہی موسمی سختیاں اور بھوک پیاس میرے مقدر کا فیصلہ کردیتی!

وہ سب غول در غول بندروں کی طرح بھاگے جارہے تھے ان کی چیخوں سے وادیاں گونج رہی تھیں۔ میں بھی مڑ مڑ کر برفانی عفریت کو دیکھتا ان آدمخوروں کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ پھر اچانک فضا چند پے در پے کربناک چیخوں سے لرز اٹھی۔ عقب سے کچھ ہڈیاں کڑکڑانے کی آواز آئی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے بے اختیار سر پیچھے گھمایا تو برفانی انسان کے ہاتھوں میں اس کے شکاری کی ٹانگیں اس طرح نظر آئیں کہ ان میں آپس میں کوئی مادی تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس پہاڑی درندے نے اس آدمخور کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا اور دونوں حصے اس کے ہاتھوں میں لٹکے تڑپ رہے تھے!

میں پوری رفتار سے آگے دوڑ پڑا میرا دل اس وقت کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا، حلق بالکل خشک ہو رہا تھا پھر سب سے پہلے ٹیلے کی اوٹ میں مجھے ڈرے سہمے آدمخوروں کا جو غول نظر آیا، میں اسی میں جا ملا۔ وہ سب بری طرح ہانپ رہے تھے اور بار بار سر آگے نکال کر برفانی انسان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے!

اچانک فضا میں برفانی انسان کی پے در پے کئی چیخیں گونجیں اور آدمخور گھگھیا کر ایک دوسرے سے لپٹ پڑے۔ خوف سے ان کی آنکھیں پیشانیوں پر جا چڑھی تھیں!

اس مرتبہ میں نے بھی سر آگے نکال کر جھانکا تو وہ برفانی انسان اچھلنے کے سے انداز میں دوڑتا ہوا نظر آیا! اس کے قدم اتنے لمبے تھے کہ چند ہی ثانیوں میں وہ سپاٹ برفانی میدان عبور کرکے ایک ڈھلان میں روپوش ہوگیا۔

اور چند ہی سیکنڈ بعد یوں محسوس ہوا جیسے اس ڈھلان میں قیامت برپا ہو گئی ہو۔ آدم خوروں کی بے شمار چیخیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ برفانی انسان شاید بے خبری میں ان پر ٹوٹ پڑا تھا اور اب ان سے اپنا حساب چکا رہا تھا!

"صفدر!" اچانک عقب سے سیتا کی تیز آواز گونجی۔

خوف، دہشت، مایوسی اور ناامیدی کے اس ماحول میں سیتا کی آواز سن کر پہلی بار مجھے خوشی کا ہلکا سا احساس ہوا۔ شاید اسے علم نہیں تھا کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں، کیونکہ وہ بے چینی کے ساتھ بار بار مجھے پکار رہی تھی۔

"سیتا..... سیتا! ادھر آؤ!" میں اسے پکارتا تودے کی اوٹ سے نکل آیا

مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میری جانب آئی۔ اس کا لنگور اس کے ساتھ ساتھ تھا، اس کی حالت بھی قابلِ دید ہو رہی تھی۔ ڈرا سہما کسی چوہے کی طرح سیتا کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس کی پتلی لمبی دم بھیگی ہوئی رسی کی طرح سخت برف پر گھسٹ رہی تھی۔ شاید اسے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ برفانی انسان کے چنگل سے اس کا بچنا بھی محال ہو گا۔

"صفدر۔ برفانی انسان ہماری راہ پر لگ گیا ہے!" وہ فضا میں ڈوبتی ابھرتی دہشت زدہ چیخوں اور کراہوں کے درمیان بوکھلائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ جب تک چن چن کر سب کو ہلاک نہ کر دے گا، یہیں گا ہیں واپس نہ جا سکے گا۔"

"ان سب کو جہنم میں ڈالو۔ ہمارے بچ نکلنے کی کیا صورت ہو گی؟" میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"اس نے شاید میری ماں کو بھی مار ڈالا ہے۔ وہ خانقاہ......!" سیتا روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی کہ میں نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹ دی۔

"مرنے والوں کو بھول جاؤ ورنہ ہم بھی اسی حشر سے دوچار ہونے والے ہیں!"

"یہ اکیلا یہاں نہ ہو گا۔ اس کی مادہ بھی آس پاس ہی ہو گی۔" سیتا متوحش نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولی۔ "تم اس کی آواز سن کر وہ کسی بھی لمحے آ سکتی ہے!"

"یہ نر ہے؟"

"ہاں! اس کی مادہ لنگڑی ہے۔ میں ایک بار اسے یہیں دیکھ چکی ہوں۔"

"سنو!" میں ایک ترکیب ذہن میں آتے ہی جوشیلے لہجے میں بولا۔ "کیا یہ خوفزدہ قبائلی اس وقت تمہاری بات مانیں گے؟"

"اگر انھیں برفانی انسان سے گلوخلاصی کا یقین ہو تو وہ جہنم میں بھی کود پڑیں گے!"

"ان سے کہو کہ یہ اپنے نیزوں سے برف کے تودے توڑیں۔ تمہارا لنگور برف کے ڈلوں کو پتھروں کی جگہ استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ہم اسے زخمی کرنے میں کامیاب ہو گئے تو شاید زندہ بچ سکیں۔" میں نے ہانپتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

ایک ثانیے کے لیے سیتا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے سہمے ہوئے لنگور پر نظر ڈالی اور وہ چمک پھر معدوم ہو گئی۔ "یہ خود بہت خوفزدہ ہے!"

"سیتا! اسے سمجھاؤ، تم اس کی زبان جانتی ہو!" میں نے کہا۔

وہ لنگور کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر زمین پر ہی اکڑوں بیٹھ کر حلق سے دبی دبی حیوانی آوازیں نکال کر اسے پچکارنے لگی۔ سیتا کے خاموش ہونے سے پہلے ہی لنگور نے ایک تیز چیخ ماری اور بے تابی سے اس کا ایک رخ چاٹنے لگا۔

"یہ آمادہ ہے!" سیتا کا لہجہ مسرت آمیز تھا۔

اس وقت ان برف پوش پہاڑی وادیوں میں اجل کی چیرہ دستیاں ہر سو اپنے عروج پر تھیں۔ برفانی انسان نہایت سکون اور مسرت کے ساتھ اپنے نشانوں پر وار کر رہا تھا۔ اس کی مختصر مگر مہیب چیخیں رہ رہ کر سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آدم خوروں کی کسی بھی ٹکڑی پر جا پڑتا، دو تین کو لہولہان کر کے ہلاک کر ڈالتا۔ بچنے والے فلک شگاف چیخیں مارتے کسی اور طرف بھاگ نکلتے۔ ادھر وہ عفریت بڑے سکون سے اپنے شکاروں کا حشر خراب کرتا اور ان کے تڑپتے ہوئے لہولہان اعضا برف پر پھینک کر چیخیں مارتا چند ہی ثانیوں میں کسی دوسری ٹولی پر جا پڑتا۔ جسموں کی حرارت سے پگھلنے والی برف میں اب ہر طرف انسانی لہو کے لہرئے بہہ رہے تھے اور کسی کو پتہ نہ تھا کہ چاندی جیسی سفید برف پر سرخ دھبے کس کس کے لہو سے جنم لیں گے۔ ذرا ہی دیر میں کم از کم سات آٹھ آدم خور اس کا نشانہ بن چکے تھے۔

سیتا بڑی مشکل سے ان حواس باختہ اور اجل رسیدہ قبائلیوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکی۔ اس کی تجویز سن کر بھی ان کے چہروں پر موت ہی کی دھند ناچتی رہی۔ انھیں یقین نہ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اپنے دشمن سے نجات پا سکیں گے۔

سیتا ان ہی لوگوں جیسے ماحول کی پروردہ تھی۔ اپنی بات پوری کرنے سے قبل اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ اس کی بات کو دیوانگی سمجھ رہے ہیں۔ خاموش ہوتے ہوتے وہ ایک بار پھر زور زور سے چیخنے لگی۔ اسی وقت وہ دیو ہیکل انسان نما درندہ دہاڑا۔ مجمعے میں عجیب افراتفری پھیل گئی مگر اس وقت تک چند آدم خور قبائلی اس کی تجویز سے متفق ہو چکے تھے۔

سیتا اپنی ہمنوا اقلیت کو ساتھ لے کر بندروں کی سی پھرتی سے ایک چٹان پر چڑھتی چلی گئی۔ جب میں بمشکل تمام اوپر پہنچا تو وہ سب نیزوں سے برف کے سخت ٹکڑے توڑ رہے تھے۔ سیتا نے حلق سے لنگوروں جیسی تیز چیخ نکالی اور اس کے ہمراہی قدآور لنگور نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی دم میں برف کا ایک ٹکڑا لپیٹ کر زناٹے کے ساتھ نیچے روانہ کر دیا۔

اس وقت نچلی وادیوں میں اجل کی ارزانی عروج پر تھی۔ گوشت، ہڈیوں اور بالوں کا ایک دیو جیسا متحرک انبار دہاڑتا ہوا آگے لپک رہا تھا اور اس کے بچنے کے لیے آدم خوروں کا ایک جمِ غفیر کربناک چیخیں مارتا، گرتا پڑتا دوڑ رہا تھا۔ موت نے قدرت نے موت ہی مسلط کر دی تھی، ایسی موت جس سے ان سرد پہاڑوں میں مفر ممکن نہ تھا۔

لنگور کا پھینکا ہوا برف کا پہلا ٹکڑا پوری قوت سے زمین سے ٹکرا کر گویا برف کی کرچیں دور دور اڑتی چلی گئیں۔ اس وقت پہلی بار مجھے لنگور کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اگر ایسے ہی چار چھ ٹکڑے نشانے پر لگ جاتے تو برفانی انسان بری طرح بوکھلا جاتا۔

دوسرا وار بھی خالی گیا مگر تیسرا ٹکڑا بھاگتے ہوئے درندے کی پشت سے ٹکرایا تو وادی میں بھونچال سا آ گیا۔ برفانی انسان چوٹ کھا کر اس بری طرح دہاڑا کہ اس کے نیچے زمین دہل اٹھی!

اچانک سیتا نے پوری قوت سے چیخ کر نیچے بھاگنے والوں سے کچھ کہا مگر وہ کہاں سننے والے تھے۔ موت ان کے تعاقب میں تھی۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ درندہ اچانک مشتعل کیوں ہوا ہے!

اپنا وار کامیاب دیکھ کر لنگور کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے برفانی انسان کو بری طرح اپنے نشانے پر لیا ہوا تھا۔ برف کا ہر ٹکڑا اب اس کے جسم پر پڑ رہا تھا اور وہ درندہ اس کی جسامت کے لحاظ سے چنگھاڑوں سے لرز رہے تھے۔ شاید وہ نادر الوجود عفریت اپنی نسل سے اب تک ایسی بے بسی کا شکار نہ ہوا تھا۔ شکست اور مجبوری نے اس کے غضب کو دو چند کر دیا تھا۔ شاید وہ اندازہ بھی لگا چکا تھا کہ اس پر کہاں سے وار ہو رہا ہے کیونکہ اب وہ روپوش آدم خوروں کو یکسر فراموش کر چکا تھا اور اس کی ساری توجہ ہی کسی طرح پہاڑی پر چڑھ کر ہمیں چیر ڈالنے پر مرکوز تھی مگر وہ قدآور لنگور کوئی موقع دیے بغیر پوری توانائی کے ساتھ اس پر ٹھوس برف کے ٹکڑے برسا رہا تھا کہ اوپر پہنچنے کی کوشش میں برفانی انسان پیش قدمی کی صلاحیت کھوتا جا رہا تھا۔

وہ ایک عجیب خونیں معرکہ تھا۔ میرے اعصاب پر ان لمحوں کا تناؤ مسلط ہو چکا تھا۔ میں نے کئی بار اس مختصر سی جماعت کا ہاتھ بٹانے کا ارادہ کیا مگر میرے قدم منجمد ہو رہے تھے، نہ ہاتھوں میں جنبش تھی۔ میں بس ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنی زندگی کا وہ بھیانک ترین منظر دیکھ رہا تھا۔

چہر بھاگنے والے آدم خوروں کو بھی صورتِ حال کا کچھ اندازہ ہو گیا تو ان کی چند دوسری ٹولیاں سفید چٹانوں کی اوٹ سے یہ جانگسل معرکہ دیکھنے لگیں۔

انھیں دیکھ کر سیتا نامانوس زبان میں زور زور سے چیخنے لگی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ ٹولیاں برفانی انسان سے بچ کر ہم تک آنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئیں۔

اس وقت دن کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ فضا میں دھند ہلکی ہلکی پھیلنے لگی تھی۔ گو ابھی تک ان برف زاروں میں ہمارا سابقہ برفانی ہواؤں سے نہیں پڑا تھا لیکن میں اس وقت بہت زیادہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ وہ رہ رہ کر مجھے یہ خوف ستا رہا تھا کہ اگر دھند گہرا ہونے تک میرے ساتھی اس عفریت کو نہ مار سکے تو رات کی تاریکی میں وہ باآسانی ایک ایک کے چیتھڑے اڑا ڈالے گا۔ سفید برف پر خون کے لہریے اور دور دور تک بکھرے ہوئے انسانی اعضا مجھے اپنے غیر یقینی مستقبل کا احساس دلائے جا رہے تھے۔

وہ وحشی برف کے ٹکڑوں کی یورش سے ذرا بھی خائف نہ تھا۔ ہاں اسے پیش قدمی میں شدید دشواری کا سامنا تھا۔ ابھی تک اس کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ایسی کوئی شدید ضرب نہیں آ سکی ہے جو فیصلہ کن ثابت ہو سکے۔ پھر اچانک برف کا ایک ٹھوس ٹکڑا وحشیانہ قوت سے اس درندے کی پیشانی یا کھوپڑی پر پڑا۔ اس کے حلق سے ایک غضبناک چیخ نکلی اور وہ بے اختیار پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔

سیتا اور اس کے معاونین نے یہ دیکھ کر پرجوش نعرہ مارا۔ لنگور نے بھی طویل سکوت کے بعد پہلی بار چیخ ماری جس میں مسرت کا ارتعاش نمایاں تھا اور جب وہ دھاڑتا ہوا متحرک انبار سیدھا ہوا تو روئی کے گالوں جیسی ابال دار کھال خون سے داغدار تھی۔ اس کی پیشانی پر آنے والا زخم گہرا تھا اور اس سے بہنے والا خون نیچے شفاف برف پر گر رہا تھا۔

برفانی انسان کے چنگل سے فرار ہونے والی ٹولیوں کی آمد کے بعد نفری بہت بڑھ گئی تھی۔ ان سب نے مل کر برف کے ٹکڑوں کا ایک ڈھیر جمع کر دیا تھا۔ اپنے خونخوار حریف کو زخمی دیکھ کر ان لوگوں نے بھی نشیب میں برف کا پتھراؤ شروع کر دیا۔ اس حرکت سے برفانی انسان کو نقصان تو نہ پہنچا، ہاں اس پر پہلی بار سراسیمگی سی طاری ہونے لگی۔

پھر ایک آدم خور نے اپنا نیزہ دونوں ہاتھوں سے بلند کیا، پنجوں پر اپنا وزن تول کر نشانہ درست کیا اور نیزہ برفانی انسان کی طرف اچھال دیا۔ اس نے فضا میں کوئی چیز اپنی طرف لپکتے دیکھی تو اس کی ہلاکت کا اندازہ نہ کر سکا بلکہ غضبناک انداز میں آگے جھپٹ کر فضا میں اڑتے نیزے کو اپنے ہاتھوں میں پکڑنا چاہا اور یہ کوشش اسے بہت مہنگی پڑی۔ نیزہ اس کے داہنے شانے اور گردن کے جوڑ سے ذرا نیچے پیوست ہو گیا۔ اس بار درندے کی چیخ سے وادی لرز اٹھی۔ ساتھ ہی بہت دور سے اسی جیسی کرخت آواز سنائی دی۔

نئی آواز خطرے کی گھنٹی تھی۔ سب لوگ یک بیک سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"تو نے وہ آواز سنی صفدر ــــ یا وہ اسی کی چیخ کی بازگشت تھی؟" سیتا نے مجھ سے پوچھا۔

"وہ واضح طور پر نئی آواز تھی ــــ شاید اس کی چیخوں نے مادہ کو متوجہ کر لیا ہے!" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں بتایا۔

سیتا بوکھلا کر آدم خوروں کے غول میں جا ملی۔ اس وقت اس کے بدن پر پڑی ہوئی کھال زمین پر گر چکی تھی اور سیتا کو اپنی برہنگی کا ہوش تک نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے، اس کے مسلک میں سردی سے بچاؤ کے لیے کھالیں اوڑھنا تو جائز نہ تھا

مگر کندن کی طرح دمکتے جوان اور صحت مند جسم کو چھپانا معیوب تھا! میں نے بس ایک ہی نظر اسے دیکھا پھر برفانی انسان کی طرف متوجہ ہو گیا! اس وقت زندگی اور موت کا معرکہ چھڑا ہوا تھا جس میں برفانی انسان کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس کے سوا روئے زمین کی ہر شے میرے لیے اپنی کشش اور اہمیت کھو بیٹھی تھی۔

برفانی انسان نے بڑی بے دردی کے ساتھ اپنے شانے سے نیزے کی انی کھینچی۔ خون کی ایک اور دھار اس کے بدن سے بہہ نکلی۔ اس نے گھٹی گھٹی غضبناک چیخوں کے ساتھ نیزے کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ایک طرف پھینک دیا اور غراتا ہوا، اندھوں کی طرح آگے لپکا مگر اس وقت تک قدرت اپنا فیصلہ صادر کر چکی تھی، لنگور کا پھینکا ہوا برف کا ایک سخت ٹکڑا برفانی انسان کی آنکھ پر پڑا اور اس بار وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھامے ایک پُرشور دھماکے کے ساتھ سخت برف پر گر گیا۔ اس کی چیخیں زمین اور آسمان ایک کیے دے رہی تھیں۔ دوسری طرف وقفے وقفے سے اس کی مادہ کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی سُنائی دے رہی تھیں۔ شاید وہ اس وقت کہیں بہت دُور موجود تھی مگر اپنے نر کی چیخیں پہچان چکی تھی اور شاید اس کی مدد کو نکل بھی پڑی تھی۔

وہ زمین پر اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا اٹھا اور کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بغیر پوری رفتار سے ایک طرف بھاگا مگر چند ہی قدم دوڑنے کے بعد ایک ابھرے ہوئے تودے سے ٹکرا کر منہ کے بل پھر برف پر ڈھیر ہو گیا۔ شاید وہ بینائی سے یکسر محروم ہو چکا تھا۔

"نیچے، سیتا نیچے اتر پڑو۔" یک بیک میری ساری قوتیں بحال ہو گئیں۔ اُمید کی کرن طلوع ہوتے ہی سارے حواس کام کرنے لگے تھے "اگر یہ کہیں روپوش ہو گیا تو ہم اگلا دن دیکھنے کو زندہ نہ بچ سکیں گے!"

سب سے پہلے میں اس چٹان سے اترنے لگا۔ سیتا نے دیگر لوگوں کو میری تقلید پر آمادہ کر لیا۔ جب یہ نیزہ بردار جماعت نیچے پہنچی تو وہ ہیکل عفریت، برف کے کسی پہاڑ کی طرح وہاں سے بھاگنا چاہ رہا تھا لیکن بار بار ناہموار زمین پر ٹھوکریں کھا کر گر رہا تھا! اس کے جسم کا اگلا حصہ خون میں تر ہو چکا تھا اور اس کی چیخوں میں اشتعال کے ساتھ ہی بے بسی بھی نمایاں ہو چلی تھی۔

سب سے پہلے میں نے ایک نیزے کو لاٹھی کی طرح گھما کر اس کی پنڈلی پر مارا اور میرا ہاتھ جھنجھنا اٹھا۔ ایسا لگا جیسے نیزہ کسی پتھریلی چٹان سے ٹکرایا ہو۔ درندے نے اندھوں کی طرح غضب کے عالم میں فضا میں ہاتھ لہرائے مگر صاف اندازہ ہو گیا کہ اس کی بصارت ضائع ہو چکی ہے۔ وہ ہم میں سے کسی کو نہ دیکھ سکا کیونکہ اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی، وہیں کھڑا دہاڑتا رہا۔

چند آدمیوں نے وہیں برف توڑ کر لنگور کے لیے مہلک اسلحہ فراہم کرنا شروع کر دیا۔ باقی لوگ نیزے تان کر اس عفریت کے گرد پھیل گئے اور تیز انیاں اس کے بدن پر کچوکے لگانے لگیں۔

اس کے بعد وہاں برفانی انسان کا ہانکا شروع ہو گیا۔ ننھے زخموں اور شدید ضربوں سے بوکھلا کر وہ جوں ہی جگہ چھوڑتا، نیزوں کے پھل اسے ہٹنے پر مجبور کر دیتے! اس کا پورا بدن زخموں سے چُور ہونے لگا۔ خون میں نہایا چہرہ پہلے سے زیادہ ڈراؤنا ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور ایک پہلو پہ نیچے گر گیا! اس بار ایک قبائلی نے ٹھیک نشانہ لے کر اس کی بائیں پسلیوں میں نیزہ اتار دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیزہ واپس کھینچتا، برفانی اذیت سے تڑپ کر زمین سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے تحاشا ایک سمت میں

اس کے قدموں تلے روندے جانے سے بچنے کے لیے سمت میں کھڑے قبائلی چیختے ہوئے اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گئے اور وہ سیدھا چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے قدم کانپ رہے تھے، سانس بھی اکھڑ چکا تھا۔ نیزہ ٹھیک اس کے قلب میں اُتر گیا تھا مگر وہ اپنی ناقابلِ تصور حیوانی قوت کے سہارے اب بھی پناہ لینے کی کوشش میں مصروف تھا۔

پھر وہ ایک جگہ پھسلا اور چیختا ہوا ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ ہم لوگوں کے آگے پہنچنے سے قبل ہی فضا اس کی دلدوز چیخوں سے کانپ اٹھی۔ اس جگہ ڈھلان کے خاتمے پر ایک بہت گہری کھائی تھی جس کی تہہ اوپر سے نظر ہی نہ آتی۔ ہمالہ کے برف پوش پہاڑوں کا وہ نایاب درندہ اس اتھاہ کھائی میں ڈوب گیا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس کی چیخیں دم توڑ گئیں اور تھوڑے سے وقفے کے بعد اس سے ایسے ہولناک دھماکے کی آواز آئی جیسے کسی خشک کنویں کی تہہ میں کوئی لاش گری ہو اور فضا پر گہرا سکوت چھا گیا۔

اس عفریت کا یہ انجام اس قدر غیر متوقع اور عبرتناک تھا کہ آنکھوں کو یقین ہی نہ آتا تھا۔ سب لوگ ہکا بکا کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ بشروں پر عجیب خیال انگیز لکیریں نقش تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے سے اس خونریز تصادم کے خاتمے کی تصدیق طلب کر رہے ہوں۔

یہ طلسم اس وقت ٹوٹا جب فضا میں دور کہیں برفانی انسان کی مادہ کی چیخ سُنائی دی اور ایک بار پھر سب چہروں پر ہراس کی لہر دوڑ گئی۔

سیتا چونک کر آدمخوروں سے گفتگو کرنے لگی اور میں اس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے قد آور لنگور کی عظمت پر غور کرنے لگا جس نے ہم سب کو ایک عظیم آفت سے بچایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہمارے پاس برف توڑنے کی صورت ہوتی تو وہ لنگور تنہا ان تمام آدمخوروں کے لیے کافی ہوتا اور مجھے ان کا قیدی نہ بننا پڑتا مگر اب وہ لمحے بیت چکے تھے اور آدمخور اتنے احمق نہ تھے کہ مجھے اور سیتا کو لنگور سمیت اپنے مقابل صف آرا ہونے کا کوئی موقع دیتے۔

"تم تھکا تو نہیں ہے؟" ان سے گفتگو ختم کر کے سیتا نے واپس پلٹتے ہوئے پوچھا

"اگر برفانی انسان کی مادہ سے بھی سامنا کرنا پڑا تو میں مقابلہ کیے بغیر مرجانا پسند کروں گا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس قدر اعصاب شکن واقعے سے میں زندگی میں کبھی دوچار نہیں ہوا۔"

"جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی اسی کا نام ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"بتانا یہ آدمخور ابھی کیا کہہ رہے تھے؟"

"کیا ہے؟" میں نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ان کا خیال ہے کہ یہ ساری مصیبت تیری وجہ سے نازل ہوئی ہے کیونکہ تو نے مقدس بھاندر ناس کی بے حرمتی کی تھی اور یہ لوگ نیا چاند چڑھنے کے باوجود ابھی تک تیری چتا نہیں جلا سکے!" وہ بولی۔

"آگ میں جل کر مرنے سے بہتر ہے کہ برفانی انسان کی مادہ مجھے دھجیوں میں تقسیم کر دے!" میں نے مستقبل کی یہ نئی تصویر سامنے آنے پر بے دلی سے کہا۔

"اس کا امکان کم ہی ہے۔"

"جس رفتار سے اس کی آواز قریب آ رہی ہے، شاید اندھیرا پھیلنے تک وہ ہمیں آ ہی لے گی۔" میں نے اس سے کہا۔

"سارے جنگلی درندے بُو کے سہارے سفر کرتے ہیں! اس کی مادہ اپنی آوازوں کا جواب نہ پا کر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسی کھائی کی تہہ میں اترے گی اور جب وہ اپنے نر کی لاش دریافت کرے گی تو ہمیں یہاں سے گزرے ہوئے کئی دن بیت چکے ہوں گے! اس وقت تک ہم شاید برف سے نکل کر بھورے پہاڑوں پر پہنچ جائیں گے۔" وہ پورے اعتماد کے ساتھ بولی۔

"کیا اس جوڑے کے بچے نہیں ہیں؟" میں اس فطری سوال کو زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔

"میری ماں بتاتی تھی کہ یہ جوڑا کبھی برف سے نہیں نکلتا اور برف میں خوراک کی بہت قلت ہوتی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ یہ ان پہاڑوں میں اس نسل کا آخری جوڑا تھا اور اپنے بچوں کو پیدا ہوتے ہی پھاڑ کھاتا تھا۔ یہ جانور اس قدر ظالم اور خونخوار ہے کہ اگر نر اور مادہ اپنی جبلتوں کی تسکین کی خاطر ایک دوسرے کے محتاج نہ ہوتے تو کوئی نہ کوئی دوسرے کو پھاڑ کھاتا!"

"تمھاری ماں نے یہ نہ بتایا ہو گا کہ مرد اور عورت بھی اسی طرح اپنی چند ضرورتوں کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں!" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" وہ سادگی سے بولی۔ "نہ مجھے کبھی یہ ضرورت محسوس کی۔"

یہ گفتگو یہیں منقطع ہو گئی کیونکہ جنگلیوں کا سالار مرنے والوں کا شمار کر رہا تھا۔ فاضل کھالیں اور نیزے جمع کر لیے گئے۔ میری حالت اور بڑھتی ہوئی سردی کے پیش نظر مجھے دو کھالیں دے دی گئیں۔ سیتا نے اپنی ہی کھال تلاش کرنے پر اکتفا کیا۔ یوں اس برفانی میدان میں سات آدمخوروں کی بھینٹ دینے کے بعد یہ کارواں آگے چل پڑا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ خطرناک پھسلواں برفانی ڈھلانوں اور تنگ پگڈنڈیوں پر بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے پڑ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پوری وادی برفانی انسان کی مادہ کی چیخوں کی مدھم سی بازگشت سے گونج اٹھتی تھی۔ شاید وہ کسی جواب کے انتظار میں کہیں دُور گھوم رہی تھی اور ابھی تک اسے علم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا ساتھی ایک سرفروشانہ مقابلے کے بعد ایک گہری کھائی میں بے جان لوتھڑے کی طرح پڑا ہوا ہے

آہستہ آہستہ دھند کے اتنے گہرے بادل اس وادی میں اُتر آئے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا دشوار ہونے لگا تو سفر کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور پورا قافلہ ایک بہت بڑی دراڑ میں شب باش ہو گیا۔

فضا میں دُور کہیں اب بھی رہ رہ کر برفانی انسان کی مادہ کی اُداس چیخیں گونج رہی تھیں۔ میرے کان ان ہی آوازوں پر لگے ہوئے تھے مگر آدمخور اب غالباً اس کے بارے میں بھول چکے تھے۔ وہ سب ہی یک رُخی سوچ کے مالک تھے۔ جب تک اس تند خو وحشی سے نبرد آزما رہے، ساری دنیا کو بھول کر صرف اسی کے بارے میں سوچتے رہے اور اب اس سے نجات پانے کے بعد وہ ان تلخ لمحوں کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔ اس وقت ان سب کے لیے پہلی ضرورت آرام کی تھی اور ان میں بیشتر دراڑ میں پہنچنے کے ذرا دیر بعد ہی گہری نیند سو چکے تھے، البتہ سیتا سے علم ہوا کہ رات بھر انھوں نے باری باری تین افراد کے ہوشیار رہنے کا انتظام کر لیا تھا۔ سیتا پر تو یہی ظاہر کیا گیا کہ اس طرح وہ بیرونی خطرات سے بروقت آگاہ ہو سکیں گے مگر ان کا اصل منشا یہ تھا کہ مجھے اور سیتا کو فرار یا ان کے نیزوں پر قابض ہونے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔

مگر میں ایک پل کے لیے بھی برفانی انسان کو نہ بھول سکا۔ اس کا تصور کسی بدروح کی طرح میرے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ بیس ہزار فٹ سے زائد بلند سرد ترین برفانی پہاڑوں کا وہ نادر الوجود عفریت مجھے ہر آن مٹیالی دھند کی چادر میں سے اُبھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر میں نے سیتا سے اسی کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ وہ اپنی ماں کے حوالوں سے میرے سوالات کے جواب دیتی رہی۔

اس گفتگو سے مجھے علم ہوا کہ برفانی انسان گوشت بہت رغبت سے کھاتا ہے مگر زندہ شکار کو کبھی نہیں کھاتا بلکہ پہلے اسے ہلاک کرتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ مُردہ خور درندوں کی ذیل میں آتا تھا اور اسی گفتگو میں مادہ کی جانب سے آدمخوروں کے اطمینان کا راز بھی مل گیا۔ وہ جب کھائی کی تہہ میں اپنے نر کی لاش دریافت کرتی تو واقعی بے حد مشتعل ہوتی مگر جب سراغ کے سہارے اوپر پہنچتی تو اسے سات انسانوں کے دریدہ اعضا برف پر بکھرے ہوئے ملتے اور یہ نعمت دریافت ہوتے ہی اس کا سارا اشتعال مسرت میں پگھل جاتا۔ وہ خوراک کھانے میں اتنی مگن ہوتی کہ اپنے نر کی موت اور اس کے انتقام کو بالکل ہی بھول جاتی

اس جانب سے تسلی ہو جانے کے بعد ویرانوں سے آنے والی آواز کی ہیبت میرے لیے بھی ختم ہو گئی اور میرا ذہن آدم خوروں سے نجات کی راہیں

تلاش کرنے لگا۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے میں نے ایک دو بار دراڑ کا چکر بھی لگایا اور تین قبائلیوں کو نیزوں کے انبار پر مستعد پایا۔

سیتا میری بے چینی کا سبب بھانپ گئی اور ایک موقعے پر بول ہی پڑی "فرار کا خیال ترک کردے۔ میں ایسی کسی کوشش میں تیرا ساتھ نہ دے سکوں گی!"

"کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں ان سے معاہدہ کر چکی ہوں اور تو بھی اس پر راضی ہو گیا تھا۔ تیری قید کے نتیجے میں انھوں نے مجھے من مانی مراعات دی ہیں اور میں وعدے کی خلاف ورزی نہیں کروں گی۔" وہ بولی۔

"خواہ وہ مجھے نذرِ آتش ہی کیوں نہ کر دیں!" میں نے قدرے غصے کے ساتھ پوچھا۔

"کیا ہرج ہے!" گہری دھند میں لپٹے ہوئے روشن اور خوبرو چہرے پر مسکراہٹ ناچ اٹھی "میری ماں کہتی تھی کہ انسان کو زبان کا پابند ہونا چاہیے۔ ان علاقوں میں سفاکی اور بربریت ضرور پائی جاتی ہے لیکن ہر شخص اپنے قول کا پکا ہوتا ہے ورنہ وہ میری بات پر کبھی اعتماد نہ کرتے۔"

"زبان کا پابند!" میں نے قدرے تلخ لہجے میں دہرایا "تم تو اپنی ماں کا تذکرہ اس انداز میں کرتی ہو جیسے وہ بدی کے اس ہجوم میں آسمانوں سے اتاری گئی تھی!"

"صفدر!" اس کا لہجہ یک بیک تیز ہو گیا "اپنی ماں کے بارے میں، میں کوئی گستاخانہ بات سننے کو تیار نہیں ہوں!"

"مگر تمھیں یاد ہے کہ تم میری گرفتاری کے بعد مجھ سے ساتھ مرنے جینے کا بھی عہد کر چکی ہو!" میں نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے وہ الفاظ یاد ہیں اور میں اب بھی ان پر قائم ہوں۔" وہ ایکبار پھر نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولی "یہ سب کچھ تیری ہی مرضی سے ہوتا آیا ہے۔ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ اگر تو اپنی قید پر آمادہ نہ ہوتا تو میں تیرے ساتھ ان کا مقابلہ کرتی اور مجھے ختم کرنے کے بعد ہی وہ تجھ پر ہاتھ ڈال سکتے۔"

"پتہ نہیں تم کیسی الجھی ہوئی باتیں کر رہی ہو!" میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا "زندگی اور موت کی جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے جب میری اور تمھاری جان پر بنی ہوئی ہے تو وعدوں کا پاس محض ایک احمقانہ سی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ تمھاری ماں ماری جا چکی ہے۔ اب ان بے رحم پہاڑوں میں تمھارے لیے کیا رہ گیا ہے۔ ایک مرتبہ ہم ان آدمخوروں کے جنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو سیدھے دھول گری روانہ ہوں گے اور وہاں سے کالی دھات کو زر بنا دینے والے پتھر لے کر مہذب دنیا میں لوٹ جائیں گے۔ وہ زندگی ... سہل اور دلچسپ ہے کہ تم ان ویرانوں کو بھول جاؤ گی۔"

وہ خاموشی سے کسی گہری سوچ میں کھوئی رہی۔

"سیتا، میری بات کا کیا جواب ہے؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"خود سے موت کو گلے لگا لینا مجھے بھی پسند نہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تو دیکھ ہی چکا ہے کہ یہ آدمخور کس قدر چالاک اور تیز ہیں۔ انھیں دھوکا دے کر تو کبھی نہ بچ سکے گا۔ یہ تیری لوکے سہارے ان پہاڑوں سے نکلنے سے قبل تجھے پھر گرفتار کر لیں گے۔ ہمیں ان کی بستی میں پہنچ کر کوئی ... اختیار کرنی ہو گی کہ یہ خود ہی تجھے جلانے کا ارادہ ترک کر دیں!"

"کیا یہ ممکن ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا

"جو میں نے سوچا ہے وہ ہو گیا تو سب کچھ ممکن ہو گا۔"

"مجھے بھی تو کچھ بتاؤ سیتا!"

"مجھے کچھ دیر تنہا چھوڑ دے صفدر!" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی "جب بھی اپنی ماں کا خیال آتا ہے میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے! برفانی انسان نے بڑی بے دردی سے اسے مارا ہو گا۔ وہ آسانی سے ہارنے والی عورت نہ تھی!"

میں دل ہی دل میں اس کی ماں کو مغلظات بکتا کھال اوڑھ کر ... پر دراز ہو گیا۔

واپسی کا سفر ان سب کے لیے تو آسان ہی تھا مگر میرے لیے ایک ایک قدم دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ مجھ پر ٹھنڈ اپنا رنگ جمانے لگی تھی۔ گلے میں سخت تکلیف شروع ہو گئی تھی، آواز بیٹھ چکی تھی، ناک ورم آلود تھی اور نتھنوں سے ہر دم پانی بہتا رہتا تھا۔ سینے پر عجیب ناقابلِ بیان دباؤ تھا جس کے باعث سانس لینے میں سینے اور پسلیوں میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔ سیتا نے میری بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر تین چار کھالیں مضبوطی کے ساتھ میرے بدن کے گرد لپیٹ کر باندھ دی تھیں مگر میری حالت تیزی سے بگڑتی ہی چلی گئی۔

واپسی کے چوتھے روز بخار نے مجھے آ لیا۔ سارا بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ میری نظریں بار بار دور دور تک جاتیں اور کیساں چوٹیوں سے ٹکرا کر نامراد واپس لوٹ آتیں۔ گو ہم لوگ برف پوش چوٹیوں سے نیچے آ چکے تھے مگر جنگلات میں بھی موسم ایسا معتدل نہ تھا کہ میں سکھ کا سانس لے سکتا۔

آخر دوپہر کے قریب پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ مجھے ایک جگہ لٹا کر وہ لوگ جنگلی پھلوں کا انتظام کرنے لگے اور اس وقت میں نے اپنے قریب موجود آدمخوروں کے چہروں پر نظر ڈالی تو دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کی نگاہوں میں عجیب وحشیانہ اور امید بھری چمک کوند رہی تھی اور وہ بار بار ندیدی نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہے تھے۔ مقدس بھاندرنا س کی بے حرمتی کرنے والے کو وہ اپنے ہاتھوں سے ہلاک تو نہ کر سکتے تھے ہاں وہ اپنی ہی موت مر جاتا تو اس کی لاش کو مالِ غنیمت کے طور پر بانٹ لینے میں شاید کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہوتی۔ وہ جب میری طرف دیکھتے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ان کی خاموش نگاہیں مجھ سے جلد از جلد مر جانے کی التجا کر رہی ہوں۔ ان کے تیز چمکیلے دانت مجھے ابھی سے اپنے جسم میں اترتے محسوس ہونے لگتے اس وقت میری حالت کسی ایسے زخمی و معذور شخص کی سی تھی جو آخری سانسوں ... کسی ویرانے میں پڑا ہو اور فضا میں کریہہ صورتوں والے گدھ بڑے بڑے پر پھڑپھڑاتے اس کی موت کے منتظر ہوں۔

"سیتا! خدا کے لیے ان سب کو یہاں سے ہٹا دو!" آخر کار میں دہشت زدہ ہو کر ہذیانی انداز میں چیخ پڑا "ان آدمخوروں سے مجھے خوف آ رہا ہے۔"

"پریشان نہ ہو صفدر۔" وہ قریب آ کر میرا تمتماتا ہوا چہرہ سہلاتے ہوئے بولی "تیری حالت جلد ہی سنبھل جائے گی۔ میرا لنگور کچھ بوٹیوں کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔"

"نہیں۔ انھیں ہٹاؤ۔" میں پوری قوت سے چیخ پڑا "یہ میری موت کی دعائیں مانگ رہے ہیں تاکہ میری لاش پر دعوت اڑا سکیں۔ ہٹاؤ ان سب کو۔"

سیتا کے چہرے پر آزردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی "یہ تیری لاش کو دانت لگانے کی بھی جرأت نہ کر سکیں گے صفدر! بھاندرنا س کے مجرموں کا گوشت کھانا ان کے دستور میں حرام ہے۔"

وہ سادہ سی پہاڑن تھی۔ باتوں کے الجھاؤ سے ناواقف! مجھے تسلی دینے کے بجائے جب مجھے اپنی لاش کے تحفظ کا دلاسہ دیا تو یک بیک میری نبضیں ڈوبنے لگیں۔ میں نے اس کی بات سے یہ مقصد اخذ کیا کہ سیتا کو بھی اب میری موت کا یقین ہو چکا ہے۔

میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دائرے سے ناچنے لگے۔ آدمخوروں کے چہرے اتنے بھیانک تر نظر آنے لگے اور میں دہشت سے چیختا ہوا بے ہوش ہو گیا۔

مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کتنے عرصے بے ہوش رہا۔ البتہ ہوش میں آتے ہی یہ معلوم ہوا کہ میرا جسم پرندوں کی طرح ہلکا ہو کر ہچکولے کھاتا آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو اوپر گہرے سرمئی بادلوں سے گھرا آسمان نظر آیا۔ میں نے تیزی سے پہلو بدلا تو فوراً ہی ساری صورتِ حال واضح ہو گئی۔ میری بے ہوشی کے دوران میں آدمخوروں نے دو طرف نیزے پرو کر میرے لیے اسٹریچر تیار کر لیا تھا اور اب مجھے اس پر ڈال کر وہ تیزی کے ساتھ منزل کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔

نرم کھال پر محسوس ہونے والے تیز ہچکولوں کے باوجود اب میرے بدن میں درد باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے حواس بحال ہونے پر سیتا کو پکارا۔ فوراً ہی بائیں جانب سے اس کا جواب آیا۔

پھر کچھ دیر کے لیے قافلہ رکا! اسٹریچر نیچے رکھ دیا گیا۔ سیتا کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ میں ڈیڑھ دن تک بے ہوش رہا ہوں۔ سیتا کے لنگور کی لائی ہوئی جڑی بوٹیوں کے اثر سے سردی کا شدید حملہ مجھے زیادہ نقصان پہنچائے بغیر ٹل چکا تھا البتہ نقاہت باقی تھی۔

"تیری حالت اب بھی اچھی نہیں ہے۔ تجھے اٹھا کر ہم تیزی سے سفر کر سکیں گے اور شاید سورج ڈھلنے سے پہلے ہی آبادی میں جا پہنچیں!" سیتا نے مشورہ دیا۔

اس کی بات معقول تھی لہٰذا یہ سفر دوبارہ اسی تیز رفتاری سے شروع ہو گیا۔ میں اسٹریچر پر ہی دراز ہو گیا تھا۔

تنگ اور دشوار گزار پگڈنڈیوں کے مقابلے میں یہ سفر میدانی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ لوگ دو تین جگہ اسٹریچر اٹھا کر دوڑنے والوں کو تبدیل کرنے کے لیے رکے ورنہ سفر کی وہی وحشیانہ رفتار برقرار رہی اور سورج کی روشنی معدوم ہونے سے قبل ہی پہاڑی پتھروں سے بنے ہوئے نیچی چھتوں والے مکانات پر مشتمل بستی کے آثار نظر آنے لگے۔

بستی کو سامنے پا کر آدمخوروں نے آواز کی پوری قوت سے ہم آہنگ ہو کر ایک نعرہ لگایا جس کے جواب میں بستی کی جانب سے تیز شور سنائی دینے لگا۔ نعروں اور جوابی نعروں کا یہ سلسلہ تیزی سے قریب ہوتا رہا۔ آخر بستی سے چند سو گز کے فاصلے پر آنے والوں نے ہمارے کارواں کو گھیر لیا۔ اسٹریچر زمین پر ڈال دیا گیا اور سارے آدمخور اپنی نامانوس زبان میں بیک وقت لپٹنے لگے۔

بستی سے استقبال کے لیے آنے والے یوں حیرت سے میرا جائزہ لے رہے تھے جیسے میں ان کے لیے کسی نایاب نسل کا عجوبہ ہوں۔ اس ہجوم میں کسی کے بھی بشرہ پر ان ساتھیوں کے لیے ذرا بھی ملال نہ تھا جو ہمالہ کے برف زار میں برفانی انسان کے غیض و غضب کا نشانہ بن گئے تھے۔

اور اس بھیڑ کا جائزہ لیتے ہوئے مجھ پر اچانک منکشف ہوا کہ سیتا گمبھیر انداز میں ان سے الگ تھلگ کھڑی ہوئی ہے مگر اس کے لنگور کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اس مقام سے مجھے بھی پیدل چلنا پڑا۔ آدمخوروں کے چرم پوش اور مسلح جمِ غفیر نے مجھے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔ وہ سب حلق پھاڑ پھاڑ کر جنون کے عالم میں کچھ گاتے جا رہے تھے۔ ان کے تیور دیکھتے ہوئے سیتا نے بھی میرے قریب آنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اس ہجوم سے الگ ہی بستی کی جانب چل رہی تھی۔

یہاں آنے کے بعد آدمخوروں کی نفری اور جوش کا مظاہرہ سامنے آیا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ ان سے براہِ راست ٹکرانا خودکشی کے مترادف تھا۔ جبکہ سیتا پر اس کی ماں کی عہد پسندی کا ضبط طاری تھا مجھے اپنی نجات کی راہیں مسدود ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

ہم بستی میں داخل ہوئے تو ہجوم کا رخ پتھر سے بنے بھونڈے مکانات کے وسط میں واقع میدان کی طرف ہو گیا۔ وہاں انھوں نے مجھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا اور میرے گرد حلقہ بند ہو کر ناچنے گانے میں مصروف ہو گئے۔ بیشتر جسموں پر اس وقت کھال بھی موجود نہ تھی۔ وہ برہنہ تن حیوانوں کی طرح خوشی سے بے خود اچھل اچھل کر ناچ رہے تھے۔

پھر یہاں دف کی آواز سنائی دی۔ دو آدمیوں کے سامنے وہ بدوضع نقارہ موجود تھا جسے کسی بڑے تنے کو کھوکھلا کر کے اور اس پر کھال منڈھ کر تیار کیا گیا ہو گا۔ وہ دونوں آدمی بھونڈے انداز میں لکڑیوں سے وہ نقارہ

پیٹنے لگے۔

اسی شور و غل میں اچانک کہیں سے لنگور کی چیخ سنائی دی۔ قبائلی اپنی دھن میں اتنے مگن تھے کہ انھوں نے اس آواز پر غور ہی نہ کیا البتہ میں نے سیتا کو چونکتے اور تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوتے دیکھا۔ یہ موڑ گو میرے لیے غیر یقینی تھا مگر مجھے محسوس ہوا کہ شاید سیتا لنگوروں کی مدد سے ان پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس مقصد کی خاطر اس نے راستے ہی سے اپنے قدآور لنگور کو کھنڈرات کی طرف روانہ کر دیا ہوگا اور اب لنگوروں نے اسے اپنی تیاری کی اطلاع دی ہوگی۔

خوشی سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مجھے اپنے گرد ناچتے گاتے ہوئے آدم خور فاترالعقل اور کمزور مویشیوں کا ریوڑ نظر آنے لگے!

وقت گزرتا رہا۔ میری نگاہیں سیتا کی راہ تکتے تکتے پتھرانے لگیں مگر وہ واپس لوٹی۔ نہ ہی لنگوروں کا کوئی غضب ناک ہجوم میری گلو خلاصی کے لیے وہاں حملہ آور ہوا۔

اور جب اندھیرا پھیلنے لگا تو آدم خوروں نے ناچنے گانے کا سلسلہ آہستہ آہستہ ختم کر دیا۔ مجھے گرفتار کرنے والی جماعت کا سپہ سالار ہی شاید اس قبیلے کا سربراہ تھا کیونکہ اس نے بڑھ کر مجھے کھول دیا اور سب لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

اس کے خاموش ہوتے ہی سارے آدم خور اپنی اپنی راہ پر ہو لئے اور چار تنومند اور چاق و چوبند قبائلی نیزوں کے بل پر مجھے ایک طرف ہانکنے لگے۔ سردار بھی ان کے ساتھ ہی تھا!

میری توقع کے خلاف وہ لوگ مجھے لے کر بستی سے باہر نکل آئے اور ناہموار میدان میں ایک طرف چلنے لگے۔ سیتا کے یوں اچانک چلے جانے کے بعد نفسیاتی طور پر میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا لہٰذا بے چون و چرا ان کے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد فضا میں کسی چیتے کی دبی دبی غراہٹ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ میری حیرت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ وہ ہولناک منظر میری آنکھوں کے سامنے آ چکا تھا!

یہ اس آدم خور قبیلے کی عورتوں کا اذیت ناک قید خانہ تھا جو کھلے آسمان تلے دوہرے حصار کے درمیان قائم تھا۔ دونوں حصاروں کے درمیان بہت سے دیو ہیکل، بھوکے درندے غراتے ہوئے گھوم رہے تھے اور ان سے اندر کی جانب عورتوں اور بچوں کی کافی بڑی آبادی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ درندوں میں محصور عورتیں اور بچے اب اس ماحول کے عادی ہو چکے ہیں کیونکہ اندر سے کوئی بھی خوف زدہ آواز نہیں سنائی دے رہی تھی ہاں کبھی کبھار بچوں کے رونے کی آوازیں ضرور ابھرتی تھیں ورنہ عورتوں کی بول چال کی بھنبھناہٹ گونجتی رہتی۔ زندگی بسر کرنے کا اتنا بھیانک تصور اب تک میری نظروں سے نہ گزرا تھا۔ اگر اس جگہ کا کوئی قیدی ذرا سی بے احتیاطی کے باعث اندرونی حصار کے قریب جا پہنچتا تو بھوکے جنگلی درندے جال کے درمیان سے تھوتھنی نکال کر بآسانی اسے اپنے جبڑوں میں دبوچ سکتے تھے۔

اس قید خانے کے قریب ہی پتھروں کا ایک چوکور اور بہت اونچا چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر چھپر کے نیچے ایک مشعل کی لو بھڑک رہی تھی اور اس روشنی میں چند چرم پوش سامنے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے ہماری ہی جانب تھے!

اچانک اس چبوترے سے ایک کڑک دار آواز گونجی شاید وہ لوگ اس اجتماعی قید خانے کے محافظ اور درندوں کے رکھوالے تھے۔ جواب میں مجھے لے کر آنے والے سردار نے ان سے کچھ کہا اور وہ چرم پوش سائے چبوترے کے پہلو میں پتھروں کی بنی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتے نیچے اتر آئے

سردار نے چند لمحوں کی گفتگو کے بعد مجھے ان خوفناک رکھوالوں کے حوالے کر دیا اور خود اپنے آدمیوں سمیت وہاں سے واپس لوٹ گیا۔

قید خانے کے محافظ اپنی نگرانی میں مجھے ہمراہ لے کر گھونڈی سیڑھیاں طے کرتے بیس فٹ سے زائد بلند اس چبوترہ پر جا پہنچے۔ یہاں چھپر کے نیچے رک کر میں نے ایک نگاہ اس کھلی جیل پر ڈالی اور میرا رواں رواں کانپ اٹھا!

رسوں، شہتیروں اور چٹانوں پر مشتمل اندرونی حصار کئی سو گز قطر کے بے ہنگم دائرے کی صورت میں دور تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے وسط میں عورتوں کی آبادی تھی یہاں سینکڑوں عورتوں کو نہ سر چھپانے کو سایہ میسر تھا نہ ہڈیوں میں اتر جانے والی یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لئے کوئی کھال یا کپڑا۔ ان کے بال پاگلوں کی طرح بکھرے اور الجھے ہوئے تھے۔ ان ہی کے درمیان ہر عمر کے بچے پتھریلی زمین پر پڑے ہوئے کلبلا رہے تھے یا شیر خوار بچے اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹے زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اندرونی حصار کے بعد کم از کم چار یا پانچ گز کی راہداری چھوڑ کر دوسرا حصار پھیلا ہوا تھا جو اس چبوترے کی اندرونی دیوار سے بالکل ملا ہوا تھا اور اس درمیانی جگہ میں بہت سے تاریک دھبے ٹہلتے پھر رہے تھے۔ ان چوپایوں کی غراہٹوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ وحشی ہیں!

مجھے زیادہ دیر اس قید خانے کا جائزہ لینے کا موقع نہ مل سکا۔ ایک محافظ نے مجھے ٹھوکا دیا اور مجھے فوراً ہی آگے بڑھنا پڑا!

اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ میں اس وقت پتھروں کے کسی بلند چبوترے پر نہیں بلکہ ایک وسیع کمرے کی چھت پر ہوں جہاں

پر ایک مختصر سا چوکور خلا موجود تھا جس کا مصرف اس وقت سمجھ میں آیا جب ایک محافظ نے اس میں ایک مضبوط رسی لٹکا کر مجھے اندر اترنے کا تحکمانہ اشارہ دیا۔ اس رسی میں ایک ایک فٹ کے فاصلہ پر بڑی بڑی گانٹھیں لگی ہوئی تھیں!

میں نے ایک بار رحم طلب نظروں سے محافظوں کی طرف دیکھا مگر ان سب کے تیور خطرناک تھے۔ مجبوراً میں ان گرہوں کو اپنے پیر کے انگوٹھوں اور انگلیوں کی گرفت میں لیتا نیچے اترنے لگا۔ ایک محافظ اوپر سے جھانک کر میری نگرانی کر رہا تھا!

جوں ہی میرے قدم زمین پر ٹکے وہ رسی اوپر کھینچ لی گئی ساتھ ہی محافظوں کے چہرے بھی غائب ہو گئے۔ اب اس چھت کے سوراخ سے آسمان نظر آ رہا تھا!

میں نے اب اپنی نئی قیام گاہ کا جائزہ لیا۔ یہ پہاڑی پتھروں سے بنا ہوا ایک مستطیل نما کمرہ تھا جس کے اوپر درختوں کے تنے ڈال کر چھت ڈالی گئی تھی۔ کمرے کی تین دیواریں تھیں جو چھت تک بالکل سپاٹ تھیں۔ ان بیس فٹ بلند دیواروں میں کہیں کوئی روزن تک موجود نہ تھا۔ چوتھی سمت زمین سے اوپر تک کوئی دیوار نہ تھی بلکہ زمین میں موٹے موٹے شہتیر گڑے ہوئے تھے۔ جو بیرونی حصار کا ایک حصہ تھے گویا اس کمرے سے نکاسی کے دو ہی راستے تھے۔ یا تو چھت والا سوراخ ورنہ شہتیروں کا درمیانی خلا!

شہتیروں کی دوسری جانب نکلنے کا مطلب یہی تھا کہ خود کو خونخوار درندوں کے بھٹ میں پہنچا دیا جائے جبکہ اوپر مسلح نگراں موجود تھے!

شہتیروں کے اس پار سے ہوا کے ساتھ سخت تعفن کے جھونکے آ رہے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس جانب گوشت وغیرہ سڑ رہا ہے!

میں نے ایک بار شہتیروں کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ انہیں گرا کر کوئی جانور میری اس نئی قیام گاہ میں نہ گھس سکے گا۔ شہتیروں اور رسوں کے درمیان اتنی جگہ تو تھی کہ مجھ جیسے بدن والا کوئی انسان کسی نہ کسی طرح اس پار نکل سکے مگر کسی قوی ہیکل جانور کا ان میں سے گزرنا بعید از قیاس تھا!

زمین پتھریلی اور ناہموار تھی۔ اس پر خشک گھاس اور پتوں کی ایک دبیز تہہ بچھی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں سمیٹ کر ہوا سے محفوظ ایک گوشہ میں پیال بنایا۔ ایک کھال اس پیال پر بچھائی اور بقیہ تین کھالیں اپنے بدن پر لپیٹ کر وہیں دراز ہو گیا۔

پہاڑی خانقاہ کے دو طرفہ سفر پھر بیماری کی تھکان سے میری حالت بہت خراب تھی۔ طویل بے ہوشی بھی میری تھکان کے اثرات کو زائل نہ کر سکی تھی۔ تمام تر خوف اور پریشانی کے باوجود مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

اسی نیم بیداری کے عالم میں مجھے اپنے بہت قریب کسی چیتے کی غصیلی غراہٹ سنائی دی اور میں خوف سے گھگھیاتا بیدار ہو گیا۔ حصار کی جانب گڑے ہوئے شہتیروں کے درمیان سے دو بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں میری طرف نگراں تھیں پھر اسی کے پہلو میں مزید دو آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ چیتے اپنے قریب کسی اجنبی کی بو پا کر قدرے مشتعل سے تھے وہ کچھ دیر وہیں کھڑے غراتے رہے پھر ان کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں! اس کے بعد میں کوشش کے باوجود ایک پل بھی نہ سو سکا۔ رہ رہ کر میرا خیال سیتا کی طرف جاتا تھا نہ جانے وہ کس پریشانی سے دوچار ہو چکی تھی

اور جب اجالا پھیلا تو میں ڈرتے ڈرتے شہتیروں کے قریب جا کھڑا ہوا اور کھلے قید خانے کا نظارہ کرنے لگا۔ آدم خوروں نے اپنی عورتوں کے لیے قید خانے کا انتخاب خاصی معقولیت کے ساتھ کیا تھا کیوں کہ حصار کے تقریباً وسط میں پانی چمک رہا تھا شاید وہ کسی پہاڑی چشمے یا نالے کی گزرگاہ تھی جس سے وہاں کے قیدی اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہوں گے۔ چشمے کے قریب ہی دو کافی بڑے سرسبز قطعات بھی نظر آتے۔ وہاں پودوں کے علاوہ کافی تناور درخت بھی موجود تھے۔ شاید ان سے قیدیوں کو پھل اور سبزیاں میسر آ جاتی ہوں گی لیکن ان کی تعداد اتنی ہرگز نہ تھی کہ سارے قید خانے کے لئے کافی ہوتی!

دوپہر کے قریب مجھے اپنے کمرے کی چھت پر نقل و حرکت کی غیر معمولی آوازیں سنائی دیں۔ اسی کے ساتھ چیتوں کی غراہٹیں شہتیروں کے آس پاس سمٹ آئیں۔ میں خوفزدہ ہو کر اپنے بستر میں دبک گیا پھر اوپر سے شاید حصار میں چیتوں کے لئے خوراک گرائی جانے لگی۔ کیوں کہ وہ تیز اور بھوکی غراہٹوں کے ساتھ بار بار ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے!

اسی کے ساتھ عورتوں اور بچوں کا شور بھی اسی طرف سمٹ آیا۔ ان کی آوازوں سے بھی یہی قیاس ہوتا تھا کہ قید خانے کے محافظ ان کے لئے بھی رسد پھینک رہے ہیں!

اسی روز شام کے وقت چھت کے خلا سے مجھے سیتا کی آواز سنائی دی۔ میں نے بے یقینی کے عالم میں سر اٹھایا تو وہ اوپر جھکی ہوئی مجھے پکار رہی تھی۔

"سیتا۔۔۔ تم کہاں رہ گئی تھیں؟" میں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"اس وقت سردار میرے ساتھ ہے۔ ان لوگوں نے بمشکل مجھے تجھ سے ملنے کی اجازت دی ہے۔ میں تجھے ایک بڑی خوش خبری سنانے آئی تھی۔" وہ واقعی بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔

"کیا میری رہائی کی کوئی صورت نکل آئی؟"

"اس سے بھی بڑی خبر ہے وہ۔ میری ماں زندہ ہے!"

اور یک بیک میرے بدن میں انگارے چٹخنے لگے۔ سیتا کے لئے روئے زمین پر اپنی ماں سے بڑھ کر کوئی شے نہ تھی۔ میں قید و بند کی صعوبتوں میں گھرا اپنی چتا روشن ہونے کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا تھا اور ایسی حالت میں وہ مجھے اپنی ماں کی زندگی کی نوید یوں سنا رہی تھی جیسے اس کے زندہ ہونے سے کائنات کا انتشار یکسر بدل کر رہ جائے گا۔

"سیتا۔ یہ مذاق ختم کرو۔" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "تمھاری ماں کی زندگی واقعی خوشی کی بات ہے مگر اس سے مجھے رہائی تو نہ مل جائے گی۔"

"پہلے پوری بات سن لے۔" وہ تیزی کے ساتھ بولی۔ "جس دن تیرے ساتھ پہاڑی خانقاہ کی طرف روانہ ہوئی تھی، میری ماں اس کے دوسرے دن ہی مجھ سے ملنے آئی تھی۔ میرے لنگوروں نے اسے ساری کہانی سنا دی۔ میری ماں آدم خوروں کی مقدس تلوار دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور جاتے ہوئے وہ تلوار ساتھ لے گئی۔ یہ بتائے بغیر وہ کہاں گئی ہے مگر واپسی پر ادھر ہی آئے گی!"

"کیا یہ آدم خور تم سے مقدس تلوار دکھانے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

"نہیں۔ میں نے ابھی تک ان پر اپنا حکم چلانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ جب بھی میں ایسا کروں گی یہ مجھ سے میرا اختیار پوچھیں گے اور اس وقت مجھے مقدس تلوار دکھانی ہوگی ورنہ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ اوپر سے بولی۔

"یعنی اب مجھے تم سے کسی مدد کی توقع نہ رکھنی چاہیے؟" میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"تجھے مایوسی میں کوئی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے غصیلے لہجے میں مجھے ڈانٹا۔ "اس قید خانے کے ساتھ ہی بھوکے درندوں سے بھرا حصار ہے اور اوپر اس قید خانے کے سفاک نگراں موجود ہیں جن کے نشانے اندھیرے میں بھی خطا نہیں ہوتے!"

"مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔" سیتا کی جانب سے اب مجھ پر بیزاری طاری ہو چلی تھی۔ "تھوڑی دیر پہلے ہی ان درندوں میں خوراک تقسیم کی گئی ہے۔ اگر میں نگرانوں کو دھوکا نہ دے سکا تو ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے بہتر ہوگا کہ درندوں کے درمیان سے گزر کر باہر نکلنے کی کوشش کر دوں!"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" سیتا اس بار غرائی۔ "ان جانوروں کو کبھی شکم سیر نہیں ہونے دیا جاتا اور اندر ان کی عورتیں بھی ہر وقت بھوکی رہتی ہیں۔ ان میں ایک دن کے وقفے سے منوں گوشت تقسیم کیا جاتا ہے جو بستی والے جنگلوں سے شکار کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔"

"خدا کے لئے اب تم چلی جاؤ۔" میں جھلاہٹ اور بے بسی کے ساتھ بولا۔ "اپنی ماں کے علاوہ تم کسی کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچ سکتیں!"

"میرا دل کہتا ہے کہ وہ جلد ہی آئے گی اور تیری رہائی کا سبب بنے گی!" سیتا پرجوش لہجے میں بولی۔

"وہ تجھے بھی ...... بہتے ہوئے کوئلوں کو ضرور ...... کرا لے گی۔" میں طنزیہ لہجے میں یہ کہتے ہوئے دل ہی دل میں کانپ ......

پھر سیتا وہاں سے لوٹ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اوپر سے ایک رسی کے ذریعے مٹی کا بڑا سا برتن میرے کمرے میں لٹکا دیا گیا۔ ساتھ ہی اوپر سے کسی نے چیخ کر مجھ کو کوئی ہدایت دی۔ میں اس کی بات تو نہ سمجھ سکا۔ البتہ جھپٹ کر برتن تک جا پہنچا۔ وہ تازہ اور شفاف پانی سے لبریز تھا۔ میں نے برتن سے بندھی ہوئی رسی کھول دی جسے اوپر کھینچ لیا گیا۔ موسم سرد ضرور تھا لیکن میں پچھلے کئی گھنٹوں سے پانی کی حاجت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس بڑے برتن سے چلوؤں کے ذریعے اپنی پیاس بجھائی اور خوراک کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ جو لوگ مجھے پانی فراہم کر سکتے ہیں وہ میری بھوک سے بھی غافل نہ ہوں گے!

وہ میرا خیال درست ہی ثابت ہوا۔

تھوڑے وقفے کے بعد اوپر سے رسی دوبارہ لٹکائی گئی۔ میں بڑی امید کے ساتھ اس کی طرف لپکا مگر اس میں بندھی ہوئی کسی پہاڑی بکرے کی کچی ران دیکھتے ہی کراہت سے ابکائی آ گئی۔ وہ ران کھال سمیت جانور کے جسم سے کاٹ لی گئی تھی۔ خون کی سرخی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ران کسی تازہ شکار ہی کے ذریعے حاصل کی گئی ہے۔ میں رسی کے قریب سے ہٹ گیا۔

اوپر والوں میں سے کسی نے مجھ سے پھر کچھ کہا مگر یہ خوراک میرے لئے ناکارہ تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشاروں سے انہیں وہ ران واپس کھینچ لینے کو کہا اور قدرے توقف کے بعد رسی دوبارہ اوپر کھینچ لی گئی۔

شدید بھوک کے آزار میں مبتلا تین دن وہاں قید رہا۔ پانی کے کثرت استعمال سے آنتیں بھی جواب دینے لگیں جس کا نتیجہ ہے میں نے پانی کا استعمال بھی ترک کر دیا۔

چوتھے روز گانٹھوں والی رسی میرے کمرے میں لٹکائی گئی اور خاصی دقت کے بعد وہ آدم خور قبائلی مجھے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئے کہ اب مجھے اس قید خانے سے باہر نکلنا ہے!

اوپر پہنچنے کے چند ہی لمحوں بعد مجھے پتہ چل گیا کہ یہ سارا اہتمام کس لئے کیا جا رہا ہے۔ اس چبوترہ کے سامنے پھیلے ہوئے میدان میں بے شمار قبائلی موجود تھے اور ایک جگہ لکڑیوں کا بہت بڑا انبار جمع کر رہے تھے۔ ان کی تیاریوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری زندگی کا آخری دن ثابت ہونے والا ہے!

قید خانے کے محافظوں نے بلند آہنگ ...... کے ساتھ میری پریشانی سے لطف اٹھایا پھر پتھروں کی چھت پر بنے ہوئے چھجے میں میرے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے اور مجھے اس زاویے سے بٹھایا گیا کہ میں کھلے میدان میں ہونے والی ساری کارروائیاں دیکھتا رہوں!

مجھ سے فارغ ہو کر محافظوں نے ایک کھال میں بندھا ہوا کچا گوشت نکالا اور بڑے آسودہ انداز میں اسے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں اور دانتوں سے کھال اور ہڈیاں نوچ کر گوشت کھا رہے تھے۔ ایک آدھ بار انھوں نے اشارے سے مجھے بھی کھانے کی دعوت دی مگر میں نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔ کھانے سے نمٹ کر انھوں نے بچی کھچی ہڈیاں وغیرہ درندوں والے حصار میں پھینک دیں اور چھت پر لیٹ کر سستانے لگے۔ میری جانب سے وہ بالکل مطمئن نظر آ رہے تھے!

یہ شاید ان سب ہی کے کھانے کا وقت تھا کیوں کہ خشک لکڑیاں جمع کرنے والوں کی تعداد بھی تیزی سے گھٹتی جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سناٹا چھا گیا۔

خاصی دیر بعد مشرقی سمت سے خچروں پر سوار قبائلیوں کا ایک ہجوم اس طرف آتا ہوا نظر آیا۔ ان کے زردی مائل سفید چہروں پر رنگین مٹی سے عجیب و غریب نقوش بنے ہوئے تھے۔ جسموں پر کھالیں خاص قرینے سے لپیٹی گئی تھیں۔ چند خچروں پر کچھ ساز و سامان بھی لدا ہوا تھا۔

تندرست پہاڑی خچر اسی علاقے میں چھوڑ دیئے گئے۔ بستی کا سردار پتھر کے کمرے کی چھت پر چڑھ آیا۔ اس نے پوری توجہ سے میرے جسم کا جائزہ لیا پھر مجھے کھول دیا گیا۔ نیچے موجود قبائلی خچروں سے اتارے ہوئے چوبی ڈرم نیچے رکھ رہے تھے۔ یہ ڈرم بھی درختوں کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور ان میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔

سردار کے اشارے پر قید خانے کے محافظ مجھے لے کر نیچے اتر گئے اور میدان میں موجود آدم خوروں نے تیز نعروں کے ساتھ مجھے اپنے نرغے میں لے لیا۔

پھر ڈھول پر پہلی چوٹ پڑی۔ قبائلیوں نے مٹی کے ڈونگوں میں چوبی ڈرموں میں سے شراب نما سیال نکال کر اپنے معدوں میں انڈیلا اور نقارہ کی چوٹ پر دھیمے دھیمے میرے گرد ناچنے لگے۔ قید خانے کے محافظ سیدھے لکڑیوں کے انبار کی طرف گئے اور اس طرف سے دھوئیں میں لپٹے ہلکے ہلکے شعلے نظر آنے لگے!

تھوڑی ہی دیر میں سورج ڈھل گیا مگر اس وقت تک لکڑیوں کے الاؤ نے آگ پکڑ لی تھی۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے سائے میں وہ سب ناچے جا رہے تھے۔ شعلوں کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں اُن کے رنگے ہوئے چہرے آسیبی ہیولوں کی مانند نظر آ رہے تھے!

میں ساکت و صامت ان کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ میری زندگی کے چند آخری سانس باقی رہ گئے تھے۔ مجھے ذرا بھی امید نہ تھی کہ اب میں آگ کے شعلوں سے بچ سکوں گا!

رفتہ رفتہ ان کے معدوں میں اترنے والا سیال رنگ دکھا رہا تھا۔ ان کی آوازیں بلند آہنگ ہوتی جا رہی تھیں۔ رقص میں جنون کا انداز نمایاں ہو چلا تھا۔ ڈھول کی آواز میں بھی مہیب گونج پیدا ہو گئی تھی

اور میں اپنی ہلاکت کے اس جشن کا شاہد تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا جو میری زبان سمجھتا۔ سینکڑوں کے اس ہجوم میں کسی کو مجھ سے ذرہ برابر ہمدردی نہ تھی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ آنتیں بری طرح بل کھا رہی تھیں۔ موت سے پہلے ہی میں خود کو عالمِ نزع میں محسوس کرنے لگا تھا!

پھر آسمان پر چاند ابھر آیا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ کھلے میدان اور محصور قید خانے میں ہر طرف پھیکی چاندنی کا سوگوار فسوں پھیل گیا تھا۔ یہ وہی رات تھی جب بستی کے مرد دوہرے حصاروں میں راستہ بنا کر کھلے قید خانے میں محصور عورتوں پر جا پڑتے تھے۔ پھر آج تو ان کے لئے دوہری خوشی کی رات تھی۔ پہلے وہ بھاندرناس کو چھونے والے اجنبی کو بھڑکتے الاؤ میں جھونکتے، اس کے بعد نشے میں ڈوبے اپنی عورتوں میں جا پہنچتے۔ میں شعلوں میں جھلس کر چیخ رہا ہوتا اور وہ اپنی عورتوں کو دبوچے مخمور قہقہے لگا رہے ہوتے پھر جب ان کی سرمستیاں دم توڑ جاتیں اور وہ قید خانے سے باہر آتے تو اس وقت تک ان کا مجرم الاؤ میں جل کر کوئلہ ہو چکا ہوتا!

رقص و سرور کا یہ ہنگامہ چند لمحوں کے لئے اس وقت برہم ہوا جب درندوں کی گزرگاہ کے درمیان جال باندھ کر اندر پہنچنے کا راستہ بنایا جانے لگا۔ خونخوار درندوں نے دہاڑتے ہوئے ان کوششوں پر احتجاج کیا، ناچنے والی ان آوازوں پر چند ثانیوں کے لئے بھڑکے پھر ان کے قدم اسی جوش و خروش سے اٹھنے لگے!

الاؤ کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ لکڑیاں چیخ چیخ کر انگاروں میں بدلتی رہیں اور جب الاؤ کے شعلے ہر طرف پھیل گئے تو آخری چوٹ کے بعد نقارہ کی آواز دم توڑ گئی اور پتھروں والے کمرے کی چھت پر موجود سردار نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا!

ساری آوازیں دم توڑ گئیں مگر اس سے پہلے کہ سردار کچھ کہتا، ہجوم کے عقب میں کوئی عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا کیونکہ سردار کی نگاہیں اسی طرف اٹھ گئی تھیں پھر سب لوگ اسی طرف دیکھنے لگے ان کی نگاہوں میں حیرت کی جھلکیاں تیر رہی تھیں۔

آخر آنے والی ان کے درمیان پہنچی تو میرا جی چاہا کہ خوشی سے دیوانہ وار رقص شروع کر دوں سیتا بدن پر ایک چیتے کی ..... دھاری دار کھال سجائے بڑی تمکنت کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں قبائلیوں کی مقدس تلوار اٹھی ہوئی تھی۔ تلوار پر نظر پڑتے ہی سارے قبائلی عقیدت کے ساتھ زمین پر سجدہ ریز ہوتے چلے گئے!

جونہی وہ سجدے میں گرے میری نگاہ سیتا کے عقب میں آنے والی عورت پر پڑی اور میں حیران رہ گیا مگر میری نگاہیں تجربہ کار تھیں۔ ان دونوں میں غیر معمولی مشابہت ہونے کے باوجود میں پہچان گیا کہ پیچھے آنے والی سیتا ہے اور آگے آنے والی تلوار بردار عورت اس کی ماں۔

وہ دونوں چند ہی منٹ میں میرے قریب آ پہنچیں۔ سیتا کی ماں کا چہرہ سرخ و سفید اور شگفتہ تھا مگر اس پر پاکیزگی کا جلال بھی نمایاں تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے ممتا کی چمک کوند رہی تھی۔ قریب آ کر وہ رک گئی۔

"تیرا نام کیا ہے بیٹے؟" اس نے رس گھولتی آواز میں سوال کیا۔

"صفدر!" میں نے کہا۔

یہ نام اس نے حیرت سے سنا۔ اس کی آنکھیں قدرے کشادہ ہو گئیں اور وہ بولی۔ "سیتا تیرا نام بھول گئی تھی۔ کہاں سے آیا ہے تو؟"

"دربدر کی خاک چھانتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب تو وطن کا تصور تک اجنبی معلوم ہونے لگا ہے۔" میں نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اس عورت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سیتا کو آگے بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔ اور جب وہ کچھ دور نکل گئی تو وہ میرے قریب آ کر ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ "تو میری بچی کے ساتھ دغا تو نہیں کرے گا صفدر؟"

"میں نے ابتک اس کا احترام کیا ہے۔" میں نظریں جھکا کر بولا "میں اس کی زبانی تمہاری داستان سن چکا ہوں۔ مگر یہ بتاؤ کہ کیا تم اندرام کی بیٹی ہو؟"

"خاموش!" وہ بے چین ہو کر تیزی سے بولی۔ "اندرام یہی جانتا ہے کہ پنڈتوں کے چنگل سے بچائے جانے کے بعد سے اس کی لڑکی پارسائی کی زندگی گزار رہی ہے اور بھگوان جانتا ہے کہ یہ سچ ہے۔" یک بیک اس کی آواز بھرانے لگی۔ "میں نے ان ویرانوں میں زندگی کا آخری فریب کھایا اور سیتا کی بن بیاہی ماں بن گئی مگر انیس برس سے میں نے یہ راز اپنے پتا سے چھپایا ہے۔ سیتا بھی نہیں جانتی کہ اس کا نانا سال میں ایک بار اس کی ماں سے ملنے ان ویرانوں میں آتا ہے۔ میں نے اندرام کے سیتا وادی میں سالانہ قیام ہی کی وجہ سے لڑکی کا نام سیتا رکھا ہے اور اسی راز کو چھپانے کی خاطر بیٹی سے دور برفانی پہاڑوں میں رہتی ہوں ...... اندرام نے مجھے تیرے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ سیتا کے ساتھ میری خانقاہ کی طرف جانے والا تو ہی ہو سکتا ہے۔ میں تجھے بچانے کی خاطر خود اس آگ میں کود پڑوں گی۔ مگر اس کے عوض تجھ سے رازداری کا عہد چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اندرام کو کبھی سیتا کے وجود کا علم نہ ہونے پائے۔ میرا باپ بہت دکھی انسان ہے۔ یہ خبر اس کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ اس نے محض میری آبرو کی خاطر بہت کٹھن زندگی اختیار کی ہوئی ہے۔ میرے انتقام کی آگ آج بھی اس کے وجود میں روشن ہے۔ میں اسے مزید دکھ پہنچانا نہیں چاہتی۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر تمہارا نام کیا ہے؟"

"سندری!" وہ بولی اور مجھے احسانمندانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اندرام کی زندگی کے اسرار ہمالہ کے ان پہاڑی ویرانوں میں بھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ جیتی جاگتی زندگی کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ شروع سے آخر تک سب کچھ ایک پُراسرار خواب معلوم ہو رہا تھا۔

سندری کے بڑھتے ہی سیتا میرے پاس آ پہنچی۔ "ماں کیا کہہ رہی تھی؟" اس کی آواز سے شوق اور پیار پھوٹا پڑ رہا تھا۔

"مجھے تسلی دے رہی تھی۔"

"تو اس میں مجھے ہٹانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ منہ بنا کر بولی۔

"تیری ماں ابھی تک تجھے شیرخوار بچی سمجھتی ہے۔" میں نے پہلی بار اسے تو کہہ کر مخاطب کیا۔

"وہ اب ایک بڑا تماشا کرنے والی ہے۔" سیتا مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "ہم نے ادھر آتے ہوئے الاؤ میں بھاندرناس کے ٹکڑے بھی ڈال دیئے ہیں۔ ابھی وہ تلوار کے بل پر اپنی سرداری اور الاؤ میں بھاندرناس کی موجودگی کا اعلان کرے گی تو یہ سب پاگل ہو کر آگ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ الاؤ میں بھاندرناس کی موجودگی انہیں بوکھلا کر رکھ دے گی اور الاؤ فوراً ہی بجھا دیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ سمجھیں کہ ان کے دیوتاؤں کو تیری بھینٹ قبول نہیں ہے لہٰذا وہ تجھے رہا کر دیں۔"

اس وقت تک سندری پتھریلے کمرے کی چھت پر جا پہنچی تھی۔ سردار نے سجدے میں گر کر اسے تعظیم دی۔ پھر وہ میدان سندری کی آواز سے گونجنے لگا۔ سجدے میں گرے ہوئے قبائلی اس کے حکم پر زمین سے اٹھ چکے تھے۔ سندری تلوار لہرا لہرا کر پُرجوش آواز میں ان سے کچھ کہتی رہی اور اچانک سارے مجمع پر ہراس طاری ہونے لگا۔ ان کا پرانا سردار چھت سے اتر کر الاؤ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ سب بھی سراسیمگی کے عالم میں اس کے ساتھ ہو لئے۔

پھر شاید انہیں خشک لکڑیوں کے انبار میں مقدس بھاندرناس نظر آ ہی گئی اور وہ سب آگ بجھانے کی سر توڑ کوششیں کرنے لگے۔

"یہاں تک تو ترکیب کارگر ہی رہی اب نہ جانے کیا ہوتا ہے۔" میں نے سیتا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"میری ماں بہت ہوشیار ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ تیری رہائی کا سبب بن کر آئے گی۔ اب دیکھ کہ میں ہر بات سچ ہی کہتی ہوں۔"

وہ کئی گھنٹے تک آگ سے لڑتے رہے۔ کئی قبائلی بری طرح جھلس بھی گئے۔ مگر وہ آگ بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ کسی طرح اسے سرد نہ کر سکے البتہ بھاندرناس کے جو ٹکڑے انہیں نظر آ سکے وہ انہوں نے آگ سے باہر نکال لئے اور چہرے لٹکائے واپس اسی میدان میں لوٹ آئے۔

"اب ماں تیرے بارے میں دریافت کر رہی ہے۔" سندری کے بولنے پر سیتا نے بتایا۔

بہت سے جنگلی بیک وقت بولنے لگے اور میں نے دیکھا کہ سیتا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔ وہ اچانک بہت زیادہ گھبرا گئی تھی۔

"کیا بات ہے سیتا؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"یہ کہتے ہیں کہ مقدس بھاندرناس نے اپنے مجرم کی بھینٹ لینے سے انکار کر دیا ہے لہٰذا اب یہ سب تجھے پھاڑ کھانے میں حق بجانب ہوں گے۔"

"اب میرا کیا بنے گا؟"

"تجھے فکر کی ضرورت نہیں۔ میری ماں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار ہو کر آئی ہے۔ مگر اب یہاں بھیانک بربادی منڈلا رہی ہے۔" اس نے مجھے تو دلاسا دینے کی کوشش کی تھی مگر خود اس کی آواز میں تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

اور اس وقت اچانک میرے ذہن پر اداسی طاری ہو گئی۔ میرا تابناک ماضی تصویر کی طرح میری نظروں میں گھوم گیا۔ میں ایک آسودہ، تجارت پیشہ گھرانے کا لاڈلا فرزند تھا۔ تعلیمی ماحول میں آوارہ لڑکوں کی ہم نشینی نے مجھے اس قدر گستاخ بنا دیا کہ میں سب گھر والوں کا معتوب ہو گیا۔ میرے والد کو یہ صدمہ نگل گیا۔ میں ہر چیز سے عاق کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ میرے تمام خوشامدی دوستوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور میں اپنی جنم بھومی لاہور کو خیرباد کہہ کر شہر خرابات آ پہنچا۔ کراچی نے مجھے دولت کمانے کے آسان گر سکھائے۔ پھر یہاں مال گنوانے کے سہل ذرائع بھی سامنے آتے چلے گئے۔ کچھ مقدر کی گردش، کچھ چڑھتے خون کی ترنگ ـــــ میری خوشحالی پر قدرت نے جلد ہی مہر لگا دی۔ اور میں بے گھر ہو کر سڑکوں پر نکل آیا اور اس تنگ دستی و روپوشی کے دوران مجھے وہ شخص ملا جس کی وجہ سے آج میں ہزاروں میل دور ہمالہ کے سرد کوہستانوں میں آدم خوروں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر اس وقت مجھے لیاقت آباد والا جمال سنیاسی نہ ملا ہوتا، اگر میں نے سینما سے ملحق تنگ و تاریک اور پُراسرار گلیوں میں اس کے ساتھ سونا نہ بنایا ہوتا تو بھاندرناس کی طلب مجھے یوں رسوا نہ کرتی۔ جمال کیمیاگر تو اپنی زندگی ناکام حسرتوں میں

گزار کر ڈھاکہ کے طبیب مدراسی نامی خبطی کے ہاتھوں مارا گیا اور میں مصنوعی سونے کو بھانپ نہ سکا۔ اس کا آخری تاؤ دے کر اصل سونا بنانے کے چکر میں دربدر ہو گیا۔ میری زندگی کی ابتدا فرار سے ہوئی، گھر سے، شہر سے، وطن سے، دوستو سے، قانون سے، جیلوں سے اور نہ جانے کہاں کہاں سے فرار ہوتا ہوا اب میں اس چوہے دان میں آ پھنسا تھا۔ شاید میری موت ان ہی وادیوں میں لکھی گئی تھی جو میں انسانی ہو کی ہولی کھیلتا یہاں تک آ پہنچا تھا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ ایک منزل پر مجھ جیسا پیشہ ور مفرور بھی بے دست و پا ہو کر رہ جائے گا۔

کراچی کی یاد میرے دل میں کسک بن کر ابھری۔ کہاں وہ شہرِ نگاراں اور کہاں یہ سنگلاخ ویرانے ۔۔۔ عظیم الشان عمارات، چمکتی دمکتی بے آواز موٹروں اور ہر دم رواں سیلِ انسانی کا منبع چھوڑ کر میں نے اپنے انجام کے لئے کس قدر بے نور اور ویران جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

میری سوچ کا تسلسل سندری کی تیز آواز سے ٹوٹ گیا۔ اس کا لہجہ اب بھی اٹل اور حاکمانہ تھا مگر آدم خور بھی سرکشی پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ بلند لہجوں میں بات ہوتی رہی اور سیتا لمحہ بہ لمحہ مجھے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتی رہی۔

سندری انہیں ڈرا دھمکا کر میرے قتل سے روک رہی تھی اور وہ میرے بدن کے پارچوں سے اپنی آتشِ شکم سرد کرنے کے لئے بے چین تھے اور جب سندری کوئی فیصلہ کر کے نیچے اتری تو سیتا نے مجھے بتایا کہ سندری میرے قتل کے جشن کو ایک روز کے لئے ملتوی کرانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ کیونکہ وہ پورے چاند کی رات تھی اور سب آدم خوروں کو حصار میں محبوس عورتوں سے اپنا حساب چکانا تھا۔ لہٰذا فی الحال مجھے اسی پتھریلے کمرے میں بند کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ مجھے قید کر کے وہ سب حصار میں جا کر اپنے حیوانی جذبوں کی آگ سرد کرتے اور اگلے دن سندری کے سامنے مجھے ذبح کر کے میرے بدن کے ٹکڑے تمام آدم خوروں میں بطورِ تبرک تقسیم کر دیئے جاتے۔

کس قدر منصفانہ فیصلہ کیا تھا سندری نے۔ میرا جی چاہ کر اس کا نرخرا اپنے دانتوں سے چبا ڈالوں۔ شاید اس طرح وہ مجھے اپنی راہ سے ہٹا کر اندرام اور سیتا سے متعلق برسوں قدیم رازوں کی حفاظت کا فیصلہ کر چکی تھی۔ پھر میں نے سیتا کو اندرام کے بارے میں بتانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ مجھے چاروں طرف سے آدم خوروں نے گھیر لیا۔ سیتا ان کی بھیڑ میں سے صاف نکل گئی تھی۔ الاؤ کی بھڑکتی روشنی میں دونوں ہم شکل عورتیں بڑے سکون سے اس طرف واپس جا رہی تھیں جدھر سے آتی ہوئی نظر آئی تھیں۔

اب میں ایک مرتبہ پھر روئے زمین پر بسنے والے ان ذلیل ترین انسانوں کا غلام بن چکا تھا جو اپنے ہی ہم نسلوں بلکہ ساتھیوں کو کھا جانے کے عادی تھے۔

انہوں نے نہایت منظم طریقے سے مجھے گھیر کر پتھریلے قید خانے تک پہنچایا۔ سردار مجھے لے کر چھت پر پہنچا اور مجھے پرانے طریقے پر ایک بار پھر اسی ناقابلِ تسخیر کمرے میں اتار دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد زمین بے شمار قدموں کی دھمک سے گونج اٹھی پھر بے شمار بدمست مردانہ آوازیں سنائی دیئے اور چند ہی ثانیوں بعد حصار میں مقید عورتوں کی چیخیں گونجنے لگیں۔ ان کی آوازوں سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وحشی مردوں نے اندر گھستے ہی قتلِ عام شروع کر دیا ہو۔

یک بیک اٹھنے والے اس شور سے چیتے بھڑک کر دہاڑنے لگے۔ پھر میں نے شہتیروں کے درمیان سے کھلے قید خانے کا منظر بھی دیکھا جو الاؤ کے لہو رنگ انعکاس میں نمایاں تھا۔

میری زندگی کی آس ٹوٹ چکی تھی۔ میرے لئے اب ہر منظر سراپا عبرت تھا۔ میں خالی الذہنی کے عالم میں اپنے پرانے پیال پر بیٹھا حصار کے اُس پار ہونے والے گھناؤنے مناظر دیکھ رہا تھا کہ اچانک چھت سے کسی کی سرگوشیانہ آواز ابھری۔

میں نے بھڑک کر اوپر دیکھا تو سندری یا شاید سیتا وہاں موجود تھی اور گانٹھوں والی رسی اندر لٹکا رہی تھی۔

جلدی باہر آ جا صفدر!" بولنے والی سیتا تھی اور اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

یہ واقعہ میرے لئے سراسر غیر متوقع تھا۔ موت کے دہانے میں اترے ہوئے شخص کو یک بیک زندگی کی نوید مل جائے تو اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونا فطری سی بات ہے۔ بے اختیار میری آنکھیں نمناک ہو گئیں اور کوشش کے باوجود میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

میں مسرت سے کانپتا ہوا اوپر پہنچا تو وہ دونوں ماں بیٹیاں فتح مند چہروں کے ساتھ اوپر موجود تھیں جیسے انہوں نے کوئی بڑا معرکہ جیت لیا ہو۔

"یہاں سے بھاگو سندری!" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر انہوں نے ہم کو دیکھ لیا تو وہ سب "آناً فاناً" ہمیں گھیر لیں گے۔"

"ماں اتنی بے وقوف نہیں ہے صفدر!" سیتا میٹھی اور پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اور اس سکون نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے مانا کہ وہ اپنی ..رتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ مگر میرے بارے میں وہ ضرورت سے

اس ہیں۔"

میرے خاموش ہوتے ہی سندری نے بڑھ کر میرا منہ چوم لیا۔ لہجے میں بولی۔ "بیٹے! تیری وجہ سے آج میں نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کیا ہے۔"

میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس سُرخ و سفید دوشیزہ سندری کے قول کے مطابق سیتا کی عمر انیس سال تھی اور اندام کے اعتبار سے سندری کسی طرح چالیس برس سے زیادہ کی نہ ریہ بھی اس کی طبعی عمر تھی ورنہ پہاڑی موسم، آزاد فضاؤں اور فکری اس کے حسن کی ساری شادابی اپنے عروج پر تھی۔ نہ بشرہ پر گی کی کوئی علامت تھی، نہ جسمانی کساؤ میں کوئی فرق آیا تھا۔ اگر مجھے خود ہی نہ بتاتی کہ سندری اس کی ماں ہے تو میں ان دونوں ان بہنیں ہی سمجھتا۔ سیتا اور سندری میں فرق تھا تو بس اتنا کہ ے ایک ایک نقش میں شوخی رچی ہوئی تھی جبکہ سندری کے چہرے گی کا نور چمک رہا تھا جو طویل ریاضت کرنے والے درویشوں کی پہچان ہوتی ہے۔

سندری چالیس برس کی تھی تو میں بھی پینتیس سال سے کسی طرح تھا۔ عمر کا اتنا کم فرق اور وہ مجھے بیٹا کہہ رہی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس را منہ بھی چوم لیا تھا۔ سندری کی اس جسارت پر میرے سارے بدن ونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"میری وجہ سے؟" میں نے سرد بھری نظروں اس کے چہرے کر حیرت سے پوچھا۔ پھر جو ہی اس کی سیاہ اور روشن نظروں چار میرا سر نیچے جھکتا چلا گیا۔ اس کی عمر کچھ بھی سہی مگر اس کے چہرے پر نے والا جلال اسے ماں کے مقدس رتبے کا ہی مستحق ٹھہراتا تھا۔

"ہاں ۔۔۔ وہ آج ہی تیرا قصہ تمام کر دیتے۔ میں نے ان سے تو نہ کی مگر انہیں حکم دیا کہ یہ کام وہ کل پر ملتوی کر دیں۔ تیری چھینی ہوئی تلوار میرے قبضے میں تھی۔ وہ میرے اس معقول حکم سے سرتابی نہ کر سکے اب قبیلے کا ایک ایک فرد حصار میں ہے۔ ہم دونوں نے تجھے نکالنے سے پہلے دونوں حصاروں کے درمیان بندھے ہوئے جال کاٹ کر نکال دیئے ہیں۔ اب وہ چاہیں بھی تو زندہ باہر نہیں آ سکتے۔ ان کا حشر ان کی عورتوں اور اولادوں کے ساتھ ہو گا۔"

"اوہ ۔۔۔ سندری، مقدس ماں! تم واقعی عظیم ہو۔ سیتا اگر تمہیں بہن بھی لگتی تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔ تم نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ان سب کو بے بس کر دیا ہے۔ یہ غریب الوطن اجنبی تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہے۔" میں بے پناہ مسرت میں ڈوب کر جذباتی ہو گیا۔

"اور اب میری سیتا تیرے حوالے ہے صفدر!" وہ میرا شانہ تھام کر اپنے دل پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "یہ ان پہاڑوں میں میری تیس سالہ زندگی کا حاصل ہے۔ اسے لے کر اپنی بارونق آبادیوں کی جانب لوٹ جا۔ میں نے اسے باہر کی دنیا کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی مگر تو نے نہ جانے اسے کیا افسانے سنائے ہیں کہ میری سیتا شہروں کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ میں اسی وقت تمہیں الوداع کہتی ہوں۔ جاؤ، بھگوان تمہیں سدا سُکھی رکھے۔"

"ماں!" بے اختیار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ لفظ ہونٹوں پر ابھر آیا۔ "تو ان ویرانوں میں کیا کرے گی، سیتا کے سوا تیرا یہاں کون رہ گیا ہے۔ تو ہمارے ساتھ نہیں چلے گی؟"

اس نے خاموشی سے میرا ہاتھ تھاما اور پتھریلی سیڑھیاں طے کرتی نیچے آ گئی۔ یہاں سے اس نے سیتا کو دو مضبوط خچر لانے کے لئے بھیج دیا اور خود اس کے آگے چلے جانے کا انتظار کرتی رہی۔

"میں تم دونوں کے ساتھ نہ جا سکوں گی صفدر!" قید خانے سے ابھرتی ہوئی وحشیانہ چیخوں میں سندری کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "میرا باپ ہر برس کوسوں کی مسافت طے کر کے صرف مجھ سے ملنے یہاں آتا ہے۔ اگر میں اُسے یہاں نہ ملی تو پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے گا۔ وہ بدنصیب یہی سمجھتا ہے کہ اس کی بیٹی کی آبرو ان ویرانوں میں محفوظ رہی ہے مگر میں جب سیتا کو دیکھتی ہوں میرے دل میں آگ سی بھڑک اٹھتی ہے۔ جی چاہتا ہے دنیا کے سارے مردوں کو ایڑی تلے مسل دوں۔ مگر تجھے دیکھ کر میرا دل کھل اٹھا ہے۔ میری سیتا شہروں میں تیرے لئے جیئے گی اور سندری ان ویرانوں میں ہر برس اپنے پتا کا سواگت کیا کرے گی ۔۔۔۔ مگر میری ایک التجا ہے میرے بچے! سیتا کو اپنی پیدائش پر اختیار نہ تھا۔ اسے بھول کر بھی بن بیاہی ماں کی اولاد ہونے کا طعنہ نہ دینا ورنہ میری روح تجھ سے اس طعنے کا انتقام لے گی۔"

اس کی باتوں نے مجھے دلگیر کر دیا اور میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تو فکر نہ کر ماں ۔۔۔۔ تیری بچی سدا سُکھی رہے گی۔"

سیتا خچر ہانک لائی تو گفتگو کا رُخ بدل گیا۔

"اب آدم خوروں کا پورا قبیلہ اندر قید ہے۔ صبح سے پہلے شاید ان میں سے کسی کو بدلے ہوئے حالات کا علم نہ ہو سکے۔ تو ان کا کیا حشر کرے گی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اب نیا چاند نکلنے تک یونہی قید رہیں گے۔ بھوک ان کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دے گی اور اس دوران تم دونوں اتنی دور نکل جاؤ گے کہ یہ کوشش کے باوجود تمہارا سراغ نہ پا سکیں گے۔" سندری اٹل لہجے میں بولی۔

"یہ بڑے سفاک ہیں ماں ۔۔۔ بھوکے ہرگز نہ رہ سکیں گے۔ اپنی عورتوں اور بچوں کو ہی کھانا شروع کر دیں گے۔" میں نے کہا اور پھر وہ

دن میں تو یہ سب ہی کا صفایا کر ڈالیں گے۔"

"میرے جیتے جی ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اگر یہ اسی حرکت پر تُل گئے تو میں ان کا نام و نشان تک مٹا دوں گی۔ میرے لنگور اندرونی حصار توڑ دیں گے۔ پھر بھو کے چیتے ان میں سے کسی کو نہ چھوڑیں گے۔ عورتیں ان کا لقمہ بنیں یا چیتوں کا نشانہ، ایک ہی بات ہے مگر یہ مرد اپنے کئے کا خمیازہ بھگت کر رہیں گے۔" سندری اپنے منصوبے کے ہر پہلو پر غور کر چکی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے دبی زبان میں سندری کو مخاطب کیا۔

"تو جھجک کیوں رہا ہے میرے بچے؟" وہ میرے لہجے پر چونک پڑی۔

"تو جانتی ہے کہ شہروں میں پیسے کے بغیر زندگی بہت دشوار ہے۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔

"تیس برس!" وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "لمبی مدت ہوتی ہے بیٹا! وہ سب تو میرے لئے ایک بھولا ہوا خواب بن کر رہ گیا ہے۔ مگر یہ بتا کہ تیرا مدعا کیا ہے؟"

"میں یہاں سے بھاندر ناس لے جانا چاہتا ہوں۔ میں اسی کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں —— میں جانتی ہوں۔" وہ جلدی سے بول پڑی۔ شاید اندرام نے اسے میرے بارے میں سب کچھ ہی بتا دیا تھا۔ سیتا بے چاری تو شاید سمجھ بھی نہ سکی ہو کہ میں بھاندر ناس کا متلاشی کیوں ہوں۔

"لے جا —— جتنی بھاندر ناس لے جا سکتا ہے، لے جا۔" سندری قدرے سکوت کے بعد بولی۔ "مگر کل تجھے ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا ہے۔"

پھر ہم لوگ تین خچروں پر وہاں سے آدم خوروں کی ویران بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں سندری نے برفانی انسان کا قصہ چھیڑ دیا۔ شاید سیتا اُسے پہاڑی خانقاہ کے سفر میں پیش آنے والے سارے واقعات سنا چکی تھی۔

وہ ساری رات ہم نے بستی کے ایک مکان میں سندری سے باتیں کرتے گزار دی۔ وہ عورت بے حد شفیق اور دلچسپ شخصیت کی مالک تھی۔ ایک لمحے کے لئے بھی مخاطب پر اکتاہٹ طاری نہ ہونے دیتی تھی۔ جب گفتگو بے تکلفانہ رُخ اختیار کرنے لگی تو میں نے سیتا کی بات چھیڑ دی۔

"ماں! اس پر اب مجھے پورا حق ہے نا؟" میں نے سندری سے پوچھا۔

"ہاں —— سیتا اب تیرے ہر حکم کی تعمیل کرے گی مگر یہ یاد رہے کہ یہ ابھی تیری بیوی نہیں ہے۔ جب تک تو اُسے باقاعدہ نکاح میں نہ لے اس کی خلوت تجھ پر حرام ہے۔" سندری نے آخری الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"ماں!" سیتا آخری الفاظ تو نہ سمجھ سکی مگر پہلے فقروں پر چونک [illegible]

"میں اس کی نوکر نہیں ہوں۔ اسے بھی میری بات ماننی پڑے گی۔ تو بھی [illegible] مشورہ دے رہی ہے جو آدم خور کرتے آئے ہیں۔"

سندری مسکرا اٹھی۔ "تو اب شہروں کے سفر پر جا رہی ہے۔ وہاں ہر چیز مختلف ہے، تجھے ہر قدم پر صفدر کی ہدایت کی ضرورت محسوس ہو گی۔"

"یہ ماں کا حکم ہے اور تجھے ماننا ہو گا۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سیتا سے کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ تو مسلمان ہے۔" سندری بولی۔ "تجھے اختیار ہے کہ سیتا کو بھی اپنے مسلک میں شامل کر لے۔"

سندری کے یہ الفاظ اچانک مجھے لونا کی یاد دلا گئے۔ اس عیسائی دوشیزہ نے بھی میری خاطر گھر بار، مذہب سب کچھ چھوڑا تھا مگر میں اس کی حفاظت نہ کر سکا۔ وہ بدنصیب کھٹمنڈو کی شاہراہوں پر ایک خونریز معرکے میں مجھ سے بچھڑ گئی تھی، ہمیشہ کے لئے۔

آخر منہ اندھیرے ہم وہاں سے نکل پڑے۔ بستی سے نکلنے کے بعد میں اسی جگہ پہنچا جہاں پہلی بار میں نے بھاندر ناس کو چٹان سمجھ کر اپنی نشست کے لئے منتخب کیا تھا اور آدم خور مجھ پر آ پڑے تھے۔

وہ منوں وزنی، پتھروں سے مشابہ سخت پہاڑی جڑ ابھی تک اسی جگہ پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں اور میں سندری کے ہاتھ سے تلوار لے کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

وہ جڑ بہت سخت تھی۔ میں اسے کئی ٹکڑوں میں کاٹ کر تینوں خچروں پر لادنا چاہتا تھا مگر سندری نے میری اس بات کی مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ واپسی کا سفر بہت دشوار ہے۔ ہمیں خچر تو ادھر جانے لیکن دو سواروں کے ساتھ تین باربردار خچر کسی طرح قابو میں نہ آتے لہٰذا مجھے سندری کی بات ماننی پڑی اور وہ بوٹی صرف ایک خچر پر لادنے کے حساب سے کاٹنی شروع کر دی۔

میری طویل اور تھکا دینے والی جدوجہد کا ثمر آخر کار میرے سامنے آ چکا تھا۔ وہ بھاندر ناس جس کی تلاش میں نہ جانے کتنے لوگ دشت و صحرا میں بھٹک بھٹک کر اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے جس کے تذکرے پر کیمیاگروں کے چہروں پر چمک اور جوش کی لہر دوڑ جاتی تھی وہ آخرکار میرے قبضے میں آ چکی تھی۔

بس ذرا ہی دیر کی بات تھی پھر میں اپنے گوہرِ مقصود کے ساتھ واپس [illegible] ہو سکتا تھا۔ ان پہاڑوں سے مجھے دو نایاب چیزیں ملی تھیں۔ بھاندر ناس اور [illegible] سیتا جو قریب کھڑی میرے جوش و خروش پر مسکرائے جا رہی تھی۔

پورے چاند کی وہ رات میرے لیے کامرانی کی رات تھی۔ بلند و بالا پہاڑیوں کے درمیان پہاڑی پتھروں سے بنی ہوئی آدم خوروں کی بستی سے چند فرلانگ دور میں سیتا کے ہمراہ بھاندر ناس کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر پہاڑی خچر پر لاد رہا تھا۔ سندری خاموشی کے ساتھ ایک پتھر پر بیٹھی میرے جوش و خروش سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کے یاقوتی اور پتلے لبوں پر سوگوار مگر آبرومندانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میں آدم خوروں کی بستی سے حاصل کی ہوئی مقدس تلوار سے بھاندر ناس کے ٹکڑے اڑا رہا تھا اور اس کی دھار پوری طرح میرا ساتھ دے رہی تھی۔ کیمیاگری کی جان میرے قبضے میں آ چکی تھی۔ تندرست اور بلند قامت خچر بار بار پتھریلی زمین پر اپنے سم مار کر مجھے روانہ ہونے کی یاد دلا رہے تھے۔

میرے ہاتھ تھمتے ہی نہ تھے۔ خچر پر بار پورا ہو چکا تھا لیکن میں اب بھی اس میں اضافہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"صفدر!" اچانک سندری کی محبت بھری آواز ہمالے کے اس ویرانے میں گونجی۔

"کیا بات ہے ماں؟" میں نے پہلی بار پورے خلوص کے ساتھ اسے پکارا اور اسے ماں کہتے ہوئے میں اپنے مقدر کی ستم ظریفی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پینتیس برس کا ایک مرد چالیس سالہ خوبرو اور صحت مند عورت کو ماں کہہ کر پکارنے پر مجبور تھا مگر اسی وقت میرے وجود کے کسی گوشے سے ملامت کی ایک لہر اُبھری اور مجھے احساس ہوا کہ سندری کی عظمت صرف اور صرف ماں ہی کے خطاب کی سزاوار ہے۔ دنیا کی ہر عورت محبوبہ، بیوی یا داشتہ ہو سکتی ہے مگر سندری ماں کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔

"راستہ طویل اور بے حد دشوار ہے!" سندری بھاندر ناس سے لدے ہوئے خچر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ خچر اتنا بوجھ نہ سہار سکے گا۔"

میں نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا پھر مقدس تلوار سندری کی طرف بڑھا دی۔ اس وقت ہمالا کی وہ چاندنی رات اپنے آخری سانسوں پر تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد صبح طلوع ہونے والی تھی۔

سندری نے بڑھ کر اپنی جواں سال اور خوبرو بیٹی سیتا کو بے اختیار اپنی باہوں میں بھینچ لیا اور دیوانہ وار اس کے لب و رخسار چومنے لگی۔ شاید بیٹی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دینے کے تصور نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی چادر لرزاں تھی جبکہ سیتا کا چہرہ انجانے جذبوں کی مسرت سے دمک رہا تھا۔ غالباً اسے ابھی تک اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے اپنی ماں سے جدا ہو رہی ہے اور اب کبھی اس سے نہ مل سکے گی۔

سیتا سے الگ ہو کر سندری میری طرف آئی اور پُروقار انداز میں گرمجوشی سے میری پیشانی چوم لی۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور ان میں بے شمار سوال رقصاں تھے۔

"صفدر —— میرے بچے! دیکھ سیتا کو تیری ذات سے کوئی دُکھ نہ پہنچے!" وہ بولی تو وفورِ جذبات سے اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"تو فکر نہ کر... تیری بچی میری زندگی ہے، اسے میرے جیتے جی کوئی دُکھ نہ پہنچے گا۔" میں نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔

"ماں... ماں تو رو کیوں رہی ہے!" سیتا معصومانہ حیرت سے آگے بڑھی اور سندری کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "کیا تو مجھے صفدر کے ساتھ بھیجنا نہیں چاہتی؟"

سندری یک بیک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بے اختیار سیتا کو ایک بار پھر اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ "میری بچی... لڑکیاں کبھی گھر نہیں رہتیں، وہ ایک نہ ایک دن بابل کی گلیاں چھوڑ کر اپنا اپنا گھر آباد کرنے چلی جاتی ہیں۔ لڑکیوں کی رخصتی ماں باپ کے لیے مسرت اور اندوہ کی ایک عجیب تقریب ہوتی ہے مگر مجھے دُکھ بس اتنا ہے کہ اب کے بعد شاید کبھی تیری صورت نہ دیکھ سکوں!"

سندری کی باتیں اور اس کا گریہ دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ میں نے اپنے شہر میں پردیس کو بیاہی جانے والی کئی لڑکیوں کی رخصتی دیکھی تھی اور اس موقعے پر کلیجے کو چھید دینے والے الم انگیز نغمے بھی میں نے بارہا سنے تھے لیکن پتھروں اور چٹانوں سے گھری اس وادی میں سیتا کی رخصتی کی یہ تقریب بڑی عجیب اور یاس آمیز تھی، ایک بن بیاہی ماں اپنی بچی کو الوداع کہنے تنہا رہ گئی تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا جو بیٹی کے بعد اس کے دکھوں کا مداوا کرتا۔ بنارس کے پنڈتوں کے ستم جھیل کر ان ویرانوں میں پناہ لینے والی سندری کیسی بدنصیب تھی کہ انتیس برس گزر جانے کے باوجود اپنے باپ کو نواسی کی پیدائش کا مژدہ سنانے کی ہمت نہ کر سکی اور اب مقدر نے اسے ایک اور جگر خراش دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ سیتا کو وہ میرے ساتھ رخصت کر رہی تھی۔ بن بیاہی ماں کی اکلوتی بیٹی بن بیاہی رخصت ہو رہی تھی۔

سندری کو مرد کی ذات کا بڑا تلخ تجربہ تھا۔ دن کے اُجالے میں ماتھوں پر تلک سجائے، چہروں پر تقدس طاری کیے، دنیا سے بے نیاز، رام کی مالا جپنے والوں نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ شاید اس ستم پر چشم فلک بھی نم ہو گئی ہو اور اس جانکاہ حادثے نے اس کے باپ، اندرام کو انتقام سے اندھا کر دیا۔ وہ خون کی نہریں بہاتا اپنی عصمت دریدہ بیٹی کو ان پہاڑوں میں لے آیا تاکہ وہ وحشی اور خود غرض مردوں سے دور اور محفوظ رہ سکے مگر وہ بے چاری یہاں بھی کمزور اور مجبور ہی ثابت ہوئی۔ پہاڑی چوٹیوں کی تسخیر کو آنے والوں نے مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر سندری کو ہی سرکرڈالا! اپنی پامالی پر مشتعل ہونا سندری کا حق تھا! اس نے اپنے دشمن کو نیست و نابود کر دیا مگر اس کے گناہ کی نشانی کو پروان چڑھانا ہی پڑا کیونکہ وہ عورت تھی جس کا وجود

ہی سراپا ماتا ہوتا ہے جس کے لیے اولاد صرف اولاد ہوتی ہے!

اور مرد کی ستم آشنا وہ عورت ایک بار پھر ایک اجنبی پر بھروسہ کر رہی تھی! اس نے بس ایک بار مجھ سے عہد لیا تھا کہ میں ویرانوں سے آبادی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے سیتا کو اپنے مسلک میں لا کر اپنے ازدواج میں لے آؤں گا! اس کے بغیر سیتا کی خلوت مجھ پر حرام ہو گی۔ یہ اس کی کتنی بڑی خود فریبی تھی۔ میں نے دل میں عہد تو ضرور کیا ہوا تھا کہ سندری کی ہدایت پر عمل کروں گا مگر ویران راہوں کی حشر سامانیاں بار بار مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتی تھیں!

سفر ہمت شکن اور ہمسفر توبہ شکن تھا۔ راستے میں ہر ہر قدم پر گناہ پرور تنہائیاں میسر تھیں اور میں اپنے غول سے بھٹکا ہوا ایک بھوکا درندہ۔ راہ میں اگر کہیں بھی میرا نفس عہد پر غالب آجاتا تو کوئی نہ ہوتا جو سیتا کو میری دستبرد سے بچا سکتا اور سندری شاید یہ سب جانتی تھی، آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں میں یہ سارے وسوسے رقصاں تھے! اس کے لب خاموش تھے مگر اس کی گریاں آنکھیں مجھ سے التجا کر رہی تھیں! مجھ سے میرے الفاظ اور میرے عہد کی توثیق طلب کر رہی تھیں، اس کے لہجے میں بھی اعتماد نمایاں نہ تھا، نہ ہی اس کی آنکھوں میں سکون نمایاں تھا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جس نے اپنی زندگی خود بنائی تھی، جو زمانے کے ہر سرد گرم سے آشنا تھی، جس کا تجربہ اس کی عمر سے کئی گنا زیادہ تھا۔ راستے میں پیش آنے والے متوقع واقعات سے وہ بے خبر نہ تھی مگر اب بہتر زندگی اور بہتر مستقبل کے لیے اس کے پاس سیتا کو میرے ساتھ بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا!

میرے اور سیتا کے بدن پر دو دو گرم کھالیں موجود تھیں پھر بھی سندری نے اپنی دونوں کھالیں جسم سے اُتار کر میرے حوالے کر دیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سر پر وزنی گُلدر دے مارا ہو۔ وہ شہروں کی پیداوار ضرور تھی مگر اس کی عمر کا بیشتر حصہ ان پہاڑوں ہی میں گزرا تھا، وہ اب شہروں کا تمدن بھول چکی تھی، اس پر ان سنگلاخ پہاڑوں کی فطری معصومیت رچ گئی تھی، کھالیں میرے حوالے کر دینے کے بعد وہ اب میرے سامنے بے حجاب، برہنہ تن کھڑی تھی! اس کا چہرہ بدستور ممتا کے پُرجلال نور سے تمتما رہا تھا! اس کے انداز میں نہ عشوہ تھا نہ ادا، بشرہ پر نہ دعوت تھی نہ خفت۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے شہر کے کسی باسی نے اپنے پیروں سے جوتے اُتار دیئے ہوں۔

اور ان چند لمحوں میں شہری زندگی کا ایک روپ میرے سامنے ننگا ہو کر آ گیا، وہ رُخ اب انتہائی گھناؤنا تھا مگر جب تک میں اس ماحول میں گھر رہا وہ پہلو میرے لیے مسرتوں اور لازوال مسرتوں کی معراج تھا۔

کراچی کے کسی مے کدے میں رقصاں، رنگوں میں نہائی، گناہ میں ڈوبی، نازک دمڑگاں کے ہتھیاروں سے مسلح سبک تن اور سیمیں بدن رقاص لڑکیاں جب مغربی سازوں کے تیز شور پر ناچتے ناچتے یک بیک اپنے جسموں سے لباس اُچھال دیتی تھیں تو ان کے دعوت آمیز کنائے دیکھ کر سینوں میں سانس گھٹنے لگتا تھا اور ہر تماشائی مجسم گناہ بن کر جذبات کے جہنم میں ناپید ہو جانے کی آرزو سے سسکنے لگتا تھا۔ عورت کا وہ روپ کس قدر گھناؤنا اور ذلت آمیز تھا — اس جز وقتی عریانی کے برعکس سندری سراپا عریاں تھی مگر اس کی نگاہوں کی تمکنت شاید میرے جذبات تک میں اُتر چکی تھی کہ اس منظر پر میرے وجود میں کوئی ایسی تحریک بیدار نہ ہوئی جس کا احساس ہی بعد میں مجھے شرمسار کر دیتا — اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ جسم بے حقیقت شے ہے، اہمیت صرف نگاہ اور اس میں کوندنے لپکنے والے جذبوں کا ہوتا ہے۔

"یہ تم دونوں رکھ لو، راستے میں شاید ان کی ضرورت پڑ جائے!"

کھالیں دینے کے بعد سندری گلوگیر لہجے میں بولی، ساتھ ہی اس نے چاندی کی ایک انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی جس میں سیاہ پتھر کا بدوضع نگ لگا ہوا تھا۔

میں نے سرد ہوا کے پیش نظر وہ کھالیں اسے لوٹانی چاہیں مگر سیتا نے جھپٹ کر میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ واپس کھینچ لیے "رکھ لے۔ ماں تجھے پیار سے دے رہی ہے ورنہ تو راستے میں سردی سے اکڑ کر رہ جائے گا!"

اس کے لہجے میں تمسخر سمٹ آیا تھا۔

میں نے ایک کھال اپنے خچر کی پشت پر ڈالی دوسری سیتا کے خچر کی پشت پر ڈال دی۔

"ماں! اگر تو یونہی روتی رہی تو میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی!"

اچانک سیتا غصیلے لہجے میں اپنی ماں سے بولی۔

"میں رو تو نہیں رہی بیٹی"۔ سندری نے جلدی سے اپنی آنکھیں خشک کر لیں اور اس کے لبوں پر سوگوار سی مسکراہٹ اُبھر آئی "میں تو پہلے بھی تجھ سے دُور اپنی خانقاہ میں رہتی تھی، بس ذرا یہ خیال آ رہا تھا کہ اب ممتا نے جوش مارا تو میں دوڑ کر تجھ تک نہ پہنچ سکوں گی"۔

"صفدر مجھے تیرے پاس لائے گا ماں!" سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے تائید طلب لہجے میں کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں سیتا" میرے بولنے سے قبل سندری ہی بول اٹھی "میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ صفدر محبت کو ترسا ہوا ایک انسان ہے، تو اس کے ساتھ خوش رہے تو میرے لیے یہی سب کچھ ہوگا"۔

پھر سیتا نے اپنے ان کھنڈرات کی طرف بھی جانا چاہا جہاں اس کے پروردہ لنگوروں کے غول رہتے تھے مگر سندری نے سختی کے ساتھ اسے منع کر دیا "وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، بس اب تم دونوں فوراً اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں چاہتی ہوں کہ آدم خوروں کی واپسی سے قبل تم دونوں ان پہاڑوں سے اتنی دور نکل جاؤ کہ وہ کسی طرح تم تک نہ پہنچ سکیں"۔

پھر سیتا نے اپنی ماں کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا اور ہم دونوں اپنے اپنے خچر پر سوار ہو گئے۔ بھاندرناس سے لدے ہوئے خچر کے گلے میں بندھی ہوئی رسی میرے ہاتھ میں تھی۔

"الوداع میرے بچو!" سندری نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی تیرنے لگی۔

میں نے جلدی سے اپنے خچر کو ایڑ لگائی اور مڑ کر سندری کو ہاتھ لہرایا اور یوں ہمارا مختصر سا قافلہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

نئے دن کا سورج تھوڑی ہی دیر میں طلوع ہونے والا تھا اور میرے لیے وہ زندگی کا عظیم ترین دن تھا! اپنی جدوجہد کے دوران میں بارہا میرے ذہن میں اس خیال نے سر اُبھارا تھا کہ شاید بھاندرناس کسی خبطی کیمیاگر کے وہم کی پیداوار ہے، کئی بار یہ سوچا کہ شاید روئے زمین پر ایسی کسی چیز کا وجود ہی نہ ہو مگر آج بھاندرناس ایک اٹل حقیقت ثابت ہو چکی تھی۔ یہ میری خوش نصیبی کی معراج تھی کہ اس کو پوجنے والے سفاک اور آدم خور قبائلیوں کو نہ صرف سندری کی مدد سے بے بس کر دیا بلکہ ان کی سرزمین سے وہ بوٹی بھی لے آیا جس پر کسی اجنبی کا قبضہ تو کجا، وہ لوگ سایہ پڑنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

راستے بہت زیادہ ناہموار اور خطرناک تھے۔ دھندلکے میں خچر قدم بہ قدم بڑھ رہے تھے۔ میں نے مُڑ کر نگاہ ڈالی تو ملگجے سے اُجالے میں بہت دُور ایک انسانی ہیولا بلند پہاڑی پر موجود تھا۔

"ماں ابھی تک ہمیں دیکھ رہی ہے!" میں نے سیتا سے کہا۔

اس نے بھی مُڑ کر اسی طرف دیکھا اور پوری قوت سے چیخی۔

"ماں الوداع!" اس کی آواز پہاڑوں اور چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس وادی میں دیر تک گونجتی رہی۔

پھر اس بازگشت کے ڈوبنے سے قبل ہی فضا سندری کی دردناک اور بھرائی ہوئی آواز سے کانپ اٹھی۔ اس نے بھی الوداع کا جوابی نعرہ لگایا تھا۔

پھر اس بلند چوٹی سے وہ انسانی سایہ غائب ہو گیا۔ وہاں اب پہاڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

ان اطراف میں دُور دُور کسی پگڈنڈی کا سُراغ نہ تھا لیکن وہ علاقہ سیتا کا دیکھا بھالا تھا لہٰذا وہی میری رہنمائی کرتی رہی۔

"ہم ان پہاڑوں سے کتنے عرصہ میں نکل سکیں گے سیتا؟" اسی روز دوپہر کے قریب میں نے سیتا سے سوال کیا پھر فوراً ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا مگر اس وقت تک سیتا قہقہہ مار کر ہنس پڑی تھی۔

"تو بالکل احمق لگتا ہے صفدر!" وہ ترنم ریز ہنسی کے دوران میں بولی "میں تجھے بتا چکی ہوں کہ میں یہیں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہوں۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ دنیا میں ان پہاڑوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تو باہر سے ان پہاڑوں میں آیا تھا تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کتنی مسافت ہے!"

"تو بہت بدتمیز ہے سیتا!" میں نے مصنوعی غصہ سے کہا "بھلا اپنے مرد سے اس طرح بات کی جاتی ہے!"

"اپنا مرد؟" اس نے حیرت سے کہا اور پھر ہنس پڑی "تو کیا واقعی میں تیری مالک ہوں؟"

اس کے اس سوال پر میں محظوظ ہونے کے بجائے قدرے جھلا گیا "تیری ماں تجھے بتا چکی ہے کہ اب تجھے ہر حال میں میری بات ماننی ہو گی، اس کے بعد بھی تو مجھے اپنا غلام سمجھ رہی ہے!"

"تو نے خود ہی تو اپنے آپ کو میرا مرد کہا تھا" وہ منہ بنا کر بولی "اور ہاں اس خیال میں بھی نہ رہنا کہ میں تیری ہر بات بے چون و چرا مانوں گی!"

"نہ مانے گی تو ابھی تجھے واپس تیری ماں کے پاس چھوڑ دوں گا"۔ میں نے دھمکی دی۔

"اس خیال کو دل سے نکال دے" وہ غصیلی آواز میں غرائی "تو چھوڑ دے گا تو میں سائے کی طرح تیرا پیچھا کروں گی تیرے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چل سکے گا اور پہاڑوں سے نکلتے ہی تیرے سامنے آ جاؤں گی!"

"جی چاہتا ہے کہ اپنے بازوؤں میں دبوچ کر تیری پسلیاں توڑ دوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا بدن بہت مضبوط ہے" وہ فخر بھرے لہجہ میں بولی "میں اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنے آدم خوروں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہوں، میری پسلیاں توڑنا تیرے بس کی بات نہیں!"

"یہ تو تجھے وقت آنے پر پتہ چلے گا" میں نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔

وہ بُرا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئی،

تیسرے دن ہم ان راہوں کو پیچھے چھوڑ آئے جن سے سیتا شناسا تھی، راستے ابھی تک بہت خطرناک تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہمارے خچر ایسی جگہوں پر جا کر رک گئے جہاں سے ایک قدم بھی آگے بڑھنا محال تھا۔ آگے ہزاروں فٹ بلند کھڑی ڈھلانیں راہ میں حائل ہو جاتیں۔ ایسے موقع پر ہمیں واپس جا کر دوبارہ نئے راستہ کا انتخاب کرنا پڑتا جس کی وجہ سے ہماری پیش قدمی کی رفتار بہت سست پڑ چکی تھی!

راستہ میں جا بجا بہنے والے چشموں کی وجہ سے پانی کی کوئی قلت نہ تھی۔ سیتا کو خاص طور پر فضا سے قرب و جوار میں پائے جانے والے ماحول کا اندازہ لگا لینے میں ملکہ حاصل تھا۔ کھانے پینے کے لئے جنگلی رس دار پھلوں کی کمی نہ تھی اور یہ سب صرف سیتا کی وجہ سے ممکن تھا۔ ہماری راتیں دراڑوں یا غاروں میں بسر ہوتیں۔ میرے لئے اس علاقہ کا موسم بہت سخت تھا۔ کئی کھالیں استعمال کرنے کے باوجود سرد ہوائیں پریشان کرتی رہتی تھیں مگر سیتا تو اس موسم کی عادی تھی۔ کئی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ مجھے کانپتے دیکھ کر

اس نے اپنی کھالیں بھی میرے حوالہ کر دیں۔ ایسے مواقع پر میں نے کئی بار اس کے حسین سراپا پر بھرپور نظریں ڈالیں اور عجیب سی بےخودی میں کھو گیا مگر ایسے ہر موقع پر سندری کا ملتجی چہرہ میری راہ میں حائل ہو گیا۔

اس مرتبہ ہمارے سفر کی راہ کچھ مختلف تھی کیونکہ کئی روز گزرنے کے باوجود مجھے کوئی ایسی علامت نظر نہ آئی جو میرے لئے شناسا ہو۔ اس کا مطلب [illegible] تھا کہ اس بار سیتا وادی راہ میں پڑنے کا امکان نہیں تھا جہاں انندرام کو چھوڑ کر میں آگے بڑھا تھا۔

اس مہلک سفر میں سیتا کی رفاقت جہاں میرے لئے تقویت کا باعث تھی وہیں میں سخت اذیت سے بھی دوچار تھا۔ دن میں نہ جانے کتنی بار جذباتی ہیجان کے بھنور میں پھنستا مگر ہر مرتبہ کوئی غیبی تادیب مجھے اس عہد کا [illegible] دلانے لگتی جو میں سندری سے کر کے آیا تھا!

یہ سفر کے ساتویں روز کا ذکر ہے کہ خلاف معمول سورج کی کرنوں [illegible] قدرے تمازت کا احساس ہو رہا تھا سرد اور تیز ہوائیں بدستور چل رہی تھیں [illegible] ور میرے معیار کے مطابق موسم کسی طرح خوشگوار نہ تھا مگر سیتا کو میں کافی دیر سے بےچین دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا تو اس نے شانوں پر پڑی ہوئی ایک کھال اتار دی۔ اس نے وہ کھال اپنے خچر کی پشت پر رکھنی چاہی مگر وہ ہاتھ سے پھسل گئی۔ سیتا نے چلتے ہوئے خچر پر سے جھک کر دوبارہ وہ کھال اٹھانی چاہی اور خچر یک بیک بری طرح بھڑک گیا۔ اس سے قبل کہ سیتا سنبھلتی خچر اسے پتھریلی زمین پر پھینک کر رینکتا ہوا تیزی سے ایک طرف بھاگ نکلا۔ اس کی آواز سن کر میرا خچر بھی بدکا مگر میں اس وقت تک ایسی کسی ناگہانی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا میں نے اس کی پسلیاں دونوں رانوں کے درمیان سختی سے جکڑ لیں اور اس طاقتور پہاڑی خچر کے تیور فوراً ہی ماند پڑ گئے۔

اس اثنا میں سیتا کا خچر کافی دور جا چکا تھا اور وہ کھال سمیت زمین سے اٹھ کر اس کے تعاقب میں ہو لی تھی۔ میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ خچر کی پشت سے کود کر سیتا کا ساتھ دوں کیونکہ وہ ایک تنگ پہاڑی گزرگاہ تھی اور میں نہ صرف اپنے خچر کو سنبھال رہا تھا بلکہ بھاندرناس سے لدے ہوئے خچر کی رسی بھی میرے ہی ہاتھ میں تھی قرب و جوار میں کوئی ایسا درخت وغیرہ بھی نہ تھا جس سے میں ان دونوں خچروں کو باندھ سکتا۔

میں نے چیخ کر سیتا کو روکنا چاہا لیکن وہ اس وقت استعمال میں تھی [illegible] کے بغیر تنگ اور ناہموار راستہ پر پوری قوت سے دوڑتی رہی مجھے اندیشہ تھا کہ ایک جگہ بھی اس کا پیر پھسلا یا توازن بگڑا تو وہ سیدھی کسی کھائی میں جا گرے گی۔

ادھر بپھرا ہوا خچر پچھلی دونوں ٹانگیں فضا میں اچھالتا بھاگا جا رہا تھا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دوڑتے دوڑتے اس کا اگلا پیر پھسلا اور وہ بائیں جانب پھیلی ہوئی گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔

"سیتا۔ واپس آجا!" گرنے والے خچر کے رینکنے کے شور میں میں گھبرا کر چیخا مگر وہ کھائی کے کنارے پر پہنچنے سے قبل نہ رکی!

پھر وہ خچر کھائی میں گرا اور ایک پرشور دھماکہ کے بعد ادھر سناٹا چھا گیا۔

سیتا واپس آئی تو بری طرح جھلائی ہوئی تھی!

"تو میری بات کیوں نہیں سنتی؟" میں نے غصہ میں پوچھا۔

"میں ننھی سی بچی ہوں، تو ذرا ذرا سی بات پر مجھے ٹوکتا کیوں ہے؟" خچر ہاتھ سے نکلنے کی جھلاہٹ کا رخ میری طرف ہو گیا تھا۔

"اور اگر تیرا پیر پھسل جاتا؟" میں غرایا۔

"تو اس وقت میرے بجائے تو میرے خچر پر آنکھیں نکال رہا ہوتا۔" اس کا پارہ بدستور چڑھا ہوا تھا "کھائی میں گرتی تو میں ہی مرتی نا۔ تیرا کیا بگڑتا!"

"تیرا جو جی چاہے کرتی پھر۔ میں تجھے ہرگز نہ روکوں گا۔"

"میں بھاندرناس یہیں پھینک رہی ہوں!" وہ میرے ہاتھ سے دوسرے خچر کی رسی چھینتے ہوئے بولی۔

"نہیں" میں ایک دم تڑپ اٹھا "اگر تو نے بھاندرناس کو ہاتھ بھی لگایا تو اچھا نہ ہو گا۔"

"میں پھینکوں گی!" وہ تنک کر بولی۔

"نہیں!" میں اپنے خچر کی پشت سے نیچے کود کر غرایا۔

"تیرے لئے بھاندرناس مجھ سے زیادہ اچھی ہے؟" وہ غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں" میں اس وقت غصہ میں آپے سے باہر ہو گیا تھا اس لئے روانی میں کہہ گیا۔

اس نے بھاندرناس سے لدے ہوئے خچر کی رسی میری طرف اچھالی اور نیچے بیٹھ کر اچانک بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

"میں نے کیا ظلم کیا ہے تیرے ساتھ؟" میں قدرے نرم لہجہ میں بولا۔ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ وہ یوں ہار مان کر یک بیک رونا شروع کر دے گی۔

"تیرے لئے بھاندرناس کی سوکھی لکڑیاں مجھ سے زیادہ اچھی ہیں، تو [illegible] مجھے میری ماں سے چھڑا کر لایا تھا کہ یہاں مجھ کو آنکھیں دکھائے گا۔" وہ روتے روتے بولی۔

"تو بھاندرناس کی دشمن کیوں ہو رہی ہے!" میں چند ثانیوں تک اس کے خاموش ہونے کا منتظر رہا لیکن جب وہ یکساں رفتار سے مسلسل روتی رہی تو تنگ آ کر مجھے بولنا ہی پڑا۔ "آخر اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

"میرا خچر مر گیا اب کیا میں تیرے سر پر سوار ہو کر سفر کروں گی؟" اس نے بھرائی ہوئی غصیلی آواز میں یہ کہہ کر میری طرف نظریں اٹھائیں۔

اس کے گلابی رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور بڑی بڑی آنکھوں

میں بھی شفاف موتی چمک رہے تھے میں اس کی نادانی پر بےساختہ ہنس دیا۔

"بس اتنی سی بات ہے!"

"یہ اتنی سی بات ہے" اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے "میری ماں جھوٹ کہتی تھی۔ تو بہت سنگدل اور مکار آدمی ہے، وہاں سے محبت جتا کر لے آیا اور اب چاہتا ہے کہ خود سواری کرے اور مجھے پیدل ساتھ لئے پھرتا رہے!"

"اچھا یہ بتا تجھے مجھ سے محبت ہے؟" میرا غصہ کافور ہو چکا تھا اور میں نے اس کی دلجوئی کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

"میں نے ماں کی خانقاہ کی طرف جاتے ہوئے تجھ سے کیا کہا تھا؟" وہ چڑچڑے لہجہ میں بولی "اور محبت نہ ہوتی تو ماں کو چھوڑ کر تیرے ساتھ کیوں آتی؟"

"تو شہروں کی سیر کرنے کے لالچ میں میرے ساتھ آئی ہے ورنہ تو کبھی اپنی ماں کو نہ چھوڑتی!"

شہروں کا نام آتے ہی وہ یک بیک رونا بھول گئی اور پرتجسس لہجہ میں پوچھنے لگی "کیا شہروں میں بھی لوگ خچروں پر سفر کرتے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "وہاں عورتوں سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہے اور ہر عورت اپنے مرد کو کندھوں پر اٹھائے پھرتی ہے۔"

"میں تو ہرگز تجھے اپنے کندھے پر نہ اٹھاؤں گی۔" وہ دونوں ہاتھ جھٹک کر زمین سے اٹھ گئی۔

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ تو دھان پان سی لڑکی ہے، میرا وزن نہ سہار سکے گی!" میری سنجیدگی اب بھی برقرار تھی۔

"تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟" وہ رونا دھونا بھول کر یک بیک مشتعل ہو گئی اور میرے خچر کے قریب آ پہنچی "میں تجھے کندھے پر اٹھا کر بغیر [illegible]"

"[illegible] اگر تو ہمت کر لے تو شاید ممکن ہو۔" میں نے بات ختم کرنے کی نیت سے مصالحانہ لہجہ میں کہا "اب یہ بتا کہ تو سواری کرے گی یا پیدل چلے گی؟"

"بھاندرناس یہیں پھینک دے میں اس خچر پر سوار ہو جاؤں گی" وہ خوش ہو کر بولی۔

"دیکھو سیتا! تو مجھے بہت عزیز ہے" میں نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "مگر شہروں میں گھومنے کے لئے پیسہ بہت ضروری ہے اور بھاندرناس کے بغیر ہم وہاں بالکل مفلس ہوں گے!" وہ میری پوری بات سننے بغیر بےیقینی کے عالم میں زور زور سے سر ہلاتی رہی میں اس کے ردعمل کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "ہم بھاندرناس پھینکے بغیر بھی سواری کر سکتے ہیں۔"

"میں تجھے کندھے پر اٹھاؤں؟" وہ پھاڑ کھانے والے لہجہ میں غرائی "یہی مطلب ہے نا؟"

اس کے شبہات پر میں بےاختیار زور سے ہنس پڑا "نہیں

تو بھی میرے خچر پر سوار ہو جا یہ آسانی ہم دونوں کا بوجھ اٹھا لے گا۔"

اس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر پوری بات سمجھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ مشکوک لہجے میں بولی "کیا ہم دونوں کی شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں!" بےاختیار میرے منہ سے نکلا۔

اس کے منہ سے اطمینان کا ایک گہرا سانس خارج ہوا اور وہ اٹل لہجے میں بولی "پھر تو یہ ناممکن ہے کہ ہم دونوں ایک خچر پر سواری کریں۔"

"کیوں بھئی؟" مجھے اس سادہ لوح لڑکی کے اس رویے پر خاصی حیرت ہوئی۔

"میری ماں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ میں شادی کے بغیر تجھے اپنے بدن کو ہاتھ نہ لگانے دوں گی!" وہ صاف اور معصومانہ لہجے میں بولی۔

"مگر ان سات دنوں میں کئی بار میں تیرے بدن کو ہاتھ لگا چکا ہوں۔ پہاڑی خانقاہ کی طرف جاتے ہوئے تو خود میرے گلے سے آ لگی تھی!" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"میری ماں نے مجھے ایک ایک بات کھلے لفظوں میں سمجھائی ہے۔ جب میں تیرے گلے سے لگی تھی اس وقت تک ماں نے مجھے کچھ نہ بتایا تھا۔"

"تجھے معلوم ہے کہ شادی کسے کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ میرے حواس اب آہستہ آہستہ مخمور ہو چلے تھے۔ جن جذبوں کو میں سات روز سے دفن کرتا آ رہا تھا وہ اب بڑے مہیب انداز میں میرے وجود پر یلغار کر رہے تھے اور اس بار مجھے سندری سے کیا ہوا عہد پامال ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"نہیں!" اس نے بڑی بڑی آنکھوں کی جنبش کے ساتھ کہا۔ "ماں کہتی تھی کہ صفدر اپنے عقیدے کے مطابق تجھ سے شادی کرے گا۔ کیسے ہوتی ہے شادی؟"

اور سیتا کے اس سوال نے میرے وجود کو [illegible]

چاروں طرف بےجان اور ٹھوس چٹانوں کا اتھاہ سمندر، مکمل اور بےخطر تنہائی، لاکھ بہادر اور جانفروش سہی مگر ایک خوبرو اور جواں سال دوشیزہ مجھ جیسے گرگ باراں دیدہ سے ایک ایسا نازک سوال کر رہی تھی جس کا جواب بدترین گناہ اور بہترین فریضہ کے درمیان حد فاصل قائم کرتا تھا۔

میرا حلق خشک ہونے لگا، سانس تو نہ جانے کب سے سینے میں گھٹ رہا تھا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ اپنا دل ٹٹولا۔

گلنار۔ جسے میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار چاہا اور وہ مہنگے داموں گندے جذبوں کا مول چکانے والی ایک بیسوا ثابت ہوئی۔ پھر لونا مارٹن میری زندگی میں آئی۔ سادہ، سچی، معصوم اور مظلوم لڑکی جو حسن میں بےشک بےمثال نہ تھی۔ مگر [illegible] اور وفاداری میں جس کا ثانی نہ تھا۔ برونز آرٹ فیکٹری کی اس [illegible] ملازمہ کو میں نے اسی ادارہ کا اقتدار اعلیٰ بن کر چاہا اور

ٹوٹ کر جاتا اور آخرکار وہ اپنے مذہب اور گھر بار سے بے نیاز ہو کر لونا سفدر غلی بن گئی۔ مگر اس وقت میرا ستارہ گردش میں تھا میرے اعمال ہر قدم پر میرا تعاقب کر رہے تھے۔ کٹھمنڈو کی ایک ویران مضافاتی سڑک پر ایک خونریز تصادم میں وہ وفا پیشہ لڑکی میرے حریفوں کے نشانے پر آ کر اپنی جان کھو بیٹھی اور میں اس کی بے گور و کفن لاش ایک بازار میں چھوڑ کر روپوش ہونے پر مجبور ہو گیا.....

سندری نے شاید میرے بارے میں درست اندازہ لگایا تھا، شاید میں واقعی محبت کو ترسا ہوا ایک معصوم انسان تھا!

میرا پہلا انتخاب صورت کا تھا، دوسرا سیرت کا! اب سیتا میرے سامنے تھی جس کا رواں رواں حسن کا شاہکار تھا جس کی سیرت میں صرف وفا ہی وفا تھی۔ اُسے جیتنا میری آرزو تھی! میرا دل اس کا طلبگار تھا۔ اگر سندری سے کیا ہوا عہد یاد نہ رہتا تو سیتا نہ جانے کب دوشیزگی کی سرحد عبور کر چکی ہوتی!

میری آنکھیں خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں، میں ایک گھاگ شکاری کی طرح پہلو بدلتی، بے چین سیتا کا جائزہ لے رہا تھا۔ بس چند قدم جھپٹنے کی دیر تھی اور وہ بے بس کر لی جاتی مگر دوسری طرف وہ اپنی ماں کی فرماں بردار بھی تھی۔ میری کسی پیش کش کو خندہ پیشانی سے قبول نہ کرتی۔ اگر وہ میرے جنون سے گھبرا کر ان راہوں پر بھڑک کر بھاگ نکلتی تو شاید میں اُسے بے قابو کر لیتا، یا خاید بدحواسی میں وہ کسی کھائی میں جا گرتی، یا شاید میں خمار سے اندھا ہو کر کسی کھڈ میں گر پڑتا اور شاید وہ دونوں خچر بھی راہ صاف پا کر دینگتے ہوئے کسی طرف بھاگ نکلتے!

یہ جسارت ہر طرح پُرخطر تھی جب کہ میرا دل سیتا کا اسیر ہو چکا تھا ... سوال ... کر میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا! ... یا پناہ، جبر یا صبر! مجھے دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا اور اچانک میرے ذہن کے سارے بند دریچے کھل گئے۔ میں عالم اور متقی تو ہرگز نہ تھا لیکن ان غیر آباد ویرانوں میں میرے سوا کوئی نہ تھا جو اس وقت سہارا دیتا، میں خود سیتا کو اپنے مسلک میں شامل کر سکتا تھا.....!

"سیتا!" میں نے طویل سکوت کے بعد بوجھل آواز میں اُسے پکارا: "یہاں قریب میں کوئی چشمہ یا ندی موجود ہو گی؟"

"ہاں ــــ نیچے وادی میں مجھے پانی کی جھلک نظر آتی ہے مگر تجھے کیا ہو رہا ہے، تیرے چہرے کی حالت بدل گئی ہے تو میرے سوال کا جواب بھی نہیں دیتا!"

"میں ٹھیک ہوں، تیرے سوال کا جواب بھی دوں گا مگر پہلے ہمیں ندی تک پہنچنا ہے۔ ابھی سورج کی کرنوں میں حرارت باقی ہے۔ سورج ڈھل گیا تو میں پانی میں نہ اتر سکوں گا!"

میں بھی اپنے خچر سے اُتر پڑا۔ سیتا نے بھاندرناس سے لدے ہوئے خچر کی رسی تھام لی اور ہم سنبھل سنبھل کر نیچے اُترنے لگے!

پُرپیچ اور تنگ ڈھلانوں سے گزرتے ہم اس مقام پر جا نکلے جہاں ایک تیز ندی کا پانی چھینٹیں اڑاتا، شور مچاتا تیزی سے نشیب میں بہا جا رہا تھا!

یہاں ایک نکیلی چٹان سے دونوں خچر باندھ دیئے گئے!

"تو یہاں کیا کرے گا؟" سیتا اچانک سراسیمہ اور پریشان نظر آنے لگی تھی۔

"غسل!" میں نے مسکرا کر کہا "تو بھی مجھ سے دور ایسی جگہ چلی جا کہ میری نگاہ تیرے برہنہ جسم پر نہ پڑ سکے اور غسل کے بعد اپنے بدن کو کھال میں لپیٹ کر یہاں واپس آ جا!"

"کیوں؟"

"کیا تجھے اپنی ماں کی ہدایت یاد نہیں رہی، جو کچھ میں کہتا ہوں تجھے اس پر عمل کرنا چاہیئے!" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر کو جنبش دی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

میں بھی ندی میں کود گیا۔ پانی میں کودتے ہی ٹھنڈ کی ایک ناخوشگوار سی لہر پورے وجود میں سرایت کر گئی میں کافی دیر ندی کے تیز پانی میں نہاتا رہا اور جب باہر آیا تو سورج کی حرارت سرد ہوا کے سامنے ماند پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کانپتے ہوئے اپنا بدن سندری کی دی ہوئی کھالوں میں لپیٹ لیا۔

کچھ دیر بعد سیتا لاپرواہانہ شان سے چلتی واپس آ گئی۔ اس کے گیلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر بالوں سے بہنے والے پانی کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے تھے!

میں اُسے ساتھ لے کر ایک بار پھر ندی کے کنارے پہنچ گیا "یہاں، بیٹھ اور جس طرح میں منہ ہاتھ دھوتا ہوں اسکی نقل کرتی رہ"

"اس سے کیا ہو گا؟" اس کی الجھن لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"جو ہو گا ابھی سامنے آ جائے گا" میں نے کہا "ہاں دل میں یہ نیت ضرور کر لینا کہ اس طرح تو خود کو پاک کرنا چاہتی ہے"

پھر میں نے نہایت سکون سے وضو شروع کر دیا۔ ندی میں چھلانگ لگاتے ہی ذہن سے ساری دھند چھٹ چکی تھی لہٰذا

... پاکر دل و دماغ میں کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی۔ سیتا ... ساتھ میری ایک ایک حرکت پر غور کر رہی تھی اور خود بھی ... کرتی جا رہی تھی!

... یہ عمل پورا ہونے کے بعد میں نے اُسے وہاں سے اٹھنے ... ہم ندی کے کنارے ایک ایسی دراڑ میں آ بیٹھے جو ہوا ... حد تک محفوظ تھی!

"اب غور سے سن کہ میں تجھے اپنے مذہب پر لانے والا ہوں" ... سنجیدگی کے ساتھ کہا "یہ بتا کہ اب تک تیرا کیا مذہب تھا؟"

"ماں بتاتی تھی کہ ہم رام کے پجاری ہیں" وہ آنکھیں ... ہوئے بولی "وہ پہاڑی خانقاہ میں دن رات اسی کی پوجا ... تھی۔ میں جب اس سے ملنے وہاں جاتی تو وہ مجھے بھی ... شامل کر لیتی تھی۔ ہم دونوں نے کئی بار مٹی سے رام ... بنانا چاہا مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ ماں کی دلی تمنا تھی کہ میرے گھر ... بت ہو میرے لیئے اس نے پہاڑی خانقاہ کی ایک دیوار ... پتھریلی مورت الگ کرنی چاہی مگر وہ بھی ٹوٹ گئی۔"

"رام کون ہے؟" میں نے اس سے پوچھا

"پتہ نہیں ماں کیا کیا باتیں بتاتی رہتی تھی۔ وہ اپنے ... کے ساتھ آسمانوں میں رہتا ہے۔ اس نے اپنے سارے کام ... دیوی دیوتاؤں کو بانٹ دیئے ہیں!"

"میرا مذہب اسلام ہے اور ہمارا مالک خدا ہے مگر اس کا کوئی ... وہ ہر جگہ ہے مگر اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اس کے حکم کے ... کوئی کام نہیں ہو سکتا"! مجھے یہ سب بتاتے ہوئے میں نے ... کی گہرائیوں سے رقت اور دہشت کی ایک لہر ابھرتی محسوس ... ایک ایسے خدا کا پجاری تھا جو ہر کام پر قادر ہے جس کا ... مکمل ہے جو اپنے ماننے والوں کو سب کچھ دیتا ہے مگر ... بھول کر دیوانہ وار ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ... اب تک میں ... رہا تھا۔ مجھے آزادی اور عیش کے لمحوں میں بھول کر بھی اس ... آئی۔ مگر مشکلات میں وہ مجھے یوں یاد آتا تھا جیسے یہ پریشانیاں ... اعمال کا ثمرہ نہ ہوں بلکہ آسمان سے مجھ پر اتاری گئی ہوں۔

"تو بتاتا کیوں نہیں اپنے خدا کے بارے میں؟ مجھے اپنے ... عالم پا کر سیتا نے پُرشوق آواز میں ٹوکا۔

"اس کی صفات لازوال اور لاانتہا ہیں" میں نے دھیمی اور ... آواز میں کہا "یہ سب میں تجھے بعد میں بتاؤں گا، ابھی تجھے ... مسلک میں شامل کرنا ہے!"

پھر میں نے عقیدت میں ڈوب کر وہ کلمات پڑھائے جن کی ادائیگی کے بعد وہ میری ہم مذہب بن چکی تھی!

نکاح کے بارے میں میری معلومات نہایت ناقص تھیں ہاں اتنا علم ضرور تھا کہ ایک اسلامی فقہ کی رو سے نکاح کے جائز ہونے کے لیئے دو گواہوں کا ہونا ضروری قرار پایا ہے اور دوسرا اسلامی فقہ گواہوں کے بغیر بھی نکاح کو جائز ٹھہراتا ہے۔

پھر میں نے اسے محرم اور نامحرم کا فرق سمجھایا۔ اس سے سوال کیا کہ کیا وہ مجھے اپنا شوہر قبول کرتی ہے جب اس نے اقرار کر لیا تو میں نے اُسے زن و شوہر کے حقوق اور فرائض سے مختصراً آگاہ کیا۔ پھر میں نے ایک چرمی کھال کے مہر کے عوض اس سے تین بار ایجاب و قبول کرایا۔ یوں میری دانست میں سیتا شرعی اعتبار سے میرے نکاح میں آ گئی۔

مہر میں مقرر کی جانے والی کھال میں نے اسی وقت اس کے حوالے کر دی اور اُسے بتایا کہ اب وہ علی الاعلان خود کو میری بیوی کہے گی۔ اس وقت میری اپنی رائے یہ تھی کہ مرد و عورت کے مابین جب کوئی تیسرا فریق موجود نہ ہو اور وہ دونوں نکاح پر راضی ہوں تو ایسے نکاح کے جائز ہونے کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اس کا کھلے بندوں اعلان اور اقرار کر لیا جائے۔ کیونکہ اعلان اور اخفا کا فرق ہی گناہ اور شریعت کے مابین ہے!

شادی کا یہ انداز سیتا کے لیئے بڑا دلچسپ ثابت ہوا!

"اگر میرا خچر ضائع نہ ہوتا تو شاید ہماری شادی اس طرح نہ ہوتی" وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"شادی تو اٹل تھی، ہاں شاید دیر سے ہوتی!"

"یعنی تو نے مجھے اپنے ساتھ خچر پر بٹھانے اور بھاندرناس بچانے کے لیئے یہ شادی کی ہے؟" اس نے غور سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ـــ" میں موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے جلدی سے بولا: "یہ بھاندرناس تجھ پر قربان کی جا سکتی ہے سیتا، تجھے پا کر میں سب کچھ کھو دینے کو تیار ہوں، شہروں میں مفلسی کی زندگی بھی گوارا کر لوں گا۔"

"پھر میری خواہش ہے کہ تو بھاندرناس اس ندی میں بہا کر اپنی نیت کی مضبوطی کا ثبوت دے۔ مفلسی میں میں گردن گردن تیرا ساتھ دوں گی!"

لمحہ بھر کے لیئے مجھ پر تذبذب طاری ہوا مگر سیتا اس وقت غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھی اور میں ہر قیمت پر اُسے اپنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے لپک کر بھاندرناس سے لدے ہوئے خچر کی رسی

کھولی اور اسے ہانکتا ہوا ندی کی طرف لے چلا۔ سیتا کے شبہات نے میری دوہری کامیابی کا پندار چور چور کر دیا تھا۔ میری طویل جدوجہد کا ثمر میرے اپنے ہاتھوں ضائع ہونے والا تھا۔ مگر یہ موقع میرے لئے سیتا یا بھاندرناس میں سے کسی ایک کے انتخاب کا تھا۔ اگر میں بھاندرناس بچانے کے لئے ذرا بھی بحث کرتا تو سیتا یقیناً مجھ سے ترک تعلق کر کے واپسی کی راہ پکڑ لیتی، خواہ اس میں اس کی جان ہی ضائع ہو جاتی!

میں نے خچر کی پشت سے بھاندرناس کا پہلا ٹکڑا اٹھایا اور بوجھل دل کے ساتھ ندی میں اچھال دیا۔ اسی وقت پیچھے سے سیتا کی آواز گونجی: "بس صفدر مجھے تیری نیت کا اعتبار آگیا!"

اس کا یہ اعلان میرے لئے غیر متوقع تھا۔ میں پلٹا تو وہ ننگے پیروں نکیلے پتھروں پر دوڑتی میری طرف چلی آ رہی تھی اور قریب آکر وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے بھی خچر کی رسی چھوڑ دی اور پورے جوش و خروش سے اپنی اس نوبیاہتا پہاڑی دلہن کو اپنی باہنوں میں سمیٹ لیا۔

نہ جانے کتنی دیر وہ خچر یوں ہی کھلا رہا لیکن اسے فرار کی نہ سوجھی۔ وہ ندی کے کنارے اگا ہوا سبزہ چرتا رہا اور وقفے وقفے سے آوازیں نکال کر اپنی موجودگی سے باخبر کرتا رہا!

"یہ سب تجھے پہلے کیوں نہ یاد آیا صفدر، اگر ہماری شادی ماں کے سامنے ہو جاتی تو وہ کس قدر خوش ہوتی۔ مجھے تیرے ساتھ بھیجتے ہوئے اس کا دل کانپ رہا تھا، وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں خود اس کی طرح، اس کی بیٹی سیتا بھی کسی فریب کا شکار نہ ہو جائے۔" سیتا بولی

"نہ جانے وہاں اب کیا حالات ہوں؟" میں پُرخیال لہجے میں بولا: "سندری بے چاری ساری زندگی تیری طرف سے تفکرات کا شکار رہے گی۔ ہمیں وہاں سے نکلے سات روز ہو چکے ہیں۔ اگر ہم ابھی واپسی کا سفر شروع کریں تو ہمارے پہنچنے سے پہلے تیری ماں آدم خوروں کو رہا کر چکی ہوگی اور وہ ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

"نہیں۔ اب واپسی کا خیال بھی چھوڑ دے۔" وہ گھبرا کر بلندی سے بولی۔

"مگر بعد میں تو اپنی ماں سے ملنے کیسے آئے گی؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ماں بتا چکی تھی کہ ایک بار میں تیرے ساتھ گئی تو کبھی واپس نہ آ سکوں گی، وہ تو میں تجھے چڑانے کے لئے کہتی تھی ... تو میری ماں سے جلتا تھا نا!" وہ ہنستے ہوئے میری باہنوں میں آ گری۔

"اس لئے جلتا تھا کہ تیری ماں تجھ سے زیادہ حسین ہے!"

"جھوٹ، میں نے اپنے گھر میں صاف پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب بنایا ہوا تھا۔ اس میں کبھی کبھار میں اپنا عکس دیکھتی تھی، میں بالکل اپنی ماں کی ہم شکل ہوں!" وہ اترا کر بولی

ہم نے وہ شبِ عروسی اسی محفوظ دراڑ میں بسر کی۔ سیتا نے اس رات کی سیاہی میں میرے دل پر ایسا اَن مٹ نقش چھوڑا کہ آج بھی اس کا تصور میرے لئے سکون کی معراج ہے!

اگلے روز ہم وہاں سے آگے چل پڑے!

سفر کے گیارہویں دن ہم ڈھلوان جنگلات میں داخل ہو گئے۔ میرا اندازہ تھا کہ انندرام کے تعاقب میں میں انہی جنگلات کے کسی حصے میں سے گزرا تھا اور اگر میرا یہ خیال درست تھا تو یہ جنگل بہت خطرناک تھا کیوں کہ اس جنگل میں درندوں کی کثرت تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد جنگل سے آنے والی آوازوں نے میرے اندیشے کی تائید کر دی اور مجھے اپنے تحفظ کی فکر لاحق ہو گئی۔ یہاں خچروں کو قابو میں رکھنا بھی دشوار نظر آ رہا تھا کیونکہ وہ درندوں کا شور سن کر بار بار بھڑک رہے تھے!

انندرام کے ہمراہ سیتا وادی جاتے ہوئے جنگل کا یہ حصہ ایک رات میں ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس سے آگے ناہموار پہاڑی علاقے تھے اور یہ پورا سفر گیارہ دن میں طے ہوا تھا مگر اس مرتبہ ابھی تک بلند پہاڑوں میں ہی تھے۔ وہ وسیع و عریض میدان کہیں نظر نہ آیا تھا اور اگر یہ وہی جنگل تھا تو ہم اسے دس بارہ گھنٹوں میں عبور کر کے اس ندی تک جا پہنچے۔ جس کی دوسری جانب نواکوٹ کی بستی واقع تھی!

"تجھے کوئی گیت آتا ہے سیتا؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"ہاں کئی گیت آتے ہیں جو ماں نے اپنے بچپن میں سیکھے تھے!" وہ شوق سے بولی۔

"تیری ماں کا بچپن کہاں گزرا تھا سیتا؟" میں نے ٹٹولنے کی نیت سے پوچھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کے افسوس ناک اور قابلِ رحم ماضی سے کس حد تک باخبر ہے؟

"مجھے ماں سے یہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ کہتی تھی کہ آدم خوروں میں عورتوں کی ذلت وہ گوارہ نہ کر سکی تو اس نے لنگوروں میں پناہ لے لی۔ پھر پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف جانے والی ایک جماعت راستہ بھٹک گئی، میری ماں کئی دن چھپ کر ان کا پیچھا کرتی رہی تاکہ وہ اس کے علاقے میں کوئی شرارت نہ کر سکیں مگر وہ بیمار تھے اور سخت پریشان بھی۔ میری ماں کو ان پر رحم آیا، وہ آدم خوروں کے قبضے میں آ جاتے تو بے موت مارے جاتے۔ ماں ان کو اپنے ہمراہ ان کھنڈرات میں لے آئی جہاں وہ لنگوروں کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں نے بڑی محبت سے ان کی دیکھ بھال کی، ان کا علاج کیا اور وہ صحت مند ہو گئے تو ان سفید چمڑی والے درندوں کو معلوم ہوا کہ کھنڈروں میں میری ماں تنہا رہتی ہے تو ایک روز انھوں نے اس کی عزت پر حملہ کر دیا۔ میری ماں نے بڑی جدوجہد کی مگر اپنا آپ نہ بچا سکی۔ مگر اس سے پہلے کہ باقی دو آدمی بھی اسے پامال کرتے لنگوروں نے ماں کی چیخیں سن کر ان پر حملہ کر دیا۔ دو کو تو لنگوروں نے لہولہان کر کے مار ڈالا مگر اپنی عزت کے دشمن کو میری ماں نے اپنے قید خانے میں بھوکا پیاسا قید کر کے سسکا سسکا کر مار ڈالا۔ ان مردوں کی کھوپڑیاں بھی اس نے نشانی کے طور پر وہیں ڈال دیں۔ پھر اس کی کوکھ سے میں پیدا ہوئی ... اس سے پہلے میری ماں کہاں تھی یہ مجھے معلوم نہیں!"

سیتا کو ایک ایک نقش اپنی ماں سے ورثہ میں ملا تھا وہی پلکیں، وہی بڑی بڑی آنکھیں، گداز بدن، دراز قامت، سرخ ... اس نے سب کچھ ماں سے پایا تھا۔ مگر بالوں کی سرخی اور آنکھوں کی نیلاہٹ اسے اپنے بدیسی باپ سے ملی تھی!

اسی وقت قریب سے ایک گیدڑ کی آواز ابھری اور خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

"تم اونچی آواز میں گانا شروع کر دو، میں بھی چیخوں گا۔" میں نے بولا: "اس طرح جنگلی جانور ڈر کر ہم سے دور رہیں گے!"

سیتا نے فوراً ہی میری ہدایت پر عمل کیا اور میں بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔ وہ شادی بیاہ کے موقع پر ہندوستانی گھرانوں میں گائے جانے والا ایک قدیم گیت گا رہی تھی جو شاید اس کی ماں اپنے بچپن میں بکثرت سنتی رہی ہوگی!

گاتے اور شور مچاتے ہم یوں ہی بڑھتے رہے اور تقریباً چار گھنٹے بعد ہی ہم جنگل سے باہر نکل آئے مگر اب سامنے ایک بلند پہاڑی سلسلہ موجود تھا۔ یعنی ہم ابھی تک نواکوٹ کے نواحی جنگل میں نہیں پہنچے تھے۔

راتوں کو قیام اور دن کو مسلسل سفر۔ ابھی تک اس معمول میں کسی تبدیلی کے آثار نہ تھے۔ ان وادیوں میں سردی ضرور تھی مگر سیتا کے بدن پر اضمحلال کے بجائے چونچالی آتی تھی!

اس رات ہم ایک غار میں فروکش تھے۔ سیتا میری فرمائش پر مدھر آواز میں ایک گیت سنا رہی تھی وہی قدیم گیت جس میں شادی بیاہ کے گھریلو تک بندیاں تھیں۔ رات تاریک اور موسم سرد تھا ... رس بھرے بولوں سے رچے گیت کے بول فضا میں گونج رہے تھے اور جب آخری تان لگا کر خاموشی ہوئی تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"سندری!" اچانک ہمارے سروں پر ایک چٹان سے قہر میں ڈوبی ہوئی آواز گونجی۔

میں بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ سیتا میرے بدن سے چپکی کانپ رہی تھی۔ اس دور افتادہ ویرانے میں اپنی ماں کا نام سن کر وہ دہل اٹھی تھی۔

میرے اٹھتے ہی اس چٹان پر آہنی زنجیریں آپس میں ٹکرائیں اور وہاں موجود ایک تاریک انسانی ہیولا پیچھے اچھل کر اندھیرے میں معدوم ہو گیا۔

زنجیر کی جھنکار اور وہ قہر بار آواز میرے لئے اجنبی نہ تھی اس وقت مجھے احساس ہوا کہ دنیا بہت مختصر اور محدود ہے۔ انندرام کسی آسیب کی طرح یہاں بھی آ پہنچا تھا!

ممکن تھا کہ وہ ادھر سے گزر رہا ہو مگر سیتا کا گیت سن کر ادھر آ پہنچا ہو۔ اس کی طاقت ور مقناطیسی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے پر قادر تھیں مگر وہ سیتا کے چہرے پر سندری کا فریب کھا گیا مجھے ڈر تھا کہ اشتعال کے عالم میں وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لے!

"انندرام ... تم کہاں چھپ گئے۔ یہ تمھاری بیٹی سندری نہیں ہے!" میں پوری قوت سے چلایا اور رات کے اندھیرے میں میری آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔

"یہ کون ہے صفدر؟" سیتا نے سرگوشی کی۔

"انندرام!" میں نے بے چین نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ میری ماں کا باپ ہے؟"

سیتا کا یہ سوال میں نے اَن سنا کر دیا میرے کان انندرام کی آواز کے منتظر تھے۔ مگر اس کی تو آہٹ تک مفقود ہو چکی تھی جیسے وہ کوئی سایہ رہا ہو!

پھر فضا میں اچانک چمٹے کے آہنی پھلوں کا تیز شور ایک خچر کی آواز کے ساتھ بلند ہوا۔ میں بوکھلا کر پلٹا تو بھاندرناس سے لدا ہوا خچر بدک کر ایک طرف بھاگ نکلا تھا اور ایک نحیف و نزار انسانی ہیولا دوسرے خچر کی رسی کھولنے میں مصروف تھا۔

"انندرام" میں پوری قوت سے چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ اس نے بس ایک پل کے لئے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحہ اس نے دوسرے خچر کی رسی کھول کر اس کی پشت پر اپنا لمبے پھل والا آہنی چمٹا رسید کیا اور وہ خچر بھی ریگتا ہوا ایک طرف ہو لیا۔

"سندری! میں تجھے پیوند زمین کر دوں گا۔" انندرام کی آواز میں قہر و غضب کی بجلیاں کوند رہی تھیں اور وہ ہر مقابلے کے لئے تیار نظر آتا تھا۔

"انندرام یہ سندری نہیں ہے!" میں دوڑتے دوڑتے چیخا

"مجھے فریب نہ دے صفدر!" وہ طنز اور حقارت کے ساتھ چیخا۔

"مجھے جس پہ ناز تھا آج اس کا فریب سامنے آیا ہے، لعنت ہے میری زندگی پر، اب یہ میرے ہاتھوں ماری جائے گی بس نوجوان ہے وہیں رک جا ورنہ اپنے چمٹے کا پھل تیرے سینے میں اتار دوں گا۔"

غیر ارادی طور پر میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"انند رام یہ سندری نہیں، تیری نواسی سیتا ہے!"

"نواسی؟" انند رام نے چیخ کر چمٹے سے اپنی پیشانی پیٹ لی اور زہریلے لہجے میں بولا: "کیا سندری نے میری جوان نواسی کو جنم دیا ہے، کیا بنارس کے پنڈتوں نے اُسے یہاں بھی نہ چھوڑا؟" وہ بڑے کرب کے عالم میں کراہا: "رام۔ تو کہاں سو گیا ہے، میں تیری مالائیں جپتے جپتے بوڑھا ہو گیا اور اس کا صلہ.... اس کا صلہ یہ جوان نواسی ملی ہے!" آخر میں اس کی آواز بھرا گئی۔

اسے نئے انکشاف کے صدمے سے نڈھال پا کر میں بے آواز آگے بڑھا مگر وہ چوکنا تھا۔ "خبردار جو تو آگے آیا۔ یہ اگر سندری نہیں ہے تو بولتی کیوں نہیں؟"

"بابا۔ سندری میری ماں ہے، وہ اونچے پہاڑوں میں لنگوروں کے درمیان رہتی ہے!"

"لنگور!" انند رام نے پاگلوں کی طرح ہذیانی قہقہہ لگایا۔ "تو کیا سندری نے تجھے لنگوروں کے نطفے سے جنا ہے! میں مار ڈالوں گا اس کمینی کو!"

"انند رام۔ کیا بک رہا ہے اپنی بیٹی کے لئے!" میں اس کی بکواس سن کر طیش میں آ گیا۔ "سندری نے اپنی عزت کے دشمن کا دیا بچہ سکھا کر محفوظ رکھا ہوا ہے، وہ دھوکہ کا شکار ہوئی تھی ورنہ وہ آج بھی معصوم اور پاکیزہ ہے!"

"شاید تو اس چھوکری کو بھگا کر لایا ہے؟" انند رام کی آواز زہر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"یہ میری بیوی ہے!"

"ناجائز لڑکی ناجائز بیوی بھی بن سکتی ہے!" وہ ہذیانی انداز میں ہنسا۔ "میں نے سندری کی خاطر اپنی زندگی جہنم بنا لی ہے اور وہ مجھ سے اپنی بیٹی چھپاتی رہی۔ اگر وہ بے قصور ہوتی تو اسے لوتھڑے کی شکل میں میرے قدموں میں لا ڈالتی اور میں اس کا قصہ تمام کر دیتا۔"

"انند رام! سیتا اپنی ماں کی ناجائز اولاد سہی مگر اب میری جائز بیوی ہے، اگر اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو تجھے زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

"شاید تجھے سندری نے بھاندرناس دلا دی جو تو صلے میں اس کی لڑکی بیاہ لایا۔ اب نہ بھاندرناس ہے نہ تمہارے خچر، میں جا رہا ہوں میں سندری کی بوٹیاں اڑا دوں گا اور تم دونوں خود ہی یہاں بھٹک کر مر جاؤ گے۔ میں تمہیں بھی اپنے ہاتھوں مارتا لیکن ایک بوڑھا جوانوں کے مقابلے میں نہ ٹک سکے گا!"

"مگر میں تجھے نہ جانے دوں گا بڈھے!" اس کی ہرزہ سرائی پر میں بھی مشتعل ہو گیا۔ "تو ساری زندگی پاپ کماتا رہا، سستے داموں بدی اور بدکاری بیچتا رہا اور سندری کو تیرے گناہوں کا عذاب جھیلنا پڑا۔ لیکن اب دیکھ کر تو کتنا دکھی ہے اور وہ کس قدر... وہ تیری بیٹی ہو نہ ہو، میری ماں ضرور ہے!"

"بڑی ہمدردی ہے تجھے اس سے!" انند رام نفرت اور انتقام کا پیکر بنا ہوا تھا۔ "شاید سندری نے تجھے اچھی رشوت دی ہے، کہیں تو اس کی کوکھ میں دوسری....."

انند رام کی بات پوری ہونے سے پہلے میں آگے جھپٹا۔ اس نے میری زد سے بچنا چاہا مگر اب میری قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ انند رام نے آہنی چمٹا میری پنڈلیوں پہ مارا، میں اچھل کر کو اس کاری وار سے تو بچ گیا لیکن آہنی پھل نے میرے بائیں پیر کی انگلیاں توڑ ڈالیں!

میرے دونوں ہاتھ انند رام کے نرخرے پر جم گئے، اس کے بدن سے لپٹی ہوئی آہنی زنجیروں کی جھنکار سے گونج اٹھی۔ اس نے ایک بار پھر آہنی پھل بلند کیا تاکہ میرے سر پر ضرب لگائے مگر سیتا نے بجلی کی سی پھرتی سے لپک کر اس سے چمٹا چھین لیا۔

انند رام بوڑھا ضرور تھا لیکن اس کی ہڈیوں میں بے پناہ طاقت تھی پھر وہ تنفس کی عجیب و غریب مشقوں کا ماہر تھا، شروع ہی پہلے تو بوکھلا گیا تھا پھر اس نے نہ جانے کیا حرکت کی کہ مجھے اپنی انگلیوں کے نیچے اس کی گردن پر بہت سی سخت آہنی سلاخیں محسوس ہوئیں۔ اس مکار نے اپنے گلے کی تمام رگوں کو اس طرح پھلا لیا تھا کہ اب میرے لئے اس کا گلا گھونٹنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا اسی کے ساتھ اس کا پورا جسم بھی اکڑ گیا تھا!

میں نے صورتِ حال کا اندازہ ہوتے ہی بے مقصد زور لگانے کی کوشش ترک کر دی اور اچانک اس کی دونوں ٹانگوں سے لپٹ کر اُسے زمین پر دے مارا پھر اس سے قبل کہ میں اُسے بے بس کروں اُس نے مجھے اپنے بدن سے دور اُچھال دیا اور خود زمین سے اٹھ کر سیتا کی طرف لپکا تاکہ اُس سے آہنی چمٹا چھین کر مجھ پر بھرپور حملہ کر سکے!

سیتا اپنی جگہ سکون سے کھڑی اس کی منتظر رہی اور جیسے ہی انند رام اس کے نزدیک پہنچا وہ چمٹا ایک طرف پھینک کر جونک کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ تاریکی کے باعث میں سیتا کا

دیکھ سکا لیکن انند رام بری طرح کراہ کر پیچھے اچھلا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

سیتا اس کے سر پر جا پہنچی اور اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔ اسی اثنا میں میں آہنی چمٹا لئے وہاں پہنچ گیا مگر سیتا نے سختی سے مجھے دخل اندازی سے روک دیا!

"اگر تیرا خون اصل ہوتا تو یوں مجھ پہ ہاتھ نہ اٹھاتی" انند رام زمین پر پڑے پڑے کراہتا ہوا بولا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بری طرح اپنا پیٹ دبایا ہوا تھا۔

میں نے اب آؤ دیکھا نہ تاؤ آہنی چمٹے کا پھل اس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ وہ زور سے چیخا اور زمین اس کے خون سے رنگین ہونے لگی۔

"اپنی ماں کے بدخواہ سے بدلہ لینے میں میں تجھ سے پیچھے نہ رہوں گی۔" سیتا نے یہ کہتے ہوئے آہنی چمٹا مجھ سے لے لیا۔ سیتا کی لگائی ہوئی ضرب کاری ثابت ہوئی۔ انند رام کا جسم آہستہ آہستہ تڑپ کر بے جان ہو گیا اور سیتا نے نفرت سے اس کی لاش پر تھوک دیا۔

"ہمارے خچر نکل گئے۔ یہ بہت برا ہوا۔" اس کام سے فارغ ہو کر سیتا اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

"ابھی وہ زیادہ دور نہ نکلے ہوں گے انہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ان کی تلاش میں جانے سے پہلے انند رام کی تلاشی لے لو۔"

انند رام کے بدن پر گیروے رنگ کی دھوتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ سیتا نے اس کے جسم سے آہنی زنجیریں اور پتھر کی تمام مالائیں اتار لیں، اس کا خیال تھا کہ یہ چیزیں آئندہ کسی نہ کسی موقع پر کام آ سکیں گی۔ سیتا نے انند رام کے بدن سے اترے ہوئے زرد کپڑے میں باندھ لیا۔ آہنی چمٹا سیتا کے پاس تھا اس کام سے فارغ ہو کر ہم خچروں کی تلاش میں نکل پڑے۔ وہ ساری رات ہم نے خچروں کی تلاش میں بھٹکتے گزار دی۔ اگلا دن بھی اسی تلاش میں صرف ہوا لیکن خچر تو کیا ہمیں ان بنجر پہاڑوں میں کسی چوہے کا بچہ تک نظر نہ آ سکا۔ مجھے سواری کے خچر سے زیادہ بھاندرناس کے لدے ہوئے خچر کی فکر تھی اور اس فکر میں سیتا برابر کی شریک تھی۔ سیتا نے بعد میں انند رام کے بارے میں مجھ سے ایک لفظ نہ پوچھا۔ مجھے اُمید تھی کہ اس منحوس واقعے کا جذباتی تاثر ختم ہونے کے بعد وہ کم از کم ایک بار مجھ سے ضرور بات کرے گی۔

اور ہوا بھی یہی۔ اگلی رات جب تھک ہار کر ہم نے قیام کیا تو سیتا نے انند رام کا ذکر چھیڑ دیا۔ "کیا یہ درست ہے کہ میری ماں اسی منحوس بڈھے کی بیٹی تھی؟"

"ہاں۔" میں نے یہ اقرار کرتے ہوئے افسوس محسوس کیا۔

"مگر ماں نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا، تو بھی تو شاید اسی کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا؟"

"ہاں — یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

"میں پورا قصہ سننے کو بے چین ہوں، یہ کیسا مردود باپ تھا کہ خود اپنی بیٹی پر بدکاری کے الزام لگاتا تھا۔" وہ نفرت کے ساتھ بولی۔

میں نے سندری کی پہنائی ہوئی چاندی کی انگوٹھی کے نگ سے کھیلتے ہوئے بات شروع کر دی اور آہستہ آہستہ اسے انند رام اور سندری کے ماضی سے باخبر کرتا چلا گیا۔ انند رام کی موت کے بعد اب میں سندری سے کئے ہوئے ہر عہد سے بری ہو چکا تھا۔

"میری ماں نے مجھے کبھی نہ بتایا کہ ہر برس پہاڑی خانقاہ سے اُتر کر وہ کہاں جاتی ہے۔" سیتا دُکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"وہ تجھے کیا بتاتی...... اس نے تو اپنے باپ کی خوشی کی خاطر اپنا ہر شوق اور ہر ارمان تج دیا تھا۔ اس کی خاطر شاید وہ تجھے بھی پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیتی مگر ممتا اس کائنات کا وہ جذبہ ہے جس کے سامنے دوسرے تمام جذبے ہیچ ہوتے ہیں۔"

"چاندی کی یہ انگوٹھی جو ماں نے تجھے دی، شاید اسے انند رام ہی سے ملی تھی۔" سیتا نے کہا۔ "مجھے تو کچھ پتہ نہ تھا کہ ماں کہاں جاتی ہے۔ ایک بار وہ ایسے ہی سفر سے لوٹی تو بد وضع سیاہ پتھر کے نگینے والی یہ انگوٹھی اس کے پاس تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ بولی کہ انگوٹھی اسے پڑی ملی ہے۔"

"ہو گا۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "میرے لئے تو یہ سندری کی نشانی ہے۔"

"اب میں تجھے ایک بات بتاتی ہوں۔" کچھ دیر کے بوجھل سکوت کے بعد سیتا بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہم شہروں میں مفلس بن کر ہرگز نہ جائیں گے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"بھاندرناس ضائع ہو گئی مگر سیتا میں محنت کا چور نہیں۔ اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ کیمیاگری میرے مقدر میں نہیں ہے۔ یہ ساری تگ و دو یہ پُرمصائب زندگی تو تجھ تک رسائی کا بہانہ تھی۔ میں اب گھبرانے لگا ہوں، میں شہر لوٹ کر مشقت کروں گا اور تو کبھی تنگدست نہ ہونے پائے گی۔"

"تو نے اتنا عرصہ اپنے شوق میں گزارا، اب میں تجھے دھول گری کے اس پار لے جاؤں گی۔ ہم وہاں سے کالی دھات کو زرد بنانے والا پتھر لائیں گے، تجھے اس کی بھی تو تلاش تھی نا؟"

میری آتشِ شوق یک بیک پھر بھڑک اٹھی۔ "تو مجھے وہاں تک لے جائے گی۔ سیتا! اگر میں نے پارس حاصل کر لیا تو میں دُنیا کو حیران کر دوں گا۔ سائنس کہتی ہے کہ کسی بھی عنصر کے ایٹم میں ناقابلِ عمل تبدیلیاں کئے بغیر

اس کی ہیئت نہیں بدلی جاسکتی مگر میں یہ کرکے دکھادوں گا۔" میں فرطِ جوش میں اس کے سامنے وہ باتیں کہتا چلا گیا جو اس کے ذہن کے لئے معمّے سے کم نہ تھیں اور وہ دیوانوں کی طرح بس میرا منہ تکتی رہ گئی۔

بھاندرناس کے علاقے کا رُخ کرنا اب میرے لئے ناممکن تھا' میں وہاں پہنچ ضرور جاتا مگر زندہ لوٹنا ناممکن تھا۔ میں نے یہ تجویز بھی سوچی کہ اپنی بے تحاشا بڑھی ہوئی داڑھی صاف کردوں' اپنا اور سیتا کا سر منڈوا دوں' شہر لوٹ کر شیو کا سامان بھی ہمراہ لے لوں تاکہ یہ بہروپ قائم رکھ سکوں اس طرح وہ آدم خور تو کیا سندری تک مجھے نہ پہچان سکے گی مگر سیتا نے یہ تجویز رَد کردی۔ اس نے بتایا کہ آدم خوروں کے کھوجی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی مجھے پہچان لیں گے۔ وہ خدوخال سے نہیں' انسانی جسم کی بُو سے شناخت کا کام لیتے ہیں جسے بدلنا ناممکن ہے۔"

دھول گری کی طرف واپسی میں اب ایک سخت مشکل تھی۔ یہ تمام علاقے سیتا کے لئے اجنبی تھے۔ یہاں سے راہ کا تعین اس کے لئے بہت دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ میں اندر رام کے ہمراہ سیاہ پتھروں والی سیتا وادی میں جاچکا تھا جس کے غاروں میں ہر طرف دیوی دیوتاؤں کی عجیب و غریب مورتیں تسلسل کے ساتھ ابھری ہوئی تھیں۔ اندر رام کی ان اطراف میں موجودگی سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہم لوگ سندری سے الگ ہونے کے بعد غلط راستے پر بھٹکتے رہے ہیں ورنہ سیتا وادی سے آدم خوروں کے قبیلے تک پیدل پہنچنے میں مجھے کُل تین دن صَرف ہوئے تھے اور لوا کوٹ سے سیتا وادی پہنچنے میں کُل گیارہ دن لگے تھے جبکہ اس مرتبہ بیس بائیس دن گزر جانے کے باوجود ہمیں راہ کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔ شاید ان بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد اب ہم سیتا وادی کے قریب پہنچے تھے۔ ورنہ اندر رام کا ادھر آ نکلنا دشوار ہی تھا۔

یہ سوچ کر ہم نے ایک مرتبہ پھر سمت بدلی یا رستہ میں ایک ندی میں اندر رام کے جسم سے اُتاری ہوئی تمام چیزیں دھولی گئی تھیں۔ ان سے خون اُتر جانے کے بعد میں نے ساری مالائیں سیتا کے گلے میں ڈال دیں۔ دھوتی کا زرد کپڑا اپنے سر اور کانوں پر لپیٹ لیا۔ ایک زنجیر اپنے بدن پر کھالوں کو باندھنے کے لئے رکھ لی' دوسری سیتا کو دی۔ باقی ناکارہ وزن سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔

جب میں نے اپنے ان اندازوں سے سیتا کو باخبر کیا تو وہ متوحش نظر آنے لگی۔ "اب یہاں سے نکل جانے کی فکر کر۔ اگر ہم آدمخوروں سے اس قدر قریب ہیں تو ان کے کھوجی کسی بھی لمحے ہمیں آلیں گے اور سیتا وادی تو یقیناً ہمارا قبرستان ہی ثابت ہوگی۔"

"پھر تو نے دھول گری کی تجویز کیوں پیش کی تھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"آدمخوروں کا خیال ذہن سے نکل گیا تھا۔" اس کی نیلی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

ہم مزید تین دن پہاڑوں میں بے نیل و مرام سرگرداں رہے ایک طرف راستہ بھول جانے کی وحشت' دوسری طرف آدمخوروں کا خوف کم از کم میرا تمام وقت شدید اعصابی انتشار میں گزرتا تھا۔ سیتا کو بھی صورتِ حال کی نزاکت کا پورا احساس تھا مگر اسے خود پر اتنا اختیار تھا کہ بشرے سے اپنی پریشانی کا اظہار نہ ہونے دیتی تھی۔

اندر رام کے آہنی چمٹے سے متاثر ہونے والی میرے بائیں پیر کی دو انگلیاں مستقل ورم آلود تھیں۔ گو چلنے سے ان میں تکلیف نہیں ہوتی تھی مگر دو ٹہنے یلے طرح پیر پڑنے سے بس جان نکل جاتی تھی۔ سیتا نے ایک دو مرتبہ جنگلی پودوں کے رس سے مالش بھی کرنی چاہی لیکن تکلیف کی وجہ سے میں یہ تجربہ نہ کرسکا۔ سیتا نے ایک بار پورے خلوص کے ساتھ مجھے اپنے کندھے پر اٹھانے کی پیشکش کی جسے میں نے سختی سے مسترد کردیا ساتھ ہی اس کی یہ غلط فہمی بھی دُور کردی کہ شہروں میں مرد عورتوں کے کندھوں پر سواری کرتے ہیں۔

سندری سے رخصت کے شاید چھبیسویں دن سیتا خوشی سے ایکدم اچھل پڑی۔ "صفدر...... صفدر! یہ علاقہ تو مجھے جانا پہچانا سا لگتا ہے۔"

"واقعی؟" حیرت اور مسرت کے باعث میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

"تو یہیں رُک جا' میں ابھی بتاتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر دوڑتی ہوئی ایک بلند ٹیلے پر جا چڑھی۔ پھر وہیں سے مسرت بھری آواز میں چیخی۔ "ہاں میں ٹھیک کہہ رہی تھی صفدر! یہاں آ' میں تجھے بھی یہ منظر دکھاؤں۔"

میں تیز تیز چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔ اس ٹیلے کے پار چند سو گز آگے ایک بہت چوڑی اور گہری کھائی میلوں دُور تک پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"ہم بستی سے واپس لوٹنے کے بجائے بہت بڑا چکر کاٹ کر آگے نکل آئے ہیں۔ جس طرف سے ہم آئے ہیں اُدھر یہ کھائی میلوں دُور تک پھیلی ہوئی ہے اور راستے میں اسے عبور کرنا ناممکن ہے۔ یہ بستی سے لُٹنے کے لئے جو راستہ پکڑتی تھی وہ یہاں سے تھوڑی دُور ہے۔ جہاں یہ کھائی اچانک ختم ہوجاتی ہے اور یہی راستہ آگے جنگلوں اور دلدلوں سے گزر کر دھول گری تک پہنچتا ہے۔"

"یہاں آدمخوروں کا تو اندیشہ نہیں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں ــــ اگر ہم ان کے قرب و جوار میں ہوتے تو شاید اچانک ہمیں آلیتے مگر اب تو ان کے کھوجی بُو کے سہارے اسی طویل راہ پر نکلیں گے جو ہم نے اختیار کیا تھا اور ان کو راستے ہی سے مایوس ہو کر لوٹنا پڑے گا۔"

"یہاں سے واپسی کا سفر کیسے ہوگا؟"

"واپسی؟" وہ حیرت سے بولی۔ "اب تو ہم بلاخوف و خطر دھول گری کی طرف بڑھیں گے۔"

پہلے میں نے روا روی میں اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی اس وقت میرا ذہن آدمخوروں کے خطرے میں اُلجھا ہوا تھا اور اب اس کے یاد دلاتے ہی میرا دل اچھل پڑا۔

اس اچانک دریافت نے میرا حوصلہ ایک بار پھر بلند کردیا۔ شاید قدرت مجھ پر مہربان ہوچلی تھی جو مایوسی کے کٹھن لمحات میں یک بیک یہ نوید سامنے آئی تھی۔

اس بار سفر ایک نئے عزم کے ساتھ شروع ہوا۔ منزل متعین تھی' مقصد واضح اور راہیں شناسا ـــــ گو آگے سیتا کے بقول دھواں اُگلتی سفید دلدلیں بھی تھیں اور تاریک جنگلات بھی مگر اب میرے لئے راستے کی یہ رُکاوٹیں بے معنی تھیں۔ میرے سامنے جو مقصد تھا اس کے حصول کی خاطر یہ سارے مصائب ہنستے کھیلتے برداشت کئے جاسکتے تھے۔

اس مرتبہ خلافِ توقع ہمارا رُخ بلندی کی جانب نہ تھا بلکہ مسلسل نشیب میں اُتر رہے تھے۔ اور اس سے پیشتر میرا قیاس بھی یہی تھا کیونکہ بلندیوں میں دلدلوں کے امکانات بالکل نہیں ہوتے پھر آہستہ آہستہ موسم بھی تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ نہ جانے یہ تبدیلی کی عمومی لہر تھی یا دلدلوں سے قریب آنے کی وجہ سے کبھی کبھار فضا میں ہلکی سی گرمی کا احساس ہونے لگتا تھا۔

تین دن تک نشیب کی جانب یہ سفر جاری رہا۔ اب ہم ایسی جگہ پر آگئے تھے جہاں سے سامنے پھیلے ہوئے گھنے جنگلات نظر آنے لگے جو وادی کے اُس پار ڈھلانوں پر اوپر کی جانب اُٹھتے چلے گئے تھے۔ گو ابھی ہم ان جنگلات سے دُور تھے لیکن میلوں کے رقبے میں پھیلے ہوئے وہ جنگلات اس بلندی سے دھبوں کی صورت میں ہمارے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔ بھوری چٹانوں کے پس منظر میں سیاہی مائل سبز دھبوں کی اصلیت پہلے سیتا نے پہچانی پھر مجھے ایک دشوار سفر کے لئے تیار رہنے کی ہدایت کی۔

اس روز سورج ڈھلنے سے ذرا دیر قبل ہم جنگلات میں داخل ہوسکتے تھے لیکن میں نے وہ رات باہر ہی گزارنے کا فیصلہ کرنا مناسب سمجھا ان اطراف میں ہر سو بے پناہ دراڑیں اور غار بکھرے پڑے تھے لہٰذا پناہ گاہ کی تلاش میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ پورے راستے خورد و نوش کے مسائل سیتا کے ذمے تھے اور وہ انہیں بخوبی نمٹاتی آرہی تھی۔ شب باشی کے لئے غار کا انتخاب کرنے کے بعد غذا کا مسئلہ سامنے آیا تو سیتا نے جنگل میں گھسنے کی تجویز پیش کی۔ اس کا خیال تھا کہ مناسب پھل تلاش کرکے اندھیرا پھیلنے سے قبل ہی واپس لوٹ آئے گی۔ میرے لئے یہ مشورہ ناقابلِ قبول تھا۔ راستے بھر سیتا نے ان جنگلات کے بارے میں مجھے ایسی کہانیاں سنائی تھیں کہ اب میرے لئے ان میں داخل ہونے کا تصور کسی معرکے سے کم نہ تھا۔

"یہ رات ہم فاقے میں بسر کرسکتے ہیں' تیرا جنگل میں جانا مناسب نہیں ہے۔" میں نے کچھ دیر کے تذبذب کے بعد اس سے کہہ ڈالا۔

"ابتدا میں یہ جنگل گھنا اور بھیانک نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"پھر میں تیرے ساتھ چلوں گا۔"

یہ سُن کر وہ زور سے ہنسی۔ "تجھ سے شادی کرنے سے پہلے میں نہ جانے کتنی بار اس جنگل سے گزری ہوں اور ادھر چوپائے بھی ہیں' شاید اس وقت کوئی بکرا وغیرہ بھی ہاتھ لگ جائے' تو جب سے یہاں آیا ہے گوشت کو ترسا ہوا ہے۔"

"میں ایک بار تجھے بتا چکا ہوں کہ یہ رات میں بھوکا رہ کر گزار سکتا ہوں۔" میں اس پر آنکھیں نکال کر بولا۔

"تجھے بس اپنی ہی فکر رہتی ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "یہ زبردستی کا فاقہ میرے بس کا نہیں۔ میں ساری رات سو بھی نہ سکوں گی۔"

"ٹھیک ہے' یہ جنگل جانوروں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم میں سے ایک آدمی جاگتا ہی رہے تو بہتر ہے۔ کم از کم میں سُکھ کی نیند سو سکوں گا۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے بے بسی سے دانت پیسے پھر منہ پھیر کر بولی۔ "ابھی تُو جانے میں ادھر جانے سے مجھے روک رہا ہے مگر یاد رہے کہ تیرے سونے کے بعد جب بھی بھوک لگی میں خاموشی سے جنگل میں چل دوں گی' اس وقت تو کیا کرلے گا۔"

"اچھا چل' دونوں چلتے ہیں۔" میں ہارمانتے ہوئے بستر سے اُٹھ گیا

"نہیں۔" وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔ اس وقت اس پر کچھ ضد سوار ہوگئی تھی۔ "...... ایک آدمی خواب ...... گا ......"

سونے کی جگہ بنائے گا۔ اس غار کا فرش بہت ناہموار ہے۔ بول، تو کون سا کام کرے گا؟"

"تُو بعض اوقات بے جا ضد کرنے لگتی ہے۔" میں چڑ کر بولا۔

"شادی کے بعد سے تُو مجھے بچی سمجھنے لگا ہے' ہر بات پر نصیحت کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ شاید تو بھول گیا ہے کہ میں تیرے بغیر اسی ماحول میں اس عمر کو پہنچی ہوں۔"

"جا بابا ــــ تو پھل لے آ۔" میں دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔" میں گیا تو پھر شور مچائے گی کہ زہریلے اور ناکارہ پھل اُٹھا لایا۔"

وہ اچھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں معصومانہ سی مسرت چمکنے لگی اور وہ میرے کھلے ہوئے سینے سے اپنا رخسار رگڑتے ہوئے بولی۔ "تُو بہت اچھا آدمی ہے' میری ذرا سی دھمکی پر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بس میں تھوڑی ہی دیر میں آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی تو میں مہارشی اندرام سے حاصل کیے ہوئے آہنی چھٹے کے پھل سے غار کے فرش پر اُبھرے ہوئے نکیلے پتھر ہموار کرنے لگا۔ ایک وہی غار نہیں بلکہ اس علاقے کی ساری زمین ایسی ہی تھی اور اسے صاف کیے بغیر آرام سے لیٹنا واقعی دشوار تھا۔

نہ جانے کتنی دیر میں اپنے کام میں مگن رہا۔ جب اندھیرے کے باعث بینائی پر زور پڑنے لگا تو میں چونکا اور ایک دم وحشت زدہ ہو کر غار سے باہر نکل آیا۔

باہر کافی اندھیرا پھیل چکا تھا' سورج پہاڑوں کے عقب میں روپوش ہو چکا تھا۔ قریبی جنگل سے جھینگروں اور اِکا دُکا جانوروں کا شور رہ رہ کر ابھر رہا تھا۔ اندھیرے میں چند قدم آگے کی چیز دیکھنا بھی دشوار ہوتا جا رہا تھا اور سیتا کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔

وہ نہ جانے کہاں رہ گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اسے کافی دیر قبل واپس لوٹ آنا چاہیے تھا' پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں میری خلافِ معمول بحث کے نتیجے میں مجھے پریشان کرنے کی نیت سے وہ واپس آ کر آس پاس روپوش نہ ہو گئی ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں دل ہی دل میں مُسکرا اٹھا' عورت کوئی بھی ہو اور کہیں بھی پلی بڑھی ہو' اس کی فطرت مرد کے بارے میں یکساں فیصلے ہی صادر کرتی ہے۔

میں نے سوچا کہ اب مجھے پُرسکون رہنا چاہیے تاکہ وہ انتظار سے اکتا کر خود ہی میرے سامنے آ کھڑی ہو اور میں واپس غار میں جا کر صاف کی ہوئی جگہ پر دراز ہو گیا۔ میرے کان باہر سے اُبھرنے والی کسی بھی آہٹ کے منتظر تھے۔

کراچی کی عشرت گاہوں میں اپنی پسند کی لڑکی کا انتخاب کرنے والا خوش پوش صفدر علی اس وقت شکار کیے ہوئے جنگلی درندوں کی تین کھالیں اوڑھے' سردی سے سکڑا' ہمالہ کے ایک دُور اُفتادہ اور ویران غار میں اپنی بیوی کا منتظر تھا جو اس کے اور اپنے لئے خوراک تلاش کرنے ایک جنگل میں گئی ہوئی تھی ـــــ انتظار کا ایک ایک لمحہ اس وقت قیامت تھا کان کسی بھی لمحے سیتا کی آہٹ اور آواز سننے کے متوقع تھے مگر یوں ہی پڑے پڑے گویا صدیاں گزر گئیں مگر وہاں میرے سانسوں کے زیروبم کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی جس پر میں چونکتا۔

پھر یہ سکوت اتنا گھمبیر ہو گیا کہ مجھے خلجان ہونے لگا۔ میں اضطراب کے عالم میں غار سے باہر کھلی فضا میں نکل آیا۔ یہاں اب ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ میں ظلمات کے اس سمندر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر سُو دیکھتا رہا لیکن وہاں کوئی ہیولا نظر نہ آیا۔

اب میرے دل میں عجیب خیالات سر اُبھارنے لگے۔ اندھیرے کی چادر ان جنگلات کو نگل چکی تھی۔ میں نے گلا صاف کر کے پوری قوت سے سیتا کو پکارا اور یہ آواز دشت و جبل سے ٹکرا کر مایوس لوٹ آئی۔

میں نے گھبرا کر یکے بعد دیگرے کئی بار اسے پکارا مگر بے سُود' سیتا نہ جانے کہاں تھی' کہاں چلی گئی تھی' بے اختیار میرا دل بیٹھنے لگا۔

اس وقت میرے لیے جنگل کا رُخ کرنا ناممکن تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان حالات میں میرے لئے اس جگہ سے ہلنا بھی ناممکن تھا۔ میرے پاس نہ منزل کا سراغ تھا نہ راستوں کا نشان' جاتا تو کدھر جاتا۔ میں دل ہی دل میں گڑگڑا کر سیتا کی سلامتی اور واپسی کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔ یہ درست ہے کہ وہ میری چاہت تھی مگر محبت اور پیار سے بڑھ کر وہ میری ایک اٹل ضرورت تھی۔ میں اس وقت جس مقام پر تھا وہاں سے نہ میں اپنی دنیا میں لوٹ جانے کے قابل تھا نہ پیش قدمی کر سکتا تھا۔ اگر اس وقت سیتا کو کچھ ہو جاتا اور وہ میرے پاس واپس نہ آتی تو میں ایک حقیر و بے بس چوہے کی طرح یکسال چوٹیوں اور رہر نگ چٹانوں کے اس بے رحم اور لامتناہی جال میں پھنس چکا تھا۔

وہ پوری رات میں نے کرب' خوف اور بے یقینی کے روح فرسا عذاب میں گزاری۔ مجھے کسی پہلو چین نہ آتا تھا۔ دل یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ سیتا راہ بھٹک گئی ہو گی۔ میں نے چلتے چلتے اسے جلد واپسی کی ہدایت کی تھی اور اگر اس نے اس ہدایت پر عمل کیا تھا تو وہ یقیناً اتنی دُور نہ گئی ہو گی کہ کسی مصیبت میں اس کی چیخیں مجھ تک نہ پہنچ سکیں مگر اس کی کوئی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی تھی' نہ جانے وہ کہاں تھی اور اس پر کیا گزری تھی۔

صدیوں طویل ـــــ انتظار کی وہ رات جوں توں کر کے ختم ہوئی اور جب اس وادی میں کہر کی دبیز چادر میں روشنی کے ہلکورے تیرنے لگے تو میں سخت سردی کی پرواہ کیے بغیر پاگلوں کی طرح جنگل کی طرف بڑھ گیا۔

چھدرے درختوں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار سیتا کو آوازیں دیں مگر اسے نہ ملنا تھا نہ وہ ملی اور میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔

وہ جنگل حیوانات سے بھرا ہوا تھا جیسے جیسے میں آگے بڑھتا رہا فضا میں بھانت بھانت کی بولیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ درختوں کا درمیانی فاصلہ بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر راستہ قدرے دشوار ہونے لگا جھاڑیاں بار بار راستے میں حائل ہو رہی تھیں۔ اوپر درختوں کا پھیلاؤ اتنا گھنا ہو چلا تھا کہ سورج کی براہِ راست روشنی کے بجائے انعکاس کا اجالا رہنمائی کر رہا تھا۔

پھر سب سے پہلے بندروں کے غول سامنے سے گزرے' درخت رنگا رنگ پرندوں سے آباد تھے اور ان کے سائے میں پھیلی ہوئی خود رو جھاڑیاں اعلان کر رہی تھیں کہ ان پر سے وزنی چوپائے بکثرت گزرتے رہتے ہیں اور ان سے میرا کسی بھی لمحے سامنا ہو سکتا ہے۔

جنگلی بکرے' ہرن' بارہ سنگھے' گیدڑ' سوّر اور خوبصورت لومڑیاں اس جنگل میں بھری ہوئی تھیں۔ میں شاخوں اور جھاڑیوں سے اُلجھتا' سیتا کو پکارتا آگے بڑھا جا رہا تھا۔ جسم پر کئی خراشیں بھی آ چکی تھیں مگر سیتا کی تلاش کا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

جنگل میں دوڑتے دوڑتے دوپہر آ گئی۔ مسلسل دوڑنے اور بھٹکنے کے باعث میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ پیاس کے ساتھ ہی بھوک بھی ستانے لگی تھی۔ کئی بار میں نے درختوں کا جائزہ لیا لیکن زہر خورانی کے خوف سے باز رہا۔ بھیڑیے اور گیدڑ چلتے پھرتے اور چلاتے ہوئے انسان سے تو خوفزدہ ہو کر بھاگ سکتے تھے مگر زہریلا پھل کھا کر بے ہوش پڑے ہوئے انسان کو لقمہ بنانے میں انہیں ذرا بھی تردّد نہ ہوتا۔

نہ جانے رات آئی یا میں تاریک جنگل میں داخل ہوا کہ ہر سُو ایسی دھندلکا نظر آنے لگا۔ برسوں پرانے تناور درختوں کی شاخیں یوں ایک دوسری میں جڑی ہوئی تھیں کہ کھلا آسمان نظر نہ آتا تھا۔ زمین مضبوط جنگلی بیلوں اور بھانت بھانت کی خود رو بیلوں سے بھری ہوئی تھی۔

جنون کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ جنگل میں تنہا سفر سے متعلق اندرام کا کامیاب تجربہ خوب یاد رہا اور میں نے دیکھا کہ جنگل کے بیشتر جانور میری بے مقصد چیخ و پکار اور آہنی چھٹے کے شور سے گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر کسی غول نے نرغے میں لے ہی لیا تو آہنی چھٹے سے تلوار کا کام لوں گا۔

میں پاگلوں کی طرح تاریکی میں اپنا راستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک قریب سے ایک ہولناک غراہٹ سنائی دی' اس کے جواب میں بے شمار پرندے اور چوپائے خوفزدہ آوازیں نکالنے لگے' پھر تاریکی میں مجھے معاً دو روشن گولیاں نظر آئیں جو زمین سے کم از کم تین فٹ کی بلندی پر متحرک تھیں۔

اس

وقت میں مخبوط الحواس ہو چکا تھا۔ وہ دونوں روشن آنکھیں مجھ سے بمشکل چند گز دُور تھیں اور آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہی تھیں اور اگر غراہٹ کے بارے میں میرے حواس کا فیصلہ دُرست تھا تو وہ کسی گلدار کی آواز تھی۔

میں نے بوکھلا کر اپنے قرب و جوار میں پھیلی ہوئی تاریکی کا جائزہ لیا۔ میں اس وقت گنجان اور تاریک جنگل میں موجود تھا جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا مگر جان کا خوف بہت بُرا ہوتا ہے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر وقتی طور پر میری قوتِ بصارت کچھ زیادہ حساس ہو گئی اور مجھے اپنی داہنی جانب ایک درخت کا قوی ہیکل تنا نظر آ گیا۔ اب اندرام سے چھینا ہوا چھٹا میرے لیے ایک ناکارہ بوجھ تھا۔ میں نے اسے پھینک کر درخت کی طرف لپکنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ شاید میرا مدِمقابل میرا ذہن پڑھنے میں کامیاب ہو گیا' اس خون آشام درندے نے ایک دبی دبی دہشتناک آواز اپنے حلق سے بلند کی' زمین پر گرتی ہوئی شاخیں اور خشک پتوں کے ٹوٹنے کی آوازیں اُبھریں اور وہ جست لگاتا ہوا سیدھا میری طرف ہو لیا۔

آہنی چھٹا ابھی میرے قبضے میں تھا۔ میں نے اس کے پھل مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیے' نگاہیں ان دو روشن نقطوں پر جما دیں جو میری طرف بڑھے آ رہے تھے۔ میرے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا' موت بالکل سامنے چلی آ رہی تھی مگر امید کی ایک موہوم سی کرن اب بھی سہارا بنی ہوئی تھی۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ درندہ میرے مقابل آ گیا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ اس کی روشن آنکھیں زمین سے قدرے قریب ہو گئیں۔ شاید وہ اگلے پیروں پر جُھک کر آخری اور فیصلہ کن زقند لگانے کے لیے تیار تھا۔

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا' ہیجان اور اعصابی اضطراب ناقابلِ برداشت ہونے لگا۔ مجھ میں اب اتنے انتظار کا یارا نہ تھا کہ اپنی جگہ پر رہ کر اس کے حملہ آور ہونے کا انتظار کرتا۔ میں نے چھٹے کا پھل فضا میں لہرایا۔ ان دو روشن نقطوں کا اندازہ کر کے آگے لپکا اور ایک غیر ارادی چیخ کے ساتھ وہ چھٹا فضا میں پوری قوت سے لہرایا۔

اچانک میرے دونوں ہاتھوں کو ناقابلِ برداشت جھٹکا لگا' جیسے چھٹا کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا ہو اور وہ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گیا۔ اسی کے ساتھ وہ درندہ تڑپ کر پوری قوت سے دہاڑا۔ میں نے ان آنکھوں کو فضا میں کئی گز اُوپر اچھلنے اور پُرشور دھماکے کے ساتھ نیچے آتے دیکھا اور اسی کے ساتھ میرا ہاتھ ایک بار چکر گھوم گیا۔ اس بار میرا وار خالی گیا اور میں اپنی ایڑیوں پر چکر کھا کر رہ گیا۔

اب جو میں نے غور کیا تو وہ چمکیلی آ[illegible] وہاں موجود نہ تھیں۔ کچھ فاصلے سے غراہٹوں اور پتوں وغیرہ کے کچلے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی کے ساتھ اندھیرے میں ڈوبا وہ تاریک جنگل بھانت بھانت کی خوفزدہ

حیوانی چیخوں سے گونجنے لگا تھا۔ میں نے بار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ... میں گھورا مگر شیر کا زخمی ہو کر فرار ہونا ایک حقیقت تھی۔ خوشی سے اپنا [illegible] سینہ پھول گیا۔

اس وقت میں نے اپنی ملکی فلموں کے کسی ہیرو کی طرح غیر فطری اور ناقابلِ یقین انداز میں اس خون آشام درندے سے چھٹکارا حاصل کیا تھا مگر اسی کے ساتھ مجھے ڈر تھا کہ یہ نجات طویل ثابت نہ ہوگی۔ زخمی شیر کسی بھی لمحہ میری بُو کے سہارے اپنی شکست کا بدلہ لینے آسکتا تھا!

میں نے آہنی چھٹے کو اپنی کمر سے بندھی ہوئی ڈوری میں لٹکایا اور خوشی و خوف کے ملے جُلے جذبے کے ساتھ تناور درخت پر چڑھنے لگا۔ شیر کی رہ رہ کر اُبھرنے والی غضب ناک آوازیں ابھی تک قرب و جوار ہی میں منڈلا رہی تھیں، اسی کے ساتھ پورا جنگل شور و غل سے قیامت کا سماں باندھ رہا تھا۔

اندھیرے کے باعث میں یہ تو اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس قسم کا درخت ہے مگر اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ اس میں کانٹوں وغیرہ سے سابقہ نہیں پڑے گا۔ درخت کی شاخوں تک رسائی میں میرا سارا بدن دُکھنے لگا۔ شاخیں زمین سے کافی بلند اور بہت گھنی تھیں۔ میں نے سب سے نچلی شاخ پر بیٹھ کر چند لمحوں میں اپنا سانس درست کیا پھر مزید اوپر چڑھنے لگا۔

خطرے سے باہر ہونے پر میرا ذہن ایک بار پھر سیتا میں اُلجھ گیا وہ پتھریلے غاروں میں مجھے بستر تیار کرنے کے کام میں مصروف چھوڑ کر پھل وغیرہ لینے جنگل میں آئی تھی۔ ابتدا میں جنگل نہ گھنا تھا نہ تاریک اور وہاں پھلوں کے بے شمار درخت بھی موجود تھے۔ ان حالات میں سیتا کے زیادہ دُور نکل جانے کا امکان نہ تھا اور اگر قرب و جوار ہی میں اسے کسی جنگلی جانور وغیرہ کا خطرہ لاحق ہوتا تو کم از کم اس کی چیخیں ضرور مجھ تک پہنچتیں۔ سیتا پچھلے روز سورج غروب ہونے سے قبل جنگل میں آئی تھی اور میں نے وہ پوری رات اس کے [illegible]۔

میں غاروں کے باہر گزاری تھی اور صبح ہوتے ہی اس کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ میری پیش قدمی کے ساتھ جنگل گھنا اور قدرے تاریک ہوتا چلا گیا تھا مگر اس وقت جیسی گھور تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات ہو چکی ہے، اس کا مطلب تھا کہ سیتا کو مجھ سے بچھڑے ہوئے چوبیس گھنٹوں سے زائد وقت گزر چکا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں کھویا ہوا تھا کہ میری پنڈلیوں میں ہلکی ہلکی سوزش ہونے لگی۔ میں نے وہاں ہاتھ پھیرا تو کچھ کیڑوں کی موجودگی کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی نمی بھی محسوس ہوئی۔ میں نے دونوں پنڈلیوں پر ہاتھ پھیر کر ان سے نجات حاصل کی مگر اسی کے ساتھ اب سارے بدن پر ان کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی اور میں پاگلوں کی طرح انھیں اپنی جلد سے نوچ نوچ کر نیچے پھینکنے لگا۔ میری یہ جدوجہد زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی۔ وہ جس جگہ ایک مرتبہ کاٹ لیتے تھے وہاں جلد میں ناقابلِ برداشت سوزش ہونے لگتی تھی جو انھیں نوچ پھینکنے کے باوجود لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جاتی تھی۔ ادھر زخم خوردہ شیر کی آوازیں ابھی تک قرب و جوار ہی میں منڈلا رہی تھیں۔ اس کی غضب ناک آوازوں کے ساتھ بسیرا کرنے والے پرندوں کے غول خوفزدہ آوازیں نکالتے اِدھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ ایک طرف یہ ناگہانی مصائب مجھ پر مسلط تھے۔ درخت پر رہتا تو روشنی ہونے تک یہ کیڑے مکوڑے نہ جانے میرا کیا حال کرتے۔ نیچے جاتا تو کوئی بھی درندہ غفلت میں مجھے پھاڑ کھاتا، دوسری طرف پچھلی شب بیداری اور دن بھر کی دیوانہ وار بھاگ دوڑ کے باعث رہ رہ کر غنودگی کا حملہ ہو رہا تھا۔ کیڑوں کے کاٹنے کی شدید تکلیف بھی غنودگی کی اس خود رو لہر کو روکنے میں مدد نہ دے سکی، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیند کو بھگانے کی کوشش کرتا رہا مگر گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ میرے اعصاب مفلوج ہوتے جا رہے تھے۔ میرے ذہن میں یہ خوف بھی جاگزیں تھا کہ یوں درخت پر سوتے ہوئے اگر میں نیچے لڑھک گیا تو ہڈیاں پسلیاں الگ ٹوٹیں گی اور کسی درندے کی نظر پڑ گئی تو ایک ایسی عقوبت شروع ہو جائے گی جس کا اختتام صرف اور صرف اذیت ناک موت پر ہوگا، اس کے بعد رُوح تو جہاں بھی بھیجی جائے، جسم گوشت خور درندوں اور فضا میں چیختی چلّاتی چمگادڑوں کا ہی لقمہ بنے گا۔

مجھے غفلت اور غنودگی کی اس یلغار سے دہشت سی ہو رہی تھی، پھر میں نے محسوس کیا کہ اب ہاتھ پیر ہلانا بھی میرے اختیار میں نہیں رہا ہے۔ میرے جسم کے کسی حصّے پر سوزش ہوتی، میں ہاتھ بڑھا کر اس جگہ کو سہلانا یا کیڑوں کو وہاں سے ہٹانا چاہتا لیکن شدید کوشش کے باوجود ہاتھ جنبش نہ کرتے، پھر معاً میرے ذہن میں ایک ڈراؤنا خیال آیا اور میرے غیر متحرک وجود میں رہ رہ کر سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔

میں نے سوچا کہیں یہ زہریلے حشرات الارض تو نہیں ہیں جو میرے زندہ وجود سے چمٹے ہوئے ہیں نہ جانے وہ میری شریانوں سے خون پی رہے تھے یا میری جلد اُدھیڑ کر گوشت کے ریشے کھا رہے تھے پھر میرا یہ اندیشہ قوی تر ہوتا چلا گیا۔ غالباً ان کے کاٹنے کے باعث ان کا زہر میرے دورانِ خون میں سرایت کر چکا تھا اور اب آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ شاید ہاتھ پیروں کا سکوت اور غنودگی کا ناقابلِ مزاحمت حملہ ان ہی زہریلے مادوں کا ردِعمل تھا!

خوف اور دہشت سے بے قابو ہو کر میں اچانک مدد کیلیے چیخنے لگا اور یہ جان کر مجھے خاصا سکون ہوا کہ ابھی میری آواز میری تابع تھی۔ میرے چیخنے پر جنگل میں ماند پڑتی ہوئی حیوانی آوازیں یک بیک تیز ہوگئیں۔ اسی دوران میں ایک دو بار میں نے سیتا کو بھی پکارا مگر جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری چیخ پکار بالکل بے سود ہے، اس طرح اپنی توانائی ضائع کر کے میں رینگ رینگ کر اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کو خود ہی گلے لگاؤں گا۔ اب میں پوری طرح درخت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ ہاتھ پیر بالکل مفلوج تھے، آواز کا [illegible] جواب نہ تھا، آنکھوں کے سامنے ہر طرف سیاہی مائل سبز پتے اور گھور [illegible] اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور میرے لیے تن بہ تقدیر ہو کر آنے والے رُوح فرسا لمحوں کا انتظار کرنے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

میری بُو جنگل میں بھرے ہوئے درندوں کو میری طرف متوجہ کر رہی تھی۔ زخم خوردہ شیر بھی میری توقع کے مطابق ایک مرتبہ ادھر واپس آیا اور خوفناک غراہٹوں کے ساتھ درختوں کے تنے اپنے مہلک پنجوں سے کھرچتا رہا، پھر مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ گیا۔ اس کے بعد کوئی بھیڑیا کافی دیر نیچے میرے گرنے کا منتظر رہا۔ اس کی رہ رہ کر اُبھرنے والی حریص اور پُرامید آوازیں طویل انتظار کے بعد جھلاہٹ میں بدل گئیں اور آخرکار وہ بھی مایوس ہو کر اپنے گمنام مسکن کی طرف لوٹ گیا۔

رفتہ رفتہ غنودگی کا اثر اعصاب سے ذہن تک پھیلنے لگا۔ میرے ذہن پر عجیب و غریب اور بے تکے خیالات نے یلغار کر دی تھی۔ میں نے اپنی ذہنی رَو کو قابو میں رکھنے کے لیے لاکھ جتن کیے پھر مجبوراً ساری توجہ اپنے دُکھتے ہوئے بدن کی اذیت پر مرکوز کرنا چاہی مگر مجھے احساس ہوا کہ اب میرا ذہن بھی ماؤف ہوتا جا رہا ہے اور میرے لیے اپنا ذہن کسی ایک مسئلے پر مرکوز کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔

ایک ایک لمحہ اذیت اور بے بسی کی ناقابلِ فراموش یادگار ثابت ہو رہا تھا اور اس رات شاید وقت کی رفتار بھی سُست پڑ گئی تھی یا شاید اپنے محور پر زمین کی گردش ہی تھم گئی تھی، ہر طرف لامتناہی اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور فضا میں رچی ہوئی سردی سے میرا بدن اکڑا جا رہا تھا۔ اس درخت پر شب بسری کا انتظام کرتے ہوئے مجھے وہم بھی نہ تھا کہ مردم آزار حشرات الارض مجھ پر حملہ آور ہو جائیں گے مگر پھر بھی سردی سے بچاؤ کے لیے میں نے اپنا پورا بدن کھالوں میں لپیٹ لیا تھا مگر میں کوئی بے جان مجسمہ تو نہ تھا، نقاہت اور اعصابی سکتے کے باوجود میرے بدن کی غیر ارادی اور غیر اختیاری جنبشوں نے جگہ جگہ سے میرا بدن برہنہ کر دیا تھا۔ وہ تو قسمت تھی جو اس رات سرد ہوائیں نہیں چل رہی تھیں ورنہ اس حالت میں تو میں چند ہی گھنٹوں میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہوتا۔

آخر گھنے پتّوں سے اوپر مجھے آسمان کی ہلکی سی سفیدی جھلکتی نظر آئی اور خوشی سے میرے دل کی دھڑکنیں یک بیک تیز ہوگئیں۔ شب ظلمات میں روشنی کی وہ موہوم سی کرنیں میرے لیے بڑی اُمیدیں لیکر طلوع ہوئی تھیں۔ بلند پہاڑی مقامات کی طرح وہاں دھند لکے میں نہائی ہوئی صبح کا عروج بہت سُست تھا۔ آخر پتوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں میری آنکھیں اس قابل ہوگئیں کہ آس پاس کی چیزیں دیکھ سکیں۔ سب سے پہلے میں نے نیچے نگاہ ڈالی، وہاں براہِ راست روشنی کا کہیں بھی گزر نہ تھا۔ ہاں گھنے درختوں سے منعکس ہونے والی روشنی نے وہاں پُراسرار اُجالا ضرور کر دیا تھا۔

پھر میری نگاہ جسم پر اُدھڑی ہوئی کھال سے جھانکتے برہنہ حصّوں پر پڑی اور میں دہشت سے چیخ پڑا۔ پتوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں میرے جسم سے سُرخ رنگ کے بڑے بڑے چیونٹے چمٹے ہوئے تھے! انھوں نے رات بھر میں میرے جسم کی کھال جابجا کھالی تھی اور اب گوشت کے ریشوں سے اپنی آتشِ شکم سرد کر رہے تھے۔ میری ٹانگیں، بازو، پیٹ کا کھلا ہوا حصّہ اور دوسرے برہنہ اعضا ان زخموں سے پُر تھے، یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے بدن کے ان حصّوں پر سوراخ کر دیے گئے ہوں۔ ایسے ہر زخم سے بلامبالغہ سینکڑوں چیونٹے لپٹے ہوئے تھے۔ زخموں کے آس پاس کہیں بھی خون بہنے کا کوئی نشان نہ تھا۔ زندہ انسانی گوشت کے ریشوں کے ساتھ ہی شاید وہ تازہ خون بھی بڑی رغبت اور مہارت سے پی جاتے تھے۔

میری دہشت سے پھٹی ہوئی نگاہیں ان خونی بلاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کے وہ حصّے میلوں دُور پڑے ہوں۔ بدن سے حرکت کی قوت سلب ہو چکی تھی، جسمانی فالج کی اس کیفیت میں میری آواز بھی حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ میرا سارا بدن تیز بخار میں جل رہا تھا۔ سارے جوڑ بُری طرح دُکھ رہے تھے۔

یہ ننھے ننھے حشرات الارض تو میرے لیے شیر سے زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوئے تھے۔ مجھے آہستہ آہستہ ان خونی چیونٹوں کے بارے میں برسوں پہلے پڑھی ہوئی ایک بات یاد آ رہی تھی۔ یہ خونخوار اور موذی چیونٹے زمین کے بجائے سرسبز درختوں کی شاخوں وغیرہ میں دیمک کی طرح سوراخ بنا کر رہتے تھے۔ اس سے آگے ان کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہ تھا لیکن اب ان کا شکار ہو کر میں اس رُوح فرسا تجربے سے گزر رہا تھا۔ اپنی ابتر حالت کے پیشِ نظر مجھے پورا یقین تھا کہ ان سُرخ چیونٹوں کے جسم میں کوئی نہ کوئی زہریلا مادہ ضرور موجود ہوگا جو ڈنک اور کھلے ہوئے ننھے ننھے سوراخوں کے ذریعے آہستہ آہستہ میرے دورانِ خون میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اس زہر کے اثر سے میرے بدن میں ناقابلِ بیان درد کی لہریں دوڑ رہی تھیں، درجۂ حرارت غیر معمولی حد تک بڑھ چکا تھا۔ نقل و حرکت تو کجا مجھے اپنے کسی عضو کی جنبش تک پر اختیار نہ رہا تھا۔ میں درخت کی مضبوط شاخوں کے درمیان جس طرح پھنس کر بیٹھا تھا، اس کی وجہ سے عدم توازن یا نیچے گرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ گوشت خور چیونٹے میری ہڈیوں سے کھال اور گوشت کا آخری ریشہ تک نوچ لیتے اور میں بے حس و حرکت بیٹھا اس وقت تک یہ سب دیکھتا رہتا جب تک نقاہت، زہر یا دہشت سے رُوح قفسِ عنصری سے پرواز نہ کر جاتی پھر اس درخت پر ہڈیوں کا ایک خشک پنجر پھنسا رہ جاتا اور شاید

پھوکر یہ پرندے اس پنجر کو اپنا مسکن بنا لیتے!

صفدر علی کی خشک استخوانی کھوپڑی اور پسلیوں کے کھوکھلے پنجر میں چمگادڑوں وغیرہ کے قیام کا تصور اس قدر دہشتناک اور روح فرسا تھا کہ میں کانپ اٹھا مگر کانپنا کجا، یہ تو صرف میرا احساس تھا ورنہ میرا جسم تو کانپنے کی قوت تک سے محروم ہو چکا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر میں یوں ہی ہولناک اور حقیقی اندیشوں کے بارے میں سوچتا رہا، اپنے جسم کی بربادی کا جگر خراش منظر دیکھتا رہا۔ بعض چیونٹے جب میرا بدن نوچتے نوچتے سیر ہو جاتے تو حسب استطاعت لہو میں رنگا ہوا کوئی لحمی ریشہ اپنے ڈنک میں دبا کر آسودہ انداز میں شاید اپنی کمین گاہ کی طرف چل دیتے تاکہ جب ان کے شکار کی ہڈیوں پر گوشت کا آخری ریشہ تک باقی نہ رہے تو وہ اپنے پس انداز کیے ہوئے ان خشک ریشوں پر دعوتیں اڑا سکیں۔

کتنا لرزہ خیز تھا وہ سماں.... میرا ذہن اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ اچانک کسی جانب سے نقارے کی مدھم آواز ہوا کے دوش پر ابھری، یک بیک میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں یہی ابھرا کہ شاید سندری نے ہمالیہ کے آدم خور قبیلے کو درندوں کے حصار سے آزاد کر دیا ہے اور اب وہ اپنے کھوجیوں کی مدد سے میری بو کے سہارے ان دور دراز جنگلات تک آ پہنچے ہیں اور ان آدم خوروں کے لیے میرے دل میں ایک بار پھر وہی جذبہ ابھرا جس نے برفانی انسان کے مقابلے میں مجھے ان کے ساتھ رہنے پر اکسایا تھا، وہ لاکھ وحشی، غیر مہذب اور آدم خور سہی مگر تھے مجھ جیسے انسان ہی.... اور جب انتخاب دو آدم خور نسلوں کے درمیان ہوا تو میرا ذہن چیونٹوں کے بجائے ان ہی کی طرف مائل ہوا۔

میں نے پہلی بار بے بسی کے بجائے غصے کے ساتھ ان سرخ چیونٹوں کو گھورا جو میرے برہنہ بدن کو اپنی جاگیر سمجھ کر اس پر دندناتے پھر رہے تھے اور اسی کے ساتھ میں پوری قوت سے مدد کے لیے چیخ پڑا۔

میری چیخ پر بہت سے پرندوں نے خطرے کی تیز آوازیں بلند کیں، نقارے کی مدھم سی آواز یک بیک معدوم ہو گئی۔

چند منٹ کے بعد نقارے کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔

بھوک، طویل بیداری، بخار اور نقاہت کے باعث اب مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے یقین نہ تھا کہ ان نقارہ بردار لوگوں کی آمد تک میں زندہ رہ سکوں گا۔ میں درخت پر تھا جبکہ وہ مجھے جنگل ہی میں ڈھونڈتے رہتے اور ناکام ہو کر واپس لوٹ جاتے۔

میں نے یکے بعد دیگرے پوری قوت سے مدد کے لیے تین مرتبہ پکارا، اسی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ نقارے کی آواز بتدریج قریب آتی جا رہی تھی۔ شاید میری آواز ان لوگوں تک پہنچ چکی تھی اور اب وہ میری تلاش میں تھے۔

مگر میری حالت اب ابتر تھی۔ میں نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اپنے حواس قائم نہ رکھ سکا اور بے ہوشی نے مجھے آلیا۔

بے ہوشی کا وقفہ کتنا طویل تھا، یہ مجھے یاد نہیں، دوبارہ آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظریں پھوس کے چھپر پر پڑیں، میں نے بلبلا کر پہلو بدلا تو نیچے نرم پیال کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ ایک نہایت مسرت انگیز احساس تھا کہ اب میں حسب مرضی اپنے بدن کو جنبش دے سکتا تھا۔ نقاہت اب بھی باقی تھی، بخار سے میرا بدن اب بھی جل رہا تھا مگر میں ہمت کر کے پیال سے اٹھ ہی گیا۔

یہ دیکھ کر میری حیرت اور مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا کہ میں اس بلند و بالا درخت کے بجائے پھوس کی ایک کشادہ اور صاف ستھری جھونپڑی میں موجود تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان خون آشام چیونٹوں کے جان لیوا عذاب سے بھی نجات مل چکی تھی مگر بے شمار گہرے زخموں کے باعث میری ساری جلد سرخ ہو رہی تھی اور بدن پر ورم آ چکا تھا۔

کمزوری کے باعث مجھے چکر آ رہے تھے اور کھڑا رہنا میرے لیے دشوار تھا لہٰذا میں دوبارہ اسی پیال پر بیٹھ گیا اور اس صاف ستھرے جھونپڑے کا جائزہ لینے لگا۔

وہاں نکاسی کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جو اس وقت بند نظر آ رہا تھا۔ پیال کے قریب ہی پانی سے بھرا ہوا مٹی کا ایک برتن موجود تھا، سندری کی دی ہوئی کھالیں پیال پر بچھی ہوئی تھیں، البتہ اندرم سے چھپا ہوا چھٹا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں جن لوگوں میں موجود ہوں وہ میرے دوست ہوں یا دشمن مگر نرم دل ضرور ہیں ورنہ میری تیمارداری کی زحمت نہ کرتے۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک باہر سے کسی کی آواز ابھری۔

”قیدی کا کیا حال ہے؟“

یہ آواز سن کر میں چونک پڑا۔ لہجہ شکستہ اور نامانوس سا تھا البتہ زبان بگڑی ہوئی نیپالی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی غیر ملکی زبان بول رہا ہو۔

”ابھی تک بے ہوش پڑا ہے!“ یہ آواز کسی مقامی اہل زبان کی تھی! اس نے احترام آمیز لہجے میں پوچھنے والوں کو جواب دیا تھا۔

”ڈان! اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی سوچو۔ یہ خبیث مجھے اسی لڑکی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔“ یہ کوئی تیسری آواز تھی اور نہایت شستہ انگریزی میں بات کی گئی تھی!

”سردار بہت بااصول آدمی ہے۔ وہ اسے جرگہ میں پیش کرنے سے قبل کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے حرام زادے کو خاص مہمانوں کی طرح یہاں رکھا ہوا ہے اور ایک طبیب صرف اس کے [illegible] رہا مور کیا ہوا ہے۔“

ان کی گفتگو سن کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ ہمالیہ کے [illegible] افتادہ اور دشوار گزار علاقوں میں دو غیر ملکیوں کی موجودگی چونکا [illegible] بات تھی۔ پھر وہ میرے بارے میں کسی لڑکی کے حوالے سے سوچ [illegible] تھے جس کا مقصد یہی تھا کہ کسی طرح سیتا ان کے جنگل میں پھنس گئی [illegible] وہ دونوں مجھے ٹھکانے لگانے کا ارادہ کر چکے تھے مگر اس قبیلے [illegible] ان کی راہ میں حائل تھا۔

دروازہ کھولو۔ ہم اسے دیکھیں گے!“ اس بار شکستہ مقامی زبان [illegible] میرے جھونپڑے کے محافظ کو ہدایت دی گئی!

میری داڑھی مہینوں سے بڑھی ہوئی تھی، لمبے لمبے الجھے ہوئے [illegible] دہشت زدہ چہرہ، پھر جسم پر جانوروں کی کھالیں لباس کا کام دے رہی [illegible] اس حالت میں شاید کوئی بھی یہ اندازہ نہ کر پاتا کہ میں بیرونی دنیا کا [illegible] تعلیم یافتہ نوجوان ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں کے سامنے [illegible] خود کو انگریزی سے نابلد ظاہر کروں گا تاکہ ان کی باہمی غیر محتاط گفتگو سے [illegible] مطلب نکال سکوں۔

چند ثانیوں بعد جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور دو دبلے پتلے، [illegible] سفید فام اندر داخل ہوئے۔ ان کے جسموں پر میری جیکٹ [illegible] نظر آ رہی تھی۔ ایک نہایت سکون سے سگریٹ پی رہا تھا جبکہ دوسرا [illegible] بے چین تھا مجھے پیال پر بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں ہی بری طرح چونکے

”میرے خدا! یہ تو ہوش میں ہے ڈان!“ بے چین حرکات [illegible] والا شخص نے تحیر آمیز آواز میں اپنے سگریٹ نوش ساتھی سے کہا۔

ڈان نے قہر بار نظروں سے اسے گھورا اور بولا۔ ”اپنی زبان بند [illegible]... پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ کون سی بولی سمجھ سکتا ہے!“

”وہ لڑکی بھی نہ جانے کیا بکتی رہتی ہے۔ اس کی زبان مقامیوں [illegible] کے لیے اجنبی ہے، مجھے تو یہ پتھر کے زمانے کا کوئی باقی ماندہ جوڑا معلوم [illegible] ہے!“ اپنی غور سے میرے دہشت زدہ اور سپاٹ چہرے کو [illegible] گھورتا ہوا بولا۔

”اے ___ کون ہے تو؟“ اس بار ڈان نے میرے قریب [illegible] تحکم آمیز دھیمے لہجے میں سوال کیا! اس بار وہ مقامی زبان بول رہا تھا۔

”جوموساتی!“ میں بھرائی ہوئی خوفزدہ آواز میں بولا۔ ”میرا [illegible] قبیلہ یہاں سے بہت دور برف سے ڈھکے ہوئے غاروں میں رہتا ہے۔“

”جوموساتی!“ ڈان نے پرخیال انداز میں دہرایا پھر بولا۔ [illegible] ”یہاں کیسے آیا ہے؟“

میں نے اس سوال پر اچانک خوفزدہ ہو جانے کی اداکاری کی [illegible] شاید میں کامیاب رہا، کیونکہ میرے ردعمل پر وہ دونوں چونک پڑے تھے۔ ”مجھے ایک خطرناک لڑکی میرے قبیلے سے اٹھا لائی تھی۔“ میں سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ ”وہ مجھ سے محبت کرتی تھی مگر مجھے اس سے نفرت تھی۔ یہاں پہنچنے پر ایک شام اس سے میرا جھگڑا ہو گیا اور وہ خاموشی سے کسی طرف نکل گئی۔ میرے لیے یہ علاقہ اجنبی ہے اس لیے اس خطرناک جنگل میں ناقابل بیان مصائب میں گھر گیا۔“

میرے جواب پر ان دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر ریٹی انگریزی میں بولا۔ ”دیکھا میرا اندازہ درست ہی نکلا اس کی حرکات و سکنات ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہاں تنہا نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے جوموساتی کو کھو دینے کے بعد اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا ہو، وہ ابھی تک اس کی منتظر ہے!“

پھر ڈان نے مجھ سے لڑکی کے بارے میں بہت سے سوالات کیے اور میرے ہر جواب میں سیتا کی شخصیت کا عکس نمایاں تھا۔

اس کے بعد وہ دونوں چلے گئے۔ جھونپڑے کا دروازہ ایکبار پھر بند کر دیا گیا!

میرے لیے یہ انکشاف مسرت افزا تھا کہ سیتا ان کی قید میں ہونے کے باوجود زندہ تھی۔ مجھے سیتا کی دلیری اور بے خوفی کا خوب اندازہ تھا مگر وہ ایک لڑکی ہی تھی۔ مجھے بس اس کی جانب سے ایک ہی فکر لاحق تھی، نہ جانے وہ اپنی آبرو کے تحفظ میں کہاں تک کامیاب رہی تھی!

کچھ دیر بعد جھونپڑے کے باہر آہٹیں سنائی دیں اور اس بار دس گیارہ افراد کی ایک ٹولی اندر آئی۔ یہ سب مقامی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے بے ہنگم ہتھیاروں وغیرہ سے پسماندگی صاف ظاہر تھی۔

آنے والوں میں ایک دراز قامت اور مضبوط جسم کا ادھیڑ عمر شخص پیش پیش تھا جس کے داہنے شانے پر ایک پہاڑی شکرہ براجمان تھا۔

اس کی ہدایت پر آنے والوں میں سے ایک سفید ریش شخص نے بڑھ کر میرے زخموں کا جائزہ لیا پھر پانی کے ساتھ مجھے ایک تلخ سفوف کی خاصی مقدار کھلائی اور وہ سب میرے پیال کے قریب بیٹھ گئے۔

”تمہارا نام جوموساتی ہے؟“ دراز قامت شخص نے تیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

میں نے بے بسی سے ان سب کا جائزہ لیا پھر کمزور آواز میں بولا۔ ”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میں یہاں کیوں قید کیا گیا ہوں، پھر میں اپنے بارے میں سب کچھ اگل دوں گا۔“

اس نے ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر غصے سے مجھے گھورا پھر بولا۔ ”تجھ پر نینی کے قتل کا الزام ہے!“

”نینی!“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ ”یہ کون ہے؟“

”نینی میری بستی کی سب سے حسین لڑکی تھی!“ وہ رنج اور غصے

کے ساتھ بولا "کسی نے اسے قتل کر کے لاش جنگل کے آخری حصے میں دبا دی تھی مگر کسی مُردہ خور جانور نے وہ لاش زمین سے کھود نکالی اور ہم ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں تک جا پہنچے۔ واپسی پر ہمیں جنگل سے انسانی چیخیں سُنائی دیں اور ہماری ایک ٹولی نے تجھے ڈھونڈ نکالا۔"

"یہ میری بدنصیبی ہے!" میں روہانسی آواز میں بولا۔ "اس قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تو خود یہاں اپنی بیوی کی تلاش میں بھٹک رہا تھا!"

"بیوی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "تو اپنی بیوی کے ساتھ یہاں کیا کر رہا تھا؟"

"میں اس کے ساتھ دسول گری کی طرف جا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "جنگل میں گھسنے سے پہلے ہم غاروں میں رُکے اور وہ پھلوں کی تلاش میں جنگل میں گھس گئی اور طویل انتظار کے باوجود نہ لوٹی تو میں بھی خطرات کی پرواہ کیے بغیر جنگل میں گھس پڑا۔ تم یقین کرو کہ میں نے نینی تو کیا ان جنگلوں میں کسی انسان کا سایہ تک نہیں دیکھا!"

"تیری بیوی کہاں گئی؟" اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ "ہم لوگوں نے نینی کی تلاش میں جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا مگر کسی دوسری لڑکی کا سُراغ نہ مل سکا۔"

"مجھے علم ہے کہ وہ کہاں ہے!" میں دھیمی آواز میں بولا۔

غصے سے اس کا پارہ یک بیک چڑھ گیا۔ "کبھی کہتا ہے کہ اسے ڈھونڈ رہا تھا، اب بتاتا ہے کہ اس کا پتہ ہے، کیا تو ہمیں احمق سمجھتا ہے!"

"میں تنہائی میں تم سے بات کروں گا سردار!"

"یہ سب جرگہ کے رکن ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں کوئی بات نہ ہوگی۔"

میں نے ایک ثانیے کے لیے سوچا پھر سوال کیا۔ "ڈان اور ریٹی تمہاری بستی میں کیا کر رہے ہیں؟"

سردار کا منہ حیرت سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ "تو ان کے نام بھی جانتا ہے!"

"میں ان کی زبان بھی جانتا ہوں سردار مگر وہ یہاں آئے تو میں ان کی زبان سے اجنبی بنا رہا اور میں نے اپنی بیوی کا سُراغ پا لیا، وہ ان ہی کی قید میں ہے!"

"ناممکن.... ناممکن!" سردار گمبھیر لہرا کر غرایا۔ "وہ دونوں میرے معزز مہمان ہیں اور اس علاقے میں آباد قبیلوں پر ایک تحقیقی کتاب لکھنے یہاں آئے ہیں، وہ کبھی ایسی گندی حرکت نہیں کر سکتے۔"

"میں نے اپنے کانوں سے سُنا ہے سردار۔" میں گڑگڑایا۔ "میری بیوی جنگلوں کی نباض ہے۔ اگر تم نے اسے زندہ برآمد کر لیا تو شاید وہ نینی کے بارے میں کچھ بتا سکے!"

سردار کچھ دیر تک سر جھکائے سوچ میں ڈوبا رہا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "میں نینی کے قتل کے ایک اجنبی ملزم کی شہ پر ڈان کی بے عزتی نہیں کر سکتا۔ اگر یہ الزام غلط نکلا تو میں ان کا سامنا کرنے سے پہلے مر جانا پسند کروں گا۔ وہ میری مرضی اور اجازت سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں!"

"میں نینی کا قاتل نہیں ہوں سردار۔" میں نے التجا کی۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ڈان اور ریٹی سے ٹکرا جاؤ۔ مجھے محدود آزادی دے دو، کام میں خود کر لوں گا۔"

پھر سردار، جرگہ کے ارکان سے مشورہ کرنے لگا۔ ان میں سے کئی افراد میرے ہمنوا تھے۔ گو وہ لوگ پس ماندہ قبائلی تھے مگر ان کی اخلاقی قدریں بہت بلند تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ نینی مر چکی ہے اور اگر میں ہی قاتل ہوں تو جلد یا بدیر ان کے ہاتھوں اپنے کیفر کردار تک پہنچا دیا جاؤں گا جبکہ سیتا ابھی تک زندہ تھی اور اس کی جانب سے ذرا بھی غفلت برتی گئی تو شاید وہ ہلاک کر دی جائے۔ محض میرے مشکوک کردار کی وجہ سے میرے بیان کو نظر انداز کرنا مناسب نہ تھا۔

اور آخر کار جرگہ نے فیصلہ صادر کیا کہ مجھے سیتا کے بارے میں اپنے بیان کی صداقت ثابت کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ نینی کے قتل کا مقدمہ اس کے بعد پیش ہوگا۔

میرے زخموں پر اس رات جڑی بوٹیوں کا لیپ چڑھا دیا گیا۔ معالج ساری رات میرے سینے سے کان لگا لگا کر دل کی دھڑکنیں محسوس کرتا رہا اور اپنے مشاہدے کے مطابق مجھے مختلف مشروبات پلاتا رہا جس کے نتیجے میں مجھے بار بار اور کثرت سے پیشاب آنے لگا۔

اس طبیب نے مجھے سُرخ چیونٹوں کے بارے میں لرزہ خیز کہانیاں سُنائیں۔ وہ چیونٹے حد درجہ خونی اور خطرناک تھے۔ وہ لوگ قبیلے میں قتل، سازش، بغاوت اور زنا کے مجرموں کو ہاتھ پیر باندھ کر ایک قدآدم چوبی تابوت میں بند کر دیتے تھے اور وہ تابوت جنگل میں ڈال دیے جاتے تھے۔ گوشت کی بُو پا کر بے شمار سُرخ چیونٹے تابوت میں چھوڑے ہوئے سوراخوں سے اندر گھُس جاتے اور تیسرے دن جب تابوت واپس لا کر کھولا جاتا تو اس میں صرف انسانی ہڈیوں کا خشک پنجر موجود ہوتا تھا۔ چیونٹے گوشت کھانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اپنے شکار کا دل، دماغ، آنتیں، گردے حتیٰ کہ پھیپھڑے تک کھا جاتے تھے۔ لوگ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تھے۔

میرے معالج کی محنت جلد ہی رنگ لے آئی اور نصف شب کے قریب میں اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے جھونپڑے کے محافظ کے ذریعے فوراً ہی یہ خوشخبری سردار تک پہنچائی۔ محافظ نے واپس آ کر اسے کوئی تفصیلی پیغام سنایا اور واپس اپنی جگہ چلا گیا۔

اگلی صبح جھونپڑے کے باہر نقل و حرکت کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ میرے استفسار پر طبیب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ مجھے لیکر باہر نکلا تو میں نے سر سبز درختوں سے ... میں کم از کم بیس نیزہ بردار مقامی موجود تھے۔

"یہ سب تمہاری نگرانی کے لیے یہاں جمع ہیں۔" طبیب مجھ ... کے محاصرے میں تم ڈان اور ریٹی کے مکان میں داخل ہو ... تمہاری بیوی برآمد نہ ہوئی تو تم پر نینی کے قتل کے ساتھ ہی ... جرم بھی عائد ہو جائے گا۔"

"میں ابھی اس قابل نہیں ہوں کہ تنہا ان دونوں سے مقابلہ ..." میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے زخموں سے چور بدن میں سنسنی ... کی۔

"سردار ان دونوں کو اپنے ساتھ شکار پر لے گیا ہے، وہ لوگ ... پہلے واپس نہ آئیں گے۔" میرے معالج نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

پھر میں نیزہ برداروں کے محاصرے میں اس خوش منظر خطے ... علاقہ سبزہ اور پانی کی قدرتی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ اونچی نیچی ... ڈھلانوں پر سبزہ ہی سبزہ بکھرا ہوا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ گہرے سُرمئی ... بادلوں کے غول اس وادی میں اُترے ہوئے تھے اور سرد ہوائیں ... زور پکڑ رہی تھیں جن کے لمس سے میرے زخموں کی سوزش کو ... آرام مل رہا تھا۔

اس خوابناک ماحول میں چند سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ... پتھر کے بنے ہوئے بے شمار جھونپڑوں پر مشتمل بستی آگئی۔ لوگ ... رنگ برنگ ٹوپیاں اوڑھے چھپروں پر ادھر اُدھر آ جا رہے تھے، کہیں ... بچے ٹولیاں کھیلنے میں مصروف تھیں جن کی مسرت آمیز معصوم ... سے فضا رچی ہوئی تھی۔ امن و سکون کی وہ وادی اس وقت ... کا منظر پیش کر رہی تھی۔

"بیرونی دنیا سے تمہارا کیا رابطہ ہے دوست؟" اونی کمبل ... وغیرہ دیکھ کر میں نے اپنے معالج سے پوچھا۔

"یہاں سے چالیس میل کی مسافت پر بھٹ گڑھ نامی ایک ... جہاں مہینے میں ایک بار لاری سے رسد آتی ہے۔ ہم لوگ زعفران ... کے ضرورت کی چیزیں لے آتے ہیں۔"

بستی سے الگ تھلگ درختوں کے کنج میں گارے اور پتھروں سے بنی ... بھونڈی سی عمارت کے پاس وہ لوگ رُک گئے۔

"یہ ڈان اور ریٹی کی قیام گاہ ہے۔" وہ بولا۔ "تم تنہا اندر جاؤ ... تمہاری واپسی تک عمارت کے گرد پھیلے رہیں گے تاکہ تم بھاگنے ... نہ کر سکو۔"

میں نے چند ثانیوں تک عمارت کا جائزہ لیا پھر دیوار کے قریب ... درخت کی طرف بڑھ گیا جس کی شاخیں عمارت کے اندر تک پھیلی ہوئی تھیں۔

زخموں کی وجہ سے مجھے درخت کے سہارے اندر پہنچنے میں سخت دشواری پیش آئی مگر یہ میرے لیے ایک بڑا معرکہ تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ سیتا زندہ اور سلامت اسی عمارت میں موجود ہے۔

اندر سے عمارت کی ساخت بہت سادہ تھی۔ ایک کمرے میں دو بستر موجود تھے، دوسرے کمرے میں لکھنے پڑھنے کا سامان موجود تھا۔ دیوار پر چند بڑے بڑے نقشے آویزاں تھے جن پر جا بجا قلم سے نشانات لگا کر یادداشتیں لکھی گئی تھیں۔

مجھے وہاں ان دو کمروں کے علاوہ ایک کوٹھری بھی نظر آئی، جس کا وزنی چوبی دروازہ مقفل تھا۔ میں نے دروازے سے منہ لگا کر کئی بار سیتا کو پکارا لیکن اندر گہرا سکوت چھایا رہا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ اگر اندر سیتا موجود ہوتی تو میری آواز سُن کر کوئی نہ کوئی آہٹ ضرور پیدا کرتی مگر وہاں تو موت کا گمبھیر سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی ذی رُوح موجود نہ ہو۔

معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں ان دونوں خبیثوں نے سیتا کو بستی سے باہر کسی غار وغیرہ میں نہ رکھ چھوڑا ہو۔ اس صورت میں میرا یہاں سر کھپانا بے سود تھا۔

جب میں مایوس ہو کر واپس لوٹ رہا تھا تو خوابگاہ میں سیتا کی کسی تلاش میں بستر کی تلاشی لی۔ وہاں ایسی تو کوئی چیز نہ ملی، ہاں امریکی ساخت کا ایک ننھا سا خودکار ریوالور ضرور مل گیا جس کا چیمبر بھرا ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس کوٹھری کا بھی جائزہ لے لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ میں واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ میری نگاہ فرش پر رکھے ہوئے گتے کے ایک بکس پر پڑی جس میں بلیک ڈاگ وہسکی کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔

یہ نعمت مجھے مہینوں بعد نظر آئی تھی، میں نے جلدی سے ایک بوتل نکالی اور اس کا کاک اُڑا کر بوتل اپنے منہ سے لگا لی۔

وہ آتشیں سیال ایک لکیر بن کر میرے معدے میں اُترتا چلا گیا! ایک ثانیے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے پھندا لگ جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ باہر کی فضا میں دھندلکا گہرا ہو چلا تھا۔ شاید اس علاقے میں موسم کی پہلی برفباری شروع ہونے والی تھی۔

میں نے آہستہ آہستہ وہسکی کے کئی گھونٹ لیے اور میرا ذہن تر و تازہ ہونے لگا۔

پھر اچانک باہر ایک کھٹکا ہوا، میں اُچھل کر بستر سے اٹھ گیا اور اس سے قبل کہ میں اس آواز کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرتا، باہر سے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ اُبھری اور یک بیک میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ نہ جانے وہ ڈان اور ریٹی تھے یا سردار کے آدمی؟

مجھے اندیشہ تو یہی تھا کہ وہ دونوں خبیث برفباری کے اندیشے کی آڑ لیکر یا دانستہ سردار کی ٹولی سے بچھڑ کر لوٹ آئے ہوں گے۔ یہ خیال

آتے ہی میں نے شراب کی بوتل اور ریوالور ہاتھ میں سنبھالا اور لپک کر ان کے مطالعے کے کمرے میں جا گھسا۔ مجھے اُمید تھی کہ اس موسم میں وہ لکھنے لکھانے کا ارادہ نہیں کریں گے! اس کمرے میں ایک دروازے کے پٹ کی اوٹ میں، میں نے خود کو اچھی طرح چھپا لیا۔

چند سیکنڈ بعد مجھے جوتوں کی دھمک کے ساتھ ہی ریِنی کی آواز سُنائی دی ”پتہ نہیں آج سردار کو بیٹھے بٹھائے شکار کی کیا سوجھی تھی، اب کسی بھی لمحے برفباری شروع ہونے والی ہے مگر وہ واپسی پر آمادہ ہی نہ تھا۔“

”شکار تو ضرور ہوگا۔“ ڈان کا لہجہ شوخ تھا ”اگر وہ آج بھی طاقت آزمائی پر تلی رہی تو میں اسے بے ہوشی کا انجکشن دے دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ دونوں یقیناً سیتا کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

”یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔“ ریِنی بولا ”مگر میں بستر پر گرمجوش لڑکیوں کی رفاقت ہی پسند کرتا ہوں.... نینی نے بھی بڑے ہاتھ پیر چلائے تھے مگر آخر کار اسے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے تھے۔“

”شٹ اپ ریِنی!“ ڈان غصے میں غرّایا ”ہم عہد کر چکے ہیں کہ بھول کر بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کریں گے۔“

”سوری ڈان!“ وہ جلدی سے بولا ”وہ اتنی لذیذ تھی کہ اسے بھولنا بڑا مشکل ہے، ویسے آیندہ تم یہ ذکر نہیں سُنو گے!“

یہ سُن کر میرا خون کھول اٹھا! انھوں نے نہ صرف سیتا کو قید کیا ہوا تھا بلکہ نینی کو بھی انھوں نے ہی ٹھکانے لگایا تھا۔ شاید انھیں اندیشہ رہا ہوگا کہ نینی بستی جا کر سردار کو اپنی آبرو ریزی کی کہانی سنا دے گی اور سُرخ چیونٹوں کا تابوت ان کا مقدر بنے گا تو اپنا راز چھپائے رکھنے کے لیے انھوں نے نینی کو ہلاک کر کے اس کی لاش جنگل ہی میں دبا دی ہوگی!

پھر شاید وہ دونوں لباس تبدیل کرنے لگے۔

”لو — برفباری بھی شروع ہو گئی!“ اچانک ریِنی مسرت بھری آواز میں بولا۔

”بادل بہت گھر آئے ہیں، ہوا بھی رُک چکی ہے۔ برفباری جم کر ہوتی نظر آ رہی ہے!“ ڈان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”قسمت ہم پر بڑی مہربان ہے ورنہ کہاں ہمالیہ کی وادیاں اور کہاں نیویارک کی مصروف مشینی زندگی۔ اتنی حسین برفباری میں نے شاید ہی کبھی دیکھی ہو!

”اور ابھی تو یہ حُسن دو آتشہ ہونے والا ہے۔“ ڈان کی مکّارانہ آواز اُبھری ”جوموساتی کی عاشق کو یہیں نکال لے آؤ!“

”تھوڑی دیر توقف کرو ڈان۔“ ریِنی نے مشورہ دیا ”برفباری ذرا تیز ہونے دو تاکہ ساری آبادی جھونپڑوں میں جا چھپے پھر ہم [illegible] سے اپنا کھیل شروع کر سکیں گے اس دوران میں تم چاہو تو میں [illegible] لیے وہسکی تیار کردوں۔“

”ضرور — یہ کام ضرور کرو۔“ ڈان جلدی سے بولا ”[illegible] کے لوگ نہایت قدامت پسند ہیں۔ عورت کو کانچ کی گڑیا سمجھتے ہیں [illegible] چند برس پہلے میں نے کچھ دن آسام میں گزارے تھے، وہاں تو یہ عالم [illegible] کہ معمولی سی رقم کے عوض لوگ لڑکیوں کو میرے ڈاک بنگلے پر چھوڑ جا[تے] تھے اور صبح سویرے خود ہی انھیں واپس لیجانے کیلیے آموجود ہوتے [تھے]۔“

”یہاں کی عورتیں حُسن کی دولت سے مالا مال ہیں۔“ ریِنی [حسرت] بھرے لہجے میں بولا ”میں نے ابھی تک بدصورت تو کیا؛ وسط خد و خال [کی] بھی کوئی عورت نہیں دیکھی مگر یہ سارے انگور کھٹے ہیں!“

وہ دونوں غالباً شراب پیتے اور اسی قسم کی عامیانہ گفتگو [کرتے] رہے۔ میں نے بھی اپنی کمین گاہ میں بوتل سے منہ لگا کر وہسکی کے کئی گھ[ونٹ] لیے۔ وہ دونوں سیتا کے بارے میں جب فحش قسم کے تبصرے کرتے [تو میرا] خون کھول اٹھتا مگر اس وقت میں نے خود بھی قابو پاتے ہوئے کسی بھی ا[قدام] سے گریز کیا۔ ان کی گفتگو سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ سیتا اسی عمارت [میں] قید ہے اور میری دانست میں وہ مقفل کوٹھری ہی اس کا زندان بنی ہوئی [ہے]۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھے۔ میرے کان انہی کی [آہٹ پر] لگے ہوئے تھے۔ پہلے قفل کھولنے پھر دروازہ وا کرنے کی آواز آئی۔

”خوب — یہ تو شاید ہماری ہی منتظر ہے!“ ڈان کی شیطا[نی] آواز میرے کانوں میں آئی ”اس کے ہاتھ بندھے رہنے دو، منہ بھی [بند] رہے تو بہتر ہے۔ اس کے پیر کھول کر اسے خوابگاہ میں لے چلو، بیچاری [بندھے] بندھے بیچاری اکتا گئی ہوگی۔“

میرے لیے اب خود پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔ میں نے شراب کی بوتل وہیں رکھی اور ریوالور سنبھال کر دبے قدموں اسٹڈی سے نکل آیا۔ راہداری کے آخری سرے پر کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا نظر آ[رہا] تھا۔ باہر کھلے آسمان تلے فضا میں ننھے ننھے برف کے ذرات تیزی [سے گر رہے تھے]۔ میں نے ایک لحظہ کے لیے رُک کر سوچا۔ کوٹھری کی جانب [گھپ] تاریکی تھی اور یہ امکان تھا کہ وہ دونوں کہیں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر مجھے [زیر] کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں جبکہ میں اپنی نازک حالت کے باعث کو[ئی] بھی خطرہ مول لینے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کی خوابگاہ میں آمد کا انتظار کرنا [بہتر] ہوگا۔ کوٹھری کی جانب سے اُچھل کود کی آوازیں آ رہی تھیں جو ہتھوڑوں کی طرح میری سماعت پر گر رہی تھیں مگر سیتا کے ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ سے کہیں زیادہ مجھے اس کی زندگی کی فکر تھی۔

آخر چند ثانیوں بعد دھما چوکڑی کی آوازیں تیز ہو گئیں، پھر وہ تینوں ایک دوسرے سے اُلجھتے راہداری سے نکلتے نظر آئے۔ میں سانس روک کر دیوار سے چپک گیا۔

اس وقت سیتا کسی وحشت زدہ شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی! اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، منہ میں کپڑا ٹھونس کر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ وہ دونوں بار بار اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سیتا کسی طرح ان کے بس میں نہ آتی تھی۔ جوں ہی وہ تینوں خوابگاہ میں گھسے، میں ریوالور سمیت تیزی سے دیوار کی اوٹ سے نکلا اور خوابگاہ کے دروازے پر جم گیا۔

سب سے پہلے ڈان کی نظر مجھ پر پڑی اور اس کے منہ سے ایک تحیر زدہ بے معنی سی آواز نکل کر رہ گئی! اس کے ساتھ سیتا اور ریِنی نے بھی مڑ کر میری طرف دیکھا۔

”صفدر!“ سیتا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، شاید اس نے مجھے پکارنا بھی چاہا لیکن منہ بندھا ہونے کے سبب کوئی آواز نہ نکل سکی اور وہ تیر کی طرح میری طرف جھپٹی اور پاگلوں کی طرح میرے سینے سے چمٹ گئی۔

”جہاں ہو وہیں رُکے رہو!“ میں ریوالور کی نال لہرا کر سرد اور بے رحمانہ آواز میں پھنکارا۔

”اوہ! یہ مردود انگریزی بھی بول سکتا ہے!“ ریِنی بوکھلا کر بولا۔

”سیتا! الگ ہٹو، پہلے مجھے ان مردودوں سے نمٹنا ہے۔“ میں نے خالی ہاتھ سے سیتا کو پچکارتے ہوئے کہا اور وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔

”تم کون ہو؟“ ڈان مجھے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

”جوموساتی۔“ میں زہریلے لہجے میں بولا ”اور اب تم دونوں ہاتھ بلند کر کے سامنے والی دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

”مم.... مگر ہم نے ابھی تک لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے!“ ریِنی ہکلایا۔ فرطِ خوف سے اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔

”یہ میں سُن چکا ہوں۔“ میں غرّایا ”جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ میں بے دریغ فائر کر دوں گا۔“

ان دونوں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے میں نے نہایت احتیاط اور خاموشی سے سیتا کے ہاتھ کھول دیے۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس نے اپنے منہ سے ٹیپ نوچا اور دیوانہ وار ان دونوں پر ٹوٹ پڑی۔ ڈان کمر پر لات پڑتے ہی منہ کے بل پتھریلی دیوار سے ٹکرایا اور کریہہ آواز میں چیخ پڑا۔ ریِنی کے منہ پر سیتا کا بھرپور تھپڑ پڑا اور اس کے دہانے سے خون کی لکیر بہہ نکلی۔

”سیتا! انھیں چھوڑ دے!“ میں نے اسے پکارا مگر وہ تو غصے میں شاید اندھی اور بہری ہو چکی تھی! اس نے میری ایک نہ سُنی اور نہایت ماہرانہ انداز میں ان دونوں کی مرمت کرتی رہی۔

اس مقابلے میں، میں خاموش تماشائی بنا دروازے پر کھڑا رہا تاکہ وہ دونوں خبیث کمرے سے باہر نہ بھاگ سکیں۔ مجھے خاموش پا کر ڈان اور ریِنی کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ یہ کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح سیتا کو گھیر کر زیر کر لیں مگر جنگلوں اور پہاڑوں میں پروردہ وہ لڑکی تحقیق و تصنیف کا کام کرنے والے ان مردوں کے بس میں کہاں آتی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں بُری طرح لہولہان ہو گئے اور چیخ چیخ کر مجھ سے التجا کرنے لگے کہ میں سیتا کو روک لوں۔

”سیتا! ابھی انھیں اپنی ٹانگوں پر چلنا ہے!“ آخر میں نے اس کو ہدایت دے ہی دی۔

سیتا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا! اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے ”صفدر... تیری کیا حالت ہو رہی ہے سارا بدن زخموں سے چور چور ہو رہا ہے!“

”یہ لمبی کہانی ہے اور شاید تیری ضد کا نتیجہ!

”تیری ضد؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں نہ تو پھلوں کی تلاش میں نکلنے کی ضد کرتی نہ ہم دونوں ان مصائب میں مبتلا ہوتے۔“ میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”چل اب تو جلدی سے ان میں سے کسی کا لباس پہن لے۔“

”تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔“ وہ چرمی جین پہنتے ہوئے بولی ”تجھ سے رخصت ہو کر جب میں پھلوں کی تلاش میں نکلی تو مجھے کہیں سے ان دونوں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ میں چھپتی چھپاتی وہاں تک جا پہنچی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ دونوں بھیڑیے کسی لڑکی کی لاش زمین میں دبا رہے تھے۔ تجسس میں مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا، جب یہ لاش دبا کر واپس لوٹے تو میں بھی ان کے تعاقب میں ہو لی۔ جنگل سے گزر کر یہ اس مکان میں آ پہنچے۔ مجھے یقین تھا کہ انھوں نے لڑکی کو مارا ہے، میں انھیں اس کی سزا دینا چاہتی تھی۔ لہٰذا جب اندھیرا پھیل گیا تو میں درخت کے ذریعے مکان میں کود گئی — کودنے کی دھمک سے یہ ہوشیار ہو گئے۔ اگر طاقت کا مقابلہ ہوتا تو میں ذرا سی دیر میں ان کو ختم کر دیتی مگر ان کے پاس آگ برسانے والا ایسا ہی ہتھیار تھا جیسا اس وقت تیرے پاس ہے۔ اسے دیکھ کر میں ڈر گئی اور انھوں نے مجھے باندھ لیا۔ یہ روزانہ کئی بار کوٹھری میں آتے مگر میں ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود ان کے قابو میں نہ آئی! انھوں نے آگ برسانے والے ہتھیار سے بھی دھمکایا مگر مجھے ماں کی ہدایت یاد تھی، میں نے ہتھیار نہ ڈالے اور آج کا تماشا تو تُو نے دیکھ ہی لیا۔“

”تو واقعی بڑی بہادر ہے!“ میں نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ چرمی جین اور جیکٹ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی! اس کی نیلی آنکھوں میں معصومانہ چمک کوند رہی تھی اور سُرخ و سفید چہرے پر بکھری ہوئی

سُرخ زلفیں مجھے دعوت دے رہی تھی

مگر یہ وقت عیش کا نہیں تھا۔ نہ جانے میرے ساتھ آنے والے مسلح محافظ ابھی تک باہر ہی موجود تھے یا برفباری سے گھبرا کر واپس لوٹ چکے تھے۔ میں نے سیتا کو ہدایت کی کہ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دے اور پیروں میں ایسے پھندے ڈال دے کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے قدموں پر چل سکیں مگر بھاگ نہ سکیں۔ میرا ارادہ اسی وقت بستی میں جانے کا تھا۔

اس کام سے نمٹ کر ہم نے انھیں باہر ہانکنا شروع کر دیا۔

”تم ہمیں کہاں لیجا رہے ہو؟“ ڈان نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بستی!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”راستے میں بے شمار گڑھے ہیں جو بھاری برفباری کی وجہ سے چھپ چکے ہوں گے۔ ہمارے ساتھ تم خود بھی موت کے منہ میں جا گرو گے!“

”فکر نہ کرو۔ تم ہماری رہنمائی کرو گے!“ میں بے رحمی سے ہنسا۔

اس وقت ہوائیں بالکل بند تھیں۔ برفباری لحظہ بہ لحظہ شدید ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مکان کے صحن میں برف کے سفید گالوں کی کئی انچ موٹی تہہ جمع ہو چکی تھی۔ برف کے روئی جیسے ہلکے ذرات ہمارے شانوں وغیرہ پر بھی تیزی سے گر رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر نکاسی کا دروازہ کھول دیا۔

پھر ہم لوگ جیسے ہی باہر نکلے برف کی سفید دھند میں سے مقامی محافظوں کی ٹولی امڈ پڑی۔ وہ سب سیتا کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

”یہ میری بیوی سیتا ہے!“ میں نے نیپالی زبان میں اپنے معالج کو بتایا۔ ”اور یہ نینی کے قتل کی چشم دید گواہ ہے!“

”نہیں!“ ڈان ایکدم چیخ پڑا۔ ”جوموساتی جھوٹ بول رہا ہے!“

”جوموساتی نہیں۔ میرا نام صفدر ہے مسٹر ڈان برین!“ میں استہزائیہ لہجے میں بولا۔

سیتا کی برآمدگی کے بعد مقامیوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ڈان وریی کو انھوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ایک شخص نیزے کی مدد سے برف کی گہرائی کا اندازہ کرتا رہنمائی کرنے لگا۔ باقی سب لوگ ایک طویل قطار کی صورت میں اس کے پیچھے ہو لیے۔ بے آواز اور تیز برف باری میں چند گز دور کی چیز دیکھنا بھی مشکل ہو رہی تھی مگر مجھے امید تھی کہ ہم جلد ہی صحیح وسلامت بستی میں پہنچ جائیں گے۔

”تمھارا قیدی اوّل درجے کا جھوٹا اور بدمعاش ہے!“ ڈان برہمی کی اداکاری کرتے ہوئے میرے معالج سے کہہ رہا تھا۔ ”ہماری غیر موجودگی میں یہ اس عورت کے ہمراہ چوری کی نیت سے اندر گھسا تھا۔ ہم خلاف توقع جلدی لوٹ آئے تو ان دونوں نے ہم پر بھی حملہ کر دیا!“

”اپنی زبان بند رکھو!“ معالج قہر بھری آواز میں بولا۔ ”صفدر ہمارے سامنے تنہا اندر گیا تھا اور یہ لڑکی تمھاری قیامگاہ سے برآمد ہوئی ہے، اب جو کچھ کہنا ہو وہ جرگہ کے سامنے کہنا!“

”یہ گورا کیا بکواس کر رہا ہے؟“ سیتا نے غصیلی آواز میں پوچھا۔ ”لگاؤں اس کے دو چار ہاتھ!“

”نہیں!“ میں سختی سے بولا۔ ”اب اپنے ہاتھ پیروں کو قابو میں رکھ، یہ لوگ ان دونوں سے خود ہی نمٹ لیں گے!“

”مگر تیرے بدن پر یہ لیپ کیسا چڑھا ہوا ہے، بدن بھی سوجا ہوا ہے؟“

”شکر ہے کہ تجھے میرا خیال تو آیا!“

”اے۔۔۔ زیادہ باتیں نہ کر، میں اس کوٹھری میں ہر وقت تیری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی ہوں!“ وہ تیزی سے بولی۔ ”یہ بتا کہ تو اس حال کو کیسے پہنچا ہے۔ اگر مقامیوں نے تیرے ساتھ ظلم کیا ہے تو میں ان کی پوری بستی میں آگ لگا دوں گی!“

”ان ہی لوگوں نے تو مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے ورنہ اب تک تو میرا ڈھانچہ ہی باقی رہ گیا ہوتا!“ میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

پھر سیتا کے اصرار پر میں نے اپنی پوری کہانی دہرا دی۔

میری بات ختم ہوتے ہی سیتا نے لپک کر میرا منہ چوم لیا اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”واقعی تیری قسمت اچھی تھی جو ان لوگوں نے تجھے بچا لیا ورنہ سُرخ چیونٹے تو اس زمین پر رام کا اٹل عذاب سمجھے جاتے ہیں!“

”رام نہیں خدا!“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”اب تو مسلمان ہو چکی ہے!“

بستی میں پہنچتے تک اتنی برف گر چکی تھی کہ پوری پنڈلیاں برف میں گھسی جا رہی تھیں۔ ڈان اور وریی کے پیر کھولے جا چکے تھے کیونکہ ان کے لیے قدم بڑھانا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

سردار کے جھونپڑے کی چھت سفید برف کے کئی انچ موٹے گالوں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ تاحدِ نظر پھیلی ہوئی برف کی سفیدی میں ابھری ہوئی پھوس اور پتھر کی بھوری، سیاہ اور سرمئی دیواریں نہایت حسین لگ رہی تھیں۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت دوپہر کا وقت تھا، لیکن وادی میں اُترے ہوئے گہرے سرمئی بادلوں کی وجہ سے ہر طرف شام کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔

سردار نے بذاتِ خود خیمے سے باہر آ کر قیدیوں کے اس قافلے کا جائزہ لیا۔

میرے ہمراہ جانے والے معالج نے وہیں کھڑے کھڑے سردار کو مختصر الفاظ میں ساری روداد سنائی۔ اس دوران میں ڈان اور وریی مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے رہے۔

سردار نے تحسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا پھر

ڈان، وریی اور بوڑھے طبیب سمیت مجھے اور سیتا کو اندر جھونپڑے میں بلا لیا۔ جھونپڑے کے وسط میں فرش پر الاؤ روشن تھا، قریب ہی دو آدمی کچھ پرندوں کی آلائشیں صاف کر رہے تھے۔ شاید یہ سردار کے لیے گوشت بھوننے کی تیاری تھی!

معاملہ چونکہ سنگین تھا لہٰذا سردار نے اسی وقت اپنے جھونپڑے میں جرگہ طلب کر لیا تاکہ فوری طور پر اس مقدمے کا فیصلہ کیا جا سکے۔

”تمھاری ایک بات درست نکلی مگر نینی کے قتل کے الزام سے تم اب بھی بری نہیں کیے گئے ہو!“ سردار نے مجھ سے کہا۔

”میرے تمام مصائب اور میری بیوی کی قید کا نینی کی موت سے گہرا تعلق ہے سردار، اس کے قاتل یہی دونوں ہیں!“ میں نے جلدی جلدی کہا۔

”کیا؟“ سردار کے منہ سے تحیر آمیز طویل آواز نکلی۔

”انھوں نے نہ صرف اسے قتل کیا بلکہ پہلے اس کی آبرو ریزی بھی کی تھی!“ میں نے ڈان اور وریی کو خاموش پا کر پُرجوش لہجے میں کہا۔

”ڈان! کیا یہ الزام درست ہے؟“ سردار نے قہر بھری آواز میں سوال کیا۔

”نہیں۔ یہ بکواس کر رہا ہے!“ ڈان نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے سیتا سے سُنی ہوئی پوری کہانی سردار کو بے کم و کاست سُنا دی، آخر میں وہ باتیں بھی بتائیں جو میں نے چھپ کر ان دونوں کے درمیان سُنی تھیں۔ ان ہی کی بنا پر مجھے پتہ چلا تھا کہ انھوں نے نینی کو اپنا مجرمانہ سلوک چھپانے کی وجہ سے ہلاک کیا ہے جبکہ سیتا صرف اسی قدر بتا سکی تھی کہ وہ دونوں جنگل میں نینی کی لاش چھپا رہے تھے۔

جرگہ کے اراکین جمع ہوئے تو ڈان اور وریی پر کڑی جرح شروع ہو گئی۔ وہ دونوں نینی کے قتل سے صاف مکر گئے تھے مگر سیتا کو قید کرنے کا الزام تسلیم کر رہے تھے بلکہ ڈان نے تو اس حقیقت کو اپنی بے گناہی کا سب سے بڑا ثبوت بنا لیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ سیتا کو اس نے چوروں کی طرح اپنے گھر میں گھستے دیکھ کر پکڑا تھا۔ پہلے وہ یہ سمجھا کہ سیتا کوئی آوارہ خانہ بدوش لڑکی ہے، وہ دونوں بھی بے کیف دن گزار رہے تھے لہٰذا ڈان نے سوچا کہ لڑکی راہ پر آ گئی تو وہ اسے اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔ ان کی قید میں دو دن گزرنے کے باوجود سیتا مزاحمت پر تلی رہی مگر سارے خطرات مول لیکر بھی انھوں نے اسے زندہ رکھا کیونکہ ان کے نزدیک انسانی خون بہانا قابلِ نفرت کام تھا۔

یہ قلابازی دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اگر ان کا اعتراف میں نے اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو شاید میں بھی اس دلیل کو مان لیتا۔

”یہاں کیا بحث ہو رہی ہے؟“ طویل سوال جواب سے اکتا کر سیتا نے مجھ سے پوچھا کیونکہ ان لوگوں کی زبان اس کے لیے اجنبی تھی۔

اس پر میں نے اسے پوری صورتِ حال بتا دی۔

یہ سُن کر وہ زور سے ہنسی۔ تلخ گفتاری اور تصادم کی اس فضا میں اس کا لاپرواہانہ قہقہہ سُن کر سب لوگ چونک پڑے اور غصے سے اسے گھورنے لگے۔

”اجنبی! اپنی عورت کو لگام دو، یہ جرگہ ہے کوئی میلہ نہیں!“ سردار تیوری پر بل ڈال کر ناگواری کے ساتھ بولا۔

میں سیتا کو ڈانٹنے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔ ”اگر انھوں نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا تو ان سے یہ پوچھو کہ اس رات ان کے کپڑے خون آلود کیوں تھے!“

”خدا کے لیے خاموش رہ سیتا!“ میں بیزاری سے بولا۔ ”یہاں ثبوت کے بغیر کوئی بات نہ مانی جائے گی، سردار تیری ہنسی سے ناراض ہو رہا ہے!“

”میں ہنسوں گی!“ یہ کہہ کر اس نے زبردستی ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”میں اسی وقت وہ کپڑے لا سکتی ہوں۔ یہ لڑکی کے قتل سے انکار نہیں کر سکتے!“

”اسے باہر نکال دو!“ سردار اپنے آدمیوں کی طرف پلٹ کر دہاڑا۔

”سردار، یہ لڑکی الہڑ اور بے وقوف ہے!“ میں نے اس کی خوشامد کی۔ ”اسے اپنی خوشی پر قابو نہیں رہا ہے کیونکہ وہ نینی کے قتل کی چند ناقابلِ تردید شہادتوں سے واقف ہے!“

”کیا یہ ہماری زبان نہیں بول سکتی؟“ سردار کا پارہ ابھی بھی تیز تھا۔

میں نے مایوسی سے سر کو نفی میں جنبش دی اور کہا۔ ”یہ لڑکی بتاتی ہے کہ ڈان اور وریی کے خون آلود کپڑے وہ اسی وقت لا سکتی ہے!“

یہ الفاظ ہر ایک کے اعصاب پر بم کی طرح گرے اور ڈان پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ ”ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا، وہ کپڑے ہماری غیر موجودگی میں ہماری قیامگاہ میں دبا دیے گئے ہوں گے!“

یہ سُن کر بوڑھا اور تجربہ کار طبیب بے اختیار مسکرا دیا اور ڈان سے بولا۔ ”مگر یہ تو کسی نے نہیں کہا کہ وہ کپڑے تمھارے مکان میں دبے ہوئے ہیں۔ وہ کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر صفدر میرے سامنے خالی ہاتھوں تمھارے مکان میں گیا تھا!“

پھر تو یوں محسوس ہوا جیسے ڈان کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ ”تم سب ملے ہوئے ہو، سور کے بچو! میں دیکھوں گا کہ تم میرا کیا بگاڑ لو گے۔ وہ کپڑے ایک تیتر کو ذبح کرتے ہوئے خون میں بھر گئے تھے جنھیں میں نے اپنے مکان کے صحن میں دبا دیا تھا!“

اب سارا بھرم کھل چکا تھا۔ شدید برفباری کے باوجود پورا

جرگہ روانگی کے لیے تیار ہوا۔ ڈان اور ریی بھی ساتھ تھے اور سیتا بساط الٹ دینے پر خوشی سے اکڑی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی

سیتا کی نشاندہی پر صحن کے ایک حصّے سے برف کے گالے ہٹائے گئے تو نیچے سخت زمین نکل آئی۔ اسے کھودنے پر ڈان اور ریی کے خون آلود کپڑے برآمد ہوئے جنھیں سردار سمیت جرگہ کے بیشتر ارکان نے پہچان لیا

ڈان اور ریی کے چہرے زرد پڑ گئے اور وہ سردار کے سامنے رحم کے لیے گڑگڑانے لگے۔

"انھوں نے واپس آتے ہی اپنے کپڑے تبدیل کر کے یہ خون آلود لباس زمین میں دبا دیے تھے۔ میں درخت پر چھپی یہ سب دیکھ رہی تھی۔" سیتا مجھے بتا رہی تھی۔

سردار نے بڑھ کر مجھے اور سیتا کو سینے سے لگا لیا۔ "ان دونوں قاتلوں کا سارا سامان تمھارا انعام ہے، اب تم برفباری ختم ہونے تک اسی مکان میں میرے مہمان رہو گے!"

"تم عظیم ہو سردار۔" میں دفورِ مسرت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر تم نرم دل اور انصاف پسند نہ ہوتے تو میں سیتا کو کھو کر نینی کے قتل کے الزام میں مارا جاتا۔"

"سردار!" اچانک ریی کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔ "میں نے ڈان کا ساتھ ضرور دیا تھا مگر نینی کا قاتل یہی ہے۔ اس نے ہی نینی کو اٹھا لیجانے کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ اسی کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھی۔"

"خاموش رہ گندے سور۔" ڈان اس پر جھپٹ پڑا۔ "اس کے ساتھ منہ کالا کرنے میں تو مجھ سے آگے آگے تھا۔"

"خاموش!" سردار نے کرخت آواز میں انھیں پھٹکارا۔ "اس بستی میں قتل اور زنا کی ایک ہی سزا ہے جو تم دونوں کو ملے گی۔ خبردار جو اپنی ناپاک زبان سے نینی کا نام لیا۔"

"میرے دل میں اپنا نیزہ اتار دو مگر مجھے سرخ چیونٹوں کے حوالے نہ کرو سردار۔" ریی خوف سے پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "اگر تم میری زندگی نہیں بخش سکتے تو مجھے میری پسند کی موت تو دے دو!"

سردار نے اس کی واویلا پر کان نہ دھرا اور پوری جماعت کو لیکر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے اور سیتا کو وہ پہلے ہی اس مکان کا مالک بنا چکا تھا۔

جب ان کے دھندلے ہیولے برف کی دبیز چادر میں روپوش ہو گئے تو میں نے دروازہ بند کیا اور واپس لوٹا تو سیتا میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے کپکپا رہے تھے اور آنکھیں نم تھیں۔

"صفدر!" اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے بھرائی ہوئی آواز نکلی اور وہ پاگلوں کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے بالوں اور شانوں پر فوراً ہی برف کے ذرات کی تہہ جمنی شروع ہو گئی تھی۔

میں نے آہستہ سے اس کے سرخ بالوں کو چوما اور اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔

کئی دن کی جدائی تھی اور وہ بھی ایسی کہ نہ سیتا کو میری زندگی کا یقین تھا نہ مجھے اس کی سلامتی کی جانب سے اطمینان تھا۔ اب جو تنہائی، سکون اور تحفظ کے لمحات میسر آئے تو شوق دیوانگی بن گیا مگر سیتا کی خوشی میں اداسی بھی شامل تھی۔ میرے زخموں کی فکر نے اسے پریشان کیا ہوا تھا۔

پھر میں نے غنیمت میں ہاتھ آئے ہوئے سامان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ گرم کپڑوں، شراب اور سگریٹ کی خاصی تعداد چرمی صندوقوں اور چوبی پیٹیوں میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ خشک پھلوں اور گوشت کے چند سربند ڈبے تھے یا پھر کتابیں وغیرہ۔ ان میں ایک چیز جو سیتا کے لیے شدید حیرت کا باعث بنی وہ ایک طاقتور سرچ لائٹ تھی جس میں خشک سیل پڑے ہوئے تھے۔

ان کے کاغذات اور ایک ڈائری سے پتہ چلا کہ ڈان سماجیات کا ایک اسکالر ہے، وہ انسان کے جدید سماجی رجحانات سے متعلق ایک مشہور اسٹڈی گروپ کا سربراہ تھا اور اس سلسلے میں کئی تحقیقاتی کتابیں لکھ چکا تھا۔ وہ "دوہم عصرِ انسان" نامی ایک کتاب کی تیاری کے سلسلے میں کئی دشوار گزار اور غیر مہذب علاقوں کی خاک چھانتا وہاں تک پہنچا تھا۔ اس کتاب میں وہ جدید ترین سائنسی ترقیوں سے استفادہ کرنے والے مہذب معاشروں اور علم کی روشنی سے محروم صدیوں پیچھے رہنے والے گمنام قبائل کے سماجی رجحانات کے تضاد کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ان کی رسوم سے براہِ راست واقفیت کا جنون اسے وہاں تک لے آیا تھا۔ ریی ولسن اس کا اسٹینو اور سیکریٹری ہونے کے علاوہ گہرا دوست بھی تھا۔

ڈان برین کے علمی رتبے سے متعلق انکشافات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ جو شخص خود سماجی اصلاحات کا دعویدار تھا، وہ اپنے موروثی ماحول سے نیم مہذب قبائلی ماحول میں آ کر کس قدر بدل گیا تھا۔ اس نے اپنے میزبان قبیلے کی ایک لڑکی سے جو سلوک کیا وہ اس کے درجہ کے انسان کو کسی طرح زیب نہ دیتا تھا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ انسان اپنی ذات پر نفاست، وسیع النظری اور تہذیب کے جتنے خول چاہے منڈھ لے مگر اس کی اصل وہی ہے جو پتھر کے دور کے انسان کی تھی، جب ہر طاقتور کمزور کو فنا کر دینے پر تلا رہتا تھا، جہاں معمولی سی ذاتی ضرورت بھی اہم ترین اجتماعی تقاضوں پر غالب رہتی تھی۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود انسان کی جبلت وہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے اظہار میں مکاری سے

م لیتا تھا مگر جب اور جہاں اسے موقع میسر آتا وہ سارے خول اتار کر ے آباؤ اجداد کی صف میں جا کھڑا ہوتا تھا۔

ڈان برین کے کاغذات کا جائزہ لیتے ہوئے میں کتنی دیر ہی خیالات میں کھویا رہا۔ پھر میری توجہ اس علاقے کے دیوار گیر نقشے کی ت مبذول ہو گئی۔ نقشہ بہت تفصیلی تھا۔ اس میں ۸۳ درجہ طول البلد اور ۲ درجہ عرض البلد پر کالی گاپ نامی ایک بستی کے گرد قلم سے دائرہ لگا ہوا تھا۔ الباً یہ وہی بستی تھی جہاں ہم مقیم تھے کیونکہ اس کے قریب ہی بھٹ گرہ کی بادی موجود تھی۔ ایک کچی پہاڑی سڑک نیپال کے جنوب مشرقی علاقے سے آ کر بھٹ گرہ پر ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ نقشے میں کالی گاپ سے وہاں ک رسائی کا کوئی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ کالی گاپ کی بستی سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ بلند تھی! اس سے اور آگے دلدلی علاقہ تھا۔ پہاڑوں میں دلدلی علاقے کی موجودگی ابھی تک میرے لیے ناقابل فہم بنی ہوئی تھی مگر نقشے پر اس بارے میں ایک نوٹ درج تھا۔ یہ دلدلی علاقہ نو ہزار فٹ بلند تھا اور وہاں بڑے پیمانے پر چونے کی کانیں موجود تھیں جو بلندی سے بہہ کر آنے والے پانی کے باعث بتدریج خطرناک دلدل میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ان دلدلوں سے اس پار دھول گری کا گلیشیئر نسے بھرا ہوا علاقہ تھا جہاں ہر قدم پر موت اجنبی سیاحوں کی منتظر رہتی ہے۔

"یہ تو کہاں کھو گیا ہے؟" سیتا میری طویل محویت سے بیزار ہو کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"یہ دھول گری پہنچنے کا نقشہ ہے۔" میں اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا۔ "ہماری منزل اب قریب آ پہنچی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تجھے میری رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے!" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے۔" میں اسے چڑانے کے لیے بولا۔ "یہ نقشہ بالکل واضح ہے، بلکہ اس کی مدد سے تو شاید میں دلدلوں سے گزرے بغیر اس پار نکل جاؤں۔"

اس نے طیش کے عالم میں بڑھ کر وہ نقشہ دیوار سے نوچ لیا اور میرے روکتے روکتے اس نے نقشے کے پرزے اڑا کر رکھ دیے۔

"یہ سب بکواس ہے۔" وہ غصّے سے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں خود ادھر جا چکی ہوں۔ دلدل میں سے گزرے بغیر کوئی ادھر نہیں جا سکتا۔"

"تجھے معلوم ہے کہ ان دلدلوں سے دھواں نکلتا رہتا ہے، اس نرم زمین پر جس کا قدم پڑا، وہ تحت الثریٰ ہی میں جا کر دم لے گا۔"

"اس دلدل میں بھی ایک محفوظ راستہ ہے۔" وہ جھلا کر بولی۔ "میں آنکھ بند کر کے اس پر دوڑ سکتی ہوں۔"

"وہ تو جب دلدل آئے گی تو پتہ چلے گا۔" میں ہنس کر بولا۔ "ابھی تو ہم برفباری کی وجہ سے یہیں پھنس کر رہ گئے ہیں۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔" اچانک اس کا غصہ کافور ہو گیا۔ "اگر ہمارے آگے پہنچنے پر برفباری ہمیں آ لیتی تو کوئی طاقت ہمیں موت سے نہ بچا سکتی۔ برف کی سفید چادر کے نیچے قدم قدم پر موت بکھری ہوتی ہے۔ کوئی بھی قدم انسان کو گہری کھائیوں میں پہنچا سکتا ہے۔"

"خاموش جنگلوں اور پہاڑوں میں دُور دُور تک برف کی سفید چادر میں واقعی بڑے خطرات چھپے ہوتے ہوں گے!" میں اس منظر کا تصور کرتے ہوئے بولا۔

"خاموشی اور سکون کا خیال اپنے دماغ سے نکال دے۔" وہ داہنا ہاتھ فضا میں لہرا کر بولی۔ "ان علاقوں میں برفباری کے بعد تھوڑی ہی دیر خاموشی رہتی ہے پھر ہڈیوں میں اتر جانے والی تیز، ٹھنڈی ہوائیں چل نکلتی ہیں جو گھنے جنگلوں میں سے گزرتے ہوئے بھیانک آوازیں پیدا کرتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان جنگلوں میں ساری دنیا کی بدروحیں جمع ہو کر بین کر رہی ہوں اور پہاڑوں سے بہہ نکلنے والی برف موت کا سماں باندھ دیتی ہے۔ بس یوں لگتا ہے جیسے ہواؤں کے بین سے پہاڑ بھی رد پڑے ہوں۔"

"ارے تو مثالیں تو بڑی زبردست دیتی ہے!" میں حیرت سے اس کا منہ تکتے ہوئے بولا۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ تو لنگوروں میں پلی ہوئی ایک جاہل لڑکی ہے۔"

"میرے لنگور!" وہ اچانک اداس ہو گئی۔ "وہ مجھے اپنے درمیان نہ پا کر کرب سے ان کھنڈرات میں چیختے پھرتے ہوں گے۔ ماں بھی شاید اپنی خانقاہ پر جا چکی ہو گی۔"

"اچھا یہ بتا کہ دھول گری کی طرف بھی اگر آدم خور برفانی انسان کی مادہ سے ٹکراؤ ہو گیا تو کیا ہو گا۔" میں نے اسے سنجیدہ ہوتے ہوئے دیکھ کر فوراً موضوع بدل دیا۔

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"جا۔ جنگل سے پھل لے آ۔" میں نے چھیڑتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"رام کے ہر کام ....."

"پھر وہی رام۔" میں نے اسے ٹوکا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "مذہب بدل گیا ہے مگر عادت ذرا

دنوں میں جائے گی۔ میں کہہ رہی تھی کہ خدا کے ہر کام میں کوئی اچھائی ہوتی ہے، نہ میں پھلوں کے چکر میں یہاں قید ہوتی، نہ ہمیں اتنی اچھی پناہ گاہ ملتی۔ میں سچ کہتی ہوں کہ یہ سفر جاری رہتا تو عین دلدلوں پر برفباری ہمیں آلیتی!"

"تو نے اس مشکل کا حل پہلے کیوں نہ سوچا تھا؟"

"میں موسموں کا حساب چاند سے لگاتی تھی مگر تو اتنی گھبراہٹ میں بھاندر ناس لیکر بھاگا کہ میں سب کچھ بھول گئی۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"اوہو— شاید تو اپنا چاند بھی وہیں چھوڑ آئی ہے!" میں ہنسا۔

"دیکھ صفدر۔ تو اب ہر بات پر میرا مذاق اڑانے لگا ہے۔"

"تو بات ہی ایسی کرتی ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ میں چاند وہیں چھوڑ آئی ہوں؟"

"پھر کیا مطلب تھا تیرا؟"

"میں اپنے گھر میں ہر چاند پورا ہونے پر ایک کالا پتھر طاق میں رکھ دیتی تھی۔ ہر مرتبہ آٹھ پتھر پورے ہونے کے کچھ دن بعد برف گرنی شروع ہو جاتی تھی۔ یہ سلسلہ تین چار چاند چلتا رہتا اور جب برف پگھلنی شروع ہوتی تو میں پھر سے برف باری کے اگلے موسم کا حساب شروع کر دیتی تھی۔ ہم ماں سے جدا ہو کر اتنی گھبراہٹ میں بھاگے تھے کہ میں گھر جا کر طاق میں کالے پتھر گننا بھول گئی تھی۔ شاید وہاں آٹھ پتھر پورے ہو چکے تھے جبھی اتنی جلدی برف پڑنی شروع ہو گئی ہے۔"

اس کے ذہانت آمیز جواب نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ انسان کسی بھی زمانے میں اور کہیں بھی ہو، دوسری مخلوق سے اشرف ہی ہوتا ہے۔ جنتری اور موسمی پیشن گوئیوں کے سائنسی نظام سے ناآشنا اس جاہل لڑکی نے اپنی ضرورت کے تحت ایک ایسا نظام اپنایا ہوا تھا جو ہر لحاظ سے اٹل تھا اور اسی وقت مجھے قمری ماہ و سال کے حساب کی اہمیت کا صحیح احساس ہوا۔ یہ وہ حساب تھا جو ہر جگہ یکساں مفید تھا۔ پھر نظامِ کائنات پر اس کے اثرات مسلمہ ہیں۔ سمندر کا مد و جزر، موسمی تبدیلیاں، انسانی مزاج کا تلون اور نسوانی نظام کی تبدیلیاں — یہ سب چاند ہی کے عروج و زوال سے وابستہ تھیں، جو ہر نئے دن ایک نئے انداز سے طلوع ہوتا ہے اور اس کی یہ باقاعدہ تبدیلیاں یاد رہتی مسلمہ تبدیلیوں کی تقیب ہوتی ہے جبکہ سورج ہر روز ایک ہی انداز میں طلوع ہوتا ہے پھر اسی یکسانیت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کی ہیئت سے انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والی ان اہم تبدیلیوں کا سراغ پانا ناممکن ہے — کم از کم سیتا جیسی لاعلم اور قبائلی لڑکی تو دس بار جنم لیکر بھی موسم کا کوئی حساب نہ دریافت کر پاتی۔

ڈان برین اور ریٹی ولسن کے سامان میں دو بڑے بڑے تھیلے بھی تھے جن میں گھس کر آدمی ڈوریاں کھینچ لے تو حشرات الارض سے محفوظ رہتے ہوئے کہیں بھی بے فکری کی نیند سو سکتا ہے۔ میں نے اب

آہستہ آہستہ سیتا کو ایسی چیزوں کے بارے میں سمجھانا شروع کر دیا جو میں باقی سفر میں ساتھ لیجانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سیتا کے لیے بعض چیزیں بے انتہا دلچسپی کا باعث تھیں، یہ سب اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے تو اپنے بدن پر موجود چرمی جین اور جیکٹ تک پر حیرت ہو رہی تھی۔ جب اس کے اصرار پر میں نے بھی ایک ایسا ہی لباس پہنا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ "ارے! اس لباس میں تو تیری شان ہی کچھ اور ہو گئی ہے!"

میں نے اپنی بے تحاشا بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور سیتا کے تبصرے پر ہنس دیا۔ "اس حلیے میں میں تو بالکل جنگلی معلوم ہو رہا ہوں گا؟"

"ہاں ہاں۔ میں بھی تو کہہ رہی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "اس وقت تو بالکل جنگلی بھیڑیا لگ رہا ہے جو اپنی کھال میں مست ہو اور سامنے آنے والی ہر چیز کو اطمینان سے پھاڑ کھانے پر قادر ہو۔"

"تیرے نزدیک یہ شان ہے؟"

"اور کیا— مردانہ شان یہی ہوتی ہے۔" وہ میرے سینے سے آ لگی "ورنہ تیرا بدن زخموں سے چور ہے مگر آنکھوں میں وحشت کی سرخی رچی ہوئی ہے۔ دھول مٹی میں اٹا چہرہ، الجھے ہوئے گندے بال اور بڑے بڑے سیاہ بالوں سے بھرا تیرا یہ کشادہ سینہ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے!"

اس کی تعریف پر میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ گو بیرونی دنیا کی سلیس زبان میں وہ مجھے وحشی درندہ قرار دے رہی تھی مگر اس بھیانک اور تیزی سے تغیر پذیر ماحول میں میری اور اس کی بقا کے لیے یہی بھیڑیا پن اور خونی تیور کارآمد تھے۔

اس سے ملنے کی خوشی میں میں اپنے زخموں کو بھی بھول گیا تھا مگر طویل گفتگو اور محنت سے تکان طاری ہونے لگی تھی! اسی حالت میں مجھے دو بار بستی اور اس پتھریلے مکان کے درمیان بھی آنا جانا پڑا تھا۔ میں نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔

برفباری ابھی تک یکساں رفتار سے جاری تھی۔ درختوں کی برف سے لدی شاخیں اور ٹہنیاں لحظہ بہ لحظہ زمین کی طرف جھکتی جا رہی تھیں اور فضا میں نہایت خوشگوار اور فرحت بخش خنکی رچی ہوئی تھی۔ میں نے بستر پہ دراز ہو کر دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور مجھے اپنے پھیپھڑوں پر معمول سے زیادہ زور ڈالنا پڑا۔ سندری کی برفانی خانقاہ والی صورتِ حال یہاں بھی سامنے تھی۔ سطحِ سمندر سے زیادہ بلندی ہونے کے سبب یہاں ہوا میں آکسیجن کی مقدار خاصی کم تھی۔

آکسیجن کی کمی کا دوسرا اندازہ اس وقت ہوا جب سیتا نے آگ جلانے کی کوشش کی۔ یہ کام اس کیلیے کافی دقت طلب ثابت ہوا تھا۔

سارے دن برفباری اسی زور و شور سے ہوتی رہی۔ روشنی کا تو کہیں نام و نشان نہ تھا۔ برفباری کا کہرآلود دھندلکا جب گہری تاریکی میں

...رات کی آمد کا احساس ہوا اور ہم دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔

اگلی صبح ملی جلی انسانی آوازوں کا شور میری بیداری کا باعث بنا۔ ...ناگواری کے ساتھ آنکھیں کھول کر غنودگی کے عالم میں آوازوں کی ...یں دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھنا پڑ گیا۔ سیتا کسی شیرنی کی طرح خوابگاہ کے ...ے میں یوں اڑی ہوئی کھڑی تھی کہ اسے گرائے بغیر کسی کا اندر داخلہ ممکن ...دروازے کے اس پار صحن میں میرا مقامی طبیب چند افراد کے ہمراہ ...تھا جن کے ہاتھوں میں چند ٹوکریاں موجود تھیں۔

طبیب اپنی زبان میں نہایت احترام اور شرافت کے ساتھ ...ے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا! اس کی زبان تو سیتا کے لیے ...ہم نہ تھی مگر وہ اتنا ضرور سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھ تک پہنچنا چاہتے ہیں لہٰذا ...کے عالم میں انھیں دھمکیاں دے رہی تھی کہ اگر انھوں نے اندر گھسنے ...شش کی تو وہ ان کی ٹانگیں توڑ دے گی۔ طبیب کے لیے سیتا کی زبان ...ی مگر وہ لوگ اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر باہر ہی رکے ہوئے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سیتا؟" میں نے بستر سے اترتے ہوئے بلند ...میں پوچھا۔

میری آواز سن کر بھی وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئی "یہ سالے زبردستی ...گھس رہے تھے، دیکھتی ہوں یہ کیسے آگے بڑھتے ہیں!"

"صفدر! اس لڑکی کو سمجھاؤ، یہ نہ جانے ہماری طرف سے کس ...فہمی کا شکار ہے۔" مجھ پر نظر پڑتے ہی میرا طبیب جلدی سے بولا۔

"ہٹ جاؤ راستے سے!" میں نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے ...سے کہا۔ "اپنے میزبانوں سے یہ سلوک کرتے تجھے شرم نہیں آتی۔"

اس نے غصے سے مجھے گھورا اور ہاتھ جھٹک کر دروازے ...سے ہٹ گئی۔ "ایک تو میں تیرے آرام کے لیے ان سے لڑی اور الٹا تو ...مجھی کو پھٹکار رہا ہے۔"

"میرے آرام کے لیے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آواز بھرا گئی۔ "میں ان ...سے کہہ رہی تھی کہ تیری نیند خراب نہ کریں، تو زخمی اور تھکا ہوا ہے مگر یہ جاہل ...میری بات ہی نہیں سنتے!"

"اور تو بڑی عالم فاضل ہے نا۔" میں اس کی نادانی پر ہنس ...دیا۔ "تو نے ان کی بات سمجھ لی تھی؟"

معاملہ رفع دفع ہوتے دیکھ کر گھٹنوں گھٹنوں برف میں کھڑے ...ہوئے وہ لوگ دروازے تک بڑھ آئے تھے۔ سیتا کا جواب سنے بغیر میں ...ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمھارا کیا حال ہے صفدر؟" طبیب نرمی اور محبت کے ...ساتھ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"خشک ہوتے ہوئے زخموں کی سوزش ستا رہی ہے!" میں ہنس کر بولا۔ "ورنہ تمھارے لیپ میں تو نہ جانے کیا جادو ہے۔ تکلیف ہی جاتی رہی!"

"ہاں۔ میں نے اس لیپ پر جادو کیا ہوا تھا۔" وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

"واقعی؟" میں اپنے مذاق کی اس سنجیدہ تائید پر اچھل پڑا۔

"ہاں۔" وہ نرم نرم برف سے نکل کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "اس علاقے میں بڑے پھن والا کالی ناس نامی ایک چتکبرا سانپ پایا جاتا ہے، اگر یہ کسی جاندار کو کاٹ لے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے، جسم کی تمام شریانیں کمزور ہو جاتی ہیں اور ان سے خون رسنا شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار جلد کے مساموں تک سے پسینے کے بجائے خون آنے لگتا ہے اور اس کا کاٹا چند ہی گھنٹوں میں مر جاتا ہے۔ یہ سانپ بہت مشکل سے پکڑا جاتا ہے۔ تمھارے لیے میں نے اس کی کھال حاصل کی تھی! اس کھال پر جادو بہت جلدی اثر کرتا ہے۔ لیپ میں کالی ناس کی چمڑی کا سفوف بھی ایک خاص مقدار میں شامل تھا۔"

اس کی باتیں سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کالی ناس نامی سانپ کا تذکرہ سن کر معاً مجھے بھاندر ناس یاد آ گئی جس کی طلب نے مجھے یہ دن دکھائے تھے مگر بھاندر ناس میرے قبضے میں آنے کے باوجود ضائع ہو گئی تھی۔

"بابا! کیا یہاں بھاندر ناس بھی ملتی ہے؟" میں نے لرزتے دل کے ساتھ اس سے پوچھا۔

اس نے مایوسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "سنا ہے کہ یہ زمینی جڑ بہت دور آدمخوروں کے علاقے میں ملتی ہے، جو اسے پوجتے ہیں، مگر تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

"ایسے ہی خیال آ گیا تھا۔" میں نے بات بنا دی۔

سب سے پہلے اس نے لیپ صاف کر کے میرے زخموں کا تفصیلی جائزہ لیا، پھر مطمئن ہو کر نیا لیپ چڑھا دیا۔ میرے زخم حیرت انگیز تیزی کے ساتھ بھر چلے تھے۔

پھر اس نے ساتھ لائے ہوئے تھیلوں میں سے خورد و نوش کی کافی چیزیں پیش کیں۔ سردار نے خاص طور پر چند شکار کیے ہوئے پرندے ہمارے لیے بھیجے تھے۔

"تم لوگ واقعی محسن شناس ہو!" میں نے اپنے احساس کو لفظوں میں ڈھال دیا۔

"مجھے تو دوہری خوشی ہے کہ ہم ایک بے گناہ کے خون سے بال بال بچ گئے۔" وہ گہرا سانس لیکر بولا۔ "ان دونوں پر تو ہمیں ذرا بھی شبہ نہ تھا۔"

"اب وہ کہاں ہیں؟"

"سردار کے نہہ خانے میں۔" وہ بولا "اور میں تمھارے لیے سردار کا ایک پیغام بھی لایا ہوں!"

"وہ کیا؟"

"ڈان اور رینی کے لیے چوبی تابوت تیزی سے تیار کیے جا رہے ہیں۔ پرسوں جو جلوس یہ تابوت جنگل میں چھوڑنے جائے گا اس میں تم بھی شریک ہو گے۔ واپسی پر تمھارے اعزاز میں سردار دعوت دے گا اور وہیں تمھیں ایک انعام بھی دیا جائے گا۔"

"مگر برف باری سے راستے تو بند ہو چکے ہوں گے، پھر یہ تابوت بھی برف ہی میں دب کر رہ جائیں گے!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ چپہ چپہ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ ہم گردن گردن برف میں بھی جنگل تک پہنچ سکتے ہیں۔" وہ عجیب بے نیازی کے ساتھ مسکرا کر بولا۔ "ان کے تابوتوں کو ایسی جگہ پر رکھا جائے گا جہاں پورے موسم میں برف کا ایک ذرہ بھی زمین تک نہیں پہنچ پاتا۔"

"افسوس کہ میں برف سے لدی اس وادی کی سیر نہیں کر سکتا۔" میں نے حسرت کے ساتھ کہا۔ "میرے لیے تو برف سے ڈھکی ہوئی سفید زمین پر راستہ پانا ہی دشوار ہوگا۔"

"ہاں۔ ایسی کوشش بھی نہ کرنا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اور اگر ایک آدھ روز میں برف پگھل بھی جائے تو یہ خیال رکھنا کہ سورج کی روشنی میں ہمارے قبیلے کی عورتوں کا باہر نکلنا معیوب ہوتا ہے اور رات ان کیلیے ہوتی ہے۔ اس وقت کوئی مرد باہر نہیں نکلتا۔ تمھیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا۔"

"یعنی میں سیتا کے ہمراہ باہر نہ نکل سکوں گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔۔ دن کی روشنی میں جو چاہو کرو مگر سورج ڈھلنے کے بعد تم باہر نہیں نکلو گے۔ سردار اس بارے میں کسی کو رعایت نہیں دیتا۔"

"اگر یہاں اتنا سخت پردہ ہے تو ڈان اور رینی اس لڑکی کو جنگل میں لیجانے میں کیسے کامیاب ہوئے؟"

"انھوں نے ایک دوسرے پر الزام ڈالنے کی کوشش میں سب کچھ اگل دیا ہے۔ ان کے پاس دوربین نامی ایک ایسا حیرت انگیز آلہ ہے جو دور کی چیزوں کو قریب اور بڑا کر کے دکھاتا ہے۔ وہ ہر روز اپنی چھت سے بستی میں عورتوں اور جوان لڑکیوں کی کھیل کود دیکھا کرتے تھے۔ یوں وہ بدنصیب لڑکی ان کی نظر میں آگئی اور اس روز سورج ڈھلتے ہی جب وہ مویشیوں کے باڑے میں گئی تو رینی نے اسے اٹھا لیا، سارا خونیں کھیل سورج کی روشنی چھپ جانے کے بعد ہی کھیلا گیا تھا!"

وہ کافی دیر وہاں بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہا اور مجھے اس سے کالی گاپ کے باسیوں کے بارے میں بہت سی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئیں۔ وہ لوگ نہایت رحمدل اور امن پسند تھے۔ آسمانی بجلی کے پجاری تھے۔ جب بھی گرج چمک شروع ہوتی تو وہ سمجھ لیتے کہ ان کا خداوند ان سے بھینٹ طلب کر رہا ہے۔ وہ فوراً ہی چار صحت مند بکرے کھلے آسمان تلے ذبح کر ڈالتے۔ ان کے خون سے بستی کا ہر فرد اپنی پیشانی پر ایک نشان لگا اور وہ اپنے اپنے جھونپڑوں میں گھس کر عبادت شروع کر دیتے جو کم از کم ڈیڑھ دن جاری رہتی تھی۔ ان کی عورتیں اپنے شوہر اور اولادوں کے سوا کسی کے سامنے نہ آتی تھیں۔ اولاد کی شادی ہوتے ہی اسے الگ جھونپڑا مل جاتا تھا۔ اگر غلطی سے کوئی غیر مرد کسی گھر میں جا گھستا تو وہاں موجود عورتیں اور بالغ لڑکیاں چلنا تک ترک کر دیتیں اور جہاں ہوتیں وہیں اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر زمین پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور اس وقت تک یوں ہی سہمی بیٹھی رہتیں جب تک آنے والے کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہو اور وہ باآواز بلند اپنے آپ کو ملامت کرتا واپس نہ لوٹ جائے۔

ان میں شادی کی رسم بھی عجیب تھی۔ جب کوئی لڑکی بلوغت کی عمر کو پہنچتی تو سردار کا ایک مشیر مردانہ دربار میں باقاعدہ اس لڑکی کی صورت اور سیرت کی اچھائیاں برائیاں بیان کرتا پھر شادی کے خواہش مند لڑکے ایک ایک پتھر پر کوئی علیحدہ اور مخصوص نشانی لگا کر سردار کو دیتے۔ اس معاملے میں سردار کو اختیار تھا کہ اگر وہ چاہے تو کسی لڑکے کو مقابلے میں شرکت سے روک دے۔ پھر تمام پتھر مٹی کے بنے ہوئے ایک رنگا رنگ تھال میں سجا کر لڑکی کے جھونپڑے پر بھیج دیے جاتے۔ لڑکی جس پتھر کا انتخاب کرتی، وہی لڑکا اس کا شوہر قرار پاتا۔

چلتے وقت طبیب نے سیتا کی طرف دیکھا جو منہ پھلائے ملہر پیروں سے برف اڑا رہی تھی اور مجھ سے بولا "یہ لڑکی تو بہت ضدی ہے، اس کے ساتھ تم کیسے گزارہ کرتے ہو؟"

"ضدی ضرور ہے مگر مجھے دیوانہ وار چاہتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سیتا کو مخاطب کیا "یہ لوگ جا رہے ہیں، کیا تم انھیں الوداع نہیں کرو گی؟"

اس نے کچھ کہے بغیر ہاتھ ہلا کر اس ٹکڑی کو خدا حافظ کہا اور وہ لوگ کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔ سیتا دروازہ بند کر کے کمرے میں لوٹ آئی۔

ناشتے پر سیتا کا غصہ کافور ہو گیا اور میں اسے وہ تمام باتیں بتانے لگا جو مجھے طبیب کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔

"مگر ہم اس مکان میں بند نہیں رہیں گے۔" وہ بولی۔ "میں نے باہر کا جائزہ لیا ہے۔ سفید اور نرم برف سے لدی ہوئی یہ وادی بہت حسین ہے، ہم باہر کی سیر کریں گے۔"

اس روز مطلع صاف تو نہ تھا لیکن بادلوں میں سرمئی رنگ زیادہ تھا۔ ہلکے ہلکے بادل وادی میں ٹھہرے ہوئے سے نظر آ رہے تھے جن ... نظر فی الحال برفباری کا امکان نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اپنے زخموں ... نے کے لیے ڈان اور رینی کے لانگ بوٹ پہن لیے تاکہ برف اور ... نمی براہِ راست میرے زخموں کو نقصان نہ پہنچا سکے، پھر میں بھرا ہوا ... ساتھ لیکر سیتا کے ہمراہ باہر آ گیا۔

سیتا کے ہاتھ میں مقتول اندرام کا وہ لمبا آہنی چمٹا تھا جو ... گاپ والوں نے میری بے گناہی ثابت ہونے پر واپس کر دیا تھا۔ اس ... وہ زمین پر برف کی گہرائی کا اندازہ کرتے ہوئے اپنا راستہ منتخب کر رہی تھی۔

میں قدرتی مناظر کی دلکشی میں محو سیتا کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ ہر ... بکھری ہوئی برف کی چادر میں جابجا سرسبز درخت کھڑے ہوئے تھے ... کی تازگی اب چند ہی دنوں کی مہمان تھی، پھر وہ پت جھڑ کی زد میں آ جاتے ... ان کی برگ و بار سے محروم ننگی شاخیں برفباری کے مقابلے میں تنہا رہ ... میں اس ناہموار میدان اور ٹیلوں سے بہت دور دھندلے پس منظر میں ... پہاڑی کی وہ برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں جہاں پورے سال ٹھوس ... کی نہیں جمی رہتی ہیں اور ان ہی کے آس پاس کہیں دھول گری کا ... علاقہ تھا جہاں ہزاروں ٹن وزنی برفانی سلیں گلیشیرز کی صورت میں ... محسوس طریقے پر سرکتی رہتی تھیں۔

کچھ دور چلنے کے بعد وہ آہنی چمٹا میں نے لے لیا۔ سیتا میری ... ہمائی میں قدم بہ قدم بڑھی آ رہی تھی۔ اس کے سرخ و سفید رخساروں پر ... کی نیلی، مدھ بھری آنکھوں میں اور اس کے شہ زور شباب میں رعنائی ... زندگی کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ وہ میرے ساتھ ہنستی مسکراتی شوخیاں ... بکھیرتی چل رہی تھی کہ اچانک اس کے منہ سے ایک تحیر زدہ سی آواز نکلی اور ... میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔

میں نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہیں کسی چیز ... پر یوں جمی ہوئی تھیں کہ حیرت سے آنکھیں باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ سیتا کی ... مبہوت و ششدر نظروں کے تعاقب میں میں نے بھی اسی طرف دیکھا ... تو اپنی بصارت پر یقین نہ آیا اور جب اپنے اس ناقابلِ یقین مشاہدے پر ... سچائی کا شائبہ سا شبہ ہوا تو وہ وادی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ میری ... آنکھوں کے سامنے ہلکورے لینے لگی۔ زمین ہل رہی تھی یا وہ میرے حواس ... کی پراگندگی کا ردِ عمل تھا کہ میرے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ... ہونے لگا۔ میں نے آہنی چمٹے کو داہنے ہاتھ میں پوری قوت سے بھینچ لیا اور ... بائیں ہاتھ سے فوراً سیتا کے شانے کا سہارا لے لیا!

"یہ کیسے ہوگیا صفدر؟" آخر سیتا کے حلق سے پھنسی پھنسی تحیر زدہ سی آواز نکلی۔

"یہاں پارس موجود ہے، راہ میں کہیں پارس ضرور ہے!" میں خوشی سے بے قابو لہجے میں بولا۔ میرا دل سینے میں یک بیک اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کہ میں اس کی دھمک اپنی پسلیوں پر محسوس کر رہا تھا۔ میری حیرت سے اُبلی ہوئی نگاہیں اندرام سے حاصل کیے ہوئے وزنی آہنی چمٹے پر جمی ہوئی تھیں جو میں نے غیر ارادی طور پر پوری قوت سے اپنے داہنے ہاتھ میں دبایا ہوا تھا۔ سیاہ رنگ کے لمبے پھلوں والے اس چمٹے کا رنگ اب تبدیل ہو کر طلائی ہو چکا تھا۔

"پارس کے علاوہ اور کسی چیز میں یہ تاثیر نہیں کہ کالی دھات کو زرد کر سکے۔" سیتا متحیرانہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے چمٹے کو چھو کر دیکھنے لگی۔

پھر اس نے وہ چمٹا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اس عمل میں چمٹے کے دونوں پھل ٹکرائے اور اس سے جو آواز پیدا ہوئی اس میں آہنی جھنکار کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ یقینی طور پر کسی ٹھوس اور لوہے سے زیادہ وزنی دھات کے آپس میں ٹکرانے کی آواز تھی۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ معاملہ صرف رنگ کی تبدیلی کا نہیں بلکہ کسی محیر العقول واقعہ کی بنا پر آہنی دھات کی ماہیئت سونے میں بدل چکی ہے۔

ہم دونوں کو اتنا تو یقین تھا کہ جب تک چمٹا سیتا کے ہاتھ میں رہا، اس کا رنگ قائم تھا مگر میرے ہاتھ میں آنے کے بعد کسی وقت غیر محسوس طریقے پر یہ ساری تبدیلی عمل میں آگئی۔ راستے میں ہم دونوں ہی اس آہنی چمٹے کو چھڑی کے طور پر استعمال کرتے آئے تھے۔ وادی میں ہر طرف برف کے نرم نرم اور سفید گالوں کی کئی فٹ موٹی تہہ بکھری ہوئی تھی لہٰذا نادیدہ گڑھوں سے محفوظ راستے کے انتخاب کے لیے پہلے ہم چمٹے کے پھل برف میں گاڑ کر سطحِ زمین کا اندازہ لگاتے پھر اپنے قدم آگے بڑھاتے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ چند سو گز کے اس راستے پر، جو میری رہنمائی میں طے کیا گیا تھا، کہیں برف کی سطح سے نیچے زمین پر پارس موجود تھا جس کے لمس سے لوہا، سونا بن گیا تھا۔

جس گوہرِ مقصود کی تلاش میں ہم دونوں چونے کی خوفناک دلدلیں عبور کر کے دھول گری کے جان لیوا برف پوش علاقے میں جانے کا قصد کر کے ادھر آئے تھے، وہ حادثاتی طور پر ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تھا! اس وقت برف ہمارے لیے بیش بہا نعمت تھی۔ اسی کی وجہ سے ہمیں آہنی چمٹے کو چھڑی کے طور پر استعمال کرنا پڑا اور اب ہماری کمین گاہ سے اس مقام تک سارے راستے پر نرم برف میں گہرے سوراخ ان مخصوص مقامات کی نشاندہی کے لیے موجود تھے جہاں آہنی چمٹے کے پھل نرم برف سے اُتر کر ٹھوس زمین سے ٹکرائے تھے۔

اس وقت حیرت و مسرت کے باعث میرے دل کی جو کیفیت تھی، اسے بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ کراچی کی گلیوں میں ملنے والے کیمیاگر نے مجھے کیمیاگری کا وہ راز بتایا جس کی حسرت میں کتنے دیوانوں کا لہو چاٹ چکی تھی مگر لیاقت آباد میں، فردوس سینما کی تنگ و تاریک اور پُراسرار گلیوں میں رہنے والے جمال نے مجھے بتایا کہ بھاندرناس کے تاؤ کے بغیر کیمیا کی تیاری ناممکن ہے اور یہ بھاندرناس مجھے مشرقی پاکستان اور ہندوستان کی راہ سے نیپال لے آیا اور اب میں نیپال کے شہری علاقوں سے دُور تھا۔ بھاندرناس کی خاطر میں آدم خور قبائلیوں سے ٹکرایا، برفانی انسان سے میرا تصادم ہوا جس کا نام ہی مہذب دنیا میں ایک سنسنی بنا ہوا ہے اور پھر میں جیت گیا۔ بھاندرناس کی مقدس زمینی جڑ میرے قبضے میں آگئی مگر نیپال کا پُراسرار مہارشی اندرام اپنی جان کی بازی ہارتے ہارتے بھی مجھے اپنی اس بیش قیمت بوٹی کے ذخیرے سے محروم کر گیا اور اب اس کی ناجائز نواسی اور اپنی خوبرو بیوی سیتا کی رہنمائی میں، میں جنگل، پہاڑ، دریا، دلدلیں اور گلیشیر عبور کر کے پارس پتھر حاصل کرنے کا عزم کر چکا تھا مگر یہ کیسی خوش نصیبی تھی کہ وہ پتھر جس کی تلاش میں، میں جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ تھا، میرے اس پاس ایک محدود علاقے میں کہیں موجود تھا اور مجھے صرف اتنا کرنا تھا کہ برف ہٹا کر وہ پتھر زمین سے اٹھا لینا تھا..... یقیناً قدرت کو میری طویل محرومی اور بے بسی پر رحم آگیا تھا جو مجھے اپنی مُرادیں آسانی سے ملنے والی تھیں۔

ہم دونوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے عقب میں نرم برف میں پڑے ہوئے چمٹے کے گہرے نشان کے اردگرد سے برف کے ڈھیر ہٹانے شروع کیے۔ برف روئی کے گالوں کی طرح نرم تھی، پوری احتیاط کے باوجود چند ہی منٹ میں بھوری پتھریلی زمین ہمارے سامنے آگئی جس پر ننھے ننھے سنگریزوں کے علاوہ پتھر کے چند بڑے ٹکڑے بھی مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔

سیتا نے حیران اور پُرجوش مگر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "یہ کیسے پتہ چلے گا صفدر کہ ان میں پارس پتھر کون سا ہے؟"

"کیا تجھے اس کی پہچان نہیں ہے؟" میں نے ناامید بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے مایوسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اس کی کوئی خاص پہچان نہیں ہوتی۔ دھول گری کے ایک خاص علاقے میں ہر طرف بھورے، سرمئی اور سیاہ پتھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں رنگ رنگ کے پارس پتھر بھی ہیں اور کالی دھات کو ان سے مس کیے بغیر پارس پتھر کا پتہ چلانا ناممکن ہے!"

[illegible] لیے [illegible] پر موجود [illegible]
[illegible] جنیت [illegible] مردہ [illegible]
[illegible] کہیں بھی [illegible] نام و نشان نہ تھا۔ [illegible] تنگی میں موجود وہ انگوٹھی دیکھی جو روانہ ہونے [illegible] اندرام [illegible] یادگار کے طور پر سیتا کے حوالے کی تھی [illegible] والی وہ انگوٹھی چاندی [illegible] سفید دھات [illegible] پارس پتھر کی شناخت کے لیے بالکل [illegible] رہ گئی۔

اب [illegible] اسی وقت [illegible] سے ہمیں [illegible] اور [illegible] میں نے [illegible] سیتا سے کہا۔

پھر ہم دونوں برف [illegible] ہوئے آہنی چمٹے کے نشانات [illegible] ہوئے واپس چل دیے۔ کیا اتفاق تھا کہ [illegible] ہوئے ہم آہنی چمٹے [illegible] کوشش کر رہے تھے اور واپسی میں ٹھوس طلائی چمٹا ہمارا سہارا [illegible] برف کی گہرائی کا اندازہ کرتے ہم حتی الامکان تیز رفتاری [illegible] آگے بڑھ رہے تھے۔ مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے وقت کا صحیح اندازہ ممکن نہ تھا مگر مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ ابھی دوپہر میں کافی دیر [illegible] اور اگر ہم نے پھرتی سے کام لیا تو شام کا دھندلکا پھیلنے سے پہلے [illegible] نرم برف کی تہہ میں دبے قیمتی پارس پتھر کو تلاش کر لیں گے۔

ابھی ہم تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ اچانک مجھے اس [illegible] ریوالور کا خیال آیا جو میں ڈان اور ریتی کے سامان میں سے اٹھا لایا تھا۔ چلتے چلتے میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میں نے پھرتی سے ریوالور نکالا اور سیتا سے کہا۔ "اب بستی میں جانے کی ضرورت نہیں [illegible] وہ ہمارے پاس موجود ہے۔"

سیتا نے مجھ سے ریوالور لینا چاہا مگر میں نے اس کا چیمبر خالی کیے بغیر سیتا کو ریوالور چھونے نہ دیا۔ کہیں وہ شوق میں سیفٹی کیچ ہٹا کر ریوالور کا ٹریگر دبا دیتی تو کوئی بھی اندوہناک حادثہ رونما ہو سکتا تھا۔

اپنے کام میں تسلسل اور نظم قائم رکھنے کے لیے ہم ایک بار پھر اسی مقام پر واپس جا پہنچے جہاں لوہے کی ماہیئت سونے میں تبدیل ہونے کا انکشاف ہوا تھا۔ میں نے ریوالور کا وزنی دستہ ٹھوس پتھروں پر رگڑ [illegible] تاکہ اس پر چڑھے ہوئے سیاہ رنگ کے نیچے چھپا ہوا لوہا سامنے آجائے۔ پھر میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ باری باری ہر پتھر سے مس کیا۔ ہم دونوں کی پُرشوق اور تجسس آمیز نگاہیں ریوالور کے دستے پر جمی ہوئی تھیں لیکن وہ لوہا سونے میں تبدیل نہ ہوا۔

پھر ہم پچھلے نشان کی طرف متوجہ ہوئے، برف کے گالے ہٹائے اور ٹھوس پتھریلی زمین کا امتحان لیا گیا لیکن ہمارے لیے وہ ٹکڑا بھی بنجر ثابت ہوا۔

[illegible] سے کام لیتے ہوئے [illegible] ہوتے تھے [illegible] ریوالور [illegible] پڑ رہا تھا [illegible] سیتا کے ہاتھ میں رہا [illegible] ہوا تھا مگر [illegible] میرے ہاتھ میں آنے [illegible] وہ پارس پتھر سے مس ہوا [illegible] طے کیے ہوئے راستے میں پارس [illegible] تو ہم نے تلاش کا سلسلہ ترک نہ کیا بلکہ [illegible] کی طرف لوٹتے ہوئے ہر دوسرے مقام پر برف ہٹا کر پتھروں کو [illegible]

[illegible] سیتا نے صفدر [illegible] کی مسلسل ناکامی سے دل برداشتہ [illegible] سیتا ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

[illegible] چند ثانیوں تک [illegible] کے الفاظ پر غور کیا [illegible] درست ہے [illegible] عام آدمی کے لیے ہر لوہا [illegible] ہے مگر مخصوص مقاصد کی خاطر لوہے [illegible] مختلف تناسب میں [illegible] کی دوسری دھاتیں ملا کر [illegible] خصوصیت [illegible] جو خالص لوہے سے بدرجہا بہتر ہوتی ہیں [illegible] کے نتیجے میں کوئی نیا عنصر نہیں بنتا۔ کیمیائی اعتبار سے اس آمیزے [illegible] اور دوسری دھات کے سالمے جدا جدا حالت میں موجود ہوتے ہیں [illegible] دستہ خالص لوہے کا نہ بھی تھا تو اس میں [illegible] تھی اور اس اعتبار سے پارس پتھر سے [illegible] یا دھبے وغیرہ نمودار ہونے لازمی تھے۔

پارس کی تلاش کی یہ مہم ابھی زور و شور سے جاری تھی [illegible] ہم اپنی پتھریلی پناہ گاہ سے خاصی دُور نکل آئے [illegible] لگا۔ ساتھ ہی کچھ بھیگی بھیگی سُست رفتار ہوائیں بھی چلنے [illegible] سر اٹھایا تو پوری وادی میں گہرے سرمئی بادل اُترتے ہوئے دکھے اور آثار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی بھی لمحے برف باری کی ابتدا ہو سکتی ہے۔

"یہاں تلاش بے سود ہے سیتا۔" میں نے [illegible] سانس لیکر کہا۔ "مجھے یاد ہے کہ اس مقام تک چمٹا سونے [illegible] نہیں ہوا تھا۔"

سیتا نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا اور ہم مایوسی کے عالم میں اپنی پناہ گاہ کی طرف چل دیے۔ ابھی ہم راستے ہی [illegible] بالکل بند ہوگئی اور یک بیک تیز برف باری نے [illegible] اچانک برفانی طوفان سے گھبرا گیا۔ ابھی تک [illegible] بھی نظر نہ آیا تھا۔ ایسی صورت میں راہ بھٹک کر کالی گا [illegible]

میں جانکلنے کا اندیشہ موجود تھا مگر سیتا کے لیے برفانی طوفانوں میں اپنی راہ تلاش کرنا کوئی نیا کام نہ تھا، ہمالیہ کی وادیوں میں اس کی ساری عمر ایسے ہی بلکہ اس سے شدید طوفانوں سے کھیلتے گزری تھی۔ وہ نہایت مہارت کے ساتھ چمٹے کی مدد سے ٹھوس زمین تلاش کرتی پناہ گاہ کی طرف میری رہنمائی کر رہی تھی۔

طبیب کے علاج کے باعث میرے زخم تیزی سے بھر چلے تھے مگر ابھی جسمانی طور پر میں ایسی کسی مشقت کے قابل نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں تکان کے ساتھ میرے بدن کے زخم خوردہ حصوں میں درد کی ناقابلِ بیان ٹیسیں سی اٹھنے لگیں مگر میں کسی نہ کسی طرح اس تیز رفتار بنتِ جبل کا ساتھ دیتا رہا۔

خدا خدا کر کے ہم پتھروں سے بنی ہوئی اس بھونڈی عمارت میں جا پہنچے جو کالی گاپ کے سردار نے ہمیں دے دی تھی۔ اتنی دیر میں برف کی سطح کئی انچ بلند ہو چکی تھی اور میرا ذہن اس اچانک برفباری سے اضمحلال اور مایوسی کا شکار ہو گیا تھا۔ برفباری اگر اسی رفتار سے چند گھنٹوں تک جاری رہتی تو نرم برف پڑنے ہوئے وہ سارے نشانات چھپ جاتے جن کے سہارے ہم مقامی قبائلیوں کی مدد سے پارس پتھر کی تلاش کا کام ازسرِ نو شروع کر سکتے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر سیتا نے طلائی چمٹا لاپروائی سے ایک طرف پھینک دیا اور اپنے لباس وغیرہ پر سے برف کے ذرات جھاڑنے لگی۔ اس لڑکی کی عمر انسانوں اور ان کی نئی تہذیب سے دور اپنی ذات کے خول میں گزری تھی، اسے کوئی اندازہ نہ تھا کہ لوہے اور سونے کی قیمت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک تو یہ بس سیاہ دھات کے زرد ہونے کا عمل تھا۔

اس روز برفباری پچھلے دن سے بھی شدید تھی۔ کب شام آئی اور سورج ڈھلا، یہ پتہ ہی نہیں چلا، سیاہ گھٹائیں پہاڑوں سے گھری اس وادی میں یوں ٹھہری ہوئی تھیں جیسے اپنا سارا بار اسی وادی میں برسا کر ٹلیں گی۔

سیتا کی محنت پھر بستر پر اس کے حرارت آگیں قرب کی وجہ سے میرے جسم پر سرخ چیونٹوں کے ڈالے ہوئے زخموں کی سوزش خاصی حد تک مندمل ہو گئی اور کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز دن چڑھے اس طویل برفباری کا زور ٹوٹا اور وادی میں ہر طرف سورج کی حرارت سے محروم پھیکی پھیکی روشنی پھیل گئی۔ اس عمارت کے صحن میں برف کا انبار بلا مبالغہ کئی فٹ بلند ہو چکا تھا۔ مجھے تو شبہ تھا کہ اب ہم اس برف میں سے گزر بھی سکیں گے کیونکہ نرم برف کے گالوں کا یہ انبار مجموعی طور پر قدِ آدم سے کچھ زیادہ ہی ہو چکا تھا۔

مگر پھر تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ سورج کی کرنوں کی تپش بھی ان ہواؤں کی قیامت خیز خنکی کو کم نہ کر سکی۔ ہڈیوں میں اتر جانے والی یخ بستہ ہوائیں برف کو پگھلاتی آوارہ روحوں کی طرح شور مچا رہی تھیں جنگل کی جانب سے درختوں کے جھنڈوں میں سے گزرتی ہوئی ہواؤں کا سیٹیوں جیسا تیز شور عجیب ویرانی اور دل گرفتگی کا سماں باندھ رہا تھا۔ یہی ہوائیں جب ہمارے اس مکان کے چوبی شہتیروں کے درمیانی روزنوں سے گزرتیں تو میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی بری طرح چونک پڑتا۔ یہ آوازیں اچانک پوری شدت سے ابھرتیں اور یک بیک معدوم ہو جاتیں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا جیسے ہمارے قرب و جوار میں کوئی موذی جنگلی بلا بھیانک چیخ مار کر اچانک اپنے بھٹ میں جا چھپی ہو۔

اس ہوا کے ساتھ ہی نرم نرم برفانی گالے تیزی سے پگھلنے لگے اور ہر طرف پانی کی لکیریں بہتی نظر آنے لگیں، اسی کے ساتھ برفانی انبار کی سطح غیر محسوس رفتار سے نیچے جانے لگی۔ میں بستر پر اونی کمبلوں میں چھپا یہ سب دیکھتا رہا۔ برفباری جو نشیبی علاقوں میں رہنے والے شہری باشندوں کے لیے ایک تفریح اور بہلاوے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی، قریب سے کیسی بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔ اگر ہوا نہ چلے تو سارے مقامی باشندے اپنے مکانوں میں محصور بلکہ مدفون ہو کر رہ جائیں اور ہوا چلے تو ہڈیوں تک میں اتر جانے والی سردی کے عذاب سے بچنا محال ہو جائے۔

وہ پورا دن انتظار میں گزر گیا اور بستی کی طرف سے کوئی ادھر نہ آیا۔ میں جانتا تھا کہ ان طوفانی ہواؤں اور بہتے ہوئے یخ بستہ دھاروں میں باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہ ہوائیں غیر محسوس طریقے پر انسانی نظام پر اثر کرتی ہیں اور جب اچانک اعضائے رئیسہ ان کا شکار ہوتے ہیں تو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے مگر یہ ہواؤں کا شکار ہونے والے کی زندگی کے آخری سانس ہوتے ہیں اور اس وقت مرض کا تدارک ناممکن ہوتا ہے۔

موسم تیسرے روز بھی بگڑا ہوا تھا مگر برف کے بیشتر انبار پگھل کر بہہ چکے تھے۔ مجھے اس روز بستی سے کسی خبر کی امید تھی کیونکہ اس دن ڈان اور ریٹی کو چوبی تابوتوں میں بند کر کے سرخ چیونٹوں کے حوالے کرنے کا پروگرام طے تھا۔

دوپہر کے قریب جب سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی سورج کی کرنوں میں کچھ جان پڑی تو بستی سے ایک سہ نفری جماعت آئی۔ وہ ہم دونوں کے لیے چیتے کی کھالوں کے بنے ہوئے دو لباس لائے تھے تاکہ ہم سردی سے محفوظ رہتے ہوئے بستی تک جا سکیں۔

میں اس مکان میں پڑے پڑے اکتا چکا تھا۔ بستی میں پہنچنے کے بعد میں سردار سے پارس پتھر کی تلاش کے سلسلے میں کچھ مدد حاصل

[کرنا چاہتا] تھا لہٰذا ہم دونوں فوراً ہی تیار ہو کر ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ [چیتے کی] کھال سے بنے ہوئے لباس ایسے تھے کہ ان میں پورا جسم چھپ [جاتا] تھا۔ سر اور چہرے کو ہوا سے بچانے کے لیے اسی کھال کی ٹوپیاں [تھیں] جنہیں اوڑھ کر صرف آنکھیں اور ناک کا نچلا حصہ کھلا رہ جاتا تھا۔

[راستے] میں ہر طرف برف اور یخ بستہ پانی کی نالیاں ہی [بہتی] نظر آ رہی تھیں۔ انہیں عبور کرتے ہم تھوڑی ہی دیر میں بستی کے [قریب] جا پہنچے۔ وہاں مقامی باشندے گرم ملبوسات میں لپٹے اپنے [جھو]نپڑوں کے ان بوسیدہ حصوں کی مرمت کر رہے تھے جنہیں شدید [برف]باری سے نقصان پہنچا تھا۔ اس کام میں وہ سب ایک دوسرے سے تعاون کر رہے تھے مگر وہاں دور دور تک کسی عورت کا سایہ بھی نظر نہ [آ]تا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بستی صنفِ نازک سے خالی ہو۔

کھلے میدان سے جھونپڑوں کے درمیان آجانے پر سیتا نے اپنے سر اور چہرے پر منڈھی ہوئی ایال دار چرمی ٹوپی الٹ دی اور [انہوں] نے دیکھا کہ سورج کی روشنی میں ایک عورت کو یوں کھلے بندوں گھومتے دیکھ کر تقریباً تمام مقامیوں کی آنکھیں حیرت سے پیشانیوں پر جا چڑھیں اور وہ سیتا کے بارے میں دبی دبی آوازوں میں تبصرے کرنے لگے مگر یہ امر غنیمت تھا کہ ہم سے کسی نے تعرض نہ کیا۔ غالباً پوری بستی ہی کو علم ہو چکا تھا کہ وہاں دو اجنبی آئے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے نینی کی آبرو کے لٹیرے اور قاتل بہت جلد کیفرِ کردار کو پہنچنے والے تھے۔

ہمارے سفر کا اختتام پتھروں کے بنے ہوئے ایک بلند اور حویلی نما مکان پر ہوا۔ یہاں بستی کا بوڑھا طبیب ہمارا منتظر تھا۔ اس نے بڑی محبت سے ہمارا استقبال کیا۔ پھر ہم دونوں کو ساتھ لیکر حویلی کے عظیم الشان پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا۔

حویلی کے کچے صحن میں مضبوط شہتیر گاڑ کر ایک عارضی چھپر بنایا گیا تھا جس کے نیچے کچھ مقامی لوگ لکڑی کے دو تابوتوں کا آخری جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ قریب ہی ایک تپائی پر بہت بڑا نقارہ رکھا ہوا تھا اور چھپر سے ذرا دور حویلی کی اصل عمارت نظر آ رہی تھی۔

طبیب کو اس قبیلے میں خاص رتبہ حاصل تھا۔ وہ صرف معالج ہی نہ تھا بلکہ اپنے سردار کا معتمد، مشیر اور رازداں بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے دونوں تابوتوں کا جائزہ لیا، کاریگروں سے ان کے بارے میں کچھ سوالات کیے پھر چوبدار کو نقارہ پیٹنے کا اشارہ کیا۔

نقارے پر چوٹ پڑی اور فضا ایک بھیانک آواز سے گونج اٹھی جس پر سیتا غیر ارادی طور پر اچھل پڑی۔

سیتا کے چونکنے پر طبیب مسکرا اٹھا "یہ ہمارے قبیلے کا خاص نقارہ ہے جسے جنگ و جدل یا خوفناک سزاؤں کے موقعے پر بجایا جاتا ہے۔ اس کی آواز میں عجیب دہشت پائی جاتی ہے ۔۔۔ [اس] سے ہم دو مواقع پر اپنے دشمنوں کو سراسیمہ کر چکے ہیں۔"

میں اس موضوع پر طبیب سے کچھ دریافت کرنے ہی والا تھا کہ اچانک حویلی کی عمارت کی جانب سے ایک شور ابھرا ساتھ ہی کچھ لوگوں کی بھیڑ بھی عمارت سے نکلتی نظر آئی۔

آنے والوں میں بستی کا دراز قامت اور مضبوط جسم والا ادھیڑ عمر سردار پیش پیش تھا۔ اس نے کسی دھاری دار چیتے کی کھال بڑے لاپرایانہ انداز میں اپنے جسم کے گرد یوں لپیٹ رکھی تھی کہ اس کا بایاں شانہ اور بازو برہنہ تھا۔ داہنے شانے پر اس کا پالتو شکرہ نہایت سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس شکرے کی نیلگوں پشت تھی۔ نچلے حصے کا رنگ مٹیالا، خوفناک چونچ کے قریب دونوں طرف سیاہ دھبے نمایاں تھے۔ گلے کے علاوہ سارے بدن پر شکستہ سیاہ لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ ٹانگوں پر پروں کا لمبا لمبا نرم رواں لٹک رہا تھا۔ وہ گرد و پیش سے بے نیاز بے حد آسودہ اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

سردار کے پیچھے ڈان برین اور ریٹی دسن تماشائے عبرت بنے آ رہے تھے۔ ان کے الجھے ہوئے خشک بال، بڑھی ہوئی داڑھیاں، گندے اور پھٹے ہوئے کپڑے ان کے چہروں کی دہشت کو خون آلود بنا رہے تھے۔ ان مصائب کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ شاید پچھلی راتیں بے خوابی کے عالم میں گزارتے رہے تھے کیونکہ ان کی آنکھیں سرخ اور ورم آلود ہو رہی تھیں۔ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور بہت سے مسلح افراد کی ایک ٹولی انہیں ہانکتی ہوئی چھپر کی طرف لا رہی تھی۔ سب سے آخر میں ایک شخص اپنے سر پر ایک وزنی ٹوکرا لیے چلا آ رہا تھا۔

یہ جلوس چھپر کے نیچے آ کر رک گیا۔ سردار نے قریب آ کر بڑی گرمجوشی سے میرا شانہ دبایا۔ سردار میری مزاج پرسی میں مصروف تھا کہ اچانک اس کا شکرہ کریہہ اور غصیلی آواز میں چیخا۔

سردار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بائیں ہاتھ سے ہولے ہولے اس کی پشت سہلانے لگا۔ سیتا سہم کر میرے شانے سے آ لگی۔

"شاید اس لڑکی نے شکرے کو چھیڑا تھا" سردار مجھ سے کہہ رہا تھا "اسے بتاؤ کہ یہ شکرہ بہت خونخوار ہے اور پل بھر میں دشمن کی آنکھیں نوچ لیتا ہے۔ اس سے چھیڑ چھاڑ میں کہیں اسے زک نہ اٹھانی پڑے!"

"تو نے اسے چھیڑا تھا؟" میں نے پلٹ کر سیتا سے پوچھا۔

"میں نے تو بس ہاتھ ہلایا تھا" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

”اور یہ مردود نوری آواز سے چیخ پڑا۔“
... سے ناراض ہوا اس کی
آنکھیں نکال لیتا ہے۔“

”صورت ہی سے خونی لگتا ہے۔“ وہ پھریری لیکر بولی۔
اسی وقت ڈان برین خود پر قابو پاتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں سردار سے مخاطب تھا۔ ”کیا تم یہ طے کر چکے ہو کہ ہمیں سزائے موت دی جائے ہے؟“

”ہاں!“ سردار کا لہجہ اٹل تھا۔ ”سرخ چیونٹے تمہارا مقدر قرار پا چکے ہیں۔“

”مجھے تم سے اتنی بے رحمی کی توقع نہیں ہے سردار تلنگا، میں مرنے کو تیار ہوں مگر خدا کے لیے کوئی آسان موت تجویز کرو۔“ ڈان کی آواز کانپ رہی تھی۔

”نینی کے ساتھ تم نے کون سی رعایت کی تھی اجنبی مہمانو! جو میں تمہاری پسند کا لحاظ کروں!“ سردار تلنگا کی آواز میں قہر اور نفرت کے کوندے لپک رہے تھے۔ ”اور موت کی دوسری صورت بھی کم بھیانک نہ ہوگی، بولو کسی اور موت کے لیے تیار ہو!“

”وہ کیا ہے؟“ ڈان برین کا لہجہ امید سے بھرپور تھا۔
”میرا شکرہ تمہاری بوٹیاں نوچے گا۔“ سردار کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔ ”میں تمہیں یہاں سے بھاگنے کے لیے ایک دن کی مہلت دیتا ہوں، پھر میرا شکرہ آزاد فضاؤں میں بلند ہوگا۔ میں نے اسے بُو کے سہارے پرواز کے لیے سدھایا ہے۔ اس مہلت کے بعد تم جہاں اور جس حال میں ہوگے، یہ تمہارے ٹکڑے اڑا دے گا۔“

”نہیں نہیں!“ ڈان ہذیانی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے لڑکھڑا گیا پھر اچانک اس پر پاگل پن کا دورہ سا پڑ گیا اور وہ اول فول بکنے لگا۔
سردار کا معالج خاص ٹوکرے میں لائی ہوئی خاص خوشبویات چوبی تابوتوں میں بسا رہا تھا۔ ان کے سہارے سرخ چیونٹوں کو فوراً متوجہ کیا جا سکتا تھا۔ پھر ڈان اور ربی کو زرد رنگ کے مشروب کے پیالے دیے گئے۔ وہ دونوں شاید کافی پیاسے تھے، فوراً ہی سارا سیال پی گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بے سدھ ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

ان دونوں کے ہاتھ کھول دیے گئے اور ان کے ساکت جسموں کو تنگ تابوتوں میں ڈال دیا گیا۔ اس سے پیشتر ان کے بدن سے سارے کپڑے الگ کر دیے گئے تھے۔ پھر ان کے جسموں پر بھی وہی خوشبویات مل گئیں اور سردار کے اشارے پر تابوتوں کے ڈھکنے مضبوطی سے جڑ دیے گئے۔

میرے استفسار پر سردار نے بتایا کہ دونوں مجرموں پر سیال کا اثر محض وقتی ہے ... انھیں محض اس لیے بے ہوش کیا گیا تھا کہ تابوتوں ... بند کیا جا سکے۔

ایک شخص نے نقارہ گلے میں ڈالا ... دھیمے دھیمے چوٹ لگاتا حویلی کے احاطے سے نکا ... راہ پر ہولیا۔ اس کے پیچھے چند مضبوط مقامیوں نے دونوں تابوت ... کندھوں پر اٹھا لیے ... ہم دونوں اور اپنے معالج کے ہمراہ آخر ... تھا۔
شاید نقارے کی پہلی چوٹ کسی خاص اعلان کی حامل تھی ... باہر نکلے تو پورا میدان مقامی مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں ... جوش و خروش بلکہ اشتعال پایا جاتا تھا۔
باہر نکلتے ہی نقارے کی آواز یک لخت تیز ہو گئی۔ سردار ... آگے بڑھ کر جلوس کی رہنمائی کی تیاری کی۔ میں سیتا سمیت اس ... پیچھے تھا۔ پھر نقارہ بردار شخص جس کے بعد دونوں چوبی تابوت تھے۔ میں بستی کے مشتعل اور مغموم مردوں کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کی نیت سے جمع تھے۔

اس دوران میں میرے ذہن میں بار بار پارس پتھر کا خیال سر ابھارتا رہا۔ میں پہلی فرصت میں سردار تلنگا کے معالج خاص سے ... انوکھے تجربے کے بارے میں گفتگو کرنی چاہتا تھا۔ میں پارس پتھر کی طرف سے ابھی تک پُرامید تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر اب بھی مقامیوں کی مدد سے میں اس پورے علاقے کا جائزہ لوں تو کہیں نہ کہیں پارس پتھر دریافت ہو ہی جائے گا مگر اس وقت یہ بات چھیڑنے کا موقع نہ تھا۔ قاتلوں کی آخری رسوم کے سلسلے میں بستی والوں کے دلوں پر معصوم و مظلوم لڑکی نینی کے سوگ کے اثرات گہرے ہو گئے تھے۔
نقارے کی تیز اور وحشیانہ گونج پر یہ جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک چوبی تابوتوں میں سے ربی اور ڈان کی دہشت زدہ غصیلی چیخیں ابھرنے لگیں۔ شاید وہ دونوں ہوش میں آ چکے تھے اور اب خود کو بے دست و پا محسوس کرتے ہوئے خوفزدہ ہو گئے تھے۔

ان کی چیخوں کی کسی نے پروا نہ کی۔ کبھی وہ غصے سے ... بکنے لگتے اور کبھی رو رو کر فریاد کرتے مگر پورے جلوس نے ان کی باتوں کے جواب میں چپ سادھی ہوئی تھی۔ نقارے کے شور کے سوا ... کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔
رفتہ رفتہ جلوس کی رفتار تیز ہو گئی۔ بستی سے ... بعد سب لوگ دائرے کی صورت میں تابوتوں کے گرد بیٹھ ... قبائلی نے ایک لحظے کے لیے ہاتھ روک کر بدن ہوئی دھن ...

چوٹ لگائی اور سارے مقامی بلند آواز میں کوئی نامعلوم گر پُر درد گیت گاتے تابوتوں کے گرد ناچتے آگے بڑھنے لگے۔ گیت میں بار بار نینی کا نام آ رہا تھا جس کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید اپنے عقیدے کے مطابق نینی کی روح کی مغفرت کے لیے دعاگو ہیں۔
تھوڑی دیر بعد کالی گاپ کے مضافاتی جنگل کے آثار نظر آنے لگے۔ وہاں داخل ہونے کے بعد تابوتوں کے گرد پھیلے ہوئے مقامیوں کو مجبوراً قطار کی صورت میں سمٹنا پڑا کیونکہ وہاں راستہ بہت تنگ تھا۔ چند منحنی سی پگڈنڈیوں سے گزرنے کے بعد جلوس یک بیک جنگل کے ایسے حصے میں جا پہنچا جہاں ہر سو گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ زمین پر سورج کی براہ راست روشنی کا گزر کہیں نظر نہ آتا تھا۔ ہاں پتوں اور شاخوں سے منعکس ہو کر زمین پر پڑنے والی روشنی کی وجہ سے آنکھیں قرب و جوار کا سرسری سا جائزہ لے سکتی تھیں۔
سردار تلنگا کے داہنے شانے پر بیٹھا ہوا خوفناک شکرہ سارے راستہ خاموش اور پُرسکون رہا تھا مگر نقارے کے شور سے سارے جنگلی پرندے خوفزدہ آوازیں نکالتے اِدھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔ قرب و جوار سے جنگلی جانوروں کی دہشت زدہ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مگر اس جلوس کی جانب کسی درندے نے رُخ نہ کیا۔
اونچے اونچے درختوں سے گھرے ایک کشادہ خطے میں پہنچ کر سردار رُک گیا۔ یہاں زمین بالکل خشک پڑی ہوئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ برف یہاں زمین تک پہنچ ہی نہ پائی تھی۔ سردار کے اشارے پر دونوں تابوت اُتار کر ایک درخت کے دیوہیکل تنے کے قریب رکھ دیے گئے۔
”تلنگا! خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔“ اچانک ایک تابوت سے ڈان برین کی کپکپاتی ہوئی آواز ابھری۔
”ظالموں کے ساتھ رحم کرنا سب سے بڑی بے رحمی ہے!“ تلنگا نے جواب دیا۔
”تم سب وحشی اور درندے ہو۔“ ڈان حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”تم پر بہت جلد مسیح کا عذاب نازل ہوگا اور تم ان ہی پہاڑوں میں پیس کر رکھ دیے جاؤ گے۔“
سردار تلنگا نے اس زانی اور قاتل کی ہرزہ سرائی پر کوئی توجہ نہ دی۔ نقارہ کی آواز رک چکی تھی اور سب لوگ نیم دائرے کی صورت میں ان تابوتوں کے گرد پھیل چکے تھے۔ پھر اچانک میں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔ چوبی تابوتوں میں بسائی گئی تیز خوشبو خونی چیونٹوں کو اپنی طرف متوجہ کر چکی تھی۔ جنگل کے اس حصے میں پھیلی ہوئی ملگجی روشنی میں قریبی درختوں کے تنوں میں بنے ہوئے سوراخوں میں سے بے شمار بڑے بڑے سرخ چیونٹے نکل پڑے تھے۔ وہ باہر آ کر لحظہ بھر کے لیے شاید اپنی مانوس بو کے مخرج کا اندازہ لگاتے پھر تابوتوں کی طرف چل پڑتے۔!

اور جب ان کی پہلی یلغار تابوتوں میں چھوڑے ہوئے سوراخوں میں سے اندر گھسی تو سردار تلنگا نے بے اختیار دعائیہ انداز میں اپنے ہاتھ بلند کیے اور زیرلب کچھ بڑبڑانے لگا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں نے آنکھوں سے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم بھی اس دعا میں شریک ہو گئے۔ مجھے چونکہ اس دعا کا مقصد اور مفہوم معلوم نہ تھا لہٰذا میں نے خدا کے حضور گڑگڑا کر اپنے مشن کی کامیابی اور زندہ سلامت واپسی کی دعا مانگنی شروع کر دی۔ میرے نزدیک یہ مسئلہ نینی کی ہلاکت یا ڈان اور ربی کی سزایابی سے زیادہ اہم تھا۔
ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے درختوں سے بے شمار چیونٹے ابل پڑے اور ہر سمت سے سرخ حشرات الارض کی لکیریں نمودار ہو کر تابوتوں میں روپوش ہونے لگیں۔ اپنے جسموں پر چیونٹوں کی سرسراہٹ محسوس کر کے وہ دونوں ذبح ہوتے ہوئے جانوروں کی طرح تیز آوازوں میں چیخنے لگے۔
طویل اور عبرتناک سزا کا آغاز ہو چکا تھا۔ سردار اور دیگر لوگوں نے دعا ختم کی تو مجرموں کو وہیں سسکتا بلکتا چھوڑ کر یہ کارواں خاموشی سے واپس ہو لیا۔
”اس سرزمین پر جب تک انصاف کی حکمرانی ہے ظلم کبھی نہیں پنپ سکتا۔“ کچھ دیر کی دلگیر خاموشی کے بعد سردار تلنگا نے مجھ سے کہا۔
”میں تم لوگوں کے کردار سے بہت متاثر ہوں سردار!“ میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
”میں نے تم دونوں کے اعزاز میں بستی میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا ہے اور وہیں تم کو ایک ایسے انعام سے نوازا جائے گا جو بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوا ہے۔!“
”میں تاحیات تمہارا احسان نہ بھول سکوں گا سردار!“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارا انعام میرے لیے باعث عزت ہے مگر میں اس کے علاوہ تم سے کچھ اور بھی چاہوں گا۔“
”کچھ اور؟“ سردار نے حیرت سے دہرایا۔ شاید میری یہ بے باکی اور جرأت اسے زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔
”ہاں سردار... شاید میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ دھولاگری جاتے ہوئے مقدر کی ستم ظریفی کا شکار ہو گیا تھا۔“
”ہاں ہاں... مجھے یاد ہے۔“ سردار میرا مدعا جاننے کے لیے بے چین تھا۔
”دھولاگری کے علاقے میں پارس پتھر کثرت سے ملتا ہے، مجھے اسی کی تلاش تھی۔“
”اوہ!“ سردار یک بیک مضطرب ہو گیا۔ ”وہ پتھر جس کے لمس سے کالی دھات زرد ہو جاتی ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ زرد دھات کس قدر قیمتی ہوتی ہے؟“
”میں یہ سب جانتا ہوں سردار اور یہی واقفیت مجھے بھرے پرے شہروں سے ان ہولناک ویرانوں میں لے آئی ہے مگر وہ دن بہ دن یک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میری عقل دنگ رہ گئی ہے۔“

"کیسا پتھر؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے آہنی چمٹے کے سونے میں تبدیل ہونے کی کہانی سنا دی۔ سردار خاموش رہا مگر فرطِ جوش سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"یعنی تو کہتا ہے کہ میری اس بستی میں پارس پتھر موجود ہے!" وہ میرے خاموش ہونے پر جوشیلی آواز میں بولا۔

"ہاں سردار۔ میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔"

"میں اس کی تلاش میں ضرور تیری مدد کروں گا۔" وہ اضطراری انداز میں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "میرے دل میں کالی گاپ کی ترقی کے بڑے ارمان مچلتے ہیں مگر زعفران قیمتی ضرور ہے لیکن یہاں کا موسم بہت خراب ہے۔ کبھی پوری فصل ہمارے ہاتھ نہیں آ سکی۔ پھر بھی اس کے عوض بھٹ گرہ کے تاجروں سے اتنا سامان لے آتے ہیں کہ پورا سال کسی نہ کسی طرح گزر جاتا ہے۔ اگر یہاں وہ قیمتی پتھر واقعی موجود ہے تو میں یہاں کا چپہ چپہ چھان ماروں گا۔ مگر اس پتھر کی دریافت پر میرا بھی حق ہوگا۔" وہ اس معاملے میں بہت زیادہ پُرجوش اور جذباتی ہو گیا تھا۔

پارس پتھر کا یہ نیا شریک میرے ارمانوں پر اوس ثابت ہوا اور میں نے نیم دلی سے کہا۔ "سردار! مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔!"

"پہلا پتھر تیرا ہوگا — اس کے بعد میرا اور میرے ساتھیوں کا حق ہوگا۔"

سردار نے یہ کہا تو میری جان میں جان آئی۔

"برف باری شروع ہونے سے پہلے ہی تلاش کی مہم کی ابتدا ہو جائے تو بہتر ہوگا۔" میں نے دبے لفظوں میں تجویز پیش کی۔

"آج کی رات تیرے اعزاز میں جشن کی رات ہے!" سردار میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "پتھریلے معبد میں دعوت کی تیاریاں مکمل ہیں، البتہ کل سویرے ہی ہم نئے کام کی ابتدا کر دیں گے۔!"

میں نے سیتا کو بھی اس تمام گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ اسے سردار کی پارس پتھر سے دلچسپی پر خاصی حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ سردار کو... دھول گری میں پارس پتھر کی موجودگی کا علم ہوگا۔"

پھر موقع پا کر میں نے یہی سوال سردار سے دہرا دیا۔ "کیا ان اطراف میں کسی کو علم نہیں کہ دھول گری کے علاقے میں پارس پتھر ملتا ہے۔؟"

سردار نے پورے یقین سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "ہم لوگ بس دھول گری کا نام ہی نام سنتے آئے ہیں۔ ادھر جانے والا ہر راستہ انتہائی خطرناک اور ناقابلِ عبور ہے اور آج تک کوئی ادھر کا رُخ کرنے کی ہمت نہ کر سکا، کوئی نہیں جانتا کہ دھول گری میں کیا ہے۔؟"

"بڑی عجیب بات ہے!"

"لیکن تم یہ بتاؤ کہ دھول گری کیسے پہنچ گئے جبکہ یہ سارا علاقہ تمہارے لئے اجنبی ہے؟" سردار نے کافی دیر کے بعد مسئلہ کے اس پہلو پر توجہ دی۔ پارس پتھر میں سردار تلنگا کی بڑھتی ہوئی دلچسپی مجھے کوئی نیک شگون نظر نہیں آ رہی تھی لہٰذا میں نے اس سوال کا جواب قدرے سوچ کر دیا۔ "بس یہ تو لگی کی بات ہے۔ اگر ہم دونوں حالات کا شکار ہو کر کالی گاپ میں نہ آ پھنسے ہوتے تو اب تک وہ مہلک راستے عبور کر چکے ہوتے یا وہیں کسی گرم دلدل میں دھنس کر اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوتے!"

اس موضوع پر گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔ سردار تلنگا کسی گہری فکر میں کھویا ہوا نظر آ رہا تھا۔

واپسی اسی وسیع پتھریلی حویلی پر ہوئی جہاں ڈاکٹر ہیری اور بینی ولسن کو تابوتوں میں بند کیا گیا تھا لیکن اس وقت عمارت کا حلیہ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ احاطہ کا میدان اتنی دیر میں صاف کیا جا چکا تھا۔ رنگین مٹی سے حویلی نما عمارت کے پھاٹک تک راہداری بنا دی گئی تھی۔ میدان میں دونوں طرف ہر عمر کے بچے جنگلی پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لئے موجود تھے۔ جونہی ہم لوگ حویلی یا اس معبد کے احاطہ میں داخل ہوئے، سارے بچوں نے ہم آواز ہو کر ایک دلکش استقبالیہ نغمہ گانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ ٹوکریوں سے جنگلی پھول نکال کر ہمارے آگے راستے پر پھیلانے لگے۔

معبد کی مضبوط اور سنگلاخ عمارت کے دیوہیکل دروازے پر سفید لبادوں میں ملبوس تین افراد موجود تھے۔ ان میں ایک شخص بہت زیادہ عمر رسیدہ اور باریش تھا۔ اس کے سر، داڑھی اور بھنوؤں کے سارے بال برف کی طرح سفید تھے، جنہیں سیاہی نام کو بھی نہ تھی مگر اس کے قویٰ اس عمر میں بھی خاصے مضبوط تھے۔ وہ کسی سہارے کے بغیر اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں پتھر کی چند مالائیں... بھی جھول رہی تھیں۔!

اس کاہن نے پُروقار انداز میں پہلے سردار کی پیشانی پر بوسہ دیا، پھر میری پیشانی چومی، اور ہمیں عمارت میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ سیتا یوں نظر انداز کئے جانے پر برہم سی ہو گئی تھی اور گستاخ انداز میں اکڑ اکڑ کر چل رہی تھی جیسے اس طرح وہاں اپنی موجودگی منوانا چاہتی ہو۔!

"تمہاری بیوی نے مجرموں کی نشان دہی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا،" سردار تلنگا کا معالج تونل مجھ سے سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اور وہ بہت بڑے اعزاز کی مستحق ہے۔ مگر ہمارے قبیلے میں مرد غیر عورتوں سے کبھی مخاطب نہیں ہوتے۔!"

اونچی ڈھلان دار چھت والے وسیع کمرے میں ہر طرف دیوار گیر مشعلیں روشن تھیں۔ اور آخری سرے پر ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ ادھر جاتے ہوئے مجھے سیتا کو سمجھانے کا موقع مل گیا مگر میری وضاحت پر وہ اور زیادہ چراغ پا ہو گئی۔ "کیا یہ لوگ عورت کو حقیر مخلوق سمجھتے ہیں۔ آخر میرے لئے ان میں اور کوم خوروں میں کیا فرق ہے؟"

"ذرا ٹھنڈے دماغ سے کام لے، ممکن ہے یہ لوگ جلد ہی اس کی تلافی کر دیں!" میں نے سیتا کا ہاتھ دبا کر قدرے سخت لہجے میں کہا، اور وہ محض بُرا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

خوشبوؤں سے مہکتے اس وسیع کمرے میں مرصع تخت پر کاہن اور سردار کے ساتھ مجھے اور سیتا کو بٹھا لیا گیا۔ تونل بھی وہیں آ بیٹھا۔ باقی لوگ نظم و ضبط کے ساتھ ہال کے فرش پر بیٹھتے چلے گئے۔ بیٹھنے کے بعد ایک عقبی دروازے سے ... بڑے بڑے تھال اٹھائے اندر داخل ہوئے اور وہ ہال بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہک اٹھا۔

جب گوشت کے تھال ہر جگہ پہنچا دیئے گئے تو سردار کے اشارے پر کھانے کی ابتدا ہوئی۔ گوشت کا ذائقہ محسوس کرتے ہی میری اشتہا بھڑک اٹھی۔ میں نے اتنا لذیذ گوشت زندگی میں کبھی نہ کھایا تھا!

کھانے کے بعد لوگ سرک کر دیواروں سے جا لگے اور تین رقاص درمیان میں آ گئے۔ انھوں نے فحش حرکات سے عاری چند مقامی رقص پیش کئے جس کے بعد سردار حاضرین سے خطاب کرنے اٹھا۔

سردار تلنگا نے بھرپور انداز میں مجھے اور سیتا کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ... کے لئے ایک یادگار انعام کا اعلان کیا۔

تونل کے اشارے پر اُٹھ کر میں نے وہ نامعلوم انعام قبول کرنے کا اعلان کیا ... کا پُرجوش نعروں سے خیر مقدم کیا گیا۔ سیتا اس تمام کارروائی میں خاموش ... بیٹھی رہی کیونکہ نیپالی زبان اس کے لئے بالکل اجنبی اور ناقابلِ فہم تھی۔

"ہماری بستی میں یہ صدیوں پرانی ریت چلی آ رہی ہے کہ عورتیں سخت پردہ ... میں۔" سردار تلنگا کہہ رہا تھا۔ "شاید ہمارے مہمان کو اب تک علم ہو چکا ہو کہ ... شادی تک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے صورت آشنا نہیں ہوتے۔ جس ... کو بیاہنا مقصود ہو اس کی ساری خوبیاں اور خامیاں معبد کے اسی کمرے ... ہجوم کے سامنے بیان کی جاتی ہیں پھر شادی کا متمنی ہر لڑکا میری اجازت سے ... مخصوص نشانی لگا کر ایک پتھر میرے حوالے کرتا ہے اور یوں جمع ہونے والے ... پتھر مٹی کے زنگار رنگ تھال میں سجا کر لڑکی کے جھونپڑے پہنچ دیئے جاتے ... لڑکی جس پتھر کا انتخاب کرتی ہے اس کا بھیجنے والا لڑکا اس کا مرد قرار ... پاتا ہے مگر انعام کی اس رسم میں ہم نے یہ طریقہ بدل دیا ہے۔!"

یہ سُن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ دربار میں موجود لوگ اس اعلان پر ... دبی سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ میں نے بوکھلا کر سیتا کی طرف دیکھا مگر وہ بیزاری سے چھت کی طرف نگراں تھی۔!

"اپنے معزز مہمان کے لئے ہم نے بستی کی سات حسین ترین لڑکیوں کا انتخاب کیا ہے جن کے سامنے چاند کا حُسن شرماتا ہے، جن کی آواز آج تک بستی کے کسی ... نے نہیں سنی۔ ان میں سے ہر لڑکی کی مخصوص نشانی مقدس کاہن کی تحویل میں ہے ... مہمان ان میں سے جو نشانی منتخب کرے گا، اسی کے مطابق ایک لڑکی اسے ... بخش دی جائے گی۔ ..." سردار کی باقی بات نعروں اور تالیوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔ "مگر میں شادی شدہ ہوں!" میں تونل کے قریب کھسک کر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

اچانک تونل کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور وہ میرے رازدارانہ لہجے کی پرواہ کئے بغیر تیز آواز میں غرایا۔ "اجنبی! کیا تیری تہذیب یہی سکھاتی ہے کہ... محسنوں کی توہین کی جائے!"

تونل کی تلخ نوائی پر سارے مجمع پر خاموشی اور سنسنی چھا گئی۔ ہر شخص اس بدمزگی کا سبب جاننے کے لئے بے چین تھا۔

"کیا بات ہے تونل؟ صفدر کی تہذیب سے تجھے کیا دکھ پہنچا ہے؟" سردار تلنگا نے اس کی بات سُن کر حیرت سے سوال کیا۔

"اپنے مہمان سے خود پوچھ لے معزز تلنگا!" تونل کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

"معزز سردار! میرا مقصد تونل کی دل آزاری ہرگز نہ تھا۔" میں نے مجمع کا جائزہ لیتے ہوئے نرم اور خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"تو نے اس سے کیا کہا تھا؟"

"تم نے مجھے جو عزت بخشی ہے سردار! میں اس کا ہرگز مستحق نہ تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے جسے قبول کرنا میری خوش بختی ہوگا مگر میں نے تونل کو بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ اگر اس قبیلے کی کوئی نازنین میرے سپرد کر دی گئی تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید اس سے انصاف نہ کر سکوں۔"

"مگر تو پہلے ہی یہ انعام قبول کرنے کا اعلان کر چکا ہے؟" سردار کا لہجہ بھی بگڑ گیا۔ "مردوں کے الفاظ عہد کے برابر ہوتے ہیں کیا اب تو ہمارا انعام ٹھکرا کر ہمیں ذلت سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔!"

بگڑتے ہوئے حالات نے مجھے سراسیمہ کر دیا اور میں جلدی سے بولا۔ "یہ لڑکی میری بیوی ہے سردار۔ شاید یہ اس بات کو کسی قیمت پر گوارا نہ کر سکے کہ اس کا مرد کسی دوسری عورت کے تعلق سے بھی پہچانا جائے۔ تونل کو اس کے مزاج کی تندی کا خوب تجربہ ہے۔"

"ہمارے قبیلے کا کوئی مرد اپنی عورت کے سامنے اتنا بے بس نہیں ہوتا۔" سردار برہم ہو گیا۔

"میں اس انعام سے انکار نہیں کرتا سردار!" میں نے حالات سنبھالنے کی کوشش میں جلدی سے قلابازی کھائی۔ "یہ انعام تو میرے لئے عزت اور اعزاز کا باعث ہے۔ میری بات کو غلط سمجھا گیا۔ میں تونل کو صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ میری بیوی تند خو ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں اس کی کسی زیادتی کے باعث مجھے اس بستی میں نظریں نیچی کرنی پڑیں۔!"

"کیا تو صرف یہی واضح کرنا چاہتا تھا؟" سردار کے لہجے میں شبہات رقصاں تھے۔

"ہاں سردار!" میں نے گہرے خلوص کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "صرف اتنی سی بات تھی۔ تمہارے انعام سے انکار میرے لئے بدنصیبی ہوگا۔"

میرے اس بیان پر فضا میں چھائی تلخی کافی حد تک چھٹ گئی مگر تونل کی نگاہوں میں اب بھی میرے لئے وہ پہلا سا خلوص نہیں رہا تھا۔

"کیا یہ لڑکی جانتی ہے کہ ہماری جانب سے تجھے کیا انعام دیا جانے والا ہے؟"
سردار نے سیتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ مقامی زبان سے بالکل ناواقف ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں خود مناسب موقع پر اسے پوری بات بتا دوں گا۔"

پھر پتھریلے معبد کے اس دربار ہال میں رقص و سرود کی ہلکی پھلکی مگر خالص مردانہ محفل جم گئی۔ لوگ چہروں پر رنگین مٹی سے عجیب و غریب اور مضحکہ خیز نقوش بنائے ناچ رہے تھے۔ سردار نے موج میں آکر مجھے بھی اُن کے درمیان دھکیل دیا اور مجھے مجبوراً اس مضحکہ خیز اچھل کود میں حصہ لینا پڑا۔ مقدس کاہن اپنے دونوں ساتھیوں سمیت تخت سے اتر کر کہیں جا چکا تھا۔!

یہ ہنگامہ کم و بیش آدھ گھنٹہ جاری رہا پھر مقدس کاہن کی آمد کے اعلان کے ساتھ ہی سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ میں واپس تخت پر چلا گیا۔ وہاں سیتا کو موجود نہ پاکر میں بے چینی سے ہال کا جائزہ لینے لگا۔ میرے اضطراب کو محسوس کر کے تونل نے بتایا کہ میرے رقص کے دوران میں سیتا خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

میں سیتا کے بارے میں اسی سوچ بچار میں مبتلا تھا کہ سفید ریش مقدس کاہن مٹی کا ایک رنگین تھال لئے تخت پر آپہنچا۔ خوشبوؤں سے رچے ہوئے اس تھال میں سات بڑے بڑے پتے سجے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک پر رنگین مٹی سے کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ مجھے ان میں سے ایک پتہ کا اور اس کے ذریعے انعامی لڑکی کا انتخاب کرنا تھا۔!

میں دھڑکتے دل کے ساتھ ان ساتوں پتوں کا باری باری جائزہ لے رہا تھا۔ اس وقت میں سیتا اور اپنی موجودہ مشکلات کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ ان میں سے ہر پتہ کی اوٹ میں مجھے بستی کی ایک گوری حسینہ مسکراتی نظر آرہی تھی۔ ہال میں موجود لوگ میرے انتخاب کا منظر دیکھنے کے لئے میرے گرد سمٹ آئے تھے آخر میں نے آہستگی سے ان میں سے ایک پتہ اٹھا لیا۔
وہ پتہ اٹھاتے ہی پورا دربار سرگوشیوں سے گونج اٹھا اور مقدس کاہن نے ان آوازوں کے درمیان میرے انتخاب کا اعلان کیا۔
وہ پتہ بھیجنے والی لڑکی کا نام لاچی تھا۔ وہ سترہ برس کی دراز قامت حسینہ بتائی جاتی تھی۔ مقامیوں کی پرجوش مبارکباد کے درمیان مقدس کاہن مجھے بھیڑ سے نکال کر ایک بغلی دروازے کی راہ سے معبد کے ایک عقبی کمرے میں لے گیا۔ سردار تلگا اور اس کا معالج بھی ہمراہ تھا۔

اس کمرے میں ہر طرف خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ وسط میں سبز پتوں اور جنگلی پھولوں کی ایک بلند سیج موجود تھی جس کے سرہانے ایک مومی شمع روشن تھی!۔۔۔ "تجھے انعام مبارک ہو صفدر!" سردار تلگا خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ "لاچی تھوڑی ہی دیر میں یہاں پہنچا دی جائے گی اور معبد کا یہ کمرہ تم دونوں کی خوشیوں کا امین بنے گا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ میں لاچی کو اپنی موجودہ قیامگاہ پر لے جاؤں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" مقدس کاہن نے کہا۔ "اس وقت سورج غروب ہو چکا اور اب اس بستی میں کوئی مرد کھلے آسمان تلے نہ نکل سکے گا۔ تو ساری رات اسی کمرے میں لاچی کے ساتھ رہے گا اور ہم لوگ یہ رات دربار ہال میں عبادت میں بسر کریں گے۔"
"یعنی صبح میں لاچی کو وہاں لے جا سکوں گا؟" میں نے پوچھا اور کاہن کا جواب اثبات میں تھا۔

کاہن اس کے بعد وہاں سے لوٹ گیا۔ تلگا اور تونل مجھ سے پتھر کی تلاش کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔ تھوڑی دیر قبل دربار میں میری حماقت کی وجہ سے جو کدورت پیدا ہو گئی تھی اب صاف ہو چکی تھی۔ اور وہ دونوں طے کر چکے تھے کہ میری نشاندہی پر وہ محدود رقبہ میں خچروں کے پیروں میں لوہے زنجیریں باندھ کر چھوڑ دیں گے تاکہ بآسانی پارس پتھر کا سراغ لگایا جا سکے۔

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں کچھ دیر وہاں تنہا رہا۔ مقامی رواج کے مطابق لاچی میری بیوی بنائی جا چکی تھی لیکن میرے مذہب کی رو سے وہ میرے لئے نامحرم تھی۔ میں نے لاچی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن اس میں مجھے بری طرح ناکامی ہوئی تھی اور اب میں سارے مسائل کو بھول کر محض اس پیکر کا منتظر تھا جس کا حسن اس بستی والوں کے لئے باعث افتخار تھا۔ محرم و نامحرم اور گناہ و ثواب کی ساری باریکیاں میرے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔
پھر بیرونی دروازے سے کسی عورت کی کانپتی ہوئی آواز ابھری جس میں عمر کی پختگی رچی ہوئی تھی۔ "بستی کے مہمان کو اس کا انعام مبارک ہو۔ لاچی اس کے در پر آپہنچی ہے۔"

میں نے چونک کر ادھر دیکھا اور اندھیرے میں ایک کوزہ پشت بڑھیا تیزی سے دروازے کے سامنے سے گزر کر کہیں معدوم ہو گیا اور خوشبوؤں میں رچی شرم و حیا کی ایک گٹھری چوکھٹ پر تنہا کھڑی رہ گئی۔ میں شوق نظارہ سے بےتاب ادھر پہنچا مگر وہ سراپا ایک سرخ لبادہ میں یوں پوشیدہ تھی کہ اس کی قامت و جسامت تک کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔
"لاچی!" میں نے قریب ہو کر محبت آمیز اور مضطرب سرگوشی کی۔ اس ساکت انبار میں سے ہلکی سی ہنکار بلند ہوئی۔
لحظہ بھر کے لئے میرے ذہن پر الجھن طاری ہوئی۔ نہ جانے ایسے موقعوں کے لئے اس بستی کی کیا رسم تھی! پھر میں نے اس بیہودہ خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ رسم جو بھی رہی ہو اس کا مدعا ایک ہی ہو سکتا تھا۔ وہ کالی گاپ کی حسین ترین لڑکی ہی سہی مگر بنیادی طور پر صرف عورت تھی اور میں لاکھ بےخانماں سہی مگر ایک تندرست و توانا مرد تھا۔
میں نے بڑھ کر اس گٹھری کو اپنی بانہوں کا سہارا دیا اور اس نے اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی ہر بو میں تو خیز

... بارستے تیز تھی جس نے میرے حواس پر خمار طاری کر دیا۔ اور میں اسے تقریباً ... ہوئے مشعل کی بھڑکتی ہوئی زرد روشنی میں سبز پتوں اور جنگلی پھولوں کی سیج کی طرف ہو لیا جو کسی معطر، خوش رنگ، گداز، حرارت آفریں اور حیات آگیں ... کے استقبال کے لئے سجائی گئی تھی۔

لڑکی کے وجود میں تیز سانسوں نے ایک زلزلہ بپا کیا ہوا تھا۔ اس کے ... حرارت سرخ لبادے سے گزر کر میرے وجود کو پگھلائے دے رہی تھی۔ میرے ... من بھر کے ہونے لگے مگر میں کسی نہ کسی طرح اسے نرم پیال پہلے ہی آیا۔
دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اس کے رخ سے لبادہ سرکایا اور میں بس ... دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسی حسین صورت کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی۔ کسی ... ہرنی کی دو خوفزدہ سیاہ آنکھیں، دراز پلکوں کی چلمن تلے چھپ چھپ کر میری ... نگراں تھیں۔ گلاب کی دو پتیاں اور نازک پنکھڑیاں سفید دانتوں کی قطار ... آگے یوں لرز اٹھیں جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر گلے سے آواز نہ نکلتی ہو۔ ... ہوئے سرخ رخسار، کشادہ پیشانی، وجاہت آمیز کھڑے نقوش، ستواں ... اور اس سے نیچے صراحی دار شہابی گردن ... میں کئی منٹ تک حیران اور ... شوق نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔
میرا والہانہ شوق دیکھ کر اس آہوئے رمیدہ کی وحشت کو کچھ قرار ... آنکھوں میں آشفتگی کی جگہ شگفتگی نکھر آئی، لرزتے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہوئی۔ پھر اس بت طناز نے آہستگی سے پہلو بدلا اور مومی شمع گل کر دی۔

چند ثانیوں تک میری بصارت نے کچھ کام نہ کیا۔ میرا اپنا دل تو پہلے ہی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا مگر اس کے دل کی ہر دھڑکن بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ آخر مجھے اس کا عروسی ہیولا نظر آیا۔ پھر مسکراتی نظریں چار ہوئیں اور میں اس کے قریب جا پہنچا۔
وہ میری زندگی کی مختصر ترین رات تھی جو اتنی جلدی بیت گئی کہ احساس ہی نہ ہو سکا۔ میری آتش شوق اس کے پہلو میں قرار نہ پا سکی۔ وہ میرے اضطراب کو ... کر ... کانپتی رہی اور میں نے بھی اپنی زندگی کے ... مگر جب دروازے کی راہ سے روشنی کا دھندلکا اندر در آیا تو مجھے خیال آیا کہ ایسے ہم نشین کے لئے تو ہزار راتیں بھی کم ہیں!
میں نے آخری بار نظریں بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی غزالی آنکھوں میں آسودہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "میں صبح کے بڑے کمرے میں جا رہا ہوں لاچی!" میں نے اس سے کہا۔
"جاؤ۔ مگر کیا نام بھی نہ بتاؤ گے!" ترنم اور حلاوت میں ڈوبی آواز ابھری۔
"میں تیرا صفدر ہوں لاچی!" میں نے بےاختیار ... اور وہ اپنا عروسی لبادہ درست کرنے لگی۔
معبد میں سب لوگ زمین پر پڑے بےخبر سو رہے تھے۔ تلگا، تونل، کاہن اور اس کے ساتھی مرصع تخت پر دراز تھے۔ میں بھی ان ہی کے درمیان جگہ پا کر لیٹ گیا مگر آنکھوں میں نیند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دل میں عجیب سی خواہشات جنم لے رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ واقعی میری شادی کی پہلی رات ہو۔ بار بار یہ آرزو ہوتی کہ کاش میں اس وقت کراچی میں اپنے بےتکلف دوستوں کے درمیان ہوتا۔ وہ کرید کرید کر شب زفاف کے بارے میں پوچھتے میں تجاہل سے کام لیتے ہوئے کچھ بتاتا کچھ ٹالتا، ان کی بےچینی سے لطف اٹھاتا اور ان پر اپنی خوش نصیبی کی دھونس جماتا۔!

مگر وہاں کوئی نہ تھا جسے میری گزری ہوئی رات کی فکر ہوتی۔ وہ لوگ بیدار ہوئے تو کسی نے مجھ سے لاچی کے بارے میں سوال نہ پوچھا۔ معبد کے خادموں نے وہیں ناشتہ فراہم کیا۔ تلگا اور تونل نے ایک بار پھر پارس پتھر کے بارے میں بات چھیڑ دی۔!
ناشتہ سے فارغ ہو کر جب لوگ واپسی کیلئے اٹھے تو میری بےچین نظریں بار بار اس بغلی دروازے کی طرف اٹھنے لگیں جس کے اس پار لاچی سیج پر بیٹھی تھی۔ میری اس حد سے بڑھی ہوئی بےچینی کو بوڑھا تونل بھانپ گیا۔
"وہ تیری قیامگاہ پر پہنچا دی جائے گی، اب اس کی فکر چھوڑ دے!" وہ میرے قریب آکر رازدارانہ لہجے میں بولا۔
میں خجالت آمیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔
"سیتا کہاں چلی گئی، رات کے بعد وہ کہیں نظر نہ آئی۔" اچانک تونل نے پوچھا اور میں چونک پڑا۔ اپنے حسین اور زندہ انعام کی رنگینی میں ڈوب کر میں سیتا کو بالکل ہی بھول بیٹھا تھا۔ وہ بیچاری نہ صرف مقامیوں کی بلکہ میری توجہ سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ معبد میں آنے کے بعد وہ جس لاتعلقی کا شکار ہوئی تھی اس سے بیزار یا شاید ناراض ہو کر وہ رات ہی کہیں نکل گئی تھی۔ نہ جانے اس نے رات کہاں اور کس حال میں بسر کی تھی اور اب وہ کہاں تھی۔؟
"مجھے کچھ علم نہیں تونل!" میں نے گھبرا کر کہا۔ "کچھ لوگوں کو اس کی تلاش پر مامور کرو۔ وہ بہت حساس اور خودسر لڑکی ہے۔ اگر مایوسی کے عالم میں اس نے خود کو نقصان پہنچا لیا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔"
"اگر وہ مل جائے تو اسے پکڑوا لیا جائے؟" تونل نے دریافت کیا۔
"نہیں۔ اس کے ساتھ کسی گستاخی کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاں بھی ملے اس کی دور سے نگرانی کی جائے اور فوراً مجھے اطلاع دی جائے۔!"
معبد سے نکلنے کے بعد سردار اور تونل چند ہمراہیوں سمیت میرے ساتھ ہو لئے تاکہ میری قیامگاہ کے قرب و جوار میں پارس پتھر کی تلاش کے کام کی ابتدا کر سکیں۔ اس سے پیشتر تونل وہ آہنی چمٹا دیکھنے کے لئے بےچین تھا جو سونے میں بدل چکا تھا۔
میں پتھروں اور شہتیروں سے بنی اپنی قیامگاہ پر پہنچا تو وہاں سیتا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میرا ذہن اب مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر میں تلگا کی دلجوئی پر بھی مجبور تھا۔

اندرام سے چھپے ہوئے آہنی چمٹے کا طلائی روپ دیکھ کر تونل حیرت سے اچھل پڑا کیونکہ یہ چمٹا وہ اس وقت بھی دیکھ چکا تھا جب یہ لوہے کا تھا۔

"ابھی زمین صاف ہے' دھوپ بھی نکلی ہوئی ہے سردار!" وہ جلدی سے بولا۔ "فوراً تلاش شروع کر دینی چاہیئے ورنہ برف گرنے لگی تو نہ جانے کتنے دن انتظار کرنا ہوگا۔"

"مگر میں شاید اس علاقے کی صحیح نشاندہی نہ کر سکوں۔" میں نے کہا "اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں سیتا کو تلاش کرنا ہوگا۔"

دوپہر تک کالی گاپ کا چپہ چپہ دیکھ لیا گیا مگر سیتا کا کہیں سراغ نہ مل سکا بلکہ اسی کے ساتھ کچھ ایسی خبریں موصول ہوئیں جن کی بنا پر میری پریشانی بڑھتی چلی گئی۔

سب سے پہلے جنگل کی طرف جانے والی ایک جماعت یہ خبر لائی کہ ڈان اور ریتی کے چوبی تابوتوں کو کسی نے توڑ ڈالا ہے اور اب ان دونوں مجرموں کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ گو ان لوگوں کو اس بارے میں سیتا پر ذرا بھی شبہ نہ ہو سکا مگر میں خوب جانتا تھا کہ وہ جتنی پرخلوص اور باوفا ہے اس سے کہیں زیادہ ضدی بھی ہے۔ کالی گاپ والوں نے اسے نظر انداز کر کے اس کے وجود میں شدید منفی ردعمل پیدا کیا تھا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد دوسری خبر یہ آئی کہ زعفران کے کھیتوں کے بڑے حصے کو رات میں آگ نے خاکستر کر دیا۔

یہ تشویشناک خبریں سن سن کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ سردار تنگا فوراً ہی ایک جماعت لے کر تابوتوں کا معائنہ کرنے چل دیا' کچھ لوگ کھیتوں کی خبرگیری پر روانہ کر دیئے گئے البتہ تونل میرے پاس رہ گیا۔

"بستی میں یہ سب کیا ہو رہا ہے صفدر؟" تنہا رہ جانے پر تونل نے معنی خیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"کہیں کوئی دشمن قبیلہ تو یہ سب حرکتیں نہیں کر رہا۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔

میرے اس تبصرے پر تونل بے ہنگم انداز میں ہنسا پھر بولا۔ "مجھے تو سیتا کی روپوشی اور ان واقعات میں کچھ تعلق محسوس ہو رہا ہے۔"

میں کھوکھلے انداز میں زبردستی ہنس پڑا۔ "نہیں' وہ ہرگز ایسی حرکات نہیں کر سکتی۔ بھلا اس میں اُسے کیا فائدہ حاصل ہونے لگا۔"

"فائدے کی بات نہیں۔" تونل سنجیدہ ہو گیا۔ "میرے دوست! میں انسانی ذہن کو پڑھنے میں ملکہ رکھتا ہوں۔ میرا قیافہ کہتا ہے کہ سیتا انانیت پسند لڑکی ہے۔ اس کی خود سری کا تو تم بھی تذکرہ کر چکے ہو۔ وہ ہر جگہ اپنی ذات کو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانا چاہتی ہے لیکن بدقسمتی سے کالی گاپ کی رسوم بہت مختلف ہیں۔ ہماری سرد مہری سے شاید وہ مشتعل ہو کر ان حرکات پر اتر آئی ہو تاکہ اپنی اہمیت منوا سکے۔"

"نہیں ــــ میں سیتا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے بظاہر پُر اعتماد لہجے میں کہا مگر تونل کی باتوں سے میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ "وہ ضدی اور جذباتی ضرور ہے مگر تخریبی حرکات پر نہیں اتر سکتی۔"

"پھر بھی میری رائے یہ ہے کہ سیتا کو اب جلد از جلد تلاش کرنا چاہیئے اگر ان حرکات کی پشت پر وہی سرگرم ہے تو اس کے لئے بڑے خطرات ہیں۔ اس نے ڈان اور ریتی کو آزاد کر کے بہت بُرا کیا ہے۔"

"تونل ــــ خدا کے لئے مفروضات پر اتنی دور تک قیاس آرائیاں نہ کرو۔ سیتا معصوم ہے۔ وہ یقیناً کسی گمنام گوشے میں پڑی ہو گی اور جب اس کا غصہ سرد ہو گا تو وہ خود میرے پاس آ جائے گی۔"

"ایسا ہوا تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہو گی۔"

پھر سردار تنگا واپس آیا تو بہت زیادہ برہم تھا۔ "نہ جانے کون ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے اور ابھی تک اُس لڑکی سیتا کا بھی کوئی پتہ نہیں چل سکا۔"

"سیتا خود ہی لوٹ آئے گی سردار! مگر ہمیں پارس کی تلاش میں تاخیر نہ کرنی چاہیئے۔" میں نے موضوع بدلنے کی خاطر جلدی سے کہا۔ "کسی حد تک میں بھی اس علاقے کی نشاندہی کر سکوں گا۔"

یہ بات سردار کی سمجھ میں آ گئی اور وہ سب لوگوں کو لے کر باہر نکل پڑا۔ میں نے اپنے اندازے کی بنا پر اس علاقے کی نشاندہی کی جہاں میری دانست میں پارس پتھر کی موجودگی کا امکان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سردار کے آدمی اس علاقے میں پھیل گئے اور جہاں جہاں برف جمی رہ گئی تھی اسے صاف کرنے لگے۔ کچھ لوگ خچروں کا ایک ریوڑ وہاں ہانک لائے جن کے پچھلے پیروں میں آہنی زنجیریں باندھ دی گئیں۔

سورج غروب ہونے سے ذرا دیر پہلے تک اس علاقے میں پارس پتھر کی تلاش پورے زور و شور سے جاری رہی مگر سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر بڑی تیزی کے ساتھ تلاشی کی مہم ختم کی گئی تاکہ سورج ڈوبنے سے قبل وہ لوگ بستی میں اپنے اپنے جھونپڑوں میں پہنچ سکیں اور میں اپنی پناہ گاہ میں لوٹ آیا۔

وہاں پہنچا تو ایک خوشگوار حیرت میری منتظر تھی۔ میری غیر موجودگی میں لاچی کو وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اور وہ مکان کی صفائی میں مصروف تھی۔ میری آہٹ پاتے ہی وہ میری طرف لپکی اور میرے سینے سے لپٹ کر یوں گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے شدید بھاگ دوڑ کے بعد وحشی درندوں کے ریوڑ سے اسے نجات ملی ہو۔

"تو یہاں کب آئی؟" میں نے اسے قریب پا کر اپنی پریشانی میں نمایاں کمی محسوس کی۔

"لکڑی کی پالکی والے کافی دیر پہلے مجھے یہاں اتار گئے ہیں۔" وہ بولی۔ "مگر بستی سے الگ تھلگ اس تنہا مکان میں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ کئی بار یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چھپ کر میری نگرانی کر رہا ہو۔"

"یہ تیرا وہم ہے۔ تیرا چند دن یہاں گزارنے لگی تو سارا ڈر نکل جائے گا۔" اس روز واقعات نے ایسا رُخ اختیار کیا تھا کہ لاچی کی رفاقت سے بھی پورے طریقے پر لذت اندوز نہ ہو سکا۔ میرا ذہن مستقلاً سیتا میں الجھا رہا۔ نہ جانے کہاں تھی اور اب کیا منصوبہ بنا رہی تھی۔ میں اس سے مل کر سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ کالی گاپ والوں سے ٹکرا کر آگ سے کھیل رہی ہے۔ تونل [illegible] لفظوں میں سیتا پر اپنے شبہات کا اظہار کر چکا تھا۔ اگر یہی بات عام ہو جاتی تو نہ صرف سیتا ان کی مجرم قرار پاتی بلکہ میں بھی شدید مصائب میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

"میں نے سُنا تھا کہ سُرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک خوبصورت عورت بھی تیرے ساتھ یہاں آئی ہے' وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی؟" لاچی نے میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' تو نے ٹھیک سُنا تھا۔" میں گہرا سانس لے کر بولا۔ "وہ میری بیوی ہے۔"

"کیا اسے سردار نے کوئی الگ جھونپڑا دے دیا ہے؟"

"نہیں' وہ مجھ سے ناراض ہے اور کہیں جا چھپی ہے۔"

لاچی اس کے بارے میں جاننے کے لئے بہت بے چین تھی مگر میں نے اسے ٹال دیا۔ اس لڑکی کو حُسن کے ساتھ ہی قدرت نے ایک اور خوبی بھی عطا کی تھی کہ وہ ضدی ہرگز نہ تھی۔ میرا رجحان دیکھ کر بات کرتی تھی سیتا کے بارے میں میری مرضی کے خلاف اس نے بحث نہیں کی بلکہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔

میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود سونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پچھلی رات کی بیداری' لاچی کے ساتھ تھکا دینے والی مصروفیات' پھر دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد میرا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا جسمانی نظام آرام کا طالب تھا مگر ذہنی انتشار نے بے چین کیا ہوا تھا۔ آخر میں نے ایک بار پھر لاچی کے حسین گداز سراپا کا سہارا لیا اور خود کو اس کے وجود کی دلفریب رعنائیوں میں گم کر دیا۔

اگلی صبح جب میں بیدار ہوا تو میرا ذہن بوجھل سا ہو رہا تھا آنکھیں ملتے ہوئے میں نے بستر پر نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاچی کا وہاں کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی جگہ سیتا میرے ساتھ سو رہی تھی۔

اس حیرتناک واقعہ پر میں چند ثانیوں کے لئے مبہوت سا رہ گیا پھر میں نے بڑھ کر بے خبر سوتی ہوئی سیتا [illegible] وہ ہوتے ہوتے کسمسائی پھر اس نے اپنی خمار آلود آنکھیں وا کر دیں۔

"سیتا! تو کہاں جا چھپی تھی' واپس کب آئی؟" میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بستر سے اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"رات تیرے [illegible] کون سو رہی تھی؟" جواب دینے کے بجائے سیتا نے تلخ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"وہ کہاں ہے سیتا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ "میرے شدید انکار کے باوجود وہ لڑکی انعام کے طور پر میرے حوالے کر دی گئی' مگر وہ گئی کہاں؟"

"وہ لڑکی زبردستی تیرے حوالے کی گئی اور تُو اس میں کھو کر مجھے بھول گیا۔"

"نہیں سیتا! میں ہر پل تیری جانب سے فکرمند تھا اور اگر میں اس لڑکی کو ٹھکرا دیتا تو سردار تنگا میرا دشمن ہو جاتا۔"

"میں عورت ہوں صفدر!" سیتا نے پہلی بار مجھے ایسے لہجے میں مخاطب کیا کہ میں چونک پڑا۔ "اس بستی والوں نے دانستہ مجھے نظر انداز کیا پھر ایک لڑکی تیرے حوالے کر کے مجھے اپنے پیار سے محروم کرنا چاہا۔ تو سمجھتا ہے کہ میں غافل تھی۔ میں رات درختوں میں چھپی سارا کھیل دیکھ رہی تھی۔ تنگا حرام کا تخم ہے۔ اس نے تجھے ایسی حسین لڑکی کے جال میں پھانسا تھا کہ میں تیری توجہ کو ترستی رہ جاتی۔ رات میں دیکھ چکی ہوں کہ تُو اس پر کس حد تک فریفتہ تھا' مگر اب وہ کبھی میری راہ میں حائل نہ ہو سکے گی۔"

سیتا کے یہ الفاظ میرے اعصاب پر کسی بم کی طرح گرے اور میں نے اسے تقریباً جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "وہ کہاں ہے؟ تُو نے لاچی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

"میں نے ڈان اور ریتی کو رہا کر دیا۔" وہ فاتحانہ لہجے میں بولی۔ "کالی گاپ والوں کی زعفران کی فصلوں کو آگ لگا دی' پھر جب میں نے اس فاحشہ لڑکی کو تیری آغوش میں دیکھا تو میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے ایک بوٹی کے سفوف سے تم دونوں کو بے ہوش کر دیا۔ اس لڑکی کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا اور میں نے تیرے پہلو میں اپنی جگہ سنبھال لی۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"اس کی یاد ستا رہی ہے۔" سیتا اس وقت حسد و رقابت کی زندہ تصویر بنی ہوئی تھی۔ "آ' میرے ساتھ آ۔ شاید اسے دیکھ کر تیرے ارمان ٹھنڈے ہو سکیں۔"

"سیتا! وہ لڑکی معصوم ہے' وہ اپنی بستی کی رسوم کا نشانہ بنی ہے۔ وہ خود سے میرے پاس نہیں آئی' اسے میرا امیدوار بننے پر مجبور کیا گیا ہوگا۔"

سیتا کچھ نہ بولی اور مجھے ساتھ لئے سیدھی اس کوٹھڑی میں پہنچی جہاں ڈان اور ریتی نے اسے قید کیا ہوا تھا۔ یہاں فرش پر [illegible] ہوئی تھی۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف لپکا مگر چند قدم دور مجھے رُک جانا پڑا۔ دہشت سے میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لاچی کے حسین و تابناک چہرے اور جسم [illegible] سے سینکڑوں گوشت خور سُرخ چیونٹے چپٹے ہوئے تھے اور اس کا بدن بالکل ساکت تھا۔

میں نے دہشت زدہ نظروں سے سیتا کی جانب دیکھا اس کا چہرہ

طمانیت سے جگمگا رہا تھا۔ نیلی آنکھوں میں اطمینان رقصاں تھا۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھے فتح اور کامرانی کی دیوی کی طرح سرفراز کھڑی تھی۔

"یہ تُو نے کیا کیا سیتا؟" میرے حلق سے ڈری ڈری آواز نکلی۔ "لاچی معصوم تھی وہ کسی طرح سزا کی مستحق نہ تھی۔ تُو نے بڑی سنگدلی اور سفاکی کا ثبوت دیا ہے۔" "اس لڑکی میں اور ڈان اور رینی میں کوئی فرق نہ تھا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "تُو نے ہی مجھے بتایا تھا کہ شادی کے بغیر مرد اور عورت کا تعلق بہت بڑا گناہ ہوتا ہے اور لاچی نے یہ گناہ کیا تھا۔ یہی جرم ڈان اور رینی نے نینی کے ساتھ کیا تھا۔ اگر کالی گاپ والے کسی کو سزا دیتے ہیں تو میں نے بھی لاچی کے لئے وہی سزا منتخب کی ہے۔"

"ہر بستی کی رسوم مختلف ہوتی ہیں۔" میں نے اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس کی۔ "کالی گاپ کی رسم کے مطابق وہ میری بیوی بن چکی تھی۔"

"ایک مرد کی دو بیویاں نہیں ہو سکتیں۔" وہ تیز لہجے میں غرائی۔ "اگر تلنگا اپنی بستی کا کوئی خوبرو مرد مجھے بخش دیتا تو کیا تُو یہ گوارا کر لیتا کہ تیری سیتا کسی اور کا پہلو گرمائے؟ تُو لاچی کی طرف نہیں بڑھا تھا وہ خود تیرے پاس آئی تھی۔ اور میں نے اسے وہ سزا دے دی جس کی وہ مستحق تھی۔ میری زندگی میں دنیا کی کوئی عورت میری حق تلفی کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"شاید لاچی مر چکی ہے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب ان موذی چیونٹیوں کو یہاں سے ہٹانے کی صورت نکال ورنہ لاچی کے بعد یہ میرا رُخ کر سکتے ہیں۔"

"جب تک لاچی کی ہڈیوں پر گوشت کا ایک ریشہ بھی باقی ہے یہ کہیں نہ جائیں گے۔ میں نے ڈان کے ٹوٹے ہوئے تابوت سے وہ خوشبو نکال کر لاچی کے جسم کے خاص حصوں پر لگائی تھی جو ان سُرخ چیونٹوں کے لئے کشش رکھتی ہے۔ یہ چیونٹے بھی میں اسی جنگل سے لائی تھی اور اب میں جب چاہوں ان کا صفایا کر سکتی ہوں۔"

"یہ بہت بُرا ہوا سیتا! اب ہم اس بستی میں نہ رہ سکیں گے۔ کسی کو لاچی کی موت کی بھنک بھی مل گئی تو ہم دونوں کا حشر خراب کر دیا جائے گا۔"

"یہ بستی ہمارے لئے منحوس ہے، اب یہاں سے نکلنے کی فکر کرنا ہو گی۔ میں یہ بھی دیکھ چکی ہوں کہ لاچی تلنگا کو یہاں پارس پتھر کی تلاش میں بُری طرح ناکامی ہوئی ہے۔"

اس کوٹھڑی کو ہم نے مضبوطی سے مقفل کر دیا اور واپس رہائشی کمرے میں لوٹ آئے۔

تھوڑی دیر بعد تونل آیا۔ پردے کی سخت رسم کے باعث اُس نے باہر ہی سے مجھے آواز دی۔ اور قدرے توقف کے بعد میں نے اسے اندر بلا لیا۔

سیتا کو دیکھ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "یہ واپس آ گئی؟"

"ہاں۔" میں لاپروائی کے انداز میں ہنسا۔ "یہ اسی مکان کی چھت پر چھپی ہوئی تھی اور بھٹکے آدمی اسے ساری بستی میں ڈھونڈتے رہے!"

"ڈان اور رینی فرار کے باوجود اپنے انجام کو پہنچا دیئے گئے؟ ابھی تک یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ انہیں آزاد کرنے والا کون تھا؟"

"کیا وہ پکڑے گئے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"سردار نے اپنا شِکرہ ان کے تعاقب میں روانہ کیا تھا اور وہ خوفناک پرندہ آدھی رات کو اس حالت میں لوٹا ہے کہ اس کے پنجے، چونچ اور سارے پَر تازہ خون میں تر تھے۔ اگر وہ مرے نہ ہوں تو بھی اس حالت میں ہوں گے کہ سسک سسک کر جنگل ہی میں دم توڑ دیں گے۔"

"سیتا سے میں نے اس بارے میں باز پُرس کی تھی مگر تمہارے تمام اندیشے بے بنیاد نکلے۔ وہ کالی گاپ والوں کی احسان مند ہے۔ اس کی ناراضگی صرف میرے رویّہ سے تھی جو اب دُور ہو چکی ہے۔" میں نے تونل کے ذہن سے خطرناک شبہات کھرچنے کی کوشش کی۔

"زعفران کی فصل کا نقصان ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔ اس سال کالی گاپ والوں پر تنگدستی کا سایہ نظر آتا ہے۔" تونل فکر مندانہ لہجے میں بولا۔

"اگر میری مدد قبول کرو تو شاید یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔" میں نے اپنے دل کے چور سے مجبور ہو کر فراخدلانہ پیشکش کی۔

"وہ کیا؟" تونل نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے پاس جو سونے کا چمٹا ہے وہ میں سردار کی نذر کرنے کو تیار ہوں۔ پندرہ سولہ سیر وزنی سونا شاید بھٹ گرہ سے اتنے دام دلا دے گا کہ کالی گاپ والوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔"

یہ سُن کر تونل خوش ہو گیا۔ "تُو واقعی ہمارا دردمند ہے، میں ابھی واپس جا کر سردار سے بات کروں گا۔ یہ سونا بیچ کر ہم خاصی رقم پس انداز بھی کر سکیں گے۔"

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے اچانک تونل نے لاچی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس بدنصیب لڑکی کا نام آتے ہی میرا دل یک بیک اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

"وہ واقعی بے حد حسین اور وفادار لڑکی ہے۔" میں نے کہا۔

"سیتا نے کیا اسے تیری بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے؟" تونل نے میری دُکھتی رگ کو چھیڑا۔

"لاچی کا رویّہ سیتا کے ساتھ اس قدر دوستانہ ہے کہ دونوں میں سمجھوتہ ہو ہی جائے گا۔" یہ سفید جھوٹ بولتے ہوئے میں کانپ اٹھا۔

"شاید کل لاچی کا باپ آئے گا۔" تونل بولا۔ "اپنی اکلوتی بیٹی سے اسے بے انتہا محبت ہے۔"

تونل کی آخری اطلاع میرے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ میں تونل یا سردار سے تو لاچی کے قتل کا واقعہ چھپا سکتا تھا مگر لاچی کے باپ کو فریب دینا ناممکن تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگلا دن طلوع ہونے سے قبل ہی ہمیں کالی گاپ سے فرار ہو جانا تھا ورنہ یہ تو مجھے بتایا ہی جا چکا تھا کہ قتل کی سزا سُرخ چیونٹے ہوتے ہیں۔

تونل کے روانہ ہونے کے بعد میں نے سیتا کو خطرے سے آگاہ کیا۔ وہ صورتِ حال کی نزاکت پہلے ہی بھانپ چکی تھی اور اس کی رائے یہ تھی کہ اب ہمیں جلد از جلد کالی گاپ سے کھسک لینا چاہیئے۔

سردار تلنگا کے شِکرہ کی کہانیاں بار بار میرا حوصلہ توڑ رہی تھیں مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر جب اسے ہمارے فرار اور لاچی کے قتل کا علم ہو گا تو وہ بیک وقت سارے وسائل ہمارے خلاف کام میں لائے گا۔ بستی سے فرار کے بعد ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ گھنٹوں کی مہلت ہوتی پھر سردار کے آدمیوں کی ٹولیاں ہر طرف ہماری تلاش میں نکل کھڑی ہوتیں۔ ساتھ ہی اس کا شِکرہ ہماری بُو پر فضا میں نکل پڑتا اور شاید بستی کے قرب و جوار ہی میں ہمیں آ لیتا۔

اس خطرے کے پیش نظر سب سے پہلے میں نے وہ سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا جو ہلکا پھلکا ہونے کی وجہ سے ساتھ لے جایا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد ہر وہ چیز جو ہمارے جسموں سے مَس ہوتی رہی تھی، نذرِ آتش کرنا شروع کر دی تاکہ سردار کے خونخوار شِکرہ کی رہنمائی کا امکان نہ رہے۔

مکان کے دروازے کو بند کئے شام تک ہم ان ہنگامی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ سر پر موت کا بھیانک خطرہ منڈلا رہا تھا اور اب صرف یہی دُھن تھی کہ جلد از جلد کالی گاپ سے اتنی دُور نکل جائیں کہ کوئی ہمارے نقوش پا بھی نہ ڈھونڈ سکے۔

اور جب سورج غروب ہو گیا تو ہم نے مکان کا داخلی دروازہ اندر سے بند کیا اور درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے سہارے آہستگی سے باہر کود گئے۔ مکان میں لاچی کی تیزی سے مسخ ہوتی ہوئی استخوانی لاش کے علاوہ جا بجا راکھ کے ڈھیر باقی رہ گئے تھے۔

آبادی سے کنی کاٹ کر ہم برق رفتاری سے شمال کی سمت میں بڑھنے لگے۔ آسمان پر اس وقت بھی بادل تیرتے پھر رہے تھے لیکن ان کی اوٹ سے کہیں کہیں اکا دکا تارے جھانک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی خنک ہواؤں کے ساتھ خزاں رسیدہ خشک پتے اِدھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔

"ایک بار ہم دلدلوں کے پار نکل جائیں تو کوئی ہم تک نہ پہنچ سکے گا۔" سیتا پُرجوش لہجے میں بولی۔

"دلدلیں یہاں سے کتنی مسافت پر ہیں؟"

"شاید وہ ڈھائی دن کا راستہ ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "اس وقت ہم جس راہ پر چل رہے ہیں اس میں جنگل کا آخری حصہ ہی ہمیں عبور کرنا پڑے گا۔"

"بشرطیکہ برفباری ہمیں نہ آ لے۔"

"برفباری ہو یا نہ ہو ہمیں ہر خطرہ مول لے کر آگے بڑھنا ہی ہو گا کیونکہ کالی گاپ کا سردار یہ جان چکا ہے کہ ہم دھول گری کی طرف جانے والے ہیں۔ اس کا کوئی بھی تیز رفتار قافلہ ہمیں راستے ہی میں آ لے گا۔" سیتا اس وقت ہٹ دھرم اور بیوقوف لڑکی کے بجائے بہترین مشیر کا کام کر رہی تھی۔

ہم بے تکان اپنی راہ پر بڑھے جا رہے تھے مگر قدرت ہمارے عزائم پر خنداں تھی۔ آدھی رات کے قریب جب ہم جنگل کے ویران حصے سے گزر رہے تھے تو اچانک ہوائیں بند ہو گئیں۔ آسمان پر بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ ٹھہرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ پہلے ہلکی ہلکی برفباری شروع ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے برفباری نے اتنا زور پکڑ لیا کہ ہمارے لئے سفر جاری رکھنا دشوار ہو گیا۔ یہ صورتحال ایسی نازک تھی کہ سیتا بھی حواس باختہ ہو گئی۔

"ہمیں ہر قیمت پر سفر جاری رکھنا ہے ورنہ کالی گاپ والے غفلت میں ہمیں آ لیں گے۔" اسے شاید سُرخ چیونٹوں کے ذریعہ مسلط کی جانے والی مہیب موت پریشان کر رہی تھی۔

"اس وقت حالات ہمارے لئے ناساز ہیں سیتا۔" میں نے اسے دلاسہ دیا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ سردار تلنگا آنکھیں بند کر کے اپنے آدمی دلدلوں کی طرف روانہ کر دے گا۔ اگر ہم فی الحال اپنا راستہ تبدیل کر لیں تو اس ایک مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔"

"مگر ہم کدھر جائیں گے؟"

"یہاں سے بھٹ گرہ کی بستی سب سے قریب ہے۔ اگر میری یادداشت دھوکا نہیں دیتی تو ڈان برین کے نقشے کے لحاظ سے بھٹ گرہ چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔"

"وہی بستی جہاں لاریاں آتی ہیں؟" سیتا نے حیرت اور شوق سے پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔ فی الحال ہم وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "چند دن وہاں روپوش رہنے کے بعد ہم نئے سرے سے سفر کا آغاز کر سکیں گے۔"

میں نے اس نئے منصوبے پر جتنا غور کیا اسے اسی قدر محفوظ پایا۔ گو بھٹ گرہ کالی گاپ سے خاصا قریب تھا مگر ہلکی سی برفباری بھی درمیانی راستے کو ناقابلِ گزر بنا دیتی تھی جس کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ تلنگا کو ہماری وہاں روپوشی کی خبر نہ مل سکے گی۔ رہے خطرات تو وہ ہر راہ میں حائل تھے۔ دلدلوں کی جانب نکلنے میں دُہرے خطرات تھے جبکہ بھٹ گرہ جانے میں صرف راستے کی احتیاط مطلوب تھی۔

برفباری میں راہ چلنے کے لئے میں نے پلاسٹک کے تھیلے میں سے وہ سرچ لائٹ نکال لی جو میں نے ڈان اور رینی کے سامان میں سے حاصل کی تھی۔ سیتا نے طلائی چمٹا سنبھال لیا اور ہم شمال کے بجائے اندازے سے شمال مشرق کی سمت چلنے لگے۔

اس نئے رُخ پر جنگل کی کثافت ذرا ہی دیر میں معدوم ہو گئی

اور بمشکل نصف گھنٹے بعد ہم سنگلاخ پہاڑی راستوں پر نکل آئے۔ یہاں ہر طرف یکساں چٹانیں بکھری ہوئی تھیں جن پر لمحہ بہ لمحہ برف کی گہری تہیں جمتی جا رہی تھیں۔

وہ پوری رات ہم نے سفر میں گزاری۔ راستوں کی یکسانیت تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔ ساری رات چلنے کے باوجود یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہم جہاں سے چلے تھے وہیں کھڑے ہوں۔ صبح صادق کے قریب خدا خدا کر کے برفباری کا زور ٹوٹا مگر آسمان پر ابھی تک گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہم نے ایک کھاڑی میں رُک کر تھیلے سے خورد و نوش کا کچھ سامان نکالا اور قدرے توانائی حاصل کرنے کے بعد پھر چل پڑے۔

"صفدر!" چلتے چلتے سیتا نے مجھے مخاطب کیا۔ "یوں تو ہم ساری عمر بھی ان پہاڑوں میں بھٹکتے پھریں تو بھٹ گرہ نہ پہنچ سکیں گے۔ ناہموار پہاڑی راستوں کی وجہ سے ہم سمت کا احساس بھی کھو چکے ہیں۔ ذرا اُجالا پھیلے تو کسی اونچے مقام سے قرب و جوار کا جائزہ لینا چاہیئے۔"

اس کی تجویز معقول تھی لہٰذا میں اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔

سورج طلوع ہونے پر ہم برف کے گالوں پر دھکی ہوئی ایک بلند چوٹی پر پہنچے اور میں نے بے اختیار سیتا کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اس پہاڑی کے پار کافی نشیب میں بے شمار جھونپڑوں اور نیم پختہ مکانات پر مشتمل ایک بستی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مکانات سے جا بجا سرمئی دھوئیں کے بادل تھکے تھکے انداز میں اوپر اٹھ رہے تھے بیشتر مکانات دبیز تازہ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔

اگر ہم جائزہ لئے بغیر اپنی راہ پر بڑھتے رہتے تو اس بستی کے پہلو سے بے خبری کے عالم میں گزر جاتے۔ گو ہمیں یہ علم تو نہ تھا کہ یہ کون سی بستی ہے مگر پہاڑی ڈھلانوں پر آبادی کا پھیلاؤ دیکھتے ہوئے میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہی بھٹ گرہ کی آبادی ہے۔

منزل قریب پا کر ہمارے جسموں میں کچھ اور توانائی سمٹ آئی اور ہم تیز رفتاری سے پہاڑی سے اترنے لگے۔ سیتا کے چہرے پر بھی مایوسی کی جگہ بشاشت اُبھر آئی تھی جس کا سبب مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ دراصل بھٹ گرہ پہنچنے کی اُمید نے اسے لاری دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس نے ساری عمر جس غیر تہذیبی حصار میں گزاری تھی وہاں جدید مشینی ایجادات کا دُور تک گزر نہ تھا اور اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ایک مشین بہت سے آدمیوں کا بوجھ اٹھا کر تیز رفتاری سے کیسے سفر کرتی ہے۔

بظاہر قریب نظر آنے والی وہ آبادی کافی مسافت طے کر لینے کے باوجود سراب بنی ہوئی تھی۔ میں ناہموار اور دشوار گزار راستے عبور کرتے کرتے تھک کر چور ہو گیا۔ آخر سیتا نے رُکنے کی تجویز پیش کی جسے میں نے فوراً قبول کر لیا۔ اور ہم کھلی دھوپ میں ایک جگہ آ بیٹھے۔ اونچی ڈھلانوں سے پھسل کر آنے والی برف ننھے ننھے سنگریزوں کو ساتھ لیتی مترنم آواز پیدا بکھیرتی تیزی سے نشیب میں بہی جا رہی تھی۔ گو ابھی ہوا ساکت تھی مگر فضا میں خاصی خنکی رچی ہوئی تھی۔

ہم وہاں بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک سیتا اُچھل پڑی۔ اس کی نگاہیں آسمان پر کسی چیز پر مرکوز تھیں پھر وہ تیزی سے بڑھتا ہوا بے حس و حرکت نقطہ مجھے بھی نظر آ گیا اور میرے ذہن میں سب سے پہلا خیال سردار تلنگا کے شکرے کا آیا تھا۔

اگر وہ کوئی پرندہ ہی تھا تو اس میں کوئی حرکت نام کو نہ تھی وہ طوفانی رفتار سے کسی پتھر کی طرح نیچے آ رہا تھا۔ میں نے فوراً تھیلے سے ریوالور نکالنا چاہا مگر اس سے پہلے وہ اپنے لمبے لمبے نکیلے پر کھول چکا تھا اور بمشکل سو سوا سو فٹ کی بلندی سے ہم پر حملہ آور ہونے والا تھا۔

پھر جوں ہی وہ ایک کریہہ چیخ مار کر تیر کی طرح نیچے آیا سیتا نے ایک طرف اُچھل کر خود کو بچایا مگر وہ آخری لمحے میں سمت بدل کر سیدھا میرے چہرے پر آیا۔ میری شدید مدافعت کے باوجود اس نے اپنے تیز پنجے میرے بائیں شانے میں گاڑ دیئے اور اپنے لمبے لمبے پر پھڑپھڑا کر مڑی ہوئی چونچ سے میرا چہرہ نوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ ہولناک منظر دیکھ کر سیتا کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے پھرتی سے طلائی چمٹا سنبھالا اور اس کے پھلوں سے شکرے کے پھڑپھڑاتے ہوئے داہنے پر اور جسم کے درمیانی جوڑ پر ضرب لگائی۔ اس وار سے شکرے کا توازن بگڑ گیا اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں میرے شانے کا خاصا گوشت پنجوں میں ادھیڑتا نیچے جا گرا۔ جتنی دیر میں سیتا اس تک پہنچتی، وہ تیز چیخیں مارتا فضا میں پرواز کر گیا۔

میں اپنے شانے کے زخم کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ سیتا نے ہذیانی چیخوں کے ذریعے اس کی واپسی سے آگاہ کیا۔ وہ دھیمے دھیمے اپنے پروں کو ہلاتا ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس آ رہا تھا۔ سیتا نے زمین سے پتھر اُٹھا کر اس کی طرف اُچھالا اور وہ یک بیک فضا میں بالکل سیدھا اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ پروں کی ہلکی ہلکی جنبش کے ساتھ وہ اتنا اوپر چلا گیا کہ ننھی سی چڑیا سے مشابہ نظر آنے لگا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ تھیلے میں سے ریوالور نکال لیا اور سیدھا ہوا تو وہ منحوس پرندہ حیرتناک رفتار سے غوطہ مار کر نیچے آ چکا تھا اور فضا میں تقریباً ایک ہی جگہ رُکا ہوا تھا۔ اس کے داہنے پر کی جنبش سے پتہ چل رہا تھا کہ سیتا کا لگایا ہوا زخم خاصا کاری ثابت ہوا ہے۔

میں نے فوراً ہی ریوالور سے شست لی مگر وہ تیزی سے قلابازی کھا کر ایک لمبے دائرے کی صورت میں دُور ہوتا چلا گیا۔ اس مرتبہ وہ دُور ہی سے تیز رفتاری کے ساتھ واپس ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری زد پر آیا، میں نے فوراً گولی چلا دی لیکن اس کے وار سے خود کو بچانے کی

کوشش میں نشانہ خطا گیا اور وہ ایک بار پھر اوپر اٹھتا چلا گیا۔

اب زیادہ دیر کھلی فضا میں رُکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ پرندہ اس قدر پھرتیلا اور طرار تھا کہ ذرا سی غفلت میں کسی بھی سمت سے آ کر اپنا کام کر جاتا۔ میں نے سیتا کا ہاتھ تھاما اور ایک قریبی کھوکھلی چٹان میں جا چھپا۔ فضا میں شکرے کی تیز غضبناک چیخیں رہ رہ کر گونج رہی تھیں۔ ہم دونوں سردار تلنگا کے آدمیوں کی فکر میں پڑ کر اس بلا کو فراموش ہی کر چکے تھے اور اگر سیتا مجھے بروقت اس خطرے سے آگاہ نہ کرتی تو وہ میرا منہ یا آنکھیں نوچ لے جانے میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔

اس بار وہ خاصی دیر بعد کھوکھلی چٹان کے دہانے کے سامنے کھلی فضا میں نمودار ہوا اور تیزی سے ہماری طرف آیا۔ میرا نشانہ اس بار بھی خطا ہوا مگر ہم دونوں خود کو اس کی زد سے بچا گئے اور وہ اپنی پوری قوت سے چٹان کے عقبی ٹھوس حصے سے جا ٹکرایا۔

پُرشور دھماکے کے ساتھ وہ نیچے گرا ہی تھا کہ سیتا نے اس کی گردن مٹھی میں دبوچ لی اور وہ کھوکھلی چٹان فائر کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ شکرے نے سیتا کے ہاتھ ہی میں تڑپ کر دم توڑ دیا اور اس نے مُردہ شکار کو باہر ڈھلان پر اُچھال دیا۔

میں خالی خالی نظروں سے شکرے کے نیچے لڑھکتے ہوئے بے جان جسم کو دیکھتا رہا۔ گزرے ہوئے لمحات مجھے ایک بھیانک خواب کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ سردار تلنگا کا شکرا میرے تصور سے کہیں زیادہ بھیانک ثابت ہوا تھا اور اب مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ ڈان اور رینی کو اس خونخوار پرندے نے زندہ ہرگز نہ چھوڑا ہو گا۔ وہ جس طوفانی رفتار سے فضا میں غوطہ مارتا تھا اس کے پیش نظر اگر وہ نوچ کھسوٹ نہ کرتا بلکہ پوری قوت سے میرے چہرے سے آ ٹکراتا تو یقیناً میرا چہرہ ناقابلِ شناخت ہو گیا ہوتا۔

سیتا نے پوری توجہ اور دردمندی سے میرے شانے کا زخم صاف کیا، پٹی باندھی اور زمین پر بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگی۔ یہاں کچھ دیر حواس بحال کرنے کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر نیچے اُترنے لگے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بستی کی نواحی پہاڑیوں میں ہمیں جو پہلا شخص ملا وہ نیپالی زبان بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے میرے وحشت زدہ حلیے کو بڑی حیرت سے دیکھا اور میرے استفسار پر بتایا کہ اس بستی کا نام بھٹ گرہ ہی ہے۔

یہ سُن کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور اس سے کہا "ہم سیاح ہیں۔ بارہ روز سے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہمیں بستی میں کہیں پناہ مل سکے گی؟"

"بستی میں سیاحوں کے لئے کئی ہوٹل ہیں، رقم ہے تمہارے پاس؟"

"سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو رقم بھی ادا کر دیں گے۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔ وہ ہماری رہنمائی پر آمادہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ ان اطراف میں ہلکی ہلکی برفباری شروع ہو چکی ہے۔ دس پندرہ دن بعد موسم اتنا خراب ہو جائے گا کہ ساری آبادی اپنے مکانوں میں محصور ہو کر رہ جائے گی۔ شہر سے ماہانہ رسد لیکر آنے والی لاری ابھی بھٹ گرہ میں ہی تھی اور تین دن بعد واپس جانے والی تھی۔ اس کا مشورہ تھا کہ ہم شدید موسم سے بچنے کے لئے اسی بس سے نکل جائیں ورنہ کئی مہینے کے لئے بھٹ گرہ میں پھنس کر رہ جائیں گے۔

میں نے اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور جب اس نے سون ہاٹ نامی ایک ویران سرائے پر پہنچایا تو میں نے اسے اپنے سامان میں سے خشک گوشت کا ایک سربند ڈبہ دے دیا اور وہ خوشی خوشی واپس لوٹ گیا۔

سون ہاٹ پتھر اور گارے سے بنی ہوئی ایک صاف ستھری سرائے تھی جس میں کل پانچ کمرے تھے۔ یہاں سیتا نے چارپائیوں وغیرہ کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ جب بوڑھے مالک نے ہمیں کمرہ دکھا دیا تو میں نے اسے اندر سے مقفل کر دیا تاکہ طلائی چمٹے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر سکوں۔ اس وقت مفلسی دُور کرنے کے لئے ہمارے پاس وہی سونا تھا اور اگر میں سیر وزنی چمٹا بیچنے لے جاتا تو اس میں پہلا خطرہ دھر لئے جانے کا تھا۔ دوسری طرف بھٹ گرہ کے چور اُچکے بھی ہمارے درپے آزار ہو جاتے۔

ابھی میں نے اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے طلائی چمٹا بستر کے نیچے چھپا کر دروازہ کھولا تو سون ہاٹ کا بوڑھا مالک چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ لئے موجود تھا۔

"کچھ رقم پیشگی دے دو بچو! تو میں تمہارے کھانے پینے کا انتظام کروں" وہ حریصانہ لہجے میں بولا۔

"ابھی تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ آج ہم شہر گھومیں گے، کل سے تمہیں کھانے پکانے کا انتظام کرنا ہو گا۔" میں نے خوش دلی سے اسے ٹال دیا۔

کمرہ بند کر کے میں نے دوبارہ چمٹا توڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سیتا کی مدد اور شدید محنت کے بعد میں اس کا ایک پھل توڑنے میں کامیاب ہو سکا۔ اس ٹکڑے کا وزن کسی طرح چھ سات تولے سے کم نہ تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس ٹکڑے کو بیچ کر میں بازار سے لوہا کاٹنے والی ایک مضبوط قینچی بھی خرید لوں گا تاکہ باقی ٹکڑے آسانی سے کاٹے جا سکیں۔

اس کام سے نمٹ کر ہم دونوں نے منہ ہاتھ دھویا اور سونے کا چھوٹا ٹکڑا لے کر سرائے سے نکل پڑے۔ بڑا حصہ احتیاط سے چھپا دیا تھا۔

ابھی ہم بمشکل سرائے سے چند قدم دُور ہی گئے ہوں گے کہ پیچھے سے بوڑھے سرائے والے نے کانپتی ہوئی آواز میں مجھے پکارا۔ میں چونک کر پلٹا تو قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

سرائے والے کے پاس ایک وردی پوش پولیس والا کھڑا ہوا ہماری طرف نگراں تھا۔ شاید وہ ہمارے نکلتے ہی مخالف سمت سے وہاں پہنچا تھا۔

سرائے دار

کے پاس وردی پوش سپاہی کو کھڑا دیکھ کر میرے ذہن پر خوف اور بے چینی کی ایک شدید لہر طاری ہوگئی اور میرے دماغ میں سب سے پہلا خیال یہ کوندا کہ اس سپاہی کی سون ہاٹ کے دروازے پر موجودگی کسی بڑے خطرے کی گھنٹی ہے لہٰذا مجھے سیتا کے ہمراہ فوراً کسی طرف بھاگ نکلنا چاہیے تاکہ بھٹ گرہ کی پولیس ہمارا کوئی سراغ نہ پا سکے۔

ہمیں کالی گاپ سے فرار ہو کر یہاں پہنچے چند ہی گھنٹے گزرے تھے اور بس اسی اثنا میں مقامی پولیس ہماری طرف متوجہ ہوگئی تھی نہ جانے انھیں مجھ سے رابطہ کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی۔ ان تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود میرے ذہن نے خود بخود فرار کی تجویز مسترد کردی۔ پولیس سے بھاگ کر اس انجان علاقے میں خود کو غیر یقینی حالات میں روپوش رکھنا میرے لیے بڑا دشوار ہوتا۔ پولیس جلد یا بدیر ہم دونوں کو ڈھونڈ ہی نکالتی اور اس صورت میں ہم مفرور مجرموں کی حیثیت میں ان کی کوئی ہمدردی نہ جیت پاتے۔

میں نے بظاہر پولیس والے کی وہاں موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ مگر لاپروایانہ لہجے میں بوڑھے سرائے دار سے اونچی آواز میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے بڑے میاں؟“

”حوالدار صاحب آئے ہیں بیٹا! تمھارا ہی پوچھ رہے تھے۔“ بوڑھے نے کانپتی ہوئی خوشامدانہ آواز میں دہیں سے جواب دیا۔

”خبردار! کسی موقع پر بھی تمھیں دخل اندازی کی ضرورت نہیں، معاملہ کچھ گڑبڑ نظر آرہا ہے مگر میں خود ہی نمٹ لوں گا۔“ میں نے سرائے کی جانب واپس لوٹتے ہوئے سیتا کو تادیب کی۔

نیکر اور قمیض پر اوورکوٹ پہنے ہوئے وہ لمبی لمبی مونچھوں والا سپاہی نخوت سے گردن اکڑائے کھڑا تھا اور نہایت مضحکہ خیز نظر آرہا تھا۔ دور ہی سے وہ ہم دونوں کو ایسے کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا جیسے محض مشاہدہ کی بنا پر ہمارا پورا شجرہ جان جائے گا مگر ہم قریب پہنچے تو ہمالیائی بستی، بھٹ گرہ کے اس شرلک ہومز نے مجھے بے حد مایوس کیا۔ اس کا پہلا سوال ایک ایسی حقیقت کے بارے میں تھا جس پر کوئی بھی مقامی پورے یقین سے فیصلہ صادر کرسکتا تھا۔

”کیا باہر سے یہاں آیا ہے؟“ اس ... رے بائیں شانے کے زخم پر بندھی ہوئی خون آلود پٹی کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم سیاح ہیں۔ برف ... پر بھٹک کر راستہ بھٹک گئے تھے، گیارہ دن کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آج ایک انسانی آبادی کی صورت دیکھی ہے!“

”ہوں۔“ وہ خالص افسرانہ شان سے غرایا پھر اپنی بید سے میرے بائیں شانے کو ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ گو میرا زخم جیکٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا مگر پٹی کی وجہ سے جیکٹ کافی پھولی ہوئی تھی۔

”چوٹ لگی ہوئی ہے۔“ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہم پر کسی قسم کا شبہ کیا جارہا ہے؟“

”یہ چوکی پر پتہ چلے گا۔“ اس نے بید سے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سپاہی کی معیت میں چند گز دور چلنے کے بعد ہم داہنی جانب گھومے اور ذرا ہی دیر بعد ایک ایسی چوڑی پتھریلی سڑک پر آنکلے جہاں سے نشیبی ڈھلان میں دور تک پھیلی ہوئی بھٹ گرہ کی عسرت زدہ بستی نظر آنے لگی۔ پتھر اور گھاس پھوس یا گارے سے بنے ہوئے مکانات کی کھڑی ڈھلان والی چھتوں پر رات کی گری ہوئی برف کے تودے ابھی تک موجود تھے۔ سردی سے ٹھٹھری ہوئی سورج کی نحیف و نزار کرنیں ان برفانی تودوں پر بمشکل ہی اثر کرتی نظر آرہی تھیں۔ سڑکوں پر بھی ابھی جابجا برف موجود تھی اور جہاں برف نہیں تھی وہاں ہر طرف نمی یا پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔

”سنتری صاحب! ہمیں کوتوالی کیوں بلایا گیا ہے؟“ کچھ دیر تک خاموشی سے چلنے کے بعد میں نے سراپا انکسار بنتے ہوئے اس مضحکہ خیز سپاہی سے پوچھا۔

میری اس گستاخی پر اس نے پلٹ کر مجھے قہربار نظروں سے گھورا مگر میرے سوال کا جواب دینے کی زحمت کیے بغیر خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔

جس مقام پر ہمارے اس سفر کا اختتام ہوا وہاں زمین میں گڑی ہوئی ... کے سہارے ٹین کا ایک بوسیدہ بورڈ جھول رہا تھا جس پر بڑے بڑے الفاظ میں ”دفتر انچارج صاحب بہادر پولیس چوکی علاقہ بھٹ گرہ“ لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔

اس بورڈ سے ذرا پیچھے انگریزوں کے زوال رسیدہ اقتدار کی نشانی، ایک مظلوم سی عمارت واقع تھی۔ پہاڑی پتھروں اور گارے سے بنے ہوئے اس بلند لیکن مختصر کمرہ پر بوسیدہ کھپریل کی چھت پڑی ہوئی تھی جو کسی زمانہ میں یقیناً سرخ رہی ہوگی مگر اب ... پر مٹیالا پن آچکا تھا۔ اس چھت کی ڈھلان پر ابھی تک برف کے بڑے بڑے تودے جمع تھے جو آہستہ آہستہ پگھل رہے تھے کیونکہ کھپریل کی چھت کے چوبی کناروں سے تسلسل کے ساتھ پانی کی بوندیں پتھریلی زمین پر ٹپک رہی تھیں۔ سپاہی مجھے اور سیتا کو ہمراہ لیکر اندر گھسا تو وہاں کسی حقے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

حقے کی آواز پر میں چونکا اور وہاں پھیلی ہوئی دھندلی روشنی میں ... کمرے کا جائزہ لیا تو وہ پولیس چوکی کے بجائے کسی مویشی خانے کے ... کی کوٹھری لگ رہی تھی۔ کمرے میں ایک چارپائی پر میلے کچیلے بستر اور ایسے ہی لحاف میں دبکا کوئی شخص نہایت سکون سے حقہ پی رہا تھا۔ چارپائی کے قریب ہی فرش پر کوئلوں سے بھری انگیٹھی دہک رہی تھی جس کے نیم سوختہ کوئلوں سے اٹھنے والے دھوئیں نے فضا کو ناخوشگوار بنایا ہوا تھا۔ چارپائی کے سرہانے دیوار سے لگی ہوئی ایک میز پڑی ہوئی تھی جس پر گرد و غبار، دو فائلوں، قلمدان اور ایک موٹے سے رجسٹر سے زیادہ ایک ڈنڈا نمایاں تھا۔

”کون لے آیا رے بھولا؟“ ہماری آہٹیں گونجتے ہی حقے کی بے تابانہ گڑگڑاہٹ دم توڑ گئی۔ اسی کے ساتھ چارپائی والے کی تحکم آمیز آواز ابھری۔

”بھولا نہیں، میں جانی ہوں حوالدار جی۔“ ہمیں لانے والے سپاہی نے دانت نکال کر گویا دوہرا تعارف کرایا۔ اب مجھ پر واضح ہوچکا تھا کہ اس سپاہی کا نام جانی ہے جبکہ حقہ نوش شخص حوالدار ہے!

”اوہو— مجرموں کو لے آیا کیا؟“ حوالدار نے ایسے لہجہ میں پوچھا جیسے اس وقت اسے ہمارے وہاں آجانے سے تکلیف ہوئی ہو۔ پھر لحاف کو حرکت ہوئی اور دھوتی اور روئی کے سینہ بند میں ملبوس حوالدار صاحب بہادر، انچارج پولیس چوکی بھٹ گرہ فرشی حقے کی نے سنبھالے سالم کے سالم سامنے آگئے۔

”یہ دونوں سون ہاٹ سے نکلے ہی تھے کہ میں نے انھیں جالیا۔“ جانی فخریہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”لڑکی تو ٹھیک ٹھاک ہے مگر مرد کا بایاں شانہ زخمی ہے!“

”تم کون ہو؟“ حوالدار نے قریب آکر باری باری ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے مشکوک لہجے میں سوال کیا۔

”میں سیاح ہوں!“ میں نے جلدی سے کہا پھر فوراً ہی قدرے جھوٹ سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ”میں کئی برسوں سے کھٹمنڈو میں رہ رہا تھا۔ پھر ادھر کی تفریح پر آنکلا مگر راستہ بھٹک کر آدم خوروں کے قبیلہ میں جا پھنسا اور اب دھکے کھاتا یہاں تک آیا ہوں۔“

”کاغذات کہاں ہیں؟“

”وہ ... وہ تو فرار ہوتے وقت اسی قبیلے میں رہ گئے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر ان موذیوں کے جنگل سے نکل سکا۔“ میں نے فی البدیہہ دوسرا جھوٹ بولا۔

”اور یہ لڑکی تمھاری کون ہے؟“

”یہ میری بیوی ہے!“

اسی وقت کو نہ لانے والا شخص آگیا اور میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ہمیں سون ہاٹ پہنچایا تھا۔ شاید ہمیں وہاں پہنچانے کے بعد اسی نے انعام وغیرہ کے لالچ میں پولیس چوکی میں دو بے موسم سیاحوں کی آمد کی مخبری کی تھی۔

”بیوی؟“ اس نے حیرت سے یہ کہتے ہوئے سیتا پر گہری نظریں ڈالیں پھر گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔ ”اس لڑکی کے باقی رشتہ دار کہاں ہیں؟“

”یہ ایک قبائلی لڑکی ہے اور اس کی ماں کی اجازت سے میں نے اس سے شادی کی ہے!“

”یا وُر نیم؟“ حوالدار نے میرا جواب نظرانداز کرتے ہوئے بگڑے ہوئے غیانہ لہجے میں یہ سوچ کر سیتا سے پوچھا کہ وہ شاید انگریزی سمجھ سکے۔

سیتا پہلے ہی اس سے بھنائی ہوئی نظر آرہی تھی، حوالدار کے منہ سے نکلے ہوئے دونوں انگریزی الفاظ اس کے لیے لایعنی تھے، وہ زور سے ہنس پڑی۔ ”یہ کیا بک رہا ہے؟“

”ارے! یہ تو اردو بول رہی ہے۔“ حوالدار بھی کھسیانے انداز میں ہنسنے لگا۔

کافی دیر کی بحث کے بعد ساری صورت حال میری سمجھ میں آسکی۔ دراصل اسی روز صبح سویرے کسی مقامی نے بھٹ گرہ کی مضافاتی پہاڑیوں میں دو سفید فام آدمیوں کی مسخ شدہ برہنہ لاشیں دریافت کی تھیں۔ ان کے جسموں پر بہت سے ننھے ننھے زخم موجود تھے، اس کے علاوہ سارے بدن اور چہرے پر لمبی لمبی گہری خراشیں تھیں جیسے چاقو کے پھل سے ان کا بدن کاٹا گیا ہو۔ ان کی آنکھیں بھی بڑی بے رحمی سے نوچ لی گئی تھیں۔ اس تفصیل سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ لاشیں کالی گاپ کے سردار کے مجرموں ڈان برین اور رینی ولسن کی رہی ہوں گی جنھیں سیتا نے چوبی تابوتوں اور گوشت خور چیونٹوں کے عذاب سے فرار کا موقع فراہم کیا تھا مگر وہ دونوں اپنے انجام سے نہ بچ سکے۔ سردار کے خون آشام شکرہ نے واقعی ان دونوں کا کام تمام کردیا تھا۔

بھٹ گرہ جیسی بستی کے لیے یہ لاشیں سنسنی کا باعث بن گئیں۔ مُردہ گھر یا باقاعدہ ہسپتال نہ ہونے کے باعث وہ لاشیں خستہ حالی کے پیش نظر ایک عیسائی قبرستان میں اس مفروضہ کے ساتھ دفنا دی گئیں کہ ہر سفید چمڑی والا عیسائی ہوتا ہے۔ اس واقعہ پر پوری بستی میں ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ان حالات میں جب ہم دونوں بھٹ گرہ پہنچے تو ہمارے رہنما، بھولا نے حوالدار کو مخبری کردی اور چوکی سے فوراً ہی جانی کو ہماری طلبی کے لیے روانہ کردیا گیا۔

سیتا کی سرخ و سفید رنگت، نیلی آنکھوں، بھوری زلفوں

اور اس کے بے حجابانہ رویّہ سے بھولا اور پھر حوالدار اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ سیتا مرنے والوں کی ساتھی ہے اور میں نے ہوس اور رقابت کے جذبوں سے مغلوب ہو کر ان دونوں کو قتل کیا اور سیتا کو لے بھاگا۔ اس شبہے کو میرے شانے کے زخم اور بگڑنے والے حلیے سے بھی بڑی تقویت ملی مگر سیتا سے طویل باز پرس کے بعد حوالدار، جو بلحاظ عہدہ ہیڈ کانسٹبل تھا، کے شبہات بے یقینی کا شکار ہو گئے۔

بھٹ گرہ کی پولیس چوکی نہایت پسماندہ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس علاقے میں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ کسی قریبی شہر سے براہِ راست مواصلاتی رابطہ نہ ہونے کے سبب بیشتر مسائل کے حل کا انحصار حوالدار کی صوابدید پر ہوتا تھا اور جو مسئلے اس بے عقل کے لیے دشوار ہوتے انھیں وہ مختصر روداد اور مجرم سمیت اپنے واحد سپاہی کی تحویل میں ہر ماہ آنے والی لاری کے ذریعے علاقائی پولیس اسٹیشن روانہ کر دیتا جو بھٹ گرہ سے ایک سو چار میل دور تھا۔

میں نے پوری گفتگو میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ میری زبان سے کالی گاپ کا نام نہ نکلے نہ ہی میں نے مرنے والوں سے اپنی شناسائی کا کوئی حوالہ دیا۔ سیتا بھی شاید یہ نکتہ سمجھ چکی تھی لہٰذا اس کے منہ سے بھی کوئی قابلِ گرفت بات نہ نکلی۔

پرجوش باز پرس کا اختتام چوکی کے انچارج کے لیے حد درجہ یاس انگیز تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ باتوں میں اُلجھ کر اسے میری جامہ تلاشی کا خیال نہ آیا ورنہ ریوالور اور سونے کے ڈلی ٹکڑے کے بارے میں جوابدہی مشکل ہو جاتی، آخر کار وہ اپنی دھوتی سمیٹ کر دوبارہ چارپائی پر جا چڑھا بھولا انگیٹھی میں مزید کوئلے ڈال کر راکھ کرا رہا تھا اور جانی ایک غیر جانبدار مبصر کی طرح وہاں موجود تھا۔

حوالدار نے گرد آلود میز سے ایک فائل اٹھائی اور اس میں سے ایک سادہ کاغذ نکال کر اس پر پنسل سے میرا اور سیتا کا نام لکھا میں نے اسے کھٹمنڈو کا ایک فرضی پتہ بھی لکھوا دیا۔ پھر اس نے مختصراً ہماری وہاں آمد کا سبب اور اپنی تفتیش کا خلاصہ لکھا۔ آخر میں میرے بیان پر اس نے یہ بھی لکھ دیا کہ یہ جوڑا پہلی فرصت میں بھٹ گرہ سے واپس اپنے شہر چلا جائے گا۔ اس کاغذ پر اس نے میرے دستخط لیے۔ سیتا سے انگوٹھا لگوانے کے لیے سیاہی میسر نہ تھی لہٰذا حوالدار نے اپنے غلیظ تکیے کے نیچے سے سُرمہ کی ڈبیہ نکالی اور اس کی مدد سے کاغذ پر سیتا کے انگوٹھے کا نشان لیا اور ہمیں زبانی دھونس کے بعد وہاں سے نجات مل گئی۔

باہر آتے ہی سیتا مجھ پر برس پڑی ”تو اس قدر بزدل کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ ان تینوں کے سامنے ڈر ڈر کر بات کیوں کر رہا تھا؟“

اس کے الزام پر میں جھلا گیا ”تجھے میری ہر بات میں بزدلی نظر آتی ہے۔ تجھے کچھ خبر ہے کہ یہ کون لوگ تھے؟“

”ہوں گے کوئی بھی“۔ وہ لاپرواہی سے بولی ”مگر میں تو ان تینوں کی مرمت کر سکتی تھی!“

”مرمت کی بچی! وہ سرکاری آدمی ہیں۔ ان سے اُلجھنے کے ہمیں کہیں امان نہ ملتی۔ یہ کوئی جنگلی علاقہ نہیں ہے، یہاں قانون ہوتا ہیں اور ہر ایک کو ان پر چلنا ہوتا ہے!“

اب دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ میں جلدی جلدی بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوتوالی سے نکلنے پر ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔

سیتا کے لیے شہر کی معمولی معمولی چیزوں میں دلچسپی کے سامان پوشیدہ تھے۔ انسانی زندگی بسر کرنے کا منظم اور مربوط نظام اس کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ ان سب سے بڑھ کر وہ سب سے پہلے لاری دیکھنے کیلیے بے چین تھی۔ بھٹ گرہ کا بازار جھونپڑوں اور کیبنوں پر مشتمل تھا۔ میں لاابالی سیاح کی طرح دکانوں کا جائزہ لیتا دکانوں کے رُخ پر ایک کشادہ گلی میں مُڑا تو قریب ہی ڈھلان دار سڑک پر لاری کھڑی نظر آ گئی اور پھر سیتا کو میں کسی طرح نہ روک سکا۔ وہ پُرشوق انداز میں دوڑتی ہوئی لاری کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اِکا دُکا خریداروں اور دوکانداروں نے اسے حیرت اور دلچسپی کی نظروں سے دیکھا مگر کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکے۔

لاری کے ٹائروں پر موٹی موٹی آہنی زنجیریں چڑھی ہوئی تھیں، سیتا کو شوق اور انہماک سے ان کا معائنہ کرتے دیکھ کر قریبی قہوہ خانہ سے دو تین منچلے نوجوان اس کے قریب آ کھڑے ہوئے اس سے قبل کہ وہ لوگ سیتا سے کوئی شوخی کرتے، میں تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں جا پہنچا۔

”لاری کب روانہ ہو گی؟“ میں نے ان لوگوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے پوچھا۔

”پہلے تو تین دن بعد جانے کا پروگرام تھا لیکن اب شاید جلدی چلی جائے گی کیونکہ موسم بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ اگر چار چھ فٹ برف اور گر گئی تو سارے راستے بند ہو جائیں گے!“ ان میں سے ایک بولا۔

سیتا نے جب دل بھر کر بس کا معائنہ کر لیا تو میں نے بازار کے باقی حصّے کا چکر لگا ڈالا۔ پورے بازار میں مجھے کوئی صرّاف نظر نہ آیا۔ پھر اچانک ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

وہ بستیاں جہاں لوگوں کو پیٹ بھرنے کو دو وقت کی روٹی بمشکل میسر آتی ہو وہاں صرّاف کا ہونا ناممکن سی بات تھی۔ ایسے مقامات پر قیمتی اشیاء کا لین دین عموماً مہاجنوں کے ذریعہ ہوتا ہے لہٰذا

اس بار میں کپڑے اور اونی کمبلوں کی ایک دوکان میں جا گھسا جہاں اس وقت کوئی گاہک نہیں تھا۔

موٹی توند والے دوکاندار نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”لالہ جی! ہمارے پاس پیسہ ختم ہو گیا ہے، یہاں کوئی چیز گروی رکھ کر پیسہ دینے والا بھی ہے؟“ میں نے اس پر اپنا مدعا واضح کیا۔

”چوری چکاری کا مال تو نہیں ہے؟“ اس نے راز دارانہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔ سونے کا ایک ٹکڑا میری ذاتی ملکیت ہے!“

”دکھاؤ“۔ اس کا تجسس بڑھ گیا۔

میں نے جیکٹ کی جیب میں سے سونے کا ٹکڑا نکالا اور اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے بڑے غور سے اس ٹکڑے کا جائزہ لیا پھر اپنے جسم کی آڑ میں پیچھے رکھی ہوئی تجوری کھولی۔ میں بمشکل تجوری کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ اس میں سونے کے کئی زیورات، نقد رقم اور مزید کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ لالہ نے تجوری میں سے کسوٹی اور کانٹا نکال کر پھرتی سے اسے مقفل کر دیا۔

کسوٹی کی پرکھ کے بعد اس نے مستند باٹوں کے بجائے چند موتیوں اور کنکروں کے ذریعے اس ٹکڑے کا وزن کیا اور حساب جوڑ کر مجھے اس کا وزن دو تولے تین ماشے بتایا۔

”کیا غضب کرتے ہو لالہ جی! یہ ٹکڑا کسی طرح چھ تولے سے کم نہیں ہے!“ میں نے اس سے وہ ٹکڑا واپس لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں یک بیک حریصانہ چمک عود کر آئی اور اس نے وہ ٹکڑا مضبوطی سے مٹھی میں دبا کر ہاتھ پیچھے کر لیا ”تمھارے پاس اس کی خریداری کی رسید تو ضرور ہو گی۔ مجھے دکھاؤ کہ اس پر کیا وزن لکھا ہوا ہے؟“

”رسید کی بات چھوڑو“۔ میں نے غصّہ ضبط کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا ”میں نے یہ سونا بیچنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے!“

”دیکھو جی مجھے اس معاملے میں گڑبڑ نظر آ رہی ہے۔ تم اسے بیچو یا نہ بیچو مگر اب مجھے پولیس چوکی کو خبر کرنی ہو گی۔ ایسے معاملات میں میں ہمیشہ اپنی قانونی ذمہ داریاں پوری کرتا ہوں!“

میں سمجھ گیا کہ وہ خبیث لالہ میری دُکھتی رگ پکڑ چکا ہے اور بے ایمانی سے وہ سونا ہضم کرنا چاہتا ہے، پولیس کا نام اس نے صرف بلیک میل کے لیے استعمال کیا تھا ورنہ اس کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ یا تو میں اس کی مرضی کے مطابق سونا اس کے ہاتھ بیچ دوں ورنہ وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ چوکی سے نجات ملے مجھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی اور میں اتنی جلدی کسی متنازعہ مسئلے میں ملوث ہو کر دوبارہ حوالدار کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بے انتہا طیش کے باوجود مجھے اس سے اپنا رویّہ مصالحانہ رکھنا پڑا۔

”لالہ! کیوں پردیسیوں کو پریشان کرتے ہو۔ اب اس کی رسید میں گلے میں لٹکائے تو نہیں پھر سکتا۔ تم کسی پرچون فروش کی ترازو پر بھی اس کا وزن کرو تو یہ چھٹانک سے زیادہ ہی نکلے گا“۔

”وزن اس کا وہی ہے جو میں نے بتایا ہے“۔ وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا ”پھر تمھارا نقصان ہی کیا ہے تم اسے رہن رکھا رہے ہو رقم لوٹا دو گے تو یہ ٹکڑا واپس مل جائے گا“۔

”لاؤ۔ کیا حساب ہوا؟“ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس سے جیتنا میرے لیے مشکل تھا۔

”ایک سو بیس روپے تولہ سے دو سو ستر ہوئے“۔ اس نے استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں ٹھیک ہے“۔ میں راضی ہو گیا۔

اس نے سونے کا ٹکڑا کانٹے اور کسوٹی کے ساتھ تجوری میں مقفل کر دیا اور بنڈی کی جیب سے نوٹ گن کر میرے حوالے کر دیے۔

ایک سو پینتیس روپے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا ”یہ کیا؟ یہ تو آدھی رقم ہے!“

”شاید پہلی بار کوئی چیز رہن کرا رہے ہو؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا ”کوئی بھی مہاجن یا ساہوکار رہن میں آدھی سے زیادہ رقم نہیں دیتا۔ پیسے لوٹا دو گے تو تمھاری چیز تمھیں واپس مل جائے گی۔ روپے پر چار آنے ماہوار سود دینا ہو گا“۔

”رہن پر لعنت بھیجو“۔ میں بھنّا کر بولا ”پوری رقم نکالو تاکہ حساب ہی بیباق ہو جائے“۔

اس نے مایوسی سے اپنے سر کو جنبش دی ”سونے کے لین دین کا پرمٹ میرے پاس نہیں ہے لہٰذا میں اسے خرید نہیں سکتا، میں تو بس رہن کر کے لوگوں کی پریشانیاں حل کر دیتا ہوں“۔

”لیکن میں اسے بیچنا چاہتا ہوں“۔

”بیٹھ جاؤ“۔ وہ لاپرواہانہ شان سے بولا ”شاید جانی گشت پر اِدھر آنے والا ہو گا، تم نے اسے مطمئن کر دیا تو جہاں چاہو، اپنا سونا بیچ دینا“۔ وہ بُری طرح مجھ پر حاوی ہو چکا تھا۔

میں نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا اور دل ہی دل میں اسے بے تحاشہ مغلظات بکتا اس کی دوکان سے باہر آ گیا۔

”کوئی اور چیز ہو تو آدھی رات کو بھی میں حاضر ہوں بلا کھٹکے چلے آنا۔ میں اسی دوکان میں سوتا ہوں“۔ اس نے چلتے چلتے آخری نشتر لگایا۔

میں نے پلٹ کر اسے لعنت دکھائی اور وہ بے حیا مسکرا کر رہ گیا اور یوں اپنے دور کا ذہین و فطین النسان ہمالیہ کی ایک پسماندہ بستی کے مہاجن کے ہاتھوں لٹ گیا اور اُف تک نہ کر سکا۔

بہرحال میری ضروریات کے لیے وہ رقم کافی تھی۔ میں نے بازار سے کچھ پھل وغیرہ خریدے۔ لوہا کاٹنے والی قینچی حاصل کی اور واپس سون ہاٹ کی طرف چل دیا۔

سون ہاٹ کے عمر رسیدہ سرائے دار نے ہمارا استقبال کیا تو وہ کچھ پریشان سا تھا۔ میں نے اس سے اس کا سبب دریافت کیا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے اسے مالی پریشانی میں مبتلا سمجھ کر دس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ نوٹ لے لیا اور بولا ”تمھارا نام کیا ہے بیٹا؟“

”داؤد خان!“ میں نے فوراً ہی وہ نام دہرا دیا جو میں نے پولیس چوکی پر لکھایا تھا۔

یہ سن کر بوڑھے کے منہ سے بے اختیار اطمینان کا ایک گہرا سانس نکل گیا ”بھگوان کی کرپا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا ”ورنہ میں تو بڑا پریشان تھا۔ سون ہاٹ کی چھت کے نیچے آج تک کوئی خونی تو کیا کوئی چور اچکا تک نہیں آیا ہے۔“

”کیا قصہ ہے بابا، کھل کر بات کرو!“

”پہلے پولیس دو گوردوں کی لاشوں کے سلسلے میں تمھیں لے گئی پھر تھوڑی ہی دیر بعد خونیوں جیسے چہرے والا ایک خوفناک بوڑھا یہاں آیا۔ اسے صفدر نامی کسی شخص کی تلاش تھی جو کالی گاپ میں اس کی اکلوتی بیٹی لاچی کو قتل کر کے بھاگا ہے....!“

”پھر، پھر تم نے اس سے کیا کہا ہے؟“ میں نے بے تابی سے اس کی بات کاٹ دی۔ لاچی کے باپ کی یہاں آمد کی خبر پا کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

”کہتا کیا۔ وہ کالی گاپ کا رہنے والا ہے، جہاں نیپال کا کوئی قانون نہیں چلتا۔ ان آزاد قبیلوں میں سردار یا پھر جرگہ کی مرضی چلتی ہے، پھر وہ بڈھا اس قدر مشتعل تھا کہ میرے لیے اس کا سامنا کرنا ہی دشوار ہو گیا تھا۔ مجھے تمھارا نام تو معلوم نہیں تھا مگر میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ صفدر نام کا کوئی آدمی سون ہاٹ نہیں آیا اور وہ قسمیں کھاتا لوٹ گیا کہ وہ اپنی بیٹی کے قاتل کو پاتال میں بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔“

”تم نے بہت اچھا کیا بابا۔ ایسے خونی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کیا خبر وہ تم پر ہی حملہ کر بیٹھتا۔“ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال تک نہ تھا ۔۔چی کا باپ یا کالی گاپ کا کوئی بھی شخص میری تلاش میں اتنی جلدی بھٹ گرہ آ پہنچے گا۔

اس رات میں نے طلائی چھلے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر ایک تھیلے میں چھپایا تاکہ وہ کسی کی نظر میں نہ آ سکے۔ پھر میں سیتا کے ساتھ ڈھول گری کی جانب پیش قدمی کے امکانات پر تبادلۂ خیال کرنے لگا۔ ان بدترین حالات میں سیتا ادھر کا رخ نہ کرنے پر مصر تھی۔ کالی گاپ اور پھر بھٹ گرہ میں ہی سردی اور برفباری میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی اور میں لحہ بہ لمحہ خود کو غیر یقینی حالات میں پھنستا محسوس کر رہا تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ سردار تلنگا نے لاچی کی لاش دستیاب ہوتے ہی ہمارے تعاقب میں کوئی تیز رفتار جماعت کالی گاپ سے ڈھول گری کی راہ پر روانہ کر دی ہو گی تاکہ وہ دلدلوں تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں جا لے، دوسری طرف لاچی کا باپ جوشِ انتقام سے اندھا ہو رہا تھا۔ اسے یہ تو یقین رہا ہو گا کہ اگر ہم ڈھول گری کی طرف گئے ہیں تو تلنگا کے آدمی ہر قیمت پر ہمیں پکڑ لیں گے لہٰذا وہ احتیاطاً بھٹ گرہ کی طرف آ گیا تاکہ ہمارے فرار کی یہ راہ بھی مسدود کر سکے۔ اس کی یہاں موجودگی ہمارے لیے زبردست خطرہ تھی۔ کالی گاپ والوں کی مخصوص وضع قطع کی بنا پر تو میں شاید اسے پہچان لیتا لیکن اس کا چہرہ میرے لیے شناسا نہ تھا۔ وہ کہیں بھی ہمارے سامنے پڑ سکتا تھا۔ اگر ہم اس کے ہاتھوں مارے جاتے تو قصہ ہی نمٹ جاتا اور اگر ہم اس پر غالب آ جاتے تو بھٹ گرہ کی دو نفری پولیس پارٹی سے جان بچانا محال ہوتا کیونکہ شہر میں اجنبی ہونے کے ناطے کسی بھی جرم کا پہلا شبہ ہم دونوں پر ہی ہوتا، اس کے علاوہ ایک اور خطرہ یہ تھا کہ اگر حوالدار کو یہ بھنک مل جاتی کہ کالی گاپ سے کوئی قتل کر کے فرار ہوا ہے تو وہ سرائے دار کی طرح ہماری معصومیت پر ایمان نہ لاتا بلکہ پہلی فرصت میں ہمیں پکڑوا کر لاچی کے باپ کے سامنے کر دیتا اور ہماری گلو خلاصی خواب ہو کر رہ جاتی۔

جوں جوں میں حالات پر غور کرتا گیا میرے ذہن سے پارس پتھر کا بھوت اترنے لگا۔ میں نے مختصر سے قیام میں کالی گاپ والوں کی فطرت کے بارے میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ وہ دوستوں کے بہترین دوست اور دشمنوں کے بدترین دشمن تھے۔ بستی کی جانب سے انعام میں ملی ہوئی حسینہ لاچی کا قتل ان کی روایات کی بدترین توہین کے مترادف تھا گویا میں ان کے منہ پر بھرپور طمانچہ رسید کر کے بھاگا تھا۔ وہ اس قدر ضدی اور خود سر لوگ تھے کہ ہمارے گھیراؤ کے لیے ڈھول گری کی راہ میں پڑنے والی دلدل کے کنارے

...ت تک ہمارا انتظار بھی کر سکتے تھے۔ اب ادھر کا رخ کرنا ...ان میں پھنسنے کے مترادف تھا۔ وہ پوری رات میں نے لاچی ...ب کی طرف سے چوکنا رہ کر سوچ بچار میں گزار دی اور صبح ...ٹتے کے بعد ہی سرائے دار سے روانگی کا ارادہ ظاہر کر دیا۔

”بیٹا! ابھی تو بس جانے میں دو روز باقی ہیں۔ ایسی سخت ...ں تم کہاں جاؤ گے؟“ اس نے حیرت سے میرا منہ تکتے ہوئے کہا۔

”بابا! ہمارے پاس رقم بالکل نہیں ہے!“ میں نے مفلسی ...ہ تراشا ”دو سرائے میں رہے تو واپسی کا لاری کا کرایہ تک نہ رہے گا۔“

”فکر نہ کرو۔ میں اتنا سنگدل نہیں ہوں۔“ بوڑھا فراخدلی ...ا تھا ”تم جو دس روپے دے چکے ہو میرے لیے وہی کافی ہیں۔ ...دن بے فکری سے میری چھت کے نیچے بسر کر سکتے ہو۔“

میں نے اس سے کافی بحث کی لیکن بوڑھے کی شفقت ...گے میری ایک نہ چل سکی اور مجھے اس کی پیشکش قبول کرنی پڑی۔

اس روز میں سارا دن سرائے سے باہر نہ نکلا۔ باتوں ہی باتوں ...رائے دار سے لاچی کے باپ کے بارے میں اتنی معلومات حاصل ...کہ اس سے سامنا ہونے پر اسے پہچان سکوں۔

اگلے دن بوڑھے سرائے دار نے بتایا کہ لاری اسی دن جانے ...ہے۔ اسے یہ اطلاع اپنے کسی پڑوسی سے ملی تھی۔ بھٹ گرہ میں لاری ...اور اس کی روانگی کا کافی شہرہ ہوتا تھا۔ پوری بستی میں تقریباً بچے بچے ...اطلاع ہوتی تھی۔

میں نے جلدی جلدی اپنا سامان تھیلوں میں سمیٹا اور سیتا ...ہمراہ سرائے دار سے رخصت ہو گیا۔ میں نے راستے میں ایک دکان ...دو اونی چادریں بھی خرید لیں اور انھیں ہم دونوں نے چرمی لباس ...س طرح اوڑھ لیا کہ لاچی کا باپ ہمیں نہ پہچان سکے۔ جیکٹوں کے کالر ...ے کرنے کے بعد وہ اونی ٹوپیاں بھی اوڑھ لیں جن میں سے صرف ...ک اور آنکھیں نظر آتی تھیں۔

جب ہم بازار کے اس حصے میں پہنچے تو لاری کے قریب ...ل دوڑ اور ہیجان کے آثار نظر آئے۔ بس کا عملہ روانگی سے پہلے ...فوک بجا کر بس کی کمانیاں، پہیے وغیرہ دیکھ رہا تھا مگر ان سب میں نمایاں ...بہ دراز قامت سفید ریش شخص تھا جس نے اپنے بدن پر ریچھ کی کھال ...نڈھی ہوئی تھی۔ اس کے لمبے لمبے سفید بال بے ترتیبی سے پیشانی ...پر بکھرے ہوئے تھے۔ جھریوں دار توانا چہرے پر بڑی بڑی آنکھوں ...سے وحشت جھلک رہی تھی۔ آنکھوں کی سرخی اور ورم سے ظاہر ہو رہا تھا ...کہ وہ پچھلی کئی راتوں سے جاگتا رہا ہے۔ اس کا داہنا ہاتھ کھال میں چھپا ہوا ...تھا اور کھال میں بار بار پیدا ہونے والے نکیلے ابھار سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں تیز دھار والا کوئی کھلا ہتھیار موجود ہے۔ وہ بڑی بے چینی سے لاری کے دروازوں کے درمیان کیچڑ بھری زمین پر ٹہل رہا تھا اور ہر نئے آنے والے کو بھڑک کر گھورنے لگتا تھا۔ اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ شدید بے چینی سے وہاں کسی ناپسندیدہ شخصیت کا منتظر ہے۔

میری چھٹی حس چیخ چیخ کر خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ سرائے دار کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق وہ لاچی کا باپ ہی ہو سکتا تھا جسے میرے لہو کی پیاس نے بے چین کیا ہوا تھا اور اس کے علاوہ وہاں ایک بوسیدہ تپائی پر بھٹ گرہ کا واحد سپاہی جانی اپنی وردی پر اوور کوٹ پہنے لوگوں سے ہنسی مذاق میں مصروف تھا۔

مجھے اتنا تو یقین تھا کہ ہماری ہیئت کذائی پر لاچی کا باپ ہمیں عورتیں سمجھ کر ہماری طرف آنکھ بھی نہ اٹھائے گا مگر جانی بہت بدتمیز اور گستاخ شخص تھا، وہ ہماری مشکوک وضع قطع پر ضرور چونکتا اور شاید دست درازی کرتے ہوئے چادریں کھینچ لیتا اور اس وقت ہمارے لیے لاچی کے باپ کے برہنہ خنجر سے بچنا محال ہو کر رہ جاتا۔

میں سیتا کا ہاتھ تھامے سامنے پڑنے والی پہلی تنگ گلی میں گھستا چلا گیا۔ چند قدم تیزی سے طے کرنے کے بعد میں نے ہوشیاری سے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر اپنی پشت کو خاصا جھکا کر منہ سے کسی مریض جیسی کراہیں نکالتا آگے ہو لیا۔

”یہ اچانک تجھے کیا ہو گیا؟“ سیتا میری اس اداکاری پر بوکھلا گئی۔

”مجھے نمونیہ ہو گیا ہے۔“ میں کراہتے ہوئے خونخوار لہجے میں غرایا۔ ”میرے ساتھ چلی آ۔ لاری پر لاچی کا باپ خنجر بدست کھڑا ہے۔“

سیتا میرے بدلے ہوئے لہجے سے شاید سہم گئی اور ایک لفظ کہے بغیر میرے ساتھ ہو لی۔

آبادی کا ایک طویل چکر کاٹ کر میں اندازے کی بنا پر اس سڑک کی طرف ہو لیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ لاری کے وہاں سے روانہ ہونے کے بعد اسے راستے میں روکا جائے ورنہ اس قید خانے میں تو چند روز بھی زندہ رہنا محال نظر آ رہا تھا۔

ایک جگہ میں نے کھیل میں مصروف چند بچوں سے لاری کی گزرگاہ کے بارے میں معلوم کیا پھر ہم سیدھ باندھ کر اسی طرف ہو لیے، جدھر ہماری رہنمائی کی گئی تھی۔

نصف گھنٹے کی تھکا دینے والی بھاگ دوڑ کے بعد آخرکار ہم پتھروں سے بنی ہوئی اس پہاڑی سڑک تک جا ہی پہنچے جس سے لاری گزرنے والی تھی۔

یہاں ہمیں چٹانوں کی آڑ میں تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنا

پڑا پھر ویران بلندی سے لاری کے انجن کا تیز شور سُنائی دیا اور ہم دونوں چادروں میں لپٹے سڑک پر آ گئے۔

جوں ہی ڈھلان کے ایک موڑ سے بس گھوم کر نیچے رینگتی نظر آئی ہم دونوں سڑک کے وسط میں آ گئے اور ہاتھ لہرا لہرا کر لاری کے ڈرائیور کو رُکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ چند منٹ بعد ہماری کوششیں بارآور ہوئیں۔ شاید لاری والے نے ہمیں دیکھ کر ہی دو بار کرخت آواز والا ہارن بجایا تھا مگر میں اس وقت تک سڑک سے نہ ہٹا جب تک میرے کانوں میں انجن کی آواز کی تبدیلی نہ پہنچی۔ ڈرائیور نے رفتار سُست کرنے کے لیے نچلا گیئر تبدیل کر کے کلچ چھوڑا تو یک بیک انجن کی آواز تیز ہوئی پھر لاری کی رفتار بتدریج سُست ہوتی چلی گئی۔

لاری رُکتے ہی میں کلینر کے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے سامان سمیت اندر گھس گیا۔ سیتا نے بھی میری تقلید کی۔

"اسے کہاں جانا ہے؟" کلینر میرا ہاتھ جھنجھوڑ کر بولا۔

"شہر!" میں اس کی طرف پلٹ کر غرّایا! اس اثناء میں، میں لاری کے مسافروں کا جائزہ لے چکا تھا! اس میں کل گیارہ نفوس سوار تھے۔ ڈرائیور اور کلینر کے علاوہ تین بوڑھے، دو نوجوان مرد، ایک باپردہ لڑکی اور مختلف عمروں کے پانچ بچّے! اس کے علاوہ پچھلی نشستوں کے قریب کئی سربمہر تھیلے اور بوریاں وغیرہ پڑی ہوئی تھیں۔

ہم دونوں کے بیٹھتے ہی لاری پھر چل پڑی۔ مسافروں میں لاچی کے باپ کو موجود نہ پا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سر سے ٹوپی اُتار دی۔

"شہر سے لاری میں کیوں نہیں بیٹھے؟" نشست پر بیٹھنے کے بعد کلینر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں تیری گردن پر سوار نہیں ہوا ہوں" میں اسے گھورتے ہوئے غرّایا "تجھے کیا تکلیف ہے؟"

"کیوں جھگڑا کرتا ہے، موسم خراب ہے شاید اڈّہ پر پہنچنے میں بے چاروں کو لاری چھوٹنے کا ڈر ہو گا" ان مکالمات پر ایک قوی الجثہ بوڑھا گھوم کر کلینر سے بولا۔

"ارے بابا تم نہیں جانتے ان لوگوں کو، شاید کرائے کے پیسے بھی نہیں ہوں گے ان کے پاس" بوڑھے سے یہ کہہ کر اس نے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیا "کدھر جانا ہے، کرائے کے پیسے نکالو!"

میں نے چرمی جیکٹ کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال لی۔

"یہ لاری کہاں تک جائے گی؟"

نوٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں اور وہ مرعوب لہجے میں بولا "راستہ صاف ہوا تو موٹھ تک جائے گی!"

میں نے ایک نوٹ اس کے حوالے کر دیا! اس نے باقی رقم لوٹائی تو میں نے شانِ بے نیازی سے وہ اسی کو دے دی اور وہ مسترّی یک بیک یوں میرا احسان مند نظر آنے لگا جیسے اس کے آباؤ اجداد تک میری فیاضی سے بہرہ ور ہوتے آئے ہوں۔

سیتا بڑی حیرت کے ساتھ لاری کے سفر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر جمی ہوئی تھیں جہاں تیزی سے بھاگتی ہوئی بھوری پہاڑیاں، برفانی تودے اور خزاں رسیدہ بے برگ و بار درختوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ اسے شاید ابھی تک یقین نہ آ سکا تھا کہ وہ فی الحقیقت ایک تیز رفتار سواری میں موجود ہے جو بیک وقت بہت سے آدمیوں اور سامان کو لیجانے کی استطاعت رکھتی ہے۔

بس کا راستہ بے حد ہولناک اور دشوار گزار تھا۔ بھٹ گرہ سے نکلنے کے تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہی چکر دار مسلسل چڑھائی شروع ہو گئی اور بس رینگتی ہوئی اُوپر جانے لگی۔ بائیں طرف برف پوش چٹانیں تھیں، داہنی طرف گہری کھائیاں اور سڑک پر جمی ہوئی شفاف برف کی ٹھوس سطح، بس ڈرائیور کی مہارت کے لیے کٹھن آزمائش ثابت ہو رہی تھی۔ پہاڑی جنگلوں میں چیختی چنگھاڑتی یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے ساری کھڑکیوں کے شیشے کھینچ لیے گئے تھے اور ان پر ترپال کے پردے ڈال دیے تھے مگر سیتا نے ترپال ہٹا دی تھی۔ اس کی چمکتی ہوئی معصوم نگاہیں شفاف شیشوں کے اس پار بکھرے ہوئے حسین نظاروں میں گم تھیں۔

میری بخشش کے نتیجہ میں لاری کا کلینر میرا دوست بن چکا تھا! اس کی زبانی پتہ چلا کہ لاری کی پہلی منزل کاٹھ مندر ہے! اس بستی میں صدیوں پرانا لکڑی کا ایک حسین مندر موجود تھا جس کی مضبوطی میں صدیاں بھی خلل انداز نہ ہو سکیں۔ مندر کے صحن میں میٹھے پانی کا ایک چشمہ موجود تھا جس سے سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں یخ بستہ پانی بہتا تھا۔ قدرت کے اس بیش بہا عطیہ کی بدولت کاٹھ مندر خاصا خوشحال علاقہ گنا جاتا تھا۔

بستی کے آثار نظر آتے ہی ڈرائیور نے بار بار ہارن بجانا شروع کر دیا اور جب لاری بستی کی حدود میں داخل ہوئی تو سڑک کے کنارے برف کے نرم تودوں میں بے شمار سُرخ و سفید بچّے چیخ چیخ کر لاری پر نرم نرم برف اُچھالنے لگے۔

کاٹھ مندر کی آبادی ان دنوں شدید برفانی ہواؤں کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ تہہ در تہہ اُونی کپڑوں میں لپٹے ہوئے لاری کے نظارے کے شوقین بچّوں کے سوا سڑکوں پر اکا دکا ہی راہگیر نظر آ رہے تھے ورنہ ہر طرف عجیب یاس انگیز ویرانی کا راج تھا۔ علاقے میں ہریالی کا کہیں نام تک نہ تھا۔ درختوں پر خزاں کا پورا پورا راج تھا۔ پتّوں، کونپلوں اور

پھولوں سے محروم بلند و بالا، تناور درختوں کی ننگی شاخیں یاسیت کے تاثر کو اور گہرا کر رہی تھیں۔

پھر لاری ایک جگہ رُک گئی۔ وہاں ہارن کی آوازیں سُن کر کچھ لوگ آ چکے تھے اور ان کی وہاں آمد کسی شوق کا نتیجہ نہ تھی۔ ان میں ایک آدمی کاٹھ مندر کے ڈاک خانے سے آیا تھا! اس نے ایک فارم پر کلینر کے دستخط لیکر دو پارسل اور چند خطوط پر مشتمل ایک سربمہر لفافہ اس کے حوالے کیا پھر کلینر نے ایک فارم پر دستخط لیکر بھٹ گرہ سے آنے والی ڈاک اس کے حوالے کی، چند تاجروں کے سامان کے تھیلے ان کے سپرد کیے، آگے جانے والا مال کاغذی خانہ پُری کے بعد لاری میں بار کیا۔ ان کارروائیوں سے نمٹ کر کلینر نے ڈرائیور سے کچھ بات کی پھر میرے پاس آ گیا۔

"میرے گھر چلو گے؟" اس نے قریب آ کر مجھ سے پوچھا۔

"کہاں؟"

"میری بیوی، میری ماں کے ساتھ یہیں کاٹھ مندر میں رہتی ہے۔ میں آتے جاتے اس سے مل لیتا ہوں اور برفباری کے طوفانی موسم کے آغاز سے پہلے آخری پھیرے میں، میں ان دونوں کو اپنے ساتھ موٹھ لے جاتا ہوں۔ وہ دونوں بالکل تیار میری منتظر ہونگی!" اس نے بتایا۔

"کیا تم موٹھ میں ہی رہتے ہو؟"

"ہاں، وہاں میرے پاس سرکاری کوارٹر ہے!"

میرے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ لاری میں بیٹھ کر اونگھنے سے بہتر تھا کہ اس شہر کے گلی کوچے بھی دیکھ لیے جائیں، کون جانے زندگی میں اس شہر میں آنے کا دوسرا موقع بھی میسّر آ سکے!

اس معاملے میں سیتا میری ہم نوا تھی۔ ہم دونوں جیسے ہی نشست سے اُٹھے، کلینر چونک کر ایک دم اگلی سیٹ میں کسی چیز پر جُھک پڑا، ساتھ ہی اس کے منہ سے تحیّر آمیز آواز بھی نکلی تھی۔

پھر میں نے بھی وہ حیرت ناک منظر دیکھا۔ ہم سے آگے والی نشست کے عقب میں آہنی دستے لگے ہوئے تھے تاکہ پیچھے بیٹھنے والے انھیں پکڑ کر خود کو شدید دھچکوں اور جھٹکوں سے بچا سکیں۔ میرے آگے نصب آہنی دستہ اس وقت زرین چمک دے رہا تھا۔ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ ہمارے سوار ہونے کے وقت اس کا کیا رنگ تھا۔

جوں ہی میری نظریں کلینر سے چار ہوئیں، وہ بڑبڑانے لگا "یہ سنہرا کیسے ہو گیا؟"

"شاید ڈپو والوں نے بدل دیا ہو گا" میں نے اسے ناخن سے کھرچتے ہوئے کہا۔ ورنہ یہ انقلاب دیکھ کر تو میرا دل بھی کنپٹیوں میں دھڑکنے

"ناممکن!" اس نے پُر زور لہجے میں سرگوشی کی "بھٹ گرہ میں ایک رات میں اسی جگہ سویا تھا جہاں تم بیٹھے ہو۔ یہ دستہ لوہے کا ہی تھا!"

اور اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میری نظر اپنے بائیں ہاتھ پر گئی اور یک بیک میرے ذہن میں خوشی کا ایک شدید جھماکا ہوا۔ سیتا بھی صورتِ حال کا اندازہ لگا چکی تھی اور اس وقت وہ پلکیں جھپکائے بغیر پُرجوش انداز میں میرے بائیں ہاتھ کو گھورے جا رہی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ سیتا بولتی میں نے اپنے جوش و خروش کو دباتے ہوئے کلینر سے کہا "چھوڑو، ہوا ہو گا کچھ، کیا تم اپنے گھر نہیں چلو گے؟"

"ہاں... آں!" وہ چونک کر بولا "آؤ!"

راستے میں لاری کا کلینر مجھے کاٹھ مندر کے بارے میں جانے کیا کیا بتاتا رہا اور میں ہوں ہاں کر کے اسے ٹالتا رہا کیونکہ اس وقت میرا ذہن بے وزنی کے عالم میں خلاء میں تیرتا پھر رہا تھا۔ مجھے اپنے اردگرد خوابوں کی ایک جنّت رقصاں نظر آ رہی تھی۔ میری نظریں رہ رہ کر اپنے بائیں ہاتھ پر جا پڑتی تھیں جس کی ایک اُنگلی میں بھونڈے اور سیاہ پتھریلے نگ والی چاندی کی انگوٹھی پڑی ہوئی تھی۔ ان لمحات سے پیشتر وہ انگوٹھی میرے لیے بالکل بے حقیقت اور معمولی تھی! اس کی اہمیت صرف اس جذباتی رشتہ کی وجہ سے تھی جو سندری نے اپنی بیٹی میرے حوالے کر کے قائم کیا تھا۔ سندری بے سر و سامان اور درندوں کے غول میں تنہا ضرور تھی مگر اس کی فراخدلی بے مثال تھی۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے وہ سادہ دل بنتِ جبل مجھے کوئی قیمتی تحفہ تو نہ دے سکی، ہاں اس کی آنکھوں میں لرزتے بیش بہا آنسو یا پھر بظاہر بے وقعت نظر آنے والی چاندی کی انگوٹھی میرے لیے اس کی دو لازوال یادگاریں تھیں اور یہ حقیقت ہے کہ سندری سے رخصت ہونے کے بعد بارہا میں نے اسے یاد کیا تھا۔ جب بھی انگوٹھی پر نظر پڑتی، بے اختیار سندری یاد آ جاتی تھی، جس نے اپنے باپ، انندرام کی دی ہوئی وہ نشانی میرے حوالے کر دی تھی۔

اور اب میرے بائیں ہاتھ میں وہ انگوٹھی یک بیک یوں نمایاں ہو گئی تھی کہ مجھے صرف وہی نظر آ رہی تھی! اس کے سامنے میرا پورا ہاتھ اپنا وجود کھو چکا تھا اور اگر میرا خیال درُست تھا تو وہ انگوٹھی روئے زمین پر میرے لیے اہم ترین مادی شئے کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔

لاری میں کلینر کی نشاندہی پر جب میں آہنی دستے کا جائزہ لے رہا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ میرے بائیں ہاتھ کی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی اس طرح گھومی ہوئی تھی کہ اس کا پتھریلا، سیاہ نگ ہتھیلی کی طرف ہو گیا تھا اور میں اسی ہاتھ سے کافی دیر تک وہ دستہ تھامے بیٹھا رہا تھا اور شاید اسی نگ کے لمس سے وہ لوہا سونے میں بدل گیا تھا۔ یہ قیاس انندرام کے آہنی چمٹے کی ماہیئت کی تبدیلی کے راز پر سے بھی پردہ

ہٹتا رہا تھا۔ شاید نرم نرم برف سے لدی ہوئی زمین پر چھٹے سے محفوظ راہ تلاش کرتے ہوئے کسی طرح اس نادر الوجود انگوٹھی میں جڑا ہوا پتھر آہنی چھٹے سے مس ہوتا رہا اور یوں وہ لوہا ٹھوس سونے میں تبدیل ہو گیا۔

انند رام نے وہ انگوٹھی سندری کو بلاوجہ نہیں دی تھی۔ میں جتنا غور کر رہا تھا اسی قدر یہ امر یقین کو پہنچتا جا رہا تھا کہ بظاہر حقیر اور بے وقعت نظر آنے والی اس انگوٹھی میں نگ کی جگہ پارس پتھر جڑا ہوا ہے جو صدیوں سے محض پُراسرار داستانوں کا ایک موضوع بنا ہوا تھا۔

مگر کیمیاگری کا خبط شروع ہونے سے اب تک کے میرے تجربات نہایت جگر خراش تھے۔ بارہا گوہر مراد ہاتھ آتے آتے منزل اچانک یوں دور ہو گئی کہ زندگی کی آس ٹک جاتی رہی اور جب میں اپنی سخت جانی اور مقدر کی یاوری کے باعث سارے صدمات جھیل کر بھا اندر ناس پالینے میں کامیاب ہو گیا تو یک بیک کہیں سے انند رام، خبیث شیطان بن کر نمودار ہوا اور مجھے میری اس بیش قیمت یافت سے محروم کر گیا اور میں انگلی میں پارس پتھر کی انگوٹھی پہنے، اس کی اصل سے بے خبر سیتا کی تشفی اور اعتماد کے سہارے دھول گری کی خوفناک دلدلی اور برف پوش راہوں پر چل کھڑا ہوا مگر کاتب تقدیر میری ہر تدبیر پر خندہ زن تھا۔ یہ سفر بھی مجھے راس نہ آیا۔ سیتا ایک خون کی مرتکب ہوئی اور میں پل بھر میں اپنے میزبانوں کے محترم مہمان سے خونی مجرم کے درجے پر آ گرا اور کیمیاگری کے شدید جنون کو خیرباد کہتے ہوئے ناکام و نامراد ان ہولناک وادیوں سے بھاگنا پڑ گیا اور اب جبکہ میں کیمیاگری اور پارس پتھر کو خواب کا فسوں سمجھ کر ناامید ہو چلا تھا تو یک بیک پتہ چلا کہ مجھے جس سنگ گراں مایہ کی جستجو ہے وہ تو پہلے ہی سے میری ملکیت ہے مگر اب میں شدید بےیقینی کا شکار تھا۔ مجھے کچھ یقین نہ تھا کہ قدرت نے کتنی مدت کے لیے اس انعام سے مجھے نوازا ہے اور یہ کب اچانک میرے قبضے سے نکل جائے گا۔

میری سوچ کا یہ تسلسل اس وقت ٹوٹا جب ہم کلینر کے مکان پر جا پہنچے۔ اس کی بوڑھی ماں کچے مکان کے دروازے کو تالا لگائے اسی کی منتظر تھی۔ اس کی بیوی کے جوان و رعنا چہرے پر اپنے شوہر کو سامنے پا کر طمانیت کی سرخی پھیل گئی۔

کلینر نے محبت آمیز انداز میں ان دونوں کو ہمارے بارے میں بتایا پھر ٹین کا ایک صندوق اور تنکوں کی ٹوکری پر مشتمل سامان لیکر وہ واپس چل پڑا۔

”یہ ہماری زبان نہیں جانتی۔“ کلینر نے اپنی بیوی کو سیتا میں دلچسپی لیتے دیکھ کر کہا ”یہ صرف ہندوستانی زبان جانتی ہے!“

واپسی میں کلینر نے مختلف راستہ اختیار کیا اور ایک ٹیکری سے ہمیں کاٹھ مندر کی مہیب عمارت دکھائی جس کے سنہرے کلس دور ہی سے چمک رہے تھے اور یوں بمشکل نصف گھنٹہ میں ہی ہم لاری میں واپس پہنچ گئے۔

ہمارے جانے کے بعد مسافروں میں سے کسی نے سنہرے دستے کی طرف توجہ نہیں دی تھی، نہ ڈرائیور کو ہی اس بات کا علم ہو سکا تھا۔ کلینر دونوں عورتوں کو لاری کے اگلے حصے میں بٹھا کر میرے ہی پاس لوٹ آیا۔

”میں آگے چلی جاؤں؟“ اچانک سیتا نے مجھ سے پوچھا۔

”کیوں، یہاں کیا برائی ہے؟“ میں نے اس سے الٹا سوال کر دیا۔

”آگے سے آنے والا لاری کا شور مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ قریب سے سنوں گی اور پھر سامنے والے شیشے سے راستہ بھی اچھا معلوم ہو گا۔“ وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

”چلی جا، مگر کسی چیز سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنا ورنہ لاری پوری رفتار سے کسی کھڈ یا کھائی میں جا گرے گی۔“ میں نے اسے تادیب کی۔

”جا رہی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی ”مگر اب انگوٹھی سے ہوشیار رہ، میری ماں نے یہ تجھے بلاوجہ نہیں دی تھی، شاید اسے نگ کی اصلیت معلوم تھی!“

”بک بک نہ کر۔“ میں نے اسے گھورا ”اگر کسی نے تیری بات سمجھ لی تو ہمیں مار ڈالے جائیں گے۔“

وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔ چلتی لاری میں آگے بڑھنا اس کے لیے بہت دشوار ثابت ہوا۔ وہ کئی جگہ بری طرح لڑکھڑائی مگر کسی نہ کسی طرح میرے سہارے آگے پہنچ ہی گئی۔ اسے چھوڑ کر میں دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا۔

”دیکھو استاد.....!“ کلینر نے میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے بات شروع کرنی چاہی مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”ہو سکے تو کسی کو پتہ چلے بغیر یہ دستہ یہاں سے کھول لو۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ یہ خالص سونے کا ہے، پانسہ کے سونے کا!“ میں نے تیز سرگوشی کی ”میں سیاحت سے پہلے برسوں صراف رہا ہوں اور میری آنکھ ہی کسوٹی کا کام کرتی ہے۔“

”مگر..... مگر یہ ہوا کیسے؟“ وہ الجھن اور بےیقینی کے عالم میں بولا۔

”جیسے بھی ہوا ہو، یہ بعد میں سوچیں گے پہلے اسے نکال کر کہیں چھپا دو۔“

لاری میں مسافر کم ہونے کے سبب ہم سے اگلی نشست خالی پڑی ہوئی تھی۔ کلینر نے اپنی جیب سے پیچ کس نکالا اور چند ہی منٹ میں اگلی نشست کی پشت گاہ سے دستہ کھول لیا اور میرے ہی ایما پر اس نے اپنی ماں کے صندوق کا تالا کھول کر دستہ اس میں دبا دیا۔

”اگر یہ سونا ہی ہے تو موٹھ پہنچ کر ہم اسے بیچ کر مالا مال ہو جائیں گے۔“ اپنے کام سے نمٹ کر وہ مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”وہ سونا تمہارا ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں — سیاحوں کے لیے پیسہ بے حقیقت ہوتا ہے۔“ میں نے شان بےنیازی سے جواب دیا۔

وہ میری بےنفسی سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اسے لوہے کے سونے میں بدل جانے کے بارے میں شدید خلش تھی مگر جب وہ بلا شرکت غیرے اس کا مالک ہو گیا تو اس کے تجسس کی جگہ رازداری کے جذبے نے لے لی۔

دھندلکا پھیلتے پھیلتے لاری گوری شنکر نامی گاؤں جا پہنچی اور ڈرائیور نے وہاں شب باشی کا اعلان کر دیا کیونکہ رات میں ان ہولناک پہاڑی راستوں کا سفر یقینی موت کا پیش خیمہ تھا۔

یہ بستی بھی انتہائی پسماندہ اور عسرت زدہ تھی اور لاری رکنے تک اس کے اردگرد پھٹے پرانے گرم کپڑوں میں ملبوس بہت سے لوگ آ چکے تھے جو واجبی معاوضے پر مسافروں کو اپنے گھروں میں ٹھہرانے کے لیے کوشاں تھے۔ کلینر میرا اتنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ میرے ساتھ ہی کسی مکان میں ٹھہرنا چاہتا تھا مگر مجھے انگوٹھی کی آزمائش کے لیے تنہائی درکار تھی لہٰذا ایک رو ہانسی بڑھیا کے ساتھ ہو لیا جس کا مکان چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

کچے جھونپڑے میں بستر دینے کے بعد بڑھیا باہر جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔ وہاں غربت کا یہ عالم تھا کہ وہ لوگ معمولی معاوضے پر اپنا گھر مسافروں کے حوالے کر کے خود طوفانی سردی میں کھلے آسمان تلے پڑے رہتے تھے مگر میں نے یہ ظلم گوارا نہ کیا اور بڑھیا کو وہیں سونے کی اجازت دے دی۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ بڑھیا سو گئی ہو گی تو میں دبے پاؤں اپنی جگہ سے اٹھا، سیتا نے بڑھیا کا جائزہ لیا اور اس سے مطمئن ہو کر ہم دونوں چربی سے بنائے ہوئے چراغ کے نزدیک ہو گئے۔ جھونپڑے میں کام کی اشیاء کم اور کاٹھ کباڑ زیادہ تھا مگر میں نے کسی وزنی چیز پر لوہے کی چھری کو ترجیح دی۔

روشنی میں غور سے چھری کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ انگوٹھی کا نگ اس کے آہنی پھل سے مس کیا۔ میری اور سیتا کی بےچین نگاہیں لوہے پر جمی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ لوہے کی سیاہی دھندلانے لگی۔ ساتھ ہی لوہے میں نہ جانے کہاں سے ہلکی سی حرارت بھی سرایت کر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چھری کا پھل چمکتے ہوئے سونے میں تبدیل ہو گیا اور میں اسے پھینک کر والہانہ انداز میں سیتا سے لپٹ گیا۔

میرے لیے وہ خوشی کی معراج تھی۔ گو سیتا کو لوہے اور سونے کی قدر و قیمت کا فرق معلوم نہ تھا، اس کے نزدیک یہ صرف رنگ بدلنے کی بات تھی مگر اس نے بھی میری خوشی کا بھرپور ساتھ دیا۔

اگلی صبح، ابھی فضا میں روشنی کی پہلی کرن بھی نہ چمکی تھی کہ ہماری میزبان بڑھیا بیدار ہو گئی اور چولہا گرم کر کے ہمارے لیے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں اس سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران میں فضا لاری کے انجن کے شور سے گونج اٹھی۔ پھر صبح صادق کے طلسماتی سکوت میں اس کا ہارن گونجا۔ یہ سواریوں کے لیے روانگی کا اعلان تھا۔

”یہ رکھ لے ماں!“ میں نے جھونپڑی سے نکلتے ہوئے طلائی چھری اسے تھماتے ہوئے کہا ”یہ کسی ایماندار آدمی کے ہاتھ بیچ کر تو خاصے پیسے کما سکے گی۔“

وہ ضعیف ضرور تھی مگر بصارت کی اس میں اب تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی، اس نے فوراً ہی اسے دیکھا اور سردی سے کانپتی ہوئی تعجب آمیز آواز میں بولی ”یہ تو میری چھری ہے مگر اس کا رنگ سنہرا کیسے ہو گیا؟“

”یہ سونے کی چھری ہے۔“ دوسرا ہارن سن کر میں جلدی سے بولا اور سیتا کو لیے آگے بڑھ گیا۔

ہمارے سوار ہوتے ہی بس روانہ ہو گئی۔ بڑھیا اپنی جھونپڑی کے سامنے کھڑی حیران و پریشان نظروں سے چھری کو گھورے جا رہی تھی۔

اس روز ہمیں سورج دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ صبح ہی سے وادیوں میں گہرے سیاہ بادل امڈے ہوئے تھے مگر تیز ہوائیں بار بار انہیں منتشر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے کلینر کی زبانی پتہ چلا کہ لاری کے عقبی حصے میں رکھے ہوئے ڈیزل کے ڈرم میں کسی طرح ننھا سا سوراخ ہو گیا جس کے باعث ڈرم کے پیندے سے مسلسل تیل رس رہا تھا۔ موٹھ سے چلتے وقت ہی لاری میں پینتالیس گیلن کا ڈیزل سے بھرا ہوا ڈرم رکھ دیا جاتا تھا جو بھٹ گرہ تک دوطرفہ سفر کے لیے کافی ہوتا تھا۔ کلینر اب تک لاری کی ٹنکی میں بیس بائیس گیلن ڈیزل ڈال چکا تھا اور

کم ازکم ستّر میل کی مسافت باقی تھی۔ یہ سوراخ اگر گوری شنکر میں دریافت ہوجاتا تو کوئی متبادل انتظام بھی کیا جاسکتا تھا مگر وہاں سے پندرہ بیس میل دُور آجانے کے بعد واپسی کی کوئی امکانی صورت نہ رہی تھی۔ وہ کچی پہاڑی سڑک اس قدر خطرناک اور پتلی تھی کہ اس پر لاری کا واپس گھمایا جانا ناممکن تھا۔ اسی طرح خطرناک موڑ اور خون آشام کھائیاں ریورس ڈرائیونگ میں مانع تھیں۔ لاری روک کر پیدل گوری شنکر جانے کا خیال ہی احمقانہ تھا کیونکہ اس طرح کافی وقت اور سوراخ کے ذریعے ڈیزل ضائع ہوتا اور اگر گوری شنکر میں کوئی خالی ڈرم مل بھی جاتا تو اسے لاری تک لانا محال تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد لاری روک دی گئی۔ میرے مشورے پر قریب ہی سے چند پہاڑی پتھر اٹھائے گئے اور ڈرم اٹھا کر اس کا پیندا کسی نہ کسی طرح پتھروں پر ٹکا دیا گیا۔ اسے مضبوطی سے رکھنے کے بعد نیچے اتنی جگہ پیدا ہوگئی کہ ہاتھ داخل کیا جاسکے اور یوں ہمیں وہ سوراخ مل گیا۔ کلینر نے لاری کے فرش پر لیٹ کر ایک انگلی سے سوراخ بند کرلیا اور یوں سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ میری اس بروقت تدبیر پر میرے سارے ہی ہم سفر خوش نظر آرہے تھے۔

مگر یہ خوش خیالی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ ایک جگہ بس کو تیز جھٹکا لگا۔ عقبی حصے سے عجیب سی آواز اور اسی کے ساتھ کلینر کی چیخ اُبھری۔ سارے مسافر ہڑبڑا کر نشستوں سے اٹھ گئے اور یہ دیکھ کر سب کے چہرے اُتر گئے کہ سا[illegible] ڈرم سے [illegible] نکلا تھا۔

جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ جب تک ڈرم پیندے کی گوٹ پر ٹکا رہا غنیمت تھا مگر پتھروں پر ٹکائے جانے کے بعد سارا وزن پیندے پر آگیا جو بُری طرح زنگ آلودہ اور کمزور ہوچکا تھا۔ جھٹکا لگتے ہی ایک پتھر پیندے کو پھاڑ کر اندر گھُس گیا اور سارا ڈیزل ضائع ہوگیا۔

یہ صورت حال سخت تشویش ناک تھی۔ ڈرائیور نے دو ٹوک الفاظ میں اعلان کردیا کہ وہ ٹنکی میں موجود ڈیزل کو لاکھ کفایت سے استعمال کرے مگر اب لاری کا موٹھ تک پہنچنا ناممکنات میں سے ہے۔

یہ سُنتے ہی لاری میں ہراس پھیل گیا۔ نوجوان اپنی ساتھی برقعہ پوش لڑکی کی جانب سے تشویش کا شکار تھے اور جب مجھے یہ پتہ چلا کہ اس وقت ہم ایک غیر محفوظ علاقے میں ہیں جہاں جابجا راہزن قبائل آباد ہیں تو میں بھی سخت اُلجھن میں پڑ گیا۔

لاری کا ڈرائیور واقعی بہت ہوشیار تھا۔ اب اس نے یہ ترکیب اختیار کی کہ ڈھلان اُترتے ہوئے وہ لاری کا انجن بند کردیتا تھا اور چڑھائی پر بحالتِ مجبوری انجن چلا لیتا تھا۔

یہ شاید سچ ہی ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ اِدھر لاری انجن کے شدید بحران سے دوچار تھی اُدھر آسمانی قوتیں بھی ہمارے سامنے صف آرا ہو چلی تھیں۔ پہلے ہوائیں بند ہوئیں پھر اچانک گھرے بادلوں سے برف گرنی شروع ہوگئی۔ ڈرائیور کو اب ڈھلان پر بھی احتیاط کے پیشِ نظر انجن چلانا پڑ گیا اور یوں ہمارا پورا کارواں سخت خطرات سے دوچار ہوگیا۔

برفباری شدید ہونے سے پہلے ہی ہوائیں چل پڑیں اور بادلوں کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مگر برفباری ختم ہونے تک راستوں اور پہاڑیوں پر کئی انچ برف جم چکی تھی۔ یہ سطح سڑک پر سفر کے لئے اتنی خطرناک نہ تھی کیونکہ سڑک کے کنارے اور گڑھے اب بھی دیکھے جاسکتے تھے۔

اور ایک ڈھلان پر ڈرائیور نے انجن بند کرتے ہوئے آواز لگائی کہ اب گاڑی رُک گئی تو آگے نہیں جائے گی۔ مسافر اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کرلیں۔

میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ آخری قطرہ تک لاری کو چلاتا رہے مگر وہ نہ مانا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ ڈیزل کی ٹنکی اگر ایک بار خالی ہوجائے تو سارا سسٹم ایرلاک ہوجاتا ہے جسے ٹنکی دوبارہ بھرنے کے باوجود دُور کرنا مشکل ہوتا ہے اور ایسے میں اگر بیٹری بھی ڈاؤن ہوجائے تو اس نیم پختہ پتھریلی سڑک پر لاری کو کھینچنا بھی محال ہوگا لہٰذا کیوں نہ دو چار میل کا لالچ کئے بغیر لاری وہیں بند کردی جائے۔

ڈیزل گاڑیوں کے بارے میں میری معلومات ناقص تھیں لہٰذا میں خاموش ہو رہا۔ پھر ڈرائیور کو نہ جانے کیا سُوجھی کہ اس نے پھر انجن اسٹارٹ کیا اور سڑک کے ایسے حصے پر لاری کنارے سے روک دی جہاں خاصی دُور تک ڈھلان نظر آرہی تھی اور بریک چھوڑتے ہی لاری آگے لڑھکنی شروع ہوجاتی۔

لاری کے تمام پہیوں میں پتھر لگانے کے بعد ڈرائیور اور کلینر مشورہ کرنے لگے۔ ابھی موٹھ یہاں سے کم ازکم پچاس میل دُور تھا اور یہ مسافت ایک روز میں پیدل طے کرنا ناممکن تھا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے مگر دھندلکا اتنا گہرا تھا کہ شام کا گمان ہوتا تھا۔

کافی مباحثہ کے بعد طے پایا کہ وہ رات سب لوگ اسی جگہ بس میں بند رہ کر بسر کریں۔ اگلے روز علی الصبح ڈرائیور پیدل موٹھ کی طرف چل دیتا۔ انہیں یہ تو یقین تھا کہ جب لاری مقررہ وقت پر موٹھ نہیں پہنچے گی تو وہاں سے امدادی پارٹی لاری کی تلاش میں نکلے گی مگر انہیں یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ بدنصیب لاری ڈیزل کی کمی کا شکار ہوئی ہے۔ پھر بھٹ گرہ سے لاری ایک دن پہلے روانہ ہوئی تھی لہٰذا موٹھ والے نہایت اطمینان سے اگلا دن تو انتظار میں گزار ہی دیتے اور یوں کم ازکم ہمارے تین دن ضائع ہوجاتے۔

اس نازک موقع پر مسافروں میں عمر، علاقہ اور جنس کا سارا امتیاز ختم ہوگیا۔ مشترکہ خوف نے سب کو یوں شیر و شکر کردیا تھا جیسے سب لوگ

ایک ہی کنبہ کے افراد ہوں۔ اس وقت بس کی کُل آبادی سترہ نفوس پر مشتمل تھی۔ ان میں تین بوڑھے، پانچ بچے اور سیتا کے علاوہ مزید تین عورتیں تھیں اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری اب کُل چھ افراد پر تھی۔ ڈرائیور، کلینر، بھٹ گرہ سے آنے والے دو نوجوان، سیتا اور میں خود۔

متوقع خطرات پر گفتگو شروع ہوئی تو میں ان لوگوں کو لاری سے نیچے لے آیا کیونکہ اس طرح عورتوں اور بچوں کے حد سے زیادہ خوفزدہ ہوجانے کا امکان تھا۔ نیچے آکر سب سے پہلے میں نے ان سے اسلحہ کے بارے میں دریافت کیا۔ ڈرائیور اور کلینر لمبے پھل والے شکاری چاقوؤں سے مسلح تھے۔ نوجوان نہتے تھے۔ میں نے انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے اس ریوالور اور فالتو راؤنڈز کی موجودگی سے آگاہ کردیا جو مجھے ڈان برین کے سامان سے مالِ غنیمت کے طور پر ہاتھ آیا تھا۔

میرا مفہوم سمجھ کر ڈرائیور پھیکے انداز میں ہنس دیا۔ "اگر لٹیرے آہی گئے تو یہ ریوالور بے کار ہوگا بابو! اگر تم نے ان کے ایک آدمی کو بھی زخمی کردیا تو وہ صرف لوٹ مار پر ہی اکتفا نہیں کریں گے بلکہ چُن چُن کر سارے مسافروں کو مار ڈالیں گے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ایک نوجوان نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ لٹیرے رائفلوں وغیرہ سے لیس ہوتے ہیں، لوٹ مار میں اسلحہ ان کا پہلا نشانہ بنتا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم خود کو لٹیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"نہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔ "اس سے بہتر یہ ہوگا کہ ہم لاری میں رُک کر رات کو ان کے حملے کا انتظار کرنے کے بجائے خود ان کی بستی میں پناہ لے لیں۔"

"یہ سراسر احمقانہ تجویز ہے۔" میں نے سختی سے اس کی مخالفت کی مگر وہ چاروں میرے مقابلے میں ہمخیال ہوگئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لٹیرے عام حالات میں سہل پسند ہوتے ہیں اور جب تک مشتعل نہ کیا جائے خوں ریزی سے گریز کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ قیمتی سامان کو ڈیزل کے ٹوٹے ہوئے ڈرم میں چھپا دیا جائے اور دیگر اسباب لیکر سب لوگ اسی وقت لٹیروں کی قریبی آبادی کی طرف چل دیں تاکہ اندھیرا پھیلنے یا دوبارہ برفباری شروع ہونے سے قبل وہاں پناہ لے سکیں۔

لاری کے مسافروں کے ہمراہ قیمتی سامان بہت کم تھا البتہ نقدی خاصی تھی۔ بیشتر رقم ایسے سامان کے ساتھ ڈرم میں چھپا دی گئی۔ خیال تھا کہ اگر ڈاکوؤں نے ہماری غیر حاضری میں لاری کی تلاشی بھی لی تو وہ تیل کے ڈرم کا رُخ نہیں کریں گے۔

ہم لوگ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تگ و دو کے بعد ایک چھوٹی سی آبادی کے آثار پالینے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ وہاں بڑے رقبہ میں کُل سولہ سترہ مکانات بنے ہوئے تھے۔

"یہاں کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ڈرم سے ڈیزل بہہ گیا ہے۔" ڈرائیور نے سب کو دانشمندانہ ہدایت دی۔ "میں کسی اور خرابی کا بہانہ کردوں گا تاکہ یہ لوگ ڈرم کی طرف متوجہ نہ ہوں۔"

بستی والے دُور ہی سے ہماری جھلک دیکھ کر مکانوں سے نکل آئے اور ہمارے قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ ان کے تیور قطعی غیر دوستانہ نظر آرہے تھے۔

ہم سب لوگ ان کے سامنے جاکر رُک گئے اور ڈرائیور ان سے مخاطب ہوگیا۔ "ہم سب سرکاری لاری کے مسافر ہیں۔ لاری میں کوئی بڑی خرابی ہوگئی ہے اور وہ سڑک پر کھڑی ہے۔ ہم تم لوگوں کے احسان مند ہوں گے اگر موٹھ سے مدد آنے تک ہمیں یہاں پناہ دے دی جائے۔"

چند ثانیوں تک ان پر سکوت چھایا رہا۔ خطرناک چہروں والے مرد معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر چہرے سے خونی لٹیرہ نظر آنے والا ایک پستہ قامت شخص مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔ "ہم کو کوئی اعتراض نہیں لیکن تمہیں یہاں رہنے اور کھانے پینے کا معاوضہ دینا ہوگا۔"

"اس کے لئے ہم تیار ہیں۔" ڈرائیور بولا۔

"تم لوگوں کے پاس کوئی قیمتی سامان تو نہیں ہے؟" اس پستہ قامت مکار شخص کے لہجے میں یہ سوال کرتے ہوئے بلا کا تجسس سمٹ آیا۔

"تھوڑا بہت تو سب ہی کے پاس ہوگا۔" ہماری جماعت کے ایک بوڑھے نے ڈرائیور کو خاموش پاکر کہا۔

پستہ قامت شخص نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا جیسے یہ جان کر اسے اطمینان ہوا ہو۔ پھر بولا۔ "ہم یہاں تمہاری جانوں کی پوری حفاظت کریں گے لیکن سامان کے بارے میں ہمارا کوئی ذمہ نہ ہوگا کیونکہ یہاں آس پاس میں بہت سے ڈاکو رہتے ہیں جو آئے دن ہمارا مال و اسباب چُرا لے جاتے ہیں۔ ہم ان کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے ہیں اس لئے سامان کی کوئی ذمے داری ہم پر نہ ہوگی۔"

"ہمیں تمہاری مجبوری کا پورا احساس ہے۔" بوڑھا بولا۔

پھر خود کو شریف ظاہر کرنے والے ان ڈاکوؤں نے بڑھ کر ہم سب کے ہاتھوں سے سامان لے لیا۔ اس طرح وہ نوعیت اور وزن کی بنا پر مالِ غنیمت کی مالیت کا تعین کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

ہمیں ایک بڑے جھونپڑے میں چھوڑ کر وہ سب یکے بعد دیگرے تیزی سے کھسکتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں دبے قدموں

باہر نکلا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غالباً وہ سب کسی جگہ یکجا ہو کر ہمیں لُوٹنے کا منصوبہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔

دیگر لوگوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔ ہم سب یہ طے کر چکے تھے کہ اگر جانوں کے تحفظ کے بدلے ہمارا سارا اسباب بھی لُٹ جائے تو قطعی مزاحمت نہیں کریں گے۔ بظاہر خود کو حالات سے بے پرواہ ظاہر کرنے کے لئے ڈرائیور نے اپنے تھیلے سے تاشوں کی گڈی نکال لی۔ بوڑھے، بچوں کو سمیٹ کر علاقہ کی کوئی دلچسپ لوک کہانی سنانے بیٹھ گئے۔

میں نے دبے الفاظ میں گفتگو کرتے ہوئے جوکرز کی تلاش میں گڈی اٹھائی۔ اتنے عرصہ بعد وہ باون پتے ہاتھ میں آئے تو اجنبی اجنبی سے نظر آئے۔ اس وقت کسی کا دل کھیل میں نہ تھا مگر خود کو مصروف دکھانا بے حد ضروری تھا۔ آخر طے ہوا کہ ابتدا رمی سے کی جائے۔ میں نے پتے بانٹنے کے لئے اپنے ہاتھ میں موجود گڈی کی طرف دیکھا تو اچانک بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ گڈی میں حکم کی بیگم سب سے اوپر تھی۔ نہ جانے کب میں نے غیر ارادی طور پر اسے اوپر لگا دیا تھا۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے ایک بار میں حُلیہ بدل لینے کے باوجود کراچی میں پہچان لیا گیا تھا جب کہ میں قانون کو مطلوب تھا۔ پھر میں نے عرصۂ دراز تک تاش کے کھیل کا منہ نہ دیکھا مگر یہ عادت شاید میرے لاشعور میں جڑ پکڑ چکی تھی۔

بظاہر ہم سب ہنس بول رہے تھے مگر ہر چہرے پر تشویش کے سائے لرزاں تھے علاوہ سیتا کے جو اپنی حرکات و سکنات سے نہایت بے خوف لگ رہی تھی۔ میں اسے پہلے ہی بس کا سفر منقطع ہو جانے کے سبب سے آگاہ کر چکا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس وقت ہم لیٹروں کے مہمان ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک شخص ہمارے جھونپڑے پر آپہنچا اور اس نے بستی والوں کی طرف سے ہمیں بتایا کہ اس رات بستی میں روایتی طور پر ایک لڑکی بیاہی جانے والی ہے اور ہم سب اس تقریب میں بطورِ خاص مدعو ہیں۔

ہمارے سامنے یہ دعوت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم میں سے ہر شخص سمجھ رہا تھا کہ ہمیں اپنے سامان کے پاس سے ہٹانے کے لئے بستی والوں نے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں وہ ہمارا سارا اسباب غائب کر دیتے پھر ہم سے ہمدردی کرتے ہوئے سارا الزام نامعلوم لیٹروں کے سر تھوپ دیتے۔ یہ سب جاننے کے باوجود ہمارے پاس اس دعوت سے فرار کی کوئی صورت نہ تھی۔

سیتا ماحول پر طاری قنوطیت سے ویسے ہی بیزار اور اکھڑی اکھڑی نظر آرہی تھی۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ شام کو کیا ہونے والا ہے تو وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں مجھ پر برس پڑی۔ "تم سب دعوت میں جھک مارنے جاؤ میں تنہا ان سب کو دیکھ لوں گی، کوئی ایک تنکا بھی نہ لے جاسکے گا۔"

"شاید تو بھول رہی ہے کہ ان لوگوں کے پاس آتشیں اسلحہ کی جھلک بھی نظر آئی ہے۔"

"سیتا صرف ایک بار مرے گی۔" وہ برہم لہجے میں بولی۔ "تم لوگوں کا محکومانہ رویّہ دیکھتے دیکھتے میں تو بیمار پڑ جاؤں گی۔ کیا شہروں میں سب ہی ایسے ہوتے ہیں؟"

"مرنے کی بچی، تیری وجہ سے دوسری عورتوں کی مٹی پلید ہو جائے گی۔" میں دانت پیس کر بولا۔ "عورتوں کے بارے میں ہر دشمن کا رویّہ ایک ہی ہوتا ہے، وہ مرنے سے پہلے زندہ درگور کر دی جائیں گی۔"

"ہونہہ۔" اس نے حقارت سے سر جھٹکا۔ "مجھے تو بے دست و پا کر دینے کے باوجود ڈاان اور رینی میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"یہ عورتیں تیری طرح لنگو۔ دل میں نہیں پلی ہیں۔" میں نے چڑ کر کہا۔

وہ چند سیکنڈ تک خاموشی سے مجھے گھورتی رہی پھر اس کے لبوں کے گوشے کپکپائے اور وہ تیزی سے جھونپڑی سے نکلی چلی گئی۔ میں اسے پکارتا ہوا تیزی سے اس کے پیچھے لپکا مگر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر میں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔ اس کے شانے تھام کر میں نے اسے اپنی طرف گھمایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

"ارے، روتی کیوں ہے پگلی!" میں نے اسے پچکارا۔

"میں لنگوروں میں پلی ہوں نا، میری ماں بھی لنگور تھی۔ جا اب کسی انسانوں میں پلی ہوئی لڑکی سے شادی کر لے۔" وہ غصیلی مگر گلوگیر آواز میں بولی۔

"یہ بات تو میں نے تعریف میں کہی تھی۔" میں بوکھلا کر بولا۔ "اگر ان کی تربیت بھی تیری طرح ہوئی ہوتی تو ہمیں ان کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ وہ خود اپنی حفاظت کر لیتیں۔"

"نہیں ـــــ تو نے مجھ پر طنز کیا تھا۔"

"رام قسم طنز نہیں کیا تھا۔" میں اسے موم ہوتے دیکھ کر بولا۔ اور وہ روتے روتے یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "مسلمان ہو کر رام کی قسم کھاتا ہے۔"

اسے منا کر میں واپس جھونپڑے میں لایا تو ڈرائیور بولا۔ "کیوں بابو! جورو کو کیوں ستاتے ہو؟"

"یہ ذرا بہادر واقع ہوئی ہے اور اس بات کی مخالف ہے کہ ہم دیدہ و دانستہ لیٹروں کو اپنی من مانی کرنے کا موقع دیں۔"

"بات تو واقعی گھٹیا ہے لیکن کیا کریں، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" وہ منہ لٹکا کر بولا۔

اندھیرا پھیلتے ہی بستی ڈھول کے شور سے گونج اٹھی۔ ساتھ ہی گوپال نامی پستہ قد اور مکار رہزن دو آدمیوں کے ہمراہ ہمیں لے جانے کو آپہنچا۔

گوپال کی بے چین اور لالچی نگاہیں بدنصیب لاری کے مسافروں سے زیادہ سامان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے گوپال سے بچوں کو وہیں چھوڑ دینے کے لئے کہا لیکن وہ ایک دم بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ کسی بھی شادی کے موقع پر بستی میں موجود ہر تندرست اور بیمار شخص کو چوپال میں آنا پڑتا ہے۔ کسی کا رُکنا شادی کے لئے بدشگونی شمار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد کوئی گنجائش ہی نہ رہی اور سب لوگ ان کی معیت میں چوپال کی طرف چل پڑے۔ وہاں زمین میں گڑی ہوئی لکڑیوں کے سروں پر جا بجا چربی کی مشعلیں جل رہی تھیں۔ تقریباً پوری ہی بستی وہاں موجود تھی۔ ایک آراستہ مسند پر ایک کریہہ صورت، گنجا اور عمر رسیدہ شخص براجمان تھا۔ اس کے برابر میں ایک قدرے نیچے تخت پر ایک سجی بجائی دلہن بنی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ گوپال نے بتایا کہ وہ گنجا ان کی بستی کا سردار ہے اور لڑکی اس تقریب کی دلہن ہے۔

ہمیں وہاں پہنچا کر گوپال سیدھا سردار کے پاس گیا اور اسے شاید ہم لوگوں کے بارے میں بتایا کیونکہ سردار نے فوراً ہی ہماری طرف دیکھا تھا۔ پھر گوپال نے آراستہ مسند کے سامنے زمین پر لکڑیوں کا ایک الاؤ روشن کر دیا۔ اس مختصر سے الاؤ میں چوبی دستے والی ایک پتلی سی آہنی سلاخ پہلے سے دبی ہوئی تھی۔

الاؤ جل اُٹھنے کے بعد ڈھول کی آواز تیز ہو گئی اور لیٹروں کی تمام عورتیں ایک گیت گاتے ہوئے مسند کے سامنے ناچنے لگیں۔ سردار کے اشاروں اور گوپال کی ہدایت پر ہماری عورتوں کو بھی اس رقص میں ناچار شرکت کرنا پڑی۔ سیتا ان کی بھیڑ میں شامل ہو کر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ وہ ناچتے ہوئے ہر بار کسی نہ کسی عورت کا پیر دبا دیتی تھی۔ گیت میں کئی بار ہلکی پھلکی سُریلی چیخیں بھی اُبھریں مگر وہ رسم بدستور جاری رہی۔ آہستہ آہستہ ہمارے ذہنوں سے سارے خطرات زائل ہونے لگے کیونکہ چند مقامی لڑکیاں بڑی بے باکی سے اپنے رقص میں جنسی انداز نمایاں کرتی جارہی تھیں۔ پھر ڈھول کا آہنگ بدلا اور ان چند لڑکیوں کے علاوہ باقی سب عورتیں تماشائیوں میں لوٹ آئیں اور تین نوجوان اچھل کر وسط میں جا پہنچے۔ میں ذہنی عیاشی کے باوجود گرد و پیش سے غافل نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ سردار کا غیر محسوس اشارہ پا کر گوپال اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے کھسک گیا۔

وہ تین نوجوان قزاق اور ان کی ساتھی چار ... لڑکیاں اب حسن و کلام کے نت نئے جلوے بکھیر رہی تھیں۔ لڑکیاں ڈھول کے آہنگ پر ترنم کے ساتھ شبِ عروسی پر دلہن کی آرزوؤں کا برملا اظہار کر رہی تھیں اور لڑکے دُولہا کی نمائندگی کرتے ہوئے انہیں ہر توقع پوری کئے جانے کا یقین دلا رہے تھے۔

رقص اور گیت کا یہ دَور بہت طویل چلا۔ اس دوران نہ جانے کس وقت گوپال واپس آگیا تھا۔ شاید اسے مسافروں کا سامان ٹھکانے لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی تھی۔

رقص ختم ہونے کے بعد گنجا سردار مسند سے اُترا۔ اس نے الاؤ میں سے چوبی دستہ والی پتلی آہنی سلاخ نکالی جو تپ کر سُرخ ہو چکی تھی۔ وہ نکیلی سلاخ لے کر سردار تخت پر بیٹھی لڑکی کے قریب پہنچا۔ اسی وقت دو عمر رسیدہ عورتیں بھی وہاں آگئیں۔ سردار نے نہایت پھرتی اور مہارت سے گرم سلاخ کا نکیلا سرا لڑکی کے داہنے نتھنے میں اُتار کر واپس نکال لیا۔ دھوئیں کا ہلکا سا مرغولہ بلند ہوا۔ لڑکی نے بے اختیار اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچ لئے مگر اس کے منہ سے اُف تک نہ نکلی۔ سلاخ کے بنائے ہوئے سوراخ میں ایک عورت نے ایک پتلی سی ہڈی پرو دی۔ ناک چھیدنے کے بعد یہی عمل دونوں کانوں پر دُہرایا گیا اور لڑکی کے کانوں میں بھی پتلی پتلی ہڈیاں پرو دی گئیں۔ اس وقت اتفاق سے گوپال میرے قریب کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اس ظلم کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ شادی کی رات ناک اور کان اس لئے چھیدے جاتے ہیں تاکہ دلہن کو اس تکلیف کی وجہ سے کسی اور وقتی اذیت کا احساس نہ ہونے پائے۔

ناک اور کان چھیدنے کے بعد لوگ کسی قریبی مقام سے مختلف برتنوں میں پانی لا کر چوپال کے وسط میں ڈالنے لگے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک وہاں اچھی خاصی کیچڑ نہ ہو گئی پھر سردار نے اپنی مسند کے قریب رکھا ہوا ایک ڈبہ وسط میں آکر اُلٹ دیا۔ ڈبہ میں سے پانی کے ساتھ ہی چھ خاصی بڑی مچھلیاں بھی کیچڑ میں گریں اور پانی ناکافی ہونے کے سبب بُری طرح تڑپنے لگیں۔

ساتھ ہی تیزی سے ڈھول بجنا شروع ہوا اور وہی تین نوجوان جو قبیلے کی لڑکیوں کے ہم رقص رہے تھے، پتلی اور چمکدار انی والے نیزے لے کر وسط میں آکودے۔ تماشائی فرطِ جوش سے چیختے چلاتے کیچڑ میں تڑپتی ہوئی مچھلیوں کے گرد سمٹ آئے اور وہ نوجوان پینترے بدل بدل کر کیچڑ میں تڑپتی ہوئی مچھلیوں پر وار کرنے لگے۔ قبائلیوں کے شور سے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی اہم مقابلہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے آدمی کی

زبردست حوصلہ افزائی کررہے تھے اور وہ تینوں نیزے تول تول کر شاید مچھلیوں کے کسی خاص حصے کو نشانہ بنا رہے تھے کیونکہ ابھی تک کسی مچھلی سے کوئی نیزہ مس نہیں ہوا تھا۔

یہ مقابلہ لاری کے مسافروں کے لئے بھی بے حد دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ پھر ایک نوجوان نے نیزہ تول کر مچھلی پر وار کرنا چاہا۔ مچھلی اچانک تڑپی، نوجوان نے بڑھتے ہوئے نیزہ کو روکنا چاہا مگر اس کے مقدر نے یاوری نہ کی اور نیزہ کی انی زد میں آئی ہوئی مچھلی کے پیٹ میں پیوست ہوگئی۔

نوجوان نے سخت مایوسی اور جھلاہٹ کے عالم میں نیزہ کی انی زمین پر دے ماری۔ تڑپتی ہوئی مچھلی بے جان ہوچکی تھی۔ نوجوان نیزہ وہیں چھوڑ کر تماشائیوں کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ اس کے رویے سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ مقابلہ ہار چکا ہے۔ اب میدان میں صرف دو حریف رہ گئے تھے۔ پانچوں مچھلیوں نے انہیں بُری طرح زچ کیا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" سیتا نے جوشیلی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ وہاں تو ہر ایک فرطِ جوش سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ کوئی ہوش میں ہوتا تو میں اس سے اس انوکھے کھیل کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔

وہ دونوں ہی ماہر نشانہ باز معلوم ہوتے تھے۔ بعض اوقات تو زد پر آئی ہوئی مچھلی کے جسم کے کسی غیر مطلوب حصے سے نیزہ کی انی یوں صاف بچائے جاتے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ مقابلہ طویل سے طویل تر ہوتا جارہا تھا۔ آخر کار مجھے ایک قدرے لنگڑا شخص بھیڑ کے پیچھے اکیلا کھڑا نظر آیا۔ وہ اس مقابلے میں کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کررہا تھا۔

اس کی زبانی مجھے بعض عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔ اس رہزن قبیلے میں لڑکی کے شوہر کے انتخاب میں کسی کی مرضی اور پسند یا ناپسند بالکل بے معنی تھی۔ لڑکیوں کے گناہ پرور رقص کے دوران تین نوجوانوں نے یک رقص ہوکر دلہن کے لئے اپنی اُمیدواری کا اعلان کیا تھا۔ دلہن ان سہیلیوں سے کھلے بندوں اظہار و اقرار کے بعد انہیں امتحان سے گزرنا تھا۔ ان تینوں کو کیچڑ میں تڑپتی ہوئی کسی بھی مچھلی کی ایک آنکھ نیزہ سے پھوڑنی تھی۔ جو بھی سب سے پہلے اپنے نیزہ کی انی کسی مچھلی کی آنکھ میں اتار دیتا وہی لڑکی کا مستحق قرار پاتا۔ مچھلی کے جسم کے کسی دوسرے حصے میں انی پیوست ہونے کی صورت میں وہ اُمیدوار مقابلے سے خارج کردیا جاتا۔ میدان میں دو حریف رہ جانے کے بعد اگر ایک کا نیزہ مچھلی کی آنکھ کے بجائے جسم کے کسی اور حصے میں اُتر جاتا تو وہ بھی مقابلے سے خارج قرار پاتا اور باقی رہ جانے والا آخری اُمیدوار مچھلی کی آنکھ پھوڑے بغیر لڑکی کا حقدار قرار پاتا۔

میری زبانی یہ تفصیلات معلوم ہونے کے بعد میرے ساتھیوں میں نئی دلچسپی پیدا ہوگئی اور اب وہ مقابلے کے ہر پہلو سے لطف اندوز ہونے لگے۔

"یہ تو بہت معمولی سی شرط ہے۔" معاملے کی نوعیت معلوم ہونے پر سیتا منہ بنا کر بولی۔ "بھلا مچھلی کی آنکھ میں نیزہ اتارنا بھی کوئی بات ہے۔ لڑکی بیاہنے کے لئے یہ شرط بہت آسان ہے۔"

"مُردہ مچھلی کی آنکھ نہیں پھوڑنی ہے۔" میں اس کے بڑے بڑے دعووں سے ہمیشہ چڑ جاتا تھا۔

"ہاں ہاں، میں سمجھ گئی۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ "یہ کام تو میں چٹکی بجاتے میں کرسکتی ہوں۔"

"اگر مچھلی نر ہوئی تو شاید تمہاری مسکراہٹ پر خود ہی اپنی آنکھ نیزہ کی زد میں دے بیٹھے۔" میں غصے میں بولا۔

مگر وہ اپنے دعوے پر اڑی رہی اور میں بھی اسے شرمندہ کرنے کے خیال سے گوپال کے پاس جا پہنچا جو سردار کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"میری ساتھی بہترین نشانہ باز ہے، وہ بھی ان مچھلیوں پر اپنا نشانہ دکھانا چاہتی ہے۔"

اس نے حیرت اور بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"وہ صرف دس منٹ کا وقت مانگتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ممکن ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مقابلہ شروع ہوئے بہت دیر ہوچکی ہے وہ دونوں بھی بُری طرح تھک چکے ہیں، اتنی دیر میں تازہ دم ہولیں گے۔"

اس نے سردار سے مشورہ کرکے مقابلہ ملتوی کرنے کا اعلان کردیا اور جب اس نے لوگوں کو سیتا کے دعوے کے بارے میں بتایا تو ہجوم میں تیز سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ لوگ اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے اس کے سر پر اچانک سینگ نکل آئے ہوں۔

مقابلہ کے دونوں حریف تھکے قدموں مگر پُرجوش چہروں کے ساتھ تماشائیوں میں آملے۔

گوپال نے مقابلے سے خارج تیسرے اُمیدوار کا نیزہ سیتا کے حوالے کردیا۔ سیتا نے ایک بار ہاتھ پر اسے تولا اور مجھ سے بولی۔ "یہ بہت ہلکا ہے۔ انہیں بتادے کہ میں مچھلی کی آنکھ اس طرح پھوڑوں گی کہ نیزہ اس میں پیوست نہ ہونے پائے گا۔"

"زیادہ ہرزہ سرائی نہ کر، لوگ پہلے ہی تجھ پر مسکرا رہے ہیں۔"

"ابھی ان کی آنکھیں ندامت سے جھک جائیں گی۔ میں کہتی ہوں بتادے سب کو۔"

میری لڑکی اپنے فن کے مظاہرہ کی اجازت دینے پر سردار کی ...زار ہے۔" میں نے سیتا کی تسلی کے لئے نیپالی زبان میں ایک مختلف ...کا اعلان کیا اور وہ مطمئن ہوکر نیزہ بدست کیچڑ میں تڑپتی مچھلیوں ...ف بڑھ گئی۔

سیتا چند ثانیوں تک نہایت لاپرواہی سے فضا میں نیزہ ...ہرا کر مچھلیوں کی اچھل کود کا گہرا مشاہدہ کرتی رہی۔ اس کی ان حرکات ...اناڑی پن نمایاں تھا لہٰذا مجمع دل کھول کر اس کا مضحکہ اڑانے لگا۔

پھر وہاں بھڑکتی مشعلوں کی سُرخ روشنی میں سیتا کے ہاتھ ...ے ہوئے نیزے کی انی بجلی کی طرح چمکی اور ایک مچھلی کی آنکھ ...ع ہوگئی۔ نیزہ مچھلی کی آنکھ پھوڑ کر نہایت صفائی سے فضا میں اُٹھ ...تھا اور زخم خوردہ مچھلی بُری طرح تڑپنے لگی تھی۔

ہجوم کے تحسین آمیز نعروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور میں ...فخر سے اپنا سر بلند کرلیا۔ اگر میں سیتا کے دعوے کا اعلان کردیتا تو ...ی تماشائی اس کارنامے پر ششدر رہ جاتے۔

پھر سیتا بقیہ چار مچھلیوں کو چھوڑ کر اسی زخم خوردہ مچھلی کی طرف ...ی اور اس بار نیزے کی انی مچھلی کی آنکھ میں پیوست ہوگئی اور سیتا ...آخری سانسوں پر تڑپتی ہوئی مچھلی کو نیزے میں پروئے اوپر اٹھا لیا۔ ...آواز یک بیک تیز ہوگئی۔ تحسین اور تعریف کے فلک شگاف نعروں سے ...ین لرزنے لگی اور سیتا وہ نیزہ زمین پر پھینک کر میرے پاس آگئی۔

"میں نے زندگی میں اتنا سچا نشانہ باز نہیں دیکھا۔" گنجا سردار ...بھی آواز میں بولا۔ "تُو انعام کی مستحق ہے۔ میں تیرے تمام ساتھیوں کو یہاں ...یام کا کرایہ معاف کرتا ہوں۔"

چند لمحوں بعد لڑکی کے دونوں اُمیدواروں کے درمیان دوبارہ مقابلہ شروع ہوگیا۔ اس بار ضرورت سے زیادہ پھرتی کے مظاہرہ میں ایک ...ریف کا نیزہ مچھلی کے گلپھڑے میں اُتر گیا اور اس کا مدِ مقابل خوشی سے فضا میں اچھل پڑا۔

کھلے آسمان تلے، سرد ہواؤں میں سردار نے لڑکی مقابلے کے فاتح کے حوالے کردی جو مقررہ شرط پوری کئے بغیر اس کا حقدار بن چکا تھا۔ دُولہا، دلہن سردار کی معیت میں جلوس کی شکل میں چل دیئے اور ہم لوگ آدھی رات گئے اپنے جھونپڑے میں آگئے۔

وہاں حسبِ توقع میدان بالکل صاف تھا۔ گوپال اور اس کے ہمراہی جھونپڑی سے بستروں سمیت ایک ایک چیز اُٹھالے گئے تھے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ان لٹیروں نے ہمارا مال واسباب ہتھیانے کی نیت سے شادی کا ڈھونگ رچایا ہے مگر اس تقریب میں شرکت کے بعد میرا خیال قدرے بدل چکا تھا۔ شاید اس لڑکی کی شادی مستقبل قریب میں ہونے

والی تھی اور وہ ہمیں بالجبر لُوٹنا بھی نہ چاہتے تھے لہٰذا اپنی سادہ رسوم کی بنا پر فوری طور پر لڑکی کی شادی کا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح ایک پنتھ دو کاج ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد گوپال چند آدمیوں کے ہمراہ بوکھلایا ہوا ہمارے پاس پہنچا اور پھُولے ہوئے سانسوں کے درمیان پوچھا۔ "ڈ ڈ ..... ڈاکو یہاں تو نہیں آئے تھے؟"

"ہمارا ایک ایک تنکا لُوٹا جاچکا ہے۔" ایک نوجوان نے مایوسی سے کہا۔

"بستی میں بھی دو جھونپڑے لُوٹے جاچکے ہیں۔" وہ اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "دلہن کا مکان بھی صاف پڑا ہے مگر مجھے سب سے زیادہ تمہارے اسباب کی فکر تھی۔"

"اب ہم ہر فکر سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں رہنے کا کرایہ سردار پہلے ہی معاف کرچکا ہے ورنہ ہمیں تو تن کے کپڑے بھی یہیں چھوڑنے پڑ جاتے۔"

"ہم ایسے ظالم نہیں ہیں۔" وہ لٹیرا فیاضی کے اعلان پر اُتر آیا۔ "صبح ہم تمہارے آدمی کو ایک تندرست خچر دے دیں گے تاکہ شہر سے جلدی مدد آسکے۔"

"یہ تمہاری بڑی عنایت ہوگی۔" ڈرائیور نے پیدل سفر سے جان بچنے پر دلی مسرت کے ساتھ کہا۔ "برفباری شروع ہو گئی تو ہم یہیں محصور ہو کر رہ جائیں گے۔"

مال و اسباب کے ساتھ جو بیتنی تھی وہ بیت چکی تھی اور اب کسی کو مزید چوری چکاری کا ڈر نہ تھا لہٰذا رات کا باقی حصہ سب نے گہری نیند سو کر گزارا۔ خور و نوش کا بندوبست بستی والوں نے ہی کیا مگر خوراک بہت کفایت سے فراہم کی گئی۔ ناشتے سے نمٹتے ہی لاری کا ڈرائیور خچر کے ذریعے موتھ روانہ ہو گیا۔

وہ دن سب نے ڈرائیور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے جھونپڑے ہی میں گزارا۔ اگلے روز دوپہر تک ڈرائیور خچر پر واپس آگیا۔ موتھ سے وہ خچر کو بھی پک اپ پر لاد کر لایا تھا مگر سڑک سے آبادی تک دوبارہ اسی پر سفر کرنا پڑا۔ خچر بستی والوں کے حوالے کر کے ہمارا کارواں واپس لاری کی طرف روانہ ہو گیا۔ گوپال اور گنجے، مکروہ سردار نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں رخصت کیا کیونکہ اس ڈاکے میں خاصا مال ان کے ہاتھ آیا تھا۔ طلائی چمڑے کے کٹے ہوئے تمام ٹکڑے بھی اسی ایک تھیلے میں تھے جو وہ لٹیرے ہماری عدم موجودگی میں اُٹھا لے گئے تھے۔

سڑک پر لاری کے آگے ایک کھُلی پک اپ موجود تھی۔ اس کے عقبی حصے میں مختلف اوزاروں کے علاوہ ڈیزل کا ایک ڈرم بھی موجود تھا۔ لاری تک آنے سے پہلے ہی سڑک کے کسی کشادہ حصے پر پک اپ کو واپس گھما کر بقیہ راستہ ریورس میں طے کیا گیا تھا کیونکہ اب پک اپ کا رُخ بھی موتھ کی طرف تھا۔

ہم لوگوں نے واپس آکر سب سے پہلے ڈیزل کے ٹوٹے ہوئے ڈرم کا جائزہ لیا مگر وہ خالی پڑا ہوا ہماری ہوشیاری کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ ان لٹیروں نے ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور ہم ان کے خلاف کچھ بھی نہ کرسکتے تھے۔

ٹنکی میں ڈیزل بھرنے کے بعد سفر بڑے سکون سے جاری رہا۔ سارے راستے پک اپ ہماری لاری کے آگے آگے چلتی رہی۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد رفتار کچھ سُست کردی گئی اور آخر کار رات میں لاری موتھ جا پہنچی۔

رات کا سناٹا موتھ کی پوری بستی پر حاوی تھا۔ نشیب اور بلندیوں پر پھیلے ہوئے مکانات سے آنے والی ٹمٹماتی روشنیاں خوابناک سماں باندھ رہی تھیں۔ اور مجھے اس شہر میں اتنی رات گئے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش دشوار نظر آرہی تھی۔

مگر میرا یہ مسئلہ کلینر نے حل کردیا۔ "اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"فی الحال تو رات گزارنے کی فکر ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پھر کھٹمنڈو جانے کا ارادہ ہے۔"

"اس وقت تو کوئی جگہ ملنی مشکل ہے۔ میرے کوارٹر میں تمہیں تنگی تو ہوگی مگر یہ رات وہیں گزار لو تو بہتر ہے۔"

میں نے اس کی پیشکش بلا تاخیر قبول کرلی۔

راستے میں میں نے اس سے ڈکیتی کی واردات پر افسوس کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑا۔ "میں نے سارا سامان کھو کر بھی بہت کچھ پالیا ہے دوست! میں نے وہ طلائی دستہ ہر وقت اپنی جان سے لگا کر رکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے نیفے میں سے وہ طلائی دستہ نکال کر میرے سامنے کردیا۔ اب تک میں یہی سمجھتا آرہا تھا کہ کلینر نے وہ سونا ڈیزل کے خالی ڈرم میں چھپایا تھا جسے لٹیرے نکال لے گئے مگر اب مجھے اس کی خاموشی اور ہوشیاری کا پتہ چلا تھا۔

"نیفے میں ایک طرف یہ دستہ تھا اور دوسری طرف چاقو۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں نے زندگی میں اتنی قیمتی کسی چیز کو چھُونے تک کا تصور نہیں کیا تھا اور اب کوئی مجھے اس سے محروم نہیں کرسکتا۔"

کلینر سے زیادہ اس کی بیوی خوش مزاج تھی۔ دوسرے مسافروں سے الگ ہونے کے بعد جب کلینر نے تفصیل سے اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ میری گرویدہ ہو گئی اور راستہ بھر ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ سیتا کو اس کی یہ بے تکلفی بُری طرح کھل رہی تھی

اور رات کو سونے سے پیشتر اس نے اپنا فرمان سُنا دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی اس تنگ کوارٹر کو خیرباد کہہ دے گی۔ اس کی وجہ اس نے میرے اصرار پر بھی نہ بتائی۔

اگلے روز دوپہر کے وقت موتھ سے ایک لاری کھٹمنڈو روانہ ہونے والی تھی اس لئے میں ناشتے کے بعد ہی گھر سے نکل آیا۔ کلینر ہماری رہنمائی کے لئے ساتھ تھا۔ میرے ایما پر اس نے طلائی دستہ بھی ساتھ لے لیا تھا۔

موتھ قدرے کم بلندی پر واقع ہونے کے سبب بہت زیادہ سرد نہ تھا۔ ہواؤں میں خنکی ضرور تھی مگر چمکتے سورج کے سائے میں یہ ہوائیں ناخوشگوار نہیں تھیں۔ موتھ سیتا کے لئے شہرِ عجائبات سے کم نہیں تھا۔ وہاں دو تین لاریاں بھی چلتی تھیں۔ شہر کے بعض باحیثیت لوگوں کے پاس جیپ گاڑیاں بھی تھیں اور ہاتھ سے کھینچے جانے والے رکشے تو قدم قدم پر عام تھے۔

سامان کی رسل و رسائل میں لاری کی اہمیت کے باعث شہر میں کلینر کی شناسائی کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس نے طلائی دستہ میرے حوالے کردیا تاکہ میرے نام سے وہ کسی دوکاندار کو فروخت کرسکے۔ اپنے نام سے وہ سونا بیچنے میں اس کی حیثیت مشکوک ہوجاتی۔

جس دکاندار کو ہم نے وہ دستہ دکھایا، وہ پہلے تو ہکا بکا رہ گیا۔ شاید سونے کی اتنی بڑی مقدار اس نے کبھی اکھٹی نہ خریدی ہوگی۔ اس کا وزن کیا گیا تو وہ اڑتیس تولے سے زائد نکلا۔ سونے کی مالیت آٹھ ہزار سے اوپر بنتی تھی۔ دکاندار نے مجھے پورے آٹھ ہزار کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔ باہر آکر وہ رقم میں نے کلینر کو دی تو خوشی سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے بہت چاہا کہ کچھ رقم میں بھی رکھ لوں مگر میں نہ مانا اور اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ رقم جیب میں رکھ لی۔

موتھ کے بازاروں کی چہل پہل اور رونق دیکھتے ہوئے وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ ہمیں احساس ہی نہ ہوسکا اور بھاگ دوڑ کرکے ہم بمشکل کھٹمنڈو جانے والی لاری میں سوار ہوسکے۔

کھٹمنڈو کی طرف میری واپسی کا سفر بہت کامران تھا۔ میں اپنا گوہرِ مقصود بہتر روپ میں حاصل کرچکا تھا۔ بھاندر ناس پلینے کے بعد زہریلے بخارات اور تیزابی مادوں سے گریز ناممکن تھا جو آخرکار کیمیاگر کو خون تھوکنے پر مجبور کردیتے ہیں جبکہ پارس کا صرف مَس ہی لوہے کو سونے میں بدلنے کی قدرت رکھتا تھا۔

کھٹمنڈو، نیپال کا وہ شہرِ غدار تھا جس نے مجھے بے شمار دکھ پہنچائے تھے۔ جہاں قدم رکھتے ہی میں بُری طرح غنڈوں اور بدمعاشوں کے چنگل میں جا پھنسا تھا جن کا اہم ترین ہرکارہ ایرجان کافی دنوں مجھ پر چھایا رہا۔ پھر زیرو پوائنٹ نامی خفیہ جوئے خانے پر نہ صرف میرے ہاتھوں مارا گیا بلکہ جراثیم اور تعفن سے نجات پانے کے لئے مجھے اس کی لاش شراب میں نہلا کر نذرِ آتش کرنی پڑی تھی۔ کھٹمنڈو کے منشیات کے تمام ٹھکانے اور سارے غیر قانونی اڈے میرے ٹھکانے تھے پھر اس سیاہ تنظیم کے خبطی سربراہ نرائن داس کی شہہ پر میں پرونز آرٹ فیکٹری کا منیجر بنا۔ انندبھون میں نرائن داس اور اس کے خونخوار محافظوں سے خونریز معرکے ہوئے اور میں نے تنظیم کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ نرائن داس کی جوان اور خوبرو بیوہ گیتا رانی ابھی تک مجھے یاد تھی جس کے گھناؤنے چہرے کو قدرت نے حُسن کا دلفریب نقاب عطا کیا ہوا تھا۔ لونا مارٹن یاد آئی جو سیکریٹری سے میری بیوی بنی اور ایک معرکے میں وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ گئی۔ اس شہر کا سب سے بڑا گروہ بند ہپی بڈ یاد آیا جس نے مجھ پر پے در پے کئی احسانات کئے مگر اپنا راز چھپانے اور انند رام کا تعاقب کرنے کے لئے مجھے اپنے ہاتھوں بے رحمی سے اس محسن کو ٹھکانے لگانا پڑا کیونکہ اس وقت میں قانون سمیت بے شمار دشمنوں کے نرغے میں تھا جو مجھ سے بہت قوی اور سفاک تھے۔

یہ واقعات یاد آتے ہی میرے وجود میں سویا ہوا وہ صفدر علی انگڑائیاں لینے لگا جو بے خوف تھا اور جس کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ ایک بار پھر میں اس شہر میں جارہا تھا جو اب بھی میرے دشمنوں سے بھرا ہوا تھا، ایسے دشمن جو اب بھی میرا سُراغ پاکر میری ہلاکت کے لئے اپنے سارے وسائل داؤ پر لگا دیتے۔

مگر اب میرا حُلیہ کافی بدل چکا تھا۔ ہولناک پہاڑی وادیوں کے سفر، خون آشام بلکہ آدم خور برفانی قبائل اور بے شمار دوسرے فطری خطرات نے میری ظاہری ہیئت تک بدل کر رکھ دی تھی۔ میرے ستھرے اور حسین چہرے پر اب اُلجھے ہوئے لمبے لمبے بالوں کا ایک گھنا جنگل اُگا ہوا تھا جو وقتی طور پر مجھے ان فوری دشمنوں سے بچانے میں معاون تھا۔ اپنے اس قدرتی بہروپ کی آڑ میں میں اپنے دشمنوں پر کسی بھی وقت کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ اور اس مہم میں سیتا میری ہمراہی تھی جس کی سلامتی کی مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ وہ خود خطرات کی رسیا تھی، ان میں کُود کر حظ اُٹھانے میں ملکہ رکھتی تھی۔

لاری یکساں رفتار سے بڑھتی جارہی تھی اور میں ایک پرانے شہر میں داخل ہونے کے نئے انداز اپنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ وہاں میرے بہت سے پُرانے حساب باقی تھے جنہیں چُکانے کی آرزو منزل قریب آنے کے ساتھ لحظہ بہ لحظہ شدید تر ہوتی جارہی تھی۔

راستہ میں لاری ہچکولے کھاتی اپنی منزل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور میں اپنے ذہن میں آنے والے دنوں کا خاکہ تیار کر رہا تھا۔ پیر دھند لکا پھیلنے سے قبل ہی میرے جانے پہچانے علاقے نظر آنے لگے۔ نیلی سفید نسل کے ہپیوں کا پہاڑی مسکن لحظہ بہ لحظہ قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر لاری اپنے اڈہ پر جا کر رُک گئی۔ طویل سفر سے اُکتائے ہوئے مسافر سکون کا سانس لیتے نیچے اُترنے لگے۔

"کیا رات یہاں پڑاؤ ہوگا؟" سیتا کی آواز نے میرے خیالات کا طلسم بکھیر دیا۔

"لاری اس سے آگے نہیں جائے گی۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "کچھ دن ہم اسی شہر میں قیام کریں گے اس کے بعد آگے روانہ ہوں گے۔"

گو شہر میں شام کا اندھیرا پھیل چلا تھا مگر اس شہر کی زندگی اس وقت بھی رواں دواں تھی۔ لاری کے اڈہ پر رنگا رنگ انسانوں، اشیاء اور دکانوں کا ایک ہجوم تھا جس کا ہر حصہ سیتا کے لئے عجائبات میں شامل تھا۔ گرد و پیش میں بے شمار لاپرواہ غیر ملکی ہپی جوڑے اپنی ترنگ میں کھوئے ہوئے تھے اور سیتا اس وقت کسی ایسے چوپائے سے مشابہ نظر آ رہی تھی جس نے پوری زندگی جنگل میں بسر کی ہو۔ پھر یک بیک اسے اپنے ہم نسلوں سے الگ کر کے انسانوں کی بھیڑ میں چھوڑ دیا گیا ہو۔

"یہاں میرا نام لینے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اچانک سیتا کے کان کے نیچے تیز سرگوشی کی کیونکہ اسی وقت قریب سے چند لڑکے اردو میں ہنسی مذاق کرتے گزرے تھے اور یہاں سیتا کی ہر بات بآسانی سمجھی جا سکتی تھی۔ پھر نام تو کسی بھی زبان میں ہو، پہچانا جا سکتا ہے۔ مجھے پہلے اس خطرے کا بالکل احساس نہیں تھا مگر ان لڑکوں کی بول چال نے مجھے بروقت چوکنا کر دیا۔

اندرام کے تعاقب میں جب میں پہاڑی وادیوں میں داخل ہوا تو اپنی دانست میں میں نے اپنا ماضی شہروں اور بستیوں میں دفن کر دیا تھا۔ میں ایک نیا روپ لے کر ان برفانی وادیوں میں گھسا تھا جہاں میرے ماضی کا کوئی شناسا نہ تھا اور کھٹمنڈو کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میرا سنسنی خیز ماضی تمام مہیب خطرات سمیت سامنے آ گیا۔

چند ماہ کی مدت انسانی ذہنوں کے لئے بے حقیقت ہوتی ہے اور جو نام ایک دفعہ شہرہ پا جائیں انہیں لوگ برسوں نہیں بھولتے۔ میں نے اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے اس شہر کے گلی کوچوں میں قدم بقدم انسانی لہو کی ہولی کھیلی تھی۔ امیر خان، نرائن داس، گیتا رانی، دبے سبنا، بڈ، لونا مارٹن، انند بھون، برونز آرٹ فیکٹری ——— یہ سارے نام میرے ذہن میں تازہ تھے اور کھٹمنڈو والوں کو بھی یہ نام یاد ہوں گے میرے نام سے وابستہ خونریز معرکے ان کے ذہنوں میں نقش ہوں گے کیونکہ اس شہر کی تاریخ میں کبھی اتنے بڑے پیمانے پر خونریزیاں نہ ہوئی ہوں گی اور اگر کسی کو شبہ بھی ہو جاتا کہ میں وہی مفرور صفدر علی ہوں تو وہ میری آزادی کا آخری لمحہ ہوتا۔ پھر سولی میرا مقدر قرار پاتی یا زنداں کی سلاخیں میری زندگی کی رفیق بن جاتیں۔ اور ان دونوں میں کوئی بھی صورت پسندیدہ ہرگز نہ تھی۔

"تیرا نام نہ لوں۔" سیتا نے مجھے گھورتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "کیا تو چوری کر کے یہاں سے بھاگا تھا؟"

"ان بستیوں میں اپنے جانی دشمنوں کو بھی مارنا جرم ہے سیتا!" میں نے راہگیروں سے ہوشیار رہتے ہوئے کہا۔ "مگر میں نے یہاں اپنے بیشتر دشمنوں کو مار ڈالا تھا اور اسی لئے یہاں کا قانون میرا متلاشی ہے۔"

"پھر میں تیرا اپنا نام رکھے دیتی ہوں۔" وہ شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟"

"چاند کہوں گی میں اب تجھے۔"

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ وہ راستہ بھر ہر چیز کو حیران نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس پر بار بار حیرت کے دورے پڑ رہے تھے اور مجھ پر سوالات کی بھرمار ہو رہی تھی جن کے باعث میرے لئے یکسوئی سے کچھ سوچنا ممکن نہ رہا تھا۔ میرے لئے اس شہر میں سب سے بڑا مسئلہ پناہ کا تھا اور میں بلا تامل تین مقامات کا رُخ کر سکتا تھا۔ پہلی جگہ اندرام کی خوشبوؤں میں بسی وہ پہاڑی خانقاہ تھی جہاں اندرام کی آزادی کی تعلیمات سے مغلوب سفید نسلوں والے ہپی جمع رہتے تھے، دوسرا ٹھکانہ وہ کھنڈرات بن سکتے تھے جہاں کھٹمنڈو کے ہپیوں کا سب سے بڑا کیمپ تھا۔ اس کیمپ پر حکومت کرنے والا شہر کا خطرناک ترین گروہ بند اور میرا محسن، بڈ میرے ہی ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور اب اس کے بعد وہاں زیادہ چھان بین کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ مگر میرا ارادہ تیسرے مقام پر جانے کا تھا۔ نرائن داس کی ہلاکت کے بعد اس کے گروہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی آوارہ اور جواں سال بیوہ اس دھندے کو آگے نہ بڑھا سکی ہو گی کیونکہ امیر خان کی موت کے باعث نچلی سطح کے تمام رابطے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ اس اعتبار سے زیرو پوائنٹ کی عمارت ویران ہو گی تھی۔ آبادی اور انسانوں سے دُور وہ ایسا گوشۂ عافیت تھا جہاں میں چند دن بے فکری سے گزار سکتا تھا۔

میں شہر کے نسبتاً نیم آباد اور ویران علاقوں سے گزرتا اندھیرا گہرا ہونے سے ذرا ہی دیر پہلے اس ویران عمارت پر جا پہنچا۔

بے آب و گیاہ بھوری چٹانوں سے گھری وہ عمارت اس

وقت بظاہر ویران نظر آ رہی تھی مگر اس کا بڑا داخلی دروازہ نیم وا تھا جبکہ مجھے بخوبی یاد تھا کہ بڈ کے ساتھ رات کی تاریکی میں زیرو پوائنٹ سے روانہ ہوتے ہوئے جو لوگ وہاں رہ گئے تھے انہیں بڈ نے عمارت مقفل کرنے کی ہدایت کی تھی اور اس دلیر شخص کے ساتھیوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی بات ٹالتا۔

"ہوشیاری کے ساتھ۔" میں نے سیتا کے کان میں تیز سرگوشی کی۔

سیتا یک بیک چوکنے انداز میں میرے قریب سمٹ آئی اور ہم دونوں چوپایوں کی طرح جھکے ہوئے ایک دیوار کی اوٹ میں جا پہنچے۔ ہمارے سروں پر عمارت کی ایک کھڑکی موجود تھی جو اس وقت بند تھی۔ کچھ دیر تک میں وہاں بیٹھا سُن گُن لیتا رہا مگر وہاں تو جھینگروں کے وقفہ وقفہ سے اُبھرنے والے دھیمے شور کے سوا کسی آواز کا وجود نہ تھا۔

پھر میں نے ایک پتھر اُٹھا کر دروازے کے قریب اُچھال دیا۔ اس کے گرنے کا شور رات کے سناٹے میں دُور تک گونجا مگر پھر بھی زیرو پوائنٹ میں زندگی کے آثار پیدا نہ ہو سکے۔ میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر وہ جگہ چھوڑ دی۔

کالی گاپ سے فرار ہوتے وقت میں نے ڈہان اور رینی کے سامان میں سے اسلحہ کے علاوہ ایک ٹارچ بھی ساتھ لے لی تھی جو اس وقت بھی تھیلے میں میرے ساتھ موجود تھی مگر عمارت کی پوری تلاشی لینے سے قبل میں اسے روشن کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

دروازہ ہاتھ رکھتے ہی بے آواز کُھلتا چلا گیا۔ میں سیتا کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوا تو کسی شناسا بُو کا ایک تیز بھبکا نتھنوں سے ٹکرایا۔ وہ بُو شاید عمارت کی فضا ہی میں رچی ہوئی تھی۔ اندر قدم رکھنے کے بعد چند ثانیوں کے لئے ہمیں رُک جانا پڑا تاکہ ہماری آنکھیں اندر پھیلے ہوئے گھور اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو سکیں۔ عمارت کا پورا نقشہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ ہم نے باری باری اوپر نیچے ہوئے کمروں کا جائزہ لیا اور ہر جگہ بے ترتیبی محسوس کی کیونکہ ہر کمرے میں فرش پر مختلف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے روشنی کئے بغیر یہ اندازے قائم کئے اور پھر تہہ خانہ کی طرف ہو لیا۔ اس بار میرے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔

تہہ خانہ کی آخری سیڑھی اُترتے ہی میں نے طاقتور سرچ لائٹ روشن کر دی۔ سیتا کے منہ سے ہلکی سی تحیر آمیز آواز اُبھری اور میری نگاہیں روشنی کے ساتھ اس لڑکی کے جسم پر ٹھہر گئیں جو زیرو پوائنٹ کے گیمز ہال کے بیش قیمت سازو سامان کے ملبے کے درمیان پڑا ہوا تھا۔

سیتا تیزی کے ساتھ اس لڑکی کی طرف لپکی تھی مگر میری غراہٹ نے اسے واپس لوٹ آنے پر مجبور کر دیا۔ بظاہر وہ لڑکی مدد کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اس کی داہنی کنپٹی کے قریب اور فرشی قالین پر خون جما ہوا تھا۔

وہ لڑکی دراز قامت اور خوبرو ضرور تھی مگر وضع قطع سے ہپی لگ رہی تھی۔ زیرو پوائنٹ کی فضا میں رچی ہوئی چرس اور دیگر نشہ آور اشیاء کی بُو، تہہ خانے میں بار کاؤنٹر کے عقب میں خالی الماریاں، ٹوٹا ہوا فرنیچر اور ایک لڑکی کی لاش مجھے بہت کچھ بتا رہی تھی۔ یقینی طور پر کسی نہ کسی طرح ہپیوں نے اس عمارت کا سراغ پا لیا تھا اور شاید یہ زیادہ دن کی بات نہیں تھی کیونکہ تہہ خانے کی دیواروں وغیرہ پر گندے نشانات کی تعداد خاصی کم تھی۔ پھر شراب کی چند بوتلیں بھی بھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ زیرو پوائنٹ پر قابض ہونے والے ہپیوں میں یقیناً کسی بات پر معرکہ آرائی ہوئی ہو گی۔ جب کرسیاں وغیرہ چلیں اور اسی افراتفری میں ایک لڑکی ماری گئی۔ ایک قتل ہو جانے پر وہ سب ہی بدحواس ہو کر وہاں سے نکل بھاگے ہوں گے اور یوں ہمیں وہاں صرف ایک مقتولہ کا سامنا کرنا پڑا۔

لاش کو ہاتھ لگائے بغیر میں نے احتیاط سے اس کا جائزہ لیا۔ مرنے والی کی عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ اس کی کنپٹی کا زخم کسی بوتل یا دوسری وزنی چیز کی ضرب کا نتیجہ تھا۔ زخم پر جمے ہوئے خون کی سُرخی اور لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ زیرو پوائنٹ میں وہ خونریز تصادم برپا ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔

میں نے کاؤنٹر کے نیچے لڑھکی ہوئی بلیک ڈاگ وہسکی کی سربند بوتل اٹھائی اور ایک اسٹول پر آ بیٹھا۔ جلتی ہوئی سرچ لائٹ کاؤنٹر پر رکھ دی اور بوتل کی سیل توڑ کر ایک لمبا گھونٹ لیا۔ تلخ لاوے کی ایک دہکتی ہوئی لکیر میرے حلق سے معدے تک تیرتی چلی گئی اور الکحل کی تیزی سے میرا دماغ قدرے حرارت محسوس کرنے لگا۔ اب میں صورتِ حال کے بارے میں بہتر اور دو ٹوک فیصلہ کر سکتا تھا۔

"اس بوتل میں کیا ہے؟" سیتا نے ندیدی نظروں سے بوتل کو گھورتے ہوئے کہا۔

"شراب۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ کیسی ہوتی ہے؟"

"اچھی ہوتی ہے مگر صرف مردوں کے لئے۔"

"مجھے بھی پلا دے نا۔" اس بیوقوف کے لہجے میں بلا کا شوق تھا۔

میں نے بوتل سے ایک اور گھونٹ لیا اور بوتل اسے دے دی۔ سیتا نے چند ثانیوں تک اسے دیکھا۔ پھر میری نقل کرتے ہوئے تیز شراب حلق میں انڈیلنی چاہی اور اس کا وہی ردِ عمل ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس کو بُری طرح پھندا لگا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے بے تحاشا کھانستی چلی گئی۔ بوتل اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ

چلی تھی اور کھانستے کھانستے سیتا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ شراب کے بارے میں وہ سیتا کا پہلا اور آخری سبق تھا۔ میں نے اس کی مدد کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ پورے تہہ خانے میں چکراتی اور کھانستی رہی، پھر بے دم سی ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھی۔ میں اس سے لاپرواہ اپنے آئندہ اقدامات پر غور کر رہا تھا۔

وہ لاش اگر کسی غیر ہپّی کی ہوتی تو میں شاید ایک لمحے کے لئے بھی وہاں رُکنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔ مگر ہپیوں کے بارے میں میرا تجربہ بہت وسیع اور تلخ تھا۔ ان کی حالت مُردہ خور بھیڑیوں جیسی ہوتی ہے۔ جب تک اپنے غول میں رہیں گے، دلیر نظر آئیں گے مگر فساد برپا ہوتے ہی ہر ایک صرف اپنی فکر کرتا ہے اور اس خود غرضی میں چوہے سے زیادہ بزدل ہو جاتا ہے۔ مرنے والے ساتھیوں کو یکسر فراموش کر دینے میں انہیں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا مجھے یقین تھا کہ زیرو پوائنٹ کے ہنگامے میں ملوث کوئی ہپّی اپنی زبان سے شکایت نہیں کرے گا، نہ ہی ان میں سے کسی کی واپسی کا امکان تھا۔ البتہ اس جگہ قیام کرنے کی صورت میں لاش کا ٹھکانے لگایا جانا ضروری تھا ورنہ ایک دو روز میں وہاں تعفن کے باعث رُکنا بھی دشوار ہو جاتا۔

زیرو پوائنٹ کے علاوہ جو دو ٹھکانے میری نظر میں تھے وہ محفوظ ضرور تھے مگر وہاں میں کم از کم اپنے ہم جلیسوں کی نظر میں ضرور آجاتا جبکہ میرے منصوبے کی کامیابی کے لئے کچھ عرصے کی روپوش زندگی نہایت ضروری تھی۔

سیتا پر پڑنے والا کھانسی کا شدید دورہ اب ختم ہو چکا تھا مگر اس کی آنکھیں اب بھی سُرخ ہو رہی تھیں اور ان میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ میرے قریب کھڑی غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی میں بے اختیار مسکرا دیا۔ "اور پیئے گی؟"

"شراب پینے کی کیا ترکیب ہوتی ہے؟" وہ بھرّائی ہوئی غصیلی آواز میں بولی۔

"ترکیب تو کوئی نہیں ہوتی۔" میں لاپرواہی سے ہنسا۔ "تیرے سامنے میں نے یونہی بوتل منہ سے لگا کر پی تھی۔ دراصل شراب صرف مردوں کے پینے کی چیز ہوتی ہے۔"

"کیا مردوں کے حلق میں شراب کے لئے کوئی خاص سوراخ ہوتا ہے؟" وہ جلے کٹے لہجے میں غرا کر بولی۔

"یہ تو کسی کا گلا کاٹ کر ہی پتہ چلے گا۔" میں نے اسے اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔ "تجھے ہر بات میں میری نقل کرنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟"

"میں تیری ہی بیوی ہوں۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "تیری نہیں تو اور کس کی نقل کروں گی۔"

"تو جانتی ہے کہ اس وقت ہم کس عمارت میں ہیں؟" میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

عمارت کا ذکر آتے ہی اس کا سویا ہوا شوق دوبارہ جاگ اٹھا۔ "یہ تو بہت خوبصورت جگہ ہے، میں نے ایسا غار آج تک نہیں دیکھا۔"

"یہ غار نہیں، انسانوں کی بنائی ہوئی ایک عمارت ہے۔"

"یہ زمین کے نیچے والا حصہ بھی بنایا ہوا ہے؟" سیتا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں — اندر رام کے تعاقب میں سیتا وادی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے میں نے کافی عرصہ یہاں گزارا تھا۔ پھر میرے ساتھی میرے خون کے پیاسے ہو گئے اور میں ایک خون آشام جدوجہد کے بعد یہاں سے زندہ سلامت نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔"

"پھر تو یہ بستی تیرے لئے خطرناک ہے۔"

"ہاں — اس شہر میں اب بھی میرے دشمنوں کی کمی نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے تجھے اپنا نام لینے سے منع کیا تھا۔ یہاں بھول کر بھی مجھے صفدر کے نام سے نہ پکارنا۔"

"کیا یہ تیرا اپنا شہر ہے؟"

سیتا کے اس سادہ سے سوال سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ اس سرزمین پر میں محض ایک غریب الوطن اجنبی تھا جس کو ہر طرف سے خونخوار دشمنوں نے گھیرا ہوا تھا۔ میرا اپنا شہر تو کراچی ہی تھا جس نے اپنی کھلی آغوش میں مجھے سمیٹ رکھا تھا۔ لاہور میں خانگی اختلاف پیدا ہونے کے بعد کراچی نے مجھے زندگی کی ہر وہ آسودگی عطا کی تھی جس کی آرزو مدتوں مجھے محض ایک خواب معلوم ہوتی رہی مگر میں اپنی ان مسرتوں اور آسودہ حالی کا اہل نہ ثابت ہو سکا۔ جوئے کی عادت نے میرے خطیر سرمائے کو یوں چاٹنا شروع کیا کہ جب مجھے اپنا مکان ہار کر تن کے کپڑوں کے ساتھ کھلے آسمان تلے نکلنا پڑا تو مجھے یقین بھی نہ آسکا کہ ایک لکھ پتی یوں مختصر سی مدت میں مفلوک الحال ہو سکتا ہے۔

"میرا شہر یہاں سے بہت دُور ہے سیتا!" مجھے اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "ہم کچھ دن اسی عمارت میں گزاریں گے پھر میں روپ بدل کر یہاں سے باہر نکلوں گا اور جلد ہی تجھے اپنے شہر میں لے جاؤں گا۔ وہ روشنیوں اور زندگی کا شہر ہے۔ وہاں بلند عمارتوں کے سائے میں لاکھوں انسانوں کا ہجوم ہر آن وقت کے تعاقب میں سرگرداں رہتا ہے اور وقت ہر سُو مسرتیں بکھیرتا تیزی سے گزرتا رہتا ہے۔ وہاں لوگ ایک دوسرے کی خوشیوں کے دشمن نہیں ہوتے۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ پلٹ کر دوسروں پر نظر ڈال سکے۔ ہر ایک اپنی لامتناہی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ ہاں جس کا مقدر

یاوری نہ کرے میرا شہر اس کے لئے بڑا ظالم ہے۔ ایسے درماندہ لوگوں کے دکھ بٹانے والا وہاں مشکل سے میسر ہوتا ہے۔ الم رسیدہ لوگ ان ہی عمارتوں کے سائے میں سسک سسک کر ہر سانس کے لئے مصائب سے لڑتے ہیں۔ پھر کسی بھی لمحے ان کی سانس کی لڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ نہ ان کا کوئی ہمنوا ہوتا ہے نہ انہیں یاد رکھنے والا — میں تجھے جلد از جلد اس شہر میں لے جانا چاہتا ہوں۔"

سیتا حیرت سے منہ کھولے میری باتیں سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو بولی۔ "تو کبھی کبھی بڑی عجیب باتیں کرنے لگتا ہے۔ بھلا تیرے شہر کے لوگوں کو زندہ رہنے کے علاوہ اور کیا فکر ہے جو ہر وقت اس قدر مصروف رہتے ہیں۔"

"تو پہاڑوں میں پلی ہے سیتا! جہاں مقابلے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "شہروں میں صرف زندہ رہنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ زندہ تو ہر جاندار رہ لیتا ہے۔ آوارہ چوپایوں کے ریوڑ وہاں کوڑے کے ڈھیر کرید کرید کر اپنی خوراک ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اصل مسئلہ بہتر طور پر زندہ رہنے کا ہوتا ہے اور اس مقابلہ کی وہاں کوئی حد نہیں۔ وہاں قدم قدم پر تعیش کے اس قدر سامان بکھرے ہوئے ہیں کہ ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے پوری عمر نا کافی ہے۔"

"تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "اب یہ بتا کہ کیا اس سڑتی ہوئی لاش کے ساتھ یہاں رہنے کا ارادہ ہے تیرا؟"

"نہیں۔ اسے ٹھکانے لگانا ضروری ہے۔"

"مگر تو نے بتایا تھا کہ مہذب شہروں میں اپنے جانی دشمن کا قتل بھی جرم سمجھا جاتا ہے — اگر کسی نے اس لڑکی کے قتل کی ذمے داری ہم پر لگا دی تو کیا ہوگا۔"

"جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

ہپّی لڑکی کی لاش زیادہ بھاری نہیں تھی۔ زیرو پوائنٹ میں مجھے اس سے پہلے بھی ایک لاش تلف کرنے کا تجربہ تھا اور میرا خیال تھا کہ اس بار بھی وہی طریقہ کامیاب رہے گا جو میں نے امیر خان کی لاش پر آزمایا تھا لیکن رات کے وقت اس ویرانے میں بھڑکتی ہوئی آگ کا لہو رنگ انعکاس میلوں دُور سے بھی کسی کو متوجہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس وقت میں نے لاش کو اوپر پہنچانے پر ہی اکتفا کیا۔ باقی کام دن کے اُجالے میں بہتر طور پر انجام دیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد بے خطر ہم وہاں رہ سکتے تھے۔ ہپّیوں کی لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کے باوجود زیرو پوائنٹ کے تہہ خانے میں سربند اور محفوظ غذا کا اتنا ذخیرہ موجود تھا جو ہم دونوں کے لئے عرصے تک کافی ہوتا۔ اس تمام جائزے سے نمٹ کر ہم نے ٹوٹا ہوا فرنیچر ہٹا کر تہہ خانے میں بچھے ہوئے قالین پر اپنے لئے جگہ بنائی اور سرچ لائٹ گل کر کے ہم وہیں دراز ہو گئے۔

میں نے بوتل سے شراب کے جو گھونٹ لئے تھے، عام حالات میں وہ میرے لئے اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر ثابت ہوتے مگر طویل عرصہ بعد لال پری کے اس وصال نے عجیب ہی رنگ دکھایا تھا اور میری رگ و پے میں ہلکی ہلکی سنسنی کی لہریں سرایت کر چلی تھیں۔ میری یہ کیفیت نشہ کی ذیل میں ہرگز نہ آتی تھی۔ البتہ اسے سرور کہا جا سکتا تھا اور اسی سرور کے عالم میں میں نے سیتا سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو تہہ خانے میں پھیلی ہوئی تاریکی اس کی دبی دبی شوخ ہنسی سے گونج اٹھی۔

اگلی صبح لاش نذرِ آتش کرتے ہوئے مجھ پر قنوطیت سی طاری تھی۔ جوں ہی میں نے زیرو پوائنٹ کے ایک کمرے میں لاش پر پھیلائے ہوئے کاغذوں وغیرہ کو آگ دکھائی، سیتا بے اختیار میرے قریب سمٹ آئی۔

"کیا یہ لڑکی ہندو تھی؟" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے باوثوق لہجہ میں کہا۔

"پھر تو اسے جلا کیوں رہا ہے؟" سیتا نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

اس وقت میرا ذہن کہیں اور کھویا ہوا تھا۔ میں اس کے سوال کی تہہ تک نہ پہنچ سکا اور سرسری لہجے میں بولا۔ "یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔"

"مگر ماں تو کہتی تھی کہ صرف ہندو ہی اپنے مُردے جلاتے ہیں۔ اور یہ کام بھی ہر جگہ نہیں ہوتا بلکہ مُردے کی ارتھی شمشان لے جاتے ہیں۔ وہاں صندل کے ڈھیر میں گھی ڈال کر ارتھی جلائی جاتی ہے۔ تُو نے تو کچھ بھی نہیں کیا، لاش کو یوں ہی آگ لگا دی ہے۔"

"ہم یہ کام مجبوراً کر رہے ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس کارروائی کا کسی مذہبی رسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سخت زمین میں قبر کھودنا کم از کم میرے لئے ناممکن تھا۔"

جب لاش نے آگ پکڑ لی تو ہم دونوں عمارت سے باہر کھلے میدان میں نکل آئے۔ اور ایک ٹیکری پر بیٹھے دیر تک عمارت سے اُٹھتے دھوئیں کے سیاہ بادلوں کو دیکھتے رہے۔ گو ہم ہوا کی مخالف سمت میں بیٹھے ہوئے تھے مگر دھوئیں کی کثافت سے میں مرنے والی بدنصیب ہپّی لڑکی کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی ہیئت کے بارے میں بالکل صحیح قیاس لگا رہا تھا۔ اور جب آہستہ آہستہ دُھواں بالکل معدوم ہو گیا تو میں سیتا کا ہاتھ تھامے عمارت کی طرف چل دیا۔

اندر راکھ کا ایک سلگتا ہوا ڈھیر ہمارا منتظر تھا اور فضا میں گوشت پوست کے جلنے کی تیز بُو ابھی تک رچی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے وہ ساری راکھ عمارت سے باہر بکھیر دی۔ جب تک ہم وہاں کسی لاش کی موجودگی

کے سارے نشانات مٹاتے خنک ہواؤں نے فضا میں موجود اثرات بھی اس حد تک زائل کر دیئے کہ ہمارا اندر ٹھہرنا ممکن ہو گیا۔

زیرو پوائنٹ میں تقریباً دس گیارہ دن ہمارا قیام رہا۔ اس دوران میں میرے چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی اُگ آئی جسے بے ترتیب کر دینے کے بعد میرے چہرے پر عجیب وحشت برسنے لگی۔ اوپر والے کمروں میں روزمرہ ضروریات کا سارا سامان ہمیشہ موجود رہا کرتا تھا وہاں جا کر میں نے اپنے سر کے تمام بال بالکل صاف کر دیئے اور اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے مقتول مہارشی انندرام کی تقلید میں اپنی بھنویں تک صاف کر دیں۔ میری یہ ہیئت کذائی دیکھ کر سیتا پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اگر میں نے یہ تمام کارروائی اس کے سامنے نہ کی ہوتی تو شاید وہ پہچاننے سے ہی انکار کر دیتی۔

لباس کے معاملے میں بھی زیرو پوائنٹ کی عمارت معاون ثابت ہوئی۔ گالی گاپ سے حاصل کئے ہوئے چرمی ملبوسات کی جگہ میں نے کُرتا اور دھوتی پہن لی۔ زنانہ لباس چونکہ میسر نہ تھا لہٰذا وقتی طور پر سیتا کو بھی ایسے ہی کپڑے پہنائے اور آخری بار آئینے میں اپنا جائزہ لیکر میں وہاں سے نکل پڑا۔

اب میرا ارادہ ایک رشی کے روپ میں رہنے کا تھا۔ اس طرح حلیہ بدل کر میں خود کو بے شمار مسائل سے بچا سکتا تھا۔ اور یہی ایسا حلیہ تھا جس میں مجھے بلا روک ٹوک نیپالی سرحد عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہونے کی اُمید تھی۔

میرے لئے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سیتا کا تھا وہ بنیادی طور پر ایک بے خوف مگر سادہ دل لڑکی تھی اور اس کی غیر محتاط گفتگو مجھے کسی بھی مرحلے پر دشواری میں ڈال سکتی تھی۔ کافی غور و خوض کے بعد میں نے اسے گونگی بہری لڑکی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی گوری رنگت، سرخ بال اور نیلی آنکھیں اسے ہر شُبہ سے بچانے میں مددگار ہوتیں اور گونگی بنے رہنے میں وہ میرے لئے کسی تشویش کا باعث نہ بنتی۔

طویل بحث کے بعد سیتا نہ صرف میرے منصوبے سے پوری طرح واقف ہو گئی بلکہ اس نے پورا پورا تعاون کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا اور جب ہم ویرانے عبور کرتے بستی میں داخل ہوئے تو وہ ایک پُرجلال رشی کی معتقد کا بہروپ اختیار کر چکی تھی۔

شہر میں گھستے ہی میں نے بھی لاپروایانہ انداز اختیار کر لیا تھا اور وقفہ وقفہ سے ہری رام ہری اوم کے مستانہ نعرے مارتا اپنے طے شدہ راستے پر بڑھتا رہا۔ میرا یہ روپ اتنا کامیاب تھا کہ قریب سے گزرنے والا ہر شخص مجھے عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کئی جگہ لوگوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے عقیدت سے پرنام کیا اور میں ان پر حقارت آمیز نظریں ڈالتا جواب دیئے بغیر بڑھتا رہا۔ راستے میں بہتیرے بھی مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے سیتا کے رنگ و روپ سے دھوکا کھا کر اس سے میرے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہا اور سیتا نے حلق سے بے معنی آوازیں نکال کر انہیں ٹال دیا۔

آزادی اور تحفظ کے لازوال احساس کے ساتھ کھٹمنڈو کے بازاروں میں گھومتے ہوئے مجھے عجیب سی تسکین مل رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس سرزمین پر میرا وجود کسی اور کی مرضی کے تابع نہ تھا۔

ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران مجھے نام نہاد پنڈتوں پجاریوں اور رشیوں کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ ان کے روایتی کردار پر بھرپور طریقے سے عمل کرتے ہوئے میں نے بازار سے ہلکی آہنی زنجیریں حاصل کیں۔ غریب دکاندار نے میری کوشش کے باوجود قیمت وصول نہ کی۔ اس کے نزدیک یہی خوش بختی کی معراج تھی کہ ایک تارک الدنیا عابد اس کی دکان سے کوئی چیز لے جائے۔ پھر میں نے مقامی دستکاری کے نمونے فروخت کرنے والی ایک دکان سے گیروے رنگ کے لبادے خریدے۔ وہاں موجود غیر ملکی سیاحوں نے حیرت اور مسرت آمیز نظروں سے میرا جائزہ لیا جیسے میں ان کے لئے کوئی عجوبہ رہا ہوں۔

"اس مقدس ہستی کا کیا نام ہے خاتون؟" ایک سفید فام سیاح نے شُستہ انگریزی میں سیتا سے دریافت کرنا چاہا اور سیتا بے بسی سے چند مہمل آوازیں نکال کر رہ گئی۔

"بے چاری گونگی ہے۔" اسی سیاح نے اپنی ساتھی سے کہا۔

"یہ سرزمین بڑی پُراسرار اور خوابناک ہے اسمتھ!" لڑکی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "بظاہر دنیاوی عیش و عشرت سے بیزار نظر آنے والے یہ رشی ناقابل یقین قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ شاید اس لڑکی نے رشی کا کوئی معجزہ دیکھ لیا ہوگا جبھی گویائی سے محروم ہو گئی ہے۔ یہ لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کی قوتوں کی کہانیاں عام لوگوں میں پھیلیں۔"

لباس خرید کر میں ترقی یافتہ قوموں کے ان اوہام زدہ سیاحوں کی عقل پر ماتم کرتا دکان سے باہر آ گیا۔ جب جدید علوم سے آشنا لوگوں کی توہم پرستی کا یہ عالم ہو تو ذہنی پسماندگی میں مبتلا ہجوموں کو مفروضات کی پرستش سے کون سی طاقت روک سکتی ہے۔

اور اگر دیکھا جائے تو یہی مادی اور سائنسی ترقی انسان کو زندگی کے لگے بندھے اصولوں سے انحراف پر اکسا رہی ہے۔ ہر نیا سائنسی نظریہ اپنے جلو میں ہزاروں نئے مسائل لے کر طلوع ہوتا ہے اور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سوچ و بچار کرے مگر ایک عام آدمی کے ذہن میں اتنی سکت نہیں ہوتی۔ جب سوچتے سوچتے اس کا ذہن

...جاتا ہے تو وہ یک بیک فرار کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اسے وہ ...ندگی اچھا لگتا ہے جو سہل ہو جہاں ایک رشی کے اشارے پر بہت ...ہو جانے کا یقین ہو جہاں جان توڑ محنت کے بجائے پُراسرار قوتوں ...عجزوں کے سہارے کامیابیاں حاصل ہونے کی اُمید ہو۔ اس مرحلے پر ...انسان کی سہل پسند جبلت اور عقل کے درمیان پیکار چھڑتی ہے ...میں اُبھرنے والے تضاد اور پھر بیزاری سے نجات پانے کے لئے ...وہ حشیش میں ڈوب جاتا ہے کبھی چرس کے سہارے فرار چاہتا ہے ...ی ایل ایس ڈی کے ذریعے ایک نئی جنت تلاش کرنے میں مصروف ...تا ہے۔

میں یہ سب سوچتا اور انندرام کی اس پہاڑی خانقاہ کی طرف ...تا رہا جہاں ایک رات میں نے ہپیوں کے بدمست غول میں بسر کی ...جہاں مینگی براؤن نامی ایک خوبرو لڑکی میرے رُکنے کا بہانہ بنی تھی۔ ...آزادی اور آزاد روی کے نام پر انندرام نے انسانیت کی تذلیل کا ...گھناؤنا کاروبار چلایا ہوا تھا کہ زندگی کی ساری اقدار جنس کے گھناؤنے ...میں دفن ہو کر رہ گئی تھیں۔

دوپہر کے قریب میں پہاڑیوں سے گھری اس وادی میں پہنچا ...وہاں ویرانی کا راج تھا۔ پوری وادی میں صرف تین خیمے لگے ہوئے تھے ...ن کے آس پاس دس بارہ ہپی لڑکے لڑکیاں دھوپ تاپ رہے تھے۔ میری زبان سے بلند آہنگ ہرے رام کا نعرہ سُن کر وہ سب ...اُچھل پڑے اور تقریباً اس طرح دوڑتے ہوئے میری طرف آئے جیسے ...ہیں مجھ سے جنتِ گم گشتہ مل جانے کی اُمید ہو لیکن قریب آ کر ان کے ...وحشت سے تمتماتے ہوئے چہرے ماند پڑ گئے۔

"یہ ہمارا پوپ تو نہیں ہے۔"

"اسی کا کوئی چیلا معلوم ہوتا ہے۔"

"پتہ نہیں یہ ہمیں چرس دلا سکے گا یا نہیں۔"

وہ اُمید و بیم کے عالم میں آپس میں تبصرے کرنے لگے اور میں بے نیازی سے اس غار کی طرف بڑھتا رہا جسے انندرام اپنی خانقاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

"میرے مقدس باپ!" اچانک ایک لڑکی آگے بڑھ کر میرے قدموں میں آ گری اور کانپتی ہوئی آواز میں انگریزی میں بولی۔ "میرے ساتھی پیسہ پیسہ کو محتاج ہو چکے ہیں.....تم......"

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی کہ سیتا کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر غُراتی ہوئی لپکی اور بالوں سے پکڑ کر اس لڑکی کو میرے قدموں سے دُور اچھال دیا۔

وہ وادی لڑکی کی سُریلی چیخ سے گونج اٹھی۔

"تُو..... گندی کُتیا! پوپ کو اپنے باپ کی میراث سمجھتی ہے" پٹنے والی لڑکی کے ایک دراز قامت ساتھی نے یہ کہتے ہوئے پلک جھپکتے میں چاقو نکال لیا۔

میں ایک ثانیے کے لئے سکتے میں آ گیا۔ مگر میری دخل اندازی سے قبل ہی سیتا نے سفاک چہرے والے اس ہپی پر چھلانگ لگا دی۔ وہ پھُرتی سے ایک طرف سرک گیا اور سیتا اپنے ہی زور میں آگے جا گری چاقو بردار لڑکے کی ویران آنکھوں میں خونی چمک لہرائی اور اس نے چاقو کی نوک پکڑ کر اسے سیتا کے بائیں پہلو میں اتارنا چاہا مگر میں نے بروقت اس کی کہنی پر لات ماری اور اس کا نشانہ خطا گیا۔ سیتا تو صاف بچ گئی مگر فضا میں اُڑتے ہوئے چاقو کا پھل ایک اور ہپی کی گردن میں دستے تک پیوست ہو گیا۔ زخم خوردہ ہپی کا بدن فضا میں اُچھلا اور کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ شاید چاقو کا پھل شہ رگ کے آرپار نکل گیا تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھتے ہی ہپیوں میں افراتفری پھیل گئی اور جس کے جدھر سینگ سمائے اُدھر بھاگ گیا۔ میں نے مشتعل سیتا کو بمشکل سمجھایا اور اپنے ساتھ لے کر خانقاہ کی طرف چل دیا۔

میرا انندرام کی خانقاہ کی طرف آنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں کچھ عرصہ وہاں گزار کر اپنی رشی کی حیثیت مستحکم کر سکوں۔ سُندری کی دی ہوئی پارس پتھر والی انگوٹھی میرے پاس تھی اور میں اس کے سہارے خاصی شہرت حاصل کر سکتا تھا۔ نیپال کے اس مرکزی شہر میں اپنا سکہ جمانے کے بعد جب میں سرحد کا رُخ کرتا تو میرے بارے میں بے شمار کہانیاں پھیل چکی ہوتیں اور ان میں کسی کو بھی شُبہ کا موقع دیئے بغیر قانون کی نظروں میں دھول جھونک کر سیتا کے ہمراہ سرحد عبور کر سکتا تھا۔ مگر اس وادی میں آتے ہی سیتا کی حد سے بڑھی ہوئی شکی طبیعت کی بنا پر واقع ہونے والے حادثے نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے غالباً یہ سمجھ کر اس لڑکی کو مجھ سے دُور اُٹھا پھینکا تھا کہ وہ مجھ سے عشق کا اظہار کر رہی ہے مگر اب جو کچھ ہو چکا تھا اسے لوٹانا ممکن نہ تھا لہٰذا میں نے سیتا سے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ میرے لئے اتنا ہی غنیمت تھا کہ وہ قتل سیتا کے ہاتھوں نہیں ہوا تھا اور اس کے کئی گواہ بھی موجود تھے۔ اگر میں ان پر کسی طرح اپنی اہمیت واضح کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ کسی بھی صورت میں حقائق نہ چھپاتے اور اس کے لئے مجھے ان کی واپسی کا انتظار کرنا ہوتا کیونکہ اس وقت تو قتل کی واردات ہوتے ہی وہ سب کہیں بھاگ نکلے تھے۔

انندرام کی خانقاہ دیکھ کر سیتا کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں کئی ماہ کی مدت گزر جانے کے باوجود وہ غار ابھی تک تیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ غار کے اندر ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔ انندرام

کی غیر موجودگی میں بھی کوئی ہپّی وہاں داخل ہونے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔

"یہ تیرے نانا انندرام کا مسکن تھا۔" میدان صاف پاکر میں نے سیتا سے کہا۔

"اور یہ تمام گورے اسی کے ساتھ رہتے تھے؟"

"ہاں — وہ انہیں مفت نشہ فراہم کرتا تھا اور کھلی آوارگی کی ترغیب دیتا تھا۔ اس کی اپنی زندگی بھی یہاں بڑی رنگین گزرتی تھی۔"

"اب میں سمجھی۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "تو اسی لئے میرے نانا جیسا رُوپ دھار کر یہاں آیا ہے تاکہ خود بھی رنگ رلیاں منا سکے مگر کان کھول کر سُن لے، میں تیری بیوی ہوں اور میرے جیتے جی ایسا ہرگز نہ ہوگا۔"

"تو بہت زیادہ وہمی ہے۔" میں سنجیدگی سے بولا۔ "وہ لڑکی میرے قدموں میں گر کر اپنی مفلسی بیان کررہی تھی اور تُو اس پر بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑی۔"

"جو لڑکی تیرے قریب آئے گی اس کا یہی حشر ہوگا۔" وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولی۔ "وہ دُور رہ کر بھی بات کرسکتی تھی۔"

معاً مجھے لاچی یاد آگئی اور میں پھریری لے کر رہ گیا۔ کالی گاپ کے سردار نے وہ خوبرو لڑکی عزت افزائی کے طور پر مجھے انعام میں دی تھی اور سیتا نے جوشِ رقابت میں اُس کے ننگے بدن پر گوشت خور چیونٹے چھوڑ کر اسے ہلاک کردیا تھا کیونکہ وہ لڑکی اس کے شوہر کی آغوش کی زینت بن رہی تھی۔ سیتا ہر اعتبار سے ٹھیک تھی مگر میرے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس اور شکی تھی۔

شام کا دھندلکا پھیلنے سے تھوڑی دیر قبل غار سے باہر کچھ قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ مجھے توقع تھی کہ آنے والے ہپّی ہی ہوں گے مگر نئی جگہ اور نئے حالات کے تحت میں نے سیتا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور غار سے باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی اچانک میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ سامنے کوتوالِ شہر کرن سنگھ وردی میں ملبوس، ریوالور سنبھالے خانقاہ کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ اس کے ہمراہ کئی اور سپاہی بھی تھے۔ پیچھے چند ہپّی چلے آرہے تھے۔

"تم جو ہو، وہیں ٹھہرو اور ہاتھ اوپر اُٹھالو۔" میرا سایہ دیکھتے ہی کرن سنگھ پوری قوت سے چیخا۔

غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ اوپر اُٹھتے چلے گئے، سیتا نے بھی میری تقلید کی۔

کرن سنگھ نیپال میں میرا پرانا شناسا تھا۔ ایک شہر میں اس کے ہاتھوں حوالات میں بُری طرح مار کھائی۔ دوسری بار کھٹمنڈو ہی میں اس کے ستم کا نشانہ بننا پڑا مگر لونا مارٹن کی بے لوث محبت کے سہارے مجھے زنداں سے نجات مل گئی۔ اس بار مجھے اتنا تو یقین تھا کہ حلیئے کی یکسر تبدیلی کے باعث کرن سنگھ مجھے صفدر علی کی حیثیت سے نہ پہچان سکے گا مگر اس کی گستاخانہ چیرہ دستیوں سے خود کو بچانا بڑا محال تھا۔

چند ہی منٹ میں وہ قافلہ خانقاہ کے دروازے پر آپہنچا۔

"یہی ہے؟" کرن سنگھ نے پیچھے مڑ کر انگریزی میں پوچھا۔

"ہاں — !" ہپّیوں میں سے سیتا پر چاقو نکالنے والا سفاک صورت شخص سامنے آگیا اور اب میں نے دیکھا کہ کرن سنگھ کے ساتھ آنے والے سارے ہپّی وہی تھے جو قتل کی واردات کے عینی شاہد تھے — !

کسی جُرم کے سلسلے میں اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ پولیس سے رجوع کرنا میرے لئے حیرت ناک امر تھا بظاہر یوں معلوم ہورہا تھا کہ قاتل نے خود سامنے آکر اس معاملے میں مجھے ملوث کرنے کی کوشش کی تھی!

"او پنڈت! کیا نام ہے تیرا؟" کرن سنگھ نے اپنے مخصوص خونخوار اور تحقیر آمیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ زبان نیپالی تھی۔

"میرا نام گنگا رام ہے!" میں نے سیتا کو پوری صورتحال سے باخبر رکھنے کے لئے اُردو میں کہا "اور یہ میری ساتھی سیتا ہے، یہ بول نہیں سکتی۔"

"ہوں!" کرن سنگھ نے ایک طویل ہنکارا بھرا۔ "رشی اور پنڈت خون خرابہ کب سے کرانے لگے ہیں۔ اس لڑکی پر ایک ہپّی کے قتل کا الزام ہے اور اب تم دونوں حراست میں ہو — !"

"یہ کیسا کلجگ ہے حوالدار جی؟" میں احتجاجی لہجے میں بولا "قاتل تو خود تمھارے ساتھ کھڑا ہے، یہ خونی چہرہ والا لمبا لڑکا، اسی کے چاقو سے وہ ہپّی مرا تھا، بھلا سیتا کو قتل سے کیا سروکار؟"

"زیادہ باتیں نہ بنا۔" کرن سنگھ نے آنکھیں نکال کر کہا "یہ کہتے ہیں کہ تو انندرام کی خانقاہ پر قبضہ کرنے آیا تھا۔ انھوں نے روکا تو تیری ساتھی نے چاقو نکال کر حملہ کردیا اور ان کا ایک ساتھی مارا گیا۔"

"بھلا مجھے خانقاہ پر قبضہ کی کیا ضرورت تھی!" میں پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "میں تو انندرام ہی کی ہدایت پر یہاں آیا ہوں۔ ہم رشیوں کو جگہ سے کیا فرق پڑتا ہے، یہاں نہیں کھلے آسمان تلے کہیں اور آسن جمالیں گے۔ ہمیں خون خرابہ کی کیا ضرورت ہے!؟"

مگر بدمعاش کرن سنگھ اس وقت میری بات نہیں سن رہا تھا اس کی بھوکی نگاہیں سیتا کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور سیتا ان نگاہوں کا مطلب سمجھے بغیر کرن سنگھ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی!

"حوالدار جی، اسے کیا گھور رہے ہو —؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے آہنی زنجیروں کا شور پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تو نے کیا نام بتایا اس کا… سیتا! ہاں سیتا ہی بتایا تھا —؟"

"… بڑے پُراسرار لہجے میں بولا۔ "مگر یہ لڑکی تو غیر ملکی لگتی ہے۔"

میں نے اس کی خود کلامی کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ پھر کرن سنگھ نے ہم دونوں کے ساتھ اس قاتل لڑکے کو بھی حراست میں لے لیا۔ اس نے گرفتاری پر بڑا اودھم مچایا۔ اس کی سینہ زوری میرے لئے حیرانی کا باعث تھی مگر کرن سنگھ نے جلد ہی اُسے خاموش کردیا۔

اس موقعے پر میں نے غار میں سے اپنے سامان کا تھیلا ساتھ لینے کی حماقت نہیں کی کیونکہ اس میں ایک پستول بھی موجود تھا جس کی موجودگی کا میرے پاس کوئی جواز نہ ہوتا اور یوں کرن سنگھ کو سیتا پر دانت تیز کرنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آجاتا — !

پہاڑیوں سے باہر پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ کرن سنگھ نے لاش کے سرسری معائنے کے بعد آلۂ قتل پر قبضہ کیا اور ہم تینوں کو لاش سمیت ایک گاڑی میں بند کردیا گیا اور ہمارا کوتوالی کی جانب سفر شروع ہوگیا۔

اس وقت میرے ذہن میں کرن سنگھ سے پہلی ملاقات کے مناظر گھوم رہے تھے۔ ایک پُرانی ڈاج کے ذریعے نیپال میں داخل ہوتے وقت جب مجھے اپنے ہمسفر جوزف سمیت چرس کی اسمگلنگ اور جعلی کاغذات پر سفر کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا تو ہم دونوں کو سمرا نامی آبادی میں لے جانے والا پولیس افسر کرن سنگھ ہی تھا مگر سمرا پہنچنے سے قبل امیر خان کسی ذریعے سے میری ضمانت کرا چکا تھا۔ یہ چیز کرن سنگھ کے اشتعال کا سبب بن گئی اور اس نے مجھے رہا کرنے سے پہلے بُری طرح لہولہان کرکے رکھ دیا تھا۔ پھر دوسری بار اس سے کٹھمنڈو میں سامنا ہوا جب لونا مارٹن سے شادی کے بعد شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلنے لگی تھی جس کے نتیجے میں مجھے ہوٹل سے نقضِ امن کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور جب پولیس کی جمعیت مجھے لیکر کوتوالی پہنچی تو وہاں کرن سنگھ انچارج تھا۔ وہ دیکھتے ہی مجھے پہچان گیا مگر اس بار کرن سنگھ کو مجھ پر تشدد کا موقع نہ مل سکا کیوں کہ انندبھون کے مکین میری رہائی پر مجبور کردیئے گئے تھے — !

کوتوالی میں ہمارے بیانات لئے گئے۔ سب سے پہلے ٹام نامی اس دراز قامت امریکی ہپّی کو حوالات میں بھیجا گیا۔ پھر میری باری آئی۔ کرن سنگھ اس وقت سیتا کو وہیں روکنے کے موڈ میں نظر آرہا تھا — !

"حوالدار جی… لڑکی تو بیچاری گونگی ہے، اسے یہاں کیوں روک رہے ہو؟" میں نے ملتجی لہجے میں کرن سنگھ سے کہا۔

اس نے بھرپور وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ "گونگی ہے! میں ابھی اسے بولنے پر مجبور کردوں گا۔"

"نہیں — اس پر ظلم نہ کرنا۔" میں تڑپ کر اس کے سامنے آگیا۔ "میں تمہیں دھن سے مالا مال کردوں گا — اس لڑکی کو نہ ستاؤ —"

"تیری خاص بچارن معلوم ہوتی ہے — !" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"تم جو چاہو کہہ لو پر اسے معاف کردو۔" میں کرن سنگھ سے بھرپور مصالحت پر آمادہ تھا۔ اس کے قریب جاکر سرگوشیانہ لہجے میں بولا "میرے پاس ایک بہت بڑی طاقت ہے میں لوہے کو سونا بنا سکتا ہوں۔ میرے گرو، انندرام نے مجھے یہ گر سکھا کر یہاں بھیجا ہے، میں تمہیں مالا مال کردوں گا — !"

کرن سنگھ کی آنکھوں میں حریصانہ چمک پیدا ہوئی۔ چند ثانیوں تک وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اشارے سے محرر وغیرہ کو اس کمرے سے رخصت کردیا!

چونکہ اس کمرے میں روشنی کا انتظام ناکافی تھا۔ لہٰذا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اپنی انگوٹھی میں لگے ہوئے پارس پتھر کو ایک آہنی زنجیر سے مس کرنا شروع کردیا تھا — !

"تم لوہے کو سونا کس طرح بناتے ہو؟" اس نے میرے لئے پہلی بار تم کا لفظ استعمال کرتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ بہت زبردست علم ہے اور گرو کی اجازت کے بغیر اس کے بارے میں ہمیں ایک لفظ بھی بتانے کی اجازت نہیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"تمہارا گرو انندرام کہاں ہے؟"

"وہ پہاڑوں پر گہری نیند لینے چلا گیا ہے۔" میں نے عقیدت سے بھرپور لہجے میں جھوٹ بولا۔ "وہ اپنے کام سے بہت تھک گیا ہے۔ اب شاید کافی دِنوں بعد نیچے آئے گا، اسی لئے اس نے مجھے ادھر بھیجا ہے تاکہ اس کے چیلے اُسکے غم میں دیوانے نہ ہوجائیں — !"

"میں نے سُنا تو تھا کہ انندرام لوہے کو سونا بنا دیتا ہے۔ جب وہ اپنے سالانہ سفر سے واپس آتا تھا تو اس کے گلے میں جھولتی ہوئی ساری لوہے

کی زنجیریں سونے کی ہوچکی ہوتی تھیں مگر تمہارے گلے میں تو لوہا ہی لوہا جھول رہا ہے۔!"

میں اس کے سامنے پہلی بار اعتماد کے ساتھ ہنسا پھر اپنے گلے سے وہ زنجیر اُتار کر اس کی طرف بڑھلوی۔ جس سے میں پارس پتھر مس کرتا رہا تھا۔ کرن سنگھ نے دھندلکے میں اس زنجیر کا زردی مائل رنگ دیکھا۔ پھر بے تابی سے اُسے روشنی کے قریب لے گیا۔ اور میں نے اس کے بشرے پر حیرت کے طوفان اُمڈتے دیکھے۔!

"یہ... یہ تو سونا معلوم ہوتا ہے!" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ نیپالی پولیس فورس کے اس سخت گیر اور کینہ پرور افسر کی دکھتی رگ پر میرا ہاتھ پڑ چکا تھا۔ یک بیک میرا کھویا ہوا اعتماد بحال ہوگیا اور میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم اور رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "ہاں ـــ یہ ٹھوس اور خالص سونا ہے، اگر تم اس معاملے میں مجھے اور سیتا کو ملوث نہ کرو تو یہ سب تمہارا ہے؟"

"لیکن... لیکن یہ قتل کی واردات ہے۔" وہ اپنے ہاتھ میں لٹکی ہوئی سیروں وزنی طلائی زنجیر کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تمہارے خلاف کئی عینی شاہد موجود ہیں... مگر میں یہ سونا بھی کھونا نہیں چاہتا۔ گھر آئی لکشمی کو دھتکارنے والے زندگی بھر رویا کرتے ہیں۔!"

"تم یقین کرو کہ قاتل ٹام ہے۔ تشدد کے سامنے وہ سب کچھ اگل دے گا اور اگر تم یہ سونا ہتھیا کر مجھے قید کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہو تو یہ یاد رکھنا کہ میں ذرا سے اشارے سے نہ صرف اس زنجیر کو بلکہ تمہاری ملکیت میں موجود تمام سونے کو راکھ میں بدل دینے کی قدرت بھی رکھتا ہوں!" میں آہستہ آہستہ کرن سنگھ پر حاوی ہوچلا تھا اور سیتا اب صورتحال سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

کرن سنگھ کچھ دیر تک کھوئی کھوئی نظروں سے اس زنجیر کو گھورتا رہا پھر جوشیلی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں رہا کردوں گا۔ ٹام قاتل ہو یا نہ ہو مگر اب سزا اسی کا مقدر بنے گی۔ میں اس کی گواہی دینے والی لڑکیوں کو حوالات میں سڑا دوں گا اور جب نشہ پیئے بغیر میرے سپاہی انھیں پامال کریں گے تو وہ خود پر چیخ اٹھیں گی، میں اُن سے نمٹنا خوب جانتا ہوں۔!"

پھر کرن سنگھ نے وہ زنجیر اپنی میز کی ایک دراز میں مقفل کردی اور میرا بیان قلم بند کرنے کے بعد نہایت عقیدت کے ساتھ مجھے روانہ ہونے کی اجازت دے دی۔

کوتوالی کے عملے نے مجھے سیتا کے ہمراہ یوں عزت کے ساتھ روانہ ہوتے دیکھا تو وہاں دبی دبی سرگوشیاں پھیلتی چلی گئیں اور میں بے نیازی کے ساتھ باہر آگیا۔

شہر پر رات کا اندھیرا گہرا ہوچلا تھا۔ کوتوالی سے باہر سڑک پر گہرے سناٹے کا راج تھا۔ دُور سے آوارہ کتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں یا پھر خچر سوار گشتی سپاہیوں کی تیز سیٹیوں کا شور رات کا سناٹا مجروح کرتا دُور تک پھیلتا چلا جاتا تھا!

"ہرے کرشنا ہرے اوم!" فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اچانک میں نے زور سے نعرۂ مستانہ مارا اور سیتا اچھل پڑی۔

"کیا تو نے اپنا دھرم بدل لیا ہے؟" اس نے بیزاری کے ساتھ پوچھا۔

"دھرم نہیں ـــ یہ ایک سوانگ ہے!" میں نے اس کے بازو میں چٹکی لیکر کہا "اس کے بغیر میں زندہ سلامت اپنی سرزمین پر پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔!"

آہستہ آہستہ ہم اس علاقے میں آ پہنچے جہاں بند دکانوں کے سائبانوں کے نیچے عسرت زدہ مقامی گداگر اور آوارہ منش ہپی سردی سے سکڑے سونے کی کوشش میں مصروف تھے۔!

ہری اوم کے لگاتار نعرے مارتا اور ہولے ہولے باقی ماندہ آہنی زنجیروں کا شور پیدا کرتا میں ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اس وقت شب بسری کے لئے مجھے کسی محفوظ اور ویران گوشے کی تلاش تھی۔!

میں تھوڑی ہی دُور چلا تھا کہ عقب میں بھاری آہٹیں سنائی دیں۔ میں نے چونک کر پیچھے سر گھمایا تو میرے فرشتے کوچ کر گئے لاچی کا باپ کسی مکار چیتے کی طرح تیزی سے ہمارے تعاقب میں چلا آرہا تھا۔

اس کے جسم پر اس وقت بھی ریچھ کی وہی کھال موجود تھی جس کی ایک جھلک میں نے بھٹ گرہ کے لاری اڈے پر دیکھی تھی۔ رات کے اندھیرے میں اس کی ورم آلود سُرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور داڑھی کے بڑے بڑے سفید بال ہوا سے اس کے سینے پر لہرا رہے تھے اس وقت بھی اس کا داہنا ہاتھ کھال میں چھپا ہوا تھا۔

لاچی کا باپ اپنی بیٹی کے قتل سے باخبر ہوتے ہی کالی کا روپ دھارے ہمارے تعاقب میں نکل پڑا تھا۔ بھٹ گرہ پہنچ کر اس نے ہر جگہ ہمیں تلاش کیا پھر آخری لمحہ تک لاری کے قریب کھڑا ہمارا انتظار کرتا رہا مگر ہم اسے جل دے کر نیپال کے دارالحکومت تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس لاری کے بعد بھٹ گرہ سے کئی ماہ تک کوئی سواری ملنے کا امکان نہیں تھا۔ پھر برف باری کے باعث راستے نہایت پُرخطر اور دشوار گزار ہوچکے تھے مگر وہ خون آشام بوڑھا انتقام کی آگ میں سلگتا صرف پندرہ ہی دن میں ہمارا کھوج نکال کر کسی بدروح کی طرح بھٹ گرہ سے کھٹمنڈو آ پہنچا تھا۔!

مجھے یقین تھا کہ بھٹ گرہ سے لاری روانہ ہونے کے بعد اسے کسی نہ کسی طرح ہماری وہاں موجودگی پھر فرار کا علم ہوگیا ہوگا لہٰذا وہ کسی نہ کسی طرح کھٹمنڈو آ پہنچا۔ یہاں وہ محض اتفاقات کے انتظار میں فٹ پاتھوں پر وقت گزارتا رہا ہوگا۔ اس وقت مجھے وہاں سے گزرتے دیکھ کر تو اسے شبہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ میں وہی صفدر علی ہوں جسے اس کی اکلوتی خوبرو بیٹی، لاچی دی گئی تھی مگر اس نے سیتا کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا ہوگا اور اب وہ ہمارے پیچھے تھا!

میں نے دوبارہ پیچھے سر گھمایا تو سیتا نے بھی میری تقلید کی اور... بے اختیار اس کے منہ سے ایک گہرا سانس خارج ہوگیا۔ "یہ لاچی کا باپ معلوم ہوتا ہے" اس نے نیچی آواز میں سرگوشی کی۔

میں نے بھڑک کر قرب و جوار میں سوئے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔ پھر غرّا کر بولا۔ "کیا تو بھول گئی کہ تو گونگی ہے۔؟"

ہم نے اپنی رفتار تیز کردی مگر اس بوڑھے کی آہٹیں مستقل فاصلے سے مسلسل اُبھر رہی تھیں۔ میرے بدن میں رہ رہ کر سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہوچکے تھے، سردی کے باوجود میری پیشانی پسینے سے تر تھی، میں نے بارہا موت سے دوبدو جنگ کی تھی لیکن ایسی صبر آزما اور جانگسل صورتحال سے کبھی دوچار نہ ہوا تھا۔ دشمن ہمارے عقب میں اور مسلح تھا۔ اسے اپنی پسند کے وقت اور موقع پر وار میں پہل کرنے کی آزادی حاصل تھی، وہ ہماری ایک ایک حرکت کی کڑی نگرانی کررہا تھا مگر ہم اس کے بارے میں بالکل لاعلم تھے۔ آہٹوں سے صرف یہ اندازہ ضرور تھا کہ وہ ہم سے چند گز دُور چلا آرہا ہے۔ ایسے میں اگر ہم... یک بیک بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے تو وہ بلا تامل ہم پر وار کردیتا اور میں یہ جانتا تھا کہ کالی کا روپ والے رات کے گھور اندھیرے میں محض آہٹ پر نشانہ لگانے میں ماہر ہوتے ہیں۔!

ابھی یہ امر مشکوک تھا کہ لاچی کا باپ مجھے بدلے ہوئے حلیئے میں پہچان سکا ہے یا نہیں مگر سیتا کی شناخت مصدقہ بات تھی اور شاید ہمارا دشمن ہمیں گھیر کر سیتا سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہتا تھا اور اگر یہ مفروضات غلط تھے تو وہ ہمیں سسکا اور سہما کر لذت اندوز ہو رہا تھا اور جس لمحہ بھی اس کی ذہنی رو بہک جاتی، فضا میں اڑتا ہوا کوئی ہتھیار عقب سے ہمیں چاٹ لیتا۔

آخر کار میں نے اپنی جان پر کھیل جانے کا منصوبہ بنا ہی لیا اور دبی زبان میں سیتا کو ہدایات دینے لگا تاکہ اس بھاگ دوڑ سے نجات مِل سکے۔!

اس وقت ہم سڑک کی داہنی جانب چل رہے تھے۔ چند قدم بڑھنے کے بعد جوں ہی ایک تنگ اور تاریک سی گلی سامنے آئی سیتا آخری لمحہ پر بجلی کی سی پھرتی سے اس میں گھس گئی اور میں سیدھا بڑھتا چلا گیا۔!

"ٹھہرو!" سیتا کے مڑتے ہی پیچھے سے وہ بوڑھا نیپالی زبان میں چیختا اور بھاگتا ہوا آگے چلا آیا۔ اس کا داہنا ہاتھ کھال سے باہر آچکا تھا اور اس میں ایک تیز دھار خنجر چمک رہا تھا اس وقت تک اندھیری گلی میں سیتا کے قدموں کی دھمک معدوم ہوچکی تھی اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہاں کچھ بھی نہ ہوا ہو!

لاچی کا باپ نہایت چالاک شخص تھا۔ اس نے نکڑ ہی سے گلی کا جائزہ لیا لیکن وہاں سیتا تو کیا اس کا ہیولا تک نظر نہ آیا۔ آخر وہ میری طرف گھوم گیا۔ اس نے گہری ناقدانہ نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لیا اور میں نے اپنے تمام تر خوف کے باوجود اپنے چہرے پر درویشانہ لاتعلقی کھینچنے کی کوشش شروع کردیں!

"بابا۔ وہ لڑکی کدھر گئی؟" آخر اس نے کرب اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھ سے سوال کیا تو میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر آسکیں۔ وہ مجھے بطور صفدر علی پہچاننے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ اور یہ میری خوش بختی کی علامت تھی۔

میں نے پہلی بار غور سے اپنے اس جانی دشمن کی طرف دیکھا۔ اسکے تندرست اور توانا چہرے کی بے شمار جھریاں اس کے عزم کی کہانی سنا رہی تھیں میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ لڑکی تم سے خوفزدہ تھی۔ وہ اور اس کا ساتھی کئی دن سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے، انھیں ہر آن تمہارا خوف تھا اور اس وقت تم اچانک سامنے آئے تو لڑکی نے مجھ سے مدد کی آخری درخواست کی اور میرے انکار پر فرار ہوگئی۔"

"اوہ خدا!" بوڑھے نے اچانک اپنا سر پیٹ لیا۔ "مجھے لڑکی سے کوئی دشمنی نہیں تھی، اس کا ساتھی میری اکلوتی بچی کو قتل کرکے بھاگا تھا۔ میں اس عمر میں فاقے کرتا اور پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتا اس کے کھوج میں یہاں تک پہنچا تھا۔ میرا رواں رواں انتقام کی آگ میں جل رہا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ میں اس سے اپنی بیٹی کے قاتل کا ٹھکانہ معلوم کرتا اور اسے کچھ نہ کہتا، کہاں بھاگ گئی وہ ـــ؟" بوڑھے کے برہنہ پیر بُری طرح ورم آلود اور زخمی تھے، پنڈلیاں جگہ جگہ سے گھائل تھیں۔ وہ یقیناً بھٹ گرہ سے یہاں تک پیدل ہی آیا ہوگا اور ان دنوں وہاں سواری کا تصور تک محال تھا ـ "شاید تمہیں صفدر علی کی تلاش ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں ـ" بوڑھا میرے نام پر اچانک بھڑک اٹھا۔ "تم جانتے ہو اس کا ٹھکانہ، وہ خونی کہاں ملے گا ـ؟"

میں نے مایوسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور بولا "وہ لڑکی بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ تنہا زیادہ دور نہ جاسکی ہوگی، اسی گلی میں کہیں دبکی کانپ رہی ہوگی۔ اسے تلاش کرتے ہیں وہی صفدر تک تمہاری رہنمائی کرسکے گی، اور لاؤ یہ خنجر مجھے دے دو، اسے دیکھ کر وہ پھر خوفزدہ ہوجائے گی!"

وہ میرے فریب کا شکار ہوگیا اور اپنا خنجر اس نے میرے حوالے کردیا۔ "سیتا، بوڑھے کا خنجر میرے پاس ہے، واپس آجا اب چھپنے کی ضرورت نہیں رہی!" میں نے اس ویران گلی میں داخل ہوکر بلند آواز میں کہا۔

گہرے اندھیرے میں دیوار سے چپکا ہوا ایک سایہ حرکت میں آیا، قدموں کی ہلکی سی چاپ اُبھری اور سیتا اعتماد کے ساتھ ہمارے قریب آگئی۔ اس وقت ہمارے آس پاس گہرا سناٹا تھا لہٰذا ابھی تک کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔

"یہ گھامڑ میری ہی تلاش میں ہے اور میں نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ تو مجھ تک اس کی رہنمائی کرے گی۔" میں نے اُردو میں سیتا سے کہا۔

"تو بتا دوں اسے؟" سیتا نے شوخی سے کہا۔

"بتا بھی دے تو کیا فرق پڑتا ہے میں اس سے خنجر پہلے ہی لے چکا ہوں!" میں نے کہا پھر بوڑھے سے بولا۔ "لڑکی تیار ہے، ہمارے ساتھ چلے آؤ۔"

پوری طرح قابو میں آتے ہوئے اس بوڑھے کو زندہ چھوڑنا حماقت سے کم نہ تھا مگر میں اب دشواریوں سے دامن بچانا چاہتا تھا۔ کھٹمنڈو کا شہر اس بار بھی مجھے راس نہ آیا تھا۔ اپنے گوشۂ تنہائی سے قدم نکالتے ہی مجھے خون خرابے اور فساد میں ملوث ہونا پڑا تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ شراب اور منشیات کا کاروبار کرنے والے یہودی گریسی کو اس کی احسان فراموشی کی سزا دوں اور چیرانند بھون کی جواں سال آوارہ مالکہ کو اس کے ناکام قاتلانہ حملوں کا جواب دیکر آگے روانہ ہو جاؤں مگر حالات یوں لمحہ بہ لمحہ بگڑتے جا رہے تھے کہ مجھے ایک بار پھر قید و بند کی صعوبتیں مقدر بنتی نظر آ رہی تھیں لہٰذا اب میرا آخری فیصلہ یہ تھا کہ لاچی کے باپ کو ٹھکانے لگاتے ہی مجھے آگے بڑھ جانا چاہیئے۔

کافی دیر کے سفر کے بعد میں اس بوڑھے کو ایک لق و دق اور ویران میدان میں لیجانے میں کامیاب ہو گیا جہاں دُور دُور تک اس کی جگر خراش چیخیں سننے والا کوئی نہ تھا۔!

چند ٹیلوں کے درمیان پہنچ کر اچانک میں رُک گیا۔

"رُک کیوں گئے؟" بوڑھے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"اس لئے کہ صفدر علی میں خود ہوں!" میں نے یہ کہتے ہوئے پھرتی سے خنجر دستے تک اس کی بائیں پسلیوں میں اُتار دیا۔ میرا انکشاف سُنکر بوڑھے کی آنکھوں میں ناقابلِ بیان حیرت عود کر آئی تھی، جو خنجر دل میں اُترتے ہی اذیت میں ڈھل گئی۔ بوڑھے کے حلق سے ایک ناتمام سی چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔!

اس کا جسم ساکت ہونے تک ہم دونوں وہیں رکے رہے پھر واپس بستی کی طرف ہو لئے!

وہ رات ہم نے بے فکری سے ایک فٹ پاتھ پر سو کر گزاری۔ اگلی صبح ایک سستے ہوٹل سے ناشتہ کرنے کے بعد ہم پھر انند رام کی خانقاہ کی طرف ہو لئے۔ میں وہاں سے اپنا تھیلا لینا چاہتا تھا جس میں دیگر اہم سامان کے علاوہ پستول اور سرچ لائٹ موجود تھی۔

اس روز میں کھٹمنڈو میں بہت مصروف رہا۔ شاید کرن سنگھ نے اسی روز طلائی زنجیر کی چند کڑیاں فروخت کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ پورے شہر میں میری طلا سازی کی افواہیں گشت کرنے لگیں اور میں جدھر نکل جاتا لوگوں کے ہجوم مجھے گھیر لیتے۔ لوگ ہزار طرح سے میری خوشامدیں اور منتیں کرتے، اپنے دُکھڑے سناتے مگر میں حقارت سے انھیں دھتکارتا رہا۔ ان میں بہت سے لوگ میرے لئے لوہے کی زنجیریں بھی لائے تھے تاکہ میں انھیں سونے میں بدل سکوں۔ میں نے ان میں سے بیشتر زنجیریں اپنے گلے میں ڈال لیں اور جھوم جھوم کر ہرے کرشنا ہرے رام کے نعرے لگاتا ایک طرف ہو لیا۔

آہنی زنجیروں کے پُرشور آہنگ، زردلباس اور گونجیلے نعروں نے تھوڑی ہی دیر میں بے شمار غیر ملکی ہپیّوں کو میری طرف متوجہ کر دیا۔ وہ انند رام کی ذات میں یہ سب چیزیں دیکھنے آتے تھے ادھر میری وضع قطع بھی مختلف تھی میں نے اپنے ماتھے پر تلک بھی بنا لیا تھا، ننگے بازوؤں پر مختلف نقش بھی بنے ہوئی تھیں لہٰذا عقیدت اور نشے کی طلب سے بے چین ہپیّوں نے منطقی طور پر مجھے اپنے دیسی پوپ، انند رام کا جانشین سمجھتے ہوئے مقامیوں کی بھیڑ میں میرے پیچھے اپنا حلقہ قائم کر لیا اور میرے ساتھ آواز ملا کر ہرے کرشنا کے فلک شگاف نعرے مارنے لگے۔ اب مجھ پہ مقامیوں کی یلغار ختم ہو چکی تھی البتہ ان کی ایک بڑی تعداد اس خود سر جلوس سے باہر میرے ساتھ چلی آ رہی تھی!

مجھے صرف ایک دو ہی بھجن یاد تھے لہٰذا بڑے بااعتماد ہوتے ہوئے گونجتے ہوئے میں نے ایک بھجن الاپنا شروع کر دیا، ہپی بھی میرے بول دُہرانے کی کوشش کر رہے تھے اگرچہ اس تمام صورتحال میں میرا زیادہ دخل نہیں تھا مگر اب میں اس طوفانِ بدتمیزی میں مرکزی کردار بن چکا تھا لہٰذا میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا اور میری انگوٹھی میں جڑا ہوا پارس پتھر کچھ بعد دیگرے آہنی زنجیروں سے مَس ہونے لگا اسی کے ساتھ میں نے اپنا رُخ آبادی کے ایک مضافاتی ویرانہ کی طرف کر لیا۔

جلوس جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا شہر کے خاک نشین ہپی اپنے ساتھیوں کی اندھی تقلید میں جلوس میں شامل ہوتے رہے۔ ان میں سے بعض والہانہ انداز میں میرے سامنے اپنے سر دھنتے، اچھلتے اور ناچتے بڑھ رہے تھے۔ اس وقت مجھ پر اپنی عظمت کا عجیب احمقانہ احساس طاری تھا۔ اسی شہر میں ایک بے مایہ اور حسکم کے غلام انسان کی حیثیت میں طویل عرصہ گزارنے والا صفدر علی محض اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نہایت کامیابی سے ایک بڑے انبوہ کو بے وقوف بنا رہا تھا۔

بستی سے باہر کھلے میدان میں پہنچ کر میں ایک ٹیلے پر جا چڑھا، اور اچانک اپنے گلے سے آہنی زنجیریں اتار کر ہجوم میں اچھال دیں۔ چند ثانیوں تک لوگوں کے پلے کچھ بھی نہ پڑ سکا پھر زنجیروں سے معمولی طور پر زخمی ہونیوالوں کی چیخوں میں بیک وقت سونے، سونے کی آوازیں گونجیں اور وہاں لوٹ مار کا وحشیانہ سماں بندھ گیا۔ اس مرتبہ مقامیوں نے بھی تماشا دیکھنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی تمام تر شہ زوری سے کام لیتے ہوئے لوٹ مار میں شامل ہو گئے۔!

اس وقت کوئی بھی میری یا سیتا کی طرف متوجہ نہ تھا۔ میرے لئے یہ مہلت غنیمت تھی میں سیتا کا ہاتھ تھامے تیزی سے ٹیلے کے عقب میں اترتا چلا گیا!

مجھے یقین تھا کہ اس واقعے کی شہرت آناً فاناً میں نیپال کے طول و عرض میں پھیل جائے گی لہٰذا میں نے شہر کے بجائے زیرو پوائنٹ کی راہ اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

تیزی سے بدلتے ہوئے پے در پے واقعات نے سیتا کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اتنی تیز زندگی گزارنے کی عادی بھی نہیں تھی تنہائی میسر آتے ہی اس نے مجھ پر بے شمار سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔!

"اس شہر کے بسنے والوں کے لئے یہ نیا ڈھونگ نہیں تھا۔" میں نے اسے جلوس کے بارے میں بتایا۔ "انند رام ہر سال اپنی بیٹی سندری سے ملنے پہاڑوں میں جاتا تھا پھر واپسی پر یہی سب کرتا تھا جو آج میں نے کیا ہے۔"

"تو یہ سارے گورے اسی کے مرید تھے؟" سیتا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ بلکہ انھیں برباد کرنے میں انند رام کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ جس لڑکی کو اپنے بستر کے لئے منتخب کر لیتا تھا وہ احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی!"

"پھر شاید قدرت نے انند رام کی ان ہی بدکاریوں کا انتقام اس کی بیٹی سندری سے لیا ہے۔" وہ غصّہ اور مایوسی کے ساتھ بولی۔ "میری ماں کو اسی سیاہ کار بڈھے کے اعمال کی سزا ملی تھی!"

"وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔" میں نے کہا "اب ان تمام باتوں کو بھول کر سونے کی کوشش کرو کل صبح ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔"

اس رات زیرو پوائنٹ پر ہم گہری نیند سوئے۔ صبح اٹھتے ہی ہم نے شہر کا رُخ کیا۔ ویرانہ سے آبادی میں پہنچتے ہی ہمیں قدم قدم پر تعظیم ملنے لگی شاید سیتا بھی میرے حوالہ سے شہرت پا چکی تھی کیونکہ بعض لوگ بطور خاص اسے بھی پرنام کر رہے تھے۔!

املیکھ گنج والی لاری روانہ ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی لہٰذا میں نے اوّہ پر اچھی طرح شکم سیر کیا۔ کوئی بھی دوکاندار مجھ سے پیسے لینے کو تیار نہ تھا۔ ادھر آہستہ آہستہ میرے گرد عقیدتمندوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی، آج بھی لوگ میرے لئے آہنی زنجیریں لائے تھے مگر میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا اور جونہی لاری روانگی کے لئے تیار ہوئی میں پھرتی سے اندر جا بیٹھا۔

خدا خدا کر کے لاری کا انجن بیدار ہوا۔ کلینر نے ڈرائیور کو اشارہ دیا اور لاری رینگتی ہوئی کھٹمنڈو کے بازاروں سے گزرنے لگی۔

یوں تو لاری کے تمام مسافر میری ذات میں دلچسپی لے رہے تھے اور میری توجہ کے طالب تھے مگر میں بظاہر آنکھیں موندے زیرِ لب بے معنی الفاظ دُہرائے جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ لاری میں موجود دو آدمی خاص طور پر میری طرف متوجہ ہیں۔ اُن کے بشروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ عزت اور شرافت کے ہر مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ اُن کے چہروں کی کرختگی واضح طور پر اُن کے ناپسندیدہ مشاغل کا اعلان کر رہی تھی۔!

پھر اُن میں سے ایک نے سیتا میں دلچسپی لینی شروع کر دی، میرے لئے اب محض تماشائی رہنا ناممکن تھا۔ میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں اور قہر بار نظروں سے انھیں گھورنے لگا۔ چند ثانیوں تک ان میں سے ایک نے مجھ سے نگاہیں چار رکھنے کی کوشش کی پھر سٹپٹا کر وہ بھی سیدھا ہو گیا۔

لاری یکساں رفتار سے اپنے مقررہ راستے پر دوڑی جا رہی تھی۔ مسافروں کی دبی دبی سرگوشیاں جاری تھیں۔ میری موجودگی کی وجہ سے بس میں احتیاط کی فضا پائی جا رہی تھی۔ مسافر اونچی آواز میں بولنے یا زور سے ہنسنے سے بھی پرہیز کر رہے تھے۔!

اور جب لاری ایک لق و دق میدانی راستے پر دوڑ رہی تھی تو ان دونوں بدمعاشوں نے گہری نظروں سے پوری بس کا جائزہ لیا۔ چند ثانیوں تک سر جوڑے کچھ سرگوشیاں کرتے رہے پھر اچانک ہی وہ دونوں ریوالور نکالکر اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔

"سارے مسافر خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہیں!" ان میں سے ایک چیخا" اور ہاتھ اوپر اٹھا لیں۔"

اس اثنا میں دوسرا لفنگا ڈرائیور کی پشت پر جا پہنچا تھا اور اسے لاری روکنے کی ھدایت دے رہا تھا۔ لاری کی رفتار آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی۔ اور جب لاری رُک گئی تو ان میں سے ایک نیچے اتر گیا اور دوسرے نے باری باری سارے مسافروں کو نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ میں نے دوسرے مسافروں کے برعکس ابھی تک ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے تھے نہ ہی اندر والے نے دوبارہ مجھے کوئی حکم دیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر محسوس طریقے پر اپنی گود میں رکھے ہوئے تھیلے میں سے پستول نکال لیا۔

جب باری آنے پر سیتا نے نشست چھوڑی تو ریوالور والا غرّایا "لڑکی تو لاری ہی میں رُکی رہے گی۔" اُس نے یہ الفاظ نیپالی زبان میں ادا کئے تھے۔! اُس کے لہجے سے اس کے عزائم کی سیاہی جھلک رہی تھی۔ وہ دونوں لاری کے مسافروں کا قیمتی سامان ہتھیانے کے ساتھ ہی سیتا پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک لاری سے باہر مسافروں کو ریوالور کی زد پر روکے رکھتا، دوسرا قیمتی مال جمع کرنے کے ساتھ شاید سیتا سے زبردستی کی کوشش کرتا اور یہ خیال ذہن میں آتے ہی میری کنپٹیاں چٹخ اٹھیں اور میں نے فوراً ہی پستول سے اندر والے کی داہنی ران چھید ڈالی۔ وہ تیز چیخ مار کر پائیدان میں لڑھک گیا۔ فوراً ہی چند مسافروں نے اسے بے بس کر دیا۔

یہ اتنی تیزی سے ہوا کہ باہر والے قزاق کو کچھ سمجھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ وہ یہی سمجھا ہو گا کہ اس کے ساتھی نے اپنے ریوالور سے کسی کو زخمی کیا ہے اور میں اسے اصل صورتحال سمجھنے کی مہلت دیئے بغیر ایک کھڑکی کے قریب گیا۔ وہ مسافروں سے دُور کھڑا بے چینی سے لاری کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اچانک ہی اپنا پستول سیدھا کیا اور ایک پُرہول دھماکے کے ساتھ اس کا بایاں شانہ بُری طرح زخمی ہو گیا، ریوالور اس کے ہاتھ سے اڑ کر دُور جا گرا۔

چند ثانیوں تک باہر کھڑے ہوئے مسافر ہکا بکا اسے زمین پر تڑپتا دیکھتے رہے جب میں نے انھیں للکارا تو انھوں نے فوراً ہی اسے بے بس کر دیا۔!

ان دونوں کے زخم کاری تھے مگر جان لیوا نہ تھے۔ مسافروں میں کوئی بھی اُن سے رعایت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اُن کی پٹائی اتنی تواضع کی گئی کہ وہ بُری طرح چیخنے لگے۔ آخر میری مداخلت پر کلینر نے اُن کے زخموں پر پٹی باندھی اور لاری تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔!

نصف گھنٹہ بعد لاری ٹانک پور جا پہنچی۔ دونوں مجرموں کو انکے

اسلحہ سمیت پولیس چوکی پر چھوڑ دیا گیا۔ وہاں چند مسافروں نے اپنے نام گواہوں کی فہرست میں لکھا دیئے۔ مسافروں کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت چوکی کے عملہ پر بھی اثر انداز ہوئی اور انھوں نے میرے ساتھ اپنا رویہ بہت نرم رکھا۔

شام سے پہلے لاری املیکھ گنج پہنچ گئی۔ یہاں وہ ستی سرائے ابھی تک موجود تھی جہاں میں نے جاتے ہوئے خلصے تماشے دیکھے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک مختصر سا صاف ستھرا رہائشی ہوٹل تھا۔ یہاں میں نے ہوٹل میں رہائش کو ترجیح دی۔

لاری سے آنے والے مسافروں کی زبانی میرے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں اس شہر میں بھی پھیلنے لگیں مگر یہاں میرے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا۔

"کیا یہی تہذیب کہلاتی ہے۔!" ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی سیتا بپھر گئی "یہاں تو ہر انسان بھیڑیا بنا ہوا ہے۔ یہ تو ان آدم خوروں سے بھی بدتر ہیں جن کے درمیان میری ماں نے کبھی رہنا پسند نہ کیا۔"

"یہاں نیکی اور بدی ساتھ ساتھ ہے سیتا۔" میں نے کہا۔ "یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس مرتبہ ہر جگہ برے واقعات ہمارا تعاقب کر رہے ہیں مگر تو فکر نہ کر، اب ہم جلد ہی ایک نئے ملک میں داخل ہوں گے۔ وہاں سے میں تجھے اپنے شہر لے جاؤں گا۔"

املیکھ گنج میں ہمارا دو روزہ قیام خاصا خوشگوار رہا اور ہمیں اپنی تھکان اتارنے کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔ سیتا تنہائی میں میری بہترین رفیق ہوتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ تبدیلیوں کی عادی ہوتی جارہی تھی اور نئی چیزوں پر ہونقوں کی طرح چونکنے کی عادت بتدریج زائل ہوتی جارہی تھی۔

تیسرے دن ہم املیکھ گنج سے سرحد کی طرف روانہ ہوگئے۔ سرحدی چوکی سے ذرا دور جب لاری رکی تو اس میں صرف پانچ مسافر رہ گئے تھے۔ چوکی کے عملہ نے سب سے پہلے میرا استقبال کیا۔ ان کے چہروں سے عقیدت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ شاید آنے جانے والوں سے وہ بھی میرے بارے میں بہت کچھ سن چکے تھے۔!

سرحدی دستہ کا انچارج مجھے بڑی عقیدت سے اپنے کمرے میں لے گیا اور مجھے اپنی کرسی پر بٹھا کر خود میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ سیتا میز پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"رشی جی — میں آپکا بڑا شہرہ سنتا آیا ہوں، کچھ مجھ پر بھی کرم کردو، میری تین لڑکیاں شادی کے قابل ہو چکی ہیں۔ مگر میں پیسہ سے مجبور ہوں۔"

"فکر نہ کر — رام بھلی کرے گا۔" میں نے اس کی میز سے آہنی پیپرویٹ اٹھاتے ہوئے شانِ بے نیازی سے کہا۔

وہ میری لاپروایانہ گفتگو کے باوجود میرے قدموں سے لپٹا رہا اس دوران میں پارس پتھر پیپرویٹ پر اپنا کام دکھا رہا تھا آخر جب لوہے نے سونے کا روپ اختیار کرلیا تو میں پیپرویٹ اس کے سامنے ڈال کر کرسی سے اٹھ گیا۔!

سونے کا وزنی پیپرویٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور جب اسے اپنی آنکھوں پر یقین آگیا تو وہ میری پنڈلیوں سے لپٹ کر پھوٹ کر رو دیا۔!

شاید زندگی میں پہلی بار قسمت اس پر مہربان ہوئی تھی کیونکہ اس کا پورا وجود رقت آمیز مسرت سے کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپ رہا تھا اور وہ یوں بلک بلک کر رو رہا تھا جیسے ان ہی آنسوؤں میں اپنا وجود پگھلا دیگا۔

میں نے بمشکل اسے دلاسہ دیکر کھڑا کیا اور یوں ہم سرحد عبور کر گئے۔

بیر گنج سے ہندوستان کے سرحدی قصبہ رکسول میں داخل ہونے میں خلافِ توقع کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ چوکی کا عملہ مجھے سرحد عبور کرتے دیکھتا رہا اور میں تھوڑی دور چل کر لوگوں کے ہجوم میں گم ہوگیا۔

میرے لئے اب کسی رشی کا بہروپ غیر ضروری تھا لیکن احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اس میں کوئی تبدیلی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

رکسول میں نہ کوئی ڈھنگ کی سرائے تھی نہ ہوٹل، پھر وقت بھی کافی تھا۔ میں سیتا کو ہمراہ لئے بسوں کے اڈہ پر جا پہنچا۔ وہاں سے ایک بس موتی ہاری روانہ ہو رہی تھی۔ میں فوراً اس میں سوار ہوگیا۔ پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ رکسول سے سیتا کو ریل کے ذریعہ موتی ہاری لیجاؤں گا تاکہ وہ اس سفر سے بھی لطف اندوز ہوسکے مگر اسٹیشن کا رخ کرنے کی صورت میں یہ آخری بس بھی نکل سکتی تھی۔

لاری خاصی رات گئے موتی ہاری پہنچی۔ اس شہر میں رات ہوجانے کے باوجود خاصی رونق تھی۔ ہندوستان اور نیپال کی سرحد کا آخری بڑا شہر ہونے کی وجہ سے یہاں مجرمانہ سرگرمیوں میں خاصا زور تھا۔ پھر یہاں آوارہ گرد ہپیوں کی خاصی بڑی تعداد بھی پورے سال قیام پذیر رہتی تھی لہذا یہاں کی راتیں خاصی ہنگامہ پرور ہوتی تھیں۔

موتی ہاری میرا دیکھا بھالا شہر تھا۔ پٹنہ جیل سے فرار کے بعد میں قتل کے ایک مجرم شیکھر کے ساتھ اسی شہر میں ٹھہرا تھا۔ راستہ میں ڈینی سالومن نامی ایک لڑکی اور اس کا بے غیرت دوست جوزف ہمارے ساتھ ہولئے تھے۔ شیکھر زبان نہ جاننے کے باوجود اس لڑکی کو شیشہ میں اتارنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور ایک رات خاموشی سے اسے لے اڑا تھا!

ماضی کی یہ سب باتیں سوچتا میں چاند ہوٹل جا پہنچا۔ ہوٹل کے مالک نے نہایت شائستگی سے ہمارا استقبال کیا۔

"کمرہ نمبر تین خالی ہے؟" میں نے اس سے استفسار کیا' دراصل نیپال جاتے ہوئے میں اسی کمرے میں رکا تھا اور اس کی نفاست مجھے پسند آئی تھی۔

"رشی جی شاید پہلے بھی اس ہوٹل کو رونق بخش چکے ہیں!" ہوٹل والے نے دانت نکال کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"رشی جی الہام پر عمل کرتے ہیں۔" اچانک سیتا بول پڑی۔ نیپال کی سرحد عبور کرنے کے بعد میں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی تھی مگر اب بھی وہ مجھے صفدر کے بجائے رشی گنگا رام کہہ رہی تھی۔ "انھیں کل رات خواب آیا تھا کہ چاند ہوٹل کے کمرہ نمبر تین میں رکنا ہے۔!"

میں نے سیتا کو کڑی نظروں سے گھورا۔ ہوٹل کا مالک اس انکشاف سے مرعوب ہوگیا تھا اور کمرہ نمبر تین ہمیں دے رہا تھا۔

موتی ہاری سیتا کو بہت پسند آیا۔ یہ شہر نچلے طبقے کے غریب لوگوں یا کروڑپتی تاجروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کے بدنام علاقوں کے باسی مال و اسباب کی غیر قانونی نقل و حرکت سے خونریزی تک تمام کام مناسب معاوضہ پر نمٹانے پر تیار رہتے تھے!

روزانہ شام کو میں سیتا کو ہمراہ لیکر شہر کے گرد پھیلے ہوئے سرسبز باغات اور گھنے جنگلوں کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ اس دوران میں میں نے کچھ سونا فروخت کرکے اتنی رقم حاصل کرلی تھی کہ ہم آسانی سے وہاں گزر بسر کرسکتے تھے۔!

اب میرے لئے زیادہ ڈھونگ رچانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی لہذا میں نے مقامی پنڈتوں کا لباس پہننا شروع کردیا تھا۔ بھنویں دوبارہ اگنے لگی تھیں البتہ سر پر میں روز استرا پھروا آتا تھا۔ داڑھی اور گنجا سر ہی میری ہیئت بدلنے کے لئے کافی تھا کیونکہ یہاں مجھے پہچاننے والے نہ ہونے کے برابر تھے۔

موتی ہاری میں قیام کے چوتھے روز ہم دونوں سیر سے لوٹے تو ہوٹل والے کے پاس کاؤنٹر کے سہارے دو دبلے پتلے دراز قامت افراد بیٹھے نظر آئے۔!

"لیجئے، رشی جی آگئے!" مجھے دیکھتے ہی ہوٹل والا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کا انداز دیکھ کر میں چونک پڑا۔

وہ دونوں آدمی شاید وہاں بیٹھے میرے ہی منتظر تھے۔!

میں ان کے قریب پہنچا تو انھوں نے نہایت خوش خلقی سے اپنا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک کا نام رانا گرنام سنگھ تھا۔ دوسرا پرتاپ تھا جس کی بغل میں خاکی رنگ کی ایک سرکاری فائل دبی ہوئی تھی۔ اور وہ غور سے سیتا کا جائزہ لے رہا تھا۔!

وہ دونوں وہاں رکنے کے بجائے میرے ساتھ ہی سیڑھیوں کی طرف آگئے۔ ان کے تیوروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی سرکاری محکمہ کی طرف سے آئے ہیں اور یہ بات میرے لئے سخت تشویش کا باعث تھی آخر میں اپنے خلجان پر قابو نہ پاسکا اور پہلی منزل پر اپنے کمرے کا قفل کھولتے ہوئے ان سے پوچھ ہی لیا "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"کمرے میں چل کر تفصیلی گفتگو ہوگی۔" رانا گرنام سنگھ خشک لہجہ میں بولا۔ اس دوہرے بستر والے کمرے میں پہنچکر پرتاب نے دروازہ اندر سے کنڈی چڑھادی اور فائل سنبھال کر کرسی پر آبیٹھا۔

"میرا تعلق انڈین سیکرٹ سروس سے ہے رشی جی!" گرنام سنگھ خشک لیکن مہذب لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہم آپ سے کچھ اہم معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔"

"بھلا میں انڈین سیکرٹ سروس کے کس کام آسکتا ہوں!" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آپ موتی ہاری میں کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" گرنام سنگھ نے پہلا سوال کیا اور پرتاب نے فائل کھول کر قلم سنبھال لیا۔

"میں نیپال سے آرہا ہوں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"کاغذات؟"

میں نے اپنے وجود کے کسی گوشے سے خوف کی ایک سرد سی لہر اٹھتی محسوس کی اور بے بسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا "کاغذات نہیں ہیں۔"

"آپ کی سکونت اور شہریت کس ملک کی ہے۔؟"

"نیپال!" اب مجھ پر اس باز پرس سے وحشت سوار ہونے لگی تھی۔

"نیپال کا پتہ۔؟"

"رشی اور سادھوؤں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔" میں نے ایک گہرا سانس لیکر کہا۔ "کالی گاپ، بھٹ گرہ، کاٹھ مندر، موٹھ، کٹھمنڈو اور نہ جانے کہاں کہاں رہتا آیا ہوں۔ گیان دھیان کی خاطر تو نگر نگر کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔!"

"خوب!" اس نے جذبات سے عاری لہجہ میں کہا، پھر سب سے خطرناک سوال کیا۔ "ہماری معلومات کے مطابق آپ نے موتی ہاری میں ایک بار سات تولہ اور دوسری بار نو تولہ سونا فروخت کیا ہے، یہ آپ نے کہاں سے اور کیسے حاصل کیا۔؟"

چند ثانیوں تک میں سکتہ کے عالم میں اس کا چہرہ تکتا رہا پھر تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ سونا میری ملکیت میں تھا!"

"مجھے اس پر شبہ نہیں۔" اس نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔ "مگر آپ نے وہ کیسے حاصل کیا۔؟"

"میں کیمیا گر بھی ہوں!" میں ایک طویل سانس لیکر بولا۔ "آتی عمر گنوا کر میں نے بس یہی ایک ہنر سیکھا ہے جو میرے کام آتا ہے۔"

"کیا آپ اپنے اس بیان کو ثابت کرسکتے ہیں؟"

"اگر سامان اور دیگر لوازمات مہیا کئے جائیں تو میں ہر وقت تیار ہوں مگر میں اس راز میں کسی کو شریک نہ کروں گا۔"

"آپ ہند کس مقصد سے تشریف لائے ہیں؟"

"نیپال میں شہرت سے تنگ آکر ادھر کا رخ کیا ہے۔ وہاں کے لوگ گنگا رام کو سونا بنانے کی مشین سمجھنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں لوہے کو چھودوں تو وہ سونا بن جائے۔"

"ہمارے مخبروں نے نیپال سے ایسی ہی اطلاع بھیجی ہیں!" گرنام سنگھ کے یہ الفاظ میرے اعصاب پر کسی بم کی طرح گرے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نیپال میں بھی انڈین سیکرٹ سروس میری نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہی ہے اور اس باز پرس کے ذریعہ محض میری صداقت کی آزمائش مطلوب تھی!"

"جناب میں سمجھ نہیں سکا کہ میری بیکار ذات آپ کے محکمہ کیلئے اتنی اہمیت کیوں اختیار کر گئی ہے۔؟" میں نے اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"وقت آنے پر آپ ہر بات جان لیں گے!" وہ اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے بولا "فی الحال اس تمام گفتگو کو اپنی ذات تک محدود رکھیں!"

گرنام سنگھ نے فائل کا سرسری جائزہ لیا اور مجھے ہکا بکا چھوڑ کر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سیتا کے بارے میں انھوں نے ایک لفظ بھی نہ پوچھا تھا۔!

"یہ کیا چکر ہے؟" اُن کے چلے جانے کے بعد سیتا نے پوچھا۔

"خدا رحم کرے ۔۔ یہ کوئی بڑی مصیبت معلوم ہوتی ہے!" میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں اسی وقت خاموشی سے اس شہر کو خیرباد کہہ دینا چاہئے ورنہ گلوخلاصی مشکل ہو جائے گی۔"

پھر ہم نے بہت جلدی میں اپنا مختصر سامان سمیٹا اور ہوٹل کا حساب بے باق کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے اس مرتبہ میرا رخ ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا۔

وہاں پتہ چلا کہ صبح چھ بجے پہلی ٹرین موتی ہاری سے حاجی پور روانہ ہوگی۔ ہم نے تیسرے درجے کے مسافر خانے میں ایک گوشہ سنبھال لیا میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ آخر انڈین سیکرٹ سروس میرے متعلق کیوں سرگرم ہو گئی ہے۔!

اچانک ہی میرا ذہن میجر انل کے قتل کی طرف گیا۔ وہ مشرقی پاکستان میں اپنے ملکی مفادات کے لئے کام کر رہا تھا اور میں نیپال جاتے ہوئے حالات کا شکار ہو کر اس کے ۔۔ آدمیوں کے جنگل میں پھنس گیا تھا مگر وہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ پھر مجھے کیپٹن بھاٹیہ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے پٹنہ جیل بھیج دیا گیا۔ بھاٹیہ نے میرے خلاف میجر انل کے قتل کا کیس محض اس وجہ سے کمزور کر دیا تھا کہ وہ خود کیمیا میں دلچسپی رکھتا تھا اور میری مہم میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ پھر میں جیل سے فرار ہو گیا اور کٹھمنڈو میں بھاٹیہ سے میرا سامنا ہوا۔ وہ بھی یقیناً فوج سے بھاگا تھا۔ شاید میرے ۔۔ کے فرار میں محکمہ نے کسی سازش کی بو پائی تھی اور یوں سیکرٹ سروس میری راہ پر لگ گئی تھی۔!

مگر اس مرحلے پر ایک اور بات تشویشناک تھی۔ اگر یہ میجر انل ہی کا قصہ تھا تو سیکرٹ سروس والوں کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ گنگا رام کے روپ میں صفدر علی چھپا ہوا ہے جبکہ گرنام سنگھ نے اپنی گفتگو یا رویہ سے ایسا کوئی تاثر نہ دیا تھا۔ میرے ساتھ پراسرار رویہ رکھنے کے بجائے وہ لوگ مجھے اپنے کسی بھی مرکز پر بلوا کر کھلے تشدد کے ذریعے ہر بات اگلوا سکتے تھے۔

اس موضوع پر میں جتنا سوچتا گیا ذہن الجھتا رہا۔ اپنی ذات میں انڈین سیکرٹ سروس کی اس غیر معمولی دلچسپی کا جواز پانا میرے لئے ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔

رات ڈھلتی رہی مگر میری آنکھوں میں دُور تک نیند کا پتہ نہیں تھا۔ میرا ذہن مسلسل اس گتھی میں اُلجھا ہوا تھا۔ آخر اسٹیشن کے گھنٹے نے صبح کے پانچ بجنے کا اعلان کیا اور میں سیتا کو بیدار کرنے لگا۔!

ہندوستان۔۔ پچاس کروڑ انسانوں کا ایک اتھاہ سمندر تھا جہاں میرا کوئی شناسا نہ تھا۔ ایک بار میں موتی ہاری سے نکل کر اس بیکراں سمندر میں شامل ہو جانے میں کامیاب ہو جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت میرا سراغ نہ پا سکتی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد میری اس مہم کی ابتدا ہونے والی تھی ۔۔!

موتی ہاری کا اسٹیشن ریلوے ٹریفک کے اعتبار سے نہایت غیر اہم اور قصباتی انداز کا نظر آتا تھا اور پھر صبح سویرے تو وہاں سناٹا ہونا قدرتی سی بات تھی۔ اسٹیشن پر ساری رات کوئلہ سے چلنے والے اسٹیم انجن کا تیز شور یکساں آہنگ سے گونجتا رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے کافی دُور، پٹریوں کے اس پار صبح کے ملگجے اجالے میں بھاپ اگلتا ہوا وہ سیاہ انجن اور اس کی بھٹی سے اُبھرنے والا شعلوں کا لہو رنگ، انعکاس عجیب آسیبی سماں باندھ رہا تھا۔ اس سے ذرا دُور شنٹنگ یارڈ میں ریلوے کے کئی مستری مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹین سنبھالے بوگیوں کے نچلے حصّوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے اور پٹریوں کے درمیان آوارہ کتّوں کے چند غول زمین سونگھتے اپنی خوراک کی تلاش میں سرگرداں تھے!

سیتا میرے اشارے پر فوراً ہی بیدار ہو گئی۔

"تو سویا نہیں گنگا رام؟" میری ورم آلود سُرخ آنکھوں پر نظر پڑتے ہی وہ چونک کر بولی۔

اس وقت تیسرے درجے کے اس مسافر خانہ میں ہم دونوں کے سوا صرف دو افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک چادر تانے گہری نیند سو رہا تھا اور دوسرا ہمارے قریب ہی ایک چوبی بنچ پر بیٹھا لاتعلقانہ انداز میں اونگھ رہا تھا۔ میں نے ایک نظر اُن دونوں پر ڈالی پھر پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میں بہت پریشان ہوں سیتا! ہوٹل پر آنے والوں کا مسئلہ بار بار میرے ذہن پر کچوکے لگا رہا ہے۔!"

"تو رات ہی سے پریشان ہے۔" وہ میرے قریب کھسکتے ہوئے بولی "یہاں مجھے بڑی عجیب عجیب چیزیں نظر آ رہی ہیں مگر اب میں خاموش نہیں رہوں گی، تجھے ہر چیز کے بارے میں بتانا پڑے گا۔"

"تو فکر نہ کر!" میں آہستہ سے بولا "اب ہم ریل گاڑی میں ہی سفر کریں گے جسے وہ چنگھاڑتا ہوا کالا انجن ان چمکتی ہوئی آہنی پٹریوں پر کھینچتا ہے۔"

میرے بشرہ پر پریشانی کی جگہ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر سیتا کا سویا ہوا شوق دوبارہ بھڑک اُٹھا اور اس کے دل میں ریل گاڑی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش بھڑک اٹھی۔

میں نے اپنا تھیلا سنبھال کر سیتا کو ہمراہ لیا اور پلیٹ فارم سے اتر کر پٹریاں عبور کرنے لگا تا کہ اسے قریب سے وہ انجن دکھا سکوں۔

انجن اور ریل کے بارے میں سیتا کو میری ہر بات ناقابلِ یقین معلوم ہوئی۔ وہ تحیّر آمیز معصومیت کے ساتھ ایک ایک بات پر مجھ سے بحث کر رہی تھی۔ آخر کار انجن پر اونگھتے ہوئے فائرمین نے ڈوری کھینچ کر تین بار سیٹی بجائی اور اسی وقت پٹریوں کے درمیان انجن ڈرائیور اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اِدھر آتا ہوا نظر آیا۔

"چل اب انجن چلنے والا ہے!" میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ۔۔ تیزی کے ساتھ اسے پلیٹ فارم کی طرف لیتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد انجن کو ریل کے ڈبّوں کے ساتھ جوڑنے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ سیتا بڑے انہماک کے ساتھ انجن کی آسیبی حرکات کا مشاہدہ کر رہی تھی!

ٹرین اسٹیشن پر آئی تو ہم دونوں تیسرے درجے کے ایک ویران ڈبہ میں جا بیٹھے جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ موتی ہاری سے یہ ٹرین یوں ہی خالی روانہ ہوگی مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن پر آمد و رفت کا سلسلہ تیز ہوتا گیا اور جب ٹھیک چھ بجے ٹرین نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو ٹرین میں خاصے مسافر سوار تھے۔ ہمارے ڈبہ میں بھی اب دس گیارہ مسافر موجود تھے جن میں ایک سفید فام ہپّی نوجوان جوڑا بھی تھا!

مسافروں کی موجودگی کے پیشِ نظر میں نے اپنے چہرے پر بے نیازی طاری کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر ہونٹوں کو بے معنی انداز میں جنبش دینے لگا۔

بظاہر میں بوگی کے ماحول سے بالکل لاپرواہ تھا مگر کنکھیوں سے پورے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔۔ دراصل موتی ہاری کے چاند ہوٹل میں رانا گرنام سنگھ سے ہونے والی گفتگو نے مجھے بہت زیادہ خائف کر دیا تھا۔ اس شخص نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا تھا کہ انڈین سیکرٹ سروس کو میرے بارے میں اپنے نیپالی مخبروں سے بعض اطلاعات ملی تھیں جبکہ میں نے نیپال میں اپنے طویل قیام کے کسی مرحلے پر خود کو زیرِ نگرانی نہیں پایا تھا۔ کم از کم اپنے اصل روپ میں میں نے کہیں اپنا سراغ نہ چھوڑا تھا اور جب میں مہارشی انند رام کے تعاقب میں سیتا وادی کی طرف روانہ ہوا تو اس وقت میری نگرانی کرنے والے کا کہیں وجود تک نہ تھا۔ برف پوش پہاڑوں اور خون آشام قبائل سے میری واپسی نہایت خاموشی کے ساتھ ہوئی تھی مگر ۔۔ کے دھارے میں پھنس کر مجھے خود کو ایک باکمال سنتی کے روپ میں ۔۔ پڑا۔ میرا خیال تھا کہ لوہے کو سونے میں تبدیل کر دینے کی ناقابلِ یقین قوت کا مالک ہونے کی ہی وجہ سے میں انڈین سیکرٹ سروس کے کسی ہرکارے کی نظر میں آیا تھا اور جب میں نے نیپال سے ہندوستان کی سرحد کا رُخ کیا تو نگراں آنکھیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔

میرے لئے صورتحال کا یہ تجزیہ خاصا اطمینان بخش تھا۔ کم از کم ایک بات صاف ہو جاتی تھی کہ موتی ہاری میں ہونے والی باز پرس کا میجر انل کے قتل یا کیپٹن بھاٹیہ کے فرار سے کوئی تعلق نہ تھا!

"اس بزرگ ہستی کا کیا نام ہے؟" اچانک بوگی میں عقیدت میں ڈوبی ایک نسوانی سرگوشی گونجی اور میں نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

سفید فام ہپّی جوڑا میرے سامنے والی نشست پر موجود تھا۔ لڑکی نے سیتا کو اپنا ہم نسل سمجھ کر میرے بارے میں انگریزی میں سوال کیا تھا اور وہ بے چاری ہونقوں کی طرح اس کا منہ تک رہی تھی!

"گنگا رام جی!" میری آنکھیں کھلی دیکھ کر سیتا جلدی سے بولی "یہ لڑکی مجھ سے کیا کہہ رہی ہے؟"

میں نے اپنی وحشت آمیز نگاہیں لڑکی کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ شب بیداری کی وجہ سے ورم آلود اور سُرخ آنکھوں کو یوں اپنی جانب نگراں پاکر وہ سفید فام ہپّی لڑکی بوکھلا گئی اور داہنے ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی سے سینے پر کراس بناتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا۔!

"اس کی آتما سکھ کی متلاشی ہے!" میں نے بوگی کے تمام مسافروں کو اپنی طرف متوجہ پاکر گمبھیر آواز میں سیتا سے کہا "ہم ان کی زبان تو نہیں جانتے مگر ان کے چہروں کی ریکھائیں پڑھ سکتے ہیں، یہ لڑکی نروان کی تلاش میں اپنی ساری پونجی لُٹا چکی ہے اور اب اس کی جیب خالی ہے۔ ۔ ۔ یہ ہم سے مایا چاہتی ہے، اسے دھن کی ضرورت ہے تاکہ یہ ایکبار پھر ہزاروں میل دُور اپنے لوگوں میں پہنچ سکے!"

سیتا منہ پھاڑے میری باتیں سنتی رہی مگر میرے خاموش ہوتے ہی کچھ دُور سے ایک خوش پوش شخص اٹھا اور اس ہپّی لڑکی کے قریب آگیا۔

وہ شاید انگریزی زبان سے واقف تھا اور مَردوں کی اس قسم سے متعلق نظر آتا تھا جو حسین لڑکیوں سے ہمکلامی کی خاطر خاصی قربانیاں دے سکتے ہیں۔

"رشی جی کا خیال ہے کہ تم عسرت کا شکار ہو!" وہ آہستہ سے کھنکھار کر اس ہپّی لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "اور ان سے مدد کی طالب ہو۔؟"

لڑکی نے اپنا خوبصورت چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں اس مسافر کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ "کیا یہ بزرگ ہستی انگریزی سمجھ سکتی ہے؟" یہ سوال کرتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد یاس انگیز اور درد آمیز تھا۔!

"زبان ان لوگوں کے لئے بے معنی چیز ہے!" وہ مسافر سفید فام لڑکی کے قریب ہی ٹک گیا "یہ تو براہ راست دلوں میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" اس دوران میں لڑکی کا کسرتی بدن والا دراز قامت ساتھی اس مسافر کو کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا جبکہ وہ شخص اس کے تیوروں سے لاپرواہ بلکہ بے خبر لڑکی پر ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا!

"ریٹا!" اچانک اس نے تیز لہجے میں لڑکی کو پکارا۔ "ختم کرو یہ بکواس!"

اور اسی کے ساتھ وہ اُٹھ کر دخل در معقولات کرنے والے مسافر کے سامنے آگیا۔

"او مسٹر! یہ بہروپیہ تم کو گاہک پھانسنے کا کیا کمیشن دیتا ہے۔ تم اس کے پرانے نمکخوار معلوم ہوتے ہو۔!"

وہ لڑائی جھگڑے سے بچنے والا آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے ایک نظر اس لمبے تڑنگے اور صحت مند ہپّی کے سراپا پر ڈالی اور ہکلاتا ہوا نشست سے اُٹھ گیا۔ "یہ.... یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں ہند کا ایک معزز شہری ہوں، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جو کسی کی دلالی کرتا پھروں۔"

ہپّی نے بھنّاتے ہوئے لہجے میں ہند کے بارے میں کچھ ناشائستہ، بلکہ فحش فقرے ادا کئے اور تلخ لہجے میں بولا۔ "میں یہاں کے معزز لوگوں سے خوب واقف ہوں جو ہر سفید فام لڑکی کو طوائف سمجھ کر ندیدے کتوں کی طرح اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں!"

اس ہپّی کا رویہ سخت جارحانہ تھا۔ اس تپلون پوش منحنی سے مسافر نے کہیں سے سہارا ملنے کی امید میں بے بسی سے بوگی کے مسافروں پر نظریں دوڑائیں مگر وہاں کوئی بھی اس انگریزی گفتگو کی سنگین نوعیت سے واقف نظر نہ آتا تھا۔ میں نے بھی مکاری کے ساتھ اپنی آنکھیں موندلی تھیں۔!

مگر سیتا بڑی نابکار لڑکی تھی۔ گفتگو تو خاک اس کے پلّے نہ پڑی مگر ہپّی کے جارحانہ رویہ اور اس مسافر کی مظلوم صورت نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

"یہ گورا تجھ سے کیوں لڑ رہا ہے؟" بوگی میں سیتا کی تیز آواز گونجی تو میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ سیتا تھا نے ان دونوں کے قریب موجود تھی!

سیتا کے منہ سے صاف اُردو سُن کر اس الم رسیدہ مسافر کو خاصی حیرت ہوئی جس کا اظہار صرف اس کی آنکھوں تک ہی محدود رہا کیونکہ اس نازک مرحلہ پر زیادہ تکلفات کا موقع نہیں تھا۔ وہ اچانک ہی بولا۔ "یہ ہند کو گالیاں دے رہا تھا!"

"ہند؟" سیتا نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دہرایا پھر اتنی تیزی کے ساتھ اس لمبے تڑنگے ہپّی کے پیٹ میں لات ماری کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ہپّی کی ہمراہی لڑکی خوفزدہ اور سریلی سی چیخ مار کر دُور بھاگ گئی۔ سیتا کو فساد میں اُلجھانے والا بھی اس مہلت کو غنیمت جان کر راہداری میں سمٹے ہوئے حیرت زدہ مسافروں میں جا ملا۔ ادھر وہ دیوہیکل ہپّی سیتا کی لات کھا کر کسی بھیڑیئے کی طرح غرّاتا ہوا نشست سے ٹکرا کر بوگی کے فرش پر آگرا۔

"سیتا، یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" آنکھیں کھولتے ہی میں زور سے چیخا۔

"سالا اپنی عورت کو گالیاں دے رہا تھا۔!" یہ کہتے ہوئے اس نے فرش سے اُٹھتے ہوئے ہپّی کی پشت پر بھرپور لات رسید کی اور وہ توازن کھو کر ایکبار پھر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

سیتا کے جواب پر میری کھوپڑی ناچ اُٹھی۔ ابھی تک مجھے یہی حیرت تھی کہ آخر سیتا کو ہند سے اتنی محبت کیسے ہوگئی کہ اس کی توہین کا بدلہ لینے کے لئے وہ ایک طاقتور مرد سے اُلجھ پڑی مگر اب مجھے پتہ چلا کہ وہ ہپّی لڑکی کا نام ہند سمجھی تھی اور محض اس وجہ سے اس نوجوان پر چڑھ دوڑی تھی کہ اس کی دانست میں وہ اپنی ہمراہی لڑکی کو گالیاں دے رہا تھا!

سیتا کا تیسرا حملہ میری مداخلت کی بنا پر ادھورا رہ گیا اور وہ ہپّی فرش سے اُٹھ کر خوفناک تیوروں کے ساتھ سیتا کی طرف لپکا۔

میں نے چیخ کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ غصے میں اندھا اور بہرا ہو چکا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ قریب آیا سیتا نے میری گرفت میں ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر ایک بھرپور گھونسہ رسید کیا اور وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ میرے لئے یہ موقع غنیمت تھا میں نے سیتا کو چھوڑ کر اس ہپّی کو دبوچ لیا۔ مجھے پیشقدمی کرتے دیکھ کر کچھ مسافروں کو بھی غیرت آئی اور ذرا ہی دیر میں کئی آدمیوں نے مل کر اسے پُرسکون ہو جانے پر مجبور کر دیا۔!

سیتا کے آخری گھونسے نے غالباً اس کا کوئی دانت ہلا دیا تھا یا شاید اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا کیونکہ اس کے دہانہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی تھی اور وہ خاموش ہو جانے کے باوجود سیتا کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا جبکہ سیتا دوبارہ اپنی جگہ پر آبیٹھی تھی اور معصومانہ شوق سے کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی!

"مارک، تم کبھی ٹھنڈے دماغ سے کام نہیں لیتے!" ریٹا اپنے سفید رومال سے اس کے دہانہ سے بہتی ہوئی خون کی لکیر صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "یہ درست ہے کہ اس ملک میں ہمیں ہر قدم پر جعلسازی اور لوٹ مار سے واسطہ پڑا ہے مگر پھر بھی کوئی مقامی یہ گوارہ نہیں کرے گا کہ ہم اس کے ملک کو کھلے عام گندے الفاظ سے نوازتے پھریں۔ تمہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیئے۔!"

"اپنا وعظ بند کرو!" مارک نے اسے جھڑک دیا۔ "میں تو جس دن سے یہاں آیا ہوں خود کو مکار بھیڑیوں کے غول میں گھرا ہوا محسوس کر رہا ہوں اور اب تم بھی ان ہی کی ترجمانی کر رہی ہو!"

"تم جو چاہے کہو مارک!" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "مگر اس وقت تمہارا اشتعال غیر ضروری تھا۔ وہ بیچارہ تو مجھے اس بزرگ کے بارے میں بتا رہا تھا۔!"

"شاید تم بنارس کے اس مقدس بزرگ کو بھول چکی ہو جو کہ ہمارے تین ہزار ڈالر ہضم کر گیا تھا اور پھر تم پر ہاتھ صاف کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ بنارسی ٹھگ تو اس سے کہیں زیادہ مقدس معلوم ہوتا تھا۔" مارک زہریلے لہجے میں بولا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ مارک کے لہجے کی تلخی بدستور باقی تھی اور وہ رہ رہ کر سیتا کو گھورے جا رہا تھا۔ ان دونوں کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ وہ امریکی باشندے ہیں اور شادی کے فوراً بعد ہنی مون منانے ہندوستان کی طرف آگئے۔ ان کے لباس رنگا رنگ اور بھڑکیلے تھے، بال بھی لمبے اور بے ترتیب تھے مگر اپنی ظاہری ہیئت کے باوجود وہ دونوں ہپّی طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ مقامیوں میں آسانی سے گھلنے ملنے کی نیت سے انہوں نے یہ انداز اپنایا تھا۔

اس وقت باہر تا حدِ نظر پھیلے ہوئے میدانوں میں راہوارِ مشرق کی طلائی کرنوں کا جال پھیل چلا تھا۔ صبح کی خوشگوار فضا میں جا بجا پرندوں کے غول آسمان کی بیکراں وسعتوں میں تیرتے پھر رہے تھے۔ سیتا ان قدرتی نظاروں میں اتنی محو تھی کہ شاید میری موجودگی کو بھی فراموش کر چکی تھی۔

اچانک ریل کے انجن نے ایک گھٹی گھٹی طویل سیٹی بجائی اور چند ہی لمحوں بعد ریل کی رفتار بتدریج سُست پڑنے لگی۔ سب سے پہلے ہماری بوگی ایک پسماندہ اور کچے لیول کراسنگ سے گزری جہاں دو بیل گاڑیاں ٹرین گزرنے کے انتظار میں رُکی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔!

لیول کراسنگ سے گزرنے کے تھوڑی دیر بعد ٹرین دھول میں اٹے ہوئے ایک کچے پلیٹ فارم پر رُک گئی اور یکبیک اسٹیشن سے چائے، پانی انڈے اور ناشتہ فروخت کرنے والوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ اس چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر نام وغیرہ کی کوئی ایسی تختی نہیں تھی جس سے اس گاؤں کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا۔ ٹرین وہاں بمشکل چند منٹ رکی اور خورد و نوش کا سامان لینے والوں کو آخری سیٹی پر افراتفری کے عالم میں بوگیوں میں سوار ہونا پڑا۔

ٹرین دوبارہ روانہ ہوئی تو میں نے اپنے موجودہ حالات کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ موتی ہاری میں اخبارات کے لب و لہجہ سے صاف ظاہر تھا کہ ہندوستان کا با اقتدار طبقہ پاکستان کے خلاف محاذ آرائی پر تُلا ہوا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدیں تو عرصۂ دراز سے بند پڑی ہوئی تھیں پھر ان دنوں ہندوستان میں بنگلہ دیش کے معاملے پر خاصی سرگرمی پائی جا رہی تھی۔ ان حالات میں میرے لئے کاغذات وغیرہ کے بغیر یہ تو ممکن تھا کہ میں کلکتہ کی جانب سے نام نہاد پناہ گزینوں وغیرہ میں مل کر کسی طرح مشرقی پاکستان چلا جاؤں لیکن ادھر کی خبریں سخت روح فرسا تھیں۔ محبِ وطن اور سرکش عناصر کے انتقامی جذبے لہو میں آلودہ ہوتے جا رہے تھے۔ اِکا دُکا قتل کی وارداتوں کی جگہ بلوؤں نے لے لی تھی۔ چند شرپسند جس بستی کی طرف ہاتھ اُٹھا دیتے، جنونی لوگوں کا ایک انبوہ آزادی کے نام پر وہاں ٹوٹ پڑتا اور ہر غیر مقامی کو تہ تیغ کئے بغیر واپس نہ لوٹتا۔ میرے لئے مغربی بنگال سے نکل کر خون کا دریا عبور کرنا ناممکن تھا جبکہ مغربی پاکستان سے ملنے والی سرحدوں سے بھی سخت کشیدگی اور بھاری فوجی نقل و حرکت کی خبریں آرہی تھیں۔ ایسے ماحول میں ادھر کا رُخ کرنا بھی خطرناک تھا۔ بارودی سرنگیں، ہندوستانی سرحدی محافظ پھر پاکستانی فوجی۔ یکے بعد دیگرے ان سب سے بچ نکلنا بڑا محال نظر آتا تھا جبکہ انڈین سیکرٹ سروس کے افراد سے ملاقات کے بعد میں جلد از جلد ہندوستان کی سرزمین کو خیر باد کہہ دینا چاہتا تھا۔

ہمالیہ کے ہولناک برفانی انسان اور ان اطراف میں بسنے والے ... سے زندہ سلامت بچ نکلنے والے صفدر علی کو مہذب انسانوں کے درمیان سے سرحدیں عبور کرنے سے خوف آرہا تھا اور یہ خوف بے سبب نہیں تھا میری زندگی کے تجربات نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ انسان جتنا مہذب اور ترقی یافتہ ہوا اسی قدر چالاک اور خطرناک ہوتا ہے۔!

گو فی الحال میرا ارادہ یہی تھا کہ ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں انسانوں کے بیکراں سمندر میں کھو جاؤں گا اور جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ اب میں انڈین سیکرٹ سروس کے مخبروں کو جل دینے میں کامیاب ہو چکا ہوں تو پھر اپنے وطن کی راہ لوں گا مگر فی الحال میرے اس سرزمین سے نکلنے کے آثار دُور دُور نظر نہ آتے تھے!

مظفر پور پر ٹرین تھوڑی دیر کے لئے رُکی پھر حاجی پور کی سمت روانہ ہوگئی جہاں اس کا سفر ختم ہو جاتا تھا۔ سیتا کے ہاتھوں سے پٹنے والا گورا اب خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوندنے والی وحشیانہ چمک ماند پڑ چکی تھی اور سیتا تو اپنے بدلتے ہوئے رویّہ کے اعتبار سے انوکھی شخصیت کی مالک تھی۔ اسے معمولی باتیں یاد رکھنے میں جو ملکہ حاصل تھا وہی مہارت وہ بڑے بڑے واقعات کو بُھلا دینے میں ظاہر کرتی تھی!

حاجی پور میں ہم نے صرف دو راتیں بسر کیں پھر آگے روانہ ہوگیا۔ جب میں پنڈتوں، مندروں اور ریشیوں کی پراسرار سرزمین پر اترا تو شہر کی عمارتیں سورج کی دم توڑتی کرنوں میں دور سے چمکتی نظر آرہی تھیں مجھے بے اختیار انند رام کی بیٹی اور سیتا کی ماں سندری یاد آگئی۔ اس بدنصیب مگر باعزم عورت نے بنارس کی سرزمین پر ہی جنم لیا تھا مگر روحانی تقدس کے لبادوں میں چھپے نفس زدہ بھیڑیوں نے اپنے سفلی جذبات کی تسکین کی خاطر ایک مندر میں اسے لہولہان کر دیا.... اور سندری اب اپنی جنم بھومی سے ہزاروں میل دور ہمالیہ کے برفانی پہاڑوں میں جدوجہد بہادری اور معصوم امنگوں سے بھرپور ایسی زندگی گزار رہی تھی جس کا ان شہروں میں تصوّر ہی لرزہ خیز تھا۔ میرا جی چاہا کہ سیتا کو یہ سب بتا ڈالوں۔ اسے بتا دوں کہ اس وقت وہ اپنی ماں کے وطن میں ہے۔ اسے ہر بات کھول کر بتا دوں مگر میں اس کی ہمت نہ کر سکا۔ "او گنگا رام!" آس پاس سناٹا دیکھ کر سیتا نے میرے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔ "یہاں اترتے ہی تو کہاں کھو گیا۔؟"

"تیری ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"اور وہ ہم دونوں کے بارے میں سوچتی ہوگی!" وہ بھی یک بیک اداس ہوگئی۔ پھر ہم خاموشی کے ساتھ ریلوے اسٹیشن سے کھلی فضا میں نکل آئے۔ ڈھلتے سورج کے سائے میں اس شہر کی زندگی بہت تیز آہنگ اختیار کر چکی تھی سڑکوں پر ملا جلا ٹریفک رواں تھا۔ دن بھر محنت مشقت کرنے والے ہزاروں انسان تیزی کے ساتھ اپنے گھروں کی سمت میں چلے جا رہے تھے اور اس ہجوم میں ہر تیسرا شخص جوگیوں کے لباس میں نظر آرہا تھا۔ مالاؤں سے لدے پھندے یہ رشی محنت کش لوگوں کے مقابلہ میں بڑے پُرسکون نظر آرہے تھے اور دبی دبی آواز میں ہری رام ہری کرشن کی مالا جپتے لوگوں کی بھیڑ میں اُلجھتے، گول

چھتری والے قدیم وضع کے یکوں سے بچتے بچاتے چلے جا رہے تھے۔ اس ماحول میں میری زرد دھوتی، گنجا سر اور وحشت زدہ داڑھی اپنی انفرادیت کھو چکی تھی یہاں کا ہر پجاری، رشی اور جوگی پورا صفدر علی تھا!

عمارتوں میں بھی یہی رنگ نمایاں تھا، ہر طرف اونچے نیچے، چھوٹے بڑے، سادہ اور مرصع مندر ہی مندر بکھرے ہوئے تھے ان میں گئو شالے بھی تھے مندر بھی اور آشرم بھی۔ مختلف سمتوں سے بہت سی ملی جلی مترنم آوازیں بھجن وغیرہ الاپ رہی تھیں اور ان آوازوں پر کانسی کی گھنٹیوں کا تیز شور سب سے حاوی تھا مورتوں سے منقش بہت سی رنگا رنگ برج دار عمارتوں کے احاطوں پر بنے ہوئے طاقوں میں تیل کے دیئے رکھے ہوئے تھے جنہیں زرد پوش پنڈت عقیدت کے ساتھ جلانے میں مصروف تھے۔ فضا کی لطافت مجھے تھوڑی ہی دیر کی بات نظر آ رہی تھی۔ اندھیرا پھیلتے تک پورے شہر میں تیل کے اتنے چراغ جل اٹھتے کہ ان کے دھوئیں سے ساری فضا آلودہ ہو جاتی۔

میرے لئے یہ افیون زدہ ماحول اور اپنی ذات میں گم انسان بہت پسند آئے۔ ان میں خاصی تعداد بیرونی شہروں سے آنے والے یاتریوں کی بھی تھی اور اس شہر میں کوئی بھی اجنبی بڑی سہولت کے ساتھ اپنا وجود چھپا سکتا تھا۔ یہاں صفدر علی کے بہروپ پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

سیتا کے لئے یہ سارے مناظر حیرت انگیز تھے "یہ کون سی جگہ ہے، تو مجھے کہاں لے آیا ہے؟" اس نے سحر زدہ آواز میں میرے کان کے نیچے سرگوشی کی!

"ہرے رام!" میں نے اسے گھور کر ایک نعرۂ مستانہ مارا سیتا کی نیلگوں آنکھوں میں غصہ کی چمک لہرائی اور وہ گردن جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

ریلوے اسٹیشن کے آس پاس کئی ہوٹل بھی تھے مگر میرا حلیہ ایسا نہ تھا کہ میں ہوٹل کا رخ کرتا۔ بنارس میں یاترا کے لئے آنے والوں کے لئے قدم قدم پر گئو شالے قائم تھے جہاں ٹھہرنے والوں سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ کھانا بھی لنگر سے مفت ہی ملتا تھا۔ یہ تمام اخراجات مندروں کے چڑھاووں سے پورے کئے جاتے تھے۔

شہر میں کافی دیر تک بے مقصد چکر لگانے کے بعد میں نے گنیش مندر کے احاطہ میں واقع گنیش آشرم کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا یاتریوں کا وہ مسافر خانہ کھپریل کی چھت کے نیچے بنے ہوئے ایک بڑے ہال پر مشتمل تھا پتھر کی دیواروں میں ستونوں کی جگہ ہندوؤں کے گنیش دیوتا کی مورتیں بنی ہوئی تھیں یوں تو میں بارہا گنیش دیوتا کا نام سن چکا تھا لیکن اس روز پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ قدیم ہندوستانی دیو مالا میں گنیش دیوتا کا کیا تصور ہے۔ شیوا ہندو دھرم کا ایک بھگوان ہے جس سے خوف، دہشت تباہی اور زرخیزی کے تصورات وابستہ ہیں جب اس نے شکتی کی مہربان دیوی پاربتی دیوی سے تعلق قائم کیا تو پاربتی دیوی کی کوکھ سے گنیش نے جنم لیا۔ یہ ہندوؤں میں کامیابی کا دیوتا سمجھا جاتا ہے اور شیوا اور پاربتی کا بڑا لڑکا ہے گنیش آشرم کے ستونوں کی جگہ جو مورتیں نصب ہیں ان میں اس کا سر بہت بڑا اور ہاتھی سے مشابہہ تھا۔

اس بڑے ہال میں چھ سات دیوار گیر لیمپ جل رہے تھے ان کی روشنی میں وہاں سات مسٹنڈے پجاری براجمان تھے ان سب کے اوپری حصے برہنہ تھے۔ ان سب کے جسم فربہ اور کھالیں چمکدار تھیں ہر ایک نے مسافر خانہ کے فرش پر بستر لگایا ہوا تھا۔ ہماری آہٹ پر تقریباً وہ سب ہی چونکے اور آشرم کی فضا رام رام کی اضطرابی سسکیوں سے گونج اٹھی۔

مگر میں نہ عقیدت میں ڈوبا کوئی پجاری تھا نہ دیوتاؤں کا اوتار! میری زندگی کا بیشتر حصہ ان مصروفیات میں گزرا تھا جو مستند طور پر ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں اور میں ہر بدی کو دور ہی سے سونگھ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا میں نے ان آوازوں میں جنسی پکار واضح طور پر سنی۔ ان کی بے رحم، چمکیلی نگاہیں دزدیدہ اور کھلے انداز میں سیتا کے حسین جسم کے نشیب و فراز ٹٹول رہی تھیں۔ میں نے یہ سب محسوس کیا لیکن اندر گھستے ہی واپس لوٹ جانا میرے بہروپ کی نفی کے مترادف تھا لہٰذا میں نے اس تلخی کو پیتے ہوئے ان سے ذرا دور ہی دیوار کے سہارے اپنا تھیلا رکھ دیا۔

"یہاں اپنی زبان کو قابو میں رکھنا!" میں نے دبی زبان میں سیتا سے کہا۔

"کیا تو دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جانتا جہاں میں پوری آزادی سے بول سکوں۔؟" وہ غرائی۔

"ہوش میں رہ سیتا!" یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے داہنی جانب آہٹ سنائی دی اور میں نے اچانک اپنا لہجہ اونچا کر دیا۔ "یہ رشیوں اور پجاریوں کے گیان دھیان کی جگہ ہے۔ اونچی آواز میں بول کر دوسروں کی عبادت میں خلل ڈالنا بہت بڑا پاپ ہے!"

"واہ سادھو جی! کیا بات کہی ہے!" میرے قریب ہی سے ایک بھاری آواز ابھری۔

میں نے بڑے اطمینان سے سر گھمایا تو تیل کی مالش سے چمکتے ہوئے سیاہ بدن اور کریہہ چہرہ والے ایک زرد دھوتی پوش کو اپنے قریب کھڑا پایا۔

"ہاں رشی جی!" میں سنجیدہ لہجے میں اس سے بولا "یہ لڑکی نئی نئی ہمارے دھرم میں آئی ہے۔ یہ باتیں ذرا دیر ہی سے اس کی سمجھ میں آئیں گی؟"

"لڑکی سندر ہے!" اس نے حریصانہ لہجہ میں کہا۔ ایک ثانیہ کے لئے خاموش ہو کر میرے چہرے کے تاثرات پڑھے پھر جلدی سے بات کا رخ بدل لیا "مگر سندر صورتوں کے ساتھ سندر آتما بھی ہونی ضروری ہے ورنہ دھرم کی ہر بات پھیکی اور بے مزہ لگتی ہے!" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب ہی پختہ فرش پر بیٹھ گیا۔

"یہ شہر بڑا عجیب ہے، یہاں آکر آتما کو عجیب سکون ملتا ہے!" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"یوں تو ساری دھرتی برہما کی بنائی ہوئی ہے!" اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے مصنوعی بے خودی کے ساتھ کہا۔ "مگر گیانیوں کے لئے بنارس سے اچھی جگہ پورے ہند میں نہیں۔ یہاں کی مٹی تک میں بھگوان کی بو رچی ہوئی ہے، میں گیارہ برس پہلے بریلی سے یاترا پر آیا تھا اور اسی دن سے یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"رشیوں کا نہ گھر ہوتا ہے نہ ٹھکانہ... نگر نگر کی خاک چھانتے ہیں اور جیون بتا دیتے ہیں۔" میں ایک گہرا سانس لیکر بولا۔ "میں نے کئی بار ادھر آنا چاہا مگر ہر بار گرو نے کہیں اور بھیج دیا۔ اس بار گرو کی آگیا سے حاجی پور سے سیدھا ادھر ہی آیا ہوں!"

"حاجی پور سے آئے ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارے گرو کا؟"

"مہارشی اوم پرکاش!"

"مہارشی اوم پرکاش؟" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے دہرایا "اس آشرم میں پچھلے دو برس سے میرے ساتھ حاجی پور کے تین رشی ٹھہرے ہوئے ہیں، میں نے ان سے کبھی اوم پرکاش کا نام نہیں سنا!"

میں نے دل ہی دل میں خود پر ہزار بار لعنت بھیجی اور لاپروایانہ لہجہ میں جلدی سے بولا "نہ سنا ہوگا... وہ مدتوں سے بن باس لئے ہوئے ہیں۔ شہرت سے گھبراتے ہیں۔ ان کے چیلے بھی گنتی کے ہیں!"

"اوہ!" وہ ایک گہرا سانس لیکر بظاہر مطمئن ہو گیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"گنگا رام۔" میں نے جواب دیا۔

"اور یہ لڑکی؟" وہ چالاکی کے ساتھ پھر سیتا کی طرف متوجہ ہو گیا

"سیتا!" میں اپنے لہجہ کی ناگواری نہ چھپا سکا۔

"رام اور سیتا!" وہ معنی خیز لہجہ میں دہرا کر بے حیائی کے ساتھ ہنسا "خوب اتفاق ہے، اور خوب جوڑ ہے، تمہیں سیتا کہاں مل گئی تھی!"

"رشی جی!" میں غصیلے لہجہ میں غرایا "بھگوان سے ڈرو، تمہارے لہجہ سے پاپ کی بو آ رہی ہے!"

"ارے گنگا رام جی! ناراض ہو گئے!" وہ میرے بدلے ہوئے لہجہ پر بوکھلا گیا "اس کا روپ بدیسی لگتا ہے، اس لئے پوچھ لیا تھا!" وہ زیادہ دیر میرے پاس نہ رکا اور واپس اپنے ساتھیوں میں چلا گیا۔ گنیش آشرم کے عقبی احاطہ میں رات کے لئے کہیں سے لنگر آتا تھا۔ ماش کی بہترین دال اور اصلی گھی کے پراٹھوں پر مشتمل بھوجن تقسیم ہونے تک آشرم کی فضا سازگار تھی!

کھانے کے دوران سیتا کو اپنی ذہنی الجھنوں سے چھٹکارا پانے کا موقعہ مل گیا۔ وہ موتی ہاری سے میری اچانک روانگی کے اسباب ابھی تک غیر مطمئن تھی۔

"تو نے مجھے اب تک نہیں بتایا کہ موتی ہاری کے ہوٹل میں تجھ سے ملنے کون دو آدمی آئے تھے؟"

"پتہ نہیں کون تھے!" میں نے اس سے صاف جھوٹ بولا "معلوم ہوتا تو ان سے وہیں نمٹ لیتا، ایکدم وہاں سے کیوں بھاگتا؟"

"اب مجھ سے زیادہ باتیں نہ بنا!" وہ لقمہ نگلتے ہوئے بولی۔ "اتنے عرصہ تیرے ساتھ رہ کر میں تجھے اچھی طرح سمجھنے لگی ہوں!"

"کیا سمجھنے لگی ہے؟" میں نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"تو ہر خطرہ سے بھاگتا پھرتا ہے، جب تک تیری جان پر نہ بن جائے لڑنے کی ہمت ہی نہیں کرتا!" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

"یعنی میں مفرور اور بھگوڑا ہوں!" اس کے الفاظ پر مجھے طیش آ گیا۔

"ہاں!" وہ بغیر ڈرے بولی۔

"اور برفانی انسان کو تو نے مارا تھا، کالی گاب کے سوامی کا خونی لشکرہ کیا خود مر گیا تھا، لاچی کے باپ کو بھی بھول گئی جو خنجر لے کر تیرے پیچھے لپکا تھا!"

"میں نے اس سے کب انکار کیا ہے؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی "میں یہی تو کہہ رہی ہوں کہ جب تیرے فرار کے سب راستے بند ہو جاتے ہیں صرف اسی وقت تو بہادری دکھاتا ہے!"

اس کی وضاحت پر میرا غصہ قدرے سرد ہوا "شہروں اور جنگلوں کی زندگی مختلف ہوتی ہے، یہاں طاقت کا قانون نہیں چلتا۔!"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "ہر جگہ صرف طاقت کا قانون چلتا ہے، اگر میں طاقتور اور بہادر نہ ہوتی تو نہ جانے اب تک کتنی بار خون کے آنسو رو چکی ہوتی اگر کوئی دوسرا قانون ہے بھی تو وہ صرف طاقتور کو ہی سہارا دیتا ہوگا!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "تو نے بتایا نہیں کہ تو نے ان دونوں سے بچ کر کیوں بھاگا تھا؟"

"اس لئے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ میں سونا بنا سکتا ہوں!"

"اوہ!" یہ سنتے ہی اس کی آنکھیں تحیر آمیز انداز میں پھیل گئیں۔ "تو وہ تجھ سے انگوٹھی مانگ رہے تھے!"

"نہیں۔۔ لیکن بے خبری میں اگر دس پندرہ آدمی ہم دونوں کو گھیر لیتے تو انگوٹھی کے ساتھ ہماری جان بھی جاتی رہتی!"

"تو ایکبار اس انگوٹھی سے اتنا سونا بنا لے کہ ہم زندگی بھر عیش کر سکیں، پھر وہ انگوٹھی کسی ندی میں پھینک دیں گے!" اس نے تجویز پیش کی۔

"تیری ہر تجویز سے بے وقوفی ٹپکتی ہے!" میں سرگوشیانہ لہجہ میں بولا "پارس پتھر کی دریافت اس دور کی تہلکہ خیز حقیقت ہے اگر لوگوں کو علم ہو جائے کہ یہ پتھر میرے قبضہ میں ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا میں میری شہرت ہو جائے۔"

"مجھے سبق نہ پڑھا!" وہ ہٹ دھرم لڑکی ہر وقت میری برابری پر تلی رہتی تھی۔ اپنی ذات پر میری برتری کو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کرتی تھی "اندر رام کے ہاتھوں بھاندر ناس گنوا کر تو بالکل مایوس ہو گیا تھا پھر

کالی گاپ والوں کے خوف سے اناپورنا کی طرف بھی نہ جاسکا۔ اپنی دانست میں تو بے نیل و مرام واپس آرہا تھا کہ اچانک ہی مجھے انگوٹھی کی حقیقت پتہ چلی اور یہ انگوٹھی مجھے میری ماں نے دی تھی۔"

کھانے کے بعد فرش پر دراز ہونے تک وہ مجھ سے بات بات پر بحث کرتی رہی۔ اس دوران میں آشرم میں مقیم ساتوں مہنت اور رشی ہم سے کافی دُور سر جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے ان میں سے ایک چرس کا بھی عادی تھا۔ جب بھی وہ سگریٹ سلگاتا، پورا آشرم چرس کی بو سے بھر جاتا۔ اُس کے ساتھی محض شوق میں اس سگریٹ کا ایک آدھ کش لے لیتے تھے۔!

ان کی دبی دبی سرگوشیوں پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے بستر پر دراز ہونے سے قبل سیتا کو ان کی طرف سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا۔

"میں بھوکے اور ندیدے مردوں کو دُور ہی سے بھانپ لیتی ہوں؟" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی" مجھے تو ان سب کے منحوس چہروں پر شیطانی عزائم کی پرچھائیاں نظر آرہی ہیں، کیا سارے شہروں میں اب رام اور بھگوان کے نام پر یہی کھیل ہوتا ہے! ماں تو کہتی تھی کہ مندر کے سائے تک میں گناہ کے بارے میں سوچنا پاپ ہے!"

میں سفر اور بھاگ دوڑ سے کافی تھکا ہوا تھا۔ تھیلا سر کے نیچے رکھ کر فرش پر دراز ہوا تو ذہن پر کوئی خاص فکر نہ تھی۔ بھگوان کے سائے میں میرے سارے تفکرات ختم ہوچکے تھے البتہ بھگوان کے ان سات ہٹے کٹے پجاریوں کی جانب سے ہلکا سا اندیشہ تھا اور وہ یوں پریشان کن نہ تھا کہ مجھے سیتا پر پورا اعتماد تھا۔ مجھے لیٹتے ہی نیند آگئی اور تھوڑی دیر میں، میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

رات میں کسی وقت ایک دبی دبی چیخ کے باعث میری آنکھ کھُل گئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھنے لگا۔ خمار کے باعث بینائی پوری طرح کام نہیں کررہی تھی بس ہاتھ سے ٹٹول کر میں نے صرف یہ محسوس کیا کہ سیتا میرے پہلو میں موجود نہیں ہے اور اسی وقت میرے قریب انسانی ہیولا لہرایا، سر کے پچھلے حصّے پر ایک بھرپور ضرب پڑی اور میں کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہوگیا! — دوبارہ ہوش آیا تو آشرم میں جالیوں سے نسیم سحری کے لطیف جھونکے آرہے تھے۔ مٹی کے تیل کے دیوار گیر لیمپ بدستور دھیمی روشنی میں جل رہے تھے ان کی شیشے کی چمنیوں کے اندر جم جانے والے سیاہ دھوئیں کے باعث بہت ہلکی روشنی چھن کر باہر آرہی تھی۔

آنکھ کھلتے ہی پہلا احساس شدید تکلیف کا تھا میرے سر کا پچھلا حصّہ کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا مگر میں نے اس تکلیف کو اہمیت دیئے بغیر آشرم کا جائزہ لیا اور مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ ہاتھی کے سر والے دیوتا کے اس آشرم میں، میں تنہا رہ گیا ہوں۔ سیتا اور ان ساتوں پنڈتوں پجاریوں کا کہیں پتہ نہیں تھا جو پچھلی رات سر جوڑے سازشیں کر رہے تھے۔!

یک بیک میری تکلیف کا احساس شدید ہوگیا۔ میں نے ہاتھ لگایا تو انگلیوں پر خون کی نمی محسوس ہوئی۔ شاید پچھلی رات سیتا کے اغوا کے دوران ہی میری آنکھ کھلی تھی اور ان بدمعاش پجاریوں میں سے کسی نے میرے سر پر ضرب لگا کر مزاحمت کا آخری راستہ بھی صاف کرلیا۔

سیتا اغوا کرلی گئی، معصوم اور باعفت دوشیزہ کو ہوس کے پجاری اٹھا کر لے گئے اور پتھر کا بے جان دیوتا یہ سب دیکھتا رہا۔ اس کی مورتوں کے سائے میں یہ سارا گھناؤنا کھیل ہوا اور اسے اتنی بھی غیرت نہ آئی کہ ان غنڈوں پر آشرم کا کوئی ستون ہی گرجاتا۔

میرے وجود میں مایوسی، خوف، دہشت اور پھر انتقام کی خودرو لہریں دوڑنے لگیں۔ تاریخ خود کو دُہرا رہی تھی۔ سیتا کی ماں سندری بھی اسی شہر کی باسی تھی۔ یہاں اُس کا باپ اندرام محنت مزدوری کر کے اپنی بے ماں کی کمسن بچّی کی پرورش کرتا تھا مگر ایک روز سندری اغوا کرلی گئی اور جب وہ جگر خراش حالت میں بازیاب ہوئی تو اندرام کو پتہ چلا کہ وہ ان مقدّس بھیڑیوں کی اجتماعی ہوس کا نشانہ بنی ہے جو اپنے مسکن کے لئے عبادت گاہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

یہ جان کر اندرام قہر مجسّم بن گیا۔ وہ اپنی مظلوم بیٹی کو سینہ سے لگائے خنجر بکف میدان میں اُترا اور یکے بعد دیگرے کئی رشیوں اور مہنتوں کے خاتمہ کے بعد ہمالیہ کی طرف فرار ہوگیا۔ محض اس واقعہ کی وجہ سے سندری اپنی عمر پہاڑوں اور ویرانوں میں تہذیب سے عاری خوں آشام قبائل کے درمیان گزار رہی تھی تاکہ باعفت رہ سکے مگر وہاں بھی وہ فریب سے نہ بچ سکی اور اس کی کوکھ سے سیتا نے جنم لیا، جس کا قانونی باپ کوئی نہ تھا۔!

اور اب وہی بنارس تھا، وہی رشی اور مہنت تھے اور سیتا یقیناً ان کے چنگل میں کسی جاں گسل مرحلہ سے گزر رہی تھی۔ وہ اب میری بیوی تھی، غصّہ اور انتقام کے جذبات کی شدت سے میری ہڈیاں چٹخنے لگیں، دورانِ خون میری کنپٹیوں کو پھاڑ دینے پر آمادہ ہوگیا' سیتا کے الفاظ رہ رہ کر میرے اشتعال کو بھڑکا رہے تھے۔ پچھلی رات وہ مجھے علاوی مفرد قرار دے چکی تھی جو صرف اسی وقت جانفروشی کی کہانیوں کو جنم دیتا ہے جب فرار کی ہر راہ مسدود ہوجائے۔!

اور اب صلح و سکون کی ہر راہ مسدود ہوچکی تھی۔ میں نے اپنا تھیلا اٹھایا اور کسی مکار چیتے کی طرح آشرم کے عقبی دروازے سے مندر کے احاطہ میں داخل ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ سیتا کو زیادہ دُور لے جانے کی ہمت نہ کرسکے ہوں گے۔ انھوں نے مندر کے یہاں پجاری سے ساز باز کر کے وہیں سیتا کے لئے کوئی زنداں، کوئی مقتل تیار کیا ہوگا۔

مندر کا ایک خدمتگار احاطہ میں نل سے پانی بھر رہا تھا' میں خاموشی سے اس کے سر پر جا پہنچا۔ "آشرم میں ٹھہرے ہوئے ساتوں پجاری کہاں ہیں؟" میری سرد اور سفاکانہ آواز سُن کر وہ بوکھلا گیا۔

اس نے گھبرا کر خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا مگر چند ثانیوں سے زیادہ نظریں چار نہ کرسکا" مجھے نہیں معلوم، شاید تیرتھ یاترا کو گئے ہوں۔"

"تیرتھ یاترا۔!" میں نے ایک ایک حرف پر زور دیکر دہرایا۔ "میری بیوی غائب ہے، بتا وہ کہاں ہے، مندر کے کس حصّہ میں ہے؟" میں نے اچانک تھیلے میں سے خنجر نکال کر اس کی نوک خدمتگار کے بائیں پہلو پر رکھ دی۔!

وہ یک بیک گڑگڑا کر رو پڑا" میں گنگا جلی اُٹھاتا ہوں، مجھے نہیں معلوم، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اُن کی رمیش جی سے بڑی دوستی ہے، شاید وہیں گئے ہوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"اناتھ آشرم کے منتظم ہیں!" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

میرے ذہن میں یک بیک آگ بھڑک اٹھی سیاہ کار پجاریوں اور پنڈتوں کے لئے اناتھ آشرم سے اچھا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہاں شہر بھر کی ہر عمر کی بیوائیں داخل کی جاتی تھیں ان میں کمسن اور خوبرو مگر وہ بدنصیب لڑکیاں بھی ہوتی تھیں جن کے مردان سے بہت جلد روٹھ کر سورگباش ہوجاتے تھے۔ اناتھ آشرم میں ان سب کو سفت تربیت دیکر داسی بنایا جاتا ہے۔ مقدّس بھیڑیوں کے لئے اس سے اچھی شکارگاہ بھلا کیا ہوسکتی تھی۔ جہاں انھیں بڑے ریوڑ میں اپنے شکار کے انتخاب کی آزادی حاصل ہو اور شکار بھی وہ جسے اس کا دھرم منحوس ٹھہراتا ہے، جسے معاشرہ کسی قیمت پر قبول نہیں کرتا۔

اچانک ہی میرا ہاتھ چلا، خنجر کی نوک پسلیاں چیر کر اس کے دل میں اُترتی چلی گئی۔ اس کے حلق سے بمشکل کوئی آواز نکل سکی، وہ تڑپ کر نیچے گرا، میں نے جلدی سے خنجر باہر کھینچ لیا۔ زخم سے جیتے لہو کا ایک فوّارہ اُبلا اور اس کا جسم بے جان ہوگیا۔

میں نے جلدی سے خنجر کا پھل نل کی تیز دھار میں دھویا اور اسے تھیلے میں اڑس کر تیزی سے آشرم کے راستہ اس عمارت سے باہر نکلتا چلا گیا۔

ابھی سورج طلوع ہونے میں بہت دیر تھی۔ شہریوں اور پجاریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں رام کی مالا جپتی، کانسی یا پیتل کی لٹیاں اٹھائے تیزی کے ساتھ شہر کی جنوب مشرقی سمت میں رواں تھیں جہاں گنگا کا پوتر پانی بہتا تھا وہ اپنے تمام گناہوں کو شیواجی کے سر سے بہنے والے اس مقدّس پانی میں بہا کر سورج طلوع ہونے سے قبل ہلکے پھلکے ہو کر واپس لوٹ آتے تھے۔!

راستے میں جگہ جگہ جیتی جاگتی زندہ گائیں جگالی کرتی، کوڑے کے ڈھیر سونگھ رہی تھیں۔ ان میں سے بیشتر گئو ماتائیں آراستہ تھیں۔ ان کی گردنوں میں پتھروں وغیرہ کی مالائیں لپٹی ہوئی تھیں، پیروں میں پیتل اور کانسی کے گھنگھرو بندھے ہوئے تھے، سینگوں پر رنگ برنگ منقش اور مزین دھاتی خول چڑھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ گئو ماتا پیشاب کرنے میں مصروف تھی۔ گنگا اشنان کو جانے والا ایک توہم پرست یاتری پھرتی سے اس کے قریب پہنچا اور کانسی کی لٹیا گئو ماتا کے پیشاب سے لبریز کر کے اس سے اپنے چہرے اور بدن پر چھینٹے مارنے لگا۔ میں نے کسی تاثر کے بغیر یہ منظر دیکھا اور اپنی سمت میں چلتا رہا۔ اسٹیشن سے آتے ہوئے، راستہ میں کسی جگہ میں اناتھ آشرم کا بہت بڑا بورڈ دیکھ چکا تھا اور اب اسی کی تلاش تھی۔!

وہ شہر اور اس کے راستے میرے لئے اجنبی تھے لہٰذا میں راستہ بھٹک گیا۔ کافی جدوجہد کے بعد میں اسٹیشن پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہاں سے واپسی کی راہ میں بہتر طریقہ پر شناخت کرچکا تھا۔ اس اثنا میں سورج طلوع ہوچکا تھا۔ آہستہ آہستہ بازار بھی کھلتا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اناتھ آشرم پر اگر رمیش کے پاس ان ساتوں میں سے کوئی موجود ہوا تو میرا زندہ بچ نکلنا مشکل ہوجائیگا لہٰذا اب ایک بار پھر میرے حلیئے میں تبدیلی ناگزیر ہوچکی تھی۔ میں نے کافی غور و خوض کے بعد ایک دوکان سے استرا خریدا، کافی فاصلہ پر دوسری دوکان سے ایک آئینہ لیا اور دونوں چیزیں ایک تھیلے میں اڑس کر اپنی راہ پر ہو لیا۔

راستہ میں سب سے پہلا جو مندر نظر آیا میں اس سے ملحق غسلخانہ میں جا گھسا۔ اندر اچھی خاصی روشنی تھی، میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی ڈاڑھی مونڈ دی، اسی کے ساتھ ایک بار پھر ناچار اپنی بھنویں بھی صاف کردیں کیونکہ اپنی شناخت مٹانے کے لئے یہ اقدام ناگزیر تھا۔

سارے بال نالی میں بہانے کے بعد میں نے وہ آئینہ کھونٹی سے لٹکا دیا اور اُسترا ساتھ لیکر باہر آگیا۔ گو ڈاڑھی کی جگہ میری جلد کی قدرے صاف رنگت میرے تازہ اقدام کی چغلی کھا رہی تھی مگر پھر بھی مجھے یقین تھا کہ بہت غور سے دیکھے بغیر کوئی مجھے نہ پہچان سکے گا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے وجود میں نفرت اور انتقام کے ساتھ مکاری بھی حلول کرتی جارہی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ میں بآسانی ان ساتوں بدمعاشوں اور ان کے گرو رمیش کو ٹھکانے لگانے میں کامیابی حاصل کرلوں گا۔

جب میں اناتھ آشرم کے دروازے پر پہنچا تو کہیں قریب ہی گجر نے صبح کے دس بجنے کا اعلان کیا۔ میں نے چند ٹہلتے ٹہلتے رک کر عمارت کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بہت وسیع احاطہ پر مشتمل تھی جس کے وسط میں ایک مندر کے کلس چمک رہے تھے۔!

اناتھ آشرم کے رہائشی حصّہ یا مندر میں مردوں کا داخلہ سخت ممنوع تھا اور اس ہدایت پر عمل درآمد کے لئے ایک موٹی سی ہندو عورت پھاٹک پر براجمان تھی۔

"مجھے رمیش جی سے ملنا ہے ماتا جی!" میں نے عورت کے قریب جاکر ادب سے کہا۔

اس نے غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا پھر جلائی" صورت دیکھی ہے اپنی سرامی کی صورت چھلے ہوئے آلو جیسی ہے، تو نے مجھے ماتا کیسے کہا رے؟"

"ارے اماں... پھر بھلا کیا...؟"

مگر وہ آپے سے باہر ہوگئی۔ وہ تہڑ اٹھا کر میری طرف لپکی" حرامی مجھ سے بڑی عمر کا ہو کر مجھے ماتا بتاتا ہے... ابے کیا تیرے باپ کو کوئی جورو نہیں ملی تھی جو مجھے ماں بنانے چلا آیا ہے...!"

اس نے میری تمام تر مزاحمت کے باوجود میرے سینے پر دم تر جما ہی دیا" مجھے کیا پڑی ہے جو تیرے باپ سے اپنی پسلیاں تڑواؤں، سالا جو یہاں آتا ہے اپنے باپ کو میرا خصم ہی بناتا آتا ہے، ایسے میں کیا اتنی گئی گزری ہوں کہ ہر سو کھے سڑے مرد سے لپٹتی پھروں ۔!"

اس کا شور سن کر کئی راہگیر بھی رک گئے۔ اس دوران میں پھاٹک سے ملحق ایک چوبی دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کا ایک مضبوط جسم والا شخص باہر نکل آیا ۔" کیا ہو رہا ہے سریتا۔؟" وہ موٹی عورت کو گھورتے ہوئے دہاڑا۔

"ارے رمیش جی! پوچھو کہ کیا نہ ہوا ؟" وہ روہانسی آواز میں اس سے بولی ۔" جب میرا مرد زندہ تھا تو کوئی آدمی مجھے چھیڑے بغیر سامنے سے نہ گزرتا تھا جب سے وہ مرا ہے سریتا کو ہر ایک اپنے باپ کی جورو بنانے پر تلا رہتا ہے، یہ مسٹنڈا آیا تو یہ بھی مجھے ماتا جی کہہ رہا ہے!"

رمیش میری طرف اور میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بغیر داڑھی مونچھوں کے تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک کوندرہی تھی جو اس کی عمر سے میل نہ کھاتی تھی، مگر صحت اور تندرستی کے اعتبار سے وہ نوجوانوں پر بھاری تھا۔

"کوئی نیا یاتری معلوم ہوتا ہے ۔" رمیش بھاری آواز میں سریتا سے کہہ رہا تھا" پتہ نہیں تو ماتا کے لفظ سے اتنی کیوں چڑتی ہے۔ جانی گوالا تو اب تک تجھے کلی سمجھ کر آہیں بھرتا ہے ۔!"

وہاں جمع ہونے والے راہگیروں کے سامنے رمیش کے منہ سے اتنی کھلی بات سن کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اناتھ آشرم کی آڑ میں کیا کچھ نہ کرتا ہوگا۔

"تجھے کیا کام ہے بھائی ۔؟" سریتا کو خاموش کرنے کے بعد رمیش میری طرف متوجہ ہوا۔

"تمہارے ہی پاس آیا تھا!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

" آجاؤ ــــ میرے کمرے میں پردہ والا کوئی نہیں ہے!" رمیش دروازے سے ہٹتے ہوئے بولا۔

میں نے دو سیڑھیاں طے کیں اور چوکھٹ عبور کر کے رمیش کے پیچھے اس کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ کمرہ کیا، اچھا خاصا نشاط کدہ تھا۔ فرش پر قیمتی اور دبیز قالین بچھا ہوا تھا جس پر دیوار کے سہارے چھ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ چھت کے وسط میں ایک بہت بڑا مراد آبادی برقی فانوس جھلملا رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف پنکھے لگے ہوئے تھے۔ کمرہ کی فضا میں شراب کی ہلکی ہلکی بو رچی ہوئی تھی۔ جلد ہی میری نظر اس کے مخرج پر بھی پڑ گئی۔ ایک چوبی تپائی پر مارٹینی کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا۔

اس کمرے کا دوسرا دروازہ شاید اناتھ آشرم میں کھلتا تھا کیونکہ اس جانب سے ملے جلے زنانی قہقہوں اور باتوں کا شور سنائی دے رہا تھا!

"رمیش بابو کیا تم مجھے بیٹھنے کو نہ کہو گے ؟" میں نے لاپروایانہ انداز میں اپنی جگہ پر بیٹھتے دیکھ کر شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ!" وہ گلاس بھرتے ہوئے روکھے لہجہ میں بولا "کیا کام ہے؟"

میں بوسیدہ چپلیں اتار کر قالین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ رمیش سے اس وقت سیتا کے بارے میں بات کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس کے طور طریقوں سے ظاہر تھا کہ اسے شہر کے بارسوخ حلقوں میں رسائی حاصل ہے۔ بہترین ترکیب یہی تھی کہ کسی طرح اسے اناتھ آشرم سے ہٹانے کے بعد بے بس کیا جائے۔

"رمیش بابو میں صرف دو چیزوں کا بھوکا ہوں ۔" میں نے سر جھکا کر نیچی آواز میں کہنا شروع کیا "شراب اور عورت ـــ میں دولت کے ایک ایسے خزانے پر قابض ہوں جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں پیسے سے یہ دونوں چیزیں خرید سکتا ہوں مگر گشتیوں سے مجھے نفرت ہے، آوارہ عورتیں میری ضرورت تو بن سکتی ہیں لیکن شوق ہرگز نہیں ...،"

"بولتے رہو، بولتے رہو!" مجھے خاموش پا کر اس نے ٹوکا۔

"میں تم سے دولت کے عوض اپنے شوق کا سودا کرنے آیا ہوں۔"

"برا نہ ماننا" وہ تلخ لہجہ میں بولا "تمہارا حلیہ تو مجھے بھکاریوں سا لگتا ہے"

"ضرور لگتا ہے!" میں نے اعتماد سے کہا" مجھے خوش پوشی سے کوئی دلچسپی نہیں، میں نے کہا نا کہ میرے بس دو ہی شوق ہیں، شراب اور شباب!"

"وہ خزانہ کیا ہے ؟" رمیش نے مارٹینی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے پارس پتھر کا نام سنا ہے؟" میں نے سرسراتی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں پوچھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، شراب کا گلاس اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا اور وہ بے یقینی کے عالم میں بولا۔" تم ... تمہارا مطلب ہے ... !"

"مطلب نہیں رمیش جی!" میں اس کی بات کاٹ کر ہنسا۔" میں وہ پتھر حاصل کر چکا ہوں، یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے ۔!"

"دیکھوں ۔!" اس نے بیتابی سے بایاں ہاتھ میرے آگے پھیلا دیا۔

"میں اسے ساتھ لئے نہیں پھرتا، کچھ لوگوں کو اس بات کا شبہ ہو چکا ہے اگر تم آج شام میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں اس کا تجربہ کرا سکتا ہوں۔"

"یعنی تم لوہے کو اس کے لمس سے سونے میں بدل دو گے ۔؟"

"ہاں!" میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔" اس اناتھ آشرم میں شہر کی حسین ترین بیوائیں بھی آتی ہیں معزز گھرانوں کی یہ عورتیں مجھے تم تک لانے کا سبب بنی ہیں۔ اس معاملہ میں، میں بڑا کم نصیب واقع ہوا ہوں۔ دنیا کی ہر شے خرید سکتا ہوں مگر کوئی معزز عورت میری طرف توجہ ہی نہیں دیتی۔ اب تو یہ میری انا کا زخم بن چکا ہے جسے شاید میں تمہارے تعاون سے بھر سکوں!" میں نے چند ثانیے توقف کیا پھر بولا۔" میں اناتھ آشرم میں اپنی ہر رنگین رات سونے سے خریدوں گا، میں تمہیں فی شب ایک سیر سونا دوں گا رمیش! تم لکھ پتی ہو جاؤ گے اور میں بھی مفلس نہیں ہو جاؤں گا، ایسا سودا شاید تم نے کبھی نہ کیا ہو!"

"شراب پیو گے ؟" رمیش اب مجھ سے مرعوب ہو چلا تھا۔

اس بار اس نے دو گلاس تیار کئے اور بولا" ہمارے معاشرہ میں ستی کی رسم تو ختم کر دی گئی مگر بیوائیں آج بھی منحوس اور دھرتی کا بوجھ سمجھی جاتی

ہیں یہاں لائی جانے والی ہر عورت جانتی ہے کہ اب وہ کبھی آزاد دنیا میں اپنا نام نہ منوا سکے گی۔ بڑے گھرانوں کی بیوہ بیٹیاں سیاحت کے بہانے سمندر پار ے ملکوں میں چلی جاتی ہیں جہاں عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ ماں بیوی اور بہن کے علاوہ عورت کا صرف ایک ہی روپ ہے اور اس روپ میں احترام کوئی دخل نہیں۔ یہ لڑکیاں وہاں آزاد روی اپناتی ہیں اور پھر ایک دن چپکے سے ہمیشہ کے لئے کہیں کھو جاتی ہیں۔" اس نے شراب کا گلاس رکھ کر سگریٹ سلگایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔" مگر اناتھ آشرم میں آنے والیاں حیلہ بہانہ کے باوجود آخر میں خود کو میرے سامنے مجبور پاتی ہیں ... ابتدا میں شاید تم اپنی پسند کو آزادی سے نہ اپنا سکو کیونکہ ابھی کچھ نئی لڑکیاں حالات کو صحیح طور پر نہیں سمجھ پائی ہیں، چند دن بعد جب ان کے خاندان سے آنے والے ملاقاتیوں کا زور ٹوٹے گا تو وہ اچانک تنہا رہ جائیں گی، اس وقت میرا فلسفہ ان پر اپنا کام کرتا ہے۔"

"میں یہ سب دیکھ لوں گا۔" میں نے اپنی کامیابی پر خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔" مجھے بس ہر رات اناتھ آشرم میں داخلہ کی اجازت درکار ہے۔"

"نہیں ـــ میں اس عمارت میں تشدد اور دھما چوکڑی کی ہرگز اجازت نہ دوں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔" یہاں ہر کام باہمی رضامندی سے ہوتا ہے ۔!"

"میری ذات سے تمہیں کبھی شکایت نہ ہوگی!" میں نے اپنا گلاس اس کی طرف بڑھایا اور فضا شیشہ ٹکرانے کی ہلکی سی کھنک سے گونج اٹھی

"آؤ ـــ میں تمہیں دکھاؤں کہ میرے اس خزانہ میں کیسے نوادر جمع ہیں۔" گلاس خالی کر کے وہ خود ہی بولا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

رمیش پہلے پھاٹک کی طرف کھلنے والے دروازے پر گیا اور گردن باہر نکال کر سریتا کو کچھ ہدایات دیں اور اندر سے دروازہ کی کنڈی چڑھا کر واپس آگیا۔

آشرم کی طرف والا دروازہ کھلتے ہی میری نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ سامنے ہی لڑکیوں اور عورتوں کا ایک رنگا رنگ اور حسین جھرمٹ جمع تھا۔ ہر ایک کے انداز سے بے حجابی نمایاں تھی پھر جوں ہی انھیں کھلے ہوئے دروازہ میں میری اور رمیش کی موجودگی کا احساس ہوا، ہر ایک عورت جلدی جلدی اپنا لباس درست کرنے لگی!

وہ آشرم بہت وسیع تھا۔ اس میں احاطہ کی دیوار کے ساتھ تین طرف دو رویہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ احاطہ کی دیوار پر کئی فٹ اونچا خاردار تاروں کا جنگلہ تھا تاکہ کوئی ادھر سے کود کر اندر نہ آسکے۔ وسط میں مندر کی پر ہیبت عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ رمیش کے کمرے کے برابر میں غسلخانوں کی قطار بنی ہوئی تھی جن کے سامنے دونوں کونوں پر دو کنویں بنے ہوئے تھے کچھ عورتیں چرخی کی مدد سے کنویں سے پانی نکال کر بڑی بڑی آہنی ٹنکیاں بھر رہی تھیں۔

پورے احاطہ میں کہیں بھی ننگی زمین نظر نہیں آرہی تھی۔ ہر طرف گھاس اگی ہوئی تھی یا پھولوں سے لدی ہوئی کیاریاں اور گھنیرے درخت تھے جنہیں عورتیں ہی پانی دے رہی تھیں کچھ لڑکیاں درختوں میں جھولے ڈالے اونچے ہلکورے لے رہی تھیں۔

"اس اناتھ آشرم کا ماحول تو بہت اچھا ہے۔"

"یہاں آنے والی بیواؤں کے وارث آشرم کو ماہانہ چندہ دیتے ہیں مگر اس کی کوئی حد مقرر نہیں بعض غریب عورتوں کا تو کوئی وارث ہی نہیں ہوتا، وہ دو وقت کی روٹی ملنے کی امید میں یہاں آجاتی ہیں۔ چندہ سے ملنے والی رقم بہت قلیل ہوتی ہے جس سے ان سب بیواؤں کے لئے روٹی کپڑے کا انتظام ناممکن ہے۔ یہ بات میں نے ان سب کو سمجھائی۔ وہ بھی جانتی ہیں کہ اب انھیں ساری عمر یہیں بسر کرنی ہے لہذا میں نے آمدنی کا دوسرا طریقہ نکال لیا۔ میں اس آمدنی کا بڑا حصہ کمانے والیوں پر ہی خرچ کرتا ہوں۔ یہاں کی زیادہ عورتیں سرخی پوڈر سے لیکر کپڑے تک اپنی پسند کے پہنتی ہیں۔ اوپر کے سارے کام یہی عورتیں باری باری کرتی ہیں۔" رمیش نے اپنے طریقۂ کار کی تفصیلی وضاحت کی۔

"اور جو عورتیں تمہاری ہدایات سے بغاوت کریں؟" میں نے سوال کیا

"عقبی حصے کی ساری کوٹھریاں نئی بیواؤں اور ایسی عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔ میں نے ان پر پرانی اور سخت گیر عورتوں کو مقرر کیا ہوا ہے جو انھیں دوسری عورتوں سے ملنے سے روکتی ہیں اور ہر وقت مختلف حوالوں سے یہ بات انھیں ذہن نشین کراتی رہتی ہیں کہ وہ حقیر اور کمتر ہیں۔" رمیش کے سارے منصوبے بہترین حکمت عملی کے عکاس تھے۔

رمیش ساری ہی عورتوں سے بے تکلف تھا۔ اسے دیکھ کر وہ عمر رسیدہ بیوائیں بھی جمع ہو گئیں جنہیں رمیش نے لامحدود اختیارات کے ساتھ نظم و نسق کی نگرانی پر مامور کیا ہوا تھا۔

وہ ان سب سے کھلے الفاظ میں ناشائستہ مذاق اور گندی چھیڑ چھاڑ کرتا مجھے آشرم کی سیر کراتا رہا۔

کوٹھریوں کی سیر کے دوران میں مجھے سیتا کی جھلک تک نظر نہ آئی۔ میری فرمائش پر رمیش مجھے ان عقبی کوٹھریوں کی طرف بھی لے گیا، جو معتوب عورتوں کے لئے مخصوص تھیں۔ میں نے ان میں سے ہر کوٹھری دیکھی لیکن الم زدہ اور روتے بسورتے غمناک چہروں میں سیتا کا دلکش چہرہ... کہیں نظر نہیں آیا۔

"میں ایک اور کوشش میں لگا ہوا ہوں۔" مندر کے قریب سے گزرتے ہوئے رمیش بولا۔" میں نے اس سلسلہ میں سارے بڑے بڑے صنعت کاروں کو مراسلے بھیجے ہیں۔ اگر اس اناتھ آشرم میں کلوز سرکٹ ٹیلی وژن آگیا تو اس کی مدد سے میں بہت سے مسئلے آسانی سے حل کر لوں گا!"

"بیوہ عورتوں کو عریاں مغربی فلمیں دکھا کر انھیں شیشہ میں اتارو گے ؟" میں یہ کہہ کر ہنسا۔

"یہ تو بہت چھوٹا سا مسئلہ ہے کوئی عورت چند ماہ سے زیادہ اپنی

پاکیزگی برقائم نہ رہ سکی۔" وہ ہنس کر بولا "میرے ارادے بہت اونچے ہیں... اور بیواؤں کی تعداد کے اعتبار سے یہ شاید ہند کا سب سے بڑا اناتھ آشرم ہے اب اسمبلیوں کے انتخابات آنے والے ہیں۔ کوئی نہ کوئی ہمت کر ہی لے گا نیکنامی کا ایسا موقع مشکل ہی سے ہاتھ آتا ہے۔!"

میں نے اپنی دانست میں اس عمارت کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر سیتا تو کیا اس کی پرچھائیں تک مجھے نظر نہ آسکی مگر مجھے اتنا یقین ہو چکا تھا کہ رمیش اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے!

"عزت دار عورتیں صرف حلیے کی وجہ سے تمہاری طرف توجہ نہیں دیتیں!" طویل راستہ طے کرتے ہوئے رمیش بولا۔ "تمہارے خدوخال تو خاصے دلکش ہیں مگر سر اور بھنویں منڈا کر تم واقعی چھلے ہوئے آلو لگتے ہو" اس نے ہنستے ہوئے سریتا کا تبصرہ دُہرایا۔ "میری مانو تو اپنی وضع قطع بدل لو۔ ہر عورت دولتمند اور خوبرو مرد کے خواب دیکھتی ہے جو اسے دنیا کی ہر شے خرید کر دے سکے!"

"میں سدا کا جوگی ہوں رمیش بابو!" میں نے دکھی لہجہ بنا کر کہا۔ "بھلا بہروپ بدل کر کسی کو جیتا تو کیا جیتا... تم یقین مانو کہ جو عورتیں اپنے دکھ لیکر میرے پاس آتی ہیں وہ عقیدت میں ڈوب کر اپنا سب کچھ میرے حوالے کرنے پر تیار ہوتی ہیں مگر ان کا مجبور رویہ میرے جذبات پر برف سی جما دیتا ہے۔ میں سرکش گھوڑوں کا سوار ہوں، دوسروں کے سدھائے ہوئے گھوڑے مجھے نہیں بھاتے!"

پھر اس کمرے میں آکر میں نے اسے پارس پتھر کے بارے میں سخت رازداری کی تنبیہ کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ راز افشا ہونے کی صورت میں میرے ساتھ ہی وہ بھی مارا جائے گا اور کوئی تیسرا شخص پتھر پر قابض ہو جائے گا اور اس نے پورے خلوص سے رازداری کا وعدہ کر لیا۔

اس سے شام چھ بجے درگا مندر کے سامنے ملنے کا پروگرام طے کر کے میں اناتھ آشرم سے روانہ ہو گیا۔ وہاں سے کچھ دُور نکلنے کے بعد میں نے گول چھتری والا ایک یکہ کرائے پر لیا اور دریائے گنگا کی طرف چل دیا۔

دریائے گنگا کے کنارے اس وقت بھی اشنان کرنے والوں کی خاصی بھیڑ جمع تھی۔

میں نے یہ مناظر سرسری نظروں سے دیکھے پھر دریا کے کنارے کنارے دھارے کی مخالف سمت میں بڑھنے لگا۔

تھوڑی دور بعد چند ٹیلے عبور کرنے کے بعد میں راج گھاٹ کے ویران علاقہ میں جا پہنچا۔ اس وقت یہاں دُور دُور کسی ذی روح کا وجود نہیں تھا۔ دریا کا سست رو پانی راج مندر کے صدیوں پرانے سنگین آثار سے لگ کر بہہ رہا تھا۔ پتھر سے بنا ہوا یہ مندر سترھویں صدی میں مقامی برہمنوں نے خاص طور پر اپنے لئے تعمیر کرایا تھا تاکہ وہ دوسرے نیچ طبقہ کے لوگوں سے الگ تھلگ تیرتھ یاترا کے دنوں میں اپنی عبادت کر سکیں مگر اب یہ مندر ویران تھا۔ ہاں تیرتھ یاترا کے دنوں میں جب ہند کے کونے

گوشہ سے ہندو سمٹ کر بنارس میں جمع ہوتے تھے تو گنگا کے کنارے تا حدِ نظر انسانوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ اس وقت راج مندر پر بھی چند مقامی پجاری قابض ہو جاتے اور یاترا ختم ہونے پر سالانہ چڑھاوے سمیٹ کر سال بھر کے لئے چلے جاتے! میں نے ہر طرف گھوم پھر کر راج مندر کا جائزہ لیا۔ میرے مجوزہ پروگرام کے لحاظ سے یہ جگہ بہت مناسب تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مندر میں ایک تہہ خانہ بھی بنا ہوا تھا جس کے صندلی دروازوں کو بند کر دینے کے بعد بیرونی مداخلت کا ہر اندیشہ ختم ہو جاتا تھا۔

اپنے جائزہ سے فارغ ہو کر میں واپس شہر روانہ ہو گیا۔ اس بار میں نے تانگہ درگا مندر کے پاس ہی چھوڑا تا کہ بعد میں وہاں تک پہنچنے میں دقت نہ ہو۔ رمیش کے انتظار میں باقی وقت میں نے اپنی شکم پری اور بازار کی سیر میں گزارا۔ اس دوران میں میرا ذہن سیتا کی طرف سے مسلسل پریشانی کا شکار تھا۔ مجھے یہ تو یقین ہو چلا تھا کہ گنیش آشرم سے اغوا کے بعد سیتا اناتھ آشرم ہی لائی گئی تھی مگر وہاں اس کا سُراغ نہ پا کر مجھے سخت ذہنی دھچکہ لگا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان بدمعاشوں نے کہیں سیتا کو ٹھکانے ہی نہ لگا دیا ہو۔ دن بھر مجھے گنیش آشرم کا چکر لگانے کا وقت نہیں مل سکا ورنہ کم از کم دور رہ کر ہی پتہ چلا لیتا کہ رات کی روپوشی کے بعد وہ ساتوں کس وقت واپس لوٹے اور مندر کے خدمتگار کے قتل کا ان پر کیا ردِ عمل ہوا ہے۔ رمیش سے معاملات طے کرنے کے بعد اگلے روز میرا پہلا پروگرام گنیش آشرم ہی سے شروع ہوتا تھا!

رمیش مقررہ وقت سے ذرا پہلے درگا مندر آپہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مختصر سا وزنی پیکٹ بھی تھا جو خاکی کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔

"یہ کیا لے آئے؟" میں نے ہنس کر سوال کیا۔

"لوہے کا ٹکڑا ہے۔" وہ خجالت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میں نے سوچا کہ تم لوہا لانا نہ بھول جاؤ اور میرا تجربہ ادھورا رہ جائے۔"

"آؤ۔" میں یہ کہہ کر تانگوں کی طرف بڑھ گیا۔

"جانا کدھر ہے۔؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"راج مندر!" میں نے سرگوشی میں کہا۔

راستہ بھر یکہ میں روح فرسا خاموشی طاری رہی۔ میں ہر پہلو سے اپنے منصوبہ کی خامیاں جانچ رہا تھا ادھر وہ شاید تصوّر میں خود کو بھگتی ہوتا دیکھ رہا تھا۔ سارا سفر اسی خاموشی میں طے ہو گیا۔ رمیش نے یکہ والے کو کرایہ دیکر میری ہدایت کے مطابق رخصت کر دیا۔

اس وقت دریا کے کنارے اندھیرا پھیل چلا تھا۔ دن کی ساری رونق ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے تھیلے میں سے ٹارچ نکال کر روشن کر لی اور اس کے سہارے راج مندر کی طرف بڑھنے لگے!

"کیا تم نے پارس پتھر راج مندر میں چھپایا ہوا ہے؟" اس نے بے چین لہجہ میں سوال کیا۔

"بس ذرا ہی دیر میں وہ تمہارے سامنے ہوگا۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔

ہندوستان میں ہندوؤں کے سات مقدس شہروں بنارس ہردوار، اجودھیا، دوارکا، متھرا، اجین اور کنچی پورم میں بنارس کا رتبہ سب سے بلند تھا۔ یہ دیوی دیوتاؤں اور ان کے اوتاروں کی سرزمین سمجھی جاتی تھی مگر اسی کے ساتھ یہاں بدی بھی اپنے عروج پر تھی۔ سندری کی آپ بیتی اور انند رام کے کرب کو میں سیتا کی فرقت میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور اسی شہر میں رمیش دھرم سیوا کے نام پر جسم فروشی کا وہ گھناؤنا کاروبار کر رہا تھا جو ہر دین اور دھرم میں ناقابلِ معافی جرم ہے!

اور اب میں اس مقدس شہر سے گزرنے والے گنگا کے مقدس دھارے کے کنارے اپنا کھیل شروع کرنے والا تھا۔ یہ وہ گنگا ہے جس کا پانی ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق کوہ کیلاش کی چوٹی پر براجمان شیوا جی کی کھوپڑی سے بہہ کر آرہا ہے اور یہ پانی میرے ہاتھوں ایک پاپی کے لہو سے رنگین ہونے والا تھا کیونکہ گنگا جل ہر گناہ کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے اور رمیش میری نظر میں مجسم گناہ تھا جس کو مارنا باعثِ ثواب تھا۔

رمیش جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا تیزی سے اپنا اعتماد کھوتا جا رہا تھا۔ اس کے وجود پر پارس کے تجسس کے ساتھ ہی ماحول کا خوف بھی طاری ہوتا جا رہا تھا۔ درگا مندر پر اس سے ملاقات کے وقت ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ نہتا ہے اگر اس کے جسم پر کوئی پوشیدہ ہتھیار تھا تو وہ پہلے ہی وار میں اس کی گرفت سے نکل جانے والا تھا۔

مندر میں پہنچ کر ہم رام کی دیوہیکل پتھریلی مورتی کے سامنے رُک گئے میں نے ٹارچ کی تیز روشنی رمیش کے سراپا پر ڈالی تو وہ خنکی کے باوجود پسینوں میں نہایا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی لرزاں تھیں۔!

"کیا ڈر رہے ہو رمیش؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"نن... نہیں۔!" وہ جلدی سے بولا۔ "پارس پتھر کہاں ہے، جلدی سے نکالو، اندھیرا میری بہت بڑی کمزوری ہے مجھے ابھی یاد آیا کہ راج مندر کے اطراف میں سانپ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تاریکی میں ان کے شکار ہو جائیں۔"

"لاؤ یہ لوہا مجھے دے دو، پارس تہہ خانے میں ہے!" میں نے ہاتھ بڑھا کر لوہے کا پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے تہہ خانے میں اترنے کا اشارہ کیا۔

"تم لے آؤ، میں یہیں انتظار کرتا ہوں!" اس کی چھٹی حس شاید خطرہ بھانپ چکی تھی۔

چند ثانیوں تک صرف راج مندر کی دیواروں سے ٹکرانے والی لہروں کا شور ہی سنائی دیتا رہا پھر میں بولا۔ "اگر تم خوفزدہ ہو تو چلو واپس چلتے ہیں۔"

"نہیں۔!" مجھے واپس مڑتے دیکھ کر اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلیاں پسینہ میں بھیگی ہوئی ہیں۔ پھر بھی خوف پر لالچ غالب آگیا تھا۔ "میں خوفزدہ نہیں ہوں، چلو نیچے اترتے ہیں ذرا مجھے ...۔" وہ بڑھ کر صندلی دروازہ میں داخل ہو گیا۔ میں نے اس کی تقلید

کی اور صندلی دروازہ کے بھاری پٹ بند کر دیئے۔ صدیوں پرانے زنگ خوردہ قبضوں کا شور سُن کر وہ تیزی سے گھوما۔ "اسے بند کیوں کر رہے ہو؟"

"احتیاط۔" میں نے ٹھوس لہجہ میں کہا۔ آہستہ آہستہ میرا دورانِ خون بھی تیز ہو چلا تھا "صرف احتیاط رمیش جی! تاکہ کوئی ادھر آنکلے تو تہہ خانے میں قبضوں کے شور سے ہمیں پتہ چل جائے گا اور ہم بہتر طور پر صورتحال کا مقابلہ کر سکیں گے!"

"یہ ویران اور سنسان جگہ ہے!" وہ تیز تنفس کے درمیان بولا "میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ پورے سال یہاں سانپوں کا راج رہتا ہے مگر تم تو ایسی احتیاط کر رہے ہو جیسے کوئی فوج ہمارا پیچھا کر رہی ہو۔!"

دروازہ کی کنڈی چڑھاتے ہوئے میں تھیلے میں سے پستول نکال چکا تھا۔ اپنا کام پورا کر کے میں اس کی طرف مڑا اور کسی زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا "بکواس بند کرو رمیش، میں جو حکم دے رہا ہوں اس پر عمل کرو۔!"

"حکم!" اس نے حیرت سے دُہرایا۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے حیرت سے اس کی آنکھیں پیشانی پر چڑھتے دیکھیں۔

"ہاں حکم!" تہہ خانہ کی محدود فضا میں میری سرد آواز گونجی اور میں نے اپنا پستول والا ہاتھ قدرے آگے بڑھا دیا تاکہ روشنی میں اسے پستول کا ہولناک سیاہ دہانہ نظر آسکے۔

"یہ کیا مذاق ہے جے راج؟" وہ پھیکی، بے جان اور بے یقین سی ہنسی کے ساتھ ہکلایا۔

"جے راج نہیں، اگر ان ساتوں نے تمہیں بتایا ہو تو میرا نام گنگا رام ہے سمجھے... سیتا والا رام!" میں نے پستول کی نال لہرا کر کہا۔

اس کے چہرے پر تاریکی سی آکر گزر گئی "سیتا، گنگا رام... پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ کن ساتوں کا تذکرہ کر رہے ہو؟"

"نیچے اترو!" میں نے کرخت لہجہ میں اسے پھٹکارا۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ ساتھ ہی وہ بولتا بھی جا رہا تھا "اسی لئے تم نے مجھے سخت رازداری کی تنبیہ کی تھی۔ مگر مجھے شبہ ہو چکا تھا۔ میرے دو آدمی ہمارا شروع سے پیچھا کرتے رہے ہیں، تم میرا جو حشر کر دو مگر مجھے نقصان پہنچا کر تم بھی ان دونوں کے ہاتھوں سے نہ بچ سکو گے۔ وہ پیشہ ور قاتل ہیں اور اب تک شاید مندر تک آپہنچے ہوں گے!"

مگر اس کا لہجہ کھوکھلا اور بے جان تھا۔ اگر کوئی ہمارا تعاقب کرتا تو راج مندر کی طرف آتے ہوئے وہ اس قدر خوفزدہ نہ ہوتا۔ میں نے اس کی ہرزہ سرائی کا کوئی جواب نہ دیا اور سیڑھیاں اُتر کر اس کے مقابل چند فٹ کے فاصلہ پر جا رکا۔ "سیتا کہاں ہے؟" میں نے شہادت کی انگلی ٹریگر پر رکھ کر پستول کا بھاری دہانہ اس کے چہرہ سے چند انچ کے فاصلے پر سیدھا کر لیا۔

"کون سیتا؟" اس نے سپاٹ لہجہ میں پوچھا ایک مرتبہ پوری صورتحال سمجھ میں آجانے کے بعد وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا۔

میں نے ٹریگر پر دباؤ ہلکا کر کے پستول کی نال سے اس کے ہونٹوں پہ سخت ضرب لگائی اور وہ چیخ مار کر پیچھے الٹ گیا۔

اس کے اٹھنے سے قبل میں دوبارہ اس کے سر پر سوار ہوگیا۔ اسکے منہ سے خون جاری ہوگیا تھا۔ شاید دو چار دانتوں نے جگہ چھوڑ دی تھی اور دونوں ہونٹ بری طرح کٹ گئے تھے۔ وہ بار بار آستین سے اپنا دہانہ صاف کر رہا تھا۔ "رمیش مجھے ہر قیمت پر اپنے سوال کا جواب چاہیئے!" میں نے سرد اور بے رحمانہ لہجہ میں کہا۔

"میں کسی سیتا سے واقف نہیں سور کے بچے!" وہ کراہتے ہوئے بولا "تو نے میرے دو دانت توڑے ہیں۔ میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

"اگر زندہ بچ گئے تو ضرور بدلہ لینا" میں کوئی گولی ضائع کئے بغیر اسی طرح تیرا جوڑ جوڑ الگ کردوں گا اور تو مر گیا تو ان ساتوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور بول اٹھے گا۔"

"وہ مر کر بھی تجھے سیتا کا پتہ نہ بتا سکیں گے۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں تجھے زندہ رکھ کر اس قدر اذیت پہنچاؤں گا کہ خود بخود بول اٹھے گا۔" میں یہ کہتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔" وہ غرایا۔

میں نے پستول والا ہاتھ بلند کیا تاکہ اس کی نال سے رمیش کے داہنے جبڑے پر ضرب لگاؤں مگر اس بار وہ میرا ارادہ بھانپتے ہی اپنی جگہ سے اچھلا اور تہہ خانہ پستول کے ہولناک دھماکہ سے لرز اٹھا۔ گولی کسی دیوار سے ٹکرائی تھی اور ساتھ ہی پستول میرے ہاتھ سے نکل کر وسیع تہہ خانہ میں کہیں جا گرا۔ سرچ لائٹ بھی زمین پر گر گئی۔ گو وہ بدستور روشن تھی مگر ہم دونوں اس کے حلقہ سے باہر الجھے ہوئے تھے!

رمیش نے مجھے کسی جونک کی طرح اپنی گرفت میں لے لیا اور اندازہ سے میرے چہرہ پر ٹکر رسید کرنی چاہی۔ میں چہرہ تو بچا گیا مگر بائیں کان پر ٹکر پڑتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے میرے کان کا سرمہ ہوگیا ہو۔ میں نے پوری قوت صرف کرکے قدرے جگہ پیدا کی اور میرا داہنا گھٹنا اوپر اٹھتا چلا گیا۔۔۔ رمیش اس کی چوٹ پر تڑپ اٹھا اور میں اس کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔۔۔ سب سے پہلے فرش سے جو چیز میرے ہاتھ آئی وہ خاکی کاغذ میں لپٹا ہوا لوہے کا وزنی ٹکڑا تھا۔ میں نے اسے پوری قوت سے رمیش کے پیٹ پر مارنا چاہا مگر اس نے اندازہ کی غلطی کی بنا پر جھکائی دیکر خود کو بچانا چاہا اور اپنی پیشانی زخمی کر بیٹھا۔ پیشانی سے خون کا فوارہ ابلا تو وہ روشنی کی زد میں تھا۔ اس نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر سنبھل نہ سکا اور کراہتے ہوئے بیہوش ہوگیا۔۔۔ میں نے ٹارچ اٹھا کر پہلے اپنا پستول، تھیلا اور باقی سامان یکجا کیا پھر اپنے کان کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا وہ کان گو اپنی جگہ موجود تھا مگر رمیش کی وحشیانہ ٹکر کے باعث کئی جگہ سے کھال پھٹ گئی تھی۔ رمیش کی حالت کے پیش نظر یہ سودا کچھ مہنگا نہیں تھا۔ گو رمیش کی پیشانی کی ضرب بہت شدید اور گہری تھی مگر وہ صرف بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے نہایت اطمینان سے اس کی جامہ تلاشی لی مگر کوئی قابل ذکر چیز ہاتھ نہ لگی۔ اس کے پرس میں رقم کے علاوہ بہت سے وزٹنگ کارڈ بھی تھے جو اناتھ آشرم کے سرپرستوں یا پھر گاہکوں کے رہے ہوں گے۔ میرے اندازہ کے مطابق رمیش بے پناہ قوت برداشت کا مالک تھا لہٰذا میں نے اس کی ظاہری حالت پر اطمینان کئے بغیر اس کی قمیص اتار کر اس کے دونوں ہاتھ قمیص سے کس دیئے تاکہ ہوش میں آنے کے بعد وہ مقابلے کے بارے میں نہ سوچ سکے لیے تو میرے ہاتھوں ہر حالت میں مرنا ہی تھا مگر مجھے اس سے بازپرس کے بعد سیتا کی بازیابی کے لئے نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑتا۔ لہٰذا میں اپنی جسمانی توانائی کے اصراف میں خاصا محتاط تھا۔

رمیش نے ہوش میں آنے میں میرے اندازے سے کہیں زیادہ وقت لیا۔ جوں ہی اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں مجھے اپنے سر پر مسلط پایا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اپنے حواس پر قابو پانے کے بعد اس نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔

"سیتا کا سراغ!" میں نے اس پر ایک بار پھر واضح کیا۔

"اس کے بعد تم مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟"

"وعدہ نہیں کرسکتا!" میرا لہجہ سرد تھا۔

"پھر تم میرے ٹکڑے بھی اڑا ڈالو تو میری زبان نہ کھلوا سکو گے!"

"میں تمہاری تجویز ضرور آزماؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے تھیلے سے وہ تیز دھار استرا نکال لیا جو صبح میں نے داڑھی صاف کرنے کے لئے خریدا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے استرے کو گھورنے لگا!

"اب یہ بھی بتا دو کہ تم اپنے جسم کے کس عضو سے سب سے پہلے محروم ہونا پسند کروگے؟" میں نے اسے دہشت زدہ کرنے کے لئے سوال کیا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ وہ مجھے مزید ایذا رسانی پر مجبور کئے بغیر ہی سب کچھ اگل دے تو میں کم از کم اس اعصابی انتشار سے بچ سکوں گا جو بصورت دیگر مجھ پر مسلط ہوجائے گا۔

"تم واقعی ایسا کر گزرو گے؟" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"میں ہر تیاری کے ساتھ آیا ہوں۔"

"مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا؟" وہ اس وقت دنیا کا مظلوم ترین آدمی نظر آ رہا تھا۔

"سکون۔" میں نے جواب دیا "سیتا کی طرف اٹھنے والا ہر ہاتھ توڑ دوں گا۔ تم تو اس کے اغوا میں برابر کے شریک تھے۔"

"نہیں۔" وہ اپنے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "وہ ساتوں سیتا کو لئے اچانک ہی میرے پاس آ پہنچے تھے اور مجھے انہیں پناہ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تمہارے اصل مجرم تو وہ ساتوں ہیں!"

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے! تم صرف میری بات کا جواب دو!"

"وہ سیتا کو لائے تو وہ بیہوش تھی۔ وہ اناتھ آشرم کے مندر میں ایک زمین دوز کوٹھڑی میں قید ہے!" وہ رک رک کر بولا۔

"کل رات تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" یہ سوال کرتے ہوئے میرے خون میں چنگاریاں سی بھڑک اٹھیں۔

"کوٹھڑی میں لے جانے تک وہ ہوش میں آگئی تھی۔ اس وقت ہم پی رہے تھے۔ سیتا نے غیر متوقع طور پر ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم بڑی ہی ... کے بعد سے ......"

بس میں نے جیخ کر اسے خاموش کر دیا اور تھیلے سے پستول ... نے لگا۔

"وہ نہیں ہوا جو تم سمجھ رہے ہو!" وہ دہشت زدہ آواز میں چیخ ... اناتھ آشرم میں آج تک کسی کے ساتھ جبر نہیں ہوا۔ میں چیخ پکار اور دھماچوکڑی ... سے گھبراتا ہوں۔ وہ ساتوں مصر تھے مگر میں نے انہیں روک دیا اور ہم اسے ... کر کوٹھڑی سے نکل آئے!"

میرا ہاتھ رک گیا۔ "سیتا تک پہنچنے کی کیا صورت ہے؟"

"سریتا میرے ہر راز کی شریک ہے۔ رات میں پھاٹک بند کر دیا جاتا ہے۔ سریتا اندر پھاٹک سے ملحق کوٹھڑی میں سوتی ہے تم دروازہ کھلوا کر اس سے ... اتنا کہنا کہ تمہیں پھول چاہئیں وہ تمہیں اندر بلا لے گی۔ یہ ہمارے گاہکوں ... پہچان ہے۔ پھر وہ تم سے پھولوں کی پسند کے بارے میں پوچھے گی۔ عام اشارہ ... گلاب ہے۔ سیتا کے لئے تمہیں بتانا ہوگا کہ جنگلی گلاب چاہیئے۔ وہ ... سرکشی سے آگاہ کرے گی اور دو ہزار روپے طلب کرے گی۔ رقم ادا ... کے بعد تم اسی وقت سیتا تک پہنچ سکتے ہو!"

"اور اگر مجھ سے پہلے کوئی پہنچ چکا ہو تو؟" میں نے سوال کیا۔

"ان ساتوں کے علاوہ میں نے صرف تمہیں سیتا کا شناختی اشارہ بتایا ... اور وہ شاید آج اناتھ آشرم کا رخ بھی نہ کریں کیونکہ کل رات کسی نے گنیش مندر ... ایک خدمتگار کو مار دیا ہے۔ شیام مجھے بتانے آیا تھا کہ یہ شاید سیتا کے ... ہی کی حرکت ہے مگر پولیس ان ساتوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ شاید ان کی ... رانی بھی ہو رہی ہے۔ تم چاہو تو ڈیڑھ گنی رقم دے کر سیتا کو آشرم سے باہر بھی ... سکتے ہو!"

"تم نے مجھے بدترین حالات میں بہترین خبر سنائی ہیں لہٰذا تم انعام ... مستحق ہو!" میں نے پستول سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ... رت کی چمک کوندی اور ہمیشہ کے لئے ثبت ہو کر رہ گئی کیونکہ دل میں اترنے ... لی گولی نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

میرا کام توقع کے خلاف جلدی ختم ہوگیا اس وقت بارہ کا عمل تھا ... قی رات بسر کرنے کے لئے ایک لاش کا قرب اتنا ڈراؤنا نہیں تھا جتنا سانپوں ... تصور! میں فوراً ہی تہہ خانہ سے نکل آیا اور راج مندر سے واپس روانہ ہوگیا۔

اتنی رات گئے کسی سواری کا ملنا محال تھا لہٰذا میں پیدل ہی شہر کی طرف ... ل دیا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اسی رات سیتا کو اناتھ آشرم سے نکال لے جاؤں، ... اس کے لئے میرے پاس تین ہزار روپے موجود نہیں تھے۔ میں نے فوری طور پر ... دنا تو بنا سکتا تھا مگر سریتا کو یہ یقین دلانا مشکل ہوتا کہ سونا اصلی ہے۔ اپنے ... قا' رمیش کی عدم موجودگی میں اس باراں دیدہ، گھاگ عورت کو قائل کرنا بہت ... صورت یہ تھی کہ نقب زنی کے ذریعے رقم حاصل کی جائے،

تیسری اور آخری صورت سریتا کو خنجر کی نوک پر مجبور کرنے کی تھی لیکن اس میں ذرا بھی چوک ہو جاتی تو سارا معاملہ قبضہ سے باہر ہو جاتا۔

نقب زنی میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ بنارس میرے لئے نیا شہر تھا۔ دوکان کا انتخاب اگر غلط ہوتا تو بلاوجہ مایوسی ہوتی، کافی سوچ بچار کے بعد میں نے سیتا کی بازیابی کا معاملہ اگلے روز پر ملتوی کر دیا۔ کاروبار شروع ہونے کے بعد میں سونا بیچ کر تین تو کیا تیس ہزار روپے بھی بآسانی حاصل کر سکتا تھا اور اس میں کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔

مگر شہر کے کاروباری علاقے میں داخل ہوتے ہی میرا ارادہ بدل گیا۔ رمیش میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ اس کی گمشدگی کی خبر پھیلتے ہی وہ ساتوں فوراً مجھ پر شبہ کرتے پھر شاید اپنے تحفظ کی خاطر وہ کسی نہ کسی طرح مجھے اور سیتا کو اس معاملے میں ملوث کر دیتے۔ پولیس مجھے تو کیا ڈھونڈتی، ہاں سیتا اناتھ آشرم سے سیدھی حوالات میں پہنچ جاتی لہٰذا مجھے جو کچھ کرنا تھا اسی رات کرنا تھا۔

بازار کے کئی چکر لگانے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ اس شہر کے تاجر چوکیداروں وغیرہ کے معاملے میں کاہل واقع ہوئے ہیں یا تو سرے سے چوکیدار تھے ہی نہیں اور اگر تھے تو کہیں پڑے سو رہے تھے۔۔۔ اس دوران میں مجھے ایک دوا فروش کی دوکان نظر آئی جس کے چوبی دروازوں پر آہنی پٹی لگا کر دونوں سروں پر وزنی تالے لگائے گئے تھے۔

میں نے چوکنی نظروں سے ہر طرف کا جائزہ لیا اور پھرتی کے ساتھ ایک تالے پر قسمت آزمائی شروع کر دی۔ میرے پاس قفل شکنی کا کوئی اوزار نہیں تھا بس ایک تار ہی کے ذریعہ ساری کوشش جاری تھی کہ دور سے کسی کار کی تیز روشنیاں نظر آئیں۔ میں تیزی کے ساتھ دوکان کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ کار تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی اور میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ تیار ہو رہا تھا۔ کار قریب آئی تو میں دونوں ہاتھ اٹھا کر سڑک پر آ گیا۔

کار میں موجود شخص نے بریک لگا کر میرے قریب کار روک لی۔

"کہاں جا رہے ہیں سرکار؟" میں نے پشتینی غلاموں کے سے لہجے میں منمنا کر سوال کیا۔

"پاربتی پور!" لڑکھڑاتی ہوئی آواز ابھری۔

"سرکار مجھے بھی وہیں جانا ہے، اتنی رات گئے شہر میں کوئی سواری بھی نہیں ہے!" میں نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"بیٹھ جاؤ!" میں نے پھرتی کے ساتھ اس پرانی مرسڈیز کی اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور کار کے واحد مسافر کے پہلو میں براجمان ہوگیا۔

جب کار چکنی سڑک پر پھسلنے لگی تو میں نے بات چھیڑی "کہاں سے آ رہے ہیں سرکار؟"

"ہم شراب پی کر اور رقم ہار کر آ رہے ہیں پنڈت! تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

وہ خاصی ترنگ میں تھا مگر اسٹیرنگ کو مہارت سے کنٹرول کر رہا تھا۔

"اتنی بڑی رقم ساتھ لیکر نکلا کریں لالہ جی؟" اس کے ذہنی اختلال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے براہ راست مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"بڑی رقم تو ہم شام میں لائے تھے۔" وہ ہنسا "اب تو چند سو ہی رہ گئے ہیں!"

پھر جوں ہی کار ایک ویران علاقہ میں پہنچی میں نے ہاتھ بڑھا کر اگنیشن آف کر دیا۔ کار ایک تیز جھٹکے کے ساتھ خاصی دُور گھسٹتی چلی گئی اور پھر رُک گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ غرایا۔

"بدتمیزی کا ہیں، اپنا بٹوا نکالو!" میں نے پستول سامنے کر دیا۔

"ڈیش بورڈ سے لے لو۔" اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔

میں نے اس کا پرس نکالا۔ اس میں کل بائیس سو روپے موجود تھے۔

میں نے رقم نکال کر بٹوا واپس رکھا اور چابی اس کی گود میں اچھال دی۔ "بس، اب سیدھے گھر چلے جاؤ۔!"

اس روز مجھے پتہ چلا کہ بعض لوگ شراب پی کر نہایت سعادتمند ہو جاتے ہیں کیونکہ اس نے ذرا بھی احتجاج کئے بغیر گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنی راہ چلا گیا۔

گو یہ رقم سیتا کی رہائی کے لئے ناکافی تھی مگر اس کے سہارے میں کم از کم اپنی سیتا سے ضرور مل سکتا تھا!۔

میں تیزی کے ساتھ واپس ہو لیا۔ اتنی رات گئے اناتھ آشرم کا راستہ تلاش کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ انجنوں وغیرہ کا دُور سے سُنائی دینے والا ہلکا ہلکا آسیبی شور ہی سمت کے بارے میں میری رہنمائی کر رہا تھا۔ ورنہ میں بالکل مخالف سمت میں بھی جا سکتا تھا!

مجھے شہر میں بھٹکتے چار بج گئے۔ رات گزرنے میں اب تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ مجھے تو شبہ ہو چلا تھا کہ شاید اس وقت سریتا آشرم کی کسی بھی لڑکی کو باہر بھیجنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ رمیش ہر معاملے میں اصول کا سخت پابند تھا اور اس کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ آمد و رفت کا تمام سلسلہ رات کی تاریکی ہی میں مکمل ہو جانا چاہیئے۔

ساڑھے چار بجے ہوا کے دوش پر مجھے ایسا شور سُنائی دیا جیسے بہت سے آدمی آپس میں لڑ رہے ہوں۔ آوازوں کا رُخ وہی تھا جدھر میں جا رہا تھا۔ بے اختیار میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مجھے شبہ سا ہوا کہ کہیں رمیش کی موت کا راز فاش نہ ہو گیا ہو۔!

میرے قدموں کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ آوازیں لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھیں پھر یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ اناتھ آشرم کے سامنے دُور دُور تک انسانوں کا ایک ہجوم پھیلا ہوا ہے اور اس ہجوم کے درمیان

پولیس کی کئی گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ لوگ ٹولیوں میں بٹے گہرے انہماک کے ساتھ تبصروں میں مصروف تھے!

جلد ہی میں بھی اس ہجوم میں جا پہنچا اور جو سب سے پہلا شخص سامنے آیا، اس سے سوال کیا کہ وہ لوگ وہاں کیوں جمع ہیں!

"انیائے ہو گیا بھیا، انیائے!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کراہا۔ "اناتھ آشرم میں چار پجاریوں کا خون ہو گیا، خون بہہ بہہ کر سڑک تک پھیل گیا ہے، ایک خون کل گنیش مندر میں ہوا تھا۔ جانے دیو تاؤں کی اس پوتر دھرتی پر کون خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔!"

مختلف لوگوں سے بات کرنے کے بعد مجھے اتنا پتہ چلا کہ اناتھ آشرم میں رہنے والی کوئی بیوہ سات پجاریوں کو بُری طرح لہولہان کر کے فرار ہو گئی ہے، ان میں سے چار دم توڑ چکے ہیں، تین خطرناک حالت میں ہسپتال لے جائے جا چکے ہیں۔

مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد نے میرے کان کھڑے کئے پھر مجمع میں سیتا کا نام بھی سُنا جانے لگا۔ لوگوں کے بیان کے مطابق وہ ساتوں پجاری اناتھ آشرم کے منتظم رمیش کے گہرے دوست تھے اور اس کے کمرے میں سو رہے تھے کہ سیتا نامی گوری چمڑی والی ایک بیوہ نے کسی تیز دھار آلے سے ان سب کو بُری طرح زخمی کیا اور آشرم سے فرار ہو گئی۔

کہانی عجیب اور حیرت ناک تھی مگر ابھی تک صحیح تفصیل کا کچھ پتہ نہیں تھا میرے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ سیتا ان ساتوں کی ہوس کا نشانہ بننے کے بجائے اُن سے اپنا انتقام لے کر صاف بچ نکلی ہے۔ لوگوں کے نزدیک وہ بیوہ تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس کا سہاگ زندہ ہے۔ سیتا نے اپنی پیشانی پر مفرور بھیڑیوں کے لہو کی سرخی سجا کر اپنے سہاگ کی لاج رکھ لی تھی!

غیر ارادی طور پر میرا سر غرور سے تن گیا اور میں حادثہ کی مزید تفصیلات جانے بغیر اس بھیڑ سے نکل آیا سیتا فرار ہو چکی تھی اور اس خوفزدہ ہرنی کو اب میرے سہارے کی ضرورت تھی ورنہ وہ کسی بھی لمحہ قانون کے ہرکاروں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس سکتی تھی۔

پھر بنارس میں سیتا کو جلد از جلد ڈھونڈھ نکالنا ہی میرا سب سے اہم کام تھا!

*

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں

ملاحظہ فرمائیں جو کہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے

مفرور

از

اقلیم علیم

حصہ دوم

اقلیم علیم

اناتھ آشرم کے سامنے رات کی سیاہی میں دور تک پھیلے ہوئے ہجوم میں اپنا راستہ بناتا میں باہر نکل رہا تھا۔ لوگوں کی گفتگو سے رمیش کی چالاکی کا ایک ثبوت اور سامنے آگیا تھا۔ وہ اپنے ہر غیر قانونی کام کے لئے قانونی خانہ پری ضرور کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ سفید فام سیتا کو بیوہ کہہ رہے تھے۔ غالباً رمیش نے اناتھ آشرم کے رجسٹر میں سیتا کے بارے میں ایسے فرضی اندراجات کئے ہوئے تھے جن سے پتہ چلتا ہو کہ وہ اناتھ آشرم میں داخل کی جانے والی کوئی لاوارث بیوہ ہے۔!

گنیش مندر میں خیراتی ٹکڑوں پر پلنے والے وہ سات مسٹنڈے پجاری میری بلکہ رمیش تک کی توقعات سے بڑھ کر ہوس کار اور بے خوف نکلے تھے۔ راج مندر کے ویران تہہ خانے میں اپنی بقا کی جدوجہد کے دوران میں رمیش نے مجھے بتایا تھا کہ گنیش مندر میں میرے ہاتھوں ہونے والے پجاری کے قتل کے سلسلے میں پولیس ان ساتوں پر شبہ کر رہی ہے اور ان کی نگرانی کی جا رہی تھی۔۔ دوسری طرف وہ لوگ یہ اندازہ بھی لگا چکے تھے کہ قتل کی اس واردات میں میرا ہاتھ ہے مگر سیتا کے بارے میں یہ تمام خطرات بھی ان کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکے۔ وہ رات کی سیاہی میں اس نیت سے اناتھ آشرم پہنچے ہوں گے کہ رمیش کے ساتھ مل کر ہوس، بربریت اور درندگی کا کھیل رچائیں اور رمیش کو موجود نہ پا کر انھیں اپنی دلی مراد بر آتی نظر آئی ہوگی۔ رمیش وہاں ہوتا تو شاید کسی قیمت پر انھیں سیتا کے ساتھ جبر و تشدد کی اجازت نہ دیتا۔ اس کے بارے میں میرا قیاس یہی تھا کہ اپنے اصولوں کے تحفظ کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کرتا۔

پھر ان ساتوں نے یقینی طور پر سیتا کو شیشے میں اتار کر رمیش کے آراستہ کمرے میں محفل جمائی ہوگی۔ ان کی ہدایت پر سیتا وہاں لائی گئی مگر حیرت انگیز طور پر وہ پہاڑوں کی غیور بیٹی ان سات دیو ہیکل بھیڑیوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ چار اس کے ہاتھوں مارے گئے، تین زخمی ہوئے اور وہ ایک بار پھر آزاد فضاؤں میں نکل آئی۔!

یہ سوچتے ہوئے بار بار میرے وجود میں غرور کا جذبہ سرایت کئے جا رہا تھا۔ مجھے اپنے مقدر پر رشک آ رہا تھا کہ میری بیوی کوئی بے بس، مظلوم اور ناتواں لڑکی نہیں تھی۔ مشرقی لڑکیوں کے برعکس اس کے وجود میں قوت عزم اور حوصلے کے وہ جذبے پوشیدہ تھے جن کے سامنے پہاڑوں کے سینے پھٹ پڑتے ہیں۔ اپنی عصمت کے تحفظ کے لئے وہ کسی کی محتاج نہ تھی۔ ساری عمر ہمالیہ کے سنگلاخ برف زاروں میں برہنہ تن گزارنے کے باوجود وہ پاکیزگی کے مفہوم سے خوب آشنا تھی، جس وقت میں نے لنگوروں میں پروان چڑھنے والی سیتا کو کسی بھی خفت یا شرمندگی سے عاری اور مادر زاد برہنہ حالت میں دیکھا تھا تو میرے دل میں یقینی طور پر اس بات کا شائبہ تک نہیں تھا کہ سندری کی وہ حسین اور نوخیز بیٹی اپنی طرف اٹھنے والی بھوکی نگاہیں نوچ ڈالنے کی قوت رکھتی ہوگی مگر اب وقت اس کا سب سے بڑا گواہ تھا۔ وہ گندے انسانی خون کی ہولی کھیل کر اپنا دامن صاف بچا لے گئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ساتوں اسے چھو بھی نہ پائے ہوں گے

کیونکہ پامالی کے بعد عورت اپنے آنسو تو بہا سکتی ہے، اپنے لٹیروں کا خون بہانا اس کے لئے عملاً ناممکن ہوکر رہ جاتا ہے!

میں اپنے ذہن میں گونجتے ان والہانہ خیالات میں کھویا نہ جانے کب اس ہجوم سے باہر نکل آیا، جب خیالات کا تسلسل ٹوٹا تو میں رات کے ہولناک سناٹے میں ایک ویران سڑک پر کھڑا ہوا تھا اور قرب و جوار سے آوارہ کتوں کا تیز شور رہ رہ کر سنائی دے رہا تھا۔

بنارس ایک بہت بڑا شہر ہے۔ نہ جانے یہ میرے مقدر کی خرابی تھی یا حالات کی ستم ظریفی کہ تقدس اور ماورائی اسرار کی اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی میرا واسطہ گناہ کی بدترین اقسام سے پڑا تھا۔ میں خود کو بالکل اسی دھارے میں بہتا محسوس کر رہا تھا جس میں اندر رام اپنا ذہنی توازن کھوکر معمولی محنت کش سے ایک خونی درندہ بن گیا تھا۔ مجھ میں اور اس خود ساختہ مہارشی میں فرق بس یہی تھا کہ اس کی روح سندری کے خونچکاں تجربے کے نتیجے میں زخموں سے چور ہوگئی تھی۔ مگر میرا پندار ابھی قائم تھا، میرا سر ابھی بلند تھا اور یہی عزم مجھے سیتا کی تلاش کی مہم میں سہارا دینے والا تھا۔

رات دھیمے دھیمے بہی جارہی تھی۔ لمحے خاموشی سے سرک رہے تھے، درندوں کے غول سے بھڑکی ہوئی میری خوفزدہ ہرنی انسانوں کے اس جنگل میں نہ جانے کہاں بھٹک رہی تھی، اس کا رنگ، روپ، سراپا اور انداز لاکھوں میں منفرد تھا، اسے بھرے مجمع میں الگ سے پہچانا جاسکتا ہے، لے دے کر رات کی سیاہی اس کی مددگار تھی اور جب رات بیت جاتی تو شہری زندگی سے ناآشنا وہ معصوم لڑکی اس اجنبی شہر میں کسی قیمت پر روپوش نہ رہ سکتی تھی۔ صبح کا اجالا پھیلتے پھیلتے اناتھ آشرم کا خونیں فسانہ پورے شہر میں گونجنے لگتا، گنیش مندر میں قتل کی ایک واردات ہی نے پورے شہر کو ہلاکر رکھ دیا تھا۔ پھر یہ تو سات پنڈتوں کا معاملہ تھا۔!

حالات کی یہ تصویر بڑی بھیانک تھی، میرے بدن کے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ بہہ نکلا اور پیٹ میں خوف سے ہلکی ہلکی اینٹھن ہونے لگی جیسے ساری آنتیں ایک سخت گولے کی شکل اختیار کرچکی ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ میں سیتا کو کہاں تلاش کروں، اپنے دشمنوں سے معرکہ نمٹا کر وہ نہ جانے کدھر فرار ہوگئی تھی!

مجھے مفرور قرار دینے والی اب خود فرار ہوچکی تھی!

میں پاگلوں کی طرح بنارس کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا، لیکن مجھے سیتا تو کیا اس کی بو تک نہ محسوس ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد آسمان سے تاریکی چھٹنے لگی، پھر آہستہ آہستہ آسمان پر سورج کی روشنی نکھرنے لگی اور ہر طرف چہل پہل شروع ہوتی گئی!

صبح کے اخبارات میں میری توقع کے مطابق اس واقعے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ آیا تھا۔ رات کے تین بجے ہونے والے واقعات عموماً اگلے ہی دن اخبارات میں آتے ہیں کیونکہ بڑے سے بڑے اخبار کے بھی آخری صفحات ایک ڈیڑھ بجے تک چھاپہ خانے کی مشینوں پر لگادیئے جاتے ہیں۔ مگر دس بجے تک بنارس کے گلی کوچے سیتا کے نام سے گونجنے لگے۔ اس شہر کی تاریخ میں وہ واقعہ اتنا ہولناک تھا کہ تقریباً سارے ہی اخبارات نے سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ اس حادثہ پر تفصیلی ضمیمے نکال دیئے۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ایک ضمیمہ خریدا۔ اس کے پورے صفحہ کی سرخی چونکا دینے والی تھی۔ "مندروں کا شہر نیلی آنکھوں والی سفاک قاتلہ کے جنگل میں"۔ نیچے چند ضمنی سرخیاں پھر مرنے اور زخمی ہونے والے مسکین درندوں کی تصاویر تھیں، ایک گوشے میں اناتھ آشرم کی نگہبان سرتیا کی بھی تصویر تھی۔ خبر میں سرتیا کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ سیتا کو ایک ہی روز پہلے ایک باریش یوگی لاوارث بیوہ کے طور پر آشرم میں چھوڑ گیا تھا۔ پچھلی رات سیتا کسی طرح سے رمیش کے کمرے میں گھسنے میں کامیاب ہوگئی اور سوتے ہوئے پنڈتوں کا خون خرابہ کرکے بھاگ نکلی۔ اناتھ آشرم والے میری توقعات سے بڑھ کر چالاک تھے ان ساتوں نے سرتیا کو پوری طرح ساتھ ملایا ہوا تھا۔ زندہ بچ جانے والے پنڈتوں نے اس کے بیان کی تصدیق کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سیتا کو ان کے سامنے آشرم لایا گیا تھا اور انھوں نے سیتا کو لانے والے یوگی کا جو حلیہ بیان کیا وہ میرا ہی تھا۔ اخبار کے مطابق پولیس نے شہر سے نکاسی کا ہر راستہ بند کردیا تھا اور سیتا کے ساتھ ہی اسے لانے والے یوگی، گنگا رام کی بھی تلاش میں تھی۔ اس طرح اپنی دانست میں انھوں نے مجھے بھی پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ میں اناتھ آشرم میں قدم رکھنے سے قبل اپنی داڑھی اور بھنویں مونڈ کر اپنا حلیہ بالکل ہی تبدیل کرچکا تھا ورنہ بغیر مہلت دھر لیا جاتا۔!

مجھے کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا۔ سر پر بس یہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح اس شہر خرابات میں سیتا کو ڈھونڈ نکالوں جس کا نام بنارس کے ہر گھر اور ہر مجمع میں سنائی دے رہا تھا۔

پھر شام کے اخبارات آگئے۔ بنارس سے ان دنوں دو انگریزی اور تین ہندی اخبار ہر شام چھپتے تھے۔ ان میں سیتا کے بارے میں ایک نئی خبر تھی جسے پڑھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

چند شہریوں نے گنیش مندر کے عقب میں بہنے والے نالے کے قریبی ٹیلوں پر ایک دراز قامت سفید فام لڑکی کو دیکھا جو مشکوک انداز میں وہاں ٹہل رہی تھی۔ چند آدمی وہاں پہنچے تو وہ نیلی آنکھوں والی ثابت ہوئی۔ پھر جوں ہی ایک شخص "یہی ہے سیتا" کا نعرہ مار کر اس کی طرف لپکا لڑکی نے ناقابل یقین پھرتی کے ساتھ اسے واپس فضا میں اچھال دیا۔ باقی لوگوں نے اسے گھیرنے کی کوششیں شروع کردیں مگر کوئی بھی اسے زیر نہ کرسکا۔ جتنی دیر میں قرب و جوار سے دوسرے لوگ مدد کو پہنچتے، لڑکی تین شہریوں کو زخمی کرکے بندر کی طرح قلانچیں مارتی پل بھر میں پہاڑیوں میں غائب ہوگئی، پولیس نے اطلاع ملتے ہی سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا اور سیتا کی تلاش کی کارروائی پورے زور و شور سے جاری تھی۔ اخبار نے اپنے طور پر اس امکان کا بھی اظہار کیا تھا کہ اگر اس خونخوار اور وحشی لڑکی کی تلاش میں ضرورت پیش آئی تو فوج سے بھی مدد لی جائے گی جس کے چند دستے ان دنوں فیض آباد کی چھاؤنی سے مشقوں کے سلسلے میں بنارس کے نواح میں آئے ہوئے تھے۔!

یہ خبر پڑھتے ہی میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ سیتا بنارس میں لاکھ اجنبی سہی مگر اسے راستوں کی شناخت میں حیرتناک ملکہ حاصل تھا۔ یہ تو میرا ذاتی تجربہ تھا کہ وہ تاحدِ نظر پھیلے ہوئے یکساں پہاڑوں میں محض پتھروں اور جھاڑیوں کی شناخت کے ذریعے اپنی راہ ڈھونڈ نکالتی تھی۔ لہٰذا پچھلی شب اناتھ آشرم سے فرار ہونے ہی اس نے گنیش مندر کا رخ کرنا چاہا ہوگا۔ اناتھ آشرم چونکہ اسٹیشن اور گنیش مندر کے

درمیانی راستے پر واقع تھا جس سے میں سیتا کے ہمراہ گزر چکا تھا لہٰذا اس نے راستے کی کوئی نہ کوئی نشانی پہچان لی ہوگی اور مجھ سے ملنے کی توقع میں ادھر ہی کا رخ کیا ہوگا مگر خوف، ہیجان اور بے اعتمادی کے سبب میری عقل پر پتھر پڑ گئے اور میں گنیش مندر کو بھول کر شہر ہی میں بھٹکتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں پچھلی رات سیدھا گنیش مندر چلا جاتا تو سیتا خود ہی کسی نہ کسی طرح مجھ سے آملتی اور شاید ہم دونوں اجالا پھیلنے سے قبل ہی کسی گاڑی میں چھپ کر شہر سے صاف نکل جاتے مگر اب یہ موقع ضائع ہوچکا تھا۔ مجھے گنیش مندر میں موجود نہ پاکر سیتا مایوس ہوگئی ہوگی۔ پھر شہریوں سے تصادم کے بعد تو وہ ہرگز وہاں نہ رک سکتی تھی۔ گو اس کا سراغ گم ہوچکا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اب وہ بنارس سے شاید ہی باہر نکل سکے!

میری بھوک پیاس اڑ چکی تھی، نہ رات کو نیند آتی تھی نہ دن میں سکون ملتا تھا۔ شدید ذہنی انتشار کے عالم میں سارا دن شہر اور اس کے مضافاتی علاقوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔ صرف اس امید پر کہ شاید سیتا مجھے دیکھ لے اور کسی طرح مجھ سے آملے، لیکن یہ میری احمقانہ خام خیالی تھی۔

ان روح فرسا حالات میں محض اخباری خبریں میرے لئے امید کا پیغام تھیں۔ پولیس گنگا رام کے شبہے میں باسٹھ باریش سادھوؤں اور یوگیوں کو حوالات کی سیر کراچکی تھی۔ ادھر سیتا چھلاوہ بنی ہوئی تھی۔ پانچ دن میں وہ تین بار مختلف مقامات پر دیکھی گئی مگر اسے گھیرنا ممکن نہ ہوسکا۔ وہ اپنے قریب سائے کو دیکھ کر بھی بھڑک اٹھتی تھی اور اتنی تیزی کے ساتھ غائب ہوتی کہ چپہ چپہ چھان مارنے پر بھی اس کا سراغ نہ ملتا۔ ایسی ہر خبر میرے لئے آسودگی کا باعث تھی جس سے پتہ چل سکے کہ سیتا ابھی آزاد اور زندہ ہے۔

شاید اس کے ستارے عروج پر ہی تھے جو ابھی تک وہ پولیس سے بچی ہوئی تھی۔ اسے ہر بار نہتے شہریوں نے ہی دیکھا۔ مجھے ہر آن یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں وہ مسلح پولیس کے نرغے میں نہ پھنس جائے اور پھر مقابلہ کرتے ہوئے یا فرار کی کوشش میں کسی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔!

سیتا کے بارے میں رائے عامہ غیظ و غضب کا شکار ہوچکی تھی، انتظامیہ پر ہر طرف سے لعن طعن ہو رہی تھی اور اخبارات ہر اشاعت میں سیتا کو ہیرو کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ اس کے بارے میں قیاس آرائیاں زور و شور سے جاری تھیں۔ پھر یہ پڑھ کر تو میری ساری امیدیں بلبلوں کی طرح بیٹھ گئیں کہ سیتا قتل اور اقدام قتل کی وارداتوں کے بعد تین بار دیکھی گئی اور ہر بار وہ شہر سے باہر مضافاتی ویرانوں میں نظر آئی، لہٰذا پولیس شہر چھوڑ کر تیزی کے ساتھ نواحی علاقوں میں پھیل رہی تھی!

ساتویں روز ہاکر کی تیز آواز پر میں اچھل پڑا۔

"مارزن کی بیٹی گرفتار کرلی گئی، پنڈتوں کی قاتل ہتھے چڑھ گئی"۔ وہ اخبار فضا میں لہراتا چیختا چلا جارہا تھا۔

چند ثانیوں تک مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آسکا۔ میرے لئے سیتا کی گرفتاری کی خبر ایک اندوہناک صدمے سے کم نہ تھی۔

مگر زندگی نام ہی ان حقیقتوں کا ہے جو ہمیں ناپسند ہوتی ہیں اگر دنیا میں ہر کام انسان کی مرضی اور پسند کے مطابق ہوتا چلا جائے تو دنیا بے کیف ہوکر رہ جائے۔ جدوجہد، مسابقت، ولولہ اور ساری ہمت دم توڑ جائے۔ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوری خبر پڑھ ڈالی۔

میری محبوب اور رفیقِ تمنّہ بیوی سیتا بچاری پکڑی گئی — وہ نہ جانے کتنی راتوں کی بھاگ دوڑ اور جانفشانی کے بعد ایک جگہ جھاڑیوں میں پڑی بے خبر سو رہی تھی کہ ایک گشتی دستے کے سپاہیوں کو جھاڑیوں میں اس کے لباس کی جھلک نظر آگئی اور آناً فاناً میں وہ علاقہ گھیر لیا گیا۔

پولیس پر سیتا کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ اس خوابیدہ لڑکی کو ہتھکڑیاں پہنانے کے لئے خاصی دیر تک کوئی بھی پیش قدمی نہ کرسکا اور جب اپنی کلائیوں پر سرد آہنی لمس محسوس کرکے وہ جاگی تو چاروں طرف سے رائفلوں کے دہانے اس کی طرف اٹھے ہوئے تھے، میرے ساتھ رہ کر وہ آتشیں اسلحہ کی کارگزاریوں سے باخبر ہوچکی تھی لہٰذا اس نے بلا مزاحمت بدلے ہوئے حالات قبول کرلیئے۔ پولیس اس کے بارے میں سخت رازداری سے کام لے رہی تھی سب سے حیرتناک بات یہ تھی کہ بنارس کا ہر شہری سیتا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ اس کے کارناموں اور جراًت مندانہ اقدامات کے باعث لوگوں میں اس کی طرف سے نفرت کا جذبہ اتنا شدید نہیں تھا جتنا تجسس کا!

بنارس میرے لئے حیرتوں کا مرکز ثابت ہوا تھا، پے در پے ایسے واقعات پیش آتے چلے جارہے تھے جن کی رفتار پر مجھے کوئی اختیار نہ تھا اور میں اپنا دامن بچانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود حالات کے اس دھارے میں تیزی سے بہا جارہا تھا۔ موتی ہاری سے میں محض اس وجہ سے فرار ہوا تھا کہ وہاں انڈین سیکرٹ سروس کے دو افراد پُراسرار طریقے پر مجھ سے آٹکرائے تھے اور محض ان سے روپوش ہونے کے لئے میں موتی ہاری سے نکل پڑا تھا، پھر بنارس آنے میں میرے کسی خاص مقصد کا دخل نہیں تھا مگر یہاں مقدر کی گردش میں انڈین سیکرٹ سروس اور دوسرے تمام اندیشے دب گئے تھے کیونکہ پہلے میرے سامنے سیتا کی تلاش کا مسئلہ تھا اور اب کسی طرح اس کی پولیس سے گلوخلاصی مطلوب تھی۔

پولیس کسی بھی ملک اور شہر کی ہو، مجرموں کے ساتھ اس کا رویہ یکساں ہی ہوتا ہے۔ پھر ہندوستان کی پولیس سے میرا خاصا واسطہ رہ چکا تھا۔ میری سرگرمیاں ہی ایسی تھیں کہ مجھے ہر لمحہ پولیس سے ٹکراؤ کا خوف رہتا تھا۔ پھر سیتا تو عورت ذات تھی۔ کم از کم یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ کوئی معمولی اور گمنام مجرمہ نہیں تھی۔ اس کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی لہٰذا اس امر کا امکان ختم ہوکر رہ گیا تھا کہ حوالات میں نچلے درجے کے افسران روایتی انداز میں اس پر تشدد کا وہ انداز اختیار کریں جس میں ان کے لئے تعیش کا پہلو نکل آتا ہو۔ مگر یہ بات تو طے تھی کہ اب سیتا کے مقدر میں زنداں کی سلاخیں لکھی جاچکی تھیں بلکہ یہ امکان قوی تھا کہ اسے کال کوٹھری کے ذریعے پھانسی کے پھندے پر پہنچا دیا جائے گا۔

میں اس کی بپتا کا چشم دید گواہ تو نہیں تھا مگر اس کی مظلومیت اور مجبوری سے اچھی طرح واقف تھا مگر سیتا شاید کسی طرح عدالت سے اپنے بیان کی صداقت نہ منوا سکتی تھی، زندہ بچنے والے تینوں پجاری اس کے خلاف پوری قوت سے اپنے جھوٹے بیان کی مدافعت کرتے اور یوں چار معصوم پنڈتوں کے قتل کے الزام میں سیتا ستونِ دار پر کھینچ دی جاتی!

کم از کم یہ بات تو یقینی تھی کہ سیتا شہر ہی کی کسی حوالات میں نوشتۂ تقدیر بھگت

سے بھی گفتگو نہیں کر سکتا تھا ورنہ میری ذراسی بے احتیاطی میری آزادی کے لمحات کو مختصر کر دیتی۔ بدمعاش پنڈتوں کی مفروضہ کہانی کی بنیاد پر پولیس پہلے ہی میری ریتی تھی مگر میرے لئے اس کا کھوج نکالنا بہت مشکل تھا۔ سیتا کے حوالے سے میں کسی متلاشی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میری ذات مشتبہ فہرست میں آتے ہی شناخت کرلی جائیگی داڑھی اور بھنویں صاف ہونے کے باوجود کوئی بھی ذہین آدمی مجھے پہچان سکتا تھا کیونکہ بعض خبروں سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ گزشتہ مدت میں پولیس نے پنڈتوں کی یادداشت کے سہارے کسی مصور سے میرا خاکہ... تیار کرکے اخباروں میں مشتہر کر دیا تھا۔ وہ خاکہ میری نظر سے تو نہیں گزرا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس کی بنا پر جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی مجھے پہچان ہی لے گا۔

گرفتاری کے تیسرے روز سیتا سخت مسلح پہرے میں کسی بند عدالت میں... پیش کی گئی اور وہاں سے اس کے بیان کی جو تفصیلات جاری ہوئیں انھوں نے میرے چھکے چھڑا دیئے۔

سیتا نے ان چاروں کے قتل اور بقیہ تین کے زخمی ہونے کے سلسلے میں تقریباً وہی سب کچھ بتایا تھا جس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جوش میں آکر میری شخصیت بھی بے نقاب کر دی تھی۔!

اس نے بڑے فخر سے عدالت میں کہا کہ وہ دنیا کے کسی قانون سے نہیں ڈرتی۔ اُس نے جو کچھ کیا' وہ درست کیا ہے اگر عدالت نے اسے سزا دی تو اسے پورا یقین تھا کہ اس کا شوہر جان پر کھیل کر اسے آزاد کرالے گا اور پھر کوئی طاقت اس کی گرد بھی نہ پا سکے گی۔

"میرا شوہر دنیا کا سب سے عظیم انسان ہے"۔ اخبار نے اس کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھا تھا "اس نے برف کے پہاڑوں میں ایک دیو پیکر درندے کو نیست و نابود کر دیا۔ وہ اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے میں 'ناقابل یقین مہارت رکھتا ہے' تم مجھے قید کر دو مگر وہ مجھے رہا کرالے گا۔ وہ بلا کا ذہین ہے' طاقت میں بھی اس کا ثانی ملنا محال ہے اور رقم سے دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہے۔ وہ جب چاہے لوہے سے سونا بنا کر اتنی رقم حاصل کر سکتا ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی... تم اسے کبھی نہ پکڑ سکو گے۔ وہ جب چاہتا ہے صفدر علی بن جاتا ہے۔ جب چاہتا ہے گنگا رام بن جاتا ہے۔ وہ ایک انسان ہے مگر اس کے بے شمار بہروپ ہیں۔ میرا صفدر مجھ سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوگا۔"

یہ پڑھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سیتا نے نادانی میں میرے لئے بڑی دشواریاں کھڑی کر دی تھیں اور وہ ان کے نتائج سے بے خبر تھی۔ اس طرح اب پولیس میرے بارے میں ہر امکانی پہلو پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتی اسی کے ساتھ کیمیاگری کا اہم راز بھی افشا ہو چکا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ عدالت اور پولیس کی کڑی بازپرس کے باوجود سیتا نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ میں لوہے کو سونا کیسے بناتا ہوں۔

اس کے بعد تو مجھے ہر راہگیر کی نظریں... اپنے وجود میں اترتی محسوس ہونے لگیں مجھے ہر آن یہ دھڑکا لگا رہنے لگا کہ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے۔

اگلے کئی روز اخبارات میرے بارے میں سیتا کے انکشافات کو خوب اچھالتے رہے۔ ادھر معاملہ سنگین' جرم بہت واضح اور اقبال جرم موجود تھا لہٰذا غیر روایتی انداز میں مقدمہ کی مسلسل سماعت ہوتی رہی اور چار دن بعد عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنادی۔

اپنے ہوش میں اس روز میں پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھری دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ سیتا کے جیل پہنچائے جانے کے بعد اسے دیکھنے یا اس سے ملنے کی ہر امید دم توڑ گئی۔ اب تو بس یہی راستہ رہ گیا تھا کہ میں بھی خود کو قانون کے حوالے کر دوں اور اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی پاداش میں زنداں میں ڈال دیا جاؤں' تاکہ سیتا کے قریب رہ سکوں۔ سیتا کی زندگی کے بہترین چودہ سال جیل کی عقوبت زدہ فضا کے لئے منتخب کئے گئے تھے۔ اپنے شوہر پر ناز کرنے والی وہ حسین و جمیل لڑکی جب طویل انتظار کے بعد مایوس ہو جاتی تو جیل ہی میں اس کی صحت کو گھن لگ جاتا میرے تصور میں چودہ برس بعد کی وہ تصویر ابھر آئی جس میں سیتا ہڈیوں کے بیمار ڈھانچے کی صورت میں بنارس جیل کے ہولناک آہنی پھاٹک سے نکل رہی تھی!

میں یک بیک بے چین ہو گیا۔ دل میں ہوک سی اٹھی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہر خطرہ مول لیکر میں جیل میں سیتا کے ملاقاتی کی حیثیت میں جاؤں گا۔ اگر قدرت کا فیصلہ یہی تھا کہ میں سیتا کے ہمراہ ہندوستان کا قیدی رہوں تو میں کسی قیمت پر اس فیصلے کو نہیں ٹال سکتا تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں شاید قانون کے محافظوں کی بصارت مجھے پہچاننے سے معذور رہ جاتی!

میں اپنے سینے میں سلگتی آگ کو دبائے اس خشک نالے سے نکلا جسے ان دنوں میں شب بسری کے لئے استعمال کرتا تھا اور اپنے خیالات میں کھویا شہر کی طرف چل دیا میرا ارادہ اسی دن جیل میں جاکر سیتا سے ملنے کا تھا۔

میں اپنے خیالات میں گم شہر کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اچانک میری چھٹی حس نے قرب و جوار میں کسی خطرے کی موجودگی کی نشاندہی کی۔

میں نے ہڑبڑا کر آس پاس کا جائزہ لیا اور میرا دل یک بیک کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا اس وقت میں شہر کے ایک نسبتاً کم آباد علاقے سے گزر رہا تھا جہاں سڑکوں پر اکا دکا ہی راہگیر نظر آ رہے تھے مگر میرے عقب میں چند قدم کے فاصلے پر دو دراز قامت اور جسیم غنڈے پتلونوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' شانے ملائے میرے پیچھے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان سے بس ایک لحظہ کے لئے میری نظریں چار ہوئیں اور میں نے محسوس کیا کہ ان کی عقابی نظریں میرے بشرے پر جم کر رہ گئیں۔ اُن کے ہونٹوں پر تحقیر اور فتح مندی کے ملے جلے جذبوں میں ڈوبی مسکراہٹ رقصاں تھی۔!

غیر ارادی طور پر میرے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی مگر وہ آہٹیں بدستور اسی فاصلے سے سنائی دیتی رہیں۔ وہ دونوں موت کے فرشتوں کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

میں نے ایک ثانیے کے لئے سوچا۔ گو پولیس والوں کے چہروں پر بھی معصومیت نہیں برستی لیکن میرا برسوں کا تجربہ بتا رہا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والے محض غنڈے ہیں اگر وہ سرکاری کارندے ہوتے تو مجھے یوں ڈرامائی انداز میں ہراساں کرنے کے بجائے للکار کر اپنے شبہات دور کرنے کے لئے کڑی اور دو ٹوک بازپرس کرتے اور اس کے نتیجے میں ایک رائے قائم کر لیتے۔

میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی مگر وہ آسیبی آہٹیں دور نہ ہوئیں۔ میں نے چلتے چلتے اپنا سر پیچھے گھمایا۔ وہ اسی طرح شانے ملائے چلے آ رہے تھے۔ مجھے متوجہ پاکر ان میں سے ایک نے سر جھکا لیا اور اپنے ساتھی کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور وہ دونوں ایک ساتھ زور سے ہنس پڑے' سرد اور بھیانک سی ہنسی جس میں درندگی جھلک رہی تھی!

یہ کیفیت ہیجان انگیز تھی۔ اگر وہ مجھ سے بات کر لیتے یا گھیر بھی لیتے تو میں اتنا پریشان نہ ہوتا لیکن ان کے اس خاموش مگر کھلے تعاقب نے میرے اعصاب ہلا کر رکھ دیئے۔ میں نے بتدریج اپنی رفتار کم کر دی اور شاید ان کے قدم بھی سست پڑنے لگے۔ اور جب میں ایک قدرے بارونق علاقے میں پہنچا تو میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں چلتے چلتے ایک دم رک گیا ادھر وہ دونوں آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے اور میرے قریب دونوں پہلوؤں پر آ رکے۔!

"تم لوگ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پرسکون لہجے میں ان سے پوچھا۔

"پیچھا...!" اُن میں سے ایک ہنسا۔ "بھلا ہم تمہارا پیچھا کیوں کرنے لگے۔؟"

"تم کافی دور سے میرے پیچھے لگے آ رہے ہو!" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "میں بالکل قلاش اور مفلس آدمی ہوں' بھگوان کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"اگر ہم خاموشی سے ایک ہی راستے پر چلے آ رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تمہارا تعاقب کرتے رہے ہیں" اُن میں سے ایک میری طرف جھک کر سخت لہجے میں بولا۔

"چھوڑ یار... کیوں وقت خراب کر رہا ہے!" اس کا دوسرا ساتھی بیزاری سے بولا۔ پھر غور سے میرے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے بولا "پنڈت جی تم نے داڑھی کب صاف کرائی ہے؟"

میرا دل یک بیک ڈوبنے لگا۔ مگر میں نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "فرض کرو کہ چند دن قبل ہی صاف کرائی ہے؟"

"شاباش!" یہ کہہ کر اس نے میرے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی۔ "مجھے سچے آدمی پسند ہیں۔ اگر تم انکار کرتے تو اپنے چہرے پر تازہ صاف کی ہوئی داڑھی کے سبب نمایاں ہونے والی صاف رنگت کا جواز پیش نہ کر پاتے! اب جلدی سے اپنا نام بھی بتا دو۔!"

"کیا ہم یہ ساری گفتگو کسی اور جگہ نہیں کر سکتے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

مگر وہ بلا کا چالاک تھا۔ شاید اس نے میری آنکھوں میں مکاری کی پرچھائیں دیکھ لی۔ فوراً سخت لہجے میں بولا۔ "نندن کو فریب دینے والے صرف اور صرف موت سے دوستی کر پاتے ہیں۔ وہ زندگی بھر بنارس کی جیل میں سڑتی رہے گی اور تمہاری ہڈیاں کسی ویرانے میں گدھوں کے بوجھ سے چٹختی رہیں گی۔!"

میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس کی۔ "پتہ نہیں تم کس کی بات کر رہے ہو۔؟"

"اڑنے کی ضرورت نہیں!" وہ غرایا۔ "ہم دونوں کی جیبوں میں بھرے ہوئے ریوالور موجود ہیں' تم کسی بھرے بازار میں بھی مارے جا سکتے ہو لہٰذا حماقت کی ضرورت نہیں خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے آؤ۔"

"عجیب دھونس ہے' پتہ نہیں تم لوگ کس غلط فہمی کا شکار ہو!" میں سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ مگر ان کا اعتماد کم نہ ہوا۔ آخرکار ان میں سے ایک آگے ہو لیا۔ میں درمیان میں اس کی تقلید کرنے لگا۔ نندن چند قدم کے فاصلے سے میرے پیچھے چلنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم سیاہ رنگ کی ایک آسٹن کے قریب پہنچ گئے۔ نندن مجھے ساتھ لیکر عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ دوسرے آدمی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور کار تیزی سے ایک طرف چل دی۔!

"تم لوگ کون ہو؟" کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اس شہر میں ہمارے نام کا سکہ چلتا ہے"۔ نندن سپاٹ لہجے میں بولا "ہمیں تم سے کوئی پرخاش نہیں' ہم صرف سونا بنانے کی ترکیب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔!"

میں نے دل ہی دل میں سیتا کو ایک موٹی سی گالی دی میرے اندیشے درست نکلے تھے۔ عدالت میں اس کی ہرزہ سرائی کے نتیجے میں پولیس کے علاوہ مقامی جرائم پیشہ افراد بھی میرے پیچھے لگ چکے تھے۔

"سونا!" قدرے خاموشی کے بعد میں بے جان انداز میں ہنسا "سونا بنانا اگر ایسا ہی سہل ہوتا تو اس وقت میں تمہیں فٹ پاتھ پر گھومتا ہوا نظر نہ آتا۔"

"بکواس مت کرو!" نندن یک بیک تیور بدل کر غرایا "میں تمہاری اصلیت کی تہہ تک پہنچ چکا ہوں اور اگر تم نے میرے ساتھ تعاون نہ کیا تو زبردست خسارے میں ہوگے"۔

"میں نفع نقصان سے بے نیاز ہوں"۔ میں آخری لمحے تک مزاحمت کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"یہ وقت بتلائے گا"۔ وہ الفاظ چبا کر بولا۔

پھر سفر خاموشی سے جاری رہا۔ آخر سیاہ آسٹن ایک سالخوردہ سی مضافاتی سڑک پر طویل سفر طے کرنے کے بعد پتھروں سے بنی ایک ذیلی سڑک پر اتر گئی جس کا اختتام ایک چوبی پھاٹک پر ہوا۔ پھاٹک کے اردگرد خاردار تاروں کے اندر تناور درخت پھیلے ہوئے تھے اور فضا امرودوں کی مہکار سے رچی ہوئی تھی!

ہارن کی آواز پر ایک بوڑھے نے پھاٹک کھول دیا اور آسٹن دھول اڑاتی تیزی سے اندر گھستی چلی گئی۔ وہ امرود کا کوئی بہت بڑا باغ تھا جس کے کافی اندرونی حصے میں تختوں کی ایک وسیع سی عمارت بنی ہوئی تھی جس پر باہر سے سناٹے کا راج نظر آتا تھا۔

وہ دونوں مجھے لیکر اس غیر مقفل چوبی عمارت میں داخل ہو گئے جو اندر سے خاصی مزین اور آراستہ تھی اور بظاہر ہم تینوں کے سوا وہاں کوئی موجود نظر نہ آتا تھا۔

چوبی عمارت کے پرتکلف ڈرائنگ روم کے بجائے ہماری پیش قدمی کا اختتام ایک بے رونق کوٹھری میں ہوا۔ یہاں فرش پر ایک میلی سی دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک گوشہ میں مضبوط آہنی الماری موجود تھی جبکہ کھپریل کو سہارنے والی کڑیوں میں تین آہنی کڑے جھول رہے تھے!

وہاں میرے ہاتھ سے تھیلا چھین لیا گیا۔ نندن نے اسے فرش پر الٹا اور میرے پستول پر نظر پڑتے ہی اُسکے لبوں پر زہرخند پھیل گیا۔ "یہ تمہارے پاس کیسے ہے پنڈت جی؟"

"میں پنڈت نہیں صفدر علی ہوں!" میں سر جھکا کر بولا۔ "تمہارا اندازہ درست تھا!"

"شاباش!" نندن تحسین آمیز لہجے میں بولا "ہم سے معاملہ کرکے تم گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ ہمارے وسائل لامحدود ہیں اور اگر تم نے استاد کا اعتماد جیت لیا تو ہمارے آدمی جیل توڑ کر سیتا کو تمہارے پاس پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں' ہمارے دھندے کالے مگر دل ہیرے کی طرح شفاف ہیں۔"

"سیتا کا بیان غلط تھا' میں سونا بنانے کی کوشش میں ضرور مصروف ہوں مگر ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے!" میں نے کہا "ویسے میں اس سلسلے میں تمہارے استاد کی تسلی کرانے کو تیار ہوں۔"

"استاد کی طرف سے اس معاملے میں ٹنڈن کو پورا اختیار حاصل ہے!" اس بار دوسرا آدمی بول پڑا۔ "یہ دوطرفہ سودا ہے جس کی صرف ایک ہی قیمت ہے۔ ہمارے لئے سونا تیار کرو اور ہم سیتا کو آزاد کرا دیں گے۔ اس کے علاوہ ہر بات بیکار ہے۔!"

"مگر میں بتا رہا ہوں کہ ابھی میں سونا بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا!"

"برابری سے بات کرتے ہوئے تم یہ سب بکواس کر سکتے ہو!" ٹنڈن غرایا۔ "مگر ہم تشدد کے سامنے تم سے سچ اگلوالیں گے۔ اس عمارت میں اگر تم ذبح بھی کر دیئے جاؤ تو تمہاری چیخیں کسی کو متوجہ نہ کر سکیں گی اور اگر تم ہماری تھرڈ ڈگری سے زندہ بچ نکلے اور تمہارا یہ بیان سچ ثابت ہوا تو ہم تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ گنیش مندر کے پجاری کے قتل کے سلسلے میں واقعاتی شہادتیں تمہارے خلاف ہیں اور تم پھانسی کے پھندے سے بچ بھی جاؤ تو لمبی قید سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔ سیتا کے ہاتھوں زخمی ہونے والوں نے تمہارے بارے میں پولیس سے جھوٹ بولا ہے مگر ہمارے سامنے انھوں نے ہر سچ اگل دیا ہے۔"

میری نظریں اپنے اس سامان پر جمی ہوئی تھیں جو ٹنڈن نے تھیلے سے فرش پر الٹ دیا تھا۔ اعشاریہ تین آٹھ کا بدنما ہتھیار ٹنڈن کے ہاتھ میں تھا مگر میں اس کی آخری گولی تک استعمال کر چکا تھا اس کے علاوہ فرش پر دو ہتھیار اور بھی تھے۔ ایک تو تیز دھار والا وہی خنجر تھا جس کا پھل گنیش مندر کے ایک خدمت گار کی موت کا بہانہ بنا تھا، دوسرا استرا تھا۔ استرے کی دھار گو مؤثر تھی مگر کسی جان گسل معرکے میں اسے حسب مرضی استعمال کرنا مشکل تھا جبکہ خنجر مجھ سے نسبتاً دور ٹنڈن کے گھٹنے کے قریب پڑا ہوا تھا۔ اگر میری جنبش سے ایک ثانیہ قبل بھی اسے میری نیت پر شبہ ہو جاتا تو خنجر میرے ہاتھ لگنا ناممکن تھا۔۔۔ میں بظاہر یوں بیٹھا رہا جیسے ٹنڈن کی گفتگو نے میرے لئے لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا ہو مگر میرا ذہن تیزی سے اُن سے نجات حاصل کرنے کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔!

"تمہارا فیصلہ بہت سخت ہے ٹنڈن!" آخر کار میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گفتگو کی ابتدا کی "میں تمہیں ہر طرح یقین دلانے کو تیار ہوں کہ میں آج تک سونا بنانے میں پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ میں ہر کامیابی حاصل کر چکا ہوں مگر میرا بنایا ہوا سونا اصل کے مقابلے میں ذرا سخت ہوتا ہے اور کسوٹی پر ہر صراف یہ بات پکڑ لے گا۔ ہاں آنکھ سے بڑے سے بڑا تجربہ کار صراف بھی دھوکہ کھا جائیگا اور نرمی لانے کے لئے مجھے بھاندر ناس نامی ایک بوٹی درکار تھی جسے ہمالیہ پر بسنے والے آدم خور نیپالی قبائل پوجتے ہیں۔ میں اسی کی تلاش میں انا پورنا کی طرف گیا تھا مگر میرا مقدر یاور نہ تھا جو میں بھاندر ناس نہ لا سکا اور بمشکل اپنی جان بچا کر وہاں سے واپس بھاگ سکا۔ تم چاہو تو میں تمہیں منوں کے حساب سے ایسا سونا تیار کر کے دے سکتا ہوں مگر سب سے پہلے تمہیں سیتا کو جیل سے نکالنا ہوگا تاکہ میں یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کر سکوں۔"

"اس سونے پر لاگت کیا آتی ہے؟" ٹنڈن کو شاید میری گفتگو پر یقین آگیا تھا۔

"بڑے پیمانے پر میں نے یہ سونا صرف ایکبار بنایا ہے۔" میں نے بتایا "اس کی لاگت دس روپے تولہ سے زیادہ نہیں آئی تھی۔"

"اور اگر اسے اصلی سونے میں ملایا جائے تو کیا ہوگا؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

اس تجویز پر میں واقعی اچھل پڑا۔ "ہاں۔۔۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، یہ تجربہ کامیاب رہے گا۔ اگر ہم ایک خاص تناسب سے ان دونوں کی ملاوٹ کر کے سونے کی اینٹیں ڈھال لیں تو کوئی کسوٹی ہماری چال نہ پکڑ سکے گی۔ اس طرح ہم بآسانی دس کے پانچ سو اور چھ سو روپے بنا سکتے ہیں۔" یہ بات پوری کرتے ہی مجھے اپنی حماقت کا خیال آیا۔

ٹنڈن کی تجویز پر میں یوں چونکا تھا جیسے اصل سونا تیار کرنا واقعی میرے بس کی بات نہ ہو۔ حالانکہ یہ مسئلہ پارس کے نہ ملنے تک باقی تھا اور اب پارس پتھر کے ہوتے ہوئے میں ہر مقدار میں اعلیٰ ترین معیار کا سونا بنا سکتا تھا۔ بہرحال ٹنڈن کی تجویز پر مجھے یہ خلش ضرور ہوئی کہ اگر کراچی میں جمال سنیاسی کے ساتھ کیمیاگری کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال آجاتا تو اس وقت میں اپنے ملک اور اپنے شہر میں بہترین زندگی گزار رہا ہوتا۔ بھاندر ناس کی تلاش میں میں نے جو ناقابلِ بیان صعوبتیں جھیلی تھیں، شاید میں اُن سے بچ جاتا مگر اگلے ہی لمحے میں یہ خلش دُور ہو گئی کیونکہ میں نے ان صعوبتوں کے بہت بھاری دام پائے تھے۔ سیتا جو شاید اس صدی کی سب سے عجیب لڑکی تھی محض بھاندر ناس کی تلاش کے بہانے میری بیوی بنی تھی اور پارس پتھر جو تاریخ کی شاید سب سے تہلکہ خیز دریافت تھی، اسی مہم میں میرے ہاتھ لگا تھا!

"یہ معاملہ ذرا مختلف ہے، مجھے استاد سے اجازت لینی پڑے گی!" ٹنڈن کہہ رہا تھا "مگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ سیتا کو جیل سے نکالنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اگر استاد ہمارے منصوبے سے متفق ہو گیا تو تمہیں فوراً ہی کام شروع کرنا ہوگا۔ ہم سیتا کو جلد از جلد باہر لانے کی کوشش کریں گے مگر اس بارے میں وقت کی کوئی شرط قابلِ قبول نہیں ہو سکتی!"

گفتگو معقولیت کے رُخ پر تھی اس وقت میرے سامنے بے شمار مسائل بکھرے ہوئے تھے اور سیتا کی رہائی کے معاملے میں، میں بالکل بے بس تھا۔ سیتا کے لئے تنہا جیل سے نکل بھاگنا تو محض احمقانہ خیال تھا۔ اب اگر پارس پتھر کو ان لوگوں کی نظروں میں لائے بغیر مجھے ان کا تعاون حاصل ہو رہا تھا تو یہ میری غیبی امداد تھی۔ بعض اوقات بدترین لوگوں سے بھی قدرت بعض بہت اچھے کام لے لیتی ہے اور ٹنڈن شاید اسی صف میں شمار کیا جانے والا تھا اور مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔!

ہر بڑے جرائم پیشہ کی طرح یقیناً ان لوگوں کا بھی مضبوط گروہ رہا ہوگا۔ میں کیمیاگری کے ذریعہ ان کی ہمدردیاں جیت سکتا تھا۔ بنارس میں ان کی جمعیت میرے لئے زبردست سہارا بنی رہتی اور میں ان کی پناہ میں روپوشی کا طویل عرصہ گزار سکتا تھا حتیٰ کہ میرے اور سیتا کے افسانے محض خواب بن جانے پھر میں سیتا کو لیکر بآسانی اپنے ملک کی طرف نکل سکتا تھا!

میں نے خنجر اور استرے کو نظر انداز کر دیا۔ اُن سے اُلجھنے میں سراسر نقصان تھا یوں میں شہر میں اپنے دشمنوں میں اضافہ ہی کرتا اور میرے لئے تنہا اتنے محاذوں پر برسرپیکار رہنا مشکل تر ہو جاتا۔!

"مجھے اس بات کا احساس ہے!" میں نے ٹنڈن سے کہا۔ "اور جب ہم ایک سمجھوتے پر پہنچ چکے ہیں تو میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمارے معاہدے کی بنیاد نیک نیتی ہے۔"

اس کے بعد وہ کوٹھری غیر ضروری ہو گئی۔ میں ان کے قیدی سے مہمان کے درجے پر آ گیا۔ ہم تینوں ڈرائنگ روم میں آئے تو ٹنڈن کہیں اور چلا گیا۔ اس کا ساتھی جس کا نام جسونت راؤ تھا، میرے ساتھ رُکا رہا۔

"کیا یہ درست ہے کہ سیتا کو تم ہمالیہ کے علاقے سے ساتھ لائے ہو؟" جسونت راؤ نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ وہ مجھے وہیں ملی تھی۔!"

"مگر وہ وہاں کیسے پہنچی؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بہت لمبی کہانی ہے۔" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا "مگر وہ اس قدر دلیر اور حوصلہ مند لڑکی ہے کہ ہمارے لئے اس کا تصوّر تک محال ہے۔!"

"تم اسے غیر قانونی طریقے پر جیل سے نکالنا چاہتے ہو۔" وہ بولا "مگر اس کے بعد وہ کبھی آزادی کا سانس نہ لے سکے گی۔ میں نے اس کی تصویریں دیکھی ہیں۔ اس کا رنگ روپ اور چہرہ مہرہ لاکھوں میں پہچانا جائے گا اور جب بھی وہ کھلے بندوں باہر نکلی، دھر لی جائیگی۔"

"اس کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ میں اسے گوشہ نشینی اختیار کرنے پر آمادہ کر لوں گا۔ وہ جس قدر سرکش ہے اس سے زیادہ شوہر پرست ہے!"

"اس کا تو مجھے اندازہ ہے۔" وہ لطف لیتے ہوئے ہنسا "وہ تمہیں روئے زمین کا سب سے عقلمند اور طاقتور مرد سمجھتی ہے اور تمہارے بارے میں اس نے اپنے فخر کا اظہار کرتے ہوئے کھلی بے احتیاطی کی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اس معاملے میں وہ میری نادان دوست ثابت ہوئی ہے!"

"محض اسی بیان کی وجہ سے تم ہمارے ہاتھ لگے ہو۔"

"خیر یہ تو شاید میری خوش قسمتی ہے!" میں نے کہا "مجھے سیتا کی رہائی اور روپوشی کے لئے بھرپور مدد کی ضرورت ہے جو تم لوگوں سے مل سکے گی ورنہ اس شہر میں تو میں بھٹکتا ہی رہتا اور شاید کبھی کسی مضبوط گروہ تک نہ پہنچ پاتا۔"

"تم تو مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہو گے کہ یہ سارے رشی، سادھو، مہنت اور گرو ساری عمر پراسرار علوم کے چکر میں پڑے رہتے ہیں جن میں کیمیاگری سرفہرست ہے۔ بن باس تو محض مجبوری کا دوسرا نام ہے ورنہ انھیں دولت مل جائے تو ان میں سے بیشتر سب سے پہلے گناہوں کی دلدل میں غرق ہو جائیں۔ سیتا کا بیان چھپنے کے بعد ایک طرف تو یہ سارے لوگ شہر میں تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں، دوسری طرف دولت حاصل کرنے کے رسیا جرائم پیشہ بلکہ ہمارے ہم پیشہ لوگ تمہاری گھات میں ہیں۔۔۔ قانون کے محافظ ان کے علاوہ ہیں۔ اس بھیڑ میں یہ اتفاق ہی تھا کہ سب سے پہلے ہم نے تمہارا سراغ نکالا۔"

"ہاں۔۔۔ اسی لئے میں اسے خوش قسمتی شمار کرتا ہوں!" میں نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔ "پولیس تو مجھے سیدھی جیل ہی پہنچاتی، اٹھائی گیروں یا مکار رشیوں کے ہاتھوں میں پھنستا تو دوطرفہ فائدے کے بجائے صرف ان کے لئے سونا بنانے کا معاملہ ہی زیرِ غور رہتا اور وہ میرے ساتھ سونا اگلنے والی مشین کا سا رویہ رکھتے، مجھے سیتا کو ہر قیمت پر بھولنا پڑتا!" میں اسے بھرپور تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں اس سمجھوتے سے مطمئن ہوں۔

"تم میری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو، تمہاری سوچ بالکل درست ہے!"

تھوڑی ہی دیر بعد ٹنڈن بھی آپہنچا۔ اس کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "استاد راضی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں خود ہی یہاں پہنچ کر تم سے بات کرے گا۔"

"تمہارا استاد کون ہے؟" میں نے اس کی آمد سے قبل اس کے بارے میں جاننا مناسب سمجھا۔

"سردار بھوپت سنگھ اس علاقے میں پھلوں کے باغات کا سب سے بڑا ٹھیکیدار ہے!" ٹنڈن کے آجانے کے بعد جسونت راؤ خاموش ہی رہا تھا "جس عمارت میں تم اس وقت موجود ہو، یہ سردار جی کے ذاتی باغ میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال وہ سرکاری اور نجی باغات کی فصلیں نیلام میں خریدتا ہے۔"

"یہ تو بڑا منافع بخش کاروبار ہے!" میں نے کہا "اور اس میں ایسی غیر قانونی کیا بات ہے جو وہ تم لوگوں کو ساتھ رکھنے پر مجبور ہے!"

"منافع ضرور ہے، لیکن اتنا نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ بعض اوقات تو ٹھیکیدار آپس کی ضد میں بولی آتنی اونچی لے جاتا ہے کہ ایک ہی ٹھیکہ ہزاروں کی رقم لے ڈوبتا ہے" ٹنڈن مجھے بتا رہا تھا۔ "پھر سردار جی کے شوق ایسے ہیں کہ اس کے لئے قارون کا خزانہ بھی کم ہے۔ اس لئے وہ ہم جیسوں کو بھاری معاوضوں پر پال رہا ہے۔ اس نے آج تک ہمیں شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

"کاروبار کیا ہے؟" مجھ میں سویا ہوا آصف علی ایکبار پھر جاگ اٹھا۔

"فی الحال صرف کیمیاگری!" وہ ہنسا "ایسے دھندوں میں زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی جس کام سے تمہارا تعلق نہ ہو اس کی جستجو میں نہ پڑو۔"

تھوڑی دیر بعد ان کا استاد وہاں آپہنچا اور اپنے نام کی کسوٹی پر پورا اترتا نظر آیا۔ ٹنڈن کے منہ سے اس کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں بھوپت ڈاکو کے تصوّر نے سر ابھارا تھا اور سردار بھوپت سنگھ جثے، حلیئے اور قد و قامت کے لحاظ سے ڈاکو ہی نظر آتا تھا۔

چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، موٹی گردن، خوفناک شیو کیا ہوا چہرہ اور کرخت آواز۔۔۔ یہ میرا نیا آقا بھوپت سنگھ تھا۔

اس نے فراخدلی کے ساتھ مجھ سے کیمیاگری کے موضوع پر گفتگو کی اور آخر یہ طے ہو گیا کہ میں اپنی بہترین کوششیں اس کے لئے وقف کر دوں گا۔ بھوپت نے سیتا کی رہائی میں میری پوری مدد کا یقین دلایا اور عارضی طور پر میری تنخواہ دو ہزار روپے ماہانہ مقرر کر دی۔!

"سیتا کی رہائی کے لئے ہمیں کچھ دن انتظار کرنا ہوگا۔" بھوپت کہہ رہا تھا "ابھی وہ نئی قیدی ہے۔ اس کی حرکتوں کی وجہ سے جیل کا سارا عملہ اس کی طرف سے چوکنا ہوگا۔ تھوڑے دن بعد جب جیل کا عملہ اسے عام قیدیوں میں شمار کرنے لگے گا تو میرے آدمی اپنا کام شروع کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے!" میں نے کہا۔

میں بھوپت کے ہمراہ ایک قیمتی اور آرام دہ صوفے پر براجمان تھا جبکہ ٹنڈن اور جسونت فرشی قالین پر بیٹھے ہوئے تھے!

"اس معاہدے کی خوشی میں، میں تجھے ناچ کی ایک بہترین محفل میں لے جاتا مگر بھنویں مونڈ کر تو نے اپنی صورت مضحکہ خیز بنا لی ہے، تیری یہ دعوت میری طرف باقی رہے گی۔" اُس نے کہا۔

"یہ میری عزت افزائی ہے!" میں نے انکسار سے کہا۔ "سیتا کے سوا مجھے دنیا

میں اب کسی عورت سے رغبت نہیں رہ گئی ہے ۔"

"شراب پیتا ہے؟"

میں نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور دھیمی آواز میں بولا " یہ ہمیشہ سے میرا شوق رہا ہے اور اب تو اس کی ضرورت بھی ہے ۔"

اسی عمارت کے کسی حصے میں ریفریجریٹر بھی موجود تھا۔ ٹنڈن بہترین روسی ووڈکا کی ایک سربند بوتل، چار گلاس اور برف کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی پلاسٹک کی بالٹی لے آیا اور بھوپت کے ساتھ ہم شراب نوشی میں مصروف ہو گئے ۔

کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد بھوپت اپنی کار میں واپس لوٹ گیا جسے وہ خود ہی چلا رہا تھا۔ اور ہم تینوں اسی عمارت میں لوٹ آئے ۔!

اس عمارت کا نام تارا کاٹیج تھا۔ باغ بھی تارا باغ کہلاتا تھا۔ یہ بھوپت کا رکھا ہوا نام نہیں تھا بلکہ پشتوں سے اس کا یہی نام چلا آ رہا تھا اور اب بھوپت سنگھ اس کا واحد وارث تھا۔ اس نے خاصی عمر گزر جانے کے باوجود شادی نہیں کی تھی اس کا خیال تھا کہ شادی غریب آدمی کی ضرورت ہوتی ہے اور جو شخص ہر رات اپنی من پسند لڑکی کی ادائیں خریدنے کی استطاعت رکھتا ہو اس کے لیے شادی ہوتی ہے کم نہیں ۔

اسی گفتگو میں ٹنڈن نے اناتھ آشرم کا بھی نام لیا۔ بھوپت سنگھ اس ادارے کا بھی سرپرست تھا اور ہر ماہ ایک خطیر رقم معاوضوں کے علاوہ آشرم کو عطیے میں دیتا تھا۔

"یار ۔۔۔ وہ سالا رمیش پتہ نہیں کہاں غائب ہے !" اناتھ آشرم کے نام پر جسونت راؤ چونک کر ٹنڈن سے بولا "جس رات اناتھ آشرم میں سیتا نے خون خرابہ کیا ہے اس کے بعد سے اس کا سراغ ہی نہیں مل رہا ہے ۔"

رمیش کے تذکرے پر میں زیر لب مسکرا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت آشرم ہی کے کسی حصے میں دادِ عیش دے رہا ہوگا اور جا کر قتل ہونے پر گھبرا گیا ہوگا۔ اگر اناتھ آشرم کی آڑ میں رمیش کے دھندوں کی بھنک بھی پھیل جاتی تو بنارس والے اس کے ٹکڑے اڑا ڈالتے ۔ وہ پولیس کی بازپرس کے خوف سے روپوش ہو گیا ہے ۔ یہ قصہ دب جانے پر ایک روز کسی نئی کہانی کے ساتھ سامنے آ جائے گا ۔"

میرا جی چاہا کہ انھیں دریائے گنگا کے کنارے پر ویران راج مندر کے تہہ خانے میں اترنے کا مشورہ دوں تاکہ وہ رمیش کا حشر دیکھ سکیں لیکن میری چھٹی حس نے مجھے روک دیا۔ فی الحال وہ لوگ گو میرے حلیف تھے لیکن اپنی کمزوریوں کا ڈھنڈورا پیٹنے والے ایک روز خود کو جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ انھیں یہ بتا کر میں انھیں اپنے خلاف ایک قتل کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیتا جسے وہ کسی بھی مرحلے پر میرے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ جبکہ اس وقت میرا دامن بالکل صاف تھا۔ گنیش مندر کے خدمتگار کے قتل کا کوئی گواہ نہیں تھا اور میں کسی بھی اچھے وکیل کے ذریعے اس الزام سے صاف بچ سکتا تھا۔

حالانکہ یہ بالکل آخری اور بدترین حالات کے اندیشے تھے مگر میرا اصول یہی تھا کہ کسی بھی کام کی ابتدا سے پہلے میں اس کے بدترین پہلوؤں کو ضرور سامنے رکھ لیتا تھا اور یہی اصول آج تک میری آزادی کا سبب بنا ہوا تھا ورنہ میں کبھی کا زندہ درگور ہو چکا ہوتا !

اگلے دن ان دونوں نے تارا کاٹیج کے ایک حصے میں میری ہدایت کے مطابق بھٹی تیار کرانی شروع کر دی اور میں نے ایک گوشے میں جا کر اپنے داہنے بازو سے تعویذ کی صورت میں بندھا ہوا وہ کاغذ کھولا جس پر میں نے جمال سنیاسی سے معلوم ہونے والا کیمیا گری کا پورا نسخہ قلمبند کیا ہوا تھا۔ اس میں ہر جزو کی مقدار، طریقۂ کار اور آنچ یعنی حرارت کے بارے میں اہم باتیں مندرج تھیں۔

بھاندرناس کی تلاش کے مرحلے تک میں نے اس کاغذ کی جان سے بڑھ کر حفاظت کی تھی کیونکہ ایک بار اسے کھو دینے کے بعد بھاندرناس بالکل بے کار ہو جاتا۔ پھر مجھے پارس پتھر مل گیا اور یہ کاغذ میرے نزدیک ردی پرزے کی حیثیت اختیار کر گیا مگر میں نے کبھی اسے ضائع کرنے کے بارے میں نہ سوچا اور آج یہ کاغذ میرے لیے ایک بار پھر اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

کیمیا گری کے لوازمات کی فراہمی میں پانچ روز گزر گئے۔ بھوپت کے حکم کے مطابق مجھے پانچ سیر کا گھان تیار کرنا تھا۔ اس تجرباتی مقدار کے بعد آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا جاتا جس کا انحصار بازار میں اس کی کامیاب کھپت پر تھا۔

پھر ایک روز تارا کاٹیج کا ایک حصہ مختلف تیزابی مادوں کی آویزش سے ہونے والی مہلک بدبو سے بھر گیا۔ ٹنڈن اور جسونت جو شوق سے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے اس بو کی تاب نہ لا سکے اور بری طرح کھانستے ہوئے ۔۔۔

میں شب و روز پوری تندہی سے اپنے کام میں لگا رہا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ کیمیا گری سے مجھے جنون کی حد تک دلچسپی رہی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں ۔۔۔ یا نگرانی کے بغیر سارے کام خود سرانجام دے رہا تھا۔ میری سرگرمی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں بھوپت کو پوری طرح اپنے اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی شرط یہی تھی کہ تجربہ کامیاب ہو !

میرا کام گیارہ روز جاری رہا۔ اس دوران میں بھوپت بذاتِ خود چار مرتبہ تارا کاٹیج آیا اور میں نے ہر بار اسے حوصلہ افزا خبریں سنائیں۔

گیارھویں روز میں نے کانپتے ہاتھوں سے انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی ہیں لہریں لیتا سنہرا سیال خالی سانچے میں پلٹا تو ٹنڈن اور جسونت میرے قریب تھے۔ ان کی حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں اس سرخی مائل سنہرے سیال پر جمی ہوئی تھیں۔

سونے کا رنگ ضرور آ چکا تھا مگر ابھی اس نئی دھات کے خواص کا جائزہ ضروری تھا اور یہ کام سانچہ ٹھنڈا ہونے سے قبل ممکن نہیں تھا۔

اگلے روز ہم تینوں نے اس سانچے کا معائنہ کیا۔ جمے ہوئے سنہرے سیال کی سطح پر بلبلوں کا نشان تک نہ تھا۔ ذرات کے درمیان کہیں بھی بلبلے کا نشان نہ تھا۔ سیماب اور تانبے کی بہترین آویزش کا ثبوت تھا جس کی وجہ سے اس دھات کے سالموں کی طبعی ساخت سونے سے مشابہ ہو جاتی۔ پھر میں نے اسے کسوٹی پر رگڑا یا تو سونے کا ہی تھا۔ وہ دونوں تو چیخ کر ایک دوسرے سے لپٹ پڑے مگر میری گہری نظریں اس لکیر میں سرخی کا بہت ہی خفیف سا امتزاج بھانپ چکی تھیں اور یہ خامی اس دھات کی سختی کے ساتھ منسلک تھی جسے دور کیے بغیر کسوٹی کی جانچ پر پورا اترنا ناممکن تھا۔

میرے ایما پر یہ خبر بھوپت کو پہنچا دی گئی اور وہ تھوڑی ہی دیر میں تارا کاٹیج میری بنائی ہوئی سنہری اینٹ دیکھ کر بھوپت مبہوت سا رہ گیا۔ "کون کہتا ہے کہ یہ سونا نہیں ہے، یہ تو اصلی سے بھی زیادہ اصلی معلوم ہوتا ہے۔" وہ جوشیلی مگر دھیمی آواز میں بولا۔

"میں کہہ چکا ہوں سرکار جی کہ ننگی آنکھ سے کوئی اسے شناخت نہیں کر سکتا مگر کسوٹی پر اس کا کس ہلکی سی سرخی دے جاتا ہے ۔۔۔۔۔!"

"ملا ۔۔۔ اسے اصلی سونے میں ملا!" وہ میرا بازو دباتے ہوئے اضطراری انداز میں بولا "تیرے ہاتھ چومے جانے کے قابل ہیں میرے دوست ہم اسے اصلی سونے میں ملا کر فروخت کریں گے !"

بھوپت سونے کی چند گنیاں آویزش کے لیے ساتھ لایا تھا جو میں نے واپس کر دیں۔ صحیح نتائج کے لیے پانسے کا سونا درکار تھا جو اس نے چند ہی گھنٹے میں ٹنڈن کے ہاتھ بھجوا دیا۔

تجربے کی ابتدا میں نے چار تولے پانسے سے کی میرا ارادہ اس میں بتدریج اسی قدر مصنوعی سونا ملانے کا تھا۔ مجھے امید تھی کہ یہ تجربہ کامیاب ہوگا۔

اس دوران میں اپنے بنائے ہوئے سونے کی ایک اور خامی میری نظر میں آئی۔ خالص سونا ۱۰۶۳ درجہ سنٹی گریڈ پر پگھل جاتا تھا اور میرا تیار کیا ہوا سونا اس سے دو درجہ اوپر پگھلتا تھا مگر یہ فرق اتنا باریک تھا کہ عام صراف اس کا پتہ ہی نہیں چلا سکتے تھے۔ صرف تجربہ گاہ میں یہ بات معلوم ہو سکتی تھی ۔

میں مرحلہ وار خالص سونے میں اپنے بنائے ہوئے سونے کی مقدار بڑھاتا رہا اور چار تولے میں چار تولے گیارہ ماشے ملاوٹ کے بعد بھی کسوٹی اسے خالص دکھاتی رہی اس مقدار میں اضافہ کیا تو سرخی بہت نمایاں ہو گئی لہٰذا میں نے چار اور ساڑھے چار تولے کی نسبت کو محفوظ سمجھتے ہوئے معیار مقرر کر لیا۔

وہ سونا بھوپت نے اسی روز بازار بھجوا دیا اور اس وقت اس کی خوشی قابلِ دید تھی جب بازار جانے والے نے اسے ایک مشہور صراف کے ہاتھوں وہ سونا فروخت ہو جانے کی خبر سنائی۔

اب ہر چیز طے پا چکی تھی۔ ہمارے پاس کم و بیش پانچ سیر مصنوعی سونا موجود تھا جس کی تیاری پر تین ہزار دو سو اسی روپے لاگت آئی تھی یعنی وہ ہمیں دس روپے تولے سے بھی سستا پڑا تھا۔ بھوپت نے سب سے پہلے اسی کو اصل سونے میں ملا کر فروخت کرنے کی ہدایت کی اس کے بعد مجھے ایک ماہ کی کھلی چھوٹ تھی کیونکہ اس تجربے کے دوران میری صحت پر گہرا اثر پڑا تھا۔ ایک ماہ کے آرام کے بعد ہمیں کیمیا گری کا کاروباری منصوبہ شروع کرنا تھا جس کے تصور ہی سے بھوپت کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

اگلی صبح جسونت ایک سنسنی خیز خبر لایا۔ سیتا جیل سے بیالیس قیدی عورتوں سمیت فرار ہو گئی تھی اور اب جیل کے حکام کو یقین تھا کہ جیل سے باہر کوئی منظم گروہ سیتا کی پشت پناہی کر رہا ہے کیونکہ جیل کے زنانہ حصے میں فصیل کے قریب ایک سرنگ کا دہانہ دریافت ہوا تھا جو جیل سے باہر تقریباً بیس گز دور کھلے میدان میں تھا۔ پولیس بڑے پیمانے پر شہر میں چھاپے مار رہی تھی۔ تیئس مفرور عورتیں دوبارہ گرفتار کی جا چکی تھیں جو صرف اتنا ہی بتا سکیں کہ سیتا نے انھیں فرار کی دعوت دی اور رات کے تین بجے جب جیل کا حفاظتی عملہ غافل تھا تو سیتا ان سب کو چوپایوں کی طرح فصیل کے قریب لے گئی وہاں اس نے ایک گٹر کا ڈھکنا اٹھایا تو اندر نالے کی دیوار میں تازہ کھدی ہوئی ایک سرنگ کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ ساری عورتیں یکے بعد دیگرے اس سرنگ میں گھستی چلی گئیں اور جب وہ کھلی فضا میں آئیں تو سیتا پوری قوت سے ایک طرف بھاگی جا رہی تھی۔ بندروں کا ایک چیختا چنگھاڑتا غول اس کے پیچھے تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہوا جسونت ؟" میں نے اس سے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"پہلے میرا خیال تھا کہ یہ استاد کا بندوبست تھا لیکن وہ تو یہ خبر سنتے ہی اچھل پڑا۔ پتہ نہیں وہ سرنگ کیسے تیار ہو گئی۔ جیل کا پورا عملہ معطل کیا جا چکا ہے اور حفاظتی ۔۔۔ فرائض سے غفلت برتنے کے الزام میں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ شاید ان سب پر مجرمانہ غفلت کے الزام میں مقدمہ چلے گا ۔"

میں فوراً ہی تارا کاٹیج سے نکل پڑا۔ سیتا ایک بار پھر آزاد تھی مگر مسئلہ پھر وہی تھا کہ میرا اس سے رابطہ کیونکر قائم ہو۔ میری درخواست سے پہلے ہی بھوپت نے اپنے آدمی پورے شہر میں پھیلا دیے تھے تاکہ سیتا جہاں بھی نظر آئے اسے حفاظت اور احترام کے ساتھ تارا کاٹیج پہنچا دیا جائے !

سیتا کے بارے میں ہر لحظہ شہر میں نئی افواہیں گونج رہی تھیں۔ ہر ڈیڑھ دو گھنٹے بعد شہر کے مختلف حصوں سے اس کے دیکھے جانے کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ پھر یہ پتہ چلا کہ بنارس میں پائے جانے والے ہزاروں بندروں کی وجہ سے یہ سارا ڈرامہ ممکن ہوا۔

بنارس جیل میں بھی بے شمار بندر دن رات دندناتے رہتے تھے۔ پھاٹک پر تو انھیں روک لیا جاتا تھا مگر وہ جیل کی بلند و بالا فصیل عبور کر کے اندر گھس آتے تھے اور عرصۂ دراز سے جیل میں ان کی خاصی تعداد رہتی چلی آ رہی تھی۔ سننے میں آیا کہ یہ تمام بندر سیتا سے بے حد مانوس تھے وہ دن رات ان ہی میں گھری رہتی تھی۔ سیتا کو کھانے میں ابلی ہوئی دال اور روٹی ہی ملتی تھی مگر اس کی کوٹھری میں ہمیشہ پھل وغیرہ موجود رہتے تھے جبکہ اس کے پاس پوری قید کے دوران میں ایک بھی ملاقاتی نہ آیا تھا۔

کڑی نگرانی کے دوران پتہ چلا کہ جیل میں دندناتے والے سرکش بندر مراعات یافتہ قیدیوں کے کمروں سے خورد و نوش کی بہترین چیزیں اڑاتے تھے اور سیتا کو پہنچا دیتے تھے۔ کئی بار سیتا کو بندروں کے ساتھ کھانے پینے میں مصروف دیکھا گیا۔

عام خیال یہ تھا کہ سیتا نے بندروں کو جیل سے باہر پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا تھا اور یوں وہ سرنگ کے ذریعے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ٹنڈن نے سیاہ آسٹن کار میرے حوالے کی ہوئی تھی لہٰذا میرے لیے رات گئے تارا باغ واپسی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں بے مقصد کار کو بنارس کی سڑکوں پر دوڑاتا رہا۔ میرے بدن پر اب گیروے لبادے کے بجائے انگریزی وضع کا لباس تھا۔ گنجے سر کو ایک ٹوپی سے چھپا لیا تھا۔ منڈی ہوئی بھنوؤں کی جگہ اب ہلکے ہلکے بال اگنے لگے تھے جن کی وجہ سے میری صورت کچھ قرینے کی ہو چلی تھی۔

میں باری باری شہر کے مختلف گنجان علاقوں میں گاڑی روک کر لوگوں میں گھومتا اور سیتا کے بارے میں خبریں جمع کرتا رہا لیکن افواہوں کے سوا کوئی کارآمد بات علم میں نہ آ سکی۔ جیل سے فرار کے بعد سیتا یوں روپوش ہوئی تھی جیسے اسے زمین نگل گئی ہو

اس وقت شاید رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ میں ایک تھیٹر کے قریب پنواڑی کی دوکان سے سگریٹ خرید رہا تھا کہ اچانک پشت سے کسی نے مجھے دھکا دیا میں کاؤنٹر پر گرتے گرتے بچا۔ میں بچاؤ کی ہیئت سے مڑا ہی تھا کہ ایک بندر کو اپنے شانوں پر موجود پایا۔ اس نے میری ٹوپی خود اتار لی تھی اور اب نہایت آسودہ انداز میں ہولے ہولے میری کھوپڑی سہلا رہا تھا۔

ہندوستان میں بندر کو گائے کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل ہندوؤں کے دیوتا، ہنومان جی سے ملتی جلتی ہے اور وہاں کے لوگ بندروں کی ہر شرارت کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کرنے کے عادی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر محض بندروں کی ضیافت کے لیے مخصوص مقامات پر بھاری مقدار میں حلوہ، پوریاں اور پراٹھے رکھے جاتے ہیں تاکہ ہنومان جی کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔

میرے آس پاس موجود لوگوں نے اس بندر کی اس گستاخانہ حرکت پر نہ کسی ردِ عمل کا اظہار کیا، نہ میرا مضحکہ اڑایا مگر میری کھوپڑی بھنا کر رہ گئی۔ ہندوؤں کے نزدیک بنارس مقدس شہر اور بندر مقدس حیوان سہی مگر صفدر علی کو بھلا تقدس کے اس غیر عقلی فلسفے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے اس بندر کا ہاتھ پکڑا اور بے دردی سے اسے دور فٹ پاتھ پر اچھال دیا۔

وہ خوفزدہ چیخیں مارتا ایک جگہ گرا اور سنبھلنے کے بعد مجھے گھورتے ہوئے غرانے لگا۔ میری ٹوپی فٹ پاتھ پر گر گئی تھی۔

اس بندر کی بدمعاشی پر لوگ خاموش تھے مگر میرے رویے پر لوگوں کے تیور بگڑ گئے اور وہ حقارت سے مجھے گھورنے لگے۔

"تمھیں شرم نہیں آئی اس بے زبان پر ظلم کرتے ہوئے!" ایک شخص نے زہریلے لہجے میں مجھ سے کہا۔

میں نے فوراً ہی بگڑی ہوئی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس شخص کے لیے اپنے دل میں امڈنے والے نفرت کے طوفان کو مصنوعی مسکراہٹ کی آڑ میں چھپاتے ہوئے بولا۔ "غلطی ہو گئی جناب ۔۔ دراصل میرے شانوں میں کئی دن سے اتنا شدید درد ہے کہ قمیص کا بوجھ بھی تکلیف کا باعث بنتا ہے!"

میری معذرت کا اثر خوشگوار رہا۔ لوگوں کے تیور نرم پڑ گئے مگر وہ خبیث بندر وہیں بیٹھا مجھے بھبکیاں دیتا رہا۔ وہ بار بار چند قدم آگے سرکتا اور دوبارہ اپنی جگہ پر لوٹ جاتا۔

جب میں سگریٹ خرید کر دوکان سے ہٹا تو وہ پھر میری طرف لپکا۔ اس بار میں نے اسے پچکارا اور وہ حلق سے مسکین آوازیں نکالتا میرے قدموں میں آ بیٹھا۔

میں نے جھک کر نرمی سے اس کا سر سہلایا اور اپنی کار کی طرف بڑھا مگر اس نے میری پتلون کا پائنچا پکڑ لیا اور مجھے ایک طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے پیر جھٹک کر پتلون کا پائنچا چھڑانا چاہا مگر وہ تو میرے حق میں جونک بن گیا تھا۔ اسی کوشش میں میری پتلون کا وہ پائنچا پھٹ گیا اور مجھے اپنی کوشش ترک کرنی پڑی ورنہ پتلون اوپر تک پھٹتی چلی جاتی۔

اس جگہ بندر کی مرمت کرنے میں خود میری مرمت کا خطرہ تھا لہٰذا میں نے غصے میں کھولنے کے باوجود ہتھیار ڈال دیے اور بندر کی خواہش کے مطابق ایک طرف چل پڑا۔

تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد سڑک ویران ہو گئی۔ بندر نے ابھی تک میرا دایاں پائنچا پکڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک ثانیہ کے لیے رک کر ارد گرد نظریں دوڑائیں پھر میری بائیں لات چلی مگر میں اس کے زور میں داہنی ایڑی پر گھوم کر رہ گیا۔ وہ بندر بروقت خطرہ بھانپ کر میری لات کی زد سے دور جا کھڑا ہوا تھا۔

پھر اس سے قبل کہ میں اپنا توازن سنبھالتا، وہ بندر جست لگا کر غراتا ہوا میری طرف آیا اور میری پنڈلی ادھیڑتا دوسری طرف نکل گیا۔

درد کی ایک شدید ٹیس کے ساتھ ہی معاً مجھے وہ بندر یاد آئے جنھوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں میں مجھے اپنے نرغے میں لیا تھا اور پھر مجھے اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر ان ہی بندروں نے ایک کھلے احاطے میں میری ایسی کڑی نگرانی کی تھی میں سر توڑ کوششوں کے باوجود انھیں جُل دے کر وہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

یک بیک میرے ذہن کے سارے بند دریچے کھلتے چلے گئے۔ ہمالیہ کے بندر سیتا کے سدھائے ہوئے تھے۔ ان میں لمبی دموں والے لنگور بھی تھے اور شریر بھی ۔ سیتا جیل سے جیسے بھی فرار ہوئی ہو اس مہم میں بندروں کا اہم رول تھا اب ایک بندر مجھے کسی خاص سمت میں لے جانے پر مصر تھا!

بے اختیار میرے قدم اسی طرف اٹھ گئے جدھر بندر مجھے کھینچ رہا تھا۔

جب بندر نے مجھے راہِ راست پر آتے دیکھا تو آہستہ آہستہ ایک بار پھر میرے قریب آ گیا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اسے پچکارا۔ میری جانب سے خیر سگالی کے اس اظہار کے جواب میں وہ تقریباً میری گود میں سمٹ آیا۔

اس مرتبہ بندر حلق سے عجیب و غریب دبی دبی آوازیں نکالتا آگے آگے جا رہا تھا اور میں پوری رفتار سے اس کی تقلید کر رہا تھا۔

تقریباً پون گھنٹہ بعد ہم گنجان آبادی سے باہر آ گئے اور میرا دل موہوم اندیشوں کی بنا پر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آبادی کے اختتام پر ناہموار اور پتھریلا میدان پھیلا ہوا تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں مجھے بہت سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا کیونکہ وہاں قدم قدم پر گڑھے اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔

پھر ہم اتنی دور نکل آئے کہ آبادی کی روشنیاں بھی عقب میں پھیلے ہوئے ٹیلوں کی اوٹ میں چھپ گئیں۔ ہر طرف گہری تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔

اچانک اس بندر نے ایک تیز چیخ ماری اور بجلی کی سی سرعت سے دوڑتا ہوا اندھیرے میں کہیں روپوش ہو گیا۔ میں نے احمقانہ انداز میں پچکار کر اسے واپس بلانا چاہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی اور میں اس گونجتے سناٹے میں تنہا کھڑا رہ گیا۔

آہستہ آہستہ میرے مساموں کے دہانے کھل چکے تھے۔ گرمی نہ ہونے کے باوجود میرا بدن پسینے میں ڈوبتا جا رہا تھا، دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں میں گونج رہی تھیں اور تنفس کی ابھرتی، دم توڑتی آوازیں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں۔

بندر کی چیخیں تو چند ثانیوں بعد ہی رک گئی تھیں میرے کان کسی کی بھی آہٹ

کے منتظر تھے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دور تک گھور رہا تھا۔

آخر مجھے بہت دور تاریکی میں ایک ہیولا متحرک نظر آیا۔ میں غیر ارادی طور پر سینے کے بل زمین پر لیٹ گیا۔ لیٹنے کے باعث وہ سایہ میری نظروں سے روپوش ہو گیا مگر چند لمحوں بعد وہ ٹیلوں کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ پھر فضا میں ایک دبی دبی، سہمی ہوئی آواز ابھری۔

"صفدر!" کسی نے مجھ کو پکارا تھا۔

آواز ابھری اور ڈوب گئی لیکن مجھے اس کی بازگشت اس ویرانے کے ذرے ذرے سے گونجتی معلوم ہو رہی تھی۔ میں بجلی کی سی سرعت سے اٹھا اور آگے دوڑ پڑا۔ پھر شاید وہ سایہ بھی میری طرف لپکا اور میں نے پاگلوں کی طرح اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

جذبات کا تلاطم اتنا شدید تھا کہ مجھے اپنا دل پھٹ جانے کا خوف لاحق ہو گیا۔ مسرت اتنی بے پایاں تھی کہ اس میں ڈوب کر میری زبان گویائی سے محروم ہو گئی۔

"صفدر! تو کہاں تھا؟" میرے کان کے نیچے اس کی بھرائی ہوئی آواز گونجی۔ میرے الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ بولنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔ پھر اچانک مجھے اپنی پشت پر لوہے کی کھنک سنائی دی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں سے الگ کر دیا۔

اس کے بائیں ہاتھ میں وزنی ہتھکڑی جھول رہی تھی۔

"سیتا میری جان! میں تجھ سے شرمندہ ہوں!" میری آواز کانپ رہی تھی، الفاظ ادھورے تھے اور نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اسی وقت قریب سے ایک ہلکی سی قلقاری بلند ہوئی۔ میں نے دیکھا تو مجھے وہاں لانے والا عظیم بندر سیتا کے قریب زمین پر بیٹھا ایک پتھر اکھاڑ رہا تھا۔

"تو کہتا تھا کہ بنارس بڑا مقدس شہر ہے، یہاں ہر طرف امن اور شانتی ملے گی۔"

"نہیں سیتا! اب میں کسی سے یہ نہ کہوں گا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے پتہ نہیں تھا کہ تقدس کا روپ سجا کر اس شہر میں ایسے وجود بھی رینگتے رہتے ہیں جن میں ہر آن اور ہر جگہ نفس کا ہولناک جہنم دہکتا رہتا ہے۔ جو نہ مندر کا احترام جانتے ہیں، نہ خانقاہ کو تعظیم دیتے ہیں۔"

"اس شہر سے بھاگ نکل صفدر ۔۔ یہاں تو میں زندہ درگور ہو گئی ہوں۔ میری ماں سچ کہتی تھی کہ شہروں کے قانون اندھے اور بہرے ہوتے ہیں۔" اس کی آواز میں رقت نمایاں تھی۔ "یہ آبرو بچانے والے کو قاتل کہتا ہے اور عصمت کے لیٹروں کو مظلوم کہتا ہے۔"

میں نے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ تنہائی میں عفریتوں کو زیر کرنے اور ہر رکاوٹ کو عبور کرنے والی سیتا اپنے شوہر کو سامنے پا کر محض ایک لڑکی رہ گئی تھی جو اپنے تحفظ کا ذمہ دار صرف اپنے شوہر کو تصور کرتی ہے۔ اسے اس حال میں دیکھنے والے یقین نہ کرتے کہ اناتھ آشرم میں خون کا دریا عبور کر کے باعصمت نکلنے اور بنارس جیل سے فرار ہونے والی سیتا وہی ہے۔

پھر ہم دونوں سیتا کی قیام گاہ پر پہنچے۔ یہ ایک بلند اور تناور درخت تھا جس پر سیتا پچھلی رات سے مقیم تھی۔

"انسانوں سے تو بندر اچھے ہیں صفدر!" وہ آہستہ آہستہ معمول پر آتی جا رہی تھی۔ "جیل میں محض بندروں کی وجہ سے میرا وقت بڑا اچھا گزرا۔ اگر انہیں شبہ بھی ہو جاتا کہ میں بندروں کو اپنی بات سمجھا سکتی ہوں تو شاید مجھے سلاخوں دار کوٹھری کی بجائے پختہ دیواروں کے درمیان ڈال دیا جاتا۔ میں جس سرنگ سے فرار ہوئی وہ میرے لئے بنارس جیل میں پلنے والے بندروں نے تیار کی تھی۔ میں نے چند ہی دن میں انہیں ایسا سدھا لیا تھا کہ میرے فرار تک کسی کو سرنگ کی موجودگی یا تیاری کا شبہ نہ ہو سکا۔ پھر تیری تلاش کے لئے بھی میں نے بندروں ہی کا سہارا لیا۔ میرے پاس تیرا ایک رومال اور چند چیزیں موجود تھیں۔ ان کی بو کے سہارے اس وقت پورے شہر میں چالیس پچاس بندر تجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔"

"ارے باپ رے۔" میں پہلی بار ہنسا۔ "میرے لئے تو یہی ایک بندر مصیبت بن گیا تھا۔ یہ کسی قیمت پر میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ تھا بلکہ اس نے تو میری پنڈلی بھی زخمی کر دی۔"

"تیری بو پر لگا ہوا ہر بندر تیری بو پاتے ہی تجھے ادھر آنے پر مجبور کرتا یا تیرے ہاتھوں مارا جاتا۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "تو چاہے تو اب شہر لوٹ کر یہ بات آزما سکتا ہے۔"

"مجھے شہر جانے کی ضرورت نہیں ۔۔ اب ہم یہیں سے کسی طرف نکل

بھاگیں گے۔ اس شہر کا بچہ بچہ تیری صورت پہچان لے گا۔"

"وہ کیسے؟" اس کی معصومیت قابلِ پرستش تھی۔

"تیری تصویریں اخباروں میں چھپی ہیں۔"

اخبار کے بارے میں وہ کافی دیر بعد میری بات سمجھ سکی۔ پھر ہم نے علیحدہ گزارے ہوئے دنوں کے بارے میں گفتگو شروع کردی۔

سیتا کے ساتھ گنیش آشرم سے اغوا کے بعد وہی واقعات پیش آئے تھے جن کا میں پہلے ہی اندازہ قائم کرچکا تھا۔ جس رات میں رمیش کو بازپرس کے لئے گنگا کنارے واقع راج مندر میں لے گیا تھا' اس رات وہ ساتوں اناتھ آشرم پہنچے۔ پھر بہلا پھسلا کر مندر کے تہہ خانے سے باہر لائی اور سیتا کو ان ساتوں کے ہمراہ رمیش کے کمرے میں بند کردیا۔

وہ سب بڑی بے دردی سے قیمتی شراب پی رہے تھے۔ سیتا کو دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہوگئے اور اسے گھیرنا چاہا مگر سیتا نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ان کو پہلے شراب نوشی ختم کرنے کا مشورہ دیا اور انہیں اپنے ہاتھ سے شراب پلانے لگی۔ جب وہ نشے میں بالکل دُھت ہوگئے تو دوئے دماغ پر سیتا سوار ہوگئی اور وہ سیتا کے ساتھ ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔

ان کی دست درازی سے پہلے سیتا کا ارادہ تھا کہ انہیں مدہوش کرکے کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل بھاگے گی۔ شراب کی تاثیر کے بارے میں کھٹمنڈو میں زیرو پوائنٹ کا تجربہ اسے خوب یاد تھا۔ ان دونوں کی بے حیائی پر سیتا ایکدم مشتعل ہوگئی اور اس نے طیش میں آکر رمیش کے کمرے سے ایک چھری اٹھائی اور بلا امتیاز ان ساتوں پر ٹوٹ پڑی۔

سیتا کے شکاروں کی ہولناک چیخوں سے گھبرا کر پتا نے رمیش کے کمرے کا دروازہ کھولا تو سیتا خون آلود چھری فضا میں لہراتی باہر نکل بھاگی۔ وہ چھری ابھی تک سیتا کے قبضے میں موجود تھی کیونکہ اناتھ آشرم سے زندہ سلامت نکل آنے کے بعد اُس نے یہ چھری ایک جگہ چھپادی تھی لہٰذا گرفتاری کے وقت وہ غیرمسلح تھی۔ جیل سے فرار کے بعد سب سے پہلے اُس نے وہ چھری حاصل کی تھی تاکہ اپنے کسی بھی حریف کو ٹھکانے لگانے میں اسے دشواری کا سامنا نہ ہو۔

ادھر جیل میں بندروں نے سیتا کے لئے حیرتناک کارنامے انجام دیئے تھے۔ کھانے پینے کے سامان کی فراہمی تو معمولی سی بات تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک بندر سوتے ہوئے مسلح محافظ کو شبہ کا موقع دیئے بغیر اس کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال لایا تھا۔ ان ہی میں ایک چابی کے ذریعے سیتا نے آہنی کٹہرے میں لگا ہوا حصہ کھولا مگر اپنے ہاتھ کسی بھی چابی سے آزاد نہ کرا سکی۔ اپنی کوٹھڑی کا قفل بھی اس نے چابی ہی سے کھولا۔ گچھے میں زیادہ تین چابیاں تھیں جنہیں آزما کر سیتا نے تین بیرکوں کے آہنی دروازے کھول دیئے اور جو قیدی ہتھکڑیوں کے بغیر قید تھیں وہ سب فرار کی اس مہم میں سیتا کے پیچھے ہولیں۔ چابیاں سیتا نے راہ میں زمین پر پھینک دی تھیں۔

پہلے تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب شہر واپس جانا بے سود ہے۔ ہم دونوں کو وہیں سے راتوں رات کسی طرف نکل جانا چاہیئے لیکن یہ طریقہ آگے چل کر دشواریاں پیدا کردیتا۔

فی الحال پہلا مسئلہ سیتا کے لئے لباس کی فراہمی کا تھا۔ قیدیوں کے لباس میں وہ ہر وقت خطرے میں رہتی۔ پھر ہتھکڑی سے نجات بھی ضروری تھی۔ تیسرا مسئلہ ہتھیار کا تھا۔ فرار کی اس راہ پر غیرمسلح چل نکلنا حماقت سے خالی نہ تھا چوتھا اور آخری مسئلہ خاصی رقم کی فراہمی کا تھا کیونکہ ہندوستان میں حد سے بڑھی ہوئی معاشی ناہمواریوں کے باعث رشوت بہت مقبول تھی اور رقم کی مدد سے ہم بہت سے اُلجھاووں سے بچ سکتے تھے اور ان تمام مسائل کے حل کے لئے میرا شہر جانا ضروری تھا۔

ایک مرتبہ میری شخصیت پر سے پردہ ہٹ جاتا تو میں بنارس سے سو میل کی حدود میں آبادی کا رُخ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ صرف ایک دن توقف کیا جائے۔ سیتا اسی مقام پر روپوش رہے میں تارا باغ لوٹ جاؤں۔ اگلی رات میں پورے بندوبست کے ساتھ اسی جگہ پہنچوں اور ہم دونوں خاموشی سے کسی طرف نکل جاتے۔

کافی بحث کے بعد سیتا میری تجویز سے متفق ہوگئی اور میں صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل وہاں سے واپس روانہ ہوگیا۔ سیتا نے میری تلاش میں سرگرداں بندروں سے حفاظت کے پیشِ نظر وہ بندر میرے ساتھ کردیا جو مجھے اس تک لایا تھا۔ اُس نے اپنے حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکالیں جنہیں بندر غور سے سنتا رہا اور سیتا کے خاموش ہوتے ہی مست خرامی سے میرے ساتھ چل دیا۔

بندروں کے بارے میں سیتا کا قیاس درست تھا۔ اس ویرانے سے کار تک پہنچنے کے دوران میں مختلف مقامات پر دو بندر میری بُو پا کر میری طرف لپکے تھے مگر سیتا کا بھیجا ہوا بندر انہیں روکنے میں کامیاب ہوگیا اور میں کار تک پہنچنے کے قابل ہوسکا۔

میں رانا باغ پہنچا تو صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ ٹنڈن اور جسونت شاید میرے انتظار میں جاگ رہے تھے کیونکہ انجن کا شور سنتے ہی وہ برآمدے میں نکل آئے۔

ان کے ہاتھوں میں سگریٹیں دبی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے' آنکھیں نیند اور شراب کے خمار سے گہری سُرخ ہورہی تھیں کیونکہ ان کے سانسوں سے وہسکی کی بُو آرہی تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" میرے اُترتے ہی ٹنڈن ہاتھ لہرا کر بولا۔ پھر اس کی نظر میری پھٹی ہوئی پتلون پر پڑی۔ شاید پنڈلی کا زخم بھی نظر آگیا کیونکہ وہ چونک کر بولا تھا۔ "ارے' تم تو زخمی ہو۔"

ہاں' میں بمشکل جان بچا کر آسکا ہوں۔" میں نے فوراً ہی ذہن میں ایک کہانی تراش لی۔ "ہتھیار کے بغیر چلنے والا سپاہی ہمیشہ زک اُٹھاتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" وہ مجھے سہارا دیتے ہوئے بولا۔

"وہ کوئی خونخوار کُتا تھا۔ آوارہ کُتوں میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ انسان سے باقاعدہ مقابلہ کریں۔ شاید پولیس اب میرے کھوج کے لئے کُتے بھی استعمال کررہی ہے۔" میں نے ڈرائنگ روم میں صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا

"لیکن پولیس کے کُتے تنہا تو تلاش پر نہیں نکلتے۔ ہر کُتے کے ساتھ رکھوالا ضرور ہوتا ہے۔" ٹنڈن نے میری زخمی ٹانگ کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ جسونت دوسرے کسی کمرے سے فرسٹ ایڈ کا سامان لینے چلا گیا تھا۔

"مجھے یہ سب نہیں معلوم۔" میں جھلا کر بولا۔ "میں سیتا سے اتفاقی ٹکراؤ کی اُمید میں شہر کے ایک غیرآباد حصے میں ٹہل رہا تھا کہ ایک قدآور کُتا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میرے ستارے اچھے تھے کہ میرا ایک بھرپور گھونسہ ہی اسے بے ہوش کرگیا ورنہ وہ کسی قیمت پر مجھے زندہ نہ چھوڑتا......تم میرا پستول واپس کردو۔ اس کے بغیر موجودہ حالات میں باہر نکلنا مخدوش ہے۔"

"پستول تمہاری امانت ہے' وہ میں ابھی دے دیتا ہوں۔ ہوسکتا ہے تم پر حملہ آور ہونے والا کُتا پاگل رہا ہو۔ تمہیں انجکشن ضرور لینے پڑیں گے۔"

میں زور سے ہنسا۔ "پیٹ میں انجکشن لگوانے کے تصور ہی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"مگر یہ بہت ضروری ہے۔"

"میں انجکشن نہیں لگواؤں گا۔ کُتے کی طرح بھونکتے ہوئے پاگل ہوجانا مجھے پسند ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"انجکشن تو لگوانے ہی پڑیں گے۔ استاد اپنے ایک اہم آدمی کا یوں ضائع ہوجانا پسند نہیں کرے گا۔" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولا اور جسونت کے لائے ہوئے سامان سے زخم صاف کرنے لگا۔

کئی گھنٹے گزر جانے کے باعث زخم پر خشک خون کی پپڑیاں جم چکی تھیں مگر اسپرٹ سے تو زخموں میں آگ سی لگ گئی۔ ٹنڈن کسی پیشہ ور ڈسپنسر کی طرح اپنے کام میں لگا رہا اور مرہم وغیرہ لگا کر میری پنڈلی پٹیوں میں لپیٹ دی۔ ڈریسنگ سے فارغ ہوتے ہی ٹنڈن نے الماری سے میرا پستول لادیا اور میں شدید تکان کا بہانہ کرکے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بیدار ہوا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ ٹنڈن میرے قریب ہی مسہری پر موجود تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ میرے سوتے ہوئے ڈاکٹر آیا تھا اور میرے پیٹ میں پہلا انجکشن لگایا جاچکا ہے۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر میں نے کار سنبھالی اور شہر روانہ ہوگیا۔ چلتے ہوئے کاٹیج سے میں نے لوہے کا ایک ٹکڑا ساتھ لے لیا تھا۔

راستے ہی میں اس لوہے کو پارس پتھر کے لمس سے میں نے سونے میں تبدیل کیا۔ ایک دکان پر نہایت رازدارانہ انداز میں اسے فروخت کیا کیونکہ ہندوستان میں گولڈ بانڈ اسکیم کے بعد سونے کا غیرسرکاری لین دین قانوناً جُرم قرار پاچکا تھا۔

پھر میں نے بازار سے خریداری کی۔ خشک خوراک کے چند سربند ڈبے' سیتا کے سائز کے چند مقامی زنانہ لباس' جوتے' ایک عدد برقعہ' ایک چرمی تھیلا' سرچ لائٹ' شکاری چاقو' اعشاریہ تین آٹھ کے کارتوسوں کا ایک ڈبہ اور چند دوسری ضروری اشیاء خریدنے کے بعد میں بنارس کے ایک ہوٹل میں جا پہنچا تاکہ اس شہر میں آخری بار شکم پُری کرسکوں۔

میں ہوٹل سے باہر آیا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں گاڑی اسٹارٹ کرکے سیتا کی طرف روانہ ہوگیا۔

گاڑی کو آبادی کے آخری سرے پر چھوڑ کر میں سرچ لائیٹ اور چند ضروری چیزیں چرمی تھیلے میں لے کر میدان میں داخل ہوگیا۔ سیتا شاید درخت پر میری ہی منتظر تھی۔ میرا سایہ دیکھ کر تیزی سے نیچے اُتر آئی۔ آج اس پر وہی بھرپور شوخی طاری تھی جو میں نے پہلے دن محسوس کی تھی۔

اس پُرہول ویرانہ میں لڑکی تو کیا کسی جری مرد کا بھی یوں دو دن اور دو راتوں تک روپوش رہنا اسے نیم مُردہ کردینے کے لئے کافی تھا مگر سیتا کے خمیر میں خوف اور بزدلی جیسے عناصر شامل ہی نہیں تھے۔ اپنی آزادی کا یہ عرصہ اس نے یوں گزارا تھا جیسے اپنے مکان میں ہی رہتی آئی ہو۔

سیتا کی کمین گاہ آبادی سے بہت دُور تھی اور میں فیصلہ کرکے آیا تھا کہ پستول سے فائر کرکے اسے ہتھکڑی سے نجات دلاؤں گا مگر ساری کارروائی میں یہ میرا آخری اقدام تھا۔

سب سے پہلے میں نے سیتا کا لباس تبدیل کرایا۔ پھر ہوٹل سے خریدی ہوئی تازہ اور گرم گرم غذا سے اس کی خاطر کی اور آخر میں پستول کی نال ہتھکڑی کے حلقہ کے ایک سرے پر رکھ کر فائر کردیا۔ وہ ویرانہ ہولناک دھماکہ سے لرز اُٹھا۔ ساتھ ہی سیتا کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ میں نے بوکھلا کر ٹارچ روشن کی تو وہ مُسکرا رہی تھی۔

فائر کے نتیجے میں سیتا کی کلائی پر چند خراشیں ضرور آئی تھیں مگر اس کی چیخ کا زخم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دھماکے کا غیرارادی ردِعمل تھا۔

پھر ہم تیزی سے آسٹن کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

کار کے اطراف میں دُور تک کسی ذی رُوح کا پتہ نہیں تھا۔ میں نے دانستہ کار سڑک پر اس طرح پارک کی تھی کہ درختوں کے سائے میں وہ تاریکی ہی کا ایک جزو نظر آتی تھی۔

"میں اپنے ساتھ تمہارا حُلیہ بدلنے کا سارا سامان لایا ہوں مگر بنارس سے نکلنے تک تمہیں کار کی ڈکی میں چھپا رہنا ہوگا۔" میں نے سیتا سے کہا اور وہ خلافِ توقع اعتراض کی بجائے خوش ہوگئی۔ اس کے لئے تو یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔

ڈکی کھول کر ریوالور' ٹارچ اور شکاری چاقو کے علاوہ سارا سامان میں نے اس میں رکھا۔ ڈکی کے ڈھکنے کے نیچے لگے ہوئے واٹر ٹائٹ ربر کے کئی ٹکڑے کاٹ کر اس طرح نکال پھینکے کہ ڈکی بند ہونے کے بعد سیتا کو تازہ ہوا بھی ملتی رہے اور گاڑی چلنے کے دوران میں ڈھکنا غیرمعمولی شور پیدا نہ کرے۔

"اچھا سیتا! اب خاموش رہنا۔" میں نے اس کے رُخسار پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں ڈھکنا نہ کھولوں' آواز نہ نکالنا۔ اور جب گاڑی رُکی ہوئی ہو تو ذرا بھی حرکت نہ کرنا ورنہ ہم دونوں چوہوں کی طرح پکڑ لئے جائیں گے۔"

"اچھا جی!" وہ ٹھنک کر بولی "میں تو اتنی تھکی ہوئی ہوں کہ شاید اس میں لیٹتے ہی نیند آجائے۔ درخت پر بیٹھے بیٹھے میرا بدن پھوڑے کی طرح دُکھنے لگا ہے۔"

سیتا ڈکی میں داخل ہوئی۔ میں نے آہستگی سے ڈکی کا ڈھکنا مقفل کردیا۔ اور اطمینان کا گہرا سانس لیتا اپنی نشست پر بیٹھنے لگا۔

"ٹھہرو صفدر!" دروازے کے ہینڈل پر میرا ہاتھ پڑتے ہی عقب سے کوئی للکارا اور میرا وجود لرز کر رہ گیا۔ میں بوکھلا کر آواز کی سمت میں گھوما تو تاروں کی مدھم روشنی میں ٹنڈن ایک ٹیلے پر ریوالور بدست کھڑا نظر آیا۔

"تت — تم یہاں؟" میں غیرارادی طور پر ہکلایا۔

"ہاں، تم سمجھ رہے تھے کہ مجھے جُل دے کر بھاگ جاؤ گے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "مگر مجھے صبح ہی تمہاری کہانی پر شُبہ ہوگیا تھا۔ اگر تمہارا بیان کیا ہوا کُتے کا حُلیہ درُست تھا تو اس کے حملے کے نتیجے میں اتنے سطحی زخم آنا ناقابلِ یقین تھا اور ڈاکٹر نے تمہاری بے ہوشی کے دَوران میں میرے شُبہ کی تصدیق کردی۔ ان میں کوئی خراش دانتوں سے نہیں آئی تھی۔ وہ سب پنجوں کے زخم تھے، کسی ہلکے جانور کے پنجوں کے۔ خونخوار کُتے کے پنجے بھی بدن سے گوشت کے لوتھڑے نوچ لیتے ہیں...... تمہارے اسی جھوٹ نے مجھے اُکسایا اور آج دوپہر سے میں تمہارا پیچھا کر رہا ہوں۔ تمہاری خریداری سے مجھے شُبہ ہوگیا تھا کہ تم نے سیتا کا سُراغ پالیا ہے اور اب فرار کی تیاری کر رہے ہو — مگر تم یہ بھول گئے کہ تم استاد سے ایک معاہدہ کر چکے ہو، اسے توڑ کر تم بنارس سے زندہ نہ نکل سکو گے۔"

"میرا راستہ نہ روکو ٹنڈن! اس وقت میں تنہا پہاڑوں تک سے ٹکرا جاؤں گا۔"

"پہاڑ نہیں، صرف ٹنڈن سے ٹکرا کر دیکھو۔" اس نے ریوالور نچایا۔ اب اس کے اور میرے درمیان بمشکل دس بارہ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا اور ہم دونوں درخت کے سائے میں کھڑے تھے۔ "میں ایک کے مقابلے میں ایک کا قائل ہوں۔ اس خونی لڑکی کو ڈکی میں مقفل کرکے تم نے میرا کام بہت آسان کردیا ہے۔" وہ پورے اعتماد سے کہہ رہا تھا۔ "سلامتی اسی میں ہے کہ واپس تارا باغ چلو ورنہ تم پر گولی چلاتے ہوئے مجھے کوئی دُکھ نہ ہوگا اور میں لڑکی سمیت یہ آسٹن اُستاد کے حوالے کر دوں گا۔"

"میں کیمیاگری کا نسخہ تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے چیخ کر مجھے وارننگ دی اور میں نے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

"اس نسخہ میں ساری تدبیر موجود ہے۔" میں نے قدرے توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ "تجربہ کے دوران تم خود اس بات کے شاہد رہے ہو۔ اُستاد کو صرف مصنوعی سونا چاہیئے، صفدر علی اس کے لئے بیکار ہے۔ مجھے خاموشی سے نکل جانے دو۔"

"اسے کیا چاہیئے اور کون اس کے لئے بیکار ہے، یہ فیصلہ کرنا صرف استاد کا کام ہے۔ اگر وہ تمہاری بات مان گیا تو تارا باغ سے تم جدھر چاہو جا سکو گے۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔

"تم بھی میرے ساتھ نکل چلو، میں تمہیں مالا مال کردوں گا۔ کیمیاگری کے علاوہ میں پارس پتھر کا بھی مالک ہوں جو ابھی تک صرف افسانہ بنا ہوا تھا۔"

"تم تختِ سلیمان بھی دے دو تو ٹنڈن استاد سے نمک حرامی نہیں کرسکتا۔"

"ٹنڈن!" میں نے نرم لہجے میں اُسے سمجھانا چاہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں سیتا کے ہمراہ اس وقت اپنی بقا کی شاید آخری اور بھرپور جنگ لڑ رہا ہوں۔ میرے لئے بنارس سے نکلنے کا یہ بہترین موقع ہے، میں بھی استاد سے نمک حرامی نہیں کر رہا۔ کیمیاگری کا راز تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ میری آزادی کے لمحات تو مختصر نہ کرو۔ میرے دوست! مجھے جانے دو۔"

"نہیں — یہ ناممکن ہے۔" وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "استاد کی شاگردی میں آج تک ٹنڈن نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ استاد دماغ ہے اور ٹنڈن اس کی تابع طاقت۔"

"پھر تم نے میرے تعاقب کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یہ استاد کے حکم کے مطابق تھا۔ اس نے مجھے اور جسونت کو تمہاری حفاظت پر مامور کیا ہوا ہے۔" وہ اپنے موقف سے ذرا بھی ہلنے کو تیار نہ تھا۔

میں اسے باتوں میں لگا کر سوچنے کی مہلت بھی لے رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے میں مصروف تھا اور میں اس بدترین صورتِ حال کو اپنے حق میں بدلنے کی کوئی تدبیر نہیں سوچ پا رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ سیتا جیل سے کیسے فرار ہوئی؟" میں نے اچانک لہجہ بدل کر بڑے سکون کے ساتھ سوال کیا۔

"یہ میرا دردِ سر نہیں، پولیس کو اس کی فکر ہونی چاہیئے۔"

"نہیں، تم بھی سنو۔" میں نے اب بڑے اعتماد سے کہا۔ "سیتا کو بندروں کی زبان پر ملکہ حاصل ہے۔ بنارس جیل میں پھرنے والے بندروں نے اس کے لئے خفیہ سُرنگ تیار کی تھی۔"

"یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ پریشانی بھی تھی۔ شاید میرے لہجے کے سکون اور اعتماد نے اسے چکرا دیا تھا۔

"اس لئے کہ بندروں کا ایک غول سیتا نے کل رات سے میری حفاظت پر مامور کیا ہوا ہے اور اگر اب تم نے صرف لہجہ بھی تیز کیا تو تمہارے پیچھے موجود بندروں کی فوج تمہارے ٹکڑے اُڑا دے گی۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

ٹنڈن کو میری بات پر یقین نہ آیا مگر اس کی گردن غیرارادی طور پر پیچھے گھوم گئی اور یہی وہ مہلت تھی جو مجھے درکار تھی۔

میرا ہاتھ تیزی سے جیب میں گیا۔ اعشاریہ تین آٹھ کا بھرا ہوا مہلک ہتھیار برآمد ہوا جس کا سیفٹی کیچ پہلے ہی ہٹا ہوا تھا اور ایک زبردست دھماکے کے ساتھ کئی تولہ پگھلا ہوا سیسہ ٹنڈن کے سینے میں اُتر گیا۔ وہ کربناک سی چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے زمین پر گر گیا۔ اس کا ننھا سا ریوالور نہ جانے کہاں جا گرا تھا۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھا۔ ٹنڈن کا بدن ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ اس کا زندہ بچنا میرے لئے بہت خطرناک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں سیاہ آسٹن کے ذریعے سیتا سمیت فرار ہو رہا ہوں۔ میں زمین سے ایک پتھر اُٹھانے کے لئے جھکا تاکہ دوسرا فائر کئے بغیر اس کا سر کھول کر اسے موت کی سرحدوں میں دھکیل سکوں کہ اچانک فضا میں گھوڑوں کے سموں کی تیز آوازیں اُبھریں۔ میں پتھر چھوڑ کر تیزی سے سیدھا ہوگیا۔

اتنی دیر میں دو گھڑ سوار گشتی سپاہی میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔

"غضب ہوگیا، غضب ہوگیا۔" میں نے اچانک ہذیانی اور اضطراری انداز میں چیخنا شروع کردیا۔ "وہ خونی لڑکی میرے ساتھی کو مار گئی..... اس کا پیچھا کرو حوالدار جی۔ وہ ابھی اس میدان میں بھاگی ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ہتھکڑی پڑی ہوئی ہے۔"

"کدھر گئی وہ؟" خونی لڑکی کا نام آتے ہی ان کا دورانِ خون تیز ہوگیا۔ اس وقت لاش کی دریافت سے زیادہ اہم سیتا کی بازیابی تھی۔

"اُدھر — اُدھر بھاگی ہے کسی لنگور کی طرح۔" میں نے سامنے ہاتھ اُٹھا دیا۔

ان کی آنکھوں میں دُہری ترقی اور کئی پیشگی اضافوں کی حسرت چمکی۔ اور وہ بولے۔ "ہم اس کے پیچھے جا رہے ہیں، تم ہماری واپسی تک یہیں رُکو۔"

یہ کہتے ہی انھوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ویران میدان میں گھستے چلے گئے۔

میں نے پتھر اٹھا کر ٹنڈن کے سر پر رسید کیا۔ خون کے فوارے اُبلے اور اُس کا بدن ایک بار اُچھل کر بے جان ہوگیا۔

میں نے پھرتی سے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ٹنڈن مر چکا تھا۔ تاریکی اور بدحواسی کے باعث وہ سپاہی نہ کار کا نمبر نوٹ کر سکے تھے، نہ انہیں اس کی ساخت یاد رہی ہوگی۔ قلیل ترین تنخواہ پانے والے ان مفلوک الحال کارندوں کے لئے ہر موٹر صرف موٹر ہوتی ہے۔ اس کا نہ ماڈل ہوتا ہے، نہ ساخت — اور ان کی یہ لاعلمی میرے لئے کامیابی کی کلید تھی۔

ابھی تک سنسنی خیز رکاوٹوں اور حادثات کے باوجود میرا منصوبہ کامیاب جا رہا تھا اور اگر کوئی مزید رکاوٹ سامنے نہ آئے تو میں بس چند ہی گھنٹوں میں دریائے گنگا کے اُس پار مرزا پور پہنچ سکتا تھا۔

ہیڈلیمپس کی روشنی میں تارکول کی ویران سڑک بل کھاتی ہوئی سیاہ ناگن کی طرح چمک رہی تھی۔ کار کی رفتار ظاہر کرنے والی سُوئی ستر اور پچھتر کے درمیان لرز رہی تھی اور میرا بس نہ چلتا تھا کہ کار کے پائیدان کو توڑ کر ایکسیلیٹر پیڈل اس سے بھی زیادہ نیچے دبا تا چلا جاؤں۔

سیاہ

آسٹن کا انجن پوری قوت سے غرا رہا تھا۔ گزرے ہوئے سنسنی خیز لمحوں کے تصور سے میرا سارا بدن پسینے میں نہا گیا تھا۔ اگر ٹنڈن بندروں کے بارے میں میری مفروضہ دھمکی پر میری طرف سے پل بھر کے لیے غافل نہ ہوتا یا اس پر میرا نشانہ خطا جاتا تو میں اسی لمحے ملک عدم کو سدھار جاتا اور سیتا ایک مجبور قیدی کی طرح استاد بھوپت سنگھ کے سامنے پہنچا دی جاتی جو بنارس میں پھلوں کے باغات کی ٹھیکیداری کی آڑ میں بڑے پیمانے پر بدمعاشی کرتا تھا اور اگر فائر کا شور سن کر وہاں پہنچنے والے گھوڑے پر سوار سپاہی عقل سے پیدل نہ ہوتے تو میں انھیں سیتا کے فرضی ہیولے کے تعاقب میں دوڑانے میں کامیاب نہ ہو پاتا!

میری طویل، خون آشام اور سنسنی خیز جدوجہد میں بارہا ایسے مواقع آئے جہاں موت میرے روبرو، آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ میرا ایک غلط لفظ، ایک غلط جنبش میری موت کا بہانہ بن سکتی تھی کیونکہ میں نہ غیر انسانی قوتوں پر اختیار رکھتا تھا نہ نادیدہ ماورائی پیکر میرے تحفظ پر مامور تھے۔ میرے تجربے کا نچوڑ بس یہ تھا کہ اگر انسان مشکل ترین حالات میں بھی محض اپنے حواس پر قابو رکھے اور اس کی حرکات و گفتگو اس کی عقل کی تابع ہو تو انسان وقت کے ہر خطرناک چنگل سے بچ نکلتا ہے۔

میں نے بنارس کی ویران سڑکوں پر آسٹن دوڑاتے ہوئے اپنے ماضی کے بارے میں سوچا اور میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ مجھے قدرت نے بدترین حالات کو اپنے حق میں ڈھالنے کی صلاحیت سے نوازا تھا اور میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ کراچی میں پولیس سے روح فرسا آنکھ مچولی، ڈھاکہ میں طیب مدراسی کی موت، میجر انل کے گرگوں کے ہاتھوں ننگِ وطن کاموں میں ملوث ہونا، انڈین آرمی کی قید، پٹنہ جیل سے فرار، نیپال میں نرائن داس کے خوفناک گروہ کی غلامی، اناپورنا کی راہ میں ہولناک مصائب، آدم خور انسانوں سے بھرے قبیلے سے مقابلہ، سیتا کے پالتو بندروں سے معرکہ، برفانی انسان کی مادہ سے اعصاب شکن مقابلہ، کالی گاپ میں ڈان اور رینی کی رقابتیں، مسز ارتلنگا کا عتاب، لاچی کے باپ کا انتقام، انڈین سیکرٹ سروس کی بازپرس، بنارس کے مقدس غنڈوں کی دشمنی اور اب استاد بھوپت سنگھ کے نمک خواروں اور قانون سے فرار ——— میں نے اب تک ہر مرحلے پر اپنے مقدر کے ستاروں کو ڈوب ڈوب کر ابھرتے دیکھا تھا۔ میں اس جان توڑ جدوجہد سے اب اکتا چلا تھا۔ دن بہ دن، ماہ بہ ماہ میں بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے سیتا جیسی مثالی بیوی مل چکی تھی۔ دولت اور اس کے ذریعے زندگی کی ہر سہولت خریدنے کے لیے پارس پتھر میرے پاس تھا اور میں کسی پرسکون مقام پر اب عام آدمیوں کی طرح گھریلو زندگی بسر کرنی چاہتا تھا مگر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اب ہنگامے میرا تعاقب کر رہے ہوں۔ بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ بنارس جیسا امن و آشتی کا شہر راتوں رات صفدر علی اور سیتا کو قتل و غارت گری کے دیوتا کا روپ دے دے گا! مگر میرے ساتھ یہ ہو رہا تھا۔ زندگی کے تمام ناقابل یقین واقعات پے در پے میرے ساتھ پیش آتے چلے جا رہے تھے۔

سیتا میری ہدایت کے مطابق نہایت خاموشی سے کار کی ڈکی میں دبکی پڑی ہوئی تھی۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ وہ شاید جھٹکوں وغیرہ سے بے نیاز گہری نیند سو چکی ہے۔

تھوڑی دیر بعد آسٹن شہر کے شب بیدار علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے رفتار کم کر دی۔ اس علاقے میں تیز رفتاری غیر ضروری طور پر لوگوں کو میری طرف متوجہ کر دیتی اور میں کسی بھی ناگہانی مصیبت سے دوچار ہو سکتا تھا۔

ٹنڈن کی ہلاکت کے بعد اب وہ سیاہ آسٹن بھی میرے لیے خطرے کی علامت تھی۔ جوں ہی بھوپت سنگھ کو اس واقعے کا علم ہوتا وہ اسی لمحے سمجھ جاتا کہ میری گمشدگی اور ٹنڈن کی ہلاکت ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ پھر نہ صرف وہ خود بلکہ پولیس بھی آسٹن کے سہارے ہندوستان کے آخری سرے تک میرا تعاقب کر سکتی تھی لہٰذا مسئلہ یہ تھا کہ بنارس سے نکلنے سے قبل آسٹن سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

کسی بارونق علاقے میں آسٹن چھوڑ کر دوسری کار چوری کرنا نسبتاً آسان کام تھا مگر اس میں یہ قباحت تھی کہ ڈکی سے نکلتے ہوئے سیتا کی ایک جھلک کسی کو نظر آجاتی تو میں آناً فاناً گھیر لیا جاتا جبکہ ویران علاقوں میں کار تبدیل کرنے کا کوئی موقع نظر نہ آسکا۔

بالآخر میں نے تن بہ تقدیر ہو کر آسٹن ہی میں سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور گزرنے والا ہر لمحہ مجھے بے پناہ خطرات کا پیغام دے رہا تھا۔

خدا خدا کر کے میں شہر کی آخری بستی سے بھی گزر گیا اور آسٹن بنارس سے نکل کر مغرب کی طرف جانے والی اس شاہراہ پر دوڑنے لگی جو دریائے گنگا کے ساتھ چلتی ہوئی الٰہ آباد کے مقام پر دریا کا پاٹ عبور کرتی ہے مگر میں فی الحال اتنی طویل مسافت اختیار کرنے پر تیار نہ تھا۔ میرا ارادہ درمیان ہی سے گنگا کو عبور کر کے مرزا پور پہنچنے کا تھا جو بنارس سے قریب ترین اور نسبتاً محفوظ قیام گاہ تھی۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد سڑک پر مجھے ایک چوبی بورڈ کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں چمکتا نظر آیا اور میں نے کار کی رفتار سست کر کے اسے بائیں طرف موڑ دیا۔

میں اپنے خیالات میں گم اس تاریک سڑک پر بڑھا جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر پل شروع ہونے سے پہلے واقع پولیس چوکی پر پڑی۔ وہاں پولیس کی وردیاں دور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ آکٹرائے والوں کے کیبن سے ملحق کچی ڈھلان پر دو عارضی خیمے بھی نصب تھے۔ شاید یہ ساری کارروائی سیتا کی تلاش میں شہر کی ناکہ بندی سے متعلق تھی۔

یک بیک میرے اعصاب پر تناؤ چھاتا چلا گیا۔ اب میرے لیے واپسی کی راہ مسدود ہو چکی تھی اور آگے بڑھنے میں خطرات پوشیدہ تھے۔ اگر یہ ساری کارروائی سیتا کی بنارس سے فرار کی راہیں مسدود کرنے کے لیے کی گئی تھی تو پولیس والے یقینی طور پر کار کی مکمل تلاشی لیتے اور ڈکی میں سوئی ہوئی سیتا ایک بار پھر پابند سلاسل کر دی جاتی۔

میں نے ڈیش بورڈ کے خانے سے بھرا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکالا اور اسے اپنی جیب میں اڑس لیا۔ اگر سیتا کو ان سے بچا لینے کے لیے مجھے دو چار خون بھی کرنے پڑتے تو اب میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا۔

کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دیکھ کر نگراں چوکی پر ہلچل سی نظر آئی۔ پھر تین باوردی سپاہی سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو کر میرے قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب فاصلہ پچاس ساٹھ گز رہ گیا اور کار کی رفتار کم نہ ہوئی تو انھوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ ویرانے میں سیٹی کی تیز آواز گونجی اور غیر ارادی طور پر میرا داہنا پاؤں ایکسلریٹر سے ہٹ کر بریک پیڈل پر آگیا۔

گاڑی پرشور آواز کے ساتھ پولیس والوں سے چند فٹ کے فاصلے پر جا رکی۔ میں نے ہیڈ لائٹس ضرور بند کر دی تھیں مگر انجن بدستور بیدار تھا۔ گاڑی پہلے گیئر میں پڑی ہوئی تھی، بایاں پاؤں کلچ پر تھا اور میں خطرے کی بو محسوس کرتے ہی نکل بھاگنے کے لیے پوری طرح آمادہ!

"انجن بند کر کے نیچے اترو!" ان میں سے ایک میری طرف آتے ہوئے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈال کر سخت لہجے میں بولا۔

"دوسرے شہر میں میرا بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے حوالدار جی!" میں نے اپنے لہجے کو رقت آمیز بناتے ہوئے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔ "تمہیں جو کچھ دیکھنا ہے جلدی دیکھ لو مجھے بہت جلدی ہے۔ اگر وہ میرے پہنچنے سے پہلے مر گیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

اتنی دیر میں وہ قریب آچکا تھا! اس نے کھڑکی میں سے ٹارچ کی روشنی ڈال کر بڑبڑاتے ہوئے اندر کا سرسری جائزہ لیا، پھر بولا "ڈکی کھولو!"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور میں نے بے جان سی آواز میں پوچھا "ڈکی کھولوں؟"

"ہاں۔ نیچے اتر کر ڈکی کھولو!" وہ اس بار افسرانہ شان سے غرایا۔

میں نے تیزی سے اپنا لائحہ عمل مرتب کرتے ہوئے داہنے ہاتھ سے اپنے بھرے ہوئے ریوالور کا دستہ گرفت میں لیا جو تاریکی کے باعث اس کی نظروں سے اوجھل تھا پھر اگنیشن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن طلوع ہوئی۔

"ارے یہ تو استاد بھوپت کی گاڑی ہے!" دور سے ایک دوسرا سپاہی چیخا۔

اس انکشاف پر مجھ سے بازپرس کرنے والا سپاہی ٹھٹکا گیا! اس نے آگے جا کر کار کی نمبر پلیٹ پر روشنی ڈالی اور واپس میری طرف آیا۔

اس دوران میں میری چھٹی حس مجھے بدلے ہوئے حالات کا مژدہ سنا چکی تھی۔ گاڑی پہچاننے والے کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ لوگ بھوپت کے نمک خوار ہیں۔ اس کا احترام کریں یا نہ کریں مگر اس سے ڈرتے ضرور ہیں۔ یہ اندازہ کرتے ہی میں نے اپنا ہاتھ ریوالور سے ہٹا لیا! اگر اس بدبخت کو گاڑی پہچاننے میں پل بھر کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اب تک میں وہاں تڑپتے ہوئے زخمی سپاہیوں کے درمیان سے فرار ہو چکا ہوتا۔

"گاڑی تو استاد ہی کی ہے مگر آدمی نیا ہے۔" وہی سپاہی قریب آکر میرا جائزہ لیتے ہوئے اشتباہ آمیز لہجے میں بولا۔

"بھوپت ہر روز نئے آدمی خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے!" اب میں برہم ہو کر گاڑی سے اتر آیا۔ انجن اب بھی اسٹارٹ ہی تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"گاڑی قبضے میں لے کر مجھے گرفتار کر لو یا خاموشی سے مجھے نکل جانے دو۔ اگر مجھے ذرا بھی تاخیر ہوئی تو کل صبح تم سب کم از کم لائن حاضر تو کر ہی دیے جاؤ گے!"

اشارہ ہاتھ آجانے کے بعد اب میں بری طرح اس پر حاوی ہو چلا تھا۔

"ہمیں اس پل سے گزرنے والی ہر گاڑی کی بھرپور تلاشی لینے کا حکم ملا ہے۔ ان رجسٹر میں گاڑی کا نمبر، ماڈل اور منزل درج کرنی پڑے گی۔ سواروں کے نام پتے لکھنے کی ہدایت ملی ہوئی ہے۔" بھوپت سنگھ سے ملنے والے لقمۂ تر اور فرض کی کش مکش میں وہ بولا۔

میں نے کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کر انجن بند کر دیا اور چابی حقارت سے اس کی طرف اچھال دی "گاڑی یہاں کھڑی ہوئی ہے، یہ رکھو! میں استاد کو ہی بھیجے دیتا ہوں۔ میرے فرائض میں پولیس کو جوابدہی شامل نہیں ہے۔ استاد تم لوگوں کو بھاری رقمیں بلاوجہ نہیں دیتا!"

"کیوں بات بگاڑتے ہو کشور جی!" اچانک ہی ایک دوسرا سپاہی قریب آکر رازدارانہ لہجے میں بولا "بھلا اندراج کی کیا ضرورت ہے۔ یہ گاڑی تو آج رات اس پل سے گزری ہی نہیں ہے۔"

"شاباش!" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی "تم جیسے ہوشیار آدمی کو تو اس شہر کا کوتوال ہونا چاہیے!"

"استاد بارسوخ آدمی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "اگر اسے پتہ چل گیا کہ ہم لوگوں نے اس کا مال پکڑا ہے تو وہ نیچے سے اوپر تک پورے محکمے کو ہلا کر رکھ دے گا اور ہم تینوں غریب معطل کر دیے جائیں گے۔"

"تجھے کیا معلوم گوپال!" کشور بولا "اگر ہم سیتا کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو اوپر والے بھوپت سنگھ جیسے دس آدمیوں کی ناراضگی بھی معاف کر دیں گے۔"

"تم لوگ میرا وقت کیوں خراب کر رہے ہو!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ مگر مضبوط لہجے میں کہا "گاڑی نکلنے دو یا واپس جانے دو۔"

کشور نے آسٹن کی چابی سے کھیلتے ہوئے چند ثانیوں تک کچھ سوچا پھر چابی مجھے لوٹا دی "جاؤ۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ آج کی رات تم اس پل سے نہیں گزرے ہو!"

"میں خوب جانتا ہوں!"

آسٹن کا انجن بیدار ہوا اور کار پوری رفتار سے سڑک پر آگے بڑھتی چلی گئی۔

پل کے نیچے دریائے گنگا کا پانی، تاروں کی چھاؤں میں جا بجا نقرئی انعکاس بکھیرتا، بے آواز بہے جا رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اس خطرناک مرحلے سے بچ نکلنے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ قدرت غیر محسوس انداز میں میری مدد کر رہی تھی اور بنارس شہر میں آسٹن کار کا تبدیل نہ ہونا بھی اسی تائید غیبی کا مظہر تھا۔ آسٹن تو استاد بھوپت کے حوالے سے تلاشی کی زد سے صاف بچ نکلی تھی، اگر اس وقت میں کسی دوسری کار میں ہوتا تو تلاشی کے نتیجے میں سیتا کی برآمدگی اور ٹکراؤ یقینی تھا۔

ڈیش بورڈ میں لگے ہوئے میٹر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پٹرول کی ٹنکی اب زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکے گی۔ ادھر وہ علاقہ میرے لیے اجنبی تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آبادی کس طرف ہوگی اور پٹرول کہاں مل سکے گا۔ میرے سامنے بس یہی صورت تھی کہ جہاں تک ممکن ہو گاڑی کے سہارے سفر جاری رکھا جائے اور جب کار رک جائے تو ہم پیدل ہی کسی جانب نکل چلیں۔

مرزا پور میری توقع کے برخلاف بنارس سے بہت قریب نکلا۔ شہر کی روشنیاں نظر آتے ہی میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ شہر پر ہر طرف خوابناک خاموشی محیط تھی۔ سڑک پر آسٹن کے سوا نہ کوئی دوسری سواری نظر آ رہی تھی نہ راہگیر۔

اب میرا ارادہ یہ تھا کہ پہلی فرصت میں کسی محفوظ مقام پر کار روک کر سیتا کو ڈکی سے نکالوں اور اسے برقعے میں ملبوس کرا کے آسٹن سے مستقل نجات حاصل کر لوں

مگر اس کام کے لیے رات کا وہ پہر مناسب نہ تھا۔ چھوٹے سے شہر میں اتنی رات گئے ایک مرد اور برقعہ پوش عورت کو چہل قدمی کرتے دیکھ کر ہر شخص شبہات کا شکار ہو سکتا تھا اور اگر کسی سپاہی وغیرہ سے سامنا ہو جاتا تو میں اپنے نام پتے اور ٹھکانے کے بارے میں ایک بھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتا تھا۔

اس وقت میں کئی منزلہ عمارات پر مشتمل ایک آسودہ حال رہائشی علاقے سے گزر رہا تھا کہ اچانک کار کے انجن نے پے در پے کئی ہچکیاں لیکر دم توڑ دیا۔ پٹرول کی سوئی میٹر کے آخری سرے کو چھو رہی تھی اور اب ایک مرتبہ پھر وقت کی حرکت رک چکی تھی۔

میں کار سے اتر کر پٹرول کی ٹنکی کا جائزہ لینے کے بہانے ڈکی کے قریب آیا اور آہستگی سے سیتا کو پکارا۔ پہلی دو آوازوں کا کوئی جواب نہ ملا۔ تیسری آواز پر ڈکی میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور سیتا کی غنودہ آواز سنائی دی "کیا بات ہے؟"

"سیتا! ہم دوسرے شہر میں ....."

"یہ ڈبہ تو کھول!" اس نے میری بات درمیان ہی سے اچک لی۔ "اندھیرے میں اب میرا دم گھٹ رہا ہے میں باہر آؤں گی۔"

"تو بہت اچھی لڑکی ہے۔" میں جلدی سے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "ہم بنارس سے نکل چکے ہیں مگر اس وقت آبادی کے درمیان گاڑی میں تیل ختم ہو گیا ہے۔ یہاں تجھے باہر نکالنے میں دیکھے جانے کا خطرہ ہے۔ میں تیل لینے جا رہا ہوں پھر گاڑی کسی ویرانے میں لیجا کر میں تجھے اس ڈبے سے نکال لوں گا۔ میری واپسی تک تو اسی طرح دم سادھے اندر لیٹی رہ۔"

"اگر تو جلدی نہ آیا تو میں چیخنا شروع کر دوں گی۔" ڈکی میں سے اس کی شرارت آمیز آواز ابھری۔

"بس میں ابھی آتا ہوں۔"

میں نے گاڑی کے شیشے چڑھا کر دروازے لاک کیے اور ایک طرف چل دیا۔

میری رسٹ واچ کے مطابق ٹنڈن کے قتل کو ڈھائی گھنٹے کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس مدت میں میرے بہکائے ہوئے گھڑسواروں کے لیے واپس آکر اپنی حماقت کا احساس کرنا لازمی تھا۔ ٹنڈن اپنے پیشے کی وجہ سے یقیناً پولیس کی نظروں میں رہا ہوگا، پھر شاید بھوپت سنگھ کو بھی یہ خبر مل ہی گئی ہوگی۔ جب اسے جائے واردات پر کسی سیاہ کار کی موجودگی کا علم ہوا ہوگا تو اس نے تارا باغ میں جسونت راؤ سے میرے بارے میں معلوم کیا ہوگا۔ آسٹن سمیت میری روپوشی اور ٹنڈن کا قتل بھوپت جیسے گھاگ کے لیے مکمل کہانی سے کم نہ ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک پورے بنارس میں آسٹن اور صفدر علی کی تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ جب اعلیٰ حکام نے پل والی چیک پوسٹ سے رابطہ قائم کیا ہوگا تو انھیں آسٹن کا سراغ نہ مل سکا ہوگا۔ وہاں موجود سپاہیوں نے محض غلط فہمی میں آسٹن کو نکل جانے دیا تھا اور جب ان کو علم ہوتا کہ وہ گاڑی لیجانے والا سیتا کا ساتھی تھا تو وہ کسی بھی قیمت پر اپنی حماقت کا اعتراف نہ کرتے اور میرے لیے یہی ایک بات اطمینان کا باعث تھی کہ فوری طور پر پولیس کی توجہ مرزا پور اور اس کے نواح میں مرکوز نہ ہو پاتی اور جب تک کسی دوسرے ذریعے سے مرزا پور میں وہ آسٹن دریافت ہوتی میں سیتا کے ہمراہ کہیں دور نکل چکا ہوتا۔

تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد ایک پٹرول پمپ مجھے نظر آ ہی گیا۔ سالا

اسٹاف کیبن بند کیے اندر فرش پر پڑا سو رہا تھا۔ ایک کارندہ پمپ کے قریب کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو رہا تھا۔ یوں بے وقت جگائے جانے پر اس کے چہرے پر شدید بیزاری کے آثار عود کر آئے۔

"کیا مصیبت ہے؟" میرے جھنجھوڑنے پر اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میری گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ جھنجھلا کر بولا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

"تم پٹرول دینے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہو!" میں نے سختی سے اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

اس نے پلکیں جھپکا کر میری طرف دیکھا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا "پٹرول تو دے دوں گا مگر کس چیز میں دوں؟"

اس نے مجھ سے کافی بحث کی مگر میں نے معقول زرِ ضمانت جمع کرا کے مٹی کا تیل ناپنے کے پیمانے میں آدھا گیلن پٹرول لیا اور واپس چل دیا۔ اتنے پٹرول کے سہارے باآسانی پمپ تک آ سکتا تھا۔

آسٹن کے لیے پٹرول کی یہ ناوقت فراہمی میرے لیے بھی کوفت کا باعث تھی۔ گاڑی جس علاقے میں بند ہوئی وہ اگر رہائشی علاقہ نہ ہوتا تو میں سیتا کو اسی وقت ڈکی سے نکال لیتا مگر اس وقت ڈر یہ تھا کہ اگر بے خوابی کا کوئی مریض اپنی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ لے کہ ایک کار کی ڈکی سے پُراسرار انداز میں ایک عورت برآمد ہو رہی ہے تو وہ ہر قیمت پر پولیس کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا جبکہ موجودہ حالات میں میں پولیس سے حتی الامکان دامن بچا رہا تھا۔

میں ان ہی خیالات میں مگن چلا جا رہا تھا کہ اچانک میرے قریب سے ایک جیپ تیز رفتاری سے اسی طرف نکل چلی گئی جدھر میں آسٹن چھوڑ کر آیا تھا۔ جیپ کے حصے پر وائرلیس ٹرانسمیٹر کا اونچا ایریل لہرا رہا تھا اور جیپ کی رفتار تشویشناک حد تک تیز تھی۔

میں دل ہی دل میں آنے والے خطرات کے بارے میں سوچتا تیزی سے آگے بڑھنے لگا اور تھوڑی دیر بعد جب سیاہ آسٹن نظر آئی تو میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آسٹن کے قریب پولیس جیپ کے علاوہ دو موٹر سائیکلیں بھی موجود تھیں اور اسٹریٹ لائٹ کی دھندلائی ہوئی روشنی میں وہاں بہت سے پولیس والے نظر آ رہے تھے۔

میں نے پٹرول سمیت وہ برتن ایک طرف پھینک دیا۔ میرا ذہن سوچنے کی قوت کھو چکا تھا۔ ہر طرف ناامیدی اور مایوسی کی گھٹائیں محیط نظر آ رہی تھیں۔ مقدر نے ایک ہی رات میں تیسری بار اسیری اور رہائی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ آسٹن کی ڈکی میں بند بے دست و پا اپنے نوشتۂ تقدیر کی منتظر تھی اور میں اس سے تھوڑی دور بالکل ہی مجبور اور بے بس تماشائی تھا۔

پولیس کی وہاں موجودگی سے کم از کم ایک بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ مرزا پور پولیس کو آسٹن اور اس کے سوار کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ایک کمزور سا امکان یہ تھا کہ گنگا کے پل پر قائم چوکی کے سپاہیوں نے بوکھلا کر اپنی حماقت کا اعتراف کر لیا ہو۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ بنارس کے حکام نے حفظ ماتقدم کے طور پر آسٹن کے بارے میں ساری تفصیلات ریڈیائی رابطہ پر قرب و جوار کے مراکز کو پہنچا دی ہوں اور مرزا پور کی کسی گشتی گاڑی نے آسٹن کو پہچان لیا ہو۔

اتنا فاصلہ ہونے کے باعث مجھے کچھ علم نہ تھا کہ آسٹن کے سلسلے میں وہاں کیا کارروائی جاری ہے۔ اگر وہ ڈکی کھول کر سیتا کو برآمد کر چکے تھے تو فی الحال ہر حربہ بیکار تھا اور اگر ڈکی ان کی توجہ سے بچی ہوئی تھی تو ان روح فرسا لمحات میں بھی میں سیتا کی رہائی کی ایک آخری کوشش کر سکتا تھا۔

میں نے پٹرول کے لیے روانہ ہونے سے قبل سیتا کو خاموشی کی ہدایت کی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اگر آسٹن کے قریب توپیں بھی داغ دی جائیں تو سیتا دیدہ و دانستہ کوئی آواز نہ نکالے گی۔ دوسری طرف کار کے دروازے وغیرہ مقفل دیکھ کر پولیس منطقی طور پر یہی نتیجہ اخذ کرتی کہ مفرور مجرم مرزا پور پہنچتے ہی گاڑی چھوڑ کر بھاگ نکلے ہیں۔ اس صورت میں وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کے نرغے میں آئی ہوئی کار کی ڈکی میں ان کی اشتہاری اور خطرناک مجرمہ چھپی ہوئی ہے۔

اور اس تجزیے کے بعد میں نے آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

وہ علاقہ چونکہ متمول لوگوں پر مشتمل تھا اس لیے پولیس والوں نے رات کے سناٹے میں سائرن وغیرہ بجا کر خوف و ہراس پیدا کرنے سے خلاف معمول گریز کیا تھا جس کا اظہار مکانات کی کھڑکیوں سے ہو رہا تھا۔ علاقے کے لوگ سڑک پر ہونے والے سنسنی خیز ڈرامے سے بے خبر اپنے بستروں میں دبکے سو رہے تھے۔

میرے لیے اس وقت آسٹن سے زیادہ دور جانا مناسب نہ تھا۔ میں نے وہیں رک کر ٹیلی فون کے کھمبوں کا جائزہ لیا اور پھر ایک دو منزلہ عمارت کی طرف ہو لیا۔ عمارت مختصر سے رقبے پر بنی ہوئی تھی۔ نچلی منزل پر غالباً دو الگ الگ مکانات تھے۔ میں ان میں سے ٹیلی فون والے مکان کے دروازے پر پہنچا جس پر ڈی۔ ایل۔ تیواڑی کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

میں نے آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری کوشش میں فوراً ہی دروازے کے عقب سے نیند میں ڈوبی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ "کون ہے؟"

"میں کلیان چند ہوں بیگم صاحبہ، کلکتے سے آیا ہوں!" میں نے نرم، نیچی اور نہایت شائستہ آواز میں کہا۔

"کلیان چند... کلکتے سے؟" عورت نے باآواز بلند حیرت سے دہرایا پھر پوچھا۔ "آپ کس کام سے آئے ہیں؟ تیواڑی جی سخت بیمار ہیں!"

"مجھے اشوک مہتہ صاحب نے ایک خط دے کر بھیجا ہے۔" اہل خانہ کی بیماری کا سن کر میں نے ترپ چال چلی۔ "اگر تیواڑی جی سو رہے ہیں تو انھیں نہ جگائیے۔ میں گھر میں کہیں بھی پڑ کر سو رہوں گا۔ صبح ان سے بات ہو جائے گی۔"

عورت کے پس و پیش سے ظاہر تھا کہ مکان میں اس کے اور تیواڑی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو وہ خود پوچھ گچھ کرنے کے بجائے اسی کو باہر بھیجتی۔

ذرا سے توقف کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ میں نے سر کو قدرے خم دے کر اندر موجود ادھیڑ عمر عورت کو تعظیم دی اور اندر بلائے جانے کا منتظر رہا۔

میرے شریفانہ رویے نے اسے خاصا متاثر کیا اور اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ میں قالین سے آراستہ پُرتکلف نشست گاہ میں داخل ہو گیا۔

پھر وہ عورت جوں ہی دروازہ بند کر کے پلٹی میں نے اچھل کر اسے دبوچ لیا۔ میرا داہنا ہاتھ پوری قوت سے اس کے کھلے ہوئے دہانے پر جم گیا اور میں نے ذرا بھی مہلت دیے بغیر بائیں ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر بھرپور ضرب لگائی اور اس کا بدن بے جان ہو کر میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔

میں نے اس کا ساکت بدن آہستگی سے نرم قالین پر ڈالا اور اندر سے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ پٹ بدستور بند رہنے دیے تاکہ کسی ناگہانی مصیبت کی صورت میں فوراً باہر بھاگ سکوں۔

اس گھر میں میرا کام محدود تھا لہٰذا میں نے زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میرے کان کسی بھی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں ریوالور موجود تھا اور میں جلدی جلدی ٹیلی فون ڈائرکٹری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

چند ہی ثانیوں میں مجھے مطلوبہ نمبر مل گیا۔

مرزا پور پولیس ہیڈ کوارٹر والے اس وقت شاید بہت مستعد تھے کیونکہ مجھے فوراً ہی جواب مل گیا اور میں نے آپریٹر سے ڈیوٹی پر موجود کسی سینئر افسر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"آپ لوگوں نے لیلی نگر میں اس آسٹن کو کیوں گھیر رکھا ہے جناب؟" سلسلہ مل جانے پر میں نے بدلی ہوئی نحیف آواز میں کہا۔ "کیا اس میں کوئی لاش پڑی ہوئی ہے؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" دوسری جانب سے قدرے تلخ لہجے میں پوچھا گیا۔

"میں بے خوابی کا مریض ہوں اور میرے مکان کے قریب پولیس کی موجودگی نے مجھے پراگندہ کر رکھا ہے۔ اگر وہ دونوں پکڑ لیے گئے ہیں تو پولیس اور آسٹن کو یہاں سے منگوا لیں!" اس بار میں ہلکی سی کھانسی کے دوران میں بولا۔ مجھے امید تھی کہ یہ آواز تیواڑی کو متوجہ نہ کر سکے گی۔

"کون دونوں؟ کیا آپ نے انھیں دیکھا تھا؟" دوسری طرف سے حیرت اور خوشی کے ساتھ پوچھا گیا۔

"ارے دیکھا کیا جناب — وہ تو میرے سامنے اس گاڑی سے اتر کر ایک سفید مورس میں گئے ہیں۔ شاید صبح ہی مورس کے مالک کو اپنی گاڑی کی چوری کا پتہ چلے گا۔ وہ آسٹن اچانک یہاں رکی تھی اسے ایک مرد چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک انگریز لڑکی بھی تھی۔"

"انگریز لڑکی؟" افسر کا لہجہ ہیجان آمیز تھا۔ "آپ نے مورس کا نمبر دیکھا؟"

"نہ دیکھتا تو کیا کرتا۔" میں نے لہجہ لاپروایانہ رکھا۔ "بی ایس کے تین سو سترہ نمبر تھا اس کا!"

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"نہیں بابا۔ میں ان سب چکروں میں نہیں پڑتا۔ مجھے تو بس یہ کہنا ہے کہ پولیس کو میرے مکان کے پاس سے ہٹا لو!"

یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ڈائرکٹری اور ایڈریس کو قرینے سے رکھا۔ پھر فون کا ایک تار کھینچ کر توڑ دیا تاکہ اس گھر کی مالکہ اگر ہوش میں آکر پولیس کو فون کرنا چاہے تو کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کارروائی کے بعد میں پھرتی کے ساتھ اس مکان سے نکل آیا۔

پولیس ہیڈ کوارٹرز سے آسٹن کی نگرانی کرنے والوں کو احکام ملنے میں یقیناً کچھ وقت لگتا جبکہ میں اب ایک ایک لمحہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔

میں واپس پٹرول پمپ کی سمت میں چلا ہی تھا کہ میری نظر ایک طرف کھڑی ہوئی کار کی نمبر پلیٹ پر پڑی اور میرا سر پیٹ لینے کو جی چاہنے لگا۔ اس کار کا وہی نمبر تھا جو میں پولیس کو بتا چکا تھا۔ شاید پٹرول لاتے ہوئے یہ نمبر میرے لاشعور سے چپک گیا ہوگا جو میں نے سفید مورس کے حوالے سے دہرا دیا۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ کار ایک ایسی گلی میں کھڑی ہوئی تھی جہاں سڑک سے گزرتے ہوئے اس کا دیکھا جانا مشکل تھا ورنہ میرا سارا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔

باحیثیت لوگ چھوٹے مکانوں میں رہیں تو چور اچکوں کا مقدر عروج پر ہوتا ہے۔ گو میں نہ چور تھا نہ اچکا مگر اس وقت میری ضرورت ایک کار کی متقاضی تھی جسے خریدنا ناممکن تھا للٰہذا مجبوراً مجھے چوری کے بارے میں سوچنا پڑا۔

چند گلیوں میں بھٹکنے کے بعد مجھے ایک غیر مقفل کار نظر آ ہی گئی۔ میں نے اس کا بانٹ اٹھا کر اگنیشن کے تار جوڑے اور اس کا انجن جاگ اٹھا۔ میں نے بانٹ بند کر کے کار تیزی سے گلی میں سے نکال لی۔

ایک لمبا چکر کاٹ کر جب میں لیلیٰ نگر کی اس سڑک پر پہنچا تو پولیس کی وائرلیس جیپ وہاں سے جا چکی تھی۔ موٹر سائیکلیں بھی وہاں سے روانہ ہونے والی تھیں۔ میں نے وہ گاڑی دور ہی روک لی اور اس کی عقبی نمبر پلیٹ پر کیچڑ لگا دی جو اس صاف ستھرے علاقے میں بھی مفقود نہ تھی۔

موٹر سائیکلیں جانے کے بعد میں آگے بڑھا۔ آسٹن کے قریب اس وقت ایک سپاہی موجود تھا جو فٹ پاتھ پر بیٹھا بیڑی سلگا رہا تھا۔

میں نے آسٹن کے متوازی اپنی کار روک دی اور اتر کر سپاہی کے پاس جا پہنچا۔ "کیا اس گاڑی سے کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے! ابھی یہاں کافی پولیس موجود تھی؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے سیتا کا نام سنا ہے؟" وہ ڈرامائی لہجے میں بولا "جس نے بنارس میں پندرہ بیس آدمی مار دیے اور جیل توڑ کر بھاگ نکلی۔"

اس نے مبالغے میں چار کی تعداد کو پندرہ تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے جلدی سے سر ہلا کر سیتا سے واقفیت کا اقرار کیا۔

"ہم لوگ اسی کو پکڑنے کے چکر میں ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اس کالی گاڑی میں تھی اور اب سفید مورس میں بھاگی ہے۔" وہ بیڑی کا کش لیتا ہوا بولا۔

میں نے اچانک اپنا ریوالور اس کے بائیں پہلو سے لگا دیا "دوسری طرف منہ کر کے خاموش کھڑے رہو۔ اگر ذرا بھی آواز نکالی تو سینہ چھلنی کر دوں گا!"

وہ گھگھیاتے ہوئے فوراً ہی مجوزہ سمت میں گھوم گیا اور میں نے اس پر کڑی نظر رکھتے ہوئے احتیاط سے آسٹن کی ڈکی کھول دی۔

"شکر ہے!" ڈکی کھلتے ہی سیتا کی آواز آئی اور وہ اچھل کر باہر آ گئی۔

میں نے ریوالور کی زد پر اس سپاہی کو دوسری کار کی عقبی نشست پر بٹھایا اور اسے سیتا کے حوالے کرنے کے بعد آسٹن کا مقفل دروازہ کھول کر اندر سے ضروری سامان نکال لیا۔ ڈکی میں سے برقعہ وغیرہ نکالنا بھی میں نہ بھولا تھا۔

یہ ساری کارروائی چند لمحوں میں مکمل ہو گئی اور میں اس سپاہی کو بطورِ یرغمال لیکر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس بار میرا رخ ایک ویرانے کی طرف تھا۔

وہ سپاہی ایک جھلک دیکھتے ہی سیتا کو پہچان گیا تھا اور اسی کے ساتھ وہ ہذیان میں مبتلا ہو گیا۔ سیتا نے جب اس کی مسلسل بکواس کا کوئی حل نہ پایا تو اس کی کھوپڑی پر دو تین گھونسے رسید کر کے اسے خاموش کر دیا۔ سیتا کو اتنا اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ سپاہی مر چکا ہے یا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ وہ تو اس کے بے حس و حرکت بدن کو پائیدان میں ڈالے نہایت انہماک سے کار کی سواری کا لطف لے رہی تھی اور پرخطر حالات سے بالکل بے پرواہ نظر آ رہی تھی۔

"بنارس سے چلتے ہوئے تو نے مجھے گاڑی کے ڈبے میں کیوں بند کیا تھا؟" اسے نرم نرم سیٹ پر اچھلتے ہوئے اچانک میری زیادتی کا خیال آ گیا۔

"ڈبے میں نہ ہوتی تو اب تک جیل پہنچ چکی ہوتی!"

"نیند تو وہاں بھی مزے سے آئی، بس جگہ ذرا تنگ تھی۔" وہ ترنگ میں بولی "مگر یہ بتا کہ تیل لانے میں اتنی دیر کیسے ہوئی، تیرے جانے کے بعد تو وہاں بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں!"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"میری ہی کچھ باتیں تھیں۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں کالی گاڑی سے بھاگ چکی ہوں!"

"ڈبہ نہیں کھولا انھوں نے؟"

"ایک دو دفعہ ہاتھ تو مارا تھا کسی نے اور میں بھی ان کے دانت کھٹے کرنے کے لیے تیار تھی مگر وہ گاڑی شاید کسی بڑے آدمی کی تھی، وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔"

"یہ تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"ان میں سے کوئی شیشے توڑ کر تلاشی لینے کو کہہ رہا تھا مگر دوسروں نے منع کر دیا۔"

وہ بولی پھر کسی فوری خیال کے تحت دوبارہ مخاطب ہو گئی "ہم کب تک ایسے بھاگتے پھریں گے صفدر! تو کہتا تھا کہ ہم شہر میں لوٹ کر اپنا گھر بنائیں گے جہاں ہمارے بچے ہوں گے۔ میں تو اس گھر کی آرزو کو دھندلاتا دیکھ رہی ہوں، بھلا گھر بغیر بچے بھی کیا اچھے لگیں گے!"

یک بیک میرا دل اداس ہو گیا "میں پرسکون زندگی کی طرف جتنے قدم بڑھاتا ہوں، مقدر مجھے اس سے کئی گنا پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ میرا بس چلے تو ابھی ہی میں اپنا گھر آباد کر لوں۔"

پھر کار میں گہری خاموشی چھا گئی۔

شہر سے باہر آنے کے بعد میں نے ایک ویرانے میں کار روکی اور بے ہوش سپاہی کو گاڑی سے باہر سڑک کے کنارے اس طرح ڈال دیا کہ آنے جانے والی گاڑیوں کے مسافر بآسانی اسے دیکھ کر اس کی مدد کو پہنچ سکیں۔ پھر میں نے سیتا کو برقعہ پہنایا۔ لباس اس کے لیے قطعی نیا اور الجھن آمیز تھا لیکن اسے نقاب کے بارے میں چلا تو اس نے بڑی خوشی سے یہ الجھن قبول کر لی۔

اس بار میں نے مرزا پور سے بڑی شاہراہ پر ہو کر منگاواں کے راستے کی راہ اختیار کرنے کے بجائے گنگا کے جنوبی کنارے اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ والی سڑک کی راہ لی۔ یہ راستہ گو ذرا خراب تھا مگر کسی نہ کسی طرح صبح سویرے ہم الٰہ آباد جا پہنچے۔

شہر کے ایک دور افتادہ حصے میں گاڑی چھوڑ کر ہم نے کچھ دور پیدل سفر کیا پھر تانگے کے ذریعے بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ فی الحال میں نے ریل سے سفر کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ادھر پولیس کی موجودگی اور کڑی نگرانی کا خطرہ تھا۔

الٰہ آباد سے فتح پور اور پھر کانپور تک ہم نے بس کے ذریعے سفر کیا۔ اس دوران میں میں اخبارات کا مطالعہ کرتا رہا اور میں نے محسوس کیا کہ ان علاقوں میں بنارس کے واقعات کا اثر اتنا گہرا نہیں تھا۔ البتہ اخبارات کے اندرونی صفحات پر میرے اور سیتا کے بارے میں پولیس کی کارروائیوں کی چھوٹی چھوٹی خبریں ہوتی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ پولیس کو ابھی تک ان ہی نواح میں ہماری روپوشی کا شبہ ہے۔

مرزا پور میں گمنام ٹیلی فون اور پھر میرے ہاتھوں پولیس کی درگت کا قصہ اخبارات میں سرے سے آیا ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ بھی پتہ چلا کہ گنگا کے پل پر واقع عارضی نگران چوکی کے سپاہیوں نے آسٹن کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا مگر جب مرزا پور میں اس کار کی موجودگی ثابت ہو گئی تو انھیں اعتراف پر مجبور ہونا پڑا اور انھیں معطل کر دیا گیا۔

بنارس سے نکلنے کے بعد مجھے ایک لمحے کا بھی آرام نصیب نہیں ہوا تھا للٰہذا میں نے ایک آدھ روز کانپور میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں اسٹیٹ ہوٹل ان دنوں اول درجے کی قیام گاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ میں نے مسٹر اور مسز اکبر کے نام سے وہاں دوہرے بستر والا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔

ویرانوں سے آبادی میں آنے کے بعد سیتا ہمیشہ مجھے بدلی ہوئی لڑکی معلوم ہوئی۔ شہروں کی نت نئی چیزوں پر اس کی حیرت فطری بات تھی مگر جب سے اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اس کی غیر معمولی حرکات و سکنات کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں، اس کے رویے میں ناقابلِ بیان وقار اور ٹھہراؤ عود کر آیا تھا۔ ہاں تنہائی میں وہ مجھ سے بچوں کی طرح ایسے ایسے احمقانہ سوالات کرتی کہ میں چڑ جاتا۔

ہوٹل میں میرا کمرہ چوتھی منزل پر تھا۔ میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ زینوں کے بجائے لفٹ میں داخل ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ہوٹل کا ایک خدمتگار بھی موجود تھا۔

جوں ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا اور وہ ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ اوپر اٹھی سیتا نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ لیا اور جب خدمتگار ہمیں کمرہ دکھا کر لوٹ گیا تو سیتا فوراً ہی جرح کے لیے تیار ہو گئی۔

سب سے پہلے اس نے ایک کھڑکی سے جھانک کر بازار کا منظر دیکھا اور ایک گہرا سانس لیکر میری طرف متوجہ ہو گئی "کیا وہ کمرہ اوپر نیچے چلتا ہے؟"

"ہاں!" میں نے ایک کرسی میں دھنستے ہوئے کہا۔

"اسے کتنے آدمی اوپر کھینچتے ہیں؟" اس کا لہجہ تحیر آمیز تھا۔

"آدمی نہیں، اسے ایک مشین اوپر لاتی اور نیچے لے جاتی ہے!"

"مشین کو کتنے آدمی چلاتے ہیں؟"

"اسے آدمی نہیں چلاتے وہ بجلی سے کام کرتی ہے۔"

"بجلی ۔۔۔ یہ کیا ہوتی ہے؟"

میں نے ایک روشن بلب کی طرف اشارہ کیا "یہ بجلی ہی ہے، اس شیشے کے اندر موم بتی نہیں جلا کرتی، کمال ہے کہ تجھے آج تک یہی پوچھنے کا خیال نہیں آیا۔"

"چل یہ تو ٹھیک ہے کہ اس کمرے کو بجلی چلاتی ہے مگر بجلی بھی تو آدمی ہی بناتے ہوں گے نا؟"

"نہیں، بجلی مشینوں سے بنتی ہے، آدمی ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔"

وہ بیساختہ زور سے ہنسی "مشینیں بجلی بناتی ہیں پھر بجلی مشینیں چلاتی ہے، تیرا یہی مطلب ہے نا؟" اس نے ہنسی کے دوران میں پوچھا۔

"تو اس میں دانت نکالنے کی کیا بات ہے!" میں چڑ کر بولا۔

"یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ انڈے سے مرغی پیدا ہوئی پھر مرغی سے انڈا۔ اب میں پوچھوں گی کہ بجلی بنانے والی مشین کو کتنے آدمی چلاتے ہیں تو تو کہے گا کہ وہ بجلی ہی سے چلتی ہے!"

"نہیں!" میں غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا "میں کہوں گا کہ وہ مشین تیل یا گیس سے چلتی ہے۔ اسے ہوا سے بھی چلا سکتے ہیں، پانی سے بھی بجلی کی مشینیں چلتی اور اسے ایٹمی طاقت سے بھی چلایا جاتا ہے۔ آیا کچھ تیری سمجھ میں یا نہیں؟"

"مجھے کیا معلوم کہ یہ سب چیزیں کیا ہوتی ہیں۔" وہ دیدہ دلیری کے ساتھ بولی "میں تو یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ شہروں کے رہنے والے کتنے طاقتور ہوتے ہیں مگر تو بتا رہا ہے کہ اس کمرے کو چلانے میں کسی آدمی کی طاقت ہی نہیں لگتی۔ بھلا طاقت کا کام بغیر طاقت کے کیسے ہو سکتا ہے!"

"شہروں میں رہنے والے تیری طرح طاقتور نہیں ہوتے بلکہ چالاک اور مکار ہوتے ہیں۔ وہ طاقت کا کام بھی اشاروں سے نکال لیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اسے دکھایا "اگر اس میں پوری گولیاں بھری ہوں اور نشانہ سچا ہو تو ایک کمزور بچہ بھی محض انگلی کے اشارے سے سات ہٹے کٹے اور دیو ہیکل آدمیوں کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ شہر والوں کا ہر کام ایسا ہی ہوتا ہے!"

میری اس بات پر وہ قائل ہو گئی کیونکہ آتشیں اسلحہ کی کارگزاریاں تو وہ بارہا خود بھی دیکھ چکی تھی۔

وہ دن میں نے ہوٹل کے کمرے میں گہری نیند سوتے ہوئے گزارا۔ اگلے روز صبح دس بجے کے قریب سیتا کو کمرے میں محدود رہنے کی ہدایت کر کے میں باہر نکل گیا۔

بازار سے میں نے لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا حاصل کیا پھر ایک ہوٹل کے پرائیویٹ کیبن میں بیٹھ کر پارس پتھر کے لمس سے اسے سونے میں تبدیل کیا اور چائے وغیرہ کا بل ادا کر کے وہاں سے نکل گیا۔ سونے کا وہ وزنی ٹکڑا میرے بریف کیس میں موجود تھا۔

بہت ہی محتاط تلاش کے بعد میں نے کانپور کے بدنام علاقے میں ایک نوجوان کا انتخاب کیا اور پچاس روپے کے نوٹ اس کی مٹھی میں دبا کر میں نے اس سے ایک فرضی شخص کے بارے میں دریافت کیا۔

"سادھو ۔ یہ نام تو میں پہلی بار سن رہا ہوں!" نام سن کر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا "یہ کرتا کیا ہے؟"

"سادھو میرے ساتھ تین برس تک کام کرتا رہا ہے۔ وہ سونے کا لین دین کرتا تھا۔ ایک چکر میں اسے سات سال کی جیل ہو گئی۔ میں نے سنا ہے کہ بریلی سے رہا ہو کر وہ چند ماہ پہلے یہیں آیا ہے۔ اس کا پتہ ٹھکانا مجھے نہیں معلوم، بس نام کے

سہارے اس کی تلاش ہے۔"

"اگر جیل سے آکر بھی اس نے پرانی لائن اختیار کی ہے تو صرف کوٹھاری سنز سے ہی اس کا سراغ مل سکے گا۔" وہ بولا۔

"کوٹھاری سنز؟"

"ہاں!" وہ مٹھی میں دبے ہوئے نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔" وہ لوگ چمڑے کے بیوپاری ہیں مگر در پردہ ناجائز سونے کا لین دین کرتے ہیں۔ سادھو کو پورے شہر میں اپنے مال کا ان کے علاوہ کوئی خریدار نہ مل سکا ہوگا۔"

میں نے اس سے کوٹھاری سنز کا پتہ دریافت کیا اور پھر اسی طرف روانہ ہو گیا۔ بارونق اور وسیع بازار میں کوٹھاری سنز کا دفتر ایک وسیع اور عالیشان عمارت کی نچلی منزل پر واقع تھا۔ میں دفتر کی شان و شوکت دیکھ کر پل بھر کے لیے شش و پنج میں پڑ گیا مگر پھر شیشے کے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔

اس وسیع ہال میں راہداری پر اُونی روش بچھی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف کئی میزوں پر لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ داخلی دروازے سے چند گز دور برابر برابر دو کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازوں پر باوردی چپراسی موجود تھے۔

پورے ہال میں چمڑے کی تیز بُو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وسیع دفتر کا عقبی حصہ شاید کھالوں وغیرہ کے گودام کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔

میرے اندر داخل ہونے پر جب کسی طرف سے پذیرائی نہ ہوئی تو میں ان دونوں کمروں کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں چپراسی موجود تھے۔

"مجھے ایک اہم کاروباری سلسلے میں منیجر صاحب سے ملنا ہے!" کمروں پر عہدوں کے بجائے ناموں کی تختیاں دیکھ کر میں نے ایک چپراسی سے کہا۔

"آپ نے ان سے ملاقات کا وقت طے کیا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ مگر میں ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔"

"مشکل ہے جناب۔" وہ سر ہلا کر بولا۔"کمرے میں میٹنگ ہو رہی ہے۔"

"میں انتظار کر لوں گا!"

"آپ کی مرضی۔" وہ سر جھکا کر بولا۔" ویسے وہ شاید دیر سے فارغ ہوں گے۔"

میں ان کمروں کے باہر ملاقاتیوں کے لیے پڑے ہوئے صوفوں پر بیٹھ کر رسائل کا مطالعہ کرنے لگا۔

میں نے بھاری مقدار میں سونا فروخت کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اب مجھے حالات ساز گار نظر آرہے تھے اور میں کانپور سے ایک نئی جیپ خرید کر اس کے ذریعے ہندوستان سے نکلنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ سفر کے وہ تمام ذرائع مجھے مخدوش نظر آرہے تھے جن میں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے واسطہ پڑتا ہو جبکہ پیدل یا چوری کی گاڑیوں کے ذریعے اتنی طویل مسافت طے کرنی ناممکن تھی۔

تھوڑی دیر بعد کچھ ملی جلی آوازیں سُن کر میں چونک پڑا۔ سر اٹھایا تو ایک کمرے سے تین آدمی باہر آرہے تھے اور ان میں سے ایک میرا شناسا سا تھا۔

میں نے جلدی سے ایک اخبار اٹھا کر اپنا چہرہ چھپانا چاہا مگر مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ استاد بھوپت سنگھ پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان چکا تھا اور یک بیک اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

بھوپت سنگھ کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر اس کے ساتھ کمرے سے ہونے والے دونوں افراد بوکھلائے ہوئے نظر آنے لگے اور فوراً ہی انھوں نے لگالیا کہ میرے اور بھوپت کے درمیان نگاہوں کی سرد اور خون آشام جنگ چھ ہوئی ہے۔

بھوپت سنگھ کی وہاں موجودگی کا ایک جواز تو فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا۔ اسے کیمیا کے ذریعے جو سونا بنا کر دیا تھا اس کا یکمشت بنارس میں فروخت کرنا ناممکن یہ بات مجھے اپنے تجربے کے دوران میں ٹنڈن کی زبانی بھی معلوم ہو چکی تھی۔ دوسری طرف کوٹھاری سنز کی راہ دکھانے والی گفتگو سے ظاہر تھا کہ یہ لوگ بڑے پیمانے پر سونے کے لین دین پر آس پاس کے علاقوں میں اجارہ داری رکھتے ہیں لہٰذا امکان یہی تھا کہ ٹنڈن کی موت کے بعد سونے کی اکٹھی فروخت کے سلسلے میں بھوپت سنگھ بنارس سے کانپور آپہنچا ہو۔ اب یہ صریحاً میری بدقسمتی ہی تھی کہ میں نے کوٹھاری سنز میں آنے کے لیے اسی وقت کا انتخاب کیا جب میرا زخم خوردہ حریف بذاتِ خود وہاں موجود تھا۔

اب مجھے وہاں رُکے رہنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ اگر چپراسی سے بات کرنے کے بعد میں لوٹ جاتا تو وہاں رُک کر از خود خطرے کا انتظار کرنے کی حماقت سے بچ جاتا۔ مگر اب یہ تاسف بیکار تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور مجھے وقت ضائع کیے بغیر کوئی تدبیر کرنی تھی۔

"اوئے — ادھر آ!" بھوپت سنگھ نے وہیں کھڑے کھڑے حقارت سے مجھے اشارہ کیا۔

میں دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیجتا اس کی طرف چل دیا۔ اس وقت چاقو کے سوا میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اپنا پستول میں محض اس لیے چھوڑ آیا تھا کہ اپنے وزن کی وجہ سے وہ جسم یا لباس کے کسی بھی حصے میں چالاک نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہتا۔

میں اس سے چند فٹ دُور ہی تھا کہ وہ کسی سے بولا۔"کمرے میں چلو۔" اس کے ساتھ کمرے سے باہر آنے والے دونوں آدمی اندر غائب ہو گئے۔ بھوپت نے خونخوار نظروں سے مجھے بھی اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا اور میرے دروازہ بند کر کے خود بھی اندر آگیا۔ باہر موجود چپراسی ہونقوں کی طرح یہ سارا کچھ دیکھتے رہ گئے۔

وہ نہایت وسیع و عریض کمرہ تھا جس کے تقریباً وسط میں ایک بڑی منقش صندلی میز پڑی ہوئی تھی۔ میز کے گرد دس گدے دار منقش، صندلی کرسیاں تھیں۔ میز کے پیچھے وہ دونوں افراد اپنی بھاری، گردش کرنے والی کرسیوں پر بیٹھے تھے جو شاید کوٹھاری سنز کے مالکان میں سے تھے۔

"سیٹھ! اب تم سے ایک ضروری کام ہے!" بھوپت سنگھ میری موجودگی نظر انداز کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں ان سے بولا۔

"بولو بابا — ہم تو ابھی تمھارا یار ہے۔" ان میں سے نسبتاً کم عمر شخص بولا گو اس نے پُرسکون رہنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے لہجے میں تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

"مجھے اس لڑکے کو بوری میں بند کر کے یہاں سے لیجانا ہے۔ جوٹ کی

مضبوط بوری اور کچھ رسّی منگوا دو!" بھوپت سنگھ نے میری طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ارے بابا۔" وہ خوفزدہ اور بے ڈھنگے انداز میں ہنس دیا۔"کیوں مذاق کرتا ہے!"

"مذاق نہیں۔ میں تو اس کی تلاش میں تھا ہرمز جی!" بھوپت سنگھ تلخ لہجے میں بولا۔" یہ میرا مال چرا کر بھاگا تھا۔ اس کی شامت ہی تھی جو یہ یہاں آپھنسا۔"

"یار ایسا نہیں کرونا۔" ہرمز جی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔" سالے کو چپ چاپ گاڑی میں بٹھاؤ اور لیجاؤ، ادھر اپنا دفتر میں گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔"

"رستم جی!" اس بار بھوپت نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا۔" ایک بوری ورنہ میں اسے بے ہوش کر کے اپنے کندھے پر اٹھا لیجاؤں گا۔"

"اے مصیبت!" رستم جی غصیلی اور روہانسی آواز میں مجھ پر برس پڑا۔" تم سالا ادھر ہماری فرم میں آیا کیوں تھا؟"

"سونا!" میں نے بریف کیس پر ہاتھ مارا۔

"کدھر کا مال ہے؟" رستم جی کا غصہ کافور ہو گیا اور اس کے لہجے میں حریصانہ کاروباری مصلحت سمٹ آئی۔

"سونا صرف سونا ہوتا ہے۔ کسوٹی پر دیکھو اور دام لگاؤ۔" میں نے بریف کیس اس کے آگے میز پر ڈال دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔

بریف کیس کی وزنی دھمک سُن کر وہ تینوں ہی چونکے اور جب رستم جی نے اس کا ڈھکنا کھولا تو تینوں کی نگاہیں پھیل گئیں۔

"اپنا استاد دس سیر لایا ہوگا، یہ اس سے کچھ ہی کم ہے۔" میں نے کہا۔

ہرمز جی سونے کا نام آتے ہی میز کی دراز سے کسوٹی نکال چکا تھا! اس نے کس لگا کر غور سے اس کا جائزہ لیا۔ چند ثانیوں تک وہ دونوں سرگوشیوں میں مشورہ کرتے رہے۔ آخر رستم جی سونے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔" کیا دام چاہیے؟"

"ایمانداری کے دام چاہئیں!" میں بولا۔ بھوپت سنگھ بالکل خاموشی سے ساری گفتگو سُن رہا تھا۔ شاید وہ میرے ساتھ رقم بھی بوری میں لیجانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ رستم جی نے سونے کے دام ایمانداری سے ہی لگائے۔ وزن کے معاملے میں میں نے انھیں دو چار تولے کی چھوٹ دے دی۔ انھوں نے چمڑے کے نمونے تولنے کی ترازو پر سونے کا وزن کیا۔ حساب لگایا گیا تو رقم دو لاکھ سے اُوپر ہی بنی۔ رستم جی نے حساب کا پرچہ میرے آگے سرکا دیا۔

"ٹھیک ہے .... رقم نکالو!" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"کیش مانگتا ہے تو کل ملے گا، ابھی چیک ملے گا۔" ہرمز جی چیک بک کھولتے ہوئے بولا۔

"کل میں ہی یہ رقم بھی لیجاؤں گا!" بھوپت سنگھ بول اٹھا۔" اس وقت تم صرف بوری منگواؤ۔"

"یار — یہ بھی اب اپنا بیوپاری ہے، تم لوگ باہر جا کر اپنا فیصلہ کر لو نا!" رستم جی خوشامدانہ لہجے میں بھوپت سے بولا۔" ادھر کیوں گھپلا کرتا ہے۔ اندر سے چار آدمی کے بجائے تین آدمی اور ایک بوری نکلے گا تو ہمارا دفتری لوگ سمجھے گا کہ ہم نے ادھر کسی کو جان سے مارا ہے۔"

"استاد! یہ میرا تمھارا معاملہ ہے۔ میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں — ان بے چاروں کو مشکل میں کیوں ڈالتے ہو!" میں نے فراخدلی کے ساتھ کہا۔

"خدا تیرا بھلا کرے بابا!" رستم جی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دُعا دی۔" تیرا پیسہ بھی استاد کو دینا ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔ میرا اور استاد کا ایک ہی معاملہ ہے۔"

"یہ بتا دوں کہ میرے ساتھ کوئی حرامی پن کیا تو بھرے بازار میں گردن توڑ دوں گا!" استاد بے اعتباری سے مجھے گھورتے ہوئے غرّایا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے خود کو اس کے حوالے کر دوں گا۔ وہ اسے بھی میری کوئی چال سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ بغیر ہتھیار کے میں اس سے نہ جیت سکتا تھا۔ جسامت میں تو وہ مجھ سے برتر ہی تھا مگر اس کے کوٹ کے نیچے بغلی ہولسٹر سے ایک عدد ریوالور بھی جھول رہا تھا جسے وہ کسی بھی وقت استعمال کر سکتا تھا لہٰذا میری کوشش یہ تھی کہ بوری میں بند ہونے کے بجائے اپنے قدموں سے چل کر اس چوہے دان سے نکلوں۔ کھلی فضا میں میں بہتر طور پر اپنی مدافعت کر سکتا تھا۔

دفتر سے باہر آکر بھوپت سنگھ مجھے فٹ پاتھ پر ایک طرف لے چلا۔ میری بے چین نگاہیں فٹ پاتھ کے سہارے کھڑی ہوئی گاڑیوں میں بھوپت کی کار تلاش کر رہی تھیں۔

کوٹھاری سنز سے کافی دُور بھوپت کی مرسڈیز کار موجود تھی! اس نے چابی میرے حوالے کر دی۔" تو گاڑی چلائے گا اور اگر میری مرضی کے خلاف ذرا بھی حرکت کی تو گردن توڑ دوں گا۔"

"میں آج بھی اسی طرح تمھارا خادم ہوں استاد جیسے تارا کا بیج میں پہلے روز تھا۔" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔" اگر ٹنڈن دوستی کے نام پر دغا نہ کرتا تو میں آج بھی تمھارے ساتھ ہوتا!"

"ٹنڈن اور دغا!" اس نے حقارت سے سر جھٹک کر کہا۔" دغا تو اس کے خمیر میں ہی نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تیری راہ روکتے ہوئے مارا گیا ہے!"

اس کے منہ سے یہ حقیقت سُن کر میں چونک پڑا۔" یہ کس نے کہا، یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

"کہتا کون! یہ تو میرا اندازہ ہے او بیٹا۔ میرے اندازے ہمیشہ درست ہوتے ہیں!"

"تم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے استاد۔" میں نے اس کے اشارے پر کار ایک گلی میں موڑتے ہوئے کہا۔" اگر تمھارا اندازہ درست ہوتا تو آج میں دربدر نہ بھٹک رہا ہوتا۔" میں ایک ثانیے کے لیے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے مصنوعی غصے کے ساتھ بولا۔" جب عورت بیچ میں آجائے تو بڑے بڑوں کی وفاداری دغا دے جاتی ہے۔ وہ سیتا کا ٹھکانا معلوم کر چکا تھا مگر اس نے مجھے ایک لفظ نہ بتایا۔ وہ میری آڑ میں اسے نقصان پہنچانا چاہتا تھا! اس روز میں نے ٹنڈن کا پیچھا کیا کیونکہ اس کی باتوں سے مجھے شبہ ہو چلا تھا۔ وہ سیتا کو مجھ سے ملوانے کے بہانے آسٹن میں اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر لے جانے کے ارادے سے وہاں پہنچا اور میں نے رنگے ہاتھوں اسے پکڑ لیا۔ میں اسے زندہ تمھارے پاس لانا چاہتا تھا مگر سیتا کو جب اس کی غداری کا علم ہوا تو اس نے اشتعال میں ٹنڈن کو گولی مار دی! اس کا غصہ اسی پر سرد نہیں ہوا بلکہ اس نے پتھر

سے ٹنڈن کا سر بھی کچل دیا۔"

"وہ لڑکی اعشاریہ تین آٹھ کا پستول چلا لیتی ہے؟" بھوپت کے لہجے میں طنز تھا۔

"وہ چار پجاریوں کو ہلاک اور تین کو زخمی کر کے ناتھ شرم سے بھاگی تھی استاد!"

"نشے میں دُھت آدمیوں سے مار پیٹ دوسری بات ہے مگر اتنے بھاری پستول سے صحیح نشانہ لینا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"میں بحث نہیں کرتا۔ کسی موقعے پر تم خود دیکھ لوگے، میں تو ٹنڈن کے قتل سے بوکھلا کر بھاگ نکلا کیونکہ ایک طرف تمھارا عتاب ہوتا دوسری طرف پولیس کا خوف!"

"تو اب کیوں میرے ساتھ چلا جا رہا ہے؟" استاد کے لہجے میں چبھن تھی جو میرے دل میں اترتی چلی گئی۔

"جانہیں رہا مجبوری لیجا رہی ہے۔" میں بولا "ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر سکو گے!"

"کیوں؟"

"میں تمھارے لیے سونا بنانے والی مشین ہوں استاد۔" میں ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "مجھے پولیس کے حوالے کر کے تم گھاٹے ہی میں رہو گے۔ مجھے سب معلوم ہے کہ باغوں کے ٹھیکوں میں تم کتنا کماتے ہو پھر تمھارے معیار کی عیاشی کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کم ہے۔"

"تیری بیوی کہاں ہے؟" اچانک ہی وہ پوچھ بیٹھا۔

"اسی شہر میں — اجازت دو تو اسے بھی ساتھ لے لوں۔"

"میں کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا "پتہ بتا دے، میرے آدمی اسے تیرے پاس لے آئیں گے!"

"ٹنڈن جیسے آدمی!" میں نے اپنی من گھڑت کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے زہریلے لہجے میں کہا "وہ دس بھی ہوئے تو اسے ہاتھ نہ لگا سکیں گے!"

"تم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے بارے میں بڑھ چڑھ کر ڈینگیں مارتے ہو۔" بھوپت نے پُرشور قہقہہ مار کر کہا "عدالت میں اس نے تیرے بارے میں ایسی باتیں کی تھیں کہ تو اس دنیا کا انسان معلوم ہی نہیں ہوتا تھا اور اب تو ایک معمولی شوفر کی طرح میرے اشاروں پر کار چلا رہا ہے۔"

جب کار کا رُخ اسٹیٹ ہوٹل کی طرف ہوا تو میں چونک پڑا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید بھوپت سنگھ کو میرے ٹھکانے کا سراغ مل چکا ہے اور اگر میں اتفاقاً کوٹھاری سنز میں اس سے نہ جا ٹکراتا تو اس کے آدمی ہوٹل ہی میں مجھ پر ہاتھ ڈال دیتے۔

ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں کار روک کر ہم دونوں اترے تو آنے والے لمحات کے تصور سے میرا دماغ گھومنے لگا۔ بھوپت کے ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ رقصاں تھی جو میری ہڈیوں تک کو سلگانے کے لیے کافی تھی۔

میں نے اس سے وہیں بھڑ جانے کے امکانات کا جائزہ لیا مگر وہ مردود میری طرف سے پوری طرح باخبر تھا۔

میری اس وقت جان میں جان آئی جب بھوپت سنگھ نے اسٹیٹ ہوٹل کی پہلی منزل پر چابی کی مدد سے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ میں کھلے ہوئے دروازے میں سے اندر گھستا چلا گیا۔

جب بھوپت سنگھ میرے سامنے آیا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا۔

"صفدر علی! اب تیری سلامتی اسی میں ہے کہ پارس پتھر میرے حوالے کر دے اور جلد از جلد بنارس سے جتنی دُور نکل سکتا ہے نکل جا!"

اس کے منہ سے پارس پتھر کا نام سنتے ہی میں یوں اچھلا جیسے بے خیالی میں بجلی کا ننگا تار چھو لیا ہو "پارس پتھر!" میرے منہ سے سرسراتی ہوئی کھوکھلی آواز نکلی۔

"ہاں۔ پارس پتھر کی وہ انگوٹھی جو سیتا کی ماں نے ہمالیہ کی وادیوں میں تیرے حوالے کی تھی۔" بھوپت سنگھ کا ایک ایک لفظ میرے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

"کیسا پارس استاد؟ میں تو صرف کیمیاگر ہوں، کیمیاگر!" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ مجھے اپنا وجود اندر سے کھوکھلا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے الفاظ بے جان اور لہجہ تاثر سے عاری تھا۔ بھوپت سنگھ نے میرے وہم و گمان کے خلاف اچانک میری شہ رگ پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

"میں تجھے مار بھی سکتا ہوں مگر میں بلا وجہ خون خرابہ نہیں کرتا۔" وہ مسکرا رہا تھا اور وسیع القلب فاتح کی طرح مجھے قابل رحم زندگی کی نوید دے رہا تھا "میری رسائی وہاں تک ہے جہاں پرندے پر نہیں مار سکتے۔ عدالت کے ریکارڈ پر سیتا کا بیان ہے کہ اس کی ماں نے تجھے پارس پتھر کے نگ والی انگوٹھی دی تھی۔ حکومت نے اس خبر کو سختی کے ساتھ دبا دیا اور اگر ٹنڈن نہ مارا جاتا تو شاید میری زخم خوردہ انا مجھے سیتا کے کیس کی فائلوں تک نہ لیجاتی۔ اب اپنے ہاتھ سے وہ انگوٹھی اتار کر میز پر رکھ دے اور اس کمرے سے نکل جا ورنہ میں انگلی سمیت وہ انگوٹھی تیرے جسم سے جُدا کر لوں گا!"

"شاید تجھے یہی کرنا پڑے گا بھوپت!" میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا "یہ انگوٹھی میری اب تک کی زندگی کا نچوڑ ہے، تو اتنی آسانی سے اسے حاصل نہ کر سکے گا۔"

"خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا!" بھوپت نے پیچھے سرکتے ہوئے مجھے وارننگ دی۔

"ورنہ تو کیا کرے گا۔" میں پاگلوں کی طرح ہنسا "گولی چلائے گا نا، اس کے شور سے کمرے کے باہر پورا ہوٹل جمع ہو جائے گا اور تیرے لیے جوابدہی مشکل ہو جائے گی۔"

"تو ایک خطرناک اشتہاری مجرم ہے، میں بے دریغ تجھے گولی مار دوں گا۔ تو مجھے لوٹنے میرے کمرے میں آیا اور میں نے اپنی حفاظت میں تجھے قتل کر دیا۔ خبردار وہیں رُک جا!"

غیر ارادی طور پر میرے قدم رُک گئے اور میں کرسی پر بیٹھ گیا "سیتا جانتی ہے کہ میں کوٹھاری سنز گیا ہوا ہوں۔" میں نے اپنی مدافعت میں دوسری چال چلی "مجھے کوئی نقصان پہنچا تو سیتا منظرِ عام پر آ کر اس کا اعلان کر دے گی۔ میرے بغیر وہ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی اور جب رستم اور ہرمز پولیس کے ہاتھ لگیں گے تو ہر ایک کو پتہ چل جائے گا کہ صفدر علی تیرے کمرے میں گھسا تھا یا تو اسے اغوا کر کے لایا تھا۔"

"میں یہ شہر چھوڑ دوں گا، ملک چھوڑ دوں گا۔ پیسہ ہو تو انسان کہیں بھی وطن بنا سکتا ہے۔ میں اب بھی کہہ رہا ہوں کہ انگوٹھی میرے حوالے کر دے، میں تجھے زندہ چھوڑ دوں گا۔"

اس کے تیور خطرناک تھے۔ وہ انگوٹھی حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا! اس کی باتوں سے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کوشش میں وہ میرے قتل سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ میری لاش سے انگوٹھی الگ کرنے کے بعد وہ کمرہ کھول دے گا اور دنیا کا کوئی قانون اسے نہ پکڑ سکے گا۔ سیتا والی دھمکی اوّل تو فرضی تھی، اگر سچ بھی ہوتی تو بھوپت پہلی فرصت میں کہیں روپوش ہو سکتا تھا۔ میں اس وقت بے حد خطرناک صورتِ حال میں پھنس گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انگوٹھی دے دینے کے بعد بھوپت میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا!

میں نے انگوٹھی اتارنے کے لیے ہاتھ سامنے کیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انگوٹھی میرے ہاتھ میں موجود تھی مگر اس کا سیاہ، بدوضع نگ میری لاعلمی میں نہ جانے کہاں گر چکا تھا۔

میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر شاید بھوپت کو بھی معاملے کا کچھ اندازہ ہو گیا اور وہ احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میرے قریب آ گیا "کیا ہوا — کیا بات ہے؟"

"نیتوں کا فتور!" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا "پارس پتھر کہیں گر چکا ہے۔"

اس صدمے سے میری حالت اتنی غیر ہوئی کہ بھوپت نے بحث کیے بغیر میرے بیان کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور ریوالور ہولسٹر میں اڑس کر مجھے دلاسہ دینے لگا۔

"وہ مل جائے گا، ضرور مل جائے گا۔" وہ میری پشت سہلاتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولا "تو نے اسے کب تک انگوٹھی میں موجود دیکھا تھا؟"

"آج دوپہر ہی میں نے اس کے لمس سے سونا بنایا تھا جو میں نے کوٹھاری سنز کو فروخت کیا ہے۔" مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"پھر تو کہاں کہاں گیا تھا؟"

"یہ شہر میرے لیے اجنبی ہے۔ میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا ہوں۔" میں چاندی کی خالی انگوٹھی کو گھورتے ہوئے بولا "نہ جانے وہ پتھر اب کس کس ٹھوکروں میں پڑا ہوگا۔ میرا مقدر تو خراب ہی تھا استاد مگر تم بھی کچھ کم بدنصیب نہیں ہو، تمھاری باری آئی تو پارس ہی کھو گیا!"

"میرے ساتھ چل۔ میں شہر کا ذرّہ ذرّہ چھلنی میں چھنوا دوں گا۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

"اور اسے تجھ سے چھین لوں گا — یہ بھی تو کہو نا استاد!"

"نہیں۔ اب وہ پتھر میری اور تیری مشترکہ ملکیت ہوگی۔ تو اس پتھر کو پہچانتا ہے اور میں اسے ڈھونڈنے کے وسائل رکھتا ہوں۔"

"میں سیتا کو بتا دوں ورنہ وہ میرے انتظار میں پریشان ہوگی۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"اسی ہوٹل کی چوتھی منزل پر۔" میں نے کہا اور ہم دونوں بیک وقت شکست خوردہ انداز میں ہنس پڑے۔

چند ثانیوں قبل ہمارے درمیان بغض اور عداوت کی ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی۔ ہماری راہیں جُدا، ہمارے مفادات متصادم اور ہمارے عزائم متضاد تھے۔ ہم پوری قوت سے اپنے رازوں کی ایک دوسرے سے حفاظت کر رہے تھے مگر تقدیر نے پلک جھپکتے میں ہمیں ایک ہی راستے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اب ہم روئے زمین پر ایک دوسرے کے سب سے زیادہ جاں نثار تھے۔

سیتا نے میری آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ میرے ساتھ ایک خوفناک صورت والے اجنبی کو دیکھ کر وہ قدرے جھجکی مگر میں بھوپت کو اندر لے گیا۔

"یہ میرا دوست اور پرانا آقا بھوپت ہے سیتا۔ تھوڑی دیر قبل ہم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے مگر اب دوست ہیں۔ آج میری انگوٹھی سے پارس پتھر کا نگ کہیں گر گیا ہے، ہم دونوں اسے ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پوری رات میں واپس نہ آ سکوں۔"

میں دانستہ وہاں زیادہ دیر نہیں رُکا۔ مجھے ڈر تھا کہ بھوپت کہیں ٹنڈن کا قصہ نہ چھیڑ دے کیونکہ اس بارے میں میں نے بھوپت کو ایک فرضی کہانی سُنائی تھی۔

ہوٹل سے ہم دونوں سیدھے کوٹھاری سنز پہنچے۔ اس وقت صرف رستم جی وہاں موجود تھا! اس نے ہمیں دوستوں کی طرح آتے دیکھا تو اسے شدید حیرت ہوئی۔

"پیسہ تو کل ملے گا نا بابا!" وہ ہماری آمد کو تقاضا سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"یہاں میرا ایک مقدس تعویز گر گیا ہے، ہم اسی کی تلاش میں آئے ہیں۔" میں نے فرشی قالین پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو۔ ضرور دیکھ لو!"

ہم نے فرش کا ہر وہ حصہ چھان مارا جہاں سے میں گزرا تھا مگر پارس تو کجا ہمیں اس کا سایہ بھی نہ مل سکا۔

اس کے بعد ہم نے پیدل شہر کا وہ تمام حصہ چھان مارا جہاں سے میں دوپہر میں گزر چکا تھا۔ ہم جس انہماک اور توجہ سے زمین کو گھورتے چل رہے تھے اس کی بنا پر کئی منچلے راہگیروں نے فقرے بھی چست کیے مگر اس وقت ہماری ساری خودداری پارس پتھر کے تجسس میں دفن ہو چکی تھی۔

رات کے نو بجے ہم اس ناکام مہم سے نمٹتے ہوئے اس ہوٹل میں پہنچے جس کے ایک کیبن میں بیٹھ کر میں نے لوہے کو سونے میں تبدیل کیا تھا۔

دوپہر والے کیبن میں اس وقت کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے لہٰذا ہم کھلے ہال میں ہی بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کیبن خالی ہو گیا تو ہم اندر جا پہنچے۔ مختصر سا کیبن اس وقت بالکل صاف پڑا ہوا تھا اور اگر پارس پتھر وہیں گرا تھا تو اس کا ابھی تک وہاں پڑا رہنا ناممکن تھا کیونکہ اس قسم کے کیبنوں میں دن میں کئی بار صفائی ہوتی ہے۔

جب سروس بوائے آرڈر کے لیے آیا تو میں نے اس سے صبح والے ویٹر کے بارے میں دریافت کیا۔

"وہ آج کچھ جلدی چلا گیا۔ ویسے اس کی ڈیوٹی صبح سات سے شام کے سات بجے تک ہوتی ہے۔" وہ میز صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تم کب آتے ہو؟" بھوپت نے سوال کیا۔

"میں شام سے صبح کے سات بجے تک رہتا ہوں۔ اس لڑکے سے آپ کو کیا کام ہے بابو جی؟"

"آج دوپہر کو میں اسی کیبن میں اپنا پرس بھول گیا تھا جس میں کچھ قیمتی کاغذات بھی ہیں۔" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"اوہو۔ شاید اس میں رقم بھی ہوگی۔ وہ سالا آج بڑا خوش تھا۔ پیٹ میں درد کا بہانہ کر کے گیا ہے اور کسی شراب خانے میں کتے کی طرح شراب پی رہا ہوگا۔"

"تو نے کبھی کسی کتے کو شراب پیتے دیکھا ہے؟" بھوپت نے غصے سے پوچھا۔ وہ

خود بادہ نوش تھا اسی لیے یہ چھچھوری مثال برداشت نہ کرسکا۔

"نن ... نہیں صاحب!" بھوپت کے لہجے پر وہ بوکھلا گیا۔ "وہ تو میں نے مثال دی تھی۔"

وہ آرڈر لیکر چلا گیا تو بھوپت مجھ سے بولا۔ "حرامزادوں کو خود تو اتنی آمدنی ہوتی نہیں کہ اپنی ضرورتیں بھی پوری کرسکیں اور جو اپنے شوق پورے کرنے کے وسائل رکھتے ہیں ان کی تحقیر کرکے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔ جس دن کتوں نے شراب کو منہ لگا لیا، نیچ ذات پر بھونکنا تک چھوڑ دیں گے۔"

"اسے چھوڑو یار۔" میں رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں اسی وقت اس ویٹر کو پکڑنا چاہیے کہیں لاپرواہی میں وہ اسے ضائع نہ کردے۔"

"یہ کام صبح پر ہی رکھ۔ اب تو میں تھک گیا ہوں۔" بھوپت نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے یہ تو بتا کہ پارس پتھر کا رنگ روپ کیسا ہے؟"

"سفید رنگ کے موتی جیسا گول نگ ہے۔" میں نے سفید جھوٹ بولا۔

ہم مزید کچھ دیر اسی کیبن میں بیٹھے رہے۔ ویٹر آیا تو سرسری طور پر اس سے صبح والے کے بارے میں بات چھیڑی اور میں نے نہایت خوبصورتی سے اس کا نام پتہ معلوم کرلیا! اس ویٹر کو احساس بھی نہ ہوسکا ہوگا کہ اس سے میری ساری گفت گو کا مقصد ہی یہی تھا۔

ہم وہاں سے واپس چلے تو بھوپت خاموش اور فکرمند تھا۔

"استاد! ایک بات میرے ذہن پر کچوکے لگا رہی ہے۔" میں نے اسے اپنی خلش کا شریک بنانا چاہا۔

"کیا؟" وہ یوں چونکا جیسے کسی گہری سوچ میں گم رہا ہو۔

"اگر بنّے کو کیبن سے پارس پتھر ملا تھا تو وہ اس کی اصلیت کیا جانے، اس کے جلد لوٹ جانے کی کوئی وجہ مجھے اپنے حلق سے اترتی نظر نہیں آتی۔" میں نے اس بیرہ کے بارے میں کہا جو دن میں مجھے سرد کرچکا تھا۔

"جیسا تو نے بتایا ہے، سفید اور گول پتھر دیکھ کر اسے شبہ ہوا ہوگا کہ وہ کوئی قیمتی چیز ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے وہ وزنی موتی بازار میں بیچنے کی کوشش کی ہو۔" وہ اچانک بے چین ہوگیا۔ "بیٹھے! گاڑی گھمالے ہمیں اسی وقت ڈبی بازار چلنا ہے۔ دیر کرنے میں خطرہ ہے کہ پارس ہاتھوں ہاتھ اتنی دور نکل جائے کہ ہم اس کا سراغ نہ پاسکیں۔"

میں نے فوراً گاڑی گھمالی۔ پارس کے بارے میں میرے جھوٹ کی بنیاد پر بھوپت نے جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا مگر میں تو اچھی طرح جانتا تھا کہ پارس سیاہ رنگ کا بھونڈا سا ایک پتھر ہے۔ گہرے سیاہ رنگ کے سوا اس میں کوئی بات قابلِ توجہ نہیں تھی۔ وضع اور بھدی ساخت کی بنا پر وہ سینکڑوں سرمئی پتھروں کے ٹکڑوں کی طرح بظاہر بے وقعت نظر آتا تھا مگر بھوپت کے اس فیصلے سے مجھے پورا اتفاق تھا کہ ہمیں فوراً ہی بنّے کو پکڑنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ بھوپت اگر واپس ہوٹل چلا جاتا تو میں اس سے الگ ہوتے ہی تنہا بنّے کا کھوج نکالنے چل دیتا! اس طرح میرا دوہرا فائدہ ہوتا۔ اوّل تو وقت کا زیاں نہ ہوتا، دوئم اگر مجھے پارس پتھر مل جاتا تو میں بھوپت کو صاف جُل دے جاتا اور وہ قیمتی بلکہ نایاب پتھر بلا شرکتِ غیرے میری ملکیت ہوتا۔

بھوپت سنگھ کے لیے کانپور نیا شہر نہیں تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی گاڑی ایک ایسے علاقے میں جا پہنچی جہاں اسے آگے بڑھانا ممکن نہیں رہا تھا۔

"اب کدھر استاد؟" میں نے دائیں بائیں اور سامنے کی تپلی تپلی گلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آگے پیدل چلنا ہوگا۔ ہم سے چوک ہوگئی، گاڑی دور ہی چھوڑنی تھی۔ اس طرح ہم بلاوجہ نظروں میں آئیں گے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ وہ علاقہ سرکاری روشنی سے محروم تھا لہٰذا گاڑی سے اترے بغیر ہمارے پہچانے جانے کا امکان نہیں تھا۔ [illegible] نے گاڑی ریورس گیئر میں پیچھے ہٹائی اور ایک جگہ موقع دیکھ کر اسے واپس گھمالیا۔ اس بار میں تقریباً دو فرلانگ دور ایک کشادہ سڑک کے کنارے رُکا تھا۔

گاڑی لاک کرکے ہم پیدل اسی طرف چل دیے جدھر سے آئے تھے۔ [illegible] بازار اوّل تو نہایت ہی گمراہ کن نام تھا کیونکہ وہاں بازار جیسی کوئی چیز نہیں [illegible] اور متعفن جھونپڑیوں پر مشتمل اس گنجان آبادی کو لسباتے ہوئے غالباً یہ یقین کرلیا گیا تھا کہ ڈبی بازار کا کوئی بھی باسی زندگی بھر گاڑی تو کیا سائیکل بھی نہ خرید سکے گا کیونکہ بل کھاتی ہوئی تنگ گلیوں میں گندے پانی کے کچے جوہڑ اس ترتیب سے بنائے گئے تھے کہ آدمی دس گز بھی سیدھا پیدل چلتا جائے تو کم از کم دو تین جگہ بدبودار پانی سے بھرے ہوئے ننھے ننھے گڑھوں میں گرنا ضروری تھا۔ [illegible] جگہ جھونپڑیوں سے باہر کھلی فضا میں سونے کے شوقین لوگوں کی چارپائیوں نے گھیری ہوئی تھی اور مجموعی طور پر وہ جگہ آبادی کے بجائے چوتھے درجے کی [illegible] سرائے کا منظر پیش کررہی تھی۔

اس اندھیرے میں ہمیں اتنی مرتبہ رُخ بدلنا پڑا کہ راستہ میرے ذہن سے نکل گیا۔ آخرکار ہم آبادی کے وسط میں ایک نسبتاً کشادہ حصے میں آنکلے جہاں حکیم ہری چند کے بڑے سے بورڈ پر ایک برقی قمقمہ آخری سانس لے رہا تھا۔

یہاں آکر بھوپت کی مہارت جواب دے گئی اور اس نے کسی سے بنّے خان کا مکان دریافت کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک طرف حقہ نوشی میں مصروف لوگوں کے اجتماع کا رُخ کرنے کی نیت رکھتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا اور اسے ساتھ لیکر حکیم ہری چند والے بورڈ سے داہنی طرف گھوم گیا۔

اس گلی میں جھونپڑیاں بھی کشادہ تھیں۔ شاید اسی وجہ سے گلی میں چارپائیوں کا میلہ نظر نہیں آرہا تھا۔ گلی کے ساتویں مکان کے دروازے پر ذرنی[illegible] جھول رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ بنّے خان گھر پر موجود نہیں ہے۔

"دروازہ ٹین کا ہے استاد!" میں نے چٹائیوں کی آڑ میں ہوکر سرگوشی کی۔ "یہاں تک آئے ہو تو تلاشی ہی لے لیں۔ شاید سالے نے وہ پتھر لاپرواہی سے یہیں ڈال رکھا ہو!"

"آزمانے میں کوئی حرج نہیں۔"

اسی وقت کوئی نرم سی چیز پوری قوت سے میرے پیروں سے ٹکرائی [illegible] ایک بلی آوازیں نکالتی کسی طرف بھاگتی چلی گئی۔ میں اضطراری طور پر اچھل کر [illegible] چٹائیوں سے جا ٹکرایا۔

"کون ہے؟" فوراً ہی اس جھونپڑی سے ایک سخت گیر نسوانی آواز گونجی۔

"بنّے خان کا گھر یہی ہے کیا؟" بھوپت نے زور سے میرا شانہ دبا کر الٹا سوال داغ دیا۔

اور اندر سے جو جواب آیا وہ نہایت بلیغ تھا۔ "اس حرامی کا میرے گھر میں کیا کام۔ برابر والا دروازہ دیکھ بھائی۔"

بھوپت نے بڑھ کر تالے کے بجائے ٹین کے دروازے میں لگے ہوئے کنڈے پر زور آزمائی کی اور دو تین ہی منٹ میں کنڈا تالے اور کیلوں سمیت اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔

ہم دونوں دروازہ کھول کر پھرتی سے اندر گھس گئے اور دروازہ دوبارہ بند کردیا۔

اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا کر ہم پلٹے تو ایک حیرتناک منظر ہمارا منتظر تھا۔ جھونپڑی میں لالٹین کی زردی مائل سرخ روشنی میں سارا سامان بے ترتیبی میں بکھرا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہورہا تھا جیسے کسی نے جلدی میں سامان کی تلاشی لی ہو اور جھونپڑی کی عقبی دیوار بلکہ چٹائیوں کا نچلا حصہ لوٹا ہوا تھا جس میں سے ایک آدمی باآسانی گزر سکتا تھا۔

ہم نے نظروں ہی نظروں میں خیالات کا تبادلہ کیا اور ایک لحظہ بھی وہاں رُکے بغیر باہر نکل آئے اور تیزی سے واپس چل دیے۔

آبادی سے باہر آنے تک ہم بالکل خاموش رہے۔ سناٹے میں آتے ہی بھوپت زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارا۔ "شاید کوئی اور بھی پارس پتھر کی تلاش میں ہے۔ ہمیں گہری چوٹ ہوئی ہے۔"

"لالٹین کا روشن ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہوٹل سے چھٹی کرکے بنّے خان سیدھا گھر آیا تھا۔ گھر کی تلاشی اس کے جانے کے بعد ہی لی گئی ہے۔ پچھلی چٹائیاں توڑ کر کوئی آدمی ہی اندر گھسنے کی جرأت کرسکتا ہے جو اس علاقے سے پوری واقف ہو!"

"ہاں۔ وہاں تو اس طرح دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے کہ سانس کی آواز بھی تین گھروں دور سُنی جاتی ہوگی۔ یہ تو کسی دیکھے بھالے آدمی کا ہی کام معلوم ہوتا ہے۔" وہ بُری طرح بھنایا ہوا تھا۔

"بنّے خان شراب پینے گولڈن بار جاتا رہتا ہے، اسے وہیں دیکھنا چاہیے۔" میں نے تجویز پیش کی اور وہ راضی ہوگیا۔

اس وقت مجھے بھوپت کی ایک بہت بڑی کمزوری کا علم ہوا۔ چوٹ کھانے کے بعد غصے میں اس کے حواس قابو سے باہر ہوجاتے تھے اور وہ سمجھنے یا فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم ہوجاتا تھا۔

گولڈن بار کی مہم بھی ناکامی پر منتج ہوئی۔ وہاں بنّے خان کی بارمین سے خاصی یاری تھی! اس کی زبانی علم ہوا کہ بنّے پچھلے کئی دنوں سے ادھر نہیں آیا ہے۔

بنّے کی گمشدگی اور اس کے مکان کی تلاشی نے حالات کو ایک نیا موڑ دے دیا تھا۔ مجھے بھوپت کی اس بات پر یقین آنے لگا تھا کہ کوئی اور بھی پارس پتھر کا رازدان نکلا ہے اور بظاہر بنّے خان اس معمّے کی اہم کڑی نظر آرہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگر ہم کسی بھی طرح بنّے خان تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں تو پارس پتھر کا سراغ مل جائے گا۔

اس سلسلے میں رہ رہ کر ایک خیال مجھے پریشان کررہا تھا۔ بھٹ گرہ سے میں اپنی دانست میں بے نیل و مرام واپس ہوا تھا مگر راستے میں اتفاقاً انکشاف ہوا کہ سندری کی دی ہوئی انگوٹھی میں نگ کی جگہ وہ پارس پتھر جڑا ہوا ہے جس کی تلاش میں، میں دشت و جبل کی خاک چھانتا پھرا تھا۔ شاید بنّے اس معاملے میں خوش نصیب تھا اور اسے فوراً ہی کسی اتفاق کے تحت اس پتھر کی خاصیت کا علم ہوگیا اور وہ میرا گمشدہ پارس پتھر لے کر کہیں روپوش ہوگیا۔

اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ ہم دوبارہ اسی ہوٹل کا رخ کریں جہاں بنّے خان کام کرتا تھا اور وہاں کسی کو رشوت دے کر بنّے خان کے ٹھکانے کا کھوج نکالیں۔

وہاں پہنچے تو دور ہی سے ہوٹل میں کئی پولیس والے موجود نظر آئے۔ باہر ان کی ایک گاڑی بھی موجود تھی۔ میں نے فوراً ہی گاڑی ایک گلی میں گھمالی۔ اس ہوٹل پر پولیس کی موجودگی کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ نظر آرہی تھی اور اب میں پولیس سے حتی الامکان دور ہی رہنا چاہتا تھا۔

"ابے بھاگ کیوں رہا ہے؟" بھوپت غرایا۔ "پولیس پھاڑ تو نہیں کھائے گی، دور رہ کر ہی پتہ چلائیں گے کہ کیا قصہ ہوا ہے؟"

"نہیں میرے باپ! ہرگز نہیں!" میں بوکھلا کر بولا۔ "میں آج دو بار اس ہوٹل میں جاچکا ہوں، تیسری بار کسی نے پہچان لیا تو سارے اگلے پچھلے گناہ گلے پڑجائیں گے۔ میں تو ادھر کا رُخ بھی نہیں کروں گا۔"

"دراصل ہم دونوں الو کے پٹھے ہیں۔" وہ اچانک دھیمی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "سچ بتا کیا تجھے امید تھی کہ کانپور جیسے شہر میں کھوئے ہوئے ایک ننھے سے پتھر کا یوں سراغ مل جائے گا؟"

"میری ولدیت کے بارے میں تم اتنے وثوق سے بات کرنے کا حق نہیں رکھتے استاد!" میں اسے گھور کر بولا۔

"ابے یہ جواب ہے میری بات کا؟" اس کے لہجے سے ظاہر ہورہا تھا کہ اس نے کم از کم مجھے وہ گالی حقیقی معنوں میں نہیں دی تھی۔

"بس موہوم سی امید تھی۔" میں نے کہا۔ "امید نہ ہوتی تو تمھارے ساتھ شہر بھر میں دھکے کیوں کھاتا پھرتا!"

"جب ہم دونوں ہوٹل میں گئے تھے، ہمیں اسی وقت بنّے کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنی تھیں۔ اگر ہم سے پہلے وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

"اس وقت مجھے وہم بھی نہ تھا کہ وہ پتھر بنّے کو ملا ہوگا یا اسے اس کی حقیقت کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔"

"یقین سے تو ہم اب بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔" وہ بولا۔ "ہوسکتا ہے کہ پولیس کی آمد کا کوئی دوسرا ہی سلسلہ ہو مگر یہ بنّے سالا کہاں غائب ہوگیا؟"

"اس شہر میں تمھارے کچھ آدمی ہیں؟" میں نے چند ثانیوں کے توقف

کے بعد پوچھا۔

"بس میرا منشی ہے۔" وہ چونک کر بولا۔ "کیوں آدمیوں کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

"وہ ایک ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہوٹل واپس پہنچ کر تم اسے بنّے کے ہوٹل بھیجو، ہمارے مقابلے میں نیا آدمی زیادہ معلومات جمع کر سکتا ہے۔ وہ ہوٹل ویسے بھی رات بھر کھلا رہتا ہے۔"

بھوپت یہ تجویز سُن کر اچھل پڑا۔ "ایسی ترکیبیں تو سالا لاسنڈن بھی نہیں سوچتا تھا، آج سے تو میرا پکا یار ہے!"

"جوش کی یاری بلبلوں کی دیوار ہوتی ہے استاد! ہمارا واسطہ بس پارس پتھر میں شراکت کا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

باتوں ہی باتوں میں ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ بھوپت کا منشی اسٹیٹ ہوٹل کی پہلی منزل پر اس سے چوتھے کمرے میں مقیم تھا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ سوتے سے یوں اچانک اٹھایا گیا تو بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا! اس کے منہ سے چند بے ربط باتیں سُن کر بھوپت کو غصہ آگیا۔ اپنے تنخواہ دار ماتحتوں کے حق میں وہ بلا کا سخت گیر اور بے رحم آدمی تھا! اس نے منشی کو بازو سے پکڑ کر باتھ روم میں دھکیلا اور اس پر ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا۔

ٹھنڈے پانی کی پہلی ہی بوچھار میں اس کی گھگھی بندھ گئی اور نیند کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ کپڑے پانی میں بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گئے تھے۔

"کپڑے بدل کر دو منٹ میں باہر آجا ورنہ کھال گرا دوں گا۔" بھوپت تولیے سے اپنے ہاتھ وغیرہ خشک کرتا ہوا باتھ روم سے نکل آیا۔

منشی بے چارہ دو منٹ سے بھی کم وقفے میں عجیب ہیئت میں باتھ روم سے آگیا۔ بھوپت نے اسے نہایت تفصیل سے اس کا کام سمجھایا۔ اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ پولیس وہاں کیوں آئی تھی اور اگر پولیس کی آمد کا تعلق بنّے خان کی ذات سے تھا تو اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی تھیں۔

منشی چلا گیا تو میں بھی چوتھی منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں سیتا سخت بے زاری کے عالم میں میری منتظر تھی۔

"آگیا، فرصت مل گئی تجھے پارس پتھر کی تلاش سے؟" وہ میری صورت دیکھتے ہی برس پڑی۔

"شش!" میں نے بوکھلا کر اسے اشارہ کیا اور دبی ہوئی آواز میں بولا۔ "پارس کا بھول کر بھی نام نہ لینا، ان کمروں کی آواز باہر تک سُنائی دیتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں!" وہ تن کر میرے مقابل آگئی۔ "تجھے کچھ ہوش ہے میرے کھانے پینے کا؟ یہی وعدے کر کے لایا تھا مجھے، اس سے تو میں ماں کے پاس ہی بھلی تھی۔"

"کھانا منگا لیا ہوتا جان!" میں مسہری پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔ "میں سارے شہر کی خاک چھان کر آرہا ہوں اور اب تیرے کھانے کی فکر کروں!"

"خاک چھاننا تو شاید تیرا مقدر ہی بن گیا ہے!" وہ فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ "جنگل، پہاڑ، دلدلیں، دریا، مندر، ویرانے اور اب شہروں کی خاک چھاننے کی باری آئی ہے۔"

اس کی بات بہت کڑوی مگر ادا دلربا تھی۔ میں نے اٹھ کر ہنستے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "اس وقت میں صرف تیری وجہ سے یہاں آیا ہوں۔ پارس پتھر ملنے کی ذرا سی امید بندھی ہے۔ شاید میں رات بھر باہر مصروف رہوں گا.....!"

"یہ رات کا باہر رہنا مجھے پسند نہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "باہر کے کام دن کے اُجالے میں اچھے لگتے ہیں، رات آرام کے لیے بنائی گئی ہے۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا اور آنکھیں پھاڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "تو پلی بڑھی تو جنگلوں میں ہے اور باتیں شہری عورتوں جیسی کرتی ہے۔"

"اگر تو جا رہا ہے تو میں بھی شہر گھومنے نکل رہی ہوں، صبح تجھ سے پہلے لوٹ آؤں گی!"

"یہ شہر نیا ہے، راستے نئے ہیں، تو یہیں آرام کر، میں کل تجھے شہر گھماؤں گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں جس راستے سے ایک بار گزر جاؤں وہ ساری عمر مجھے یاد رہتا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "تجھے میری فکر کی ضرورت نہیں۔"

"اوہ!" میں اچانک ہنس دیا۔ "تجھے اس کمرے میں اکیلے سوتے ڈر لگ رہا ہوگا!"

"سندری کی بیٹی نے ڈرنا سیکھا ہی نہیں۔" وہ بنیادی طور پر معصوم تھی۔ بس میرے ایک ہی طعنے پر اس کی ذہنی رو بہک گئی۔ "اب تو رُکنا بھی چاہے گا تو میں تجھے باہر نکال دوں گی۔ میں تنہا اس کمرے میں سوؤں گی۔ میرا نام سیتا ہے سیتا!"

"شہر نہیں گھومے گی؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"شہر کی ایسی کی تیسی!" وہ مُکا فضا میں لہرا کر بولی۔ "تو نے مجھے ڈرپوک کہا ہے، اب تو میں اسی کمرے میں رات گزاروں گی۔"

"بھوک زور کی لگی ہے؟" مجھے یاد آیا کہ بنارس سے خریدے ہوئے خشک غذا کے چند ڈبے ابھی تک میرے سامان میں موجود ہیں۔

"کچھ مل جائے گا تو کھاؤں گی۔" وہ سوچ کر بولی۔

میں نے چند ڈبے کاٹ کر خود بھی اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس دوران وہ مجھ سے ایسی من موہنی باتیں کرتی رہی کہ میرا جی چاہا کہ پارس پتھر پر لعنت بھیج کر وہ رات سیتا کی زلفوں کے سائے میں گزار دوں مگر سیتا میری بیوی تھی، محبوبہ نہیں جو ایک بار آجائے تو جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور جب چلی جائے تو اس کے کبھی نہ آنے کا پورا یقین ہوتا ہے!

"تو پھر تو اکیلی ہی سوئے گی؟" کھانے سے نمٹ کر میں نے مکارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں!" اس نے مختصر سا جواب دیا اور میں باہر نکل آیا۔

پہلی منزل پر بھوپت سنگھ کسی بھوکے شیر کی طرح بپھرا ہوا اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔ "چالیس منٹ ہو گئے اور وہ حرامزادہ ابھی تک نہیں پلٹا۔"

"وہ ہوٹل یہاں سے کافی دُور ہے استاد، ابھی تو وہ پہنچا بھی نہ ہوگا! اتنی رات گئے سواری ملنا بھی تو مشکل ہے۔" میں نے اپنی دانست میں مظلوم منشی کی وکالت کی۔

"سواری!" استاد حقارت سے بولا۔ "وہ میرا منشی ہے کسی چوڑے چمار کا نہیں، وہ خود اپنی کار رکھتا ہے۔ اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔"

"وہ کام پورا کر کے ہی آئے گا، تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ تھوڑی دیر آرام کر لو ہو سکتا ہے یہ رات بھاگ دوڑ ہی میں گزر جائے۔"

"منشی پورا خبط الحواس ہے۔" وہ اچانک کچھ سوچ کر ہنس دیا۔ "پتہ نہیں نیند کے خمار میں ہوٹل کا پتہ سمجھ بھی گیا تھا یا اب پورے شہر میں چکراتا پھر رہا ہوگا!"

"تم بھی عجیب ہو استاد۔ لوگوں کو مرعوب اور دہشت زدہ کر کے لطف اٹھانا شاید تمہارا شوق ہے۔ اگر پتہ نہ ملا تو وہ لوٹ ہی آئے گا۔"

"ہرگز نہیں!" وہ پورے یقین کے ساتھ بولا۔ "اسے ہوٹل ڈھونڈنے میں چار دن بھی لگ جائیں تو اب وہ پوری معلومات جمع کیے بغیر نہیں لوٹے گا۔"

"جب تم یہ جانتے ہو تو بلاوجہ بے چین کیوں ہو رہے ہو؟"

"اکیلا پن مجھے کھانے کو دوڑتا ہے۔ میرے ساتھ جب تک ایک دو آدمی نہ ہوں دل نہیں لگتا۔ اب تو آگیا ہے تو مجھے کوئی پریشانی نہیں۔"

"شادی کر لو، یہ بات جاتی رہے گی!"

وہ زور سے ہنسا۔ "شادی تو ہر رات ہی کرتا ہوں، صبح طلاق ہو جاتی ہے مگر جب سامنے کام آجائے تو بھوپت حسینۂ عالم کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔"

"کاش تم پہلے ملے ہوتے!"

"تو کیا ہوتا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں تمھیں بتاتا کہ صفدر علی کیا شے ہے مگر زندگی میں ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے جب یہ سارے کھیل اپنی دلکشی کھو دیتے ہیں۔" میں اچانک جذباتی ہو گیا۔ "آدمی چاہتا ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو، اس کی اپنی بیوی ہو جو اس کے ہر حکم کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ یہ احساس انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتا ہے کہ وہ پورے طور پر کسی کے تحفظ اور کفالت کا ذمہ دار ہے۔"

"فلسفہ بھی بگھار لیتا ہے۔" وہ پھر ہنسا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر آنے والا بھوپت سنگھ کا منشی تھا۔

"کیا ہوا؟" بھوپت نے دروازہ بند کرتے ہوئے تجسّس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ مارا گیا!" منشی ایک گہرا سانس لیکر بولا۔ "پیپل گلی میں کسی نے پسلیوں میں چھرا مار کر اسے ختم کر دیا۔"

"ابے کسے ختم کر دیا؟" بھوپت نے اسے گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"بنّے خان۔ اس کی لاش پولیس کے قبضے میں ہے۔" منشی جلدی سے بولا۔

یہ سنتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں سست پڑ گئیں۔ اپنی کھوئی ہوئی پونجی ملنے کی جو ایک آس بندھی تھی، اس خبر نے وہ آس بھی توڑ دی تھی۔

منشی کی زبان سے جیسے ہی یہ انکشاف ہوا کہ پیپل والی گلی میں چھرے سے ہلاک ہونے والا بنّے خان تھا بھوپت نے منشی کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور گریبان کو جھٹکا دے کر اسے ایک کونے میں پھینک دیا جیسے بنّے خان کے قتل کا ذمہ دار منشی ہی رہا ہو۔!

اس وقت بھوپت کی حالت قابلِ دید تھی۔ غصے اور بے بسی کے عالم میں اس کی زبان سے ایسی ایسی نادر الوجود گالیاں امڈ رہی تھیں جو عملی طور پر قطعی ناممکن تھیں۔ منشی بے چارا صوفہ میں سہما سکڑا، خوفزدہ نظروں سے استاد بھوپت کو تکے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی ہلکی سی شکن تک نہیں تھی۔ بھوپت کے ملازمین شاید ایسے سلوک کے عادی تھے، اسی وجہ سے وہ بھوپت کی بے جا زیادتیاں برداشت کر لیتے تھے۔ ورنہ عام حالات میں بھوپت کو اپنے گرد ایک دو آدمی بھی جمع رکھنا محال ہو جاتا۔!

گو ابھی تک مجھے ایسا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جس کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جا سکے کہ میری انگوٹھی سے گرنے والا پارس پتھر کا نگ بنّے خان ہی کو ملا تھا مگر واقعات کا رخ اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بنّے خان کی ہوٹل سے غیر معمولی انداز میں جلد روانگی، اس کی جھونپڑی میں تلاشی کے آثار کا پایا جانا، پھر اس کی لاش کی دستیابی کی خبریں ایک ہی معاملہ کی کڑی تھیں!

تلاشی اور بنّے خان کے قتل سے کم از کم ایک بات اور واضح ہو رہی تھی۔ اگر پارس پتھر بنّے خان ہی کو ملا تھا تو اس کے علاوہ کوئی اور بھی اس راز سے واقف تھا اور بنّے خان محض پارس پتھر ہی کی وجہ سے مارا گیا تھا۔

"وہ کیسے مارا گیا؟ کس نے مارا اُسے؟؟" اچانک کمرے میں بھوپت سنگھ کی دبی دبی مگر غضبناک غراہٹ گونجی۔ وہ منشی کے مقابل کھڑا اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔!

"پپ... پتہ نہیں استاد!" وہ ہکلایا۔

"دور بیٹھ کر بات کرو استاد!" میں نے بھوپت کا شانہ دباتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "اسے بدحواس کیوں کیے دے رہے ہو، بنّے خان کے قتل میں بھلا اس بے چارے کا کیا قصور ہے!"

بھوپت سنگھ نے مڑ کر مجھے گھورا پھر مسہری پر آبیٹھا اور آنکھ سے مجھے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب منشی سے مجھے بات کرنی ہے۔!

"بنّے خان کی موت کی اطلاع کیسے ملی منشی؟" میں نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"پولیس والوں کو اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش پیپل گلی کے ایک ویران گوشے میں پڑی ملی تھی۔ لاش کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ شاید قاتل اس کے پاس کسی چیز کی تلاش میں تھا۔ پولیس نے ایک بل کے ذریعہ ہوٹل کے نام کا سراغ لگایا۔ وہ بل بنّے خان کی ایک جیب سے نکلا تھا۔ پھر پولیس بنّے خان کے مکان پر گئی۔ اس کا سارا سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ کسی نے جلدی میں وہاں کی بھی تلاشی لی تھی۔ اس کے بعد پولیس نے ہوٹل پر ڈیرہ ڈال دیا۔ ملازمین کے بیانات لیے جا چکے ہیں

اور بس اتنا ہی پتہ چلا ہے کہ بنّے خان پیٹ میں درد کی شکایت کی بنا پر ہوٹل سے جلدی چلا گیا تھا۔ ایک بیرا نے یہ بھی بتایا ہے کہ بنّے کے چلے جانے کے بعد دو آدمی ہوٹل میں اس کے کھوج میں آئے تھے۔ ان میں سے ایک کا کہنا تھا کہ دوپہر میں وہ اپنا بٹوہ اس کیبن میں بھول گیا تھا جہاں بنّے خان کی ڈیوٹی تھی۔ وہ دونوں بنّے خان کے گھر کا پتہ معلوم کر کے چلے گئے تھے۔" منشی مشینی انداز میں بغیر رکے کہتا چلا گیا۔!

میری اور استاد بھوپت سنگھ کی نگاہیں چار ہوئیں۔ معاملہ خاصا سنگین ہو گیا تھا۔ ہمارے ستارے اچھے ہی تھے جو ہوٹل پر پولیس کو دیکھتے ہی میں نے ادھر کا رخ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ورنہ ہمیں بنّے خان کا پتہ ٹھکانا بتانے والا بیرا ہمیں فوراً ہی پہچان لیتا۔ اور ہم دونوں اسی وقت دھر لئے جاتے۔ بھوپت سنگھ تو شاید کسی نہ کسی طرح بچ ہی نکلتا مگر میری گلوخلاصی ناممکن ہو جاتی کیونکہ میں پولیس کو اپنا کوئی پتہ تک نہیں بتا سکتا تھا۔ پھر شاید جلد ہی مجھے سیتا کے معاون کی حیثیت سے پہچان لیا جاتا اور میرے ہی ساتھ سیتا بھی ناقابلِ تصور دشواریوں کا شکار ہو جاتی!

"دو گھنٹہ میں بس یہی معلوم ہوا ہے؟" اس بار بھوپت نے منشی کو للکارا۔

"ایک بات اور پتہ چلی ہے استاد!" وہ جلدی سے بولا۔ "بنّے کے جانے کے بعد سے ہوٹل کا ایک باورچی بھی غائب ہے۔ جب بیان کے لئے اس کی باری آئی تو پتہ چلا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ اس کی ڈیوٹی ہوٹل میں رات کے بارہ بجے تک ہوتی ہے۔ باورچی خانہ میں کام کرنے والے ایک مددگار نے بتایا کہ وہ شام چھ بجے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے جلدی میں کہیں گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں لوٹ آئے گا مگر ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔!"

"نام کیا ہے اس باورچی کا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"دیوان داس!" منشی نے کہا۔ "مگر استاد! یہ بتا دوں کہ پولیس دیوان داس کو اہمیت نہیں دے رہی اب ان کا سارا زور ان دو آدمیوں کی تلاش پر ہے جو بٹوہ تلاش کرتے ہوٹل پر پہنچے تھے۔!"

منشی کی یہ بات خاصی منطقی تھی۔ پولیس کہیں کی بھی ہو مسائل کے حل کے لئے مختصر ترین اور سب سے آسان راستہ اپناتی ہے۔ انھوں نے بنّے خان کے قتل کے بارے میں یہ فرض کر لیا ہوگا کہ بٹوے میں بھاری رقم موجود تھی جو بنّے کے ہاتھ لگی اور وہ خوشی میں ہوٹل سے چلا گیا۔ جب بٹوہ کے مالک کو رقم کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ بنّے کی تلاش میں ہوٹل پہنچا۔ ان دونوں کو بنّے خان ہوٹل پر موجود نہ ملا تو وہ ڈبی بازار گئے رقم کی تلاش میں بنّے خان کی جھونپڑی کا سامان تہہ و بالا کیا اور جب ادھر سے بھی ناکامی ہوئی تو کسی نہ کسی طرح انھوں نے بیل گلی میں بنّے خان کو جا لیا۔ اس نے رقم اور بٹوہ سے لاعلمی کا اظہار کیا ہوگا اور جب ان دونوں نے اس کی جامہ تلاشی لینے کی کوشش کی تو بنّے نے مزاحمت کی ہوگی۔ لہٰذا ان دونوں میں سے کسی نے بنّے خان کو ہلاک کر دیا اور لاش کی جامہ تلاشی کے ذریعے اپنا بٹوہ اور رقم حاصل کر کے بھاگ نکلے۔ گویا اب پولیس کی نظروں میں بنّے خان کا قاتل استاد بھوپت سنگھ تھا یا میں!

"اس بیرے نے ان دونوں آدمیوں کا کیا حلیہ بتایا ہے؟" بھوپت سنگھ نے گہری سوچ کے دوران میں منشی سے سوال کیا۔

"وہ بیرا پولیس کو بیان دینے کے بعد باہر اپنے ساتھیوں کو ساری روداد سنا رہا تھا۔" منشی ڈرتے ڈرتے بولا "ان میں سے ایک آدمی کا حلیہ تو تم سے ملتا جلتا ہے استاد، دوسرا آدمی دراز قامت کسرتی بدن کا مالک خوبرو جوان تھا۔" آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے اس نے معنی خیز نظروں سے میرا جائزہ لیا تھا۔

بھوپت نے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد منشی کو اس کے کمرہ میں بھیج دیا۔ منشی کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک کمرہ میں گمبھیر خاموشی چھائی رہی جسے بھوپت ہی نے توڑا۔

"اب کیا کرنا ہے۔؟"

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے!" میں سگریٹ کا ٹکڑا جوتے کے نیچے مسلتے ہوئے بولا۔ "جتنی تاخیر ہوگی پارس ہماری دسترس سے اسی قدر دور نکلتا جائیگا۔"

"دیوان داس کا کھوج نکالا جائے؟"

"اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔!"

ایکبار پھر منشی کی طلبی ہوئی۔ استاد بھوپت نے پھاڑ کھانے والے انداز میں اس سے دیوان داس کا پتہ معلوم کیا اور یہ غنیمت ہوا کہ منشی اس گمشدہ باورچی کا پتہ نکال لے آیا تھا۔!

سیتا کو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ساری رات ہوٹل سے باہر بھاگ دوڑ میں گزرے گی لہٰذا ہم دونوں فوراً ہی ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔

دوکانوں پر مشتمل وہ علاقہ اتنی رات گئے ویران پڑا ہوا تھا۔ آس پاس اکا دکا آوارہ کتوں کی نیم دلانہ غراہٹیں ہی اس علاقے میں زندگی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ استاد کی کالی مرسیڈیز سست روی سے سڑک پر بڑھی جا رہی تھی کہ اچانک میری نظر جین ویئر ہاؤس کے بڑے سے بورڈ پر پڑی اور میرے اشارہ پر استاد نے اچانک بریک لگا دیئے۔!

دیوان داس اسی دوکان سے ملحق گلی میں کسی کوٹھری میں رہتا تھا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ بھوپت آہستہ رفتار سے گاڑی اسی سڑک پر گھماتا رہے گا یا اسے کسی ایسی جگہ روک دے گا جہاں وہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے۔ مجھے تنہا دیوان کی کوٹھری میں جانا تھا وہاں سے باہر آکر میں ماچس کی تیلی جلا کر اشارہ دیتا اور استاد گاڑی لے کر آپہنچتا۔ اور اگر میں اس کوٹھری میں کسی افتاد کا شکار ہو جاتا تو استاد دس منٹ انتظار کرنے کے بعد خود بھی وہاں آپہنچتا۔

مجھے امید تھی کہ پولیس اپنی دانست میں بنّے خان کے قتل کی گتھی سلجھانے کے بعد زیادہ مستعدی کا مظاہرہ نہیں کرے گی اور اتنی رات گئے محض رسمی کارروائی کی خاطر دیوان کی کوٹھری کا رخ نہیں کرے گی۔

گلی میں اسٹریٹ لائٹ کی ناکافی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس کے سہارے نالیاں وغیرہ عبور کرتا ذرا ہی دیر میں داہنی قطار کی ساتویں کوٹھری کے سامنے جا پہنچا۔ مجموعی طور پر یہاں بھی سناٹے کا راج تھا۔ تقریباً تمام کوٹھریاں باہر سے مقفل تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گلی میں بھی تمام تر دوکانیں وغیرہ ہیں شاید

ایک آدھ بے گھر دوکاندار کاروبار ختم کرنے کے بعد دوکان میں ہی پڑ رہتا ہو، ورنہ وہ جگہ کسی طرح رہائش کے قابل نہیں تھی۔!

چند ثانیوں تک میں اس غیر مقفل کوٹھری کے سامنے کھڑا اندر کی آہٹ لیتا رہا مگر وہاں تو گہرے سناٹے کا راج تھا۔ گہرا اور مکمل سناٹا۔!

پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چوبی دروازہ پر آہستہ سے دستک دی اور جواب کا منتظر رہا۔ مگر جواب ندارد! دوسری دستک ذرا تیز تھی اور اس بار اندر سے کسی کی کرخت مگر خوابیدہ سی آواز ابھری "کون ہے... بھاگ جاؤ، مجھے نیند آرہی ہے!"

"کنڈی کھولو، میں دیوان داس ہوں!" میں نے اپنا منہ دروازہ کے قریب لا کر اس طرح سرگوشی کی کہ اندر والے کو میری آواز پر شبہ نہ ہو! پھر فوراً ہی میرا دل دھڑک اٹھا۔ اگر بولنے والا خود دیوان داس ہوا تو کیا ہوگا؟

مگر کیسا شبہ۔ اسے تو فوراً ہی یقین آگیا۔ شاید نیند نے اس کے حواس کو بالکل ہی مفلوج کیا ہوا تھا۔ اندر سے آہٹ کے ساتھ ہی اس کی بھاری آواز ابھری "تو کیوں آگیا رے، کیا ٹرین نہیں ملی؟"

میں جواب دیئے بغیر سانس روکے کھڑا رہا۔ اس کے تبصرے پر میرا دل بلیوں اچھل پڑا تھا۔ ٹرین کے تذکرہ سے ظاہر تھا کہ دیوان داس اندر موجود نہیں ہے اور جو کوئی بھی بول رہا ہے اسے یہ معلوم ہے کہ دیوان داس ٹرین سے کہیں جانے والا تھا۔

جوں ہی دروازہ کی کنڈی کھلی میں پٹ دھکیل کر اندر گھستا چلا گیا۔ اندر موجود شخص لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا اور میں نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔

دیوار پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر ہلکی روشنی کا دودھیا بلب جل رہا تھا۔ اس روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ کوٹھری میرے اندازہ کے عین مطابق پرچون کی دوکان ہے اسی کے عقبی حصہ میں فرش پر بستر لگا ہوا تھا، دوسرا بستر لپٹا ہوا دیوار کے کنارے رکھا ہوا تھا۔

"کک... کون ہے؟" میرا مقابل گرتے ہوئے خوفزدہ آواز میں بولا۔

"دیوان داس کہاں ہے؟" میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر فرش سے اٹھاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجہ میں سوال کیا۔

وہ ادھیڑ عمر، اوسط قامت اور اعصاب زدہ سا شخص تھا۔ اس کا چہرہ مقابل آتے ہی شراب کا تیز بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔!

"تم کون ہو؟" اس نے خوفزدہ لہجہ میں اپنا سوال دہرایا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں دہشت کے باعث حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔

"تیرا باپ!" میں نے اس کی گردن پر گرفت جمایا اور وہ کراہ کر آگے کو جھک گیا۔ "دیوان داس ٹرین سے کہاں گیا ہے؟"

"پتہ نہیں... مم... مجھے پتہ نہیں!" وہ میرے جارحانہ رویہ سے بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔

میں نے اچانک اپنی پتلون کی جیب سے بھوپت سنگھ کا دیا ہوا ریوالور نکال لیا "مجھے فرصت نہیں ہے!" میں نے ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر ٹکا کر کہا، میرا لہجہ دھیما مگر درشت تھا۔ "اگر دو منٹ میں دیوان کا پتہ نہیں بتایا تو میں تیرا بھیجہ اڑا دوں گا۔"

"نہیں نہیں!" وہ ایکدم گھگھیانے لگا "مجھے نہ مارو، وہ مجھے زبان بند رکھنے کے لئے پانچ ہزار روپے دیکر گیا ہے، میں اس کا ٹھکانا نہیں بتا سکتا۔"

یہ سن کر اچانک میرا خون کھول اٹھا۔ دیوان جیسا قلّاش باورچی اسے زبان بندی کی قیمت کے طور پر پانچ ہزار روپے دیکر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ نہ صرف پارس پتھر حاصل کر چکا ہے بلکہ اس سے سونا بنا کر بیچ بھی چکا ہے!

میں نے نال سے اس کی پیشانی پر ضرب لگائی اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر نیچے لڑھک گیا۔ اس کی چیخ میرے اعصاب پر بم کی طرح گری اور میں نے بیدردی سے اس کے نرخرے پر پیر رکھ دیا۔ میرے کان باہر سے ابھرنے والی کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ اس گلی میں اگر کوئی موجود تھا تو اس نے وہ چیخ ضرور سن لی ہوگی۔

میری پوری توجہ باہر مرکوز تھی۔ جب کئی منٹ گزر گئے اور کوئی مداخلت نہ ہوئی تو میں دوبارہ اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ میرے پیر کے نیچے دبا یوں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا جیسے ذرا بھی جنبش کرے گا تو موت اسے آدبوچے گی!

"وہ... وہ لکھنؤ گیا ہے، اس کے پاس کہیں سے کہیں سے موٹی رقم آگئی ہے، وہ بڑا خوش تھا!" زمین سے اٹھتے ہی وہ مشینی انداز میں بولنے لگا۔

"لکھنؤ میں وہ کہاں ملے گا۔؟"

"مجھے بتا کر نہیں گیا۔" وہ رو دینے والے لہجہ میں بولا۔ "مگر وہ لچھمی بائی پر مرتا ہے، اس کے کوٹھے پر ضرور جائے گا۔" اس کی آنکھیں رحم طلب انداز میں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تالا اٹھا کر باہر نکل!" میں نے چند ثانیئے سوچنے کے بعد اسے حکم دیا۔

"مجھے چھوڑ دو مہاراج۔ غریب آدمی ہوں، مجھ سے ساری رقم بھی لے لو، شاید اس حرامی نے تمہارا پیسہ چرایا ہوگا، اس کے لچھن شروع ہی سے خراب لگتے تھے!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر روتا ہوا میرے قدموں میں گر گیا مگر میں نے لات سے اسے دور دھکیل دیا۔! میری اب تک کی حکمتِ عملی یہ رہی تھی کہ میں جہاں جاتا اپنا سراغ نہیں چھوڑتا تھا اور نہ کوئی میری نئی منزل کا پتہ چلا سکتا تھا۔

اس بڈھے کو اب زندہ چھوڑنا میرے اصول کے خلاف تھا۔ مجھے ہر قیمت پر دیوان کے تعاقب میں لکھنؤ جانا تھا جبکہ یہ بڈھا زندہ رہ کر کسی اور کو بھی اس راہ پر ڈال سکتا تھا۔ خصوصاً دیوان کے بارے میں اس تشدد آمیز باز پرس کے بعد جب پولیس دیوان کی روپوشی کے سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ کرتی تو گھاگ افسروں کی نظر سے وہ کچھ بھی نہ چھپا سکتا تھا۔ یوں میری مہم مشکلات کا شکار ہو جاتی!

پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ اسے باہر لیجا کر کسی ویران مقام پر ٹھکانے لگاؤں مگر اس کی خستہ اعصابی کیفیت مجھے اسی وقت کچھ کر گزرنے کی دعوت دے رہی تھی۔

وہ زمین پر پڑا رو رہا تھا۔ میں نے ریوالور جیب میں رکھا اور اسے اسی حالت میں فرش پر دبوچ لیا۔ بڈھے کے حلق سے چند کریہہ مگر دبی دبی آوازیں نکلیں اور

اس کی شہ رگ پر میری انگلیوں کے تنگ ہوتے ہوئے حلقے کے ساتھ ساتھ دم توڑ گئیں۔

چند منٹ بعد میں اس کی بے جان لاش کوٹھری میں مقفل کر کے واپس لوٹ رہا تھا۔ چابی میں نے ایک گٹر میں پھینک دی تھی!

ماچس کی تیلی روشن ہوتے ہی جنوبی سمت میں کسی کار کی روشنیاں جل اٹھیں اور تیزی کے ساتھ وہ کار میرے سامنے آ رکی۔

"کیا رہا؟" بھوپت نے میرے بیٹھتے ہی سوال داغ دیا۔

"ہمیں لکھنؤ جانا ہے!" میں سرد اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔

"تجھے کیا ہوا ہے؟" بھوپت نے میرے بدلے ہوئے لہجہ پر چونک کر پوچھا۔

"گاڑی دھیان سے چلاؤ استاد!" میں سیاہ اور چکنی سڑک کو گھورتے ہوئے بولا "میں آج تک قاتلوں، اسمگلروں اور سازشیوں کو مارتا آیا ہوں مگر آج مجھے ایک بیگناہ بڈھے کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے ہیں۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا!

"کس کا خون کیا تو نے؟" بھوپت میری زبان سے یہ انکشاف سنکر اچھل پڑا۔

"دیوان اسی کے ساتھ رہتا تھا۔ رازداری کی قیمت کے طور پر اسے پانچ ہزار روپے دیکر وہ آج رات لکھنؤ کی طرف گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو قتل کی کیا ضرورت پیش آ گئی تجھے؟" بھوپت نے حیرت سے پوچھا۔

میں آہستہ سے بے رحمانہ انداز میں ہنسا "پارس پتھر کی خاطر میں لہو کی ہولی کھیلتا آیا ہوں استاد! تمہاری شراکت کے بعد پہلی ہی واردات ہوئی تو تم اس کا جواز پوچھ رہے ہو ــــ وہ بڈھا جانتا تھا کہ دیوان کہاں ہے اور جب تک ہم پارس پتھر حاصل نہ کرلیں کسی کو اس کا ٹھکانہ معلوم نہیں ہونا چاہیئے۔!"

"جب اسے مار ہی دیا تو اب افسوس بیکار ہے بیٹا!" بھوپت بولا۔ "آجکل جس کی دم اٹھا کر دیکھے گا وہی شیطان کا باپ نکلے گا۔"

اب میرے سامنے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ سیتا کو کہاں چھوڑا جائے۔ اگر اسے بھنک بھی مل جاتی کہ میں دوسرے شہر جا رہا ہوں تو وہ ہرگز میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتی جبکہ موجودہ غیر یقینی حالات میں اسے ساتھ لئے پھرنا نہ صرف میرے لئے بلکہ خود سیتا کے لئے بھی خطرناک تھا!

بھوپت کا ارادہ اسی وقت لکھنؤ روانہ ہونے کا تھا مگر جب میں نے اسے سیتا کے بارے میں اپنی تشویش سے آگاہ کیا تو وہ ہوٹل کی طرف ہو لیا۔

"یہاں کانپور میں میری ایک جاننے والی رہتی ہے، سیتا کو ہم اس کے پاس چھوڑ سکتے ہیں!" کافی سوچ بچار کے بعد بھوپت نے تجویز پیش کی۔

"تمہاری جاننے والی!" میں طنزیہ لہجہ میں بولا "طوائف سے تو وہ کیا کم ہوگی!"

میرے اس تبصرے پر بھوپت چڑ گیا۔ "رنڈی بڑی ہرجائی ہوتی ہے مگر جب وہ کسی کو چاہنے لگے تو اس کے لئے جان بھی دے دیتی ہے۔"

"تو وہ تمہاری محبوبہ ہے؟" میں سنجیدہ ہو گیا۔

"میں محبوبہ پالتا ہی نہیں پٹھے۔" وہ جھینپتے ہوئے لہجہ میں بولا۔ "وہ کئی برسوں سے میری دیوانی ہے۔ آج جھوٹوں کہوں تو سچ مچ بیاہ پر تیار ہو جائے، سیتا کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے گی!"

"کوئی اور ترکیب سوچو استاد!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میری زندگی میں سیتا کبھی طوائف کے قریب بھی نہ پھٹکے گی خواہ وہ میری ہی داشتہ کیوں نہ رہی ہو۔"

"میں مجرد آدمی ہوں، یہ نہیں جانتا کہ مرد اپنی بیوی کے بارے میں کتنے حساس ہوتے ہیں۔ اس کے لئے تو تجھے ہی کوئی صورت نکالنی ہوگی۔!" بھوپت نے ہتھیار ڈال دیئے۔

بھوپت سے گفتگو ختم کرنے کے بعد جب میں نے اسٹیٹ ہوٹل میں اپنے کمرہ پر دستک دی تو صبح طلوع ہونے والی تھی۔ فضا میں عجیب خوابناک سی خنکی رچی ہوئی تھی۔

سیتا نے فوراً ہی دروازہ کھولا تھا۔ اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں نیند کے خمار سے حسین تر ہو گئی تھیں۔ سُرخ بال بے ترتیبی سے اس کے چہرے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔!

"فرصت مل گئی تجھے؟" میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس نے سوال کیا۔

"فرصت تو مل گئی مگر پارس نہیں ملا!" میں نے کمرہ کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"پارس گیا جہنم میں!" وہ جل کر بولی "ساری رات گزار کر آیا ہے اور اب پھر پارس ہی کی رٹ لگا رکھی ہے!"

میں نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور وہ کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح میری آغوش میں دبک گئی۔ "اگر وہ بالکل ہی کھو جاتا تو میں بھی اس پر لعنت بھیج دیتا مگر اس کا کچھ کچھ سراغ ملا ہے۔ میری جان! ان حالات میں قارون کے اس خزانے کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں تیرے آرام کے لئے، تیرے گھر بار اور بچوں کے لئے اس پتھر کا دوبارہ ملنا بہت ضروری ہے۔!"

"میں کب کہتی ہوں کہ اسے بھول جا!" وہ میرے سینہ میں منہ گھسا کر منمنائی۔ "مجھے تو یہ شکایت ہے کہ اس کے چکر میں تو مجھے بالکل بھول گیا ہے۔!"

اس کی شکایت بالکل بجا تھی۔ وہ بھی گوشت پوست کا پیکر تھی جس میں ہر سانس کے ساتھ جذبوں کا ایک سمندر انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ پھر اس کے لئے دو ٹیگا کے دور میں بہت سی تشنہ کامیاں بے نام تھیں۔ اسے میں نے ہی ہر نام سے آشنا کیا، اسے زندگی کے وہ رموز سکھائے جن کا اسے مطلق تجربہ نہ تھا۔ اب اگر وہ میری لاپرواہی اور عدم توجہی کی شکایت کرتی تھی تو اس میں اس سے زیادہ میرا قصور تھا۔

جب سورج طلوع ہوا تو سیتا کے دل سے غبار مٹ چکا تھا۔ اس نے میری ساری کوتاہیاں معاف کر دی تھیں، اس خوشگوار ماحول میں، میں نے اسے اپنی نئی پریشانی سے آگاہ کیا۔!

"میں یہاں تنہا ہرگز نہ رہوں گی!" میری بات سمجھتے ہی وہ بول اُٹھی۔ "میں کبھی تجھ پر بوجھ نہیں بنتی۔ اپنی حفاظت میں خود کر لوں گی مگر چلوں گی تیرے ساتھ!"

"میرے ساتھ جانا خطرناک ہے سیتا! تو پہچان لی جائے گی۔"

"مجھے ڈبّہ میں بند ہونا منظور ہے، مگر چلوں گی ساتھ!" اس نے کار کی ڈکی کے لئے ڈبّہ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

اس کی یہ تجویز واقعی معقول تھی۔ لکھنؤ میں ہمارا کام صرف اتنا تھا کہ دیوان کو لچھمی بائی کے کوٹھے پر پکڑیں اور اس سے پارس کی کہانی اگلوائیں۔ اگلی کارروائی کا سارا انحصار دیوان کے بیان پر تھا!

میں نے سیتا کو سامان سمیٹنے کی ہدایت کی اور خود پروگرام طے کرنے بھوپت کے پاس چلا گیا۔ وہ کافی پیتے ہوئے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔!

"کیا طے ہوا۔؟"

"سیتا ہمارے ساتھ چلے گی!" میں نے اسے بتایا۔ "یہاں سے وہ برقع میں ہمارے ساتھ ہوگی۔ راستے میں موقع صاف دیکھ کر ہم اسے ڈکی میں بند کر دیں گے۔"

"لکھنؤ پہنچنے کے بعد کیا ہوگا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہاں زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کا کام ہے، اس دوران میں وہ ڈکی ہی میں رہے گی!" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اور اگر ڈکی میں اس کی نقل و حرکت سے کوئی ادھر متوجہ ہو گیا؟"

"یہ میرا ذمہ!" میں اعتماد کے ساتھ مسکرایا۔ "وہ بنارس سے تمہاری کالی آسٹن میں اسی طرح مرزاپور پہنچی تھی!"

"جبھی پل والی چوکی سے تو صاف نکل گیا تھا۔" وہ حیرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

میں نے نیچے کاؤنٹر پر جا کر اپنا حساب صاف کیا اور سیتا کو برقع میں تیار کر کے اپنے مختصر سامان سمیت ہوٹل سے باہر آ گیا۔

پارکنگ لاٹ میں بھوپت اپنی گاڑی میں ہمارا منتظر تھا اس نے احترام کے ساتھ سیتا کے لئے عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور مجھے آنکھ مار کر بولا۔ "بیٹھ جا پٹھے، تو بھی پیچھے بیٹھ جا! آج میں ڈرائیور کی ڈیوٹی کروں گا۔"

گاڑی روانہ ہوئی تو اس کے سارے شیشے چڑھے ہوئے تھے تاکہ ہوا سے سیتا کا برقع یا نقاب نہ اُڑنے پائے۔ شناخت کے اعتبار سے سیتا ہمارے لئے مجسم خطرہ تھی اس کے سُرخ بال منفرد، نیلی آنکھیں ممتاز، گوری رنگت نمایاں، دراز قامت بے مثال، اسے تو محض ایک جھلک دیکھ کر بھی کوئی پہچان سکتا تھا!

جب تک گاڑی شہر کی مصروف سڑکوں پر چلتی رہی ہم تینوں خاموش رہے۔ پھر بھوپت ہی نے سکوت توڑا۔ "بھابی! تیرا مرد تو بہت خونخوار ہے، تم دونوں کا گزارا کیسے ہوتا ہے۔؟"

"بہادر کا گزارا بہادر ہی کے ساتھ ہوتا ہے،" سیتا کی مترنم آواز اُبھری "میرے لئے یہ بہادر ہے اور اپنے دشمنوں کے لئے خونخوار!"

میں بے اختیار ہنس پڑا اور بھوپت جھینپتے ہوئے لہجہ میں بولا "یہ تھوڑے دن کے لئے میرا دشمن تھا مگر اب تو میرا جگری یار ہے!"

سیتا نے مسکرا کر میٹھی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر بھوپت سے بولی۔ "تیری اور صفدر کی دوستی نئی نئی معلوم ہوتی ہے۔؟"

"ہاں!" وہ گہرا سانس لیکر بولا "اگر پارس پتھر کھو نہ جاتا تو شاید حالات ہی مختلف ہوتے مگر اب ہم دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں۔!"

"پارس سے تیرا کیا واسطہ؟" سیتا چونک پڑی۔

"اس نئے ماحول میں اسے ڈھونڈھ نکالنا میرے اکیلے کی بس کی بات نہیں" مجھے بات سنبھالنے کے لئے اچانک دخل انداز ہونا پڑا۔ "اب بھوپت پارس پتھر میں میرا شریک ہے۔"

"کیوں؟" سیتا نے مجھ پر آنکھیں نکالیں۔ "میری ماں نے وہ پتھر صرف تجھے دیا ہے، اس میں کسی کو شریک کرنے کا تجھے کیا حق ہے۔!"

"تیری حماقت نے مجھے اس حصہ داری پر مجبور کیا ہے!" میں اسے گھور کر بولا۔

"میں نے کیا حماقت کی ہے؟"

"تو نے عدالت میں پارس پتھر کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا...!"

"ہاں کہا تھا۔ پھر؟" وہ میری بات کاٹ کر سینہ زوری پر اُتر آئی۔

"پھر یہ کہ بہت سے لوگ اس پتھر کی وجہ سے میرے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں، بھوپت تو شریف آدمی ہے جو شراکت پر راضی ہو گیا!" میں نے اسے بتایا۔

"بھابی۔ تو بہادر ضرور ہے، پر ذرا بیوقوف بھی ہے!" بھوپت نے قہقہہ مار کر ہماری بحث میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ "بھلا عدالت میں تجھے پارس کی کہانی دُہرانے کی کیا ضرورت تھی!"

"چھوڑو استاد! اب کیوں اس بات کو چھیڑتے ہو!" میں نے جلدی سے کہا۔ "سیتا سے بعض اوقات نادان دوست والی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں!"

بھوپت نے میرے تبصرے پر ایک جاندار سا قہقہہ لگایا۔

راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر سیتا کو ڈکی میں پہنچا دیا گیا۔ نشستوں پر... آرام دہ سفر کا لطف اٹھانے کے بعد وہ ڈکی میں جانے پر ذرا مشکل ہی سے راضی ہوئی۔ لکھنؤ تک کا سفر کسی خاص واقعے کے بغیر بخوبی طے ہو گیا۔ اس شہر کے مکینوں کے حالات پر وقت نے معاشی اور تعلیمی اعتبار سے گہرا اثر ڈالا تھا مگر زبان اور لباس کے معاملے میں اس شہر کی ندرت اب بھی نمایاں تھی۔

راستے میں دو تین جگہ رُک کر بھوپت نے منزلِ مقصود کا پتہ معلوم کیا اور اس شہر کے سراپا انکسار باسیوں نے بڑی خوشدلی سے اس کی رہنمائی کی اور آخر کار ہم اس علاقے میں جا پہنچے جہاں لچھمی بائی مقیم تھی!

کار ایک محفوظ اور نسبتاً ویران مقام پر پارک کر کے ہم دونوں آبادی کی طرف ہو لئے۔ لچھمی بائی کے بالاخانے پر ہماری ملاقات ڈھلتی عمر کی ایک سیکھال عورت سے ہوئی جو اپنے اطوار سے ہی نائکہ نظر آ رہی تھی۔

"آیئے سرکار۔ آج تو اس بالاخانہ کے مقدر کا ستارہ عروج پر ہے کہ شرفا دن کے اجالے میں بھی یہاں چلے آ رہے ہیں!" اُس نے گرم جوش لہجہ میں کہا۔

اس کی رہنمائی میں ہم دونوں ایک مختصر لیکن صاف ستھرے کمرہ میں پہنچے جہاں فرش پر دری اور سفید براق چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ چاندنی کے وسط میں قالین بچھا ہوا تھا تاکہ مجرے کے دوران ناچنے والی کے قدموں کی مچلتی جنبشوں سے چاندنی پر شکنیں نہ آئیں۔ قالین کے گرد، چاندنی پر چھوٹے چھوٹے کامدار غلافوں والے تکیئے رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک گوشہ میں طبلے کی جوڑی، ہارمونیم اور موسیقی کے دو تین دوسرے آلات رکھے ہوئے تھے۔!

"لچھمی بائی کہاں ہے؟" کمرہ میں پہنچنے کے بعد بھوپت نے قدرے توقف کے بعد اس سے براہِ راست اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"سو رہی ہے سرکار!" وہ خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی "ساری رات

ناچنے کے بعد وہ دن چڑھے تک سوتی رہتی ہے، حکم ہو تو اسے ابھی بیدار کردوں؟"

میری اور بھوپت کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس وقت دونوں کے جذبات تقریباً یکساں ہی تھے بلکہ بھوپت کی آنکھوں سے تو دیوان کے لئے نہایت ثقیل گالیاں برستی محسوس ہو رہی تھیں!

"میں کانپور سے آ رہا ہوں!" بھوپت نے جیب سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا بھتیجا کل رات سے غائب ہے، مجھے اس کے دوستوں سے پتہ چلا کہ وہ لچھمی بائی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے۔ اسی کی تلاش مجھے تمہارے گھر تک لائی ہے!"

اس نے نوٹ لیکر سر کو قدرے خم دیا پھر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"سرکار! نام کیا ہے آپکے بھتیجے کا؟"

"دیوان داس!" بھوپت بولا۔ "وہ بہت ضدی ہے۔ محض ضد کے باعث گھر اور جاگیر چھوڑ کر کئی برسوں سے روپوش تھا۔ مدت کے بعد مجھے اس کا سراغ ملا تو وہ میرے کانپور پہنچنے کی خبر پاتے ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔!"

میں نے دیکھا کہ دیوان داس کا نام آتے ہی اس کی تیوریوں پر ہلکے سے بل پڑ گئے مگر جب اس نے بھوپت کی زبان سے دیوان کی جاگیر کا تذکرہ سنا تو خلیقانہ انداز میں ہنس دی۔ "وہ اکثر یہاں آتا تھا۔ مگر پچھلے کئی ہفتوں سے نہیں آیا۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ کانپور کے کسی ہوٹل میں باورچی کا کام کر رہا ہے۔ آپ نے وہاں معلوم کیا ہوتا۔!"

"وہ بدبخت خاندان کے نام کو بٹہ لگانے پر تلا ہوا ہے" بھوپت نے غصہ سے کہا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ بس تم سے میری ایک گزارش ہے کہ وہ یہاں آئے تو اُسے کسی ترکیب سے روک لینا۔ میں دو چار ٹھکانوں پر ہو کر واپس ادھر آؤں گا۔"

"لکھنؤ میں وہ اکثر دلبر خان کے پاس ٹھہرتا ہے۔ میرے یہاں بھی اسی کے ساتھ آیا کرتا ہے، معاف کرنا سرکار میں ذرا صاف گو ہوں ــــ اگر آپ اُسے یہاں آنے سے روک دیں تو یہ مجھ غریب بندی کی بڑی خدمت ہوگی۔!"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں اس نے لچھمی پر کیا جادو کیا ہے کہ جب وہ آتا ہے لچھمی اپنے سرپرستوں سے منہ پھیر لیتی ہے۔ اگر دلبر خان کا ڈر نہ ہوتا تو میں نہ جانے کیا کر گزری ہوتی؟"

"خیر خیر ــــ ایک بار وہ مجھے مل جائے پھر میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ ہاں یہ دلبر خان کہاں رہتا ہے؟" بھوپت کی اداکاری لاجواب تھی۔

"اے سرکار! وہ تو پورے لکھنؤ میں رہتا ہے!" وہ جلدی سے بولی۔

"میں اس کا نام ضرور جانتی ہوں، پتہ سے واقف نہیں۔"

اب وہاں وقت ضائع کرنا بیکار تھا۔ بھوپت چند رسمی باتوں کے بعد وہاں سے نکل آیا۔

"سالا بچ کر کہاں جائے گا۔" گلی میں آتے ہی بھوپت دانت پیس کر بولا۔

"سالا نہیں، بھتیجا کہو استاد!" میں نے ہنس کر کہا۔

بھوپت کی زبان سے میری اس بات کے جواب میں جو کلمات برآمد ہوئے وہ صحیح معنوں میں دیوان داس کے شایانِ شان تھے۔!

دلبر خان پورے لکھنؤ میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ ہم کئی گھنٹے اس کی تلاش میں پھرتے رہے لیکن اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ ہر جگہ سے اس کے ایک نئے ٹھکانے کا پتہ چلتا مگر دلبر خان کہیں بھی موجود نہیں تھا۔!

دوپہر کے وقت تھک ہار کر ہم دونوں ایک گھٹیا سے ہوٹل میں کھانا کھانے پہنچے تو اچانک وہ خود ہی وہاں آ پہنچا اور اس کے آتے ہی ہوٹل میں سراسیمگی پھیل گئی۔

"میں نے سنا ہے کہ تم دونوں کو میری تلاش ہے!" وہ لاپروائی سے ہمارے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا وہ چھریرے مگر کسرتی بدن اور دراز قامت کا مالک تھا۔ لمبی سی گردن پر لمبوترا چہرہ، باریک ترشی ہوئی مونچھیں، گنجا سر، داہنے کان میں سونے کی بالی پڑی ہوئی، کرتے کے گریبان میں سونے کے قیمتی بٹن واضح طور پر اس کا تعارف کرا رہے تھے!

"دلبر خان! دیوان داس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے آگے جھک کر اچانک اس سے سوال کر ڈالا۔ اب براہِ راست گفتگو کے سوا کوئی راہ مناسب نہیں تھی!

وہ سپاٹ نظروں سے چند ثانیہ تک میری طرف دیکھتا رہا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "خاموشی کے ساتھ یہاں سے باہر نکل چلو۔"

اس وقت تک ہمارے لئے کھانا نہیں لگایا گیا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں نے فوراً ہی وہ میز چھوڑ دی۔!

"تم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔" ہوٹل سے باہر آکر بھوپت نے دلبر خان کو ٹوکا۔

"تم دونوں سے اس کا کیا تعلق ہے؟" دلبر نے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

"ہم اس کے دوست اور رازدار ہیں!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "یہ باتیں یہاں مناسب نہیں ہیں۔ ہمیں کہیں تنہائی میں بات کرنی چاہیئے۔"

دلبر خان نے تانگہ کو بلانے کے لئے ہاتھ اٹھایا مگر میں نے اسے روک دیا "ہمارے پاس گاڑی ہے۔"

بھوپت نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی میں دلبر کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھ گیا اور مرسیڈیز دلبر کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہو گئی!

"دیوان داس میرا جگری دوست ہے اور یہ بات پورا کانپور جانتا ہے۔ کل رات اس کے ہاتھوں ایک خون ہو گیا ہے۔ واردات کے بعد وہ میرے گھر آیا تھا مگر میں وہاں موجود نہیں تھا۔ جب رات گئے میں واپس آیا تو کمرہ میں دیوان کا ایک پرچہ پڑا ہوا تھا کہ وہ لکھنؤ تمہارے پاس جا رہا ہے، میں فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔"

"تو وہ کانپور میں خون کر کے آیا ہے؟" دلبر خان گہرا سانس لیکر بولا۔

"ہاں ــــ اور پولیس اس کی تلاش میں ہے، پولیس سے یہ بات زیادہ دیر تک نہ چھپ سکے گی کہ دیوان لکھنؤ کی ایک طوائف، لچھمی بائی پر مرتا ہے۔

پولیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے اسے یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔"

"وہ بہت ہی ذلیل ہے!" اچانک دلبر خان غصیلے لہجہ میں بولا۔ "وہ آدھی رات گئے گھبرایا ہوا میرے پاس پہنچا تھا۔ اس کے پاس اٹھارہ بیس ہزار روپیہ نقد موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کانپور میں ایک لمبا ہاتھ مار کر بھاگا ہے مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ قتل کر کے آیا ہے تو اس سے دُور ہی رہتا۔ لکھنؤ میں بڑے بڑے بدمعاش میرے نام سے کانپتے ہیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ آج تک میرے ہاتھ سے کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی ہے۔"

"کمال ہے کہ دیوان نے اس معاملے میں تم پر بھی اعتماد نہیں کیا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ مولچند ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں جیپال کے نام سے ٹھہرا ہوا ہے، اسے بتا دینا کہ اب وہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔" دلبر خان تلخ لہجہ میں بولا۔ "اس نے میری طرف کا رُخ بھی کیا تو جیل کی ہوا کھائے گا۔"

"تو تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے؟" میں نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" دلبر کا لہجہ تلخ اور اٹل تھا۔ "جو سالا دوستی میں بھی اعتماد کو دھوکہ دے، اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں، مجھے اگلے چوک پر اُتار دینا۔!"

بھوپت نے کسی منجھے ہوئے پیشہ ور ڈرائیور کی طرح اگلے چوک پر گاڑی روک دی اور دلبر خان خاموشی سے وہاں اُتر گیا۔

"پٹھے۔! کیا بات ہے تیری۔؟" بھوپت نے گاڑی آگے بڑھا کر نعرہ مارا۔

"میں نے اندھا جوا کھیلا تھا۔" میں ہنس کر بولا۔ "میرا خیال تھا کہ دیوان نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی دانست میں سچ بات کہنے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ بنے خان کے قتل کا حوالہ دے کر اسے میں اپنی اور دیوان کی دوستی کا یقین دلا سکوں گا۔"

"اور اسے نہ صرف یقین آگیا بلکہ اُس نے دیوان کو ہماری جیب میں ڈال دیا!" بھوپت اس کامیابی پر بہت زیادہ خوش تھا۔!

مولچند ہوٹل کی تلاش بہت آسان ثابت ہوئی۔ یہ قدیم وضع کا صاف ستھرا اور پُرسکون اقامتی ہوٹل تھا۔ استقبالیہ گیلری میں لگے ہوئے بورڈ کے مطابق ساتواں کمرہ ابھی تک جیپال راؤ کے نام پر ہی بُک تھا!

بھوپت باہر گاڑی میں ہی بیٹھا تھا اور میں اس کا ریوالور جیب میں چھپائے ساتویں کمرہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔

دوسری دستک پر اندر سے کسی کی دھیمی سی آواز اُبھری "کون ہے؟"

میں نے جلدی سے راہداری کا جائزہ لیا، وہ ویران پڑی ہوئی تھی چھٹا کمرہ مقفل تھا۔ میں نے دروازہ کے قریب منہ لیجا کر سرگوشیانہ آواز میں کہا۔

"دروازہ کھولو جیپال، مجھے دلبر نے بھیجا ہے!"

اندر کچھ آہٹیں سنائی دیں اور چند سکنڈ کے بعد دروازہ کھول دیا گیا کھلے ہوئے پٹ کے عقب میں دہشت سے ستا ہوا ایک جوان چہرہ نظر آ رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے مشکوک نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"دلبر نے تمہیں بلایا ہے!" میں نے انتہائی ضبط اور تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اندر آ جاؤ۔" اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

میں اطمینان سے اندر داخل ہو گیا۔

"اس نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" دیوان نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم، اسی سے پوچھ لینا!" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "وہ کسی کو بتا رہا تھا کہ کانپور سے پولیس کی ایک جماعت یہاں آ پہنچی ہے اسے دیوان داس کی تلاش ہے۔"

"شش! آہستہ بولو۔" وہ اچانک بوکھلا گیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "یہاں میرا نام جیپال ہے۔"

جب وہ تیار ہو رہا تھا تو میں نے بساط پر ایک اور چال چلی "اپنا اہم اور ضروری سامان ساتھ لے لینا۔ شاید اب تمہاری ادھر واپسی نہ ہو۔ پولیس سب سے پہلے سارے ہوٹل ہی چیک کرے گی۔ دلبر نے تمہاری رہائش کا دوسرا انتظام کر لیا ہے۔"

دیوان داس نے لباس تبدیل کرنے کے بعد ایک بریف کیس ساتھ لیا اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"تم میرے نکلنے کے بعد باہر آنا۔ میں فٹ پاتھ پر تمہارا انتظار کروں گا۔" اس پر اپنی گرفت مضبوط پا کر میں نے اپنی حکمتِ عملی میں تھوڑی سی تبدیلی کرتے ہوئے کہا۔ "تم خاموشی سے میرے پیچھے چلے آنا۔ ہوٹل سے کچھ دُور ایک گاڑی ہماری منتظر ہے۔"

"چلو!" اس نے نیم مردہ آواز میں کہا۔

میں سگریٹ سلگا کر لاپروایانہ انداز میں ہوٹل سے باہر آگیا۔ اور یوں فٹ پاتھ کے کنارے پر رُک گیا جیسے سواری کا انتظار ہو۔ مگر میری چور نگاہیں ہوٹل کے دروازے پر مرکوز تھیں۔!

چند منٹ بعد ہوٹل کے دروازہ سے دیوان داس نکلتا نظر آیا۔ اس وقت وہ بہت زیادہ نروس اور سہما ہوا تھا!

جب اس نے مجھے دیکھ لیا تو میں اس طرف چل دیا جہاں بھوپت کار لئے میرا منتظر تھا۔ میں نے عقبی نشست پر بیٹھ کر اس وقت تک دروازہ بند نہیں کیا جب تک میرا شکار پنجرہ میں نہ آگیا۔

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا جیسے کئی میل کی دوڑ لگا کر آیا ہو!

بھوپت نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور مرسڈیز تیزی سے آگے بڑھاتا چلا گیا۔

"دیوان داس! تم پائیدان میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے ہدایت دی۔ "اگر کھڑکی میں سے کسی نے تمہارا خوبصورت چہرہ پہچان لیا تو ہم دشواریوں میں پڑ جائیں گے!"

اس نے فوراً ہی ہدایت پر عمل کیا اور پائیدان میں بیٹھنے کے بعد پوچھا۔ "یہ سفر

کتنی دیر جاری رہے گا۔؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور انگریزی میں بھوپت سے کار کسی ویرانے کی طرف لیجانے کے لئے کہا۔ میرے اندازہ کے عین مطابق دیوان داس انگریزی سے بالکل نابلد تھا کیونکہ میری ہدایت پر چونکنے کے بجائے وہ بیوقوفوں کی طرح میرا چہرہ تکتا رہا۔ کانپور کے ایک تیسرے درجہ کے ہوٹل کے باورچی کا انگریزی سے واقفیت ہونا ناممکن سی بات تھی!

پارس پتھر میرے ہاتھ سے نکلے کم و بیش چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور طویل جدوجہد کے نتیجہ میں آخرکار دیوان داس ہمارے قبضہ میں آ چکا تھا۔ مجھے توی امید تھی کہ اس سے ہمیں پارس کا سراغ مل سکے گا مگر اس سے بازپرس کے لئے بھری پری سڑک مناسب نہیں تھی۔ اب یا تو یہ آنے والے لمحات کی سنسنی تھی یا بھوپت کی سست رفتار... ڈرائیونگ کہ مجھے وقت کی رفتار ٹھہری ہوئی معلوم ہونے لگی تھی!

پھر ایک کچی مضافاتی سڑک پر آتے ہی بھوپت نے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا اور میں نے فوراً ہی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی نال دیوان پر تان لی۔ ریوالور کا مہیب دہانہ دیکھتے ہی وہ ہذیانی انداز میں گھگھیانے لگا۔

"بنے خان سے ملنے والا پتھر کہاں ہے۔؟" میں نے ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"پ پ... پتہ نہیں... پتہ نہیں، مجھے کچھ پتہ نہیں۔" وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔

"جھوٹ مت بول۔" میں غرایا۔ "اگر مجھ سے اڑنے کی کوشش کی تو میں بڑی اذیت دے کر ماروں گا۔ میں تیرا جوڑ جوڑ کھول دوں گا۔"

"وہ وہ پتھر بنے خان نگل گیا تھا۔!" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"نگل گیا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔! وہ سچ مچ رو دیا!

"تجھے کیسے پتہ۔؟"

"یہ پستول رکھ لو۔ اسے رکھ لو۔ میں تمہیں ایک ایک لفظ بتا دوں گا!" وہ روتے ہوتے گڑگڑایا۔

اسی وقت بھوپت نے ٹیلوں کے درمیان گاڑی روک دی اور میں نے ریوالور گود میں رکھ لیا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے لہٰذا کم سے کم لفظوں میں پورا قصہ بتاتا چلا جا۔!"

"کل دوپہر بنے خان نے ہوٹل کے کیبن نمبر تین میں ایک گاہک کو نمٹانے کے بعد میز صاف کی تو اسے کرسی پر ایک سیاہ رنگ کا بدوضع سا پتھر پڑا ہوا ملا۔ اس کی بناوٹ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی انگوٹھی کا نگ ہے۔!" دیوان داس کانپتی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔

پارس کا ذکر آتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگر بھوپت کڑی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے بشرہ پر برہمی کے آثار نمایاں تھے!

"یہ پارس ہی کا ذکر کر رہا ہے استاد!" میں نے دیوان داس کی بات کاٹ کر کہا۔

"مگر تو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سفید رنگ کا موتی جیسا گول نگ ہے۔"

بھوپت نے تلخ لہجے میں اپنی ناراضگی کا سبب ظاہر کر دیا۔

"پہلے اس سے نمٹ لیں پھر تمہیں مطمئن کر دوں گا۔" استاد سے یہ کہکر میں نے دیوان داس کو بات جاری رکھنے کا حکم دیا۔

"بنے خان نے وہ پتھر لاپرواہی سے اپنی جیب میں ڈال لیا۔" دیوان کہنے لگا۔ "تھوڑی دیر بعد مجھے پیاز نکالنے کے لئے ہوٹل کے اسٹور کی چابی کی ضرورت پڑی جو بنے خان کی جیب میں رہتی تھی۔ اس نے چابی نکالی اور میرے حوالے کی تو گچھے میں پڑی ہوئی لوہے کی پانچ چابیاں سنہری ہو چکی تھیں۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں اچھل پڑے۔ ہم نے سب کی نظروں سے چھپ کر ایک فالتو چابی کو کاٹ کر دیکھا مگر وہ اندر سے بھی سونے کی طرح نرم اور سنہری ہو چکی تھی۔ اسی وقت بنے خان نے مجھے کیبن سے ملنے والے سیاہ رنگ کے پتھر کے بارے میں بتایا۔ ہم دونوں نے اس پتھر کو لوہے کی ایک چھری پر گھسا، اور وہ بھی حیرت انگیز طور پر سنہری ہو گئی۔ بنے خان نے وہ چھری اور چابیاں ساتھ لے لیں اور بیماری کا بہانہ کر کے ہوٹل سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی ہوٹل سے نکل پڑا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ایک ساتھ وہ چابیاں اور چھری فروخت کریں گے اور اگر وہ سونا ہی ثابت ہوا تو نوکری چھوڑ دیں گے اور کالے پتھر کے ذریعہ خوب دولت کمائیں گے۔ میں بنے خان کی جھونپڑی پر گیا تو وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ میں پچھلے حصے سے چٹائی پھاڑ کر اندر گھس گیا اور سامان کی تلاشی لے ڈالی، مگر وہاں چھری یا چابیوں کا پتہ نہیں تھا اس کے بعد میں پاگلوں کی طرح پورے شہر میں بنے خان کو ڈھونڈتا رہا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ بنے خان کی وعدہ خلافی اور غداری پر میں غصے سے بے حال ہو رہا تھا کہ اس عالم میں پیپل گلی میں بنے خان مجھے مل گیا۔ میں نے اپنا انتظار نہ کرنے پر اسے برا بھلا کہا مگر اب اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ اس کی جیب نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے مجھے چھری، چابیوں یا پتھر کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا بس جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کر مجھے دیئے اور کہا کہ چھری اور چابیوں وغیرہ کو بھول جاؤں۔ بنے خان کے اس رویہ پر میں آپے سے باہر ہو گیا میں سمجھ چکا تھا کہ چھری اور چابیوں کا لوہا سونا بن چکا تھا جسے بیچ کر بنے خان نے رقم حاصل کی ہے اسے دھمکانے کے لئے میں نے اپنا چاقو نکال لیا اور بنے خان مجھ سے بھڑ گیا۔ اسی ہاتھا پائی میں، میں نے چاقو اس کی پسلیوں میں بھونک دیا۔ بنے خان نے اسی حالت میں جیب سے وہ پتھر نکالا اور میرے کچھ سمجھنے سے پہلے نگل گیا۔ اسے خون میں تڑپتے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا میں تو اسے دھمکا کر اپنا جائز حصہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب مجھے اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو میں نے اس کی جیب سے ساری رقم نکالی، اپنی کوٹھری سے سامان لیا اور اپنے ساتھ رہنے والے بڈھے کو پانچ ہزار روپے دے کر اسی وقت لکھنؤ آ گیا۔ وہ پتھر میرے پاس نہیں ہے۔ ہاں بنے خان کی جیب سے ملنے والی رقم اس بستر میں میرے ساتھ ہے۔ تم یہ ساری رقم لے لو مگر مجھے زندہ چھوڑ دو۔"

"تو وہ پتھر بنے خان نگل گیا تھا؟" میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"ہاں!" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "دم توڑنے سے پہلے اس نے خود کہا تھا کہ پارس پتھر خدا نے اسے دیا ہے اور یہ اس کی لاش کے ساتھ ہی جائے گا!"

"تجھے اس بات کا پورا یقین ہے؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ اس نے یہ پتھر نگلا تو اسے پھندا بھی لگا تھا۔ پارس اسی کے پیٹ میں ہوگا۔" وہ امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میری اور بھوپت کی نظریں چار ہوئیں اور میں نے دیوان داس کو گاڑی سے اُترنے کا حکم دیا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے مرسیڈیز کا دروازہ کھولا اور پائیدان سے جونک کی طرح چپک گیا۔ "تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ میں نیچے نہیں اُتروں گا، تم مجھے مار ڈالو گے۔" سامنے ویرانہ دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گیا۔

"سالے کی چھٹی حس بڑی تیز ہے۔" بھوپت گاڑی سے اُترتے ہوئے غرایا اور اس نے کھلے ہوئے دروازے میں سے بیرحمی سے اسے نیچے کھینچ لیا۔

نیچے اُترتے ہی دیوان داس پاگلوں کی طرح بھوپت سے لپٹ پڑا۔

معاً میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال کوندا۔

پارس کا سراغ مل چکا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ بنے خان کی لاش کے پوسٹ مارٹم کے نتیجے میں وہ پتھر پولیس کے ہاتھ لگ جاتا۔ اب بھوپت سنگھ میرے لئے بیکار تھا۔ پارس پتھر کے دو دیوانے مرسیڈیز سے باہر ویرانے میں باہم الجھے ہوئے تھے۔ میں مسلح اور بہتر پوزیشن میں تھا۔ میں نے ریوالور کی نال سیدھی کی۔ اس وقت بھوپت کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے اس کے بائیں پہلو پر گولی چلا دی۔

ایک زبردست دھماکہ ہوا اور دیوان داس کی چیخ میں دب گیا۔ فائر کے آخری لمحے پر بھوپت کو گرانے کی کوشش میں دیوان میری زد میں آ گیا تھا۔

گو میرا نشانہ دیوان ہی بنا تھا مگر میرے فائر کرتے ہوئے وہ دونوں ایسی غیر یقینی اور خطرناک پوزیشن میں تھے کہ بھوپت کا رنگ اُڑ گیا۔

وہ دیوان کو چھوڑ کر تیزی سے میری جانب گھوما۔ میرے ریوالور کی نال اب اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ "صفدر... صفدر! یہ کیا کر رہا ہے، ریوالور پھینک دے!" وہ غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے دیوانہ وار چیخ پڑا۔

میں نے سوچا کہ شاید پولیس سرجن کے دفتر سے پارس پتھر کے حصول میں بھوپت میرے کسی کام آ سکے اور مسکراتے ہوئے ریوالور نیچے کر لیا۔

"اوہ... بھگوان تیرا شکر ہے۔" بھوپت آسمان کی طرف سر اٹھا کر بولا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں تو سمجھا کہ اب میری باری آ گئی ہے۔"

"کیوں بدگمانی کرتے ہو استاد!" میں ہنس کر بولا۔

اس وقت تک دیوان داس دم توڑ چکا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اس کی لاش پر موجود لباس کی تفصیلی تلاشی لی مگر ہمیں کامیابی نہ ہو سکی۔ پھر اس کے بریف کیس کی باری آئی۔ اس میں ایک پرانی دھوتی میں لپٹے ہوئے بڑے نوٹوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہ یقینی طور پر وہی رقم تھی جس کا حوالہ دلیر خان نے دیا تھا۔ یہ رقم دیوان داس نے بنے خان کو ہلاک کر کے حاصل کی تھی اور اب یہ ہمارے قبضے میں آ چکی تھی۔

ان کارروائیوں سے نمٹ کر میں چابی سنبھالے ڈکی کی طرف بڑھا تو بھوپت بوکھلا کر بولا۔ "ابے گاڑی آگے بڑھا لے بھائی یہ لاش دیکھ کر ڈر جائے گی۔"

"استاد! تم ابھی اسے سمجھ ہی نہیں سکے ہو۔" میں نے یہ کہہ کر ہنستے ہوئے ڈکی کھول دی۔ سیتا شاید انتظار میں تھی۔ ڈھکنا اُٹھتے ہی اچھل کر باہر آ گئی۔

اس کا شہابی چہرہ اس وقت تمتمایا ہوا تھا اور پورا بدن پسینوں میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کی سرخ زلفیں تک پسینے میں بھیگی ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

وہ پھیکے انداز میں ہنس دی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے مگر اس ڈبے میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ یہ بڑا ہمدرد ہے مگر ہوادار نہیں ہے۔"

بے اختیار میرا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ اگر ہمارا سفر طویل ہو جاتا اور ہمیں سیتا کو ڈکی سے باہر تازہ ہوا میں نکالنے کا موقع نہ ملتا تو شاید وہ حبسِ دم کا شکار ہو جاتی۔ بنارس سے فرار ہوتے وقت جب میں نے اسے بھوپت سنگھ کی سیاہ آسٹن کی ڈکی میں بند کیا تھا تو ڈھکن کے نیچے لگا ہوا ربر اس طرح کاٹ دیا تھا کہ سیتا کو تازہ ہوا ملتی رہے مگر اسے مرسیڈیز کی ڈکی میں بند کرتے وقت مجھے ہوا کے مسئلہ کا بالکل بھی دھیان نہ رہا تھا۔

"استاد! اب سیتا کو ڈکی میں بند کرنے سے پہلے مجھے ڈکی کی گاسکٹ خراب کرنی پڑے گی۔" میں نے بھوپت سے کہا۔

"بیٹھے! تو چاہے تو ڈھکن میں سوراخ بھی کر سکتا ہے۔" بھوپت نے فراخ دلی سے کہا۔

"ارے... تم دونوں نے کسے مارا ہے؟" اسی وقت سیتا نے بھوپت کے پیچھے پڑی ہوئی دیوان داس کی لاش دیکھ لی اور اس کی طرف لپک پڑی۔

"پارس کا چکر۔" میں طویل سانس لیکر بولا۔ "نہ جانے یہ پتھر کتنی جانوں کی بھینٹ لے گا۔"

"پارس ملا یا نہیں؟" سیتا نے لاش کے جائزے سے فارغ ہو کر واپس آتے ہوئے پوچھا۔

"مقدر میں ہوگا تو مل ہی جائے گا۔" میں نے کہا۔

ڈکی میں ہوا کے گزر کا بندوبست کرنے کے بعد سیتا کو ایک بار پھر اس میں مقفل کر دیا گیا اور مرسیڈیز غبار کا بادل اُڑاتی واپس روانہ ہو گئی۔

شام ہونے سے بیشتر ہم واپس کانپور پہنچ گئے۔ سب سے پہلے بھوپت نے کوٹھاری سنز سے پچھلے دن والے سودے کی رقم وصول کی جو مجموعی طور پر تین لاکھ سے اوپر تھی۔ پھر کانپور کے ایک نواحی ویرانے میں سیتا کو ڈکی سے نکال کر سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور ہم رمنا ہوٹل جا پہنچے۔

وہاں ایک کمرہ لے کر سیتا کو میں نے وہیں چھوڑا اور ایک قریبی دکان سے کچھ ضروری سامان لے کر واپس آ گیا۔ بھوپت کار لے کر پولیس ہسپتال جا چکا تھا تاکہ بنے خان کی لاش کے پوسٹ مارٹم کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔

رات دو بجے کے قریب بھوپت واپس آیا تو سیتا کو مطلق نہ پہچان سکا۔ میں نے خضاب سے اس کے بال سیاہ کر دیئے تھے گھٹنوں تک کے سیاہ اسکرٹ اور بلاؤز میں وہ غیر ملکی معلوم ہو رہی تھی۔ آنکھوں پر جدید فیشن کے مطابق بڑے شیشوں

والی تاریک عینک چڑھی ہوئی تھی۔

"یہ کون ہے ؟" اندر گھستے ہی وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"یہ بے چاری گونگی اور بہری ہے۔ اپنے ملک سے سیاحت کے شوق میں نکلی تھی مگر یہاں مال ختم ہوگیا اور یہ مجھ سے آٹکرائی۔" میں اسے آنکھ مار کر بولا۔

"زوردار لونڈیا......" اس کا تبصرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اس کی حماقت آمیز حیرت پر سیتا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جوں ہی اس نے آواز پہچانی، تبصرہ ادھورا چھوڑ کر گالوں پر طمانچے لگانے لگا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے استاد!" میں نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ "مجھے تو خوشی ہے کہ میری محنت کام آئی اور تم بھی اسے نہ پہچان سکے۔"

"تو بھی پورا بازی گر ہے۔" بھوپت صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔ "اب تو کسی کا باپ بھی اسے نہ پہچان سکے گا۔"

"بس ایک کسر اور ہے، مجھے اس کی نیلی آنکھوں کا رنگ بدلنا ہے۔" میں نے کہا۔

"کانٹیکٹ لینس۔" وہ تحیر آمیز لہجے میں بولا۔ "اسے اُلجھن نہیں ہوگی ؟"

"یہ خود سراپا اُلجھن ہے، بھلا اسے کیا اُلجھن ہوگی۔" میں ہنس کر بولا۔ "ویسے تین لاکھ سے اوپر کے چند ہزار تو شاید مجھے مل ہی جائیں گے۔"

"میں بے ایمان نہیں ہوں۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ "اس میں آدھی رقم تیری ہے، چاہے تو ابھی بانٹ لیتے ہیں۔"

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اس وقت تک پیسے کے معاملے میں مجھے بھوپت سے سخاوت کی اُمید نہیں تھی مگر میں نے اس کی پیشکش پر غیر معمولی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ سرسری طور پر اسے ہی اپنی رقم کا امین مقرر کر دیا۔

"اب ایک بُری خبر سُن لے پٹھے!"

"کیا ؟" اس کے اُداس لہجے نے مجھے چونکا دیا۔

"بنّے خان کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے۔ اس کے معدے سے صرف ولایتی وہسکی، چکن تکہ، مونگ پھلی اور چند الا بلا چیزیں نکلی ہیں۔"

"اور پارس ؟"

"پتہ نہیں وہ کدھر گیا۔" بھوپت بدستور اُداس تھا۔ "میں نے سرجن سے لیکر آپریشن روم کی بھنگن تک سے معلومات حاصل کی ہیں اور ان سب پر ساڑھے چار ہزار روپے خرچ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پارس کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔"

"ہو سکتا ہے، لاش کا معدہ کاٹتے ہوئے پارس کے لمس سے کوئی آہنی اوزار سونے میں بدل گیا ہو اور سرجن نے رپورٹ میں اس کا تذکرہ ہی نہ کیا ہو۔"

"رپورٹ نہیں، میں نے تو پوسٹ مارٹم کرنے والے عملے سے معلومات حاصل کی ہیں۔" وہ بولا۔ "اور یہ بھی بتا دوں کہ آجکل سرجری میں عام لوہے کے بجائے اسٹین لیس اسٹیل کے آلات استعمال ہوتے ہیں اور تو خود ہی بتا چکا ہے کہ اسٹین لیس اسٹیل پر پارس پتھر بے اثر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ سرجن نے پارس کو معمولی پتھر سمجھ کر پھینک نہ دیا ہو۔ بھنگن نے آج سارے دن کا کوڑا اور گند چھان مارا مگر مجھے پارس کہیں نظر نہ آیا۔"

"اگر بنّے خان نے وہ پتھر نگلا تھا تو اس کے معدے سے برآمد ہونا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سالا مرتے مرتے بھی اسے ہضم کر گیا۔" بھوپت کے لہجے میں مایوسی اور بے چارگی کا ایسا ملا جلا عنصر تھا کہ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمہیں یاد ہے کہ دیوان نے ہمیں کیا بتایا تھا ؟" میں ایک فوری خیال کے تحت چونک کر بولا۔

"بنّے نے مرنے سے پہلے پارس نگل لیا تھا۔"

"یہ یاد نہیں کہ بنّے کو پارس نگلنے کی وجہ سے پھندا بھی لگا تھا۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں، یہ کہا تو تھا دیوان داس نے۔" میرے جوش سے بھوپت بھی مضطرب ہو گیا۔

"لہٰذا پارس اس کے معدے سے نہ برآمد ہونے کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔" میں مُٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

بھوپت نے غصے سے مجھے گھورا۔ اس کے لب کانپے اور سیتا پر نظر پڑتے ہی اس نے سر جھکا لیا۔ شاید میری پُرپیچ گفتگو پر اس کے ذہن میں چند نایاب گالیوں نے جنم لیا تھا جو سیتا کی موجودگی کی وجہ سے زیر لب ہی دم توڑ گئیں۔

"پھندے کی وجہ سے پارس بنّے خان کے مُنہ سے نکل گیا ہو گا جسے اپنی بدحواسی پھر تاریکی کی وجہ سے دیوان داس نہ دیکھ سکا یا......"

"یہی بات ہے۔۔۔ یہی بات ہے۔" بھوپت اُچھل پڑا۔ "پارس عام سنگریزوں کی طرح پیپل والی گلی میں ہی پڑا ہو گا۔"

"ایک صورت اور بھی ہو سکتی ہے استاد!" میں نے اپنی بات پوری کرنی چاہی۔

"اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی پٹھے!" وہ قریب آ کر پوری قوت سے میرا شانہ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "تیرا دماغ کوڑی بہت دور کی لاتا ہے، اس کے علاوہ دوسری بات ممکن ہی نہیں۔"

"اور اگر وہ پتھر حلق سے اُترنے کے بعد معدے میں پہنچنے کے بجائے آنت ہی میں پھنسا رہ گیا ہو ؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں سوّر کے بچے کی آنتیں کھینچ لوں گا۔" اس بار بھوپت گالی ضبط نہ کر سکا۔ گالیوں کے بغیر بات کرنے کی کوشش میں وہ اپنی گفتگو کا بھرپور انداز کھو چکا تھا۔

"مگر وہ سوّر کا بچہ مر چکا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "اس کی لاش کہاں ہے ؟"

"میں نے یہ معلوم نہیں کیا۔" وہ جھلا کر بولا۔ "میں اُس کی لاش ہر قیمت پر حاصل کر لوں گا۔"

"جوش نہیں استاد! ہوش سے کام لو۔" میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔ "ابھی تم پیپل والی گلی میں بھاگے جا رہے تھے، اب لاش حاصل کرنے پر تل گئے!"

"اب وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا۔" وہ غرایا۔ "تو پیپل والی گلی میں جائے واردات کے آس پاس پارس تلاش کر۔ میں لاش حاصل کرنے کی تدبیر کرتا ہوں۔"

"میں اُدھر نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی قتل کی واردات تازہ ہے، وہ جگہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہوگی۔ میرا ان اطراف میں پایا جانا خطرناک ہو گا۔"

"اور لاش تو تیرے فرشتے بھی نہ حاصل کر سکیں گے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"یہ دونوں کام تم ہی کو کرنے ہوں گے استاد!" میں اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔۔ میرے دو ٹکڑے کر دے پھر یہ ممکن ہے۔" اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

"وہ خبیث منشی کس کام آئے گا ؟"

چند ثانیوں کے لئے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "تو چالاک حرام خور ہے پٹھے! کام سے بچنے کی ترکیبیں خوب نکالتا ہے۔"

"استاد! یہ پٹھے کا خطاب مجھے پسند نہیں ہے۔" اچانک میں نے کہا۔

"کیوں ؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "تو خود ہی تو مجھے استاد کہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم میرے استاد سہی مگر یہ لفظ سُن کر مجھے ادھوری گالی کا احساس ہوتا ہے۔"

میری بات سُن کر وہ زور سے ہنسا۔ "ابے اُلّو کے پٹھے اور بھوپت سنگھ کے پٹھے میں بڑا فرق ہے۔"

"ہو گا، مگر مجھے محسوس نہیں ہوتا۔" میں نے سچی بات کہہ ڈالی۔

مگر اس کے ذہن پر اپنی بڑائی کا احساس اتنی شدت سے مسلط تھا کہ میری بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا اور آئندہ سے یہ خطاب ترک کرنے کا وعدہ کر لیا۔

پھر ہم دونوں نے پروگرام طے کرنے میں صبح کر دی۔ بھوپت کو سب سے پہلے لاش کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں اور پھر منشی کو لاش کے حصول پر مامور کرنا تھا۔ اس نے خود مجذوب کے روپ میں پیپل والی گلی میں پارس کی تلاش کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ کسی ہوش مند آدمی کے رُوپ میں گلی کے پتھروں کی چھان بین اس کے لئے ناممکن سی بات تھی۔

صبح کے پانچ بجے بھوپت رمنا ہوٹل سے چلا گیا اور ہم دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ نو دس بجے کے قریب سیتا کو بازار لے جا کر اس کے لئے کانٹیکٹ لینس کا بندوبست کروں گا۔

سات بجے دروازے پر دستک کے مسلسل شور سے میری آنکھ کھُل گئی۔ دروازہ کھولا تو بھوپت سامنے موجود تھا۔ اس کے چہرے سے کامیابی پھُوٹی پڑ رہی تھی۔

"لاش کا بندوبست ہو گیا ہے۔" اندر آتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ "نکا نپور میں بنّے خان کا کوئی وارث نہیں ہے اور ہوٹل والا اس کے کفن دفن پر تین چار سو روپے خرچ کرنے سے جان بچا رہا ہے۔ آج کل تو پیسے کے بغیر مرنا بھی مشکل ہے۔ ارتھی جلانے میں بھی دو چار سو لگ ہی جاتے ہیں۔"

"تو بنّے خان کی لاش کہاں ہے ؟"

"وہ لاوارث لاشوں کے ساتھ مُردہ گھر میں پڑی ہے۔ اسے آج دوپہر تک سرکاری خرچ پر دفنانے کا پروگرام تھا مگر منشی نے ہسپتال جا کر خود کو بنّے خان کا ماموں ظاہر کیا ہے۔ وہ کاغذی خانہ پُری کے بعد تھوڑی ہی دیر میں لاش حاصل کرے گا۔ میں نے سلامت پورے میں ایک مکان کرائے پر لے لیا ہے۔ منشی لاش لیکر وہیں پہنچے گا۔"

اس نے مجھے سلامت پورے والے مکان کا محلِ وقوع اچھی طرح سمجھایا اور چابی میرے حوالے کر دی۔ میں نے سیتا کو ضروری ہدایات دیں اور ہوٹل سے بھوپت کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

راستے میں بھوپت کو پیپل والی گلی کے قریب چھوڑ کر میں اس کی گاڑی میں سلامت پورے روانہ ہو گیا۔ جوں جوں پارس کی بازیابی کی مہم آگے بڑھ رہی تھی میرے اعصاب پر ناقابلِ بیان تناؤ طاری ہوتا جا رہا تھا۔

مکان تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بڑے مکانات پر مشتمل آبادی تھی اور وہاں کسی کے میری طرف متوجہ ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

گرد و غبار سے اَٹے ہوئے ویران کمروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مکان طویل عرصے سے غیر آباد ہے۔ میں نے بھوپت کی مرسیڈیز بنگلہ نما مکان کے احاطے میں پارک کی ہوئی تھی لہٰذا انتظار کے لئے میں نے اسی میں بیٹھے رہنے کو ترجیح دی کیونکہ اندر کوئی جگہ اس قابل نظر نہ آتی تھی۔

انتظار کا ایک ایک لمحہ اب میرے لئے اعصاب شکن تھا۔ خدا خدا کر کے گیارہ بجے کے قریب پھاٹک پر ایک گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے پھاٹک کھولا تو منشی اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ اس کی اسٹیشن ویگن کے عقبی حصے میں سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش موجود تھی۔

میں نے پھُرتی سے مرسیڈیز باہر نکالی اور منشی نے اپنی کار برآمدے کے سامنے کھڑی کر دی۔ پھاٹک بند کرنے کے بعد ہم نے احتیاط اور خاموشی کے ساتھ لاش اُتاری اور اسے غسل خانے میں لے گئے تاکہ پانی کے لئے ہمیں بار بار بھاگنا نہ پڑے۔

بنّے خان کے قتل کو چھتیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا لہٰذا لاش میں ہلکی ہلکی بدبو پیدا ہو چلی تھی۔ اگر موسم خوشگوار نہ ہوتا تو اب تک لاش کبھی کی گل چکی ہوتی۔

چادر ہٹائی تو بنّے خان کی ہیبتناک لاش برہنہ حالت میں سامنے آ گئی۔ پسلیوں کے زخم کے علاوہ اس کا پیٹ چاک تھا۔ سرجن نے پوسٹ مارٹم کے بعد پیٹ کے زخم کو بند کرنے کے بجائے کمر اور پیٹ کے گرد ایک چوڑی پٹی کس دی تھی۔

اس ورم آلود لاش کو دیکھ کر میں کانپ اُٹھا۔ جیتے جاگتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے میں نے کبھی ایک لحظے کے لئے تردد نہیں کیا تھا۔ قتل و خونریزی کے معاملات میں میرے تمام فیصلے فوری اور اٹل ہوتے تھے مگر ایک لاش پر خنجر آزمائی کی یہ مہم میرے لئے نئی تھی۔ میں سب کچھ سہی لیکن عقیدے کے اعتبار سے مسلمان تھا اور لاش کی بے حرمتی پر میرا دل کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ مرنے والا بھی مسلمان ہی تھا۔

"استاد کہاں ہیں ؟" منشی کی دھیمی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا اس نے تمہیں کوئی ہدایت دی تھی ؟"

"ہاں۔۔۔ ان کی واپسی تک مجھے تمہارے ساتھ رُکنا ہے۔" منشی خوف زدہ نظروں سے لاش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے جیب سے سات انچ لمبے پھل والا گراری دار چاقو نکالا اور کھٹکا دبا کر اسے بے آواز کھول لیا۔ منشی میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر غسل خانے سے باہر سرک گیا۔

"یہ لو۔" میں نے چاقو اس کی طرف بڑھایا۔ "احتیاط سے لاش کی پسلیوں کے اُوپری حصے اور گردن کے درمیان شگاف ڈالو۔"

"مم ..... میں ..... میں یہ کام نہیں کر سکتا" وہ دہشت زدہ گھگھیائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ لاش تمہیں لپٹ نہیں جائے گی" میں نے غرّا کر کہا۔

"نہیں" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ میری ہدایت سُن کر اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

میں نے اُنگلی پھیر کر چاقو کی دھار کا جائزہ لیا اور ناچار بنّے خان کی لاش پر خنجر آزمائی کے لئے تیار ہو گیا۔

زندگی سے بھرپور کساؤ دار انسانی جسم پر چاقو کی دھار کچھ اور ہی اثر رکھتی ہے مگر بنّے خان کے مُردہ اور ورم آلود جسم میں چاقو کی نوک یوں اُتر گئی جیسے نرم اسپنج میں انگلی دھنس جائے۔ کام کی ابتدا کراہت آمیز تھی مگر چند ہی ثانیوں میں پارس پتھر کا تصور ذہن پر یوں سوار ہوا کہ میرے ہاتھ مہارت سے چلنے لگے۔

گلے سے معدے تک پہنچنے والی غذا کی نالی قدرت نے انسانی جسم میں محفوظ راستوں سے گزاری ہے۔ یہ تجربہ مجھے اسی روز ہوا۔ پیٹ کے زخم پر بندھی ہوئی پٹی کُھلتے ہی بنّے خان کا کٹا ہوا معدہ اور آنتوں کا گچھا سامنے آ گیا مگر غذا کی نالی کی تلاش نے مجھے پریشان کر دیا۔ پسلیوں کے درمیان ہاتھ ڈالے بغیر اس کا جائزہ لینا ناممکن تھا۔ اور آخر میں نے پسلیوں کے درمیان بھی شگاف ڈال دیا۔

جب میں اس شگاف میں ہاتھ ڈال کر اندازے سے مختلف نالیاں وغیرہ ٹٹول رہا تھا تو کچن کے باہر لگی ہوئی گھنٹی یکبارگی چیخ اٹھی۔ منشی کے حلق سے ہلکی سی خوفزدہ چیخ نکلی اور میں بھی بُری طرح اُچھل پڑا۔ میرا ہاتھ مشینی طور پر لاش کے اس محفوظ پنجرے سے باہر نکل آیا جہاں اعضائے رئیسہ کا ہجوم ہوتا ہے۔

میں لاش چھوڑ کر پھُرتی سے باورچی خانے میں سرک گیا اور منشی کو باہر جا کر دریافت حال کا حکم دیا۔ میری ہدایت سُن کر اس کے چہرے پر ایسی ہیبت اُمڈ آئی جیسے میں نے اسے کند چھُری سے ذبح کرنے کے ارادے کا اظہار کیا ہو۔ اس نے فریاد کناں نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میری سرد اور سفّاک نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور باہر کی طرف ہو لیا۔

اس کے نکلتے ہی میں نے پھُرتی سے اپنی پوزیشن بدل ڈالی تا کہ آنے والے تشدد بھی کریں تو منشی سے ایسی اطلاع حاصل نہ کر سکیں جس کی بنا پر میں چوہے کی طرح مارا جاؤں۔

قدرے سکوت کے بعد میرے کانوں میں بھوپت کی تھکی ہوئی آواز آئی۔ وہ بلند آواز میں اپنے مقدّر کی ماں سے اپنے نازیبا رشتوں کا اعلان کر رہا تھا۔

اس کی آواز پہچان کر میں آڑ سے نکل آیا اور بھوپت پر نظر پڑتے ہی ششدر رہ گیا۔ اس وقت بھوپت کے بدن پر پھٹے ہوئے میلے چیتھڑے جھول رہے تھے۔ سر کے بال خاک آلود اور بُری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں لہو کی سُرخی رقصاں تھی۔ وہ برہنہ پا دلہنے ہاتھ میں ایک وزنی تھیلا لٹکائے منشی کے ہمراہ چلا آ رہا تھا۔

"کیا رہا؟" مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے تُرش مگر تجسس آمیز لہجہ میں سوال کیا۔

لاش آ چکی ہے اور اس کا غیر سرکاری پوسٹ مارٹم جاری ہے" میں نے اس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے تھیلے کو گھورتے ہوئے کہا۔

قریب آ کر اُس نے یہ تھیلا فرش پر پلٹ دیا اور چھوٹے چھوٹے سُرمئی اور سیاہ سنگریزے وہاں بکھر گئے۔ اسی کے ساتھ پلاسٹک کی ایک تھیلی گری ہوئی جس میں بھوپت کے صاف کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔

"میں اس گلی میں سے ہر وہ پتھر چُن لایا ہوں جس پر پارس کا ذرا گمان تھا۔ میں نہانے جا رہا ہوں، تو اچھی طرح انہیں دیکھ لے۔"

"لاش غسل خانے ہی میں پڑی ہے، چاقو بھی وہیں ہے۔ اُس سے بچ کے لینا" میں نے اپنی جان بچاتے ہوئے کہا۔

اس وقت بھوپت کی حالت ابتر تھی، اُس نے مجھ سے بحث نہیں کی، غسل خانے میں جا گھُسا۔

میں نے گہرے تجسس کے ساتھ اس کے لائے ہوئے تمام سنگریزے اچھی طرح پھیلا دیئے اور کئی بار ان کا جائزہ لیا مگر وہاں پارس تو کیا اس کا سایہ تھا، اسے تو میں لاکھوں نوادر میں بھی دُور ہی سے پہچان سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد بھوپت نہا کر غسل خانے سے نکلا اور آتے ہی مجھ سے پارس کے بارے میں سوال کیا۔

"یہ سب معمولی سنگریزے ہیں استاد!" میں نے مایوسی سے کہا۔ "لاش کے اندر سے کچھ برآمد ہوا؟"

"صرف غلاظت" بھوپت بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "میں نے پوری لاش ادھیڑ کر رکھ دی مگر پارس جیسی کوئی چیز نہیں ملی۔!"

"یہ ناممکن ہے استاد!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے یقین ہے بنّے نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

میں نے کسی مقصد اور ارادے کے بغیر اس رائے کا اظہار کیا تھا مگر گھاگ نظروں نے دیکھا کہ میری اس بات پر بھوپت کے چہرے کا رنگ لمحے کے لئے اُڑ گیا۔!

"میں تیرا مطلب نہیں سمجھا!" بھوپت سنبھل کر بولا۔

"پارس اسی لاش میں ہو گا استاد!" اِس بار میں نے چال چلی۔ "لاؤ ذرا میں بھی اس کے بخیئے اُدھیڑ دوں گا۔"

"چاقو کا کیا کرے گا؟" وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ ہنسا۔ "میں نے اس کی پسلیاں تک چیر ڈالی ہیں۔ گردن سے پیٹ تک اندر کی ہر چیز نظر آ رہی ہے۔"

"اور پھر بھی پارس نہیں ملا۔؟"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ میں نے اسے چھپا لیا ہے؟" وہ بھنا کر بولا۔

میں نے پھُرتی کے ساتھ ریوالور نکال کر بیک وقت اسے اور منشی کو کور کر لیا اور زہریلے لہجہ میں بولا۔ "میرا خیال یہی ہے استاد! پارس پا کر تمہاری نیت بدل گئی ہے۔ شاید تم نے اُسے چاقو کے پھل پر ہی آزمایا ہے۔ غسل خانے میں تمہیں کوئی اور چیز نہ ملی ہو گی۔"

"بکواس مت کر!" وہ غرّایا۔ "اور ریوالور جیب میں رکھ لے۔ پارس مل جاتا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم دونوں اس میں برابر کے شریک ہیں۔"

میں تلخ انداز میں ہنسا۔ "آدمی بڑا کمینہ ہے استاد، دولت اور بیوی میں کسی کو حصہ دار بنانا پسند نہیں کرتا۔ پتھر ملا ہو یا نہ ملا ہو، میں تمہاری تلاشی ضرور لوں گا۔"

"حقیر کیڑے! تو میری تلاشی لے گا!" وہ تنفر آمیز لہجہ میں بولا۔ "میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔!"

"تمہاری زندگی میرے لئے بے معنی ہے، اس وقت کا سب سے اہم مسئلہ تلاشی ہے، تم نہ سہی تمہاری لاش ہی کی تلاشی لے لوں گا۔"

"دغا باز، کمینے ...!" وہ غرّاتا ہوا میری طرف لپکا۔

"وہیں رُک جاؤ بھوپت!" میں ریوالور والا ہاتھ سیدھا کر کے بولا۔

"ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو تڑپتے نظر آؤ گے، وہیں رُک کر ہاتھ اُٹھا لو!"

میری اس دھمکی پر اس کے بڑھتے ہوئے قدم ضرور رُک گئے مگر اس نے ہاتھ بلند کرنے کی بجائے نفرت بھرے لہجہ میں بولا۔ "چلا گولی! میں بھی دیکھوں تو کتنا جیالا ہے۔ اس علاقہ کے لوگ پاس پڑوس سے بیگانہ تو رہتے ہیں مگر اتنے لاتعلق بھی نہیں کہ گولیوں کے دھماکے انہیں نہ چونکا سکیں۔!"

"پارس کہاں ہے؟" میں نے اس کی للکار کو نظر انداز کرتے ہوئے سرد لہجہ میں پوچھا۔

"میرے پاس!" وہ سینہ پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اسے میں نے بنّے خان کے گلے اور معدہ کی درمیانی نالی سے برآمد کیا ہے، وہ صرف میرا ہے۔"

میں نے چند سیکنڈ کے وقفہ میں اس نئی صورتحال کے بارے میں سوچا، پارس پتھر بھوپت کے قبضہ میں تھا اور وہ منشی سمیت میرے مقابلے پر آمادہ تھا۔ اس مکان میں ان دونوں کو قتل کرنے کی صورت میں میرے لئے شدید خطرہ تھا۔ اگر میں انہیں مار بھی دیتا تو ویر شور دھماکوں کے بعد مجھے اتنی مہلت نہ ملتی کہ بھوپت کی مکمل جامہ تلاشی لے پاتا۔ جتنی دیر میں تلاشی میں مصروف رہتا، علاقے کے مکین اس عمارت کو گھیر لیتے اور میرے فرار کی راہیں مسدود ہو کر رہ جاتیں جبکہ تلاشی کے بغیر بھاگ نکلنا سراسر ناکامی کے مترادف تھا اگر میرا نشانہ ذرا بھی خطا ہوتا اور ان میں سے ایک بھی زندہ بچ نکلتا تو میرا تو جو حشر ہوتا سو ہوتا سب سے پہلے ستیا بے خبری میں ماری جاتی اس پر بھوپت کے آدمی ہاتھ ڈالتے یا پولیس، ان میں سے کوئی صورت میرے لئے خوشگوار نہ ہوتی، تیسری راہ یہ تھی کہ میں ریوالور کی زد پر ان دونوں کو اس مکان سے کسی ویرانہ میں نکال لے جاتا جہاں مجھے ہر اعتبار سے ان پر برتری حاصل ہوتی مگر بھوپت اتنا احمق نہیں تھا کہ ریوالور کی زد پر میرے کسی ایسے حکم کو مان ہی لیتا۔ اپنی گفتگو میں وہ خود کہہ چکا تھا کہ اس مکان میں میرے لئے اس پر فائر کرنا علاقے کے مکینوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا دعوت نامہ ثابت ہو گا۔!

یہ سارا تجزیہ بمشکل چند سیکنڈ میں مکمل ہو گیا اور میں اچانک دوستانہ انداز میں ہنس دیا۔ بھوپت کے چہرہ پر حیرت اُبھری۔ وہ میرے رویہ کی اس تبدیلی کو میری چال سمجھ رہا تھا مگر جب میں نے ریوالور ہتھیلی پر رکھ کر اس کی طرف بڑھایا تو اسے میری سنجیدگی پر یقین نہ آ سکا۔

"یہ لو اور مجھے گولی مار دو استاد!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ زبردست خطرہ مول لیتے ہوئے اس سے کہا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے وہ ریوالور لے لیا اور جب اس کی توقع کے برعکس میں نے اپنا ہاتھ واپس نہ کھینچا اور بلا تامل ریوالور اسے دے دیا تو وہ اپنی زبان بند نہ رکھ سکا "تت... تو میری تلاشی نہیں لے گا؟"

"میں بہت ذلیل ہوں استاد!" میں بھرّائی ہوئی ندامت آمیز آواز میں بولا۔ "پارس کا نام آتے ہی میری آنکھوں پر خود غرضی کا پردہ گر گیا تھا۔ میں تمہاری دوستی کے قابل نہیں ہوں، مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو۔!"

جیسا کہ میرا اندازہ تھا، بھوپت میرے اس ناقابلِ فہم رویہ پر شدید الجھن اور حیرت کا شکار ہو چکا تھا۔ میں اس کی نفسیات سے واقف تھا اور اسی لئے میں نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا کہ بھرا ہوا ریوالور اس کے حوالے کر دیا اور خود نہتا رہ گیا۔

"تیری باتیں بعض اوقات مجھے حیران کر دیتی ہیں" وہ ریوالور ہاتھ میں گھماتے ہوئے بولا۔ "مجھے تیرا کوئی دماغی پرزہ کھسکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

"پارس میری بہت بڑی کمزوری تھا استاد، مگر اب میں اس کمزوری سے پیچھا چھڑانے کا تہیہ کر چکا ہوں" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

"اب تو پارس کا دعویدار نہیں ہے؟" وہ مسرت اور بے یقینی کے عالم میں بولا۔

"نہیں ... " میں نے اٹل لہجہ میں کہا۔ "میں اسے کھو چکا تھا، اگر وہ واقعی

تمہارے پاس ہے تو یہ بازیابی تمہاری کوششوں کے سبب ہوئی ہے' اس پر صرف تمہارا حق ہے۔ میرے لئے وہ ہمیشہ کے لئے گم ہو چکا ہے۔"

"شاید... شاید تو واقعی پاگل ہو گیا ہے!" اس نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔" پارس کو آزما کر مجھ پر لالچ غالب آگیا تھا' میں تجھے اس میں برابر کا حصہ دوں گا۔ وہ گھسنے یا ختم ہونے والی چیز نہیں ہے۔ ہم مل کر اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔"

اس کے ایمانداری کے اظہار پر میں دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ مقدر کی کیسی ستم ظریفی تھی کہ ابھی ہم دونوں محض پارس کے لئے ایک دوسرے کو خون آشام نظروں سے گھور رہے تھے اور اب دونوں پر ہی اس بارے میں تکلف اور انکسار کا دورہ پڑا ہوا تھا!

"مجھے پارس نہیں' صرف سکون چاہیے استاد!" میں گہرا سانس لیکر بولا۔"پارس تمہیں مبارک ہو' تم مجھے صرف دو لاکھ روپے دیدو' کوٹھاری سنز سے ملنے والی رقم میں میرا حصہ میرے لئے کافی ہے' اسکے سہارے میں سکون سے اپنی نئی زندگی کی ابتدا کر سکوں گا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا' یقین نہیں آتا۔" وہ حیرت سے بولا۔" تو دو لاکھ کہتا ہے' میں وہ ساری رقم تجھے دے دوں گا۔"

"اب بنّے خان کی لاش کا کیا بنے گا؟" میں نے مضمحل لہجہ میں پوچھا۔

"یہ اس کا رشتہ دار کھڑا ہے نا۔" یک بیک اس کی زندہ دلی عود کر آئی۔ "یہ لاش بنّے خان کے محلہ میں لے جائے گا۔ ادھر مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے آسانی سے غسل اور کفن دفن کا انتظام ہو جائے گا۔"

"اور تم نے اس کی لاش کو درمیان سے کھول جو رکھا ہے۔؟"

"منشی اس کا بندوبست کرے گا۔" بھوبت پہلی بار اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب تک کی ساری گفتگو میں ہم دونوں نے بری طرح اسے نظر انداز کیا ہوا تھا۔" تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پٹیاں باندھ کر زخم کا دہانہ بند کر دیا جائے گا۔ وہ جاہلوں کی بستی ہے' منشی ان سے کہدے گا کہ ہسپتال میں پوسٹ مارٹم اسی طرح ہوتا ہے' یہ تو معمولی سی بات ہے۔!"

پھر وہ منشی کو ہدایات دینے لگا۔ اس سے نمٹ کر ہم دونوں باہر نکل آئے!

"استاد گاڑی تم چلاؤ!" مرسیڈیز کے قریب پہنچ کر میں نے تھکے ہوئے لہجہ میں کہا۔

بھوبت نے میری درخواست نہ ٹالی اور اسٹیرنگ سنبھال لیا میں اسکے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس کی واسکٹ کی بائیں جیب سے ریوالور کا سیاہ دستہ جھانک رہا تھا جو کسی بھی لمحہ میری گرفت میں آسکتا تھا۔!

گاڑی روانہ ہوئی تو شام آ لگی تھی' سورج آہستہ آہستہ مغربی افق کی طرف جھکتا جا رہا تھا' سائے دراز ہو رہے تھے اور میں بالکل خاموش تھا۔!

"کیا بات ہے۔ خاموش کیوں ہے بلبل؟" میری طویل خاموشی پر بھوبت نے فقرہ چست کیا۔

"میں تمہارے سامنے اب سر نہ اٹھا سکوں گا استاد!" میرے لہجہ سے گہرے دلی افسوس کا اظہار ہو رہا تھا" اور نہ زبان کھولوں گا۔ میں جب تک تمہارا ساتھ لکھا ہے تمہارے غلام کی طرح رہوں گا۔"

"بیٹے اتنا ملال نہ کر!" بھوبت نے حقیقی پدرانہ شفقت سے کہا۔" چڑھتے خون میں ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ شکر ہے کہ تجھے گولی چلانے سے پہلے ہی ہوش آگیا۔!"

"تم عظیم ہو استاد!" میں نے بوجھل آواز میں کہا" تمہاری جگہ تو شاید ریوالور ہاتھ آتے ہی اس کا بھیجہ اڑا دیتا جو میرے مقابل ہوتا۔"

"تیری اداسی مجھے کھا جائے گی!" وہ میری ران پر ہاتھ مار کر بولا۔" اس قصہ کو بھول جا۔ میں تجھے ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا ہوں۔!"

"شراب ہی میرے اس جمود کو توڑ سکے گی۔"

"یہ کہنا میرے یار۔!" اس نے قہقہہ لگا" بوتل کی یاد ستا رہی ہے سالے کو۔ چل ابھی شراب خانہ چلتے ہیں۔"

"شراب خانہ کی گھٹن کے بجائے کھلے آسمان تلے ہی پئیں گے استاد!" "یہ تو نے میرے دل کی بات کی ہے' شراب ہو اور تنہائی بھی تو مزا دوبالا ہو جاتا ہے۔"

پھر اس نے شراب' عورت اور تنہائی کے فلسفے پر نہایت عالمانہ بلیغ مذاکرہ شروع کر دیا۔ مذاکرہ اس لئے کہ میرے لئے اس گفتگو میں کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بس سر ہلا ہلا کر اس کی تائید کرتا رہا۔!

شہر میں بھوبت سنگھ نے ایک جگہ کار روکی اور بھیڑ میں کہیں غائب ہو گیا۔ واپس آیا تو اخباری کاغذ میں لپٹے ہوئے دو چپٹے ادھے اسکے ساتھ تھے۔

"تیرا مقدر عروج پر ہے۔ کھول کر دیکھ تیرے لیے کیا لایا ہوں۔" میں گاڑی اٹھاتے ہوئے وہ بولا۔

میں نے کاغذ پھاڑا تو واقعی دل خوش ہو گیا۔ ظالم بلیک ڈاگ لایا تھا جو ان دنوں ہندوستان میں تقریباً نایاب ہوا کرتی تھی۔

"بوتلوں ہی سے پئیں گے' ایک تیری ہے دوسری میری!" اس نے آگاہ کیا۔

پھر گاڑی شہر سے مضافات کی طرف بھاگنے لگی۔ بھوبت نہایت معقول آدمی تھا۔ میرے منصوبہ کا نصف حصہ وہ خود تکمیل کو پہنچا رہا تھا اور جب سڑک سے اتر کر اس نے سنگلاخ پہاڑیوں کے قریب کار روکی تو آسمان پر دنگا رنگ انعکاس لرزاں تھا۔ رات کا دھندلکا دن کی دہلیز پر اتر رہا تھا!

اس نے جوں ہی انجن بند کیا' میرا ہاتھ چلا اور بھوبت کے ہوش سنبھالنے سے قبل ریوالور میرے قبضہ میں آچکا تھا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" بھوبت بوکھلا کر بولا۔

"شراب اور تنہائی میسر ہو تو سرور دوبالا ہو جاتا ہے استاد!" میں نے ہر لہجے میں بولا۔" اس ویرانہ میں تم میری تنہائی کے دشمن ہو اور تمہیں سلانا میرا مقصد ہے!"

وہ خوفزدہ انداز میں ہنسا" تو بھی بچوں جیسا مذاق کرتا ہے!" الفاظ اس کے منہ میں پھنس رہے تھے۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ میں نہایت مکاری کے ساتھ اسے جال میں پھانس لایا ہوں۔" یہ ریوالور جیب میں رکھ لے' کہیں مذاق ہی مذاق میں گولی نہ چل جائے۔"

"گاڑی سے اترو!" میں غصہ میں دہاڑا۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور میں اسے ذرا بھی مہلت دیئے بغیر اسے کور کیے کار سے باہر آگیا۔" پارس کہاں ہے؟" میں نے سرد لہجہ میں اس سے دریافت کیا۔

"م م... میری جیب میں! مگر تو نے تو وہ پتھر مجھے بخش دیا ہے!" وہ ہکلایا۔!

"وہ میری وقتی چال تھی استاد۔" میں پاگلوں کی طرح ہنسا' پارس میرا ہے میرا ہی رہے گا۔ صفدر علی کی زندگی میں کوئی اسے چھو بھی نہیں سکے گا۔"

"تو دھوکہ باز ہے صفدر۔!" وہ غصہ اور بے بسی کے عالم میں بولا" اس لئے تو نے شاید اسی لئے ندامت کا فریب رچایا تھا کہ وہاں تو فائر نہیں کر سکتا تھا اور یہاں... یہاں تو نے مجھے چوہے دان میں پھانس لیا ہے۔!"

"چوہے پنجروں میں نہیں بند کیے جاتے' یہ بتاؤ... ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہیں' صرف زبان سے بتاؤ کہ پارس تمہاری کس جیب میں ہے۔؟"

"واسکٹ کی اوپر والی جیب میں!" اس کے حلق سے بے جان سی آواز نکلی۔ فوراً ہی میں نے گولی چلا دی۔ ویرانہ دھماکے سے گونج اٹھا۔ اس کا بایاں زرد میں آیا اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر اوندھے منہ پتھریلی زمین پر آ رہا اور چند سیکنڈ میں دم توڑ دیا۔!

میں چند ثانیوں تک دور کھڑا اس کی لاش کا جائزہ لیتا رہا اور جب اس کی موت کا یقین ہو گیا تو میں اس کی طرف بڑھا اور خون میں تر واسکٹ کی اوپری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

میری انگلیاں کسی سخت چیز سے ٹکرائیں اور میں نے جلدی سے اسے باہر کھینچ لیا۔ میری زندگی کی کل پونجی میرے سامنے آگئی' بلاشبہ وہ پارس پتھر کا وہی سیاہ اور بدوضع نگ تھا جو میری انگوٹھی سے گم ہوا تھا۔ گو وہ بھوبت کے تازہ تازہ گرم خون میں تر تھا مگر میں اسے ہزاروں پتھروں میں پہچان سکتا تھا۔!

پارس جو شدید مصائب کے بعد حیرت انگیز طریقہ پر میرے پاس دریافت ہو کر کھونے کے بعد دوبارہ میرے قبضہ آچکا تھا اور اس بازیابی کے درمیان کئی ہوشیار انسانوں کا لہو حائل تھا۔ بنّے خان سے لیکر بھوبت سنگھ تک چار آدمی میرے ہاتھوں مارے جا چکے تھے اور اب پانچویں کی باری تھی!

پارس

پتھر میں نے پوری احتیاط کے ساتھ رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور استاد بھوبت سنگھ کا پستول بھی ساتھ ہی لے لیا۔ ابھی اس خوفناک ہتھیار سے مجھے اور کام بھی نمٹانا تھا۔

بھوبت کی خون میں لتھڑی ہوئی سرد لاش کو میں نے کہیں چھپانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ رات کی سیاہ چادر تیزی کے ساتھ اس سنگلاخ ویرانے پر ڈھلکتی آ رہی تھی اور رات انسان کے ہر راز کی امین ہوتی ہے۔ عام گزرگاہ سے کافی دور' اس علاقے میں بھوبت کی لاش اسی وقت دریافت ہو سکتی تھی جب اس پر منڈلانے والے مردہ خور' بھوکے گدھوں کے غول کسی کی توجہ کا مرکز بنتے!

بھوبت کی سیاہ مرسڈیز میں میرا واپسی کا سفر بے حد پر سکون تھا میری کھوئی ہوئی دولت میرے قبضے میں آچکی تھی۔ پارس پتھر میں شراکت کا ایک خود ساختہ دعویدار میرے ہاتھوں اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا تھا اور اب اس کے ایک گرگے کا صفایا کرنے کے بعد میں پوری طرح آزاد اور خود مختار ہونے والا تھا۔

جب میں شہر میں داخل ہوا تو رات آچکی تھی۔ شہر میں ہر طرف روشنیوں کی چکا چوند ہو رہی تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اہالیانِ کانپور پارس پتھر کی بازیابی پر چراغاں کر کے میری خوشیوں میں اپنی دلی شرکت کا اظہار کر رہے ہیں۔

مرسڈیز ہوٹل سے دور چھوڑ کر میں رمنا ہوٹل پہنچا۔ وہاں سبینا بڑے صبر اور سکون کے ساتھ میری منتظر تھی۔ اس کے جسم پر اب بھی مغربی طرز کا وہی لباس تھا جو میں نے اسے پہنایا تھا۔ سیاہ بالوں نے اس لباس سے مل کر اس کی شخصیت کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

"پارس کا کیا رہا؟" اس نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد دھیمی آواز میں سوال کیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے جیب سے وہ سیاہ اور بدوضع مگر نایاب پتھر نکال کر دکھایا اور کہا" اب یہ بلا شرکتِ غیرے ہمارا ہے؟"

"پہلے تو تو نے بتایا تھا کہ بھوبت سنگھ اس میں برابر کا شریک ہے!" وہ حیرت سے بولی۔

"اس کا حصہ اسے مل گیا" میں نے گلے پر انگلی چھری کے انداز میں پھیرتے ہوئے مکارانہ لہجے میں کہا۔

"تو نے اسے مار دیا" وہ قدرے حیرت اور خوشی کے ساتھ بولی" مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ تو موقع پاتے ہی اس کا کام تمام کر دے گا"

"ہاں۔ تو ولی ہے نا" میں چڑ کر بولا" تجھے ہر بات وقت سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی ہے"

"ناراض کیوں ہوتا ہے" وہ مسکراتے ہوئے ایک ادا کے ساتھ میرے سینے سے آلگی" میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ بعض واقعات کے

بارے میں مجھے پہلے سے یقین ہو جاتا ہے تیرا دوست صورت ہی سے مکار اور کمینہ نظر آتا تھا میرا بس چلتا تو اسی وقت کھوپت کا کام تمام کر دیتی جب تو نے مجھے پارس پتھر میں اس کی شراکت کے بارے میں بتایا تھا۔ میری ماں کی دی ہوئی چیز میں کوئی بھی تیرا شریک نہیں ہو سکتا۔"

"اب ہمارا یہاں رُکے رہنا خطرناک ہوگا۔" میں نے اُس سے کہا۔ "نیچے کھوپت کی کار موجود ہے، ہم اسی وقت کانپور سے روانہ ہو رہے ہیں۔"

"یہ کھوپت شاید اسی لئے پیدا کیا گیا تھا کہ ہمارے کام آجائے۔" میری بات سُن کر وہ زور سے ہنسی۔

"وہ کیسے؟"

"بنارس سے بھی ہم اسی کی گاڑی میں بھاگے تھے اور اب یہاں بھی اسی کی کار کام آئے گی۔" اُس نے ہنستے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"یہی نہیں اُس کی گاڑی میں لاکھوں روپے سے بھرا ہوا ایک بریف کیس بھی رکھا ہوا ہے۔ یہ رقم اس ملک سے نکلنے میں ہمارا ساتھ دے گی!"

"کیا ہمیں اسی وقت روانہ ہونا ہے؟" سیتا نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں ۔ ابھی اور اسی وقت!"

"پھر پہلے کھانا منگا لے، پتہ نہیں دوبارہ کب نصیب ہو!"

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے کمرے ہی میں کھانا طلب کیا اور نہانے کے بعد سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اس دوران میں میں نے سیتا کو پوری تفصیل سے آنے والی دشواریوں سے آگاہ کر دیا۔ پارس پتھر کی بازیابی کے بعد اب میں ہر قیمت پر کانپور سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کانپور سے قنوج اور آگرہ کے راستے مجھے اپنا سفر جاری رکھنا تھا اور کانپور سے نکلنے کے بعد پہلی فرصت میں کوئی نئی یا پرانی جیپ خرید کر کھوپت کی مرسڈیز سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ ہندوستان کی سرحد عبور کرنے تک سیتا کو کسی آوارہ گرد، گونگی لڑکی کے ہی روپ میں میرے ساتھ رہنا تھا تاکہ اُس کے بدلے ہوئے حلیے کا بھرم قائم رہے!

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سیتا کو اپنا مختصر سامان سمیٹنے کی ہدایت دی اور خود ہوٹل کے برآمدے میں لگے فون پر اسٹیٹ ہوٹل سے رابطہ قائم کیا۔

یہ میری خوش بختی تھی کہ کھوپت سنگھ کا منشی اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔

"منشی! تمہارا کام نمٹ گیا؟" کمرے سے سلسلہ مل جانے پر میں نے سوال کیا۔

"ہاں صاحب!" وہ میری آواز پہچان کر بولا۔ "مگر ایک اور مصیبت ساتھ لگ گئی ہے!"

"تم آدھے گھنٹے کے اندر کباڑیوں والے بازار کی نکڑ پر پہنچو، وہیں بات ہوگی۔" میں نے احتیاط کے پیش نظر بات کاٹ دی۔

"میں آجاؤں گا۔" اُس کے لہجے میں خوف کی ہلکی سی جھلک تھی۔ "مگر تم اور اُستاد اب ادھر کا رُخ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"وہ کیوں؟" اُس کے لہجے نے مجھے چونکا دیا۔

"نئی دہلی سے انڈین سیکرٹ سروس کے دو افسر آئے ہوئے ہیں، انہیں تم دونوں کی تلاش ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم وہاں پہنچ کر میرا انتظار کرو!"

میں نے سلسلہ منقطع کیا تو میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ میرے ذہن میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب نیپال سے ہندوستان کے قصبہ موتی ہاری میں پہنچنے کے چوتھے روز چاند ہوٹل میں انڈین سیکرٹ سروس کے دو افسر مجھ سے ملے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رانا گرنام سنگھ اور دوسرے کا نام پرتاپ چند تھا۔ وہ میری کیمیاگری کے راز سے واقف تھے۔ اُن کے بقول اُن کے ہرکارے نیپال سے میری نقل و حرکت کے بارے میں رپورٹیں بھیجتے رہے تھے۔ ان دونوں نے سختی سے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اُن سے ہونے والی تمام گفتگو کو راز میں رکھوں۔ موتی ہاری میں میرا قیام بھارتی شہری کی حیثیت سے تھا اور اب سیکرٹ سروس والے صفدر علی کی تلاش میں تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ یہ جان چکے تھے کہ میں بھیس بدل کر بھاگ رہا ہوں اور وہ گذشتہ ڈیڑھ دو ماہ میں میری طرف سے پوری طرح باخبر تھے۔

میں حساب صاف کرنے کی نیت سے کاؤنٹر پر گیا اور اچانک میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہاں دو افراد رجسٹر پر جھکے گہرے مشاہدے میں مصروف تھے۔

میں نے فوراً واپس لوٹنا چاہا مگر اس وقت تک میری آہٹ پا کر ان میں سے ایک نے سرسری طور پر میری طرف سر گھما لیا تھا اور اب اُس کی نگاہوں میں چمک سی عود کر آئی تھی۔ وہ کسی ماہر شکاری کی طرح میری طرف نگران تھا اور میری بدقسمتی کہ وہ دونوں چہرے میرے شناسا تھے۔ گرنام اور پرتاپ کے چہرے تو میں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

مگر میرے لئے حیرت اور خوف کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں بھی مجھے پہچان چکے تھے۔ میرا بدلا ہوا حلیہ بھی اُن کی گھاگ نظروں کو دھوکا نہ دے سکا۔ جب وہ موتی ہاری میں مجھ سے ملے تو میرا نام گنگا رام تھا۔ میری بھنویں منڈی ہوئی اور داڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی۔ بدن پر گیروا لباس تھا جبکہ موجودہ حالت میں میرے سر پر گھنے بال تھے، بھنویں تھیں، چہرہ کلین شیو اور لباس انگریزی وضع کا تھا!

کوشش کے باوجود میرے بڑھتے ہوئے قدم نہ رک سکے۔ گرنام کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی زہریلی مسکراہٹ اُبھر آئی اور وہ مجھ سے بولا "آیئے گنگا رام صاحب! ہمیں آپ ہی کی تلاش تھی!"

اور میرے پاس جوابی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا! کاؤنٹر پر کلرک کے ساتھ منیجر بھی موجود تھا جسے شاید گرنام ہی نے طلب کیا تھا۔ اس نے چونک پڑا کیونکہ ہوٹل میں میں نے اپنا نام اور پتہ کاشی لکھوایا تھا!

"ان کا حساب صاف کر دو منیجر! یہ اسی وقت ہوٹل چھوڑ رہے ہیں۔" گرنام نے دھیمے مگر تحکمانہ لہجے میں منیجر سے یہ کہتے ہوئے وہ رجسٹر بند کر دیا جس کی وہ ورق گردانی کر رہا تھا۔

"آپ کمرے میں چلیں، میں بل تیار کر کے ادھر آتا ہوں۔" منیجر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

گرنام کا اشارہ پاکر میں رہائشی کمروں کی طرف ہولیا۔ راستہ خاموشی سے طے ہوا مگر میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔

میری دستک پر سیتا نے دروازہ کھولا تو میرے ہمراہ ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹکی مگر موتی ہاری کے ان ناپسندیدہ ملاقاتیوں کو وہ بھی پہلی نظر میں ہی پہچان گئی مگر میری ہدایت کے مطابق زبان نہ کھولی۔ گونگوں کی طرح خاموش رہی۔

کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی گرنام نے تہذیب کا دامن چھوڑ دیا اور ترش لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے ہماری اجازت کے بغیر موتی ہاری کیوں چھوڑا؟"

"اس لئے کہ تم نے مجھے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا!" میرا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ اب میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا اور آہستہ آہستہ ایک حکمت عملی میرے ذہن میں ترتیب پاتی جا رہی تھی۔

"ہم اس لئے نہیں دیا تھا کہ مجھے اُمید تھی کہ میرے شریفانہ رویے کے باعث تم کوئی مکاری کرنے کی حماقت نہیں کرو گے۔" وہ غرایا۔

"اجنبیوں سے اُمید کر کے تم زیادہ دن اس ادارے کی ملازمت نہیں کر سکو گے جس کی روٹیاں تم کھا رہے ہو!" میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"ہوش میں رہ کر بات کرو!" پرتاپ نے میرا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "تم پر کئی انسانی جانوں کے اتلاف اور دہشت گردی کے الزامات ہیں اور تم ذمہ دار افسروں سے مخاطب ہو!"

"یہ غیر ضروری گفتگو ہے، مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے پرتاپ کا ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پارس پتھر کہاں ہے؟" گرنام کے الفاظ مجھے کسی گہرے کنویں سے ابھرتے محسوس ہوئے۔

میں نے اپنا بایاں ہاتھ اُس کے سامنے کر دیا جس میں پارس کے نگ سے محروم چاندی کی انگوٹھی موجود تھی "پارس یہاں ہوا کرتا تھا!"

"اور اب کہاں ہے؟" گرنام کے لہجے میں شبہات لرزاں تھے۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کھوپت کی تلاش میں تھے!" میں ہنس کر بولا۔ "اسے ڈھونڈ نکالو، وہی پارس کا پتہ جانتا ہے!"

ان دونوں نے ایک ثانیے کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر گرنام دھیمے لہجے میں بولا۔ "تم ہماری توقع سے زیادہ چالاک ہو صفدر علی۔ اگر بنارس میں تمہاری ساتھی لڑکی عدالت میں پارس پتھر کا ذکر نہ کرتی تو شاید ہم کبھی تمہارا سراغ نہ پا سکتے۔ لڑکی کے اسی بیان نے ہمیں تمہاری اصلیت کا احساس دلایا مگر جب تک ہم بنارس پہنچے، لڑکی جیل سے فرار ہو چکی تھی۔۔۔۔ کہاں ہے وہ؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے گہری نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

یہ محسوس کر کے میرا سر غرور سے تن گیا کہ مجھے پہچاننے والے وہ دونوں خرانٹ افسر بھی سیتا کے بہروپ سے دھوکا کھا گئے۔ میں آہستہ سے ہنسا اور بولا۔

"اس لڑکی کو یوں نہ گھورو۔ یہ ایک بے سہارا گونگی لڑکی ہے جسے میں نے پناہ دی ہوئی ہے، سیتا تو نہ جانے کہاں ہوگی!"

"مرزا پور میں تمہارے ساتھ کون لڑکی تھی؟" یہ سوال پرتاپ نے کیا تھا۔

"وہ آزاد فطرت لڑکی تھی، شہروں کی پابند زندگی اسے راس نہ آسکی ایک رات وہ مرزا پور میں مجھ سے ایسی بچھڑی کہ آج تک نہ مل سکی۔"

"اور اس کا کیا نام ہے؟" گرنام نے سیتا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں تو اسے سیتا ہی کہتا ہوں۔ یہ گونگی ہی نہیں جاہل بھی ہے۔ پڑھ لکھ بھی نہیں سکتی۔ اسے میں نے یوں ساتھ رکھ لیا کہ بولنے والی کسی عورت کے برخلاف یہ میری سرگرمیوں کے لئے کبھی خطرہ نہ بن سکے گی۔"

"چالاک نہ بنو صفدر علی!" گرنام کا غصہ قدرے اعتدال پر آ چکا تھا "میرے پاس تمہارے لئے بہت بڑی پیشکش ہے۔"

"میں تو بقول تمہارے مجرم ہوں، میرے لئے بھلا یہ رعایت کیوں؟" اس کے الفاظ میرے لئے واقعی حیران کن تھے!

"تمہاری تلاش کی مہم میں ہی کھوپت ہماری نظروں میں آیا اور اس کا کھوج نکالتے ہم یہاں پہنچے ہیں۔ اگر پارس اسی کے پاس ہے تو ہماری گفتگو بے ہوگی۔ تم پر عام مجرموں کی طرح مقدمہ چلے گا۔ جیل یا پھانسی تمہارے نصیب کی بات ہے!"

"گویا تمہاری دلچسپی صرف پارس سے ہے؟"

"ہاں!"

"یہ دلچسپی سرکاری ہے یا غیر سرکاری؟" میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ سوال قبل از وقت ہے، ہاں کھوپت کا پتہ کیا ہے؟"

گرنام پھر مکاری پر اُتر آیا تھا۔ ابھی مجھے منشی سے پتہ چل ہی چکا تھا کہ وہ دونوں اسٹیٹ ہوٹل میں جھک مارتے رہے تھے لہٰذا میں نے اطمینان سے جواب دیا "اسٹیٹ ہوٹل۔"

"مگر وہ آج صبح سے وہاں نہیں ہے!"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ تم لوگوں کے علاوہ ایک اور پارٹی پارس پتھر کے جنون میں مبتلا ہے۔ اگر کھوپت ان کے ہاتھ لگ گیا تو پارس کے ساتھ ہی جان سے بھی جائے گا۔ وہ لوگ جس وقت مجھ تک پہنچے وہ پتھر میرے قبضے سے نکل کر کھوپت کی تحویل میں جا چکا تھا۔"

"مگر کیسے؟" گرنام یہ سُن کر مضطرب ہو گیا۔

"پستول کی زد پر سب کچھ ہو سکتا ہے۔" اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے میں شکست خوردہ انداز میں ہنسا۔ "کھوپت کو عدالت کے ریکارڈ ہی سے پتہ چلا تھا کہ میرے پاس پارس پتھر ہے۔ پھر کل اس نے مجھے گھیر لیا۔ اس وقت میں بھی اسٹیٹ ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور میں نہتا ۔۔۔ پھر بھی میں نے انگوٹھی اتارنے کے بہانے اس پر حملہ کر دیا میرے مقدر کی خرابی کہ اس دھینگا مشتی میں پارس انگوٹھی سے نکل گیا۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ گرا ہوا پستول کھوپت کے ہاتھ آگیا اور وہ اس کی زد پر پارس پتھر پر قبضہ

کر کے صاف نکل گیا۔"

"جب ہی وہ کل صبح سے غائب ہے، رات بھی ادھر نہیں پہنچا۔" پرتاپ نے میری اس کہانی پر تبصرہ کیا۔

"میں کل صبح تک اسٹیٹ ہوٹل ہی میں تھا۔ بھوپت سے ٹکراؤ دس بجے کے قریب ہوا، اس کے بعد ہی میں نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا اور کل رات یہاں آگیا۔"

"کل سارا دن کیا کرتے رہے؟"

"پاگلوں کی طرح بھوپت کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔" میں نے کہا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ان دونوں کو میری اس برجستہ گھڑنت پر یقین آتا جا رہا ہے۔ ابتدائی تلخ کلامی کے بعد میرے ساتھ ان کا رویہ اعتدال پر آتا جا رہا تھا اور اب میں اُن کی جانب سے کسی ایسی پیشکش کا منتظر تھا جس میں مشترکہ طور پر بھوپت کی تلاش کا تذکرہ ہو۔

"پارس پتھر کی تلاش میں دوسری پارٹی کون ہے؟" گرنام ان دونوں میں سینئر معلوم ہوتا تھا کیونکہ بیشتر اہم سوالات وہی کر رہا تھا۔

"بنارس ہی کے کچھ غنڈے ہیں، میں انھیں صرف چہروں سے پہچانتا ہوں!"

"بھوپت کہاں کہاں مل سکتا ہے؟"

"میں کیا جانوں!" میں نے ایسے لہجے میں کہا جو ان دونوں کے دل میں میری لاعلمی کی جانب سے شبہات پیدا کر دے!

"تم جھوٹ بولتے ہو!" گرنام پر میری اداکاری کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ تم مجھے چارہ بنا لو۔" میں گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ "بھوپت کے کانپور میں دو ایک ایسے ٹھکانے ہیں جہاں اُس کے دشمنوں کے لئے صرف موت تقسیم ہوتی ہے۔ میں جان پر کھیل کر تمہیں وہاں لے بھی جاؤں تو اس پر قابو پانے کے بعد تم مجھے جیل میں دھکیل دو گے کیونکہ پارس بھوپت کے پاس ہے اور تمہیں اسی کی ضرورت ہے!"

"اگر تمہاری مدد سے پارس پتھر مل گیا تو یقین رکھو کہ ہم تمہاری طرف سے چشم پوشی اختیار کر لیں گے ہند میں تم پر کبھی پولیس ہاتھ نہ ڈالے گی۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے ہند پر تم ہی حکمراں ہو!"

"میں حکمراں نہیں مگر میری پشت پر حکومت ہے۔ مجھے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔" وہ جوش میں آکر بولا۔

"پولیس سے بچاؤ ناکافی ہے۔ پارس چھن جانے کے بعد میں تو فقیر ہو جاؤں گا۔ مجھے عزت اور روزگار بھی درکار ہے، پھر پارس صرف میری ملکیت ہے، بھوپت نے اس پر طاقت اور دھوکہ سے قبضہ کیا ہے۔" میری اداکاری میں خاصا زور پیدا ہو گیا تھا۔

"یہ سب ہو جائے گا، حکومت ہر قیمت پر پارس خرید لے گی۔" گرنام سنگھ کھڑا ہو گیا۔

"اور اگر یہ وعدے فریب ثابت ہوئے تو؟"

"اس وہم کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔" گرنام جھلا گیا۔

مہم میری مرضی کے مطابق موڑ لے چکی تھی۔ اپنا سامان لے کر میں سب کے ہمراہ کمرے سے نکلا۔ منیجر راستے ہی میں مل گیا۔ اُس کے ہمراہ کاؤنٹر پر تھا نے حساب بیباق کیا اور ہم چاروں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

ہوٹل کے سامنے ہی اُن کی سرکاری جیپ موجود تھی۔ گرنام نے سیٹ سنبھالی۔ میں اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ سیتا اور پرتاپ پیچھے بیٹھ گئے۔

"پہلے لوکل ایجنسی چلتے ہیں۔" گرنام نے مڑ کر پرتاپ سے کہا۔ "وہاں سے کچھ آدمی بھی ساتھ لے لیں گے۔"

"زیادہ بھیڑ بھاڑ ہوئی تو سب بے موت مارے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اُسے پکڑنا ہے تو اب وقت برباد نہ کرو۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لوکل ایجنسی پر اب کون ہوگا۔ ہمیں اس کے گھر پر ہی ملنا ہوگا وہ کسی تھانے سے انتظام کرے گا تو دیر ہو جائے گی۔" پرتاپ نے میری تائید کی۔

اور یوں جیپ میری بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہو گئی۔ میں اُسے کوکانپور کے اسی مضافاتی ویرانے کی طرف لے جا رہا تھا جہاں ابھی شام کو بھوپت کا کام تمام کیا تھا!

راستے بھر میں ان دونوں کو باتوں میں الجھائے رہا تاکہ انہیں تمام کارروائی کے بارے میں سوچنے کا موقع نہ مل سکے۔

اور جب گاڑی شہر سے نکل کر مضافاتی سڑک پر دوڑ رہی تھی تو عقبی نشست سے سیتا کی سریلی سی چیخ کے ساتھ "حرامزادہ" کا لفظ ابھرا اور ساتھ ہی فضا تھپڑ کے شور سے گونج اٹھی۔

"اسے گونگی بول پڑی۔" گرنام بوکھلا کر بولا۔ اس کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گیا تھا۔

میں پیچھے گھوما تو سیتا پرتاپ پر بُری طرح برسے جا رہی تھی اور پرتاپ بے غیرتوں کی طرح ہنسے جا رہا تھا جیسے اُس پر دورہ پڑ گیا ہو۔

"کیا بات ہوئی سیتا؟" گونگے پن کا بھانڈا پھوٹ جانے پر مزید فضول تھا۔

"ذلیل نے میری ران پر چٹکی لی تھی!" سیتا غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

اس وقت گرنام نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور میں سیٹ پر چڑھ کر پرتاپ پر ٹوٹ پڑا۔ اُس کی ہنسی چند بے معنی آوازوں میں ڈوب گئی اور جب تک وہ مدافعت کے لئے تیار ہوتا میں اُس کے چہرے پر کئی بھرپور مکے رسید کر چکا تھا۔

"ہٹ جاؤ۔ الگ ہٹو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" گرنام جیپ سے اُتر گیا اور میں پرتاپ کے بارے میں فحش گالیاں بکتا جیپ سے اُتر گیا۔

پرتاپ کے اُترتے اُترتے سیتا نے اُس کی پشت پر لات جما دی اور وہ بدحواسی کے عالم میں گرنام کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا تھا؟" گرنام نے اس سے پوچھا۔

"لڑکی پر مجھے شروع ہی سے شبہ تھا۔ وہ تمہاری اور صفدر کی گفتگو کے دوران بار بار یوں چونک رہی تھی جیسے ساری باتیں سمجھ رہی ہو۔" پرتاپ اس سے کہہ رہا تھا۔ "اُردو زبان پر ایک گونگی غیر ملکی لڑکی کا یوں چونکنا عجیب سی بات تھی اسے آزمانے کے لئے ابھی میں نے اس کی ران پر چٹکی لی اور تم نے دیکھا کہ یہ غصے اور تکلیف میں بول ہی پڑی!"

"بکواس!" میں غصے میں چیخا۔ "اس ذلیل آدمی نے سیتا سے ناشائستہ مذاق کرنے کی جسارت کی ہے، میں اسے سبق دوں گا۔"

"مجھے ناشائستہ مذاق کرنا ہوتا تو چٹکی لینے کے بجائے کوئی اور حرکت کرتا۔" پرتاپ اپنا جبڑہ سہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

اس کی بات معقول تھی لہٰذا میں نے موضوع بدل دیا۔ "یہ سیتا ہی ہے اس سے فاصلہ رکھ کر بات کرنا ورنہ گردن توڑ دے گی۔"

میں نے سمجھا بجھا کر سیتا کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اسی بہانے سرگوشی میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا اور یوں جیپ کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

منزل مقصود قریب آجانے پر میں نے جیپ کی رفتار سست کرا دی پھر بائیں طرف سڑک سے نیچے کچے راستے پر اُترنے کی ہدایت دی۔

کچی زمین پر اُترنے کے بعد جیسے ہی جیپ سیدھی ہوئی اُس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں زمین پر ٹائروں کے نشان نظر آئے اور گرنام خوشی سے اچھل پڑا۔

"وہ یہیں آیا ہے۔ ٹائروں کے نشان تازہ ہیں!"

میں دل ہی دل میں اُس کی نادانی پر ہنسا، یہ نشانات شام کے وقت مرسڈیز کی آمد و رفت سے بنے تھے اور گرنام پر یہ نشان دیکھ کر ایسی سنسنی طاری ہوئی کہ اُس نے پھرتی کے ساتھ جیپ کی روشنیاں گل کر دیں۔

"جیپ یہیں چھوڑ دو، ہمیں دو تین فرلانگ پیدل چلنا ہوگا۔ انجن کے شور سے وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے!" میں نے تجویز پیش کی۔

جیپ فوراً ہی ایک چٹان کی اوٹ میں روک دی گئی اور ہم چاروں جیپ سے اُتر گئے۔ حالانکہ میری جیب میں بھوپت سے حاصل کیا ہوا، بھرا ہوا پستول موجود تھا مگر میں نے غیر مسلح ہونے کی بنا پر آگے چلنے سے انکار کر دیا۔

اس پر وہ دونوں تذبذب کا شکار ہو گئے۔ تاریکی میں اُن کی نظریں چار ہوئیں اور گرنام نے مجھے اور سیتا کو قدم ملا کر اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ پرتاپ کو سب سے آخر میں آنا تھا۔ وہ مجھے مسلح کر کے ذرا بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا پھر اُس کی مجوزہ فارمیشن میں میرے علاوہ سیتا بھی ہر لمحہ پرتاپ کے ریوالور کی زد پر رہتی اور ہمارے لئے ذرا بھی چالبازی کی گنجائش نہ رہتی۔

"ہمیں بہت احتیاط سے بے آواز آگے بڑھنا ہے۔" میں نے اُن کے اعصاب پر دہشت سوار کرنے کی نیت سے کہا۔ "یہاں سے کئی فرلانگ آگے غاروں میں اُس کا مسکن ہے اور ایک اونچے ٹیلے پر ہر وقت مسلح پہرے دار گھومتا رہتا ہے جو ہمیں دور ہی سے دیکھ سکتا ہے!"

"غار؟" گرنام نے حیرت سے کہا۔ "ان ٹیلوں میں غار کدھر سے آگئے؟"

"سنا ہے یہ مضافاتی سڑک بنانے کے لئے اس علاقے سے ہزاروں ٹن پتھر نکالا گیا ہے اس کھدائی کے نتیجے میں گہرے گہرے غار بن گئے ہیں۔" میں نے جلدی سے بات بنائی۔

ہم چاروں رات کے گھور اندھیرے میں چٹانوں سے چپکے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھرے ہوئے ریوالور تھے جو کسی بھی لمحہ آگ اُگلنے کو تیار تھے۔

سنسنی، خوف اور بے یقینی کے ساتھ ہم کافی دور تک نکلتے چلے گئے۔ پھر اچانک ہی میں نے دبی دبی خوفزدہ آواز میں سرگوشی کی "نیچے لیٹ جاؤ۔"

اور ہم چاروں سینے کے بل پتھریلی زمین سے چپک گئے۔

"کیا بات ہے؟" گرنام نے آہستہ سے پوچھا۔

"سامنے والے ٹیلے پر میں نے ابھی ایک سایہ حرکت کرتے دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔

پرتاپ چونکہ سب سے آخر میں تھا لہٰذا میری اور گرنام کی سرگوشیانہ گفتگو سننے کے شوق میں پیٹ اور کہنیوں کے بل رینگتا ہمارے قریب آگیا۔

گرنام دبی دبی آواز میں اسے میرے شبہ سے آگاہ کرنے لگا۔ میرے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ اُن کے اعصاب پر اس وقت بھوپت سوار تھا۔ نگاہیں اندھیرے میں آگے مرکوز تھیں اور وہ ہم سے بالکل ہی غافل تھے۔ میں نے فضا میں ہاتھ لہرا کر سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں چیتوں کی طرح بے آواز ان پر ٹوٹ پڑے۔

میں گرنام کی پشت پر سوار ہوا اور سیتا نے پرتاپ کو دبوچ لیا۔ فضا اُن کی خوفزدہ چیخوں سے لرز اٹھی۔ میں نے اپنی جیب سے بھوپت کا پستول نکالا اور پل بھر میں ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ گرنام کی کھوپڑی کے ٹکڑے اڑ گئے۔ ادھر سیتا پرتاپ کی پشت پر سوار اُس کے بال پکڑ کر بار بار اس کا چہرہ پتھریلی زمین سے ٹکرا رہی تھی۔ اور وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے سانڈ کی طرح چیخ رہا تھا۔

میں نے سیتا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اٹھایا اور چند تولہ پگھلا ہوا سیسہ پرتاپ کی کھوپڑی میں بھی اتار دیا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پرتاپ کی مشکل آسان ہو گئی اور ایک بار پھر وہاں گہرا سناٹا چھا گیا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ان دونوں کے ریوالور اور شناختی کاغذات حاصل کر کے ہم دونوں سرکاری جیپ میں واپس روانہ ہو گئے۔ اس کامیابی پر سیتا بے حد خوش تھی۔

"جب پرتاپ نے چٹکی لی تھی تو تجھے بولنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"بیٹھے بیٹھے اُس نے اچانک چٹکی لی تھی اور چیخ کے ساتھ ہی میری زبان بھی چل پڑی۔ کسی ناگہانی مصیبت کے وقت گونگوں جیسے رونے کا اظہار ناممکن ہے!"

"تو جگہ جگہ میرے لئے دشواریاں پیدا کرتی آرہی ہے!"

"تو گلا گھونٹ دے میرا۔"

"تو نے بنارس کی عدالت میں پارس کا نام لے کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"بس ایک ہی تو غلطی کی تھی۔ اب کب تک اس کے طعنے دیئے جائے گا؟"

وہ تقریباً روہانسے لہجے میں بولی اور اپنے اسکرٹ کے دامن سے الجھنے لگی۔

"ایک غلطی!" میں گہرا سانس لے کر بولا۔ "اس ایک غلطی کے نتیجے میں تین خون ہو چکے ہیں۔ اگر تو زبان نہ کھولتی تو بھوپت، گرنام اور پرتاپ میرے پیچھے نہ لگتے۔"

"اور وہ جو تین آدمی تیری لاپروائی سے مرے ہیں!" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"وہ کون ہے؟"

"دیوان داس، اس کا ساتھی بڈھا اور بنّے خاں!"

"چل حساب برابر ہو گیا۔" میں زور سے ہنسا۔ "واقعی، اگر مجھ سے پارس پتھر نہ کھویا ہوتا تو ان تینوں کی باری نہ آتی، مگر اُن کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ انگوٹھی سے پارس کا گرنا تو اُن کی موت کا ایک بہانا تھا۔"

شہر کے ایسے حصّے میں ہم نے جیپ چھوڑ دی جہاں سے سواری مل سکتی تھی۔ جیپ میں فائلوں سے بھرا ہوا بریف کیس بھی موجود تھا۔ ان میں صرف ایک فائل میری ذات سے متعلق تھی میں نے وہ فائل تینوں ریوالورز سمیت بریف کیس میں بند کی باقی فائلیں جیپ میں ڈالیں اور ٹیکسی پکڑ کر واپس رمنا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں ٹیکسی چھوڑ کر ہم بھوپت کی مرسڈیز میں سوار ہوئے اور گاڑی کباڑی بازار کی راہ پر ڈال دی۔ گومتی کو وقت دیئے مجھے ڈیڑھ گھنٹہ گذر چکا تھا مگر وہ مقررہ مقام پر ابھی تک ایک پول کے سہارے کھڑا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور دوبارہ اسی ویرانے کی طرف چل دیا جہاں تین تازہ لاشیں موجود تھیں۔

راستے میں نہ منشی کو کوئی سوال کرنے کی ہمت ہوئی نہ میں نے اس سے بات کی اور مرسڈیز تازہ ترین دو لاشوں کے قریب لے جا کر روک دی۔

"رحم بھگوان!" لاشیں دیکھ کر منشی کراہا۔ "آج سارا دن تو لاشیں دیکھنے اور مردے ڈھوتے ہی گزرا ہے!"

دونوں لاشوں کے چہرے مسخ ہو چکے تھے مگر میرے حکم پر منشی ڈرتا کانپتا اُن کے قریب گیا، لائٹر کی روشنی میں اُن کے چہروں کا جائزہ لیا اور بتایا کہ یہی دونوں اسٹیٹ ہوٹل میں میری اور بھوپت کی تلاش میں پہنچے تھے۔

"بنّے خاں کی لاش کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"محلّہ والوں نے اسے دفن کر دیا، کل دو سو تیرہ روپے خرچ ہوئے!"

میں نے پہلے سے جیب میں رکھا ہوا گرنام کا ریوالور نکالا اور اس سے قبل کہ منشی کو شبہ ہو سکے اُسے بھی وہیں پہنچا دیا جہاں اُس کا آقا شام سے اُس کا منتظر تھا۔

پھر میں نے صورتِ حال کو پیچیدہ بنانے کے لئے بھوپت کا پستول منشی کی لاش کے قریب ڈالا۔ گرنام کا ریوالور اسی کے قریب پھینکا اور پرتاپ کا بھرا ہوا ریوالور ساتھ لے کر گاڑی میں آ گیا۔

کانپور میں اب ایسا کوئی فرد زندہ نہیں رہا تھا جو یہ بتا سکے کہ صفدر علی وہاں پہنچا تھا۔ نہ پارس پتھر کی گمشدگی۔ جانکسن تلاش اور سنسنی خیز بازیابی کا کوئی شاہد رہا تھا۔ انڈین سیکرٹ سروس کے وہ دو افراد جو مجھے ہر حال اور ہر بہروپ میں پہچان سکتے تھے میرا سراغ پاکر... حسرت ناک موت کو گلے لگا چکے تھے۔

اب پارس کا موہوم سا وجود بنارس کی عدالت کے ریکارڈ پر... شاید انڈین سیکرٹ سروس کی چند فائلوں میں ورنہ ہر طرح وہ نادر و نایاب... میری ملکیت تھا۔

مگر گرنام سنگھ کی زبانی اس معاملے کا ایک نیا موڑ میرے سامنے... اور وہ عقدہ بھی کھل گیا تھا جو مدت سے مجھے پریشان کر رہا تھا۔

دراصل موتی ہاری میں انڈین سیکرٹ سروس کے افسر کی آمد... ماضی کے کسی ناخوشگوار واقعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھیں یہ اطلاع... نیپال سے کوئی مہارشی ہندوستان آ رہا ہے جو سونا بنانے کا ہنر... انھوں نے اس رشی کے لئے اپنا جال پھیلا دیا۔ اور جب اُن کی معلومات... مرعوب ہو کر میں نے انھیں پارس کے بجائے کیمیاگری کی داستان سنائی... مطمئن ہو گئے اور شاید اپنے مرکز سے ہدایات لینے کی خاطر مجھے چھوڑ دیئے... میں جال میں کسنے سے قبل پھندے کاٹ کر موتی ہاری سے فرار ہو گیا۔

پھر بنارس کے واقعات کے نتیجے میں سیتا کی گرفتاری اور... بیان نے ایک بار پھر سیکرٹ سروس کو میری طرف متوجہ کر دیا۔ سیتا کی... دیکھتے ہی گرنام اور پرتاپ سمجھ گئے کہ صفدر علی وہی رشی ہے جو کبھی... دے کر موتی ہاری سے فرار ہوا تھا اور بنارس ہی سے انھوں نے میرے اور... کے تعلق کا بھی سراغ نکال لیا اور بھوپت کو تلاش کرنے کا ... بدقسمتی سے میں بھی موجود تھا۔ مجھ پر سیکرٹ سروس والوں کا وار پھر پڑتا... بار وہ حکومت کی جانب سے پارس پتھر کا واضح مطالبہ کرنے آئے تھے مگر... نپی تلی اور بے خطا منصوبہ بندی نے یہ رکاوٹ بھی صاف کر دی۔

اب مجھے صرف ایک ہی خوف تھا۔ گرنام اور پرتاپ کی لاشوں کے... ملتے ہی سیکرٹ سروس پورے وسائل کے ساتھ میری تلاش میں سرگرم ہو... چھوٹے یا بڑے گروہ بند بدمعاشوں سے مقابلہ اتنا مشکل نہ تھا مگر ایک... اور منظم سرکاری تنظیم کے مقابلے میں صرف ایک ہی بات میرے حق میں جا... کہ اُن کے پاس اب کوئی ایسا آدمی نہ تھا جس نے مجھے دیکھا ہو۔ اُن کے... میری جو تصاویر رہی ہوں گی اُن میں میرا حلیہ مہارشی گنگا رام کا تھا یا... میں جدید تہذیب کے دلدادہ صفدر علی کے روپ میں تھا۔ یہ میرا دعویٰ... محض تصویر دیکھنے والا کوئی بھی فرد یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ صفدر علی اور گنگا... ایک ہی شخصیت کے دو رُوپ ہیں۔

میرے لئے اصل خطرہ صرف سیتا تھی۔ بنارس میں اُس کا بہت چرچا... ہوا۔ اُس کی بیشمار تصویریں چھاپی گئیں وہ اب بھی اشتہاری مجرمہ تھی۔ میں نے اُ... حُلیہ امکانی حد تک بدل کر رکھ دیا تھا مگر پرتاپ جیسا کوئی بھی زیرک آدمی... کو اشتعال دلا کر اسی کی زبان سے اُس کی اصلیت اگلوا سکتا تھا۔

میں نے بالکل غیر جذباتی ہو کر اپنے دل کو ٹٹولا۔ اگر اس... سیتا کی راہیں جُدا ہو سکتی نہیں تو ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے شاید ... دونوں محفوظ اور خوشگوار مستقبل اپنا سکتے تھے مگر سیتا سے علیحدگی کا تصور ... ہی مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میں نے کار چلاتے ہوئے نظریں پھیر کر اس طرف دیکھا۔ وہ میرے ذہن میں چلنے والی ان آندھیوں سے بے خبر معصومانہ انداز میں پشتگاہ سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔

میری اور سیتا کی رفاقت طویل تو نہیں تھی مگر اس مختصر رفاقت کا ہر لمحہ ... زوال یادوں کا امین تھا میری خاطر اُس نے اپنی جنم بھومی کو خیرباد کہا، اپنی ماں کو آدمخوروں اور بندروں کے غول میں تنہا چھوڑا، ماضی کو بھول کر نئی زندگی کی بنیاد ڈالی، مجھے اس طرح ٹوٹ کر چاہا کہ مجھے خود پر ناز ہونے ... میرے ہر عیب اور میری ہر بُرائی کو یوں محبت سے گلے لگایا جیسے وہ کوئی ... ہوتی سچائی ہو۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی آبرو کے تحفظ میں اس نے وہ بنا... کہ سورماؤں کے بھی کلیجے دہل اٹھیں!

میرا دل مجھے ملامت کرنے لگا۔ میں آزادی کی خاطر اسے ٹھکرا رہا تھا! ... سیتا کی قیمت پر آزادی تو کیا زندگی بھی ہیچ تھی!

میں نے تارکول کی سیاہ چمکیلی سڑک پر کار آہستگی سے ایک کنارے پر ... روک دی اور والہانہ انداز میں اُسے اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔

خلافِ توقع وہ ہڑبڑائی، نہ بوکھلائی، بلکہ خمار آلود آنکھیں کھول کر ... میری نظروں میں جھانکا اور مسکرا کر سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔

اسی شاہراہ پر آگے چل کر میں نے مرسڈیز کچے راستے پر اتار دی۔

"کیا اب کسی اور کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ ہے؟" گاڑی سڑک سے اُترتے ہی سیتا بولی۔

"ہاں!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کسے؟" اُس نے مجھے تقریباً جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"ارے۔ ارے یہ کیا کر رہی ہے۔" میں اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے جھلّا کر بولا۔

میں نے درختوں کی آڑ میں گاڑی روک دی اور اندھیرے میں سیتا کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا "اب تیری باری ہے سیتا!"

"میری باری!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مار دے ایک گولی میرے ... سر میں۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھ سے اُکتا جائے گا، شہروں ... کا کتّا تجھے مجھ سے اچھی ہزار لڑکیاں مل جائیں گی۔" یہ کہتے ہوئے فرطِ جذبات سے ... تقریباً رو پڑی۔

میں نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا میری بات کو سچ سمجھ کر بھی وہ ... سکون سے میرے ہاتھوں مرنے پر آمادہ تھی۔ مگر میں نے لہجہ سخت بنا کر ... چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "تجھے یہ بھی پہلے سے پتہ تھا؟"

"ہاں!" اندھیرے میں اُس نے سر ہلا کر رندھی آواز میں کہا اور ... اُس کی نیلی آنکھوں میں نمی لرزتی نظر آئی۔ "میں اب تیری عادتوں کو اچھی ... طرح سمجھنے لگی ہوں، تیرا من بہت ہرجائی ہے۔ تیری محبت اور دوستی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، وقت تیرا ساتھ چھوڑ دے تو تو پل بھر میں آنکھیں بدل لیتا ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ تو نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں نہ جانے کتنی بار سوچا ہو گا۔ اگر میرا مقدّر یہی ہے تو تیرے ہاتھوں مر کر بھی مجھے دکھ نہ ہو گا۔"

اُس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ ڈال دیا تھا، میں تلملا اٹھا اور اس مذاق کو فوراً ہی ختم کر دیا۔ "تجھ پر تو ہر بات کا الہام ہوتا ہے، بے وقوف میں یہاں دوسرے کام سے آیا ہوں۔"

میں نے گرنام کی جیپ سے حاصل کی ہوئی فائل نکالی اور کار کی اندرونی بتّی روشن کر کے اُس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس میں میری گیارہ تصاویر موجود تھیں۔ کچھ نیپال میں میری لاعلمی میں اُتاری گئی تھیں اور دو تصویریں موتی ہاری کی تھیں کیونکہ اُن میں میرا حلیہ گنگا رام کا تھا۔ بہت سے کاغذات پر میری نقل و حرکت کے بارے میں تفصیلی اطلاعات تھیں ان کاغذات پر جابجا سُرخ اور نیلی سیاہی سے لمبے چوڑے نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے دو کاغذات سے مجھے پتہ چلا کہ سیکرٹ سروس کو اپنی حکومت کے لئے میری خدمات مطلوب تھیں۔ اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ مجھے گھیر کر حکومت ہند کے لئے سونا بنانے پر آمادہ کیا جائے۔

میں نے کار سے باہر آ کر ان تمام کاغذات کو آگ لگا دی۔ گرنام اور پرتاپ کے شناختی کاغذات بھی ان ہی شعلوں کی نذر کر دیئے اور اس وقت تک رکا رہا جب تک سارے کاغذات راکھ میں نہ بدل گئے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں دوبارہ آگے روانہ ہو گیا۔

اگلے روز صبح نو بجے کے قریب ہم قنوج میں داخل ہوئے اور مرسڈیز میں نے ایک ویران مقام پر چھوڑ دی کیونکہ اب یہ کار میرے لئے شدید خطرے کی علامت تھی۔

قنوج میں میں نے سب سے پہلے گلے میں لٹکایا جانے والا سفری تھیلا خریدا اور بریف کیس سے ساری رقم اُس میں منتقل کر لی۔ پرتاپ کا ریوالور اور سیتا کے چند کپڑے بھی اسی میں ٹھونس لئے اور دونوں بریف کیس لوگوں کی توجہ بچا کر شہر کے گندے نالے میں پھینک دیئے۔

اس تھیلے سے قطع نظر میرا حلیہ زیادہ معقول تھا اور اس حُلیے میں میں کسی جیپ کی خریداری کرتے ہوئے شبہ کی نظر سے نہ دیکھا جاتا البتہ نئی جیپ کی خریداری ابھی مناسب نہیں تھی۔

شہر میں آوارہ گردی کے دوران میں نے کئی گیراجوں میں چھان بین کی اور آخر کار ایک جگہ مجھے چار سال پُرانی لینڈ روور پسند آ گئی۔ اُس کی اصل خوبی یہ تھی کہ اُس کا انجن بہت جاندار تھا اور باڈی سے ہڈ تک مضبوط فولادی چادر استعمال کی گئی تھی۔ جیپ میں کینوس کا ہڈ ہونے کے باعث اتنا طویل سفر خوشگوار نہ گزرتا۔ میرے پاس رقم کی کوئی کمی نہ تھی مگر خود کو شبہ سے بالاتر رکھنے کے لئے میں نے مول تول میں کافی وقت صرف کیا اور ستائیس ہزار میں وہ گاڑی خرید لی۔

رسید پر میں نے اپنا نام سنیل موہن لکھوایا اور رقم کی ادائیگی کے بعد چابی اور لینڈ روور کے کاغذات لے کر وہاں سے چل دیا۔

کراچی میں اپنا مکان ہار کر نکلے ہوئے مجھے کم و بیش ڈھائی سال ہو رہے تھے اس دوران میں میں نے زندگی کے نت نئے روپ دیکھے تھے، غلسی کے آخری درجے سے تمول کے عروج تک دن دیکھے مگر اس عرصے میں پہلی بار صحیح معنوں میں ایک گاڑی کا مالک بنا تھا۔ رسید برنام غلط سہی، مگر یہ لینڈ روور میری زرخرید تھی۔ ایک محروم انسان کے لئے کسی سہولت کا حصول کتنا جذبات انگیز ہوتا ہے، اس کا اندازہ مجھے اسی روز ہوا۔ قنوج کی سڑکوں پر لینڈ روور دوڑاتے ہوئے میرا دل بھر آیا!

مگر یہ جذباتی اُبال مجھ پر زیادہ دیر طاری نہ رہ سکا۔ اس زمانے میں میرا ہر کام ٹھوس اور مصلحت آمیز ہوتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنی ذات پر کیسا سخت اور ناقابل رسائی خول منڈھا ہوا تھا۔ عام انسانوں کی طرح میں کبھی جذبات کا شکار نہیں ہوا۔ میرا دماغ ہر مرحلے پر جذبات پر غالب رہا اور کبھی میرا دل موم بھی ہوا تو بس چند ثانیوں کے لئے۔ اس کے بعد میں وہی صفدر علی ہوتا جو سینے میں پتھر کا دل رکھتا تھا اور آناً فاناً میں اپنی راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کے چیتھڑے اُڑا دینے کی صلاحیت رکھتا تھا جس کے فیصلے فوری مگر اٹل ہوتے تھے۔ وہی صفدر علی اب قنوج کی سڑکوں پر رواں تھا۔

پاکستان سے نیپال اور پھر ہمالیہ کی برفانی وادیوں تک کا میرا سفر بالکل بے نام سا تھا۔ میں بھاندر ناس کا خواب لے کر کراچی سے نکلا تھا مگر سنسنی، دہشت اور موت کی دہلیز سے جب میں نے بھاندر ناس سمیٹ لی تو اچانک میری کامیابی نامرادی میں بدل گئی۔ میرے حریف انندرام نے پوجی جانے والی وہ بیش قیمت پہاڑی جڑ تلف کر دی اور یوں اپنی دانست میں میں نیپال سے بے نیل و مرام ہی لوٹا تھا۔

مگر قدرت اپنی تمام تر ستم ظریفیوں کے باوجود مجھ پر مہربان تھی۔ میں نے پارس حاصل کیا جو ہر دور کی سب سے بڑی دریافت تھی، اس سے محروم ہوا اور آخر کار اب پھر اس پر قابض تھا اب میرے سامنے ایک واضح منزل تھی۔ گزرنے والا ہر لمحہ مجھے اس سرحد کے قریب لے جا رہا تھا جس کی دوسری جانب میرا ماضی اپنی تمام تلخیوں اور محبتوں کے ساتھ زندہ تھا، جہاں میں سیتا کے ساتھ اپنا گھر آباد کر سکتا تھا!

"تو کیا سوچ جا رہا ہے؟" سیتا نے میرے بازو میں چٹکی لے کر مجھے خوابوں سے چونکا دیا۔

"تو اپنے پہلے بچے کا نام کیا رکھے گی سیتا؟" میں نے شوخ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ سوچ رہا تھا تو؟" اُس نے غصے سے پوچھا۔

میں نے مسکرا کر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"اسے صفدر کا بچہ کہوں گی!" وہ دانت پیس کر بولی "تو مجھے کبھی اپنے دل کی بات نہیں بتاتا۔ ہمیشہ ٹال دیتا ہے!"

"اور لڑکی ہوئی تو اُسے سیتا کی بچی کہے گی۔ یہی بات ہے نا؟"

میں نے اُس کا آخری فقرہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوں کیا سوچ رہا تھا تو؟" وہ پائیدان ... سے پیر پٹخ کر بولی۔

"تجھے تو ہر بات پہلے سے معلوم ہوتی ہے، میں بتا کر ..." میں اسے چڑانے پر تلا ہوا تھا۔

"بتا ورنہ میں نیچے کود جاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ... کا دروازہ کھول لیا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے ... تمتما رہا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"تو بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے ... بند کر لے!" میں نے اُسے پچکار کر کہا "میں یہ سوچ رہا تھا کہ ... راستے سے چلنا چاہیئے، آگے کئی راستے پڑتے ہیں!"

اُس نے جیپ کا دروازہ بند کر دیا اور کھل کھلا کر ہنس ...

"دیکھا۔ کس طرح دھونس میں لیا۔ میرے مرنے سے ڈرتا ہے ..."

"ہاں بابا!" میں نے کہا "دنیا کی ہر عورت اپنے مرد کو ... ڈراتی ہے۔ آخر کو تو بھی تو عورت ہی ہے نا!"

"صفدر! یہ عورت اور لڑکی میں کیا فرق ہوتا ہے؟" ا... قریب کھسک کر شوق سے پوچھا۔

"بس شادی کا فرق ہوتا ہے!"

"سمجھ گئی، سمجھ گئی!" اُس نے جلدی سے میری بات اُچک ...

ہمارا سفر بہت سکون سے جاری رہا۔ میرے ذہن پر کوا ... تھا۔ سیتا پر بھی بے انتہا خوشی سوار تھی۔ یوں ہی ہنستے کھیلتے ہم ... گئے۔ وہ شہر تاج محل کی وجہ سے بے شمار سیاحوں کا گڑھ تھا۔ وہاں ... کے سواد نیا کے ہر خطے کا آدمی دیکھنے کو ملتا تھا اور اس ہجوم میں ہم ... لئے بہت گنجائش تھی۔

پچھلی بھاگ دوڑ کی تکان اُتارنے کی خاطر میں نے ... ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیتا نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی ... ٹورسٹ اِن نامی ہوٹل میں ٹھہر گئے۔

آگرہ میں ہمارا بیشتر وقت ہوٹل میں آرام کرتے گزرا ... دونوں تھوڑی دیر کے لئے تاج محل اور دوسرے بارونق مقامات ... نکل جاتے تھے!

میں نے دوسرے ہی روز ایک دکان سے سیتا کے لئے ... کانٹیکٹ لینس خرید لئے۔ ان میں مجھے مطلوبہ سیاہ رنگ تو نہ مل سکا ... کی نیلی آنکھیں سرمئی نظر آنے لگیں میری دانست میں یہی تبدیلی ... سیتا کو دو تین روز ان کی وجہ سے اُلجھن رہی مگر ... آن کی عادی ہوتی چلی گئی۔

آگرہ میں قیام کے چوتھے دن اخبارات نے طبیعت خا... کر دی۔ پہلے ہی صفحے پر کانپور میں چار سڑی ہوئی لاشوں کی دریافت ... بڑی خبریں موجود تھیں۔ بھوپت سمیت چاروں لاشیں شناخت کر لی گئی تھیں مگر پوری خبر میں کہیں بھی گرنام یا پرتاب کی سرکاری حیثیت کا تذکرہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی کہیں میرا نام آیا تھا! سرکاری ذرائع نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا مگر اخبارات نے اپنے طور پر کہانی مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات کوئی راز نہیں تھی کہ بھوپت غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہتا ہے۔ اخبارات کی کہانی میں سارا زور اسی بات پر تھا۔ منشی نے اپنے آقا کو دغا دے کر ہلاک کیا پھر اسی کے ہاتھوں گرنام اور پرتاب مارے گئے اور مرتے مرتے گرنام نے منشی کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اخبارات کی رائے میں سارا جھگڑا کسی قیمتی شے پر رہا ہوگا جو ان چاروں کی ہلاکت کے بعد کسی نامعلوم شخص کے قبضے میں چلی گئی۔ اس رائے کی حمایت میں اخبارات نے ان ریوالورز کا حوالہ دیا تھا جو لاشوں کے قریب ملے تھے۔

ان لاشوں کی بازیابی کا ردِ عمل میری توقع کے برعکس بہت شدید اور فوری ہوا کیونکہ اسی شام پولیس کی ایک جماعت ہوٹل میں مقیم سیاحوں کو چیک کرنے آپہنچی۔ وہ پارٹی میرے کمرے پر بھی آئی مگر میرے خشک اور باوقار رویے کے باعث وہ مجھ سے زیادہ سوالات کی ہمت نہ کر سکے اور معذرت کے چند رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد چلے گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد منیجر سراپا ندامت بن کر میرے کمرے میں گیا اور اُس کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ پولیس کی بھاری جمعیت پورے شہر میں چیکنگ کرتی پھر رہی ہے۔ اوّل درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے مسافر بھی اس چھان بین سے نہیں بچے تھے۔ پولیس کو کسی مجرم کی تلاش تھی جس کا نام سختی سے صیغۂ راز میں تھا!

"نام سے تو یہ لوگ زندگی بھر بھی مجرم تک نہیں پہنچ سکتے۔" میں نے منیجر کی معذرت قبول کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا "مجرم ذرا بھی ہوشیار ہے تو کوئی اور نام اختیار کر چکا ہوگا۔"

"یہ پولیس بھی جانتی ہے جناب۔" منیجر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "آپ کسی سے ذکر نہ کیجئے گا، انھوں نے مجھے مجرم کی تصویر بھی دکھائی تھی۔"

"تصویر!" میرا دل اچانک کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

"جی ہاں۔ وہ کوئی جوڑا ہے۔ مرد گنجے سر، بغیر بھنووں اور داڑھی والا کوئی پنڈت ہے۔ اُس کی ساتھی سرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی سفید فام لڑکی ہے!" پھر وہ عاجزی سے بولا "انھوں نے پہلے مجھے تصویریں ہی دکھائی تھیں مگر آپ کسی سے ذکر نہ کریں انھوں نے مجھے رازداری کی تاکید کی تھی۔ وہ دو تصویریں ہر پولیس پارٹی کے پاس موجود ہیں!"

"آپ بے فکر رہیں!" میں نے اسے تسلی دی اور تھوڑی دیر بعد وہ چلا گیا۔

ہم دونوں کی تصاویر کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ پولیس ٹھیک راہ پر تھی۔ میں نے جیپ سے ملنے والی جو فائل جلائی تھی اس کے علاوہ بھی سیکرٹ سروس والوں کے پاس ہم دونوں کی تصویریں تھیں

میرا اور سیتا کا حلیہ بالکل ہی بدل چکا تھا۔ انفرادی طور پر ہم میں سے کسی کا کبھی پہچانا جانا ناممکن تھا مگر ایک بات بہت خطرناک تھی۔ حلیوں کی وجہ سے ٹورسٹ اِن کا منیجر اور پولیس پارٹی دھوکے کا شکار ہو گئی تھی مگر ایک چیز ان کی توجہ سے بچ گئی۔ اہم نکتہ تھا کہ پولیس کو جس جوڑے کی تلاش تھی اس میں مرد مقامی اور لڑکی سفید فام تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم دونوں مجرموں کی طرح پولیس کے روبرو موجود ہیں۔ مقامی اور سفید فام رنگت کا یہ سنگم ایسا تھا کہ جلد یا بدیر پولیس میری طرف متوجہ ہو سکتی تھی اور پولیس کی تندہی سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ تصاویر کی بنیاد پر تلاش میں ناکامی کے بعد دو تین ہی روز میں پولیس بڑے پیمانے پر ہر اس جوڑے کو چیک کرے گی جو مقامی مرد اور سفید فام لڑکی پر مشتمل ہو پولیس کے لئے لاکھوں کی آبادی میں ایسے چند سو جوڑوں کو چیک کرنا نسبتاً بے حد آسان تھا۔

مزید ایک خرابی یہ تھی کہ بھوپت کی مرسڈیز میں نے قنوج میں چھوڑی تھی اگر میں اُس کی نمبر پلیٹ ہٹا کر اسے نذرِ آتش کر دیتا تو اس جلے ہوئے ڈھانچے کو لاوارث سمجھ کر کباڑی اُٹھا لے جاتے۔ انجن اور چیسز کے نمبروں کے سہارے مالک کی تلاش کی عرق ریز مہم کی نوبت ہی نہ آتی جبکہ موجودہ صورتِ حال میں پولیس بآسانی یہ اندازہ کر لیتی کہ میں قنوج تک ضرور پہنچا تھا اور پھر قنوج سے آگے میری تلاش پر زور دیا جاتا۔ قنوج سے دو ہی شاہراہیں آگے نکلتی ہیں۔ ایک گنگا کے مغربی کنارے کی آبادیوں کو چھوتی علی گڑھ جاتی ہے دوسری فیروز آباد اور آگرہ کے راستے علی گڑھ سے جا ملتی ہے۔ یوں آگرہ، علی گڑھ اور دہلی پر پولیس زیادہ توجہ دیتی کیونکہ علی گڑھ سے آگے قریب ترین بڑا شہر دہلی ہی ہے۔

میرے لئے اب اپنی حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی ضروری ہو گئی تھی۔

پولیس کی آمد کے فوراً بعد ٹورسٹ اِن کو خیرباد کہنا مشکوک ہوتا لہٰذا میں نے بڑے اضطراب کے عالم میں وہ دن کمرے میں محدود رہ کر گزارا اور اگلی صبح ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔

سیتا لینڈ روور کی عقبی نشستوں کے درمیان چھپ گئی اور میں پوری رفتار سے آگرہ سے روانہ ہو گیا۔ ہنذرس اور علی گڑھ کے راستے میں بڑھتا چلا گیا کیونکہ دہلی اب میرے لئے زنداں ہی ثابت ہوتا۔ علی گڑھ سے آگے خورجہ اور سنبھل ہوتے شام سے پہلے پہلے ہم ہاپڑ جا پہنچے۔ یہ ہندوستان کا ایک چھوٹا سا غیر معروف شہر ہے۔ یہاں ایک ہوٹل سے میں نے خورد و نوش کا کچھ سامان بندھوایا اور آگے چل پڑا۔ کئی دن کے مسلسل آرام کے بعد یوں طویل ڈرائیونگ کرنی پڑی تو میرے اعصاب شل ہو کر رہ گئے مگر اب غفلت مہلک ہو سکتی تھی۔ مجھے ہر قیمت پر اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔

شام کے دھندلکے میں ہاپڑ اور میرٹھ کے درمیان کھیتوں میں رک کر میں نے اور سیتا نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ تھرماس سے گرم گرم چائے معدوں میں

انڈیلی اور میں نے سگریٹ سلگا کر ریڈ روور آگے بڑھا دی۔

میرٹھ نہایت کشادہ، صاف ستھرا اور پرسکون شہر ہے، ہم رات کے تقریباً نو بجے میرٹھ میں داخل ہوئے تو وہاں ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ میں نے سیتا کو عقبی حصے سے اپنے برابر والی نشست پر بلا لیا۔

وہ ساری رات ہم نے سفر میں گزاری۔ مظفر نگر، پانی پت، کرنال اور بے شمار چھوٹے چھوٹے دیہات یکے بعد دیگرے گزرتے رہے اور اگلی رات گیارہ بجے ہم مشرقی پنجاب کے شہر انبالہ میں جا پہنچے۔

چھتیس گھنٹوں کی مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے بے حال کر دیا تھا سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا آنکھوں پر ورم آ گیا تھا اور سوزش سے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اب آرام نہ کیا تو راستے میں کوئی خطرناک حادثہ پیش آ سکتا ہے کیونکہ ان راستوں پر رات کے وقت مال بردار ٹرکوں کی تیز روشنیاں مخالف سمت سے آنے والی چھوٹی گاڑیوں کے ڈرائیورز کو تقریباً اندھا کر دیتی ہیں جبکہ میرے اعصاب اب کسی بھی لمحے جواب دے سکتے تھے۔

انبالہ دربار ہوٹل اوسط درجہ کا صاف ستھرا رہائشی ہوٹل تھا۔ اس کے سکھ منیجر نے بڑے اخلاق کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور ہم اپنے کمرے میں پہنچتے ہی گہری نیند سو گئے۔

مجھے سوئے نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی نے پوری قوت سے مجھے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ میرے لئے آنکھیں کھولنا بھی مشکل ہو رہا تھا پھر میرے کانوں میں نقاروں کا شور گونجنے لگا اور میں ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"باہر کوئی ہے!" سیتا نے میرے کان کے نیچے سرگوشی کی اور اب میں نے غور کیا تو واقعی کوئی دروازے پر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا!

"کون ہے؟" میں نے غنودگی اور جھلاہٹ کے عالم میں سیتا سے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون ہے، کافی دیر سے دستک دے رہا ہے!"

یہ سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے اور یک بیک ساری غنودگی کافور ہو گئی۔ "تو گونگی ہے۔ یہ یاد ہے نا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے زور سے اثبات میں سر ہلایا اور میرے اشارے پر چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی۔

"کون ہے؟" میں نے بوجھل مگر اونچی آواز میں پوچھا۔

"دروازہ کھولیں۔ پولیس!" باہر سے آواز اُبھری اور یکایک میرا دل ڈوبنے لگا۔

اپنے اوسان پر قابو پاتے ہوئے میں نے دروازہ کھول دیا۔ باہر منیجر ایک سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل کے ہمراہ موجود تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے بیزار اور چڑچڑے لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں آپ سے کچھ سوال کرنے تھے!" سب انسپکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیا اس شہر میں صبح طلوع نہیں ہوتی جو آپ اس وقت تشریف لائے ہیں؟" میں نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

میری رسٹ واچ اس وقت رات کے سوا دو بجا رہی تھی۔

"سرکاری فرائض دن اور رات کے پابند نہیں ہوتے جناب!" انسپکٹر ناگواری سے تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟" میں نے بیچارگی والے لہجے میں کہا۔

"آپ کا نام؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"سنیل موہن!" میں اُسے جواب دے کر سکھ منیجر پر برس پڑا۔ "... نہیں بتا سکتے تھے۔ تمہارے رجسٹر میں اپنا پورا شجرہ لکھ کر آیا تھا۔"

"جناب میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے تھانے میں آپ کی آمد کی اطلاع دی تھی۔" منیجر گھگھیایا۔

"کیا میں صورت سے تمہیں چور، ڈاکو، خونی لگتا ہوں!" یہ تنفر آمیز تھا۔

اُن کے ساتھ میرا یہ رویّہ بہت مناسب رہا۔ جس کے دل میں چور ہو وہ باوردی سرکاری اہلکاروں کے سامنے اتنی دیدہ دلیری نہیں دکھا سکتا۔ اسی بات نے سب انسپکٹر کو مطمئن کر دیا۔ منیجر کو میرے عتاب سے بچانے کے لئے وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "منیجر بے قصور ہے سنیل صاحب! ... طرف سے ہوٹل کی انتظامیہ کو حکم ہے کہ دیسی مرد اور غیر ملکی لڑکی پر مشتمل جوڑے کی آمد سے قریبی تھانے کو فوراً باخبر کیا جائے....."

"تاکہ انھیں پھانسی پر لٹکایا جا سکے!" میں نے چڑچڑے لہجے میں اُس کی بات کاٹ دی۔

میری اس بات پر انسپکٹر بے اختیار مسکرا دیا۔ "آپ لاہور سے تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی ہاں! میں نے غصے سے جواب دیا۔ "میرا نام سنیل موہن ہے ... سے میری شامت یہاں لائی ہے۔ چند کاروباری مسئلے نمٹا کر جلد ہی ... جاؤں گا۔ میری ساتھی لڑکی فرنچ نژاد مس این ہے اس کے سارے ... سامان کے ساتھ چوری ہو گئے اور وقت گزاری کے لئے میں نے اس ... لڑکی کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اب مجھے سونے کی اجازت ہے؟"

ہیڈ کانسٹیبل میرے چڑچڑے پن سے محظوظ ہو رہا تھا کیونکہ ... زیرِ لب مسکرائے جا رہا تھا یہی حال سب انسپکٹر کا تھا مگر اس کی مسکراہٹ میں تسلسل نہیں تھا۔

"بہت بہت شکریہ۔ اب آپ آرام کر سکتے ہیں!" سب انسپکٹر نے ... میری جان میں جان آئی۔

"میں صبح یہ ہوٹل چھوڑ دوں گا" میں نے منیجر سے کہا "میرا حساب تیار رکھنا!"

"میرا مشورہ ہے کہ آپ ہوٹل تبدیل نہ کریں سنیل صاحب!" سب ... کا لہجہ واقعی مخلصانہ تھا۔ "آپ دوسرے ہوٹل میں گئے تو ایک بار پھر کوئی ... آپ کو زحمت دے گی۔"

"مشورے کا شکریہ!" میں نے کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

جب راہداری میں ان تینوں کی آہٹیں معدوم ہو گئیں تو سیتا چادر پامال کر اُٹھ گئی۔ "چلے گئے؟ کون تھے وہ لوگ؟"

"پولیس!" میں دونوں کان چھو کر بولا۔ "اس وقت ہم بال بال بچے ... میری اور تمہاری تلاش میں پولیس ہر بے تکے جوڑے کو چیک کر رہی ہے۔"

"میں بے تکی ہوں!" وہ اچانک اُداس ہو گئی۔

"ہم میں سے ایک ضرور ہے۔" میں بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر ... کی طرح میری چمڑی سفید اور تیری کالی ہو جائے تو کوئی ہماری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔"

وہ پُرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے میرے پہلو میں دراز ہو گئی۔

"صفدر!" کچھ دیر بعد سیتا کی دھیمی سی آواز اُبھری۔

"کیا تجھے نیند نہیں آ رہی؟" میں نے سر گھما کر پوچھا۔

"تو کس بستی میں گھر بسائے گا؟" اُس نے سوال کیا۔

"کیا مطلب؟"

"یہاں تو ہر بستی کا نام ہوتا ہے نا، تیری منزل کا نام کیا ہے؟" اس کی ... اور معصومانہ آواز میں ایک عجیب سی تڑپ تھی۔

"لاہور یا کراچی۔" میں نے اُسے جواب دیا۔ "ان ہی میں سے کسی شہر میں اپنا گھر آباد کریں گے۔ لاہور میری جائے پیدائش ہے۔ میری ماں، میرے نانی، میرے سب گھر والے لاہور ہی میں رہتے ہیں۔ میں تجھے مال روڈ دکھاؤں گا۔ انارکلی کی تنگ گلیوں اور کشادہ دکانوں کی سیر کراؤں گا۔" لاہور کا ذکر آتے ہی ... دل میں ایک لاوا سا اُبل پڑا۔ "جو برجی، شالامار، بادشاہی مسجد، تادربار، شاہی قلعہ، لارنس گارڈن، شملہ پہاڑی، تانگے، لسّی کے ہاتھ بھر لمبے پسینوں میں نہائے گلاس .... لاہور دیکھ کر تو پاگل ہو جائے گی سیتا۔ ... پھر کراچی نے تو مجھے نئی زندگی دی تھی۔ اونچی نیچی عمارتوں کے سائے میں بھاگتے دوڑتے لاکھوں انسانوں کا وہ شہر بھی عجیب ہے جہاں سمندر کی لہریں ... شہر کی رونق دیکھنے کی آرزو میں مچل مچل کر ساحل پر ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ ... تجھے تیرنے والے جہاز دکھاؤں گا۔ یہ چھوٹے چھوٹے شہر اپنی ہی دنیا رکھتے ہیں۔ وہاں کلفٹن ہے۔ بڑی بڑی تفریح گاہیں ہیں... جب سال کی آخری رات کو بارہ بجتے ہیں تو سارے جہازوں کے سائرن اور ہوٹر ہم آواز ہو کر چیخ اُٹھتے ہیں۔ رقص گاہوں میں اندھیرا پھیل جاتا ہے، ہر طرف سانسوں کے ساز بج اُٹھتے ہیں۔ میں تجھے یہ سب دکھاؤں گا سیتا، یہ سب دکھاؤں گا۔"

"لاہور یا کراچی!" سیتا نے آہستہ سے زیرِ لب دہرایا جیسے یہ نام یاد کر رہی ہو ... پھر بولی۔ "پہلے کون سا شہر آتا ہے ان میں سے؟"

"لاہور۔!" میں نے کہا۔ "وہ یہاں سے بس ایک دن کی مسافت پر ہے پھر آخری سرے پر کراچی ہے جس کے آگے جھاگ اُڑاتا سمندر بکھرا ہوا ہے!"

سیتا محبت کے ساتھ میرے بالوں میں آہستہ آہستہ اپنی نرم انگلیاں پھیرنے لگی اور میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ ذرا ہی دیر میں میں گہری نیند سو گیا۔

اس رات میں ذہنی طور پر لاہور اور کراچی میں گھومتا رہا۔ سیتا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے میں نے ان شہروں کا چپہ چپہ دیکھا۔

میں بیدار ہوا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے سیتا کو آواز دی مگر جواب ندارد۔ پھر میں نے اس کی جانب کروٹ لی تو شکن آلود بستر خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ اُسے پکارا۔ میرے لاشعور سے خوف کی ایک لہر اُبھری اور پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ میں نے لپک کر باتھ روم دیکھا، مسہری کے نیچے تلاش کیا مگر سیتا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

میرے کانوں میں سیٹیاں سی گونجنے لگیں۔ سیتا نہ جانے کہاں تھی۔ میری اجازت کے بغیر وہ ہوٹل کے کمرے سے قدم بھی نہ نکالتی تھی مگر اب وہ لاپتہ تھی۔

لباس تبدیل کر کے میں نیچے پہنچا۔ دربان سے دریافت کیا، استقبالیہ کلرک سے پوچھا مگر سب نے سیتا کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔

جوں جوں سیتا کی تلاش میں ناکامی کا احساس بڑھ رہا تھا، مجھے اپنی ساری توانائی اور صلاحیتیں زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں نے ہوٹل میں الٹا سیدھا ناشتہ کیا اور وہاں سے نکل گیا۔ سارا دن میں پاگلوں کی طرح انبالہ شہر میں بھٹکتا رہا مگر مجھے سیتا کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ شام ڈھلے میں آخری اُمید لئے ہوٹل پہنچا تو وہاں بھی کوئی اچھی خبر نہ ملی۔ سیتا ابھی تک نہ لوٹی تھی۔ میرے دل و دماغ پر اُداسی نے ڈیرے ڈال دیئے۔ میں شکستہ دل اپنے کمرے میں پہنچا اور تکیے میں منہ چھپا کر بلک کر رو پڑا۔

اس روز میں زندگی میں پہلی بار آواز اور ہچکیوں سے رو دیا۔ میرے دل کا غبار کسی طرح صاف نہ ہوتا تھا، زندگی بے کیف اور بے روح نظر آنے لگی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ سیتا مصیبت میں ہے وہ آزاد اور سلامت ہوتی تو کبھی مجھ سے دور نہ رہتی۔ اُسے تو ہر دم میرے قریب رہنے کا جنون تھا۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر میری بے خبری میں کہاں جا سکتی تھی!

وہ پوری رات میں نے سیتا کی یاد اور فراق میں جاگتے گزار دی۔ راہداری میں اُبھرنے والی ہر آہٹ پر میرے دل میں اُمید کی چنگاری بھڑک اُٹھتی اور آہٹ معدوم ہونے کے ساتھ ہی راکھ ہو جاتی۔

اگلے روز مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے ہوٹل کو خیرباد کہا اور خالی الذہنی کے عالم میں ایک طرف روانہ ہو گیا۔

شعوری طور پر میں نے کئی مرتبہ شہر سے نکلنے کی کوشش کی لیکن لاشعور مجھے اسی شہر کی سڑکوں پر بھٹکاتا رہا۔ میں ہر دراز قامت، خوبرو اور گوری لڑکی کو غور سے دیکھتا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سیتا کسی بھی لمحہ اچانک میرے سامنے آ جائے گی۔

کاتبِ تقدیر نے میرے نصیب میں گردش ہی گردش لکھی تھی۔ سیتا میرے ہمراہ تھی تو پارس گم ہو گیا۔ پارس ملا تو اب سیتا روٹھ گئی۔ ایک خوشی نصیب ہوتی تھی تو دوسری جانب سے کوئی اندوہناک حادثہ اس خوشی کو بھولا ہوا خواب بنا دیتا تھا

شام ڈھلے میں نے سہتے کر بدنام حلقوں کی مدد لینے کا ارادہ کرلیا۔ میں اس قدر مجبور تھا کہ سیتا کی تلاش میں قانون کی دہلیز پر دستک نہیں دے سکتا تھا۔ اس بے وفا سرزمین پر نہ میرا کوئی ٹھکانا تھا نہ سیتا کا کوئی نشان!

میرے لئے وہ شہر اجنبی تھا۔ بدنام ٹھکانوں کا سراغ پانا میرے لئے مشکل تھا۔ آخر مجبوری کے عالم میں میں نے ایک بار پھر آزمودہ ترکیب پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

جیب میں معقول رقم لے کر جب میں ایک تانگے میں سوار ہوا تو جواں سال کوچوان نے ٹھیٹھ پنجابی میں منزل کا پتہ پوچھا۔

"کسی اچھی جگہ لے چلو!" میں نے دس کا نوٹ اسے تھما کر آنکھ دبا کر کہا۔

"باؤ — بازار چلنا ہے یا پرویٹ ٹھکانے لے چلوں!" اُس نے نوٹ جیب میں اڑستے ہوئے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"بازار چلو!" میں دل پر جبر کر کے مسکرایا۔

تھوڑی ہی دیر میں پائل اور چوڑی کا شور سنائی دینے لگا۔ میں نے تانگہ وہیں رکوایا اور کوچوان کی مزید رہنمائی قبول کئے بغیر آوازوں کے تعاقب میں ہولیا۔

وہ بازار تھا کہ مقتل — میری سمجھ میں نہ آسکا۔ دہلیزوں پر، چوباروں میں، چلمنوں کے پیچھے ایسے ایسے سراپا نظر آئے کہ نگاہ ہٹائے نہ بنے۔ ستواں اور تیکھے نقوش، گورے رنگ، دراز قامتیں، گداز بدن، وہاں سب کچھ تھا۔ بس آنکھوں میں حیا نہ تھی۔ بھوکی اور ننگی نسوانی آنکھیں ہر راہگیر کو دور تک تکتی رہتی تھیں اور میں بھی اُن کی نگاہوں کی زد میں آتا چلا گیا۔

میرے انداز میں اضطراب، چال میں بے یقینی اور نگاہوں میں ایسی بے چینی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر مگر کڑیل سکھ میرے قریب آ ہی پہنچا۔ میں مدتوں اس راہ کا راہی رہا تھا اور جانتا تھا کہ یہ لوگ گاہک اور تلاشِ تماش بین کی حرکات کو دور ہی سے سونگھ لیتے ہیں اور صرف اسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں جس سے کچھ ملنے کی اُمید ہو۔

"باؤ! جلندھری کڑی ہے!" وہ میرے سر سے سر ملا کر بولا۔

"یہ لو!" میں نے بیس روپے اُس کی مٹھی میں دیدئے اور اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے ایک تاریک گوشے میں لیتا چلا گیا۔

"ایک لڑکی میرے کمرے سے بیس ہزار روپیہ لے بھاگی ہے۔" میں نے اُس سے کہا۔ "مجھے اسی کی تلاش ہے۔"

"پیشہ والیاں ایسا نہیں کرتیں باؤ۔" وہ بولا۔ "کوئی شوقین ہوگی۔ ان بے چاریوں کا تو روز کا یہی دھندا ہے۔ گاہک کی چوری کریں تو نام بدنام ہوجاتا ہے!"

"میں یہ نہیں کہتا۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "میں اُسے ڈھونڈنے کے دو ہزار روپے دینے کو تیار ہوں، مجھے آدمی چاہئیں۔"

"دو ہزار۔" اُس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک عود کر آئی۔ "جگا اُستاد اُسے قبر سے بھی نکال لائے گا۔ چلو اس سے بات کرلو!"

جگا اُستاد اسی علاقے میں دیسی شراب اور افیون کا ٹھیکہ چلاتا تھا۔ خاصی آن بان اور ہیبت والا آدمی تھا۔ پگڑی کا مدار کرتا اور تہمد، ریشمی لنگی پہنے دوکان سے باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میرے ساتھ والے نے دور ہی سے آواز لگائی۔ "اُستاد دھندا لایا ہوں!"

"آجا بھائی — ادھر بیٹھ جا!" جگا نے حقے کی نے چھوڑ کر میرے لئے جگہ پیدا کی۔

میری درخواست پر جگا نے اپنے تمام خوشامدیوں کو بھگا دیا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اُسے اپنے مسئلے سے آگاہ کردیا۔

"ہوں — بیس ہزار روپیہ لے کر بھاگی ہے!" جگا نے ایک کش لے کر حکیمانہ لہجے میں کہا پھر سوال کیا۔ "کہاں سے اُٹھائی تھی؟"

سیتا کے بارے میں یہ گفتگو سخت ذلت آمیز تھی مگر میں اس پر مجبور تھا کیونکہ بیوی، بیٹی یا بہن کی تلاش کے لئے لوگ غنڈوں کی خدمات حاصل نہیں کرتے۔

"گردوارے کے پاس سے لے گیا تھا گوری لڑکی تھی!" میں نے کہا۔

"غیر ملکی؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں!" میں نے کسی بدترین تبصرے کی توقع کرتے ہوئے جواب دیا اور سیتا کا حلیہ بھی دہرا دیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔ یہ راستہ چلتی اور بہتی لڑکیاں ہوتی ہی چور ہیں۔ کوئی ٹھکانے والی دیسی چھوکری ہوتی تو لاکھ کو بھی ہاتھ نہ لگاتی۔ رنڈی کا پہلا اصول یہی ہے بیٹا کہ چلتی پھرتی چھوکریوں سے نہ پھنسو!"

"تو اسے تلاش کر دو گے؟"

"ہاں — چار ہزار لوں گا۔" وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پھر نقرہ لگایا۔ "ہزار نقد، تین لڑکی ملنے کے بعد!"

"منظور!" میں نے جیب سے ہزار روپے نکال کر اسے پکڑا دیئے۔

"لڑکی کہاں پہنچانی ہے؟" اُس نے رقم گنے بغیر جیب میں اڑستے ہوئے پوچھا۔

یہ مسئلہ خاصا ٹیڑھا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں ہوٹل چھوڑ چکا ہوں۔ اسی چارپائی پر پڑ جاؤں گا لڑکی کو بھی یہیں لے آنا!"

میں لمبا جُوا نہیں کھیلتا ملنی ہے تو کل شام تک مل جائے گی ورنہ میرے لئے یہ سودا برا نہیں تھا۔ میں وہاں سے واپس چل دیا کہ لینڈ روور اسی طرف لے آؤں۔ اس میں رکھی ہوئی رقم تو سیٹ کے نیچے پوشیدہ تھی کہ اس پر کسی کا ہاتھ پڑنا محال تھا۔

میں جیب کا مسئلہ حل کر کے واپس ٹھیکے پر پہنچا تو جگا نے مجھے بتایا کہ اپنے آدمی روانہ کرچکا ہے اور لڑکی شہر میں ہوئی تو صبح سے پہلے ہی پکڑ لی جائے گی۔ ٹھیکہ بند ہونے کے وقت جگا نے مجھے دری تکیہ منگا دیا اور خود جگا نے چارپائی دیوار کے سہارے لگائی اور دری پھیلا کر نیم دراز ہوگیا۔

وہ پوری رات میں نے سگریٹیں پھونک پھونک کر گزاری۔ صبح ہوئی

وہاں آیا اور بتایا کہ ابھی تک لڑکی کا سراغ نہیں مل سکا۔ میری سُرخ آنکھیں دیکھ کر اس نے مجھے دوکان کے عقبی حصے میں بھیج دیا۔

"ادھر جا کر سولے، کوئی خبر آئی تو اٹھالوں گا۔"

دن گزرا شام ڈھلی، پھر رات بھی آگئی اور جگا نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا۔ "میرے آدمیوں نے پورا شہر چھان مارا مگر تیرے بتائے ہوئے حلیے کی لڑکی کہیں بھی نہیں مل سکی۔"

یوں میں مایوس و نامراد وہاں سے لوٹ آیا۔

سیتا کی تلاش میں جگا کے آدمیوں کی ناکامی نے مجھے سخت مایوس کیا میرا اب انبالہ میں رکے رہنا بے کار تھا۔ اخباروں میں بھی کوئی ایسی خبر نہیں آئی تھی جس سے یہ شبہ ہو کہ سیتا پولیس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اس کی جانب سے میں مکمل طور پر لاعلمی کا شکار تھا۔

سیتا کے یوں لاپتہ ہو جانے پر میرے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے، سینہ فگار اور روح زخمی تھی میں نے لینڈ روور ایک بار کے سامنے روک دی۔

اس سے قبل میں نے شراب ترک نہیں کی تھی مگر گاہے گاہے صرف سرور کے لئے پیتا تھا مگر اس رات تو شراب میں ڈوب جانے کو جی چاہتا تھا یکے بعد دیگرے جام میرے معدے میں خالی ہو رہے تھے ماضی کا بلا نوش پئے جا رہا تھا مگر سیتا کا تصور ذہن سے چپکا ہوا تھا۔

جب میں نے پانچویں بڑے پیگ کا آرڈر دیا تو بیرے نے غور سے میری طرف دیکھا، کاؤنٹر پر جا کر چیف بارٹنڈر سے کچھ گفتگو کی اور جب وہ شراب لایا تو وہسکی کا ذائقہ بدلا ہوا تھا۔

میں نے بیرہ کو بلایا تو وہ کچھ سہما ہوا تھا۔ "چیف بارٹنڈر کو بھیجو!" میں نے ہاتھ لہرا کر اسے ہدایت دی اور وہ فوراً ہی لوٹ گیا۔

"وہسکی میں پانی ملانے کی ضرورت نہیں، جب چڑھنے لگے گی تو میں خود اُٹھ جاؤں گا۔" میں نے چیف بارٹنڈر سے آہستگی سے کہا۔

میرے الفاظ پر وہ بُری طرح بوکھلا گیا۔ "معاف کیجئے گا جناب، بہت سے لوگ زیادہ پی کر ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ بعض کرم فرما تو اپنے قدموں چل کر باہر جانے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ ہم گاہکوں کے مفاد میں ہی پانی ملاتے ہیں۔"

"اپنا مفاد مجھے زیادہ عزیز ہے!" میں نے کہا اور وہ سر کو خم دے کر چلا گیا۔

باہر سے تکوں کے بھُونے جانے کی اشتہا انگیز خوشبو آرہی تھی اور میں آہستہ آہستہ شراب خوری کے ساتھ شکم سیری بھی کر رہا تھا۔

رات کے بارہ بجے شراب خانے میں صرف میں رہ گیا تھا۔ وہاں لوگوں میں بیٹھ کر پینے کا رجحان زیادہ نہیں تھا بیشتر گاہک بوتلیں خرید کر لیجاتے تھے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب اسٹاف بار بند کرنے کی تیاری کر رہا ہے تو بل ادا کر کے باہر آگیا۔

رات کی خنک ہوا چہرے سے ٹکرائی تو سرور کی ایک لہر نے دماغ میں گدگدی سی چھیڑ دی اور میں ہولے ہولے گنگنانے لگا۔

لینڈ روور اسٹارٹ کر کے وہاں سے میں روانہ ہوا تو میں بڑی حد تک حواس میں تھا اور فیصلہ کرچکا تھا کہ اب اس شہر غدار کو خیر باد کہہ دوں گا۔

گاڑی خراماں خراماں شہر سے نکلی اور شاہراہ پر آکر میں نے سنگ میل دیکھتے ہوئے اسٹیرنگ لدھیانہ کی سمت میں کاٹ لیا۔

کھلی سڑک پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سرور میں اضافہ کر رہے تھے۔ میرے حواس ابھی معطل نہیں ہوئے تھے مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ذہنی طور پر بالکل ناکارہ ہو جاؤں گا کیونکہ سامنے سے جب بھی کوئی گاڑی تیز روشنیوں کے ساتھ آتی۔ میرا ہاتھ اسٹیرنگ پر بہکنے لگتا اور زبان سے غیر ارادی طور پر غلیظ گالیاں اُبلنے لگتیں۔

اپنی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے ویران شاہراہ پر ایک جگہ گاڑی بند کر دی۔ چابی جیب میں ڈالی اور سر اسٹیرنگ پر ٹکا کر زور زور سے گانے لگا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ میں گانے کے ہر بول میں زبردستی سیتا کا نام شامل کر رہا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور فوری طور پر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش میں لانے کا باعث سارے بدن اور سر میں اُٹھنے والی شدید ٹیسیں تھیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ہسپتال کے بستر پر موجود پایا۔ میرے گرد کئی نرسیں، ایک ڈاکٹر اور دو پولیس افسران موجود تھے۔

"مجھے کیا ہوا، میں کہاں ہوں؟" میں نے بستر سے اُٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"لیٹے رہو، آرام سے لیٹے رہو۔" ڈاکٹر نے جلدی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تمہارے سر اور ہاتھوں پر خاصے زخم آئے ہیں۔"

"کیسے؟ یہ زخم کیسے آئے؟" میرے ذہن پر اب بھی دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر کا اشارہ پا کر ایک پولیس افسر میرے قریب آگیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم کیسے ہو صفدر علی؟"

"بہت تکلیف ہے!" میں نے کہا پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میں تو سنیل بنا ہوا تھا۔ پولیس افسر نے مجھے صفدر علی کیوں کہا؟

"تم شراب پی کر انبالہ جالندھر روڈ پر اپنی گاڑی میں سو رہے تھے کہ پیچھے سے ایک ٹرک گاڑی سے ٹکرا گیا۔ تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے!" پولیس افسر مجھے تسلی دے رہا تھا۔

"مم — مگر میں صفدر علی نہیں سنیل ہوں، سنیل موٹن۔" میں نے کمزور آواز میں احتجاج کیا۔

"ذہن پر زور نہ دو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی تم سنیل ہی ہو۔"

"اور سیتا کہاں ہے؟" ذہن کی تادیب کے باوجود یہ سوال میری زبان سے نکل ہی گیا۔ اس وقت نہ زبان میرے قابو میں تھی نہ اعصاب۔

"وہ بھی آجائے گی۔ تم آرام کرنے کی کوشش کرو۔"

میری آنکھوں پر بہت زور پڑ رہا تھا میں نے آنکھیں موندلیں اور چند ہی ثانیوں میں غافل ہوگیا۔

تیسرے روز میں اس قابل ہوسکا کہ اپنی حالت اور نئے حالات کے بارے میں کچھ سوچ سکوں۔ میرے پاس جو ادھیڑ عمر نرس مامور تھی وہ بہت نرم خو اور شفیق تھی۔ اس نے بتایا کہ جب میں ہسپتال لایا گیا تو اسی نے مجھے فرسٹ ایڈ دی تھی۔

"تم شاید اسٹیرنگ پر سر اور کہنیاں ٹکائے سو رہے تھے۔" میرے استفسار پر اس نے بتایا۔ "تمہارے سر اور پیشانی اور کلائیوں پر گہرے زخم آئے تھے ٹرک کا ڈرائیور اور کلینر ٹرک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تمہیں ایک راہگیر نے بیہوشی کی حالت میں یہاں پہنچایا۔ تمہارے سر اور پیشانی کے زخموں سے شیشے کی کرچیں نکالنے کے لئے آپریشن بھی کئے گئے تھے!"

"مگر سسٹر!" میں نے اس سے پوچھا۔ "پرسوں ایک پولیس افسر مجھے صفدر علی کہہ رہا تھا جب کہ میرا نام سنیل ہے!"

وہ میٹھے انداز میں مسکرائی۔ "ہمیں ہر حادثے کی صورت میں پولیس کو بھی مطلع کرنا پڑتا ہے۔ جب آپریشن کے لئے تمہارے سر اور بھنوؤں کے بال صاف کئے گئے تو تھانے سے آنے والا کانسٹبل چونک پڑا۔ پھر پولیس کے اعلیٰ افسران کی بھاری جماعت تمہارے آپریشن کے دوران میں ہی تھیٹر میں پہنچ گئی ان کے پاس تمہاری تصویریں تھیں جن میں تم رشیوں کے لباس میں تھے اور چہرے پر داڑھی بھی تھی۔ پھر ان ہی کے سامنے تم نے بیہوشی کے عالم میں بار بار کسی سیتا کو پکارا اور انھوں نے متفقہ رائے دی کہ لینڈ روور سے ملنے والے کاغذات فرضی ہیں، تمہارا نام صفدر علی ہے۔ سنا ہے گاڑی سے چار لاکھ روپے سے زیادہ رقم بھی ملی تھی وہ پولیس کے قبضہ میں ہے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ شراب نے زندگی میں پہلی بار مجھ سے بھرپور دغا کی تھی۔ ایسی دغا کہ اب میں چوہے دان کا قیدی ہو کر رہ گیا تھا۔

"میں کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا سسٹر؟" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد میں نے سوال کیا۔

"شاید ایک ہفتہ تک!" وہ چادر درست کرتے ہوئے بولی۔ "تمہارے علاج کے بارے میں اوپر سے سخت ہدایات ہیں۔ تمہیں کمرہ بھی اہم ترین شخصیات والا دیا گیا ہے۔ یہ سیتا تمہاری کون ہے؟"

"میری بیوی!" میں نے سینہ میں درد کی ایک لہر سی اٹھتی محسوس کی۔ "وہ کہاں ہے سسٹر؟ اس کا کوئی پتہ چلا؟"

"کسی کو کچھ نہیں معلوم، تمہارے بارے میں اعلیٰ سرکاری حکام ڈاکٹروں سے رازدارانہ لہجہ میں باتیں کرتے ہیں۔" وہ کہنے لگی۔ "سرجن گپتا ایک بار کہہ رہے تھے کہ سیتا بری طرح تمہارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ کہاں گئی وہ؟"

میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر آنکھیں بھینچ لیں۔

اسی روز اچانک مجھے پارس پتھر کا خیال آیا اور میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ میرے کپڑے میرے بدن پر موجود تھے۔ میں نے [illegible] کی داہنی جیب ٹٹولی تو پارس وہاں موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں [illegible] کی انگوٹھی دیکھنے کے بعد شاید کسی کو بھی میری جامہ تلاشی کا خیال نہیں آیا [illegible] ورنہ اب تک میں پارس پتھر سے محروم جنرل وارڈ کے کسی بستر پر پڑا ڈیوٹی [illegible] کی توجہ کو ترس رہا ہوتا۔

چوتھے روز سرجن گپتا نے پٹیاں تبدیل کرنے کے بعد مجھے چلنے پھرنے کی اجازت دے دی اور اسی کے ساتھ ملاقاتیوں پر عائد پابندی بھی [illegible]۔ پابندی کا ہٹنا تھا کہ میرے کمرے میں ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ [illegible] والے اپنی حرکات و سکنات اور رکھ رکھاؤ سے سرکاری افسران ہی نظر آتے تھے۔ ہر ایک مجھے سنیل کے نام سے مخاطب کرتا اور محبت کے ساتھ پیش آتا کسی نے بھی مجھ سے سیتا یا پارس پتھر کے بارے میں ذکر تک نہ کیا۔

میں بستر پر پڑا بے بسی سے ان سب کے چہرے تکتا رہا۔ میری حالت قربانی کے اس بکرے جیسی تھی جس کے ذبح کئے جانے میں چند دن باقی ہوں اور ہر طرح اس کی بہترین دیکھ بھال کی جا رہی ہو مگر جان جانے کی دہشت سے اس کی جان نکلی جا رہی ہو۔

میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ یہ فیاضانہ سلوک چند دن کی بات ہے اور میرے صحتیاب ہوتے ہی میرے ساتھ کوئی خوفناک کھیل شروع ہونے والا ہے۔

ایک روز میل نرس نے میرا لباس تبدیل کرانا چاہا مگر میں نے سختی سے انکار کردیا اور بات اتنی بڑھی کہ سرجن گپتا کو میرے کمرے میں آنا پڑ گیا۔

"تمہارا لباس میلا ہوگیا ہے بیٹے! کپڑے تبدیل کرا لو!" سرجن نے شفقت سے کہا۔

"خدا کے لئے سرجن! مجھے مجبور نہ کرو۔" میں نے التجا کی۔ "ہسپتال کا لباس مجھے کفن معلوم ہوتا ہے۔ مجھے کفن نہ پہناؤ۔"

بوڑھا سرجن مسکرا کر سر ہلانے لگا۔ "اگر تمہاری حالت ابتر نہ ہوتی تو آپریشن تھیٹر ہی میں تمہارا لباس بدل دیا جاتا، خیر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔"

ہسپتال میں رہتے ہوئے میں نے بالا ہی بالا سیتا کے بارے میں لاکھ چھان بین کی مگر کچھ معلوم نہ کر پایا اور آخر تیرھویں روز مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

سرجن گپتا مجھے ہمراہ لے کر اپنے دفتر میں پہنچے تو وہاں دس بارہ افراد میرے منتظر تھے۔ ان میں ایک باوردی سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی تھا سب نے باری باری مجھے صحتیابی پر مبارکباد دی اور ایس پی نے نوٹوں سے بھرا ہوا وہ سفری تھیلا میرے حوالے کردیا جو میں نے قنوج میں خریدا تھا۔

"اس میں چار لاکھ تین ہزار روپے ہیں!" ایس پی نے ایک فارم دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تھیلا لینڈ روور کے ڈھانچے سے اسی طرح برآمد ہوا تھا۔ اس میں ایک سروس ریوالور بھی ہے۔"

"شکریہ!" میں نے مختصر الفاظ میں کہا۔ میرے لئے ان کا رویہ حیرتناک تھا۔ تھیلے کی زپ بند تھی اور اس پر لاکھ سے سرکاری مہر لگی ہوئی تھی اور رقم ہی نہیں اس نے مجھے وہ سرکاری ریوالور بھی لوٹا دیا تھا جو میں نے پرتاب کو ہلاک کر کے حاصل کیا تھا۔ یہ سب سوچ سوچ کر میرے دماغ کی رگیں پھوڑے کی طرح دکھنے لگیں۔

رقم اور ریوالور کی واپسی کے کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد میری چھٹی ہوگئی اور اب ان میں سے ایک گنجا، دراز قامت شخص آگے بڑھ آیا۔

"آیئے سنیل صاحب! اب آپ میرے مہمان ہیں۔" اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا میں نے بے بسی سے اس کی چمکتی ہوئی جہاندیدہ نظروں اور تجربہ کار بشرہ کا جائزہ لیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔

ہسپتال کے برآمدے سے لگی ایک چمکتی ہوئی شیورلے کھڑی ہوئی تھی باوردی ڈرائیور نے پھرتی سے اس کا دروازہ کھولا اور میں گاڑی میں سوار ہوگیا میرے ساتھ اس گنجے کے علاوہ مزید دو افراد بھی شیورلے میں آگئے اور گاڑی سبک رفتاری کے ساتھ باہر روانہ ہوگئی!

احاطہ میں کئی اور سرکاری گاڑیاں ابھی تک موجود تھیں۔

"سنیل صاحب! آپ سگریٹ پئیں گے!" گنجے نے بڑے احترام سے مجھے سگریٹ پیش کرتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے قہر بار نظروں سے اسے گھورا۔ یہ ڈرامہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو چلا تھا میں نے اس پر گالیوں کی بے تحاشہ بوچھاڑ کر دی۔

اسٹیرنگ پر ڈرائیور کا ہاتھ بہکا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اور فوراً ہی سیدھا ہوگیا۔ گنجا اور اس کے دونوں ساتھی تشویشناک سنجیدگی سے میرا جائزہ لے رہے تھے اور ان کی خاموشی میرے اشتعال کو حد سے زیادہ بڑھاتی جا رہی تھی۔

"سنیل صاحب! یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے، خود کو سنبھالئے!" گنجا مجھ سے دور کھسکتے ہوئے بوکھلائے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"سور کے بچے! میں سنیل نہیں صفدر ہوں، صفدر علی!" میں آپے سے باہر ہوکر اس پر الٹ پڑا۔ "تم سب جانتے ہو مگر مجھے ذہنی طور پر مفلوج کرنے کے لئے یہ چکر چلا رہے ہو۔ بتا حرامزادے! میری سیتا کہاں ہے، تم نے اسے کہاں چھپایا ہے!"

اس کے سنبھلنے کے باوجود میں نے اس کے چہرے پر ایک گھونسہ رسید کر ہی دیا۔ شیورلے کا ڈرائیور بہت ہوشیار تھا۔ اس نے پھرتی سے کار سڑک کے کنارے روک دی اور ان سب نے مل کر مجھے گنجے سے الگ کر دیا۔

غصے سے میرا ذہن کھول رہا تھا۔ انھوں نے جسمانی طور پر مجھے بے بس کر دیا مگر میری زبان نہ رک سکی۔ پھر اچانک مجھ پر نقاہت کا حملہ ہوا اور میں تقریباً کراہتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

"کیا ہوا، اسے کیا ہوا؟" ان میں سے کسی کی بوکھلائی ہوئی آواز ابھری۔

"واپس، واپس ہسپتال چلو!" بہت دور کی باریک سی آواز میرے کانوں میں آئی اور میرا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو نرم اور آرام دہ بستر پر موجود پایا۔ میں نے حیرت کے ساتھ اس کمرے کا جائزہ لیا وہ دوہرے بستر والی ایک پُرتکلف خوابگاہ تھی۔ دیواروں پر ہلکا نیلا رنگ تھا اور کھڑکیوں پر اسی رنگ کی مناسبت سے پردے لہرا رہے تھے۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں بستر سے ذرا دور ایک شخص آرام کرسی پر نیم دراز اونگھ رہا تھا۔ پردوں سے چھن کر آنے والی ہلکی ہلکی روشنی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی شام نہیں ہوئی ہے۔

میں نے غور سے اونگھتے ہوئے شخص کا جائزہ لیا اور اچانک مجھے غصہ آگیا۔ یہ وہی گنجا شخص تھا جس نے شیورلے میں مجھے سگریٹ پیش کی تھی اور میں نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔

میں کوئی آواز پیدا کئے بغیر کسی چیتے کی سی مکاری اور پھرتی کے ساتھ بستر سے اترا۔ ہوش میں آجانے کے باوجود میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا مگر میرے لئے یہ موقع بہت قیمتی تھا۔

انبالہ دربار ہوٹل سے سیتا پراسرار طور پر مجھ سے بچھڑ گئی تھی اور وہیں سے میرے لئے حیرتناک واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ سیتا کے فراق میں میں نے انبالہ کا ہر گوشہ چھان مارا تھا پھر اس کا غم بھلانے کے لئے دل کھول کر شراب نوشی کی۔ اسی حالت میں انبالہ جالندھر روڈ پر ایک ٹرک نے میری لینڈ روور کو ٹکر ماری اور میں بیہوشی کے عالم میں ہی صفدر علی کی حیثیت سے پہچان لیا گیا مگر اعلیٰ پولیس افسران اور دوسرے سرکاری حکام بدستور مجھے سنیل موہن ہی کے نام سے پکارتے رہے۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ اس کمرے میں اس دراز قامت گنجے کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ میں ابھی تک ان ہی لوگوں کی تحویل میں تھا اس وقت اگر میں اس گنجے کو غنودگی کے عالم میں زیر کر لیتا تو چند ہی لمحوں میں اس کی زبان سے ہر سچ اگلوا سکتا تھا!

بستر سے اترتے ہی میں نے بے چین نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ مگر مجھے اپنا وہ بیگ کہیں نظر نہ آیا جس میں چار لاکھ تین ہزار روپے کے علاوہ انڈین سیکرٹ سروس کے نمائندہ پرتاب سے چھینا ہوا سروس آٹومیٹک چند گولیوں سمیت موجود تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت ایک ایس پی نے [illegible] تھیلا سر بمہر حالت میں مجھے لوٹا دیا تھا۔

جب تک پارس پتھر میرے قبضہ میں تھا۔ مجھے رقم کی کوئی فکر نہیں تھی مگر موجودہ صورت حال میں وہ بھرا ہوا ریوالور میرے لئے نئی اور آزاد زندگی کی نوید بن سکتا تھا مگر میں اتنا بھی سہل پسند نہیں تھا کہ محض نہتا ہونے کے خوف سے اس گنجے کو خود پر مسلط رہنے کی کھلی چھوٹ دے دیتا۔

میں دبیز قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا گنجے کے سر پر جا پہنچا اور اس کے قریب تپائی پر رکھی ہوئی پتھر کی ایشٹرے اٹھا کر اس کی کنپٹی پر دے ماری مگر اس کی چھٹی حس بہت تیز تھی۔ جوں ہی میرا ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے نیچے آیا وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور وزنی ایشٹرے کنپٹی کے بجائے اس کے داہنے شانے پر پڑی

گنجے کے حلق سے اذیت میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ بلند ہوئی اور اسی کے ساتھ تین مسلح باوردی سپاہی خوابگاہ میں گھس آئے۔ شاید وہ خوابگاہ سے باہر نگرانی پر مامور تھے مگر وہاں پھیلی ہوئی ہیبت خاموشی کے باعث میں نے یہ امکان بالکل ہی نظرانداز کر دیا تھا۔

"ہینڈز اپ!" تینوں سپاہیوں نے اپنی بندوقیں مجھ پر سیدھی کرتے ہوئے بیک وقت حکم دیا مگر اُن کے لہجے سے خوف کی کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

گنجا بائیں ہاتھ سے اپنا زخمی شانہ دبائے میرے مقابل کھڑا مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ "تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے کمینے؟" اس نے اپنا شانہ دباتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"کمینہ جو ٹھہرا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو، میں کن لوگوں کی قید میں ہوں اور اس وقت کہاں ہوں؟"

"ابھی سب پتہ چل جائے گا!" وہ غرّایا پھر ایک سپاہی سے بولا "میرے شانے کی ہڈی متاثر ہوئی ہے تم جسپال صاحب کو خبر کر دو، وہی اسے سب کچھ بتائیں گے!"

مخاطب کیا جانے والا سپاہی فرمانبردارانہ انداز میں سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا اور دراز قامت گنجا اپنا شانہ دبائے مسہری پر جا بیٹھا۔ اُس کے بشرے سے سخت اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں سپاہیوں کی بندوقوں کی پرواہ کئے بغیر سکون سے اس آرام کرسی پر دراز ہو گیا جس پر وہ گنجا اونگھ رہا تھا۔ سپاہی یوں تو مجھ پر بندوقیں تانے ہوئے تھے مگر اُن کے انداز سے ہچکچاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا جیسے مجبوری کے تحت انہیں اپنے کسی اعلیٰ افسر یا معزز مہمان پر ہتھیار اُٹھانے پڑ گئے ہوں۔

جسپال جو کوئی بھی رہا ہو، شاید اسی عمارت کے کسی حصے میں موجود تھا کیونکہ چند ہی منٹ بعد وہ سپاہی کے ہمراہ بوکھلایا ہوا وہاں آن پہنچا۔

دراز قامت گنجا اپنے شانے کی تکلیف کے باوجود مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ "سر! میرے شانے کو اس نے بُری طرح زخمی کر دیا ہے!"

"شاید تم سو گئے تھے؟" آنے والے نے چشمے کے موٹے موٹے عدسوں کے پیچھے سے اُسے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

"اونگھ گیا تھا ذرا۔" گنجا بولا "اگر بروقت ہوشیار نہ ہو جاتا تو شاید میرا سر ہی ایش ٹرے کا نشانہ بنتا!"

"باہر گاڑی موجود ہے۔ فوراً ہسپتال جاؤ۔" اُس نے حکم دیا۔ "اگر ہڈی متاثر ہوئی ہو تو ہسپتال سے ہی مجھے فون کرا دینا۔"

گنجا آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا۔ اس شخص کے اشارے پر تینوں سپاہی بھی میری اس بے نام خوابگاہ سے نکل گئے۔ وہ سگار کا گوشہ توڑتے ہوئے اس وقت تک انہیں دیکھتا رہا جب تک وہ پردہ اُٹھا کر باہر نہ چلے گئے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت دلیر اور خونخوار ہو۔" وہ سگار سلگاتے ہوئے پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مگر تمہارے سر اور جسم کے کئی حصّوں پر ابھی تک ٹانکے موجود ہیں، ایسی حالت میں تمہیں ہنگامہ آرائی کے بجائے سکون سے کام لینا چاہئے۔"

"مشورے کا شکریہ۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا "کیا میں اپنے محسن کا نام جان سکتا ہوں!"

"جسپال سنگھ!" اُس نے سگار کا کثیف دھواں کمرے کی فضا میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"جسپال صاحب... مجھے بھی تمباکو نوشی سے کچھ شغف ہے، تمباکو کے دھوئیں کی بو میرے لئے طلب کا باعث بن گئی۔"

"یہ لو۔" جسپال نے بے خوفی کے ساتھ میرے قریب آ کر ایک سگار اور لائٹر میرے حوالے کر دیا۔ اُس کا یہ رویّہ مجھے بہت پسند آیا۔

جسمانی اعتبار سے وہ مجھ سے کمتر اور قد سے عمر رسیدہ بھی تھا۔ میں چند منٹ پہلے اُس کے ایک ماتحت کو شدید طور پر زخمی کر چکا تھا مگر نہتا ہونے کے باوجود اُس کے رویّے سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہے۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے سگار سلگا لیا۔ وہ کہہ رہا تھا "بہتر ہوگا کہ تم آرام کرو تاکہ میں یہاں بیٹھ کر تم سے کچھ ضروری گفتگو کر سکوں۔"

میری پہلی کوشش ناکام ہو چکی تھی اور مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ باہر تین مسلح محافظ بھی موجود ہیں لہٰذا اب جسپال سنگھ کی بات نہ ماننے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ میں مسکراتے ہوئے آرام کرسی سے اُٹھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ جسپال سنگھ نے کرسی سنبھال لی۔

"تمہارا کس محکمے سے تعلق ہے؟" قدرے سکوت کے بعد میں نے سوال کیا۔

"سیکرٹ سروس۔" وہ سنجیدگی کے ساتھ بولا

"مجھے حراست میں کیوں لیا گیا ہے؟"

"حراست نہیں، حفاظت کہو۔" اُس نے اپنی دانست میں تصحیح کی۔

"جب تک باہر مسلح محافظ موجود ہیں، میرے نزدیک دونوں میں فرق نہیں۔" میں تلخ لہجے میں بولا "بھلا ایک غریب الوطن اجنبی سے انڈین سیکرٹ سروس کو اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے!"

"ہمارے لئے غریب الوطن ضرور ہو، مگر اجنبی نہیں، کیا تم مجھے اپنا نام بتاؤ گے؟"

"حادثہ سے قبل سنیل موٹن اور اب صفدر علی!"

"خوب!" اُس کی آنکھیں یک بیک چمک اُٹھیں "حادثے میں تمہارے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں اور سرجن گپتا کی ہدایت تھی کہ تم سے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جو ذہنی صدمہ یا اشتعال کا باعث بنے اسی لئے ہم آخر تک نہیں کہتے رہے مگر اب تم خود کو موجودہ صورتِ حال کے لئے تیار کر چکے ہو اور شاید کھل کر مجھ سے بات کرنے کو تیار ہو!"

"میں اگر مجرم ہوں تو مقدمہ چلا کر مجھے سزا دو ورنہ رہا کر دو۔ تمہاری عنایات میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"تمہارے خلاف فردِ جرم بہت طویل ہے صفدر علی!" وہ گہری سانس لے کر بولا "نیپال سے ہند میں غیر قانونی داخلہ، بنارس میں چار خون، آشرم کے منتظم مہیش کا متعفن ڈھانچہ بھی روج منڈی کے ویران تہہ خانے سے برآمد ہو چکا ہے اور اُسے بھی تمہارے حساب میں سمجھا گیا ہے۔ سردار کلبھوت کے آدمی منڈی کا قتل، نبے خان، دیوان داس، گمنام، پرتاپ، کلبھوت اور دیگر تین افراد کی موت۔ یہ سب تمہارے کارنامے ہیں صفدر! عدالت میں ان الزامات کو ثابت کرنا ذرا بھی مشکل نہ ہوگا۔ وہ لڑکی سیتا بھی جلد یا بدیر ہمارے ہاتھ آ جائے گی جو ہر جرم میں تمہاری معاون رہی ہے۔"

"اگر تم مجھ پر نفسیاتی حربے آزما کر ان جرائم کا اقرار کرانا چاہتے ہو تو میں ان سب سے لاتعلق ہوں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا "میں غیر قانونی طور پر تمہارے ملک میں ضرور آیا مگر باقی واقعات کو تم کسی طرح بھی ثابت نہ کر سکو گے، میں ان میں سے کسی نام تک سے واقف نہیں!"

وہ دھیمے اور پُرسکون انداز میں ہنسا۔ "مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تم چالاک ہو مگر قانون کے محافظ چالاک تر! مجھے تسلیم ہے کہ تم نے ہر واردات کے بعد سارے شواہد ضائع کر دیئے اور اپنی دانست میں حالات کو پیچیدہ بنا دیا۔ مگر ہسپتال سے رخصت کے وقت تم نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کئے ہیں۔"

وہ قدرے خاموش ہوا اور میں نے اپنے وجود میں بے چینی کی ایک لہر سرایت کرتی محسوس کی۔ وہ کہہ رہا تھا "ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت تم نے سوچے سمجھے بغیر ایس۔ پی سے وہ سر بمہر تھیلا وصول کر لیا جس میں چار لاکھ تین ہزار روپے اور پرتاپ سے چھینا ہوا سروس ریوالور موجود تھا۔ ان کاغذات میں تم نے حلفیہ اقرار کیا ہے کہ وہ چیزیں تمہاری ملکیت تھیں اُن میں سروس آٹومیٹک کی تمام تفصیلات بھی درج تھیں اب وہ تھیلا میرے محکمہ کی تحویل میں ہے اور تمہارے خلاف قتل کی بھرپور شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ تم عدالت میں نہ اس رقم کا کوئی قانونی جواز دے سکتے ہو نہ پرتاپ کے ریوالور کی موجودگی کا عذر تمہارے پاس ہوگا۔ صرف پرتاپ کے قتل کا الزام ہی تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے کافی ہوگا۔"

"مجھے جیل کی کوٹھری کے بجائے اس آرام دہ خوابگاہ میں رکھ کر تم ہند سرکار سے بغاوت کے جُرم کے مرتکب ہو رہے ہو!" میں نے اس پر طنز کیا۔

"میں تم سے سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بجھتے ہوئے سگار کو دوبارہ سلگاتے ہوئے بولا۔

"وہی پیشکش جو گمنام کو میرے تعاقب میں کانپور تک لائی تھی؟"

"گمنام اپنی ذات پر حد سے زیادہ اعتماد کے سبب مارا گیا۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ نیچے سے اوپر تک سینکڑوں اہلکار ہر بات کے گواہ ہیں۔"

"گویا تم صرف پارس پتھر کے متلاشی ہو!" اس وقت مجھے خود اپنے اعتماد پر حیرت ہو رہی تھی یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے پارس میرے پاس نہ ہو۔

"ہاں ——— میں حکومت کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ پارس مل جانے کے بعد تمہارے اور سیتا کے تمام جرائم سے پردہ پوشی اختیار کر لی جائے گی تم ہند میں رہنا چاہو یا کسی اور ملک کا رُخ کرو، حکومت تمہاری مدد کرے گی۔ تم اوّل درجے کے آزاد شہریوں کی طرح کھلے بندوں زندگی گزار سکو گے!"

میں نے جسپال کو دوسری طرف متوجہ پا کر احتیاط سے اپنی پتلون کی جیب ٹٹولی اور پارس کی موجودگی کا احساس پاتے ہی میرے دل میں ایک نئی امنگ دوڑ گئی میں نے نرم اور مصالحانہ لہجے میں کہا۔ "پارس پتھر میرے پاس نہیں ہے ہسپتال میں میں تمہاری تحویل میں تھا۔ اگر وہ پتھر میرے پاس ہوتا تو ابھی تک برآمد ہو چکا ہوتا۔ یہ محض تم لوگوں کی خوش فہمی ہے!"

"وہ تمہارے پاس ہو یا نہ ہو، تم اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو، ممکن ہے تم نے اسے کہیں چھپا دیا ہو!"

میں زور سے ہنسا "اگر تم کو یہی شبہ ہے تو مجھے اسی حالت میں فوراً ملک بدر کرا دو۔ میں وہ پتھر تمہارے ملک سے نہ لے جا سکوں گا۔"

میرے لہجے پر جسپال کو غصہ آ گیا "ہمیں احمق نہ سمجھو، تم جیسے ہیروں سے میں خوب واقف ہوں۔ پارس جیسی چیز کے لئے آدمی طویل منصوبہ بندی بھی کر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے پارس کسی بہت ہی محفوظ جگہ چھپایا ہوگا۔ تم ایک مرتبہ زندہ سلامت ہند سے نکل گئے تو سال دو سال بعد حلیہ بدل کر کسی بھی فرضی پاسپورٹ پر یہاں آ دگے پھر پارس تمہارا ہوگا۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتی تدبیر نے جنم لیا۔ مصیبت کے کٹھن لمحات میں آج تک ذہن نے کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا تھا اور اب میں اس نئی تدبیر کے ذریعہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتا تھا۔ مجھے کھوئی ہوئی سیتا بھی مل جاتی اور اس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر میں اپنے آخری فرار کی بے داغ منصوبہ بندی بھی کر سکتا تھا۔

"جسپال صاحب! میں پارس پتھر کے بارے میں واقعی اہم ترین بات جانتا ہوں!" میں نے چند ثانیوں تک تردد کا مصنوعی اظہار کرنے کے بعد کہا۔

"وہ کیا؟"

"یوں نہیں، اس کے عوض تمہیں میری رہائی کا وعدہ کرنا ہوگا۔" میں نے مکارانہ لہجے میں کہا۔

"اپنے بیان کی تصدیق تک تم ہمارے مہمان رہو گے، جس لمحہ پارس مل گیا تم آزاد کر دیئے جاؤ گے۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

"مگر میں اس وعدے پر کیسے اعتبار کر لوں؟" میں اُلجھن آمیز لہجے میں بولا

"جہاں عام قوانین مجبور ہو جاتے ہیں وہاں سے ہمارا اختیار شروع ہوتا ہے۔" وہ فخر آمیز لہجے میں بولا۔ "انڈین سیکرٹ سروس میں میرا نام طاقت اور اختیار کی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے آج تک میری زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلے جنہیں اوپر والوں نے ٹھکرایا ہو میرے وعدے اٹل ہوتے ہیں۔"

"پارس پتھر مجھے سیتا کی ماں نے دیا تھا۔" میں نے مضمحل لہجہ میں اپنی بات شروع کی۔ "شاید اس بیچاری کو پارس کی حقیقت کا احساس تک نہ تھا مگر میں نے اس پتھر کی اصلیت جان لی پھر جب ہر طرف سے لوگ بھوکے کتوں کی طرح پارس کی طرف لپکے تو سیتا تڑپ اُٹھی۔ وہ حساس اور جذباتی لڑکی ہے اسے یہ منظور نہ تھا کہ اس کی ماں کی نشانی میرے نقصانات کا باعث بنے پھر لالچی اجنبیوں کے ہاتھ لگ جائے۔ میں نے کلبھوت سے پارس چھینا تو وہ سیتا نے لے لیا

اور اب وہ پارس سمیت کہیں کھو گئی ہے، تم پارس پتھر حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری سیتا کو تلاش کرو۔ مجھے وہ مل جائے تو میں اس پرسے ہزار پارس پتھر بھی قربان کر سکتا ہوں!" آخری فقروں پر میری آواز بھرا گئی۔

"وہ جلد ہی ہمارے قبضے میں ہو گی" جسپال مٹھیاں بھینچ کر کرسی سے اُٹھ گیا "سڑکوں کی ناکہ بندی جاری ہے۔ سرحدوں پر کڑی نگرانی ہے میں آج ہی سخت ترین احکامات جاری کرائے دیتا ہوں۔ وہ ہم سے بچ کر کہیں نہ جا سکے گی۔"

اس مرحلہ پر میرا جی چاہا کہ جسپال کو سیتا کے بدلے ہوئے حلیے سے آگاہ کر دوں، اسے بتاؤں کہ سیتا اب سیاہ زلفوں اور سرمئی آنکھوں والی ہیپّی دوشیزہ کا روپ اختیار کر چکی ہے لیکن کسی غیبی طاقت نے میری زبان بند کر دی۔

"سیتا کی تلاش تک میری یہاں کیا حیثیت ہو گی؟" میں نے سوال کیا۔

"تم مراعات یافتہ قیدی کی طرح اس عمارت میں محدود رہو گے!" جسپال کے لہجے میں تحکم اُبھر آیا تھا۔ پل بھر میں وہ شفیق دوست سے ایک سخت گیر حاکم کا روپ بدل چکا تھا "تمہیں اس خواب گاہ کے سوا کسی کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہو گی، ہاں تم لان اور برآمدے میں نکل سکتے ہو اور آؤ میں تمہیں احتیاط کے طور پر ایک تماشا بھی دکھا دوں!"

میں کچھ حیران سا اس کے ہمراہ کمرے سے نکل آیا۔

عمارت کا برآمدہ اونچا اور بہت وسیع تھا۔ جہاں تینوں سپاہی کسی نادیدہ دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ان کی یہ مستعدی جسپال کی وجہ سے تھی اور اگر وہ موجود نہ ہوتا تو تینوں سپاہی برآمدے کے فرش پر دراز گپّیں لڑا رہے ہوتے۔

اس پختہ برآمدے کے آگے خاصا طویل و عریض سرسبز لان پھیلا ہوا تھا۔ گھاس کی دبازت، تازگی اور گہرے سبز رنگ سے پتہ چل رہا تھا کہ اس سبزہ زار کی بہت زیادہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ لان پر مناسب فاصلوں سے رنگا رنگ پھولوں کے تختے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے ایک خاص بات یہ محسوس کی کہ پورے احاطہ میں کہیں بھی کوئی اونچی جھاڑی یا ایسا درخت موجود نہیں تھا جسے کوئی آڑ کے طور پر استعمال کر سکے۔ لان کے آخری سرے پر سات آٹھ فٹ اونچا آہنی جنگلا لگا ہوا تھا جس سے چند فٹ کے فاصلے پر احاطہ کی پختہ اور فصیل نما دیوار نظر آ رہی تھی۔ آہنی جنگلا احاطے کی دیوار سے یکساں فاصلہ پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک لگا ہوا تھا اور اس پر مستزاد خار دار تاروں کی وہ دو رویہ باڑھ تھی جو احاطے کی دیوار پر لگی ہوئی تھی ان تاروں کا درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ انھیں چھوئے بغیر کوئی شخص دیوار پھاند کر اندر نہیں کود سکتا تھا میں برآمدہ میں حیرت سے یہ سارے انتظامات سے دیکھتا رہا۔

"نیچے آؤ!" جذبات سے عاری جسپال کی سپاٹ آواز نے میری محویت کا طلسم بکھیر دیا۔

میں اُس کی تقلید میں سیڑھیاں عبور کر کے نیچے اُترا اور چند قدم بڑھنے کے بعد بُری طرح چونک پڑا۔ میرے ذہن میں ہمالیہ کی برفپوش پہاڑیوں میں بسنے والے وہ آدم خور قبائل گھوم گئے جو اپنی عورتوں کو حقیر اور ناپاک تصور کرتے ہوئے دوہری باڑھ کے وسط میں قید رکھتے تھے اور ان دونوں باڑھوں کے درمیان آدم خور چیتوں کو کھُلا رکھتے تھے تاکہ نہ کوئی عورت فرار ہو سکے، نہ کوئی باہر سے اندر گھس کر ان کی مجبور و مظلوم عورتوں کو گزند پہنچا سکے۔

"تمہیں کتوں کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟" جسپال نے لان کے تقریباً وسط میں پہنچ کر مجھ سے اپنے افسرانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں!" میں نے جنگلے کے عقب میں گھورتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

جسپال نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا "چھوٹے قد کے یہ کتے رکھوالی کے لئے بے نظیر ہیں۔ یہ روسی نژاد کتے دو نسلوں کے ملاپ سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان کی سماعت کی حس غیر معمولی طور پر تیز ہے اور یہ سونگھنے سے زیادہ کانوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ صرف اس وقت بھونکتے ہیں جب بھوکے ہوں ورنہ بالکل خاموش مگر چوکنے رہتے ہیں اور اپنی زد میں آنے والے کسی بھی اجنبی کو نہایت خاموشی سے اس وقت تک بھنبھوڑتے رہتے ہیں جب تک وہ بے حس و حرکت نہ ہو جائے۔ اس کی دو ہی صورتیں دیکھنے میں آئی ہیں بے ہوشی یا موت کے سوا کوئی کیفیت انسان کو ان کتوں سے نجات نہیں دلا سکتی۔"

اس وقت ہم دونوں جنگل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہماری آہٹیں پا کر یا بُو سونگھ کر چار کتے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہانپتے ہوئے ہمیں گھورے جا رہے تھے۔ اُن کی ہلتی ہوئی دُمیں ساکت ہو چکی تھیں، نگاہوں میں غیض و غضب کی سُرخی دمک رہی تھی۔ اگر ہمارے درمیان آہنی جنگلہ حائل نہ ہوتا تو شاید وہ چاروں مجھ پر ٹوٹ پڑتے۔

خرگوش سے ذرا زیادہ جسامت والے وہ سیاہ کتے ہر وقت احاطے کی دیوار اور آہنی جنگلے کے درمیان اس عمارت کی حفاظت پر مامور رہتے تھے۔ شاید جسپال کو میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی معلومات حاصل ہو چکی تھیں اور وہ مجھے یہ بندوبست دکھا کر جتانا چاہتا تھا کہ اس بار میرے فرار کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکے گی۔

"یہ انتظام ناقابلِ شکست نہیں ہے!" میں نے اُسے اپنے حوصلے کا احساس دلانے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" جسپال چونک پڑا۔

"کتوں کو زہریلا گوشت دیا جا سکتا ہے، پھر آمد و رفت کا راستہ تو ضرور اس جنگلے کی زد سے باہر ہو گا۔" میں نے کہا۔

"یہ کتے تیتروں کے اُبلے ہوئے گوشت پر پالے گئے ہیں۔" وہ فتحمندانہ انداز میں مسکرایا "دوسرے گوشت کو سونگھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ان کتوں کی غذا ایک راز ہے مگر یہ راز میں تمہیں بتا رہا ہوں ... صرف اس لئے کہ لاعلمی میں تم کوئی قدم نہ اُٹھا لو۔"

"نہیں۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم اس لئے بتا رہے ہو کہ میں ان دیواروں کے اندر رہوں اور یہاں تیتر کا زہریلا گوشت حاصل کرنا ناممکنات سے ہو گا۔"

"خیر!" وہ لاپرواہی سے شانے اُچکا کر بولا۔ "یہ بھی سُن لو کہ اس عمارت میں آمد و رفت اتنی آسان نہیں ہے۔ شناختی کاغذات، سیکرٹ سروس کا اجازت نامہ اور آمد و رفت کے اوقات طے ہو جانے کے بعد آہنی جنگلے میں دو ایسی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں کہ صرف پھاٹک کا حصہ آمد و رفت کے لئے بلا خوف استعمال کیا جا سکتا ہے باقی سارا احاطہ پھر بھی کتوں کی زد میں ہوتا ہے۔ دراصل جب سے رشوت عام ہونی شروع ہوئی ہے، ہم اہم کاموں کے لئے انسانوں پر انحصار کم سے کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔"

"شاید وہ وقت بھی آ جائے جب سیکرٹ سروس میں کوئی انسان ہی نہ ملے!" میں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر گہرا طنز کیا۔

"صفدر احد سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں!" جسپال آنکھیں نکال کر غرّایا۔ اُس نے پہلی بار مجھ سے غیر دوستانہ لہجے میں بات کی تھی "میرے منہ لگانے کا یہ مطلب نہ لو کہ میں تمہیں اپنے سر پر سوار ہو جانے کی اجازت دے دوں گا۔"

"مجھے افسوس ہے!" میں نے معذرت آمیز لہجے میں جلدی سے کہا۔ "تمہاری دوستانہ باتوں میں میں اپنی حیثیت بھول گیا تھا۔"

"جب تک سیتا یا پارس پتھر نہیں مل جاتا، تمہیں ہر لمحہ یہ یاد رکھنا ہو گا کہ تم ہمارے قیدی ہو۔" اس کے لہجے میں اب رعونت اُمڈ آئی تھی "حفاظتی انتظامات کے بارے میں آخری بات یہ بھی سُن لو کہ احاطہ کی دیوار پر جو خار دار تاروں کی دو رویہ باڑھ ہے اس میں ہر لمحہ برقی رَو دوڑتی رہتی ہے اور اس سرکٹ کا فیوز پچاس ایمپیئر کا ہے۔ برقی رَو کی یہ مقدار آناً فاناً میں کسی بھی جاندار کو بھسم کرنے کے لئے کافی ہے۔"

اس عمارت کے حفاظتی انتظامات واقعی زبردست تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں قرونِ وسطیٰ کے کسی سفاک آمر کے خلاف بغاوت کے جرم میں اس کے محفوظ ترین زنداں میں پھینک دیا گیا ہوں جہاں سے جیتے جی گلو خلاصی نہ ہو سکے گی۔

"یہ کون سی عمارت ہے؟" میں نے آہستہ سے سوال کیا "میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پورے ہند میں کوئی ایسی جگہ بھی ہو گی جہاں سدا کا مفرور محض قیدی بن کر رہ جائے گا۔"

"تم اس وقت انبالہ میں ہی ہو!" جسپال واپس لوٹتے ہوئے بولا "یہ عمارت ہماری گفتگو میں پی فور کہلاتی ہے۔ لوگ اُسے ڈان ہاؤس کے نام سے جانتے ہیں۔ یہاں صرف وہ خطرناک سیاسی قیدی رکھے جاتے ہیں جو باغیانہ رجحانات کے مالک ہوں اور حکومت انھیں تنہائی میں رکھنا چاہتی ہو، چند روز پہلے تک یہاں ناگالینڈ کے نام نہاد محاذِ آزادی کا ایک سرغنہ موجود تھا!"

"تمہارا بہت بہت شکریہ!" میں نے کہا "تم نے مجھ سے کھل کر بات کی ہے اور اب مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا ہے کہ میں کن ہاتھوں میں ہوں!"

"میں نے یہ ساری گفتگو اس اُمید پر کی ہے کہ تم یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے!" وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا

"میں تمہاری توقعات پر پورا اُتروں گا۔" میں نے خلوص سے کہا۔

مجھے خوابگاہ میں پہنچا کر جسپال سنگھ واپس لوٹ گیا۔ میں مسہری پر دراز کافی دیر تک اپنی نئی مشکلات کے بارے میں سوچتا رہا مگر اس بار مجھے اپنی گلو خلاصی ناممکن نظر آ رہی تھی۔ ایک طرف سیتا کی پُراسرار گمشدگی نے میرا ذہنی سکون تباہ کیا ہوا تھا دوسری طرف میں خود انڈین سیکرٹ سروس کے ناقابلِ شکست حصار کا قیدی تھا۔ وہ لوگ ہند سرکار کے نام پر مجھ سے پارس پتھر طلب کر رہے تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ انھیں ابھی تک شبہ نہیں ہو سکا تھا کہ پارس پتھر میری تحویل میں ہے۔

ابھی تک وہ لوگ میرے ساتھ آبرومندانہ طریقہ پر پیش آ رہے تھے کیونکہ انھیں پارس پتھر کے بارے میں میری ذات سے خاصی اُمید تھی۔ سیتا کی تلاش میں اُن کا ناکام ہونا فی الحال یقینی تھا کیونکہ سیتا کا رُوپ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ ہاں ایک آدھ ماہ بعد جب اُس کے بالوں سے خضاب کی سیاہی صاف ہونی شروع ہوتی اور اُس کے بالوں کا سُرخ رنگ سامنے آتا تو وہ توجہ کا مرکز بن جاتی۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کسی وجہ سے ایک بار بھی سیتا کی آنکھوں سے کانٹیکٹ لنس نکل گئے تو وہ انھیں دوبارہ نہ لگا سکے گی اور یوں اُس کی نیلی آنکھیں اُس کی بدلی ہوئی شخصیت کا بھرم کھول دیں گی۔

سیتا کی تلاش سے مایوس ہو کر جب سیکرٹ سروس دوبارہ میری طرف رُخ کرتی تو یقینی طور پر اس کا رویّہ جارحانہ ہوتا کیونکہ میں اُن کے سامنے اپنی افادیت سے محروم ہو جاتا اور وہ محض آخری کوشش کے طور پر میری زبان کھلوانے کے لئے تشدّد کی راہ اختیار کر سکتے تھے۔ پھر نہ مراعات باقی رہتیں نہ عزت قائم رہتی جو لوگ سیاسی قیدیوں کے لئے ایسے بے رحمانہ قید خانے بنا سکتے تھے اُن کے بنائے ہوئے عقوبت کدے بھی روح کو لرزا دینے والے ہوتے۔ جلد یا بدیر میں کسی کال کوٹھری میں حقیر مجرموں کی طرح اُن کے سفاکانہ تشدّد کا نشانہ ضرور بنتا۔

ادھر سیتا کا مسئلہ مجھے خاصا پیچیدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جس دم خم کی لڑکی تھی اُس کے پیشِ نظر یہ بات عقل سے بعید نظر آتی تھی کہ کوئی اسے ہوٹل کے کمرے سے اُٹھا لے جاتا اور میں اُس کے پہلو میں بے خبر سوتا رہتا۔ جذباتی اُبال اور احمقانہ جوش دب جانے کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اُسے کھونے میں خود میرا ہاتھ ہے!

سیتا سے آخری رات میں نے مذاق مذاق میں خاصی تلخ باتیں کہی تھیں اُسے مصیبت قرار دیا تھا، بے تکا بھی کہا تھا اور وہ ایک حساس لڑکی تھی۔ شاید اُسے میری بات بُری لگ گئی تھی۔ اُس نے سوچا ہو گا کہ میں اس سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اس احساس کے ساتھ اُس نے میرے ہمراہ وقت ضائع کرنے میں توہین محسوس کی ہو گی اور یوں محض میرے مذاق کے باعث وہ ناراض ہو کر خاموشی سے انسانوں کے بیکراں سمندر میں کہیں گم ہو گئی۔ مجھے نہ اُس کی منزل کا پتہ تھا، نہ عزائم کا اندازہ!

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ جسپال کو سیتا کے حلیہ کے بارے میں ساری باتیں بلا کم و کاست بتا دی جائیں تاکہ انڈین سیکرٹ سروس کے ذریعہ میری بیوی میرے پاس لوٹ آئے۔ جب ہم ازدواجی رشتے میں منسلک

ہو چکے تھے تو ہماری تقدیر بھی مشترک ہونی چاہیئے تھی۔ پارس تھر کی ملکیت کے ساتھ بے فکر زندگی ہو یا انڈین سیکرٹ سروس کے ہاتھوں کربناک موت دونوں جگہ سیتا کو میرے دوش بدوش ہونا چاہیئے تھا۔

میں نے ہر پہلو سے اپنے اس فیصلے کا جائزہ لیا اور آخر کار باہر سے ایک سپاہی کو طلب کرنے کے لئے مسہری کے سرہانے لگا برقی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

"جسپال صاحب کو اطلاع دو کہ میں اُن سے فوراً بات کرنی چاہتا ہوں!" سپاہی کے آنے پر میں نے کہا اور وہ نہایت سعادت مندانہ انداز میں سر کو خم دے کر چلا گیا۔

چند منٹ بعد برآمدے میں چند آہٹیں سُنائی دیں پھر ایک شخص میری خوابگاہ میں داخل ہوا مگر وہ جسپال سنگھ نہیں تھا۔

وہ جو کچھ بھی تھا، پہلی ہی نظر میں مجھے اچھا نہ لگا۔ دُبلا پتلا شخص تھا طویل استخوانی چہرہ پر رخساروں کی ہڈیاں نمایاں طور پر اُبھری ہوئی تھیں۔ پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ، سرد اور راکھ جیسی بجھی ہوئی سیاہ آنکھیں جن میں زندگی کی چمک کے بجائے موت کی بے رونقی رچی ہوئی تھی۔ اس کا داہنا کان شاید پیدائشی طور پر ناقص تھا کیونکہ وہاں کان کی جگہ گوشت کا ایک لوتھڑا سا جھول رہا تھا۔

"اے۔ ڈی۔ جی واپس جا چکے ہیں، اُن کی غیر موجودگی میں تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو!" اُس شخص کا لہجہ بھی آنکھوں کی طرح سرد اور سپاٹ تھا۔ اُس کی شخصیت کا مجموعی تاثر کچھ ایسا تھا جیسے کسی فرعون کی صدیوں پُرانی لاش نے ممی سے نکل کر چلنا اور بولنا شروع کر دیا ہو۔

"اے۔ ڈی۔ جی!" میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔ گویا میرا معاملہ اعلیٰ پیمانے پر طے کیا جا رہا تھا۔ اور اگر جسپال انڈین سیکرٹ سروس کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل ہی تھا تو میرے لئے بچاؤ کی کوئی اُمید بے سود تھی۔ میں آنے والی مشکلات کو ٹال ضرور سکتا تھا مگر اُن سے بچنا ناممکنات میں سے ضرور نظر آ رہا تھا۔

"تم کس اے۔ ڈی۔ جی کی بات کر رہے ہو؟" میں نے غلط فہمی کا امکان دُور کرنے کے لئے انجان بن کر اس سے سوال کیا۔

"تمیز سے بات کرو!" خلاف توقع اُس نے سرد لہجے میں مجھے ڈانٹ دیا اور میں نے اسی لمحہ اسے اپنے دشمنوں میں سرفہرست رکھ لیا۔

"بدتمیزی!" میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا کان شاید کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوا ہے۔ میں نے جسپال سنگھ سے ملنے کی خواہش کی تھی، تم اے۔ ڈی۔ جی کی خبر لائے ہو۔"

میری اس بات پر وہ ذرا بھی نہ بدکا۔ اُس کے ہونٹ خفیف سے پھیلے۔ شاید وہ مسکرایا تھا۔ پھر اُس کی وہی ٹھہری ہوئی آواز اُبھری۔ "غیر معمولی آسائشوں نے شاید تمہارے ذہنی توازن پر خراب اثر ڈالا ہے مگر یقین کرو کہ آخر کار جب تم مکمل طور پر میری تحویل میں دیئے جاؤ گے تو میں تمہارے کانوں پر ہی سب سے پہلے توجہ دوں گا۔ نمبر دو یہ کہ جسپال صاحب ہی اس عمارت میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل کہلاتے ہیں وہ یہاں سے سیدھے ایئرپورٹ گئے ہیں اور کچھ دیر بعد شہر سے باہر ہوں گے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو یا خاموشی سے بستر پر پڑے رہو!"

"تم کون ہو؟"

"عام حالات میں اس عمارت میں صرف میرا اختیار چلتا ہے۔ تمہارے لئے صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ جسپال صاحب کے جانے کے بعد یہاں ہنگامی صورتِ حال معمول پر آ چکی ہے!"

"مجھے تمہارے عہدے یا اختیارات سے کوئی دلچسپی نہیں!" میں نے خشک لہجے میں کہا "میں صرف تمہارا نام جاننا چاہتا ہوں!"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا مسہری کی طرف آیا۔ اُس کے ہونٹوں پر لکلکی ہوئی زہریلی سی مسکراہٹ رقصاں تھی مگر دُھندلائی آنکھیں بدستور موت کی طرح سرد تھیں۔

میرے بالکل قریب آ کر رُکا اور دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر بولا "مجھے ڈاکٹر بیدی کہتے ہیں!" فقرہ مکمل ہوتے ہی بجلی کی سی سرعت سے اُس کا بایاں ہاتھ فضا میں لہرایا اور جب تک میں اپنی مدافعت کے بارے میں سوچوں اس کا طاقتور مکا میری پیشانی پر پڑا اور میں کراہتا ہوا مسہری پر ڈھیر ہو گیا۔

میں اُن لوگوں کا قیدی ضرور تھا مگر آپریشن اور تازہ زخموں کے باعث میرا اعصابی نظام بہت زیادہ حساس ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر بیدی نے میری پیشانی پر گھونسہ رسید کر کے میرے حواس زائل کر دیئے۔ میری نگاہوں کے سامنے ستاروں کی ایک دُھندلائی ہوئی کہکشاں رقص کرنے لگی۔

میں نے مسہری پر پڑے پڑے بلند آواز میں ڈاکٹر بیدی کو ہر وہ گالی سُنائی جو میرے حافظے میں موجود تھی پھر اُس سے چند ناشائستہ رشتوں کا اظہار کیا اور جب اُس کا ہڈیوں بھرا چہرہ دوبارہ میری نگاہوں کی زد میں آیا تو وہاں وہی سلگا دینے والی مسکراہٹ موجود تھی۔

اب میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ بیدی کے والدین کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کر دوں کیونکہ اس جیسے موذی کی پیدائش میں ذریعہ بن کر انھوں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا۔

اسی دوران میری ہنگامہ آرائی نے مسلح محافظوں کو خوابگاہ میں آنے کی دعوت دی مگر ڈاکٹر بیدی نے نہایت سکون کے ساتھ انھیں باہر بھیج دیا۔

"یہ شور اور اداکاری بند کرو!" اس بار وہ بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں وہ بات جاننا چاہتا ہوں جو بتانے کے لئے تم جسپال کو بُلا رہے تھے!"

"تم جانوروں سے بدتر ہو کمینے!" میں غصہ سے بھرا ہوا تھا۔ "میں صرف جسپال سے بات کروں گا۔ تم چلے جاؤ یہاں سے!"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں، شاید اُن سے رابطہ قائم ہو جائے!" اُس نے لاپروائی سے کہا اور وہاں سے واپس چلا گیا۔

میں کافی دیر تک مسہری پر پڑا غصہ میں کھولتا رہا۔ بیدی جیسا کوئی ڈاکٹر میں نے زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اوّل درجہ کا مکار اور بے رحم آدمی نظر آتا تھا، اُس نے میری ابتر حالت کی پرواہ کئے بغیر جس طرح میری پیشانی پر گھونسہ مارا تھا اُس کی توقع کسی صحیح الدماغ آدمی سے نہیں کی

جا سکتی تھی۔ پھر جسپال کے برعکس اس مردود کو میری کسی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا۔ اُس کے اطوار سے ظاہر تھا کہ میرے معاملے میں اُسے ذرا بھی ڈھیل ملی ہوتی تو وہ میری زبان کھلوانے کے لئے تشدد کا آغاز کرا چکا ہوتا۔

جب میرے اعصاب ذرا بحال ہوئے تو میں باتھ روم میں پہنچا۔ آئینہ میں صورت دیکھتے ہی مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ میرا پورا سر پٹیوں میں بندھا ہوا تھا اور چہرے سے میں برسوں کا مریض معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے تنہائی کاٹنے اور اس عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی نیت سے باہر موجود محافظوں کو کمرے ہی میں بلا لیا۔

"تم لوگ میرے ساتھ تاش کھیلو گے؟" میں نے ان تینوں سے دریافت کیا۔

انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باہمی تبادلۂ خیال کیا پھر ایک بولا۔

"میں سارجنٹ سے اجازت لے کر آتا ہوں!" اور میرے جواب دینے سے قبل ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔

چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں تاش کی گڈی موجود تھی۔

"سارجنٹ نے اجازت دے دی ہے مگر تم ہمارے ساتھ کوئی چالاکی نہیں کرو گے!"

"تم فکر نہ کرو!" میں مسکرایا۔

پھر ہم چاروں فرشی قالین پر ہی بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنی تینوں بندوقیں ایسی جگہ رکھیں جہاں وہ میری رسائی سے دُور اور اُن کے قریب تھیں۔ میں نے نیچے رکھی ہوئی گڈی اٹھائی اور تاش سیدھے کر کے الٹ پلٹ کرنے لگا اُن سے گفتگو کرتے ہوئے چند لمحوں کے بعد میری نظر گڈی پر پڑی اور میں چونک پڑا۔ میری برسوں پُرانی عادت ابھی تک میرے لاشعور سے چپکی ہوئی تھی۔ گڈی میں حکم کی بیگم سب سے اوپر موجود تھی:

کھیل شروع ہوا، آہستہ آہستہ تکلف ختم ہوا اور ہلکی پھلکی گفتگو بھی چل پڑی۔

"اگر اس عمارت میں صرف تم لوگوں کا ساتھ ہو تو یہ قید بھی راحت ہے!" ایک مرحلے پر موقع غنیمت جان کر میں نے بات چھیڑی۔

"تم قیدی ہو یہاں؟" اس بات پر وہ تینوں ہی چونکے تھے مگر استفسار ایک نے کیا تھا۔

"کیا یہاں قیدیوں کے علاوہ بھی کوئی آتا ہے؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ تم یہاں ایک اہم مہمان کے طور پر لائے گئے ہو اور تمہاری سخت حفاظت کی جا رہی ہے۔"

"اگر مہمان کے سر پر ہر وقت تین بھری ہوئی بندوقیں مسلط ہوں تو وہ خود کو قیدی ہی کہے گا!" میں نے ہنس کر بات ٹال دی۔

میں نے انھیں شبہ کا کوئی موقع دیئے بغیر اُن سے بہت سی باتیں دریافت کیں لیکن وہ بیچارے اس عمارت کے بیشتر معاملات سے بے خبر تھے۔ اُن کا واسطہ صرف اپنے سارجنٹ سے پڑتا تھا جو اس عمارت کے حفاظتی انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ سارجنٹ سمیت اس عمارت میں کل گیارہ ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل حفاظتی دستہ مقیم تھا۔ انھیں عمارت سے باہر جانے کی سخت ممانعت تھی۔ کھانا وغیرہ بھی وہیں ملتا تھا۔ یوں وہ اس عمارت میں کل وقتی ملازم تھے۔

وہ عمارت کافی وسیع تھی مگر حفاظتی عملہ کو ناگزیر ضروریات کے سوا حتی الامکان عمارت کے اندرونی حصوں سے دُور رہنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ ڈاکٹر بیدی اس عمارت میں آمرِ مطلق کا درجہ رکھتا تھا اور لوگ اس کے سائے تک سے کانپتے تھے۔ آج تک کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کس قسم کا ڈاکٹر ہے مگر افواہ یہ تھی کہ وہ بہت ماہر نفسیات داں ہے۔ اس سمیت عمارت میں کام کرنے والے وہیں مقیم رہتے تھے۔ ہر شخص کو اپنی باری کے مطابق مہینے میں ایک بار چار روز کی مسلسل چھٹی ملتی تھی۔ اس چھٹی کے علاوہ کوئی باہر نہیں جا سکتا تھا۔ وہاں رہنے والوں کا بیرونی دنیا سے صرف اتنا رابطہ تھا کہ ہفتہ میں ایک بار گاڑی روزمرہ ضروریات کا سامان اور رسد وہاں پہنچانے آتی تھی۔

پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ شاید ذہنی طور پر مجھے مرعوب کرنے کے لئے ان تینوں کے ذریعہ عمارت کے بارے میں میرے سامنے پُراسرار باتیں پہنچائی جا رہی ہیں مگر جلد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ سچ بول رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں اس عمارت کا وجود میرے لئے سخت حیرت کا باعث تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی سنگین قلعہ میں آ پھنسا ہوں جہاں کوئی کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور جہاں داخلے کے بے شمار راستے ہوں مگر نکاسی کی ہر راہ مسدود ہو۔

شام پانچ بجے ایک شخص نے ڈاکٹر بیدی کا پیغام لا کر وہ محفل برہم کر دی بیدی نے مجھے فوراً طلب کیا تھا۔ یہ پیغام ملتے ہی میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ شاید وہ مردود میرے بارے میں وسیع اختیارات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میرے پاس اس بلاوے سے مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں با دلِ ناخواستہ بیدی کے قاصد کے ساتھ ہو لیا۔ برآمدے میں نکلنے کے بعد ایک طویل چکر کاٹ کر ہم راہداری میں داخل ہوا۔ اس وقت پوری عمارت پر ہولناک سکوت طاری تھا۔ خاص طور پر اس کشادہ راہداری میں آنے کے بعد تو ہمیں اپنے قدموں کی آواز کے سوا کوئی آہٹ نہیں سُنائی دے رہی تھی۔

باہر سے وہ دو منزلہ عمارت جتنی وسیع تھی اُس کی اندرونی ساخت اسی قدر پیچیدہ تھی۔ راہداریوں اور کئی اندرونی دالانوں سے گذر کر آخر کار ہم ایک راستہ کے آخری سرے پر پہنچے۔ وہاں ایک بند دروازہ موجود تھا۔ مجھے لانے والے نے اپنی جیب سے کوئی چیز نکال کر دروازے میں بنے ہوئے پیتل کے ایک چوکور خانہ میں رکھی اور وہ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ جب وہ آدمی پھرتی کے ساتھ اپنا ہاتھ جیب میں واپس ڈال رہا تھا تو میں سنہری رنگ کے دھات کے ایک چوکور ٹکڑے کی بس جھلک ہی دیکھ سکا۔

اس دروازہ کے پیچھے تہ خانے کی کشادہ سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم دونوں نے پہلی سیڑھی پر قدم ہی رکھا تھا کہ دروازہ کسی خود کار نظام کے تحت بند ہو گیا۔

سیڑھیوں کا اختتام ایک راہداری ہی میں ہوا جس میں دونوں طرف دو دو دروازے موجود تھے۔ بائیں جانب آخری دروازہ نیم وا تھا اور اس جانب

سے مشینی کھٹکوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے کرلانے والے نے اسی کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر مجھے اندر جانے کو کہا اور خود وہیں رک گیا۔

میں اندر داخل ہوتے ہی چونک پڑا۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑا ریڈیو کنسول موجود تھا اور اس کے آگے دو آدمی کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے دھیمی آواز اور ناقابلِ فہم زبان میں کچھ کہے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی پنسل سے پیڈ پر نوٹ لیتے جا رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ڈاکٹر بیدی موجود تھا اور دروازے کی طرف منہ کئے شاید میرا ہی منتظر تھا!

"جی سکس وَن نائین پر ہاک سے ملاؤ!" مجھے دیکھتے ہی بیدی نے ایک آپریٹر سے سرد، سپاٹ مگر تحکم آمیز آواز میں کہا۔

"یس سر!" اُس نے جلدی سے کہا۔ پھر اُس نے اپنے سر پر چڑھے ہوئے ہیڈ فون کا پلگ پینل پر لگے ہوئے ساکٹ میں لگا دیا۔ اور اُس کی انگلیاں پھرتی کے ساتھ مختلف ڈائلوں اور کھٹکوں سے اُلجھنے لگیں۔

وہ عمارت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے لئے طلسم ہوشربا بنتی جا رہی تھی۔ مواصلات کا وہ لاسلکی اور ریڈیائی نظام اس عمارت کی اہمیت کا ایک اور بڑا ثبوت تھا۔

"تم نے مجھے کیوں بُلایا ہے؟" میں نے بیدی سے یہ سوال کرتے ہوئے اپنے لہجے پر کمزوری کا غلبہ محسوس کیا۔

"شش ش!" اُس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

ادھر وہ آپریٹر بیدی کی ہدایت پر عمل پیرا تھا۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد کنسول میں لگے ہوئے کسی خفیہ اسپیکر پر دھیمی سی ٹوں ٹوں کی آواز اُبھرنے لگی۔

"جی سکس وَن نائین ۔ زیرو کالنگ!" ریڈیو ٹون پہچانتے ہی آپریٹر کی زبان مشینی انداز میں چل پڑی۔

"جی سکس وَن نائین ۔ ریسیونگ، اوور!" چند سکنڈ کے بعد بھاری مردانہ آواز اُبھری۔

وہ آواز سنتے ہی بیدی لپک کر ریڈیو کنسول پر پہنچ گیا۔ "جی سکس وَن نائین! زیرو ٹو اسپیکنگ مجھے ہاک سے بات کرنی ہے۔ اوور!"

وہ بہت حساس وائرلیس ریسیونگ سیٹ تھا جس پر آواز بالکل صاف اور واضح سُنائی دیتی تھی۔ میری نظر کنسول پر لگے ہوئے مونوگرام پر گئی۔ وہاں امریکہ کے مشہور زمانہ ادارہ آئی۔ٹی۔ٹی۔ کا نام لکھا ہوا تھا جو لاسلکی اور ریڈیائی مواصلات میں دورِ جدید کا رہنما سمجھا جاتا ہے۔

"ہیلو زیرو ٹو ۔ میں ہاک ہوں، اوور!" قدرے سکوت کے بعد کمرے میں آواز اُبھری اور مجھے یہ پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ بولنے والا جسپال سنگھ تھا۔

"وہ میرے ساتھ موجود ہے سر! اوور!" ڈاکٹر بیدی کے الفاظ احترام آمیز تھے مگر لہجہ سپاٹ اور سرد!

"میری بات کراؤ اس سے، اوور!"

بیدی نے مڑ کر مجھے دیکھا "جسپال صاحب سے بات کرو!"

میں اپنے عروج کے دنوں میں جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ رہا تھا قانون کے محافظ مجھ پر شبہ کرنے کے باوجود مجھ سے ڈرتے ڈرتے ہمکلام ہوتے تھے مگر بیدی جو کچھ بھی رہا ہو، ماہر نفسیات ضرور تھا۔ اُس نے اپنی قوت اور وسائل کے بھرپور مظاہرے کے ذریعے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ اس بات بار چیونٹی اور پہاڑ کا ہے۔ احساس کمتری شدت سے مجھ پر غالب آتا جا رہا تھا۔

"میں صفدر علی بول رہا ہوں، اوور!" میں نے کنسول پر لگے ہوئے ماؤتھ پیس کے قریب جا کر کہا۔

"ہاں ۔ کیا بات ہے؟ اوور!"

"سیتا کے بارے میں چند ضروری باتیں میں چھپا گیا تھا، اُس کی تلاش کے سلسلے میں یہ باتیں اہم ہیں۔ اوّل یہ کہ میں نے سیتا کے سُرخ بال خضاب سے سیاہ کئے ہوئے، دوئم اُس کی نیلی آنکھوں پر کانٹیکٹ لنس لگا کر اُن کا رنگ سُرمئی کر دیا گیا ہے۔ اب وہ اسکرٹ اور بلاؤز میں سفید فام، گونگی لڑکی بنی ہوئی ہے جو پہلی نظر میں ہی نظر آئے گی، اوور!"

"تم نے یہ باتیں بتا کر بڑی عقلمندی کی ہے صفدر!" جسپال سنگھ کی مسرّت آمیز آواز اُبھری۔ "اور ہاں تمہارا ہر وقت مجھ سے رابطہ ہونا مشکل ہے، تم بے کھٹکے ہر بات ڈاکٹر بیدی کو بتا سکتے ہو، اوور!"

اُس کا نام آتے ہی میرے ذہن پر جھلاہٹ سوار ہو گئی "یہ مشکل ہے، ڈاکٹر بیدی کا ساتھ میری زندگی تلخ کر دے گا!"

"وہ بہت ہمدرد انسان ہے صفدر!" جسپال بولا "ہند میں اُس کے پائے کا ماہر نفسیات ملنا مشکل ہے، وہ تمہاری بہتیری ذہنی گتھیوں کو سلجھا سکے گا۔ اوور!"

"ماہر نفسیات! مجھے تو وہ خود بگڑا ہوا نفسیاتی مریض معلوم ہوتا ہے، تمہیں معلوم ہے کہ اُس نے میرے ساتھ ہاتھا پائی کی ہے!" میں بگڑ کر بولا۔

"اوہ، تھوڑا صبر کرو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا، اس وقت میں بہت مصروف ہوں، تمہاری خاطر ایک میٹنگ سے اُٹھ کر آیا ہوں، اوور اینڈ آل!"

ریسیونگ اپریٹس اچانک ہی خاموش ہو گیا۔

"باہر نکلو!" بیدی کا لہجہ شاید حالات اور واقعات کا کوئی اثر قبول کئے بغیر سدا یکساں رہتا تھا۔

تہہ خانے کی راہداری میں آ کر اُس نے ریڈیو روم کا دروازہ بند کر دیا۔ مجھے خوابگاہ سے وہاں پہنچانے والا شاید پہلے ہی جا چکا تھا۔

"سنو صفدر!" دروازہ بند کرنے کے بعد وہ سختی سے میرا بازو دبا کر بولا "حادثہ کے بعد جب تمہیں پہلی بار صفدر علی کی حیثیت سے پہچانا گیا تو اپنے محکمہ کی جانب سے میں نے بھی تمہارا معائنہ کیا تھا۔ بے ہوشی کے عالم میں تم جو ہذیان بک رہے تھے میں نے صرف اسی کی بنا پر اپنا فیصلہ سُنا دیا تھا، تم جیسے مکار اور خود غرض لوگ لاکھوں میں چند ہی ہوا کرتے ہیں۔ میں انسانوں کے ذہن میں جھانکنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہوں، اور میرا دعویٰ ہے تم ابھی تک ہمارے ساتھ مخلص نہیں ہو، پارس پتھر جہاں بھی ہے تمہاری پہنچ میں ہے۔ جب تک تمہارے ساتھ رویّہ نرم رکھا جائے گا تم مکاری اور مدافعت برتتے رہو گے۔ تم صرف اور صرف تشدد کے سامنے سچ اگل سکتے ہو، مگر میرے اوپر والے

تمہیں سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھ رہے ہیں۔ وہ تمہارے ذہنی توازن کی طرف سے فکرمند ہیں، پارس پتھر کی دستیابی تک تمہاری زندگی اور صحت کے محافظ بنے ہوئے ہیں، انہوں نے میری بات مان لی ہوتی تو اب تک تم پارس پتھر کا سُراغ بتا چکے ہوتے!"

"بڑے مجبور ہو تم اوپر والوں کے سامنے!" میں نے طنز کیا۔

"اتنا زیادہ بھی نہیں!" وہ سکون سے بولا اور میرا ہاتھ تھامے تہہ خانے کے ایک کمرے میں گھس گیا۔ "جہاں جسمانی تشدد سے مجبور رہ جاتا ہوں وہاں ذہنی اذیت سے آدمی کو پاگل کر دیتا ہوں۔ دیکھو یہ میری تجربہ گاہ ہے۔ اس کمرے میں میری کوششوں کے نتیجے میں تین برس قبل ناگالینڈ آزاد ہونے سے بچ گیا۔ وہ لوگ ایک بیرونی طاقت کے سہارے علیٰحدگی کی سازش کر چکے تھے۔ ہمیں اس کی ذرا سی بھنک مل گئی۔ اصل سازشی بچ نکلے مگر اُن کا ایک رکن ہاتھ لگ گیا اور اس کمرے میں صرف تین گھنٹے کی محنت کے بعد اُس نے پورا منصوبہ اگل دیا۔ سازش کی جڑیں کاٹ دی گئیں اور سازشی لیڈر لندن بھاگ گئے۔ اب وہ وہاں رضاکارانہ جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں۔

"تمہارا نام طب کے پیشے پر بدنما داغ ہے بیدی!" میں نے حقارت سے کہا۔

"یہ صندوق دیکھ رہے ہو تم!" وہ میرے تبصرے پر توجّہ دلائے بغیر بولا۔ "اس میں آدمی کو لٹا کر ڈھکنا مقفل کر دیا جاتا ہے۔ اس صندوق میں تین طرف تانبے کی نالیاں ہیں جن میں حسبِ خواہش بھاپ یا نمک کا یخ بستہ محلول گذارا جاتا ہے۔ مجھے صرف ایک بٹن دبانا پڑتا ہے اور سارا کام خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔ صندوق کی ساخت ایسی ہے کہ نہ وہ باہر کی حرارت جذب کرتا ہے نہ اپنی حرارت خارج کرتا ہے۔ میرا قیدی نصف گھنٹہ جہنم کی گرمی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اُس کے فوراً بعد صندوق کے اندر درجۂ حرارت انجماد سے بھی کئی درجے نیچے گر جاتا ہے۔ یہ ریکارڈ ہے کہ آج تک کوئی قیدی اس صندوق میں تین سے زیادہ موسمی تبدیلیاں برداشت نہیں کر سکا۔ اس صندوق کے قیدیوں کی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ سچ بولنے تک وہ نمونیہ کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔ دو پر تو فالج کے اثرات ہو گئے تھے!"

"تم درندے ہو ڈاکٹر، تمہیں سیکرٹ سروس کے بجائے کسی جگہ جلّاد ہونا چاہیئے تھا!"

"مارنا آسان کام ہے!" وہ بھیڑیوں کی طرح سنگدل تھا۔ ذرا سا مسکرا رہا تھا۔ "مار مار کر جِلانا مہارت کا کام ہے۔ پیشہ ورانہ مہارت کا کام، تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی صفدر کہ میرا کوئی شکار آج تک میرے ہاتھوں مارا نہیں گیا!"

"سسکتی ہوئی فالج زدہ زندگی سے تو موت بہتر ہوتی ہے!"

"تمہارے لئے اس وقت یہ تبصرہ کرنا آسان ہے، ذرا اُن سے پوچھو جو یہاں سے زندہ گئے ہیں، زندگی اتنی بے وقعت نہیں ہے کہ فالج کے داموں اسے نیلام کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہی ہو جائے تو حرکت، ہمّت، طاقت اور بینائی سے محروم ہزاروں بوڑھے روزانہ خودکشی کر لیا کریں!"

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"اس لئے کہ آخرکار تمہیں اسی کمرے میں لانا ہے۔ یہاں کی ہر چیز بظاہر نفیس اور خوشنما ہے مگر اس کے پردے میں تشدد کی ایک نئی دنیا پوشیدہ ہے وہ نرم اور آرام دہ بستر میرے اشارے پر برقی کرسی جیسی چیز بن جاتی ہے۔ اس پر لیٹنے والے عموماً مرگی کے مریض بن کر اٹھتے ہیں!"

"میں جا رہا ہوں۔ سُور کے بچے! تم مجھے بلاوجہ خوف زدہ کرنا چاہتے ہو!" میں چیختا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

وہ سرد اور بے رحمانہ انداز میں ہنسا "یہ تہہ خانہ اور اس عمارت کے سارے کمرے ساؤنڈ پروف ہیں صفدر۔ میری مدد کے بغیر تم اس دروازے کو بھی نہ کھول سکو گے۔ یہ انڈین سیکرٹ سروس کا اہم ترین تجرباتی مرکز ہے یہاں آنے والے صرف میری مرضی پر عمل کر کے صحیح الدماغ رہ سکتے ہیں!"

میں نے تہہ خانے سے نکاسی کے دروازے پر خاصی زور آزمائی کی مگر اُس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔

"یہ فوٹو الیکٹرک کنٹرول کا کمال ہے!" اُس نے جیب سے پیتل کا ایک چمکدار چوکور ٹکڑا نکالا جس پر ڈھلائی میں باریک تحریر اُبھری ہوئی تھی۔ وہ ٹکڑا اُس نے دروازے میں بنے ہوئے پیتل کے فریم میں رکھا اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

"جلدی باہر نکلو!" وہ پیتل کا ٹکڑا اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "اسی سیکنڈ کے بعد یہ دروازہ پھر بند ہو جائے گا!"

میں تیزی سے دروازے کی دوسری طرف نکل گیا۔

"اب تمہیں اندازہ ہو چکا ہو گا کہ یہاں تم کس قدر مجبور اور محکوم ہو!" راستہ میں وہ بولا "میں سینکڑوں آنکھیں اور ہزاروں کان رکھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اپنی خوابگاہ میں گارڈ کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے تم نے ان سے اس عمارت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی ناکام کوشش کی تھی مگر یہ یاد رکھو کہ یہاں کوئی شخص ضرورت سے زیادہ نہیں جانتا!"

میں نے اس سے مزید اُلجھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور کمرے میں لوٹ آیا۔

اگلے تین روز وہاں غیر معمولی خاموشی اور سکون سے گزر گئے، مجھے کھانا وغیرہ وقت پر مل جاتا تھا۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ اس دوران میں بیدی مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

چوتھے روز صبح سویرے وہ میرے کمرے میں آ موجود ہوا اور سپاٹ لہجے میں بولا "آج تم رہا کئے جا رہے ہو، تمہارے زخم بھر چکے ہیں تھوڑی دیر بعد پٹیاں کھول دی جائیں گی!"

میں نے یہ خبر سخت حیرت کے ساتھ سُنی اور پوچھا "کیا پارس مل گیا؟"

"مل جائے گا" اُس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"سیتا کا کچھ پتہ چلا؟" اس کے لہجے نے میری بے چینی بڑھا دی!

"ہاں!" وہ مختصر سا جواب دے کر واپس جانے کے لئے پلٹ گیا۔

میں نے لپک کر سامنے سے اس کا راستہ روک لیا اور سخت لہجے میں پوچھا "کہاں ہے سیتا؟ مجھے بتاؤ ورنہ تم اس کمرے سے زندہ نہ جا سکو گے!"

"وہ چندی گڑھ کے نواح میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ پرسوں ہمارے آدمیوں نے اسے دیکھا تھا!"

"انھیں کیسے پتہ چلا کہ وہ سیتا ہی ہے؟" میں نے حیرت اور جوش سے مغلوب ہو کر اگلا سوال کیا۔

"وہ ملیں گے تو ان سے پوچھوں گا۔"

"تم جھوٹے ہو۔ بکواس کرتے ہو۔" میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "سیتا یہاں لائی جا چکی ہے، اس لئے تم مجھے اچانک رہا کر رہے ہو۔ وہ تمہارے ہاتھ آ گئی ہے اور اب تم اس پر تشدد کرو گے! میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

وہ ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی تھا۔ لہٰذا اس وقت پھر اس کا وہی ہاتھ چلا اور میری کنپٹی اس کی ضرب سے جھنجھنا اٹھی میں قالین پر لڑھک کر بے ہوش ہو گیا۔

میں کتنے عرصے بے ہوش رہا اس کا مجھے علم نہیں ویسے یہ مدت دس گھنٹے سے کسی طرح کم نہیں تھی کیونکہ میں صبح بے ہوش ہوا تھا اور جب دوبارہ حواس بحال ہوئے تو رات کے آٹھ کا عمل تھا۔

ہوش میں آنے کا پہلا سبب وہ گرم گرم لجلجا لمس تھا جو مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہا تھا حواس کی بحالی کے ساتھ ہی اس لمس میں حرارت آگیں سانسوں کا احساس بھی شامل ہو گیا میں نے کسلمندانہ انداز میں آنکھیں کھولنے اور پہلو میں اس وجود کو ٹٹولنے کی کوشش کی جس کے سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے تو بیک وقت دو انکشافات ہوئے۔ اول یہ کہ میں ننگی زمین پر پڑا ہوا تھا دوم یہ کہ اس وقت سردی خاصی شدید تھی۔

میں ہڑبڑا کر زمین سے اٹھا اور دفعتاً ایک ہلکی سی چیخ سے گونج اٹھی میرا منہ چاٹنے والا کتا مجھے بیدار ہوتا دیکھ کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

کافی دیر تک تو میری سمجھ ہی میں نہ آسکا کہ یہ سب کیا ہے اور میں کیونکر اس حال کو پہنچا مگر عناصر فطرت ایسے حالات میں انسان کی بڑی مدد کرتے ہیں۔ سردی کی شدت نے ذرا ہی دیر میں حواس معمول پر پہنچا دئے اور مجھے گزرے ہوئے واقعات یاد آ گئے۔

ڈان ہاؤس یا پی فورنامی اس عمارت سے کچی زمین پر پایا جانا اس امر کا کھلا ثبوت تھا کہ ڈاکٹر بیدی انتہائی کمینہ خصلت انسان تھا۔ اس کی یاد آتے ہی میں نے جلدی جلدی اپنی جیبوں کی تلاشی لی اور یہ معلوم کر کے خاصا اطمینان ہوا کہ پارس پتھر ابھی تک میری تحویل میں تھا۔

میرے بدن پر ابھی تک وہی کپڑے موجود تھے جو میں انبالہ جالندھر روڈ پر حادثہ کا شکار ہوتے وقت پہنے ہوئے تھا میں نے ڈان ہاؤس میں ان کپڑوں کو ایک بار دھویا ضرور تھا مگر اب وہ کچھ زیادہ صاف ستھرے نہیں رہ گئے تھے۔

پھر مجھے سیتا یاد آئی اور میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ انڈین سیکرٹ سروس اسے گرفتار کر چکی تھی اور اب وہ ڈان ہاؤس میں ڈاکٹر بیدی کے ستم کا نشانہ بن رہی ہوگی۔ ان لوگوں کو میرے اس بیان پر یقین آچکا تھا کہ پارس پتھر سیتا کے پاس ہے جب تک وہ ہاتھ نہ آئی میں ان کا قیدی بنا رہا خود جیالی نے مجھ سے ایک موقع پر کہا تھا کہ اپنے بیان کی تصدیق تک مجھے انڈین سیکرٹ سروس کا قیدی رہنا ہوگا، جب ہی سیتا کی گرفتاری کے بعد مجھے چھوڑ دیا گیا کیونکہ ان کی دانست میں میں ان کے لئے بے کار تھا۔

میں نے غول سے بچھڑے ہوئے وحشی کی طرح گرد و پیش کا جائزہ لیا وہاں ہر طرف ویرانی کا راج تھا تارکول کی سیاہ چمکیلی سڑک دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اطراف میں کھلا میدان تھا یا اکا دکا تناور درخت ایک طرف میدان سے بہت دور ننھے ننھے روشن نقطے جھلملا رہے تھے جن سے اس طرف آبادی کی موجودگی کا پتہ چل رہا تھا۔

میں کہاں اور کس شہر میں تھا، مجھے علم نہ تھا میں سخت جھلاہٹ اور بے بسی کے عالم میں اس ویران میدان میں ہو لیا جس کے اس پار آبادی نظر آ رہی تھی۔

میں جہاں بھی تھا اب مجھے جلد از جلد انبالہ پہنچنا تھا۔ نہ جانے یہ محض اتفاق تھا یا ان لوگوں کی سوچی سمجھی تدبیر کہ ڈان ہاؤس میں جاتے اور وہاں سے آتے ہوئے دونوں مرتبہ میں بے ہوش تھا اور اس عمارت کے محل وقوع سے باخبر نہ ہو سکا تھا۔ مگر مجھے امید تھی کہ اس جیسی ہیبت اور شوکت والی عمارت دور دور مشہور ہوگی۔ اس کا اصل نام تو پی فور تھا مگر ڈان ہاؤس کے حوالے سے انبالہ کا کوئی بھی رہنے والا مجھے وہاں پہنچا دیتا۔ پھر اس عمارت کے احاطہ کی دیوار غیر معمولی طور پر بلند تھی اور اس پر خاردار تاروں کی دوہری باڑھ بھی موجود تھی۔ ان نشانیوں کی بنا پر ایک چھوٹے شہر میں اس عمارت تک پہنچنا میرے لئے اتنا دشوار نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے میرا ذہن دکھنے لگا، چلتے چلتے قدم تھک گئے مگر وہ شیطانی روشنیاں اب بھی اسی فاصلہ پر تھیں جو میں نے ہوش میں آتے ہی دیکھا تھا۔ رات اندھیری اور راستہ نامانوس ہونے کے علاوہ غیر ہموار بھی تھا۔ میں گرتا پڑتا نصف شب کے لگ بھگ آبادی میں داخل ہو ہی گیا مگر اس وقت کسی کا ملنا محال تھا۔

میرے سامنے پہلا مسئلہ سردی سے بچاؤ اور شب بسری کا تھا گرمیاں ہوتیں تو کہیں بھی پڑ رہتا مگر اس رات تو یخ بستہ ہوائیں مجھے منجمد ہی کر دیتیں۔

پہلے میں نے کسی گھر میں کودنے اور چند گرم کپڑے چرانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہ کر سکا۔ سیکرٹ سروس سے ٹکراؤ کے بعد اپنی ذات پر میرا اعتماد ہل کر رہ گیا تھا اور میں یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ چوری جیسے حقیر جرم میں حوالات کی سیر کروں۔

آبادی میں گھومتے ہوئے اچانک میری نظر ایک دروازے پر جھولتے ہوئے ٹاٹ کے پردے پر پڑی اور بے اختیار میرے قدم اسی طرف بڑھ گئے۔

صفدر علی کو وقت کے بے رحم دھارے نے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ جیب میں پارس پتھر موجود ہونے کے باوجود وہ ٹاٹ کا پردہ چرانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پردہ چند کیلوں کے ذریعہ چوبی چوکھٹ میں ٹھکا ہوا تھا۔ دو تین محتاط جھٹکوں کے بعد ٹاٹ کا وہ پردہ صحیح سالم میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں اسے کمبل کی طرح اوڑھ کر ایک طرف ہو لیا۔

وہ رات میں نے ٹاٹ اوڑھ کر فٹ پاتھ پر کروٹیں بدلتے بسر کی اور قرب جوار میں زندگی کی نقل و حرکت محسوس کرتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

سورج طلوع ہونے تک مجھے مجبوراً وہ ٹاٹ اوڑھے رہنا پڑا اس کے بعد مجھے اپنے وہ چار لاکھ سے زائد روپے یاد آئے جو بے ایمان ڈاکٹر بیدی ہضم کر گیا تھا۔ وہ رقم پاس ہوتی تو بازار کھلتے ہی اپنے لئے کچھ گرم ملبوسات وغیرہ خرید سکتا تھا مگر اب تو مٹھی بھر چنوں سے آتش شکم سرد کرنے کی بھی استطاعت نہ تھی۔

بھکاریوں جیسے حلیے میں سونا بیچنے کی کوشش خطرناک تھی۔ لوہے کی کسی ہلکی پھلکی چیز کو پارس پتھر کے لمس سے سونے میں بدلنا آسان تھا اس سے آگے ہر کام مشکل تھا۔ اول تو سونے کا لین دین کرنے والے کسی ادارے کا پتہ چلانا محال تھا۔ پتہ چل بھی جاتا تو وہ یہی سمجھتے کہ چوری کا مال بیچ رہا ہوں جبکہ میں اب ذرا بھی خطرہ مول لینے کا یارا نہ تھا۔

میرے بدن پر بوسیدہ کپڑوں کے سوا کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے میں بیچ سکتا۔ اس نازک صورت حال میں اچانک میری نظر ناگ سے محروم چاندی کی انگوٹھی پر پڑی جو ہمالیہ کی ہولناک وادیوں میں سیتا کی معصوم ماں سندری نے مجھے تحفے میں دی تھی۔ اس میں جڑا ہوا نگ میری جیب میں تھا اور میں یہ انگوٹھی دس پانچ روپے میں بیچ سکتا تھا۔

چاندی کے ظروف بنانے والوں کے بازار میں چاندی کا لین دین کرنے والے کئی کیبن نظر آئے۔ میرا مدعا جان کر دوکاندار نے گہری ناقدانہ نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر اس کی نگاہیں میرے دھول میں اٹے ہوئے ننگے پیروں پر جم کر رہ گئیں۔

"یہ چوری کی نہیں ہے!" اس کی نگاہیں بھانپ کر میں جلدی سے بول پڑا۔ اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ "یہ دیکھو میری انگلی پر اس انگوٹھی کا نشان موجود ہے، مجبوریوں نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے ورنہ یہ انگوٹھی میرے لئے لاکھوں روپے میں بھی سستی تھی۔"

اس نے اظہار تاسف میں سر کو جنبش دی، انگوٹھی کا وزن کیا اور ستره روپے ساٹھ پیسے میری طرف بڑھا دئے۔

میں نے سب سے پہلے جھونپڑی میں قائم ایک گھٹیا سے ہوٹل میں خوب سیر ہو کر کھانا کھایا پھر پرانے کپڑوں کے بازار کی طرف چل دیا۔

اس روز پہلی مرتبہ مجھے تیزی سے بدلتے ہوئے فیشنوں کی افادیت کا اندازہ ہوا ورنہ بازار میں لاکھوں کی تعداد میں تقریباً نئے جیسے ملبوسات کے ڈھیر نظر نہ آتے جو بے شمار غریب لوگوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

اس بازار سے مجھے اپنے سائز کی قمیض پتلون بھی مل گئی اور سوئیٹر تو شاید میرے ہی لئے بنایا گیا تھا۔ اس خریداری کے بعد بھی میری جیب میں سوا تین روپے باقی بچے جن سے میں نے اسٹیل کی ایک چپل خرید لی۔ اور میں یوں اپنی حالت سدھارنے کے قابل ہو سکا۔

ایک باغ کے ویران سے گوشے میں میدان صاف دیکھ کر میں نے جلدی جلدی لباس بدل ڈالا۔ پرانی پتلون کی جیب سے پارس پتھر اور انشی پیسوں پر مشتمل کل پونجی نکالی اور باہر سڑک پر آ گیا۔

سڑکوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی جگہ لوگوں سے ڈان ہاؤس کا پتہ پوچھا لیکن ہر ایک نے لاعلمی کا ہی اظہار کیا۔ ایک شخص نے نہ جانے کیا سمجھ کر بگڑی ہوئی پنجابی میں داہنے بائیں اور سیدھے کی گردان کرتے ہوئے ایک راستہ بتا دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اسی راستہ پر ہو لیا۔ مگر بتائی ہوئی منزل پر پہنچ کر کھوپڑی بھنا گئی۔ وہاں میدان میں بہت سی چھولداریوں اور پنجروں میں جنگلی جانور بند تھے اور ایک طرف کپڑے کا بڑا سا بینر لگا ہوا تھا جس پر ڈابا سرکس کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ شاید وہ ڈان ہاؤس کو ڈابا سمجھا تھا۔

میرے پاؤں پر ایک مرتبہ پھر گردش سوار ہو چکی تھی۔ میں کبھی سیتا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور کبھی پارس پتھر کے ذریعہ کچھ رقم حاصل کرنے کے بارے میں منصوبہ بنا رہا تھا۔

اسی کوچہ نوردی کے دوران میری نگاہ ایک شخص پر پڑی جو کھڑکی بازار میں فٹ پاتھ کے سہارے آئینہ پر بھانت بھانت کی انگوٹھیاں لئے بیٹھا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے پاس پیتل کے علاوہ لوہے کی بھی انگوٹھیاں ہیں میں نے مختلف انگوٹھیوں کا جائزہ لینے کے بعد دام پوچھے تو اس نے ہر انگوٹھی کی قیمت دو روپے بتائی۔ ظاہر تھا کہ یہ خریداری میری گنجائش سے باہر تھی مگر میرے ذہن میں ایک زبردست تدبیر آ چکی تھی۔ اور میں اپنی کارگزاری آزمانے کے لئے بے چین تھا۔

مختلف انگوٹھیاں دیکھتے ہوئے میں نے لوہے کی ایک انگوٹھی پتلون کی بیلٹ میں اڑس لی اور ناپسندیدگی کا عذر کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ خوانچہ فروش سے دور نکل آنے کے بعد میں نے وہ انگوٹھی اسی انگلی میں پہن لی جس میں پہلے سندری کی دی ہوئی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔

انگوٹھی والا ہاتھ جیب میں ڈال کر میں کچھ دیر پارس پتھر کو انگوٹھی سے مس کرتا رہا پھر جب ہاتھ باہر نکالا تو یہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھل پڑا کہ میری انگلی میں طلائی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر چاندی والوں کے بازار میں جا نکلا اور کئی بار جائزہ لینے کے بعد ایک ایسی دوکان میں پہنچا جس کا مالک صورت ہی سے خدا ترس نظر آ رہا تھا۔

"کیا لینا ہے؟" اس نے گدی پر بیٹھے ہی بیٹھے سوال کیا۔

"بزرگوار لینا تو کچھ بھی نہیں بس مجبوری آپ کے پاس لے آئی۔ بات تو غیرت کی ہے مگر میرے حالات بہت خراب ہیں اور میں اپنے باپ کی یہ نشانی فروخت کرنا چاہتا ہوں!" میں نے لہجے میں درد اور مایوسی کا دریا سمیٹتے ہوئے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو سونے کی ہے!" دوکاندار انگوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"سونے ہی کی ہے اور میرے لئے جان سے زیادہ عزیز بھی،" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹا دس پانچ روپے لے لو، ان دھندوں سے ڈر لگتا ہے۔" وہ مجھے انگوٹھی لوٹاتے ہوئے بولا۔

"میں بہت تنگ دست ہوں مگر بے غیرت نہیں، دس پانچ ہی دے دیں میرے لئے تو اس انگوٹھی کے دس ہزار بھی کم ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ واپس

کر دیا۔

"یہ تمہاری ہی ہے؟" میری بات سُن کر بوڑھے نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں!" میں نے ایک بار پھر وہی انگلی آگے کر دی جس میں سندری کی نشانی مدّتوں پہنے رہا تھا۔ اس انگلی کی جڑ میں سفید حلقہ بہت نمایاں تھا۔

تھوڑی سی بحث کے بعد میں نے وہ انگوٹھی بیچ کر سات سو روپے کی رقم حاصل کر لی اور اپنی کامیابی پر نازاں دوکان سے باہر نکل آیا۔

تنگ دستی کا نازک مرحلہ نہایت خوبی سے طے ہو چکا تھا اور اب میں ڈاکٹر بیدی سے آخری ٹکراؤ کے لئے تیار تھا۔ میں گھومتا پھرتا شہر کے اس علاقہ میں جا پہنچا جہاں بڑے بڑے مکانات واقع تھے میں گھنٹوں اس علاقہ میں چکر لگاتا رہا، بے شمار لوگوں سے ڈان ہاؤس کا پتہ پوچھا مگر اس نام پر ہر ایک نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ انبالہ شہر میں وہ عمارت اتنی مشہور نہیں کہ جتنی میں اب تک سمجھتا چلا آیا تھا۔

اس مرتبہ میں پارس پتھر کے استعمال میں بہت محتاط تھا۔ چاہتا تو سونے کی بھاری مقدار تیار کر کے اونے پونے داموں میں بیچ دیتا اور لاکھوں کا مالک ہوتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس بار میری بے جگری اور خطرات سے کھیلنے والی فطرت میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی میں محتاط اقدامات کر رہا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ ڈاکٹر بیدی تھا۔ بظاہر اس کی باتیں بے تکی، گھٹیا اور بے مقصد معلوم ہوتی تھیں لیکن اس کا ہر لفظ میرے لاشعور سے چپک کر رہ گیا تھا اس نے اس قدر جارحانہ انداز میں میری توہین کی تھی کہ اب میں خود کو اندر سے کھوکھلا محسوس کر رہا تھا۔

میں نے انبالہ کے ایک سستے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا اور باری باری شہر کے مختلف حصوں میں گھومنے لگا لیکن مجھے کہیں بھی ایسی کوئی عمارت نظر نہ آ سکی جس کا احاطہ غیر معمولی طور پر بلند ہو یا اس دیوار پر خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہو۔

جائداد کے دلالوں، پوسٹ آفس، میونسپل کمیٹی۔ کوئی جگہ ایسی نہ رہی تھی جہاں سے میں نے ڈان ہاؤس کا پتہ معلوم نہ کیا ہو مگر مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ ہر نئی ناکامی کے بعد میری جھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

سیتا ڈاکٹر بیدی کی قیدی بن چکی تھی اور اسے چھڑائے بغیر میری زندگی بے مقصد تھی میں ساتویں روز سیدھا سٹی پولیس اسٹیشن جا پہنچا اور ہیڈ محرر سے اسٹیشن انچارج سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

انبالہ کی پولیس بھی سہل کوش اور سست تھی۔ کوتوالی میں کئی افراد کی جرح کے بعد بمشکل مجھے انچارج سے ملاقات کی اجازت ملی جو عہدہ کے اعتبار سے انسپکٹر تھا۔

"میرا نام صفدر علی ہے!" میں نے اس کے کمرے میں پہنچ کر کہا۔

میرا خیال تھا کہ یہ سنتے ہی اسے مفرور صفدر علی یاد آ جائے گا اور مجھے ہتھکڑیاں لگا دی جائیں گی مگر وہ لاتعلقانہ انداز میں میرا چہرہ تکتا رہا۔ "اس شہر میں کہیں انڈین سیکرٹ سروس کا دفتر ہے۔ وہ عمارت ڈان ہاؤس کہلاتی ہے۔ مجھے وہاں اپنے ایک پرانے دوست ڈاکٹر بیدی سے ملنا ہے۔"

وہ سیکرٹ سروس کے نام پر چونکا اور میرے خاموش ہونے پر بولا "سیکرٹ سروس؟ اس کا ہمیں کوئی پتہ نہیں۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

"بنارس سے۔" میں نے بے زاری کے ساتھ کہہ ڈالا۔

یہ سُن کر وہ پھڑکا اور حیرت سے بولا "صفدر علی بنارس والا!" یہ کہہ کر وہ ایک دراز میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ آخر کار ایک فائل اس کے ہاتھ نظر آئی۔ فائل کی ورق گردانی کرتے کرتے ایک جگہ وہ رُک گیا اور چند ثانیوں تک پڑھنے کے بعد فائل بند کر دی۔

"تم جاؤ جی! ہم کسی سیکرٹ سروس کو نہیں جانتے۔" فائل بند کر کے اس نے بے رُخی سے کہا۔

اس کا یہ رویّہ میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ صفدر علی اور بنارس کے حوالے پر وہ جس طرح چونکا اس سے ظاہر تھا کہ وہ میرے ماضی سے باخبر ہے پھر اس شہر میں کچھ ہی دن پہلے پولیس وسیع پیمانے پر میری تلاش میں مصروف رہی تھی، آخر فائل میں ایسی کیا بات تھی کہ اچانک ہی وہ میرے ماضی کو بھول کر مجھے کوتوالی سے بھگانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"میں وہی صفدر علی ہوں جس پر بنارس اور کانپور میں کئی آدمیوں کے خون کا الزام ہے۔" میں اپنی بے توقیری پر جھلا گیا اور کھل کر اپنی شخصیت کا اظہار کر بیٹھا۔

"ہمیں کچھ نہیں معلوم، چلو باہر جاؤ۔" وہ جلدی سے بولا۔

غصّے اور تجسّس نے اس وقت میری عقل ہی چوپٹ کر دی اور میں اس کے سر ہو گیا "تمھیں نہیں معلوم مگر میں بتا رہا ہوں کہ میں پولیس کا مفرور مجرم ہوں۔"

"تمھارا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔" وہ غرّایا "ابھی سیکرٹ سروس کا پتہ مانگ رہا تھا اور اب مفرور مجرم بن رہا ہے۔ شاید اخباروں میں تصویر چھپوانے کا شوق ہے تجھے!"

"دماغ تمھارا خراب ہے!" میں میز پر مکّہ مار کر دہاڑا "تم سب لوگ مجھے پاگل کرنا چاہتے ہو۔ میں باہر جا کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ میں قاتل ہوں مگر پولیس مجھے پہچاننے سے انکار کرتی ہے۔"

وہ تشویش زدہ نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر ٹیلی فون کا ہینڈ سیٹ اٹھاتے ہوئے بولا "تمھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم باہر رکو۔ میں ابھی بلاتا ہوں۔"

میں اس کے کمرے سے باہر آ گیا مگر ٹیلی فون پر اس انسپکٹر کی اونچی آواز مجھے وہاں بخوبی سُنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے افسر سے بات کر رہا تھا۔

"صاحب وہ بنارس والا خونی میرے پاس آ پہنچا ہے!"

"ہاں ہاں وہی اشتہاری مجرم صفدر علی!" مجھے انسپکٹر کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھی "کہتا ہے مجھے گرفتار کرو... میں نے وہی کیا صاحب مگر وہ باہر جا کر پولیس کے خلاف پروپیگنڈے کی دھمکی دے رہا ہے... پہلے تو وہ سیکرٹ سروس کے دفتر کا پتہ پوچھنے آیا تھا ڈان ہاؤس نام بتا رہا تھا... ہاں جی بات تو بہت خطرناک ہے... جی جی ہاں!"

اس کے بعد وہ بار بار جی، جی ہاں کرتا رہا۔ شاید دوسری جانب سے اسے ہدایات دی جا رہی تھیں۔

ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے مجھے اندر بلایا اور پوچھا۔ "تم اپنی گرفتاری چاہتے ہو یا ڈاکٹر بیدی کا پتہ؟"

"بیدی۔ مجھے اس کا پتہ چاہیے!"

"سیکرٹ سروس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "نہ ہم پورے شہر میں ڈان ہاؤس نام کی کسی عمارت سے واقف ہیں۔ تم سیدھے نئی دہلی چلے جاؤ، وزارتِ داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری گوپال صاحب تمھیں سب کچھ بتا دیں گے۔"

"اور اگر میں گرفتار ہونا چاہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم تمھیں گرفتار کر کے پاگل خانے بھجوا دیں گے۔" وہ بولا۔

"پاگل خانے؟" میں غرّایا۔

"ہاں۔ تم پاگل ہو۔ شہر میں تمھاری وجہ سے نقصِ امن کا خطرہ تھا۔ تم خود کو کبھی صفدر علی کہتے ہو کبھی صدر نکسن کا بھانجا بتاتے ہو۔" وہ بولا۔

اس کی بات پر میں دانت پیس کر رہ گیا! اس کا افسر واقعی ذہین آدمی تھا۔ شاید محکمۂ پولیس کو کہیں سے ہدایات مل چکی تھیں کہ صفدر علی کا قصہ بھلا دیا جائے لہٰذا میری فائل بند کی جا چکی تھی مگر میری دھمکی خطرناک تھی۔ میں شہر میں واقعی شور مچا دیتا کہ میں صفدر علی ہوں اور پولیس مجھے گرفتار نہیں کر رہی تو پھر اس کے علاوہ پولیس کے خلاف نفرت بھی پھیل جاتی۔ اس نے اپنی ساکھ بچانے اور اوپر کی ہدایات کی پابندی کرتے ہوئے بڑا اچھا راستہ نکالا تھا۔ مجھے پاگل قرار دے کر پولیس پاگل خانے پہنچا دیتی اور چند ہی دن میں میں وہاں واقعی پاگل ہو جاتا۔ کسی کو خبر تک نہ ہوتی کہ صفدر علی کون تھا اور کہاں گیا!

میں کوتوالی سے نکلا تو غصّے سے میرا دماغ کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر پورے شہر کو اپنے گرد جمع کروں اور انھیں بتاؤں کہ میں اس دور کا سب سے عظیم انسان ہوں۔ میں ایسے پتھر کا مالک ہوں جس کے مس سے لوہا سونے میں بدل جاتا ہے اور لوگوں کی نظریں میرے احترام میں جھکتی چلی جائیں۔ انھیں صحیح معنوں میں میری عظمت کا اندازہ ہو جائے۔

میں ان ہی خیالات میں غلطاں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں سیتا کا نام آیا۔ میں تیزی سے پلٹا تو دو آدمی گرد و پیش سے بے خبر باتیں کرتے چلے آ رہے تھے ان کے سوا دور تک کوئی نہ تھا۔ میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے اور وہ باتیں کرتے میرے قریب سے لاپروایانہ انداز میں گزر گئے۔

میں دبے قدموں ان کے پیچھے ہو لیا۔

"کب کی بات ہے؟" ان میں سے ایک پوچھ رہا تھا۔

"کل شام پکڑی گئی ہے۔ سُنا ہے دھوکے سے ہاتھ آئی ہے۔" دوسرا بولا۔

"اتنی بہادر لڑکی کو تو ضرور دیکھنا چاہیے۔ کیا نام بتایا ہے تم نے اس کا؟"

"سیتا!" یہ سُن کر میرا دل بے اختیار شدّت سے دھڑک اٹھا "اس کا ساتھی تو پہلے ہی پکڑا گیا تھا مگر پولیس نے یہ خبر دبا دی تھی۔"

"ہاں تمھارا بھانجا تو سول ہسپتال میں وارڈ بوائے ہے آپریشن کے وقت وہ وہیں پہچانا گیا تھا۔"

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں لپک کر ان دونوں کے برابر میں جا پہنچا۔

"کیا سیتا پکڑی گئی؟" میں نے ان سے پوچھا۔

ان دونوں نے حیرت اور ناپسندیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا، پھر ایک بولا "کون سیتا؟"

"وہی جس کی تم باتیں کر رہے تھے۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں وہ کل شام پکڑی گئی۔ سُنا ہے ڈان ہاؤس میں ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔

"ڈان ہاؤس؟" حیرت اور خوشی سے میرا ذہن فضا میں پرواز کرنے لگا "یہ کہاں ہے؟"

"بہت بڑی بلڈنگ ہے کہیں دیکھی تو ہے اس وقت یاد نہیں۔" پھر وہ اچانک مشتبہ نظروں سے مجھے گھورنے لگا "کیا سیتا تمھاری رشتہ دار ہے؟"

"ن... نہیں!" میں بوکھلا کر بولا "بس اسے دیکھنے کا شوق ہے۔"

"رہتے کہاں ہو؟" دوسرے نے سوال کیا۔

"راجہ ہوٹل میں!"

"او ہو ہم بھی تو اسی ہوٹل میں ہیں۔" وہ چونک کر بولا۔

"میں سولہ نمبر کمرہ میں ہوں، میرا نام دلپت رائے ہے، ڈان ہاؤس کا پتہ یاد آ جائے تو ذرا مجھے بتا دینا، بڑی مہربانی ہو گی۔"

"اچھا اچھا بتا دیں گے۔" پہلا میری مداخلت سے کچھ ناخوش نظر آ رہا تھا۔

"بھول نہ جانا بھائی۔" میں نے پھر تاکید کی "تمھارا کونسا کمرہ ہے؟"

"کمرہ نمبر دو!" وہ بولا "تم فکر نہ کرو ہم تمھیں وہاں پہنچا بھی دیں گے۔"

وہ مجھ سے جلد از جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"بہت بہت شکریہ!" میں نے جلدی سے کہا اور یہ سوچ کر ان سے الگ ہو گیا کہ بلاوجہ چپکے رہنے سے وہ ناراض نہ ہو جائیں۔ میں اس وقت تک وہیں کھڑا اُمید کے ان فرشتوں کو دیکھتا رہا جب تک وہ ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

میں ہوٹل واپس پہنچا تو میرا ذہن کافی ہلکا ہو چکا تھا۔ ان دونوں کا اتفاقی ٹکراؤ میرے لیے معجزہ سے کم نہیں تھا۔ اب میری یہی دُعا تھی کہ

انھیں جلد از جلد ڈان ہاؤس کا بھولا ہوا پتہ یاد آجائے تاکہ میں وہاں پہنچ کر ڈاکٹر بیدی سے انتقام لے سکوں۔ میری زندگی میں وہ پہلا اور شاید آخری شخص تھا جس نے مجھے بے پناہ ذہنی اذیت پہنچائی تھی۔

جب ذہن پر بار نہ ہو تو سوچنے کی قوت بھی تیز ہو جاتی ہے۔ ایک بات رہ رہ کر میرے ذہن میں چبھ رہی تھی کہ جب بیدی نے مجھے ناکارہ سمجھ کر اپنی قید سے ہاکر دیا تھا تو اب پولیس کو میری گرفتاری سے کیوں باز رکھا ہوا تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ شاید یہ پہلے کی ہدایت ہو جسے ابھی تک واپس نہ لیا گیا ہو مگر یہ دلیل بے وزن سی محسوس ہوئی۔ ڈان ہاؤس میں قید سے رہائی تک میں نے کسی بھی مرحلے پر سیکرٹ سروس والوں سے پارس پتھر کے بارے میں کوئی مصالحتی گفتگو نہیں کی تھی جس کی بنا پر وہ محکمۂ پولیس کو میری جانب سے چشم پوشی کے احکام جاری کراتے۔ یہ ہدایت یقیناً میری رہائی کے بعد جاری کی گئی تھی جس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر بیدی میرے ساتھ کوئی لمبی بازی کھیل رہا تھا جس میں اسے اپنی فتح کا یقین تھا۔

ان غیبی فرشتوں سے ملاقات کے بعد صورتِ حال فیصلہ کن موڑ لیتی نظر آ رہی تھی۔ ان حالات میں پارس پتھر کو ساتھ لیے پھرنا حماقت تھا۔ ہنگامہ آرائی میں وہ کہیں گم بھی ہو سکتا تھا یا میری شکست کی صورت میں بیدی کو میری لاش سے وہ پتھر حاصل ہو سکتا تھا۔ میں اس پتھر کو کھلے سمندر میں پھینک سکتا تھا مگر یہ گوارا نہ تھا کہ وہ بیدی یا اس کے ذریعے اس کے آقاؤں کی ملکیت بنے!

دوسری طرف اس شہر میں میرا نہ کوئی رازداں تھا نہ کوئی ٹھکانہ، میں پارس پتھر چھپاتا تو کہاں چھپاتا۔ ذہن پر زور دیتے دیتے میرے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ پارس پتھر چھپانے کے لیے ہوٹل کے اس کمرے سے بہتر جگہ کوئی نہ تھی۔

ہوٹلوں اور نچلے درجے کے ہوٹلوں میں واجبی سی اوپری صفائی پر توجہ دی جاتی ہے، اگر اس کمرے میں کوئی ناقابلِ رسائی جگہ میسر آ جاتی تو میں پارس وہاں چھپا سکتا تھا اور ڈاکٹر بیدی کے معرکے سے نمٹنے کے بعد بشرطِ زندگی اسے دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔

سب سے پہلے میری نظر نواڑ کی بنی ہوئی چارپائی پر گئی۔ نواڑ کی دوہری بُنائی کے درمیان وہ ننھا سا پتھر برسوں محفوظ رہ سکتا تھا مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ کسی ہنگامی ضرورت کے تحت وہ چارپائی کسی دوسرے کمرے میں بھی جا سکتی تھی اور مجھے پارس پتھر حاصل کرنے کے لیے راجہ ہوٹل کی تمام چارپائیاں چھاننی پڑتیں۔

کافی سوچ بچار اور تلاش کے بعد ایک تجویز میرے ذہن میں آ ہی گئی۔ میں کمرے سے نکلا اور کاؤنٹر سے چیونگم کا پیکٹ خرید کر واپس آ گیا۔ اپنی تجویز پر عمل کرنے کے لیے مجھے کھانے کا انتظار تھا۔

کھانا آیا تو میں نے بیرے سے چھری بھی منگوالی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی، کی ہول کے سامنے کرسی رکھ دی اور کھڑکی کا پردہ پوری طرح پھیلا دیا۔

پھر میں نے کمرے میں موجود دیوار گیر چوبی الماری کھولی اور اس کے سب سے اوپری خانے کی نچلی جڑ میں لگی ہوئی تختی میں چھری کی نوک سے [illegible] سوراخ کر دیا کہ پارس پتھر اس میں سما سکے۔ اس دوران میں میرے دانت چیونگم چبانے میں مصروف رہے۔

میں نے پارس پتھر اس میں ڈال کر اوپر سے چیونگم بھر دی پھر اس پر فرش کی مٹی لگا کر اسے لکڑی سے ہم رنگ کر دیا۔ اول تو وہ اوپری خانہ شاید ہی کوئی مسافر استعمال کرتا کیونکہ فرش پر کھڑے ہو کر اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر کوئی بالفرض کرسی وغیرہ پر کھڑا ہو بھی جاتا تو پارس کے چھپائے جانے کے بارے میں ذرا بھی شبہ نہ ہوتا۔ نہایت غور سے دیکھنے پر بھی یہی معلوم ہوتا کہ لکڑی کی سطح ہموار رکھنے کے لیے اس جگہ سفید بھر کر وارنش لگائی گئی ہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں سگریٹ پیتا ہوا باہر نکلا تاکہ کمرہ [illegible] میں رہنے والوں سے سلام دعا کر لوں۔ وہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔

"کھانے کے بعد ہم تمھاری طرف آنے والے تھے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" میں مسکرا کر بولا۔

"دراصل شہر میں ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ ہم کل صبح پٹیالہ [illegible] جا رہے ہیں۔ تم سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے سوچا کہ ڈان ہاؤس کا پتہ بتا دیں گے۔"

"پتہ یاد آ گیا تم کو؟" میں نے خوشی سے پوچھا۔

"ہاں۔ موہن پورہ میں ہے۔ یاد تو کیا خاک آتا دراصل شام کو ہم ادھر سے گزرے تو بورڈ نظر آ گیا۔"

"کیا بات ہے تمھیں لڑکی دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ عشق تو نہیں ہو گیا اس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر؟" دوسرے نے میری غیر معمولی دلچسپی پر تبصرہ کیا۔

"لڑکی ذات میں اتنا حوصلہ کبھی دیکھا نہ سنا، اسے ذرا قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔" میں نے بات بنانے کے لیے ہنس کر کہا۔

"قریب سے یا چھو کر!" وہ بولا اور دونوں ہی ہنس پڑے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔

میری خواہش تھی کہ ان کے جانے سے قبل ایک بار ان کے ہمراہ ڈان ہاؤس دیکھ لوں تاکہ بعد میں وہاں پہنچنے میں دشواری نہ ہو لیکن میری اس خواہش کا اظہار مجھے ان کی نظروں میں مشکوک بنا دیتا لہٰذا میں خاموش ہی رہا۔

"کرم علی سے تو ملنا ہی ہے۔ اسے بھی ساتھ لے لو، راستے میں ڈان ہاؤس دکھا دینا۔" کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایک نے کہا۔

"ہاں ہاں، ذرا ہوا خوری بھی ہو جائے گی۔" میں نے جلدی سے تائید کی۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد میں نے کمرے سے سوئٹر لیا اور ہم تینوں ہوٹل سے نکل آئے۔ میں نے ٹیکسی روکنی چاہی تو ان سے پتہ چلا کہ قریب ہی ان کی گاڑی موجود ہے۔ ہوٹل سے تھوڑی دور بہت پرانے ماڈل کی ایک سیاہ فورڈ پریفیکٹ کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک مجھے ساتھ لے کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا، دوسرا عقبی نشست پر قابض ہو گیا۔

وہ گاڑی نہایت خستہ حال تھی۔ تیسری کوشش میں وہ اسٹارٹ ہوئی تو آواز سے پتہ چلا کہ انجن اتنا ناکارہ نہیں جتنا گاڑی کے احوال سے معلوم ہوتا ہے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میں اپنی خوش بختی پر نازاں تھا کہ گو حفاظتی انتظامات کے باعث میرا ڈان ہاؤس میں گھسنا مشکل تھا مگر میں باہر رہ کر بھی بیدی کا انتظار کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی کی گھڑیاں اب جلد ہی پوری ہونے والی تھیں۔ وہ باہر نہ آتا تو میں ہفتہ وار رسد لانے والی گاڑی کے ذریعے بھی اندر گھس سکتا تھا۔ اندر گھس کر اسے ٹھکانے لگانے اور سیتا کو آزاد کرانے میں مجھے جو تسکین تھی وہ باہر بدلہ لینے میں ممکن نہیں تھی۔ بہتر تو یہی تھا کہ بیدی کو اسی صندوق میں بند کیا جاتا جس کے اندر ہر نصف گھنٹے بعد متضاد اور شدید موسمی کیفیات رونما ہوتی تھیں۔

میں ان ہی خیالات میں غلطاں تھا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ ایک [illegible] ویران سڑک پر دوڑ رہی تھی کہ اچانک میرے سر کے عقبی حصے پر کسی سخت چیز کی شدید ضرب لگی اور میں فوراً ہی حواس کھو بیٹھا۔ میرا ذہن تیزی کے ساتھ تاریکیوں کی دلدل میں گہرا ـــــ اور گہرا ڈوبتا جا رہا تھا۔

جانے کتنی دیر اور کتنی دور میرا بے ہوشی کا یہ سفر جاری رہا جب دوبارہ ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ مسہری پر پڑا ہوا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اگلے ہی لمحے میں میرے دل کی دھڑکنیں ڈوبنے لگیں۔ بی نوریا ڈان ہاؤس نامی اس زیرِ زمین کمرے میں ایک بار مجھے ڈاکٹر بیدی خود لا چکا تھا اور جس مسہری پر میں پڑا ہوا تھا اس کے بارے میں خود بیدی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے صرف ایک اشارے پر مسہری بجلی کے جھٹکے مارنے لگتی ہے اور اس سے اٹھنے والے ساری زندگی کے لیے مرگی کے مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔

میں بوکھلا کر مسہری سے نیچے کود گیا اور زمین سے قدم لگتے ہی میرے حلق سے بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں اور میں خود بخود بار بار فضا میں اچھلنے لگا۔ اس وقت مسہری محفوظ تھی مگر فرش میں بجلی دوڑ رہی تھی جس کے مسلسل جھٹکوں نے میرے اعصاب ہلا کر رکھ دیے تھے اور مجھے ڈر تھا کہ زیادہ دیر میں فرش پر کھڑا رہا تو کہیں میرے خون کی بیشتر مقدار برقی تحلیل کا شکار نہ ہو جائے۔ غیر ارادی چیخوں اور اچھل کود کے درمیان میں بمشکل تمام دوبارہ مسہری پر جا بیٹھا اور خوفزدہ نظروں سے فرش کو گھورنے لگا جہاں کنکریٹ کی پختہ اور چمکدار سطح پر کوئی برقی تار وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہاں برقی رو موجود تھی!

اس وقت میرے ذہن پر غصہ یا جھلاہٹ کے بجائے دہشت طاری تھی۔ بیدی میرے ساتھ نہ جانے کیا کھیل کھیل رہا تھا۔ ڈان ہاؤس سے ایک مرتبہ مجھے میری مرضی کے خلاف رہا کیا گیا مگر پھر حالات نے مجھے اس قدر مشتعل کر دیا کہ پورے انبالہ میں پاگلوں کی طرح اس عمارت کا پتہ تلاش کرتا رہا اور اسی دوران میں مجھے بے بس کر کے دوبارہ ڈان ہاؤس میں پہنچایا جا چکا تھا!

ڈان ہاؤس کے اس آسیب زدہ زیرِ زمین کمرے میں میں گھنٹوں تنہا پڑا رہا۔ میرا ایک ایک لمحہ سنسنی اور ہراس کی بے یقینی کیفیت میں گزر رہا تھا۔ مسہری کے خواص میں بیدی کی زبانی سن چکا تھا۔ فرش کا کربناک تجربہ مجھ پر گزر چکا تھا۔ اب نہ یہ ہمت تھی کہ دوبارہ نیچے اترنے کی کوشش کرتا نہ ہی مسہری پر پڑے رہنے کا حوصلہ تھا۔ نہ جانے وہ آرام دہ بستر کس لمحہ برقی جھٹکے مارنے شروع کر دیتا۔

کافی دیر بعد میرا مفلوج ذہن سوچ بچار کے قابل ہو سکا اور میں نے اپنی حالت پر غور کرنا شروع کر دیا۔ جن حالات میں مجھے دوبارہ ڈان ہاؤس پہنچایا گیا ان سے یہ بات تو صاف ظاہر تھی کہ مجھے کسی خاص مقصد کے تحت اس عمارت سے باہر نکالا گیا تھا اور کھلی فضا میں ہر لمحہ میری نگرانی کی جاتی رہی۔ شاید ڈاکٹر بیدی کو شبہ تھا کہ میں سیتا کے ٹھکانے سے واقف ہوں یا میں نے پارس پتھر کسی خفیہ ٹھکانے پر چھپایا ہوا ہے۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی اندازہ درست ہوتا تو میں ڈان ہاؤس سے رہائی پاتے ہی سیتا کے پاس دوڑا جاتا یا پھر خفیہ ٹھکانے سے پارس پتھر حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور یوں میرے تعاقب میں لگے ہوئے انڈین سیکرٹ سروس کے کتے سیتا یا پارس تک رسائی حاصل کر لیتے۔

میں جتنا غور کرتا رہا میرا یہ نظریہ اسی قدر پختہ ہوتا گیا۔ ڈان ہاؤس سے غیر متوقع رہائی کے وقت مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید انھوں نے سیتا کو پکڑ لیا ہے اور اب مجھے ناکارہ سمجھ کر رہا کر رہے ہیں۔ کمبخت بیدی نے بھی اپنے مبہم رویے سے میرے اس شبہ کو تقویت دی تھی اور میں رہائی پانے کے بعد بھی پاگلوں کی طرح ڈان ہاؤس کی کھوج میں پھرتا رہا تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی سیتا کو ڈاکٹر بیدی کے ظلم و ستم سے نجات دلا سکوں مگر یہ میری کھلی بے وقوفی تھی۔

اگر سیتا ان کے ہاتھ آ ہی گئی ہوتی تو انھیں اس سے معلوم ہو جاتا کہ پارس اس کے پاس نہیں ہے اور وہ مجھے رہا کرنے کے بجائے مجھ پر تشدد کا فوری آغاز کرا دیتے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ لوگ ابھی تک بالکل تاریکی میں تھے اور انھوں نے مجھے چارہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

رہا ہونے کے بعد یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے پارس کو لاپروایانہ انداز میں استعمال نہیں کیا بلکہ بے سر و سامانی کے عالم ہی میں وقت کاٹتا رہا۔ دوسری طرف میں ڈان ہاؤس کی کھوج میں لگا رہا اور جب انھیں یہ علم ہوا کہ میرا ذہن مایوسی کی آخری سرحدوں کو چھو رہا ہے اور میں نے کوتوالی پہنچ کر اپنی گرفتاری پر اصرار کیا ہے تو انھوں نے واپس بلانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اگر میں واقعی شور مچا دیتا کہ میں وہی صفدر علی ہوں جس پر سیتا کے قتل کی متعدد

وارداتوں کی ذمہ داری عائد کی جاتی رہی ہے اور اب پولیس مجھے گرفتار کرنے پر آمادہ نہیں تو نہ صرف رائے عامہ پولیس کے خلاف ہو جاتی بلکہ دو سرکاری محکموں کے درمیان بھی تلخیاں جنم لے لیتیں کیونکہ اتنا تو صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ میرے معاملے میں پولیس حکام کے اختیارات سیکرٹ سروس والوں نے محدود کر دیئے تھے!

یہ سوچتے سوچتے اچانک مجھے مسہری کا خیال آ گیا۔ اگر وہ مسہری برقی جھٹکے مارتی تھی تو اس میں کسی نہ کسی جگہ برقی تار آنے ضروری تھے۔ اگر میں اُن کا سُراغ لگا کر انھیں نوچ ڈالتا تو مسہری بے ضرر ہو جاتی اور میں اُس پر آرام سے سو سکتا تھا!

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے احتیاط کے ساتھ سفید چادر ایک طرف اُلٹ دی۔ چادر کے نیچے اسی رنگ کے کپڑے سے منڈھا ہوا اسپرنگوں والا گدا بچھا ہوا تھا۔ میں نے پوری احتیاط کے ساتھ گدے کا ایک حصہ اُٹھایا تو اس کے نیچے مسہری کا آہنی ڈھانچہ اور جال نظر آیا۔ میں غور سے دیکھنے کے باوجود کہیں بھی برقی تاروں کی موجودگی کا سُراغ نہ لگا سکا۔ میں نے باری باری گدے کے مختلف کونے اٹھا کر مسہری چھان ماری۔ مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی البتہ ایک غیر معمولی بات میرے مشاہدے میں آئی

مسہری کے چاروں پائے فرش میں دفن تھے آہنی نہیں بلکہ گول آہنی پایوں پر ربر کا خول چڑھا کر انھیں فرش میں دبایا گیا تھا کہ فرش میں دوڑنے والی ... رو مسہری میں سرایت نہ کر سکے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی کھوکھلے پائے میں سے زیر زمین برقی تار خفیہ طریقہ سے گزار کر مسہری کے ڈھانچے سے منسلک کئے گئے ہیں ... اُن کو نہ چھیڑتے۔ ڈاکٹر بیدی کے ان شیطانی تہہ خانے کا پورا انتظام اتنا مربوط اور مضبوط تھا کہ اُسے نقصان پہنچانا مشکل تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ مجھے اس کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔

مسہری کا بستر درست کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں نے اسکول میں کسی مرحلے پر پڑھا تھا کہ برقی رو خشک لکڑی، ربر اور کپڑے وغیرہ میں سے نہیں گزر سکتی۔ اسی وجہ سے برقی ترسیل کے نظام پر کام کرنے والا عملہ لکڑی کی سیڑھیاں استعمال کرتا ہے۔ کمرے میں کہیں بھی لکڑی تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا میں نے بستر کی چادر اُٹھائی اور اُس میں سے دو بڑے بڑے ٹکڑے پھاڑ لئے۔ انھیں پیروں پر باندھ کر میں کسی بھی خطرے کے بغیر فرش پر چل پھر سکتا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ پچھلی مرتبہ ڈاکٹر بیدی نے کسی خاص تدبیر کے بغیر اس کمرے کا دروازہ کھولا اور بند کیا تھا اگر اس وقت بھی وہ کمرہ غیر مقفل تھا تو میں اُسے کھول کر راہداری میں کسی جگہ چھپ سکتا تھا اور جیسے ہی بیدی یا کوئی اور شخص میری زد پر آتا میں اسے بے بس کر کے بیتل کا وہ چوکور ٹکڑا حاصل کر سکتا تھا جس کے بغیر تہہ خانے سے نکاسی کا دروازہ کھولنا ناممکن تھا۔ میں ایک بار تہہ خانے سے نکل جاتا تو میری آزادی کے امکانات روشن تھے!

میں نے بہت احتیاط کے ساتھ چادر سے پھاڑے ہوئے ٹکڑے پیروں پر باندھے اور دونوں پیر مسہری سے نیچے لٹکا لئے۔ میں نے آخری بار اپنا حافظہ ٹٹولا اور مجھے یاد آیا کہ سوت میں سے بجلی نہیں گزر سکتی بشرطیکہ وہ خشک ہو۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ جوں ہی فرش پر قدم رکھے ... منہ کے بل فرش پر آ رہا۔ برقی جھٹکوں اور میری غیر ارادی چیخوں کا تسلسل بار بار کمرے میں گونجنے لگا۔ نہ جانے فرش میں کیسی برقی رو ... کے ٹکراؤں سے بھی نہ رک سکی تھی۔

میں کئی بار گرنے اور سنبھلنے کے بعد بمشکل مسہری پر چڑھ ... میرے پورے بدن میں تشنج کی سی کیفیت طاری تھی:

اس بار مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دروازہ بے آواز ... تھا مگر تہہ خانے کی راہداری سے ہلکی سی آہٹ کی آواز اُبھری ... ادھر متوجہ ہوا تو ادھ کھلے دروازے میں ڈاکٹر بیدی کا ستا ہوا ... چہرہ نظر آیا۔ سرد اور دھنسی ہوئی ویران آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں ... مگر پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر ذہن للکارتی ہوئی مسکراہٹ ... جو خاص خاص مواقع پر نظر آتی تھی!

”ولد الحرام کمینے!“ اُسے دیکھتے ہی بے اختیار میری زبان چل پڑی۔

”مسلمان تو اپنے من جانب قد کی سلامتی کے ساتھ ملاقاتی کا استقبال ...“

اُس نے سرد اور سپاٹ آواز میں طنز کیا۔

”تمہارے خون میں یقیناً کسی بھیڑیے ......“

”شٹ اپ!“ وہ پہلی بار غضبناک لہجے میں جھنکارا ... ”اگر میری ذات پر کوئی ایسا ذلیل تبصرہ کیا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہارا ... مسخ کر دوں گا!“

اپنا مسخ شدہ کان درست کر لو پھر میرا شجرہ بگاڑنا ... زبان ... تک تو میں نے حوصلے سے کام لیا مگر اُس کی عجیب دھمکی پر میرا دل کانپ ...

”کان کھول کر سُن لو“ وہ اسی لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور ... بولا ”سیتا کی عزت اب تمہاری زبان سے وابستہ ہے۔ اگر تم نے اپنا ... حرامی کہا تو سیتا کے بطن سے میرے بچے پیدا ہوں گے جو تمہیں باپ کہہ کر ...“

میرے پورے وجود میں انگارے دہک اٹھے۔ نفرت، حقارت اور ... کا ایک آتش فشاں میرے وجود میں جاگ اٹھا مگر میں نے اس بات کو ... نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اس وقت حالات میرے خلاف تھے ...

چند سیکنڈ تک کمرے میں بوجھل سا سکوت چھایا رہا جسے بیدی نے توڑا۔ ”اوہ تم نے بھاگ نکلنے کے سارے ہی جتن آزما ڈالے!“

اُس کی نظریں میرے پیروں پر جمی ہوئی تھیں جن پر اب چادر کے پھٹے ہوئے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”اس کمرے میں تمہیں کوئی ایسی چیز نہ مل سکے گی جو غیر موصل ہو ... بنا ہر کپڑے سے بنی ہوئی نظر آنے والی یہ چادر اور گدے کا غلاف بھی ... کیمیائی ریشوں سے بنایا گیا ہے جن میں سے برقی رو گزر سکتی ہے۔ یہ میرا ... تہہ خانہ ہے، کسی جاہل کا زندان نہیں!“

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”چند سوالوں کے صحیح ترین جوابات!“

”کیا پچھلی بازپرس ناکافی تھی؟“

”اس ملاقات کا تعلق کچھ نئے واقعات سے ہے!“ وہ لاپروایانہ انداز میں بولا۔ میں نے غور سے دیکھا کہ اس کے پیروں میں ربر سول جوتے تھے

اس کمرے میں وہ کھلا شیر تھا اور میں دست و پا بریدہ قیدی!

”سیتا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سوالات کا حق صرف مجھے ہے!“ اُس نے گھورتے ہوئے کہا اور دیے ٹھہر کر دریافت کیا۔ ”پارس پتھر کہاں ہے؟“

”سیتا کے پاس!“

”یہ بکواس ہے!“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا ”اگر تم نے وہ پارس پتھر ہمارے حوالے کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تو اس بار میں اپنے طریقوں سے تمہاری زبان کھلواؤں گا“

”اگر تم نے سچ کو جھوٹ سمجھنے کا تہیہ کر رکھا ہے تو میں مجبور ہوں۔“

”تم ڈان ہاؤس سے تن کے کپڑوں کے ساتھ نکالے گئے تھے۔ پھر تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی جس کے ذریعہ تم راجہ ہوٹل کے اخراجات اٹھا رہے تھے؟“

”میں نے چاندی کی انگوٹھی فروخت کی تھی“ میں نے سکون کے ساتھ جواب دیا۔ ”وہی انگوٹھی جس میں کبھی پارس پتھر کا نگ جڑا ہوا تھا۔“

”وہ تم نے صرف سترہ روپے ساٹھ پیسے میں فروخت کی تھی“ اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”یہ نہ بھولو کہ ڈان ہاؤس سے نکلنے کے بعد تمہاری ہر ایک مصروفیت میری نظر میں رہی ہے!“

میں نے اپنے دل کی رفتار کچھ سُست پڑتی محسوس کی۔ ”میں نے ایک دوکان سے کچھ رقم چوری کی تھی ورنہ ایک رات میں نے چرایا ہوا ٹاٹ کا پردہ ... فٹ پاتھ پر لپیٹ کر بسر کی تھی!“

”یہ نہ بھولو صفدر کہ میں تمہاری فطرت جان چکا ہوں۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، میری اطلاعات اس بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ تم اول درجے کے ہٹ دھرم اور ضدی انسان ہو مگر یہ یاد رکھو کہ تمہاری اس بار کی ہٹ دھرمی تمہیں ساری عمر دکھ دیتی رہے گی!“

”جب تمہیں سب کچھ معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”تصدیق۔ صرف تصدیق!“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”اب سنو کہ تم نے چاندی کی انگوٹھی بیچنے کے بعد پُرانے کپڑوں کے بازار سے کپڑے خریدے، ایک عدد چپل خریدی جس کے بعد تمہاری جیب میں صرف اسّی پیسے بچے ہوں گے۔ پھر فٹ پاتھ پر المونیم اور لوہے کی انگوٹھیاں بیچنے والے کے پاس رُکے وہاں تم نے کوئی خریداری نہیں کی مگر بعد میں میرے آدمی کے کہنے پر اس خوانچہ فروش نے انگوٹھیاں گننے کے بعد انکشاف کیا کہ کوئی اُس کی ایک انگوٹھی اڑا لے گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے وہاں سے آہنی انگوٹھی چرائی ہو گی۔ چوری کا سبب بھی واضح ہے۔ تمہارے پاس کل پونجی اسّی پیسے پر مشتمل تھی اور انگوٹھی کے دام دو روپے تھے۔ پھر تم چاندی کا کاروبار کرنے والوں کے علاقے میں گئے اور تم نے نہایت مکاری کے ساتھ مدن سنز کے بوڑھے مالک کے ہاتھ سونے کی ایک انگوٹھی فروخت کی۔ اس بوڑھے نے چند ہی دھمکیوں میں سب کچھ اُگل دیا اور انگوٹھی بھی میرے حوالے کر دی۔ اس انگوٹھی کی ساخت بالکل وہی ہے جو خوانچہ فروش کی آہنی انگوٹھیوں کی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ تم نے لوہے کی انگوٹھی چرائی اُسے سونے میں تبدیل کیا اور انگوٹھی بیچ کر سات سو گیارہ روپے حاصل کر لئے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر پارس پتھر سیتا کے پاس ہے تو لوہے کی انگوٹھی چند لمحوں میں طلائی کیسے بن گئی؟“

جتنی دیر وہ بولتا رہا میں تیزی کے ساتھ سوچتا رہا اور اُس کے خاموش ہوتے ہی مسکرا کر اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”بعض اوقات تقدیر بڑی ستم ظریفی دکھاتی ہے ڈاکٹر بیدی! حالات کے پیش نظر تمہارے شبہات بجا ہیں مگر یہ سب اتفاقات تھے، خوفناک اتفاقات: بات صرف اتنی ہے کہ میں نے بازار سے جو پرانے کپڑے خریدے اُن میں پتلون کی ایک جیب سے وہ انگوٹھی ملی تھی جسے میں نے بیچ دیا۔ خوانچہ فروش کے پاس میں محض اس لئے رکا تھا کہ سیتا کی ماں کی دی ہوئی نقرئی انگوٹھی بیچ دینے کے بعد مجھے اپنی خالی انگلی بُری لگ رہی تھی۔ میرا ضمیر مجھے سنگدلی کا مجرم قرار دے رہا تھا اور میں اس احساس کے ازالہ کے لئے اس خالی انگلی میں کوئی سستی سی انگوٹھی پہننا چاہتا تھا جو اس خوانچہ پر نہ مل سکی۔“

”تم ایک جھوٹ چھپانے کے لئے مسلسل جھوٹ بولے جا رہے ہو!“ اُس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں مان ہی نہیں سکتا کہ ایک پرانی پتلون کی جیب سے کوئی طلائی انگوٹھی نکل سکتی ہے!“

”اس لئے کہ تم نے کبھی پُرانے کپڑے استعمال نہیں کئے، جن کا گزر اسی اُترن پر ہوتا ہے ذرا اُن سے پوچھو وہ لوگ ہر خریدے ہوئے کپڑے کی جیبیں بڑی اُمید سے ٹٹولتے ہیں اور انگوٹھی تو کیا یہ حقیقت ہے، بعض اوقات ان کپڑوں میں سے بیش قیمت زیورات، بٹن اور کرنسی تک برآمد ہوتی ہے!“

”ہو سکتا ہے!“ وہ جلدی سے بولا ”مگر میں نہیں مان سکتا کہ ایک ہی شخص کے ساتھ بیک وقت کئی کئی اتفاقات یکجا ہو سکتے ہیں!“

”اسی لئے میں نے انھیں خوفناک اتفاقات کہا ہے ڈاکٹر!“

”اس کہانی سے میں نہیں بہل سکتا“ اس کا سرد لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ”مجھے صرف اور صرف پارس چاہیئے ورنہ تم اسی تہہ خانے میں سسکتی ہوئی زندگی گزار دو گے!“

”شاید سیتا تمہارے ہاتھ نہیں آ سکی“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر شوشہ چھوڑا۔ ”وہ پکڑی جاتی تو میں تمہاری عنایات سے بچ سکتا تھا!“

”جلد یا بدیر وہ بھی اسی جگہ ہو گی“ ڈاکٹر بیدی کا لہجہ شکست کی تلخی لئے ہوئے تھا۔ ”وہ ابھی تک چندی گڑھ ہی میں پھنسی ہوئی ہے، مشکل یہ ہے

کہ وہ ویرانہ چھوڑ کر آبادی میں جا گھسی ہے!"

"مجھے اُمید ہے کہ تمہارے آدمی اُسے کوئی گزند پہنچائے بغیر گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"وہ خود مشکلات کو دعوت دے رہی ہے، پچھلے منگل کو اُسے گھیر لیا گیا تھا مگر وہ ہتھیار ڈالنے کے بجائے مقابلے پر اُتر آئی۔ ہمارا ایک مخبر مارا گیا اور دو افسر زخمی ہو گئے، وہ خود بھی صحیح سلامت نہ نکل سکی، میرے آدمیوں کی رپورٹ ہے کہ اُس کا ایک شانہ زخمی کر دیا گیا ہے!"

"یہ بہت بُرا ہوا۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "اگر میں جلدی گڑھ جا سکوں تو اُسے سمجھا کر آؤں گا۔ ڈاکٹر اُسے نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے!"

"پارس پتھر میرے حوالے کر دو، ہم اسے بالکل بھول جائیں گے!" ڈاکٹر بیدی کا لہجہ مصالحت سے یکسر عاری تھا۔

"کوئی ایسی شرط پیش کرو جس پر میرا اختیار ہو۔"

"تمہیں فیصلہ کرنے کے لئے صرف دو گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں اس کے بعد اپنی کارروائی کا آغاز کر دوں گا!" یہ کہہ کر بیدی کمرے سے نکل گیا۔

بازی لمحہ بہ لمحہ میرے ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھی۔ بیدی کی زبانی میں نے جو کچھ سُنا وہ حوصلہ افزا ضرور تھا مگر ایک بے یار و مددگار لڑکی کب تک اُن کے چنگل سے بچی رہ سکتی تھی۔ سیتا کے بارے میں اُن لوگوں کو مطلع کرنے کا ایک مقصد تو حل ہو چکا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ آزاد اور بخیریت ہے مگر دوسرا مقصد حاصل ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ بآسانی سیتا کو پکڑ کر ڈان ہاؤس لے آئیں گے مگر سیتا اُن کے لئے لقمہ تر بننے کو تیار نہ تھی۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں اس معرکہ آرائی کے نتیجے میں سیتا کو ناقابلِ تلافی جسمانی گزند نہ پہنچ جائے۔

اس وقت پارس پتھر راجہ ہوٹل کے ایک بعید از قیاس گوشہ میں محفوظ ضرور تھا مگر مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میں کب تک اس بارے میں اپنی زبان بند رکھ سکوں گا۔ تشدد کے نتیجے میں انسان اپنے اعصاب اور عضلات پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ ایسی صورت میں اُس کی زبان سے وہی بات نکلتی ہے جو سچ ہو۔ اس جانگسل معرکہ میں بس بیدی ہی کے الفاظ مجھے اُمید کی روشنی دکھا رہے تھے۔

ڈان ہاؤس میں پچھلی قید کے دوران اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اُس کے ساتھ مخلص نہیں ہوں، پارس جہاں بھی ہے میری پہنچ میں ہے جب تک میرے ساتھ رویّہ نرم رکھا جائے گا میں مکاری اور مدافعت پر تُلا رہوں گا۔ اُس کے تجربے کے مطابق مجھ جیسے مکار اور خود غرض لوگ لاکھوں میں چند ہی ہوا کرتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ میرے بارے میں بیدی کا یہ فیصلہ درست ثابت ہو اور میں اُس کے تشدد کو جھیل سکوں۔

اس کمرے میں وقت کا کوئی احساس نہیں تھا جب بیدی دو آدمیوں کے ساتھ وہاں آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پچھلی ملاقات کو دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔

اُس کے ساتھ آنے والے دونوں افراد ہسپتال کے عملہ جیسے سفید کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں وزنی چرمی بیگ لٹک رہا تھا۔

"تمہارا فیصلہ کیا رہا؟" بیدی نے آتے ہی سوال کیا۔

"سچ کے بعد مزید سچ بولنا ناممکن ہے!" میں اب بدترین حال کے مقابلے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

بیدی نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے سیاہ بیگ کھول کر اس میں سے موٹی سی سرنج اور ایک شیشی نکالی۔ شیشی کا سیال سرنج میں منتقل کیا اور میری طرف آ گئے۔

اس وقت مجھ پر نہ جانے کیسی تنویمی کیفیت طاری ہو گئی، میں نے شدید مزاحمت نہیں کی اور انھوں نے سرنج کا سارا سیال بازو میں اُتار دیا۔ درد کی لہر ایک ٹھوس سلاخ کی صورت میں میں پیوست ہوتی چلی گئی!

"میری مہارت اور تمہاری قوتِ ارادی کی جنگ شروع ہو صفدر علی!" ڈاکٹر بیدی کی آواز مجھے بہت دور کسی گہرے کنویں سُنائی دی!

میں نے جواب دینا چاہا مگر میری زبان بھاری اور خشک ہو میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا اور تیزی کے ساتھ میری ہر حس معطل چلی گئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں اس تابوت نما صندوق کا قیدی تھا میں ہلنے جلنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ بیدی مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا صندوق کے دونوں پہلوؤں اور پیندے میں تانبے کی نلیاں لگی ہیں جن میں حسبِ مرضی وہ بھاپ یا نمک کا یخ بستہ محلول گزار سکتا تھا کا ڈھکن بند تھا۔ چہرے کے سامنے سوراخ دار شیشہ یا پلاسٹک کا ٹکڑا تھا۔ میرے ہاتھ پیر صندوق میں نصب کنڈوں میں پھنسے ہوئے تھے میں دیکھ تو نہ سکتا تھا لیکن محسوس بخوبی کر رہا تھا۔

"ہوش میں آ گئے صفدر!" میرے کانوں کے قریب بیدی کی گونجی اور میں چونک پڑا۔ اسی کے ساتھ بیدی دوبارہ بولا "ڈرو نہیں دونوں کانوں کے قریب صندوق میں اسپیکر لگے ہوئے ہیں جو میری تم تک پہنچا رہے ہیں۔ صندوق میں ایک حساس مائکروفون بھی ہے جو ہر آواز مجھ تک پہنچائے گا!"

اسی کے ساتھ بتدریج صندوق کا درجۂ حرارت بڑھنے لگا نے بے چینی سے اپنا سر گھمایا۔ مگر بیدی مجھے نظر نہ آ سکا۔

ابتدا میں حرارت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ پھر اچانک یوں ہوا جیسے مجھے کسی کٹھالی میں بند کر کے بھٹی میں جھونک دیا گیا ہو کے سارے مساموں کے دہانے کھُل گئے۔ پہلے لباس پسینوں میں تر ہوا بہتی ہوئی لکیریں پھریریوں کا باعث بننے لگیں۔ میرے لئے وہ صندوق بنا ہوا تھا۔ حرارت ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے اپنا سر اور کولہے پشت صندوق کی سطح سے اُٹھائی تاکہ اذیت کا احساس کچھ کم ہو سکے۔ بے سود! ان کوششوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ تپش کے باعث میرے بدن

یا آبلے پڑنے لگے ہیں جو حرکت کرنے سے پھوٹ رہے ہیں۔ میرے ہونٹوں بے اختیار کراہیں نکلنے لگیں۔ ذہن میں اس کے بعد والے مرحلے نے سر اُبھارا دی کتنی ہی شدید ہو، اس عذاب سے یقیناً بہتر ہوگی۔ ٹھنڈ کا تصور ہی اس ت راحت آفریں تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچ لئے اور پوری ت سے انھیں کاٹنے لگا۔ یہ زخم شاید گرمی کی طرف سے میری توجہ ہٹا سکتے تھے! تھوڑی ہی دیر میں پسینے کی صورت میں میرے بدن سے پانی کی اری مقدار خارج ہو گئی تھی! ادھر پیاس کے باعث حلق میں کانٹے پڑ رہے ے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کی بے بسی اور مجبوری کا اس سے زیادہ روح منظر میں نے کبھی نہ دیکھا تھا نہ سُنا!

میں جانکنی کے عالم میں کراہ رہا تھا، مچل رہا تھا۔ میرا رواں ں دعا مانگ رہا تھا کہ مصیبت کا یہ دور جلد ختم ہو کہ اچانک مجھے اپنے دہانہ نمی کا احساس ہوا جیسے میں نے بے تابانہ انداز میں اپنے خشک حلق میں سمیٹ ا۔ اس گاڑھے اور گرم سیال کی نمکین سی نمی حلق میں پہنچی تو مجھے اندازہ ہوا انتوں سے دبا دبا کر میں اپنے ہونٹ زخمی کر چکا ہوں جن سے خون بہہ رہا ہے۔ قیامت سے طویل لمحے گزرنے کا نام ہی نہ لیتے تھے، وقت کی رفتار تھم کر ئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ آج یہی تپش مجھے اس صندوق میں جلا کر بھسم کر دے گی ری ساری توانائی تیزی کے ساتھ زائل ہوتی جا رہی تھی اور میں نڈھال ا زمیں کراہ رہا تھا

اچانک اس صندوق میں تپش کم ہونے لگی۔ راحت کا ایک قابل احساس میرے اعصاب میں سرایت کرنے لگا۔ میں نے جلتی ہوئی غنودہ آنکھیں ل دیں۔ حرارت تیزی کے ساتھ اپنی شدت کھوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ لمحہ ی آیا جب صندوق میں تازگی بخش خنکی پھیل گئی۔ میں نے چند گہرے رے سانس لئے اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیا مگر یہ سرور پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ ردی کی لہر ہر احساس پر بُری طرح حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ میرے نتھنوں ں کچھ تحریک سی ہوئی۔ پھر چھینکوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ کہر کی صورت ٹھنڈ قطۂ انجماد تک پہنچ رہی تھی۔ میرے نتھنوں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا ٹھنڈ میرے تمام جوڑوں میں اُترتی جا رہی تھی۔ پھر میرے دانت آواز بجنے لگے۔ میرے حلق سے ڈری ڈری بے ہنگم آوازیں بھی خارج ہو رہی تھیں میں نے پوری قوت صرف کر کے اپنا بدن گٹھڑی کی صورت میں سمیٹنا چاہا میری کوشش بُری طرح ناکام رہا اور میرا پورا بدن بُری طرح کانپنے لگا۔

"میں کچھ نہیں جانتا، میں کچھ نہیں جانتا، مجھے چھوڑ دو!" میں دانت چیخ کر ہذیانی انداز میں پوری قوت سے چیخا۔

میرے کانوں کے قریب بے رحمانہ ہنسی کی آواز اُبھری پھر بیدی کے الفاظ سُنائی دیئے "تم سب جانتے ہو صفدر علی! تمہاری زبان سے سچ سننا میرا فرض ہی نہیں رہا، یہ میری آرزو بن گئی ہے۔ ابھی تمہاری قوتِ ارادی باقی ہے۔ تھوڑی دیر میں تمہاری اعصابی قوت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور تم کسی ننھے سے بچے کی طرح بلک بلک کر مجھے سب کچھ بتا دو گے۔"

میں تیزی سے اپنے اعصاب پر گرفت کھوتا جا رہا تھا۔ "نمونیہ، لقوہ، گٹھیا یا یہ سارے مرض اکٹھے لے کر ہی تم اس صندوق سے نکلو گے ورنہ سچ بتا دو، سچ اور صرف سچ ہی اس وقت تمہیں بچا سکتا ہے..."

میرے دماغ کی کوئی رگ پھڑکی بیدی ماہرِ نفسیات تھا، وہ میرے احساسات جگا رہا تھا۔ مجھے مصائب کی دہشت میں مبتلا کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، کیوں نہ اپنے احساسات مٹا دوں۔ گرمی، سردی، سچ اور جھوٹ یہ سب شعور کے کھیل تھے میں نے اپنا لرزتا ہوا سر اُوپر اُٹھایا اور پوری قوت سے صندوق کے فرش پر دے مارا۔ میرے حلق سے گھگھیائی ہوئی چیخ بلند ہوئی، آنکھوں کے سامنے چند ثانیوں کے لئے رنگین کہکشاں رقصاں ہوئی اور میں ہر احساس سے بے نیاز ہو گیا!

اس مرتبہ ہوش آیا تو مجھے صندوق سے اسی عمارت کی ایک آرام دہ خوابگاہ میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ میرا پُورا بدن بخار میں جل رہا تھا۔ رُواں رواں پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میرے بدن پر کئی کمبل پڑے ہوئے تھے مگر پھر بھی سردی لگ رہی تھی اور دانت بج رہے تھے!

شاید میری آوازوں سے اسے پتہ چلا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں ڈاکٹر بیدی فوراً ہی میرے سرہانے آ پہنچا۔ "میں تمہاری جان کا دشمن نہیں ہوں صفدر! اب جلدی سے بھی بتا دو کہ وہ سوراخ کہاں ہے!"

"کیسا سوراخ، میرا سارا بدن دُکھ رہا ہے!" میں کراہتے ہوئے بولا۔

"ابھی میں نے تمہارا علاج شروع نہیں کیا ہے۔" وہ خبیث بولا۔ "جلدی سے اپنی ادھوری کہانی پوری کرو تاکہ میں تمہاری دیکھ بھال شروع کر سکوں۔"

"کونسی کہانی؟ کیسی کہانی؟ پتہ نہیں تم کیا بک رہے ہو!" میں نے بے زاری کے عالم میں یہ کہتے ہوئے اپنا چہرہ کمبلوں میں چھپا لیا۔

"بے ہوشی کے عالم میں تم بتا چکے ہو کہ تم نے پارس ایک سوراخ میں چھپایا ہے۔" بیدی کی سرد اور ظالمانہ آواز گونجی۔ "اب اس کا پتہ بھی بتا دو!"

یہ انکشاف میرے لئے شدید صدمے کا باعث بنا۔ چند ثانیوں کے لئے میں اپنا سارا دکھ بھول گیا۔ میرا خیال تھا کہ شدید مصائب اور بخار نے میرا دماغ ماؤف کر دیا ہے مگر اُسی لمحہ مجھے ایک ایسا اچھوتا خیال سوجھا کہ میرا یہ اندیشہ باطل ہو گیا۔

میں نے اپنا سر لحاف سے نکالا اور کمزور آواز میں بولا۔ "میں نے سیتا کے داہنے سینڈل کی ایڑی میں سوراخ کر کے اُسی میں پارس چھپایا تھا۔ پارس کے نیچے سریش بھر دیا تھا!"

"وہ سینڈل کہاں ہے؟"

"وہی تو سیتا ساتھ لے گئی ہے۔" میں درد کی ٹیسوں میں کراہتے ہوئے بولا۔ "پارس کو جہنم میں ڈالو، تم میرا علاج کرو!"

"سیتا! پھر وہی سیتا!" ڈاکٹر بیدی کی جھلائی ہوئی آواز اُبھری۔ "اس لڑکی کو پکڑے بغیر کوئی کام سیدھا ہوتا نظر نہیں آتا!"

بیدی کو میری بات پر یقین آ گیا اور اسی لمحہ میرا علاج شروع کر دیا گیا۔ بیدی کو فریب دے کر میری زخمی انا شیر ہو چکی تھی۔ اُس کی لاتعداد ہی بازپرس کا اختتام ایک ایسا انعام تھا جس کے سامنے تہ خانے کی ساری اذیتیں بچوں کا کھیل محسوس ہونے لگی تھیں۔ اس مردود نے ایذا رسانی کی مہم کے دوران اسے اپنی مہارت اور میری قوت ارادی کی جنگ قرار دیا تھا اور میں یہ جنگ جیت چکا تھا۔ اُس کا بدترین حربہ بھی میری زبان نہ کھلوا سکا تھا۔

ڈان ہاؤس میں ڈاکٹر بیدی دو ہفتے تک میرا علاج کرتا رہا۔ ہر تکلیف میں نمایاں افاقہ ہوا تھا مگر میرے گھٹنوں میں درد ایسا رچا تھا کہ جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ڈاکٹر بیدی نے دبے لفظوں میں شبہ ظاہر کیا تھا کہ شاید یہ درد میرے لئے زندگی بھر کا روگ بن کر رہ جائے گا!

گو بیدی کو میری بات پر یقین آ گیا تھا مگر اُس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ سیتا کی گرفتاری اور پارس پتھر کے حصول تک مجھے اُس کا قیدی رہنا ہوگا!

تیسرے ہفتے میرے گھٹنوں کا درد کم ہونا شروع ہوا۔ بیدی کے نزدیک یہ تبدیلی معجزے سے کم نہ تھی۔ اُس نے میرے لئے روزانہ ایک گھنٹے کی چہل قدمی تجویز کر دی۔ سورج طلوع ہونے کے بعد اُس کی تیز روشنی میں ایک آدمی بلاناغہ روزانہ میرے گھٹنوں پر روغن زیتون کی مالش کرتا۔ پھر میں اُس کے سہارے سبزہ زار پر ٹہلتا رہتا۔

میری طرف سے بیدی کا دل صاف ہو چکا تھا مگر میرے دل میں اس کی طرف سے بغض پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ اکثر میرے پاس آ جاتا اور میں اُس کی موجودگی میں ہر لمحہ یہی سوچتا رہتا کہ کس طرح اس سے اپنا انتقام لوں۔ ساتھ اُس نے جو سلوک کیا میرے نزدیک وہ قابل معافی تھا کیونکہ ... اپنے دام میں آئے ہوئے حریف سے بدترین سلوک ہی کرتا ہے۔ اس ... کی اصل وجہ اس کی وہ قسم تھی جو ایک بار اُس نے میری زبان بند کرانے ... کے بارے میں کھائی تھی۔ مجھے جب بھی اُس کے الفاظ یاد آتے دوران ... کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگتا۔

مجھے ڈان ہاؤس میں دوبارہ آئے ایک مہینے کا عرصہ گزر چکا ... کو سیتا کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا مگر اسے یقین تھا کہ سیتا جلد ... ہے۔ اُس کے آدمیوں سے بچ کر چند دن گرا ہوا ہے چوہے کا بچہ ... نکل نہیں ... مگر میں سیتا سے بخوبی واقف تھا۔ جنگلوں اور پہاڑوں پر چڑھنے کے باعث اُس میں کچھ حیرت انگیز قدرتی صلاحیتیں تھیں۔ ... کسی مورچہ میں چھپے رہنے پر کھلی فضا میں لڑ کر مر جانا پسند کرتی۔ وہ ... بیدی کے کتوں کو جُل دے کر نکل گئی تھی اور بیدی نے اُس کی گرفتاری ... خوش فہمی میں مجھے قیدی بنایا ہوا تھا۔

صورتِ حال کا یہ جمود میرے لئے اکتاہٹ کا باعث بنا ... ڈان ہاؤس میں سڑتے رہنا میرے لئے قابلِ قبول نہیں تھا۔ لہٰذا ... فیصلہ کیا کہ کسی طرح بیدی کا اعتماد جیت لوں تاکہ کسی مرحلے پر اُس کے ساتھ ... اُٹھا کر باہر نکل سکوں۔

ایک شام بیدی میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ... پی رہے تھے۔ ان دنوں بیدی مجھ پر کچھ اتنا ہی مہربان تھا کہ کبھی کبھار ... میں بھی شریک کر لیتا تھا۔

"ڈاکٹر! اس بار مجھے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟" ... اُس نے پوچھا۔

"اٹھائیس دن۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"اگر سیتا برسوں ہاتھ نہ آئی تو کیا میں یوں ہی پڑا رہوں گا؟"

ڈاکٹر بیدی نے بُرا سا منہ بنایا۔ سیتا کا نام اُس کی کمزوری ...

"یہ اوپر والوں کا حکم ہے میری دانست میں تو تمہارا مصرف ختم ...

"میں اُسے جانتا ہوں، وہ اب تک نہ جانے کہاں پہنچ چکی ہو ...

نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم ... کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟" ...

پیچ کر تلخ لہجے میں بولا۔

"یہ بہت ضروری ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "آخر تم کو ... ملے گا؟"

"پارس! پارس! پارس!" وہ میز پر مسلسل مکے مارتے ...

"تم پارس چاہتے ہو یا سونا؟"

اُس نے مجھے یوں گھورا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ... لا پروایانہ انداز میں بولا۔ "ایک ہی بات ہے!"

"نہیں! بہت فرق ہے دونوں باتوں میں!" میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "جہاں تک مجھے علم ہے میری حکومت کو پارس پتھر سے اس کی روایتی اہمیت کی وجہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اُس کے سرد اور سپاٹ چہرے پر اُلجھن کے تاثرات عود کر آئے تھے۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے شراب کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "افراطِ زر، خسارے کی تجارت اور عالمی کساد بازاری کے اس دور میں صرف سونا ہی ہماری معاشی دشواریوں کا واحد حل ہے۔ فرد اور حکومت، دونوں کے مسائل کا ایک ہی حل سونا ہے!"

"مجھے معاشیات سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اس وقت خوش نصیبی سے پارس پتھر ہند میں موجود ہے اور میری حکومت ہر قیمت پر اُسے حاصل کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔"

"تاکہ دنیا کو اس معجزہ نگار پتھر کی موجودگی کی خبر دیئے بغیر خاموشی سے اپنے سونے کے ذخائر میں اضافہ کر سکے!" میں نے کہا۔

"سامنے کی بات ہے۔"

"اس سلسلے میں میں تم سے تعاون کر سکتا ہوں!" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"وہ کیسے؟" ڈاکٹر بیدی نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم کو سیتا کا ٹھکانا معلوم ہے؟"

"سیتا اور پارس کو بھول جاؤ ڈاکٹر!" میں نے آگے جھک کر کہا۔ "پارس قدرت کی چیز ہے، وہ ڈھونڈے بغیر اچانک مجھے مل گیا تھا اور اسی طرح چھن بھی گیا۔ میرا اصل پیشہ کیمیاگری ہے۔ میں جڑی بوٹیوں کے ذریعہ سونا بنا سکتا ہوں!"

"پارس کے بغیر؟" اُس کے منہ سے حیرت میں ڈوبی تیز سرگوشی اُبھری۔

"ہاں۔ اس خونی پتھر کے بغیر!" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تانبہ، پارہ، آگ، تیزاب اور کچھ جڑی بوٹیاں درکار ہوں گی!"

"مجھے یہ خبر ہیڈ کوارٹر پہنچانی چاہیئے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "وہ لوگ ... انتظار کرتے کرتے اکتا چکے ہیں۔"

"ایک بات بتا دوں۔" میں نے اس سے کہا۔ "میرا بنایا ہوا سونا اسی وقت کارآمد ہوگا جب اُس میں ہم وزن اصلی سونا ملایا جائے۔"

اس رات ہم دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور ایک موقع پر بیدی کی زبان سے ایسی بات نکل گئی جس سے مجھے پتہ چلا کہ ڈان ہاؤس ابھی وہ عمارت انبالہ میں نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں اس وقت کسی نامعلوم مقام پر قید تھا اور اس عمارت کا محلِ وقوع راز میں رکھنے کی خاطر پہلی بار انھوں نے مجھے انبالہ میں ڈالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں انبالہ کا چپہ چپہ چھاننے کے باوجود بلند فصیل اور خاردار تاروں کی باڑھ والی کوئی عمارت تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ڈان ہاؤس میں غیر معمولی چہل پہل شروع ہو گئی مجھے بھی خلافِ معمول بیدار کر دیا گیا، ڈاکٹر بیدی کا کہیں پتہ نہیں تھا جو میں اُس سے کچھ معلومات حاصل کرتا!

نو بجے فضا میں کسی بھاری ہیلی کاپٹر کے انجن اور پنکھوں کا تیز شور سنائی دیا۔ میں برآمدے میں آیا تو بری فوج کے نشانات والا ایک بھاری ہیلی کاپٹر ڈان ہاؤس پر نیچی پرواز کرتا آہستہ آہستہ مشرق کی طرف جا رہا تھا۔

اس کے نصف گھنٹہ بعد ڈان ہاؤس کی رکھوالی کرنے والے کتوں کے نگہبان مصروف نظر آئے۔ کتوں کو پھاٹک سے دور ہٹا کر بند عارضی جنگلے لگا دیئے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈان ہاؤس میں کچھ لوگ آنے والے تھے!

اسی دوران بیدی میری تلاش میں آیا۔ "تم اپنے ہی کمرے میں رہو، ضرورت پڑنے پر میں تمہیں کانفرنس روم میں بلواؤں گا، تم تیار رہنا۔"

وہ مجھے تقریباً دھکیلتا ہوا خوابگاہ میں لے گیا اور جاتے ہوئے باہر سے دروازہ بند کر دیا!

میں بستر پر دراز سگریٹ پیتا رہا۔ مجھے اُمید تھی کہ نئی حکمت عملی کے ذریعہ میں جلد ہی اس عمارت سے نجات حاصل کر لوں گا۔

تقریباً گیارہ بجے خوابگاہ کا دروازہ کھولا گیا۔ آنے والا ڈاکٹر بیدی ہی تھا۔

"دارالحکومت سے اعلیٰ اختیاراتی ٹیم آئی ہے، وہ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" اُس نے پُرجوش لہجے میں بتایا

"اسی کیمیاگری کے چکر میں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ تارا پور نیوکلیر پروجیکٹ کے مشیر ڈاکٹر رامانند بھی آئے ہیں!"

"یہ کس قسم کے ڈاکٹر ہیں؟" میں نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے سوال کیا۔

"صفِ اوّل کے ایٹمی سائنسداں ہیں۔ جوہری طبیعات میں اُن کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے!" ڈاکٹر بیدی شاید آنے والوں میں ڈاکٹر رامانند ہی سے متاثر تھا!

"یہ مجھ سے مل کر کیا کریں گے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ آنے والوں میں وزارتِ خزانہ کے سکریٹری، اسٹیٹ بنک آف انڈیا کے گورنر اور جسپال صاحب شامل ہیں۔"

ڈان ہاؤس کا کانفرنس رُوم مختصر لیکن انتہائی عالیشان تھا۔ ڈاکٹر بیدی مجھے دروازے پر ہی چھوڑ کر لوٹ گیا اور سیکرٹ سروس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل نے بڑے تپاک کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ میں دُوسرے افراد کی وجہ سے کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ جسپال نے باری باری اُن سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر رامانند انتہائی ضعیف شخص تھا مگر موٹے موٹے عدسوں کے پیچھے اُس کی آنکھیں زندگی کی جوت سے روشن تھیں۔ یشونت راؤ وزارتِ خزانہ کا سکریٹری تھا ادھیڑ عمر اور مکّار آدمی تھا۔ گورنر کا نام جے۔ سی کھنہ تھا۔ اس کھیڑ میں وہی قدرے معقول نظر آتا تھا۔

"ہم لوگ تمہارے منصوبے کی تفصیلات جاننے کے لئے آئے ہیں!" چند منٹ کی رسمی گفتگو کے بعد جسپال نے مجھے مخاطب کیا۔

"پارس پتھر کی وجہ سے بڑی حد تک مجھے قیدِ تنہائی میں رہنا پڑ رہا ہے۔ میں اس تنہائی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں نے بیدی کو بتایا تھا کہ میں پارس کے بغیر بھی سونا تیار کر سکتا ہوں!"

"سونا — ! تیار کر سکتا ہوں!" رامانند نے چونک کر تیز آواز میں دہرایا۔ "برخوردار کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" شاید اُس نے میری پوری بات نہیں سُنی تھی ورنہ اچھل پڑا ہوتا۔

"میری بات بہت سادہ اور آسان ہے ڈاکٹر صاحب!" میں نے احترام آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تانبہ اور پارہ سے سونا تیار کر سکتا ہوں مگر اُس میں صرف ایک کسر رہ جاتی ہے۔ میرا بنایا ہوا سونا ہر اعتبار سے مکمل ہوتا ہے۔ رنگ، خواص اور کثافت کی بنیاد پر کوئی شُبہ نہیں کر سکتا۔ مگر اُس میں اصل سونے کے مقابلے میں قدرے سختی رہ جاتی ہے جو کسوٹی پر پکڑی جاتی ہے۔ میں ایک تجربہ کر چکا ہوں۔ اگر میرے بنائے ہوئے سونے میں برابر کی مقدار میں اصلی سونا ملا دیا جائے تو اُس کی شناخت ناممکن ہو کر رہ جاتی ہے!"

"تم کس طرح یہ سونا تیار کرتے ہو؟" رامانند کے چہرے پر بے اعتباری نمایاں تھی۔

"کیمیا!" میں نے آہستہ سے کہا اور اسی کے ساتھ مجھے لیاقت آباد والے سنیاسی کے الفاظ یاد آئے اور میں نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کیمیا دھاتوں کا آواگون ہے ڈاکٹر صاحب! آپ سائنس کے آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات آپ کو عجیب لگے مگر میرا تجربہ ہے کہ سونا تیار کرنا ناممکن نہیں"

"ناممکن۔ برخوردار بالکل ناممکن ہے۔" رامانند جوشیلے لہجے

"اگر تم سائنس کی ابجد سے بھی واقف ہو تو ضرور جانتے ہوگے کہ ہر عنصر کے ایٹم کی ماہیئت جُدا ہوتی ہے۔ ایٹم اور نیوکلس کی ساخت بدلے بغیر ایک عنصر کو دوسرے میں بدلنے کا تصور ہی احمقانہ ہے!"

"میری علمی استعداد تو اتنی نہیں کہ آپ سے بحث کر سکوں۔ میں آپ کو اپنا بنایا ہوا سونا پرکھنے کی دعوت دیتا ہوں!" میں نے انکساری

"جڑی بوٹیوں اور آگ کے سہارے ایسی تبدیلی لانے کا دعوے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔" بوڑھے رامانند کے خرانٹ چہرے پر اور نمایاں ہوگئی۔ "یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے اور روسات ہوتے ہیں۔ برخوردار تم تو سائنس کی بنیادیں ہلا دینا کر رہے ہو۔ یہ بھٹیوں اور جڑی بوٹیوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لئے کروڑوں مالیت کے ری ایکٹر درکار ہوتے ہیں جو حساس ترین آلات کے ذریعہ کنٹرول ہوتے ہیں۔ سونا بنانا کبھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہا گیا ہے مگر وہ اصل سونے سے کئی گنا قیمتی ہے۔ یہ منصوبہ ابتدا ہی میں دم توڑ چکا ہے!"

"میں کوئی دعویٰ نہیں کر رہا۔ مگر میری پیشکش اسی قدر تو میں اس سے دستبردار ہوتا ہوں!"

"اوہو۔ یوں دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" بوڑھا میرے قریب اُٹھ آیا۔ "ہو سکتا ہے سونے کے رنگ کی کوئی مرکب دھات ہو۔ میں ہمیشہ تجربات کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ہوں۔ تم وہ مرکب تیار کرو تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا بنایا ہے!"

"اب میں ایک بات اور پوچھوں گا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کیا؟"

"کیا محض پتھر کے لمس سے لوہے کو سونے میں تبدیل کرنا" میں نے پوچھا۔ جسپال کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ یشونت راؤ کھنہ حیرت سے یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔

بوڑھا اندر سے ہنسا۔ "شاید تم پارس پتھر کی بات کر رہے ہو۔ میں اس کی کہانیاں میں نے بھی پڑھی ہیں مگر یہ ان کاہلوں کی اختراع جو محنت کئے بغیر پلک جھپکتے میں کروڑپتی بننے کا خواب دیکھا کرتے!"

"اور اگر میں کہوں کہ چند دن پہلے تک پارس پتھر میرے میں نے اُس سے خاصی مقدار میں سونا تیار کیا اور کھلے بازار میں کیا تھا!"

"میں اسے تمہارا دماغی خلل کہوں گا۔" رامانند نے میز پر جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

میں اُسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ میرا دماغی خلل نہیں بلکہ پارس وجہ سے میں سیکرٹ سروس کا قیدی ہوں اور اُس کی حکومت اپنے

کے ذریعہ پارس حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے مگر جسپال کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

"ڈاکٹر صاحب میرا خیال ہے کہ صفدر کو اپنی دریافت آپ کے تجربہ کی پر آزمانے کا موقع دینے میں کوئی حرج نہیں۔" جسپال نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ یہ پیشکش تو میں خود کر چکا ہوں۔" بڈھا فضا میں ہاتھ لہرانے کے بعد بے زاری سے بولا

"تمہارے اس تجربے پر کتنی لاگت آئے گی؟" وزارتِ خزانہ کے سکریٹری یشونت راؤ نے پہلی بار زبان کھولی۔

"چند ہزار روپے!" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"بجٹ بہت معمولی ہے!" یشونت راؤ نے کھنہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اتنی رقم تو ہر وقت دی جا سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی بڑا منصوبہ ہوگا۔"

"تمہیں اس دھات کی تیاری میں کتنا عرصہ لگے گا؟" رامانند نے سوال کیا۔

"اگر آج سامان مل جائے تو شاید تین دن کافی ہوں گے!" میں نے دیا۔

"ٹھیک ہے۔" رامانند یشونت راؤ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ تین چار دن تو میں اسی جزیرے پر گزاروں گا۔ میرا داماد یہاں نیول بیس پر مامور ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" یشونت راؤ نے کہا۔

میں نے گھور کر جسپال کی طرف دیکھا۔ چند دن پیشتر مجھے بیدی سے معلوم ہو چکا تھا کہ ڈان ہاؤس انبالہ میں نہیں ہے۔ مگر جسپال نے شروع سے مجھے اس غلط فہمی میں مبتلا رکھا تھا اور اب ڈاکٹر رامانند کسی جزیرہ بات کر رہا تھا۔

اس مرحلے پر جسپال نے مجھے کانفرنس رُوم سے باہر بھیج دیا۔ بیرونی نظارگاہ میں ڈاکٹر بیدی بے چینی کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر رہائشی کمرے کی طرف چل دیا۔

"یہ کون سا جزیرہ ہے؟" کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے بیدی سے پہلا سوال کیا۔

"جزیرہ!" میرے سوال پر وہ بُری طرح چونکا تھا۔

"ہاں۔ جب میں نے تمہیں ایک دوستانہ پیشکش کی ہے تو میرے ساتھ تمہارا پُراسرار رویّہ مناسب نہیں ہے!" میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"اگاٹی۔ اس جزیرے کا نام اگاٹی ہے۔" بیدی خفت آمیز لہجے میں بولا "تم اس وقت ہند کے جنوب مغربی سمندر میں موجود ہو!"

"یعنی جزائر مالدیپ کے آس پاس؟" میں نے پوچھا اور بیدی نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

سیکرٹ شروع ہی سے میرے ساتھ بہت بڑا کھیل کھیل رہی تھی۔ انبالہ کے گرد و نواح میں سینکڑوں میل دُور تک بھی سمندر کا نام و نشان نہیں تھا جب کہ پہلی گرفتاری کے موقع پر جسپال نے مجھے یہی تاثر دیا تھا کہ ڈان ہاؤس انبالہ میں ہے۔ ان لوگوں نے مجھے طیارہ کے ذریعہ کبھی انبالہ سے اس جزیرے پر منتقل کیا تو یہ سفر کسی طرح چار پانچ گھنٹوں سے کم نہیں تھا۔ پھر طیارہ وغیرہ کا انتظام بھی فوری طور پر ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈان ہاؤس میں ہر آمد و رفت کے موقع پر ان لوگوں نے میرے حافظے سے کئی گھنٹوں کی وہ مدت بُھلائی ہوئی تھی۔ یک بیک مجھے احساس ہوا کہ اپنی تمام حاضر دماغی کے باوجود ان لوگوں کے سامنے میں بالکل بے حیثیت ہوں!

میری اس وقت تک کی زندگی مجرمانہ سرگرمیوں تک محدود رہی تھی۔ اگر میں اپنی ذات کے ساتھ جانب داری سے کام لوں تو مہم جوئی بھی میرے مشاغل میں شامل تھی۔ مگر سیاست اور فوجی مسائل یقینی طور پر میری دلچسپیوں کے زمرے سے خارج تھے۔ جزیرے کے تذکرے پر مجھے اتنا ضرور یاد آیا کہ ہند میں سیتا کے ساتھ روپوشی کے دوران میں بلاناغہ مقامی اخبارات کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ میرا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اپنے اور سیتا کے بارے میں رائے عامہ اور سرکاری مہم کا اندازہ کر سکوں۔ ان ہی دنوں میں نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ ہند سرکار اپنے علاقائی سمندروں میں اپنی قوت مستحکم کر رہی ہے تاکہ ساحل سے دُور جزائر سے بڑی طاقتوں کے بحری بیڑوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکے۔ شاید مجھے حفاظت اور رازداری کے خیال سے ایسے ہی کسی جزیرے پر لایا گیا تھا۔

میں ان ہی خیالات میں کھویا رہا۔ بیدی نے واپس جا کر ایک خدمتگار کے ذریعہ مجھے ڈمپل کی ایک سربند بوتل بھجوا دی۔ میری طرف سے شبہات دُور ہو جانے کے بعد اُس کا رویّہ بہت معقول ہو گیا تھا مگر میری نظروں میں اس کا مقام بلند نہ ہو سکا تھا۔

کافی دیر بعد جسپال میرے پاس آیا۔ "تمہیں رامانند سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔" اُس نے آتے ہی کہا۔ "ابھی اس سے تمہاری ملاقاتیں اور ہوں گی اس کا کام صرف اتنا ہے کہ تمہارے بنائے ہوئے سونے کا معیار جانچ سکے۔"

"وہ تو تجربے کو جھٹلاتا ہے، کہیں پارس پتھر کی کارگزاری دیکھ لیتا تو پاگل ہی ہو جاتا۔" میں نے کہا

"ہند میں اُس کے پایہ کا دوسرا آدمی نہیں۔ دنیا کے چند گنے چنے سائنسدانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور وہ اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس بھی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ سنکی بوڑھا تمہارے ساتھ زیادہ وقت نہ گزارنے پائے!"

"میرے کام کا آغاز کب ہوگا؟"

"آج" اُس نے اٹل لہجے میں کہا "تم سامان بتاؤ!"

میں نے احتیاط کے ساتھ اپنے بازو پر بندھا ہوا تعویذ کھولا جو ابھی تک سیکرٹ سروس والوں کی نظرِ کرم سے بچا ہوا تھا۔ جسپال نے حیرت سے مجھے تعویذ ادھیڑ کر کاغذ کا وہ مڑا تڑا پُرزہ کھولتے دیکھا جس پر نسخۂ کیمیا درج تھا۔

میں نے نہایت تفصیل کے ساتھ اُسے ہر چیز کی مقدار لکھوا دی بھٹی اور کٹھالیوں وغیرہ کے بارے میں بھی ہدایات دے دیں۔

"فہرست خاصی طویل ہے۔" جسپال کاغذ پر ایک نظر دوڑاتے ہوئے

بولا" کھٹی وغیرہ لگنے میں بھی وقت صرف ہوگا۔ تم کل شام سے پہلے کام کا آغاز نہ کر سکو گے!"

"ہاں چند تولہ تیزابی سونا اور نمک شورہ کا تیزاب بھی درکار ہوگا" میں نے بتایا۔

"سونے کا کیا ہوگا؟" جسپال نے پوچھا۔

"میں اپنے تیار کئے ہوئے سونے اور اصل سونے کی ملاوٹ والا نمونہ بھی ساتھ ہی تیار کروں گا تاکہ راماند اسے بھی آزما سکے!"

"ہاں یہ مناسب رہے گا۔"

"خریداری کے لئے کسی تجربہ کار شخص کا جانا ضروری ہے۔ ہر چیز خالص ہونی چاہئے!" میں نے چلتے چلتے اُسے تاکید کی۔

"تم بے فکر رہو، یہ میرا کام ہے!"

اگلے روز دوپہر کے وقت مجھے اطلاع ملی کہ سارا سامان ڈان ہاؤس پہنچ چکا ہے۔ بیدی مجھے ساتھ لے کر اس وسیع و عریض عمارت کے ایک اندرونی کمرے میں پہنچا جہاں ایک کاریگر کھٹی لگا رہا تھا۔

"اس کمرے میں ہوا کی نکاسی کا انتظام ناکافی ہے" میں نے وہاں پہنچتے ہی کہا۔

"تم فکر نہ کرو، کھٹی کی گرمی تمہیں پریشان نہیں کرے گی، میں یہاں پنکھے رکھوا دوں گا!" اس وقت جسپال ہی سارے انتظامات کا براہِ راست ذمّہ دار معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کی موجودگی میں بیدی کی شخصیت پس منظر میں چلی گئی تھی۔

"گرمی نہیں، تجربہ کے دوران یہ کمرہ زہریلے بخارات سے بھر جائے گا مجھے اپنی صحت بھی عزیز ہے!" میں نے جواب دیا اور جسپال کمرہ کی ایک دیوار توڑ کر اگزاسٹ فین نصب کرانے کے انتظامات پر تبادلۂ خیال کرنے لگا۔

اسی رات میں نے بحر ہند کے اس دور اُفتادہ جزیرے پر کھٹی روشن کی۔ تجربہ کے آغاز سے قبل جسپال نے نہایت مکارانہ طریقہ پر اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ اس کے لائے ہوئے سامان کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چیز نہیں ہے۔

میں نے وزن کر کے چالیس تولے تانبے کی پتلی پتلی سلاخیں کٹھالی میں ڈالیں اور چند سفوف ڈال کر اُسے آگ پر رکھ دیا۔ برقی پنکھے کی تیز ہوا آگ کو بھڑکا رہی تھی، شعلے کمرے کی بند فضا میں لپک رہے تھے۔ وہاں صرف سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، یا کھٹی کے پنکھے کی موٹر کا دھیما دھیما یکساں شور فضا کو مرتعش کر رہا تھا۔

میں نے کنکھیوں سے جسپال اور بیدی کا جائزہ لیا دونوں کرسیوں پر بیٹھے بڑے انہماک سے کھٹی کو گھور رہے تھے۔ میں نے کٹھالی کھٹی پر سے اُتار لی اور بیکر سے ناپ ناپ کر چند قطرے تیزاب اور محلول اس میں ڈالنے لگا۔ کٹھالی سے تیز بدبو اُبھری اور فوراً ہی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے چند بوٹیوں کے سفوف کٹھالی میں ڈالے اور اُسے دوبارہ کھٹی پر چڑھا کر پنکھا چلا دیا۔

چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ کٹھالی میں سے نارنجی اور سُرمئی رنگ کا تیز بدبودار دھواں اٹھنا شروع ہو گیا۔ اس کثیف دھوئیں نے کمرے کی حالت غیر کر دی۔ جسپال اور بیدی تو اپنے سینے دبائے بُری طرح کمرے سے نکل گئے مگر میرا وہاں رہنا ضروری تھا۔

"صفدر! کمرے سے نکل آؤ، یہ موذی بخارات تمہیں بیہوش کر دیں گے" باہر سے کھانسی کے دوران میں بیدی نے مجھے پکارا۔

"میری فکر نہ کرو" میں نے کسی ماہر کیمیاگر کی طرح اعتماد سے کہا "چند منٹ کی بات ہے پھر تم بھی اندر آسکو گے!"

کھٹی سلگتی رہی۔ میری نظریں آنچ پر جمی ہوئی تھیں، میں وقفہ وقفہ سے کوئلے ڈالتا رہا۔ آخر کار آگ اس کثیف دھوئیں کو ... باہر کی راہداری سے جسپال اور بیدی کے قدموں کی بے چین آوازیں آ رہی تھیں۔ دھواں صاف ہونے کے انتظار میں باہر ٹہل رہے تھے۔

"اندر آجاؤ۔ اب دھواں صاف ہو گیا!" میں نے انہیں ...

"اُف۔ یہ تو بڑا موذی کام ہے" جسپال اندر آتے ہی گھبرا کر بولا" اس کے لئے تو واقعی کھلی جگہ درکار ہے!"

"کیمیا کھیل نہیں ہے جسپال صاحب!" میں نے اپنے ... لہجے میں فنکارانہ اعتماد کا تاثر دیا۔ "کیمیاگر اپنا خون جگر ... ہے۔ یہ دھواں براہِ راست پھیپھڑوں کو گلانے میں کمال کی صلاحیت رکھتا ہے اور راماند ایسے قیمتی تجربے کو جھٹلانے پر تُلا ہوا ہے۔"

جسپال زور سے ہنسا۔" تم پھر اسی بڈھے کو لے بیٹھے، ارے بھئی صفدر! سرکار تمہارے فن کو مانتی ہے، کیا تمہارے لئے اتنا کافی نہیں ہے ...

رات دھیمے دھیمے سرکتی رہی۔ وقفہ وقفہ سے کانی کے ذریعہ ... جب ان دونوں نے مجھے کھٹی کے قریب بیٹھے اور اُس میں کوئلے جھونکتے دیکھا تو جسپال نہ رہ سکا اور بول ہی پڑا۔" تم آرام کرلو، میں ایک آدمی کو ... صبح تمہاری واپسی سے قبل آگ دھیمی نہ ہونے دیگا۔"

کھٹی روشن رہنے کے بعد سترہ اٹھارہ گھنٹے میں ... میں سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔" اس تاؤ کو پارہ میں ڈالنے کے بعد ...

"تانبے کو پگھلانا ہے نا؟"

میں نے سر کو نفی میں جنبش دی۔" مجھے اس مرحلہ کا انتظار ... نکٹھیوں میں رہے گا اور نہ پگھلنے پائے گا۔ اس وقت میرے شامل کئے ... تانبے میں رچ کر اپنا کام دکھا چکے ہوں گے!"

"تمہاری باتیں بھی راماند سے کم نہیں ہیں" جسپال ...

"اس سے دان زٹی کی بھی بات کر دو تو وہ اُس میں الکٹرون پروٹون اور ایٹم گھسیٹ لاتا ہے۔ بھلا یہ بھی ممکن ہے کہ تانبہ نہ نکٹھیوں میں ہو ... دھواں کرنے کا ارادہ ہے!"

"بس دیکھتے رہو، جو ہوگا سامنے آجائے گا" بساط ... آنے کے بعد میں ایک بار پھر اُس سے برابری کے ساتھ گفتگو کرنے ... ہو چکا تھا۔

باہر شاید صبح کا دھندلا سا اُجالا پھیل چلا تھا۔ جب تانبے کی وہ سلاخیں اپنے ہی بوجھ سے موم کی طرح مڑنے لگیں اور ان سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا۔ میں نے فوراً کھٹی کا برقی پنکھا بند کر دیا، اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر پانی کا چھینٹا مار کر اسے سرد کر دیا۔

پارہ کی مقررہ مقدار چینی مٹی کے کھلے منہ کے مرتبان میں تیار تھی۔ میں نے کٹھالی میں چمٹا ڈال کر تانبے کی وہ سیاہی مائل سلاخیں نکالیں اور پارہ کے مرتبان میں ڈال دیں۔

گرم گرم تانبہ سیال پارہ میں ڈوبا تو مرتبان میں چند تڑاخے ہوئے، دھیا رنگ کے زہریلے دھوئیں کے بادل فضا میں بلند ہوئے اور میں نے فوراً ہی مرتبان کا منہ بند کر دیا۔

"کیا کام ختم ہو گیا؟" جسپال نے حیرت اور مسرت کے ساتھ پوچھا۔

"فی الحال آگ کا کام ختم ہوا ہے۔ اب چوبیس گھنٹے بعد اس مرتبان میں سے چاندی کی طرح چمکتی سلاخیں برآمد ہوں گی جنہیں کیمیا کی زبان میں سفید کندن کہا جاتا ہے۔"

"یعنی تانبے پر پارے کا ملمع چڑھ جائے گا۔"

"ملمع نہیں۔ تانبہ تو اب جل گیا۔ جو کچھ رہ گیا ہے وہ پارے کے ساتھ یکجان ہو جائے گا۔ تم کسی سلاخ کو کاٹو گے تو اندر سے بھی وہی کندن کا نکلتا ہوا نکھار چمکے گا۔"

انگارے اچھی طرح بجھانے کے بعد میں نے سارا سامان وہیں چھوڑا، کمرے کو مقفل کیا اور خوابگاہ میں لوٹ آیا۔ اب وہ رہ رہ کر میرے ذہن میں بھاندر ناس کا خیال آرہا تھا۔ اگر کہیں سے وہ مل جاتی تو سفید تانبے کو رنگنے کے بعد میں اسے بھاندر ناس کا تاؤ دیتا اور میرا بنایا ہوا سونا کانوں سے نکال کر صاف کئے ہوئے سونے کا ہم پلہ ہوتا۔ مگر یہ میرا اپنا راز تھا۔ میں اسے زبان سے کبھی نکالنا چاہتا تھا۔ میں جن لوگوں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا ان کے وسائل محدود تھے۔

نیپال ایک چھوٹا اور امن پسند ملک ہے جس کی علاقے میں کوئی فوجی حیثیت نہیں۔ ہندو فوج کے دستے تحقیق یا کسی مذہبی مہم کا بہانہ بنا کر دندناتے ہوئے نیپال میں گھس سکتے تھے۔ وہ مشین گنوں کی باڑھ پر بھاندر ناس کو پوجنے والے آدمخور قبائل کو زیر تو کیا، نیست و نابود کر سکتے تھے اور یوں چند ہی دنوں میں ڈان ہاؤس میں بھاندر ناس کے انبار لگ سکتے تھے مگر کوئی نادیدہ طاقت مجھے یہ راہ اختیار کرنے سے روک رہی تھی۔ بھاندر ناس کے پجاری آدمخور ہی سہی مگر انہیں اپنے علاقے میں زندہ رہنے کی اجازت ہونی چاہیئے تھی!

سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ خواب میں کبھی میں نیپال کے کوہساروں میں بھٹکتا رہا، کبھی لباس سے محروم سُندری کے سُندر سراپا کے درشن کرتا رہا، کبھی کھنڈروں میں انند رام کی خانقاہ کے باہر ہرے کرشنا ہرے رام کے نعرے لگاتا رہا۔ اس رات میں نے بڑی مہمات سر کیں، بہت طویل سفر کئے۔ کبھی امیر خان اور اس کے مخبوط الحواس آقا نرائن داس سے جا نکلا، پیکار میں اُلجھا رہا، بڈھے سے خونریز مقابلہ کیا، برفانی انسان سے ہولناک معرکہ جیتا، بندروں کے غول میں گھرا رہا۔ جب تک میں سوتا رہا لازوال یادوں کا نہ ختم ہونے والا سفر جاری رہا اور جب ڈاکٹر بیدی نے مجھے بیدار کیا تو آدھی رات بیت چکی تھی نہ یادیں تھیں نہ سفر۔ میں بحر ہند کے اسی جزیرے پر ڈان ہاؤس کا قیدی تھا۔

"ڈاکٹر راماند نے معلوم کیا ہے کہ تمہارا کام کس مرحلے میں ہے؟" بیدی نے مجھے مطلع کیا۔

"وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نیو کنٹرول بیس پر اپنے داماد کے پاس مقیم ہے۔ کل واپس جانا چاہتا ہے!"

"شاید کل شام تک میں نمونے اُس کے حوالے کر سکوں گا!"

رات کے کھانے کا وقت تو کبھی کا گزر چکا تھا مگر میری خاطر بیدی نے سارا انتظام کرایا۔ اور کھانے وغیرہ سے نمٹ کر میں دوبارہ اسی کمرے میں جا پہنچا جہاں تانبے کو پارہ جِلائے رہا تھا۔

"جسپال کہاں ہیں؟" میں نے اسے غیر موجود پا کر بیدی سے پوچھا۔

"وہ شام کو بنگلور چلے گئے کل تک لوٹ آئیں گے!"

اور اسی وقت میرے ذہن میں انتقام کے بچھو نے اپنا ہولناک ڈنک اُبھارا۔ ڈاکٹر بیدی میرے ساتھ تنہا تھا اور اپنی دانست میں میرے ساتھ دوستی استوار کر چکا تھا لیکن میں ایک ثانیے کے لئے بھی وہ بدترین گالی نہ بھول سکا تھا جو بیدی نے میری پیاری سیتا کے لئے استعمال کی تھی۔

"کمرے کا دروازہ بند کر دو!" میں نے بیدی سے کہا تو مجھے اپنی آواز عجیب سی لگی۔

"اس کی کیا ضرورت ہے، میری اجازت کے بغیر کوئی اندر نہیں آئے گا۔"

"ہوا تمہاری اجازت کی پابند نہیں ہے" چند ثانیوں کے توقف کے بعد مجھے بہانہ سوجھ گیا" اب مجھے سفید سونے کو ہوا سے بچانا ہے ورنہ تجربہ برباد ہو جائے گا!"

اُس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں شانے جھٹکے اور دروازہ بند کر دیا۔

پھر میں نے مقررہ وقت پر چینی مٹی کا مرتبان کھولا۔ وہ خشک پڑا ہوا تھا۔ تانبے کے کشتہ کے ساتھ یکجان ہو چکا تھا۔ اب مرتبان میں سیمابی رنگ کا ایک ٹھوس ڈلا پڑا ہوا تھا۔

میں نے فخر اور مسرت کے ساتھ اسے مرتبان سے باہر نکال لیا۔

"یہ، یہ کیا ہو گیا؟" بیدی نے حیرت سے پوچھا۔

"پارہ۔ جو دنیا کی واحد مائع دھات ہے، اب اپنی انفرادیت کھو چکا ہے!" میں نے وہ ڈلا شیشے کے ایک جار میں ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے بیکر سے ناپ کر پانی جیسے رنگ والا ایک مہلک تیزاب شیشے کے جار میں ڈالا اور گھڑی دیکھ کر پورے تین منٹ منتظر رہا پھر میں نے گلابی محلول کے نپے تُلے قطرے اس جار میں ٹپکائے۔ جار کی تہہ میں ہلکی سی سنسناہٹ

ُمنائی دی اور نوسادر کی بو لئے سفید دھواں اُٹھنے لگا۔ میں جار ہاتھ میں لئے اُس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ محلول تیزی کے ساتھ فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا پھر چند ہی منٹ میں جار خشک ہوگیا اُس کے اندر سفید سونے کی جگہ سُرخ رنگ کا ڈلا موجود تھا۔

یہی عمل میں نے مسلسل تین مرتبہ دہرایا اور اُس ڈلے کا رنگ تیزابی سونے کی چمک دینے لگا۔ میں نے غور سے بیدی کی طرف دیکھا وہ حیرت سے منہ پھاڑے اسی جانب دیکھے جا رہا تھا۔

میرے اعصاب پر اب تناؤ طاری ہونے لگا تھا۔ وجود میں ایک میٹھا میٹھا سا درد رینگ رہا تھا کیوں کہ میرا شکار اب میرے چنگل میں تھا اور اپنے انجام سے بے خبر۔!

اس وقت میرے اختیار میں بہت کچھ تھا میرے پاس ایسے کیمیائی مرکبات موجود تھے جن کی ایک چٹکی پلک جھپکتے میں اُس کا کام تمام کر سکتی تھی۔ اور کچھ نہیں تو شورے کے تیزاب میں ذرا سا سفوف ڈال کر میں گلاس اس کے نتھنوں کے نیچے لے جاتا تو تیزاب سے پیدا ہونے والی نائٹرس گیس بآسانی اس کا قصہ پاک کر سکتی تھی۔ مگر میری دانست میں وہ مردود اتنی آسان موت کا حقدار نہیں تھا۔ قیامت کے وہ لمحے مجھے ابھی تک یاد تھے جب اُس نے مجھے تنگ تابوت میں پابندِ سلاسل کیا تھا۔ کیسا ہولناک طریقہ تھا وہ اذیت رسانی کا! جب گرمی سے بدن جل رہا تھا تو ٹھنڈک کی آرزو ہر روئیں سے اُبھرتی تھی اور جب درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی بائیس درجہ گر جاتا تھا تو حرارت کی اتنی شدید خواہش اور طلب جاگ اٹھتی کہ آتشِ نمرود بھی سامنے آجائے تو اس کرب انگیز اور ہڈیوں میں پیوست ہونے والی ٹھنڈ سے نجات پانے کے لئے آدمی اسی میں بے خطر کود پڑے۔

ڈاکٹر بیدی کے مقدر میں لکھا جا چکا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے مگر میں اُسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، سسکتے ہوئے مرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پر اذیت کے لمحے جتنے طویل اور روح فرسا ہوتے میری انا کو اسی قدر تسکین ملتی مگر میری تشویش یہ بھی تھی کہ ساری کارروائی خاموشی سے انجام پائے وہ ہر قید و بند سے آزاد ہو مگر کسی کو نہ پکار سکے، کہیں نہ جا سکے!

میں نے اُس کی طرف پشت کر کے ایک گلاس میں شورے کا تیزاب بھر لیا یہ ترکیب میرے ہر معیار پر پوری اُترتی نظر آرہی تھی۔

"یہ بخارات بہت زہریلے تھے۔" میں تیزابی سے کلی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہلکے سے ابر کی طرح میری زبان اور تالو پر جم گئے ہیں اور جب بھی میں کوئی ٹھوس چیز کھاؤں گا یہ میرے معدے میں پہنچ کر میری ہلاکت کا سامان کر دیں گے۔ ذرا روئی لے کر میرا منہ تو صاف کر دو!"

بیدی پیشہ کے اعتبار سے نفسیات داں تھا مگر عملی طور پر وہ اس وقت میری کیمیاگری کے سحر میں مبتلا تھا۔ اس کا پیشہ طب ہوتا تو شاید وہ میری اس موشگافی پر چونکتا مگر میرا وار اُس پر کارگر رہا۔ اُس نے بُرا سا منہ بنایا پہلی بار اُس کی سرد اور بے رونق آنکھوں میں خوف کی لہر اُبھری اور وہ بولا "میرے منہ کا ذائقہ بھی بہت تلخ ہو رہا ہے' پہلے میرا دہانہ وغیرہ صاف کر[...] فرسٹ ایڈ بکس سے روئی لے لو' وہ صاف کی ہوئی ہے!"

اس وقت اُس کی نفسیات دانی جانے کہاں سوئی ہوئی [...] میرے مقابلے میں وہ ایک عام آدمی تھا' شہر کی گلیوں میں بھٹکتے [...] میں نے اُسے صوفے پر لٹا دیا۔ اُسے دکھانے کے لئے روئی [...] اُٹھا لیا۔ روئی کی پھریری سے اُس کی زبان صاف کرتے ہوئے [...] میں نے تیزاب سے بھرا ہوا گلاس بھی اُٹھا لیا۔

میں نے آخری بار دروازے پر نظر ڈالی' وہ بدستور بند [...] گھماتے گھماتے میں نے اُس کا دہانہ پوری طرح کھلوایا پھر اچانک [...] میں چمٹی آڑی کر کے اس طرح پھنسا دی کہ وہ منہ بند نہ کر سکے۔ زبان [...] نوکیلے سروں کے نیچے دب گئی۔ اُس کی چھٹی حس نے موت کی بو پالی [...] قوت سے اچھلنا چاہتا تھا کہ میں نے شورے کا تیزاب اُس کے حلق [...] دیا۔ اُس کے حلق سے لرزہ خیز غراہٹیں اُبھریں اور میں نے تیزاب [...] سے بچتے ہوئے اُس کا چہرہ کشن کے نیچے دبا دیا اور خود اُس پر چڑھ [...] میں نے فرش پر پھینک دیا۔

وہ کسی سانڈ کی طرح میری گرفت سے نکلنے کے لئے مچل [...] اس پر تکلیف غالب آئی اور مزاحمت دم توڑنے لگی تو میں الگ [...]

وہ اندھوں کی طرح بے تابی سے کچھ ٹٹولتا ہوا صوفے [...] منہ کے بل فرش پر گر گیا۔ اُس کا کریہہ چہرہ دیکھ کر میرا رواں رواں [...] میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تیزاب پلانے کی کوشش میں اُس [...] قدر مسخ ہو جائے گا۔

اُس کا سارا چہرہ جھلس چکا تھا۔ جلد جگہ جگہ سے پھٹ [...] سینہ اور پشت کے اوپری حصے کا بھی یہی حال تھا کیوں کہ [...] کے بعد وہ حصے نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں گلنے کے عمل سے دوچار [...] مہیب اُس کا دہانہ تھا۔ ہونٹ غائب ہو چکے تھے اور سیاہ دانتوں [...] ایک کئی انچ لمبا لوتھڑا رہ رہ کر پھڑک رہا تھا۔

مجھے اس پر چند ثانیوں کے لئے رحم آیا مگر ذہن میں پھر [...] اُبھری۔ میں اُسے اپنی اذیتیں تو معاف کر سکتا تھا مگر اس گال [...] کیا آگ بھری ہوئی تھی کہ مجھے بیدی کی وہ حالت بھی اطمینان [...] وہ اظہار کے وسیلوں سے محروم ہو چکا تھا۔ اب اس کی سزا یہی [...] زندگی کو طول دیا جائے، بے چارے کو بچانے کی کوشش کی جائے۔

وہ اُٹھ رہا تھا، ٹھوکریں کھا رہا تھا اور پھر گر رہا تھا۔ [...] تیزاب لیا اور اس بار بیدی کے دونوں ہاتھ جھلسا دیئے۔ گویا اس [...] کوئی اُمید نہیں تھی لیکن میرا انتقام شاید اس کی زندگی طویل [...] بلیا نہ لکھ سکتا تھا، نہ آنکھوں کے تنفر آمیز اشارے اس بند کمرے [...] سکتے تھے۔ اُس کا پورا وجود اس وقت اس کے لوتھڑے سا دا [...] ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ سماعت اُسے قدرت نے آدھی عطا کی تھی!

پانی میں نے فنا کر دی جس زبان سے اُس نے میری انا پر کاری وار لگایا تھا وہ زبان سیاہ دانتوں میں بھینچی دھیمے دھیمے گل رہی تھی! اس میں اب نہ رونے کی ہمت تھی نہ سسکنے کی صلاحیت۔ وہ ایک بشے میں پڑا ہوا تھا اُس کا پورا بدن بار بار فضا میں اچھل رہا تھا میں اپنے اس شاہکار کو آخری بار غور سے دیکھا اور اچانک چیختے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

رات کا اندھیرا آخری سانسوں پر تھا مگر ڈان ہاؤس کے رکھوالے بیدار تھے۔ آناً فاناً میں اونگھتی ہوئی راہداریوں نے سات آدمی اُگل دیئے۔

"غضب ہو گیا۔ بیدی کو بچاؤ' اُس نے دھوکے میں تیزاب پی لیا۔" میں چلایا۔

وہ ساتوں بے دریغ کمرے میں گھس پڑے۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھے اور کرڈیل بھی۔ مگر چند سکنڈ ان میں کوئی اس کانپتے اور اچھلتے ہوئے لوتھڑے کے قریب جانے کی ہمت نہ کر سکا۔

آخر ان ہی میں سے کسی کا فوجی تجربہ بیدار ہوا۔ ایسڈ پروف دستانے لائے گئے اور وہ لوگ بیدی کے مکروہ وجود کو اسٹریچر پر اُٹھا لے گئے!

"کمرے میں کوئی قدم نہ رکھے!" میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور اسٹریچر کے پیچھے دوڑ پڑا۔

اس مرتبہ ان لوگوں نے جو راستہ اختیار کیا وہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ یہ کارواں چند ہی منٹ میں وسیع برآمدہ میں جا نکلا جس کے آگے ایمبولنس تیار کھڑی تھی۔ نہ جانے اسے کس نے خبر دی تھی کہ گاڑی کا انجن بیدار تھا اور چھت پر لگا ہوا سُرخ روشن دائرہ تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

میرے لئے ڈان ہاؤس سے نکل بھاگنے یا کم از کم بیرونی فضا کا جائزہ لینے کا یہ سنہری موقع تھا میں اسٹریچر کو سہارا دینے کے بہانے جھپٹ کر سب سے پہلے ایمبولنس میں گھس گیا۔

وہاں اس وقت ہنگامی صورتِ حال درپیش تھی مگر ان ساتوں کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے جونہی انھیں علم ہوا کہ میں اسٹریچر سے بھی پہلے ایمبولنس میں سوار ہو چکا ہوں تو اسٹریچر روک لیا گیا اور کسی نے گونجیلی آواز میں کہا: "آپ نیچے آجائیں سر!" الفاظ ادب آمیز مگر لہجہ تحکم آمیز تھا۔

"بیدی مر رہا ہے، اُسے ہر قیمت پر بچنا چاہیئے۔ میں اسے تم لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ہم احکام سے مجبور ہیں سر!" ایک گارڈ نے بغلی دروازہ کھول کر سخت لہجے میں کہا اور نہایت بدتمیزی سے میرا بازو تھام کر مجھے باہر کھینچ لایا۔

اُن کا سخت گیر رویہ دیکھ کر میں نے اصرار ترک کر دیا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ الفاظ کی حد تک وہ ضرور میرا احترام کریں گے مگر عملی طور پر کھینچا تانی کرتے ہوئے اتفاقی ضربات لگانے سے بھی گریز نہیں کریں گے جب کہ میں ایسی احترام آمیز مار کھانے کا قائل نہیں تھا۔

جیسے ہی گارڈز اسٹریچر ایمبولنس میں رکھ کر نیچے اُترے ایک جانب سے سفید کوٹ میں ملبوس شخص طبی آلات کا وزنی صندوق اُٹھائے دوڑتا ہوا آیا اور ایمبولنس کے عقبی حصے میں چڑھ گیا۔ اپنی وضع قطع سے ڈاکٹر یا سند یافتہ ڈسپنسر لگ رہا تھا

ایمبولنس تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور میں تھکے قدموں سے اپنی خوابگاہ میں لوٹ آیا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے بشرہ سے اداسی اور صدمہ کا اظہار ہو مگر خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں نے بیدی کے ساتھ اپنا حساب بڑے اچھے طریقے سے چکایا تھا۔ اس کی ایذاؤں سے لوگ زندہ ضرور بچ نکلتے تھے مگر معذور ہو جاتے تھے۔ اور وہ خود بھی میرا انتقام بھگت کر زندہ تھا مگر مکمل طور پر معذور ہو چکا تھا۔

خوابگاہ سے ملحق غسلخانہ میں گرم پانی کا ہر وقت انتظام رہتا تھا میں دل کھول کر شاور کے نیچے نہایا پھر گرم پانی بند کر کے ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کھول دی۔ مجھے ہلکی سی پھریری آئی میں نے ٹھنڈے پانی کو بند کر کے دوبارہ گرم پانی کھول دیا۔ دو تین بار گرم ٹھنڈے کا یہی عمل دُہرانے کے بعد میری ساری تکان رفع ہو چکی تھی اور میں خود کو نئے دن کی جدوجہد کیلئے بالکل تازہ دم محسوس کر رہا تھا ذہن کا ایک ایک خلیہ روشن ہو گیا تھا اور اب بہت سے امکانات میرے زیرِ غور تھے۔

تھوڑی دیر بعد خاکی پتلون اور جرسی میں ملبوس ایک اوسط قامت گٹھیلے جسم والا آدمی دو گارڈز کے ہمراہ میرے کمرے میں آیا اسے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

میں نے اداکاری شروع کر دی اور بستر پر پڑا اداس نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔ خاکی لباس والا خاصا سیاہ فام تھا مگر اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا کہ وہ مدراس یا اس کے قرب و جوار کا رہنے والا ہے!

"میں اس اسٹیشن کا سیکنڈ ان کمانڈ ہوں، ڈاکٹر بیدی کے حادثے کے بعد اب سائیکو فورٹ میری تحویل میں ہے!" مدراسی نے خشک لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے مہندر واڈیکر کہتے ہیں"۔

اس کی گفتگو سے ظاہر ہوا کہ ڈان ہاؤس کا اصل نام سائیکو فورٹ ہے یہ نام عمارت کے خواص سے خاصی مطابقت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نام ... ڈان ہاؤس ہی ہوتا تو پہلی بار یہ نام بتانے کے بعد مجھے رہا نہ کیا جاتا۔ یہ لوگ اس عمارت کے نام اور محل وقوع کی رازداری کے سلسلے میں حد سے زیادہ محتاط تھے لیکن یہ موقع ایسا نہ تھا کہ میں ایسی ضمنی باتوں پر چونکنا شروع کر دیتا!

"تم نے بہت دیر کی واڈیکر!" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "بیدی کی حالت بہت خراب تھی۔ کسی ذمہ دار آدمی کو اس کے ساتھ جانا تھا۔" اس نے بڑی روانی سے انگریزی میں تاڑنا شروع کر دیا۔ "یہاں ہر شخص اپنے فرائض بخوبی جانتا ہے، آئندہ اپنی احمقانہ رائے کے اظہار میں احتیاط کیا کرو۔"

"شاید..... شاید اس عمارت میں پتھر کے انسان بستے ہیں!" میں دلگیر

لہجے میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

پھر واڈیکر نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے چند کاغذات پر نظریں دوڑائیں اور بولا "تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو تمہیں اس وقت اپنے کام پر ہونا چاہیے تھا!"

"میں جانتا ہوں کہ مجھے کس وقت کیا کرنا چاہیے!"

"بحث کی ضرورت نہیں، یہاں ہر کام شیڈول کے مطابق ہوتا ہے تمہیں دو بجے رات سے اس وقت تک مصروف رہنا ہے جب تک نتیجہ سامنے نہ آجائے!" وہ کاغذات پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا "یہ شیڈول مجھے بیدی کے دفتر سے ملا ہے!"

"بیدی کے حادثے نے میرے اعصاب پر اثر ڈالا ہے" میں نے دھیمی آواز میں کہا "اگر یہ کاغذات اتنے ہی مکمل ہیں تو ان میں یہ بھی لکھا ہوگا کہ میرا تجربہ کس قدر مہلک اور توجہ طلب ہے!"

"ہاں کل کی رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے!" اس نے کاغذات پر سے نظریں ہٹائے بغیر فکر آمیز لہجے میں اقرار کیا "تمہارا کام واقعی بہت نازک ہے!"

"میں نہیں چاہتا کہ ضرورت سے زیادہ ذہنی دباؤ کے باعث میں بھی تیزاب پی کر بیدی کے حال کو پہنچ جاؤں؟" میں نے مزید وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے" وہ یک بیک نرم پڑ گیا "ہو سکتا ہے کہ تم بیدی کو بہت زیادہ پسند کرنے لگے ہو مگر اس حادثے سے ہمت ہارنا فضول سی بات ہے مناسب یہ ہوگا کہ تم جلد از جلد اس کام کو مکمل کر لو جس پر بیدی تمہارے ساتھ مصروف تھا یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے!"

"مجھے صرف تھوڑی دیر کا سکون اور تنہائی درکار ہے!"

"اچھا — اب یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"مجھے کچھ علم نہیں۔ بیدی صوفہ پر دراز تھا۔ میں نے شورہ کے تیزاب کی بچی ہوئی مقدار گلاس میں بھر کر اس کے پاس رکھوائی ہوئی تھی۔ پھر گلاس لوٹنے کے شور اور چند بھیانک آوازوں پر میں چونکا تو بیدی صوفہ پر مچل رہا تھا کبھی وہ اپنا منہ کشن سے ڈھانپتا تھا کبھی تڑپنے لگتا تھا۔ اس کا مسخ شدہ چہرہ اور لوٹا ہوا خالی گلاس دیکھتے ہی مجھے سنگین صورتحال کا اندازہ ہوا اور میں نے دروازہ کھول کر شور مچایا!"

"گڈ!" اس نے سرسری انداز میں کہا یہ لفظ اس نے یقینی طور پر میرے بیان کی تحسین کی خاطر استعمال کیا تھا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے بیدی کے آزار پر تسلی کا اظہار کیا ہوا!

ڈان ہاؤس یا سائیکو فورٹ کی لگی بندھی زندگی میں وہ حادثہ زبردست سنسنی کا باعث بنا ہوا تھا لوگ خود کو اس واقعہ سے لاپرواہ ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر ہر طرف ہلچل کا سا سماں تھا وہاں شاید بیدی کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ واڈیکر کی باتوں سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ بیدی کے زخمی ہونے کے بعد کاغذات اور بیدی کی لکھی ہوئی رپورٹوں سے ہی اسے میری مصروفیت کا علم ہوا تھا۔ ان حالات میں ہر شخص کا میری طرف مشکوک اور خوفزدہ نظروں سے دیکھنا فطری امر تھا۔

دس بجے کے قریب میں دوبارہ عارضی تجربہ گاہ میں گیا۔ دل بالکل راغب نہ تھا مگر میں نے بھٹی میں کوئلوں کی ایک دبیز تہہ جمائی، تیار کیا ہوا طلائی ڈلا رکھا اور بھٹی اوپر تک کوئلوں سے بھر دی۔ یہ کرنے کے بعد میں اس وقت تک وہاں رہا جب تک سارے کوئلے پھر میں نے بھٹی کا برقی پنکھا بند کر دیا اور بھٹی کے دہانے پر آہنی ڈھکن رکھ کر باہر آگیا۔

مجھے محافظوں سے بیدی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تو میں نے ایک گارڈ کے ذریعہ واڈیکر کو پیغام بھجوایا اور تھوڑی ہی دیر بعد

"بیدی کا کیا حال ہے؟" میں نے اس کے آتے ہی سوال کیا۔

"بہت بُرا حال ہے سانس اور غذا کی نالیاں گل گئی ہیں، بصارت بھی ضائع ہو گئی ہے۔ نلی ڈالنے کے باوجود آکسیجن پہنچانے میں پیش آرہی ہے!" اس نے بتایا۔

"کیا وہ اگال ٹ میں ہی ہے؟"

"ہاں اے ڈی جی خود نیول ہسپتال پہنچے ہوئے ہیں کسی بھی لمحے بیدی کا آپریشن شروع ہو سکتا ہے۔ جو کچھ میں نے سنا ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو بیدی موت کی سرحد پر کھڑا ہے اور کسی بھی لمحہ بری خبر آسکتی ہے!"

"مجھے جانے دو، میں صرف ایک بار بیدی کو دیکھنا چاہتا ہوں" میں نے التجا کی۔

"ناممکن!" وہ اٹل لہجے میں بولا "اے ڈی جی نے ہسپتال سے وائرلیس پر ہدایت کی تھی کہ تمہاری خصوصی حفاظت کی جائے!"

"حفاظت یا نگرانی؟" میں بوجھل انداز میں ہنسا۔

"سائیکو فورٹ میں دونوں الفاظ ہم معنی ہیں" واڈیکر نے کہا۔

شام سے ذرا دیر پہلے واڈیکر نے مجھے بتایا کہ جسپال نے وائرلیس پر تجربہ کی تکمیل کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ واڈیکر نے کہ نصف شب سے پہلے یہ کام ناممکن ہوگا۔ اس اطلاع کی بنیاد پر جسپال کو مزید ایک روز اگال ٹ میں رکے رہنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

رات کو میں واڈیکر کے ہمراہ اپنی تجربہ گاہ میں جا پہنچا کٹھالی کو چھو کر دیکھا تو وہ سرد ہو چکا تھا میں نے اسے اُلٹ دیا کٹھالی میں سوا کچھ نظر نہ آتا پتھر کے جلے ہوئے کوئلوں کے سخت انبار کو کریدا کرید کر سونے کا ڈلا نکالا اس کا رنگ بدستور وہی تھا میں نے آہستہ سے مارا اور وہ کونہ اندر دب گیا۔

پہلے کے مقابلے میں میرا بنایا ہوا سونا نرم ہو چکا تھا۔

پھر میں نے کسوٹی پر جسپال کے لائے ہوئے تیزاب سونے کی لکیر لگایا اس کے متوازی خود ساختہ سونے سے لکیر ڈالی جو بادی النظر میں ہم رنگ تھی میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا مگر جب میں نے موازنہ کیا تو میرے بنائے ہوئے سونے کا کس تیز تھا جو اس کو تاب

تھا اور یہی وہ عیب تھا جس کی بنا پر لیاقت آباد کا جمال سنیاسی اپنا پوچھنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا!

پھر میں اصل سونے اور خود ساختہ سونے کی برابر کی مقدار کو کٹالی کیمیان سے بنانے میں مصروف ہو گیا اور واڈیکر سے بھی باتیں شروع کر دیں۔

بیدی سے میری دوستی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اس کا جانشین بھی مجھ سے خاصا قریب ہو چکا تھا عہدے کے اعتبار سے وہ انڈین آرمی کا کرنل تھا ہند میں اپنے قیام کے دوران میں کیپٹن بھاٹیہ کے بعد واڈیکر مجھے دوسرا فوجی افسر ملا تھا اور پہلے کی طرح یہ بھی اپنے افسران سے بددل تھا۔

وہ انٹر سروسز انٹیلی جنس کا آدمی تھا اور اس کا ریکارڈ ہر طرح صاف تھا مگر جب کرنل واڈیکر کی ترقی کا موقع آیا تو اچانک ہی اس کی خدمات سیکرٹ سروس کو مستعار دے دی گئیں۔

ابھی واڈیکر گفتگو میں اور میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ اس کی کوئی ہم کال آئی اور وہ فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو جسپال اُس کے ہمراہ تھا!

"بیدی کا کیا حال ہے؟" اسے دیکھتے ہی میں نے کام چھوڑ کر سوال کیا۔

"فکر نہ کرو وہ ٹھیک ہو جائے گا" جسپال کے ہونٹوں پر تھکی ہوئی اور وہ مسکراہٹ اُبھری "وہ ابھی خطرہ سے باہر نہیں ہے مگر پہلے سے بہتر ہے!"

"خدا کرے وہ ٹھیک ہو جائے!" میں نے اس کے حق میں گڑگڑا کر صدق دلی سے دعا کی۔

"تمہارا کام کتنی دیر میں ختم ہو جائے گا؟" جسپال نے اپنا بجھا ہوا سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"شاید ڈیڑھ دو گھنٹے میں — صرف ملاوٹ باقی ہے!" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا بنایا ہوا سونا اس کے حوالے کر دیا۔ ملاوٹ کے لئے اس میں سے ایک ٹکڑا پہلے ہی کاٹ چکا تھا۔

جتنی دیر میں کام میں لگا رہا جسپال وہیں بیٹھا سگار پیتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ جسپال مجھ سے بیدی کے ناقابلِ بیان کرب کا تذکرہ کرے، دلگیر آواز میں اپنے شفیق القلب ساتھی کی معذوری بیان کرے مگر وہ مشینی پتلے کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

رات کے دو بجے کام ختم کر کے تینوں اپنے اپنے کمروں میں لوٹ گئے۔ بیدی پر ناقابلِ تردید برتری اور فتح میرا ایسا کارنامہ تھا کہ میں چیخ چیخ کر گانا اور ناچنا چاہتا تھا۔ سائیکو فورٹ جیسے ناقابلِ شکست حصار میں تنِ تنہا اس حصار کے نگراں کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا میری ہر کامرانی سے افضل تھا!

اگلے روز صبح نو بجے کانفرنس روم میں میری طلبی ہوئی۔ وہاں وہی پہلے سے موجود تھے۔ ڈاکٹر رامانند، یشونت راؤ، جے سی کھنہ اور جسپال۔

"کھوٹ کا کیا حال ہے؟" ڈاکٹر رامانند نے مجھے دیکھتے ہی فضا میں ہاتھ لہرایا۔

"شکر ہے اللہ کا" میں نے جسپال کے اشارہ پر اپنی کرسی سنبھالی!

"سونا تیار کر لیا تم نے؟" رامانند نے قہقہہ مار کر پوچھا۔

"دعویٰ نہیں، کوشش ضرور کی ہے۔ اب تصدیق یا تردید آپ کا شعبہ ہے!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور چرمی پیکٹ اس کے سامنے میز پر ڈال دیا۔

یشونت اور کھنہ کی نگاہیں رامانند پر مرکوز تھیں جو چرمی بٹوہ کھول رہا تھا اس نے سونے کے تقریباً ہم وزن دونوں ٹکڑے نکالے انھیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اُس نے باری باری ان کی کثافت کا اندازہ لگایا اس کی خوش مزاجی یک بیک سنجیدگی میں بدل گئی تھی "ان دونوں میں کیا فرق ہے؟" سوال مجھ ہی سے کیا گیا تھا۔

"وہی فرق میں بھی جاننا چاہتا ہوں!" میں نے انکسار آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دھات تو وزنی ہے — کیا اندر بھی ان کا یہی رنگ ہے، سنہرا؟ طلائی؟" اس نے ایک بار پھر باری باری دونوں ٹکڑوں کو تولا۔

"جی — میں کاٹ کر دیکھ چکا ہوں!"

"خیر!" بوڑھے نے دونوں ٹکڑے چرمی بٹوے میں ڈال لئے "میں دو تین روز میں ان نمونوں کی لیبارٹری رپورٹ یشونت راؤ کو بھجوا دوں گا تم لگ کو آرڈی نیٹ کر لینا۔"

"ڈاکٹر صاحب! ذرا میں بھی دیکھ لوں یہ نمونے؟" یشونت راؤ نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں — ضرور دیکھو!"

یشونت اور کھنہ نے باری باری دونوں ٹکڑوں کا معائنہ کیا۔ نگاہوں کا معنی خیز تبادلہ ہوا پھر انھوں نے کوئی تبصرہ کئے بغیر دونوں نمونے چرمی بٹوے میں رکھ دیئے۔

"اس پر لاگت کیا آئے گی؟" کھنہ نے ایک معقول سوال کیا۔

"چار پانچ روپے تولہ یا اس سے بھی شاید کم!" میں نے کہا اور اس بے چارے کی آنکھیں عدسوں کے عقب میں پیشانی پر جا چڑھیں۔

اس بارے میں وہاں کچھ دیر مزید گفتگو ہوئی لیکن معیار سطحی تھا دراصل ہر شخص چار پانچ روپے تولہ لاگت والے سونے کے بارے میں سوچ رہا تھا رامانند بظاہر لاپرواہی برت رہا تھا مگر اس کے بشرہ سے شدید ذہنی اُلجھن عیاں تھی۔

آخر یہ اجلاس ختم ہو گیا۔ اس بار جسپال پہلی مرتبہ مجھے برآمدے تک ساتھ لایا جہاں انھیں لانے والی فوجی گاڑی موجود تھی۔

انھیں رخصت کرنے کے بعد جسپال میرے ساتھ میرے کمرے میں آیا۔ واڈیکر شاید پہلے سے وہاں موجود ہمارا منتظر تھا اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت میرے کمرے کے باہر ایک کے بجائے چار مسلح گارڈز موجود تھے ہر ایک کے شانے سے اسٹین گن لٹک رہی تھی۔

اچانک میری چھٹی حس نے خطرے کا نعرہ لگایا۔

"دروازہ بند کر دو!" جسپال نے واڈیکر سے کہا اور اس نے بڑھ کر دونوں پٹ بھیڑ دیئے البتہ کنڈی نہیں لگائی تاکہ حسبِ ضرورت دروازہ فوراً

کھولا جاسکے۔

میں نے بھیڑیوں کے غول میں گھرے کسی وحشت زدہ ہرن کی طرح جسپال کی طرف دیکھا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

اس وقت جسپال کا چہرہ بہت گمبھیر ہو رہا تھا چمکتی ہوئی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ سگار کا گوشہ بے رحمی سے دانتوں میں بھینچے مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے اور اس وقت میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ جسپال کی پتلون کی داہنی جیب غیر معمولی طور پر بھاری نظر آرہی ہے۔

"کیا بات ہے جسپال صاحب؟" میں نے قدرے گھبراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا "خیریت تو ہے!"

"خیریت نہیں ہے صفدر علی!" وہ غصیلی مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا... "بیدی مر گیا۔ سیکرٹ سروس ایک بہترین آدمی سے محروم ہو چکی ہے۔"

"اوہ!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا "یہ بہت برا ہوا، اسے زندہ رہنا تھا"

"شاید... شاید تم اسے بے بس و مجبور حالت میں زندہ دیکھنا چاہتے تھے!" جسپال نے ادھ جلا سگار فرش پر تھوک کر ایڑی سے مسل دیا "مگر کیوں؟ اس کی زبان بہت گندی تھی مگر اس نے تمہاری بہترین دیکھ بھال کر کے ہر زیادتی کا ازالہ کر دیا تھا، تم نے کیوں مارا اسے؟"

"میں نے.... میں نے مارا اسے؟" میں حیرت سے تقریباً چیخ پڑا "اس نے خود تیزاب پیا تھا!"

"شاید یہ سچ ثابت ہو جاتا مگر وہ اتنا احمق نہیں تھا صفدر کہ اپنے دہانہ کو کھولنے کے لئے منہ میں چمٹی آڑی کر کے پھنساتا اور پھر تیزاب پیتا!" اس کا ایک ایک لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

اچانک میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ بیدی کے چرے ہوئے دہانے میں تیزاب انڈیلنے کے بعد میں آہنی چمٹی نکالنا بھول گیا تھا۔ تیزاب پڑتے ہی اس کا چہرہ اس قدر کریہہ اور ڈراؤنا ہو گیا تھا کہ کہیں بھی چمٹی کا ابھار نظر نہیں آیا تھا۔

"میں رات کو ہسپتال سے روانہ ہوا تو وہ مر چکا تھا اگر فوراً چمٹی نکال دی جاتی تو آکسیجن کی ٹیوب اتارنے کا راستہ بن جاتا، شاید وہ زندہ بچ جاتا، رات سے میرے سینے میں لاوا ابل رہا ہے صفدر علی۔ وہ چمٹی دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ تمہارا کام ہے۔ میں تمہیں بھون ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر تجربہ کی خاطر میں نے اپنے سینے پر صبر کی سل رکھی اور ان لمحوں کا انتظار کرتا رہا۔"

میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میں کسی بت کی طرح یہ سب سنتا رہا۔ جوں ہی وہ خاموش ہوا، رقت اور مظلومیت کی ایک لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ میں گڑگڑا کر اس کی طرف لپکا مگر اس نے پھرتی کے ساتھ اپنی داہنی جیب سے ریوالور نکالا اور فوراً ہی اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

"وہیں رکو صفدر۔ ورنہ میں گولی مار دوں گا" جسپال قہر بھری آواز میں دہاڑا اور مجھ پر ایک بار پھر سکتہ طاری ہو گیا۔

میں اس وقت جہاں تھا وہیں رک گیا۔ شاید جسپال ابھی تک بیدی کی موت کے بارے میں واڈیکر کو اپنے خیالات سے آگاہ نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے ... واڈیکر کے سرمئی چہرے پر حیرت کے آثار دور ہی سے دیکھے جا سکتے تھے۔

"تم مجھے مارنا چاہتے ہو تو ضرور مار دو مگر مجھے بیدی کے قتل کا الزام تو نہ دو" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جسپال سے کہا۔

"بیدی کے قتل کا الزام نہ دوں" وہ زہریلے لہجے میں بولا "یوں کہ اس نے تیزاب خود اپنے حلق میں انڈیل لیا تھا"

"ہو سکتا ہے کہ کسی حادثے کے سبب ایسا ہوا ہو مگر میں اس سے بالکل بری الذمہ ہوں میری بدنصیبی صرف یہ ہے کہ اس حادثے کا گواہ نہیں ہے اور تم مجھ پر اعتبار کرتے نظر نہیں آتے" میں نے ... پژمردہ لہجے میں کہا۔

"بیدی کے ساتھ کیا ہوا تھا" جسپال نے ادھ جلا سگار ... کر تلے سے مسلتے ہوئے مجھ سے پہلی بار دریافت کیا۔ اس کے ... میں دبے ہوئے ریوالور کی ہیبت سیاہ نال بدستور میرے سینے کی طرف ...

"میں کرنل واڈیکر کو پوری بات بتا چکا ہوں"

"میں وہ جھوٹ دوبارہ سننا چاہتا ہوں" جسپال کا ایک ایک ... زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"یہ درست ہے کہ میری زبان سے سچ اگلوانے کی خاطر ... مجھ پر درندگی کی انتہا کر دی تھی مگر اس کے سینے میں محبت بھرا دل ... نے دھیمے اور پرخیال لہجے میں کہنا شروع کیا "جب تک وہ مجھے ... سمجھتا رہا میرے حق میں بھیڑیا بنا رہا لیکن ایک بار میری سچائی کا یقین ... کے بعد وہ روئے زمین پر میرا مخلص ترین دوست بن چکا تھا اس ... بن کر میری جو دیکھ بھال کی اس نے میرے ذہن سے ہر تلخ یاد بھلا ... میری بدنصیبی کی رات تھی میں نے ایک گلاس میں شورے کے تیزاب کی ... ہوئی مقدار صوفے کے قریب رکھ دی تھی تاکہ سفید سونے کو رنگنے ... وہ تیزاب استعمال کر سکوں۔ مگر اس وقت کمرے میں بار بار بھر جانے والے ... بخارات سے بیدی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ زہریلے ... اس کے دہانے میں جم گئے ہیں اور ٹھوس غذا کے ساتھ معدے میں ... ہلاک کر دیں گے۔ اگر تمہیں اس کے دہانے میں سے آہنی چمٹی ملی ... بھی ملی ہو گی۔ وہ فرسٹ ایڈ بکس سے روئی اور چمٹی لے کر اپنا دہانہ ... تھا۔ جب میں نے آخری بار اسے زندہ سلامت دیکھا تو وہ صوفے پر ... دہانہ صاف کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور تیزاب کا گلاس اس کے قریب ... رکھا ہوا تھا۔ مجھ سے بس اتنی غلطی ہوئی کہ میں نے اسے ٹوک دیا ... سے کہا کہیں اس کا پاؤں لگ کر تیزاب فرش پر نہ گر جائے۔ یہ کہہ کر ... میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور اسی وقت میں نے وہ ہولناک ... شیشے کا گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو چکا تھا اور بیدی کا مسخ شدہ ...

سامنے تھا۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا کمرے میں ناچ رہا تھا اور اس کے حلق سے دہشتناک غیر فطری آوازیں ابھر رہی تھیں"

"تم نے پہلے مجھے یہ ساری تفصیلات نہیں بتائی تھیں" کرنل واڈیکر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ پر ہی بیدی کا قاتل ہونے کا شبہ کیا جائے گا" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "نہ ہی تم نے تفصیلات میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تھا"

"یہ سراسر بکواس ہے" جسپال غرایا۔ "مجھے تمہاری کہانی کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں"

"یہ میری بدنصیبی ہے جسپال" اس وقت مجھ پر نہ جانے کیا دورہ پڑا کہ میری آواز خود بخود بھرانے لگی۔ "اگر تم مجھے بیدی کا قاتل سمجھتے ہو تو مجھے گولی مار دو"

"تمہارے کارناموں کا واحد انعام قتل ہی ہے صفدر!" وہ ریوالور کی نال جھکا کر مایوسی اور غصے کے عالم میں بولا "مگر کچھ لوگ تمہیں زندہ دیکھنے کے متمنی ہیں بعض اوقات انسان موذیوں کو بھی پالنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور میں تمہیں بدترین قسم کا موذی سمجھتا ہوں تم اب تک سیکرٹ سروس کے تین آدمیوں کو ہلاک کر چکے ہو"

"تین نہیں — صرف دو کہو جسپال" میں بے دم سا ہو کر مسہری پر گر گیا۔

"ہیڈ کوارٹرز سے احکام آنے تک اسے کمرہ نمبر دو میں بند کر دو" جسپال نے مجھے گھورتے ہوئے واڈیکر کو حکم دیا۔

"کیسے احکام؟" میں یک بیک گھبرا گیا "کیا تم لوگ مجھے پھانسی چڑھانے کی امید لئے بیٹھے ہو؟"

"کاش ایسا ہو سکے" جسپال دانت پیس کر بولا "کاش راما سند کی رپورٹ یہ ظاہر کرے کہ تمہارا بنایا ہوا سونا بے حقیقت اور فریب نظر ہے جس سے اوپر والوں کو یہ یقین ہو گیا کہ تم سونا بنانے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے وہ تمہیں ناکارہ قرار دے کر میرے حوالے کر دیں گے۔ اس وقت میں تم سے بیدی کے قتل کا حساب ضرور چکاؤں گا"

اس دوران واڈیکر چاروں مسلح گارڈز کو اندر لے آیا اور انہیں آہستہ آہستہ میرے بارے میں تفصیلی ہدایات دینے لگا۔

اس کی گفتگو ختم ہونے کے بعد چاروں گارڈز نے مجھے اسٹین گنز کی زد پر کمرے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ باہر نکلتے ہی ان میں سے ایک آگے ہو لیا میں اس کی تقلید کرنے لگا میرے پیچھے باقی تینوں گارڈز مجھے کور کئے چلے آ رہے تھے۔

جسپال سے گفتگو کے بعد مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ غصہ اور انتقام کی حالت میں کی ہوئی کوئی بھی کارروائی محفوظ نہیں ہو سکتی۔ بیدی سے میری بدترین نفرت کا پس منظر بہت گہرا اور جذباتی تھا۔ اس نے میری سیتا کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کئے تھے کہ ہر لفظ تیر بن کر میرے دل میں ترازو ہو گیا تھا مگر سائیکو فورٹ میں میری حیثیت ایک بے بس و مجبور قیدی سے زیادہ نہیں تھی لہٰذا فوری طور پر میں بیدی کو سبق نہ دے سکا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ میرے جسم کا ہر زخم بھرنے لگا مگر میری انا کا کاری زخم بگڑتا ہی رہا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سائیکو فورٹ میں رہتے ہوئے مجھے امید تک نہ تھی کہ میں بیدی پر ہاتھ ڈال سکوں گا مگر اس رات کے سناٹے میں جب میں نے اسے اپنے ساتھ پایا تو میرے ذہن میں انتقام کی ہولناک لہر نے انگڑائی لی اور میں نے فوری منصوبے کے تحت اسے بدترین عذاب میں مبتلا کر دیا۔ نہ جانے وہ کامیابی کا نشہ تھا یا بیدی کے جھلسے ہوئے مسخ شدہ چہرے کی ہیبت، کہ میں اس کے منہ میں پھنسی ہوئی آہنی چمٹی کو بالکل بھول گیا اور میری یہی بھول اب مجھے مصائب کا پھندا بنتی نظر آرہی تھی۔ اس بار مجھے فرار یا نجات کی ہر راہ مسدود نظر آرہی تھی۔

پیچ در پیچ، نیم روشن اور پراسرار راہداریوں کے جال سے گزرنے کے بعد محافظ کسی حصے میں عمارت سے باہر آ چکے تھے اور اب سر پر نیلا آسمان نظر آ رہا تھا مگر اجالے سے سورج کی تیز روشنی میں نکل آنے کے باعث میری آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔

چند ثانیوں بعد میری بصارت معمول پر آئی تو میں نے دیکھا کہ ہم پختہ فرش پر موجود ہیں۔ سائیکو فورٹ کا خاردار تاروں والا بلند حصار ہم سے بمشکل پندرہ سولہ گز دور رہ گیا تھا۔ تاروں کی اس باڑھ کے پیچھے عمارت کی غیر معمولی سنگین فصیل کھڑی ہوئی تھی۔ تاروں اور پتھریلی دیوار کے درمیان خرگوش جیسی جسامت والے لمبے لمبے بالوں میں چھپے چار سیاہ کتے بے چینی سے ہماری طرف متوجہ تھے۔ ان کی سونگھنے کی قوت بلاشبہ بہت تیز تھی۔ وہ نہ جانے کہاں سے عین موقع پر وہاں آ پہنچے تھے۔ ان کی سرخ آنکھوں میں ویرانی اور خون کی پیاس رچی ہوئی تھی۔ جبڑوں سے باہر لٹکی ہوئی سرخ زبانیں اور ان کے قدموں کی بے چین حرکات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ واقعی بہت خونخوار نظر آ رہے تھے اور شاید جسپال نے ان کی خاموش فطرت کے بارے میں سچ ہی کہا تھا کیونکہ حرکات و سکنات سے غضب ناک اور برہم نظر آنے کے باوجود انہوں نے ابھی تک اپنے حلق سے کوئی ہلکی سی آواز بھی نہیں نکالی تھی۔

عمارت سے باہر آنے کے بعد ہمارا سفر بمشکل چند منٹ جاری رہا۔ پھر ہماری رہنمائی کرنے والا گارڈ گیراج نما ایک کمرے کا مقفل دروازہ کھولنے لگا۔

بڑے پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کے ذریعے ہم لوگ یکے بعد دیگرے اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھل پڑا کہ وہ کوئی عقوبت کدہ نہیں تھا۔

وہ ایک وسیع و عریض، روشن اور ہوادار کمرہ تھا۔ ہم جس ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے، وہ پوری دیوار کی چوڑائی اور اونچائی پر مشتمل دو پٹ

والے دو پیکل آہنی دروازے میں بنی ہوئی تھی۔ کمرے کی بقیہ تین دیواریں مسطح اور پختہ تھیں جن پر ہلکا سبز رنگ کیا ہوا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں فرش پر اسفنج کا بہت موٹا گدا بچھا ہوا تھا۔ چھ فٹ لمبے اور اسی قدر چوڑے اس گدے پر بچھی ہوئی چادر اور دو نرم تکیوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہی میرا بستر ہوگا۔ کمرے کے ایک گوشے میں چھوٹا سا ایک اور کمرہ تھا جس کا دروازہ بڑے کمرے ہی میں تھا۔ سائیکو فورٹ کی فصیل کی جانب والی دیوار میں دو فرانسیسی طرز کے دریچے بنے ہوئے تھے۔ چار چار فٹ اونچے یہ دریچے فرش سے چند انچ اوپر سے شروع ہو کر چھت تک چلے گئے تھے۔ ان پر باہر کی طرف شیشے کی شفاف چادر نصب تھی اور اندر کی طرف خوبصورت ڈیزائن والی مضبوط آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس آہنی جالی کے بیل بوٹے اس طرز پر ویلڈ کئے گئے تھے کہ ان میں سے ہاتھ باہر نکالنا ناممکن تھا۔

پورے کمرے میں بس وہ دو آہنی زنجیریں ہی ایسی تھیں جن سے پتہ چل رہا تھا کہ میں وہاں قیدی کے طور پر لایا گیا ہوں۔ وہ دونوں مضبوط چمکیلی زنجیریں چھت کے وسط میں، فوم کے بستر کے عین اوپر لگے ہوئے ایک چوکور صندوق سے جھول رہی تھیں۔ زنجیروں کے دوسرے سرے بستر پر پڑے ہوئے تھے اور ان کے آخر میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

ایک محافظ نے اپنی اسٹین گن شانے سے لٹکائی اور جیب سے چابیاں نکالتے ہوئے جوتوں سمیت بستر پر چڑھ گیا۔

"اوپر چلو" میرے قریب موجود ایک گارڈ نے اپنی اسٹین گن کی نال میری پسلیوں میں چبھاتے ہوئے مجھے بھی گدے پر جانے کا حکم دیا۔

میں نے پلٹ کر اسے گھورا اور کچھ کہے بغیر گدے پر چڑھ گیا۔

چند ہی منٹ میں میری دونوں کلائیاں آہنی ہتھکڑیوں میں قید کی جا چکی تھیں۔ پھر ایک گارڈ نے اپنی خاکی جیکٹ کی جیب سے چھوٹا سا چوکور ڈبہ نکالا۔ میں اسے دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈبے میں ایک جگہ چٹکی سے کوئی چیز باہر نکالی اور چند ہی ثانیوں میں کئی فٹ اونچا نازک سا ایریل اس ڈبے پر لہرانے لگا۔

گارڈ اس ڈبے کو اپنے داہنے کان اور دہانے کے قریب لے گیا۔ اس کا انگوٹھا ڈبے میں لگے ہوئے کسی نظر نہ آنے والے سوئچ کو گھما رہا تھا۔

پھر ڈبے سے ابھرنے والا ہلکا ہلکا ریڈیائی شور مجھے بھی سنائی دیا۔ غالباً وہ واکی ٹاکی قسم کا کوئی وائرلیس ٹرانسمیٹر ریسیور سیٹ تھا جو قریبی رابطہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

"ہیلو کنٹرول... ہیلو کنٹرول...!" گارڈ بار بار دہرا رہا تھا "میں او۔پی۔ون بول رہا ہوں۔"

"کنٹرول ریسپونڈنگ یو، او۔پی۔ون!" چند ثانیوں بعد ریسیور پر ہلکی سی آواز ابھری۔

"میں کمرہ نمبر دو سے بول رہا ہوں" او۔پی۔ون نے کہنا شروع کیا۔

"قیدی کو ہتھکڑیاں لگائی جا چکی ہیں اور وہ پوزیشن میں ہے۔ اس کا وزن [illegible] کلوگرام کے قریب ہوگا۔"

"او کے" دوسری طرف سے پھرتی کے ساتھ کہا گیا۔

"اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لو" ایک گارڈ نے مجھے حکم [illegible]

اچانک میرے ذہن میں ایک خطرے نے سر ابھارا۔ او۔پی۔[illegible] ابھی ابھی کسی کو میرے وزن سے آگاہ کیا تھا اور اب میرے دونوں ہاتھ [illegible] جا رہے تھے۔ چھت میں لگے ہوئے صندوق میں غائب ہوتے ہوئے [illegible] زنجیروں کے دوسرے سرے یقینی طور پر کسی مربوط مشینی نظام سے [illegible] اور اب مجھے بار بار فضا میں معلق کر کے اس گدے پر پھینکا جانے والا [illegible]

"میں ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا" میں نے غراتے ہوئے دونوں [illegible] مٹھیوں میں جکڑ لیں۔ ہتھکڑیوں اور میری مٹھیوں کے درمیان زنجیروں [illegible] لمبائی جھول رہی تھی کہ چھت تک پہنچنے کے بعد میں زنجیر پر پھسلتا ہوا بآسانی گدے پر آ سکتا تھا۔ اچانک گرنے کے مقابلے میں یوں [illegible] بلکہ بڑی حد تک محفوظ نظر آ رہا تھا۔

"تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی کرو" [illegible] کا لہجہ سخت اور حاکمانہ تھا۔

"تم میرا بدن چھلنی بھی کر دو تو اب میں تمہارے سامنے سر نہ جھکاؤں [illegible]

"ہم تمہیں ہاتھ بھی نہ لگائیں گے" وہ طنز اور تحقیر آمیز لہجے میں [illegible]

"فرماں بردار قیدیوں کے لئے یہ کمرہ پُرسکون ہے اور خود سر یہاں ہر [illegible] اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔"

"ہر چیز ٹھیک ہے او۔پی۔ون؟" واکی ٹاکی سیٹ پر پوچھا گیا۔

"قیدی سرکشی پر آمادہ ہے، تم اپنا کام شروع کرو۔" او۔پی۔ون [illegible]

"او کے۔"

اور اسی کے ساتھ چھت میں نصب صندوق سے بہت دھیمی آواز ابھرنے لگی جیسے کسی پنکھے کی موٹر گردش میں آ گئی ہو۔ اس آواز کے ساتھ زنجیر کے دونوں حصے آہستہ آہستہ اس صندوق میں رینگنے لگے۔

میرا دل یک بیک تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میری نگاہیں چھت میں ابھرے ہوئے اس شیطانی صندوق پر جمی ہوئی تھیں جس میں کوئی خودکار میکانزم پوشیدہ تھا۔

میں نے پوری قوت سے زنجیریں مٹھی میں تھامی ہوئی تھیں۔ زنجیر [illegible] ہونے کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھ آہستہ آہستہ بلند ہوتے جا رہے [illegible] چاروں گارڈز دور کھڑے دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

پھر میرے دونوں ہاتھ سر سے اوپر بالکل سیدھے ہو گئے مگر زنجیریں بدستور مختصر ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے آہستہ آہستہ پنجوں کے بل اٹھنا [illegible] کر دیا۔ میری کوشش یہ تھی کہ اوپر اٹھتے وقت میرے شانوں پر کم سے کم زور آئے۔ میری مٹھیوں میں دبے ہوئے حصے اور ہتھکڑیوں کی درمیانی زنجیر کے کئی کئی فٹ طویل ٹکڑے میرے پہلوؤں پر آزادانہ جھول رہے تھے

جب میں پنجوں کے بالکل سروں پر کھڑا ہو گیا تو میری مٹھیوں پر زور آنا شروع ہوا اور میں فضا میں معلق ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت تقریباً میرا آدھا بوجھ مٹھیوں پر منتقل ہو چکا تھا کہ اچانک زنجیریں میری گرفت سے نکل گئیں۔ میرے حلق سے تیز دہشت زدہ چیخ نکلی اور میں اچھل کر چاروں خانے چت نرم گدے پر گر پڑا۔

چند ثانیوں تک میں سمجھ ہی نہ سکا کہ کیا ہوا ہے۔ دہشت اور آسیب زدگی کے عالم میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میری پھٹی پھٹی نگاہیں چھت میں نصب صندوق پر جمی ہوئی تھیں۔ زنجیروں کے غائب ہوتے ہوئے سرے اب رک چکے تھے البتہ میرے گرنے کے جھٹکے سے زنجیریں ابھی تک جھول رہی تھیں اور میرے پورے بدن میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ رہی تھی۔

"سسٹم ری سٹ کر کے اسٹارٹ کرو" او۔پی۔ون نے واکی ٹاکی سیٹ پر کہا۔

کمرے میں ایک بار پھر گھوں گھوں کی ہلکی سی آواز گونجنے لگی اور چھت میں لگا ہوا صندوق دھیرے دھیرے آہنی زنجیریں نگلنے لگا۔

"جو حکم دیا گیا تھا اس پر عمل کرو ورنہ طاقتور برقی جھٹکے تمہارے بدن سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیں گے۔" دوسرے گارڈ کی کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

برقی جھٹکے کا نام آتے ہی میرے اعصاب پر دہشت سوار ہو گئی۔ میں بوکھلاہٹ کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے کے وسط میں مقررہ جگہ پر دونوں ہاتھ بلند کر کے کھڑا ہو گیا۔

دونوں ہتھکڑیوں سے منسلک زنجیریں مختصر ہوتی رہیں اور جب زنجیروں کا جھول ختم ہو گیا تو یک بیک گھوں گھوں کی آواز رک گئی۔

او۔پی۔ون ایریل دبانے کے بعد واکی ٹاکی دوبارہ جیکٹ کی جیب میں رکھ چکا تھا۔ اس بار وہ مجھ سے مخاطب ہوا "ہر آٹھ گھنٹے بعد یہ زنجیریں دو گھنٹے کے لیے خود بخود ڈھیلی ہوں گی۔ اس دوران تم آرام کر سکتے ہو۔ کھانا مین وقت آئے گا۔ باتھ روم سامنے کونے میں ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ ان زنجیروں پر تم نے زور آزمائی کی ذرا بھی کوشش کی تو شدید برقی جھٹکا تمہارا استقبال کرے گا۔"

"مگر اس زنجیر کے ساتھ میں باتھ روم تک کیسے پہنچ سکوں گا؟"

"جب زنجیریں ڈھیلی ہوں گی تو تم بآسانی وہاں تک پہنچ سکو گے۔"

پھر وہ چاروں وہاں سے لوٹ گئے۔ میں نے باہر سے ذیلی کھڑکی مقفل ہونے کی آواز سنی اور ان چاروں کی وزنی آہٹیں دور ہوتی چلی گئیں۔

گو میرے دونوں ہاتھ اوپر لٹکے ہوئے تھے اور میں انہیں ذرا بھی نیچے نہ لا سکتا تھا مگر زنجیروں کے تناؤ میں اتنی گنجائش باقی تھی کہ میں آگے بڑھے بغیر اپنی جگہ پر چاروں طرف گھوم سکتا تھا۔

میں ان زنجیروں کا ایک برقی جھٹکا کھا چکا تھا اس لئے بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ دانستہ زور آزمائی تو دور کی بات ہے مجھے اپنی نادانستہ

اور غیر ارادی حرکات سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ پھر ذہن میں بیدی کا خیال در آیا۔ وہ ذہین ضرور تھا مگر شیطان سے زیادہ تخریبی رجحانات کا مالک! سائیکو فورٹ کے زیرِ زمین کمروں میں میں اس کے چند تجربات جھیل چکا تھا اور اب کمرہ نمبر دو میں قید تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ان ہولناک زنجیروں کا منصوبہ بھی بیدی کے ذہن کی پیداوار رہا ہوگا۔ وہ میرے ہاتھوں مر چکا تھا مگر اس کے تخلیق کئے ہوئے عفریت قدم بہ قدم میرا تعاقب کر رہے تھے۔

بیدی کے ہر نظام میں بجلی کی کارفرمائیاں ضرور پوشیدہ تھیں۔ اندھیری راتوں کو روشنی کی چکاچوند بخشنے اور سرد لمحوں کو حرارت کی لذت سے سنوارنے والی قوت سے بیدی نے خوفناک کام لئے تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

سائیکو فورٹ کی پوری عمارت میں شب و روز ایک خاموش سی گونج محسوس ہوتی تھی جیسے کہیں میلوں کی گہرائی میں کوئی چھوٹی سی مشین تسلسل کے ساتھ چل رہی ہو۔ گو اس موضوع پر اس وقت تک کسی سے میری بات نہیں ہوئی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ اگاٹی نامی اس جزیرے پر برقی فراہمی کا کوئی مرکزی نظام نہ ہوگا۔ ہر مرکز اپنی ضروریات کے مطابق خود بجلی پیدا کرتا ہوگا۔ اس خیال کی روشنی میں مجھے خاموش گونج کا جواز بھی نظر آتا تھا۔ شاید اسی عمارت کے کسی ساؤنڈ پروف حصے میں انجنوں وغیرہ کی مدد سے جنریٹر چلائے جاتے تھے۔ ان کا تیز شور ساؤنڈ پروف دیواروں سے گزر کر دم توڑ دیتا تھا۔ لیکن ارتعاش کی لہریں مسلسل گونج کی صورت میں ہر طرف تیرتی رہتی تھیں۔

اگر میں کسی طرح برقی فراہمی کے اس نظام کو ناکارہ یا برباد کر دینے کے قابل ہو جاتا تو سائیکو فورٹ کا ہر حفاظتی حصار، ہر قید خانہ بیکار ہو کر رہ جاتا مگر فی الحال اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ سب سے پہلے مجھے نئے جنجال سے چھٹکارا پانا تھا۔

فرانسیسی طرز کے دونوں دریچوں پر دانستہ یا نادانستہ پردے نہیں ڈالے گئے تھے۔ میں سارا دن ان ہی کی طرف منہ کئے کھڑا رہا۔ وہاں بھرپور اور سوگوار ویرانی کے سوا دن بھر کچھ نظر نہ آیا۔ آدمی کی تو پرچھائیں کا بھی پتہ نہیں تھا۔ ہاں خاردار تاروں کے پیچھے کبھی کبھار خرگوش نما خونخوار کتے ٹہلتے نظر آ جاتے تھے یا کھلے آسمان کے سائے میں اڑنے والے سمندری پرندوں کی تیز آوازیں آ جاتی تھیں۔

کھڑے کھڑے میری ٹانگیں سُن ہونے لگیں، بازو شل ہونے کے قریب تھے۔ ہاتھوں کو مسلسل اٹھائے رکھنا روئے زمین کا بدترین عذاب معلوم ہو رہا تھا مگر برقی جھٹکوں کی دہشت نے ہر چیز سہہ جانے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ دریچوں کے باہر پھیلی ہوئی دھوپ کو بڑھتے ہوئے سائے نگل گئے۔ پھر ان سایوں پر تاریکی غالب آنے لگی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کمرے میں صبح ہی سے دو ٹیوب لائٹیں روشن تھیں مگر کمرے میں موجود روشنی کے باعث مجھے باہر کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں کچھ نظر نہ آیا۔ آہنی جالیوں اور شیشے سے گزر کر پختہ فرش پر پڑنے والی روشنی اندھیرے اجالے کے اس تضاد کو اور نمایاں کر رہی تھی۔

میں کرب اور مایوسی کے عالم میں خاموش کھڑا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک ہولناک آواز گونجی اور میری نبضیں یک بیک تیز ہوگئیں۔ چھت میں نصب صندوق سے اُبھرنے والی دھیمی اور مسلسل گھُوں گھُوں کی آواز پر میں نے ہڑبڑا کر اپنا سر اوپر اُٹھایا تو بے اختیار میرے ہونٹوں سے ایک سکون آمیز مگر بے معنی آواز آزاد ہوگئی۔

میری صبر آزما مشقت کا پہلا مرحلہ بیت چکا تھا۔ شاید آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے کیونکہ اب دونوں زنجیریں آہستہ آہستہ نیچے آتی جارہی تھیں۔

اچانک میرے ذہن پر بے شمار مصروفیات نے یلغار کردی۔ کچھ دیر بعد مجھے محدود آزادی کے دو مکمل گھنٹے میسر آنے والے تھے۔ اسی وقت آہنی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھُلی، ایک بے آواز سایہ باہر پھیلی ہوئی تاریکی سے اندر داخل ہوا۔ شاید سائیکو فورٹ میں عام حالات میں بیرونی روشنیاں جلانے کا رواج نہ تھا۔

آنے والا قوی الجثہ ہندوستانی کھانے کی ٹرے فرش پر ایک طرف رکھ کر واپس چلا گیا۔ اس نے رسمی طور پر بھی میری طرف توجہ دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ذیلی کھڑکی بند ہوگئی۔

اس وقت تک زنجیریں اتنی نیچے آچکی تھیں کہ میں اپنے ہاتھ گرا سکتا تھا۔ ہاتھوں کو جنبش دیتے ہی میرے مُنہ سے کراہ نکلی۔ میرے دونوں بازو پھوڑوں کی طرح دُکھ رہے تھے اور ان میں دورانِ خون سُست پڑنے کے سبب ورم آگیا تھا۔

جُوں ہی طوالت پذیر زنجیروں نے اجازت دی میں فوراً نرم گدّے پر تقریباً گر گیا۔ آٹھ گھنٹے تو کیا میرے لئے کئی کئی دن چلتے رہنا بھی کوئی خاص کام نہیں تھا۔ ہمالیہ کی وادیوں میں اندرام کے تعاقب کے دوران، اور پھر سُندری سے ملنے پہاڑی خانقاہ کے سفر کے سلسلے میں مجھے شب و روز کی پرواہ کئے بغیر کئی کئی دن چلنا پڑا تھا۔ لیکن میں نے اتنی تکان کبھی محسوس نہ کی تھی جو گزشتہ آٹھ گھنٹوں میں مجھ پر طاری ہو چکی تھی۔

دراز ہوتی ہوئی زنجیریں جب ایک ڈھیر کی صورت میں میرے سینے پر جمع ہونے لگیں تو مجھے اُٹھ جانا پڑا۔ اور میں احتیاط سے زنجیریں فرش پر پھیلانے لگا۔ اگر ایک بار وہ اُلجھ جاتیں تو انہیں سُلجھاتے ہوئے میں نادانستہ کسی برقی جھٹکے کا شکار ہو سکتا تھا۔

او۔ پی۔ سون کے بیان کے مطابق جب زنجیر کھُلنے کا عمل موقوف ہوا تو میں بآسانی باتھ روم میں پہنچ گیا۔ مُنہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے کھانے کے برتن اُٹھائے اور شاہانہ انداز میں کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ہر چیز تازہ اور خوش ذائقہ تھی۔ البتہ ایک بات سائیکو فورٹ کے منتظمین کی ہوشیاری کا اعلان کر رہی تھی۔ پلیٹیں، چمچہ، ٹرے، پانی کی بوتل حتیٰ کہ گلاس تک پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ پلاسٹک کی یہ ہلکی پھلکی چیزیں کسی بھی طرح ہتھیار یا اوزار کے طور پر استعمال نہیں کی جا سکتی تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد میرے اعصاب پر غنودگی سوار ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ سگریٹ کی طلب نے بھی سر اُبھارا مگر وہاں تمباکو نوشی کا [illegible] بندوبست نہیں تھا۔ میں نے اپنی کلائی پر نظر ڈالی مگر وہاں ماند پڑتا ہوا ایک سفید نشان، گھڑی کی یادگار رہ گیا تھا۔ کھٹمنڈو سے نکلنے کے بعد مجھے گھڑی خریدنے یا باندھنے کی مہلت ہی نہ مل سکی تھی۔ وقت کے بارے میں [illegible] صرف اندازے سے کام لینا تھا۔ میری دانست میں زنجیریں دراز ہوئے بمشکل نصف گھنٹہ گزرا تھا گویا ابھی میرے پاس ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت باقی تھی۔

میں یہ ڈیڑھ گھنٹہ سو کر بھی گزار سکتا تھا مگر میرے ذہن پر برقی جھٹکوں کا خوف بُری طرح مسلط تھا۔ اگر میری آنکھ بروقت نہ کھُلتی تو وہ جھٹکے لازمی تھے۔ آخر میرے ذہن نے اس کا حل بھی تلاش کر لیا۔ میں نے اپنی قمیض کے دامن سے کپڑے کی ایک پٹّی پھاڑی اور باتھ روم میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے بالوں کا ایک گُچھا پٹّی کے ایک سرے میں مضبوطی سے کس دیا۔ بستر پر واپس آکر پٹّی کا دوسرا سِرا میں نے ایک زنجیر کی کڑی سے باندھ دیا۔ اب زنجیریں لپیٹنے والی چرخی چلنے کے چند ہی منٹ بعد میرے بال کھنچنے لگتے اور میں بروقت بیدار ہو سکتا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ زنجیر پر [illegible] والا وہ معمولی ساز و برقی جھٹکے کا سبب نہیں بنے گا۔

اس بندوبست کے بعد میں پیروں پر اُونی کمبل ڈال کر بستر پر دراز ہوگیا اور چند ہی منٹ میں میری آنکھ لگ گئی۔

یوں تو میں گہری نیند سویا لیکن میرے تحت الشعور پر برقی جھٹکوں کا خوف اتنی شدت کے ساتھ طاری تھا کہ جونہی میرے بالوں پر ہلکا سا کھنچاؤ آیا، میں ہڑبڑا کر بیدار ہوگیا۔ میں کسی مشینی پُتلے کی طرح مقررہ جگہ پر ہاتھ اُٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت مجھے کپڑے کی پٹّی کا خیال آیا اور میں نے پھُرتی کے ساتھ اسے زنجیر کی کڑی سے کھول دیا ورنہ وہ پٹّی میرے بندھے ہوئے بال جڑ سے اُکھاڑ لے جاتی۔

مشین کے دھیمے دھیمے شور کے ساتھ زنجیریں مختصر ہوتی رہیں۔ آخر کار مشین بند ہوگئی۔ میں ایک مرتبہ پھر آٹھ گھنٹے کے لئے قید ہوگیا تھا۔

اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے واڈیکر میرے پاس آیا۔ اس وقت میں زنجیروں کی قید میں کھڑا آرام کے تیسرے وقفے کا منتظر تھا۔

"کیا ہیڈ کوارٹرز سے میرے بارے میں احکام آگئے؟" میں نے [illegible] دیکھتے ہی سوال کیا۔

اس نے سر کو نفی میں جنبش دی اور گدّے پر آبیٹھا۔

"زنجیروں کا یہ نظام بہت خوفناک ہے، تم لوگ بھیڑیوں سے [illegible] سنگدل ہو۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے لہجے میں طنز کی بجائے شکست [illegible] کا عنصر محسوس کیا۔

"سائیکو فورٹ میں قدم قدم پر ایسے جال بکھرے ہوئے ہیں۔" واڈیکر کا لہجہ بھی چونکا دینے والی حد تک فخر یا دھمکی سے عاری تھا۔ "یہ زنجیریں [illegible] قیدی کو سدھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔"

"اور زور آزمائی کی صورت میں ہلاک بھی کر سکتی ہیں؟" میں نے [illegible] طلب لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں ـــ" وہ بدستور سنجیدہ اور پُرسکون تھا۔ "زنجیروں کے سرکٹ میں ایک ٹائم سوئچ لگا ہوا ہے۔ اگر تم ان زنجیروں پر زور آزمائی جاری رکھو تو ہر پانچ منٹ کے بعد ایک برقی جھٹکا لگتا رہے گا اور اگر تیسرے جھٹکے کے بعد بھی قیدی راہِ راست پر نہ آئے تو جھٹکا مارنے کے بجائے زنجیریں چرخی پر لپٹنے لگتی ہیں اور قیدی کو فرش سے اوپر معلق کر دیتی ہیں۔"

"شاید تم میرے پاس کسی مقصد سے آئے ہو؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں ـــ آج میں نے تمہاری پوری فائل پڑھی ہے۔" اس نے بلا تامّل جواب دیا۔ "کیا پارس پتھر کا وجود حقیقت ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہند سرکار مجھ سے اسی کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔"

"وہ میں پڑھ چکا ہوں۔" واڈیکر جلدی سے بولا۔ "پارس سیتا کے قبضے میں ہے اور وہ کہیں روپوش ہے۔ تم نے رضاکارانہ طور پر بیدی کو کیمیاگری کے ذریعے سونا بنانے کی پیشکش کی تھی۔"

میں کوئی جواب دیئے بغیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی بڑے خطرے کی خبر دے رہی تھی۔ اس وقت سیتا کا نام بھی مجھے بے چین نہ کر سکا۔

"تمہاری فائل میں بیدی کے آخری تبصرے تمہارے حق میں ہیں۔ گو اس کی رائے میں تم اوّل درجے کے مکّار اور خود غرض انسان ہو مگر بیدی کے نفسیاتی حربوں کے نتیجے میں راہِ راست پر آگئے تھے۔ مگر بیدی کی ذاتی ڈائری کے کچھ مندرجات مجھے تم تک لانے کا سبب بنے ہیں۔"

"وہ کیا؟" میں نے اپنے وجود میں خوف کی ایک سرد سی لہر سرایت ہوتی محسوس کی۔

"ابھی تک میرے سوا کوئی اور اس ڈائری سے واقف نہیں۔" واڈیکر نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اپنی موت یا قتل سے دو روز پہلے کی تاریخ میں بیدی نے تمہارے بارے میں چند خوفناک ریمارک لکھے ہیں۔ پارس پتھر کے سلسلے میں تمہاری ذات سے مایوس ہونے کے بعد وہ تمہیں ناکارہ قرار دے چکا تھا۔ مگر کیمیا کے بارے میں تمہاری پیشکش کے بعد اس نے لکھا تھا کہ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو جائے تو وہ اوپر والوں سے سفارش کرے گا کہ آپریشن کے ذریعے تمہاری دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے جوڑ سے نکال دی جائیں تاکہ معذور ہونے کے بعد تم کبھی فرار ہونے کی کوشش نہ کرو اور خاموشی سے سرکار کے لئے سونا بناتے رہو۔ اس نے تمہارے ذہن کو تابع تو کر لیا تھا مگر تمہارے رجحانات سے خائف تھا۔ اس کی رائے تھی کہ تم کسی بھی وقت سرکشی، بغاوت یا فرار پر آمادہ ہو سکتے ہو۔ اپنی موت کے باعث وہ اپنی نجی آراء کو سرکاری ریکارڈ پر منتقل نہ کر سکا ورنہ اب تک کسی آپریشن تھیٹر میں تمہاری صحت مند ٹانگیں کاٹی جا چکی ہوتیں۔"

یہ سُن کر میرا سانس سینے میں پھنسنے لگا۔ بیدی کا ہر تجزیہ اور مشورہ حیوانیت کی آخری سرحدوں کو چھُوتا تھا۔

"اب میں اس اسٹیشن کا کمانڈر ہوں۔" قدرے توقف کے بعد واڈیکر پھر بولنے لگا۔ "سپہ گری میرا آبائی پیشہ ہے اور میں اب تک میدانِ جنگ میں بے شمار دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوں۔ چند حق تلفیوں کے باوجود میں اپنی سرکار کا بھی وفادار ہوں مگر میرا ضمیر درندگی کا مخالف ہے۔ تم میرے قومی مجرم اور قاتل ہی سہی مگر میں تمہیں معذور کرنے کی تجویز پر صاد کرنے پر خوش نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہیں پھانسی چڑھا دیں، قید کریں یا رہا کر دیں۔ ان تین کے سوا ہر صورت حیوانیت کے راستے پر لے جاتی ہے۔ اگر تم مجھ سے کھُلے دل سے عہد کرو کہ جب تک میں اس اسٹیشن کا کمانڈر ہوں تم میرے احکام کی بے چوں و چرا تعمیل کرو گے تو میں بیدی کی نجی ڈائری جلا دوں گا ورنہ اسے بھی سرکاری ریکارڈ میں شامل کر دوں گا۔"

میرے دل میں بے اختیار واڈیکر کے لئے عزت و احترام کے جذبات اُمڈ آئے۔ وہ صحیح معنوں میں سچا اور رسیدہ سپاہی تھا جو ظالم کے ٹکڑے اُڑا دیتا ہے مگر مجبور کو سہارا دیتا ہے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم عظیم انسان ہو واڈیکر ـــ میں غلام کی طرح تمہارے ہر حکم کے سامنے سر جھکاتا چلا جاؤں گا۔ تم میرے دشمن ہی سہی مگر میں شریف دشمن کا بھی احترام کرتا ہوں۔"

"شکریہ۔" واڈیکر نے سرسری لہجے میں کہا۔ "مگر مجھ سے کسی ناجائز فائدے کی اُمید نہ رکھنا۔ میرا اور تمہارا رشتہ صرف فاتح اور مفتوح کا ہے۔ اگر تم نے سرکار کے مفادات سے ٹکرانے کی کوشش کی تو تمہارے سینے میں اُترنے والی پہلی گولی میری ہوگی۔"

"میرے لئے یہی ایک رعایت بہت بڑی ہے کہ میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہونے سے بچ گیا ہوں۔ اگر تم زندگی بھر بھی سائیکو فورٹ کے کمانڈر رہے تو مجھے اپنا غلام پاؤ گے۔"

وہ مزید کچھ کہے بغیر اُٹھا اور چلا گیا۔

اپنی جدّوجہد اور مہم جُوئی سے بھرپور زندگی میں کراچی سے ہمالیہ اور پھر اگاکی تک مجھے اپنے جتنے دشمن ملے وہ کم ظرف اور غیر اصولی تھے۔ ہر ایک اپنے محدود مفادات کی خاطر میری جان کا خریدار بنا پھرتا تھا مگر اس سیاہ فام مدراسی نے میرے احساس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنے عہدے اور ذمّہ داریوں کے لحاظ سے اس وقت وہ میرا جانی دشمن تھا لیکن بیدی کی ایک خفیہ تجویز سامنے آجانے پر اس نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور کھُلے دل سے ساری بات مجھے بتا دی۔ سیتا کے بعد وہ پہلا آدمی تھا جس کے لئے میں نے عزت، احترام اور محبت کا جذبہ اپنے دل میں اُبھرتا محسوس کیا۔

نہ جانے وہ قسمت کی مہربانی تھی یا نامہربانی کہ اگلی صبح مجھے ایک سنسنی خیز اطلاع ملی۔ شاید کاتبِ تقدیر کو یہ پسند نہ آیا کہ میں کرنل واڈیکر سے شریفانہ سمجھوتہ کے بعد سکون کے ساتھ انڈین سیکرٹ سروس کی قید جھیلتا رہوں۔ تقدیر مجھے ہر آن جدّوجہد میں مصروف دیکھنا چاہتی تھی۔

اس صبح میں زنجیروں کی قید سے دو گھنٹے کی آزادی کی مہلت بستر

پرواز ہو کر گزار رہا تھا کہ آہنی پھاٹک پر کچھ آوازیں سنائی دیں اور کرنل واڈیکر اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ بھنچے بھنچے ہونٹوں اور مشتعل نگاہوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کسی بات پر کھول رہا ہے۔ میں اس کے احترام میں اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں جا رہا ہوں صفدر!" واڈیکر نے سخت اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"کہاں کرنل؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا انڈین آرمی میں فوری تبادلہ کر دیا گیا ہے۔" اس کی دھیمی آواز کی گہرائی میں غصے کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ "انڈین سیکرٹ سروس والوں کی نظر میں میری وفاداریاں مشکوک ہیں۔ میں ماتحت تو رہ سکتا ہوں مگر سائیکو فورٹ کا کمانڈر نہیں بن سکتا۔"

اس لمحے مجھے کرنل واڈیکر پر بہت رحم آیا۔ ملازمت کے سلسلے میں بعض لوگ پیدائشی طور پر بدنصیب ہوتے ہیں۔ جب آرمی میں اس کی ترقی کا معاملہ سامنے آیا تو اسے بے رحمانہ طریقے پر انڈین سیکرٹ سروس میں بھیج دیا گیا اور جب یہاں اس کے قدم جمنے لگے تو فٹ بال کی طرح ٹھوکر مار کر اسے واپس کیا جا رہا تھا۔

"مجھے تمہاری مختصر رفاقت ہمیشہ یاد رہے گی کرنل۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ "اور شاید اب میں سائیکو فورٹ میں تم سے کئے ہوئے معاہدہ کا پابند بھی نہیں ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "میری طرف سے تم پر اب کوئی پابندی نہیں ہے۔"

میں نے چند ثانیوں تک تذبذب کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے قریب جا کر سرگوشیانہ مگر سفاک لہجے میں پوچھا "جسپال؟"

اس نے میرا مفہوم پا لیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس مرتبہ واڈیکر کا مستقبل تباہ کرنے کی پوری ذمے داری جسپال پر تھی۔

اس کے بعد ہم دونوں کی الوداعی نظریں ملیں اور واڈیکر دل شکستہ وہاں سے لوٹ گیا۔

سائیکو فورٹ پر کرنل واڈیکر کا جانشین پاٹھک رائے تھا۔ اول درجے کا کمینہ، خود غرض اور انا پسند آدمی۔ دوسروں کے بارے میں ہتک آمیز گفتگو کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ان دنوں سائیکو فورٹ میں میری ذات شاید ضرورت سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی کیونکہ صبح واڈیکر سے ملاقات کے بعد سرِ شام میرے کمرے میں چھ مسلح اور تنومند محافظ آ پہنچے۔

اس وقت زنجیریں تنی ہوئی تھیں اور میں دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے مجبوری کی حالت میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ سب مجھ سے تھوڑی دور رک گئے۔ بار بار ان کی نظریں اپنی گھڑیوں پر جا رہی تھیں۔ شاید وہ کسی مقررہ وقت پر کسی خاص واقعے کے منتظر تھے۔

ان کے انتظار کا سبب مجھ پر اس وقت واضح ہوا جب آٹھ گھنٹے کی مدت پوری ہونے سے بہت پہلے خلافِ معمول مشین چل پڑی اور دونوں زنجیریں ڈھیلی ہونے لگیں۔

جب تک مشین بند نہ ہوئی وہ سب مستعد اور چوکنے انداز میں اپنی جگہوں پر کھڑے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے جیب سے چابیاں نکال کر میرے ورم آلود ہاتھ ہتھکڑیوں سے آزاد کئے۔ ابھی میں اطمینان کا پہلا سانس لے بھی نہ پایا تھا کہ اسی دیو ہیکل محافظ نے پھرتی کے ساتھ میری ٹانگوں میں اپنی ٹانگیں پھنسا کر کسی مویشی کی طرح گدے پر گرا دیا۔

میرے حلق سے چند غضبناک غراہٹیں نکلیں اور نادر الوجود گالیاں بھی مگر جب تک میں اس افتاد کو سمجھ کر کسی باقاعدہ جسمانی مزاحمت کا آغاز کرتا وہ سب مجھے اپنے ساتھ لائے ہوئے نائیلون کے ایک بڑے سے تھیلے میں ڈال چکے تھے اور اس کا منہ باندھ رہے تھے۔

اس سلوک پر میری کھوپڑی بھنا اٹھی مگر اب چیخ و پکار بے سود تھی مجھے جو کچھ کرنا تھا اس کے لئے تھیلے سے رہائی کا انتظار ضروری تھا۔ میں تن بہ تقدیر خاموش ہو گیا۔

پھر تھیلے کا سفر جاری ہوا۔ تھوڑی دیر بعد تھیلا نیچے رکھ دیا گیا اس کے ساتھ کسی کی تحسین آمیز آواز میرے کانوں میں آئی جو میرے لانے والوں سے مخاطب تھی۔

ایک جھٹکے کے ساتھ جب تھیلے کا منہ کھلا تو میں اچھل کر باہر آ گیا۔ چند ثانیوں تک تیز روشنی کے باعث مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ میں کہاں ہوں اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جب آہستہ آہستہ چندھیائی ہوئی آنکھیں تیز روشنی سے مانوس ہوئیں تو مجھے پتہ چلا کہ میں ایک بڑے کمرے میں موجود ہوں پورے فرش پر نرم اور دبیز قالین بچھا ہوا تھا کمرے کی عقبی دیوار میں تیز لائٹیں اس طرح نصب تھیں کہ ان کے نیچے کمرے کا ایک حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باقی کمرہ تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ میں اور مجھے لانے والے چھ گارڈز روشنی میں کھڑے تھے۔ دیواروں وغیرہ سے منعکس ہونے والی روشنی گو قطعی ناکافی تھی مگر پھر بھی کمرے کے تاریک حصے میں ایک بڑی میز کا ہیولا محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میز کے عقب میں ایک سگریٹ کا دھواں اگلتا ہوا انگارہ سراواں کسی شخص کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا اور دھواں صاف ہوا تو مجھے مخصوص بلندی پر دو چمکدار آنکھیں بھی نظر آ گئیں۔ وہ جو بھی تھا میز کے عقب میں اپنی کرسی پر براجمان تھا۔

"صفدر علی! تم جہاں ہو وہیں رکے رہو گے۔ اگر تم نے میری طرف آنے کی کوشش کی تو چند گرام پگھلا ہوا سیسہ تمہارا استقبال کرے گا۔" میز کے عقب سے دھمکی آمیز مکارانہ آواز ابھری

"تم کون ہو؟" میں نے بے دھڑک سوال کیا۔

"پاٹھک رائے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں بیدی اور واڈیکر کی طرح عقل سے محروم نہیں ہوں۔ کچھ لوگ تمہیں ہر قیمت پر زندہ دیکھنے کے متمنی ہیں اور میں تمہیں زخمی کر کے اوپر والوں کے احکام کی خلاف

ورزی کا مرتکب نہیں ہوں گا۔" وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہوا پھر گارڈز سے بولا۔ "تم لوگ فی الحال گارڈ روم میں ٹھہرو۔"

قالین پر ان کی ایڑیوں نے ہم آہنگ مگر ہلکی سی دھمک پیدا کی اور وہ قطار کی صورت میں کمرے سے باہر نکل گئے۔ خودکار دروازہ ان کے جاتے ہی خود بخود بند ہو گیا۔

"تم نے مجھے یہاں بلانے کے لئے جو وحشیانہ طریقہ اختیار کیا ہے میں اس کی شکایت سائیکو فورٹ کے کمانڈر سے ضرور کروں گا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہی سائیکو فورٹ کا نیا سربراہ ہے۔

"میں تمہاری شکایت مسترد کرتا ہوں کیونکہ میں خود اس اسٹیشن کا سربراہ ہوں۔ کرنل واڈیکر اپنی حماقتوں سمیت واپس کیا جا چکا ہے اور اب تمہیں یہاں کوئی رعایت حاصل نہ ہو گی۔ واقعات اور حالات کی روشنی میں سیکرٹ سروس ہائی کمان تمہیں ڈاکٹر بیدی کے وحشیانہ قتل کا مجرم قرار دے چکی ہے اور تمہیں تیسرے درجے کے ایک قیدی کی طرح ہر حکم کی تعمیل کرنا ہو گی۔"

"یہ میرے لئے کوئی نئی اطلاع نہیں ہے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "قیدی صرف قیدی ہوتا ہے، اس کا کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ میں مہینوں قبل سائیکو فورٹ میں اپنی قیدی کی حیثیت تسلیم کر چکا ہوں اور اگر تمہیں بتایا گیا ہو تو تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں حکم کی تعمیل سے بڑھ کر رضاکارانہ تعاون کرتا رہا ہوں۔"

"یہ تمہاری چال تھی جسے بیدی نہ سمجھ سکا اور اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔" وہ دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسی لئے کہا کہ میں نہ بیدی ہوں اور نہ واڈیکر۔"

"جو بھی ہو خوبصورت ضرور ہو۔" میں اس کی بکواس پر اپنا زہریلا تبصرہ ضبط نہ کر سکا۔ "ورنہ اتنی احتیاط سے اندھیرے میں نہ سجائے گئے ہوتے۔"

وہ طیش میں آنے کے بجائے زور سے ہنسا۔ "جب تم مجھے جان لو گے تو ایسے الفاظ کے تصور ہی سے تمہاری روح لرزنے لگے گی۔ فی الحال میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

"مجھے یہاں کیوں طلب کیا گیا ہے؟"

"تبدیلیوں سے آگاہ کرنے کے لئے۔" وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "آج کی رات تم بستر پر گزارو گے۔ کل سے یہاں ایک تجربہ گاہ کی تیاری شروع ہو جائے گی جہاں تم سونا بنانا شروع کرو گے۔"

"کیا نمونوں کی رپورٹ آ گئی؟" میں نے خوشی سے پوچھا۔

"وہ اپنے وقت پر آئے گی۔" پاٹھک رائے کا لہجہ خشک تھا۔

"سیتا کا کچھ سراغ ملا؟" میں نے پژمردہ لہجے میں پوچھا۔ پاٹھک کا بار بار بدلتا ہوا رویہ مجھے مایوسیوں کی نوید دے رہا تھا۔ وہ غیر معمولی حد تک تلون مزاجی کا شکار معلوم ہوتا تھا۔

"جس روز سیتا اور پارس پتھر مل گیا اس روز تمہیں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے پہنچا دیا جائے گا۔ لہٰذا آئندہ یہ احمقانہ سوال دہرانے کی ضرورت نہیں۔"

تاریک میز کے عقب میں پاٹھک کے ہاتھ کا سایہ جنبش میں آیا۔ شاید اس نے کوئی بٹن وغیرہ دبایا تھا کیونکہ فوراً ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور گارڈز کا دستہ دوبارہ اندر گھس آیا۔

"قیدی کو کمرہ نمبر بیالیس میں پہنچا دو۔" پاٹھک نے انہیں حکم دیا۔

"او کے سر!" محافظوں میں سے ایک نے کہا اور میں گارڈز کی کسی ہدایت کے بغیر ہی کمرے سے واپس چل دیا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس بار مجھے تھیلے میں ٹھونس کر لے جانے کے بجائے اپنے پیروں پر چلنے کی آزادی تھی۔ اور میں مزید بحث میں الجھ کر اس آزادی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح مجھے کم از کم پاٹھک رائے کے کمرے کا محلِ وقوع معلوم ہو سکتا تھا۔

بظاہر سائیکو فورٹ میرے لئے ناقابلِ شکست آہنی حصار بنا ہوا تھا۔ اس کے کسی نظام میں رخنہ ڈالنا قریب قریب ناممکن سا نظر آ رہا تھا مگر اس کے باوجود بیدی پر میرا وار چل گیا تھا۔ اگر کسی مرحلے پر مجھے ذرا بھی ڈھیل ملتی تو کم از کم میں براہِ راست پاٹھک کے کمرے پر پہنچ کر اسے یرغمال بنا سکتا تھا کیونکہ کسی یرغمال کے بغیر سائیکو فورٹ میں مجھے اپنی دال گلتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

محافظ شاید میرا ذہن پڑھنے پر بھی قادر تھے کیونکہ دروازے سے باہر آتے ہی ان میں سے ایک نے اپنی جیب سے ایک سیاہ پٹی نکالی اور میری آنکھوں پر کس دی۔ میں نے اس کارروائی پر ذرا بھی برہمی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اس موقع پر ذرا سی غلط حرکت مجھے دوبارہ برق پاش زنجیروں والے کمرے میں پہنچانے کا بہانہ بن سکتی تھی جبکہ میرے ورم آلود بازو آرام کے طلبگار ہو رہے تھے۔ کئی روز کی مسلسل مشقت کے نتیجے میں میری دونوں بغلوں میں غدود ابھر آئے تھے جو ہاتھ گرانے پر تکلیف دے رہے تھے۔

وہ رات میں نے اسی خوابگاہ میں بے خبر سوتے گزاری جہاں اب تک سے قبل مہینوں رہتا آیا تھا۔ شاید وہی کمرہ سائیکو فورٹ میں بیالیسواں کمرہ کہلاتا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے قریب پھر میری طلبی ہوئی۔ اس بار مجھے ڈرائنگ روم کے طرز پر آراستہ ایک پُرتکلف کمرے میں پہنچایا گیا جہاں چند لوگوں کے درمیان ڈاکٹر رامانند بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بوڑھا ایک والہانہ جذبے سے میری طرف لپکا۔

"ارے لڑکے! تو نے میری نیند اڑا دی ہے۔ وہ دونوں نمونے یکساں ہیں۔۔۔۔ بالکل اصلی سونے سے مشابہ۔ میری تجربہ گاہ انہیں پارس کا سونا ثابت کر چکی ہے۔" وہ پُرجوش انداز میں میرا شانہ دباتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے دکھتے ہوئے شانے پر سے ہٹا دیا اور پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ بولا "مجھے خوشی ہے کہ آپ کی تجربہ گاہ

نے میرے تجربے کو تسلیم کر لیا۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟" وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک صوفے پر اپنے پہلو میں بٹھاتے ہوئے بولا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے ناقابلِ بیان جوش اور حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"آگ، تانبہ، پارہ اور چند جڑی بوٹیاں میرے تجربے کا نچوڑ ہیں۔" میں نے وہاں موجود اجنبی چہروں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پورا یقین ہے کہ ان چیزوں کے سوا تمہارے تجربے میں کوئی اور عنصر شامل نہیں تھا؟" رامانند کا علم اور اس کی سائنسی منطق ٹھوس ثبوت کے باوجود میرے کام میں کوئی ناکام پہلو تلاش کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔

"بالکل اتنا ہی جتنا آپ کے ہونے یا ڈاکٹر بیدی کے نہ ہونے کا یقین ہے۔"

"ڈاکٹر بیدی؟" رامانند اس غیر متعلقہ تبصرے پر بُری طرح چونکا۔ "تو کیا اس تجربے میں وہ تمہارا نگران تھا؟ وہ کس مضمون کا ڈاکٹر تھا؟"

"نگراں ضرور تھا مگر اس کا اور میرا رشتہ استاد شاگرد کا نہیں تھا۔ وہ اس عمارت کا اور اس اسٹیشن کا سربراہ تھا اور میں اس کا قیدی۔ اس نے نفسیات کے شعبے میں ڈاکٹریٹ کیا تھا مگر بدقسمتی کہ اس تجربے کے دوران وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔" میں نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اوہ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ شاید میں اس سے نہیں ملا تھا۔" رامانند کے پُرجوش چہرے پر سوگواری بکھر گئی۔

"یہ میری زندگی کا بدترین حادثہ تھا ڈاکٹر صاحب۔" میں فوری طور پر سوچے ہوئے منصوبے کے تحت بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "گو میں ڈاکٹر بیدی کا قیدی تھا مگر طویل قید میں وہ میرا گہرا دوست بن گیا تھا۔"

"ڈاکٹر رامانند کا وقت ضائع نہ کرو صفدر علی۔" گندمی رنگت والے ایک دراز قامت شخص نے قدرے تلخ لہجے میں دخل اندازی کی اور میں اس کی آواز پہچان گیا۔ وہ یقینی طور پر پاٹھک راٹے ہی تھا۔

"پاٹھک صاحب! ڈاکٹر رامانند اپنے وقت کا خود بھی احساس رکھتے ہیں۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھا سر آپ نے۔" پاٹھک نے شکایتی لہجے میں اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک وجیہہ مگر ادھیڑ عمر شخص سے کہا جس کی بڑی بڑی آنکھیں شروع ہی سے خمار آلود نظر آ رہی تھیں۔ "یہ ضرورت سے زیادہ سرکش ہے شاید اسے یہ بات اچھی طرح سمجھا دی گئی ہے کہ یہ ہر بدزبانی کے لئے آزاد ہے۔ ہم خواہش کے باوجود اسے کوئی کڑی سزا نہ دے سکیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ سائیکو فورٹ میں مجھ پر ہر بدترین سزا آزمائی گئی ہے۔" میں ڈاکٹر رامانند کو کسی نہ کسی طرح اپنی بے پناہ مظلومیت کا احساس دلانے پر تُلا ہوا تھا۔ "شب و روز ہاتھ اُٹھا کر کھڑے رہنے کے سبب میرے ہاتھ ابھی تک ورم آلود ہیں۔ میری بغلوں میں غدود اُبھر آئے ہیں۔ برقی جھٹکوں نے میری اعصابی قوت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اب یہی کسر رہ گئی ہے پاٹھک صاحب! کہ آپ مجھے پھانسی پر چڑھا دیں۔"

"صفدر! ہوش میں رہ کر بات کرو۔" خوابناک آنکھوں والا وجیہہ شخص تلخ لہجے میں بولا۔ "قتل کے مجرم کے لئے ہند کے قانون میں پھانسی کا پھندا ہے۔ یہ ہماری بہت بڑی رعایت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔"

"مگر میں نے کسے قتل کیا ہے؟" میں نے بے بسی کے ساتھ باری باری ان چاروں کی طرف دیکھا جیسے کوئی معصوم سا ہرن خونی بھیڑیوں کے غول میں گھر گیا ہو۔

"ڈاکٹر بیدی کو ــــ اس کا وحشیانہ قتل تم نے کیا تھا صفدر علی!" وہ صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"مگر وہ حادثہ تھا جناب!" میں مدافعانہ لہجے میں کراہا۔

"کوئی احمق ہی اسے حادثہ تسلیم کرے گا۔ ہمارے ماہرین نے اسے قتل کی واردات ثابت کیا ہے۔ ان کے پاس ناقابلِ تردید دلائل موجود ہیں۔" وہ بلند آواز میں بولا۔

"آپ بااختیار ہیں اور میں محکوم و مجبور۔" میں سر جھکا کر بولا۔ "اگر آپ چاہیں تو مجھے دوسری جنگِ عظیم میں بے شمار مرنے والوں کا قاتل بھی قرار دے سکتے ہیں۔"

"شٹ اپ!" وہ مُٹھیاں بھینچ کر چیخا۔ اس کی خوابناک آنکھوں میں یکایک بے رحمانہ چمک کوندنے لگی جیسے موقع پاتے ہی وہ میرا نرخرا چیر دے گا۔

"صفدر! تم گفتگو کے آداب سے ناواقف ہو۔" بات بگڑتے دیکھ کر رامانند جلدی سے بولا۔ "سیکرٹ سروس کے سربراہ سے تمہیں تمیز سے بات کرنی چاہیئے۔"

"سربراہ!" میرے منہ سے تحیّر آمیز آواز اُبھری اور میری نگاہیں اس خوابناک آنکھوں والے کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

"ہاں ــــ جنرل گوندہ سیکرٹ سروس کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ ہم چند مسائل طے کرنے آئے ہیں اور تم دشواریاں پیدا کر رہے ہو۔" ڈاکٹر رامانند کا لہجہ میرے لئے ملامت آمیز تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں جنرل۔" میں نے کمزور آواز میں کہا۔ "سائیکو فورٹ کی قید نے ذہنی طور پر مجھے بالکل ناکارہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"اگر ابھی سے تمہارا یہ حال ہے تو تم منصوبہ آگے کیسے بڑھا سکو گے؟" چوتھا اجنبی جو ابھی تک خاموش بیٹھا ہوا تھا، پہلی بار بولا۔ "سونے کی تجارتی پیمانے پر تیاری کیسے ممکن ہو گی؟"

"وہ بعد کی بات ہے لالہ جی!" ڈاکٹر رامانند نے ہاتھ اُٹھا کر بات کاٹ دی اور مجھ سے بولا۔ "سنو صفدر! میں نے دونوں نمونوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے یکساں ہیں طبعی اور کیمیائی خواص میں دو نمونے سونے کے ثابت ہوئے ہیں۔ جوہری ساخت میں بھی کوئی فرق نہیں ہے البتہ میری آنکھوں نے ایک فرق محسوس کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میرا وہم ہو کیونکہ کوئی آلہ میرے وہم کی تصدیق نہیں کر سکا۔ آلات کے مطابق دونوں نمونوں کا نقطۂ پگھلاؤ

۱۰۶۳ ڈگری سنٹی گریڈ تھا مگر حرارت ماپنے کا کوئی آلہ دو درجے اعشاریہ سے زیادہ نہیں پڑھ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک نمونے کا درجۂ پگھلاؤ معیار کے مقابلے میں ایک سنٹی گریڈ کا چند ہزارواں حصہ زیادہ تھا۔"

"آپ کا خیال درست ہے ڈاکٹر۔" میں دل ہی دل میں رامانند کے بے پناہ مشاہدے کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ جہاں جدید دَور کے حساس ترین سائنسی آلات کام نہ کر سکے وہاں رامانند کی نگاہیں پہنچ گئیں۔ "میں نے آپ کو دو نمونے دیئے تھے۔ ان میں سے ایک خالص سونا تھا، دوسرا اصل سونے اور میرے بنائے ہوئے سونے کا ایک متناسب مرکب تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ مصنوعی سونے کے وجود سے لاعلم ہوتے تو یہ فرق سامنے نہیں آتا۔"

"ناممکن تھا۔" رامانند نے وثوق سے کہا۔ "اور اب بھی میں اسے فرق تسلیم نہیں کرتا۔ بس ایک احساس ہے، ہو سکتا ہے کہ فریبِ نظر ہو۔"

"یہ آپ کا انکسار ہے ڈاکٹر۔"

"میں نے دونوں نمونوں کے کچھ حصے دو بڑی تجربہ گاہوں میں بھیجے ہیں۔ جب تک امریکی خلائی تحقیقاتی ادارے، ناسا اور برطانوی رائل کالج کی تجربہ گاہوں سے تجربے کی تفصیلات نہ آ جائیں، میں سونے کی تجارتی پیمانے پر تیاری کے حق میں نہیں ہوں۔"

"میں حکم کا غلام ہوں۔"

"ڈاکٹر رامانند کی خواہش ہے کہ ایک مرتبہ تم یہ تجربہ ان کی موجودگی میں دُہراؤ۔ ان کی اس خواہش کو اعلیٰ ترین سرکاری حلقوں کی تائید حاصل ہے۔" لالہ نے کہا۔

"کیا میرے تجربے پر کوئی شک کیا جا رہا ہے؟" میں نے انہی سے سوال کیا۔

"نہیں ــــ ہرگز نہیں۔" رامانند جلدی سے بولا۔ "میں خالص علمی نقطۂ نظر سے اس تجربے کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ دنیا کی تاریخ کا ایک انقلاب انگیز کارنامہ ہے۔"

"میں آپ کے سامنے بے علم انسان ہوں۔ تحقیقی کاموں میں میرا ملوّث ہونا محال ہے۔"

"تحقیق کی بات نہیں کر رہا۔" ڈاکٹر رامانند مسلسل میری دلجوئی میں لگا ہوا تھا۔ "تم اپنا کام کرتے رہنا۔ میں دخل دیئے بغیر دیکھتا رہوں گا۔"

"پھر میں تیار ہوں۔"

"کام کب سے شروع کرو گے؟" رامانند کی آنکھوں میں اشتیاق کے دیپ جل اُٹھے۔

"سامان مل جانے پر منحصر ہے، میں تو ابھی تیار ہوں۔"

"کیسا عجیب تصور ہے۔" ڈاکٹر رامانند خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "نہ کسی ایکسلریٹر کی ضرورت، نہ کروڑوں کا صرفہ، نہ تابکار شعاعوں کا خوف اور پھر ایک عنصر کی جوہری ماہیت دوسرے جوہر میں بدل جاتی ہے۔ ایسا کفایت شعار اور نفع بخش طریقہ جدید سائنس تو کبھی نہ دریافت کر سکے گی۔" پھر چونک کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ علم تم نے کہاں سے اور کیسے حاصل کیا تھا؟"

"ایک بوڑھے شخص سے جو ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں گھسا شب و روز خون تھوکتا اور کھانستا رہتا تھا۔" میں نے محفل پر حاوی بازیگر کے سے اعتماد سے کہا۔ "اور پھر اپنے ایک پیشہ ور رقیب کے ہاتھوں ناگہانی موت کا شکار ہو گیا تھا۔"

"کوئی جوگی؟"

"نہیں ــــ وہ ایک مسلمان فقیر تھا۔" میں پوری گفتگو میں پاکستان کے ذکر سے دامن بچاتا رہا ورنہ اپنے بدنصیب استاد جمال کا ذکر کرتے ہوئے میری نظروں میں کراچی کی بستی لیاقت آباد کے وہ شب و روز گھوم رہے تھے جب میں فردوس سینما سے ملحقہ پُراسرار گلیوں میں چھپا جمال کے ساتھ کیمیاگری کرتا رہتا تھا۔

"بچپن میں ہندو جوگیوں وغیرہ کے بارے میں، میں نے بہت سی کہانیاں سُنی تھیں کہ وہ سونا بنا لیتے ہیں۔" ڈاکٹر رامانند کا تصور اسے برسوں پیچھے دھکیل لے گیا۔ "مگر یہ کہانیاں میرے لئے کبھی حقیقت نہ بن سکیں پھر جب میں نے سائنس کی ٹھوس حقیقتوں کا مطالعہ کیا تو یہ کہانیاں بکھر گئیں۔ رُوئے زمین پر جتنے بھی عناصر پائے جاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی واضح اور الگ نشانیاں ہیں، الگ مزاج ہے، الگ خواص ہیں۔ ہر عنصر کا ایٹم اپنی انفرادی ساخت رکھتا ہے اور اس ایک ننھے سے ایٹم میں ناقابلِ دید ذرّات کی ایک پوری کائنات متحرک ہوتی ہے۔ ہر ایٹم اپنے نظامِ شمسی سے کسی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے مرکز میں نیوٹرون، پوزیٹرون ہوتے ہیں مثبت برقی بار والے پروٹون ہوتے ہیں جن کے باہر کئی مستقل دائروں میں منفی بار والے الیکٹرون شب و روز دیوانہ وار گردش کرتے رہتے ہیں۔ تمہیں ہر ٹھوس چیز ساکن نظر آتی ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ اس ننھے سے وجود میں اربوں ننھے ننھے ذرّات رقصاں اور گرداں ہیں۔ اس پورے نظام میں ایک ناقابلِ شکست مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو اس نظام کو ہم آہنگ رکھتی ہے۔ اگر یہ قدرتی کشش نہ ہو تو لوہا لمحہ بھر میں خود بخود کبھی سونا بن جائے، کبھی سیسے کا روپ دھار لے اور کبھی چاندی کا نکھار دکھانے لگے۔ مگر یہ ناممکن ہے۔ ان ذرّات کی یہ باہمی کشش اتنی شدید ہوتی ہے کہ صرف تابکار شعاعوں کی ہولناک بوچھاڑ ہی اس کا خاتمہ کر سکتی ہے اور یہ کام کھلی فضا میں نہیں ہوتے...... مگر تمہارے تجربے نے ان سب حقیقتوں کو جھٹلا دیا ہے صفدر! اگر تم سے یہ کارنامہ ایک بار سرزد ہوتا تو میں اپنے علمی عقیدے کی نفی کرتے ہوئے اس کو معجزہ کہہ دیتا مگر...... مگر تمہارا تو دعویٰ ہے کہ تم حسبِ مرضی جب چاہو اور جتنا سونا چاہو بنا سکتے ہو۔ تمہارے اس دعوے نے میرا علمی غرور خاک میں ملا دیا ہے۔" عینک کے موٹے موٹے عدسوں کے پیچھے بوڑھے رامانند کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ "میں نے باون برس کی علمی ریاضت کے بعد جو کچھ سیکھا تم نے اسے بے حقیقت بنا کر

رکھ دیا ہے مگر۔۔۔ مگر میں ایک بار اپنی آنکھوں سے تمہارا پورا تجربہ کامیاب ہوتا دیکھ لوں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے باون برس جھوٹے سراب کا پیچھا کرنے کے بعد چند لمحوں میں علم کی سچائیاں پالی ہیں۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب ــــ میرا تجربہ آپ کے علم کی توہین نہیں ہے۔" رامانند جذباتی ہوتا جا رہا تھا لہٰذا اسے قابو میں رکھنے کے لئے مجھے بولنا ہی پڑا۔ "علم تو تجربہ کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور تجربہ ہر لمحے نئی سچائیاں سامنے لاتا ہے۔ اگر یہ عمل رُک جائے تو ساری ترقیاں ایک نقطے پر رُک کر رہ جائیں۔"

"صفدر علی!" جنرل گوندہ کی پاٹ دار آواز نے مجھے عرش سے فرش پر کھینچ لیا۔ "ڈاکٹر رامانند کی نظروں میں تم ایک باصلاحیت آدمی ہی سہی مگر سیکرٹ سروس کے لئے تم محض ایک مجرم ہو کئی انسانوں کے قاتل! مجھے اُمید ہے کہ تم اپنی یہ دوہری حیثیت ہر وقت یاد رکھو گے۔ اگر تمہاری حماقتوں کی وجہ سے کسی وقت انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا تو پورا حق ہمیں حاصل ہوگا اور ہم تمہیں صرف قاتل سمجھتے ہیں۔"

"کئی انسانوں کا قاتل؟" ڈاکٹر رامانند نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دہرایا۔ "لڑکے! جنرل تمہارے بارے میں درست کہہ رہے ہیں؟"

"ان کا منصب جان لینے کے بعد مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ جنرل کی کسی بات کی تردید کر سکوں۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں اسی تمام سامان کی ضرورت ہے جو پچھلے تجربے کے لئے منگوایا گیا تھا؟" پاٹھک رائے نے اپنی گود میں رکھی ہوئی ایک فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" میرا مختصر سا جواب تھا۔

پھر سب لوگ منتشر ہونے لگے۔ مجھے واپس کمرہ نمبر بیالیس میں پہنچا دیا گیا۔

اگلے روز میں پھر اسی کمرے میں تھا جہاں میں نے کیمیاگری کے دوران ڈاکٹر بیدی سے اپنا ہولناک انتقام لیا تھا۔ اس بار کمرے میں چار مسلح گارڈز موجود تھے اور سابقہ تجربے کی روشنی میں اس امر کا بھی اہتمام رکھا گیا تھا کہ زہریلے بخارات وغیرہ ان کی مستعدی یا موجودگی پر اثر انداز نہ ہوں۔ ان سب کے چہروں پر گیس ماسک چڑھے ہوئے تھے جن کا رابطہ ایک پتلی سی نلی کے ذریعے ہوا یا آکسیجن کے ان چھوٹے چھوٹے سلنڈروں سے تھا جو چرمی پیٹی کے ذریعے انہوں نے کمر سے لٹکائے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد پروفیسر رامانند بھی وہاں آپہنچا۔ اس کے بشرہ پر سنسنی آمیز جوش نمایاں تھا۔ شاید پاٹھک رائے اور جنرل گوندہ نے اسے میری طرف سے بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا۔

"اب تم اپنا کام شروع کرو۔" پاٹھک رائے نے مجھے ہدایت دی۔ وہ ڈاکٹر رامانند کے ساتھ ہی وہاں پہنچا تھا اور بظاہر اس کے ساتھ ہی رُکنے پر آمادہ تھا۔

"تم نے اچھا کیا کہ گارڈز کو گیس ماسک فراہم کر دیئے۔ بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کے لئے بھی یہ بندوبست کرا دو۔" میں نے پاٹھک سے کہا۔

"اوہ! تم میری فکر نہ کرو۔" رامانند لاپرواہانہ لہجے میں بولا۔

"بخارات بہت زہریلے ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب!"

"جب تم انہیں برداشت کر سکتے ہو تو وہ مجھ پر بھی اثر انداز نہیں ہو سکیں گے۔" وہ اعتماد کے ساتھ بولا۔ "میں میز کرسی کا آدمی نہیں ہوں۔ میرا بھی بیشتر وقت تجربہ گاہوں میں گزرا ہے۔"

میں خفت آمیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا اور بھٹی روشن کرنے کی تیاری کرنے لگا۔

کٹھالی میں تانبہ، بوٹیوں کا سفوف وغیرہ ڈال کر میں نے بھٹی روشن کر دی۔ تھوڑی دیر بعد جب زہریلے بخارات کا گھنا بادل کمرے کی فضا میں پھیلا تو پاٹھک رائے پر شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ دبائے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ مگر ڈاکٹر رامانند پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بھٹی میں لپکتے شعلوں کے انعکاس سے اس کا چہرہ سُرخ نظر آرہا تھا۔ عدسوں کی اوٹ میں چھپی ہوئی آنکھوں میں اُمنگ اور ولولے کی ایسی چمک تھی جو جوان آنکھوں میں بھی بھولے بھٹکے ہی نظر آتی ہے۔

جب مصروفیت کے لمحے گزر گئے اور میں نے تانبے کی سلاخیں کٹھالی میں ڈال کر تاؤ پر رکھ دیں تو میں ڈاکٹر رامانند کی طرف متوجہ ہوا۔ مایوسی کے اس گھمبیر اندھیرے میں اس کی ذات میرے لئے اُمید کی کرن بنی ہوئی تھی۔ کئی بار اس نے مجھ پر ملامت بھی کی تھی مگر مجموعی طور پر اس کا رویہ میرے لئے ہمدردانہ تھا یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ میرے تجربے کو جھٹلانے والا بوڑھا رامانند اس بار میرے تجربے کا واحد گواہ تھا۔ کھانسی کے دورے کے بعد پاٹھک رائے دوبارہ اس کمرے میں نہ آیا۔ بس ڈاکٹر رامانند کو پیغام بھجوا دیا کہ اس کی حالت خراب ہے لہٰذا وہ وہاں نہ آسکے گا۔ یہ اطلاع میرے لئے خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ پاٹھک کی غیر موجودگی میں میں رامانند پر آزادی کے ساتھ اپنے ترکش کا ہر تیر آزما سکتا تھا۔

"اب یہ آگ تانبہ کا نکھار چھین لے گی۔" میں نے بھٹی کے شعلوں پر نظریں جما کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے رامانند سے آہستہ سے کہا۔

"تم نے اس میں جو سفوف ڈالے ہیں، ان کا کیا کام ہے؟" مجھے گفتگو پر آمادہ پا کر رامانند نے اپنا پہلا سوال داغ دیا۔

"یہی سفوف پارہ کے ساتھ عمل کے لئے اس تانبے کو تیار کریں گے۔ جب میں بھٹی سرد کروں گا تو کٹھالی میں موجود تانبہ اپنی انفرادیت کھو چکا ہوگا۔ اسے میں جس رنگ میں چاہوں رنگ لوں گا۔" میں نے اسے گول مول سا جواب دیا۔

"جس رنگ میں چاہو، رنگ لو گے؟" رامانند نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ میں نے محاورے کے طور پر کہا ہے۔ دراصل اس کے بعد میں تانبہ کو پارہ کی مدد سے سفید سونے میں بدل لوں گا۔"

"یہ بجائے خود بڑی عجیب سی بات ہے۔"

"عجیب ضرور ہے ڈاکٹر صاحب! لیکن میرا تجربہ کامیاب رہا تو آپ دیکھیں گے کہ ناممکن نہیں ہے۔" میں نے غیر محسوس طریقہ پر گفتگو کو موڑ دیا۔

"تو کیا تمہیں اپنے تجربے کی کامیابی پر شبہ ہے؟" رامانند کا چونکنا قطعی متوقع تھا۔

"اگر یہ سفوف اور مرکبات صحیح ہیں تو میں سُرخرو رہوں گا۔" میں سوچے سمجھے انداز میں اپنی گفتگو کو اُلجھاوے دے رہا تھا۔

"تم پہلے بھی ایک بار ان ہی چیزوں کی مدد سے سونا بنا چکے ہو۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم جب چاہو تجارتی پیمانے پر سونے کی تیاری شروع کر سکتے ہو۔ آخر اب ان شبہات کا کیا جواز ہے؟ ایسا تو نہیں کہ تمہیں میری موجودگی بار محسوس ہو رہی ہو۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں جلدی سے بولا۔ "آپ کی موجودگی تو میرے لئے فخر کا باعث ہے۔ ایک خاک نشین، آوارہ گرد، کیمیاگر کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ ہند کا مایۂ ناز ماہرِ طبیعیات اس کے تجربے کا گواہ ہو اور مجھے تو قاتل کا بھی خطاب ملا ہوا ہے۔"

"شاید تم سیکرٹ سروس والوں کے رویّے سے بدظن ہو؟" رامانند کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔

"آپ درست سمجھے۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "دراصل یہ لوگ طویل عرصے سے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ اسی دوران بدقسمتی سے ان کے دو ایسے آدمی پُراسرار طریقے پر مار دیئے گئے جو میرا پیچھا کر رہے تھے اور ان لوگوں نے مجھے قاتل سمجھ لیا۔ اب تک میں بہت سے اعزازی عہدوں کا ذکر سُنتا آیا تھا۔ ایسے لوگ عملاً کچھ نہیں کرتے بس نام کے ساتھ ایک اضافہ ہو جاتا ہے اور اب میں بھی خود کو اعزازی قاتل سمجھنے لگا ہوں۔"

"اور وہ بیدی کا کیا قصہ تھا؟" رامانند کا تجسس بیدار ہو چکا تھا۔

"ایک طرح میں اس کا قاتل ہوں۔" میں نے بھٹی میں کوئلے ڈالتے ہوئے مجرمانہ لہجے میں اعتراف کیا۔ "دراصل یہ لوگ ہمیشہ سے میرے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ کیمیاگری کے سلسلے میں میرے تجربات کامیاب ہوں اور وہ مجھے ایذائیں دے کر ہلاک کر سکیں۔"

"یہ عجیب سی بات ہے۔" رامانند بولا۔ "میں نے دارالحکومت کے ذمے دار لوگوں سے سُنا ہے کہ تمہاری کیمیاگری کی خبر حکومت کو سائیکو فورٹ ہی کے حوالے سے پہنچائی گئی تھی۔"

"یہ لمبی کہانی ہے ڈاکٹر صاحب!" میں گہرا سانس لیکر بولا۔ "دراصل انہیں شبہ تھا کہ پارس نامی ایک پتھر میری تحویل میں ہے جس کے لمس سے لوہا سونے میں بدل جاتا ہے۔۔۔۔۔۔"

"یہ تو سراسر بکواس ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"وہی بات میں بھی کہتا رہا ہوں یہاں کسی کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ مجھے ایسی ہولناک اذیتیں پہنچائی گئیں کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ یہ لوگ اپنے دو آدمیوں کی ہلاکت پر جھلائے ہوئے تھے اور کسی بہانے مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے مگر دارالحکومت کے کچھ بڑوں کی خواہش تھی کہ پارس ملنے تک مجھے ہر قیمت پر زندہ رکھا جائے۔ جب تشدد کا سلسلہ دراز ہونے لگا تو مجھے مجبوراً اعتراف کرنا پڑا کہ میں کیمیاگر ہوں۔" میں خاموش ہو کر بھٹی کی طرف متوجہ ہو گیا اور بلامقصد انگارے کریدنے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ اپنی کہانی میں رامانند کی دلچسپی کا اندازہ کر سکوں۔

"بولتے رہو۔۔۔۔ کام کے ساتھ ساتھ بولتے رہو۔" رامانند کی بے چین آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ کو یہ سب بتانا بے سُود ہے ڈاکٹر صاحب!" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر جنرل گوندہ یا پاٹھک کو علم ہو گیا کہ میں نے ان کے وحشیانہ انتقامی جذبوں کی کہانی آپ کو سُنا دی ہے تو میں ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔"

"میں اگر تمہارا دوست نہیں ہوں تو دشمن بھی نہیں ہوں۔" رامانند نے مجھے دلاسہ دیا۔ "تم یقین رکھو کہ یہ تمام باتیں میری ذات تک محدود رہیں گی بلکہ میں نے تمہاری سچائی محسوس کی تو شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔ دارالحکومت میں ہر طبقہ میری بات پر توجہ دیتا ہے۔"

"سیکرٹ سروس والے میرے اس اعتراف کو جان بچانے کا بہانہ سمجھے۔" میں نے اپنی من گھڑت کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب بے ہوشی اور ہذیان کے عالم میں بھی ڈاکٹر بیدی نے میرے منہ سے کیمیاگری کا تذکرہ سُنا تو ناچار اس نے ہیڈکوارٹرز کو میرے اعتراف سے باخبر کر دیا۔ اس کا مدعا صرف یہ تھا کہ مجھے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کی رائے میں جب مجھے ناکامی ہوتی تو اوپر والے میری سلامتی کی فکر چھوڑ دیتے اور پھر سیکرٹ سروس والے مجھے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ پھر آپ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میں نے تجربے کا آغاز کیا تو بیدی میرے سر پر مسلط تھا۔ وہ شروع ہی سے میرا حوصلہ پست کرتا رہا۔ اس نے کھل کر میرا مذاق اُڑایا، بارہا میری توجہ بٹانے کی کوششیں کیں مگر میں اپنے کام میں لگا رہا۔ جب اس نے مجھے سفید سونے کو رنگتے دیکھا تو اسے اپنا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آیا۔ اس نے مجھ سے میرا بنایا ہوا سونا چھین لیا جسے صرف نرم کرنا باقی تھا۔ وہ اس ٹکڑے کو تیزاب میں گلا کر برباد کرنے پر تُلا ہوا تھا تاکہ مجھے جھوٹا قرار دے سکے۔ یہ میرے لئے زندگی اور موت کا معرکہ تھا۔ اسی کمرے میں دست بدست مقابلہ ہوا اور عین اس وقت جب وہ میرا سونا تیزاب میں ڈالنے والا تھا، میں نے تیزاب کا برتن اُلٹ دیا۔ بیدی کا مقدر گردش میں تھا کہ اس کا پورا چہرہ تیزاب سے جھلس گیا اور وہ چند دن ہسپتال میں رہنے کے بعد مر گیا۔ سیکرٹ سروس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل جسپال کو اس حادثے نے سہما دیا۔ بیدی کی موت نے میرے حق میں ایک اچھائی کی کہ میرا تیار کیا ہوا سونا تجزیے کے لئے آپ کے حوالے کر دیا گیا۔ جسپال کو ڈر تھا کہ بیدی کی موت کی تحقیقات کے سلسلے میں کسی دوسرے ادارے کے لوگ مقرر نہ کر دیئے جائیں۔ ایسی صورت میں میری ہر بات

اُگل دیتا۔ بیدی تو مر ہی چکا تھا' جسپال اور اس کے ساتھی بھی سرکاری عتاب کا نشانہ بنتے لہٰذا سائیکو فورٹ سے کامیاب کیمیاگری کی خبر جاری کر دی گئی اور بیدی کی ہلاکت اس کامیابی کے چرچوں میں دب گئی۔ پہلے تجربے کے بعد سب جانتے ہیں کہ میں سونا بنا سکتا ہوں لہٰذا اب ان کی آخری حرکت یہ ہو سکتی ہے کہ جڑی بوٹیاں وغیرہ بدل دی جائیں۔ ان میں ذرا بھی فرق ہوا تو میرا تجربہ ناکامی پر منتج ہو گا۔"

"اوہ ۔۔۔!" میرے خاموش ہونے پر رامانند کے چہرے پر تشویش کے سائے لرزنے لگے۔ "تم بہت گمبھیر خطرے سے دوچار ہو۔"

"بس بے حیا ہوں کہ اب تک زندہ ہوں ورنہ میرے جسم سے اتنی برقی رو گزاری جا چکی ہے کہ اب تک کئی ہاتھی بھی ہوتے تو مر چکے ہوتے۔" میں اس کے سامنے اپنی مظلومیت کی بھرپور تصویر پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔

"یہ لوگ واقعی تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "اب سمجھ میں آیا کہ اس روز جنرل گوندہ اور پاٹھک کا رویہ اس قدر جارحانہ کیوں تھا۔ وہ اسی لئے بار بار تمہیں یاد دلا رہے تھے کہ تم صرف ان کے قیدی ہو اور ان کے احکام کی خلاف ورزی تمہاری موت ہو گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ میری موت ان ہی کے ہاتھوں لکھی ہو مگر میں آسانی سے ہتھیار نہ ڈالوں گا۔"

"میں تمہیں ان کے ہاتھوں نہیں مرنے دوں گا۔" رامانند کی بوڑھی آواز میں عزم کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ "تم نے اچھا کیا کہ مجھے اعتماد میں لے لیا۔ میں ایک بہترین دماغ جنون کی بھینٹ نہ چڑھنے دوں گا۔ فوجی ہر ملک میں ہوتے ہیں مگر ہمارے فوجی عقل سے بالکل یتیم ہیں۔ یہ لوگ ہر مسئلے کا حل جنگ یا قتل سمجھتے ہیں۔ بھلا تمہیں مار کر وہ ہند سرکار کی کیا خدمت کریں گے؟ خزانوں میں کتنا اضافہ کریں گے؟ تمہارے عظیم انقلابی تجربے کی کیا آبیاری کریں گے؟ یہ جہاں بھی چھائے ہوئے ہیں وہاں توازن کی جگہ جنون جھلکتا ہے۔"

"شاید سیکرٹ سروس پر ان ہی کا قبضہ ہے؟" میں نے معصومیت سے شوشہ چھوڑا۔

"جنرل گوندہ سمیت سروس کے بہت سے لوگ ہیں اور ریٹائرڈ فوجیوں کی تو بھرمار ہے۔ اور یہیں نہیں، یہ لوگ ہر طرف ہاتھ پیر پھیلا رہے ہیں۔ ہم اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر، دنیا تیاگ کر ہند میں جوہری توانائی کو پروان چڑھا رہے ہیں تاکہ اس سے بجلی پیدا ہو، ہمارے مریضوں کا علاج ہو، صنعت و زراعت کو فروغ ہو مگر یہ ہم سے ایٹمی دھماکوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں ہر میٹنگ میں برملا کہتا ہوں کہ ہم جوہری توانائی کے استعمال کے سلسلے میں بین الاقوامی معاہدوں کے پابند ہیں۔ یہ مطالبے ہمارے غریب ملک پر ظلم کے برابر ہیں لیکن کوئی نہیں سنتا۔ معاہدے میں کرتا ہوں، غیر ملکی ماہرین کو میں مطمئن کرتا ہوں، وہاں کوئی جنرل نہیں پھٹکتا مگر جب ری ایکٹر چل پڑتے ہیں تو ایک وقت میں چھ چھ جنرل مجھے گھیر کر طاقت کے توازن کی باتیں سمجھانے لگتے ہیں۔"

رامانند کی یہ گفتگو میری ذات سے سراسر غیر متعلق تھی مگر میں نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع دیا۔ اس بہانے مجھے رامانند کی ایک کمزوری کا بھی علم ہو گیا۔ وہ اپنے فوجی افسروں سے بے انتہا بدظن تھا اور میں اس کی ہمدردیاں جیتنے کے لئے اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

"آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ "میرے مقدر میں جو لکھا جا چکا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ آپ کا نام ایک اعزازی قاتل کے ساتھ لینے لگیں۔"

"بکواس مت کرو۔" بڈھے کو اچانک طرارہ آ گیا۔ "مجھے سب جانتے ہیں۔ میں اصولوں کی خاطر کسی بات کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ تجربہ ناکام ہوتا ہے تو ہونے دو۔ میں تمہیں یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم اپنی مرضی کی ہر چیز خرید سکو گے۔ پھر میں دیکھوں گا کہ کون تمہارے آڑے آتا ہے۔"

اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ابھی تک میری عقل ہی کام نہیں کر رہی تھی کہ میں رامانند کو شبہ کا موقع دیئے بغیر کس طرح کہوں کہ وہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے چلے مگر اس نے خود ہی یہ تجویز پیش کر کے میری مشکل آسان کر دی تھی۔

"آپ عظیم انسان ہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے اپنی بے پایاں خوشی پر قابو پاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"عظمت تمہارے لئے ہے جو کوڑیوں کے مول سونا بناتے ہو۔ اگر تمہارا یہ تجربہ کامیاب بھی رہا تو میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ اس گھٹن میں تمہیں دق ہو جائے گی۔ ذہنی سکون کے بغیر تو سوئی میں دھاگہ پرونا بھی مشکل ہوتا ہے بھلا تم کیا کر سکو گے۔" میرا انکسار رامانند کی انا پر تازیانہ کا کام کر رہا تھا۔

بات بنتی دیکھ کر میں نے بھٹی کی آنچ قدرے دھیمی کر دی مگر بظاہر پورے انہماک سے اپنے کام میں لگا رہا۔ شام ڈھلنے کے بعد میں نے پارے کی مقررہ مقدار سے بھرا ہوا مرتبان قریب سرکایا اور پانی کے چھینٹے مار کر بھٹی سرد کر دی۔ پھر آہنی چمٹے سے تانبے کے جھلسے ہوئے ٹکڑے پکڑ کر پارے کے مرتبان میں ڈال دیئے۔ وہی چند مانوس تڑاقے ہوئے، دھوئیں کا زہریلا بادل امڈا اور میں نے مرتبان کا منہ بند کر دیا۔

جب میں طویل انگڑائی لے کر اٹھا تو رامانند حیران سا نظر آ رہا تھا۔

"کیا کام ختم ہو گیا؟" اس نے پوچھا۔

"آج کا کام ختم ہوا ہے۔ اب چوبیس گھنٹے بعد میں مرتبان کا منہ کھولوں گا تو اس میں چاندی کی طرح چمکتا ہوا سفید سونا موجود ہو گا۔"

ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ دو محافظ ڈاکٹر کی رہنمائی کرنے لگے اور دو مجھے اپنے کمرے کی طرف ہانکنے لگے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو پاٹھک میرے بستر پر دراز میرا منتظر تھا۔

"میں نے تمہارے پچھلے تجربے کے بارے میں بیدی کی لکھی ہوئی رپورٹ پڑھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ شام کے سات اور ساڑھے سات کے درمیان تمہیں اپنے کمرے میں ہونا چاہیئے۔ اور اس وقت سات بج کر اکتیس منٹ ہوئے ہیں۔" وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے فخر سے بولا۔

"شاید اسی وجہ سے تم واڈیکر کی جگہ بھیجے گئے ہو۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ دراصل رامانند سے گفتگو کرتے ہوئے وقتی طور پر میں یہ فراموش کر چکا تھا کہ میں سیکرٹ سروس کے آہنی حصار کا قیدی ہوں جہاں معمولی سی بات کا بھی ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور بدنصیب بیدی تو شاید لکھے بغیر سوچنے کا بھی قائل نہ تھا۔ اگر میرے بارے میں اس کی بچی تحریری آراء واڈیکر کے بجائے کسی اور کے ہاتھ لگی ہوتیں تو اب تک میری دونوں مستند ٹانگیں گھٹنوں سے کاٹ کر مردہ خور پرندوں کو کھلائی جا چکی ہوتیں۔

"آج تم سفید سونا تیار کر کے آئے ہو۔" اس نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا تجربہ جلد از جلد ختم کر لو تاکہ رامانند یہاں سے دفع ہو۔"

"اس سے بدظن نظر آتے ہو۔"

"جنرل گوندہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ محض سرکاری مجبوریوں کی بنا پر وہ یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔" پاٹھک اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"میں بھی سگریٹ پیتا ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا اور اس نے جلتی ہوئی سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر میری طرف اچھال دی۔ خود دوسری سگریٹ جلانے لگا۔

"یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں یہاں کئی مہینے گزارنے کے باوجود سائیکو فورٹ والوں کا مزاج نہ پا سکا۔" میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیکر کہا۔

"کیوں ۔۔۔ کیا یہاں جن بستے ہیں؟"

"جنوں کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے۔ مگر بیدی کو میں کبھی نہ سمجھ سکا۔ ایک مرحلے پر وہ میرے خون کا پیاسا تھا۔ پھر دوست ہوا تو شراب نوشی تک میں شریک کر لیتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجھ پر کب اچانک برس پڑے گا۔ تمہارا رویہ بھی اس وقت بہت معقول ہے مگر پہلے دن تم نے مجھے تھیلے میں ٹھونس کر منگوایا تھا۔"

"یہ رعایت صرف تجربہ کی وجہ سے ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔ "مجھ سے شراب نوشی کی دعوت کی توقع مت رکھنا۔ میں اپنے مجرموں کو منہ لگانے کا عادی نہیں ہوں۔"

رامانند سے عزت افزا گفتگو کے بعد پاٹھک کے ان ہتک آمیز جملوں پر میری کھوپڑی بھنّا اٹھی۔ میں نے غصے میں اس کی دی ہوئی سگریٹ قالین پر پھینک کر جوتے سے مسل دی۔

پاٹھک میری طرف دیکھے بغیر واپس لوٹ گیا۔

اگلی دوپہر وہ دوبارہ آیا تو اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"تم نے بڈھے سے کیا بکواس کی ہے؟" وہ تقریباً میرے سر پر سوار ہو کر غرایا۔

یک بیک میرا دل ڈوبنے لگا' آنکھوں کے سامنے پرچھائیاں کانپنے لگیں۔ میرے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید میں نے بڈھے کے سامنے خود کو ضرورت سے زیادہ مظلوم بنا کر پیش کیا تھا اور اس کے دل میں میری ہمدردی کا کچھ زیادہ ہی جذبہ امڈ آیا۔ شاید وہ اپنے دل کا غبار نہ چھپا سکا اور پاٹھک پر لعنت ملامت شروع کر دی۔

"کس بڈھے سے؟ کیسی بکواس؟" میں نے مدافعانہ لہجے میں پوچھا۔

"رامانند کا منہ سوجا ہوا ہے، وہ میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا ہے۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ وہ شاید رامانند کے پاس سے سیدھا میرے کمرے میں آیا تھا۔

"اسے تھیلے میں بند کر کے چند گھنٹوں کے لئے ساحل پر پھینکوا دو، عقل ٹھکانے آ جائے گی۔" اپنی ذات کو ملوث نہ ہوتے دیکھ کر میں شیر ہو گیا۔

شاید میری تجویز کی مضحکہ خیز تصویر اس کی نظروں میں گھوم گئی کیونکہ وہ غصہ بھول کر اچانک زور سے ہنس پڑا۔ "قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے مگر دماغ پر بری طرح میں سوار ہے سالے کے۔"

"اگر اس نے بدتمیزی کی تھی تو تم مجھ پر کیوں چڑھ دوڑے؟"

"میں سمجھا، شاید تم نے اس کے کان بھرے ہیں۔"

"میرے لئے اس کی اور تمہاری حیثیت ایک ہی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "تم تو چلے آئے تھے، وہ سارا دن وہیں بیٹھا زہریلا دھواں پھانکتا رہا۔ ان بخارات کا اثر زائل ہونے میں کئی دن لگیں گے۔ میں نے اسی لئے کہا تھا کہ اسے بھی ماسک دے دو۔"

"شاید یہی بات ہے۔" وہ پرخیال انداز میں بولا۔ "اس کے بوڑھے اعصاب اب ایسی مشقتوں کے قابل نہیں رہے۔"

یوں میں نے بگڑتی ہوئی بات سنبھال لی اور پاٹھک میرے پاس سے رخصت ہو گیا۔

شام کو مجھے عارضی تجربہ گاہ میں بلایا گیا تو رامانند پہلے سے وہاں موجود تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے بڑے اہتمام سے مرتبان کا منہ کھولا۔ اور میری زبان سے چند تحیر آمیز کلمات بلند ہوئے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" رامانند یہ کہتے ہوئے بوکھلائے ہوئے انداز میں قریب آیا اور اس کی نظریں مرتبان کی تہہ میں جم گئیں جہاں پارے میں جھلسا ہوا تانبہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔

"کیا کچھ غلط ہو گیا؟" رامانند نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"سب کچھ غلط ہو گیا۔" میں نے ڈرامائی انداز میں دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ "یہاں مجھے ذلیل کیا جا رہا ہے ڈاکٹر صاحب۔ میرے حساب سے اس وقت مرتبان خشک ہونا چاہیئے تھا۔ جھلسا ہوا تانبہ، پارے سے یک جان ہو کر ٹھوس نقرئی دھات کی صورت اختیار کر چکا ہوتا۔"

"تمہارے اندیشے درست تھے ۔۔۔۔ اب افسوس نہ کرو۔" ڈاکٹر رامانند میری طرف جھک کر تسلی آمیز سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

رامانند مجھے تسلی دیتا رہا اور میری اداکاری جاری رہی۔ اسی دوران کسی گارڈ نے پاٹھک کو تجربہ گاہ میں "گڑبڑ" کی خبر پہنچا دی اور وہ مضحکہ خیز

حالت میں بوکھلایا ہوا دہاں آپہنچا۔ اس کے ہاتھ میں خود کار ریوالور دبا ہوا تھا۔

اس کی آہٹ پاکر رامانند نے اس کی طرف دیکھا اور قہر آلود لہجے میں بولا۔ "اس خبیث کو ہوسٹل میں اڑس لیجئے پاٹھک صاحب! یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

میں کھوئی کھوئی نظروں سے اسے سیفٹی کیچ لگا کر ریوالور جیب میں ڈالتے دیکھتا رہا۔

"مجھے اطلاع ملی تھی کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔" پاٹھک تیز تیز سانسوں کے درمیان بولا۔

"گڑبڑ تجربے کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس بار صفدر علی ناکام ہوگیا ہے۔" رامانند کی آواز میں طنز کی کاٹ نمایاں تھی جسے پاٹھک بالکل نہ سمجھ سکا اور وہ سمجھتا بھی کیسے جب کہ وہ درپردہ ہونے والی گہری سازش سے لاعلم تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہوا؟"

"ہماری نیتوں کا فتور ہے پاٹھک صاحب۔" رامانند نے اپنی دانست میں پاٹھک پر بھرپور اور براہِ راست وار کیا۔ "لکھ کر رکھ لیجئے کہ یہ ملک کبھی نہیں پنپ سکتا۔"

"میں سمجھا نہیں ڈاکٹر صاحب؟" اس بار پاٹھک کے لہجے میں ناگواری عود کر آئی تھی۔

"آپ کچھ نہیں سمجھیں گے۔" رامانند کو اپنے غصے پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ "آپ معصوم پیدا ہوئے تھے اور معصوم ہی پرلوک کو سدھاریں گے...... بس یہ سن لیجئے کہ میں صفدر کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

رامانند کی باتیں بہت تیز و تند تھیں۔ پاٹھک کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا اور ہونٹوں کے گوشے کانپنے لگے۔ ڈاکٹر کے سامنے تو اس کی زبان نہ کھل سکی وہ گارڈز کی طرف گھوما اور پوری قوت سے حلق کے بل چیخا۔ "گٹ آؤٹ۔"

میں بظاہر حسرت کی تصویر بنا کھوئی کھوئی نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا مگر میرے پورے حواس اس عارضی تجربہ گاہ میں ہونے والے مقابلے پر مرکوز تھے۔ میرے لئے یہ صورتحال بیحد دلچسپ اور لذت انگیز تھی۔

"آپ...... آپ چاہیں تو اسی وقت تشریف لے جا سکتے ہیں مگر صفدر سائیکو فورٹ کا قیدی ہے، آپ اسے نہ لے جا سکیں گے۔" رامانند کا مرتبہ اس وقت بری طرح پاٹھک کی بدزبانی کے آڑے آرہا تھا۔ اس کے فقرے محتاط اور ادب آمیز تھے مگر میں اس کے دل کا حال خوب سمجھ رہا تھا جب تک آدمی ذہن میں ابھرنے والی گالی اپنے حریف کو نہ سنا دے وہ گالی اسے اپنی ہی ذات پر چپکی محسوس ہوتی ہے اور پاٹھک کا دماغ تو اس وقت شاید گالیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا۔

اس کا جواب سن کر رامانند مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہوگیا۔ "میں اسی وقت جنرل گوندہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ سائیکو فورٹ کے مواصلاتی رابطے کوئی بیرونی آدمی استعمال نہیں کرسکتا۔" پاٹھک نے اپنا فتویٰ صادر کر دیا حالانکہ چاہتا تو جنرل سے خود بات کرکے ڈاکٹر کی خواہش اس تک پہنچا سکتا تھا، جنرل چاہتا تو اسے ڈاکٹر کو بلانے کی ہدایت کر دیتا۔

"خواہ وہ ڈاکٹر رامانند ہی ہو؟" رامانند پیر پٹخ کر غرایا۔

"جی ہاں۔" پاٹھک کی آواز اس سے بھی اونچی تھی۔

چند لمحوں تک وہ دونوں آمنے سامنے خاموش کھڑے ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھتے رہے۔ میں مٹی کے پتلے کی طرح بے جان بیٹھا ہوا تھا جیسے ناکامی کے صدمے سے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا ہو۔

"میں جا رہا ہوں اسی وقت۔" رامانند کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ شاید اس کے ساتھ زندگی میں کبھی ایسا توہین آمیز سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ "تم دیکھنا کہ صفدر کو تم خود میرے دروازے پر چھوڑنے آؤ گے۔"

اس مرتبہ پاٹھک کو میری وہاں موجودگی کا علم ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ فوری خیال کے تحت پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوگیا۔ "آپ کی فوری روانگی مشکل ہے۔ سائیکو فورٹ کے حفاظتی انتظام میں آپ کے لئے راستہ بنانے میں کچھ دیر لگے گی۔ آپ انتظار کریں۔ یہ انتظام مکمل ہوتے ہی اطلاع کرا دوں گا۔"

"میں جانتا ہوں ـــ سب جانتا ہوں۔ اس وقت تم میری بربادی کا جشن منانے پر تلے ہوئے ہو، تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" رامانند بڑبڑاتے ہوئے تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"صفدر!" اب پاٹھک میری طرف متوجہ ہوا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ ہتک کا مظہر تھا۔

میں کچھ نہ بولا تو اس نے میرا گریبان پکڑ کر مجھے صوفے سے اٹھا دیا۔ میں نے چونکنے کی لاجواب اداکاری کی اور ہڑبڑا کر سوال کیا۔ "کون ہو تم؟"

میری حرکات و سکنات اس قدر فطری تھیں کہ پاٹھک رائے مجھ پر شک نہ کرسکا اور قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "کیا ہوا تھا یہاں؟"

"میں نے مرتبان کھولا تو اس میں سفید سونے کے بجائے پارہ الگ جھلسا ہوا تانبہ الگ الگ نظر آرہا تھا۔ میں نے رامانند کو اپنی ناکامی سے باخبر کیا تو وہ برہم ہوگیا۔ پھر مجھے یاد نہیں۔"

"تجربہ کیوں ناکام ہوا؟"

"مجھ سے یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اس بار میں نے ضرورت سے زیادہ اعتماد سے کام لیا اور پرچے پر مقداریں پڑھے بغیر کام شروع کر دیا تھا۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں کل پھر کام شروع کروں گا۔ میرا تجربہ ناکام نہیں ہوسکتا۔"

"اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" پاٹھک رائے نے کہا اور مجھے سہارا دے کر باہر لے آیا۔ وہاں دو بوکھلائے ہوئے گارڈ

مجھے سہارا دینے کے لئے موجود تھے۔

سائیکو فورٹ میں اگلا دن بڑا سنسنی خیز تھا۔ مجھے بہت سی باتیں پاٹھک رائے سے معلوم ہوئیں جو بیحد دل برداشتہ نظر آرہا تھا۔ رامانند کو سرکاری طور پر ایک ہیلی کاپٹر ملا ہوا تھا جو پائلٹ سمیت اگاٹی ایرفیلڈ پر موجود تھا لہٰذا وہ رات ہی کو جزیرے سے پرواز کر گیا۔ اس نے رات کا خیال کئے بغیر وفاقی دارالحکومت میں کھلبلی مچا دی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ مجھے پاٹھک رائے کی نگرانی میں فوری طور پر اگاٹی سے بمبئی بھیجا جائے ورنہ وہ استعفیٰ دے کر امریکہ چلا جائے گا۔ صبح طلوع ہونے سے قبل وزارتِ دفاع اور خزانہ کے سیکریٹری نے فون پر جنرل گوندہ کو پوری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ادھر پاٹھک رائے رامانند کے روانہ ہونے سے قبل ہی پورا واقعہ جنرل کو سنا چکا تھا۔ جنرل نے نئی دہلی سے وائرلیس رابطے پر پاٹھک رائے کو اس کے جرأت مندانہ رویّہ پر مبارکباد بھی دی تھی۔ گو جنرل گوندہ کا اس تلخ واقعے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ نہ جانے کب سے رامانند کے خلاف دل میں کدورت لئے بیٹھا تھا لہٰذا اس نے پاٹھک کی نگرانی میں میری بمبئی روانگی کو انا کا مسئلہ بنا لیا۔ اس نے سیکریٹری دفاع سے صاف کہہ دیا کہ وہ مجھے حوالہ کرنے پر تیار ہے مگر وہ مجھے کس کے ہمراہ رامانند کے پاس بھیجے یہ اس کے اپنے محکمے کا معاملہ ہے جو صرف اسی کی صوابدید کے مطابق طے ہوگا۔ اس بارے میں اس نے سیکریٹری کا حکم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب اس پر کئی سمتوں سے دباؤ ڈالا گیا تو اس نے پاٹھک کو میری منتقلی کا نگران مقرر کرنے کے ساتھ ہی اپنا استعفیٰ داخل کر دیا ـــ جسے سیکریٹری نے قبول ضرور کر لیا مگر اس کی منظوری غیر یقینی تھی۔

پاٹھک کو یہ ساری تفصیل جنرل سے ملی تھی۔ یہ رامانند کے رسوخ کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا کہ اس نے چند گھنٹوں میں سب کو معلق کرا دیا۔ اس نے تو جو کہا تھا کر دکھایا مگر پاٹھک مجھے ساتھ لے جانے میں شدید ذلت محسوس کرنے کے باوجود کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"آخر ڈاکٹر کو مجھ سے کیا ہمدردی ہوگئی ہے جو وہ مجھے بمبئی بلانے پر تلا ہوا ہے؟" میں نے انجان رہتے ہوئے پاٹھک سے سوال کیا۔

"سور کا بچہ جھکی ہے اور اپنی جھک کو اصول کا نام دیتا ہے۔" پاٹھک نے تلخ لہجے میں کہا۔ "بس ایک بات اس کے منہ سے نکل گئی ہے اب وہ اسے منوا کر رہے گا۔"

"جنرل سے اسے کیا پرخاش ہے؟"

"اسے فوجی وردی پہننے والے ہر شخص سے نفرت ہے۔" پاٹھک بولا۔ "بااختیار حلقوں میں وہ ہند کے بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات کا سب سے کٹر مخالف ہے۔ ایک زمانے میں تو اس نے ہندی افواج میں تخفیف کی مہم پورے زور و شور سے شروع کی تھی اور شاید وہ کامیاب بھی ہو جاتی کہ ان ہی دنوں نیفا کے علاقے میں چینی فوجوں سے ہمارا تصادم ہوگیا اور یہ تحریک دب گئی۔"

"کمال ہے کہ ایسا مخنی اور ضعیف سا آدمی ایسے بڑے بڑے مسائل کھڑے کرتا رہتا ہے۔"

"اس کی کھوپڑی میں الّو کا بھیجہ بھرا ہوا ہے۔ سالے کو سامنے کی باتیں بھی نظر نہیں آتیں۔ بھلا مناسب فوجی طاقت کے بغیر ہم چین سے اپنا دفاع کرسکتے ہیں؟ پھر پاکستان تو ہمارے لئے ایک مستقل روگ بنا ہوا ہے۔ جس دن اسے اپنی عسکری برتری کا یقین ہوگیا اس کی فوجیں کشمیر پر چڑھ دوڑیں گی۔"

میں نے اس کا تبصرہ نہایت سکون سے سنا۔ ہند میں داخل ہونے کے بعد میں نے کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی تھی کہ میں پاکستانی ہوں لہٰذا میرے لئے اس سے بحث کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

نو بجے کے قریب میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میری روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور پاٹھک گاڑی میں میرا منتظر ہے۔

گاڑی ہچکولے لیتی روانہ ہوئی تو میں نے سائیکو فورٹ کے آسیب سے نجات ملنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں ایک بار کسی بھرے پرے شہر میں پہنچ گیا تو جلد ہی فرار کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لوں گا۔ سائیکو فورٹ میں تو میں ہر اعتبار سے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

سائیکو فورٹ سے سڑک بالکل سیدھی جاتی تھی کیونکہ پھاٹک پر گھنٹیاں بجنے کی آواز ابھرنے کے بعد گاڑی کہیں نہیں مڑی۔ پھر کھڑکی سے سمندر کی لہروں کا دھیما دھیما شور سنائی دیا اور گاڑی دھیمی کرکے بائیں طرف موڑ دی گئی۔ اس بار شاید سڑک ساحل کے متوازی تھی کیونکہ خاصی دیر تک لہروں کا شور اسی فاصلے پر ابھرتا اور دم توڑتا رہا۔

گاڑی ایرفیلڈ پر ہیلی کاپٹر کے قریب ہی روکی گئی تھی کیونکہ چند قدم چلنے کے بعد ہی پاٹھک نے کسی کے ساتھ مل کر مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دی پھر میں ایک نرم اور آرام دہ نشست پر بٹھا دیا گیا۔ اسی کے ساتھ ہیلی کاپٹر کا خوابیدہ انجن بیدار ہوگیا اور سر پر پنکھے کا تیز شور سنائی دینے لگا۔

چند منٹ بعد انجن کی آواز تبدیل ہوئی اور یکایک میرے سینے پر دباؤ بڑھ گیا۔ ہیلی کاپٹر تیزی سے اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ ہم اگاٹی کی پرہول سرزمین کو خیرباد کہہ چکے تھے۔

اس وقت میرے دل میں شدید خواہش ابھری کہ اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اس جزیرے کو ایک بار دیکھ تو لوں جہاں میں نے کئی مہینے بے خبری کے عالم میں گذارے تھے۔ میں نے اس خواہش کا اظہار پاٹھک پر بھی کیا لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ ریوالور لیے بیٹھا ہے اور اس کی نظریں مسلسل مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔

ابھی ہیلی کاپٹر کے اٹھنے کا عمل جاری ہی تھا کہ اچانک ایک شدید جھٹکا لگا۔ باہر فضا میں ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھوں سے پٹی نوچ دی اور ہڑبڑا کر سیٹ چھوڑ دی۔

"سر ہیلی کاپٹر میں آگ لگ گئی ہے.....!" کیبن میں لگے ہوئے اسپیکر پر پائلٹ کی آواز گونجی۔ میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکا اور میرے ہاتھ پیراشوٹ کی طرف بڑھ گئے۔

اس وقت تک انجن ناکارہ ہو چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا عقبی حصہ آگ کے گولے میں بدلتا جا رہا تھا اور کشش ثقل اس دیو ہیکل مشینی پرندے کو تیزی سے نیچے لیے جا رہی تھی۔

معاً میری نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ زمین ہم سے چند سو فٹ دُور رہ گئی تھی۔ اس وقت پیراشوٹ کا استعمال بے کار تھا۔ جب تک چھتری کھلتی، جسم تھپڑں اور ریت سے ٹکرا کر چیتھڑوں میں بدل چکا ہوتا بلکہ وزن کے باعث گرنے کی رفتار بھی تیز ہو جاتی۔

اچانک دروازہ کھلا اور پائلٹ اچھل کر ہیلی کاپٹر سے باہر کھلی فضا میں نکل گیا۔ پاٹھک پاگلوں کی طرح پیراشوٹ میں الجھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے تقریباً بیک وقت باہر چھلانگ لگائی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اضطراری طور پر پاٹھک کی پیراشوٹ کی ایک ریشمی ڈوری پکڑ لی تھی۔

میری آنکھیں بند تھیں۔ تیز اور سرد ہوا کے اتھاہ سمندر میں میرا وجود تیزی سے نیچے چلا جا رہا تھا۔ ذہن ناامیدی کے باوجود پیراشوٹ کھلنے کے جھٹکے کا منتظر تھا کہ اچانک میرے پیروں پر چوٹ لگی اور میں تیزی کے ساتھ پانی میں اترتا چلا گیا۔ ریشم کی ڈوری جھٹکے کے باعث میرے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔

ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن نے پوری صورتِ حال سمجھ لی اور میں نے اپنا سانس روک لیا۔ یہ غنیمت تھا کہ میں ٹھوس زمین کے بجائے سمندر میں گرا تھا ورنہ زمین چھوتے ہی جسم کے پرخچے اُڑ جاتے۔

سطح سمندر پر اُبھرنے میں مجھے کتنی دیر لگی، اس کا مجھے صحیح اندازہ نہیں کیونکہ بے خبری میں جسم میں داخل ہو جانے والے کھارے سمندری پانی کے باعث مجھے ہر لمحہ صدیوں طویل معلوم ہو رہا تھا۔ البتہ جب پانی کی سطح سے سر اُبھارا تو ساحل چند سو گز دُور نظر آیا۔

میں نے تیرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ سمندر کی تیز اور سرکش لہریں میرے ورم آلود بازوؤں سے زیر ہونے والی نہ تھیں۔ سائیکو فورٹ میں کئی دن برق پاش ہتھکڑیوں میں ہاتھ بلند کر کے کھڑے رہنے کے باعث میرے بازو پیراکی کے قابل نہ رہے تھے اور خود سے تیر کر ساحل تک پہنچنا قطعی ناممکن نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوری قوت سے مدد کے لیے چیخنا شروع کر دیا۔ میرے اعصاب پر بے ہوشی کی لہر تیزی سے چھاتی جا رہی تھی مگر میں خود کو پانی کی سطح پر رکھنے کی تمام تر کوششیں کرتے ہوئے مسلسل چیخ رہا تھا۔ کہیں قریب ہی کوئی اور بھی مدد کے لیے چیخا۔ اس کے بعد میری ساری مزاحمت ناکام ہو گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

اس مرتبہ میں ہوش میں آیا تو خود کو ہسپتال کے ایک صاف ستھرے اور پُرسکون کمرے میں موجود پایا۔ نیول یونیفارم میں ملبوس ایک اسٹاف

میرے داہنے ہاتھ میں لگی ہوئی ڈرپ کی سوئی کو درست کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے معمولی سی نقاہت کے سوا کوئی اور احساس نہیں تھا۔ میں نے نرس کو پکارا اور وہ ایک دم چونک پڑی پھر جھینپتے ہوئے انداز میں مسکرا دی۔

"میں کہاں ہوں سسٹر؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"اگاٹی نیول ہسپتال میں!" وہ بولی۔ "تم کو نیوی کے غوطہ خوروں نے بے ہوشی کی حالت میں سمندر سے نکالا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں آگ لگتی دیکھ کر ہی امدادی پارٹی روانہ کر دی گئی تھی!"

"ہیلی کاپٹر میں میرے ساتھ دو افراد اور بھی تھے، ان کا کیا رہا؟"

"یہ تمھاری آخری ڈرپ ہے پھر تم ان سے بھی مل سکو گے۔"

"میرے بدن پر تو کوئی ضرب نہیں آئی؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"نہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ تم لوگوں نے ساٹھ ستر فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگائی تھی۔ ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ پانی میں اتنی بلندی سے گرنے پر ہڈیاں ٹوٹنے کا ڈر ہوتا ہے مگر تم خوش قسمت ہو کہ ایسے حادثے کے بعد تمھارے جسم پر خراش تک نہیں آئی!"

تھوڑی دیر بعد مجھے اس ڈرپ سے بھی نجات مل گئی۔ جب میں کمرے میں تنہا رہ گیا تو میں نے کھڑکی کے پردے ہٹا کر باہر جھانکا۔ میں جزیرے کی ایک جھلک دیکھنے کی شدید خواہش محسوس کر رہا تھا مگر پردے ہٹانے تو سامنے ایک مختصر سا سبزہ زار نظر آیا جس کے آگے عمارت کا دوسرا بلاک بنا ہوا تھا۔ شاید مجھے دانستہ اندرونی کمرے میں رکھا گیا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے حادثے کے سلسلے میں دوسرے روز ایک تحقیقاتی جماعت ہسپتال پہنچی اور رسمی طور پر میرا بھی بیان لیا گیا۔ وہ لوگ جلد ہی واپس چلے گئے۔ ہیلی کاپٹر کا حادثہ پورے ہسپتال میں گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر وغیرہ میرے ساتھ نہایت سرد مہری سے پیش آ رہے تھے لہٰذا میں نے معلومات حاصل کرنے کے لیے نچلے عملے پر ہی انحصار کیا۔

آگ لگنے کے بعد ہیلی کاپٹر جزیرے کے مشرقی ساحل پر چھ سات ناٹ گہرے پانی میں گرا تھا۔ حادثے کا سبب ابتدائی تحقیقات ہی میں سامنے آ گیا تھا۔ آتش زدگی کسی اتفاقی فنی خرابی کا نتیجہ تھی۔ پائلٹ بالکل صحیح سلامت بچ نکلا تھا۔ گرا وہ بھی سمندر ہی میں مگر خود تیر کر ساحل پر پہنچ گیا تھا، البتہ پاٹھک رائے اتنا خوش قسمت نہیں رہا تھا۔ پیراشوٹ کی رسیوں میں اُلجھا ہونے کے باعث اسے سمندر میں گرنے کے بعد بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پیراشوٹ آخر تک نہیں کھلی تھی اور اس کے جسم پر ہلکی ہلکی خراشیں سی آ گئی تھیں۔

دو روز ہسپتال میں گزارنے کے بعد تیسرے دن مجھے ڈسچارج کر دیا گیا۔ پاٹھک رائے استقبالیہ کمرے میں میرا منتظر تھا۔

"تمھارے زخم کیسے ہیں؟" اس پر نظر پڑتے ہی میں نے گرمجوشی سے پوچھا۔

"بس سفر کے قابل ہو چکا ہوں۔" وہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"یعنی سفر اب بھی سوار ہے؟"

"جب تک نیا حکم نہ ملے ہر آخری حکم اسٹینڈنگ آرڈر ہوتا ہے جانی۔ ...لی وجہ سے مجھے رُک جانا پڑا۔ اب سفر کے قابل ہوتے ہی مجھے آخری ہدایات کی تعمیل کرنی ہے۔"

جب وہ مجھے لے کر باہر نکلنے لگا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا اس مرتبہ آنکھوں پر پٹی باندھنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"بند پورٹیکو میں اندھے شیشوں والی گاڑی موجود ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

باہر واقعی ایک عدد فیلڈ ایمبولینس موجود تھی جس پر نیوی کے نشانات نمایاں تھے۔ اس کے عقبی کیبن کے شیشوں پر سفید رنگ کیا ہوا تھا۔ ہم دونوں اسی حصے میں سوار ہو گئے اور ایمبولینس وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس بار میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ سفر بخیر و خوبی منزل پر ہی ختم ہو۔ ابھی تک تو میرا تجربہ یہ تھا کہ ...ہیں وہ جزیرہ چھوڑنے کی آرزو کر رہا تھا اور اگاٹی کی سرزمین میرے قدموں میں زنجیر ڈال رہی تھی۔

ایمبولینس رُکی تو ہم دونوں نیچے اُترے۔ میرے سامنے دوپہر کی چمکیلی دھوپ میں وسیع ایئرپورٹ کا پختہ رن وے چمک رہا تھا جس پر تین چھوٹے طیارے نظر آ رہے تھے۔ ہمارے قریب ہی ایک بھاری مال بردار فوجی ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا تھا اور عقب میں کنٹرول ٹاور کی مختصر سی عمارت نظر آ رہی تھی۔

ہم دونوں یکے بعد دیگرے ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے۔ پائلٹ اور اس کا معاون آلات وغیرہ کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ ہیلی کاپٹر کے کیبن میں عملے کے علاوہ صرف دو ہی افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ہمارے سوار ہونے کے چند منٹ بعد پائلٹ نے انجن اسٹارٹ کیا، کنٹرول ٹاور سے چند فقروں کا تبادلہ ہوا اور ہیلی کاپٹر فضا میں اٹھتا چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم اتنی بلندی پر پہنچ گئے کہ کھڑکی سے پورا جزیرہ نظر آنے لگا۔ پورا جزیرہ نیلے سمندر میں گھرے ہوئے بھورے دھبے کی طرح نمایاں نظر آ رہا تھا۔ جزیرے پر ہر طرف موت کا گہرا سکوت طاری تھا۔ وسط میں مٹیالے رنگ کی ایک وسیع عمارت کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ شاید وہی سائیکو فورٹ تھا۔ اس سے کافی دُور جزیرے کے مغربی ساحل سے ملا ہوا عمارات کا ایک طویل سلسلہ تھا جس کے اختتام پر ایئر فیلڈ چمک رہی تھی۔ ایئر فیلڈ کا آخری سرا مشرقی ساحل سے تقریباً ملا ہوا تھا۔

ہیلی کاپٹر تیز شور مچاتا کھلے سمندر پر شمال کی سمت میں پرواز کر رہا تھا۔ نیچے سمندر کے سینے پر اُبھرے ہوئے بے شمار ویران اور دلدلی جزائر ننھے نقطوں کی طرح گزرتے جا رہے تھے۔ پھر اچانک ہی میری نظر مشرق کی طرف گئی اور مجھے ایک سینکڑوں میل طویل لکیر تا حدِ نظر پھیلی ہوئی نظر آنے لگی۔ یہ ہندوستان کا جنوب مغربی ساحل تھا جو بحیرۂ عرب کی سرکش موجوں کے سامنے صدیوں سے سپر انداز تھا۔ میں کھوئے کھوئے انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ اگاٹی میں مہینوں کی نظر بندی کے بعد میں ایک بار پھر اپنے جیسے انسانوں میں پہنچنے والا تھا۔ سائیکو فورٹ میں بھی انسان رہتے تھے لیکن وہ چلتے پھرتے لوہے کے پتلوں سے ذرا بھی مختلف نہیں تھے۔ ان کے سینوں میں پتھر کے دل تھے۔ وہ جذبات سے عاری اور حکم کے غلام تھے۔ میں جب تک وہاں رہا انسانوں میں گھرا ہونے کے باوجود تنہائی کے کربناک احساس سے دوچار رہا مگر مجھے فخر تھا کہ وہ وحشت ناک ماحول اور سنگین قلعہ بھی میرے عزائم کی راہ میں دیوار نہ بن سکا۔ میرے منصوبوں میں تاخیر ضرور ہوئی مگر کامیابی میرا ہی مقدر بنی۔ میں نے ڈاکٹر بیدی سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور آخر کار وہ عبرتناک موت سے دوچار ہوا۔ میں نے سائیکو فورٹ سے نکل بھاگنے کا عزم کیا اور ڈاکٹر راما نند جیسے عظیم دماغ کو اپنا آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

پھر مجھے سیتا یاد آئی۔ جدید تہذیب سے ناآشنا، پہاڑوں اور حیرانی ماحول کی پروردہ وہ دلربا نازنین، جسے میں نے اپنی محبت سے جیتا اور جو محض میری خاطر اپنی دُکھیاری ماں، سندری کو بندروں اور آدم خوروں کے غول میں تنہا چھوڑ آئی۔ اسے میں نے صرف اپنی زبان کی بنا پر کھو دیا تھا۔

وہ جن حالات میں کمرے سے غائب ہوئی اور بعد میں مجھے وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں جو اطلاعات ملیں ان کی بنا پر مجھے پورا یقین تھا کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ مجھ سے روٹھ کر چلی گئی تھی۔ میں نے کئی بار اسے احساس دلایا کہ محض اس کی وجہ سے میرا پولیس اور سرکاری اہلکاروں سے چھپنے رہنا دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ جب اسے میری سنجیدگی کا وہم ہوا تو محض میری آزادی اور میرے مستقبل کی خاطر اس نے اچانک چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنی دانست میں میری ذات پر احسان کیا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس طرح وہ مجھے ناقابلِ برداشت روحانی کرب کے چنگل میں پھنسا رہی ہے۔ وہ میری محبوبہ تھی، بیوی تھی، دوست تھی اور نہ جانے کیا کیا تھی۔ اس کی موجودگی میں میں نے کبھی اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا مگر اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس بے جگر لڑکی کے بغیر صفدر علی کی ذات نامکمل تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ گہری رفاقت بدترین لمحوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ کراچی میں میں ہر رات نئی لڑکی کے ساتھ اپنی نظر نواز خوابگاہ کو سجاتا تھا۔ شراب کے خمار میں ڈوب کر میں نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو قسمیں کھا کھا کر اپنی محبت کا یقین دلایا مگر ان لمحوں میں میں اپنی بیوی کا انتخاب نہ کر سکا۔ میں انھیں فریب دیتا رہا وہ مجھے لوٹتی رہیں۔ شراب، شباب اور پیسے کا شیطانی مثلث مجھے کبھی آسودگی نہ دے سکا۔ میں آبلہ پا صحرانورد کی طرح ہر رات ایک نئے سراب کا پیچھا کرتا تھا مگر منزل کبھی نہ پا سکا۔

ہاں جب سیتا کے ساتھ میں نے دلدلوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنی زندگی کے بدترین دن گزارے جہاں موت کے فرشتے ہر سو میری بُو سونگھتے پھر رہے تھے تو یکایک مجھے محبت، رفاقت اور دوستی کے آسمانی رشتوں کا عرفان حاصل ہوا اور میں نے سیتا کو اپنا لیا مگر اب میری سیتا انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے طوفانی سمندر میں نہ جانے کہاں کھو چکی تھی۔ اس بار مجھے یقین نہ تھا کہ میں دوبارہ اس کو پا سکوں گا۔

میں یادوں اور خیالوں میں کھویا رہا۔ دن دبے قدموں گزر گیا۔ ساحل کے اس پار دھندلکوں میں روشنیاں جل اٹھیں جیسے ناامیدی میں اُمید کے دیے

جگمگا اٹھے ہوں۔ نیچے سمندر کی لہروں کا اضطراب رات کے اندھیرے نے نگل لیا۔ اب وہاں غضب ناک لہروں کی جگہ ایک سیاہ چادر پھیلی ہوئی تھی۔

"اب ہم بمبئی سے کتنی دُور ہیں؟" اچانک میں نے پاٹھک سے سوال کیا۔

"وہ سامنے بمبئی کی بندرگاہ ہے۔" پاٹھک نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا اور بے اختیار میری نظریں اسی طرف اٹھ گئیں۔

میرے سامنے رنگ و نور کا ایک دلفریب سماں بکھرا ہوا تھا۔ بلند و بالا عمارتوں کی روشن کھڑکیاں تاروں بھرے آسمان کو چھوتی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے دامن میں تیز روشنیوں میں جہازوں کی کچھ خوابیدہ اور بہت سی دھواں اُگلتی چمنیاں جگمگا رہی تھیں۔ کچھ روشنیاں سمندر کے سینے پر سرک رہی تھیں۔

ہیلی کاپٹر کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ منظر لمحہ بہ لمحہ واضح تر ہوتا چلا گیا۔ پھر ہمارا ہیلی کاپٹر بندرگاہ سے باہر لنگر انداز جہازوں پر سے گذرا۔

انجن اور پنکھڑیوں کے یکساں شور پر حاوی کسی جہاز کے ہوٹر کی تیز آسیبی چیخ سُنائی دی۔ بندرگاہ پر دیو ہیکل مشینی کرینوں کے آہنی ڈھانچے بے چین کتوں میں مصروف نظر آئے۔ وہاں رات کا سکوت کہیں نظر نہ آتا تھا۔ زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔

پھر وہ مناظر پیچھے رہ گئے اور ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ داہنی سمت جانے لگا۔ بلندی بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ہم جوہو کے جگمگاتے علاقے پر جا پہنچے۔ پائلٹ نے جوہو ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا۔ نیچے رن وے کے اطراف میں لگی ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کنٹرول سے کلیئر کا سگنل ملتے ہی ہیلی کاپٹر نیچے جانے لگا! اس کی تیز سرچ لائٹ روشن ہوئی اور ایئرفیلڈ کا بڑا حصّہ اس حد تک روشن ہو گیا کہ زمین پر پڑی ہوئی کیل بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

ایئرپورٹ کے اس دُور افتادہ حصّے میں چند گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور زرد وردی میں ملبوس ایک شخص ہارڈ بورڈ کے سفید سگنل کارڈ کو نیم دائرے کی شکل میں گردش دے رہا تھا۔

آخر کار ہیلی کاپٹر زمین سے جا لگا۔ پنکھڑیوں سے آنے والی تیز ہوا کے جھونکوں سے وہاں آندھی کا سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ سگنل دینے والے کی وردی بُری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ ان ہی جھونکوں میں ہم دونوں ہیلی کاپٹر سے اُترے اور تیز ہوا سے پناہ لینے کے لیے دُور کھڑی گاڑیوں کی طرف دوڑ پڑے۔

یہاں پاٹھک رائے کا استقبال کرنے والوں میں شاید سیکرٹ سروس کا ایک کارندہ بھی موجود تھا کیونکہ اسی نے ناموں کی حد تک لوگوں کا تعارف کرایا! اس موقعے پر مجھے نظرانداز کر دیا گیا۔

جتنی دیر وہ لوگ باتوں میں مصروف رہے، میں نے آس پاس کا جائزہ لیا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہم ایئرپورٹ کے بجائے اس سے ملحق ہیلی پیڈ پر اُترے ہیں۔

چند منٹ بعد میں پاٹھک رائے کے ہمراہ ایک لمبی کار میں سوار ہوا۔ سیکرٹ سروس کے مقامی ایجنٹ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

نصف گھنٹے بعد ہمارے سفر کا اختتام ایک بہت بڑے مکان پر ہوا جس کے پھاٹک پر بنے ہوئے کیبن میں دو مسلح سنتری پہرے پر موجود تھے۔

"پاٹھک رائے صاحب ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے ہیں۔" ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے سنتری سے کہا اور وہ کیبن میں چلا گیا۔ میں نے اسے کیبن میں ٹیلی فون کا چونگا کان سے لگائے دیکھا۔ وہ انٹرکام پر ڈاکٹر راما نند سے بات کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد گاڑی اندر لے جانے کی اجازت مل گئی۔

دو رویہ اونچے اونچے درختوں کے درمیان بجری کی سڑک پر ٹائروں کی آواز کافی گونج رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے لیکن ان کی روشنی چند فٹ سے باہر کام نہیں کر رہی تھی۔ درختوں کے عقب میں شاید باغ وغیرہ پھیلا ہوا تھا۔ ادھر سے جھینگروں کا مسلسل شور اُبھر رہا تھا۔ ان ہی آوازوں میں کبھی کبھار کی آوازیں بھی آنے لگتی تھیں۔

جب ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے سڑک اور درختوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا تو پہلے میں یہ سمجھا کہ وہ کوئی اجتماعی کالونی ہے جو اس احاطے میں ہے مگر ایک ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرا یہ خیال باطل ہو گیا۔ قدیم ہندوانی طرز کی ایک بڑی سی عمارت نظر آ رہی تھی جس کے برآمدے میں ڈاکٹر راما نند اوور کوٹ پہنے بنفسِ نفیس موجود تھا۔

"ارے لڑکے! میں تو تمھارا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔" گاڑی سے اُترتے ہی راما نند خوشی سے چیختا ہوا میری طرف لپکا۔ "میں نے سُنا تھا کہ ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا تھا۔ تمھیں چوٹیں تو نہیں آئیں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے والہانہ انداز میں مجھے گلے سے لگا لیا۔

"میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب!" اس کا خلوص دیکھ کر مجھ پر ندامت سی طاری ہونے لگی۔ میرا جی چاہا کہ اس عظیم انسان کے قدموں میں گر کر اس بات کا اعتراف کر لوں کہ اب تک میں اسے بے وقوف بناتا رہا ہوں مگر اب اس سے ہرگز دھوکا نہیں کروں گا مگر میں یہ نہ کر سکا۔

ڈاکٹر نے پاٹھک سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ "حادثے میں تمھیں چوٹ نہیں آئی؟"

"بس مقدر اچھے تھے جو بچ گیا۔" پاٹھک نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کے چہرے سے شکست خوردگی کی ساری علامات ظاہر تھیں۔

پھر ڈاکٹر راما نند سب کو اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ تعارف کے دوران میں مجھے پتہ چلا کہ تیسرے آدمی کا نام حبیب تھا۔

اندر پہنچ کر راما نند میرے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گیا اور پاٹھک اپنے ساتھ لائے ہوئے بریف کیس میں سے کچھ کاغذات نکالنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ یہ کاغذات پڑھ لیں۔ صفدر علی کی حوالگی کے سلسلے میں آپ کو ان پر دستخط کرنے ہوں گے۔" پاٹھک نے کہا۔

"یہ تو پوری کتاب ہے۔" راما نند نے اس کے ہاتھ سے کاغذات کا پلندہ لیتے ہوئے کہا۔ "تم زبانی خلاصہ بتا دو، میں دستخط کر دوں گا۔"

"صفدر علی کا ماضی پُراسرار اور مشکوک ہے۔" پاٹھک نے نپے تلے الفاظ میں کہنا شروع کیا۔ "یہ ایک رشی کی صورت میں ہند میں داخل ہوا اور نیپال کو رُوپوش ہو جاتا ہے۔ سیکرٹ سروس کی صریح ہدایات کے باوجود صفدر نے روپوشی اختیار کی، پھر بنارس وغیرہ میں قتل و غارت گری کے متعدد واقعات میں ملوث ہوا، پھر کانپور میں اس نے سیکرٹ سروس کے دو افسران کو قتل کیا جو اسے پہچان کر اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ آخر کار سیکرٹ سروس نے اسے گرفتار کر لیا مگر سیکرٹ سروس کی تحویل میں ہونے کے باوجود صفدر نے وحشیانہ طریقے پر ڈاکٹر ہمدی کو مار ڈالا۔ آپ ان تمام واقعات سے بخوبی واقف ہیں اور صفدر علی کو اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں لہٰذا سیکریٹری وزارتِ دفاع اور خزانہ کے حکم سے آپ کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اب اس کی پوری ذمّہ داری آپ پر ہو گی۔ سیکرٹ سروس صفدر کے بارے میں کسی طرح ذمّہ دار نہ ہو گی۔ یہ نہایت خطرناک، مکّار اور عادی مجرم ہے۔"

اس دوران میں راما نند حیرت سے منہ پھاڑے مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ پاٹھک کے خاموش ہوتے ہی وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکا میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں ثابت ہو گا۔" اور اس نے پاٹھک سے قلم لے کر کاغذات پر دستخط کر دیے۔

"ان کاغذات کی ایک نقل آپ رکھیں۔" پاٹھک نے اپنے دستخط ثبت کرنے کے بعد چند گلابی کاغذ ڈاکٹر کے حوالے کر دیے۔

پھر میں ڈاکٹر کے ہمراہ ان دونوں کو الوداع کہنے برآمدے تک آیا۔ میرے لیے یہ بات حیرت ناک ثابت ہوئی کہ اس ملاقات میں ان دونوں میں سے کسی نے سائیکو فورٹ کے تلخ واقعات کا ذکر نہیں کیا۔

"آپ نے مجھے ان کے چنگل سے نکال کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔" میں نے گاڑی جانے کے بعد راما نند سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کوئی احسان نہیں کیا۔" وہ میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے فراخدلی کے ساتھ بولا۔ "میں نے اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کیا ہے۔ اگر میں تمھیں مظلوم سمجھتے ہوئے بھی سائیکو فورٹ میں سڑنے دیتا تو میرا ضمیر ہمیشہ مجھے کچوکے لگاتا رہتا۔ یہ احسان تو میں نے اپنی ذات پر ہی کیا ہے۔"

واپسی میں راما نند مجھے اپنے اسٹڈی روم میں لایا جہاں دو دیوار گیر الماریاں ضخیم سائنسی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔

"یہ جگہ بہت پُرسکون ہے۔" راما نند گلابی کاغذات ایک دراز میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں اطمینان سے اپنا کام کر سکو گے! ابھی کچھ عرصہ میں بھی یہاں رہوں گا۔ ٹرامبے کے ری ایکٹر میں فیول راڈز ڈمپنگ سسٹم میں خرابی ہو گئی ہے اسے دُور کرانے کے بعد میں تاراپور چلا جاؤں گا۔"

"ٹرامبے کا کام کتنے دن میں ختم ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کچھ اندازہ نہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "یہ ری ایکٹر کا سب سے اہم حفاظتی نظام ہے۔ اس کے بغیر ری ایکٹر ایٹم بم ثابت ہو سکتا ہے۔"

"مجھے اپنے کام میں ہر قدم پر آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہو گی۔"

"کیسی رہنمائی؟ میں تو خود تم سے کچھ سیکھنے کا متمنی ہوں!" اس نے حیرت سے کہا۔

"بمبئی میرے لیے نیا شہر ہے۔ سامان کی خریداری پھر ملاوٹ کے بے اصل سونے کی فراہمی میرے بس سے باہر ہو گی۔ ہند میں سونے کا لین دین قانوناً جرم ہے۔"

"اوہ! تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ سب سرکاری طور پر ہو گا ویسے میرا بیٹا یہیں رہتا ہے، وہ ہر وقت تمھاری مدد کرے گا۔"

"آپ کا بیٹا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" راما نند خوشی سے بولا۔ "میں ابھی اسے بُلاتا ہوں۔"

"اوشا بیٹا!" قدرے توقف کے بعد راما نند نے بلند آواز میں پکارا اور مجھ پر حیرت کا شدید حملہ ہوا۔ تذکرہ بیٹے کا تھا اور نام نسوانی۔

"آئی بابا!" کسی قریبی کمرے سے سُریلی سی آواز اُبھری اور میں اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

فوراً ہی کسی کے دوڑتے ہوئے ننگے پیروں کی دھمک سُنائی دی اور جب وہ دھمک اسٹڈی روم کے دروازے پر پہنچی تو میرا سانس اوپر کا اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔

دروازے میں ایک سبک اندام، دراز قامت، بے حجاب، شوخ صورت، دلربا نازنین سیاہ جین اور جیکٹ میں ملبوس کھڑی حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی۔

اس کے معصوم اور شوخ چہرے پر بکھری ہوئی حیرت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے میری وہاں موجودگی کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنے بابا کو اکیلا جان کر جس حال میں تھی اسی حال میں ننگے پیروں وہاں دوڑی آئی تھی اور اب خود کو اس حال میں ایک جوان اجنبی کے سامنے پا کر بوکھلا گئی تھی۔

"آؤ بیٹا۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں، یہ صفدر علی ہے اور اب اسی گھر میں رہے گا۔" عدسوں کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھیں لازوال محبت کے نور سے جگمگا رہی تھیں۔

"یہ... یہ ہے صفدر علی!" وہ حیرت سے جھجکتے ہوئے بولی۔ "صورت سے تو نہیں لگتا کہ یہ سونا بھی بناتا ہو گا۔" اس کے الفاظ بیباک تھے اور لہجہ معصومانہ۔

"بیٹا! تو کیا تم نے اسے مریخ کی مخلوق سمجھ رکھا تھا؟" باپ بیٹی میں حد سے زیادہ محبت کے ساتھ ہی بے تکلفی بھی پائی جاتی تھی۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ یہ ڈراؤنے چہرے اور بڑے بڑے بالوں والا کوئی جوگی ہو گا!"

راما نند بڑے زور سے ہنسا پھر بولا۔ "مگر یہ سُندر سا لڑکا ہے.... آؤ یہاں اپنے بابا کے پاس آؤ، وہاں کیوں کھڑے ہو بیٹا؟"

"میں جوتے پہن آؤں بابا!" وہ یہ کہہ کر جانے کے لیے مُڑی مگر راما نند نے اسے روک لیا۔

"آجاؤ۔" اس نے پکارا۔ "یہ تو دن رات یہیں رہے گا، اب اس کے سامنے تکلف کیسا!"

وہ فرماں بردار بیٹی کی طرح آئی، راما نند کے سامنے جھکی اور بوڑھے نے اس کا سُرخ و سفید رخسار چوم لیا۔ یکایک میرے ہونٹوں میں ناقابلِ بیان سوزش ہونے لگی اور میں نے بے رحمی سے اپنے ہونٹوں کو مسل ڈالا۔

وہ لاکھ نوخیز، بے حجاب اور قیامت شکن سہی مگر میرے محسن کی بیٹی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹانی چاہیں مگر وہ میرے سامنے ہی آ بیٹھی۔

"بابا! یہ گونگا ہے کیا؟" بیٹھتے ہی اس نے مجھ پر دوسرا وار کیا۔

"لڑکے! تم شرما کیوں رہے ہو!" راما نند مسکراتے ہوئے مجھ سے بولا۔

"تم خود اسے جواب دو ورنہ یہ میرا سر کھا جائے گا!"

راما نند کی زبان سے ایسی مکمل دوشیزہ کے لیے مردانہ صیغہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس کے توانگ انگ میں نسائیت بھری ہوئی تھی۔ حسن ایسا کہ دیکھنے والا خود شرما جائے!

"زبان تو ہے!" میں نے اوشا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اور تم سونا بھی بناتے ہو؟" اس نے شوق سے پوچھا۔

"تمھیں اپنے بابا کی بات پر یقین کرنا چاہیے!"

وہ میرے جواب پر بوکھلا گئی۔ "یقین تو ہے . . . بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔"

"کھانے کی میز لگواؤ۔" راما نند نے فوری خیال کے تحت کہا۔ "صفدر اگاڈی سے آیا ہے، بھوکا ہو گا، کھانے پر باتیں کر لینا۔"

اوشا وہاں سے چلی گئی۔

"میرا بیٹا میرے ہر راز کا شریک ہے۔" راما نند صوفے کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر بولا۔ "میں ہر کام میں اس سے مشورہ ضرور کرتا ہوں اور میرے ذہن سے سارا بوجھ اُتر جاتا ہے۔"

"اچھا کیا کہ آپ نے بتا دیا۔" میں ہنس کر بولا۔ "ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں کل سے اوشا کی سہیلیوں کے سامنے میری نمائش نہ شروع ہو جائے۔"

"اوشا بیٹا بہت سوشل ہے مگر اس کی ذات سمندر ہے، کبھی بھول کر بھی اس نے میرا کوئی راز افشا نہیں کیا۔"

پھر اس نے اپنی اور اوشا کی مقدس جذبوں میں ڈوبی کہانی چھیڑ دی۔ راما نند کی بیوی اوشا کی ولادت کے بعد ہی چل بسی تھی۔ اس وقت ڈاکٹر جوان تھا۔ کئی لڑکیاں اس سے شادی کی متمنی تھیں مگر راما نند نے اوشا کی خاطر ایسے ہر مشورے کو ٹھکرا دیا۔ اس نے جہاں اوشا کو باپ کی شفقت دی وہیں ماں بن کر اسے پروان چڑھایا، اسے بہترین اداروں میں تعلیم دلائی۔ وہ بیرونی دوروں پر جہاں بھی گیا، اوشا اس کے ساتھ رہی۔ راما نند کو دیوانگی کی حد تک اپنی اکلوتی لڑکی سے پیار تھا۔ گفتگو کے دوران میں، میں نے اندازہ لگایا کہ راما نند کے ذہن کے کسی گوشے میں اوشا کی شادی کا تصور نہیں تھا۔ وہ یہی سوچتا تھا کہ اوشا سدا اس کے ساتھ رہے گی۔

کھانے کے دوران میں اوشا کی زبان چلتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں میری جھجک بھی دُور ہو گئی اور ہم تینوں گہرے دوستوں کی طرح بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کون باپ ہے، کون بیٹی اور کون مفرور قاتل —— جسے مقدر نے راما نند کی گود میں ڈال دیا تھا۔

اس رات میں سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے بارے میں [illegible] خوابگاہ میں گونجتا تاریک سناٹا میری بے چینی بڑھا رہا تھا۔

جس رات کراچی کے ساحل سے دُور میری لانچ [illegible] جوئے میں سب کچھ ہار، وہ میرے سکون کی آخری رات تھی۔ [illegible] چور راستے پر اپنی معتمد داشتہ سوزی کو الوداع کہنے کے بعد میں نے [illegible] منتخب کی اور ابھی تک میں اسی راستے پر دوڑا جا رہا تھا۔ میں نے [illegible] سے اپنے دل کو ٹٹولا کہ اب میں کس لیے بھاگ رہا تھا اور میرے دل [illegible] میں سیتا کا نام نور بن کر چمکنے لگا۔ اگر سیکرٹ سروس میری راہ [illegible] تک میں پارس پتھر سمیت سرحد عبور کر کے پاکستان پہنچ چکا ہوتا اور [illegible] اپنا گھر بسا لیا ہوتا۔ اپنا گھر، آزاد زندگی اور اپنے بچے —— بس یہی [illegible] آرزو تھی جو مجھے کہیں نہ رُکنے دیتی تھی۔

مگر اب سیتا کہیں کھو چکی تھی۔ اس کی بازیابی کی اُمید بہت [illegible] میں قانون کے خوف سے بچا لیا گیا تھا اور راما نند کی پناہ میں تھا۔ میرا [illegible] کتاب کے اعداد صفحوں کی صورت میں اس کے سامنے تھا مگر میری [illegible] کے طلسم میں پھنس کر اس نے ان حقیقتوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ میری خود غرضی [illegible] کے جواب میں راما نند نے میرے ساتھ جو مہربان رویہ اختیار کیا وہ [illegible] قدموں کی زنجیر بنتا جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں چند دن اور اس [illegible] رہا تو کبھی اسے دغا دے کر ہند سے فرار نہ ہو سکوں گا۔ اگر میں راما نند کے [illegible] رہتا تو میرا مستقبل تابناک ضرور تھا مگر وطن سے دُور، خون کے رشتوں [illegible] میں کبھی سکون سے نہ رہ پاتا . . . میری ماں، میرے بھائی، میری [illegible] تصور پر چھانے لگیں۔ ہندوستان میں سب کچھ پا کر بھی میں ساری [illegible] سا رہتا . . . پھر شاید کسی موڑ پر میں اوشا کو بھی جیت سکتا تھا۔ اس [illegible] کی کمی نہ تھی مگر سیتا کی محبت کا یہ کوئی مول نہ تھا!

پھر اچانک مجھے پارس پتھر یاد آیا۔ وہ میرا ضرور تھا مگر فی الحال [illegible] قبضے میں نہ تھا۔ میں ہندوستان کے ایک سرے پر بیٹھا تھا اور پارس [illegible] سرے پر انبالہ کے راجہ ہوٹل کی ایک الماری کے سوراخ میں پوشیدہ تھا۔ [illegible] راما نند کے پاس سے بھاگ نکلتا تو پارس لیے بغیر ہندوستان کی سرحد [illegible] کا تصور بھی محال تھا جبکہ بمبئی سے انبالہ کے طویل سفر میں بے شمار [illegible] تھے۔ سائیکو فورٹ میں میری ہر شناخت موجود تھی۔ مختلف زاویوں [illegible] میری بے شمار تصاویر لی گئیں، انگلیوں کے نشانات لیے گئے، [illegible] کر کے میرے جسم پر موجود ہر نشانی کا ریکارڈ تیار کیا گیا حتیٰ کہ طبی معائنے [illegible] دوران میں یہ بھی نوٹ کر لیا گیا کہ میری ایک عدد اوپری داہنی داڑھ [illegible] ہے جو میں نے عرصۂ دراز قبل کیڑا لگنے کے سبب نکلوا دی تھی۔ اس [illegible] ریکارڈ کی موجودگی میں میرا بچا رہنا محال نظر آتا تھا۔ پھر میری چھٹی حس [illegible] کہ بظاہر سیکرٹ سروس والے مجھے راما نند کے حوالے کر کے میری ذات [illegible] ہو چکے ہیں مگر وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ روپوش رہ کر ہر [illegible] پر میری نگرانی کریں گے۔ پوشیدہ آنکھیں ہر آن مجھ پر جمی رہیں گی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کوئی مناسب تجویز ذہن میں آنے تک میں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دوں۔ ہند سرکار کے خزانے کے لیے مصنوعی سونا بنا رہا ہوں تاکہ میری خاموشی پوشیدہ آنکھوں کو مطمئن کر دے اور جب لوگ میری [illegible] کر بھولنے لگیں تو میں آزاد فیصلہ کر سکوں۔

اگلے روز راما نند میرے جاگنے سے قبل ہی ٹرامبے جا چکا تھا۔ یہ اطلاع ملازمین سے ملی جن کی فوج اس عمارت میں پلی ہوئی تھی۔ ان میں [illegible] باورچی بھی تھا، چمپا بھی، سلونی بھی اور داروغہ صفائی ہوبرٹ بھی۔

میں ناشتے میں مصروف تھا کہ اوشا آ گئی۔

"صبح بخیر مس اوشا!" میں نے ملائم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"شاید تم رات کو سو نہیں سکے!" اس نے میری ورم آلود سُرخ [illegible] میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نئے اصطبل میں پہلی رات گھوڑا بھی بے چین رہتا ہے!"

"وہ کمرہ تمھیں اصطبل لگتا ہے!" اس کے چہرے پر بکھری ہوئی مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی۔

"اوہ نو۔ روانی میں کہہ گیا۔" میں نے سٹپٹا کر وضاحت کی۔ "میرا مطلب تھا کہ نئی جگہ ہے، ایک دو روز میں عادی ہو جاؤں گا۔"

اس کے حسین چہرے پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ "کمروں کی آرائش میں خود کرتی ہوں، آئندہ اس بارے میں سوچ سمجھ کر تبصرہ کرنا۔"

"ڈاکٹر کہاں ہیں؟"

"وہ ٹرامبے گئے ہیں۔ تم میرے ساتھ خریداری کے لیے چلو گے۔ بابا شام تک لوٹ آئیں گے۔ ہمیں ان سے پہلے لوٹ آنا ہے۔"

ناشتے کے بعد میں اوشا کی گاڑی میں وہاں سے چل دیا۔

بمبئی کی سڑکیں بھانت بھانت کے لوگوں اور ٹریفک کے اژدہام سے بھری ہوئی تھیں۔ اوشا ماہرانہ انداز میں گاڑی چلاتی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی۔

سب سے پہلے وہ مجھے گالا ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں لے گئی۔ وہاں اس نے مول تول کیے بغیر اپنی پسند سے میرے لیے بہت سے دیدہ زیب بے شمار ملبوسات خریدے۔ رومال، موزے، شیو کا سامان، بنیان۔ وہ مسلسل خریدے جا رہی تھی اور میں اسے روک رہا تھا۔

"یوں لگتا ہے جیسے تم نے مجھے ساری زندگی ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔" اسٹور کے ایک گوشے میں تنہائی پا کر میں نے کہا۔

"تو کیا تمھارا یہاں سے بھی بھاگنے کا ارادہ ہے؟" اس کے برجستہ جواب نے مجھے خاموش کر دیا۔

شاید راما نند کے لیے ساری خریداری وہی کرتی تھی کیونکہ روزمرہ ضروریات کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس نے ٹرالی پر نہ لاد دی ہو۔

اسی دوران میں اچانک میری نظر ان دونوں پر پڑی جو اسٹور کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑے تھے۔ سیکرٹ سروس کے ایجنٹ جیکب کو میں فوراً پہچان گیا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے دوسرے آدمی کو کچھ بتا رہا تھا۔ میرے گھومتے ہی وہ پھرتی سے سامان سے لدی الماریوں کے درمیان گھس گیا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی۔

میں دوسرے آدمی کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا البتہ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ ضرور محسوس کی۔ وہ سرمئی رنگ کے دھاری دار سوٹ میں ملبوس تھا۔

میں نے اوشا سے اس قصے کا کوئی ذکر نہ کیا اور بل ادا کر کے ہم اسٹور سے باہر آ گئے۔ اسٹور کے ملازمین نے سارا سامان عقبی نشست پر ڈھیر کر دیا۔

پھر گاڑی کا رُخ جدید بازاروں سے قدیم عمارات کی طرف ہو گیا۔ ایک جگہ گاڑی پارک کرنے کے بعد اوشا نے بتایا کہ اب ہمیں کیمیاگری کے لوازمات کی خریداری کرنی ہو گی۔

بمبئی کے بازاروں میں حُسن کے جلووں کی کمی نہ تھی۔ منی اسکرٹ، منی ساڑی، جینز، قمیص شلوار، نیچے گلے کے ملبوسات، ہر فیشن موجود تھا مگر اوشا میں کچھ نہ کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ لوگوں کی نگاہیں دُور تک اس کا پیچھا کرتی رہتی تھیں۔

دکان دکان خاک چھاننے کے بعد ہم لدے پھندے واپس ہوئے۔ سارا وقت میری بے چین نظریں ہر طرف بھٹکتی رہیں مگر سرمئی سوٹ والا وہ لنگڑا کہیں نظر نہیں آیا جو گالا اسٹور میں جیکب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف نظر آیا تھا۔

ہماری غیر موجودگی میں ٹرامبے سے ڈاکٹر کا فون آیا تھا کہ وہ دیر سے گھر لوٹے گا لہٰذا میں اوشا کے ہمراہ مکان کے سروے میں مصروف ہو گیا۔ میں جلد سے جلد ڈاکٹر راما نند پر اپنے تجربے کی سچائی ثابت کرنی چاہتا تھا لہٰذا ایک کمرے کا انتخاب کرنے کے بعد میں نے بھٹی وغیرہ لگانی شروع کر دی۔

یہ کمرہ عمارت کے آخری حصے میں واقع تھا۔ اس کی کھڑکی عقبی حصے میں پھیلے ہوئے ویران باغ میں کھلتی تھی جہاں روشنی کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا۔

"پتہ نہیں تم نے بابا پر کیا جادو کیا ہے کہ وہ ہر وقت تمھارا دم بھرتے رہتے ہیں!" اوشا میرا ہاتھ بٹاتے ہوئے اچانک بولی۔

"تمھارے بابا بہت سیدھے اور سچے انسان ہیں! انھوں نے اپنی آنکھوں سے میری مظلومیت دیکھی اور میری مدد پر تل گئے!"

"مجھے تو کبھی کبھی تم اوّل درجے کے مکار لگتے ہو!" وہ کھنکتا ہوا قہقہہ مار کر بولی۔

"تمھارا سایہ پڑنے لگتا ہوگا!"

"میں مکار ہوں؟"

"ہاں!" میں نے اس کی نظروں میں نظریں ڈال کر کہا۔ "بابا کے سامنے دودھ پیتی بچی بنی رہتی ہو اور جب تنہا ہوتی ہو تو خرانٹ بوڑھیوں کے سے رویے کا اظہار کرتی ہو!"

"بابا میرا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں میں ہر فکر سے بے نیاز ہو جاتی ہوں۔" وہ بولی۔

"اور اکیلے میں کیا پریشانیاں ڈراتی ہیں؟"

اس نے نظریں جھکا لیں اور ایک کوئلے سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "بابا نے مجھے ایسی تربیت دی ہے کہ مجھ میں بلا کی خود اعتمادی ہے مگر بنیادی طور پر میں ایک لڑکی ہوں۔ بابا کے پکارنے سے لڑکا تو نہیں بن سکتی۔ ہمارے معاشرے میں لڑکی کا ذرا بھی غیر متوازن رویہ بے شمار مصائب کو دعوت دے بیٹھتا ہے!"

"تمھیں اپنی اس کمزوری کا احساس ہے؟"

"بہت شدید!" وہ بولی اور میرا دل دھڑک اٹھا۔

"تو اس کا علاج کیوں نہیں کرتیں۔ کہو تو میں بابا سے بات کروں؟"

"کیا؟" اس نے بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"شٹ اپ!" وہ میرا مفہوم غلط سمجھی۔ "تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے شادی کروں گی! خرابی تو یہی ہے کہ جس سے بے تکلفی سے بات کرو وہ شادی کرنے پر تل جاتا ہے!"

"میں شادی شدہ ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میرا یہ مقصد نہیں تھا۔"

"کیا؟" حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اسی وقت باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے باہر مجھے خشک پتوں کے چرچرانے کی ہلکی سی آواز آئی۔ میں دوپہر میں جیکب کے ساتھ سرمئی سوٹ والے لنگڑے کو دیکھنے کے بعد سے لاشعوری طور پر بہت زیادہ محتاط تھا لہٰذا چیتے کی سی پھرتی سے کھڑکی کی طرف لپکا۔

کھڑکی سے باہر گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہاں جو بھی تھا کھڑکی پر میرا ہیولا دیکھتے ہی باڑھ کی طرف لپکا اور میں نے اسے للکارتے ہوئے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔

باڑھ پھلانگ کر جنگل نما تاریک باغ میں گھسنے کی کوشش میں وہ جھاڑیوں میں اُلجھ کر گرا اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے خشک جھاڑیوں میں [illegible] اس نے کسی وحشی بھینسے کی طرح غرا کر میرے چہرے پر ایک [illegible] رسید کی اور میری گرفت اس پر کمزور پڑ گئی۔

اس نے نہایت پھرتی سے مجھے ایک طرف اچھال [illegible] باغ میں گھستا چلا گیا۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے منتشر حواس [illegible] قدموں کی دھمک کے تعاقب میں خشک پتوں کو مسلتا اندھیرے [illegible]

پھر تاریکی میں اس کا بھاگتا ہوا ہیولا بھی مجھے نظر آ گیا۔ [illegible] دوڑتے اچانک وہ پلٹا، ایک زبردست دھماکے سے فضا [illegible] ہوئے جھینگر اچانک خاموش ہو گئے اور گولی چند انچ کے فاصلے کے ساتھ گذر گئی۔ میں بے اختیار سینے کے بل زمین پر گر گیا۔

اس اثنا میں حملہ آور کے قدموں کا شور دور جا کر معدوم [illegible] پھاٹک کی طرف سے سنتریوں کی تیز سیٹیوں کا شور سنائی دے [illegible] عمارت میں بھی اچانک ملی جلی خوفزدہ چیخیں گونجنے لگی تھیں۔ ان میں [illegible] آواز نمایاں تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں مسلسل مجھے پکارے جا رہی [illegible]

"میں زندہ ہوں!" میں زمین سے اٹھتے ہوئے چیخا اور [illegible] چل دیا۔ مسلح حملہ آور کے تعاقب میں اس ویران اور تاریک جنگل [illegible] اس وقت موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

اندھیرے میں واپس لوٹتے ہوئے میں نے اپنی دکھتی پیشانی [illegible] ٹٹولا تو وہاں خون کی نمی محسوس ہوئی۔ وہ جو بھی تھا نہایت وحشی [illegible] کی طرح طاقتور تھا۔

میں کھڑکی کے راستے اندر پہنچا تو اوشا کی نہتی ہوئی آواز [illegible]

"گولی تمھاری پیشانی پر لگی ہے... کون تھا وہ مردود؟" خوفزدہ [illegible] ملازموں کی بھیڑ نے مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔

سخت کوفت اور تکلیف کے باوجود میں مسکرا دیا۔ "گولی [illegible] لگی ہوتی تو میں زندہ نہ ہوتا، یہ معمولی سا زخم ہے!"

"تم نے اسے پکڑ تو لیا تھا نا؟"

"ابھی بتاتا ہوں، ملازموں کو واپس بھیجو پہلے!" میں نے [illegible] سہلاتے ہوئے کہا پھر اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا اور میں نے [illegible] لوٹتے ہوئے ملازمین کو واپس بلا لیا۔ "کیا سب لوگ موجود ہیں؟"

بے چین اور خوفزدہ نظروں نے بھیڑ کا جائزہ لیا۔ کچھ [illegible] ہوئیں پھر مشترکہ جواب ملا کہ راجو موجود نہیں ہے۔

"اسے تلاش کر کے بھیجو!" میں نے ہاتھ ہلا کر انھیں جانے [illegible]

وہ چلے گئے تو میں اوشا کو اس قصے کے بارے میں بتا[illegible] نظریں کھڑکی سے باہر ویران باغ میں جمی ہوئی تھیں جہاں [illegible] چمکاتے، سیٹیاں بجاتے چکراتے پھر رہے تھے۔

اسی وقت باغ میں ایک اور فائر گونجا اور فضا دم توڑتی [illegible] انسانی چیخ سے گونج اٹھی۔ اوشا چیختی ہوئی کسی شہتیر کی طرح میرے [illegible] سے آ لگی۔ اس کا پورا بدن خوف سے کانپ رہا تھا!

اِس وقت ماحول اس قدر سنسنی خیز اور ہولناک تھا کہ مجھے اپنی آغوش میں دُبکی ہوئی، سہمی سکڑی اوشا کے [illegible] ہوئے حسین و جوان بدن کا خمار بالکل محسوس نہ ہو سکا۔ دہشت اور بے[illegible] کے اس عالم میں اگر میری باہوں میں کھردرے پتھروں سے بنا ہوا کوئی ستون ہوتا تو میرے خیالات وہی ہوتے جو اس وقت میرے ذہن پر مسلط تھے! کھلی کھڑکی میں سے ویران اور تاریک باغ اب بھی نظر آ رہا تھا۔ مسلح [illegible] کی ٹارچوں کے ناچتے ہوئے روشن دائرے دوسرا فائر ہوتے ہی غائب ہو چکے تھے۔ وہ فائر بجائے خود بہت بڑے خطرے کی علامت تھا۔ اس کا مطلب تھا مسلح آدمی ابھی تک اس گنجان اور تاریک باغ کے کسی جھنڈ میں دُبکا ہوا تھا اور کسی بھی لمحے تیسرا فائر سنائی دے سکتا تھا۔

وہ دم توڑتی ہوئی لرزہ خیز انسانی چیخ یقینی طور پر باغ میں ایک قتل کی نشاندہی کر چکی تھی۔ وہ گولی مہلک نشانے پر ہی لگی تھی اور جو بھی اس کی زد میں آیا تھا دم توڑ چکا تھا کیونکہ یہ چیخ معدوم ہونے کے بعد باغ میں اچانک غیر فطری سناٹا چھا گیا تھا۔ جھینگر تک خوفزدہ ہو کر یک بیک خاموش ہو چکے تھے اور میرے کان اس پُرہول سناٹے میں نقل و حرکت کی کسی آہٹ کی تلاش میں تھے۔

اسی وقت مکان کے کسی قریبی حصے سے چند ملی جلی خوفزدہ آوازیں اور [illegible] ہٹیں سنائی دیں اور چند ہی ثانیوں میں ملازموں کی دہشت زدہ بھیڑ وہاں آ پہنچی۔

"روشنی گل کر دو!" میں اچانک چیخا اور کھٹکے کی چند آوازوں کے ساتھ ہی وہ کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

وہاں روشنی ہونے کے باعث سب لوگ چھپے ہوئے قاتل کے لئے آسان نشانہ تھے۔ تاریکی ہو جانے پر کم از کم یہ خطرہ ٹل گیا تھا۔

"سب لوگ نیچے بیٹھ جاؤ ورنہ کسی کی بھی کھوپڑی میں سوراخ ہو سکتا ہے!" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں ان سب کو ہدایت دی اور خود آہستگی کے ساتھ اوشا کو فرش پر لٹانے لگا۔ وہ خوف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

"کیا پتہ چلا؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"نہیں!" جگدیش کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہم مکان سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ گولی چلنے کی دوسری آواز سنائی دی اور ہم واپس ادھر دوڑ پڑے!"

"اوشا بی بی یہیں بے ہوش پڑی ہیں، میں باہر جا رہا ہوں، میری واپسی تک تم سب اسی کمرے میں رکے رہو گے!" میں کسی چوپائے کی طرح کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"باغ میں نہ جاؤ موہن بابو!" داروغہ صفائی ہوبرٹ کی سرگوشیانہ آواز میں خوف اور تشویش کے سائے لرزاں تھے۔ "ادھر تمھاری جان کو خطرہ ہے!"

میری خواہش پر ڈاکٹر رامانند نے اپنے ملازمین کو میرا نام موہن کانت بتایا تھا اور وہ سب مجھے اسی نام سے پکارتے تھے!

"ہو سکتا ہے کہ ہماری مدد زخمی ہونے والے کی زندگی بچا سکے، بزدلوں کی طرح ہم کب تک اس کمرے میں بند رہیں گے!" میں نے کہا۔

اندھیرے میں کوئی میری طرف لپکا اور میرا بازو پکڑ لیا۔ "وہ آخری چیخ، موہن بابو!" ہیربرٹ کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ "اب تک وہ مر چکا ہوگا۔ ابھی قاتل بھی باغ ہی میں ہے۔ پھر ہمارے دو مسلح سنتری بھی ادھر موجود ہیں۔ اندھیرے میں دوست دشمن کی تمیز نہیں ہوتی۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارا ہی کوئی سنتری دھوکے میں تم پر گولی چلا دے۔"

اس کے شبہات معقول تھے لہٰذا میں رک گیا!

باہر جھینگروں کا شور ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا مگر سنتریوں کی سیٹیوں کی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ ابھی تک جانوں کے خوف سے کہیں دبکے پڑے تھے۔

پھر اچانک ہی مجھے انٹرکام یاد آیا اور میں تیزی سے نشست گاہ کی طرف لپکا۔ نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز آتی رہی مگر کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ میں نے سلسلہ منقطع کر کے دوبارہ نمبر ملایا تو فوراً ہی ایک ہانپتی ہوئی خوفزدہ سی آواز ریسیور میں سنائی دی۔

"سس... سرکار باغ میں ایک... ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔"

"تم دونوں کہاں غائب تھے؟"

"دوسرا فائر ہوتے ہی ہم چھپ گئے تھے سرکار! اندھیرے میں بڑی مشکل سے لاش تک پہنچے ہیں بھولا ناتھ وہیں رکا ہوا ہے!"

"تم پھاٹک پر اپنے کیبن میں ٹھہرو، میں ادھر آ رہا ہوں!" میں نے یہ ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں کمرے میں واپس لوٹا تو اوشا ہوش میں آ چکی تھی۔ ملازمین نے اسے خوابگاہ میں لے جانا چاہا مگر وہ اسی تاریک کمرے میں میرا انتظار کرتی رہی۔

میری دانست میں اب وہاں اندھیرا رکھنا حماقت ہی تھا۔ باغ کا معرکہ نمٹ چکا تھا، مرنے والا مر گیا تھا اور قاتل بھی یقیناً بھاگ نکلا تھا لہٰذا میں نے کمرہ روشن کر دیا۔

روشنی میں اوشا کو دیکھتے ہی مجھے شدید ذہنی صدمہ پہنچا۔ اس کا گلابی، شہابی چہرہ خوف سے زرد پڑا ہوا تھا۔ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں گزرے ہوئے واقعات کی دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ روشنی ہونے پر چند سیکنڈ تک ماحول جوں کا توں رہا پھر اچانک اوشا کی نگاہیں میرے چہرے پر پڑیں اور وہ بے اختیار سسک کر رو پڑی۔

"اوشا بی بی! ہمت سے کام لو۔" چمپا نے بھرائی ہوئی ہمدردانہ آواز میں اپنی مالکن کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"رونے کی ضرورت نہیں۔ اس حادثے سے تمھارے اعصاب متاثر ہوئے ہیں، کمرے میں جا کر آرام کرنے کی کوشش کرو، میں باہر کا جائزہ لے کر ابھی آتا ہوں!" میں نے ہولے ہولے اس کا شانہ سہلاتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔

وہ روتے روتے اچانک خاموش ہو گئی اور رندھی آواز میں بولی۔ "میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی، تمھارے ساتھ باہر جاؤں گی!"

"تم اکیلی نہیں ہو اوشا!" میں نے اُسے سمجھانا چاہا۔ "سارے ملازمین تمہارے پاس موجود ہیں۔ میں صرف ہوبرٹ کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی، حملہ آور ابھی باہر اندھیرے میں چھپے ہوئے ہیں، وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"میں نے ابھی انٹرکام پر ایک سنتری سے بات کی ہے۔" میرا لہجہ ناصحانہ تھا۔ "حملہ آور بھاگ چکے ہیں اور باغ میں ایک شخص زخمی حالت میں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔"

"تم پولیس کو کیوں نہیں بلاتے، وہ خود سب دیکھ لیں گے۔"

"تم پولیس کو فون کرو، میں پھاٹک تک جا رہا ہوں۔ بچوں کی سی ضد نہ کرو۔"

اس بار وہ کچھ نہ بولی اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی اس کمرے سے نکل گئی۔

میں نے ملازمین کو اوشا کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور خود ہوبرٹ کو لے کر پورٹیکو کی طرف چل دیا جہاں اوشا کی گاڑی رہتی تھی۔

چند ہی منٹ میں میں پھاٹک پر جا پہنچا۔ سنتری ارجن سنگھ رائفل سنبھالے کیبن کے باہر بے چینی کے ساتھ میرا منتظر تھا۔

"وہ دو تھے موہن بابو!" میرے گاڑی سے اُترتے ہی ارجن سنگھ کی زبان مشینی انداز میں چل پڑی۔ "پہلے فائر کی آواز سنتے ہی ہم دونوں للکارتے ہوئے اندھیرے باغ میں گھسے۔ ہمیں دور تک دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دے رہی تھی پھر دوسرا فائر ہوا، ایک چیخ سنائی دی اور کسی کے زمین پر گرنے کا پُرشور دھماکہ سنائی دیا۔ اسی وقت بھولا ناتھ نے ایک سائے کو احاطے کی دیوار پھاند کر باہر کودتے دیکھا۔ وہ اتنی پھرتی سے بھاگا تھا کہ بھولا ناتھ اپنی رائفل بھی سیدھی نہ کر سکا۔ اندھیرے میں ہم بمشکل اس لاش تک پہنچ سکے۔ گولی اُس کے بائیں پہلو لگی ہے۔"

"وہ کدھر پڑا ہے؟"

ارجن سنگھ ہمیں لے کر اس اجاڑ اور ویران باغ میں گھس پڑا۔ بے ہنگم جھاڑیوں اور خود رو جنگلی پودوں کی بہتات نے اچھے خاصے باغ کو جنگل بنا یا ہوا تھا۔ اگر ارجن سنگھ کے پاس ٹارچ نہ ہوتی تو میں ان میں اُلجھ کر لہولہان ہو چکا ہوتا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم وہاں جا پہنچے۔

لاش پر روشنی پڑتے ہی میں چونک پڑا۔ اس کے بدن پر سُرمئی رنگ کا دھاری دار سوٹ نظر آ رہا تھا جو بُری طرح خون اور مٹی میں لتھڑ چکا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں گالا ڈپارٹمنٹل اسٹور کا منظر گھوم گیا جہاں دوپہر کے وقت میں اوشا کے ہمراہ خریداری کے لئے گیا تھا۔

وہاں میں نے انڈین سیکرٹ سروس کے مقامی ایجنٹ جیکب کو اسی قسم کے سوٹ میں ملبوس ایک شخص کے ہمراہ ستون کی آڑ میں محوِ گفتگو دیکھا تھا۔ اس کے انداز پر مجھے شبہ بھی ہوا تھا کہ جیکب اُسے میرے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔

اور اب اسی قسم کے سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص وہاں مرا پڑا تھا۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مرنے والا یقینی طور پر وہی آدمی ہے جسے جیکب کے ہمراہ دیکھا تھا مگر اُس کی موت کا سبب میرے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ اسے کیوں مارا گیا اور مارنے والا کون تھا؟

میں ان سوالات پر جتنا غور کرتا رہا ذہن اسی قدر اُلجھتا رہا۔ مرنے والا وہی تھا جسے دوپہر کو میں نے جیکب کے ہمراہ دیکھا تھا تو وہ یقیناً کسی طرح سیکرٹ سروس سے وابستہ تھا۔ شاید جیکب نے اسے میری نگرانی پر مامور کیا تھا۔ گو میں سیکرٹ سروس والوں سے چھٹکارا پا کر یہاں آ چکا تھا مگر میرے اندیشوں کے عین مطابق سیکرٹ سروس والوں نے لاتعلقی اختیار نہیں کی تھی۔ وہ سائیکو فورٹ سے میری رہائی کا راز جاننے کو بے چین تھے۔ شاید انہیں یقین تھا کہ یہ بھی میری کوئی چال ہے اور شاید اسی لئے مستند معلومات حاصل کرنے کا شوق ہی متوفی کو چوروں کی طرح یہاں لے آیا تھا۔ وہ اپنے آقاؤں کی ہدایت کے مطابق یہ دیکھنے آیا تھا کہ میں ڈاکٹر کی نجی قیام گاہ، روز ہاؤس میں کیا چکر چلا رہا ہوں یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر اس کے قتل کا معمہ نہایت پیچیدہ تھا۔ آخر وہاں میرا ایسا کون ہمدرد پیدا ہو گیا تھا جو سیکرٹ سروس والوں کے خون کا پیاسا تھا۔

ہم لوگ لاش کو چھوئے بغیر وہاں سے ہٹ گئے۔ بھولا ناتھ وہیں لاش کے پاس رُکا رہا۔ میں ارجن سنگھ اور ہوبرٹ کے ہمراہ پھاٹک پر ہی ڈاکٹر کی آمد کا منتظر رہا۔

پھر اندر سے اوشا نے انٹرکام پر مجھے بلایا۔

"تم وہاں کیا کرتے پھر رہے ہو، مجھے یہاں ہول آ رہا ہے!" ریسیور کان سے لگاتے ہی مجھے اوشا کی تیز آواز سنائی دی۔

"کیا تم نے پولیس کو فون کر دیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں - وہ آنے ہی والے ہوں گے، تم اندر لوٹ آؤ!"

"میں یہاں ڈاکٹر صاحب کا انتظار کر رہا ہوں!" میں نے مختصراً کہا۔ "باغ میں ایک آدمی زخمی اور بے ہوش حالت میں پڑا ہوا ہے!"

"اوہ بھگوان!" اُس کی سہمی ہوئی آواز اُبھری۔ "وہ زندہ ہے نا؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم نے اُسے بالکل نہیں چھیڑا، ڈاکٹر ہی بتائے گا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے!"

"موہن! میں تمہاری منتی کرتی ہوں، لوٹ آؤ۔" اُس کی خوشامدانہ آواز سنائی دی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

اسی وقت پھاٹک پر ڈاکٹر رامانند کی کار کا مانوس ہارن سنائی دیا۔ میں جلدی سے بولا۔ "لو تمہارے بابا بھی آ گئے، بس میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا!

ڈاکٹر رامانند نے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں اوشا کی گاڑی کھڑی دیکھی تو تیز آواز میں ارجن سنگھ سے کچھ دریافت کیا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر اور ہوبرٹ پر پڑی اور اُس نے گاڑی ہمارے قریب لا کر روکی۔

"ہیلو موہن! کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ کار سے اُترتے ہوئے خوشدلی سے ہاتھ ہلاتا ہوا بولا۔

"میں آپ کا انتظار کر رہا تھا!" میں پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"ارے، تمہاری تو پیشانی بھی زخمی ہے!" وہ بوکھلا کر میری طرف لپکا۔

"میرے پاس ایک بُری خبر ہے ڈاکٹر صاحب!" میں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ اچانک قتل کی اطلاع دے کر میں اس بوڑھے کے حواس زائل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"کیسی خبر؟ کیا ہوا؟ اوشا بیٹا کہاں ہے؟" رامانند پر میری احتیاط کا الٹا ہی اثر ہوا اور اُس نے اضطراری طور پر میرا گریبان مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اُس کی آواز میں ناقابلِ بیان کرب سمٹ آیا تھا۔ عدسوں کے پیچھے چمکتی آنکھوں میں دہشت سمٹ آئی تھی۔

"اوشا بی بی خیریت سے ہیں!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "وہ اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

میرے گریبان پر رامانند کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ چہرے پر ایک پُرسکون پھیل گیا۔ "اگر اوشا بیٹا خیریت سے ہے تو کوئی خبر بُری نہیں ہو سکتی۔ حادثے اور اتفاقات انسانی زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ ہاں تو کیا خبر ہے تمہارے پاس؟"

"آج کچھ لوگ چوروں کی طرح روز ہاؤس میں گھسے تھے!" میں نے ایک ہی سانس میں پورا قصہ بیان کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"ارجن اور بھولا کیا کر رہے تھے؟" رامانند قدرے غصے میں بولا۔ "کیا وہ زندہ بچ نکلے یہاں سے؟"

"باغ میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے!"

"واقعی؟" رامانند کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تفصیل سے بتاؤ، تفصیل سے بتاؤ کہ یہ کیسے ہوا، کون گھسا تھا اندر؟"

میں نے اپنی جانب سے کسی تبصرے یا رائے کا اضافہ کئے بغیر پورے واقعات تفصیل سے سُنا دیئے۔ دوپہر میں گالا اسٹور میں جیکب اور مقتول کے نظر آنے کا ذکر گول کر دیا۔

"بڑی عجیب بات ہے۔" ڈاکٹر میرے خاموش ہونے پر بولا۔ "ہو سکتا ہے اندر کودنے والے تعداد میں دو رہے ہوں۔ ایک جائزہ لینے اندر گھسا ہو گا دوسرا احاطے کے قریب رکا ہو گا۔ پہلے فائر نے احاطے کے قریب والے کو بوکھلا دیا ہو گا۔ اپنے واپس لوٹتے ہوئے ساتھی کو دیکھ کر اُسے مغالطہ ہوا ہو گا کہ روز ہاؤس کا کوئی آدمی اُسے پکڑنے آ رہا ہے اور اُس نے بے سوچے سمجھے اُس کا کام تمام کر دیا۔ خیر ایک نظر مرنے والے کا جائزہ تو لے لوں!"

ہم دوبارہ لاش کے قریب پہنچے۔ ڈاکٹر رامانند میری توقع سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اُس نے چھیڑے بغیر بہت قریب سے اُس کا جائزہ لیا اور طویل سانس لے کر بولا۔ "مرنے والا وہی معلوم ہوتا ہے جسے تم نے جھاڑیوں پر پکڑ لیا تھا؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"خیال نہیں۔ یہ یقیناً وہی ہے!" رامانند بولا۔ "تم نے بتایا کہ اس نے ٹکر مار کر تمہاری پیشانی زخمی کر دی تھی۔ ٹکر مارنے کے باعث اس کی پیشانی کا اوپری حصہ خاصا پھولا ہوا ہے۔"

میں نے ٹارچ کی روشنی میں اُس کا جائزہ لیا اور ڈاکٹر کے مشاہدے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کی پیشانی پر اُبھرا ہوا گول نشان بہت نمایاں تھا جو پہلی مرتبہ میری نظروں میں نہ آ سکا تھا!

"معاملہ تشویشناک ضرور ہے مگر اب یہ پولیس کی ذمہ داری ہے۔"

ڈاکٹر رامانند واپس لوٹتے ہوئے بولا۔ "روز ہاؤس میں ایسا واقعہ پہلی بار ہوا ہے۔ اب مجھے حفاظتی انتظامات میں اضافہ کرنا ہو گا۔"

"اس تاریک باغ میں روشنیاں ہونی بھی ضروری ہیں!" میں نے دبی زبان میں کہا۔

"پہلے میں نے اسے عیاشی سمجھ کر اس طرف توجہ نہیں دی تھی کہ ایک ایک یونٹ بجلی پیدا کرنے کے لئے ہمارا قیمتی زرِمبادلہ صرف ہوتا ہے۔ مگر اب یہ شدید ضرورت بن گئی ہے میں کل ہی کام شروع کرا دوں گا تاکہ آئندہ چور اُچکے تاریکی سے فائدہ نہ اٹھا سکیں!"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ ڈاکٹر رامانند اس سنگین مداخلت کو محض چور اُچکوں کا معاملہ سمجھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کسی نہ کسی مرحلے پر اسے خود ہی معاملے کی گہرائی کا علم ہو جائے گا۔ [illegible] نے اپنی زبان بند رکھی۔

مجھے اور ڈاکٹر رامانند کو اپنے پاس دیکھ کر اوشا کی طبیعت بحال ہو گئی۔ ڈاکٹر نے صاف الفاظ میں اسے بتا دیا کہ باغ میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ یہ سُن کر اوشا سہم سی گئی مگر مجموعی طور پر اس کا رویہ حوصلہ افزا رہا۔

ہم تینوں کھانے میں مصروف تھے کہ جگدیش راجو کے بارے میں خبر لایا۔ وہ ملیریا کے تیز بخار میں جل رہا تھا اور کسی کو بتائے بغیر اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا جہاں وہ لحاف اوڑھے ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ یہ معلوم ہو کر مجھے کم از کم اتنا اطمینان ہو گیا کہ اس خونیں ڈرامے میں روز ہاؤس کے کسی باسی کا ہاتھ نہیں تھا۔

گو اوشا نے پولیس کو وہاں قتل کی اطلاع نہیں دی تھی مگر سرکاری اہلکار ڈاکٹر رامانند کی قیام گاہ کی اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے۔ پولیس کی بھاری جمعیت وہاں پہنچی تو وہ لوگ ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔

آناً فاناً میں جائے واردات پر تیز ہنگامی روشنیوں کا بندوبست کیا گیا اور کئی پارٹیاں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

ڈی ایس پی اپنے اسٹینو اور چند دوسرے افراد کے ہمراہ روز ہاؤس کے مکینوں کے بیانات لینے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

واقعات جس طرح پیش آئے تھے بے کم و کاست اسی طرح بیان کر دیئے گئے۔ جس وقت میرا بیان ہوا، وہاں کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔ یہ احتیاط محض اس لئے رکھی گئی تھی کہ انہیں میرے اصل نام کا علم نہ ہو سکے ورنہ دُہرے نام والے ایک شخص کی وہاں موجودگی غیر ضروری حد تک سنسنی خیز ثابت ہو سکتی

تھی جبکہ ڈاکٹر میری ذات کو ہر ہنگامے سے بچانا چاہتا تھا!

اسی دوران میں باہر کام کرنے والوں کی جماعت میں سے ایک انسپکٹر بوکھلایا ہوا وہاں آیا اور ڈی ایس پی کو تخلیے میں لے گیا۔ ہم تینوں اُن کی حرکات و سکنات بخوبی دیکھ رہے تھے مگر اُن کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

انسپکٹر نے اپنے افسر کو جلدی جلدی کچھ بتاتے ہوئے اپنی جیب سے کوئی چیز نکال کر دکھائی اور ڈی ایس پی یک بیک مضطرب نظر آنے لگا چند ثانیوں تک وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اُس نے وہ چیز احتیاط سے جیب میں ڈال لی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہماری طرف آیا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کا ٹیلیفون استعمال کر سکتا ہوں؟" اُس نے آتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"خیریت تو ہے؟" رامانند کو اس اضطراب پر حیرت تھی۔

"معاملے کی نوعیت ہی بہت سنگین ہو گئی ہے۔" ڈی ایس پی اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولا "مرنے والے کی جیب سے انڈین سیکرٹ سروس کا شناختی نشان برآمد ہوا ہے' مجھے اعلیٰ افسران کو اس امر کی اطلاع دینی ہوگی!"

"سیکرٹ سروس؟" رامانند کسی کٹ کھنے کتے کی طرح غرایا "یہ لوگ باز نہیں آئے اپنی حرکتوں سے! انھیں ڈاکوؤں کی طرح قیام گاہ میں داخل ہونے کا اختیار کس نے دیا؟"

"میں بھی آپ ہی کی طرح لاعلم ہوں جناب!" ڈی ایس پی بوکھلا کر بولا۔

"کمینگی کی انتہا ہے!" رامانند غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا "اوشا بیٹا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی جنرل گوندہ کا دماغ درست کرتا ہوں!"

"بابا۔ صفدر کو میرے ساتھ بھیج دو!" اوشا نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"جاؤ۔" رامانند ہاتھ اُٹھا کر بولا "مجھے صفدر کی ضرورت ہے!"

اوشا تقریباً دوڑتی ہوئی نشست گاہ سے نکل گئی تاکہ اُس کی آنکھوں میں اُمڈنے والے آنسو کوئی نہ دیکھ سکے۔

رامانند غصے میں بڑبڑاتا ہوا فون کرنے لگا۔ خاصی دیر بعد وہ مطلوبہ نمبر ملانے میں کامیاب ہو سکا اور بھری آواز میں بولا "میں رامانند بول رہا ہوں' جنرل گوندہ کہاں ہیں؟"

"سو رہے ہیں تو اُٹھا دو!" قدرے توقف کے بعد وہ ماتحتوں میں دہاڑا۔ جب تک دوسری طرف جنرل گوندہ فون پر نہ آ گیا ڈاکٹر رامانند کسی زخمی شیر کی طرح بار بار پہلو بدلتا رہا۔

"شب بخیر جنرل!" جنرل کے لائن پر آجانے پر رامانند قہر کبری آواز میں بولا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں سوتے سے اٹھایا مگر تمہارے محکمے نے میری نیندیں حرام کی ہوئی ہیں۔"

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا!" جنرل کا جواب سننے کے بعد وہ تلخ لہجے میں بولا "تھوڑی دیر پہلے کچھ لوگ لٹیروں کی طرح دیواریں پھاند کر میرے مکان میں گھسے' صفدر علی پر فائر ہوا اور اب تمہارے محکمے کے ایک آدمی کی لاش میرے ویران باغ میں پڑی ہے۔"

"کیسے نہیں ہو سکتا۔ یہ ہوا ہے جنرل۔" رامانند کے لہجے ... کاٹ تھی۔ "پولیس روز ہاؤس میں دندناتی پھر رہی ہے ... والے کی جیب سے سیکرٹ سروس کا شناختی نشان برآمد کیا ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ صفدر علی سے اب تمہارا تعلق کیا ہے ... بری الذمہ ہو چکے ہو۔ تم نے مجھ سے سارے کاغذات پر دستخط لے ... کی نگرانی کیوں ہو رہی ہے۔"

"سرکاری احکام' سرکاری احکام" رامانند جھلائے ہوئے ... بولا "یہ آسمان سے نہیں اُترتے سیکرٹ سروس کے ہر فعل کے ...

"میرا لہجہ ٹھیک ہے جنرل۔" وہ پھنکارا "تم اپنا رویہ درست ... پیسے پر پلنے والوں کو اتنا دیدہ دلیر نہیں ہونا چاہیے کہ قانونی تقاضوں ... رکھ کر شرفا کے گھروں میں گھستے پھریں!"

"یہ ہنگامی حالات کا ناجائز استعمال ہے۔" رامانند اس ... مشتعل ہو گیا "ہنگامی حالات کا یہ مطلب نہیں کہ تم لوگوں کی عزت ... خاک میں ملاتے رہو!"

"شکایت؟ تم دیکھنا کہ میں اس معاملے کو کہاں تک لے ... فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس نے پوری قوت سے رسیور پٹخ دیا۔ شاید جنرل ... بند کر دیا تھا۔

"حرامزادہ کہتا ہے کہ ہنگامی حالات کے تحت ایسے لامحدود ... ہیں۔" رامانند غصے میں پیر پٹختے ہوئے بولا "جب میرے ساتھ ان ... ہے تو عام آدمی تو ہر وقت سولی کے نیچے کھڑا رہتا ہوگا۔ یہ لوگ جب ... ڈال دیں۔"

رامانند کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈی ایس پی بالکل خاموش ...

"کیا وہ اب بھی میری نگرانی کرا رہا تھا؟" میں نے تجسس سے ... کو چھیڑا۔

"ہاں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری حوالگی محض کاغذی خانہ پری ... سیکرٹ سروس کو اب بھی ہر لمحہ تمہاری نگرانی کے سرکاری احکامات ملے ...

"نہ جانے یہ لوگ مجھ غریب پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔" میں ... میں بولا "آپ مجھے ان ہی کے حوالے کر دیں ڈاکٹر ورنہ یہ لوگ آپ ... داؤں پر لگانے پر تُل گئے ہیں۔"

"شٹ اپ۔" رامانند پوری قوت سے دہاڑا "جاؤ اوشا ... میں دُم دبا کر وہاں سے کھسک گیا۔

اوشا کی خوابگاہ کا دروازہ کھلا ملا۔ وہ وہاں موجود نہ ... نے بوکھلاہٹ کے عالم میں روز ہاؤس کا ایک ایک کمرہ دیکھ ڈالا ... نہ ملی۔

اس وقت مجھے چمپا نظر آئی۔ اس سے پتہ چلا کہ اوشا چھت ... یہ سن کر میری کھوپڑی گھوم گئی۔ اس موسم اور ماحول میں ... چھت پر تنہا موجود ہونا بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ عمارت میں ایک لاش پڑی ... تھی' ڈاکٹر اپنی توہین پر آپے سے باہر ہو رہا تھا' باغ میں ہر طرف پولیس پھیلی ہوئی تھی اور وہ جذباتی لڑکی چھت پر موجود تھی۔

زینے طے کر کے میں دبے قدموں چھت پر پہنچا تو اُس کی پشت میری جانب تھی۔ شاید وہ گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی کیوں کہ اُس کی دبی دبی سسکیاں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔

"اوشا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے دُور ہی سے اُسے پکارا۔

"اب کیوں آئے ہو!" وہ اُچھل کر کھڑی ہو گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "جاؤ' تمہاری ضرورت تو پاپا کو ہے نا!"

"ڈاکٹر نے خود مجھے روکا تھا اوشا" میں اُس کے قریب جا کر اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "میں اُن کے حکم کے سامنے دم نہیں مار سکتا!"

"تو اب کیوں آئے ہو میرے پیچھے؟" اُس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"تمہارے بابا نے بھیجا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اُس کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرانے لگا۔ شاید وہ میری زبان سے ... اور سننا چاہتی تھی۔ اُس وقت میرے دل نے ملامت کی۔ اگر میں اُس سے ... دیتا کہ میں محض اس کی دلجوئی کی خاطر ڈاکٹر کی نظر بچا کر آیا ہوں تو اُسے ... انتہا خوشی ہوتی بعض اوقات سیدھے اور سچے الفاظ بھی کیسے سنگدل ہو جاتے ... کہ نازک جذبوں کو تار تار کر دیتے ہیں!

"تم نے بابا کے فیصلوں کو اپنی ذات پر حد سے زیادہ مسلط کر رکھا ہے ... میں روز ہاؤس میں ہر وقت صرف ان ہی کی خوشنودی کی فکر رہتی ہے!" ... سر جھکائے آہستہ آہستہ بولی۔

"وہ میرے محسن ہیں اوشا!" میں جلدی سے بولا "تمہیں اندازہ نہیں ... میں آگاٹی میں کیسے ہولناک مظالم جھیل رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے وہاں سے ... نکال کر خرید لیا ہے۔"

"تمہاری نظروں میں میری کیا حیثیت ہے؟" اچانک وہ ایک نازک ... سوال کر بیٹھی۔

"تم میرے اسی محسن کی بیٹی ہو!"

"اس کے علاوہ؟"

میں پل بھر میں اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ خرانٹ اور تجربہ کار ... صفدر علی الفاظ کے پردوں میں ہر احساس کو پڑھ لینے میں ماہر تھا۔ میں نے کہا "اس کے علاوہ تم ایک خوبصورت' جوان اور ذہین لڑکی بھی ہو جس پر کوئی ... بھی دل مچل سکتا ہے!"

"اپنے دل کی بات کرو۔" اوشا کا لہجہ شوخ ہو گیا۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا ... چند لمحات پہلے وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"میں شادی شدہ ہوں اوشا۔" میں سنجیدہ ہو گیا۔

"سُنا ہے تمہاری بیوی تو تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئی۔"

میں نے دماغ میں اُتر جانے والی تیز نظروں سے اُسے گھورا۔ اُس کے الفاظ سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی سیتا پر بے وفائی کا الزام لگانے والی شاید مجھے اپنی وفا کے دام میں اُلجھا رہی تھی۔

صفدر علی کی زندگی میں مہینوں' سالوں اور بے شمار مکالمات کی کوئی اہمیت نہ تھی میرے ہر فیصلے کی پشت پر چند الفاظ یا چند لمحات ہوتے تھے اور اوشا نے محض اس ایک فقرے کی وجہ سے میری نگاہوں میں اپنا مقام کھو دیا۔

وہ بے انتہا حسین' الہڑ' شوخ' دراز قامت' گداز بدن' خوش گفتار اور سب سے بڑھ کر جوان سال لڑکی تھی مگر میں شروع سے اُس کا احترام کرتا آیا تھا وہ میرے محسن کی بیٹی تھی اور میری ہمدرد بھی۔ مگر اپنی ساری خوبیوں کے باوجود وہ سیتا کا بدل ہرگز نہیں تھی۔ روز ہاؤس میں آنے کے بعد میں نے کئی بار ٹھنڈے دل سے اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اُس کا سراپا نفس کے سرکش انگاروں کو ضرور ہوا دیتا تھا مگر دل کے نازک تار سیتا کے گیت گنگناتے تھے۔

"وہ مجھے چھوڑ کر نہیں بھاگی تھی اوشا۔" میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "اُس نے میری بہتری کے لئے اپنا الگ اور دشوار راستہ چنا تھا' وہ اب بھی میری تلاش میں بھٹک رہی ہوگی!"

"تم اسے بھول نہیں سکتے؟"

"شاید اُس کا جسم بھول جاؤں۔" میں نے اُسے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے کہا۔ "مگر اُس کے والہانہ جذبے میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔"

"میں اس سے خوبصورت ہوں نا؟" بظاہر یہ ایک سوال تھا مگر اُس کا لہجہ تائید طلب تھا وہ آہستہ آہستہ میرے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی۔

"میں نے سیتا کو بہت قریب سے دیکھا تھا مس رامانند!" میں نے اپنی کنپٹیوں میں آگ سی بھرتی محسوس کی۔ "میں اُس کا اور تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"پپ .... پتہ نہیں' تم کک ... کیا کہہ رہے ہو!" میرے الفاظ پڑھ اچانک سہم گئی اور اپنے ہی جسم میں سکڑنے لگی۔

میں آہستہ سے ہنس دیا "اپنے کمرے میں چلو تمہارے بابا پریشان ہیں۔"

میری اس تجویز پر اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہمراہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئی۔ اُس کو خوابگاہ میں پہنچا کر میں ڈرائنگ رُوم میں آیا تو رامانند کسی ایسی بیوہ کی طرح سر جھکائے اُداس بیٹھا ہوا تھا جس کی سرِ بازار آبرو لوٹی گئی ہو۔

ڈی ایس پی مجرموں کی طرح سر جھکائے ڈاکٹر کے سامنے صوفے پر دراز تھا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

میرے قدموں کی آہٹ سُن کر ڈاکٹر رامانند نے سر اُٹھایا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا "مجھے افسوس ہے لڑکے کہ میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا!"

"آپ کے مجھ پر کئی احسانات ہیں ڈاکٹر!" میں نے حیرت سے کہا۔

"انسان ماں کے پیٹ سے کچھ بنیادی حقوق لے کر پیدا ہوتا ہے۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا "آزادانہ نقل و حرکت تمہارا پیدائشی حق ہے۔ مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ سیکرٹ ایجنٹ کشور کے قتل کی گتھی سلجھنے تک تم روز ہاؤس میں نظر بند رہو گے!"

"مگر اس معاملے میں میں بے قصور ہوں۔"

"میں سب کچھ کہہ چکا!" رامانند ہاتھ اُٹھا کر تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ تمہارے ہاتھوں میری بھی جان خطرے میں ہے۔ نہ جانے کیوں ہر ایک مجھے ہی ہوا سمجھ رہا ہے۔"

"مسٹر صفدر! اس عمارت میں آپ پر کوئی پابندی نہ ہوگی، بس آپ کا باہر نکلنا بند کیا جا رہا ہے!" ڈی ایس پی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"مجھے دُکھ صرف اس بات کا ہے کہ میری ذات کی آڑ لے کر ڈاکٹر صاحب جیسی مقدس ہستی کو پریشان کیا جا رہا ہے۔ ورنہ یہ پابندی میرے لئے پچھلی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے!" میں نے ملامت آمیز لہجے میں ڈی ایس پی سے کہا۔

اس کے بعد ڈاکٹر رامانند شکست خوردہ انداز میں اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔ میرے بیان کے بعد مجھے بھی چھٹی مل گئی اور پولیس کے عملے کو ملازمین پر چھوڑ دیا گیا۔

میں نے وہ ساری رات بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزاری۔ میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی میں اپنے بے نام مستقبل کے ہولناک اندیشوں میں مبتلا ہو جاتا۔ کبھی سیتا کی یاد ناقابلِ برداشت خلش بن کر سینے میں چبھنے لگتی۔ اور کبھی اوشا کا شاداب و شگفتہ حسین سراپا نگاہوں میں ناچنے لگتا۔

اگلی صبح ہم تینوں ناشتے کی میز پر یکجا ہوئے تو ماحول اجنبی اجنبی سا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر رامانند کے ذہن پر یہ خلش سوار تھی کہ میرے بارے میں اُس کی بات نہ مانی گئی تھی۔ اوشا پر رات کی قدرے جذباتی گفتگو کی جھینپ سوار تھی۔ شاید میرے الفاظ ابھی تک اُس کے ذہن میں ڈنک مار رہے تھے کیوں کہ اس کا نیم مردانہ رویّہ اب خالص نسوانی موڑ لے چکا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں بھی اپنے دل میں اوشا کی طرف سے چور چھپا محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کے سامنے اس سے گفتگو کرتے ہوئے خوف آ رہا تھا کہ کہیں میری کسی بات سے اُسے شُبہ نہ ہو جائے کہ میں اوشا میں ایک مختلف انداز میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔

"تم کل سارا سامان لے آئے تھے؟" چائے پیتے ہوئے ڈاکٹر رامانند نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں۔ بھٹی بھی تیار ہے، بس آپ کے حکم کی دیر ہے!"

"آج میں باہر نہیں جاؤں گا، کیوں نہ ابھی کام شروع کر دیا جائے!"

"پچھلی رات کی کوفت سے چھٹکارا پانے کی اچھی تدبیر ہے!"

"اچھا یاد دلایا۔" ڈاکٹر چونک کر بولا پھر اُس نے اپنے خدمتگار اشوک کو آواز دی۔

"وہ لوگ گئے یا ابھی تک یہیں دندناتے پھر رہے ہیں؟" ڈاکٹر رامانند نے اُس سے سوال کیا۔

"گئے مالک۔" اشوک مؤدب ہو کر بولا۔ "صبح کے چار بجے واپس گئے ہیں۔"

"لاش اُٹھائے گئے؟"

"لاش تو لے گئے مالک پر دو سپاہی باہر پھاٹک پر موجود ہیں!"

اشوک کے لہجے پر اوشا بے ساختہ ہنس پڑی۔ اُس کا لہجہ پولیس افسران آبادی کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ایک لاش کے بدلے سپاہی زندہ چھوڑ گئے ہوں۔

"کسی الیکٹریشن کو بُلا کر عمارت پر اس طرح سرچ لائٹس لگوا دو کہ رات میں باغ کا کوئی حصّہ تاریک نہ رہے اور سب کو بتا دو کہ میری اجازت کے بغیر احاطے سے عمارت میں قدم نہیں رکھیں گے۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم تینوں اس کمرے میں آئے جہاں ... لگائی ہوئی تھی۔ پھر کام کی ابتدا سے قبل باغ کا جائزہ لیا گیا۔ سُورج کی تیز اور چمکیلی دھوپ کے باوجود باغ کسی ... جنگل کا سماں باندھ رہا تھا۔ وہاں جنگلی چوہوں اور چھوٹے حشرات ... تھی جس جگہ رات کو لاش پڑی ہوئی تھی وہاں اب زمین پر خون کا بڑا دھبّہ نظر آ رہا تھا جس کے گرد چونے سے نشان لگا ہوا تھا۔

پھر میں نے تجربہ گاہ میں آ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اوشا قریب بیٹھے شوق سے میری تمام کارروائیاں دیکھ رہی تھی۔ ... ہوادار تھا لہٰذا زہریلے بخارات اور دھوئیں نقصان دونوں پر ... کیا۔ بس کھانے کے وقت اوشا باہر گئی اور ٹرالی پر خورد و نوش کا سامان لئے وہاں آ پہنچی۔ ہم نے وہیں کھانا کھایا اور جب باہر شام کا دھندلکا ... تو میرے کام کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ میں نے جُھلسا ہوا تانبہ ... میں ڈالا اور اس کا منہ بند کر کے ہم وہاں سے لوٹ آئے!

"بابا۔ یہ کام تو صفدر تمہاری تجربہ گاہ میں بھی کر سکتا تھا۔" ... سے لوٹتے ہوئے اوشا نے کہا۔

"کر ضرور سکتا تھا بیٹا۔" ڈاکٹر بولا۔ "مگر میں کافی دن سے ... جب تک وہاں روزانہ صفائی نہ ہو، کام کرنا ذرا دشوار ہے!"

"کیا روز ہاؤس میں تجربہ گاہ ہے آپ کی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ رہائشی عمارت کے عقب میں ایک چھوٹی سی ... مگر وہاں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ بس کوئلے کی بھٹی نہیں ..."

"اپنے کام کے لئے رہائشی کمروں سے الگ رہنا ہی پسند کرتا ... بلاوجہ ملازمین وغیرہ میری طرف متوجہ ہو جائیں گے!"

"جاؤ۔ ایک نظر تجربہ گاہ پر ڈال ہی لو، شاید تم ابھی تک ... نہیں گئے۔"

"آپ تھکے ہوئے ہیں، پھر کسی وقت دیکھ لوں گا!"

"میں تو اب آرام کروں گا، تم اوشا کے ساتھ چلے جاؤ ... آدھا سائنسداں ہے!" رامانند نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"چلو بھئی نیم سائنسداں!" میں نے اوشا سے کہا۔

رامانند نے اس پر بھرپور قہقہہ لگایا مگر اوشا خلافِ ... انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔ پچھلی رات کے بعد سے میرے بارے ... بے باکانہ نہیں رہا تھا۔

رامانند سے الگ ہونے کے بعد ہم بالکل خاموش عمارت کے عقبی حصّے سے باہر نکلے۔ وہاں سے ایک چند سو فٹ طویل پختہ اور سایہ دار راہداری ایک مستطیل نما عمارت پر ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"کیا مرنے والا تمہارا کوئی عزیز تھا!" مسلسل خاموشی کو توڑنے کی نیت سے میں نے اُسے چھیڑا۔

اُس نے بڑی بڑی خمار آلود نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر سٹپٹا سی گئی۔ "وہ میرا عزیز کیوں ہونے لگا، تم سے ملنے آیا تھا۔"

"اچھا رات کو تم چھت پر چڑھ کر کیوں رو رہی تھیں؟"

"میری مرضی، میں جہاں بھی جاؤں!"

"بالکل، بالکل!" میں جلدی سے بولا۔ "تم چاہو تو کسی درخت کی چوٹی پر بیٹھ کر بھی رو سکتی ہو، بھلا میں تمہیں ٹوکنے والا کون ہوتا ہوں!"

"تم بے وقوف ہو۔" وہ جھینپے ہوئے انداز میں ہنس دی۔

"بے وقوف نہ ہوتا تو اب تک تمہارے حسن کے قصیدے پڑھ پڑھ کر تمہیں اپنے دام میں اُلجھا رہا ہوتا!" میں اُس پر چھائی ہوئی جھجک دُور کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

"مجھے افسوس ہے صفدر کہ رات میں نے تم سے کچھ ایسی باتیں کیں جو مجھے زیب نہ دیتی تھیں۔" وہ یک بیک بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔

"خوف بڑی بُری چیز ہے مس اوشا!" میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ "عام حالات میں انسان اپنی ذات پر ایک خول چڑھائے رکھتا ہے۔ اُس کے سارے جذبے اسی خول میں پروان چڑھتے ہیں اور معاشرتی یا اخلاقی مجبوریاں جن جذبوں کے اظہار میں آڑے آتی ہیں وہ اسی خول میں دم توڑ دیتے ہیں۔ مگر خوف اس خول کو حیرت ناک طور پر ختم کر دیتا ہے اور انسان وہی کچھ کہہ ڈالتا ہے جو اُس کے دل میں ہو۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو!" وہ آہستہ سے بولی۔ "اگر پچھلی رات کے دربے واقعات میرے حواس پر اثر انداز نہ ہوتے تو میری زبان کبھی نہ کھلتی!"

"تم میری بیوی کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"مجھے افسوس ہے صفدر کہ میں نے رات اُس کے بارے میں کچھ نازیبا باتیں کہیں۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم اسے بہت زیادہ چاہتے ہو!"

میں خاموش، اُس کے ساتھ تجربہ گاہ کی طرف بڑھتا رہا۔

"پاپا جس طرح ٹوٹ کر مجھے چاہتے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں۔" وہ قدرے سکوت کے بعد پھر بولی۔ "اور تم سے ملنے تک میں اپنی زندگی سے مطمئن تھی مگر اب اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ ماں باپ کائنات کی ساری خوشیاں بھی بیٹی کے قدموں میں ڈھیر کر دیں تو یہ محبوب کی ایک دلنواز مسکراہٹ کا بھی بدل نہیں بن سکتیں۔ مرد ہر عورت کی ضرورت ہے، ایسا مرد جس کی زندگی کا محور وہ خود ہو!"

اُس کے شانے پر میری گرفت کچھ سخت ہو گئی۔ "میں ہر لڑکی کو فریب دے سکتا ہوں اوشا، مگر تمہیں نہیں۔ میرا ماضی تمہارے لئے بے نام ہے۔ آج میں ایک بدنام مجرم ہوں۔ یہ صرف ڈاکٹر کی نوازش ہے کہ میں تمہاری چھت کے نیچے آزادی کا سانس لے رہا ہوں۔"

اُس نے اپنے شانے پر سے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔ "میں قدامت پسند ماحول میں نہیں پلی بڑھی صفدر۔ میں رنگ برنگی تقریبات میں جاتی ہوں، جہاں ہر عمر اور ہر رُوپ کے مرد ہوتے ہیں۔ مگر تم سے ملنے کے بعد میرے دل میں ایک خلش نے سر اُبھارا ہے جو نئی ضرور ہے مگر اجنبی نہیں!"

"میرے اور تمہارے راستے جُدا ہیں اوشا!" میں راستے میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ "میں ایک ... سراب ہوں، میرا پیچھا کر کے تم اپنا مستقبل برباد کر لوگی، مجھے بھولنے کی کوشش کرو، تمہیں مجھ سے بہتر ساتھی مل جائیں گے!"

"مجھے یہ تلقین نہ کرو!" وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔ "تم سیتا کو نہ بھلا سکو گے اور میں تمہیں نہیں بھول سکتی یہ اختیاری باتیں نہیں ہوتیں!"

"وقت ہر یاد مٹا دیتا ہے!" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم اچھے دوستوں کی طرح ساتھ رہ سکتے ہیں!"

"اندھیرا بڑھ گیا ہے، واپسی میں دیر ہو جائے گی، واپس چلو!" وہ کسی فوری خیال کے تحت بولی اور ہم مکان میں لوٹ آئے۔

پچھلی رات میں سو نہ سکا تھا پھر دن بھر کام میں لگا رہا اس لئے بستر پر گرتے ہی گہری نیند نے آلیا۔ نہ جانے وہ کیا احساس تھا کہ گہری نیند میں بھی ایکدم چونک پڑا۔ پھر ہلکی سبز روشنی میں مجھے اپنے قدموں میں مسہری پر ایک سایہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں چادر اُچھال کر بستر سے اُتر گیا۔ آنکھوں میں نیند کا گہرا خمار چھایا ہوا تھا میں نے بوکھلا کر کمرہ روشن کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد میری چندھیائی ہوئی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو بے اختیار دل دھڑک اُٹھا۔ اوشا میرے کمرے میں موجود تھی!

اس کے جسم پر سلیپنگ سوٹ موجود تھا۔ سیاہ زلفیں گورے گورے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں، اُس کی آنکھیں سُرخ اور ورم آلود ہو رہی تھیں۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میری تیز سرگوشیانہ آواز کسی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔

"ایک لڑکی چوروں کی طرح، ننگے پیروں تمہارے کمرے میں کیوں آسکتی ہے؟" اُس کا لہجہ ...... اس وقت بے انتہا جارحانہ تھا۔

"نکل جاؤ اوشا، میرے کمرے سے نکل جاؤ!" میری آواز کانپ اُٹھی۔

"میں بیوی بننے نہیں آئی، دوست بن کر آئی ہوں!" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"دوستی ایک مقدس رشتہ ہے اوشا!" میری زبان اسے لوٹا رہی تھی مگر میرا وجود تیزی سے بکھرتا جا رہا تھا۔ "اندھیروں میں صرف گناہ پروان چڑھتا ہے!"

"میں یہاں فلسفہ سننے نہیں آئی۔"

"میں کہتا ہوں چلی جاؤ!"

"دھکے دے کر نکال دو، چلی جاؤں گی!" وہ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گئی۔
میں مشتعل ہو کر اُس کی طرف لپکا اور ایک جھٹکے سے اُس کا بازو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا تاکہ اُسے دھکے دے کر باہر نکال سکوں لیکن اُس کے ننگے اور گداز بازو کا لمس محسوس ہوتے ہی میرے جسم میں کروڑوں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔
"مجھے بھوکی نظروں سے نہ دیکھو، میں تمہارے محسن کی بیٹی ہوں صفدر!"
اُس کا لہجہ طنزیہ تھا۔
میں دوراہے پر کھڑا اُسے گھورے جا رہا تھا۔ دورانِ خون یک بیک تیز ہو چکا تھا، دل حلق میں دھڑک رہا تھا، آنکھیں سلگنے لگی تھیں۔

وہ میری لاعلمی میں وہاں آئی تھی اور میری بے خبری میں چلی گئی لیکن روز میں دیر تک سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو راما نند جا چکا تھا۔ اوشا رسوئی میں مصروف تھی۔
ناشتے کے دوران ہی وہ میز پر آ گئی۔ اُس کے چہرے پر نہ ندامت تھی نہ حجاب۔ وہ فاتحانہ شان سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔
"میں ڈاکٹر کے سامنے کبھی نظریں نہ اُٹھا سکوں گا اوشا!"
"شٹ اَپ!" وہ مسکرائی "یہ زندگی کے کھیل ہیں۔ میں ڈاکٹر راما نند کی بیٹی ضرور ہوں مگر ایک عورت بھی ہوں، بابا تو شاید بیٹا کہتے کہتے بھول گئے ہیں کہ میری اصلیت کیا ہے!"
"جب میں نے بابا سے تمہاری شادی کی بات کرنے کی تجویز کی تھی تو تم بھڑک کیوں گئی تھیں؟" میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے ماضی کو چھیڑا۔
"اس وقت وہ بات قبل از وقت تھی"
"تم تو یہ سمجھ کر مجھ پر برس پڑی تھیں کہ میں شاید خود کو ڈاکٹر کی فرزندی میں دینے کا ارادہ رکھتا ہوں!"
"غلطی ہو گئی تھی!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر اچانک بولی "ایک سوال کا جواب دو گے؟"
"سوال پر منحصر ہے!"
"تم نے سیتا کو قریب سے دیکھا اور اب تم فیصلہ کر سکتے ہو کہ سیتا اور اوشا میں کون بہتر ہے!" وہ میری پسند کو جیتنے کے لئے اخلاق اور شائستگی کی ہر حد کو عبور کر جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔
"سیتا کئی مہینے میری رفیق رہی، تم سے تو کل ہی تعارف ہوا ہے" میں نے نہایت خوبصورتی سے بات ٹال دی۔
"میں نے سُنا تھا کہ کوئی پہاڑن تھی؟"
"ہاں!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کی زبان سے سیتا کا تذکرہ سُن کر مجھے اُلجھن سی ہو رہی تھی۔ ذہن بار بار بے وفائی کا طعنہ دے رہا تھا۔
"جب وہ تم سے بچھڑ چکی ہے تو اب کیسے ملے گی ۔۔۔ نہ یہاں آنے سے رہی اور تم تو ہمیشہ کے لئے یہاں رہنے کا فیصلہ کر چکے ہو"
"کل رات سے میں اُسے بھولا ہوا ہوں، اس کا ذکر نہ کرو تو بہتر ہے!"

میں نے تنگ آ کر اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ ڈال دیا۔
میری توقع کے عین مطابق اوشا کے چہرے پر خوشی کی لہر دو[ڑ گئی] دانست میں وہ مجھ پر اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔
محبت انسان کو واقعی اندھا کر دیتی ہے۔ وہ خوبصورت لڑکی اپنی محبت کا شیش محل بناتے ہوئے یہ بھول چکی تھی کہ اُس کا وا[سطہ] ایسے مرد سے پڑا ہے جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہے جس کی شاطرانہ حرکتوں کے سب سے منظم ادارے کو ہلا کر رکھ دیا ہے
اس روز خلافِ معمول ڈاکٹر راما نند دوپہر کے وقت گھر [آ گیا] اُس کے بُشرے سے بے پناہ مسرت پھوٹ پڑ رہی تھی۔
وہ مجھے پکارتا ہوا گھر میں گھسا اور جونہی میں اُس کے سامنے [آیا] پاگلوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا "مبارک ہو لڑکے ناسا اور رائل کا [جواب] آ گئی ہے۔ دونوں نمونے یکساں ہیں۔ میں نے ہر طرف سے بات پکی کر لی [ہے] تم آزاد ہو!"
"آزاد؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں ہاں۔ نظر بندی کے احکام واپس لے لئے گئے ہیں" [ڈاکٹر] پھولے نہ سما رہا تھا۔
اس شام ہم نے مرتبان کھولا تو ڈاکٹر راما نند سفید سونے کا [ڈلا دیکھ کر] حیران رہ گیا۔ "یہ۔ یہ کون سی دھات ہے؟"
"پتہ نہیں ڈاکٹر!" میں نے جواب دیا۔ "ہماری زبان میں یہ دھسم [؟] سونا کہلاتی ہے"
"یہ دھات اندر سے بھی ایسی ہی چمکیلی سفید ہو گی؟"
"ہاں!"
"ایسی دھات میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں" وہ اُ[س] کو ہاتھ میں لے کر پُرجوش لہجے میں بولا "تم اس کا ایک ٹکڑا مجھے دو [میں] تجزیہ کراؤں گا"
میں نے آری سے اس کا ایک چھوٹا ٹکڑا کاٹ کر ڈاکٹر کو دے [دیا۔ پھر میں] نے تقریباً چھ تولہ وزنی ایک اور ٹکڑا کاٹا اور وہ اوشا کو دے دیا۔ "اس کا زیور بنوا لینا اوشا.... یہ اس بات کی نشانی رہے گی کہ کبھی تم ایک کیمیا[گر سے] ملی تھیں"
پھر ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت سے اُبلنے لگیں۔ سفید سونے کو [دیکھنا] اُس کے لئے عجیب ترین تھا۔ وہ منہ پھاڑے اس ٹکڑے کو آہستہ آہستہ [؟] دیکھ رہا تھا۔
اور جب یہ کام ختم ہوا تو ڈاکٹر راما نند حیرت سے اور بے یقینی [سے] زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اُس کے الفاظ میرے لئے ناقابلِ فہم تھے۔
"ڈاکٹر!" میں نے آہستہ سے اُسے پکارا۔
"اس قدر آسان۔ ایسا بے خطر طریقہ!" وہ کھوئے ہوئے انداز [میں بولا] "آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آتا کہ تم کیمیا گر ہو"

"اب اس کو نرم کرنا باقی ہے ورنہ یہ تیار ہے!" میں نے سونے کی رنگت کا وہ ڈلا بکھرے نکال کر اسے تھما دیا۔
"اس کا بھی ایک ٹکڑا دے دو مجھے!" ڈاکٹر نے للچائے ہوئے انداز میں مجھ سے التجا کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ننھا سا بچہ اپنے بزرگ سے مٹھائی مانگ رہا ہو۔
میں نے اُس کا بھی ایک ٹکڑا ڈاکٹر کو دے دیا۔ اور سونے کی نرمی لانے کے سلسلے میں کارروائی شروع کر دی۔
اگلے روز صبح سویرے اسٹیٹ بنک آف انڈیا کے دو افسران مع ٹی زین کے دو سربمہر تھیلے لئے روز ہاؤس پہنچے اور باقاعدہ اندراجات وغیرہ کر کے وہ تھیلے ڈاکٹر راما نند کے حوالے کر دیئے۔ ان میں مجموعی طور پر ایک سو دس کلوگرام پاسکا سونا چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی شکل میں موجود تھا۔
میں اپنا کام شروع کرنے ہی والا تھا کہ اوشا سے پتہ چلا کہ راما نند گزشتہ روز حاصل کئے ہوئے دونوں نمونوں کا تجزیہ کرنے اپنی تجربہ گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ اس وقت میں خوشی میں اتنا سرشار ہو رہا تھا کہ بے اختیار اوشا کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔
"ایے.... ایے، یہ کیا بدتمیزی ہے!" میری اس حرکت پر وہ بُری طرح بوکھلا گئی۔
"بدتمیزی نہیں، ابتدائے عشق ہے!" میں نے اپنے بازوؤں کا حلقہ اس کے گرد ڈھیلا کئے بغیر کہا۔
"چھوڑو مجھے!" وہ خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "کوئی ملازم آ نکلا تو کیا ہو گا"
"شرما کر خود ہی بھاگ جائے گا" میں نے یہ کہتے ہوئے اُس کی ناک پکڑ لی۔ اور ہاتھوں کی گرفت سے اُسے آزاد کر دیا۔
جب منتیں کر کے وہ رہائی پانے میں کامیاب ہوئی تو اُس کی ناک پر ہلکے نشانات نظر آ رہے تھے اور ناک سُرخ ہو گئی تھی۔
"اب ہم ڈاکٹر کے ساتھ تجربہ گاہ میں جائیں گے، دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں"
"میں تو ہرگز نہ جاؤں گی تمہارے ساتھ!"
"کیوں؟ کیا میں کاٹ کھاؤں گا تمہیں؟" میں قہقہہ مار کر بولا۔
"میری ناک پر نشان پڑ گیا ہو گا، بابا کو کیا بتاؤں گی!"
"کہہ دینا صفدر نے زمین پر ناک گھسوائی تھی"
ہم باتیں کرتے باہر نکلے ہی تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اوشا نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ چند سیکنڈ بعد اُس کی حیران سی آواز سُنائی دی "صفدر علی تو یہاں نہیں رہتے۔ یہ ڈاکٹر راما نند کا مکان ہے!"
پھر وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے بولی "وہ میرا نام بھی جانتا ہے کہہ رہا ہے اوشا میں صفدر کا دوست ہوں دشمن نہیں"
میں نے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔
"ہیلو ۔۔۔ میں موہن کانت بول رہا ہوں" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔
"اگر تم موجودہ حالات سے نجات کے خواہاں ہو تو آج شام چھ بجے بونانزا کے بال رُوم میں ملو" دوسری جانب سے ایک بھاری مردانہ آواز سُنائی دی اور فون بے جان ہو گیا۔
میں کئی سیکنڈ فون ہاتھ میں لئے ہیلو ہیلو کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا۔
اوشا میرے قریب کھڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی "یہ بمبئی میں تمہارا کون شناسا پیدا ہو گیا، کیا کہہ رہا تھا؟"
"کچھ بھی نہیں، میری آواز سنتے ہی فون بند کر دیا!" میں نے کہا۔
"عجیب بات ہے!" اس انکشاف نے اسے سہما دیا "مجھے تو لگتا ہے کہ بمبئی میں کچھ لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں!"
"ذہن پر زور نہ دو" میں لاپروایانہ انداز میں بولا "ڈاکٹر سے بھی اس فون کال کا تذکرہ نہ کرنا۔ وہ بلاوجہ پریشان ہوں گے۔"
"تمہاری شخصیت مجھے کبھی کبھی بہت پُراسرار سی نظر آنے لگتی ہے سیکرٹ سروس والے اگر تم سے خائف رہتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہو گا" وہ بولی۔
"پُراسرار شخصیت!" میں زور سے ہنسا "وہ لوگ مجھ سے نہیں، میری قوتِ برداشت سے خائف ہیں بے بی! کیا تم یقین کرو گی کہ اُن کے تشدد کے تمام حربے میری ذات پر ناکام رہے"
"میں نے وہ کاغذات پڑھے ہیں جن کے ذریعہ تمہیں سیکرٹ سروس والوں نے بابا کے حوالے کیا ہے" وہ داہنی ہتھیلی سے اپنی ناک کا سِرا مسلتے ہوئے بولی۔ "اُن میں لکھا ہے کہ تم ایک رشی کے رُوپ میں نیپال سے ہند میں داخل ہوئے تھے مگر تمہاری گفتگو اور طریقوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم نے جدید زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تم بعض انگریزی الفاظ روانی میں بول جاتے ہو، مجھے تو شبہ ہے کہ تم کسی یونیورسٹی میں بھی پڑھ چکے ہو۔ رشی اور جوگی تو بیچارے یہ بھی نہیں جانتے کہ کھانے کی میز پر دو ہاتھوں سے چھری چمچے اور کانٹے کو کیسے سنبھالا جائے"
"میرے بارے میں ذہن پر زیادہ زور نہ دو" میں اُس کا شانہ تھپتھپا کر بولا "کھٹمنڈو میں میرے بے شمار پیروکار تھے جن میں بیشتر تعلیم یافتہ لڑکے لڑکیاں تھیں"
"تمہاری تعلیمات کیا تھیں؟"
"ہرے کرشنا ہرے رام!" میں نے داہنی آنکھ دبا کر مٹھی کو سگریٹ نوشی کے انداز میں ہونٹوں سے لگا کر کہا۔
"ہائے رام!" وہ حیرت سے بولی "تو تمہارا تعلق اس طبقہ سے تھا جو عالمگیر پیمانے پر ہپی سوسائٹی کی تحریک چلا رہا ہے!"
"یہ کوئی باقاعدہ تحریک نہیں ہے" میں نے کہا "دُنیا میں ہر طرف جنسی اور معاشی ناآسودگیوں کا راج ہے اس لئے نئی نسل ہر قید و بند سے آزاد معاشرے کے قیام کی طرف راغب ہے۔ اب یہ محض اتفاق ہے کہ ایک شخص یہی تحریک نیپال میں چلاتا ہے تو اس سے ہزاروں میل دور شکاگو میں بیٹھے ہوئے جہاں گرد چند

سبھی یہی نعرہ آگے بڑھاتے ہیں!"

"اور تم مجھے اخلاقیات کا درس دیتے رہے تھے!" وہ اپنی بڑھتی ہوئی حیرت پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"ڈاکٹر رامانند کی بیٹی اور حرص و ہوس جنس زدہ لڑکیوں میں بڑا فرق ہے اوشا۔ لوگ مجھے خود غرض کہتے ہیں مگر میں تمہاری طرف بڑھتے ہوئے ڈر رہا تھا!"

"عورت سے ڈر رہے تھے!" وہ منہ چڑھا کر بولی۔

"تم سب کچھ جان کر میرے قریب آئی ہو تو یہ میرے لئے لذت ہے، اگر میں تمہیں اپنی چاہت کا فریب دیتا تو یہ میری روح کا عذاب بن جاتا!"

"تم اور بابا، دونوں مجھے ضمیر کے قیدی لگتے ہو!" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

"تم تجربہ گاہ میں نہیں گئیں!" ڈاکٹر کا تذکرہ آتے ہی مجھے یاد آیا۔ "وہ وہاں اکیلے ہیں، پریشان ہو جائیں گے!"

"وہ باپ میرے ہیں اور اُن کی خبر گیری کا دعویٰ تم کرتے ہو!"

"دعویٰ نہیں، انھیں وہاں مددگار کی ضرورت پڑ سکتی ہے!"

"اُن کا ایک اسسٹنٹ وہاں ہوتا ہے۔ بابا کام کے دوران میں کسی اور کی وہاں موجودگی کو پسند نہیں کرتے!"

"تو اب تک وہ کہاں تھا؟"

"شادی کے لئے چھ ہفتوں کی چھٹی پر دہلی گیا تھا، آج ہی واپس آیا ہے!"

میں انٹرکام پر تجربہ گاہ کا نمبر ملانے لگا۔

"اجیت!" دوسری طرف سے سرد اور سپاٹ آواز اُبھری۔

"ڈاکٹر کو دو، میں موہن بول رہا ہوں!"

"کیا بات ہے لڑکے؟" چند ثانیوں بعد ڈاکٹر کی محبت آمیز آواز سنائی دی۔

"آپ وہاں کب تک مصروف رہیں گے؟"

"رات ہو جائے گی!"

"تو آج مجھے چھٹی چاہیے!"

"کیسی چھٹی؟" ڈاکٹر حیرت سے بولا۔

"آج شام میں باہر کھانا کھاؤں گا!"

"اور بابا۔ میں بھی باہر کھانا کھاؤں گی!" اوشا میرے اوپر جھک کر ماؤتھ پیس میں چیخی۔

ڈاکٹر کے ہنسنے کی آواز سنائی دی پھر وہ بولا "لے جانا، اسے بھی ساتھ لے جانا، کس ہوٹل میں جاؤ گے؟"

"بونانزا!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہہ دیا۔

"اچھی جگہ ہے، مگر جلدی لوٹ آنا!" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی!" میں نے ریسیور رکھ کر اوشا سے کہا۔

"میں تمہارے سر پر سوار ہو کر نہیں جاؤں گی!" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"تو تم جاؤ، میں یہیں دال دلیہ کھا کر سو رہوں گا!" میں اُسے ٹالنا چاہ رہا تھا تاکہ آزادی کے ساتھ معاملے کی تہہ تک پہنچ سکوں۔ اس ٹیلی فون نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ اگر وہ واقعی میرا کوئی ہمدرد تھا تو میں پہلی بار ہندوستان سے فرار کی پیشکش سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ مگر [illegible] نہیں آتا تھا کہ وہاں میرا کون سا ایسا مخلص پیدا ہو گیا! یہ امکان [illegible] مجھ سے پارس کی قیمت پر فرار کے موقع کا وعدہ کیا جاتا۔ یہ سیکرٹ [illegible] بھی ہو سکتی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی ایسے ہنگامے میں اوشا [illegible] فریق بنے۔

"بونانزا بہترین ہوٹل ہے۔ وہاں ہر شام بمبئی کے حسن کا [illegible]" وہ مجھے للچانے کے لئے بولی۔

"تو یوں کہو کہ نگرانی کے لئے ساتھ جا رہی ہو!"

"وہاں میری شناسائی کا حلقہ بہت وسیع ہے!" وہ آنکھیں [illegible] بولی "میں خود تمہیں اُن سے متعارف کراؤں گی!"

"مگر کس رشتے سے؟"

"تم موہن کانت ہو، میرے دُور کے رشتے دار!" اُس کے [illegible] ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

شام کو وہ چلنے کے لئے تیار ہوئی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا [illegible] اور باریک بھنویں قدرت نے اُسے عطا کی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھ[یں] مسکارا میں لپٹی ہوئی خمدار لانبی لانبی پلکیں خمار سے ڈھلکی پڑ رہی [تھیں] اور ستواں ناک کی جڑ میں اُس کی آنکھوں کے گلابی ڈورے جھلکتے جا رہے تھے۔ بھرے بھرے رخساروں کی رنگت ایسی سُرخ و سفید تھی کہ ہلکے [illegible] نے انھیں دوآتشہ کر دیا تھا۔ بڑا ظلم اُس نے اپنے ہونٹوں پر کیا تھا۔ گہر[ے] سُرخ رنگ کی لپ اسٹک پر پڑنے والے روشنی کے انعکاس کے سبب [illegible] پر شبنم کے قطرے چمکتے نظر آ رہے تھے۔ اوپری ہونٹ کے درمیان والے [illegible] اُبھار کے باعث اُن کے ادھ کھلے ہونٹوں میں بڑی کشش پیدا ہو گئی [illegible] اُس وقت [illegible] کے بجائے پہلی رات کی بھرپور سہاگن نظر آ رہی تھی۔

"کسی کو قتل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟" میں نے بوتیکو کی [illegible] ہوئے کہا۔

"تم میرے پہلے اور آخری مقتول ہو!" وہ کھنکتا ہوا قہقہہ [illegible]

"گاڑی میں چلاؤں گا!" میں نے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے چابی [illegible]

"ڈرائیونگ بھی جانتے ہو؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"مہ رخوں کے لئے سیکھی ہے!"

"رشی اور جوگی واقعی عیاش ہوتے ہیں!" وہ دوسرے دروازے [سے] گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی "بظاہر دنیا تیاگ دیتے ہیں پھر کھدر کے [illegible] شکار کھیلتے ہیں!"

"شکار تم جیسا ہو تو شاید دیوتا بھی شکاری بن جائیں!" [illegible] میں چابی لگاتے ہوئے بولا۔

"دیوتا!" اُس نے حقارت سے کہا "میں چاروں وید پڑھ چکی ہوں [illegible] ہندی دیومالا میں ہر دیوی دیوتا کو جنس کے شرمناک پجاری کے رُوپ میں پیش کیا گیا ہے!"

"یہ تو تمہارے دھرم کا ایک حصہ ہے!"

"میں تو آج تک مندر میں بھی نہیں گئی!" وہ بولی "بہت سے مندر تو کھلے قحبہ خانے بنے ہوئے ہیں!"

مجھے اچانک بنارس یاد آ گیا۔ وہاں کا اناتھ آشرم یاد آیا جہاں ہندو معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی بدنصیب بیواؤں سے رمیش اجتماعی بہبود کے نام پر پیشہ کراتا تھا۔

"مندر نہیں گئیں تو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" میں اوشا کی ٹوسیٹر گھماتے ہوئے بولا۔

"مندر جانے والوں سے ملتی تو رہتی ہوں!" وہ بے زاری سے بولی "لمبی لمبی جٹاؤں اور گیرُوے لباس والے پنڈت، مہنت اور پجاری مندر میں آنے والیوں کو ایسی ننگی بھوکی نظروں سے گھورتے ہیں کہ تو بہ ہی بھلی میری ایک سہیلی نے صرف اسی لئے مندر جانا چھوڑ دیا کہ شیو مندر کا مہا پجاری اُسے نظروں ہی نظروں میں نگل جانے کی کوشش کرتا تھا!"

"یہ اُس کا وہم ہو گا، گیان دھیان کی وجہ سے ہر رشی پجاری کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت سما جاتی ہے!" میں اُس کی گفتگو میں دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔

"وہم نہیں، یہ حقیقت ہے!" وہ ساری کا پلّو اُٹھاتے ہوئے بولی۔ بالشت بھر بلاؤز اور ساری کے درمیان اس کی کمر اور نمایاں ہو گئی "میری سہیلی کو اس کی ماں پوجا پاٹ کے لئے لے جاتی تھی وہ مہا پجاری کی آشیرباد کے لئے اُسے ہمیشہ مہا پجاری کے سامنے بھی لے جاتی تھی۔ وہ خبیث اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بہانے اس کے رخساروں پر بھی اپنے گھناؤنے ہاتھ پھیرتا تھا۔ عقیدت کی اندھی ماں کو یہ سب نظر نہ آتا تھا۔ پھر ایک روز مہا پجاری نے اُس کی ماں کی نظر بچا کر اُس کے گال پر چٹکی لی تو اُس نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا!"

"پجاری بوڑھا ہو گا!"

"ہاں۔ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا مردود!" اُس نے روانی میں کہہ ڈالا پھر میری ہنسی سنتے ہی غصے سے مجھے گھورنے لگی۔

"ایسے نہ دیکھو، ہاتھ بہک جائے گا!" میں نے ویران سڑک پر گاڑی لہراتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے بھی عیاشی کے لئے سوانگ رچایا تھا!" وہ دانت پیس کر بولی۔

"ایسا چارہ منہ کو لگ جاتا تو زندگی بھر مندر کی چوکھٹ نہ چھوڑتا!" میں اور زور سے ہنسنے لگا۔

"بنے ہوئے تھے رشی اور نام صفدر ہے!" وہ چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد بولی "یہ مسلمان رشی کب سے ہونے لگے!"

"میرا تو کوئی بھی نام نہیں تھا۔ سیکرٹ سروس والوں نے صفدر بنا دیا۔ ورنہ میں تو اپنی سیتا کا رام تھا!" میں نے کہا "جنگل جنگل اس کے پیچھے بانسری لئے پھرتا تھا!"

"بیوی سیتا اور میاں صفدر!" وہ بولی "سچ کہتی ہوں تم بہروپئے لگتے ہو بعض اوقات۔ دھوتی پہن لی تو ہندو، دھوتی آتاری اور مسلمان!"

میرے پاگلوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر ہنسنے کی وجہ سے وہ فوراً ہی سمجھ گئی کہ گفتگو کی رَوانی میں وہ کوئی غلط بات کہہ گئی ہے۔ اس بار اُسے ایسی چپ لگی کہ میرے بار بار تنگ کرنے پر بھی اُس نے زبان نہ کھولی۔ بس داہنے بائیں اور سیدھے کرتی رہی!

اس سے گفتگو کرنے کے باوجود میں غافل نہیں تھا۔ گاڑی خود ڈر[ائیو] کرنے کی یہی وجہ تھی کہ میں عقب نما آئینے میں پیچھے کا خیال رکھنا چاہتا تھا۔

جس وقت ہم روز ہاؤس سے نکلے، سڑک ویران پڑی ہوئی تھی۔ پھر کہیں سے ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی۔ شاید میں اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہوتا مگر وہ لوگ اپنی حماقت کی وجہ سے میری نظروں میں آ گئے۔ جب کبھی ایک دو گاڑیاں ہمارے درمیان حائل ہوتیں وہ اپنے ہیڈ لیمپس بجھا لیتے تھے پھر ایسے ہی کسی موقع پر روشنیاں جلا لیتے تھے۔ اسی طرح وہ اپنی دانست میں احتیاطی تدبیر کر رہے تھے مگر یہی احتیاط میری ہوشیاری کا سبب بن گئی تھی!

"وقت کیا ہوا ہے؟" میں نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے اوشا سے سوال کیا۔

"پونے چھ بج رہے ہیں!"

"پہلے ہم کسی ویران سڑکوں والے علاقے میں چلیں گے!"

"کیوں؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔

"ہمارا تعاقب ہو رہا ہے!"

اوشا نے بے اختیار اپنا سر پیچھے گھمایا۔

"یہ کیا حماقت ہے، سیدھی بیٹھی رہو!" میں غرّایا اور وہ یوں حیرت سے مجھے گھورنے لگی جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

اس کے لئے میرا لہجہ نامانوس تھا!

اوشا کے بتائے ہوئے راستوں سے گزر کر جب ہم مالا بار ہلز کے علاقے میں داخل ہوئے تو وہ جیپ بدستور پیچھے لگی ہوئی تھی۔ تعاقب کا یقین ہو جانے پر میں نے اوشا کی زیرِ ہدایت گاڑی بونانزا کے راستے پر ڈال دی۔

بونانزا ایک تین منزلہ شاندار ہوٹل تھا جو کچھ عرصہ قبل بمبئی میں قائم کیا گیا تھا۔ جس وقت میں ہوٹل کے احاطے میں گاڑی پارک کر رہا تھا وہ جیپ تقریباً رینگتی ہوئی پھاٹک کے سامنے سے گزر گئی۔ جیپ کے ڈھانچے پر ہڈ اور دروازے چڑھے ہونے کے باعث میں یہ نہ دیکھ سکا کہ اُس میں کتنے آدمی ہیں۔

میں اوشا کے ہمراہ بونانزا کے استقبالیہ لاؤنج میں داخل ہ[وا تو] بے شمار نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ سرخ رنگ کی کامدار منی ساڑ[ی اور] مختصر سے بلاؤز کے درمیان اُس کے جسم کے بعض ایسے نازک زاویے نظر آ رہے تھے کہ نگاہیں ہٹتی ہی نہ تھیں۔ گھر سے چلتے ہوئے اُس نے ساڑی کا آنچل

بڑے اہتمام کے ساتھ لپیٹا ہوا تھا مگر ہونا نرا ایہنچ کر اُس نے یہ تکلف چھوڑ دیا تھا۔

وہیں اوشا کو اپنی چند شناسا لڑکیوں کی ٹولی نظر آ گئی اور وہ میرا ہاتھ تھام کر انھیں پکارتی اُن کے پیچھے لپکی۔

اُن سب نے اوشا کا بڑا گرمجوشی سے استقبال کیا مگر مجھے حیرت سے دیکھا۔ اوشا نے باری باری اُن سب سے میرا تعارف کرایا۔

"شاید انکل کو یاد آ گیا ہے کہ تو لڑکا نہیں، لڑکی ہے۔" ایک چنچل سی لڑکی نے فقرہ چست کیا اور وہ ہال نقرئی گھنٹیوں کے ترنم سے گونج اٹھا، سب کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

"تم سب تو احمق ہو گئی ہو!" اوشا کا چہرہ دہک اٹھا۔ اُس نے میرے سامنے حیا کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور لڑکیوں کے سامنے شرما رہی تھی۔

پھر ان کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری بے چین نگاہیں گرد و پیش کا طواف کر رہی تھیں تاکہ کوئی شناسا چہرہ نظر آ سکے۔

وہ میرا آشنا تو ہرگز نہ تھا مگر پام کے ایک گملے کے قریب کھڑا شہادت کی انگلی کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بُلا رہا تھا۔ دوسرے اُسے دیکھتے تو یہی سمجھتے کہ وہ انگلی کے اشارے سے سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہا ہے!

"تم اندر چلو۔ میں ابھی آتا ہوں!" میں نے اوشا کے کان میں سرگوشی کی اور وہاں سے کھسک لیا۔

میں اُس شخص کے قریب سے گذرتا ہوا نیم تاریک راہداری میں داخل ہو گیا۔ وہ بھی ہوشیار معلوم ہوتا تھا، میرے پیچھے اندر چلا آیا۔

راہداری کے فرش پہ دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ اُس کے اختتام سے آنے والی ملی جلی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ ادھر بلیرڈ روم واقع ہے!

اس شخص نے مجھے راستے ہی میں آ لیا اور تقریباً میرے برابر میں آ کر استفسار طلب لہجے میں سرگوشی کی "صفدر علی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرے ساتھ آؤ!" یہ کہہ کر وہ داہنے ہاتھ پر ایک دروازے میں گھس گیا۔

"تم نے دیر کر دی آنے میں!" راستے میں اُس نے کہا۔

"ڈاکٹر کی بیٹی میرے ساتھ آنے پر تُل گئی تھی!"

"وہی سُرخ ساڑھی والی؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اُسے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں کہا تاکہ وہ اوشا کے بارے میں کوئی نازیبا بات سوچ رہا ہو تو اُسے زبان سے ادا نہ کر سکے۔

وہ قوی الجثہ اور مجھ سے زیادہ مضبوط بدن کا مالک تھا۔ اس کے جسم پر نفیس تراش کا سیاہ سوٹ موجود تھا۔ شاید عام حالات میں وہ شریف آدمی ہی ثابت ہوتا مگر مجھے اُس کے بشرے سے خباثت ٹپکتی دکھائی دے رہی تھی۔

ڈائننگ ہال کا طویل چکر کاٹ کر آخر کار ہم دونوں ایک عقبی راستے سے ہوٹل کے سرسبز لان پر جا نکلے۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگی ہوئی روشنیاں اندھیرا دور کرنے کے لئے ناکافی تھیں۔ البتہ لان کے آخر میں بنا ہوا وسیع سوئمنگ پول روشنیوں میں نہایا ہوا تھا!

موسم سرد ہونے کی وجہ سے سوئمنگ پول تو ویران پڑا ہوا تھا البتہ لان میں گلاب کے تختوں کے قریب ایک عشق زدہ نوجوان جوڑا ظالم سماج کی نظروں سے چھپ کر ٹھنڈ پھانک رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میں تمہارا بہی خواہ ہوں، کیا تمہارے لئے اتنا جاننا ناکافی ہے؟"

اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بے رحمانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تمہاری قسم کے لوگ بلا مقصد ہمدردیاں نہیں بانٹتے پھرتے۔"

"خوب! تو اتنی سی دیر میں تم نے میری قسم بھی پہچان لی!"

"آدمی کا پیشہ چہرے پر لکھا ہوتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو اور اس ہمدردی کی آڑ میں مجھ سے کیا چاہتے ہو!" میں نے صاف اور بے لاگ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ مجھے ایک ویران گوشے میں لے گیا اور میرے مقابل کھڑا ہو کر بولا۔

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم موجودہ حالات سے خوش ہو یا فرار چاہتے ہو؟"

"اب میں قانون کا نہیں نورا ماسند کا قیدی ہوں۔ میں تو پہلی فرصت میں یہاں سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے آدمی چوبیس گھنٹے میں تمہیں یہاں سے نکال سکتے ہیں!"

"معاوضہ کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"معاوضے کی بات ٹھکانے پر چل کر اُستاد سے کر لینا!"

"معاوضہ بتا دو، میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

وہ پھر اسی بے رحمانہ انداز میں ہنسا "جب بات ہو گئی تو سوچنا بے کار ہے۔ معاوضہ تمہاری حیثیت کے مطابق ہی ہوگا!"

"پھر بھی میں جاننا چاہتا ہوں!" مجھے فضا میں خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے آس پاس نظریں دوڑائیں لیکن وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ عشق زدہ جوڑے کو بھی ہم کافی دور چھوڑ آئے تھے۔

"بچوں کی سی ضد نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا داہنا ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں ڈالا کہ کوٹ کے نیچے بغلی ہولسٹر سے جھولتا ہوا ریوالور نظر آ گیا۔ ریوالور دکھا کر اُس نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ اب میں اُس کے رحم و کرم پر ہوں۔

میں نے کوئی موقع دیئے بغیر اُسے پوری قوت سے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اسی کے ساتھ اچھل کر اُس کے چہرے پر بھرپور ٹکر رسید کی۔ اُسے مجھ سے اس قدر فوری ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ میں اُسے زمین سے اُٹھنے کا موقع دیئے بغیر اُس کے سینے پر سوار ہو گیا! وہ ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے بھرپور مکے نے اُس کے حواس خراب کر دیئے اور ریوالور کا دستہ میری گرفت میں آ گیا۔

اُس نے بائیں ہاتھ سے مجھے اپنے سینے پر سے پھینکنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میں کسی جونک کی طرح اس سے لپٹا ہوا تھا۔

میں نے اپنی پوری قوت صرف کر کے اُس کے جبڑے پر کئی بھرپور گھونسے برسائے مگر اُس نے ریوالور نہ چھوڑا۔ پھر نہ جانے کس طرح اُس نے اپنی ٹانگیں ہوا میں اچھال کر میری گردن پر پنڈلیوں کی قینچی لگا دی اور میں اپنے ہی زور میں گھاس پر جا گرا۔ گردن کی ہڈی پر پڑنے والا زور اتنا شدید تھا کہ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

اُس نے میری گردن ٹانگوں میں جکڑے جکڑے میری پسلیوں پر ایک شدید ضرب لگائی اور مجھے چھوڑ دیا۔

میں پھر کر زمین سے اُٹھا تو ریوالور کی مہیب نال میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اور وہ آستین سے بار بار اپنا دہانہ صاف کر رہا تھا۔

"سُؤر کے بچے میں دیکھ لوں گا تم کو!" وہ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ریوالور جیب میں رکھ کر ابھی دیکھ لو، جو مر گیا وہی ہار جائے گا!" میں نے اسے اشتعال دلانے کی نیت سے کہا۔

"ریوالور میری جیب میں ہے۔" وہ ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے بولا "اگر تم نے ذرا بھی چالاک بننے کی کوشش کی تو میں فائر کر دوں گا!"

"تمہاری پتلون برباد ہو جائے گی!"

"مجھ سے دُو قدم آگے باہر کے راستے سے پارکنگ لاٹ کی طرف چلو!" وہ غرایا۔ "اگر بھاگنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا کُتے کی موت مارے جاؤ گے!"

میرے لئے اس خبیث کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں چہل قدمی کے انداز میں اُس کے بتائے ہوئے راستے پر ہو لیا۔ عقبی لان کا جنوبی سرا پارکنگ لاٹ سے تقریباً ملا ہوا تھا۔ اس طرف روشنی بھی ناکافی تھی لہٰذا ہمارے بگڑے ہوئے حلیوں پر بھی کسی کی نظر پڑنے کا امکان نہیں تھا!

اس کی گاڑی لان کے قریب ہی موجود تھی۔ اُس نے وہاں پہنچ کر بائیں ہاتھ سے چابی میری طرف اچھال دی۔

"گاڑی تم چلاؤ گے مگر میرے بتائے ہوئے راستوں پر!"

اُس کی ہدایت کے مطابق پہلے میں نے بائیں طرف کا دروازہ کھولا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جانے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اُس نے للکارا "ادھر نہیں، اس طرف سے اندر چلو!"

میں نے دل ہی دل میں اُسے گالیاں بکتے ہوئے اُس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ مجھے کوئی بھی موقع دیئے بغیر میرے بائیں طرف والی سیٹ پر آ بیٹھا۔

اُس کی ہدایت پر گاڑی چلاتے ہوئے مجھے اچانک ہی اپنی حماقت پر طیش آ گیا۔ اگر میں اس سے انکار کر دیتا کہ میں گاڑی چلانا نہیں جانتا تو یقیناً وہ دشواری میں پڑ جاتا۔ شاید مجھے پھانسنے کا منصوبہ بناتے ہوئے اُسے اُمید تھی کہ فرار کا لالچ سامنے آتے ہی میں کسی پالتو کُتے کی طرح دُم ہلاتا اُس کے پیچھے ہو لوں گا۔

ممبئی انسانوں کا سمندر ہے۔ اس شہر میں ہندوستان کی ہر نسل کا فرد پایا جاتا ہے۔ سری نگر سے مدراس اور کلکتہ سے جیسلمیر تک ہر خطے کا آدمی یہاں بستا ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں مل کر یہاں ایک نئی زبان کو جنم دیتی ہیں۔ بے شمار ثقافتیں آپس میں گڈمڈ ہو کر ممبئی کا ایک اچھوتا روپ دھار چکی ہیں۔ راستے ٹریفک سے بھرے ہوئے تھے۔ تانگوں سے نودولتیوں کی چمکیلی گاڑیوں تک ہر سواری موجود تھی اور انسان تو موج در موج ایک دوسرے سے بے پرواہ کندھے اور کہنیوں سے اپنا راستہ بناتے چلے جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں زندگی کا یہ روپ پیچھے رہ گیا۔ اب کار ایک طویل اور ویران شاہراہ پر چل رہی تھی جس کے دونوں طرف بے آب و گیاہ میدان یا کھوری پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

میں نے چور نظروں سے اپنے دشمن کی طرف دیکھا۔ اُس کا داہنا ہاتھ ڈیش بورڈ کے نیچے اس طرح گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا کہ ہاتھ میں موجود ریوالور کی نال میری طرف تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ریوالور جیب سے نکال لیا تھا۔

سڑک پر میلوں دُور آبادی کے آثار نظر نہ آئے تو میں نے اسے چھیڑا۔ "کہاں لے جانے کا ارادہ ہے مجھے، ممبئی تو ہم میلوں پیچھے چھوڑ آئے ہیں!"

"بکواس مت کرو۔" وہ جلے بھنے لہجے میں بولا۔

گاڑی کی رفتار سو کلومیٹر کے قریب تھی۔ میری نظریں غیر ارادی طور پر بار بار ریوالور کی طرف جا رہی تھیں۔ اور میں کوئی بڑا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

پھر ایک بار وہ اپنی پنڈلی پر کھجانے کے لئے جوں ہی نیچے جھکا میں نے گاڑی بائیں طرف پھیلے ہوئے ناہموار کچے میدان میں اُتار دی اور پوری قوت سے بریک لگا دیئے۔ وہ چیختا ہوا نیچے پائیدان پر جا گرا۔

میں نے گیئر نیوٹرل کئے بغیر اُسے دہیں دبوچ لیا۔ کلچ آزاد ہوتے ہی گاڑی نے ایک جھٹکا کھایا اور انجن بند ہو گیا۔

میں نے اُس کا سر پوری قوت سے آہنی ڈیش بورڈ کے نچلے حصے سے مارا پھر اُس کے چہرے پر لگاتار مکے برسانے لگا۔ وہ ایک گٹھری کی صورت میں پائیدان میں پڑا ہوا تھا، مجھے ہر لحاظ سے اس پر برتری حاصل تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے اُس کی ران کے نیچے دبا ہوا ریوالور میرے قبضے میں آ چکا تھا۔

اب اس پر زور آزمائی بے کار تھی، میں دروازہ کھول کر باہر کود گیا وہ پائیدان پر ہی پڑا کراہتا اور گالیاں بکتا رہا۔

"نیچے آؤ۔" میں سرد اور سفاکانہ لہجے میں غرایا "ورنہ میں تمہارے چیتھڑے اُڑا دوں گا۔"

وہ دہشت کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا فوراً ہی باہر آ گیا۔

"میرے پاس وقت کم ہے لہٰذا مجھے اپنی ہر بات کا جواب مختصر اور صحیح چاہیئے۔" میں نے کہا "اگر مجھے شبہ بھی ہوا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو گولی مار دوں گا، یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا۔"

"پپ۔ پوچھو!" وہ ہانپتے ہوئے بولا، اُس کے سارے کس بل نکل

چکے تھے۔

"تمہارا نام؟"

"اچھن، پورا نام اچھے خان ہے۔"

"تم مجھے کہاں لے جارہے تھے؟"

"بیلاپور کی ایک ویران حویلی میں پہنچانا تھا!"

"تم کس کے لئے کام کررہے ہو؟"

"اُس کا نام معلوم نہیں۔ کوئی روسی ہے۔ وہ بیلاپور کی لال حویلی میں میرا انتظار کررہا ہوگا۔"

"روسی؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آسکا۔

"ہاں۔ اُس نے تمہیں لانے کے دس ہزار دیئے تھے۔ آدھی رقم میں پیشگی لے چکا ہوں۔" وہ کوشش کے باوجود سیدھا کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔

"روز ہاؤس کس نے فون کیا تھا؟"

"میں نے۔ اُس نے مجھے تمہاری تصویر دکھائی تھی اور بتایا تھا کہ تم روز ہاؤس میں رہتے ہو۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "یہ پوچھ گچھ بعد میں کرلینا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو، شاید میری کوئی پسلی ٹوٹ گئی ہے!"

"وہ رہتا کہاں ہے؟"

"اُس کا ٹھکانا نہیں معلوم، ویسے پونا نزا میں روز آتا ہے۔"

"اُس کا حلیہ؟"

"گورا رنگ، بھورے بال، پیشانی پر کسی چوٹ کا گہرا نشان ہے۔"

"کچھ روز پہلے راما نند کے مکان میں کون گھسا تھا؟" میں نے اندھیرے میں ریوالور کی نال سیدھی کرتے ہوئے آخری سوال کیا۔

"م م... میں نہیں تھا۔"

میں نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکے کے ساتھ گولی اُس کے پہلو میں اُتر گئی۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی کریہہ چیخ نے دوسرے فائر کے ساتھ دم توڑ دیا اور اُس کا جسم فضا میں اچھل کر ساکت ہوگیا۔

میں نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی کے ساتھ شہر کی طرف ہولیا۔ راستے میں میں نے اپنے حلیے کا جائزہ لیا۔ میرا لباس بُری طرح شکن آلود ہوچکا تھا۔ سفید قمیص پر خون کے کئی تازہ دھبے اندھیرے میں بھی چمک رہے تھے۔ چہرے پر ہونے والی سوزش سے پتہ چل رہا تھا کہ وہاں ورم اور خراشیں موجود ہیں۔ اس حالت میں میرے لئے ہوٹل کا رُخ کرنا شامت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

دوسری مصیبت یہ تھی کہ روز ہاؤس میں پونا نزا تک میرا پیچھا کرنے والے جب ہوٹل پہنچے ہوں گے تو مجھے غائب پاکر بوکھلا گئے ہوں گے اور اب پورے ہوٹل میں میری تلاش جاری ہوگی۔

راستے میں مجھے یہ شبہ ہوا تھا کہ شاید مجھے بُلانے والے ہی میرا تعاقب کررہے ہیں مگر اب مجھے پُورا یقین تھا کہ وہ انڈین سیکرٹ سروس کے آدمی تھے۔ بار بار کی یقین دہانی کے باوجود ان لوگوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے وہ کار چھوڑ دی اور پیچ در پیچ تاریک گلیوں سے گذرتا ہوا ایک ایسی نیم تاریک سڑک پر پہنچا جہاں ٹیکسی ملنے کی اُمید تھی!

ٹیکسی ڈرائیوروں کی عادات کے لحاظ سے بمبئی کراچی سے مختلف نہیں۔ میٹر سے پانچ روپے زائد پر سودا طے ہوا اور میں واپس روز ہاؤس روانہ ہوگیا۔

گاڑی چھوڑنے سے قبل میں نے کوٹ کے تینوں بٹن لگا کر کالر کھڑا کر لیا تھا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ میں نے سردی سے بچاؤ کی تدبیر کی ہے۔ درحقیقت میں نے قمیص پر لگے ہوئے خون کے دھبے چھپائے تھے۔ اچھن سے چھینا ہوا تین دو کا ریوالور میری جیب میں موجود تھا۔ اُس کا چرمی ہولسٹر میں نے الگ کرکے راستے میں پڑنے والے ایک نالے میں پھینک دیا تھا۔

روز ہاؤس کے سنتریوں نے ٹیکسی کے ہارن پر دروازہ نہیں کھولا۔ گذشتہ واقعات نے انھیں بہت زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ انہوں نے دُور ہی سے میری آواز پہچان لی اور میں ان دونوں کی نظروں میں آئے بغیر اندر پہنچ گیا۔

گھنٹی کی آواز پر جگدیش نے دروازہ کھولا اور حیرت سے بھونچکا رہ گیا۔ "ارے موہن بابو یہ کیا حالت بنا رکھی ہے، بٹیا کو کہاں چھوڑ آئے۔"

"اوشا خیریت سے ہے، آتی ہی ہوگی!" میں نے جلدی سے کہا۔ "جھگڑا ہوگیا تھا، کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ بلاوجہ ڈاکٹر پریشان ہوں گے۔"

اُس نے مجبور اور خوفزدہ نظروں سے رو دینے والے انداز میں میری طرف دیکھا اور میرے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

خوابگاہ میں پہنچ کر میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنا جائزہ لیا تو ہنسی چھوٹ گئی۔ میرے چہرے پر رگڑ کے دو تین معمولی سے نشانات تھے اور چہرہ سیاہ مٹی میں لتھڑا ہوا تھا جس میں گھاس کے تنکے نمایاں تھے۔

شاید پونا نزا کے عقبی لان میں لڑتے ہوئے میرا یہ حلیہ بنا تھا۔ حیرت تھی کہ طویل ڈرائیونگ میں کوئی میری اس حالت کو نہ دیکھ سکا۔ اس کا جواز بھی خودبخود ذہن میں آگیا۔

سامنے سے آنکھوں پر پڑنے والی ہیڈ لیمپس کی بھرپور روشنی کسی کو اس قابل ہی نہیں رہنے دیتی کہ چند ثانیوں تک کچھ دیکھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ رات کے اندھیرے نے مجھے بڑی مشکلات سے بچا لیا تھا ورنہ شہر کی سڑکوں پر تماشا بن گیا ہوتا۔

جلدی جلدی لباس تبدیل کرکے میں ڈرائنگ رُوم میں آیا۔ راما نند ابھی تک تجربہ گاہ میں مصروف تھا۔ اس مہلت کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے ڈائرکٹری کی مدد سے پونا نزا کا نمبر ملایا اور آپریٹر کو ہدایت کی کہ مسز راما نند کو فون پر بلائے۔

"ہیلو اوشا بول رہی ہوں میں!" ٹیلی فون پر اس قدر آواز کچھ زیادہ ہی مترنم اور رسیلی سُنائی دے رہی تھی۔

"میں موہن بول رہا ہوں اوشا۔" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "شدید مجبوری کی بنا پر میں واپس روز ہاؤس آگیا ہوں۔ تم اپنی سہیلیوں سے معذرت کرکے جلدی لوٹ آؤ!"

"اوہ!" اُس کی غصیلی آواز سُنائی دی۔ "وہ سب تمہارا انتظار کررہی ہیں، اب وہ میرا مذاق اُڑائیں گی!"

"انھیں بھی ساتھ لے آؤ، تمہارا جلد از جلد گھر پہنچنا ضروری ہے!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا کوئی خطرناک بات ہے؟" اس بار اُس کی آواز سے تشویش نمایاں تھی۔

"ٹیلی فون پر بکواس مت کرو۔" میں غصے میں برس پڑا۔ "فوراً گھر پہنچنے کی کوشش کرو۔ کار کی چابی تمہارے پرس میں ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اُس کا جواب سُنے بغیر سلسلہ منقطع کردیا۔

میں سگریٹ سلگا کر حالات کے اس نئے رُخ پر غور کرنے لگا۔ میں قانون سے بھاگا ہوا ایک معمولی مجرم تھا۔ آخر میری ذات میں کون سے سُرخاب کے پر لگ گئے تھے کہ انڈین سیکرٹ سروس کے علاوہ ایک رُوسی محض میرے اغوا کے لئے بمبئی کے کسی غنڈے کو دس ہزار روپے میں خریدنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ سیکرٹ سروس کی دلچسپی کا سبب واضح تھا۔ اُن کی نظروں میں میں قاتل بھی تھا اور کیمیاگر بھی۔ وہ تنظیم بنیادی طور پر ملکی مفادات کی نگراں تھی۔ ڈاکٹر راما نند کی ضد کے باعث مجھے اس کے حوالے کیا جاچکا تھا اور میں اس بات پر رضامند ہوچکا تھا کہ روز ہاؤس میں رہتے ہوئے ہند سرکار کے لئے سونا بناتا رہوں گا۔ راما نند پر تو میری مظلومیت کا وار چل گیا تھا اس لئے اس بے چارے نے مجھ پر بھروسہ کرلیا تھا مگر سیکرٹ سروس والے میرے ماضی کے چند گوشے بے نقاب دیکھ چکے تھے۔ وہ میری فطرت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ ڈاکٹر راما نند کو جُل دے کر میں کسی وقت بھی بھاگ نکلوں گا۔ لہٰذا ڈاکٹر کے علم میں لائے بغیر وہ ہر وقت میری نگرانی کررہے تھے مگر یہ روسی والا قصہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں ڈوبا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے خاموشی سے ریسیور اُٹھا لیا۔ جب دوسری جانب سے گھبرائی ہوئی آواز میں کئی بار ہیلو ہیلو کہا گیا تو میں نے پوچھا۔ "آپ کس سے بات کریں گے؟"

"موہن کانت صاحب موجود ہیں؟"

"بول رہا ہوں!" میں نے کہا اور لائن اچانک بے جان ہوگئی۔

ریسیور رکھتے ہوئے میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ شاید مجھے کھو دینے کے بعد سیکرٹ سروس والوں نے اپنی توجہ اوشا پر مرکوز کردی تھی جب انھوں نے اوشا کو ایک کال وصول کرنے کے بعد تنہا واپسی پر آمادہ دیکھا ہوگا تو کسی ذہین شخص کو روز ہاؤس میں میری موجودگی کا شبہ ہوا اور یوں مجھے وہ عجیب وغریب فون کال ریسیو کرنی پڑی۔

تھوڑی دیر میں اوشا بھی آپہنچی۔ اس بار وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ وہی پری پیکر اور شوخ گفتار دوشیزہ بھی تھی جس نے پونا نزا میں میرے تعارف پر چھبتا ہوا تبصرہ کیا تھا۔

"میں نینی کو بھی ساتھ لے آئی، ویران راستے پر اکیلے ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے!" اوشا نے نینی کی موجودگی کا جواز پیش کیا۔

"یہ وہی صاحبہ ہیں ناجنھوں نے جن کی بیماری کی وجہ سے مندر جانا چھوڑ دیا تھا۔" میں نے اوشا کو تنگ کرنے کے لئے کہا۔

اوشا نے دانت پیس کر مجھے غصے سے گھورا اور میں مسکرا کر نینی سے مخاطب ہوگیا۔ "اب آپ کو اکیلے یہاں سے جاتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا؟"

"تم بے وقوف ہو!" اوشا پیر پٹخ کر بولی۔ "نینی یہیں رہے گی۔ میں نے اتنی مشکل سے اُس کی ماتا کو فون پر منایا ہے اور تم اُسے ابھی بھگانے پر تلے ہوئے ہو!"

"معاف کیجئے گا مس نینی......!"

"مس نہیں۔ مسز نینی ورما!" اوشا میری پے در پے حماقتوں پر جھنجھلا گئی۔ "ان کی شادی کو دو سال ہوچکے ہیں۔ ان کے پتی فلائٹ پر نیروبی گئے ہوئے ہیں، اسی لئے یہ میرے ساتھ آگئیں ورنہ تم تو مجھے اکیلا چھوڑ بھاگے تھے!"

"کیا بچے نانی کے پاس رہ لیں گے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

اوشا نے کالر پکڑ کر مجھے دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ "پتہ نہیں تم کیا اول فول بک رہے ہو۔ پہلے مس بنا دیا، تصحیح کی تو اب بچوں کی اماں بنائے دے رہے ہو۔"

نینی میری باتوں سے بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شروع ہی سے اُس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ مدتوں بعد صفدر علی کو دو خوش ذوق اور تعلیمیافتہ خواتین کی صحبت میسر آئی تھی لہٰذا زبان کا چلنا فطرتی امر تھا۔

"چھوڑو اوشا، میں بُرا نہیں مانتی ایسے مذاق کا۔" نینی ہنستے ہوئے بولی۔ میں کار چھوڑ کر واپس پلٹا تو نینی مجھے دیکھ کر ہنسے جارہی تھی۔ اُس کی نظروں میں عجیب سی اپنائیت تھی جو ہر عورت اپنے شوہر کے لئے رکھتی ہے۔ میرا دل چاہا کہ نینی کے پہلو میں جا بیٹھوں۔

"بابا کہاں ہیں؟" اوشا نے مجھ سے پوچھا۔

"تجربہ گاہ میں ہیں، ان کا کھانا وہیں جائے گا۔"

"آؤ نینی رسوئی میں چلتے ہیں۔" اوشا نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "موہن نے پونا نزا کا ڈنر تو گنوا دیا۔ اب ہمیں دال روٹی بنوانا پڑے گی!"

نینی نے اُٹھتے اُٹھتے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بے اختیار میری داہنی آنکھ پھڑک گئی۔ نینی کی نگاہوں میں وضاحت پوشیدہ تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ میں خود نہیں جانا چاہتی، یہ اوشا کی بچی زبردستی مجھے تم سے محفوظ رکھنے پر تلی ہوئی ہے!

وہ دونوں باتیں کرتی راہداری میں چلی گئیں اور میں طویل انگڑائی لے کر صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ نینی کو دیکھنے کے بعد تکان کا احساس کچھ اور بڑھ

گیا تھا۔

اس مہلت کو غنیمت جان کر میں نے لیبارٹری فون کیا۔ ریسیور پر دوبارہ وہی مشینی آواز سُنائی دی "اجیت!"

"اجیت صاحب ڈاکٹر کس وقت تک فارغ ہوں گے؟"

"شاید صبح ہو جائے!" اُس نے کہا۔

"اگر مدد کی ضرورت ہو تو میں بھی وہاں آجاؤں؟"

"آپ آنا چاہیں تو ضرور آجایئے، ڈاکٹر صاحب تو اہم کاموں میں مجھ پر بھی بھروسہ نہیں کرتے!" اُس نے خوبصورت الفاظ میں مجھے ٹال دیا۔

"ڈاکٹر کو بتا دیں کہ ہم لوگ لوٹ آئے ہیں۔ اوشا کی ایک سہیلی مینی ہمارے ساتھ آئی ہے!" میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

کھانے کی میز پر میں مینی کے سامنے بیٹھا۔ اس عورت میں بے انتہا جاذبیت پائی جاتی تھی۔ ایسی غیر مرئی کشش جسے صرف مرد ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

میں نے میز کے نیچے اپنی ٹانگیں آگے تک پھیلا دیں۔ اوشا اپنی ذات کو میری جاگیر میں بدل چکی تھی۔ اب میری دلچسپی کا محور مینی کی ذات تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں کے گوشوں سے میری طرف جھانکتی تو میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو جاتی تھیں۔

"اس میں نمک نہیں ہے!" میں نے آملیٹ کا پہلا لُقمہ لیتے ہی بُرا سا منہ بنایا

"اوہ ۔۔ معاف کیجئے گا، یہ میں نے بنایا ہے!" مینی نے بوکھلا کر نمک دان میری طرف بڑھا دیا۔ اسی وقت میز کے نیچے اس کا پیر میرے پیر سے ٹکرایا میں نے چور نظروں سے دیکھا کہ اس کے ہونٹ معذرت کے لئے کھلے مگر مجھے متوجہ نہ پا کر وہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔

چند ثانیوں کے بعد اس کا سینڈل میری چپل سے آملا۔ بیک وقت ہم دونوں کی نظریں اُٹھیں، اور جھکتی چلی گئیں اس کا مطلب تھا کہ میرا نشانہ درست رہا وہ پیر اوشا کا نہ تھا اور مینی مجھ سے دوستی پر پوری طرح آمادہ تھی!

میں نے چپل اُتار دی اور میرا پیر اس کی پنڈلی سے چھونے لگا۔

"آپ تکلف کر رہی ہیں مسز مینی!" میں نے پیر کے انگوٹھے سے مینی کی پنڈلی میں ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے کہا "یہ شوربہ لیجئے، جگدیش ایسی چیزوں کا ماہر ہے"

"جی شکریہ! میں لے رہی ہوں!" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی

"ارے مینی لحاظ نہ کرو اس کا" اوشا نے تقریباً چیخ کر اُسے شہہ دی" دو چار چلی کٹی سُناؤ گی تو ہونٹ چاٹتا رہ جائے گا!"

نگاہیں پھر اُٹھیں، ملیں اور جھک گئیں مینی کی پنڈلی پر میرے سخت اور کھُردرے پیر کی کارروائی کا میدان کچھ اور وسیع ہو گیا۔

"یہ کہاں رہتے ہیں؟" مینی نے اوشا سے پوچھا۔

"ابھی تو طویل عرصے یہیں رہنے کا امکان ہے، پھر دیکھو کدھر جاتے ہیں!"

"جس دن میرے پتا کو خیال آگیا کہ میں لڑکی نہیں لڑکا ہوں، اسی روز گھر بس جائے گا!" میں نے اوشا سے کہا اور مینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت مجھے بے حد حسین معلوم ہوئے۔ جی چاہا کہ وہ یوں ہی ہنستی رہے!

"یہ تم پر چوٹ کر رہا ہے" اوشا نے مینی کو تاؤ دلانے کی کوشش کی "تمہارا بونانزا والا تبصرہ دہرا رہا ہے اور تم دانت نکال رہی ہو!"

"جس کے دانت حسین اور آبدار ہوں وہ ہنسنے میں بخل کیوں کرے!" مجھے مینی کے دانتوں کی تعریف کا ایک موقع میسّر آگیا۔

"آپ کیوں چڑا رہے ہیں بے چاری کو؟" مینی نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"مشکل تو یہی ہے کہ اوشا کسی بات سے نہیں چڑتی!" میں نے کہا "آپ شاید اس کی کالج کی ساتھی ہیں۔ اس زمانے کی ہی کوئی چڑ بتا دیں!"

"کالج" اوشا ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولی "کیوں مینی وہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ اب بھی کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے!"

"اچھا وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے!" میں نے مینی کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بات اُچک لی "کچھ دیر بعد ہم ان خوشگوار لمحوں کو یاد کریں گے جو ہم اب میز کے گرد بیٹھے گزار رہے ہیں!"

میری نگاہیں مینی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کا رنگ یوں فق ہو گیا جیسے میں نے بھری محفل میں اس کا کوئی راز افشا کر دیا ہو اور میرے پیر سے اُلجھتی ہوئی پنڈلی اچانک کہیں غائب ہو گئی۔

مینی نے جیسے تیسے کر کے پلیٹ میں بچا ہوا کسٹرڈ ختم کیا اور ہاتھ دھونے اٹھ گئی میرے لئے تنہا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہٰذا میں بھی اُٹھ گیا۔

مینی کچن سے نکل رہی تھی کہ میں ہاتھ دھونے اندر گھسا، اس نے ٹکر سے بچنے کی نیم دلانہ کوشش کی اور میرے سینے سے آٹکرائی۔

"اُف میری پنڈلی!" اپنی پشت پر اوشا کی آواز سُن کر میں کراہتا ہوا نیچے جھُک گیا اور مینی بوکھلائی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

میری توقع کے برعکس اوشا نے سونے کا بندوبست جلد ہی کر لیا اور مینی کو ہمراہ لے کر اپنی خوابگاہ میں گھس گئی میں گزرے ہوئے حسین لمحوں کی یاد میں کھویا اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

ابھی میں پہلی سگریٹ بھی ختم نہ کر پایا تھا کہ اوشا وہاں آموجود ہوئی۔

"کچھ اہم باتیں تو میں بعد میں کروں گی، پہلے یہ بتاؤ کہ بونانزا سے کہاں غائب ہوئے تھے اور تمہارے داہنے جبڑے پر ورم کیسا ہے؟" وہ اس وقت بہت سنجیدہ تھی۔

"بمبئی لیٹروں کا شہر ہے!" میں اپنا جبڑہ سہلاتے ہوئے بولا "پان لینے باہر نکلا تھا کہ پارکنگ لاٹ کے قریب ایک آدمی ٹوٹ پڑا۔ وہ میرا بٹوہ چھیننے کی کوشش میں تھا جب اس کی مرمّت ہوئی تو بھاگ نکلا مجھ پر تعاقب کرنے والوں کی دہشت سوار تھی اس لئے نروس ہو کر بھاگ نکلا۔ مار پیٹ کے بعد میرا حلیہ اس قابل نہیں تھا کہ تمہاری سہیلیوں کا سامنا کرتا!"

"جہاں جاتے ہو فساد تم سے آگے آگے ہوتا ہے!" وہ مسکرا کر بولی۔

"مقدر ہی کچھ ایسا ہے!"

"اچھا اب میں جو کچھ پوچھوں سوچ سمجھ کر جواب دینا" اس بار وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔

"میں بغیر سوچے بولنے کا عادی نہیں ہوں!"

"کھانے کی میز پر تم کیا کر رہے تھے!"

"کھانا کھا رہا تھا!"

"اس کے علاوہ؟" اس کی سنجیدگی گمبھیر ہو گئی۔

"باتیں کر رہا تھا!" کہنے کی حد تک تو میں نے شیر بن کر جواب دے دیا مگر اس کی باتوں سے مجھے دہشت ہونے لگی دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اس نے مجھے مینی سے ٹانگیں لڑاتے دیکھ لیا ہے۔

"جھوٹ مت بولو!"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، شاید تمہیں میرا مینی سے ہنسنا بولنا پسند نہیں آیا!" میں نے اسے دبانے کی کوشش کی۔

"تم پنڈلی کس کی سہلا رہے تھے؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"پنڈلی، کیسی پنڈلی؟ دماغ خراب ہوا ہے تمہارا" میں بوکھلا کر بستر سے اُٹھ گیا۔

"ہاں ۔۔ مجھے بتاؤ کہ تم اپنے پیر سے کس کی پنڈلی سہلا رہے تھے!" وہ فضا میں مُکا لہرا کر بولی۔

"تم مجھ سے قسم لے لو جو میں نے کسی کی پنڈلی کو چھوا بھی ہو!" میرا لہجہ مدافعانہ تھا میں نے زندگی میں بے شمار جھوٹ بولے اور ڈنکے کی چوٹ ان پر اڑا رہا مگر اس بُری طرح میں کبھی شکنجے میں نہ پھنسا تھا جیسا اوشا نے مجھے گھیرا تھا۔

"کھاؤ قسم!" وہ جھلا کر بولی۔

"خدا کی قسم میں نے کسی کی پنڈلی کو نہیں دیکھا!" میں نے پورے خلوص اور سنجیدگی سے اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلایا قسم کھاتے ہوئے میں نے بچاؤ کا فنی پہلو فراموش نہیں کیا تھا قسم دیکھنے کی حد تک کھائی جو سچی تھی۔ چھُونے کا حال تو میرا دل ہی جانتا تھا۔

اوشا غصے میں بپھری ہوئی چند ثانیوں تک مجھے گھورتی رہی پھر مسہری پر بیٹھ کر اچانک رونے لگی۔

"کیا ہوا؟ مجھے کچھ تو بتاؤ!"

"مجھے اب پتہ چلا کہ تم مینی کے دھوکے میں میری پنڈلی سے کھیل رہے تھے تم جھوٹے ہو اور وہ حرامزادی تو تمہیں ایسے دیکھ رہی تھی جیسے بس چلے تو تم پر سے قربان ہو جائے گی!" وہ روتے ہوئے بولی اور میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر فرش پہ اکڑوں بیٹھ گیا۔

میں چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اب اگر کہیں بھی میز کے نیچے کسی سے پیر ٹکرائے تو بلند آواز میں معذرت ضرور کروں گا تاکہ ایسی کسی سنگین غلطی کا امکان نہ رہے۔

کھانے کی میز پر میں نے جتنا لُطف اُٹھایا تھا، اوشا کے انکشاف سے وہ کرکرا ہو چکا تھا۔ مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ میرے اعصاب اوشا اور مینی کے لمس کا فرق نہ محسوس کر سکے کسی نے سچ کہا ہے کہ جب ذہن پر عورت سوار ہو تو سارے حواس مفلوج ہو جاتے ہیں۔

میں اوشا کو بڑی مشکل سے منا سکا۔ وہ تو مینی پر بھی برسنے پر تلی تھی میں نے اُسے احساس دلایا کہ یہ سارا مسئلہ غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مینی اس قصے سے لاعلم ہے اگر گھر بلانے کے بعد اس کی ذات پر کیچڑ اُچھالی گئی تو اوشا سہیلیوں میں بدنام ہو جائے گی۔ یہ نکتہ خاصا کارگر رہا اور اوشا خاصی دیر بعد میری باہوں سے الگ ہوئی تو اس کا غصہ رفع ہو چکا تھا۔

ناشتے کے وقت تک ڈاکٹر رامانند تجربہ گاہ سے واپس نہیں آیا تھا میز پر ہم تینوں ہی تھے اور ترتیب وہی رات والی تھی میں اوشا کی وجہ سے تقریباً خاموش بیٹھا ہوا تھا حتی الامکان مینی کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا کہ کہیں بات کا بتنگڑ نہ بن جائے۔

"آج آپ خاموش ہیں!" چائے پیتے ہوئے مینی نے مجھے ٹوک ہی دیا۔

"یہ سورج ڈوبنے کے بعد بولنا شروع کرتے ہیں!" اوشا بول پڑی۔

مینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے غصے اور بے بسی کے ساتھ اوشا کو گھورا اور اُس نے مجھے زبان دکھا دی۔ اس وقت وہ کسی بچی کی طرح پیش آرہی تھی۔

ہنسی سے مینی کے آنسو نکل آئے تھے، وہ رومال سے آنکھیں خشک کر رہی تھی کہ میری پنڈلی سے بہت آہستگی سے کسی کا نرم نرم پیر ٹکرایا۔

میں نے جلدی سے ٹانگیں سکیڑ لیں۔ اور مشینی انداز میں میرے منہ سے نکلا "سوری"! میری نگاہیں اس وقت اوشا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"سوری موہن صاحب"! قدرے تاخیر سے ادا ہونے والا یہ فقرہ مینی کا تھا شاید وہ اظہارِ افسوس کے لئے تیار نہ تھی۔ اسے توقع بھی نہ رہی ہوگی کہ سینڈل کے بغیر ٹکرانے والا اس کا دوستی کا پیر میں یوں ٹھکرا دوں گا۔

رات کو مجھے سوری کہنا تھا تو خاموش رہ کر چوہے دان میں پھنس گیا اور اب خاموش رہ کر مینی کے پیروں کا خمار جذب کرنا تھا تو سوری کہہ کر اسے ٹھکرا دیا۔ اوشا ہم دونوں سے بے خبر آہستہ آہستہ بلیک کافی کے گھونٹ لے رہی تھی۔

جانے سے ذرا دیر پہلے چند سکنڈ کے لئے اوشا ہم دونوں سے غافل ہوئی اور مینی نے پرس سے کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

کارڈ میں صرف تین سطریں چھپی ہوئی تھیں کیپٹن ورما۔ ۲۸ جوپاٹی بمبئی میں نے وہ کارڈ جلدی سے جیب میں اُڑس لیا۔ اور اوشا ہوبرٹ کے ہمراہ مینی کو چھوڑنے چلی گئی۔

تجربہ گاہ سے ڈاکٹر رامانند کی واپسی دوپہر کے قریب ہوئی مسلسل کام اور بے خوابی کے باعث اس کے بوڑھے چہرے پر بے شمار وریدیں اُبھر آئیں تھیں اور آنکھوں سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"جسے تم سفید سونا کہتے ہو وہ کوئی عجیب ہی چیز ہے!" ڈاکٹر آتے ہی بولا "میں اسے ہر طرح آزما چکا۔ نہ اس کی تحلیل ہوتی ہے نہ کوئی معیاری تجربہ کارگر ہوتا ہے البتہ زرد سونے کے کیمیائی خواص اصل کے مطابق ہیں طبعی خواص بہت مختلف!"

"اس عمر میں مسلسل محنت اچھی نہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے اسے سہارا دیا اور سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے کہا "آپ آرام کا خیال بھی رکھا کریں!"

"ہاں تمہارے ساتھ رات کیا ہوا تھا" رامانند نے اچانک سوال کیا "جگدیش

نے فون کر کے مجھے تجربہ گاہ ہی میں سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"میں نے اسے منع کیا تھا۔"

"میرے ملازم مجھے ہر بات بتاتے ہیں۔" راماند بولا۔ "اگر ان پر اعتماد نہ ہو تو میں اتنے بڑے گھر میں ایک منٹ بھی بے فکری سے نہ رہ سکوں۔"

میں نے ڈاکٹر کو بھی وہی کہانی سنا دی جو اوشا کو سنا چکا تھا۔

"آخر یہ سیکرٹ سروس کب تمہارا ساتھ چھوڑے گی۔"

"انھیں بھول جائیں۔" میں نے کہا۔ "اپنی دانست میں اس طرح وہ میری اور آپ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جب تک وہ ہمارے آڑے نہیں آتے ہمیں ان کو بھلائے رکھنا ہوگا۔"

"اوشا بیٹا کہاں ہے؟"

"وہ نینی کو چھوڑنے گئی ہے، آتی ہی ہوگی۔"

"میں سونے جا رہا ہوں، کوئی اہم کال آئے تو جگا دینا۔"

اس شام اوشا کے روکنے کے باوجود میں گھر سے نکل پڑا۔ میں جلد از جلد اس روسی تک پہنچنا چاہتا تھا جس نے اجنتن کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ اجنتن سے حاصل کیا ہوا ریوالور میں نے کوٹ کی بغلی جیب میں چھپا لیا تھا۔

ابھی اندھیرا پھیلنے میں کافی دیر تھی لہٰذا میں نے کار چوپاٹی کے راستے پر ڈال دی۔ بیالیسواں مکان ایک مختصر لیکن خوشنما بنگلے پر مشتمل تھا۔

میں نے نینی کے مکان کے سامنے کئی چکر لگائے مگر وہاں جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے اس کے گھر کے ماحول وغیرہ کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کوئی رکاوٹ ہوتی تو نینی یوں خاموشی سے اپنا کارڈ میرے حوالے نہ کرتی۔

میں گاڑی اس کے مکان کے احاطے میں لیتا چلا گیا۔

ہارن کی آواز پر ایک بوڑھی خادمہ برآمد ہوئی میں نے اسے اپنا نام موہن ہی بتایا۔

چند منٹ کے بعد نینی خود ہی آئی۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ میں اتنی جلدی اس تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اس نے حیرت اور خوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ پچھلی ملاقات میں ہم دونوں میں کچھ زیادہ باتیں تو نہیں ہوئی تھیں ہاں اشاروں کنایوں میں ہم نے ایک دوسرے پر اپنا مدعا واضح کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں وہ ملاقات بڑی بے تکی ثابت ہو چکی تھی۔ نہ نینی کے پاس الفاظ تھے نہ میرے پاس کوئی موضوع تھا۔

"آپ کے پتی نہیں ہیں؟" سب سے پہلے میں نے اہم ترین سوال ہی پوچھ ڈالا۔

"وہ ایر انڈیا میں ہوا باز ہیں۔ ان کا بیشتر وقت باہر گزرتا ہے۔" اس کے لہجے میں دکھ چھپا ہوا تھا۔ شاید اس کا شوہر اسے مسلسل نظر انداز کرتا رہا تھا۔

"آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟" میں نے اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میری اندھی ماتا اور ایک بوڑھی ماما ساتھ رہتی ہے!"

اس کا ڈرائنگ روم دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ آرائش میں حسن اور نزاکت کا ایسا بیش قیمت اظہار کم ہی نظر آتا ہے کمرے کے ایک گوشے میں چھوٹا سا بار بنا ہوا تھا جس میں کئی الماریاں شراب کی بوتلوں سے سجی ہوئی تھیں!

"یہ شوق شاید کیپٹن ورما کا ہے۔"

"وہ یہاں رہتے کب ہیں جو ان کے شوق رکھے جائیں، آپ کچھ پسند کریں گے؟"

"شیمپین!" میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے اپنے لیے پورٹ کا گلاس تیار کیا۔ شیمپین میری طرف بڑھا دی، پھر ہنستے ہوئے بولی۔ "پچھلی رات آپ کا اوشا سے جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں تو!" میں نے سفید جھوٹ بولا۔

"وہ کافی دیر آپ کے کمرے میں گھسی رہی تھی، شروع ہی سے خود سر لڑکی ہے۔ بات بات پر رقابت کا مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے!" وہ مسکرا مسکرا کر بتا رہی تھی۔

"کیا پہلے کوئی عشق کر چکی ہے؟"

"عشق تو میں نے کیا تھا" وہ آزردہ لہجے میں بولی مگر ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ باقی تھی۔ "ورما شادی سے پہلے میرے پجاری تھے اور اب میں ان کے دیدار کو ترستی ہوں۔ اوشا میری بہت پکی سہیلی تھی۔ اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں اپنا زیادہ وقت اس کے بجائے ورما کے ساتھ گزاروں!"

"آپ حسین ہیں، جوان ہیں، آپ میں کس چیز کی کمی ہے جو ورما صاحب آپ سے دور رہتے ہیں۔" میں اس کی بالواسطہ تعریف کرتے ہوئے بولا۔

"ان کے پاس ڈیوٹی کا بہانہ ہے!" وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ کوششیں کر کے اپنی ڈیوٹی یورپ وغیرہ کے روٹ پر لگواتے ہیں۔ دراصل شادی عشق کا حسرتناک انجام ہوتی ہے موہن صاحب!"

میں اس کے قریب کھسک گیا۔ "مسئلہ انتخاب کا ہوتا ہے، اگر ورما کی جگہ کوئی معقول آدمی ہوتا تو ساری عمر آپ کے چرنوں میں پڑے رہنے کی آرزو کرتا!"

"چھوڑیے" وہ گلاس خالی کر کے ہنسی۔ "صبح میرا پیر چھو گیا تھا تو آپ یوں اچھلے تھے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو!"

"میں اسی کی معذرت چاہنے آیا ہوں!" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"معذرت تو میں نے اسی وقت آپ کی آنکھوں میں پڑھ لی تھی!" وہ گرمجوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔

"اس وقت میری آنکھوں میں کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟"

وہ اچانک وہاں سے اٹھ گئی۔ "میں نے اس گھر میں اپنی ذات کو کھو دیا ہے۔ ورما کی بے وفائی کے باوجود میرے قدموں میں لغزش نہ آئی مگر آپ کی ذات میں جانے کیا جادو ہے جو میرے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میں مدت سے کسی کی رفاقت کو ترسی ہوئی ہوں!"

دوسرا گلاس لبریز کر کے وہ واپس آئی اور ٹہلتے ہوئے کچھ سوچ کر مسکرا دی۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"اگر اس وقت اوشا یہاں آ جائے تو کیا ہو، آپ اسے بتائے بنا آئے ہیں نا؟"

"کیا وہ اکثر یہاں آتی رہتی ہے؟"

"فلمیں دیکھنے آ جاتی ہے۔ ورما نے یہی مہربانی کی ہے کہ مجھے دل بہلانے کی ہر چیز دلائی ہوئی ہے!"

"پروڈیوسر وغیرہ؟" میرے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ ذہن میں ان کہانیوں نے سر ابھارا جو بمبئی کے اعلیٰ ترین فلمی حلقوں کے بارے میں مشہور تھیں وہ لوگ ہر نئی لڑکی کو ہیروئن بنانے کا لالچ دے کر اسکرین ٹیسٹ کے نام پر اس کی بلو فلمیں بناتے تھے جو ان کی نجی محفلوں میں گھومتے گھومتے تجارتی پیمانے پر چلنے لگی تھیں۔

"پروڈیوسر نہیں۔ وڈیو کیسٹ ریکارڈر ہے، میری خوابگاہ میں رنگین ٹیلی ویژن پر فلمیں دیکھ کر اوشا بہت خوش ہوتی ہے۔"

سنسنی کی لہر جس تیزی سے ابھری تھی اسی تیزی سے معدوم ہو گئی۔ ان دنوں وڈیو کیسٹ ریکارڈر غیر معمولی چیز ہوا کرتی تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وی سی آر کے فیتے پر جیتی جاگتی زندگی کیسے منتقل کی جاتی ہے۔ پھر نینی کے معصوم اور حسین چہرے سے ایسے اندیشوں کی نفی جھلکتی تھی۔

"یہ میری خوش نصیبی ہوگی اگر اسی بہانے آپ کی خوابگاہ میں قدم رکھ سکوں" میں نے کہا۔

"وہ دیواریں ڈیڑھ سال سے کسی مرد کی آواز کو ترسی ہوئی ہیں!" نینی کا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔ "ورما بمبئی آتے بھی ہیں تو ہوٹلوں میں دوستوں کے ساتھ ٹھہرتے ہیں!"

"آپ ورما سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں؟" میں نے اپنے دل میں اس عورت کے لیے ہمدردی کی تڑپ محسوس کی۔

"طلاق!" وہ یوں میری طرف گھومی جیسے میں نے اسے گالی دے دی ہو۔ "آپ خود ہندو ہو کر ایسا مشورہ دے رہے ہیں موہن صاحب۔ ہمارا دھنیانہ معاشرہ عورت کی بیوگی تک کو اسی کا جرم گردانتا ہے جس کی تلافی وہ ستی ہو کر ہی کر سکتی ہے ورنہ منحوس بن کر ذلت کی زندگی گزارتی ہے۔ بھلا طلاق لینے والی ایسے لوگوں میں زندہ رہ سکے گی!" آخری الفاظ پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"مجھے افسوس ہے نینی دیوی کہ میرے الفاظ سے آپ کو صدمہ ہوا" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"چھوڑیں موہن صاحب ان باتوں کو" آنکھوں میں آنسو ہونے کے باوجود وہ ہنس دی۔ "آپ چند لمحوں کی آسودگی کی تلاش میں یہاں آئے ہوں گے اور میں نے اپنے دکھ چھیڑ دیئے۔"

"اوشا یہ سب جانتی ہے؟"

"اوشا" اس نے کہا۔ "آپ کو حیرت ہوگی موہن صاحب کہ میری اندھی ماں بھی میری زندگی سے بے خبر ہے۔ میں اسے ہر روز ورما کے محبت بھرے فرضی خطوط سناتی ہوں۔ میری ماں یہ سمجھتی ہے کہ ایر انڈیا ورما کے دم سے چل رہی ہے جس روز وہ چھٹی پر گھر آ گیا، ہند کی فضاؤں میں کوئی جہاز نہ اڑ سکے گا!"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے صوفے سے اٹھا لیا اور بے تکلفی سے بولی۔ "تم نے پھر وہی باتیں چھیڑ دیں۔ میں کہتی ہوں کہ میرے دکھ بھول جاؤ اور مجھے اپنی خوشیوں میں شریک کر لو!"

نینی کی خوابگاہ شاہانہ طور پر آراستہ تھی۔ فرش پر ہاتھ کا بنا ہوا دبیز اونی قالین بچھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر گہرے نیلے پردے پڑے ہوئے تھے سنگھار میز بیش قیمت اشیاء سے لدی ہوئی تھی بستر کے عین مقابل اونچی تپائی پر پورٹیبل ٹیلی ویژن رکھا ہوا تھا۔ وی سی آر مسہری کے ساتھ سائیڈ ٹیبل پر سجا ہوا تھا۔ دوسری سائیڈ ٹیبل پر وہائٹ ہارس کی دو بوتلیں اور ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔

نینی مجھے کسی بچے کی طرح اپنی سنگھار میز کے سامنے لے گئی۔ میری گردن پر وینشنگ کریم کا مساج کیا پھر چلو بھر یوڈی کلون گریبان سے ہاتھ ڈال کر میرے سینے پر لگا دیا۔

"تھینک یو منی!" میں اس کی اداؤں پر پاگل ہوا جا رہا تھا مگر میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے صرف اس کی پیشانی چومنے پر اکتفا کیا۔ اور کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگ دیا، ٹائی کرسی پر ڈال دی۔

باہر سے ایک اور گلاس لانے کے بعد وہ مسہری پر دراز ہو گئی۔ وہ اپنے پہلو پر دوسی آرمیں الجھنے لگی اور میں گلاسوں میں وہائٹ ہارس انڈیلنے لگا۔

ٹی وی سیٹ شاید ہر وقت تیار رہتا تھا نینی نے سرہانے لگا ہوا بٹن دبایا اور ٹی وی اسکرین پر رنگین لہریے ناچنے لگے۔ ٹی وی اسکرین سے منعکس ہونے والی روشنی میں میں نے اسے دیکھا اور آنکھیں بھینچ لیں۔

اسکرین پر ایک رنگین تاریخی فلم شروع ہو گئی، وہ تاریخی ہی تھی کیونکہ اس کا تعلق اس دور سے تھا جب انسان لباس کی قیود سے بیگانہ تھا۔

دھیمی آواز میں وہ فلم چلتی رہی نینی کی خوابگاہ کی ترسی ہوئی دیواریں ایک جیتے جاگتے مرد کی آوازیں سنتی رہیں۔

جب میں وہاں سے نکلا تو رات کے دس بج چکے تھے۔

یونا نزار پائنس ہوٹل تھا۔ مجھے موہوم سی امید تھی کہ شاید اجنتن کا روسی آقا اسی ہوٹل میں مقیم ہو۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے اپنی مہم کی ابتدا لفٹ والے سے کی۔ لفٹ کے سامنے پہنچ کر میں نے چند سیکنڈ کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرنے کی اداکاری کی پھر بے ساختہ انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "گستاف صاحب کون سے کمرے میں ہیں؟"

"گستاف؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "کوئی غیر ملکی ہیں؟"

"ہاں روسی ہیں، پیشانی پر زخم کا بڑا سا نشان ہے!" میں نے اپنے شکار کی واضح نشانی بتائی۔

"کمرہ نمبر تین سو چار، مگر وہ شام سے کہیں گئے ہوئے ہیں!" لفٹ والے نے بتایا میں نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

کاؤنٹر پر اس روسی کا صحیح نام بتائے بغیر کچھ معلوم کرنا محال تھا۔ وہاں بیٹھی ہوئی تیز و طرار لڑکی حلیے اور قد و قامت کا حوالہ سنتے ہی مجھے مشکوک سمجھتی جب کہ لفٹ مین کو پانچ روپے دے کر میں نے بہترین معلومات حاصل کر لی تھیں۔

میں لفٹ والے کی نظروں سے دور آس پاس ہی منڈلاتا رہا۔ ایک بار جوں ہی چند مسافروں کو لے کر لفٹ اوپر روانہ ہوئی میں تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

تیسری منزل کی راہداری ویران پڑی ہوئی تھی ترتیب کے اعتبار سے

وہ اس منزل کے چوتھے کمرے میں مقیم تھا اور وہ کمرہ راہداری کے آخری سرے پر تھا۔

میں تالوں کا جائزہ لیتا ہوا چند ہی سیکنڈ میں چوتھے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا تھا۔

میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور بھی تھا۔ اور چند مڑے تڑے تار بھی۔

میں نے جیل کی چار دیواری میں سیکھا ہوا فن پہلی بار اس تالے پر آزمایا اور دروازہ ہلکے سے دباؤ سے کھل گیا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا۔ ان دروازوں میں دو بڑی خوبیاں تھیں ان کے قبضے بے آواز تھے اور قفل ایسی ساخت کے کہ اندر سے لٹو گھماتے ہی کھل جائیں مگر باہر سے چابی کے بغیر نہ کھلیں!

اندر گھستے ہی میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا تھا سب سے پہلے میں نے باتھ روم کا جائزہ لیا۔ کپڑوں کی الماری دیکھی اور آخر میں مسہری کے نیچے جھانکا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

کمرے میں تقریباً ہر چیز ہی ہوٹل کی ملکیت نظر آ رہی تھی۔ میں نے رائٹنگ ٹیبل کی درازیں چھان ماریں۔ بستر الٹ پلٹ کر دیا مگر وہاں کاغذ کا ایک پُرزہ بھی نہ مل سکا۔

آخر میری توجہ الماری میں لٹکے ہوئے ملبوسات پر گئی۔ میں نے باری باری ساری جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن چند سکوں اور سگریٹ کے پیکٹوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

اس کمرے میں گھسنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میرا خیال تھا کہ اس طرح میں اس کی شخصیت اور مقاصد کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر سکوں گا مگر وہاں تو میدان ہی صاف پڑا ہوا تھا۔ چند ملبوسات کے علاوہ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے پتہ چل سکے کہ کوئی وہاں مقیم ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ یا تو لفٹ مین نے مجھے کمرے کا غلط نمبر دیا ہے یا میں غلطی سے تین سو چار کے بجائے کسی اور کمرے میں گھس آیا ہوں!

یہ بات کسی طرح سمجھ میں ہی نہ آتی تھی کہ ہوٹل میں قیام کرنے والا کوئی غیر ملکی اتنا مختصر سامان رکھتا ہو۔ حد تو یہ تھی کہ وہاں پاسپورٹ اور سفری کاغذات کا بھی پتا نہیں تھا۔ ملبوسات کے علاوہ لے دے کر ایک سستا سا سفری ہینڈ بیگ نظر آ رہا تھا جو شاید اس کمرے کا مکین لباس وغیرہ ٹھونسنے کے لئے استعمال کرتا ہو گا۔

اچانک میری نظر ردی کاغذات کی ٹوکری پر گئی۔ اس میں کاغذ کے باریک پُرزے پڑے ہوئے تھے۔ ان ہی میں ایک لفافے کے پھٹے ہوئے ٹکڑے بھی تھے جو نسبتاً آسانی سے جوڑے جا سکتے تھے۔ میں نے پھُرتی کے ساتھ انھیں جوڑنا شروع کیا اور لفافے سے اس کا نام معلوم ہو گیا۔ اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ میں صحیح کمرے میں آیا ہوں۔

لفافے پر مسٹر الانوف، کمرہ نمبر تین سو چار، بونانزا، بمبئی لکھا تھا۔ لفافے پر نہ ڈاک کے ٹکٹ تھے نہ کوئی مہر۔

باقی پرزوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان پر روسی زبان لکھی ہوئی ہے لہٰذا میں نے انھیں جوڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سارے پُرزے اسی طرح جیب میں ٹھونس لئے۔ فرصت میں انھیں جوڑنا کارآمد ثابت ہوتا۔

کمرے میں نظر آنے والا سامان اتنا ناکافی تھا کہ پورا کمرہ چھان مارنے کے باوجود مجھے کوئی چیز نظر انداز ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ تو سو میل کے سفر پر نکلنے والے ساتھ لے جاتے ہیں۔

جب میں آخری بار مسہری کے نیچے جھانک رہا تھا تو اچانک عقب میں کنجی گھومنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی میں پھُرتی کے ساتھ پلٹا مگر مجھے تاخیر ہو چکی تھی اور اس وقت ریوالور بھی میری جیب میں پڑا ہوا تھا۔

میرا دشمن دروازہ مقفل کر کے آگے بڑھ آیا۔ اس کے ہاتھ میں عجیب ساخت کا ایک چھوٹا سا پستول تھا جس کا رُخ میری جانب تھا۔

”خوش آمدید مسٹر صفدر!“ اس نے روسی لہجے میں انگریزی الفاظ ادا کئے۔ اس کی آواز سرد اور جذبات سے عاری تھی ”مجھے امید نہیں تھی کہ تم خود ہی یہاں تک چلے آؤ گے!“

وہ دراز قامت اور چوڑے جسم کا مالک تھا، سر پر چھوٹے چھوٹے بھورے بال تھے پیشانی کے وسط میں زخم کا نشان اس قدر نمایاں تھا کہ اس نشان نے پیشانی کو دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ جسم کے مقابلے میں اس کی آنکھیں چھوٹی اور چمکیلی تھیں چوڑے اور اُبھرے ہوئے جبڑوں کے نیچے اس کا چہرہ تقریباً مثلث کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں کسی عجیب ساخت کا ریوالور تھا اور بائیں ہاتھ میں وزنی بریف کیس جھول رہا تھا۔ شاید وہ اپنی ساری اہم دستاویز اسی بریف کیس میں ساتھ لئے پھرنے کا عادی تھا۔

”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ اس کا سکون میرے لئے اضطراب کا باعث بن رہا تھا!

”میں الانوف ہوں اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں“، اس کا لہجہ سرد اور سفاکانہ تھا۔ ”اب تم ہاتھ اوپر اُٹھا لو اور دیوار سے ناک لگا کر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ یاد رکھنا کہ میرے پاس بے حد محفوظ ہتھیار ہے۔ میں فائر کر دوں گا تو کوئی دھماکا نہیں ہو گا۔ اس میں سے ہلکی سی آواز کے ساتھ ایک سوئی اُڑ کر تمہارے بدن میں اُتر جائے گی اور وہ سوئی پوٹاشیم سائنائڈ میں بجھی ہوئی ہے۔ آج تک کوئی اس زہر کا ذائقہ نہیں جان سکا ہے میں تمہاری اکڑی ہوئی لاش کھڑکی سے نیچے پھینک دوں گا۔ اور کوئی نہ جان سکے گا کہ تم کبھی یہاں آئے تھے۔“

میں ہاتھ نیچے گرائے اسے گھورتا رہا۔

”قتل کے معاملے میں میرا ہاتھ نہیں رُکتا صفدر“، وہ بے حد پُرسکون تھا۔ ”روز ہاؤس میں میرا ایک شکار تم دیکھ چکے ہو۔ جلدی کرو۔“

”توکشور کے قاتل تم ہو!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنا چہرہ دیوار سے لگا لیا۔ اس بار میں واقعی کسی خطرناک آدمی کے نرغے میں تھا۔

”گڈ“، اس کی پُرسکون آواز سنائی دی پھر نرم قالین پر اس کے بے آواز قدموں کی دھمک میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ موت کو اتنے قریب پا کر میری حسیں تیز ہو چکی تھی۔

قالین پر بے آواز قدموں کی دھمک میرے عقب میں آ کر رک گئی۔ اس کے ہموار سانسوں کی دھیمی دھیمی آواز کمرے کے سکوت میں سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ میری پشت اس کی جانب تھی، سامنے ٹھوس دیوار تھی اور میرے ہاتھ فضا میں اٹھے ہوئے تھے اگر اس کے ہاتھ میں کوئی روایتی ہتھیار ہوتا تو میں اس موقع پر اس سے بھڑ جانے کا خطرہ مول بھی لیتا۔ ریوالور کی گولی بھی اچانک فائر کی صورت میں مجھے زخمی ہی کر پاتی۔ اس سے ہلاکت کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا مگر دنیا کے خطرناک زہر میں بجھی ہوئی سوئی کی نوک میرے جسم کے کسی بھی حصے میں پیوست ہوتی، موت یقینی تھی!

آخر کار اسے میری جیب سے ریوالور مل گیا اور اس کی آواز سنائی دی ”اوہ! تو یہ تم نے اچھن سے حاصل کیا ہے۔“

شاید وہ ریوالور پوری الانوف ہی نے اچھن کو دیا تھا جو وہ پہلی نظر میں اسے پہچان گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس بدبخت روسی نے مجھے پھانسنے کے لئے بہت مضبوط جال بُنا تھا۔

مجھے غیر مسلح کرنے کے بعد اس نے مجھے ہاتھ گرا کر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اور خود مجھ سے محفوظ فاصلے پر صوفے پر دراز ہو گیا۔ زہریلی سوئی پھینکنے والا عجیب ساخت کا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور اس جنبش کے تیور بتا رہے تھے کہ ضرورت پیش آنے پر وہ اس کے استعمال میں ذرا بھی نہ جھجکے گا۔

”میں کل رات ڈیڑھ بجے تک بیلا پور کی لال حویلی میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔“ چند ثانیوں بعد اُسی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ گو وہ اپنے روسی لب و لہجے کو بدلنے پر قادر معلوم نہ ہوتا تھا مگر انگریزی الفاظ کے انتخاب میں خاصا محتاط تھا۔

”مجھے بلانے کے لئے تم نے بہت بھونڈا طریقہ اختیار کیا تھا۔“ میں نے بےخوف لہجے میں کہا۔ میں اپنے اطوار سے اسے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ میں اس سے خائف نہیں ہوں۔

وہ ہونٹ بھینچ کر دھیمے سے ہنسا اور اس کی آواز مجھے کسی مکار بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنے سفاک ہو سکتے ہو ورنہ کوئی دوسری تدبیر اختیار کرتا۔“

”جب تم جانتے تھے کہ میں ڈاکٹر رامانند کے یہاں مقیم ہوں تو خود بھی فون کر سکتے تھے۔ اگر تمہاری شرائط معقول ہوتیں تو میں خود ہی سر کے بل دوڑا چلا آتا۔“

”میرے کام میں رازداری بنیادی شرط ہے۔“ وہ یکایک سنجیدہ نظر آنے لگا۔ ”اگر میں براہ راست تم سے رابطہ قائم کرتا تو اضطراری طور پر تم رامانند کو اعتماد میں لے سکتے تھے۔ وہ خنزیر کا تخم روسیوں سے نفرت کرتا ہے حالانکہ اس کی روزی ہماری جوہری امداد سے وابستہ ہے۔ وہ بدک کر سارا معاملہ الجھا سکتا تھا اور میں غیر ضروری خطرات سے گریز کرتا ہوں!“

”اگر تم میرے مددگار ہی ہو تو مجھے رامانند سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ”اعتماد میں لینے کا مسئلہ تو خطرے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر سفاکانہ مگر معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی ”یہاں آنے سے پہلے تمہارے بارے میں مجھے افسانوی قصے سنائے گئے تھے مگر مجھے یقین نہ تھا کہ تم اس قدر بے خوف ہو سکتے ہو۔“

”کس قدر؟“

”مجھے ذرا بھی امید نہ تھی کہ تم اچھے خاں سے الجھ پڑو گے اور تم نے اُسے مار ہی ڈالا۔“ آہستہ آہستہ اس کا لہجہ اعتدال پر آنے لگا تھا۔

”سنو مسٹر الانوف! میں ہند میں بدترین حالات کا شکار بنا ہوا ہوں۔ یہاں سے فرار میری سب سے بڑی آرزو ہے مگر میں ایک کنوئیں سے نکل کر کسی کھائی میں گرنا پسند نہیں کروں گا۔“ میں نے دوٹوک لہجے میں کہا ”تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم صرف میری مدد کرنے کے لئے باہر سے یہاں بھیجے گئے ہو۔ تم کون ہو اور میری ذات میں کیوں دلچسپی لے رہے ہو؟“

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ چند ثانیوں تک وہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا ”کے جی بی میرے ذریعے تمہیں یہاں سے نکالنا چاہتی ہے۔“

”کے جی بی!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”روسی سیکرٹ سروس کی یہ ہمدردی بلا مقصد نہیں ہو سکتی۔“

”مقصد ضرور ہو گا مگر میں اس سے لاعلم ہوں۔“ اس کے عجیب وضع کے پستول کی نال اس دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نیچے نہیں جھکی تھی نہ شہادت کی انگلی ٹریگر سے ہٹی تھی ”مقصد کے بارے میں میرے اُوپر والے تم سے اسی وقت بات کریں گے جب تم اس قید سے رہائی پا لو گے!“

”ہند کے بجائے رُوس کی قید؟“ میں سر ہلا کر بولا۔ یک بیک میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنی خواہشات کے برعکس زیر زمین تنظیموں میں خطرناک شہرت حاصل کرتا جا رہا تھا ”نہیں مسٹر الانوف! یہ سودا بہت مہنگا ہے۔“

”اب تم زندہ رہو گے تو کریملن میں ورنہ موت تم پر سایہ فگن ہے۔ کے جی بی کے ہرکارے صرف احکام کی تعمیل جانتے ہیں۔ میں وہاں سے روانہ ہوا تو تم اگاٹی پر انڈین سیکرٹ سروس کے قیدی تھے اور میں تمہیں وہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ اب تم اگاٹی کے بجائے بمبئی میں ہو۔ تمہارے سامنے انتخاب کا معاملہ نہیں ہے۔ میری بات مانو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

مجھے اپنی ہتھیلیوں پر پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔ میں چند ثانیوں تک الانوف کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا ”مجھے فیصلہ کرنے کے لئے کچھ مہلت درکار ہے۔“

الانوف نے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور بولا ”اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔“

میں خوفزدہ انداز میں ہنس دیا ”میں دنوں کی بات کر رہا ہوں، مجھے سکون اور تنہائی چاہیئے تاکہ میں آزادانہ فیصلہ کر سکوں۔“

وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور سرد لہجے میں بولا ”تم کسی تیسرے درجے کے اٹھائی گیرے کے سامنے نہیں ہو صفدر! اب تم واپس روز ہاؤس نہ جا سکو گے اور نہ میں طویل انتظار کا قائل ہوں۔ مجھے جلد از جلد واپس رپورٹ کرنا ہے۔“

میں نے بے چارگی سے سر جھکا دیا ”میری نکاسی کی کیا صورت ہو گی؟“

”وہ میرا کام ہے۔“ وہ خشک لہجے میں بولا ”تمہیں وہ جادوئی پتھر ساتھ لینا

ہوگا جو لوہے کو سونے میں بدل سکتا ہے۔"

"پارس؟" میں نے دہشت زدہ لہجے میں دہرایا "مگر وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ بے یقینی کے عالم میں غرایا "وہ تمہارا ہے اور تمہارے ہی پاس رہے گا۔ مگر اسے تمہارے ساتھ ہونا چاہیئے۔"

یہ جال بہت خوفناک تھا۔ الانوف کی اصل دلچسپی پارس ہی سے تھی۔ مجھے پارس سمیت ہند سے باہر لے جانے کی کوئی بھی کوشش خطرناک ہو سکتی تھی کیونکہ انڈین سیکرٹ سروس بھاری جانی نقصان اٹھانے کے بعد میری طرف سے بہت زیادہ محتاط ہو چکی تھی۔ الانوف مجھے رہائی کا لالچ دے کر پارس پتھر کی نمائش پر اکسا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جس لمحہ اس نے پارس کو آزمایا وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہوگا اور الانوف وہ نایاب پتھر لے کر خاموشی کے ساتھ ہند سے نکل جائے گا۔

"مگر وہ میرے پاس نہیں ہے۔" اس کا مقصد واضح ہو جانے سے میری خود اعتمادی بحال ہو گئی۔ جب تک مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے مجھے اس سے ہر لمحہ اپنی جان کا خطرہ تھا۔ مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ پارس پتھر کے کھوج میں تھا اور محض اسی مشن پر اسے روس سے بھارت بھیجا گیا تھا۔ اسے ہر قیمت پر پارس درکار تھا، پارس ملے بغیر وہ میری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ یہ بڑی احمقانہ سی حرکت ہوتی کہ سینکڑوں میل کا سفر کرنے کے بعد وہ محض ایک آدمی کو ہلاک کر کے بے نیل و مرام واپس لوٹ جاتا۔

"اگر تمہارے پاس ہوتا تو اب تک انڈین سیکرٹ سروس اسے حاصل کر چکی ہوتی۔" وہ سفاکانہ انداز میں مسکرایا "وہ تم نے جہاں کہیں بھی چھپایا ہے، وہاں سے حاصل کرو ورنہ پارس کا نام تمہارے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔"

"سیتا کا سراغ لگانا میرے لئے بہت دشوار ہو چکا ہے۔ پارس اسی کے پاس ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ ۔۔۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہنا شروع کیا لیکن اس نے روکھے لہجے میں میری بات کاٹ دی۔

"تمہاری اب تک کی ساری مکاریاں میرے علم میں ہیں۔ تمہاری داشتہ یقینی طور پر سرحد عبور کر چکی ہوگی۔ اور جلد ہی وہ بھی پکڑی جائے گی۔"

"الانوف ہوش میں رہ کر بات کرو۔" اس کے حقارت آمیز فقرے سن کر میں کھول اٹھا "سیتا میری بیوی ہے داشتہ نہیں۔"

"شٹ اپ!" وہ میرا مضحکہ اڑاتا ہوا بولا "ہرجائی مرد کے لئے ہر عورت داشتہ ہوتی ہے۔ تم راما نند کی لڑکی کے ساتھ عیاشی کر رہے ہو۔ تمہیں اپنی کسی بیوی کا تذکرہ زیب نہیں دیتا۔"

شاید اس نے اوشا کا حوالہ سرسری طور پر دیا تھا مگر یہ میری دکھتی رگ تھی، میں ایک دم بھڑک گیا "تمہیں شرم آنی چاہیئے، اوشا میرے محسن کی بیٹی ہے۔"

وہ زور سے ہنسا "قریب رہتے تو شاید وہ پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری گود میں آگری ہوتی۔ مردوں کے قرب کے ہوا آوارگی کا ہر انداز اس کا مزاج ہے۔"

یہ سن کر میں کانپ اٹھا۔ اوشا پہلی نظر میں کس قدر حسین اور معصوم نظر آئی تھی اور ڈاکٹر راما نند کس طرح والہانہ انداز میں اسے چاہتا تھا بیٹی پر کیسا فخر کرتا تھا بوڑھا! مگر چند ہی گھنٹوں میں میری نظروں میں اوشا کی پاکباز تصویر چکنا چور ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں انکشافات ہونے سے قبل میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ میری ذات اور کارناموں سے متاثر ہو کر میری خوابگاہ میں چلی آئی تھی مگر زینی نے بتایا کہ اوشا اس کے گھر نائٹ کلبوں کا شوق پورا کرنے آتی رہتی تھی اور اب الانوف پورے اعتماد سے اس کی ذات کے روپوش چہرے دکھا رہا تھا۔

اگر راما نند کو ان انسانوں کی بھنک بھی مل جاتی تو وہ ملک اور قوم کی خدمت کے جذبوں کو کہیں دفن کر کے اپنی کنپٹی میں گولی ہی مار لیتا۔

"اپنے گندے خیالات اپنے دماغ تک محدود رکھو۔ یہ بتاؤ کہ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں الانوف سے کہا۔

"میں پارس کے ساتھ تمہیں لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہاری ذات سے میری دلچسپی صرف اسی حد تک ہے۔" وہ ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ اس کا بریف کیس اس کے سٹول پر میں رکھا ہوا تھا اور زہریلے تیر پھینکنے والا پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

"میں پارس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"میں تشدد کے بہترین طریقوں سے واقف ہوں مسٹر صفدر!" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "اور بیلا پور کی ویران حویلی میرے لئے بہترین ٹھکانہ ثابت ہوگی۔"

"اگاٹی والے بھی تشدد کر کے عاجز آ گئے تم بھی اپنے حربے آزما لو۔"

"میں جوڑ اتارنے میں خصوصی مہارت رکھتا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں اچانک وحشیانہ چمک کوندنے لگی "کہنی، بازو، ٹخنے اور گھٹنے کے جوڑ اتارنے کے بعد تم گوشت اور ہڈیوں کا ایک کراہتا ہوا انبار بن کر رہ جاؤ گے۔ تشدد ہی کامیاب رہتا ہے جو انسان کو پوری زندگی کے لئے معذور کر دے۔"

اس کی وحشیانہ گفتگو سن کر میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور میں چند ثانیوں کے لئے ایک لفظ بھی نہ بول سکا، خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"تم پارس کس لئے چاہتے ہو؟" آخر میں نے بے چارگی کے ساتھ پوچھا۔

"مجھے اس کام پر مامور کیا گیا ہے۔"

"پارس میری رسائی سے باہر ہے۔"

"میں سچ اور صرف سچ سننے کا عادی ہوں۔" وہ خطرناک لہجے میں بولا۔

"اگر تم سونا چاہتے ہو تو میں پارس کے بغیر بھی سونا بنا سکتا ہوں۔" میں نے اسے پیشکش کی۔

"سونا!" وہ حقارت سے ہنسا "روس بھکاریوں کا دیس نہیں ہے۔ وہاں ہر شخص آسودہ اور مطمئن ہے۔ ہمارے قومی وسائل خوش حالی کا سرچشمہ ہیں۔ ننگے بھوکے ملکوں کے لئے سونا کشش انگیز ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے نہیں۔ کریملن میں روس کے بہترین دماغ پارس کی ماہیت پر غور کریں گے۔ ہمارا ملک وسیع تر مفادات کے لئے کام کرتا ہے، وقتی فائدوں کے لئے نہیں۔"

اس کی یہ گفتگو میرے لئے تعجب خیز تھی۔ یہ پروپیگنڈے کا دقیانوسی انداز تھا اور کسی سیکرٹ ایجنٹ کی زبان سے ایسی فرسودہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔

"تو تمہارا ملک سائنسی تحقیق کے لئے پارس حاصل کرنا چاہتا ہے؟" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"یہ میرا قیاس تھا۔" وہ غصیلے انداز میں غرایا "تمہیں مزید بکواس کی ضرورت

نہیں۔ پارس کے بارے میں آخری بار سوچ سمجھ کر جواب دو۔"

"جو چیز میری پہنچ سے باہر ہے اس کے بارے میں سوچ بچار فضول ہے۔" میں نے آخری دم تک اسی بات پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"پھر دیوار سے چہرہ ٹکا کر کھڑے ہو جاؤ!" وہ پستول لہرا کر سرد لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ چند منٹ بعد اس نے مجھے گھومنے کی اجازت دے دی۔ اس دوران میں وہ ایک سیاہ اوورکوٹ پہن چکا تھا اور اس کے سر پر اسی رنگ کا فلیٹ ہیٹ نظر آ رہا تھا۔

"نیچے قالین پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ۔ اور داہنا ہاتھ آگے پھیلا دو۔" اس بار اس نے مجھے مضحکہ خیز قسم کی ہدایت دی "اور اپنا بازو کہنی تک ننگا کر دو۔"

"میں احمقانہ حرکتوں کے لئے تیار نہیں ہوں۔" میں بھنا کر بولا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔" الانوف سرد اور بے رحمانہ لہجے میں بولا۔

میں دل ہی دل میں اسے بے تحاشا گالیاں بکتا ہوا قالین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور داہنا ہاتھ پوری طرح آگے کی طرف پھیلا دیا۔ میری نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں اور کلائی پر سے آستین اوپر سمٹی ہوئی تھی۔

"اب اپنا چہرہ بائیں طرف موڑ لو۔" اس کا اگلا حکم تھا۔

چند ثانیوں تک سناٹا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کسی ترکیب سے بے ہوش کرنے کی فکر میں ہے مگر اچانک ہی مجھے اپنی پوری کلائی کے اوپری حصے پر کسی دھات کا سرد لمس محسوس ہوا اور ایک کڑا میری کلائی کے گرد محیط ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنی کلائی پر الانوف کے دونوں ہاتھ تیزی سے حرکت کرتے محسوس ہوتے۔ میرے لئے یہ مہلت غنیمت تھی۔ اس وقت میرے مقابلے میں وہ خود بھی نہتا ہو چکا تھا۔ میں پوری قوت سے اچھل کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

اس کے حلق سے دبی دبی غراہٹ ابھری، مگر وہ خبیث ایسی کسی بھی کارروائی کے لئے تیار تھا۔ میرا ایک اچھا گھونسہ اس کی پسلیوں پر پڑا اور وہ پلک جھپکتے میں میری زد سے نکل گیا۔

میں نے اسے پھرتی کے ساتھ کوئی چابی نما چیز جیب میں ڈالتے دیکھا اور اسی کے ساتھ اس نے اپنا عجیب ساخت کا پستول اوورکوٹ کی جیب سے نکال لیا۔

میں جہاں تھا وہیں رک گیا اور میری نگاہیں اپنی داہنی کلائی پر جم گئیں۔ میری کلائی پر تقریباً ایک انچ موٹا اور ایک فٹ طویل خاصا وزنی ڈبہ موجود تھا۔ اس کی لمبائی میں دونوں سروں پر ہتھکڑی نما دو آہنی کڑے تھے۔ ہاتھ کے قریب والا کڑا الانوف مقفل کر چکا تھا جبکہ کہنی کے قریب والی ہتھکڑی کے دونوں سرے کھلے ہوئے تھے۔

"یہ لو، اور اوپر والی ہتھکڑی مقفل کر کے چابی واپس میری طرف اچھال دو۔" الانوف نے ایک چابی میری طرف اچھالی۔ میں نے خاص طور سے یہ بات نوٹ کی کہ یہ چابی الانوف نے اس جیب سے نہیں نکالی تھی جس میں پہلی چابی ڈالی تھی گویا دونوں ہتھکڑیوں کی چابیاں الگ الگ تھیں۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟" میں نے اس سیاہ صندوق کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے ساتھ زور آزمائی مت کرو۔" وہ بوکھلا کر جلدی سے بولا "دوسری ہتھکڑی مقفل کر دو تو میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

میں اس کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اگر ایک ہتھکڑی کے ذریعے وہ آہنی بلا میری کلائی سے چپکی نہ ہوتی تو میں ہرگز اسے گلے لگانے پر آمادہ نہ ہوتا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ میں نے ناچار دوسری ہتھکڑی بھی مقفل کی اور چابی اس کی طرف پھینک دی۔

"گڈ۔" چابی واپس مل جانے پر الانوف یک بیک مطمئن اور خوش نظر آنے لگا "اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ اسی سے تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ انڈین سیکرٹ سروس اور کے جی بی میں کتنا خوفناک فرق ہے۔"

"مگر پارس نہ وہ پا سکے نہ تم حاصل کر سکو گے۔" میں کوشش کے باوجود اس زہریلے طنز کو زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔

"وہ میں بعد میں دیکھوں گا۔" الانوف نے خلافِ توقع خوش دلی سے قہقہہ لگایا "فی الحال تمہاری حیثیت میرے کسی پالتو کتے سے زیادہ نہیں ہے۔ تمہاری داہنی کلائی پر ایک جدید قسم کا دھماکہ خیز اور آتش گیر بم بندھا ہوا ہے جو دس میل کے فاصلے سے بھی میرے ایک اشارے پر پھٹ کر تمہیں نیست و نابود کر سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے ایک قلم نکالا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا "یہ الیکٹرونکس کا کمال ہے۔ میں جونہی اس سوئچ کو دباؤں گا تمہاری کلائی پر بندھے ہوئے بم میں پوشیدہ ریسیور سوئچ جنبش کرے گا اور یہ بم ایک شدید دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گا۔ یہ بم تمہارے جسم کے چیتھڑے ہی اڑانے پر بس نہ کرے گا بلکہ ہر ٹکڑا آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔"

میں نے پہلی بار اپنے وجود میں دہشت کی لہر سرایت کرتی محسوس کی اور خوفزدہ نظروں سے اس چپٹے سیاہ بکس کو گھورنے لگا جو آستین کے نیچے چھپنے کے بعد شاید کسی کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔

"اگر تم نے ہتھکڑیاں توڑنے کی کوشش کی تو جھٹکوں کے باعث یہ بم خود بخود بھی پھٹ سکتا ہے۔ اب تم خاموشی کے ساتھ نیچے اتر کر بونانزا سے باہر نکلو اور قریبی ٹیکسی اسٹینڈ پر رک کر میرا انتظار کرو۔ اگر تم نے راستے میں کسی سے بات کرنے کی کوشش کی یا بھاگنا چاہا تو یہ یاد رکھنا کہ میں جانی نقصان کی پرواہ کئے بغیر سوئچ دبا دوں گا۔ میں ہر لمحہ پیچھے رہ کر تمہاری نگرانی کروں گا۔"

اس وقت میرے دل کی رفتار سست ہو چلی تھی مگر میں نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "ان شعبدوں سے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ الیکٹرونک ڈیٹونیٹر کیا ہوتا ہے۔"

"یہ اچھی بات ہے۔" مجھے اچھی طرح بے بس کرنے کے بعد اس کا موڈ بہت زیادہ خوش گوار ہو گیا تھا "عقلمندوں کو شکار کر کے مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔"

"شاید تم نے بونانزا کو اسی لئے ٹھکانا بنایا ہے کہ یہاں سے بیلا پور کا فاصلہ دس میل سے کم ہے۔" میں نے اسے کریدنے کی نیت سے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ الانوف سے الگ ہونے سے قبل اس مہیب خطرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کروں تاکہ ٹیکسی اسٹینڈ تک جاتے ہوئے میں اپنے لئے کوئی محفوظ لائحہ عمل مرتب کر سکوں۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے کور کئے ہوئے راہداری میں نکل آیا۔ کمرے کا خودکار دروازہ ہمارے پیچھے مقفل ہو گیا۔

میں اس کے ہمراہ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ الانوف میرے ہمراہ لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچ رہا تھا۔ پہلی منزل پر وہ دانستہ مجھ سے کافی پیچھے رہ گیا۔

رات کے دو بج رہے تھے مگر بونانزا میں زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ ہال مرکزی طور پر ائیر کنڈیشنڈ تھا مگر اس کے باوجود فضا شراب اور سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی بُو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ دبی دبی آوازوں اور مترنم قہقہوں پر مغربی آرکسٹرا کی گونج حاوی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو الانوف مجھ سے تھوڑی دور اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لاپرواہانہ انداز میں چلا آ رہا تھا۔

میں براہِ راست راہداری سے باہر نکلنے کے بجائے محض اس لئے ہال میں گھسا تھا کہ شاید اوشا نظر آ جائے یا اس کی کوئی سہیلی مجھے پہچان لے۔ اس طرح کم از کم راماننڈ کو یہ ضرور معلوم ہو سکتا تھا کہ گمشدگی سے پہلے میں آخری بار بونانزا میں موجود تھا مگر میری یہ امید بار آور ثابت نہ ہو سکی۔

بونانزا سے نکلتے ہی رات کی ویرانی اور سرد ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔ گو آہنی خول والا بم زیادہ وزنی نہیں تھا مگر مجھے اپنا وہ ہاتھ سُن ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ الانوف کی دھمکیوں کے پیشِ نظر میں چلتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی فطری حرکات کو بھی سُست رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں کسی جھٹکے کے باعث وہ بم خود بخود ہی نہ پھٹ جائے۔

ویران فٹ پاتھ پر مجھے عقب میں کوئی آہٹ نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو الانوف دس پندرہ گز پیچھے بے آواز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔ شاید اس کے پیروں میں کریپ سول جوتے تھے۔

چلتے چلتے مجھے ایک جگہ بجری اور پتھروں کا ڈھیر نظر آیا۔ فٹ پاتھ کے کنارے یہ چیزیں ایک زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے ڈھیر تھیں۔ میں اچانک کراہ کر لڑکھڑایا، جیسے مجھے ٹھوکر لگی ہو اور جب میں سنبھل کر سیدھا ہوا تو میری مٹھی میں چند پتھر موجود تھے۔ میں نے ٹٹول کر ایک چھوٹا سا گول مٹول پتھر اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھرتی سے مٹھی خالی کر دی۔

میرے تعاقب میں چند منٹ بعد الانوف بھی وہاں آ پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہاں موجود ٹیکسی ڈرائیوروں نے ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی مگر الانوف کو دیکھتے ہی تین چار آدمی ٹیکسیوں سے نکل کر اس کی طرف لپکے اور ٹوٹی پھوٹی مضحکہ خیز انگریزی میں اُسے اُن آبرو باختہ لڑکیوں کے بارے میں سمجھانے لگے جن کی وہ دلالی کرتے تھے۔ مگر الانوف نے خشک رویّہ اختیار کیا ہوا تھا۔

"پچاس روپے کمیشن دوں گا، اسے میری گاڑی میں لے چل بابُو!" الانوف کو پگھلتے نہ دیکھ کر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے میرے قریب آ کر اردو میں کہا۔

اسی وقت الانوف نے میرا ہاتھ تھاما اور تیزی کے ساتھ ایک ٹیکسی میں جا گھسا۔ میں بھی عقبی نشست پر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انتہائی ادب کے ساتھ دروازہ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ دوسرے ڈرائیور موٹی مرغی ہاتھ سے نکلنے پر کفِ افسوس ملتے رہ گئے، اور ہماری ٹیکسی نیم تاریک اسٹینڈ سے نکل کر ممبئی کی جگمگاتی، لیکن ویران سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"اسے بتاؤ کہ ہمیں بیلاپور جانا ہے۔" الانوف نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتی تدبیر کوند گئی۔ الانوف نے مجھے ہتھیار بنا کر نجات کی ایک راہ سجھا دی تھی۔ میں ڈرائیور کو اپنے اعتماد میں لے سکتا تھا اگر الانوف بھی نرا احمق نہیں تھا۔ میرے فقرے میں بیلاپور کا نام نہ آنے پر وہ ہوشیار ہو سکتا تھا۔

"ڈرائیور، میری بات پر چونکنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "یہ مجھے بیلاپور لے جا کر قید کرنا چاہتا ہے۔" میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ الانوف توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میری زبان سے بیلاپور کا نام سن کر مطمئن ہو گیا تھا۔

وہ ڈرائیور میری توقع سے زیادہ ہوشیار نکلا اور ذرا بھی حیرت کا اظہار کئے بغیر سکون سے بولا "کیا چوری چکاری کا معاملہ ہے؟"

اب الانوف چونک سکتا تھا لہٰذا میں انگریزی میں اس سے مخاطب ہو گیا۔ "یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس تین زبردست لڑکیاں ہیں!"

"اس کتے کے بچے سے کہو کہ لڑکیوں کو جہنم میں ڈالے!" الانوف غصیلے لہجے میں بولا۔ "میں اسے میٹر سے دس روپے زائد ادا کروں گا۔"

"چوری نہیں چیز کا معاملہ ہے۔" میں اس بار ڈرائیور سے مخاطب تھا۔ "اگر تم اسے ہوشیار ہونے کا موقع دیئے بغیر زیر کر سکو تو دو ہزار نقد دوں گا۔"

"اوہ!" ڈرائیور کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی۔ "اس رقم کے لئے تو میں اس کا گلا کاٹ سکتا ہوں!" یہ ممبئی کے ڈرائیور کا اصل رُوپ تھا۔

"یہ حیران کیوں ہوا تھا؟" چند ثانیوں کے بعد الانوف نے پوچھا۔

"میں نے اسے بتایا کہ ہم نے بیلاپور میں پہلے سے دو لڑکیوں کا انتظام کیا ہوا ہے۔" میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔

الانوف صورتحال سے مطمئن ہو گیا اور میں بے چینی سے کسی ہنگامے کے رونما ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میرے اعصاب پر تناؤ طاری ہونے لگا تھا کیونکہ ڈرائیور کی ذرا سی کوتاہی میری موت کا سبب بن سکتی تھی۔ اگر الانوف کو شک ہو جاتا تو وہ لمحہ بھر میں میرے بدن کے چیتھڑے اڑا سکتا تھا۔ اس بھیانک موت کا تصور کرتے ہی ٹھنڈ کے باوجود میری پیشانی سے پسینے کی بوندیں پھوٹنے لگیں۔

چلتے چلتے گاڑی نے اچانک جھٹکے لینے شروع کر دیئے اور ڈرائیور قدرے بلند آواز میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے بے چینی کا اظہار کرنے لگا۔

"کیا ہوا؟" الانوف نے اس کی طرف جھک کر غصیلی انگریزی میں براہِ راست پوچھا۔

یہ بات ڈرائیور کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے ہاتھ کا منفی اشارہ کرتے ہوئے کہا "پٹرول ختم!" اسی کے ساتھ اس نے اگنیشن بند کر دیا اور گاڑی کا گیئر نیوٹرل کر دیا۔ گاڑی اپنے زور میں سڑک پر بے آواز دوڑتی رہی۔

اور جب رفتار کا زور ٹوٹا تو ڈرائیور نے ٹیکسی سڑک سے نیچے اتار کر بریک لگا دیئے اور پھرتی سے نیچے اتر گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ڈرائیور کارروائی کا آغاز کر چکا تھا اور اب چند ہی ثانیوں میں میری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

میں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا لہٰذا دروازہ کھول کر اسی کی سمت میں اترا۔

"ہینڈز اپ!" باہر نکلتے ہی میرے کانوں میں ڈرائیور کی کرخت آواز گونجی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو چھوٹے بور کے ایک ریوالور کا دہانہ میری طرف اٹھا ہوا تھا۔

ڈرائیور کی پوری توجہ مجھ پر مرکوز تھی۔ الانوف کو وہ وقتی طور پر بھولا ہوا نظر آ رہا تھا کیونکہ الانوف نے گاڑی سے اترتے ہوئے جوں ہی ڈرائیور کی للکار سنی، وہ ٹیکسی کی آڑ میں دبک گیا اور ڈرائیور نے بھی اسے نظر انداز کر دیا۔

ڈرائیور کی اس حرکت پر میں چراغ پا ہو گیا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟"

"جیبوں میں جتنی رقم ہے میرے حوالے کر دو۔" ڈرائیور کا لہجہ سخت اور حاکمانہ تھا۔ "ابھی میں گورے کو تمہاری سازشی پیشکش کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ بھی مجھے بھاری انعام دے گا۔ ایسا بڑا شکار تو مقدر والے ہی کو... ملتا ہے۔ خالی کرو اپنی جیبیں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے ریوالور والے ہاتھ کو... دھمکی کے انداز میں جنبش دی۔

"میرے پاس... ... !" میں نے غصے میں چیخنا ہی چاہا تھا کہ ڈرائیور کے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکلی اور وہ کسی بے جان شہتیر کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اسے دبوچنے کے لئے آگے لپکا مگر اسی وقت ٹیکسی کے عقب سے الانوف کی سرد آواز آئی۔

"وہ مر چکا ہے!" یہ سن کر میں تیزی سے گھوما تو پوری الانوف میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ کھلونے نما پستول دبا ہوا تھا جو زہریلے تیر برساتا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا کہ میرا بھانڈا پھوٹنے سے قبل ہی الانوف نے اس لالچی کا کام تمام کر دیا تھا۔

"ممبئی ٹھگوں کا شہر ہے!" ڈرائیور کی لاش کو ٹیکسی کی ڈکی میں ٹھونستے ہوئے الانوف بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ پٹرول ختم نہیں ہوا تھا، وہ بار بار کلچ دبا کر گاڑی کو جھٹکے دے رہا تھا۔ سڑک ویران دیکھ کر اس نے ہمیں لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہوگا!"

میں نے لاش کے دونوں پیر تھامے ہوئے تھے۔ الانوف نے اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر ڈکی میں پڑے ہوئے جیک کے آہنی ہینڈل پر پڑی اور میں نے لاش کو پوری قوت سے الانوف کی طرف دھکیلا اور لپک کر آہنی سلاخ اٹھا لی۔

میری یہ حرکت نہایت غیر متوقع تھی۔ الانوف لاش کا وزن نہ سہار سکا اور بے تحاشا گالیاں بکتا ہوا لاش کے نیچے دبا، زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے پوری قوت سے آہنی سلاخ اس کے سر پر رسید کی اور وہ کریہہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں نے پھرتی سے الانوف کی جامہ تلاشی لی اور سارا سامان اپنی جیبوں میں منتقل کر لیا۔ اس میں زہریلے تیر برسانے والا پستول بھی تھا، میرے داہنے ہاتھ پر بندھے ہوئے الیکٹرونک ڈیٹونیٹر کی چابیاں بھی تھیں اور اس بم کا کنٹرول سوئچ بھی!

میں نے سب سے پہلے پوری احتیاط سے اپنی داہنی کلائی کی ہتھکڑیاں کھول کر وہ مہلک بلا اتاری اور اسے ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ تلے رکھ دیا۔ پھر میں نے باری باری دونوں لاشیں ٹیکسی کی نشست پر ڈالیں اور الانوف کا بریف کیس لے کر واپس دوڑ پڑا۔

چلنے سے پہلے میں نے آہنی سلاخ ڈکی میں ڈال دی تھی مگر میں نے یہ نہیں دیکھا کہ الانوف زندہ ہے یا مر گیا۔ اس کے سر کے زخم سے بہنے والے خون کی وافر مقدار دیکھ کر میں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ ضرب لگتے ہی مر گیا ہوگا۔

میں سڑک سے اتر کر درختوں اور ٹیلوں کی اوٹ میں کئی سو گز دور واپس دوڑتا چلا گیا۔ پھر میں نے جیب سے قلم نما سوئچ نکالا جس کا اوپری حصہ بال پن کی طرح دبایا جا سکتا تھا۔ میں نے جوں ہی وہ حصہ دبایا، سڑک کی جانب ایک ہولناک دھماکہ سنائی دیا اور رات کے اندھیرے میں شعلوں کی سرخی بھڑکنے لگی۔ دھماکے کا شور سن کر میرا رواں رواں لرز اٹھا۔ الانوف نے جو کچھ کہا تھا اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں تھا مگر یہ میرے نصیب ہی کی خوبی تھی کہ شکاری خود ہی جال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے رومال سے پسینوں میں بھیگا ہوا چہرہ خشک کیا اور پیدل شہر کی طرف چل پڑا۔

ویران سڑک سے شہر کی طرف لوٹتے ہوئے میری پوری کوشش یہ تھی کہ سڑک سے دور مگر اس کے متوازی چلتا رہوں جو تاروں کی چھاؤں میں کچے میدان سے تقریباً ایک ڈیڑھ فٹ اوپر چمکتی نظر آ رہی تھی۔ اگر میں راستہ بھٹک جاتا تو میرے لئے بے شمار دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

اس وقت صبح کے تین بجنے والے تھے اور میرا ذہن تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف تھا۔ پچھلی شام جب میں ڈاکٹر راماننڈ کی قیام گاہ سے روانہ ہوا تو میرا خیال تھا کہ اپنی ذات میں دلچسپی لینے والے پراسرار روسی کا سراغ لگانے کے بعد میں واپس روز ہاؤس جاؤں گا مگر بونانزا میں مجھے اپنے مشن میں خلافِ توقع کامیابی حاصل ہوئی اور میں براہِ راست الانوف کے کمرے میں جا پہنچا۔ اس کے بعد حالات میرے قابو سے باہر ہو گئے۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے الانوف کا داؤ اسی پر الٹ دیا تھا مگر مجھے اس ہنگامے سے اپنا دامن بچانا مشکل نظر آ رہا تھا۔

میں جب روز ہاؤس سے نکلا تو ڈاکٹر راماننڈ طویل محنت کے بعد تھک کر سو چکا تھا۔ یہ یقینی بات تھی کہ میری واپسی میں تاخیر ہونے کے ساتھ ساتھ اوشا کی بے چینی بڑھتی رہی ہو گی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ گزشتہ روز مجھے ایک ایسا فون موصول ہوا تھا جس میں میرا اصل نام لیا گیا تھا۔ اس کے بعد بونانزا میں اچھن سے میرا معرکہ ہوا گو میں نے اپنی چوٹوں کا سرسری سا فرضی جواز پیش کر کے اوشا کو مطمئن کر دیا تھا مگر رات گئے تک میری واپسی نہ ہونے پر وہ پچھلے واقعات پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ مجھے یقین تھا کہ اوشا اور راماننڈ نے بوکھلا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہوگا اور سورج نکلنے سے پیشتر ہی بونانزا کی پارکنگ لاٹ میں اوشا کی لوسیٹر کار دریافت کر لی جائے گی یا شاید اسی وقت اس کا سراغ بھی لگا لیا گیا ہو۔ پھر الانوف کی جھلسی ہوئی لاش کے ٹکڑے بھی جلد ہی شناخت کر لئے جاتے کیونکہ بونانزا کی انتظامیہ کمرہ نمبر تین سو چار کے مکین کی غیر حاضری کی رپورٹ درج کرا دیتی۔ ٹیکسی کے نمبر کے سہارے پولیس یقیناً بونانزا کے قریبی ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچ جاتی اور وہاں متوفی ٹیکسی ڈرائیور کے کئی ساتھیوں نے مجھے دیکھا تھا، گو وہاں بھرپور روشنی نہیں تھی مگر اس کے باوجود خدوخال پہچانے جا سکتے تھے اور یوں الانوف کی موت میری ذات سے منسوب کی جا سکتی تھی۔ شاید بونانزا کا لفٹ بوائے بھی مجھے پہچان کر گواہی دیتا کہ میں نے اس سے الانوف کے بارے میں دریافت کیا تھا!

ہند سرکار مجھے مقامیوں سے خون خرابے کے سلسلے میں تو رعایت دے سکتی تھی مگر غیر ملکی کے قتل کا معاملہ بالکل ہی مختلف تھا۔ الانوف کا سفارت خانہ تو اسے عام شہری ہی قرار دے کر سخت کارروائی کا مطالبہ کرتا مگر میں جانتا تھا کہ الانوف کے۔ جی۔ بی کا مہرہ تھا اور ہر طرح لیس ہو کر ایک خاص مشن پر ممبئی پہنچا تھا لہٰذا میرا حشر جو بھی ہوتا، نہایت عبرتناک ہوتا!

ادھر بمبئی میرے لئے اجنبی شہر تھا، وہاں میرے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ میں اس بارے میں جتنا سوچتا رہا، مایوسی بڑھتی ہی چلی گئی۔ پھر اچانک مجھے مسز نینی ورما یاد آئی۔

بڑی بڑی آنکھوں والی وہ سوگوار خاتون ان کٹھن لمحات میں میرے قریب آسکتی تھی۔ وہ محبت کو ترسی ہوئی تھی اور اس نے میری ذات کا سہارا لیا تھا، اس کے گھر میں بوڑھی ماما کے سوا کوئی نہ تھا، میں کچھ عرصے کے لئے اس کے گھر میں روپوش رہ سکتا تھا۔

وہاں جانے سے پہلے میں الالوف کے بریف کیس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی وہ خاصا وزنی تھا اور آزادانہ نقل و حرکت میں حارج ہو رہا تھا۔ جوں ہی مجھے ایک ویران مقام پر لیمپ پوسٹ کی یرقان زدہ روشنی نظر آئی، میں اسی طرف ہو لیا۔

گرد و پیش سے غافل ہوئے بغیر میں نے الالوف کی جیبوں سے نکلنے والے چابیوں کے مختصر سے گچھے کا جائزہ لیا اور بریف کیس کی چابی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا بریف عجیب ساخت کا تھا۔ تالا ایک چکور آہنی پٹی پر لگا ہوا تھا اور چابی کے سوراخ کے نیچے ہی چند چھوٹے چھوٹے بٹن لگے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری ہر بٹن کو دبایا مگر کوئی کھٹکا نہ سنائی دیا پھر میں نے جوں ہی تالے میں چابی گھمائی، ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور میرے چہرے کے سامنے دھوئیں کا ایک گرم اور کثیف بادل چھا گیا، ہاتھوں کی جلد جلتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

میرے دونوں ہاتھوں کی جلد جھلس چکی تھی اور زمین پر پڑا ہوا بریف کیس دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ شاید بریف کیس کے قفل کے ساتھ کوئی حفاظتی نظام وابستہ تھا تاکہ کوئی خاص ترکیب اختیار کئے بغیر قفل کھولے جانے کی صورت میں ہر چیز جل کر برباد ہو جائے۔۔۔ اور کسی غیر متعلقہ شخص کے ہاتھوں میں نہ پہنچ سکے!

میں دہشت اور سکتے کے عالم میں چند ثانیوں تک جلتے ہوئے بریف کیس کو گھورتا رہا۔ جھلسے ہوئے ہاتھوں کی سوزش نے مجھے بے چین کر دیا اور میں بے چارگی کے عالم میں شہر کی طرف دوڑ پڑا۔ جلی ہوئی سیاہ کھال پر بڑے بڑے آبلے نمودار ہونے لگے تھے!

پھر میری نظر ایک جوہڑ پر پڑی، میں نے زخم بگڑنے کی پروا کئے بغیر دونوں ہاتھ گندے پانی میں ڈال دیئے، یہ ترکیب کارگر رہی اور زخموں کی ناقابل برداشت اذیت میں خاصی کمی ہو گئی مگر چند منٹ کے بعد میں نے جوں ہی ہاتھ باہر نکالے، تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا، میں نے دونوں ہاتھ جوہڑ کے کناروں پر پھیلی ہوئی دلدل کیچڑ میں ڈال دیئے اور زخموں کو تازہ کیچڑ میں چھپا کر ہاتھ باہر نکال لئے اس بار کیچڑ کی نمی نے بہت سکون دیا اور میں ایک بار پھر آگے چل پڑا۔

رات کی ویرانی میں اکا دکا بے گھر راہ گیروں اور آوارہ کتوں کے غول سے بچتا بچاتا میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ مجھے شہر کے راستوں کا کچھ علم نہیں تھا، نہ میں ایسی حالت میں تھا کہ اتنی رات گئے کسی لاابالی راہگیر کی مشتبہ نظروں کا سامنا کر سکوں۔ آخر میری نگاہ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے ایک بھکاری پر پڑی۔

وہ چیتھڑوں کا انبار اپنے جسم پر لپیٹے سکڑا ہوا، بے خبر سو رہا تھا، میں ... دونوں ہاتھ پشت پر چھپا لیے اور آہستہ سے اسے پکارا تو اس نے ... نکالے بغیر ہی مجھے پھٹکار دیا۔ کئی کوششوں کے بعد اس نے چیتھڑوں سے سر ... کر میری بات سننے پر آمادگی ظاہر کی تو میں اس کا چہرہ دیکھ کر لرز اٹھا۔ ... تھا!

"بابا چوپاٹی کا راستہ کس طرف ہے؟" میں نے خوشامدانہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

وہ بھیانک اور غیر فطری انداز میں غرایا "میں اپاہج ہوں اور ... سے یہیں پڑا ہوا ہوں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ اتنی معمولی سی بات کے لئے ... کو ستاتا پھر رہا ہے!"

وہ معذور اور مفلس تھا، انسانی نقطۂ نظر سے وہ ہر قسم کی ہمدردی کا مستحق ... مگر اس کے لہجے میں اس قدر تکبر اور نفرت کی آمیزش تھی کہ بلند آواز میں اسے ایک فحش گالی دی اور ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کی غضبناک آوازیں اپنے ... کے ساتھ دور تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔

میں شہر کے مختلف حصوں میں ٹھوکریں کھاتا پونے پانچ بجے کے قریب ... کے مکان پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پورٹیکو اور پھاٹک کے سوا پوری عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی ادھر میرے جھلسے ہوئے ہاتھوں پر لتھڑی ہوئی کیچڑ خشک ہو چلی تھی اور ... شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

مسز نینی ورما کے مکان کے احاطے کی دیواریں تین چار فٹ سے زیادہ ... نہیں تھیں۔ انہیں حفاظت سے زیادہ آرائش کے انداز میں تعمیر کیا گیا تھا اور یہ بات میرے لئے سود مند تھی کیونکہ میں ہاتھوں کو مزید زخمی کئے بغیر آسانی اندر کود گیا، میری ... یہ تھی کہ بوڑھی ماما یا نینی کی اندھی ماں کو میری وہاں آمد کا علم نہ ہونے پائے لہٰذا ... دستک دینے یا گھنٹی بجانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔

احاطے کی دیوار نیچی ہونے کے سبب مجھے اندر پہنچنے کے بعد رکوع کی حالت میں جھک کر آگے بڑھنا پڑا تاکہ باہر سے کوئی چوکیدار وغیرہ میری نقل و حرکت نہ دیکھ سکے۔

میں شام کے وقت اس مکان میں آ چکا تھا اور نینی کی خوابگاہ میں عیش و عشرت کے کچھ یادگار لمحات بھی گزارے تھے لہٰذا مجھے خوابگاہ کے محل وقوع کا بخوبی اندازہ تھا۔

مسز نینی ورما کے خوابیدہ مکان کے احاطے میں پھیلی ہوئی تاریکی میں کسی چوپائے کی طرح عمارت کے عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے مقدر کی ستم ظریفی پر مسکرا کر رہ گیا۔ صرف چند گھنٹوں میں میری حیثیت میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ پہلی بار دل میں آوارگی کا چور لئے میں اس مکان میں آیا تو آبرو کے ساتھ ... استقبال کیا گیا تھا۔ وہاں کی رہنے والی نے اپنی قبائے عصمت میری نذر کر دی مگر ... رات کے سناٹے میں کسی موشی کی طرح وہاں رینگنے پر مجبور تھا۔

عقبی رخ پر پہنچتے ہی میں چونک پڑا۔ فضا میں دبی دبی اور سہمی ہوئی کچھ ... سی تیر رہی تھیں۔ اچانک میری کنپٹیاں جلنے لگیں۔ شاید نینی وہاں تنہا نہیں تھی۔

میں مزید آگے بڑھا اور نینی کی خوابگاہ کی کھلی ہوئی عقبی کھڑکی میری نظروں کے سامنے آ گئی۔ کھڑکی کے اندرونی حصے پر دبیز نیلے پردے لٹکے ہوئے تھے جن کے پیچھے ہلکی روشنی تھی۔ پردوں کے درمیان ذرا جھری نہیں تھی جس سے میں اندر جھانک سکتا۔ نینی کی والہانہ سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ ایک حسین سراپا کو ایک جگہ قرار نہیں ہے، شاید وہ زیر و بم کی طرح مچل رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کسی مرد کی لڑکھڑاتی ہوئی مخمور آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ جو بھی تھا نینی پر خاصا حاوی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے بے ربط بلکہ مہمل فقروں کا لہجہ تحکمانہ اور سخت گیر تھا۔

نینی کی ذات سے میری کوئی گہری وابستگی نہیں تھی۔ میری اور اس کی ملاقات ایسی تھی جیسے دو مختلف راستوں کے مسافر اتفاقاً چند لمحوں کے لئے کسی چوراہے پر مل جائیں مگر نینی کی خوابگاہ میں اپنے بجائے کسی اور جیتے جاگتے مرد کو موجود پا کر میرے وجود میں اچانک نفرت اور انتقام کا جوالا مکھی بھڑک اٹھا، میرا جی چاہنے لگا کہ میں اپنے ہاتھوں سے نینی کے ٹکڑے اڑا دوں۔

اس نے میری دوستی کی خاطر اپنے شوہر سے بے وفائی کی اور اب اپنے کیف کے لمحوں کو نکھارنے کی خاطر کسی اور کو اپنے دام میں پھانسے بیٹھی تھی۔ وہ نہ میری بیوی تھی نہ محبوبہ۔ ہاں ایک اعتبار سے میری داشتہ کہی جا سکتی تھی جس سے میری دوسری ملاقات ہونی باقی تھی مگر مرد کی ذات عورت کے حق میں بدترین آمر ہوتی ہے ہر مرد اس عورت کو اپنا پیدائشی غلام سمجھنے لگتا ہے جس سے اس کا ذرا بھی تعلق پیدا ہو جائے اور اگر وہ عورت کسی اور پر ملتفت ہو جائے تو وہی مرد حسد سے پاگل ہو جاتا ہے!

میں نے کسی چیتے کی سی مکاری کے ساتھ آہستگی سے ہاتھ بڑھایا اور ایک پردے کو ذرا سی جنبش دی۔ پل بھر کے لئے دو پردوں کے سرے ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور میرا خون کھول اٹھا۔ ایک خوفناک غراہٹ میرے حلق میں ہی دم توڑ گئی اور آنکھیں جلنے لگیں۔

میں نے غیر ارادی طور پر اپنی جیب سے وہ عجیب پستول نکالا جو میں نے الالوف سے چھینا تھا اور اگلے ہی لمحے ایک بے آواز زہریلا تیر نینی کے پاس لیٹے ہوئے مدہوش شخص کی گردن میں پیوست ہو گیا۔

میں نے تیر نشانے پر لگتے دیکھ کر فوراً پردہ چھوڑ دیا مگر چند ہی سیکنڈ میں نینی کی نیلی چیخوں سے میری زخمی انا کو تسکین مل گئی۔ وہ دیوانہ وار مدد کے لئے چیخ رہی تھی۔

میرے لئے یہ صورتحال بہت خطرناک تھی۔ میں پناہ لینے کے لئے وہاں پہنچا تھا مگر حالات نے اچانک ہی ایک ڈرامائی موڑ اختیار کر لیا۔ نینی کے چیخنے سے پہلے تک مجھے اپنے اقدام کے نتائج کی پرواہ نہیں تھی مگر نینی کی سریلی چیخوں نے میرے حواس پر تازیانے کا کام کیا۔ اگر اب میں ذرا بھی غفلت سے کام لیتا تو وہ مکان میرا مقبرہ بن سکتا تھا۔

اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں طویل چکر کاٹ کر عمارت کے سامنے والے حصے سے جانے پہچانے راستے پر فرار کی کوشش کرتا ۔۔۔ چند ہی لمحوں میں نینی کی چیخوں کا ردعمل ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ بالائی منزل سے دو مختلف عورتوں کی چیخیں بھی سنائی دینے لگی تھیں اور قرب و جوار کے مکانات کی کھڑکیاں تیزی سے روشن ہوتی جا رہی تھیں۔

اس وقت صورتحال ایسی سنسنی خیز اور روح فرسا تھی کہ میں اپنے جھلسے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو بالکل ہی بھول گیا اور نینی کے مکان کے احاطے کی عقبی دیوار کسی بندر کی سی پھرتی سے کود گیا۔ وہ ایک پتلی اور ناہموار سی گلی تھی۔ میں پوری رفتار سے اس گلی میں ایک طرف دوڑنے لگا۔

فضا میں اب ملی جلی بلند انسانی آوازوں کے ساتھ ہی پہرے پر مامور سپاہیوں کی سیٹیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

میں اس گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر چند ثانیوں کے لئے ٹھٹکا پھر میدان صاف پاتے ہی پوری رفتار سے داہنی طرف کی ایک فٹ پاتھ پر دیواروں کے سائے میں دوڑ پڑا۔

رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی ہوئی خوفزدہ نسوانی چیخیں دم توڑ چکی مگر اب فضا کا سکوت بھی باقی نہیں رہا تھا۔ جائے واردات کے قرب و جوار سے ابھرنے والی دھیمی دھیمی آوازوں نے مل کر ایک گونج کی شکل اختیار کر لی تھی اسی کے ساتھ آوارہ کتوں کا تیز شور بھی سنائی دینے لگا۔ اس ماحول میں پولیس والوں کی تیز سیٹیاں آسیبی چیخوں کا سماں باندھ رہی تھیں۔

میں پوری قوت سے بھاگا جا رہا تھا کہ اچانک سامنے کے کسی موڑ سے ایک کار کے ہیڈلیمپس کی تیز روشنی طلوع ہوئی اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس وقت میرے پاس سوچ بچار کا وقت نہیں تھا، میں ہر قیمت پر اس علاقے سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

میں نے سڑک کے وسط میں آ کر آنے والی کار کو روکنے کے لئے دونوں ہاتھ لہرانے شروع کر دیئے مگر کان پوری توجہ سے انجن کی آواز پر مرکوز تھے تاکہ بے خبری میں میں آنے والی کار کے پہیوں تلے روند نہ ڈالا جاؤں۔

مگر اس کار کا ڈرائیور خاصا نرم دل معلوم ہوتا تھا، بمبئی والوں کے روایتی لاتعلقانہ رویئے کے برعکس اس نے دور ہی سے بریک لگانے شروع کر دیئے اور میرے قریب لا کر کار روک دی۔

"مجھے لفٹ چاہیئے!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کہاں جائیں گے؟" کار کے اندر اندھیرے میں ایک شبہات آمیز آواز ابھری اسے میری حالت، میرے لہجے اور پولیس کی سیٹیوں کے شور نے شبہ میں ڈال دیا تھا۔

میں نے غرا کر اسے ایک بھیانک سی گالی دی اور اس سے قبل کہ وہ جواب دے سکے، یوری الالوف کے پستول سے نکلے ہوئے زہریلے تیر نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ اسٹیرنگ وہیل پر بیٹھے بیٹھے ہی مٹی کے کسی بے جان پتلے کی طرح پائیدان میں ڈھلک گیا۔ گاڑی گیئر میں تھی لہٰذا اس نے آگے کی طرف ایک تیز جھٹکا لگایا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔

اس وقت صحیح معنوں میں مجھ پر خون سوار تھا، جنون اور دہشت کے باعث میں اپنی ہر تکلیف کو قطعی فراموش کر چکا تھا۔ میں نے جھلسے ہوئے ہاتھوں سے اسے ایک طرف دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی ساتھ ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔ میں آندھی بن کر اس خطرناک علاقے سے روانہ ہوا۔ میں نے گلیوں کے پیچ

راستوں کے بجائے کھلی سڑک کی راہ اختیار کی اور چند ہی لمحوں میں سارے ہنگاموں کو پیچھے چھوڑ آیا۔

مگر اس وقت دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے جب میں نے اپنے پیچھے ایک پولیس کار کا تیز سائرن سنا۔ بے اختیار میری نگاہیں عقب نما آئینے پر گئیں اور مجھے ایک کار تیزی سے قریب آتی نظر آئی جس کی چھت پر سرخ روشنی تیزی سے جل بجھ رہی تھی۔

اس وقت میری کار کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ تھی میں نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور پیڈل پائیدان سے جا لگا۔ اب کار ستر میل کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ شاید اس کا ایکسیلیٹر دانستہ اس رفتار پر جامد کیا گیا تھا۔

رفتار بڑھانے کے بعد میرے اور پولیس کار کے درمیان مستقل فاصلہ قائم ہو گیا جو بظاہر خاصا محفوظ تھا مگر رائفل کے لئے بالکل بے حقیقت!

میں نے کار کے فیول میٹر پر نظر ڈالی تو سوئی کی پوزیشن سے پتہ چلا کہ ٹنکی پوری بھری ہوئی ہے۔ ____________ اور میں اس معرکے کو کئی گھنٹوں تک طول دے سکتا ہوں۔ اگر اس گاڑی میں میرے ساتھ ایک اکڑی ہوئی لاش نہ ہوتی تو شاید میں رک کر پولیس پارٹی کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا مگر موجودہ حالات میں یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ فضا رائفل کے ہولناک دھماکے سے لرز اٹھی مگر فائر خطا ہو گیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ گاڑی کو لہرانا شروع کر دیا۔ چند ثانیوں تک سکوت رہا۔ پھر ایک اور فائر ہوا اور کار کا عقبی شیشہ چور چور ہو گیا۔ گولی اسے توڑ کر ونڈ شیلڈ کے پار نکل گئی اور مجھے اس کی دوسری طرف دیکھنا مشکل ہو گیا۔ جس جگہ گولی لگی وہاں ایک سوراخ ہو گیا تھا اور پورا شیشہ اس بری طرح چٹخ گیا تھا کہ ڈرائیونگ ناممکن ہو گئی۔

میں نے بریک لگانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک کار کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اچھل کر چھت سے جا ٹکرایا۔ اسی وقت ایک پرشور دھماکے اور اعصاب شکن جھٹکے سے کار رک گئی۔ میں بدحواسی کے عالم میں دروازہ کھول کر باہر کود گیا۔ کار ایک چبوترے پر چڑھ کر الیکٹرک پول سے اس طرح ٹکرائی تھی کہ پول زمین پر آ گرا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ بجلی کے تار گاڑی پر نہیں گرے تھے مگر میں گاڑی سے کود کر اندھا دھند ایک طرف بھاگا تو سامنے ہی بجلی کے تار گرے نظر آئے۔ میں پوری احتیاط سے ان پر سے کود کر آگے دوڑ پڑا۔

پولیس کار اب بہت قریب آ چکی تھی۔ مجھے بھاگتے دیکھ کر ایک آوارہ کتا ہڑبڑا کر بھونکنے لگا اور پھر بے شمار آوارہ کتے بھونکتے ہوئے اپنے مسکنوں سے باہر نکل آئے اور جلوس کی صورت میں میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔

کتوں کے شور کے ساتھ ہی وہ علاقہ پولیس کار کے سائرن اور سیٹیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ میں اس وقت تنگ اور تاریک گلیوں میں دوڑ رہا تھا جہاں دو رویہ نیم پختہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وقت میرا ذہن تیزی کے ساتھ نجات کی کوئی راہ تلاش کر رہا تھا۔ مجھے ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا میں مڑ کر دیکھے بغیر اس میں گھس گیا۔

شور و غل سن کر اس مکان کے ایک کمرے سے کوئی سایہ باہر آ رہا تھا۔ جس وقت مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا تاخیر ہو چکی تھی۔ میں اپنے پورے زور میں اس سے جا ٹکرایا۔

اس سائے کے حلق سے ایک غضبناک غراہٹ ابھری۔ چہرے پر ایک طاقتور گھونسا پڑا۔ میں لڑکھڑا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے صحن کا کھلا ہوا دروازہ بند کیا۔ شاید اسے یقین تھا کہ میں اس کی واپسی سے قبل سنبھل نہ سکوں گا۔ واپس آ کر اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے چلا۔

"تت ..... تم کون ہو؟" میں نے ہانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔ کیا مگر وہ کچھ بولا نہیں اور کمرے میں پہنچ کر اس نے بلب روشن کر دیا۔ اچانک روشنی ہونے کے باعث میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ بینائی قدرے بحال ہوئی تو میں نے اسے اپنی آنکھوں میں جھانکتے پایا۔

"مجھے پناہ چاہیئے۔" میں نے اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے بمشکل اس سے کہا۔

"پولیس تمہارا پیچھا کر رہی ہے؟" اس نے فضا میں سیٹیوں کی آوازیں سنتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔ وہ پختہ عمر کا قوی الجثہ شخص تھا اور اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔

"ہاں، میرے ہاتھ سے ایک آدمی مارا گیا ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تم بے فکر رہو۔ تمہارا مقدر عروج پر ہے۔ تم صحیح ٹھکانے پر پہنچے ہو۔" اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ مجھ سے چالاکی کی کوشش تمہیں لے ڈوبے گی۔"

"میری شامت آئی ہے کہ تم سے الجھنے کی حماقت کروں گا۔" میں نے خوفزدہ انداز میں ہنسنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے اسی کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر دراز ہونے کا مشورہ دیا اور خود باہر جانے لگا۔

"میرے دونوں ہاتھ جھلسے ہوئے ہیں۔" میں نے اسے روک لیا اور گرفتاری کی دہشت کم ہو جانے کے سبب زخموں کی تکلیف پوری شدت سے ابھر آئی تھی۔ "تمہارے پاس مرہم پٹی کا بندوبست ہو گا؟"

اس نے روشنی میں میرے زخموں کا جائزہ لیا۔ پھر شیشے کی ایک الماری میں سے مرہم کی ڈبیہ نکال کر جھلسی ہوئی جلد پر مرہم کا ہلکا ہلکا لیپ کر دیا۔ اس کے بعد روشنی گل کر کے وہ کمرے سے نکل گیا اور باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد فضا پر سکوت چھا گیا۔ پولیس والے شاید میری تلاش میں بھٹکتے ہوئے کہیں دور نکل گئے تھے، ادھر مرہم کے اثر سے تکلیف میں اتنی کمی ہو چکی تھی کہ میں اپنا ذہن دوسرے مسائل پر مرکوز کر سکوں لیکن مجھے سوچ بچار کی مہلت نہ مل سکی اور وہ دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ میں نے دروازے پر اس کی آواز سنتے ہی اندر روشنی کر دی تھی۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو باہر صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلتا نظر آیا۔ فضا پرندوں کے شور سے گونج رہی تھی۔

"ہاں۔ اب تم اپنی کہانی سناؤ۔" اندر آ کر وہ نہایت سکون سے میرے قریب بیٹھ گیا۔

"میں نیپال سے چرس باہر بھیجتا تھا۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کہنا شروع کیا۔ "مگر کچھ عرصے سے انٹرپول کی نشاندہی پر مقامی پولیس میرے پیچھے لگ گئی اور مجھے مجبوراً ہندوستان کی طرف فرار ہونا پڑا۔ یہاں کی پولیس پہلے سے ہوشیار تھی۔ اس آنکھ مچولی میں میری ساری پونجی ختم ہو گئی۔ آج رات میں ایک مکان میں چوری کی نیت سے گھسا مگر وہاں کے مکین بیدار ہو گئے اور انہوں نے شور مچا دیا۔ میں بمشکل وہاں سے جان بچا کر نکل سکا، مگر پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ راستے میں میں نے ایک کار روکی اور جب وہ مجھے لفٹ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو میں نے اسے مار دیا اور اس کی کار لے بھاگا یہاں سے تھوڑی دور کار ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ پولیس میرے تعاقب میں تھی۔ میں اندھا دھند اس بستی میں گھس آیا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"امیر خان۔" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے اپنے ایک پرانے دشمن کا نام نکل گیا۔

"یہ بہت خطرناک علاقہ ہے۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔ "رات تو بڑی بات ہے، دن کے اجالے میں بھی یہاں نئے آدمی کا گھسنا اور صحیح سلامت بچ نکلنا محال ہے، تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ جب تک میں اجازت نہ دوں تم یہیں چھپے رہو۔ میں استاد دلگیر سنگھ سے تمہارا ذکر کر دوں گا۔ شاید وہ تمہیں بھی کسی دھندے سے لگا دے۔"

"دلگیر سنگھ!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "عجیب نام ہے۔ کون ہے یہ؟"

"اس کے نام سے لوگوں کے دل دہل جاتے ہیں۔" اس شخص نے کہا۔ "بمبئی کا ہر بدمعاش استاد کا باجگزار ہے۔"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"ٹھاکر!" اس نے جواب دیا۔ "یہ یاد رکھنا کہ دلگیر سنگھ کے ہاتھ بہت دراز ہیں۔ ممکن ہے کہ تم پولیس سے بچ سکتے ہو مگر استاد تمہیں پاتال سے بھی کھینچ نکالے گا۔ اس سے دغا کرنے والے کتے کی موت مار دیئے جاتے ہیں۔"

"میں تو صرف پناہ کی امید میں تمہارے دروازے میں گھسا تھا، اگر اسی طرح مجھے دھندا بھی مل جاتا ہے تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا، مجھے بھلا دغا بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ٹھاکر میری فرمانبردارانہ گفتگو سے مطمئن ہو گیا۔ سورج طلوع ہونے پر وہ مجھے اسی کمرے میں بند کر کے کہیں چلا گیا اور میں بستر پر دراز ہو گیا۔

اس وقت دونوں ہاتھ ناکارہ ہو جانے کے باعث میں مفلوج ہو کر رہ گیا تھا اور فی الحال خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

دوپہر کے قریب ٹھاکر واپس آیا تو میں گہری نیند سو رہا تھا، اس نے مجھے جگایا اور خوش خبری سنائی کہ دلگیر سنگھ شام کے سات بجے اپنے ایک اڈے پر مجھ سے ملے گا۔ وہ میرے لئے تندوری نان اور کباب وغیرہ ساتھ لایا تھا۔

شام کو روانگی سے قبل میں نے اپنا لباس اتار کر ٹھاکر کا ایک جوڑا پہنا سر پر پگڑی جمائی اور ہم دونوں دھند لکے میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

شہر میں روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ زندگی ہر طرف پورے جوش و خروش سے رواں دواں تھی اور ہماری ٹیکسی ساحلی علاقے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

بندرگاہ کے نواحی علاقے میں ایک شراب خانے کے سامنے ٹیکسی رک گئی۔ سامنے ہی بڑے بڑے روشن حروف میں سیلرز کلب کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ علاقہ بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سستے شراب خانے اور ہوٹل بکھرے ہوئے تھے اور غیر ملکی جہازوں سے اترنے والے ملاح طویل سمندری سفر کے بعد یوں ان تفریح گاہوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے جیسے چند گھنٹوں بعد قیامت آنے والی ہو۔

ٹھاکر نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور مجھے ساتھ لے کر سیلرز کلب میں داخل ہوا اندر قدم رکھتے ہی تیز موسیقی اور تیز آوازوں کے ملے جلے شور نے ہمارا خیر مقدم کیا

سیلرز کلب کے نیچی چھت والے ہال میں صرف رنگین قمقموں کی آرائشی جھالریں روشن تھیں اور رنگ برنگی روشنیوں کے متحرک ہالے میں ایک نیم عریاں اینگلو انڈین رقاصہ میزوں کے درمیان ناچتی پھر رہی تھی، ہال کے ایک سرے پر بنے ہوئے دو فٹ اونچے اسٹیج پر سازندے تیز آوازوں میں ساز بجا رہے تھے اور رقاصہ ہر بدلتے ہوئے سر کے ساتھ اپنے جسم کو نت نئے زاویوں سے واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھی، میزوں پر ہر رنگ اور نسل کے لوگ موجود تھے۔ فضا شراب اور تمباکو کے دھوئیں کی ملی جلی بو سے بوجھل تھی۔ رقاصہ جدھر جاتی لوگ کرسیوں سے اٹھ کر رقص میں اس کا ساتھ دینے لگتے پھر جیسے ہی کوئی ہاتھ اسے گرفت میں لینے کے لئے آگے بڑھتا، رقاصہ کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر دور نکل جاتی۔

ٹھاکر مجھے سیدھا کاؤنٹر کی طرف لیتا چلا گیا جہاں ایک پستہ قامت خونخوار چینی موجود تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں شناسائی کے انداز میں ٹھاکر کی طرف اٹھ گئیں

"اندر جانا ہے۔" ٹھاکر نے قریب جا کر سرگوشی کی۔

"یہ بھی ساتھ جاتا ہے؟" چینی نے بمبئی والوں کے لہجے میں اردو میں پوچھا اور اس کی سخت ناقدانہ نظریں مجھ پر جم گئیں۔

"ہاں، استاد سے ملنا ہے۔" تیز شور میں اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ میں بھی بمشکل ہی اسے سن سکا۔

چینی نے دراز کھول کر پیتل کے دو ڈھلے ہوئے گول سکے نکالے اور ٹھاکر کی مٹھی میں تھما دیئے اور بولا:

"ماسٹر اد — فور میں ہے۔"

ٹھاکر مجھے ساتھ لے کر ہال سے گذرتا ہوا چلا گیا۔ ہم عقبی راہداری میں نکلے تو اس کے آخری سرے پر ایک شخص نے راستہ روک لیا۔ ٹھاکر نے مینی سے ملے ہوئے مخصوص سکے اس کے حوالے کئے اور اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

آگے راہداری نیم تاریک تھی، اس کے اختتام پر نیچے جانے والے زینے تھے۔ ٹھاکر بے دھڑک نیچے اترتا چلا گیا۔ زینوں کے اختتام پر ایک بند دروازہ تھا۔ ٹھاکر نے دروازے پر دوبار دستک دی اور دروازے کے پیچھے موجود مسلح دربان نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی تہہ خانے سے گرم ہوا کے تیز بھبکے باہر آئے اور ٹھاکر مجھے لیکر اندر گھس گیا۔ سیلرز کلب کا وہ تہہ خانہ جوئے کی کئی مشینوں سے آراستہ تھا جہاں مضحکہ خیز لباس والے بے فکرے ملاح قسمت آزمائی کر رہے تھے، میزوں پر بھی جوا ہو رہا تھا لیکن رقم کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ سارا کام ٹوکنوں کے ذریعے طے ہو رہا تھا۔ ٹھاکر نے بتایا کہ تہہ خانے میں آنے والے مختلف مالیت کے ٹوکن خریدتے ہیں اور واپسی کے وقت دو فیصد کا معمولی سروس چارج منہا کر کے ہر شخص کو ٹوکنوں کے بدلے رقم ادا کر دی جاتی ہے۔ میری دانست میں یہ بندوبست کچھ عجیب سا تھا۔ اگر پولیس کے چھاپے سے بچاؤ کے لئے رقم کے بجائے ٹوکن جاری کئے جاتے تھے تو یہ ایک احمقانہ اقدام تھا۔ کیونکہ اس طرح سارا الزام انتظامیہ ہی کے سر آتا تھا۔

تہہ خانے کے ایک کمرے میں میری ملاقات دلگیر سنگھ سے ہوئی۔ وہ ایک نہایت کڑیل اور خوش شکل نوجوان تھا، اگر اس کے داہنے رخسار پر چاقو کے زخم کا ایک لمبا سا پرانا نشان نہ ہوتا تو یہ کہنا دشوار تھا کہ دلگیر سنگھ بدمعاش ہے۔

"تو یہ ہے مارتے خاں!" مجھے دیکھتے ہی دلگیر قہقہہ مار کر بولا۔ "تم جاؤ ٹھاکر میں اس سے خود بات کر لوں گا۔"

ٹھاکر نے ادب سے سر کو خم دیا اور واپس چلا گیا۔

"بیٹھ جاؤ امیر خان!" دلگیر سنگھ نے صوفے پر دراز ہو کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ تمہاری کہانی میں سچ کتنا ہے؟"

"اس میں جھوٹ بالکل نہیں ہے۔"

"شام کے اخبار پڑھے ہیں تم نے؟" اس بار دلگیر سنگھ کا لہجہ سخت تھا۔

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"صبح طلوع ہونے سے قبل بمبئی میں پانچ قتل ہوئے ہیں۔" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اطمینان سے بولا۔ "ایک طوائف کے کوٹھے پر گولی چلنے سے اس کا ایک گاہک ہلاک ہوا، بیلا پور جانے والی سڑک پر ایک ٹیکسی بم کے دھماکے سے اڑائی گئی جس میں ٹیکسی ڈرائیور اور ایک روسی مسافر ہلاک ہوا۔ چوپاٹی کے علاقہ میں ایئر انڈیا کا کیپٹن ورما اپنی خواب گاہ میں ایک زہریلے تیر کا نشانہ بنا اور ایک کھمبے سے ٹکرائی ہوئی کار میں کار والے کی لاش ملی ہے، وہ بھی زہریلے تیر کا نشانہ بنا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور میرا دل کھوپڑی میں دھمکنے لگا۔ دلگیر سنگھ کی گفتگو بالکل واضح تھی وہ مجھے بتا رہا تھا کہ طریقۂ قتل کی یکسانیت سے ظاہر ہے کم از کم دو قتل کئے ہیں مجھے شدید صدمہ اس بات کا تھا کہ میرے ہاتھوں ہو گئی تھی۔ طویل مدت کے بعد جب کیپٹن ورما کو بیوی کی یاد آئی اور اس کا رخ کیا تو میں نے اسے مینی کا آشنا سمجھ کر حسد کے جذبے سے قتل کر دیا اور یوں میرے حساب میں ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا۔

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ چوپاٹی والے مکان میں میرا نشانہ کون ..." میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خوب!" وہ زور سے ہنسا۔ "بہت سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔" چند ثانیوں تک خاموش رہا پھر بولا۔ "زہریلے تیر تم کیسے پھینکتے ہو؟"

"سرکنڈے کی نالی میں پھونک مار کر میں شکار کھیلتا ہوں۔" میں جھوٹ بولا۔ "مگر بھاگتے ہوئے وہ نالی کہیں گر گئی۔ کار والے کو میں نے تیر چبھا کر ختم کیا تھا۔"

"کیا کیا کام جانتے ہو؟"

"جیب تراشی کے علاوہ ہر کام کر سکتا ہوں۔"

"تاش کے کھیلوں میں شارپنگ کر لیتے ہو؟" اس کا لہجہ ...

"یہ تو میرا خاص شعبہ ہے۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"آؤ ذرا دیکھوں تمہارا کھیل۔" وہ یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے ...

"ابھی میرے ہاتھ زخمی ہیں۔"

"ہاں۔ تمہارے ہاتھ کیسے زخمی ہوئے؟"

"سگریٹ سلگاتے ہوئے، میرے ہاتھ پٹرول سے تر تھے ... جھلس گئی ہے۔"

"تم یہیں رہو گے، دو چار روز میں تمہارے ہاتھوں کے زخم ... میں تمہارا کھیل دیکھوں گا، اس کے بعد ہی تم کو کام پر لگایا جائے گا۔"

یہاں تک تو میں نے بات نبھالی، تہہ خانے میں تین رہائشی ... تھے جو لمبا کھیل کھیلنے والے جواریوں کو کرائے پر دیئے جاتے تھے ... میں خالی پڑے رہتے تھے، ان ہی میں سے ایک کمرہ میرے حوالے ... گیا اور زخموں پر لگانے کے لئے چند مرہم بھی فراہم کر دیئے گئے۔

اگلے دنوں میں مجھے عجیب و غریب معلومات حاصل ہوئیں ... کلب کا جوا خانہ باقاعدہ سرکاری لائسنس کے تحت چلایا جاتا ... وہاں آوارہ عورتوں کو بھی خاصا دخل تھا۔ وہ عام طور پر جیتنے والوں کے گرد منڈلاتی ہوئی پائی جاتی تھیں۔ دلگیر سنگھ ان سے ماہانہ ایک ... وصول کرتا تھا، ٹوکن سسٹم رائج کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ... ہو سکے کہ تہہ خانے سے نکلنے والے کی جیب میں کتنی رقم موجود ہے ... ایسا ہوا کہ بھاری رقمیں جیت کر نکلنے والے سیلرز کلب کے نواحی علاقے ... باہر جانے سے قبل لوٹ لئے گئے اور لٹیروں کا کوئی سراغ نہ مل سکا ... خانے میں کچھ تنخواہ دار ملازم بھی جوا کھیلتے تھے اور عملے کی مدد سے ... کرتے تھے۔ ان کا نشانہ عام طور پر وہ ملاح بنتے جن کے جہاز چند ... بمبئی کی بندرگاہ پر ٹھہرتے تھے۔ ان پیشہ ور جواریوں کو ٹوکن مفت فراہم ... جاتے تھے اور جیتی ہوئی رقم میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ مقررہ معاوضے کے علاوہ کسی بڑی جیت پر دلگیر انہیں انعام وغیرہ بھی دے دیا ... تھا۔

دلگیر سنگھ کا عجیب نام سن کر میں پہلے ہی دن چونکا تھا۔ بعد میں ... چلا کہ وہ تضادات کا مجموعہ ہے، اس کا باپ مسلمان تھا اور ماں کا تعلق ... گھرانے سے تھا۔ دونوں کا عشق سچا تھا مگر شادی کی کوئی صورت نہ تھی۔ لہٰذا وہ ... گھروں سے فرار ہو گئے۔ اس کی ماں نے دہلی پہنچ کر اسلام قبول کیا اور ... محبوب سے شادی رچالی۔ فرار کا چرچا ہوتے ہی شہر میں فرقہ وارانہ فسادات ... پھوٹ پڑے۔ دونوں طرف کے بے شمار آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اسی دوران ... لوگوں کو پتہ چل گیا کہ مفرور جوڑا دہلی کے ایک ہوٹل میں ہنی مون منا رہا ہے ... تاتی ایک بارہ نفری مسلح جماعت دہلی روانہ ہوئی اور دلگیر سنگھ کے باپ کو بے ... دردی سے ہلاک کر دیا گیا، اس کی ماں کو گھر لایا گیا تو وہ حاملہ تھی۔ اس کی کوکھ اجاڑنے ... کے بہت جتن کئے گئے مگر دلگیر سنگھ تو ماں کی کوکھ سے جونک کی طرح چمٹا ہوا ... تھا۔ لہٰذا جب وہ پیدا ہوا تو اسے ایک گوردوارے کے دروازے کے قریب ... پھینک دیا گیا۔ سنت کی ردٹیوں پر پلنے والے اس لڑکے کا نام تو کچھ اور رکھا گیا ... تھا مگر ہوش سنبھالنے پر جب اس کو اپنی اصلیت کا علم ہوا تو وہ باغی ہو گیا۔ اس نے ... فسادات گوردوارے میں سوتے ہوئے تین سکھ یاتریوں کی داڑھیاں اور ... مونڈ دیئے اور خود بمبئی بھاگ آیا۔ لوگوں نے بتایا کہ بمبئی آکر وہ خوب رویا اور ... اس نے عہد کیا کہ وہ بدی سے اچھائیوں کا کام لے گا۔ اسے ان جنونیوں ... سے نفرت تھی جو مذہب کے مقدس نام پر درندگی کے ساتھ انسانی لہو کی ہولی ... کھیلتے ہیں، اس نے اپنا نام دلگیر سنگھ رکھا مگر وہ نہ سکھ تھا نہ مسلمان، اس نے اپنے ... ہوش میں مسجد، مندر یا گوردوارے میں قدم تک نہ رکھا البتہ اس کے قریبی ... لوگ بتاتے تھے کہ دلگیر سنگھ کی ناجائز آمدنی کا بیشتر حصہ یتیموں، بیواؤں ... اور معذوروں کے کام آتا تھا۔

سیلرز کلب کے جوئے خانے میں ملازم بشن ملہوترہ نامی ایک پیشہ ور ... جواری مجھے ان دونوں کینہ توز نظروں سے دیکھتا تھا۔ اسے اپنی شارپنگ پر بڑا ناز ... تھا اور دلگیر عام طور پر وہی زیادہ تر جیتا کرتا تھا۔ جب اسے میری آمد کے مقصد کا ... پتہ چلا تو اس نے میرا کھیل دیکھے بغیر ہی مجھ کو اپنا رقیب سمجھ لیا، وہ جب بھی مجھ ... سے بات کرتا اس کا لہجہ طنز آمیز ہوتا۔

کلب کے بار روم میں کاؤنٹر پر بیٹھنے والا خونخوار چینی دلگیر سنگھ کا ملازم ... تھا یہ بات گروہ سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہیں تھی۔ کلب کا لائسنس بھی ... اسی چینی کے نام پر تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ گیارہ خون کر چکا ہے، ... بارہا اس پر مقدمہ بھی چلا مگر ہر بار ثبوت نہ ہونے کی بنا پر اسے رہا کر دیا گیا۔ ... ایک بار تو اس نے ایک بھرے بازار میں اپنے ایک حریف کو زمین پر گرا کر ذبح کیا ... اور موقع سے فرار ہو گیا۔ پورا شہر جانتا تھا کہ قاتل کون ہے مگر جب وہ گرفتار ہوا ... تو پولیس کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود استغاثہ کو کوئی گواہ نہ مل سکا۔ لوگ جانتے تھے کہ چینگ ہوا کے خلاف زبان کھولنے والے کے پورے خاندان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اپنی مجرمانہ سرگرمیوں سے قطع نظر چینگ ہوا بمبئی میں رہنے والے چینیوں کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے ذرا سے اشارے پر شہر میں ہنگامے پھوٹ سکتے تھے۔ اس کے ملنے والوں میں ہاتھی دانت کے دستے والے اعشاریہ دو دو کے پستول کو بڑی شہرت تھی۔ کوئی بھی شخص چینگ ہوا کا وہ پستول دکھا کر بمبئی کے چینیوں سے ہر کام لے سکتا تھا۔

میں تین دن تک بے کاری کے عالم میں وہاں مقیم رہا۔ اس دوران میں میرے ہاتھوں کے زخم حیرت ناک تیزی سے بھرتے جا رہے تھے مگر پہلی ملاقات کے بعد وہاں دلگیر سنگھ کا سایہ تک نظر نہیں آیا، وہ شاذ و نادر ہی کلب کا رخ کرتا تھا تاکہ چینگ ہوا کا نام اس کے ساتھ ملوث نہ ہونے پائے اور وہ چینی سارے معاملات بڑی مہارت سے نمٹا لیتا تھا۔

تیسری شام میری طلبی ہوئی۔

سیلرز کلب کی عمارت دو منزلہ تھی۔ تہہ خانے کے اوپر بار روم تھا اور اس کی اوپری منزل پر چینگ ہوا کی رہائش تھی۔ مجھے عمارت کے اسی حصے میں طلب کیا گیا تھا۔ جہاں چینگ ہوا اپنے ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔

اس کے ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہاں شیشے کی نازک الماریوں میں تاریخی اہمیت کے بے شمار تاریخی نوادرات سجے ہوئے تھے دیواروں پر صدیوں پرانے نفیس قالین، تلواریں اور زرہ لٹکی ہوئی تھیں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" چینگ ہوا کی چبھتی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"امیر خان۔" میں نے جواب دیتے ہوئے محسوس کیا کہ میرے ساتھ کچھ گڑبڑ ہو چکی ہے اور چینگ ہوا کا سوال خالی از علت نہیں ہے۔

وہ چند ثانیوں تک مجھے چیر کھانے والی نظروں سے گھورتا رہا، پھر بجلی کی سی سرعت سے میری طرف لپکا اور اس سے پیشتر کہ میں اس کے عزائم کا اندازہ لگاتا۔ اس نے مجھے کسی ننھے سے بچے کی طرح فضا میں اچھال دیا۔ میرے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور میں لیشت کے بل قالین پر آ رہا۔ چینگ ہوا پھرتی سے میرے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے میرے شانے کی کچھ رگیں، اس طرح دبانی شروع کیں کہ میرا پورا جسم بے جان ہونے لگا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، چھوڑو مجھے۔" میں بوکھلا کر چیخا۔

جواب میں اس نے رکے بغیر مجھے چند گالیاں دیں اور بولا۔ "اگر تم نے دو منٹ میں اپنا اصل نام نہ بتایا تو میں تمہیں ساری عمر کے لئے معذور کر دوں گا۔"

اس مردود کو اپنی قوت اور مہارت پر اتنا ناز تھا کہ اس نے اپنے آراستہ ڈرائنگ روم ہی میں مجھ پر حملہ کر دیا۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ میں اس کے داؤ سے بچ کر ہنگامہ آرائی کروں گا تو وہ یقیناً کسی اور جگہ کا انتخاب کرتا۔

میں نے اس کی خوفناک گرفت سے بچنے کی کوشش کی مگر اسی لمحے

چنگ ہوا نے میرے پٹھوں پر اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھا دیا اور میں درد سے تڑپ اٹھا۔

"نام... نام بتاؤ۔"

"صفدر علی!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور وہ اچھل کر میرے سینے سے اتر گیا۔

رہائی پاتے ہی میں غصے اور جنون کے عالم میں اس کی طرف لپکا مگر اس نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر مجھے وارننگ دی۔ "اگر میرے ڈرائنگ روم کو ذرا بھی نقصان پہنچا تو میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ میں جہاں تھا، وہیں رک گیا۔

ڈرائنگ روم میں وکٹورین ساخت کی ایک آبنوسی کرسی موجود تھی۔

چنگ ہوا اس پر بیٹھ گیا اسی وقت مکان کے کسی دور افتادہ حصے میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور فوراً ہی ایک زرد رو مگر دراز قامت چینی سینے پر ہاتھ باندھے وہاں آ موجود ہوا۔

چنگ ہوا نے چینی زبان میں اسے کچھ ہدایت دی اور وہ سر جھکائے وہاں سے لوٹ گیا۔

"میرے ساتھ اس بدتمیزی کی کیا ضرورت تھی؟" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد میں نے تلخ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"اس لئے کہ تم جھوٹ بول رہے تھے۔"

"مگر نام کی کیا اہمیت ہے، میرا نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"بڑا فرق ہے۔" وہ طنز آمیز انداز میں مسکرایا۔ "آج کے اخبارات میں تمہاری تصاویر شائع ہوئی ہیں۔ صفدر علی کو گرفتار کرانے والے کے لئے دس ہزار روپے کا انعام مقرر کیا ہے مگر امیر خان کی پورے شہر میں کسی کو پرواہ نہیں ہے۔"

"اخبارات میں میرا جرم کیا بتایا گیا ہے؟"

"عجیب بات یہی ہے کہ تمہارے جرم یا جرائم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بس اشتہارات میں تمہاری تصاویر ایک خطرناک مجرم کے طور پر چھپی ہیں۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ پولیس کیوں اتنی شدت سے تمہاری متلاشی ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ انٹرپول میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ آج کل ہر ملک کی پولیس منشیات کی دشمن ہو رہی ہے۔"

اسی اثناء میں چنگ ہوا کا دراز قد چینی ملازم سبز چائے لے آیا۔ اور چنگ ہوا نے ایک پیالی اور قہوہ دان میرے پاس بھیج دیا۔

"بے عزتی کے بعد یہ عزت افزائی میری سمجھ سے باہر ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ پہلا سبق تھا اور مجھے امید ہے کہ وہی آخری بھی ثابت ہو گا۔ میں اپنے آدمیوں کے منہ سے جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"مگر میں تمہارا آدمی کب سے ہو گیا؟"

"جس وقت تم ٹھاکر کے مکان میں گھسے تھے۔ پولیس سے بچتے پھرنے والے میرے لئے بہترین آدمی ثابت ہوتے آئے ہیں۔"

"دگبیر سنگھ کہاں ہے؟"

اچانک چنگ ہوا کا چہرہ غضبناک ہو گیا۔ وہ کسی زخمی بو... سرگوشیانہ انداز میں غرایا۔

"خبردار! اگر اس عمارت میں کبھی اس کا نام لیا۔ بھول... اسے سیلرز کلب میں دیکھا بھی تھا ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے... سائے کی طرح یہاں آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔"

"باہر پولیس میری متلاشی ہے، کلب میں آنے والوں... اخباروں میں میری تصاویر بھی دیکھی ہوں گی، اب یہاں یہ کیا..."

"تمہارے ہاتھوں کے زخم کیسے ہیں؟" جواب کے بجائے... سوال کر ڈالا۔ وہ میرے بارے میں پوری طرح باخبر معلوم ہوتا... تھا کہ میری کیمیاگری وغیرہ کے قصے انڈین سیکرٹ سروس نے... رکھے تھے ورنہ یہ باتیں بھی چنگ ہوا کے علم میں ہوتیں۔

"زخم تیزی سے بھر رہے ہیں۔"

ان زخموں کے بارے میں تمہاری کہانی بے جان ہے... ہوئے بولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ دھماکے سے اڑائی جانے والی... بھی تعلق رہا ہے۔"

"ٹیکسی!" میں مضحکہ خیز انداز میں ہنسا۔ "ممبئی میں قدم رکھنے... نے ٹرام کے سوا کسی سواری میں قدم نہیں رکھا۔"

"آج میرے آدمیوں نے تحقیقات کی ہیں۔" وہ بولا۔ "ٹیکسی... کے قریب سے کرائے پر لی گئی تھی۔ سواریوں میں ایک روسی اور... تھا۔ اندھیرے کے باعث وہاں موجود ڈرائیور رنگوں کے نمایاں... علاوہ کچھ نہ دیکھ سکے مگر ٹیکسی سے روسی کے علاوہ صرف ڈرائیور کی... جلے ہوئے ٹکڑے ملے ہیں، جب میں تمہارے جلے ہوئے ہاتھوں... ہوں تو تم ہی ٹیکسی کے روپوش مسافر معلوم ہوتے ہو۔"

"اگر ایسا ہے تو میں یقیناً غیر انسانی قوتوں کا مالک ہوں۔" ... ہنس کر کہا مگر چنگ ہوا کے ٹھوس استدلال نے مجھے ہلا دیا۔ میں... ٹیکسی کا حادثہ شہر سے میلوں دور سیلا پور جانے والی سڑک پر ہوا... بم کے دھماکے سے اڑا کر چوپاٹی آنا اور پھر ٹھاکر کے مکان تک پہنچنا... کھیل نہیں ہے اور پھر ان حرکات کا کچھ نہ کچھ مقصد بھی تو ہونا چاہئے...

"خیر، میرے لئے صرف یہی جاننا کافی ہے کہ تم پولیس کو مطلوب... اور پناہ کے متلاشی ہو۔ فی الحال تم اسی مکان میں رہو گے۔ میرے پاس... دن میں ہاتھوں کے زخم ٹھیک ہوں۔ تم داڑھی بھی بڑھا لو۔ پھر تمہیں... جگہ بھیج دوں گا جہاں پولیس کا سایہ بھی نہ پڑ سکے گا۔"

"ممبئی سے باہر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" اس کا جواب بے حد مختصر تھا۔

"مگر مجھے تو بتایا گیا تھا کہ مجھے کلب میں آنے والوں کی جیبیں... پر مامور کیا جائے گا۔"

"اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی شدت سے پولیس کو مطلوب ہو، جعل ساز قتل کرنے والے کے لئے ممبئی پولیس دس ہزار کے انعام کا اعلان نہیں کر سکتی، اور شارپنگ تو بچے بھی آسانی سے کر لیتے ہیں، تمہیں کام سونپا جائے گا۔"

ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میری چھٹی حس جاگ اٹھی اور میں نے کہا: "میری شارپنگ کو پکڑنا ناممکنات میں سے ہے۔"

"میرے سامنے ایسا مضحکہ خیز دعویٰ نہ کرو، تمہارے لئے جو کام چنا ہے تم اسی کے لئے موزوں ہو اور وہاں تم خود کو محفوظ بھی پاؤ گے۔"

بے اختیار میرے سینے میں کسک سی اٹھی، چنگ ہوا انسان کی صورت کوئی بدروح تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے جہاں بھی بھیجنے والا ہے، وہ جگہ بدخانے سے ہرگز کم نہ ہو گی، میں ایک جال سے نکل کر دوسرے جال میں پھنستا جا رہا تھا، قید پولیس کی ہو، سیکرٹ سروس کی یا چنگ ہوا کی، میرے لئے ان میں کوئی فرق نہیں تھا بلکہ میں دن بدن اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ قانون کے نگہبان اداروں کے علاوہ اب قانون شکن افراد بھی میری راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ پارس پتھر انبالہ کے ایک ہوٹل میں پوشیدہ تھا، میری محبوب بیوی سیتا میری زبان کے کاری زخم کھا کر سرحدوں کے قریب مجھ سے بچھڑ چکی تھی، میں ان دونوں کی طرف ایک قدم آگے بڑھاتا تھا، مگر مقدر مجھے سو قدم پیچھے دھکیل دیتا تھا۔

"اگر میں اپنے طور پر کوئی راہ اختیار کرنی چاہوں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چنگ ہوا سے ایک خطرناک سوال کیا۔

"تمہارے سامنے انتخاب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ منقش آبنوسی کرسی سے اٹھ گیا۔ "اگر میری تجویز ناقابلِ قبول ہو تو پولیس کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہو، یہ دس ہزار مفت ہاتھ آئیں گے اور میری ساکھ بھی بنے گی۔"

"مجھے کام کی نوعیت بھی تو معلوم ہونی چاہئے۔"

"یہ میرے کاروباری اصولوں کے منافی ہے۔" وہ مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "مناسب وقت آنے پر ہر بات خود بخود تمہیں معلوم ہو جائے گی۔"

اس گفتگو کے بعد وہ پیچھے بار روم میں چلا گیا اور اس کے جاتے ہی اس کا زرد رو ملازم کسی آسیب کی طرح اچانک میرے سر پر مسلط ہو گیا۔

"آئیے آقا، میں آپ کو کمرے میں پہنچا دوں۔" اس نے ادب سے سر جھکا کر اپنے استخوانی ہاتھوں سے اشارہ کیا۔

بظاہر اس کا لہجہ احترام آمیز تھا مگر اس کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ میں نے ذرا بھی تامل سے کام لیا تو وہ مجھے کندھے پر لاد کر وہاں سے لے جائے گا، ناچار میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

وہ مجھے ملحقہ باتھ روم سے مزین ایک آرام دہ کمرے میں لے گیا جہاں ضروریات کا مختصر سامان موجود تھا اور بولا۔

"آپ یہاں آرام فرمائیں گے، اگر اس کمرے سے باہر نکلنے کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا کر مجھے طلب فرما لیجئے گا۔ تنہا باہر نکلنے کی صورت میں آپ مشکلات سے دوچار ہو جائیں گے۔"

میں اس مردود کو قہربار نظروں سے گھورنے لگا مگر وہ میری نگاہوں کی پرواہ کئے بغیر کسی مسکین کی طرح مسکراتا رہا۔

اور یوں میں اس کمرے میں نظر بند کر دیا گیا۔

چنگ ہوا کے مکان میں آسیبی سکوت طاری تھا۔ سڑک اور شراب خانے سے آنے والے شور کے سوا وہاں کوئی آہٹ نہ سنائی دیتی تھی۔ شاید اس مکان میں چنگ ہوا اور اس کے ملازم کے سوا کوئی نہ رہتا تھا اور وہ ملازم تو مجھے کمرے میں پہنچانے کے بعد ایسا غائب ہوا کہ کھانے کے وقت تک اس کا سایہ بھی کہیں نظر نہ آیا۔

وقت گذاری کے لئے میں بستر پر دراز ہو کر گذرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ مجھے رہ رہ کر خلش ستا رہی تھی کہ میں نے نادانستگی میں زینی کے شوہر کیپٹن درما کو اپنی سفاکی کا نشانہ بنایا تھا۔ شوہر کی توجہ کو ترسی ہوئی وہ عورت میرے ہاتھوں بیوگی کے جہنم میں جھونک دی گئی تھی مگر اب اس زیادتی کے ازالے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

میں اسی سوچ بچار میں غلطاں تھا کہ چنگ ہوا کا ملازم کھانے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں آیا۔ جب تک میں کھانے میں مصروف رہا وہ کمرے میں موجود رہا اور میرے فارغ ہوتے ہی ٹرالی لے کر واپس چلا گیا۔

گیارہ بجے میں نے کمرے کی روشنی گل کر دی۔ اس وقت پورے مکان میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی مگر نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ مکان میں چھایا ہوا گہرا سکوت بار بار مجھے کچھ کر گذرنے پر اکسا رہا تھا۔

جب بڑھتی ہوئی بے چینی کے باعث میرا بستر پر پڑے رہنا محال ہو گیا تو میں آہستگی سے بستر سے اترا اور ننگے پیروں کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ میں دیوار سے چپک کر سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا مگر باہر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید چنگ ہوا کا ملازم بھی سو چکا تھا۔

میں پوری احتیاط سے پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کی اوٹ سے نکلا اور جونہی میں کھلے ہوئے دروازے کے درمیان پہنچا، سامنے سے ایک چمکدار خنجر زناٹے سے اڑتا ہوا آیا اور داہنی جانب کی چوکھٹ میں پیوست ہو گیا، میں ہلکی سی چیخ مار کر پیچھے اچھل گیا، اسی کے ساتھ خواب گاہ کے باہر تیز روشنی پھیل گئی۔

چند سیکنڈ بعد چنگ ہوا کا دبلا پتلا دراز قامت چینی ملازم چہرے پر ندامت کے آثار لئے پلکیں جھپکاتا میری طرف آیا۔

"ارے آقا، آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں!" اس کا لہجہ سراسر انکسار آمیز تھا۔ "دراصل مجھے دن میں کام سے فرصت نہیں ہوتی اور میں بے خوابی کا بھی مریض ہوں اس لئے رات کو اندھیرے میں خنجر سے نشانہ بازی کی مشق کرتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ میرے بے ہودہ مشغلے سے آپ کو

زحمت ہوئی۔" دروازے کی چوکھٹ سے تیز دھار خنجر نکالتے ہوئے وہ خواب گاہ میں گھس آیا۔

اس کی بکواس پر میرا خون کھول اٹھا۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ باہر بیٹھا میری نگرانی کر رہا تھا اور جوں ہی اس نے اندھیرے میں مجھے باہر نکلتے دیکھا، چوکھٹ پر خنجر پھینک کر مجھے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا اور اب مجھے یوں بہلا رہا تھا جیسے میں کوئی شیر خوار بچہ ہوں۔

میں غراتا ہوا اس پر جھپٹ پڑا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں اس نحیف و نزار ڈھانچے کو پل بھر میں مسل کر رکھ دوں گا لیکن اس نے میرے حملے سے قبل ہی لپک کر میرے بڑھتے ہوئے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لیے اور ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار کیے بغیر پرسکون لہجے میں بولا:

" میں اپنی غلطی پر معافی کا خواستگار ہوں جناب، آپ کے دونوں ہاتھ زخمی ہیں۔ اگر میرے ہاتھوں سے آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو مالک میری چمڑی گرا دیں گے۔ میں پھر التجا کرتا ہوں کہ مجھے معاف فرما دیں۔"

اس کی گفتگو سے میرا پارہ اور چڑھ گیا، میں نے زور آزمائی کر کے اپنی کلائیاں چھڑانی چاہیں مگر اس کی ہڈیوں میں بلا کی طاقت تھی۔ اس کی انگلیاں مجھے اپنی زخمی جلد میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

زخموں کی تکلیف اچانک بڑھ جانے کے باعث میں نے زور آزمائی ترک کر دی اور وہ میرے ہاتھ چھوڑ کر پھرتی سے کئی قدم پیچھے سرک گیا۔ خنجر وہ پہلے ہی نیفے میں اڑس چکا تھا۔

" دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

" مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہاں آنے والے کسی مہمان کو آج تک میری صورت پسند نہیں آئی، مگر میں آپ کا بدخواہ نہیں ہوں۔ میں پھر التجا کروں گا کہ جب مکان میں اندھیرا یا سناٹا ہو تو مجھ نابکار کو خبر دیے بغیر باہر نہ نکلیں۔ اگر میری نشانہ بازی سے آپ کو کوئی زخم آگیا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا، میں اپنے مالک کے مہمانوں کا پورا احترام کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نابکار واپس چلا گیا اور وہاں ایک بار پھر گہرا اندھیرا چھا گیا۔

چنگ ہوا کے آسیبی مکان میں میں پورے دس دن مقیم رہا۔ اس دوران میں نہ صرف میرے ہاتھوں کے زخم بھر گئے بلکہ جھلسی ہوئی کھال کی جگہ نئی کھال بھی آنے لگی۔ اس پوری مدت میں چنگ ہوا ہمیشہ میرے سامنے فراخدلی سے پیش آتا رہا۔ اس نے پہلی شب کے قصے کا بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ادھر اس کے ملازم کا رویہ اس حد تک احترام آمیز تھا کہ میں اس کے سامنے خود کو بالکل بے بس سمجھنے لگا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہر وقت پوشیدہ رہ کر میری نگرانی کرتا رہتا ہے۔ اگر اس میں یہ خوبی نہ ہوتی تو چنگ ہوا مجھے اپنے کھلے گھر میں ٹھہرانے کی پیش کش ہرگز نہ کرتا۔

گیارہویں رات چنگ ہوا دس بجے کے قریب تاش کی گڈی لے کر کمرے میں آموجود ہوا۔ اس کی بے وقت آمد پر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

"پریشانی کی ضرورت نہیں، آج رات تمہیں اپنے کام پر روانہ ہونا ہے۔ میں نے سوچا جانے سے پہلے تم اپنے دل کی خلش بھی نکال لو۔" وہ تاش پھینٹتے ہوئے بولا۔

"دل کی خلش؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔" اس نے تاش میرے سامنے بستر پر بکھیر دیے۔ "تم بازی میں تمہیں پکڑوں گا۔"

"اگر نہ پکڑ سکے؟" میں نے گڈی سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"تو تمہیں نیچے قمار خانے ہی میں جگہ دے دوں گا۔"

میں نے حسب عادت حکم کی بیگم تلاش کر کے سب سے اوپر لگائی اور اس دوران میں چاروں یکوں کے کناروں پر ناخن سے نشان لگا دیے۔ ان کناروں کی موٹائی میں خفیف سا اضافہ ہو گیا جسے صرف میری ہی انگلیاں محسوس کر سکتی تھیں۔

میں نے تاش پھینٹنے شروع کیے۔ ایک اکا میرے دائیں ہاتھ کی طرف تھا۔ کارڈز ایک دوسرے پر سے پھسلے اور اکے کے نیچے والا کارڈ میرے ہاتھ میں آگیا۔

"فاؤل!" چنگ ہوا فوراً بول پڑا اور میں نے ایک مرتبہ پھر تاش سمیٹ لیے۔

میں نے سات مرتبہ تاش بانٹے اور ہر بار چنگ ہوا کی عقابی نظروں نے میری چالاکی پکڑ لی۔ آخر میں نے شرمندہ ہو کر گڈی اسے لوٹا دی۔ "تمہاری داد نہ دینا زیادتی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار اس طرح پکڑا گیا ہوں۔"

"جوئے خانے کو نفع میں چلانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "سیلرز کلب سے ممبئی پولیس کو ہر ماہ اسی ہزار روپیہ دیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس جوئے خانے کا لائسنس بھی ہے۔ ایکسائز والوں کو بھی رقم دی جاتی ہے اور یہ مال میرے آدمی عارضی گاہکوں کی جیبوں سے نکالتے ہیں ــــــ!"

"مجھے کہاں روانہ ہونا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا بحری سفر ہے۔" اس نے کہا۔

"کھلے سمندر سے ڈلیوری لینی ہے؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"کام کی نوعیت منزل پر پہنچ کر ہی معلوم ہو گی۔" وہ گنگناتے ہوئے بولا۔ "کام بے حد دلچسپ اور حوصلہ طلب ہے۔"

میرے ذہن میں ان دنوں کی یاد تازہ ہو گئی جو میں نے انڈیمان کے ایک جزیرے پر سائیکو فورٹ میں گزارے تھے۔ ایک بار میں رانا مندک کی مہربانیوں کے طفیل اگاٹی سے رہا ہو کر ممبئی پہنچا تھا اور اب ایک بار پھر کسی گمنام مشن پر سمندر کے سفر پر جا رہا تھا۔

شراب خانہ بند ہونے کے بعد رات کے تین بجے چنگ ہوا نے مجھے روانگی کا پیغام دیا۔ میرے پاس چنگ ہوا کے لاتے ہوئے چند جوڑوں اور ایک سوٹ کیس کے سوا کچھ بھی نہ تھا جو مجھے دیر لگتی۔ پوری الانوف سے بنا ہوا زہریلے تیر پھینکنے والا ننھا سا پستول میں نے پہلے ہی کوٹ کی اندرونی جیب میں چھپایا ہوا تھا۔ اس میں اب بھی گیارہ ہلکے پھلکے مگر مہلک تیر موجود تھے۔

سیلرز کلب کے باہر ایک بند گاڑی میں تین افراد میرے منتظر تھے۔ چنگ ہوا نے مجھے ان کے حوالے کیا اور گاڑی تیزی کے ساتھ سڑک پر دوڑنے لگی۔

سیلرز کلب ممبئی کے ایک ساحلی علاقے میں واقع تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ اس سفر کا اختتام جلد ہی ہو گا مگر خلاف توقع سفر کافی دیر تک جاری رہا۔ عقبی حصے کے شیشوں پر سفید رنگ ہونے کی بنا پر مجھے راستوں کا اندازہ نہ ہو سکا مگر جب گاڑی رکی اور مجھے نیچے اترنے کو کہا گیا تو قریب ہی سمندر کی سرکش موجوں کا شور سنائی دیا۔

اس وقت ہم ساحل سے بمشکل پندرہ بیس گز دور ناہموار پہاڑیوں میں موجود تھے۔ تاروں بھرے آسمان کی چھاؤں میں سیاہ سمندر کے سینے پر ہیبت ناک موجیں ابھر رہی تھیں اور کنارے پر ایک چھوٹی سی کشتی کا ہیولا نظر آرہا تھا۔

میرے ہمراہ گاڑی سے دلیپ نامی ایک شخص اترا جس کے بعد گاڑی تیزی سے واپسی کے راستے پر چلی گئی۔

دلیپ مجھے ساتھ لے کر چٹان سے بندھی ہوئی لائف بوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چٹان سے رسی کھول کر ہم دونوں اچھلتے پانی میں دوڑتے ہوئے کشتی کو ریت سے پانی میں لے گئے اور جب ہمارے گھٹنوں سے اونچا پانی آگیا تو ہم دونوں اچھل کر کشتی میں سوار ہو گئے۔

پلاسٹک کے چپوؤں کے سہارے ہم کشتی کو گہرے پانی کی طرف لے چلے۔ اس علاقے میں تاحدِ نظر ساحل ویران پڑا ہوا تھا اور سوائے بے ترتیب پہاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

دلیپ کی ہدایت پر کشتی کا رخ درست کیا جانے لگا پھر دلیپ نے بغل سے بحری چمگادڑ کی کریہہ آواز یکساں وقفوں کے تین بار بلند کی۔ تیسری آواز ابھرتے ہی گہرے سمندر میں کافی دور سبز رنگ کی محدود روشنی نمودار ہوئی اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

"ہمیں اسی طرف جانا ہے۔" دلیپ نے معدوم ہونے والی روشنی کی سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم ایک بار پھر پلاسٹک کے چپوؤں سے پانی کاٹنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے گہرے سمندر میں لنگر انداز ایک تاریک بوٹ کا ہیولا نظر آنے لگا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر وہاں کچھ ہیولے نقل و حرکت میں بھی مصروف نظر آئے۔

"کون ہے ادھر؟" اچانک موجوں کے شور پر حاوی ایک انسانی آواز گونجی جو تاریک بوٹ کی جانب سے سنائی دی۔

"دو مچھیرے۔" دلیپ منہ پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے چیخا کیونکہ ہم ہوا کی مخالف سمت میں جا رہے تھے اور ابھی بوٹ ہم سے کافی دور تھی۔

"چلے آؤ۔" بوٹ سے کہا گیا۔

پرسکون سمندر کی موجوں سے لڑتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں ہم اس بوٹ کے قریب پہنچ گئے۔ عرشے سے رسے کی سیڑھی لٹکائی گئی اور ہم دونوں باری باری اوپر چڑھ گئے۔ لائف بوٹ بھی اوپر کھینچ لی گئی اسی کے ساتھ بوٹ کا ڈیزل انجن بیدار ہو گیا۔

اندھیری رات میں سمندری ہوا کے خنک تھپیڑے اگر ناگوار نہیں لگ رہے تھے تو کچھ ایسے خوشگوار بھی نہیں تھے۔ بوٹ پر مچھلیوں کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ عرشے پر پہنچنے کے بعد میں اندھیرے میں آگے بڑھا تو میرے پیر نیچے پڑے ہوئے جال میں الجھ گئے۔

اسی وقت بوٹ کا لنگر اٹھا دیا گیا اور وہ ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ رخ بدلنے لگی۔

عرشے پر میرے ساتھ دلیپ کے علاوہ دو آدمی اور موجود تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں محدود روشنی والی سگنل ٹارچ تھی جس کے شیشے پر سبز فلٹر لگا ہوا تھا۔ گو موٹر بوٹ حرکت میں آچکی تھی مگر اس کی تمام روشنیاں ابھی تک گل تھیں۔ ہمیں اسی سگنل ٹارچ کی محدود سبز روشنی میں کیبن تک پہنچایا گیا جہاں وہیل پر ایک داڑھی والا خوفناک شخص نیلی جین اور جیکٹ پہنے مصروف تھا۔ کنٹرول پینل پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی رنگین روشنیوں کے انعکاس میں اس کا چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ کیبن میں اس کے علاوہ تین افراد اور موجود تھے۔

ان سب کے لباس ماہی گیروں جیسے تھے اور وہ بوٹ میں ساخت کے اعتبار سے چھوٹا فشنگ ٹرالر معلوم ہو رہی تھی۔ بوٹ کا انجن بہت طاقتور تھا کیونکہ رخ درست کرنے کے بعد اس کی رفتار تیزی کے ساتھ بڑھی تھی اور اب وہ سیدھی جا رہی تھی۔

"اسے بتا دیا ہے نا؟" وہیل پر موجود شخص نے مڑے یا کسی کو مخاطب کیے بغیر سوال کیا۔

"سنو!" اچانک دلیپ نے میرا شانہ جھنجوڑ کر کہا۔ "ہم کھلے سمندر میں ماہی گیری کے لیے جا رہے ہیں، تمہارا نام ودیا راتے ہے، عمر ۴۳ سال باپ کا نام اسنہا راتے، سمجھ گئے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ اس وقت میرا ذہن ماضی کے دریچوں میں جھانک رہا تھا۔ کراچی میں میرا بھی یہی کام تھا مگر میں نے کبھی یوں چوروں کی طرح بحری سفر نہیں کیا تھا۔ میں شان و شوکت سے اپنی فرم کے دفتر میں بیٹھتا تھا اور میرے کارندے کھلے سمندر میں لنگر انداز جہازوں سے مال لا کر بازار میں پہنچاتے تھے پھر جس راستے میں عروج پر پہنچا تھا اسی راہ سے میرا زوال شروع ہوا۔ میری ساحل نامی لانچ پر چھاپہ پڑنے کی خبر جس وقت مجھ

تک پہنچنے میں تاکہ شس کی بازی پر بازی ہار رہا تھا اور ساحل کی اطلاع ملنے پر ہاتھ کی بازی میں اپنا سجا سجایا گھر بھی ہار کر میں تن کے کپڑوں سے سڑک پر نکل آیا تھا۔ اس کے بعد سے میں در بدر بھٹک رہا تھا اور اب مقدر نے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ ملاحوں کی ایک فوج کی کفالت کرنے والا صفدر علی ایک بدبودار لانچ میں معمولی ملاح کی طرح سمندر میں چوری چھپے سفر کر رہا تھا۔

اور یہ میری بدنصیبی کی انتہا تھی کہ اس وقت میرا نام بھی اپنا نہ تھا۔ میری ولدیت بدل دی گئی تھی، میری عمر پہ ڈاکہ ڈالا گیا تھا مگر میں یہ سب ستم جھیلنے پر مجبور تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں بندرگاہ کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اسی کے ساتھ موٹر بوٹ کی بھی ساری روشنیاں جل اٹھیں، رفتار میں بھی بتدریج اعتدال آگیا۔

موٹر بوٹ بندرگاہ کے بیرونی علاقے سے گزر رہی تھی تو کسٹم پولیس کی ایک گشتی لانچ سے رُکنے کا سگنل موصول ہوا۔ موٹر بوٹ کے کپتان نے دانت پیس کر چند مہمل اور غیر عملی گالیاں دیں اور چند منٹ میں بوٹ کی رفتار دم توڑ گئی۔

اس کے ساتھ ہی کسٹم والوں کی بوٹ ساتھ آگئی۔ چند سوال جواب ہوتے۔ ہماری بوٹ سے ایک شخص کاغذات لے کر کسٹم والوں کی بوٹ پر گیا، اور ماہی گیری کا پرمٹ دیکھنے کے بعد انھوں نے سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

وقت گزرتا رہا۔ بندرگاہ کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آتے۔ سمندر کے مشرقی کناروں سے سفیدی جھکنے لگی۔ ستارے دُھندلانے لگے۔ پھر نسیم سحری کے لطیف جھونکے سرسرائے۔ فضا میں بحری پرندے معصوم آوازیں نکالتے قطار در قطار خوراک کی تلاش میں پرواز کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سورج طلوع ہو گیا۔

میرے ساتھ کیبن میں بیٹھے ہوتے سب لوگ اُونگھ رہے تھے مگر بوٹ کا ناخدا پوری بشاشت سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

معاً میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ میرے پستول میں اب بھی گیارہ مہلک تیر موجود تھے اور وہ تعداد میں کُل سات تھے۔ ان میں سے چھ اُونگھ رہے تھے، ساتواں بوٹ چلانے میں منہمک تھا۔ میں بآسانی ان سب کو زیر کر سکتا تھا۔

میں نے آہستگی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اُونگھنے والوں میں سے کوئی نہ چونکا اور میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

"ہینڈز اپ!" میری للکار ان سب کے اعصاب پر کسی بم کے دھماکے کی طرح گری اور وہ ہڑبڑا کر عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگے۔ ناخدا نے اپنے مقدر کو ایک وزنی گالی دے کر پوری قوت سے آہنی پہیے پر گھونسہ مارا، اور دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

"میرے ہاتھ میں مہلک تیر برسانے والا پستول موجود ہے۔" میں نے باری باری ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اور اس میں [illegible] تمھاری جلد کے کسی بھی حصے میں پیوست ہو جائیں تو ایک [illegible] حصے میں موت واقع ہو جائے گی لہٰذا اب وہی کرو جو میں [illegible]

"کام ایسا بتانا جو ہم کر بھی سکیں۔" ناخدا تلخ لہجے میں [illegible] حال سے ذرا بھی خائف نظر نہ آتا تھا اور خوفناک نظروں سے مجھے [illegible]

"تم بوٹ کی رفتار کم کرو۔" میں نے اسے حکم دیا۔

"ہاتھ اٹھا کر یہ کرنا مشکل ہے۔" وہ مضحکانہ لہجے میں بولا۔

"بکواس مت کرو سوّر کے بچے، میں تمھیں جہنم [illegible]

میں اس وقت ایسی خطرناک صورتِ حال سے دوچار تھا کہ اس [illegible] مجھے ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ اگر مجھ سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو [illegible] میں میری بوٹیاں اڑا دیتے۔

ناخدا مُڑ کر بوٹ کی رفتار کم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

"اور دلیپ! تم باقی لوگوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دو [illegible] بعد سب کے پیر جکڑ دو۔" میں نے اگلا حکم دیا۔

دلیپ نائیلون کی رسیاں اٹھانے آگے بڑھا تو اس [illegible] مسلسل مجھ پر مرکوز تھیں مگر میں ہر طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ ناخدا نے اچانک بوٹ کی رفتار بڑھا دی اور پھرتی سے میری [illegible] مگر میں ایسی حرکت کے لئے تیار تھا۔ میں ایک کھڑکی تھام کر [illegible] بچ گیا اور پستول کی نال ناخدا کی طرف اُٹھالی۔ اس نے سر کو جھکا [illegible] رفتار کم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

نیچے گرنے والوں میں سے کسی کو ہتھیار نکالنے کی مہلت [illegible] دلیپ نے فرش پر ایک کونے میں پڑا ہوا جال میری طرف اُچھالا [illegible] پر میری انگلی چل گئی۔ وہ حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر [illegible]

اس کا عبرتناک حشر دیکھ کر بقیہ پانچوں کے چہرے دہشت [illegible] سفید پڑ گئے۔

میں نے ان میں سے ایک کو دلیپ کا چھوڑا ہوا کام پورا [illegible] کا حکم دیا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو میں نے خود ہر ایک کی بندش [illegible] ان سے مطمئن ہو کر میں نے چھٹے کو خود جکڑ دیا۔ وہ میرے پستول [illegible] اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔

"مائیکل!" میدان صاف کرنے کے بعد میں نے ناخدا کو [illegible] وہ بشرے پر ناگواری کے اثرات لئے میری طرف گھوم [illegible]

"دلیپ نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو اس کا حشر [illegible] سامنے ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے اسے مار دیا؟" وہ حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں ـــــ ان زہریلے تیروں کی صفت یہی ہے کہ ان [illegible] کو چیخنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور [illegible]

مائیکل نے باری باری اپنے تمام ساتھیوں کا جائزہ لیا [illegible] [illegible] آواز میں بولا۔ "اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"یہ موٹر بوٹ کہاں جا رہی تھی؟"

"بوٹ کی منزل کا علم دلیپ کو تھا، اُسے تم نے مار دیا۔" اُس [illegible] نے بلا تامل جواب دیا۔ "اب یہ وہیں جائے گی جہاں تم چاہو گے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کھلے سمندر میں کسی جہاز سے اسمگلنگ [illegible] کا مال لینے جا رہے تھے۔" یہ کہہ کر میں اس کے تبصرے کا منتظر رہا مگر وہ [illegible] ایک لفظ نہ بولا تو قدرے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "مگر اب یہ بوٹ واپس [illegible] بمبئی کے کسی ویران ساحل پر لگے گی۔"

"جیسا تمہارا حکم۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مگر یہ کوشش [illegible] بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ کسٹم والے کھلے سمندر سے واپس آنے والی ہر بوٹ کو [illegible] اچھی طرح چیک کرتے ہیں۔ پھر ہم اتنی جلدی واپس لوٹیں گے تو انہیں لازماً [illegible] شبہ ہو گا۔"

"کیا مقصد ہے تمہارا؟" اس کی گفتگو نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔

"میں خود اس زندگی سے تنگ آیا ہوا ہوں۔" وہ بیحد سنجیدہ تھا۔

"یہ خیال رکھنا کہ تم نے کوئی چالبازی کی تو میں کوئی رعایت نہ [illegible] بلا تامل خواہ سمندر میں بھٹک کر مجھے جان دینی پڑے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"بمبئی واپس چلیں گے۔" اس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

"مگر ابھی تو تم اس میں خطرات بتا رہے تھے۔"

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔"

"نہیں۔ میں تمہاری تجویز سُننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ چند ثانیوں تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "کھلے سمندر میں بحری [illegible] جہازوں کی گزرگاہ پر کئی ویران اور آباد جزائر موجود ہیں، ہم وہاں پناہ لے سکتے ہیں۔ جوں ہی ہمیں کوئی جہاز نظر آیا ہم اس سے مدد مانگ کر نکل سکتے ہیں۔"

میں خاصی دیر اس کی تجویز پر غور کرتا رہا۔ بمبئی جانے کا مطلب تھا کہ میں ایک بار پھر ان ہی خطرات میں گھر جاؤں جن سے نجات کے لئے میں مہینوں سے کوشاں تھا۔ پولیس، انڈین سیکرٹ سروس، کے [illegible] دلگیر سنگھ اور چینگ ہوا ـــــ ان میں سے کوئی بھی کم خطرناک نہ تھا۔ آخر میں نے مائیکل کو کوئی جزیرہ تلاش کرنے کی اجازت دے دی [illegible] نقشے اور کمپاس کی مدد سے سمتوں کا تعین کرنے لگا [illegible] سنبھال کر کوچ پر دراز ہو گیا۔ میرے لئے کھلے سمندر میں سمت کا کوئی [illegible] باقی نہیں رہا تھا۔ ہر طرف ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا نیلگوں پانی ہی پھیلا ہوا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ مائیکل اتنی آسانی سے میرے ساتھ [illegible] آمادہ ہو گیا ورنہ میں شدید مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا۔

[illegible] سفر میں گزرا۔ میں نے خشک غذا کا ایک ڈبہ کاٹ کر اپنا پیٹ بھرا کیونکہ خالی پیٹ کے سبب مجھے متلی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک ڈبہ مائیکل کے حوالے کیا اور جب سورج مغربی اُفق کے اُس پار ڈوب رہا تھا تو مائیکل بے اختیار خوشی سے چلا اُٹھا۔

"ہم ایک جزیرے کے قریب ہیں۔ سامنے خشکی نظر آ رہی ہے۔"

میں نے اس سے محفوظ فاصلے پر رہتے ہوئے ونڈ شیلڈ سے دیکھا اور کچھ دُور سمندر کے سینے پر سرسبز درختوں کی قطار ایک لکیر کی صورت میں اُبھری ہوئی نظر آئی۔ گو مائیکل کا رویّہ میرے ساتھ بہت ہی مصالحانہ تھا مگر میں آخر تک کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا۔ بوٹ کی روشنیاں ایک بار پھر جل اُٹھیں مگر وہ جزیرہ قریب نہ آیا۔ مجھے جاگتے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور میرے اعصاب بوجھل ہونے لگے تھے، سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے نصف شب کے قریب بوٹ ساحل کے قریب پہنچی۔ میں مائیکل کے پیچھے کھڑا ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین مرتبہ بوٹ کا سائرن بجایا اور یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ ساحل پر تین بار سبز روشنی بالکل اسی طرح جلائی اور بجھائی گئی جس طرح لائف بوٹ کے لئے موٹر بوٹ پر جلائی اور بجھائی گئی تھی۔

مگر مجھے خطرے کا اندازہ قدرے تاخیر سے ہوا۔ میری محویت سے فائدہ اُٹھا کر مائیکل کسی بھوکے درندے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ تکان سے ویسے ہی میرے اعصاب شکستہ ہو رہے تھے۔ مائیکل کی پہلی ہی ٹکر نے مجھے بوٹ کے چوبی فرش پر ڈھیر کر دیا اور پستول میری گرفت سے نکل گیا۔ اس کے بعد میرے سر پر ایک بھرپور ٹھوکر پڑی اور میرا ذہن اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں مٹی اور پھوس کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں پیال پر پڑا ہوا تھا جس کی چھت پر سیمنٹ کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پیال سے اُٹھنا چاہا لیکن چکروں کے باعث دوبارہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میرا پورا سر کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔

میں نے سر گھما کر پورے جھونپڑے کا جائزہ لیا مگر وہاں میرے سوا کوئی ذی رُوح موجود نہیں تھا۔ میں نے چند ثانیوں تک اپنی بکھری ہوئی قوّت کو مجتمع کیا اور بلند آواز سے مائیکل کو پکارا۔

میری آواز کے جواب میں جھونپڑے کے دروازے پر قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ پھر گنجے سر والا ایک خبیث اور سیاہ چہرہ دروازے میں نظر آیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے میرا جائزہ لیا اور اس کے قدموں کی آہٹیں کہیں دُور معدوم ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر فضا میں قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اس بار آنے والے تعداد میں کئی تھے۔ جب وہ اندر آئے تو دلگیر سنگھ ان میں پیش پیش تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا حال ہے تیرا؟" اُس نے پیال پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"مائیکل نے میرا سر توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" میں کراہتے ہوئے بولا۔

"یہاں آتے ہوئے راستے میں تُو نے جو کچھ کیا وہ جگر والوں کا کام ہے۔" دلگیر سنگھ خلافِ توقع مصالحانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ "مگر اب یہ چکر ختم ہو جانا چاہیئے۔ میں نے دلیپ کا خون تجھے صرف اس لئے معاف کیا ہے کہ وہ عقل کا کام بھی طاقت سے لینے لگا تھا اور اس جزیرے پر مجھے عقل والے کی ضرورت ہے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"سرکاری ریکارڈ پر یہ ویران جزیرہ ہے مگر یہ ملکیت ہے میرے آدمی یہاں افیم اور حشیش کی بڑے پیمانے پر کاشت کرتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک سو اُنیس ہے۔ تجھے یہاں رہ کر ان سے کام لینا ہے۔ آج سے اس جزیرے پر تیرا حکم چلے گا۔"

"ابھی تو میں بستر سے بھی اُٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے، جب تک تُو سنبھل نہیں جاتا میں یہیں رہوں گا۔ ویسے میری واپسی جلد از جلد ہونی ہے۔"

دو دن میں میری طبیعت سُدھر گئی۔ اس دوران یہ سوچ کر مجھے کوفت ہوتی رہی کہ مائیکل نے نہایت مکاری سے مجھے بیوقوف بنایا تھا۔ اس کا شروع سے جو پروگرام تھا اس نے مجھے دھوکے میں رکھ کر اسی پر عمل کیا اور مجھے آخر تک اس پر شُبہ نہ ہو سکا۔

طبیعت سُدھرنے کے بعد میں نے دلگیر سنگھ کے ہمراہ جزیرے کا چکر لگایا۔ وہاں کسی زمانے میں گھنا جنگل رہا ہو گا مگر دلگیر نے جنگل کی ساحلی پٹی چھوڑ کر جزیرے کے وسطی حصے سے سارا جنگل صاف کرا دیا تھا اور وہاں دُور دُور تک افیم اور حشیش کے پودے لہلہا رہے تھے جن کی دیکھ بھال کے لئے جزیرے پر وہ مجرم جمع کئے گئے تھے جو سنگین جرائم کے تحت پولیس کو مطلوب تھے۔ دلگیر سنگھ یہاں ان کی تمام بنیادی ضروریات پوری کرتا تھا۔ اور ان سے سختی کے ساتھ پورا کام لیتا تھا۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں جن سے کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ مقررہ باریوں کے مطابق جزیرے کے باسیوں کے ساتھ وقت گزاریں۔

جزیرے کے ساحل پر جنگل باقی چھوڑ دینے کا مقصد یہ تھا کہ اس علاقے سے گزرنے والے بحری جہاز جزیرے کے وسطی حصے میں ہونے والی کارروائیوں سے باخبر نہ ہو سکیں۔ بمبئی سے رابطے کے لئے سمندر سے ایک گہری نہر جزیرے میں لائی گئی تھی جس نے ایک گھاٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ منشیات کی کاشتکاری کے لئے ساری آبی ضروریات تین کنوؤں سے پوری ہوتی تھیں جن پر کثیر صرفے سے ڈیزل سے چلنے والے پمپ نصب کئے گئے تھے۔ اس وسیع و عریض جزیرے پر زیرِ زمین میٹھے پانی کے ذخائر طویل عرصے کے لئے کافی تھے۔

"ان میں ایک لڑکی بہت طرار ہے۔" جزیرے پر مقیم عورتوں کے بارے میں بتلاتے ہوئے دلگیر سنگھ نے کہا۔ "اس پر دو آدمیوں کے قتل کا الزام ہے اور میرے آدمی اسے اندور سے لائے تھے۔ ... ہونے کو ہیں مگر کسی مرد کو قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔ ایک دو لوگوں کو ... ذرا اس سے ہوشیار رہنا۔"

"دو روز میں اس کا سارا کس بل نکال دوں گا۔" میں ...

تو بتاؤ کہ جزیرے کا نظام چلانے کے لئے میرے پاس کیا ہے ... نہتا انہیں کیسے سنبھال سکوں گا؟"

"تیرے جھونپڑے میں ریوالور سے ٹامی گن تک ... اس کی چابیاں میں وہیں چل کر تیرے حوالے کر دوں گا۔"

دلگیر سنگھ نے جس طرح دلیپ کا خون معاف کیا تھا ... پیشِ نظر میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ کچھ عرصہ ... جزیرے پر ... جائے تاکہ لوگ صفدر علی اور اس کی کہانیوں کو بھول جائیں۔ پھر ... شہروں میں رہتے ہوئے سیتا کی راہ تلاش کرنا میرے لئے ... مشکل تر ہوتا چلا گیا تھا۔

جس وقت دلگیر سنگھ جھونپڑے میں موجود ... مجھے اسلحے کا ذخیرہ اور شراب کی بوتلیں دکھا رہا تھا ... جزیرے پر ... سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں کچھ نسوانی آوازیں بھی ...

"پھر ہو گیا بلوہ۔" دلگیر سنگھ غصے میں بولا۔

"عورتیں بھی جھگڑے میں شریک ہیں۔"

"عورتیں کیا، وہی حرامزادی ہو گی۔" دلگیر سنگھ ایک رائفل ... حوالے کرتے ہوئے بولا۔ دوسری اس نے خود سنبھال لی تھی اور ... کو تالا لگا رہا تھا تاکہ جائے واردات پر پہنچ کر معاملہ جلد ہی ختم کر ...

"کون حرامزادی؟" میں نے سرسری طور پر سوال کیا۔

"وہی پارسا کی بچی، سیتا ... اور کون ہو گی۔" دلگیر سنگھ ... سے بولا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایسی شہر در شہر ... پر ایک ہی سیتا تھی جس کی تلاش میں، میں نہ جانے کہاں کہاں ... ہوں اور وہ بدنصیب بحرِ ہند کے اس گناہ پرور جزیرے پر درندوں ... غول میں گھری اپنی آبرو کی پیکار میں مصروف تھی۔

میرا سینہ غرور سے تن گیا۔ وجود میں عزم اور ہمت کی ... سرایت کر گئی۔ دلگیر سنگھ کے ہتک آمیز الفاظ اس انکشاف کے ... میرے سینے میں چبھنے لگے اور بے اختیار میں نے اس پر ... رائفل کی اُٹھتی ہوئی نال دیکھ کر دلگیر سنگھ بوکھلا گیا۔ "یہ ... دماغ چل گیا ہے تیرا؟" وہ بے اختیار چیخ اُٹھا۔

"دماغ نہیں چلا، اب تو ہوش آیا ہے دلگیر سنگھ!" میں ... لہجے میں کہا اور اسی وقت باہر سُنائی دینے والا شور یک بیک ... نہ جانے اس شور میں کیا مقناطیسی اثر تھا کہ میں ایک لحظہ ... نہیں ٹھہر سکا اور رائفل اُٹھائے بے اختیار اُدھر دوڑ پڑا جدھر ... سُنائی دے رہا تھا۔ دلگیر سنگھ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا ...

پر تاحدِ نظر سفیدی مائل سبز پودے لہلہا رہے تھے۔ ان کی سفیدی میں مٹیالا پن نمایاں تھا۔ پودوں میں سفید رنگ کے بڑے بڑے پھول کھلے ہوئے تھے اور ان ہی کے درمیان بھورے رنگ کے ... ڈوڈے تھے جن میں خاص ترتیب سے سوراخ کئے گئے تھے تاکہ ان ... سے بہنے والا سفید رس جمع کر کے حاصل کیا جا سکے۔ کھیتوں کے درمیان ... دیوانہ وار اس طرف دوڑ رہا جدھر سے ہر لمحے روشن پہ چیخ و پکار کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"صفدر... صفدر! کیا ہو گیا ہے تجھے؟" مجھے اپنے عقب میں دلگیر سنگھ کی تحیر آمیز آواز سنائی دی۔ مگر میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ سیتا کا نام سنتے ہی میرے وجود میں جوش کی ایک ایسی لہر سرایت کر گئی تھی کہ مجھے اپنی کسی حرکت پر اختیار نہیں رہا تھا۔

کھیتوں کو عبور کرنے کے بعد میں اس میدان میں پہنچا جہاں پھوس کے چھپروں کے سائے میں افیون کو خشک کیا جاتا تھا۔ وہاں کئی عورتیں ایک دوسرے سے بری طرح گتھی ہوئی تھیں اور کھیتوں میں کام کرنے والے تنومند مزدور بھیڑ کی صورت میں ان کے گرد جمع تھے۔

ان عورتوں کے لباس کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ہر مزدور کی بھوکی آنکھیں ان ہی شگافوں پر جمی ہوئی تھیں۔ تماشائیوں میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ پوری قوت سے چیخ چیخ کر لڑنے والیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اچانک دلگیر سنگھ غضبناک آواز میں چیخا، اور تماشائیوں کی بھیڑ افراتفری کے عالم میں کھیتوں کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ یوں سہم گئے تھے جیسے انہوں نے ملک الموت کی آواز سن لی ہو۔

میں لڑنے والیوں کے چہرے نہ دیکھ سکا۔ ان پر دلگیر سنگھ کی للکار کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے رائفل زمین پر پھینکی اور دیوانہ وار ان پانچوں کے درمیان جا گھسا۔ ان سب کے چہرے شدید ضربات کے باعث سوجے ہوئے تھے۔ رخساروں پر نوکیلے ناخنوں کی لمبی لمبی خراشوں سے تازہ خون رِس رہا تھا مگر ان میں کوئی بھی میری سیتا نہیں تھی۔

میری اچانک دخل اندازی پر انہیں چند ثانیوں کے لئے حیرت ہوئی۔ پھر سانولے رنگ کی ایک دل کش لڑکی چیخی: "یہ حرامزادہ کون آ گھسا، پہلے اس کے ہاتھ پیر توڑ دو، ہم اپنا فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

یہ کہتے ہوئے اس لڑکی نے اچھل کر میرے پیٹ میں لات ماری اور میرے سنبھلنے سے قبل ہی ان سب نے مل کر مجھے زمین پر گرا لیا۔

"رائفل ... رائفل اٹھاؤ!" اچانک اس سانولی لڑکی کی آواز گونجی، اُس وقت وہ میرے سینے پر سوار تھی۔

اسی وقت فضا رائفل کے ہولناک شور سے لرز اٹھی اور اسی کے ساتھ دلگیر کی سخت آواز سنائی دی: "خبردار جو کسی نے زمین سے رائفل اٹھائی۔" ... سنبھلنے کے لئے خاموش ہوا۔ شاید میری رائفل کی طرف بڑھنے والیوں کے ردِ عمل کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب وہ ان سے مطمئن ہو گیا تو اس کی آواز دوبارہ گونجی۔ "اسے چھوڑ دے سیتا ورنہ تیرا بھیجا اڑا دوں گا۔"

سیتا شکست خوردہ انداز میں میرے سینے سے اتر گئی۔ دوسری دو لڑکیوں نے بھی میرے پیر آزاد کر دیئے اور میں خفت آمیز انداز میں مسکراتا ہوا زمین سے اٹھ گیا۔ میری نگاہیں اس لڑکی پر جمی ہوئی تھیں جسے دلگیر سنگھ نے سیتا کہہ کر پکارا تھا۔ مگر وہ میری گمشدہ سیتا ہرگز نہیں تھی۔

"یہ کمینہ ہمارے درمیان کیوں آیا؟" سیتا دلگیر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکا رکھے تھے۔

"ہوش میں رہ کر بات کر۔" دلگیر کسی درندے کی طرح غرایا "یہ اس جزیرے کا نگراں ہے اور تیری بوٹیاں بھی اڑا سکتا ہے۔ تُو اب یہاں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے!"

"مجھے واپس اندور بھجوا دے، میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رکوں گی۔"

وہ اپنے پھٹے ہوئے لباس اور زخموں سے بالکل بے پروا نظر آ رہی تھی۔

"یہ تیرے باپ کا گھر نہیں ہے جہاں تیری مرضی چلے گی۔" دلگیر سنگھ نے رائفل کی نال اس کے سینے کی طرف اٹھائی "جاتی ہے یا ابھی تیرا قصہ پاک کروں!"

"میں جا تو رہی ہوں مگر کان کھول کر سن لے کہ تیرے تلوے چاٹنے والوں میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ میرے قریب آ سکے۔ میں نے تیرے پاس پناہ لی ہے اپنے جسم کا سودا نہیں کیا۔ کھانے پینے کے بدلے میں سارا دن کھیتوں میں کام کرنے کو تیار ہوں لیکن بکاؤ مال ہرگز نہیں بنوں گی۔" وہ واپس مڑتے ہوئے بولی۔

دلگیر سنگھ نے اس مرتبہ اسے یکسر نظر انداز کر دیا اور ایک قوی الجثہ عورت سے مخاطب ہو گیا جو لڑنے والیوں میں شامل تھی۔ "کیوں شرمیلی! کیا ہو رہا تھا یہاں؟"

"میں اس کو سمجھا رہی تھی سرکار۔" وہ ہولے ہولے کراہتی ہوئی بولی: "مگر اس نے بال نوچ کر مجھے زمین پر گرا لیا۔ حرامزادی کے بدن میں سانڈ جیسی طاقت ہے۔ اگر یہ دو تین عورتیں نہ آ جاتیں تو آج وہ مجھے مار ہی ڈالتی اور سارے مرد بھی کھیتوں سے نکل نکل کر اسے شہ دینے لگے۔ ہر ایک اس کا خوشامدی بنا ہوا تھا۔"

"اب اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں، میں اس کا علاج کروں گا۔" دلگیر سنگھ نے سرد لہجے میں کہا اور واپس ہو لیا۔ میں بھی اپنی رائفل اٹھا کر سر جھکائے اس کے پیچھے چل دیا۔

"تو نے مجھ پر رائفل کیوں اٹھائی تھی؟" وہاں سے دُور نکل آنے کے بعد دلگیر نے سرد لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"غلطی ہو گئی۔" میں نے مجرمانہ لہجے میں اعتراف کیا۔

"مگر کیوں؟" وہ غصیلے لہجے میں غرایا۔ "تجھ کو یہ ہمت کیسے ہوئی؟ کیا اس لئے کہ میں نے تجھے دلیپ کا خون معاف کر دیا تھا؟"

"سیتا کا نام سُن کر میں حواس کھو بیٹھا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میری بیوی کا نام بھی سیتا ہے اور وہ مہینوں سے مجھ سے بچھڑی ہوئی ہے۔"

دلگیر نے پُرخیال انداز میں طویل سیٹی بجائی اور چند سیکنڈ کے بعد بولا۔ "اب مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے۔ تیری بیوی وہی تو نہیں جس نے بنارس میں کئی پنڈتوں کا خون کیا تھا؟"

"پنڈتوں کا نہیں، پاپیوں کا۔" میں نے سوگوار لہجے میں تصحیح کی۔ "وہ اسے ایک اناتھ آشرم میں اٹھالے گئے تھے۔ وہاں اپنی عزت بچانے کے لئے اسے خونریزی کرنی پڑی تھی ورنہ وہ بڑی معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔"

"کہاں گئی وہ؟" دلگیر کے لہجے میں تجسس پوشیدہ تھا۔

"پتہ ہوتا تو اس کا سُراغ ہی نہ لگا لیتا۔ بس یوں لگتا ہے جیسے زمین اسے نگل گئی ہو۔" اس تذکرے پر میرے دل کے زخم ہرے ہوگئے۔

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تجھے کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" دلگیر سنگھ میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "ورنہ اسی وقت تیرا کام تمام کر دیتا۔"

"سیتا کے نام پر مرنے کا مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوتا۔"

"بڑی محبت ہے اپنی بیوی سے!" وہ زور سے ہنسا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ ایک عورت بیک وقت بیوی اور محبوبہ نہیں ہوسکتی مگر سیتا سے میرے یہ دونوں رشتے تھے۔ وہ بڑی فراخدل اور دلبر لڑکی ہے!"

"کہاں بچھڑی تھی وہ تجھ سے؟"

"فیض آباد میں۔" میں نے دانستہ جھوٹ بولا "پولیس سے بچنے کے لئے ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ پھر کبھی نہ مل سکے!"

باتیں کرتے ہم جھونپڑے پر پہنچے تو اچانک مجھے اپنا وہ پستول یاد آگیا جو میں نے یوری الانوف سے چھینا تھا۔ موٹر بوٹ پر مائیکل کے ہاتھوں بے ہوش ہونے کے بعد وہ میرے قبضے میں نہیں رہا تھا۔

"وہ مجھے پسند آگیا ہے!" میرے استفسار پر دلگیر سنگھ نے کہا۔ "اس سے پہلے میں نے زہریلے تیر پھینکنے والا ایسا کوئی ہتھیار نہیں دیکھا اور سیلرز کلب میں تو نے جھوٹ بول کر اسے چھپایا تھا۔"

"مگر اس میں صرف گیارہ تیر ہیں۔ اس کے بعد وہ بے کار ہے!" میں نے اس کا آخری فقرہ نظرانداز کر دیا۔

"بمبئی میں ایسے ایسے کاریگر پڑے ہیں جو توپیں بنا سکتے ہیں۔ نمونہ دے کر میں سینکڑوں ننھے ننھے تیر بنوالوں گا۔ اس میں نہ دھماکے کا ڈر ہے نہ دار خطا ہونے کا ڈر۔ میں نے ایک بلی پر اس کا نشانہ آزمایا تھا تیر لگتے ہی وہ دم توڑ گئی۔" وہ بھی شاید اچھے موڈ میں تھا۔ میرے جھوٹ کا دوبارہ تذکرہ نہیں کیا۔

"اگر تمہیں وہ اتنا ہی پسند ہے تو لے لو، اس جزیرے پر وہ میرے کس کام آئے گا۔" میں نے کہا۔

"ایک بات یاد رکھنا کہ اس جزیرے پر میں نے ایک ایک آدمی بڑی محنت سے جمع کیا ہے۔ ان میں بیشتر قاتل ہیں، کئی تو پھانسی سے چند دن پہلے کال کوٹھریوں سے بھاگے ہیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انہیں پناہ گاہ ایسی مل سکے گی۔ موت کو قریب سے دیکھنے کے بعد اب وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور پوری طرح میرے وفادار ہیں۔ بس ماحول کی یکسانیت سے اُکتا کر کبھی کبھا

شورش پر اتر آتے ہیں ایسے مواقع پر ڈانٹ پھٹکار یا ہلکا سا تشدد ... ہے، جانی نقصان کو حتی الامکان ٹالنے کی کوشش کرتا ... حکمت عملی سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو، جب تک میری جان کو خطرہ لاحق نہ ہوا، میں ... ایک مزدور بھی نہ مارا جائے گا۔ میں تمہاری مجبوریوں سے واقف ہوں۔"

اس پراسرار جزیرے پر ... اگلے چند روز میں میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ جزیرے پر افیم اور حشیش کی کاشت میں مشینی طریقوں سے کام نہیں لیا جاتا تھا مگر دلگیر سنگھ کے لائے ہوئے آدمی نہایت ماہر ... لئے سونا اگاتے تھے۔

جزیرے کی نرم اور ریتلی زمین میں مناسب اقسام کی ... کر ہر سال زمین از سرِ نو تیار کی جاتی تھی اور خزاں کے موسم میں افیم کی ... گرمی کے دنوں میں فصل اتاری جاتی تھی۔ ان پودوں سے حاصل ... افیم میں مارفین کی تعداد بہت کافی ہوتی ہے جس کی بنا پر عالمی منڈی ... کی زیادہ قیمت ملتی تھی۔ دلگیر سنگھ نے مجھے بتایا کہ افیم کے پودوں کی ... ہوتی ہیں جو پھولوں کے رنگ کی بنا پر پہچانی جاتی ہیں، گو افیم کے پھول ... اور عنابی بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں نشہ آور جزو کم ہوتا ہے جبکہ سفید ... قسم کی ضمانت ہوتے ہیں۔ افیم کے حصول کا طریقہ بھی بہت دلچسپ ... تھا۔ پھول جھڑنے کے بعد جب پوست کے ڈوڈے پکے ہوتے ہیں ... ترتیب سے چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیئے جاتے ہیں اور ان سوراخوں ... نکلنے والا سفید رس جمع کر کے خشک کیا جاتا ہے تو وہ گہرا رنگ اختیار ... ہے۔ اس نرم افیم کو چار چار اونس کی چوکور ٹکیوں میں تبدیل کر کے جزیرے ... کر دیا جاتا تھا۔ دلگیر سنگھ نے ابتدا میں جس افیم کی کاشت کا تجربہ ... ہو کر سیاہ ہو جاتی تھی، اس میں مارفین کی تعداد بھی کم ہوتی تھی لہٰذا ... نفع ملتا تھا جب کہ اس جزیرے پر رسل و رسائل وغیرہ کی بنا پر پیداوار ... خاصی زیادہ آتی تھی۔ مگر دلگیر سنگھ منافع سے زیادہ رازداری پر توجہ ...

اسی طرح حشیش کے اونچے اونچے پودوں کے کھیت وسیع قطعات ... پھیلے ہوئے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو چرس کی کاشت سے کئی فائدے حاصل ... تھا۔ اس کے بیج تیل نکالنے کے مصرف میں آتے تھے، پودوں سے ... کیا جا سکتا تھا۔ مگر دلگیر سنگھ یہ اشیا سمندر میں پھینکوا دیتا تھا۔ چرس کی ... میں چھوٹے چھوٹے پیکٹوں پر اسے اتنا بھاری منافع ملتا تھا کہ اس نے ... نقل و حمل کے خطرات مول لینے سے ہمیشہ گریز کیا اور شاید یہی وجہ تھی کہ ... تک اہلکاروں کی نگاہوں سے محفوظ تھا۔

چرس اور افیم کی کاشت کے لئے آدمی الگ الگ بنے ہوئے ... افیم کے پودے ہر سال لگائے جاتے تھے جبکہ چرس ... دو ... مرتبہ کاشت ہوتی تھی مگر آدمیوں کو ہمیشہ یکساں سہولتیں فراہم کی جاتی ... سے ہر مہینے پڑا رہتا تھا جس میں دو بڑے بڑے خفیہ ڈیزل ... یہ ڈیزل ٹیوب ویل چلانے کے لئے جزیرے پر پہنچایا جاتا۔ خورد و نوش ...

... بحری پرندوں کے شکار پر تھا جو اس جزیرے پر کافی ملتا ... ہی حد تک ... گوشت، کافی، چائے، خشک دودھ اور سربند پھلوں کے ڈبے نپی تلی مقدار میں شہر سے آتے تھے اور حصے کے مطابق بانٹ دیئے جاتے تھے ... ضروریات پوری کرنے کے سلسلے میں ماہی گیری بھی بہت مؤثر تھی اس کے علاوہ جزیرے کے ایک حصے میں آسانی سے کاشت ہونے والی سبزیوں کے کھیت تھے جن کی وجہ سے لوگ غذا کی یکسانیت کا شکار نہیں ہو پاتے تھے۔

دلگیر سنگھ نے مجھے وہ خوبصورت کاٹیج بھی دکھایا جو باہر سے مٹی کا جھونپڑا نظر آتا تھا۔ مگر اس کے اندر دو صاف ستھرے اور آراستہ کمرے تھے جہاں بید کی کرسیاں اور نرم بستر والی مسہری کے ساتھ ہی بہت سی آسائشیں بھی میسر تھیں۔ کاٹیج کی چھت شہتیروں پر مٹی بچھا کر بنائی گئی تھی چھت پر جانے کے لئے ایک زینہ بھی تھا۔ چھت پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی مگر دلگیر نے بتایا کہ جزیرے پر آگ جلانے کے لئے لکڑی اور روشنی کے لئے صرف مٹی کا تیل ... سرچ لائٹس ہنگامی ضروریات کے لئے لگائی گئی تھیں ان کا سلسلہ ڈیزل سے چلنے والے ایک جنریٹر سے ملا ہوا تھا جس سے بیک وقت دو ہزار واٹ بجلی مل سکتی تھی۔ جنریٹر ... کاٹیج کے ایک محفوظ حصے میں نصب تھا۔

وہ کاٹیج سمندر سے لائی ہوئی مصنوعی نہر کے کنارے تھا جہاں موٹر بوٹ بھی لنگر انداز ہو سکتی تھی اس جگہ تختوں اور شہتیروں کو ملا کر ایسا پلیٹ فارم بھی بنایا گیا تھا۔ جو موٹر بوٹ سے سامان اتارنے اور لدائی کے وقت کام آسکے ہیں جس جھونپڑے میں مقیم تھا وہ اس کاٹیج سے تھوڑی دور واقع تھا۔

جب دلگیر سنگھ نے مجھے بتایا کہ وہ کاٹیج فی الوقت اس کے تصرف میں ہے اور اس کے جانے کے بعد میری رہائش گاہ بنے گا تو مجھے لازماً اسلحہ سے بھرے ہوئے اس فولادی صندوق کا خیال آیا جو میرے جھونپڑے میں موجود تھا۔

میرا سوال سن کر دلگیر سنگھ زور سے ہنسا اور بولا "یہ کاٹیج نیا بنا ہے۔ اس سے پہلے وہی جھونپڑا میری قیام گاہ ہوا کرتا تھا، وہ صندوق یہیں منتقل کیا جانا ہے!"

"تو کیا ابھی تک تم خود جزیرے کا انتظام چلاتے تھے؟"

"نہیں۔ لوگوں کے کام بٹے ہوئے ہونے کی وجہ سے سارا انتظام خودبخود چل جاتا تھا، میں ہر دوسرے تیسرے ہفتے چکر لگا لیتا تھا مگر شروع سے یہاں ایک کل وقتی افسر کی ضرورت ہے تیرے آنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا ہے۔ اس دور افتادہ جزیرے پر ایسا شخص سکون سے میرے مفادات کی نگرانی کر سکتا ہے جو شہروں سے خوفزدہ ہو ورنہ کوئی یہاں زیادہ دن نہیں ٹک سکتا۔"

"یہ بات تو درست ہے۔" میں نے اقرار کیا۔ "اگر شہروں میں مجھے پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کا خوف نہ ہوتا تو شاید یہ چند روز بھی گزارنے مشکل ہوتے۔ پہلے تو صرف منشیات کی اسمگلنگ کا الزام تھا اور اب دوسرے قتل کا بھی مجرم ہوں ان حالات میں یہ جزیرہ جنت معلوم ہوتا ہے۔"

دلگیر سنگھ کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری اس گفتگو سے مطمئن تھا۔ میں خود کو پوری طرح سے خوفزدہ ظاہر کر کے اس کا بھرپور اعتماد جیت سکتا تھا۔ بہر حال ابھی ...

جس روز وہ جانے والا تھا اس دن اس نے مجھے کاٹیج میں مدعو کیا۔ باہر چلچلاتی دھوپ پھیلی ہوئی تھی مگر درختوں کے کنج میں واقع کاٹیج میں موسم بہت خوشگوار تھا۔

"تو نے اپنی باتوں اور رویئے سے میرا دل جیت لیا ہے۔" ادھر اُدھر کی گفتگو کے درمیان دلگیر سنگھ نے اصل موضوع چھیڑا۔ "میرا خیال ہے کہ تو یہاں اپنا کام بخوبی سمجھ گیا ہے!"

"ہاں۔ اور اس سلسلے میں تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔" میں نے خلوص سے اسے یقین دلایا۔

"پہلے میرا ارادہ تجھے بتانے کا نہیں تھا مگر اب اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں چند ماہ کے لئے امریکہ جا رہا ہوں۔ نئی پارٹیوں سے سودوں کے علاوہ کچھ سیاحت کا بھی ارادہ ہے۔ اگر آدمیوں کے سر سے میری موجودگی کا خوف ٹل جائے تو افراتفری پیدا ہو سکتی ہے مگر تیرا معاملہ مختلف ہے۔ میری عدم موجودگی میں تجھے جزیرے پر اپنے فیصلوں پر انحصار کرنا پڑے گا اگر اب بھی کوئی دشواری ہو تو مجھ سے بات چیت کرلے!"

"کیا سیلرز کلب والے بھی تمہاری روانگی سے بے خبر ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں چینگ ہوا بڑی گندی ذہنیت کا مالک ہے۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ تیری زبان سے یہ بات اس تک پہنچے!"

"تم بے فکر رہو۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ویسے فی الحال مجھے اپنے کام میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ سیدھا سادا کام ہے!"

"تو نے نیپال سے کہاں کہاں مال بھیجا تھا؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

میں نے فوری طور پر ان غیر ملکی فرموں کے نام گنا دیئے جو مجسموں کی آڑ میں پیتو آرٹ فیکٹری سے منشیات خریدتے تھے!

دلگیر سنگھ نے تین اداروں کے نام نوٹ بک میں لکھ لئے جو امریکہ میں واقع تھے اور بولا۔ "امریکہ میں میرا مال چار گنے داموں میں بک سکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی منڈی میں مقابلہ بہت سخت ہے کیونکہ ترکی میں بڑے پیمانے پر منشیات کی کاشت ہوتی ہے اور وہ لوگ یہ سارا مال آس پاس کے علاقوں میں پھیلا دیتے ہیں تجھے وہاں سے اعلیٰ درجے کی چرس کے کیا دام ملتے تھے؟"

"میرا بیشتر کاروبار ہپیوں کے ذریعے چلتا تھا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھے چھ ہزار ڈالر فی کلو تک کے دام ملے ہیں۔"

دلگیر سنگھ نے برا سا منہ بنایا۔ "یہ بھی کم ہے، چار ہزار ڈالر فی کلو میں تو کھلے سمندر میں سودا ہو جاتا ہے۔ بے شمار ہندوستانی اپنی لانچوں میں مال مشرق وسطیٰ کی بندرگاہوں میں لے جاتے ہیں!"

"نیپال میں بڑی مشکل یہی ہے کہ وہاں سے سمندر تک رسائی نہیں ہے پھر براہِ راست خریدار بھی ادھر کم رجوع کرتے ہیں زیادہ لین دین ان ہپیوں سے ہوتا ہے جو نیپال کی سیاحت کے بہانے دو چار کلو چرس خرید لیتے ہیں اور

اپنے ملک میں اسے بیچ کر سیاحت کا سارا خرچ نکالنے کے بعد بھی نفع میں رہتے ہیں۔"

"تیری معلومات بہت وسیع ہیں۔" دستگیر سنگھ ستائشی لہجے میں بولا۔ "مجھے تیرے جیسے چند آدمی اور مل جائیں تو میں پوری منڈی پر اجارہ داری قائم کر سکتا ہوں۔"

"ذرہ نوازی ہے ماسٹر۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "ورنہ اب تو یہ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ میں ماضی میں کیا کچھ کرتا رہا ہوں۔"

"تیرے دن پھرنے والے ہیں۔" اس نے میرا شانہ تھپتھپا کر کہا۔ "میں واپس آجاؤں تو تجھے تیرا اصل کام سونپوں گا۔ تجھ جیسے آدمی کو میں اس جزیرے پر برباد نہیں ہونے دوں گا۔ تو شہروں میں آزادانہ پھرے گا اور کوئی مائی کا لعل تجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔"

دستگیر سنگھ نے مجھے بہتر مستقبل کی نوید دینے کے ساتھ ہی جزیرے پر کام کرنے والے دو ایسے معتمد خونیوں سے تعارف کرایا جو بقول اس کے ہر قسم کے حالات میں اعتماد میں لئے جا سکتے ہیں۔"

اسلحے سے بھرا ہوا صندوق اسی روز کاٹیج میں منتقل کر لیا گیا اور جب سرِ شام بوٹ گھاٹ پر پہنچی تو دستگیر سنگھ نے مجھے تفصیل سے سمجھایا کہ ٹارچ کے اشاروں سے کس طرح آنے والوں کی شناخت کا کام لیا جاتا ہے۔

"اس جزیرے سے بمبئی کا فاصلہ کتنا ہے؟" میں نے سرسری طور پر اس سے پوچھا۔

"اس بوٹ میں ساڑھے چار گھنٹے کا سفر ہے۔"

"مگر آتے ہوئے تو ایک دن سے زیادہ وقت صرف ہوا تھا۔" میں نے حیرت سے چونکتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"وہ ٹیکنیکل کمال تھا۔" دستگیر سنگھ زور سے ہنسا۔ "وہ تجھے طویل مدت تک کھلے سمندر میں گھماتا رہا تاکہ تیری قوت مدافعت تکان کی وجہ سے کمزور ہو جائے۔ اس کے علاوہ بوٹ کی آمد و رفت میں مد و جزر کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ جب پانی اتر ا ہوا ہو تو اس سمندری نہر میں صرف کیچڑ رہ جاتی ہے۔"

"یہ تو بڑا سنگین مسئلہ ہے۔"

"نہیں۔ یہ صورتحال صرف دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں ہوتی ہے۔ اس زمانے میں یہ نہر ہر روز صرف چند گھنٹوں کے لئے قابلِ استعمال رہتی ہے ورنہ عام دنوں میں تو کسی نہ کسی طرح کام چلتا ہی رہتا ہے۔" دستگیر سنگھ نے وضاحت کی۔

اس شام وہ تو واپس لوٹ گیا اور میں کاٹیج میں لوٹ آیا۔ دستگیر سنگھ کے دو تو معتمد وہاں موجود تھے میں نے انہیں بیشتر وقت ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں مجھے وہاں بے بسی کا احساس نہ ہو البتہ رات کے وقت انہیں اپنے ٹھکانوں پر سونے کی اجازت تھی۔

جزیرے پر کام کرنے والوں کی رہائش کے لئے جزیرے کے مشرقی حصے میں پتھر، گارے، لکڑی اور پھوس کے بڑے بڑے جھونپڑے بنے ہوئے تھے ہر جھونپڑے میں بیک وقت پندرہ بیس افراد رہتے تھے اور ایک سو مردوں کے ان ننگے بھوکے غول میں گیارہ عورتیں بھی رہتی تھیں۔ ان سب کو الگ جھونپڑے ملے ہوئے تھے۔ اور اس نام نہاد سیتا کے علاوہ ہر عورت کا جھونپڑا رات بھر آباد رہتا تھا جزیرے کے وحشی باسی اپنی باری کے معاملے میں خاصے مطمئن تھے مگر پھر بھی تندرست لاتی ہوئی وہ نئی عورت ان میں سے بیشتر کے اعصاب پر سوار تھی جسے ابھی تک کوئی ... نہ سکا تھا۔

اگلے روز میں نے تیکھے خدوخال والی اس دلکش عورت کو نہر میں پاؤں ڈالے اکیلا بیٹھے دیکھا تو میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے سر گھمایا اور ... گھورتی ہوئی سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جھک مار رہی ہوں۔" وہ غرائی۔ "تجھ سے مطلب؟"

میں نے اچانک اپنا لہجہ سخت کر لیا۔ "اس جزیرے پر ... کا مجھ سے تعلق ہے۔ مجھ سے پوچھے بغیر تو ادھر کیسے آئی؟"

"میری مرضی۔" وہ میرے بدلے ہوئے لہجے پر جنون ... جارحانہ رویئے میں کوئی فرق نہ آیا۔ "میں جہاں چاہوں گی جاؤں گی۔"

"یہ تیرے باپ کا گھر نہیں ہے جہاں ... گی تو تمہیں روٹی کو بھی ترسا دی جائے گی۔"

"ہونہہ۔" اس نے حقارت سے ریت کے ٹیلے پر ٹھوکر ماری۔ "... پناہ لی ہے۔ طوائف بننے نہیں آئی ہوں۔ ایسی ہوتی تو ... ضرورت ہی پیش نہ آتی۔"

"میرے سامنے پارسائی کا ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں۔" ... تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تو ایسی پارسا نہیں ہے کہ تیرے لئے میں یہاں ... بدل دوں۔ مردوں سے بھاگتی ہے تو میں تجھے اس پر ہرگز مجبور نہیں کروں گا۔ تجھے محنت بہرحال میں کرنی ہو گی۔"

میرے یہ الفاظ اس کے لئے ناقابلِ یقین تھے۔ شاید اس جزیرے ... آسودگی کے سوا عورتوں کا کوئی دوسرا مصرف ہی نہیں تھا۔

"محنت سے میں جی نہیں چراتی۔" وہ یک بیک پشیمان سی نظر آنے لگی۔ "یہاں تو میرے لئے کام کرنا مشکل ہے جس کھیت میں قدم رکھتی ہوں ... ہو سکا پیچھا شروع ہو جاتی ہے۔ بیکار گھومتے گھومتے تو میرا ... دینے لگا ہے۔"

"آج سے میرے کاٹیج کی اندرونی صفائی اور دیکھ بھال تیری ذمہ داری ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اس جزیرے پر اپنا پہلا فیصلہ ... "اور اس کام میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو تجھے کڑی سزا دوں گا۔"

وہ چپ چاپ بے یقینی کے عالم میں مجھے گھورتی رہی اور میں ... توجہ دیئے بغیر وہاں سے واپس ہو لیا۔

جزیرے کے گشت کے دوران میں میں نے دیکھا کہ کم و بیش ... ہی مرد دن بھر نہایت محنت سے اپنے کام نمٹاتے تھے البتہ عورتوں کے ... کی گنجائش پیدا ہوتی تھی مصروفیات کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ وہ سارا دن بیٹھی ... یا کھیل کود میں مشغول ہو جاتیں۔

میں گشت ختم کر کے کاٹیج کی طرف روانہ ہونے ہی والا تھا کہ جانی ... ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ کسی شکین ... دوچار ہے۔

"صاحب وہ حرام زادی کاٹیج میں گھس آئی ہے!" اس نے قریب آتے ہی تیز لہجے میں کہا۔

"کیا کر رہی ہے؟"

"مجھے اور جوشی کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ کہتی ہے کہ اب کاٹیج کا سارا کام وہ خود کرے گی۔" جانی نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ ٹھیک کہتی ہے۔ تم کرنے دو، اچھا ہے اسی بہانے مصروف رہے گی۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا تاکہ اسے یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ اس خبیث عورت نے میرے حکم کی من مانی تعمیل میں یہ ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔

"مگر شراب کی کئی بوتلیں موجود ہیں۔" وہ مدقوق لہجے میں بولا۔ "مجھے تو ڈر ہے کہ اس نے تمہارے لئے ایک بوند بھی نہ چھوڑی ہوگی اور کھانے پینے کا بھی کافی سامان وہاں موجود ہے۔"

میں اس کی بوکھلاہٹ پر دل ہی دل میں ہنسا اور بولا۔ "تم فکر نہ کرو، اگر اس نے کسی شے کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کا دماغ درست کر دوں گا۔"

"صاحب اسے ڈھیل نہ دو۔" جانی کو میرا یہ مصالحانہ رویہ پسند نہیں آ رہا تھا۔ "تمہارے آنے سے پہلے وہ ہمیں نچاتی رہی ہے۔ بڑی بے لگام اور بدزبان ہے!"

"میں ابھی اس سے پوچھوں گا کہ اس نے یہ حرکت کیسے کی!"

"پوچھ گچھ بے کار ہے مالک! تو میرے حوالے کر دو، پندرہ منٹ میں غرور خاک میں ملا دوں گا۔" اس نے جلدی سے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔

"یہی دعویٰ ہے تو اب تک اسے کیوں ڈھیل دی ہوئی ہے!" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"وہ..... دراصل جوشی اس کا عاشق ہے، وہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں ہونے دیتا۔ اس کا ایمان ہے کہ ایک روز وہ خود اس کی باہنوں میں آ گرے گی۔" میرے اس سوال پر جانی سٹپٹا گیا۔

"اور اب وہ زبردستی ہونے دے گا؟" میرا لہجہ سخت تھا۔

"تم ہمارے سائیں باپ ہو، تمہارے حکم کے سامنے اس کی کیا مجال کہ دم بھی مار سکے۔ پہلے تو میں اس لئے مجبور تھا کہ جزیرے پر میری اور جوشی کی ایک ہی حیثیت تھی اور مجھے اس سالی سے کیا لینا، میں تو اس کا گھمنڈ توڑنا چاہتا تھا۔"

"تم اس چکر میں نہ پڑو۔" موقع ہاتھ آتے ہی میں نے اسے چپ کرا دیا۔ "بلاوجہ جوشی تم سے بددل ہو جائے گا، یہ معاملہ میں خود نمٹاؤں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی!" اس نے خفیف سی آواز میں کہا۔ "اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"تم معمول پر عمل کرتے رہو۔" میں نے کہا۔ "رات کے وقت تمہارا مزدوروں میں رہنا ضروری ہے تاکہ وہاں کے تازہ حالات سے ہم بے خبر نہ رہیں، وہ لڑکی مجھ سے کوئی چالاکی نہ کر سکے گی۔"

جانی کے چلے جانے کے بعد میں جزیرے پر بے مقصد آوارہ گردی کرتا رہا اندھیرا پھیلنے سے قبل ہی کھیتوں میں سناٹا چھا گیا۔ ٹیوب ویل کا انجن بھی بند کر دیا گیا اور رہائشی علاقے سے شور و غل کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

جھونپڑوں میں دیئے روشن ہونے کے بعد اچانک تال سر میں ٹین کا کنستر بجائے جانے کی آواز ابھری اور رات کا سناٹا کسی عورت کی ترنم ریز آواز سے گونج اٹھا۔

میں ٹارچ کی روشنی میں ان آوازوں کی طرف بڑھنے لگا۔ قانون اور معاشرے سے بھاگے ہوئے لوگوں کی اجتماعی زندگی کا انداز میں قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھیوں اور وحشتناک چہروں والے افراد کی بڑی تعداد جھونپڑوں کے باہر نیم دائرے کی صورت میں زمین پر براجمان تھی۔ ایک عورت کنستر کو ڈھول کی طرح بجا کر گانے میں مصروف تھی کچھ من چلے تاروں بھرے آسمان کے نیچے ناچنے کی کوشش میں بے معنی اور فحش اچھل کود کر رہے تھے۔ وہاں شرم اور حیا کا کوئی تصور نہیں تھا۔

میں دور ہی سے یہ سارا منظر دیکھتا رہا پھر خاموشی سے اپنے کاٹیج کی طرف چل دیا۔

وہاں پہنچا تو اندر سے آنے والی دیئے کی روشنی میں ایک نسوانی ہیولا دروازے کے وسط میں کھڑا نظر آیا پھر شاید اس نے مجھے دیکھ لیا اور کسی قسم کے جوش کا مظاہرہ کئے بغیر اندر چلی گئی۔

میں کاٹیج میں پہنچا تو ہر چیز کی ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ کمرے کی آرائش میں یہ خوشگوار تبدیلی دیکھ کر میں زیرِ لب مسکرا دیا۔ عورت کا ہاتھ لگنے سے پیشتر گھر کا نقشہ ہی سونا سونا اور ویران سا نظر آتا ہے۔

وہ لڑکی میرے قدموں کی آہٹ کی پرواہ کئے بغیر الماری سے خشک غذا کے کچھ ڈبے باہر نکال رہی تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔

"سیتا!" میں نے کمرے کے وسط میں رک کر اسے پکارا۔

وہ آہستہ سے میری طرف گھومی۔ دیئے کی مدھم روشنی میں اس کی نگاہوں میں ہلکی سی چمک کوندتی نظر آئی پھر اس کی نرم آواز ابھری جو دوپہر والے خشمناک لہجے سے بالکل مختلف تھی۔ "عزت کا کام دیا ہے تو مجھے میرے نام سے پکارو بابو!"

اس کے لہجے میں درد کی ہلکی سی کسک تھی، میں چونک پڑا۔ "کیوں؟ کیا تمہارا نام سیتا نہیں ہے؟"

"میرا نام گیتا ہے!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"پھر لوگ تمہیں سیتا کیوں کہتے ہیں؟" اس کا جواب سن کر میری حالت دو بالا ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ شاید دستگیر سنگھ میری اصلیت سے واقف تھا اور محض میرا ردعمل دیکھنے کے لئے اس نے لڑکی کو سیتا کے نام سے یاد کیا تھا۔

"جب اندور میں میرے ہاتھوں دو خون ہوئے تھے تو اس زمانے میں سیتا نامی ایک لڑکی کا بڑا شہرہ تھا جس نے بنارس میں پانچ پنڈتوں کا خون کیا تھا، اسی روز سے لوگ مجھے اندور کی سیتا کہنے لگے!" اس نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

یہ بات سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے سے بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اسے سیتا کہتے ہوئے مجھے عجیب سی خلش ستانے لگی تھی۔ اس میں سیتا جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ رنگ و روپ، خدوخال، قامت و جسامت جرأت

بیباکی۔ کچھ بھی تو سیتا سے مشابہ نہیں تھا اور پھر عقل کے اندھوں نے اسے سیتا کا نام دے دیا تھا۔

میں غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو کر آیا تو دستر خوان تیار تھا۔ ڈبوں کی سربند غذا کے ساتھ ہی میں نے مرغابی کا تازہ سالن دیکھا تو حیرت ہوئی مگر گیتا نے بتایا کہ اس نے اپنی غلیل سے وہ مرغابی شکار کی تھی۔ اس جزیرے پر رہنے والوں کو کوئی ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں تھی البتہ پرندوں کے شکار کے لئے عمدہ قسم کی غلیلیں اور ماہی گیری کے لئے کانٹے دیئے ہوئے تھے۔

میں نے کھانا شروع کیا تو وہ سامنے بیٹھی میرا چہرہ تکتی رہی۔ کچھ دیر بعد مجھے اس کا بھی خیال آیا۔ "تو نے کھانا کھا لیا؟"

"نہیں تم کھالو، بچے گا تو میں کھالوں گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی سرکش لڑکی ہے جس نے جزیرے پر ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔

"یہ بہت ہے، میرے ساتھ کھالے۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ ہچکچاتے ہوئے میرے ساتھ کھانے میں شریک ہوگئی۔

"تو نے جوشی اور جانی کے ساتھ زیادتی کیوں کی تھی؟" کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سوال کیا۔

"زیادتی؟" اسے اچانک غصہ آگیا۔ "چور ہیں وہ دونوں حرامزے!"

"چور ہیں؟" میں نے حیرت سے دوہرایا۔

"ہاں میں یہاں پہنچی تو چوری سے تمہاری شراب پی رہے تھے۔"

"تجھے کیسے پتہ کہ وہ میری اجازت کے بغیر پی رہے تھے؟"

"میں دبے قدموں ان کے سر پر پہنچی تھی، مجھے دیکھتے ہی ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور مجھے ڈرانے دھمکانے لگے کہ میں اندر کیسے گھسی!"

"اور تو نے انہیں باہر نکال دیا؟" میں آہستہ آہستہ اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا۔ بظاہر وہ اس جزیرے کی واحد مخلوق تھی جو میری رفیق بن سکتی تھی۔

"بھگاتی کیا، وہ کمینہ جانی تو ہاتھا پائی پر اتر آیا تھا، بالکل جنگلی ہے جنگلی!" اس نے حقارت سے کہا پھر قدرے آہستہ سے بولی۔ "مگر جوشی اسے سمجھا کر باہر لے گیا، وہ ذرا بے وقوف سا ہے!"

"بیوقوف نہیں، وہ تجھ پر مرتا ہے!" میں نے اسے چھیڑا۔

"مرتا ہے تو مر جائے۔" وہ جل کر بولی۔ "میں تو اس کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں!"

"تو مردوں سے اتنی بدظن کیوں ہے؟"

"مرد؟" اس نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "یہاں مرد ہیں کہاں؟"

"تو یہ سب تجھے کیا نظر آتے ہیں؟"

"کتے ہیں کتے۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "مرد تو اپنی عورت کے دکھ درد کا ساتھی ہوتا ہے، یہاں تو سب چند ٹانیوں کی عیاشی کے چکر میں پڑے رہتے ہیں!"

"تیری شادی ہو چکی ہے کیا؟" اس کے پُراعتماد لہجے نے مجھے یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

"ہمارے یہاں شادی نہیں ہوتی۔" وہ یکبارگی اداس ہوگئی، اس کے لفظوں میں حسرت اتر آئی۔ "شادی بیاہ شریف لڑکیوں کے ہوتے ہیں بابو، طوائف زادیوں کے نہیں!"

"طوائف زادی؟"

"ہاں!" اس کے لبوں پر غمناک مسکراہٹ بکھر گئی۔ "ہر رات بکنے والی تھی۔ میری زندگی میں اب تک صرف ایک مرد آیا ہے جس نے نیلام میں میری سب سے اونچی بولی لگائی تھی!"

"میں سمجھا نہیں!"

"مجھے بچپن سے ہر آن آبرو کی حفاظت کا سبق دیا گیا تھا!" اس نے نظریں جھکا کر کہنا شروع کیا۔ "ہمارے کوٹھے پر ہر قسم کے گھناؤنے کھیل ہوتے تھے مجھے سخت پہروں میں رکھا جاتا تھا پھر کوٹھے پر میرا پہلا مجرا ہوا تو کوٹھا خوب سجایا گیا۔ گنے چنے رئیس زادوں کو دعوت دی گئی۔ اس روز میری سولہویں سالگرہ تھی، اس بہانے ہر ایک نے مجھے قیمتی تحفے دیئے، بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان رئیس زادوں میں ہر ایک میرا خریدار تھا اور وہ دعوت نہیں تھی بلکہ میرا نیلام گھر تھا۔ کنور پرتاب نے میری ماں کو دس ہزار نقد دیئے اور دو ہزار ماہانہ خرچہ دینے کا وعدہ کیا اور میری بولی جیت لی۔ میں نے پچھلے چھ برس میں کبھی گناہ کے بارے میں نہیں سوچا، میری کنور جی سے شادی بے شک نہیں ہوئی مگر میں دل و جان سے انہیں اپنا پتی سمجھتی ہوں۔ ہر رات بستر بدلنے والیوں سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ طوائف کہلانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ عورت بیاہ رچائے بغیر کسی مرد کے بستر پر چلی جائے۔"

"اب کنور کہاں ہے، سنا ہے تم دو خون بھی کر چکی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"میرا مقدر خراب تھا۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولی۔ "میری ساتھ والیاں ہمیشہ [illegible]ت پر رشک کرتی تھیں۔ کنور جی مہینے میں دو چار ہی دن آتے تھے خرچہ [illegible]ت پر پابندی سے ملتا رہتا تھا اور اس کے علاوہ وہ ہمیشہ مجھے تحفے دیتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اچانک اُن کا آنا جانا بند ہوا۔ خرچہ ملتا رہا اور تین مہینے بعد وہ بھی رک گیا......

میں نے سنا کہ کنور جی بھوپال کی کسی ڈیرے دارنی کے چکر میں پڑ گئے۔ میں ان کا انتظار کرتی رہی مگر وہ لوٹ کر نہ آئے۔ دو تین مہینے میری ماں نے صبر کیا پھر مجھے مجبور کرنے لگیں کہ میں کنور کا خیال چھوڑ دوں اور ہر روز نئے گاہکوں کو بھگتاؤں مگر میں نہ مانی۔ میرا دل کہتا تھا کہ ایک نہ ایک دن کنور جی ضرور آئیں گے۔ ادھر میں اپنی ماں اور محلے والیوں کے دباؤ کے باوجود اڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف میرے خلاف سازش ہو رہی تھی۔ میں کنور جی کے انتظار میں ہر روز بناؤ سنگھار کرتی مگر چوکھٹ پر نہ جاتی تھی۔ ایک رات میں زیور اتار رہی تھی کہ اچانک میری ماں شراب کے نشے میں دھت ایک دیوہیکل آدمی کو لئے اندر آئی اور مجھے بتایا کہ وہ میرا نیا گاہک ہے، یہ کہہ کر وہ چلی گئی دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میری اس آدمی سے بہت زور آزمائی ہوئی پھر اچانک میں نے اس کے پہلو سے جھولتا ہوا طمنچہ چھین لیا اور اس کے دل پر نالی رکھ کر گولی چلا دی۔ دھماکا اور چیخ سن کر اس کا باہر بیٹھا ہوا ساتھی دروازہ کھول کر اندر گھسا اور میں نے اس کو بھی مار دیا۔ میرے ہاتھ میں طمنچہ اور کمرے میں خون دیکھ کر سب لوگ خوفزدہ

ہو گئے اور میں گھر سے بھاگ گئی۔ میں تین دن اندور کے گلی کوچوں میں پھرتی رہی پھر میری بدقسمتی نے مجھے پکڑوا دیا۔ وہ دو آدمی تھے انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے انہیں اپنے پاس چھپے ہوئے چند زیوروں کا لالچ دے کر پناہ مانگی تو وہ پگھل گئے اور مجھے بمبئی میں ایک جگہ پہنچا دیا۔ وہاں سے مجھے بیہوش کر کے لایا گیا ہوش آیا تو میں اس جزیرے پر تھی!"

اس کے خاموش ہوتے ہی میرے حلق سے ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ اس لڑکی کے بارے میں میرے تمام قیاسات غلط نکلے تھے میں ابھی تک اسے تیسرے درجے کی کوئی مجرمہ سمجھتا رہا تھا جو اپنے جرائم کی پردہ پوشی کے لئے خون خرابہ بھی کر سکتی تھی مگر گیتا میری توقع کے خلاف خاصی دلیر اور باا صول لڑکی ثابت ہوئی تھی۔

رات کو میں اندرونی کمرے میں مسہری پر دراز ہو گیا تو وہ برآمدے میں ہی چلی گئی۔ میرے رویئے کی بنا پر اسے میری ذات پر اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ وہ بے خوف میرے ہمراہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے پر راضی ہو گئی تھی اور یہ میرے لئے خوشگوار ابتدا تھی۔

جزیرے پر اگلے چند روز پرسکون گزرے البتہ میں نے جوشی اور جانی کے رویئے میں خفیف سی تبدیلی محسوس کی شاید انہیں گیتا کے بارے میں میرا مصالحانہ رویہ پسند نہیں آیا تھا۔ اگر وہ جزیرے پر بے یار و مددگار بھٹکتی رہتی تو کسی نہ کسی وقت ان کے چنگل میں پھنس ہی جاتی مگر اب اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ رہا تھا۔

جزیرے پر میرا وقت سکون سے گزر رہا تھا کہ رات شور و غل کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھا، اسی وقت گیتا بھی کمرے میں آگئی۔

"مزدوروں میں فساد ہو گیا ہے۔" وہ اندر آتے ہی سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"تو یہیں رہ، میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے طاقتور سرچ لائٹ اٹھائی اور رائفل کندھے سے لٹکا کر باہر اندھیرے میں نکل گیا۔

جزیرے کے رہائشی علاقے میں ایک بیرک نما جھونپڑے کے باہر دس بارہ ہیولے وحشیوں کی طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ ہاتھا پائی کے ساتھ ہی غلیلوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا کیونکہ کئی پتھر سنّاٹے کی آواز سے میرے آس پاس سے بھی گزرے تھے۔ اس مقابلے کا تماشا دیکھنے والوں کی بھاری تعداد میں بہت زیادہ جوش و خروش پایا جا رہا تھا۔ وہ جنگلی درندوں کی طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے!

میں نے چند ثانیوں تک صورتحال کا جائزہ لیا پھر رائفل سے ایک ہوائی فائر کر ڈالا۔

اچانک تماشائیوں میں "آگیا، آگیا" کا شور بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہو گیا۔ لڑنے والے بھی اپنا جھگڑا بھول کر جھونپڑوں میں جا گھسے۔

میں سرچ لائٹ کی طاقتور روشنی میں آگے بڑھا تو زمین پر خون کے کئی بڑے بڑے دھبے نظر آئے مگر وہاں کوئی زخمی موجود نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہاں خون کی جو مقدار نظر آ رہی تھی اس کے پیش نظر ایک دو آدمیوں کا بیہوش ہونا معمولی سی بات تھی۔

میں نے رائفل کندھے سے لٹکالی اور جیب سے پستول نکال کر ایک جھونپڑے میں گھس گیا۔ اندر ناکافی روشنی میں بالکل سکوت پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنے پیال یا بستر پر یوں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا جیسے گھنٹوں سے بے خبر سو رہا ہو مگر وہاں سناٹے میں ابھرنے والی چڑھتے ہوئے سانسوں کی آوازیں ان سب کی مکاری کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"کیا ہو رہا تھا یہاں؟" میں سرچ لائٹ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک گردش دیتے ہوئے غصیلی آواز میں بولا۔

جواب میں کوئی نہ بولا۔ وہ دم سادھے پڑے رہے۔

اچانک سرچ لائٹ کی روشنی میں میری نظر دروازے کے قریب ہی ایک پیال پر پڑے ہوئے شخص پر پڑی جو پہلو بدلتے ہوئے آہستہ سے کراہا تھا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا تو وہ شدید زخمی تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون پیال سے رِس رِس کر کچی زمین پر پھیلتا جا رہا تھا۔

میں نے غصے میں اس کے قریب ہی لیٹے ہوئے ایک شخص کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا اور وہ پھرتی سے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہو رہا تھا یہاں؟" میں غرّایا۔

"پپ..... پتہ نہیں۔" وہ ہکلایا۔ "میں تو شام سے بے خبر سو رہا ہوں۔"

میں اُسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور کر رہ گیا۔ اس مردود کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا پتہ نہیں تھا۔

"یہ کیسے زخمی ہوا؟" میرا پارہ بتدریج چڑھتا جا رہا تھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ معصومیت سے پلکیں جھپکاتا ہوا بولا۔ "یہ شام کو تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔"

میں غصے میں اس پر برس پڑا اور وہ کسی یتیم کی طرح منہ لٹکائے ساری ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا۔ زبان سے ایک لفظ نہ بولا۔ میری چیخ پکار سن کر سب لوگوں نے بیدار ہونے کی اداکاری کی اور آہستہ آہستہ میرے گرد جمع ہونے لگے۔

میں نے بلند آواز میں ایک بار پھر ان سے دریافت کیا کہ میری آمد سے قبل وہاں کیا ہنگامہ ہو رہا تھا اور ایک آدمی لہولہان کیوں ہے مگر سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ وہ لوگ وہاں ہونے والے کسی ہنگامے کا علم نہیں رکھتے۔

معاملہ جو کچھ بھی رہا ہو، اگر وہ جھوٹ نہ بولتے تو میں سرسری باز پرس کے بعد وہاں سے لوٹ جاتا۔ مگر اب معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔ ہنگامے کا سبب درکنار وہ تو ہنگامے کے وجود ہی سے صاف منکر ہو چکے تھے۔

میں نے باری باری پانچوں بیرکوں میں اپنے سوال دُہرائے مگر کہیں سے دوسرا جواب نہ ملا۔ ہر چہرے پر سنجیدگی اور تیمی طاری تھی۔ اسی بھیڑ میں مجھے جانی بھی نظر آیا۔ اس کا داہنا جبڑا ابری طرح سُوجا ہوا تھا اور چہرے پر کئی تازہ خراشیں بھی نمایاں تھیں۔

"تم بتاؤ کیا ہوا تھا یہاں؟" میں نے اسے گریبان پکڑ کر اپنے سامنے کھینچ لیا۔

"کچھ نہیں ہوا ماسٹر۔" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا پھر مجمع کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھا اور سب ہی نے اپنے سروں کو اثبات میں جنبش دی۔

اب میرے لیے وہاں سے خاموش واپس لوٹ جانا توہین کے مترادف تھا۔ میں نے ان سب کو اپنے بستروں پر جانے کا حکم دیا۔

اس کے بعد میں نے باری باری ہر ملک کا جائزہ لینا شروع کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ وہاں دو شدید زخمی بے ہوش پڑے ہیں، سات افراد کے چہروں اور جسم پر شدید مارپیٹ کے نشانات نمایاں تھے جن میں جانی بھی شامل تھا۔ میں نے ان ساتوں کو الگ کر لیا۔ دو چار آدمی زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

باقی لوگوں کے ہجوم کو ساتھ لے کر میں اس جگہ پہنچا جہاں زمین پر خون کے تازہ دھبے پڑے ہوئے تھے اور وہاں سے خون کی بوندیں جھونپڑوں تک جا رہی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟ اگر یہاں کچھ ہوا نہیں تو یہ خون کہاں سے آیا، لوگ زخمی کیسے ہوئے؟" وہ دھبے وغیرہ دکھانے کے بعد میں ان پر برس پڑا۔

"جھگڑا تو ہوا ہے۔" ایک مکار صورت شخص نے تشویش آمیز لہجے میں کہا "مگر سب کچھ خاموشی سے ہوا ہے، ہمیں بالکل علم نہیں ماسٹر۔"

"زخمی ہی کچھ بتائیں گے ماسٹر، ہم تو سوگند کھاتے ہیں کہ ہم نے مارا ماری کا کوئی شور نہیں سنا۔" ایک اور شخص نے کہا۔

اچانک ہی مجھے جوشی کا خیال آیا۔ وہ ابھی تک مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ استفسار پر پتہ چلا کہ وہ اپنی باری کے مطابق شرمیلی کے ساتھ رات بسر کر رہا تھا۔ میں نے عورتوں اور ان کے ساتھیوں کو بھی طلب کیا مگر وہ بھی جھوٹ بولتے رہے۔ جوشی بھی ان کا ہمنوا تھا۔ ان تمام بدمعاشوں نے شاید یک زبان ہو کر جھوٹ بولنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

"زخمیوں کی حالت سدھر جائے تو انہیں بھی میرے پاس بھیج دینا۔" میں نے الگ کیے ہوئے سات افراد کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ہجوم سے کہا۔

"اچھا ماسٹر!" بیک وقت کئی آوازیں سنائی دیں۔

اس وقت مجھ پر اتنا شدید غصہ طاری تھا کہ خاموشی سے کاٹیج تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ وہاں گیتا میری منتظر تھی۔ مگر مجھے برہم دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

"ہاں تو تم زخمی کیسے ہوئے؟" کاٹیج پہنچتے ہی میں ان پر برس پڑا۔

"میں دوپہر کو نہر میں گر گیا تھا ماسٹر، اسی وقت سے میرا جبڑا سوجا ہوا ہے۔" جیٹھا نے نظریں جھکا کر کہا۔

"اور اس کے باوجود ابھی تک خراشیں تازہ ہیں!" میں غرایا۔

"مجھے پیشاب میں شکر آتی ہے ماسٹر۔" وہ مسکین لہجے میں بولا "یہ خراشیں کئی دن تک ایسی ہی تازہ ہی نظر آتی رہیں گی۔"

یہ چوری اور سینہ زوری کی انتہا تھی۔ میرا بھرپور تھپڑ اس کے سوجے ہوئے رخسار پر پڑا۔ اور وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تم میری کھال بھی گرا دو تو میں اُف نہ کروں گا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے بتاؤ ماسٹر کہ تم میری زبان سے کیا سننا چاہتے ہو۔ میں وہی دوں گا۔"

"میں صرف حقیقت جاننی چاہتا ہوں، ورنہ تم ساتوں کا راشن بند کر دوں گا۔" اس کا رویہ مجھے تقریباً پاگل کیے دے رہا تھا۔

"بتا کیوں نہیں دیتا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔" گیتا نے معاملے کی نزاکت سمجھنے کے بعد پہلی مرتبہ ثالث کے طور پر دخل اندازی کی۔

"ماسٹر! اس کتیا کو خاموش کرو۔" اچانک ان میں سے ایک بول پڑا۔ "جزیرے پر ہم صرف تمہارے تابع ہیں۔ کسی اور نے حکم چلانے کی کوشش کی تو اس کی ٹانگیں چیر دیں گے۔"

اس کے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میرے پستول سے نکلنے والی گولی اس کی پسلیاں چیر کر دل کے پار نکل گئی۔ اور اس نے چند ہی ثانیوں میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔

"میرے نام پر ایک پاگل کتا بھی تم لوگوں کو حکم دے سکتا ہے سمجھے!" میں نے چیخ کر باقی لوگوں سے کہا جو لاتعلقانہ انداز میں مرنے والے کو دیکھے جا رہے تھے۔

"ہاں ماسٹر، ہم جانتے ہیں۔" سب ہی نے بیک زبان کہا۔ پھر جیٹھا بولا "جیٹھا تو عقل سے کورا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم نے اسے سزا دے دی۔ وہ اسی قابل تھا۔"

"تم لوگ جاؤ، مگر یاد رہے کہ جب تک تم چھ آدمی مجھ سے سچ نہیں بولو گے تمہارا راشن بند رہے گا۔" میں نے غصے سے ہانپتے ہوئے کہا "اور جیٹھا کی لاش نہر میں ڈال دو۔ اس جیسے بدزبان کو اس جزیرے پر قبر کی بھی جگہ نہیں دی جا سکتی۔"

وہ بے چون و چرا جیٹھا کی لاش اٹھا کر چلے گئے۔

اگلے روز صبح پتہ چلا کہ رات کے واقعہ کے بعد زخمی پائے جانے والے دونوں افراد چل بسے۔ ان کی لاشیں میرے معائنے کے بعد کھلے سمندر میں بہا دی گئیں۔

دوپہر کو میں کھانے کے لیے کاٹیج پہنچا تو گیتا نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ مجھ پر پچھلی رات کی شکست کی شدید جھلاہٹ سوار تھی۔ میں نے اسے نظرانداز کرنا چاہا مگر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر میرا راستہ روک لیا۔

"میں تمہاری بڑی احسان مند ہوں بابو۔" یہ کہتے ہوئے وہ پہلی بار میرے اتنے قریب آ گئی کہ میں اس کے سانس اپنے کھلے سینے پر ٹکراتے محسوس کر رہا تھا اور وہ سر اٹھائے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

گیتا کا یہ بدلا ہوا رویہ ایسا غیر متوقع تھا کہ چند ثانیوں کے لیے میں ساری جھلاہٹ بھول گیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا "یہ اچانک احسانمندی کیوں مسلط ہو گئی تجھ پر؟"

"تم نے اس گھناؤنے جزیرے پر میری عزت بچائی، اور مجھے گھر کے دھندے سے لگا دیا۔" وہ وفورِ جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی "ورنہ میں تو اب تک سمندر میں کود کر جان دے چکی ہوتی، پھر کل رات تم نے ایک آدمی کو صرف اس لیے مار دیا کہ اس نے مجھے گالی دی تھی، تم نے میرا من جیت لیا ہے بابو۔"

میں نے اپنا دل ٹٹولا تو وہاں وقتی رفاقت کی ہزاروں تمنائیں مچل رہی تھیں مگر گیتا کے لیے محبت کا جذبہ دُور دُور موجود نہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پچھلی رات میں نے جیٹھا کو صرف اس لیے ہلاک کیا تھا کہ اس وقت میں مشتعل تھا اور جیٹھا نے میرے سامنے باغیانہ لہجے میں زبان کھولی تھی۔ اگر وہ میری انا کو ٹھیس لگائے بغیر گیتا کو کچھ اور بھی کہہ لیتا تو میں درگزر کر دیتا۔ مگر اس نے میرے روبرو بدترین گستاخی کا ارتکاب کیا تھا جس کی مناسب سزا وہی تھی جو اسے دی گئی تھی۔

اس جزیرے پر قتل و خون میرے لیے ذرا بھی تردد کا باعث نہ تھا کیونکہ یہاں سب کے سب چھٹے ہوئے مجرم تھے جنہوں نے زندگی کی رنگینیوں کے عوض اس جزیرے کا تحفظ خریدا تھا۔ مگر گیتا کے لیے میرا وہ اقدام ایک انقلاب کا محرک بن گیا، اور من ہی من میں کنور جی کی پوجا کرنے والی پجارن نے اپنا مندر شریر پل بھر میں میرے چرنوں میں ڈال دیا جس بدن کی حفاظت کے لیے گیتا نے اندور میں دو خون کیے تھے۔ صفدر علی نے محض ایک خون کر کے اسے جیت لیا تھا۔

ہیجان انگیز لمحوں کے بعد گیتا نے مجھے چھیڑا: "تمہیں پتہ چلا کہ رات کیا ہوا تھا؟"

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"میں نے کھوج لگا لیا۔" وہ فاتحانہ شان سے بولی۔

"کیسے؟"

"جوشی آیا تھا۔ اس نے سب اُگل دیا۔" اتنا کہہ کر وہ دانستہ خاموش ہو گئی۔

"بتاتی کیوں نہیں؟"

"وہ لوگ جوا کھیل رہے تھے کسی کی بے ایمانی پکڑی گئی۔ اور پھر بلوہ ہو گیا۔ گیارہ آدمی لڑائی میں شامل تھے۔ دو مر گئے، سات کو تم یہاں لائے تھے اور دو کو اندرونی چوٹیں آئی ہیں۔"

"جوا؟" حیرت سے میری آنکھیں پیشانی پر جا چڑھیں۔ "ان کے پاس ہے کیا جس پر وہ جوا کھیل رہے تھے؟"

"یہ اپنے اپنے راشن، سگریٹوں اور چائے کا جوا کھیلتے ہیں۔" گیتا نے انکشاف کیا۔ "جوشی بتا رہا تھا کہ جیلوں میں پہننے کے کپڑوں کا جوا ہوتا ہے اور یہ سب جیلوں کی یاترا کیے ہوئے ہیں۔"

"تجھے بتا دیا جوشی نے؟"

"ہاں۔ مگر اس نے سوگند دی تھی کہ تمہیں نہ بتاؤں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اور تو نے بتا دیا۔"

"اور کیا کرتی۔ سوگند بھی اس نے اپنی جان کی دی تھی۔" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "مجھے کیا پروا ہے اس کی جان کی!"

اگلے روز صبح سویرے میں نے جوشی کو جا لیا۔ وہ ٹیوب ویل پر مرمت کے کام میں مصروف تھا میری صورت دیکھتے ہی وہ سب کام چھوڑ کر چوکس کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ایک سرکش مزدور کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے پوچھا۔

"پمپ کی گریسنگ کر رہے ہیں ماسٹر!" اپنی عزت افزائی پر وہ کھل اٹھا۔

"تم میرے ساتھ آؤ جوشی۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا اور وہ پھرتی سے میرے پیچھے ہو لیا۔ میں نے ایک بار بھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا، پانی کی نالیاں پھلانگتا آگے بڑھتا رہا۔

کھیتوں سے نکلنے کے بعد میرا رُخ گھنے جنگل کی طرف ہوا تو جوشی پر اضطراب طاری ہونے لگا میری خاموشی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

"ماسٹر، کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

میں نے پلٹ کر اسے خوفناک نظروں سے گھورا اور بولا "بہت خاص۔ میں تم سے ایسی جگہ بات کرنا چاہتا ہوں جہاں ہماری بات سننے والا کوئی نہ ہو۔"

جنگل میں ایک ویران مقام پر پہنچ کر میں رک گیا۔

"پرسوں رات جھونپڑوں کی طرف کیا ہوا تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر سرد اور سفاک لہجے میں سوال کیا۔

"جوئے میں بے ایمانی پر جھگڑا ہوا تھا ماسٹر۔" اس نے نظریں جھکا کر سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر تو نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" اس کے یوں اچانک ہتھیار ڈالنے سے مجھے غصہ آ گیا۔ میں تو یہ سمجھ کر اسے جنگل میں لایا تھا کہ وہ تشدد کے بغیر سچ نہ بولے گا۔

"مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے ماسٹر۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا "اگر اس وقت میں بتا دیتا تو صبح ہونے سے پہلے کسی حادثے میں میری موت واقع ہو جاتی۔"

"تو اس جزیرے پر ہر ایک کو من مانی کرنے کی اجازت ملی ہوئی ہے؟" میں غصیلے لہجے میں غرایا "اور تم دونوں نمک حرام بھی ان سازشیوں سے ملے ہوئے ہو؟"

"مم... ماسٹر!" وہ ہکلاتے ہوئے بولا "پہلے اس جزیرے کا نظام ہی دوسرا تھا۔ اب جیسا تمہارا حکم ہو گا ویسا ہی کیا جائے گا۔"

"نظام!" میں نے حقارت سے کہا "اگر دلگیر کو شبہ بھی ہو جاتا کہ تم دونوں نے یہاں ایسا سازشی ماحول پیدا کیا ہوا ہے تو وہ تم دونوں کو گولی مار دیتا۔"

"یہ انہی کا حکم تھا ماسٹر!" وہ بے چارگی سے بولا۔

"کیا؟"

"ہاں ماسٹر!" وہ بولا "ان میں ایک سے ایک خطرناک آدمی ہے۔ استاد کا حکم تھا کہ جب تک مقررہ راشن کے بدلے یہ لوگ کام کرتے رہیں ان سے بالکل نہ الجھا جائے۔ تمہاری جگہ استاد بھی ہوتا تو پرسوں رات ادھر کا رخ نہ کرتا۔"

"کیوں... آخر کیوں؟" میں جھلا کر چیخا۔

"جب تک کوئی آدمی شکایت نہ لائے، ہمیں ان کے معاملات سے دور رہنا چاہیے ماسٹر۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا "یہیں خونی بھیڑیوں کے غول

کارکھوالا بنایا گیا ہے جب تک یہ رہتے ہوئے تمہارے در پر نہ آئیں ان کے ذاتی معاملات میں دخل نہ دو۔ ان کی عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ یہ اپنے راشن پر جوا کھیلتے ہیں، اپنی باری کی عورتیں، چائے اور سگریٹ کے بدلے دوسروں کو سونپ دیتے ہیں۔"

"اور تم بھی ان کے ساتھی ہو؟" میں غرایا۔

"ہم بھی انہی کی طرح لائے گئے تھے ماسٹر۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں اعتراف کیا۔ "جب تک ہمیں استقام ملا رہا ہم ان پر چھائے رہے، تمہارے آجانے کے بعد ہم انہی میں لوٹ گئے ہیں۔"

"جانی بھی جواری ہے؟"

"ہاں ماسٹر۔ وہ تو اس بات پر بھی شرطیں لگاتا ہے کہ پانی پر بیٹھی ہوئی کونسی مرغابی پہلے اڑے گی۔ وہ کھائے بغیر رہ سکتا ہے جوا کھیلے بغیر نہیں۔"

"اور وہ بھی مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔"

"مجبوری تھی ماسٹر۔ وہ تو خود جوا کھیل رہا تھا، اسی کی بے ایمانی پر بلوہ ہوا تھا۔ مگر میں کل سارا دن فکر میں رہا کہ موقع ملے تو تم کو سچ بتادوں۔ وہ لوگ غداروں کو معاف نہیں کرتے۔ انہیں پتہ نہ چلے کہ میں نے تمہیں ساری بات بتادی ہے۔"

"لوگوں کو ایک بات بتادو۔" میں اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔ "جو جھگڑا خاموشی سے جانی نقصان کے بغیر نمٹ جائے، اس میں دخل نہیں دوں گا لیکن بلوائیوں کے لئے مجھے ہتھیار اٹھانا پڑے گا۔ میں یہاں اندھا اور بہرہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ جزیرے پر خون کی سزا خون بہا کر دی جائے گی محنت سے جمع کئے ہوئے مزدور کا سر مولی کی طرح کاٹنے کی اجازت میں ہرگز نہیں دوں گا۔"

"میں بتادوں گا ماسٹر۔"

"اس مرتبہ میں ان فسادیوں کا راشن جاری کر رہا ہوں جنہیں جانی کے ساتھ بلایا گیا تھا۔ مگر آئندہ ذرا بھی رعایت نہیں برتوں گا۔"

"تمہاری مہربانی ہے ماسٹر۔"

"اور سنو!" اچانک میرا لہجہ نرم ہوگیا "گیتا تمہیں مل سکتی ہے۔"

اس کا منہ احمقوں کی طرح کھل گیا اور وہ میرا چہرہ تکنے لگا "مم... مگر میں نے تو اسے نہیں مانگا ماسٹر۔ وہ تمہاری داسی ہے۔"

"تم نے نہیں مانگا مگر میں اُسے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"اوہ ماسٹر! تم کتنے عظیم انسان ہو۔" اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں، اور وہ بے تابانہ انداز میں دونوں ہتھیلیاں مسلنے لگا۔

"مگر ایک شرط ہے!" میں رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"میں ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

"جانی کیسا آدمی ہے؟" میں چند ثانیوں کے توقف کے بعد سوال کیا۔

"حرامی ہے ماسٹر!" اس کے منہ سے روانی میں نکل گیا۔ پھر گالی کا خیال آتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹنے لگا۔

"بتاؤ، بتاؤ۔ میں سچ سننا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"یہاں سب سگریٹ کے عادی ہیں ماسٹر، اور ان کے لئے ایک پیکٹ روز کے حساب سے کوٹہ ملتا ہے۔ ہفتہ واری کوٹہ جانی ہی تقسیم کرتا ہے، وہ ہر ایک کو سات کے بجائے چھ پیکٹ فی ہفتہ دیتا ہے اور ان چرائے ہوئے پیکٹوں سے وہ عورتیں خریدتا ہے۔ کسی بھی رات اسے مردانہ جھونپڑوں میں اکیلا سوتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔"

"اور کاٹیج سے شراب بھی چراتا ہے۔" میں نے کہا۔

جوشی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ مجرم جب ذہنی طور پر کسی کی برتری کو تسلیم کرلے تو اس کے سامنے بھیگے ہوئے چوہے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ "میں نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا ماسٹر میرے لئے تو ٹھرے کی وہی ایک بوتل کافی ہے جو مہینے میں ایک بار مل جاتی ہے۔" وہ خوفزدہ لہجے میں گھگھیانے لگا۔

"جانی کا کام تمام کردو" میں اس کی طرف جھک کر بولا "تمہیں ولایتی شراب بھی ملے گی اور گیتا بھی۔ جزیرے پر میری آڑ میں صرف تمہارا حکم چلے گا۔"

وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہوگیا۔ شاید میرے الفاظ کی صداقت جانچ رہا تھا جب اُسے یقین ہوگیا کہ میں نے یہ بات اُسے آزمانے کے لئے نہیں کی ہے تو پورے اعتماد سے بولا "یہ بہت آسان کام ہے ماسٹر، شاید میں کل ہی پورا کردوں گا۔"

"جلدی کی نہیں، احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"وہ ہر روز ٹیوب ویل کے ساتھ بنے ہوئے گہرے ٹینک میں نہاتا ہے ماسٹر" وہ رازدارانہ انداز میں بولا "کل وہ ٹینک میں نہا رہا ہوں گا تو میں پمپ چلادوں گا۔ سینکڑوں گیلن پانی کا ریلا چند ہی سیکنڈ میں اس کا کام تمام کردے گا۔"

اس کی ترکیب واقعی لاجواب تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ماہر اور پیشہ ور قاتل ہے ورنہ پانی جیسی بے ضرر چیز سے ایسا مہلک کام نکالنا کسی شریف ذہن کا کام نہیں تھا۔

اسی رات میں آرام دہ مسہری پر دراز تھا اور میرا ذہن اب واضح طور پر جزیرے سے فرار کا نقشہ تیار کر رہا تھا۔

میری آمد سے قبل وہاں جوشی اور جانی سارے اختیارات کے مالک تھے اور دلگیر سنگھ جیسے جہاندیدہ شخص نے انہیں بلا کسی معقول سبب کے اس منصب پر فائز نہ کیا ہوگا۔ جزیرے سے فرار کے لئے ہر صورت میں مجھے موٹر بوٹ ہی کو استعمال کرنا تھا۔ وہ لوگ دلگیر سنگھ کی عدم موجودگی سے لاعلم تھے اور میں کوئی بھی بہانہ بنا کر انہیں استعمال کر سکتا تھا۔ مگر مجھے اصل خطرہ آستین کے ان دو سانپوں کی جانب سے تھا۔ وہ کسی بھی مرحلے پر میرے سارے منصوبے پر پانی پھیر سکتے تھے۔

اگر میں کسی جواز کے بغیر انہیں راہ سے ہٹاتا تو شاید موٹر بوٹ والے میری جانب سے شبہات کا شکار ہو جاتے۔ لہٰذا میں نے انسانی نفسیات سے فائدہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

جوشی اور جانی مساویانہ حیثیت میں عرصۂ دراز تک جزیرے کا انتظام چلاتے رہے تھے۔ میری دانست میں یہ دلگیر سنگھ کی بدترین غلطی تھی۔ ماتحت ہونے کی صورت میں انسان اپنے اوپر والے کی بہت سی زیادتیوں کا خود ساختہ جواز

تلاش کر کے اپنی انا کو مطمئن کئے رہتا ہے مگر جب دو افراد کو یکساں اور مساویانہ اختیارات دے کر ایک ہی کرسی سونپ دی جائے تو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی جانب سے بدگمانی پیدا ہونا لازمی ہے۔ میں نے محض اسی مفروضے کی بنا پر جوشی کو کریدا تھا اور وہ میری توقع کے عین مطابق جانی سے بدظن نکلا۔

اب میرا منصوبہ یہ تھا کہ جونہی جوشی اپنا کام مکمل ہونے کی خبر لائے میں اسے اپنے ہاتھوں ہلاک کردوں۔ اس طرح میں یہ دعویٰ کرسکتا تھا کہ جوشی نے جانی کو ہلاک کیا اور میں نے سزا کے طور پر اسے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور یوں میں جزیروں پر اندرونی خطرات سے بے فکر ہو سکتا تھا۔ ایسے حالات کا پیدا کیا جانا یوں بھی ضروری تھا کہ رسد لانے والی موٹر بوٹ کا ناخدا مائیکل بہت چالاک تھا جب وہ اسے دیکھتا کہ جوشی اور جونی کے بجائے میں اپنی نگرانی میں مال اتروا رہا ہوں تو وہ لازماً ان کا ذکر چھیڑتا اور کوئی بھی کمزور کہانی سیلرز کلب والے خبیث چینی چنگ ہوا کو قبل از وقت میری طرف متوجہ کرنے کا سبب بن جاتی۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو؟" میری طویل خاموشی سے اکتا کر گیتا نے میرے بالوں میں اپنی ملائم انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"مقدر پر غور کر رہا تھا۔" میں نے دیے کی سُرخی مائل زرد روشنی میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اور تجھے لاکر کہاں اکٹھا کیا ہے۔"

"تم نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"میں دلگیر سنگھ کا پرانا ساتھی ہوں۔ امداد پیداوار میں اضافے کی غرض سے یہاں بھیجا گیا ہوں۔"

"اتنا تو سب ہی جانتے ہیں۔" وہ بولی "مگر سنا ہے کہ جب تم یہاں آئے تھے تو بے ہوش تھے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر لاپرواہانہ انداز میں کہا "جزیرے کے راستوں کی رازداری کی غرض سے ہر نیا آدمی یہاں بے ہوشی کی حالت میں لایا جاتا ہے۔ کیا تو اپنا قصہ بھول گئی؟"

"یاد تو ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "مگر میری اور تمہاری حیثیت میں بھی تو بڑا فرق ہے۔"

"اصول سب کے لئے یکساں ہیں۔"

معاً کاٹیج کے بیرونی کمرے میں ہلکی سی آوازیں ابھریں۔ جیسے کوئی بےخیالی میں کسی وزنی چیز سے ٹکرا گیا ہو۔ میں نے کہنیوں کے بل اُٹھ کر درمیانی دروازے سے اس کمرے میں نظر ڈالی مگر یرقان زدہ روشنی میں وہاں کوئی نظر نہ آیا۔

"لیٹ جا، کچھ نہیں ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

اسی وقت گیتا کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اچھل کر مسہری پر اکڑی۔ میں بوکھلا کر بستر سے اُترا تو سامنے ہی دو سفاک چہرے موجود تھے۔

"ماسٹر۔ دونوں ہاتھ اوپر اُٹھالو۔" جانی نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل کا مہیب دہانہ میرے سینے کی طرف اٹھایا ہوا تھا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" میں غرایا۔

"یہ مرنے پر راضی نہیں ہوا ماسٹر!" جوشی کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔ وہ خود بھی مسلح نظر آ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

میری بازی الٹ چکی تھی۔ میں نے جوشی کی وفاداریاں پرکھنے میں سخت دھوکا کھایا تھا اور اب میرے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ مگر بچ نکلنے کی ایک موہوم سی امید مجھے باوقار رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"تم دونوں کس کی اجازت سے اندر گھسے ہو؟" میں نے ہاتھ بلند کئے بغیر پُرسکون لہجے میں کہا۔

"استاد ہمیں تم پر نگاہ رکھنے کی ذمہ داری بھی سونپ کر گیا تھا۔ اس سوال کا جواب وہی دے سکے گا۔" جوشی نے فاتحانہ لہجے میں کہا "وہ تو ہمیں تمہاری وفاداری بھی آزمانے کو کہہ گیا تھا مگر تم بے صبر نکلے اور خود ہی ہمارے سامنے ننگے ہوگئے۔"

"رائفل نیچی کرلو جانی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "تمہیں کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"غلط فہمی!" وہ استہزائیہ انداز میں بولا "غلط فہمی تم کو ہوئی تھی جو تم پانی کی ٹنکی میں میری لاش تیرانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔"

"میں خود تمہاری حفاظت کرتا جانی۔" میں نرم لہجے میں بولا "میں جوشی کو آزما رہا تھا، شاید جلد ہی تمہیں بھی کسی آزمائش سے دوچار کرتا۔ میں آنکھیں بند کر کے کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ سب اُستاد کی ہدایت کے تحت کیا ہے۔"

"تمہارا کوئی گواہ نہیں ہے۔" اس بار جانی کا لہجہ سخت تھا۔ "اور ہم ایک دوسرے کے گواہ ہیں۔ یہ دونوں رائفلیں ہماری گواہ ہیں۔ یہاں تمہارے سوا کسی کے پاس اسلحہ نہیں ہے۔ مگر استاد نے ایسے ہی کسی خطرناک موقع پر تم سے نمٹنے کے لئے یہ رائفلیں خفیہ طریقے سے ہمارے حوالے کی تھیں۔ اگر تم سچے ہو تو چند ہی روز میں موٹر بوٹ آنے والی ہے۔ ہم استاد کو پیغام بھجوائیں گے اور وہ تمہارا فیصلہ کردے گا۔"

میں نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھالئے۔ کچھ دیر پہلے میں جزیرے سے فرار کے جو سہانے خواب دیکھ رہا تھا وہ آنِ واحد میں چکنا چور ہو گئے تھے مگر ابھی مجھے یہ اطمینان تھا کہ دلگیر سنگھ شہر سے نہیں، ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور ان دونوں کے لئے فی الحال انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

دوسری طرف مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں دلگیر سنگھ نے اپنی روانگی کے بارے میں غلط بیانی سے کام نہ لیا ہو۔ وہ لوگ بہت بڑے منظم پیمانے پر اپنا کاروبار چلا رہے تھے۔ میں نے ان کی صلاحیتوں کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ میری آزمائش اور نگرانی منطقی طور پر نہایت ضروری تھی۔ اگر وہ لوگ لاپرواہی کے انداز میں بڑے بڑے معاملات اجنبیوں کو سونپ دینے کے عادی ہوتے تو کبھی کامیابی کی اس منزل سے ہمکنار نہ ہو پاتے، جو اب ان کے سامنے تھی۔

جوشی نے میری مکمل جامہ تلاشی لی اور میرے قبضے سے اسلحے سے بھرے ہوئے فولادی صندوق کی دوہری چابیاں حاصل کرلیں جو کاٹیج ہی میں موجود

تھا۔ میری رائفل اور ریوالور بھی چھین لیا گیا۔

"اب تم ان جھونپڑوں میں مزدوروں کے ساتھ کام کرو گے۔" جانی نے کہا "تمہیں روزانہ افیون کے پودوں کی آبیاری کرنے والی نالیوں کی دیکھ بھال کرنی ہو گی۔ استاد کی طرف سے فیصلہ ہونے تک تم جزیرے پر ایک عام مزدور کی طرح کام کرو گے۔"

"اس حرکت کے لئے تم کو بھگتنا ہو گا جانی۔" میں تلخ لہجے میں بولا "میری تحقیر کر کے تم سکون سے نہ رہ سکو گے۔ ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔"

"اس جزیرے پر تحقیر اور توقیر بے معنی الفاظ ہیں ماسٹر۔" وہ ملعون مجھے کسی مجرم کی طرح زیر کرنے کے باوجود ماسٹر کہے جا رہا تھا "یہاں پر سب لوگ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

میں نے دونوں ہاتھ گرا لئے اور تیزی کے ساتھ نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

"راشن لیتے جاؤ ماسٹر۔" پیچھے سے جانی نے پکارا "وہاں تمہیں کچھ بھی نہیں مل سکے گا۔"

میں واپس پلٹا تو گیتا ان دونوں سے مخاطب تھی۔ "مجھے بھی میرا راشن چاہیئے۔"

"تو تم نے ماسٹر کو پھانس لیا ہے۔" جانی ایک طویل سانس لے کر بولا۔ پھر جوشی سے مخاطب ہوا "سن رہے ہو اس کی باتیں؟ ذرا اس معشوق کو سمجھا کہ اب ہم دونوں اس جزیرے کے مالک ہیں۔ ہم سے مل کر عیش کرے گی مگر اس بد زبانیاں بھگتنے سے نہ بچ سکے گی۔"

"میں نے اب تک تمہاری ہر بدتمیزی کو برداشت کیا ہے۔ اگر گیتا سے بد زبانی کی تو زبان کھینچ لوں گا۔" میں نے کڑے تیوروں سے جانی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نئی نئی منہ لگی ہے، باسی ہو جائے گی تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔" جانی رائفل کی نال دوبارہ میری جانب اٹھاتے ہوئے بولا "مگر یہ تمہارے ساتھ نہیں رہے گی ماسٹر۔ جھونپڑوں میں ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر تمہیں بخش دی گئی تو باقی مزدور فساد کھڑا کر دیں گے۔"

"مجھے اس سے غرض نہیں۔" میں غرایا "گیتا اپنی مرضی کے مطابق رہے گی۔"

"ماسٹر کے ساتھ جائے گی؟" جوشی نے طنزیہ لہجے میں گیتا سے پوچھا۔

"ہاں، دیکھوں گی کون روکتا ہے مجھے۔" وہ سینہ تان کر بولی۔

"کل ہی سے باری لگانی پڑے گی تیری۔" جوشی کی آواز غصے سے کانپنے لگی "جس کی باری ہو گی وہ خود ہی تیرے کس بل نکال دے گا۔"

میرے لئے اس وقت خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔ میں نے خشک دودھ، پتی سگریٹ اور نمک کے ڈبے لئے۔ جوشی نے مجھے پرندوں کے شکار کے لئے ایک مضبوط غلیل اور ماہی گیری کے لئے ڈور کانٹا لیا اور میں گیتا کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔

میں اپنے منصوبے کی ناکامی سے اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ میں نے جھونپڑوں کے بجائے کھیتوں کی راہ لی اور ایک ٹیوب ویل کے قریب ٹیلے پر ڈیرہ ڈال دیا۔

میں اور گیتا دونوں کافی دیر تک خاموشی سے نرم اور ٹھنڈی زمین پر لیٹے رہے۔ پھر اسی نے سکوت توڑنے میں پہل کی "بابو۔ ایک بات پوچھوں؟"

"کیا؟" میں نے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں پیداوار بڑھانے کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔ پھر یہ سب کیا ہو گیا؟" اس کے لہجے میں تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں طنز یا تضحیک کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور کہا "میں نے جھوٹ بولا تھا گیتا۔"

"تو کیا تم بھی زبردستی لائے گئے ہو؟" اس کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

"ہاں!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "مجھے یہاں مراعات یافتہ قیدی کی حیثیت دی گئی تھی مگر میرے اندازے کی ذرا سی غلطی سے سارا کھیل بگڑ گیا۔"

"میں پہلے بھی تمہارے ساتھ تھی اور اب بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ شاید قسمت ہمیں یہاں سے نکلنے کا کوئی موقع دے ہی دے گی۔"

"فی الحال ہمیں بدلے ہوئے حالات کو جوں کا توں قبول کرنا ہو گا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہی اس بارے میں سوچا جا سکے گا۔"

اگلے روز سر جھکائے میں کھیتوں میں داخل ہوا تو مجھے دیکھنے والوں نے مسرت آمیز چیخوں سے میرا استقبال کیا اور تیزی سے میرے گرد جمع ہونے لگے۔

"ماسٹر بھی ادھر ہی آ گیا، ماسٹر کو بھی دھندے سے لگا دیا گیا۔" آناً فاناً ایسی آوازیں دور دور تک گونجنے لگیں۔ میرے گرد جمع ہونے والے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ پرانے چہروں میں ایک نئے ساتھی کا اضافہ ان سب کے لئے سنسنی آمیز مسرت کا سبب ثابت ہوا تھا۔ کسی کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں اقتدار سے محروم کیا گیا تھا یا اب ان پر کون حکمران تھا۔ وہ سب اپنی دھن میں مگن رہنے والے لااُبالی خانہ بدوشوں جیسے مزاج کے مالک تھے جنہیں اپنے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ بس جب تک انہیں سلامتی کے ساتھ وقت کی روٹی ملتی ہے ان کی دانست میں ہر طرف خیر خیریت اور امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے۔

میں سارا دن کام میں مصروف رہا۔ کبھی کبھار آس پاس والوں سے باتیں بھی کرنے لگتا۔ ان لوگوں کے رویئے نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ورنہ وہ طنز اور تشنیع پر اتر آتے تو میرے لئے وہاں چند لمحے بھی گزارنا دشوار ہو جاتا۔ اس دوران میں ایک بار جوشی اور جانی گشت پر ادھر آئے مگر میں نے ان پر ذرا بھی توجہ نہ دی۔ سر جھکائے نالیوں کا ڈھال اور ٹوٹے ہوئے کنارے درست کرتا رہا۔

شام کو جب کانسی کے گھنٹے کا شور فضا میں گونجا تو سب نے کام چھوڑ دیا اور فضا سیٹیوں سے گونج اٹھی۔ کچھ لوگ ٹولیوں کی شکل میں ڈور کانٹے سنبھالے سمندری نہر کی طرف نکل گئے۔ میں ایک جماعت کے ساتھ مرغابیوں کے شکار کے لئے کھلے سمندر کے رخ پر واقع گھنے جنگل میں چل دیا۔

"ماسٹر جیل سے بھاگے تھے کیا؟" ایک قوی الجثہ شخص نے پہلی بار میرا ماضی کریدنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ تین خون کئے تھے۔" میں نے اب انہی کے رنگ میں رنگ جانا مناسب سمجھا۔

"ملاؤ ہاتھ۔" ایک اور شخص یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور تپاک سے ہاتھ ملانے لگا "میں نے بھی تین مارے تھے۔ دو مقدموں میں ضمانت کرا لی تھی۔ کانگریس کا ایک لیڈر میرا یار تھا مگر جب میرا قتل ہوا تو وہ بھی گھبرا گیا اور مجھے مقدر یہاں لے آیا۔"

"بمبئی میں اب تو کیا دنگا فساد ہوتا ہوگا" ایک اور نے مایوسانہ لہجے میں کہا "شہر کے چھٹے ہوئے جیالے تو یہاں بھنگ کی کاشت کر رہے ہیں۔"

اس کے تبصرے پر سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ سمندر کے کنارے سے ملحقہ پانی میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک غلیلوں سے آبی پرندوں کا شکار جاری رہا۔ اس دوران میں صرف ایک مرغابی ہاتھ آسکی۔ بیشتر پرندے زخمی ہو کر اڑ گئے۔ غلیل کے شکار میں بڑی مہارت ہی تھی کہ کاری نشانہ لگانا بہت مشکل تھا۔ واپس آئے تو جھونپڑوں کے باہر جگہ جگہ آگ روشن تھی۔ لوگ ایک دوسرے پر پُرجوش آوازے کس رہے تھے اور ساتھ ہی پرندوں اور مچھلیوں وغیرہ کو بھوننے میں مصروف تھے۔ فضا میں گوشت جلنے کی اشتہا انگیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ عورتوں کے جھاؤ کے قریب زور آزمائی اور دوڑ کے مقابلوں میں مصروف تھے۔ عورتیں چیخ چیخ کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ انہی میں گیتا بھی موجود تھی لیکن وہ بالکل خاموش اور سب سے الگ تھلگ نظر آ رہی تھی۔

دھندلکا پھیلنے سے قبل ہی سب لوگ کھانے پکانے سے فارغ ہو گئے۔ میں نے بمشکل مرغابی کے بھنے ہوئے بے ذائقہ پارچوں کا ایک ٹکڑا حلق سے اتارا۔ پھر خشک غذا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر وہ لوگ نہایت رغبت کے ساتھ ہر چیز سے انصاف کر رہے تھے۔ جزیرے پر لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی چولھے الاؤ میں بدل گئے اور ہر الاؤ کے گرد ٹکڑیاں جم گئیں۔ اس وقت پہلی بار میں نے وہاں تاش کی گڈیاں دیکھیں جو کثرت استعمال سے خستہ حالت میں تھیں مگر کھیلنے والے انہی سے کام چلا رہے تھے۔

جھونپڑوں کے باہر کھلے میدان میں کسی میلے کا سا سماں تھا۔ مجھے پہلی بار اس ماحول میں آ کر قدرے خوشی محسوس ہوئی ورنہ کاٹیج میں گیتا کی رفاقت کے باوجود میں ہر وقت گھٹن کا شکار رہتا تھا ـــــ میں خاموشی سے اپنی ٹولی سے نکلا اور جھونپڑوں کے عقب میں چلا گیا۔ شاید گیتا میری ہی طرف متوجہ تھی کیونکہ چند ثانیوں بعد وہ بھی وہیں آ پہنچی۔ اور میں اسے ساتھ لے کر ساحل کی طرف نکل گیا۔

اس رات ہم کافی دیر تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کی ذات میں کھوئے رہے۔ میں نے گیتا کو سمجھایا کہ وہ مردوں کو نزدیک قریب نہ آنے دے مگر عورتوں سے دوستی گانٹھ لے لیکن اس کا کہنا تھا کہ یہ کام بہت محال ہے۔ وہ عورتیں جب تک اس کی پارسائی کا طلسم نہیں توڑیں گی، اسے قبول نہیں کریں گی۔ اس بیچاری کے لئے ان میں دن گزارنا بھی دوبھر تھا۔

وقت گزاری کے لئے میں نے گیتا کے لئے ایک اچھوتا کام سوچا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ روز صبح سویرے جزیرے کے کسی بھی ساحل پر پہنچ جایا کرے اور جونہی کوئی جہاز وغیرہ نظر آئے اپنے اشاروں سے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔ گیتا یہ سن کر بہت مسرور ہوئی مگر میں جانتا تھا کہ وہ اس کام سے چند روز ہی میں اکتا جائے گی۔ دلگیر سنگھ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ جزیرہ بحری جہازوں کی گزرگاہ سے بہت دور محفوظ علاقے میں واقع ہے۔

میری معزولی کے چوتھے روز موٹر بوٹ نظر آئی۔ جانی نے سلطانہ مجھے بوٹ سے سامان اٹھانے پر مامور کر دیا۔ مجھے مزدوروں میں شامل دیکھ کر موٹر بوٹ کا ناخدا چونک پڑا اور مجھ سے پوچھنے لگا "کیا ہوا ماسٹر؟ تم اور مزدوروں میں؟"

"ماسٹر اپنی اوقات کو پہنچا دیئے گئے۔" گھاٹ سے جانی بولا۔ وہ جوشی کے ہمراہ رائفل کندھے سے لٹکائے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں اس ذلیل تبصرے پر دانت پیس کر رہ گیا۔ موجودہ حالات میں ذرا ذرا سی بات پر برہمی کا اظہار میرے لئے اعصاب زدگی کا باعث بن سکتا تھا۔ دوسرے روز موٹر بوٹ روانہ ہوئی تو دلگیر سنگھ کے لئے ان دونوں نے مائیکل کی زبانی پیغام بھجوا دیا۔ انہوں نے یہ مہربانی کی کہ مجھ سے بھی پوچھ لیا کہ میں چاہوں تو اپنی صفائی میں دلگیر تک کوئی پیغام بھجوا سکتا ہوں۔ مائیکل وسیلے کا کام دے گا مگر میں نے انکار کر دیا۔ البتہ ان پر یہ واضح کر دیا کہ میں کوئی زبانی فیصلہ اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک خود دلگیر سنگھ جزیرے پر نہ آئے۔

موٹر بوٹ دوسری بار آئی تو اس گفتگو کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں میں بہت احتیاط سے پیشہ ور مجرموں میں چند دوست پیدا کر چکا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے رویئے پر ایسی لاتعلقی طاری کی ہوئی تھی کہ جزیرے پر کسی نے بھی میرا نام جاننے کی زحمت نہ کی۔ سب لوگ بدستور مجھے ماسٹر کے نام سے پکارتے تھے۔

اس مرتبہ موٹر بوٹ خاموشی کے ساتھ گھاٹ پر پہنچی۔ محض نہر کی طرف سے اس کے انجن کی آوازیں ابھرنے کے باعث مجھے پتا چلا کہ بوٹ آ گئی ہے اور میں خود کو ذہنی طور پر آنے والے حالات کے لئے تیار کرنے لگا جو یقینی طور پر میرے لئے خوشگوار نہ ہوتے!

وہ پہاڑ سا دن میں نے انتظار میں کاٹ دیا مگر میری طلبی کا پروانہ نہیں آیا۔ کھانے کے وقت میں اپنا سامان اٹھا کر جھیڑے سے نکل گیا اور تھوڑی سی تلاش کے بعد گیتا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں وہ عورتوں میں اپنا مقام پیدا کر چکی تھی!

"سنا ہے آج پھر بوٹ آئی ہے؟" جھیڑے سے نکلتے ہی گیتا نے سوال کیا۔

"ہاں۔ شاید میرے بارے میں کوئی نئی ہدایت آئی ہے۔" میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اندازہ ہے میرا، ورنہ اتنی جلدی دوبارہ آمد کا کیا مقصد ہو سکتا ہے!"

"اگر وہ تمہیں پکڑ کر شہر لے گئے؟" گیتا میری باتوں سے خوفزدہ نظر آنے لگی۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "وہ مجھ سے یہاں کام لیں گے یا مار ڈالیں گے، وہ کسی ایسے شخص کو شہر کیوں لے جائیں گے جو اس پُراسرار جزیرے کا راز افشا کر سکے۔"

"مرنے کی بات منہ سے نہ نکالو۔" اس نے پھرتی سے اپنا نرم نرم ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا "اب تو یہاں تمہاری ہی ذات کا سہارا ہے، تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی!"

"میں بھی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں۔" میں نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایسا وقت آ ہی جائے تو تجھے حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی اور سامنے آ کر میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ تاریکی کی مدھم چھاؤں میں اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ چند ثانیوں کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی "انہوں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تو میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں گی، ان کے رحم و کرم پر زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ میں سمندری مچھلیوں کی خوراک بن جاؤں۔"

"پگلی!" میں نے ہولے سے اس کے رخسار پر چپت ماری۔ "میں نے تجھے رونے کے لئے نہیں بلایا ہے، آج میں کچھ کر گزرنے کی نیت لے کر آیا ہوں!"

"کیا؟" اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"بوٹ نہر میں موجود ہے۔" میں نے کھلے میدان میں آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "رات کے اندھیرے میں میں اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں۔" وہ اس تجویز پر سہم گئی۔ "وہ ادھر سے غافل نہ ہوں گے، ان کے پاس ہر قسم کا اسلحہ ہے اور تم نہتے ہو، غلیل سے ان کا مقابلہ نہ کرسکو گے۔"

"مقابلے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "اگر خطرہ مول لئے بغیر کام بننے کی صورت نظر آئی تو کوشش کروں گا۔ ورنہ صبر!"

"میں خاک بھی نہیں سمجھی!"

"جب جھونپڑوں میں سناٹا پھیل جائے تو تم کھیتوں کے پاس اس پیال میں آگ لگانی ہوگی جہاں منوں کے حساب سے حشیش کے سوکھے پودے جمع ہیں۔" میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ "وہ پیال ایک مرتبہ آگ پکڑلے تو جزیرے پر بھونچال آجائے گا۔ وہ آگ پھیل کر سارے کھیتوں کو خاکستر کرسکتی ہے۔ شعلے بھڑکتے ہی وہ سب ادھر آجائیں گے اور میں بوٹ کے قریب منڈلا رہا ہوں گا، اگر میری توقع کے مطابق میدان صاف ہوا تو میں بوٹ پر قبضہ کرلوں گا۔ تیرے آگ لگانے اور شعلے بھڑکنے کے درمیان خاصا وقت ہوگا اور اس سے فائدہ اٹھا کر تو کاٹیج کے پیچھے مونگے والی پہاڑی کے پاس مجھ سے آملے گی۔ دراصل میں پہلے سے وہاں موجود رہنا چاہتا ہوں تاکہ ماحول اور نفری وغیرہ کا جائزہ لے سکوں ورنہ بوٹ پر قبضے کے وقت ہم یکجا ہوں گے!"

"اور اگر تمہیں پہلے ہی موقع مل جائے تو نکل جانا، میری فکر نہ کرنا، اگر میری مدد تم کو اس جہنم سے نکال سکی تو میں سمجھوں گی کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہوگیا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر میں نے قبضہ کربھی لیا تو اس وقت بوٹ اسٹارٹ نہیں کروں گا جب تک تو نہ آئے گی۔ انہیں تو اس وقت ہوش آئے گا جب وہ بوٹ کے انجن کا شور سنیں گے ورنہ کھیتوں کی طرف لپکتی ہوئی آگ ان کے اعصاب پر سوار ہوگی۔"

"تم بوٹ چلالو گے؟" اس نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں۔" مجھے اپنے حافظے پر پورا اعتماد تھا۔ "یہاں سے اتنی دور تو لے ہی جاؤں گا کہ ان کی گولیاں ہم تک نہ پہنچ سکیں۔"

"اور اگر ہم کھلے سمندر میں بھٹک گئے؟" اس کا بدن ہولناک مصائب کے تصور سے بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

"اس جزیرے پر بھٹکنے سے وہ موت بہتر ہوگی!" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"تمہارے حوصلے میری زندگی ہیں بابو!" یہ کہتے ہوئے وہ سسک کر رو پڑی اور میں نے ایک بار پھر اسے سینے سے لگالیا۔

اسے حوصلہ دلانے کے بعد میں سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے منصوبے سے تو آگاہ کردیا تھا مگر ابھی سمندر کی کیفیت دیکھنی باقی تھی۔ وہ ڈھلتے چاند کی راتیں تھیں اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں سمندر اتنا اترا ہوا نہ ہو کہ بوٹ پر قبضہ کرنے کے باوجود اسے نہر سے باہر نہ لایا جاسکے۔

نہر میں پانی کافی تھا مگر اس کی سطح اتنی بلند نہیں تھی کہ ہم منصوبے پر عمل کرنے میں طویل وقت گزار دیں۔ سمندر کے مدوجزر کے اوقات کا میں نے ان دنوں میں خاصا مشاہدہ کیا تھا جب میں پورے اختیارات کے ساتھ نہر کے قریب کاٹیج میں مقیم تھا اور میرا تجربہ یہ بتا رہا تھا کہ رات کے آخری پہر تک سطح آب اتنا کم ہوجائے گا کہ بوٹ کو نکالنا ناممکن ہوکر رہ جائے گا۔

پھر میں نے گیتا کو مونگے کی وہ پہاڑی دکھائی جہاں اسے پہنچنا تھا۔ ہم نے اندھیرے میں وہیں بیٹھ کر اپنی حکمت عملی طے کی۔ پھر میں نے گیتا کو رخصت کردیا۔ میں نے ایک بھری ہوئی ماچس بھی اس کے حوالے کردی جو میں نے اپنے کوٹے سے پس انداز کی تھی۔

میں دیر تک وہاں کھڑا گیتا کے تاریک ہیولے کو درختوں کی اوٹ میں غائب ہوتے دیکھتا رہا پھر میں نے ماچس کے شعلوں کو ہتھیلیوں کے درمیان چھپا کر ایک سگریٹ سلگالی۔ اس سنسنی خیز مہم کی کامیابی یا ناکامی تو مقدر کی بات تھی مگر یہ طے شدہ بات تھی کہ دونوں ہی صورتوں میں اس رات مجھے دوبارہ ماچس سلگانے کا موقع نہ ملتا۔

سگریٹ پھونکنے کے دوران میں میں نے ایک بار پھر ذہن میں اپنے منصوبے کا جائزہ لیا اور سگریٹ کا ٹوٹا مسل کر محتاط انداز میں کاٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔

جزیرے پر سہ پہر سے رات کا آسیبی اور ہولناک اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس کے ساتھ روح فرسا سناٹا بھی پھیلا ہوا تھا، جنگل میں جھینگروں کا تیز شور گونج رہا تھا یا میٹھے پانی کے جوہڑوں میں آباد مینڈک بول رہے تھے۔ شاید اس رات مزدوروں نے بھی جلد ہی سوجانے کا فیصلہ کرلیا تھا کیونکہ ہوا کے دوش پر ادھر سے بھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

میں کاٹیج کے عقب میں بآسانی پہنچ گیا مگر وہاں بھی گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایک ثانیے کے لئے مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دہشت کی سرد لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی کہ کہیں وہ لوگ میرے ارادوں سے باخبر نہ ہوگئے ہوں اور کاٹیج میں پڑے غافل ہونے کے بجائے میری گھات میں آس پاس چھپے ہوئے ہوں!

میں کسی سہمے ہوئے چوپائے کی طرح کاٹیج کی عقبی دیوار کی جڑ سے چپک کر بیٹھ گیا۔ میرے سارے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے مگر وہاں حشرات الارض کے یکساں شور کے سوا کوئی حرکت یا آواز نہیں سنائی دے رہی تھی جو کسی سمت میری رہنمائی کا سبب بنتی!

میرے نقطۂ نظر سے کاٹیج کی تعمیر میں ایک شدید نقص تھا۔ اس کی عقبی دیواروں سے کوئی کھڑکی یا دراز نہیں تھی جس کے ذریعے مجھے اندر کے حالات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملے۔ پھر میں نے پیٹ کے بل ٹھنڈی زمین پر لیٹ کر کان زمین سے لگادیئے۔ اس بار قدرے مایوسی کے بعد مجھے زمین پر قدموں کی ہلکی سی دھمک سنائی دی اور مجھے یقین ہوگیا کہ کاٹیج ویران نہیں ہے۔

میں دوبارہ پیچھے ہٹ گیا اور محفوظ فاصلہ اختیار کرنے کے بعد بغلی سمت سے سامنے کی طرف بڑھنے لگا۔ کاٹیج کا عقبی حصہ ساحل پر پھیلے ہوئے جنگلات کے رخ پر تھا۔ سامنے کا حصہ جزیرے کے قابل کاشت حصے کی جانب واقع تھا۔ ایک پہلو کے متوازی سمندری نہر اور چوبی گھاٹ تھا اور دوسرے پہلو پر چھدرا جنگل اور ریتیلے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔

درختوں کی اوٹ سے نکل آنے کے بعد احتیاط کے پیش نظر مجھے پیٹ کے بل زمین پر کھسکنا پڑا۔ وہ علاقہ خودرو پودوں اور سخت جھاڑیوں سے پاک تھا اس لئے مجھے غیر معمولی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور تھوڑی دیر ہی میں میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے مجھے کاٹیج کا دروازہ اور دو روشن کھڑکیاں نظر آرہی تھیں جسب معمول اندر دیئے روشن تھے جن کی روشنی میں مرخی کا گہرا انعکاس نمایاں تھا دروازہ بند تھا اور اس کے باہر ایک دراز قامت سایہ کندھے سے رائفل لٹکائے اکتائے ہوئے انداز میں ایک سرے سے دوسرے کونے تک رک رک کر ٹہل رہا تھا۔

اپنے قدوقامت کی بنا پر وہ جانی یا جوشی سے بالکل مختلف تھا۔ اپنے گشت کے دوران میں وہ بیشتر وقت تاریکی میں رہتا تھا البتہ جب بھی وہ چند ثانیوں کے لئے کھڑکی سے باہر پڑنے والی روشنی میں سے گزرا میں نے اسے پہچاننے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہا مگر اس کے کندھے سے جھولتی ہوئی رائفل ہر بار صاف نظر آتی رہی۔

اس طرف بھی مجھے کاٹیج سے کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ اس گارڈ کا ڈھیلا ڈھالا اور بیزاری سے بھرپور انداز دیکھ کر میں نے یہی رائے قائم کی کہ اس وقت کاٹیج ویران پڑا ہوا ہے۔ اگر اندر کچھ تحفظ طلب لوگ موجود ہوتے تو گارڈ بھی چاق وچوبند ہوتا پھر فوراً ہی میرے ذہن میں اپنے نظریے کی تاویل میں ایک دلیل بھی آگئی بجلی سے دلگیر سنگھ کی آمد تو بعید از قیاس تھی۔ وہ آیا ہوتا تو پورا دن یوں بے مقصد نہ گزار دیتا۔ اس کی جگہ جو بھی آیا تھا وہ اس وقت جوشی اور جانی کے ہمراہ جھونپڑوں کی طرف گیا ہوا تھا اور اسی وجہ سے وہاں طوفان بدتمیزی رکا ہوا تھا۔

یہ مضبوط رائے قائم کرنے کے بعد میں دوبارہ عقبی حصے کی طرف لوٹ گیا اور اس بار نہر اور کاٹیج کے درمیانی حصے کا رخ کیا۔

موٹر بوٹ کا ہیولا ندی میں دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ اس پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی میں درختوں اور تختوں کی آڑ لیتا ہوا خطرناک حد تک بوٹ کے قریب پہنچ گیا۔ تختوں اور شہتیروں سے بنا ہوا گھاٹ کا فرش مجھ سے بمشکل چند گز دور رہ گیا تھا۔

بوٹ پر سناٹا دیکھ کر میں نے ایک پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے پانی کی طرف اچھال دیا۔ عرشے یا چوبی فرش پر پتھر لڑھکنے کی سمت سے میری کمین گاہ کا راز افشا ہوسکتا تھا اس لئے میں نے پانی کا انتخاب کیا تھا۔

پتھر گرنے سے نہر میں پُرشور چھپاکا ہوا۔ فوراً ہی بوٹ سے کوئی للکارا پھر مجھے بوٹ پر دوڑتے ہوئے قدموں کا شور سنائی دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف کھسکتا چلا گیا۔

"کیا بات ہے؟" کاٹیج کی طرف سے شاید گارڈ نے چیخ کر کہا۔

"کوئی پانی میں کودا ہے!" بوٹ والے نے چیخ کر کہا۔ اس بار میں نے آواز پہچان لی۔ وہ یقینی طور پر مائیکل ہی تھا۔

پھر عرشے پر طاقتور ٹارچ کی روشنی چمکتی نظر آئی۔ مائیکل جھک کر ندی کا جائزہ لے رہا تھا۔ ادھر وہ گارڈ بھی بلند آواز میں کچھ مہمل فقرے بکتا بوٹ کی طرف آرہا تھا۔ شاید وہاں ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔

میرے لئے یہ سنہری موقع تھا۔ جوں ہی میں نے گارڈ کو بوٹ کی طرف بڑھتے دیکھا میں کسی چوپائے کی طرح پوری قوت سے کاٹیج کے دوسرے پہلو کی طرف دوڑ پڑا۔ اس بار میں نے طویل چکر کاٹنے میں بالکل وقت ضائع نہیں کیا اور پیچھے سے گھوم کر پھرتی سے کاٹیج کے دروازے پر پہنچ گیا۔

بے آواز قدموں سے وہاں پہنچ کر میں چند ثانیوں کے لئے رکا۔ گھاٹ سے ان دونوں کی نقل وحرکت اور گفتگو کرنے کی دھیمی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ میں نے دروازے کا بولٹ سرکایا اور پھرتی سے اندر گھس گیا۔

اس وقت میرا دل کنپٹیوں تک دھڑک رہا تھا۔ بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل گئے تھے۔ اگر مجھ سے ذرا بھی غلطی ہوتی تو وہ کاٹیج میرا مقبرہ بن سکتا تھا۔

اندرونی کمرے میں مسہری کے سرہانے چرمی غلافوں میں پوشیدہ تین رائفلیں کندوں کے بل، دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ایک رائفل پر قبضہ کیا، چوبی صندوق سے کارتوسوں کی ایک پٹی نکال کر گلے میں ڈال لی، سائڈ بورڈ سے چھری اٹھائی اور تیزی سے باہر آگیا۔ وہ دونوں ابھی تک نہر کے جائزے میں مصروف تھے، میں نے دروازہ بند کرکے کنڈی لگائی اور پوری رفتار سے گھنے جنگل کی طرف دوڑ پڑا۔

اس غیر متوقع کامیابی نے میرا حوصلہ بلند کردیا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ رائفل سے دیوانہ وار فائرنگ شروع کردوں مگر اس معرکے میں میرا ہر قدم فیصلہ کُن تھا۔

گو مجھے معلوم تھا کہ کاٹیج میں ساری رائفلز ایک ہی ساخت کی ہیں اور چوبی صندوق میں بھری ہوئی کارتوسوں کی پٹیاں ان کے لئے کارآمد ہیں مگر باہر رکھی ہوئی رائفلز کی تعداد نے مجھے شک میں مبتلا کردیا تھا۔ جانی اور جوشی کے لئے صرف دو رائفلیں کافی تھیں جبکہ وہاں تین رکھی ہوئی تھیں۔ یہ امکان بھی تھا کہ شاید وہ شہر سے آنے والوں کی ملکیت ہوں اور ان کی ساخت مختلف ہو ایسی صورت میں ایک فائر کے بعد رائفل۔۔۔ لکڑی کے ٹکڑے کے برابر رہ جاتی۔

کارتوسوں کی افادیت کا سراغ لگانے کے لئے میں جنگل سے گزر کر سیدھا ساحل پر پہنچ گیا جہاں سمندر کی سسکتی ہوئی موجیں ساحل پر دم توڑ رہی تھیں۔

میں نے جب رائفل چرمی غلاف سے نکالی تو اپنی خوش بختی پر میرا دل جھوم اٹھا۔ رائفل اسی ساخت کی تھی جو کاٹیج میں رکھے ہوئے فولادی صندوق میں

مقفل اسلحہ کی تھی۔ دلگیر سنگھ کی ایک حماقت آخر کار میرے کام آ ہی گئی تھی۔ وہ ہتھیار تو صندوق میں مقفل رکھتا تھا مگر فاضل میگزین چوبی صندوق میں غیر مقفل رہتا تھا۔ دلگیر سنگھ کا خیال تھا کہ ہتھیار کے بغیر فاضل میگزین پتھروں سے زیادہ بے مصرف ہے، لوگ اسے غلیلوں سے تو پھینکنے سے رہے اور محض اسی فلسفہ کی بنا پر اس وقت میں پچاس فاضل راؤنڈز پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

رائفل کا چرمی غلاف میں نے ایک جگہ زمین میں دفن کیا، کارتوسوں کی پیٹی کندھے پر سجائی اور چھری قمیض کے نیچے بلٹ میں اڑس کر مونگے کی پہاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں انتظار کرتے مجھے کافی دیر گزر گئی مگر نہ کھیتوں کی طرف شعلوں کی سرخی نظر آئی نہ گیتا کی واپسی کے آثار نظر آئے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے گئے دو گھنٹے گزر چکے تھے اور اسے اپنے کام سے فارغ ہو کر کافی دیر قبل واپس آ جانا چاہیے تھا!

جب یہ انتظار طویل سے طویل تر ہونے لگا تو مجھ پر وحشت سوار ہونے لگی۔ میری چھٹی حس اب مستقل خطرے کا نعرہ بلند کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ گیتا کسی سنگین مشکل سے دوچار ہو چکی ہے۔ اگر وہ پھنس ہی گئی تھی تو چیخ و پکار کر کے میری توجہ مبذول کرا سکتی تھی۔ رات کے وقت سناٹے میں اگر جزیرے کے ایک سرے پر انسانی چیخ بلند ہوتی تو وہ کافی دور تک سنی جا سکتی تھی۔

مایوسی اور جھنجھلاہٹ کی آخری سرحدوں پر پہنچ کر میں نے نہر کا جائزہ تو سارا ولولہ سرد پڑ گیا۔ سمندر کا پانی خطرناک حد تک نیچے جا چکا تھا۔

منصوبہ کا دشوار ترین مرحلہ غیر متوقع کامیابیوں کے ساتھ طے پایا گیا تھا مگر سہل حصہ پورے ہونے کے دور دور آثار نہیں تھے۔ مجھے شدت کے ساتھ گیتا پر غصہ آنے لگا جو عورت ہونے کے ناطے ناقص العقل واقع ہوئی تھی۔

رائفل کارتوس اور چھری میرے وہ ہتھیار تھے جنہیں میں فرار سے کم کسی موقع پر استعمال کر کے گنوانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا لہٰذا مایوسی اور جھلاہٹ کے عالم میں میں واپس ادھر روانہ ہوا جہاں میں نے رائفل کا چرمی غلاف دفن کیا تھا۔

میں نے غلاف نکال کر رائفل اس میں ڈالی۔ کافی کوشش کے بعد میں نے بیس کارتوس بھی اسی غلاف میں ڈال دیئے کیونکہ چرمی بلٹ میں دفن کرنے کی صورت میں نمی سے کارتوس ضائع ہو سکتے تھے۔ چھری بھی کسی نہ کسی طرح اسی غلاف میں سما گئی۔ میں نے وہ غلاف اور کارتوسوں کی پیٹی پوری احتیاط سے ایک خشک قطعۂ زمین میں دفن کر دی اور اوپر اس طرح مٹی بکھیر دی کہ بادی النظر میں اس مقام پر کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔

اس بار میں کاٹیج سے محفوظ فاصلہ اختیار کر کے واپس جھونپڑوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں ہر طرف سکوت اور سکون چھایا ہوا تھا، کہیں بھی کسی غیر معمولی واقعہ کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔ میں نے باری باری پانچوں جھونپڑوں کا طواف کیا مگر سونے والوں کے خراٹوں کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی۔ دن بھر کے تھکے ہارے مزدور گہری نیند سو چکے تھے اور ایسا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا کہ وہاں کسی نے گیتا کو زبردستی روک لیا ہو۔

عورتوں کے جھونپڑوں کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے ادھر کا رخ کیا جہاں حشیش کے سوکھے پودوں کا انبار جمع تھا۔ گیتا کو منصوبے کے مطابق اسی جگہ میں آگ لگانی تھی۔

خشک پودوں کے انباروں کے درمیان ایک جگہ مجھے زمین پر ایک سایہ انسانی ہیولا نظر آیا۔ میں دھڑکتے دل سے قریب پہنچا تو اچانک میری آنکھوں میں نفرت اور قہر کا جہنم بھڑک اٹھا۔

تاروں بھرے آسمان کے نیچے گیتا ننگی زمین پر برہنہ تن بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ دشمنوں نے اس پر پوری طرح جوانی نکالی ہے۔ قریب ہی اس کے کپڑوں کی راکھ بکھری ہوئی تھی۔ اس راکھ میں بچی ہوئی چند دھجیوں کی بنا پر مجھے صورتحال کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا اور اسی کے ساتھ مجھے خود پر قابو پانا دشوار ہونے لگا۔

میں اس کے قریب بیٹھ کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

پرندوں کی ہلکی ہلکی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں صبح ہونے کا اجالا پھیلنے والا ہے۔ میری کوشش یہ تھی کہ اجالا پھیلنے سے قبل ہی گیتا کو ہوش میں لا کر کسی دور افتادہ گوشے میں لے جاؤں جہاں برہنگی کے باعث وہ شرمندگی اور مذاق کا شکار ہونے سے بچ سکے۔

اسی اثنا میں مجھے کہیں قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی اور میں چونک کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا مگر دوبارہ مجھے کوئی آہٹ نہ سنائی دی۔ پھر اچانک ہی کسی جانب سے مجھ پر سرچ لائٹ کی تیز روشنی ڈالی گئی اور میں بھڑک کر کھڑا ہو گیا۔

"پکڑ لو اسے!" روشنی کے عقب سے جانی کی آواز ابھری اور مختلف سمتوں سے تین سائے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

سب سے پہلے جو شخص میرے قریب آیا وہ میرا شناسا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس کے چہرے پر ٹکر ماری اور وہ کراہتا ہوا پیچھے گر گیا مگر دوسرے دو افراد بہت پھرتیلے تھے۔ میرے دوبارہ تیار ہونے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے دبوچ لیا۔

"لڑکی کی لاش بھی اٹھا لو۔" جانی نے ان کو ہدایت کی۔

"لاش؟" میں حیرت اور غصے سے تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں۔ اس جزیرے پر غدر اور سرکشی کی یہی سزا ہے۔" جانی کا لہجہ سرد اور جذبات سے یکسر عاری تھا۔

"رائفل کہاں ہے؟" اس بار جوشی مجھ سے مخاطب ہوا۔ میری ٹکر کھانے کے بعد اب وہ اپنے حواس یکجا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

"ہوش میں رہ کر بات کرو۔" میں غرایا۔ "میرے پاس تم دونوں نے کوئی ہتھیار نہیں چھوڑا تھا۔ اگر رائفل ہوتی تو گیتا کو تم لوگ چھو بھی نہ پاتے!"

جانی استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "وہ ماچس لے کر یہاں آگ لگانے آئی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ دیکھ لی گئی اور جوشی کو اپنے ارمان پورے کرنے کا موقع

مل گیا اور اس کا ہر دو مخالف میں ملانے سے بعد اس کا سر جزا دیا گیا۔ اگر تم نے مکاری کی تو اس بار تم بھی زندہ نہ رہ سکو گے!"

"میں فوراً ہی دلگیر سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"استاد کا ہرکارہ خود تمہارا منتظر ہے!"

وہ چاروں مسلح تھے انھوں نے مجھے اس طرح کور کیا کہ میرے لئے کسی چالبازی کی گنجائش نہ رہی اور صبح صادق کی دھندلی روشنی میں وہ مجھے کاٹیج کی طرف لے چلے۔ ایک شخص نے گیتا کی برہنہ لاش کندھے پر لاد لی تھی۔

کاٹیج کے قریب پہنچ کر لاش والا نہر کی طرف بڑھ گیا اور جانی مجھے ہمراہ لیکر اندر داخل ہو گیا۔

کاٹیج میں قدم رکھتے ہی میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ دیئے کی روشنی میں چنگ ہوا مسہری پر دراز خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

میں ایک بار اس پستہ قامت چینی کی قوت اور مہارت کا مظاہرہ دیکھ چکا تھا جب اس نے سیلرز کلب کی اوپری منزل میں نہایت اعتماد کے ساتھ مجھے کسی شیر خوار بچے کی طرح بے بس کر کے سچ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"جانی۔ تم باہر جاؤ!" چنگ ہوا نے چند ثانیوں تک مجھے گھورتے رہنے کے بعد کہا اور جانی فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔

"تم جانتے ہو کہ میرے سامنے تمہاری حیثیت کیا ہے؟" چنگ ہوا نے مسہری کے پہلو میں تپائی سے شراب کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا میرا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں میں جو کچھ پوچھتا ہوں اس کا سیدھا سیدھا جواب دو!"

"میں تمہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے چوبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہاں جو کچھ کیا استاد کی ہدایت کے مطابق کیا ہے!"

"میرا استاد سے رابطہ نہیں ہو سکا۔" وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسی لئے میں یہاں آیا ہوں۔ یہ معاملہ اب میری مرضی کے مطابق طے ہوگا۔"

"جانی اور جوشی نے میرے خلاف صرف اس لئے کارروائی کی ہے کہ تمہارے دلگیر سنگھ کی ہدایت کے مطابق جوشی کی وفاداریاں آزمانے کے لئے اسے چارہ ڈالا تھا۔"

"یہ میں سن چکا ہوں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولا۔ "تمہاری زبان سے کوئی نئی بات سننا چاہتا ہوں۔"

"اس بار تمہیں مایوسی ہوگی۔" میرا لہجہ پُراعتماد تھا۔

اس نے بلند آواز میں جانی کو پکارا اور وہ فوراً ہی اندر آ گیا۔

"رائفل کا سراغ ملا؟" چنگ ہوا نے اس سے سوال کیا۔

"نہیں۔" یہ کہتے ہوئے جانی کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ "اس جزیرے پر یہ حرکت ماسٹر کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"کیسی رائفل؟" میں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم تھوڑی دیر پہلے بھی مجھ سے رائفل کے بارے میں سوال کر چکے ہو!"

"منوج کیا کہتا ہے؟" چنگ ہوا نے میری برہمی کو نظر انداز کرتے ہوئے جانی سے اگلا سوال کیا۔

"وہ ابھی تک بضد ہے کہ وہ پل بھر کے لئے بھی غافل نہیں ہوا۔ بس چند سیکنڈ کے لئے مائیکل کی للکار پر بوٹ کی طرف گیا تھا مگر وہاں سے بھی کاٹیج کا دروازہ اس کی نظروں میں تھا!"

میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ منوج یقیناً وہی شخص تھا جسے جُل دیکر میں کاٹیج میں گھسا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس کے پاس جھوٹ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اگر اس کی غیر حاضری کے بارے میں مائیکل گواہ رہتا تو وہ شاید وہاں سے نہ ہلنے کی قسم تک کھانے پر تل جاتا۔

"منوج کو یہاں پہلے آؤ۔" چنگ ہوا کا لہجہ سرد تھا۔

چند منٹ میں منوج وہاں پہنچا دیا گیا۔ اس دوران میں چنگ ہوا خاموشی سے شراب کا گلاس خالی کرتا رہا۔

"تم صفدر کا خیال رکھو۔" جانی کو یہ ہدایت دیتے ہوئے چنگ ہوا بستر سے اتر گیا اور منوج کے سامنے جا کر تلخ لہجے میں بولا۔ "کیوں نمک حرام، جھوٹ بولنے سے باز نہیں آئے گا؟"

"میں جھوٹ نہیں بولتا استاد۔" وہ تقریباً کراہتے ہوئے بولا۔

اچانک چنگ ہوا برق رفتاری سے فضا میں اچھلا اور منوج نامعلوم طریقے پر چیخ مار کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر گیا۔ اس کے پلٹنے سے قبل ہی چنگ ہوا اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اس کی انگلیاں جونکوں کی طرح منوج کی ریڑھ کی ہڈی کے گرد گوشت میں پیوست ہونے لگیں۔

اچانک منوج کے ہاتھ پیر بے جان ہو کر ڈھیلے پڑ گئے مگر اس کے حلق سے کربناک چیخیں ابل رہی تھیں۔

"بوٹ سے کاٹیج کا دروازہ نظر آ رہا تھا؟" چنگ ہوا نے بیٹھے اور پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں۔" منوج نے چیخوں کے درمیان بے اختیار کہا۔

"تم کتنی دیر وہاں رکے تھے بیٹے؟" چنگ ہوا کا لہجہ مضحکانہ تھا۔

"چار پانچ منٹ!"

چنگ ہوا اچھل کر اس کی پشت سے اتر گیا۔ "اتنی دیر میں تو پورا کاٹیج خالی کیا جا سکتا تھا۔"

منوج چند سیکنڈ تک اسی مفلوج حالت میں زمین پر پڑا رہا پھر یوں اچھل کر اٹھا جیسے دوبارہ چنگ ہوا کے سوار ہو جانے کا خطرہ ہو۔

"میں جاؤں؟" منوج نے اٹھتے ہی خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کوئی آہٹ تو نہیں ہوئی تھی؟" چنگ ہوا نے پوچھا۔

"نہیں استاد!" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "میں واپس آیا تو بولٹ اسی طرح چڑھا ہوا تھا۔"

"جاؤ اور اس سزا کو یاد رکھنا۔"

"صفدر۔ رائفل لوٹا دو!" اس بار چنگ ہوا پُراعتماد اور دھمکی آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا تھا اور اس کے تیور خراب نظر آ رہے تھے۔

"شاید اب تم مجھے کسی نئی سازش کا ایندھن بنانے کی کوشش کر رہے ہو!"

میں غصیلے لہجے میں بولا "اس جزیرے پر ایک سے ایک شاطر پڑا ہے۔ جانی اور جوشی نے یہاں سازشی ماحول قائم کر کے ان کے حوصلے بڑھائے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی۔ حرکت کر سکتا ہے۔"

"تم رات بھر کہاں تھے؟"

"میں مشرقی ساحل پر موجود تھا۔" میں نے بیزاری کے عالم میں کہا "وہ رائفل بھی ایسی جگہ نہیں جسے میں نگل گیا ہوں۔"

"وہ زمین میں بھی دبائی جا سکتی ہے۔"

"تو سارے مزدور لگا کر جزیرے کو کھدوا ڈالو، ہو گی تو مل ہی جائے گی۔"

چنگ ہوا سے گفتگو میں میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے لہجے سے خوف یا بے اعتمادی کا اظہار نہ ہونے دیا تھا۔

"سیتا کو ماچس کس نے فراہم کی تھی۔"

"جوشی اس کا عاشق تھا۔ وہ کسی بھی مرد سے ماچس حاصل کر سکتی تھی۔ یہاں اس کے بہت سے چاہنے والے موجود ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ اگر وہ اتفاقاً نظر نہ آتی ہوتی تو خشک پودوں کے ساتھ ہی بیشتر کھیت بھی جل کر تباہ ہو جاتے۔"

"مجھے معلوم ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھ سے سارے اختیارات چھینے جا چکے ہیں۔"

"اختیارات کا سلب کیا جانا دوسری بات ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولا "تم ابھی تک جزیرے کے اقتدار کے دعویدار ہو۔"

"مگر تمہاری ذات سے مجھے انصاف کی امید نظر نہیں آتی۔"

اس مرحلے پر چنگ ہوا نے اشارے سے جونی کو باہر بھیج دیا اور جب اس کی آہٹیں [illegible] معدوم ہو گئیں تو رازدارانہ لہجے میں بولا "تم نے ابھی کسی سازشی ماحول کا ذکر کیا تھا؟"

اس کے لہجے پر میں چونک پڑا۔ چند ثانیوں میں بے یقینی کے عالم میں اسے گھورتا رہا۔ جب وہ سر ہلاتے ہوئے حوصلہ افزائی کے انداز میں مسکرایا تو میں نے کہا۔ "ان دونوں نے یہاں مزدوروں کو خون خرابے کی کھلی چھٹی دی ہوئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" چنگ ہوا کا لہجہ اشتیاق آمیز تھا۔

"ان کے باہمی جھگڑوں حتیٰ کہ مہلک خونریزی میں بھی اس وقت تک دخل نہیں دیا جاتا جب تک لڑنے والوں میں سے کوئی فریق شکایت نہ لائے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "اور مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ پالیسی دگیر سنگھ کی ہدایات کے عین مطابق ہے۔"

"دگیر سنگھ!" وہ دانت پیس کر زیر لب بڑبڑایا۔ انداز خود کلامی کا تھا مگر لہجہ اتنا بلند تھا کہ میں بھی باآسانی اس کے الفاظ سن سکتا تھا "وہ نہ انتظام چلا سکتا ہے نہ پیسہ کما سکتا ہے۔ اسی لئے سونا اگلنے والی اس زمین سے واجبی نامدے پر قناعت کر رہا ہے۔"

"کیا مجھ سے کچھ کہا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے چونک کر چنگ ہوا سے کہا۔

"نہیں۔" وہ جھلا کر بولا "تمہارا تنازعہ دگیر سنگھ ہی آ کر طے کرے گا۔"

"اور اگر وہ طویل عرصے تک نہ آیا؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں جانی اور جوشی کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔" اس نے لاتعلقانہ انداز میں کہا۔ پھر چونک کر بولا "مگر وہ طویل عرصے تک کیوں نہیں آئے گا؟"

"میں نے یونہی رائے ظاہر کی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اس رائے کی کوئی وجہ بھی ضرور ہو گی۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"وجہ تو کوئی نہیں ہے۔" میں نے سٹپٹا کر کہا۔ چنگ ہوا کا رویہ میرے لئے ناقابل فہم اور قدرے پُراسرار ہوتا جا رہا تھا۔

"اگر مجھے یقین ہو کہ چار چھ ہفتوں تک وہ ادھر کا رخ نہ کر سکے گا تو میں معاملے نمٹا دوں گا۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مجھے صرف اپنے معاملے سے دلچسپی ہے۔" میں خواہش کے باوجود اس کے سامنے کھلنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے یاد تھا کہ جزیرے سے روانگی کے وقت دگیر نے چنگ ہوا کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ دگیر سنگھ کی طویل بیرونی دورے کی اطلاع چنگ ہوا کے کانوں تک نہ پہنچاؤں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ان دونوں کے بغض سے میں بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہوں مگر کوئی غیبی طاقت مجھے چنگ ہوا پر بھروسہ کرنے سے باز رکھ رہی تھی۔

"پہلا معاملہ تمہارا ہی ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولا "اگر میں جزیرے پر قابض بھی ہو جاؤں تو میں یہاں نہیں رک سکتا۔ مجھے یہاں اپنا آدمی مامور کرنا ہو گا۔"

اب میرے کان کھڑے ہوئے۔ چنگ ہوا نے کھل کر اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا "مگر جانی اور جوشی میرے دشمن ہو گئے ہیں۔"

"ان کے نزدیک اس وقت میں دگیر سنگھ کا بااختیار نمائندہ ہوں اور اسی حیثیت میں تمہارے اختیارات بحال کر سکتا ہوں، تم کسی بھی وقت انہیں راستے سے ہٹا سکتے ہو۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بڑا مشکل امتحان تھا۔ چنگ ہوا کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ مگر خرابی یہ تھی کہ اس مردود کے چہرے سے دل کا حال جاننا ناممکنات میں سے تھا۔

"میرا قیافہ کہتا ہے کہ تم دگیر کے بارے میں کوئی خاص بات جانتے ہو۔" اس نے مجھے خاموش پا کر کہا "جب میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں تو تم کیوں ڈر رہے ہو؟"

اس مرحلے پر میں فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چنگ ہوا مجھ سے ایسی گفتگو کر رہا تھا جو دگیر سنگھ سے غداری کے مترادف تھی۔ اس وقت جزیرے پر میری حیثیت متنازعہ تھی۔ اگر میں چنگ ہوا کی پیش کش کا مثبت جواب نہ دیتا تو دگیر اپنے راز کی خاطر مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیتا۔ وہ باآسانی مجھے غدار قرار دے کر سب کے سامنے گولی مار سکتا تھا۔ اس کے رویے سے اب ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ دگیر سنگھ کا وفادار نہیں ہے۔

"دگیر سنگھ یہاں نہیں ہے۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"کہاں نہیں ہے؟" اس نے بیتابانہ لہجے میں سوال کیا۔

"وہ کئی ہفتے کے لئے ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس نے سختی سے مجھے ہدایت کی تھی کہ یہ خبر تم سے چھپاؤں۔"

"اور تم نے اس کا یہ راز میرے سامنے اگل دیا۔" یہ کہہ کر وہ بھیانک انداز میں ہنسا۔

میرے بدن میں دہشت اور سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی بے محل ہنسی بڑی خوفناک تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے چنگ ہوا نے چارے میں لپیٹ کر میرے سامنے کانٹا پھینکا اور میں اسے نگل گیا۔

شاید اس نے میرے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت بھانپ لی اور یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے تمہاری صلاحیتوں کا خوب اندازہ ہے۔ مجھے یقین تھا کہ دگیر کا احمقانہ نظام تمہیں جزیرے کا قیدی نہ رکھ سکے گا۔ شاید تم نے جانی اور جوشی کو راہ سے ہٹانے کا منصوبہ اسی لئے بنایا تھا کہ دگیر بیرون ملک گیا ہوا تھا۔"

"نہیں۔ اس وقت تک میں نے کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔" اس بار میں محتاط ہو گیا تھا۔

"تو آج رات رائفل کس لئے لے اڑے؟" اس کا دھیما لہجہ بے حد دوستانہ تھا۔

"نہیں نہیں۔" میں جلدی سے بولا "میں نے تو ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ یقین کرو کہ وہ کسی اور کے ہاتھ لگی ہے۔ رائفل کا یوں گم ہونا کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔"

"خیر رائفل بھی تلاش کر لی جائے گی۔"

"یہ کام سب سے پہلا ہے۔" میں نے اس کے رہے سہے شبہات زائل کرنے کے لئے کہا۔ "اگر میں۔ . . . بحال ہو گیا تو گمشدہ رائفل میرے لئے سب سے بڑا خطرہ ہو گی۔ چرانے والے نے پرندوں کے شکار کے لئے تو رائفل نہ چرائی ہو گی؟"

وہ ایک بار پھر بھیانک انداز میں ہنسا اور جونہی اس کا قہقہہ تھما، اس نے میرے دائیں رخسار پر ایک بھرپور گھونسہ رسید کیا۔

بے خیالی کے سبب دانتوں سے زبان زخمی ہو گئی اور میں اپنے دہانے میں اپنے ہی خون کی حرارت محسوس کرنے لگا۔ میں نے پوری قوت سے اس پر چھلانگ لگائی۔ مگر وہ پھرتی سے بچ گیا اور اسی وقت اس کی للکار پر چھ سات آدمی دوڑتے ہوئے اندر گھس آئے۔

"ہینڈز اپ!!" مجھے دوسرے حملے کی تیاری کرتے دیکھ کر جوشی دروازے سے دھاڑا اور میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

"چارہ اس طرح ڈالا جاتا ہے۔" چنگ ہوا میرا مضحکہ اڑاتا ہوا بولا "استاد نے خود بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور تجھ سے ہونے والی گفتگو بھی دہرائی تھی تاکہ کسی مرحلے پر میں تیری وفاداری کا امتحان لے سکوں۔ اس جزیرے پر مزدوری کرتے کرتے مرنا اب تیرا مقدر بن چکا ہے جسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ جانی سے مخاطب ہو گیا "اسے جھونپڑوں کی طرف ہانک دو۔"

"مگر وہ رائفل. . . . ؟" جوشی نے کہنا چاہا۔

"بکواس مت کرو۔" چنگ ہوا کسی بھیڑیئے کی طرح غرّایا "وہ اس نے چرائی ہوتی تو اگل چکا ہوتا۔ نکال دو اسے باہر۔"

پھر میرے بڑھنے کے باوجود وہ مجھے دھکے دینے لگے۔

باہر صبح کا اجالا تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ نسیم سحری کے خوشگوار جھونکے آ رہے تھے۔ فضا اور پرندوں کے ملے جلے تیز شور سے گونج رہی تھی۔ میں نے خون سے بھرا ہوا منہ ریتلی زمین پر خالی کیا اور شکست خوردہ قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

میں اس رات کا معرکہ ہار چکا تھا مگر یہ شکست حتمی نہیں تھی۔ کسی غیبی قوت یا اپنی چھٹی حس کے سہارے میں نے اپنی اس مکمل شکست کو آئندہ کامرانی کی بنیاد بنا لیا تھا۔ اگر مجھ سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو وہ رائفل بھی میرے قبضے سے نکل جاتی جو میں نے گیتا کی زندگی اور چنگ ہوا کے ایک طاقتور گھونسے کے عوض خریدی تھی۔

میں ملے جلے خیالات کی رو میں بہتا ہوا جھونپڑوں کے قریب پہنچا تو وہاں بیداری کے آثار ہویدا تھے۔ مجھے دیکھ کر کسی جانب سے ڈی سوزا نامی ایک مزدور تیزی سے میری طرف آیا۔

"ارے ماسٹر! تمہارا جبڑا سوجا ہوا ہے۔" قریب آتے ہی اس نے حیرت سے کہا۔

اور اچانک مشینی طور پر میرا ہاتھ چل گیا۔ ڈی سوزا گھونسہ کھا کر چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا اور چند ہی سیکنڈ میں پلٹ کر کسی وحشی درندے کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔

اس کی چیخیں اور گالیاں سن کر لوگ تیزی سے وہاں جمع ہونے لگے. . . .

ڈی سوزا کے دوستوں کے تیور خراب تھے۔ باقی لوگ محض پرجوش تماشائی تھے۔ میرے لئے کسی کے چہرے پر ہمدردی یا حمایت کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔

ڈی سوزا پر ہاتھ اٹھا کر میں نے بلاوجہ جھگڑے کی پہل کی تھی مگر اس میں میرا زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ اس کا تبصرہ سنتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔ رات بھر کی بیداری، بھاگ دوڑ اور چنگ ہوا کے آخری سلوک سے جھلایا ہوا ذہن وہ تبصرہ نہ سہہ سکا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور مجھے اس جھگڑے سے باآسانی گلو خلاصی ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

چنگ ھوا سے پٹنے کے باعث میرے ذہن پر جو جھلاہٹ سوار ہوئی تھی اُو ہی اس وقت میرے کام آئی۔ ڈی سوزا کو میں نے جنون کے عالم میں گھونسوں پر رکھ لیا۔ تماشائی چیخ چیخ کر مجھے داد دے رہے تھے۔ بعض لوگ مقابلے کو طول دینے کی غرض سے ڈی سوزا کو للکار رہے تھے۔ مگر میرے وحشیانہ حملوں نے اسے ذرا سی دیر میں بدحواس کر دیا، اور جونہی اسے موقع ملا وہ لہولہان چہرہ لیئے پلٹ کر جھونپڑوں کی طرف سرپٹ بھاگ لیا اور سارے تماشائیوں نے میری فتح کی خوشی میں چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

آہستہ آہستہ میرے گرد سے بھیڑ چھٹنے لگی۔ میں ان سب سے کٹ کر ایک طرف ہو لیا۔ دن چڑھے مجھے پتہ چلا کہ مجھے پانی کی نالیوں کی دیکھ بھال کا پرانا کام ہی دیا گیا ہے۔ دوپہر کے وقت سمندری نہر کی جانب سے موٹر بوٹ کے انجن کا شور سنائی دیا۔ شاید چنگ ہوا اپنا کام نمٹا کر واپس ممبئی جا رہا تھا۔

اسی وقت گریش پانڈے نامی ایک ادھیڑ عمر شخص اپنا کام چھوڑ کر میرے قریب آگیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "بوٹ تو گئی ماسٹر!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے تجسس جھانک رہا تھا۔ مگر چنگ ہوا کے ہاتھوں اعتماد کا کاری زخم کھانے کے بعد میں کوئی نئی مصیبت مول لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں چند ثانیوں تک اسے گھورتا رہا۔ پھر بولا "گئی تو میں کیا کروں؟"

"بوٹ پر قبضہ کئے بغیر اس شیطانی جزیرے سے نکلنا ناممکن ہے ماسٹر!" وہ پرجوش مگر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا گریش۔" میں غراتے ہوئے بولا "کیا تم اسی لئے یہاں لائے گئے تھے کہ لوگوں کو فرار پر اکساتے رہو۔"

اس نے اضطراری طور پر میرے دہانے پر ہتھیلی رکھ دی۔ "ارے ماسٹر، ایسا غضب نہ کرو، شاید واقعی میرا دماغ پھر گیا ہے۔"

یہ کہہ کر گریش پانڈے اتنی تیزی کے ساتھ وہاں سے بھاگا جیسے اس نے تاخیر کی تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔

وہ تو چلا گیا مگر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ آخر اس نے کس بنا پر یہ اندازہ لگایا کہ میں موٹر بوٹ پر قبضہ کر کے جزیرے سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ وہ جس اعتماد کے ساتھ میرے پاس آیا تھا اس کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ وہ بڑی حد تک میرے عزائم سے آگاہ ہے اور شاید خود بھی فرار کے چکر میں تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں گریش کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔ میں نے اسے دھتکار کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اس بے رحم سرزمین پر ایک آدھ ہم خیال کا ملنا نعمت سے کم نہیں تھا اور میں نے اس نعمت کو ٹھکرا کر سخت حماقت کا مظاہرہ کیا تھا۔

میرے بھڑکے ہوئے رویّے نے یقیناً اسے سہما دیا تھا۔ اگر وہ واقعی فرار کے کسی منصوبے پر کام کر رہا تھا تو رازداری کے پیش نظر کسی بھی وقت مجھ کو خاموش کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

کافی جستجو کے بعد ایک دُور افتادہ اور محفوظ کُنج میں وُہ مجھے نظر آ ہی گیا۔ مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی موجود تھے۔

میری آہٹیں سُنتے ہی وہ تینوں بھڑک کر کھڑے ہوگئے۔ ان کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ وہ مرنے مارنے پر تلے ہُوئے ہیں۔

میں ان کی کینہ توز نگاہوں کی پرواہ کیئے بغیر مسکراتا ہُوا ان کے قریب گیا۔ "یار گریش! مجھے اپنی بدکلامی پر افسوس ہے۔ زخموں کی وجہ سے میں بگڑا ہُوا ہے۔"

"مزاج تو ہم ابھی درست کر سکتے ہیں ماسٹر!" شُکلا تلخ لہجے میں بولا۔

"میں غلط فہمی دُور کرنے آیا ہوں۔" میں اپنی جگہ رُک کر سنجیدگی سے بولا "تم لڑنے پر ہی تلے ہو تو یہ بھی سہی۔"

"کیسی غلط فہمی؟" گریش نے نرم لہجے میں پوچھا۔

میں نے باری باری اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا "میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔"

"تم ان کے سامنے کھل کر بات کر سکتے ہو۔" گریش پانڈے نے جلدی سے کہا "دراصل ہم پچھلے کئی گھنٹے سے تمہارے بارے میں بات کر رہے ہیں۔"

"تو شاید میں وقت پر آگیا؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تم کسی غلط فہمی کا ذکر کر رہے تھے۔" شُکلا نے مجھے یاد دلایا۔

"ہاں۔ دراصل اس وقت میں اپنے سائے سے بھی بدک رہا تھا۔" میں نے کہا "مجھے اپنے رویّے پر ندامت ہے۔"

"اور فرار والی بات؟" گریش نے دبی زبان میں کہا۔

"وہی بات تو مجھے تم تک لانے کا سبب بنی ہے۔"

گریش بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ "تم نے اچھا کیا ماسٹر جو یہاں چلے آئے ورنہ ہم تمہیں ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔"

"اوہ خُدا!" بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا۔ "تو تمہارا منصوبہ اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے!"

"اگر تم درمیان میں نہ آگئے ہوتے تو اس بار ہم نکل گئے ہوتے۔" گریش بولا "تمہاری وجہ سے لوگ بہت زیادہ چوکنے تھے۔ اور ہم نے تمہیں کاٹیج کے آس پاس منڈلاتے دیکھ لیا تھا۔ ہمیں تو یقین سا ہو چلا تھا کہ تم کچھ کر گزرو گے۔۔۔۔ وہ چھوکری کہاں ہے؟"

"وہ ماری گئی۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ "ان لوگوں نے اُسے باہر خشک پودوں کے پاس دیکھ لیا تھا۔ ایک بار جزیرے پہ آگ بھڑک اٹھتی تو میں بوٹ پر قبضہ کر لیتا۔"

"ماسٹر تمہارا دماغ واقعی لاجواب ہے!" گریش پرجوش لہجے میں بولا "ان کی توجہ ہٹانے کے لئے اس سے بہتر تجویز سوچنا ناممکن ہے۔ ایک بار وہ اپنی جگہ چھوڑ دیں تو پھر کوئی طاقت ہمیں نہیں روک سکتی تھی۔ اب مجھے یقین ہے کہ ہم چاروں مل کر یہاں سے فرار ہو سکیں گے۔"

"کیا تمہیں پُورا یقین ہے کہ اس منصوبے سے ہم چاروں کے سوا کوئی واقف نہیں ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"ہاں۔" گریش بولا "میں نے پورے اعتماد کے ساتھ تم سے بات چھیڑی تھی مگر تمہارے منفی رویّے نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ اور محض رازداری کی خاطر ہم نے تمہیں راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"ہمارا کام سے زیادہ دیر غائب رہنا مناسب نہیں۔" میں نے کہا "شام کو ہم چاروں مچھلیاں پکڑنے چلیں گے۔ وہیں بات ہوگی۔"

"ہاں یہ تجویز مناسب ہے۔"

دن کا باقی حصہ میں نے معاملے پر غور کرتے ہوئے گزارا۔ بظاہر میں کام میں مصروف تھا مگر ذہن فرار کے نئے منصوبے کا خاکہ تیار کر رہا تھا، اور اس بار میں کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس دوران میں دو مرتبہ میرا جانی سے بھی سامنا ہُوا مگر میں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی۔

شام کو جب جزیرے پر چھٹی کا گھنٹہ بجا تو فضا مزدوروں کی مسرت آمیز آوازوں سے گونج اٹھی اور لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھیتوں سے باہر نکلنے لگے۔ مجھے باہر آتے ہی گریش پانڈے نظر آیا۔ اس وقت وہ کچھ بوکھلایا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑھنا چاہا لیکن وہ مجھے دیکھ لینے کے باوجود تیزی سے دوسری طرف بڑھتا چلا گیا۔

چند گھنٹوں میں اس کے رویّے میں رُونما ہونے والی تبدیلی میرے لئے بڑی حیرت کا باعث بن گئی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ شاید ان تینوں نے اپنے منصوبے پر نظرثانی کی ہے اور اب وہ کسی چوتھے فرد کو اپنے ساتھ شامل کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

جھونپڑوں کے آس پاس میں نے ان تینوں کو بہتیرا تلاش کیا مگر مجھے ان کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ تھک ہار کر میں نے اس گھاٹ کا رخ کیا جہاں لوگ سمندری نہر میں کانٹے ڈال کر مچھلیوں کا شکار کھیلتے تھے۔ مگر اس بھیڑ میں وہ تینوں موجود نہیں تھے۔

اندھیرا پھیلنے سے ذرا دیر قبل میں جھونپڑوں کی طرف لوٹ آیا۔ وہاں مزدوروں کی ٹولیاں ناچنے گانے میں منہمک تھیں۔ میں بھی ایسی ہی ایک بھیڑ میں شامل ہوگیا۔

اندھیرا پھیلنے کے بعد میں پیشاب کرنے کے لئے میدان کی طرف گیا تو وہاں کسی جانب سے اچانک گریش آ نکلا۔ شاید وہ وہیں میرا انتظار کر رہا تھا۔

"تم مجھے بے وقوف۔۔۔۔" میں نے کہنا چاہا مگر گریش نے خوفزدہ انداز میں مجھ سے خاموش رہنے کی التجا کی اور میرے الفاظ حلق ہی میں دم توڑ گئے۔

"ڈی سوزا آج شام سے تمہاری نگرانی کر رہا ہے ماسٹر!" گریش نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی "اسی وجہ سے ہمیں آج کی ملاقات کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔"

"وہ کیوں میرے پیچھے لگا ہُوا ہے؟" میں نے قدرے تعجب اور غصے سے کہا۔

"اسے جانی نے تم پر نظر رکھنے کی ہدایت دی ہے۔" گریش کی آواز میں خوف کی لرزش نمایاں تھی "وہ پیٹ کا ہلکا ہے۔ میں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ تمہارے پیچھے لگا ہُوا ہے۔ شُکلا نے اس سے بات کی تو وہ فوراً ہی کھُل گیا۔ تمہارے ہاتھوں پٹنے کے بعد وہ سخت مشتعل ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اب اسے جانی کی حمایت حاصل ہے اور وہ ماسٹر کو ٹھکانے لگوا دے گا۔"

میرا زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہیں تھا اس لئے میں واپس جھونپڑوں کی طرف آگیا۔ ڈی سوزا زمین پر میری طرف منہ کیئے لیٹا ہُوا تھا۔ دن بھر میں پہلی بار میں نے اس کی موجودگی محسوس کی تھی اور مجھے پُورا یقین تھا کہ جانی نے محض رائفل کی وجہ سے ڈی سوزا کو میرے پیچھے لگایا تھا۔

گو چنگ ہوا میرے رویّے سے دھوکہ کھا گیا تھا اور اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ کاٹیج سے چوری ہونے والی رائفل میرے پاس نہیں تھی مگر جانی اور جوشی اب بھی میری جانب سے مشکوک تھے۔ انہیں یقین رہا ہوگا کہ حالات معمول پر آتے ہی میں رائفل کی خیر خبر لوں گا۔ اور یوں ڈی سوزا بھی رائفل تک پہنچ جائے گا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ گریش نے بروقت ڈی سوزا کی نگرانی کا سُراغ لگا لیا ورنہ میں لاعلمی میں کسی بھی وقت رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکتا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے ڈی سوزا؟" میں نے دانستہ وہاں رُک کر اُسے چھیڑا۔

وہ یک بیک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "ماسٹر۔ اب میرے منہ نہ لگنا۔ تمہاری ہڈیاں توڑ ڈالوں گا۔"

"میں اپنے رویّے پر شرمندہ ہوں یار!" میں نے نرم لہجے میں کہا "صبح میں کہیں سے پٹ کر آ رہا تھا۔ ساری جھلاہٹ تمہارے سر پر اُتر گئی۔"

اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور سینہ پُھلا کر بولا۔ "صبح تو میں بے خبری میں مارا گیا ورنہ اس وقت تم چلنے پھرنے سے معذور نظر آتے۔"

"میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے بڑھ کر دوستانہ انداز میں اس کا شانہ تھپتھپایا۔ پھر قدرے دھیمی آواز میں بولا "تم دوپہر سے میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

"تو تمہیں معلوم ہے؟" وہ یک بیک خوفزدہ نظر آنے لگا۔

"میں چار آنکھیں رکھتا ہوں۔ یہ نہ بھولو کہ کچھ دن پیشتر جزیرے پر میرا حکم چلتا تھا۔" میرا لہجہ اب بھی دوستانہ ہی تھا۔

"تم نے کسی سے شکایت تو نہیں کی کہ میں تمہارا پیچھا کر رہا ہوں؟" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے کیا ضرورت تھی۔" میں نے لاپرواہی سے کہا "مجھے معلوم تھا کہ تم مجھ سے ناراض ہو اور شاید بدلہ لینے کے چکر میں ہو اس لئے سیدھا تمہارے ہی پاس چلا آیا۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا "جانی وغیرہ کو بھنک بھی نہ لگنے دینا کہ تم اپنے تعاقب سے باخبر ہوگئے تھے۔ یہ وعدہ کرلو تو ہماری دشمنی ختم!"

"یہ وعدہ پکا!" میں نے مسکرا کر کہا۔

ڈی سوزا نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"شاید ان دونوں نے تمہیں میرے پیچھے لگایا تھا؟" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"ہاں۔ جانی کا حکم تھا کہ تم سے پوشیدہ رہ کر تمہاری نگرانی کروں۔ شاید اُسے معلوم تھا کہ میرا تم سے جھگڑا ہُوا تھا اور میں تمہارا دشمن ہو چکا ہُوں۔ اگر اس سالے کو پتہ چل گیا کہ نگرانی ناکام رہی ہے تو میری شامت آجائے گی۔"

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے خوشدلی سے کہا "تم بدستور اپنا کام کرتے رہو۔ اس نے نگرانی کا کوئی مقصد بھی بتایا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے بتایا تھا کہ تم نے مزدوروں کو دھمکانے کے لئے ایک نقلی بندوق بنائی ہے۔ وہ اس کا سراغ حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ وہ لوگ مخالف ہونے کے باوجود ایک عدد رائفل کی گمشدگی کا اعلان کرنے کی ہمت نہیں کر پائے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر جزیرے والوں کو میرے مسلح ہونے کی بھنک بھی مل گئی تو جزیرے سے فرار میں دلچسپی رکھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد میری جاں نثار بن جائے گی۔ جب کہ وہ کسی بھی قیمت پر مجھے تقویت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں تاش کھیلنے والوں میں جا ملا۔ تاش اس قدر خستہ حال اور پرانے تھے کہ تقریباً ہر کھلاڑی ہر پتہ پہچان لیتا تھا۔ مگر کھیل پھر بھی جاری تھا۔ وہ لوگ بھونڈے انداز میں کھیلنے کے عادی تھے۔ کھلے بند دن اشارے بندی اور بے ایمانی ہو رہی تھی۔ میں اکتا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔

"آج رات کسی وقت آؤں گا۔ ہوشیار رہنا۔" اچانک کسی جانب سے تسکلا نمودار ہُوا اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

میں اسی وقت اپنی پیال پر پہنچ گیا۔ واقعات و حالات اب تیزی کے ساتھ موڑ لے رہے تھے۔ مجھے کسی بھی لمحے اپنے حق میں پانسہ پلٹنے کی امید ہو چلی تھی۔

رات گئے جب جھونپڑوں میں خوابناک سناٹا طاری ہو گیا تو خراٹوں کی آواز میں مجھے کسی کے دبے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف سر گھمایا تو تسکلا مجھے اشارے سے باہر بلا رہا تھا۔ میں نے پھرتی سے پیال چھوڑ دیا۔ اور تاروں بھرے آسمان کی چھاؤں میں باہر نکل آیا۔

جھونپڑوں کے عقب میں پھیلی ہوئی خودرو جھاڑیوں کے درمیان گریش اور رنجیت پہلے ہی سے ہمارے منتظر تھے۔ مجھے اور تسکلا کو دیکھ کر ان کے چہرے کھل اُٹھے۔

"ڈی سوزا کہاں ہے؟" وہاں پہنچ کر میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اس کا اور میرا بستر قریب قریب ہے، اس وقت وہ بے خبر سو رہا ہے۔" تسکلا نے بتایا۔

"خوب!" میں نے تعریفی لہجے میں کہا "تم لوگ واقعی بہت محتاط اور باخبر ہو۔ اب میں تمہارے منصوبے کی تفصیلات سننی چاہتا ہوں۔"

"ہمارا منصوبہ بہت خطرناک ہے ماسٹر۔" گریش تفکر آمیز لہجے میں بولا "ہم تو اس مرتبہ اپنا وار کر گزرتے مگر ہم نے تمہیں چھوکری سمیت کاٹیج کے آس پاس منڈلاتے دیکھ لیا تھا اور ہم وہاں سے ہٹ گئے۔ ایک ہی وقت میں دو ٹولیوں کا سامنے آنا خطرناک تھا۔ اگر ہم آپس میں ہی بھڑ جاتے تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔ صبح تمہاری حالت دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ تمہارا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے۔ ہم اس بات سے بہت متاثر تھے کہ تم نے تنہا ان سے ٹکرا جانے کا فیصلہ کیا تھا، اس لئے ہم نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔"

"مگر تمہارا منصوبہ کیا تھا؟" میں ان کی حکمت عملی جاننے کے لئے بے چین تھا۔

"وہ لوگ مسلح ہیں اور ہم کسی بھی قیمت پر اسلحہ حاصل نہیں کر سکتے۔" گریش کہنے لگا "ہم نے اچانک ان پر ٹوٹ پڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم انہیں زیر کر لیتے تو آزادی مل جاتی ورنہ موت ہمارا مقدر تھی۔ جزیرے پر یوں تو ہمیں بہت سے ہم خیال مل سکتے تھے مگر ہم نے رازداری کے پیش نظر کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ ہم کئی مہینے سے اس پر کام کر رہے ہیں۔ شروع میں میں تنہا تھا۔ پھر میں نے بہت سے لوگوں ... آخر ان دونوں کو اعتماد میں لے لیا۔ تم چوتھے اور شاید آخری آدمی ہو جس پر ہم نے بھروسا کیا ہے۔"

"فی الحال موٹر بوٹ واپس جا چکی ہے اور اب اس کی واپسی میں چار پانچ ہفتے ... پہلے ممکن نہیں ہے۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"نہیں اس بار بوٹ جلدی آئے گی۔" رنجیت بولا۔

"وہ کیوں؟"

"شاید تمہیں معلوم ہو کہ اس جزیرے سے جانے والی افیم ... ہوتی ہے۔ بمبئی میں اس چرس اور افیم کی صفائی کی جاتی ہے۔ افیم سے مارفین ... ہیروئن پاؤڈر تیار کیا جاتا ہے۔ چند دنوں میں یہاں افیم کی کھیپ تیار ہونے والی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ بوٹ اسی ہفتے واپس آئے گی۔"

"اگر ایسا ہے تو ہمیں جلد از جلد قدم اٹھانا ہو گا۔ تم جانتے ہو کہ میں جزیرے پر ... رہ چکا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم جانی اور جوشی کو معزول کر کے جزیرے پر قبضہ کر لیں۔ اس طرح اسلحے کا ذخیرہ بھی ہماری تحویل میں آ جائے گا۔ اور ہم بوٹ کو لنگر انداز ہوتے ہی اپنے تصرف میں لے سکیں گے۔"

"مگر ماسٹر! وہ دونوں مسلح ہیں۔ ان پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان تو نہ ہو گا۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "اصل مسئلہ یہ ہے کہ مزدوروں کو بھنک بھی نہ ملنے پائے کہ یہاں فرار کا کوئی منصوبہ تیار ہو رہا ہے ورنہ شورش پھیل جائے گی۔ اور شاید موٹر بوٹ میں اتنے آدمی گھس جائیں کہ وہ سمندر کی تہ میں بیٹھ جاتے۔ اصل کام افراتفری سے بچنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم لوگ جزیرے پر یہ تاثر پھیلانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ایک بار پھر جانی اور جوشی کو معزول کر کے مجھے جزیرے کا حکمراں بنا دیا گیا ہے۔"

"اس میں کوئی دقت نہ ہو گی۔ تمہاری سابقہ حیثیت کے پیش نظر کسی کو شبہ نہ ہو سکے گا۔" گریش نے مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مگر یہ تو بتاؤ تم ان دونوں سے کیسے نمٹو گے؟"

"کل دوپہر کسی طرح ڈی سوزا کو اس حد تک معذور کر دو کہ وہ میرا پیچھا نہ کر سکے۔ پھر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"تو کیا مصنوعی بندوق والی کہانی درست ہے؟" گریش نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈی سوزا نے تمہیں یہ بھی بتا دیا؟" اس بار میں چونک پڑا۔

"ہاں ہاں اس نے تو ساری بات اگل دی۔ جانی اور جوشی کو شبہ ہے کہ تم وہ نقلی بندوق کسی خطرناک موقع پر کام میں لاؤ گے۔"

"مصنوعی نہیں وہ اصل رائفل ہے۔" میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا "اگر ایک بار اسے حاصل کر لوں تو کوئی طاقت مجھے اس جزیرے کا قیدی نہ رکھ سکے گی۔"

"اصلی!" ان تینوں کی آنکھیں حیرت سے اُبل پڑیں۔ "وہ کیسے ... تمہارے پاس ہے؟"

"وہ میں نے کل رات کاٹیج ہی سے اڑائی تھی!" میں نے کہا۔

"اب وہ کہاں ہے؟" گریش نے بے تابی سے پوچھا۔

"جہاں بھی ہے، میری پہنچ میں ہے۔" میں نے جواب دیا "جب تک وہ دوبارہ میرے قبضے میں نہیں آجاتی میں اس کے بارے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"تمہارے علاوہ اور کوئی اس ٹھکانے سے واقف ہے؟" گریش پانڈے نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

اس کے لہجے میں کوئی عجیب تاثر پوشیدہ تھا جس نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے چند ثانیوں تک خاموشی سے اُسے گھورا اور اس سے قبل کہ وہ میری غیرمعمولی خاموشی کو محسوس کر سکے، میں بولا "اس جزیرے پر میرا بھی ایک شریک ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو وہ رائفل تک پہنچ جائے گا۔ اور یہ جزیرہ انسانی لہو کی بوچھاڑ میں نہا جائے گا۔"

"ماسٹر۔ ہم نے تم پر مکمل بھروسا کیا ہے۔" رنجیت کی آواز ابھری "اگر تمہارا بھی کوئی شریک ہے تو سامنے آنا چاہیے۔"

"وہ ضرور سامنے آئے گا، مگر مناسب وقت پر۔" میں نے سرکارانہ لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں ہم پر اعتماد نہیں؟"

"پورا اعتماد ہے۔" میں نے جواب دیا "مگر رائفل کے معاملے میں مجھے مجبور نہ کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہم چاروں کے کام آئے گی۔"

"کل تم رائفل حاصل کر لو گے؟" گریش نے پوچھا۔

"شاید۔" میں نے کہا "اگر مجھے وہاں تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔"

"تو اسی وقت رائفل کیوں نہ نکال لی جائے۔" رنجیت نے کہا "ڈی سوزا تو اپنے جھونپڑے میں پڑا بے خبر سو رہا ہے۔"

"رائفل کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ باقی سارے کام ہم مشورے سے کریں گے۔"

"ماسٹر! تمہارا لہجہ ابھی سے تحکم آمیز ہے۔" گریش شکایتی لہجے میں بولا "ہم برابر کے ساتھی ہیں۔ آقا اور غلام نہیں۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے گریش۔" میں نے نرمی سے کہا "اگر اب بھی تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں تو تم اپنا اپنا راستہ اختیار کر سکتے ہو۔ ایسے کاموں میں بھروسا بہت ضروری ہوتا ہے۔"

"ہم اس مقام پر آ گئے ہیں ماسٹر جہاں الگ راستوں کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" تسکلا نے کہا "کل ہم ڈی سوزا کو روکنے کی پوری کوشش کریں گے۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔"

اس کے بعد ہم یکے بعد دیگرے جھونپڑوں کی طرف واپس ہو لئے۔

اس رات میں پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ گریش وغیرہ کو جانی اور جوشی نے رائفل کا سراغ لگانے کے لئے میری راہ پر لگایا ہے۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ مجھے ان پر بہت تاخیر سے شبہ ہُوا۔ پھر بھی میں نے اپنے ایک فرضی ہمراز کی کہانی گھڑ کر اپنے تحفظ کی آخری کوشش کی تھی۔ ورنہ وہ لوگ رائفل حاصل کئے بغیر بھی مجھے ٹھکانے لگا سکتے تھے۔ کیونکہ میری موت کے بعد رائفل جہاں تھی وہیں پڑے پڑے زنگ آلود اور ناکارہ ہو جاتی مگر جزیرے پر میرے ایک رازداں کی کہانی انہیں اس وقت تک مجھے زندہ رکھنے پر مجبور کر دیتی جب تک رائفل ان کے قبضے میں نہ آ جاتی۔

اگلی صبح سب لوگ کام پر نکل گئے تو میں گریش والے جھونپڑے میں جا گھسا۔ میں نے اس کے پیال کی تلاشی لی۔ راشن والے صندوق کا تالا بھی ایک تار کی مدد سے کھول دیا۔ مگر وہاں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو میرے شبہات کو تقویت پہنچاتی۔ میں دوبارہ تالا بند کر کے اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔

دن چڑھے خبر ملی کہ ڈی سوزا کے سر پر کسی نے پتھر سے شدید ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا ہے۔ اسے فوری طور پر اس کے جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا جہاں جوشی اسے طبی امداد دے رہا تھا۔

ڈی سوزا کے زخمی ہونے کی اطلاع مجھے دوسروں کی زبانی پہنچی تھی۔ گریش، رنجیت یا تسکلا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

ان پیچیدہ حالات میں میرے لئے وہاں رُکے رہنا دشوار ہو گیا۔ آخر میں ان تینوں کی تلاش میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ خاصی تگ و دو کے بعد ٹیوب ویل کے پیچھے ایک ویران جگہ پر مجھے تسکلا نظر آیا۔ وہ میری طرف پُشت کئے کھانے میں مصروف تھا۔ پھر اس نے ایک شیشی منہ سے لگا کر چند گھونٹ لئے۔ اسی وقت میں نے اُسے آواز دی اور وہ بڑبڑا کر اُٹھ گیا۔

جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی چپٹی شیشی قمیص کے نیچے پتلون کے بیلٹ میں اڑس کر چھپا لی مگر میری گھاگ نظریں وہائٹ ہارس کی بوتل اور لیبل پہچان چکی تھیں۔

میں اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے قریب پہنچا تو زمین پر بھنگ کے پتوں میں لپٹے ہوئے مچھلی کے چند تلے ہوئے بے رُوپ پارچے پڑے ہوئے تھے۔

"ادھر کیسے آ نکلے ماسٹر؟" تسکلا نے مجھے دیکھ کر ہکلاتے ہوئے خوش دلی سے سوال کیا۔

"تمہاری ہی تلاش تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا "ڈی سوزا کو کس نے زخمی کیا ہے؟"

"یہ گریش کی کارستانی ہے۔ اس نے رات ہی یہ کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس کی غلیل بہت مضبوط بنی ہوئی ہے۔"

"پھر تم میرے ساتھ آؤ۔"

"کہاں؟"

"رائفل لینے۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا اور وہ فوراً میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم کھیتوں اور انسانی آوازوں کو بہت دور چھوڑ آئے۔ کبھی کبھی ہوا کے دوش پر اکا دکا آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔

"کدھر جانا ہے ماسٹر؟" سفر طویل ہوتے دیکھ کر تسکلا اپنی تشویش چھپا نہ سکا۔

"جزیرے کے شمالی ساحل کی چٹانوں میں۔" میں نے خاردار جھاڑیوں کو عبور کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" وہ خوفزدہ آواز میں بے ڈھنگے پن سے ہنسا "وہاں سے تو ہماری آوازیں بھی نہ سنی جا سکیں گی۔"

"کیا تم ایسی جگہ جانا چاہتے ہو جہاں سے چیخیں دوسروں تک پہنچ سکیں؟"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو ماسٹر؟" وہ بھونڈے انداز میں پھر ہنسا۔

لحظہ بہ لحظہ اس کے بشرے پر گھبراہٹ کے آثار بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"پیاس لگ رہی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔ گرمی کس قدر ہے یہاں!"

"شراب کے دو گھونٹ لے لو!" اس بار میرا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

"شراب؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "شراب یہاں کہاں ماسٹر؟"

میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی پتلون کی بلٹ میں اڑسی ہوئی وہائٹ ہارس کی بوتل نکال لی۔ "یہ زہر ہے کیا؟"

"لاؤ...." اس نے اضطراری انداز میں ہاتھ بڑھا دیا۔ "اسے میں بھول ہی گیا تھا!"

"تمہارے پاس ولایتی شراب کہاں سے آئی؟" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"پڑی ہوئی ملی تھی۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

میرا بھرپور گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ چیخ مار کر پیچھے الٹ گیا۔ میں اس کے سنبھلنے سے پہلے اس کے سر پر سوار تھا۔ "یہ بوتل جانی نے تمہیں پیشگی انعام کے طور پر دی تھی!"

"نن.... نہیں!" وہ میری متوقع ٹھوکر سے اپنا چہرہ بچاتے ہوئے ہکلایا۔

"بکواس!" میری ٹھوکر اس کے سینے پر پڑی۔ "تم تینوں جانی کی شہ پر مجھے کراس کر رہے تھے تاکہ رائفل کا پتہ چلا سکو!" اسی کی تجویز پر تم فرار کا منصوبہ لے کر میرے پاس آئے تھے!"

"یہ غلط ہے۔" وہ اپنا سینہ دباتے ہوئے کراہا۔ "جانی نے ہمیں اندھیرے میں رکھا تھا۔ اس نے مصنوعی بندوق کی کہانی سنائی تھی۔"

میں نے زہریلا قہقہہ لگایا۔ "تم غلط آدمی سے ٹکرائے ہو شسکلا، میں تر لقمہ نہیں ہوں!"

"مم.... مگر کل رات سے ہم تمہارے ساتھ ہیں، مصنوعی حد تک ہم ان کے ساتھی تھے مگر جب تم نے یہ بتایا کہ تمہارے پاس اصلی رائفل ہے تو ہم نے مشورہ کر کے اپنا ارادہ بدل دیا۔ تت.... تم یقین کرو ماسٹر! ہم اس جزیرے سے اکتا گئے ہیں۔ میری اندھی ماں ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اگر میں جلد ہی واپس نہ گیا۔ تو میری دو جوان بہنیں غلط راستوں پر پڑ جائیں گی۔ اب ہم پوری طرح تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں نے وہائٹ ہارس کا پوا کھول کر باقی ماندہ شراب اپنے حلق میں انڈیلی اور خالی بوتل پوری قوت سے زمین پر پڑے ہوئے شسکلا پر دے ماری۔

شسکلا کے حلق سے ایک کریہہ چیخ ابھری اور اس کا پورا چہرہ زخم سے بہتے ہوئے زندہ لہو کی سرخی میں ڈوب گیا۔

میں نے بڑھ کر اپنے پیر کی پوری قوت سے اس کا نرخرا دبا دیا۔ اس کا بدن پوری قوت سے اچھلا اور تڑپتا رہا مگر میں نے لمحہ بھر کے لئے بھی پیر کا دباؤ کم نہیں کیا اور تھوڑی ہی دیر میں شسکلا کے ہاتھ پیر بے جان ہو گئے میرا شکار زندگی سے اپنا رشتہ توڑ چکا تھا۔

میں اس کی لاش کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چٹانوں کے درمیان ... پھر اسے سمندر کی سرکش لہروں کے سپرد کر دیا۔ پانی میں انسانی خون کی بو ... ہی پل بھر میں خونخوار مچھلیاں وہاں سمٹ آئیں اور جب لہروں کے ساتھ ... سمندر کی طرف بڑھی تو مچھلیوں کا ایک جم غفیر اس سے چمٹا ہوا تھا۔

میں نے احتیاط کے ساتھ پانی میں اپنے ہاتھ پیر صاف کئے اور ... کھیتوں کی طرف چل دیا میں وہاں پہنچا تو حالات جوں کے توں تھے ... میری یا شسکلا کی غیر حاضری محسوس نہیں کی تھی۔

شام کو کام ہونے تک دو مرتبہ میرا گرلش سے سامنا ہوا اس کے چہرے سے سراسیمگی کے آثار ضرور ہویدا تھے مگر اس نے مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش ... چھٹی کے وقت مزدوروں کی بھیڑ میں گرلش اور رنجیت مجھ سے ... نے خلاف معمول گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔

"ماسٹر، تھوڑی دیر کے لئے اس بھیڑ سے باہر نکل چلو۔" رنجیت نے ... کان میں سرگوشی کی۔

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ... گرلش بھی پریشان تھا میں نے اپنی رفتار سست کر دی۔

جب دوسرے مزدور ہم تینوں سے آگے نکل گئے تو رنجیت نے گرلش ... کہا۔ "پوچھو!"

"تم ہی پوچھو!" گرلش نے دھیمی آواز میں کہا۔

چند ثانیوں تک قدموں کی دھمک کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی پھر ... نے کھنکار کر آہستہ سے کہا۔ "شسکلا کا کچھ پتہ ہے ماسٹر؟"

"وہائٹ ہارس کی تشنگی خالی کر کے کہیں بے ہوش پڑا ہو گا۔" میں نے ... لہجے میں کہا۔

"دوپہر سے اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔" گرلش بڑبڑایا۔

"تو اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟" میں نے برہم ہو کر پوچھا۔

"کھانے کے وقفے میں اسے تمہارے ساتھ جنوبی ساحل کی طرف ... دیکھا گیا تھا۔" اس نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے کراس کرنے والے اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں گرلش پانڈے صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ماسٹر.... کل رات ہم سے غلطی ہوئی ہمیں فیصلہ کرتے ہی تمہیں ... کرنا چاہئے تھا۔ جب تک ہمیں رائفل کا علم نہیں ہوا تھا، ہم جانی کے ساتھ کام کر رہے تھے مگر اب تمہارے ساتھ ہیں۔"

"مگر میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"ماسٹر، صرف ایک بار ہمیں معاف کر دو!" رنجیت گڑگڑایا۔

"تمہیں ساتھیوں کی ضرورت ہے اور ہم آزادی کے طلبگار ہیں۔"

"جانی کو تباہ کر کے ایسے ہتھکنڈوں میں آنے والا نہیں ہوں ..." ... حقارت سے کہا۔ "شسکلا کی لاش اب تک مچھلیوں کی خوراک بن چکی ہو گی ..."

... اسی انجام سے دوچار ہونے والے ہو، میں بزدل دشمنوں کو جلد یا بدیر ... معاف نہیں کرتا!"

"تم یقین کرو اس بار ہم مخلص ہیں۔ تم جس طرح چاہو آزما سکتے ہو۔" گرلش ... لہجے میں بولا۔

"اگر مخلص ہو تو سیدھے جا کر جانی اور جوشی کو تباہ کرو میں نے شسکلا کو کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"ماسٹر! تم جانتے ہو کہ اس جزیرے پر ہر شخص بھوکے کتے کی طرح زندگی ... ہے۔ جانی نے ولایتی شراب، خشک غذا کے فاضل ڈبے اور قیمتی سگریٹ ... نہیں خریدا تھا مگر تمہارا حوصلہ دیکھ کر ہم نے جینا سیکھ لیا ہے۔ یہ رعایتیں ... ہی اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہیں!" رنجیت نے کہا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "ان لوگوں نے تمہیں میرے پیچھے ... وہ تم سے رپورٹ طلب کریں گے تو تم انہیں کیسے مطمئن کرو گے؟"

"میں نے انہیں صرف پہلی ملاقات سے باخبر کیا ہے اور وہ یہی جانتے ... نے فرار کی پیشکش ٹھکرا دی ہے کل رات کی گفتگو ہم تک ہی محدود ہے۔ ... جیسا تم چاہو گے ویسا ہی کیا جائے گا۔" اس مرتبہ گرلش نے صورتحال کی ... کی تھی۔

"اور ڈمی سوزا بھی تمہارا ساتھی ہے؟"

"نہیں۔ اسے جانی اور جوشی نے براہ راست تمہارے پیچھے لگایا ... ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے تو اتفاقاً ہی سب کچھ اگل دیا تھا۔"

"اس وقت تک تمہیں رائفل کی اصلیت کا علم نہیں تھا پھر تم نے کس ... کے تحت مجھے ڈمی سوزا کے عزائم سے آگاہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتے تھے تاکہ جزیرے پر زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کر سکیں۔ تم ڈمی سوزا کی طرف سے ہوشیار ہو جاتے ... ناکام بنا دیتے پھر اس طرح ہم تمہارے قریب بھی آ سکتے تھے۔ ... ہمارا کوئی مطلب نہیں تھا!"

"اب صرف ایک ہی صورت میں تم پر میں بھروسہ کر سکتا ہوں۔" میں ... کہا۔

"ہمیں ہر شرط منظور ہے!" گرلش جلدی سے بولا۔

"شرط اتنی آسان نہیں ہے۔" میں نے ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ... کہا۔ "تم دونوں کو آج رات جوشی یا جانی کو ٹھکانے لگانا ہو گا۔ دوسرے ... میں نمٹ لوں گا۔"

"... ان دونوں کے چہرے لٹک گئے۔ "یہ تو واقعی جان لیوا کام ..."

"مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا وعدہ ہے کہ تم ... ہدایات پر عمل کرو تو میں بہت قریب رہ کر تم دونوں کی حفاظت کروں گا۔"

وہ دونوں آپس میں بحث کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں انہیں میری ... کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔ اس معاملے میں گرلش زیادہ پُرجوش تھا۔

"تم کسی بہانے سے ان دونوں میں سے ایک کو ٹیوب ویل کی طرف لے آؤ۔ بہترین بہانہ یہ ہو گا کہ تم نے رائفل کا ٹھکانہ تلاش کر لیا ہے۔ وہاں پہنچ کر اچانک ہی اسے قابو میں کر لینا۔ اگر اس نے اپنا اسلحہ اٹھانے کی کوشش کی۔ تو میں اپنی رائفل سے اس کا کام تمام کر دوں گا ورنہ یہ کام تم دونوں کو نمٹانا ہو گا۔" انہیں آمادہ پا کر میں نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے، تو آج ہی کی رات یہ کام کرنا ہے۔" رنجیت نے سوال کیا۔

"ہاں۔ مگر یہ خیال رہے کہ دوسرے کو بھنک بھی نہ ملنے پائے۔ اگر وہ دونوں آ گئے تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم دونوں خطرے میں پڑ جاؤ گے!"

"ہمیں اندازہ ہے ماسٹر!" گرلش پھیکے انداز میں ہنس دیا۔

"... اب رات گئے ملاقات ہو گی!" میں نے ہاتھ لہرا کر کہا اور ان دونوں سے الگ ہو گیا۔

اس روز میرے ... اعصاب شکن ثابت ہو رہا تھا میرے لئے سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اندھیرا پھیلتے ہی رائفل حاصل کروں اس کے بعد میرا کام نسبتاً آسان تھا!

سورج غروب ہونے تک چند گھنٹے میں نے بڑی بے چینی سے گزارے اور جب دھندلکا پھیلنے لگا تو میں احتیاط کے ساتھ جھونپڑوں سے روانہ ہو گیا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ میں گرلش، رنجیت یا ڈمی سوزا کی نظروں میں نہ آ سکوں۔

پوری احتیاط کے ساتھ میں ایک طویل چکر کاٹ کر کاٹیج کے عقب میں اس ساحلی پٹی پر پہنچ گیا جہاں میں نے رائفل دفن کی تھی۔ تھوڑی دیر کی جستجو کے بعد میں نے وہ قطعہ زمین بھی تلاش کر لیا اور انگلیوں سے نرم مٹی کھودنے لگا۔

"تھوڑی دیر بعد رائفل میرے قبضے میں آ چکی تھی میں نے گڑھا ہموار کیا اور رات کے گہرے اندھیرے میں واپس چل دیا۔

وہ چاند کی آخری رات تھی۔ ہر سو گہرے اندھیرے کی حکمرانی تھی اور جنگل حشرات الارض کی بھانت بھانت کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میں رائفل کندھے سے لٹکائے پوری احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کئی مقامات پر احتیاط کے پیش نظر مجھے زمین پر پیٹ اور کہنیوں کے بل بھی رینگنا پڑا اور جب میں جھونپڑوں کے عقب سے گزرا تو درمیان میں محفوظ فاصلہ حائل ہونے کے باوجود میں نے چوپایوں کی طرح چلنے کو ترجیح دی اور کم و بیش دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد میں پسینوں میں شرابور ٹیوب ویل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

سب سے پہلے میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا مگر وہاں میرے علاوہ کوئی ذی روح موجود نہیں تھا اس طرف سے مطمئن ہو کر میں ایک محفوظ مقام پر بیٹھ گیا۔

...وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا۔ حتیٰ کہ نصف شب کے قریب مجھے بستی سے آنے والے راستے پر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ جو بتدریج قریب آتی جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں تین انسانی ہیولے باتیں کرتے اتنے قریب آ گئے کہ میں ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ باآسانی سن سکتا تھا۔

"بس یہیں کہیں ہے وہ بندوق!" اچانک گریش کی آواز آئی اور وہ تینوں کھلے میدان میں ایک ایسے مقام پر رک گئے جو پوری طرح میری زد میں تھا۔

ان میں سے ایک سایہ زمین کا جائزہ .... لینے جیسے ہی جھکا۔ باقی دو بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ جوشی کی دبی دبی غضبناک غراہٹوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اس کا منہ پوری قوت سے دبایا گیا ہے۔

پھر ایک سائے کے ہاتھ میں رائفل نظر آئی۔ اگلے ہی لمحے اس کا کندہ پوری قوت اور کھٹ کی ٹھوس آواز کے ساتھ کسی کے سر پر پڑا۔ اس بار شاید جوشی پوری قوت سے تڑپا تھا کیونکہ اس کے منہ پر جما ہوا ہاتھ اس کی چیخ کو مکمل طور پر دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

رائفل والے کا ہاتھ ایک بار پھر گردش میں آیا۔ کندہ ٹکرانے کی آواز خاصی بلند تھی مگر اس بار کوئی انسانی چیخ نہ ابھری۔

دو سائے کھڑے ہو کر سانس درست کرنے لگے۔ تیسرا زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا شاید اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

میں بدستور اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا پھر گریش کی ہانپتی ہوئی آواز فضا میں گونجی۔

"ماسٹر، ہم فارغ ہو چکے ہیں۔ تم کہاں ہو!"

"رنجیت! رائفل زمین پر ڈال دو، میں آ رہا ہوں!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ رائفل والے نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور میں اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔

جوشی کی لاش بہت بھیانک نظر آ رہی تھی مگر میرے پاس اس کا جائزہ لینے کے لئے زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو اعشاریہ چار دو بور کا ایک ہولناک پستول نکلا جس کا چیمبر بھرا ہوا تھا۔ دو چابیاں ملیں جو میری جانی پہچانی تھیں۔ ان میں سے ایک اسلحے کے صندوق کی اور دوسری کاٹیج کے دروازے کے تالے کی تھی۔ سگریٹیں اور چند ننگی تصویریں بھی برآمد ہوئیں جو میں نے رنجیت کو دے دیں!

"اسے کہاں سے لائے؟" میں نے گریش کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"یہ کامنی کے جھونپڑے میں داد عیش دے رہا تھا، ہم نے اسے وہیں جا لیا۔ گمشدہ رائفل کا نام آتے ہی یہ وہاں سے نکل آیا!" گریش نے بتایا۔

"ماسٹر! اب تو شاید ہم نے تمہارا اعتماد جیت لیا ہے؟" رنجیت نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ اب ہم مل کر کام کر سکیں گے!" میں نے کہا۔

جوشی کی لاش وہیں زمین میں دبا دی گئی۔ اس کی قبر کھودنے میں میری چھری نے خاصا کام دکھایا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم تینوں کاٹیج کی طرف چل دیئے۔

کاٹیج پر گہرا سناٹا محیط تھا۔ جانی اندر سے دروازہ مقفل کر کے سویا ہوا تھا۔ ہم نے کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر کاٹیج کا طواف کیا مگر اندر گھسنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔

میرے لئے باہر رک کر جانی کے بیدار ہونے کا انتظار کرنا بہت مشکل تھا۔ میں ساری کارروائی رات کے اندھیرے میں مکمل کرنی چاہتا تھا تاکہ صبح کے اجالے میں یکسوئی کے ساتھ جزیرے پر اپنی گرفت مضبوط کر سکوں۔

اسی سوچ بچار میں مجھے کاٹیج کا وہ چوبی زینہ یاد آیا جو چھت کے لئے بنا ہوا تھا۔ میں تناور درخت کی جھولتی ہوئی شاخ ... کاٹیج کی چھت پر کودنے میں کامیاب ہو گیا اس کے بعد ... ثابت ہوا۔ زینے کے اختتام پر بنا ہوا تختوں کا دروازہ ... تھا۔ میں نے ایک جھری میں سے ہاتھ ڈال کر کنڈی ... اور نیچے ... ہوا جانی کی خوابگاہ میں داخل ہو گیا۔

جزیرے پر گرمی کے باعث وہ صرف نیکر پہنے ... کی یرقان زدہ روشنی میں وہ کسی بے جان ممی سے مشابہ لگ ...

پہلے تو میں نے سوچا اسے بستر پر ہی ختم ... لیکن اس ... وہ بستر میرے یا میرے ساتھیوں کے ہی کام آتا تھا اس لئے میں ... سے بستر کو ناپاک کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور پوری قوت سے ... اس کی پسلیوں میں مارا۔

وہ سوتے سوتے چیخ مار کر بستر سے کئی فٹ اوپر فضا میں اچھلا ... کے بستر پر گرتے ہی میں نے اسے بال پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔

وہ بے تحاشا گالیاں بکتے ہوئے وزنی لاش کی طرح فرش پر ... میں نے اسے ذرا بھی مہلت نہیں دی۔ براہ راست اس کے بائیں پہلو ... پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ ہولناک دھماکے کے ساتھ گولی اس کے دل کو ... سے نکل گئی۔

جانی کا جسم صرف چند ثانیوں کے لئے فضا میں اچھلتا رہا ... فرش اس کے بہتے ہوئے خون سے رنگین ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو گریش اور رنجیت پاگلوں کی طرح ...

"تم عظیم ہو ماسٹر، تم واقعی عظیم ہو۔ ہم زندگی بھر تمہارے غلام رہیں گے!"

"الگ ہٹو، پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے، اگر گولی چل گئی تو ... مل جاؤ گے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ بوکھلا کر الگ ہو گئے۔

کاٹیج میں ولایتی شراب کی بوتلوں سے بھری الماری دیکھ کر وہ ... طرح اس کی طرف لپکے تھے مگر میں نے سختی سے انہیں روک دیا۔ وہ ... سرور میں آ جاتے تو اس لاش کو مجھے تنہا ہی ٹھکانے لگانا پڑتا۔

"پہلے یہ لاش نہر میں ڈال کر فرش صاف کر دو اس کے بعد ہی شراب ..." میں نے کہا۔

"آج کئی برس بعد میری کمر نرم بستر کے لمس سے آشنا ہوئی ہے!" ... ہاتھ پیر پھیلا کر مسہری پر دراز ہو گیا۔ "پڑا رہنے دو سالی لاش کو!"

"نہیں رنجیت، پہلے کام!" گریش نے اسے تنبیہ کی ادا ...

لاش نہر میں پھینکنے کے بعد دونوں نے فرش صاف کیا۔ پھر تینوں نے ... گوشت کے لذیذ پارچوں اور سارڈین کی واٹن سے آتش شکم سرد کی ... کاٹیج کا دروازہ بند کر کے مسہریوں پر دراز ہو گئے۔ ایک مسہری میرے ... تھی دوسری پر وہ دونوں دراز ہو گئے تھے دن بھر کی تکان اور ... نیند ... لگ گئی۔ وہ دونوں دبی دبی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے!

... مجھے میری آنکھ کھلی تو میں کاٹیج کا دروازہ باہر سے مقفل کر کے کھیتوں ... رائفل لٹکی ہوئی تھی اور بغلی ہولسٹر میں پستول جھول رہا ... شان سے آ تا دیکھا تو نگاہوں میں حیرت سمٹ آئی ... دی اور میں سرکو جنبش دیتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔

"جانی اور جوشی کہاں ہیں ماسٹر؟" ایک جگدر گداس نامی ادھیڑ عمر شخص نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"انھوں نے غداری کی تھی اور اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ اب جزیرے پر سارے ... مجھے حاصل ہیں!" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

اس وقت میری نظر ڈی سوزا پر پڑی جو تپلیاں صاف کرتے کرتے کنکھیوں سے ... دیکھ رہا تھا۔ "ڈی سوزا!" میں نے اسے پکارا۔

"یس ماسٹر!" وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہاری ساری حرکتوں سے باخبر ہوں، اگر آئندہ تم کسی سازش میں ملوث ... تو میں تمہیں زندہ سمندر میں پھنکوا دوں گا!"

"میں نے ہمیشہ کاٹیج والوں کے حکم کی تعمیل کی ہے ماسٹر!" وہ سر جھکا کر مردہ ... لہجے میں بولا۔

"حکم کی تعمیل اور سازش میں فرق ہوتا ہے ڈی سوزا!" میں نے سخت لہجے ... آئندہ اس بات کا خیال رکھنا!"

میں نے اس روز پورے جزیرے کا گشت لگایا تاکہ مزدوروں کو اقتدار کی ... علم ہو جائے۔ جب میں واپس کاٹیج پہنچا تو وہ دونوں میرے منتظر تھے!

"ماسٹر! ایک بات کہوں؟" اس بار گریش نے زبان کھولی تھی۔

"کیا؟"

"ایک میں ہماری کوئی بے اعتدالی تینوں ہی کو نہ لے ڈوبے، اگر تم اجازت دو تو ... پہلے کی طرح جھونپڑوں میں چلے جائیں!" اس نے کہا۔

"تمہاری مرضی پر منحصر ہے!"

"اس طرح ہم باہر والوں کے خیالات سے بھی باخبر رہ سکیں گے!" رنجیت ...

"مجھے کوئی اعتراض نہیں!" میں نے کہا۔ "مگر وہاں رہائش کی صورت میں تم ... ہتھیار نہ رکھ سکو گے!"

"ہم اسلحہ کی پوری حفاظت کریں گے!" گریش نے کہا۔

"نہیں!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم دیکھ چکے ہو کر محض ایک ... سے جانی اور جوشی کو عبرتناک موت سے دوچار ہونا پڑا۔ میں اپنے ساتھ ... کو نہیں چاہتا!"

"... اسلحہ یہاں جمع کرا دیا کریں گے!"

"... ٹھیک ہے!" میں نے جواب دیا۔ "موٹر بوٹ کی آمد تک ہمیں پوری طرح ... ہو جانا ..."

... مجھے رضامند پا کر ان کا اطمینان ہو گیا اور وہ اسلحہ ساتھ رکھنے کے مطالبے سے یکسر دستبردار ہو گئے البتہ ہم نے یہ طے کر لیا کہ ہم تینوں دوپہر کا کھانا کاٹیج میں ساتھ ہی کھایا کریں گے تاکہ روزانہ واقعات پر تبادلۂ خیال ہو سکے اور ساتھ ہی وہ دونوں اعلیٰ قسم کی شراب اور لذیذ کھانوں سے بھی لذت اندوز ہوتے رہیں۔

اس کے بعد جزیرے پر نہایت سکون سے وقت گزرتا رہا۔ اس دوران میں گریش اور رنجیت میرے ساتھ خاصے بے تکلف ہو گئے۔

جزیرے کے اقتدار پر قبضے کے ستائیسویں دن موٹر بوٹ کے ہوٹر کی مخصوص آواز سن کر بے اختیار میرا دل حلق میں آ گیا۔

اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ اور میں کاٹیج میں اکیلا تھا میں نے باہر آ کر گھاٹ سے جائزہ لیا تو بوٹ کھلے سمندر سے نہر میں داخل ہو رہی تھی۔ دن کا اجالا ہونے کے باعث روشنیوں کے اشارے غیر ضروری تھے!

میں بوکھلا کر گھاٹ سے واپس ہو لیا۔ اس وقت گریش اور رنجیت کی وہاں موجودگی بہت ضروری تھی۔ اور وہ نہ جانے کہاں مرے ہوئے تھے۔

میں چند ہی قدم چلا تھا کہ سامنے سے وہ دونوں آتے ہوئے نظر آئے۔ شاید انہوں نے بھی ہوٹر کی آواز سن لی تھی۔

ہم نے بڑی تیزی کے ساتھ تین رائفلیں سنبھالیں۔ فاضل راؤنڈز جیبوں میں بھر لئے، میں نے اعشاریہ چار دو کا ریوالور بھی ساتھ لے لیا اور بوٹ کی آمد سے پہلے ہی ہم نے گھاٹ کو نرغے میں لے لیا۔

کچھ دیر بعد بوٹ چوبی گھاٹ سے آ لگی۔ بوٹ سے ریشم کا ایک موٹا سا رسہ پلیٹ فارم پر پھینکا گیا۔ پھر ایک ملاح بھی اوپر آ گیا۔ اس نے وہ رسہ زمین پر گڑے ہوئے شہتیر سے باندھ دیا اور بوٹ کا انجن بند کر دیا گیا۔

"راجہ۔ ذرا دیکھ تو جانی لوگ کدھر ہے!" بوٹ سے کسی نے چیخ کر کہا۔ وہ آواز واضح طور پر بوٹ کے کپتان مائیکل کی تھی۔

سب سے پہلے گھاٹ پر اترنے والا ملاح کاٹیج کی طرف چل دیا اور بوٹ کا تھکا ہارا عملہ آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔

مائیکل کی معیت میں جب وہ لوگ سایہ دار حصے کی طرف بڑھنے لگے تو ہم تینوں نے اچانک خود کو ظاہر کر دیا۔

"ہینڈز اپ!" میں پستول سے ہوائی فائر کرتے ہوئے غرایا۔

ان میں سے چھ نے مشینی طور پر ہاتھ اٹھا دیئے۔ ساتواں پھرتی سے سینے کے بل زمین پر گر گیا اس کا ہاتھ داہنی جیب میں گیا تھا۔

بیک وقت دو فائر ہوئے۔ گریش کی رائفل کے ایک فائر نے دو ملاحوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور میرے پستول سے نکلی ہوئی گولی نے ساتویں کا بھیجا اڑا دیا۔

"حکم کی تعمیل کرو!" اچانک مائیکل ہذیانی انداز میں چیخا۔ "ان لوگوں پر خون سوار ہے!"

یہ بڑی حوصلہ افزا پیش رفت تھی۔ "تم ان کو یہیں کور کئے رہو، نیلی جرسی والے کے سوا جسے چاہو ہلاک کر سکتے ہو، میں راجہ کو دیکھتا ہوں!" میں نے گریش کے کان میں سرگوشی کی اور تیزی کے ساتھ وہاں سے واپس ہو لیا۔

میں درختوں کی اوٹ سے نکلا ہی تھا کہ اچانک سامنے سے فائر ہوا، گولی میرے داہنے شانے سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی اور میں پلٹ کر جھاڑیوں میں جا گرا۔

کاٹیج کی طرف آنے والا راجہ نامی ملاح خاکی نیکر میں ملبوس ریوالور لئے ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں کھڑا ہوا تھا جہاں سے اس نے مجھ پر فائر کیا تھا۔ شاید گھاٹ کی طرف چلنے والی گولیوں کی آوازوں نے اس پر پہلے ہی صورتحال واضح کر دی تھی۔

میں جہاں تھا سانس روکے وہیں پڑا رہا۔ ادھر راجہ بار بار تنے کی اوٹ سے سر قدرے باہر نکالتا اور مجھے ذرا بھی مہلت دیئے بغیر پھر وہیں دبک جاتا۔

انہی کوششوں میں غیر ارادی طور پر راجہ کی داہنی پنڈلی تنے کی اوٹ سے اس حد تک باہر آ گئی کہ میں اس کا نشانہ لے سکتا تھا۔ گو مجھے پستول چلانے کی مشق نہیں رہی تھی اور نہ ہی میں اتنے بڑے بور کے اسلحہ کے استعمال پر قادر تھا مگر اس وقت ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں ذرا بھی آہٹ کئے بغیر نیم تاریکی میں اس کی پنڈلی کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

ہولناک دھماکے کے ساتھ ہی راجہ کی دلخراش چیخ بلند ہوئی اور وہ پرشور آواز کے ساتھ نیچے گر گیا۔ میں ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر جھاڑیوں سے نکلا تو راجہ کا ریوالور دور پڑا ہوا تھا اور وہ گھسٹ کر اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی داہنی پنڈلی کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔

میں نے جھپٹ کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ اپنے پیر سے کچل دیا اور اس کا ریوالور زمین سے اٹھا لیا پھر اسی کے ریوالور کی ایک گولی میں نے اس کے بائیں پہلو میں اتار دی۔

میں اسے وہیں تڑپتا چھوڑ کر دوبارہ گھاٹ کی طرف واپس ہو لیا۔

وہاں گریش اور رنجیت ان چاروں کو کور کئے کھڑے تھے۔ دو زخمی بے ہوش پڑے تھے تیسرا میرے ہاتھوں پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔

"ان چاروں کی تلاشی لو!" میں نے رنجیت کے ہاتھوں سے رائفل لیتے ہوئے اسے حکم دیا۔

"ماسٹر، یہ خون ریزی تمہیں مہنگی پڑے گی!" مائیکل نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "استاد کے ہاتھ تمہیں قبر سے بھی کھینچ نکالیں گے۔"

"شٹ اپ باسٹرڈ!" میں نے غصے میں اسے دھتکار دیا۔

"وہ چاروں ہی مسلح تھے۔ ان کے ہتھیار برآمد کرنے کے بعد رنجیت نے بوٹ سے ریشم کی پتلی ڈوری کا لچھا نکالا اور باری باری ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔

"زخمیوں کو ختم کر کے نہر میں پھینک دو، ایک لاش درختوں میں بھی پڑی ہوئی ہے!" میں نے ان چاروں کو کاٹیج کی طرف ہانکتے ہوئے گریش کو ہدایت کی۔

"تمہیں ان چاروں کے خون کا حساب دینا ہوگا ماسٹر!" مائیکل زہریلے لہجے میں بولا۔ "تمہارے سینے میں شاید پتھر کا دل ہے، جو آدمیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے پر تلے ہو!"

"بکواس مت کرو مائیکل!" میں رائفل کی نال اس کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے بولا۔ "یہ یاد رکھو کہ میں تمہارے بغیر بھی بوٹ ممبئی لے جا سکتا ہوں!"

میری یہ دھمکی کھوکھلی تھی، میرے لئے بوٹ چلانا تو درکنار انجن اسٹارٹ کرنا بھی دشوار تھا مگر ان الفاظ کا مائیکل پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ بے یقینی کے عالم میں...

گریش اور رنجیت کی واپسی تک میں ان چاروں کو نشانے پر لئے بیٹھا رہا۔ مائیکل قدرے مضبوط اعصاب کا مالک تھا، بقیہ تینوں کی حالت قابل رحم تھی، ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، خشک ہونٹوں پر زبانیں پھیر رہے تھے اور آنکھوں میں ایسی کیفیت تھی جیسے وہ کسی بھی لمحے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیں گے۔

"اب چاروں کے پیر بھی باندھ دو!" ان دونوں کے لوٹنے پر میں نے رنجیت سے کہا، اس نے پھرتی کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل کی۔ انہیں اندرونی کمرے میں چھوڑ کر ہم تینوں باہر نکل آئے۔

"ماسٹر! کمال کر دیا تم نے، اتنی بڑی بھیڑ پر ایسی آسانی سے... یقین نہیں آتا!" باہر آتے ہی گریش بولا۔

"مجھے تو یہ سب ایک بھیانک خواب لگ رہا ہے!" رنجیت ... میں بولا۔ "مجھے صرف ایک قتل اتنا مہنگا پڑا کہ اس جزیرے پر پناہ... اور اس مہینے ہمارے ہاتھوں چھ قتل ہو چکے ہیں... ابھی ہم آزاد..."

"سنو گریش!" میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "اس بوٹ کا... بدمعاش ہے، میں اسے تاثر دینا چاہتا ہوں کہ تم بھی اچھے نیوی گیٹر ہو... میرے احکام پر عمل کرتا رہے!"

"مگر میں تو انجن بھی اسٹارٹ نہیں کر سکتا ماسٹر!"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، بس میری ہاں میں ہاں ملاتے جانا!"

"ابھی تک تو یہی کرتا آ رہا ہوں!" وہ بے جان انداز میں مسکرا...

میں کچھ دیر ان دونوں سے باتیں کرتا رہا پھر انہیں چھوڑ کر... داخل ہو گیا۔ وہ چاروں بدستور فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

"ماسٹر! ہم پیاسے ہیں!" مائیکل نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پانی چاہیے یا شراب؟" میں نے جاندار قہقہہ لگا کر سوال کیا۔

"اتنی خونریزی دیکھنے کے بعد تو شراب ہی ضروری ہے!" ... اس بار بھی خشک تھا۔

"مزید خون خرابہ دیکھنے کا شوق ہو تو سرکشی کی بھی اجازت..." کہہ کر میں نے باری باری ان کا جائزہ لیا، پھر ان میں سے ایک کی... کھولنے لگا جس کی حالت سب سے ابتر نظر آ رہی تھی۔ وہ بندشیں کھلنے... فرش پر پڑا رہا۔

"اٹھو!" میری غراہٹ سنتے ہی وہ اچھل کر یوں اٹھا جیسے... میں اسپرنگ لگ گئے ہوں۔ "ان تینوں کو ان کی پسند کی شراب دو..."

پھر اس کی جان میں جان آئی اور وہ زبان ہلائے بغیر الماری سے شراب کی بوتل نکالنے لگا۔

پھر تینوں نے ندیدوں کی طرح شراب کے گلاس خالی کئے۔ آخر... نے چوتھے کو بھی شراب پینے کی اجازت دے دی، اس نے جہنم کے... اسی طرح وہ آتش صفت سیال اپنے معدے میں انڈیل لیا۔

"تم اس تمام کارروائی کا مقصد ضرور سمجھ گئے ہو گے!" میں نے سگریٹ سلگا... کش لینے کے بعد مائیکل سے کہا۔

"اگر اب بھی نہ سمجھوں تو لعنت ہے میری عقل پر!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"تم بوٹ چلاؤ گے اور اگر مجھے تم پر ذرا بھی شبہ ہو گیا تو میں بلا تامل زندگی کا چراغ گل کر دوں گا!" میں نے پستول کی نال بلند کرتے ہوئے کہا۔

"میں بوٹ ضرور چلاؤں گا ماسٹر اور مجھے کوئی چالاکی کرنے کی بھی ضرورت... ہے کہ تمہاری دھمکی بے جان سی معلوم ہو رہی ہے!"

"میں اپنے الفاظ ضائع کرنے کا عادی نہیں ہوں!" میں نے تیز لہجے... اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ تمہارے بغیر بوٹ نہ چل سکے گی تو یہ خیال ذہن... نکال دو!"

"بوٹ تو کوئی بھی چلا لے گا ماسٹر!" وہ ہونٹ بھینچ کر آہستہ سے ہنسا۔ "کھلے سمندروں کا تعین اور راستے کی تلاش بچوں کا کھیل نہیں ہے ماسٹر!"

"میرے پاس ایک بہترین ملاح موجود ہے!" میں نے اسی لہجے میں کہا اور بلند آواز میں رنجیت کو پکارا۔

چند ہی ثانیوں میں وہ بوکھلایا ہوا اندر آ پہنچا۔ "مجھے پکارا ماسٹر!"

"ہاں، ذرا گریش کو بھیجو!"

گریش کسی پیدائشی نیم کی طرح منہ لٹکائے کاٹیج میں داخل ہوا۔ مائیکل طنزیہ مسکراہٹ لئے ناقدانہ نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

"موٹر بوٹ کو ممبئی پہنچانا ہے!" میں نے گریش سے کہا۔

میری توقع کے برعکس گریش نے ایسی بے ساختہ اداکاری کی کہ میں جھوم... یہ الفاظ سنتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا اور اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "شہر کی رونق دیکھنے کو ترس گیا ہوں ماسٹر! اس بہانے یہاں سے نکل گیا تو... دعائیں دوں گا!"

"زندگی میں پہلے کبھی تنہا سمندر کا سفر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ عاجزانہ انداز میں ہنسا پھر بولا۔ "بڑی بات تو نہیں کرتا ماسٹر، بس ساری عمر سمندروں میں ادھر کا مال ادھر کرتے گزاری ہے اور شاید... مجھے یہاں آنا پڑا ہے!"

"تو یہ راستہ تمہارے لئے اجنبی ہوگا!"

"ذرا بھی نہیں!" وہ بھرپور اعتماد سے بولا۔ "اگر بوٹ میں تیل، پانی اور... تو میں تمہیں ممبئی پہنچا دوں گا!"

"بس جیتے جی اس موٹر بوٹ کو کوئی نہ چھو سکے گا ماسٹر!" آخر کار مائیکل... اور وہ بول ہی اٹھا۔

"تم فکر نہ کرو۔ تمہاری لاش میں اسی جزیرے پر چھوڑ جاؤں گا!" میں نے پستول کی نال بلند کر کے اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"بوٹ میں خود چلاؤں گا!" وہ جھلا کر بولا۔

"اگر یہ تمہاری رضاکارانہ پیش کش ہے تو میں قبول کرتا ہوں!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"پھر میرا کیا ہوگا ماسٹر!" گریش نے موقع کی مناسبت سے پرزور لہجے میں احتجاج کیا۔

"دفع ہو جاؤ باہر!" میں غرایا۔ "اگر آئندہ میری بات میں دخل دیا تو قوت گویائی سے محروم کر دیئے جاؤ گے!"

گریش نے سہم جانے کی اداکاری کی اور دبے قدموں باہر چلا گیا۔

"وہ بھی میرے ساتھ جائے گا!" چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے مائیکل کو آگاہ کیا۔ "اور جہاں بھی مجھے تم پر شبہ ہوا، میں تمہیں ٹھکانے لگا کر گریش کو تمہارا کام سونپ دوں گا۔ کوئی غلط خیال ذہن میں ابھارے تو اس پہلو پر ضرور غور کر لینا!"

"واپسی کا سفر کب ہوگا؟" مائیکل نے شکست خوردہ لہجے میں سوال کیا۔

"اسی وقت!"

"اب شام ڈھل رہی ہے!" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہم فی الحال نہر سے باہر کھلے سمندر میں رکیں گے، ہمارا سفر اندھیرے میں ہی شروع ہوگا!"

"رات کے وقت کسٹم والوں کی گشتی کشتیاں چپے چپے پر گھومتی رہتی ہیں ہم ان سے بچ کر نہ نکل سکیں گے!"

"یہ تمہاری ذمے داری ہے!"

"ہم آج صبح ہی پرمٹ لے کر ممبئی سے نکلے تھے!" وہ تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ "اور آج ہی واپس ہوں گے تو کسٹم والے لازماً ہم پر شبہ کریں گے!"

"مگر تم جزیرے سے اسی روز روانہ ہو جاتے ہو جس دن پہنچے ہو!"

"ظاہر ہے کہ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ جزیرے پر کام پورا کرنے کے بعد چار پانچ دن گہرے پانی میں ماہی گیری کرتے ہیں، پھر واپسی کا سفر اختیار کرتے ہیں!"

"بوٹ میں خوراک وغیرہ موجود رہتی ہے؟"

"ہاں۔ اگر نہ بھی ہو تو تم جزیرے سے ساتھ لے سکتے ہو!"

"ٹھیک ہے، فی الحال ہم کھلے سمندر میں ماہی گیری کریں گے!" میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ممبئی پہنچنے کے بعد میرا کیا بنے گا؟" مائیکل نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"میری طرف سے تم آزاد ہو گے!"

"مگر جنگ ہوا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، اس غداری کے بعد وہ میرے خون کا پیاسا ہو جائے گا!" مائیکل کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے!" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم چاہو تو خود

اس سے مل سکتے ہو، پستول کی نال کے زور پر مجبور کیے جانے کی کہانی اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوگی۔"

"یہ اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم اس ولد الحرام سے واقف نہیں ہو ماسٹر۔" مائیکل اب ذہنی طور پر میری جانب مائل ہوتا جارہا تھا۔

"اگر تم میرے ساتھ مخلص ہو تو میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"پتہ نہیں میرے مقدر میں کیا لکھا ہوا ہے۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بڑبڑایا پھر مجھ سے بولا۔ "اس خبیث کے بارے میں تو میں ہر بات جانتا ہوں، مگر تمہارے بارے میں مجھے کوئی تجربہ نہیں، کیا معلوم تم مجھے خطرے میں گھرا چھوڑ کر غائب ہی ہو جاؤ۔"

"تمہارے بیوی بچے ہیں؟" میں نے اسے پوری طرح مطمئن کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا ورنہ فرار اور رہائی کی آرزو ایک خواب سے زیادہ نہیں تھی۔

وہ ہذیانی انداز میں آہستہ سے ہنسا۔ "بال بچوں والے ان دھندوں میں نہیں پڑتے ماسٹر جہاں آدمی کو اپنے اگلے سانس کا بھی بھروسہ نہ ہو۔"

"پھر میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"مگر میں فاقے نہ کرسکوں گا۔"

"فاقے نہیں، میرے ساتھ تم عیش کی زندگی بسر کرو گے۔"

اس گفتگو کے بعد وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ میں نے اس چوتھے کے بھی ہاتھ پیر باندھ دیئے اور کاٹیج سے باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی میری نظر گریش پر پڑی، وہ ایک ٹیلے پر کھڑا پنجوں کے بل اچک اچک کر کافی دور کوئی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رنجیت کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"کیا بات ہے گریش؟" میں نے دور ہی سے اسے پکارا۔

میری آواز سنتے ہی وہ چونک کر پلٹا اور تیر کی طرح میرے قریب آ پہنچا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے، تم پریشان کیوں ہو؟"

"ماسٹر! ہم خطرے میں گھرنے والے ہیں۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "مزدوروں کو کسی طرح بھنک مل گئی ہے کہ کچھ لوگ بوٹ پر قابض ہو چکے ہیں اور فرار ہونے والے ہیں اور اب وہ خاموشی سے کاٹیج اور گھاٹ کو گھیرنے کی فکر میں ہیں۔"

"رنجیت کہاں ہے، تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" یہ سوال کرتے ہوئے مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔

"رنجیت درخت پر سے جائزہ لے رہا ہے۔" اس نے ایک اونچے درخت کی طرف اشارہ کیا اور مجھے اس کی شاخوں کے درمیان رنجیت نظر آیا۔ وہ رائفل سنبھالے بستی کی طرف نگراں تھا۔ "ہم نے بستی کی طرف سے پہلے شور کی آوازیں سنی تھیں اور پھر اچانک غیر فطری سناٹا چھا گیا، ہمیں اسی سے شبہ ہوا ہے۔"

"تم کاٹیج کا خیال رکھو، وہ چار فل اندر بندھے ہوئے پڑے ہیں۔" میں نے اسے ہدایت کی اور خود بھی درخت پر چڑھنے لگا۔

اوپر پہنچتے ہی مجھے صورتحال کی سنگینی کا اندازہ ہوگیا۔ درخت نشیبی میدان میں ساٹھ ستر افراد چوپاؤں کی طرح نیم دائرے کی صورت میں ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ لوگ ابھی رائفل کی پہنچ سے باہر ہی تھے مگر میں نے ... ان میں مائیکل پھنسا کر اس طرف فائر کر دیا۔ ابھی اس فائر کی بازگشت ... ہی تھی کہ میرے اشارے پر رنجیت نے دوسرا فائر کر دیا۔

... ان لوگوں پر فائرنگ کا ردعمل میرے لیے اعصاب شکن ... انہوں نے اچانک غضب ناک انداز میں چیخنا شروع کر دیا ... احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر پوری قوت سے آگے دوڑنے لگے ... ہم خوفناک اور جارحانہ نظر آرہے تھے۔

ہم دونوں پھرتی سے نیچے آئے، ابھی حملہ آور کاٹیج سے ... تھے کہ ہمیں چند منٹ کی مہلت مل ہوئی تھی۔ کاٹیج میں پہنچ کر میں ... سے ان چاروں کو آزاد کیا اور فاضل راؤنڈز کا صندوق ... کر گھاٹ چل دیا۔

ہمارے باہر آتے ہی گریش اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ کاٹیج ... سلامت چھوڑنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا، وہاں اسلحہ ... ہوئے دو آہنی صندوق موجود تھے۔ اگر جنونی حملہ آور تالا توڑ کر اسلحہ ... کر لیتے تو کھلے سمندر میں پہنچنے سے پہلے بوٹ کو غرقاب کر سکتے تھے ... ایک ہی اسلحہ کے استعمال سے واقف تھا۔

ہوا کے دوش پر ابھرنے والی جنون آمیز آوازیں اب بہت ... آچکی تھیں۔

گریش کاٹیج میں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ دکھا چکا تھا۔ شاید اس نے ... شراب کو بھی آتش گیر مادے کے طور پر استعمال کیا تھا، کیونکہ اس کی واپسی ... پہلے ہی کاٹیج ہولناک شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔

"ٹھہرو ماسٹر! میں آرہا ہوں۔" موٹر بوٹ کا انجن اسٹارٹ ہوتے ... فضا میں گریش کی مضطربانہ آواز ابھری، شاید اسے خطرہ تھا کہ ہم اسے ... چل دیں گے۔

"جلدی آؤ!" بوٹ کے عرشے سے کوئی خوف زدہ آواز میں چیخا۔ چند ہی سیکنڈ میں گریش آ پہنچا، وہ اپنے ساتھ وہاٹ ... سات بوتلیں بھی اٹھا لایا تھا۔

جونہی وہ عرشے پر کودا، ٹیلوں کی اوٹ ... مزدوروں کا بپھرا ہوا غول بھی نمودار ہوگیا اور زناٹے کی آوازوں کے ساتھ بڑے بڑے پتھر بوٹ پر آنے لگے۔ وہ وحشیوں کی طرح پتھراؤ کرتے ... اور گالیاں دیتے آگے بڑھتے آرہے تھے۔

مائیکل نے موٹر بچا کر بوٹ آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ سب لوگ ... پتھراؤ سے بچنے کے لیے پناہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ میں نے ... کر آنے والوں پر رائفل سے فائر کیا۔ فضا میں خون کے فوارے اچھل پڑے۔

... تین شدید زخمی ہو کر زمین پر گر گئے، مگر آنے والوں میں اس کا ... ہوا۔ وہ اشتعال کے عالم میں زخمیوں کو روندتے آگے ہی بڑھتے آئے۔ پھر اچانک پہلو کے علاوہ سامنے سے بھی پتھراؤ ہونے لگا۔ کیبن سے دیکھا تو دس بارہ آدمیوں کی ایک ٹولی بوٹ سے دس پندرہ گز آگے نہر ... پہنچ چکی تھی۔

... میں ناقابل بیان جوش و خروش پایا جارہا تھا، ان کے چہرے جنون ... تھے، حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے ساتھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ سمندری نہر زیادہ چوڑی نہیں تھی اور مجھے شدید خطرہ لاحق ہوگیا تھا ... سے کیا جانے والا شدید پتھراؤ ہمارے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو ...

اسی اثنا میں چند جوشیلے مزدور جان کی پروا کیے بغیر نہر میں کود پڑے ... تیرتے بوٹ کی طرف آنے لگے، ان کے ساتھیوں نے پوری قوت سے ... نعرے لگائے مگر یہ آوازیں رائفل کے ہولناک نغمے میں ڈوب گئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو رنجیت اور گریش اپنی خالی رائفلیں دوبارہ لوڈ کر ... تھے۔ نہر کا ایک حصہ خون سے رنگین ہوگیا تھا۔ زخمی پانی میں ڈوب ڈوب کر ... تھے، مگر وہاں کسی میں اتنی ہمت نہ تھی جو ان کی زہرہ گداز چیخوں سے ... اپنی جان داؤ پر لگاتا۔

میں نے اپنی رائفل کا رخ کنارے سے پتھراؤ کرنے والوں کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ موت کی اس ارزانی نے ان کے قدم اکھاڑ دیئے۔ رہی سہی کسر رنجیت اور گریش نے پوری کر دی، ان دونوں نے دوبارہ رائفلیں تانیں تو مشتعل ہجوم سست رفتاری سے پسپا ہو رہا تھا، مگر جب فائر ہوئے تو ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

چند ہی ثانیوں میں وہ گھنے جنگلات میں معدوم ہوگئے مگر ان کی چیخوں نے اب بھی آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ بھاگنے والوں کو اتنا ہوش کہاں نہیں رہا تھا کہ زخمیوں کو اٹھا کر لے جاتے، جو جہاں تھا وہیں پڑا زندگی کی آرزو میں تڑپ رہا تھا۔

بوٹ مناسب رفتار اور احتیاط کے ساتھ کھلے سمندر کی طرف بڑھتی رہی۔ ہم تینوں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہوائی فائرنگ کرتے جارہے تھے تاکہ جنگل میں روپوش حملہ آور دوبارہ سامنے آنے کی ہمت نہ کرسکیں۔

پھر جب موٹر بوٹ غراتی ہوئی آخری موڑ سے گھومی اور کھلا سمندر نظر آیا تو میں ایک بار پھر بے چین ہوگیا۔ کچھ حملہ آور نہر کے دہانے پر موجود تھے اور نہایت عرق ریزی کے ساتھ کچھ گرے ہوئے تناور درختوں کو نہر میں دھکیلنے کی کوششوں میں مصروف تھے تاکہ نہر سے نکاسی کی راہ مسدود کر کے ہمیں زیر کرسکیں۔

"فائر!" میں دیوانہ وار چیخا۔ "اگر وہ تنا نہر میں گرا دیا گیا تو ہم چوہوں کی طرح مار دیئے جائیں گے۔"

فاصلہ کم تھا مگر اس بار وہ لوگ ہوشیار ہو چکے تھے، بوٹ کو دیکھتے ہی تنے کی اوٹ میں دبک کر اسے نہر میں لڑھکانے لگے۔ فائرنگ کی گئی مگر کوئی

نشانہ کاری نہ رہا۔

"بوٹ کی رفتار تیز کردو۔" میں چیخا۔

"ایک بار مجھے بھی حکم دو ماسٹر!" کیبن سے مائیکل چیخا۔ "میں ان کا بھوسہ اڑا دوں گا۔"

"کچھ بھی کرو، اس خونی نہر سے ہمیں زندہ باہر نکالو۔" میں دوبارہ فائر کرتے ہوئے چیخا۔

اور اسی وقت اچانک فضا ہلکی مشین گن کے بھیانک شور سے لرز اٹھی۔ چند ثانیوں تک تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ مشین گن کہاں ہے اور کدھر فائر ہو رہا ہے، مگر بوٹ کو لگنے والے جھٹکوں سے فوراً ہی ساری صورت حال واضح ہو گئی۔

کیبن کی چھت پر گھومنے والی ایک سب مشین گن نصب تھی جسے محض ایک بٹن دبا کر بیٹریوں کی مدد سے حرکت میں لایا جا سکتا تھا۔ مشین گن کی بیرل کو حسب منشا اٹھایا اور جھکایا بھی جا سکتا تھا اور یہ ساری کارروائی کنٹرول کیبن میں نصب بٹن دبا کر مکمل کی جا سکتی تھی۔

میں حیرت سے پلکیں جھپکاتا کیبن میں مائیکل کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر اعتماد بحال ہو چکا تھا اور اب وہ بوٹ چلانے کے ساتھ ہی بار بار مشین گن کے فائر کی سمت بھی تبدیل کرتا جا رہا تھا۔

مشین گن کے مسلسل فائر نے حملہ آوروں کے اوسان خطا کر دیئے تھے، درخت کے تنے کی حرکت ختم ہو چکی تھی، مشین گن کی گولیوں نے کئی کو زندگی سے محروم کر دیا تھا، ان کی خاصی تعداد نے کاری زخم کھائے اور نہر کا دہانہ چند ہی ثانیوں میں صاف ہو گیا۔

"تم نے پہلے اسے کیوں نہ چلایا؟" میدان صاف ہو جانے پر میں نے حیرت کے ساتھ مائیکل سے سوال کیا۔

"اب میں تمہارا ماتحت ہوں ماسٹر۔" وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "میں نے اپنا مستقبل تمہارے حوالے کر دیا ہے۔"

"میرے آدمیوں سے ٹکراؤ کے وقت تم نے یہ گن کیوں استعمال نہ کی؟"

"اس وقت ہم سب کیبن سے باہر آ چکے تھے۔" وہ آہستہ سے ہنس کر بولا۔ "اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو اس وقت حالات مختلف ہوتے۔"

میں احمقانہ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

چند منٹ کے بعد ہم نہر کے دہانے سے بخیر و خوبی گزر گئے، ہمارے سامنے تاحد نظر سمندر کا پانی لہریں لے رہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی قرمزی کرنوں نے پانی کو لہو کا رنگ دے دیا تھا۔ ہمارے عقب میں جزیرے سے بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور درختوں کے وسط میں آگ کے ہولناک شعلے بھڑک رہے تھے، شاید پورا کاٹیج بری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

میں نے رنجیت اور گریش سے رائفلیں لے لیں اور انہیں ایک صندوق میں مقفل کر دیا۔ میری جیب میں چھوٹے بور کا ایک ریوالور موجود تھا جو میں نے رنجیت کے حوالے کر دیا۔

"تم ہر وقت میرے ساتھ رہو گے۔" بوٹ کے عقبی حصے میں میں نے گریش سے کہا۔ "تم مائیکل سے گفتگو سے پرہیز کرو گے، ورنہ وہ میں تمہاری اصلیت جان لے گا۔ اسے ایک بار شبہ بھی ہو گیا کہ سفر کے معاملے میں اناڑی ہو تو وہ ہمیں انگلیوں پر نچائے گا۔"

"میں یہ جانتا ہوں ماسٹر!" گریش نے سر جھکا کر کہا۔

اندھیرے پھیلنے تک سفر معمول کے مطابق جاری رہا۔ مائیکل اور اس کے ساتھی پھرتی کے ساتھ اپنا اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ پہلے انہوں نے ... وغیرہ سے بوٹ صاف کئے، اس کے بعد ماہی گیری کے لئے جال تیار کئے۔

"ماسٹر! اب گریش بوٹ چلائے گا۔" مائیکل نے بڑھتے ہوئے میں انگڑائی لے کر مجھ سے کہا۔ "میں تھک گیا ہوں۔"

"وہ وہیل کے قریب بھی نہ بھٹک پائے گا۔" میں نے ... کہا۔ "جب تک تم حکم ماننے سے انکار نہیں کرتے، تم ہی بوٹ چلاؤ گے۔"

"مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو ماسٹر! ہم مل بانٹ کر کام چلا لیں گے۔" اس نے التجا کی۔

"میں سمندری راستوں سے ناواقف ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ... بدلنے کے بعد تم ایک دوسرے پر راستہ بھٹکانے کے الزام لگاؤ۔ وہ ... بیٹھا تمہارے راستے کا نقشہ بناتا جا رہا ہے۔"

"باہر نقشہ بنا رہا ہے؟" مائیکل نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ اس کو سمتوں کے بارے میں کمپاس سے زیادہ اپنی ... پر بھروسہ ہے۔"

"مگر رفتار اور فاصلے کے بغیر ماسٹر؟"

"ختم کرو۔" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "وہ باہر بیٹھا ... ترچھی لکیریں بنا رہا ہے، مجھے نہیں معلوم وہ کیا کر رہا ہے۔" میں نے ظاہر کیا تھا۔

مائیکل اچانک ہنس دیا جیسے اس کے ذہن سے کوئی بڑا بوجھ ... اندھیرے کی چادر گہری ہونے تک موٹر بوٹ کھلے سمندر میں پہنچ چکی تھی۔ ہر طرف تاحد نظر پانی ہی پانی بکھرا ہوا تھا۔ آباد کار ... آسیبی جزیرہ اتنی دور رہ گیا تھا کہ اب اس کا سایہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

مائیکل نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا اور موٹر بوٹ کا ... بوٹ کی رفتار سمندر کے تموج کے سنگ دم توڑنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے رک گئی۔ اب وہ موجوں کے سینے پر دھیمے دھیمے ہلکورے لے رہی تھی۔

بوٹ کب رکی، درحقیقت مجھے تو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ ... صاف دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بوٹ مسلسل آگے بڑھ رہی ہو ... یہ ایسی کوئی نشانی بھی نہیں تھی جس سے فاصلہ کا تعین کر کے ... کا اندازہ کر سکے، وہ تو جب لنگر ڈالا جانے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ ہم رک چکے ہیں۔

مائیکل

اور اس کے ساتھی بری طرح تھکے ہوئے تھے۔ ادھر ہم تینوں کی حالت بھی ابتر تھی۔ لہٰذا میں نے انہیں ماہی گیری کی مزید تیاریوں سے روک دیا۔ کم از کم اس رات کو ہم سب کے لئے آرام کرنا ضروری تھا۔ تاکہ دن کے اجالے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔

مائیکل نے بتایا کہ احتیاطی اقدامات کے طور پر جزیرے سے واپسی پر بوٹ اس وقت تک ماہی گیری کے لئے کھلے سمندر میں رکی رہتی ہے جب تک اس کے اسٹوریج کی گنجائش ختم نہیں ہو جاتی۔

پہلے میں نے مائیکل سمیت سونے کی تیاری کی۔ اس نے لاکھ زور دیا کہ ہم دونوں میں سے ایک کا جاگتے رہنا ضروری ہے۔ مگر میں نے اس کی تجویز پر ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ میں اسے گریش سے قربت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ میری نگرانی میں رہے۔

سونے سے قبل میں نے رنجیت اور گریش کو واضح الفاظ میں صورت حال کی نزاکت اور حکمت عملی سے آگاہ کر دیا تاکہ وہ بے خبری میں کوئی فاش غلطی نہ کر بیٹھیں۔ انہیں یہ بھی ہدایت کر دی کہ گریش مائیکل کے آدمیوں سے بھی دور رہے۔ مگر رنجیت ان سے دوستی پیدا کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وہ کس حد تک بوٹ کو بمبئی پہنچانے میں معاون ہو سکتے ہیں۔

اس ساری پریشانی کا سبب مائیکل کی ذات تھی۔ میں مختصر ترین مدت میں ان امکانات کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ وہ اگر بغاوت یا سرکشی پر آمادہ ہو جائیں تو ان کو کن میں سے کام آ سکے گا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی مائیکل کے قریب رہتا تھا تاکہ اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر کے بوٹ کو چلانے کے قابل ہو سکوں، راستوں کا تعین بہرحال میرے بس سے باہر تھا۔

بوٹ تین دن تک کھلے سمندر میں لنگر انداز رہی۔ مائیکل پیشہ ور مچھیروں کے ساتھ مشینی جالوں سے مچھلیاں پکڑتا رہا۔ آخر کار حد پوری ہو گئی۔ تیسری شام مائیکل نے مجھے بتایا کہ اب وہ روانگی کے لئے تیار ہے۔ کوئی بھی لمحہ میرا اشارہ پا کر وہ لنگر اٹھا دے گا۔

مجھے پہلے ہی وکٹیر سنگھ کی زبانی علم ہو چکا تھا کہ جزیرے سے بمبئی کا ساحل چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے لہٰذا میں نے فوری طور پر روانگی کا حکم دے دیا۔ تاکہ اندھیرا پھیلنے تک ہم بمبئی کے کسی خفیہ ساحلی علاقے یا ماہی بندر پر لنگر انداز ہو سکیں۔

جس وقت لنگر اٹھا لئے گئے اور بوٹ کا انجن آہستہ آہستہ بوٹ کو حرکت میں لے آیا تو اچانک مائیکل کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی۔

"کیا بات ہے مائیکل؟" میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"ادھر دیکھو، سامنے کچھ نظر آ رہا ہے تمہیں؟" اس نے شیشہ کی شفاف شیلڈ کے اس پار کھلے سمندر پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے بہت غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے کی طرف دیکھا مگر مجھے وہاں اونچی نیچی لہروں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

"کیا ہے وہاں؟ مجھے تو کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آ تی!"

"وہ..... وہ ادھر دیکھو!" مائیکل نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "کیا ہے وہ؟"

اور اچانک ہی میری بھی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سمندر کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کے عقب میں افق کے نزدیک کسی جہاز کا مدہم سا ہیولیٰ نظر آ رہا تھا۔

"شاید جہاز ہے!" میں نے ادھر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "مگر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، تم تو خاصے بوکھلا گئے ہو۔"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ اسی طرف آ رہا ہے!" وہ دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

"یہ کھلا سمندر ہے، کوئی بھی جہاز کسی بھی طرف جا سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے میز پر پڑی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگا لی۔

وہ واقعی ایک بڑا جہاز تھا۔ مگر میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ کس سمت جا رہا ہے۔ مگر میں نے مائیکل کی تسلی کی خاطر کہا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو، بوٹ کو اپنے راستے پر رکھو، وہ کسی اور سمت سفر کر رہا ہے!"

"میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں ماسٹر!" وہ بڑبڑایا۔ "سمندری سفر کرنے والوں کی چھٹی حس بڑی تیز ہو جاتی ہے۔ وہ خطرات کو دور ہی سے بھانپ لیتے ہیں۔"

"تمہاری بوٹ تباہ کن جہاز سے کم نہیں ہے۔" میں نے بلاوجہ قہقہہ لگا کر کہا۔ "اگر خطرہ ہوا تو مشین گن کا فائر اسے غرق کر دے گا۔ اس میں میگزین تو موجود ہے نا؟"

"اس میں بہت میگزین ہے۔ بلٹ خود کار طریقہ پر چڑھی ہے۔ اور میگزین کی موجودہ مقدار مسلسل ڈھائی گھنٹے کیلئے کافی ہے۔"

بوٹ آگے بڑھتی رہی۔ جہاز کا ہیولہ بتدریج واضح ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ تو عجیب سا جہاز ہے ماسٹر!" کچھ دیر کے خاموش سفر کے بعد انجن اور لہروں کے شور میں مائیکل کی آواز ابھری۔

"وہ جہاز تمہارے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے!"

"نہیں ماسٹر! میں نے انگریزی فلمیں بہت دیکھی ہیں۔ یہ ایسا جہاز ہے جو جمے ہوئے سمندر میں بھی برف توڑتا گھس جاتا ہے۔ اس کا یہاں ہونا عجیب بات ہے، بحر ہند میں بھلا برف کہاں؟"

"اوہ!" میں اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنس دیا۔ "یہ کوئی تحقیقاتی جہاز ہے۔ وہ لوگ شاید اس علاقے میں سمندر کے بارے میں تحقیق کرنے آتے ہوئے ہیں۔"

مگر تھوڑی ہی دیر بعد میری ساری خوش فہمی رفع ہو گئی۔ سامنے سے تنے والا جہاز اب بہت واضح ہو گیا تھا مگر دھندلکے کے باعث مستول پر لہراتا ہوا پرچم پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ جہاز تو شاید رک چکا تھا۔ لیکن اس کے پہلو سے ایک تیز رفتار موٹر بوٹ اپنے پیچھے جھاگ اڑاتی سیدھی ہماری طرف چلی آ رہی تھی۔

"اب بولو۔۔۔۔ اب بولو کیا ہو گا؟" مائیکل نے شانے پکڑ کر مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی آواز میں وحشت کے سائے لرزاں تھے۔

"تمہاری بوٹ پر لاؤڈ اسپیکر ہے؟" میں نے چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد سوال کیا۔

"اسس پر تنااور وینیع کے گانے بجاؤ گے؟" وہ یہ کہہ کر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا: "ماسٹر ہمارے دن پورے ہو چکے ہیں۔ شاید چنگ ہوا کو سارے واقعات کا علم ہو گیا ہے۔ وہ اتنا بااختیار آدمی ہے کہ چاہے تو بحری فوج کے جہاز بھی ہمارے مقابلے میں لا سکتا ہے۔"

"وہ جو بھی ہوں۔۔۔۔ ہمارے قریب نہ آ سکیں گے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو تم ان کی بوٹ غرق کر دو گے؟" مائیکل کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"ہاں۔۔۔۔ اگر وہ مقابلے پر اتر ہی آئے تو ہم مجبور ہوں گے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "تم بوٹ روک دو مگر اس کا انجن بیدار رہے۔ جب وہ چند سو گز دور رہ جائیں تو مشین گن سے ہوائی فائر کا ہلکا سا برسٹ مار دینا۔ اگر ان کی رفتار پھر بھی سست نہ ہو تو بے دریغ انہیں تہہ نشین کرنا ہو گا۔ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"مگر۔۔۔۔۔ مگر وہ تو سفید پرچم لے کر آ رہے ہیں۔" مائیکل ہکلایا۔

میں نے غصے سے ہونٹ بھینچ لیے "جب تک وہ اپنا مقصد نہ بتائیں انہیں دور ہی رکنا ہو گا۔"

"جیسا حکم ماسٹر!"

"میں گریش کو ساتھ لے کر عرشے پر جا رہا ہوں۔ ان سے چیخ کر معلوم کرنا ہو گا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کون ہیں؟"

"جاؤ۔۔۔۔ تم پر مسیح کا سایہ ہو!" مائیکل نے داہنے ہاتھ کی انگلی سے اپنے سینے پر کراس بناتے ہوئے کہا۔

عرشے پر آ کر مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ ہم ہوا کے رخ پر جا رہے تھے۔ ورنہ محض چیخ کر اپنی آواز آنے والوں تک پہنچانی ناممکن سی بات تھی۔

ہماری بوٹ کی رفتار سست پڑنے لگی تھی کہ بوٹ کے عقب میں پانی کی لہر نے دار دھار بنی ختم ہو گئی۔ جس کا مطلب تھا کہ بوٹ رک چکی ہے۔ جب آنے والی بوٹ چند سو گز دور تھی تو ہولناک دھماکوں سے ہماری بوٹ لرز اٹھی۔ مائیکل نے حسب ہدایت ہوائی فائر کیے تھے!

جب کھلے سمندر میں فائرنگ کی آواز دور دور تک چلی گئی تو میں نے پکار کر پوری قوت سے چلایا: "تم جو بھی ہو وہیں رک جاؤ!"

چند ثانیوں کے سکوت کے بعد سفید پرچم والی بوٹ سے لاؤڈ اسپیکر پر کسی مرد کی آواز ابھری جو شکستہ لہجے میں انگریزی بول رہا تھا: "ہم دوست ہیں۔ انگریزی کے علاوہ دوسری زبان نہیں سمجھ سکتے۔"

میں نے پوری آواز سے انگریزی میں اپنی بات دہرائی اور دھمکی دی کہ اگر ہدایت کی تعمیل نہ کی گئی تو ان کی بوٹ غرق کر دی جائے گی۔

میری بات مکمل ہوتے ہی اچانک اس بوٹ کا رخ بدل گیا اور وہ ... کی شکل میں دور تک جاتی چلی گئی۔ ساتھ ہی اس میں سے رائفل کے دو ... فائر ہوائی فائر تھے۔ اور ہمیں محض یہ جتانے کیلئے کیے گئے کہ ... مسلح نہیں ہیں۔ جو آسانی سے ہماری شرائط مان کر اپنے نامعلوم عزائم ترک کر دیں گے۔

کافی طویل چکر کاٹ کر جب وہ بوٹ دوبارہ ہماری طرف آئی تو اس کی رفتار سست ہو چکی تھی: "ہم قریب آنا چاہتے ہیں۔ ہم سے مقابلہ کیا تو تم خسارے میں رہو گے۔ یہ بوٹ تارپیڈو سے لیس ہے۔ ہماری ... تمہیں قبول کرنی ہو گی۔"

ان کے رویے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ دھونس ماننے پر آمادہ نہیں ... پھر اچانک ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اب جو بات لاشعوری طور پر میرے ذہن میں چبھ رہی تھی وہ ... صاف ہو کر سامنے آ گئی۔ بولنے والوں کا لہجہ بلاشبہ روسی تھا۔ اور ... سنگین خطرے کی علامت تھی۔

بمبئی میں روسی سیکرٹ سروس کے۔جی۔بی۔ کے ایک ہوشیار کارندے یوری الانوف نے مجھے چاؤ کے ساتھ قید کر لیا تھا۔ مگر میں ... تکمیل کرا کے چوٹ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ الانوف میرے ہاتھوں ... سے مارا گیا۔ اور مجھے اچانک روپوشی اختیار کرنی پڑی۔ شاید رشین ... تھا کہ الانوف کا قاتل کون ہے اور اس نے پناہ کہاں لی ہے۔ شاید اس ... سمندری تحقیقات کی آڑ لے کر بحر ہند میں آگھسے تھے۔ تاکہ خفیہ جزیرے کا سراغ پا سکیں۔

اس مفروضہ میں صرف ایک جھول تھا کہ جب انہیں میری کمین ... ہو چکا تھا۔ تو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس جزیرے پر کن لوگوں کا تصرف ہے ... چنگ ہوا پر ہاتھ ڈال کر باآسانی جزیرے تک پہنچ سکتے تھے۔ یوں ان ... میں بھٹکنا ناقابلِ فہم معلوم ہوتا تھا۔

"نیچے آؤ!" میں نے چلا کر کہا اور بھاگ کر کیبن میں مائیکل کے پاس ... گریش بھی بوکھلایا ہوا میرے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔

"ماسٹر یہ تم نے برا کیا۔" مجھے دیکھتے ہی مائیکل منہ بنا کر بولا۔ شاید ... میری آواز سن لی تھی۔

میں نے سامنے دیکھا تو سفید پرچم والی بوٹ تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ میں نے مائیکل کے شانے پر جھک کر کہا میں نے انہیں ...

... پہلے ہی برسٹ میں لے سے تہہ نشین کر دو، انہیں ہم پر فائر کرنے کی ذرا ... مہلت نہ ملنی چاہیے!"

"تم بہت ظالم ہو ماسٹر" مائیکل طویل سانس لے کر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی ... دیوانگی سی بچی ہوئی تھی اور آنکھوں میں یک بیک وحشت سمٹ آئی تھی۔ ... اس نے یکے بعد دیگرے چند بٹن چھیڑے اور چند ہی ثانیوں بعد سامنے ... آنے والی سفید پرچم والی بوٹ گولیوں کی زد میں آ گئی۔

ان لوگوں نے بوٹ کو سمت کاٹ کر اسے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ مگر ... مائیکل نے مشین گن کی متحرک نال کو ساکن کر دیا۔ اور وہ بوٹ ... اپنا استہ پانی میں چکر کھانے لگی۔

مگر اچانک ہی اس طرف سے رائفل کے مسلسل چار فائر ہوئے۔ ہماری ... بلیک جھلک ہوتی ہچکولے لے رہی تھی۔ لہٰذا باآسانی زد میں آ گئی۔ اس کے ... پیندے میں گہرے سوراخ ہو چکے تھے۔

اس سے قبل کہ بوٹ کے گرد خوفناک بھنور پیدا ہوتا۔ میں نے ... جیکٹ سنبھال کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ دوسروں نے بھی وہاں رکنے کی ... حماقت نہیں کی۔ رنجیت تیرنے سے واقف نہیں تھا۔ اس نے مائیکل سے اپنا ... بالآخر مائیکل کو معلوم تھا کہ آنے والے چند لمحات کتنے نازک ہیں۔ اس نے ... پوری قوت سے رنجیت کو سمندر میں اچھال دیا۔ اور وہ ہولناک چیخیں مارتا سمندر ... پانی میں غوطے کھانے لگا۔

ادھر ہمارے مخالفین بھی سمندر میں کود چکے تھے۔ وہ شاید ایسی صورتحال کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ کیوں کہ ان میں سے کئی غوطہ خوری کے مکمل لباس میں نظر آتے تھے!

وہ لوگ چونکہ پوری طرح تیار تھے۔ لہٰذا نہایت تیزی کے ساتھ ہماری طرف آ رہے تھے۔ جب کہ ہم میں سے بیشتر کیلئے خود کو سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ ... صورتحال دیکھ کر میں نے دوسروں کی فکر ترک کر دی اور خود پوری صلاحیت ... سے آگے بڑھنے لگا تاکہ ان کے نرغے میں نہ آ سکوں۔

پھر اچانک فائر کی آواز آئی اسی کے ساتھ ایک عجیب سی لرزا دینے والی انسانی چیخ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زخم کھانے والا پانی ... میں ڈوب رہا ہے۔

یکے بعد دیگرے ایسے مزید تین فائر ہوئے اور زخم کھانے والے ... پانی کی سطح کے نیچے بیٹھتے چلے گئے۔

ہم لوگ اپنی موٹر بوٹ سے ایسی افراتفری میں کودے تھے کہ تقریباً سب ... بدحواس تھے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار ثابت نہیں ہوا ... کہ فائرنگ کرنے والے سفید پرچم والی بوٹ سے سمندر میں کودے ہیں۔ اور ... حالات کے مقابلے کیلئے تیار ہیں۔

میری ہر کوشش رائیگاں گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے دیکھا کہ دو ... کافی آگے پانی کی سطح پر ابھر آئے ہیں۔ شاید وہ زیرِ آب تیرتے ... نکل گئے تھے۔ میں نے پیچھے نظر ڈالی تو دو غوطہ خور ادھر ... تھے۔ ان کے شانوں سے جدید ترین ساخت کا ایسا اسلحہ جھول رہا تھا جو پانی میں فائرنگ کر سکتا تھا۔

کم و بیش اسی وقت پلاسٹک سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی موٹر بوٹ جھاگ اڑاتی ہمارے سروں پر آ پہنچی۔ اس میں نیلی وردی میں ملبوس ایک سفید فام سوار تھا۔

نیلی وردی والے نے تحکمانہ بلند آواز میں کچھ کہا۔ اس کا لہجہ مانوس مگر زبان نامانوس تھی۔ مجھے گھیرنے والوں نے اسی لہجہ میں جواب دیا۔ پھر مجھے اٹھا کر بوٹ میں ڈال دیا گیا۔ ایک غوطہ خور بھی اچھل کر اوپر آ گیا۔ باقی تین پانی کے نیچے غوطہ مار کر غائب ہو گئے۔

پلاسٹک کی موٹر بوٹ تیز رفتاری کے ساتھ جہاز کی طرف واپس چل دی۔ غوطہ خور اپنے چہرے سے ماسک ہٹا چکا تھا اور اب اس کی سرد نیلی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

چند ثانیوں کے بعد اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور روسی لب و لہجے میں پوچھا "صفدر علی؟"

میں نے اعتماد سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

مجھے توقع تھی کہ وہ مزید گفتگو کرے گا۔ مگر وہ لاتعلقانہ انداز میں اپنا غوطہ خوری کا لباس اتارنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اپنے ساتھی سے روسی زبان میں گفتگو بھی کرتا جا رہا تھا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے سمندر سے فائرنگ اور انسانی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے پہچاننے کے بعد شاید وہ تینوں غوطہ خور بقیہ افراد کا صفایا کر رہے تھے۔ تاکہ وہاں ہونے والے ہولناک ٹکراؤ کی کہانی ہندوستانی ساحل تک نہ پہنچ سکے۔

تھوڑی دیر میں جہاز قریب آ گیا۔ اس پر بڑے بڑے انگریزی حروف میں جہاز کا نام ابانوف لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے قدرے چھوٹے حروف میں میرین ریسرچ بیورو کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اور مستول پر درانتی کے نشان والا سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔

جہاز کے عرشے پر عملے کے بہت سے افراد بے چینی سے پلاسٹک بوٹ کے منتظر تھے۔ انہوں نے روسی زبان میں بہت سے سوالات کئے۔ میرے ساتھ آنے والے غوطہ خور نے شاید انہیں یقین دلا دیا کہ سمندر میں ملاح پرسکون رہے ہیں۔ کیونکہ جلد ہی ان کے استفسار ختم ہو گئے۔

رسی کی سیڑھی کے ذریعہ مجھے اوپر جانا پڑا۔ وہاں سب افراد نیلی وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان میں بعض مسلح اور چاق و چوبند تھے۔ ان کے کندھوں پر پیتل کے مختلف نشان آویزاں تھے۔ جو شاید ان کے عہدوں کا امتیاز ظاہر کرتے تھے۔

وہاں ایک نرم خو شخص نے بڑھ کر میرا استقبال کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا "تم ہی صفدر علی کے نام سے پہچانے جاتے ہو؟" اس کا لہجہ مانوس اور زبان انگریزی تھی۔ چہرے کے نقوش اور لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ روسی نژاد ہے۔

"اس خطے میں صفدر علی نام کے ہزارہا افراد ملیں گے۔ میں بھی ان میں

سے ایک ہوں۔" میں نے لاتف بٹ گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ہمیں صرف ایک صفدر علی کی تلاش تھی اور تم وہی ہو۔" اس بار اس کے چہرے سے مسکراہٹ یکلخت غائب ہو گئی۔

"میری تلاش تھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے مضبوطی سے میرا شانہ تھام لیا اور ایک تنگ راہداری میں مڑتے ہوئے بولا "میرے ساتھ آؤ، ابھی سب سمجھ جاؤ گے۔"

چند سیڑھیاں اترنے اور پیچ در پیچ نیم تاریک راہداریوں سے گزرنے کے بعد وہ میرا ہاتھ تھامے ایک کیبن میں گھس گیا۔

کیبن خاصا گندہ تھا۔ اس میں ایک تنگ مسہری اور لمبی سی میز کے سوا کوئی تیسری قابل استعمال چیز موجود نہیں تھی۔ میز پر کوئی شخص بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے پیروں تک ایک سیاہ چادر ڈھکی ہوئی تھی۔

نیلی وردی والے نے بڑھ کر اس شخص کے بدن سے چادر کھینچ لی اور طنزیہ لہجے میں بولا "اِدھر دیکھو، شاید تم اسے جانتے ہو!"

وہ ایک بھیانک لاش تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرا رواں رواں لرز اٹھا۔ میرے سامنے میز پر سیلرز کلب کے مالک چک ہوا کی مسخ شدہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا سارا بدن زخموں سے چور تھا۔ جسم کے بعض حصوں پر کسی تیز دھار آلے سے شگاف لگانے کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ اسی شدید ایذا رسانی کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا۔

"یہ......یہ یہاں کیسے پہنچا؟" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد سوال کیا۔

"تمہاری تلاش میں!" اس بار اس کا لہجہ سرد تھا۔ "اچھا ہوا کہ تم نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ ورنہ تمہارے دلکش خدوخال میں بھی خاصی تبدیلیاں واقع ہو جاتیں!"

چک ہوا کی لاش کو دیکھنے سے مجھے جو شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ میں ابھی اس پر قابو نہیں پا سکا تھا کہ وہ شخص مجھے لے کر ایک آراستہ اور پر تکلف کمرے میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک جوان العمر روسی لڑکی پہلے سے موجود تھی۔

وہ ایک صوفے میں وحشی بشری سے شغل کر رہی تھی۔ روسی مرد کو دیکھتے ہی وہ وہاں سے چلی گئی۔ وہ شخص مجھے لے کر کیبن کی ایک دیوار کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ جہاں دیوار میں پورٹ ہول بنا ہوا تھا۔

"تم یوری الانوف کے قاتل ہو؟" اس نے اپنی سگریٹ سلگانے کے بعد جذبات سے عاری سرد لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"اگر اس وقت وہ نہ مارا گیا ہوتا تو میں زندہ نہ ہوتا۔" میں نے اٹل اور فیصلہ کن رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا "تو پھر تمہارا نام کیا ہے؟"

"چیخوف!" وہ بولا "تم نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ الانوف کے قتل کے بعد تم روپوش ہو گئے۔ اور ہمارے آدمی ہر طرف بھٹکتے رہ گئے۔ بڑی دقت کے بعد ہمیں تمہارا موہوم سا سراغ ملا اور محض اسی بنا پر مجھے اپنے جہاز اور عملے سمیت بحر ہند میں داخل ہونے کی ہدایت ملی۔ مگر ہم کسی پراسرار جزیرے کا پتہ نہیں چلا سکے۔ اس دوران میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ تم اسی جزیرے پر لے جائے گئے ہو۔ اور آخری بار سیلرز کلب میں دیکھے گئے تھے۔ تو ہم نے اس کلب کے مالک کو پکڑوا لیا۔ یہ چینی بہت سخت جان مردود تھا۔ وہ اذیت سہتے سہتے جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مگر اس نے جزیرے کا پتہ بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ آخر میں نے جہاز اس مقام پر لنگر انداز کرا دیا۔ کیونکہ یہاں سے ایک راستہ خطرناک ہے اور جہازوں وغیرہ کا اس طرف جانا ممنوع ہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم کھلے سمندر میں آتے ہی ہماری نظروں میں آ گئے۔ ہم نے اپنی کشتی پٹرولنگ کیلئے بھیجی تھی۔ یہ امید بھی دھی کہ تم اس پر موجود ہو گے۔ بہرحال اب تم ہماری تحویل میں ہو۔ اور میں جلد از جلد تمہیں مقررہ مقام پر پہنچانے کا پابند ہوں۔"

"اگر میری تقدیر میں یہی لکھا جا چکا ہے تو میں تیار ہوں۔"

"تقدیر؟" اس بار وہ تلخ لہجے میں بولا "تقدیر کو تم ایشیائیوں نے ایک بہانہ بنایا ہوا ہے۔ مگر تمہارے بارے میں یہ بات درست ہے کہ تم جزیرے سے کیوں نکلے تھے؟"

"ایک خونریز تصادم کے بعد میں وہاں سے فرار ہوا ہوں!"

"فرار؟" وہ اس بار پھر ہنسا "پہلے تم الانوف کو قتل کر کے فرار ہوئے اور اب دوسرا فرار تمہارے لئے پھندا بن گیا۔"

"میں اب تمہارا قیدی ہوں!" میں نے سر جھکا کر کہا "تمہیں حق ہے کہ میرے ساتھ جو سلوک چاہو، روا رکھو!"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"کون؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے جیب ٹٹول کر ایک ڈائری نکالی پھر اس کی ورق گردانی کرتے کرتے ایک جگہ رک گیا۔ اور پڑھنے لگا "نام سیتا، عمر بیس، بائیس سال، قد پانچ فٹ سوا سات انچ، نیلی آنکھیں، سرخ بال، خود کو صفدر علی کی بیوی بتاتی ہے!" اتنا پڑھ کر وہ رک گیا۔

یہ سن کر میرے دل کو ناقابل بیان ٹھیس لگی۔ میری سیتا مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ اور اس کے ہونے کے بعد سے اب بھی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

"اگر اس کا ٹھکانہ معلوم ہوتا تو اب تک میں دربدر کی ٹھوکریں نہ کھا رہا ہوتا" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور وہ پتھر کہاں ہے؟" وہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"پتھر؟" میں ایک طویل سانس لے کر بولا "پارس پتھر میرے قبضہ میں نہیں ہے۔ وہ میں نے سیتا کے سینڈل کی ایڑی میں چھپایا تھا۔ اور وہ مجھ سے بچھڑ چکی ہے!"

"مگر تمہیں ہر قیمت پر اس پتھر کو حاصل کرنا ہے۔ اس کے بغیر تمہاری ذات ناکارہ ہے۔ ہمیں دراصل وہی پتھر درکار ہے!"

"مگر اسے ڈھونڈنا میرے بس سے باہر ہے۔ اگر وہ خونی پتھر مجھے مل جاتا تو میں اسے کہیں دفن کر دوں گا۔ وہ نہ جانے کتنی جانیں لے چکا ہے!"

"یہ نہ کہو" چیخوف سرد لہجے میں بولا "اگر وہ نہ ملا تو شاید تمہارا خون بھی اس کے شہیدوں میں شامل ہو جائے گا۔"

"میں سیتا کو تلاش کر دوں" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اگر میری بیوی مل گئی تو میں پارس تمہارے حوالے کر دوں گا!"

"اور وہ بھی کہ اس نے اپنے سینڈل کہیں پھینک دیئے تھے تو اس کے بعد ہمیں سارے ہندوستان کے پرانے سینڈل تلاش کرنے پڑیں گے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا "نہیں مسٹر صفدر! میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ مجھے پارس چاہیئے اور اسے فراہم کرنا صرف تمہاری ذمہ داری ہے!"

"مجھے ساحل پر اتار دو، اگر سیتا مل گئی تو خواہ مجھے کشمیر سے مدراس تک کی خاک ہی کیوں نہ چھاننی پڑے، میں پارس تمہیں لا دوں گا۔"

"کیا میں صورت سے تمہیں احمق معلوم ہوتا ہوں؟" چیخوف میری تجویز پر یک بیک برہم ہو گیا۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"میں نے تمہاری توہین تو نہیں کی ہے!" میں نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "میں نے تمہیں اتنی دشواریوں کے بعد پکڑا ہے۔ اور اب تمہیں ساحل پر اتار دوں۔ کیا یہ میرے ساتھ بدترین مذاق نہیں ہے؟"

"مذاق نہیں میں سنجیدہ ہوں میرے محترم دوست!" میں نے نرمی سے کہا "تمہارے آدمیوں کی مکمل نگرانی میں مجھے نقل و حرکت کی آزادی چاہیئے!"

"پولیس تمہاری متلاشی ہے، میرے آدمی تمہیں پولیس سے تو بچا سکیں گے اور اگر تمہیں ٹیکسی ڈرائیور اور الانوف کے قتل کے جرم میں عمر قید ہو گئی تو مجھے الانوف کی کورٹ مارشل سے نہ بچا سکے گی۔ میں ایسا کھیل نہیں کھیل سکتا!"

"پھر شاید میری موت تمہارے ہاتھوں واقع ہو گی!" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

چند ثانیوں تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا "تمہارا ماضی نہایت سیاہ ہے۔ تم نے ہند میں متعدد خون کئے ہیں۔ سائیکو فورٹ میں تم نے انڈین سیکرٹ سروس کے ایک بہترین دماغ کو اپنی مکاری کا نشانہ بنایا پھر ڈاکٹر راماسنگھ کی آڑ لے کر تم وہاں سے بچ نکلے۔ یہ ایسے جرائم ہیں جنہیں ہندوستانی حکومت کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں تمہیں ساحل پر قدم رکھنے کی اجازت بھی نہیں دی جا سکتی۔"

"پھر تم آزاد ہو، جو سلوک چاہو کرو، موجودہ حالات میں پارس مہیا کرنا میرے بس سے باہر ہے۔" میں نے بیزاری کے عالم میں کہا۔

"اچھا!" اس نے ہونٹ بھینچ کر سخت لہجے میں کہا اور روسی زبان میں کچھ بڑبڑاتا ہوا میز پر موجود فون کی طرف بڑھ گیا۔

فون پر چند ثانیوں تک گفتگو کرنے کے بعد وہ پھر میری طرف آیا اور چیلنج کرتے ہوئے لہجے میں بولا "میرے ساتھ آؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری ہٹ دھرمی کب تک قائم رہتی ہے!"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ گیا اور قدم بقدم اس کے ساتھ کیبن سے باہر چل دیا۔

اس بار پھر مجھے چیخوف کے ساتھ بھول بھلیاں نیم تاریک راہداریوں اور سیڑھیوں سے گزرنا پڑا اور اس بار وہ مجھے جہاز کے سب سے نچلے حصے میں بنے ہوئے ایک وسیع ہال میں لے گیا جہاں مجموعی طور پر کسی تجربہ گاہ کا سماں موجود تھا۔

بہت سے روسی مرد سفید لبادے پہنے بحری نباتات وغیرہ پر مختلف تجربوں میں مصروف تھے۔ بعض جگہ ان کی مدد کے لئے لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ روسیوں کے معیار کے لحاظ سے حسین رہی ہوں۔ لیکن میری نگاہوں میں مشرق کا فسوں خیز اور سحر کار حسن بسا ہوا تھا۔ مجھے پھیکے رنگ اور بھاری کولہوں والی کوئی لڑکی توجہ کے قابل نظر نہ آئی اور شاید چیخوف بھی مجھے وہاں عیاشی کے نقطہ نظر سے نہیں لایا تھا۔

وہ سر کے اشارے سے ہال موجود لوگوں سے سلام دعا کرتا ایک منحنی سے شخص کے قریب جا رکا جو ٹسٹ ٹیوب میں گلابی رنگ کا شفاف سیال لئے اس میں چھوٹی سی ایک مچھلی کی حرکات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

"مسٹر اسپاسکی!" اس بار چیخوف نے اس منحنی سے روسی کو دانستہ انگریزی میں مخاطب کیا تھا۔ "یہ ہمارا مہمان ہے اسے تھوڑے تھوڑے وقفے سے کلورین سنگھاتے رہو۔ جب اس کے اعصاب بالکل بکھر کر رہ جائیں تو مجھے خبر کرا دینا۔"

اسپاسکی کی بے رونق آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی اور اس نے چیخوف سے روسی زبان میں کچھ گفتگو کی جو خاصی دیر جاری رہی۔

"یہ کرنا ہو گا۔" اسپاسکی کے خاموش ہوتے ہی چیخوف انگریزی میں بولا۔ "تم نتائج کی پرواہ نہ کرو۔ میں اس معاملے میں اوپر والوں کو براہ راست جوابدہ ہوں......"

بوڑھا شانے اچکا کر رہ گیا۔

چیخوف چلا گیا تو بوڑھے نے پہلی بار میری طرف ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی کی ہلکی سی لہر نمایاں تھی۔

میں اس سے نگاہیں چار ہوتے ہی دوستانہ انداز میں مسکرایا مگر اس نے میری مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بنچ پر لگے ہوئے انٹرکام پر کسی سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بنیان اور نیکروں میں ملبوس دو قوی الجثہ روسی وہاں آ پہنچے۔ بنیان کی تنگ آستینوں کے نیچے ان کے بازوؤں کی ابھری ہوئی توانا مچھلیاں بے چینی سے پھڑک رہی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی سروں کو خم دے کر اسپاسکی کو تعظیم دی اور کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

اسپاسکی تحکم آمیز لہجے میں زور زور سے انہیں کچھ سمجھانے لگا۔

اسپاسکی کے خاموش ہوتے ہی وہ دونوں پھرتی سے میرے دونوں پہلوؤں پر آ گئے اور میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے تقریباً کھینچتے ہوئے آگے لے چلے۔

"مجھے چھوڑ دو، میں خود تمہارے ساتھ چل رہا ہوں" میں نے جھنجلا کر کہا۔

وہ دونوں اچانک یوں کھلکھلا کر ہنس پڑے جیسے کسی بچے نے ان کے سامنے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ مگر انہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔

وسیع ہال میں موجود لوگوں نے میری طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی سب سر جھکائے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ایک آدھ نے ان دونوں کے بلند آہنگ قہقہوں پر برا سا منہ بنا کر ان کی طرف دیکھا مگر ان جنیشوں پر کسی کا

کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور لاپروایانہ انداز میں خرمستیاں کرتے مجھے ایک طرف گھسیٹتے رہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے معلوم ہوتے تھے جاپانی فنی مرتبل کے سامنے دوسروں کے ہر جذبے کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

اس تنگ دود کا اختتام پھر ایک کمرے پر ہوا۔ جہاں دیوار کے سہارے آہنی اسٹینڈ میں مختلف رنگوں کے گیس کے سلنڈر کھڑے ہوئے تھے۔ ہر سلنڈر سے تانبے کی ایک پتلی سی نلی منسلک تھی جس کا دوسرا سرا ایک دیوارگیر پائپ میں لگا ہوا تھا۔ وہ دیوارگیر پائپ دیوار میں گزر کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔

ان دونوں نے شانوں پر دباؤ ڈال کر مجھے فرش پر بٹھا دیا اور میرے سر پر زرد رنگ کا ایک آہنی خود پہنانے لگے۔ اس میں بھی دو پلاسٹک کی پتلی پتلی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس خود کی ساخت اس قدر بے ہودہ تھی کہ اسے سر پر منڈھ دیئے جانے کے بعد سر سے گردن تک پورا چہرہ چھپ گیا تھا حتیٰ کہ آنکھوں کے سامنے بھی کوئی سوراخ یا شیشہ نہیں تھا البتہ سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں ہورہی تھی۔

ان دونوں نے اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد مجھے چھوڑ دیا میں جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ کیونکہ عملی طور پر میری حیثیت کسی نابینا جیسی تھی۔

چند ثانیے اسی طرح سکوت اور خاموشی کے عالم میں گزر گئے۔ اس دوران میرا ذہن روسی جہاز البالنوف کے کمانڈر چیخوف کے الفاظ میں اُلجھا رہا۔

اس وقت تک مجھے کلورین گیس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا بس اتنا جانتا تھا کہ شہری استعمال کے پانی میں سے جراثیم کے خاتمے کے لئے یہ گیس پانی میں ملائی جاتی ہے۔ بلکہ کراچی میں اپنے قیام کے دوران کئی بار میں نے یہ بھی سنا تھا کہ پانی میں کلورین کا ذائقہ تک محسوس ہوتا ہے۔ اس بنا پر میرا اندازہ تھا کہ یہ گیس زیادہ خطرناک نہیں ہوگی جبکہ چیخوف نے وہ گیس میرے لئے کڑی سزا کے طور پر تجویز کی تھی اور وہ اس کے ذریعے میرے اعصاب پراگندہ کرنا چاہتا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ناک سے حلق تک کوئی جلتی ہوئی چیز گزر گئی ہو۔ بے اختیار مجھے کھانسی آگئی اور اسی کے ساتھ پلاسٹک ماسک کا اگلا حصہ کسی خودکار اسپرنگ کی مدد سے خود بخود اوپر ہٹ گیا۔

کھانسنے کے ساتھ ہی مجھے اپنے حلق اور سینے میں خراش بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور اس بار میرے دہانے سے کھانسی کے ساتھ خون کی ننھی ننھی بوندیں فرش پر آپڑیں۔ اسی کے ساتھ کھانسی میں ناقابلِ برداشت شدت آگئی۔

میں نے دونوں ہاتھ سے سینہ دبا کر کھانستے ہوئے بے چارگی کے ساتھ پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ مگر وہاں میرے سوا کوئی ذی رُوح موجود نہیں تھا۔ مجھے لانے والے شاید مجھے اس کمرے میں مقفل کرکے کہیں چلے گئے تھے۔

میں نے اپنی کھوپڑی اور گردن میں پھنسے ہوئے اس خود کا لاسیسی خول کو اُتار پھینکنا چاہا مگر وہ بہت مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور میں پوری کوشش کے باوجود اسے کھولنے کا طریقہ دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔

کھانسی کا دورہ جُوں ہی رُکا پلاسٹک کے خود کا اگلا حصہ ایک بار پھر اچانک اس طرح گر گیا کہ میرا پورا چہرہ اس میں بند ہوکر رہ گیا اور اس ماسک کے اندر تیزی سے کلورین گیس بھرنے لگی۔ میں نے سانس روک کر خود کو اس مصیبت سے بچانا چاہا۔ آنکھوں کی سوزش میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی لیکن میرے پھیپھڑے زیادہ دیر سانس نہ روک سکے اور میں نے جونہی سانس لیا میرے اندرونی نظامِ تنفس میں آتشی لکیر سی تیرتی چلی گئی۔

اس بار کھانسی کا دورہ بہت شدید تھا۔ کھانسی کے ساتھ ہی ماسک کا اگلا حصہ پھر اوپر اُٹھ گیا۔ اس بار میری حالت بہت ابتر تھی۔ میرے دہانے سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ حلق کی خراشیں چند ثانیوں کے لئے بھی کھانسی نہ رُکنے دیتی تھیں۔

نہ جانے کتنی دیر میری یہی کیفیت رہی پھر میں کھانستے کھانستے نڈھال ہوکر فرش پر ڈھیر ہوگیا اور اسی عالم میں مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔

آنکھ کھلی تو میں نے ذہنی خوابیدگی کے ہی عالم میں اپنے قریب خوشبو میں ڈوبے کسی پیکر کا وجود محسوس کیا جو کسی سائے کی مانند مجھ پر جھکا ہوا تھا۔

چند ثانیوں میں جب میری بصارت اور بینائی بحال ہوگئی تو میں نے اسے دیکھا اور ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کے جسم پر جو لباس تھا مغربی طرزِ معاشرت کے اعتبار سے کافی تھا مگر مشرقی معیار کے مطابق وہ تقریباً نیم برہنہ تھی۔

اس کے سنہرے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ نیلی آنکھوں میں دلچسپی نمایاں تھی اور پتلے پتلے آتشیں ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"تم کیسے ہو؟" اس نے مسہری پر میرے قریب ہی بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے بدن سے عجیب بھینی بھینی مہکار پھوٹ رہی تھی۔ میں یہ اندازہ نہ کرسکا کہ یہ اُس کے گداز بدن کی بُو ہے یا اس نے کوئی خوشبو لگائی ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر اذیت ناک بیہوشی کے بعد میرا ذہن لذت انگیز خمار کے سمندر میں ہلکورے لینے لگا۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میری آواز کانپ رہی تھی۔ "میں اس وقت کہاں ہوں اور تم کون ہو؟"

اس نے کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح دروازے کی طرف دیکھا پھر میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "تم یہیں آرام کرو۔ میں بڑی مشکل سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ جہاز کے ایک انجن میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہے چیخوف وہاں مصروف ہے۔"

اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ انگریزی اس کی مادری زبان نہیں ہے مگر اس وقت میرے لئے ہر زبان قابلِ فہم تھی۔ اس کا ہاتھ میرے سینے پر تھا اور میرے بدن میں آہستہ آہستہ حرارت سی کوندر رہی تھی جو کسی بھی لمحے بھڑک سکتی تھی۔

"تم وہی ہو نا جسے میں نے چیخوف کے کیبن میں دیکھا تھا؟" میں نے خمار سے بوجھل لہجے میں یہ پوچھتے ہوئے نرمی سے اس کا وہ ہاتھ تھام لیا جو میرے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

"میں نے مدتوں بعد کسی عورت کو اپنے اوپر مہربان دیکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے مسہری سے اُٹھنا چاہا مگر نقاہت کے باعث آنکھوں کے سامنے تاریک دائرے رقص کرنے لگے اور مجبوراً مجھے دوبارہ بستر پر دراز ہونا پڑ گیا۔

"میں جارہی ہوں۔" وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "پھر کسی وقت آؤں گی۔ اپنے دماغ پر قابو رکھنا غلط حرکتوں میں پڑے سب سے تمہاری لاش بھی سمندر میں پڑی نظر آئے گی۔"

"تم کون ہو؟" میں نے پہلی بار اس کی ذات کے بارے میں تجسس آمیز سوال کیا ورنہ اس سے قبل تو میرے ذہن پر صرف جنس سوار ہوکر رہ گئی تھی۔

"ایک لڑکی۔" اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی کیبن سے نکلتی چلی گئی۔

میں کافی دیر تک بستر پر پڑا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ جانے وہ میری ذات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھی۔ بظاہر وہ کافی طرار نظر آتی تھی الاہ پہلی مرتبہ اس نے جس انداز میں چیخوف کو لتاڑا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جہاز کے عملے میں ہی شامل ہے اور اپنی اداؤں کے باعث چیخوف کی منظورِ نظر بھی ہے۔

ذہن سے اس کی خوبصورتی کا بھوت اُترا تو میں نے سنجیدگی سے صورتحال کے بارے میں غور کیا اور جُوں جُوں میں سوچتا رہا میرا یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ چیخوف مجھ پر اب دو طرفہ وار کر رہا ہے۔ خود تشدد کے ذریعے پارس پتھر کا سراغ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور دوسری طرف وہ لڑکی میری ذات میں ہمدردانہ دلچسپی لے کر میرے قریب آرہی ہے تاکہ کسی مناسب موقع پر میری زبان کھلوا سکے۔ شاید چیخوف کو میرے بارے میں خاص معلومات مہیا کی گئی تھیں اور وہ اپنی دانست میں ان سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس بے چارے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ صفدر علی بوتوں کا رسیا ضرور ہے مگر ان کی غلامی قبول نہیں کرتا۔

لڑکی کے چلے جانے کے کم و بیش پندرہ منٹ بعد ہی چیخوف وہاں آپہنچا۔ اس وقت اُس کے جسم پر نیلی وردی کے بجائے ڈانگری چڑھی ہوئی تھی جس پر جابجا تیل گریس اور سیاہی کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس کی جیبوں میں مختلف اوزار موجود تھے۔

"تمہارے حواس کچھ ٹھکانے آئے یا نہیں؟" اس نے مجھے بیدار پاکر پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"میرے حواس شروع ہی سے ٹھکانے پر ہیں۔" میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

"کان کھول کر سُن لو کہ میرے پاس تمہارے بارے میں واضح احکام آچکے ہیں۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مجھے پارس پتھر دے دو تو میں تمہاری زندگی کی ضمانت دینے کو تیار ہوں ورنہ تمہاری لاش سمندر میں پھینک دی جائے گی اور اگر وہ لڑکی سیتا مل گئی تو یہی سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جائے گا خواہ اس کے قبضے سے پارس پتھر برآمد ہو یا نہ ہو۔"

"اگر مجھے مارنے کے لئے بہانہ درکار ہے تو یہ شرط خاصی مناسب ہے۔" اس بار میں نے بھی طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "آخر تم مجھ سے اس بات کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو جو فی الحال میرے اختیار سے باہر ہے اور میں اسے کسی طرح پورا نہیں کرسکتا۔"

"پارس اگر کہیں بھی موجود ہے تو اس پر ماسکو کا حق ہے۔ وہ پتھر ماسکو جائے گا یا ایک بھولا ہوا خواب بن جائے گا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "وہ تحقیق کا ایک زبردست موضوع ہے۔ تمہیں زندہ چھوڑ کر یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا کہ تم وہ پتھر اس کے خفیہ ٹھکانے سے نکال کر کسی اور کے حوالے کردو۔ اگر لے ورنہ بہانے پر تلاش کرتا ہی ہے تو یہ کام تمہارے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں استہزائیہ انداز میں ہنس دیا۔ "اس پتھر کو پہچاننا واقعی ایسا ہی سہل کام ہے۔"

"تمہیں سوچنے کے لئے صرف دس گھنٹے دیئے جارہے ہیں۔ بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے سے قبل مجھے تمہارا جواب چاہیئے۔"

میں کچھ نہ بولا۔ اس سے مزید بحث بے سُود تھی۔ وہ اپنی بات ختم کرکے باہر چلا گیا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد وہ لڑکی آئی۔ وہ بہت جلدی میں معلوم ہوتی تھی۔ اندر گھستے ہی اُس نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے میرے قریب آگئی۔

"سُنا ہے تمہیں دس گھنٹے بعد مار کر سمندر میں پھینک دیا جائے گا؟" اس نے ہیجان آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"مجھ سے چالبازی کی کوشش نہ کرو۔ یہ بات تمہیں چیخوف سے بھی معلوم ہوسکتی تھی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف آدمی! میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے بدستور زہریلے لہجے میں کہا۔ "چیخوف سے کہو کہ مجھے مارنے کے بعد سمندر میں پھینکنے کے بجائے تمہارے حوالے کردے۔ میری لاش محفوظ کرا کے اپنی خوابگاہ کے کسی خالی گوشے میں سجا لینا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں احمق آدمی۔" وہ اچانک روہانسی ہوگئی۔ "میں چیخوف سے تنگ آچکی ہوں۔ وہ بدترین جنسی مریض ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ یہی رویہ رکھا تو اس کا غیر انسانی سلوک مجھے خودکشی پر مجبور کردے گا۔"

"تمہیں اس پُراسرار پتھر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"جہنم میں جائے پتھر۔" وہ جھلا کر بولی۔ "مجھ پر اعتبار کرسکتے ہو تو کرو

ورنہ میں جا رہی ہوں۔ جو میرے مقدر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"روزیلا — میں اس جہاز پر چیخوف کی اسٹینو کے طور پر ملازم ہوں مگر وہ ہمیشہ سے مجھے اپنی مرضی پر چلاتا رہا ہے۔ وہ اوّل درجے کا ڈھیٹ اور بے حیا ہے۔ میری لعن طعن بھی اسے راہِ راست پر نہ لاسکی۔ اس جہاز پر کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ چیخوف کے خلاف سوچ بھی سکے۔ اسی لئے میں نے تم پر بھروسا کیا ہے۔ اسی کے ساتھ میں تمہیں پسند بھی کرنے لگی ہوں۔ تم میں ایسے مردانہ خواص موجود ہیں جو عورتوں کو متوجہ کرتے ہیں۔ چیخوف تو اس قدر وحشی ہے کہ اسے میری کسی بھی نسوانی خوبی سے دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے بس ایک کھلونا بنا رکھا ہے۔"

"اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں۔" میں خشک لہجے میں بولا۔ "تمہاری بات میں سمجھ چکا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"اس منحوس جہاز سے نجات۔"

"میرے کتنے ساتھی اس جہاز پر قیدی ہیں؟" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد روزیلا سے دریافت کیا۔

"ایک بھی نہیں۔" وہ فوراً بولی۔ "تمہارے سوا ہر ایک کو غوطہ خوروں نے کھلے سمندر میں ہی ہلاک کر دیا تھا۔"

"اور تم چاہتی ہو کہ میں تنہا چیخوف سے بھڑ جاؤں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "کہیں اس کی بدسلوکیوں کے باعث تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟"

"تم بس میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو۔ سارا کام میں خود نپٹا لوں گی۔ آخری مرحلے پر مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہوگی۔"

"جب تک منصوبے کا پورا علم نہ ہو، میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"جہاز پر دو انجن ہیں۔" وہ میرے قریب آکر سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "دونوں کو تیل کی فراہمی ایک ہی جگہ سے کی جاتی ہے۔ اس ٹنکی میں تیل کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے اسٹیل کی نالیوں میں سے ٹھنڈا پانی گزارا جاتا ہے۔ میں ایک ایسی جگہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں جہاں سے پانی تیل میں مل سکتا ہے۔ اس بات کا کسی کو علم بھی نہ ہوگا اور اچانک انجن کام کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اتفاق سے اس وقت ایک انجن خراب ہے۔ جب دوسرا بھی ناکارہ ہو جائے گا تو جہاز کھلے سمندر میں رُک جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"اس منصوبے میں ہم دونوں کی رہائی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔" خاموشی کا وقفہ طویل ہوتے دیکھ کر میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہنگامی حالت کا اعلان ہوتے ہی چیخوف سمیت سارا عملہ انجنوں کی مرمت اور خرابی کا سُراغ لگانے میں مصروف ہو جائے گا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ہم عقبی حصے سے سمندر میں اُتر جائیں گے۔ انجن بند ہونے کے سبب روشنی بھی نہیں ہوگی۔ رات کے اندھیرے میں ہم لائف بوٹ لیکر آسانی سے فرار ہو سکیں گے۔" اس نے وضاحت کی۔

"اور اگر تعاقب کیا گیا؟"

"پلاسٹک کی سفید کشتی بہت تیز رفتار ہوتی ہے۔ اسے پکڑنا ان کے بس سے باہر ہوگا۔ پورے جہاز پر اس ساخت کی وہی ایک کشتی ہے۔"

"اگر ہم پر فائرنگ کی گئی؟"

"اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ جھلا کر بولی۔ "لائف بوٹ جہاز کے سب سے ویران اور عقبی حصے میں ہے۔ اگر عرشے پر اندھیرا ہو تو کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔"

"زبانی حد تک تو تمہارا منصوبہ بے داغ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عمل پر یہ کہاں تک کارآمد ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ بیک وقت دونوں انجنوں کی خرابی چیخوف کو چوکنا کر دے اور جہاز پر ایسی ہنگامی حالت پیدا نہ ہو سکے جس کی تم توقع کر رہی ہو۔"

"یہ مشکل ہے۔ پھر اس کا امکان صرف اسی وقت ہوگا جب وہ یکسوئی کے ساتھ سوچ سکے۔ تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ہنگامی حالات میں پیچیدہ نکات نظر انداز کر جاتا ہے۔"

"بہر حال میں تیار ہوں — لیکن یہ منصوبہ تمہارا ہے اس لئے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینا تمہاری ذمے داری ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اپنا کام دکھانے کے بعد چیخوف کو کیبن میں لے آؤں گی۔ چلتے چلتے آخری بار مجھے اس کی حرکتیں ایک بار اور برداشت کرنا پڑیں گی۔ جب بستر پر اسے یہ خبر ملے گی تو ہر کام میرے منصوبے کے مطابق ہوتا جائے گا۔" وہ اس ماحول سے بیحد دل برداشتہ نظر آرہی تھی۔ "مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ تمہارا کام کیا ہے؟"

"تمہاری تقلید کے علاوہ بھی مجھے کچھ کرنا ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہارے وجود پر کلورین کے اثرات ابھی گہرے ہیں اس لئے میں تمہیں مشقت کا کوئی کام نہیں دوں گی۔ جہاز پر خطرے کا سائرن ہوتے ہی تم اپنے کیبن میں آگ لگا کر باہر نکل آنا۔ یہاں گدّے، تکیے اور ڈھیروں کاغذ موجود ہے جو ذرا سی کوشش میں آگ پکڑ لے گا مگر دروازہ کھلا نہ چھوڑنا تاکہ لوگوں کو فوراً ہی آگ کا علم نہ ہو سکے۔"

"شاید یہ کیبن کچھ اہم تنصیبات سے ملحق ہے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اُس کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں۔ "تم تو میری توقع سے زیادہ ہوشیار ہو۔ اس کیبن کے ساتھ ہی ریڈار اور ریڈیو کنٹرول روم ہے۔ وہاں سے ہمیں بآسانی میزائل کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ایک بار تمہارا کمرہ آگ پکڑ لے تو وہ نظام ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"کنٹرول روم کو بجلی فراہم کرنے والے تار تمہارے کمرے کی چھت میں سے گزر رہے ہیں۔ ان تاروں کو چھپانے کے لئے پلائی ووڈ کی دُہری چھت بنائی گئی ہے۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے جلدی جلدی بولی۔ "البتہ ایک تار تمہارا نشانہ ہوں گے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو میں دُہری چھت توڑ کر براہِ راست ان تاروں کو

کو تباہ کر دوں گا۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔

"بہتر تو یہی ہوگا۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ اس کام میں تم اتنی توانائی ضائع کر بیٹھو کہ عین فرار کے موقع پر مجھے تم کو سنبھالنا پڑ جائے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ایمرجنسی سائرن کی آواز کے ساتھ ہی تمہیں کام شروع کرنا ہے۔ اس کے بعد عرشے کے آخری حصے پر میرا انتظار کرنا۔" اس نے جاتے جاتے ایک بار پھر یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔ "تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ چیخوف تمہاری آغوش کا متلاشی ہوگا۔"

وہ مجھے آنکھ مار کر وہاں سے چلی گئی۔

کچھ کر گزرنے کا مقام آتے ہی میری توانائی تیزی سے بحال ہوتی چلی گئی۔ شاید یہ میری مضبوط قوتِ ارادی کا کمال تھا جو تکلیف کے احساس پر غالب آتی چلی گئی۔ میں نے اپنے کمرے کی چھت کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک ایسے کمزور جوڑ کا سُراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا جسے میں معمولی سی کوشش سے اُکھاڑ سکتا تھا۔

روزیلا کے چلے جانے کے بعد تقریباً دو گھنٹے کی مدت شدید اعصابی تناؤ اور انتشار کے عالم میں گزری۔ میرے کان بے چینی کے ساتھ ایمرجنسی سائرن کی ڈراؤنی آواز کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ آواز اچانک ہی سنائی دی۔ اس سے قبل جہاز کو دو ہلکے جھٹکے لگے اور پھر سائرن پوری قوت کے ساتھ چیخ اُٹھا۔ میں نے پھُرتی کے ساتھ کُرسی چھت کے نشان زدہ حصے کے نیچے کھینچی اور جوڑ میں انگلیاں پھنسا کر پلائی ووڈ نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں ابھی اس کا ایک ہی سرا اُکھاڑ پایا تھا کہ اچانک بجلی غائب ہو گئی اور کیبن میں گھور اندھیرا چھا گیا۔ شاید بیٹری کو محفوظ رکھنے کی خاطر جہاز کی ساری روشنیاں گُل کر دی گئیں تاکہ اس توانائی کو اہم ترین ضروریات کے لئے بچایا جا سکے۔ انجن بند ہونے کی صورت میں سارا برقی بار شاید محفوظ بیٹریوں پر منتقل ہو گیا تھا۔

میرے لئے یہ تاریکی نیک شگون تھی۔ باہر راہداری میں افراتفری اور بھاگ دوڑ کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی شخص دروازہ کھول کر میرے کیبن میں گھس سکتا تھا مگر اندھیرا ہو جانے کے بعد میں اس خطرے سے پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد پلائی ووڈ کا ایک بڑا سا ٹکڑا چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ میرے ہاتھوں میں آگیا اور میں نے سہارا دے کر اسے فرش پر گرا دیا۔

اسی وقت کیبن میں لگے ہوئے کسی دیوار گیر اسپیکر پر ایک مردانہ آواز سنائی دی جو روسی زبان میں کچھ اعلان کر رہی تھی۔ اعلان ختم ہوتے ہی اسپیکر بے جان ہو گیا اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی۔

دیا سلائی کی رگڑ کی آواز کے ساتھ ہی شعلہ لپکا اور کمرے میں یرقان زدہ روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیا سلائی کی لَو بھڑکتے ہی اپنا ہاتھ بلند کیا اور چھت میں پیدا ہونے والے خلا میں سے اندر داخل کر دیا۔

وہ تاریک خلا جُوں ہی روشنی میں نہائی میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھل پڑا۔ چار موٹے موٹے برقی تار اور بے شمار باریک تاروں کا ایک گچھا اس تاریک خلا میں سے گزرتا ہوا نظر آیا۔ وہ اتنا قریب تھا کہ میں نے پنجوں کے بل اُچک کر ان تمام تاروں کو چھُو لیا۔

دیا سلائی اپنے آخری سانس پر تھی تو میں نے اسے تاروں پر ڈال دیا اور وہ وہاں گرتے ہی بُجھ گئی۔ میں نے تاروں کو چھُو کر اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ موٹے تاروں پر جو خول منڈھا ہوا ہے وہ آسانی سے آگ نہ پکڑے گا۔ البتہ باریک تاروں کے فوراً ہی جل جانے کا امکان تھا۔

اس اندازے کے پیشِ نظر میں احتیاط کے ساتھ کُرسی سے نیچے اُتر آیا اور مزید ایک تیلی سُلگا کر کمرے سے کاغذ وغیرہ سمیٹنے لگا تاکہ تاروں کو فوری طور پر تباہ کرنے کا بندوبست کیا جا سکے۔

اس تمام کارروائی میں مجھے بمشکل چند منٹ صرف ہوئے اور میں نے تاروں کے اوپر کاغذ بکھیر کر ان کو آگ دکھا دی۔

اس کے بعد میرا وہاں رُکنا اور نتائج کا انتظار کرنا غیر ضروری تھا۔ میں نے خلا میں سے آنے والے انعکاس کی مدد سے کمرے میں سے ہر آتش گیر چیز اُٹھائی اور اوپر ڈال دی۔ اس میں بستر کی سوتی چادر، تکیے، میز پوش، کمبل اور تولیہ تک شامل تھا۔

میری یہ محنت جلد ہی بار آور ثابت ہوئی اور آگ تیزی کے ساتھ بھڑک اُٹھی۔

میں پھُرتی کے ساتھ دروازے کے قریب پہنچا۔ چند ثانیوں تک کان لگا کر راہداری میں نقل و حرکت کا اندازہ لگاتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں مکمل سناٹا ہے تو میں دروازہ کھول کر پھُرتی سے باہر آیا اور دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

تنگ راہداری میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہاں سمتوں کے تعین کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مجھ سے ایک چُوک یہ ہوئی کہ روزیلا سے یہ معلوم کرنا بھُول گیا کہ میرا کیبن جہاز کے کس حصے میں واقع ہے۔ بہر حال وہ موقع خطرناک تھا۔ میں محض قیاس کے سہارے تیز تیز قدموں سے ایک طرف ہو لیا۔

تقریباً چھ سات منٹ میں غول سے بچھڑے ہوئے کسی بھُوکے بھیڑیئے کی طرح ... بھٹکتا رہا۔ کامیابی کے احساس نے خوف یکسر مٹا دیا تھا۔ اب مجھے صرف اس بات کی فکر تھی کہ جلد از جلد مقررہ مقام پر پہنچ سکوں۔

خاصی جدّوجہد کے بعد میں سیڑھیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے میدان صاف ملا۔ سیڑھیوں پر کئی آدمی مجھ سے ٹکراتے ہوئے گزرے لیکن اندھیرے اور ہنگامی حالت کے باعث کسی کو ہوش نہیں تھا کہ وہ کس سے ٹکرایا ہے۔

میں عرشے پر پہنچا تو وہاں چند لڑکیاں ریلنگ کے سہارے کھڑی بیک وقت بول رہی تھیں۔ ان کے لہجوں میں ہراس کا عنصر نمایاں تھا۔ شاید وہ اندھیرے اور سائرن سے گھبرا کر عرشے پر نکل آئی تھیں تاکہ انتہائی خطرناک حالات پیدا ہو جائیں تو پہلی لائف بوٹ پر جگہ پا سکیں۔

میں ان سے کترا کر عرشے کے پچھلے حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہاں روزیلا کے بیان کے مطابق سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید سارے مرکارکن انجن روم اور اس کے گرد و نواح میں اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

میں تاروں بھرے آسمان کے سائے میں عرشے کے تقریباً بالکل آخر میں اس مقام پر پہنچا جہاں پلاسٹک کی برق رفتار لائف بوٹ موجود تھی تو نائیلون کے رسّوں کے ایک ڈھیر کے عقب سے مجھے سیٹی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

میں چھلانگ لگا کر غیر ارادی طور پر ایک ڈرم کی اوٹ میں چھپ گیا۔ تاریکی میں میری نگاہیں رسّوں کے انبار کی طرف لگی ہوئی تھیں مگر میں کوشش کے باوجود وہاں کسی کی موجودگی محسوس نہ کر سکا۔

پھر اچانک کسی نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اچھل کر پیچھے کی طرف پلٹا اور اس سے قبل کہ میرا ابھرا ہوا گھونسا حرکت میں آتا میں نے روزیلا کو پہچان لیا۔

"بچاؤ" جلدی کرو

"اگر انہیں علم ہو گیا تو وہ کسی بھی لمحے ہمیں آ لیں گے۔"

"ابھی وقت باقی ہے۔۔۔ وہ سرخ بتی دیکھ رہے ہو جب تک وہ نہیں بجھ جاتی، کنٹرول روم کے تار سلامت رہیں گے۔ ان کے جھلسنے کے بعد ہی ہم سمندر میں اتریں گے۔"

یہ میری خوش نصیبی ہی تھی کہ اس دوران اس طرف مکمل سکوت چھایا رہا۔

اب سرخ روشنی غائب ہو رہی تھی۔ کیبن میں میری لگائی ہوئی آگ بھڑک رہی تھی۔ کنٹرول روم کو بجلی کی فراہمی منقطع ہو چکی تھی اور ایک طرف سے کثیف دھوئیں کے بادل امڈ رہے تھے۔ ساتھ ہی بے شمار آوازوں کا ملا جلا شور بھی ابھرنے لگا تھا۔ شاید روزیلا نے وقت کا باقاعدہ حساب رکھا ہوا تھا۔

برقی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے باعث لائف بوٹ کو سمندر میں اُتارنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر روزیلا شاید پہلے ہی اس نظام کا بغور مشاہدہ کر چکی تھی اس لئے اس کی مدد سے میں نے یہ کارروائی پوری کر لی۔

پھر رسّی کی سیڑھی کے ذریعے پہلے روزیلا بوٹ میں گئی۔ اس کے بعد میں بھی نیچے پہنچ گیا۔ میں نے ہلکے چپوؤں کی مدد سے بوٹ کو کچھ آگے بڑھایا۔ پھر روزیلا نے اس کا طاقتور انجن اسٹارٹ کر دیا اور بوٹ اچانک تیزی کے ساتھ آگے کی طرف ہو لی۔

جہاز پر گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رات بھی تاریک ہی تھی لہٰذا ہم بے روک ٹوک آگے بڑھتے رہے۔ میں نے کافی دُور نکل آنے کے بعد چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اچانک ایک نئی تشویش نے میرے ذہن کو آ لیا۔

ہمارے چاروں طرف تاحدِ نظر سمندر کا پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا۔ دُور تک کہیں بھی خشکی یا روشنی کا دھبہ نظر نہیں آ رہا تھا اور خاص طور پر میرے لئے سمندر میں سمتوں کا احساس بے معنی تھا۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں روزیلا؟" میں نے اپنی آواز میں ٹھہراؤ قائم رکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"بے خوف اور اس کے جہاز سے دُور۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

"ایسا تو نہیں کہ ہم ساحل کے بجائے مخالف سمت میں جا رہے ہوں؟"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس کے لہجے میں ذرا بھی پریشانی نہیں تھی۔

"میں سمندر میں ڈوب کر مرنا پسند نہیں کرتا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اگر تمہاری آغوش میسر ہو تو میں ہر خطرہ مول لے سکتی ہوں۔ سمندر تو بے حقیقت سی چیز ہے۔" وہ اندھیرے میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک عود کر آئی۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ اسی وقت میری نظر ڈائل بورڈ پر گئی۔ وہاں چمکدار ڈائل اور سوئی والا بیش قیمت قطب نما موجود تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ لائف بوٹ مشرق کی طرف سفر کر رہی ہے۔

میرے منہ سے اطمینان کا ایک طویل سانس آزاد ہو گیا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ہم بحیرۂ ہند کے علاقے میں کسی جگہ موجود تھے اور اگر قطب نما درست تھا تو مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے ہم جنوبی ہندوستان کے مغربی ساحل پر کہیں بھی پہنچ سکتے تھے۔ جو ترلیوندرم سے مانڈوی تک پھیلا ہوا تھا۔

"تم نسلاً روسی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہیں کیا لگتی ہوں؟"

"روسی ضرور ہو مگر باغیانہ ذہن کی مالک ہو۔"

"میں جرمن نژاد ہوں۔" وہ اپنا سر میرے سینے سے لگا کر بولی۔ اس کے گداز بدن کا لمس میرے ذہن پر سرور طاری کر رہا تھا۔ جہاز کے غیر یقینی ماحول سے نکل آنے کے بعد میرے لطیف احساسات پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ اور ذہن پر یہ تصور طاری ہوتا جا رہا تھا کہ کھلے سمندر کی بیکراں وسعت میں یہ کیسی حسین اور بے حد دل فریب ہم سفر ہے جو میری ہر خواہش کے سامنے خوشی سے سر جھکا دیگی۔

وہ اپنے بارے میں نہ جانے کیا کیا بتاتی رہی مگر میرا ذہن اس وقت رنگ و بو سے معمور آسمانوں میں پرواز کر رہا تھا اور غیر ارادی طور پر اس پر میری گرفت جارحانہ ہوتی جا رہی تھی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے مجھے تقریباً جھنجوڑ کر کہا تو میں چونک پڑا۔

میں نے اس کی ریشمیں زلفوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ "میں تمہارے تقرب کی لذت میں کھویا ہوا تھا۔"

وہ کسی ننھی سی بچی کی طرح میرے بازوؤں میں سمٹ آئی اور آہستہ سے بولی۔ "تم سوچ کیوں رہے ہو، میں تمہارے لئے ناقابل حصول تو نہیں ہوں۔"

صفدر علی کے محروم جذبے حسن کی بارگاہ سے فیضیاب ہونے لگے۔ وہ سراپا بخشش تھی اور میں سراپا فراق۔ اس پیکر کا کوئی پہلو فراق کی چیرہ دستیوں سے نہ بچ سکا۔ جہاز کا ہیولا خواب بن کر اندھیرے میں معدوم ہو چکا تھا۔ موجوں کا دھیما دھیما تلاطم صبر کی تلقین کر رہا تھا مگر لائف بوٹ کا غراتا ہوا انجن سرکشی اور شوریدہ سری پر اکسا رہا تھا۔ سمندر سے اٹھنے والی بوچھاڑ جسموں کی آگ بجھانے کی ناکام کوشش کرتی رہی، لمحے قیامت کا طول کھینچتے رہے اور آخر جذبوں کی یہ ہولناک پیکار سسک سسک کر خود ہی دم توڑ گئی۔

"میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گی صفدر۔" وہ آنکھیں موند کر بولی۔ "تم نے مجھے جیت لیا ہے۔ مجھے زندگی کے اس روپ سے آشنا کیا ہے، جس کے لئے میں ترستی رہی ہوں۔"

"تم کتنا ہو۔" میں نے اس کے نرم، چمکتے ہوئے بال مٹھی میں جکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرے لئے یہ بھی اعزاز ہے۔" وہ بولی۔ "تم مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس سرزمین سے اتنی دُور نکل جاؤ کہ کوئی ہماری گرد کو نہ پا سکے۔ یہاں روسی ہمیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"ساحل پر پہنچنے سے پہلے یہ آرزو احمقانہ ہے۔"

"اگر وہ پتھر واقعی تم نے کہیں چھپایا ہے تو اسے حاصل کرتے ہی نکل چلو، ہندوستان کی سرزمین ہمیں راس نہ آ سکے گی۔" اس نے پیٹ کے بل لیٹتے ہوئے کہا۔

پتھر کا نام آتے ہی میری کھوپڑی پر جمی ہوئی برف یک بیک پگھل گئی۔

میں اس کی لاعلمی میں چند ثانیوں تک اسے گھورتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "اس وقت کون سا پتھر پلسا گیا نہیں؟"

"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر لاپروایانہ لہجے

میں بولی۔ "اگر تم واقعی پارس پتھر کے مالک ہو تو ہم عیش کی زندگی گزار سکیں گے۔ فکرِ معاش انسان کی آدھی سے زیادہ مسرتوں کو نگل جاتی ہے۔"

میں نے نرمی سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تم فکر نہ کرو۔ میں اس پتھر کے بغیر بھی تمہیں عیش کرانے کی استطاعت رکھتا ہوں۔"

"یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔" وہ میرے ہاتھ کے لمس سے پھریری لیکر بولی۔

لائف بوٹ بدستور مشرق کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں نے قطب نما کا جائزہ لینے کے بعد روزیلا سے پٹرول کے بارے میں دریافت کیا اور اس نے بتایا کہ بوٹ پر ایندھن کی وافر مقدار موجود ہے لہٰذا ہم بآسانی کسی نہ کسی ساحل سے جا لگیں گے۔

پھر وہ بنچ پر لیٹے لیٹے اسی عالم میں سو گئی۔ اس کا جسم انتہائی متناسب اور دعوت انگیز تھا لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں مجھے وہ اپنے حسن کے دام میں نہ الجھا رہی ہو۔ تاکہ اس طرح پارس پتھر کا سراغ لگا سکے۔ پارس کے بارے میں اس کی گفتگو پہلے ہی میرے ذہن میں شبہات کو جنم دے چکی تھی۔ . . یہ خیال آتے ہی اس کا گداز بدن میرے لئے یک بیک ساری کشش کھو بیٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے قصاب کی دوکان پر لٹکا ہوا بے جان لوتھڑا میرے سامنے لا ڈالا ہو۔

میں تیزی سے اٹھا اور بوٹ کے مختلف حصوں کی تلاشی لینے لگا۔ اگر وہ مجھے فریب دے رہی تھی تو مجھے جلد از جلد اس کا سراغ لگانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں بوٹ پر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا جو روزیلا کے عزائم پر روشنی ڈال سکے۔

میں نے بوٹ کا چپہ چپہ چھان ملرا مگر مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اسی دوران میں دُور تک ابھرتی لہروں کے عقب میں کچھ روشنیاں ٹمٹماتی نظر آئیں، جو فوراً ہی معدوم ہو گئیں۔

تلاشی مکمل ہو چکی تھی لہٰذا میں پوری طرح روزیلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ روزیلا گہری نیند سو رہی تھی۔ مگر اب اس کے سراپا میں میری دلچسپی ختم ہو چکی تھی، جب تک وہ اپنے ... رویے سے میرے شبہات کی تردید نہ کر دیتی۔ وہ میری بدترین دشمن تھی اور مجھے اس کے ساتھ سرد جنگ جاری رکھنی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ روشنیاں واضح ہو گئیں۔ مگر وہ ساکن نہیں متحرک تھیں۔ شاید وہاں چھوٹی بادبانی کشتیوں میں مچھیرے ماہی گیری میں مصروف تھے اور دُور سے ان کی لالٹینوں کی یرقان زدہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے یہ تو سنا تھا کہ ماہی گیری کے لئے بہترین وقت صبح کی روشنی طلوع ہونے سے ذرا دیر قبل شروع ہوتا ہے لہٰذا اتنی رات گئے ماہی گیری کا امکان کم نظر آتا تھا لیکن ان کو میں ماہی گیروں کے علاوہ اور کچھ سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے آہستہ سے روزیلا کو جھنجوڑا اور وہ ہڑبڑا کر بیدار ہو گئی۔ اس وقت وہ اپنا بدن سمیٹے گٹھڑی کی صورت میں سو رہی تھی۔ اس کی رانیں پیٹ سے لگی ہوئی تھیں اور چہرہ داہنے بازو میں چھپائے وہ اسی کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔

"کک۔ ۔ کیا بات ہے؟" اس نے بیدار ہوتے ہی لکنت آمیز خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہم کسی ساحل کے آس پاس ہیں۔" میں نے کہا "سامنے سمندر میں کچھ کشتیاں موجود ہیں۔ ہندی مچھیروں نے تمہارے حسین سراپا کو بے حجاب دیکھ لیا تو میں تمہیں ان کی دست برد سے نہ بچا سکوں گا۔"

وہ خمار انگیز انداز میں مسکرائی ... نیچے اس کا پرس موجود تھا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا اور پھر اپنے شانے سے لٹکا لیا۔

"ہم کسی ویران ساحل کی طرف جا رہے ہیں۔" وہ سمندر کے سینے پر تیرتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ کر پُرخیال لہجے میں بولی۔

"بوٹ مسلسل مشرق کی طرف بڑھتی رہی ہے۔" میں نے قطب نما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ویسے ہمارے لئے ویران ساحل زیادہ محفوظ ہے۔"

"ان کشتیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اگر ہم لائف بوٹ کی لائٹ روشن کر دیں تو بہتر ہو گا۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"اگر ہم ان سے بچ کر نکل سکیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"وہ ہم سے اتنے قریب ہیں کہ اب تک ہمارے انجن کی آواز سن چکے ہوں گے۔" وہ ہنس کر بولی "اب یہ احتیاط بے کار ہے۔ ان نیم جاہل ہندیوں سے نمٹنا اتنا مشکل نہ ہو گا۔"

پھر اس نے ایک سوئچ دبایا اور بوٹ کے آگے سمندر میں دُور تک روشنی کی دھار پھیل گئی۔

"ہے۔ ۔ ۔ کون ہے؟" چند ثانیوں بعد کسی نے پوری قوت سے ہمیں للکارا۔

"مسافر!" میں نے منہ پر ہتھیلیوں کا پیالہ بنا کر پوری آواز سے جواب دیا۔

"ادھر کاہے مرنے چلے آئے بھیا؟" اُدھر سے سوال کیا گیا۔

"ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔"

"وہیں ٹھہرو، ہم آتے ہیں۔"

میں نے انجن بند کر دیا۔ مسلسل سفر کے بعد اسے تھوڑی دیر آرام دینا بہتر تھا۔ دوسری طرف روشنیاں سمٹ رہی تھیں، اور غیر محسوس طریقے پر ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد دو کشتیاں ہم سے اتنے قریب آ گئیں کہ ہمیں ان کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ دونوں واقعی بادبانی کشتیاں تھیں جن کے بیشتر بادبان بندھے ہوئے تھے۔

ہم سے محفوظ فاصلے پر آ کر ایک کشتی سے کوئی پانی میں کودا۔ چھپاکے کی تیز آواز پر روزیلا چونک پڑی۔ "کیا کوئی ادھر آ رہا ہے؟"

"شاید، دیکھیں یہ کون لوگ ہیں۔"

کچھ دیر بعد ہماری بوٹ کے قریب ہی پانی میں ایک تندرست اور نوجوان شخص ابھرتا نظر آیا۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟" اس نے منہ سے پانی اڑاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمارا جہاز خراب ہو گیا۔"

"ادھر سمندر خراب ہے ... آگے کھاڑی میں بھیانک بھنور آیا ہوا ہے" کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ شاید پہلی بار اس کی نظر روزیلا پر پڑی تھی۔ وہ اسے گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے آیا اور بوٹ کا کنارا پکڑتے ہوئے بولا "یہ چھوکری کون ہے؟"

"میری دوست ہے۔" میں نے غصہ برداشت کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس شخص کے لہجے سے خباثت اور گستاخی نمایاں تھی۔

وہ زور سے ہنسا۔ "معلوم پڑتا ہے جہاز سے بھگا کر لائے ہو؟"

"ہاں بھگا کر لایا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "یہ بتاؤ کہ راستہ کدھر ہے۔ ہمیں ساحل پر پہنچنا ہے۔"

وہ اجازت لئے بغیر کنارا پکڑ کر بوٹ میں کود آیا۔ اس کے جسم پر صرف جانگیہ موجود تھا اور پورے بدن سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کی حریصانہ نظریں روزیلا پر جمی ہوئی تھیں جو لاتعلقانہ انداز میں اپنے پرس سے کھیل رہی تھی۔

"راستہ بتائیں گے تو انعام ملے گا؟" اس نے اپنے بالوں بھرے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"ہماری بات مانو گے؟" اس کی ہوسناک نظریں روزیلا کے بدن پر مرکوز تھیں۔

"اگر تم نے بدمعاشی کی کوشش کی تو میں تمہارے ہاتھ پیر توڑ دوں گا۔" میں نے اس کے عزائم بھانپتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"ہوش میں رہ کر بات کر بابو۔" وہ بھی برابری پر اُتر آیا اور براہِ راست مطلب پر آ گیا۔ "چھوکری ہم کو دے دے اور خود کنارے چلا جا ورنہ تجھے کشتی سمیت ڈبو دیں گے۔" پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر گھوما اور بلند آواز میں اپنے ساتھیوں سے بولا: "ارے اس نیا پر تو ایک سُندر چھوکری ہے۔"

یہ پیغام ملتے ہی دونوں کشتیوں پر ہلچل سی مچ گئی۔ اور بیک وقت کئی ملاح کھلے سمندر میں کود پڑے۔

"کیا بات ہے؟" روزیلا نے سرد اور پرسکون لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"ارے واہ۔ یہ تو بولتی بھی ہے۔" لائف بوٹ پر موجود نوجوان روزیلا کی آواز سن کر خوشی سے چہکا۔ "سُسری کی آواز بھی سُندر ہے۔"

میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات رسید کی اور وہ چیخ کر سمندر میں جا گرا۔ روزیلا کے لئے اب صورتِ حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ ہوتے ہی اس نے اپنے دستی بیگ میں سے ایک چھوٹا ریوالور نکال لیا۔

میری لات کھا کر سمندر میں گرنے والا ہندی میں بے تحاشا مغلظات بکتا دوبارہ بوٹ کی طرف آ رہا تھا کہ روزیلا نے آگے جھک کر اس پر فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی اس کا بھیجہ گولی کی زد میں آ گیا اور وہ پانی کی سطح پر آ کر چیختا ہوا ڈوب گیا۔

فائر اور چیخ نے آنے والوں کو خوفزدہ کر دیا۔ ان کی ہیجان آمیز آوازیں سنائی دیں اور میں نے رہی سہی کسر پوری کر دی: "جو بھی قریب آیا اس کا یہی حشر ہو گا۔"

وہ لوگ کون تھے اور وہاں کیا کر رہے تھے مجھے اس سے اب کوئی غرض نہیں تھی یہ ضرور واضح ہو چکا تھا کہ روزیلا کے ساتھ وہ شرارت پر آمادہ تھے۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ ان میں سے ایک کی زبانی آگے کسی خوفناک بھنور کی موجودگی کا علم ہو چکا تھا لہٰذا میں نے روزیلا کو انجن اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کر دیا —

اس وقت میں نے دیکھا کہ دونوں کشتیوں پر کئی افراد بندروں کی طرح رسّوں پر چڑھے بادبان کھولنے میں مصروف تھے۔ شاید ان کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں تھا لہٰذا وہ ہم سے مقابلے کے بجائے تعاقب کی تیاری کر رہے تھے۔

"ذرا ہوشیار رہنا۔" میں نے روزیلا کو خبردار کیا "یہ لوگ چھری چاقو ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں اور ان کا نشانہ بھی پختہ ہوتا ہے۔"

اسی وقت انجن اسٹارٹ ہو گیا اور لائف بوٹ جھاگ اڑاتی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ دونوں بادبانی کشتیاں بھی حرکت میں آ گئیں۔ انہوں نے دوسری کشتیوں کو بھی صورتِ حال سے باخبر کر دیا تھا لہٰذا وہ بھی آگے بڑھیں مگر بوٹ کی رفتار کا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ ہم لحظہ بلحظہ ان سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔

"جنوب مشرق کی سمت چلو۔" میں نے کہا "اس طرف ہمیں محفوظ علاقہ مل سکے گا۔"

"یہ لوگ کیا چاہتے تھے؟" روزیلا نے لائف بوٹ کا رُخ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا سودا۔" میں نے ہنس کر کہا "جو انہیں راس نہ آ سکا۔"

"پتہ نہیں مرد عورت کے معاملے میں اتنے خود غرض کیوں ہوتے ہیں ——" وہ بڑبڑائی۔

"لیکن تم نے بھی کمال کیا، میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ دست بدست مقابلہ ہو گا۔ اور فرار کے علاوہ ہم کوئی راہ اختیار نہ کر سکیں گے۔ تم نے مجھے یہ بھی نہ بتایا کہ تمہارے پاس ریوالور موجود ہے۔"

"بتا کر کیا کرتی۔ وقت آنے پر تم نے خود ہی دیکھ لیا۔" وہ سرسری لہجے میں بولی۔ پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد پوچھا: "میرے سونے کے بعد تم نے دستی بیگ کی تلاشی نہیں لی تھی؟"

"یہ خیال کیوں آیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ ویسے سچی بات یہ تھی کہ اب مجھے بیگ کو نظر انداز کرنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں بوٹ کے ہر گوشے میں جھک مارتا رہا لیکن سامنے کی چیز کو بھول گیا۔

"تم تجسس آمیز طبیعت کے مالک ہو۔" اس نے ہنس کر کہا "اگر تم کر بھی لیتے تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔ میں خاصی حد تک تمہارا مزاج سمجھ گئی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کہ تمہاری بات درست ہو مگر تمہاری ذات کے بارے میں میرا سارا تجسس اس وقت ختم ہو گیا تھا جب تم نے خود کو میرے حوالے کر دیا تھا۔"

"وہ تمہیں بہلانے کی رشوت بھی ہو سکتی تھی۔" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ وہ اس وقت بالکل وہی بات کہہ رہی تھی جو پہلے میرے ذہن میں موجود تھی۔ مگر میں نے پوری شدت سے اس کی تردید کی۔

"میرے لئے یہ سوچنے کا جواز ہی نہیں ہے۔" میں نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا "رشوت کسی مقصد کے لئے دی جاتی ہے۔ اگر تم جہاز پر رہتے ہوئے مجھے یہی پیشکش کرتیں تو شاید میں سوچتا کہ تم کچھ خوف کے تقاصد کے حصول کے لئے مجھے پھانس رہی ہو۔ لیکن اب تو یہ بالکل احمقانہ خیال ہے۔"

"میں اپنا سب کچھ تمہیں سونپ چکی ہوں۔ اب چاہے تم مجھ پر اعتبار کرو یا نہ کرو، میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گی۔"

"مجھے تم پر اعتبار ہے سویٹی!" میں نے یہ کہتے ہوئے بھرپور طریقے پر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس پر یقین نہ ہونے کے باوجود فی الحال میں اسے سہارا بنائے رکھنے پر مجبور تھا تاکہ حیخوف یا کے۔ جی۔ بی کی اس حکمت عملی سے واقف ہو سکوں جس کے تحت ایک پیچیدہ طریقہ کار کے تحت روزیلا کو مجھ پر مسلط کیا گیا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ روزیلا کے معاملے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ میرے ساتھ اتنی مخلص نہیں ہے جتنا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اچانک ہی ہم نے سامنے بھورے رنگ کی تاریک لکیر دیکھی جو کسی ویران ساحل کی علامت تھی۔ روزیلا کی رسٹ واچ اور بوٹ کے قطب نما نے فرار کی اس طویل اور پُرخطر بحری مہم میں بڑا بہت ساتھ دیا تھا اور اب آزاد زندگی کی نوید ویران ساحل کی صورت میں میرے سامنے موجود تھی۔

"ساحل آ گیا روزیلا!" میں خشکی کو سامنے پا کر اپنی خوشی پر قابو نہ پا سکا اور اس کی کمر تھام کر اسے فضا میں اٹھا لیا۔

"ارے..... ارے یہ کیا ہو رہا ہے!" اس نے بوکھلا کر اپنے بازو میری گردن کے گرد حمائل کر دیئے۔

میں نے اسے آہستگی سے نیچے اتار دیا۔

چند منٹ کے بعد کشتی اتھلے پانی میں جا کر ریت میں پھنس گئی۔ روزیلا نے انجن بند کر دیا اور میں کود کر پانی میں اتر گیا۔

اس وقت میری ذہنی کیفیت کسی بچے جیسی تھی جسے طویل محرومی کے بعد غیر متوقع طور پر اس کا کھلونا مل گیا ہو۔

"صفدر، کہاں جا رہے ہو؟" مجھے ساحل کی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے آواز لگائی۔

"ایک بار ساحل پر قدم تو رکھ لوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔" میرا جواب سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

میں جب واپس لوٹا تو وہ بدستور بوٹ میں موجود تھی اور اس کے بشرے سے خاصی الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"یہ بوٹ!" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "اسے غرق کرنا ضروری ہے ورنہ یہ اس بات کی نشاندہی کر دے گی کہ ہم نے انہی اطراف میں روپوشی اختیار کی ہے۔"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "حسین بھی ہو اور عقل مند بھی! یہ دو خوبیاں کسی عورت میں بمشکل یکجا ہوتی ہیں۔"

"میں نے ان لوگوں کے ساتھ رہ کر زیادہ یہی سب سیکھا ہے۔"

"اس وقت پانی ٹھنڈا ہے۔ یہ رات ہم کسی قریبی علاقے میں گزاریں گے۔ صبح میں کشتی گہرے پانی میں لے جا کر غرق کر دوں گا اور خود تیر کر ساحل پر آ جاؤں گا۔"

"اس کا پیندا بہت مضبوط ہے۔"

"تمہارا ریوالور کس کام آئے گا؟"

"مگر جب تم تیرتے ہوئے واپس آؤ گے تو پانی میں ڈوبنے کے سبب وہ ناکارہ ہو جائے گا۔"

"تم اس کے چیمبر میں صرف ایک گولی چھوڑ کر باقی گولیاں نکال لو۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "ساحل پر آ کر میں اسے فوراً صاف کر دوں گا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی ترکیب کارگر نہ ہو گی۔ شاید بوٹ فائر پروف پلاسٹک سے بنائی گئی ہے!"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پھر اپنے پرس سے ایک گیس لائٹر نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولی۔ "بوٹ پر ہر بات کا انتظام ہے اس کے ڈیش بورڈ پر پہیل کے ساتھ جو خانہ ہے اس میں ایک بارود کی فلیتہ موجود ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خانہ کھول دیا اور فلیتے کا سرا پکڑ کر آہستگی سے باہر کھینچ لیا۔ "اسے سلگا کر تم فوراً سمندر میں کود جانا۔ یہ فلیتہ تین منٹ کے اندر اندر ڈائنامائیٹ تک جل جائے گا اور ایک دھماکے کے ساتھ بوٹ کے پرخچے اڑ جائیں گے!"

"تو اتنی دیر سے بلاوجہ تم میرا امتحان لے رہی تھیں!"

اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "تم دلیر ہو اور عقل مند بھی۔ مردوں میں حوصلے اور عقل کی یکجائی بہت کم نظر آتی ہے۔ میں یہی جاننا چاہتی تھی کہ ڈائنامائیٹ کے بغیر تم بوٹ سے کیسے چھٹکارا حاصل کرو گے!"

ہم دونوں پانی میں اترے اور میں اسے سہارا دے کر ساحل کی طرف لانے لگا۔

وہ سارا علاقہ خشک جھاڑیوں اور پتھریلے ٹیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹیلوں کی چھاؤں میں کافی دیر تک بھٹکنے کے بعد میں بمشکل ایک ایسا قطعہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکا جہاں ہم رات کا باقی حصہ قدرے سکون سے گزار سکتے تھے۔

"نہ جانے ہم اس وقت کس علاقے میں ہیں۔" وہ ٹھنڈی زمین پر بیٹھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"جہاں بھی ہیں محفوظ ہیں!" میں یہ کہہ کر زمین پر دراز ہو گیا۔

"مجھے یہی فکر ہے۔" وہ بولی۔ "جہاز سے ہمارے فرار کی خبر زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکے گی۔ ہنگامی حالات کے باوجود اب تک حیخوف کو ہمارے فرار کا علم ہو چکا ہو گا۔"

"تو کیا ہو گا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ جہاز پر کوئی ایسی دوسری تیز رفتار بوٹ موجود نہیں ہے جو ہمیں پکڑ سکے!"

"وہ رفتار کی بات تھی، اب ہم ایک جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ چھوٹی تو چپوؤں والی کشتی میں بھی وہ ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "پھر بحر ہند میں ہمارے دوسرے جہاز بھی موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری اہمیت کے پیش نظر حیخوف ان سے تلاش کی درخواست کرے!"

"مگر انجن ناکارہ ہونے کے بعد بجلی کہاں ہو گی جو وہ ریڈیو سے کام لے سکے!"

"ریڈیو اور وائرلیس ہمیشہ بیٹریوں سے چلائے جاتے ہیں اور بیٹریاں چارج کئے بغیر بھی تین چار دن تک کام دے سکتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک ہلکی سی جھرجھری لی اور بے اختیار اس کا ہاتھ اپنی بائیں کلائی پر گیا جہاں رسٹ واچ موجود تھی۔ اور وہ کلائی سہلانے لگی۔

"تو تمہارا مقصد ہے کہ میں بوٹ سے اسی وقت چھٹکارا حاصل کر دوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی آ کر بات کرتی ہوں!"

"کہاں جا رہی ہو؟"

"بھاگ نہیں رہی!" وہ چڑچڑے لہجے میں بولی۔ "تم یہیں رکو، میں آتی ہوں!"

"آخر اس ویرانے میں کہاں جاؤ گی تم؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پیشاب کرنے جا رہی ہوں!" وہ جھلا کر بولی۔

"تو دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟" میں ہنس کر بولا۔ "میرے اور تمہارے درمیان اب تکلف کی تو کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے!"

"شٹ اپ!" وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولی اور پرس ہلاتی ہوئی تیزی سے ایک طرف چل دی۔

اس جیسی لڑکی کا یہ رویہ میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں اس نے اپنا بیشتر وقت میرے ساتھ بے تکلفانہ گزارا تھا اب یکایک اتنی پارسا اور شرمیلی بن گئی تھی کہ محض پیشاب کرنے کے لئے اس اندھیری رات اور ہولناک ویرانے میں تنہا ایک طرف چل پڑی تھی!

میری نگاہیں اس پر جمی رہیں۔ وہ اگر تھوڑی بھی ہوتی تو دس پندرہ قدم دور جا کر رک جاتی مگر وہ مسلسل بڑھتی ہی رہی۔ ایک بار اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور فضا میں ہاتھ بھی لہرایا۔

میرے حواس پر یک بیک بے نام سا اضطراب چھا گیا اور میں سینے کے بل زمین پر چپک گیا۔ جب وہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں غائب ہوئی تو میں تیزی سے پنجوں کے بل آگے کی طرف دوڑ پڑا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ اس کی لاعلمی میں اس پر نگاہ رکھوں۔ اسی احتیاط کے سبب مجھے اس کو تلاش کرنے میں قدرے تاخیر ہو گئی۔

جب میں ایک ٹیلے پر پہنچا تو اچانک ہی مجھے وہ نظر آ گئی۔ وہ بار بار اپنے پہلوؤں پر نظریں ڈال رہی تھی مگر اوپر سے بے خبر تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا آلہ موجود تھا جسے وہ دہانے کے قریب لا کر دھیمی آواز میں کسی سے گفتگو کر رہی تھی۔ وائرلیس سے نکلا ہوا پتلا سا ایریل تاریکی میں ایک عمودی لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔

وائرلیس پر دوسری طرف سے آنے والی آواز اتنی مدھم تھی کہ میں کان جمانے کے باوجود بھنبھناہٹ کے سوا کچھ نہ سن سکا۔ روزیلا روسی زبان میں بول رہی تھی۔ اور اس وقت وہ کسی بھی طرح وہ لڑکی نہیں معلوم ہو رہی تھی جس نے بڑی سادگی سے اپنی آبرو میرے قدموں میں لٹا دی تھی۔

اس کا جھوٹ پکڑا جا چکا تھا۔ میرے لئے روسی زبان سمجھنا ناممکن تھا لہٰذا میں دبے قدموں واپس ہو لیا اور تیزی سے اپنی جگہ پہنچ کر زمین پر دراز ہو گیا تاکہ وہ واپس آئے تو مجھ پر شبہ نہ کر سکے!

"صفدر!" تھوڑی دیر بعد کچھ فاصلے پر سے اس کی آواز سنائی دی۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں لیٹا ہوا ہوں، چلی آؤ!" میں نے ہاتھ لہرا کر اسے اشارہ کیا۔

"ارے تم زمین پر لیٹے ہوئے ہو!" قریب آ کر وہ حیرت سے بولی۔

"تو یہاں مسہری کہاں ہے؟"

اس نے نیچے بیٹھ کر بڑی محبت سے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ "اب تم سو جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرا سر سہلانے لگی۔

"اور بوٹ؟"

"جو ہو گا دیکھا جائے گا، اگر تم اس وقت تیرنے کے سبب بیمار پڑ گئے تو سارا منصوبہ دھرا رہ جائے گا۔" وہ محبت آمیز لہجے میں بولی۔

وائرلیس پر گفتگو کے بعد اس کے لہجے میں اعتماد ابھر آیا تھا۔ میں یہ تبدیلی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے فیصلہ کیا کہ بوٹ کو اسی وقت ٹھکانے لگا دینا چاہیے تاکہ روزیلا نے اگر کسی کو بوٹ کی نشانی بتا کر اپنی کمین گاہ سے آگاہ کیا ہو تو وہ مجھ تک نہ پہنچ سکے!

روزیلا نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی مگر میں نہ مانا۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جب میں بوٹ کھلے سمندر میں لے جاؤں گا تو روزیلا تنہائی میں بآسانی اپنے نامعلوم ساتھیوں کو وائرلیس پر آگاہ کر سکتی تھی کہ بوٹ............ تباہ کی جا چکی ہے لہٰذا اس کی تلاش بے سود ہو گی مگر میں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا۔ میری دانست میں بوٹ کا تہہ نشین ہونا ہر حال میں سود مند تھا۔ کوئی نشانی نہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں کا مجھ تک پہنچنا محال ہی ہوتا۔

روزیلا اس قدر مکار اور چالاک لڑکی تھی کہ میرے گلے میں بانہیں ڈالے بوٹ تک میرے ساتھ آئی۔ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے اسے وائرلیس پر گفتگو کرتے نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کے پُرخلوص رویے سے میں بھی دھوکا کھا جاتا۔ مگر اب میں اس سے ہوشیار ہو چکا تھا۔

"اب کچھ دیر کے لئے تم تنہا ہو۔ کوئی مسئلہ رہ گیا ہو تو اسے بھی نمٹا لینا۔" میں نے بوٹ میں سوار ہوتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا اور انڈرویئر کے سوا باقی تمام کپڑے اتار کر روزیلا کے حوالے کر دیئے!

"تم بہت سنگدل ہو۔" وہ یک بیک اداس ہو گئی۔

میں نے اس کی اداکاری پر توجہ دیئے بغیر انجن اسٹارٹ کیا۔ روزیلا نے بوٹ کو دھکیل کر ریت سے نکالا اور میں برق رفتاری سے کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں ساحل سے کافی دور پہنچ گیا تو میں نے خانہ کھول کر فلیتہ باہر نکالا۔ اسے لائٹر سے آگ دکھائی اور لائٹر بجھا کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ بوٹ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

سمندر کا پانی خاصا ٹھنڈا تھا۔ اس میں کودتے ہی مجھے جھرجھری سی آ گئی مگر جب میں نے ہاتھ پیر چلانے شروع کئے تو آہستہ آہستہ خنکی کا احساس مٹتا چلا گیا۔

کم و بیش تین منٹ بعد مجھے اپنے عقب میں ایک ہولناک دھماکہ سنائی دیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو فضا میں ہلکی سی روشنی بھی نظر آئی جو بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔

میں اس وقت جسمانی طور پر خاصا کمزور تھا۔ جہاز پر اسپاسکی نے مجھے جو کلورین گیس سنگھائی تھی، میری اعصابی قوت اس کے اثر سے ابھی تک جزوی طور پر مفلوج تھی للہٰذا ساحل تک پہنچتے پہنچتے تھکن سے میرا برا حال ہو چکا تھا۔

خشکی پر آنے کے بعد میں کافی دیر ریت پر پڑا اپنی منتشر قوت کو یکجا کرتا رہا اس دوران میں میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ میری واپسی اس مقام پر نہیں ہوئی ہے جہاں سے میں روانہ ہوا تھا۔

خشک اور خاردار جھاڑیوں میں کچھ دیر تک بھٹکنے اور روزیلا کو بار بار پکارنے کے بعد آخر کار قریب ہی سے مجھے اس کا جواب ملا اور میں وہاں پہنچ گیا۔

میں نے گیلا انڈر ویر اتار کر خشک کپڑے پہنے اور روزیلا کو لے کر زمین پر دراز ہو گیا۔ اس وقت مجھے شدت سے اس کی پُر جوش اور حیات آفریں رفاقت کی ضرورت تھی۔

معاً میں نے پہلو بدلا، روزیلا زمین پر چت ہو گئی اور میں اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا اپنے سینے پر میرا وزن محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں خمار کے پیچھے حیرت نمایاں تھی۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ میری اس حرکت میں محبت کی نرمی کی جگہ سرد مہری کار فرما تھی۔

چند ثانیوں تک ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے اس کی نظروں میں بے بسی کی سی حیرت موجود تھی اور میں شکار پر حاوی خونخوار صیاد کی طرح بے رحمی سے اسے گھور رہا تھا۔

"کیا بات ہے، تمہیں اچانک ہو کیا گیا ہے!" آخر وہ ہکلاتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ خوف نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔

میں بھیانک انداز میں ہنسا مقصد یہی تھا کہ اسے خوفزدہ کر کے جسمانی تشدد کے بغیر اس سے ہر بات اگلوا لوں "تم پیشاب کا بہانہ کر کے کہاں گئی تھیں؟"

"بہانہ نہیں، وہ حقیقت تھی" وہ زبان سے اپنے لبوں کو تر کرتے ہوئے بولی "میں ایک ٹیلے کی آڑ میں گئی تھی" اس کے لہجے کا زیر و بم اس کی دہشت کا اظہار کر رہا تھا۔

"سچ بولو روزیلا" میں غرایا "ورنہ یہی ویرانہ تمہارا مدفن بھی بن سکتا ہے!"

اچانک اس کے لبوں کے گوشے کپکپائے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تو بہتر یہی ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مجھے مار دو!"

اس کی مکاری پر میری نگاہوں میں خون اتر آیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ اٹھا مگر میں نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور اس کے رخسار پر تھپڑ مارنے کے بجائے میں نے اس کا پرس چھین لیا۔

پرس میں ایک چرمی کیس میں محفوظ ٹرانسمیٹر موجود تھا میں نے وہ باہر نکال کر پرس زمین پر پھینک دیا "یہ کیا ہے؟" میں وہ ٹرانسمیٹر اس کی آنکھوں کے سامنے نچا کر غرایا۔

اچانک اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ کمزور آواز میں بولی "تو تم نے میرا پیچھا کیا تھا"

"میں فریب کھانے والوں میں سے نہیں ہوں" میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر کہا "بتاؤ کس سے بات کر رہی تھیں؟"

"میں تمہیں مر کر بھی اپنی بات کی صداقت کا یقین نہیں دلا سکوں گی۔ للہٰذا مجھ سے نہ پوچھو تو بہتر ہے" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

"مگر میں ہر جھوٹ سننے کے لئے تیار ہوں!" میں یہ کہہ کر اس کے سینے سے اتر گیا اس سے پیشتر میں ریوالور پر قبضہ کرنا نہیں بھولا تھا جو پرس سے نکل کر زمین پر گر گیا تھا۔

"میں نے جہاز سے رابطہ قائم کیا تھا" وہ زمین پر پڑے پڑے بولی۔ "میں نے ایک دوسری عورت کے شناختی کوڈ استعمال کر کے جہاز کے فرسٹ آفیسر سے بات کی تھی میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ لوگ ہمارے فرار سے باخبر ہوئے ہیں یا نہیں!"

"کہانی دلچسپ ہے مگر کمزور ہے" میں نے کہا "تم نے مجھے احمق سمجھا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے کال کی نہیں تھی بلکہ باہر سے آنے والی کال ریسیو کی تھی۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم مجھ پر یقین نہیں کرو گے" وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔

"تم نے کال کے بارے میں اپنی رسٹ واچ پر کوئی سگنل وصول کیا تھا" میں نے اعتماد سے کہا "اس گھڑی میں یقیناً کوئی ایسا بٹن ہے جو لاسلکی اشارہ ملتے ہی کلائی میں چبھنے لگتا ہے۔ تم نے بے چینی سے اپنی کلائی سہلائی تھی اور اس کے فوراً ہی بعد تمہیں پیشاب کرنے کی حاجت محسوس ہونے لگی اور تم اپنی دانست میں مجھے دھوکہ دے کر بات کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ میں بہت قریب سے تمہاری ہر حرکت اور ہر آواز سن رہا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ چیخوف نے کس مقصد کی خاطر تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے۔؟"

"فی الحال اسے بھول جاؤ، تصادم سے پہلے میں ایک بار تمہاری آغوش سے لذت اندوز ہونا چاہتی ہوں، اس کے بعد جو تم چاہو، کر سکتے ہو!" اس نے یہ کہتے ہوئے دونوں بازو پھیلا کر مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے میری بات کا جواب دے دو پھر میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا!"

"چیخوف تمہاری نقل و حرکت کی نگرانی کرانی چاہتا تھا!"

"پارس پتھر کا سراغ لگانے کیلئے؟"

"ہاں!" وہ بولی "مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ تم میری ذات کو حاصل کرنے کے باوجود اپنے حواس سے کام لیتے رہو گے!"

"اور فرار کا منصوبہ بھی تم نے اسی کے ایما پر بنایا تھا؟"

"ہاں ۔۔۔ وہ سب ڈھونگ تھا منصوبے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے اس میں آتش زنی بھی شامل کی گئی تھی تاکہ تم یہ یقین کر سکو کہ میں ان سے بد ظن ہو چکی ہوں۔ وہاں آگ بجھانے کا سارا انتظام تھا، تمہارے نکلتے ہی اس پر قابو پا لیا گیا ہوگا۔"

"اور چیخوف کے بارے میں تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟"

"نہیں وہ سچ تھا، چیخوف پکا جنونی ہے۔ عہدے کے اعتبار سے وہ مجھ سے برتر ہے۔ ہم لوگوں کی نجی زندگی بھی ڈسپلن کی پابند ہوتی ہے" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ سچ ہے کہ میری نجی زندگی حسرت اور ناکام آرزوؤں کا مجموعہ ہے۔ میں نے چیخوف کے احکام کی تعمیل کے سلسلے ہی میں تمہارا قرب بھی حاصل کر لیا۔ اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہارا دل جیتنے کی کوشش کروں مگر حد کا تعین نہیں کیا تھا!"

"تمہارا تعلق کس تنظیم سے ہے؟"

"تمہارے سامنے اعتراف سے قبل میں کے۔ جی۔ بی کی رکن تھی اور اس بات کے گواہ ہو کہ میں نے پوری جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دیئے جواب میں صرف تمہاری کنیز ہوں ۔۔۔ آؤ میرے قریب آجاؤ!" اس کے آخری الفاظ میں التجا بھی ہوتی تھی۔

"تم بازی ہار کر بھی فاتح رہنا چاہتی ہو روزیلا ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکے گا" میں نے تلخ لہجے میں کہا "جنس عورت کا آخری اور سب سے طاقتور ہتھیار ہوتا ہے؟"

"مجھے صرف ایک بار موقع دو، اگر پھر بھی میں تمہیں اپنی سچائی کا یقین نہ دلا سکوں تو جو سلوک چاہو میرے ساتھ روا رکھنا" وہ گڑگڑا کر بولی۔

"مکار اور آوارہ عورت کبھی وفا نہیں کرتی روزیلا۔ یہ فطرت کا قانون ہے اور اس سے مفر نہیں ہوتا" یہ کہتے ہوئے میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ کھٹکا سن کر وہ یک بیک زمین سے اٹھ گئی اور ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی میری طرف لپکی "تم مجھے نہیں مار سکتے، تم مجھ پر گولی نہیں چلا سکتے!"

وہ میری زندگی کا بدترین لمحہ تھا جس میں ایک نہتی عورت پر ہتھیار اٹھانے کو تیار تھا۔ اس سے قبل بھی میں لاہور میں ایک عورت کو ہلاک کر چکا تھا۔ مگر وہ پیشہ ور دوشیزہ تھی جو محض دولت سمیٹنے کی خاطر اپنا روپ بدل کر طویل عرصہ تک مجھے محبت کا فریب دیتی رہی۔ اس کے ناز اٹھانے کی خاطر میں نے اپنے باپ سے گستاخی کی، اپنے بھائی پر ہاتھ اٹھایا اور یوں محض اس فاحشہ کی خاطر اپنے گھر سے نکال دیا گیا اسے ہلاک کرتے ہوتے میں ذرا بھی نہ جھجکا تھا جسے میں عاشق بن پر پوجتا تھا خریدار بن کر میں نے اسے بڑے سکون سے مار دیا مگر روزیلا پر فائر کرتے ہوئے ٹریگر پر میری انگلی کانپ رہی تھی۔

اتنی دیر میں وہ بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پاگلوں کی طرح ہذیانی انداز میں بڑبڑائی بھی جا رہی تھی کہ میں اس کی محبت کو نہ ٹھکرا سکوں گا، اسے اپنے ہاتھوں نہ ماروں گا۔ میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ جذبات کی رو میں بالکل بہہ چکی ہے اس کے منہ سے بے ربط اور بہکی بہکی آوازیں نکل رہی تھیں مگر اس نے یکبارگی میری پتلون کی داہنی جیب میں ہاتھ ڈال دیا جس میں ریوالور موجود تھا۔ اس نے یہ کام اتنی پھرتی سے کیا کہ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ بس لاشعوری طور پر میرا سر چلا اور گھٹنا پوری شدت سے اس کے پیٹ کے نچلے حصہ میں لگا۔

وہ چیخ مار کر نیچے گر گئی، ریوالور اچھل کر دور جا گرا۔

میری آنکھوں میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کی گھناؤنی حرکت نے مجھے پاگل کر دیا۔ وہ زمین پر اپنا پیٹ پکڑے بری طرح کراہ رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر ریوالور اٹھایا اور اس کی پیشانی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔

اس کی چیخ دھماکے کی گونج سے بھی مختصر ثابت ہوئی۔ اس کا چہرہ اپنے ہی لہو کی سرخی میں نہاتا جا رہا تھا۔ غبن کر ہر مصیبت سے نجات کا راستہ سمجھنے والی بالشت بھر کی دو دھموں میں بھرس زمین پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔

میں نے سمندر کے مدوجزر سے محفوظ حصے میں ریتلی زمین کھود کر ایک گڑھا کیا اور روزیلا کی لاش کو زمین پر کھینچتے ہوئے لے جا کر اس میں ڈال دیا۔ اس کے پرس میں جو کارآمد چیزیں تھیں وہ میں نے اپنی جیب میں ڈال لیں اس کی ریسٹ واچ داہنی کلائی میں پہنی۔ ٹرانسمیٹر جیب میں ڈالا اور پرس وغیرہ سمیت روزیلا کی لاش کو گڑھے میں دفن کر دیا۔

اس کارروائی سے نمٹ کر میں نے وہاں سے سارے نشانات مٹائے اور پرس سے ملنے والی جیبی ٹارچ کی روشنی میں ساحل سے دور چل دیا۔

مجھے چلتے چلتے صبح کے پانچ بج گئے۔ فضا میں پرندوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ہوا میں عجیب سی خوشبو اٹھ آئی۔ مگر پھر بھی دور دور کہیں آبادی کے آثار نظر نہ آئے جس سے مجھے یہ پتہ چل سکتا کہ میں بھارت کے کس علاقے میں موجود ہوں۔

سورج طلوع ہونے کے بعد مجھے ایک طرف کچھ کچے مکانات نظر آئے جہاں فضا میں دھواں لہریئے بناتا اوپر اٹھ رہا تھا۔ شاید وہاں لوگ کھانے پکانے میں مصروف تھے!

میں نے پرس سے ملنے والا جیبی آئینہ نکال کر دیکھا۔ میرا شیو بے تحاشہ بڑھا ہوا تھا۔ لمبے لمبے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے، جزیرے کی کٹھن زندگی کی علامات چہرے کی سیاہی کی صورت میں نمایاں تھیں، آنکھیں شب بیداری اور تکان کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔

میں ہر قسم کے حالات کیلئے ذہنی طور پر تیار ہو کر لاپروایانہ انداز میں بستی کی قریبی چراگاہ کی طرف ہو لیا، جہاں چند بچے جانور چرا رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کھیل کود بھول کر مجھے گھورنے لگے۔ ان کے چہروں سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان کے کسی منفی ردعمل کو ٹالنے کے لئے میں انہیں دیکھ کر مسکرایا اور سہمے ہوئے چہروں پر سکون نظر آنے لگا۔

"یہ کون سی جگہ ہے بیٹا؟" میں نے ان کے قریب پہنچ کر نرم لہجے میں دریافت کیا۔

بچوں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بیک وقت کئی بچے بولنے لگے۔ وہ زبان میرے لئے نامانوس تھی البتہ ان کی آوازوں میں ڈاور ڈگی بار بار تکرار سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ملیالم یا تامل بول رہے ہیں۔

"ہندی؟" میں نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

بیک وقت سب نے اپنے سروں کو نفی میں جنبش دی اور ایک بچہ ایک مرتبہ پھر اپنی زبان میں جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔

اس کے الفاظ تو میری سمجھ سے بالاتر تھے البتہ اشاروں سے میں اتنا ضرور سمجھ گیا کہ وہ مجھے بستی میں چلنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

میں انہی بچوں کے ساتھ بستی کی طرف ہو لیا۔ وہاں لوگوں کی حیرت زدہ نظروں نے میرا استقبال کیا۔ دو تین بچے بڑھ کر جوشیلے انداز میں انہیں میرے

بارے میں بتانے لگے۔

"کون ہو بھائی؟" بچوں کی کہانی کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"ایک بھٹکا ہوا مسافر!" میں نے جواب دیا۔ "بھگوان کی مہربانی ہے کہ یہاں تم نے ہندی سمجھ لی ورنہ جانے مجھے کب تک بھٹکنا پڑتا۔"

"یہاں بھاشا کا بڑا چکر ہے، اس بستی میں مراٹھی کے سوا کوئی زبان نہیں چلتی" وہ نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"جے گڑھ!" وہ مجھے جھونپڑوں کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

وہ لوگ حد درجہ کے مہمان نواز تھے۔ انہوں نے میری کافی خاطر مدارت کی میں نے انہیں اپنے بارے میں دلگیر لہجے میں ایسی کہانی سنائی کہ وہ میری طرف سے مطمئن ہو گئے بلکہ مجھے چند دن کے لئے وہاں رکنے پر مصر ہو گئے۔ لیکن میرے لئے اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر مختصر ترین مدت میں ساحلی علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

جے گڑھ سے میں بھوسہ لے جانے والی بیل گاڑی میں روانہ ہوا۔ بیل مست خرامی کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ میرا بس چلتا تھا ورنہ انہیں پوری طاقت سے بھاگنے پر مجبور کر دیتا۔

جب سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا تو پختہ سڑک کے آثار نظر آنے لگے حالانکہ بیل گاڑی والے کو اسی طرف جانا تھا مگر اب مجھ میں صبر کا یارا نہیں تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے ہنکاتا چھوڑ کر پیدل ہی سڑک پر دوڑ لیا۔

وہاں مجھے کافی دیر انتظار کرنا پڑا تب وہاں ایک بس پہنچی میں نے ہاتھ دکھایا تو وہ دھول اڑاتی میرے قریب رک گئی۔

"کہاں جانا ہے" گاڑی رکنے سے قبل ہی کنڈکٹر نے دروازے سے سر نکال کر پوچھا۔

"بمبئی!" میں یہ کہتے ہوئے اچھل کر بس میں سوار ہو گیا۔

"چل بے، نیچے اتر، یہ چاپلن جا رہی ہے، بمبئی والی اگلے مہینے آئے گی" کنڈکٹر میرا حلیہ دیکھ کر تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ جہاں جا رہی ہے میں وہیں جاؤں گا" میں نے غرّا کر کہا۔

میرے لہجے پر اس نے چونک کر مجھے گھورا اور رینگتی ہوئی بس سے نیچے دھکیلنے کی کوشش فوراً ترک کر دی۔ میں لاتعلقانہ انداز میں ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔

کنڈکٹر موقع ملتے ہی ڈرائیور کے قریب والی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کے پاس گیا اور اس سے سرگوشیوں میں کچھ باتیں کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ بار بار میری طرف بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ میں بظاہر ان کی طرف سے لاپرواہ بنا ہوا تھا مگر میری توجہ ان پر ہی مرکوز تھی۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے برابر میں خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کنڈکٹر بس کے اگلے حصے میں موجود تھا۔

وہ شخص چند ثانیوں تک میرا جائزہ لیتا رہا پھر قدرے سخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "تم کہاں جانے کیلئے بس میں سوار ہوئے ہو؟"

میں نے سر گھما کر شان بے نیازی سے اس کو دیکھا اور عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "منزل ان کی ہوتی ہے جن کا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے۔ لاری جہاں اتارے گی وہیں ڈیرہ ڈال دوں گا۔"

میرے نرم رویے نے اس کو خاصا متاثر کیا اور وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا "ٹکٹ کے پیسے بھی ہیں تمہارے پاس یا بالکل قلاش ہو۔"

میں آہستہ سے ہنس دیا "دھن سے بڑا پاپ کوئی نہیں ہے۔ جس کی آتما کو شانتی حاصل ہو اسے قلاش کون کہے گا۔"

"ارے منی لال! ادھر آ" اس شخص نے کنڈکٹر کو پکارا اور وہ فوراً ہی وہاں آپہنچا۔

"حکم سنتری جی!" منی لال کے ان الفاظ پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ کوئی سپاہی تھا جو سادہ لباس میں بس میں سفر کر رہا تھا۔

"تیرے دماغ پر تو بس جھگڑا سوار رہتا ہے، یہ تو سنیاسی معلوم ہوتے ہیں ان سے معافی مانگ اپنی بدتمیزی کی!" سنتری نے پرخلوص لہجے میں منی لال کو ڈانٹا۔

"سنیاسی وہ ہوتے ہیں سنتری جی جو اپنا سکھ چین تج کر دوسروں کے کام آتے ہیں" میں نے فلسفیانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "میں تو کچھ بھی نہیں ہوں میری زبان سے تمہیں دکھ ہوا تو مجھے معاف کر دو منی لال جی!"

اور منی لال نے بوکھلا کر میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ سنتری اسے طنز آمیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ شاید کنڈکٹر نے اسے میرے خلاف بھڑکایا تھا کہ میں زبردستی بس میں سوار ہو گیا ہوں۔ شاید میرے اکھڑ رویے سے اُسے اندیشہ ہوا ہو اگر اس نے مجھ سے براہ راست بات کرنے کی کوشش کی تو میں اس سے الجھ پڑوں گا۔

سنتری وہیں بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ منی لال نے مجھ سے ٹکٹ کا مطالبہ نہیں کیا۔ بس کے بیشتر مسافر اونگھ رہے تھے اور بس جگہ جگہ رکتی مسافروں کو لاتی چڑھاتی منزل کی طرف رواں تھی۔

شام جب رات کی آغوش میں پناہ لینے لگی تو بس چاپلن پہنچ گئی۔ ڈرائیور انجن بند کر کے نیچے اتر گیا۔ مسافر بھی اپنا اسباب سمیٹ کر دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگے۔

اترنے کے بعد منی لال اور سنتری نے بڑی محبت سے مجھے رخصت کیا اور میں بے فکروں کی طرح ایک ایسے راستے پر ہو لیا۔ جس پر خاصے لوگ جا رہے تھے مجھے توقع تھی کہ وہ راستہ مجھے شہر کے کسی بارونق علاقے میں پہنچا دے گا۔

میں اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ اچانک میری داہنی کلائی میں چبھن محسوس ہوئی اور میں بے اختیار چونک پڑا۔ روزیلا کی ریسٹ واچ میری داہنی کلائی پر موجود تھی۔ اور اس کے نچلے حصے سے کوئی پن اچانک میری جلد میں چبھنے لگی تھی۔ جیسے کوئی کیڑا کاٹ رہا ہو۔

میں نے فوراً ہی قرب و جوار کا جائزہ لیا اور تیزی کے ساتھ سڑک سے اتر کر ایک میدان میں ہو لیا۔ جہاں جابجا مٹی کے تودے موجود تھے اور قریب ہی بڑے ظرفی سیمنٹ کی پائپ لائن بھی پڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ لائن بچھانے کے لئے وہاں کھدائی کا کام جاری تھا۔

ایک گڑھے میں اتر کر میں نے جیب سے ٹرانسمیٹر نکالا اور چٹکی سے اس کا انٹینا باہر کھینچ لیا۔ میں پہلے ہی اس آلے کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس پر فریکوئنسی کے انتخاب کے لئے کوئی سوئچ وغیرہ موجود نہیں تھا۔ بس وہ ایک ہی مقررہ فریکوئنسی پر کام کرتا تھا اور اسے آن آف کرنے کیلئے اس میں دبانے والے دو سوئچ موجود تھے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سرخ سوئچ دبا دیا۔

ٹرانسمیٹر کے ریسیور پر ریڈیائی لہروں کا شور سنائی دیا جو آہستہ آہستہ ایک مردانہ آواز میں تبدیل ہو گیا۔ کوئی بار بار روزیلا کو پکار رہا تھا۔ اس کے نام کے علاوہ بقیہ الفاظ شاید روسی زبان کے تھے کیونکہ میں انہیں نہ سمجھ سکا۔

پھر ایک فوری منصوبہ کے تحت میں بول اٹھا "ہیلو۔۔۔۔ ہیلو صفدر جنگ!"

ریسیور پر چند ثانیوں کیلئے صرف ریڈیائی شور باقی رہ گیا۔ انسانی آواز یک بیک غائب ہو گئی مگر میں مسلسل اپنا نام دہراتا رہا۔

"تو تم نے اس پر بھی قابو پا لیا" سکوت کے بعد ریسیور پر ایک مردانہ غصیلی آواز ابھری۔ اس بار اس نے انگریزی زبان استعمال کی تھی۔

میں زور سے ہنسا "تم چیخوف بول رہے ہو نا؟"

"تم اپنے باپ کو خوب پہچانتے ہو!" وہ جلے کٹے لہجے میں بولا تھا۔

"تم نے روزیلا کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے چیخوف" میں نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "تم اپنی مجبوری کی تسکین کے لئے اسے استعمال کرتے رہے۔ اور بھول کر بھی یہ نہ سوچا کہ وہ بنیادی طور پر ایک عورت ہے۔ تم نے اسے اپنا ماتحت بنا کر میرے پیچھے لگایا تھا مگر وہ ایک عورت بن کر میرے سینے سے آ لگی ہے۔ اس نے مجھے ہر بات بتا دی ہے کیونکہ میں نے اسے سچی مسرت سے آشنا کیا ہے اور اب وہ تھک کر گہری نیند سو رہی ہے۔ تم کبھی بھی ہم دونوں کا سراغ نہیں پا سکو گے!"

وہ روسی زبان میں کسی بھیڑیے کی طرح غرّایا، شاید روزیلا کو گالیاں دے رہا تھا کیونکہ بے انتہا مسرت اور غصے کے عالم میں انسان غیرارادی طور پر اپنی مادری زبان کا سہارا لیتا ہے پھر اس کی آواز سنائی دی "تو اس نے ہم سے غداری کی ہے وہ کمینی دھوکے باز کتیا ہے۔ اگر اسے تم سے بہتر ساتھی مل گیا تو وہ تمہیں بھی دغا دے جائے گی۔"

"اسے تم سے بہتر ساتھی مل سکتا تھا مجھ سے بہتر رفیق نہیں مل سکتا، تم یہ فکر چھوڑو کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گی۔"

"اسے جگاؤ، میں اس کتیا کی بچی سے ایک مرتبہ بات کرنی چاہتا ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے، وہ گہری نیند سو رہی ہے!"

"اس کے بال پکڑ کر اسے اپنے قدموں پر کھڑا کر دو" وہ غرّایا۔

"مجھ میں اور تم میں یہی فرق ہے چیخوف!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "محبت اور وفاداری دونوں طرف سے ہوتا ہے۔ تمہیں جو پیغام دینا ہے مجھ کو بتا دو، وہ اس تک پہنچ جائیگا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ آئندہ تم ہم سے بات نہ کر سکو گے میں اس سیٹ کو تباہ کر دوں گا۔"

"اس سے کہہ دینا" یہ کہتے ہوئے وہ غصے کی شدت سے تقریباً ہانپ رہا تھا کہ اب اسے کہیں امان نہ مل سکے گی۔ ہمارے آدمی تم دونوں کو قبر سے بھی نکال لیں گے۔"

"ذرا احتیاط سے نکالنا، دوسرے مُردوں کی نیند خراب نہ ہو!" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے سیاہ سوئچ دبا کر ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔

میں نے رسٹ واچ اور ٹرانسمیٹر کو ایک پتھر سے بری طرح کچل کر وہیں مٹی کے انبار میں دفن کر دیا اور دوبارہ سڑک پر نکل آیا۔

اس وقت چیخوف سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خطرہ موجود تھا کہ وہ لوگ کبھی بھی روزیلا کی لاش دریافت کر سکیں گے۔ میری گفتگو ان کو غلط راہ پر ڈالنے کا سبب بن سکتی تھی۔ مجھے تلاش کرتے ہوئے وہ پوری توجہ اس امر پر مرکوز رکھتے کہ روزیلا بھی میرے ساتھ موجود ہے۔

گھڑی اور ٹرانسمیٹر کو میں نے ایک فوری اندیشے کے تحت برباد کیا تھا۔ مجھے الانوف کے وہ طوق یاد آ گئے تھے جن میں ریڈیو سگنل سے پھٹنے والے ہولناک آتش گیر بم پوشیدہ تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں گھڑی اور ٹرانسمیٹر میں بھی کوئی ایسا تباہ کن ہتھیار پوشیدہ نہ ہو حالانکہ بعد میں خود میرے ہی ذہن نے ان شبہات کی تردید کر دی اگر واقعی ایسا ہوتا تو چیخوف مجھے گفتگو میں الجھا کر اسی وقت میرا کام تمام کرنے کی کوشش کرتا کیونکہ اس طرح وہ اپنی دانست میں مجھے مارنے کے ساتھ روزیلا کو بھی ناقابل تلافی جسمانی نقصان پہنچا سکتا تھا میں نے اسے اپنے قریب روزیلا کی موجودگی کا تاثر دے کر دانستگی میں مہلک وار کرنے کی دعوت دی تھی مگر غنیمت یہ تھا کہ یہ دونوں چیزیں خطرناک نہیں تھیں۔

وہ رات میں نے اس قصبے کے ایک باغ میں سو کر گزاری۔ شدید تھکان کے باعث میں بے خبری کی نیند سویا۔ صبح سورج کی کرنوں کی چکاچوند سے آنکھ کھلی تو آنتوں میں شدید اینٹھن ہو رہی تھی اور پورے بدن میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔

اپنی شدید ضروریات کے پیش نظر میں کئی بار نقب زنی اور چھوٹی موٹی ڈکیتی کی وارداتیں کر چکا تھا اور اس روز مجھے جیب تراشی پر مجبور ہونا پڑا۔ دن کی روشنی میں پیسے کے حصول کا کوئی دوسرا سہل طریقہ موجود نہیں تھا جب کہ آتش شکم اندھیرا ہونے سے پہلے مجھے کسی قابل نہ چھوڑتی۔

قصبے کے بارونق بازار میں ایک ادھیڑ عمر شخص میرا نشانہ بنا۔ میں نے بھرے بازار میں اس صفائی سے اپنا کام دکھایا کہ میں خود حیران رہ گیا۔

اس رقم سے سب سے پہلے میں نے اپنی آتش شکم سرد کی اس کے بعد اپنی ظاہری ہیئت میں صرف اتنی تبدیلی کی کہ پتلون قمیض کے بجائے کھدر کا لباس خرید لیا اور پیروں میں بان کے چپل پہن لئے۔ داڑھی وغیرہ کو یوں ہی چھوڑ دیا۔

اس وقت میں چاروں طرف سے مہیب خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ بنگلہ دیشی پولیس میرے تعاقب میں تھی۔ انڈین سیکرٹ سروس میرے لہو کی پیاسی تھی کیونکہ میں سائیکو فورٹ میں ان کے ایک بہترین آدمی بیدی کو ہلاک کرنے کے باوجود ڈاکٹر راما نند کے سہارے صاف بچ نکلا تھا۔ پھر روسی سیکرٹ سروس کے افراد پارس

پتھر کے حصول کی خاطر میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ان سے میرا ٹکراؤ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ مجھے ڈاکٹر رادھا نند کی تحویل میں دینے سے قبل انڈین سیکرٹ سروس کے اہل کاروں نے میری ہر شناخت اپنی فائلوں میں محفوظ کر لی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کوئی تفصیل نظر انداز نہیں کی تھی۔ درجنوں کے حساب سے میری مختلف تصاویر لی گئی تھیں، انگلیوں کے نشانات بھی محفوظ تھے اور مجھے یقین تھا کہ اگر اس بار میں کسی بھی جگہ پولیس وغیرہ کے چکر میں آگیا تو میرے لئے خود کو بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے اس بار مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔

بنیادی کاموں سے نمٹنے کے بعد سب سے پہلے میں چاپلن سے سانورہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ چاپلن ایک ایسا قصبہ [illegible] بھی وقت سیتا کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا [illegible] محفوظ تھا۔

سانورہ کی ایک سرائے میں قیام کے دوران میں میں نے اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور کیا۔ میرے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ہندوستان میں رہ کر موقع کی گھات میں رہوں اور پھر انبالہ کے ہوٹل میں چھپا ہوا پارس پتھر حاصل کر کے سرحد عبور کر لوں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میری عزیز از جان سیتا اب ہندوستان کی منحوس سرزمین پر نہیں ہے۔ میں نے سیتا کو ہمالیہ کی گود سے حاصل کیا تھا۔ اس کی ماں سندری نے بڑی حسرت کے ساتھ اپنی بیٹی کو میرے ساتھ رخصت کیا تھا۔ وہاں ہر ہر قدم پر بھیانک مسائل موجود تھے۔ مگر میری راہ خود بخود ہموار ہوتی چلی گئی۔

میں بھاندر ناس کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹکتا آدم خور قبائل کے اس غول میں پہنچا تھا جہاں سیتا اور سندری نے مجھے موت کے چنگل سے نکال کر نئی زندگی کی نوید دی پھر مجھے بھاندر ناس بھی مل گئی اور سندری نے مجھے تحفے میں ایسی نادر الوجود انگوٹھی دی جس میں نگ کی جگہ پارس پتھر جڑا ہوا تھا۔ نیپال کی سرزمین تمام تر مصائب کے باوجود میرے لئے مبارک ثابت ہوئی مگر ہندوستان کی سرحد میں قدم رکھتے ہی موتی ہاری میں مشکلات نے گھیر لیا۔

نیپال میں طویل اور روح فرسا جدوجہد کے بعد میں نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ میں یکے بعد دیگرے وہاں گنواتا چلا گیا۔

پہلے میری درویشی کا بھرم ٹوٹا پھر سیتا روٹھ کر مجھ سے بچھڑ گئی۔ اس کے بعد پارس بھی میرے اختیار سے باہر ہو گیا۔ ہر چند کہ وہ محفوظ تھا مگر میرے لئے اسے حاصل کرنا شیر کے دہانے میں ہاتھ ڈالنے سے ہرگز کم نہیں تھا۔

میرے لئے دوسرا راستہ یہ تھا کہ فی الحال پارس پتھر کو بھول جاؤں اور ہندوستان سے فرار کی کوشش کروں اور کچھ عرصہ بعد دوبارہ وہاں آ کر پارس پتھر حاصل کروں۔ یہ درمیانی مدت میں سیتا کا کھوج نکالنے میں صرف کر سکتا تھا۔

میں نے بہت غور کیا مگر ان دونوں ہی تجاویز میں یکساں خطرات تھے۔ ہندوستان میں رہتا تو ہر آن ان خونی کتوں کا خوف لگا رہتا جو میرے لہو کی بو پر ہر طرف منڈلا رہے تھے۔ میری آزادانہ نقل و حرکت کسی وقت بھی سلب کی جا سکتی تھی۔ انڈین سیکرٹ سروس کی قید میں میں نے جو ہولناک ذہنی اور جسمانی عذاب جھیلے تھے ان کا تصور کر کے بھی میرا رواں رواں کانپ اٹھتا تھا۔

ہندوستان سے نکلنے کی راہ بھی اسی قدر پر خطر تھی۔ وہاں ہر بندرگاہ اور ہوائی اڈے پر میرا ریکارڈ موجود ہونے کے قوی امکانات تھے پھر میں باقاعدہ کاغذات کے بغیر ہندوستان میں گھسا تھا۔ لہٰذا نکلنے کیلئے کسی قانونی راستے کو اپنانا بہت مشکل تھا۔ اس مقصد کے لئے میں انسانوں کی اسمگلنگ کرنے والوں پر تو انحصار کر سکتا تھا مگر ان کا کھوج لگانا بھی مشکل تھا۔ میرا قیاس کہتا تھا کہ ایسے لوگوں کا پتہ بمبئی یا کلکتے ہی میں مل سکتا ہے۔

بمبئی میرے لئے شہر ممنوعہ تھا۔ وہاں میرے پہچاننے والے بہت تھے ڈاکٹر رادھا نند، اس کی خوبصورت اور آوارہ مزاج بیٹی اوشا، اس کی سہیلی نینی جو میرے [illegible] بیوہ ہو گئی تھی۔ میرے لئے بمبئی کا رخ کرنا مشکل تھا جب کہ کلکتہ تک کے طویل سفر میں پکڑے جانے کے خطرات پنہاں تھے!

سوچتے سوچتے میرے اعصاب جواب دینے لگے تو میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بمبئی ہی کا رخ کرنا چاہیئے جب دونوں ہی طرف خطرات تھے تو وہ خطرہ کیوں نہ مول لیا جائے جس میں سفر کی صعوبتیں کم ہوں۔

سانورہ سے چند میل شرق میں کوری گاؤں نامی ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے جہاں بیلگام سے آنے والی ریل گاڑیاں تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہیں اور پھر بمبئی کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ مجھے کوری گاؤں کے اسٹیشن پر زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور میں تن بہ تقدیر ہو کر ایک بار پھر اسی شہر غدار کی طرف ہو لیا جہاں سے کئی بار اپنی مرضی کے خلاف نکالا گیا تھا۔

ایک بار سیکرٹ سروس والے مجھے اگالی ٹ نامی ہولناک جزیرے پر لے گئے تو دوسری بار چینگ ہو اور دلگیر سنگھ نے مجھے ایک پراسرار جزیرے پر پہنچا دیا تھا اور اس بار کیا ہونے والا تھا، اس سے میں مطلق بے خبر تھا۔ البتہ ذہنی طور پر ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

بمبئی کا ریلوے اسٹیشن اس شہر کی طرح انسانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی فکر میں کھویا ہوا تھا۔ اس بھیڑ میں جو بھی ذرا پر سکون نظر آیا مجھے اسی سے خطرہ محسوس ہوا اور میں نے ایسے لوگوں سے بچ کر نکلنے کی کوشش کی۔

اسٹیشن کے باہر بھانت بھانت کی سواریاں موجود تھیں مگر میں نے شہر میں جانے کی بجائے وہیں کسی سستے سے ہوٹل میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک جگہ میں سڑک عبور کرنے کے لئے رکا۔ دوسری جانب کئی ہوٹل نظر آ رہے تھے مگر سڑک پر ٹریفک کا ایک اژدہام رواں تھا۔ گاڑیاں یکے بعد دیگرے تیزی سے گزر رہی تھیں۔ میرا ذہن سوچ میں ڈوبا ہوا تھا نظریں ٹریفک پر مرکوز تھیں۔ اچانک سیاہ رنگ کی ایک کار تیزی کے ساتھ قطار سے الگ ہو کر میری طرف آئی۔ میں اچھل کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا، اسی وقت کار کے بریک پوری قوت سے بجے اور یک بیک میرا دل ڈوبنے لگا۔

بمبئی کی سرزمین پہ قدم رکھتے ہی میرے لئے مصائب شروع ہو چکے تھے۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر نینی موجود تھی اور حلیہ بدل جانے کے باوجود مجھے پہچان چکی تھی۔ میرا جی چاہا کہ پلٹ کر پوری قوت سے بھیڑ میں گھستا چلا جاؤں مگر اسی وقت اس نے کھڑکی سے اشارہ کر کے مجھے بلایا۔

میں انجان بنا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ چند ثانیوں بعد مجھے خیال آیا کہ میرا یوں کھڑے

رہنا غیر فطری سا ہے لہٰذا میں نینی کی کار کے پیچھے سے دوبارہ سڑک کے کنارے پر پہنچا تاکہ سڑک عبور کر سکوں۔

میری اس حرکت سے بھی نینی کا اعتماد متزلزل نہ ہو سکا وہ انجن بند کر کے [illegible] اور تیر کی طرح میرے سر پہ آ پہنچی۔

"سندر ___ تم اس حال میں؟" اس نے میرا بازو تھام کر حیرت اور دکھ کے ساتھ پوچھا۔

میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے خاتون، میرا نام سی کے نلاپلائی ہے!"

"میرے ساتھ چلو" وہ میری بات سنی ان سنی کر کے بولی "میں نے تمہیں اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ اندھی بھی ہو جاؤں تو ٹٹول کر تمہیں پہچان لوں گی۔"

"عجیب زبردستی ہے!" میں نے شانے اچکا کر کہا پھر فوراً ہی [illegible] ساتھ ہو لیا کیونکہ ٹریفک کانسٹیبل سیٹی بجاتا ادھر آ رہا تھا۔ حالانکہ وہ غلط جگہ گاڑی کھڑی کرنے پر نینی کو اشارہ کر رہا تھا مگر ان دنوں میں ذہنی طور پر پولیس سے بہت خائف تھا لہٰذا اس جبری شاہراہ پر نینی سے بحث کے بجائے اس کی بات ماننے ہی میں عافیت نظر آئی ورنہ کسی کو میرے نام کی بھنک بھی مل جاتی تو میری عاقبت برباد ہو جاتی۔

نینی کے بدن پر سفید ساڑھی تھی جس میں وہ آسمان سے اتری ہوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت نہ اس کے کانوں میں آویزے تھے، نہ ہاتھوں میں چوڑیاں، بائیں ہاتھ میں رسٹ واچ تھی یا ناک میں ہیرے کی خوبصورت کیل۔

"ہاں ___ تو تمہارا نام نلاپلائی ہے!" وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے عجیب انداز میں مسکرا کر بولی اور میں دل ہی دل میں اس کی خود اعتمادی پر مسکرا دیا۔

"میرے والدین نے یہی نام رکھا تھا" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"اوشا کے یہاں تم کسی اور ہی نام سے ملے تھے" وہ میرے لاتعلقانہ رویے کی پرواہ کئے بغیر بولی "مگر جب اخباروں میں تمہاری تصویریں اور نام چھپا تو اوشا ملنے میرے پاس آئی تھی۔ سنا ہے تم نے اس سے بھی پکی دوستی کی [illegible]؟"

"اگر آپ کچھ دیر ایسے ہی انکشافات کرتی رہیں تو میں حیرت سے پاگل ہو جاؤں گا" میں نے تلخ لہجے میں کہا "ایک عورت کو کسی اجنبی سے یکطرفہ طور پر بے تکلف ہونا زیب نہیں دیتا۔"

اس نے پہلی بار گھور کر میری طرف دیکھا اور غصیلے لہجے میں بولی "گھر چل کر پوچھوں گی کہ تم کون ہو؟"

اس کے لہجے میں ایسی اپنائیت اور ایسا پیار رچا ہوا تھا کہ میں بے اختیار کہہ اٹھا "تمہاری نظروں کی داد نہ دینا ناانصافی ہے نینی!"

"تم اجنبی کیوں بن رہے تھے؟"

"تم جانتی ہو کہ اب میں اپنے سائے سے بھی بدکتا ہوں، میں اس وقت نامساعد حالات کا شکار ہوں" میں نے کہا "تمہیں دیکھ کر تو میری روح ہی فنا ہو گئی!"

"دشمنوں کیلئے تم جو بھی ہو مگر میرے لئے وہ پہلے مرد ہو جس پر میں نے شوہر سے زیادہ بھروسہ کیا" وہ پرخیال لہجے میں بولی "میں تم پہ جان نثار کر سکتی ہوں، تمہیں دکھ نہیں دے سکتی۔ تم کیا جانو کہ ورما کی موت کے بعد میں تمہیں کتنا یاد کرتی رہی ہوں!"

"ورما!" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "مر گئے وہ؟"

"ہاں ___ اب میں اس جھوٹے بندھن سے آزاد ہوں" وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی "کئی ہفتوں کے بعد اس رات وہ گھر آئے تھے۔ ہم بستر میں تھے کہ کسی نے انہیں ہلاک کر دیا۔"

"وہ پکڑا نہیں گیا؟"

"چھوڑو اس ذکر کو" وہ منہ بنا کر بولی "ورما جی جتنی دھوم سے جئے تھے اسی خاموشی سے سرگباش ہو گئے۔ تم یہ بتاؤ کہ اتنے دن کہاں رہے اور اب کہاں جا رہے تھے؟"

"مقدر کا لکھا جھیل رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بمبئی پہنچا تھا اور اسی بات سے ڈر رہا تھا کہ یہاں ایسے کئی لوگ ہیں جو مجھے پہچان لیں گے!"

"عورت اپنے پریمی کو ہر بہروپ میں پہچان لیتی ہے۔"

"آج تو مجھے بھی اس بات کا یقین آ گیا!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو تم آج کل روپوش ہو؟"

"ہاں تمہاری زبان سے یہ راز فاش نہ ہونا چاہیئے ورنہ میرے ساتھ تم بھی مصیبت کا شکار ہو جاؤ گی" میں نے نرم الفاظ میں اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔

"میری ذات سے تم بے فکر رہو!"

جب اس نے گاڑی ایک ایسے احاطے میں موڑی جو میرے لئے نیا تھا تو میں چونک پڑا "یہ کہاں لئے جا رہی ہو تم مجھے؟"

"فکر نہ کرو، یہ پولیس اسٹیشن نہیں ہے" وہ قہقہہ لگا کر بولی "میں نے مکان بدل لیا ہے۔"

"وہ مکان برا تو نہیں تھا"

"وہاں ہر چیز سے ورما کی یاد جھلکتی تھی۔ پھر خوابگاہ سے تو دہشت آنے لگی تھی جہاں انہوں نے وہیں بستر پر دم توڑا تھا۔ انشورنس کا سوا لاکھ روپیہ ملا تو کچھ رقم ملا کر میں نے نیا مکان لے لیا۔ باقی کے شیئرز لے لئے ہیں تاکہ دال روٹی کی فکر نہ رہے!"

"ورما جی مرتے مرتے بھی تمہیں فکر سے بری کر گئے" میں نے اپنے الفاظ میں طنز کی آمیزش محسوس کرتے ہی جلدی سے موضوع بدل دیا "ماتا جی کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔ ہر وقت کمرے میں پڑی رہتی ہیں بیچاری" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی "آنکھوں کا نہ ہونا بھی بڑا عذاب ہے!"

میں نینی کے ستھرے ذوق کا پہلے سے قائل تھا۔ اس مکان میں داخل ہوا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فرنیچر، قالین، پردوں اور آرائشی اشیاء کی ساخت اور رنگوں کے انتخاب میں نینی نے غضب کا کمال کیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی آدمی چند لمحوں کے لئے مبہوت سا ہو جاتا تھا۔

"تم نے تو کمال ہی کر دیا" آخر میں نے اس پہ اپنے تاثر کا اظہار کر ہی دیا۔

"میں نے ہوم اکنامکس میں گریجویشن کرنے کے بعد اندرونی آرائش میں ایک

ڈپلومہ کورس کیا تھا۔ اگر تم ساتھ دو گے تو میں اسکو بھی کام میں لاؤں گی۔" وہ مجھے اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"میں ایک اشتہاری مجرم ہوں۔" میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں تمہارا کیا ساتھ دے سکوں گا۔ یہی بات بہت ہے کہ اس وقت میری آزادی تمہارے ایک شانے کی مرہون منت ہے!"

"یہ اس سے کہو جس نے تمہیں اس سے پہلے تمہارے نکھرے ہوئے روپ کو نہ دیکھا ہو۔" اس نے مجھے اپنی مسہری پر دھکیل کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میں جانتی ہوں کہ تم ذہین ہی نہیں انتہا ذہین ہو۔ تمہارے ساتھ مل کر میں اپنا کاروبار جما لوں گی۔"

"کاروبار؟" میں نے مسہری پر بے تکلفی سے دراز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ اندرونی آرائش کا کام بہت سود مند ہے۔ ایک ایک مکان کا ٹھیکہ لاکھوں کا ہوتا ہے۔ وقت گزاری کے ساتھ ہی یہ آمدنی کی بھی معقول صورت ہے!" وہ میرے پیروں سے بان کے چپل اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے بولی۔ اس وقت وہ میرے ساتھ کسی سگھڑ اور وفا شعار بیوی کی طرح پیش آ رہی تھی۔

"مگر میں تمہارے کس کام آسکوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"تم میرے منیجر ہوگے۔ سارا دفتری کام اور حساب کتاب تمہیں دیکھنا ہوگا۔"

"میری حیثیت ایک مجرم کی ہے۔ میں کبھی اس طرح منظر عام پر نہ آسکوں گا اور اگر ایسی حماقت کی تو پکڑا جاؤں گا۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں، پہلے تم تازہ دم ہو لو۔" اس نے میرے سینے میں انگلی مار کر کہا۔

"میرے پاس لباس بھی نہیں ہے!" میں نے باتھ روم میں گھستے ہوئے کہا "نہا دھو کر یہی کپڑے پہنوں گا۔"

"کپڑے بھی آجائیں گے، تم نہا لو، میں ماتا جی کو دیکھ کر آتی ہوں!"

نینی کے باتھ روم میں ایک بڑی الماری بیش قیمت غیر ملکی خوشبویات سے بھری ہوئی تھی اور ساری فٹنگز نہایت شاندار تھیں۔ میں کافی دیر تک شاور تلے نہاتا رہا، پھر بدن خشک کر کے لباس بدلنے لگا۔

باہر آیا تو نینی میک اپ کے لوازمات سے لدی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنا جوڑا اتار رہی تھی

"کیا دیکھ رہے ہو!" اس نے آئینے میں مجھ پر نظریں جما کر مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"شاید میں بروقت آگیا ہوں۔ ابھی نازک مرحلہ باقی ہے" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم بہت گستاخ ہو۔" یہ کہہ کر وہ ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھ گئی اپنا جوڑا اتار کر اس نے میز پر رکھ دیا "اور اس بار کچھ بدل بھی گئے ہو!"

"میں نے یہ چند مہینے بڑی مشکلات میں گزارے ہیں" میں نے بال خشک کرتے ہوئے کہا "اب تو تمہارا قرب ایک خواب معلوم ہو رہا ہے!"

"آنکھیں بند کرو میں لباس بدل لوں!"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا اور کمرہ یک بیک تاریکی میں ڈوب گیا۔ میں سوئچ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کمرہ روشنی میں نہا گیا...
نینی کی دبی دبی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا۔ ابھی میں حیران ہی تھا کہ...
گیا۔ نینی سلیپنگ سوٹ میں ملبوس میرے سامنے موجود تھی۔ اس نے لباس...
بے انتہا پھرتی سے کام لیا تھا

میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں نینی کا ہیٹی کوٹ دبا ہوا تھا... اپنے قریب رکھے ہوئے ٹیلی ویژن سیٹ پر ڈال دیا۔

"میں بھوکا ہوں!" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو تمہاری آنکھوں سے ظاہر ہے" وہ برجستہ بولی "فکر نہ کرو میں تمہارے بھوکا نہیں سلاؤں گی۔ ابھی کھانے کا انتظام کرتی ہوں!"

کچن میں فریزر بھانت بھانت کی اشیائے خورد و نوش سے بھرا ہوا تھا... میرے لئے جلدی جلدی بیف اسٹیک تلنے لگی اور کچن گوشت کی اشتہا انگیز بو سے بھر گیا۔

"تم گائے کا گوشت کھاتی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"لذیذ جو ہوتا ہے" وہ چٹخارہ لے کر بولی۔

"اور تمہارا دھرم؟"

"دھرم کی بات نہ کرو" وہ برا سا منہ بنا کر بولی "یہ سب جنون کی باتیں ہیں... دینے اور لذیذ گوشت والے جانور کو محض پوجتے رہنا میرے بس سے باہر ہے... گائے کے پیشاب کو پوتر سمجھ کر اپنے چہرے پر ملتے ہیں مگر اس کے گوشت سے جلتے ہیں۔ یہ سب فرسودہ خیالات ہیں۔"

میں اس کی پشت پر پہنچ گیا "اور اگر کسی کو پتہ چل جائے؟"

"بمبئی میں اب تو کھلے بندوں گائے کا گوشت ملتا ہے۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو گوشت کی قسم پوچھے بغیر اسے خرید لیتے ہیں تاکہ بے خبری میں گوشت کھا کر عذاب سے بچے رہیں!"

اسی وقت گھنٹی بجنے کی تیز آواز سنائی دی۔

"اس سمے کون آیا؟" نینی تیوریوں میں بل ڈال کر بولی۔

"تم جا کر دیکھو، میں یہیں رہوں گا۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسی وقت دوبارہ گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ نینی کو شاید گون پہننے میں تاخیر ہو رہی تھی۔

میں نے چولہا بند کیا اور تیزی کے ساتھ کچن سے نکل کر نینی کی خوابگاہ میں گھس گیا۔ اس غیر متوقع گھنٹی نے مجھے سخت ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس وقت تک نینی خوابگاہ سے گون پہن کر نکل چکی تھی میں نے پھرتی سے اس کے کپڑوں کی الماری کھولی اور ملبوسات کے درمیان بیٹھ کر الماری کا دروازہ بند کر لیا۔ میرے کان دروازے کی طرف جمے ہوئے تھے اور ذہن تیزی کے ساتھ کسی متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے کی تجویز سوچنے میں مصروف تھا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی!

کیا

مر گئی تھیں جانی؟" چند ثانیوں کے بعد میرے کانوں میں ایک شوخ اور سُریلی آواز آئی اور ... دل اچھل کر حلق میں آگیا میرے لئے وہ آواز اجنبی نہیں تھی۔ ... ہونے سے پہلے پیٹ پوجا کی تیاری کر رہی تھی" نینی کی نرم اور کھنکتی ... آواز سنائی دی۔

"اکیلی سوؤ گی؟" اس مرتبہ ایک معنی خیز سوال پوچھا گیا تھا اور دونوں ... آہٹیں رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔

"تیرے ساتھ سوؤں گی!" نینی نے قہقہہ لگایا۔

"تیرے چہرے کا رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے، کیا میں غلط وقت پر آگئی؟ ... آنے والا ہے کوئی؟" اس مرتبہ پوچھنے والی کی آواز میں حیرت نمایاں تھی۔

آہٹیں ایک جگہ رک گئیں اور نینی کی آواز سنائی دی "میرے چہرے کا رنگ تو نہیں اڑا ہوا ہے مگر تو اس وقت کیسے آئی ہے؟"

"وفا رس روڈ آئی تھی۔ سوچا تجھ سے بھی ملتی چلوں۔"

"تو اب یہ نوبت آگئی ہے" نینی معنی خیز لہجے میں بولی "کیا وہاں ... دل کو بہلا لیا ہے؟"

"وائیڈیٹ" جھینپی ہوئی آواز سنائی دی "میرا ڈرائیور وہاں رہتا ہے ... سے چھڑانے آئی تھی۔ تیری تو نیت ہی خراب ہے۔"

"تو بیٹھ، میں ابھی آئی" نینی کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ میری طرف سے پریشان تھی کہ کہیں میں رنگے ہاتھوں نہ پکڑا جاؤں۔

"میں تیری مدد کروں نینی؟"

"بس میں دو منٹ میں آئی۔"

میں بدستور نینی کی خواب گاہ میں الماری میں چھپا بیٹھا تھا۔ آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ آنے والی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے اور شاید نینی مجھے ... میں نہ پا کر بوکھلا گئی تھی۔ چند ہی ثانیوں بعد نینی کی آہٹیں کچن سے خوابگاہ ... آگئیں۔

اس مکان کی ساخت ایسی تھی کہ ڈرائنگ روم سے خوابگاہ کا دیکھا جانا ناممکنات میں سے تھا۔ میں نے آہستگی سے الماری کا پٹ کھول دیا۔

نینی جھک کر مسہری کے نیچے جھانک رہی تھی۔ الماری کے قبضے کی ہلکی سی آواز پر وہ خوفزدہ انداز میں پلٹی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے خوبصورت چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اپنے لبوں پر انگلی رکھے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

وہ دبے قدموں تیزی سے میری طرف آئی اور جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں بولی "اُوشا آگئی ہے۔" اور فوراً ہی خواب گاہ سے نکلتی چلی گئی۔

"کس سے ملنے کر کے آئی ہو دیوی جی" نینی کے وہاں پہنچتے ہی ... بظاہر معصوم مگر آوارہ مزاج لڑکی اُوشا کی طنزیہ آواز سنائی دی۔

"کیا بکواس ہے!" چوری پکڑی جانے پر نینی برہم ہوگئی۔ شاید اسے شبہ ہوا ہوگا کہ اُوشا چھپ کر اس کی نگرانی کر رہی تھی۔

"بکواس نہیں، تمہاری لپ اسٹک پھیلی ہوئی ہے۔"

"اوہ" نینی کی آواز میں اطمینان کی گہری جھلک تھی "ہاتھ لگ گیا ہوگا۔"

اوشا کافی دیر وہاں موجود رہی اور نہایت بے باکی کے ساتھ نینی کے ساتھ اوباش قسم کی گفتگو کرتی رہی۔ نینی چونکہ میری موجودگی کی وجہ سے محتاط تھی لہٰذا وہ بیشتر وقت خاموش ہی رہی۔ اوشا نے اسے کئی بار ٹوکا مگر نینی پھر بھی کھل کر گفتگو نہ کر سکی جبکہ اُوشا میری موجودگی سے بے خبر زبانی عیاشی کے جوہر بکھیرتی رہی۔

وہ اس وقت شاید کسی مختصر لباس میں تھی کیونکہ وہ نینی کو اپنے ادھیڑ عمر ڈرائیور کا قصہ سنا رہی تھی جو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود تھا۔ بقول اُوشا اس بڈھے کی نگاہیں مسلسل اوشا کی ٹانگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈرائیونگ کے باعث اوشا بے خبر ہے مگر وہ خبیث عورت اس کی ہر بات نوٹ کر رہی تھی۔

جب اوشا چلی گئی تو میں الماری سے نکل آیا۔

نینی دروازہ بند کر کے واپس آئی تو میں کچن میں موجود تھا۔ مجھے پیاز کاٹتے دیکھ کر وہ لپک کر اندر آگئی "کیوں شرمندہ کرتے ہو مجھے؟"

"تمہاری اس بدتمیز دوست نے مجھے بھوکا مار دیا" میں نے آنکھیں موند کر کہا۔

"اُوشا دن بدن تیزی سے بگڑتی جا رہی ہے۔ آجکل ہر بڑی پارٹی میں اسی کا چرچا رہتا ہے۔ آجکل بیک وقت دو مسلمان لڑکوں کو اُلو بنا رہی ہے۔"

"اُلو بنا رہی ہے؟" میں نے حیرت سے کہا "یا ان دونوں نے اسے کھلونا بنایا ہوا ہے؟"

"بات تو یہی ہے" وہ مترنم آواز میں کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کے دونوں رخساروں میں خوبصورت گڑھے نمایاں ہوئے "چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، نقصان خربوزے ہی کا ہوتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ ایک لڑکا بے حد سنجیدہ ہو گیا ہے اور اُوشا سے بار بار شادی کی درخواست کر رہا ہے۔ اور وہ خود بھی محسوس کر رہی ہے کہ وہ اس معاملے کو نہیں سنبھال سکے گی اور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"وہ دھمکی دے رہا ہے کہ اوشا نے اسے ٹھکرایا تو وہ خودکشی کر لے گا۔ اگر اس نے واقعی ایسا کر لیا تو اُوشا کا نام اخباروں کی سرخیوں میں آ جائے گا اور رام انند تو شاید صدمے سے مر ہی جائے۔ وہ ابھی تک اوشا کو پارسا سمجھتا ہے۔"

"وہ بہت ہی احمق معلوم ہوتا ہے۔ جب شادی کے بغیر اُوشا کو حاصل کر چکا ہے تو اس بکھیڑے میں کیوں پڑنا چاہ رہا ہے۔"

"مرد ذات کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔" وہ بیف اسٹیک فرائی کرتے ہوئے بولی۔ "جانے اسے اوشا کی کون سی ادا بھا گئی ہے۔"

"اور وہ اس کے دوسرے معاشقے سے بھی واقف ہے؟"

"بھلا کیوں نہ ہوگا۔" وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔ "سب ہی جانتے ہیں مگر اس نے براہِ راست کبھی اُوشا سے اس معاملے میں بات نہیں کی۔"

"پھر وہ مرد نہیں مردُود معلوم ہوتا ہے۔"

"مردُود؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیا ہوتا ہے؟"

"یہ مرد کی جمع ہوتی ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

کھانے کے دوران ہم دونوں ڈائننگ ٹیبل پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے اچانک ہی میرے ذہن میں نینی کی پہلی ملاقات کی یاد تازہ ہوگئی۔ بے اختیار میرا داہنا پیر آگے بڑھا اور نینی کی گداز پنڈلی پر رینگنے لگا۔ وہ ہنس پڑی۔

"شکر کرو کہ اس وقت اُوشا نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "ورنہ اس بار بھی میرے دھوکے میں اسی کی پنڈلی سہلانی شروع کر دیتے۔"

"اور اس رات وہ بھی زبان سے ایک لفظ نہ بولی۔ کمرے میں تنہائی میسر آتے ہی مجھ سے لڑ پڑی کہ میں اس کو نظر انداز کر کے تم پر ڈورے ڈال رہا ہوں۔"

"کہتی تو سچ تھی۔"

"تمہارے سامنے اس پر توجہ دینا ہی مشکل تھا۔ تمہارے حسین چہرے پر پھیلی ہوئی تشنگی اور آنکھوں میں جھلکتی دوستانہ چمک نے مجھے فوراً ہی تمہاری طرف متوجہ کر دیا تھا۔ سچ سچ بتاؤ کہ میری طرف سے تمہارے دل میں بھی چور تھا نا؟" میں نے لذیذ گوشت کا ایک پارچہ نگلتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے گلاس میں بیئر انڈیلنے لگی اور اس کی دھار پر نظریں جما کر بولی۔ "میری جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو وہی کرتی جو میں نے کیا۔ عورت زرِ خرید ملکیت نہیں ہوتی کہ انسان ایک عمارت کی طرح اسے خرید کر بھول جائے۔ عورت جیتے جاگتے جذبات کی مالک ہوتی ہے اور پھر اب تو وہ دَور آگیا ہے کہ خالی مکانوں تک پر ناجائز قبضے ہو جاتے ہیں۔"

"ورما کی موت کے بارے میں تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" اس شخص کے بارے میں اپنا تجسس میں اس بار بھی نہ دبا سکا۔

اس نے چند ثانیوں کے لئے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر بولی۔ "مجھے اس ذکر سے اُلجھن ہوتی ہے۔ تمہیں آخر ورما سے اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی ہے؟"

"آخر اسے مارنے والا کون تھا؟"

"تم نہیں جانتے؟" اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ میرے بدن میں دہشت کی ایک سرد سی لہر سرایت کر گئی۔

"بھلا میں کیسے جانوں گا۔" میں نے کھوکھلا قہقہہ لگا کر کہا۔

"تو تم سے کھل کر بات کرنی ہی پڑے گی۔" وہ طویل سانس لیکر بولی۔ "دیکھو میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ ورما کا قاتل قانون کی نظروں میں مُجرم سہی مگر میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے ایک ایسی ان چاہی زندگی سے چھٹکارا دلایا جو میرے لئے جہنم سے کم نہ تھی۔"

"میں اس تمہید کا مطلب نہیں سمجھا۔" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"اب سنتے رہو مطلب بھی معلوم ہو جائے گا۔" وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ "ورما اس رات کئی مہینے بعد گھر آئے تھے اور نشے کے نشے میں دھت تھے۔ رات گئے ہم دونوں بستر پر ساتھ رہے تھے۔ نہ میں نے گولی چلنے کی آواز سُنی نہ کچھ دیکھا۔ اس وقت وہ میری باہوں میں تھے اور ہم پریم کی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ان کے بدن نے جھٹکا لیا اور وہ بے جان ہوگئے۔ ان کا پھٹا ہوا منہ اور پتھرائی آنکھیں دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ وہ مر چکے ہیں۔ ان کا بدن بھی اکڑ گیا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح چلانے لگی اور چلاتے چلاتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں تھی میرے ننگے بدن پر چادر پڑی تھی اور ایک ڈاکٹر کئی پولیس والوں سمیت موجود تھا اور ورما کی لاش لے جائی جا چکی تھی۔ جب میری حالت سنبھل گئی اور ورما کی ارتھی چلی گئی تو پولیس والوں نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کی اور اسی دوران انہوں نے تمہارا نام لیا۔ اس وقت تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمہارا اصل نام صفدر علی ہے۔ انہوں نے تمہاری تصویر دکھائی تو میں نے انہیں بتا دیا کہ میں ڈاکٹر کے ہاں تم سے مِل چکی ہوں۔ انہوں نے گھما پھرا کر مجھ سے بہت سے سوال کئے مگر میں نے صاف انکار کر دیا کہ اس کے بعد تم مجھ سے نہیں ملے۔ اگلے روز کے اخباروں سے مجھے پتہ چلا کہ اسی رات شہر میں دو لاشیں اور ملیں اور تم پر قاتل ہونے کا شُبہ تھا۔ ان میں ایک لاش میں زہریلا تیر بھی تھا، بعد میں پتہ چلا کہ ورما کی موت بھی ایک زہریلے تیرے ہوئی تھی۔ شاید اسی لئے پولیس مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ پولیس والے کئی روز تک آتے رہے۔ وہ نئے نئے ڈھنگ سے پرانے سوال دُہراتے تھے مگر ہر بار میرا ایک ہی جواب تھا۔ آخر انہوں نے مجھ سے کہا کہ صفدر علی ایک بھیانک مجرم ہے اور وہ جہاں بھی مجھے نظر آئے میں انہیں خبر کر دوں۔"

اس کے خاموش ہونے کے بعد میں چند ثانیوں تک مبہوت سا بیٹھا رہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ نینی مجھے اپنے شوہر کا قاتل سمجھنے کے باوجود مجھ سے اتنے خلوص سے پیش آسکتی ہے۔

"تو اب کیا کہتے ہو؟" مجھے ہکا بکا دیکھ کر اس نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

"ورما کو کس نے مارا تھا؟"

"یقین کرو نینی! کہ مجھے کچھ علم نہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ شاید تم اس رات بھی مجھ سے ملنے آئے

جب مجھے ورما کے ساتھ دیکھا تو سمجھے ہو گے کہ میں کسی غیر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہوں۔ تم مجھ پر تو وار نہ کر سکے مگر ورما کو ٹھکانے لگا دیا۔"

اس کا قیاس سو فیصدی درست تھا۔ عورتیں مرد کی نفسیات خوب سمجھتی ہیں۔ اس کے الفاظ سُن کر میرا دل ڈوبنے لگا مگر میں نے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا اور نہ ان دونوں مقتولوں سے واقف تھا۔ دراصل میں اسی وجہ سے غائب ہوا کہ کچھ لوگوں نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی اور تم دیکھ لو کہ میری بدقسمتی سے یہ ناکردہ قتل میرے نام لکھے گئے۔ حد تو یہ ہے کہ ان پیچیدہ حالات کے باعث تم نے بھی مجھے قاتل سمجھ لیا۔"

"ارے تو فرق کیا ہوا۔" اس نے اپنا سر محبت بھرے انداز میں میرے شانے سے ٹکا دیا۔ "میرے لئے تو تم وہی صفدر علی ہو جسے میں اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہے۔"

میں نے آہستگی سے اس کے مہکتے ہوئے گیسو چُوم لئے۔ "میں تمہارے سامنے کبھی سر نہ اُٹھا سکوں گا نینی! تم نے اپنے سلوک سے مجھے خرید لیا ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر ہم خواب گاہ میں آگئے۔ نینی نے تیز روشنیاں گُل کر دیں اور خوشبوؤں سے مہکتی ہوئی خوابگاہ میں مدھم سی روشنی باقی رہ گئی۔ نیم تاریکی کے باعث بڑی بڑی دیوار گیر عُریاں اور نیم عُریاں پینٹنگز کے خدوخال اُبھرے اُبھرے نظر آنے لگے۔ نینی نے گاؤن اتار دیا اور شراب کا بندوبست کرنے لگی۔ کمرے میں وہ رنگین ٹیلیویژن اور وی سی آر بھی موجود تھا جس پر میں پہلے بھی کچھ غیر اخلاقی فلمیں دیکھ چکا تھا۔

حرارت سے میری کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ نینی نے شیمپین کا گلاس میرے جام سے ٹکرایا۔ ہلکی سی اس کھنک کے ساتھ ہی اس نے آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے رخساروں کے ڈمپل گڑھے نمایاں تھے۔ "ٹی۔ وی آن کر دوں؟" اس نے خمار آلود آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔ اندھیرا کر دو۔"

ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ خواب گاہ اندھیرے میں ڈوب گئی۔ چند سیکنڈ تک اس کا منتظر رہا مگر وہ نہ آئی تو میں نے اسے ہولے سے پکارا۔ "نینی!"

"ہوں۔۔۔۔ اوں۔" وہ کسی گوشے سے منمنائی۔

"کہاں ہو تم؟" میں نے شکستہ آواز میں پوچھا۔

"تلاش کرو۔" اندھیرے میں اس کی مترنم ہنسی گونجی۔

"اس اندھیرے میں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "چوٹ لگ جائے گی۔"

"لگنے دو۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

میں نے آہٹ پیدا کئے بغیر آواز کے سہارے اُسے جا لیا اور بازوؤں میں اُٹھا کر اسے بے رحمی سے مسہری پر پھینک دیا۔

جب تک ذہن میں آگ بھڑکتی رہی۔ احتیاط کا سر جذبہ سوتا رہا مگر جب یہ آتش فشاں ریزہ ریزہ ہو کر گمنام پہنائیوں میں بکھر گیا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں بچھو نے ڈنک مارا۔ نینی سدا بہار اور میری شیدا سہی مگر اس کا گھر میرا مقبرہ بھی بن سکتا تھا۔ ہندی پولیس اس کو میرے بارے میں ٹٹولتی رہی تھی اور میں انڈین سیکرٹ سروس کو بھی مطلوب تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کئی ماہ گزرنے کے بعد بھی وہ چین سے نہ بیٹھے ہوں گے۔ ہر وہ جگہ جہاں سے میرا ذرا بھی رابطہ رہا تھا ان کی نظروں میں ہوگی اور پھر بمبئی میں تو میرے گنے چُنے ہی رابطے تھے۔

اگر ایک بار انہیں میری بُو مل جاتی تو میں خونخوار بھیڑیوں کے غول میں گھِر جاتا اور میرے لئے کہیں پناہ ممکن نہ ہوتی۔ اس وقت میرا کسی ایک جگہ رُک کے رہنا خطرناک تھا۔

میں نے سر اُٹھا کر نینی پر نظر ڈالی۔

"کہاں جارہے ہو؟" وہ تھکی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔

"دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ نہانے جا رہا ہوں۔"

"تو میں کیا کروں گی؟"

"اب تم بھی سو جاؤ۔" میں نے کہا اور باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

ٹھنڈے پانی کی پہلی ہی پھوار میرے ذہن کو بھٹکے ہوئے راستے سے اعتدال پر لے آئی۔ نینی کسی مرد کی چاہت کو ترسی ہوئی ضرور تھی جس کی جھولی میں مسرت کے چند لمحے ڈالنا خود میرے لئے بھی ذہنی اور جسمانی آسودگی کا باعث تھا مگر وہ میری منزل نہیں تھی۔ وہ میرے راستے کا ایک خوشنما اور دلکش سنگِ میل تھی مگر اسے منزل نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

ہند میں ایک نہیں یکے بعد دیگرے کئی عورتیں میری زندگی میں داخل ہوئیں۔ اُوشا بھی کچھ کم طرحدار نہیں تھی۔ اس کے شاداب و شگفتہ حُسن اور بدن کے فسوں خیز پیچ و خم انسان کو دیوانہ کر دینے کے لئے کافی تھے مگر میری گمشدہ سیتا کے سامنے اُوشا، نینی اور روزیلا کی ہر ادا ہر قربانی ہیچ تھی۔ وہ کچھ بھی سہی مگر پھر آبرو باختہ تھیں۔ اُوشا کنواری ہونے کے باوجود گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی رہی تھی اور اب تو اس کی حرکتیں اس موڑ پر آپہنچی تھیں کہ اس کے باپ کا نام اُچھلنے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ نینی نے شاید یہ سچ کہا ہو کہ اس نے اپنے شوہر سے پہلی بار محض میری خاطر بے وفائی کی تھی۔ میں اس کی خوابگاہ سے لذتیں چرانے والا پہلا غیر مرد تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ورما کی موت کے بعد نینی بھی آوارگی کی راہ اختیار کر چکی ہے۔ اس مکان میں بظاہر وہ اپنی ماں کے ساتھ مقیم تھی مگر اس کے باتھ روم میں مردانہ استعمال کی خاصی چیزیں موجود تھیں۔ جن سے ظاہر تھا کہ اس کے پاس لوگ آتے رہتے

ہوں گے۔

ایسی عورتوں کے چکر میں میں اپنی عاقبت خراب نہیں کرسکتا تھا۔ زندگی کے ہر نئے تجربے کے ساتھ میرے دل پر سیتا کی عظمت کا نقش اور گہرا ہوجاتا تھا۔ وہ بدی کے حصار میں گھر کر بھی فرشتوں سے زیادہ پاک اور معصوم دل کی مالک تھی اور یہ عورتیں نفاست کے خول منڈھ لینے کے باوجود اندر سے گھناؤنے کردار کی مالک تھیں۔ ان میں اور کوٹھا سجانے والیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ جنس بیچ کر رقم بٹورتی ہیں اور نینی وغیرہ جنس کے معاوضے میں آسودگی حاصل کرتی تھیں۔ ان کا کاروبار بارٹر سسٹم کے تحت چل رہا تھا کیونکہ مالی طور پر وہ خود کفیل تھیں۔

نہاتے نہاتے میں یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ نینی کا گھر چھوڑ دوں گا۔ بدن خشک کرتے ہوئے میں نے قدِ آدم آئینے سے پردہ ہٹایا تو میری داڑھی نظر آئی۔ بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر ریک سے شیونگ مشین اُٹھائی مگر فوری خیال کے تحت اسے واپس رکھ دیا۔ شیو بنا لینے کے بعد ہر وہ شخص بآسانی مجھے پہچان سکتا تھا جس نے بمبئی کے اخباروں میں میری تصویر بغور دیکھی ہوگی جبکہ یہ بدوضع داڑھی میرے لئے ایک آڑ تھی۔

میں نے کھدر کا لباس دوبارہ زیبِ تن کیا اور بال وغیرہ سنوار کر غسل خانے سے باہر آگیا۔ وہ بدستور مسہری پر دراز تھی اور خوابگاہ میں ہلکی سبز روشنی موجود تھی۔

"تم نے داڑھی نہیں بنائی؟" وہ مجھے دیکھتے ہی تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا اس حلیے میں بُرا لگتا ہوں؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وحشی لگتے ہو۔"

"عورتیں وحشی اور جنگلی مردوں کو پسند کرتی ہیں۔"

"ایسا ہی ہوتا تو ہند سے ساری عورتیں افریقہ کے جنگلوں میں بھاگ گئی ہوتیں۔"

"جب وہ یہیں افریقہ بنا لیتی ہیں تو بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور ہاں، یہ اس چھت کے نیچے میری پہلی اور آخری رات ہے نینی!" میں نے خوابناک لہجے میں کہا۔ "ہوسکے تو اسے یادگار بنالو۔"

"کہاں جاؤ گے تم؟" میری بات سنتے ہی اس کا نشہ ہرن ہوگیا۔

"بمبئی مجھے راس نہیں آئے گا۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔

"جہنم میں گیا بمبئی۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولی۔ "کیوں موڈ خراب کرتے ہو۔ یہ واہیات باتیں دن کے اجالے میں بھی ہوسکتی ہیں۔"

لذت و سرور کے ان لمحات میں اچانک میرے اعصاب سُن ہوکر رہ گئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے سوتے ہوئے میرے سر پر یکایک کوئی وزنی شہتیر آگرا ہو۔

میری نگاہیں اندھیرے میں بھٹکنے لگیں۔

"کہاں کھو گئے؟" نینی جھلا کر بولی۔

"یہ گھنٹی؟"

اور اسی وقت دوبارہ گھنٹی بجی اور نینی مجھے جھنجھوڑ کر بولی "ہونے دو، ہوگا کوئی رانگ نمبر، ٹیلیفون میں یہی مصیبت ہے۔"

مگر میں اس سے متفق نہ ہوسکا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی یکساں اور آسیبی انداز میں بجے جارہی تھی۔ وہ جو بھی تھا نینی کو جگا کر بات کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

مجھے متوجہ نہ پاکر نینی مایوسی اور جھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔ ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل کے نچلے خانے سے فون کا ریسیور اُٹھالیا۔

"ہیلو!" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں ماؤتھ پیس میں غرائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آواز میں حیرت سمٹ آئی "ارے تم... اس وقت..."

معاً مجھے خیال آیا کہ نینی کے باتھ روم میں بھی فون رکھا ہوا ہے شاید وہ بھی اسی کا ایکسٹینشن تھا۔ میں نے پھرتی سے بستر چھوڑ دیا اور باتھ روم میں جاکر دوسرے فون کا ریسیور اُٹھالیا۔

"تم کیا کررہی ہو؟" دوسری جانب سے ایک سرد اور قدرے کھردری مردانہ آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"سونے کی کوشش کررہی تھی جانی!" نینی کا لہجہ خوشامدانہ تھا مگر اس کی آواز اس کی مصروفیتوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کا سانس قدرے چڑھا ہوا تھا۔

"پھر فون اُٹھانے میں اتنی دیر کیوں لگی؟" مرد کا لہجہ سخت ہوگیا۔

"میں سمجھی تھی کوئی رانگ نمبر ہوگا۔ کوئی سرپھرا بدمعاش کافی دیر سے فون پر تنگ کررہا ہے۔ میں تو ریسیور ہی کریڈل سے نیچے رکھنے والی تھی۔" نینی نے برجستہ ایسا سفید جھوٹ بولا کہ میں دل ہی دل میں اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم تنہا ہو؟"

"ہاں... آں"۔ اس بار وہ سٹپٹا گئی۔ "تم کیسی باتیں کررہے ہو گپتا! اتنی رات گئے تمہیں کیا سوجھی ہے کھل کر بات کرو نا۔"

"واقعی تنہا ہو؟" مرد نے نینی کی بات نظر انداز کرکے دوبارہ سوال کیا۔

"ہاں بابا... تنہا ہوں۔ تم چاہو تو خود آکر دیکھ سکتے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے وہ چلا گیا۔" اس نے کہا۔

"کون؟" نینی کی آواز پُرتجسس تھی۔

"وہ آوارہ گرد جو گاڑی میں تمہارے ساتھ آیا تھا۔" مرد کا لہجہ بدستور تھا۔ "کون تھا وہ اور تم سے رخصت ہوکر کہاں گیا ہے؟"

مرد کا لہجہ توہین آمیز تھا۔ اس بار نینی برہم ہوگئی۔ "اپنا لہجہ درست کرو گپتا۔ ابھی ہم دونوں صرف دوست ہیں۔ اگر ابھی سے تمہارا یہ حال ہے کہ تم میرا پیچھا کرتے رہتے ہو تو شاید مجھے اپنے وعدے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ وہ ایک معذور بھکاری تھا۔ اگر میں نے گھر لاکر اس کی کچھ دیکھ بھال...

...کون سا ایسا قصور ہوگیا کہ تم رات کے دو بجے مجھے فون کررہے ہو۔"

"اس لئے کہ وہ ابھی تک تمہارے ساتھ موجود ہے۔" مرد کا لہجہ زہریلا...

"شٹ اپ!" نینی کسی شیرنی کی طرح غرائی اور ریسیور رکھ دیا۔

"الو کی پٹھی" میں نے ریسیور میں مرد کی بڑبڑاہٹ سنی۔ پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں آہستگی سے باتھ روم سے نکل آیا۔ نینی غصّے کے عالم میں مسہری پر دراز تھی اور سگریٹ سلگا رہی تھی۔

میں نے خوابگاہ میں روشنی کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کون تھا یہ؟"

"مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے... سامنے والی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔ پہلے بھی حرامزادہ ...چھپ لگا کر میری خوابگاہ میں جھانکتا رہتا تھا۔ میں جب بھی لباس تبدیل کرتی اس کا فون آتا اور وہ شاعری شروع کردیتا۔"

"تو تم پردے ہٹا کر لباس بدلتی ہو؟"

"نہیں، پہلے تو مجھے بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں سے مجھے ... اور اسے میرا فون نمبر کہاں سے معلوم ہوا۔ جب میں اس سے ...پر آمادہ ہوگئی تو اسی نے بتایا کہ وہ ایک روشندان سے میری ...گاہ میں جھانکتا رہتا تھا۔ وہ روشندان کبھی میری نظروں میں نہیں آیا مگر اس کے بعد میں نے اسے بند کرا دیا ہے۔" اس کے اشارے کے تعاقب میں ...نظریں اس روشندان پر گئیں جس کے شیشوں پر سیاہ رنگ کا دبیز پردہ ...پھیرا ہوا تھا۔

"تمہارا اسی کا راستہ بھی اسی رُخ پر ہے۔ شاید وہ شام ہی سے ...گھر کی نگرانی کررہا ہے۔ مجھے باہر نہ نکلتے دیکھ کر آخر اب وہ فون ...پر مجبور ہوگیا مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ایک شخص مجھے تمہارے ...ساتھ دیکھ چکا ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ لاپروایانہ انداز میں بولی مگر اس کے بشرے ...سے اُلجھن کا اظہار ہورہا تھا۔

"کون سے فلیٹ میں رہتا ہے وہ؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

اس نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کیا کروگے تم؟"

"اس کے درشن کروں گا۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "تم فلیٹ ...بتاؤ اس کا... اکیلا رہتا ہے نا؟"

"ہاں اکیلا ہی ہے۔" وہ بولی۔ "اسی لئے میں نے بھی اس میں دلچسپی ...ظاہر کی تھی۔ وہ خود کو بڑا آزاد خیال ظاہر کرتا تھا۔ میں نے سوچا شادی ...میں گھر بسانے میں آسانی رہے گی۔ اس کے مالی حالات بھی اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ جب ...پیسے گا تو لازماً مجھے ڈھیل دینے پر بھی مجبور ہوگا۔"

"تو تم اسے آڑ کے طور پر شوہر بنانا چاہتی تھیں۔" میں اپنا لباس ...پہنتے ہوئے بولا۔ "خیر تم فلیٹ نمبر تو بتاؤ اس کا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ ...نظروں میں کیسا ہے۔"

"سامنے شرما ہاؤس میں دوسری منزل پر گیارہ نمبر فلیٹ ہے اس کا، مگر اس وقت تمہارا اُدھر جانا مناسب نہیں۔ غصّے میں بات بڑھ جائے گی۔"

"وہ تمہارا پریمی نہیں معلوم ہوتا نینی!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ خراب مالی حالات میں کوئی اس علاقے میں رہائش کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کے فلیٹ میں تو فون بھی ہے۔ شاید اسے تمہارے مکان کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہے اور اس احمق نے اب اپنی شامت کو دعوت دی ہے۔"

"مگر کیوں؟" نینی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"اس لئے کہ وہ ہر قیمت پر مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ شاید انہیں موہوم سی اُمید رہی ہو کہ میں تمہاری طرف آنے کی کوشش کروں گا۔ اب مجھے پورا یقین ہے کہ اُوشا اور اس کے گھر کی بھی نگرانی جاری ہوگی۔ شاید وہ مجھے پہچان نہیں سکا ورنہ ابھی تک پولیس یہاں دھاوا بول چکی ہوتی۔"

"تم باہر نہ جاؤ۔" وہ کانپتی ہوئی میرے سینے سے آلگی۔ "ایسا نہ ہو کہ تمہیں نقصان پہنچ جائے۔ میں گاڑی میں چھپا کر تمہیں باہر نکال دوں گی۔"

"اب میرا یہاں رُکنا خطرناک ہے نینی!" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے ہی سے یہ اندیشہ تھا۔ اگر یہ فون نہ بھی آتا تو میں کل تمہارے گھر سے چلا جاتا۔ میں تم سے کہہ چکا تھا کہ اس چھت کے نیچے یہ میری آخری رات ہے۔ پتہ نہیں اس مردود نے کیا سوچ کر تمہیں فون کیا ہے۔ اگر قدرت مجھے موقع دے رہی ہے تو مجھے اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔"

"میرا دل لرز رہا ہے صفدر!" وہ میرا بازو تھام کر بولی۔

میں نے پیار سے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی عقبی راستہ بتاؤ کہ میں اس خبیث کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکوں۔"

"میرے مکان کی پچھلی دیوار پڑوسیوں کے احاطے سے ملی ہوئی ہے۔" صورتِ حال کی نزاکت محسوس کرکے وہ سراسیمہ نظر آنے لگی تھی۔ "پہلوؤں پر بھی مکان ہیں۔ تمہیں سامنے ہی سے جانا ہوگا۔"

"تم فکر نہ کرو میں پیچھے والوں کے احاطے سے نکل جاؤں گا۔ سامنے کے دروازے پر کوئی سایہ بھی نظر آیا تو گپتا ہوشیار ہوجائے گا۔" پھر میں نے فوری خیال کے تحت کہا۔ "میرے جانے کے بعد خوابگاہ میں یہ سبز روشنی رہنے دینا تاکہ وہ پردے کے پیچھے انعکاس دیکھ کر اسی غلط فہمی میں رہے کہ میں یہاں موجود ہوں اور تمہارے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوں۔"

لباس تبدیل کرکے وہ مجھے اپنے ہمراہ کچن میں لائی اور روشنی کئے بغیر عقبی کھڑکی کھول دی۔ تاریکی میں تھوڑی دُور سات فٹ بلند دیوار نظر آرہی تھی۔

"اب کب ملوگے صفدر؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ تاریکی میں اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

"بمبئی میں رہا تو کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔" میں نے اسے باہوں میں سمیٹ کر ________ کہا اور وہ یک بیک سسک کر رو پڑی۔

مگر نینی کے آنسو میرے قدموں کی زنجیر نہ بن سکے۔ میں سے روتا چھوڑ کر کچن کی کھڑکی سے تاریکی میں کود گیا۔ اور جب میں احاطے کی عقبی دیوار سے نیچے کود رہا تھا تو اس کا تاریک ہیولا کچن کی کھڑکی میں موجود تھا اور وہ مضطربانہ انداز میں فضا میں ہاتھ لہرا رہی تھی۔

میں آہستگی سے نیچے کود گیا۔ نرم اور ٹھنڈی گھاس پر قدم پڑتے ہی دھپ کی ہلکی سی آواز ہوئی۔ وہاں خاصی دور تک اندھیرے کا راج تھا۔ عمارت کے برآمدے میں ایک یرقان زدہ بلب جل رہا تھا۔ میں چند ثانیوں تک اسی جگہ بیٹھا کسی ردِ عمل کا منتظر رہا مگر وہاں ہر طرف بدستور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میں احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ احتیاط سے ایک طرف بڑھنے لگا حتیٰ کہ نکاسی کا راستہ میری نظروں میں آ گیا۔ آہنی پھاٹک بند تھا اور وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں کسی دقت یا رکاوٹ کے بغیر ذیلی کھڑکی کھول کر باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر آہنی پٹ یوں بند کر دیا کہ دور سے دیکھنے پر اس عمارت کے مکینوں کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ کوئی اس کھڑکی سے باہر گیا ہے۔

نینی کے بارے میں تو مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میرے بارے میں اپنی زبان بند رکھے گی مگر گپتا سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اسے مجھ پر شبہ ہو سکتا تھا کیونکہ نینی ایسی گری پڑی یا گئی گزری عورت نہیں تھی کہ اپنی ویران راتوں میں زندگی کے رنگ بھرنے کے لئے مفلوک الحال اور آوارہ گرد لوگوں کا سہارا لیتی پھرے۔ لہٰذا لازمی طور پر گپتا کو میری اصلیت پر شبہ ہو جاتا اور اگر وہ میرے اندازے کے مطابق کوئی سرکاری مخبر ہی تھا تو نینی سے کڑی بازپرس شروع ہو سکتی تھی اور وہ غیر مہذب ہندوستانی پولیس کے تشدد کے سامنے سچ اگلنے پر مجبور ہو جاتی۔ ایک بار بھی سرکاری اہلکاروں کو بھنک مل جاتی کہ میں بمبئی یا اس کے نواح میں موجود ہوں تو پورے وسائل کے ساتھ میرا گھیراؤ شروع کر دیا جاتا۔

ان پیچیدگیوں سے بچنے کی واحد صورت یہ تھی کہ میں گپتا سے فوری اور فیصلہ کن ملاقات کروں۔ میں مکانوں کے گرد ایک طویل چکر کاٹ کر اس سڑک پر آ گیا جو نینی کے خوبصورت بنگلے اور شرما ہاؤس کے درمیان واقع تھی۔ اس سڑک پر روشنی کا خاصا انتظام تھا اور ایک کھمبے کے ساتھ لگی ہوئی تختی پر ہندی میں سڑک کا نام لکھا ہوا تھا۔

شرما ہاؤس نامی عمارت مجھے دور ہی سے نظر آ گئی۔ زینوں کے اوپر انگریزی میں بڑے بڑے حروف میں عمارت کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے رک کر دوسری منزل پر نظر ڈالی مگر وہاں تمام کھڑکیوں کے پیچھے گہری تاریکی کا راج تھا اور ایسی ہی کسی تاریک کھڑکی کے پیچھے سے گپتا نینی کے مکان کی نگرانی کر رہا تھا۔

میں سڑک عبور کرنے کی نیت سے فٹ پاتھ سے اتر رہا تھا کہ اچانک شرما ہاؤس کے زینوں سے ایک دراز قد اور قوی الجثہ شخص اترتا نظر آیا۔ زینوں سے اتر کر وہ رکے بغیر سڑک عبور کرنے لگا۔ ... پُراعتماد انداز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھے چونکا ... اس کی نظروں میں آنے سے قبل پھرتی سے ایک تناور درخت ... میں ہو گیا جو سائے کے لئے فٹ پاتھ پر لگا ہوا تھا۔

وہ شخص سڑک عبور کر کے سیدھا نینی کے مکان کے سامنے ... چند ثانیوں بعد وہ احاطے میں غائب ہو گیا۔ شاید اس نے ہاتھ ... کھول لیا تھا۔

یک بیک میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ یقینی طور پر ... میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات تھی کہ میرا ناعاقبت اندیش شکار کمین گاہ سے باہر آ چکا تھا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا نینی کے مکان ... وہ دراز قامت سایہ روشن برآمدے میں کھڑا دروازہ کھلنے کا منتظر تھا ... پھاٹک میں بنی ہوئی جھری میں سے اس کی نگرانی کرنے لگا۔

چند ثانیوں بعد اندر سے نینی کے سوال کے جواب میں ... نام بتایا اور میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ گپتا ہی تھا۔ گو اس کا لہجہ دھیما تھا مگر رات کے سناٹے میں میں نے اس کی آواز واضح طور پر ...

اسی وقت سڑک پر کسی کار کے ہیڈ لیمپ کی روشنی چھا گئی ... پھرتی سے نینی کے احاطے کی دیوار کے ساتھ فٹ پاتھ پر اس طرح دراز ہو گیا کہ دیکھنے والا مجھے آوارہ گرد فقیر ہی سمجھے۔

"کیوں آئے ہو اس وقت یہاں؟" نینی کی دھیمی مگر برہم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"اب صبر نہیں ہوتا، یہ رات تمہارے ساتھ گزاروں گا۔" مردانہ آواز سنائی دی۔

نینی نے کچھ کہا مگر اسی وقت تیز رفتار کار قریب پہنچ گئی اور اس کے انجن کے شور میں میں کچھ بھی نہ سن سکا۔ کار گزر گئی تو میں نے پھر کان لگائے مگر وہاں سناٹا تھا۔ اٹھ کر اندر جھانکا تو وہاں برآمدہ ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں اندر جا چکے تھے۔

میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیا اور پھرتی سے اندر داخل ہو کر نینی کی کار کے برابر سے گزر کر میں برآمدے میں پہنچا اور کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اندرونی راہداری روشن ضرور تھی مگر ویران پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور مجھے اپنی خوش بختی پر رشک آنے لگا۔ نہیں نینی دروازہ بولٹ کرنا بھول گئی تھی یا اس نے دانستہ دروازہ کھلا رکھا تھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ میں گپتا کی خبر لوں گا۔ جب اس نے گپتا کو اپنے دروازے پر دیکھا تو سمجھ گئی ہو گی کہ میں بھی اس کے تعاقب میں کسی وقت بھی وہاں پہنچ سکتا ہوں اور اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

میں دروازہ کھول کر راہداری میں داخل ہو گیا۔

"کمال ہے، کہاں گیا وہ؟" اندر قدم رکھتے ہی میرے کانوں ... برہم آمیز آواز آئی۔ "وہ تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا تھا۔ آخر تمہیں اس میں کیا دلچسپی پیدا ... ہے؟" یہ نینی کی غصیلی آواز تھی۔

"مگر میں تو مسلسل کھڑکی میں بیٹھا رہا ہوں۔ وہ گیا کدھر سے؟"

"تمہاری بینائی کمزور ہو گئی ہے یا میں نے اسے سینے میں چھپا لیا ہے۔" ... کر بولی۔

"بینائی تو خیر ٹھیک ہے۔" اس بار گپتا کا لہجہ مکارانہ تھا۔ "ذرا سینے تک ... مجھے تو وہ بھیڑیا ہی خوش نصیب ہے کہ تمہارے سینے تک ..."

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم اتنے گھٹیا ذہن کے مالک ہو کہ فقیروں سے ... کرتے رہتے ہو۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔" نینی کا پارا بتدریج چڑھتا جا رہا تھا۔

"صبح ہونے والی ہے۔ اب جا کر کیا کروں گا۔"

"خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا۔" نینی اچانک غرائی۔ شاید گپتا اس پر دست درازی کر رہا تھا۔ "میں ابھی پورے محلے کو بیدار کر دوں گی۔"

"یہ مدن پورہ نہیں ہے، کوئی گھر سے نہیں نکلے گا۔ تم بڑے دنوں مجھے ترسا رہی ہو۔ آج میں ہرگز پیاسا نہ جاؤں گا۔"

"ادھر دیکھو!" میں نے اچانک ڈرائنگ روم میں آ کر سخت لہجے میں کہا۔ ... نینی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ نینی کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ ... انداز میں گر گئے اور وہ پھرتی سے ایڑیوں کے بل میری طرف گھوما۔ ... ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"صفدر!" نینی مسرت بھرے انداز میں بولی اور میری طرف دوڑ پڑی۔ ... کے منہ سے میرا نام سن کر گپتا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"تت... تم صفدر علی ہو؟" اس نے ہکلاتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"اب نینی کی حماقت سے تم میرا نام جان ہی گئے ہو تو یہ بھی سن لو ... میرے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی تاخیر کی تو بے موت مارے جاؤ گے۔ اپنے ... دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اس نے بے چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کی۔ وہ مجھے یوں حیرت سے گھور رہا تھا جیسے میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں۔

"تم لباس تبدیل کر لو۔" میں نے نینی کے سلیپنگ سوٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ہم باہر چلیں گے۔"

"ابھی؟" اس نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اسی وقت۔"

نینا خاموشی سے اپنی خوابگاہ میں چلی گئی اور میں صوفے پر دراز ہو گیا۔ ... دونوں ہاتھ اٹھائے ہکا بکا کھڑا ہوا تھا۔

"تمہاری اصلیت کیا ہے؟" میں نے روز یلا سے حاصل کیا ہوا ریوالور ... گپتا سے سرد اور تحکمانہ لہجے میں پہلا سوال کیا۔

"میں نینی کا دوست ہوں۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"دوست یا عاشق ساری ساری رات گھر کی نگرانی نہیں کرتے۔ یہ سرکاری کتوں کا کام ہوتا ہے۔" میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے نگرانی پر مامور کیا ہے؟"

"میں نینی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔" وہ بوکھلا کر بولا۔

"تو اس وقت منہ کالا کرنے کیوں آئے تھے؟"

"نینی کی خوابگاہ میں بار بار روشنی جلتی بجھتی دیکھ کر میرے دل میں کھوٹ آ گیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے اور ان ہی خیالات نے مجھے بھی بہکا دیا۔"

"اگر تم نے نینی کی واپسی تک اپنی اصلیت نہ بتائی تو میں تمہیں کتے کی موت ماروں گا۔" میں نے سرد لہجے میں اس کو آگاہ کیا۔ "تمہاری زندگی کا دارومدار تمہاری زبان پر ہے۔"

اس کے چہرے سے شدید اندرونی کشمکش کا اظہار ہونے لگا۔ وہ بے چینی سے بار بار پہلو بدلنے لگا۔ پھر اچانک ہی بولنے لگا۔ "میں انڈین سیکرٹ سروس کا انفارمر ہوں۔"

"نینی کے پیچھے کیوں لگائے گئے تھے؟"

"مجھے تمہاری کئی تصاویر دی گئی تھیں اور یہ ہدایت تھی کہ جیسے ہی تمہیں یہاں دیکھوں اپنے کو نٹیکٹ کو فوراً مطلع کر دوں۔"

"تو آج تم نے اسے خبر دی؟"

"نہیں، اس حلیے میں میں تمہیں پہچان ہی نہیں سکا۔ اگر اب بھی نینی تمہارا نام نہ لیتی تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا کہ تم صفدر علی ہو۔"

"تو آج تم نے کسی کو کوئی رپورٹ نہیں دی؟"

"نہیں۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

اسی وقت نینی نیلے رنگ کی جینز اور جیکٹ پہن کر آ گئی۔ میری ہدایت پر اس نے پوری احتیاط سے گپتا کی تلاشی لی مگر اس کے پاس چاقو کے سوا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

پھر میں گپتا کو لیکر نینی کی کار کی عقبی سیٹ پر اس طرح پھیل کر بیٹھ گیا کہ کھڑکی میں سے میرا یا گپتا کا دیکھا جانا ممکن نہ رہے اور نینی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

کار باہر نکال کر نینی نے پھاٹک مقفل کیا اور دوبارہ اپنی سیٹ پر آ گئی۔ "کہاں چلنا ہے؟"

"کسی ویران اور غیر آباد علاقے میں۔" میں نے کہا۔

"وہاں... وہاں کیوں لے جا رہے ہو مجھے؟" گپتا خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "میں نے تمہیں ہر بات سچ سچ بتا دی ہے۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ابھی تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" میں نے نینی کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں سیکرٹ سروس والوں کو تمہارے ذریعے ایسی چوٹ دینا چاہتا ہوں کہ وہ آئندہ کے لئے میرا خیال ترک کر دیں۔"

"گاڑی روکو — جو تم کہو گے میں ماننے کے لئے تیار ہوں — میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"نینی کا نیتا دکھاؤں گا تم کو۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اب خاموش بیٹھے رہو۔ اگر بکواس جاری رکھی تو مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔"

"بھگوان کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نینی کو اپنی بہن سمجھوں گا۔ صرف اس بار مجھے معاف کر دو۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"میرے ناجائز سالے کہلاؤ گے۔" میں اس رشتے کا تصور کر کے دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ "اب بکواس بند کرو ورنہ تمہاری بہن گاڑی لڑا دے گی۔"

کچھ دیر بعد نینی نے ایک ویرانے میں گاڑی روک دی۔ میں نیچے اُتر آیا اور گپتا کو بھی اپنی ہی جانب سے نیچے آنے کا حکم دیا۔ جونہی اس نے گاڑی کے دروازے سے سر باہر نکالا، میں نے پوری قوت سے ریوالور کا آہنی دستہ اس کی کنپٹی پر رسید کیا اور وہ کراہ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا آدھا دھڑ پائیدان سے باہر جھولنے لگا۔ میں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے باہر گھسیٹ لیا۔

"تم نے مار دیا اسے؟" نینی خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"فکر نہ کرو، وہ زندہ ہے۔ بس بے ہوش ہو گیا ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اب تم واپس جاؤ۔ یہ یاد رکھنا کہ آج تم نہ مجھ سے ملی ہو نہ تم نے گپتا کو دیکھا ہے۔ اگر اس وقت کسی نے تمہیں گاڑی چلاتے دیکھا بھی ہو گا تو اسے پچھلی سیٹ پر کچھ نظر نہ آیا ہو گا۔ واپسی میں تم کسی میڈیکل اسٹور سے چند خواب آور گولیاں خرید لینا اور گھر جا کر وہ کھا کر سو جانا۔ اگر کسی مرحلے پر بازپرس کی نوبت آ جائے تو تم کہہ سکتی ہو کہ اعصابی ہیجان کے باعث تمہیں نیند نہیں آ رہی تھی لہٰذا تم دوا خریدنے نکلیں اور واپس آ کر سو گئیں۔"

"تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اس وقت گاڑی بھی نہ چلا سکوں گی۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میں اس خبیث سے کچھ اور معلومات حاصل کروں گا پھر اسے چھوڑ دوں گا مگر یہ خود سیکرٹ سروس والوں کی طرف رُخ نہ کر سکے گا۔ وہ غداری کی کڑی سزا دیتے ہیں۔ میں نے تمہیں محض اس لئے ترکیب بتائی ہے کہ کہیں گپتا کی رُوپوشی کے سلسلے میں تمہیں پریشان نہ کیا جائے۔"

"وعدہ کرو کہ تم اسے ہلاک نہیں کرو گے۔" وہ بے اعتباری کے عالم میں بولی۔

"احمق ہو گیا ہے؟" میں نے ہنس کر اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "مجھے کیا ضرورت ہے جو بلاوجہ اس بے چارے کا خون کر دوں۔ اس نے تو خود ہی گھبرا کر ہر بات اُگل دی ہے۔"

میری اس گفتگو سے نینی کی دہشت قدرے کم ہوئی اور وہ میرے سینے سے آ لگی۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئی تو اس کے اعصاب اعتدال پر آ چکے تھے اور لبوں پر آسودہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ — مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ کوئی حادثہ کئے بغیر میرے منصوبے کے مطابق ... پہنچ جائے گی۔

جب اس کی کار کی عقبی سُرخ روشنیاں بہت دُور اندھیرے میں ... ہو گئیں تو میں نے قرب و جوار کا جائزہ لینا شروع کیا اور کافی ... ایک مناسب جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گپتا اتنا وزنی ... لئے اسے ہاتھوں پر اُٹھا کر لے جانا مشکل تھا جبکہ زمین پر گھسیٹنے ... مشکوک نشانات بن جاتے لہٰذا مجھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار ...

تیسری سگریٹ کے خاتمے پر اس کے جسم نے حرکت کی ... اسے بغلوں میں سہارا دے کر قدموں پر کھڑا کر دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ... ساتھ ہو لیا۔

ایک ٹیلے پر پہنچ کر میں نے اچانک اسے دھکا دے دیا ... سے خوفزدہ چیخیں نکالتا تیزی سے ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ ... پہنچنے سے قبل اس کی آوازیں دم توڑ چکی تھیں۔

میں نے نیچے اُتر کر اس کا جائزہ لیا تو وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا سارا بدن زخمی ہو گیا تھا اور گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

میں اسے اسی حال میں چھوڑ کر وہاں سے واپس ہو لیا۔ ... موجودگی کا ایک گواہ مر چکا تھا اور دوسرے سے مجھے رازداری کی ... دراصل میرے ہاتھوں گپتا کی موت کی بیشتر ذمے داری نینی پر ... جاتی تھی۔ اس نے گپتا کے سامنے میرا اصل نام لے کر اس کا قتل میرے لئے ناگزیر بنا دیا تھا۔ اس سے پیشتر گپتا کو مجھ پر شبہ ضرور تھا مگر وہ ... دیکھنے کے باوجود مجھ پر صفدر علی ہونے کا شبہ نہیں کر سکا تھا ... زیادہ رقابت کے جذبے نے میرے خلاف بھڑکایا ہوا تھا۔ اگر وہ نینی پر ڈورے نہ ڈال رہا ہوتا تو شاید میری طرف اتنی توجہ بھی نہ دیتا۔

نینی کے باعث میرے ہاتھوں یہ دوسرا قتل تھا۔ وہ خوبرو ... نرم خُو برہمن زادی میری خواہش کے برعکس غیر محسوس طریقے پر میرے لئے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی مگر اس بار میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر وہ ... سامنے آ گئی تو میں ہر قیمت پر اس سے بچ نکلنے کی کوشش کروں گا ... قریب آ کر وہ میرے ذہن پر اپنے شباب اور اداؤں کا ایسا سحر طاری کر دیتی تھی کہ اسے کسی اور کی آغوش میں دیکھنے کا تصور بھی خون کو کھولا دیتا تھا۔ میرے لئے یہی بہتر تھا کہ اس سے گریز کروں ورنہ میرے ہاتھوں ناگہانی مارے جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

اس رات کا باقی ماندہ حصہ میں نے ایک مندر کی سیڑھیوں پر ... گزارا اور دن نکلتے ہی بے مقصد ایک طرف ہو لیا۔ اب مسئلہ یہ ... جیب میں بہت معمولی رقم موجود تھی اور ابھی مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا ... میں کب تک بمبئی میں بھٹکتا رہوں گا۔

دوپہر سے ذرا پہلے میں گودی کے علاقے میں جا نکلا۔ میرا خیال تھا ... مجھے وہاں مزدوروں کی بھیڑ میں جگہ مل سکے گی۔ دو چار روز وہاں مزدوری ...

... کے بعد میں ہندوستان سے فرار کی کوئی راہ نکال سکتا تھا۔ بہترین طریقہ ... جگہ میں سامان لادتے یا اتارتے ہوئے کسی جہاز کے گودام میں چھپ جاتا۔ جب وہ کسی دوسری بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتا تو میں وہاں پوشیدہ طریقے سے نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

باہر گودی کے سنگین پھاٹک کے باہر بوسیدہ لباس میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے مزدور بے چینی سے قطار بند تھے۔ میں بھی خاموشی سے قطار کے آخر میں دیوار سے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

میرے آس پاس قطار میں جو مزدور موجود تھے ان کی زبان میرے لئے ناقابلِ فہم تھی۔ وہ ایک دوسرے سے مسلسل باتیں کئے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار ان میں ہلچل بھی پیدا ہوتی، بلند آہنگ قہقہے اور شور سنائی دیتا اور پھر پتہ چلتا کہ دو چار مزدور آپس میں فحش اور عملی مذاق پر تلے ہوئے ہیں اور دوسرے مزدور چیخ چیخ کر ان کی حرکتوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگتے۔

"خوچہ تم روتی کیوں ہے؟" اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔ آواز کرخت مگر لہجہ محبت آمیز تھا۔

میں نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک تنومند پٹھان تھا۔ اس کے سُرخ و سفید چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں موجود تھیں۔ پسینوں میں بھیگی ہوئی قمیض میں سے اس کا مشقت کا عادی کسرتی بدن نظر آ رہا تھا۔ لیکن بھاری جسم اور بارعب چہرے کے باوجود اس کی آنکھوں میں ملائمت موجود تھی۔

"میں رو تو نہیں رہا ہوں خان صاحب!" میں نے مُسکرا کر کہا۔

"خوچہ تم بلبل کا موافق خاموش بیٹھی ہے، ہم تم کو دو گھنٹے سے دیکھتا ہے!" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "تم ادھر نیا معلوم ہوتی ہے۔"

خان صاحب نے جس طرح میری جنس تبدیل کی اُس پر میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ "بمبئی میں نیا ہی ہوں۔ پیسہ کمانے آیا ہوں۔"

وہ میرے قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنے مقدر کو ایک موٹی گالی دے کر بولا "ہم بھی ادھر پیسہ کمانے آئی تھی۔ ابھی پیاز اور روٹی کھاتی ہے تو ڈھائی سو روپیہ گھر بھیجتی ہے۔ ادھر کام بھی روز نہیں ملتا۔ یہ قطار کیسی ہے؟"

"ہم کو معلوم نہیں۔ یہ خانہ خراب لوگ کب ادھر آتی ہے ہم فجر پڑھ کے آتا ہے تو ادھر دو ہزار آدمی ہوتی ہے۔ فجر میں زیادہ مزدور رہ جاتی ہے۔ تو کبھو باری آتا ہے یا واپس جانا پڑے گا۔" آخری فقرہ اس نے بڑی ... لے ادا کیا تھا۔

"تم صبح سے آیا ہے پھر آنا پیچھے کیسے ہو گیا؟"

"خوچہ ہم روٹی کھانے گئی تھی۔" وہ میرے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "... یہ خانہ خراب لوگ شور مچاتی ہے کہ پیچھے جاؤ۔ ابھی ہم تم سے بہت ... ہے۔"

"تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔"

اُس نے دزدیدہ نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پتھر سمیت آہستگی سے قطار میں میرے آگے سرک آیا۔ جب کسی نے اس کی حرکت پر توجہ نہ دی تو وہ خوش ہو گیا اور دانت نکال کر بولا "ابھی ہمارا باری جلدی آئے گا۔ خوچہ تم کسی شریف کا اولاد معلوم ہوتی ہے۔"

پھر وہ اپنی جیب میں نسوار کی پڑیا تلاش کرنے لگا۔ اسی دوران اس کی جیب سے ایک کارڈ باہر گرا جس پر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی اور بندرگاہ کے کسی ادارے کا نام بھی چھپا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اس سے پُوچھا۔

"یہ اندر جانے کا چھٹی ہے۔" وہ کارڈ جیب میں رکھ کر پڑیا سے نسوار کی چٹکی نکالتے ہوئے بولا "تمہارے پاس یہ چھٹی نہیں ہے؟"

میں نے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"تو ادھر کیا کرتی ہے؟" خان صاحب محبت آمیز انداز میں مجھ پر برس پڑے اور ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "اُس کھڑکی پر یہ چھٹی صبح چھ بجے سے آٹھ بجے تک بنتا ہے۔ دو فوٹو اور منشی کو ایک روپیہ رشوت دو تو سارا کام ہو جاتی ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی تم کو گودی میں گھسنے نہیں دے گی۔"

اس وقت قطار میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ شاید دوسری شفٹ کے لئے مزدور ڈیوٹی پر لئے جا رہے تھے۔

وہ قطار میں آگے جگہ مل جانے پر بہت خُوش تھا۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ میں اگر رات کے دس بجے اُسے وہیں ملوں تو وہ اپنے ڈیرے پر مجھے کھانا کھلائے گا اور صبح سویرے میرے لئے گودی میں کام کرنے کا اجازت نامہ بھی بنوا دے گا۔

میں مایوسانہ انداز میں قطار سے الگ ہو گیا۔

رات دس بجے تک میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مجھے امید تھی کہ شاید میں غیر قانونی نکاسی کی کوئی راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس سادہ لوح پٹھان سے دوستی کروں گا تاکہ کام بننے تک سونے کا ٹھکانہ مل سکے۔ اس بھرے شہر میں وہ شخص فرشتے کے رُوپ میں مجھ سے ٹکرایا تھا اور اس کی پیش کش سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت کے مترادف تھا۔

وہ مزدوروں کی بھیڑ میں ساڑھے دس بجے پسینوں میں نہایا ہُوا گودی کے پھاٹک سے باہر آیا اور والہانہ انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

"اوئے خوچہ جان! آج ہم نے پورا آٹھ روپیہ کمایا ہے۔ ابھی ہم تم کو روٹی کباب کھلائے گی۔"

اس کا نام شاہ گل تھا اور وہ واقعی بڑا سادہ دل انسان تھا۔ اُس کی رہائش مدن پورے کی غلیظ اور کچی آبادی میں تھی، جہاں مچھروں، کھٹملوں اور انسانوں کی آبادی میں توازن برقرار رکھا گیا تھا۔ اُبلتے ہوئے گٹر، متعفن

نالیاں اور کچی گلیاں وہاں کے باسیوں کے لئے کسی زحمت کا باعث نہیں تھیں۔ وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔

شاہ گل مجھے فارس روڈ کے علاقے میں ایک سستے سے ہوٹل میں لے گیا۔ یہ بمبئی کے خوش نما چہرے کا بدترین ناسور تھا۔ جہاں پورے ملک کی غلاظت جمع تھی۔ علاقے میں ٹراموں کا شور دم توڑ چکا تھا۔ لکڑی اور کوئلے کے گودام بند پڑے تھے مگر بالا خانوں سے ساز اور آواز کا رسیلا آہنگ گونج رہا تھا۔ دروازوں پر سرکنڈوں کی چٹائیاں پڑی ہوئی تھیں اور چکا چوند روشنی میں چاندنی، گاؤ تکیے کے فرش پر جوان اور ادھیڑ عمر رقاصائیں ناچتی نظر آرہی تھیں۔ غلیظ فٹ پاتھوں سے گزرنے والے، ہر دروازے کے سامنے رک کر چند لمحوں تک ندیدی نظروں سے ناچنے والیوں کے دعوت آمیز اشاروں کا نظارہ کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ہوٹلوں میں اس وقت بھی خاصا رش تھا۔ قدم قدم پر دلال گھوم رہے تھے جو ہر راہ گیر کے کان کے پیچھے معنی خیز فقروں میں مال کی خوبیاں جتاتے۔ پھر کسی تاریک گوشے میں سرگوشیاں ہوتیں اور دام طے ہوتے ہی گاہک کسی چق کے پیچھے غائب ہو جاتا۔

چق کے عقب میں طبلہ سارنگی کی آواز فوراً معدوم ہو جاتی اور وہاں اندھیرا پھیل جاتا۔ ہار فروش لڑکے ہاتھوں میں موتیا، چنبیلی اور گلاب کے ہار لئے آوازیں لگاتے پھرتے تھے۔ کہیں کہیں فٹ پاتھ پر کوک شاستر اور ننگی تصویریں بیچنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گرد بھی شوقین لوگوں کا ہجوم تھا جو ہندی، چینی، امریکی، یونانی عورتوں کی تصویریں یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں ان چہروں کو زندہ کر کے چبا جائے گا۔

شاہ گل کھانے کا آرڈر دے کر بے نیازی سے اپنا خالی پیٹ سہلانے لگا۔ میں بڑی دلچسپی سے فٹ پاتھ پر ہونے والے رنگ رنگ کے تماشے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہوٹل ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع تھا جہاں چولھوں اور پتیلیوں کے بعد بمشکل اتنی جگہ رہ گئی تھی کہ ہوٹل کا پست قامت چینی وہاں بیٹھ سکے۔ اسی لئے ساری میزیں وغیرہ فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی تھیں اور سر پر بوسیدہ ٹاٹ کا پردہ تنا ہوا تھا۔

شاہ گل نے بڑی رغبت سے اور میں نے بڑی بے چارگی سے کھانا ختم کیا۔ اس دوران مجھے کئی بار مینی کا گھر اور کچن یاد آیا جہاں میں نے بڑی نفاست سے پچھلی رات کا کھانا کھایا تھا۔

کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو بیک وقت کئی دلال ہماری طرف لپکے۔ اُن میں سے ایک کسی سردارنی کا نمائندہ تھا جو مجھے نظر انداز کر کے پوری طرح شاہ گل کی طرف متوجہ تھا اور اسے محض تین روپے میں حسینۂ امرتسر کی آغوش سے بار یاب ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس نے چند ہی سیکنڈ میں شاہ گل کے سامنے اس سردارنی کے سراپا کی تعریف بیان کر ڈالی، جو شاہ گل کی طرح دراز قد اور توانا تھی۔ دوسرا مجھے ایک بنگالن سے ملوانے پر مُصر تھا جو بقول اس کے پھولوں کی طرح نازک اور چاندنی سے زیادہ حسین تھی۔ دام اس کے بھی وہی تھے۔

فارس روڈ سے نکلتے نکلتے کم از کم پندرہ بیس دلالوں نے ہم پر یلغار کی۔ شاہ گل نے سب کو باری باری دھتکار دیا۔ زندہ گوشت کے اس عظیم بازار بلکہ منڈی سے باہر آکر شاہ گل نے ایک طویل سانس لیا۔

"کیا بات ہے شاہ گل، بڑی ٹھنڈی سانس لے رہے ہو؟" میں نے اسے معنی خیز انداز میں چھیڑا۔

"یہ خدائی خوار لوگ دل خراب کر دیتے ہیں۔" وہ منہ چلاتے ہوئے بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا جیسے امرتسر کا سردارنی ہمارے سامنے آگیا ہو۔"

"تو تین روپے خرچ کر دیئے ہوتے۔" میں ہنس کر بولا۔

"جب ہم بمبئی آیا تو ہمارا بی بی نے قسم دیا تھا کہ ہم کسی سے دوستی نہیں کرے گا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔ "ابھی بولو ہم کیا کرے؟"

"اگر تم قسم کے چکر میں پڑے رہے تو ایک روز پھولتے پھولتے پھٹ جاؤ گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا

میری توقع کے برعکس وہ زور سے ہنس پڑا۔ "ہم نہیں پھٹتا خانا۔ ہم بھی بڑی چالاک ہے۔"

"کیا چالاک ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں بتائے گی۔" وہ زور زور سے سر ہلا کر بولا۔ "ہرگز نہیں بتائے گی۔"

اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا میں اس کی جھونپڑی پر پہنچا تو وہاں ایک صندوق اور بان کی ایک بوسیدہ چارپائی کے علاوہ صرف ایک لوٹا اور گلاس موجود تھا۔

"اس جھونپڑی میں ہم دونوں کیسے سوئیں گے شاہ گل؟" میں نے جھونپڑی کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم، چارپائی پر سوئے گی۔"

"مگر وہ تو تمہارے لئے بھی کم ہے، میرے لئے جگہ کہاں سے آئے گی؟"

"تم فکر مت کرو، ہم زمین پر سو جائے گی۔" وہ زور سے میرے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔

اور ہوا بھی یہی۔ شاہ گل مفلوک الحال ضرور تھا مگر دل کا غنی تھا۔ چارپائی میرے حوالے کر کے سیلی زمین پر دراز ہوا اور تھوڑی دیر بعد جھونپڑی اس کے خراٹوں سے گونجنے لگی۔

میں کافی دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا مگر کب تک؟ نیند پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے لہٰذا میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح منہ اندھیرے ہم پھر گودی پہنچ گئے۔ شاہ گل مزدوروں کی قطار میں لگ گیا اور میں اجازت نامہ حاصل کرنے والوں کی بھیڑ میں پہنچ گیا۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ تصویروں کے بغیر کارڈ ملنا محال ہے، لہٰذا میں چپکے سے الگ ہو گیا۔ میں یہاں تصویر دے کر مزید کسی دشواری میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

نو بجے کے قریب میں گودی کے احاطے کی دیوار میں ہی داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر بنے ہوئے کوڑا گھر کی وہ کھڑکی سے ملی ہوئی تھی اور کوڑا گھر بُری طرح بھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں لاپروائی کے سے انداز میں وہیں گشت کرنے لگا۔

داخلی راستوں پر سخت پہرے اور دیوار پر خاردار تاروں کی اونچی باڑھ کے باعث میں وہ راستے اختیار کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کوڑے گھر کی کھڑکی میری واحد اُمید تھی۔

گیارہ بجے کچرا اٹھانے والی سرکاری گاڑی وہاں آئی اور تھوڑی دیر میں کوڑا گھر خالی کر کے واپس چلی گئی۔

اس وقت وہاں چند ٹرک اس طرح کھڑے تھے کہ میں راگیروں کی بڑی تعداد کی نظروں سے محفوظ رہ کر اپنی کارروائی کر سکتا تھا۔ میں کھڑکی کے قریب دیوار کے سہارے اس طرح بیٹھ گیا جیسے بے شمار بے روزگار بیٹھے ہوں مگر میری نگاہیں گردوپیش پر مامور تھیں۔

ایک بار جوں ہی میدان صاف ہوا، میں پھرتی سے کھڑکی میں کود گیا اور ایک بغلی دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ وہاں بدبو سے دماغ کی رگیں پھٹی جا رہی تھیں۔

وہ بغیر چھت کا کوڑے گھر تھا جو چند بڑی بڑی عمارتوں کے عقب میں تھا۔ شاید نگہبانوں کو توقع بھی نہیں رہی ہوگی کہ کوئی اس طرف سے احاطے میں داخل ہو سکتا ہے، لہٰذا وہاں کوئی نگران موجود نہیں تھا۔ میں اطمینان کے ساتھ کوڑا گھر سے باہر نکل آیا۔

انتہائی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر مزدوروں کی بھیڑ میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں مل جانے کے بعد کوئی میری طرف مشکوک نظروں سے نہیں دیکھے گا۔

کرینوں کے شور، مزدوروں کی بھاگ دوڑ اور ٹرکوں کی آمد و رفت نے ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا جیسے کسی خاص کام پر مامور ہوں اور جلد ہی کسی جگہ پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں پہلے ہی اس سمت کا تعین کر چکا تھا جہاں برتھ پر جہاز لنگر انداز تھا۔ جب میں نے وہاں اپنا کافی وقت صرف کیا تو پتہ چلا کہ میرا کسی جہاز پر پہنچنا ناممکنات میں سے ہے۔

جہاز پر کام کرنے والے مزدوروں کی نگرانی ایک سپروائزر کر رہا تھا۔ سپروائزر کے مزدوروں کے شانوں پر شناختی نمبر لگا ہوا تھا۔ اس نمبر کے بغیر کوئی شخص جہاز کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ دو بجے جب پہلی شفٹ ختم ہونے کا سائرن بجا تو مزدوروں کی ٹولیاں کام چھوڑ کر اپنے اپنے سپروائزر کے گرد جمع ہونے لگیں جو باری باری ان کے نام پکار کر نمبر کے ٹوکن واپس لے رہے تھے۔ دوسری شفٹ کے مزدوروں نے تیزی سے اپنی جگہ پہنچنا شروع کر دیا۔

نگرانی کا یہ نظام اتنا معقول تھا کہ میں مزدور کی حیثیت سے کارڈ بنوانے کی کوشش کرتا اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتا تو میرا جہاز پر پہنچنا محال تھا۔ شفٹ ختم ہوتے ہی سپروائزر کو میری گمشدگی کا علم ہو جاتا اور فوری طور پر اس مخصوص جہاز کے چپے چپے کی تلاشی شروع ہو جاتی۔

ان مایوس کن معلومات کے باوجود میں وہیں رکا رہا۔ میں نے اس امکان کا بھی جائزہ لیا کہ میں رات کے وقت محافظوں کی نظریں بچا کر کسی ایسے چوبی کریٹ وغیرہ میں چھپ جاؤں جسے اگلے روز لادا جانا ہو۔ مگر میں نے یہ ارادہ فوراً ہی ترک کر دیا۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ مزدور اور خلاصی نہایت بے دردی کے ساتھ سامان کے گرد فولادی رسّے لگاتے تھے اور پھر کئی بار ایسا ہوا کہ کرین آپریٹر نے انہیں نہایت لاپروائی سے ادھر اُدھر پھینک دیا۔ اس کوشش میں قوی امکانات اس بات کے تھے کہ جہاز کے گودام تک پہنچنے سے قبل ہی میری پسلیاں ٹوٹ جاتیں یا میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی جب کہ مجھے ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت پسند نہیں تھی۔

رات کے دس بجے جب دوسری شفٹ ختم ہوئی تو میں مزدوروں کے ہجوم کے ساتھ بندرگاہ سے نکل آیا۔

اس رات میں نے شاہ گل کے یہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میری جیب میں کل تو تین روپے رہ گئے تھے اور مجھے اپنی خاصی ضروریات کا بندوبست کرنا تھا۔

میں پیٹ کا جہنم سرد کرنے کے لئے ایک سستے سے ہوٹل میں پہنچا تو میری نظر ایک اُردو اخبار پر پڑی۔ میں نے فوراً ہی اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اخبار میں کہیں بھی گیتا یا مینی کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی البتہ درمیانی صفحے پر میری نگاہیں ایک اشتہار پر مرکوز ہو گئیں۔

وہ بمبئی کی کسی فرم کی جانب سے مشرق وسطیٰ کے لئے بھاری تعداد میں مزدوروں کی بھرتی کا اشتہار تھا۔ اس میں کرین آپریٹر، راج، مستری، مکینک اور ڈرائیور سے لے کر قلیوں تک کی فہرست موجود تھی۔ میں نے تفصیل سے اس اشتہار کا معائنہ شروع کر دیا۔

اشتہار کے مطابق مشرق وسطیٰ کے ایک ملک میں ان افراد کی فوری ضرورت تھی۔ مناسب امیدواروں کو تجربے وغیرہ کی اسناد کے ساتھ تیسرے روز ایک پتے پر طلب کیا گیا تھا۔

میں نے وہ رات نقب زنی کی دو چھوٹی چھوٹی وارداتوں میں گزاری اور میری جیبوں میں ڈھائی ہزار روپیہ آگیا جو میری بہت سی ضروریات کے لئے کافی تھا۔

مقررہ دن میں اخبار میں دیئے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ ایک پرانی سی عمارت کی نچلی منزل میں دو کمروں پر مشتمل دفتر تھا جس کے باہر سینکڑوں افراد کی بھیڑ موجود تھی جس نے مجھے خاصا مایوس کیا۔ میرا خیال تھا کہ میں وہاں فرصت سے اپنا مسئلہ پیش کر سکوں گا مگر فرصت تو درکنار وہاں باری آنی بھی محال نظر آتی تھی۔

دس بجے کے قریب ایک مدقوق سا کلرک ایک کمرے سے باہر نکلا۔

اس کے ہاتھ میں سائیکلو اسٹائیل کئے ہوئے فارموں کا ایک پلندہ تھا۔ اس نے کھڑکی کے پیچھے اپنی کرسی سنبھالی اور ہر اُمیدوار سے رجسٹریشن فیس کے نام پر بیس روپے اینٹھ کر وہ فارم بانٹنے لگا۔ میں اس حرکت سے سمجھ گیا کہ یہ سب لوٹنے کا دھندا ہے۔ لیکن میرے لئے ایسے ہی لوگ کارآمد ہو سکتے تھے۔ لہٰذا میں نے بھی فارم خرید لیا۔

وہاں آنے والوں میں بیشتر لوگ جاہل تھے جو ایک روپیہ فی کس دے کر اُسی دفتر کی ایک مدراسی لڑکی سے فارم بھروا رہے تھے۔ میں نے اپنا فارم پُر کر کے فوراً جمع کرا دیا، اور اس کے نتیجے میں جلد ہی میری باری آگئی۔ میں نے فارم میں اپنا نام اجمل خاں لکھا تھا۔

اندر کمرے میں ایک میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر چالاک شخص موجود تھا۔ اس نے عینک کے موٹے موٹے عدسوں کے پیچھے سے میری طرف دیکھا۔ اور نام پوچھا: "اجمل خاں؟"

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں اطمینان سے بیٹھ گیا تو وہ بولا۔ "کچھ پیسے ویسے بھی خرچ کر سکتے ہو یا کیس یوں ہی منہ اُٹھا کر چلے آئے ہو؟"

"پیسے؟ کتنے پیسے خرچ ہوں گے۔" میں نے پُوچھا۔

"دو ہزار کرایہ ہے اور چار پانچ سو اُوپر خرچ ہوں گے جتنی جلدی ڈھائی ہزار جمع کرا دوگے اتنی ہی جلدی کام بن جائے گا۔ پاسپورٹ ہے نا؟"

"رقم تو میں دے دوں گا مگر پاسپورٹ نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے آہستہ سے کہا "اس چکر میں پڑا تو کافی دن لگ جائیں گے۔"

"تم رقم جمع کرا دو، میں کوشش کروں گا۔" وہ میرے فارم پر کچھ لکھتے ہوئے بولا "تمہارا نمبر بیاسی ہے۔ بس یاد رکھنا، کام نہ ہوا تو پندرہ دن میں پیسے واپس مل جائیں گے۔"

"کیا پاسپورٹ کے بغیر میں جا سکوں گا؟" میں نے حیرت کے ساتھ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"کوشش کریں گے۔" وہ بیزاری کے ساتھ بولا۔

"اور رقم بھی اتنی ہی خرچ ہو گی؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پُوچھا۔

"پاسپورٹ والے ہوائی جہاز سے جائیں گے اور تمہیں لانچ سے جانا ہو گا۔ اب جاؤ یہاں سے، مجھے دوسروں کا بھی انٹرویو لینا ہے۔ بس کل رقم جمع کرا دو۔" وہ مشینی انداز میں جلدی جلدی بولا۔

میرے لئے حالات کا یہ رُخ حیرت ناک اور مسرت آمیز تھا۔ وہاں فنی سوال جواب کے بجائے محض اُمیدوار کی جیب ٹٹولی جاتی تھی اور یہ خاصا مناسب طریقہ تھا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ انسانوں کی اسمگلنگ کرنے والے ادارے بمبئی میں یوں کھلے بندوں کام کرتے ہوں گے۔

"رقم ابھی دے دوں؟" میں نے پُوچھا "دو چار سو کم ہوں گے۔"

"تو منہ کیا دیکھ رہے، نکالو جلدی سے۔ بلاوجہ میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

میں نے دو ہزار تین سو روپے اُس کے حوالے کر دیئے۔ اس نے رقم گن کر فارم پر ایک بار پھر کچھ لکھا، اور دوسرے فارموں سے اُسے الگ رکھ دیا۔

"اب اگلے ہفتے آنا اور دو سو روپے بھی لیتے آنا۔"

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا، اور میں جلدی سے اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں اس وقت خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ہندوستان سے میرے فرار کی ایسی آسان صورت نکل آئی تھی کہ اب بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

اگلا ہفتہ میں نے بمبئی میں بھٹکتے گزارا۔ اس دوران میں نے فارس روڈ اور دیگر بھیڑ بھاڑ والے علاقوں میں جیب تراشی کی کئی وارداتیں کیں۔ ہر کامیابی کے بعد سے میرا حوصلہ کافی بڑھ گیا تھا اور نقب زنی کے مقابلے میں یہ کام آسان بھی نظر آیا تھا۔

ان کوششوں کے نتیجے میں میرے پاس ایک مرتبہ پھر ڈیڑھ ہزار روپے جمع ہو گئے۔ میں نے داڑھی بدستور بڑھائی ہوئی تھی البتہ رقم ہاتھ لگ جانے کے بعد کھدر کے لباس کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

مقررہ دن میں اس ادارے کے دفتر پہنچا تو خاصی دیر کے بعد اندر جانے کی اجازت مل جاتا تھا مگر اس روز وہاں میدان بالکل صاف تھا۔

اس کمرے میں مدراسی لڑکی اپنے ادھیڑ عمر مالک کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ گھٹنوں سے اُونچے اسکرٹ میں سے کالی کالی گرسڈول ٹانگیں جھانک رہی تھیں اور چہرے سے سکون کا اظہار ہو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر میرے پہنچنے کے باوجود اپنے کام میں مصروف رہا۔ البتہ لڑکی میری طرف متوجہ ہو گئی، "کیا مانگتا ہے؟"

"مجھے صاحب نے بُلایا تھا۔"

"نمبر بولو۔" وہ لمبے ناخنوں سے اپنی داہنی ران سہلاتے ہوئے بولی۔

"بیاسی۔ اجمل خاں۔" میں نے میز پر اس کے قریب جھک کر کہا۔

اس نے چند ہی سیکنڈ میں میرا فارم نکال لیا اور پہلی بار غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولی "پیسے لایا ہے؟"

میں نے جیب سے رقم نکالی اور گن کر دو سو روپے اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ حریصانہ انداز میں میری نوٹوں کی گڈی کو دیکھتی رہی۔ رقم لے کر اس نے اپنے باس کو متوجہ کیا جو ابھی تک گونگا اور بہرا بنا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے چشمہ قدرے نیچے سرکایا اور رقم گننے لگا۔

"سیلرز کلب جانتا ہے؟" نوٹ جیب میں ڈال کر وہ بولا۔

میرا دل یک بیک تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ میری محدود معلومات کے مطابق پورے بمبئی میں ایک ہی سیلرز کلب تھا جو گودی کے نواحی علاقے میں واقع تھا۔ وہ چینگ ہوا کی ملکیت تھا اور دلگیر سنگھ کا ایک خفیہ ٹھکانہ بھی۔ گمنام جزیرے کی طرف میرے پچھلے سفر کی ابتدا بھی سیلرز کلب سے ہوئی تھی، اور اس بار پھر وہی نام میرے سامنے آ رہا تھا۔

"وہ گودی والا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔" وہ جلدی سے بولا "آج شام چار بجے اُدھر جاؤ۔ سات نمبر کالی جرسی میں ایک آدمی ہو گا۔ جیسا وہ بولے، ویسا ہی کرنا۔ اب اِدھر آنے کی ضرورت نہیں۔"

اسی وقت لڑکی جنوبی ہندوستان کی کسی زبان میں اس سے مخاطب ہوئی۔ چند ثانیوں تک وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر مرد مجھ سے بولا۔ "نہیں پانچ سو روپیہ اور دینا ہو گا۔ لوٹ کا خرچہ بہت بڑھ گیا ہے۔"

بے اختیار میری نظریں لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر اُسے آنکھ ماری اور جیب سے رقم نکالنے لگا۔ وہ بوکھلا کر کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔

اس شخص نے جس انداز میں رقم مانگی تھی اس کی بنا پر مجھے پُورا یقین تھا کہ لڑکی نے اپنی مادری زبان میں اُسے اطلاع دی ہو گی کہ میری جیب میں ابھی بھاری رقم موجود ہے جو اُن کے ہاتھ آ سکتی ہے لہٰذا اس شخص نے فوراً ہی مزید پانچ سو کا مطالبہ کر دیا۔

میں نے ناچار مزید پانچ سو اس کے حوالے کئے اور دفتر سے باہر آ گیا۔

ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ عقب میں اُونچی ایڑی والے سینڈل کی آوازیں آئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مدراسی لڑکی میرے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ رک کر کھڑا ہو گیا۔

میرے قریب آ کر وہ رک گئی اور چند ثانیوں تک یوں ٹپٹائی ہوئی کھڑی رہی جیسے گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے اسے مناسب بہانہ نہ مل رہا ہو۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"مس رینا جارج!" وہ مس پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"مدراسی ہو؟"

"نہیں، کیرالہ کی رہنے والی ہوں۔" مجھے متوجہ پا کر اس کا حوصلہ کھل چکا تھا۔

"میرے پاس کس لئے آئی ہو؟" میں نے نرم لہجے میں پُوچھا۔

"تم ہی نے تو ادھر اشارہ کیا تھا۔" وہ دل پھینک مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

وہ چالاک اور موقع پرست تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس نے میرے نوٹوں کی جھلک نہ دیکھی ہوتی تو ہرگز مجھے گھاس نہ ڈالتی۔ ویسے بھی اُسے آنکھ مارتے ہوئے میرے ذہن میں کوئی خاص مقصد نہیں تھا مگر وہ خود ہی میرے پیچھے چلی آئی تھی تو میں اس کے بھرپور سراپا کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی جلد کی رنگت گہری گندمی ضرور تھی مگر وہ عمر کے اس مرحلے میں تھی جہاں عورت کا ایک ایک عضو تصویر کی صورت ہوتا ہے۔

میں نے اس کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا: "میرے ساتھ چلو۔"

"ابھی؟" اس نے حیرت سے کہا "مسٹر جگدیش مشکل سے چھٹی دیں گے۔"

"کوشش کرو، میں دس منٹ تک سامنے والے نکڑ پر تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے داہنی آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

جواب میں اُس نے بھی مجھے آنکھ ماری اور واپس چل دی۔

دفتر سے اس کی واپسی تقریباً فوراً ہی ہوئی۔ میرے پاس آتے ہی بولی "ایک دن کی تنخواہ کٹے گی۔ اس شرط پر چھٹی ملی ہے۔"

میں دل ہی دل میں اس کی چالاکی پر عش عش کرنے لگا۔ وہ نہایت خوبصورت انداز میں معاملے کے مالی پہلو کی طرف آ رہی تھی۔

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کہاں جائیں گے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا گھر نہیں ہے؟"

"گھر ہوتا تو بھلا سوچنے کی کیا بات تھی؟"

"تو میرے فلیٹ چلو۔ راستے سے کھانے پینے کا کچھ سامان لے لیں گے۔"

اس نے فراخدلانہ پیش کش کی، اور اشارہ کر کے ایک ٹیکسی روک لی۔

ٹیکسی کی عقبی نشست پر وہ مجھ سے چپک کر بیٹھ گئی۔ اور شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

ٹیکسی ایک بازار میں چھوڑ دی گئی۔ اس نے خریداری شروع کی تو میں نے دل پر جبر کر کے سو روپے اس کے حوالے کر دیے۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ وہ خود اپنے دام بتائے مگر مجھے اپنی یہ خواہش غیر مناسب سی معلوم ہوئی۔

سو روپے لے کر اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ پورے جوش و خروش سے ضروریات زندگی کی خریداری میں مصروف ہو گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پورے ماہ کی ضروریات خریدنے پر تل گئی ہو۔

ہم جب اس کے مختصر سے فلیٹ میں داخل ہوئے تو وہ سامان سے لدی پھندی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ عجیب سی مسرت سے دمک رہا تھا۔ وہ اس فلیٹ میں تنہا رہتی تھی۔ میں جاتے ہی اس کے بستر پر دراز ہو گیا۔

"کیا تھک گئے؟" اس نے حیرت سے پُوچھا۔

"تمہیں قریب پا کر اداکاری کو جی چاہ رہا ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا "اگر تم برا نہ مانو تو ذرا میرا بدن دبا

دو۔ میں عرصے سے اس لذت کے لئے تڑپ رہا ہوں اور اب تو شاید اس کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

"تم کتنی تنخواہ پر جا رہے ہو؟" اس نے میری ٹانگیں دباتے ہوئے سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔" میں نے لاپروائی سے کہا "یہاں سے تو بہتر ہی ہو گی۔"

وہ بڑے شوق اور محنت سے بدن دباتی رہی اور میں آنکھیں موندے اس کے ہاتھوں کے حیات آفریں اور نرم لمس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

تین بجے تک میں اسی کے فلیٹ میں موجود رہا۔ اس دوران میں اس کی زبانی بمبئی کی ملازمت پیشہ لڑکیوں کے بارے میں بعض عجیب و غریب کہانیاں معلوم ہوئیں۔ جن کی بنا پر میں اس سے ہمدردی کئے بغیر نہ رہا جب میں نے واپس چلتے ہوئے اسے مزید دو سو روپے دیئے تو جذبۂ احسان سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور میں تیزی سے واپس چل دیا۔ سیلرز کلب کا رخ کرتے ہوئے میرے دل میں خوف کی ہلکی سی لہر تھی۔ گو جنگ ہوا ... تھا مگر مجھے اس ... جو اپنے آقا کے لئے اپنی جان بھی دینے کو تیار رہتا تھا۔ میں نے دور ہی سے جائزہ لیا تو کاؤنٹر پر ایک اجنبی چہرہ موجود پایا۔

ٹھیک چار بجے میں سیلرز کلب میں داخل ہوا۔ ہال میں ساتویں میز پر کالی جرسی والا شخص موجود تھا، اور کسی کو رخصت کر رہا تھا۔ دوسرے آدمی کے روانہ ہوتے ہی میں اس میز پر پہنچ گیا۔

اس نے استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"بیاسی ہے؟" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں مجھ سے سوال کیا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آج رات گیارہ بجے مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں میں" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کیا آج ہی روانگی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"ہاں بس دفع ہو جاؤ۔" وہ غرایا "ابھی مجھے بہت کام کرنا ہیں۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے میز چھوڑ دی۔ میرے کلب سے نکلنے سے قبل ہی ایک اور شخص اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔

میں نے بازار سے ایک تھیلا خرید کر اس میں کچھ سامان ڈالا، جو سگریٹ، ماچس، بسکٹ، وہسکی کی ایک بوتل اور بھنے ہوئے چنوں پر مشتمل تھا۔ ریوالور میں نے اس طرح کمر پر باندھ لیا کہ اسے آسانی سے دیکھا نہ جا سکے۔ آخر میں ایک ادنیٰ کمبل خریدنے کے بعد میرے پاس نو سو روپے موجود تھے۔ وہ میں نے اپنے موزوں میں چھپا لئے۔

رات کے گیارہ بجے مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں میں مجھے مقررہ مقام تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان کے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔

جب انہیں میرے بارے میں اطمینان ہو گیا تو مجھے آگے بڑھنے کی اجازت مل گئی۔

وہاں ہندوستان کے ہر علاقہ کے کم و بیش دو سو افراد موجود تھے۔ ان میں چھ سات عورتیں بھی تھیں البتہ کوئی ... رات کے گہرے اندھیرے میں سب لوگ ہیجان اور ... تھے۔ لے جانے والوں نے سختی کے ساتھ کوئی روشنی استعمال کرنے یا سگریٹ نوشی پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔

جانے والوں میں ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ سامان موجود تھا ... نے اندھیرے میں ہی گھوم پھر کر جائزہ لیا کہ میرے پاس سب سے مختصر سامان تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک سب لوگ وہاں پہنچ گئے۔ ایک شخص نے بھیڑ بکریوں کی طرح مسافروں کی گنتی شروع کی۔ اسی دوران پہاڑیاں انجنوں کے شور سے گونجنے لگیں۔ یک بیک ہر شخص خوفزدہ ہو گیا اور وہاں دبی دبی سرگوشیاں گونجنے لگیں۔

"خاموش!" گنتی کرنے والے کا ایک ساتھی غرایا۔ "جو بولے گا میں اس کا گلا دبا دے گا۔ سب لوگ زبان بند رکھو۔"

انجنوں کی گڑگڑاہٹ رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی پھر پیچھے سے کھلے ہوئے دو باربردار ٹرک وہاں آ پہنچے۔ دونوں ٹرکوں کی تمام روشنیاں گل تھیں۔

"چلو۔ ٹرکوں میں چلو۔" اندھیرے میں کسی کی آواز گونجی اور اچانک وہاں بھونچال آ گیا۔ ہر شخص سب سے پہلے سوار ہونے کے چکر میں تھا۔ مرد، عورت، بوڑھے اور جوان کا ہر لحاظ مٹ چکا تھا۔ لوگ گرنے اور ایک دوسرے سے ٹکرانے کے باوجود خاموش تھے کہ کہیں لے جانے والوں کا مزاج نہ بگڑ جائے۔ ایک شخص کا ٹین کا صندوق کافی زور سے میرے دائیں گھٹنے سے بھی ٹکرایا اور میں بے اختیار کراہتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ دوسرے لوگ مجھ سے ٹکراتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ سب لوگ ٹرکوں پر سوار ہو چکے تھے۔ میں بھی ایک ٹرک کے پائیدان پر کھڑا ہو گیا اور دونوں ٹرک ناہموار پتھریلی زمین پر اچھلتے آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھنے لگے۔ ڈرائیور ان راستوں پر اندھیرے میں سفر کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

نصف گھنٹے بعد رات کے سناٹے میں لہروں کا تیز شور سنائی دینے لگا۔ پھر ٹیلوں کی اوٹ سے نکلنے کے بعد سمندر میں موجود لانچ بھی نظر آ گئی۔ دونوں ٹرک اسی مقام پر خالی کرا لئے گئے۔ لانچ ساحل سے کچھ دور قدرے گہرے پانی میں موجود تھی۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ اپنا اپنا سامان سر پر اٹھا کر لانچ کی طرف چل دیں۔

اس نادر شاہی حکم پر کچھ لوگوں خصوصاً عورتوں نے احتجاج کیا مگر ... کی ننگی گالیوں نے ہر ایک کو احساس دلا دیا کہ اس وقت سب لوگ ان کے رحم و کرم پر ہیں اور ان کے ہر حکم کی لازمی تعمیل کرنی ہو گی۔

لانچ جس جگہ لنگر انداز تھی وہاں کم از کم تین فٹ گہرا پانی تھا جس میں پانی کے اچھال کے باعث توازن برقرار رکھنا بہت مشکل تھا مگر لوگ اس ہنگ پانی میں گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح لانچ پر پہنچنے لگے۔ میں نے کیبن کے نزدیک ایک جگہ پر قبضہ جما لیا جہاں تیز ہوا اور پانی کی بوچھاڑ سے بچاؤ ہو سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد جب ملاحوں کی ڈانٹ پھٹکار کے نتیجے میں ہر شخص جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا تو لانچ کا انجن چلا دیا گیا۔ ساتھ ہی کچھ مسافروں نے زیرِ لب گیتا کے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔

پھر بوٹ نے ساحل چھوڑ دیا اور دھیمے دھیمے بحرِ ہند کے گہرے پانیوں کی طرف بڑھنے لگی میرے دل پر اس وقت عجیب سی مسرت چھائی ہوئی تھی ذہن آزادی کے تصور سے ناچ رہا تھا۔

لانچ کی رفتار بتدریج تیز ہوتی گئی۔ کھلے ہوئے حصوں میں موجود مسافر پانی کی بوچھاڑ میں بھیگنے لگے۔ لانچ پر ابھی تک کوئی روشنی نہیں جلائی گئی تھی۔ شاید محفوظ سمندر میں پہنچنے تک یونہی تاریکی برقرار رکھنی ضروری سمجھی گئی تھی۔

پھر ملاحوں نے اندھیرے ہی میں ترپالیں کھولنی شروع کر دیں تھوڑی دیر بعد لانچ کا خاصا بڑا حصہ پانی کی پھوار اور ہوا سے محفوظ ہو گیا۔

کسی منچلے نے جیبی ٹرانزسٹر نکال کر آن کر دیا۔ لتا کی سریلی آواز سنتے ہی ایک ملاح غراتا ہوا اس کی طرف لپکا اور ٹرانزسٹر چھین کر سمندر میں پھینک دیا۔ "خانہ خراب لانچ پر چھاپہ پڑوائے گا۔ ہم بولتا ہے ابھی چپ ہو کے بیٹھو تھوڑی دیر بعد چاہے ننگا ہو کر ناچنا شروع کر دینا۔"

لانچ غراتی اور جھاگ اڑاتی کھلے سمندر کے سینے پر تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے سفر کے لئے نہ جانے کون سی راہ اختیار کی تھی کہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود کسی بھی طرف روشنیاں یا بندرگاہ کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔

اسی وقت ایک عورت کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ بوٹ کے آخری سرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ لسے یکے بعد دیگرے دو ابکائیاں آئیں اور وہ ہلاکت آواز میں کراہنے لگی۔

اس مرتبہ لانچ کے عملے نے غیر معمولی شرافت کا ثبوت دیا اور اس عورت کو کوئی شربت دیا گیا جسے پینے کے بعد اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ اس کے ساتھ اسے آخری سرے سے اٹھا کر وسط میں میرے قریب جگہ دلا دی کہ جہاں ہچکولوں کا اثر نسبتاً کم تھا۔

تاریکی اور ملاحوں کی ناروا پابندیوں کے باعث لانچ کی فضا میں بوجھل سا جمود طاری تھا کہ اچانک ساری روشنیاں جلا دی گئیں اور مسافر ہلکا ہلکا جھپکا کر ایک دوسرے کا جائزہ لینے لگے۔

"اب جو جی چاہے کرو۔" عملے میں سے کسی نے اعلان کیا "مگر اس سے پہلے ہر مسافر کھانے اور ناشتے کے بیس روپے نکال لے۔"

کئی مسافروں نے اس مطالبے پر احتجاج کیا اور بتایا کہ وہ جو رقم ادا کر چکے ہیں اس میں سفر اور خوراک کا سارا خرچ شامل تھا مگر انہیں یہ روکھا سا جواب دیا گیا کہ وہ پیسے ادا نہیں کریں گے تو انہیں منزل تک بھوکا رہنا ہو گا۔

یہ ان لوگوں کی لوٹ مار کا شاید آخری مرحلہ تھا جو انہوں نے حسبِ منشا پورا کر لیا۔ بلا استثنا تمام مسافروں سے بیس روپے فی کس وصول کر لئے گئے۔

رقم کی وصولیابی کے بعد اندرونی بتیاں گل کر دی گئیں تاکہ لوگ بیٹھے بیٹھے سونے کی مشق کر سکیں۔ گو وہ لانچ خاصی بڑی اور کشادہ تھی مگر کم و بیش دو سو مسافر بھرنے کے بعد آزادانہ نقل و حرکت کی گنجائش بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ جن کو نشستوں پر جگہ نہ مل سکی تھی وہ سامان پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

میں سگریٹ پیتے پیتے اونگھنے لگا۔ ہند کی سمندری حدود سے بخیر و عافیت نکل آنے کی خوشی میں کافی عرصہ بعد میں نے سکون محسوس کیا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو افق کے مشرقی گوشے سرخی میں نہائے ہوئے تھے۔ سمندر میں پڑنے والا یہ سرخ انعکاس نظروں کو بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ لانچ کے تقریباً سارے ہی مسافر بیدار ہو چکے تھے۔ بوٹ کے آخری سرے پر مضبوط بلیوں کے سہارے دو کیبن سمندر پر معلق تھے جو حوائج ضروریہ سے فراغت کے کام میں آ رہے تھے اور ادھر مسافروں کا خاصا ہجوم تھا۔

سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی ناشتے کا دور شروع ہو گیا۔ پہلے ہر مسافر کو گیہوں کی ایک روٹی تھوڑے سے اچار کے ساتھ دی گئی پھر پھیکی اور بدمزہ چائے تقسیم کی جانے لگی۔ پانی کے بارے میں پہلے ہی اعلان کر دیا گیا تھا کہ کسی مسافر کو چوبیس گھنٹوں میں دو گلاس سے زیادہ پانی نہیں دیا جائے گا۔

چائے حلق سے اتارنے کے بعد میں نے مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس پوری بھیڑ میں ایک لڑکی مجھے سب سے الگ تھلگ نظر آئی۔ وہ وسط میں ایک سوٹ کیس پر تنہا اور قدرے ہراساں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے نقوش بھی خاصے دلکش تھے۔ شاید وہ تنہا اس لانچ پر سفر کر رہی تھی۔ ورنہ دوسری عورتیں اپنے مردوں کے ہمراہ تھیں۔

کچھ دیر توجہ دینے کے بعد اس کے ہراس کا سبب بھی مجھ پر واضح ہو گیا ایک ملاح مسلسل اس لڑکی کے گرد منڈلا رہا تھا اور شاید اس سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں کوئی بات تو نہ سن سکا مگر اس شخص کے چہرہ پر رقصاں خباثت آمیز مسکراہٹ اور لڑکی کی وحشت نے مجھ پر صورت حال واضح کر دی۔ دوسرے مسافر اس لڑکی اور اس کی پریشانی سے لاتعلق نظر آ رہے تھے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بڑی بڑی خوفزدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے ہی وجود میں سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ کچھ پریشان ہیں؟" میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

"نن... نہیں تو" وہ ہکلا کر جلدی سے بولی۔

"وہ اکیلا دیکھ کر آپ کو تنگ کر رہا ہے، اجازت ہو تو یہاں بیٹھ جاؤں؟" میں نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔

"تو آپ اسے دیکھ رہے ہیں؟" وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "شکر ہے کہ اس لانچ پر کوئی تو آنکھوں والا بھی ہے۔"

"وہ کیا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ مجھے فوراً ہی اپنے سوال کی احمقانہ نوعیت کا احساس ہوا مگر اس سے قبل کہ میں اس سے معذرت کرتا، وہ نظریں جھکا کر بولنے لگی۔

"وہ رات ہی سے آتے جاتے ـــــــ چھیڑ رہا ہے۔ دو مرتبہ دانستہ میرے اوپر گرا بھی ہے۔ جب بھی اس کی طرف دیکھتی ہوں، ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہے۔"

"آپ کو تنہا ایسے سفر سے گریز کرنا چاہئیے تھا۔ یہ لوگ کھلے سمندر میں آکر بھیڑیوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔" میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"اس دنیا میں میرا اپنے پتی کے سوا کوئی نہیں ہے۔" وہ اداس لہجے میں بولی۔ "وہ تین سال قبل ایک خون کر کے روپوش ہو گیا تھا۔ اسے پکڑنے کے لئے سرکار نے میری نقل و حرکت پر پابندی لگا دی۔ میں تین برس سے ہر روز تھانے میں حاضری دیتی ہوں۔ پچھلے دنوں مجھے پتہ چلا کہ وہ مسقط میں کام کر رہا ہے۔ میرے لئے پاسپورٹ حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

اس کی مجبوری سُن کر میرا دل لرز اٹھا۔ بعض اوقات حالات انسان کو کتنا مجبور اور بے بس کر دیتے ہیں کہ وہ محض کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔

"اس سے خون کیسے ہو گیا تھا؟" میں نے گفتگو بڑھانے کے لئے سوال کیا۔

"مذاق مذاق میں ایک دوست کو چھری مار دی تھی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اس کے ایک دوست نے خط لکھا ہے کہ وہ محض اس لئے مجھ سے خط و کتابت نہیں کرتا کہ پولیس کو بھنک بھی مل گئی تو میرا جینا الگ حرام کر دے گی اور وہ بھی پکڑا جائے گا۔"

"شاید اس سفر کی تجویز تمہارے پتی ہی نے اس دوست کے ذریعے بھیجی ہو گی؟"

اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور نظریں جھکا لیں۔

اسی وقت وہ بدمعاش ملاح وہاں آپہنچا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"او مجنوں کا اولاد! چلو اپنی جگہ پر جا کر بیٹھو۔"

میں اسے خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا کھڑا ہو گیا مگر لہجے پر قابو رکھتے ہوئے پُرسکون انداز میں بولا۔ "یہ عورت میرے ساتھ ہے، ایسے الفاظ استعمال مت کرو۔"

اس نے لڑکی پر ایک نظر ڈالی اور شانے اُچکا کر چل دیا۔ لڑکی تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی نشست کے قریب ہی اس کے لئے جگہ پیدا کر لی اور اسے وہاں بُلا لیا۔ اس کے ساتھ زبان کا مسئلہ نہ ہونے کی وجہ سے میرا سفر اچھا گزر سکتا تھا۔

لڑکی کا نام پاربتی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ راج پال نامی ایک شخص کے ذریعے اس لانچ پر پہنچی تھی اور اس نے مسقط پہنچنے کے چار ہزار روپے ادا کئے تھے۔

میرے پاس آنے کے بعد پاربتی اس ملاح کی براہ راست بدتمیزی سے تو محفوظ ہو گئی تھی مگر اس کی نظریں اب بھی پاربتی کی طرف اٹھ رہی تھیں اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا کوئی تدارک نہ کیا گیا تو یہ معاملہ سنگین صورت اختیار کر لے گا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں وہاں سے اُٹھ گیا اور سیدھا لانچ کے کپتان کے کیبن میں جا پہنچا۔ مجھے وہاں دیکھتے ہی کپتان کی تیوریاں چڑھ گئیں مگر جب میں نے عاجزانہ انداز میں اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ پاربتی میری رشتے دار ہے۔

"ننکو بدمعاش چھوکرا ہے، تم اسے کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کرو۔" پوری بات سننے کے بعد کپتان نے مشورہ دیا جو میرے لئے حیرتناک تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"سو دو سو روپے دے دو، وہ چھوکری کو اپنی ماں بنا لے گا۔" کپتان نے صاف الفاظ میں کہا۔

"دیکھتا ہوں، شاید کچھ رقم نکل ہی آئے۔" میں نے مایوسانہ انداز میں مُنہ لٹکا کر کہا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔

میں ان لوگوں کی ذہنیت اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ نیچے سے اوپر تک وہ سب پیسے کے غلام تھے۔ اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ میرے پاس خاصی رقم موجود ہے تو وہ اسے بھی اینٹھنے کی کوشش شروع کر دیتے۔

میں نے باتھ روم کے طور پر استعمال ہونے والے ایک کیبن میں جا کر موزے میں سے ایک سو بیس روپے نکال کر جیب میں ڈالے اور پاربتی کے پاس لوٹ آیا۔

میں نے اسے نئے موڑ سے آگاہ کر کے مزید احسان جتانا مناسب نہیں سمجھا اور کچھ وقت گزار کر دوبارہ کپتان کے پاس پہنچ گیا۔ رقم دیکھ کر وہ جس طرح خوش ہوا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں خود اس کا بھی خاصا حصہ ہو گا۔ رقم لیکر اس نے مجھے یقین دلایا کہ اب ننکو لڑکی کو تنگ نہیں کرے گا۔ چلتے چلتے میں نے اُس پر یہ بھی واضح کر دیا کہ میں نے اپنی کل پونجی اس کے حوالے کر دی ہے اور میں بالکل قلاش ہو گیا ہوں تاکہ وہ میری ذات سے مزید منفعت کی کوئی اُمید وابستہ نہ رکھے۔

لانچ پر دوپہر کا کھانا اُبلی ہوئی مسور کی دال، اچار اور دو روٹیوں پر مشتمل تھا۔ صبح کے مقابلے میں وہ روٹیاں خشک تھیں۔ شاید لانچ پر بمبئی سے اتنی روٹیاں لادی گئی تھیں جو پورے سفر میں کام آسکیں البتہ دال وغیرہ تازہ بنائی جا رہی تھی۔

"تین دن تک یہی ملتا رہا تو میں تو بیمار ہو جاؤں گی۔" پاربتی نے بے مزہ دال کھاتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس کچھ بسکٹ موجود ہیں، چاہو تو تھیلے سے نکال لینا۔" میں نے اپنے حصے کی دال سمندر میں بہاتے ہوئے کہا۔

اسی طرح سمندر میں تین دن گزر گئے۔ لانچ یکساں رفتار سے سمندر میں بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا۔ منظر کی یکسانیت سے بیشتر مسافر اُکتائے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ اس دوران اس بدمعاش نے مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ کپتان نے شاید درست ہی کہا تھا کہ رقم ملنے کے بعد وہ پاربتی کو اپنی ماں تک بنانے پر آمادہ ہو جائے گا۔

اُبلی ہوئی دال اور باسی روٹیاں کھا کھا کر مسافروں کا ہاضمہ برباد ہو چکا تھا۔ تیز دھوپ سے جھلسے ہوئے چہروں پر نقاہت کی زردی ناچ رہی تھی اور سارا دن لانچ کے آخری سرے پر بنے ہوئے معلق کیبنوں کے سامنے بھیڑ لگی رہتی تھی۔

چوتھی شام لانچ کا عملہ کچھ مستعد نظر آنے لگا۔ لانچ کی رفتار بھی سست پڑ گئی پھر اس خوش خبری کا بھی اعلان ہوا کہ آنے والی رات کے اندھیرے میں لانچ ساحل سے جا لگے گی۔ یہ سنتے ہی نقاہت زدہ اور پریشان حال مسافروں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان کا ساحل چھوڑنے کے بعد ہر آنکھ خشکی کی جھلک دیکھنے کو ترس گئی تھی۔

خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا مگر لانچ پر خلافِ معمول کوئی روشنی نہیں جلائی گئی۔ میں پہلے ہی محسوس کر چکا تھا کہ اس بار پھر پہلے جیسی احتیاط برتی جائے گی کیونکہ لانچ اب سمندر میں بے مقصد گھوم رہی تھی۔ وہ لوگ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ساحل کا رُخ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پھر سمندر کے تاریک سینے پر اچانک کچھ روشنیاں جل اُٹھیں اور لانچ کے عملے پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ لانچ کی رفتار یک بیک تیز کر دی گئی اور روشنیوں سے اس کا فاصلہ بڑھنے لگا۔

کافی دیر بعد مجھے اصل صورتِ حال کا علم ہوا۔ وہ لوگ ان راستوں کے کیڑے تھے اور انہیں اپنے مشاہدات پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ ان کے اندازے کے مطابق خلیج کے دہانے میں کچھ جہاز موجود تھے۔ ان بالخصوص روشنیوں کی بنا پر ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایرانی بحریہ کے جہاز تھے جن کی موجودگی میں لانچ کو خلیج فارس میں لے جانے کا تصور ہی خودکشی کے مترادف تھا۔

ایرانی بحریہ کے جہاز اور گشتی کشتیاں ایک دو مہینے میں ایک بار نزدِ خلیج اور اس سے باہر کھلے سمندر کا گشت لگاتی تھیں۔

روشنیوں سے دُور نکل آنے کے بعد لانچ کی رفتار سُست کر دی گئی۔ منزل سامنے آتے آتے یکایک دُور ہو جانے پر سارے مسافر اُداس ہو گئے تھے۔ اُدھر لانچ کا سارا عملہ کپتان کے کیبن میں جا گھسا تھا۔ شاید وہ لوگ اس نئی صورتِ حال سے نمٹنے کی تجاویز پر غور کر رہے تھے۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" میں یہ کہہ کر پاربتی کے پاس سے اُٹھ گیا اور تاریکی میں اس طرف بڑھنے لگا جدھر کپتان کے کیبن کا دروازہ تھا۔

مگر جونہی میں کیبن کے عقب سے نکلا، اچانک ایک کرخت آواز فضا میں اُبھری۔ "کون اَکھّلہ ہے اس طرف؟"

میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ تاریکی میں کیبن کے سامنے ایک قد آور انسانی ہیولا موجود تھا جو جارحانہ انداز میں کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"مجھے کپتان سے ملنا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ابھی وہ کسی سے نہیں ملے گا۔ واپس جاؤ، اُدھر میٹنگ ہو رہا ہے۔" اس نے میرے لہجے کی نرمی کا کوئی اثر لئے بغیر تحکمانہ انداز میں کہا۔

ناچار میں اپنی جگہ پر واپس لوٹ آیا۔

"کہاں گئے تھے؟" میرے جاتے ہی پاربتی نے سوال کیا۔

"معلوم کرنے گیا تھا کہ اب لانچ کب تک ساحل پر پہنچے گی۔"

"تو کیا پتہ چلا؟" اس نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"کیبن میں میٹنگ ہو رہی ہے۔ میں کسی سے بات نہیں کر سکا۔"

"معاملہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔" اس نے سہمی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں کہا۔

"یہ پورا سفر ہی خطرناک ہے۔ اگر میں تمہارا شوہر ہوتا تو ہرگز ایسا احمقانہ مشورہ نہ دیتا۔" میں نے بے اختیار جواب دیا اور وہ یک بیک سٹپٹا گئی۔

"میں نے یہ بات کسی بُری نیت سے نہیں کہی ہے۔" میں نے اسے خاموش پاکر اپنی بات کی وضاحت کی۔ "اگر سارے مسافر تماشائی بنے رہتے تو تم سفر کے آغاز ہی میں ایک بدترین صورتحال سے دوچار ہو گئی تھیں۔"

"میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مگر میرے آدمی کو کچھ نہ کہو۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کس طرح مجھے لوٹ کر چاہتا تھا۔"

"میرے الفاظ سے تمہاری دِل شکنی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دو۔ شاید تمہارے شوہر کو اندازہ نہیں تھا کہ اس قسم کا غیر قانونی سفر کرنا کسی شریف اور گھریلو عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"اس لانچ پر تم نہ ہوتے تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔" وہ میرے شانے سے سر ٹکا کر رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔"

اس گفتگو کے بعد میرے ساتھ پاربتی کا رویّہ خاصا بے تکلفانہ ہو گیا۔ پہلے وہ میرے اور ایک ملباری بوڑھے کے درمیان اس احتیاط سے سکڑی ہوئی بیٹھی تھی کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ میرے یا اس بوڑھے کے جسم سے مَس نہیں ہو رہا تھا مگر پھر اس نے اپنے اور بوڑھے کے درمیان میرا تھیلا رکھ دیا اور خود میرے جسم سے چپک کر بیٹھ گئی۔

سارے مسافر شدید ذہنی اُلجھن کے عالم میں کسی حوصلہ افزا خبر کے منتظر تھے۔ رات گہری ہو جانے کے باوجود ہر شخص بیدار تھا۔ ٹھنڈی

ٹھنڈی نمناک ہوا کی لوریاں بھی ان پراگندہ ذہنوں کو نیند پر مائل نہ کر سکی تھیں۔ کہ کپتان نے آکر اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

اس کی دانست میں خلیج کا دہانہ ایرانی بحریہ کے گشتی جہازوں کی نگرانی میں تھا اور ان سے بچ کر علاقے میں داخل ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ یہ نگرانی یا گشت ایک دو روز میں ختم ہو جاتا اور ایرانی بحریہ اپنی ... گاہ میں واپس چلی جاتی تو میدان صاف ہو جاتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لانچ دو روز تک یونہی سمندر میں بے مقصد بھٹکتی رہتی مگر کپتان نے ایندھن کی بچت کی خاطر لانچ کو علاقے کے ایک دلدلی جزیرے کے قریب لنگر انداز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

دوسری طرف لانچ پر راشن کی حالت نازک تھی۔ خشک روٹیوں اور پانی سمیت ہر چیز ختم ہونے والی تھی جبکہ ساحل پر اُترنے میں کم و بیش دو دن باقی تھے لہٰذا فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہر مسافر کو صرف آدھی روٹی روز دی جائے گی۔ پانی صرف اشد ضرورت کے وقت دیا جائے گا۔

کھلے سمندر میں یہ بھیانک صورتحال جان کر سب ہراساں ہو گئے۔ دو عورتوں نے تو بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

"جس نے بھی لانچ پر فضا خراب کرنے یا لوگوں کو بھڑکانے کی کوشش کی اُسے بلاجھجک کھلے سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔" کپتان کے ان آخری الفاظ نے سب کو سہما دیا۔ عورتوں کا بین بھی فوراً رُک گیا۔

"تھیلے سے ہوشیار رہنا۔" میں نے پاربتی کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ "یہ کافی لوگوں کی نظروں میں آچکا ہے اور غذائی بحران میں اس کی چوری کا ڈر پیدا ہو گیا ہے۔"

پاربتی نے تھیلے کا بلٹ اپنی کلائی کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔

کچھ دیر بعد لانچ مجوزہ مقام پر لنگر انداز ہو گئی۔ اسی کے ساتھ مسافروں کو تمباکو نوشی کی اجازت بھی مل گئی۔ مگر لائٹر یا دیا سلائی جلانے کی ممانعت تھی۔ سگریٹ سے سگریٹ سُلگائی جا سکتی تھی یا کیبن میں جا کر سگریٹ سلگائی جا سکتی تھی۔ تمباکو نوشی کے دوران سگریٹ کا سُلگتا ہوا سرا ہتھیلی کے درمیان اس طرح پوشیدہ رکھنا تھا کہ کش لیتے وقت کسی بھی طرف سے سُرخی نہ دیکھی جا سکے۔

جزیرہ کہاں تھا۔ یہ کسی کو بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ ہر طرف سمندر کی پُرسکون لہریں نظر آرہی تھیں مگر وہاں شدید بدبو موجود تھی۔ مسافروں کے استفسار پر ملاحوں نے بتایا کہ وہ بدبو دلدل کی وجہ سے ہے اور جزیرہ پانی چڑھنے کی وجہ سے زیرِ آب ہے۔ نرم دلدلی زمین صرف اسی وقت نظر آتی ہے جب پانی اترا ہوا ہوتا ہے۔

انجن کا تیز شور اور شدید ہچکولے ختم ہونے کے باعث میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پاربتی مجھ سے پہلے ہی سو چکی تھی۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری بھی آنکھ لگ گئی اور مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا مگر صبح کا اُجالا طلوع ہونے سے قبل ہی اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ چند ثانیوں تک تو میں خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ میری کنپٹیاں بُری طرح دُکھ رہی تھیں اور آنکھیں جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

پھر مجھے پاربتی نظر آئی۔ وہ کسی بچے کی طرح میری گود میں سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے بے خیالی میں داہنا ہاتھ اس کے بدن پر رکھا ہوا تھا۔ میں کئی منٹ تک کسی بے جان بُت کی طرح اپنی گود میں سوئی ہوئی اس حسین دوشیزہ کو دیکھتا رہا جس کا حُسن نیند کے عالم میں اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ پھر میری نظر اس کے داہنے ہاتھ پر پڑی اور بے اختیار میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

میرے بیگ کی بیلٹ بدستور پاربتی کی داہنی کلائی میں لپٹی ہوئی تھی مگر بیگ غائب تھا۔ کسی نے تیز دھار چاقو سے بیلٹ کاٹ کر بیگ اڑا لیا تھا۔

میرے آس پاس موجود تمام مسافر گہری نیند سو رہے تھے۔ فضا ان کے تیز خراٹوں سے گونج رہی تھی۔ لانچ کے کسی حصے میں کچھ بوڑھے کھانس رہے تھے۔ ایک دو بیمار افراد گہری نیند سونے کے باوجود وقفے وقفے سے کراہ رہے تھے۔

اس وقت تک میرے حواس پر نیند چھائی ہوئی تھی۔

پھر وہ بھی کسمسائی اور چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"تم سوئی نہیں؟" میں نے بوجھل آواز میں سوال کیا۔

"نیند نہیں آتی۔" اس نے نظریں ملائے بغیر سفید جھوٹ بولا۔

"یہ بیگ کہاں گیا؟" میں نے اس کی توجہ اس کی داہنی کلائی کی طرف دلائی۔

"ارے!" وہ بوکھلا کر بولی۔ "کوئی بیگ اڑا لے گیا؟ شاید میں بیٹھے بیٹھے کچھ دیر کے لئے اونگھ گئی ہوں گی۔ میرے جاگتے ہوئے تو یہ ناممکن تھا۔"

"چلو اب اُبلی ہوئی دال اور سوکھی روٹی پر گزارا کرنا ہوگا۔"

"تلاش کرو۔ شاید چُرانے والے کو ابھی تک بیگ ٹھکانے لگانے کا موقع نہ ملا ہو۔" اس نے اپنی کلائی سے بیلٹ کے بل کھولتے ہوئے کہا۔

"بے سُود ہے۔" میں نے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "چور بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ نیند سے فائدہ اُٹھا کر اپنا کام بنانے والا اب تک وہ بیگ خالی کر کے سمندر میں پھینک چکا ہوگا۔"

"لعنت ہو چوری کرنے والے پر۔" وہ بیلٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے بڑبڑائی۔

اگلی صبح لانچ کے مسافروں کے لئے ایک بُری خبر کے ساتھ نمودار ہوئی۔ مسافروں میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص رات میں کسی وقت چل بسا تھا۔ سفر کی ابتدا ہی میں ناقص غذا کے باعث اسے آنتوں کی بیماری لاحق ہو گئی تھی اور وہ ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔ جب کپتان وغیرہ اس کی بے رونق اور ٹھٹھری ہوئی لاش کا معائنہ کر رہے تھے تو تقریباً تمام ہی مسافروں کے چہروں سے تشویش نمایاں تھی۔

جو تھوڑے بہت بیمار تھے ان کی حالت تو بہت ہی اَبتر تھی۔ شاید انہیں مرنے والے کی لاش میں اپنا مستقبل نظر آرہا تھا۔

موت کی تصدیق کے بعد ملاحوں نے اس کی لاش سمندر کی موجوں کے حوالے کر دی۔ بے سروسامانی اور کسمپرسی کی موت کا یہ سماں ایسا تھا کہ کئی افراد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ لاش کو لہروں کے حوالے کرنے کے بعد ملاح متوفی کے سامان کی طرف متوجہ ہو گئے جو ایک گٹھڑی پر مشتمل تھا۔ اس میں پہننے کے چند کپڑے، تھوڑی سی ہندوستانی کرنسی اور کچھ کاغذات موجود تھے مگر میں کپڑوں کے درمیان چھپا ہوا اپنا بیگ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے کٹے ہوئے چرمی تسموں کے بقیہ حصے ابھی تک دونوں سروں پر موجود تھے اور اسی گٹھڑی میں ایک تیز دھار چاقو بھی موجود تھا۔

مرنے والے نے لانچ پر آخری کام جو کیا وہ میرے بیگ کی چوری تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس کا وقت آنے والا ہے اور اُبلی ہوئی دال کھا کر وہ تیزی سے موت کے مُنہ میں جا رہا ہے۔ میرا بسکٹوں وغیرہ سے بھرا ہوا بیگ اس کی نظروں میں رہا ہوگا اور اس نے موقع پاتے ہی اسے چُرا لیا مگر اجل کے بے رحم ہاتھوں نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ چوری کا یہ مال چکھ بھی سکتا۔

میں نے کپتان کو بتایا کہ وہ بیگ میرا ہے اور رات چوری ہو گیا تھا مگر ہر شخص نے میری طرف اشتباہ آمیز نظروں سے دیکھا۔ ان کی دانست میں یہ بات ناممکن تھی کہ ایک قریب المرگ اور نحیف و نزار شخص اپنی آخری سانسوں پر ایسا کام کرنے کا فیصلہ کر سکے۔ مگر جب میں نے کٹی ہوئی بیلٹ کا باقی حصہ لا کر دکھایا تو سب خاموش ہو گئے اور کپتان نے بیگ میرے حوالے کر دیا

"یہ کہاں سے ملا؟" میرے ہاتھ میں بیگ دیکھتے ہی پاربتی حیران رہ گئی۔

"مرنے والے کے سامان میں سے ملا ہے۔"

"سچ؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں۔" میں نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر لانچ کے عملے کا خوف نہ ہو تو سارے مسافر ابھی ایک دوسرے پر بھوکے کُتوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔ ناکافی اور ناقص غذا نے ہر ایک کو زندگی کی سرحدوں پر لا کھڑا کیا ہے۔ جب میں نے کپتان سے یہ بیگ لیا تو کئی مسافر مجھے بھوکی اور خطرناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔"

"ہر ایک نہ کہو۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "ابھی تم اس سرحد سے بہت دُور ہو۔"

"میرے دل کا حال تم کیا جانو۔" میں لاپرواہی سے ہنس دیا۔

اسی وقت پتہ چلا کہ کپتان نے اچانک سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نظر نہ آنے والے زیرِ آب جزیرے کے ساحل سے لنگر اٹھا لیا گیا اور لانچ سمندر کے سینے پر آہستہ آہستہ رفتار پکڑنے لگی۔

فضا پر عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ سمندر بظاہر پُرسکون تھا مگر میں عملے کے افراد کو غیر معمولی طور پر سرگرم دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی نگاہیں بار بار شمال مشرق کی طرف اُٹھ رہی تھیں جہاں آسمان پر ہلکی ہلکی سُرخ دھند پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے ملاحوں کو کریدنے کی بہت کوشش کی مگر ان سب نے سختی سے زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اور کپتان انجن روم میں گھسا کام میں مصروف تھا۔

مگر صورتِ حال زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رہ سکی۔ لانچ اس وقت بھی کھلے سمندر میں تھی اور تاحدِ نظر کہیں بھی خشکی نظر نہ آتی تھی کہ اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ اسی کے ساتھ سمندر میں سرکش موجیں سر ابھارنے لگیں جن کی شدت سے لانچ تنکے کی طرح لرزنے لگی۔

"ہوشیار! سمندر میں طوفان آنے والا ہے۔" ہواؤں کے آسیبی شور میں بیک وقت کئی ملاحوں نے پہلی بار خطرے کا اعلان کیا۔

یہ الفاظ مسافروں کے شکستہ اعصاب پر بجلی بن کر گرے۔ ہر طرف دہشت اور سنسنی پھیل گئی۔ ہر ایک خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں اضطراب کے عالم میں کپتان کے کیبن میں جا گھسا۔ وہ بے چینی کے ساتھ کیبن میں ٹہل رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" میں نے جاتے ہی سوچے سمجھے بغیر سوال داغ دیا۔

"صرف مقدر کام آئے گا۔" اس نے ادھ جلی سگریٹ چوبی فرش پر پھینک کر ایڑی سے مسل دی۔ شدید پریشانی کے باوجود وہ پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"طوفان میں یہاں سے روانہ ہونے کی کیا ضرورت تھی؟" میرا لہجہ دردمندانہ تھا

اس نے غضبناک تیوروں سے میری طرف دیکھا اور غرایا "ایک ہی ریلا لانچ کو دلدل میں پہنچا دیتا۔ دلدل میں سسک سسک کر مرنے سے یہ بہتر ہے کہ کھلے سمندر میں جدوجہد جاری رکھی جائے۔ یہ باتیں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ سمندر میں پھینکوا دوں گا۔"

اسی وقت لانچ کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ کپتان لڑکھڑا کر دیوار کے سہارے سنبھل گیا اور میں اُچھل کر بُری طرح فرش پر گرا۔ اسی کے ساتھ ہواؤں کے ہولناک شور میں باہر سے کئی مسافروں کی دلدوز چیخیں سنائی دیں۔

میں لپک کر باہر نکلا۔ اپنی چوٹوں کا مجھے احساس بھی نہ ہوا تھا۔ لانچ کے عرشے پر قیامت کا سماں تھا۔ سارے مسافر ایک دوسرے سے لپٹے گڑگڑا گڑگڑا کر رو رہے تھے۔ پتہ چلا کہ اچانک لہر آجانے سے جو جھٹکا لگا تھا، اس کے نتیجے میں تین مسافر سمندر میں جا گرے تھے۔

اس طوفان میں کس کی ہمت تھی کہ انہیں بچانے کی کوشش کرتا۔ بپھری ہوئی موجیں پل بھر میں ان بدنصیبوں کو نہ جانے کہاں بہا لے گئی تھیں۔

"انجن بند کرو!" اچانک کوئی پوری قوت سے چلایا۔ "ورنہ لانچ

کے تختے کھل جائیں گے۔ خود کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔"

انجن بند کر دیا گیا۔ ہولناک لہروں نے لانچ کو بار بار اچھالنا شروع کر دیا۔ جوں ہی کوئی لہر لانچ سے ٹکراتی فضا میں جھاگ اڑنے لگتی۔ ہوائیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ سمندر کے سینے پر اس طرح جھاگ اڑ رہے تھے کہ تھوڑی دور کی چیز دیکھنا بھی محال ہو رہا تھا۔

"بچاؤ!" اچانک میرے کانوں میں ایک دردناک چیخ گونجی اور میں بے چین ہو گیا۔ یہ آواز لازمی طور پر پاربتی کی تھی۔ پھر اس کی مسلسل چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میں دہشت زدہ مسافروں پر گرتا اور ان کو پھلانگتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ پاربتی اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔

اسی وقت ایک بار پھر پاربتی کی دہشت زدہ چیخ ابھری۔ وہ لانچ پر ہی موجود تھی۔ یہ اندازہ کر کے میری پریشانی قدرے کم ہو گئی کہ وہ سمندر میں نہیں گری بلکہ لانچ پر ہی موجود ہے۔ اس کی ادھوری اور گھٹی گھٹی چیخوں سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی بار بار اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا کیبن کی عقبی راہداری میں گھس پڑا۔ وہاں نیم تاریکی میں وہی بدطینت ملاح پاربتی کو گرائے اس پر سوار تھا۔ جسے میں نے کپتان کے ذریعہ محض اس لئے رشوت ادا کی تھی کہ وہ پاربتی پر بری نظر نہ ڈالے۔

اس نے پاربتی کا لباس کئی جگہ سے پھاڑ دیا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ پاربتی کو گھسیٹ کر کیبن کی طرف لے جائے مگر وہ کسی جونک کی طرح فرش سے چمٹی ہوئی تھی۔

میں اس ملاح کی بے خبری میں پشت سے اس پر ٹوٹ پڑا اور اسے پاربتی کے سینے سے گراتا ہوا دور تک رگیدتا لے گیا۔

میرے اچانک اور وحشیانہ حملے نے اس جنس زدہ ملاح کو بوکھلا دیا اور وہ ہذیانی انداز میں اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے پکارنے لگا۔

میں نے لگاتار اس کے چہرے پر کئی بھرپور مکے رسید کئے پھر اس کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور چوبی فرش اس کے خون سے رنگین ہونے لگا۔

"مارو... اس کے ہاتھ پیر توڑ کر اسے سمندر میں پھینک دو۔!" اچانک کوئی غرایا۔

میں پھرتی سے اپنے شکار کو چھوڑ کر اٹھ گیا۔ راہداری میں دو ملاح لمبے لمبے پھلوں والے چاقو لئے موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے چاقو کی نوک چٹکی میں تھامی ہوئی تھی اور مجھ پر چاقو پھینکنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"پاربتی۔ یہاں سے نکل جاؤ۔" میں پیچھے مڑے بغیر ہذیانی انداز میں چیخا مجھے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چاقو کا پھل میرے بجائے پاربتی کے بدن میں ترازو ہو جائے۔

چوبی تختوں پر مجھے پاربتی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دی اور اسی وقت لانچ کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ جیسے کسی ہولناک آبی عفریت نے لانچ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا ہو۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکھڑا کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے آیا اور اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کا پھل پاربتی کی آبرو کے دشمن کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ بلند ہوئی جو ایک تیز ہچکی پر ختم ہو گئی۔

تیسرا اس جھٹکے سے سنبھل گیا تھا اور غراتا ہوا میری طرف آ رہا تھا کہ میں نے فوری فیصلے کے تحت ہاتھ اٹھا کر تیزی سے کہا: "رک جاؤ۔ میں کسی سے لڑنا نہیں چاہتا۔ خدا کے لئے رک جاؤ۔!"

اسی وقت پے در پے چیخوں نے کپتان کو وہاں آنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے شاید میرے الفاظ سن لئے تھے کیونکہ اس نے آتے ہی اپنے آدمیوں کو روک دیا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" کپتان غصے اور ہذیان کے عالم میں چیخا۔ "لانچ طوفان میں گھری ہوئی ہے اور تم لوگ یہاں خون کی ہولی کھیل رہے ہو!"

"ہمیں کچھ نہیں معلوم راجہ۔" ایک چاقو بردار ملاح بولا۔ "ہم چیخیں سن کر ادھر آئے تو یہ شخص موتی کو بری طرح زخمی کر چکا تھا۔"

"وہ بدمعاش تمہارے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہے کپتان۔" میں جلدی سے بولا۔ "وہ لڑکی کو زبردستی اٹھا کر لے جا رہا تھا۔"

کپتان نے غرا کر مرنے والے کو ایک غلیظ سی گالی دی اور بولا: "وہ سمجھا ہوگا کہ طوفان میں کسی کو ادھر کا ہوش نہ ہوگا۔" پھر اپنے آدمیوں سے بولا: "نکو کو دیکھو اگر وہ زخمی ہے تو مرہم پٹی کر دو، مر گیا ہے تو اس کی لاش سمندر میں پھینک دو۔ مجھے تم سب کی ضرورت ہے، یہ طوفان بہت خطرناک ہے اور جلد گزرتا نظر نہیں آ رہا۔"

میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا واپس ہو لیا۔ پاربتی ایک کونے میں گھسی دہشت سے کانپ رہی تھی۔ اس وقت ہر مسافر کا حال برا تھا کشتی کسی لہر کے سہارے پچیس تیس فٹ اوپر اٹھتی چلی جاتی اور لہر کے گزرتے ہی پل بھر میں یوں نیچے آتی جیسے کسی نے کشتی کو پھینک دیا ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مزید کئی بدقسمت مسافر غضبناک لہروں کا لقمہ بن گئے۔ ہواؤں کے آسیبی شور اور انسانی آہ و بکا کے درمیان کسی مسلمان مسافر نے رقت آمیز آواز میں اذان دینی شروع کر دی۔ ہندو زور زور سے گیتا کے اشلوک پڑھ رہے تھے سکھ گرنتھ صاحب کے پاٹھ دہرا رہے تھے۔ کسی برہمن نے کانسی کی لٹیا بجا کر منتر جپنے شروع کر دیئے تھے۔ سب کے طریقے مختلف تھے مگر مدعا ایک ہی تھا۔ ہر شخص سچے دل سے اپنے خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ طوفان جلد ٹل جائے۔!

تیز طوفانی ہواؤں کے ساتھ سمندری لہروں کی بوچھاڑ یوں اڑ رہی تھی کہ موسلا دھار بارش برستی معلوم ہو رہی تھی۔ چمکتا ہوا سورج اس طوفان میں دھندلا گیا تھا۔

اچانک ایک طرف سے دہشت زدہ چیخیں بلند ہوئیں۔ ان میں سوراخ سوراخ کا شور نمایاں تھا۔ لانچ کے پیندے میں ایک سوراخ ہو گیا تھا۔

"سارا سامان پھینک دو۔" اچانک کپتان بدحواسی کے عالم میں چیخا۔ "سامان سمندر میں پھینک دو، ورنہ یہ سوراخ بڑھ جائے گا۔"

زندگی اور موت کے اس فیصلہ کن دوراہے پر بھی لوگوں کے دلوں میں اپنے مال کی محبت باقی تھی۔ کپتان کا حکم سننے کے باوجود کسی نے پہل نہ کی سب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

کپتان یہ دیکھ کر غصے میں پاگل ہو گیا اور اس نے سامان پر بیٹھے ہوئے مسافروں پر ٹھوکروں اور گالیوں کی بوچھار کر دی۔ "سامان پھینک دو ورنہ اسی کے ساتھ تمہیں بھی جہنم واصل کرا دوں گا۔"

ملاحوں نے ایک طرف سے سامان پھینکنے کی ابتدا کر دی۔ سفر کی کوئی موت نہ دیکھ کر وہ بیٹھے ہوئے مسافر گٹھڑیوں سے قیمتی سامان نکال نکال کر اپنی دھوتیوں اور نیفوں میں اڑسنے لگے۔

کچھ ملاح ہتھیلیوں سے وہ حصہ دبائے بیٹھے تھے جہاں سے پانی اندر آ رہا تھا۔ درحقیقت وہ کوئی سوراخ نہیں تھا اور نہ ہی لانچ کے پیندے میں تھا بلکہ کشتی کی ایک دیوار کے تختوں کا جوڑ کھل گیا تھا جو سطح سے چند انچ نیچے تھا۔ لانچ میں وزن کم ہونے کی صورت میں اگر لانچ چھ انچ بھی اونچی ہو جاتی تو وہ کمزور حصہ پانی سے باہر آ جاتا۔

مسافروں کا سارا سامان پھینک دیا گیا مگر وہ حصہ پھر بھی پانی میں ڈوبا رہا کپتان نے یہ صورت حال دیکھ کر اپنی جگہ سے اونچی آواز میں کچھ ناقابل فہم الفاظ ادا کئے اور سارے ملاح بھوکے درندوں کی طرح مسافروں پر ٹوٹ پڑے۔

جب تک لوگ کچھ سمجھتے، ملاح پھرتی کے ساتھ دس بارہ مسافروں کو سمندر میں پھینک چکے تھے۔ اکثریت کی زندگی بچانے کے لئے کچھ لوگوں کی قربانی لازمی ہو گئی تھی۔

جوں ہی یہ صورت حال مسافروں کی سمجھ میں آئی ہر ایک جونک کی طرح ستونوں اور بلیوں سے لپٹ گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے اور چوبی نشستوں کے نیچے گھسنے لگے تاکہ ملاح ان تک نہ پہنچ سکیں۔ کئی افراد نے بھاگ کر کیبن میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر ادھر کا رخ کرنے والے ہر مسافر کو ملاحوں نے بڑی آسانی سے اس ہی کے زور میں سمندر میں اچھال دیا۔

اس وقت لانچ پر دہشت اور نالہ و فریاد کا ایسا بھیانک سماں تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انسانی لہو کی ایسی ارزانی میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ خوش نصیبی کی تلاش میں چوروں کی طرح ملک سے ہجرت کرنے والے چنگھاڑتے ہوئے سمندر کی بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے۔ لہروں کے ابھرنے اور ایک دوسرے سے ٹکرانے کے باعث فضا میں ہیبت ناک گونج پھیلی ہوئی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ میں شروع سے ہی پاربتی کو لئے ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں ملاحوں کی رسائی ذرا محال تھی۔ مجھ تک پہنچنے سے پہلے انہیں اپنے شکار مل رہے تھے!

"بس، اب ختم کرو!" اچانک کپتان دہاڑا اور بجلی کی طرح حرکت کرتے ہوئے ملاح رک گئے۔ شاید لانچ میں سے خاصا وزن کم کیا جا چکا تھا اور کمزور تختے پانی کی سطح سے باہر آ گئے تھے۔ اگر کپتان بروقت وہ المناک فیصلہ نہ کرتا تو موجوں کا زبردست دباؤ ان تختوں کو اکھاڑ دیتا اور پھر پوری لانچ تباہ ہو جاتی۔

عملے کے لوگ تو شاید لانچ کی تباہی کے بعد بھی سمندر کی ہولناک موجوں سے مقابلہ کر کے بچنے کی کوششیں کر سکتے تھے مگر مسافروں میں سے کسی کے زندہ بچنے کا امکان نہیں تھا۔

لانچ لہروں کے دوش پر اوپر نیچے ہچکولے کھاتی انجانی منزل کی طرف رواں تھی کہ اچانک زبردست لہروں کے تصادم سے ایسی بھیانک گونج پیدا ہوئی کہ بہت سے مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ پاربتی بھی چیخ مار کر میرے سینے سے لپٹ گئی۔

وہ طوفان ایک ڈراؤنے خواب کی طرح دیر تک جاری رہا۔ ہر لمحہ یہ خوف لاحق تھا کہ کوئی تیز و تند موج لانچ کو الٹ کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی سرکش ہواؤں کے دوش پر اچھال دے گی مگر اس کے بعد کوئی خوفناک واقعہ پیش نہ آیا۔

خدا خدا کر کے طوفان کا زور ٹوٹنے لگا۔ آوارہ ہواؤں کا آسیبی شور ماند پڑنے لگا۔ میں نے آہستگی سے اپنے سینے سے لپٹی ہوئی پاربتی کو ہلایا اور وہ بے جان مورتی کی طرح نیچے ڈھلک گئی۔ میں نے جلدی سے اس کی نبض ٹٹولی تو وہ دھیمے دھیمے چل رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ابھی جاری تھیں۔ شاید وہ خوف اور دہشت کی زیادتی کے باعث بے ہوش ہو چکی تھی۔

طوفان کی شدت نے لانچ پر رہ جانے والے مسافروں کو بے حال کر دیا تھا کئی مسافر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ اور کئی بار بار تے کئے جا رہے تھے طوفانی موجوں کے بھیانک زیر و بم نے ہر شخص کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت میری حالت بھی ابتر تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے زرد رنگ کے بے شمار دائرے گردش کر رہے تھے اور دل بار بار اچھل کر حلق میں آتا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے پاربتی کو باہوں میں اٹھا کر پشت گاہ کے سہارے بٹھانے کی کوشش کی مگر نقاہت اور چکروں کے باعث میں اس نازک سراپا کا بوجھ بھی نہ سنبھال سکا اور اسے باہوں میں لئے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں بے ہوش تو نہیں ہوا مگر نڈھال ہو کر وہیں پڑا رہا۔ آنکھیں کھولنا تک مجھے محال معلوم ہو رہا تھا۔ میرے کانوں میں تمام آوازیں آ رہی تھیں مگر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ میلوں دور سے آ رہی ہوں۔

کچھ دیر بعد طوفان کا زور بالکل ٹوٹ گیا اور لانچ سمندر میں سکون سے تیرنے لگی۔ اس کا انجن ابھی تک بند پڑا ہوا تھا۔

"جو لوگ مر چکے ہیں، انہیں سمندر میں ڈال دو اور لانچ صاف کر دو ورنہ بدبو سے دماغ پھٹ جائے گا۔" اچانک کپتان کی آواز سنائی دی۔

میں نے کسمسا کر پہلو بدلنا چاہا۔ مگر میرا بدن سن پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنی چاہیں تو پپوٹے اپنی جگہ جمے ہوئے محسوس ہوئے۔ طوفان کے دوران میں اپنے اعصاب پر قابو کئے رہا مگر ہنگامی صورت حال گزر جانے کے بعد وہ جان لیوا اعصابی تناؤ اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کوئی میرے پاس بھی آ پہنچا اور بے دردی سے میرا بدن ہلانے جلانے لگا۔

"ارے زندہ ہے یا مر گیا؟" کسی نے اپنی ٹھوکر میری پسلیوں میں چبھاتے ہوئے کہا مگر میں جواب نہ دے سکا۔ دھند میں لپٹے ہوئے میرے حواس ناکارہ ہو چکے تھے۔ بس قوت سماعت کسی حد تک بحال تھی۔ میں سب کچھ سن رہا تھا لیکن

بولنے یا حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔

"یہ تو وہی ہے!" اچانک کسی کی تحیر آمیز سرگوشیانہ آواز ابھری "جس نے ننکو کو مارا تھا، چھوکری بھی وہی ہے، سالی لپٹی پڑی ہے اپنے یار سے!"

اچانک میرے آس پاس غیر فطری سناٹا چھا گیا۔ پھر دبی دبی غیر واضح سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ اس وقت تک میں سن ضرور رہا تھا مگر میرا ذہن سمجھنے یا فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم تھا۔

چند ثانیوں بعد کسی نے اپنا وزنی ہاتھ میرے بائیں پہلو پر رکھ دیا۔ پھر ایک آواز سنائی دی جو پُرجوش اور جارحانہ تھی "زندہ ہے ابھی!"

میرے ذہن میں یک بیک ابال سا آگیا۔ وہ ملاح میرے ہاتھوں ننکو کا حشر نہیں بھولے تھے اور شاید اب مجھ سے اپنے ساتھی کا انتقام لینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ میرا گلا بھی دبا سکتے تھے یا اسی حالت میں سمندر میں پھینک سکتے تھے کیونکہ کپتان نے انہیں مردہ مسافروں کو سمندر میں پھینکنے کا اختیار دیا تھا۔ وہ بآسانی مجھے مردہ قرار دے سکتے تھے۔!

"چھوکری زور دار ہے، سالی کا بدن دیکھو کیسا کسا ہوا ہے!" کسی ملاح نے شاید پاربتی کا بدن چھونے کے بعد حریصانہ انداز میں تبصرہ کیا۔

"پہلے اسے ٹھکانے لگاؤ، چھوکری تو پھر ہمارے ہی رحم و کرم پر ہوگی" ایک شخص کی آواز ابھری "جلدی کرو، ایسا نہ ہو کہ یہ ہوش میں آجائے یا کپتان ادھر آنکلے۔"!

پھر میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے ایک طرف گھسیٹا جانے لگا۔ میں نے اپنے جسم کو حرکت دینی چاہی مگر بے سود، چیخنا چاہا مگر آواز مفقود تھی۔ بس ذہن میں بچاؤ بچاؤ کے نعرے گونج رہے تھے مگر وہ خاموش فریاد صرف میں ہی سن سکتا تھا۔ یہ بے آواز نعرے دوسرے لوگوں کے لئے کوئی وجود ہی نہ رکھتے تھے۔

"بہت بھاری ہے سالا!" کسی نے یہ کہہ کر میری پسلی میں ٹھوکر ماری۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک ہولناک چیخ بلند ہوگئی جس میں موت کا بھیانک خوف رچا ہوا تھا۔ اچانک مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میرا سر خاصی زور سے ایک کنارے سے ٹکرایا۔ میرے اعصاب پر چھایا ہوا سکتہ ختم ہوگیا اور میں نے داہنے ہاتھ سے اپنے سر کا زخمی حصہ دبا لیا۔

پھر آہستہ آہستہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ جب نگاہوں کے سامنے سے دھند چھٹی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میرے ارد گرد کوئی موجود نہیں ہے میری چیخ سنتے ہی میرے خون کے پیاسے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور اب لاتعلقانہ انداز میں بے ہوش اور مردہ مسافروں کو دیکھتے پھر رہے تھے۔ جیسے مجھ سے ان کا واسطہ ہی نہ ہو۔

یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ میں اس وقت لانچ کے کنارے پر موجود تھا۔ اگر میرا مقدر یاوری نہ کرتا تو چند ثانیوں میں میرا بدن سمندر کی بے رحم اور سفاک موجوں کے حوالے کیا جا چکا ہوتا۔

میں نے دہیں پڑے پڑے اپنی پسلیاں ٹٹولیں مگر کہیں کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جس ٹھوکر کے باعث میں چیخنے میں کامیاب ہوا وہ شدید کیوں نہیں تھی میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ چیخ کا سبب موت کی دہشت تھی یا ٹھوکر کی چوٹ۔!

میں نڈھال انداز میں لانچ کی چوبی دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میرا بدن پسینوں میں نہایا ہوا تھا اور گزرے ہوئے لمحات کی دہشت سے دل ابھی تک تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر واپس آیا۔ پاربتی ابھی تک بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

طوفان گزر جانے کے بعد سمندر خلاف معمول کچھ زیادہ ہی پرسکون ہو گیا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور سورج کی تیز کرنیں براہِ راست جسم پر پڑ رہی تھیں۔ شام ہونے تک لانچ یوں ہی سمندر میں بے مقصد تیرتی رہی۔ اس کا انجن بند تھا۔ اور وہ لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔

پاربتی ہوش میں آنے کے بعد سہمی سہمی سی تھی، اسے پتہ چل چکا تھا کہ اس طوفان میں بیالیس مسافر کام آئے تھے۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں کس طرح موت کے ہولناک دہانے سے بال بال بچا ہوں تو اس کی دلکش آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تم سچ کہتے ہو، کھلے سمندر میں یہ ملاح واقعی درندے بن جاتے ہیں۔"

"میں جھوٹ بہت کم بولتا ہوں۔"!

"رام رام!" وہ دونوں کانوں کو چھو کر بولی "اگر لانچ پر تم نہ ہوتے تو یہ لوگ میرا کیا حشر کرتے میں تو شروع ہی سے ان کی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔"

"تم سے پریم کے علاوہ بھلا اور کیا کرتے" میں نے اس کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے قدرے شوخ لہجے میں کہا "سندرتا کے پریمی تو ہر جگہ پیدا ہو جاتے ہیں۔"

"میری وجہ سے وہ لوگ ابھی تک تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔" وہ میرا تبصرہ نظر انداز کر کے ناخن سے ایک تختہ کریدتے ہوئے بولی۔

"بھیڑیوں کے غول میں کسی خوبصورت لڑکی کی حمایت کرنا بھیانک جرم ہوتا ہے، راستے کے پتھر کو بھلا کون ہٹانا نہیں چاہتا!"

"تم نے کپتان سے شکایت کیوں نہیں کی؟"

"وہ بے چارہ کیا کر سکتا ہے، اس کی یہی مہربانی ہے کہ اس نے کھلے سمندر میں ہونے کے باوجود ننکو کے خون کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ڈالی۔ بار بار کی شکایتوں سے وہ چڑ جائے گا۔"

"ہم سمندر میں کب تک یونہی بھٹکتے رہیں گے؟"

"جب تک مقدر میں لکھا ہے۔"

"تم عجیب آدمی ہو!" وہ سر جھٹک کر آہستہ سے بڑبڑائی۔

"کیا عجیب بات دیکھی تم نے مجھ میں؟"

"کسی بات کی پرواہ ہی نہیں کرتے، تمہیں معلوم ہے کہ کشتی والے تمہاری جان کے دشمن ہیں اور تمہیں ذرا بھی غافل پائیں تو مار ڈالیں گے مگر تم پھر بھی بے فکر ہو۔"!

"موت آنی ہے تو بیٹھے بیٹھے آجائے گی، کوئی اسے نہیں ٹال سکتا، اور زندگی ہے تو سب مل کر بھی میرا بال بیکا نہ کرسکیں گے!"

"تم مجھ سے ناراض ہونا؟" اچانک اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟" میں نے چونک کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تم سوچتے ہوگے کہ میں بڑی احسان فراموش ہوں!"

"میں نے تم پر کون سا احسان کیا ہے جو یہ سوچوں گا؟"

"طنز کر رہے ہو!" وہ آزردہ ہو کر بولی "تمہارا احسان تو میں ساری عمر بھی نہ بھول سکوں گی۔ یہ بھیانک سفر اور تمہارا ساتھ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"تم یہ ساری باتیں اپنے پتی کو بھی بتاؤ گی؟"

وہ چند ثانیوں کے لئے سوچ میں پڑ گئی، پھر آہستہ سے بولی "نہیں۔"

"وہ ذرا چھوٹے دل کا آدمی ہے۔ یہ برداشت نہیں کرسکے گا کہ میں اس کے علاوہ بھی کسی اور مرد کی احسان مند ہوں اور اس کا نام میرے دل میں نقش ہے"!

"شاید وہ یہ بھی یقین نہ کرے کہ میں نے تم سے اپنی محنت کے دام وصول نہیں کئے ہیں!"

"ہاں!" وہ دھیمے لہجے میں بولی "اصل بات یہی ہے۔ ہمارے یہاں عورت جب گردن تک کسی کے احسان تلے دب جائے تو اس کے چرنوں پر اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ وہ ان بھوکے اور خونی بھیڑیوں کو بھول جائے گا مگر تمہیں کبھی نہ بھول سکے گا۔"

"حالانکہ تم ....!"

اس نے جلدی سے میری بات کاٹ دی "تم اپنا من چھوٹا نہ کرو، پاربتی احسان فراموش نہیں ہے۔"

"مگر میں تم سے کسی چیز کا طلبگار نہیں، تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو!"

"تم نے جو چاہا میرے ساتھ سلوک کیا، اب مجھے بھی حق ہے کہ تمہارے ساتھ جو رویہ چاہوں اختیار کروں۔" وہ پہلی بار شوخ انداز میں مسکرا کر بولی۔

وہ میرے قریب کھسک آئی اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی "جانتے ہو میں کون ہوں!"

"ایک جوان اور مظلوم لڑکی!"

"نہیں۔ میں پاربتی ہوں اور تم میرے شیو ہو۔" وہ گرم گرم سانسوں کے درمیان بولی "ان دونوں کی کہانی سنی ہے تم نے، شیو جی بھی تو دیوتا ہیں۔"

"دھرم سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں!"

"دھرم سے زیادہ تو یہ رنگین قصے ہیں شیو جی!" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"پاربتی دیوی پہلے جنم میں ستی ہو گئی تھی پھر اس نے برسوں تک پوجا کی تو دوسرے جنم میں وہ شیو دیوتا کو ہمیشہ کے لئے پانے میں کامیاب ہو گئی۔ ہند میں ہر برس لاکھوں کنواریاں مندروں میں اب بھی یہ پوجا کرتی ہیں!"

"ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"دھرم کی باتیں ہیں یہ تو۔" وہ آہستہ آہستہ بے حجاب ہوتی جا رہی تھی۔

"شاید تم نے کبھی یونی پوجا بھی نہیں دیکھی۔ مندروں کے پھیرے لگاتے تو پتہ چلتا کہ گیان دھیان والوں کو سرگ اسی دنیا میں مل جاتی ہے جو مندروں میں پہرہ رکھتے۔ ان کے لئے یہی جنم نرگ ہے۔ باقی قصے تو بہلاوے کے لئے ہیں۔"

"کوئی مہنت یا پجاری یہ سن لے تو تمہارے ٹکڑے اڑا دے گا!" میں بگڑ کر بولا "ٹکڑے اڑا دے۔" وہ دھیمے سے ہنسی "رال ٹپکاتا نظر آئے گا۔"

"میں نہ پنڈت، نہ مہنت، نہ پجاری! مجھے تم اپنے دھرم کے کمال تو اس سے معاف رکھو!"

"میرا دھرم؟" وہ حیرت سے بولی "تو کیا تم ہندو نہیں ہو؟"

مجھے اچانک اپنی غلطی کا خیال آ گیا اور میں جلدی سے بولا "میں نے کہا کہ مجھے دھرم سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

اس کے بشرے پر اطمینان کی لہر پھیل گئی۔

باتوں ہی باتوں میں وقت تیزی سے گزر گیا۔ پھر جب شام کا دھندلکا پھیلا تو لانچ کا انجن اسٹارٹ کر دیا گیا۔ مسافروں کو ایک بار پھر احتیاطی اقدامات اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ساتھ ہی کپتان نے بتایا کہ لانچ کی خستہ حالت کے پیش نظر کھلے سمندر میں مزید رہنا ناممکن تھا جبکہ خلیج کے دہانے سے ایرانی بحریہ کے چلے جانے کے امکانات اس وقت تک مفقود تھے لہٰذا فیصلہ کیا گیا تھا کہ خلیج فارس میں داخل ہونے کے بجائے تمام مسافروں کو کھلے سمندر میں واقع ایک ویران ساحل پر اتار دیا جائے۔ کپتان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے عملے سمیت اس وقت تک مسافروں کے ساتھ ساحل پر رکے گا جب تک انہیں لاریوں کے ذریعہ منزل کی طرف روانہ کرنے کا انتظام نہ ہو جائے۔

مسافروں کے لئے یہ نوید حوصلہ افزا تھی۔ ساحل کا لفظ ہی ان کے لئے خوشیوں کا باعث تھا۔ پل بھر میں لوگ گزرے ہوئے ہولناک حادثے کو بھول گئے اور ان میں جوش و خروش کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی۔ چھ روز تک مسلسل لہریں اور آسمان دیکھتے دیکھتے مسافر اکتا چکے تھے اور اب ساحل کی امید نے ان کے دلوں میں تازہ ولولے بیدار کر دیئے تھے۔

پاربتی بھی بہت خوش تھی مگر مجھے کپتان کے اس فیصلے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار اپنے ذہن کو ٹٹولا مگر اپنے اس ذہنی ردعمل کا کوئی جواز نہیں پا سکا۔

جوں جوں اندھیرا گہرا ہوتا گیا میرا بے نام ذہنی اضطراب بھی بڑھتا چلا گیا۔ لانچ کھلے سمندر میں غراتی تیزی سے گمنام منزل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

کپتان کو کیبن کے باہر ریلنگ کے سہارے کھڑا دیکھ کر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

"ہم کتنی دیر میں ساحل پر پہنچ جائیں گے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ساحل نظر آئے گا تو بتا دیا جائے گا۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔

"ہم کس جگہ اتریں گے؟" میں نے اس کے چڑچڑے پن کو نظرانداز کرتے ہوئے اصل سوال داغ دیا۔

جواب میں اس نے غرا کر چند فحش گالیاں بکیں۔

میں خاموشی سے واپس ہو لیا۔

کچھ دیر بعد کپتان کے گلے میں دوربین نظر آنے لگی۔ مسافروں میں بھی ہیجان بڑھنے لگا۔ وہ بار بار اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر گھور اندھیرے میں ساحل دیکھنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔

اسی سنسنی کے عالم میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ مسافروں کے لئے انتظار اعصاب شکن ہوتا جا رہا تھا کہ موجوں کے ساحل سے ٹکرانے اور دم توڑنے کا دھیما دھیما شور سنائی دیا۔

"ساحل .... ساحل آ گیا!" ایک مسافر خوشی میں بے اختیار چیخ اٹھا۔

ایک ملاح غراتا ہوا اس کی طرف لپکا اور چند گالیوں کے ساتھ اس کی گردن پر بھرپور ہاتھ جڑ دیا "اب آواز نکالی تو گلا دبا دیا جائے گا۔"

پٹنے والا سہم کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ طوفان کے دوران میں ملاحوں کی سفاکی ہر شخص دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ ملاح جو کہتے ہیں وہ کر گزرنے پر بھی تیار ہیں۔

رفتہ رفتہ اندھیرے میں تاریک ساحل ایک سیاہ لکیر کی طرح نظر آنے لگا۔ دم توڑتی ہوئی متحرک موجوں سے آگے ویران، تاریک اور خاموش ساحل تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔

انجن بند کر دیا گیا اور لانچ اپنے ہی زور میں خاموشی سے ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔ مسافروں کے چہرے مسرت سے کھلے پڑ رہے تھے اگر انہیں بولنے کی آزادی ہوتی تو پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر آسمان سروں پر اٹھا لیتے مگر سخت گیر ملاح اجل کے فرشتوں کی طرح ان کے سروں پر مسلط تھے۔

اتھلے پانی میں پہنچنے کے بعد لانچ کا رخ بدل دیا گیا اور وہ ساحل کے متوازی تیرنے لگی۔ ایک ملاح کپڑے اتار کر آہستگی سے پانی میں کود گیا۔

کچھ دیر تک پانی میں تیرنے اور غوطے لگانے کے بعد اس ملاح نے ریلنگ پر جھکے ہوئے کپتان کو بتایا کہ اس مقام پر پانی کی گہرائی مناسب ہے۔

"ساحل کا بھی چکر لگا لو۔" کپتان نے نیچی آواز میں حکم دیا۔

لانچ اسی جگہ رک سی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ساحل پر گئے ہوئے ملاح نے واپس آ کر میدان صاف ہونے کی اطلاع دی اور یہ بھی بتایا کہ وہاں ایسی کھاڑیاں موجود ہیں جن میں پوری فوج چھپ سکتی ہے۔

مسافروں کو اترنے کا حکم ملا۔ کئی افراد جوش میں نیچے کودے اور پانی کی گہرائی کا اندازہ نہ ہونے کی بنا پر ڈبکیاں کھانے لگے۔

بیزار ملاحوں نے بدقت تمام انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ وہاں پانی کمر تک گہرا تھا اور اس میں قدم بڑھاتے ہوئے توازن برقرار رکھنا بہت مشکل تھا۔

بیشتر سامان پہلے ہی سمندر میں پھینکا جا چکا تھا جو رہ گیا تھا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لانچ تیزی کے ساتھ خالی ہونے لگی۔ کپتان بدستور لانچ پر ہی موجود تھا۔

میں نے کمر سے بندھا ہوا روزیلا کا ریوالور احتیاط سے اپنی بغل کے قریب کھسکا دیا تاکہ پانی کے باعث گولیاں ناکارہ نہ ہو سکیں۔ پھر میں بھی پاربتی کے ہمراہ پانی میں اتر گیا۔ جس وقت میں اسے گود میں لے کر پانی میں اتار رہا تھا اس نے میرے حواس پر چھا جانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میں نے اسے فوراً ہی پانی میں اتار دیا۔ اور وہ اچانک پھریریاں لینے لگی۔

"جلتے ہوئے بدن پر ٹھنڈا پانی کیسا مزا دیتا ہے۔" میں نے ہنس کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"نمونیہ ہو جاتا ہے۔" وہ جل کر بولی۔

جب کچھ دیر بعد سارے مسافر ساحل پر آ گئے تو ملاحوں نے بے زبان انسانوں کی اس بھیڑ کو ٹیلوں کی طرف ہانکنا شروع کر دیا۔

نرم نرم اور ٹھنڈی ریت اس وقت ایک نعمتِ غیر مترقبہ معلوم ہو رہی تھی۔ ان سے ذرا دور خوابناک ٹیلوں اور چٹانوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

چٹانیں عبور کرنے کے بعد لانچ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور مسافروں کو چٹانوں کی اوٹ میں جگہ تلاش کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

مسافر خوشی خوشی اپنے ٹھکانے بنانے میں مصروف تھے کہ ملاح غیر محسوس طریقے پر وہاں سے کھسکنے لگے۔ میں شروع ہی سے ان کی طرف سے ہوشیار تھا۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے ایک ملاح کا راستہ روک کر سخت لہجے میں پوچھا۔

"لانچ سے کھانے پینے کا سامان لانا ہے!" وہ چمکدار آنکھیں میرے چہرے پر جما کر پرسکون لہجے میں بولا "آؤ، تم بھی ساتھ آ جاؤ!"

"لانچ وہیں کھڑی رہے گی؟"

"نہیں اسے کسی کھاڑی وغیرہ میں چھپانا ہوگا۔" وہ خلافِ توقع شریفانہ لہجے میں بولا "تاکہ دن کے اجالے میں اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑا۔

اس کے شریفانہ رویے نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ میں نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا "رک جاؤ اور میری طرف دیکھو!"

وہ بجلی کی سی سرعت سے میری طرف گھوما اور ریوالور کا مہیب دہانہ دیکھتے ہی دہشت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ قدم جہاں تھے وہیں گڑ کر رہ گئے۔

اس وقت ہم دونوں ایسی جگہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں تھے جہاں ہمارا دیکھ لیا جانا مشکل تھا۔ اس کے بیشتر ساتھی لانچ کی طرف جا چکے تھے۔ جو رہ گئے تھے ان کی کسی بھی لمحہ آمد کا اندیشہ تھا۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو، جلدی بتاؤ، ورنہ بھیجا اڑا دوں گا۔" میں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے سخت سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"لل .... لانچ سے کھانا اتارنے!" وہ ہکلا کر بدقت تمام بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" میں کسی متوقع خطرے سے بچنے کے لئے ایک طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"مجھے جانے دو، وہ مجھے چھوڑ کر نکل جائیں گے۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔

"تو تم لوگ ہمیں یہاں بے یار و مددگار چھوڑ کر جاؤ گے؟" میں دانت پیس کر خونخوار لہجے میں غرایا، اسی کے ساتھ مجھے اپنی بے نام ذہنی خلش کا سبب بھی معلوم ہو گیا غالباً میری چھٹی حس اس خطرناک صورتِ حال کو پہلے ہی بھانپ چکی تھی۔

میرے لہجے کی سختی بھانپ کر وہ بے چون وچرا میرے ساتھ ہولیا۔

اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے اس شخص پر ہاتھ ڈال کر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر میں اسے چھوڑ دیتا تو وہ لوگ وہاں رک کر مجھے گھیر سکتے تھے۔ اسے ہلاک کرنے کی صورت میں وہ سب اس وقت تک فرار نہ ہوتے جب تک کسی کھاڑی میں اپنے ساتھی کی لاش نہ پالیتے۔ میرے لئے لانچ کو روکنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

میں نے اضطراری کیفیت میں اچانک اس کی کنپٹی پر فائر کر دیا وہ ایک لمبی چیخ مار کر زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور میں پوری قوت سے تاریک چٹانوں کی بھول بھلیوں میں گھس گیا۔

فائر کے ردعمل کے بارے میں میرا آخری اندازہ سو فیصدی درست ثابت ہوا۔ فائر کے شور کے ساتھ ہی رات کا سناٹا انسانی شور وغل سے گونج اٹھا۔ شور کا اصل مخرج مسافروں کی طرف تھا۔ شاید فائر کی وجہ سے وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ادھر سمندر کی جانب سے بھی ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پھر سناٹے میں لانچ کے انجن کی تیز آواز سنائی دی جو بتدریج دور ہوتی جا رہی تھی۔

میں اپنی کمین گاہ میں چھپا اپنے چڑھتے ہوئے سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ لانچ والے فائر کا شور سن کر یہی سمجھے ہوں گے کہ کسی گشتی جماعت نے اچانک دھاوا بول دیا ہے۔ اسی لئے وہ بلاتوقف دُم دبا کر بھاگ نکلے تھے مگر مجھے بے سروسامان مسافروں کی پریشانی کا افسوس تھا جو شاید مختلف سمتوں میں بھگ کھڑے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد لانچ کے انجن کا شور رات کے سناٹے میں گم ہوگیا۔ اسی کے ساتھ مسافروں کا شور بھی مختلف سمتوں میں معدوم ہوتا جا رہا تھا۔

میں ریوالور سنبھالے احتیاط کے ساتھ چٹانوں سے نکل آیا۔

میرے شکار کی خون میں نہائی ہوئی لاش اسی جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں وہ میرے ہاتھوں زخم کھا کر گرا تھا۔ اس کے سر کے زخم سے بہنے والے خون نے ریتلی زمین پر بہت بڑے سرخ دھبے کی صورت اختیار کر لی تھی میں نے اس کی موت کا یقین کرنے کے بعد اس طرف کی راہ اختیار کی جہاں لانچ کے بدنصیب مسافروں کو شب بسری کے لئے ٹھہرایا گیا تھا۔

اور وہاں پہنچ کر میرے اندیشوں کی تصدیق ہوگئی۔ کھاڑیاں ویران پڑی ہوئی تھیں اور اندھیرے میں وہاں جوتے اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ مسافروں کا تقریباً سارا سامان طوفان سے بچاؤ کی خاطر سمندر میں پھینک دیا گیا تھا اور جو کچھ ان کے پاس رہ گیا تھا وہ دہشت کے باعث وہاں چھوڑ بھاگے تھے میں نے اپنے دل پر اداسی کی لہر غالب آتی محسوس کی۔

مسافروں کو جس انداز میں اس ویران ساحل پر اتارا گیا تھا اسکے پیش نظر ان کا مقدر مجھ پر واضح ہوچکا تھا۔ ناگہانی طوفان کے باعث لانچ کی حالت اتنی خستہ ہوچکی تھی کہ کپتان کے لئے سمندر میں ٹھہر کر خلیج کا دہانہ صاف ہونے کا انتظار کرنا دشوار تھا۔ اسے یقین رہا ہوگا کہ کسی بھی وقت لانچ کے تختے اپنی جگہ چھوڑنی شروع کردیں گے۔ لہٰذا اس نے مسافروں کو ایک فرضی کہانی سنا کر دھوکے سے اس گمنام ساحل پر اتار دیا۔ اس کا شیطانی منصوبہ یہی رہا ہوگا کہ مسافروں کو وہاں چھوڑ کر خود واپس فرار ہوجائے اور مرنے والا میرے سامنے اس منصوبہ کا اعتراف بھی کرچکا تھا ان حالات میں مسافروں کا وہاں بھٹکنا لازمی تھا مگر میرے اضطراری فائر کے باعث وہ حالات کو پوری طرح سمجھے بغیر ہی بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ بس میں بہتری کا بس ایک ہی پہلو تھا کہ وہ لوگ جو وقت آرام کرنے میں ضائع کرتے اب وہ جدوجہد میں صرف کیا جاسکتا تھا۔

معاً مجھے پاربتی کا خیال آیا۔ وہ بھی رات کے اندھیرے میں نہ جانے کس طرف نکل گئی تھی۔ وہ عورت اپنی حرکتوں کے باعث آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بچھڑ جانے سے میں خاصی دشواریوں سے بچ گیا تھا۔

میں نے ریوالور ایک مرتبہ پھر اپنی کمر سے باندھ لیا اور وہیں زمین پر دراز ہوگیا۔ دن کے اجالے میں علاقے کا جائزہ لینے کے بعد ہی میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

کھردری چٹان کی ٹھنڈی سطح اس وقت میرے لئے نرمی کی خوابگاہ میں موجود پرتکلف بستر سے کم نہیں تھی۔ سفر کی صعوبتوں اور مسلسل تکان نے میرا حال ابتر کر دیا تھا۔ میں تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

وہ ساری رات میں نے بھیانک خواب دیکھتے بسر کی، پھر بدن میں عجیب سی سوزش کے باعث میری آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہونے کے ساتھ ہی وہ سوزش اتنی بڑھ گئی کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

میرا پورا لباس پسینے میں شرابور تھا۔ سمندری ہواؤں میں شامل جو نمک میرے بدن پر تہہ در تہہ جم گیا تھا شدید گرمی اور پسینے کے باعث رنگ کھا رہا تھا

سورج مشرقی افق سے تھوڑا ہی بلند ہوا تھا۔ میری رسٹ واچ اس مقام پر ناکارہ ہوچکی تھی کیونکہ اس جگہ کے مقامی وقت کا مجھے علم نہیں تھا۔ پھر بھی سورج کی بلندی کو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ تھا کہ صبح کے نو یا دس بجے ہوں گے مگر اس وقت سورج سے آگ برس رہی تھی۔ ہواؤں میں بھی لو کا سا اثر موجود تھا اور پتھریلی چٹانیں دھوپ کی شدت سے تپ رہی تھیں۔

میں گہرے گہرے سانس لیتا ہوا ایک سایہ دار جگہ پر پہنچ گیا۔ وہاں جلتی ہوئی زمین اور سورج کی براہِ راست تپش سے تو نجات مل گئی مگر گرم ہوا پھر بھی جسم کے کھلے ہوئے حصوں کو جھلسا رہی تھی۔

میں نے اپنے گریبان کے سارے بٹن کھول دیئے۔ گرمی اور بدن کی سوزش سے مجھے شدید دہشت ہو رہی تھی۔ پھر میرا گلا بھی خشک ہو رہا تھا۔ میں نے تھوک نگلنے کی کوشش کی مگر دہانہ پہلے ہی خشک پڑا ہوا تھا۔ یہ میرے لئے تلخ تجربہ تھا۔

میرا قیاس بتا رہا تھا کہ اگر میں مزید کچھ دیر وہاں رکا رہا تو دوپہر تک سورج اس قدر آگ برسانے لگے گا کہ میرے لئے سایہ دار جگہ سے باہر نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ پانی کے بغیر اس غضب کی گرمی سے مقابلہ کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ مجھ سے چند سو گز کے فاصلے پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود تھا مگر میں وہ پانی پیاس بجھانے کے لئے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ ناقص غذا اور صبر آزما سفر کے باعث سارا جسمانی نظام پہلے ہی ضرورت سے زیادہ حساس تھا۔ اگر میں

پانی پی کر بیٹھتا تو شاید آنتوں کی سوزش میرے لئے جان لیوا روگ کی صورت اختیار کر لیتی۔

میں آہستہ آہستہ سائے سے باہر نکلا۔ گرم ہوا نوکیلے نیزوں کی طرح جسم اور آنکھوں میں پیوست ہو رہی تھی۔ یہ احساس ہو رہا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں میرا سارا وجود موم کی طرح پگھل کر بہہ جائے گا۔

ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہوکر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرے چاروں طرف پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا گویا میں کسی ویران اور غیر آباد جزیرے کا قیدی تھا۔

پھر فوراً ہی مجھے دوسرے بدنصیب مسافر یاد آئے، جو رات کے اندھیرے میں فرار پر مجبور ہوگئے تھے۔ ان میں سے کوئی مجھے نظر نہیں آیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ نادانستگی میں وہ سب سمندر میں جا ڈوبے تھے۔

معاً میرے ذہن میں سراب کے تصور نے سر ابھارا اور میں نے پوری توجہ سامنے نظریں مرکوز کر دیں۔ کافی دیر تک ادھر کا جائزہ لینے کے بعد میں نے پشت پر پھیلے ہوئے سمندر کا رخ کیا اور مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ میری نگاہیں اب تک سراب دیکھتی رہی ہیں۔ چٹانوں کے پیچھے ٹھاٹھیں مارتا کھلا سمندر تھا اور ان سے آگے تاحدِ نظر ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ گرم ہواؤں کے باعث اس صحرا نے بھی سمندر کا بہروپ اپنا لیا تھا۔ کافی دیر تک میں بے یقینی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صحرا میں گھورتا رہا۔ میں سراب کے بارے میں سنتا رہا تھا مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ سراب اس قدر پُرفریب اور حقیقت سے قریب ہوتا ہے۔

آگے جھلستا ہوا صحرا اور پیچھے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ میرے لئے کسی طرف پناہ نہیں تھی۔ بس وہ کھاڑیاں اور بنجر ٹیلے مجھے سایہ فراہم کرسکتے تھے مگر ایک بھوکا پیاسا انسان اس ہولناک گرمی کا کب تک مقابلہ کرسکتا تھا۔!

میں نے فوری سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔ ان ٹیلوں کے سائے سے نکلنے کے چند گھنٹوں بعد ہی میری حالت اس قدر خراب ہوجاتی کہ میرے لئے آگے بڑھنا ممکن رہتا نہ واپسی کی قوت رہتی۔ گرمی کا زور ٹوٹنے کے بعد ہی سفر شروع کرنا مناسب تھا۔

میں ایک سایہ دار جگہ پر لیٹ گیا جہاں ہوا کے براہِ راست جھونکے بھی نہیں آرہے تھے مگر اسکے باوجود وہاں تپش بہت شدید تھی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی تنور کے دہانے کے قریب بیٹھا ہوا ہوں۔

میں نے سونے کی کوشش کی مگر اس قدر خوفناک صورتحال میں سونا تو کیا آنکھ جھپکنا تک مشکل تھا۔ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی گرمی کے ساتھ بدن کے مساموں کی جلن بڑھتی جارہی تھی اور زبان حلق کی جڑ تک بالکل سوکھتی جارہی تھی۔

میں اپنے جسم کو کم سے کم حرکت دینی چاہ رہا تھا تاکہ آنے والے صبر آزما سفر کے لئے زیادہ سے زیادہ توانائی محفوظ رکھ سکوں مگر میرے لئے زیادہ دیر تک وہاں پڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ پسینوں میں بھیگا ہوا لباس جسم سے چپکا جا رہا تھا۔

میں نے گھبرا کر وہ جگہ چھوڑ دی اور سمندر کی طرف ہولیا۔ ریوالور، سگریٹ ماچس اور دیگر چیزیں میں نے ایک جگہ رکھ دیں اور خود کپڑوں سمیت پانی میں اتر گیا۔

اس قیامت خیز گرمی کے مقابلہ میں پانی بہت فرحت بخش تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے پانی میں غوطہ لگایا اور میرے بدن کے روئیں روئیں میں تازگی کی لہر سرایت کرگئی اور میں الٹے سیدھے ہاتھ پیر چلا کر پانی میں تیرنے کی کوشش کرنے لگا مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کام اتنا سہل نہیں۔ پیراکی میں انسان کی توانائی خاصی تیزی سے زائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں کنارے پر آکر گیلی ریت میں لیٹ گیا اور لہریں میرے جسم کے اردگرد دم توڑنے لگیں۔

اچانک میری نظر ٹیلوں کے ایک دور افتادہ سرے پر پڑی اور میں چونک پڑا۔ کوئی انسانی سایہ کھاڑیوں سے نکل کر لڑکھڑاتا ہوا ساحل کی طرف آرہا تھا چند ہی ثانیوں میں میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ پاربتی تھی۔

"پاربتی!" میں نے اٹھ کر اسے پکارا۔

اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ دیوانوں کی طرح چیختی ہوئی میری طرف دوڑ پڑی۔ قریب آکر وہ ہانپتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے نرمی سے اسے اپنی بانہوں میں لے کر الگ کرنا چاہا مگر وہ میرے ہاتھوں میں آگئی۔ اس کی آنکھوں سے رخساروں پر آنسو رواں تھے اور وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔

میں نے اسے احتیاط سے پانی میں لٹا دیا اور خود دور بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

جب دو چار لہروں نے اس کے بدن پر سے گزر کر دم توڑا تو اچانک اسے ہوش آگیا، پھر اس سے قبل کہ میں اس کے ارادے سے آگاہ ہوتا، وہ بیتابانہ انداز میں قدرے آگے بڑھ کر غٹاغٹ سمندری پانی پیتی چلی گئی۔

"یہ پانی مت پیو۔" میں چیختا ہوا اس کی طرف لپکا، مگر اس پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور جب میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اوپر اٹھایا تو وہ نڈھال سی میرے شانے سے آلگی۔

"نمکین اور کڑوا ضرور ہے مگر پانی ہے!" وہ عجیب مگر آسودہ لہجے میں بولی۔

"یہ تمہاری آنتوں کو برباد کردے گا۔"

"پیاسا مرنے سے تو بہتر ہی ہوگا!"

"رات سے کہاں تھیں تم؟"

"چھاپے کے بعد سے ایک دراڑ میں چھپی بیٹھی تھی، تمہیں ڈھونڈنے کی بھی ہمت نہ پڑی۔ اب پیاس سے بے حال ہوکر مجبوراً باہر آئی ہوں۔"

میں دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گیا۔ میرے فائر سے وہ بھی چھاپے کے وہم میں مبتلا ہوگئی تھی۔ "باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جس کا جدھر منہ اٹھا، ادھر بھاگ لیا۔" وہ نیم خوابیدہ لہجے میں بولی۔ شاید اس پر پھر بیہوشی طاری ہونے والی تھی۔ خالی پیٹ میں سمندری پانی پی کر اس نے اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے سہارا دے کر پانی سے باہر لاتا وہ ایک مرتبہ پھر بیہوش ہوگئی اور میں اسے بانہوں میں اٹھا کر جھلسا دینے والی گرم ہوا سے محفوظ اس کھاڑی میں لے آیا جو میں نے بڑی دشواری کے بعد تلاش کی تھی۔

اسے مسطح جگہ پر لٹا کر میں ایک پتھر کے سہارے بیٹھ گیا۔ میرا ذہن اس وقت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ہندوستان سے فرار ہونے میں تو کامیاب ہوگیا تھا مگر مقدر کی گردش ابھی باقی تھی۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میں کس علاقے میں موجود ہوں اور سامنے پھیلا ہوا صحرا کتنا وسیع ہے اور پہلی آبادی وہاں سے کس فاصلے پر مل سکے گی۔

میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ پھر پاربتی کی کمزور آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور میرا دل لرز کر رہ گیا۔ وہ نقاہت کے عالم میں بدستور زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا حسین چہرہ زرد پڑا ہوا تھا، یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے گلاب کی پتیاں سوکھ چلی ہوں، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے اور وہ آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے پتلے پتلے مرجھائے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ موجود تھی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ لانچ چلی گئی؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"گولی کی آواز کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں، یہ کون سی جگہ ہے، یہاں تو آسمان سے آگ برستی معلوم ہو رہی ہے!"

"ہم ایک صحرا کے کنارے ہیں۔ وہ ہمیں یہاں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے میں نے ان کا ایک آدمی مار دیا۔ پتہ نہیں اس قیامت کی گرمی میں باقی لوگوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟"

"تو وہ گولی تم نے چلائی تھی؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"اتنی دور کیوں بیٹھے ہو... میرے قریب آجاؤ نا!" اس کے لہجے میں التجا چھپی ہوئی تھی۔

"دور رہنا ہی بہتر ہے، نہ جانے کب تک ہمیں بھوکا پیاسا رہنا ہوگا۔ ذرا گرمی کم ہو تو ہم آگے روانہ ہوں گے۔ دن کو تو سفر کرنا ناممکن ہے!"

"مجھے لگتا ہے کہ میرا آخری سمے آگیا ہے۔" وہ ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "میرے قریب آجاؤ۔ شاید اسی طرح میری زندگی کچھ طویل ہو جائے! مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میری آنتیں کٹتی جا رہی ہوں!"

"یہ سمندری پانی کا اثر ہے!" میں سپاٹ لہجے میں بولا "میں نے اسی لئے تمہیں وہ پانی پینے سے منع کیا تھا مگر تم نہ مانیں!"

"تم کتنے اچھے ہو!" وہ ایک بار پھر دکھی انداز میں ہنس دی۔ "شروع سے ہی میرا خیال رکھتے آرہے ہو، نام کیا ہے تمہارا؟ ابھی تک بتایا نہیں تم نے؟"

"زیادہ باتیں نہ کرو۔ بولنے سے پیاس کی شدت اور بڑھ جائے گی!"

"نام بتا دو، پھر چپ ہو جاؤں گی۔" وہ ضدی بچے کی طرح بولی۔

"دقیا ساگر!" میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام دہرا دیا۔

وہ پاگلوں کی طرح ہنس دی: "ساگر ہو کر بھی پیاسے ہو، خدا کے لئے تو میرے من کی آگ تو بجھا دو۔ یا یہ بھی نہیں کر سکتے؟"

"اپنے ذہن پر قابو رکھو پاربتی، ہم بہت بھیانک صورت حال سے دوچار ہیں!"

"مجھے پتہ ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔" وہ اداس لہجے میں بولی۔ "مگر میں تمہیں چاہنے لگی ہوں ساگر، میرے ساتھ اتنا ظلم نہ کرو!"

میں نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس نے کئی بار مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر میں نے ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ جب کافی دیر تک اس کی آواز نہ سنائی دی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر گہری نیند سو چکی تھی۔

وقت کی رفتار سست پڑ چکی تھی میرے لئے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ زبان اور ہونٹ بالکل خشک ہو گئے تھے اور ذہن پر گزرنے والے لمحات کی ہیبت سوار تھی۔ اپنی بقا کی خونریز جدوجہد میں نہ جانے مجھ سے کون سے ایسے گناہ سرزد ہوئے تھے جن کی پاداش میں مجھے یہ صعوبت جھیلنی پڑ رہی تھی۔

خدا خدا کر کے سورج کی تپش اور گرم ہواؤں کی شدت میں کمی آنا شروع ہوئی۔ میں نے اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل کر فضا کا جائزہ لیا۔ زمین اب بھی جل رہی تھی مگر مجموعی طور پر موسم قدرے بہتر ہو گیا تھا میں نے واپس آکر پاربتی کو بیدار کیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی اور خوفزدہ انداز میں بار بار پلکیں جھپکانے لگی۔ اس کے نقاہت زدہ چہرے پہ خوف کے سائے لرزاں تھے اور وہ بار بار زبان سے اپنے ہونٹوں کو تر کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"ہمیں سفر شروع کرنا ہے پاربتی!" میں نے ترحم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے میرے چہرے کو تکتے ہوئے اٹھ گئی۔ میں ریوالور سمیت اپنا ساز و سامان پہلے ہی سمیٹ چکا تھا لہٰذا اس کا بازو تھامے کھلے آسمان کے نیچے آگیا۔

"پانی... ساگر وہ دیکھو سامنے کوئی جھیل ہے!" باہر آتے ہی پاربتی خوشی سے دیوانہ وار چیخ اٹھی۔ اس کی نگاہیں تپتے ہوئے صحرا کی وسعتوں میں کہیں مرکوز تھیں۔

گرم ہواؤں کے انعطاف کے باعث چمکیلی ریت ہلکورے لیتے ہوئے پانی کی طرح نظر آرہی تھی۔ میں نے مایوسی کے ساتھ کہا: "جھیل نہیں وہ سراب ہے پاربتی!"

"نہیں، غور سے دیکھو۔" وہ پرجوش لہجے میں بولی: "وہ پانی ہے ساگر! بھلا سراب بھی ایسا ہو سکتا ہے، ہم تھوڑی دیر میں وہاں تک پہنچ جائیں گے!"

میں نے اس کی تردید کرنی مناسب نہ سمجھی۔ یہ امید اس میں نیا حوصلہ پیدا کر سکتی تھی۔ "ہم اسی طرف چل رہے ہیں۔"

سمت کا بس ایک ہی اندازہ باقی تھا۔ سورج اور اپنے سائے کے ذریعہ

میں نے شمال کا یقین کیا اور پھر ہم آگے بڑھنے لگے۔

"اس جھیل کے کنارے پہنچ کر تو تم غصہ تھوک دو گے نا؟" پاربتی نے تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد پرامید لہجے میں سوال کیا۔

"زندگی کی دعا مانگو پاربتی، پاپ کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا: "اگر کوئی نیکی ہی کام آگئی تو ہم اس صحرا سے زندہ نکل سکیں گے۔"

"کیوں ڈرا رہے ہو مجھے؟" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی: "اس جھیل کے آس پاس کوئی نہ کوئی بستی ضرور ہوگی، وہ لوگ ہماری مدد کریں گے!"

اس وقت تک ہم کافی آگے نکل آئے تھے۔ میں چلتے چلتے رک گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہم اسی طرف سے آئے ہیں نا؟" میں نے ہاتھ سے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھو اب وہاں بھی پانی ٹھاٹھیں مارتا نظر آرہا ہے!"

وہ پلٹی اور پھر حیران رہ گئی مگر اس کے ذہن پر ابھی تک خود فریبی سوار تھی۔ جلدی سے بولی: "پانی تو ہے مگر وہ شاید سمندر ہے!"

"سمندر!" میں تلخ انداز میں ہنس دیا: "سمندر تو چٹانوں اور ٹیلوں کی اوٹ میں رہ گیا، اور وہ دیکھو ذرا، وہ کیا ہے؟"

میرے اشارے کی سمت میں اس نے دیکھا اور اس کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی، پھر اس نے بائیں جانب بھی دیکھا تو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر نیچے بیٹھ گئی: "اوہ... یہ تو ہر طرف پانی ہی پانی پھیل گیا ہے!"

"اور تم کہو گی کہ ہم کسی جزیرے پر ہیں!" میں آہستہ سے ہنس دیا: "ہر طرف سراب ہی سراب ہے۔ یہ پانی جیسی پرچھائیاں بھٹکتے ہوئے صحرا نوردوں کو تھکا تھکا کر ہلاک کر دیتی ہیں۔ ان کا خیال چھوڑ دو، ورنہ ہم سمت بھی بھلا بیٹھیں گے!"

اس کے چہرے پر ناامیدی پھیل گئی اور وہ دل شکستہ انداز میں میرے ساتھ ہو لی۔ ہم دونوں کے لئے نرم اور گہری ریت میں چلنا سخت دشوار ہو رہا تھا ہم آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ریتیلی زمین ہمیں پیچھے کھینچ رہی تھی ہر قدم ریت میں کئی کئی انچ اندر دھنس جاتا تھا۔ پاربتی شروع ہی سے برہنہ پا تھی، مگر مجھے بھی جوتے اتار کر شانوں سے لٹکانے پڑے کیونکہ جوتوں کے اندر ریت بھی بہت بھر گئی تھی اور اس وزن کے ساتھ چلنا دشوار تر ہو گیا تھا۔

خدا خدا کر کے آگ برساتا ہوا، قہر بار سورج مغرب کی جانب غروب ہونے لگا صحرا کے سینے پر سرخ، زرد، نارنجی رنگوں کے حسین لہریے پھیل گئے۔ آگ اگلتی زمین کی حرارت بھی ماند پڑنے لگی پھر سرمئی دھندلکا چھاتا چلا گیا۔

"سورج ڈوب چکا ہے، اب سمتوں کا خیال رکھنا پاربتی۔" میں نے اسے آگاہ کیا: "ہمیں ہر قیمت پر بالکل سیدھے چلنا ہے ورنہ ہم اسی بھول بھلیاں میں گھومتے رہیں گے۔"

"مجھ سے چلا نہیں جا رہا ساگر۔" وہ کراہتے ہوئے بولی: "میری ٹانگیں پھوڑوں کی طرح دکھنے لگی ہیں۔"

وہ سچ کہہ رہی تھی، یہ احساس مجھے بھی تھا اور اس قدر شدید کہ اسکے سامنے پانی کی طلب قدرے ماند پڑ چکی تھی۔

"اس جگہ رک جاؤ۔" میں نے اس سے کہا: "سستانے سے پہلے نشانی لگانے دو تاکہ بعد میں ہم کسی اور رخ پر نہ چل پڑیں۔"

ریت نرم تھی، میں دونوں ہاتھوں سے شمالاً جنوباً ایک نالی بنانے لگا دو تین فٹ لمبی نالی تیار کر کے میں نے اسکے شمالی سرے پر ایک چھوٹا سا ٹیلا بنا دیا، جو سفر کے دوبارہ آغاز میں ہماری رہنمائی کر سکتا تھا۔ پھر میں ریت پہ دراز ہو گیا جو اب بھی ہلکی ہلکی گرم تھی۔

پاربتی کراہتی ہوئی میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ اس کا بدن گرم ہو رہا تھا۔

"تمہیں بخار ہو گیا ہے!" میں نے چونک کر کہا۔

"تم مجھ سے پریم کے دو بول بول لو تو میں ٹھیک ہو جاؤں گی!" وہ میرے سینے پر سر رکھ کر التجا آمیز لہجے میں بولی۔

"میں تم سے نفرت کے ساتھ تو نہیں بول رہا!" میں نے آہستگی کے ساتھ اپنے بازو اس کے جسم کے گرد حمائل کر دیئے۔

میرے ہاتھوں کا ڈھیلا حصار محسوس کر کے وہ لذت آمیز انداز میں بولی: "مجھے بانہوں میں بھینچ لو!"

میرے وجود میں کروڑوں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

میں نے اسے الگ کر دیا اور خود بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ ہوا میں فرحت آمیز تازگی اور خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ ریت بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ سر پہ تاروں بھرا آسمان جگمگا رہا تھا۔ صحرا کی وہ رات اتنی سکون آمیز اور راحت بخش تھی کہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ دن میں وہ صحرا جہنم کا منظر پیش کرتا ہوگا۔ تاریکی اور سناٹے کا وہ امتزاج میرے لئے بڑا صبر آزما تھا کیونکہ میرے ساتھ پاربتی موجود تھی۔ جو تھکن، بخار، پیاس اور بھوک کے باوجود میرے قرب کے لئے کوشاں تھی۔

"دور کیوں ہٹ گئے ساگر؟" وہ میرا دامن پکڑ کر مجھے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولی۔

"تمہارے بدن سے اٹھنے والی مہکار میرے حواس پہ چھا رہی تھی!" میں نے بے تابی سے پے در پے سگریٹ کے کئی کش لیتے ہوئے کہا۔

"تو چھا جانے دو۔" وہ خوابناک آواز میں بولی: "دیکھو یہ سمے کتنا پیارا ہے۔ پتہ نہیں یہ ٹھنڈی ہوا اور خنک ریت کا بستر ہمیں دوبارہ نصیب بھی ہو گا یا نہیں!"

"یہ باتیں بھول جاؤ پاربتی!"

وہ میرے قریب آگئی: "ایسا نہ کہو ساگر!"

اس کی بے باکانہ جسارتوں سے بوکھلا کر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور غراتے ہوئے بولا: "مجھ سے دور رہو پاربتی، میں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔"

"کھلونا نہیں تم تو میرے محسن ہو ساگر۔" وہ میرے قدموں سے لپٹ گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "مجھے اس طرح نہ ٹھکراؤ۔ میں اتنی بری تو نہیں ہوں!"

پھر وہ بیمار اور پیاسی عورت اٹھ کر اچانک مجھ سے لپٹ گئی۔ چند ثانیوں تک میں منتظر رہا کہ شاید وہ خود ہی الگ ہو جائے گی، مگر جب جنون کے عالم میں وہ

حد سے تجاوز کرنے لگی تو میں نے بے رحمی سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

وہ ہلکی سی چیخ مار کر ریت پر جا گری۔

"مجھ سے دُور رہو پاربتی!" میں سرد اور سفاکانہ لہجے میں بولا۔ "اگر اب میرے بدن کو چھیڑنے کی کوشش کی تو تھپڑ مار مار کر چہرہ لہولہان کر دوں گا۔"

"تم ..... تم مجھے تھپڑ مارو گے؟" اس نے حیرت کے ساتھ کہا۔ میرے بدلے ہوئے رویے نے اسے حقیقی دنیا میں لوٹ آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہاں!" میں نے بدستور اسی لہجے میں جواب دیا۔ "میں اپنی قوتِ مزاحمت تمہاری عیاشی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔ مجھے ہر قیمت پر اس صحرا سے زندہ نکلنا ہے۔"

"میں دیکھوں گی کہ تم کیسے اس صحرا سے نکل سکتے ہو۔" اچانک وہ غصیلے لہجے میں چیخنے لگی۔ "مجھ کو نظر انداز کر کے تم راستہ بھی نہ پا سکو گے۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میری بنائی ہوئی نالی میں ریت بھرنے لگی۔ اس نشان کو مٹا کر وہ میرے مصائب میں اضافہ کرنا چاہتی تھی۔

میں تیزی سے لپکا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اسے زمین سے اٹھا لیا۔ وہ بری طرح چیختی ہوئی سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ساتھ ہی وہ میرے چہرے اور سینے پر گھونسے بھی مارتی جا رہی تھی۔

میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑے اور داہنے ہاتھ سے اس کے رخسار پر ایک بھرپور طمانچہ رسید کیا۔ صحرا کے سناٹے میں چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی پاربتی کی سُریلی چیخ گونجی اور یک بیک اس نے بلک کر رونا شروع کر دیا۔

اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا اور اس نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں کے درمیان چھپا لیا تھا۔ میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے۔

"میرے ساتھ سفر کرنا ہے تو اس تھپڑ کو یاد رکھنا۔" یہ کہہ کر میں ٹھنڈی ریت پر دراز ہو گیا اور وہ نیچے بیٹھ کر روتی رہی۔

جب خاصی دیر تک اس کے رونے میں فرق نہ آیا تو مجبوراً مجھے دوبارہ بولنا پڑا۔ "یہ رونا دھونا بند کرو، یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں سنے گا۔ تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کر لو۔ اس کے بعد میں آگے روانہ ہو جاؤں گا اور سورج چڑھنے سے پہلے کہیں نہیں رکوں گا۔"

"میرے آرام کی تم کو کیوں فکر ہے؟" وہ رونا بھول کر زہریلے لہجے میں بولی۔ میں دل ہی دل میں اس کی جھلاہٹ سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس لئے کہ تمہاری ٹانگیں دکھ رہی تھیں اور تم بھوکی پیاسی بھی ہو!"

وہ کچھ کہے بغیر ریت پر لیٹ گئی۔ رونے کی آواز دوبارہ نہ سنائی دی۔

مجھ پر کئی بار نیند کا شدید حملہ ہوا مگر ہر بار میں نے اسے ٹال دیا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار آنکھ لگ گئی تو اگلی صبح کا سورج ہی مجھے بیدار کر سکے گا۔ جب کہ میں رات کے خنک سناٹے میں ہی کسی آبادی یا ویران نخلستان تک پہنچنے کی کوشش میں تھا۔

میرے اندازے کے مطابق جب سستاتے ہوئے تقریباً نصف گھنٹہ گزر گیا تو میں نے اسے پکارا۔

"ہاں!" وہ فوراً ہی بولی۔

"اٹھ جاؤ۔ اب چلنا ہے!"

اس نے بے چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کی اور ہم دونوں پہلو بہ پہلو ٹیلے کے سہارے شمال کی سمت میں بڑھنے لگے۔ پاربتی نے خلافِ معمول اب میرے ہاتھ کا سہارا نہیں لیا تھا، خاموشی کے ساتھ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر چل رہی تھی۔

ہمیں چلتے چلتے کافی دیر گزر گئی۔ پاربتی کے چڑھے ہوئے سانسوں کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی رفتار بھی سست پڑتی جا رہی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ رک گئی۔ میں نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں فریاد نمایاں تھی۔ میں بھی رک گیا۔ سفر کے دوبارہ آغاز کے بعد سے ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بالکل بات نہیں کی تھی اور اس وقت بھی یہ خاموشی پوری شدت کے ساتھ برقرار تھی۔

وہ کچھ دیر کے لئے زمین پر بیٹھ گئی۔ میں شمال کی طرف سر کر کے زمین پر لیٹ گیا۔ پاربتی کے کھنکارنے کی آواز پر میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ چلنے کے لئے تیار تھی۔ میری اور اس کی نظریں چار ہوئیں اور وہ مقررہ سمت میں چل پڑی۔ میں بھی زیرِ لب مسکراتا اس کے پیچھے ہو لیا۔

وہ پوری رات اسی طرح خاموشی سے سفر کرتے گزر گئی۔ خنکی کے باعث پیاس کی شدت میں نمایاں کمی آ گئی تھی مگر بھوک اور تھکان پوری طرح اعصاب پر غالب تھی۔ میرے مقابلے میں پاربتی کی حالت ابتر تھی۔ وہ اس قدر نڈھال ہو گئی تھی کہ ریت میں تقریباً گھسٹ رہی تھی۔

آہستہ آہستہ آسمان پر سفیدی نمودار ہونے لگی۔ دن نکلنے والا تھا اور دور دور ہمیں ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ آنے والے دن کی ہولناک گرمی کے تصور ہی سے مجھے وحشت ہونے لگی۔ سفر کا آغاز کرتے ہوئے یہ پہلو میرے ذہن سے اوجھل تھا کہ جھلستا ہوا بنجر اور بے آب و گیاہ صحرا دوسرے روز بھی ہمیں کوئی پناہ یا سایہ فراہم نہ کر سکے گا۔

سورج طلوع ہونے سے قبل جب سپیدۂ سحری پوری طرح پھیل گیا تو یہ دیکھ کر میں کانپ اٹھا کہ آسمان کے شمال مشرقی حصے پر سُرخ دُھند چھائی ہوئی ہے۔ اسی قسم کی دُھند سمندری طوفان سے پہلے بھی نظر آئی تھی اور میں اس طوفان کی ہلاکت خیزی سے بخوبی واقف تھا۔

اس روز ہوا صبح ہی سے تیز چل رہی تھی۔ سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ہی تمازت میں شدت پیدا ہوتی چلی جا رہی تھی۔

"پپ ..... پانی ساگر!" چلتے چلتے اچانک پاربتی لڑکھڑا کر گرم ریت پر ڈھیر ہو گئی۔ پوری رات کی خاموشی کے بعد اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا تھا۔

میں نے بے چارگی سے قرب و جوار میں نظریں دوڑائیں مگر وہاں تاحدِ نگاہ ریت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ شمال مشرقی افق پر چھایا ہوا دھندلا غبار بتدریج آگے بڑھتا آ رہا تھا۔ زمین انگاروں کی طرح تپ رہی تھی اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ ان حالات میں، میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پاربتی نیچے گرنے کے بعد ہذیانی انداز میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔ میں خود بھی کربناک صورتِ حال سے دوچار تھا۔ گرم ہوا کے باعث میری آنکھوں تک میں درد ہونے لگا تھا، بھوک سے آنتوں

میں اینٹھن پیدا ہو رہی تھی اور پیاس کی شدت سے زبان دہانے سے باہر ... تھی۔ مجھے پانی کی بوند چکھے تیس گھنٹے سے زائد مدت گزر چکی تھی!

ریت میں مسلسل چلنے کے باعث میرے پیروں پر ورم آ گیا تھا۔ پاربتی کی ... سے مجھے رکنا پڑا تو زمین پر پیر جلنے لگے۔ میں نے شالوں سے لٹکے جوتے پہننے کی کوشش کی تو جوتے چھوٹے پڑ گئے۔ ورم کے باعث میرے پیر بہت پھول گئے تھے۔ میں نے دونوں جوتوں کی سلائیاں اُدھیڑ ڈالیں اور کسی طرح تسموں کے سہارے جوتے پیروں پر کس لئے تاکہ براہِ راست جھلسا دینے والی ریت سے میرے پیروں کا رابطہ نہ ہو۔

... مجھے ان بدنصیبوں کا خیال آیا جو خوش بختی کے سہانے سپنے دیکھنے اپنے ... چوروں کی طرح فرار ہوئے تھے۔ وہ سب نہ جانے کہاں تھے۔ صحرا کی بے رحم وسعتیں ان سب کو اس طرح نگل گئی تھیں کہ کسی کا نام و نشان تک نہ مل سکا تھا۔

پاربتی بے ہوشی کے عالم میں بھی رہ رہ کر پانی، پانی کی صدا لگا رہی تھی۔ چہرے پر ناقابلِ بیان کرب کے سائے لرزاں تھے اور بار بار اس کے بدن پر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہر بار یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یوں ہی سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔

ایک طرف پانی نایاب تھا دوسری طرف گرمی کے باعث میرے لباس کے اندر بدن پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ جسم سے نمی کا یہ اخراج میرے لئے ... ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے بدن سے سارے کپڑے اتار دیئے بس ایک ... باقی رہ گیا۔

پسینے میں تر بازوؤں پر نظر پڑتے ہی میری بے قراری بڑھ گئی اور میں ... اپنا ہی پسینہ چاٹنے لگا۔ وہ نمی میرے لئے سکون بخش ثابت ہوئی۔ ... میں شامل نمکیات کی تلخی اور ریت کے باریک ذرات کی کرکراہٹ بھی میرے ... کو نہ چھین سکی اور میں دیوانہ وار اپنے ہی بدن کے پُرنم حصے کو چاٹنے لگا۔ جب میرے حلق میں پڑتے ہوئے کانٹے دور ہوئے تو میں پاربتی کی طرف ... وہ بھی پسینوں میں شرابور تھی۔

میں نے جھنجھوڑ کر اسے ہوش میں لانا چاہا مگر وہ ہر بار غنودہ انداز میں ... پکار کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

میں ابھی کوششوں میں مصروف تھا کہ تیز ہواؤں کے ساتھ غبار اڑنے ... سر اٹھایا تو ریت کا ہولناک طوفان سر پر آ پہنچا تھا۔ سورج کا دہکتا ... سُرخ ریتیلی دھند میں ماند پڑ گیا تھا اور اس پر تان زدہ سورج ... صحرا کے سینے پر ہر طرف ریتیلے بگولوں کا رقص شروع ہو گیا تھا۔ چھوٹے ... بے شمار ریتیلے ستون صحرا میں سرگرداں تھے جن کی بلندی کا ... دشوار تھا۔

طوفان چند ہی لمحوں میں اس قدر شدید ہو گیا کہ میرے لئے آنکھیں کھولے ... ناممکن ہو گیا۔ ریت کے باریک ذرات پوری قوت سے نوکیلی سوئیوں کی طرح ... ٹکرا رہے تھے۔ چیختی چنگھاڑتی آوارہ ہوائیں اپنے جلو میں ریت کے

ہولناک گرداب لئے طاغوتی رقص میں مصروف تھیں۔

آندھی کے تیز جھونکوں میں میرا لباس میرے ہاتھ سے نکلنے لگا۔ میں نے لباس سمیٹ کر قابو میں کرنے کے لئے جوں ہی آنکھیں کھولیں، جلتی ہوئی ریت کے ڈھیر میری آنکھوں میں گھس گئے۔ میں بے اختیار بُری طرح چیخنے لگا۔ لباس میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔

میں آنکھیں بند کئے ٹھوکروں سے زمین ٹٹولتا ہوا بدقت پاربتی کے قریب پہنچا اور جلتی ہوئی ریت پر سینے کے بل لیٹ کر اپنا چہرہ پاربتی کے پہلو میں چھپا لیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میں نے اس کے چہرے پر رکھ دیئے تاکہ اس کا دہانہ اور نظامِ تنفس ریتیلے ذرات سے قدرے محفوظ رہ سکے۔

آندھی کی شدت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ خوفناک آوازوں اور سیٹیوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بے شمار مہیب عفریت پاگل ہو کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ہوں، ریت جسم کو چھلنی کرنے پر تلی ہوئی تھی البتہ اس آندھی کے باعث گرمی میں اچانک خاصی کمی آ گئی تھی۔

"پپ ..... پا!" پاربتی نے کسمسا کر بولنا چاہا لیکن اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی، پھر اس کا جسم تیزی سے حرکت میں آیا۔

"میری آنکھیں!" وہ خوف اور اذیت کے عالم میں اچانک چیخی، شاید وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہا، مگر ریت نے اسے اندھا کر دیا۔

"آندھی آئی ہوئی ہے!" میں اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا کر چیخا۔ "آنکھیں اور منہ بند رکھو، اپنا چہرہ میرے جسم میں چھپا کر نیچے لیٹ جاؤ۔"

وہ یک بیک کسی جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ اس وقت شرم، حیا، تکلف اور فاصلے کا ہر احساس مٹ چکا تھا۔ چند ہی سیکنڈ کی کوششوں میں ہم دونوں نے اپنے چہرے ایک دوسرے کے بدن میں اس طرح دبکا لئے کہ ریت سے چہرے محفوظ ہو گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ساگر؟" وہ خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ریت اور ہوا کا ہولناک طوفان گزر رہا ہے!" میں نے کہا۔ "جب تک یہ طوفان باقی ہے، اسی طرح چپ چاپ لیٹی رہو!"

"پیاس، میرا حلق سوکھ چکا ہے ساگر!" اس نے دردناک آواز میں کہا اور اپنی اینٹھی ہوئی، لکڑی کی طرح خشک زبان میرے جسم کے ایک حصے سے مس کی۔ "اس بار میں زندہ نہ بچ سکوں گی، میرا آخری وقت آ گیا ہے!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا پیاسا دہانہ نمی کی تلاش میں بار بار میرے کرکرے جسم پر بھٹک رہا تھا اور میں دم سادھے خاموش پڑا ہوا تھا۔ ریت کے باعث میرے بدن کا سارا پسینہ خشک ہو چکا تھا۔

پھر اچانک ہم دونوں بیک وقت چیخ پڑے۔ یوں محسوس ہوا جیسے منوں وزنی کوئی عفریت ہم دونوں پر ٹوٹ پڑا ہو۔

میں نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی اور فوراً ہی ایک ہولناک حقیقت کا احساس ہو گیا۔ غضبناک ہواؤں کے دوش پر ریت کے ذرات نہیں

بلکہ پورے پورے تودے اور ٹیلے اڑتے پھر رہے تھے اور ہم دونوں ایک تودے میں دب چکے تھے۔ سانس کے ساتھ ریت نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ ہوا مفقود ہو جانے کے باعث سینے میں جلن اور گھٹن ہونے لگی تھی۔

زندہ دفن ہو جانے کا احساس اس قدر بھیانک تھا کہ میں نے اپنی تمام قوت مجتمع کر کے زور لگایا اور ریت کے انبار سے نکل گیا۔ پھر میں نے آنکھوں میں معمولی سی جھری پیدا کر کے پاربتی کا حال دیکھا اس کا پورا جسم ریت میں دفن تھا بس ایک ٹانگ قدرے باہر نکلی ہوئی تھی جو بُری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

میں نے ریت سے اپنی پنڈلیاں باہر نکالیں اور پاربتی کی ٹانگ پکڑ کر اسے باہر کھینچنے لگا۔ میری یہ کوشش بارآور ہوئی مگر باہر نکلنے تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی اور سانس رک رک کر آ رہا تھا۔

میں اپنے ہوش و حواس میں اور اس سے قدرے بہتر حالت میں ہونے کے باوجود بے بس تھا اور اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر پاربتی کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ چیختی چنگھاڑتی ستم زدہ ہوائیں اس روز شاید صحرا کو تہس نہس کر دینے پر تلی ہوئی تھیں۔ ہوا کے طوفانی جھکڑوں نے کئی بار مجھے اپنی جگہ سے دور اُچھال دیا مگر میں دوبارہ پاربتی کے قریب آ گیا۔ جب تک اس کے جسم میں زندگی کی ذرا بھی رمق باقی تھی میں اسے ریت میں زندہ درگور ہونے کے لئے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بار بار سیروں وزنی ریت میرے بدن پر یوں آ گرتی تھی جیسے کچھ لوگ تھالیوں میں بھر بھر کر مجھ پر ریت پھینک رہے ہوں۔ ایسے ہر موقع پر میں پاربتی کے بدن کو ٹٹولتا۔ جب بھی اس پر ریت کی گہری تہہ جمتی محسوس ہوتی میں اس کے جسم کو ایک دو کروٹیں دلا کر اس بوجھ سے نجات دلا دیتا۔

پھر اچانک میرے کانوں میں ایک ذی روح کی بلبلاتی ہوئی آواز آئی، طوفانی ہواؤں اور ہولناک ریتیلے بگولوں کے باوجود میں اپنی آنکھیں بند نہ رکھ سکا آنکھ کھلتے ہی میرا دل خوشی سے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک اونٹنی اپنے دو بچوں سمیت طوفان سے گھبرا کر بلبلاتی ہوئی صحرا میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوانہ وار اونٹنی کے پیچھے لپکا۔ میرے قدم ریت میں دھنس رہے تھے۔ ہوائیں مجھے پیچھے اڑا لے جانے پر تلی ہوئی تھیں، ریت کے ہولناک بگولے مجھے اندھا کر دینے پر آمادہ تھے، مگر وحشت زدہ اونٹنی ان مصائب کے باوجود بلبلاتی ہوئی سبک رفتاری سے دوڑی جا رہی تھی۔

پھر اچانک ایک غضبناک جھونکے نے اونٹنی کے ایک بچے کو فضا میں کئی گز پیچھے اُچھال دیا۔ وہ بری طرح چیختا اور بلبلاتا ہوا گردن کے بل ریت پر گرا، اور کربناک چیخیں مارتا ہوا تڑپنے لگا۔

وہ اونٹنی طوفان سے گھبرائی ہوئی ضرور تھی مگر اس ہولناک آفت میں بھی اس کا ممتا کا جذبہ پوری طرح بیدار تھا۔ اپنے تڑپتے ہوئے بچے کی چیخیں سُن کر وہ پوری قوت سے بلبلائی اور واپس دوڑ پڑی۔ اس کا دوسرا بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔

اونٹنی نے گردن جُھکا کر اپنے بچے کے لرزتے کانپتے بدن کو سُونگھا، پھر دردناک آوازیں نکالتے ہوئے اس کے گرد بے تابانہ انداز میں کئی چکر لگا کر یک بیک تھکے ہوئے انداز میں ریت پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت غبار کا ایک ہولناک ریلا آیا جس میں اونٹنی اور اس کے دونوں بچے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چند ثانیوں بعد وہ ریتیلی دھند صاف ہوئی تو اونٹنی اپنی طویل گردن ریت میں چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کے بچے نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ دوسرے بچے کا بدن ساکت ہو چکا تھا۔

"ساگر، ساگر!" اچانک ہواؤں کے آسیبی شور میں پاربتی کی ہذیانی چیخیں ابھرنے لگیں۔ میں جوش کے عالم میں اسے یکسر فراموش کر چکا تھا۔ شاید وہ ہوش میں آ چکی تھی اور مجھے اپنے قریب نہ پا کر دہشت زدہ ہو گئی تھی۔

ریت کے ہولناک طوفان کی زد میں آئے ہوئے اس لق و دق صحرا میں تنہائی کا احساس کسی بھی ذی روح کے لئے موت سے زیادہ بھیانک تھا اور یہ دہشت پاربتی کی آواز میں نمایاں تھی۔

"میری آواز کے سہارے چلی آؤ!" میں پلٹ کر پوری قوت سے چیخا۔ میری نگاہیں اس جگہ مرکوز تھیں جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا مگر وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ریت کی دیوار میری بصارت اور پاربتی کے درمیان حائل تھی۔

"کدھر آؤں؟ کہاں ہو تم؟" اس کی دہشت زدہ آواز ابھری۔ "مجھے ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا، بھگوان کے لئے قریب آ کر میرا ہاتھ تھام لو!"

اس کی التجا سُن کر میرا دل رواں رواں کانپ اُٹھا۔ میں نے ایک بار پھر اونٹنی کی طرف دیکھا، وہ بدستور اپنی تھوتھنی ریت میں چھپائے بیٹھی تھی۔

"میں آ رہا ہوں پاربتی!" میں نے چیخ کر کہا اور تیزی سے واپس ہو لیا۔ پاربتی تک پہنچنے میں مجھے شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ میں ریت کے زبردست ریلے میں اڑتے اڑتے بچا مگر میں نے اسے تلاش کر ہی لیا۔ وہ صحرا کے سینے پر کسی پتھریلے مجسمے کی طرح آنکھیں بھینچے بے حس و حرکت کھڑی ہوئی تھی۔

"آؤ، میرے ساتھ آؤ!" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ساگر!" وہ بلک کر میرے سینے سے آ لگی۔ "مجھے بچا لو ساگر! میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔!"

"ہمت رکھو اور میرے ساتھ آؤ!" میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "قریب ہی ایک اونٹنی موجود ہے، ہمیں اسے پکڑنا ہے!"

اس نے مجھ سے کئی سوال کئے مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا اسے تقریباً اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا تیزی سے آگے چل دیا۔

جب آسمان سے آگ برس رہی تھی تو وہ گرمی مجھے روئے زمین کا بدترین عذاب معلوم ہو رہی تھی پھر پیاس کی شدت نے سر اُبھارا تو گرمی کا احساس ماند پڑ گیا اور اس کے بعد ریت اور ہوا کے بدترین طوفان نے ہر اذیت کو ہیچ ثابت کر دیا۔ بھوک، پیاس اور تکان کا ہر احساس لاشعور کی گہرائیوں میں دفن ہو چکا تھا اور اب دماغ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جلد از جلد کسی طرح اس

طوفان سے نجات حاصل کی جائے۔

[...]ی روح فرسا جد و جہد کے بعد میں الم زدہ اونٹنی تک پہنچنے میں کامیاب [...] وہ بدستور اپنے مردہ بچے کے پہلو میں گردن ریت میں چھپائے بیٹھی تھی اس [...] بچہ ناتجربہ کاری کے باعث ریت میں منہ چھپائے رکھنے میں کامیاب [...] ہو رہا تھا۔ وہ بار بار گردن تک اپنی تھوتھنی ریت میں چھپاتا پھر گھبرا کر باہر [...] نکال لیتا اور بے چارگی کے ساتھ اپنی ماں کے گرد گھومنے لگتا۔

"پھرتی سے اونٹنی کی پشت پر سوار ہو کر اس کی گردن سے لپٹ جاؤ۔" [...] نے قریب پہنچ کر پاربتی سے کہا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری [...] طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

پاربتی کے سوار ہوتے ہی اونٹنی ہڑبڑا کر بلبلاتی ہوئی زمین سے اٹھی اگر [...] ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میں اس کے کوہانوں کے درمیان سوار ہونے کے [...] بجائے اس کے پیروں تلے بری طرح روندا جاتا۔

پاربتی اونٹنی کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے اٹھنے کے ہچکولوں سے [...] بے اختیار اس کی چیخیں نکل گئیں۔ چند ثانیوں کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ [...] اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے گی اور نیچے گر جائے گی۔

اس سُرخ اونٹنی کی گردن پر بڑے بڑے بال تھے۔ اس کا جسم بھی بالوں [...] سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کسی خاص نسل سے تعلق رکھتی تھی، کیونکہ اس کے دو کوہان تھے [...] کے درمیان بیٹھ کر میں نے اپنے آپ کو پوری طرح سنبھالا ہوا تھا۔

وہ اونٹنی چند ثانیوں تک اپنی جگہ پر کھڑی غصیلی آوازیں نکالتے ہوئے [...] ماری اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ ہم دونوں کو نیچے اچھال دے۔ اونٹنی کی [...] حرکت کے نتیجے میں پاربتی بری طرح چیخے جا رہی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ اونٹنی کا بچہ [...] کم سن اور بے ضرر تھا ورنہ وہ بآسانی ہم دونوں کی ہڈیاں چبا کر اپنی ماں کو [...] مشکل سے نجات دلا سکتا تھا۔

جب اونٹنی اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو گئی تو بھڑک کر سرپٹ ایک طرف [...] دوڑ پڑی۔

خشک دلدل جیسی نرم اور گہری ریت کے باوجود وہ اونٹنی تیز رفتاری [...] سے دوڑ رہی تھی۔ طوفان کے باعث وہ بار بار رک کر بلبلانے لگتی اور پھر دوڑ پڑتی [...] اس کی تیز رفتاری دیکھ کر میرا دل کھوپڑی میں دھڑکنے لگا۔ اگر اس تیز رفتار پر ہم دونوں [...] میں سے کوئی بھی نیچے گر جاتا تو اس کی ہڈیوں کا سُرمہ بن جاتا۔ میں آنکھیں بند کئے [...] جھٹکے کھاتا کوہان سے لپٹا رہا۔

اس خطے میں بھٹکی ہوئی وہ طوفان زدہ اونٹنی میرے اور پاربتی کے لئے [...] رحمت بن کر نازل ہوئی تھی ورنہ اس لق و دق صحرا میں ایسی کسی مدد کی [...] امید نہیں تھی۔ اس بے مہار اونٹنی کی موجودگی سے یہ بھی ظاہر تھا کہ قرب و جوار [...] میں کہیں کوئی نخلستان یا چراگاہ ضرور موجود ہے۔ مجھے یقین تھا کہ [...] طوفان تھمنے پر بوکھلائی ہوئی اونٹنی کے حواس بحال ہوں گے تو وہ سیدھی اسی ٹھکانے [...] کا رخ کرے گی۔ آبادی کے بارے میں، میں اس لئے پُریقین نہیں تھا کہ اس کی [...] موجودگی ضروری نہیں تھی۔ پھر بھی یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی۔ اونٹوں کی گلہ بانی کرنے والے ہر مویشی کو نکیل نہیں دیتے۔ وہ اونٹنی ایسے ہی کسی گلے سے بھٹکی ہوئی بھی ہو سکتی تھی۔ بہرحال میرے لئے دونوں صورتوں میں بہتر اور امید افزا صورتحال نظر آ رہی تھی۔

سینکڑوں میل کی رفتار سے گزرنے والے اس طوفان کی شدت میں کمی کے دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ اونٹنی بار بار بھڑکنے اور گھبرانے کے باوجود خاصی تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے بار بار اس کے قدم اکھاڑ دے رہے تھے مگر پھر بھی وہ تھکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

دوڑتے دوڑتے ایک جگہ وہ ریت کے زبردست بھنور میں پھنس گئی۔ میرے لئے اس کی پشت پر جمے رہنا دشوار ہونے لگا۔ پھر گھبرا کر اچانک وہ رک گئی اور اس سے قبل میں کوئی اندازہ قائم کرتا وہ تیزی کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

ہچکولوں کے سبب پاربتی زور زور سے چیخنے لگی۔ میں نے سر اٹھا کر آنکھوں میں قدرے جھری پیدا کی تو پاربتی مضحکہ خیز حالت میں اونٹنی کی گردن میں جھول رہی تھی اور اونٹنی ریت پر تھوتھنی رگڑ رہی تھی۔ اس کا بچہ اس کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا میں نے جلدی سے پاربتی کو اپنی طرف بلا لیا اور وہ میرے ساتھ دونوں کوہانوں کے درمیان پھنس کر بیٹھ گئی۔ اونٹنی کی گردن میں جھولتے رہنے کے مقابلے میں یہ جگہ بہت بہتر تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہواؤں کا زور ٹوٹنے لگا۔ چنگھاڑتے ہوئے غضبناک جھونکوں کی جگہ صرف سسکاریاں سی باقی رہ گئیں جیسے عذاب میں مبتلا آوارہ روحیں اس ریگزار میں روتی پھر رہی ہوں۔ فضا میں ریت کی مقدار بھی کم ہوتی گئی۔ پھر بتدریج وہاں ریت کا باریک غبار باقی رہ گیا جو صحرا کے سینے سے آسمان کی بلندی تک پھیلا ہوا تھا۔ سورج بدستور ریت کا غبار زدہ ہو رہا تھا۔ اس کی چمک اور کرنوں کی تمازت کو اس غبار نے گہن لگا دیا تھا۔

صحرا میں اکا دکا بگولے اب بھی چکراتے پھر رہے تھے۔ مگر مجموعی طور پر فضا اس قابل ہو گئی تھی کہ میں اپنی آنکھیں کھلی رکھ سکوں۔

"طوفان گزر گیا ساگر؟" پاربتی نے بے یقینی کے عالم اور سہمی ہوئی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔ اس کا بدن دہشت سے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"ہاں۔ ہم نے کئی گھنٹے اس مصیبت میں گزارے ہیں۔ اب دیکھو یہ اونٹنی ہمیں کہاں پہنچاتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے کپڑے کیا ہوئے؟" اس نے میرے برہنہ جسم کے بارے میں پہلی مرتبہ سوال کیا۔

"طوفان میں اڑ گئے!"

وہ میرے سینے سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئی اور طویل سانس لے کر بولی "کیسا بھیانک طوفان تھا۔ سمندر کا بھونچال نہ بھولنے پائے تھے کہ اس آندھی نے اسے بھی مات کر دیا۔"

"سنبھل کر بیٹھو، میں اونٹنی کو اٹھا رہا ہوں!" میں نے اسے ہوشیار کیا اور وہ اگلے کوہان سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔

پھر میں نے اونٹنی کی پشت پر زور زور سے کئی ہاتھ مارے اور وہ تیزی

کے ساتھ اُٹھ گئی۔ اس بار اس کی چال متوازن بلکہ دھیمی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خاصی سبک رفتاری کے ساتھ صحرا کے سینے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ میرے اور پاربتی کے بوجھ کو وہ اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر چکی تھی کیونکہ اس نے ہمیں گرانے کی کوششیں ترک کر دی تھیں۔

طوفان کی ہیبت ختم ہونے کے بعد بھوک اور پیاس نے ایک بار پھر تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ریت کے غبار میں سرخ بالوں والی وہ اونٹنی سبک رفتاری سے ایک طرف دوڑ رہی تھی۔ اس کے سکون سے ظاہر تھا کہ وہ بے مقصد نہیں دوڑ رہی بلکہ اپنی منزل سے واقف ہے اور یہی ایک بات میرے لئے امید افزا تھی کہ جلد یا بدیر ہم کسی آبادی یا کم از کم سرسبز مقام پر پہنچنے والے تھے۔

اونٹنی کی پشت پہ کئے جانے والے اس سفر نے جلد ہی اکتاہٹ سوار کر دی مجھ پر شدت سے غنودگی کا حملہ ہوا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ذرا بھی غفلت اختیار کی تو زمین پر گر کر میں اپنی ہڈیاں پسلیاں تڑوا بیٹھوں گا۔

"ساگر! بھوک سے پیاس ستا رہی ہے!" پاربتی نے پہلو بدلتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"پیاس!" میں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ریت کے سمندر کا جائزہ لیا۔ "یہ ہولناک پیاس ہمیں لے ڈوبے گی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں!"

"سورج ڈوبنے والا ہے، تیسری رات بھی شروع ہو جائے گی۔"

"میں اپنے دانتوں سے اس اونٹ کا نرخرا بھی نہیں چیر سکتا ورنہ اس کا لہو ہماری پیاس بجھا سکتا تھا۔" میں نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ایسی وحشیانہ باتیں نہ کرو ساگر۔" پاربتی سہم کر بولی۔ "مجھے ویسے ہی تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

میں ہنس دیا۔ "اس اونٹنی کے کوہان میں اتنا پانی موجود ہو گا جو ہمارے لئے کافی ہو، پیاس بجھانے کے لئے اس کا کاٹا جانا ضروری ہے!"

"بس چپ ہو جاؤ بھگوان کے لئے۔" وہ دہشت سے تقریباً چیخ پڑی۔ "تمہاری ہنسی تک سے درندگی جھلک رہی ہے!"

اس کے بعد میں خاموش ہو گیا۔

اور اسی خاموشی کے دوران میں مجھے اپنی سیتا یاد آئی۔ بے اختیار میرا دل تڑپ اٹھا۔ آنکھوں میں نمی ابھر آئی اور سینے پر منوں وزنی پتھریلی سل کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔

وہ مجھ سے ایسی بچھڑی تھی کہ اپنا سراغ بھی نہ چھوڑا تھا۔ انبالہ کے اجنبی گلی کوچوں سے سر ٹکراتی وہ نہ جانے کہاں نکل گئی تھی۔

سیتا میری محبت اور میری چاہت تھی۔ میرے سپنوں کا شیش محل تھی۔ ہمالہ کے پہاڑوں میں اس بنت جبل کو پا کر میں نے سب کچھ پا لیا تھا۔ اس کی ذات میں محبت، رفاقت، قربانی، مٹھاس، حسن اور گداز کا ایسا سنگم موجود تھا جو ناز و نعم میں پلنے والیوں میں بھی مفقود ہوتا ہے۔ وہ بن بیاہی ماں کی اولاد تھی مگر اس کو اپنے وجود اور جذبوں پہ بے پناہ قابو حاصل تھا۔ اس کے کردار نے میری ذات کو بے مول خرید لیا تھا اور مجھے اپنا اسیر بنا کر وہ چپکے سے نہ جانے کہاں نکل گئی تھی۔

"تم رو رہے ہو ساگر؟" اچانک پاربتی نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ ... آنسو اس کی برہنہ گردن پر ٹپک گیا تھا۔

"میں رونا نہیں جانتا پاربتی!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کسی کی یاد میں بے اختیار آنسو امڈ آئیں تو اسے رونا نہیں کہتے۔"

"کسی کی یاد میں؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "تو تم بھی زخم خوردہ ہو ... وہ کون خوش نصیب ہے جو تمہارے دل کی مالک ہے!"

"وہ چاندنی کا نکھار اور فرشتوں کا سا دل رکھتی ہے!"

"تفصیل سے بتاؤ۔" وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔ یک بیک وہ اپنی پیاس کے بارے میں بھول گئی تھی۔ "تمہاری زبان سے یہ باتیں عجیب سی لگتی ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ تمہارے سینے میں پتھر کا دل ہے مگر اب پتہ چلا کہ وہ پتھر بھی کسی کے لئے موم ہو چکا ہے!"

"کبھی میرا مزاج بھی سیماب صفت ہوا کرتا تھا پاربتی۔" میں افسردہ لہجے میں بولا۔ "ہر حسین چہرے اور گداز بدن کو دیکھ کر اسے حاصل کرنے اور برتنے کی آرزو ابھر آتی تھی مگر سیتا نے مجھے اصل زندگی کا عرفان بخشا ہے۔ میں اپنی ذات کی پستیوں میں گرے جا رہا تھا، اس نے مجھے سربلند رہ کر جینا سکھلایا۔ وہ میرے قریب ہو یا مقدر کا لکھا پورا کرنے کے لئے مجھ سے دور میری تلاش میں سرگرداں ہو، میرے دل میں وہی بستی ہے۔ یہ بانہیں شاید کسی کے لئے پھیل جائیں مگر میں اپنا دل اس کے قدموں میں ہار چکا ہوں۔ اس کی جگہ کوئی عورت نہیں لے سکتی۔"

"مگر میرے لئے تو تمہاری بانہیں کبھی نہیں پھیلیں!" اس نے حسرت زدہ لہجے میں سرگوشی کی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے کیا بتایا کہ اس نے میری انا کو چھیڑا تھا اور جب انسان کی خود پسندی جاگ اٹھے تو وہ اپنے ہر جذبے کو کچل دینے پر قادر رہتا ہے۔

"بولو ساگر۔ جواب دو نا۔" مجھے خاموش پا کر اس نے اصرار کیا۔

"تم نے مجھے دیوتا کہا ہے پاربتی تو دیوتا ہی رہنے دو!"

"دیوتا بھی اپنے سیوکوں کے ارمان پورے کرتے ہیں، تم تو مجھ سے یوں بچ رہے ہو جیسے میں چھوت کی کوئی بیماری ہوں!"

"مجھے حیرت ہے پاربتی کہ اس بھوک، پیاس اور مصیبت میں بھی تمہارے ارمان زندہ ہیں، مجھے تو اگر پانی کی چند بوندیں بھی مل جائیں تو میں سمجھوں گا کہ مجھے دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی۔"

"اس صحرا میں پانی ایک سپنا ہے اور تم زندہ حقیقت ہو۔" وہ میری طرف گھما کر براہ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "تم جانے محسوس کرنے رہنا چاہتے ہو میں اسے بالکل ہی بھول جانا چاہتی ہوں۔"

اس نے ایسی بات کہی کہ وہ پل بھر میں مجھے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آنے لگی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ موضوع ختم کرو پاربتی میں خاموشی سے کچھ سوچنا ...

... خاموش ہو گئی۔ صحرا میں ہر طرف سکوت اور ویرانی کا راج تھا تیز ... رکی تھیں۔ سورج ڈھل رہا تھا مگر فضا میں ریتیلا غبار دھوئیں کی طرح ... اونٹنی نرم ریت پہ بے آواز قدموں سے بھاگ رہی تھی کہ اچانک میری ... نچے ہیولوں پر پڑی۔ پہلے تو میں اسے بھی سراب سمجھا پھر دم مجھے اپنی ... نکھوں کا فتور معلوم ہوا مگر چند ثانیوں تک غور سے دیکھنے کے بعد میرا دل ... اچھل پڑا۔ میرا جی چاہا کہ اونٹنی کی پشت پہ کھڑے ہو کر والہانہ انداز میں ناچنا ... ں۔

... سامنے کسی نخلستان کے دھندلے آثار نظر آ رہے تھے۔

... پاربتی نے تھوڑے تاخیر سے وہ زندگی بخش منظر دیکھا اور میں اسے مخاطب ... بتایا تھا کہ وہ پاگل کی طرح نخلستان، نخلستان کی تکرار کرنے لگی۔

... ہم اس سبزہ زار سے بہت دور تھے۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا ... تاریکی کے ساتھ ان آثار کو نگلتی چلی گئی اسی کے ساتھ ہوائیں فرحت بخش ... ہو گئیں۔

... اسی دوران میں اونٹنی کا کم سن بچہ طویل سفر سے گھبرا کر آوازیں نکالنے لگا ... پہلے تو اسے نظر انداز کرتی رہی پھر بتدریج اس کی رفتار میں کمی آ گئی ... اونٹنی ٹھہری تو اس کا بچہ بے تابانہ انداز میں لپک کر اس کے تھنوں سے ...

... اس وقت نخلستان بھی قریب تھا۔ خنک ہوا کے باعث پیاس کی ... شدت میں تھوڑی سی کمی آ گئی تھی مگر اونٹنی کے بچے کو دودھ پیتے دیکھ کر میں ... اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار اونٹنی کی پشت سے کود پڑا۔ ... میں نے بے رحمی کے ساتھ بچے کی پچھلی ٹانگیں پکڑ کر اسے دور کھینچ لیا۔ ... اور دودھ پینے کے لئے اونٹنی کے نیچے جا گھسا۔ میرے ہاتھوں کا لمس ... پاتے ہی وہ بھڑک کر بھاگ نکلی۔ اس کی ایک ٹانگ نے میرے داہنے پیر ... کو کچل دیا۔

... میں چیخ مار کر ریت پر دوہرا ہو گیا۔ پاربتی نے بھی گھبرا کر بدکی ہوئی اونٹنی ... سے چھلانگ لگا دی اور صحرا میں اس کی سُریلی چیخ دور تک گونجی ...

"کیا ہوا؟ کیا ہوا ساگر؟" زمین سے اٹھتے ہی وہ میری طرف لپکی۔

"... الو کا پٹھا ہوں!" میں کراہتے ہوئے غرایا۔ "وہ اونٹنی تھی!"

"اونٹنی تھی تو کیا ہوا؟" وہ میری بات نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"میری عقل ٹھکانے ہوتی تو ہم گھنٹوں پہلے اپنی پیاس بجھا چکے ہوتے۔ ... دودھ سے بھرے ہوئے ہیں۔" میں جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اوہ!" اس کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی۔ "واقعی ہماری عقلوں پر ... پتھر پڑ گئے تھے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ اونٹنی ہے!"

"... سر جنس کا بھوت اترتا تو اسے بھی دیکھتیں!" میں ... جھلا کر بولا۔ "اب گھیر لاؤ اسے ورنہ نخلستان تک پیدل اور پیاسا جانا ہو گا۔"

تاریکی میں کچھ دور اونٹنی کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ وہ سکون سے اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس بار میں دبے قدموں اس کی طرف بڑھا میرا ارادہ تھا کہ میں اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں جکڑ لوں گا اور پہلے پاربتی دودھ پی لے گی پھر وہ اونٹنی کی ٹانگیں تھامے گی اور میں اپنا حلق تر کر لوں گا۔

مگر وہ وحشی اونٹنی میرے اندازے سے زیادہ ہوشیار اور طاقتور تھی۔ اس کی پچھلی ٹانگیں میری امید کے برخلاف پوری طرح میری گرفت میں آ گئیں مگر وہ اس بار بُری طرح بھڑکی اور پل بھر میں اس نے مجھے کئی فٹ پیچھے اچھال دیا اور تیر کی طرح اندھیرے میں سیدھی بھاگتی چلی گئی۔

میں پاربتی کے سہارے کراہتا ہوا زمین سے اٹھا تو اونٹنی اپنے بچے سمیت اندھیرے میں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ صحرا کے سینے پر کافی دور چراغوں کی اکا دکا روشنیاں دھندلائے ہوئے نقطوں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ غنیمت یہ تھا کہ تاریکی میں ان روشنیوں کے سہارے ہم نخلستان کی سمت کا تعین کر سکتے تھے ورنہ پوری رات روشنی کے انتظار میں گزارنی پڑ جاتی۔

نخلستان کے فاصلے کا تعین کرتے ہوئے مجھے اپنی جلد بازی پہ غصہ آنے لگا۔ اوّل تو میں اونٹنی سے افادے کے پہلو کو مسلسل بھولے رہا پھر اس کا خیال آیا تو ایسے مرحلے پر خطرہ مول لیا کہ اونٹنی بھی ہاتھ سے نکل گئی اور پیاس بھی نہ بجھ سکی۔ میں کچلے ہوئے داہنے پیر پہ لنگڑاتا ہوا، پاربتی کے سہارے روشنیوں کی طرف ہو لیا۔

"کیا تمہارا پیر زیادہ زخمی ہوا ہے؟" پاربتی نے ہمدردانہ لیکن تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ ہو یا کم۔ تم اس کا کیا کر سکو گی؟" میں چڑ کر بولا۔

"ساگر تم مجھ سے اس قدر بے زار کیوں ہو؟" اس نے روہانسی آواز میں پوچھا۔ "مجھ سے ایسی کون سی خطا سرزد ہو گئی ہے؟"

"تم معصوم ہو، خطا تو سراسر میری ہے!"

"اب ہم اجنبی لوگوں میں جا رہے ہیں۔ اب تو میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو نہ جانے وہ ہمارے ساتھ کس طرح پیش آئیں!"

"میں نے تمہاری حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اسے آخر تک نبھانے کی کوشش کروں گا، مگر تم مجھ سے بحث کرنی ترک کر دو!"

"اگر تم مجھے خاموش دیکھنا پسند کرتے ہو تو اب میں تمہارے مخاطب کئے بغیر نہیں بولوں گی، مجھے صرف تمہاری خوشی عزیز ہے۔ تم شروع سے میری ذات پر یکے بعد دیگرے اتنے احسانات کرتے آئے ہو کہ میں تمہاری کسی خواہش کو نظر انداز نہیں کر سکتی!"

"یہاں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا ہو گا۔ ہم ان لوگوں کو شاید اپنی کوئی بات بھی نہ سمجھا سکیں گے۔" میں نے اس کا جواب نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کم از کم بھوک اور پیاس سے تو آگاہ کر ہی سکیں گے۔" مجھے گفتگو پر آمادہ پا کر وہ جلدی سے بولی۔

"وہ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ ہم کون ہیں کہاں سے اور کیسے آئے ہیں!"

"ہم قانون سے بچ کر یہاں آ گھسے ہیں، پتہ نہیں وہ لوگ ہمیں قبول بھی کریں گے یا پولیس کے حوالے کر دیں گے۔" وہ بولی۔

"اب میری بات غور سے سنو،" میں نے رک کر کہا۔ "ہم غیر قانونی طور پر یہاں نہیں آئے۔ ہماری لانچ خوفناک طوفان میں گھر گئی اور ہمیں سمندر میں بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارا مال واسباب اور کاغذات سب لانچ کے ساتھ غرق ہو گئے ہم بمشکل ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔"

"میں سمجھ گئی میری زبان سے اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔"

صحرا کی روایتی رات بھرپور انداز میں اپنے قدم جما رہی تھی۔ ہم دونوں کشاں کشاں روایتی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کی طرف بڑھتے رہے۔

ریتیلی زمین میں ہمارے قدم دھنسے جا رہے تھے۔ ہمیں ایک ایک انچ فاصلہ عبور کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ سورج کی تپش ختم ہو چکی تھی مگر پیاس کی شدت سے ہماری خشک زبانیں دہانے سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

پھر ہم اس نخلستان کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ اندھیری رات میں درختوں کے بلند ہیولے دوبارہ نظر آنے لگے۔ روشنیوں کے حلقے بھی واضح ہو گئے تھے۔

"مدد ..... مدد!" میں غیر ارادی طور پر بے اختیار چلانے لگا اور پاربتی بھی خوفزدہ انداز میں مسلسل شور مچانے لگی۔

چند ہی ثانیوں بعد ہماری کوششیں بار آور ہوئیں اور نخلستان کی طرف سے کچھ لوگوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ ہم ان کا مفہوم تو نہ سمجھ سکے، لیکن بلند لہجوں سے اندازہ ہو گیا کہ ہماری آوازیں وہاں سن لی گئی ہیں۔

مدد ملنے کی امید پیدا ہوتے ہی میرے حوصلے نے ساتھ چھوڑ دیا۔ پیاس کا احساس شدید تر ہوتا گیا، آنتوں میں ناقابل برداشت اینٹھن ہونے لگی نگاہوں کے سامنے بے شمار تاریک اور روشن دائرے پھیلنے لگے۔ پنڈلیاں بید مجنوں کی طرح کانپنے لگیں اور میں ہذیانی انداز میں چیختے چیختے ریتیلی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پاربتی مجھ سے پہلے ہی گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

میں زمین پر گر گیا تھا مگر میرے حواس ابھی کام کر رہے تھے۔ نرم زمین پر کچھ دور دوڑتے ہوئے قدموں کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر چیخ کر آنے والوں کو سمت کا تعین کرنے میں مدد دینے کی کوشش کی، میری خشک زبان دہانے میں پھڑپھڑا کر رہ گئی مگر کوئی آواز نہ ابھر سکی۔

پھر لالٹین سنبھالے ہوئے کئی افراد مجھے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ میں نے بدقت تمام اپنا داہنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ میرا ہاتھ دیکھتے ہی آنے والے چلا اٹھے۔ شاید اس وقت تک وہ محض قیاس کی بنا پر ایک طرف دوڑ رہے تھے اور میرا ہاتھ لہراتا دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ انہوں نے سمت کے تعین میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

میرا اٹھا ہوا ہاتھ اچانک منوں وزنی ہو گیا۔ اور کسی بے جان لوتھڑے کی طرح میرے پہلو میں آ گرا۔ اسی کے ساتھ میرا ذہن بے نام تاریکیوں کی دھند میں ڈوبتا چلا گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو کمبلوں کے نرم بستر پر موجود پایا، اوپر بھی دو کمبل سر سے پیر تک پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ہڑبڑا کر اپنا ... دیا۔ ایک ثانیے کے لئے میں دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ مدد کے لئے پہنچنے ... نے کہیں مردہ سمجھ کر مجھے دفن نہ کر دیا ہو۔

میرا بدن بری طرح جل رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ خارج ہو ... میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے دہانے میں زبان کو جنبش دی ... تبدیلی کا احساس ہوا۔ شاید بے ہوشی کے دوران میں مجھے کچھ پلایا گیا تھا ... ابھی تک دہانے میں موجود تھی۔

اسی وقت میرے قریب کوئی درد بھری آواز میں کراہا۔ میں نے ... گھمانے کی کوشش کی مگر میری گردن بری طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ پہلو بدلا تو ریت اور پھوس کے بنے ہوئے اس جھونپڑے ... میرے قریب ہی فرش پر پاربتی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا بدن بھی ... میں دفن تھا مگر سورج کی آنے والی روشنی میں اس کا ستا ہوا چہرہ ... زندگی سے عاری معلوم ہو رہا تھا۔ وہ زندہ عورت کے بجائے ایک لاش ... ہو رہی تھی۔

میں اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے لبوں کو پھر جنبش ہوئی ... زبان سے کراہوں کے درمیان چند مہمل فقرے نکلے جن میں میرا مصنوعی نام ... شامل تھا۔ بے ہوشی کے عالم میں بھی وہ ساگر کو پکار رہی تھی۔

میرا جلتا ہوا بدن پسینوں میں نہا رہا تھا اور میں بے حس و حرکت ... خالی الذہنی کے عالم میں پاربتی کو تکے جا رہا تھا کہ اچانک باہر قدموں کی آہٹ ہوئی اور چند ثانیوں بعد بے داغ سفید جبے اور عمامے میں ملبوس ایک دراز قامت عرب وہاں آ پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تسبیح موجود تھی جس کے دانے تیزی سے اس کی انگلیوں میں پھسل رہے تھے۔

"صباح الخیر یا رفیق!" مجھے بیدار پا کر وہ نرم لہجے میں بولا۔ میں اس کا تلفظ تو سمجھ گیا مگر مفہوم نہ سمجھ سکا۔ بس مسکرانے کی کوشش کر کے رہ گیا اور وہ میرے قریب آ پہنچا۔

پھر اس نے یکے بعد دیگرے عربی میں مجھ سے کئی مرتبہ بات کرنے کی کوشش کی مگر میں ہر بار سر کو نفی میں جنبش دے کر رہ گیا۔

"پاکستانی؟" آخر اس نے سوال کیا۔

میرا دل چاہا کہ ہاں کہہ کر اس سے گلے لگ جاؤں مگر اس حال میں بھی میرا ذہن منطقی انداز میں کام کر رہا تھا۔ پاربتی میرے ساتھ تھی اور میں نے اس کے ساتھ مل کر جو کہانی تیار کی تھی اس میں پاکستان کا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔ ہم دونوں کی تضاد بیانی ان میزبانوں کو شبہات میں مبتلا کر دیتی اور ہم ان کی حمایت و ہمدردی سے محروم ہو جاتے۔

"نہیں!" میں نے سر کو نفی میں جنبش دے کر کہا۔

"ہندی؟" اس نے پرامید لہجے میں پھر سوال کیا۔

اس بار میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ مجھے چھوڑ کر دروازے تک گیا اور زور زور سے عربی میں کسی سے ... نے لگا۔ دوسرا شخص میری نگاہوں سے اوجھل تھا مگر اس کی آواز میرے ... تک پہنچ رہی تھی۔

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر دوسرا آدمی ... پہنچا۔ وہ بھی سفید جبے اور عمامے میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں ... موجود تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے میری طرف آ رہے تھے مگر تسبیح ... پر ان کی انگلیاں بدستور چل رہی تھیں۔ لہجے کے زیر و بم کے ساتھ ہی ... بھی کم و بیش ہو رہی تھی۔

... عرب کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔

پہلا عرب دراز قامت اور جوان تھا۔ مگر دوسرا آدمی ادھیڑ عمر تھا۔ ... چہرے سے پختہ کاری عیاں تھی عجیب بات یہ تھی کہ سرخی مائل گندمی ... کے باوجود اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ میں اس خطے کے ماحول معاشرت ... سے بالکل واقف نہیں تھا مگر پھر بھی نیلی آنکھیں میرے ذہن میں چبھ ... گئیں۔

میرے قریب آ کر وہ شخص دوستانہ انداز میں مسکرایا پھر بولا "نمستے!" ایک عرب کی زبان سے یہ لفظ میرے لئے انوکھا تھا میں نقاہت آمیز انداز ... وہ دونوں اس وقت میرے اور پاربتی کے درمیان پہلو بہ پہلو کھڑے ... نیلی آنکھوں والے کا قد دوسرے سے نکلتا ہوا تھا۔ میرے اندازے ... وہ کسی طرح ساڑھے چھ فٹ سے کم طویل نہیں تھا۔

"تم ہندی ہو؟" نیلی آنکھوں والے نے قدرے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"انگریزی سمجھ لیتے ہو؟" وہ تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے بولا۔

"ہاں!"

"تو میں انگریزی میں بات کروں گا؟" وہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر ... آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہوا بولا۔ "مجھے ہندی پر پورا عبور نہیں ہے!"

"مگر یہ تو اردو ہے!"

"یہاں اردو اور ہندی ایک ہی بات ہے۔" وہ ہنس کر انگریزی ... پھر اپنے جوان ساتھی سے مخاطب ہو کر عربی میں جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ نوجوان کمرے سے چلا گیا۔ نیلی آنکھوں والا ... خاموشی کے ساتھ تسبیح کے دانوں سے کھیلتا رہا۔ پھر بولا۔ "تمہاری ... طبیعت کیسی ہے؟"

"بخار، شدید درد اور نقاہت میں مبتلا ہوں!" میں نے انگریزی ... میں جواب دیا۔

"تم پر لو کا شدید اثر ہے، یہ حالت کئی دن برقرار رہے گی!"

"اور بھوک نے بھی پریشان کیا ہوا ہے!"

"نہیں،" اس نے سر کو نفی میں جنبش دے کر کہا۔ "فی الحال پیاز کے عرق کے علاوہ تمہیں کوئی چیز نہیں دی جائے گی۔ تم خوش قسمت ہو کہ اس بھیانک طوز میں گھرنے کے باوجود زندہ سلامت اس نخلستان تک پہنچ گئے ورنہ وہ ہوائیں تمہاری ہڈیاں تک اڑا لے جاتیں!"

"طوز کیا؟" میں نے سوال کیا۔ کیونکہ اس نے انگریزی میں "طوز" کا لفظ ہی استعمال کیا تھا جو میرے لئے ناقابل فہم تھا۔

"ریت کی آندھی کو مقامی زبان میں طوز کہا جاتا ہے۔ آج کا طوفان بہت ہولناک تھا۔ تمہاری چیخیں سن کر ہمیں تو حیرت ہوئی تھی کہ اس آفت میں صحرا کو عبور کرنے والا خوش نصیب کون ہے!"

"یہ کون سی جگہ ہے؟ تمہارا نام کیا ہے میرے محسن؟"

"یہ چھوٹی سی بستی الشوئیخ کہلاتی ہے اور میرا نام ابو خالد ہے!" وہ تسبیح کے دانوں کو عادتاً گردش دیتے ہوئے بولا۔ "تمہاری اور تمہاری بیوی کی حالت بہت ابتر تھی اس لئے ہم نے ابتدائی دیکھ بھال کر لی۔ اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں سے اور کیسے آئے ہو؟"

"ہم ہندوستان سے آ رہے تھے کہ چند دن قبل ہماری لانچ طوفان میں گھر کر غرقاب ہو گئی۔ ہم سرکش موجوں سے لڑتے ساحل پر پہنچے تو سامنے صحرا پھیلا ہوا تھا۔ ہم کئی دن سے بھوکے پیاسے بھٹک رہے تھے مگر ہمیں کوئی پناہ گاہ نہ مل سکی۔ پھر ریت کی آندھی سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے" میں پاربتی کے بارے میں اس کے الفاظ کی تردید کئے بغیر بولا۔

"کہاں جا رہے تھے؟"

"مسقط، ملازمت کے لئے!"

"مجھے امید ہے کہ تم نے سچ بولا ہو گا۔" وہ لاپروایانہ انداز میں کہنے لگا۔ "ساحلی ریاستوں سے قتل، ڈاکے اور زنا کا ارتکاب کرنے والے مجرم ہی عموماً قانون کے شکنجے سے بچنے کے لئے صحرا کا رخ کرتے ہیں مگر ہم ایسے مجرموں کو کبھی پناہ نہیں دیتے۔ تمہاری بدنصیبی تمہارے چہرے اور حالت سے ظاہر ہے، ہم تمہاری پوری مدد کریں گے، نام کیا ہے تمہارا؟"

"ساگر اور وہ پاربتی ہے!"

"تمہاری عورت بہت خوبصورت ہے!" وہ سادگی کے ساتھ بولا۔ "اس بستی میں تم دونوں محفوظ و مامون رہو گے!" پھر لہجہ بدل کر بولا۔ "یہ یاد رکھنا کہ ابھی کئی دن تک تم بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ ہو سکو گے۔ اگر تم کسی ریاست سے بھاگے ہوئے مجرم ہو تو ایک آدھ روز ہی میں شتر سوار سپاہی یہاں آ پہنچیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ بھاگنے والے صحرا سے زندہ نہیں نکل سکتے۔ اکثر جھوٹی کہانیاں سنا کر نخلستانوں میں پناہ لیتے ہیں۔ اس لئے یہ نخلستان ہی سب سے پہلے پولیس کی تلاش کا مرکز بنتے ہیں۔"

"میں اپنے محسنوں کو شرمندہ نہیں کروں گا۔"

"جب تک تم اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہ ہو جاؤ، اپنی عورت سے دور رہنا!" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ورنہ ساری عمر کے لئے روگ لگا لو گے!"

"شکریہ ابو خالد!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم واقعی مخلص اور ہمدرد انسان

معلوم ہوتے ہو، میں تمہاری پوری بستی کا زندگی بھر ممنون رہوں گا۔"

وہ چلا گیا اور میں وہاں ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔ پاربتی بدستور بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

اس صحرائی بستی کے رہنے والے خاصے مہمان نواز اور مخلص لوگ تھے۔ ان کی زبان سے لاعلمی کے باوجود میری اور پاربتی کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ مجھے تین روز کے علاج کے بعد عام غذا کھانے کی اجازت مل گئی مگر پاربتی کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہو گیا تھا۔ سمندری پانی پی جانے کے باعث اس کی آنتوں میں زخم ہو گئے تھے جن کو مندمل کرنے کے لئے اسے مسلسل صحرائی جڑی بوٹیوں کے کڑوے کسیلے عرق پلائے جا رہے تھے۔

اس دوران پاربتی بستر پہ پڑے پڑے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے کئی بار چلنے پھرنے کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہی۔ اس کے لئے چند قدم چل کر بیت الخلا تک جانا بھی سہارے کے بغیر مشکل ہو جاتا تھا۔

اس کے حسین چہرے پر ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ سرخ و سپید رنگت مرجھائی ہوئی زردی میں ڈھل چکی تھی، وہ ہر وقت یہی کہتی رہتی تھی کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا ہے اور وہ میری بانہوں میں آخری سانس لے گی۔

اپنی حالت سدھرنے کے بعد ایک روز میں اس جھونپڑے سے باہر نکلا تو جھلسا دینے والی مرطوب ہوا نے میرا استقبال کیا۔ سرسبز درختوں سے گھرے ہوئے اس نخلستان میں بھی دن کے وقت گرمی سے امان ملنی مشکل تھی۔ میں ویران گلی میں چند ہی قدم چلا تھا کہ میرا پورا بدن پسینوں میں نہا گیا اور جلد پر چپچپاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

الشوتنج کے بیشتر باسی اپنے مکانوں میں چھپے ہوئے تھے۔ میرے سامنے پھیلی ہوئی گلی کے آخر میں بنے ہوئے ایک میدان میں بہت سے بچے گرمی سے بے پرواہ جلتے ہوئے سورج کے نیچے فٹبال کھیلنے میں منہمک تھے۔ میں کھجور کے چند جڑے ہوئے درختوں کے سائے میں رک کر انہیں دیکھنے لگا۔ جھونپڑے کی یکسانیت سے میں بیزار ہو چکا تھا اور اس وقت کھلی فضا میں چند لمحے گزارنے چاہتا تھا۔

کھیلتے ہوئے بچوں نے میری وہاں موجودگی پر خاص توجہ نہیں دی جب کافی دیر بعد میرے بدن میں گرمی اور پسینے کے باعث چبھن ہونے لگی تو میں واپس جھونپڑے میں چل دیا۔

وہاں مجھے موجود نہ پا کر ایک شخص پاربتی پر برہم ہو رہا تھا اس کے زور زور سے بولنے کی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں مگر پاربتی شاید اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ پائی تھی۔ میں اندر پہنچا تو وہ آنکھوں میں آنسو لئے بے بسی سے اسے تکے جا رہی تھی۔

میرے قدموں کی آہٹ پا کر وہ شخص تیر کی طرح میری طرف لپکا اور میرا شانہ پکڑ کر مجھے تقریباً جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسی کے ساتھ وہ عربی میں کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر وہ میرا ہاتھ تھام کر باہر چل دیا۔

"کہاں جا رہے ہو ساگر؟" پاربتی نے پوچھا۔

"معلوم نہیں یہ کہاں لئے جا رہا ہے۔ شاید جلد ہی واپس آ جاؤں گا" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں آندھی کے دوران میں صحرا ہی میں اپنے لباس سے محروم ہو گیا تھا مگر الشوتنج والوں نے علاج کے ساتھ ہی مجھے ایک لباس بھی فراہم کر دیا تھا۔ مجھے تیز تیز چلنے میں خاصی الجھن ہو رہی تھی۔ ایک بار میرا جی چاہا کہ اس اور تند خو شخص کو تھوڑی سی سزا دے ڈالوں، مگر میں پیش قدمی کی ہمت نہ کر سکا۔ کئی پر پیچ گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ گارے کی بنی ہوئی ایک فصیل دیوار میں نصب دروازے سے اندر داخل ہوا تو اندر وسیع احاطے میں جگہ جگہ سرسبز قطعات موجود تھے اور ان ہی کے درمیان چند کمروں پر مشتمل ایک بڑا مکان موجود تھا۔

مکان کے دروازے پر پہنچ کر اس شخص نے دستک دی، جس کے جواب میں ایک سیاہ فام، پستہ قامت شخص نے دروازہ کھولا اور اشارے سے دونوں کو اندر بلا لیا۔

مجھے لانے والا راہداری میں رک کر چند ثانیوں تک اس سیاہ فام خادم سے نیچے لہجے میں کچھ گفتگو کرتا رہا پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ خادم دروازہ مقفل کر کے مجھے عمارت میں اندرونی کمروں کی طرف لے چلا۔

اس سفر کا اختتام ایک ایسے کمرے میں ہوا جہاں پورے فرش پر نرم اور بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا اور دیوار کے کنارے درجنوں گاؤ تکیے مخمل کے غلاف والے تکیے رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کے وسط میں پیتل کا ایک بہت بڑی جگمگاتی ہوئی منقش تھالی میں کسی سفید دھات کا بنا ہوا حقہ رکھا ہوا تھا۔ اس کی چلم مانند پڑی ہوئی تھی اور تھالی میں نصب فولادی سلاخوں پر کئی نیچے رکھے ہوئے تھے جن کی مدد سے بیک وقت دس افراد حقہ نوشی کر سکتے تھے۔ دیواروں پر ایک قطار کی صورت میں مشعلیں کثیر تعداد میں نصب تھے ان میں نئی موم بتیاں موجود تھیں جو چھت کے قریب بنے ہوئے روشندان سے آنے والی سورج کی روشنی میں خوشنما لگ رہی تھیں۔

مجھے لانے والے نے اشاروں کی مدد سے مجھے بتایا کہ مجھے اس کمرے میں رک کر کسی کا انتظار کرنا ہے میں اس نخلستان میں وہ پرتکلف اور آراستہ نشست گاہ دیکھ کر ذہنی طور پر خاصا مرعوب ہو چکا تھا اس لئے چپل اتار کر خاموشی سے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔

مجھے لانے والا سیاہ فام دروازہ بند کر کے واپس چلا گیا۔

مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے کافی دیر گزر گئی تو میرے اعصاب پر بے چینی سوار ہونے لگی اور میں مضطربانہ انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ایک بار میں دیوار کے قریب پہنچ کر جوں ہی پلٹا، بے اختیار میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دروازے کے قریب ابوخالد موجود تھا۔ وہ میری لاعلمی میں کوئی آواز پیدا کئے بغیر کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں دلچسپی کے ساتھ میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ ابوخالد اس وقت بھی

...سفید لبادے میں ملبوس تھا۔ اس کے سر پر بٹی ہوئی موٹی سی سیاہ رسی ...نیچے میں باریک کپڑے کا سفید رومال روایتی انداز میں بندھا ہوا تھا ...کے نیچے اس کی کنپٹیوں کے سفید بال نمایاں نظر آ رہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے ساگر؟" ابوخالد نے آگے بڑھتے ہوئے نرم اور ساحرانہ ...لہجے سے سوال کیا۔ اس کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری ...تھی۔

"انتظار!" میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ...اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال اُبھرا تھا کہ الشوتنج کے مقامی ...لوگوں کے گندمی رنگ کے برخلاف ابوخالد کی جلد کی رنگت سرخ ...ہے۔ اس کی پتلی پتلی سپید انگلیاں آہستہ آہستہ تسبیح کے دانوں سے ...کھیل رہی تھیں مگر پھر بھی وہ میرا ذہن اسے مقامی سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔ میں نے ہی تمہیں بلایا تھا۔" وہ قالین پر بیٹھتے ہوئے ...بولا "مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں، جو ہم دونوں کے لئے اہم ہیں۔"

میں خاموشی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

ابوخالد چند ثانیوں تک تسبیح کے دانے گھماتا رہا پھر بولا "تم کیا کرتے ہو؟"

"مزدور صرف محنت کرنا جانتا ہے۔ میں کوئی ہنرمند نہیں ہوں۔"

"مگر تم مزدور نہیں ہو۔" ابوخالد کا لہجہ یک بیک سرد ہو گیا۔ "...مزدور اتنی اچھی انگریزی نہیں جانتے۔"

مجھے اپنا سانس سینے میں گھٹتا محسوس ہوا۔ "میں گریجویٹ ہو کر ...بھی کوئی مناسب ملازمت حاصل نہیں کر سکا۔ وہاں میں گودی ...پر مال لادنے اور اتارنے کا کام کرتا تھا۔ محض بہتر زندگی کی امید پہ ...گھر سے نکلا تو یہاں بھی بدقسمتی آڑے آ گئی۔"

"تمہیں مسقط میں کتنے معاوضے کی امید ہے؟"

"تین چار ہزار روپے تو مل ہی جائیں گے!"

"اور اگر میں تمہیں دس ہزار کی ملازمت کی پیشکش کروں!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ براہِ راست میری طرف ...دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ "کیا تم اتنی ...رقم دے سکتے ہو ابوخالد صاحب؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"میں نے تمہیں مذاق کرنے کے لئے نہیں بلایا۔" وہ قدرے ...ناگواری سے بولا۔

"...کام کیا ہو گا؟"

"میرے احکام کی تعمیل!" وہ پراعتماد مگر دھیمے لہجے میں بولا۔

...محسوس کیا کہ ابوخالد کی پیشکش کو ٹھکرا کر میں خسارے میں ...میری چھٹی حس مجھے کسی بڑے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔

"مجھے یہ پیشکش منظور ہے!" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"...تمہاری عورت تمہارے ساتھ نہ رہ سکے گی، تم جہاں چاہو میں اسے ...میری رضامندی پاتے ہی اس نے پہلی شرط پیش کی۔ اس کا رویہ میرے ساتھ پل بھر میں حاکمانہ ہو گیا تھا۔

"مگر میں اسے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں!"

"نہیں،" وہ کسی بھیڑیے کی طرح غرایا۔ "تم کام کی ابتدا ہی حکم عدولی سے کر رہے ہو۔"

"وہ میری عورت نہیں ہے۔" اس کے تیور دیکھ کر میرا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ "اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتی تو وہ جہاں چاہے اسے بھجوا دو۔"

"پھر کون ہے وہ؟"

"میری ایک بدنصیب ہم سفر!" میں نے کہا۔ "وہ اپنے شوہر کے پاس مسقط جا رہی تھی۔!"

"اسے مسقط پہنچا دیا جائے گا مگر اب تم اس سے نہیں ملو گے!"

"ایک بار بھی نہیں؟"

"نہیں!" ابوخالد نے غرا کر تسبیح میرے منہ پر مار دی۔ "میرے احکام پر سوال کرنے والوں کا حشر جاننے کے لئے یہ سزا کافی ہے۔"

تسبیح پوری قوت سے میری ٹھوڑی اور دہانے پر پڑی تھی۔ میرا نچلا ہونٹ اندر سے زخمی ہو گیا تھا اور گرم گرم خون میرے دہانے میں بھرتا جا رہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے میرے قریب کھسک آیا اور قالین سے اپنی تسبیح اٹھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے جرح کرنے والوں سے نفرت ہے۔ مجھ سے معاوضہ پانے والے ہمیشہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں یا معذور اور اپاہج ہو جاتے ہیں۔ یہ یاد رکھو گے تو ہمیشہ فائدے میں رہو گے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ تم پہلی تنخواہ بھی وصول کرنے کے قابل نہ رہو گے۔ میری بات مانو گے تو میں تمہیں زندہ رہنا سکھا دوں گا۔"

میں اپنا گرم گرم خون نگل گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمہیں مجھ سے کبھی شکایت نہ ہو گی۔ تم ہمیشہ مجھے اپنا پیدائشی غلام پاؤ گے۔"

"شاباش!" وہ میرا شانہ تھپتھپا کر بولا۔ "میرے ساتھ آؤ میں تمہیں تمہاری نئی قیام گاہ دکھا دوں۔"

میں اٹھ کر اس قوی ہیکل شخص کے پیچھے ہو لیا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا باوقار انداز میں راہداری میں ایک طرف چل دیا۔ کمرے سے باہر موجود سیاہ فام خادم نے پھرتی کے ساتھ جھک کر ابوخالد کو سلام کیا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

میرے ہونٹ کے زخم سے خون بدستور جاری تھا، دل غصے کی شدت سے کنپٹیوں میں دھمک رہا تھا مگر اس وقت میں بے بس تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے ابوخالد کی غلامی قبول کر کے اپنا مستقبل ہمیشہ کے لئے تاریک کر لیا ہو۔ پارس پتھر اور کھوئی ہوئی سیتا شاید کبھی میرے ہاتھ نہ آ سکے! دس ہزار روپے ماہانہ کے عوض میں نے اپنی ہر آزادی ابوخالد کے ہاتھ فروخت کر دی تھی اور وہ نہ جانے مجھے کس جہنم کا ایندھن بنانے والا تھا۔ اس نے ابتدا ہی میں مجھے آنے والے دنوں کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔ جس کے بعد اپنے عزائم پر عمل کرنا مشکل ہی نہیں محال نظر آ رہا تھا۔

مٹی

گارے اور لکڑی سے بنی ہوئی بلند فصیل کے اندر بنا ہوا وہ مکان وسعت اور تعمیر کے اعتبار سے اس نخلستان میں کسی محل سے کم نہیں تھا۔ پہلے میں چند کمروں پر مشتمل جس عمارت کو مکمل سمجھتا رہا وہ بعد میں اس فصیل میں واقع تعمیرات کا معمولی حصّہ ثابت ہوئی۔

سورج کی تیز روشنی میں ابوخالد لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ دھوپ کی حدت سے گھاس اور بھانت بھانت کے پودے مُرجھائے ہوئے تھے۔ مختلف سمتوں میں بنے ہوئے مکانات پر گہرا سکوت طاری تھا۔ کبھی کبھار کسی کمرے کی دیواروں کے پیچھے سے لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سُنائی دے جاتی تھیں۔

پھر مجھے دُور ہی سے اونٹوں کا اصطبل نظر آیا۔ ایک کشادہ چھپّر کے نیچے بہت سے اونٹ قطار در قطار بیٹھے جگالی میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے مٹّی کے بڑے بڑے برتنوں میں سبز چارہ اور پانی قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اس سمت سے ہلکی ہلکی بدبو کے بھبکے بھی آ رہے تھے۔

ابوخالد مجھے لیے ہوئے اسی طرف جا رہا تھا۔ ابھی ہم اس چھپّر سے تھوڑی دُور ہی تھے کہ مویشیوں کے درمیان ایک انسانی سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔

"ابومالک!" ابوخالد نے سخت تحکمانہ اور اونچی آواز میں اسے پکارا۔

وہ شخص اس کی آواز سنتے ہی تیزی کے ساتھ کچھ کہتا باہر کی طرف لپکا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیلچہ موجود تھا جس کی مدد سے وہ شاید زمین صاف کرنے میں مصروف تھا۔

ابوخالد اور ابومالک، میرا ذہن ان دو ناموں میں الجھ گیا۔ عجیب سے نام تھے اور بڑی حد تک یکساں۔ کوئی اجنبی ہوتا تو ناموں کی یکسانیت سے انھیں بھائی یا رشتے دار سمجھتا مگر میں ابو کے مفہوم سے واقف تھا۔ ناموں کے اعتبار سے ایک خالد کا باپ تھا دوسرا مالک کا۔ یعنی ان کے اصل نام کچھ اور تھے مگر اس نخلستان میں شاید لوگوں کو اولادِ نرینہ کے حوالے سے یاد کرنے کا رواج تھا۔

میں یہی سوچنے میں مصروف تھا کہ ابومالک قریب آ پہنچا۔ وہ دُبلا پتلا، دراز قامت، پھرتیلا آدمی تھا۔ اس کی جلد کی سیاہ رنگت بتا رہی تھی کہ وہ پیدائشی طور پر کسی صحرا کا باشندہ ہے اور بیشتر وقت کھلے آسمان تلے گذارنے کا عادی ہے۔

وہ دونوں چند ثانیوں تک آپس میں کچھ باتیں کرتے رہے پھر کئی منٹ تک مجھے لانے والا عربی میں بولتا رہا۔ ابومالک وقفے وقفے سے میری طرف دیکھ کر تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دیتا رہا۔

اپنی بات ختم کر کے ابوخالد میری طرف متوجہ ہوا اور انگریزی میں بولا۔ "اب ابومالک تمھارا آقا ہے تمھیں اس کی ہر ہدایت پر عمل کرنا ہے۔"

میں نے مایوسی سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ابومالک کا حشر میں دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ پھوس کے چھپّر کے سائے میں اونٹوں کی پھیلائی ہوئی غلاظت بیلچے سے سمیٹ رہا تھا اور اب یہ میرے مقدر کی ستم ظریفی تھی کہ وہ شخص میرا آقا مقرر کر دیا گیا تھا۔

ابوخالد نے ایک بار پھر عربی میں ابومالک کو کچھ سمجھایا پھر واپس چلا گیا۔

ابومالک نے اپنے سفید سفید دانت چمکاتے ہوئے محبت سے میرا بازو [illegible] میں نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور ناچار مسکرانے کی [illegible] کرنے لگا۔

"ہندوستانی ہو؟" ابومالک نے میری بے چارگی بھانپتے ہوئے [illegible] میں سوال کیا اور میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ کٹر عرب نظر آنے والے شخص کے منہ سے صاف لہجے میں اپنی زبان سُن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے [illegible] نے میرے سر پر اچانک لٹھ دے مارا ہو۔

"حیران کیوں ہو رہے ہو؟" مجھے خاموش پا کر اس نے کہا اور ایک بار پھر مسکرانے لگا۔ سیاہ فام چہرے پر موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے سفید دانتوں کی ادھ کھلی قطاریں عجیب معلوم ہو رہی تھیں۔

"تم بہت اچھی اُردو بولتے ہو!" میں نے اس کے ہمراہ چھپّر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بائیس سال سے اسی علاقے میں رہ رہا ہوں!"

"تو تم مقامی نہیں ہو؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"بائیس برس یہاں گذارنے کے بعد تو مجھے خواب بھی عربی میں نظر آنے لگے ہیں۔ تمھیں دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ کئی سال بعد میں ہندی بول رہا ہوں"

"ابوخالد بھی ہندی جانتا ہے؟"

"ٹوٹی پھوٹی بول لیتا ہے۔" اس نے کہا پھر غیر ضروری طور پر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "آیندہ اس طرح اس کا نام نہ لینا۔ عملی طور پر وہ اس بستی کا حکمران ہے اور یہ شیخ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

"تو کیا اصل شیخ کوئی اور ہے؟" ابومالک کے ہر فقرے نے میرے لیے حیرتوں کے پہاڑ سمیٹے ہوئے تھے اور میرے لیے صورتِ حال یک بیک پُر اسرار ہو چلی تھی۔ ابوخالد کی تسبیح کی ضرب سے اندر سے پھٹے ہوئے ہونٹوں کی سوزش مجھے احساس دلا رہی تھی کہ نادانستگی میں کسی نئے جال میں الجھتا جا رہا ہوں۔

"آہستہ آہستہ تم سب کچھ جان لوگے۔" ابومالک نے مربیانہ لہجے میں کہا پھر اچانک سوال کیا۔ "نام کیا ہے تمھارا؟"

"ودیا ساگر!" میں نے جواب دیا۔

"اچھا نام ہے۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"دہلی!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ بعد میں احساس ہوا کہ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ابومالک میری طرف سے شبہات میں مبتلا ہو جاتا۔

"اسی لیے اتنی اچھی ہندی بول لیتے ہو۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "سنا ہے جنوبی ہندوستان میں تو ہندی جاننے والے تیزی سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بس شمالی علاقوں کی بھاشا بن کر رہ گئی ہے۔"

جواب میں میں نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ابومالک نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا بیلچہ ایک طرف زمین پر رکھ دیا اور اپنے لبادے سے ہاتھ جھاڑتا ہوا اونٹوں سے گذرتا ایک جھونپڑی کی طرف ہو لیا۔

"تم بائیس برس سے یہاں ہو اور اونٹوں کی نگہبانی کر رہے ہو [illegible]

[illegible] کو بے حد نرم الفاظ کے سہارے ظاہر کیا ورنہ حقیقت تو یہ تھی [illegible] مدت گذارنے کے بعد محض اونٹوں کی پھیلائی ہوئی غلاظت صاف [illegible] اور نظر آ رہا تھا۔

[illegible] شیخ حکم دے تو میں شب و روز کھجور کے کسی درخت کی چوٹی پر بھی بسیرا [illegible] یہ باتیں تم کو جلد ہی معلوم ہو جائیں گی۔"

"مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟"

"تمھارا حافظہ کمزور معلوم ہوتا ہے۔" اس نے پہلی بار مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمھیں شیخ کے الفاظ یاد نہیں رہے؟"

"وہ یاد ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب تھا کہ تم مجھے کس [illegible] بارے؟"

"سب سے پہلے مجھے تم کو مسلمان بنانا ہے!" وہ نیم تاریک جھونپڑی [illegible] ہوتے ہوئے بولا۔

"مسلمان؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں دُہرایا۔

"لباس آثار و تو پتہ چل جائے گا۔" وہ ٹین کے ایک صندوق میں کچھ [illegible] ہوئے بولا۔

[illegible] بیٹا تو اس کے ہاتھ میں چند اوزار دیکھ کر یک بیک اس کا مفہوم [illegible] ہو گیا اور میں جلدی سے بولا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں [illegible] پہلے اس مرحلے سے گذر چکا ہوں!"

"مگر تم تو ہندو ہو؟" اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"بعض اوقات طبّی ضروریات مجبور کر دیتی ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا۔" اس نے مُڑ کر اپنے اوزار صندوق میں واپس ڈال دیے [illegible] بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

"اب تم بھول جاؤ کہ تمھارا نام ودیا ساگر ہے۔" وہ قدرے خاموشی کے [illegible] سے "تم یوسف حسین العداوی ہو۔"

"کیا اسلامی نام ضروری ہے؟"

"آیندہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "یہ شیخ کا پہلا اصول ہے جو کہا جائے اسے ایک دفعہ میں پوری طرح [illegible] ڈالو۔"

"یہ نام ذرا مشکل ہے۔ اگر حرج نہ ہو تو مجھے صفدر علی بنا دو۔" میں [illegible] نام برقرار رکھنے کی خواہش ظاہر کر دی۔

[illegible] چند ثانیوں تک سوچتا رہا پھر سر ہلا کر بولا۔ "کوئی حرج نہیں۔ [illegible] کیا خاص بات ہے؟"

"میرے ایک گہرے دوست کا نام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس نام پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ نرم لہجے میں [illegible] کل سے تم اس چھپّر کے نیچے صفائی کا خیال رکھوگے [illegible] اونٹنیوں کا دودھ دوہنے کی تربیت بھی دوں گا دو چار روز [illegible] کرنا ہوگا۔"

"یعنی میں اونٹوں کی غلاظت سمیٹوں گا؟" میں نے کراہت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں نے مشکل زبان استعمال نہیں کی ہے۔" اس بار ابومالک کا لہجہ زہریلا تھا۔ "اگر تمھارے حافظے کا یہی عالم رہا تو تمھارا علاج کرنا پڑے گا۔"

"میں خود کو سنبھال لوں گا بس چند روز میں بے چون و چرا تعمیل کی عادت پڑ جائے گی۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں جلدی سے کہا۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر لکڑیوں کے چولھے پر اپنے لیے قہوہ تیار کرنے لگا۔

"مجھے سگریٹ مل سکے گی؟" میں نے کچھ دیر کے بوجھل سکوت کے بعد دریافت کیا۔

"باہر دکان پر ملتی ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"مگر فی الحال میں قلّاش ہوں، پہلی تنخواہ ملنے تک میری گزر اوقات کیسے ہوگی؟"

"تم کتنی تنخواہ پر ملازم رکھے گئے ہو؟"

"دس ہزار!" میں نے کہا۔

چند ثانیوں تک وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا رہا، ساتھ ہی اپنی انگلیوں پر گنتا بھی جا رہا تھا۔ اپنا حساب مکمل کرنے کے بعد بولا۔ "تمھیں کھانا فراہم کیا جائے گا۔ اس کے اخراجات منہا کر کے تمھیں تقریباً تین ہزار ریال ملیں گے، چاہو تو مجھ سے دو چار سو ریال اُدھار لے لو۔"

"پانچ سو ریال دے دو۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنے جبّہ کی اندرونی جیب سے سعودی نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور گن کر چار سو اٹھانوے ریال میرے حوالے کر دیے ساتھ ہی ٹین کے صندوق سے انگریزی سگریٹ کے دو پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیے اور یوں پانچ سو کی رقم پوری کر دی۔

"یہاں سعودی کرنسی چلتی ہے؟" میں نے نوٹ گننے کے بعد سگریٹ سلگاتے ہوئے اس سے سوال کر ڈالا۔

"یہ آزاد علاقہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہاں ہندوستانی کرنسی رائج تھی مگر پچھلے پندرہ سالوں سے سعودی کرنسی رائج ہے کیونکہ یہاں سے سعودی علاقہ بہت قریب ہے۔"

"تم بائیس سال سے اسی نخلستان میں مقیم ہو؟"

اس نے قہوہ کی ایک پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سترہ سال میں اسی علاقے کی مختلف ریاستوں میں نوکری کرتا رہا۔ پانچ سال پہلے میں نے شیخ کی ملازمت اختیار کی اور اس کے ہمراہ الشویخ آ گیا بس جب ہی سے یہاں ہوں۔"

"تمھارا اصل نام کیا ہے؟" اسے گفتگو پر آمادہ پا کر میں نے اگلا سوال کیا۔

"اصل نام میں پانچ سال پہلے بھول چکا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ان علاقوں میں ہر شخص کو پہلی اولادِ نرینہ کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ شیخ نے مجھے ابومالک بنا دیا اور اب میں کبھی کبھی محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میں واقعی

مالک نامی کسی بیٹے کا باپ ہوں۔"

"تمھارے بیوی بچے؟"

"میں ان بکھیڑوں سے ہمیشہ آزاد رہا ہوں۔" وہ قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ یہ باتیں تمھارے سینے میں ہی دفن رہنی چاہئیں۔ اگر تم شیخ کے آدمیوں کے رازوں کی حفاظت نہ کر سکے تو کسی روز ناگہانی کوئی پاگل اونٹ تمھاری کھوپڑی چبا ڈالے گا۔"

اس کے الفاظ سن کر میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ بالکل واضح دھمکی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ میری ذرا سی بے احتیاطی مجھے کسی جان لیوا مصنوعی حادثے سے دوچار کر سکتی تھی۔

قہوہ ختم کر کے ابو مالک جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ میں خالی الذہنی کے عالم میں جھونپڑی کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ ابو مالک اونٹوں کے درمیان کہیں روپوش ہو چکا تھا۔

اس شخص نے وہ جھلستی ہوئی دوپہر باہر ہی گزاری۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ وہ کس خمیر کا بنا ہوا ہے جو یوں گدھے کی طرح بے سوچے سمجھے کام میں لگا رہتا ہے۔ اس مویشی خانے میں اگر باقاعدگی سے محض دو وقت بھی صفائی کر دی جاتی تو بہت کافی تھی۔ اس قدر دھوپ اور گرمی میں مسلسل ایسے غیر ضروری کام میں مصروف رہنا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر قبل ابو مالک واپس آیا۔ اس کا سیاہ چہرہ اور لباس پسینوں میں نہایا ہوا تھا۔

"ارے تم یہیں موجود ہو؟" مجھے دیکھ کر اس نے حیرت سے کہا۔

"پھر کہاں جاتا؟"

"باہر نکلو۔ ذرا دیکھو کہ صحرا کے سینے پر کیسی حسین اور سرسبز بستی آباد ہے۔" وہ تولیے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے بولا۔

"تو کیا مجھے گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہے؟"

"یہ قید خانہ نہیں ہے بھائی۔" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "کام کے وقت کام کرو پھر تم آزاد ہو۔ ذرا بستی کا مختصر سا بازار بھی دیکھو۔ یہاں تمھیں کوئی خدمت گار نہیں ملے گا، اپنا ہر کام تمھیں خود سرانجام دینا ہوگا۔ باہر نکلو تو عورتوں کی حرمت کا خیال رکھنا۔ ان پر بری نظر ڈال کر تم زندہ نہ رہ سکو گے۔"

"ایک بات بتا سکو گے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"عورت کے نام پر شاید تمھیں اپنی ہم سفر یاد آ گئی ہے!" وہ میرے لہجے سے فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ "یہی بات ہے نا؟"

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "شیخ نے مجھے اس سے ملنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ یہیں ہے یا کسی طرف روانہ کر دی گئی ہے؟"

"بڑی طرار عورت ہے وہ۔" ابو مالک کسی خیال کے زیرِ اثر مسکراتے ہوئے بولا۔ "اسے دو آدمیوں کی حفاظت میں بندرگاہ کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے جہاں سے اسے سقط پہنچا دیا جائے گا۔ وہ تم سے ایک بار ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں ہندی جانتا ہوں تو اس نے ... کرانے کے عوض مجھے اپنے جسم تک کی پیشکش کر ڈالی تھی۔"

اس کے یہ الفاظ سن کر مجھے ذہنی صدمہ ہوا۔ ابتدا میں ... کا دعویٰ کرنے والی چند ہی دنوں میں کیسی پستی میں جا گری تھی۔ بہرحال ... ہوا کہ اب وہ الشویخ میں نہیں رہی تھی ورنہ اس کے باعث ... پر خودسری پر آمادہ ہو سکتا تھا۔

ابو مالک نے خیمے میں لالٹین روشن کرنے کے بعد کھانے ... چلنے کو کہا اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ احاطے میں مٹی کا ایک ... کا کام دیتا تھا۔ وہاں دریوں پر چھ سات عرب پہلے سے ...

ابو مالک نے بتایا کہ وہ سب شیخ کے ملازم ہیں اور ... کے لیے مجھے ان کے ہمراہ وہیں آنا پڑے گا۔ موٹی تندوری روٹیوں ... بغیر مرچوں کے سالن پر مشتمل کھانا میری توقعات سے کہیں بہتر تھا ... سیر ہو کر کھانا کھایا جس کے بعد دودھ کا ایک بڑا گلاس دیا گیا۔ اس ... سی بو موجود تھی، رنگ بھی قدرے زردی مائل تھا جیسے دودھ میں ... ہو مگر ابو مالک نے بتایا کہ وہ مویشی خانے کی اونٹنیوں کا دودھ ہے ... زندہ اور صحت مند رہنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

وہ رات میں نے ابو مالک کی جھونپڑی میں بڑے سکون سے ... اس قدر خطرناک حالات سے دوچار ہونے کے باوجود مجھے ...

اگلی صبح میں ابو مالک کے ہمراہ ناشتے کے لیے پہنچا تو ... چند پیچیدہ سوالات جنم لے چکے تھے جن کا جواب پانا بظاہر ناممکن سے نظر آتا تھا۔

ابو خالد کون تھا؟ بستی کے لوگوں کے مقابلے میں اس کا ... اور خدوخال مختلف تھے مگر اس کے باوجود وہ وہاں معزز حیثیت ... تھا یہ بات کسی طرح میرے ذہن میں نہیں سما رہی تھی۔ سیدھے سادے ... کی اس صحرائی بستی میں ابو خالد نے اپنی ذات کے گرد ایک پُراسرار ... خول منڈھا ہوا تھا۔ آخر یہ سوانگ رچانے کی کیا ضرورت تھی اور سب ... اہم بات یہ تھی کہ اس نے مجھے خطیر معاوضے پر ملازمت کی پیشکش کیوں ...

ناشتے کے بعد ابو مالک مجھے مویشی خانے میں لے آیا۔ وہاں کئی ... میں کم و بیش ستر اسی اونٹ موجود تھے۔ ابو مالک مجھے تفصیل سے ان کے ... میں بتانے لگا۔ جب وہ بول رہا تھا تو اس کے لہجے سے ایسی محبت جھلک ... تھی جیسے وہ اپنے قریبی رشتے داروں اور اولادوں کا ذکر کر رہا ہو۔

وہاں بھانت بھانت کے اونٹ جمع تھے۔ دو کوہان والے ... بالوں والے سرخ ایرانی اونٹوں سے لے کر گندمی رنگ کے قد آور عام ... تک دس بارہ نسلوں کے ... نے بیان کر ڈالیں۔ ان میں سے بعض سواری ... لیے مخصوص تھے جو وقتِ ضرورت شیخ کے آدمی وہاں سے لے جاتے ... اونٹنیاں دودھ نکالنے کے علاوہ کسی اور مصرف میں نہ آتی تھیں۔ ان ... کے لیے بھی کچھ جانور مخصوص تھے جن کی خوراک وغیرہ پر کافی توجہ دی جا ... تے میں ایک بار اس پورے گلہ کو نخلستان کے نواح میں چراگاہ ... پہنچایا جاتا تھا۔

دو کوہان والی ایرانی نسل کی ایک اونٹنی کے قریب جا کر ابو مالک ... اور پیار سے اس کی گردن سہلانے لگا۔ اونٹنی نے اپنی تھوتھنی اس کے سینے سے لگا دی۔ وہ اداسی کے عالم میں جگالی کر رہی تھی۔ اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کے قریب ہی اس کا ایک بچہ زمین پر ... ہوا تھا۔

"اس کا نام صائقہ ہے۔" ابو مالک مجھے بتانے لگا۔ "چند روز قبل ... چراگاہ پر اپنے دو بچوں سمیت غول سے بچھڑ گئی تھی۔ اسی روز صحرا میں آندھی ... ریت کا ہولناک طوفان آیا۔ یہ اسی روز کا ذکر ہے جب تم الشویخ پہنچے ... پھر رات کے اندھیرے میں صائقہ واپس پہنچی تو اس کے ساتھ صرف ... بچہ موجود تھا۔ دوسرا بچہ شاید طوفان کے باعث کسی اور طرف نکل گیا یا ... ریت کے کسی تودے میں دب گیا۔ یہ اسی روز سے بہت سوگوار ہے۔ ذرا اس ... کا خاص طور پر خیال رکھنا۔"

مجھے ہمت نہ ہوئی کہ صائقہ سے اپنی پرانی شناسائی کا اعتراف کروں۔ ... پہچان چکا تھا کہ اسی اونٹنی کی پشت پر میں نے پاربتی کے ہمراہ صحرا کا وسیع ... عبور کیا تھا اور اس کا ایک بچہ میرے ہی سامنے گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے ... ختم ہو گیا تھا۔ اگر صحرا کے وسط میں صائقہ رحمت بن کر نہ آتی تو شاید میں ... اور پاربتی اسی صحرا میں سسک سسک کر مر گیا ہوتا۔

وہاں موجود تقریباً سارے ہی مویشی ابو مالک سے حد درجہ مانوس ... اور اس کے اشاروں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اس تعارفی تقریب کے خاتمے ... ابو مالک نے ایک بیلچہ مجھے تھما دیا اور میں اپنے مقدر کو کوستا غلاظت کی صفائی ... میں مصروف ہو گیا۔ ابو مالک وہاں سے چلا گیا۔

وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا۔ میں وہاں بالکل تنہا تھا مگر رہ رہ کر مجھے ... محسوس ہو رہا تھا جیسے دو جلتی ہوئی سرخ آنکھیں پوشیدہ رہ کر میری نگرانی ... کر رہی ہوں۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر جھونپڑی میں ... رکھے ابو مالک کے سامان کی تلاشی لے ڈالوں تاکہ اس کے بارے میں ... تفصیلات کا علم ہو سکے مگر میں اس کی دھمکی کا تصور کر کے اس ارادے کو ... عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت بھی ابو مالک واپس نہ آیا تو میں تنہا کھانے ... میں چل دیا۔ مجھ سے پہلے وہاں صرف دو افراد موجود تھے۔ میں نے مطبخ والوں ... سے پلیٹ میں سالن لیا اور دری پر بیٹھ کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے ... کے دوران میں وہاں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ دونوں مقامی کبھی کبھار لاتعلقانہ ... انداز میں نوالے چباتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگتے تھے۔ میں نے ان کی نگاہوں ... کا جواب دوستانہ مسکراہٹ سے دیا مگر اس سے آگے کوئی پیش رفت نہ ... ہوئی اور میں کھانے سے فارغ ہو کر واپس اپنے کام پر چل دیا۔

مجھے ... پیچھے دو مقامی میرے منتظر تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی عربی میں پُرجوش لہجے میں مرحبا اور اہلاً وسہلاً وغیرہ کی گردان شروع کر دی اور میں محض ہونق کی طرح سر ہلاتا ان کے قریب جا پہنچا۔ ان میں سے ایک لپک کر دو قدم آگے آیا اور مجھ سے مصافحہ کر کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر پھیرے، پھر باری باری میرے دونوں رخسار چوم لیے۔ پھر دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی۔

اس کے بعد میں ان کے فقروں کا مفہوم بالکل نہ سمجھ سکا۔ انھوں نے بھی میری بے چارگی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے سمجھانے کی مزید زبانی کوششیں ترک کر دیں اور اشاروں کی مدد سے بتایا کہ انھیں دو عدد اونٹ درکار ہیں۔ میں نے سر ہلا کر انھیں اجازت دے دی۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے قبل وہ دونوں واپس آ گئے۔ اس دوران میں ابو مالک مسلسل غائب تھا۔ میں نے آخری بار چھپر کے نیچے صفائی کی اور پھر جھونپڑی میں چل دیا۔

وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ابو مالک نہایت بے فکری کے ساتھ چٹائی پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ وہ میری لاعلمی میں نہ جانے کس وقت وہاں آ پہنچا تھا۔ پھر مجھے اس کے سرہانے چند چوبی پیٹیاں رکھی ہوئی نظر آئیں، جو اس سے پہلے وہاں موجود نہیں تھیں۔

دن بھر گرم اور مرطوب ہوا میں کام کرنے کے باعث میرا سارا بدن چپک رہا تھا مگر وہاں نہانے کے لیے پانی موجود نہیں تھا۔ میں نڈھال ہو کر چٹائی پر ہی دراز ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ابو مالک بیدار ہوا۔ چند ثانیوں تک انگڑائیاں لینے کے بعد لالٹین روشن کرنے لگا۔

"تم کہاں گئے ہوئے تھے؟" میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"باہر کچھ کام تھا۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تم کو؟"

"تمھارے بغیر میں خود کو بے سہارا محسوس کر رہا تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"صفائی کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں مگر جب دو مقامی اونٹوں کے لیے آئے تو میں پریشان ہو گیا۔ میرے لیے مقامی زبان سمجھنا دشوار ہے۔ پھر میں لوگوں سے واقف بھی نہیں۔"

نیم تاریکی میں اس کی دھیمی مگر معنی خیز ہنسی کی آواز گونجی۔ "تم بے فکر رہو، یہاں کسی میں ہمت نہیں کہ بے ایمانی کر سکے۔ جو بھی آئے، تم اونٹ اس کے حوالے کر سکتے ہو۔"

"پھر تو لوگ مجھ سے دریافت کیے بغیر بھی جانور لے جا سکتے ہیں!"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "تمھاری اجازت کے بغیر کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس طرح ہمیں یہ معلوم رہتا ہے کہ کوئی اونٹ مہار توڑ کر نہیں بھاگا ہے۔"

"بہرحال مجھے یہاں رہنا ہے تو زبان تو سیکھنی ہی پڑے گی۔"

"آہستہ آہستہ خود ہی سیکھ جاؤ گے۔"

اگلے روز ابو مالک نے صبح سویرے ہی نئی چوبی پیٹیوں میں سے ایک

کو کھولا تو اس میں افیون موجود تھی۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ افیون کی بھاری مقدار گھوٹنے میں مصروف ہو گیا اور مجھے ہدایت کی کہ میں رات بھر کی غلاظت سمیٹ کر فوراً واپس آ جاؤں۔

میری مدد سے جب اس نے افیون تیار کر لی تو اس کے سیاہی مائل بھورے محلول کو ایک کنستر میں منتقل کیا گیا اور پھر وہ کنستر باہر لے گیا۔

مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ افیون کی بو پاتے ہی چند گنے چنے اونٹ یک بیک مضطرب ہو گئے اور مظلوم آوازوں میں بلبلانے لگے۔ ابومالک نے وہ کنستر ایک اونٹ کے آگے رکھ دیا اور وہ بے تابی کے ساتھ غٹا غٹ وہ محلول پیتا چلا گیا۔

کنستر خالی ہو جانے کے بعد ابومالک نے اس اونٹ سے کچھ کہا اور وہ پھرتی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے لبادے کی جیب سے متعدد چرمی تعویزوں والا ایک ہار نکالا اور اس اونٹ کی گردن سے باندھ دیا۔ وہاں موجود بیشتر اونٹوں کی گردنوں میں اسی قسم کے بوسیدہ ہار پڑے ہوئے تھے مگر ابومالک نے جس اہتمام کے ساتھ وہ ہار باندھا تھا اس سے کسی حد تک مجھے معاملے کا اندازہ ہو گیا تھا۔

ابومالک چند اونٹوں کو افیون کے سہارے اپنی مرضی کا غلام بنا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان چرمی تعویزوں میں کچھ خفیہ پیغامات پوشیدہ رہے ہوں گے جنھیں اس نشہ باز اونٹ کے ذریعے ابومالک کسی خاص منزل پر پہنچانے والا تھا۔ اس صحرائی بستی میں ہر روز نت نئے اور سنسنی خیز واقعات میرے سامنے آتے جا رہے تھے۔

وہ اونٹ بے مہار تھا۔ اس کے اگلے پیر کو ایک رسّی کے ذریعے کھونٹے سے باندھا ہوا تھا۔ اس کی گردن میں ہار باندھنے کے بعد ابومالک نے اس کا اگلا پیر آزاد کر دیا اور اونٹ کی پشت پر زور سے ہتھیلی مار کر کچھ ناقابلِ فہم الفاظ ادا کیے۔ اونٹ بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل دیا۔ اس کا رُخ حویلی کے احاطے سے نکاسی کے راستے کی طرف تھا۔

ابومالک اس وقت تک وہیں کھڑا پُرخیال نظروں سے اس اونٹ کو گھورتا رہا جب تک وہ حویلی میں بنی ہوئی نیم پختہ یک منزلہ عمارات کی بھول بھلیوں میں غائب نہ ہو گیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

"کچھ سمجھ میں آیا؟" چند ثانیوں کے بعد اس نے دوستانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے سوال کیا۔

"سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ کس طرف روانہ ہوا ہے؟"

"اس کا ایک ہی لگا بندھا راستہ ہے۔ سوار کے بغیر یہ آسانی سے سرحد عبور کر جائے گا۔"

"تو یہ سعودی علاقے کی طرف گیا ہے؟"

اس نے فخر کے ساتھ سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "صحرا میں پیغام رسانی کے لیے اس سے مؤثر اور بے ضرر کوئی طریقہ نہیں۔"

آہستہ آہستہ الشویخ میں ابومالک کا مصرف واضح ہوتا جا رہا تھا۔

میں پھیکے انداز میں مسکرا دیا۔ "اور منزل پر اس کی گردن سے تعویزوں [illegible] اتار لیا جائے گا؟"

"ہاں!" وہ جھونپڑی کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ "وہاں سے [illegible] پیغام لے کر آئے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہ بھٹکا سکتی ہے نہ روک سکتی [illegible] افیون کی طلب اسے دوبارہ اسی مقام پر پہنچائے گی۔"

اونٹوں کی غلاظت سمیٹنے والا وہ دُبلا پتلا، دراز قامت شخص مجھے یک بیک بہت پُراسرار اور خطرناک نظر آنے لگا۔

ابومالک کی توقع کے عین مطابق پانچویں روز جلتی ہوئی دوپہر میں وہ اونٹ آ پہنچا۔ میں نے فوراً ہی ابومالک کو اطلاع دے دی۔

اس اونٹ کے لیے ایک بار پھر افیون کا کنستر تیار کیا گیا۔ اس بار مقدار خاصی کم تھی۔ جب اونٹ کو اپنا نشہ مل گیا تو وہ بے حد پُرسکون نظر آنے لگا۔ اس کی گردن میں پہلے ہار سے مشابہ مگر مختلف رنگ کی ڈوری والا ہار موجود تھا۔ اونٹ کا پیر باندھنے کے بعد ابومالک نے وہ ہار کھولا اور وہاں سے چلا گیا۔

میرے ذہن میں بے شمار سوالات اُبھر رہے تھے اور میں بے چینی سے ابومالک کا منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو میں نے موقع پا کر بات چھیڑ دی۔

"یہ کام تم شیخ کے لیے ہی کرتے ہو؟"

"الشویخ میں ہر کام اسی کے لیے کیا جاتا ہے۔"

"تم ابھی شیخ کے پاس ہی گئے تھے؟"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "شیخ بہت مصروف آدمی ہے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ جب تم بھٹک کر یہاں پہنچے تھے تو وہ الشویخ میں تھا ورنہ وہ تو مہینوں باہر رہتا ہے۔"

"تو اس کے نہ ہونے کی صورت میں بستی کا نظام کون چلاتا ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس کا نظام خود بخود چلتا ہے۔ جہاں ہر شخص اپنے کام اور حکم عدولی کی صورت میں انجام سے واقف ہو، وہاں کسی نگراں کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"تم ہندی ہو نا؟"

"یہ اچانک تمھیں کیسے یاد آ گیا؟" اس وقت وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔

"تمھاری یہ بستی، یہ الشیخ اور تمھارے کام ایسے پُراسرار ہیں کہ سوچتے سوچتے میرا دماغ دُکھنے لگا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے سُنی ہوئی ہر بات اپنے سینے میں دفن رکھوں گا۔ مجھے بس اتنا بتا دو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شاید مقصد سمجھنے کے بعد میں بہتر طور پر تمھارے کام آ سکوں۔"

"یہاں ہر آدمی کسی نہ کسی کا پابند ہے صفدر علی۔" وہ بولا۔ "تم صرف وہی کرو گے جو کہا جائے گا۔ سوچنے اور سمجھنے کی کوشش میں تم پاگل ہو جاؤ گے۔"

ابومالک کے اس حوصلہ شکن جواب نے میری زبان بند کر دی۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ شخص مجھے ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی نہ بتائے گا۔ ساری

مجھے اپنے طور پر حاصل کرنی ہوں گی۔

الشویخ میں میرا وقت گھٹن اور اضطراب کے عالم میں گزر رہا تھا۔ وہاں ابومالک ہی میرا ہم زبان تھا اور اس کا رویّہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ بالآخر [illegible] پینے کے دوران دو افراد سے دوستی گانٹھنے میں کامیابی حاصل [illegible] اس لیے ممکن ہوا کہ ابومالک نے مجھے کام چلانے کے لیے عربی [illegible] الفاظ اور فقرے سکھا دیے تھے۔ میں کوشش کرتا تھا کہ اپنا فرصت کا بیشتر [illegible] ان دونوں کے ساتھ گزاروں تاکہ جلد از جلد عربی زبان سیکھ لوں۔

غلاظت سمیٹنے، اونٹنیوں کا دودھ دوہنے اور افیون گھوٹتے مجھے تین [illegible] گزر گیا۔ اس دوران میں، میں اس حد تک عربی سے واقف ہو گیا تھا کہ [illegible] دوستوں سے دیر تک گفتگو کر سکوں۔

ان میں فواد نامی ایک نوجوان مجھے اپنے ڈھب کا آدمی معلوم ہوا۔ ایک [illegible] چاندنی کی روشنی میں اس کے ساتھ چہل قدمی کرتا دانستہ بستی سے [illegible] دور تک نکل گیا اور وہاں ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ریت پر دراز ہو کر اس [illegible] بات چھیڑ دی مگر ابتدا اس کی مایوسی سے کی تاکہ وہ میری نیت پر [illegible]

"مایوسی؟" اس نے میرا سوال سُن کر دُہرایا۔ "شاید تمھارا خیال درست [illegible] بندھی زندگی میں بھلا زندگی کا ولولہ بیدار رہ سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس بستی میں شیخ کی ملازمت سب سے بہتر ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تم یہ کہہ رہے ہو۔ دور سے بے شک ایسا معلوم ہوتا [illegible] بستی کی عام زندگی سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"یہ ملازمت میں نے محض عزت اور آسائش کے لیے اختیار کی تھی [illegible] اپنے ملازموں سے غلاموں جیسا سلوک کرتا ہے اور آسائش کا تو تصوّر [illegible] ہے۔ دوسری طرف بستی والے شیخ کے ملازموں سے خوفزدہ رہتے ہیں [illegible] دوستی کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔"

"مگر مجھے تو یہ اندازہ نہیں ہو سکا۔"

"وہ ہنسنے لگا۔" زبان پر عبور حاصل ہوتا تو چند ہی دنوں میں سمجھ [illegible] ہے کہ کچھ عرصہ بعد تم بھی میرے خیال سے متفق ہو جاؤ۔"

"تم شیخ سے بدظن معلوم ہوتے ہو؟"

[illegible] یک بیک خوفزدہ ہو گیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "نہیں، میں [illegible] نہیں کہا۔ میں سب سمجھ گیا۔ تم یقیناً میرے خیالات کا جائزہ لینے [illegible] پیچھے لگائے گئے ہو۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے اُٹھ کر اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "میں تو خود [illegible] نالاں ہوں۔ تم یقین کرو کہ میں کوئی مخبر نہیں ہوں۔"

[illegible] مشکل سے اسے اپنے خلوص کا یقین دلا سکا اور جب وہ میری [illegible] مطمئن ہو گیا تو اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

"[illegible] اس بستی کا رہنے والا نہیں ہے پھر بھی عملاً ہم پر اسی کی حکمرانی ہے۔ اگر لوگوں کے دلوں پر اس کے ظلم کی دہشت نہ ہو تو وہ اس کے چیتھڑے اُڑا دیں۔"

"اس بستی کا نہیں ہے؟" میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"اس کا اونٹ جیسا قد، جھلسی ہوئی مگر سُرخ و سپید رنگت اور نیلی آنکھیں تم نے بستی میں کہیں اور دیکھی ہیں؟" وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ "وہ بھوکا پیاسا بے سروسامانی کے عالم میں یہاں پہنچا تھا۔ امیر معظم نے اس پر رحم کھا کر اسے پناہ دی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ امیر معظم نے اس کی جوان اور خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی اور خود گوشہ نشین ہو گئے۔ ابوخالد آہستہ آہستہ بستی کے معاملات پر چھاتا چلا گیا۔"

"تو اس کی کوئی لڑکی بھی ہے؟"

"ہاں! وہ حرافہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں یہاں آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غضب کا جادو ہے، جوان اور گداز بدن کے خمار نے بوڑھے امیر کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ سچ پوچھو تو ابوخالد نے اپنی بیٹی امیر کے ہاتھوں اقتدار کے عوض ہی بیچی ہے ورنہ پانچ برس قبل وہ ابومالک اور اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں پہنچا تو بھوک اور پیاس سے تینوں لب گور پہنچے ہوئے تھے۔"

"تو امیر معظم کو ان حالات کا اندازہ نہیں ہے؟"

"ان کی عمر پچپن سال ہے اور وہ لاولد ہیں۔ انھیں الشویخ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ لوگوں کو یقین ہے کہ ابوخالد نے اولاد کا لالچ دے کر ہی اپنی بیٹی امیر کے حرم میں پہنچائی ہو گی۔ اس کے آنے کے بعد امیر معظم اپنی تین بیویوں کو بالکل بھول چکے ہیں۔ جب ابوخالد باہر ہوتا ہے تو لیلیٰ ہی امیر کی مہر کے سہارے فرمان جاری کرتی ہے۔ امیر کے اہلِ خاندان کو باپ بیٹی نے بالکل بے بس اور مجبور کیا ہوا ہے۔ بستی کے لوگ بالکل غیر مسلح ہیں مگر ان دونوں کے دس بارہ جاں نثار ہولناک آتشیں اسلحہ سے لیس رہتے ہیں۔ وہ بربریت پر اُتر آئیں تو ایک گھنٹے میں پوری بستی کو قبرستان بنا سکتے ہیں۔"

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں بے شمار چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔

"ابومالک کیسا آدمی ہے؟"

"وہی سب سے زیادہ خطرناک اور ابوخالد کا منہ چڑھا ہے۔" فواد تلخ لہجے میں بولا۔ "بس یوں سمجھو کہ تم ہر وقت ایک خونخوار شیر کے دہانے میں بیٹھے ہوئے ہو جو کسی بھی وقت اپنے جبڑوں کے درمیان تمھیں کچل سکتا ہے۔"

"آخر ابوخالد کو اس بستی سے کیا دلچسپی ہے جبکہ وہ اپنا بیشتر وقت باہر گزارتا ہے؟"

"اس ولدالحرام نے امیر معظم سے کہا تھا کہ ان کے احسانات نے اسے خرید لیا ہے اور اب وہ کبھی الشویخ سے نہ جائے گا۔" فواد اب کھل کر مجھ سے بات کر رہا تھا۔ "مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ لیلیٰ کے ذریعے ہم سب اس کے غلام بنا دیے گئے ہیں اور وہ کسی بدروح کی طرح ہم پر مسلط ہے۔"

"اس کا اصل نام کیا ہے؟"

"کوئی نہیں جانتا۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "اس نے خود کو ابوخالد کہہ کر متعارف کرایا تھا اور وہ اسی نام سے پہچانا جانے لگا جبکہ مجھے شبہ ہے کہ

اس کی کوئی اولاد بھی ہو۔"

"لیلیٰ؟" میں نے حیرت سے کہا۔"وہ کون ہے؟"

اس نے خاموش رہ کر چند ثانیوں تک خوفزدہ نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ چاندنی رات میں صحرا میں ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ وہ اضطراری طور پر میری طرف جھک آیا اور دھیمی آواز میں بولا۔"مجھے وہ بھی اس کی کوئی لونڈی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کسی لمبے چکر میں معلوم ہوتا ہے۔"

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟" میں بے اعتباری سے بولا۔

"تم پہلے آدمی ہو جس کے سامنے میں نے یہ بات کہی ہے۔ میں اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔ میں نے ابوخالد کو ایسے انداز میں لیلیٰ کے ساتھ دیکھا ہے کہ میں انھیں باپ بیٹی مان ہی نہیں سکتا۔ پھر اس کی زبان سے کسی نے خالد کا تذکرہ نہیں سنا۔ اگر واقعی اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو ان پانچ سالوں میں کم از کم ایک آدھ بار ضرور اپنی بہن سے ملنے آتا۔ کیا یہ تمام باتیں تمھیں مشکوک نہیں لگتیں؟"

"ابوخالد اور لیلیٰ کو اس حال میں دیکھنے کے بعد تم کیسے بچ گئے؟"

"میں امیر معظم کی رہائش گاہ میں ہر شام تازہ پھولوں کے گلدستے سجانے پر مامور ہوں اور میری رسائی ہر جگہ ہے۔ میں نے پردوں کے درمیان سے لیلیٰ کی خوابگاہ میں اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں کسی بات پر بے حد خوش تھے بیں شیشوں کی وجہ سے ان کی گفتگو نہ سن سکا مگر جب ابوخالد نے اسے بانہوں میں لیا تو میں وہاں سے ہٹ گیا۔ ان دونوں کو علم ہی نہ ہو سکا کہ میں نے انھیں دیکھ لیا ہے۔"

"تم چاہو تو ہم الشویخ کو ابوخالد کے شکنجے سے نکال سکتے ہیں۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد دھیمے اور پُراعتماد لہجے میں کہا۔

وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے گھورنے لگا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔
"مجھے تو تم پاگل نظر آتے ہو۔ اس سے ٹکرانا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔"

"وہ بھی ہم جیسا انسان ہے۔" میں نے اسے حوصلہ دلانے کی کوشش کی۔

"مگر تم اس کے مسلح جاں نثاروں کو کیوں بھول رہے ہو۔" وہ بولا۔"وہ سب عرب ضرور معلوم ہوتے ہیں مگر وہ انھیں باہر سے لایا ہے۔ انھیں ہمارے اہل و عیال کا خون بہاتے ہوئے ذرا بھی ملال نہ ہوگا۔"

"اگر ہم ابوخالد کو مار دیں تو وہ ہتھیار اٹھانے کی ہمت بھی نہ کر سکیں گے۔" میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں بولا۔

وہ میرا ہاتھ جھٹک کر ایک دم کھڑا ہو گیا اور خنکی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ نظروں سے مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے فواد؟" اسے خاموش پا کر میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"تمھارے الفاظ سے خون کی بُو آ رہی ہے صفدر۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔
"مجھے تو تم ابوخالد سے زیادہ خطرناک نظر آ رہے ہو۔"

"پیر کے نیچے دب کر چیونٹی بھی خونخوار ہو جاتی ہے فواد۔" میں نے کہا۔
"میں اگر صحرا میں بھٹک کر مر جاتا تو میری کہانی ختم ہو جاتی۔ میری ایک حسین اور وفاشعار بیوی ہے میں اس سے بچھڑ کر یہاں آ پھنسا ہوں۔ مجھے ان... ہے کہ میں ابوخالد کے چنگل سے کبھی نہ نکل سکوں گا۔ اس کا فتنہ ختم کر... الشویخ کی تقدیر بھی بدل سکیں گے اور میں واپس اپنی سرزمین کی جانب... سکوں گا۔"

اسے سمجھانے کی ہر کوشش میں مجھے ناکامی ہوئی۔ ابوخالد سے شد... نفرت کے باوجود اس میں کسی عملی کارروائی کا حوصلہ نہیں تھا۔ میری ہر دلیل... جواب میں وہ یہی کہتا رہا کہ ابوخالد ایک پہاڑ ہے جس سے ٹکرا کر ہم ریزہ ریزہ... ہو جائیں گے' اس کا کچھ نہ بگڑے گا۔

کافی دیر بعد ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے غار... سے واپس لوٹ آئے۔

اس رات میں ایک پل کے لیے نہ سو سکا۔ سیتا مجھے شدت سے یاد آ... تھی۔ اسے مجھ سے بچھڑے طویل مدت گزر چکی تھی۔ اس کا بات بات پر مجھ... الجھنا، روٹھنا اور جلد ہی من جانا یاد آ رہا تھا۔ خود غرض انسانوں سے دُور... ہمالیہ کی گود میں پروان چڑھنے والی سیتا نہایت سادہ اور معصوم فطرت کی... مالک تھی۔ اس کی بے خوفی اور جرأت کے سامنے ہر مثال ہیچ تھی۔ میں نے کر... میں عیش و عشرت کی ایک طویل زندگی گزاری۔ حبیب دولت اور شباب سے... میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ حسین بنا رہا تھا۔ اس کے بعد مقدر نے مجھے ایک مفرو... مجرم بنا دیا اور میں پناہ کی تلاش میں پے در پے جرائم کا ارتکاب کرتا در بدر... بھٹکتا رہا۔ پھر ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کے سائے میں سیتا مجھے ملی۔ ایک طویل... اور روح فرسا جدوجہد کے بعد اس کی بن بیاہی ماں سندری نے اسے میرے... حوالے کر دیا۔

سنگلاخ وادیوں میں بے سروسامانی کے باوجود سیتا کی رفاقت میں... میں نے جو دن گزارے وہ میری زندگی کا نچوڑ تھے۔ اسے اپنا کر مجھے احساس... ہوا کہ اپنے باپ کی دہلیز سے دھتکارے جانے کے بعد میں جن عارضی مسرتوں... کے پیچھے بھاگتا رہا، وہ محض سراب کی مانند تھیں۔ قدرت نے سیتا کے روپ... میں مجھے بھرپور اعتماد اور سکون کے صحیح مفہوم سے آشنا کر دیا تھا۔

سندری نے مجھے دو تحفے دیے اور دونوں بے مثال تھے۔ نہ سیتا... کی ہم پلہ لڑکی مجھے میسر آ سکتی تھی اور نہ ہی پارس پتھر کا جوڑ مل سکتا تھا۔ سندری... کی مہربانیوں کے طفیل میں نے اپنی منزل پا لی تھی اور عین اس وقت جب... میں دل میں اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر اور بچوں کا ارمان لیے اپنے وطن... کی طرف بڑھ رہا تھا تو پہلے میری زبان کا گہرا گھاؤ کھا کر سیتا مجھ سے بچھڑ... گئی اور اس کے بعد پارس پتھر بھی میرے اختیار میں نہ رہا۔

پارس کے بارے میں تو مجھے امید تھی کہ میں جب بھی انبالہ پہنچنے میں... کامیاب ہوا، راجہ ہوٹل کے سترھویں کمرے کی الماری کے ایک سوراخ میں... چیونگم کے نیچے چھپا ہوا پتھر میری ملکیت بن جائے گا۔ اس جگہ وہ بالکل... محفوظ تھا مگر سیتا کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔... غائب ہونے سے قبل آخری رات اس نے میری باتوں پر...

...مجھ سے جو چند سوال کیے بس وہی میری رہنمائی کر سکتے تھے۔ سیتا جانتی... تھی کہ ہندوستان کی سرحد عبور کرنے کے بعد لاہور یا کراچی کو اپنی منزل... بنانا... میں نے والہانہ انداز میں اسے ان نکھرے نکھرے شہروں کے قصے... سنائے تھے اور مجھے امید تھی کہ وہ آخری سانسوں تک میرا انتظار کرے گی۔... اگر وہ ہندوستان کی سرحد عبور کر چکی تھی تو یقیناً لاہور یا کراچی میں میری تلاش میں... سرگرداں تھی اور میں صحرائے عرب کے ایک دُورافتادہ نخلستان میں ایک... ایسے شخص کا غلام بن چکا تھا جس کی رضا کے بغیر میرے لیے کہیں جانا... ممکن نہیں تھا۔

میں رات بھر سگریٹیں پھونکتا اور سوچتا رہا۔ صبح سویرے ابو مالک بیدار... ہوا تو جھونپڑے کے فرش پر سگریٹ کے لاتعداد مسلے ہوئے ٹوٹے دیکھ کر... حیران رہ گیا۔

"تم رات سوئے نہیں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ابو مالک! اب میں ایک پل یہاں نہیں رُک سکتا۔" میں نے سرد... اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اوہ! تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ چونک کر بولا۔

"کیا؟"

"میں تمھیں بتانے والا تھا کہ دو ایک روز میں تم یہاں سے بھیج... دیے جاؤ گے۔"

"مگر میں اپنے وطن کی بات کر رہا تھا ابو مالک!" میں اٹھتے ہوئے... قدرے تلخ لہجے میں بولا۔"آج رات میرے سینے کے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔... میں آزادی چاہتا ہوں۔ تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں نے یہاں جو کچھ دیکھا یا سنا... ہے وہ ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
"تمھاری ورم آلود سرخ آنکھیں اور پیشانی پر ابھری ہوئی وریدیں بتا رہی ہیں کہ... تم واقعی پریشان ہو۔ مجھے اپنی مشکلات بتاؤ، شاید میں تمھاری مدد کر سکوں۔ اکیلا... آدمی سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتا ہے۔"

"میری مشکلات کا حل یہاں رہتے ہوئے ناممکن ہے میرے دوست۔"

"اپنی ہم سفر یاد آ رہی ہے کیا؟"

"وہ پست اخلاق کی عورت تھی۔" میں حقارت سے بولا۔"وہ تو اپنے... دھرم کے نام پر خود کو میرے حوالے کر رہی تھی ایسی عورت کو بھلا کون یاد کرے گا۔"

ایک لحظے کے لیے ابو مالک کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔"کسی کے دھرم... کے بارے میں ایسی حقارت سے بات نہ کرو۔ صفدر علی بننے سے پہلے تم بھی دیپ ساگر... تھے۔"

دھرم کے حوالے پر ابو مالک کا یہ غیر اختیاری رویّہ مجھے بہت کچھ سمجھا... گیا اور میں نے اپنے شبہات کو تقویت دینے کے لیے شیو دیوتا اور اس سے... منسوب ایک خاص پوجا کو چند ننگی گالیاں دے کر اپنی آزاد خیالی اور غیر مذہبی... رجحانات کا مصنوعی مظاہرہ کر ڈالا۔

میرا یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ابو مالک نے آگے بڑھ کر غصے سے میرا گریبان تھام لیا اور تقریباً میرے چہرے سے اپنا چہرہ ملا کر کسی زخمی سانپ کی طرح پھنکارا۔"میں آج کل کے چھوکروں کے باغیانہ خیالات سے خوب واقف ہوں مگر یہ یاد رکھنا کہ آئندہ میرے سامنے دھرم کے بارے میں زہرفشانی کی تو زبان کھینچ لوں گا۔ ایک برہمن زادہ اپنے مقدس دیوتاؤں کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ میرا گریبان چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اس کے الفاظ میرے لیے شدید حیرت کا باعث ثابت ہوئے تھے۔ محض اتفاقی طور پر میں اس سے یہ اگلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ مجھے اپنا گمراہ ہم مذہب سمجھ کر اس نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ مسلمان نہ ہونے کے باوجود اس بستی میں نامعلوم مقاصد کے تحت مسلم بنا ہوا تھا۔

ابوخالد اس بستی میں یقیناً کوئی بڑا کھیل کھیل رہا تھا۔ اس کی ذات ہنوز میرے لیے پُراسرار تھی۔ وہ ایک ہندو کو مسلمان بنا کر لایا تھا، اسی طرح کسی فاحشہ کو اپنی بیٹی بنا کر امیر کے حرم میں پہنچا دیا تھا۔ مجھے تو یقین ہو چلا تھا کہ پانچ برس قبل وہ بھٹک کر الشویخ نہیں پہنچا تھا بلکہ اپنے مقاصد کے تحت مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر وہاں آیا تھا تاکہ اپنے قدم جما سکے اور وہ خبیث اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب نظر آ رہا تھا۔

مجھے الشویخ آئے کئی مہینے گزر چکے تھے اور میں خاصی حد تک خود کو مقامی ماحول کے سانچے میں ڈھال چکا تھا مگر اب ابو مالک نے مجھے کہیں اور روانگی کی خبر سنا کر الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر مجھے اس خوفناک چنگل سے رہائی پانے کی کوشش کرنی ہی تھی تو الشویخ میں رُکنا میرے لیے ضروری تھا ورنہ نئی جگہ جا کر ماحول اور لوگوں کو سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگ سکتا تھا جبکہ میرے لیے اس قید کا ایک ایک لمحہ گزارنا دشوار ہو رہا تھا۔ سیتا کی یاد نے مجھے یکایک ناقابلِ بیان اضطراب سے دوچار کر دیا تھا۔

اس روز میں دیر تک تفکرات میں کھویا رہا۔ میرے ذہن میں نت نئے ہولناک منصوبے جنم لے رہے تھے مگر میں کسی ایک فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ فیصلہ کرنے سے قبل میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ الشویخ میں میرا قیام کتنے دن تک رہے گا۔

دوپہر میں ابو مالک نظر آیا تو میں نے اسے جا لیا۔

اس نے سرد مہری سے میری طرف دیکھا۔ اس کے رویّے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صبح کی گفتگو کی تلخی کو ابھی تک فراموش نہیں کر سکا ہے۔

"مجھے الشویخ سے کہاں بھیجا جا رہا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ اپنے لہجے سے میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں صبح کی تلخ کلامی فراموش کر چکا ہوں۔

"جہاں تمھاری ضرورت ہے۔" اس نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"روانگی کب ہوگی؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"کل شام!" اس بار خلافِ توقع اس نے معقول جواب دیا اور یہ

کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ میں کئی ثانیوں تک اسی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اگلی شام روانگی کا مطلب یہ تھا کہ کچھ کر گزرنے کے لیے میرے پاس صرف ایک رات تھی۔ اس حویلی میں رہتے ہوئے دن کی روشنی میں کوئی مشکوک کارروائی میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ ایک تیز رفتار اونٹ لے کر خاموشی سے وہاں سے صحرا کی طرف نکل جاؤں لیکن حویلی کے دونوں راستوں پر متعین مسلح محافظ میری اس غیر معمولی روانگی پر شبہ میں پڑ سکتے تھے۔ اگر میں انھیں دھوکا دے کر نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو یہ خبر زیادہ دیر پوشیدہ نہ رہتی اور ابو مالک کے سدھائے ہوئے تیز رفتار اونٹوں پر سوار لوگ مجھے زیادہ دور نکلنے سے قبل ہی جا لیتے۔

سورج غروب ہونے تک میں گردوپیش کا جائزہ لے کر ایک بڑا فیصلہ کر چکا تھا جس کی ناکامی میری مکمل شکست اور تباہی پر منتج ہوتی مگر یہ فیصلہ میرے لیے ناگزیر تھا۔

جب چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا اور ابو مالک کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر چٹائی پر دراز ہو گیا تو میں نے لالٹین کی لو نیچی کی اور اس کے قریب ہی دراز ہو گیا۔

لمحے دھیمے دھیمے سرکتے رہے۔ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ آنے والے لمحوں کی سنسنی رفتہ رفتہ میرے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔

میں بظاہر چٹائی پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا مگر میری ادھ کھلی آنکھیں ابو مالک پر مرکوز تھیں۔ کافی دیر گزرنے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ ابو مالک گہری نیند سو چکا ہے تو میں کوئی آواز پیدا کیے بغیر آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا۔

''کیا نیند نہیں آئی صفدر؟'' نیم تاریکی میں ابو مالک کی دھیمی آواز میرے اعصاب کے لیے کسی بم کے دھماکے جیسی ثابت ہوئی اور میں بے اختیار اچھل پڑا۔

''م... میں پیشاب کرنے جا رہا ہوں۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تو ڈر کیوں گئے؟'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ مجھے اس کی آواز میں تلخی کی جھلک محسوس ہوئی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خبیث میرے ارادوں سے واقف ہو گیا ہو۔

میرا ارادہ تو یہی تھا کہ اسے سوتے ہوئے آسانی سے زیر کر لوں گا مگر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی چھٹی حس اسے خطرے سے آگاہ کر چکی ہو۔ اس نے مجھے اپنی بیداری کا احساس دلا کر مضطرب کر دیا تھا۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اچانک ہی اس پر ٹوٹ پڑا۔

میرا حملہ اس کے لیے غیر متوقع ثابت ہوا۔ اس نے میری زد سے بچنا چاہا مگر اسے میرے عزائم کا اندازہ کرنے میں قدرے تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ پوری کوشش کے باوجود میری نپی تلی گرفت سے نہ بچ سکا۔ اس کے نرخرے پر میری گرفت کے باعث اس کی چیخیں غراہٹوں میں بدل کر رہ گئیں۔

اس کا گلا گھونٹنا میرے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ اس طرح اس کے قتل کا الزام براہِ راست مجھ پر ہی عائد کیا جاتا مگر اپنی گرفت نرم کر کے میں اسے چلانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ ایسی صورت میں پل بھر میں وہاں ہجوم جمع ہو جاتا اور میں موقعۂ واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔

اس کے مچلتے ہوئے جسم پر سوار ہو کر میں نے گردن دبوچ کر اس کا سر اوپر اٹھایا اور پوری طاقت سے زمین پر دے مارا۔ اس کا بدن میری گرفت میں بری طرح مچلا۔ اندھیرے میں اس کی سیاہ آنکھیں قہر کے عالم میں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

سر کے عقبی حصے پر آنے والی ضرب نے اس کو ہراساں اور کمزور تو کر ہی دیا تھا۔ میں نے اسے ذرا بھی مہلت دیے بغیر مزید دو مرتبہ اس کا سر زمین پر مارا اور وہ ان پے درپے ضربوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

میں نے اس کے نرخرے پر سے اپنے ہاتھ اٹھا لیے مگر اس کے بدن پر چوکنے انداز میں سوار رہا۔ جب کئی ثانیوں تک اس کے بدن نے کوئی جنبش نہ کی تو میں ہانپتے ہوئے اس کے بدن سے اتر گیا۔

اس خبیث کو بے ہوش کر دینے کے بعد میرا کام نسبتاً آسان تھا۔ میں جلدی سے باہر نکلا اور چھپائی ہوئی رسی لے آیا۔

اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھنے کے بعد میں نے اس کے حلق میں کپڑا ٹھونس دیا اور اسے شانے پر ڈال کر باہر لے آیا۔

چھپر کو سہارا دینے والی ایک چوبی بلی کے سہارے اسے کھڑا کر کے باندھنے میں مجھے دشواری نہیں ہوئی پھر میں نے وہیں بندھے ہوئے ایک شہ زور اونٹ کی مہار تھام کر اسے تیز جھٹکا دیا اور اونٹ بلبلاتا ہوا اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

ابو مالک مہار والے اونٹوں کو بھی پیر باندھ کر رکھتا تھا۔ مہار عموماً اونٹوں کی گردن سے لپٹی رہتی تھی۔ میں نے خود ایسا محفوظ فاصلہ اختیار کیا کہ اونٹ غضبناک ہو کر مجھ پر حملہ آور نہ ہو سکے پھر اس کی نکیل کو آہستہ آہستہ جھٹکے دینے شروع کر دیے۔

ابتدا میں وہ اونٹ اس ناگہانی مصیبت سے گھبرا گیا مگر جب میری حرکت تسلسل کے ساتھ جاری رہی تو وہ غصے میں بپھرنے لگا۔ اس کے دہانے سے سفید سفید کف جاری ہونے لگا وہ ہر جھٹکے کے ساتھ غضبناک آوازوں میں بلبلاتا ہوا آگے کی طرف لپکتا تھا مگر پاؤں میں بندھی ہوئی رسی نے اس کی نقل و حرکت کا دائرہ بہت محدود کیا ہوا تھا۔

جب اس اونٹ کا اشتعال حد سے بڑھ گیا تو میں اس کی مہار تھامے ابو مالک کے عقب میں محفوظ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ اب اونٹ کا رخ براہِ راست ابو مالک کی جانب تھا اور وہ حد سے زیادہ مشتعل نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس بار کافی زور سے مہار کو جھٹکا دیا اور اونٹ غضبناک انداز میں بلبلاتا ہوا آگے بڑھا۔ پیر میں بندھی ہوئی رسی نے جب اسے مزید آگے نہ بڑھنے دیا تو اس کی گردن مہار کے تناؤ سے نجات پانے کے لیے نیچے جھکتی چلی گئی۔

پھر جیسے ہی اونٹ کو اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ پوری قوت سے بلبلایا اور ابو مالک کی کھوپڑی اپنے دہانے میں دبوچ لی۔ میں نے ایک بار پھر مہار کو جھٹکا دیا اور اس اونٹ نے تکلیف سے نیم پاگل ہو کر اپنی وحشیانہ قوت سے ابو مالک کی کھوپڑی چبا ڈالی۔

فضا میں ہڈیاں ٹوٹنے کی ہلکی ہلکی آوازیں ابھریں۔ ابو مالک کا بندھا

ہوا بدن نزع کے عالم میں بری طرح تڑپا اور کچلی ہوئی کھوپڑی سے بہتا ہوا خون اس کے بدن کو رنگین کرنے لگا۔

اندھیرے میں اونٹ کی آنکھوں سے دہشت ٹپک رہی تھی۔ میں نے اونٹ زور زور سے بٹھا کر نکیل کے سہارے باندھ دیا اور جلدی جلدی ابو مالک کی لاش کی ساری بندشیں کھول دیں۔ اس کی لاش ہلکے سے دھماکے کے ساتھ نیچے گر پڑی۔

کچلی ہوئی کھوپڑی اور خون میں نہائے ہوئے چہرے سے کراہت کے باوجود میں نے پھرتی سے ابو مالک کے دہانے میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا اور رسی سمیت لکڑی کے ایک انبار کے نیچے دبا دیا۔

میں واپس آیا تو ابو مالک کا بدن آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا جسم کی حرارت ابھی تک باقی تھی۔ میں نے اونٹ کی مہار کا بندھا ہوا سرا آزاد کر دیا اور پھر ایک دم زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔

میری دہشت زدہ ہذیانی چیخوں نے رات کا گہرا سکوت درہم برہم کر دیا تھا کہ چند ثانیوں بعد فصیل میں بنے ہوئے مکانات وغیرہ سے لوگ مشعلیں اٹھائے باہر نکلتے نظر آئے مگر ان سب سے پہلے دو مسلح محافظ دوڑتے ہوئے وہاں آ پہنچے۔

جب انھوں نے ٹارچ کی روشنی میں ابو مالک کی ہیبت ناک اور مسخ شدہ لاش کو دیکھا تو جھرجھری لے کر رہ گئے۔ مجھے بھی اس وقت پہلی بار اندازہ ہوا کہ بپھرے ہوئے اونٹ کے جبڑے میں کیسی وحشیانہ قوت موجود ہوتی ہے۔

پھر اونٹ کا جائزہ لیا گیا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ تیزی کے ساتھ جگالی کر رہا تھا اور اس کا دہانہ خون آلود جھاگ سے بھرا ہوا تھا۔

اس اثنا میں کافی لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ ہر ایک نے اس جانکاہ حادثے کے بارے میں مجھ پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے ہر ایک کو یہی بتایا کہ میں جھونپڑی میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ اونٹ کے زور زور سے بلبلانے کی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں باہر آیا تو اندھیرے میں ایک انسانی ہیولا اونٹ کی مہار تھامے اسے پریشان کر رہا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اونٹ نے اس شخص کا کاسۂ سر چبا ڈالا۔ لوگوں کے آنے تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مرنے والا ابو مالک ہے۔

میری کہانی پر لوگوں نے فی الفور یقین کر لیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اونٹ کی کسی سرکشی پر سزا دیتے ہوئے بدنصیب ابو مالک غلطی سے اس کی زد میں آ گیا اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

کافی دیر تک وہاں بھیڑ جمع رہی۔ اس دوران میں محافظوں نے فوری اطلاع اندر بھیجی اور وہاں سے آنے والی ہدایات کی روشنی میں ابو مالک کی لاش ایک اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے مجھے پاگل اونٹ سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی تھی۔

رات کا باقی حصہ میں نے جاگتے ہوئے گزارا۔ بظاہر میرے منصوبے کا ابتدائی حصہ میرے اطمینان کے مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ابو مالک کو راہ سے ہٹانے کے بعد الشویخ سے میری فوری منتقلی کا خدشہ ختم ہو چکا تھا اور مجھے قدرے مہلت مل گئی تھی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر میں اپنی رہائی کے منصوبے کے دوسرے حصے پر بآسانی عمل کر سکتا تھا۔

صبح نمودار ہونے کے بعد امیر معظم کا ایک ہرکارہ میرے پاس آیا اور بتایا کہ ابو مالک کی تدفین کے بعد میری پیشی ہو گی لہٰذا میں واپسی کے بجائے دیوانِ عام میں پہنچوں جہاں سے پیشکار مجھے راستہ بتلائے گا۔

ابو مالک کی تدفین کے موقع پر الشویخ کی تقریباً پوری آبادی موجود تھی مگر کسی کو اس کے مرنے کا ملال نہیں تھا۔ اس کی موت غیر معمولی حالات میں ہونے کے باوجود لوگ اس اندوہناک حادثے پر تبصرہ کرنے سے گریز کر رہے تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ الشویخ کی مقامی آبادی میں صرف ابو خالد ہی نہیں، اس کے ملازمین بھی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

اسی بھیڑ میں مجھے فواد بھی نظر آیا۔ اس کی بے چین نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اشارہ کیا تو وہ تیر کی طرح میری طرف آیا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے بھیڑ سے باہر لیتا چلا گیا۔

''تم نے اسے مار دیا؟'' اردگرد کسی کو نہ پا کر اس نے ہیجان اور مسرت سے لبریز لہجے میں سوال کیا۔

''کیسے؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا۔

''اب مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کرو۔'' وہ میرا شانہ دباتے ہوئے پرجوش لہجے میں بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ وہ تمھارے قہر کا نشانہ بنا ہے۔ بے پناہ بخدا! مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ وہ مر گیا ہے۔ ابو خالد کے تنخواہ دار اس نخلستان میں عزت اور طاقت کے ہرکارے سمجھے جاتے ہیں۔''

''تم پاگل ہو گئے ہو۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''ایک اونٹ نے اس کی کھوپڑی چبائی ہے اور وہ اونٹوں کا نگراں تھا۔ میرا اس کی موت سے کیا تعلق ہے؟''

''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔'' وہ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد قدرے اداس لہجے میں بولا۔ ''مجھ سے تمھیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں خود کو تمھارے اعتماد کا اہل ثابت کروں گا۔ تم ہماری بستی کے لیے رحمت بن کر آئے ہو۔ میں تمھاری مدد کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔''

ابو مالک پر میرا وار چل چکا تھا اور میرا حوصلہ ایک بار پھر بلند ہو گیا تھا۔ میرے وجود میں سویا ہوا وہ صفدر علی بیدار ہو چکا تھا جو چٹانوں سے ٹکرا کر ان کے پرزے اڑا دینے کا عزم رکھتا تھا۔ میں فواد جیسے شخص کو اپنا ہمراز بنا کر اپنے لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

''ابو مالک کی موت کا اس گفتگو سے کوئی تعلق نہیں جو میں نے تم سے کی تھی۔'' میں نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نے [illegible] کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تو تم میرے ساتھ ہو گے۔ ان لوگوں سے ایسے ٹکرانا

حماقت سے کم نہ ہوگا۔"

اس کی آنکھوں میں بے اعتباری کے ساتھ ہی افسردگی سمٹ آئی۔

"تم آدھی رات کو بھی مجھے طلب کروگے تو میں سر کے بل دوڑتا آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ مجھ سے الگ ہوگیا۔

ابو مالک کی خون آلود کفن میں لپٹی ہوئی لاش کو سپردِ خاک کرنے کے بعد میں حسبِ ہدایت دیوانِ عام میں جا پہنچا۔

میرا نام سُن کر بوڑھے پیشکار نے مجھے سر سے پیر تک بغور دیکھا پھر بولا۔ "امیرِ معظم آج کل بیمار ہیں۔ ان کی بیگم نے تمہیں زنان خانے میں طلب کیا ہے۔"

"مجھ سے کوئی قصور تو سرزد نہیں ہوا۔" میں نے عاجزانہ لہجے میں اس تجربہ کار بوڑھے پیشکار سے دریافت کیا۔

"یہ ذہن میں رکھنا کہ نگران کے روبرو نگاہیں نیچی رکھنا۔ وہاں گستاخی کرنے والوں کا سر شانوں سے محروم کردیا جاتا ہے۔" بوڑھے نے کہا۔

پھر وہ مجھے ساتھ لے کر اس وسیع عمارت کی پیچ در پیچ اور آراستہ راہداریوں میں داخل ہوگیا۔

چند راستوں سے گزرنے کے بعد جب میں عمارت کے خاص حصے میں داخل ہوا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فصیل کے اندر بنی ہوئی ہر عمارت کی بیرونی ساخت یکساں تھی۔ مٹی اور گارے کی ستھری دیواریں جن میں محراب دار دروازے لگے ہوئے تھے مگر عمارت کے اس حصے میں پہنچ کر پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ میں اسی سادہ سی عمارت میں موجود ہوں۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر منقش اور بیش قیمت ٹائیل جڑے ہوئے تھے۔ جھلملاتے ہوئے نفیس فانوس اور دیوارگیر مشعل دان کاریگری کی بہترین مثال تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر لمبے لمبے ریشمیں پردے پڑے ہوئے تھے، جن کے اوپری سروں پر کانسی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ پردوں کو جنبش دیتے ہی وہ گھنٹیاں دھیمی اور مترنم آواز میں گونج اٹھتی تھیں۔

عمارت کے اس حصے میں کنیزوں کا راج تھا۔ دُور دُور تک کوئی مرد نظر نہ آتا تھا۔ مجھے لانے والے نے اس مقام پر مجھے ایک ادھیڑ عمر عورت کے حوالے کیا اور خود واپس چلا گیا۔

"میرے پیچھے چلے آؤ۔" اس عورت نے کہا اور ایک پردے کے پیچھے غائب ہوگئی۔

میں پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایک وسیع اور آراستہ کمرہ تھا جو بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ دیواروں کے ساتھ پیتل کے بڑے بڑے گلدانوں میں پھول سجے ہوئے تھے۔ کمرے کے تقریباً وسط میں ایک باریک پردہ اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ وہ کمرہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ پردے کے اس پار ایک زرنگار مسند پڑی ہوئی تھی۔ اس جانب روشنی اس قدر ناکافی تھی کہ بقیہ جزئیات دیکھنا تقریباً ناممکن تھا۔

ادھیڑ عمر عورت نے مجھے کمرے کے روشن حصے میں رک کر انتظار کرنے کو کہا اور خود ایک بغلی دروازے میں سے کہیں چلی گئی۔

میں کافی دیر وہاں بیٹھا دھڑکتے دل کے ساتھ آنے والے لمحوں کا انتظار کرتا رہا۔ لیلیٰ کی طلبی نے مجھے شدید الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں اس موضوع پر جتنا سوچ رہا تھا اسی قدر پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں لیلیٰ کو ابو مالک کی موت پر سازش کا شبہ نہ ہوگیا ہو۔

میں سر جھکائے اسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک ایک مترنم رسیلی اور باوقار نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "صفدر علی! کیا سوچ رہے ہو؟"

میں ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا اور بے اختیار تعظیم بجا لایا۔ پردے کے اس پار مسند پر کوئی موجود تھا۔ میری سمت والے حصے میں روشن مشعلوں کا انعکاس مسند والی کے لباس میں ٹکے ہوئے بیش قیمت جواہرات اور ان سے بھی بے مثال دو چمکتی ہوئی آنکھوں میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ میری نگاہیں تجسس کے عالم میں اسی طرف مرکوز تھیں کہ معاً مجھے پیشکار کے الفاظ یاد آئے اور میرا سر جھکتا چلا گیا۔

"تم پر سلامتی ہو۔" مسند والی نے میری تعظیم کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔ مجھے ابو مالک کی موت کا بہت قلق ہے۔ آخر یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

"وہ بہت نیک نفس انسان تھا۔ میں اس اجنبی بستی میں ایک دوست سے محروم ہوگیا۔" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "میں سویا ہوا تھا کہ گھٹی گھٹی چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر پہنچا تو وہ اونٹ جنون کے عالم میں ابو مالک کی کھوپڑی چبا چکا تھا اور اس بدنصیب کا بدن ہولے ہولے تڑپ رہا تھا۔ میں نے مشتعل اونٹ کی مہار تھام کر اسے دور کیا اور مدد کے لئے چلانے لگا۔"

"مگر وہ اتنی رات گئے وہاں کیوں گیا تھا؟"

"مجھے علم نہیں۔ وہ اکثر راتوں کو گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اسے اپنے اونٹوں سے بے انتہا محبت تھی اور وہ اکثر ان کی تربیت پر ناز کرتا تھا۔"

"شاید یہی ناز اسے لے ڈوبا۔"

"وہ ایسی موت کا حقدار نہیں تھا۔" میں نے سوگوار لہجے میں کہا۔

"تمہیں علم ہے کہ آج تمہیں کہیں روانہ کیا جانے والا ہے۔" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد لیلیٰ نے مترنم لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں ۔۔۔ ابو مالک مجھے بتا چکا ہے۔"

"اس کی موت نے میرے لئے دشواری پیدا کردی۔"

"غلام حاضر ہے جو حکم ہو اسے بجا لائے گا۔"

"اندر آجاؤ۔" اس بار لیلیٰ کا لہجہ قدرے دھیما تھا۔

میں جھجکتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور باریک پردہ اٹھا کر کمرے کے نیم تاریک مہکتے ہوئے حصے میں داخل ہوگیا۔ پردوں کی جنبش کے ساتھ ہی اوپر لگی ہوئی کانسی اور چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"قریب آجاؤ۔" مجھے پردے کے قریب ٹھٹکتے دیکھ کر اس نے باوقار لہجے میں کہا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے روبرو جا بیٹھا۔

چند ثانیوں تک میری نگاہیں جھکی رہیں۔ میرے ذہن پر امیرِ معظم کی بیوی کی ہیبت طاری تھی جس کی طرف نگاہیں اٹھانا بھی ناقابلِ معافی تھا پھر اچانک میرے ذہن میں تیخ سی ابھرنے لگی۔

وہ امیرِ معظم کی بیوی ہی سہی مگر اس وقت وہ خود مجھے اپنے اعتماد میں لے رہی تھی۔ اس نے میرے سامنے کسی الجھن کا اعتراف کیا تھا۔ مجھے حریری پردے عبور کرکے اس طرف بلایا تھا جہاں کسی مرد کے قدم نہ گئے تھے!

بے اختیار میری نگاہیں اس کی طرف اٹھتی چلی گئیں اور پھر حیرت و ستائش کے عالم میں اسی پر جم کر رہ گئیں۔

اگر اس میں جان نہ ہوتی، اگر میں اپنے کانوں سے اس کی مدھ بھری آواز نہ سن چکا ہوتا تو میں اسے مرمر سے تراشا ہوا حسن کا ایک تخلیقی شاہکار ہی سمجھتا، مگر وہ جیتی جاگتی حالت میں میرے سامنے موجود تھی۔ حسن کا ایسا بھرپور امتزاج، سراپا کا ایسا توبہ شکن انداز، بدن کا ایسا لطیف گداز میرے تصور کو بھی چھو کر نہیں گزرا تھا۔

شانوں کے دونوں طرف پڑے ہوئے ریشمیں، دراز اور گہرے سیاہ بال، جگمگاتی ہوئی کشادہ پیشانی، بڑی بڑی سحر کار نیلی آنکھیں، بھرے بھرے گلابی شہابی رخسار، ستواں ناک، مختصر دہانہ، پتلے پتلے گلابی ہونٹ جن سے کسی بھی لمحے خون چھلک سکتا تھا۔ گردن کی جلد اتنی نازک کہ خون کا دوران تک نظر آئے۔ نیچے گلے کا سیاہ مخملی لبادہ جس پر سنہرا کام جگمگا رہا تھا۔ گریبان پر نظر پڑتے ہی میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔

اس کے گلے میں، کلائیوں پر اور انگلیوں میں قیمتی پتھروں کے بیش قیمت زیورات سلیقے کے ساتھ موجود تھے۔ اس کی پتلی پتلی مخروطی انگلیاں بے چینی کے عالم میں بار بار زرنگار مسند کے تکیے کو دبا رہی تھیں۔ جیسے وہ شدید اضطراب کے عالم میں تھی۔

اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں ناکافی روشنی میں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تمہیں معلوم ہے آج تمہیں کہاں بھیجا جانے والا ہے۔" کچھ دیر کے توقف کے بعد لیلیٰ نے دھیمی اور الجھن آمیز آواز میں سوال کیا۔

"قسمت نے ابو مالک کو یہ بتانے کی مہلت نہ دی۔"

"سورج ڈھلنے کے بعد تم یہاں سے اونٹ پر سوار ہوکر مشرق کی طرف روانہ ہوگے اور اگر تم راہ نہ بھٹکے تو کل سورج کی تمازت بڑھنے سے قبل صحرا عبور کرکے برکہ پہنچ جاؤ گے۔ وہاں یوسف نامی ایک مجذوب کا بہت شہرہ ہے۔ تم تنہائی میں اس سے مل کر میری ایک نشانی دو گے اور پھر اس کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرو گے۔" لیلیٰ نے دھیمے لہجے میں یہ کہتے ہوئے چاندی کی ایک وزنی انگوٹھی میری طرف بڑھا دی جس پر نہایت باریک اور پیچیدہ خطوط میں چند الفاظ کندہ تھے۔

انگوٹھی لیتے ہوئے میرا ہاتھ اس کی نرم و نازک انگلیوں سے ٹکرایا اور میرے بدن میں سنسنی کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔

شاید وہ میرے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت سے میرے دل کا حال بھانپ گئی تھی کیونکہ اس کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"ابو مالک کی موت سے اگر کوئی دشواری پیدا ہوگئی ہو تو میں ہر خدمت کیلئے تیار ہوں۔" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد ایک بار پھر اپنی پیشکش دہرائی۔

"تمہارا سفر ملتوی نہیں ہوسکتا۔ اس خلا کو کوئی دوسرا ہی پُر کر سکے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے زرنگار مسند پر پہلو بدلا۔ "اس بستی میں ابو مالک جیسے ایک معتمد کے بغیر کام چلانا بہت دشوار ہے۔ وہ صرف حکم کی تعمیل کرنی جانتا تھا۔"

"امیرِ معظم کے جانثاروں میں کیا کوئی بھی اس قابل نہیں ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کر ڈالا۔

"میرے علاوہ اس کا کوئی بھی جانثار نہیں ہے۔" وہ بولی تو اس کے لہجے میں فتح کا غرور نمایاں تھا۔ "اور مجھے اپنے آدمیوں میں سے کسی پر اتنا بھروسہ نہیں کہ ابو مالک کی جگہ دے سکوں۔"

میں خاموش رہا۔ اس کی چمکتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میں دل کی بے قابو ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ان آنکھوں کے بدلتے ہوئے تاثرات میرے لئے حیرت و دلچسپی کا باعث تھے۔

"میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" اچانک اس نے بوجھل لہجے اور سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تمہارے حسین اور روشن سراپا میں الشویخ والوں کی خوش بختی تلاش کر رہا ہوں۔" اس بار میں نے ہمت کرکے تکلف کی دیوار گرادی۔ وہ جو بھی ہو مگر تھی ایک عورت ہی اور میں اس کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی تحریر کو پڑھ چکا تھا۔

"کیا تمہیں بتایا نہیں گیا کہ میری طرف نگاہیں اٹھانے والوں کا سر قلم کیا جاسکتا ہے؟"

"تمہارا حکم ہو تو میں اپنا سر خود تمہارے قدموں میں ڈال سکتا ہوں۔" اس کا نرم لہجہ میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

اس نے مضطرب نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولی "میرے پیچھے چلے آؤ۔ یہاں تک آگئے ہو تو چند قدم اور سہی۔"

اس بار وہ مجھے لے کر جس آسائش گاہ میں داخل ہوئی وہ کسی بھی جوان دل کو مسحور کر دینے کے لئے کافی تھی۔ مجسموں اور تصاویر سے مزین، اس مہکتی ہوئی آراستہ خوابگاہ میں ضرورت کی ہر وہ چیز موجود تھی جس کا تصور کیا جاسکتا تھا۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی لیلیٰ نے پلٹ کر دروازہ بند کردیا اور کمرہ بالکل تاریک ہوگیا۔

"یہ لمحات تم اسی خوابگاہ میں بھول جاؤ گے۔" میرے قریب ہی اس کی تحکمانہ آواز ابھری۔

ادب، احترام اور تکلف کے لبادوں میں لیلیٰ بھی نری عورت نکلی۔ اس نے جب مجھے طلب کیا تو میرے دل میں شبہات سر ابھار رہے تھے مگر میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے جیت لیا تھا اور اب وہ میرے رحم و کرم پر تھی۔

اس کے بارے میں جب فواد نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے امیرِ معظم کو اپنے حسن اور اداؤں کے چنگل میں پھنسایا ہوا ہے اور ابو خالد کو باپ کہہ کر تنہائی میں اس کے ساتھ قابلِ اعتراض رویہ اختیار کرلیتی ہے تو مجھے ان باتوں پر یقین نہ آسکا تھا۔ لیلیٰ کو دیکھنے کے بعد بھی مجھے اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ یوں پکے ہوئے پھل کی طرح میری بانہوں میں آگرے گی۔ حسن و شباب کا وہ شاہکار میری توقع سے کہیں زیادہ آسانی سے میری گرفت میں آگیا تھا۔

باہر دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا مگر لیلیٰ کی خوابگاہ گناہ پرور تاریکی کی آغوش میں تھی۔ گناہ کے موضوع پر لیلیٰ ایک مستند اور ضخیم کتاب کی حیثیت رکھتی تھی اور میں اس نادر

فلمی نسخے کو سطر بہ سطر پڑھ رہا تھا۔

وقت بہت جلدی گزر گیا۔ میں تو وقت کا شعور بھی کھو بیٹھا تھا۔ مگر لیلیٰ کی نظر ہر پہلو پر تھی۔ وہ بمشکل مجھے صورتحال کی نزاکت اور رازداری کا احساس دلا سکی اور جب میں دوبارہ اس کے ہمراہ نیم روشن کمرے میں پہنچا تو اس کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ میرے سامنے شکست کھا جانے کے باوجود کسی فاتح کی طرح براہ راست میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"لوازم سفر ایک سربند تھیلے میں کچھ دیر بعد تم تک پہنچا دیئے جائیں گے۔" اپنی مسند پر بیٹھنے کے بعد اس نے کہا۔

سفر یاد آتے ہی میرا دل بوجھل ہو گیا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ میری جگہ کوئی اور اس سفر پر بھیج دیا جائے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ اچانک غرائی، اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ یک بیک غائب ہو گئی۔ "میں بتا چکی ہوں کہ تمہاری روانگی اٹل ہے۔"

اس کے لہجے پر میری کھوپڑی چٹخ اٹھی۔ چند لمحوں قبل میری باہنوں میں سسکنے اور کراہنے والی عورت اب یوں اجنبی بن کر مجھے حکم دے رہی تھی جیسے میں اس کا محض زرخرید غلام ہوں۔ اس نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ اس کے لئے میری حیثیت مٹی کے ایک کھلونے جیسی تھی جسے دل بھر جانے کے بعد بے رحمی کے ساتھ توڑا بھی جا سکتا تھا۔ خوابگاہ میں میرے اور اس کے درمیان جو رشتہ قائم ہوا، وہاں سے نکلتے ہی اس کی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ اب لیلیٰ الشویخ کی سب سے مقتدر اور معزز عورت تھی اور میں اس کے احکام کا تابع!

اس عمارت سے واپسی پر سب کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر شخص میرے اور لیلیٰ کے تعلق سے واقف ہو چکا ہے۔ لیلیٰ نے آخر میں میرے ساتھ جو سلوک کیا اس نے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر پوری بستی والوں کو بتاؤں کہ لیلیٰ آوارہ اور فاحشہ ہے جسے میں روند چکا ہوں مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے بارے میں تو لوگ جو کچھ سوچتے وہ بعد کی بات تھی۔ سب سے پہلے میری ہی گردن اڑا دی جاتی۔

راستے ہی میں فواد مجھ سے آٹکرایا۔ وہ کافی دیر سے مجھے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کر ڈالا۔

"بیٹی بھگتا کر آرہا ہوں۔"

"میں نے سنا تھا کہ لیلیٰ نے تمہیں طلب کیا تھا؟" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں بولا۔ "کس لئے بلایا تھا اس نے؟"

"ابومالک کی موت کا واقعہ میری زبانی سننا چاہتی تھی۔"

"تم نے دیکھا اسے؟"

"ہاں" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اچھی طرح دیکھا۔"

"اب خدا کو حاضر جان کر کہو کہ کیا اس کے بارے میں میرے اندازے غلط ہیں"

"ہاں" میں نے کہا۔ "تمہارے اندازے یکسر غلط ہیں۔"

"کیا؟" اس کے حلق سے تحیر آمیز آواز نکلی۔ میرے تبصرے پر اس کا چہرہ یک بیک اتر گیا تھا جیسے میرے الفاظ پر اسے صدمہ ہوا ہو۔

"تم نے جو کچھ اندازہ لگایا لیلیٰ اس سے کہیں آگے ہے۔" میں نے اپنی انا کی تسکین کی خاطر اسے اپنا رازدار بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیلیٰ نے خلوت سے جلوت میں آنے کے بعد میرے ساتھ جو توہین آمیز سلوک کیا تھا اس نے میرے دماغ میں آگ بھر دی تھی۔ میں اسے رسوا کر کے اپنی اس توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا تاکہ میرے جانے کے بعد میرا نام اس کے ذہن میں کچوکے لگاتا رہے۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؛ کھل کر بات کرو نا۔"

"یہاں نہیں، تنہائی میں۔"

وہ اس قدر مضطرب تھا کہ اس نے مجھے کھانا کھانے کی مہلت بھی نہ دی اور چلچلاتی دھوپ میں میرا ہاتھ تھام کر مجھے فصیل سے باہر لے گیا۔

آبادی سے خاصی دور درختوں کے سائے میں وہ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہاں ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ کام کاج کرنے والے آرام کی خاطر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے اور دیر تک ان کی واپسی کا امکان نہیں تھا۔

"ہاں اب بتاؤ"

"لیلیٰ انتہا درجہ کی بدچلن اور آوارہ ہے۔"

"یہ تو میں پہلے ہی کہتا تھا۔" وہ جلدی سے بولا

"مگر وہ تمہارے تصور سے کہیں آگے ہے!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

میرے یہ الفاظ سن کر وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہو گیا پھر نیم مردہ لہجے میں پوچھا۔ "آخر تم نے کس بات سے اندازہ لگایا؟"

"اگر ایک اجنبی نوجوان کچھ دیر گفتگو کے بعد ایک نامحرم عورت کی خوابگاہ میں پہنچ جائے تو اس سے تم کیا اندازہ لگاؤ گے؟"

وہ بے یقینی کے انداز میں مجھے گھورنے لگا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ وہ خود مجھے اپنی خوابگاہ میں لے گئی تھی۔"

وہ بدستور مجھے گھورے جا رہا تھا۔ جوش کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا پھر میری توقع کے برعکس اچانک ہی وہ مجھ پر لوٹ پڑا۔

اگر میں اس وقت پھرتی کا مظاہرہ نہ کرتا تو منڈیر سے سیدھا کنوئیں کی گہری تہہ میں جا گرتا۔ مگر میری بروقت پھرتی نے مجھے اس دلدوز موت سے بچا لیا اور میں اس کے ساتھ لپٹا ہوا زمین پر گر گیا۔ وہ مجھے بری طرح رگید رہا تھا۔

"ناپاک ہندی، تمہاری یہ جسارت کہ تم لیلیٰ کی خوابگاہ میں جا پہنچے، وہ جو کچھ بھی ہے مگر الشویخ کے امیر کی بیوی ہے، تمہیں اس جسارت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔" وہ میرے چہرے پر مکے برساتے ہوئے جنون کے عالم میں غرا رہا تھا۔ جب تک وہ خود لیلیٰ کے بارے میں زہرافشانی کرتا رہا، اسے کوئی خلش نہ ہوئی مگر میرے ذاتی تجربے کے بارے میں سن کر شاید اس کی حمیت جاگ اٹھی تھی۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ ایک بے یار و مددگار غیر ملکی اس صحرائی نخلستان کی کلی کو روندنے میں کامیاب ہو جائے۔

"فواد — پاگل مت بنو۔" میں اس کے پے در پے وحشیانہ حملوں سے خود کو بچاتے ہوئے بولا۔ "پہلے میری پوری بات سن لو۔"

"خنزیر! کیا اب اس کے ایک ایک عضو کی تفصیل سناؤ گے۔ میں تمہیں زندہ چھوڑوں گا — اور وہ حرامزادی بھی میرے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچے گی — تم دونوں نے الشویخ والوں کے چہرے گناہ کی سیاہی سے آلودہ کر دیئے ہیں۔"

اس کے تیور خطرناک تھے۔ میں نے پوری کوشش صرف کر کے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لیے۔ جب وہ ہاتھ چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے میرے سینے پر وحشیانہ ٹکریں مارنے کی کوشش کی مگر میں نے مزید کوئی خطرہ مول لیے بغیر اس کے پیٹ میں لاتیں اڑا کر اسے دور اچھال دیا۔

وہ چیختا ہوا دور جا گرا اور میرے اٹھنے سے قبل ہی کسی سانڈ کی طرح غراتا ہوا پھر میری طرف لپکا۔ اس بار میں نے مٹھی بھر ریت اس کے چہرے پر دے ماری۔ آنکھوں میں ریت پڑنے کے باعث وہ جہاں تھا رک گیا اور مغلظات بکتے ہوئے اپنی آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اٹھ کر اپنے اوسان درست کیے اور اس سے محفوظ فاصلے پر رہ کر بولا۔ "میرے الفاظ پر تم پاگل ہوئے جا رہے ہو اور جب اپنی آنکھوں سے اسے ابوخالد کی آغوش میں دیکھا تھا تو شرما کر وہاں سے ہٹ گئے تھے، کیا یہی تمہاری غیرت ہے؟"

"میں تمہیں فنا کر دوں گا۔ زیادہ بکواس مت کرو۔" وہ دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے طیش کے عالم میں دہاڑا۔

اچانک مجھے ایک تدبیر سوجھ گئی۔ میں نے اپنی انا کی تسکین کے لئے اسے اعتماد میں لے کر بڑی غلطی کی تھی۔ وہ جذباتی نوجوان اس روح فرسا حقیقت کا صدمہ نہ سہہ سکا تھا جب کہ اس کی نفرت میرے لئے موت کا پھندا بن سکتی تھی۔

"پوری بات سن کر تم مجھے فنا بھی کر دو تو دکھ نہ ہوگا۔" میں نے اس بار دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے اپنی خوابگاہ میں لے گئی۔ اس نے اپنا وجود میرے حوالے کرنا چاہا لیکن میں اس کے جال میں نہیں آیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس کی دعوت قبول کر لی تو اس کمرے سے زندہ نہ نکل سکوں گا۔ وہ اپنا راز چھپائے رکھنے کے لئے مجھے ابومالک کے قتل کے جرم میں ہلاک کرا دیتی۔ وہ اشاروں کنایوں میں اپنا مدعا بیان کرتی رہی۔ اس کی شاہانہ تمکنت اور غرور نے یہ گوارا نہ کیا کہ خوابگاہ کی تنہائی میں آئے ہوئے ایک بے حقیقت مرد کو دو ٹوک لفظوں میں اپنی سیج پر آنے کی دعوت دے اور میں انجان بنا اس کے لئے احترام آمیز رویئے کا مظاہرہ کرتا رہا اور آخر کار اس نے مجھے وہاں سے نکال دیا۔ وہ یہی سمجھی ہوگی کہ میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ حکمران عورتیں جب عیاشی پر اتر آئیں تو ان کی خلوت میں آنے والے مرد کیڑے مکوڑوں کی طرح مار دیئے جاتے ہیں تاکہ ان کی رنگین مزاجی کے قصے چار دیواری سے باہر نہ پھیلنے پائیں۔ اگر تم اب بھی مجھے مجرم سمجھتے ہو تو آگے بڑھو اور میرا گلا دبا دو۔ میں ذرا بھی مزاحمت نہ کروں گا — مجھے اطمینان ہوگا کہ میرے ایک دوست نے سوچ سمجھ کر مجھے مارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں کسی کی جذباتی فیصلے کا شکار نہیں ہوا ہوں۔"

وہ سرخ سرخ آنکھیں جھپکاتے ہوئے مسلسل مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میں نے تمہیں حقیقت بتا دی ہے۔ اگر تم اسے جھوٹ سمجھ رہے ہو تو پھر جھجک کیوں رہے ہو؟ آگے بڑھو اور اپنی آبرو کے لٹیرے کو ہلاک کر دو —"

میرے ان الفاظ نے اس پر خاصہ اثر کیا مگر وہ بدستور الجھن کا شکار تھا۔

"وہ حسین ساحرہ ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی نیلی آنکھوں میں کسی ناگن جیسی کشش ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کو پسند کرے اور پھر بھی پیاسی ہی رہے۔"

"یہ پسند اور ناپسند کی بات نہیں فواد!" میں نے اسے سمجھایا۔ "تم ابھی نادان ہو۔ ذاتی غرور اور تمکنت سے کوئی شخص ایک حد سے نیچا نہیں گر سکتا۔ اگر وہ کھل کر اپنی پسند کا اظہار کر ہی دیتی تو واقعی مجھ میں انکار کی مجال نہ ہوتی اور شاید اس وقت میں ابومالک کے قاتل کی حیثیت سے تختۂ دار پر لٹکا ہوا ہوتا۔ تمہارے ساتھ موجود نہ ہوتا۔"

"اگر تم سچے ہو تو واقعی فرشتے ہو۔" وہ اب اعتدال پر آتا جا رہا تھا۔ "مجھے معاف کر دو میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔"

"اس کو قدرت نے واقعی بے پناہ حسن اور کشش سے نوازا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے زندگی میں اس جیسی بھرپور عورت نہیں دیکھی۔ میں تو کنوئیں سے پیاسا لوٹ آیا مگر مجھے ڈر ہے کہ کوئی دوسرا آدمی اس کی نظروں کو نہ بھا جائے۔ تمہیں اس کا تدارک کرنا ہوگا۔"

"اسے میں زندہ نہ چھوڑوں گا۔" وہ خلا میں گھورتے ہوئے خوفناک لہجے میں بڑبڑایا۔ "میں اس کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دوں گا تاکہ الشویخ والوں کو کسی اجنبی کے سامنے سر جھکا کر نہ چلنا پڑے۔ اس کا ہر سانس حرم میں غلاظت گھولتا رہے گا۔ اس کا تدارک میرا فرض بن گیا ہے۔"

"خدا تمہیں کامیاب کرے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں آج ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔" وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم اس مقدس کام میں میری کیا مدد کر سکو گے؟"

"سورج کی تمازت کم ہو تو مجھے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اور اس معاملے میں جلد بازی مناسب بھی نہیں۔ تمہیں اپنی حفاظت کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔"

وہ زہریلے انداز میں ہنس دیا۔ "میری حفاظت کی فکر نہ کرو۔ اس علاقہ میں زہریلے بچھو بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اگر وہ پتھر کو ڈنک ماردیں تو پتھر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نرم جوتے میں دبکا ہوا بچھو پیر ڈالتے ہی اپنا ڈنک چلائے گا اور وہ جہنم کو سدھار جائے گی۔"

"کیا یہاں واقعی ایسے موذی بچھو ہوتے ہیں؟ میں نے تو اب تک ایک بھی نہیں دیکھا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ صحرا میں ہوتے ہیں۔ نمی اور سبزے میں وہ نہیں پنپ سکتے۔" وہ بولا۔ "بچھو تو خیر مل جائیں گے مگر مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ لیلیٰ کی اکڑی ہوئی بھیانک لاش قبر میں اتاری جائے گی تو تم اسے مٹی نہ دے سکو گے۔ آخر تمہیں جانا کہاں ہے؟"

"اس کے حکم پر ایک گمنام منزل کا سفر درپیش ہے۔"

"اس کا تو آخری وقت آپہنچا ہے، اس کے حکم کی تعمیل کر کے کیا کرو گے؟"

"تم بھول رہے ہو کہ یہاں مقامی عربوں کے روپ میں اس کے مسلح اور معتمد محافظ بھی موجود ہیں وہ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔"

"میں تو شروع سے لیلیٰ اور ابوخالد کو ناقابل شکست سمجھتا آیا تھا۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "شاید اسی لئے لیلیٰ کو ابوخالد کے ساتھ بغل گیر دیکھ کر مجھے

استعمال نہ آیا۔ تم نے ان کے خلاف میری ہمت بندھائی اور اب اس کا نتیجہ سامنے آنے والا ہے تو تم الشویخ سے جارہے ہو۔"

"مجھے خود افسوس ہے۔ میں نے تمہاری بستی میں اچھے دن گزارے ہیں۔"

پھر ہم دوستانہ ماحول میں باتیں کرتے وہاں سے واپس چل دیے۔ راستے میں کئی بار مجھے خیال آیا کہ فواد کو اونٹوں کے ذریعے خفیہ پیغام رسانی کے طریقوں وغیرہ سے آگاہ کردوں تاکہ لیلیٰ سے نمٹنے کے بعد وہ اس جال کو بھی کاٹ سکے مگر میں زبان کھولنے کی ہمت نہ کرسکا۔

ایک نازک موضوع پر زبان کھول کر میں اس کا احمقانہ ردِعمل بھگت ہی چکا تھا اور مجھ میں دوسرا خطرہ مول لینے کا حوصلہ نہیں تھا۔

فواد سے رخصت ہو کر میں طعام خانے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک قاصد میری تلاش میں گھومتا پھر رہا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں جھونپڑے میں پہنچا تو وہ ایک مہر بند تھیلا لیے دہ میں میرا انتظار کر رہا تھا۔

چند ثانیوں کی رسمی گفتگو کے بعد اس قاصد نے چرمی تھیلا میرے حوالے کردیا۔ "تم اتنی دیر سے کہاں غائب تھے؟ میں ہر جگہ تمھیں تلاش کرچکا تھا۔"

"باہر نخلستان کی طرف نکل گیا تھا۔ روانگی سے پہلے الشویخ کے حسین نظاروں کو آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تیار ہوجاؤ۔ ہمیں اب یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔"

"تو تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"شاید تم تنہا منزل تک نہ پہنچ سکو گے۔ تمھیں بخیر و عافیت منزل تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر مجھے مایوسی ہوئی۔ الشویخ سے روانگی کی اطلاع ملنے کے بعد سے میں مسلسل یہ سوچتا رہا تھا کہ میں برکہ کے بجائے کسی اور راستہ پر سفر کرکے اس آخری جنگل سے بھی نکل جاؤں گا۔ ایک بار میں ویران صحرا سے نکل کر کسی بھرے پُرے شہر میں پہنچ جاتا تو نہ لیلیٰ کے نمک خوار میرا سراغ پاسکتے تھے اور نہ ابوخالد کے گرگے مجھ تک پہنچ پاتے۔ میں کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنے کا بندوبست کرسکتا تھا، جہاں میری سیتا میری منتظر تھی۔ ایکبار اپنی کھوئی ہوئی محبت کو میں دوبارہ پالیتا تو پھر میرے پارس پتھر کی بازیابی کی جدوجہد کرنی بھی آسان ہوجاتی۔

"تم باہر جاکر سواری کے لیے اونٹوں کا انتخاب کرلو، اس اثنا میں میں اس چرمی تھیلے میں بند چیزوں کا جائزہ لے لوں۔"

وہ میری اس تجویز پر کوئی اعتراض کیے بغیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے مہر توڑ کر چرمی تھیلے کا منہ کھولا تو چند کاغذات کے ساتھ ایک تیز پھل والا شکاری چاقو اور تعویذ بھی نظر آیا۔ یہ تعویذ بالکل اسی قسم کا تھا جس قسم کا اونٹوں کے ذریعے پیغام رسانی میں استعمال کیا جاتا تھا۔

تعویذ کے ساتھ موجود کاغذات پر عربی کے بجائے نہایت شستہ انگریزی میں میرے لیے ہدایات درج تھیں۔ میرے لیے یہ بات بھی حیرت کا باعث ثابت ہوئی کہ الشویخ جیسی دور افتادہ اور پسماندہ بستی میں بھی انگریزی زبان پر قدرت رکھنے والا کوئی ایسا شخص موجود تھا جس پر لیلیٰ کو پورا بھروسہ تھا۔ اگر وہ اس کا معتمد نہ ہوتا تو لیلیٰ ہدایات لکھوانے کے لیے اسے ہرگز استعمال نہ کرتی یا پھر وہ خود انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھی اور اس نے خود ہی وہ تمام ہدایات درج کی تھیں۔

اگر میرا دوسرا اندازہ درست تھا تو لیلیٰ حد درجہ مکار عورت تھی۔ اس نے انگریزی زبان سے اپنی واقفیت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ راز رکھا ہوا تھا۔ سب لوگ یہی جانتے تھے کہ وہ ایک خالص عرب عورت ہے اور علاقائی زبان کے علاوہ کوئی بولی نہیں جانتی۔

ہدایات کے مطابق مجھے صعود نامی اس شخص کی رہنمائی میں برکہ پہنچنا تھا۔ وہ شخص مجھے برکہ پہنچا کر واپس لوٹ آتا۔ اس بستی میں مجھے اپنے طور پر یوسف مجذوب سے ملنا تھا اور نہایت رازداری کے ساتھ اسے لیلیٰ کی دی ہوئی نقرئی انگوٹھی دینی تھی۔ انگوٹھی لینے کے بعد جب یوسف مجھے پہچان لیتا تو چرمی تعویذ اس کے حوالے کرکے مجھے پوری طرح اس کی ہدایات پر عمل کرنا تھا۔

کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق ان کاغذات کو جلادیا۔ چرمی تعویذ اور چاقو اپنے لباس میں چھپالیا۔

"کیا تم فارغ ہوگئے؟" اچانک باہر سے صعود نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ آجاؤ۔"

وہ آیا تو سلگتے ہوئے کاغذات کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ "یہ کیا ہے؟"

"اپنے کام سے کام رکھو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "جن چیزوں سے مطلب نہ ہو ان کی جستجو میں پڑنا تمھارا کام نہیں۔"

"چلو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم ان باتوں سے واقف ہو۔" وہ خوش دلی کے ساتھ بولا۔ "چلو اب یہاں سے باہر نکلو، میں نے دو اونٹ منتخب کرلیے ہیں۔"

اونٹوں پر سوار ہو کر ہم دونوں نیم پختہ فصیل سے باہر آگئے۔ لیلیٰ اپنی تمام تر سحرکاری سمیت اسی چاردیواری میں رہ گئی تھی۔

باہر نکلے تو آبادی عبور کرنے سے قبل ایک درخت کے سائے میں فواد بیٹھا نظر آیا۔ مجھے پہچانتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے تابانہ انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔

میری اور فواد کی دوستی سے الشویخ میں بہت سے لوگ واقف تھے لہٰذا میں نے بلاتامل اونٹ کو روک دیا اور اسے بٹھا کر اس کی پشت سے اتر گیا۔

فواد بڑھ کر میرے سینے سے لگ گیا۔ "تو تم واقعی جارہے ہو؟" بغل گیر ہوتے ہوئے اس نے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔"

"نہ جاؤ۔" وہ دھیمی مگر پُرجوش آواز میں بولا۔ "یہ اس حرافہ کی آخری رات ہے، اپنی آنکھوں سے اس کا حشر تو دیکھ لو۔"

"میں مجبور ہوں دوست۔" میں نے کہا۔ "دیکھتے نہیں کہ صعود میرے سر پر مسلط ہے!"

"اوہ۔ تو یہ تمھارا نگران ہے۔" وہ تحیرانہ لہجے میں بولا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"خدا کی قسم، یہ اپنی حرکتوں سے یہودی کی اولاد نظر آتا ہے۔ اس سے زیادہ ذلیل شخص الشویخ میں ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ ایکبار سات ریال کی خاطر اس نے ایک بوڑھے کا پیٹ چاک کردیا تھا مگر یہ یہاں بڑے اثر کا مالک ہے صاف بچ نکلا۔"

"اس سے میں نمٹ لوں گا۔ یہ تو بتاؤ کہ کیا یہاں واقعی ایسے بچھو پائے جاتے ہیں جن کے ڈنک مارنے سے پتھر ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے؟"

وہ معصوم بزرگانہ انداز میں ہنس دیا۔ "ارے وہ تو میں نے محاورتاً کہا تھا۔ ویسے ان بچھوؤں کا ڈسا پانی نہیں مانگ پاتا۔"

"صفدر دیر ہورہی ہے۔" اسی وقت صعود نے مجھے پکارا اور میں جلدی سے فواد کے ساتھ روایتی عرب بوسوں کا تبادلہ کرکے واپس ہولیا۔

تھوڑی دور تک سفر خاموشی کے ساتھ جاری رہا۔ بستی سے باہر نکلنے کے بعد یہ سکوت صعود ہی نے توڑا۔

"وہ کیا پوچھ رہا تھا؟"

"تم نے غیر متعلقہ باتیں شروع کردیں۔" میں تیز لہجے میں غرایا۔

"یوں خاموشی کے ساتھ یہ طویل سفر کس طرح کٹے گا۔" وہ بے حیائی کے ساتھ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"اس کے لیے بہت سے موضوع پڑے ہیں۔"

"آخر اس میں کیا خرابی ہے۔" وہ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔ "اس سے تمھاری دوستی بہت گہری معلوم ہوتی ہے۔"

اس مرحلہ پر اس سے الجھنا بے سود تھا لہٰذا میں بھی بادلِ نخواستہ ہنس دیا۔ "وہ واقعی بہت اچھا دوست ہے۔ پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔"

"اور تم نے اسے بتادیا۔"

"میں احمق نہیں ہوں۔ میں نے اس سے یہی کہا کہ میں دوچار روز میں لوٹ آؤں گا۔ ایک اہم کام سے کہیں جارہا ہوں۔"

"مگر اس کے انداز سے تو معلوم ہورہا تھا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔"

"یہ تمھاری بینائی کا قصور ہے۔"

"تم آدمی اچھے ہو مگر ذرا جلدی طیش میں آجاتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

برکہ تک کا سفر بہت طویل اور اکتا دینے والا تھا۔ الشویخ کی بستی کو پیچھے چھوڑ دینے کے بعد ہر طرف تا حدِ نظر ریت ہی ریت پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ گو سورج کی تمازت دم توڑ چکی تھی مگر پھر بھی حدت ناقابلِ برداشت تھی۔ اگر میرے پاس کنویں کے میٹھے پانی سے بھرنا چرمی چھاگل موجود نہ ہوتی تو میرے لیے سفر جاری رکھنا دشوار تھا۔

ادھر دونوں اونٹ سست خرامی کے ساتھ ریت اور دھوپ

سے بے پرواہ یوں سُبک رفتاری سے چلے جارہے تھے کہ ان پر رشک آتا تھا۔ صعود کی حالت بھی اونٹوں سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس کے انداز میں بھی لاپروائی اور سکون نمایاں تھا۔

سورج ڈھلنے سے ذرا دیر پہلے ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ مطلع صاف ہونے کی بنا پر صعود بہت خوش تھا کیونکہ رات میں ستاروں کی مدد سے وہ سمت کا بہتر تعین کر سکتا تھا۔ اسے اپنی اختر شناسی کی فکر تھی اور میں اس بات پر خوش تھا کہ کم از کم اس بار ہولناک ریتیلے گرداب میں پھنسے بغیر میں اپنی منزل پر پہنچ سکوں گا۔

صعود اپنے ہمراہ ایک تھیلے میں دُنبے کی بھُنی ہوئی لذیذ رانیں لے کر آیا تھا۔ صحرا کے وسیع سینے پر دانتوں سے ادھیڑ ادھیڑ کر وہ رانیں کھاتے ہوئے میں خود کو الف لیلوی داستان کا کوئی سحر طراز کردار سمجھ رہا تھا۔

خورد و نوش کے بعد سفر دوبارہ جاری ہو گیا۔ دوران سفر میں نے محسوس کیا کہ صعود بے فکر نظر آنے کے باوجود پوری طرح مستعد تھا۔ شاید اسے اسی قسم کی تربیت دی گئی تھی کہ وہ کبھی بھی صورتِ حال سے مطمئن نہ رہتا تھا۔

میں نے کئی بار اس امر کا جائزہ لیا کہ اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دوں تاکہ مجھے فوری طور پر ابوخالد کے جال سے نجات مل جائے مگر ایک شکاری چاقو کے ساتھ اس جنّیت کو زیر کرنا محال ہی نظر آیا۔ میں اتنا ماہر نشانہ باز نہیں تھا کہ اونٹ کی پشت سے اس کو پہلے ہی وار میں ڈھکانے لگانے میں کامیاب ہو جاتا اور پہلے ناکام حملے کے نتیجے میں وہ نہ صرف میری زد سے باہر نکل جاتا بلکہ مجھے اس کی جوابی کارروائی سے بھی بچاؤ کرنا پڑتا جبکہ وہ تازہ دم نظر آ رہا تھا اور میرے اعصاب اس صعوبت آمیز سفر کے نتیجے میں بکھرتے جا رہے تھے۔

اگلی صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل ہمیں کافی دور بستی کے آثار نظر آتے اور صعود کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”ہم بہت جلدی برکہ پہنچ گئے ہیں۔“

”کیا تمھیں یقین ہے کہ یہی ہماری منزل ہے؟“ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”میں یہاں بارہا آ چکا ہوں، برکہ میرے لیے نئی جگہ نہیں ہے۔“

بستی میں پہنچنے تک خاصا اُجالا پھیل چکا تھا۔ وہ پختہ اور نیم پختہ مکانوں پر مشتمل قدیم وضع کی بستی تھی جس کے مکین اس وقت تک گہری نیند سوتے ہوئے تھے اور کہیں کہیں آوارہ کتے مکانوں کے سائے میں پڑے اونگھ رہے تھے۔

صحرائی اونٹ نرم اور ٹھنڈی زمین پر کوئی آواز پیدا کیے بغیر تیزی سے گلی در گلی پُرپیچ راستوں پر آگے بڑھتے اور آخر کار ایک جگہ صعود نے اپنا اونٹ روک دیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اونٹوں کی نکیل ایک وزنی پتھر سے باندھ کر ہم دونوں اتر گئے۔

صعود نے آگے بڑھ کر ایک چوبی دروازے پر آہستہ آہستہ مسلسل تین بار دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے ایک غراتی ہوئی خوابیدہ آواز ابھری۔

”رات کا کتا۔“ صعود نے اپنا منہ دروازے کے قریب لے جا کر اتنی آہستگی سے کہا کہ صبح صادق کے سناٹے میں اس کی آواز دور تک نہ سنی جا سکے۔

اندر والے نے اسی لہجے میں غرا کر لیلیٰ کی ماں کو ایک ثقیل گالی دی کیونکہ عربی زبان میں رات کو لیلیٰ ہی کہا جاتا ہے پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا گیا۔

دروازہ کھولنے والا شاید کھلے ہوئے پٹ کی آڑ میں ہو گیا تھا کیونکہ وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا البتہ اس کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔ ”اندر آ جاؤ۔“

صعود نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے بڑھا دیا اور میں کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے صعود بھی اندر آ گیا۔

”کتے کے ساتھ رکھوالا بھی آیا ہے۔“ دو افراد کو دیکھتے ہی اس شخص نے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا۔

اس بار میں وہ آواز سنتے ہی اس کی طرف گھوم گیا۔

نیچی چھت والے کمرے میں پھیلی ہوئی مدھم روشنی میں ایک دراز قامت شخص دروازہ بند کر رہا تھا جس کی پشت قدرے خمیدہ تھی اور اس کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی جیکٹ جھول رہی تھی۔ نچلے دھڑ کو چھپانے کے لیے ایک عجیب سے پھٹے پرانے ملبوس کا سہارا لیا گیا تھا۔

دروازہ بند کر کے وہ گھوما تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اس کے سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور ان الجھے ہوئے بالوں کے نیچے اس کی خوابناک آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ان انگاروں میں ایسی شیطانی قوت پوشیدہ تھی کہ خود کو اس کے سامنے بالکل برہنہ محسوس کر رہا تھا اور وہ مسلسل میری ہی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی رال میں لتھڑی ہوئی غلیظ داڑھی کے درمیان اس کے گلابی ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ تمباکو نوشی کی لعنت سے محفوظ ہے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر چبا کھانے والے تحکمانہ انداز میں دونوں سے کہا۔

میں تشنی انداز میں فرش پر پڑی ہوئی گندی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ صعود بھی میرے نزدیک ہی آ بیٹھا۔

درندے نما ادھیڑ عمر شخص نے اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور اسے داہنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک نظر اس کا جائزہ لیا اور نہایت بے ہودگی کے ساتھ اسے پھانک گیا۔ اب وہ میری ذات سے یکسر لاپروا نظر آ رہا تھا۔

وہ منہ میں موجود چیز کو چباتا ہوا فرش پر پڑے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کتیا کو اس بار کیا تکلیف ہوئی ہے؟“

”اس بے دردی سے اس کا نام نہ لو مقدس راہب۔“ صعود دردمندانہ لہجے میں بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ وہ شیر کے دہانے میں بیٹھی برادری کے لیے کام کر رہی ہے ورنہ کون ایسی جوان لڑکی ہے جو محض ایک مقصد کی خاطر اپنے شباب کی چتا میں خود ہی گھل گھل کر مر جانا پسند کرے۔“

وہ خونخوار عفریت بے رحمانہ انداز میں ہنسا۔ ”شیر کے دہانے میں نہیں گود میں بیٹھی ہے وہ! اس نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے وہاں بھی راستے نکال لیے ہوں گے۔“

”خیر! مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم اس کے بارے میں کیا سوچتے ہو۔“ صعود قدرے ناپسندیدگی مگر ادب کے ساتھ بولا۔ ”میں اسے تمھارے پاس پہنچانے پر مامور کیا گیا تھا اور اب میں واپس جا رہا ہوں۔“

”جاؤ۔ ربِ لایزال تمھاری مدد کرے۔“ وہ لیٹے لیٹے استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”اس سے کہہ دینا کہ اس کی چیخیں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ جب بھی فرصت ہوئی میں الشویخ ضرور آؤں گا۔ وہ تو شاید وہاں سے نہ نکلنے کی قسم کھا چکی ہے۔“

”میں یہ نہ کہہ سکوں گا۔“ صعود اٹھتے ہوئے بولا۔ ”جا ہو تو لکھ کر دے دو۔“

”جاؤ جاؤ۔“ وہ ہاتھ لہرا کر غرایا۔ ”تم کتے نہیں، خارش زدہ پلے ہو جسے وہ اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتی ہے۔ کسی روز میں خود ہی اسے یہ بتاؤں گا۔“

میں دم بخود ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا جو یقینی طور پر لیلیٰ ہی کے بارے میں تھی۔ شاید کسی موقع پر وہ اس مجذوب کی درندگی کا نشانہ بن چکی تھی۔ مگر حالات نے اسے ایسے مرتبہ پر پہنچا دیا تھا کہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر وہ لیلیٰ کے احکام و ہدایات کی پابندی کرنے پر مجبور تھا مگر اس کے باوجود وہ کسی بھی مرحلے پر اپنے دل کا غبار نکالنے اور لیلیٰ پر اپنی برتری ثابت کرنے کا موقع نہیں جانے دیتا تھا۔

صعود کمرے سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ چند ثانیوں کے لیے اس کمرے میں سکوت چھا گیا۔ میں ابھی تیز سے بات شروع کرنے کے لیے الفاظ منتخب کر رہا تھا کہ وہ لیٹے لیٹے غرایا۔ ”اگر تو گونگا ہے تو ابھی گے ساتھ دفع ہو جا۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“

میں نے چھوٹی انگلی سے چاندی کی انگشتری اتاری اور اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے روشنی کے رخ پر انگوٹھی کا جائزہ لیا پھر کسی پاگل کی طرح اسے چوم کر اپنی چھنگلیا میں پھنسا لیا۔ اس کی انگلیاں اتنی بھدی اور موٹی تھیں کہ ان میں اس انگوٹھی کا آنا محال تھا۔

”تو اسی کا بھیجا ہوا ہے، بتا کیا کام لایا ہے؟“

میں نے جیب سے چرمی تعویذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اوہ!“ تعویذ دیکھتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تو اس کا فرستادہ ضرور ہے مگر معتمد نہیں معلوم ہوتا۔“

اس وحشی کی ہرزہ سرائی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کی کمزوری سے کھیلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک شوشہ چھوڑ دیا۔ ”معتمد؟ کہو تو یہ بھی بتا دوں کہ اس کے بدن پر کتنے تل ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔“

اس نے تعویذ جیب میں ڈال لیا اور اچھل کر سیدھا بیٹھ گیا۔ ”کیفیت تو خیر تیرے لہجے ہی سے ظاہر ہے، یہ بتا کہ کیا اب بھی وہ پہلے کی طرح تر و تازہ ہے؟“

”پہلے تو میں نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اب بھی ارمانوں کی شہزادی ہے۔ اگر میرا بس چلتا تو اسی کے قدموں میں سسک سسک کر جان دے دیتا۔“

”ہائے لیلیٰ!“ اس مردود نے یہ کہہ کر زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔

چند ثانیوں بعد وہ قدرے اداس لہجے میں خود بخود بولنے لگا۔ ”پانچ برس پہلے وہ الشویخ جاتے ہوئے دو روز کے لیے کالا بان کے ساتھ یہاں ٹھہری تھی۔ اسی وقت سے میرا دل اس کے لیے تڑپتا ہے۔ ایک رات میں نے اسے تقریباً زیر کر ہی لیا تھا مگر وہ مجھ سے خائف رہتی تھی۔ بُری طرح چیخنے چلانے لگی اور میں اپنے بال نوچتا باہر نکل گیا۔ تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہے لڑکے کہ اس کے بدن کے تل تک گن آیا۔ وہ تو ربِ لایزال کا انعام ہے جو مقربین کی جھولی میں ڈالا جاتا ہے۔“

”تم کیسے درویش ہو؟ تمھارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“ میں نے اس کی جذباتی کیفیت کے پیش نظر اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

”درویش کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے لڑکے۔ پتھر کا ٹکڑا نہیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ ”اور وہ تو پتھر کو بھی پگھلا دینے کی طاقت رکھتی ہے۔“

”کالا بان اس کا محبوب تھا کیا؟“ میں... اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوال کو دل میں نہ رکھ سکا۔ کالا بان کون تھا؟ لیلیٰ کس برادری کے لیے کام کر رہی تھی؟ اس کا مقصد کیا تھا؟ آوارہ مزاج راہب کی باتوں نے ان سوالات کے بارے میں میرا تجسس بیدار کر دیا تھا۔

”وہ اس کا باپ تھا، وہ بہت عظیم آدمی ہے۔ ہم سب کا باپ ہے۔ اس کا دماغ لاکھوں کے لشکر پر حاوی ہے۔“

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ لیلیٰ کا باپ ابو خالد ہے۔ نیلی آنکھوں والا طویل قامت شخص۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ ایک چہرہ ہے مگر اس کے بہت سے نام ہیں۔" جنوبی راہب نے عقیدت آمیز لہجے میں کہا۔ "الشویخ میں وہ ابو خالد ہے۔ یہاں کالاہان، اردن میں لوگ اسے مجتبیٰ کہتے ہیں، اسرائیل میں وہ بن حیان ہے۔ اگر وہ لیلیٰ کے ساتھ نہ ہوتا تو اس رات میں یقیناً اسے پھاڑ کھاتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے لذت کے تصور سے مٹھیاں بھینچ کر آنکھیں موند لیں۔

اس بار اسرائیل کا نام کسی بچھو کے ڈنک کی طرح میرے ذہن میں پیوست ہو گیا اور معاً مجھ پر ساری صورتحال واضح پس منظر کے ساتھ روشن ہو گئی۔

اسرائیل جو عرب دنیا کے سینے میں ایک لاعلاج ناسور کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہر طرف اپنے پنجے پھیلا رہا تھا۔ اسے عربوں کی عسکری اور مالی قوت سے شدید خطرات لاحق تھے اور میں نادانستگی میں شاید ان کی کسی زیرِ زمین تنظیم کا شکار ہو گیا تھا۔ اسرائیل میں بن حیان کہلانے والا ابو خالد یقیناً اس گروہ کا سرغنہ تھا اور اس نے کسی خاص مقصد کے لیے میرا انتخاب کیا تھا۔ وہ خلیج کے دہانے پر اپنے سازشی عناصر کا جال پھیلانے کی مساعی میں مصروف تھا۔

برکہ میں یوسف اور اس کے حواری ایک مرکز چلا رہے تھے اس سے آگے صحرا کے وسط میں الشویخ پر ابو خالد کی گرفت مضبوط تھی۔ اور اس سے آگے سعودی سرحد کے پار بھی ان کا کوئی مرکز کام کر رہا تھا، جہاں ابو مالک اونٹوں کے ذریعہ خفیہ طریقے پر پیغام رسانی کیا کرتا تھا۔

وہ سب بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے مگر ان میں یہودی بھی تھے اور ہندو بھی۔ اپنے مذموم مقاصد کی خاطر انھوں نے اپنے نام اور مذہب تک بدل لیے تھے کیونکہ ان کا نشانہ ایک تھا۔ مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ آوارہ مزاج، رنگین فطرت اور حسین بدن ساحرہ لیلیٰ بھی کٹر نسل پرست یہودن تھی، جسے محض امیر کو مفلوج کرنے کی خاطر ابو خالد نے بھرپور سازش کے ذریعہ حرم میں پہنچایا تھا اور صعود نے جس برادری کے لیے لیلیٰ کی خدمات کا تذکرہ کیا وہ صیہونی برادری تھی جو طاقت اور سازش کے ذریعے پورے علاقے میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو کیا وہ واقعی بن حیان کی بیٹی ہے؟" میں نے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

"بن حیان نے آج تک شادی نہیں کی۔" وہ آنکھیں کھول کر بولا۔ "لیلیٰ ذلیل اور کمینی ضرور ہے مگر بہت دلیر لڑکی ہے۔ تم دیکھنا کہ آہستہ آہستہ اثر کرنے والے زہر کی طرح ایک روز وہ امیر کو نگل جائے گی۔ ہر روز زہر کی ایک قطرہ مقدار اس بوڑھے کی ہڈیوں میں سرایت کرتی جا رہی ہے وہ لاولد مرے گا تو الشویخ میں لیلیٰ کی حکمرانی ہوگی جس اس علاقے میں ایک مضبوط مرکز کی ضرورت ہے۔"

یوسف کے الفاظ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی باتیں معنی خیز مگر اٹل تھیں۔ مجھے گزری ہوئی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ فواد نے مجھ سے ان مسلح محافظوں کے بارے میں نفرت آمیز لہجے میں بات کی تھی جنھیں ابو خالد باہر سے لایا تھا۔ اس کی دانست میں وہ بظاہر عرب نظر آتے تھے مگر غدار تھے جنھیں الشویخ والوں کا لہو بہاتے ہوئے ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔

وہ سادہ دل صحرا نشین عرب اپنی آستین میں پلنے والے ان سانپوں سے لاعلم تھے۔ نادانستگی میں انھوں نے سازش کی آگ اپنے گھروں میں بھی روشن کر لی تھی۔ یہ تو الشویخ کی کہانی تھی ان کی گداز جسموں اور گوری رنگت والی لڑکیاں نہ جانے کن کن گھرانوں میں پہنچ چکی تھیں اور سازش کو پروان چڑھا رہی تھیں۔

"میں رات بھر کا تھکا ہوا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو دو چار گھنٹے کی نیند لے لوں؟" میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"سو جا! میں نے تجھے کب روکا ہے۔ لیلیٰ کی بستی سے آنے والوں کے لیے میرا بستر ہر وقت حاضر ہے۔ وہ میری دشمن بھی ہے اور محبوبہ بھی۔" وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے بستر سے اتر گیا۔ "میرے لیے دن طلوع ہو گیا۔ اب تیری رات شروع ہوئی ہے۔ اس بستر پر تجھے بہت آرام ملے گا۔"

میں اس کا شکریہ ادا کر کے بستر پر پہنچا تو بدبو سے دماغ کی چولیں ہل گئیں۔ گدی اور تکیے میں سے شدید بساند پھوٹ رہی تھی جیسے اسے مدت سے بغیر دھوئے استعمال کیا جاتا رہا ہو۔ میں نے کراہیت کے احساس کے تحت بستر چھوڑنا چاہا لیکن وہ آرام دہ ضرور تھا۔ میں اس خبیث بدروح سے پیچھا چھڑا کر اپنے لائحہ عمل پر غور کرنا چاہتا تھا۔ حالات کے نئے سنسنی خیز موڑ کے باعث میرے لیے اب فوری فیصلہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

مجھے کم از کم ایک بات کا اطمینان ضرور تھا کہ الشویخ سے چلتے چلتے میں فواد کے دل میں نفرت اور انتقام کی ایسی آگ بھڑکا آیا تھا کہ لیلیٰ کا اس کے ہاتھوں زندہ بچنا محال تھا۔ اس حسین فتنے کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اگر الشویخ کی بستی ان لوگوں کے چنگل سے آزاد نہ بھی ہوتی تو ان کی کارستانیوں کی شدت میں کمی ضرور آ جاتی۔ دوسری طرف بستی کا حکمران ناگہانی موت کا شکار ہونے سے بھی بچ جاتا شاید لیلیٰ کی موت کے بعد اس کے معالج ہی پتہ لگا لیتے کہ وہ زہر خورانی کے ہاتھوں تیزی سے لبِ گور پہنچتا جا رہا ہے۔

میرے بستر پر دراز ہونے کے بعد یوسف وہاں سے چلا گیا

میرے ذہن پر بھی آہستہ آہستہ غنودگی طاری ہونے لگی اور آخر کار میں گہری نیند سو گیا۔

میں بیدار ہوا تو اس کمرے میں بدستور نیم تاریکی کا راج تھا، بند دروازے کی نچلی جھری سے روشنی کی ایک لکیر اندر آ رہی تھی، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی دن باقی ہے۔ باہر سورج چمکنے کے باعث کمرے میں سیلن کا احساس بڑھ گیا تھا۔

میں اٹھا تو قریب ہی مٹی کے ایک برتن میں دودھ، اور کھجوروں سے بھری ہوئی ایک پلیٹ موجود تھی۔ جو یوسف نے شاید میرے ہی لیے رکھی تھی۔

زرد کھجوریں بادی النظر میں کچی معلوم ہو رہی تھیں مگر ان میں شہد سے زیادہ مٹھاس موجود تھی۔ میں نے اچھی طرح شکم سیر ہو کر کھجوریں کھائیں۔ دودھ کا پیالہ خالی کیا اور پھر یوسف کے مکان سے باہر چل دیا۔

وہاں آنے کے بعد اس کی جانب سے مجھ پر کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی تھی اور اس وقت وہ خود بھی نہ جانے کہاں غائب تھا للذا میرے لیے حالات کا جائزہ لینے کا یہ بہترین موقع تھا۔

برکہ سمندر کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں سبزہ موجود ہونے کے باوجود صحرائی زندگی کے آثار نمایاں نظر آتے تھے۔ مردوں میں بدو بھی تھے اور غیر بدو بھی، مگر عورتوں میں حسن کی فراوانی پائی جاتی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے میں گھاٹ پر جا نکلا جہاں خاصی تعداد میں بادبانی کشتیاں اور اسٹیمر لنگر انداز تھے وہاں اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ میرے لیے یہ بھاگ نکلنے کا اچھا موقع ہے۔ میرے پاس سعودی ریال کی صورت میں خاصی رقم بھی موجود تھی جس کی مدد سے میں سارے انتظامات بآسانی کر سکتا تھا اور کسی کو میرے نکلنے کی کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔

خاصی دیر تک جائزہ لینے کے بعد میں ایک خلاصی سے جا ٹکرایا۔

میرے تخاطب پر وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہوا اور سر سے پیر تک بغور میرا جائزہ لینے لگا جب کہ میں پہلے ہی اس کا گہرا مشاہدہ کر چکا تھا۔

اپنے لباس اور ظاہری حالت کی بنا پر وہ خاصا مفلوک الحال نظر آ رہا تھا اور مجھے امید تھی کہ معقول رقم کے لالچ میں وہ کام کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

"کیا میں تم سے واقف ہوں؟" مجھے سر سے پیر تک گھورنے کے بعد اس نے چھبتے ہوئے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"کیا اس بستی میں اجنبیوں کے ملنے پر پابندی ہے؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"کہو، کیا کام ہے؟"

"اگر فرصت ہو تو میں کہیں بیٹھ کر گفتگو کرنی چاہتا ہوں۔"

"میرے ساتھ آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف مڑ گیا۔

ساحل سے ذرا دور ایک چھپر کے نیچے چٹائی پڑی ہوئی تھی جسے شاید وہ سستانے کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ وہیں ایک حقہ اور تمباکو سے بھرا ہوا ڈبہ بھی موجود تھا۔

اس نے مجھے بٹھانے کے بعد آگ سلگا کر چلم تیار کی اور حقے کے گہرے گہرے کش لیتا میرے پاس آ بیٹھا۔

"پہلے اپنا نام بتاؤ۔" اس نے حقہ میرے قریب رکھتے ہوئے کہا۔ "کون ہو اور کہاں سے آتے ہو؟ میں نے اب سے پہلے کہیں برکہ میں نہیں دیکھا۔"

"نام صفدر علی ہے۔" میں نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "بھٹکتا ہوا اس بستی میں آ نکلا ہوں اور اب کسی ایسی جگہ پہنچنا چاہتا ہوں جہاں سے میں اپنے ملک جا سکوں۔"

"کون سا ملک ہے تمھارا؟" وہ نرم لہجے میں بولا۔

"ہندوستان۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کام کے لیے میں تمھیں معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

میرے جواب پر اس نے غیر معمولی انداز میں ہنکار بھری پھر بولا۔ "اس سے پہلے بھی بہت سے پریشان حال ہندی میں نے دیکھے ہیں جو بھٹکتے ہوئے ادھر آ نکلتے ہیں مگر تم پہلے آدمی ہو جو خاصے مطمئن نظر آ رہے ہو اور پھر خاصی عربی بھی جانتے ہو۔"

"ابھی تک تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" میں نے اسے براہ راست موضوع پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم چاہو تو یہاں سے تمھیں کھلے سمندر میں لے جا کر کسی لانچ وغیرہ میں بھی سوار کرایا جا سکتا ہے۔ تم اس کام کے لیے کتنی رقم خرچ کر سکتے ہو؟"

"یہ الٹا سوال ہے۔" میں ہنس کر بولا۔ "تم اپنا معاوضہ بتاؤ۔ میں تمھیں سعودی ریال کی صورت میں ادائیگی کر سکوں گا۔"

اسی وقت نہ جانے کہاں سے اچانک ایک بدصورت اور اکھڑ مزاج شخص وہاں آ پہنچا اور اس نے لات مار کر حقہ دور اچھال دیا۔

"دفع ہو جا یہاں سے۔" وہ غرا کر اس خلاصی سے بولا۔ "یہ یوسف درویش کا مہمان ہے اور اپنے میزبان کی ہدایت پر تیری نیت کا امتحان لینے بھیجا گیا تھا۔"

اچانک اس شخص کا چہرہ دھواں ہو گیا اور وہ گھبرائی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا۔ "قسم پروردگار کی، میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں تو خود تمھاری نیت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ میں کبھی الٹے سیدھے دھندوں میں نہیں پڑتا۔ بال بچے دار آدمی کو حلال کی روزی

ملتی رہے تو اس کے لیے وہی کافی ہوتی ہے۔"

نووارد نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لے کر واپس بستی کی طرف چل دیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔ میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔" میں نے کچھ دور چلنے کے بعد تیز لہجے میں نووارد سے کہا اور اس کے ساتھ چلتے چلتے رک گیا۔

وہ شخص بہت بدتمیز تھا، اس نے میرا ہاتھ چھوڑ کر خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر اچانک ہاتھ گھما دیا۔

میں نے اس کے تھپڑ سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر پھر بھی میری کنپٹی اس کی زد میں آگئی اور چوٹ کھا کر میں بپھر گیا۔

میری بھرپور ٹکر اس کے سینے پر پڑی اور وہ کسی زخمی بھینسے کی طرح ڈگراتا ہوا چاروں خانے چت زمین پر جا گرا۔

شاید اسے مجھ سے اتنے شدید اور فوری ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ زمین پر گرنے کے بعد وہ چند سیکنڈ تک یوں ہی ساکت پڑا رہا اور میں لپک کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ میں اس مردود پر اپنی ساری جھلاہٹ نکال دینی چاہتا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر پے درپے کئی زبردست گھونسے رسید کیے مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی نہ اس نے اپنے طور پر حرکت کرنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، منہ کھلا ہوا تھا اور ہر گھونسے کے ساتھ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک جاتی تھی۔

معاً مجھے احساس ہوا کہ میرا شکار مر چکا ہے اور میں ایک لاش کے سینے پر چڑھا بیٹھا ہوں۔ یہ احساس ہوتے ہی مجھے جھرجھری سی آ گئی اور میں اس پر سے اُتر گیا۔

پہلے میں نے اپنے دل کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ وہ شاید میری ٹکر کے باعث محض بے ہوش ہوا ہے مگر جب میں نے اس کے سینے سے کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی تو مجھے یکسر ناکامی ہوئی اور یہ یقین کرلینا پڑا کہ ٹکر کے باعث اس کی حرکت قلب بند ہو چکی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے مزاحمت کی قوت سے محروم ہو چکا ہے۔

اس پر جوابی حملہ کرتے ہوئے میری نیت یہ نہیں تھی کہ میں اسے ٹھکانے ہی لگا دیتا، مگر وہ بدبخت میری توقع سے کہیں زیادہ بے جان نکلا اور ایک ضرب بھی نہ سہہ سکا۔ میرے لیے اب وہاں رُکنا بے سود تھا۔ اس خلاصی کے پیش آنے والے تجربے کی روشنی میں یہ مشکل تھا کہ میں برکہ میں کہیں پناہ لے سکتا یا کسی اور کو رقم کا لالچ دے کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ ایسی کسی کوشش میں فوری کامیابی بہت مشکل تھی۔ جب تک میری نکاسی کا انتظام ہوتا یوسف کو اپنے ایک ہرکارے کی موت کی اطلاع مل جاتی اور اس خلاصی کے ذریعے

جب اسے یہ پتہ چلتا کہ وہ شخص موت سے قبل اسی علاقے میں آخری بار میرے ساتھ دیکھا گیا تھا، تو یوسف کے آدمی میری بو پر لگ جاتے اور میرے لیے چھپے رہنا محال ہو جاتا لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں خود یوسف کے پاس پہنچ جاؤں۔

میں یوسف کے مکان پر پہنچا تو وہ اپنے بدبودار بستر پر دراز شراب پینے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

"آ میری جان! میں تیرا ہی منتظر تھا۔" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "میرے پاس بیٹھو اور ذرا مجھے میری لیلیٰ کا احوال سناؤ تاکہ نشہ کا سرور کچھ دوبالا ہو سکے۔"

"میں ایک بُری خبر لے کر آیا ہوں۔" میں نے کھڑے کھڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بُری خبر؟" اس نے جھلاتے ہوئے لہجے میں یہ کہہ کر وہسکی کی آدھی بھری ہوئی بوتل سر سے اوپر اٹھا کر زمین پر دے ماری اور شیشے کی کرچیوں کے ساتھ ہی شراب فرش پر پھیل گئی۔ "کیا بُری خبر لانے کے لیے تو کسی بُرے وقت کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔"

"مرنے والے کسی گھڑی کا انتظار نہیں کرتے، تمھارا ایک آدمی میرے ہاتھوں ناگہانی مارا گیا ہے۔" میں نے ——— اس کے سامنے صاف صاف اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔

"مارا گیا ہے میرا آدمی؟" وہ حیرت سے بولا۔ "کیا بک رہا ہے؟"

"اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر پہل کی تھی اور جب میں نے اس کے سینے پر ٹکر ماری تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔"

"وہ کون تھا اور یہ کیسے ہوا، میں پوری بات جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں اس کے نام سے ناواقف ہوں۔ وہ بدصورت اور اکھڑ مزاج آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بھینگی تھیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس کی اجازت سے باہر گھوم رہا ہوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں تمھارا مہمان ہوں قیدی نہیں تو اس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور میں نے طیش میں آ کر اس کے ٹکر دے ماری اور اس کا قصہ پاک ہو گیا۔"

"اس کی لاش کہاں ہے؟"

"گھاٹ کے قریب ہی ریت میں پڑی ہے۔"

"تو خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "لیلیٰ نے بھی تیرے بارے میں یہی لکھا ہے۔ میں تجھے زیادہ دن یہاں نہیں رکوں گا۔"

"تو کیا مجھے کہیں اور جانا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ پاگلوں کی طرح ہنسا۔ "ہاں، تیری منزل ابھی بہت دور ہے۔"

"اب میں مسلسل سفر سے اُکتا گیا ہوں۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کچھ دن یہاں رہ کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"آرام قبر کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اب تو تجھے اس ابدی آرام گاہ میں بھیجنے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔" اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا اور میں اس کے بستر پر دراز ہو گیا۔

یوسف کی واپسی سورج غروب ہونے کے بعد ہوئی۔ اس بار وہ ایک جیپ میں دو افراد کے ہمراہ آیا تھا۔

آنے والوں کا رویہ خاصا خشک اور کاروباری تھا۔ یوسف نے انھیں میرا نام بتایا اور وہ دونوں مجھے یوں گھورنے لگے جیسے قربانی سے قبل بکرے کا جائزہ لے رہے ہوں۔ پھر ان میں سے ایک نے پہلی بار زبان کھولی۔ "مسٹر صفدر۔ ہمیں امید ہے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے کیونکہ اسی میں تمھاری بہتری مضمر ہے ورنہ ہم اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کسی حد کی پروا نہیں کیا کرتے۔"

اس کے منہ سے صاف ستھری انگریزی سُن کر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ اس بار میں نے بھی عربی کے بجائے انگریزی بولنے کو ترجیح دی۔ "تم لوگ کس سلسلے میں میرے تعاون کے طلب گار ہو؟"

"جو کہا جائے، بے چوں و چرا کرتے رہو۔" وہی شخص بولا۔ "میں اتنا ضرور بتا دوں کہ اگر تم نے کسی معاملے میں مزاحمت کی کوشش کی تو ہم تشدد کی راہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔"

"آخر تشدد کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم لوگ کسی جرم میں مجھے اپنا شریک بنا رہے ہو؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"سوالات کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس بار دوسرے آدمی نے کہا۔ "ہم ابھی ایک سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ تمھاری آنکھوں پر کالی پٹی بندھی ہو گی۔ راستے میں کہیں گاڑی روکی جائے تو تم بالکل خاموش رہو گے۔ اگر تمھارا نام لے کر براہ راست مخاطب کیا جائے تو بھی تم گونگے بنے رہو گے۔"

"یہ سفر کتنے دن جاری رہے گا؟"

"بکواس کرنے اور ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔" میرے سوال پر وہ تلملا کر بولا۔ "چند گھنٹے بعد ہم تمھاری آنکھوں سے پٹی ہٹا دیں گے۔"

"جو کہا جا رہا ہے اسے اچھی طرح سُن لو۔" اس بار یوسف نے کہا۔ "یہ لوگ موت کے ہرکاروں سے کم نہیں ہیں۔"

"میں ہر بات سُن اور سمجھ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

پھر آنے والوں میں سے ایک نے بڑھ کر میری آنکھوں پر ریشم کے سیاہ تسموں والی ایک عینک اس طرح چڑھا دی کہ میرے لیے کچھ بھی دیکھنا ممکن نہ رہا۔

مجھے دونوں بازوؤں سے سہارا دے کر جیپ میں پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ ان میں سے ایک شخص میرے پہلو میں بیٹھ گیا اور جیپ کا انجن اسٹارٹ کر دیا گیا۔ مجھے لے جانے والوں اور یوسف کے درمیان رسمی فقروں کا تبادلہ ہوا اور ایک جھٹکے کے ساتھ جیپ حرکت میں آ گئی۔

نامعلوم اور خاموش راستوں پر جیپ کا سفر جاری رہا۔ میرے کانوں میں انجن کے شور کے سوا کوئی دوسری آواز نہیں آ رہی تھی جس کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا کہ ہم کسی ویرانے میں سفر کر رہے ہیں۔ ویسے بھی اس علاقے میں برکہ سے نکلنے کے بعد دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہوا کی خنکی یا رُخ کی بنا پر بھی میرے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ یہ سفر ساحل سمندر کے ساتھ جاری ہے یا جیپ صحرا کی طرف بڑھ رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ناہموار راستہ شروع ہو گیا۔ جیپ بُری طرح اچھلتی کودتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص کی وجہ سے آنکھوں تک ہاتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے بھنوؤں وغیرہ کو حرکت دے کر بہت کوشش کی کہ سیاہ تسموں والی عینک کو سرکا کر ذرا سی جھری پیدا کر سکوں مگر مجھے اپنی اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔

جسم کے جوڑ جوڑ کو ہلا دینے والا یہ سفر کم و بیش چار گھنٹے جاری رہا۔ اس کے بعد جیپ آہستگی سے روک دی گئی۔

"کون ہے؟" قریب ہی سے کسی نے اونچی آواز میں پوچھا۔ یہ آواز یقینی طور پر جیپ کے باہر سے آئی تھی اور پوچھنے والے کا لہجہ خاصا سخت تھا۔ زبان انگریزی تھی۔ اس کے بولنے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ امریکی قومیت سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ اتنے طویل سفر کے بعد ہمیں جو پہلا آدمی ملا وہ غیر ملکی تھا۔ جیپ جس انداز میں گھنٹوں ناہموار راستوں پر دوڑتی رہی اس سے پتہ چلتا تھا کہ اس وقت ہم لوگ صحرا کے کسی دور افتادہ اور دشوار گزار علاقے میں موجود ہیں۔

"تھاب!" ڈرائیونگ سیٹ والے نے جیپ کے انجن کے شور میں چلا کر کہا۔

پھر کوئی جیپ کے قریب آیا۔ ان دونوں کے کاغذات طلب کیے گئے جو انھوں نے شاید پیش کر دیے۔ اس کے بعد طاقتور ٹارچ کی روشنی میرے منہ پر ڈالی گئی۔ سیاہ ریشمی پٹی کے باوجود میری تاریکی کی عادی آنکھوں نے اس روشنی کے انعکاس کو محسوس کر لیا۔

"یہ کون ہے؟" اس بار پھر وہی امریکی لہجہ سنائی دیا۔

"شکار۔" میرے برابر والے نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"چلے جاؤ، آپریشن روم میں فلپ تم لوگوں کا منتظر ہے۔"

جیپ ایک بار پھر آگے بڑھ گئی۔ اس بار اس کی رفتار خاصی سُست تھی۔ چند منٹ بعد شاید کچا راستہ پختہ ہموار سڑک میں تبدیل ہو گیا۔

کیونکہ جیپ کو لگنے والے شدید جھٹکے یک بیک ختم ہو گئے اور رفتار میں بھی قدرے تیزی آ گئی۔

اس بار جیپ رُکتے ہی میرے برابر والے نے میری آنکھوں سے وہ عینک اتار دی۔ باہر ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو فوری طور پر مجھے بہت ناگوار لگی اور میں چند ثانیوں تک کسی ایسے اُلّو کی طرح دیدے جھپکاتا رہا جسے تاریک کوٹھری سے اچانک چمکتی ہوئی دھوپ میں پھینک دیا گیا ہو۔ پھر جب میری آنکھیں اس روشنی کی عادی ہو گئیں تو میں جیپ سے نیچے اتر آیا۔

یہ دیکھ کر حیرت سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ ہم لوگوں کے عقب میں تھوڑی دور ایک مختصر سا رن وے پھیلا ہوا تھا جس پر ہلکے قسم کے دو چھوٹے جہاز کھڑے ہوئے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر ایک ہیلی کاپٹر بھی نظر آ رہا تھا۔

سامنے سیمنٹ کی چادروں اور آہنی فریم سے بنی ہوئی ایک لمبی سی بیرک نما عمارت تھی جس پر بڑے بڑے سیاہ حروف میں تیل کی تلاش اور کھدائی کا کام کرنے والی ایک مشہور کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔

اس عمارت کے عقب میں کئی بلند و بالا آہنی ڈھانچے نظر آ رہے تھے جن کا تعلق شاید تیل کے لیے کھدائی کرنے والے بھاری آلات سے تھا۔

مجھے زیادہ دیر تک اس جگہ کا جائزہ لینے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ دونوں مجھے ساتھ لے کر اس بیرک نما عمارت میں داخل ہو گئے۔

راہداری میں داہنی جانب ایک دروازے میں داخل ہوئے تو وہاں ایک لمبی سی کانفرنس ٹیبل کے عقب میں بھورے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص ہمارا منتظر تھا۔

اس کمرے کی دیواروں پر جابجا بہت سے چھوٹے بڑے چارٹ اور گراف لگے ہوئے تھے جن میں رنگین ماتھوں والی پنیں لگی ہوئی تھیں ایک طرف دیوار گیر بلیک بورڈ پر چاک سے بہت سے نام اور ڈیوٹی کے اوقات لکھے ہوئے تھے۔

بھورے بالوں والے نے بڑے تپاک سے ہم تینوں کا استقبال کیا۔ اس کے پُرجوش رویّے نے چند ثانیوں کے لیے یہ احساس ذہن سے مٹا دیا کہ میں ان لوگوں کا قیدی بنا ہوا ہوں۔

کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے تینوں کو سگریٹ پیش کی۔ میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے پہلے ہی سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔

اس میز پر انٹرکام بھی موجود تھا۔ اس شخص نے ایک بٹن دبا کر کسی کو چار کپ کافی اور کچھ سینڈوچ وغیرہ لانے کی ہدایت کی اور ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم لوگ پروگرام سے ایک گھنٹہ دس منٹ لیٹ آئے ہو۔" بھورے بالوں والے سفید فام نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔

"اس شخص نے برکہ میں ایک قتل کر دیا تھا۔ یوسف اس کے معاملات نمٹانے میں مصروف تھا ورنہ ہم وقت پر ہی آ گئے ہوتے۔"

"قتل؟ کس کا قتل؟" بھورے بالوں والے نے حیرت سے سوال کیا۔

اس پر ان میں سے ایک نے وہی کہانی سنا دی جو اس قتل کے بارے میں یوسف مجذوب کو سنا چکا تھا۔ یہ سن کر مجھے خاصا اطمینان ہوا کہ کم از کم اس قتل کی حد تک میری ذات غیر ضروری شبہات کا شکار ہونے سے بچ گئی تھی۔

"اب یہاں سے میں ساڑھے تین بجے پرواز کروں۔" بھورے بالوں والا بولا۔ "اس تاخیر پر بن حیان بہت برہم ہو گا۔"

"بن حیان؟" مجھے لانے والوں میں سے ایک بدحواسی کے عالم میں بولا۔ "تو کیا وہ خود وہاں موجود رہ کر اس معاملہ کی نگرانی کر رہا ہے؟"

بھورے بالوں والا ہنس دیا۔ "اس کے لیے یہ کوئی اتنا بڑا معاملہ نہیں ہے۔ اتفاق سے اسے تل ابیب میں ایک اہم مسئلہ درپیش ہے اور میں شکار کے بارے میں اسے پیغام بھیج چکا ہوں۔ ویسے بھی وہ ہر بات سے ذاتی طور پر باخبر رہتا ہے۔"

تل ابیب!

یہ نام میرے ذہن پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح محسوس ہوا۔ گمنام منزل اچانک سامنے آ گئی تھی۔ وہ لوگ گھیر گھار کر مجھے تل ابیب لے جا رہے تھے۔ اب یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہو چکی تھی کہ میں کسی زیرِ زمین یہودی تنظیم کا شکار ہوا ہوں۔

لیلےٰ، عبدالمالک، یوسف مجذوب، ابو خالد۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

مگر میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ لوگ میری ذات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے تھے۔ میں نہ کسی سیاسی اہمیت کا مالک تھا نہ مالی اعتبار سے میری ذات ان کے لیے سود مند تھی پھر آخر وہ کس مقصد کے لیے کثیر مصارف برداشت کر کے مجھے الشویخ سے تل ابیب لیجا رہے تھے۔ انھیں مجھ سے بہت کم معاوضے اور خرچ پر ہر جگہ بے شمار کارندے مل سکتے تھے۔ پھر معاً مجھے پارس پتھر کا خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میری اصلیت جان چکے ہوں اور مجھے غیر علاقوں میں رکھنے کے بجائے اپنی مملکت میں لے جا کر مجبور کرنا چاہتے ہوں کہ میں وہ نایاب پتھر ان کے حوالے کر دوں۔ مایوسی اور خطرے کے اس عالم میں مجھے بعید از امکان باتیں بھی یقینی نظر آنے لگی تھیں۔

مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ شاید ہندوستان کے سرکاری اداروں کو علم ہو گیا ہو کہ میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ پھر شاید انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ میں کس سمت میں نکلا ہوں۔ ہند اور اسرائیل کے تعلقات بہت گہرے تھے۔

...رانے کے لیے انھوں نے اپنے حلیفوں کو اعتماد میں لے لیا۔ اب یہ ...تمی تھی کہ ریت کے ہولناک طوفان میں گھر کر میں خود ہی الشویخ ...پھنسا۔ مجھے کچھ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اگر میرا مقدر مجھے زبردستی ...کی طرف نہ ہانک دیتا تب بھی وہ لوگ کسی نہ کسی طرح میرے ...ہاتھ ڈال ہی دیتے۔

...کافی اور سینڈوچ کے دوران میں وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ...میں مسلسل سوچ میں کھویا رہا۔ موجودہ حالات کا کافی جواز میری ...میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ تصوّر بھی ذرا احمقانہ لگ رہا تھا کہ محض پارس ...لیے میری ذات بین الاقوامی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مگر ...ت اس کے سوا کوئی اور سبب نظر بھی نہ آ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے میرے دماغ کی چولیں ہل گئیں تو توجہ ہٹانے کے ...میں نے سیٹ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ موجودہ حالات کے ...میں بہتر یہی تھا کہ میں خود کو حالات پر چھوڑ دوں، جلد یا بدیر ...صورتِ حال خود بخود واضح ہو جائے گی۔

میں اپنے خیالات میں اس وقت تک ڈوبا رہا جب تک کہ ...بالوں والوں نے پرواز کی روانگی کی تیاری کے لیے نہ کہا۔

"مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟" میں نے اپنے لانے والوں میں ...ایک شخص سے دھیمے لہجے میں دریافت کرنا چاہا۔

"تل ابیب!" اس نے سرد نظروں سے میری طرف دیکھتے ...کہا۔ "ہماری سرزمین تمھیں پکار رہی ہے اور اب چند گھنٹوں ...اس مقدس سرزمین پر قدم رکھو گے جہاں ہیکل سلیمانی کے ...والے حکمرانی کرتے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز اٹکتی محسوس کی۔ "تم ...جاہو میں وہاں جانے کے لیے تیار ہوں، تم جیسے مہربان لوگوں ...کو میں عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔"

اس عمارت کے باہر وہی جیپ موجود تھی۔ ہم چاروں اس ...سوار ہوئے اور بھورے بالوں والا راستے کی نشاندہی کرتا رہا۔ آخر ...ہم دو نشستوں والے جہاز کے قریب پہنچ گئے۔

"الوداع لوستاں!" ان دونوں نے ہاتھ لہرا کر بھورے بالوں ...والے سے کہا۔ "ہم تمھاری خوشگوار پرواز کے لیے دعاگو ہیں۔"

لوستاں نے مسکرا کر انھیں جواب دیا پھر وہ طیارے میں سوار ...ہو۔ میں بھی اسی کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔

مجھے اپنی برابر والی نشست پر بٹھا کر لوستاں نے حفاظتی تسمے ...مجھ پر کس دیئے۔ سر پر ایک خود پہنا دیا جس کے ساتھ ...ناک پر سانس لینے کے لیے آکسیجن کی نلکی لگی ہوئی تھی۔ اس ...کی ساخت اور انتظامات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ محض مختصر ...پرواز کے لیے محفوظ اور مناسب ہے جبکہ میری دانست میں وہاں ...سے تل ابیب کا فاصلہ کافی تھا۔

اپنی نشست پر تیار ہونے کے بعد لوستاں نے مائکروفون پر مجھ سے میری خیریت دریافت کی اور میں نے اسے بتایا کہ میں آرام سے ہوں۔

پھر لوستاں نے کنٹرول پینل پر لگی ہوئی ایک گھنڈی کو آہستگی اور احتیاط کے ساتھ جنبش دی، اسی کے ساتھ میری ناک میں ایک تیز اور ناگوار سی بُو آئی مگر اس سے قبل کہ میں اس کی نوعیت وغیرہ پر غور کرتا، میرے نظامِ تنفس میں داخل ہونے والی وہ گیس اپنا اثر دکھلانے لگی۔ محفوظ پرواز اور میری طرف سے بے فکری کی خاطر لوستاں نے مجھے مفلوج کر دینے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

چند سیکنڈ بعد آکسیجن فراہم کرنے والی نلی میں سے آنے والی بُو غائب ہو گئی اور تنفس پر پڑنے والا عارضی دباؤ بھی ختم ہو گیا۔

"اب تم آرام سے سفر کر سکو گے۔" مائکروفون سے گزر کر لوستاں کی نرم آواز مجھے اسپیکر میں سنائی دی۔

میں نے بولنا چاہا مگر میری زبان بھاری ہو چکی تھی۔ پھر جب میرا ذہن بے نام تاریکی کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہا تھا، تو مجھے جہاز کا اکلوتا انجن اسٹارٹ ہونے کا شور سنائی دیا۔ پینل پر سُرخ اور سبز رنگ کی بہت سی دھندلی روشنیاں نمودار ہو گئی تھیں جہاز رن وے پر دوڑنا شروع ہوا تو میں پوری مدافعت کے باوجود بے ہوش ہو چکا تھا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ وہ سفر کتنی دیر جاری رہا اور کس طرح گزرا۔ جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں ایک آراستہ اور آرام دہ خوابگاہ میں صاف ستھرے نرم بستر پر موجود تھا اور خوابگاہ میں ایرکنڈیشنڈ کا دھیما دھیما شور گونج رہا تھا۔

میں نے لیٹے لیٹے اس کمرے کا جائزہ لیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں جن لوگوں کے درمیان موجود ہوں ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمدردانہ ہی رہے گا۔

سفر کی تکان یا بے ہوش کرنے والی گیس کے اثر سے میرے بدن میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا اس لیے میں بستر پر ہی پڑا رہا غالباً لوستاں مجھے تل ابیب پہنچا چکا تھا اور اسرائیل میں موجودگی کے تصوّر نے میرا سارا تجسّس تباہ کر دیا تھا۔

"خوش آمدید صفدر!" اچانک کمرے میں ایک دلکش نسوانی آواز گونجی۔ "تم خود کو کیا محسوس کر رہے ہو؟"

میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گیا اور بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ لیکن وہاں عورت تو کیا عورت کا سایہ بھی موجود نہ تھا۔ خوابگاہ کا دروازہ بدستور بند تھا اور میں اس کمرے میں تنہا موجود تھا۔

اس بار لڑکی کی کھنکتی ہوئی ہنسی سنائی دی جس میں بلا کی جنسی کشش موجود تھی۔ پھر وہ بولی۔ "میں تم سے بہت دور ہوں تمھیں پریشان ہونے یا چونکنے کی ضرورت نہیں۔ میری آواز تم تک ریڈیائی

لہروں کے ذریعہ پہنچ رہی ہے اور میں تمھیں اپنے سامنے اسکرین پر دیکھ رہی ہوں۔ تم جو کچھ کہو گے، پوشیدہ مائیکروفون اسے من وعن مجھ تک پہنچا دیں گے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔ "تم کون ہو؟ اور میں کہاں ہوں؟"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ لیٹ گئے۔" وہ بولی۔ "ابھی تمھیں مزید آرام کی ضرورت ہے۔ میں کرنل ریٹا ہوں اور اس وقت تم اسرائیل میں موجود ہو۔"

"تمھاری آواز بہت دلکش ہے۔ میں تمھارا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنی دانست میں خاصا جارحانہ تبصرہ کیا۔

"میں تم سے ضرور ملوں گی۔" وہ بُرا منائے بغیر اسی پُرسکون اور میٹھے لہجے میں بولی۔ "مگر فی الحال یہ ممکن نہیں۔ میں کیپٹن ماریا کو تمھارے پاس بھیج رہی ہوں۔ وہ تمھاری میزبان ہوگی۔ تم بلا تکلف ضرورت کی ہر چیز طلب کر سکتے ہو۔"

"شکریہ کرنل ریٹا۔ تم خاصی نرم دل معلوم ہوتی ہو۔"

"یہاں تم لوگوں کو ہمیشہ نرم دل اور مہربان پاؤ گے۔ فی الحال میں تم سے اجازت چاہتی ہوں۔ کیپٹن ماریا جلدی تمھارے پاس پہنچ جائے گی۔"

اس کے بعد وہ آواز غائب ہوگئی۔

عہدوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں اسرائیلی افواج کے کسی خاص شعبے کی تحویل میں ہوں۔ آخر وہ لوگ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے تھے، ان کے عزائم کیا تھے؟ میرے لیے یہ گتھی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی تھی اور اس کا حل صرف ان ہی لوگوں کے پاس تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کیپٹن ماریا سراپا قیامت بنی اس کمرے میں آ پہنچی۔ سرخ بھبھوکا چہرے اور نیلی آنکھوں والی وہ طرار لڑکی اس قدر حسین تھی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے ترشے ہوئے سنہرے بال کیپ کے نیچے سے جھانک رہے تھے۔ جسم پر چست خاکی قمیض زیب تھی جس کے شانوں پر فوجی نشانات چمک رہے تھے۔ آدھی آستینوں میں سے اس کے گورے گورے سڈول بازو نظر آ رہے تھے۔ قمیض کے ساتھ اس نے خاکی رنگ کی نیکر پہنی ہوئی تھی جس میں چمڑے کی بیلٹ سے چرمی ہولسٹر جھول رہا تھا اور اس میں سے سروس آٹومیٹک کا سیاہ دستہ جھانک رہا تھا۔

خاکی نیکر کے نیچے بھری بھری ٹانگیں اور سڈول پنڈلیاں دیکھ کر تو میرے اعصاب بکھرنے لگے۔ ایسی فتنہ گر لڑکی میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہونٹوں پر دعوت انگیز مسکان لیے میری ہی طرف نگراں تھی اور اس کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔

"میں کیپٹن ماریا ہوں صفدر۔ تمھاری میزبان۔" اس نے قریب آکر خالص امریکی لہجے میں کہا اور داہنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے مسحور کن انداز میں نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے نرم و گداز ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی میرے وجود میں آگ سی لپک اٹھی۔

"تم کیسے ہو؟" اس نے بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی کو ٹھوکر سے درست کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے ہندوستان میں لڑکیوں سے طویل مصافحے کا رواج پایا جاتا ہے۔" وہ قہقہہ مار کر بولی اور میں نے بوکھلا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"شکریہ!" یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا تم واقعی اسرائیلی فوج میں ہو؟" میں نے تعریفی انداز میں اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"تو کیا تم مجھے کوئی بہروپیہ سمجھ رہے ہو؟" وہ بے تکلفی سے بولی۔ "اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو کرنل تمھیں میرے بارے میں پیشگی اطلاع دے چکی ہے۔"

"لڑائی بھڑائی اور گولہ بارود چلانا تمھاری جیسی لڑکیوں کا کام نہیں ہے۔"

"جب نفری کم ہو اور دشمن کی تعداد بہت زیادہ تو لڑکیاں کیا حاملہ عورتیں بھی توپیں داغنے پر مامور کر دی جاتی ہیں۔" وہ یک بیک سنجیدہ ہوگئی۔

"تمھیں کسی حقیقی جنگ کا تجربہ ہے؟"

"دو جنگوں میں میں نے محاذ پر اپنے دستوں کی قیادت کی ہے۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا، پھر اپنے سینے پر آویزاں تمغوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ میرے ان ہی کارناموں کی یادگار ہیں۔ ویسے تو ہم ہر وقت ہی برسرِپیکار ہیں۔"

"اگر تم جیسی لڑکی محاذ پر موجود ہو تو سپاہیوں کا مورال ویسے ہی بلند رہتا ہوگا۔" میں نے سنجیدگی سے گریز کی خاطر کہا۔

اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "یہ تم اپنے یہاں کی بات کر رہے ہو۔ اسرائیلی مرد اور عورتیں خندقوں میں کئی کئی دن پہلو بہ پہلو اسلحہ بدست پڑے رہتے ہیں اور کسی کو بھول کر بھی جنس کا خیال نہیں آتا۔ محاذ پر ہر ایک صرف جنگجو ہوتا ہے نہ عورت نہ مرد۔"

"پھر تو اسرائیلی مردوں کی مردانگی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔" میں ہنس کر بولا۔ وہ لڑکی بہت جلد بے تکلف ہو جانے والی معلوم ہوتی تھی اور اس سے دوستی بڑھانا سود مند نظر آ رہا تھا۔

جواب میں اس نے بھی ایک مترنم قہقہہ لگایا۔ "یہ نہ کہو۔ محاذ سے دور ہوں تو عورتوں کے حق میں وہ بھیڑیے بن جاتے ہیں۔ یہ دیکھو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی داہنی ٹانگ میرے سامنے کر دی جہاں اس

[...]نوں سے اوپر نرم اور چکنی جلد پر کسی زخم کا ایک بڑا سا ابھرا نمایاں تھا۔ "سینائی میں ایک محاذ پر میں ستر گھنٹے تک اپنے [...] سپاہی کے ساتھ خندق میں پڑی مشین گن چلاتی رہی مگر اسے کچھ [...] پھر جوں ہی جنگ بندی کا اعلان ہوا، وہ اپنے رینک کی پروا [کئے] بغیر مجھ پر ٹوٹ پڑا۔

جنون کے عالم میں اس نے اپنے دانت میری جلد میں [پیوس]ت کر دیے تھے اور میں کئی دن بعد چلنے کے قابل ہو سکی تھی۔"

"اور اس کا کیا حشر ہوا؟"

"وہ دو مہینے کے لیے گوریلا ٹریننگ کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ [...]ہولی اور ذاتی باتوں پر ہم اپنے سپاہی ضائع نہیں کرتے۔"

"مگر ڈسپلن بھی تو کوئی چیز ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس نے ڈسپلن کہاں توڑا ہے؟ اگر میں اسے روکنا چاہتی تو [...]ں اسے شوٹ کر دیتی۔" وہ سادگی سے بولی۔ "میں نے تو اسے محض [اس ل]یے گوریلا ٹریننگ کیمپ بھجوایا تاکہ آئندہ وہ عورتوں کے ساتھ [...]گی کے مظاہرے سے باز رہے۔"

"بڑی رنگین زندگی ہے تمھاری!" میں نے حسرت بھرے لہجے [میں] کہا۔

"ہم آتش فشاں کے دہانے پر جنت بسانے کی کوششوں میں [مصروف ...]رف ہیں مسٹر صفدر! دور سے تمھیں رنگینی نظر آتی ہے مگر یہ تو سوچو [...]رت کے تقاضے کیا ہوتے ہیں۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں شادی کے [...]نے سپنے آنکھوں میں بسائے محاذ پر برستی آگ میں جل گئیں۔ [...] اس زندگی کو بھی مسرت سمیٹنے میں بسر نہ کریں تو آخر کیا کریں؟"

"آتش فشاں کے دہانے پر جنت!" میں نے اس کے الفاظ [...]ئے پھر سوال کیا۔ "یہ تو بتاؤ کہ یہ کوشش مجنونانہ نہیں ہے کیا؟"

"ہم سر چھپانے کی جگہ چاہتے ہیں مسٹر صفدر!" وہ جذباتی لہجے [میں] بولی۔ "ہمیں ہمیشہ دبایا گیا۔ ملک دیا گیا تو اتنا مختصر کہ غلیل سے پھینکا [ہوا] پتھر سرحد کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ جائے۔ [...]لوگوں کو یہ ٹکڑا بھی زہر لگتا ہے۔ ہمارے وجود کو پچیس برس ہوئے [...] اور ہم اپنی بقا کی خاطر تین ہولناک جنگیں لڑ چکے ہیں اور کچھ پتہ [...] کب چوتھی جنگ چھڑ جائے۔"

"مگر اب تو توپ کا گولہ بھی تمھاری سرحدوں کے پار نہیں جا [سک]تا" میں نے کہا۔

"یہ درست ہے مگر عرب اسے تسلیم کہاں کرتے ہیں۔ ہم مصنوعی [...] نظری سرحدیں چاہتے ہیں جن میں رہ کر ہم اپنی جنت تعمیر [کر] سکیں۔"

"تمھارے منہ سے یہ خشک گفتگو اچھی نہیں لگتی۔"

"اسرائیل میں تم چھ برس کے کسی بچے کو بھی چھیڑو گے تو وہ [...]ہی باتیں بتائے گا۔ میں نے کہا ناکہ ہمارے لیے یہ بقا کا مسئلہ ہے اور تم اسے خشک گفتگو کہتے ہو۔ اقوام متحدہ میں لوگ آتے ہیں۔ لچھے دار باتیں کرتے ہیں اور ہمارے مسئلے کو سمجھے بغیر ہمیں طنز، تضحیک اور گالیوں کا نشانہ بنا کر چلے جاتے ہیں۔ دراصل کوئی بھی سنجیدگی کے ساتھ ہماری بات سننے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔"

"امریکہ نے ہمیشہ تمھارا ہی ساتھ دیا ہے۔"

"اس لیے کہ وہ مجبور ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اس نے ہمیں ایک یتیم بچہ سمجھ کر اپنی سرپرستی میں لیا تھا اور ہماری حمایت کرتا رہا۔ مگر آج وہ ہمیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ہماری حمایت میں اتنا آگے نکل چکا ہے کہ اس کے لیے واپسی دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ اسرائیل کی بقا اور سلامتی اس کے لیے انا کا مسئلہ بن چکی ہے۔"

"اچھا یہ باتیں ختم کرو، مجھے اپنے بارے میں کچھ باتیں بتاؤ۔"

"پوچھو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "جہاں تک ممکن ہوا ضرور بتاؤں گی۔"

"لہجے سے تم خالص امریکی معلوم ہوتی ہو؟" میں نے تائید طلب لہجے میں کہا۔

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "میں سن ۶۵ میں اپنے باپ کے ساتھ ہجرت کرکے یہاں آئی تھی۔ وہ امریکی ایئر فورس میں ہوا باز تھا اور محض اسرائیل کے لیے استعفیٰ دے کر یہاں آگیا اور اب بھی ایئر فورس میں ملازم ہے۔"

"شادی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

وہ مسکرا دی۔ "اچھا سوال کیا ہے تم نے۔ بولو تم تیار ہو میرے ساتھ شادی کے لیے؟"

میں اس بے ہودہ سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک ایسی لڑکی جو چند لمحوں قبل اپنے ایک ماتحت کے ساتھ اپنے جنسی تعلق کا اعتراف کر چکی ہو، کسی بھی طرح ایک شریف آدمی کے قابل نہیں تھی۔

"اسرائیل میں مرد کم اور عورتیں زیادہ ہیں۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد وہ بولی۔ "پھر میرے نزدیک شادی جنسی ضرورتوں کو پورا کرنے اور افزائش نسل کا دوسرا نام ہے۔ شادی کے بغیر میں بہتر طور پر اپنی فطری ضروریات پوری کر لیتی ہوں۔ جہاں تک افزائش نسل کا سوال ہے میں دو عدد بچوں کی ماں ہوں۔"

"بچے؟" میں نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں ہاں، اس طرح چونک کیوں رہے ہو؟" وہ جارحانہ لہجے میں بولی۔ "بچے شادی کی دستاویز پر دستخط کرنے سے وجود میں نہیں آتے۔ جو ملک حالت جنگ میں یا برسرپیکار ہوں وہاں اخلاقی اقدار برباد ہو جاتی ہیں۔ جائز اور ناجائز کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور ہم تو پچیس برس سے برسرپیکار ہیں۔ ہم سے ان روایتی اقدار کی توقع ہمارے ساتھ ظلم ہے۔"

"اور وہ بچے تمھارے پاس ہیں؟"

"سرکاری خرچ پر نرسری میں پل رہے ہیں۔ میں ان سے ملنے ضرور جاتی ہوں۔"

"اور بچوں کا باپ؟"

"ایک نہیں، دونوں کے الگ الگ باپ ہیں اور وہ بھی ضرور وہاں جاتے ہوں گے کیونکہ وہ ان کے وجود سے بے خبر نہیں ہیں۔"

"بڑے ہو کر ان بچوں کا مقام کیا ہوگا کیپٹن؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ میرے لیے اس کی دوٹوک باتیں شدید حیرت کا باعث ثابت ہو رہی تھیں۔ اخلاق کے اس زوال کا تصور بھی میرے لیے ناممکن تھا، جہاں ایک عورت کھلے بندوں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی پھرے۔

"ان کا مقام آسمانوں میں طے ہو چکا ہے۔" وہ پورے اعتماد سے بولی۔ "ہو سکتا ہے میرے بچوں میں سے ہی کوئی آنے والے دنوں میں اسرائیل پر حکمرانی کرے۔ جب جرمنی کے عوام بے باپ کے ایک بچے کو عزت کی معراج پر پہنچا سکتے ہیں تو اسرائیل والے ان سے کم فراخدل نہیں ہیں۔ تم ان کے مقام کی فکر نہ کرو مسٹر صفدر۔ ان کے مقدر میں جو لکھا جا چکا ہے وہ انھیں ضرور مل کر رہے گا۔"

"تم واقعی عجیب عورت ہو!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اگر تم مجھے عجیب کہتے ہو تو اسرائیل میں تمھیں بیشتر لڑکیاں عجیب ہی ملیں گی۔" اس نے اپنے نیکر کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی پیش کی ہوئی سگریٹ سلگا کر چند گہرے کش لیے پھر سکوت توڑتے ہوئے سوال کیا۔ "کیپٹن! کیا تم بتا سکتی ہو کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو ضرور بتا دیتی۔" وہ فضا میں دھوئیں کے مرغولے بکھیرتے ہوئے بولی۔

"تم ایک ذمہ دار عہدے پر مامور ہو، کم از کم تمھیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے تم لوگوں کی تحویل میں کس لیے دیا گیا ہے؟"

"تمھیں چند دن بعد گوریلا جنگ لڑنے والوں کے تربیتی کیمپ میں بھیجا جائے گا۔" وہ چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد بولی۔

"مگر کس لیے؟ میں نے تو کسی خاتون کے ساتھ درندگی کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا ہے!"

میرے اس تبصرے پر بھرپور انداز میں ہنس پڑی اور میں بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔ جب اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولی۔ "تمھیں سزا کے طور پر وہاں نہیں بھیجا جا رہا۔ تمھیں بطور خاص اس تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ شاید تمھیں خلیج کے کسی علاقے سے یہاں لایا گیا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اگر میرے مقدر میں وہی تربیت لکھی جا چکی ہے تو میں مہلت کے یہ چند روز تل ابیب دیکھنے میں گزارنے چاہتا ہوں۔"

"ضرور دیکھو۔" وہ جلدی سے بولی۔ "اس طرح تم اسرائیل کو بہتر طور پر سمجھ سکو گے۔"

"مجھے کوئی گائیڈ مل سکے گا؟"

"یہاں تم مہمان کے طور پر مقیم ہو۔ چاہو گے تو گائیڈ مل جائے گا مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ اکیلے ہی شہر گھومنے کی کوشش کرو۔"

"اجنبی شہر اور راستوں میں بھٹکنے کا بھرپور امکان ہوتا ہے۔"

"فکر نہ کرو تم بھٹکنے نہ دیے جاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیہ کے سائز کا ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ "کہیں باز پرس کی جائے تو تم بلا تردد یہ شناختی کارڈ دکھا سکتے ہو۔"

میں نے وہ کارڈ دیکھا تو اس پر میرا ایک ننھا سا مگر بہت واضح کلوزاپ چسپاں تھا اور ساتھ ہی میرا نام بھی درج تھا۔ کارڈ کے اوپر انگریزی میں آرمی انٹیلیجنس کور کے الفاظ درج تھے۔ ان کے نیچے گیارہ ہندسوں پر مشتمل ایک نمبر درج تھا اور کارڈ کے نیچے کسی کے دستخط مع مہر کے موجود تھے۔ پورا کارڈ پلاسٹک کے کور میں سیل تھا۔

"میری یہ تصویر کب لی گئی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اسرائیل کی سرزمین پر اترتے ہی۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اب ان معمولی باتوں پر پریشان ہونا چھوڑ دو۔ یہاں تمھارا واسطہ ایسی بے شمار چیزوں سے پڑے گا۔"

"مگر اس وقت تو میں بے ہوش تھا۔ اس تصویر میں میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں پوری طرح ہوش و حواس میں نظر آ رہا ہوں۔" میں نے غور سے اپنی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ معمولی باتیں ہیں۔" وہ بولی۔ "اگر میرے لیے کوئی کام ہو تو بتاؤ ورنہ آرام کرو۔ جب بھی باہر جانا چاہو بلا روک ٹوک جا سکتے ہو مگر یہ واضح کر دوں کہ دانستہ بھٹکنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"تم بے فکر رہو، ویسے میرے لیے تنہا آرام کا تصور بے معنی ہے۔" میں نے آخری فقرہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

کسی لڑکی کے قرب کے متلاشی ہو؟

"اسرائیل میں تم پہلی لڑکی ہو جس سے میری ملاقات ہوئی ہے۔"

"مگر میرے لیے تم پہلے مرد نہیں ہو۔" اس بار وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں ہر شخص کے لیے اتنی سہل الحصول نہیں ہوں۔"

"کیپٹن میں تمھیں پسند کرنے لگا ہوں۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی لہجے میں کہا۔ "یہ رات میں تمھارے ساتھ بسر کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ دھیمے سے مسکرا دی۔ "یہ رات نہیں دن ہے۔ باہر نکل کر دیکھو کہ کیسی چمکتی ہوئی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔"

میں بھی خفت آمیز انداز میں ہنس دیا۔ "اس کمرے میں تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ دن ہے یا رات!" میں نے یہ کہتے ہوئے اسے کرسی پر اپنے قریب بٹھا لیا۔

"میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔" وہ مسکرا کر شوخ لہجے میں بولی۔

"میزبان کی حیثیت سے میری خدمت میں تمھاری ڈیوٹی ہے۔"

کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اماوس کی کسی گھور رات کا اندھیرا ہر شے کو نگل گیا۔

"تم مجھے بہت جلد بھول جاؤ گے صفدر!" جذبوں کی ہولناک یورش میں اس کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی جو کسی گہرے کنوئیں کی تہہ سے ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"تمھیں بھلانے کے لیے پتھر کا دل چاہیے کیپٹن!"

"مجھے تم بار بار عہدے کا احساس کیوں دلا رہے ہو؟" اس کی ڈوبتی ہوئی آواز ابھری۔ "کیا میرا نام تمھارے ذہن سے اتر گیا ہے؟"

"تمھارا نام!" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "چاہوں بھی تو بھلا نہ سکوں گا۔"

"اس کے باوجود کہ میرا وطن اسرائیل ہے اور میں یہودی ہوں۔"

"جذبوں کا کوئی وطن اور مذہب نہیں ہوتا ماریا۔"

"مگر ہر مسلمان اسرائیل اور یہودیوں سے نفرت کرتا ہے۔" اس کے ہونٹوں سے پگھلی ہوئی دھیمی سی آواز نکلی۔

میں مسلمانوں کی مدافعت میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ معاً میرے ذہن میں خطرے کی للکار گونجی۔ وہ نہ میری محبوبہ تھی نہ پرانی آشنا، شاید وہ اب تک وہی کچھ کر رہی تھی جو اپنے فرائض کے پیش نظر اسے مجھ سے تجاوز کر کے کرنا چاہیے تھا۔ بدن سے حجاب سرکانے کے بعد وہ میرے ذہن سے بھی پردے سرکا کر اندر جھانکنا چاہتی تھی۔ اپنی پرجوش حرارت انگیز آغوش میں پگھلتے ہوئے میرے منہ سے کوئی بات صحیح نہ نکلتی۔ اس نے شاید مجھے سب سے موثر نفسیاتی حربے کا نشانہ بنانا چاہا تھا اور میں نے پل بھر میں اس کا وار اسی پر آزمانے فیصلہ کر لیا۔

"شاید تمھیں میرا اصل نام نہیں معلوم۔ میرا اصل نام ودیا ساگر تھا۔ میرا جہان نے صفدر بنایا ہے۔ مجھے کسی سے عداوت نہیں۔"

"اوہ۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔" میری آغوش میں وہ اٹھلا کر بولی۔ "تم تو ہندو ہو۔"

"ہاں۔ ہر ہندو کے دل میں اسرائیل سے ہمدردی کے جذبات پلتے ہیں۔" میں نے مکاری اختیار کرتے ہوئے کہا۔ جذبات کی لہر اب ذاتی تحفظ کے احساس میں دب گئی تھی مگر اسے شبہ کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے میں اس کے وجود میں سلگتی ہوئی آگ کو پوری طرح بھڑکانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ میرے لیے وہ مسرت کے لمحے تھے۔ میں یہودی افواج کی ایک ذمہ دار افسر پر مسلط تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے میں نے اسے آلۂ کار بنایا ہوا تھا اور وہ میرے اصل جذبات سے بے خبر اس آگ میں جلتی جا رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "جب مذہب کے نام پر ہند کے دو ٹکڑے کر کے پاکستان بنایا گیا تو ہر طرف شادیانے بجائے گئے مگر مذہب کے نام پر جب بالشت بھر زمین پر اسرائیل قائم ہوا تو ہر طرف طوفان آگیا۔ ہندیوں کو تو ہم سے ہمدردی ہونی ہی چاہیے۔ ان کی حمایت مسلمانوں کو چرکے لگاتی ہوگی۔"

"اگر ہماری سرکار کے سامنے کچھ مجبوریاں نہ ہوں تو وہ کھل کر تمھاری حمایت کر سکتے ہیں۔"

"ختم کرو ان خشک باتوں کو۔" اس کا مطلب پورا ہو چکا تھا۔ اس کے لیے اب یہ موضوع بے کار تھا۔

اور جب کمرے میں پھیلا ہوا گناہ پرور اندھیرا دور ہوا تو اس کا چہرہ بشاش تھا۔ اس بار وردی اس کے بدن پر زیادہ ہی سج رہی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس لباس نے کیا قیامت چھپائی ہوئی ہے۔

"آخر کار تم نے بھی گوریلا کیمپ جانے کا جواز پیدا کر ہی لیا۔" وہ اپنے گداز بازو کو ہولے ہولے سہلاتے ہوئے بولی۔

"غور کرو گی تو شاید مجھے کئی بار اس کیمپ میں بھیجنا پڑے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے۔" اس نے ...... نچلے ہونٹ پر زبان پھیر کر کہا۔ "اب میں جا رہی ہوں۔ میری ضرورت پیش آئے تو سرہانے لگا ہوا سبز بٹن دبا دینا۔"

"تو جاتی کہاں ہو، میں اسے ابھی دبائے دیتا ہوں۔" میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" وہ جلدی سے بولی۔ "مجھے کچھ ضروری کام ہے۔"

اور وہ چلی گئی۔ میں روشنی گل کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور اپنے ذہن میں اس گفتگو کو ترتیب دینے لگا جو میرے اور ماریہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس گفتگو پر میں جتنا غور کرتا گیا، یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ اسرائیلی میری ذات کو کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے مگر اصل مسئلے کی ابتدا سے قبل وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں اسرائیل اور یہودیوں کے بارے میں کن خیالات کا مالک ہوں۔ یہ جاننے کے لیے انھوں نے پیچیدہ طریقہ کار کے بجائے سیدھا، سہل اور بہترین طریقہ

اختیار کیا تھا۔ ماریا نے اس کمرے میں جو رویہ اختیار کیا وہ شاید ان ہدایات کے عین مطابق تھا جو اسے دی گئی تھیں۔ اگر مجھے ابتدا میں یہ شبہ بھی ہو جاتا تو میں اپنی جانب سے پیش قدمی نہ کرتا مگر ماریا ہر قیمت پر میرے بستر پر پہنچ کر ہی دم لیتی۔ اگر میں اس کو نظر انداز کرتا تو وہ بہتر اور براہِ راست اقدامات بھی کر سکتی تھی۔

یہی سب سوچتے سوچتے مجھے گہری نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو ملحقہ غسل خانے میں نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کافی دیر تک کھڑا رہا۔ میرا ذہن خالی خالی تھا۔ کبھی میں ستیا کے بارے میں سوچنے لگتا کبھی مجھے اپنے بہن بھائی یاد آتے جن سے میں مدت پہلے بچھڑ گیا تھا۔

خواب گاہ میں ایک الماری میں میرے سائز کے تین جوڑے موجود تھے جو میری لاعلمی میں وہاں پہنچائے گئے تھے۔ میں لباس تبدیل کر کے باہر نکلا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔

میں جس کمرے میں مقیم تھا وہ ایک تین منزلہ خوبصورت عمارت کے فلیٹ میں واقع تھا۔ اس فلیٹ کے بقیہ کمرے ویران پڑے تھے البتہ ان میں آرائش اور سہولت کا سارا سامان میسّر تھا۔ ماریا نے اپنی طلبی کے لیے مجھے جس انداز میں گھنٹی بجانے کا مشورہ دیا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود بھی اسی عمارت کے کسی فلیٹ میں مقیم ہے۔

میں نے لفٹ کے قریب لگی ہوئی مکینوں کی فہرست دیکھی جس میں میرا نام بھی موجود تھا مگر اس فہرست میں کسی عورت کا نام موجود نہیں تھا۔

باہر تل ابیب کی کشادہ اور روشن سڑکیں ٹریفک کے ہجوم سے پُر تھیں۔ جا بجا ہوٹلوں، دکانوں اور مصنوعات کے بڑے بڑے نیون سائن روشن تھے۔ میں بھی فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

تل ابیب میں گو شہری زندگی معمول پر تھی۔ فضا لوگوں کے بے فکرے قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ ارد گرد سے لاپرواہ نوجوان جوڑے بھینی بھینی خوشبوؤں میں بسے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مختلف سمتوں میں رواں دواں تھے۔ بیشتر لڑکیاں کھلے ہوئے نیچے گلے والے بلاؤز اور منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھیں۔ گورے رنگ مطمئن چہرے..... اور عمومی خوشحالی کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ تل ابیب نہیں، یورپ کے بے فکروں کا کوئی ترقی یافتہ شہر ہے۔

مگر اس کے باوجود ماحول پر عجیب سی ہیبت طاری تھی۔ اہم مقامات پر جا بجا ریت سے بھری ہوئی سینکڑوں بوریوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ہر چند سو میٹر کے فاصلے پر فضائی حملہ کی صورت میں بچاؤ کے لیے پناہ گاہوں کی نشاندہی کرنے والے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں خندقیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کے اوپری نصف حصوں پر سیاہ رنگ موجود تھا۔ تمام عمارتوں وغیرہ پر الیسا رنگ کیا ہوا تھا کہ بلندی پر پرواز کرنے والے دشمن طیاروں کے ہوا باز اندھیرے میں انھیں نہ پہچان سکیں۔ ان سب پر مستزاد وہ بھاری فوجی گاڑیاں تھیں جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے گڑگڑاتی ہوئی سڑکوں سے گزرتی تھیں۔ ان تیاریوں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی..... بھی لمحے جنگ چھڑنے والی ہو مگر لوگوں کے اطمینان اور بے فکری سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان تیاریوں کے عادی ہیں۔ کسی کے بھی بشرے سے اعصابی تناؤ یا خوف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہودیوں کا یہ رویّہ حیرت کا باعث تھا۔

تل ابیب میں جا بجا بڑے بڑے ہوٹل، شراب خانے، ناچ گھر اور تفریح کے ایسے دوسرے بہت سے مقامات موجود تھے جہاں سیاحوں کے لیے بڑی کشش تھی۔

مختلف گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا جب میں ایک نسبتاً پُرسکون علاقے میں پہنچا تو خود بخود میرے قدم ایک شراب خانے کی طرف اٹھ گئے۔

شراب خانے کی فضا دھوئیں اور مختلف شرابوں کی ملی جلی بُو سے بوجھل تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر لگے ہوئے اسپیکرز سے دھیمی آواز میں ہیجان خیز مغربی موسیقی ابھر رہی تھی اور جواں سال، خوبرو یہودی لڑکیاں گاہکوں کو مسکرا مسکرا کر شراب پیش کر رہی تھیں۔

جب میری فرمائش پر ایک لڑکی جانی واکر بلیک لیبل وہسکی کا ڈبل پیگ لے کر آئی تو گلاس، سوڈے کی بوتل اور سالٹفن میز پر رکھتے ہوئے غیر ضروری طور پر وہ جھکی۔

”کچھ سینڈوچ وغیرہ۔“ اس نے اسی طرح جھکے جھکے مجھ سے دریافت کیا۔

”اپنے لیے بھی ایک ڈبل پیگ لے کر اسی میز پر آ جاؤ۔“

”ڈیوٹی کے دوران ہمیں گاہکوں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”دس بجے میری ڈیوٹی ختم ہو گی پھر کہیں چلیں گے۔“ آخری فقرے اس نے تائید طلب لہجے میں کہے تھے۔

”دس بجے میں دوبارہ آؤں گا۔“

”ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گی، میرا نام شیرلین ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک قاتل ادا کے ساتھ مسکراتی ہوئی دوسری میزوں کی طرف چلی گئی۔

میں کچھ دیر کے بعد بار سے نکلا تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ہلکا ہلکا سرور آنے لگا اور میں سیدھا ایک طرف چل دیا۔

کافی دیر بعد میں نے خود کو ایک ایسے علاقے میں پایا جہاں سڑکیں ویران پڑی ہوئی تھیں اور دور دور تک کوئی راہ گیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے رُک کر واپسی کے راستے کا جائزہ لینا چاہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ بار والی لڑکی سے وعدہ تو محض رسمی تھا میں دراصل اب واپس

پہنچنا چاہتا تھا۔

پھر اسی وقت نہ جانے کہاں سے میرے عقب میں ایک شخص ۔۔۔ چند ثانیوں قبل تک وہ طویل فٹ پاتھ دور تک ویران ۔۔۔ تھی۔ پل بھر میں اس کا یوں ظاہر ہونا اس بات کا غماز تھا ۔۔۔ سائبان یا دیوار کے سہارے چپکا پہلے سے وہاں کھڑا تھا۔

وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا میرے قریب آ کر رُک گیا۔ اس ۔۔۔ پیروں میں کریپ سول والے جوتے موجود تھے، اور چہرے سے وہ ۔۔۔ باراں دیدہ نظر آ رہا تھا۔

”شناخت؟“ اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ۔۔۔ انگریزی میں مطالبہ کیا۔

میں اس وقت ہلکے سے سرور میں تھا اور میرے لیے وہ ملک ۔۔۔ اجنبی تھا مگر میں ایسے معاملات سے نمٹنا خوب جانتا تھا۔ میں نے ۔۔۔ اس سے سوال کر ڈالا۔ ”تم کس اختیار کے تحت میری شناخت طلب ۔۔۔ کرنے کے مجاز ہو؟“

”یہاں کوئی شخص بغیر اختیار کے کوئی کام نہیں کرتا۔“ اس نے ۔۔۔ لہجے میں یہ کہہ کر اپنی جیب سے نکال کر اپنا شناختی کارڈ میری طرف ۔۔۔ بڑھا دیا۔

کارڈ پر جو کچھ بھی لکھا ہوا تھا وہ میرے پلے نہ پڑ سکا کیونکہ زبان ۔۔۔ تھی البتہ کارڈ پر سب سے اوپر اسرائیلی حکومت کا خصوصی نشان ۔۔۔ ہوا تھا۔

میں نے خاموشی سے اپنا کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ کارڈ کا ۔۔۔ لیتے ہوئے اس کے چہرے کے جو تاثرات تھے ان کی بنا پر میں نے ۔۔۔ اندازہ لگا لیا کہ وہ میرے بارے میں پہلے سے سب کچھ جانتا ہے اور کارڈ ۔۔۔ اس لیے طلب کیا تھا کہ مجھ سے بات کرنے کا بہانہ پیدا کر سکے۔

”میں اپنے فلیٹ کا راستہ بھول گیا ہوں۔“ میں نے کارڈ واپس لیتے ۔۔۔ نرم لہجے میں اسے اپنی تازہ پریشانی سے آگاہ کیا۔

”میرے ساتھ چلے آؤ۔“ اس نے کہا۔

چند چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم پھر ایک ۔۔۔ بڑی سڑک پر آ گئے جہاں سے اس نے ٹیکسی لی۔ میں پچھلی اور وہ ۔۔۔ نشست پر بیٹھ گیا۔

مجھے عمارت کے سامنے اتار کر وہ اسی ٹیکسی میں آگے کہیں چلا گیا۔

کمرے میں آ کر لباس تبدیل کرتے ہوئے جب میں نے پتلون کی ۔۔۔ جیبیں خالی کیں تو حیرت سے میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑک اٹھا۔ میری جیب میں سبز رنگ کا ایک مڑا تڑا پرچہ موجود تھا جو چہل ۔۔۔ قدمی کے دوران میں کسی نے نہایت مہارت سے میری جیب میں پہنچا ۔۔۔ دیا تھا کیونکہ تیار ہوتے وقت جیب میں کوئی پرچہ وغیرہ موجود نہیں ۔۔۔ تھا۔ میں نے احتیاط سے اس کی تہیں کھولیں تو اس پر انگریزی میں ایک دھمکی تحریر تھی۔ ”زندگی چاہتے ہو تو کل شام سات بجے ریگل اسٹور کے آخری کاؤنٹر والی لڑکی سے باون انچ کا بلاؤز طلب کرو۔“ تحریر کے نیچے کسی کے دستخط کے بجائے فلسطینی افواج آزادی لکھا ہوا تھا۔

رقعہ پڑھ کر میرے بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل گئے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ رقعہ واقعی فلسطینی افواج آزادی کے کسی رکن نے میری جیب میں پہنچایا ہے یا محض مجھے آزمانے کے لیے اسرائیلیوں نے میرے ساتھ یہ حرکت کی ہے۔ اس بارے میں میرے اندازے کی ذرا سی غلطی مجھے موت کے دہانے پر پہنچا سکتی تھی۔

پھر مجھے معلوم تھا کہ وہ کمرہ ٹی وی کیمرے کی زد میں ہے جس پر کرنل ریٹا مجھے دیکھ سکتی تھی۔ اگر وہ میرے ہاتھ میں یہ پرچہ اور چہرے میرے تاثرات دیکھ چکی تھی تو میں اس پرچے کی اصلیت پر یقین کرنے کے باوجود ان لوگوں کو اس کے بارے میں بتانے پر مجبور تھا۔ ایسی صورت میں اسرائیلی براہِ راست ریگل اسٹور والی سیلز گرل پر ہاتھ ڈال دیتے اور میں فلسطینی افواج آزادی کے دشمنوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا۔

میں نے آہستگی سے وہ رقعہ دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور احتیاط کے ساتھ اس کمرے میں ٹی وی کیمرہ تلاش کرنے لگا۔

جس وقت کرنل ریٹا نے مجھ سے گفتگو کی میں اپنے بستر پر موجود تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ کیمرہ جہاں بھی تھا بستر اس کی زد میں آ سکتا تھا۔

اس مفروضہ کی بنا پر میں جلد ہی کیمرہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیمرہ نہایت مہارت کے ساتھ ایک دیوار گیر ریک میں اس طرح نصب کیا گیا تھا کہ اس کا لینس ریک کے دروازے کے شیشے سے مل گیا تھا اور وہ ریک خوش قسمتی سے ایسی جگہ لگا ہوا تھا جہاں سے لینس کا رخ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف کیا جانا ناممکنات میں سے تھا۔

یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس طرح کم از کم میں ایک ذہنی دباؤ سے بچ گیا تھا اور اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس پرچے میں درج ہدایت کو قبول کر لوں یا اسے جعلی مان کر کیپٹن ماریا کو اس سے باخبر کر دوں۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے پہلے ماریا سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ رقعہ میں نے اپنے سلیپنگ سوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

گھنٹی کا بٹن دبانے کے تقریباً دس منٹ بعد کیپٹن ماریا آئی۔ اس وقت وہ ہلکے گلابی رنگ کے ایوننگ ڈریس میں ملبوس تھی اور دوپہر والی شخصیت سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔

”ہیلو ماریا۔ اس وقت تو تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔“ میں نے تپاک سے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

”تم بہت دیر سے واپس آئے۔“

”راستہ بھٹک گیا تھا۔ اگر ایک آدمی میری مسلسل نگرانی نہ کر رہا ہوتا تو شاید ابھی تک واپس نہ آتا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”نگرانی؟“ وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”تمھیں کس وقت

اس کی موجودگی کا علم ہوا؟"

"شروع ہی سے وہ میری نظروں میں آگیا تھا۔" میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔

ماریا کی تیوریوں پر بل پڑ گئے "مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اس قدر گدھا ثابت ہوگا۔" پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی "تمہاری شام کیسی گزری؟"

"سعودی ریال دے کر شراب پی لی ورنہ خشک ہی گزرتی۔"

"اور اس سے دوبارہ نہیں ملے؟"

"کس سے؟" اس بار حیران ہونے کی باری میری تھی۔

"شیریلین سے۔" وہ قہقہہ مار کر بولی "وہ ابھی تک تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"تمہارے بعد کسی سے ملاقات کو دل نہیں چاہتا۔"

"پھر ملنے کا وعدہ کیوں کر آئے تھے؟"

"یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر اتنی گہری نظر رکھی جائے گی۔ میں تو بس یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسرائیل میں ملازمت پیشہ لڑکیاں کس حد تک قابل حصول ہیں۔"

"یہ یاد رکھنا کہ یہاں نگراں آنکھیں ہر قدم پر پیچھا کرتی ہیں۔"

"شاید دوپہر کے مناظر بھی کرنل ریٹلانے ٹی وی پر دیکھے ہوں گے!"

"تم ایڈیٹ ہو۔" وہ جھینپ کر بولی "اندھیرے میں کام کرنے والے کیمرے ابھی ایجاد نہیں ہو سکے ہیں۔"

"مگر سن تو ضرور لیا ہوگا؟"

"نہ بھی سنے تو آوازیں ریکارڈ ہوتی رہتی ہیں۔ یہ گفتگو بھی ریکارڈ ہو رہی ہے۔"

"اور تمہیں اس پر کوئی تشویش نہیں ہے۔" میں نے فوراً اس کی دکھتی رگ پکڑ لی "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کمرے میں آ کر تم وہی کرتی رہی ہو جو تمہیں کرنا چاہیے۔"

"ظاہر ہے۔" وہ سکون سے بولی "یہ نہ سمجھنا کہ اس وقت میں تمہاری مردانہ وجاہت سے مرعوب ہو کر تمہارے قریب آگئی تھی میں تمہیں بتا چکی تھی کہ ان معاملوں میں میں بہت تجربہ کار ہوں۔ تمہارے ذہن کی گہرائی میں اترنے کے لیے وہ کارروائی ضروری تھی اور اس کے خاطر خواہ بہتر نتائج برآمد ہوئے ہیں۔"

"عورتوں کو فوجی بنانے کا واقعی بڑا فائدہ ہے۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"کوئی نئی بات سوجھی ہے کیا؟"

"گولہ بارود کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے قدرتی ہتھیاروں کے استعمال پر اتر آئیں تو چند عورتیں پورے ڈویژن صاف کر سکتی ہیں۔"

وہ خاصی دیر وہاں موجود رہی۔ اس کی طرف سے میرے دل میں عجیب خلش پیدا ہو گئی تھی۔ اسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ اپنے جسم کے سہارے میرے خیالات معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ عقل سے بالکل پیدل ہے میں نے اسے محض اپنی لذت اندوزی کا ذریعہ بنایا تھا ورنہ میرے اصل خیالات کی پرچھائیں بھی اسے نہ مل پاتی۔

مگر میں اس سے یہ نہ کہہ سکا۔ میں نے اس کے فلیٹ کے بارے میں دریافت کیا مگر اس کے بارے میں اس نے ایک لفظ نہ بتایا البتہ یہ خبر سنا دی کہ تل ابیب میں میرا قیام صرف تین روز رہے گا اس کے بعد مجھے تربیت کے لیے بھیج دیا جائے گا۔

ساری گفتگو میں نہ اس نے یہ تاثر دیا کہ میں کسی امتحان سے دوچار کیا گیا ہوں نہ میں نے سبز رقعہ کے بارے میں اسے کچھ بتایا۔

کیپٹن ماریا کے جاتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کچن میں جا کر سنک میں سبز رقعہ اس طرح چھپا کر جلا دیا کہ اگر کوئی کیمرہ وہاں بھی موجود ہو تو کسی طرح کاغذ کے اس پرزے کو اپنی گرفت میں نہ لے سکے اس کام سے نمٹ کر میں بستر پر آگیا۔

اگلے روز میں نے کیپٹن ماریا سے کچھ مقامی کرنسی حاصل کی تاکہ باہر نکل کر مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ریگل اسٹور والا سنسنی خیز پروگرام صبح ہی سے میرے ذہن پر مسلط تھا۔ وہاں جانے سے قبل میں ایک بار اس دوکان کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

میرے لیے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اس عمارت سے باہر قدم رکھتے ہی میری نگرانی شروع کر دی جاتی۔ اگر میں راہ گیروں سے ریگل اسٹور کا پتہ دریافت کرتا تو میرے آگے بڑھتے ہی پیچھا کرنے والا ان راہ گیروں سے فوراً باز پرس کرتا اور پھر اس کے ذہن پر یہ الجھن سوار ہوتی کہ آخر میں اس مخصوص دوکان میں کس لیے اتنی دلچسپی لے رہا ہوں۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے دوپہر کے قریب پھر ماریا کو بلایا اور اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں کچھ نجی خریداری کرنی چاہتا ہوں۔

اس نے فوراً ہی میرے ساتھ چلنے کی پیش کش کر ڈالی مگر میں نے یہ کہہ کر اسے خوبصورتی سے ٹال دیا کہ شاید اس طرح میرے ساتھ وہ میرے ذہن میں مزید جھانکنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

اس نے مجھے کئی اسٹورز کے نام بتا ڈالے مگر ان میں ریگل اسٹور کا نام نہیں تھا۔ پھر میری خواہش پر وہ سیاحوں کی رہنمائی کرنے والے ایک انگریزی کتابچے کا بندوبست کرنے چلی گئی۔

مجھ تک پرچہ پہنچانے والے مضبوط تنظیم اور وسائل کے مالک معلوم ہوتے تھے جب ہی میرے تل ابیب آتے ہی ان کو خبر مل گئی۔ اگر انھوں نے کسی مزید وضاحت کے بغیر ریگل اسٹور کا نام استعمال کیا تھا تو اس دکان کو اتنا مشہور ہونا چاہیے تھا کہ ایک اجنبی بہ آسانی اسے تلاش کر سکے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ماریا کتابچہ لے آئی۔ چند ثانیوں تک وہ مجھے کچھ سمجھاتی رہی پھر واپس لوٹ گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے تل ابیب کے خریداری کے صفحے کھولا تو دوسرے کالم کی آخری سطر میں ہی ریگل اسٹور کا نام درج تھا۔ وہ دوکان اس کتابچے کے مطابق عورتوں کے ملبوسات کی خریداری کے لیے شہرت رکھتی تھی۔

میں شام کے چار بجے ہی اس عمارت سے نکل کھڑا ہوا۔ ادھر ادھر گھومتا ہوا نقشے کی مدد سے ڈیڑھ گھنٹے میں اس شاہراہ پر پہنچ گیا جہاں ریگل اسٹور واقع تھا۔

وہ کئی منزلہ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر پتلی سی لیکن کافی گہری دوکان تھی۔ میں آہستہ قدموں سے اس کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔

ساڑھے چھ بجے تک میں نے مختلف دوکانوں میں گھومتے ہوئے وقت صرف کیا۔ اس دوران میں میں نے ایک لائٹر اور سگریٹ وغیرہ کی خریداری بھی کر ڈالی۔ پھر میں دھڑکتے دل کے ساتھ ریگل اسٹور کی طرف ہو لیا۔

ابھی میں اسٹور سے تقریباً ایک فرلانگ دور ہی تھا کہ اچانک عقب میں ایک ہولناک دھماکہ ہوا، جس سے زمین لرز اٹھی پھر چند دلدوز چیخیں ابھریں اور اچانک وہاں بھگدڑ مچ گئی لوگ بری طرح چیختے، ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگے جا رہے تھے میں پوری رفتار سے آگے کی طرف دوڑ پڑا۔

ریگل اسٹور تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے اس طرف دیکھ رہے تھے جہاں چند ثانیوں قبل دھماکہ ہوا تھا۔ کہیں فاصلے سے ایمبولنس کے سائرن کی دل کو چیر دینے والی کرخت گونج سنائی دے رہی تھی۔

ریگل اسٹور کے قریب میں نے اپنی رفتار سست کر دی۔ رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو سات بجنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے میں بظاہر سکون کے ساتھ اسٹور میں داخل ہو گیا مگر اس وقت دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

اسٹور میں داخل ہو کر سب سے پہلے میں نے ایک عدد سوئٹر خرید ڈالا تاکہ چند منٹ تک میری وہاں موجودگی اسٹور کے نگراں کو نہ گزرے کیونکہ عورتوں کی خریداری کے مرکز میں مردوں کا بلا وجہ ٹھہرنا ہر جگہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔

تین الماریوں کا جائزہ لے کر میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی دو منٹ باقی تھے۔ میں نے سینٹ کی ایک شیشی خریدی اور ٹہلتے ہوئے آخر میں آخری کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

وہاں ایک سرخ و سفید پستہ قامت، معصوم سی لڑکی کاؤنٹر پر رکھی ہوئی اشیا شوکیس میں لگانے میں مصروف تھی۔ میں نرم قدموں سے ٹہلتا ہوا کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔

"باون انچ کا بلاؤز۔" جیسے ہی وہ میری طرف گھومی میں نے آہستگی سے مشینی انداز میں وہ عجیب شناختی فقرہ دہرا دیا۔

اس نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا اور شناسائی کے انداز میں مسکرا دی۔

اس نے ایک شوکیس سے زنانہ جرسیوں کے کئی پیکٹ نکال کر میرے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیے جیسے میں ان ہی کی خریداری کے لیے آیا ہوں۔ پھر ان کی تہیں کھولتے ہوئے چوکنے مگر دھیمے لہجے میں بولی۔ "فوراً اسٹور سے نکل کر داہنی طرف جاؤ۔ پہلے ٹیکسی اسٹینڈ پر سرخ رنگ کی تین سو تیرہ نمبر کار موجود ہے، ڈرائیور خود تمہیں پہچان لے گا۔"

"مگر میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔" میں نے ایک جرسی کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

"جاؤ۔" اس بار وہ غرائی۔ اس کی آواز چہرے پر پھیلی ہوئی سدا بہار معصومیت سے بالکل بھی ہم آہنگ نہیں تھی "وہ جہنم واصل ہو چکا ہوگا۔"

میں مزید کچھ کہے بغیر واپس مڑ گیا۔ اسی وقت تیز رفتار ایمبولنس سائرن بجاتی ہوئی اسٹور کے سامنے سے گزر کر بائیں طرف بڑھتی چلی گئی جدھر ہولناک دھماکہ ہوا تھا۔

رقم کی ادائیگی کر کے میں اسٹور سے باہر نکلا اور فٹ پاتھ پر داہنی طرف چل دیا۔

دھماکے سے پھیلی ہوئی ابتری ابھی تک موجود تھی، لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے تبصرے کرنے میں مصروف تھے۔ میں سر جھکائے ان سب کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ ایک آدھ جگہ انگریزی میں ہونے والی گفتگو سے پتہ چلا کہ کسی دہشت پسند تخریب کار کے پھینکے ہوئے بم سے ایک شخص ہلاک اور دو زخمی ہوئے تھے۔

لڑکی کے الفاظ اور اس تفصیل سے مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ مرنے والا میرا نگراں ہی رہا ہوگا۔ شاید میرے تعاقب سے باز رکھنے کے لیے اسے مار ڈالا گیا تھا اور لڑکی کو اس منصوبے کا پیشگی علم تھا، ورنہ وہ اتنے اعتماد کا مظاہرہ نہ کر پاتی۔ البتہ یہ بات یقینی تھی کہ زخمی ہونے والے دونوں افراد ناگہانی زد میں آ گئے ہوں گے۔

تل ابیب کی بھری پری شاہراہ پر ایک سرکاری اہلکار کو یوں تاک کر نشانہ بنانا واقعی دل گردے کا کام تھا۔

ٹیکسی اسٹینڈ ریگل اسٹور سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں بھانت بھانت کی گاڑیوں میں ایک ہی سرخ کار دکھائی دے رہی تھی۔

جس وقت میں اس کی نمبر پلیٹ دیکھ رہا تھا مین روڈ سے شور مچاتی ہوئی ایمبولنس زخمیوں وغیرہ کو لے کر واپس جا رہی تھی۔

میں کار کا نمبر دیکھ ہی رہا تھا کہ کسے ہوئے بدن والا ایک سرخ و سفید نوجوان میرے قریب آ کر کھڑا ہوا اور بولا "تو تم آ ہی گئے، جلدی گاڑی میں آ جاؤ۔"

میں کچھ کہے بغیر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور کار کا طاقتور انجن بیدار ہوتے ہی گاڑی گھوم کر تیزی سے سڑک پر پھسلتی چلی گئی۔

"کرنل ریٹلا سے تمھاری ملاقات ہوئی؟" اس نے کچھ دیر بعد براہِ راست پہلا سوال کیا۔

"نہیں۔ مگر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس گفتگو سے پہلے ہم ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرلیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ میں تل ابیب میں فلسطینی افواجِ آزادی کا نمائندہ ہوں۔ ہاں تمھارے بارے میں میں ضرور جاننا چاہوں گا۔" وہ اسٹیرنگ سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"تو تم فلسطینی ہو؟"

"ہاں۔ وقت ضائع نہ کرو، اپنے بارے میں تفصیل بتاؤ۔"

"میں پاکستانی ہوں ......"

"پاکستانی؟" اس نے حیرت سے میری بات درمیان ہی سے اچک لی۔ "مگر مجھے تو پتہ چلا تھا کہ پراسرار حالات میں آرمی انٹیلی جنس کور میں لایا جانے والا شخص ہندی ہے۔"

"یہ لمبی کہانی ہے، وہ مجھے ہندی ہی سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مجھے الشونخ میں پکڑا تھا اور اب دو روز بعد ہی گوریلا تربیتی کیمپ میں بھیجنے والے ہیں۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔"

"تم ہمارے برادر ہو۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "خون کو خون پہچانتا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں پوری امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے، نہ آتے تو وہی بم تم پر پھینک دیا جاتا جو تھوڑی دیر پہلے تمھارے نگراں پر گرا ہے۔"

"تو اسے مار دیا گیا؟"

"ہاں۔ لاش بھی نہ پہچانی جائے گی اس کی۔" وہ نفرت سے بولا۔ "مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ دو راہ گیر بھی اس کی وجہ سے زخمی ہوگئے۔"

"کیا فلسطینی تھے زخمی ہونے والے؟"

اندھیرے میں اس نے سر گھما کر چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورا۔ "وہ فلسطینی ہوں یا یہودی، راہ گیر تھے۔ ہماری جنگ ان سے ہے جو اسلحے کر ہماری زمین پر دندنانے کے منصوبوں میں شامل ہیں۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"اطلاعات۔" وہ بولا۔

"کیسی اطلاعات؟ ابھی تو میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے کیا کام لینے والے ہیں، پھر مجھ پر ہر وقت کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔"

"وہ تم سے ایک بہت بڑا کام لینے والے ہیں۔" وہ گاڑی کو ایک ویران راستے پر گھماتے ہوئے بولا۔ "وہ لوگ ہمارے بارے میں بہت چوکنے ہیں مگر ہم بھی اپنی جانوں پر کھیل کر تل ابیب میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس کوشش میں یکے بعد دیگرے سینتیس فلسطینی کرنل ریٹلا کے آدمیوں کے ہاتھوں تشدد کے باعث ہلاک ہوئے ہیں مگر ان کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ ہمارا پہلا مقصد اس قاتل کو ٹھکانے لگانا ہے۔ ہمیں صرف اس کا حلیہ درکار ہے پھر وہ پاتال میں بھی ہم سے نہ بچ سکے گی۔ وہ جو کچھ کہیں تم کرتے رہو۔ ہمارے آدمی خود تم سے رابطہ رکھیں گے۔ کرنل ریٹلا کا حلیہ اور ان کے منصوبوں سے متعلق تم جو کچھ معلوم کرسکو ان آدمیوں کے ذریعے ہم تک پہنچاتے رہو۔ تمھاری وفاداری آزمانے اور یہ بتانے کے لیے ہی آج تم کو طلب کیا گیا تھا۔ ہمارا آدمی صرف وہی ہوگا جو تمھیں کالے خون کا حوالہ دے گا۔"

"میں پوری طرح تمھارا ساتھ دینے کو تیار ہوں مگر میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟"

"میری بیوی کافی عرصے سے مجھ سے بچھڑی ہوئی ہے۔ یہاں ان سب جھگڑوں سے جان چھڑا کر پاکستان جانا چاہتا ہوں تاکہ اسے تلاش کرسکوں۔"

"فلسطین کے نہ جانے کتنے بچے اپنی ماؤں سے، کتنی بہنیں اپنے بھائیوں سے اور عورتیں اپنے سہاگ سے بچھڑی ہوئی در بدر بھٹک رہی ہیں۔ ان کا نہ کوئی گھر ہے نہ وطن۔ اگر تمھاری وجہ سے ہم انٹیلی جنس کور میں گھسنے میں کامیاب ہوگئے تو ہم ان کی بنیادیں ہلا دیں گے۔ قدرت نے تمھیں موقع دیا ہے تو اسے اتنی معمولی سی بات کے لیے نہ گنواؤ۔ تم اپنی بیوی کی تصویر مجھے دو، میرے آدمی پاکستان کا چپہ چپہ چھان ماریں گے۔ تحریک کے بہت سے لڑکے وظیفوں پر پاکستان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ تمھارا کام کریں گے مگر خدا کے لیے تم ان میں گھسے رہو۔ ہماری رسائی نچلے درجے تک ہے اوپر والوں میں گھسنا ہمارے لیے ایک خواب، ایک آرزو بن کر رہ گیا ہے۔"

"میرے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔"

"پھر تم جو کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔"

"اب تک میں حالات کے دباؤ کے تحت قسمت پر شاکر رہا۔ اب ایک مقصد کی خاطر صبر کر دوں گا۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ "تمھاری باتیں بہت معقول ہیں۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی میرے بھائی۔" وہ بھرائی ہوئی پُرجوش آواز میں بولا۔ "اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ تم پاکستانی ہو تو تمھیں دھمکی کے بجائے التجا آمیز رقعہ ملتا۔"

"رنگیلا اسٹور کی وہ معصوم سی سیلز گرل بھی تمھاری تنظیم کی رکن ہے؟"

"ہاں۔ وہ بہت پُرجوش کارکن ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ لبنان کے فلسطینی کیمپ میں پروان چڑھی ہے۔ وہ معصوم ضرور نظر آتی ہے۔ مگر اس کے دل میں انتقام کا ایک ہولناک جوالا مکھی ابل رہا ہے۔ کیمپوں کی عسرت آمیز اور دشوار زندگی میں ہم نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ وہاں پلنے والے غریب الوطنی کا درد کبھی نہیں بھول سکتے۔"

"مگر ان کی صفوں میں گھسنے کے ساتھ ہی تم کو اپنے گھروں کی ... خبریں جا پہنچنی چاہئیں۔"

"کیا کوئی خاص بات معلوم ہوئی تم کو؟"

"تمھارے خلاف یہ لوگ اپنی عورتیں بھرپور طریقے پر استعمال ... ہیں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ آوارہ کتیوں کی طرح ان کو ہماری ... ہانک دیا جاتا ہے تاکہ ان کی زلفوں میں الجھ کر ہم سب کچھ ... ہیں، اپنے مقصد کو بھول جائیں۔"

"اور وہ گھروں تک میں داخل ہوگئی ہیں۔"

"نہیں۔" اس نے حیرت اور بے اعتباری سے کہا۔ "کسی عرب ... یہ امید نہیں کرسکتا کہ وہ ایک یہودن سے شادی کرے گا۔"

"مگر وہ مسلمان بن کر ان کے سامنے جاتی ہیں۔ الشونخ میں یہ ... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا ہے؟ تم نے کیا دیکھا وہاں؟"

اس پر میں نے اسے مختصر الفاظ میں لیلیٰ اور بن حیان کی کہانی ... ائی۔

"اوہ۔ تم تو بہت کچھ جانتے ہو میرے دوست!" وہ مضطربانہ ... بولا۔ "بن حیان کا نام بھی میں نے بہت سنا ہے۔ اپنی ان ہی فی لیل ... بندیوں سے وہ پوجا جاتا ہے مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ لیلیٰ جیسی ... لڑکیاں ہماری چار دیواریوں میں در آئی ہیں۔ خدا کرے کہ وہ ... بدکار عورت ماری جا چکی ہو۔ میں جلد ہی اس کا پتہ چلاتا ہوں۔ ... رکھو کہ الشونخ سے اس کا ایک بھی حامی زندہ نہ نکل پائے گا۔ ... مجذوب اور اس کے حواری بچ سکیں گے۔ یہ انسانی خون اور ... ہاتھوں پر پلنے والے بھیڑیے ہیں۔ انھیں روئے زمین پر کہیں ... نہ مل سکے گی۔"

"لیلیٰ کے حشر سے مجھے ضرور آگاہ کرنا۔"

"اس کے بارے میں تم جلد ہی اچھی خبر سنو گے۔"

"... تم سے تفصیل سے گفتگو کرنے کا خواہاں ہوں میرے دوست۔"

"اب میں نے تم کو بھائی کہا ہے تو میرا نام بھی سن لو۔ مجھے محمود ... ہاں۔" اس نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس جنیت ... کی خبر ملتے ہی ہر طرف تمھاری تلاش شروع ہو جائے گی۔ ... بس واپس جانا چاہیے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ پھر کبھی ... ملاقات ہوگی۔"

"تم رہتے کہاں ہو؟"

"... جب وطن نہیں رہا تو ٹھکانہ کہاں ہوگا۔" وہ درد بھرے ... لہجے میں بولا۔ "فی الحال ایک ہوٹل میں پناہ گزیں ہوں۔"

"... تل ابیب میں تمھارے کتنے ساتھی ہیں؟"

"یہ میں خود نہیں جانتا۔ ہماری تنظیم میں کوئی بھی ضرورت سے زیادہ ایک لفظ نہیں جانتا کیونکہ ہمیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ کون کب پکڑا جائے گا، اور جب بے پناہ تشدد شروع ہوتا ہے تو کسی نہ کسی کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر زیادہ معلومات تنظیم کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔" اس نے مجھے تسلی بخش جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک جگہ اندھیرے میں گاڑی روک دی۔

"یہاں سے تم بائیں طرف گھوم کر گلی میں چلے جاؤ۔ کچھ دور بعد ایک چوراہا ملے گا۔ وہاں سے داہنی طرف جانے والی سڑک تمھاری بلڈنگ کے عقب میں پہنچا دے گی۔"

"شکریہ۔" میں نے سامان کی تھیلیاں سنبھال کر اترتے ہوئے کہا۔

"فی امان اللہ۔" اس نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

کاتبِ تقدیر نے میرا مقدر نہ جانے کیسی گھڑی میں تحریر کیا تھا کہ میں پیچیدگیوں سے جس قدر دامن بچا رہا تھا اسی قدر پیچیدہ تر حالات میرے آڑے آ رہے تھے، اور اس بار تو حد ہی ہوگئی تھی۔ میں دونوں طرف سے انتہا پسندوں میں گھر گیا تھا جن میں ایک مظلوم تھا اور دوسرا غاصب۔ میں مدد مظلوم کی کرنی چاہتا تھا مگر میری تکمیل غاصب کے ہاتھوں میں تھی۔

اسی ادھیڑبن میں کھویا میں فلیٹ پر پہنچا اور دروازہ کھولا تو ماریا اپنی پوری فوجی یونیفارم میں ملبوس تین ماتحت افراد کے ساتھ وہاں موجود تھی۔

میرے اندر گھستے ہی اس نے اپنے سروس آٹومیٹک کی نال میری طرف اٹھا دی اور سرد لہجے میں بولی، "ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

تھیلیاں میرے ہاتھوں سے گر گئیں، اور میرے ہاتھ سر سے بلند ہوگئے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی کیپٹن ماریا ہے جو میری آغوش میں کئی گھنٹے گزار چکی تھی۔

"تلاشی لو اس کی۔" ماریا نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا۔

میری جیبوں کی تلاشی لی گئی جو ماریا کے نقطہ نظر سے ناکام ثابت ہوئی کیونکہ میری جیبوں میں کرنسی، سگریٹ لائٹر اور رومال کے سوا کچھ نہیں تھا۔

پھر ماریا نے خود تھیلیوں کا جائزہ لیا اور سخت لہجے میں بولی۔ "یہ کس لیے خریدی گئی ہیں؟"

"تمھارے لیے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ایک ثانیے کے لیے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ پھر اس کا بھرپور بایاں ہاتھ میرے چہرے پر پڑا۔ "شٹ اپ!"

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ماریا اچھل کر مجھ سے محفوظ فاصلے پر چلی گئی اور اس کی ہدایت پر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔

فلیٹ کے نیچے بند سیاہ شیشوں والی ایک فوجی گاڑی موجود تھی۔ مجھے اس کے عقبی حصے میں دو افراد کے ساتھ سوار کرا دیا گیا۔ تیسرے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کیپٹن ماریا اسی کے ہمراہ اگلی نشست پر جا بیٹھی۔

کچھ دیر کے بعد اس سفر کا اختتام دھند لکے میں لپٹی ہوئی ایک وسیع و عریض عمارت کے کمپاؤنڈ میں ہوا جہاں کئی خطرناک کتے رکھوالی کے لئے مامور تھے۔ وہ شاید ماریا اور اس کے ماتحتوں کی بو سے مانوس تھے کیونکہ پہلے وہ غراتے ہوئے گاڑی کی طرف لپکے اور پھر ان چاروں کے پاؤں سونگھ کر دُمیں ہلانے لگے۔

عمارت میں پہنچنے کے بعد کیپٹن ماریا کے اشارے پر وہ تینوں چلے گئے اور میں کمرے میں اس کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

"یہ چیزیں کس کے لئے خریدی گئی تھیں؟" چند ثانیوں کے بعد ماریا نے سرد لہجے میں اپنا سوال ایک مرتبہ پھر دُہرایا۔

"شاید دوبارہ تھپڑ مارنے کا ارادہ ہو رہا ہے تمہارا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اسی بے مقصد شاپنگ کے لئے تم نے یہ شام باہر گزاری ہے؟"

"تمہارے نزدیک یہ چیزیں بے مقصد ہو سکتی ہیں میرے لئے ان کی جذباتی اہمیت ہے۔" میں نے ہتھکڑیوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جذباتی اہمیت۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔ "کیا تم مجھے اپنی محبوبہ تصور کرنے لگے ہو؟"

"محبوبہ نہ سہی پھر بھی اسرائیل کی سرزمین پر تم پہلی عورت ہو جس سے میری دوستی استوار ہوئی ہے۔"

"آج شام تم کہاں کہاں گئے اور کس کس سے ملے؟" اُس نے چند ثانیوں تک خاموش رہنے کے بعد سوال کیا۔

"تل ابیب میرے لئے اجنبی شہر ہے۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "سڑکوں اور دکانوں کے نام مجھے یاد نہیں۔ اس کے علاوہ میں کسی سے نہیں ملا۔"

"راستے میں تم نے کوئی حادثہ دیکھا؟"

"ہاں ــــ ایک جگہ بم کا خوفناک دھماکہ ہوا تھا۔"

"کسی عمارت میں یا شاہراہ پر؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"کیوں؟"

"دھماکہ ہوتے ہی وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی لہٰذا میں بھی نقصان کا جائزہ لینے کے لئے وہاں ٹھہرنے کی ہمت نہ کر سکا۔" میں نے سکون سے کہا۔

"بعد میں بھی تم نے اُدھر جانے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔" میں نے یہ کہہ کر ایک اور سوال داغ دیا۔ "تو کیا تم اس دھماکے کا ذمے دار مجھے ٹھہرانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ پلاسٹک بم راڈرک پر پھینکا گیا تھا۔" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"راڈرک؟"

"وہی شخص جسے تمہاری حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔" ماریا نے ناخن کی نال سے اپنا رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کی لاش ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئی اور حملہ آور کا پتہ نہیں چل سکا۔"

"یہ عجیب اتفاق ہے۔"

"ہمارے تفتیشی بیورو نے جائے حادثہ کے پاس سے تمام فلسطینیوں کو پکڑا ہے۔ اس قسم کے بم عموماً فلسطینی دہشت پسند استعمال کرتے ہیں۔ اس حملے کے دو ہی مقاصد نظر آتے ہیں۔ اول تو یہ کہ وہ لوگ تم سے رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے لہٰذا راڈرک کو مارنے کے بعد اُن کو تم سے ملنا چاہئے تھا مگر تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ بیورو کا یہ نظریہ غلط ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ وہ لوگ ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ تمہاری یہاں آمد کے مقاصد سے واقف ہیں۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ راڈرک محض اتفاقاً ان کا نشانہ بن گیا ہو؟ وہ بم میرے لئے بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے اسے اُلجھانے کے لئے کہا۔

"ممکن ہے ــــ یہ بھی قطعی ممکن ہے۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولی۔ "حملے کے وقت وہ تم سے کتنے فاصلے پر چل رہا تھا؟"

"مجھے بچہ سمجھتی ہو تم؟" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ راڈرک کی موت کا علم مجھے تمہاری زبانی ہوا ہے۔ وہ میری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ اس کی ٹوہ لیتا۔ میں کوئی غلط کام تو کر نہیں رہا تھا۔"

میرے چڑچڑے پن پر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "اس وقت تم کسی ایسے بچے کی طرح نظر آ رہے ہو جس سے اس کی پسند کا کھلونا چھین لیا گیا ہو۔"

"کھلونا تو سامنے موجود ہے مگر ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔" میں اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔ "مجھے ہتھکڑیاں کس خوشی میں لگائی گئی ہیں؟"

"تمہیں یہ یاد دلانے کے لئے کہ میں صرف ماریا نہیں کیپٹن ماریا بھی ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"میرے ماتحتوں کے سامنے تمہیں اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہئے۔"

"مگر وہ چیزیں میں نے تمہارے ہی لئے خریدی تھیں۔ میرے پاس تمہارے سوال کا کوئی اور جواب نہیں تھا۔"

"خیر ــــ میں اپنے رویّے پر معذرت خواہ ہوں۔"

"صرف معذرت کافی نہیں میرے ہاتھوں کو آزادی بھی چاہئے۔"

اس نے اپنی قمیص کی جیب سے چابی نکالی اور ہتھکڑیاں کھول دیں۔ دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے اچانک اسے دبوچ لیا اور نجات اسی وقت ملی جب وہ میری وحشیانہ یلغار سے سراسیمہ ہو گئی۔

"تم بھی کسی بھیڑیے سے کم نہیں ہو۔" نجات ملنے پر وہ اپنا نچلا ہونٹ زبان سے سہلاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ تو صرف ہتھکڑیاں لگانے کا انعام تھا۔ ابھی تو ایک عدد تھپڑ کا حساب باقی ہے۔" میں نے یہ الفاظ ہنستے ہوئے ادا کئے مگر ان سے میرے دلی احساسات جھلک رہے تھے۔

"یہ یاد رکھنا کہ میں اسلحہ کے بغیر بھی اپنے جسمانی دفاع کے بے شمار طریقے جانتی ہوں۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری تیکھی نظریں ہی تمہارے دفاع کے لئے کافی ہیں، جسے تم ایک بار نظر بھر کر دیکھ لو وہی تمہارے قدموں میں جان دے دے گا۔"

"اب ان باتوں کا وقت نہیں۔" وہ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔ "راڈرک کی موت کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر حملہ آور کا سراغ لگانا ہے۔ میں ابھی گارڈز کوارٹرز میں جا رہی ہوں۔ مجھے دیکھنا ہے کہ وہ گرفتار شدہ افراد کیا بتا سکتے ہیں۔"

"تو کیا ان پر تشدد ہو گا؟"

"ایسا ویسا۔" وہ بے رحمانہ لہجے میں بولی۔ "وہ عمر بھر اس بازپرس کو فراموش نہ کر سکیں گے۔ ان میں سے دو چار مر بھی جائیں تو مجھے حیرت نہیں ہو گی۔"

"خواہ وہ بے گناہ ہی کیوں نہ ہوں؟" میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ "ظاہر ہے کہ مجرم تو ان میں کوئی ایک ہی ہو سکتا ہے اور امکان ہے کہ شاید وہ صاف نکل گیا ہو اور تمہارے بیورو نے بے گناہ فلسطینیوں کو پکڑ لیا ہو۔"

"ہمارے نزدیک ان میں کوئی بے گناہ نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "ہم فلسطینی عورتوں کی کوکھ میں پروان چڑھنے والے بچوں کو بھی اپنا دشمن گردانتے ہیں کیونکہ ہمارے خلاف سازش میں ان کا بچہ بچہ شریک ہے۔ وہ اپنی مظلومیت کے نام پر ہمارے خلاف نفرت کا زہر پھیلا رہے ہیں۔"

"میں اپنے فلیٹ پر کب جاؤں گا؟" میں نے بحث سے گریز کرتے ہوئے موضوع تبدیل کر دیا۔ مجھے آہستہ آہستہ اسرائیلیوں میں پھیلے ہوئے ان انتہا پسند نظریات کا پتہ چل رہا تھا جو فلسطینی مفادات کے خلاف تھے۔ میرے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ میں کھل کر ماریا کی مخالفت کر کے اس طرح اپنا وہ مقام کھو دوں جو میں نے چند دنوں میں بنایا تھا۔ میرے لئے سب سے زیادہ اطمینان کی بات یہی تھی کہ ماریا کو میری باتوں پر یقین آ گیا تھا۔ میں نے فلسطینی افواجِ آزادی کی طرف سے ملنے والے خفیہ پیغام پر عمل کرنے کے لئے جو ڈرامہ کھیلا تھا، وہ کامیاب ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"فلیٹ پر جانے کی ضرورت نہیں۔" کیپٹن ماریا کہہ رہی تھی۔ "وہ حملہ آور کیا گیا ہو یا تمہارے بجائے راڈرک نشانہ بنا ہو، تمہارے لئے باہر شدید خطرہ ہے۔ تم اسی عمارت میں محدود رہو گے اور تمہیں ضرورت کی ہر چیز یہیں مہیا کر دی جائے گی۔"

"تو مجھے اسی کمرے میں رہنا ہو گا؟" میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جہاں فرشی قالین، صوفے اور تین کرسیوں کے سوا کچھ موجود نہیں تھا۔

"فی الحال یہیں رکو، بعد میں تمہیں کوئی معقول کمرہ دے دیا جائے گا۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"اور میں کرنل ربیکا سے کب مل سکوں گا؟"

"اس سے ملنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ وہ بہت مصروف عورت ہے۔"

"مگر اُس نے مجھ سے خود وعدہ کیا تھا۔"

"غیر ضروری وعدے بھول جانے میں اُسے ملکہ حاصل ہے۔ جب میں تمہاری ہر ضرورت پوری کر سکتی ہوں تو اُس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"اُس کی آواز بہت حسین ہے۔" میں اچانک ہنس دیا۔

"تم عورتوں کے بہت رسیا معلوم ہوتے ہو۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"حسن کا پرستار ہونا کوئی بُری بات تو نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "وہ نہیں تو چلو بن حیان ہی سے ملوا دو۔"

"بن حیان کا نام احترام سے لو مسٹر!" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "اسرائیل میں اسے پوجا کی حد تک لوگ پسند کرتے ہیں۔ ہماری جدید حکمتِ عملی اسی کے ذہن سے جنم لیتی ہے۔ جب مستقبل کا مورخ ہماری تاریخ لکھے گا تو بن حیان ہمارا پانچواں قومی ہیرو کہلائے گا۔"

"میں اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں۔ ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا اصل آقا تو اب بھی وہی ہے۔"

"تمہاری خواہش اس تک پہنچا دی جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ اس کمرے سے چلی گئی۔

یہ بہت غنیمت تھا کہ میں ان لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن دوسری طرف وہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ لگا چکے تھے کہ میں بہرصورت فلسطینی حریت پسندوں کا [illegible] چکا ہوں۔

ایک پاکستانی ہونے کے ناطے میرے ذہن میں اسرائیلیوں کے خلاف نفرت جاگزیں تھی جو تل ابیب پہنچنے کے بعد اور گہری ہو گئی تھی۔ ماریا نے فلسطینیوں کے بارے میں جو الفاظ ادا کئے وہ اس کی نہیں بلکہ پوری یہودی قوم کی ذہنیت کی غمازی کرتے تھے۔ ان کے نزدیک بچے، بوڑھے، عورت اور مرد کے امتیاز کے بغیر ہر فلسطینی قابلِ گردن زدنی تھا۔ دھماکہ کرنے والا حریت پسند محمود جائے واردات سے صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر ستاسی بے گناہ فلسطینی ان سفاک بھیڑیوں کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ محمود اپنی بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ میں آرام سے اس کمرے میں بیٹھا

ہوا تھا اور لوگ ناکردہ گناہ کی پاداش میں ایذا رسانی کے ہولناک اور روح فرسا عمل سے دوچار تھے۔

کچھ دیر بعد نیم فوجی یونیفارم میں ملبوس ایک شخص نے مجھے اسی عمارت کے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جہاں خوابگاہ کے بنیادی لوازم موجود تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کسی محافظ کی موجودگی کے بغیر میرے لئے اس کمرے سے نکلنا ممنوع ہے۔

اگلے روز ماریا آئی تو بہت خوش تھی۔

"کیا حملہ آور کا پتہ چل گیا؟" میں نے اس کے بشرے پر پھیلی ہوئی مسرت بھانپتے ہی اپنا پہلا سوال کر ڈالا۔

"وہ سب پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ "ایک آدمی ان کے سامنے سسک سسک کر دم توڑ چکا ہے، چار اپاہج ہو چکے ہیں مگر ابھی تک ان میں سے کسی نے زبان نہیں کھولی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی اس حادثے کے ذمے دار سے واقف نہ رہے ہوں۔" ضبط کے باوجود یہ کلمات میری زبان پر آ ہی گئے۔

"گارڈز کمانڈر کا بھی یہی خیال ہے مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں۔"

"تو کیا یہ باز پرس تمہاری نگرانی میں ہو رہی ہے؟"

"نہیں — اگر یہ میری ذمے داری ہوتی تو سراغ ملنے سے قبل تشدد کا سلسلہ ختم نہ ہو پاتا خواہ آخری آدمی بھی دم توڑ دیتا۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

میں نے اس بالواسطہ اطلاع پر خاصا اطمینان محسوس کیا کہ اس ناروا تشدد کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا مگر بظاہر خوش دلی سے بولا۔ "تمہیں دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسے خوبصورت چہرے والی اتنے سخت دل کی مالک ہے۔"

"میں اگر سخت دل ہوتی تو تم ابھی تک جذبات کے جہنم میں سُلگ رہے ہوتے۔"

"اس میں تمہارا کیا دخل تھا، تم نے تو محض احکام کی تعمیل کی تھی۔" میں شوخ لہجے میں بولا۔

"احکام میں مقصد کا تعین کیا جاتا ہے، طریقہ کار ہمارا اپنا ہوتا ہے۔"

"وہ جو بھی طریقہ کار ہو اس میں جنس بہر صورت حاوی رہتی ہے۔"

"اس کے لئے بھی میں ایک حد مقرر کر سکتی تھی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"مگر میں نے تمہیں ہر حد عبور کرنے کی اجازت دے دی۔"

"اس لئے کہ کرنل دیتا کلونڈ سرکٹ پر تمہیں دیکھ رہی تھی۔"

"مجھے ہی نہیں، تمہیں بھی دیکھ رہی تھی۔"

"ان فلسطینیوں سے معلومات اگلوانے کے لئے یہ حربہ کیوں نہیں آزمایا جاتا؟" میں نے فوری خیال کے تحت کہا۔

"افسوس تو اسی بات کا ہے۔" اس کا لہجہ ایک بار پھر تلخ ہو گیا۔ "کمانڈر نے تشدد کا سلسلہ روک دیا ہے اور ان میں سے تین افراد کا انتخاب کر کے انہیں لڑکیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر اس طرح بھی ان سے کچھ نہ اگلوا سکا تو کسی اور لائن پر سوچنا ہو گا۔"

"تمہاری قوم کی لڑکیاں قربانی کے جذبے سے سرشار معلوم ہوتی ہیں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے دل کے کسی گوشے میں خوشی کی لہر سی محسوس کی۔

"قربانی؟" وہ سر جھٹک کر تضحیک آمیز انداز میں بولی۔ "اگر ان ہی میں کوئی حملہ آور ہے تو کیا یہ طریقہ کار تمہیں مضحکہ خیز نظر نہیں آتا کہ اس نے پہلے ماڈرن کو ٹھکانے لگایا اور اب ایک یہودی لڑکی اس کی آغوش میں دی جا رہی ہے تاکہ شراب اور اپنی اداؤں کے سہارے اس سے اعتراف جرم کرا سکے۔ یہ تو بیحد شرمناک طریقہ ہے۔"

"اپنا اپنا سوچنے کا انداز ہے۔"

"ہمارے نظام میں ایک بہت بڑی اچھائی ہے جو کبھی کبھار بدترین خامی کی صورت بھی اختیار کر جاتی ہے۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"وہ کیا؟"

"یہاں کوئی شخص دوسرے کی ذمے داریوں میں اس وقت تک دخل انداز نہیں ہو سکتا جب تک اسے ایسا کرنے کا حکم نہ دیا گیا ہو۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ کبھی کبھی یہ خامی بھی بن جاتی ہے۔ اب اسی معاملے کو لے لو۔ میں سخت ناپسندیدگی کے باوجود گارڈز کمانڈر کو اس طریقہ کار پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ میدانِ جنگ سے بھاگتی ہوئی ہزیمت خوردہ فوجیں اپنی جان بچانے کے لئے اپنی ہی قوم کی خوبرو لڑکیوں کو بے دست و پا کر کے چارے کے طور پر پیچھے چھوڑ جائیں تاکہ ان کے تعاقب میں لگی ہوئی فاتح فوج کے سپاہی لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر ان کا تعاقب ترک کر دیں۔"

"مثال تو تم نے بہت موثر سوچی ہے۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"تم اب باہر جانے کے لئے آزاد ہو۔" اس نے اپنی نیکر کی جیب سے ایک چابی نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "نیچے تمہارے لئے گاڑی موجود ہے، یہ اسی کی چابی ہے۔ تمہیں پرسوں یہاں سے صحرائی کیمپ بھیج دیا جائے گا لہٰذا یہ وقت بہتر طریقے پر استعمال کرنے کی کوشش کرو۔"

"اور راستہ بھٹکنے کی صورت میں کیا ہو گا؟"

"کار میں وائرلیس موجود ہے۔ تمہیں بس اسے صرف آن آف کرنا ہو گا۔ وہ مقررہ فریکوئنسی پر ہی کام کرتا ہے۔ ریڈیو آپریشن والے تمہاری رہنمائی کریں گے۔"

کیپٹن ماریا کے جانے کے بعد میں تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو کسی نے مجھ سے تعرض نہ کیا۔ وہاں اتنی مکمل تنظیم پائی جاتی تھی کہ تمام تر احکام سے ہر فرد آناً فاناً میں واقف ہو جاتا تھا۔

سورج اس وقت ڈھلنے ہی والا تھا۔ تل ابیب کی بلند و بالا عمارتیں سورج کی ترچھی اور سُرخ شعاعوں کی روشنی میں دمک رہی تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم رواں دواں تھا۔ خوش فکر اور بے پرواہ جوڑے سینما اور ہوٹلوں ... بے خبر ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے چہل قدمی میں مصروف ... میں نے سٹی ہال کے گرد کئی مرتبہ چکر لگایا اور شہر کی ان رونقوں سے ... اندوز ہوتا رہا۔ پھر اچانک میرے ذہن پر بے نام سی اُداسی طاری ... ہو گئی۔

... سیتا نہ جانے کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ شہروں کی تہذیب سے ... بیگانہ وہ لڑکی تنہا نہ جانے کن کوچوں میں بھٹک رہی تھی۔ مجھے یقین ... تھا کہ مجھ سے روٹھ کر جانے کے بعد وہ بھی شکستہ نہ رہ سکی ہو گی۔ اس کی ... آنکھیں میری متلاشی ہوں گی اور اس کا ذہن، اس کا دل میری مفارقت کی آگ ... میں جل رہا ہو گا۔ اسے میں نے جتنی دشواریوں کے بعد حاصل کیا تھا، اس ... سے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ گنوا دیا تھا۔

پھر میں کریسٹ ہال نامی عالیشان ہوٹل میں جا پہنچا جہاں ریستوران ... لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز بُو سے مہک رہا تھا۔ فضا میں بھانت بھانت کے سگریٹوں اور شراب کی ملی جلی بُو پھیلی ہوئی تھی اور اسپیکرز سے ... ہالوں میں ہیجان خیز مغربی موسیقی اُبل رہی تھی۔

میں ایک میز منتخب کر کے بیٹھا ہی تھا کہ تتلی کی طرح میزوں کے ... درمیان بھٹکتی ہوئی ایک سُرخ و سفید خوبرو دوشیزہ میرے پاس آ پہنچی۔ اس نے آتے ہی میری میز پر جھک کر معذرت آمیز انداز میں کچھ کہا ... جس کی زبان میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ ویسے میرا اندازہ تھا کہ اس نے ... عبرانی زبان استعمال کی ہو گی۔

"میں صرف انگریزی سمجھ سکتا ہوں مادام!" میں نے احتراماً کھڑے ... ہو کر جواب دیتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔

"مگر آپ اکیلے ہوں تو میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے ... انگریزی میں اپنا مدعا بیان کیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا اور وہ میرا شکریہ ادا ... کرتے ہوئے میرے مقابل والی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

"مجھے صفدر علی کہتے ہیں۔"

"میرا نام مس اوسکالا ہے۔ میں فرانس سے ہجرت کر کے یہاں ... آئی ہوں۔"

"میں سیاحت کے ارادے سے ادھر آیا ہوں۔"

"اوہ —" وہ پُر مسرت لہجے میں بولی۔ "سیاح ہمیشہ سے میری ... کمزوری رہے ہیں۔ انہیں بھانت بھانت کے لوگوں کے رہن سہن اور معاشرت کا ... علم ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے مقابلے میں دنیا کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔" ... اس نے ایک ہی سانس میں کئی باتیں کہہ ڈالیں۔

"میرا خیال ہے کہ یہ شام ہم اکٹھے ہی گزاریں تو کوئی حرج نہ ہو گا۔"

"میں اسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ستائیس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔"

"تو کیوں نہ اوپر ہی چلا جائے؟" میں نے تجویز پیش کی۔

وہ شاید میری طرف سے اسی پیشکش کی منتظر تھی کیونکہ فوراً ہی رضامند ہو گئی اور ہم دونوں نے وہ میز چھوڑ دی۔

لفٹ خاصی کشادہ تھی مگر وہ دانستہ میرے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے خوشبو کی بھینی بھینی مہکار پھوٹ رہی تھی۔ میں نے ناقدانہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور رائے قائم کی کہ دلکش خد و خال کے ساتھ ہی وہ متناسب جسم کی بھی مالک تھی۔

"گندمی رنگ کے مرد مجھے بے پناہ پُرکشش معلوم ہوتے ہیں۔" لفٹ کے چلتے ہی وہ میری طرف جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

اسی اثنا میں لفٹ تیسری منزل پر رک گئی۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کی کمر سے ہٹا لیا اور ہم دونوں راہداری میں آ گئے۔ اپنے کمرے کے سامنے رک کر اس نے پرس میں چابی تلاش کی اور پھر قفل کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

اوسکالا کے ہمراہ میں نے اس کے کمرے میں خاصا خوشگوار وقت گزارا۔ فرانسیسی حسن کے انداز سے لطف اندوز ہونے کے لئے میں نے فرانسیسی شراب کا استعمال ہی مناسب سمجھا۔ ابتدا میں اوسکالا کا رویہ بہت نرم اور والہانہ رہا مگر بعد میں وہ خاصی غیر مہذب ثابت ہوئی۔

میں اوسکالا کے فلیٹ ہی میں تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی اور مسلسل بجتی ہی چلی گئی۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اُٹھا لیا۔ ہیلو کے بعد چند ثانیوں تک وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کچھ سنتی رہی پھر ماؤتھ پیس پر ہتھیلی رکھ کر مجھ سے بولی۔ "کوئی بدتمیز شخص تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے؟" میں نے بے یقینی کے ساتھ سوال کیا۔

"ہاں تم سے۔" وہ ریسیور کان سے ہٹائے بغیر بولی۔ ماؤتھ پیس بدستور اس کی ہتھیلی میں دبا ہوا تھا تاکہ دوسری طرف اس کی آواز نہ سنی جا سکے۔ "وہ بار بار کسی درندے کی طرح غرا رہا ہے۔"

میں نے حیرانی کے عالم میں اس سے ریسیور لے لیا۔ "ہیلو صفدر!"

"اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے؟" بولنے والے کا لہجہ تلخ اور حاکمانہ تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم میرے لئے اجنبی ہو۔ پہلی بار ملنے والوں کو ایسا بھونڈا رویہ زیب نہیں دیتا۔" میں نے بھی زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

"آدھے گھنٹے کے اندر اندر اسی مقام پر پہنچو جہاں ہم پچھلی بار ملے تھے۔" وہ میرے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔ "تم شدید خطرے سے دوچار ہو۔"

"کہاں؟" میں نے سوال کیا مگر اس سے پہلے ہی ہلکی سی آواز کے ساتھ فون بے جان ہو چکا تھا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔

"کون تھا؟" اوسکالا نے میری پریشانی بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

"کوئی پاگل تھا۔"

"مگر وہ تمہارے نام سے واقف تھا۔"

"لیکن میں اس کی آواز تک سے ناواقف ہوں۔"

جواب میں وہ کچھ نہ بولی مگر اس کے بُشرے سے بے اعتباری صاف مترشح تھی۔

"میرے لئے ایک لارج پیگ بناؤ۔" میں نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے اس سے کہا اور وہ خاموشی سے میری ہدایت کی تعمیل میں مصروف ہو گئی۔

میں ہولے ہولے اس کی پُشت سہلاتے ہوئے اس پُراسرار فون کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ آواز اور لب و لہجہ کسی طرح محمود کا نہیں تھا۔ جبکہ تل ابیب میں وہی فلسطینی افواجِ آزادی کے نمائندے کے طور پر مجھے ملا تھا۔ دوم یہ کہ میں کسی پیشگی پروگرام کے بغیر اس ہوٹل میں ادسکارا کے ساتھ وقت گزارنے چلا آیا تھا۔ وہ لوگ لاکھ منظم سہی نگران کے لئے میری نقل و حرکت کی اتنی باضابطہ اطلاعات رکھنا ناممکن نظر آتا تھا۔

دوسرا امکان یہی تھا کہ تفتیشی بیورو کی یا شاید ماریا کی نظروں میں میری ذات ابھی تک شبہات سے بالاتر قرار نہیں پا سکی تھی۔ لہٰذا بظاہر مجھے وائرلیس سے آراستہ کار میں گھومنے کی آزادی دے کر ایک نگران میرے تعاقب میں لگا دیا گیا تھا۔

اس شخص کی فراہم کی ہوئی اطلاع کی بنیاد پر ان لوگوں کو ادسکارا کے کمرے میں میری موجودگی کا علم ہوا اور انہوں نے مجھے گمنام فون کر ڈالا۔ مقصد یہی رہا ہو گا کہ اگر میں اس سے پیشتر کسی مشتبہ شخص سے مل چکا ہوں تو فون کال سے بوکھلا کر اس کے ٹھکانے پر دوڑا جاؤں گا اور میرا دوہرا کردار ان کے سامنے ننگا ہو جائے گا۔

میں اس بارے میں جتنا غور کرتا گیا میرا خیال اسی قدر پختہ ہوتا گیا کہ یہ فون کال میرے لئے ایک جال کی حیثیت رکھتی ہے۔

"ذرا آپریٹر سے معلوم تو کرو کہ فون کرنے والے نے اسے تمہارے کمرے کا نمبر دیا تھا یا نام؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت ادسکارا سے کہا۔

"یہاں سارے رہائشی کمروں میں الگ نمبروں والے براہِ راست ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ بیرونی کالز کے لئے آپریٹر نہیں ہے' ویسے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ بولی۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ تل ابیب میں مجھ جیسے ایک سیاح کا کون سا حریف پیدا ہو گیا؟"

"تم نہ بتانا چاہو تو اور بات ہے مگر اس فون نے تمہیں پریشان ضرور کر دیا ہے۔" وہ گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "کسی دیوانے کی سی بات ہوتی تو تمہارے ذہن پر اس کی باتوں کا اتنا زیادہ دباؤ نہیں پڑنا چاہیے تھا۔"

"میرے لئے پریشان کن بات یہ ہے کہ اس خبیث نے مجھے فوراً یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے۔" میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تمہیں کہیں طلب کیا ہے۔" وہ براہِ راست میرے چہرے پر نظریں جما کر بولی۔

"الہام ہوا ہو گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"الہام نہیں ــــ تم بھول گئے کہ آخر میں تم نے اس سے "کہاں" پر مشتمل ایک لفظی سوال کیا تھا۔ شاید تم سمجھ نہیں سکے تھے کہ وہ تمہیں کہاں طلب کر رہا ہے۔" اس بار اس کے رویّے میں محتاط سی تبدیلی آ گئی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے مقدر کو کوسا مگر بظاہر پُرسکون لہجے میں بولا۔ "تم واقعی کافی چالاک ہو۔ اس نے مجھے یہاں سے روانہ ہو کر کسی نامعلوم جگہ پر پہنچنے کے لئے کہا تھا جو میں قطعی نہ سمجھ سکا مگر اس نے جگہ کی وضاحت کئے بغیر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ فون کرنے والا شخص خبطی نہ رہا ہو اور یہ کال غلط فہمی کا نتیجہ رہی ہو۔"

"غلط فہمی؟" وہ دھیمے سے ہنسی۔ "یہ ناممکن ہے موسیو صفدر ــــ وہ فون تمہارے ہی لئے تھا۔ تم اس کمرے میں مقیم نہیں ہو پھر بھی وہ فون اسی کمرے میں آیا۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ وہ جو بھی تھا' تمہاری نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر ہے۔ پھر یہاں اس قسم کے نام ہی نہیں ہوتے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ اس وقت اسرائیل میں صفدر نام کا دوسرا شخص مشکل ہی سے دستیاب ہو سکے۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے اشتباہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ایک فون کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔" وہ مجھ سے دُور سرکتے ہوئے بولی۔

"کسے؟"

"اس فون کال نے تمہاری حیثیت مشکوک بنا دی ہے۔" وہ صاف صاف انداز پر اُتر آئی۔ "ایک امن پسند اسرائیلی شہری کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ تمہارے یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے میں پولیس کو پوری صورتِ حال سے باخبر کر دوں۔ تمہارے بارے میں آخری فیصلہ وہی کر سکتے ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

اسی وقت دروازے پر کسی کی تیز دستک سُنائی دی اور میں بوکھلا کر بستر سے اُتر گیا۔

ادسکارا نے بڑھ کر پھرتی سے دروازہ کھول دیا اور اسی وقت میری نظر اس دیوارگیر سُرخ بٹن پر پڑی جو پہلے ادسکارا کے پیچھے پوشیدہ تھا۔ اس نے مجھے باتوں میں اُلجھا کر ایمرجنسی کال بٹن دبا دیا تھا تاکہ عملے کے کسی فرد کی موجودگی میں میرے متوقع انتہاپسندانہ ردِعمل سے محفوظ رہ سکے۔

دروازہ کھلتے ہی سُوٹ میں ملبوس ایک دراز قامت سفید فام دو بیروں کے ہمراہ کمرے میں گھستا چلا آیا۔

"گٹ آؤٹ۔" میں اپنے بستر پر چادر لپیٹتے ہوئے غضیلی آواز میں چیخا۔

"یہ کیا ماجرا ہے مادام ادسکارا؟" منیجر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر ادسکارا میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "تم باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کر سکتے ہو۔ اس اثنا میں مَیں بھی اپنا کام کر لوں گی۔ پولیس کی آمد تک یہ تینوں یہیں موجود رہیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم میری نازک پوزیشن کے باعث اس احتیاطی تدبیر کا بُرا نہیں مانو گے۔"

"جہنم میں جائیں تمہاری احتیاطی تدابیر۔" میں غصّے میں بڑبڑاتا ہوا غسل خانے کی طرف چل دیا۔

غسلخانے میں پہنچ کر میں شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا اور نیم گرم پانی کی دھاروں میں نہاتے ہوئے اس نئے موڑ کے بارے میں سوچنے لگا۔

میرا ذہن فون کال کے بارے میں اس منطقی نتیجے پر تو پہنچ چکا تھا کہ وہ اسرائیلی حکام کی جانب سے ہی کی گئی ہے۔ ادسکارا کے احساسِ ذمّے داری نے ان کی اس چال کو بُری طرح ناکام بنا دیا تھا۔ ان کے نقطۂ نظر سے ادسکارا نے میرے پھنسنے کی راہ مسدود کر دی تھی کیونکہ کال کے نتیجے میں بالفرض میں اپنے کسی رابطے سے ملنے دوڑا چلا جاتا تو پولیس کی دخل اندازی نے اسے ناممکن بنا دیا تھا۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ ذہین اور منظم افراد پر مشتمل اسرائیلی حکام سے ایسی بھونڈی کارروائی کیونکر سرزد ہوئی۔

جب مجھے غسلخانے میں کافی دیر ہو گئی تو زور زور سے دروازہ پیٹا جانے لگا۔ اس بار کئی مِلی جُلی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"دروازہ توڑنے کی ضرورت نہیں' میں باہر آ رہا ہوں۔" میں نے جھلّا کر کہا اور شاور بند کر کے اپنا بدن خشک کرنے میں مصروف ہو گیا۔

لباس پہن کر میں باہر نکلا تو وہ کمرہ اچھے خاصے جنگی مورچے کا سماں باندھ رہا تھا۔ تین عدد پولیس افسران پوری وردیوں میں ملبوس وہاں موجود تھے۔ دو کے ہاتھوں میں خودکار پستول دبے ہوئے تھے جن کی مہیب نالیاں شاید دروازہ کھلنے کی آہٹ پاتے ہی غسلخانے کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ ہوٹل کا منیجر اپنے بیروں اور ادسکارا سمیت صوفے کے عقب میں اس طرح چوکنا کھڑا ہوا تھا کہ فائرنگ کا آغاز ہوتے ہی صوفے کی آڑ میں پناہ لے سکے۔

"ہینڈز اَپ۔" مجھ پر نظر پڑتے ہی کوئی چلایا۔

میں نے پُرسکون انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔ "یہ کیا مذاق ہے' میں پوری طرح غیر مسلح ہوں۔"

مگر میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ تیسرے غیر مسلح شخص نے بڑھ کر تفصیلی طور پر میری تلاشی لی جس کے بعد ہاتھ گرانے کی اجازت دے دی گئی۔

"ایک منٹ۔" اس افسر نے جیسے ہی مجھ سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا' میں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روک دیا۔ "میں یہ واضح کر دوں کہ میں کیپٹن ماریا سے مشورہ کئے بغیر تم لوگوں کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکوں گا۔"

"کیپٹن ماریا؟" اس افسر نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ "...لگا جو یہاں تمہاری مشیرِ خاص بنی ہوئی ہیں؟"

میں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماریا کا دیا ہوا اپنا شناختی کارڈ نکالا جس پر سب سے اوپر انگریزی میں "آرمی انٹیلی جنس کور" کے الفاظ مع مونوگرام موجود تھے۔

یہ موڑ دیکھ کر ادسکارا بھی اسی طرف آ پہنچی اور پولیس افسر کے شانوں پر سے اُچک کر اس کارڈ کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو تم آرمی انٹیلی جنس کور سے متعلق ہو۔" وہ پولیس افسر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ دونوں نالوں کے دہانے اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی جُھکتے چلے گئے تھے۔

"یہ کارڈ دکھانے کے بعد میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر صفدر کہ ہم نے آپ کو زحمت دی۔" وہ پُراخلاق لہجے میں بولا۔ "اگر ہمیں آپ کی حیثیت کا اندازہ ہوتا تو ہم فون کال پر یوں دوڑے نہ چلے آتے۔"

"مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کوئی سرکاری آدمی ہے۔" ادسکارا نے خجالت آمیز لہجے میں اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو ایک امن پسند شہری کی حیثیت سے اپنی ذمّے داری پوری کرنے کی کوشش کی تھی جس پر مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔"

"میں آپ کا مشکور ہوں مِس ادسکارا۔" وہ افسر مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے اُمید ہے کہ آپ اس غیر معمولی واقعہ سے حوصلہ شکنی محسوس نہیں کریں گی۔ آپ لوگوں کے تعاون کی بدولت ہمیں امن و امان کے دشمن دہشت پسندوں پر ناقابلِ شکست برتری حاصل رہتی ہے۔"

منیجر وغیرہ سے رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد جب پولیس پارٹی جانے لگی تو میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا مگر میں فلیٹ سے نکل بھی نہ پایا تھا کہ ادسکارا نے میرا بازو تھام کر مجھے واپس کھینچ لیا۔

میں اس کا ہاتھ جھٹک کر تیزی سے اس کی طرف پلٹا۔ "کیا بات ہے؟"

"مجھ سے ناراض ہو گئے ہو؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی تیر رہی تھی اور لبوں کے گوشے کپکپا رہے تھے۔

"میں امن پسند شہریوں کی زندگی میں خلل ڈالنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

اسی وقت منیجر اور اس کا عملہ سر جُھکائے ہمارے قریب سے گزر کر باہر چلا گیا۔ وہ لوگ تمام صورتحال سے یک بیک لاتعلق نظر آنے لگے تھے۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔" وہ میرے بالکل قریب آ کر بولی۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ پورا اسرائیل ہر وقت دہشت پسندوں کے خطرے سے دوچار رہتا ہے۔ ہر مہینے کہیں نہ کہیں کوئی بم پھٹتا ہے یا آگ لگ جاتی ہے اور بہت سے بے گناہ شہری موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا تحفظ اسی میں ہے کہ ہم ہر مشکوک بات سے فوراً سرکاری اہلکاروں کو باخبر کرتے رہیں۔ چند ثانیوں کے لئے خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔ کیا ان حالات

میں تمہارا رویہ مختلف ہوتا۔"

"سنو لڑکی!" میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "ہم دو مختلف راہوں کے مسافر ہیں۔ شام کی تنہائی نے چند ثانیوں کے لئے ہمیں یکجا کر دیا۔ میں یہاں سے باہر جاتے ہی تمہیں بھول جاؤں گا۔ کل کوئی اور لڑکی میری بغل میں ہوگی۔ تم میرے بارے میں سنجیدہ ہونے کی کوشش کیوں کر رہی ہو۔ اس سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

وہ میرے ان الفاظ پر چند ثانیوں تک بھوکی شیرنی کی طرح مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ "جاتے ہو تو جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ جاتے ہوئے تمہارے دل میں یہ خلش باقی نہ رہے کہ میں نے نادانستہ تمہاری بے عزتی کرانے کی کوشش کی ہے۔"

"اس کمرے میں ہم دونوں نے کون سا عزت کا کام سرانجام دیا ہے جو میں بے عزتی کے بارے میں سوچتا۔ ویسے فرانسیسی لڑکیاں واقعی لذیذ ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر میں اس کے جلے کٹے فقرے سنے بغیر تیزی سے باہر آ گیا۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو نصف گھنٹے کی مہلت بیت چکی تھی۔ اگر اس فون کال میں ذرا بھی صداقت تھی تو اس وقت میں کسی شدید خطرے سے دوچار تھا۔

پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ کال سچی رہی ہو یا جھوٹی میں بہرطور کسی ناگہانی خطرے میں پھنسنے والا تھا۔ فرضی کال کی صورت میں بھی اس کا محرک لازماً کوئی ڈرامہ رچانے کی کوشش کرتا تاکہ اپنی دانست میں مجھے کال کے درست ہونے کا یقین دلا سکتا۔

ہوٹل سے باہر آیا تو پولیس کا رفٹ پاتھ کے کنارے پارکنگ لاٹ سے باہر رینگ رہی تھی۔ پولیس افسر نے مجھے سیڑھیوں پر دیکھ کر کار میں سے ہاتھ ہلایا اور ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنی فائر پروف کار کی طرف بڑھتا رہا۔

گاڑی میں ایک ویران مقام پر پہنچ جانے کے بعد میں نے ڈیش بورڈ میں لگے ہوئے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کر دیا۔ چند ہی ثانیوں بعد ریڈیو آپریشن سنٹر سے میرا رابطہ پیدا ہو گیا۔

"صفدر کالنگ" سلسلہ مل جانے پر میں نے کہا۔ "میں فوری طور پر کیپٹن ماریا سے بات کرنا چاہتا ہوں — اوور۔"

چند ثانیوں تک دوسری جانب سکوت طاری رہا۔ ریڈیائی لہروں کے دھیمے دھیمے شور میں کچھ کاغذوں کے اُلٹنے پلٹنے کی سرسراہٹیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ نجانے وہ میرے بارے میں کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا یا کیپٹن ماریا کے ٹھکانے کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہیلو مسٹر صفدر — اوور۔" سکوت کے بعد اس آواز نے مخاطب کیا۔

"بول رہا ہوں — اوور۔"

"کیپٹن ماریا کو ٹریس کرنا ناممکن ہے سر — اوور۔"

"لیکن یہ اشد ضروری ہے — اوور۔"

"سوری سر — میں کچھ نہیں کر سکتا — اوور۔"

"کرنل ریٹا؟"

"آپ کرنل سے بات کریں گے؟.... اوور۔" آپریٹر نے حیرت سے سوال کیا۔

"میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، فوراً کرنل سے سلسلہ ملاؤ۔"

"ہولڈ آن۔"

ایک مرتبہ پھر ٹرانسمیٹر پر سکوت چھا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ دو منٹ بعد ڈیش بورڈ سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو — کرنل ریٹا ہیئر — اوور۔"

"میں صفدر بول رہا ہوں کرنل — اس وقت میں بہت دشوار مراحل سے دوچار ہوں، کچھ دشمن میری بُو پر لگے ہوئے ہیں — اوور۔"

"کیا تعاقب ہو رہا ہے؟.... اوور۔"

"مجھے کچھ علم نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے مختصر الفاظ میں اس پُراسرار ٹیلی فون سے لے کر پولیس کی آمد تک کے پورے واقعات اسے سنا ڈالے۔

"اور اس نے کہا تھا کہ تم شدید خطرے سے دوچار ہو — اوور۔" کرنل ریٹا کی دلکش آواز میں فکر کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے کہاں بلانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی تھی جو پوری ہو چکی ہے اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کدھر جاؤں — اوور۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟ اوور۔"

"گریٹ ہال ہوٹل سے شاید مشرق کی طرف ایک ویران علاقے میں ہوں — اوور۔"

"تمہیں اس طرف نہیں جانا چاہیئے تھا۔" کرنل نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "جس قدر جلد ممکن ہو سکے سٹی ہال پہنچو اور وہاں سے واپس چلے آؤ۔ اپنا ٹرانسمیٹر آن رکھنا — اوور۔"

"او کے کرنل! میں کوشش کرتا ہوں۔"

"خدا تمہارا ساتھ دے — اوور اینڈ آل۔"

ٹرانسمیٹر خاموش ہو گیا اور میں عقب نما آئینے میں سڑک کا جائزہ لینے لگا۔

میں دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ میرے لئے بچھایا ہوا جال نہ صرف ناکام ہو چکا تھا بلکہ میں نے ان لوگوں کو بھی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ کار گھما کر میں تھوڑی ہی دیر میں سٹی ہال جا پہنچا اور پھر گاڑی متروکہ راستے پر ڈال دی۔

راستے میں خلاف توقع کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش نہیں آیا اور میں منزل پر جا پہنچا۔ وہاں احاطے میں اس وقت بھی تاریکی کا راج تھا۔ سناٹے میں کہیں کہیں سے جھینگروں کا شور ابھر رہا تھا۔ ابھی کتے بھی نہیں کھولے گئے تھے البتہ پھاٹک پر دو مسلح سنتری موجود تھے۔ انہوں نے دور ہی

سے مجھے پہچان کر پھاٹک کھول دیا تھا۔

"ہیلو ریڈیو آپریشن" کار کا انجن بند کرنے کے بعد میں نے وائرلیس پر کہا۔

"جی ہاں جناب — اوور۔" فوراً ہی جواب دیا گیا۔

"کرنل ریٹا کہاں ہیں؟ اوور۔"

"وہ یہاں موجود نہیں ہیں — آپ اس وقت کہاں ہیں؟ اوور۔"

"میں منزل پر پہنچ چکا ہوں — اوور۔"

"آپ کے لئے پیغام ہے کہ آپ اپنے کمرے میں رُک کر اگلی ہدایات کا انتظار کریں۔ آپ ٹرانسمیٹر بند کر کے جا سکتے ہیں — اوور۔"

"شکریہ — اوور اینڈ آل۔" میں نے ٹرانسمیٹر آف کیا اور گاڑی سے اُتر آیا۔

کمرے میں پہنچنے کے تقریباً دس منٹ بعد ہی ایک شخص مجھے بلانے آ گیا۔

"کس نے بلایا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"مجھے علم نہیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ کمانڈنگ آفیسر نے بلایا ہو۔"

"کمانڈنگ آفیسر کون ہے یہاں؟"

اس سوال پر اس نے یوں حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میری کم فہمی پر اُسے سخت تعجب ہوا ہو پھر بولا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ یہاں کرنل ریٹا سی۔ او ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں "دہ مارا" کا نعرہ لگایا پھر سنجیدگی کے ساتھ اس کے سامنے اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔

اس شخص نے مجھے ایک دفتر میں چھوڑ دیا جہاں ایک عمر رسیدہ یہودی ضخیم فائلوں میں سر کھپا رہا تھا۔ اس نے موٹے عدسوں کے پیچھے سے خوابناک انداز میں میرا جائزہ لیا اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تمہارا کارڈ کہاں ہے، ذرا دکھاؤ تو مجھے۔"

میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے عینک درست کر کے کئی بار اسی انداز میں باری باری میرا اور کارڈ کا جائزہ لیا جیسے اطمینان کرنا چاہتا ہو کہ اس پر میری ہی تصویر لگی ہوئی ہے پھر آہستگی کے ساتھ کرسی سے اُٹھ گیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کی ہدایت پر اس کے ساتھ چل دیا۔

چند پُرپیچ اور ویران راہداریوں سے گزر کر ہم لفٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ اس نے لفٹ میں داخل ہو کر بٹن دبایا اور لفٹ نیچے جانے لگی۔

لفٹ رُکنے کے بعد ہم باہر آئے تو میں نے اندازہ لگایا کہ ہم ایک تہہ خانے میں آ چکے ہیں۔ میرا کمرہ اس عمارت کی پہلی ہی منزل پر تھا۔ لفٹ میں نیچے اُترنے کا مطلب یہ تھا کہ اس عمارت کا زیر زمین پھیلاؤ بھی خاصا وسیع ہے۔

اس بار دبیز قالین سے آراستہ راہداری میں وہ شخص ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہاں ایک طرف ایک میز پڑی ہوئی تھی جس پر چھوٹی سی ایک حساس مشین قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔

"گڈ ایوننگ مادام!" اس یہودی نے مشین پر جھک کر مودبانہ لہجے میں کہا۔ یہ دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی کہ گڈ ایوننگ کہتے ہوئے وہ اپنا داہنا ہاتھ یوں پیشانی تک لے گیا تھا جیسے مشین کے بجائے مادام خود اس کے سامنے موجود ہو۔

"ایوننگ۔" اسی مشین سے کرنل ریٹا کی جانی پہچانی مترنم آواز ابھری۔ "تم انتظار کرو اور صفدر کو اندر میرے پاس بھیج دو۔"

"جاؤ۔" اُس نے اس کمرے کے ایک بغلی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دروازے سے دو قدم دُور ہی تھا کہ چوبی پٹ بغیر آواز پیدا کئے دیوار کے سہارے ایک طرف سرکتا چلا گیا۔ خلا کے اُس پار مناسب دُودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن سامنے لگے ہوئے پردے کی وجہ سے اندر دیکھنا مشکل تھا۔

میں اندر داخل ہوا تو دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ چوبی فریم میں لگے ہوئے پردے کے گرد گھوم کر میں آگے بڑھا تو اچانک میرے اعصاب پر سنسنی چھا گئی۔

میرے سامنے قدرت کے عذاب کا ایک بھیانک شاہکار بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر کئی وائرلیس ریسیور اور ٹیلی فون پڑے تھے۔ کچھ فائلوں اور کاغذات سے بھری ہوئی ٹرے بھی موجود تھیں۔ اس کے مقابل والی دیوار پر تین بڑے بڑے سکرین نظر آ رہے تھے جو اس وقت ویران پڑے ہوئے تھے۔

"کیا ڈر گئے ہو؟" اس خوفناک ڈھانچے سے آواز نکلی تو میں فرطِ حیرت سے بوکھلا کر رہ گیا۔ رسیلی اور مترنم آواز میں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

"نہیں کرنل!" میں نے اپنے دل کی بے اختیار دھڑکنوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اس دفتر کے طلسم نے حیران کر دیا تھا۔"

"یہاں بیٹھ جاؤ۔" اُس نے میز کے پار رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی شیریں آواز میں کہا۔ "مجھے قریب سے دیکھ کر تمہیں شدید مایوسی ہوئی ہوگی۔"

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قدر دلکش آواز کی مالک خاتون کے ساتھ قسمت نے ایسا بھیانک مذاق کیا ہوگا۔

"اسے پلاسٹک سرجری بھی نہ سُدھار سکی۔" وہ پنسل کے سرے سے اپنا جھلسا ہوا اتھوانی چہرہ سہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ سر شٹ کی جنگ کا تحفہ ہے۔ میں سر سے پیر تک بُری طرح جھلس گئی تھی۔ میں نے دو سال تک بچے دل سے موت کی آرزو کرنے کے بعد زندگی پائی ہے۔ میرے سر پر وگ موجود ہے اور پورے جسم پر بے شمار سفید نشانات ہیں جیسے مجھے برص کا مرض ہو گیا ہو۔"

"اچھے دل کے سامنے حسین چہرے بے معنی ہیں کرنل۔" میں یک بیک اسے اپنا بزرگ سمجھنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس کے سر پر وگ موجود تھی، چہرے کی جلد جھلسی ہوئی تھی اور اس پر اتنا کھچاؤ موجود تھا کہ جبڑوں کی ساخت تک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ دائیں آنکھ شاید ضائع ہو چکی تھی کیونکہ اس خلا میں پتھر کی بے حس آنکھ موجود تھی۔ روشنی کے ردِ عمل کے طور پر مصنوعی آنکھ کی پُتلی سکڑنے سے قاصر تھی جس کے نتیجے میں اس کی دونوں پُتلیوں میں ڈراؤنی حد تک فرق نمایاں تھا۔ اس کا سینہ کسی بنجر صحرا کی طرح سپاٹ تھا۔ اپنی دراز قامتی کے ساتھ وہ عجوبۂ روزگار معلوم ہو رہی تھی۔

"میں حُسن و قبح کے فلسفے سے اچھی طرح واقف ہوں۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔ "مجھے ہمدردانہ رویّے سے نفرت ہے۔ آدمی کو وہی کہنا چاہیئے جو اس کے دل میں ہو۔"

"یقیناً۔" میں بوکھلا کر بمشکل ہی ایک لفظ ادا کر سکا۔

"تم کو میں نے یہاں اس لئے طلب کیا ہے تاکہ تمہیں تمہاری آنے والی ذمّے داریوں سے آگاہ کر سکوں۔" اس نے پتلا سا سگار سُلگاتے ہوئے کہا۔

"اس طرح میری بڑی اُلجھن دُور ہو جائے گی۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مجھے کس مصرف کے لئے اسرائیل لایا گیا ہے۔"

"کیپٹن ماریا تمہیں بتا چکی ہے کہ تم کو جلد ہی صحرائی طرز کے گوریلا تربیتی کیمپ میں بھیجا جانے والا ہے۔" وہ سگار کا کثیف دُھواں فضا میں اُگلتے ہوئے بولی۔ "گو تمہیں اسرائیل اور اس کے جواز کا فلسفہ سمجھنے کا موقع نہیں ملا ہے مگر مختلف ذرائع سے تمہارے ذہنی رُجحانات کے بارے میں مجھے جو اطلاعات ملی ہیں ان کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ آگے چل کر تم ہمارے لئے بہترین سرمایہ ثابت ہو سکو گے۔ اسرائیل چاروں طرف سے اپنے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے جو جنون کے عالم میں پوری یہودی قوم کو سمندر میں دھکیل دینا چاہتے ہیں مگر ہم پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنے قدم بڑھانے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ ہماری مملکت برسوں کی عرق ریزی اور منصوبہ بندی کے نتیجے میں قائم کی گئی ہے۔ ہماری نہ جانے کتنی نسلوں نے جلاوطنی اور ذلّت کی صدیاں بسر کی ہیں۔ ہمارے معبد زمین بوس کر دیئے گئے، ان کی بنیادیں مٹا دی گئیں۔ میری یہ باتیں تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ فلسطین میں یہودی بھی رہتے آئے ہیں۔ اگر مسئلہ صرف فلسطین کا قیام ہے تو وہ جنم لے چکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اس کا نام اسرائیل ہے۔ ہمارے دشمن فلسطین نہیں بلکہ مسلم فلسطین چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی اس پر بھی ہم رضامند ہو جائیں لیکن یہ ریاست اسرائیل کی سرحدوں سے باہر قائم ہو گی، اندر نہیں۔ اپنے مقاصد کے لئے ہمیں بعض محاذوں پر دشواریاں درپیش ہیں۔ ہمارے بے شمار افراد سراغ رسی اور جوابی تخریبی کارروائیوں کے لئے دشمن کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں مگر محدود افرادی وسائل اور شناخت کے کڑے مراحل کی وجہ سے ہمیں دوسرے ذرائع پر بھی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ بن حیان اپنے ذرائع سے اسرائیل کے لئے مددگاروں کی نفری فراہم کرتا ہے۔ تم مضبوط جسمانی ساخت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہو۔ تمہیں عراق کے خصوصی حالات کے پیشِ نظر تربیت دی جائے گی جس کے بعد تمہیں سرحد کے اُس پار ہمارے مفادات کے لئے کام کرنا ہو گا اور ہم تمہارے تمام متعلقین کی ضروریات پوری کرتے رہیں گے۔"

"مقصد معلوم ہو جانے کے بعد شاید میں بہتر طور پر تربیت سے فائدہ اُٹھا سکوں گا۔" میں نے کہا۔ کرنل ریٹا کی گفتگو نے میرے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔

"ہمارے وسائل کا تمہیں کسی حد تک اندازہ ہو چکا ہو گا۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جما کر بولی۔ "اسرائیل کے مفادات سے غدّاری کرنے والوں کو کہیں پناہ نہیں ملتی۔"

"اس بات کا مجھے بخوبی اندازہ ہے مگر میرے لئے تو ابتدا ہی سے دُشواریاں سامنے آتی جا رہی ہیں۔" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"کیسی دشواریاں؟"

"کوئی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اسرائیل کی سرحدوں سے باہر وہ شاید میرے لئے جان لیوا خطرات پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔"

"اس کا خیال ذہن سے نکال دو۔" وہ کرسی کو آہستہ سے گردش دیتے ہوئے بولی۔ "اس کا انتظام کیا جا چکا ہے۔"

"کیا وہ پکڑا گیا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں نے کہا نا کہ اسے ذہن سے نکال دو۔" وہ اپنے الفاظ پر زور دے کر بولی۔ "وہ فون کال محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔"

"اوہ۔" میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ "میں ایک بہت بڑی اُلجھن سے بچ گیا ہوں۔"

"اس پر اپنے تمام متعلقین کے نام اور پتے لکھ دو۔" اُس نے چھپے ہوئے فارموں پر مشتمل ایک پیڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انہیں مجموعی طور پر معقول رقم ہر ماہ ملتی رہے گی۔ مگر وہ تمہارے مشاہرے میں سے منہا کر لی جائے گی۔"

"میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔ ایک بیوی تھی وہ بھی بچھڑ چکی ہے۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"خیر — تو دس ہزار ہندوستانی روپوں کے مساوی مقامی کرنسی تمہیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ملے گی۔ بعد میں سرکاری اخراجات کے لئے تمہیں وسیع اختیارات بھی مل جائیں گے۔" اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ کئے بغیر جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"کیا میری بیوی کی تلاش میں کچھ مدد مل سکتی ہے؟" میں نے پُرامید لہجے میں سوال کیا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"مجھے شبہ ہے کہ وہ سرحد عبور کر کے ہندوستان سے پاکستان میں جا چکی ہے۔"

"ناممکن۔" اُس نے فیصلہ کن انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "پاکستان میں ہماری ایسی تمام سماجی تنظیموں پر پابندی عائد ہے جن کی آڑ میں ہمارے ایجنٹ سرگرم رہتے تھے۔ وہاں کے حالات ہماری کارروائیوں کے لئے سخت دشوار ہیں۔" پھر اچانک وہ لہجہ بدل کر بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ کڑی تربیت کے دوران بیوی کی یاد تمہیں ستاتی رہے اس کے بعد میرا دعویٰ ہے کہ تم بہت جلد اسے بھول جاؤ گے۔ کام سے فراغت کے لمحات بیت حسین گزریں گے۔"

"نہیں کرنل! میں اُسے کبھی نہ بھول سکوں گا، وہ ہمیشہ میری کمزوری ہی رہے گی۔"

"محبت اور لگاؤ سب نظر فریبی ہے صفدر!" وہ نرم بزرگانہ لہجے میں بولی۔ "جب تک عورت میں حُسن اور دلکشی برقرار رہتی ہے، مرد دیوانہ وار اس کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ ایک بار مرد کو ذرا شبہ بھی ہو جائے کہ عورت کا شباب ڈھل رہا ہے تو وہ اس سے اُکتا جاتا ہے۔"

"ہم مل سکتے ہیں کرنل مگر ذہنی مجبوریاں مشکل ہی سے ہو پاتے ہیں۔ ان معاملوں میں ہم لوگ ذرا تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔"

"میں دیکھوں گی کہ تمہارے لئے کیا کیا جا سکتا ہے مگر تربیت سے پہلے کچھ ممکن نہیں۔" اس نے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

"شب بخیر کرنل!" میں اُٹھ کر احتراماً قدرے جھکا اور واپس چل دیا۔

میں خود کار دروازے سے نکلا تو بوڑھا یہودی میرا منتظر تھا۔ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچنے کے بعد ہم دونوں الگ ہو گئے۔ بوڑھے نے میرا شناختی کارڈ مجھے واپس کر دیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور انٹر کام پر کچن والوں کو کھانا بھیجنے کی ہدایت دے کر ایک مقامی انگریزی اخبار پڑھنے لگا۔

ابھی مجھے لیٹے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کسی نے دستک دیئے بغیر دروازہ کھولا اور لمحے ہی لمحے کیپٹن ماریا اندر گھس آئی۔

"گڈ نائٹ براؤن بوائے!" وہ معمول سے شوخ لہجے میں بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ بھر کس چاہنے والے کا انتظار کر رہے ہو۔" میں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔" وہ بے تکلفی سے مجھے پیچھے دھکیل کر بستر پر ہی بیٹھ گئی۔

"الگ بیٹھو۔ کچن بوائے میرا کھانا لاتا ہو گا۔"

"دستک دیئے بغیر وہ اندر نہ آئے گا۔" اس وقت وہ خلافِ معمول شگفتہ موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ "سنا ہے تم ابھی کرنل سے مل کر آئے ہو۔"

"ہمیں ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیئے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"ارے یہ تو بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہاں ہر ایک کو معلوم ہو چکا ہے کہ تم اس سے ملے ہو۔" وہ میرے سینے پر اُنگلی مارتے ہوئے بولی۔

"اعزاز ہو گا مگر میرے نزدیک وہ میرے فرائض کا ایک حصّہ تھا۔"

"تمہیں اس فون والے قصّے کا پتہ چلا؟" اچانک اس نے سوال کیا۔

"کون سا فون؟"

"گرینڈ ہال میں تم نے کوئی کال ریسیو نہیں کی تھی؟"

"ہاں ہاں۔" میں اس تذکرے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا اس کے بارے میں؟"

"وہ کیپٹن ہنری کی حرکت تھی، اُسے ایک ماہ کے لئے معطل کر دیا گیا۔" وہ اس معطلی پر خاصی مسرور نظر آ رہی تھی۔

"یہ کیپٹن ہنری کون ہے؟ پورا قصّہ بتاؤ۔"

"یہ وہی نامعقول گارڈ نما ڈرہے۔" وہ مُنہ بنا کر بولی۔ "تشدّد اور دھینگا مشتی کا ماہر ہے۔ براہِ راست کرنل کی ماتحتی میں کام کرتا ہے۔ اس نے تمہارا نام بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں رکھا تھا۔ فلسطینیوں سے بازپُرس میں ناکامی کے بعد اس نے ایک آدمی تمہارے پیچھے لگا دیا تھا۔ پھر اپنے طور پر تمہیں فون کر بیٹھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ راڈرک کو مارنے کے بعد کوئی نہ کوئی مشکوک شخص تم سے ملا ہو گا۔ اس مفروضے کی بنا پر اسے یقین ہو چلا تھا کہ فون ملتے ہی تم دوڑے ہوئے اُدھر جاؤ گے اور تمہارے ساتھ ہی راڈرک کی موت کا ذمّے دار بھی دھر لیا جائے گا۔"

"مگر یہ راز کُھلا کیسے؟" میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔ ویسے دل ہی دل میں مجھے ہنری سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بدبخت نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا مگر عجلت اور غلط طریقۂ کار کی وجہ سے خود ہی عتاب کا شکار ہو گیا۔

"سُنا ہے کہ پولیس کی مداخلت اور ناکامی کے بعد کیپٹن نے خود ہی کرنل کو پورے قصّے کی اطلاع دی تھی اور انعام میں معطلی کا پروانہ مل گیا۔"

"وہ رینک میں تمہارے برابر ہے مگر سینیئر معلوم ہوتا ہے۔"

"سینیئر ہونا اور بات ہے۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اسے سارجنٹ کا عہدہ بھی دیا جائے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "تمہیں کس نے بتایا کہ وہ سینیئر ہے۔"

"تمہاری خوشی سے صاف ظاہر ہے۔"

"کرنل ریٹا کی سُریلی آواز کا خمار اترا یا اب بھی باقی ہے؟" اس نے چالاکی کے ساتھ موضوع بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک اعتبار سے وہ قابلِ رشک زندگی گزار رہی ہے۔"

"سُنا ہے کہ حادثے سے پہلے وہ بے حد حسین تھی۔ اگر اس کے مرتبے کو بھی نظرانداز کر دیا جائے تو یہی کچھ کم کمال نہیں کہ ایسی بھیانک ہیئت کے ساتھ بھی وہ صحیح الدماغ رہ کر زندگی بسر کر رہی ہے۔"

"تمہیں یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد وہ گنے چنے لوگوں ہی سے ملتی ہے اور یہ پسند نہیں کرتی کہ عام لوگوں میں اس کے بارے میں چرچے ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ لارنس بھی کبھی اس سے نہیں مل سکا ہے۔"

"یہ لارنس کون ہے؟"

"کرنل کا برائے نام اسٹینو ہے، وہی بڈھا تو تمہیں نیچے سے لیا ہو گا۔"

"اوہ۔ وہ تو بے حد خشک آدمی ہے۔" میں ہنستے ہوئے بولا۔
"حد تو یہ ہے کہ اس سے تعارف تک کی نوبت نہیں آسکی لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بھی کرنل کو نہ دیکھ سکا ہو۔ اسٹینز کا تو اپنے افسر سے بہت قریبی رابطہ ہوتا ہے۔"
"میں نے کہا نا کہ وہ برائے نام اسٹینز ہے۔" وہ برائے نام پر زور دے کر بولی۔ "بیشتر ہدایات اسے فون پر مل جاتی ہیں تفصیلی خط و کتابت کرنل ٹیپ کر کے اسے بھجوا دیتی ہے۔"
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ماریا جلدی سے مسہری سے اٹھ کر کرسی پر جا بیٹھی۔ میری آواز پر کچن بوائے کھانے کی ٹرے لیے اندر چلا آیا۔
اگلی صبح میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر دن چڑھے آوارہ گردی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ جوں ہی میں نے گاڑی عمارت کے احاطے سے نکالی۔ اچانک داہنی جانب سے ایک گداگر نما شخص گاڑی کے سامنے آگیا۔ اگر میں فوراً ہی بریک نہ لگا دیتا تو وہ یقیناً زخمی ہو جاتا۔
میں کھڑکی سے سر نکال کر اسے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ خود معذرت خواہانہ انداز میں میری طرف لپکا اور پل بھر میں میرے قریب آکر ہاتھ پھیلا دیا۔
"کالا خو!" اس نے کن انکھیوں سے پھاٹک پر متعین سنتری کی طرف دیکھتے ہوئے زیرِ لب سرگوشی میں کہا اور یک بیک میرا دوران خون تیز ہو گیا۔
میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس طرح اس کا جائزہ لینے لگا جیسے اس میں مناسب مالیت کے سکے تلاش کر رہا ہوں۔
"میں اسے دیکھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔" میں نے سکوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
"گڈ!" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ "دوپہر دو بجے پبلک لائبریری کے ریفرنس ہال میں پہنچو۔ یہاں بلاوجہ کسی کو شبہ ہو سکتا ہے۔"
میں نے ایک سکہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور وہ بلند آواز میں دعائیں دیتا ایک طرف ہو لیا۔ میں نے کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔
میں نے اپنا بیشتر وقت شہر کی سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا۔ اس دوران میں میری نظر عقب نما آئینے میں نظر آنے والی اس سیاہ سیڈان کار پر جمی رہی جو کافی دیر سے میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس میں ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی موجود تھا۔ اس کے عزائم کا اندازہ لگانے کے لیے میں نے اپنی کار ایک ویران سڑک پر ڈال دی مگر اس بار میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ کار داہنی جانب مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
میں گاڑی اسی سڑک پر بڑھاتا چلا گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ کار کسی بیکار سے کی ہی ہوگی جو اتفاقاً میری ہی طرح آوارہ گردی کر رہا تھا۔ میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔
یہ شاہراہ اس طرح تعمیر کی گئی تھی کہ آنے اور جانے والے ٹریفک کو الگ کرنے کے لیے سڑک کے درمیان گھاس لگا دی گئی تھی۔ ہوبہو منڈیر والا گھاس کا وہ سلسلہ دور تک چلا گیا تھا اور کافی دور تک ایسے آثار نہیں تھے کہ میں یوٹرن لے کر واپسی کی راہ اختیار کر سکوں۔
کچھ دیر بعد اکا دکا مکانات بھی پیچھے رہ گئے اور میں ایک ویران سے سرسبز مضافاتی علاقے میں نکل آیا۔ یوں تو اس سڑک سے کئی چھوٹی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ مگر ان پر نام وغیرہ نہ ہونے کے سبب مجھے بھٹکنے کا اندیشہ تھا لہٰذا میں سیدھا ہی چلتا رہا۔
پھر اچانک میری نظر ایک دراز قامت بھاری بھرکم شخص پر پڑی جو سڑک کے کنارے کھڑا ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔
پہلے تو میں نے اسے نظر انداز کرنے کا ارادہ کر لیا مگر اس کی بے تابی دیکھ کر مجھے رحم آگیا۔ اس ویران سڑک پر ٹریفک بہت کم تھا اور نہ جانے وہ کار کے انتظار میں سے کب سے یونہی کھڑا رہتا پڑتا۔ میں نے کلچ دبا کر ایکسلریٹر سے پاؤں ہٹا لیا۔
میں نے گاڑی اس کے قریب روکی تو وہ مضطربانہ انداز میں میری طرف آیا۔ اس کی سرخ و سفید پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔
"جناب کیا آپ سیدھے جا رہے ہیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے [illegible] لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔
"یوٹرن ملنے تک مجھے سیدھا ہی جانا ہوگا۔"
"اوہ۔ پھر تو یہ بہت اچھا ہے۔" وہ خوش ہو گیا۔ "یہاں سے دو میل آگے میرا فارم ہے۔ مجھے وہاں اتارنے کے بعد چند فرلانگ دور آپ کو یوٹرن مل جائے گا۔"
میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ بلند آواز میں اپنی ممنونیت کا اظہار کرتا ہوا میرے پہلو والی نشست پر بیٹھ گیا۔
"تم یہاں کیا کر رہے تھے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔
"کسی نیک دل انسان کا انتظار کر رہا تھا۔" اس نے کھیسیں پھیلا کر جواب دیا۔
"اوہ۔ مگر تم یہاں تک پہنچے کیسے؟" میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
جواب میں اس نے پھرتی سے اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف تان لیا۔ "اس کے پہنچنے مجھے اندازہ تھا کہ تم یوٹرن کی تلاش میں سیدھے ہی آؤ گے۔"
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی چمکتی ہوئی قہر آلود نظریں میری طرف نگراں تھیں۔ ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور اس کی شہادت کی انگلی ٹریگر پر تیار تھی۔
اسی وقت داہنی جانب کی ایک تنگ سی سڑک پر مجھے وہی کالی سیڈان نظر آئی جو شہر میں میرا تعاقب کرتی رہی تھی اور پھر غائب ہو گئی تھی۔
اس وقت سیڈان کی ڈرائیونگ سیٹ پر سنہرے بالوں والی ایک لڑکی تاریک شیشوں کی ایک عینک لگائے براجمان تھی۔

میرے ساتھ موجود شخص نے بایاں ہاتھ لہرا کر اسے اشارہ کیا اور سیڈان فوراً ہی حرکت کر کے شاہراہ پر نکل آئی۔ شاید اس کا انجن پہلے ہی سے اسٹارٹ تھا۔
"چالاکی کی کوشش کیے بغیر گاڑی چلاتے رہو۔" وہ شخص غرایا۔ "کوئی بدمعاشی کی تو میں بلا تامل تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"
"آخر تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"
"ابھی سب پتہ چل جائے گا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "تمہارے ستارے ہی گردش میں معلوم ہوتے ہیں جو اتنی جلدی گرفت میں آگئے۔"
میں نے گیئر بدلتے ہوئے ایک پل کے لیے ٹرانسمیٹر کے بارے میں سوچا۔ اگر میں اسے آن کر دیتا تو ریڈیو آپریشن سنٹر والے میرے اغوا کے بارے میں باخبر ہو سکتے تھے۔ وہ جو بھی رہا ہو کم از کم فلسطینی افواجِ آزادی کا آدمی تو نہیں تھا۔ اس کا رویہ میرے ساتھ مخاصمانہ تھا جب کہ ابھی تک میں نے فلسطینی افواجِ آزادی کے کسی فرد کو فریب دینے کی کوشش نہیں کی۔
مگر وہ خبیث میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ مجھے تردد کا شکار ہوتے دیکھ کر میرا ارادہ بھانپ گیا۔ "خبردار جو کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گاڑی میں ٹرانسمیٹر موجود ہے۔" اور اسی غراہٹ کے دوران میں اس نے ڈیش بورڈ سے لٹکتے ہوئے وہ چند تار بے رحمی سے کھینچ کر توڑ ڈالے جو واضح طور پر ٹرانسمیٹر کے لیے تھے۔
عقب نما آئینے میں کالی سیڈان مختصر سے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔
میرے لیے یہ صورت حال بڑی الجھن آمیز تھی۔ میں اپنی حماقت کی وجہ سے اس جال میں پھنسا تھا۔ اگر میں راستے ہی میں کسی ذیلی سڑک پر نکل گیا ہوتا تو اس صورت حال سے بچ سکتا تھا۔ مجھے مضافات کی طرف نکلتے دیکھ کر ہی شاید وہ بھانپ گیا تھا کہ میں سیدھا جاؤں گا لہٰذا وہ کسی مختصر راستے سے مجھ سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکی شروع ہی سے اس کے ساتھ رہی ہو جسے پوری توجہ نہ دینے کے باعث میں نہ دیکھ سکا ہوں۔
کچھ دور چلنے کے بعد اس نے مجھے ڈھلوان میں گاڑی اتارنے کا حکم دیا۔ میرے سامنے تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سیڈان شاہراہ پر ہی رک گئی۔
فائر برڈ ناہموار زمین جھاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان اچھلتی بے ڈھنگے طریقے پر آگے بڑھتی رہی۔ چند ہی منٹ میں ایک اونچا سا ٹیلا نظر آنے لگا۔ اس شخص کی ہدایت پر میں نے گاڑی ٹیلے کی اوٹ میں لے جا کر روک دی۔ اب اس کا شاہراہ پر سے دیکھا جانا ناممکنات میں سے تھا۔
"اب میری ہی طرف سے نیچے اتر آؤ۔" وہ اپنی سمت کا دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے بولا۔ انجن بند کر کے وہ چابی اپنی جیب میں ڈال چکا تھا۔
میرے سامنے اس عیار شخص کی بات ماننے ہی میں عافیت تھی۔ میں بے چون و چرا نیچے اتر گیا۔ اس وقت میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کے ہاتھوں پر جھلی نما باریک دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ کوئی پیشہ ور قانون شکن معلوم ہوتا تھا جو کام سے پہلے اس کی جزئیات پر غور کر لینے کا عادی تھا۔
"اب تمہارے ساتھ سیڈان کی طرف چلوں؟" میں نے سورج کی تیز روشنی میں آنکھیں سکیڑتے ہوئے خوش دلانہ لہجے میں سوال کیا۔
"اس عقلمندی کا مظاہرہ کرتے رہے تو جلدی گلوخلاصی ہو جائے گی۔" اس نے ریوالور کی نال کے اشارے سے میری بات کی تائید کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔
"تم اپنا مدعا بتاتے ہی نہیں جو میں عقلمندی کا مظاہرہ کر سکوں۔" میں آگے بڑھتے ہوئے بولا کیونکہ وہ خاصا اکھڑا اکھڑا نظر آ رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میری ہچکچاہٹ پر وہ ہاتھ چلانا نہ شروع کر دے۔
"اس کا بھی وقت آجائے گا۔" وہ کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرایا۔
"ہو سکے تو اسی وقت سے فائدہ اٹھا لو۔ شاید اس طرح تم اس بھاگ دوڑ سے بچ جاؤ۔ مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ تم اپنی بات منوانے والوں میں سے ہو۔"
میرے آخری فقرے نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ فوراً کچھ نہ کہہ سکا۔
"کس سوچ میں کھو گئے میرے بھائی؟" میں نے سر کھجا کر کہا۔
"پیچھے مڑنے کی ضرورت نہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "میں ریوالور جیب میں رکھ رہا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ تمہاری چالاکی سے نمٹنے کے لیے میں پتلون برباد ہونے کی پرواہ بھی نہیں کروں گا۔"
"تم نے میری پیشکش کا جواب نہیں دیا!"
"تم اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والے تو نظر نہیں آتے!" وہ اس بار قدرے الجھن آمیز لہجے میں بولا۔
"آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"
"بکواس بند۔" اس بار وہ جھلا کر بولا۔ "تم سے میں سکون کے ساتھ نمٹوں گا۔ میرے ساتھ چالبازی کی ہر کوشش ناکام ہوگی۔"
وہ شاہراہ خاصی ویران واقع ہوئی تھی۔ ناہموار میدان سے سڑک تک پہنچنے کے دوران میں مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ سیڈان بدستور اپنی جگہ پر موجود تھی۔
جب ہم دونوں قدرے قریب پہنچے تو سیڈان میں موجود عورت سکا کو کامیابی سے پھنسے دیکھ کر مسرت آمیز لہجے میں پکار اٹھی۔ "بہت خوب ہنری!"
اس بار میں چونک پڑا اور بے اختیار میرے قدم رک گئے۔ میں مڑ کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔
"آگے بڑھو ورنہ زخمی کر دوں گا۔" وہ غرایا۔
"تو تم پیٹن ہنری ہو!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔
"ہاں میں پیٹن ہنری ہوں ـــ سمجھے!" وہ فصیلی آواز میں بولا۔ "اسے ذرا سی دیر کے لیے بھی اپنی زبان پر قابو رکھنا محال ہوتا ہے!" دوسرا فقرہ اس نے یقیناً اس عورت کے لیے استعمال کیا تھا جو سیڈان میں ڈرائیونگ سیٹ

پر موجود تھی۔

"شاید تم اپنی معطلی کا بدلہ لینے کے لئے میرے پیچھے لگے ہو؟"

"بدلہ برابر والوں سے لیا جاتا ہے تم تو میرے لئے چیونٹی سے بھی زیادہ بے وقعت ہو۔"

"کرنل ریٹا تمہارے یہ خیالات جان کر خاصی مسرور ہو گی۔"

"ان ہی لوگوں نے تمہارا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔ میں پل بھر میں تم سے بہتر دس آدمی مہیا کر سکتا ہوں ـــ اب دیکھوں گا کہ تمہارے بغیر کون سا کام رکتا ہے۔"

"تم نے غیر قانونی طریقہ اختیار کیا ہے کیپٹن۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کرنل نے تمہیں اپنی مرضی سے سزا دی ہے۔ اس میں میرا کیا دخل ہے؟"

"دخل" وہ پاگل کی طرح ہنس پڑا۔ "مجھے یقین ہے کہ راڈرک کی موت کی آڑ میں تم کسی گھناؤنی حرکت میں ملوث ہوئے ہو اور میں اسے ثابت کروں گا۔"

"تمہیں غلط فہمی ہے کیپٹن۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔ آخر میں تم لوگوں کے خلاف کسی سے اور کس طرح ساز باز کر سکتا ہوں؟"

"گاڑی میں بیٹھو۔" اس نے بائیں ہاتھ سے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

میں پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا اور وہ بھی پھرتی سے میرے برابر میں آ بیٹھا۔ پھر اس سے قبل کہ میں سرک کر دوسرے کنارے پر جاتا اس نے تیزی کے ساتھ ریوالور کا دستہ میری کنپٹی پر رسید کیا اور میں ہلکی سی چیخ مار کر پائیدان پر لڑھک گیا۔

اس وقت تک سنہرے بالوں والی لڑکی سیڈان کو سڑک پر لا چکی تھی۔

مجھے ہوش آیا تو درد سے میری کنپٹی پھٹی جا رہی تھی اور نگاہوں کے سامنے بے شمار رنگین دائرے ناچ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے پتہ چلا کہ میں تختوں اور شہتیروں سے بنے ہوئے ایک بھونڈے مگر مضبوط کمرے میں قید ہوں۔ جھریوں سے آنے والی روشنی کی کرنوں سے پتہ چل رہا تھا کہ ابھی دن ڈھلنے میں کافی دیر باقی ہے۔

اس کمرے کے ایک گوشے میں خالی چوبی کریٹ ایک انبار کی صورت میں جمع تھے۔ فضا میں سڑے ہوئے پھلوں کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں خاصی دیر تک پوری توجہ سے کوئی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا [illegible] چند چوہوں کی بھاگ دوڑ کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی۔

آخر کار تھک ہار کر میں زمین سے اٹھ گیا اور دروازے پر زور آزمائی کی کوشش کرنے لگا مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ پھر میں نے دیواروں کے تختوں کا جائزہ لیا گو وہ شہتیروں کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوئے تھے مگر کسی مناسب اوزار کی مدد سے انہیں اکھاڑا جا سکتا تھا۔ عجب کہ اس ویران کوٹھڑی میں گرد اور تختوں کے سوا کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

میری رسٹ واچ اس وقت چار بجا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں کم و بیش چھ گھنٹے تک بیہوشی کا شکار رہا۔ مجھے صبح ملنے والے پیغام کا بھی خیال آیا جس کے مطابق مجھے ۱۰ بجے پبلک لائبریری کے ریفرنس ہال میں ایک فلسطینی سے ملنا تھا۔

میں نے جھریوں میں سے باہر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کمرے کے چاروں طرف بے ترتیبی کے ساتھ سبزہ اگا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مدتوں سے وہاں کسی کا گزر نہ ہوا ہو۔ ہو سکتا تھا کہ کسی زمانے میں وہاں کچھ باغات وغیرہ رہے ہوں کیونکہ خودرو سبزے کے درمیان کہیں کہیں اونچے مگر بے ترتیب پودے بھی نظر آ رہے تھے جو دیکھ بھال نہ ہونے پر زبان حال سے فریاد کناں تھے۔ رینری نے مجھے قید کرنے کے لئے یقیناً ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں میں چیخ چیخ کر مر بھی جاتا تو میری آواز کسی انسان کے کانوں تک نہ پہنچ پاتی۔ اور وہ خود بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا۔ میرے لئے وہاں بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب اندھیرا پھیلنے لگا تو چوہوں کی بھی ہمت عود کر آئی اور وہ پوری کوٹھری میں دندناتے ہوئے پھرنے لگے۔ کئی بار میں نے ان کے کراہیت انگیز پیر اپنے بدن اور ٹانگوں پر بھی محسوس کئے مگر میں نے ان سے الجھ کر اپنی توانائی ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔

جوں جوں اندھیرا بڑھتا گیا، چوہوں کی یلغار شدید ہوتی گئی۔ میرے مفاہمانہ رویئے سے غالباً انہیں شبہ ہونے لگا کہ ان کے درمیان کوئی زندہ انسان نہیں بلکہ بے جان لاش موجود ہے جس پر انہیں پوری طرح تصرف حاصل ہے۔ کئی چوہے لباس کے سہارے میرے بدن پر چڑھنے لگے۔ میں نے جھلا کر ہاتھ گھمایا اور ایک چوہا میری گرفت میں آ گیا۔ بقیہ چکاریاں مارتے فرار ہو گئے۔ اپنے ہاتھ میں آئے ہوئے چوہے کو میں نے پوری طاقت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا۔

اس کارروائی سے کچھ دیر کے لئے تو سکون ہو گیا مگر پھر وہی طوفان بدتمیزی شروع ہو گیا۔ آثار بتا رہے تھے کہ کیپٹن رینری مجھے بند کر کے اطمینان سے کہیں جا چکا ہے۔ اس کی جلد واپسی کے بھی کوئی امکانات نہیں تھے جبکہ ان چوہوں کے درمیان رات بسر کرنے کا تصور ہی کراہیت آمیز اور ناقابل برداشت تھا۔

معاً میرے ذہن میں ایک انوکھی تدبیر آئی۔ کسی طرح تھوڑی سی روشنی ہو جاتی تو چوہے خوفزدہ ہو کر اپنی کمین گاہوں میں دبکے رہتے

اور اس خیال نے فوراً ہی ایک ولولہ انگیز روپ دھار لیا۔ اگر روشنی کرنی ہی مقصود تھی تو کیوں نہ اس کوٹھری کو آگ لگا دی جائے۔

میری ماچس میں کافی تیلیاں موجود تھیں۔ کوٹھری کی تعمیر میں لکڑی ہی لکڑی استعمال کی گئی تھی اور ایک گوشہ میں پتلے پتلے خشک تختوں کے کریٹ انبار کی صورت میں جمع تھے۔ میں بآسانی انہیں آگ دکھا سکتا تھا اور جب کوئی حصہ جل کر منہدم ہو جاتا تو میں آگ میں پوری طرح گھرنے سے قبل اس قید سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔

میں دل ہی دل میں اپنی حماقت پر افسوس کرتا آگ سلگانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ اتنی آسان راہ فرار موجود ہوتے ہوئے میں نے کافی وقت گنوا دیا تھا۔

آگ سلگانے کی کوشش میری توقع کے برعکس خاصی دشوار ثابت ہوئی۔ دیا سلائی سے تختوں کو براہ راست جلانا مشکل تھا لہٰذا میں اندھیرے ہی میں کاغذ اور گھاس پھوس جمع کرنے لگا۔

جس وقت میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس مختصر سے ڈھیر کو آگ لگائی اس وقت فضا میں ایک مانوس سی آواز سنائی دی جو بتدریج واضح ہوتی جا رہی تھی۔

جب سے میں ہوش میں آیا تھا، میں نے وہاں کوئی مشینی شور نہیں سنا تھا مگر وہ آواز پل بھر میں قریب آ گئی۔ اور کوئی جیٹ جہاز چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا پھر یکے بعد دیگرے دو جنگی طیارے پوری گھن گرج کے ساتھ فضا سے گزرے۔ زمین کی لرزش اور آوازوں کی گونج سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ خاصی نیچی پرواز کرتے ہوئے گزرے تھے۔

فضا پر ایک بار پھر سکوت چھا گیا جسے چوہوں کا شور توڑ رہا تھا۔ چوبی کریٹ آہستہ آہستہ آگ پکڑ رہے تھے اور چوہے حدت سے گھبرا کر فرار کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔

اپنی کامیابی پر نازاں میں ہنری کے بارے میں سوچنے لگا۔ دنیا میں لوگوں کی دو اقسام پائی جاتی ہیں، ذہین یا بے وقوف مگر ہنری میں یہ دونوں خصوصیات بیک وقت پائی جاتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے حماقتوں کا ارتکاب محض جلد بازی کی وجہ سے ہوتا ہو مگر میرے معاملے میں شروع ہی سے اس کی غلطیاں میری خوش بختی کا باعث بن رہی تھیں۔

اب یہ سوچ سوچ کر میرا دل خوش ہو رہا تھا کہ جب وہ واپس آئے گا تو سلگتی ہوئی راکھ کے ڈھیر کو دیکھ کر سر پیٹ لے گا۔ وہ بری وجہ سے معطل کیا گیا تھا اور اگر اس کی قید سے نجات کے بعد کسی مجبوری کے تحت دوبارہ اسرائیلی حکام کے پاس جانے پر آمادہ ہو جاتا تو وہ اپنی اس انتہا پسندانہ انتقامی کارروائی کی پاداش میں شدید تر عتاب کا شکار ہو سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاندار تنظیم اور اعلیٰ وسائل کے باوجود اسرائیل کے انتظامی ڈھانچے میں ایسے خود سر لوگ بھی گھسے ہوئے ہیں جو اپنی ذات کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے کیپٹن ہنری ایسے ہی افراد کا نمائندہ تھا۔

تختے دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ گرمی کی وجہ سے مجھے کوٹھری کے دوسرے کونے میں جانا پڑ گیا۔ آگ تیزی سے پھیل کر اب دیواروں کو بھی چاٹنے لگی تھی شعلوں کی لپک میں ایسی دھیمی دھیمی سرسراہٹ تھی جیسے کئی سانپ چھپے ہوئے پھنکار رہے ہوں۔

مزید کچھ دیر گزری تو چوبی دیوار کا ایک جلتا ہوا حصہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ نیچے آ رہا۔ شعلوں کے لہو رنگ انعکاس میں دور تک ویران اور خودرو جنگل پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا مگر ابھی میرا باہر نکلنا ممکن نہ تھا گرے ہوئے، ادھ جلے تختوں میں سے کافی شعلے بھڑک رہے تھے جو میرے لباس کو بھی لپیٹ میں لے سکتے تھے۔ میرے لئے تھوڑا سا انتظار ضروری تھا!

اسی وقت بہت دور کسی کار کے انجن کی غراہٹ سنائی دی۔ اس آواز پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ رات کے سناٹے میں کون اس ویرانے کا رخ کر سکتا تھا جب کہ شام میں بھی مجھے کسی گاڑی وغیرہ کے گزرنے کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

کار کے انجن کا شور لحظہ بہ لحظہ صاف ہوتا چلا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آنے والا ہنری ہی ہو سکتا ہے۔ میرے اعصاب پر تناؤ طاری ہونے لگا۔ پھر گرے ہوئے تختوں کے اس پار مجھے آنے والی کار کی ہیڈلائٹس گھومتی نظر آئیں۔ وہ کار جنگل سے گزر کر اسی طرف آ رہی تھی۔

میرے لئے انتخاب کی راہ مسدود ہوتی جا رہی تھی۔ ہنری کی قید میرے لئے موت کا پروانہ تھی۔ اس نے اپنی بات ثابت کرنے کے لئے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا کہ وہ ہرگز مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ ہر صورت میں مجھے ہلاک کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ اب یہ اس کا مقدر تھا کہ موت سے قبل اگر میں اپنی زبان کھول دیتا تو مجھ سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ فلسطینی محاذ آزادی کے کم از کم دو ارکان پر براہ راست ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ نائٹ کلب کی سیلز گرل اور ٹیکسی ڈرائیور محمود شاید ہنری کے تشدد کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکتے اور پھر اس کی معطلی انعام میں بدل دی جاتی۔ وہ اس پورے قصے میں میرا ذکر بھی نہ لاتا بلکہ شاید یہی ظاہر کرتا کہ اس نے لڑکی کی موت کے بعد ان دونوں کو تلاش کیا اور وہ نہ صرف ایک تحریک کے ارکان نکلے بلکہ انہوں نے صفدر سے بھی رابطہ پیدا کر لیا تھا۔

میری زندگی، ہنری کی موت تھی۔ اس کے ہاتھ لگنے سے بہتر تھا کہ میں آگ پھلانگ کر جنگل میں روپوش ہونے کی کوشش کرتا۔

کار کی اگلی روشنیاں بری طرح اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ شعلوں نے شاید ہنری پر پوری صورتحال واضح کر دی تھی اور وہ راستے کی خرابی کی پرواہ کیے بغیر پوری رفتار سے بڑھا آ رہا تھا۔

میں نے ایک تختہ اٹھا کر ایک طرف سے انگارے ہٹانے شروع

کر دیئے۔ فضا میں راکھ اور چنگاریاں اڑنے لگیں۔ اسی وقت ہنری نے دانستہ یا شاید اضطراری طور پر ہارن بجایا اور میں ہڑبڑا کر آگ میں دوڑتا باہر نکلتا چلا گیا۔

میرے نتھنوں میں بال جلنے کی تیز بو آئی، پنڈلیوں پر کئی جگہ انگارے لگے مگر مجھے دہشت اپنی قمیص کی آستین سے ہوئی جس نے آگ پکڑ لی تھی۔ تکلیف اور دہشت سے بے اختیار میری چیخ نکل گئی اور میں نے دیوانہ وار گریبان پھاڑ کر جلتی ہوئی قمیص ایک طرف پھینک دی۔

"وہ رہا" کار کے انجن کے شور پر چھا دینے والی ہنری کی پرجوش چیخ سنائی دی۔ شاید اس کے ہمراہ کار میں کوئی اور بھی موجود تھا۔

میں پوری قوت سے کئی فٹ اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں دوڑ رہا تھا کہ قریب آتی ہوئی کار کا رخ بار بار تبدیل ہونے لگا۔

شاید وہ لوگ مجھے کار کی ہیڈلائٹس کی زد میں لینا چاہ رہے تھے۔ اگر ایک بار میں اس روشنی میں نہا جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے پکڑے جانے سے نہیں بچا سکتی تھی۔

کار اتنی قریب آ چکی تھی کہ ہنری کو میری تلاش کے لئے اس کی رفتار کم کرنی پڑی۔ کار کے ہیڈلیمپس کی شعاعیں اجل کے فرشتوں کی طرح مختلف سمتوں میں جھپک رہی تھیں۔ ہنری کے ساتھ ہی کسی عورت کی پرجوش آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید وہی سنہرے بالوں والی لڑکی تھی جو میرے دیدہ دلیرانہ اغوا کے وقت سیڈان چلا رہی تھی۔

اس وقت موت کی دہشت سے میرا گلا خشک ہو رہا تھا بھاگتے رہنے کی صورت میں میرے لئے زیادہ دیر روشنی سے بچے رہنا ناممکنات میں سے تھا کیونکہ خودرو جنگل قد آدم نہیں تھا اور اگر میں فوراً زمین پر لیٹ جاتا تو شاید روشنی سے تو بچ جاتا مگر کار کے پہیوں کے نیچے کچلے جانے کے بھی اسی قدر امکانات تھے جتنے زندہ رہ جانے کے!

ان کڑے لمحات میں میرا ہر قدم فیصلہ کن تھا۔ زندگی اور موت کے اس بھیانک دوراہے پر میرا پورا بدن پسینوں میں نہا گیا۔ آگ کے لگائے ہوئے زخموں کا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا، ذہن میں خیالات کی ہولناک آندھی چل رہی تھی!

پھر یک بیک مشینی انداز میں میں سینے کے بل اس طرح زمین پر لیٹ گیا کہ گاڑی مجھے نظر آتی رہے اور میں بے خبری میں کچلا نہ جاؤں۔

رینگتی ہوئی کار کا اسٹیئرنگ آہستہ آہستہ دائیں بائیں جھول رہا تھا۔

"کہاں غائب ہو گیا؟" غصے اور جھلاہٹ میں ڈوبی ہوئی ہنری کی آواز سنائی دی۔

"پیچھے تو نہیں رہ گیا؟" عورت کی آواز ابھری۔

"الو کی پٹھی، اندھا سمجھ رکھا ہے مجھے!" وہ اس پر برس پڑا پھر کوئی خیالی ہیولا دیکھ کر وہ اچانک جوشیلے انداز میں چیخ پڑا۔ "وہ رہا، وہ رہا"

کار کی رفتار اچانک تیز ہو گئی۔ فضا میں غبار کا طوفان اڑاتی وہ پلک جھپکتے میں کافی آگے نکل گئی اور میں نے اٹھ کر اندھیرے میں پوری قوت سے ادھر دوڑنا شروع کر دیا جدھر سے کار آئی تھی۔

کچھ دور جا کر ہنری کو اندازہ ہوا کہ وہ ہوا سے جھولتی ہوئی جھاڑیوں سے دھوکہ کھا گیا ہے۔ اس نے تیزی سے گاڑی واپس گھمائی۔ اس بار میں روشنی کی زد میں آنے سے بال بال بچا۔ اگر نیچے گرنے میں پل بھر کی بھی تاخیر ہو جاتی تو آسیبی کار میرے سر پر آ پہنچتی۔

اچانک کار کا انجن بند کر دیا گیا۔ روشنیاں بھی معدوم ہو گئیں۔

میں نے ایک بار پھر زمین سے اٹھ کر پوری طاقت سے دوڑ لگا دی۔

پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کے باعث اس بار مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ ہنری کیا چال چلنے والا ہے۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب اچانک عقب سے سرچ لائیٹ کی تیز روشنی نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔

"فائر!" ہنری پوری قوت سے چیخا۔

میں پھرتی سے زمین پر گرا اور گولی مجھ سے تقریباً ایک فٹ کی بلندی سے زناتی ہوئی گزر گئی۔ اس بار سرچ لائیٹ کا ہالہ کم و بیش میرے اردگرد ہی گھومتا رہا۔ اس کے ساتھ ان دونوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

میں نے پہلو کے بل زمین پر لڑھکنا شروع کر دیا۔ کانٹوں اور چند سخت جھاڑیوں کی وجہ سے مجھے کئی دفعہ اپنی غیر ارادی چیخوں کو سینے میں دفن کرنا پڑا مگر پھر بھی وہ دونوں سرچ لائیٹ کی روشنی میں جھاڑ جھنکار کی تیز جنبشوں کو دیکھ کر میری چال سمجھنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس بار ... فائر ہوئے۔ ایک گولی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر زمین پر پڑی۔

ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے پاس دو پستول رہے ہوں مگر فاضل راؤنڈز یقینی طور پر نہیں تھے کیونکہ تین گولیاں ضائع کرنے کے بعد وہ محتاط ہو گئے جب کہ میرا مفاد اسی میں تھا کہ اندھا دھند گولیاں چلا کر وہ بھی نہتے رہ جائیں پھر میں بآسانی ان سے ٹکرا سکتا تھا۔

ہنری اپنے دل میں ایک بے بس اور مجبور قیدی سے کڑی بازپرس کی تمنا لیئے آیا تھا مگر موقع پر پہنچ کر اس کے ہوش اڑ گئے ہوں گے۔

روشنی میرے اردگرد جنبش کرتی رہی۔ ناہموار راستوں اور لمبی گھاس وغیرہ میں چلنے کے باعث ان کے لئے یہ دشوار تھا کہ روشنی مسلسل ایک ہی نکتے پر مرکوز رکھ سکیں۔ مجھے جب بھی موقع ملتا میں پھرتی سے ایک انچ سرک جاتا۔

اور جب وہ اپنے اندازے کے مطابق مجھ سے بیس پچیس قدم دور رہ گئے تو وہ رک گئے۔ اور مجھے ہنری کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تم دیکھ لئے جا چکے ہو، خاموشی سے خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ بھون دیئے جاؤ گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت روشنی جس جگہ مرکوز تھی میں اس سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لیا۔ ان دونوں کی نسبت میں ان کی کار سے قریب تھا۔ میرے

عقب میں چوبی کرہ دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونج رہی تھیں۔ بھیانک شعلے اتنے اونچے تھے کہ اگر وہاں ایک آدھ میل کے علاقے میں بھی کوئی ہوتا تو جلد ہی اس طرف متوجہ ہو جاتا۔

میں نے زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور بغیر آواز پیدا کیے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ چند ثانیوں تک نشانہ لینے کے بعد میں نے پوری قوت سے سرچ لائیٹ کی طرف پتھر پھینک دیا۔ سرچ لائیٹ پر کوئی اثر نہ پڑا البتہ فضا ایک سریلی چیخ سے گونج اٹھی۔ اسی کے ساتھ ہنری کی بے تحاشہ گالیاں بھی سنائی دیں۔ ٹارچ کا رخ تبدیل ہوا اور مجھے جھاڑیوں میں گری ہوئی لڑکی پوری طرح نظر آ گئی۔ وہ اپنے داہنے شانے کو دبائے بری طرح کراہ رہی تھی اور ایک سایہ اس پر جھکا ہوا تھا۔

میں نے پھرتی سے کئی پتھر اٹھائے اور پوری قوت سے ان دونوں کی طرف پھینک دیئے۔ اس بار لڑکی کے ساتھ ہی ہنری کی بھی چیخ سنائی دی اور سرچ لائیٹ فوراً ہی بجھا دی گئی۔ اس کے ساتھ فضا میں یکے بعد دیگرے مزید تین فائر ہوئے جو بالکل غلط سمت میں کیے گئے تھے جب کہ میں پیش بندی کے طور پر پتھر پھینکنے کے بعد ہی زمین پر دراز ہو چکا تھا۔

مجھے خوشی ہوئی کہ ہنری کی چھ گولیاں ضائع ہو چکی تھیں۔ چوٹ کھا کر غصے سے بے قابو ہونے کے باعث وہ میرے لیے آسانی پیدا کر رہا تھا۔

جب کئی منٹ گزر گئے اور سرچ لائیٹ بھی روشن نہ ہوئی تو مجھے چوکنا ہونا پڑا۔ ناگہانی پتھراؤ کے خوف سے ہنری ٹارچ دوبارہ روشن کرنے کی ہمت نہ کر سکا تھا مگر اس کے ساتھ فضا میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ شاید وہ دونوں اب خاموشی سے مجھے گھیرنے کے چکر میں تھے۔

میں کہنیوں اور پیٹ کے بل تیزی سے ان کی کار کی طرف رینگنے لگا۔ کھلی فضا کے مقابلہ میں کار کی آڑ میں میں زیادہ محفوظ رہ سکتا تھا۔

زندگی کی وہ جدوجہد میرے لیے بڑی جانگسل تھی۔ رات کے گھور اندھیرے میں ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے دو حریف موت کی سی خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کی گھات میں رینگتے پھر رہے تھے۔ ایک فریق نہتا اور تنہا تھا جبکہ دوسرا مسلح اور معاون سمیت۔ اس وقت میری ساری حس کانوں میں سمٹ آئی تھی۔ اپنے دل کی دھڑکن کسی نقارے کی بے ترتیب گونج کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] کے نیچے میں [illegible] ہو گیا جو نا ہیلی کا ہی ایک حصہ نظر آ رہی تھی۔

میں نے بہت احتیاط کے ساتھ اور ڈرتے ڈرتے پنجوں سے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کار کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل خالی نظر آئی۔ میدان صاف دیکھ کر میری ہمت بندھی اور میں ذرا آگے بڑھ آیا۔ کھلے ہوئے شیشوں میں سے کار کی خالی سیٹیں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی سے اندر ہاتھ ڈال دیا اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے میرا ہاتھ جب اگنیشن کی سے ٹکرایا تو بے اختیار مجھے اپنے مقدر پر رشک آنے لگا۔ وقت کی بساط سراسر ہنری کے خلاف جا رہی تھی۔

اسی وقت مجھے کسی جانب سے کسی کے گہرا سانس لینے کی مدھم سی آواز آئی۔ میں نے بے اختیار چابی سمیت اپنا ہاتھ باہر کھینچ لیا اور پھرتی سے زمین پر گر گیا۔

اندھیرے میں چند ثانیوں تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد مجھے ایک دوسرے میں الجھے ہوئے دو تاریک ہیولے اپنی جانب بڑھتے نظر آئے۔ نہ جانے وہ پسپائی اختیار کر رہے تھے یا مجھے پھانسنے کی کوئی نئی شیطانی تجویز ان کے ذہنوں میں جنم لے چکی تھی۔

میں کار کے پچھلے حصے میں ڈگی کے نیچے رینگ گیا۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ دشمن بیدار ہونے کی صورت میں فوری طور پر پتا چل جاتا۔ کئی سیکنڈ لمحے طویل سے طویل تر ہوتے چلے گئے آخر کار کے نیچے سے ان دونوں کے بڑھتے ہوئے قدم مجھے نظر آنے لگے۔

میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اور وہ لحظہ بہ لحظہ قریب تر آتے جا رہے تھے۔ میں نے واضح طور پر اندازہ لگایا کہ عورت کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی جب کہ مرد اسے سہارا دے کر کار کی طرف لا رہا تھا۔ شاید وہ میرے پتھراؤ سے شدید زخمی ہو گئی تھی۔

بڑھتے ہوئے چار قدم سیڈان کے عقبی دروازے کے قریب آ کر رک گئے۔ وہ مجھ سے اتنے قریب تھے کہ میں چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو سکتا تھا۔

پھر آواز پیدا کیے بغیر آہستگی سے دروازہ کھولا گیا جس کا اندازہ میں نے قدموں کی جگہ کی تبدیلی سے لگایا پھر عورت کار میں داخل ہوئی اس کے وزن سے کار کی باڈی نے دھیمے سے جنبش کی اور پھر ساکت ہو گئی۔ مرد باہر ہی رکا رہا البتہ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"اس پستول میں ایک گولی ہے۔" مرد کی مدھم سرگوشی مجھے سنائی دی جس کے بعض الفاظ میں سن نہ سکا مگر میرے قیاس نے خالی جگہوں کو مؤثر اور مناسب الفاظ سے پر کر دیا۔ "تم اس سے ہوشیار رہنا ویسے وہ ادھر کا رخ نہیں [illegible] گا۔"

"میرے شانے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے ہنری میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔" عورت کی لرزتی ہوئی دھیمی آواز میں رحم کی التجا رچی ہوئی تھی۔

"وہ ابھی ان ہی اطراف میں بھٹک رہا ہے جان ——— میں اسے زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے زندہ یا مردہ لے کر میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

"وہ لومڑی کی طرح مکار ہے، میرا شانہ درد سے پھٹا جا رہا ہے، میرا تو خیال کرو۔"

"بس میں ابھی آیا۔"

مرد پر ایک ہی دھن سوار تھی وہ جدھر سے آیا تھا اندھیرے میں دبے قدموں اسی طرف واپس چل دیا اور میں نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا۔

جس پستول میں ایک گولی رہ گئی تھی، وہ عورت کے حوالے کر کے ہنری بھرا ہوا پستول لے کر میری تلاش میں گیا تھا۔ عورت زخمی تھی اور تکلیف سے بے حال تھی۔ میرے لیئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ کسی طرح خاموشی سے عورت کے پستول پر قبضہ کر لوں۔

مرد کی طرف سے میں وقتی طور پر خاصا مطمئن ہو چکا تھا اور اب میرا ذہن اس عورت سے نمٹنے کی تدبیریں سوچنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ میں نے ڈگی کے نیچے سے نکل کر پچھلے شیشے میں سے کار میں جھانکا مگر عورت مجھے نظر نہ آسکی۔ جب میں ذرا اوپر اٹھا تو داہنی جانب والی کھڑکی سے اس کے پیر باہر نکلے نظر آئے۔ شاید وہ تکلیف سے بے حال ہو کر سیٹ پر دراز ہو گئی تھی۔

میں کسی چوپائے کی طرح چلتا ہوا گاڑی کے بائیں جانب والے عقبی دروازے کی طرف پہنچ گیا جدھر عورت کا سر موجود ہونا چاہیئے تھا میں کئی منٹ تک سانس روکے اس کی سن گن لیتا رہا مگر کار میں گہرا سکوت طاری تھا۔

میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھا اور یہ دیکھ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا کہ عورت بیہوش ہو چکی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں پستول کا دستہ دبا ہوا تھا۔ ہاتھ سینے پر موجود تھا۔ بایاں ہاتھ کسی بے جان لوتھڑے کی طرح سیٹ سے نیچے جھول رہا تھا۔

میں نے پھرتی اور احتیاط کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ عورت کا جسم بدستور سیٹ پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میں لپک کر آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ ایک اہم مرحلہ نہایت آسانی سے طے ہو گیا تھا اور وہ گولی میرے قبضے میں آچکی تھی جسے قدرت نے ہنری کی موت کے لیئے بہانہ طے کر دیا تھا۔ مجھے اسلحہ کی بدولت کے باوجود اس پر برتری حاصل ہو گئی تھی۔

اگلا مرحلہ دیر لانے میں سرخرو نے ہوئے ہنری کو اس طرف دوبارہ متوجہ کرنے کا تھا پہلے میں نے کار اسٹارٹ کرنے کے بارے میں سوچا مگر فوراً ہی ایک بہتر تجویز ذہن میں آ گئی۔

اگر میں ایک بار ہارن بجا دیتا تو ہنری یہی سمجھتا کہ اس کی ساتھی نے درد کی ناقابل برداشت شدت سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ اس کا یہ یقین اس وقت اور بھی پختہ ہو جاتا جب ہارن کے بعد کافی دیر تک فائر، عورت کی چیخ یا مزاحمت کی کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔ پھر وہ یقیناً یہ سمجھتا کہ میں خوفزدہ ہو کر اس کے مقابلے سے فرار ہو گیا ہوں۔

میں نے ایک بار آہستہ سے ہارن بجایا اور پھرتی سے کار کی ڈگی کے نیچے گھس گیا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے ایک سمت سے اسے آتے دیکھ لیا۔

مجھے یقین تھا کہ اس بار وہ پوری توجہ سے کار کی طرف نگراں ہوگا۔ میں نے غیر محسوس میں اپنے بدن کو جنبش دے کر ٹائر کی آڑ سے اس طرح سر باہر نکالا کہ وہ پوری طرح مجھے نظر آتا ہے جبکہ میں اس کی نظر سے محفوظ ہوں۔

وہ آگے آتے آتے کار سے پندرہ بیس قدم دور رک گیا اور اس نے دبی زبان میں عورت کو سونیا کہہ کر پکارا اور ساتھ ہی خود زمین پر گر گیا۔

اس کی اس حرکت نے اچانک مجھے بوکھلا دیا۔ شاید آخری مرحلے پر اس نے خطرہ بھانپ لیا تھا۔ جب ہی وہ کار کی طرف آنے کی بجائے وہیں رک گیا تھا۔ اور اس کے پاس سرچ لائیٹ بھی تھی اگر وہ اسے روشن کر لیتا تو شاید میں اس کی نگاہوں سے نہ بچ پاتا۔

میں نے اضطراری طور پر اپنے گلے سے کراہنے کی دھیمی سی آواز نکالی اور وہ بچتے بچتے بھی دھوکے کا شکار ہو گیا۔

اس کے بڑھتے ہوئے قدم جوں ہی رینج میں آئے میں نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ہولناک دھماکے کے ساتھ ہی اس کی چیخ ابھری اور اس کا ہیولا اچھل کر زمین پر گر گیا۔

جب تک اس کے تڑپنے اور کراہنے کی آوازیں آتی رہیں، میں اپنے مورچے سے باہر نہیں نکلا اور جب اس طرف سکوت چھا گیا تو میں زمین سے اٹھ گیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

میں نے ہیڈ لیمپس روشن کر کے کار کا رخ گھمایا تو ہنری کی خاک اور خون میں آلودہ لاش دیکھ کر مجھے پھریری آگئی۔

میں نے انجن چلتا چھوڑ کر اس کی موت کا اطمینان کیا پھر اس کا بھرا ہوا پستول اور سرچ لائیٹ لے کر واپس سیڈان میں آگیا۔

میرے شکار کے لیئے آنے والوں میں سے ایک مر چکا تھا۔ دوسری میری قیدی تھی۔ خاصی دور ٹیلوں کی اوٹ میں چوبی کوٹھری اب بھی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔

میں نے کار اس راستے پر ڈال دی جہاں سے میں نے ہنری کو آتے دیکھا تھا۔

وہاں میرے اور ہنری کے درمیان اتنی بھاگ دوڑ ہوئی تھی کہ کار کی آمد کا راستہ میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ میں خاصی دیر تک وہیں بھٹکتا رہا۔ آخر کچلی ہوئی جھاڑیوں کا وہ سلسلہ مجھے نظر آ ہی گیا جو کار کی گزرگاہ کی نشاندہی کر رہا تھا۔

عقب نما آئینے میں چوبی کمرے سے اُبھرتے ہوئے بلند شعلے صاف نظر آرہے تھے۔ اس کمرے کی تعمیر میں اتنی کثرت سے لکڑی استعمال کی گئی تھی کہ پوری رات وہ آگ بجھنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

کار ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی رہی۔ میرا تھکا ہوا ذہن اب آنے والے حالات کے بارے میں سوچنے میں مصروف تھا۔

کچھ دیر بعد کچلی ہوئی جھاڑیاں ختم ہو گئیں اور بظاہر راستہ مسدود نظر آنے لگا کیونکہ سامنے مٹی کے اُونچے اُونچے بے ہنگم ٹیلوں کا سلسلہ ایک دیوار کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔ مٹی پر گاڑی کے ٹائروں کے نشانات واضح تھے لہٰذا میں ہلکی رفتار میں بڑھتا رہا اور بھول بھلیوں جیسے پُر پیچ راستے سے گزرنے کے بعد میں ٹیلے عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان ٹیلوں کے عقب میں ایک نشیبی راستہ پھیلا ہوا تھا اور اس کے اختتام پر کئی فرلانگ دُور پختہ سڑک کے آثار نظر آرہے تھے۔

تقریباً نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد میں سڑک پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں آکر میں نے عقب میں نگاہ ڈالی تو شعلوں کا انعکاس کہیں بھی نظر نہیں آسکا۔ وہ چوبی کمرہ ٹیلوں کے اُس پار اتنے نشیب میں واقع تھا کہ سڑک سے کمرہ تو در کنار آگ کا دیکھا جانا بھی ناممکنات میں سے تھا۔

میں نے گاڑی سڑک کے کنارے روک کر عقبی نشست پر پڑی ہوئی لڑکی کا جائزہ لیا تو وہ ہچکولوں کے باعث قدرے ہوش میں آچکی تھی اور ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

سڑک پر اس طرح رُکے رہنا کسی کو مداخلت کی دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور تھکان سے میرا بُرا حال تھا۔ مگر میں شہر کا رُخ کرنے سے پیشتر لڑکی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے وہ کار دوبارہ کچے میدان میں اُتار دی۔

ایک ٹیلے کی اوٹ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد میں عقبی نشست پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک لڑکی کی آوازوں میں قدرے تسلسل پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کراہنے کے ساتھ بار بار کسمساتی بھی جا رہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اُس کے شانے کی ہڈیاں ٹٹول کر دیکھیں۔ داہنے شانے پر میرا ہاتھ لگتے ہی وہ بے چین ہو گئی۔ مگر اس دوران مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہڈی ٹوٹی تو نہیں تھی البتہ شدید ضرب کی وجہ سے اس پر کافی ورم آگیا تھا۔

میں کچھ دیر تک اُس کا سر اپنی گود میں لیئے اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا رہا جو آخر کار بار آور ثابت ہوئی اور چند ثانیوں کے سکتے کے بعد وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔

"ہنری۔۔۔ ہنری!" اُس نے اندھیرے کے باعث مجھے ہنری سمجھتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں کہا "وہ کہاں گیا؟ خدا کے لیئے اب تو مجھے ہسپتال لے چلو۔"

میں دانستہ خاموش رہا۔

میری خاموشی نے شاید اُسے چونکا دیا۔ اندھیرے میں اُس کی چمکتی ہوئی ہراس آمیز نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں پھر وہ ہذیانی عالم میں تقریباً چیخ پڑی "کون ہو تم؟ بولتے کیوں نہیں؟ ہنری کہاں ہے؟"

"شور مچانے کی ضرورت نہیں" میں سرد لہجے میں غرایا "تمہیں ہنری تک پہنچانے کے لیئے مجھے تمہاری پیشانی میں صرف چند تولہ پگھلا ہوا سیسہ اتارنا ہوگا۔"

"اوہ" اُس کے حلق سے تحیر آمیز خوفزدہ آواز اُبھری "میرے خدا تم نے اُسے مار ڈالا۔ شاید تم صفدر علی ہی ہو۔"

"ہاں میں صفدر علی ہوں۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو مجھے اپنے کچھ سوالات کے جواب چاہیئں۔ ورنہ میں تم سے چھٹکارا پانے کی کسی آسان ترکیب پر عمل کروں گا۔"

"مم۔۔۔ مگر تم مجھے نہیں مار سکو گے۔" وہ ہکلا کر بولی۔

"اس لیئے کہ تم خوبصورت اور جوان ہو؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم۔۔۔ تم کالے خون والوں پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے۔" اُس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

اُس کے یہ الفاظ میرے اعصاب پر دھماکے کا باعث ثابت ہوئے۔ "کالا خون" فلسطینی افواجِ آزادی والوں کا شناختی کوڈ تھا جس کے ذریعے میں انہیں پہچان سکتا تھا۔ لڑکی نے کالے خون کا حوالہ دے کر مجھے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ اگر وہ فلسطینیوں کے گروپ ہی سے تعلق رکھتی تھی تو اسے میرے خون کے پیاسے کے ساتھ تعاون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس لڑکی نے دن دہاڑے میرے اغوا میں ہنری کی مدد کی اور میں تھوڑی دیر قبل موت کے دہانے میں گرنے سے بمشکل بچ سکا تھا۔ اگر وہ واقعی فلسطینیوں کے مقاصد کے لیئے کام کر رہی تھی تو شاید ہنری کے ساتھ رہ کر آخری لمحے تک میری وفاداری کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ پھر شاید وہ خود ہی ہنری کے مقابلے میں میری مدد کے لیئے تیار ہو جاتی۔

مگر اس کے لہجے میں اعتماد کا فقدان تھا۔ اُس نے کالے خون کا حوالہ دیا تو اس کا لہجہ سہما ہوا سا تھا۔ اگر وہ فلسطینی ہی تھی تو اسے بدلے ہوئے حالات پر اطمینان کا سانس لینا چاہیئے تھا جبکہ اُس نے میرے ہاتھوں ہنری کی غیر متوقع موت پر شدید حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"تم کس کالے خون کی بات کر رہی ہو۔ آج کے دَور میں ہر شخص کا خون سفید ہو چکا ہے۔" میں نے پل بھر میں ساری صورتحال کا تجزیہ کرنے کے بعد کہا "میں رنگدار نسل سے تعلق رکھتا ہوں مگر یہ اندازہ لگا چکا ہوں کہ تمہارے خمیر میں کہیں بھی سیاہ چمڑی کا گزر نہیں ہوا۔"

"تم خوب سمجھ رہے ہو کہ میں کس کالے خون کی بات کر رہی ہوں تم مجھے دہشت زدہ کرنا چاہتے ہو۔" وہ سیٹ پر پیچھے سرکتے ہوئے بولی۔

"مجھے احمق نہ سمجھو لڑکی!"

"مم۔۔۔ مجھے تمہاری مدد کے لیئے ہنری کے پیچھے لگایا گیا تھا۔ تم میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتے؟"

"اسرائیل میں میرا کون ہمدرد پیدا ہو گیا؟" میرا لہجہ تلخ تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے حکم دیا گیا تھا جس کی میں پابند تھی۔"

"حکم دینے والا کون تھا؟"

"قاضی ہادی" وہ برجستہ بول اٹھی۔

لڑکی کے اس جواب نے مجھ پر ساری صورتحال یک بیک واضح کردی۔ فلسطینی افواجِ آزادی کا نمائندہ محمود جو مجھ سے ٹیکسی ڈرائیور کے رُوپ میں ملا تھا' اپنی تنظیم کی حکمتِ عملی کے بارے میں گُر کی کئی باتیں بتا گیا تھا جن میں ایک یہ بھی تھی کہ تنظیم کے افراد اپنی معلومات کا غیر ضروری طور پر تبادلہ نہیں کرتے اور خاص طور پر ناموں کے بارے میں تو انتہائی رازداری برتی جاتی تھی تاکہ ایک شخص کی گرفتاری دوسروں کے لئے موت کا پھندا نہ بن سکے۔

مگر اس لڑکی نے بلا تامل مجھے قاضی ہادی کا نام بتا دیا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تنظیم کی نمائندہ تو کیا ہوتی' اس کے طریقۂ کار سے بھی ناواقف تھی۔ اُس نے خود کو میرے چنگل میں بے بس پاکر اپنی نجات کے لئے ایک بھرپور چال چلنے کی کوشش کی تھی۔

اس چال سے یہ بھی ظاہر تھا کہ ہنری اور اس لڑکی کو میرے بارے میں پُختہ یقین تھا کہ میں اسرائیل کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی فلسطینیوں کے ساتھ شامل ہو چکا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی پُراعتماد انداز میں کالے خون کا حوالہ نہ دیتی۔ اس کی زبان سے اس کوڈ کا اظہار بتا رہا تھا کہ ہنری کی معلومات خطرناک حد تک وسیع تھیں اور محض اسی وجہ سے اُس نے مجھ پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

ایسی صورتِ حال میں لڑکی کا زندہ رہنا میرے لئے خطرناک تھا۔ وہ ایک بار میری گرفت سے نکل جاتی اور اسے علم ہو جاتا کہ ہنری میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے تو وہ ساری معلومات براہِ راست اسرائیل کے آرمی انٹیلی جنس بیورو کو فراہم کر سکتی تھی جس کے بعد میری گلوخلاصی ناممکن تھی۔ میرے لئے بہتر یہی تھا کہ اس لڑکی سے ساری معلومات اُگلوانے کے بعد میں اسے ٹھکانے لگا دوں۔

"قاضی ہادی؟" میں نے چند ثانیوں کی پُرتفکر خاموشی کے بعد دُہرایا۔ "یہ کون شخص ہے؟ اس کا نام میرے لئے اجنبی ہے۔"

"وہ اسرائیل میں فلسطینیوں کے ایک گروپ کے لئے کام کر رہا ہے"۔

"ہنری سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟"

"اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے مجھے جنسی سطح پر اس سے تعلقات استوار کرنے پڑے تھے" لڑکی کی گھبراہٹ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھی۔

"اور اگر وہی تعلقات میں بھی قائم کرنا چاہوں؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مگر خدا کے لئے پہلے مجھے ہسپتال پہنچا دو۔ میری حالت بہت اَبتر ہوتی جا رہی ہے۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

"جب تک مجھے پوری طرح یقین نہیں ہو جاتا کہ تم فلسطینیوں کے لئے کام کر رہی ہو' میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔" میں نے اندھیرے میں اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ "تمہیں مجھ پر ابھی تک یقین نہیں آیا؟"

"نہیں" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

"میرے خدا!" وہ روہانسے لہجے میں بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح تمہیں اپنی صداقت کا یقین دلاؤں۔ تم خود ہی بتاؤ کہ میں تمہیں کس طرح یقین دِلا سکتی ہوں؟"

"ایک بات ذہن نشین کر لو کہ میں اسرائیل آنے سے پہلے بھی فلسطینیوں کے لئے کام کر چکا ہوں" میں نے اُسے خائف کرنے کے لئے جھوٹ بولا۔ "اور میں ان کے بہت سے رازوں اور طریقۂ کار سے پوری طرح واقف ہوں۔ تم اس بارے میں جو کچھ جانتی ہو' بتا ڈالو۔ مجھے تمہاری اصلیت کا پتہ چل جائے گا۔"

"مگر یہاں تو ان کے کئی گروپ کام کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں تم کس کے بارے میں جانتے ہو۔" وہ اس بار خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"دیکھو مجھ سے اڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اگر قاضی ہادی نے تمہیں میری حفاظت پر مامور کیا ہے تو ظاہر ہے کہ میں اُسی کے گروپ سے متعلق ہوں۔"

"وہ تو جارج حباش کے پاپولر فرنٹ میں شامل ہے۔"

"بات جاری رکھو۔" اُسے خاموش پاکر میں نے لقمہ دیا۔ "درمیان میں مَیں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ میرا فیصلہ تم آخر میں سُن سکو گی۔"

"تم بہت سخت دل کے مالک ہو۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔ "دیکھو مجھے زبان کھولنے پر مجبور نہ کرو۔ میں اپنی تکلیف کو بھول کر بھی تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

"خواہش!" میں سفاکانہ انداز میں ہنس دیا۔ "اگر میں اس وقت درندگی پر اُتر آؤں تو یہاں میلوں کے رقبے میں کوئی تمہاری آواز سُننے والا نہیں ہوگا۔"

"اس خطے میں فلسطینیوں کے بہت سے گروپ کام کر رہے ہیں۔" چند لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد اُس نے کہنا شروع کیا۔ "اسرائیل سے باہر ان کی پالیسیاں اور نظریات آپس میں بُری طرح متصادم ہیں۔ گو ان کا مقصد ایک ہی ہے مگر بعض تشدد اور دہشت گردی کے ذریعے عالمی رائے عامہ کو فلسطین کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور کچھ پُرامن سیاسی سرگرمیوں میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر اسرائیل میں اُن کے لئے سخت خطرات ہیں جس کی وجہ سے وہ آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں۔ قاضی ہادی نے مجھے بتایا تھا کہ تم فرنٹ کے لئے کام نہیں کر رہے مگر تم یقینی طور پر کسی فلسطینی گروپ سے وابستہ ہو' اُسے تمہارے مقاصد اور سلامتی سے شدید دلچسپی ہے اس لئے اُس نے اپنے طور پر تمہاری مدد میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ جب بم کے دھماکے میں راڈرک مارا گیا تو ہنری نے ابتدائی تفتیش کے بعد ہی یہ نظریہ قائم کر لیا کہ اس حادثے میں تمہاری ذات بھی کسی نہ کسی طرح ملوث ہے۔ قاضی ہادی کو کسی طرح اس بات کی بھنک مل گئی اور اُس نے مجھے ہنری کے ساتھ لگ جانے کا حکم دے دیا۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا

...یں کسی وقت تم نے خطرہ محسوس کروں تو کالے خون کا حوالہ ...ے سکوں گی۔ وہ تمہارے گروپ کی ماہیت اور حکمتِ عملی سے ...نہیں ہے۔ مگر تمہارے کوڈ ورڈ سے کسی طرح باخبر ہو گیا تھا۔"

"اور ہنری ایسا اُلّو کا پٹھا تھا کہ تم ایک دو دن میں ہی اُس کی ...ی معشوقہ بن گئیں؟"

...معشوقی کا پروانہ ملنے کے بعد سے وہ مسلسل میرے ساتھ تھا۔ ...ی بے عزتی پر سخت غصہ تھا اور وہ تمہیں اذیتیں دے کر تمہاری ...علوانا چاہتا تھا تاکہ اپنے اوپر والوں کو بتا سکے کہ وہ اپنی آستین میں ...سانپ کی پرورش کر رہے ہیں اور اُسے بلاوجہ موردِ عتاب کیا گیا ہے۔ ...کارنامہ تنہا سرانجام دینا چاہتا تھا' اسی لئے مجھے ساتھ لے لیا۔ ...یں اُس کے لئے حریف نہیں بن سکتی تھی۔"

"میرے اغوا کا پروگرام کب بنایا گیا؟"

"آج ہی۔" اُس نے کہا اور میرے قریب سرک آئی۔ "اگر تم خود ہی ...اتفاقاً سڑک پر نہ نکل آتے تو وہ کہیں نہ کہیں تمہیں گھیر لیتا۔ وہ ...سے تمہارے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"کرسٹائن۔"

وہ جو بھی تھی' بہت چالاک اور مکار تھی۔ مجھے اپنی کہانی سنانے ...دوران ہی میرا ہاتھ تھام کر مجھے یوں اپنے پورے وجود سے آشنا ...نے کی کوشش کر رہی تھی جس طرح کوئی نرم دل انسان کسی اندھے ...ستہ دکھاتا ہے۔

...میں جانتا تھا مگر وہ راستہ بہت پُرپیچ تھا۔ کرسٹائن مجھے مغلوب کرنے ...کوششوں میں اپنے شانے کی تکلیف کو یکسر فراموش کر چکی تھی اور میرے ...رہی تھی۔ شاید اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے الفاظ مجھے ...نہیں کر سکے لہٰذا اب وہ اپنے جیتے جاگتے اور سُلگتے ہوئے گداز وجود ...لئے میرے ذہن سے شبہات کی دُھند سمیٹنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔

"مجھ سے دُور رہو کرسٹائن!" اس کے بڑھتے ہوئے حوصلے کو ...میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے اس طرح نہ دھتکارو۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔ "میں ...ان چند لمحوں کی مسرت بھی نہ دے سکی تو مجھے زندگی بھر اس کا قلق ...رہے گا۔"

"مجھے مصنوعی مسرتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے ...کے ساتھ جیب سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ اس کی کنپٹی ...کر دیا۔

اس کا بدن سیٹ پر پوری قوت سے اُچھلا اور پائیدان میں گر گیا۔ ...سے دروازہ کھول کر کار سے باہر نکل گیا۔ باہر ایک ٹیلے پر بیٹھ کر ...نے سگریٹ سُلگائی۔ ایک لاش کے ساتھ سفر کے آغاز سے قبل میں اپنے اعصاب کو اعتدال پر لانا چاہتا تھا۔

سگریٹ ختم کرنے کے بعد میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور آہستہ آہستہ گاڑی کو سڑک پر لے آیا۔

تارکول کی چمکتی ہوئی سیاہ سڑک میرے سامنے دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جگہ میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ وہاں پھیلی ہوئی ویرانی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں تل ابیب سے کافی دُور ہوں۔ میں نے اللہ کا نام لیکر گاڑی ایک سمت میں ڈال دی۔

تقریباً نصف گھنٹے تک میرا سفر کسی روک ٹوک کے بغیر جاری رہا۔ اس دوران مجھے نہ کوئی گاڑی نظر آئی نہ ہی کہیں روشنیاں نظر آئیں۔ جن سے پتہ چلتا کہ ان اطراف میں کوئی آبادی بھی موجود ہے۔ اسرائیل کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ وہ نہایت مختصر اور گنجان آباد ملک ہوگا۔ مگر میرا اپنا تجربہ ان قیاسات کی سراسر نفی کر رہا تھا جو میں نے اسرائیل دیکھنے سے پہلے قائم کئے تھے۔

نصف گھنٹے بعد مجھے مدھم سی روشنیوں کے چند نقطے نظر آئے جو لحظہ بہ لحظہ واضح ہوتے چلے گئے اور جب میں قریب پہنچا تو ہیڈ لیمپس کی روشنی میں مجھے چند فوجی خیمے نظر آئے جو سڑک کے کنارے ایک قطار کی صورت میں ایستادہ تھے۔

اس مقام پر سڑک کے دونوں جانب دو عدد پول لگے ہوئے تھے جن سے ایک آہنی زنجیر اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ اُسے توڑے بغیر آگے بڑھنا محال تھا۔ سڑک کے بائیں جانب تین باوردی فوجی کھڑے مجھے رُکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اسٹین گن لئے فائرنگ کے لئے بالکل تیار تھا۔

میں نے کار کے ایکسیلیٹر سے پاؤں ہٹا لیا اور ان تینوں سے چند فٹ کے فاصلے پر کار روک دی۔

"کون ہے؟" ایک فوجی انجن کے شور پر حاوی اُونچی آواز میں پکارتا ہوا کار کی طرف بڑھنے لگا۔ "انجن بند کر دو۔"

میں نے فوراً ہیڈ لیمپس بند کر کے انجن آف کر دیا۔

تاریکی میں آنے والے کے وزنی جُوتوں کی دھمک قریب آکر تھم گئی۔ اس وقت تک میں بھی کار سے نیچے اُتر چکا تھا۔ بقیہ دو فوجی بدستور اپنی جگہ پر موجود تھے۔

آنے والے نے عبرانی زبان میں مجھ سے کچھ دریافت کیا جو میرے بالکل پلّے نہ پڑ سکا۔

"میں صرف انگریزی سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

اُس نے ٹارچ روشن کر کے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "معلوم ہوتا ہے کسی ٹڈّی دل اڑ کر آ رہے ہو۔"

"میرا تعلق آرمی انٹیلی جنس کور سے ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے

اپنا کارڈ نکالنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ ایکدم بھڑک اُٹھا۔

"ہینڈز اَپ!" ٹارچ بجھا کر وہ غرایا۔ "کوئی غلط حرکت کی تو ابھی بھون دیئے جاؤ گے۔"

میں نے خاموشی سے دونوں ہاتھ اُٹھا لیئے۔

"اب کیمپ کی طرف چلو۔"

میں خیموں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ میرے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اُس کی طرف گھومے بغیر کہا۔ "میرے ساتھ کار میں ایک مسافر اور بھی موجود ہے۔"

"وہ کہاں چھُپا ہوا ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"وہ ایک خوبصورت لڑکی ہے جو مُردہ حالت میں عقبی پائیدان پر پڑی ہوئی ہے۔" میں نے چلتے ہوئے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

"وِکّی!" میرے پیچھے آنے والے نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو مخاطب کیا۔ "ذرا اس کی خیر ہو۔ میں گاڑی دیکھتا ہوں، یہ کہہ رہا ہے کہ اس میں ایک لاش پڑی ہے۔"

"لاش؟" دوسری جانب سے کسی کی تحیّر آمیز آواز اُبھری۔

پھر اسٹین گن والے نے جھپٹ کر مجھے کوَر کر لیا اور مجھے ایک خیمے میں پہنچا دیا گیا جہاں پیٹرومیکس کی روشنی میں ایک اُدھیڑ عمر فوجی فولڈنگ کوچ میں یونیفارم سمیت سو رہا تھا۔ اس کے قریب ہی وائرلیس ریسیونگ اور ٹرانسمیٹنگ سیٹ تپائی پر رکھا ہوا تھا۔

قدموں کی آہٹ سُن کر وہ اُدھیڑ عمر شخص بیدار ہو گیا اور کوچ پر پڑے پڑے خالی الذہنی کے عالم میں میرا چہرہ تکنے لگا۔ اس کے شانوں پر چمکتے ہوئے نشانات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میجر ہے۔

مجھے لانے والوں میں سے ایک نے مختصر الفاظ میں اسے میری کہانی سُنا دی۔

لاش کا ذکر آتے ہی میجر کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی اور وہ اچھل کر بستر سے نیچے آ گیا۔ "اس کی جامہ تلاشی لے لی تم نے؟"

"ابھی لئے لیتا ہوں سر!" یہ کہہ کر ایک فوجی نے میری جیبیں ٹٹول کر ریوالور برآمد کر لیا اور اس کی نال سُونگھ کر اسے میجر کی طرف بڑھا دیا۔

میجر نے بھی نال کا دہانہ اپنی ناک سے لگا کر سُونگھا پھر خطرناک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس کی نال سے ابھی تک جلی ہوئی بارُود کی بُو آ رہی ہے۔"

"تازہ فائر کے بعد آنی ہی چاہیئے میجر!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اگر اجازت ہو تو میں ہاتھ گرا کر اپنی کہانی سُنا دوں؟"

"ضرور سناؤ۔" وہ ریوالور سے کھیلتے ہوئے بولا۔

اسی وقت تیسرا فوجی بوکھلایا ہوا وہاں آ پہنچا اور اُس نے میجر کو سلیوٹ مار کر مشینی انداز میں کہا۔ "یہ درست کہتا ہے سر! کار میں ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کی خون آلُود لاش موجود ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ قتل کی واردات تازہ ہے۔"

"نصف گھنٹہ قبل وہ زندہ تھی۔" میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور اس سے ذرا دیر قبل اس کا ساتھی بھی زندہ تھا۔"

"ساتھی؟" بیک وقت کئی تحیّر آمیز آوازیں اُبھریں۔

"ہاں۔ اُس کی لاش میں ویرانے میں چھوڑ آیا ہوں۔" میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر اجازت ہو تو میں آپ لوگوں کو اپنا شناخت نامہ دکھا دوں۔"

"کون ہو تم؟" میجر نے سوال کیا۔

میں نے اپنی جیب سے کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا کارڈ دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر کئی گہری شکنیں نمودار ہو گئیں۔ "تم اس طرف کہاں جا رہے ہو؟"

"راستے کا اندازہ نہیں تھا اس لئے اِدھر آ نکلا۔ ویسے میں تل ابیب جانا چاہتا ہوں۔"

"تل ابیب؟" اُس نے حیرت سے دُہرایا۔ "شاید تمہیں علم نہیں کہ اس چیک پوسٹ سے آگے خطرناک فوجی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جس سے آگے شامی فوجوں کے مورچے ہیں۔"

"اوہ — تو میں شامی سرحد کے قریب موجود ہوں۔" میں نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔

"ان دو لاشوں کا کیا قصہ ہے؟"

"لڑکی کا ساتھی تفتیشی بیورو کا کیپٹن ہنری تھا۔ اُس نے لڑکی کی مدد سے مجھے اغواء کر کے اس علاقے میں ایک کیبن میں قید کر دیا تھا۔ میں بمشکل تمام اُسے زیر کر سکا۔ لڑکی بھی میرے ہاتھوں ماری گئی۔"

"مگر تم انٹیلی جنس کور سے متعلق ہو تو آخر اُس نے تمہیں کیوں اغواء کیا تھا؟ میری معلومات کے مطابق تفتیشی بیورو اسی کور کے تحت کام کرتا ہے۔"

"ذاتی عناد۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" وہ بے اعتباری سے بولا۔ "سرکاری اہلکار ذاتی اختلافات کے لئے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی نہیں کر سکتے۔"

"تم وائرلیس پر اوپر والوں سے بات کر سکتے ہو۔" میں نے پُرسکون لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "کیپٹن ہنری میرے خلاف کام کر رہا تھا۔"

"اوپر والے!" وہ چڑ کر بولا۔ "میں خود وسیع اختیارات کا مالک ہوں۔ مسٹر صفدر! تمہیں پوری طرح مجھے مطمئن کرنا ہو گا۔"

"مجھے کوئی عُذر نہیں۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ میرا جلد از جلد تل ابیب پہنچنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو سکا تو خاصی پیچیدگی پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔"

"یہاں سے تل ابیب کی مسافت کم از کم تین گھنٹے کی ہے۔ تم صبح سے پہلے وہاں نہ پہنچ سکو گے۔ ضروری ہوا تو شاید میں تمہارے لئے

ہیلی کاپٹر بھی طلب کر سکوں گا۔"

"یہ بہت بہتر ہو گا میجر!" میں نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔ "مسلسل ٹینشن کے باعث میرے اعصاب بُری طرح بکھر کر رہ گئے ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ۔" وہ کینوس کی تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا پھر ماتحتوں سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ بھی جاؤ۔ فکر کی ضرورت نہیں۔"

"لاش کا کیا کیا جائے سر؟"

"پڑی رہنے دو۔ اتنی جلدی خراب نہیں ہو گی۔"

اُن کے چلے جانے کے بعد میجر نے اپنے تھرماس سے گرم گرم کافی پیالیاں لبریز کیں اور سگار سُلگا کر کوچ پر دراز ہو گیا۔

میں نے بھی کافی پیتے ہوئے اپنی کہانی چھیڑ دی۔ میں نے اُسے ہر ...ن وعن بتا دی علاوہ اس بازپُرس کے جو میں نے مرنے والی لڑکی ...لی تھی۔ اس کی موت کے بارے میں میں نے یہی بتایا کہ ہنری کی موت ...بعد وہ ریوالور سمیت کار کی عقبی سیٹ کے نیچے چھُپی ہوئی تھی تاکہ ...میں فرار کی نیت سے کار میں سوار ہو جاؤں تو وہ بے خبری میں مجھے ...نے لگا سکے مگر میں خوش قسمتی سے اُسے زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا ...جد و جہد کرتی ہوئی میرے ہاتھوں اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔

"تم اُس جگہ کی نشاندہی کر سکتے ہو جہاں تمہیں قید کیا گیا تھا؟" میجر نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"مشکل ہے کیونکہ سارا راستہ یکساں قسم کے درختوں اور میدانوں سے بھرا ہوا ہے۔ پھر اندھیرے کے باعث کوئی نشانی بھی ذہن میں محفوظ نہ رہ سکی ہے۔"

"جو بی جھونپڑے میں لگی ہوئی آگ تو شاید اب بھی روشن ہو گی؟"

"وہ سڑک سے دُور اتنے نشیب میں واقع ہے کہ میں سڑک سے ...ں کا انعکاس بھی دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔"

"نشیب کی آگ نظر نہیں آئے گی؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"دراصل درمیان میں بہت اُونچے ٹیلے حائل ہیں۔ میں کوشش ضرور ...تا ہوں مگر مجھے کامیابی کا ذرہ بھر بھی یقین نہیں ہے۔"

"اور تم فوراً تل ابیب جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں!"

"صاف بات تو یہ ہے کہ تمہارا پولیس کیس ہے۔ شہری حدود میں ...نے والے واقعات سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے پولیس کو باخبر کر دینا ...ہیئے پھر وہ جانیں اور تم جانو۔ مگر میرا قیاس ہے کہ تمہاری کہانی دُرست ...ہے۔ میں ہیڈ کوارٹرز سے گفتگو کرتا ہوں۔ شاید تمہارا مسئلہ حل ہو ہی جائے۔"

اس کے بعد وہ بیک وقت کافی اور سگار سے شغل کرتا رہا۔ کافی ...ختم کرنے کے بعد وہ وائرلیس سیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کچھ دیر کی کوششوں کے بعد اسے رابطہ مل گیا۔

وائرلیس پر گفتگو عبرانی زبان میں شروع ہوئی اور چند ہی فقروں کے بعد وہ ٹرانسمیٹر کو آن چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم کس گاڑی میں ہو؟"

"کالی سیڈان ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر وہ تو بتاتے ہیں کہ تم فائر برڈ میں نکلے تھے جو وائرلیس ٹرانسمیٹر سے مزین تھی۔" اُس نے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"فائر برڈ کا ٹرانسمیٹر میرے اغواء کے وقت ہی ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ وہ اس وقت بھی کسی ویرانے میں پڑی ہو گی۔ اس وقت میں کیپٹن ہنری کی کار میں ہوں۔"

وہ مجھ سے مزید کچھ کہے بغیر دوبارہ وائرلیس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس بار گفتگو چند منٹ تک جاری رہی۔ اس دوران دوسری جانب والا مسلسل بولتا رہا۔ میجر بس ہوں ہاں کرتا رہا اور آخر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"وہ لوگ شدّت سے تمہاری تلاش میں ہیں۔" وہ ایک طویل سانس لے کر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "فائر برڈ کے ٹرانسمیٹر سے رابطہ منقطع ہو جانے پر انہیں تشویش تھی۔"

"تو کیا اب میں تل ابیب واپسی کی اُمید کر سکتا ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں راستہ سمجھا دیا جائے تو تم تنہا ڈرائیونگ کر لو گے؟"

"ہاں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔"

"پھر میں خود ایک جیپ میں تمہارے پیچھے چلتا ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہاں سے واپس جانا ہو گا۔ راستے میں تم مقام کی نشاندہی بھی کر سکو گے جہاں ہنری کی لاش پڑی ہوئی ہے۔"

"یہ بہت مشکل ہے میجر!" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "ہنری کی لاش سڑک سے بہت دُور پڑی ہوئی ہے اور پھر میں کسی طرح اس مقام کی نشاندہی نہ کر سکوں گا۔"

"اگر واقعی یہ ممکن نہیں تو پھر میرا جانا بے سُود ہے۔"

تھوڑی دیر بعد میں اس چیک پوسٹ سے واپس روانہ ہو گیا۔ لڑکی کی لاش بدستور میرے ساتھ تھی۔ راستے کے بارے میں میجر نے مجھے ساری تفصیلات سمجھا دی تھیں جن کے مطابق مجھے اسمارہ نامی ایک بستی کے پولیس اسٹیشن پر پہنچنا تھا۔ وہاں سے آگے کوئی میری رہنمائی کے لئے موجود ہوتا۔

اسمارہ ایک مختصر اور صاف سُتھری آبادی تھی۔ پختہ اور کئی منزلہ عمارات پر مشتمل مکانات پر رات کا خوابناک سناٹا طاری تھا۔ مجھے پولیس اسٹیشن پہنچنے میں کوئی دُشواری نہیں ہوئی۔ وہاں عمارت کے احاطے میں ایک گشتی کار کے پاس چند پولیس افسر میری آمد کے منتظر تھے۔

انہوں نے مجھ سے میری شناخت کے علاوہ اور نہ کچھ طلب کیا نہ ہی کوئی بازپُرس کی اور فوراً مجھے گشتی کار کی عقبی آرام دہ نشست پر منتقل کر دیا گیا اور وہ کار فوراً روانہ ہو گئی۔ لاش والی سیاہ کار پولیس کے

ایک ڈرائیور نے سنبھال لی اور وہ پیچھے روانہ ہوگئی۔

سکون اور تحفظ کا احساس میسر آتے ہی مجھ پر نیند کا شدید غلبہ ہونے لگا اور میں گاڑی کے ہچکولوں کے درمیان گہری نیند سو گیا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو صبح طلوع ہو چکی تھی۔ ہر طرف سورج کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ابھی تک کار ویران راستوں پر دوڑ رہی تھی۔ کالی سیڈان مستقل فاصلے کے ساتھ پیچھے چلی آ رہی تھی۔

صبح کے آٹھ بجے کے قریب ہم اس عمارت میں جا پہنچے جہاں ان دنوں میرا قیام تھا۔ پھاٹک پر متعین سنتریوں نے شاید گیٹ کھولنے کے ساتھ ہی فون پر اوپر والوں کو خبر کر دی کیونکہ میرے کار سے اُترنے تک ماریا برآمدے میں آ چکی تھی۔ اس کے ہمراہ تین افراد اور بھی تھے۔

نہایت مختصر اور رسمی تعارف کے بعد ماریا نے کالی سیڈان کی عقبی نشست کا جائزہ لیا اور بُرا سا مُنہ بناتی واپس آگئی۔

ماریا کے ساتھ آنے والے اسمارہ پولیس کے عملے کو ساتھ لے گئے اور وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر اوپری منزل کی طرف چل دی جہاں میرا کمرہ واقع تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری ذات میں کون سی ایسی خامی ہے جو ساری اُلجھنیں تمہارا تعاقب کرتی رہتی ہیں؟" ماریا نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"میں تمہیں تو ہرگز اُلجھن نہیں سمجھتا۔"

"تم احمق ہو۔" وہ میرے بازو میں چٹکی لے کر بولی۔ "مجھے کیا ضرورت ہے جو میں تمہارا پیچھا کرتی پھروں گی۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے جلدی سے اُس کی بات اُچک لی۔ "تمہاری خاطر تو تمہارے بے شمار ماتحت گوریلا کیمپ کی صعوبتیں تک جھیلنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔"

"ہنری تم سے کیا چاہتا تھا؟" میرے کمرے میں پہنچنے کے بعد اُس نے سوال کیا۔

"مجھے یہ جاننے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ شاید وہ زبردستی کوئی مَن مانا اعتراف کرانے کا منصوبہ تیار کئے بیٹھا تھا۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"یہ معاملہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔" وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ "تمہیں اپنی مدافعت کے لئے ہر وقت تیار رہنا ہوگا ورنہ مصائب سے دوچار ہو جاؤ گے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اُس نے پوچھا۔ "تم ہنری کے ہاتھ سے بچ کیسے نکلے؟"

اس پر میں نے کیپٹن ماریا کو تفصیل سے اپنی پوری کہانی سُنا دی۔

"تو وہ حرافہ تم پر آخری وار کرنے کے چکر میں ماری گئی ہے۔" میرے خاموش ہو جانے پر ماریا نے تلخ لہجے میں میرے ہاتھوں مرنے والی کے بارے میں تبصرہ کیا۔

"شاید وہ تمہاری شناسا تھی؟"

"وہ پورے تل ابیب میں بدنام تھی۔" ماریا سگریٹ سُلگاتے ہوئے بولی۔ "ہنری سے دوستی ہونے سے پہلے تک وہ ایک بدنام ہوٹل میں کیبرے ڈانس کرتی تھی۔ پھر ہنری اس پر فریفتہ ہو گیا اور اس نے ہوٹل کی ملازمت ترک کر دی۔ وہ مدت سے شادی کے بغیر میاں بیوی کی طرح رہ رہے تھے۔"

"اگر تم اجازت دو تو میں نہا دھو کر لباس تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور۔" وہ جلدی سے بولی۔ "فی الحال تم آرام کرو۔ میں دوپہر کو آؤں گی۔"

"اور اس لاش کا کیا ہوگا؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ہنری کی لاش کے ساتھ ہی وہ بھی مُردہ خانے پہنچا دی جائے گی۔"

"ہنری کی لاش؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "اطلاع ملتے ہی اُس علاقے میں ہیلی کاپٹر بھیجا گیا تھا۔ آگ کے باعث وہ جگہ آسانی سے مِل گئی اور پھر ہنری کی مسخ شدہ لاش بھی مِل گئی۔"

ماریا چلی گئی اور میں غسلخانے میں گھس گیا۔

گرم پانی کے نیچے نہانے کے بعد میں باہر آیا تو لباس تبدیل کرتے ہوئے میں نے کال بٹن دبا دیا جس کے جواب میں فوراً ہی ایک عمر رسیدہ بیرا آ پہنچا۔

میں نے اُسے شراب اور چند ہلکی پھلکی چیزیں لانے کا حکم دے دیا مگر وہ بدستور وہیں کھڑا رہا۔

"کیا بات ہے؟" میں بال خشک کرتے ہوئے ناگواری سے اُس کی طرف گھوم گیا۔

وہ اپنے ہونٹوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھے میری طرف گھور رہا تھا۔

اُس کی سرد نگاہیں اور اپنی مخدوش حیثیت کا اندازہ کر کے میرے بدن کے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ فلسطینی افواجِ آزادی کا رُکن ہے۔ اپنی دانست میں اُس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے ڈکٹا فون وغیرہ کے خلاف احتیاطی تدبیر کر لی تھی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ اس کمرے میں کہیں نہ کہیں ٹیلی ویژن کیمرہ بھی ضرور نصب ہوگا جس پر میری ہر حرکت دیکھی جا رہی ہوگی۔ کیپٹن ہنری والے سنگین معاملے کے بعد وہ لوگ مجھے یُوں کھُلی چھوٹ نہیں دے سکتے تھے۔

"کیا بات ہے؟ اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟" میں نے غُرا کر اس سے سوال کیا۔

میرے اس رویّے پر اُس کی نگاہوں میں تحیّر کی جھلکیاں تیرتی نظر آئیں۔ پھر اُس کے لبوں نے کوئی آواز پیدا کئے بغیر جنبش کی اور میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ وہ کالے خون کا حوالہ دے رہا تھا۔

میں وقت ضائع کئے بغیر اچانک اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ مُنہ سے آواز بھی نکالتا میرے زور میں پُشت کے بل فرش پر ڈھیر ہو گیا اور میں پوری قوت سے اُس کا نرخرہ دبانا شروع کر دیا۔

وہ عمر رسیدہ شخص تھا۔ میرے اس جارحانہ رویّے سے بُری طرح بوکھلا گیا۔ اُس نے کئی مرتبہ بولنا بھی چاہا مگر اس کے حلق سے خرخراہٹ اور کوئی آواز نہ نکل سکی۔

میں اُسے جلد از جلد ٹھکانے لگا دینا چاہتا تھا تاکہ کسی کی مداخلت سے پہلے اس کا قصّہ نمٹ جائے۔ اسی وقت باہر راہداری میں کئی دوڑتے قدموں کی دھمک سُنائی دی اور میں نے جنون کے عالم میں اس بار اُس کا سر فرش پر دے مارا۔

میرا یہ وار کارگر رہا اور سر سے خون بہنے کے ساتھ ہی بوڑھے بیرے بے جان ہونے لگے۔ اس کے ہونٹوں پر نیلاہٹ پہلے ہی پھیل چکی تھی۔

میں اس پر سے اُترا ہی تھا کہ دو تنومند افراد دروازہ دھکیل کر اندر چلے آئے۔

"ارے یہ تو بُری طرح زخمی ہے۔" سسکتے اور تڑپتے ہوئے بیرے کو دیکھتے ہی ان میں سے ایک حیرت سے بولا۔

"اُٹھاؤ اسے اُٹھاؤ۔ اگر بر وقت طبّی امداد نہ دی گئی تو یہ مر جائے گا۔" دوسرے نے یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے اُٹھا لیا۔ وہ دونوں میری طرف ذرا بھی متوجّہ نہیں ہوئے اور بوڑھے کو عجلت کے ساتھ وہاں سے نکل گئے۔

میں چند ثانیوں تک تاسف آمیز انداز میں وہیں کھڑا قالین پر تازہ خون کو دیکھتا رہا پھر بوجھل دل کے ساتھ بستر پر جا لیٹا۔

مجھے شروع ہی سے یقین تھا کہ اس کمرے میں بھی کئی خفیہ کیمرے نصب ہیں جو میری پل پل کی حرکات کسی اسکرین تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ کمرے کے بارے میں میرے نظریے کی تائید دو افراد کی دخل اندازی سے ہوئی۔ بوڑھے سے معرکہ آرائی بالکل خاموشی کے ساتھ ہوئی۔ فرش پر قالین موجود ہونے کے سبب سے اس کے گرنے کا دھما کا بھی معمولی تھا۔ کسی کے اس طرف متوجّہ ہونے کا امکان نہیں تھا۔

یقیناً کوئی شخص کلوزڈ سرکٹ ٹیلی وژن پر کیمرے کی مدد سے بوڑھے کی حرکات دیکھ چکا اور اُسے یک بیک بوڑھے کی زندگی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تاکہ اس پر تشدّد کر کے اس کی زبان سے ان کہی کہانی سن سکے۔ اسی لئے انہوں نے بوڑھے کی مدد کے لئے دو آدمی روانہ کئے۔ مگر مجھے پورا یقین تھا کہ ان کا یہ وار کارگر نہیں رہا تھا۔ بوڑھا بدنصیب اپنی کہانی سینے میں دفن کئے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور کسی قسم کی طبّی امداد اس کے کام نہ آ سکتی تھی۔ اس کے لئے یہی بہتر تھا کہ وہ مر جاتا ورنہ یہودیوں کے لرزہ خیز مظالم اُسے سسکتی ہوئی زندگی کے ہولناک عذاب سے دوچار کر دیتے اور پھر وہ نہ صرف میرے بارے میں بلکہ اپنے تمام فلسطینی رابطوں کے بارے میں زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتا۔ وسیع تر مفادات کا تقاضا یہی تھا کہ ایک فرد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔

میں بستر پر دراز انہی خیالات میں کھویا ہُوا تھا کہ ماریا آ پہنچی۔

"تم نے ڈیوڈ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا صفدر؟" اس نے آتے ہی نپے تلے سرد لہجے میں سوال کیا۔ اس وقت اس کا انداز بالکل بدلا ہُوا تھا۔

"اس لئے کہ اس نے مشکوک حرکات کا آغاز کر دیا تھا۔" میں نے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کیسی مشکوک حرکات؟"

"اس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے زبان بند رکھنے کی دھمکی دی تھی اور مجھے شبہ تھا کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ بھی موجود ہے۔"

"حالاں کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس عمارت میں تم پوری طرح محفوظ ہو۔"

"تم نے تو ایک بار یہ بھی کہا تھا کہ میں اسرائیل میں بالکل محفوظ و مامون ہوں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مگر اس کے باوجود ایک بار میں بال بال بچا اور بے چارہ راڈرک ناگہانی مارا گیا اور دوسری مرتبہ میں ہنری کے ہاتھوں المناک موت کا شکار ہوتے ہوتے بچا۔"

"تمہاری ذات تو دن بدن ہمارے لئے بوجھ بنتی جا رہی ہے۔"

"میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آیا تھا۔ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ مجھے میری مرضی کے خلاف اس سرزمین پر لایا گیا ہے اور میں حالات کے سامنے بے بس ہوں۔"

"تمہارے ہاتھوں زخمی ہونے والا بوڑھا دم توڑ گیا ہے۔" وہ اسی سرد لہجے میں بولی۔ "تمہاری وجہ سے گزشتہ چند دنوں میں یہ تیسرا بلکہ چوتھا جانی اتلاف ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کیپٹن ماریا، میں ان چاروں کے پس ماندگان سے دلی تعزیت کرنے کو تیار ہوں۔"

"کان کھول کر سُن لو صفدر! کہ اب تم ہمارا اعتماد کھو چکے ہو۔" وہ بولی۔ "وقت آگیا ہے کہ تم از خود ہمیں اپنی تمام سرگرمیوں اور رابطوں سے باخبر کر دو۔"

"میرے شب و روز کا ایک ایک لمحہ تمہارے سامنے ہے۔"

"میں اسی لیے یہ بات کہہ رہی ہوں۔"

"مگر کس بنیاد پر؟" میں نے تعجب آمیز لہجے میں کہا۔ "میں شروع سے آخر تک ہر ہدایت پر پوری طرح عمل پیرا رہا ہوں۔"

"ڈیوڈ پر تمہارے حملے کی واردات پوری تفصیل سے دیکھی گئی ہے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کی ہول سے جھانکنے والوں کو ہی میرے بیان پر شبہ ہو سکتا ہے۔" میں نے بظاہر مضحکہ خیز لہجے میں کہا مگر ماریا کے ان الفاظ پر میرا

دل یکبارگی تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔ اس کے الفاظ میرے شبہات کی تائید کر رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری چھٹی حس ہر قدم پر میری بے مثال رہنمائی کر رہی ہے۔

"کنٹرول نہیں یہ مناظر ٹیلی وژن کی وسیع اسکرین پر دیکھے گئے ہیں۔ شاید تمھیں علم نہیں کہ اس کمرے میں بیک وقت تین خودکار کیمرے تمھاری نگرانی کرتے ہیں اور اس پوری واردات کی سلو موشن فلم بھی تیار ہوئی ہے جو جلد ہی دستیاب ہو جائے گی۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ فلم تمھیں بتلائے گی کہ میرے حملے کا سبب کیا تھا۔ ڈیوڈ پُراسرار اور جارحانہ انداز میں پیش آیا تھا اور میرا ردِ عمل منطقی تھا کیونکہ میں چند ہی گھنٹوں قبل ہنری کے ساتھ ایک خوفناک معرکے سے دوچار ہو چکا تھا۔"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم ان آسائشوں کو ٹھکرا کر لاک اپ کی راہ اختیار کر رہے ہو۔"

"اگر میرے مقدر میں یہی لکھا جا چکا ہے تو شاید میں جھوٹ بول کر بھی اس سے نہ بچ سکوں گا۔"

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑی۔ "تمھیں چند گھنٹوں کی مہلت دی جا رہی ہے۔ ہنری اور ڈیوڈ کے معاملات کے بارے میں تم تحریری رپورٹ تیار کر لو۔ اس کے مندرجات کی بنیاد پر تمھارے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

"رپورٹ میں ضرور تیار کر دوں گا مگر اس سے پیشتر میں کرنل ریٹا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ مصروف عورت ہے اب تم براہِ راست میرے چارج میں دیئے جا چکے ہو اس لئے کرنل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"میری رپورٹ میں ان باتوں کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔ جو تم مجھ سے سن چکی ہو۔"

"اس کے باوجود میں تمہاری تحریر چاہتی ہوں۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "شاید لکھتے ہوئے تمہیں کچھ ایسی باتیں بھی یاد آ جائیں جو تم دانستہ بھول رہے ہو۔"

اس نے اپنی موجودگی ہی میں میرے لئے لکھنے کے سامان کا بندوبست کیا اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

میں نے تھوڑی دیر ہی میں اپنی رپورٹ مکمل کر لی جس میں ہر جملہ نپا تلا تھا اس کو میں نے کئی بار پڑھا اور مطمئن ہو کر دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ رپورٹ میں کوئی لفظ یا فقرہ ایسا نہیں تھا جس کی بنا پر میری گرفت ہو سکے بلکہ تحریر کی صورت میں میری کہانی کچھ زیادہ مربوط ہو گئی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ اب میرے لئے بچاؤ کے راستے مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ ایک بار شبہ میں پڑ جانے کے بعد آسانی سے میرا پیچھا ہرگز نہ چھوڑتے۔

اسی شام ماریا نے تیسری بار مجھ سے ملاقات کی۔ اس بار مجھے ایک وسیع کمرے میں طلب کیا گیا تھا۔ جہاں کچھ عجیب سا انتظام موجود تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اب تک تمہیں اپنی حیثیت کے بارے میں شدید غلط فہمی ہے!" اس نے سرسری انداز میں رپورٹ پڑھنے کے بعد کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہاں میں کھلی جیل کا ایک قیدی ہوں۔"

"اسے لے جاؤ۔" ماریا نے پیچھے مڑ کر کہا اور تاریکی میں سے کئی قوی ہیکل سائے نکل کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

اس کمرے میں مختلف زاویوں سے تین طاقتور سرچ لائٹس اس طرح آویزاں تھیں کہ ان کے عقب میں وسیع ہال کا تقریباً نصف حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سرچ لائٹس کے سامنے والی دیواروں کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ ان سے ذرا بھی روشنی عقبی حصے میں منعکس نہیں ہوتی تھی۔ البتہ ادھر سے ابھرنے والی نقل و حرکت کی مدھم سی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ اس اندھیرے میں کچھ لوگ موجود ہیں۔

سرچ لائٹس کے روشن ہالے میں ایک خوبصورت سا چوبی چبوترہ تھا جس پر ایک پیچیدہ سی آہنی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ اس کرسی کے ساتھ ایسے حلقے بھی منسلک تھے جن کے ذریعے بیٹھنے والے کو نقل و حرکت کی آزادی سے بآسانی محروم کیا جا سکتا تھا۔

وہ لوگ مجھے پکڑ کر کسی ننھے سے بچے کی طرح اسی کرسی کی طرف لے گئے اور مجھے بٹھانے کے بعد پھرتی سے میرے ہاتھوں اور گردن کو ایک خودکار شکنجے میں کس دیا۔ میری پنڈلیاں بیٹھنے کے ساتھ ہی آہنی پٹیوں کی گرفت میں آ چکی تھیں۔ ... میں جنبش کرنے سے قاصر ہو گیا تھا۔

مجھے بے بس کرنے کے بعد وہ لوگ پھرتی سے اندھیرے میں معدوم ہو گئے اور ماریا کرسی کے مقابل بنی ہوئی ایک مختصر لیکن پیچیدہ کنٹرول ڈسک پر پہنچ گئی۔

اندھیرے میں کچھ کرسیاں سرکنے کی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ اس ادھر سے ایک بھاری مردانہ آواز نے ماریا کو کارروائی کے آغاز کا حکم دیا۔

ماریا مجھے پوری طرح نظر آ رہی تھی۔ اس نے بڑے انداز سے اپنی شہادت کی انگلی فضا میں لہرا کر دکھائی اور پھر ڈسک کا ایک بٹن دبا دیا۔

میری کرسی آہستہ آہستہ .... فرش سے بلند ہونے لگی اور قد آدم بلندی پر پہنچنے کے بعد ٹھہر گئی اسی کے ساتھ میرے بدن کو ایک خفیف برقی جھٹکا لگا میرا جسم آہنی شکنجوں میں کسمسا کر رہ گیا۔

پھر یک بیک سرچ لائٹس کی روشنی بہت تیز ہو گئی اور ان کی حرارت مجھے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگی ابھی میں اس ردِ عمل سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ یک بیک کرسی پوری قوت سے گردش میں آ گئی۔ اور میں بے اختیار چیخ پڑا۔

چند ہی سیکنڈ میں مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا کرسی تیزی کے ساتھ گردش ضرور کر رہی تھی مگر برقی جھٹکے وغیرہ ظہور پذیر نہیں ہو رہے تھے میں نے خاموش ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اپنا دل کسی گہرے کنویں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"اسرائیل میں کن لوگوں سے تمہارا رابطہ ہے؟" گردش کی ہموار آواز میں ماریا کی تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں مضبوطی سے ہونٹ بھینچے خاموش رہا۔ ماریا نے ایک بار پھر سوال دہرایا۔ اس بار بھی میں کچھ نہ بولا مگر پل بھر میں ایک شدید برقی جھٹکے نے بری طرح چیخنے پر مجبور کر دیا۔ میرے اعصاب بری طرح جھنجھنا اٹھے۔

"ان برقی جھٹکوں کے اثرات سے تم طویل عرصے تک نہ بچ سکو گے" ماریا میرے خاموش ہونے پر پرسکون آواز میں کہنے لگی۔ "برقی رَو پانی سے گزارا جائے تو وہ آکسیجن اور ہائیڈروجن گیس میں تحلیل ہو جاتا ہے اسی طرح تمہارے بدن میں سے گزرنے والی ہر برقی لہر تمہارے خون کی ایک مقررہ مقدار کو اس کے اجزاء میں تحلیل کرتی رہے گی اور اس کرسی سے اترنے تک تم یرقان کے کسی مریض سے بھی بدتر حال کو پہنچ جاؤ گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے اعصاب کی قوت بکھرنے سے قبل زبان کھول دو ورنہ جب مشینی انداز میں تم سچ اگلنے پر مجبور ہو جاؤ گے تو تمہاری حالت قابلِ رحم ہو چکی ہو گی۔"

"میں جو کچھ جانتا تھا وہ پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے اسے جواب دیا۔ تب مجھے اپنی آواز سن کر سخت صدمہ ہوا میری آواز چند ہی منٹ میں بہت زیادہ نحیف ہو چکی تھی۔

"ڈیوڈ تمہیں کس کا پیغام دینے والا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تم نے اسے کس لئے ہلاک کر دیا۔؟"

"وہ مجھے اپنی جان کے لئے خطرہ نظر آ رہا تھا۔" اس گھومنے والی کرسی میں نہ جانے کون سی مقناطیسی قوت پوشیدہ تھی کہ مجھے ہر لحظہ اپنی قوت گھٹتی اور ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اپنے جواب کی وضاحت کرو!"

میرے پپوٹے بند تھے مگر میں ہر سیکنڈ میں کئی بار سرچ لائٹس کی پیوست روشنی کو اپنے سامنے سے گزرتا محسوس کر رہا تھا۔ بار بار تاریکی اور روشنی ہونے کی وجہ سے میرے ذہن پر تنویمی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

"میری چھٹی حس نے مجھے خطرے سے آگاہ کیا تھا!" مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی میں نے اپنی آنکھیں کھولنا چاہیں مگر میرے پپوٹے بوجھل ہو چکے تھے۔ کرسی کی تیز گردش کا احساس بتدریج معدوم ہو رہا تھا اور میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں کسی سبک اندام پرندے کی طرح خلائے بسیط میں تیزی سے اوپر اٹھتا جا رہا ہوں اور بڑے بڑے ستارے تیزی سے پیچھے رہتے جا رہے ہوں۔

میرے بدن کو شاید ایک بار پھر برقی جھٹکا لگایا گیا مگر اس بار اعصاب میں ہلکی سی سنسناہٹ کے علاوہ مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"تم میری آواز سن رہے ہو؟" میلوں کے فاصلے سے ماریا کی آواز سنائی دی۔

"ہاں!" میں نے اپنے سینے سے جواب ابھرتا محسوس کیا مگر میرے کان اپنی آواز نہ سن سکے۔

اسی کے ساتھ اس آسیبی ہال میں چند دھیمی پراسرار سرگوشیاں سنائی دیں جیسے کسی جاں بلب مریض کے سرہانے بہت سی روحیں سرگوشیوں میں مصروف ہوں۔ اس کے چند ہی ثانیوں بعد یہ احساس بھی ذہن کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں ڈوب گیا۔

دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر موجود تھا میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے بے شمار رنگین لہریئے ناچ رہے تھے۔ میرے بدن پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔ بدن پسینوں میں شرابور مگر دہک رہا تھا شاید مجھے شدید بخار ہو گیا تھا۔

کئی سیکنڈ کے بعد میری بصارت معمول پر آئی تو مجھے ماریا کا حسین چہرہ نظر آیا۔ وہ میرے قریب ہی موجود تھی۔ اسے دیکھ کر غیر ارادی طور پر مجھے پھریری سی آ گئی۔

"کیسے ہو تم؟" اس نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے بولتے ہوئے شدید کمزوری محسوس کی۔ "تم نے مجھے کیا کر دیا ہے؟ تھوڑی دیر پہلے تو میں اتنا کمزور نہیں تھا!"

"تمہاری ضد نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اور اب تھوڑی دیر کی نہیں، چار دن پہلے کی بات ہے۔"

"چار دن؟" میں نے حیرت سے کہا اور کہنیوں کے سہارے بستر سے اٹھنا چاہا مگر چکر آنے کے سبب دوبارہ لیٹنے پر مجبور ہو گیا۔ "ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو تم مجھے کرسی پر نچا رہی تھیں۔"

"وہ چار دن پہلے کی بات ہے۔ اب اپنے ذہن پر اتنا زور نہ دو، تم جلد ہی صحت یاب ہو جاؤ گے!"

"تم کتنی مہربان اور نرم دل ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا اور جماہی لے کر کمبل میں منہ ڈھانپ لیا۔ مجھ پر ایک بار پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی

اس کمرے میں جب تک میں ہوش میں تھا میری حالت خراب ضرور تھی مگر نقاہت اس قدر شدید نہیں تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے بدن میں توانائی کی ذرا بھی رمق باقی نہ رہی ہو۔ ماریا نے یہ بتا کر مجھے مزید خوفزدہ کر دیا تھا کہ میں چار دن تک بے ہوشی کی اس منزل پر رہا کہ مجھے وقت گزرنے کا بھی احساس نہ ہو سکا۔ نہ جانے اس عالم میں لوگوں نے میری زبان سے کیا کچھ اگلوا لیا تھا۔ ماریا کے اطمینان سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ بہت زیادہ اطمینان بخش رہا ہے۔

میں کئی دن تک بستر سے اٹھنے کے قابل نہ ہو سکا۔ اس دوران میں کبھی کبھار ماریا آ کر میری مزاج پرسی کرتی رہی۔ میں نے کئی بار اس سے اگلوانا چاہا کہ وہ مجھ سے کیا کچھ معلوم کر چکی ہے مگر اس نے ہر بار... نہایت خوبصورتی سے

موضوع ٹال دیا اور میری الجھن بدستور برقرار رہی۔

تیسرے روز مجھے پیشگی اطلاع دیئے بغیر معذور دوں والی کرسی میں بٹھا کر اس عمارت کے ایک ایسے حصے میں پہنچایا گیا۔ جہاں سات فلسطینی تیز روشنیوں کے سامنے ایک شناختی چبوترے پر موجود تھے۔

"ان سب کو غور سے دیکھو اور ایسے شخص کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ جسے تم پہلے بھی کہیں دیکھ چکے ہو۔" کیپٹن ماریا نے جذبات سے عاری لہجے میں مجھے حکم دیا۔ اور کرسی ایک مرتبہ پھر آگے رینگنے لگی۔

اس کے اس حکم کے ساتھ ہی مجھ پر اچانک چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ان ساتوں میں کسی نہ کسی طرح حیرت انگیز مشابہت موجود تھی۔ بے اختیار میری نگاہیں اس قطار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھسلتی چلی گئیں اور یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ ان میں محمود موجود نہیں تھا۔ . .

شاید وہ لوگ میری زبان سے محمود کا حلیہ اگلوانے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ پھر اس سے ملتے جلتے خدوخال اور جسامت والے جتنے فلسطینی انہیں نظر آئے پکڑ لئے گئے۔

وہاں کئی اسرائیلی افسران گہری نظروں سے میرے اور قیدیوں کے چہروں کے تاثرات کا مشاہدہ کرتے رہے اور جب قطار کے ایک سرے پر پہنچنے کے بعد کرسی واپس گھمائی گئی تو ان کے چہرے تاریکی سے اٹک گئے۔ قیدیوں کے چہرے ابھی تک دہشت سے زرد ہو رہے تھے۔ شاید انہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ انہیں کس جرم کی پاداش میں قید کر کے اس شناختی چبوترے پر لایا گیا ہے۔

میرے قریب پہنچنے پر ماریا نے استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ان میں سب چہرے میرے لئے اجنبی ہیں!" میں نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ان لوگوں میں تمہیں کسی کی مماثلت نظر آتی ہے؟" افسروں کی قطار میں سے ایک جوان سال اور صحتمند شخص نے آگے بڑھ کر تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں" میں نے اعتراف کرتے ہوئے اپنے حلق میں کوئی سخت سی چیز اٹکتی ہوئی محسوس کی۔

"کیوں وقت ضائع کر رہے ہو سلمان؟" ماریا نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔

"صرف چند منٹ کی بات ہے۔" اس نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "ان میں جو شخص محمود سے قریب ترین مشابہت رکھتا ہے، ذرا ایک بار اس کی نشاندہی کر دو۔"

ایک بار پھر کرسی حرکت میں آ گئی میں نے بغور مشاہدہ کرنے کے بعد ایک ایسے شخص کی طرف اشارہ کر دیا جو محمود کے ساتھ سب سے کم مشابہت رکھتا تھا۔

سلمان نے قلم اور کاغذ سنبھال کر مجھ سے سوالات شروع کر دیئے ... حتی الامکان اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بے ہوشی کے عالم میں مجھ سے جو غلطی سرزد ہو گئی تھی اب میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ اسرائیلیوں کے مقابلہ میں مجھے محمود اور اس کے مقاصد زیادہ عزیز تھے۔

اس کے بعد مجھے دوبارہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اگلے چند روز میرے لئے نہایت صبر آزما ثابت ہوئے میرا تمام وقت اسی کمرے میں گزرتا تھا۔ حالت سنبھل جانے کے بعد میں نے کمرے سے باہر نکلنا چاہا لیکن مجھے سختی کے ساتھ اندر بھیج دیا گیا۔ اس دوران میں صرف دو مرتبہ ماریا سے ملاقات ہوئی۔

اس نے صاف الفاظ میں مجھے بتا دیا کہ وہ لوگ میری حرکتوں سے واقف ہو چکے ہیں اور اب مجھے مزید تربیت کے لئے بھیجنے کا پروگرام منسوخ کیا جا چکا ہے۔ اور اب میرے مستقبل کا انحصار صرف اس امر پر تھا کہ میں فلسطینی افواج آزادی کے اسرائیلی مرکز کی تباہی میں ان کی مدد کروں۔

اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری زبان سے بہت کچھ اگلوا چکے ہیں مگر پھر بھی بعض باتیں ان سے پوشیدہ رہ گئی تھیں۔ میری زبان کھلوانے کے لئے انہوں نے مجھ پر ایک جدید ترین طریقہ آزمایا تھا جسے ماریا اختصار ... ای سی ٹی کہہ رہی تھی۔ یہ حروف الیکٹرو ویپناٹک پروگرام کا مخفف تھے اور اس کے ذریعے انسان کے شعور کو کنٹرول کر کے ... میں محفوظ معلومات اگلوائی جا سکتی تھیں ... معلومات کا انحصار سوالات کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ ان لوگوں ... کے بارے میں شبہ تھا اس کے بارے میں سوالات کر کے انہوں نے مطلوبہ معلومات حاصل کر لی تھیں مگر جن پہلوؤں کے بارے میں سوالات نہیں کئے گئے وہ ابھی تک ان سے پوشیدہ تھے۔

میرے صحت یاب ہونے کے بعد ماریا نے مجھے بتایا کہ مجھے آرمی انٹیلی جنس بیورو کی تحویل سے نکالا جا رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے اپنے طور پر رہائش وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا۔

"تو کیا اب میں اسرائیل سے باہر جا سکتا ہوں؟"

اس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر کو جنبش دی۔ "جب تک محمود گرفتار نہیں کر لیا جاتا تمہارا مستقبل غیر یقینی رہے گا۔ اس سے ہمیں راڈ... کی موت کا انتقام لینا ہے!"

"تو کیا ابھی تک ان کا کوئی آدمی تمہاری گرفت میں نہیں آ سکا؟"

"تم کس کے آدمی ہو؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "تمہیں غلط فہمی تھی کہ تم غیر معینہ مدت تک یوں ہی ہمیں بے وقوف بناتے رہو گے!"

"میرے علاوہ اور کوئی نہیں پکڑا گیا؟" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"تمہارا امین افراد سے رابطہ قائم ہوا تھا" وہ بولی "محمود کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا۔ راڈرک کی موت کے بعد تم رنگیل اسٹور میں جس لڑکی سے ...

... لینے گئے تھے وہ اس واقعہ کے اگلے روز ہی ملازمت چھوڑ ... گداگر نے تم کو پبلک لائبریری کے ریفرنس ہال میں پہنچنے کا پیغام ... کی تلاش جاری ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی بہروپیہ رہا ہو گا۔ ... سمجھتی ہو کہ مجھے باہر دیکھ کر وہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی ... گے؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"جب تک تم یہاں ہو ان کے لئے کارآمد ہو۔" وہ استہزائیہ قہقہہ ... باہر جاؤ گے تو وہ پہلی فرصت میں تمہیں ٹھکانے لگانے کی کوشش ... ان کی نظروں میں انسانی خون کی کوئی قیمت نہیں ہے۔"

"... مجھے دیدہ دانستہ چارہ بنا کر موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔"

"... ان کے سوا اور کس سلوک کے مستحق ہو؟ ہاں اگر تمہارے ذریعے ان کا ... ہاتھ آ گیا تو شاید تم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لو گے۔"

"... اگر انہوں نے تمہاری توقع کے برخلاف مجھ سے دوبارہ کام لینا چاہا؟" ... ان کی مرضی پر عمل کرو گے!"

"... بہت قریب سے میری نگرانی کی جائے گی۔" ... یاد رکھنا کہ اس عمارت میں تم ان کے ایک مخبر کو ہلاک کر چکے ہو جو تمہیں کوئی اہم ... دینے والا تھا۔ اس کی بنا پر وہ ہرگز تم پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔"

"... اور میرے بارے میں اب تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟" میں نے اس کا ... سوال کیا۔

"... میں نے تمہارے ساتھ اچھا وقت گزارا ہے۔"

"... جانے سے پہلے ان چند لمحوں کی تجدید کیوں نہ کی جائے!" میں نے ... اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"اب یہ ... رہا میں اس وقت کا انتظار کروں گی جب تم سرخرو ہو کر دوبارہ ہمارے ... آ جاؤ گے۔"

"وہ وقت نہ جانے کب آئے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اٹھنے کا موقع ... دیئے بغیر اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"ہٹو ... ورنہ میں گولی مار دوں گی۔" اچانک وہ غرائی اور اسی کے ساتھ ... اپنے سروس آٹومیٹک کی سرد آہنی نال میرے پیٹ میں اڑا دی۔ ... میں چند ثانیوں کے لئے سکتے میں آ گیا۔ اس دوران میرے پیٹ پر نال ... پر بڑھ گیا اور وہ ایک مرتبہ پھر کسی بھپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرائے ... "ہٹو!"

میں نے فوراً اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور وہ اچھل کر بستر سے ...

"... بس ڈر گئے؟" اپنا لباس درست کرتے ہوئے وہ اچانک ہنس پڑی ... نے تو اس کا سیفٹی کیچ بھی نہیں ہٹایا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ... آٹومیٹک فضا میں لہرایا۔

"تم جیسی خونخوار لڑکی سے کچھ بھی بعید نہیں!" میں نے خفت آمیز لہجے میں کہا۔

اسی روز شام کو جب مجھے اس عمارت سے نکالا گیا تو میرا پرانا شناختی کارڈ واپس لیا جا چکا تھا۔ اس کے بجائے مجھے وزارت داخلہ کی جانب سے جاری کیا ہوا شناختی کارڈ دے دیا گیا تھا جس میں مجھے تارک وطن قرار دیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے ایک ہزار اسرائیلی پونڈ بھی دے دیئے گئے تھے۔

"یہ رقم کب تک میرا ساتھ دے گی؟" میں نے اس شخص سے سوال کیا جو میری رخصتی کا حکم لے کر آیا تھا۔

"یہ معقول رقم ہے۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی تم کوئی ملازمت تلاش کر سکتے ہو۔"

روانگی کے وقت میرے ساتھ خاصا توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ اس شخص نے مجھے عمارت کے پھاٹک سے باہر لا کر چھوڑ دیا اور خود طنزیہ انداز میں ہاتھ لہرا کر واپس چل دیا۔

میں نے وہیں کھڑے کھڑے سگریٹ سلگائی اور چند ثانیوں کے بعد ایک طرف چل پڑا۔

تل ابیب کے وسطی علاقے میں اقامتی ہوٹلوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ میں نے کارلٹن ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ میرے دو دن سخت کوفت اور خالی الذہنی کے عالم میں گزرے۔ میرا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ میں خود کو ایک ایسے موڑ پر محسوس کر رہا تھا جہاں ہر راستہ اجنبی تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ یوں بیٹھے رہ کر میں اپنے ذہن کو زنگ لگا لوں گا۔ لہٰذا تیسرے دن میں نے ملازمت کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔

دفتروں وغیرہ میں دھکے کھانے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میز کرسی والی ملازمت ملنی ناممکن ہے۔ لہٰذا میں نے ہوٹلوں اور دکانوں کا رخ کیا اور آخر کار میں مردانہ ملبوسات فروخت کرنے والی ایک دکان میں سیلزمین کی حیثیت سے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس تقرری سے مجھے خاصی خوشی ہوئی۔ اب کم از کم میرا وقت بہتر طور پر گزر سکتا تھا۔ واپسی پر میں یہی سب سوچتا ٹیکسی میں اپنے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک ایک آسمانی رنگ کی کار سے یکے بعد دیگرے ٹیکسی پر کئی بے آواز فائر ہوئے اور میں بوکھلا کر عقبی نشست سے پائیدان میں دبک گیا۔ ڈرائیور کا بھی ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکا اور اس نے بے تحاشہ گالیاں دیتے ہوئے فوراً کار روک دی۔

اس تیز رفتار کار سے تین فائر کئے گئے تھے۔ ایک گولی بانٹ پر لگی اور دو نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیئے مگر حیرت انگیز طور پر نہ ڈرائیور زخمی ہوا نہ ہی میں گولیوں کا نشانہ بن سکا۔

"تم زندہ ہو یا مر گئے؟" چند ثانیوں بعد باہر سے ڈرائیور نے مجھے آواز دی۔

میں دروازہ کھول کر آہستگی سے باہر نکل آیا۔

ٹیکسی کا انجن بدستور اسٹارٹ تھا۔ وہ سڑک ویران پڑی تھی ورنہ اس فائرنگ کے نتیجے میں وہاں خاصی افراتفری پھیل گئی ہوتی۔

"یہ گولیاں معلوم ہوتی ہیں۔" ڈرائیور غصیلے لہجے میں بولا "مگر حیرت ہے کہ فائرنگ کا کوئی دھماکہ نہیں سنائی دیا۔ تم نے کسی کو گولیاں چلاتے دیکھا تھا؟"

"برابر سے گزرنے والی ایک تیز رفتار کار سے بے آواز فائر ہوئے ہیں۔" میں ہولے ہولے کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تل ابیب میں تمہارا کوئی جانی دشمن ہے۔"

اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی چمکتی ہوئی قہر بار آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ "میں سیدھا سادا آدمی ہوں سمجھے؟ اور میری ٹیکسی پر یہ مصیبت تمہاری وجہ سے نازل ہوئی۔ کون ہو تم؟"

"میری وجہ سے؟" میں نے حیرت سے کہا اور پھر اپنا شناختی کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "تل ابیب میں ابھی تک میں کسی کو دوست نہیں بنا سکا تو بھلا دشمن کہاں سے پیدا ہو جائیں گے۔"

"بانٹ میں سوراخ ہو گیا۔ دو شیشے بھی چکنا چور ہو گئے۔" وہ کارڈ دیکھ کر مجھے لوٹاتے ہوئے بولا "یہ فلسطینیوں کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ جب تک ان کا بچہ بچہ نہیں کچلا جائے گا، ہمارے شہروں پر اسی طرح دہشت کے ہولناک سائے لہراتے رہیں گے۔"

"فلسطینی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "میں نے یا تم نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو وہ یوں ہماری جان لینے کے درپے ہو جائیں؟"

"تم عقل سے پیدل معلوم ہوتے ہو۔" وہ جھلا کر بولا۔ "گاڑی میں بیٹھو۔ اب پہلے پولیس اسٹیشن جانا ہوگا تاکہ مجھے انشورنس کمپنی سے پیسہ مل سکے۔"

"تم پولیس اسٹیشن جاؤ۔ میں یہاں سے دوسری ٹیکسی لے لوں گا۔" میں نے پرس نکالتے ہوئے کہا۔

"اندر بیٹھو" وہ مجھے تقریباً دھکیلتے ہوئے بولا "تم اس حادثے کے چشم دید گواہ ہو۔"

ٹیکسی روانہ ہوئی تو میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ مجھ پر پہلا ناکام قاتلانہ حملہ تھا۔ شاید محمود اور اس کے ساتھی میرا سراغ پانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ گو میں نے محض ان کے مفاد کی خاطر ان کے آدمی کو ہلاک کیا تھا کہ کہیں وہ ان کے سارے راز افشا نہ کر دے مگر بعد میں خود میں نے اسرائیلی حکام کو ساری معلومات فراہم کر دیں اور یہ میرا ایسا جرم تھا جس کو محمود اور اس کے ساتھی کبھی معاف نہ کرتے۔ محمود مجھے بتا ہی چکا تھا کہ وہ لوگ اجتماعی سلامتی کے اصول پر عمل کرتے ہیں اور اگر کسی فرد سے اجتماعی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے تو اسے بلا تردد راہ سے ہٹا دیا جاتا ہے بلکہ ان کے بعض کارکن تو اتنے کٹر تھے کہ پکڑے جانے کی صورت میں باز پرس کی ابتدا سے پہلے ہی خودکشی کر لیا کرتے تھے تاکہ ان کی زبان سے دوسرے ساتھیوں کو ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔

تل ابیب کی کشادہ سڑکیں یک بیک مجھے موت کا جال معلوم ہونے لگیں۔ میں اسرائیلی حکام کی تائید و حمایت سے محروم ہو چکا تھا اور فلسطینی حریت پسند میرے لہو کی بو پر لگ چکے تھے۔ میں خود ان کے ٹھکانے سے بالکل بچ [illegible] تھا ورنہ میں ان سے رابطہ قائم کر کے اپنی پوزیشن کی وضاحت کر سکتا تھا۔

اور اسی خیال کے ساتھ مجھ پر یک بیک وہ مقصد بھی منکشف ہو گیا جس کے تحت اسرائیلی حکام نے مجھے اپنی تحویل سے نکال دیا تھا۔

حالات اور واقعات ان کی منشا کے عین مطابق جا رہے تھے [illegible] میں... فلسطینیوں کے لئے ایک سہل نشانے کی صورت اختیار کر گیا تھا اور [illegible] قاتلانہ حملے کے بعد میں پوری کوشش کرتا تاکہ کسی طرح میر محمود یا اس کے کسی کارندے سے رابطہ قائم ہو جائے۔ اور پھر میری نگرانی کرنے والے سرکاری کارندے [illegible] ذریعہ ان کا سراغ پانے میں کامیاب ہو جاتے۔ مگر اس نکتے سے ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی۔ اگر واقعی میری نگرانی کی جا رہی تھی تو ناکام قاتلانہ حملے کے وقت [illegible] لوگ کہاں سو رہے تھے۔ میرے بجائے آسمانی رنگ کی کار کا پیچھا کر کے حملہ آور کو پکڑا جا سکتا تھا اور ایک مرتبہ وہ پکڑے جاتے تو ان کے تمام ساتھیوں کا [illegible] لگانا آسان ہو جاتا۔

میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ ٹیکسی تھانے جا پہنچی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی کہانی پولیس حکام کے لئے سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ فوری طور پر اعلیٰ افسران کی ایک بھیڑ وہاں جمع ہو گئی۔ میرا اور ٹیکسی ڈرائیور کا تفصیلی بیان لیا گیا۔ کار کا معائنہ ہوا پھر کئی گاڑیوں میں سوار ایک کارواں نے جائے حادثہ کا جائزہ لیا۔ بے شمار تصاویر تیار کی گئیں اور ٹیکسی مزید تفتیش کے لئے روک لی گئی۔

جب مجھے اور یہودی ڈرائیور کو پولیس کار میں تھانے سے روانہ ہونے کی اجازت ملی تو رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔

اگلی صبح کے اسرائیلی اخبارات میں اس واقعے کے بارے میں نفرت انگیز اور اشتعال آمیز خبریں تفصیل کے ساتھ پہلے صفحے پر موجود تھیں۔ اس کارروائی کا ذمہ دار براہِ راست فلسطینیوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔ ایک اخبار نے سرخی لگائی [illegible] "جو خود ایک فرضی وطن کے طلبگار ہیں، دوسروں کو اپنے وطن میں زندہ نہیں [illegible]"

ان خبروں کے ساتھ میری اور ڈرائیور کی تصاویر بھی تھیں۔ مجھے ایک خوش نصیب غیر ملکی مسافر قرار دیا گیا تھا جبکہ ڈرائیور کو اس واقعے کے مظلوم [illegible] کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اس کی، اس کے اہل و عیال اور ذمہ داریوں [illegible] تفصیلات شائع کرنے کے ساتھ آخر میں یہ سوال بڑے مؤثر انداز میں اٹھایا [illegible] تھا کہ اگر کوئی گولی بانٹ یا شیشوں کی بجائے ڈرائیور کی کھوپڑی میں اتر جا[illegible] تو اس کے پسماندگان کا مستقبل کیا ہوتا؟

میرے ذہن میں فلسطینی افواجِ آزادی کے کارکنوں کا خوف پہلے ہی [illegible] موجود تھا۔ ان... منطقی تجزیوں نے مجھے ان سے خاصا برگشتہ کر دیا۔ یہ درست [illegible] تھا کہ میں نے نادانستگی میں بلکہ ناگزیر حالات میں ان کے مفادات کو پامال [illegible] تھا اور وہ مجھے ختم کر دینا چاہتے تھے مگر دنیا کے کسی بھی اخلاقی اصول کے تحت انہیں یہ حق نہ تھا کہ وہ مجھ سے بدلہ لینے کے جنون میں ایک عیالدار آدمی کی [illegible] خطرے میں ڈال دیں۔

میں نو بجے ڈیوٹی پر پہنچا تو اسٹور کے یہودی مالک نے بڑے تپاک سے [illegible]

[illegible] استقبال کیا اور مجھے پچھلی رات کے قاتلانہ حملے میں بچ جانے پر مبارکباد دی۔
[illegible] تم مسلمان ہو، مگر دیکھو کہ یہ لوگ اپنی کارروائیوں کے دوران میں مذہب [illegible] عمر کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ ان کا مقصد محض دہشت کی فضا پیدا [illegible] کرنا ہے!" اسٹور کے ایک ملازم نے کہا۔

[illegible] ایسی کارروائیاں واقعی قابلِ مذمت ہیں!" میرے پاس یہ اعتراف [illegible] کوئی چارہ نہیں تھا۔

[illegible] کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایسے لوگ ایک آزاد وطن کے مستحق ہیں؟" یہ سوال [illegible] مالک نے بڑے تیکھے لہجے میں کیا تھا۔

[illegible] توپوں کے گولوں، آگ اور عسرت کے سائے میں پلنے والوں کے [illegible] حقیقت ہو جاتی ہے۔ پناہ گزیں کیمپوں میں پروان چڑھنے [illegible] عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو چڑھتا ہوا خون انہیں مسلح اقدام سے [illegible] انہیں علیحدہ وطن ملے یا نہ ملے مگر ان کی وطنیت کا مسئلہ [illegible] ہونا چاہیے۔" میں نے ڈھیلے ڈھالے اور معذرت خواہانہ انداز میں [illegible] کا اظہار کیا۔

[illegible] انہیں مصر، شام یا عراق کیوں قبول نہیں کر لیتے؟" وہ تیز لہجے [illegible] یہ لوگ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ فلسطین تو کب سے قائم ہے [illegible] اہل فلسطین ہے مگر یہ لوگ یہودیوں کو سمندر میں پھینک کر مسلم [illegible] کا قیام چاہتے ہیں، یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔"

[illegible] اس بارے میں میری معلومات ناقص ہیں۔" میں نے ہتھیار ڈال [illegible] یہیں دال روٹی کے چکر میں گھر سے نکلا ہوں۔ ان مسئلوں سے مجھے [illegible] نہیں!"

[illegible] معلومات ناقص ہیں تو ان میں اضافہ کرو۔" وہ بولا۔ "جب تم [illegible] جاؤ گے تو دوسروں کو یہی باتیں بتا سکو گے۔ دیکھو ان کی وجہ سے [illegible] یہاں ہر طرف ابتری ہے۔ کہیں یہ تختہ الٹنے کے چکر میں ہیں کہیں [illegible] نہیں کرتے ہیں، کہیں انہوں نے متوازی عسکری تنظیمیں بنائی ہوئی [illegible] انہیں ایک ملک دے دیا گیا تو وہ اس خطے کا سب سے بڑا سیاسی جغرافیائی [illegible] ناسور ہوگا۔"

[illegible] وہ اپنی دھن میں نہ جانے کیا کیا بکتا رہا اور میں خالی الذہنی کے عالم میں [illegible] سنتا رہا۔ آہستہ آہستہ یہودی ذہنیت مجھ پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ [illegible] وہ لوگ ذرائع ابلاغِ عامہ اور انفرادی رابطوں کے ذریعہ مؤثر پروپیگنڈے [illegible] تھے۔ انہیں ذرا سا بھی موقع مل جاتا تو فلسطینیوں کے خلاف [illegible] زہر پھیلانے میں مصروف ہو جاتے۔ وہ ایک باقاعدہ تنظیم اور پروگرام [illegible] اور بین الاقوامی سطح پر اپنا کام کر رہے تھے۔

[illegible] اس اسٹور میں میری ملازمت کے چار دن کسی خاص واقعے کے [illegible] پانچویں روز ایک شخص پتلونوں کی خریداری کے لئے میرے [illegible] آیا۔ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے وہ کوئی آسودہ حال امریکی معلوم [illegible]

کافی دیر کی چھان بین کے بعد اس نے تین پتلونیں پسند کیں اور انہیں اٹھا کر ٹرائیل روم کی طرف چلا گیا۔ میں اس کی غیر موجودگی میں کاؤنٹر پر پھیلی ہوئی بقیہ پتلونیں سمیٹنے لگا۔

"اے مسٹر!" چند منٹ بعد اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔

"یس سر!" میں اپنا کام چھوڑ کر جلدی سے اندرونی حصے میں واقع ٹرائیل روم کی طرف لپکا۔

"ذرا خاکی رنگ کی اونی پتلون بھی لے دو، بیالیس انچ لمبی!" اس نے دروازے سے کہا۔

میں اس کی مطلوبہ پتلون لیکر آڑ میں بنے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف گیا تو وہ دروازہ کھولے میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پھرتی سے ایک رقعہ میرے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیا اور پتلون لے کر بلند آواز میں شکریہ کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

اس حیرتناک واقعے پر میرے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔ میں اس شخص کی نگاہوں میں چمکتا ہوا پیغام پڑھ چکا تھا۔ وہ جو بھی تھا یقیناً میرے بہی خواہوں میں سے تھا۔

چند منٹ بعد وہ ڈریسنگ روم سے برآمد ہوا اور داموں پر تھوڑے سے مول تول کرنے کے بعد اس نے چاروں مردانہ پتلونیں خرید لیں اور رسمی انداز میں مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے میرے کوٹ کی جیب میں دستی بم رکھ دیا ہو۔ طبیعت پر عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی اور جب بھی دوکان کے عملے کا کوئی شخص میری طرف متوجہ ہوتا مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ مجھے اشتباہ آمیز نظروں سے گھور رہا ہو۔

خدا خدا کر کے لنچ کے وقفے کا آغاز ہوا۔ اور دوکان کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میں معمول کے مطابق عقبی دروازے سے نکل کر قریبی ریستوران کی طرف چل دیا۔

ریستوران میں آہستہ آہستہ قرب و جوار کی دوکانوں اور دفاتر کے ملازمین آتے جا رہے تھے۔ میں ہال سے گزر کر پرسکون انداز میں باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ باتھ روم کا دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے روشندان کا جائزہ لیا۔ وہ کھلا ہوا ضرور تھا مگر وہاں سے میرا دیکھا جانا ناممکنات میں سے تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ رقعہ نکالا تو اس کو پڑھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اس کی تحریر نے میرے سینے سے منوں وزنی بوجھ ہٹا دیا۔

اس پر انگریزی میں تحریر تھا: "تم پر ناکام قاتلانہ حملہ اسرائیلی حکام نے کرایا تھا تاکہ ہمارے اور تمہارے درمیان خلیج بڑھ جائے۔ آج رات دو بجے کارلٹن کے کمرہ نمبر سات میں تمہارا انتظار کروں گا۔ نگرانی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" تحریر کے خاتمے پر کسی کا نام نہیں تھا۔ مگر میں وہ تحریر اندھیرے میں بھی پہچان سکتا تھا۔

میں نے لائٹر کے شعلے سے وہ پرزہ جلا کر اس کی راکھ فلش کے ذریعے کموڈ میں بہا دی اور باتھ روم سے باہر نکل آیا۔

لنچ ٹائم کے خاتمے پر میں دوکان میں پہنچا تو جی چاہا کہ دوکان کے یہودی مالک کو بتاؤں کہ وہ جس نظریات کی آڑ لے کر فلسطینیوں اور ان کے مقاصد کے خلاف زہر افشانی کر رہا تھا وہ اسی کے بیمار ذہن آقاؤں کے دماغ کی پیداوار تھی۔ مجھے اپنے دل میں بھی شرمندگی تھی کہ رسوائے زمانہ اسرائیلی پریس اور اپنے متعصب مالک کی باتوں میں آ کر میں بھی فلسطینی تحریک سے قدرے متنفر ہو گیا تھا۔

اسرائیل کی سرحدوں میں زیر زمین رہ کر کام کرنے والے حالات کے سامنے بے بس تھے وہ دشمن کے ملک میں سرگرم تھے اور اپنے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈے کی تردید نہیں کر سکتے تھے۔

ان لوگوں سے یوں غیر متوقع طور پر دوبارہ رابطہ قائم ہو جانے پر مجھے فخر آمیز مسرت ہو رہی تھی۔ سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ محمود تل ابیب میں موجود تھا۔ اور مجھ سے ملنے والا تھا مگر وسیع اختیارات اور بے شمار وسائل رکھنے والے اسرائیلی حکام بھی اس کا سراغ لگانے میں ناکام ہو چکے تھے۔

محمود کے پیغام کے مندرجات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے بہت حد تک میری مجبوریوں کا احساس ہے اور شاید وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا پیغام پہنچانے کی کوشش کرنے والا بوڑھا بیرا میرے ہاتھوں کس وجہ سے مارا گیا ہو گا۔

ڈیوٹی کے خاتمے کے بعد میں دس بجے کارلٹن پہنچا تو وہاں زندگی کی رعنائیاں اپنے شباب پر تھیں۔ ہال بھنے ہوئے گوشت کے پارچوں اور شراب کی تیز بو سے مہک رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی وہیں رک کر کسی خوش جمال اور شیریں دہن دوشیزہ کے ہمراہ کھانا کھا کر اپنی کامیابی کا جشن مناؤں مگر احتیاط کے سبب میں نے یہ پروگرام ترک کر دیا۔ اس رات میں دو بجنے سے قبل اپنے معمولات میں کوئی فرق نہیں لانا چاہتا تھا۔

نہا دھو کر میں نے حسب معمول اپنے کمرے ہی میں کھانا طلب کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

وقت کی رفتار بہت سست تھی اور میری بے چینی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں یکے بعد دیگرے سگریٹیں پھونکتا رہا اور اندھیرے میں خاموش لیٹا کسی بھی غیر معمولی آواز پر کان جمائے رہا۔ محمود نے اپنے پیغام میں مجھے بے خوف ہو کر نگرانی کی پرواہ کئے بغیر کمرہ نمبر سات میں پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ مگر میں اس مرحلے پر کوئی بھی احتیاطی تدبیر نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا جو اس ملاقات کی ناکامی کا سبب بن سکے۔

میرا کمرہ کارلٹن ہوٹل کی تیسری منزل پر واقع تھا جب کہ کمرہ نمبر سات پہلی منزل پر واقع تھا اور لفٹ کے ذریعہ وہاں تک پہنچنے میں مجھے کم از کم تین منٹ لگ سکتے تھے لہٰذا میں نے دو بجنے میں پانچ منٹ پر آہستگی سے اپنا بستر چھوڑ دیا اور کمبل کے نیچے دو تکیے اس طرح رکھ دیئے کہ بادی النظر میں بستر پر کسی شخص کی موجودگی کا گمان ہوتا تھا۔

میں کسی چور کی طرح دبے قدموں اپنے کمرے سے نکلا۔ باہر آنے سے [...] میں نے سر نکال کر راہداری میں جھانکا جو دور تک ویران پڑی ہوئی تھی۔

میں نے پھرتی سے دروازہ مقفل کیا اور لفٹ کی طرف جانے [...] اچانک اپنا ارادہ بدل دیا۔ اتنی رات گئے لفٹ کے حرکت میں آنے [...] ہوٹل کی چاروں منزلوں پر آواز پیدا ہوتی اور اگر کوئی لفٹ کے قریب موجود [...] ہوتا تو اتنی رات گئے لفٹ کے استعمال پر اس کا تجسس بیدار ہو سکتا تھا۔

میں زینوں کے ذریعہ پھرتی کے ساتھ نیچے اترتا چلا گیا۔ راستے میں میری کسی [...] سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور جب میں پنجوں کے بل چلتا ہوا پہلی منزل کے کمرہ نمبر سات [...] پر پہنچا تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، ہینڈل کو گردش دیتے ہی دروازے [...] اکلوتا پٹ وا ہو گیا اور میں نے اندر جا کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

اندر گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور فضا پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ [...] اندھیرے میں آ جانے کے باعث میری آنکھیں کچھ نہ دیکھ سکیں۔ میں نے کسی آواز [...] پر کان جمانے کی کوشش کی مگر میری دھڑکنوں کی تیز دھمک کے علاوہ وہاں [...] آواز اس طرح معدوم تھی جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔

میں چند ثانیوں تک ساکت و صامت اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر میں نے [...] منہ سے ہلکی سی آواز نکالی۔ اس آواز کے ساتھ ہی اچانک میرے چہرے پر [...] ٹارچ کی تیز روشنی چند ثانیوں کے لئے پڑی اور پھر وہی مہیب اندھیرا چھا گیا۔

"اندر چلے آؤ۔" تاریکی میں مجھے محمود کی شناسا سرگوشیانہ آواز سنائی دی اور اسے سن کر میرے تنے ہوئے اعصاب میں سکون کی لہر سرایت کر گئی۔

"روشنی تو کر دو۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

اندھیرے میں کوئی ہنسا اور پھر ہلکی روشنی والا سبز بلب [...] اٹھا۔ ساتھ ہی مجھے ایک اجنبی شخص نظر آیا جو ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر آرام سے دراز تھا۔ اس کے سر پر سرمئی سمور دار ٹوپی تھی گھنی بھنو [...] کے نیچے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سرخ و سفید چہرے پر ہلکی [...] فرنچ کٹ داڑھی موجود تھی۔

اس اجنبی کو دیکھ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

"ڈرو نہیں میں تمہارا دوست ہوں!" اس نے صوفے سے اٹھتے [...] کہا اور اس مرتبہ میں نے اس کے داہنے ہاتھ میں دبا ہوا پستول دیکھا جس پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔

"تمہارا حلیہ تو یکسر بدل کر رہ گیا ہے۔" قریب جا کر میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"حلیہ نہ بدلتا تو اب تک مارا گیا ہوتا۔" وہ دھیمے سے ہنس کر بولا۔

"یہ آتشیں کھلونا تمہارے ہاتھ میں کیوں ہے؟"

"میری آنکھیں اندھیرے میں بھی دھوکا نہیں کھاتیں۔ تمہاری [...] کوئی غلط آدمی اس کمرے میں قدم رکھتا تو ایک بے آواز گولی اس کے دل [...] سوراخ کر دیتی!"

دروازہ مقفل کر کے وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا اور شہادت کی انگلی [...]

[...] کر تھوکتے ہوئے بولا۔ "ہاں اب مجھے اس کا حلیہ بتاؤ۔ میں نے سنا تھا [...]ک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"[...] کامیابی میں میری کسی کوشش کا دخل نہیں تھا۔" میں نے ہنس کر [...] پھر کرنل ریٹا کے بارے میں ہر وہ بات اسے بتا دی جو میرے ذہن میں [...] تھی۔

وہ خاموشی سے پرخیال انداز میں میری بات سنتا رہا اور میرے خاموش [...] مضطربانہ انداز میں مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ "رب العزت کی قسم اب [...] زندہ نہ بچ سکے گی۔ مجھے تو دکھ ہے کہ میں پہلے اسے کیوں نہ پہچاننے میں [...] ہو سکا۔"

"تو کیا تم اسے جانتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"[...] لوگوں میں وہ مادام المیسی کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور جنگی [...] کے لئے ایک محتاج خانے کی منتظم و نگران ہے۔ وہ ہر روز وہاں کچھ [...] ہے مگر اسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے۔ وہ ہر وقت عرب عورتوں [...] پردے میں رہتی ہے۔ لوگ صرف اس کی آنکھیں دیکھ پاتے ہیں۔"

"[...] وہ یاد آیا۔" میں نے فوری خیال کے تحت کہا۔ "اس کے دفتر میں اسکی [...]یب ہی ایک تپائی پر اس کا لبادہ بھی پڑا ہوا تھا جو برقع نما تھا۔"

"[...] سماجی حلقوں میں وہ بہت رحمدل مشہور ہے مگر اب اس کی سفاکی [...] پوشیدہ نہ رہ سکے گی۔ جوزف اس کا آخری شکار تھا۔"

"جوزف کون؟"

"وہی بدنصیب بوڑھا جو تمہارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔" وہ کہتے کہتے [...] کے لئے خاموش ہو گیا پھر پوچھنے لگا۔ "شاید تم نے اپنے بچاؤ کے لئے [...] داؤ پر لگائی تھی؟"

"میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں محمود۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اس نے [...] کر اشاروں کے ذریعہ مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ پوشیدہ [...] اسے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے محض اس لئے اسے مار دیا کہ وہ یہودیوں کے بے [...] تشدد کے سامنے سب کچھ اگل دے گا۔ بعد کے واقعات نے میرے اندیشے [...] ثابت کر دیئے!"

"وہ مر گیا۔ خدا اس کی مغفرت کرے!" محمود بوجھل لہجے میں بولا۔ "[...] کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ عیسائی تھا اور محض پیسے کی خاطر ہمارے [...] کا کام کرتا تھا۔"

"میں شرمندہ ہوں محمود کہ اس کے بعد میں ان کا نشانہ بن گیا۔" میں نے [...] میں کہا۔ "اگر وہ مجھ کو ای ایچ پی کا نشانہ نہ بناتے تو شاید میں عمر بھر [...] ایک لفظ بھی نہ بتاتا۔"

"ای۔ ایچ۔ پی!" اس نے تحیر آمیز آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔ کیپٹن ماریا نے ہی بعد میں مجھے بتایا تھا!"

"اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے ہیں تو یہ ہمارے لئے بہت بھیانک [...] رہے۔ اس کے سامنے انسان کی قوتِ ارادی اور جسمانی مدافعت بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے!" وہ دل شکستہ انداز میں بولا۔ "اگر وہ بدترین ایجاد تم پر آزمائی گئی ہے تو تمہارا کوئی قصور نہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے!"

"ہاں۔ الشویخ سے کوئی خبر آئی؟"

"لیلیٰ بچھو کے کاٹنے سے مر گئی۔ اس کے جوتے میں بچھو موجود تھا جس نے پیر داخل ہوتے ہی اسے ڈس لیا۔ اب وہاں شیخ کی مکمل حکمرانی ہے۔ لیلیٰ کے مسلح جانثاروں کی لاشیں ابھی تک کھجور کے درختوں سے جھول رہی ہیں۔ نوازامی ایک لڑکے نے وہاں زبردست کام کیا ہے۔"

"لیلیٰ کے جوتے میں بچھو رکھنے کا منصوبہ اسی کا تھا۔" میں نے بتایا۔ "اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اس آبرو باختہ عورت کو اسی طرح کیفر کردار کو پہنچائے گا۔"

"بر کر میں میرے آدمیوں نے دھاوا بول کر یوسف مجذوب اور اسکے حامیوں کا صفایا کر دیا ہے، وہ وہاں بہت گند پھیلا رہا تھا۔ اس علاقے میں ہم نے ان کی بروقت سرکوبی کی ہے اور وہ مدتوں ادھر کا رخ نہیں کر سکیں گے۔!" بولتے ہوئے اچانک اسے کیپٹن ہنری کا خیال آ گیا۔ "ہنری کو مار کر تم نے ثواب کمایا ہے وہ بھی بہت بڑا موذی تھا۔ جب تم مقررہ وقت پر پبلک لائبریری کے ریفرنس ہال میں نہ پہنچے تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا مگر بعد کی خبریں بہت حوصلہ افزا نکلیں تم واقعی بہت بہادر شخص ہو۔"

"تمہیں شاید یہ جان کر حیرت ہو گی کہ ہنری تمہارے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ اسی لئے اس نے مجھ پر براہ راست ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس کی ہمراہی لڑکی نے کالے خون کا حوالہ دے کر مجھے ششدر کر دیا تھا مگر میں اسکی مکاری بھانپ گیا اور وہ میرے ہاتھ سے نہ بچ سکی۔"

"یہ معلومات اس تک کیسے پہنچیں؟" محمود نے حیرت سے کہا۔

"قاضی ہادی کو جانتے ہو؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"تت... تو کیا وہ اس کمینگی پر اتر آیا ہے؟"

"ہنری کی ساتھی لڑکی نے مرنے سے پہلے یہی بتایا تھا کہ قاضی ہادی کیپٹن ہنری کا انفارمر تھا اور وہ جارج حباش کے مسلم پاپولر فرنٹ کے لئے کام کرتا ہے!"

"قاضی ہادی!" محمود دانت بھینچ کر بولا پھر میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرے دوست تم بہت عظیم آدمی ہو، تم نے اس مختصر سے عرصے میں ہمیں آستین کے سانپوں سے ہوشیار کیا ہے۔ قاضی ہادی کے بارے میں مجھے عرصے سے شبہ تھا کہ وہ اسرائیل میں ہمارے مقاصد کو سبوتاژ کر رہا ہے اور اب تم نے اس کی تائید کر دی ہے۔ وہ حرامزادہ پیشہ ور انفارمر ہے اور ہمارے ایک گروپ نے مستقل بھاری معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کی ہوئی ہیں مگر اب پتہ چلا کہ وہ انہیں ڈبل کراس کر رہا ہے اور ان کے ساتھ ہی وہ ہنری کے لئے بھی کام کر رہا تھا اس کے تقریباً ہر فلسطینی سے گہرے مراسم ہیں اور وہ ہمیں بڑی سے بڑی زک پہنچا سکتا ہے۔"

"تو شاید اسے راہ سے ہٹانا پڑے گا۔"

"اسے مارنا بھی اتنا آسان نہیں، وہ بہت مکار اور چالاک آدمی ہے!"

"میں اپنی موجودہ زندگی سے اکتا گیا ہوں محمود، اب میں پھر لوٹ کر پہلی زندگی

میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔" میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"تم اس طرح ان کی نظروں میں آگئے ہو کہ اسرائیل میں رہ کر کھلے عام کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ فی الحال تمہیں حالات سے سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ ان لوگوں کو یہ بات بھی کھل گئی ہے کہ وہ ہمارے اور تمہارے درمیان ممازآرائی کی صورتحال پیدا نہ کر سکے۔ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہونے کی وجہ سے وہ تمہاری طرف سے آجکل بہت زیادہ بھنّائے ہوئے ہوں گے۔"

"تم بھی تو ان کی نظروں میں آچکے ہو۔"!

"میری بات اور ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "انہوں نے تمہاری زبان سے میرا حلیہ سنا ہے۔ مجھے دیکھا نہیں، نہ میری تصویریں ان کے پاس ہیں، نہ فنگر پرنٹ۔ تمہارے بارے میں تو انہوں نے اب تک ایک ضخیم فائل تیار کر لی ہوگی"۔

"تو پھر میں اسرائیل سے نکل جانے کو ترجیح دوں گا۔"

"یہ حالات پر منحصر ہے، تھوڑا سا صبر کرو، جیسے ہی موقع ملا میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ بیکار بیٹھنا تمہارے لئے مشکل ہے۔"

"تم سے ملاقات کی کیا صورت ہوگی؟"

"اسے مجھ پر ہی چھوڑ دو، نہ جانے وہ کب دوبارہ تمہیں ای۔ ایچ۔ بی کا نشانہ بنا ڈالیں۔" وہ خوش دلی کے ساتھ میرے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے!" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہا۔

"وہ کیا؟"

"کیوں نہ میں قاضی ہادی سے نمٹ لوں؟"

"وہ لوگ تمہیں اس کا موقع کہاں دیں گے؟"

"یہ بات میں پہلے ہی طے کر چکا ہوں۔ ماریانے کہہ دیا تھا کہ اگر تم لوگوں کی جانب سے کوئی ہدایت ملے تو مجھے اس پر عمل کرنا چاہیے۔"!

"اس لئے کہ وہ مسلسل تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔"

"اس وقت میرا نگراں کہاں ہے؟"

"تمہارے فلور کے ہی ایک کمرے میں بے ہوش پڑا ہوگا۔ شروع میں تین راتیں اس نے جاگ کر گزاری تھیں مگر تمہارے معمول سے واقف ہونے کے بعد اس نے ایک لڑکی سے دوستی گانٹھ لی۔ وہ بارہ بجے ہوٹل بند ہونے کے بعد اسی کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور آج دوپہر کو نقب زنی کر کے سرنج کے ذریعے اس کمرے میں موجود شراب کی دو بوتلوں میں خواب آور دوا ملا دی گئی تھی۔"

"پھر قاضی ہادی کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

"جیسی تمہاری مرضی۔" وہ لاپروایانہ انداز میں بولا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ وہ لومڑی کی طرح چالاک ہے۔ آسانی سے قابو میں نہ آئے گا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ایسے شکار میں مجھے مزہ آتا ہے۔"

"اور یہ حکم تمہیں کون دے گا؟"

"کون سا حکم؟" میں اس کا سوال نہ سمجھ سکا۔

"قاضی ہادی کے سلسلے میں تم ماریا کو کیا بتاؤ گے؟"

"اوہ۔" میں طویل سانس لے کر بولا۔ "اس بارے میں تمہارا کوئی بھی کارندہ مجھے کالے خون کے حوالے سے فون پر ہدایات دے سکتا ہے۔"

"ہاں یہ درست ہے!"

اس کے بعد میں مزید کچھ دیر وہاں بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا پھر بارہ بجے کے قریب میں نے وہ کمرہ چھوڑ دیا۔ باہر راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ میں دبے قدموں سیڑھیاں عبور کر کے تیسری منزل پر اپنے کمرے میں جا پہنچا اور ۔۔۔ ہٹا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

کافی دیر تک میں محمود کے ساتھ اپنی اس ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر کار میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح میں قدرے تاخیر سے دکان پر پہنچا وہاں پتہ چلا کہ دکان کھلتے ہی کسی نامعلوم شخص نے فون پر مجھے دریافت کیا تھا اور میری عدم موجودگی کی اطلاع پا کر اپنا نام بتائے بغیر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

نصف گھنٹے بعد پھر کال آئی، مالکِ دوکان نے فوراً مجھے بلالیا۔

"صفدر؟" دوسری طرف سے کسی نے غرّا کر سوال کیا۔

"بول رہا ہوں!"

"میں کالے خون کا ہرکارہ بول رہا ہوں۔ تمہیں اس شہر میں قاضی ہادی نامی ایک شخص کا کھوج نکال کر اس کا قصہ پاک کرنا ہے۔"

"مم۔۔۔ مگر" میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن فون کرنے والا بہت ہوشیار تھا۔ اس نے فوری طور پر سلسلہ منقطع کر دیا اور میں نے ایک گہری سانس لے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"کوئی دوست ہے" مالکِ دوکان نے آنکھ مار کر سوال کیا۔

"ہاں۔ دوست ہی سمجھو" میں نے خوبصورتی سے اس کا سوال ٹال دیا۔

اس روز میں سارے دن فکر میں کھویا رہا۔ محمود سے ہونے والی ملاقات نے میرا حوصلہ بہت بلند کر دیا تھا اور مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ اسرائیلیوں کے سامنے میں بھی ممتاز حیثیت کا مالک ہوں اور یہ تاثر مجھے بار بار کوئی بڑا کام کر گزرنے پر اکسا رہا تھا۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ کسی کی مدد کے بغیر اسرائیل کی سرحد عبور کرنا میرے لیے ناممکنات میں سے ہے مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں زیادہ عرصے تک یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہ رہ سکوں گا۔

رات کو دوکان بند کرانے کے بعد میں ہوٹل کے بجائے شہر کے قدیم حصے کی طرف ہو لیا۔ اس مقصد کے لیے میں نے قدرے طویل ویران راستہ اختیار کیا تاکہ کم از کم اپنا تعاقب کرنے والے سے واقفیت حاصل کر سکوں۔ اس وقت میری حالت کسی ایسے وحشی سانڈ سے مشابہ تھی جیسے اس کی ضرورت سے زیادہ خوراک مل گئی ہو اور وہ اپنا زور آزمانے کے لیے ہر طرف اکڑتا پھر رہا ہو۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے اپنے پیچھے اس کی موجودگی کا اندازہ ہو گیا ۔۔۔ اس کا جائزہ لینے میں کامیاب نہ ہو سکا، وہ بہت محتاط انداز ۔۔۔ تعاقب کر رہا تھا۔

آخر کار میں تنگ و تاریک گلیوں پر مشتمل ایک محلے میں داخل ۔۔۔ اس پُرپیچ علاقے میں میرا تعاقب جاری رکھنے کے لیے اسے ۔۔۔ م کرنا پڑ گیا اور میں اسے تھکانے کے لیے بے مقصد ایک سے ۔۔۔ گلی میں جاتا رہا۔

ایک بار جوں ہی ایک تاریک حصے میں موڑ پر مجھے ایک بوسیدہ ۔۔۔ زینہ نظر آیا۔ میں پھرتی سے اس میں داخل ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد ۔۔۔ کے قدموں کی آواز سنائی دی جو موڑ پر معدوم ہو گئی۔ وہ غالباً یہی ۔۔۔ ہو گا کہ میں اس موڑ سے گھوم گیا ہوں۔

سیڑھیاں ویران پڑی تھیں اور عمارت کے اوپری حصے سے ۔۔۔ حرکت کی کوئی خاص آواز نہیں سنائی دے رہی تھی لہٰذا میں ۔۔۔ ان سے چوبی زینوں کی اوٹ میں چھپا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے ۔۔۔ دھوکہ دینے کا احساس ہوتے ہی وہ بوکھلا کر واپس آئے گا۔

اور ہوا بھی یہی۔ چند منٹ بعد وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ۔۔۔ آیا اور ان زینوں کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ اس بار میں نے ۔۔۔ تفصیلی جائزہ لے لیا۔ وہ دراز قامت اور پھرتیلا نوجوان تھا۔

اس کے جاتے ہی میں سیڑھیوں کی اوٹ سے نکلا اور موڑ ۔۔۔ پنجوں کے بل تقریباً دوڑتا ہوا اگلے موڑ تک پہنچا اور پھر معمول ۔۔۔ مطابق چلنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد میں الفنطیس نامی علاقے میں مروان نامی ایک ۔۔۔ کے قہوہ خانے پر جا پہنچا۔ محمود مجھے بتا چکا تھا کہ مروان کٹر قسم کا ۔۔۔ آدمی ہے اور اپنے قہوہ خانے میں سیاسی گفتگو کرنے والوں ۔۔۔ فوراً باہر نکلوا دیتا ہے مگر اس کے باوجود فلسطینیوں کی خاصی ۔۔۔ وہاں نظر آتی تھی اور ان ہی میں گھل مل کر قاضی ہادی تک رسائی ۔۔۔ صورت نکالی جا سکتی تھی۔

قہوہ خانے میں خوش گپیوں کے دور چل رہے تھے۔ میزوں ۔۔۔ پر بیٹھی ہوئی ٹولیاں شطرنج وغیرہ کھیلنے میں مصروف تھیں۔ ہر ۔۔۔ کے ساتھ کئی فٹ بلند حقہ بڑی سی چلم کے ساتھ موجود تھا۔ ہر حقے ۔۔۔ کے ساتھ تین نیچے لگے ہوئے تھے جو مسلسل استعمال کیے ۔۔۔ رہے تھے۔

میں قہوہ خانے میں داخل ہو کر ایک ایسی میز پر جا بیٹھا جہاں ۔۔۔ نوجوان تنہا بیٹھا کچھ حساب کرنے میں مصروف تھا۔ میرے بیٹھنے ۔۔۔ نے میز پر سے کاغذ سمیٹتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔

"میں تمہاری تنہائی میں مخل تو نہیں ہوا؟" میں نے مسکرا کر ۔۔۔ میں پوچھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "اس میز پر تم میرے مہمان ہو۔ بتاؤ کیا پینا پسند کرو گے؟ چائے، قہوہ یا کافی؟"

"قہوہ!"

میری آمد کے بعد وہ اپنا سارا حساب کتاب بھول گیا اور مجھ سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کا نام ابراہام ڈیوڈ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں جب تکلف کی دیوار گر گئی تو اس نے اپنی تنہائی کا سبب بھی بتا ڈالا۔

وہ کویت کی وزارت اطلاعات میں ملازم تھا اور اپنی چند عادتوں کی وجہ سے ہمیشہ مالی دشواریوں سے دوچار رہتا تھا۔ کویت میں شراب بندی کی وجہ سے پینے والوں کو بہت مہنگے داموں چور بازار سے شراب حاصل کرنی پڑتی تھی جبکہ ابراہام بلا نوش تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس قدر مقروض ہو گیا کہ اسے اپنے کسی شناسا سے مدد کی امید نہ رہی، ساتھ ہی واجب الادا قرضوں کی ادائیگی بھی محال نظر آنے لگی۔

قرض خواہوں کے پے درپے تقاضوں سے تنگ آ کر ایک روز وہ خاموشی کے ساتھ اپنا بستر بوریہ سمیٹ کر کویت سے عراق اور اردن کے راستے اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں فرار ہو گیا۔ اسرائیل اور دیگر ممالک کے کشیدہ تعلقات کی وجہ سے وہاں وہ اپنے قرض خواہوں کے تقاضوں اور ان کی قانونی کارروائیوں سے پوری طرح محفوظ تھا۔

مگر کسی نہ کسی طرح یہ خبر مقبوضہ علاقوں میں آباد لوگوں تک بھی پہنچ گئی کہ وہ لوگوں کا پیسہ لے کر بھاگا ہے۔ اس کے قرض خواہوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن کے رشتے دار مقبوضہ علاقوں میں موجود تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہام کا سماجی مقاطعہ کر دیا گیا۔ پھر جب وہ بیت المقدس سے کسی نہ کسی طرح تل ابیب پہنچا تو وہ خبریں اس کا تعاقب کرتی وہاں تک پہنچ گئیں اور وہ یہاں بھی بائیکاٹ کا شکار ہو گیا۔

"میں نے سنا ہے کہ بہت سے لوگ جرائم کے ارتکاب کے بعد اسی طرح اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں آ کر پناہ لے لیتے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ تم تو خیر مجبوری کے تحت آئے ہو۔" میں نے گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے ایک خاص پہلو اختیار کیا۔

"بہت سے لوگ تو نہیں، ہاں اکا دکا جرائم پیشہ ہر علاقے میں ہوتے ہیں اور اس قسم کے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر میں شاید بہت ہی بدقسمت واقع ہوا ہوں۔" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ قاضی ہادی نامی ایک شخص عمان میں کئی قتل کرنے کے بعد اسرائیل آ گیا تھا اور یہاں وہ بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"شش۔" اس نے اچانک مجھے خاموش کر دیا۔ "اس قہوہ خانے میں اس کا نام نہ لو۔ مروان جیسا صلح پسند آدمی بھی اس کی یہاں آمد پسند نہیں کرتا۔"

"تو کیا یہاں بھی وہ ایسے ہی دھندوں میں ملوث ہے؟" میں

نے حیرت سے سوال کیا۔

"کسی نے تمہیں غلط معلومات فراہم کی ہیں"۔ وہ فہوے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔" وہ تو شروع ہی سے یہیں رہتا آ رہا ہے مگر خود کو زبردستی فلسطینی مشہور کیا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی بے پناہ آمدنی کے کیا ذرائع ہیں"۔

"پھر تو وہ اسرائیلی پولیس کی نظروں میں بھی ہوگا"

"ختم کرو اس منحوس کے قصوں کو۔ اس سے زیادہ بے ضمیر شخص میں نے شاید ہی دیکھا ہو"۔

مجھے وہ کام کا آدمی نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے موڈ کا لحاظ کرتے ہوئے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ اس دوران میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ تل ابیب میں رہ کر بھی معاشی ناآسودگی کا شکار ہے لہذا میں نے اسے اپنے ساتھ شراب نوشی کی پیشکش کی جو اس نے فوراً قبول کر لی۔

ریوال بار میرے مقصد کے لیے خاصا مناسب ثابت ہوا۔ وہاں میزیں مناسب فاصلے پر تھیں اور بدھ کا دن ہونے کی وجہ سے وہاں گاہکوں کا بھی رش نہیں تھا۔

ہم نے وہاں بیٹھ کر تین پیگ پیے جس کے بعد ابراہام آہستہ آہستہ سرور میں آنے لگا۔ اس کے حواس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ البتہ ہمارے درمیان تکلف کی رہی سہی دیوار بھی غائب ہو گئی تھی۔

"باہر پارک میں چل کر بیٹھیں گے"۔ اس نے تیسرا پیگ خالی کرنے کے بعد میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا اور میں نے فوراً ہی رضامندی ظاہر کر دی۔

شراب کی بوتلیں لے کر ہم پارک کی کھلی فضا میں ایک پُرعافیت گوشے میں پہنچ گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں شراب نے اس کے اعصاب پر پوری طرح اپنا رنگ جما لیا اور میں نے موقع پا کر اس کے خیالات کا رُخ ایک بار پھر قاضی ہادی کی طرف موڑ دیا۔

یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ ابراہام کو قاضی ہادی کے بارے میں خاصی معلومات حاصل تھیں اور جلد ہی اس نے یہ بھی اُگل دیا کہ وہ کبھی کبھار قاضی ہادی کے لیے کچھ بے ضرر کام بھی کرتا رہتا ہے جن میں ایک شخص سے کچھ معلومات یا مواد حاصل کر کے اسے دوسرے تک پہنچانا پڑتا ہے اور قاضی ہادی ایسے کاموں کے لیے اسے معقول معاوضہ ادا کرتا رہا ہے۔

اس کے بیان کے مطابق قاضی ہادی کے کئی ٹھکانے تھے مگر یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ رات کہاں بسر کرے گا۔ شہر میں اس کی کئی داشتائیں بھی تھیں مگر وہ بھی اس کی نقل و حرکت سے زیادہ تر لاعلم ہی رہتی تھیں البتہ ہفتے اور اتوار کی درمیانی رات وہ ہلٹن ہوٹل میں خوش فعلیاں کرتے ہوئے گزارتا تھا اور وہ اس سے ملاقات کا واحد یقینی وقت اور موقع ہوتا تھا۔

اس کے بعد میرا وہاں رکنا بے سود تھا۔ میں نے اپنی بقیہ شراب بھی اس کے حوالے کی اور اسے گھاس پر دراز چھوڑ کر میں ایک اہم کام کا بہانہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

محمود جیسے بارسوخ اور جرأت مند آدمی نے قاضی ہادی کے بارے میں ایسی حوصلہ شکن گفتگو کی تھی کہ میرے دل میں اس سے ملنے جانے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ محمود کی باتوں سے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے قاضی ہادی ہر وقت بکتر بند اور مسلح محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے جنہیں دھوکا دینا ناممکنات میں سے ہے۔

میرے اگلے چند روز سخت الجھن اور بے چینی کے عالم میں گزرے۔ اس دوران میں نہ مجھے محمود کی جانب سے کوئی ہدایت ملی نہ ہی ماریا یا اس کے عملے سے میرا کوئی رابطہ قائم ہوا۔

اس دوران میں میں نے پابندی سے مقامی اخبارات کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہر روز میری نگاہیں کرنل ریٹا یا اس کے اپاہج خانے کے بارے میں کوئی بڑی چیز تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتی تھیں۔ ہر محاذ پر ایسا بھرپور سناٹا چھایا ہوا تھا کہ بعض اوقات مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ میرے ساتھ جلد ہی کوئی بڑا معرکہ پیش آنے والا ہے۔

اسی تجسس اور سنسنی کے عالم میں آخر کار ہفتہ اور اتوار کی وہ درمیانی رات آ گئی جو میرے لیے یادگار ثابت ہونے والی تھی۔

اس روز دوکان دوپہر ہی میں بند ہو جاتی تھی۔ شام کو میں نے نہا دھو کر مناسب لباس پہنا اور پھر ہلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے ہلٹن پہنچنے کے لیے ایک طویل راستے کا انتخاب کیا تاکہ مجھے وہاں زیادہ وقت انتظار کی کوفت میں نہ گزارنا پڑے۔ یوں یہ فاضل وقت اپنے کمرے میں آرام کر کے بھی گزار سکتا تھا لیکن میں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ ہلٹن جیسے ہوٹل میں تنہا جانا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ خوش مزاج اور رومان زدہ جوڑوں کی بھیڑ میں بلاوجہ لوگوں کی توجہ کا نشانہ بن سکتا تھا لہذا میں نے طے کر لیا کہ راستے ہی سے کسی خوبرو لڑکی کو ساتھ لے لوں گا جو اس رات کو حسین بنانے کے لیے کسی ساتھی کی تلاش میں بھٹک رہی ہو گی۔

شام کے وقت تل ابیب کے بارونق بازاروں میں اس قماش کی لڑکیوں کی خاصی تعداد موجود رہتی تھی اور عام طور پر وہ خود ہی ضرورت مندوں سے ٹکراتی تھیں۔ ضرورت مندوں کے انتخاب میں ان کا تجربہ ان کا ساتھی تھا۔ ایسی کسی لڑکی کی معیت میں میں بے فکر ہو کر قاضی ہادی کے انتظار

میں پوری رات ہلٹن میں گزار سکتا تھا اور کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ ہو پاتا۔

میں نے چہل قدمی کے انداز میں کافی فاصلہ طے کر ڈالا مگر مجھ سے نہ کسی لڑکی کا سامنا ہوا نہ ہی کسی دلال نے مجھ پر قسمت آزمائی ضروری سمجھی میں نے اپنے انداز میں رنگینی کا عنصر خاصا نمایاں کیا ہوا تھا اور قریب سے گزرنے والی ہر لڑکی کو گرسنہ نگاہوں سے گھور رہا تھا مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یک بیک تل ابیب میں آباد تمام خوبرو لڑکیاں گناہ آلود زندگی سے تائب ہو گئی ہوں۔

آخر کار میں ہلٹن ہوٹل بھی جا پہنچا۔ کوئی ساتھی نہ ملنے کے باعث ذہن پر الجھن سی سوار ہو رہی تھی۔ منصوبہ کی ابتدا میں یہ ناکامی مجھے بُری طرح کھل رہی تھی۔

اب میرے پاس آخری چارہ یہی تھا کہ میں بال روم میں آخری کوشش کروں۔ وہاں سازندے والز کی دھن بجا رہے تھے اور چکنے چوبی فلور پر دائرے کی صورت میں متعدد جواں سال جوڑے رقص میں مصروف تھے۔ فلور کے گرد پڑی ہوئی بیشتر میزوں پر جوڑے موجود تھے۔

میں وہاں داخل ہو کر چند ثانیوں تک اسی طرح چاروں طرف نظریں دوڑاتا رہا جیسے مجھے کسی شناسا کی تلاش ہو۔ اسی دوران میں کسی جانب سے ایک سیمیں بدن خوبرو دوشیزہ تیر کی طرح میری طرف آئی اور بے تکلفی سے شام بخیر کہہ کر وہیں رک گئی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے آنکھ مار کر دلربایانہ انداز میں مسکرا دی "مجھے فلورا کہتے ہیں۔ میں بھی آج تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔"

"پیارا نام ہے تمہارا۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک خالی میز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "تم تنہائی کے ستائے ہوئے مردوں کو پہچاننے میں ملکہ رکھتی ہو۔"

"یہ میرا پیشہ نہیں ہے۔" وہ جلدی سے مگر سرگوشیانہ لہجے میں بولی "میں ایک اچھے ادارے میں سیکرٹری کے طور پر کام کرتی ہوں۔"

"جز وقتی مشغلے کے طور پر یہ کام بھی اچھا ہے ثواب بھی ملے گا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"کیا پینا پسند کرو گی؟" میں نے ایک میز سنبھالنے کے بعد اس سے دریافت کیا۔

"تم نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔" اس نے شکایتی انداز میں کہا "یہ طریقہ شائستگی کے منافی معلوم ہوتا ہے۔"

"اوہ ــــ مجھے افسوس ہے مس فلورا۔"

"مس نہیں مسز فلورا اسمتھ۔" اس نے میرا جملہ اچک کر تصحیح کی۔ "میرا شوہر اسرائیلی فوج میں ملازم ہے اور ان دنوں کسی سرحدی مقام پر متعین ہے۔"

"خوب۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "مجھے صفدر علی کہتے ہیں اور میں سیاحت کی غرض سے اسرائیل آیا ہوں۔ تم جیسی خواتین کی بدولت اس سرزمین میں سیاحوں کے لیے بڑی کشش ہے۔"

"تم طنز تو نہیں کر رہے مجھ پر؟" وہ بہت جلد بے تکلف ہو جانے کی عادی معلوم ہوتی تھی

"ارے لعنت ہو اس پر جو تم جیسی نعمت پر طنز کرے۔" میں نے جلدی سے کہا "میں تو حقیقت بیان کر رہا تھا۔ تم واقعی بہت نرم دل اور مہربان معلوم ہوتی ہو۔"

"نرم دل اور مہربان ہونے کے ساتھ ہی میں کسی حد تک صاف گو بھی واقع ہوئی ہوں۔" وہ ایک ادا کے ساتھ مسکرا کر بولی۔

"یہ تو سونے پر سہاگہ ہے!"

"یہ رائے بعد میں دیتے تو مناسب ہوتا۔" وہ میز کے نیچے قدرے آگے کھسکتے ہوئے بولی "میں اپنا بل خود ادا نہ کر سکوں گی۔"

"اس کا اظہار کر کے تم نے مجھے بے حد صدمہ پہنچایا ہے فلورا۔" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا "تم یہ بات نہ بھی بتاتیں تو میں تمہاری میزبانی کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا۔"

"میں اس احتیاط کو ضروری سمجھتی ہوں۔ ایک بار اسی طرح ایک خوش وضع قلاش مجھے مل گیا تھا۔ اس نے یہ سمجھ کر میری دعوت قبول کی کہ میں شاید کوئی دل پھینک رئیس زادی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنا میزبان سمجھ کر خوب پیتے رہے۔ جب بل آیا تو دونوں مل کر بھی اسے ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔"

"بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی ہو گی اس موقع پر؟"

"اس ہوٹل کا منیجر شریف آدمی تھا۔ مجھے صرف دو گھنٹے اس کے ساتھ بسر کرنے پڑے اور سارا معاملہ نمٹ گیا۔"

"میرے ساتھ تمہیں ایسا کوئی تلخ تجربہ نہیں ہو گا۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تمہارا شوہر فوج میں کس عہدے پر ملازم ہے؟" میں نے محض گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کی نیت سے اس سے سوال کیا۔

"وہ میجر ہے۔" فلورا تلخ لہجے میں بولی "اول درجے کا دل پھینک اور جواری واقع ہوا ہے۔"

"حیرت ہے کہ تمہارا حسن بھی اسے قابو میں نہ رکھ سکا۔"

"ساری مصیبت اسی وجہ سے آئی۔ وہ میری محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مگر مجھے حاصل کر لینے کے بعد اس کا رویہ بدل گیا۔ اس کے دوستوں سے مجھے پتہ چلا ہے کہ ان دنوں وہ اپنے یونٹ کی ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے جو سارجنٹ کے طور پر کام کرتی ہے۔"

"یہ کوئی مناسب جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔"

"بالکل بے تکا جوڑ ہے۔ اسمتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ستھرے ذوق کا

ہے جب کہ وہ لڑکی صرف مڈل پاس ہے اور اس کا باپ ایک گوالا ہے۔"

"جب تم یہ سب جانتی ہو تو اس سے علیحدگی کیوں اختیار نہیں کر لیتیں؟"

"طلاق لے کر میں اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکوں گی۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولی "میجر اسمتھ کی بیوی کے طور پر مجھے معاشرے میں کچھ بہتر مقام حاصل ہے اس لیے میں نے کبھی اس بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کی ویسے عملاً ہم دونوں میں کافی عرصے سے ترکِ تعلق کی سی کیفیت موجود ہے۔"

"شاید معاشی طور پر وہ تمہاری کچھ کفالت کرتا ہو گا؟"

"وہ اپنی ہی کفالت کرے تو کافی ہو گا۔" وہ زہر خند کے ساتھ بولی "جوئے کے سلسلے میں ہمیشہ اپنے دوستوں کا مقروض رہتا ہے۔ اپنی بنیادی ضروریات کے لیے میں نے ملازمت کی ہوئی ہے اور تفریحی مشاغل کے لیے بھی کبھار تم جیسے فراخ دل ساتھی مل جاتے ہیں۔"

"اس قسم کے ہوٹلوں کا شوق خاصا مہنگا پڑتا ہو گا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اپنا معاملہ بیکار کر رہے ہو۔" وہ ہنس کر بولی "تم فکر نہ کرو، میں جب تفریح کے موڈ میں ہوتی ہوں تو فراخ دلی سے کام لیتی ہوں۔"

دوسرے راؤنڈ کے لیے موسیقی شروع ہوئی تو میں فلورا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈانسنگ فلور پر آ گیا اور وہ میرے بدن سے چپک کر نپے تلے اسٹیپ لینے لگی۔

دھیمے سُروں پر رقص میں اس کی مہارت قابلِ رشک تھی۔ اس کا ہر قدم موسیقی کے آہنگ کا ساتھ دے رہا تھا اور مجھے اس سلسلہ میں کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ تیز دھنوں پر اچھل کود میں مجھے کبھی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ مگر خوابناک ہلکورے والے رقص مجھے پریشان کر دیتے تھے۔ اس کے باوجود فلورا نے مجھے ہر موقع پر سہارا دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے میرے قریب رہنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کیا۔

نو بجے تک میں وہیں موجود رہا۔ اس دوران میں مجھے وہاں کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جس پر میں قاضی ہادی ہونے کا شبہ کر سکتا۔ آخر میں بل قابل ادا کر کے ڈائننگ ہال کی طرف ہو لیا۔

ڈائننگ ہال کی طرف جاتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک نئی تدبیر نے جنم لیا جس کے سہارے میں قاضی ہادی کو دور سے دیکھ سکتا تھا میں نے فلورا کو استقبالیہ کاؤنٹر کے نزدیک چھوڑا اور خود تیزی سے کاؤنٹر کے سامنے بنے ہوئے ٹیلی فون بوتھ میں گھس گیا۔

ڈائرکٹری سے ہلٹن کے استقبالیہ کاؤنٹر کا نمبر تلاش کر کے میں نے فون میں مطلوبہ مالیت کے سکے ڈالے اور نمبر ڈائل کیا۔ شیشے کے دروازے سے میری نگاہیں کاؤنٹر پر جمی ہوئی تھیں۔

سرخ بالوں والی لڑکی نے تیسری گھنٹی بجنے پر فون اٹھایا اور مجھے اپنے کانوں میں اس کے نرم، لذیذ رسمی فقرے سنائی دیئے۔

"قاضی ہادی موجود ہیں؟" میں نے ماؤتھ پیس میں سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ کون صاحب ہیں؟" لڑکی کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میک آرتھر۔" میں نے جواب دیا۔

"معاف کیجئے جناب یہ انکوائری کا نمبر ہے۔ اگر آپ دوسرے نمبر پر رنگ کریں تو ــــ آپریٹر ان سے سلسلہ ملا دے گی۔ وہ اس وقت بلیرڈ ہال میں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ مجھے کب اور کہاں فون کرنا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر ہاتھ سے کریڈل دبا کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریسیور بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ چند ثانیوں تک استقبالیہ کاؤنٹر والی ریسیور تھامے رہی پھر اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور رومال سے اپنی پیشانی صاف کرنے لگی۔

میں مزید کچھ دیر بوتھ میں ریسیور لیے بلا وجہ مصروفیت کا اظہار کرتا رہا اور پھر باہر آ گیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن یک بیک تیز ہو چکی تھی میرا شکار میرے ساتھ اسی چھت کے نیچے موجود تھا۔ اب مجھے دیکھنا تھا کہ آخر وہ کس قسم کے حفاظتی حصار میں رہتا ہے جو محمود جیسا باعمل اور ہوشیار شخص بھی اسے ایک مشکل نشانہ قرار دینے پر مجبور تھا۔

"تمہیں بلیرڈ وغیرہ سے دلچسپی ہے؟" ڈائننگ ہال کی طرف جاتے ہوئے میں نے فلورا سے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے ہر اس کھیل سے چڑ ہے جو اسمتھ کو پسند ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی "تم لوگوں میں میاں بیوی کے رشتے کو میں ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کہا "پتہ نہیں اتنے قریبی تعلق کے باوجود تم لوگ ایک دوسرے کے بارے میں اس قدر سرد مہری کا رویہ کس طرح اختیار کر لیتے ہو"

"شاید تم کسی ایشیائی ملک کے باشندے ہو؟"

"اسرائیل بھی غالباً کسی دوسرے براعظم میں نہیں ہے۔"

وہ ہنس پڑی "اسرائیل کی بات نہ کرو۔ یہاں تو تم ہر براعظم اور ہر ملک کے لوگوں سے مل سکتے ہو۔ میرا مطلب تھا کہ تم جنوب مشرقی ایشیا کے کسی ملک کے باشندے معلوم ہوتے ہو۔"

"اگر ایسا ہو تو کیا اس سے سوال کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے؟"

"یقیناً۔" وہ پرزور لہجے میں بولی "تمہارے علاقوں میں شادی کے بعد مرد عورت کو اپنی ملکیت تصور کرتا ہے۔ اور اس کے بارے میں اسی قدر حساس بھی ہوتا ہے اور عورتوں نے بھی روایتی انداز میں مرد کی بالادستی کو تسلیم کیا ہوا ہے جبکہ ہمارے یہاں شادی محض ایک رسمی بندھن کی علامت ہے۔ یوں سمجھو کہ ہمارے یہاں میاں بیوی کی حیثیت محض دوستوں جیسی ہوتی ہے جن کی مشترکہ ذمہ داری اولاد کی پیدائش سے شروع ہوتی ہے اور اولاد کے بالغ ہونے پر ختم ہو جاتی ہے۔ باقی تمام شعبوں میں اپنی انفرادی خوشیوں کے وہ خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔"

"خواہ وہ جنس ہی کیوں نہ ہو؟"

"جنسی آسودگی تو تمام خوشیوں کی کلید ہے۔ آخر اس کے لیے کوئی ایک فریق اپنی آزادی سے کیوں دستبردار ہو جائے۔"

"پھر انسانوں اور جانوروں میں کیا فرق ہے؟"

"سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ وہ شادی کی کسی دستاویز پر دستخط نہیں کرتے۔" وہ قہقہہ مار کر بولی۔ پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی "سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اولاد کے معاملے میں بھی جانوروں میں اجتماعی ذمہ داری کا رواج نہیں پایا جاتا۔"

ڈائننگ ہال میں پہنچ کر میں نے اپنے پرس سے ایک معقول رقم نکال کر فلورا کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے نوٹوں کو ہاتھ لگائے بغیر حیرت سے کہا۔

"یہ رکھ لو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ اگر ایک گھنٹے تک میری واپسی نہ ہو تو تم بآسانی بل ادا کر کے گھر جا سکو گی۔"

"مگر میں صبح سے پہلے گھر جانا نہیں چاہتی۔"

"میں کوشش کروں گا کہ جلد واپس آ جاؤں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "دیر بھی ہو جائے تو فکر نہ کرنا میں تم کو یہیں ملوں گی۔"

میں وہاں سے اٹھا اور ٹوائلٹ رومز کی طرف چل دیا۔ اس وقت میرے پاس تیز دھار اور لمبے پھل والا ایک شکاری چاقو موجود تھا جس کا پھل ایک بٹن دبانے ہی اسپرنگ کے زور سے کھل جاتا تھا۔ تل ابیب میں رہتے ہوئے میرے لیے آتشیں اسلحہ حاصل کرنا ناممکنات میں سے تھا وہاں اسلحہ کی فروخت پر سخت اور موثر کنٹرول تھا لہٰذا میں نے اپنی مدافعت کے لیے اس چاقو پر ہی انحصار کر لیا تھا۔

چاقو اپنی پتلون کی جیب میں مناسب زاویے سے رکھ کر میں ٹوائلٹ سے باہر آ گیا اب وہ پل بھر میں میرے کام آ سکتا تھا جبکہ قریب سے دیکھنے پر بھی کسی کو اس کی موجودگی کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

بلیئرڈ ہال میں اس وقت رونق اور رعنائی اپنے شباب پر تھی۔ کھیلنے والوں کے علاوہ وہاں تماشائی جوڑوں کی بھی خاصی تعداد موجود تھی ہال کی فضا شراب، بیئر اور سگریٹ کے دھوئیں کی تیز بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔

وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک اسکور بورڈ پر قاضی لکھا ہوا نظر آیا اور میں اسی میز پر پہنچ گیا۔ وہاں دوسری میزوں کے مقابلے میں زیادہ تماشائی جمع تھے۔

اسکورنگ کے ذریعے مجھے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ قاضی ہادی کون ہے وہ برف جیسے سفید بالوں اور سرخ و سفید چہرے والا ادھیڑ عمر مگر خوش لباس شخص تھا۔ وہ بہت توجہ اور انہماک کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا اور اسے اپنے حریف پر سبقت حاصل تھی۔

قاضی ہادی کو اپنے شاٹ پر تماشائیوں سے داد مل رہی تھی اس کا ایم اور زاویہ اتنا درست تھا کہ میں بھی اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر میری نظریں اس کے خوبصورت کھیل کے بجائے اس نادیدہ ... تلاش میں سرگرداں تھیں جس کی وجہ سے اس پر ہاتھ ڈالنا دشوار تھا۔

وہاں چند نرم و ملائم لڑکیاں ضرور موجود تھیں جو بے تحاشا قاضی ہادی کے کھیل کو سراہ رہی تھیں۔ ان کے علاوہ میں وہاں کسی محافظ یا نگران کی موجودگی محسوس نہ کر سکا۔

میں نے قاضی ہادی کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ وہ ایسے حلیے اور خدوخال کا مالک تھا کہ اسے سینکڑوں کے ہجوم میں پہچانا جا سکتا تھا۔

بلیئرڈ ہال میں میرے لیے اس پر ہاتھ ڈالنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لہٰذا میں تھوڑی دیر بعد وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میرا ذہن تیزی کے ساتھ آنے والے لمحات کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو فلورا والی میز خالی پڑی ہوئی تھی اور ایک بیرہ وہاں سے خالی برتن سمیٹ رہا تھا۔

"جو خاتون اس میز پر بیٹھی تھیں وہ کہاں گئیں؟" میں نے بیرہ کے قریب جا کر سوال کیا۔

"چلی گئیں۔" اس نے مجھ پر سرسری نظر ڈال کر کہا۔

میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا اور اس نے سر کو قدرے خم دے کر جیب میں اڑس لیا اور برتن چھوڑ کر ہمہ تن میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"ذرا میرے ساتھ آؤ۔" میں نے ایک خالی گوشے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا کیونکہ وہاں دو میزیں آباد ہو چکی تھیں۔ اور میری گفتگو سنی جا سکتی تھی۔

"انہوں نے کوئی پیغام چھوڑا ہے؟" اس گوشے میں پہنچ کر میں نے بیرے سے کہا۔

"پیغام تو نہیں چھوڑا مگر وہ بہت جلدی میں روانہ ہوئی ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا "وہ یہاں اطمینان سے اکیلی بیٹھی تھیں کہ ایک شخص چند منٹ کے لیے ان کے پاس آیا۔ اس کی گفتگو سے وہ کچھ خوفزدہ نظر آنے لگی۔ اس کے جاتے ہی انہوں نے بل طلب کیا اور میری واپسی کا انتظار کیے بغیر چلی گئیں۔"

"ان سے بات کرنے والا یہاں موجود ہے؟"

"وہ — وہ جا رہا ہے۔" اس نے اچانک پنجوں کے بل اچکتے ہوئے نکاسی کے راستے کی طرف اشارہ کیا جہاں سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک دراز قامت شخص قدرے لنگڑاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔

میں بیرے کو حیران چھوڑ کر تیزی سے نکاسی کے راستے کی طرف ہو لیا میرے وہاں پہنچنے تک وہ شخص باہر نکل چکا تھا۔ میں دروازہ عبور کر کے اپنی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا دربان نے میرے لیے دروازہ کھولا اور میں باہر آ گیا۔

برآمدے سے پارکنگ لاٹ تک راستہ ویران پڑا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ اتنی جلدی وہ شخص کہاں غائب ہو گیا جبکہ اس راستے سے نکلنے کے بعد وہ میری نظروں میں آئے بغیر ہوٹل کے کسی دوسرے حصے کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لمحہ مجھے پام کے ان قد آدم گملوں کا خیال آیا جو ڈائننگ ہال کے دروازے سے نکاسی کے برآمدے تک دیوار تک سجے ہوئے تھے۔

وہ شخص مجھے بیرے سے بات کرتے دیکھ کر چوکنا ہو گیا تھا اور شاید آخری لمحے پر اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں اس کے تعاقب میں لپکا ہوں لہٰذا وہ موڑ پر گھومتے ہی چند شاخوں کے پیچھے گملوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بجلی کی سی سرعت سے پیچھے گھوما مگر اس وقت تک وہ میرے قریب آ چکا تھا۔

اسے دیکھتے ہی میرے بڑھتے ہوئے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ وہ خاصا کریہہ صورت شخص تھا۔ اس کے لبوں پر اس وقت زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی اور داہنا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا جس میں سے ریوالور کی نال کا ابھار صاف نظر آ رہا تھا۔

"خاموشی سے میری ہدایات پر عمل کرتے رہو۔" اس نے مجھ سے چند قدم دور رک کر سرد لہجے میں کہا "اگر تم نے ذرا بھی مکاری کی کوشش کی تو بے دریغ مار ڈالوں گا۔"

"یہ تو تمہارے بشرے ہی سے واضح ہے۔" میں نے خوف کی ہلکی سی لہر کے باوجود جرأت مندانہ لہجے میں کہا "تمہارا پہلا حکم کیا ہے؟"

"واپس گھومو اور پارکنگ لاٹ کی طرف چل پڑو۔ ورنہ میرے پیچھے آؤ گے؟"

"بکواس مت کرو۔" وہ ایک قدم آگے بڑھ کر غرایا۔

"تمہاری مرضی۔" میں نے شانے اچکا کر لاپروایانہ انداز میں کہا "اس طرح میرے پیچھے آؤ گے تو دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ شبہ ہو گا میری دانست میں بہتر یہ ہے کہ تم پہلو میں آ کر ریوالور کی نال میری پسلیوں میں لگا دیتے۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ دو دوست جا رہے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں بکواس بند کرو۔" میری تقریر پر وہ چراغ پا ہو گیا "اور آگے بڑھو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"آہستہ مارنا۔" میں نے اسے آنکھ مار کر کہا کیونکہ اس دوران میں مجھ پر ابھار کی اصلیت واضح ہو چکی تھی۔ اس ابھار میں نال کے گول دہانے کے کناروں کے بجائے محراب نما گولائی نمایاں تھی پھر اس جیب کا حجم بھی ... حد تک کم تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پتلون کی جیب میں سے کسی نقلی کا ابھار دکھا کر مجھے مرعوب کرنا چاہ رہا ہے مگر اس کو یہ علم نہ تھا کہ میری ذات پر ایسے شعبدے بے اثر ثابت ہوں گے۔

اس نے ایک غلیظ سی گالی بکی اور داہنا ہاتھ جیب سے نکال کر مجھ پر چھلانگ لگا دی جوں ہی اس کا دیوہیکل جسم فضا میں اڑتا ہوا قریب آیا میں پھرتی سے ایک طرف سرک گیا اور ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک بھرپور ضرب بھی لگا دی۔

اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی مگر دردناک آواز نکلی اور وہ پیٹ کے بل بجری کی روش پر دور تک گھسٹتا چلا گیا۔

اس سے قبل کہ وہ سنبھالا لے کر میری طرف لوٹتا۔ میں نے اپنی جیب سے شکاری چاقو نکال لیا اور اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔

چاقو کے پھل کھلنے کا کھٹکا سن کر وہ بری طرح پھڑکا اور موت کو سامنے دیکھ کر اس نے میرے شکنجے سے نکلنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔

"اسی طرح پڑے رہو۔" میں نے اس کے بال مٹھی میں دبوچ کر چاقو کی نوک سے اس کی گردن پر ہلکا سا زخم لگاتے ہوئے کہا "اگر زور آزمائی کی تو یہی پھل تمہاری شہ رگ اڑا دے گا۔"

اس دھمکی کا میرے شکار پر خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے یک لخت ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

"قاضی ہادی کی گاڑی کا نمبر کیا ہے؟"

اس نے جلدی سے ایک نمبر دہرایا۔ اسی وقت پارکنگ لاٹ کی جانب سے کوئی ہیولا باہر آتا دکھائی دیا اور میں نے اپنے شکار کے گلے پر چاقو کی تیز دھار پھیر دی۔

وہ شخص بری طرح تڑپا اور اسی کے ساتھ چیخا بھی تھا۔ میں نے اس کی شہ رگ کے کٹ جانے کا یقین ہوتے ہی اسے چھوڑ دیا۔ اور تیزی سے ایک طرف بھاگ گیا۔

وہ شخص دم توڑتے ہوئے زمین پر جس بری طرح تڑپا اس کی بنا پر پارکنگ لاٹ میں اونگھتے ہوئے اکا دکا ڈرائیور چونک پڑے۔ اور تیزی سے جائے واردات پر پہنچے مگر میں نیم تاریکی سے گہری تاریکی میں آ چکا تھا۔ لہٰذا فوری طور پر پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں رہا تھا خون آلود چاقو ابھی میرے ہاتھ میں تھا اور میں اپنے دونوں ہاتھوں پر تازہ خون کی چپچپاہٹ بھی محسوس کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں ہوٹل تو کیا میں کسی روشن علاقے کا رخ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دوڑتے دوڑتے میں ہوٹل کے ویران عقبی علاقے میں جا نکلا اس طرف احاطے کی قد آدم دیوار کی دوسری طرف ایک بڑے خالی پلاٹ پر تعمیری کام ہو رہا تھا جو رات ہو جانے کے سبب بند ہو چکا تھا مگر بلند ٹاور کرین اور کنکریٹ کے ڈھانچے دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ میرے لیے وہ جگہ مناسب تھا۔ میں دیوار پر چڑھ کر پھرتی کے ساتھ دوسری طرف کود گیا۔

گو اس خالی پلاٹ پر بھی جگہ جگہ سرچ لائٹس لگی ہوئی تھیں مگر اس کے باوجود بیشتر رقبہ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اسی تاریکی میں مجھے ایک جگہ پانی کا پختہ تالاب نظر آ گیا جس کے کنارے کنکریٹ کے بلاک بنانے والی مشین کھڑی تھی۔

مشین کی آڑ میں بیٹھ کر میں نے نہایت سکون کے ساتھ ہاتھ دھو ڈالے۔ چاقو کا تیز پھل بھی میں نے اچھی طرح دھو لیا تھا مگر تاریکی کے باعث میں اپنے لباس کا جائزہ نہ لے سکا۔

اسی وقت کہیں سے ایمبولینس کے سائرن کی تیز آواز سنائی دی

جو لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی پھر وہ آواز ہلٹن ہوٹل کے قرب و جوار میں کہیں معدوم ہو گئی۔

پہلے میں نے اس پلاٹ پر موجود کسی عمارت کے نامکمل اور تاریک ڈھانچے میں جا کر کچھ دیر آرام کرنے کا ارادہ کیا مگر اسے فوراً ہی مسترد کر دیا کسی بند جگہ پر پناہ لینا میرے لیے اس وقت خطرناک تھا۔

تھوڑی دیر وہاں رُک کر سانس قابو میں کرنے کے بعد میں وہاں سے اٹھا اور روشنیوں سے بچتا بچاتا نکاسی کے راستے کی تلاش میں ہو لیا اس ویران تعمیراتی علاقے سے نکلنے میں کچھ دشواری پیش نہیں آئی۔ باہر آ کر میں کچھ دور پیدل چلتا رہا پھر ایک ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

کارلٹن ہوٹل سے دو فرلانگ کے فاصلے پر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اس وقت شکاری چاقو میرے لیے ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔ میں جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس وسیع شہر میں گٹر کے سوا مجھے کوئی محفوظ مقام نظر نہیں آ رہا تھا اسرائیلی شہریوں کے احساسِ ذمہ داری کے بارے میں مجھے پہلے ہی ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا جو میری خوش نصیبی کے باعث ایک جال سے نجات کا سبب بن گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے وہ چاقو کسی کھلی جگہ پر پھینکا تو اس کے کھانچوں میں رہ جانے والے خون کے ذرات کی بنا پر وہ چاقو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا اور پھر فنگر پرنٹ کے ماہرین بآسانی مجھے اس قتل میں ملوث کر لیں گے۔

دوسری طرف فلورا اور ہوٹل کے ویٹر سے بھی مجھے خطرہ تھا۔ ان دونوں کے بیانات میری نشاندہی کے لیے کافی ہوتے علاوہ ازیں مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کیپٹن ماریا کے محکمے کا کوئی نہ کوئی فرد میری نگرانی پر لگا ہوا ہو گا۔ اور اس نے بڑی حد تک واردات کا مشاہدہ کیا ہو گا محمود کے آدمی نے فون پر کالے خون کے حوالے سے مجھے قاضی ہادی کے بارے میں جو ہدایت دی تھی وہ یقینی طور پر ٹیپ کی گئی ہو گی اور اس کے بعد میری نگرانی میں پابندی پیدا کر دی گئی ہو گی مگر ان سب باتوں کے باوجود مجھے یقین تھا کہ ماریا کا محکمہ اس قتل کے سلسلے میں میری نشاندہی نہیں کرے گا ان لوگوں نے بڑے شکار کے لیے چارے کے طور پر مجھے رہا کیا تھا اور وہ اسے بھول کر چھوٹے موٹے معاملات میں الجھنا ہرگز پسند نہ کرتے۔

اگر وہ مجھے راہ سے ہٹانا ہی چاہتے تو ان کے پاس ہزار حیلے موجود تھے۔ کوئی نادیدہ گولی یا دستی بم میرا قصہ تمام کر سکتا تھا۔ قانونی طور پر وہ چاہتے تو مجھے ہنری اور اس کی داشتہ کے قتل کے جرم میں پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے یہ سب نہیں کیا تھا۔

گواہوں کے بیانات اپنی جگہ مگر سب سے اہم چیز آلۂ قتل تھی۔ میں ایک بار اسے ٹھکانے لگا دیتا تو ڈٹ کر اپنی مدافعت کر سکتا تھا۔

آخر کار میں نے ایک مین ہول تلاش کر ہی لیا۔ دو تین مرتبہ اس جگہ کا طواف کرنے کے بعد مجھے موقع مل گیا اور میں نے ڈھکن اٹھا کر چاقو اندر بہتے ہوئے گندے لاوے میں پھینک دیا۔ مین ہول کا ڈھکن آہستگی سے بند کرنے کے بعد میں بے فکری کے ساتھ ہوٹل کی طرف ہو لیا۔

کارلٹن سے روانگی کے وقت میں نے اپنی چابی دانستہ کاؤنٹر پر جمع نہیں کرائی تھی۔ میں استقبالیہ کاؤنٹر کی نظروں میں آئے بغیر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر پہنچا اور اپنے کمرے کا قفل کھول کر پھرتی سے اندر داخل ہو گیا۔

آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو میرا دل اپنی کارکردگی پر جھوم اٹھا میرے چہرے پر دور تک ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے پتہ چلتا کہ میں کسی جھگڑے میں فریق رہا ہوں۔ البتہ میری قمیص کی دونوں آستینوں پر کریہہ صورت کے ناپاک خون کے دھبے موجود تھے۔

میں نے نائلون کے دھاگے سے بنی ہوئی وہ قمیص باتھ روم میں پوری طرح نذرِ آتش کر دی۔ اس روز پہلی بار میں مصنوعی دھاگوں کی ہمہ گیر افادیت کا دل سے قائل ہو گیا۔ اگر وہ کوئی سوتی قمیص ہوتی تو اسے جلانے میں مجھے گھنٹوں صرف ہو جاتے۔

سلیپنگ سوٹ میں بستر پر دراز ہونے کے کچھ وقفہ بعد میں نے داخلی فون سروس کو کھانے کا آرڈر دے دیا۔

اس رات دو بجے تک میں کسی پولیس پارٹی کی آمد اور باز پرس کا انتظار کرتا رہا مگر مجھے اپنے دروازے پر کوئی دستک نہ سنائی دی اور آخر کار میں گہری نیند سو گیا۔

اگلے روز اتوار تھا۔ میں دن چڑھے سو کر اٹھا اور نہانے دھونے کے بعد ہال کی طرف چل دیا تاکہ رات والے حادثے کے بارے میں اخبارات کا جائزہ لے سکوں اور ساتھ ہی لوگوں کے تبصرے بھی سن سکوں۔

اخبارات میں اس قتل کے بارے میں متضاد قیاس آرائیاں کی گئی تھیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ مقامی پولیس کسی واضح نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہی تھی۔ مرنے والے کو قاضی ہادی کا ملازم بتایا گیا تھا اور اسی حوالے سے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ وہ قتل آپس کی کسی چپقلش کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

میں چائے نوشی کے دوران اخبار پڑھنے میں مصروف تھا کہ دو تنومند افراد میری میز پر آ کر میرے دائیں بائیں جم گئے۔ ان کا یہ رویہ جارحانہ اور بدتمیزی پر مبنی تھا۔ ہال میں بیشتر میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں اور پھر بھی انہیں میری ہی میز پسند تھی تو اخلاقاً انہیں مجھ سے اجازت لینی ضروری تھی

"فرمایئے۔ میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" میں نے اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے ان دونوں سے شائستہ لہجے میں دریافت کیا

"پچھلی رات کے کارنامے کی خبریں پڑھ رہے تھے؟" ان میں سے ایک چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں

"تو آخر یہ لوگ آ ہی پہنچے" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر انجان بنتے ہوئے ان سے سوال کیا "کون سا کارنامہ؟ میں تمہاری بات سمجھا نہیں"

"کاریوس کا خون قیامت تک تمہارا پیچھا کرے گا" وہی شخص آگے جھکتے ہوئے سرد اور سفاکانہ لہجے میں بولا "پولیس تم تک پہنچے نہ پہنچے مگر ہم اپنے دشمنوں کو خوب پہچانتے ہیں"

"اگر تم ہلٹن ہوٹل میں مارے جانے والے شخص کے بارے میں بات کر رہے ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ اس کے بارے میں میں نے ابھی اخبار میں پڑھا ہے۔ اس شہر میں میری کسی سے دشمنی نہیں۔ تمہیں شاید میرے بارے میں کوئی خطرناک غلط فہمی ہوئی ہے" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ بھی دیکھ لیا جائے گا۔ فی الحال تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے" دوسرے شخص نے ٹی شرٹ کی تنگ قمیص میں پھنسے ہوئے اپنے کسرتی بازو ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہوش میں رہ کر بات کرو" میں کرسی پر پیچھے کھسکا کر غصیلے لہجے میں بولا "میں تمہارا زر خرید نہیں ہوں جو تم میرے ساتھ اس طرح پیش آ رہے ہو"

کسرتی جسم والا کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے کہا "ضد اچھی نہیں ہوتی مسٹر صفدر! قاضی ہادی نے تمہیں ایک مہمان کے طور پر بلایا ہے"

"مہمان بلانے کے لیے خونخوار گینڈے نہیں بھیجے جاتے" میں نے اس کے ساتھی کو گھورتے ہوئے کہا۔

کسرتی جسم والا زیرِ لب کچھ غرا کر رہ گیا اور ان کا ساتھی احتجاجی لہجے میں بولا "تم بھی اپنی زبان کو لگام دو آنے والوں کے ساتھ یہ رویہ تمہیں زیب نہیں دیتا"

"جاؤ اور قاضی ہادی سے کہہ دینا کہ میں اسے اپنے کمرے میں فراخدلی سے خوش آمدید کہوں گا"

"وہ تمہارے پاس آئے گا؟" کسرتی جسم والے نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"نہ آئے تو اپنے گھر خوش رہے۔ مجھے اس سے ملنے کا شوق نہیں ہے"

"یہ یاد رکھنا کہ تم دن دہاڑے کسی بڑی شاہراہ سے بھی اٹھائے جا سکتے ہو" وہ دونوں اپنی کرسیوں سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"اپنے نام بتلاتے جاؤ تاکہ میں پیشگی رپورٹ میں پولیس کو ملوثوں کے بجائے تمہارے نام ہی لکھا دوں" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"اگر تم نے پولیس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو تمہاری پسلیاں توڑ دی جائیں گی۔ ایسی کوئی بھی بزدلانہ کوشش تمہیں مہنگی پڑے گی"

یہ کہہ کر وہ دونوں تیزی سے وہاں سے چلے گئے۔

دن کا باقی حصہ میں نے ان واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا۔ محمود نے مجھ سے قاضی ہادی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ درست ہی تھا۔ اس پر ہاتھ ڈالنے کے چکر میں میرے ہاتھوں ناگہانی ایک شخص مارا گیا تھا۔ گو پولیس میرا سراغ پانے میں ناکام رہی تھی مگر قاضی ہادی کے کارندے براہِ راست میرے پاس آ پہنچے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاضی ہادی بہت زیادہ باخبر شخص ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے واقف ہو یا نہ ہو مگر اپنے دشمنوں کی بو پا لینے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس موڑ پر مجھے بہت شدت سے تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ محمود کا کوئی پتہ نہیں تھا ورنہ میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں اسی سے مشورہ لے سکتا تھا۔ قاضی ہادی کو ٹھکانے لگانا اب ناممکن نظر آ رہا تھا۔ میں ان لوگوں کی نگاہوں میں آ چکا تھا اور اب قاضی ہادی کو کسی اور دشمن کی جانب سے بھی زک پہنچتی تو اس کے آدمی براہِ راست مجھ پر دھاوا بول دیتے۔

شام تک میں خیالات کے اس روح فرسا تسلسل سے بوکھلا گیا اور ذہنی سکون کے لیے سینما جانے کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

ہوٹل سے فٹ پاتھ پر آتے ہی ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رکی اور میں عقبی دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔

"سینز سینما" میں نے ٹیکسی کے حرکت میں آتے ہی ڈرائیور کو ہدایت دی۔

"بہت بہتر جناب" ڈرائیور نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

ٹیکسی چلتی رہی اور میں اپنے خیالات میں ڈوبا رہا۔ خیالات کی یہ رو اس وقت ٹوٹی جب معاً مجھے احساس ہوا کہ ٹیکسی ایک ویران سڑک پر سفر کر رہی ہے۔

میں تل ابیب میں نیا ضرور تھا مگر مشہور مقامات کے محلِ وقوع راستوں اور فاصلوں سے کافی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ میرے اندازے

کے مطابق کارلٹن سے سیزر سینما تک مشکل دس منٹ کی مسافت تھی جبکہ ٹیکسی کو چلتے ہوئے تقریباً دوگنا وقت ہو چکا تھا۔

"یہ تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے تیز لہجے میں ڈرائیور سے پوچھا

"سیزر سینما جناب۔" وہ سر گھمائے بغیر معصومانہ لہجے میں بولا۔

"ٹیکسی روک دو۔ سیزر کے راستے میں یہ ویرانہ کہاں سے آ گیا؟"

میں نے اس کے شانے پر مضبوطی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اس نے فوراً ہی بریک لگانا شروع کر دیئے "ازابیلا اسٹریٹ پر آگ لگی ہوئی ہے جناب اسی لیے مجھے اس طویل راستے سے جانا پڑ رہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں آتشگیر مادہ پھٹا ہے اور آگ تیزی سے بے قابو ہوتی جا رہی ہے۔"

"آگ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ نہ جانے کتنی معصوم جانیں اس آگ کی نذر ہو جائیں گی۔" وہ اداس لہجے میں بولا "محافظوں پر مصنوعی سکوت طاری ہے مگر جنگ کے شعلے ہمارے گھروں کو چاٹ رہے ہیں۔ اسرائیل میں زندگی کا ہر لمحہ غیر یقینی ہے نہ جانے کب کس کی باری آ جائے؟"

"ٹیکسی گھماؤ۔" میں نے اسے ہدایت کی "میں ازابیلا اسٹریٹ کی آگ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس وقت تک ٹیکسی سڑک کے کنارے رک چکی تھی اور ڈرائیور نے انجن بھی بند کر دیا تھا۔ میری ہدایت پر اس نے سیلف لگایا مگر انجن کھانس کر رہ گیا۔

"اب یہ کچھ دیر تک سیلف نہ اٹھا سکے گی۔" ڈرائیور میری طرف سر گھما کر معذرت آمیز انداز میں بولا "گرم ہو کر سیلف کا بش جام ہو جاتا ہے جب تک گاڑی ٹھنڈی نہ ہو گی میرے لیے اسے اسٹارٹ کرنا دشوار ہو گا۔"

"تم سے کس احمق نے کہا تھا کہ انجن بھی بند کر دو۔"

"بوکھلاہٹ میں غلطی ہو گئی جناب۔ آپ کے اعتراض نے سراسیمہ کر دیا تھا۔"

"دھکے سے اسٹارٹ کرو گاڑی۔"

"اکیلے سے ذرا مشکل ہے۔" وہ آہستہ سے بولا "آپ اسٹیئرنگ پر آ جائیں میں دھکا لگاتا ہوں۔"

میرے لیے یہ تجویز مناسب تھی۔ میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور جیسے ہی میں ڈرائیور کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچا وہ پھرتی سے سیٹ سے اٹھا اور مجھے فضا میں کسی بڑے سکرو ڈرائیور کا آہنی دستہ چمکتا نظر آیا جو خاصی آواز کے ساتھ میری بائیں کنپٹی سے ٹکرایا اور میں لڑکھڑا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔



اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں




حصہ سوئم
مفرور

انیلہ علیم

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو الف لیلوی ماحول میں پایا۔ وہ تھا تو کوئی کمرہ ہی مگر اس کی ساخت اور اندرونی آرائش ایسی تھی کہ اس پر کسی بڑے سے خیمے کا گمان ہوتا تھا۔ ڈھلوان دار چھت اور ترچھی دیواروں کے جوڑ پر چاروں طرف کشادہ دار ریشمی جھالریں لہرا رہی تھیں۔ چھت کے وسط میں ایک بہت بڑا بلوریں فانوس لٹک رہا تھا۔ چوبی جالی دار کھڑکیوں اور دروازے پر مخمل کے بھاری پردے جھول رہے تھے۔ فرش پر پورے سائز کا نفیس ایرانی قالین بچھا ہوا تھا جس پر دیواروں کے ساتھ خوبصورت گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ قالین کے وسط میں صندل کی ایک منقش تپائی پر کئی قسم کی اعلیٰ شراب کی بوتلیں دیگر لوازمات کے ساتھ موجود تھیں۔ تمام دیواروں پر قدیم مصری رقاصاؤں کی ہیجان انگیز بڑی بڑی پینٹنگز آویزاں تھیں جن میں زندگی کے رنگ پوری شدت سے نمایاں تھے۔

میں اس کمرے کے ایک گوشے میں گدے پر پڑا ہوا تھا۔ جب میں اس خیمہ نما کمرے کے جائزے سے فارغ ہوا تو مجھے اپنی بائیں کنپٹی میں درد کی شدید ٹیسوں کا احساس ہوا۔ اس موذی ڈرائیور نے میرے سر پر سنگدلی بے رحمی سے ضرب لگائی تھی۔

مجھے یہ پورا یقین تھا کہ میرا یہ اغوا صبح آنے والوں کی دھمکی کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ تل ابیب میں ایسے وسائل کے مالک تھے کہ انہوں نے واقعی مجھے جبری بھری سڑک سے اٹھا لیا تھا۔

میں نے کہنی کے بل بستر سے اٹھنا چاہا تو میری نظر اس پری پیکر دوشیزہ پر پڑی جو میرے قدموں کی طرف دیوار کے سہارے سر ٹکائے گہری نیند سو رہی تھی۔

اس کے گداز بدن اور بے پناہ حسن کو دیکھ کر میں چند لمحوں کے لیے اپنی تکلیف یکسر بھول گیا اور ٹکٹکی باندھ کر اس خوش جمال کا لطف کرنے لگا۔

اس کے سر پر عربی وضع کا کپڑا موجود تھا اور چہرے پر سیاہ جالی کی نقاب اس طرح چڑھی ہوئی تھی کہ آنکھوں کے نیچے چہرے کا پورا حصہ بادل میں چھپے ہوئے چاند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں بڑے پیارے انداز میں گھنیری پلکوں کے سائے میں بند تھیں۔

مختصر بلاؤز میں پوشیدہ سینے کا زیر و بم جسم کے کھلے ہوئے حصے اور نیچے ریشم کے سفید پاجامے پر پہنا ہوا زرق برق کام والا عریاں لباد اسے قلوپطرہ کے دربار کی کسی ماہر رقاصہ کے روپ میں پیش کر رہا تھا جو ناچتے ناچتے تھک کر مصر کے دربار میں سو گئی ہو۔

وہ نہ جانے فرش پر میرے قدم کی ہلکی سی دھمک تھی یا خوابیدہ حسن کے لاشعور کی کارگزاری کہ میرے اٹھتے ہی وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھی اور ایسے بدن میں خود ہی سمٹتی ہوئی دلربایانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے سامنے آگئی۔

"خوش آمدید!" میرے سامنے آ کر اس نے مخمور نگاہوں کی چلمن سے میری جانب جھانکتے ہوئے ترنم ریز اور رسیلی آواز میں کہا۔ اس کا لہجہ عربوں کا سا تھا مگر اس نے انگریزی الفاظ ادا کیے تھے۔

"میں کہاں ہوں اور تم کون ہو؟" میں نے اس سے عربی میں سوال کیا۔

"تم اس وقت میرے آقا قاضی ہادی کے مہمان ہو اور میں اس کی ایک ادنیٰ کنیز ہوں جسے تمہاری خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔" وہ دزدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے محبت آمیز نرم لہجے میں سوال کیا اس کی جھکی جھکی خمار آلود نظروں نے میرے دل کے نازک تار جھنجھنا کر رکھ دیئے۔

"میرا نام صائقہ ہے۔"

"تمہارا نام معنویت سے بھرپور ہے۔" میں نے اس کے قریب جا کر اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "تم نہ صرف آسمانی بلکہ صحرائی آسمانی بجلی ہو جس کی چمک نگاہوں کو خیرہ اور حواس کو معطل کر دیتی ہے۔"

"یہ ناچیز جو کچھ بھی ہے آپ کے حکم کی غلام ہے۔" اس نے شرما کر اپنا چہرہ دوسری طرف گھماتے ہوئے کہا "اگر خواہش ہو تو کوئی مشروب پیش کروں؟"

"مشروب یا زہر جو بھی تم پیش کرو مجھے پینے میں عذر نہ ہوگا۔" اس لڑکی کے حسن اور اداؤں نے میری طبیعت میں عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا۔

"اس چھت کے نیچے قاضی ہادی کے دوستوں کے سوا کسی کا گزر نہیں ہوتا اور زہر دوستوں کے لیے نہیں ہوتا۔ میرا آقا تو ویسے بھی دشمنوں کو للکار کر مارنے کا عادی ہے۔"

لڑکی کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ ان الفاظ سے پختگی نمایاں ہو رہی تھی۔ ابھی تک میں اسے معصوم، سادہ لوح، الھڑ اور ناتجربہ کار سمجھ رہا تھا مگر پل بھر میں وہ تو خیز کلی مجھے کوئی خزاں رسیدہ پھول نظر آنے لگی جو شاخ سے گرنے کے لیے ہوا کے ایک ہلکے جھونکے کا منتظر ہو۔

میرے ذہن پر تیزی سے چھاتا ہوا خمار یک بیک صاف ہو گیا۔ لڑکی کی سرخ و سفید بھری بھری کمر میرے لیے بے روپ ہو گئی اور میں ایک گاؤ تکیے کے سہارے قالین پر بیٹھ گیا۔

وہ ایک جام میرے لیے اور دوسرا اپنے لیے بنا رہی تھی۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو وہاں رات کے دو بج رہے تھے۔

"یہ میرے آقا کے ذخیرے کی سب سے پرانی شراب ہے جس کے ذائقے کی طلب ہوشّے دایان جیسے ذی مرتبہ شخص کو اس دروازے پر دستک دینے پر مجبور کر چکی ہے۔" اس نے سرخی مائل شراب کا جام میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس عزت افزائی کے لیے میں تمہارا اور قاضی ہادی کا مشکور ہوں۔" میں نے اس کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ اس شراب کے شوق میں ہوشّے دایان ایک آنکھ سے محروم ہوا ہے۔"

اس کے چہرے سے مسکراہٹ یک بیک غائب ہو گئی "تم مہمان ضرور ہو مگر تمہیں یہ اختیار نہیں ہے کہ ہمارے کسی محسن کے بارے میں نازیبا کلمات ادا کرو۔"

"نہیں نہیں معلوم۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "اس قیمتی شراب کا ذائقہ چکھنے کے لیے مجھے اپنی بائیں کنپٹی پر آتش شدہ ضرب کھانی پڑی ہے کہ ایک کیا میری دونوں آنکھوں کی بصارت بھی ضائع ہو جاتی تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔ دوستوں اور مہمانوں کی طلبی کا یہ انداز مجھے پسند نہیں آیا۔"

"صبح میرا آقا خود تمہارے پاس آئے گا۔ یہ شکایت تم اسی سے کرو تو بہتر ہوگا۔ میرا کام تو صرف اتنا ہے کہ تمہارے آرام کا خیال رکھوں۔"

"بہت نفیس شراب ہے۔" میں نے پہلا گھونٹ لے کر کہا "میری زبان کے لیے یہ ذائقہ نیا ہے۔ اس میں عجیب میٹھی سی تلخی رچی ہوئی ہے۔"

"میٹھی سی تلخی!" میرے الفاظ دہرا کر وہ کھنکتی ہوئی آواز میں ہنس دی "کیا بات کہی تم نے لفظوں کے جوڑ توڑ کے ماہر معلوم ہوتے ہو۔"

"میں نے جو محسوس کیا وہ کہہ ڈالا۔"

"تم اچھا کہتے ہو۔ شاعر ہوتے تو بڑا نام پیدا کرتے۔"

"تمہارا یہ لباس اور تمہارے بدن کا گداز مجھے بدن کی شاعری پر اکسا رہا ہے۔"

"بدن کی شاعری؟" اس نے حیرت سے پوچھا

"تمہارے بدن کا لوچ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے محسوس کرنا چاہو تو دوسری بات ہے۔"

"میں اس وقت تمہارا رقص دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میرے ان الفاظ پر اسے قدرے مایوسی ہوئی مگر بظاہر اس نے خوشی سے کہا "میں رقص ضرور دکھاؤں گی یہاں موسیقی کے ریکارڈز کا خاصا ذخیرہ ہے۔"

"موسیقی کا شور دوسروں کی نیند میں خلل انداز تو نہیں ہوگا۔"

"کون دوسرے؟" اس نے قہقہہ مار کر حیرت سے کہا "ہم دونوں کے سوا اس وقت دو گونگے محافظ ہیں جن کا کام ہی جاگنا ہے۔"

"تو اس وقت ہم ٹل ابیب میں نہیں ہوں؟"

"ہم تل ابیب سے کافی دور قاضی ہادی کے باغات میں ہو اس جگہ پہلے ریت ہی ریت ہوا کرتی تھی مگر اب یہاں نارنگیوں اور سیبوں کے باغات ہیں جن کا دور دور شہرہ ہے۔"

"تو کیا مجھے باہر نکلنے کی اجازت ہے؟" اس کے الفاظ پر میرا شوق جاگ اٹھا۔ فضا میں پھیلے پھلوں کی تازہ مہکار میں پہلے ہی محسوس کر رہا تھا مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت میں پھلوں کے باغات ہی کے درمیان ایک عشرت کدے میں موجود ہوں۔"

"ضرور جا سکتے ہو مگر ایک التجا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ان گونگے محافظوں سے نہ الجھنا۔ وہ بڑے ظالم اور سنگدل ہیں۔ ایک گھونسے میں ریچھ تک کی گردن کا منکا توڑ دیتے ہیں۔"

"ان کا بہترین مقام تو کوئی سرکس ہو سکتا ہے۔"

"دونوں جڑواں بھائی ہیں اور اسپین میں بل فائٹنگ کیا کرتے تھے۔ میرے آقا نے انہیں وہیں سے ملازم رکھا ہے۔"

میں صائقہ کے ہمراہ باہر آ گیا۔

قدموں کی آہٹ پر وہ دونوں چونکے مگر میرے ہمراہ صائقہ کو دیکھ کر بے نیازانہ انداز میں گشت میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں کے دیوہیکل سیفمر جسموں پر چمڑے کی جیکٹ چڑھے ہوئے تھے اور دونوں کے شانوں سے ایک ایک رائفل لٹک رہی تھی۔ پتلون کی بیلٹ کے ساتھ چمڑے کے ہولسٹرز میں ریوالور اور ایک ایک ٹارچ کے ساتھ طاقتور سرچ لائٹ جھول رہی تھی خدوخال اور قد و جسامت کے اعتبار سے دونوں ہی یکساں نظر آتے تھے تنگ پیشانیوں، گول اور سرد آنکھوں اور پتلے بھنچے ہونٹوں کے باعث وہ صورت ہی سے غارت گر اور خونی نظر آتے تھے۔

میں دانستہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے صائقہ کے ساتھ چاندنی میں باغ کی طرف چل دیا۔ ان گونگے محافظوں میں سے ایک وہیں ٹہلتا رہا دوسرا کسی مستعد فوجی کی طرح ہمارے تعاقب میں ہو لیا۔

"یہ ہمارے پیچھے کہاں آ رہا ہے؟"

"اس کا یہی کام ہے۔" صائقہ آہستہ سے بولی "رات کے وقت وہ ہمیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔"

کچھ دور نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر اس عمارت پر نظر ڈالی وہ واقعی فن تعمیر کا ایک اچھوتا شاہکار تھی۔ دور سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک دوسرے سے ملے ہوئے چار خیمے وہاں ایستادہ ہوں صائقہ نے بتایا کہ اس عمارت میں کل چار کمرے ہیں اور ہر ایک کی ساخت یکساں ہے۔

باغ سے زیادہ مجھے حفاظتی اقدامات سے دلچسپی تھی اور میں نے باہر آ کر اندازہ کر لیا کہ گونگے بہت ہی مکار اور خطرناک تھے۔ انہیں زک دے کر یہاں سے نکل جانا کسی معجزے ہی کی صورت میں ممکن تھا۔ ان کے کسرتی جسموں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک گھونسہ رسید کر کے ناک کے راستے بھیجا بہا دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ایسے شہزوروں سے مقابلے میں میرا کوئی حربہ مشکل ہی سے کارگر ہو سکتا تھا۔

عمارت میں واپس آ کر میری فرمائش پر صائقہ نے تیز موسیقی کا ایک علاقائی ریکارڈ ٹرن ٹیبل پر رکھ کر اسے آن کر دیا۔ اس کے ساتھ اس نے فانوس کے سوئچ کے ساتھ لگے ہوئے ریگولیٹر کو گھما کر روشنی کم کر دی فسوں خیز ماحول میں جوں ہی دف اور نفیری کی تیز آواز بلند ہوئی صائقہ کے قدم تھرکنے لگے۔ اور اس نے صندلی تپائی سے تیز قسم کی شراب سے بھرا ہوا خیام اٹھا کر جام سمیت میرے سامنے رکھ دیا۔

سازوں کی ترنم ریزی ہوتی ہوئی نغمگی آوازوں پر صائقہ کے کولہے تھرکتے رہے۔ اس کے بدن کا اوپری حصہ بھی ساکت تھا اور قدم قالین پر جمے ہوئے تھے۔ پھر دف پر ایک چوٹ کے ساتھ جونہی موسیقی کا بھرپور شور گونجا وہ لڑکی بجلی بن گئی۔ اس کے بدن کا ہر عضو الگ الگ تھرک رہا تھا وہ بل کھا کھا کر اور لہرا لہرا کر یوں ناچ رہی تھی کہ میرا سانس سینے میں پھنسنے لگا۔

ایک طرف شراب میرے جسم کو موم بنائے دے رہی تھی اور دوسری طرف صائقہ کا جارحانہ رقص مجھے بے خود کیے دے رہا تھا۔ دور پر دور چلتا رہا اور جب اس نے روشنیاں بالکل دھیمی کر کے مجھے بتایا کہ وہ رقص ظلمات کا مظاہرہ کرنے والی ہے تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

رات کے سناٹے میں صائقہ جیسی حسینہ کا وہ اندھیرے کا ناچ بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ میرے لیے اس کے قدموں پر نظریں جمانی مشکل ہو گئیں۔ حجاب سمٹتا رہا اور رقص پورے زور شور سے جاری رہا۔

آخر میرے اعصاب جواب دے گئے اور میں بے اختیار چیخ اٹھا "ختم کرو اس ناچ کو۔"

"جب تک تم خود نہ مجھے روکو گے میرے قدم یونہی گردش میں رہیں گے۔" موسیقی میں رقاصہ کی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میرے لیے اسے روکنا معمولی سی بات تھی۔

مگر جب میں نے پہلی مرتبہ اسے پکڑنا چاہا تو وہ یوں پھسل کر میری بانہوں سے نکل گئی کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ بدستور ناچتی رہی میں اسے روکنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ وہ سیماب کی طرح پورے کمرے میں قالین پر ہلکورے لیتی پھر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ ریکارڈ ختم ہوا اور صائقہ کے قدم تھم گئے۔

"رقص ابلیس دیکھو گے؟" نیم تاریکی میں صائقہ کی بوجھل سی آواز ابھری۔

"نہیں۔"

"یہ بہت خوبصورت رقص ہے۔" اس نے مجھے ترغیب دلائی "صحرا نشینوں کے ایک قبیلے کا یہ خاص رقص ہے جو میں نے طویل ریاض کے بعد سیکھا ہے۔"

"اب میری نگاہیں تھک چکی ہیں۔ میں سونا چاہتا ہوں صبح تمہارے آقا سے بھی ملاقات کرنی ہے۔"

"سونا چاہتے ہو؟" اس نے شکست خوردہ لہجے میں سوال کیا۔

"میرے لیے اتنا ہی کافی ہے صائقہ۔" میں نے کہا اور اس کے جواب کی پروا کیے بغیر قالین پر دراز ہو گیا۔ میں قاضی ہادی پر یہ ظاہر کر دینا چاہتا تھا کہ میں کمزور قوت ارادی کا مالک نہیں ہوں جسے وہ اپنے اشاروں پر نچا سکے۔

صبح صائقہ نے مجھے بیدار کیا تو قاضی ہادی وہاں آ چکا تھا۔

اور ناشتے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے صائقہ کی بوکھلاہٹ کے باوجود نہایت سکون سے منہ ہاتھ دھویا اور دوسرے کمرے میں جا پہنچا جہاں قاضی ہادی میرا منتظر تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور تپاک کے ساتھ میری طرف آیا۔ اس کی گرمجوشی کے جواب میں میں نے خاصی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور جب ہم دونوں قالین پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے تلخ لہجے میں اس سے سوال کیا کہ میرے ساتھ یہ سوانگ رچا کر وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟

"ناشتہ کر لو پھر سکون سے باتیں ہوں گی۔" وہ اخروٹ کی گری چباتے ہوئے بولا "تمہیں یہ سوانگ ہی معلوم ہوگا کیونکہ تم میرے لہو کے پیاسے تھے مگر میں تمہارے ساتھ کمال مہربانی سے پیش آ رہا ہوں فی الحال یہ باتیں بھول جاؤ۔ غصہ بھوک کو ختم کر دیتا ہے۔"

"میں نے سنا ہے تم اپنے دشمنوں کو للکار کر مارنے کے عادی ہو پھر میرے ساتھ چوہے اور بلی کے کھیل کا کیا مقصد ہے؟" میں نے سیب کا رس پیتے ہوئے دریافت کیا۔

"تم غلط لوگوں کے چکر میں پڑ کر میرے دشمن ہو گئے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ پوری کہانی سننے کے بعد تم بھی میرے ہم نوا ہو جاؤ گے۔"

"میں سننا چاہتا ہوں کہ میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"صائقہ تم باہر جاؤ۔" قاضی ہادی نے قریب کھڑی ہوئی کنیز سے کہا اور وہ سر جھکا کر باہر چلی گئی۔

"کیسی لڑکی ہے؟" اس کے چلے جانے پر قاضی ہادی نے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میرے صبر کے لیے کڑا امتحان ثابت ہوئی ہے۔"

"امتحان! ارے میں نے تو اسے انعام بنا کر فارم پر تمہارے پاس بھیجا تھا۔"

"دوستی کا یقین ہونے سے پہلے میں کوئی انعام قبول نہ کر سکوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کھرے لہجے میں کہا۔

میرے الفاظ پر ایک لمحے کے لیے قاضی ہادی کے چہرے پر غصے کی سرخی آ کر گزر گئی مگر جب وہ بولا تو اس کے لب و لہجے میں وہی پہلے جیسی حلاوت موجود تھی "دراصل یہ یوں ہے اسی لیے میں نے اسے باہر بھیج دیا کیونکہ اب میں تم سے کچھ صاف صاف باتیں کرنے والا ہوں۔"

"میں منتظر ہوں۔"

"تمہیں علم ہوگا میں خود ایک فلسطینی ہوں۔" اس نے چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔ "مگر میں نے اپنے بیچ رہتے ہوئے ..."

"میری معلومات کے مطابق تمہیں فلسطینی بھا مرتد جانتا ہے مگر حقیقی وطنیت بہت سے لوگوں کے لیے ایک مشکوک مسئلہ بنی ہوئی ہے"

"یہ سب میرے دشمنوں کا پروپیگنڈہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل میں رہنے کے باوجود فلسطین کے کاز کی جتنی خدمت میں نے کی ہے اتنی کوئی سارتی عمر نہ کر سکے گا۔" وہ قدرے جذباتی لہجے میں کہنے لگا "اور محض یہی وجہ ہے کہ میرے ایک جاں نثار کا قاتل اس وقت میرے ساتھ ایک دستر خوان پر میرے مہمان کی صورت میں بیٹھا ہوا ہے!"

"مہمان کہہ کر مجھے دھوکے میں نہ ڈالو۔ مہمانوں کو زخمی اور اغوا کر کے نہیں لایا جاتا۔ میں یہاں تمہارا قیدی ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ اگر میں تمہارے مشورے قبول نہ کیے تو شاید مجھے یہاں سے زندہ نکلنا نصیب نہ ہو سکے گا۔"

"یہ غلط ہے۔" وہ پُر زور لہجے میں بولا۔ "قسم رب العزت کی یہ اندیشے بالکل غلط ہیں۔ تم جانا چاہو تو اسی وقت واپس جا سکتے ہو۔ جب اپنی مرضی سے یہاں آؤ گے تو میں تم سے بات کروں گا۔"

"اگر یہ درست ہے تو پھر مجھے اغوا کر کے یہاں کیوں لایا گیا؟"

"محض تمہاری ضد کی وجہ سے۔" وہ بلا تامل بولا۔ "یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے دلیل کے سامنے میں جھک تو سکتا ہوں مگر ہٹ دھرمی کے سامنے جھکنا میں کسی طرح قبول نہیں کر سکتا۔"

"یہ کوئی عذر نہیں ہے قاضی ہادی! صبح تمہارے جو آدمی میرے پاس آئے، ان کا رویہ نفرت آمیز اور جارحانہ تھا۔ انھوں نے مجھے کارلوس کا قاتل قرار دے کر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"کیا واقعی؟" قاضی ہادی نے حیرت سے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے آدمیوں پر اتنا بھی اختیار نہیں کہ ان کی کارستانیوں سے باخبر رہو۔"

"ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ایسا کیا ہو مگر یہ میری ہدایت کی صریح خلاف ورزی تھی۔ ان کا کام صرف اتنا تھا کہ میری دعوت تم تک پہنچا دیں۔ دراصل کارلوس بائیس برس سے ان لوگوں کے ساتھ تھا اور وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ کارلوس تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں سامنے پا کر جذباتی ہو گئے ہوں۔ میں تمہارے سامنے ان سے جواب طلب کروں گا اور وہ تم سے اپنے گستاخانہ سلوک کی معافی مانگیں گے۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ میں یہاں تمہارا مہمان ہوں کیونکہ کارلوس کا درد مجھے رہ رہ کر تمہاری طرف سے بدظن کر رہا ہے۔" میں نے

"یہ لو۔" اس نے اپنے لبادے کی جیب سے کار کی چابی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ "باہر تمہاری گاڑی موجود ہے۔ ناشتہ ختم کر کے جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ گاڑی میں بعد میں منگوا لوں گا۔ گفتگو اسی وقت ہو گی جب تم اپنی مرضی سے یہاں آؤ گے۔"

"بہتر یہ ہو گا کہ اس بار تم میرے کمرے میں آ جانا۔" میں نے چابی لیتے ہوئے کہا۔ ویسے قاضی ہادی کے مخلصانہ رویے نے مجھے شدید مخمصے میں ڈال دیا تھا۔

"میرا وہاں آنا مناسب نہ ہو گا۔ تم اسرائیلی حکام کی نظروں میں ہو اور شاید تمہاری نگرانی بھی ہو رہی ہے۔ اتنی اہم گفتگو وہاں نہیں کی جا سکتی۔ دوبارہ یہاں آنے سے پہلے بھی تمہیں اطمینان کرنا ہوگا کہ اپنے پیچھے سرکاری کتے یہاں تک نہ لے آؤ۔"

"تو کیا اغوا کے وقت میری نگرانی نہیں ہو رہی تھی؟"

"اس کا اطمینان ہو جانے کے بعد ہی کارروائی کی گئی تھی ورنہ دیکھو تمہیں مطلوبہ مقام پر اتار دیتی۔ تمہیں یہاں لانے کے لیے کارلٹن کے اطراف میں میرے آدمی چار ٹیکسیاں لیے موجود تھے تاکہ تم احتیاط کے پیشِ نظر ایک دو کو نظر انداز کر دو تب بھی منصوبہ ناکام ہونے کا خدشہ نہ رہے۔"

ناشتہ ختم کرنے کے بعد میں مزید چند منٹ وہاں رکا۔ پھر چابی لے کر باہر آ گیا۔ قاضی ہادی نے بڑے تپاک سے مصافحہ کر کے مجھے رخصت کیا۔

میں نے قاضی ہادی کی مستانگ کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور بے یقینی کے ساتھ یو ٹرن لے کر نکاسی کے راستے کی طرف ہو لیا۔ قاضی ہادی ہاتھ لہرا کر اندر چلا گیا اور میں ہونق کی طرح عقب نما آئینے میں خالی سڑک کو دیکھتا ہوا پھاٹک سے نکل گیا۔

کچے راستے سے سڑک پر آنے تک مجھے یقین تھا کہ قاضی ہادی کے گرگے میرا راستہ روک لیں گے اور مجھے طاقت کے بل پر دوبارہ کنکریٹ کے ان خیموں میں پہنچا دیا جائے گا۔ مگر میرے یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے اور میں بخیر و عافیت شاہراہ پر آ گیا۔

وہاں آ کر میں نے اپنی کار دانستہ تل ابیب کی مخالف سمت میں ڈال دی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے باوجود جب کسی گڑبڑ کے آثار نظر نہ آئے تو میں سنجیدگی سے قاضی ہادی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

وہ نہ جانے مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کم از کم اس کے عزائم سے واقفیت مزید حاصل کرنی چاہیے تھی۔

مجھے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ قاضی ہادی نے اپنے فارم پر مجھے قید نہیں رکھا تھا۔ بلکہ برابری کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد وقت ضائع کرنا بے سود تھا۔ لہٰذا اگلے چوراہے سے میں نے گاڑی واپس گھما لی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد میں دوبارہ اس کے فارم پر موجود تھا۔ اس وقت مکان پر نہ گرگے محافظ مامور تھے اور نہ ہی صائقہ کا پتہ تھا۔ گھنٹی بجانے کی ضرورت اس لیے پیش نہیں آئی کہ مکان کے دروازے پر پیتل کا نہ لگی تالا جھول رہا تھا۔ میں نے گاڑی کا ہارن بجایا تو چند ہی منٹ بعد کہیں ایک مالی آ پہنچا۔

"قاضی ہادی کہاں ہیں؟"

"وہ تو کافی دیر پہلے چلے گئے۔" وہ اپنے مالک کی گاڑی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیسے گئے؟"

"شہر سے ڈرائیور جیپ لے کر آیا تھا۔"

"یہاں فون موجود ہے؟"

"نہیں جناب! ابھی تک یہاں لائن ہی نہیں پہنچی۔"

یہ ناکامی مجھے بُری طرح کھل گئی۔ اگر قاضی ہادی میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا تھا تو وہ یقینی طور پر مجھ پر برتری حاصل کر چکا تھا۔ اپنی گاڑی میرے حوالے کر کے وہ اطمینان سے شہر لوٹ گیا تھا اور میں اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔

میرے لیے اب کارلٹن واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں واپس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں تمام حالات کے بارے میں سوچتا ہوا شہر کی جانب جا رہا تھا کہ ایک خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اسرائیلی حکام میرے اور فلسطینی افواجِ آزادی کے کارندوں کے درمیان نفرت اور عداوت کی خلیج پیدا کرنے کی کوششوں میں ناکام رہ چکے تھے۔ اپنا یہ مذموم مقصد حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مجھ پر مصنوعی قاتلانہ حملے کا ڈرامہ بھی اسٹیج کیا تھا۔ مگر محمود خاصا ہوشیار آدمی تھا۔ وہ بآسانی واقعات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اور میں بڑی مشکلات سے بچ گیا تھا۔

میں نے محمود سے ملاقات میں خود ہی قاضی ہادی کا پتہ صاف کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ محمود تل ابیب اور تل ابیب نہیں تو اسرائیل میں ضرور موجود تھا۔ اخبارات میں کارلوس کے قتل کی تفصیلات پڑھ کر اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اس قتل میں میرا ہاتھ تھا۔

اب اگر محمود یا اس کا کوئی کارندہ مجھے بھرے شہر میں قاضی ہادی کی گاڑی میں تنہا گھومتے دیکھتا تو لازمی طور پر یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ میں قاضی ہادی کے ہاتھوں بک گیا ہوں اور پھر غداری کے الزام میں شاید میرا پتہ ہی صاف کر دیا جاتا۔ میں ان خطوط پر جتنا سوچتا رہا اسی قدر میرے شبہات یقین میں بدلتے چلے گئے۔

قاضی ہادی فروٹ فارم پر میرا انتظار کیے بغیر جس طرح چلا گیا اس کی بنا پر مجھے یقین ہونے لگا کہ مجھ سے کسی اہم موضوع پر گفتگو محض ایک بہانہ تھا وہ مجھے اپنی باتوں میں الجھا کر اسی موڑ پر لانا چاہتا تھا کہ میں اپنی آزادی کا یقین کرنے کے لیے اس کی گاڑی میں روانہ ہو جاؤں اور فلسطینی افواجِ آزادی کے کارندے مجھے اس حال میں دیکھ کر میرے پیچھے لگ جائیں اور میری نگرانی کرنے والے سرکاری اہلکاران بھرپور طریقے پر ہاتھ ڈال سکیں۔

ابھی تک مجھ کو یہی اندازہ ہو سکا تھا کہ اسرائیلی حکام مجھے چارہ بنا کر فلسطینی افواجِ آزادی کے اسرائیلی مرکز کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے جو مقصد وہ براہِ راست حاصل نہ کر سکے، کارلوس کے قتل کے بعد قاضی ہادی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

میرے اس خیال کو اس امر سے بھی تقویت ملتی تھی کہ ہلٹن کے بیرے اور مسز فلورا اسمتھ کے بیان کے بعد کارلوس کے قتل کے بارے میں پولیس کو میری طرف آنا چاہیئے تھا۔ یہ اس لیے اور بھی لازمی تھا کہ تعارف کے دوران میں نے فلورا کو اپنا اصل نام بتادیا تھا مگر پولیس مجھے نظر انداز کر چکی تھی گویا ایک طرف سے رسی ڈھیلی چھوڑ کر دوسری جانب سے جال تنگ کیا جا رہا تھا۔

یہ سوچ کر میرے بدن کے مساموں کے دہانے کھل گئے۔ فلسطینی افواج آزادی کے کارکنوں کے ہاتھوں رڈرک کی بھیانک موت مجھے ابھی تک یاد تھی۔ وہ تل ابیب کی بھری پڑی شاہراہ پہ ایک پلاسٹک بم کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اس کی لاش کے چیتھڑے دور تک بکھر گئے تھے۔ جو بے جگر لوگ ایک اہم سرکاری کارندے کا یہ حشر کر سکتے تھے، میری وفاداری پر شبہ ہو جانے کے بعد اپنی تنظیم کے اجتماعی مفاد کی خاطر جو کچھ کر گذرتے کم تھا۔

میں نے شہری حدود کے آغاز سے قبل ہی مستانگ ایک بازار میں کھڑی کر دی اور کھڑکیاں دروازے مقفل کر کے ٹیکسی کے لیے سڑک پر آ گیا۔

ہوٹل میں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے ڈائرکٹری سے قاضی ہادی کے گھر کے تینوں فون نمبر نوٹ کیئے پھر ایک پبلک بوتھ سے اسے ٹیلیفون کر ڈالا۔

”مجھے یقین تھا کہ تمہاری بے اعتمادی جلد ہی ختم ہو جائے گی“ میرا نام سن کر وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا ”اب بتاؤ تم کب آنے کے لیے تیار ہو؟“

”کیا اب بھی میری آمد ضروری ہے؟“

”تم بول کہاں سے رہے ہو؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”ایک پبلک بوتھ سے!“

”پھر ٹھیک ہے، تمہاری آمد اب بھی ضروری ہے۔ مجھے بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔“

”وہ نمٹانے میں دوبارہ تمہارے فارم پہ گیا تھا مگر تم وہاں سے لوٹ چکے تھے!“

”اوہ! مجھے اتنی جلدی تمہاری واپسی کی امید نہیں تھی ورنہ ضرور انتظار کرتا“ فون پہ اس کی تحیر آمیز آواز سنائی دی۔

”تمہاری کار میں نے شہر میں داخلے سے قبل فروٹ مارکیٹ میں چھوڑ دی تھی۔ چابی میرے ہی پاس ہے جب چاہو آدمی بھیج کر منگوا سکتے ہو۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اس مرحلے پر یہ مناسب نہیں ہوگا کہ کسی فریق کو میرے اور تمہارے تعلقات کی بدلی ہوئی نوعیت کا علم ہو!“ اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

اس کا یہ تبصرہ میرے لیے حیرت کا باعث ثابت ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق تو اسے میرے اس اقدام کی مخالفت کرنی چاہیئے تھی مگر میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا کہ میں ہفتے کی شام چار بجے فروٹ فارم جانے کے لیے تیار رہوں گا وہ باقی انتظامات کر لے۔

اگلے روز میں دوکان پہ پہنچا تو گذشتہ روز کی غیر حاضری پر مجھ سے جواب طلبی ہوئی۔

”میں بیمار ہو گیا تھا!“

”تم غلط کہتے ہو۔ میں نے ہوٹل سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ تم اتوار کی شام سے وہاں سے غائب تھے اور رات بھر واپس نہیں لوٹے“ دوکان کے مالک نے میرا جھوٹ فوراً پکڑ لیا۔

”اتوار کی شام میں نے ایک دوست کے یہاں زیادہ پی لی تھی جس کا اثر پیر کی صبح تک رہا۔ وہ رات میں نے اسی کے گھر بسر کی تھی۔“

”دوست نر تھا یا مادہ؟“ وہ دوکاندار اس معاملہ میں بہت بدتمیز اور خبیث واقع ہوا تھا۔

”مرد ہی ہے۔“

”تو وہ کون ہے جو کل کئی مرتبہ تمہارے لئے پوچھتی رہی؟“ اس نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

”میرے لیے پوچھتی رہی؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں ــ شاید چار مرتبہ فون کیا تھا اس نے!“

”میں تو یہاں کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ کسی چلتی پھرتی لڑکی سے ملاقات بھی ہوتی ہے تو دوکان کا نمبر دینے یا ذکر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس معاملہ میں بہت محتاط ہوں!“

”اس لڑکی کی بے چینی کے پیش نظر میں نے کال ٹن فون کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری کوئی گاہک رہی ہو اور تم پہ اس کا دل آ گیا ہو۔ آج کل ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔“

”جی! میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ مجھے تو ایسا کوئی تجربہ نہیں۔“

”اب اس کا فون آئے تو اسے مایوس نہ کرنا، چاہو گے تو میں بھی ساتھ چلوں گا“ وہ ندیدے پن کے ساتھ بولا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کا فون آ گیا۔ اس وقت میں قریب ہی موجود تھا۔ میرے دوکاندار نے ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھ کر ہیجان آمیز سرگوشیانہ لہجے میں مجھ سے کہا ”وہی ہے، دیکھو دل نہ توڑنا اس کا ـــ اور ہاں اگر کوئی گنجائش ہو تو میرا بھی ذکر کر دینا۔“

میں نے بڑھ کر اس مردود کے ہاتھ سے فون لے لیا وہ حریصانہ انداز میں میرے قریب ہی کھڑا اس طرح رسیور کو گھور رہا تھا جیسے اسے رسیور میں سے لڑکی کے نکل پڑنے کی امید ہو۔

”صفدر اسپیکنگ!“ میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

”برقی کرسی سے تمہارا فاصلہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے!“ رسیور میں مجھے ماریا کی خشک آواز سنائی دی جو میں نے فوراً پہچان لی۔

”تو تم کل سے یہ بتانے کے لیے بے چین تھیں؟“

”ہفتے اور اتوار کی درمیانی رات تم کہاں تھے؟“

”میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔“

”مسز فلورا اسمتھ نام کی کسی عورت کو جانتے ہو؟“

”ہو سکتا ہے کہ کبھی ملاقات ہوئی ہو مگر ان باتوں کے لیے ٹیلی فون کی کیا ضرورت ہے۔ تم کوئی دوسرا مناسب طریقہ اختیار نہیں کر سکتیں؟“

”میں ماریا نہیں کیپٹن ماریا بول رہی ہوں صفدر!“ اس کی غراہٹ ابھری ”دیکھو! تم اس دوکان پر ملازم ہو۔ تمہاری کال سے یہ غلط فہمی بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ تم لڑکیوں کو پھانسنے کے لیے دوکان کے وسائل استعمال کرتا ہوں۔“

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

”بے ہودگی نہیں یہ حقیقت ہے کیپٹن۔ میرے آجر کو کل سے ہی شبہ ہو رہا تھا۔ چاہو تو تم ان سے بات کر سکتی ہو۔“

”مجھے کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ یاد رکھنا کہ اس مرتبہ اگر تم کسی خونریزی میں ملوث ہوئے تو اسرائیل میں تمہاری موت پر رونے والا نہ مل سکے گا۔“

”تو کیا تم بھی سنگدل ہو گئی ہو؟“ میں نے اسے چڑانے کیلئے کہا۔

”شٹ اپ!“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کون تھی؟“ میرے رسیور رکھتے ہی دوکاندار نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”ایک فوجی افسر ہے!“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”اس گفتگو پہ سرکاری رازوں کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو دہرادوں!“

”نہیں نہیں۔ میں ایسے کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا“ قانون کا ذکر آتے ہی وہ ایکدم بھڑک گیا۔

ماریا کے اس فون نے مسئلہ اور الجھا دیا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ کارلوس کے قتل کی تفتیش مقامی پولیس نے کی ہوگی اور پھر مسز فلورا اسمتھ کا بیان بھی لیا گیا ہوگا کیونکہ متوفی آخری بار اسی کی میز پہ دیکھا گیا تھا اور فلورا کے بیان میں میرا نام آنا لازمی تھا۔

اس کے بعد دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔ اوّل تو یہ کہ آرمی انٹیلی جنس بیورو نے مقامی پولیس کو میرے بارے میں اپنے خاص مقاصد کے تحت کوئی معلومات فراہم نہیں کیں اور اگر میرا ریکارڈ پولیس کے پاس بھی موجود تھا اسے مجھ سے دور رہنے کی ہدایت دے دی گئی تھی۔ ایسی صورت حال میں ماریا کے فون کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے تشدد کی مزید کارروائیوں سے روکنا چاہتی تھی کیونکہ ان لوگوں کے مقاصد کچھ بھی رہے ہوں امن عامہ کا مسئلہ ہر چیز پر افضل تھا۔

لیکن اس طرح میرا یہ مفروضہ غلط ثابت ہو جاتا تھا کہ قاضی ہادی اسرائیلی حکام کی شہ پر مجھ سے کوئی مہم بازی کھیل رہا ہے اگر قاضی ہادی کو ان کی طرف سے شہ ملی ہوئی تھی تو اسے مرحلے پر ماریا کو مجھے جھنجھوڑنے کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ مجھے اس روز دوکان پہ فون کرتی رہی جب میں قاضی ہادی کے فروٹ فارم پہ موجود تھا۔

اس سلسلہ میں جتنا سوچتا رہا میرا ذہن اسی قدر الجھتا چلا گیا۔ اتنے عرصے کی لاتعلقی کے بعد عین میری غیر حاضری والے دن مسلسل فون کرتے رہنے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے یہ باور کرایا جا سکے کہ قاضی ہادی کی پشت پر سرکاری ہاتھ نہیں ہے۔ ہر بات اور ہر کارروائی کے مثبت اور منفی پہلو موجود تھے اور میرے لیے فیصلہ کرنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

آنے والے دنوں میں میں نے پوری کوشش کی کہ ان مسائل کے بارے میں نہ سوچوں آنے والا وقت خود ہی فیصلہ صادر کر دے گا مگر پھر بھی ہر وقت ذہن میں وہی خیالات گھسے رہے۔

ذہنی اعتدال پر آنے کے ساتھ ہی مجھے قاضی ہادی کا کردار سلجھا ہوا نظر آنے لگا۔ گو میں اس پہ پوری طرح یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر بظاہر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اب تک اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے افعال سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

اس کے کردار کے بارے میں بس ایک ہی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ وہ خود کو اسرائیل میں فلسطینی مفادات کا سب سے بڑا نگران قرار دیتا تھا جب کہ حمود نے اسے آستین کا سانپ قرار دیا تھا اور خود مجھے بھی ہنری کے ساتھ اس کے رابطے کا ثبوت مل چکا تھا جب کہ مروان کے قہوہ خانے میں ملنے والے فلسطینی نے تو قاضی ہادی کو فلسطینی ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔

ہفتے کی شام ٹھیک چار بجے میں تیار ہو کر ہوٹل سے نکل آیا۔ فٹ پاتھ پر آتے ہی میرے قریب ایک ٹیکسی آ کر رکی جس کا ڈرائیور وہی تھا جس نے چھ دن پہلے اسکرو ڈرائیور کا آہنی دستہ مار کر مجھے بے ہوش کیا تھا۔ میں کچھ کہے بغیر اگلا دروازہ کھول کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور ٹیکسی حرکت میں آ گئی۔

کافی دیر تک شہر میں بے مقصد چکر لگانے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ ٹیکسی کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو اس نے ٹیکسی مقررہ راستے پر ڈال دی۔

”اس روز تم نے میرے سر پہ کیا چیز ماری تھی؟“ میں نے کافی صبر کے بعد آخر کار اس سے سوال کر ہی ڈالا۔

”ڈھلے ہوئے آہنی دستے والا اسکرو ڈرائیور تھا۔“

”وہ اسکرو ڈرائیور کم اور ہتھیار زیادہ معلوم ہوتا ہے۔“

”یہاں ہر ٹیکسی ڈرائیور اپنے ساتھ ایک نہ ایک ایسا اوزار ضرور رکھتا ہے جو دفاعی ہتھیار کا کام بھی کر سکے کیونکہ آتشگیر اسلحے پر یہاں سخت پابندی ہے۔“

”ذرا دکھیوں تو تمہارا ہتھیار!“

اس نے ہنستے ہوئے اپنے پہلو میں پائیدان سے وہ اسکرو ڈرائیور اٹھا کر مجھے دے دیا جس کا دستہ خاصا ایک ڈیڑھ پونڈ وزنی تھا۔

باقی راستہ خاموشی سے طے ہوا البتہ جب اس نے ٹیکسی شاہراہ سے کچے راستے پر اتارنے کے لیے آہستہ کی تو میں نے خاصی قوت کے ساتھ اس کی کنپٹی پر اسکرو ڈرائیور کا دستہ دے مارا اور وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر سیٹ پر ڈھلک گیا۔ میں نے اسٹیئرنگ فوراً ہی سنبھال لیا مگر پہلے سے اس کا پیر ہٹ جانے کے باعث گاڑی نے ایک تیز جھٹکا لیا اور انجن بند ہو گیا۔

میں نے نیچے اتر کر ڈرائیور کے بے ہوش جسم کو خالی سیٹ پر سرکایا اور خود اس کی جگہ سنبھال لی۔ فروٹ فارم میں قاضی ہادی پہلے سے میرا منتظر تھا گیٹ پر ٹیکسی کا ہارن سنتے ہی وہ عمارت سے باہر نکل آیا اور جب ٹیکسی نزدیک پہنچی تو مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

ٹیکسی رکنے سے پہلے اپنا بے ہوش آدمی بھی نظر آگیا اور اس نے مضطربانہ انداز میں مجھ پر سوال داغ دیا۔ ”اسے کیا ہوا؟“

”آئندہ یہ کسی مہمان کے سر پر ضرب لگاتے ہوئے احتیاط سے کام لے گا“ میں نے نیچے اترتے ہوئے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا“ وہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے تاسف آمیز لہجے میں بولا۔

”انتقام لینا میری کمزوری ہے۔ یہ اگر کئی برس بعد بھی مجھ سے ٹکراتا تو میں اس کا یہی حشر کرتا“ میں نے قاضی ہادی کو متاثر کرنے کیلئے کہا۔

”مگر اب ہم دوست ہیں!“

”ابھی تک ہمارے درمیان ایسی کوئی بات طے نہیں پائی ہے“ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر دوستی ہو ہی گئی تو روئے زمین پر تمہیں مجھ جیسا جاں نثار نہیں مل سکے گا“

جاتے ہی قاضی ہادی نے شراب کا دور شروع کر دیا۔ وہ قیمتی اور پرانی شرابوں کا رسیا تھا اور ہر قسم کی شراب کے بارے میں بھرپور معلومات رکھتا تھا۔

”اس روز ہم نے گفتگو کہاں چھوڑی تھی؟“ قاضی ہادی نے موضوع کی طرف آتے ہوئے دریافت کیا۔

”تم اپنے فلسطینی ہونے کا تذکرہ کر رہے تھے“ میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

”ہاں، تو تم جس پروپیگنڈے کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ میرے مخالفوں کا پھیلایا ہوا تھا اور مجھے اس کی پرواہ نہیں“ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ”تمہارے بارے میں جہاں تک مجھے علم ہے تم فلسطینی نہ ہونے کے باوجود ہمارے لئے گہری ہمدردی کے جذبات رکھتے ہو اور عملی طور پر بھی ... کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم نیک مقصد میں امتیاز کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھاؤ تاکہ ہماری تحریک کو تقویت مل سکے۔“

”تو کیا تم بھی یہاں کسی تحریک کے سربراہ ہو؟“

”یہاں فلسطینیوں کے تین گروپ کام کر رہے ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مقصد تینوں کا ایک ہی ہے مگر حکمت عملی ... اسرائیل میں رہ کر کام کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہاں حکام ہر وقت ... رہتے ہیں اس لئے تینوں ہی گروپ زیر زمین کام کر رہے ہیں۔ پاپولر فرنٹ کا اپنا طریقہ کار ہے۔ وہ اسرائیل کے اہم جنگی اور سرکاری رازوں کو عرب ممالک تک پہنچانے میں مگر اپنا یہ مقصد بہت ہی محدود پیمانے پر حاصل کر پا ... دوسرا گروپ فریڈم فائٹرز کہلاتا ہے۔ یہ عملی کارروائیوں سے گریز کرتا ... کبھی کبھار اسرائیلی مظالم کے بارے میں بھرپور تصویری کتابچے ... کر کے راتوں رات اسرائیلی بستیوں میں پھیلا دیتا ہے۔ تاکہ عام یہودیوں کو علم ہو سکے کہ ان کے اخبارات آئے دن فلسطینیوں کے ظلم و ستم کے جو من گھڑت افسانے شائع کرتے ہیں ان کے مقابلے میں ... کے اہلکار معصوم فلسطینی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر کیا ... ہیں اور ایک گروپ فلسطینی افواج آزادی کے نام سے اسرائیل میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہے جس کے ساتھ بدقسمتی سے تمہارا ... رابطہ ہے۔

یہ لوگ آئے دن کے دھماکوں اور آتش زنی وغیرہ کی کارروائیوں سے ہمارے کاز کو شدید نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان تشدد آمیز کارروائیوں کی وجہ سے مہذب دنیا میں ہمارا وقار مجروح ہو رہا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس گروپ کا رہنما ایک مقامی خود غرض جنونی انسان ہے۔ وہ اسرائیل کی سرحدوں میں فلسطین کے نام ... رکھنے کے نعرے کے نام پر بہت سے دوست ملکوں سے ... رقمیں وصول کرتا ہے جن کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا البتہ ... والے دوستوں کی تشفی کے لئے وہ ہر دو چار مہینے بعد اسرائیل ... نہ کوئی بڑا حادثہ کرا دیتا ہے اور فلسطینیوں کا نام مذمت آمیز شہ سرخیوں کی زینت بن جاتا ہے۔ تم خود بتاؤ کہ اس قسم کی حرکتیں کس حد تک ... کے مہذب ملکوں کو فلسطینیوں کے مسئلے کی طرف ہمدردانہ توجہ دینے پر مجبور کر سکتی ہے؟“

”عام حالات میں میں ایسی کارروائیوں کی شدید مذمت کروں گا“

”گڈ“ وہ چٹکی بجا کر میرے قریب سرک آیا۔ ”محمود ایک نیم پاگل ... ہے۔ اسرائیل میں وہ میری ذات کو اپنی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ... ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے تمہیں اکسا کر میری ٹوہ پر لگایا ہے ... ہوں کہ تم خود کوئی فیصلہ کرو اور اگر میری باتیں تمہیں بہتر معلوم ہوں تو اس تخریب کار کے مقابلے میں میرے ہاتھ مضبوط کرو۔“

”تم اسے سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

”وہ بجید شکی اور وہمی واقع ہوا ہے۔ اپنے سائے تک سے ... اور چھلاوے کی طرح اپنی کمین گاہیں بدلتا رہتا ہے۔ میں نے کئی بار اس سے ملنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میں تو خیر اس کا دشمن ہوں، اسے تو اس کے مخبر بھی آج تک نہ دیکھ سکے۔ خود تم سے بھی وہ کتنی بار ملا ہے؟“

”صرف ایک بار۔“

”وہ شاید ایک بار اس کی طرف سے تم پر ناکام قاتلانہ حملہ بھی ہو چکا ہے؟“

”وہ غیر یقینی سی بات ہے۔ اگر وہ مجھے مارنا ہی چاہتا تو بعد میں بہت سے مواقع تھے اور پھر تمہارے قتل پر وہ مجھے کیوں مامور کرتا؟“

قاضی ہادی بزرگانہ انداز میں ہنسا۔ ”ابھی تمہیں میرے بارے میں کوئی بھرپور تجربہ نہیں ہوا ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ میری راہ پر لگا کر در اصل اس نے تمہارا قصہ ہی ختم کر دینے کی کوشش کی ہے“

”مگر خود تمہارے بارے میں یہاں مختلف باتیں مشہور ہیں“

”مثلاً“

”تمہارے اسرائیلی حکام سے گہرے مراسم ہیں“

”اس لئے کہ میں نے کبھی مقامی قانون کو پامال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے بارے میں معلوم کرنا ہو تو یہاں پاپولر فرنٹ کے ذمہ دار لوگوں سے بات کرو جنہیں میرے مراسم کے طفیل بعض بے مثال کامیابیاں ہوئی ہیں۔ میں ہمیشہ ان کے کام آتا رہا ہوں“

”خیر مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ میں نے گفتگو کو اختصار دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تو گویا تم میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو“

”مجھے فلسطین کے مسئلے سے زیادہ اپنی سلامتی عزیز ہے“

”میں سمجھا نہیں!“

”میں ایک بار اس سے مل چکا ہوں اور ساتھ ہی میں اسرائیلی حکام کی نظروں میں بھی آچکا ہوں۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہو گا کہ کہیں میں اس کی گرفتاری کا سبب نہ بن جاؤں اور اس کا یہ خوف کسی روز میری موت کا سبب بھی بن سکتا ہے“

”میں تو خود تمہیں یہی بات سمجھا رہا تھا“

”میں اب کسی تحریک وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میں محمود کے سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”اسے زندہ یا مردہ ایک بار میرے سامنے لے آؤ!“

”میں یہ کام کر گزروں گا مگر میری بھی ایک شرط ہے!“

”وہ سنے بغیر منظور کرنے کو تیار ہوں!“

”اسرائیل سے اب میرا دل اکتا گیا ہے۔ میں یہ کام ہو چکنے کے بعد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں“

”اس کا میں وعدہ کرتا ہوں“ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا...

میں نے وہ رات قاضی ہادی کے ہمراہ اسی فارم پر بسر کی۔ وہاں عیاشی کے لئے تمام سامان اور لڑکیاں موجود تھیں اور بقول قاضی ہادی یہاں وں کی قسم کی ہیودی نسل تھیں جو محض بھاری مشاہروں کے لالچ میں اس کے اشاروں پر ناچنے کو تیار رہتی تھیں۔

اگلی صبح جب ہم روانگی کی نیت سے باہر آئے تو ٹیکسی ڈرائیور میرا منتظر تھا۔

”ہمارا حساب بے باق ہو چکا ہے“ میں نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا

”مجھے علم ہو چکا تھا جناب کہ آپ کو زیادہ چوٹ آگئی تھی“ چوک یہ ہوئی کہ میں معذرت کرنا بھول گیا اور اس وقت درد سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے“

تل ابیب کے نواح میں پہنچتے ہی میری چھٹی حس نے مجھے کسی بڑے حادثے سے آگاہ کر دیا۔ ہر طرف عجیب سی بے رونقی چھائی ہوئی تھی۔ اکا دکا مکانوں پر سیاہ پرچم لہرا رہے تھے اور سڑکوں پر فوجی گاڑیوں کی ہنگامی بھاگ دوڑ وحشت کا سماں باندھ رہی تھی۔

پھر ایک مکان کے گرد فوجی دستے کا گھیرا نظر آیا۔ وہاں دور تک تماشائیوں کی بھیڑ جمع تھی جو فلسطین کے خلاف نعرے لگا رہی تھی۔ اور اسرائیلی فوجی رائفلوں کے کندے مار مار کر اس مکان سے عورتوں، بچوں اور مردوں کو باہر سڑک کی طرف ہانک رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر میں نے ٹیکسی رکوا دی۔ لوگوں سے استفسار کے نتیجے میں پتہ چلا کہ پچھلی رات بم کے دھماکے میں مادام الیسی کی کار کے ٹکڑے اڑ گئے اور اس کی لاش کا بھی پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کتنے حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

شہر میں لوگ اس حادثے کا سوگ منا رہے تھے۔ تل ابیب میں.. فلسطینیوں کے کئی مکانات کو لوٹ کر نذر آتش کر دیا گیا اور فوج مشتبہ افراد کی گرفتاری کے لیے حرکت میں آگئی تھی۔

عام اسرائیلی شہریوں کے نزدیک مادام الیسی ایک سخی دل اور مہربان عورت تھی جو جنگی معذوروں کا محتاج خانہ چلاتی تھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مادام الیسی کا بھیانک روپ کرنل ریٹا کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اخبارات میں بھی اس کی موت کی خبروں میں اس کی شخصیت کے دوسرے روپ کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ہر جگہ اسے خدا ترس اور فرشتہ سیرت خاتون کے روپ میں ابھارا گیا تھا۔

ان بے گناہ فلسطینی عورتوں اور بچوں پر یہودی سپاہ کا ظلم دیکھ کر میرے وجود میں آگ سی بھر گئی۔ شروع سے آخر تک اسرائیلیوں کا ہر فعل منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اپنے کارندوں سے مجھ پر حملہ کرایا اور الزام حریت پسندوں کے سر ڈال دیا۔ انہوں نے بے شمار مجاہدین آزادی کی قاتل سے اپنے ساتھیوں کے لہو کا حساب چکایا تو اسے ایک دردمند خاتون کا بھیانک قتل قرار دے کر نفرت کی مہم چلائی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مشرق کے سینے میں واقعی ناسور ابھر آیا ہو۔ وہاں بسنے والے سازشی ذہنوں کے مالک تھے اور اپنے رسوخ کے سہارے انہوں نے پوری دنیا میں اپنی مفروضہ مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا۔

میں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ مجھ سے جہاں تک ممکن ہوا یہودی مفادات کو پامال کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کروں گا۔

ٹیکسی مجھے وہاں اتار کر جا چکی تھی میں پیدل ہی ایک طرف ہو لیا۔ میرے ذہن میں لاوا پک رہا تھا لیکن میں حالات کے شکنجے میں بے بس تھا....

اسی عالم میں، میں ایک فون بوتھ میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے کیپٹن ماریا کے دفتر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

وہ پہلی ہی کوشش میں لائن پر مل گئی۔

"کون ہے؟" میں نے آواز کو بھاری بنا کر سرد لہجے میں سوال کیا۔

"کیپٹن ماریا!" اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"تم نے کرنل ریٹا کی لاش کے ٹکڑے گننے کی کوشش کی ہے؟" میں نے نفرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"تت.... تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ ہکلا کر بولی۔

"اب تمہاری باری ہے!"

"نہیں.... نہیں" فون پر اس کی ہذیانی آوازیں سنائی دیں مگر میں نے ان پر توجہ دیئے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور باہر نکل آیا۔

اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسرائیل کے ہر ذمہ دار سرکاری اہل کار کو فون پر بے تحاشہ گالیاں سنا کر اسی قسم کی دھمکیاں دوں تاکہ اپنی جانوں کے خوف میں پڑ کر وہ جارحانہ رویے سے باز آجائیں۔

میں سر جھکائے بڑھتا رہا۔

اچانک کسی نے پہلو میں آ کر کندھا مارا۔ اس کی یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں لڑکھڑا کر زمین بوس ہوتے ہوتے بچا۔ میں نے غصے سے سر اٹھا کر اسے گھورا اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک گلی میں گھستا چلا گیا۔

میں نگاہوں کو پہچاننے میں غلطی کیسے کر سکتا تھا۔ اس اچانک ملاقات پر خوشی سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ مایوسی اور صدمے کی اس کیفیت میں مجھے شدت سے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جس سے باتیں کر کے میں اپنے دل کا غبار ہلکا کر سکوں۔

وہ شخص کافی دیر تک ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں بڑھتا رہا پھر ایک ویران گلی میں چوبی زینے میں گھستا چلا گیا۔ میں نے بھی دائیں بائیں کا جائزہ لیکر اس کی تقلید کی اور سیڑھیوں کے اختتام پر کھلے ہوئے دروازے میں بے دھڑک گھستا چلا گیا۔

مجھے لانے والا دروازے کی اوٹ میں میرا منتظر تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

وہ ایک تنگ و تاریک سیلن زدہ مکان تھا جس میں نیچی چھت والے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ شخص مجھے لے کر جس کمرے میں داخل ہوا وہاں چھت سے لٹکا ہوا پنکھا یکساں اور مسلسل شور کے ساتھ گردش کر رہا تھا اور پنکھے کے نیچے ایک چوبی تخت پر محمود بے فکری کے ساتھ لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

"آؤ ــ کیا حال ہے؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے لیٹے لیٹے پُرتپاک لہجے میں کہا

"خدا کا شکر ہے کہ اس وقت تم سے ملاقات ہو گئی ورنہ [illegible] پورے اسرائیل کو جہنم بنا دینے کا منصوبہ بنا رہا تھا" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم بہت بے جگر آدمی ہو صفدر ــ کارلوس کو تم نے ایسے مقام پر ذبح کیا جہاں اس پر ہاتھ ڈالنے کے تصور ہی سے [illegible] کانپ جائے"

"وہ تو چند سیکنڈ کی بات تھی۔ اگر مجھے ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا" یہ کہتے ہوئے میں نے چونک کر پوچھا۔

"کیا بات ہے تم اس طرح کیوں لیٹے ہوئے ہو؟"

"کرنل ریٹا کی گاڑی سے اڑنے والا ٹکڑا میری بائیں پنڈلی میں گھس گیا تھا۔ اگر میں نے زیادہ چلنے پھرنے کی کوشش کی تو زخم سے خون جاری ہو جائے گا" وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تو یہ کام بھی تم ہی نے انجام دیا ہے؟"

"نہیں ــ میں تو صرف آپریشن کی نگرانی کر رہا تھا میرے ساتھ وہاں تیرہ آدمی اور بھی موجود تھے"

"زخم کتنا گہرا ہے؟"

"بس ہڈی بچ گئی ہے" وہ مسکرا کر بولا۔

"تو کیا تنظیم کے ہمدردوں میں کوئی سرجن یا ڈاکٹر وغیرہ نہیں [illegible]"

"احمد نے بہت اچھی ڈریسنگ کی ہے" وہ اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ تو بتاؤ کہ تم نے مجھے کس لئے بلوایا ہے؟"

"کرنل ریٹا کے خاتمے پر مجھے جو بے پناہ مسرت ہوئی وہ تمہاری موجودگی کے بغیر ادھوری رہتی اور دوسری بڑی خبر یہ ہے کہ آرمی [illegible] والوں کی الیکٹرونک مشین بھی برباد کر دی گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"توڑ پھوڑ اور تخریب کاری کے لئے سدھایا ہوا ایک [illegible] پہنچا دیا گیا تھا۔ مشین برباد کرنے کے ساتھ ہی وہ خود بھی الیکٹرک [illegible] سے مر گیا۔"

"تمہارے پاس تو واقعی بڑی بڑی خبریں ہیں میرے پاس [illegible] ایک ہی اطلاع ہے کہ میں جسے مارنے کا قصد لے کر گیا تھا اس [illegible] دوستی ہو گئی ہے۔"

"قاضی سے؟" محمود نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

"اس کے فریب میں نہ آنا برادر۔" احمد گہری سنجیدگی سے بولا

"وہ حرام زادہ وقت پڑنے پر اپنی ماں کو بھی نیلام کر سکتا ہے۔"

اس پر میں نے محمود کو پوری تفصیل بے کم و کاست سنا دی۔

"خوب" میری کہانی سُن کر وہ ہنس دیا "تم نے اُسے دوسری ملاقات سے بے خبر ہی رکھا"

"میں نے اُسے صرف وہی باتیں بتائیں جو میری دانست میں اسے اسرائیلی حکام سے پہلے ہی معلوم ہو چکی ہوں گی" میں نے وضاحت کی "کارلوس کے مارے جانے کے بعد میرے لئے قاضی ہادی پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے اس سے دوستی کا اقرار کرنے میں ہی عافیت سمجھی"

"تو اب تم مجھے زندہ یا مُردہ اس کے حوالے کرو گے؟"

"وہ اپنے آقاؤں کے اشارے پر میرے ساتھ داؤ کھیل رہا ہے۔ تم دیکھنا کہ میں اس خبیث کا کیا حشر کرتا ہوں۔ وہ انتہائی گھناؤنے کردار کا مالک ہے"

"تم فکر نہ کرو، میں بھی اُسے بے نقاب کرنے پر تُل گیا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ ناروے میں اس کا ایک چچا زاد بھائی بندرگاہ پر قلی کا کام کرتا ہے۔ وہ اس کا واحد رشتے دار ہے جس کا بڑی مشکل سے کھوج نکالا گیا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ قاضی ہادی ناروے سے ہجرت کر کے اسرائیل آیا ہے اور شاید یہودی ہی ہے"

"آخر فلسطینی اس سے کیوں ملتے ہیں؟"

"اسرائیل میں رہنے والے حالات کے سامنے بے بس ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ پوری عرب دُنیا میں کہیں بھی اُس کے رشتے گُنبے کا سُراغ نہیں مل سکا مگر اُس کے اثر و رسُوخ سے سب ڈرتے ہیں۔ ابتدا میں دو آدمیوں نے اس سے ٹکر لی تھی اور اس کے اشارے پر اسرائیلی حکام نے انہیں دہشت پسند قرار دے کر فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا اور اُن کے اہل و عیال کو اُردن کی طرف دھکیل دیا گیا۔ ایسے حالات میں بھلا کون اسے چیلنج کرنے کی ہمت کر سکے گا"

"وہ تو یہ سمجھ رہا ہو گا کہ اس کا چچا زاد بھائی کہیں مر کھپ گیا ہو گا اگر اسے شُبہ بھی ہو جائے کہ وہ زندہ ہے اور اس کی اصلیت پر سے پردہ اٹھا سکتا ہے تو اُسے بھی مروا دے گا" احمد نے کہا۔

"نہیں۔ اب اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہو گا۔ ریڈ آرمی کے [illegible] کان اس معاملے میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے ہیں" محمود نے جواب دیا۔

"یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں مگر تل ابیب میں فلسطینی گھرانوں پر ستم کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس کا اختتام کہاں ہو گا؟ کرنل ریٹا کی موت پر سارے فوجی پاگل کتوں کی طرح فلسطینیوں کی تلاش میں نکل پڑے" میں نے انہیں شہر کی صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"مرنے والے اپنے مقدس خون سے فلسطین کی سرحدیں تعمیر کر رہے ہیں برادر!" احمد بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "میرا باپ اور تین چھوٹے بھائی اسی جدوجہد میں شہید ہو چکے ہیں مگر یہ حادثے بھی مجھے میرے راستے سے نہ ہٹا سکے"

"اور میں آج تمہیں بتاتا ہوں صفدر!" محمود بولا "ستر سٹھ کی جنگ میں یہودی میری دو دن کی بیاہی بہن کو اٹھا کر لے گئے تھے جس کا آج تک سُراغ نہیں ملا۔ میرے بوڑھے باپ کے بدن کو کیلوں کے ساتھ چوبی دروازے میں ٹھونک دیا گیا۔ میرے شیر خوار بھتیجے کو سنگینوں کی نوک پر اُچھالا گیا۔ پھر بھری پُری آبادی پر چاروں طرف سے بلڈوزروں نے یلغار کر دی۔ پناہ کے لئے بھاگنے والے بلڈوزروں کی زد میں آ کر کٹ گئے اور زخمیوں کو تو اسی ملبے میں روند ڈالا گیا" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز لرزنے لگی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ "تم بتاؤ کہ ایسے مناظر دیکھنے کے بعد یہ معمولی ظلم و ستم ہمیں کتنا دبا سکتے ہیں۔ دشمن کے علاقے میں رہنے والوں کو یہ ستم تو جھیلنا ہی ہو گا۔ ہاں جس روز کسی فلسطینی ماں نے اسرائیلیوں کے جوابی تشدد کے جواب میں فریاد کا نالہ بلند کیا اسی روز ہم خاموشی کے ساتھ اسرائیل کی سرحدوں سے نکل جائیں گے"

میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ میرا دل یہ کہانیاں سُن کر بوجھل ہو گیا تھا۔ ایک میں تھا کہ اپنی سیتا اور ہاتھ سے نکلے ہوئے پارس پتھر کے فراق میں دیوانہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف محمود جیسا پُرعزم نوجوان تھا جو اپنے سارے دُکھوں کو سینے میں سمیٹے اپنی قوم کی خاطر ایک بے مثال جہاد میں مصروف تھا۔

اسی وقت مجھے ماریا یاد آ گئی اور میں نے محمود کو بتا دیا کہ جنون کے عالم میں میں اُسے فون پر ریٹا جیسا حشر کی دھمکی دے چکا ہوں۔

"تشدد کا سلسلہ جلد ہی ختم نہ ہوا تو ماریا ہی کیا ہمیں نجانے کتنے سفاک لوگوں کو ٹھکانے لگانا ہو گا۔ پھر تو تل ابیب کے گلی کوچوں میں آگ ہی آگ نظر آئے گی" محمود مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

"زخم بھرنے تک تم یہیں آرام کرو گے؟" میں نے محمود سے سوال کیا

"زخم بھرنے تک تو میرا یہاں پڑے رہنا ناممکن ہے۔ ہاں شاید ایک دو روز احتیاط کرنا پڑے گی"

"تم چاہو تو میں تمہاری دیکھ بھال کے لئے یہاں ٹھہر سکتا ہوں"

"میرے لئے احمد کی موجودگی کافی ہے۔ دو آدمیوں کی ضروریات کا سامان لانے لیجانے کے سبب وہ کسی کی نظروں میں آ جائے گا۔ اس کے علاوہ تمہاری ملازمت بھی میرے لئے اہم ہے۔ وہ دُکان ہمارے لئے پیغام رسانی کا محفوظ مرکز بن سکتی ہے"

"آجکل ہمارے آدمی کون سا شناختی لفظ استعمال کر رہے ہیں؟"

"وہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باہمی ملاقاتوں کا سلسلہ کچھ عرصہ بعد شروع کیا جائے گا کیونکہ ان دنوں پولیس بہت فعال ہو گئی ہے"

"تم سے رابطہ منقطع ہو جانے پر مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے"

"مجھ سے ملنا چاہو تو مرکزی ہیکل کے دروازے کے داہنے ستون کے

ساتھ بیٹھے ہوئے فقیر کو کوئی سکہ دے کر یہ دعا کی درخواست کرنا وہ تمہاری رہنمائی کر سکے گا۔"

"کیا وہ تمہارے ٹھکانے سے واقف ہوتا ہے؟"

"کیا اس سوال کا جواب بہت ضروری ہے؟" اس نے مسکرا کر نرم لہجے میں پوچھا اور میں معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

احمد نے پوری احتیاط سے کام لے کر مجھے اس عمارت سے نکال دیا اور میں تیزی کے ساتھ قریب ترین موڑ گھومتا ہوا اس عمارت سے دور بھول بھلیوں میں نکل گیا۔ مجھے کسی قیمت پر یہ بات گوارا نہیں تھی کہ میری وجہ سے محمود کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے۔

میں تیسرے پہر کے قریب کارلٹن پہنچا تو کاؤنٹر سے پتہ چلا کہ کوئی لڑکی میرے کمرے میں میری منتظر ہے۔ میرے استفسار پر کلرک نے بتایا کہ وہ ہرگز میرے کمرے کی چابی اسے دینے پر آمادہ نہیں تھا مگر لڑکی نے منیجر کے کمرے میں جا کر نجانے کیا بات کی کہ اس نے فوراً ہی چابی اس کے حوالے کر دی۔

کمرے میں جانے سے پہلے میں نے انٹرکام پر اس لڑکی سے بات کرنی مناسب سمجھی کیونکہ منیجر کمرے میں موجود نہیں تھا جو مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاتا۔

پہلی ہی گھنٹی پر دوسری جانب سے جو آواز سنائی دی وہ میرے لئے شناسا تھی۔ ماریا کی آواز میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

"میں اوپر آ رہا ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ماریا فوجی یونیفارم کے بجائے اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس میرے سامنے موجود تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی مگر چہرہ اترا ہوا لگ رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے برقی کرسی سے میرا تازہ ترین فاصلہ ناپنے آئی ہو۔" میں نے اسے راستے سے ہٹاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مذاق نہ کرو۔ میں اس وقت ایک بہت اہم مسئلہ لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔" وہ میرا بازو تھام کر خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

"مسئلہ لے کر میرے پاس آئی ہو؟" میں نے پلٹ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "تم صاحب اقتدار اور میں عاجز بندہ۔ بھلا میں کون سا مسئلہ حل کر سکتا ہوں؟"

"یہ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔" وہ بڑی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "خدا کے لئے سنجیدگی سے میری بات سنو۔"

اس کے ان سہمے ہوئے الفاظ نے مجھے پریشان سی صورتحال میں مبتلا کر دی مگر میں نے بدستور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے لباس بدلنے دو۔ میں اس وقت تھکا ہوا اور دل گرفتہ ہوں۔"

"تمہیں پتہ ہے ناکہ کرنل ریٹا کو کچھ ... نے بم سے اڑا دیا گیا؟"

وہ بولی۔

"کرنل ریٹا؟" میں نے دوبارہ مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "شہر میں تو کسی مادام ایبی کا تذکرہ ہے جو جنگی معذوروں کا محتاج خانہ چلایا کرتی تھی۔"

"وہ کرنل ہی کی شخصیت کا دوسرا رخ تھا۔"

"اور ... جبھی فوجی دستے اور پولیس پارٹیاں فلسطینیوں ... پکڑ رہی ہیں۔"

"مجھے فون پر دھمکی دی گئی ہے کہ ریٹا کے بعد میری باری ہے۔"

"یعنی ... یعنی اگلا شکار تم ہو گی؟"

"میں مرنا نہیں چاہتی صفدر! خدا کے لئے میرے واسطے ..."

"میں کیا کر سکتا ہوں ماریا؟" میں نے ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "دھمکی دینے والے نے تمہیں اپنا کوئی پتہ نشان بتایا ہے؟"

"بتایا تو نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ یہ فلسطینی افواج آزادی کی حرکت ہے۔ تم اس کے سرغنے سے واقف ہو۔ خدا کے لئے اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔"

"میں طویل عرصے سے اس سے لاتعلق ہوں۔ پھر یہ رائے تم نے کس بنا پر قائم کی ہے؟"

"اسرائیل میں دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں ہمیشہ یہی لوگ ملوث رہے ہیں۔"

"اگر یہ بات درست ہے تب بھی میں اس کا کھوج کیسے لگاؤں گا؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم اس کے ٹھکانے سے واقف ہو۔"

"مجھ پر شبہ ہے تو ایک بار پھر ای ایچ پی آزمالو۔ جھوٹ اور سچ کا پتہ چل جائے گا۔"

"اس کا ذکر نہ کرو۔ وہ مشین ویسے بھی برباد ہو چکی ہے۔" وہ ... لہجے میں بولی۔ "مجھے بچالو صفدر ... مجھے موت کے نام ہی سے دہشت آتی ہے۔"

"مگر پہلے تو تم نے مجھے کئی محاذوں پر اپنے کارناموں کے سلسلے سنائے تھے۔"

"وہ سب جھوٹ تھا۔ میں نے آج تک حقیقی محاذ کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مجھے سارے تمغے انتظامی اور سراغ رسانی کے شعبوں میں ملے ہیں۔"

میں چند ثانیوں تک پُرخیال انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر بولا۔ "یہ بہت ٹیڑھا مسئلہ ہے ماریا ... اول تو اس کا سراغ لگانا مشکل ہے پھر یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے دیکھتے ہی وہ شوٹ کر دے کیونکہ میں نے اس کے بہت سے راز تم تک پہنچائے ہیں اور وہ مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ بھی کرا چکا ہے......"

"وہ حملہ اس کی طرف سے نہیں تھا۔" وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔ "وہ تمہیں خوفزدہ کرنے کے لئے ہمارے ہی ایک شعبے کی منصوبہ بندی تھی۔"

وہ بے بعد ... میرے سامنے کئی خفیہ باتوں کا اعتراف کر چکی تھی۔ مادام ایبی اور کرنل ریٹا کی شخصیت کا راز، ای ایچ پی کی بربادی، اور پھر مجھ پر مصنوعی حملے کی منصوبہ بندی۔

یہ باتیں ایسی تھیں کہ مجھے اس کے بارے میں سوچنا پڑ گیا۔ موت کی دھمکی سے وہ واقعی بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔ یہ میرا مقدر ہی تھا کہ جنون اور خفقان کے عالم میں کیا ہوا یہ مقصد فون اس طرح کارآمد ثابت ہو رہا نظر آ رہا تھا۔ اب یہ میرا کام تھا کہ میں اسکے بارے میں ماریا سے بھرپور موثر بازی کرتا۔

"اور وہ لوگ کرنل ریٹا کے تو اس لئے دشمن ہوئے تھے کہ وہ گرفتار شدہ فلسطینیوں پر بے پناہ تشدد کراتی تھی۔" مجھے خاموش پا کر وہ پھر بولنے لگی۔ "مگر تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ میں ایسے وحشیانہ تشدد کے خلاف تھی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ جب راڈرک کی موت کے بعد ہنری فلسطینیوں پر تشدد کرا رہا تھا تو میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔"

"میرے سامنے صفائی پیش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ماریا۔" میں نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ محمود سے رابطہ قائم کیا جائے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو ایک بات کہتے ہیں تو ہر قیمت پر کر گزرتے ہیں۔ آخر وہ کس بنیاد پر تمہارے قتل سے دستبردار ہو جائے گا؟"

"تم اسے سمجھا سکتے ہو۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہ تمہاری سفارش کے چکر میں کہیں میں ہی اس کے ہاتھوں نہ مارا جاؤں۔"

ماریا کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا اور آنکھوں میں خوف کے سائے لرزاں تھے۔ "دیکھو صفدر! تم خود کہہ چکے ہو کہ اسرائیل کی سرزمین پر میں تمہاری زندگی میں داخل ہونے والی پہلی عورت ہوں۔ کیا اس پہلی عورت کی ایسی دردناک موت پر تمہیں افسوس نہ ہو گا۔"

"تم تو مجھے اس طرح سمجھا رہی ہو جیسے تمہیں موت کی دھمکی دینے والا میں ہی ہوں۔"

"میں تمہیں احساس دلا رہی ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان ناجائز ہی سہی مگر ایک رشتہ ضرور ہے اور میں ہمیشہ تمہاری ہدایات پر عمل کروں گی۔ تمہیں میرے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھ کر کوئی حل ڈھونڈنا چاہئے۔"

"اس معاملے میں میری عقل کوئی کام نہیں کرتی۔"

"تو سنو!" وہ بہت نیچی رازدارانہ آواز میں بولی۔ "اگر وہ مجھے اپنی فہرست سے خارج کر دے تو میں یہودیوں کے مفادات کے لئے کام کرنے کو تیار ہوں۔" موت کے حقیقی خطرے نے اسے یکبارگی میرے قدموں میں لا ڈالا۔

"یعنی تم ...... !"

اس نے مضطربانہ انداز میں میری بات اچک لی۔ "قیاس آرائی نہ کرو صفدر ... میں اس کے لئے وہاں ہر کام کروں گی ... کے عوض میں اس کی غلامی قبول کرنے کو تیار ہوں۔"

"یہ پیشکش شاید اسے اپنا ارادہ بدلنے پر آمادہ کر دے۔" میں نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اور اسے یہ بھی بتا دینا کہ اگر اس نے میری پیشکش ٹھکرا دی، تب بھی وہ مجھے شکار نہ کر سکے گا۔ میں زہر کھا کر خودکشی کر لوں گی۔"

"ایسی مایوسانہ باتیں نہ کرو ماریا ... دعا کرو کہ میں اس تک بخیر و عافیت پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

اُس روز پہلی بار میں نے ماریا کو ایک لڑکی کے روپ میں دیکھا۔ محمود کی جانب سے ملنے والی موت کی فرضی دھمکی نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے۔ اب نہ فوجی دبدبہ تھا نہ بے جگری کا ناز۔ میری باہوں کا سہارا پا کر وہ کسی عام سی بے آسرا لڑکی کی طرح یوں بلک کر رو دی جیسے اسے کسی جانب سے بھی زندگی کی موہوم سی امید باقی نہ رہ گئی ہو۔

وہ یہودن اس روز میرے لئے سراپا انعام بنی ہوئی تھی۔ اسے نہ میری کسی فرمائش پر اعتراض تھا نہ میری شوریدہ حرکتوں سے شکایت تھی۔ دردی وہ خود گم چھوڑ آئی تھی اور اس کا سہارا پندار میں نے پاش پاش کر دیا تھا۔ احساس برتری مٹ جانے کے بعد وہ لڑکی یکبارگی میرے لئے بہت زیادہ پرکشش اور دلربا ہو گئی تھی۔

"اب میں کب تمہارے پاس آؤں؟" واپس چلنے سے پہلے اس نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"روز آیا کرو۔" میں نے میٹھی اور آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"خدا کے لئے سنجیدگی سے بات کرو۔"

"تو جب جی چاہے چلی آیا کرو۔ اس کمرے کے دروازے تم اپنے لئے ہر وقت کھلے پاؤ گی۔ میں اپنے دوستوں سے کبھی نظریں نہیں پھیرتا۔"

"میں جلد از جلد محمود کا جواب جاننا چاہتی ہوں۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ اس تک میری رسائی بہت مشکل ہے۔ مجھے اس کے ٹھکانے کا علم نہیں۔ اس کے علاوہ میں دانستہ کسی آتش فشاں میں نہیں کود سکتا۔ مجھے پوری احتیاط کے ساتھ اس کا کھوج لگانا ہو گا اور اسے اپنی وفاداری کا محفوظ فاصلے سے یقین دلانا ہو گا۔ ورنہ وہ مجھے دیکھتے ہی ہلاک کر دے گا۔"

"تم یہ کام فوراً شروع کر دو۔" وہ اضطراری انداز میں بولی۔ "دو دن میں اس کا پتہ چل جائے گا۔"

"یہ مشکل ہے ماریا۔" میں نے سر کو جنبش دے کر کہا۔ "تم جانتی ہو کر میں ایک دکان پر ملازمت کر رہا ہوں۔ وہاں سے جو وقت بچے گا میں وہی تمہارے کام میں صرف کروں گا، اور اگر محمود کا پتہ چلنا اتنا ہی آسان ہوتا تو ... اسرائیلی ... کام یوں اندھیرے میں نہ بھٹکتے رہتے۔"

"حکام کی بات نہ کرو۔" وہ چڑ کر بولی۔ "ان کے لئے محمود ابھی تک ایک سایہ ہے۔ اس کا نام سب جانتے ہیں مگر اسے دیکھا کسی نے بھی نہیں۔ جب

کرتم ایک بار اس سے مل چکے ہو رہی دوکان کی بات تو میں اپنے طور پر بالا ہی بالا تمہیں دو چار رشتے کی تھیلی دلا سکتی ہوں۔"

"اور میری نگرانی کرنے والوں کا کیا بنے گا؟"

"اب ایسے بچے بھی نہ بنو۔" وہ داہنے کان کی لو سہلاتے ہوئے بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم جب چاہو انہیں غوطہ دے سکتے ہو۔"

"اگر چھٹی مل سکتی ہے تو میں اس کام پر پوری توجہ دے سکوں گا۔"

"آج کی شام تمہارے پاس ہے اس کے بعد تمہیں دو دن ملیں گے۔ میں پرسوں رات کو تمہارے پاس آؤں گی۔" اس نے آخری فقرے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہارے مفاد میں ایک مشورہ بھی دوں گا۔"

"وہ کیا؟"

"فلسطینیوں پر تشدد اور ظلم کا جو سلسلہ چل پڑا ہے جلد از جلد ختم ہونا چاہیئے۔" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مشکل ہے۔" اس نے بے بسی کے ساتھ کہا۔ "کرنل بیٹا کے قتل نے اس سب کو پاگل کر دیا ہے۔ جب تک دس بیس فلسطینیوں کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے نہ پہنچایا جائے گا یہ لہر جاری رہے گی۔"

"یہ حرکات محمود کو اشتعال دلاتی رہیں گی۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے معاملے میں بھی سخت موقف پر اڑ جائے۔"

"اگر میرے قتل کے لئے یہ شرط ضروری ہوتی تو شاید میں اسے کبھی پورا نہ کر سکوں گی۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔ "فلسطینیوں کے خلاف تشدد اور انتقام کی لہر جن لوگوں کے اشارے پر شروع ہوئی ہے وہ میری رسائی سے بہت بلند ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ ان کی آنکھوں کو کھولنے کے لئے محمود تم سے پہلے کسی بڑے شخص پر ہاتھ ڈال دے۔"

"یہ ہرگز اس کے مفاد میں نہ ہو گا۔" کیپٹن ماریا مضطربانہ لہجے میں بولی۔ "شاید تمہیں علم نہیں کہ ان دنوں ایک چھاپہ مار بریگیڈ کو صرف اس بات کی تربیت دی جا رہی ہے کہ وہ اسرائیل سرحدوں کے پار فلسطینی گوریلوں کے خلاف مختصر وقت میں تباہ کن کارروائیاں کر کے اپنے ٹھکانوں پر آ سکیں۔ اگر محمود نے کوئی نیا قدم اٹھایا تو شام اور لبنان کے فلسطینی کیمپ جہنم بنا دیئے جائیں گے۔"

"یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔" میں نے گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں محمود کا سراغ لگاؤں۔"

چند لمحوں کے بعد ماریا واپس چلی گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں بھی ہوٹل سے نکل پڑا۔ ملیا کے بارے میں میں نے جو کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کی اطلاع محمود تک پہنچانی بہت ضروری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ زخمی ہونے کے بعد وہ جس کمین گاہ میں چھپا ہوا ہے وہاں سے اگلے روز تک نکلنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ اگر میں یہ وقت ضائع کر دیتا تو پھر مرکزی ہیکل کے دروازے پر پہنچنے والے شخص [illegible] اس تک رسائی ہو پاتی جبکہ دن گزرنے سے قبل میں اس کمین گاہ [illegible] مل سکتا تھا۔

کارلٹن ہوٹل سے باہر آنے کے بعد میں کافی دیر تک [illegible] ویران سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا رہا۔ جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ میرا [illegible] نہیں کیا جا رہا تو میں اپنی یادداشت کے سہارے اس راستے [illegible] کی پناہ گاہ کی طرف لے جاتا تھا۔

تل ابیب کی ویران سڑکوں پر فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت بدستور [illegible] شہر یوں لگتا تھا جیسے خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا [illegible] لمحے کہیں بھی کوئی بھی بہت خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹ [illegible] میں تل ابیب کے قدیم علاقے میں واقع عربوں کی [illegible] قریب سے گزرا تو گھروں سے ابھرنے والی نالہ و فریاد کی آوازوں سے میرا دل لرز اٹھا۔

شہر پر شام کا دھندلکا پھیلا چلا تھا۔ سڑکوں پر روشنیاں جل [illegible] مگر اس بستی پر گہری ماتمی تاریکی کا راج تھا۔ عورتوں اور بچوں کے بین [illegible] محسوس ہو رہا تھا۔ بستی کے گرد کئی فوجی ٹرک کھڑے ہوئے تھے [illegible] گنوں سے مسلح فوجی سوار تھے اور ٹرکوں پر نصب ہلکی مشین گنوں [illegible] بستی کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

میں بھاری دل کے ساتھ ان ٹرکوں سے دور سے ہی گزرتا چلا گیا [illegible] کے قریب سے گزر کر میں کوئی ناگہانی مصیبت مول لینی نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں اس ویران گلی میں پہنچ گیا جہاں ایک بوسیدہ [illegible] محمود پناہ گزین تھا۔ اس گلی میں روشنی کا انتظام نہ ہونے کے سبب اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں آوارہ کتے نالیاں سونگھتے پھر رہے تھے [illegible] مکان کے باہر تین بچے کھیلنے میں مصروف تھے۔

میں ان بچوں کو نظر انداز کرتا ہوا اندھیرے کی آڑ میں آگے [illegible] پھر جونہی میرا جانا پہچانا ویران چوبی زینہ نظر آیا، میں پھرتی سے [illegible] میں نے فوری طور پر سیڑھیاں چڑھنے کی حماقت نہیں کی [illegible] کی اوٹ میں گہری تاریکی میں دبکا کھڑا رہا۔ میری نگاہیں سیڑھیوں [illegible] اختتام پر نظر آنے والے بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں [illegible] بالکل سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔

چند ثانیوں بعد میرے اعصاب قدرے پُرسکون ہو گئے تو [illegible] دروازے کی اوٹ سے نکلا اور پنجوں کے بل بے آواز [illegible] عبور کرنے لگا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے زینے عبور کرتے ہوئے کوئی [illegible] پیدا کی تو محمود کا میزبان کہیں اضطراری کیفیت میں مجھے [illegible] ٹھکانے ہی نہ لگا دے۔ میرا ارادہ تھا کہ زینے عبور کرنے [illegible] بند دروازے پر دستک دوں گا اور جیسے ہی اندر کسی کی آہٹ [illegible] سنائی دی [illegible] گی بتاتا دوں گا تاکہ میں اندھیرے میں آنے والے کے شبہات کا شکار نہ بن سکوں۔

دروازے پر دستک میں نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے مجھے کسی عمر رسیدہ عورت کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی جس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

"دروازہ کھولو۔" میں نے اس عورت کی غیر متوقع اور بچی آواز کے باوجود دھیمی آواز میں کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بوڑھی عورت محمود کے روپ میں کیا کر رہی تھی۔

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اندر چلے آؤ۔"

میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور وہ کھلتا چلا گیا اور میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔

یہ وہی تنگ اور سیلن زدہ مکان تھا۔ نیچی چھت والے اس کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے یرقان زدہ برقی روشنی کی کرنیں مختصر سے صحن میں پڑ رہی تھیں جس میں ایک دوپہر کو محمود سے مل چکا تھا۔ اس کے برابر والا کمرہ تاریک اور ویران پڑا ہوا تھا۔

میں جھجکتے ہوئے روشن کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں زرد روشنی والا ہلکی قوت کا ایک دیوار گیر بلب جل رہا تھا اور چھت سے لٹکا ہوا پنکھا ایک مسلسل آواز کے ساتھ اسی طرح گردش کر رہا تھا جس طرح میں اسے دوپہر میں دیکھ چکا تھا۔

سب چیزیں میری دیکھی بھالی تھیں مگر حیرت اس بات کی تھی کہ اس وقت چوبی تخت پر محمود کے بجائے ایک عمر رسیدہ عورت لیٹی ہوئی تھی اور کمرے میں پھیلی ہوئی ناکافی روشنی میں بار بار پلکیں جھپکا کر مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اندر قدم رکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ اس وقت وہاں وہ بوڑھی تنہا تھی۔ مجھے شدید حیرت تھی کہ زخمی ہونے کے باوجود محمود کہاں غائب ہو گیا اور پھر اس کی تیمارداری کرنے والے احمد کا بھی کہیں پتہ نہیں تھا۔

"تم کون ہو لڑکے؟ میں تمہیں پہچان نہیں سکی۔" اس عورت کی کانپتی ہوئی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے کھینچ نکالا۔

"میں شاید غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "میرا خیال تھا کہ یہ میرے ایک دوست کا مکان ہے۔"

"خوب!" وہ بڑھیا کہنیوں کا سہارا لے کر بستر سے اٹھ گئی۔ "تمہارے اس خیال کی وجہ کیا تھی۔ شاید تم ضرورت سے زیادہ پی گئے ہو۔"

"معاف کیجئے خاتون! میں نشے میں نہیں ہوں۔" میں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ برابر والے مکان میں رہتا ہو۔"

"برابر والے مکان میں!" بڑھیا نے یہ کہہ کر مضبوطی سے میرا دایاں ہاتھ تھام لیا اور براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "احمق! شاید تجھے یہ معلوم نہیں کہ پوری گلی میں میرا زینہ سب سے مختلف ہے۔ یہاں ہر مکان کے زینے کنکریٹ کے ہیں جبکہ میری سیڑھیاں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ مجھے تو صورت سے تو کوئی چور اچکا معلوم ہوتا ہے۔"

"ممکن ہے کہ میں کسی غلط گلی میں آ گیا ہوں۔" میں نے اس کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سیدھا کھڑا رہ۔" وہ میرا ہاتھ جھٹک کر غصیلے لہجے میں بولی۔ "اگر زور زبردستی کی تو ابھی شور مچا دوں گی اور محلے والے جوتیاں مار مار کر تیری چندیا صاف کر دیں گے۔"

"میں اس ملک میں اجنبی ہوں محترم خاتون!" میں بوکھلا کر عاجزانہ لہجے میں بولا۔ "میں نے اپنے دوست کا مکان صرف ایک بار دیکھا تھا اس لئے دھوکا کھا گیا۔ میں یہاں کسی بُری نیت سے نہیں آیا۔ آپ مجھے واپس جانے دیں تو بڑی عنایت ہو گی۔"

وہ ہونٹ بھینچے مسلسل مجھے گھورے جا رہی تھی۔ میرے خاموش ہوتے ہی بول پڑی۔ "نام کیا تھا تیرے دوست کا؟ میں اس گلی کے بچے بچے کو جانتی ہوں۔"

"منصور۔" میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام دہرا دیا۔

بڑھیا چند ثانیوں تک ذہن پر زور دیتی رہی پھر مایوسانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر بولی۔ "یہاں تو دور دور تک اس نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔"

"میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا آپ فکرمند نہ ہوں۔" میں نے اس سے اپنی جان چھڑانے کے لئے جلدی سے کہا۔ "بس مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔"

"ایسے تو ہرگز نہ جانے دوں گی۔"

"آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟"

"آج کل بہت خراب زمانہ آ گیا ہے۔" بوڑھیا میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "جوان لڑکیوں نے ہر طرف زہر پھیلا دیا ہے۔ پہلے میں گھروں میں کام کر کے کچھ کما لیا کرتی تھی لیکن اب لوگ جھاڑو برتن کے لئے بھی جوان لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ گھر کا کام الگ ہوتا ہے اور بیوی ذرا بھی چوک جائے تو مرد ان لڑکیوں کے ساتھ گلچھرے اڑانے لگے ہیں۔"

"تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"اب تم آ ہی گئے ہو تو کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا۔"

میں نے اپنے پرس سے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ بڑھیا نے وہ نوٹ تو لے لئے مگر میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ "تم جوان ہو، اگر تھوڑا سا محنت کرو گے تو بہت کچھ کما لو گے۔ یہ بڑا بھی تم سے دو اس میں خاصی بلند معلوم ہوتی ہے۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا بڑی بی؟"

"تو تیار ہو جاؤ میں ابھی شور مچاتی ہوں۔" وہ متکبرانہ لہجے میں بولی۔ "میری

ذرا سی آواز پر سارا محلہ باہر آ جائے گا۔"

"اس سے زیادہ میں نہیں دے سکتا۔" میں نے پانچ پونڈ کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"میں زبردستی نہیں کر رہی۔" وہ نوٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر بولی "اگر نہیں دے سکتے تو نہ دو۔ ٹھوکریں کھانے اور پھر حوالات جانے کے لئے تیار رہو۔"

میں نے اس سے خاصی بحث کی مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس کی دھمکی میرے حالات کے پیش نظر [illegible] مجھے ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی۔ بڑھیا کی رقم لینے کے بعد اس نے [illegible] میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اب کم از کم اتنا بتا دو کہ تم صبح سے اسی مکان میں ہو؟" بڑھیا کی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"چار دن سے باہر گئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تھکی ہاری واپس آئی ہوں۔" یہ کہتے کہتے وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی "ایسا تو نہیں کہ تمہارا وہ نابکار دوست میری عدم موجودگی میں میرا مکان استعمال کرتا رہا ہو؟"

"نہیں، مجھے پورا یقین ہے وہ اس مکان میں نہیں تھا۔" میں نے اپنا حلق تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس کے مکان میں تو بجلی بھی نہیں تھی۔"

"پھر تو وہ پچھلی گلی میں رہتا ہوگا۔ بغیر بجلی والے کچے مکان اسی طرف ہیں۔" وہ نوٹ اپنے بلاؤز میں اڑستے ہوئے بولی۔

"شکریہ، میں اسے وہیں تلاش کر لوں گا۔" میں یہ کہہ کر تیزی سے واپس چل دیا۔

میں نے بڑھیا سے جھوٹ بول کر اپنی جان بچا لی تھی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ محمود اسی مکان میں روپوش تھا اور شاید بڑھیا کی غیر متوقع آمد کے باعث اسے اپنے زخم کی پرواہ کئے بغیر وہاں سے فرار ہونا پڑ گیا تھا۔

محمود کے نئے ٹھکانے کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اب یہی صورت [illegible] مرکزی ہیکل کے دروازے پر بیٹھنے والے [illegible]

محمود کے [illegible] کہے ہوئے الفاظ اس وقت مجھے شدت سے یاد آ رہے تھے [illegible] دشمن ہو یا دوست [illegible] کسی چھلاوے کی طرح [illegible] رہتا ہے۔

[illegible] سے اپنے خون کے پیاسوں میں گھرا ہوا تھا [illegible] کی طرح مارا گیا ہوگا۔

میں کوشش کے [illegible] ایک ٹیکسی کے ذریعے واپس ہوٹل آ گیا۔

وہاں پہنچا تو [illegible]

میرے پاس [illegible] فون

کر چکا تھا۔ پھر اپنا نام بتائے بغیر اس نے اپنا فون نمبر چھوڑا تھا [illegible] اس سے رابطہ قائم کرنا تھا۔

میں نے کاؤنٹر ہی سے وہ نمبر ڈائل کر لیا۔ دوسری جانب [illegible] بجتے ہی ایک بھاری بھرکم آواز نے [illegible] جواب دیا۔

"میں صفدر بول رہا ہوں۔"

"اوہ! میں تم سے بات کرنے کے لئے بے چین تھا [illegible]"

مجھے ریسیور میں قاضی ہادی کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ شاید [illegible] کرنے والے کے قریب ہی موجود رہا ہوگا "یہ بتاؤ کہ تم اتنی دیر سے کہاں غائب تھے؟"

"میں ایک اہم کام سے نکلا ہوا تھا۔" میں نے [illegible] آپریٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں ابھی ابھی واپس آیا [illegible] پیغام ملتے ہی کاؤنٹر سے تمہارا نمبر ملایا ہے۔"

"اوہ ـــ تو آپریٹر تمہارے قریب موجود ہے۔" [illegible] لے کر بولا "خیر، تم فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ میں بڑی مشکل میں [illegible]"

"مگر کس طرح؟"

"وہ میں نہیں بتاؤں گا۔ میرا ایک آدمی تمہارے پاس پہنچ [illegible] ساتھ تمہیں میرے گھر آنا ہے۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے کمرے میں آ کر عجلت میں کھانا طلب کیا اور [illegible] بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔

میری اجازت پا کر اندر داخل ہونے والا شخص میرے [illegible] تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار وہ مجھے لے جانے کے لئے [illegible] مگر اس کے گستاخانہ رویے کی وجہ سے معاملہ تلخ کلامی [illegible] اسے نامراد واپس جانا پڑ گیا تھا۔

میرے چہرے پر شناسائی کی جھلک دیکھتے ہی وہ مسکرایا [illegible] معذرت آمیز لہجے میں بولا "مجھے امید ہے کہ تم پچھلا ناخوشگوار [illegible] فراموش کر چکے ہو گے۔"

"[illegible] باتوں کا ذکر نہ کیا جائے تو بہتر [illegible]" میں نے اسے [illegible]

میں نے [illegible] کے ساتھ کھانا ختم کیا۔ اس دوران وہ [illegible] چپ چاپ میرا انتظار کرتا رہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں نے [illegible] پوچھا "معاملہ کیا ہے؟"

"قاضی ہادی اپنے معاملے میں نیچے والوں کو بہت کم [illegible]"

"کوئی گڑبڑ بات ہے؟"

"مجھے بھی [illegible] سے دھندے تو ہم لوگ [illegible]"

میں مزید کچھ سوال کئے بغیر اس کے ساتھ ہو لیا۔

وہ شخص قاضی ہادی کی [illegible] کار لے کر آیا تھا [illegible] سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

کار تیزی کے ساتھ پختہ اور روشن سڑکیں طے کرتی ہوئی تل ابیب کی اس پرسکون آبادی میں داخل ہو گئی جہاں بڑے بڑے قطعات اراضی پر خوبصورت مکان بنے ہوئے تھے۔

اس نے جس پھاٹک میں کار گھمائی اس پر مسلح فوجیوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ پھاٹک کے اندر بجری کی روش پر آہنی زنجیر کی ایک عارضی رکاوٹ موجود تھی جس کی وجہ سے گاڑی رکنی پڑ گئی۔ پھر فوجیوں کے حکم پر ہم دونوں کار سے اتر گئے۔

فوجیوں نے دونوں کی جامہ تلاشی لے ڈالی۔ ایک ایک ڈنک آگے سے پوری کار کی بھی جانچ پڑتال کی گئی کہ کہیں اس میں آتشگیر یا دھماکہ خیز مادہ پوشیدہ نہ ہو۔ اطمینان ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔

"یہ کیا چکر ہے؟" آگے جاتے ہوئے میں نے تلخ لہجے میں اس سے سوال کیا "شاید قاضی ہادی اپنے مہمانوں کو ذلیل کر کے کوئی خاص لطف حاصل کرتا ہے۔"

"یہ نیا بندوبست ہے۔ میرے جانے تک یہاں کوئی نہیں تھا۔ شاید قاضی ہادی کسی سنگین خطرے میں گھر گیا ہے۔"

جب ہم اصل عمارت کے پاس پہنچے تو وہاں چاروں طرف طاقت ور سرچ لائٹس روشن تھیں اور چاق و چوبند فوجی یہاں بھی گشت کر رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں غلطی سے اسرائیل کی کسی اہم ترین شخصیت کی رہائش گاہ میں گھس آیا ہوں۔

قاضی ہادی کو شاید میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی کیونکہ اس نے برآمدے میں میرا استقبال کیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لرزاں تھے اور اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی پریشانی کی شدت کو کم کرنے کے لئے بھاری مقدار میں شراب نوشی کی ہے۔

"مجھے آثار اچھے نظر نہیں آ رہے!" میں نے اس کے ہمراہ مکان کے اندرونی حصوں میں جاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اچھے ـــ؟ اس حرامزادے نے میری زندگی تلخ کر دی ہے۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں دل ہی دل میں قاضی ہادی کے اس چڑچڑے رویے سے لطف اندوز ہوا مگر میں نے اپنے رویے سے دلچسپی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

"شاید محمود نے کوئی نئی بدمعاشی کی ہے؟"

"ایسی ویسی!" وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا "حرامزادے نے براہ راست مجھے للکارا ہے۔ اب جب تک اپنے ہاتھوں سے اس کی بوٹیاں نہ نوچ لوں، مجھے چین نہیں آئے گا۔"

قاضی ہادی کے وسیع اور آراستہ ڈرائنگ روم میں مشرقی اور مغربی انداز کا ایک عجیب سنگم موجود تھا۔ بیش قیمت ایرانی قالین، گلدستے، فانوس، قندیلوں اور پیچوان کے ساتھ ہی ایک گوشے میں بار بنا ہوا تھا جس کے کاؤنٹر پر دو حسین و جمیل لڑکیاں موجود تھیں۔ کاؤنٹر کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میری آمد سے قبل ہادی وہیں بیٹھا شراب نوشی کرتا رہا ہے۔

بار کا کاؤنٹر اس خوبصورتی سے بنایا گیا تھا کہ وہ کھانے کے کمرے کا ایک حصہ ہونے کے باوجود ڈرائنگ روم میں بھی شامل تھا۔ الماریوں میں ہر قسم کی شرابوں کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں ڈیپ فریزر رکھا ہوا تھا۔

وہاں بیٹھ کر جب تک قاضی ہادی نے اپنے پسندیدہ آتشیں سیال کی کچھ مقدار اپنے معدے میں نہ انڈیل لی میں خاموش رہا۔ اس کے لئے جام صحت تجویز کرنے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر بات چھیڑ دی۔

"کیا فون کیا تھا اس نے؟"

"تمہیں کیسے معلوم؟" وہ چونک کر مجھے گھورنے لگا۔

"قیاس!" میں نے مسکرا کر کہا "ملاقات کرنے آتا تو شاید زندہ سلامت واپس نہ جا سکتا تھا۔"

میری اس وضاحت نے اسے مطمئن کر دیا "آج شام ایک مفلوک الحال یہودی ایک خوبصورت ڈبے میں بند کوئی تحفہ لے کر آیا تھا۔ وہ بضد تھا کہ تحفہ میرے حوالے کرے گا مگر میرے دربان نے اس کا مشکوک حلیہ دیکھ کر اسے باہر ہی روک لیا۔ بعد میں میری ہدایت پر اس آدمی کو ڈبے سمیت اندر لایا گیا۔ تو جانتے ہو اس ڈبے میں سے کیا نکلا؟"

"کیا؟"

"اس میں چھوٹے بور کا آبنوسی دستے والا ایک ریوالور تھا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا "ریوالور دیکھتے ہی ڈبہ لانے والے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ گڑگڑانے لگا۔ کیونکہ ہمارے بعض قبائل میں یہ رواج ہے کہ اپنے دشمن پر مہلک وار کرنے سے پہلے دشمنی کے اعلان کے طور پر اسے ہتھیار کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ پہلے خنجر کا تحفہ جانی دشمنی کی علامت تھا مگر دس بارہ سال سے ریوالور نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ میرے آدمیوں کے تشدد کے باوجود وہ شخص صرف اتنا بتا سکا کہ ایک گلی میں ایک شخص نے اسے پانچ پونڈ کے عوض وہ ڈبہ پہنچانے کا کام سونپا تھا۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کام ایک مذاق کا حصہ ہے اور اس کے لئے بالکل بے ضرر ہے۔ وہ حرامزادہ، فاقوں کا مارا لالچ میں آ گیا۔ ابھی میں اسے پولیس کے حوالے کرنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ میرے نام ایک فون آیا۔ میں نے ریسیور لیا تو کسی نے کہا کہ وہ تحفہ محمود کی جانب سے خاص میرے لئے ہے۔ اس کے بعد لائن بے جان ہو گئی۔"

"شاید اس کے بعد ہی تم نے فوجی پہرے کا انتظام کیا ہے۔"

"وہ سور کا بچہ بہت مکار ہے۔ اس کھلے چیلنج کے بعد میں صرف اپنے آدمیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔" قاضی ہادی شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

"اس سلسلے میں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"تم اس نالکار کو دیکھ چکے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس عمارت میں موجود ہر شخص کا جائزہ لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان میں مل گیا ہو۔"

قاضی ہادی کی بات سن کر میرا جی چاہا کہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگاؤں۔ محمود کی دہشت نے اس بے چارے کا دماغ ہی ماؤف کر دیا تھا۔ وہ تل ابیب کا مشہور گروہ بند تھا اور اس کے سارے ہی آدمی گھاگ تھے۔ بھلا کس کی شامت نے دھکا دیا تھا جو اس کے آدمیوں کی بھیڑ میں ملنے کی کوشش کرتا۔

"میں یہ بھی کروں گا مگر میرا خیال ہے کہ وہ اندر گھسنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ وہ جو کارروائی بھی کرے گا، باہر ہی سے کرے گا۔"

"تم اس کے کتنے ٹھکانوں سے واقف ہو؟"

"کسی سے بھی نہیں۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "وہ صرف ایک بار مجھ سے ملا تھا اور وہ بھی ایک ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں۔"

"وہ نالی کا کیڑا ہے۔" قاضی ہادی چوبی کاؤنٹر پر مکا مار کر بولا۔ "میں اس کا دارا ... کر دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے کیسے زک پہنچا سکتا ہے۔"

"اس حفاظتی انتظام کی موجودگی میں تو وہ شاید ادھر کا رخ بھی نہ کر سکے۔" میں نے کہا۔ "اس دوران میں مجھے باہر ہی رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں مجھ سے ہی ٹکرا جائے۔"

"ہاں درست ہے۔ مگر پہلے تم میرے تمام آدمیوں کو دیکھ لو۔"

[illegible]

میرے لیے اس وقت باہر جانا غیر ضروری تھا کیونکہ مرکزی ہال والے فقیر کے ذریعے محمود کا سراغ صبح سے پہلے ناممکن تھا۔

میرے ایما پر قاضی ہادی نے اپنے مکان کی حفاظت پر متعین فوجی دستے کے کمانڈر کو بلوا لیا۔ عہدے کے اعتبار سے وہ ... تھا۔ یہی ایک بات اسرائیلی حکام سے قاضی ہادی کے گہرے تعلق کو ... کرنے کے لیے کافی تھا۔

قاضی ہادی جب مجھے ساتھ لے کر حفاظتی انتظامات کے جائزے کے لیے روانہ ہوا تو وہ میجر مودبانہ انداز میں اس کے ساتھ تھا۔

قاضی ہادی کے مکان کے احاطے کی بلند دیوار ... تاروں کی دوہری باڑھ پھیلی ہوئی تھی جس میں اندھیرا پھیلتے ہی ... منسلک سوئچ کے ذریعے خود بخود جان لیوا برقی لہر ... سورج غروب ہونے کے بعد پھیلے یا ابر آ جانے کی صورت ... ایک منظر سا ... روشنی کم ہوتے ہی حرکت میں آ جاتا تھا ... پھاٹک اور ذیلی کھڑکی پر مسلح چوکیدار کے علاوہ ... تھا جسے چوکیدار ... سے قبل کھول کر ... میں جاتا ... کھڑکی کھولی جاتی تو عمارت میں خطرے کا ... ہو جاتا۔

[illegible]

جب اس کے اعصاب پر ہلکا سا سرور چھانے لگا تو اس نے اپنے خوف کو چھپانے کے لیے اپنی تین خوبرو باندیوں کو طلب کر لیا۔

وہ لڑکیاں میرے لیے آزادی کا پروانہ لے کر آئیں۔ دو کو ... قاضی ہادی نے اپنی خدمت کے لیے روک لیا اور تیسری کو میرے حوالے کر کے مجھے اپنی خوابگاہ میں جانے کی اجازت دے دی۔

اس خوف ناک رات کے رینگتے ہوئے تاریک لمحات قاضی ہادی نے کم و بیش دیوانگی کے عالم میں گزارے۔ اس کے کمرے سے رات بھر عجیب ہڑبونگ کی آوازیں آتی رہیں جیسے کہ میرے کشیدہ اعصاب کسی عیاشی پر مائل نہ ہو سکے۔ میرے ذہن پر بس یہ خوف چھایا ہوا تھا کہ اگر اس رات محمود کی جانب سے قاضی ہادی پر کوئی خطرناک حملہ کیا گیا تو میں بھی بلاوجہ اس کی زد میں آ جاؤں گا۔

"تم مسلسل کس سوچ میں مبتلا ہو؟" مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر میرے ساتھ والی لڑکی کے صبر کا پیمانہ آخر لبریز ہو گیا۔

"موت کے سائے میں گزاری جانے والی رات میں آدمی خالی الذہن نہیں ہو سکتا۔"

"موت جب آنی ہے، ضرور آئے گی۔ تم اس کے بارے میں اس قدر کیوں سوچ رہے ہو؟" وہ قالین سے اٹھ کر مسہری پر آ بیٹھی۔

"کیا تم آنے والے لمحات سے خائف نہیں ہو؟"

"خوفزدہ ہوں، اسی لیے تمہاری باہوں کا سہارا چاہتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے میں کھو کر اس دہشت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔"

"دروازہ کھول کر برابر والے کمرے میں چلی جاؤ۔ اس وقت تمہیں وہیں سہارا مل سکے گا۔"

"مگر میں تمہارے سپرد کی گئی ہوں۔"

"خاموشی سے قالین پر لیٹ کر سو جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری موت کا وقت ابھی آ پہنچے۔" میں نے ... میں کہا۔

اس نے مجھے ... ہوئی نظروں سے دیکھا اور قالین ... گئی۔

وہ میری زندگی کی ... سکوت چھایا ہوا تھا ... میرے ... کو ... کافی ... کے بعد ...

[illegible]

برسوں بیت چکے تھے مگر میں نگر نگر بھٹک رہا تھا۔ شاید میں نے اپنے باپ کا دل دکھایا تھا اور اب قدرت مجھے اس کی سزا دے رہی تھی۔ باپ بددعائیں نہیں دیا کرتے مگر جب اولاد اپنے باپ کی عزت کا جنازہ نکال دے تو دکھی دل سے بددعائیں نکلنی لازمی ہوتی ہیں۔ شاید میرے مرحوم والد صاحب کی کوئی بددعا ہی میری زندگی کا سکون چھین لے گئی تھی۔

مجھے نہ مشرقی پاکستان کی لہلہاتی سرزمین نے پناہ دی، نہ ہندوستان نے قبول کیا۔ نیپال پہنچا تو وہاں میرے سر کے پیاسے پیدا ہو گئے۔ ہمالیہ کی برفانی وادیوں کا رخ کیا تو وہاں آدم خوروں نے گھیر لیا۔ پھر شاید قدرت کو میرے حال زار پر رحم آیا اور مجھے سیتا جیسی حسین و جمیل دوشیزہ مل گئی اور اس کے مقدر سے مجھے نادر روزگار پارس پتھر بھی مل گیا۔

مگر میری بدنصیبی کہ میں ان دونوں میں سے ایک کی بھی حفاظت نہ کر سکا۔ سیتا میری باتوں کا برا مان کر چپکے سے مجھ سے روٹھ کر انسانوں کے سمندر میں کہیں گم ہو گئی اور مقدر نے مجھے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ میں انبالہ کے راجہ ہوٹل میں چھپائے ہوئے پارس پتھر کو حاصل کر لیتا۔

دربدر کی ٹھوکریں کھاتا اب میں اسرائیل میں تھا۔ یہاں قدرت نے مجھے سرخروئی کے چند مواقع عطا کیے جن سے میں نے پوری طرح فائدہ اٹھایا تھا مگر ابھی تک میری منزل کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں اپنی سرزمین پر جا پہنچ جاؤں۔ میرا دل کہتا تھا کہ میری سیتا میری ...

[illegible]

پر راہگیروں کا خاصا ہجوم پایا جا رہا تھا۔

میں نے مخالف سمت ہی سے ہیکل کا جائزہ لیا وہاں دیوار کے ساتھ کئی گداگر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک گداگر ہیکل کے دروازے کے داہنے ستون سے پشت لگائے بیٹھا ہوا تھا۔

میں سڑک عبور کر کے اس طرف جا پہنچا اور جیب سے چند سکے نکال کر اس گداگر کی طرف بڑھ گیا جو آنکھیں موندے زیرِ لب کچھ بڑبڑا سا رہا تھا۔ میں نے سکے کشکول میں ڈالنے کے بجائے گداگر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ "بابا! میرے حق میں کوئی بددعا فرمایئے۔"

اس نے پپوٹوں میں ذرا سی جنبش پیدا کر کے میری طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "عیسائیوں کے قبرستان کا رکھوالا تیری مدد کرے گا۔ اس کا نام ایشکول ہے۔"

میں مزید کچھ کہے بغیر دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

تل ابیب میں عیسائیوں کا ایک ہی قبرستان تھا جو اس جگہ سے بیس پچیس منٹ کی مسافت پر واقع تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک ٹیکسی روکی اور اس میں قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور کو براہِ راست قبرستان کا پتہ بتاتے ہوئے مجھے خاصا تردد ہوا مگر میرے لیے دشواری یہ تھی کہ میں اس کے قرب و جوار میں کسی جگہ کے نام سے واقف نہیں تھا۔

ٹیکسی قبرستان کے قریب رکی تو آواز سن کر فوراً ہی ایک شخص باہر آ گیا۔ شاید اسے یہ امید ہی ہو گی کہ کوئی نیا مردہ آنے والا ہے۔

میں ٹیکسی کا بل ادا کرنے کے بعد اس وقت تک خاموش رہا جب تک ٹیکسی آگے نہ بڑھ گئی۔ قبرستان سے آنے والا حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ایشکول!" میں نے اس سے استفسار کیا۔

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور سوال کیا "کہاں سے آئے ہو؟"

"مرکزی ہیکل کے داہنے ستون والے گداگر نے بھیجا ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"اللہ کی رحمت ہو تم پر۔ میرے پیچھے چلے آؤ۔" اس نے مطمئن لہجے میں کہا اور قبرستان کے گرد بنی ہوئی پتھریلی فصیل کی طرف ہو لیا۔

اس فصیل میں ایک تو بہت بڑا چوبی پھاٹک تھا جو شاید میت گاڑی کو اندر لے جاتے وقت کھولا جاتا ہو گا۔ دوسرا عام سائز کا دروازہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم دونوں ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جہاں گورکنی سے متعلقہ ساز و سامان قرینے سے ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ ایک شوکیس میں کافور، لوبان اور دوسری خوشبویات موجود تھیں اور ان کے قریب ہی چند پٹرومیکس لیمپ رکھے ہوئے تھے۔

ایشکول نے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور مجھے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں پہنچا جو شاید اس کی رہائش کے مصرف میں تھا۔

اپنے رہائشی کمرے سے نکل کر وہ گھاس کے قطعے کو عبور کر کے قبروں کے درمیان بنے ہوئے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ میں خاموشی سے اس کی تقلید کرتا رہا۔

وہ قبرستان میری توقع سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ دور دور تک پختہ بنی ہوئی قبریں پھیلی ہوئی تھیں جن کے سرہانے لگی ہوئی سفید صلیبیں مرنے والوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے قبریں گنجان ہوتی چلی گئیں۔ درمیان میں جا بجا صنوبر کے درخت بھی اُگے ہوئے تھے جن کے باعث کہیں کہیں گھپ اندھیرا تھا۔ سرخ پتھر والی ایک قبر کے نزدیک وہ ٹھہر گیا اور چند لمحوں تک اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے حلق سے کسی پرندے کی تیز آواز نکالی۔ اس کی آواز کی گونج معدوم ہوتے ہی قبرستان کے کسی دور افتادہ حصے سے اسی طرح کی دو آوازیں سنائی دیں۔

"تم یہیں بیٹھو۔" ایشکول میری طرف مڑ کر بولا۔ "ابھی کوئی آنے والا آ جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ میرا جواب سنے بغیر قبروں کے درمیان تیز تیز چلتا ہوا واپس ہو لیا۔

میں سرخ پتھر والی اس قبر پر بیٹھا کافی دیر تک قبرستان کے تاریک حصے کی طرف دیکھتا رہا مگر وہاں مجھے کوئی سایہ حرکت کرتا نظر نہ آیا۔ مجھے عجیب سے خیالات نے آگھیرا اور بے اختیار میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

قبرستان میں ہر طرف موت کا بھیانک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آس پاس کے درختوں سے اکا دکا جھینگروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ یہ انتظار مجھے بُری طرح کھل رہا تھا۔

"چلو۔" اچانک مجھے اپنی پشت پر کسی کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔ میں بُری طرح اچھل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آواز قبر میں سے آئی ہو۔

میں پیچھے مڑا تو احمد میری بوکھلاہٹ پر مسکرا رہا تھا۔ ایک روز پہلے اسی مکان پر محمود کے ساتھ مل چکا تھا جہاں خبیث بڑھیا نے مجھے لوٹ لیا تھا۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" میں نے خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں طویل چکر کاٹ کر پیچھے میں اس لیے آیا تھا کہ تمہیں چیک کر سکوں۔ ہمارے لیے ہر قدم پر احتیاط ضروری ہے۔" وہ مجھے ساتھ لے کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"یہ ایشکول بھی ہمارا ہی آدمی ہے؟"

"ہاں۔" وہ چلتے چلتے بولا۔

اور جستجو کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔ اپنے کام سے کام رکھو۔

رہو گے۔"

جواب میں میں نے خاموشی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کا سخت لہجہ مجھے بے حد ناگوار گزرا تھا۔ میرا جی تو یہ چاہا تھا کہ ایک ہی مکے میں اسے خاک چاٹنے پر مجبور کر دوں مگر وہ میرے ایک دوست کا جانثار تھا اور میں دوستی بھانا خوب جانتا تھا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے قبرستان میں اُگا ہوا سبزہ جھاڑ جھنکاڑ کی شکل اختیار کرتا گیا۔ آخری حصے میں تو جا بجا خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور کئی پرانی قبریں اندر دھنس چکی تھیں۔ ان کی صلیبیں شاید کسی نے دوبارہ فروخت کرنے کے لیے اٹھا لی تھیں۔

قبرستان کی عقبی دیوار سے ذرا پہلے احمد بائیں طرف مڑ گیا اور پھر ایک دھنسی ہوئی قبر کے قریب رک گیا۔

"اندر کود جاؤ۔" اس نے میرے لیے جگہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں نے بڑھ کر اس قبر میں جھانکا تو نیچے کوئی نظر نہ آیا۔ نہ ہی کوئی تابوت موجود تھا۔ میں جھجکتے ہوئے اندر کود گیا۔

میرے ساتھ ہی احمد بھی اندر آ گیا۔ سوندھی سوندھی نمناک فضا میں میں نے چند گہرے سانس لیے۔ اس وقت تک احمد قبر کے پہلو میں کھدی ہوئی ایک سرنگ نما نالی میں اندر رینگ چکا تھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور اس چند فٹ طویل سرنگ میں رینگنے کے بعد میں نے خود کو ایک زیرِ زمین پختہ کمرے میں موجود پایا جہاں دو چوبی تابوت رکھے ہوئے تھے۔ دونوں تابوتوں کے ڈھکنے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور ایک تابوت میں محمود گہری نیند سویا ہوا تھا۔

"کیا ہوا اسے؟" میں نے پلٹ کر احمد سے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

"دعا کرو۔ اس کی حالت بہت خراب ہے کسی گھنٹے سے بے ہوش پڑا ہوا ہے۔"

"اور اس بے ہوش شخص کے خوف سے قاضی ہادی کسی خارش زدہ کتے کی طرح پناہ گاہوں میں چھپتا پھر رہا ہے۔" میں نے حیرت کے ساتھ تبصرہ کیا۔

"میں نے محمود کے ہی ایما پر اسے یہ پوا اور چھوڑا تھا۔" احمد نے کہا۔

"اور فون بھی تم ہی نے کیا تھا اسے؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم قاضی ہادی سے مل کر آ رہے ہو۔" احمد نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"اس نے بوکھلا کر مجھے بلوایا تھا۔ ملاقات میں نے اسی کے ساتھ گزاری۔" احمد سوگوار انداز میں ہنس دیا۔ "محمود یہی کہہ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ دشمنی کی وہ نشانی ملنے کے بعد قاضی کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔"

"اس کی حالت تشویشناک ہے میں تو اس کے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری لے کر آیا تھا۔" میں نے اداسی سے محمود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" احمد نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"تم اس کے قریب رہے ہو تمہیں بہتر اندازہ ہو گا ویسے میرا خیال ہے کہ کسی ڈاکٹر کو بلانا مناسب رہے گا۔"

"نہیں۔" اس زیرِ زمین کمرے کی محدود فضا میں محمود کی کمزور سی آواز گونجی۔ "میں کل تک اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاؤں گا ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔"

میں اس کی آواز سنتے ہی لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ "ایک ہی روز میں تمہاری کیا حالت ہو گئی کل تک تو تم اتنے نحیف نہیں تھے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر غنودہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ "میں جس مکان میں چھپا ہوا تھا اس کی مالک خلافِ توقع قبل از وقت لوٹ آئی اور مجھے افراتفری کے عالم میں وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس بے احتیاطی سے میرا زخم کھل گیا ہے۔"

"وہ عورت بہت حریص ہے کل رات میں وہاں گیا تھا اس نے میری جیب ایک ہی دھمکی میں خالی کرالی۔ اگر تم اسے بڑا لالچ دیتے تو وہ خود تمہیں چھپائے رکھنے پر آمادہ ہو جاتی۔"

"تم وہاں کیوں گئے تھے؟"

"تم سے ملنے، میرے پاس ایک اہم خبر تھی...."

"میں جو کچھ کہوں اس پر پوری طرح عمل کیا کرو۔ مقصد نہیں براہِ راست ہرگز وہاں نہ جانا چاہیے تھا۔" وہ تابوت میں کروٹ لیتے ہوئے بولا "اور ہاں وہ خبر کیا تھی؟"

"کیپٹن ماریا ہماری مٹھی میں آ گئی ہے۔"

"ذرا وضاحت سے بتاؤ نا۔" اس کی آنکھوں میں یک بیک چمک پیدا ہو گئی۔

"فون پر میں نے اسے جو دھمکی دی تھی وہ کارگر ثابت ہوئی ہے اور اب وہ جان بخشی کے عوض ہمارے لیے مخبر کا کام کرنے کو تیار ہے۔"

"سچ؟" اس نے مسرت آمیز حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"ہاں۔ اس نے کئی باتیں میرے سامنے اگل دیں۔" میں نے اس کے قریب فرش پر بیٹھ کر اسے بتایا۔ "اس نے خود تجویز کیا کہ وہ ہیڈ کوارٹر کی تباہی، مجوزہ مصنوعی قاتلانہ حملے اور ماہرام ایلیسی اور کرنل ربیقہ کی خفیہ ٹی کے راز میرے سامنے اگل دیئے۔ وہ موت سے بہت زیادہ ڈرتی ہے۔"

"جن کے سامنے زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہ ہو وہ ہمیشہ موت سے ڈرتے رہیں۔" محمود پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تمہارے لیے شہر میں کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا؟"

"ہو سکتا ہے مگر میں یہاں آرام سے ہوں۔"

"ایشکول قابلِ اعتماد ہے؟"

"اسے صرف معاوضے سے مطلب ہے وہ ہماری تنظیم کا آدمی نہیں ہے۔"

"تم جیسے آدمیوں کو یوں بے بس دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔ قاضی ہادی کی دہشت دیکھ کر تو مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم رات ہی کو کوئی کارروائی نہ کر گزرو۔"

"اسے دھمکی دیتے ہوئے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری حالت اتنی ابتر

ہو جائے گی۔ اب زیادہ دو چار دن میں اس کے کسی نہ کسی ٹھیلے ہو جائیں پھر اس کا کام تمام کر دوں گا۔"

"اس بارے کیا ہدایت ہے؟"

"اس سے کہہ دینا کہ ابھی اسے تجربے کے طور پر مہلت دی گئی ہے۔ اس دوران میں اسے ان تمام فلسطینیوں کی فہرست حاصل کرنا ہے جو اسرائیل کی فوجی اور غیر فوجی قید میں ہیں۔ ہمارے بہت سے مرد و عورتیں کافی عرصے لاپتہ ہیں۔ اسرائیل نے کبھی بھی ہمارے قیدیوں کی کوئی فہرست جاری نہیں کی۔"

"یہ واقعی بہت بڑا کام ہوگا۔"

"اس کے علاوہ بھی تم اسے اپنے طور پر کام دے سکتے ہو۔"

"قاضی ہادی کے حیاتی کا کیا بنا؟"

"تازہ ترین خبر یہ ہے کہ نارتھ سے ریڈار کی کے ارکین نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اور وہ کسی بھی وقت اسرائیل پہنچ سکتا ہے۔ اسرائیلی اخبارات شاید اس خبر کو چھپا جائیں گے۔"

"وہ پہلے ملن ٹرنے گا جب وہاں اس کی مناسب تشہیر ہو جائے گی تو وہ اسرائیل کا رخ کرے گا۔" محمود نے وضاحت کی۔

"میں ہیا کے ذریعے بن حیان کا بھی کھوج لگاؤں گا۔ میری آرزو ہے کہ میں ایک بار پھر اس مردود کا سامنا کروں۔"

"وہ جیوش نیشنل کونسل کا اہم رکن ہے اور ہمیشہ نت نئے سازشی منصوبے تیار کرتا رہتا ہے۔ اگر تم اسے ہراساں کر سکو تو بہت اچھا ہوگا۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

"اور ہاں ابھی تین چار روز تک مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ مناسب وقت پر میں خود ہی تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے گردن جھکا کر کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

محمد نے قبرے باہر آنے کے بعد سرخ پتھر والی قبر تک میری رہنمائی کی پھر حلق سے ایک مخصوص آواز نکالنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔

چند ہی منٹ میں ابن جمول وہاں آپہنچا اور اس نے مجھے قبرستان سے باہر چھوڑ دیا۔

قبرستان سے کافی دور تک پیدل چلنے کے بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔ جس کے ذریعے میں ہوٹل ویزمان جا پہنچا۔

وہاں سب سے پہلے میں نے قاضی ہادی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ حفاظتی افسران کے مشورے پر وہ فوری طور پر اسرائیل سے باہر چلا گیا ہے۔ فون ریسیو کرنے والا یہ نہ بتا سکا کہ اس کی یہ رات موت کے خوف سے کس ملک کا رخ کیے ہوتے ہوئے تھا، قاضی نے روانگی سے قبل میرے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ میں جب چاہوں اس کے سیکرٹری سے رقم حاصل کر سکتا ہوں۔ وہ شاید میری خاتمی والی ہوشیاری سے مستقل معاملوں کی ابتدا سمجھ رہا تھا۔

ہوٹل ویزمان میں تمام دن گزارنے کے بعد میں نے ایک بار پھر جا کر فون

کرکے دریافت کیا، وہیں بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گھما رہتے ہوئے [illegible] بھی پر جھپٹ کر اٹھانے میں مصروف تھا۔ [illegible] قریب ہی کی موجودگی محسوس کی۔ اس احساس میں اس کی خوشبو [illegible] تھا جو اس کے پاس دو جہان سے خوشبو رہی تھیں [illegible] انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

ابتدائی چند تجربات کے بعد میرے قتل میں ان [illegible] احتراز کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی جو اسرائیل سے پہلے [illegible] کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں نظر آتی تھیں یا شاید اس [illegible] بھی سنا ہو کہ اسرائیل میں کئی ہیں تو کام کرنی تھیں کی نذر [illegible] وہ تو بڑا بری سے بھی پچھتاتے جا رہی ہیں میں نے پیچھے ہٹنے [illegible] مرد کی خاطر خواہ کلائی مرتبیں دکھا سکتے تھے اس اعتبار سے [illegible] مردوں سے ایک درجے آگے ہی تھیں۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" [illegible] نکلتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"تم بچے بن گئے ہو۔" اس نے ایک ادا سے [illegible] اس نے اپنے میں بے تکلفی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش [illegible] جانتی ہے کہ میں پیشہ ور شکاری عورتوں کے اس عامیانہ [illegible] تھا اس لیے اس کا انداز مجھے زیادہ متاثر نہ کر سکا بلکہ میں نے [illegible] سے گھورنا شروع کر دیا۔

"میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔" میں نے خشک [illegible]

"ناراض معلوم ہوتے ہو؟" یہ کہہ کر وہ ڈھٹائی سے [illegible] والی کرسی پر نہایت اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ناراض تو اس وقت ہوتا جب کبھی رضامندی [illegible] ہوتی۔" میں نے غور سے اس کی خوبصورت آنکھوں میں [illegible] وہ خاصے دلکش خدوخال کی مالک تھی قد [illegible] جیسی نکھری ہوئی رنگت اور گداز بدن کے علاوہ اس کی [illegible] عجیب سحر انگیز کشش پائی جاتی تھی۔ اسے غور سے دیکھنے [illegible] لگا تھا کہ میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا تھا۔

"ابھی دو روز قبل ہی ملٹن میں ہماری ملاقات [illegible]" آنکھ مار کر بولی۔

"اوہ مسز فلورا اسمتھ!" میں نے ایک طویل [illegible] تم کچھ زیادہ دلکش نظر آ رہی ہو، حیرت ہے کہ میں تمہیں [illegible]

"آج میں نے بالوں کا اسٹائل بدل دیا ہے۔" [illegible] ہوئے بولی۔ "اچھی لگ رہی ہوں نا اس انداز میں۔"

"اچھی تو زیادہ لگ رہی ہو مگر مجھے حیرت ہے [illegible] یہاں نظر آ رہی ہو۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم کسی فرصت [illegible] آج [illegible] وہ کرنے جا رہا ہے اور اتفاق سے [illegible]

بڑی بے تکلفی سے وہ ہال کے ایک دورانئے دو کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی جہاں عالی افرد بیٹھے تھے۔ "میں نے اتفاقاً تمہیں دیکھ لیا تو ادھر آ گئی۔"

"پارٹی ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟"

"بس ہونے ہی والی ہے۔ پارٹی ختم ہوتے ہی اور ہم تو تم اپنی تنہائی میں مصروف ہوئے تھے؟" وہ ہنستے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"تو پھر وہ اس معاملے میں تمہاری تقلید نہیں کریں گے۔"

"اوہ تم بہت مرد ہو ہی تو میرے ساتھ کوئی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ فضا میں اپنی زلفیں لہراتی ہوئی تیزی سے ہال کے اس کونے کی طرف چلی گئی جہاں پارٹی چل رہی تھی۔

میں نے آہستہ آہستہ کھانا ختم کیا اور کافی کا آرڈر دے کر سگریٹ سلگائی۔ اسی دوران میں وہ پارٹی ختم ہو گئی اور لوگ میرے قریب سے گزرتے ہوئے واپس جانے لگے۔ فلورا بھی ان میں شامل تھی وہ میری طرف ایک مسکراہٹ پھینکتی گزر گئی۔

چند منٹ کے بعد وہ دوبارہ میرے پاس آ گئی۔ "ہاں اب سناؤ، کیسا محسوس کر رہے تھے تنہا؟"

"اس روز یہ چوروں کی طرح کہاں کھسک گئی تھیں؟"

"ایک شخص نے آ کر مجھ سے کہا تھا کہ تم ایک خطرناک آدمی ہو اور اگر میں زیادہ دیر تمہارے ساتھ رہی تو کسی نہ کسی چکر میں پھنس جاؤں گی۔"

"اور تم نے یقین کر لیا؟"

"یہ سن کر میں بوکھلا گئی تھی۔" وہ خفت آمیز لہجے میں بولی۔ "اس کی بات سن کر اضطراری طور پر ہوٹل سے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔"

"تو اب کیوں میرے پاس چلی آئیں؟"

"بعد میں مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ تم یہی سمجھو گے کہ میں رقم ملنے کے بعد دھوکا دے کر بھاگ گئی ہوں۔"

"اگر ایسا بھی ہوتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ میں ہر صورتحال کے لیے تیار تھا۔" میں نے اس کے چہرے پر دھواں بکھیرتے ہوئے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔

"یعنی تمہیں شروع ہی سے مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟"

"اور بعد کے واقعے سے میری بے اعتباری کا جواز مل گیا۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔" وہ کہنیوں کے بل میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"شاید تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ اس روز ملٹن کی پارکنگ لاٹ کے قریب ہونے والے قتل سے میرا کیا تعلق تھا؟"

"اس شخص کا کہنا تھا اس کی روشنی میں لازمی طور پر یہ سوال میرے ذہن میں ابھرنا چاہیے تھا۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"شاید تمہیں علم نہیں کہ مرنے والا وہی شخص تھا جس نے میری جانب سے تمہیں خبردار کیا تھا۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"اوہ۔" اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ "تو تم ہی نے اسے ہلاک کیا تھا؟"

"کیا اسرائیلی پولیس تو ہم اسی قدر ناکارہ سمجھتی ہو کہ ایک قتل کرنے کے بعد میں یوں آزاد پھر رہا ہوتا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں نے اس کی مصوریہ توجیہ نہیں دی تھی۔" وہ بولی۔ "اگر تم سے اس کی کوئی چپقلش نہیں تھی تو آخر اس نے مجھے بھڑکانے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

"اگر وہ زندہ ہوتا تو میں اس سے ضرور دریافت کرتا۔"

"تمہیں کیسے علم ہوا کہ مرنے سے قبل اس نے مجھ سے بات کی تھی؟"

"میں نے اسے تمہاری میز پر رکتے اور اس کے بعد تمہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا مگر میں نے دانستہ پولیس کے سامنے آ کر یہ بات بیان نہیں کی۔"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا ورنہ اس قتل میں میرا نام بھی ملوث ہو جاتا۔" وہ احسان مندانہ لہجے میں بولی۔ "پولیس کو شاید میرے سے اس واقعہ کا علم نہیں کیونکہ اس بارے میں کسی بھی سرکاری آدمی نے مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس پارٹی کے بعد تمہاری چھٹی ہو گئی ہے!"

"ہمارا ڈائریکٹر تین بجے کی پرواز سے پیرس جا رہا ہے لہٰذا عملے کو جلدی چھٹی دے دی گئی ہے۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب قدرت کی جانب سے ہم دونوں کی ملاقات کا بہانہ تھا۔"

"غلط کاموں میں قدرت اتنی دلچسپی نہیں لیتی۔"

"تم اپنے دل کی بات کہہ سکتے ہو میں تو صاف دل کے ساتھ تم سے اس روز والے رویے کی معذرت کرنے آئی تھی۔"

"اگر یہ سچ ہے تو اب تک تمہیں واپس چلا جانا چاہیے تھا۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اگر تم کسی اور کے منتظر ہو تو چلی جاتی ہوں۔"

"تمہارے بعد میں بھلا کس کی آرزو کروں گا۔"

"اب آئے نا اپنے اصل رنگ میں۔" وہ قہقہہ مار کر بولی۔ "جب تفریح کا موڈ ہو تو اسی قسم کی باتیں مزا دیتی ہیں۔"

"اسمتھ کے معاشقے کا کیا حال ہے؟"

"سارجنٹ میری نے بدستور اسے پاگل کیا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسمتھ نے ایک دفعہ اسے حاصل کر لیا تو بہت جلد اسے بھول جائے گا۔"

"میری وہی گورے کی لڑکی ہے نا؟"

"ہاں، میں نے سنا ہے کہ وہ اسمتھ سے شادی کے خواب دیکھ رہی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں میں مشترکہ ذمہ داری کا آغاز نہیں ہو سکا تھا۔"

"میں سمجھی نہیں!" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"اس روز تم نے بتایا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان مشترکہ ذمہ داری کا آغاز بچوں کی ولادت سے شروع ہوتا ہے اور اولاد کے بالغ ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

"یہ بات تمہیں خوب یاد رہی۔" اس نے ایک لمبی قہقہہ لگا کر [illegible] دیکھے تمہارا خیال درست ہے۔ میں بچے کا تجربہ تنہا

رہتی ہوں۔"

"اور میں کارلٹن ہوٹل میں تنہا رہتا ہوں۔" میں نے خشک سا منہ بنا کر کہا۔

"آجاؤ میرے یہاں آجاؤ، ہم دونوں مل کر اچھا وقت گزاریں گے۔"

"تمہارے رشتہ دار تو نہیں رہتے یہاں۔"

"وہ مین لوتھل ابیب میں ہی ہیں۔" وہ حیرت سے بولی "اس وقت اس بات کا کیا موقع تھا۔"

"ایسے رشتہ داروں سے مجھے سخت الرجی ہے جو اپنی عارضی خوشیوں کے لئے دوسروں کی زندگی درہم برہم کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔"

"اگر تمہارا مقصد یہ ہے کہ ان کی وجہ سے میری بلکہ ہماری بھی زندگی متاثر نہ ہو تو بے فکر رہو کہ وہ اسی قسم کے لوگ ہیں۔ تمہیں ان سے کوئی پریشانی لاحق نہ ہوگی۔"

"اس خوشی میں یہ شام ویرمان ہی میں گزاری جائے تو کیسا رہے گا؟"

"میں تو گھر کی ہولناک تنہائی سے گھبرا کر تفریح گاہوں کا رخ کرتی ہوں۔ جب تم ساتھ رہنے پر آمادہ ہو تو کیوں نہ کارلٹن سے تمہارا سامان اٹھوا کر گھر چلیں۔"

"قدرت نے تمہیں حسن کے ساتھ عقل سے بھی نوازا ہے۔"

"مگر استھر کے سامنے میری عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔" اس نے محبت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے استھر سے شادی سے قبل کوئی ناکام عشق بھی کیا تھا۔" میں نے کافی کی پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو بڑے مزاج شناس معلوم ہوتے ہو۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "حقیقت یہ ہے کہ میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا مگر وہ مجھے بھول کر کسی اور لڑکی کا گرویدہ ہوگیا۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔" میں نے اس کا ذہن ٹٹولنے کی خاطر کہا۔ "اگر پہلی محبت ناکام ہو جائے تو بعد میں ملنے والے شوہر کی حیثیت ایک وقتی سہارے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اپنے شوہر کے گلے میں بانہیں ڈال کر بھی عورت کو اسی کی قربت محسوس ہوتی ہے جب وہ آنکھیں بند کر کے تصور میں خود کو اپنے ہرجائی محبوب کے ساتھ محسوس کرتی ہے۔"

"اس موضوع پر تمہاری معلومات خاصی وسیع ہیں۔" وہ تحسین آمیز لہجے میں بولی۔ "یقین جانو کہ میں استھر کو اسی وقت برداشت کر سکتی ہوں جب میرا ذہن لوئی کے تصور میں ڈوبا ہوا ہو۔ اپنی اصلی حیثیت میں تو وہ مجھے بالکل گوارا نہیں۔"

"پھر بھلا اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔" [illegible] کر کہا۔ "اسے تمہاری ذات میں سچا پیار نہیں مل سکا [illegible] کی لڑکی میں سچی محبت تلاش کر رہا ہے۔"

"اگر وہ کوشش کرتا تو میرے دل سے لوئی [illegible] تھا کیونکہ وہ شادی کے وقت بھی میری اور لوئی [illegible] واقف تھا۔"

"خیر چھوڑو اس ذکر کو ــــ قصور تمہارا بھی [illegible] بات صرف اتنی سی ہے کہ اگر تم دونوں میں اختلاف [illegible] کہاں جاتا؟"

ہوٹل ویرمان کا بل ادا کر کے میں فلورا کے ساتھ [illegible] باہر آنے کے بعد ٹیکسی میں ہم سیدھے کارلٹن [illegible] گئے۔ میرے پاس فالتو ہادی سے لی ہوئی کافی [illegible] میں نے ہوٹل کا حساب بے باق کر دیا اور کاؤنٹر [illegible] نمبر چھوڑ دیا تاکہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش میں [illegible] کسی کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

کاٹیج کی طرف جاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر [illegible] رشتے کے حوالے سے وہی بات نکل آئی جسے [illegible] میں ختم کر دیا تھا۔

"نہ جانے کیوں مجھے ہر وقت یہ محسوس ہونے لگا [illegible] استھر مجھے پڑا رہا ہے۔ جب اس کی باتوں پر دل [illegible] کڑھتی رہتی تھی۔" فلورا مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"یہ تمہارے دل کا چور تھا فلورا!" میں نے آہستہ [illegible] کہا۔ "مرد اگر ایک مرتبہ کھلے دل سے اپنی عورت [illegible] کر دے تو عام طور پر وہ ہمیشہ اپنے الفاظ کا پاس [illegible]

"اپنی عورت۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی [illegible] وہ الفاظ میں۔ میں تو یہی چاہتی تھی کہ اسے میری [illegible] تو وہ میری پٹائی کرے کھل کر مجھ پر اپنے دل کا غبار [illegible] اپنے رد عمل میں محتاط رہا۔ فقرے بازی کا کوئی [illegible] جانے دیتا تھا۔ اس کی چاہ [illegible] جبکہ میں نے ہر وہ کام شروع کر دیا جو [illegible] نے اس کے ناپسندیدہ لوگوں سے ملنا شروع کر دیا [illegible] جلانے اور اشتعال دلانے کی ہر ممکن کوشش کی [illegible] کا وہی رہا اور یوں خلیج بڑھتی رہی۔"

"میں ایک دوست بن کر تمہاری زندگی میں [illegible] فلورا!" میں نے اس سے کہا۔ "اپنی نئی زندگی کے [illegible] دل کو بوجھل نہ کرو۔"

اس نے مسکرا کر گرمجوشی کے ساتھ میرا ہاتھ [illegible]

میری زبان سے کبھی ایسی باتیں نہ سنو گے!"

"ویسے یہ تو بتاؤ کہ استھر کی پوسٹنگ کس علاقہ میں ہے؟"

"بتاتے ہیں کہ وہ لبنان کی سرحد پر متعین ہے۔ آئے دن فلسطینی چھاپہ مار اسرائیلی علاقہ میں گھس کر کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہاں مستقل فوجی چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں۔ وہ کافی عرصے سے وہیں پر ہے۔"

اس سے آگے موضوع نازک رخ اختیار کر جاتا لہٰذا میں خاموش ہوگیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ فلورا آگے چل کر میرے لئے کار آمد ثابت ہو سکے گی۔

فلورا کا مکان تل ابیب کے سرسبز شمالی حصے میں واقع تھا۔ اس کا مکان واقعی نہایت خوبصورت سے کاٹیج پر مشتمل تھا جس کے گرد خاصا وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ کاٹیج کی کھپریل کی چھت پر کوئی سدا بہار پھول دار بیل پھیلی ہوئی تھی جس نے مکان کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے تھے اور اندر سے بھی مکان اسی قدر خوبصورت تھا جتنا باہر سے نظر آتا تھا۔

فلورا کے کاٹیج میں پہنچ کر مجھے بے اختیار بمبئی کی جواں سال بیوہ نینی ورما یاد آگئی۔ اس بے چاری کا شوہر نادانستگی میں میرے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔

ورما ایئر انڈیا کا ہوا باز تھا اور دیس دیس کی رنگینیوں میں پڑ کر اپنی بیوی کو بھول گیا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ شوہر دل کی ستائی ہوئی بیوی میری ذات میں کشش محسوس کرتی تھیں۔ بے چاری نینی نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور میرے ہی ہاتھوں بیوہ ہوگئی۔ گو یہ قتل سراسر غلط فہمی کا نتیجہ تھا مگر میرا دل مجھے اس پر ملامت کرتا رہا۔ بیوگی کے بعد بھی نینی نے مجھ سے پوری طرح دوستی کا حق نبھایا۔ وہ ستھرے ذوق کی عورت تھی اور اپنی اندھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی اور فلورا کی زندگی میں خاصی حد تک یکسانیت تھی۔ اور دونوں ہی سے اتفاقی طور پر میری دوستی ہوگئی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ فلورا سے میں نے ایک بار دوستی کا رشتہ قائم کر لیا تو وہ عورت ہمیشہ اور ہر حال میں میرا ساتھ دیتی رہے گی۔

مجھے اپنے گھر لا کر فلورا بہت خوش تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے غیر متوقع طور پر یک بیک کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو اور میں اس کی خوشی سے لطف لیتا ہوا پورے مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔

نینی کی طرح فلورا بھی پینے پلانے کی خاصی شوقین تھی۔ اس نے گھر آتے ہوئے میں شراب کی کئی بوتلیں لے لیا تھا جس پر وہ بہت خوش تھی۔

شراب نوشی کی ابتدا لان سے ہوئی اور اندھیرا گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ جام و سبو کی یہ محفل ڈرائنگ روم کے راستے خواب گاہ میں سمٹ آئی۔

اس روز میں نے بے فکری کے طویل لمحے گزارے۔ وقت غیر محسوس طریقے پر گزرتا رہا اور میں ہوش و مدہوشی کی سرحدوں پر آسائش کے نئے مفہوم سے آشنا ہوتا رہا۔

اگلی صبح فلورا ہشاش بشاش اپنے دفتر روانہ ہوگئی مگر میرا سر کثرت شراب نوشی سے بھاری ہو رہا تھا۔ ویسے بھی ماریا کی دلائی ہوئی چھٹی کا آخری دن باقی تھا لہٰذا میں ناشتے سے فارغ ہو کر ایک مرتبہ پھر بستر پر دراز ہوگیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو کافی دیر میں بیداری کا سبب دریافت نہ کر سکا پھر معاً مجھے خیال آیا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی کافی دیر سے بج رہی ہے۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"ہیلو! میں صفدر بول رہا ہوں۔"

"ہونہہ ــــ تو تم وہاں پہنچے ہوئے ہو۔" فون پر ماریا کی آواز خاصی استفہام آمیز تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے وہاں آمد کے پس منظر سے پوری طرح واقف ہو۔

"کہاں سمجھ رہی ہو تم؟"

"کیا تم فلورا کے مکان پر نہیں ہو؟" ماریا کی قدرے غصیلی آواز سنائی دی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔ "میں نے کارلٹن میں صرف فون نمبر چھوڑا تھا۔ تم تو فلورا کے شجرے سے بھی واقف معلوم ہوتی ہو!"

"میں فون نمبر سنتے ہی چونکی تھی۔ فلورا کا فون نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ کہاں ہے وہ کمینی؟"

"وہ دفتر گئی ہوئی ہے مگر تمہیں میری ایک دوست کے بارے میں ایسی گھٹیا زبان استعمال نہیں کرنی چاہیئے۔" میرا نیند کا سارا خمار ہرن ہو چکا تھا۔

"تمہاری دوست ہی نہیں وہ میری رشتہ دار بھی ہے ــــ" دوسری جانب سے کیپٹن ماریا کی غصیلی پھنکار سنائی دی۔ "تم وہیں ٹھہرو میں ابھی آرہی ہوں۔"

میں ہیلو ہیلو کرتا ہی رہ گیا اور فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں کئی منٹ تک فون کا ریسیور ہاتھ میں لئے خالی الذہنی کے عالم میں اسے گھورتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یک بیک یہ کیا ہوگیا۔ فلورا کے ساتھ آتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ماریا کی رشتہ دار تو کجا شناسا بھی ہوگی۔ مگر یہ ناقابل یقین حقیقت اب ثابت ہو چکی تھی اور مجھے ان دونوں خواتین کے درمیان تصادم کو ہر قیمت پر رکوانا تھا۔

ایک مرتبہ تو میرے ذہن میں آیا کہ لباس تبدیل کر کے کہیں دور

نکل جاؤں، وہ دونوں خود ہی نمٹ لیں گی۔ ان میں سے ایک اگر عہدہ کے اعتبار سے کیپٹن تھی تو دوسری رتبے کے لحاظ سے میجر کی بیوی اور میرے ساتھ دونوں کا واسطہ کم و بیش ایک ہی نوعیت کا تھا البتہ شناسائی کے حساب سے ماریا فلورا سے کچھ سینئر تھی۔

میں اس مسئلہ پر سوچ رہا تھا کہ اچانک ہی مجھے ماریا کی وہ حقیقت یاد آگئی جو وقتی طور پر میرے ذہن کے کسی خانے میں روپوش ہو گئی تھی۔ اسے فلسطینی افواج آزادی کے مقامی رہنما کی جانب سے موت کی ایک خوفناک فرضی دھمکی ملی ہوئی تھی اور وہ موت سے خائف تھی۔ میں ماریا اور محمود کے درمیان بظاہر ایک موثر رابطے کے طور پر کام کر رہا تھا اور ماریا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھل کر میری مخالفت مول لیتی۔ میں اس کو فلورا کے منہ لگنے سے روک سکتا تھا مگر اس کا دارومدار اس بات پر تھا کہ ماریا فلورا سے پہلے وہاں آجائے تاکہ میں تنہائی میں اسے سمجھا سکوں۔

میں لباس وغیرہ تبدیل کر کے جلد ہی لان میں آبیٹھا اور وقت گزارنے کے لئے وہسکی سے شغل کرنے لگا تاکہ ماریا کی آمد تک [illegible]

[illegible]

"ذاتی وقار بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے؟"

"جنسی آزادی اور ذاتی وقار دو متضاد چیزیں ہیں [illegible] کا یکجا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ تم کسی بات کے لئے وہ متضاد [illegible] نہیں بنا سکتیں؟"

"تم کس دوہرے معیار کی بات کر رہے ہو؟"

"جو بات تمہارے لئے جائز ہے وہ فلورا کے لئے کیوں ممنوع ہو گئی؟"

"بار بار میری مثال نہ دو" وہ بپھر کر بولی۔ "وہ [illegible] کہ اس کا مقابلہ میرے ساتھ کیا جائے۔ میں آزاد اور خود مختار [illegible] کچھ کرتی ہوں اس کے نتائج خود بھگتوں گی مگر فلورا [illegible] اس کی ذات میرے بھائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ فلورا کی [illegible] میرے بھائی کے لئے شرمساری کا باعث بنیں گی۔ اگر [illegible] کچھ کرنا تھا تو میرے بھائی کے شادی کیوں کی تھی [illegible] تعبیر بھی اسے ساتھ رکھنے کو تیار تھا۔"

"تم اس سے نہیں الجھو گی ماریا" میں نے [illegible] ہوئے سخت لہجے میں کہا "اور اگر فلورا نے تم سے [illegible] کی تو اس کے ساتھ بھی تیرا رویہ یہی ہوگا۔ پس جب [illegible] کوئی ہنگامہ پسند نہیں کروں گا۔"

[illegible]

"میں اسے جلانا چاہتی ہوں۔"

"یہ تو عجیب منطق ہے۔"

"یہ عورتوں کی باتیں ہیں تم انہیں نہیں سمجھ سکتے۔ عورتوں میں رقابت کا مادہ مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہاری جیسی مرضی۔"

"اور اب یہ بتاؤ کہ میرے کام کا کیا رہا؟"

"وہ تمہاری بات مان گیا ہے اور پہلا کام یہ ہے کہ اسرائیلی قید میں موجود فلسطینیوں کی مکمل فہرست اسے فراہم کر دو۔ اس کے ساتھ ہی اسے جیوئش نیشنل کونسل کے رکن بن حیان کے بارے میں پوری معلومات درکار ہیں۔"

"میں کوشش کروں گی مگر دونوں ہی کام بے حد مشکل ہیں۔"

"تمہارے لئے کیا دشواری ہوگی؟"

"فلسطینی قیدیوں کی فہرستیں راز میں رکھی جاتی ہیں کیونکہ آئے دن بہت سے قیدی تشدد اور بیگار کے نتیجے میں مرتے رہتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ قیدیوں کے نام منظر عام پر آجائیں تو کسی نہ کسی حد تک بین الاقوامی ضابطوں کی پابندی لازمی ہو جاتی ہے۔"

"یعنی قیدیوں کو ہلاک کرنے کی آزادی نہیں رہتی۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"غالباً محمود یہی جاننا ہوگا۔"

[illegible]

"وہ احمق نہیں ہے جو آرمی انٹیلی جینس میں اپنے ایک بارسوخ انفارمر کو ضائع کر دے۔" میں نے بارسوخ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے فلورا کے یہاں آکر اچھا نہیں کیا۔"

"تم پھر دہی موضوع لے بیٹھیں۔"

"اس وقت موضوع تمہاری سلامتی کا ہے" وہ سینڈل اتار کر نرم گھاس پر پاؤں پھیلاتے ہوئے بولی۔ "تمہارے بارے میں سرکاری کارروائیاں خاصی سرد ہو چلی تھیں مگر تم نے ٹھکانہ بدل کر لوگوں کو چونکا دیا ہے۔ اب شاید تمہاری نگرانی میں پھر تسلسل پیدا ہو جائے گا۔"

"ہونے دو۔ میں اپنی جگہ مطمئن ہوں!"

"محمود تم سے کہاں ملا تھا؟"

"وہ لمبی کہانی ہے۔ میں موت کے منہ سے بال بال بچا ہوں۔"

"اس کہانی کو اختصار بھی تو دیا جا سکتا ہے!"

"کوئی اور بات کرو!"

وہ اس وقت تک وہیں بیٹھی رہی جب تک فلورا ڈیوٹی سے واپس نہ آگئی۔ اسے دیکھتے ہی ماریا نے پرجوش آواز میں اسے پکارا اور اپنے سینڈل پہننے لگی۔

فلورا ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے آئی تو اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ "تم آج ادھر کیسے آنکلیں، ماریا؟" اس کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

[illegible]

"اس کو کب سے میری اتنی فکر ہوگئی؟"
"اس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں!"
"جب تمہارے سامنے وہ جھوٹ بول رہی تھی تو تم خاموش کیوں رہے تھے؟"
"میں تو اس جھوٹ پر ٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ تمہارے آنے تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ تم سے اتنا حسد کرتی ہوگی۔ ویسے وہ اسمتھ کی کیا لگتی ہے؟"
"اس کی سگی بہن ہے۔" وہ حقارت آمیز لہجہ میں بولی۔ "اس کے لچھن اپنے بھائی سے بھی زیادہ بگڑے ہوئے ہیں۔ آج تک شادی نہیں کی مگر سرکاری نرسری میں اس کے دو بچے پل رہے ہیں۔"
"بہت بانونی ہے۔" میں نے اس کا پارہ اعتدال پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی ہی دیر میں اتنی بے تکلف ہوگئی جیسے مدت سے مجھے جانتی ہو۔"
"عربوں کا ستارہ اس وقت گردش میں ہے ورنہ جس ملک کی فوج میں اسمتھ اور ماریا جیسے افسر ہوں وہ جنگ تو در کنار ڈھنگ سے ہار بھی نہیں سکتی۔" فلورا نے عورتوں کے روایتی انداز میں تبصرہ کیا۔
"فوج کیا بس ہتھیار رکھ رہے ہیں۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ماریا کو تو میں بھگت ہی چکا تھا مگر فلورا کے پاس بھی بولنے کے لئے کافی مواد تھا۔ میں نے اسے اپنے دل کا غبار نکالنے کا بھرپور موقع فراہم کیا اور جب اندھیرا پھیلنے لگا تو میں اسے اپنی بانہوں کا سہارا دے کر کاٹیج میں لے گیا۔
اگلے روز میں اسی دوکان پر اتر گیا جہاں میں ان دنوں ملازمت کر رہا تھا۔ فلورا اسی ٹیکسی پر اپنے دفتر چلی گئی۔
مالک اور دوکان کے عملے نے دو دن کی غیر حاضری کے بعد عجیب نظروں اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا مگر کوئی بھی میری غیر حاضری کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔
اس کے بعد مزید دو روز سکون سے گزرے۔ تیسری شام کو دوکان والے نے یوننگ اسٹینڈرڈ نامی اخبار خریدا تو اس کا پہلا صفحہ دو چونکا دینے والی خبروں کے ساتھ سامنے آیا۔
پہلی خبر ایک اسرائیلی مسافر بردار طیارے میں ہونے والے ہولناک دھماکے کے بارے میں تھی۔ تل ابیب کے نواح میں واقع لد کے ہوائی اڈے پر روانگی سے صرف تین منٹ قبل ایک بوئنگ طیارے میں زبردست دھماکہ ہوا تھا جس کے نتیجہ میں بین الاقوامی یہودی کانفرنس میں شرکت کے لئے بھیجوا جانے والے اسرائیلی وفد کے سات اراکین ہلاک اور چار زخمی ہو گئے تھے۔ طیارے کو شدید نقصان پہنچا تھا۔
دوسری خبر وہی تھی جس کا کئی دن سے مجھے انتظار تھا۔ اس کے مطابق ایک خستہ حال نوجوان لندن میں قیام کرتا ہوا تل ابیب پہنچا تھا۔

اس کا نام شین ہینڈرک تھا اور وہ ناروے کی بندرگاہ [illegible] قلی کا کام کرتا آ رہا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ قاضی نادی [illegible] بھائی ہے۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں وہ بہت سے [illegible] لایا تھا جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ قاضی نادی کا اصل [illegible] تھا اور وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی [illegible] گھبرا کر کسی نامعلوم جگہ فرار ہوگیا تھا۔ اس کے کنبے [illegible] گئے بس شین ہینڈرک ہی کسی طرح بچ بچا کر ناقابل [illegible] چھپتا ہوا ناروے میں اپنی خالہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب [illegible] کے مرنے کے بعد شین معمولی مزدور کی طرح کام کرتا رہا [illegible] نے اخبارات میں قاضی نادی کی ایک تصویر دیکھی تو [illegible] بھائی سے مدد کی امید لئے وہ اسرائیل آیا تھا۔
ایوننگ اسٹینڈرڈ نے شین کے حوالے سے جرمنی [illegible] پر ہونے والے مظالم کے بارے میں ایک چشم دید رپورٹ [illegible] تھی۔ اگر شین ان واقعات کا شاہد نہ ہوتا تو شاید اسرائیلی [illegible] کو سرے سے نظر انداز کر دیتے مگر اس کی سنائی ہوئی [illegible] قومیت میں یقین مضبوط کرنے کے لئے خاصی مؤثر تھیں [illegible] نمایاں جگہ دی گئی۔
دوکان میں فوراً ہی ان دونوں خبروں پر تبصرے شروع ہوگئے۔ لد کے ہوائی اڈے پر طیارے میں ہونے والے دھماکے پر [illegible] براہ راست فلسطینیوں کو گالیاں دی جانے لگیں۔ حالانکہ [illegible] طیارے کے ایک جیٹ انجن میں خرابی کے امکان کا بھی [illegible] تھا کیونکہ دھماکہ کیبن کی بجائے جہاز کے چلتے ہوئے انجن [illegible]
جب فلسطینیوں پر لعن طعن کا ذخیرہ ذرا کم ہوا تو دوسر [illegible] کا موضوع بنی۔ اس ضمن میں کسی نے اس بات پر حیرت کا اظہار [illegible] قاضی نادی دراصل یہودی نسل ہی کا نمائندہ ہے بلکہ سارا [illegible] کی یہودیت پر تبصرہ ہوتا رہا۔
رات کو میں گھر پہنچا تو فلورا اس طرح دل گرفتہ بیٹھی [illegible] یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کا واقعہ حال ہی میں پیش آیا [illegible]
"یہ برسوں پرانی کہانی ہے فلورا۔ ہمیں مہذب انسانوں کی طرح اسے بھول جانا چاہئے۔" کھانے کی میز پر اسے اداس دیکھ کر [illegible]
"یہ اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ ایک پوری قوم [illegible] جیسی بے رحمی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی گئی تھی۔"
"خدا کا شکر کرو کہ آج تم ایک آزاد ملک میں رہ رہی ہو۔"
وہ تاریک دور بیت [illegible] مگر کیا معلوم کہ نازی [illegible] پھر رہے ہوں۔ نازیوں کو بھول گئے ہو؟ ساتھ [illegible] گھاٹ اتارنے والا سفاک بد ذات [illegible] جنگ ختم ہونے کے بعد جاسوسی سرکٹ سرویس کے ہاتھ آیا۔ میرا دل کہتا ہے [illegible]

نازی سب بچے ارجنٹائن وغیرہ میں رہ رہے ہیں۔"
بس روز وہ کافی دیر تک اس موضوع پر بولتی رہی مگر مجھے ان باتوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میں تو اگلے روز ماریا سے ملنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔
اس روز رات کا بیشتر حصہ میں نے جاگتے ہوئے گزارا اور صبح دوکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس روز فلورا نے چھٹی کی تھی۔
دوکان پر دن سیاسی بحث میں گزرا۔ وہاں پر ملازم یہودی فلسطینیوں کی چھوٹی چھوٹی ترکیبیں بتا رہا تھا۔ ان سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ جب تک اسرائیل کی سرحدیں عربوں سے پاک نہیں کر دی جاتیں وہاں جان و مال کی سلامتی ممکن نہیں۔
اس ضمن میں مالک دوکان کی تجویز یہ تھی کہ سب بستیوں میں کنوؤں کے پانی میں زہر ملا دیا جائے اور اس کارروائی کا الزام بھی عربوں پر ہی منسوب کیا جائے۔ اس پر کچھ عرصہ تک اقوام عالم واویلا کریں گی مگر آخرکار طاقت کے آگے سب سر جھکا دیں گے۔
میں نے وہ دن سخت خلفشار اور بے چینی کے عالم میں گزارا۔ میرے اوقات کار اتنے طویل تھے کہ مجھے شہر کی حالت کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ پھر مجھے یہ فکر بھی تھی کہ ماریا سے ملنے والی معلومات کو جلد از جلد کس طرح محمود تک پہنچاؤں۔ ان معلومات کو روک کر میں ان گنت خطرات کو دعوت دے بیٹھتا۔
میں براہ راست اسرائیلی حکام کی نظروں میں تھا۔ اگر مجھے ان فہرستوں سمیت پکڑ لیا جاتا تو میرا جو بھی حشر ہوتا، ماریا فوراً فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑی کر دی جاتی۔
وہ حسین بھی تھی اور فراخ دل بھی مگر مجھے ان خوبیوں کی بنا پر اس سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مجھے صرف یہ اندیشہ تھا کہیں میری کسی حماقت کی بنا پر افواج آزادیٔ فلسطین کی وہ اہم ترین انفارمر نہ ماری جائے۔
خدا خدا کر کے شام کے سات بجے اور دوکان کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا گیا۔ میں اپنے طرز عمل سے دوکاندار کو شبہ کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا معمول کے مطابق سکون سے کام کرتا رہا۔
نصف گھنٹہ بعد دوکان بند کر کے سب لوگ اپنے اپنے راستے پر چل دیئے اور میں نے اپنا تعاقب کرنے والے کو گلیوں کے چکر دینے شروع کر دیئے مگر کچھ دیر بعد میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس روز کوئی بھی شخص میری نگرانی پر مامور نہیں تھا۔
سوا آٹھ بجے میں الحمرا نامی سینما پر جا پہنچا۔ خواتین کی انتظار گاہ میں مجھے دور ہی سے ماریا نظر آ گئی اور حسن اتفاق سے اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میں اندر جانے کی بجائے پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سینما ہال کی اس پچھلی راہداری میں مڑ گیا جو بیت الخلا خاتون کی طرف جاتی تھی۔

پیشاب خانے میں اس وقت سناٹا تھا۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے راہداری کا جائزہ لینا شروع کر دیا پھر جیوں ہی مجھے ماریا نظر آئی میں باہر نکل آیا۔
ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ماریا نے رفتار سست کئے بغیر ایک چھوٹا سا پیکٹ میری طرف بڑھایا اور میں اسے جیب میں اڑس کر یوں آگے بڑھتا چلا گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔
بظاہر وہ اہم ترین کام خوش اسلوبی سے انجام پا چکا تھا مگر میرا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے اچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا۔
میرے لئے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ ماریا کاغذ کے پلندے کی بجائے فہرستوں کی مائکرو فلمیں لے آئی تھی۔ اس طرح سے کئی صفحات پر مشتمل تفصیلی معلومات بمشکل دو اونس وزنی ایک پیکٹ میں سما گئیں تھیں جو مختصر ہونے کے ساتھ ہی محفوظ بھی تھا۔
گو اس وقت رات ہو چکی تھی اور مجھے محمود کے ٹھکانے کے فاصلے کا بھی علم نہیں تھا مگر میں نے بہتر ہی سمجھا کہ فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں۔
مرکزی ہیکل کے دروازے پر بیٹھنے والے فقیر کی نشست دیکھ کر میں پہلی مرتبہ ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ دن رات وہیں موجود رہتا ہے لہٰذا اس وقت بھی میں بلا جھجک اس سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔
میں وہاں پہنچا تو وہ فقیر بوسیدہ کمبل میں لپٹا ہوا ایک گٹھڑی کی صورت میں فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں دور دور تک کوئی راہگیر بھی موجود نہیں تھا حالانکہ دن میں وہاں ہر وقت خاصی چہل پہل رہتی تھی۔
"میرے حق میں دعا کریں بابا!" میں نے جیب سے چند سکے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔
وہ بظاہر تو خوابیدہ نظر آ رہا تھا مگر اس عجیب سی درخواست پر وہ چونک پڑا اور جسم کو جنبش دیئے بغیر بولا۔ "دو ٹیکسی اسٹینڈ پر ہوگا۔" پھر اس نے ٹیکسی کا نمبر دہرایا اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔
ٹیکسی اسٹینڈ مرکزی ہیکل سے کافی دور تھا۔ میں وہاں پہنچا تو فقیر کے بتائے ہوئے نمبر والی ٹیکسی وہاں موجود نہیں تھی۔ وہاں رک کر میں دوسرے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا لہٰذا میں آگے بڑھتا چلا گیا۔
ایک کیفے میں چائے کے ساتھ کچھ سینڈوچ کھا کر میں نے خاصا وقت گزارا اور دوبارہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ اس بار مجھے کامیابی ہوئی کیونکہ اڈے پر میری مطلوبہ ٹیکسی موجود تھی۔ میں قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر میرا دل بجھ گیا کیونکہ وہاں محمود کی بجائے کرخت صورت اور بڑی بڑی مونچھوں والا ایک اجنبی موجود تھا۔
میں نے کنکھیوں سے ایک مرتبہ پھر ٹیکسی کے نمبر دیکھے جو میری یادداشت کے عین مطابق تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر ٹیکسی کا دروازہ

کھولا اور عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کر خونخوار لہجے میں پوچھا

"مرکزی ہسپتال۔۔۔!"

"اچھا اچھا۔" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا اور

ٹیکسی کا انجن بیدار ہو گیا۔

ٹیکسی کافی دیر تک تل ابیب کی سڑکوں پر گھومتی رہی پھر ایک تنگ گلی

سے نکلنے پر جیا کر رکی تھی، میں ٹیکسی سے اترنے ہی والا تھا کہ ڈرائیور نے

سختی سے مجھے روک دیا اور ہارن بجا دیا۔

چند ثانیوں کے بعد گلی کے پورٹیکو میں مجھے محمود نظر آیا اس کے

ہمراہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت بھی تھی۔

"میں تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہوں مجھے ایک بیوپاری سے بات

کرنی ہے۔" پورٹیکو سے محمود کی آواز سنائی دی۔

"میں کھانا تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گی۔ ذرا جلدی واپس آنا۔"

عورت نے کہا اور محمود اقرار کرتا ہوا باہر آ گیا۔

"ارے صفدر تم!" ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی محمود حیرت سے بولا۔

"ہاں میں ایک امانت لے کر آیا ہوں۔"

"مجھے تو حیرت ہوئی تھی کہ اس وقت میری تلاش میں کون آ گیا۔

ویسے میں خود منتظر تھا کہ تم سے ملنے والا تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارا زخم اب کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے، بغیر لنگڑائے چل لیتا ہوں۔" وہ خوش دلی کے ساتھ بولا

"یہ مائکرو فلم آج ہی ملی ہے۔" میں نے وہ پیکٹ اس کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لڑکی سے؟"

"ہاں!" میں نے ماریا کا نام لیے بغیر اقرار کیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ڈرائیور

کی موجودگی میں وہ اشاروں کنایوں میں بات کرنی چاہتا ہے۔

"ہم پر دن بدن تمہارے احسانات بڑھتے جا رہے ہیں مگر اب

وقت آ گیا ہے شاید ہم بھی تمہارے لئے کچھ کر سکیں۔"

"احسان نہیں، یہ کام تو میں اپنا فرض سمجھ کر کر رہا ہوں۔"

"تم اسرائیل سے نکلنا چاہتے ہو نا؟"

"یہ تو شاید میری سب سے بڑی آرزو ہے۔"

"پھر آخری معرکے کی تیاری کر لو۔ دو روز بعد اگر خدا نے چاہا

تو تم اسرائیل سے دور چلے جاؤ گے۔"

"کوئی خطرناک پروگرام معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں تو ہم سب مارے جائیں گے یا ہم بڑا انتقام لے کر سرحد پار کر

جاؤ گے۔ میں سارا منصوبہ تیار کر چکا ہوں۔ اس میں سارے کھیل کا دارو

مدار تمہارے حوصلے پر ہے۔"

"میں تمہاری توقعات پر پورا اتروں گا۔"

"کل رات ٹھیک بجے سنیٹر پر بھی ٹیکسی تمہارا انتظار [illegible]

وقت پر قسمت میں ہوئی اجازت چاہوں گا [illegible]

بچے میں کہا، کیونکہ مجھے پتہ ہے [illegible] نہیں پہنچانی ہوگی۔

"تو مجھے نہیں مارو گے۔"

ٹیکسی نٹ پاتھ کے کنارے رک گئی [illegible]

کے پیچھے گیا اور ٹیکسی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی [illegible]

اسرائیل

[illegible] سر انجام دے چکا تھا، اسرائیل کے آرمی انٹیلی جنس [illegible]

میری وجہ سے فلسطینی افواج آزادی کی میز پر پہنچ [illegible]

ذریعہ ان بدنصیب حریت پسندوں کے ناموں کی فہرست [illegible]

میں کامیاب ہو گیا تھا جو آزادی مانگنے کے جرم [illegible]

زمانہ عقوبت خانوں میں ہولناک سزائیں جھیل رہے تھے [illegible]

بہت بڑی کامیابی تھی۔

اب کم از کم دنیا کو یہ بتایا جا سکتا تھا کہ فلسطینیوں [illegible]

تعداد یہودیوں کی غیر انسانی قید میں ہے۔ ان میں سے [illegible]

تاب نہ لا کر مر جاتے ان کی بے گور و کفن لاشیں سمندر [illegible]

جاتیں یا طاقتور برقی بھٹیوں میں جلا کر خاک کر دی جاتیں [illegible]

اسی احساس کے ساتھ مجھے رہ رہ کر محمود کی گفتگو [illegible]

اس جری نوجوان نے مجھے ایک بڑی خوشخبری سنائی تھی [illegible]

دو روز بعد کوئی زبردست معرکہ درپیش تھا جس کی کامیابی [illegible]

کا دارومدار تھا۔

میں گھر پہنچا تو خلاف معمول مجھے کافی تاخیر ہو گئی تھی [illegible]

میرے انتظار میں بے چینی کے ساتھ برآمدے میں ٹہل رہی [illegible]

"کہاں بھٹک گئے تھے؟" مجھے دیکھتے ہی فلورا تیزی کے ساتھ [illegible]

طرف بڑھی۔

"دو دکان میں کام کرنے والوں کے ساتھ ایک [illegible]

گیا تھا۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے [illegible]

"بھلا مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ تم اصل بات کو چھپانے کی کوشش [illegible]

وہ میرا کوٹ اتارتے ہوئے بولی "کون سے ریستوران [illegible]

"ہم گولڈن گرل میں تھے آخر تمہارے شہر کی [illegible]

"وہی جو افسر ماریا میری پریشانی کا سبب ہے [illegible]

ہاتھ تھام کر مجھے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ وہ مجھ پر ڈورے ڈالنے کی [illegible]

کرے گی۔"

"وہ خیال نہیں، مجھے پورا یقین ہے۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی

"وہ مجھ سے بے انتہا حسد کرتی ہے اور تمہیں یہاں دیکھ چکی ہے۔ اس

کی پوری کوشش ہوگی کہ تمہیں اپنے جال میں پھانس کر مجھ سے بدظن

کر دے۔ میرے معاملے میں وہ حد سے تجاوز بھی کر سکتی ہے۔"

"آخر وہ کس حد تک ایسی حرکتیں کر سکے گی۔ میں نہیں تو تمہارے

بنے ہوئے تل ابیب میں بے شمار دوست مل جائیں گے۔ ماریا کس کس

کو بہکائے گی؟"

"چھوڑو اس کے ذکر کو میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ شام تم

نے اس کے ساتھ نہیں گزاری ہے۔ تم یقین کرو کہ وہ ایک بازاری عورت

سے بھی بدتر ہے۔"

"رنگ روپ تو اچھا خاصا ہے۔" میں نے شوشہ چھوڑا۔

"اس عمر میں تو گدھی بھی حسین لگتی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ

اپنی کمان میں کام کرنے والے نچلے درجے کے سپاہیوں سے بھی دوستی میں

عار نہیں سمجھتی اور جو سپاہی اس کے رتبے کا لحاظ کرتے ہوئے جھجک سے

کام لے وہ کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں زیرِ عتاب آ جاتا ہے۔"

یہ سن کر میں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "دونوں بہن بھائی ایک

ہی جیسا ذوق رکھتے ہیں۔"

"بلکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں زیادہ بدذوق کون

ہے۔"

"میجر اسمتھ اپنے یونٹ کی ایک سارجنٹ پر عاشق ہے جو بنیادی

طور پر گوالن ہے اور کیپٹن ماریا اپنے سپاہیوں پر لطف و کرم کی برسات

کرتی رہتی ہے۔"

"معلوم ہو رہا ہے کہ تمہیں ماریا کے ذکر میں مزہ آتا ہے۔"

"اس کا ذکر تو تم ہی نے چھیڑا تھا۔"

"تو اب میری درخواست ہے کہ خدا کے لیے اسے بھول جاؤ۔

تمہارے انتظار میں میں نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔"

"میں کھا کر آیا ہوں مگر تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔"

"میں تمہارے پسندیدہ بیف اسٹیک لائی ہوں۔"

میں لباس تبدیل کرنے لگا اور فلورا کھانا تیار کرنے کچن کی

طرف چل دی۔

اس رات ہم دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اگلی صبح میں

بیدار ہوا تو میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ اس روز دکان کی طرف جاتے ہوئے

میں نے پہلی مرتبہ ملازمت کے بارے میں منفی رجحانات محسوس کیے۔ میں نے

زندگی میں کبھی باقاعدہ ملازمت نہیں کی تھی مگر تل ابیب آنے کے بعد

حالات کے تحت مجھے ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان سے وابستہ ہونا پڑ گیا۔

اس ملازمت کی پابندی اس روز مجھے بوجھ معلوم ہو رہی تھی۔ آدمی صحت

مند ہو یا بیمار، ہر حال میں جائے ملازمت پہنچنے کا پابند تھا۔

دوسرے روز شام کے وقت دکان پر آنے والے ایک گاہک

کے ذریعے مجھے محمود کا نیا پیغام ملا اور میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔

محمود کے بیان کے مطابق شاید عمل کا وقت آ پہنچا تھا۔

دکان بند ہونے تک میں نے بہت بے چینی سے وقت گزارا۔

اس کے بعد میں مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ

گیا۔ پروگرام کے مطابق محمود کے کسی آدمی کو خود ہی مجھ سے رابطہ

قائم کرنا تھا۔

میں وقت گزاری کے لیے ٹہلتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ سے قدرے

فاصلے پر واقع ایک بک اسٹال پر پہنچ گیا اور روشنی میں اخبارات و

رسائل کی سرخیاں دیکھنے لگا۔ اس وقت کاؤنٹر پر میرے علاوہ کوئی

اور گاہک موجود نہیں تھا۔

"چونکنے کی ضرورت نہیں، خاموشی سے میری بات سنتے جاؤ۔" اچانک

مجھے اپنے کانوں میں کسی کی سخت سرگوشیانہ آواز آئی اور یک بیک میرے

اعصاب میں سنسنی کی لہر سرایت کر گئی۔

میں نے بظاہر نہایت سکون سے اپنی جگہ بدلی اور پھر کرخت

چہرے اور بڑھی ہوئی داڑھی والا وہ شخص مجھے نظر آ گیا جو میرے عقب

میں کھڑا ہوا اخبارات کا جائزہ لے رہا تھا۔

ایک ثانیے کے لیے ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور میری چھٹی

حس نے اسے دوست ماننے کا مشورہ دیا جسے میں نے فوراً تسلیم کر لیا۔

"دھاری دار نیلے سوٹ میں ایک گنجا تمہاری نگرانی کر رہا ہے

اسے ڈاج دے کر میوزک کارنر کے فٹ پاتھ پر میرا انتظار کرو۔" اس

نے میرے قریب آ کر بہت دھیمی آواز میں ہدایت دی پھر آگے بڑھ

کر کاؤنٹر سے الونگ اسٹینڈرڈ کا تازہ اخبار خریدا اور لاپروایانہ انداز

میں ایک طرف چل دیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے کاؤنٹر پر پڑے ہوئے رسائل

کی ورق گردانی کرتے ہوئے اپنی پوزیشن اس طرح تبدیل کر لی کہ کنکھیوں

سے قرب و جوار کا جائزہ لے سکوں۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ میری نظروں میں آ گیا۔ وہ لیٹر

بکس کے سہارے کھڑا ہوا بڑے سکون سے سگار نوشی کر رہا تھا۔ بالوں

سے محروم وہ پستہ قامت شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ گو میرا اور

اس کا کبھی تعارف نہیں تھا لیکن اسرائیلی آرمی انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹرز

میں قید کے دوران، ایک بار میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا

تھا اور اس کا نام میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

میں نے اسٹال سے لائف میگزین خریدا اور دل ہی میں مسکراتے

ہوئے سیدھا اس گنجے کی طرف ہو لیا۔

اس نے شاید کنکھیوں سے مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ

لیا تھا کیونکہ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور سگار کے پے در پے

کئی کش لے ڈالے۔

پھر جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ تن کر سیدھا کھڑا ہو چکا تھا مگر بظاہر میری جانب سے لاپرواہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہیلو لیوک!" میں نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر لائف میگزین مار کر خوش دلی سے کہا "کس کا انتظار کر رہے ہو؟"

وہ تیزی سے میری طرف پلٹا اور عینک کے موٹے موٹے عدسوں میں سے گھورتی ہوئی اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں "میں نے تم کو پہچانا نہیں!" وہ خشک لہجے میں بولا۔

"تمہارا حافظہ کمزور ہو گیا ہے، میرا نام صفدر علی ہے!" میں نے قہقہہ مار کر کہا "ہیڈکوارٹرز میں قید کے دوران ماریا نے مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔"

"میں نے تمہارا نام ضرور سنا ہوا تھا۔" وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش میں خاصا مضحکہ خیز نظر آنے لگا "مگر آج پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔"

"شاید ٹیکسی کا انتظار کر رہے ہو؟"

"ہاں.....آں" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"کہاں جاؤ گے؟" میں نے جارحانہ بے تکلفی کے ساتھ سوال کیا۔

"ہارلے اسٹریٹ!" اس نے جلدی سے کہا۔

"میں تمہیں چھوڑتا ہوا نکل جاؤں گا مجھے پوتھ کلب جانا ہے" یہ کہہ کر میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو روک لیا۔

وہ انکار ہی کرتا رہا مگر میں نے اسے تقریباً دھکیل کر ٹیکسی کی عقبی نشست پر بٹھا دیا اور ڈرائیور کو ہارلے اسٹریٹ چلنے کی ہدایت کر دی۔

لیوک اس صورت حال سے خاصا بوکھلا گیا تھا۔ میں نے ٹیکسی روانہ ہونے کے بعد بھی اسے بے سروپا باتوں میں الجھائے رکھا مجھے یقین تھا کہ وہ دل ہی دل میں میری بوٹیاں نوچنے کا منصوبہ بنا رہا ہو گا۔

ٹیکسی ہارلے اسٹریٹ میں داخل ہوئی تو اس کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا۔

"کہاں اترو گے؟" میں نے اس سے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

"کہیں نہیں" وہ غرا کر بولا۔ شاید اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"مگر تم تو ہارلے اسٹریٹ پر اترنے والے تھے؟" میں نے حیرت کا مصنوعی مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"ہارلے اسٹریٹ کی ایسی کی تیسی" وہ دانت پیس کر بولا "میں پوتھ کلب جاؤں گا۔"

"پھر میں یہیں اتر جاتا ہوں" یہ کہہ کر میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا۔

"میں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔" لیوک اپنی طرف کے دروازے کے قریب کھسکتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔

پھر ٹیکسی رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر مجھ سے پہلے نیچے اتر گیا۔

"جلدی چلو" میں نے پھرتی سے لیوک والا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ لیوک وہاں کھڑا گالیاں بکتا رہ گیا اور ٹیکسی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"بہت غصے میں تھا بے چارہ!" ڈرائیور نے تبصرہ کیا۔

"اسے چڑھی ہوئی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس سے پیچھا چھڑا کر اس کی محبوبہ کے گھر جا رہا ہوں" میں نے وضاحت کی اور ڈرائیور کھل کر ہنسنے لگا۔

تھوڑی دور جا کر میں نے وہ ٹیکسی چھوڑ دی اور چند خالی گلیوں کو چھوڑنے کے بعد ایک ٹیکسی میں میوزک کارنر کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے وہاں اترے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک سیاہ رینگتی ہوئی میرے قریب آ رکی اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی داڑھی ترشی ہوئی نوجوان بیٹھا ہوا تھا جس نے بک اسٹال پر مجھے لیوک کی طرف سے ہوشیار کیا تھا۔

میرے بیٹھنے کے بعد کار آگے بڑھاتے ہوئے اس نے تاخیر کا سبب دریافت کیا اور میں نے مختصر الفاظ میں پوری کہانی اسے سنا دی۔

"تم واقعی گریٹ ہو" وہ زور زور سے ہنستے ہوئے بولا "وہ کسی کو بتا بھی نہ سکے گا کہ اسے کیسی بری چوٹ ہوئی ہے۔"

"مجھے کہاں جانا ہے؟"

"تھوڑی دیر صبر کرو، پتہ چل جائے گا۔"

کافی طویل ڈرائیونگ کے بعد ہمارے سفر کا اختتام ایک ایسے علاقے میں ہوا جہاں تاریکی میں ہر طرف اونچے نیچے پتھریلے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ پختہ سڑک تو ہم پہلے ہی کافی دور چھوڑ آئے تھے۔ مجھے لانے والے نے کار کا انجن بند کر کے مجھے ساتھ آنے کی ہدایت کی اور ایک طرف ہو لیا۔ پُرپیچ اور ناہموار راستے عبور کرنے کے بعد ہم ایک دراڑ میں داخل ہوئے جہاں پٹرومکس کی روشنی میں دو افراد پہلے سے موجود تھے۔

"کافی دیر کر دی تم لوگوں نے؟" ان میں سے ایک نے مجھے لانے والے سے مخاطب ہو کر سرد لہجے میں سوال کیا۔

"ایک سرکاری کتا صفدر کے پیچھے لگا ہوا تھا!" اس نے جواب دیا "اس سے پیچھا چھڑانے میں دیر ہو گئی ورنہ ہم وقت پر آ جاتے۔"

میری نگاہیں متجسس انداز میں دراڑ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان دونوں میں کوئی بھی میرا جانا پہچانا چہرہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ محمود بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کوئی نئی کامیابی ہوئی؟" پہلے سے وہاں موجود افراد میں سے ادھیڑ عمر شخص نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے مایوسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس سے محمود کے بارے میں سوال کروں مگر میں نے یہ ارادہ فوراً ہی ترک کر دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ کسی بھی شخص کے غیر ضروری تجسس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

"محمود ایک فوری کام پڑ جانے کے باعث نہیں آ سکا۔ اس نے مجھے ہدایت کی ہے کہ تم سے حاصل ہونے والی تمام معلومات فوراً اسے پہنچا دوں ــــ"

"مگر میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو میں اس تک پہنچا سکوں!" میں نے حیرت سے کہا۔ اس شخص کی گفتگو نے اچانک مجھے محتاط کر دیا تھا۔

"محمود سے تمہاری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

اس سوال نے میرے کان کھڑے کر دیئے اور میرا دل یک بیک اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ محمود کے نام پر میرے لیے جال بچھایا گیا ہے تاکہ ایک بار میرا اور اس کا تعلق معلوم کیا جا سکے۔ میں نے یہ احساس ہوتے ہی اپنے لہجے کو اعتدال پر رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "محمود سے ملاقات کی حسرت ہی تو مجھے یہاں لائی ہے مجھے معلوم ہے کہ وہ میری جانب سے غلط فہمیوں کا شکار ہے میں ایک بار اس سے مل کر اپنی پوزیشن صاف کرنی چاہتا ہوں۔"

"وہ تمہارے لیے دوستانہ جذبات رکھتا ہے۔"

"مگر اس کی جانب سے ایک بار مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی ہو چکا ہے۔ وہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں بال بال بچ گیا۔"

"وہ اس کا فوری ردِعمل تھا مگر اب وہ تمہارا تعاون چاہتا ہے" وہ شخص نرم لہجے میں بولا "اسے یقین ہے کہ تمہارے پاس اس کے لیے اہم معلومات ہوں گی۔"

ان فقروں نے میرے شبہات کو یقین میں بدل دیا۔ محمود تو درکنار وہ لوگ اس کے سائے سے بھی ناواقف تھے۔ مجھے لانے والے نے شاید اسی لیے مجھے لیوک کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا کہ میں اس کی اصلیت پر شبہ نہ کر سکوں۔

میرے لیے اسی روز نگرانی کا ڈھونگ رچایا گیا اور آدمی بھی ایسا منتخب کیا گیا جسے میں بآسانی پہچان سکوں اور پھر بآسانی ان کے جال میں پھنستا چلا جاؤں۔

غنیمت یہ ہوا کہ میں محمود کے آدمیوں کے طریقہ کار اور مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ وہ لوگ نہ غیر ضروری باتیں کرتے تھے، نہ سننا پسند کرتے تھے، محض اسی وجہ سے میں نے اپنے لانے والے سے کوئی بات نہیں کی اس وقت تک مجھے پورا یقین تھا کہ میں محمود ہی کے پاس لے جایا جا رہا ہوں۔ اگر میں اس سے کوئی اہم بات شروع کر دیتا تو میرے لیے بچاؤ کی ساری راہیں مسدود ہو جاتیں۔

"مجھ جیسا شخص اسرائیل کی سرزمین پر بھلا اس کے لیے کیا کر سکے گا۔ میں تو ویسے بھی اسرائیلی حکام کی نظروں میں ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے بھی میری نگرانی ہو رہی تھی۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ محمود فراخ دلی سے کام لے کر مجھے جانے۔"

"تم فلورا سے بہت سی معلومات حاصل کر سکتے ہو۔ اس کا شوہر اسرائیلی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز ہے" اس شخص نے چارہ ڈالا۔

"فلورا" میں نے حقارت سے کہا "وہ ایک جنس زدہ عورت ہے اپنے شوہر کی پیشہ ورانہ مصروفیات سے وہ لاعلم رہتی ہے ــــ اسے آسودگی کی تلاش تھی اور مجھے مہنگے ہوٹلوں کے بجائے سر چھپانے کے لیے کسی سستے ٹھکانے کی ضرورت تھی یوں میں اس کے گھر پہنچ گیا۔"

"وہ کیپٹن ماریا کی بھاوج ہے" وہ شخص پُرجوش لہجے میں بولا "تم اس سے ماریا کی کمزوریاں معلوم کر سکتے ہو اور پھر ہم ماریا کو بلیک میل کر سکیں گے۔"

میں کھوکھلے انداز میں ہنس دیا "ماریا کے بارے میں نہ سوچو تو بہتر ہو گا۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ ڈنکے کی چوٹ پر اپنی ان خامیوں کا اعتراف کرتی پھرتی ہے جن کے سہارے کسی شریف عورت کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم محمود کے ساتھ تعاون کرنا ہی نہیں چاہتے۔"

"میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا دوست!" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر کے لیے خود کو میری جگہ تصور کرو ویسا ہی بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ اسرائیلی حکام کا تشدد میں ایک بار جھیل چکا ہوں دوبارہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے!" پھر میں نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا "اگر ایک بار محمود بھی اس تشدد کا نشانہ بن جائے تو شاید اپنی موجودہ سرگرمیوں سے تائب ہو جائے گا۔"

"اسے گالی نہ دو صفدر!" وہ غرایا "محمود شیر کی کچھار میں گھس کر بھی غرانا جانتا ہے۔ اس کی دوستی ٹھکرا کر تم بے پناہ مصائب مول لے لو گے۔"

"مجھے تو خود ہی اس سے دوستی کی خواہش ہے مگر میں اس کے کسی کام نہ آ سکوں گا۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارا جواب اس تک پہنچا دیا جائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو!"

مجھے لانے والا مجھے ساتھ لے کر چل دیا۔

واپسی کا سفر بوجھل خاموشی کے ساتھ طے ہوا۔ مجھے سارے راستے ایک سوال پریشان کرتا رہا کہ جو شخص اسٹور میں محمود کا فرضی پیغام لایا تھا اس نے مجھے ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ آخر سرکاری اہلکاروں کو محمود کے اس ٹھکانے کا علم کیسے ہوا؟

ویسے محمود نے شناختی کوڈ کا خاتمہ کر کے میرے ساتھ بڑا ظلم

کیا تھا۔ میرے لیے اس کے اصل اور فرضی ہرکاروں میں تمیز کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

شہر میں سیاہ فورڈ سے اترنے کے بعد میں ایک بار میں جا بیٹھا تو ایک منہ پھیر گذرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔

میں بار سے اٹھتے ہوئے فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے محمود سے فوری طور پر ملنا چاہیئے۔

آنی رات گئے مرکزی ہیکل والی فٹ پاتھ ویران پڑی ہوئی تھی اور داہنے ستون کے ساتھ وہی فقیر اپنی گدڑی میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔

میں نے اسے سکے دے کر اپنے حق میں بددعا کی درخواست کی اور اس نے مجھے ایک نائٹ کلب کے کیش رجسٹر پر بیٹھنے والی سلویا نامی لڑکی سے ملنے کی ہدایت کی۔

جس وقت میں نائٹ کلب میں پہنچا تو لڑکی کے پاس دو بیرے موجود تھے۔ میں دیوار کے سہارے رک کر سگریٹ نکالنے لگا۔ سگریٹ سلگانے میں میں نے اتنا وقت لے لیا کہ بیرے حساب نمٹا کر واپس چلے گئے۔

میدان صاف ہوتے ہی میں مس سلویا کے پاس پہنچ گیا اور خوش خلقی سے دریافت کیا "مس سلویا؟"

لڑکی نے ایک ادا سے مسکرا کر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"مجھے اس کی تلاش ہے جو ہزاروں پہ بھاری ہوتا ہے" میں نے فقیر کے کہے ہوئے الفاظ دہرائے۔

"میز نمبر تین پر بیٹھو!" اس نے جلدی سے کہا۔

اس وقت ہال میں چند میزیں خالی تھیں جن میں تیسری میز بھی تھی۔ میں اطمینان سے وہاں براجمان ہو گیا۔

نائٹ کلب میں اس وقت ایک ہیجان انگیز شو جاری تھا۔ رقاصہ کے بدن پر ایک ڈھیلا سا گاؤن موجود تھا۔ وہ حسین اور ماہر رقاصہ جب موسیقی کی تال پر اپنے جسم کی نپی تلی تیز حرکات سے گاؤن کو فضا میں لہراتی تو ہال میں بے اختیار دبی دبی پرجوش آوازیں گونج اٹھتیں کیونکہ اس کے جسم پر گاؤن کے سوا کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ ستر پوشی بلکہ ستر نمائی کے لیے مختلف رنگوں سے اس کی جلد پہ نقش و نگار بنائے گئے تھے۔

مجھے وہاں بیٹھے تقریباً نصف گھنٹہ گذر گیا۔ وہ رقاصہ جا چکی تھی اور اب اسٹیج پر ایک نیا کھیل جاری تھا کہ نیم تاریکی میں کسی نے میرے شانے پر جھک کر مجھے اٹھنے کے لیے کہا۔

میں اس کے ہمراہ میزوں کے درمیان سے گذرتا ہوا باہر آ گیا۔ نائٹ کلب کے دروازے پر ایک کال ٹیکسی موجود تھی۔ اس شخص نے مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر عبرانی زبان میں ڈرائیور سے کچھ کہا اور ٹیکسی تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئی۔

"وہاں بھئی صفدر! کیا خیر خبر ہے!" کافی دیر کے مکمل سکوت کے بعد اچانک ٹیکسی ڈرائیور کی آواز کسی بم کی طرح میرے اعصاب پر گری۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ خود محمود ڈرائیور کے روپ میں میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔

"تم ...... تم اتنی دیر سے خاموش کیوں تھے؟"

"تمہیں حیران کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔"

"آج میں ایک بہت بڑے دھوکے سے بال بال بچا ہوں۔"

"کوئی سرکاری دھوکا؟"

"ہاں ــــ اور میں ذرا بھی چوک جاتا تو بے موت مارا گیا ہوتا۔"

"تفصیل نہیں بتاؤ گے؟"

"وہی تو بتانے آیا ہوں" یہ کہہ کر میں نے پوری کہانی سنا دی۔

"وہ اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔" میرے خاموش ہونے پر وہ بولا "مجھے تمہاری اسی صلاحیت پر ناز ہے کہ بدترین حالات میں بھی تمہارے حواس پوری طرح کام کرتے رہتے ہیں۔ تم نے بہت خوبصورتی سے انہیں مطمئن کر دیا ہے!"

"مگر میں آئندہ کے لیے احتیاط چاہتا ہوں۔ تمہارے آدمی کی پہچان کے لیے کوئی کوڈ ہونا بہت ضروری ہے" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" وہ ہنس کر بولا "آئندہ میرا جو آدمی تمہارے پاس آئے گا سب سے پہلے کینڈر کی کھال کی جیکٹ طلب کرے گا۔"

"یہ بہتر ہے" میں نے کہا "اب دوسری بات یہ کہ ٹیکسی اسٹینڈ ان لوگوں کی نظر میں آ چکا ہے ......"

"نہیں" وہ میری بات کاٹ کر بولا "تمہیں شاید یاد نہیں رہا کہ ان سے تمہاری پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی جس کی تفصیل انہوں نے الیکٹرو ہیپناٹک مشین پر تم سے اگلوائی تھی۔ ان کے پاس بس وہی کلیو تھا جس کے سہارے اس بار بھی انہوں نے ٹیکسی اسٹینڈ کا نام استعمال کیا۔"

"میرے لیے تم نے کسی بڑے معرکے کا ذکر کیا تھا۔ اس کا کیا بنا؟"

"ہمارا ایک اہم آدمی پکڑا گیا ہے۔ یہ کام اب شاید کچھ دن کے لیے ٹل جائے گا۔ ویسے کل تک شاید میں خود ہی تم سے رابطہ قائم کرتا۔"

"کوئی خاص کام؟"

"ہاں ــــ ہمارا یوسف نامی ایک ساتھی پولیس کی قید میں ہے اور اس پر وحشیانہ تشدد ہو رہا ہے۔ اسے کسی طرح سے زہریلا کیپسول پہنچانا ہے!"

"زہریلا کیپسول؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ اسے چھڑانا ناممکنات میں سے ہے!"

"مگر اخبار میں تو اس کی خودکشی خبر آ چکی ہے!"

"یہ ہمیں غافل کرنے کے لیے پولیس کا فراڈ ہے۔ یوسف کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی جس میں نگ کی جگہ زہریلا کیپسول جڑا ہوا تھا۔

اسے گرفتار کرتے ہی پولیس نے انگوٹھی بھی قبضے میں لے لی اور جب انہیں کیپسول کی اصلیت کا علم ہوا تو انہوں نے یوسف کی خودکشی کی خبر جاری کرا دی تاکہ ہماری طرف سے اس کی جان لینے کی کوئی کوشش نہ کی جائے!"

"یہ سب تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"ہمارا ایک نہ ایک آدمی دن رات تھانے کی نگرانی کر رہا ہے ــ وہاں سے نہ کوئی لاش لے جائی گئی ہے اور نہ وہاں کوئی غیر معمولی جاگ [illegible] نظر آئی ہے جو کسی قیدی کی خودکشی کی صورت میں لازمی بات ہے۔"

"تو کیا یہ اس نے [illegible] سے بھرے لہجے میں کہا۔

"تو [illegible] خودکشی کرے گا؟"

"آزادی کی جنگ جذبے کے بغیر نہیں لڑی جاتی صفدر۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا "اگر میری ذات سے تنظیم کو خطرہ لاحق ہوا تو میں بھی خود کو فلسطین کے نام پر نثار کر دوں گا۔"

"کیپسول مجھے دے دو۔" میں نے چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد دھیمی آواز میں کہا "میں یہ کام ماریلے سے کرا لوں گا۔"

اس نے گاڑی چلاتے ہوئے سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ میری طرف بڑھا دی "اس میں جو کیپسول ہے وہ پوٹاشیم سائنائیڈ سے زیادہ مہلک ہے۔ قسمت نے مجھ کو یہ وقت بھی دکھانا تھا کہ میں اپنے بچپن کے ساتھی کے لیے زہر کا تحفہ بھیجوں۔"

میں خاموش بیٹھا ڈبیہ سے کھیلتا رہا۔ میرے دل پر عجیب غبار سا چھانے لگا تھا۔

"کراچی کے انجینئرنگ کالج میں ہمارا ایک آدمی زیر تعلیم ہے، اس نے تمہارے لیے ایک اچھی خبر بھیجی ہے!" کچھ دیر کے بعد محمود نے کہا۔

یکبیک میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اور میں نے بے تابانہ لہجے میں سوال کر ڈالا "کیا خبر آئی ہے؟ جلدی بتاؤ مجھے!"

"تمہاری بیوی لاہور میں دیکھی گئی ہے!"

"لاہور میں؟" میں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا "پوری تفصیل بتاؤ میرے دوست اپنی سیتا کا حال سنے تو مجھے ایک مدت بیت گئی ہے!"

"فی الحال اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہماری تنظیم کے ایک سرگرم کارکن کا چھوٹا بھائی انجینئرنگ کالج کے تیسرے سال کا طالب علم ہے۔ تمہاری بیوی کا سراغ لگانے کے لیے ہم نے اسی کو پیغام بھجوایا تھا۔ پچھلے دنوں وہ کالج کے لڑکوں کے ساتھ پاکستان کے تعلیمی دورے پر گیا تو لاہور میں اس نے ایک لڑکی دیکھی جو تمہارے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق تھی ــــ اس لڑکے نے اس سے بات کرنی چاہی مگر وہ انگریزی نہ سمجھ سکی البتہ اس کے منہ سے تمہارا نام سن کر وہ بری طرح چونکی تھی۔"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟" میں نے مجسم اشتیاق بن کر سوال کیا۔

"وہ کتوں سے بہت ڈرتی ہے۔ گفتگو آگے بڑھنے سے پہلے ہی کوئی آوارہ گرد کتا وہاں آ نکلا اور وہ لڑکی وحشت زدہ ہو کر حیرتناک تیز رفتاری سے پر پیچ گلیوں میں کہیں روپوش ہو گئی۔"

میں ایک طویل سانس لے کر نشست گاہ سے ٹک گیا "یہ بہت برا ہوا محمود۔ اس لڑکے سے کہو کہ وہ سیتا کا کھوج نکال کر مجھے خبر دے اور اسے بھی بتا دے کہ اس کا صفدر اس کی یاد میں تڑپ رہا ہے، اسے تلاش کراؤ محمود اسے تلاش کراؤ۔"

"پنجاب یونیورسٹی میں بہت سے فلسطینی طلباء زیر تعلیم ہیں۔ لاہور میں رہتے ہوئے وہ آسانی سے سیتا کا پتہ چلا سکیں گے۔ اگر وہ لاہور سے باہر نہیں نکلی تو تم جلد ہی بہت بڑی خوشخبری سنو گے۔"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس نے مجھ سے بچھڑ کر بہت مصائب جھیلے ہیں" میں اداس لہجے میں بولا "ہندوستانی پولیس نے میرا اور سیتا کا کھوج نکالنے کے لیے سدھائے ہوئے خونخوار کتوں کو ہم دونوں کی بو پر لگایا تھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں ان کتوں کے نرغے میں آ گئی ہو گی۔ وہ پہاڑوں میں پلی ہوئی بے جگر لڑکی ہے۔ کتوں کو زیر کر کے نکل تو گئی ہو گی مگر اس معرکے کی دہشت شاید اس پر ابھی تک سوار ہے جب ہی وہ بے ضرر کتوں سے خوف کھانے لگی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب اسرائیلی تم سے کوئی کام لینے والے ہیں۔" وہ ایک سنسان علاقے میں پارک کے قریب گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

"یہ کس وجہ سے کہہ رہے ہو؟"

"اس مرتبہ انہوں نے تمہاری آزمائش کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کے بعد وہ تمہارے اور میرے درمیان رابطے کا خیال ترک کر دیں گے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ تمہیں پروگرام کے مطابق گوریلا تربیتی کیمپ میں ہی بھیج دیا جائے۔"

"اس طرح تو میں تم سے کٹ کر رہ جاؤں گا۔"

"مجبوری ہے" وہ اندھیرے میں انگلیوں کے سروں سے اسٹیئرنگ بجاتے ہوئے بولا "ویسے آج کل حالات بہت خراب اور غیر یقینی جا رہے ہیں۔"

"کون سے حالات؟"

"سرحدوں پر اسرائیلی فوج کی نقل و حرکت بڑھ گئی ہے۔ اس مرتبہ شامی سرحدوں پر ان کا زیادہ جماؤ ہو رہا ہے۔" اس کا لہجہ تفکر آمیز تھا۔

"یعنی کسی نئی جنگ کی تیاری؟" میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔ اس علاقے میں ایک نئی جنگ کے اندیشے نے مجھے پریشان کر دیا تھا جنگ چھڑ جانے کی صورت میں طویل عرصے کے لیے میں وہیں پھنسا رہ جاتا جب کہ لاہور میں سیتا کی موجودگی کی اطلاع

مجھے پہلی فرصت میں اسرائیل سے نکل کر پاکستان کی جانب فرار ہونے پر اکسا رہی تھی۔

"یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا" وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ "ویسے اسرائیلی عوام میں اپنی حکومت کی جنگجویانہ پالیسی سے نفرت کی ایک ہلکی سی لہر پیدا ہو چکی ہے مگر لوگ کھل کر اس کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اندرونی رائے عامہ کا دباؤ عربوں کے مقابلے میں ان کی حکومت کی پوزیشن بہت خراب کر دے گا۔"

"اس چیز سے تو اسرائیلی حکام بھی بے خبر نہ ہوں گے۔"

"ہرگز نہیں — وہ یہ سب باتیں جانتے ہیں!"

"ایسی صورت میں وہ کوئی نئی جنگ مول لے کر اپنے عوام کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"ابھی وہ مقام نہیں آیا ہے" محمود بولا "مگر ہم چند نئی کارروائیاں کر کے انہیں اس گوشے میں دھکیل سکتے ہیں۔"

"کیسی کارروائیاں؟"

"دو چار خطرناک دھماکے!" وہ آہستہ سے بولا۔

"نہیں محمود! اس وقت میں تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کروں گا" میں نے جلدی سے کہا "اس وقت جانی و مالی اتلاف لوگوں کو مشتعل کر دے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ رائے عامہ کا مخالفانہ حصہ بھی جنگی نعروں میں انتہا پسند یہودیوں کا ہمنوا بن جائے گا۔"

"یہ میں بھی جانتا ہوں یار" وہ بے تکلفی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا "یہ سب اسی وقت ہو سکے گا جب ہم کسی عام جگہ کو نشانہ بنائیں۔ اس بار میں سختی کے ساتھ ان فوجی مراکز میں کارروائیاں کرنی چاہتا ہوں جنہیں یہودی حکام حملے کے بعد کسی طرح رفاہی ادارہ ثابت نہ کر سکیں۔"

"مگر وہاں تک رسائی کیسے ہو گی؟"

"تم نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے میرا دل جیت لیا ہے، اس کام کے لیے تمہارے سوا میرے سامنے کوئی اور آدمی نہیں ہے۔"

"مجھے اس سلسلے میں ماریا سے بات کرنی پڑے گی۔"

"تم نے اسے جس بُری طرح دہشت زدہ کیا ہے اس کے بعد وہ شاید تمہاری کسی بات سے انکار نہ کر سکے گی۔"

"دھماکہ خیز اور آتشگیر مادہ کہاں سے ملے گا؟"

"وہ تم تک پہنچ جائے گا" محمود نے پورے وثوق سے کہا۔ "تم پروگرام طے کر کے چار گھنٹے پہلے بھی مجھے اطلاع دے دو گے تو سامان بروقت تمہیں مل جائے گا۔"

"گیدڑ کی کھال کے جیکٹ کے حوالے کے بغیر میں کسی پر اعتماد نہیں کروں گا۔"

"تم بے فکر رہو، وہ بات مجھے یاد ہے!"

"قاضی ہادی کا کیا رہا؟"

"وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

پھر محمود نے مجھے ایک جگہ چھوڑ دیا۔ میں نے چلتے چلتے پھر اسے تاکید کی کہ وہ سیتا کے معاملے میں پوری توجہ سے کام لے۔

اس رات میں گھر پہنچا تو تقریباً دو بجے کا عمل تھا۔ پورے [illegible] پر گہرا خوابناک سکوت طاری تھا مگر فلورا ابھی انتظار میں جاگ رہی تھی۔ ٹیکسی کے انجن کا شور سنتے ہی وہ برآمدے میں نکل آئی۔

جب میں پختہ روش عبور کر کے اس کے قریب پہنچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی دیر تک شراب نوشی کرتی رہی ہے۔ اس کے دہانے سے شراب کی بو کے بھبکے دور تک آ رہے تھے۔

"کہاں سے آ رہے ہو دلبر؟" وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر طنز آمیز لہجے میں بولی۔

"دیکھو فلورا! ہم دونوں اچھے دوست ضرور ہیں، میاں بیوی نہیں" میں نے اس کے ہمراہ مکان میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہیں میرے لیے اتنے زیادہ تردد کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں، نہ ہی میں تمہاری مصروفیات پر کڑی نظر رکھتا ہوں"

"تمہارے آنے کے بعد تو میں سب کچھ بھول گئی ہوں ڈیئر! تمہارے گھر کے سوا کوئی ٹھکانہ ہی یاد نہیں رہا" وہ اپنا سر میرے شانے پر ٹکا کر بولی۔

"یہ بہت اچھی بات ہے!"

"اس نے تمہیں کچھ بتایا ہے؟" کمرے میں پہنچ کر وہ [illegible] دراز ہوتے ہوئے بولی۔

"کس نے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"جس کے گھر تم موج اڑا رہے تھے۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو!"

"تمہارے انجان بننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا" اپنی دانست میں وہ میری پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

"تفصیل تو بتاؤ" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا "نہ جانے تم کس جہان کی باتیں کر رہی ہو!"

"شاید تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم ماریا کے یہاں نہیں تھے"

"ماریا، ماریا" میں غصیلے لہجے میں بولا۔ "وہ ہر وقت تمہارے اعصاب پر سوار رہنے لگی ہے۔ پتہ نہیں تم اس کے بارے میں کیوں سوچتی ہو"

"میں نے فون کیا تھا اور اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ تم اس کے بستر میں موجود تھے۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ فلورا اپنی [illegible] سراغ رسانی کی تفصیل بتا رہی تھی حالانکہ وہ اوّل درجے کی [illegible] واقع ہوئی تھی۔

اس نے ماریا کو فون کرتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا کہ میں اس کے فلیٹ میں تھا یا نہیں! اور ماریا اس کی آواز پہچانتے ہی اسے جلانے [illegible] نہ صرف میری موجودگی کے بارے میں جھوٹ بولا، بلکہ ان لمحات کی رنگینی کے قصے بھی تراش لیے جن پر فلورا آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئی۔

"تم خود کو ماریا کے ہاتھوں میں کھلونا بنانے پر تلی ہوئی ہو" میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنی کمزوری سے اسے خود آگاہ کیا ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم اس وقت بھی ماریا کو فون کر کے میرے بارے میں دریافت کرو گی تو وہ کوئی عجیب ہی کہانی سنائے گی۔"

"ابھی آزمائے لیتی ہوں!" نشے کی رو میں وہ فوراً ہی میری کہی ہوئی بات کی صداقت آزمانے پر پوری طرح آمادہ ہو گئی۔

کافی دیر تک گھنٹی بجنے کے بعد دوسری جانب سے ماریا کی خوابناک آواز سنائی دی۔ میں ریسیور کے اتنے قریب موجود تھا کہ دوسری جانب سے آنے والی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔

"کیا صفدر ابھی تک تمہارے پاس موجود ہے؟" فلورا نے سوال کیا۔

"اوہ فلورا!" ماریا کی آواز میں نیند کے خمار کے باوجود یک بیک دلچسپی عود کر آئی۔ "تو کیا تم ابھی تک اس کے انتظار میں جاگ رہی ہو؟"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے ماریا!"

"وہ یہیں موجود ہے اور شاید صبح سے پہلے واپس نہ آ سکے۔"

"مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے، ذرا اسے فون پر بلاؤ!"

"ناممکن" ماریا کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "ہم دونوں ابھی تھک ہار کر سوئے ہیں، تمہارے فون نے میری نیند تو خراب کی ہے مگر میں صفدر کا سرور برباد نہیں کروں گی۔"

"تم کتے کی پلی ہو!" فلورا پر غصہ سوار ہو گیا۔

"اور تم کتوں کی چچوڑی ہوئی باسی ہڈی ہو، الو کی پٹھی ہو اور پکی حرافہ ہو" دوسری طرف ماریا بھی آپے سے باہر ہو گئی۔

"میں تیرا منہ نوچ لوں گی، آوارہ چھوکری!" فلورا غصے میں دہاڑی۔

جواب میں ماریا کی کئی فحش گالیاں سنائی دیں اور میں نے جلدی سے کریڈل دبا کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"فون کیوں بند کیا تم نے؟"

"آدھی رات گئے گالیوں کا تبادلہ اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں اسے فون پر تمہاری آواز سنا کر بتانا چاہتی تھی کہ وہ جھوٹی اور مکار ہے، پتہ نہیں وہ خود کو کیا سمجھتی ہے!"

"وہ جو بھی سمجھتی ہے، سمجھنے دو، تمہیں تو اس کی اصلیت کا پتہ چل گیا نا؟"

"پتہ نہیں اس کے افسرانِ بالا کہاں سوئے ہوئے ہیں۔ ایسی لڑکی کا تو پہلی فرصت میں کورٹ مارشل ہونا چاہیے" وہ ریسیور پٹختے ہوئے بولی۔

"وہ ان کو بھی نوازتی رہتی ہو گی" میں نے انگڑائی لے کر کہا۔ "مگر میں اتنا واضح کر دوں کہ یہ تمہارا آخری موقع تھا اگر آئندہ تم نے ماریا کے بارے میں الجھنے کی کوشش کی تو میں خاموشی سے اپنا بستر بوریا سمیٹ کر کہیں چلا جاؤں گا۔"

"ایسی باتیں نہ کیا کرو مائی سویٹ ڈارلنگ!" وہ یہ کہتے ہوئے میرے گلے لگ گئی "آئندہ میں تم سے بالکل نہیں الجھوں گی۔"

اگلی صبح فلورا سے الگ ہونے کے بعد میں دکان پر جانے کے بجائے ایک فون بوتھ پر جا پہنچا اور ماریا کو فون کر کے اسے فوری طور پر ایک ریستوران میں پہنچنے کی ہدایت کی۔

ماریا تھوڑی دیر بعد مجھے اس ریستوران کے ہال میں نظر آئی۔ چند ثانیوں کے لیے اس نے رک کر وہاں بیٹھنے والوں کا جائزہ لیا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری دور افتادہ میز پر آ گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے آتے ہی سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے فلورا کو بلاوجہ مجھ پر حاوی ہونے کا موقع دیا ہے!“

”تم گھر کس وقت پہنچے؟“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تمہیں اس سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اسے جلانے میں مزا آتا ہے!“ ماریا شوخ لہجے میں بولی ”وہ تمہیں اپنی جاگیر سمجھنے لگی تھی اور میں اس کا غرور خاک میں ملانا چاہتی ہوں۔“

”یہ تمہارا اور فلورا کا معاملہ ہے۔ آئندہ اس سلسلے میں میرا نام ملوث نہ کیا جائے۔“ میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”اب اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”ضرورت رہے یا نہ رہے میں اپنا وہ ٹھکانا کھونا نہیں چاہتا۔“

”ساری بات ٹھکانے ہی کی ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”آرمی انٹیلیجنس تمہاری طرف سے مطمئن ہو گئی ہے اور پرسوں تم گوریلا تربیتی کیمپ بھیجے جا رہے ہو۔“

”یہ تبدیلی کیسے آ گئی؟“

”کچھ سرکاری اہلکاروں نے محمود کے کارندوں کے روپ میں کل تم سے ملاقات کی تھی۔“ وہ میرے چہرے کی علامات پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں؟“ میں نے بے یقینی کے عالم میں بے ساختہ کہا۔

”ہو نہیں“ وہ میرے ہاتھ میں چٹکی لیتے ہوئے بولی ”مجھے تو شبہ ہے کہ تمہیں شروع ہی سے ان پر شبہ ہو گیا ہو گا۔“

”تو اس ملاقات نے انہیں مطمئن کر دیا ہے؟“

”ہاں انہیں یقین آ گیا ہے کہ محمود سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہے!“

”حالانکہ تمہاری خاطر مجھے ان سے ملنا پڑا ہے۔“

”میں عمر بھر تمہارا احسان نہیں بھول سکوں گی۔“

”تمہارے لیے ایک کام فوری نوعیت کا ہے، یوسف نامی ایک شخص.......!“

اس نے میری بات درمیان ہی سے اچک لی ”تم اس پاگل کی بات تو نہیں کر رہے جسے دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے شبہ میں گرفتار کیا گیا ہے۔“

”ہاں وہی یوسف ہے“ میں نے جلدی سے کہا ”وہ محمود کا خاص آدمی ہے۔“

”یہ اب ایسا راز نہیں رہا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یوسف اس تنظیم میں خاص حیثیت کا مالک ہے۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”یہ بات کس طرح پھیلی؟“

”اسے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔“ وہ بتلانے لگی ”بعد میں جب اس پر تشدد کا آغاز ہوا اور باز پرس شروع کی گئی تو اس نے برملا اعتراف کر لیا کہ وہ محمود کو جانتا ہے اور بے شمار اہم باتوں سے بھی واقف ہے مگر مر کر بھی ان میں سے کسی بات کا انکشاف نہیں کرے گا۔“

”اس بارے میں تازہ ترین اطلاعات کیا ہیں؟“

”ویسے تو یوسف پولیس کی تحویل میں ہے مگر فلسطینی دہشت پسندوں کے خلاف کی جانے والی ہر کارروائی پہ آخری فیصلہ تو ہمارا محکمہ کرتا ہے اسلئے مجھے اس بارے میں پوری تفصیلات کا علم ہے۔ اپنی اہمیت کے اعلان کے بعد زبان بندی کے نتیجے میں یوسف بڑی مصیبت میں گھر گیا ہے۔ اس کی داہنی کہنی کا جوڑ اکھاڑا جا چکا ہے سارا بدن زخموں سے چھپا ہوا ہے۔“

”اور اس نے بدستور زبان بندی کی ہوئی ہے؟“

”وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکے گا۔“

”تم اسے رہا نہیں کرا سکتیں؟“

”کیسی بات کہہ رہے ہو!“ وہ بوکھلا کر بولی ”وہ اب صرف مشتبہ نہیں رہا، یہ طے ہو چکا ہے کہ وہ مجرم ہے۔ اسے چھڑانے کی کوشش نہ صرف بے سود ہو گی بلکہ میں خود کو مشتبہ افراد کی قطار میں پہنچا دوں گی۔ یہ کام ناممکن ہے!“

”تو پھر تمہیں اس تک ایک چیز پہنچانی ہو گی۔“

”شاید یہ کام میں کر سکوں گی۔“ وہ اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے بولی ”تم جانتے ہو کہ اس تک کیا چیز پہنچانی ہو گی؟“

”ایک زہریلا کیپسول“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”او خدا“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ”تو ان لوگوں کو پورا یقین ہے کہ کیپسول اس تک پہنچ گیا تو وہ خودکشی کر ہی لے گا۔“

”یہ تو بعد میں پتہ چلے گا۔“

”اگر وہ خودکشی کر لے تو یہ راز اس کے سینے ہی میں رہے گا کہ اسے کیپسول کس نے پہنچایا ہے لیکن خودکشی سے پہلے اگر اس کے پاس سے کیپسول برآمد کر لیا گیا تو یہ یاد رکھنا کہ میرے ساتھ ہی تم بھی زندگی اور موت کے دوراہے پر پہنچ جاؤ گے۔“

”میں موت سے خوفزدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ میں نے آہستہ مگر ٹھوس لہجے میں کہا ”میری حیثیت تمہارے اور محمود کے درمیان ایک ہرکارے کی سی ہے۔ میں نے اس کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے، کام کرنے پر راضی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسے بتا دوں گا کہ تم جان کے خوف سے اس کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبرا رہی ہو۔“

اس کے ہونٹوں پر پھیکی اور بے جان مسکراہٹ پھیل گئی ”میں تمہیں معاملے کے نشیب و فراز سے آگاہ کر رہی تھی ورنہ میرے لئے انکار کی تو قطعی گنجائش نہیں ہے۔“

میں نے جیب سے ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی جو اس نے دیکھے بغیر اپنے پرس میں اڑس لی اور جانے کی نیت سے اٹھنے لگی۔

”تم سے ایک اور بھی کام ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے روکتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی بتا ڈالو۔ غنیمت یہ ہے کہ اس وقت آس پاس کی میزیں ویران پڑی ہوئی ہیں۔“ وہ گرد و پیش میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

”میں کچھ ساز و سامان کے ساتھ تمہارے ہیڈکوارٹرز کی عمارت میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ کوئی کام ہی ہو گا، تفریح کے لئے تو میں وہاں جانے سے رہا۔“

”تم جانتے ہو کہ اس عمارت کے چپے چپے پر کیمرے نصب ہیں۔ وہاں جاسوسی کی کوئی خفیہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

”وہ کیمرے ہر وقت تو آن نہیں رہتے ہوں گے۔“

”اہم حصوں کے کیمرے تو ہر وقت فلمیں تیار کرتے رہتے ہیں، جو اگلے روز سیکیورٹی کمانڈر دیکھتا ہے۔ پھر دفاتر کے کمروں میں ٹائم لاک لگے ہوئے ہیں۔ انہیں مقررہ وقت سے پہلے کھولنے کی کوشش کی گئی تو ماسٹر الارم سسٹم حرکت میں آ جائے گا۔“

”کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔“

”تم کھل کر بتاؤ کہ وہاں جانے کا مقصد کیا ہے تو شاید میں کوئی راہ نکال سکوں۔ کاغذات کی الماریوں تک میں خفیہ الارم لگے ہونے کے سبب وہاں تمہاری کوئی بھی آزادانہ کارروائی تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑوانے کا سبب بن جائے گی۔“

”وہاں کچھ آتشگیر مادہ رکھنا ہے۔“ میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کہا۔

”محمود مجھ سے ضرورت سے زیادہ توقعات باندھ رہا ہے۔“ وہ قدرے برہم ہو کر بولی ”اپنی جان بچانے کے لئے میں ایک حد تک ضرور جا سکتی ہوں۔ ہر چیز کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔“

”اسی لئے یہ کام پوری طرح تمہارے سپرد نہیں کیا جا رہا۔“

”اس عمارت میں آگ لگا کر محمود کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟“

”اس سوال کا جواب وہی دے سکے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اچانک مجھے اس کے بلاؤز کے اندر کسی چیز کا ابھار نظر آیا اور میں چونک پڑا۔ اس وقت ماریا کہنیوں کے بل میز پر آگے جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس نے بھی میری نگاہوں کی تبدیلی بھانپ لی اور ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں یک بیک خوف و ہراس سمٹ آیا تھا اور وہ بے چین نظر آنے لگی تھی۔

”تت — تم اس طرح مجھے کیوں گھور رہے ہو؟“

”تمہارے بلاؤز میں کیا ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔“ وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

میں نے اسے ہوشیار ہونے کا موقع دیئے بغیر کن انکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ دور کی چند میزیں آباد تھیں مگر وہاں سے میری کوئی حرکت دیکھ لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

میں نے اچانک اس کے سینے کے درمیانی حصے پر ہاتھ مارا اور اس نے بوکھلا کر کرسی پر پیچھے سرکنے سے پہلے ہی وہاں کسی ٹھوس چوکور چیز کی موجودگی محسوس کر لی۔

”یہ کیا ہے؟ باہر نکالو۔“

”میں کہہ چکی ہوں کہ یہ تمہارے لئے بے کار ہے۔“ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

”بے کار ہو یا کارآمد، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اس کا تعلق میری سلامتی سے ہے۔“

”اس وقت میری اور تمہاری سلامتی مشترک ہے۔“ میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا ”اگر تم نے رضاکارانہ طور پر وہ چیز نہ دکھائی تو میں زبردستی سے کام لوں گا۔“

”اسے دیکھنے کے بعد تم میری نیت پر شبہ کرنے لگو گے۔“

”حماقت کی باتیں نہ کرو، میں جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنا جانتا ہوں۔“

”یہ ایک جیبی کیسٹ ریکارڈر ہے۔“ وہ جھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جو میری اور تمہاری گفتگو ریکارڈ کر رہا تھا؟“

اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”مگر کس لئے؟“

”میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ اس سے پہلے بھی میں دو مرتبہ اپنی اور تمہاری گفتگو ریکارڈ کر چکی ہوں، وہ دونوں کیسٹ بھی میں نے اپنے بنک لاکر میں محفوظ کئے ہوئے ہیں۔“

”تم یہ جتانا چاہتی ہو کہ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہی ہو؟“

”میں محمود سے ابھی تک مطمئن نہیں ہو سکی ہوں۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ نجانے کس وقت میرا کام تمام کر دے۔“

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسٹ تمہیں کس طرح اس کے خلاف تحفظ فراہم کرسکیں گے؟" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں نے فوج میں کمیشن ملنے کے وقت اسرائیل اور عالمی صیہونی مفادات سے وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا اور اب میں جان کے خوف سے تمہارے لئے جو کچھ کر رہی ہوں، وہ میرے ضمیر پر ایک بوجھ ہے۔ میں نے ایسا بندوبست کیا ہوا ہے کہ اگر میری موت حادثاتی طور پر واقع ہو تو بنک میرے لاکر کی چابی اسمتھ کے حوالے کردے گا۔ اور اسے معلوم ہوجائے گا کہ میں بدترین دباؤ کے تحت ملک اور قوم سے غداری کرتی رہی ہوں اور تم اس معاملے میں برابر کے شریک ہو۔"

"اور قدرتی موت کی صورت میں کیا ہوگا؟"

"بنک کو میری وصیت ہے کہ قدرتی موت کی صورت میں لاکر کی تمام اشیاء میرے وکیل کی موجودگی میں بنک کا نمائندہ نذرِ آتش کردے۔"

"یہ کیسٹ ریکارڈر میرے حوالے کردو۔"

اس نے خاموشی سے بلاؤز میں سے ہلکا پھلکا نیشنل کمپنی کا ساختہ کیسٹ ریکارڈر نکال کر میرے حوالے کردیا۔ اس کا ننھا سا کیسٹ نصف گھنٹے کی ریکارڈنگ کے لئے کافی تھا۔ ٹیپ ختم ہونے کے بعد ریکارڈر خاصی دیر پہلے آف ہوچکا تھا۔ ریکارڈنگ کے لئے اس آلے میں دو ننھے ننھے بیحد حساس مائیکروفون لگے ہوئے تھے۔

"اور اب بنک کے لاکر سے دونوں کیسٹ بھی لاکر میرے حوالے کردو۔"

"وہ میں ہرگز نہیں دوں گی۔"

"پھر تم تل ابیب کی کسی بارونق شاہراہ سے اٹھالی جاؤگی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "عورتیں تشدد کے سامنے جلد ہی زبان کھول دیتی ہیں۔"

"جب تک تم میری زبان کھلوانے میں کامیابی حاصل کروگے، بنک لاکر کی چابیاں اسمتھ کو مل چکی ہوں گی۔" وہ اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ "میری ہدایات میں یہ بھی بندوبست رکھا گیا ہے کہ میں اگر ایک خاص مدت کے لئے روپوش یا لاپتہ ہوجاؤں تو چابی اسمتھ کو دے دی جائے۔ جس روز میں بنک مینجر کو فون نہیں کروں گی، وہ سمجھ لے گا کہ مجھے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے اور گنتی شروع کردی جائے گی۔"

"کیسٹ کس بنک کے لاکر میں ہیں؟"

"یہ تو میں ہرگز نہیں بتاؤں گی۔"

"تمہارا یہ بندوبست بہت خطرناک ہے ماریا ــــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں ٹریفک کا کوئی حادثہ پیش آجائے۔"

"یہ تمہاری اور محمود کی بدقسمتی کا آغاز ہوگا۔"

"تم باہمی اعتماد کی فضا کو نقصان پہنچا رہی ہو۔"

"میں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ قدم اٹھایا ہے اور میں اس کے نتائج بھگتنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔"

"تو اب تم اپنے وعدے سے پھر گئی ہو؟"

"نہیں۔ میں اس پر قائم ہوں۔" وہ بلاتامل بولی۔ "یوسف کو پیغام آج ہی پہنچا دیا جائے گا مگر میں آنکھیں بند کرکے تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔"

"آئندہ تم ایک لفظ بھی ریکارڈ نہ کرسکو گی۔"

"فکر نہیں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی۔ "میرے تحفظ کے لئے وہی دو کیسٹ کافی ہیں۔ میرا منصوبہ تو یہ تھا کہ ساری ملاقاتیں ریکارڈ کرتی رہوں گی مگر اس بار میں تمہاری نظروں سے نہ بچ سکی۔ لہٰذا یہ سلسلہ تو اب ختم ہی سمجھو۔"

"اور دوسرے کام کے بارے میں کیا کہتی ہو؟"

"تمہیں وہاں لے جانا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ کام میں خود سرانجام دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"اس بارے میں تمہیں بعد میں مطلع کروں گا۔"

"لاؤ میرا ریکارڈر تو واپس کردو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

میں نے ریکارڈ کیا ہوا کیسٹ نکال کر ریکارڈر اسے واپس دے دیا اور وہ میز سے اٹھ گئی۔ میں بھی چند منٹ بعد بل ادا کرکے ریستوران سے نکل آیا۔

میں دُکان کافی تاخیر سے پہنچا اور اس روز دُکان کے مالک کو مجھ پر اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع مل گیا۔

"یہ تمہارے آنے کا وقت ہے؟" وہ اپنی رسٹ واچ مجھے دکھاتے ہوئے ملامت آمیز غصیلے لہجے میں بولا۔

"مجھے سواری حاصل کرنے میں دیر ہوگئی۔" میں نے آہستہ سے [illegible]

"نوکری کرنی ہے تو ملازمت کے آداب سیکھو۔" وہ غصے [illegible] "دوسرے لوگ بھی وقت پر آتے ہیں، انہیں کیسے سواری مل جاتی ہے؟"

"یہ تو انہی لوگوں سے پوچھنا پڑے گا۔" میں نے اُسے حد سے متجاوز دیکھ کر زہرخند کے ساتھ جواب دیا۔

"میں تم جیسے بدتمیز شخص کو ایک منٹ کے لئے برداشت نہیں کرسکتا۔" وہ غصے میں آپے سے باہر ہوکر فرش پر پیر پٹختے ہوئے [illegible] "اور میں بھی کسی گندے سؤر کی ملازمت برداشت نہیں کرسکتا۔"

"شٹ اپ!" وہ حلق کے بل دہاڑا۔ "نکل جاؤ یہاں سے"

"حساب لئے بغیر تو میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔" میں نے اُسے مزید سلگانے کے لئے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور لاپروا انداز میں سگریٹ سلگانے لگا۔

"تمہاری تنخواہ کا چیک ڈاک سے بھیج دیا جائے گا۔ تم نکلو یہاں سے۔" وہ میری قمیص کا کالر پکڑ کر مجھے باہر دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے پوری طاقت سے اسے پیچھے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر کاؤنٹر سے جا ٹکرایا۔

یہ سارا تماشا دُکان کے بیرونی حصے میں ہو رہا تھا اور اِکا دُکا راہگیر فٹ پاتھ پر رُک کر یہ کھیل دیکھنے لگے تھے۔ ایک پرانے ملازم نے آگے بڑھ کر دُکان کا دروازہ بند کرنا چاہا مگر دُکان والے نے اسے سختی کے ساتھ منع کردیا۔

"اندر آؤ میرے ساتھ۔" دُکان والا میرا ہاتھ تھام کر دُکان کے اندرونی حصے میں بنے ہوئے کیبن کی طرف بڑھتا چلا گیا اور اس بار میں نے بھی مزاحمت نہیں کی۔

"میں بہت خطرناک آدمی ہوں مسٹر یاغیل ــ میرے ساتھ مزید گڑبڑ کی کوئی کوشش تمہیں بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔" میں نے اندر جاتے ہوئے اسے تنبیہہ کی۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ ہانپتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔ "یہ دھمکیاں تم نہیں دے رہے، یہ کیپٹن ماریا بول رہی ہے۔ وہ چھوکری تمہارے دام میں پھنسی ہوئی ہے اور تمہارے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لئے سرکاری کام کے بہانے تمہیں چھٹی بھی دلا چکی ہے۔"

اس کے مُنہ سے ماریا کا نام سُن کر میں بُری طرح چونک پڑا۔ مگر فوراً ہی مجھے یاد آگیا کہ چند دن قبل ماریا نے فون پر اسے ہدایت کی تھی کہ مجھے دو دن کی چھٹی دے دی جائے۔ اس ٹیلیفون کے پس منظر میں یاغیل کی گفتگو بے مقصد نہیں تھی۔

"ماریا کے آدمی اسی دُکان میں بیٹھ کر تمہاری چمڑی اُدھیڑ سکتے ہیں لہٰذا اپنی زبان بند رکھو اور میرے پیسے ادا کردو تاکہ میری آنکھیں تمہاری منحوس صورت سے چھٹکارا حاصل کرسکیں۔"

"تم بدزبانی سے باز نہیں آؤ گے؟" اُس نے چلتے چلتے مُڑ کر ایسے لہجے میں کہا جس میں غصے اور فریاد کا امتزاج نمایاں تھا۔

"دو سو پونڈ دے دو تو خاموشی سے چلا جاؤں گا۔"

"دو سو پونڈ؟" وہ حیرت سے بولا۔ "تمہارے زیادہ سے زیادہ پچاس پچپن پونڈ میری طرف نکلتے ہوں گے۔"

"تو پھر میں تمہاری ملازمت نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ماریا کبھی یہ برداشت نہیں کرے گی کہ اس کا عاشق تل ابیب کی سڑکوں پر بے روزگار مارا مارا پھرتا رہے، وہ تمہارا نرخرہ دبا دے گی۔"

"تت.... تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟"

"اتنا کر بھی [illegible] لگتی ہو تو تم میرے اس عمل کو عطیے کی وصولیابی بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"مگر میں دوبارہ تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔" وہ چند ثانیوں تک مجھے بے بسی کے ساتھ گھورنے کے بعد بولا۔

"ایسا وعدہ کرنے کے لئے مجھے اپنے مطالبے میں سو پونڈ کا اضافہ کرنا ہوگا۔" میں نے خالص کاروباری لہجے میں جواب دیا۔

"یعنی تین سو پونڈ؟"

"ہاں، صرف تین سو پونڈ۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کیش بکس کا تالا کھولنے لگا۔ "میں تین سو پونڈ بھی دے دوں گا۔ یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے تمہیں مسکین سمجھ کر ملازم رکھ لیا مگر اب پتہ چلا کہ برِصغیر سے تعلق رکھنے والے سبھی مسکین نہیں ہوتے۔"

"پورے تین سو ہیں نا؟" میں نے اس سے رقم لیتے ہوئے پوچھا۔

"گن لو۔ باہر جانے کے بعد میں ذمے داری قبول نہیں کروں گا۔"

"پورے ہی ہوں گے۔" میں نے لاپرواہی سے نوٹ جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "تم پر مجھے اتنا بھروسہ ضرور ہے۔"

"میرے سامنے رقم گنو۔" وہ اُچھل کر میری واپسی کی راہ میں حائل ہوگیا۔ "تم بہت مکار آدمی ہو۔ کیا پتہ واپس آکر رقم میں کمی کی شکایت کر بیٹھو۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو یاغیل!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ورنہ پچاس پونڈ فی گستاخی کے حساب سے رقم وصول کروں گا۔"

"حضور! مجھ پر کرم فرمائیے۔" وہ دونوں ہاتھ باندھ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ "ایک بار میرے سامنے رقم گن لیں پھر جہاں آپ کا مزاج آئے چلے جائیں۔ یہ غلام ذرا بھی اعتراض نہیں کرے گا۔"

میں نے اس کے سامنے سارے نوٹ گن ڈالے جو پورے تھے۔

"شکریہ مسٹر یاغیل!" میں نے چلتے ہوئے کہا۔ "میں جارہا ہوں اور آئندہ آپ مجھے کبھی یہاں نہ دیکھیں گے۔"

"اگر ایسا ہوا تو میں اپنے مقدر پر رشک کرنے لگوں گا۔"

میں بے اختیار ہنس دیا۔ "تم میری صورت سے اسی قدر بیزار ہو تو بخدا کبھی اِدھر کا رُخ نہیں کروں گا۔ ضرورت ہوئی تو ماریا کو ہی بھیج دوں گا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے اُلّو کا پٹھا بنا رہے ہو۔" وہ کسی الم زدہ بیوہ کی طرح کراہا۔ "میرے بزرگ کہتے تھے کہ رُوئے زمین پر بارسوخ عورتوں کے محبوب سے زیادہ موذی کوئی مخلوق نہیں پائی جاتی۔"

"یہ کہتے ہوئے شاید وہ تمہاری پیدائش کو بھول گئے تھے۔" میں آخری چٹکی لے کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

یوں تو قاضی ہادی سے دوستی ہوجانے کے بعد تل ابیب میں میرے لئے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ جانے سے پیشتر قاضی ہادی مجھے کھلی چھوٹ دے گیا تھا کہ جب اور جتنی چاہوں، اس کے آدمی سے رقم لے سکتا تھا۔ مگر مجھے اس کنجوس یہودی کی تجوری سے رقم نکلوا کر جو خوشی ہوئی وہ قاضی ہادی کے آدمی سے تین ہزار پونڈ لے کر بھی نہ ہوتی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یاغیل اب کئی دن تک دُکان کے عملے اور اپنے ملاقاتیوں کو اپنے لٹنے کی دردبھری داستان سُناتا رہے گا اور شاید ایک آدھ رات

کے لئے تو اس کی نیند بھی سرے سے غائب ہو جائے۔

یاغیل کی ملازمت شروع ہی سے مجھے ناگوار گزر رہی تھی۔ صبح سے شام تک میں وہاں احمقوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا تھا۔ دن میں اِکّا دُکّا گاہک آتے جنہیں پرانے ملازم سنبھال لیتے تھے بس شام کے وقت ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے خریداروں کا رش ہوتا تھا۔ گیارہ گھنٹوں میں بمشکل دو گھنٹے کی مصروفیت مجھ جیسے آدمی کے لئے ناکافی تھی۔ مگر اتنے عرصے میرے وہاں رُکے رہنے کا سبب یہ تھا کہ محمود اس دُکان کو اپنے پیغام رسانی کے مرکز کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا مگر میرے لئے وہاں گزارا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد محمود کو اپنے اس اقدام سے آگاہ کر دوں تاکہ محمود کا کوئی معتمد میری جگہ اس دُکان پر ملازمت اختیار کر سکے۔

اب میرے سامنے پہاڑ سا دن پڑا ہوا تھا۔ ماریا دفتر میں ہوتی، فلورا بھی شام سے پہلے خالی نہیں ہو سکتی تھی۔ قاضی ہادی اسرائیل سے بھاگا ہوا تھا اور محمود سے یوں جلد جلد ملنا میرے لئے بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں غیر ارادی طور پر ٹہلتا ہوا فلسطینیوں کی آبادی میں، ابومروان کے قہوہ خانے پر جا پہنچا۔ فکرِ معاش سے بے پروا بہت سے نوجوان لڑکے اور چند عمر رسیدہ فلسطینی وہاں بیٹھے اس انہماک سے قہوہ اور حُقّہ پینے میں مصروف تھے جیسے ان کی پیدائش ان ہی دو کاموں کے لئے عمل میں لائی گئی ہو۔ قریب ہی بہت سے گندے اور عسرت زدہ مگر صحتمند بچے گولیاں کھیلنے اور لڑنے میں مصروف تھے۔

میں وہاں بیٹھا قہوہ پی رہا تھا کہ اچانک چند بچوں میں شدید تصادم ہو گیا اور آناً فاناً وہاں چیخ و پکار مچ گئی۔

اسی دوران ابومروان اپنے چٹائی کے حجرے سے باہر آیا اور اس نے بچوں کو مخاطب کر کے کرخت آواز میں چند گالیاں دیں جو عام فہم ہونے کے ساتھ ہی زُود اثر بھی تھیں مگر ایک گالی نہایت عجیب تھی، جو تکنیکی اعتبار سے نسوانی تھی لیکن مردانہ صیغے میں دی گئی تھی۔

ابومروان کی کرخت آواز سُنتے ہی سب بچے جائے واردات سے فرار ہو گئے۔ پھر اچانک ابومروان نے بلند آواز میں "ارے" کہا اور لپک کر آگے بڑھا۔

اس کی تحیّر آمیز آواز نے کئی لوگوں کو اپنی جگہ چھوڑ کر صورتحال کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا اور میں ایسے لوگوں میں پیش پیش تھا۔

جہاں چند ثانیے قبل بچے گولیاں کھیل رہے تھے، اب وہاں ایک دس گیارہ سالہ خوبرو اور صحتمند بچہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اپنے لہو کی تیز سُرخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

میرے قریب پہنچتے تک ابومروان زخمی بچے کو اپنی بانہوں میں لے چکا تھا اور بے چینی سے اپنے اردگرد نظریں دوڑا رہا تھا۔ بچہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی کنپٹی کے زخم سے تیزی کے ساتھ خون رِس رہا تھا اور سانس بھی قدرے اُکھڑا ہوا تھا۔

"ذرا ٹیکسی روکو اور ایک دو آدمی میرے ساتھ آؤ، بچے کی حالت بہت خراب نظر آ رہی ہے۔" ابومروان نے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف مُڑ کر کہا۔

اس کے ان الفاظ کا ردِ عمل میرے لئے حیرتناک تھا۔ لوگوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹنے لگی۔ ہر شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے کھسک رہا تھا اور چند ہی ثانیوں میں میرے علاوہ وہاں کوئی بھی شخص باقی نہ رہا۔

"سب بھاگ گئے۔" ابومروان مایوسانہ اور قدرے غصیلے لہجے میں بولا "بھائی! ذرا تم ہی ٹیکسی روک لو، بچے کا سانس اُکھڑ رہا ہے۔"

میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے جلدی سے قریب کھڑی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو بلایا اور ابومروان نے آہستگی سے بچے کو پچھلی نشست پر لٹا دیا۔

میں ابومروان کی درخواست کا انتظار کئے بغیر ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ چند ہی منٹ میں ٹیکسی تیز رفتاری سے ایک بڑے سے ہسپتال کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ بچے کے زخم سے بہنے والے خون سے ٹیکسی کی سیٹ خراب کر دی تھی مگر اس کا ڈرائیور کوئی نہایت نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف خون آلود سیٹ سے چشم پوشی اختیار کی بلکہ کرایہ بھی وصول نہیں کیا اور ہمیں اُتار کر وہاں سے چل دیا۔

ابومروان بچے کو ہاتھوں پر اُٹھائے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا جس کی حالت دیکھتے ہی وہاں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اس کے زخم سے بہنے والے خون کی مقدار تشویشناک حد تک زیادہ تھی اور یہ نظر آ رہا تھا کہ اگر اسے فوراً طبی امداد نہ دی گئی تو وہ چل بسے گا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" ایک میل نرس نے بچے کو اسٹریچر پر لٹاتے ہوئے ابومروان سے ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"بچوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"کہاں؟"

جواب میں ابومروان نے فلسطینیوں کی بستی کا نام لیا۔

"تو یہ بچہ فلسطینی ہے؟" میل نرس کا لہجہ یک بیک تبدیل ہو گیا۔

"ہاں۔" ابومروان نے روا روی میں اس شخص کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کئے بغیر خالی الذہنی کے عالم میں جواب دیا۔

"پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرائی تم نے؟" میل نرس نے اچانک بچے کو یوں چھوڑ دیا جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔

"رپورٹ بھی درج کرا دوں گا، ذرا اس کا خون تو روکنے کا بندوبست کرو۔" ابومروان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اضطراری لہجے میں کہا۔

"پولیس کا پرچہ لائے بغیر ہم اسے ہاتھ بھی نہ لگائیں گے۔" اس نے دُکھے لہجے میں کہا اور پھر اس نے بلند آواز میں ہسپتال کے عملے کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں، یہ پولیس کیس ہے۔ واپس آجاؤ۔"

"مگر زخم پر ٹانکے....." کسی نے کہنا چاہا۔

"سب کچھ چھوڑ دو۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا "یہ بچہ فلسطینی ہے۔"

اس کے لہجے پر میرا خون کھول اُٹھا۔ اس نے بچے کی نسل کا اظہار اس طرح کیا تھا جیسے وہ کوئی گندی گالی دے رہا ہو۔

"کیا یہ ضابطہ ایک انسانی جان سے زیادہ اہم ہے؟" میں نے آگے بڑھ کر اس میل نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

"ہمیں ہدایت ملی ہوئی ہے کہ پولیس رپورٹ کی نقل دیکھے بغیر کسی زخمی فلسطینی کی مرہم پٹی بھی نہ کریں۔ ہمیں کیا پتہ کہ یہ بم بناتے ہوئے ہی زخمی ہوا ہو۔"

"ہسپتال کا پولیس کاؤنٹر کدھر ہے؟" ابومروان نے سوال کیا۔ شاید وہ بھانپ گیا تھا کہ میں اپنے مخاطب سے اُلجھ پڑوں گا، اسی لئے اس نے دخل اندازی کی تھی۔

"وہ ہے۔" میل نرس نے ایک ویران کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"انتظار کرو۔ آجائیں گے وہ لوگ۔"

"مگر بچے کی حالت خطرناک ہے۔"

"اتنی جلدی ہے تو اسے لے جاؤ۔" وہ بیزاری کے عالم میں بولا۔ "دو بلاک آگے پولیس اسٹیشن ہے، وہاں رپورٹ درج کرا دو۔"

ایک لحظے کے لئے میری اور ابومروان کی آنکھیں چار ہوئیں اور اُس نے ہونٹ بھینچ کر خاموشی سے بچے کو بازوؤں پر اُٹھا لیا۔

ہم تھانے میں پہنچے تو محرّر نے تیکھی نظروں سے ہمارا استقبال کیا۔ ابومروان نے مختصر الفاظ میں پوری بات اسے سُنا دی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" محرّر اشتباہ آمیز نظروں سے باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

ہم اس کی تقلید میں ایک باوردی پولیس افسر کے کمرے میں پہنچے جس نے بڑی توجّہ سے محرّر کا بیان سُنا۔ اس دوران ابومروان بڑی بے بسی سے اپنی گود میں موجود بچے کو دیکھتا رہا جس کا سانس اب رک رک کر آ رہا تھا اور ہر سانس کے ساتھ اس کا بدن بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" باوردی افسر نے بید کے سرے سے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"حمزہ ابومروان۔"

"بچے کو بنچ پر لٹا دو۔" اس نے گھنٹی بجاتے ہوئے حکم دیا۔

"اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے جناب!" ابومروان نے ہچکچاتے ہوئے مؤدب ہو کر کہا۔

"ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے — لٹا دو اسے۔"

اور ابومروان نے بادلِ نخواستہ بچے کو ایک چوبی بنچ پر ڈال دیا۔ بچے کی کنپٹی سے خون بدستور جاری تھا۔

اسی وقت گھنٹی کے جواب میں دو سپاہی وہاں آ گئے۔

"ان دونوں کو حوالات میں بند کر دو۔" افسر نے انہیں حکم دیا اور سپاہی فوراً ہم دونوں کے سر پر مسلط ہو گئے۔

"مگر ہمارا قصور جناب؟" ابومروان نے فریاد کی۔

"جاؤ۔" وہ فضا میں ہاتھ اُٹھا کے دہاڑا۔

"میں غیر ملکی ہوں اور انسانی ہمدردی کی بنا پر بچے کے ساتھ یہاں تک چلا آیا۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"اسرائیل کی سرزمین پر فلسطینیوں سے ہمدردی کرنے والا کوئی غیر ملکی بے گناہ نہیں ہو سکتا۔" اس افسر نے مجھے گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ "آپ فوراً حوالات میں تشریف لے جائیں ورنہ بچے کے ساتھ آپ کو بھی فوراً طبی امداد کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔"

میں خون کے گھونٹ پی کر سپاہیوں کے ساتھ چل پڑا۔

جس وقت ہم کمرے سے باہر جا رہے تھے، بچے پر نزع کا عالم طاری تھا۔ اُس کے پورے جسم پر تشنج چھایا ہوا تھا اور کنپٹی سے بہنے والا زندہ لہو فرش کو داغدار کر رہا تھا۔

ہم دونوں کو حوالات کے جالی دار دروازے کے پیچھے دھکیل کر دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ وہاں ہم سے پہلے دو بدنصیب موجود تھے۔

"چوری کے جُرم میں پکڑے گئے ہو؟" سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد پرانے قیدیوں میں سے ایک نے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

ابومروان نے خلا میں گھورتے ہوئے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"تو پھر کوئی جعلسازی کی ہوگی؟" دوسرے نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔

"اپنی زبانیں بند رکھو اور دفع ہو جاؤ ورنہ قتل کا جُرم بھی کر بیٹھیں گے۔" میں نے ان دونوں سے دُرشت لہجے میں کہا اور وہ سہم کر ایک گوشے میں چلے گئے۔

"وہ مر جائے گا، اس پر کوئی توجہ نہیں دے گا۔" ابومروان مُٹھیاں بھینچ کر ہذیانی انداز میں بڑبڑایا۔ "اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ فلسطینی ماں باپ کی اولاد ہے۔"

"شاید اسی لئے کوئی تمہارے ساتھ آنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے میرے دوست کہ میری وجہ سے تم اس مصیبت میں آ پھنسے۔"

"اگر بچّے کی زندگی بچ جائے تو مجھے اس قید کا بھی غم نہ ہوگا۔"

"اسے قدرت ہی بچائے تو بچے گا ورنہ یہاں کوئی اس پر توجہ دینے والا نہیں ہے۔"

"اب ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟"

"مار پیٹ اور تشدّد کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "میں تو ان چیزوں سے نہیں گھبراتا مگر تم بلاوجہ پھنس گئے۔"

ہم دونوں بھوکے پیاسے شام تک حوالات میں بند رہے۔ پرانے قیدیوں نے بعد میں ہمارے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ بس ایک کونے میں دبکے دُور ہی دُور سے ہمیں دیکھتے رہے۔

شام کو ہماری طلبی کا پروانہ آیا۔

اس بار صبح والے باوردی افسر نے ہمیں جس کمرے میں بُلوایا وہ خاصا وحشت ناک تھا۔ ہمیں وہاں لے جاتے ہی چرمی تسموں کے ذریعے پُختہ ستونوں سے باندھ دیا گیا۔

"اس بچّے کی موت کیسے واقع ہوئی؟" پولیس افسر کا یہ سوال میرے اعصاب پر کسی بم کی طرح گرا۔

"مر گیا وہ؟" ابومروان نے حیرت اور اذیت کے عالم میں پوچھا۔ اچانک پولیس افسر کا ہاتھ حرکت میں آیا اور بید پوری قوت سے ابومروان کے سینے پر پڑی۔ "تمہیں سوال کرنے نہیں، جواب دینے کے لئے بلایا گیا ہے۔"

"بچوّں کی لڑائی میں اسے چوٹ آگئی تھی۔" ابومروان گہرے گہرے سانس لیتا ہوا بولا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ کُوتس کی آبادی میں کسی کو ایسے جھگڑے کا علم نہیں۔ ہم وہاں پوری طرح چھان بین کر چکے ہیں۔"

"داؤد، سمیر، ہاشم، عبداللہ سب ہی وہاں موجود تھے۔" ابومروان بولا۔ "ان کے سامنے میں نے زخمی بچّے کو اُٹھایا تھا۔"

"نام پھر دُہراؤ۔" وہ کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے بولا۔ "انہیں بھی یہاں طلب کیا جائے گا۔ اس واردات کا پوری تندہی سے کھوج نکالا جائے گا۔"

"وہ جھگڑے کے بعد میرے ساتھ وہاں پہنچے تھے۔"

"نام دُہراؤ۔" وہ دہاڑا۔

ابومروان نے مُردہ آواز میں چاروں نام دُہرا دیئے۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی وہ چاروں بھی حوالات میں ہم سے آملیں گے۔

"ہاں تو ہمدرد کی اولاد!" اس بار پولیس افسر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم وہاں کیا کرنے گئے تھے، سُناؤ کوئی مربوط سی کہانی۔"

"میں ابومروان کے قہوہ خانے میں قہوہ پینے رُکا تھا۔"

"تمہیں قہوہ پینے کے لئے وہی چنڈو خانہ ملا تھا۔" وہ زہر [illegible] لہجے میں بولا۔ "اور وہ بھی اس وقت جبکہ وہاں قتل کی ایک واردات ہونے والی تھی۔"

"یہ سوال تو ہر اس شخص سے کیا جا سکتا ہے جو وہاں موجود [illegible]"

"تمہارے شناختی کاغذات کہاں ہیں؟" وہ میرے [illegible]

"آرمی انٹیلی جنس بیوریو کی کیپٹن ماریا کے پاس۔" میں [illegible] آہستہ سے کہا۔

"کس کے پاس؟" اس نے بے اعتباری سے پوچھا۔

"کیپٹن ماریا۔"

"اس سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟"

"یہ سوال اسی سے کیا جائے تو بہتر ہوگا۔"

میرے اس جواب پر وہ خلاف توقع آپے سے باہر نہیں [illegible] مگر سخت لہجے میں بولا۔ "اس سے بھی معلوم کر لیا جائے گا مگر اس وقت تم سے پوچھا جا رہا ہے۔"

"اس سے میرا ناجائز تعلق ہے۔"

"ناجائز؟" اس کی بھنویں حیرت سے پیشانی پر جا [illegible]

"میں غیر قانونی طور پر اسرائیل میں پہنچایا گیا تھا اور یہاں آنے کے بعد ہی سے میں کیپٹن ماریا سے مسلسل رابطے میں ہوں۔"

"تمہیں کس طرح یہاں لایا گیا تھا؟" اس کے سوالات میں اب تجسّس اُبھر آیا تھا۔

"جس شخص کے حکم پر مجھے ہوائی راستے سے یہاں لایا گیا، اُسے ابوخالد کے نام سے جانتا ہوں۔" میں نے اسے مرعوب [illegible] کی خاطر کہا۔

"ابوخالد؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "یہ نام تو میں پہلی [illegible] سُن رہا ہوں۔ کیا وہ اسرائیل ہی کا باشندہ ہے؟"

"بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اسرائیلی اسے بن حیان کے نام سے جانتے ہیں۔" میں نے پُرتمکنت لہجے میں کہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس انکشاف کے بعد وہ بدتمیز افسر مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمّت نہ کر [illegible]

"اوہ۔" اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ [illegible] چلے گئے۔ چند ثانیوں تک وہ اسی طرح غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تو تم اتفاقاً اُدھر جا نکلے تھے۔ قتل کی اس واردات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے؟"

"میرا اسی قدر تعلق ہے جتنا ابومروان یا اُن چار آدمیوں کا جن کے نام تم نے لکھے ہیں۔" میں نے اس مرتبہ پُراعتماد لہجے میں [illegible]

"اپنی بات کرو۔" وہ بُرا سا مُنہ بنا کر بولا۔ "ان خبیث فلسطینیوں سے نمٹنا میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

اسی وقت باہر راہداری میں کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ افسر گردن اُٹھا کر چونکتے انداز میں اسی طرف دیکھنے لگا۔ وزنی جُوتوں کی دھمک سے معلوم ہو رہا تھا کہ آنے والا عملے ہی کا کوئی آدمی ہے۔

پھر ایک بوکھلایا ہوا مسلّح سنتری اندر داخل ہوا اور ایڑیاں بجا کر سیلوٹ مارنے کے بعد ہانپتے ہوئے بولا۔ "سر! اس نے خودکشی کر لی۔ اس کا بدن نیلا ہو کر اینٹھ گیا ہے۔"

"کس نے؟" اس انکشاف نے افسر کو بھی سراسیمہ کر دیا۔

"یوسف نے۔ چار نمبر والا فلسطینی۔"

اور یہ سُنتے ہی پولیس افسر کے پیروں میں بجلی سی سرایت کر گئی اور وہ بُری طرح دوڑتا ہوا سنتری سمیت وہاں سے چلا گیا۔ ہم دونوں بدستور پُختہ ستونوں سے بندھے ہوئے کھڑے رہے۔

یوسف کی خودکشی کی خبر سُن کر میرا دل یک بیک خوشی سے اُچھل پڑا تھا۔ سخت نگرانی اور قیدِ تنہائی میں یوسف کی کامیاب خودکشی کا یہ مطلب تھا کہ ماریا اپنے وعدے پر بدستور کاربند تھی۔ اس نے یقینی طور پر صبح ہی کیپسول یوسف تک پہنچا دیا ہوگا۔ اب یہ یوسف کی عقلمندی تھی کہ مرتے مرتے بھی اس نے حواس سے پوری طرح کام لیا۔ اس نے فوری طور پر خودکشی کرنے کے بجائے کافی وقت کے بعد زہریلا کیپسول کھایا تھا تاکہ ماریا کی پوزیشن خطرے میں نہ پڑ سکے۔

یوسف کی خودکشی کی خبر سے تھانے میں بھونچال سا آگیا۔ ہر طرف سے چلنے پھرنے اور زور زور سے بولنے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ پھر شاید پولیس اسٹیشن کی ایمبولنس حرکت میں آئی اور اس کے سائرن کا شور تیزی کے ساتھ دُور ہوتا چلا گیا۔

یہ کیسا عجیب اتّفاق تھا کہ قدرت نے مجھے حالات کے دھارے میں لے کر اسی پولیس اسٹیشن میں پہنچا دیا تھا جہاں ایک اہم واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا۔

یوسف کے بارے میں ابومروان نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور نہ ہی میں نے اس موضوع پر بات چھیڑنا مناسب سمجھی۔

کچھ دیر بعد شاید اعلیٰ حکّام وہاں آ پہنچے کیونکہ ساری ہڑبونگ یک بیک معدوم ہو گئی اور وقفے وقفے سے فضا میں ایڑیاں بجنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

کافی دیر گزر گئی لیکن کسی نے پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی۔ گیارہ بجے کے قریب کوئی اس طرف آیا اور جب وہ اندر داخل ہوا تو میں خاصا مایوس ہوا کیونکہ وہ ایک سپاہی تھا۔ اس نے ہمارے چاروں طرف چکّر لگا کر جائزہ لیا اور واپس جانے لگا۔

"اپنے افسر کو یاد دلانا کہ اس نے کیپٹن ماریا کے ایک آدمی کو یہاں باندھا ہوا ہے۔" میں نے اسے روک کر کہا۔

"وہ ایک کانفرنس میں ہیں۔" سپاہی نے یہ کہہ کر دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔

میں تو اس طرف سے مایوس ہی ہو گیا تھا مگر وہ سپاہی کچھ فرض شناس تھا۔ اس نے ماریا کو وہاں دیکھ کر مطلع کر دیا کہ کوئی حوالاتی اس کا نام لے رہا ہے اور ماریا سیدھی وہاں آ پہنچی۔

"ارے! تم اس حال میں؟" وہ آتے ہی حیرت سے بولی۔

"ایک فرضی قتل کا الزام ہے مجھ پر۔"

"تم نے میرا حوالہ نہیں دیا؟"

"دیا تھا۔ مگر اسی وقت ایک بُری خبر آگئی اور مجھ پر تشدّد کرنے والا افسر بوکھلاہٹ میں یہاں سے چلا گیا۔"

"آرتھر اس وقت ہوم ڈیپارٹمنٹ کی ایک میٹنگ میں ہے۔ تمہاری باضابطہ رہائی تو اس کی آمد پر ہی ہوگی مگر میں تمہاری بندشیں کُھلوا دیتی ہوں۔"

"تمہارا یہی احسان کافی ہوگا۔"

ماریا کے اشارے پر اسے لانے والے سپاہی نے میرے تسمے کھول دیئے۔

"اس بے چارے کو بھی کُھلوا دو۔" میں نے ابومروان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

میں ابومروان کو الوداع کہہ کر ماریا کے ہمراہ وہاں سے چل دیا۔

"یوسف نے خودکشی کر لی ہے۔" راہداری میں موقع پا کر ماریا نے میرے کان میں ہیجان آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔

"اچھا!" میں نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"آرتھر سے اسی بارے میں جواب طلبی ہو رہی ہے، اس کی ملازمت بچنی مشکل ہے۔"

"تو میری باضابطہ رہائی کا کیا بنے گا؟"

"تم آرام سے انتظار گاہ میں بیٹھو۔ میری تو رات یہیں کالی ہوگی۔ آرتھر کی جگہ جو بھی نیا انچارج آئے گا میں اس سے بات کر لوں گی۔"

"آج میں نے اسٹور کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

"کیوں؟"

"یاغیل حد سے بڑھ گیا تھا۔"

"چلو اچھا ہی ہوا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "اب تم فلورا کو پورا وقت دے سکو گے۔"

اسی وقت سامنے سے چند افسران دبے لہجے میں باتیں کرتے آگئے اور میں ماریا کو مُنہ توڑ جواب نہ دے سکا۔ ماریا نے مجھے سپاہی کے حوالے کیا اور خود ان افسروں کے ہمراہ چل دی۔

سپاہی مجھے انتظار گاہ میں بٹھا کر رخصت ہو گیا اور میں ذہن میں آئندہ کے بارے میں اپنی حکمتِ عملی ترتیب دینے لگا۔

یوسف کی خودکشی کی خبر تو اخبارات کے ذریعے محمود تک پہنچ سکتی

تھی مگر میں اُسے پہلی فرصت میں ماریا کی حرکتوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا وہ لڑکی میرے اور محمود کے لئے حد درجہ خطرناک ہو سکتی تھی اور اس کا علاج بہت ضروری تھا۔

وہ دونوں کیسٹ جن میں اس نے میری اور اپنی گفتگو ریکارڈ کی ہوئی تھی تلف کئے جانے ضروری تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ماریا از خود وہ کیسٹ میرے حوالے نہیں کرے گی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اس کی سخت نگرانی کر کے بنک اور لاکر نمبر کا پتہ چلایا جاتا اور پھر بنک پر چھاپہ مار کر لاکر خالی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں محمود کی رائے بہت ضروری تھی۔

انتظار گاہ میں ٹیلی فون موجود دیکھ کر اچانک ہی مجھے قاضی ہادی بھی یاد آ گیا جو کسی بزدل چوہے کی طرح اسرائیل سے بھاگا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کم از کم فون ہی کر کے اس کے سیکریٹری سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لوں۔

میں نے فون کا ریسیور اُٹھایا تو آپریٹر کی سُریلی آواز کانوں کو بڑی بھلی لگی۔ میں نے اسے قاضی ہادی کا فون نمبر دے دیا۔

چند منٹ بعد کال ملی اور جب میں نے قاضی ہادی کے سیکریٹری کو اپنا نام بتایا تو اس کی آواز پر چھایا ہوا نیند کا خمار فوراً غائب ہو گیا۔

”میں ابھی دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ صاحب جاگ رہے ہوں“ اس نے کہا۔

”وہ واپس کب آئے؟“ میں نے سوال کیا۔

”آج صبح ہی آئے ہیں۔“

پھر جب قاضی ہادی فون پر آیا تو وہ خاصا مضطرب تھا کم از کم اس کی آواز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”ایک سرکاری مہمان خانے میں۔“

”میرے آدمی صبح سے تمہاری تلاش میں بھٹک رہے ہیں، تم وہاں کیا کر رہے ہو؟“

”تم سمجھے نہیں میرے دوست!“ میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ ”صبح سے میں حوالات میں تھا۔“

”اور اب فون کہاں سے کیا ہے؟“

”تھانے ہی میں ہوں۔“

اور یک بیک فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میرے لئے یہ بڑا اچنبھا ثابت ہوا۔ اوّل تو میرے لئے یہی بات حیرت کا باعث تھی کہ قاضی ہادی خلاف توقع جلد واپس آ گیا اور جب وہ آ ہی گیا تھا تو اسے مجھ سے گفتگو کرنے میں تفصیل سے کام لینا چاہیئے تھا کیونکہ اس کی جانب سے میں محمود کا کھوج نکالنے پر مامور تھا۔

میں رات کے دو بجے تک یکہ و تنہا تھانے کی آراستہ انتظار گاہ میں بیٹھا سگریٹیں پھونکتا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سب لوگ تھانہ چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں۔

آخر کار دو بجے شب ماریا وہاں آئی۔ اس کے بشرے سے تکان کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے ہمراہ پولیس کا کوئی اعلیٰ عہدیدار بھی تھا۔

”یہ صفدر علی ہے۔“ ماریا نے اندر داخل ہو کر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے اس پولیس افسر سے کہا پھر مجھ سے بولی۔ ”اور یہ مسٹر ... تھانے کے نئے انچارج مسٹر گریسی ہیں۔“

گریسی نے بڑے تپاک کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اپنے طریقے اور چہرے مہرے کے اعتبار سے وہ خاصا معقول آدمی نظر آ رہا تھا۔

”میرے بارے میں کیا طے پایا ہے؟“ میں نے مسکرا کر ماریا سے دریافت کیا۔

”ابھی تک اس حادثے کی ابتدائی رپورٹ نہیں لکھی گئی لہٰذا تم آزاد ہو“ نئے انچارج گریسی نے باوقار انداز میں مجھے مژدہ سنایا۔

”ابو مروان؟“

”اسے جہنم میں ڈالو“ ماریا چڑچڑے لہجے میں بولی۔ ”اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں مگر عام خیال یہ ہے کہ وہ بہت ... ہے۔ اس بہانے ہاتھ آیا ہے تو اب پچھلا حساب بھی بے باق کر دیا جائے گا۔ غنیمت یہ ہے کہ تم اس چکر سے بال بال بچ گئے ہو۔“

چلتے ہوئے گریسی نے ماریا کے کان میں کچھ کہا اور وہ اثبات میں سر ہلاتی میرے ہمراہ باہر آ گئی۔

”اب تم کہاں جاؤ گے؟“

”فلورا کے گھر“ میں نے کہا۔ ”چاہو تو میں یہ رات تمہارے ساتھ بھی گزار سکتا ہوں۔“

”اس وقت سوا دو بج رہے ہیں۔ مجھے ابھی کچھ دیر اور رکنا ہے“ وہ عمارت سے باہر آ کر رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو اس وقت کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔“

”میری گاڑی لے جاؤ“ وہ اگنیشن کی چابی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”کل واپس کر دینا۔“

”فلورا اسے آگ لگا دے گی!“

”وہ تمہارے اعصاب پر سوار رہنے لگی ہے۔“ ماریا بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ ”اب تمہیں کسی پولیس کار میں بھجوانا ہو گا۔“

”چھوڑو، اس کی ضرورت نہیں۔ میں یہ رات کسی شراب خانے میں بسر کروں گا۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

”ایسا نہ ہو کہ صبح تمہیں کسی کوڑا گھر سے اُٹھوانا پڑ جائے!“ ماریا نے ترش لہجے میں کہا۔

”بیویوں جیسی گفتگو تمہیں زیب نہیں دیتی۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ ابو مروان کا کیا ہوا؟“

”اسے فوری طور پر ملازمت سے برطرف کر کے حراست میں لیا گیا ہے۔“

”حراست میں۔۔۔ بھلا وہ کس جرم میں؟“

”فرائض سے غفلت بجائے خود بہت بڑا جرم ہے۔“

اس کے بعد ماریا خاصی ضد کرتی رہی کہ میں جہاں بھی جانا ہو میں پولیس کار سے چلا جاؤں مگر میں نے اس کی ایک نہ سُنی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کی تگ و دو کے بعد میں قاضی ہادی کے گھر کا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس پر چل پڑا۔ اس رات قاضی ہادی کے مکان پر غیر معمولی حفاظتی اقدامات نہیں تھے۔ میری دستک کے جواب میں فوراً ہی مسلح دربان نے پھاٹک کھول دیا۔

”قاضی صاحب موجود ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

دربان چند سیکنڈ تک مجھے اشتباہ آمیز نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”قاضی صاحب انگلستان گئے ہوئے ہیں۔“

”وہ آ چکے ہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تم اندر ان کے سیکریٹری کو اطلاع کر دو کہ صفدر علی یہاں موجود ہے۔“

”اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں جناب!“ وہ جھجکتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”کیا آپ صبح کا انتظار نہیں کر سکتے؟“

”میرے ناوقت آنے سے بھی شاید تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ میری یہ ملاقات کس قدر ضروری ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کچھ دیر پہلے میں نے قاضی صاحب سے فون پر بات کی ہے۔“

دربان نے اپنی کوٹھڑی سے داخلی مواصلاتی رابطے پر اندر کسی کو میری موجودگی سے باخبر کیا اور پھر بوکھلایا ہوا باہر آیا۔

”آپ فوراً اندر آ جائیں سر!“ دربان نے سراسیمگی کے عالم میں کہا۔ ”مجھ سے اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو میرے سر پر جوتے لگا لیجیے۔ لیکن خدا کے لئے قاضی صاحب سے میری شکایت نہ کیجیئے گا ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔“

”ابھی تو تم خود کہہ رہے تھے کہ قاضی ہادی انگلستان گئے ہوئے ہیں۔“

”ان کی واپسی بہت رازداری کے ساتھ ہوئی ہے۔ میں ان کا بیس برس پرانا نمک خوار ہوں۔ میرے سوا بس دو تین ہی آدمی اس راز سے باخبر ہیں۔“ وہ روش پر میری رہنمائی کرتے ہوئے بولا۔

قاضی ہادی اپنے ڈرائنگ روم میں کسی زخم خوردہ چیتے کی طرح پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ اس کمرے کی تمام کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔

”آؤ۔“ وہ مجھے دیکھ کر گرمجوشی کے بجائے طنز آمیز لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس وقت تمہاری آمد کی قطعی اُمید نہیں تھی۔“

”مجھ سے کچھ بدظن نظر آ رہے ہو؟“

”تمہیں تھانے سے مجھے فون کرنے کی کیا سُوجھی تھی؟“ اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ ”میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں اپنے اور تمہارے تعلقات سرکاری اہل کاروں کی نظروں میں نہیں لانا چاہتا اور تم ایسی کھلی حماقت کر بیٹھے۔“

”مگر اس سے پیشتر تمہارے مکان کی حفاظت پر مامور دستے کے کمانڈر سے یہاں میری ملاقات ہو چکی ہے۔ فوجی حکام بھی تو سرکاری اہلکاروں ہی کے زمرے میں آتے ہیں!“

میری اس دلیل نے اسے لاجواب کر دیا مگر اس کے پاس ایک اور عذر تیار تھا۔ ”اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میری واپسی کو خفیہ رکھا گیا ہے۔ سیکیورٹی سے متعلق چند اعلیٰ ترین افسران کے علاوہ میرے صرف تین آدمی اس راز سے واقف ہیں۔“

”اگر اتنی رازداری برتنی تھی تو تمہیں فون پر نہیں آنا چاہیئے تھا۔“ میں نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

”بس یہی حماقت ہو گئی۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں آج صبح ہی یہاں آیا ہوں اور اسی وقت سے تم سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ تمہارا نام سُن کر اضطراری کیفیت میں فون پر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ تم نے کسی پبلک کال بُوتھ سے فون کیا ہو گا!“

”میری اتنی شدت سے تلاش کیوں تھی؟“

”اس مردود کا کوئی سُراغ ملا؟“

”نہیں۔ وہ تو کوئی فرضی کردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چکر میں مجھے اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گئے ہیں۔ آئے دن کی غیر حاضریوں سے میرا آجر مجھ سے بدظن ہو گیا تھا۔“ میں نے لگے ہاتھوں اس پر پوری صورتحال واضح کر دی۔

”اور حوالات میں تم کیا کر رہے تھے؟“

میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے حوالات پہنچنے کا قصہ سُنایا۔

”پھر رہائی کیسے ملی؟“

”یہی بات میرے لئے بھی حیرت کا باعث بنی۔۔۔ بظاہر کسی وجہ کے بغیر مجھے رہا کر دیا گیا۔“

”یعنی اب تم پوری آزادی سے میرے لئے کام کر سکو گے؟“

”وہ تو ظاہر ہے، مگر یہ بتاؤ کہ تم اچانک کیوں لوٹ آئے؟“

”تم نے اخبار میں شین ہینڈرک کا قصہ نہیں پڑھا؟“

”آج کل میں اخبارات نہیں پڑھتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ شین ہینڈرک درمیان میں کہاں سے ٹپک پڑا؟“

”مجھے بدنام کرنے کی ایک سازش کی گئی تھی۔ شین ہینڈرک ناروے کی بندرگاہ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ اسے شاید بھاری معاوضے کا لالچ دے کر یہاں آنے اور میرے خلاف زہر اُگلنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔“ قاضی ہادی مجھے بتانے لگا۔ ”اس حرام زادے نے یہاں آ کر دعویٰ کیا وہ میرا چچا زاد بھائی ہے۔ اس نے میرا اصل نام ڈان ہینڈرک اور مذہب صیہونیت بتایا۔ اس جھوٹ میں مجھے کسی بڑی سازش کی بُو آ رہی تھی لہٰذا مجھے یہاں آنا پڑ گیا۔“

”تو شین ہینڈرک کا کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا۔“ قاضی ہادی قہقہہ مار کر بولا۔ ”اسے فاتر العقل قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیا گیا۔“

”تو اب تم واپس چلے جاؤ گے؟“

”چند دن بعد ارادہ ہے۔“

”محمود کے خوف سے تم کب تک یوں مفرور رہو گے۔“ میں نے اس کی انا پر کاری ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ”مزا تو جب ہے کہ اسے ڈھونڈ کر مقابلہ کر کے شرمناک شکست دو۔“

”مجھے صرف ایک ہی بات کی دہشت ہے۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد پہلی بار صاف دلی سے اپنی ایک کمزوری کا اعتراف کر لیا۔

”وہ کیا؟“

”میں نے اسے نہیں دیکھا اور وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ کہیں بھی بے خبری میں مجھ پر وار کر سکتا ہے۔“ قاضی ہادی نے منہ لٹکا کر کہا۔

”اس کا سراغ ہم لوگ ہی لگا کر نکال سکتے ہیں۔ فوج اور پولیس کی گرفت میں وہ مشکل ہی سے آئے گا۔“

”مگر تم تو ابھی تک کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے۔“

”اس کے ایک دو عارضی ٹھکانوں کا پتہ چلا ہے مگر ہر بار وہ میرے پہنچنے سے بہت پہلے نکل چکا ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کون سے ٹھکانے ہیں اس کے؟“

”ٹیپسی گرل اور دیزمان ہوٹل کا پتہ چل سکا ہے۔“

”ٹیپسی گرل!“ قاضی ہادی اچانک اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ”میری بھی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ وہ ایک عیسائی بیوہ کا بار ہے اور وہ خاصی تشدد پسند واقع ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ اسے کسی مقدمے میں قید بھی ہو چکی ہے۔ عین ممکن ہے کہ محمود اسی کے پاس رہ رہا ہو۔“

”اگر اس نے ایک عورت پر بھروسہ کیا ہے تو وہ انتہائی احمق ہے۔“

”وہ بہتیرے مردوں پر تنہا بھاری پڑتی ہے۔ مار دھاڑ میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔ اس کے بار میں لوگ اسی وقت تک بیٹھتے ہیں جب تک انہیں خود پر قابو ہو۔“

”ضروری تو نہیں کہ محمود وہیں مل جائے۔“

”ملے نہ ملے، اس کا سراغ ضرور ملے گا۔“ قاضی ہادی ایک کلیو مل جانے پر یک بیک ہشاش بشاش نظر آنے لگا تھا۔

”تو کل تم ٹیپسی گرل پر دھاوا بولو گے؟“

”کل؟“ وہ تیوریاں چڑھا کر بولا۔ ”ہم اسی وقت وہاں چل رہے ہیں۔ دن کے وقت شاید میں اتنی آسانی سے نقل و حرکت نہ ... سکوں گا۔“

”صبح کے چار بجنے والے ہیں۔“

”چلو اٹھ جاؤ۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اس موذی کا قصہ جتنی جلد نمٹے گا، مجھے اتنا ہی زیادہ سکون ملے گا۔“

میں ناچار اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہوٹل دیزمان اور ٹیپسی گرل کے نام لیتے ہوئے میرے ذہن میں دور تک ایسا شبہ نہیں تھا کہ قاضی ہادی ان ناموں کو کوئی اہمیت دے گا۔ علاوہ ازیں ان مقامات پر کبھی بھی محمود سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ میں دو چار مرتبہ ... پر جا چکا تھا۔

قاضی ہادی وہاں سے روانہ ہوا تو اس نے گہرے ... کار منتخب کی تاکہ اندر کی کوئی چیز باہر سے نہ دیکھی جا سکے۔

ٹیپسی گرل پہنچے تو وہاں سناٹے اور گہری تاریکی کا راج ... قاضی ہادی مجھے راستے میں بتا چکا تھا کہ بار کی اوپری منزل پر ... اپنے دو ملازمین کے ساتھ رہتی ہے۔ ہم نے عبور کر کے ... کے دروازے پر پہنچے تو پتہ چلا کہ اندر لوگ بیدار ہیں ...

گھنٹی کی دوسری آواز پر مسز مارٹن نے دروازہ ... بدن پر نائٹ گاؤن موجود تھا اور داہنے ہاتھ میں پستول ...

”مال ہے؟“ قاضی ہادی نے اندھیرے میں ... کیا۔ مسز مارٹن کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ کچھ پریشان ...

قاضی ہادی کے سوال پر مسز مارٹن کا پستول بردار ... اور اس نے خلیقانہ لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں شاید پہلی بار ...“

”ہم نے آج کے لیے جن لڑکیوں کو بک کیا تھا ... نہیں آئیں تو کوفت مٹانے کے لیے ہم نے ایک دوست ... ادھر کا رخ کیا ہے۔“

”میں صرف کمرے کرائے پر دیتی ہوں۔“

”تمہاری کوئی کرائے دار خالی نہیں ہے؟“

”بھاگ جاؤ۔ میرا وقت برباد نہ کرو۔“ قاضی ہادی ... پر وہ اچانک بپھر گئی اور اس نے پوری قوت سے دروازہ ...

قاضی ہادی چند ثانیوں تک بند دروازے کو گھورتا ... ہاتھ تھام کر واپس ہو لیا۔

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔“ واپسی کے دوران میں نے ...

”اگر وہ اکیلی ہوتی تو ہم زبردستی بھی اندر گھس ... کافی لوگ معلوم ہو رہے تھے۔“ وہ خفت آمیز لہجے میں ...

”اگر محمود کا اس سے رابطہ ہے تو ہمارا یہ اوچھا ... کر سکتا ہے۔“ میں نے اسے چڑانے کی نیت سے کہا۔

”اس وقت مجھ سے سراسر حماقت سرزد ہوئی ہے ... کو ختم کرو۔ میں چند گھنٹوں کی نیند کے بعد ہی کوئی مناسب ...“

”اگر تمہارا سونے کا ارادہ ہے تو مجھے یہیں ...“

”اس وقت تم کہاں جاؤ گے؟“ اس نے حیرت ...

”ایک ہوٹل چھینسائی ہوئی ہے، میں اسی کے آستانے ...“

”میں تمہیں اس کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔“

”یہ بہت اچھا ہو گا۔“

فلورا کے کاٹیج کے سامنے مجھے اتار کر قاضی ہادی آگے بڑھ گیا۔

میں کاٹیج کی طرف چل دیا۔ وہاں ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ ڈور بیل بجائی مگر کافی دیر تک انتظار کے باوجود کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر مجھے تشویش ہوئی اور میں اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ کہیں فلورا کو کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔

جب کوئی راستہ نہ ملا تو مجبوراً مجھے عقبی کھڑکیوں کا رخ کرنا پڑا۔ اور یہ دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا کہ کچن کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔

اس وقت اسرائیل کی سرزمین پر میرا کوئی دشمن نہیں تھا۔ سرکاری ادارے، قاضی ہادی اور محمود — تینوں ہی سے میرے مراسم دوستانہ تھے۔ ایسی حالت میں فلورا کے گھر میں نقب زنی کرنے والے چور اچکے ہی ہو سکتے تھے۔

میں نہایت آہستگی اور ہوشیاری کے ساتھ کھڑکی کے راستے اندر پہنچا اور چند ثانیوں تک اپنی جگہ دبکا کوئی آہٹ سننے کی کوشش کرتا رہا مگر پورے مکان میں مہیب اور بھرپور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دیواریں ٹٹول کر کچن میں روشنی کر دی۔

پچھلی صبح فلورا میرے ہی ساتھ گھر سے دفتر کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ کچن میں بھرے ہوئے برتن جوں کے توں موجود تھے جنہیں فلورا واپسی پر شام کے وقت صاف کرتی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میرے ساتھ جانے کے بعد فلورا گھر واپس نہیں آئی — اور اگر آئی تو نامعلوم فرد یا افراد نے اسے اتنی بھی مہلت نہ دی کہ وہ کچن میں آ کر ناشتے کے برتن صاف کر سکے۔

میں احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہوا اور ساری بتیاں روشن کرتا چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچنے کے بعد مجھے پہلے ذہنی جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔ فرش سے قالین الٹ دیا گیا تھا اور سارا سامان بے ترتیبی کے ساتھ چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ خوابگاہ میں پہنچا تو وہاں بھی ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے عجلت میں سارے سامان کی تلاشی لی ہے۔

گھر کی ابتری اپنی جگہ تھی مگر میرے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ فلورا کا پورے گھر میں کہیں پتہ نہ تھا۔

میں تشویش کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گھر کی حالت دیکھتے ہوئے صرف دو ہی باتیں ممکن تھیں۔ اول یہ کہ کچھ لوگوں نے گھر کی تلاشی لی اور مطلوبہ شے کے حصول میں ناکامی کے بعد گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے اور جیسے ہی فلورا دفتر سے گھر واپس آئی، اسے اغوا کر لیا گیا۔

دوسرا کمزور سا امکان یہ تھا کہ جب فلورا نے دفتر سے واپس آنے کے بعد گھر کی بگڑی ہوئی حالت دیکھی ہو تو خوفزدہ ہو کر کسی شناسا کے یہاں جا پہنچی ہو۔ اس صورت میں ایک بات ذہن میں کھٹکتی تھی کہ آخر فلورا نے پولیس کو اس معاملے سے مطلع کیوں نہیں کیا۔

میں مکان کی تلاشی اور فلورا کی گمشدگی کے بارے میں سوچتا رہا لیکن میرا ذہن اس پہیلی کا کوئی جواب تلاش نہ کر سکا۔ دوسری طرف میرے لیے یہ طے کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا کہ اب میں اپنی باری پر فلورا کی گمشدگی کی اطلاع پولیس میں درج کراؤں یا نہ کراؤں۔

ابو مروان کے ہمراہ میں نے اسرائیلی پولیس کا رویہ دیکھ ہی لیا تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے میں خود کو مزید ملوث کرنے کی بجائے مجھے خاموشی سے اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹ کر کھسک لینا چاہیے۔

فلورا ایک راہ چلتی عورت تھی۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ اسے بھلا دوں۔ اس سے مجھے کوئی خاص جذباتی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اسے زندہ رہنا ہوتا تو وہ ہزار بندشوں میں سے بھی نکل سکتی تھی۔ فلورا کو اس کے مقدر کے حوالے کر دینے کے بعد صرف تلاشی کا مسئلہ رہ جاتا تھا کہ کس نے اور کیوں تلاشی لی۔ اس تلاشی کا تعلق فلورا کی ذات سے تھا یا مجھ سے!

مکان کا سامان جس انداز میں پھیلا ہوا تھا، اسے دیکھ کر کوئی احمق بھی بآسانی اندازہ لگا سکتا تھا کہ سامان چوری کے لیے نہیں بلکہ تلاشی کے لیے بکھیرا گیا تھا۔ قیمتی اشیاء بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ اگر وہ کوئی چور ہوتا تو اس سامان کو ہرگز نہ چھوڑتا۔

اس علاقے میں اتنی صبح سواری ملنی مشکل تھی۔ لہٰذا میں نے ضروری اشیاء ایک بریف کیس میں بند کیں اور وہاں سے کھڑکی کے راستے نکل کر شہر کی طرف ہو لیا۔

کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے ٹیکسی مل ہی گئی اور میں سیدھا کارلٹن ہوٹل جا پہنچا۔ وہاں میرا اپنا کمرہ خالی تھا لہٰذا میں نے دوبارہ اسی میں قیام کو ترجیح دی۔

میں نے کارلٹن میں کافی دیر تک آرام کیا پھر صبح گیارہ بجے ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ باہر آتے ہی میری نظر ایک انگریزی اخبار کی شہ سرخی پر پڑی اور میں بری طرح چونک اٹھا۔ میں نے وہ اخبار خریدا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

”ٹائمز آف اسرائیل“ کی شہ سرخی یوسف کی خودکشی کی ناکام کوشش کی کہانی سنا رہی تھی۔ یہ سرخی میں کئی سیکنڈ تک یوں گھورتا رہا جیسے مجھے سکتہ ہو گیا ہو۔ پچھلی رات میں نے تھانے میں ایک سپاہی کے منہ سے

یوسف کی اکڑی ہوئی نیلی لاش کا قصہ سنا تھا۔ پھر ہٹانے سے واپس لوٹتے ہوئے ماریا نے بھی یوسف کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

خبر کے مطابق یوسف نامی فلسطینی پولیس کی مسلسل اور کڑی باز پرس کے نتیجے میں ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا کہ کسی بھی لمحے اہم ترین معلومات کا انکشاف کر سکتا تھا۔ اس دوران میں اس کے ساتھیوں نے حفاظتی عملے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کسی نہ کسی طرح ایک زہریلا کیپسول اس تک پہنچا دیا اور یوسف نے اس کیپسول کے ذریعہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جو بروقت طبی امداد کے ذریعے ناکام بنا دی گئی۔

خبر کے مطابق یوسف کڑے پہرے میں ہسپتال میں تھا۔ اس پر مسلسل بے ہوشی طاری تھی۔ مگر وہ خطرے سے باہر تھا۔

یہ خبر پڑھ کر میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ تشدد نے یوسف کی قوت مزاحمت ویسے ہی ختم کر دی تھی، رہی سہی کسر زہریلے کیپسول نے پوری کر دی۔ اگر وہ زبان کھول دیتا تو سزا ہم کرنے کے سنگین جرم میں ماریا پکڑی جاتی اور جب اس کے خفیہ بنک لاکر سے دو عدد کیسٹ برآمد ہوتے تو میں کسی بھی طرح اپنے دفاع کے قابل نہ رہتا۔

میں سخت اعصابی کشیدگی کے عالم میں ہوٹل سے نکل آیا اور ایک پبلک بوتھ سے ماریا کے دفتر کا نمبر ملایا۔

"تم اس وقت کہیں مل سکتی ہو؟" میں نے فون پر گفتگو میں احتیاط برتتے ہوئے اس سے نرم الفاظ میں درخواست کی۔

"تم کس جگہ سے بول رہے ہو؟"

"نیومون ہوٹل کے قریب ہوں۔"

"تو تم نیومون میں بیٹھو، میں آتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں جس وقت نیومون میں داخل ہو رہا تھا تو اچانک عقب سے کسی نے میرے شانے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا۔

میں تیزی سے گھوما تو مجھے روکنے والے نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "گیدڑ کی کھال کا جیکٹ چاہیے مجھے!"

"اچھا۔ اچھا" میں نے جلدی سے کہا۔ یوں غیر متوقع طور پر محمود کے کسی ہرکارے سے ملاقات ہونے پر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔

"وہ تم سے ملنا چاہتا ہے!" اس نے میرے ہمراہ واپس فٹ پاتھ پر جاتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف آدھ گھنٹے کی مہلت درکار ہے۔"

"اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ وہ صرف تم سے ملنے کے لیے رکا ہوا ہے!"

"تو وہ کہیں جا رہا ہے؟"

"شاید" اس نے مبہم سا جواب دیا "یہاں کے حالات اچانک قابو سے باہر ہو گئے ہیں"

میں سمجھ گیا کہ یہ ہنگامی صورت حال یوسف کی خودکشی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے جو خطرات مجھے نظر آ رہے تھے، محمود ان سے بھی آگے دیکھ رہا ہو گا۔

"میں ایک بہت اہم انفارمر سے ملنے والا ہوں، ذرا مجھے چاہیے!"

"وہ نابیناؤں کے دستکاری کے مرکز میں تمہارا منتظر..."

وہ یہ کہہ کر تیزی سے پیدل چلنے والوں کی بھیڑ میں غائب... میں اعصابی انتشار کی حالت میں نیومون میں جا بیٹھا۔ نگاہیں مسلسل اپنی رسیٹ واچ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ... ہوئی کہ ماریا میری توقع کے برعکس بہت جلدی وہاں پہنچی۔

"اس خبر کی کیا حقیقت ہے؟" ماریا کے بیٹھتے ہی میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"وہ مر چکا ہے، یہ خبر اس کے حامیوں میں خوف و ہراس... کے لیے تراشی گئی ہے، بس ایک نفسیاتی حربہ کہہ لو اسے!"

ماریا کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے سینے میں رکا سانس آزاد ہو گیا۔ "اس خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔" اور ساتھ میں نے اپنی کرسی چھوڑ دی "میں عجلت میں ہوں... رک سکوں گا۔"

"مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے ... ہوئے کہا۔

"جلد ہی ملوں گا" یہ کہتے ہوئے میں تیزی سے ... باہر آ کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور چند منٹ میں نابیناؤں کے دستکاری مرکز پر پہنچ گیا۔ محمود کو میں نے باہر ہی سے دیکھ لیا۔ معمولی اور بوسیدہ کپڑے پہنے برش سے فرش صاف کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کے سائے لہرا رہے تھے۔ چہرے سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور نگاہیں داخلی دروازے پر ہی مرکوز تھیں۔

میں اس کے قریب سے گزرتا ہوا شیشے کے دروازے والی نمائشی الماری کی طرف ہو لیا۔ اور پورے انہماک سے دیکھنے لگا۔

محمود بھی فرش صاف کرتا ہوا میرے عقب میں آ گیا۔ اس کی بھنبھناتی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔ "یوسف نے برسوں کی محنت برباد کر دی ہے، بازی الٹ گئی۔"

"یوسف مر چکا ہے، وہ خبر دھوکا ہے" میں نے مڑے بغیر آہستہ سے کہا۔

"سچ؟" محمود کی آواز میں اچانک زندگی کا سمندر انگڑائیاں لینے لگا۔

"ہاں!"

"تم باہر جاؤ، میں ابھی آتا ہوں، خاموشی سے میرے پیچھے آتے رہنا۔"

میں نمائشی الماریوں کا جائزہ لینے کے بعد ناپسندیدگی کے انداز میں منہ بناتا اس عمارت سے باہر کی طرف چل دیا اور فٹ پاتھ پر واقع مشروبات کے ایک کیبن سے کوکا کولا کی بوتل لے کر آہستہ آہستہ پینے لگا۔

محمود کو باہر آتے دیکھ کر میں نے باقی ماندہ مشروب دو گھونٹوں میں حلق سے معدے میں اتار لیا اور پیسے ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

محمود پیدائشی مزدور کی طرح سر جھکائے تھکے تھکے قدموں سے بڑھتا رہا اور میں چند قدم کے فاصلے سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔

اس سلسلے کا اختتام ایک کثیر المنزلہ عمارت کی لفٹ پر ہوا۔

اس کے ہمراہ میں بھی سوار ہو گیا۔ تیسری منزل پر ہم دونوں لفٹ سے اتر گئے۔ پھر راہداری خالی دیکھ کر محمود تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا اور پہلی منزل پر پہنچ کر دیوانہ وار ایک دفتر میں گھستا چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

وہ دفتر کیا، آثار قدیمہ کا کوئی شعبہ معلوم ہو رہا تھا۔ بیرونی کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ اندرونی کمرے میں ساگوان کی پرانی میز کے پیچھے ایک زرد رو شخص بیٹھا فائلوں کے مطالعے میں غرق تھا۔ اس کے قریب ہی فائلوں سے بھرے ہوئے ریک کھڑے ہوئے تھے۔

"تالا لگا کر چائے پی آؤ، مجھے نصف گھنٹہ کی تنہائی چاہیے!" محمود نے تحکمانہ لہجے میں اس بوڑھے سے انگریزی میں کہا اور وہ دراز سے چابیاں لے کر تیر کی طرح باہر نکلتا چلا گیا۔

دروازے میں چابی گھومنے کی آواز کے بعد ہم دونوں نے بیک وقت سرگوشیانہ لہجے میں بولنا شروع کیا اور بیک وقت ایک دوسرے کو موقع دینے کے لیے خاموش ہو گئے۔

محمود کے ایما پر میں نے اسے یوسف کی خودکشی کی تفصیلات سنائیں، اسے ماریا کی اس پیشکش سے بھی آگاہ کیا کہ وہ آرمی انٹیلی جنس بیورو کے دفاتر میں خود دھماکہ کرنے کے لیے تیار ہے۔

قاضی ہادی کی آمد کی اطلاع محمود کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ البتہ جب میں نے اسے ماریا کی کیسٹ ریکارڈنگ کے بارے میں بتایا تو اس کے تیور بگڑ گئے۔

"ہمارے لیے یہ نئی دشواری پیدا ہو گئی۔ آخر شروع میں تم اس سے غافل کیوں رہے؟"

"میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ماریا ایسی حرکت کرے گی۔"

"وہ فوج کی ایک ذمہ دار افسر ہے، راہ چلتی لڑکی نہیں — خیر وہ خود اپنی موت کو للکار بیٹھی ہے، فی الحال اسے چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے اپنے رویّے میں کوئی فرق نہیں آنے دیا ہے۔ ابھی اسی سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس نے یوسف کی موت کی تصدیق کی ہے یہ خبر ہماری صفوں میں خوف و ہراس پھیلانے کیلئے اڑائی گئی ہے۔"

"ہراس؟" وہ بولا "میرے تو چھکے چھوٹ گئے تھے، اگر تم بارہ بجے تک نہ آتے تو سوا بارہ بجے میں ایک جیپ میں لبنانی سرحد کی طرف روانہ ہو گیا ہوتا۔"

"اور باقی لوگ؟"

"سب کے بوریے بستر تیار تھے" وہ ہنستے ہوئے بولا "میں اپنے آدمیوں کو بلاوجہ مروانے کا قائل نہیں۔"

"تو اب کیا پروگرام ہے؟"

"آج صبح اخبار دیکھنے سے پہلے ہی میں نے قاضی ہادی کو ایک رقعہ روانہ کر دیا تھا جس پر آج رات ۹ بجے کا وقت تحریر تھا۔ میں نے تو یہ منصوبہ اخبار دیکھتے ہی منسوخ کر دیا تھا مگر تم نے سارے اندیشے ختم کر دیئے ہیں لہٰذا اس رقعہ پر عمل ہو گا۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"آج رات نو بجے قاضی ہادی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا۔"

"مگر وقت دینے کے بعد وہ اپنے مکان کو قلعہ میں تبدیل کر لے گا۔"

"تم دیکھو گے کہ محمود کیسے اپنا کام دکھاتا ہے!"

"دشمن کو حقیر نہ سمجھو محمود" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "موت کے منہ میں دانستہ ہاتھ ڈالنا حماقت ہے۔ یہی کافی تھا کہ تم نے اسے وارننگ دے دی تھی۔ تم اس پر کسی بھی وقت اور کہیں بھی حملہ کر سکتے ہو۔"

"تم کہتے تو ٹھیک ہی ہو" وہ سوچتے ہوئے بڑبڑایا "مگر میں مقررہ وقت پر کوشش ضرور کروں گا، میرے ذہن میں پورا منصوبہ تیار ہے!"

"صبح ساڑھے چار بجے تک وہ میرے ساتھ تھی۔ تمہارا رقعہ ملنے کے بعد تو اس کا حال ابتر ہو گا۔ میرا اب اسی سے ملنے کا پروگرام ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں اپنے پاس ہی روک لے۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ کسی موقع پر مجھے اس کے قریب پاؤ تو تمہارے بشرے پر شناسائی کی پرچھائیں تک نہ ہونی چاہیے۔"

"نہیں — ایسا نہ کرنا محمود" میں یہ سن کر خائف ہو گیا "وہ لوگ

درندے ہیں۔ تمہارے کاز کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔ ایسا قدم اٹھا کر تم اپنی تنظیم کے حق میں برا کرو گے۔"

"میں جو کچھ کروں گا پورے غور و خوض کے بعد کروں گا میرے دوست۔" وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ "اگر زیادہ خطرہ ہوا تو میں پیش قدمی نہیں کروں گا۔"

"اور اب ایک بات اور سن لو۔" میں نے سگریٹ سلگانے کے بعد آہستہ سے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کل صبح آٹھ بجے سے آج صبح ساڑھے چار بجے تک کے درمیان فلورا کے گھر کی تلاشی لی گئی ہے وہ غائب ہے میں اس جگہ سے بچنے کے لیے اپنا کچھ سامان لے کر کارلٹن واپس آ گیا ہوں۔"

"اس کا گھر چھوڑ کر تم نے اچھا کیا۔ اس مسئلے پر کل غور کریں گے۔ آج کے لیے قاضی ہادی کا مسئلہ بہت کافی ہے۔"

میں ترحم آمیز نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضد اور دیوانگی میں دردناک موت کو گلے سے لگانے جا رہا تھا!

"تم اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔" محمود نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔ وہ اب بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔

"مجھے تمہارے فیصلہ سے شدید اختلاف ہے۔" میں نے براہ راست اس کی روشن آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بڑے مقاصد کے لئے ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں اصفدر۔"

"اگر تم ناکام ہو گئے؟"

"میں کامیاب ہو گیا تو آئندہ کوئی بدمعاش یہودی قاضی ہادی بن کر میرے سادہ لوح بھائیوں کو فریب دینے کی جرأت نہ کر سکے گا اور اگر میں ناکام رہا تو مارا جاؤں گا۔ مگر میری موت نہ جانے کتنے دلوں میں عزم اور حوصلے کی لہر دوڑا دے گی۔"

"اسرائیل کی سرزمین پر اس وقت صرف تمہارا گروپ موثر طور پر کام کر رہا ہے۔ تمہارے بعد یہ منصوبہ بندی کون کرے گا۔"

"لوگ مر جاتے ہیں مگر مقصد زندہ رہتا ہے۔" وہ جذباتی لہجہ میں بولا۔ "میں تم سے درخواست کروں گا کہ اس بارے میں مجھ سے بحث نہ کرو۔"

"یعنی آج رات نو بجے تم ہر قیمت پر قاضی ہادی پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کرو گے۔" میں نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

اس نے زبان کھولے بغیر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"میں کوشش کروں گا کہ اس وقت قاضی ہادی کے ساتھ رہوں شاید موقع آنے پر میں بھی تمہاری مدد کر سکوں۔"

"اب ایک دلچسپ بات پر غور کرو۔" وہ ایک ہلکا سا قہقہہ مار کر بولا۔ "وہ کیا؟"

"یوسف کے معاملہ میں تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی؟"

"نہیں۔" میں نے ایمانداری سے جواب دیا۔ "واقعات اتنی تیزی سے پیش آ رہے ہیں کہ کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔"

"تمہیں یاد ہوگا کہ جب یوسف گرفتار ہوا تو اخبارات میں اس کی خودکشی کی چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی۔" اس نے تصدیق طلب لہجے میں کہا۔

"ہاں یاد ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ پولیس نے یوسف کو مہلت دیئے بغیر زہریلے کیپسول والی انگوٹھی اپنے قبضے میں لے لی تھی۔"

اور ان ہی اخبارات نے اب دوبارہ اس کی ناکام خودکشی کی خبر نمایاں انداز میں شائع کی ہے۔" وہ انگلیوں سے ہولے ہولے میز کی سطح بجاتے ہوئے بولا۔

"وہ بوکھلائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ فرائض سے غفلت کے الزام میں اس پولیس اسٹیشن کا انچارج بھی معطل کیا گیا ہے جہاں یوسف لاک اپ میں رکھا گیا تھا۔"

"پہلے وہ ہمیں باور کرانا چاہتے تھے کہ یوسف مر چکا ہے تاکہ ہم اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش نہ کریں اور پولیس اطمینان سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کرتی رہے مگر اس کے باوجود اس نوجوان نے زہر کھا لیا تو اب وہ واقعی بوکھلا گئے ہیں۔ وہ ہم پر ہاتھ نہ ڈال سکے مگر ہمیں اپنی کوشش میں ناکامی کا یقین دلا کر فرار نشینی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔"

"پولیس اسٹیشن میں میری موجودگی میں ایک سپاہی نے یوسف کی ہوئی نیلی لاش کی خبر لایا تھا اور پھر رات کے سوا دو بجے تک وہی صورت حال برقرار تھی۔"

"اخبارات کا یہ تضاد ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہم سے زچ آ گئے ہیں۔ اپنے عوام میں سرکاری اطلاعاتی اداروں کی ساکھ خراب ہونے کی پرواہ کئے بغیر وہ ہمارے گروپ کو ہراساں کر کے منتشر کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے پرجوش لہجہ میں کہا۔

"اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہو؟"

"ہماری دو چار بھرپور کارروائیاں اس وقت انہیں ہراساں کر دیں گی اور ماریا والا کام بھی جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اس سلسلہ میں میں کل اس سے بات کروں گا۔"

اسی وقت دفتر کے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ محمود نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی پرانی پتلون کی ایک جیب سے ریوالور نکال لیا۔

دستک یکساں وقفوں سے تین بار سنائی دی اور محمود نے ریوالور واپس چھپا لیا۔ قفل میں چابی گھومنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں جناب!" کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ میں زرد زرد شخص نظر آیا۔

"آ جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے محمود نے کرسی چھوڑ دی اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ زرد زرد بوڑھا دروازہ بند کر کے اتنی تیزی سے اندر آیا جیسے اسے خدشہ رہا ہو کہ اسے کرسی تک پہنچنے میں ذرا بھی تاخیر ہو گئی تو محمود اسے برآمدے سے باہر اچھال دے گا۔

"زیتون کے دام اس موسم میں اچھے نہیں مل سکتے۔" زرد زرد بوڑھا اپنی ساگوان کی میز کے عقب میں پڑی ہوئی کرسی سنبھالتے ہوئے بولا۔

"زیادہ نفع کے چکر میں نہ پڑو۔ پیسہ گردش میں رہے تو بہتر ہے۔" محمود نے بوڑھے کی طرف پشت کر کے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"نابلس کا ایک بیوپاری خریداری میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

"مجھے جلد از جلد پیسہ چاہیئے۔ جتنی جلدی ممکن ہو سودا نمٹا لو۔"

"بہت بہتر جناب! میں اسے آج ہی بلاتا ہوں۔" بوڑھے نے ادب سے کہا اور محمود مجھے ہمراہ لیے اس دفتر سے نکل گیا۔

"تم لفٹ سے جاؤ میں سیڑھیوں سے اترون گا۔" راہداری میں اس نے سرگوشیانہ انداز میں کہا اور تیزی سے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

میں بٹن دبا کر لفٹ کا انتظار کرتے ہوئے محمود کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے شخصیت کے اتنے پہلو تھے کہ ہر مرتبہ مجھ پر اس کے نئے روپ ظاہر ہوتے تھے۔ وہ نابیناؤں کے دستکاری کے مرکز میں صفائی بھی کرتا تھا۔ زیتون کی تجارت بھی اور ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں تو وہ کئی بار مجھ سے مل چکا تھا اور آنے والی رات میں وہ اپنا ایک قہر آلود روپ دکھلانے والا تھا۔

اس عمارت سے نکل کر میں قاضی ہادی کی طرف پہنچا۔ وہاں خلاف معمول کوئی افراتفری یا ہنگامی صورت حال نظر نہ آئی جس کی بنا پر میں کچھ چوکنا ہو گیا۔

قاضی ہادی کے مکان کے پھاٹک پر اس وقت بھی رات والا دربان موجود تھا جو مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

چند منٹ کے انتظار کے بعد قاضی ہادی نشستگاہ میں آ پہنچا اس کے منہ سے شراب کی تیز بو آ رہی تھی۔ آنکھوں میں خمار کے ڈورے نمایاں ہو رہے تھے۔ مگر اس کے قدموں میں ذرا بھی لغزش نہیں تھی۔

"دن میں اتنی شراب نوشی؟" میں اس پر نظر پڑتے ہی اپنی بےساختہ حیرت کو الفاظ میں ڈھلنے سے نہ روک سکا۔

"وہ ولدالحرام ہے صفدر!" وہ قریب آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں نشے کی لڑکھڑاہٹ موجود تھی مگر اس کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ "اسے کہیں سے میری واپسی کی بھنک مل گئی ہے۔"

"کسے؟ محمود کو؟" میں نے مصنوعی حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایک گمنام رقعہ ملا ہے جس پر آج رات نو بجے تحریر تھا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"اگر وہ مرد کا بچہ ہوا تو آج رات نو بجے مجھ پر وار کرے گا اور اگر بزدل ہوا تو بےخبری میں کسی وقت بھی گھات لگائے گا۔"

"یہ رقعہ کس وقت ملا؟ صبح چار بجے تک تو ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔"

"آٹھ بجے کے قریب ملا۔ اور مجھے پکا یقین ہے کہ وہ ذلیل نائکہ محمود سے ملی ہوئی ہے۔"

"ٹیپسی گرل والی؟"

"ہاں۔ ٹیپسی گرل کی مالکہ مسز مارٹن ہی نے مجھے پہچان کر اسے خبر پہنچائی ہوگی۔ ورنہ پورے اسرائیل میں چار کے سوا پانچویں آدمی کو میری واپسی کا علم نہیں تھا۔"

"تو کیا وہ بار سے غائب ہو گئی ہے؟"

"غائب۔" وہ ہچکی لے کر زور سے طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "وہ فوجی تحویل میں ہے اور بدترین تشدد کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ تشدد کے سلسلے میں عورتیں مردوں کے مقابلے میں بہتر اور آسان ٹارگٹ ہوتی ہیں۔"

"مجھے تو شبہ ہے کہ محمود تمہارے ساتھ کوئی گہری چال چل رہا ہے۔ وہ اتنا احمق نہیں کہ تمہیں وقت دے کر خود ہی چوہے دان میں آ پھنسے گا۔"

"خیال تو میرا بھی یہی ہے۔" وہ مخمور لہجے میں بولا۔ "مگر اس جنونی سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ خط ملنے کے بعد سے میرے اعصاب پر بےچینی مسلط ہے۔"

"احتیاطی تدابیر تو بہرصورت ضروری ہیں۔"

"تل ابیب کے گیریژن کمانڈر، بریگیڈیئر ہیئرون نے میری حفاظت کی ذمہ داری قبول کی ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"مگر مجھے تو یہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔"

"حفاظتی حصار فاصلے پر قائم کیا گیا ہے۔ میرے مکان کی طرف آنے والے تمام راستوں پر خفیہ الیکٹرونک آلات نصب کئے گئے ہیں جو آتش گیر مادے کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ ان آلات کی زد سے بچ کر کوئی ادھر نہیں آ سکتا۔"

"اور اگر اس نے چاقو، خنجر یا ایسا ہی کوئی ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تو کیا ہوگا۔" میں نے اسے کریدنے کی نیت سے کہا۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر اضطراری انداز میں صوفے سے اٹھ گیا اور سرسراتی ہوئی تیز آواز میں بولا۔ "مجھے ہراساں نہ کرو صفدر! میرے اعصاب بکھر کر رہ جائیں گے۔"

"میں تمہاری سلامتی کا خواہش مند ہوں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں کوئی خیالی خطرہ پیدا نہیں کر رہا۔ یہ تو ایک بالکل سامنے کی عملی ترکیب ہے اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ آس پاس کے ہی کسی مکان میں اس وقت موجود ہو۔"

اس نے بے اختیار اپنی کنپٹیوں کے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے "میں کیا کروں، کہاں جاؤں، میرے لئے تو وہ ایک بے نام سایہ ہے۔ بتاؤ صفدر، میں اسے کہاں تلاش کروں؟ خدا کی قسم وہ مل جائے تو میں اپنے دانتوں سے اس کا نرخرا پھاڑ دوں گا۔" اس کی سرخ آنکھیں وحشت زدہ انداز میں قدرے کشادہ ہو گئی تھیں اور وہ چونکنے انداز میں میری طرف نگراں تھا۔

"گریژن کمانڈر نے ان سارے امکانات پر غور کر لیا ہو گا۔" میں اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ اس نے تمہیں پوری تفصیلات نہ بتائی ہوں۔"

"اس کا کیا بگڑے گا؟" وہ بپھر کر بولا۔ "اگر محمود اس کو جل دینے میں کامیاب ہو گیا تو مارا تو میں جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟"

"وہ آئے تو کھل کر اس سے بات کر لینا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"میری عقل ماؤف ہوتی جا رہی ہے۔ میں شیرون کا نمبر ملاتا ہوں۔ تم اس سے بات کر لو۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر ٹیلیفون اٹھاتے ہوئے بولا "تمہاری بات اور ہے۔ میری دخل اندازی کو وہ اپنی ہتک نہ سمجھ بیٹھے۔"

اس نے جھلا کر ٹیلیفون ریسیور دیوار پر دے مارا اور اس کی کرچیاں اور آلات بکھر گئے۔ "میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں نے اسرائیل کے استحکام کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے اور جب میری سلامتی کا سوال آیا ہے تو وہ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ مجھے اعتماد میں لے کر حفاظتی انتظامات سے باخبر کریں۔" پھر وہ کسی فوری خیال کے تحت تیز سرگوشیانہ انداز میں بولا۔ "مجھے تو شبہ ہونے لگا ہے کہ وہ مجھے چارہ بنا کر محمود کو پکڑنا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک میری سلامتی سے زیادہ اہم مسئلہ محمود کی گرفتاری ہے۔"

موت کو اپنے آس پاس منڈلاتے ہوئے محسوس کر کے قاضی ہادی کی عیاری اور مکاری خوف کے ریلے میں بہہ گئی تھی اور وہ مجھ سے اپنے تعلقات کے بھرم کا لحاظ کیے بغیر اعتراف کر بیٹھا تھا کہ اس نے اسرائیل کے لئے قیمتی خدمات سرانجام دی ہیں مگر میرے لئے وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کی گرفت کرتا۔ میرا اصل منشا یہ تھا کہ اس کا رہا سہا سکون غارت کر کے ذہنی اور اعصابی طور پر اسے قطعی ناکارہ بنا دوں تاکہ محمود اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے مزید تگ و دو کرنی پڑے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ گمنام تحریر محمود کی طرف سے نہ گئی ہو۔" میں نے اسے مزید بے یقینی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔

"میں بچہ نہیں ہوں۔ وہ تحریر محمود کی جانب سے ملنے والی تحریر سے مماثل ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ جو چار افراد میرے یہاں واپسی کے راز سے واقف تھے۔ ان میں سے کوئی میرے ساتھ ایسے خطرناک مذاق کی جسارت نہیں کر سکتا۔"

"بہرحال میں تمہاری ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ میں تمہارے تجزیئے سے اختلاف نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"تم تو اسے پہچان ہی لو گے؟" چند ثانیوں کی پرخیال خاموشی کے بعد اس نے امید بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"اگر وہ اپنی اصلی صورت میں آیا تو میں اسے ہزاروں میں پہچان لوں گا۔"

"پھر وہی بے یقینی؟" قاضی ہادی جھلا کر بولا۔ "تمہاری باتیں میرے خوف میں اضافہ کرتی جا رہی ہیں۔ وہ مونچھیں رکھ سکتا ہے، گنجا کرا سکتا ہے۔ ڈاڑھی چھوڑ سکتا ہے مگر اپنے خد و خال تو نہیں بدل سکتا۔ اپنی وہ بڑی بڑی روشن آنکھیں تو نہیں بدل سکتا جن سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔"

"آنکھوں کی بنا پر بیشک وہ نہیں چھپ سکے گا۔" میں نے ان معلومات پر اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ میں نے کہیں بھی اور کسی سے بھی محمود کی اس نمایاں نشانی کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ یقینی طور پر یہ معلومات مجھ سے الیکٹرو ڈرگ مشین کے زیر اثر اگلوائی گئی ہوں گی۔ اور پھر آرمی انٹیلی جنس کے ذریعے قاضی ہادی تک پہنچی ہوں گی۔

"میں چاہتا ہوں کہ اب تم سائے کی طرح میرے ساتھ رہو۔" قاضی ہادی اپنی عرق آلود پیشانی صاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "جو بھی مشکوک شخص نظر آئے اس کو بے دریغ گولی مار دو۔"

"اول تو میں غیر مسلح ہوں ورنہ فوجیوں کے نصب کیے آلات سے بچ کر یہاں تک نہ پہنچ پاتا۔" میں نے جواب دیا اور "ہتھیار بھی دو تو میں اتنی فراخدلی سے خونریزی نہ کر سکوں۔ اسرائیلی پہلی فرصت میں مجھے برقی کرسی پر بٹھا دیں گے۔"

"میں تمہاری آزادی کا ذمہ لیتا ہوں۔" وہ سینہ ٹھونک کر "تم تو میرے یار ہو آج کے دن تو میرے معمولی ملازمین کو بھی ملی ہوئی ہیں۔"

"مگر تمہارے ملازمین کہاں ہیں؟"

"وہ سب اپنی کمین گاہوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ آج پوشیدہ نگاہیں میرے مکان کے چپے چپے کی نگرانی کر رہی ہیں۔ نگران سب سے زیادہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔"

اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لیے اپنی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے شراب پیے جا رہا تھا۔ کثرتِ شراب نوشی سے اس کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلتے ہوئے اسے سہارے کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ مگر اس کا دماغ بدستور کام کر رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر قاضی ہادی نے اعشاریہ دو تین کا ایک وزنی پستول فاضل گولیوں سمیت میرے حوالے کر دیا۔

کھانے کے بعد خواب گاہ میں مے نوشی کا اگلا دور شروع ہوا تو میں نے بھی قاضی ہادی کا ساتھ دیا اور اسی دوران میں اچانک اسے اپنے چھوٹے سے تفریحی جہاز کا خیال آ گیا۔

"تمہارا ذاتی جہاز ہے کوئی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"چھوٹا سا لیکن خوبصورت جہاز ہے۔" وہ سرور کے عالم میں بولا "بحیرہ روم کے گہرے نیلے پانی میں تل ابیب کے قریب ہی ایک گھاٹ پر لنگر انداز رہتا ہے۔"

"اس کی سیر تو میں ضرور کروں گا۔"

وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ لبوں کی طرف بڑھتا ہوا اولڈ اسمگلر کا جام جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اور اس کی قدرے ورم آلود سرخ نگاہیں خلا میں کسی نکتے کو تکنے لگیں۔

"کیا سوچنے لگے؟" سکوت کو طول پکڑتے دیکھ کر میں نے اسے ٹوکا

"کیوں نہ ہم یہ شام سی ہاک پر گزاریں؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں دھیمے سے کہا۔

"خیال اچھا ہے۔" میں نے اوپری دل سے کہا۔ محمود قاضی ہادی کے مکان سے واقف تھا اور اپنی جان پر کھیل کر رات نو بجے وہاں پہنچنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر قاضی ہادی اپنا مکان چھوڑ کر ساری شام جہاز پر ہی گزار دیتا تو نہ صرف یہ کہ خود کو محفوظ کر لیتا بلکہ محمود کے پھنسنے کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے۔

"اچھا ہی نہیں، بہت اچھا ہے۔" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "جب میری رگوں میں خون کے ساتھ شراب بھی دوڑنے لگتی ہے تو میرا ذہن خوب کام کرتا ہے۔"

"اس وقت تو مجھے تمہاری بات ماننی ہی پڑے گی۔" میں نے مسکرا کر کہا

"میرے اور تمہارے سوا اس پروگرام کا کسی کو علم نہ ہو گا۔ ہم سی ہاک کو گہرے سمندر میں لے جائیں گے اور محمود اگر فوجیوں کے ہاتھ سے زندہ بچ گیا تو اپنا سر پیٹتا رہ جائے گا۔" اپنی اس تجویز پر وہ بہت زیادہ مگن نظر آنے لگا۔

"ہو سکتا ہے کہ بریگیڈیئر شیرون تمہیں اس کی اجازت نہ دے۔"

"وہ کون ہوتا ہے اجازت دینے یا نہ دینے والا۔" قاضی ہادی بپھر کر بولا۔ "اور اس الو کے پٹھے سے بھلا میں کیوں پوچھنے لگا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو گا کہ میں کب اور کہاں نکل گیا۔"

"اس کے آدمی اس کو خبر نہیں دیں گے؟"

"تم کو شراب چڑھ رہی ہے۔" وہ جھلا کر بولا۔ "احمق آدمی! آج میرے مکان میں اس کا کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں آنے والے راستوں پر خفیہ مورچے لگائے ہوئے ہیں۔ میں اپنے سیکرٹری کی گاڑی لے کر صاف نکل جاؤں گا۔"

"چیکنگ میں کیا ہو گا؟"

"وہ صرف اسی گاڑی یا آدمی کو روکیں گے جس کے بارے میں آتشگیر مادے کا سراغ لگانے والے الیکٹرونک آلات حرکت میں آئیں گے۔"

"تو ہم یہاں سے نہتے روانہ ہوں گے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا

"سی ہاک پر ہتھیاروں کا زبردست ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ وہ قاضی ہادی کا جہاز ہے کسی اول جلول کا نہیں۔"

وہ جانے پر تل ہی گیا تھا لہذا میں نے دانستہ ایک متوقع خطرے کی نشان دہی نہیں کی۔ نہتا ہونے کی صورت میں ایک موہوم سی امید یہ تھی کہ شاید محمود کوئی سراغ پا کر ہمیں راستے ہی میں گھیرنے میں کامیاب ہو جائے اور غیر مسلح قاضی کو آسانی سے ٹھکانے لگا دے۔

قاضی ہادی نے مجھ سے پستول اور فاضل راؤنڈ لے کر الماری میں مقفل کر دیئے اور لباس تبدیل کر کے عمارت سے باہر آ گیا۔

عقبی گیراج میں اس کے سیکرٹری کی سیاہ ڈاج ڈارٹ موجود تھی۔ قاضی ہادی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کیا اور تاریک شیشوں والی وہ لمبی کار رینگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

قاضی ہادی کا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ نہ گاڑی پہچانی گئی نہ ہی تاریک شیشوں کے باعث اسے دیکھا گیا۔ گاڑی میں اسلحہ نہ ہونے کی صورت میں برقی آلات بھی ساکت رہے ہوں گے کیونکہ ہمیں نہ کہیں روکا گیا تھا، نہ تعاقب کیا گیا اور گاڑی شہر کے مصروف ترین علاقے میں داخل ہو گئی۔

تقریباً پچاس منٹ تک یہ سفر جاری رہا۔ باہر ڈھلتے ہوئے سورج کی تیز کرنیں چمک رہی تھیں۔ مگر کار کے اندر ایئر کنڈیشنر کی وجہ سے نہایت آرام دہ موسم برقرار تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔

مجھے رہ رہ کر محمود کی بدنصیبی کا احساس ستا رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں کسی نہ کسی طرح اسے ہوشیار کر دیتا کہ وہ قاضی ہادی کے گھر کا رخ نہ کرے جہاں اس کے لئے چوہے دان تیار تھا اور

اس کا شکار بجرہ روم میں اپنی نجات کا جشن منانے جا رہا تھا۔

ویران اور بے آب و گیاہ ٹیلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ساحلی سڑک طے کرتے ہوئے اچانک قاضی ہادی نے آگے اشارہ کیا اور مجھے ٹیلوں کی اوٹ سے سی ہاک کی سفید چمنیاں وغیرہ نظر آنے لگیں۔ ہماری منزل لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔

پھر سرسبز علاقہ شروع ہو گیا مگر ویرانی وہاں بھی راج کر رہی تھی۔ آخر کار تارکول کی سڑک سے ہم سیمنٹ کی سڑک پر اترے اور کھپریل کی چھت والے ایک خوبصورت ہٹ سے ملحقہ پورچ میں گاڑی جا رکی۔

ہٹ کے چوکیدار نے حیرت، مسرت اور احترام کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اپنے آقا کا استقبال کیا۔ ہٹ کے عقب میں سمندر کی موجوں پر سی ہاک کسی بہت بڑے سفید پرندے کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ ساحل سے جہاز تک پہنچنے کے لئے کنکریٹ کے ستونوں پر ہٹ کے عقبی حصے سے قدرے گہرے پانی تک ایک چوبی پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔

"جہاز پر سب لوگ موجود ہیں؟" قاضی ہادی نے چوکیدار سے سوال کیا۔

"ہاں جناب!"

"آسوالڈ سے کہو کہ اپنے آدمیوں کو روانگی کے انتظامات کی ہدایات دے کر میرے پاس آ جائے۔" قاضی ہادی کا کھویا ہوا اعتماد بڑی حد تک بحال ہو چکا تھا۔

"ہٹ کھول دوں جناب؟"

"نہیں میں یہیں رکا ہوا ہوں۔ ہمیں جلد از جلد روانہ ہونا ہے" قاضی ہادی نے خشک لہجے میں کہا۔ "واپسی میں برتھ کے دروازوں کو کھولنے آنا۔"

"بہت بہتر جناب"، چوکیدار یہ کہہ کر چلا گیا۔

"کون سی برتھ کے دروازے کھلوا رہے ہیں؟" میں نے قاضی ہادی سے پوچھا۔

"سی ہاک ساڑھے چھ سو ٹن وزنی جہاز ہے۔" قاضی ہادی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "اس وجہ سے وہ ساحل پر نہیں آ سکتا۔ بھاری اسٹیمر اور جہاز ہمیشہ گہرے پانی میں لنگر انداز ہوتے ہیں۔ سی ہاک پر پہنچنے کے لئے میں نے اپنے ہٹ کے عقب سے گہرے پانی تک چھ سو فٹ طویل پلیٹ فارم بنوایا ہے، چونکہ سی ہاک پلیٹ فارم کے آخری سرے سے لگ کر لنگر انداز ہوتا ہے اس لئے ہم اسے برتھ ہی کہتے ہیں۔"

"وہ تو درست ہے مگر برتھ کے دروازے؟"

"ہٹ کی پشت پر پلیٹ فارم کا آغاز ایک بند راہداری سے ہوتا ہے جس پر دو دروازے ہیں۔ ان سے گزرے بغیر پلیٹ فارم پر پہنچنا ناممکن ہے۔"

"سمندر میں ڈوبے ہوئے ستونوں کے سہارے بھی تو [پلیٹ] فارم تک رسائی ہو سکتی ہے۔"

"وہ راستہ تو کوئی تخریب کار ہی استعمال کرے گا۔" وہ [...] جھلا کر بولا۔ "میرے یا تمہارے لئے پانی میں تیر کر ستونوں [...]"

"یعنی تمہارا کوئی دشمن کوشش کرے تو جہاز پر پہنچ [...]" میں نے بظاہر بے مقصد گفتگو میں سے ایک نکتہ نکال [...]

"جہاز پر سترہ آدمی رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں دھو[ل جھونکنا] ناممکنات میں سے ہے۔" وہ سینہ تان کر بولا۔ "جب [تک] سیڑھی نہ لٹکائی جائے کوئی مائی کا لال اوپر نہیں جا سکتا۔"

"تم اپنے حفاظتی انتظامات کو بہتر سمجھتے ہو۔" [...] سے شانے اچکا کر جواب دیا۔ "ویسے بھی تم نے یہ منصوبہ [...] بنایا ہے، ادھر تو کسی کا خیال بھی نہ جا سکے گا۔"

"سی ہاک میرا بہترین رفیق ہے۔ اس سے پہلے [...] اپنے دفاع کے لئے یہی ترکیب کامیابی سے آزما چکا ہوں۔"

"اوہ، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"سن سڑسٹھ کی خونریز عرب اسرائیل جنگ سے [...] ہم ارمنی کویں نے اسرائیل کے قیام کی انیسویں سالگرہ [...] میں مسلم اور یہودیوں کی تنقید کیے بغیر فلسطینی قومیت [...] پر تاریخی پس منظر میں روشنی ڈالی تھی۔ اس پر بلیک [...] لہو کی بو پر لگ گئے تھے۔" قاضی ہادی مجھے بتانے لگا۔ [...] سرحدوں کے راستہ وہ اسرائیل میں مضبوط قدم جما چکے [...] اور [...] سے بچنے کے لئے سی ہاک پر روپوشی اختیار کرنا پڑی تھی [...] چل سکا کہ میں کہاں غائب ہوا۔ پھر پانچ جوان کو چھپ[...] پھر کہی اس دوران میں اسرائیلی سرحدوں میں موجود [...] دی گئی جس پر دہشت پسند ہونے کا شبہ تھا اور اس کے بعد [...] ریاست کے نام پر دہشت گردی کرنے والے اسرائیلی [...] کی ہمت نہ کر سکے۔"

"مگر اب محمود کے آدمی خاصے سرگرم ہو گئے ہیں۔ [...] مجھے تو یہ اس کی زندگی کی آخری رات معلوم ہوتی ہے۔" [...] سامنہ بنا کر بولا۔

اسی اثنا میں سی ہاک کا کپتان آسوالڈ چوکیدار [...] آ[...]

"گڈ ایوننگ سر!" اس نے اپنی سفید مخصوص ٹوپی [...] احترام کے ساتھ اپنے آقا قاضی ہادی کو سلام کیا۔

"ایوننگ" قاضی ہادی نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ [...] "سی ہاک پر ایندھن اور خوراک کی صورتحال کیسی ہے؟"

"کھلے سمندر کے لئے ایک ماہ کا راشن اور ایندھن موجود [...]"

"مواصلاتی نظام؟"

"سب ٹھیک ہے۔ وائرلیس ٹیلی فون سسٹم میں پرسوں ایک معمولی [...]ی خرابی ہو گئی تھی جو دور کرا دی گئی ہے۔"

قاضی ہادی نے گاڑی کی چابی چوکیدار کی طرف اچھال دی [...] لاک کر کے ترپال سے ڈھانک دینا۔ میں لمبے سفر پر جا رہا ہوں۔" یہ ہدایت دے کر وہ میرے اور آسوالڈ کے ہمراہ ہٹ کے عقبی حصے کی طرف چل دیا۔

ساحل سے گہرے پانی میں سی ہاک تک پہنچنے کے لئے [...] چوبی برتھ تعمیر کیا گیا تھا وہ بہت مضبوط اور محفوظ تھا۔ اس پر دونوں [ط]رف چوبی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ اور فرش سے تقریباً چھ فٹ نیچے سمندر [...]ی کی نیلگوں لہریں دم توڑ رہی تھیں۔

طویل پلیٹ فارم کے اختتام پر جہاز سے آہنی سیڑھی حفاظتی [ر]یلنگ اور رسّوں سمیت نیچے لٹک رہی تھی۔ اور عرشے پر ایک گن مین [...]ڑا ہوا سیڑھی کی نگرانی کر رہا تھا۔

سب سے پہلے آسوالڈ نے قاضی ہادی کی کمر کے گرد بیلٹ ڈالی پھر نائیلون کا مضبوط رسّہ بیلٹ کے ایک فولادی ہک میں پھنسا دیا۔ رسّے کا دوسرا سرا عرشے پر جاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ قاضی ہادی کے اوپر [...] بڑھنے کے ساتھ رسّہ بھی اوپر کھنچتا جا رہا تھا اور جب اس نے آخری سیڑھی چھوڑی تو میں اسی حفاظتی اہتمام کے ساتھ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ آخر میں آسوالڈ بھی اوپر آ گیا اور سیڑھی مشینی نظام کے ذریعے اوپر کھینچ لی گئی۔

"جہاز پر تین بے حد حسین قبرصی لڑکیاں بھی موجود ہیں۔" قاضی ہادی نے میرے ساتھ اپنے کیبن کی طرف جاتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے حیرت ہے کہ ایسے بدترین حالات میں بھی تمہیں ان چیزوں کا ہوش ہے۔" میں نے صدق کے ساتھ اس کی تعریف کی۔

جواب میں اس نے زندگی سے بھرپور ایک قہقہہ لگایا۔ "بدترین حالات اور یہ ساحل ذرا سی دیر میں پیچھے رہ جائے گا۔ سی ہاک پر گزارا ہوا حسین وقت تم برسوں فراموش نہ کر سکو گے۔ میرے مہمان سی ہاک کی [...] دعوتوں کے منتظر رہا کرتے ہیں۔"

"کیبن میں جانے سے پہلے ایک بار عملے کے سارے افراد کو اپنے سامنے بلاؤ۔" میں نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

"وہ کیوں؟" اس نے تیوری پر بل ڈال کر سوال کیا۔

"احتیاط۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں ابھی سب کو میٹنگ روم میں بلوائے لیتا [ہ]وں۔" یہ کہہ کر وہ آسوالڈ سے مخاطب ہو گیا۔

"دراصل قاضی ہادی کی قلابازی نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا ہوا تھا۔ وہ جس خاموشی اور رازداری سے سی ہاک کی طرف آیا تھا اس کے پیش نظر اس بات کی موہوم سی امید بھی نہیں رہی تھی کہ محمود کو اس مکار اعظم کی نئی چال کا علم ہو گیا تھا۔

محمود کے سلسلہ میں مجھے یہ بات یقینی نظر آ گئی تھی کہ وہ لاعلمی میں قاضی ہادی کے مکان کا رخ کرے گا اور چوہے دان میں پھنس جائے گا۔ مگر میری خواہش یہ تھی کہ اگر محمود اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے تو میں اپنے ہی طور پر اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا دوں۔ میرے لئے قاضی ہادی کو قتل کرنا بہت آسان تھا مگر اصل مسئلہ قتل کے بعد اپنے بچاؤ کا تھا۔

میں نے جس وقت اسے عملے کو طلب کرنے کی تجویز پیش کی میرے ذہن میں اس وقت یہ خواہش جنم لے چکی تھی اور میں اس بہانے یہ چاہتا تھا کہ سی ہاک کے سترہ افراد میں کسی ایسے شخص کا جائزہ لے سکوں جسے ساتھ ملا کر میں مقررہ وقت پر قاضی ہادی کو ٹھکانے لگا سکوں اور بعد میں میری ذات شبہ سے بالاتر رہ سکے۔

آسوالڈ کو ہدایات دینے کے بعد قاضی ہادی مجھے جہاز کی سیر کرانے لگا۔

سی ہاک کی تعمیر اور آرائش پر بے دریغ پیسہ بہایا گیا تھا۔ تمام راہداریوں میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ وسیع فلم لاؤنج میں دیواروں پر حسین اور رومان پرور تصاویر آویزاں تھیں۔ ڈائننگ ہال اور اس لاؤنج کے درمیان میں ایک خوبصورت اور چھوٹا سا بار بنا ہوا تھا۔

جہاز میں کل چار رہائشی کیبن تھے عملے کی رہائش کا انتظام علیحدہ تھا چاروں کیبن پوری طرح آراستہ اور ایئر کنڈیشنڈ تھے۔

ادھر ادھر کی سیر کے دوران قاضی ہادی نے بتایا کہ روانگی کے بعد ہی عملے کے افراد ایک جگہ جمع ہو سکیں گے کیونکہ وہ جلد از جلد ساحل چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

جب تھوڑی دیر بعد انٹرکام پر آسوالڈ نے اسے روانگی کی اطلاع دی تو اس نے فرطِ مسرت سے شیمپین کی بوتل اٹھا لی، ایک دھماکے سے بوتل کا کاگ اڑا اور قاضی ہادی نے دو گلاس لبریز کر دیئے۔

"پیو ــــ یہ محمود کی موت کی خوشی کا جشن ہے!" وہ گلاس اٹھا کر بولا۔ "وہ زندہ بچ بھی گیا تو یہ ناکامی اسے پاگل ضرور کر دے گی"

میرا جی چاہا کہ شیمپین سے بھرا ہوا گلاس اس کے منہ پر دے ماروں مگر میں یہ قدم نہ اٹھا سکا اور دل پر جبر کر کے گلاس منہ سے لگا لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں میٹنگ روم میں گئے تو وہاں عملے کے سولہ افراد موجود تھے۔ سترھواں آدمی انجن روم کا نگران تھا جو اپنی جگہ چھوڑنے سے قاصر تھا۔

میں نے یکے بعد دیگرے ہر چہرے کا جائزہ لے ڈالا۔ ان میں تیکھے خدوخال والی تین لڑکیاں بھی تھیں۔ جو موم کی طرح تراشے ہوئے

مجسموں کی طرح نازک نظر آرہی تھیں۔ ان کے علاوہ ہر چہرہ گھاگ اور خرانٹ نظر آرہا تھا۔

میں دل ہی دل میں قاضی ہادی کے انتخاب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے نگر نگر کی خاک چھان کر مردم شناسی میں جو بیمثال تجربہ حاصل کیا تھا، اس کی روشنی میں وہ سب پکے جاں نثار تھے اور وقت پڑ جانے پر اپنے مالک کے لئے اپنی گردنیں کٹوا سکتے تھے۔

قاضی ہادی ہنس ہنس کر ان سے فرداً فرداً باتیں کر رہا تھا۔ ان کی مزاج پرسی کر رہا تھا اور میں کسی زخم خوردہ درندے کی طرح دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

ان سے فارغ ہونے کے بعد ہم کیبن کی طرف چل دیئے۔

"حکم ہو تو فرنانڈس کو بھی بھیجوں؟" آسو اللہ نے عاجزانہ لہجے میں انجن روم کے نگران کے بارے میں قاضی ہادی سے سوال کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں، ہاں ان تینوں کو بھیج دو۔"

"بہت بہتر جناب!" آسو اللہ یہ کہہ کر واپس مڑ گیا۔

ہم دونوں کیبن میں پہنچے ہی تھے کہ تینوں لڑکیاں بھی آگئیں۔ ان میں گہری سیاہ آنکھوں اور نیلے نیلے نیلاہٹ مائل سرخ ہونٹوں والی لڑکی مجھے پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی۔ میں نے مسکرا کر اسے آنکھ ماری اور وہ بوکھلا کر کیبن کی چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیبن کا دروازہ مقفل کر دو۔" قاضی ہادی نے بھاری لہجے میں کہا۔

ایک نے دروازہ بند کر دیا، باقی دو کیبن میں موجود الماری میں سے مینا و ساغر نکالنے لگیں۔

"بادہ و ساغر و شباب کی یہ محفل تمہارے اعزاز میں ہے صفدر" قاضی ہادی نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔

"اس عزت افزائی کے لئے میں تمہارا ممنون ہوں۔"

"ان تینوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔"

"آج کالے نینوں میں ڈوبنے کو طبیعت مچل رہی ہے۔" میں نے اپنی طبیعت میں ابھرتے ہوئے ہیجان کے زیر اثر جواب دیا۔

"خوب، خوب۔" اس نے برجستہ کہا۔ "بڑے مناسب الفاظ میں اظہار کیا ہے تم نے اپنی پسند کا۔ اس کے کالے نینوں کا جادو ہر ایک کو ڈس لیتا ہے۔"

"یہ انگور کے باغات میں پلی ہے۔" ایک لڑکی نے میری پسند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شوخ و شنگ لہجے میں کہا۔

"دیکھنے ہی میں بنتِ عنب لگتی ہے۔" قاضی ہادی تیزی کے ساتھ کھلتا جا رہا تھا۔ "مگر تم دونوں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔"

"ہ سی ہاک پر ہماری موجودگی ہی اس بات کا ثبوت ہے۔" ان میں سے ایک بولی۔

"تمہارے جسموں کے لباس سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم کسی ایسی عبادت کے لیے آئی ہو۔" قاضی ہادی نے کہا۔

وہ تینوں کھلکھلا کر ہنس دیں اور ایک تیز طرار تھی، فوراً بولی تو اس میں ہے کہ سرور بڑھنے کے ساتھ رفتہ رفتہ حجاب سرکتا جائے۔

"لباس بدل کر آؤ۔" قاضی ہادی اس مرتبہ قدرے سخت لہجے میں بولا اور وہ تینوں تیزی کے ساتھ کیبن سے چلی گئیں۔

"ماریتا بڑی دل کش لڑکی ہے!" ان تینوں کے چلے جانے پر ہادی آنکھ مارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"ماریتا کون؟"

"وہی کالے نینوں والی۔"

"بے پناہ حسن پایا ہے اس نے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "ان میں غضب کی چمک ہے، دیکھنے والا چند ثانیوں کے لیے تو سحر زدہ ہو جاتا ہے۔"

"ایک راز کی بات بتا دوں؟"

"کیا میرے اور تمہارے درمیان اب بھی کوئی راز باقی ہے؟"

"موشے دایان ماریتا پر بری طرح فریفتہ ہے!"

"میرا تو خیال تھا کہ وہ تینوں کو ہی ایک آنکھ سے دیکھتا ہوگا" میں نے مذاق کے پردے میں گہرا طنز کر کے اپنا دل خوش کیا۔

قاضی ہادی میرے اس تبصرے پر دل کھول کر ہنسا۔ "وہ بڈھا ہے مگر عورتوں کے معاملے میں بڑا باذوق ہے۔"

"تو کیا وہ بھی سی ہاک پر آچکا ہے؟"

"سی ہاک پر کون نہیں آیا؟" وہ فخر کے ساتھ بولا۔ "اور ہو کہ دایان ماریتا پر کیوں دل و جان سے فدا ہے؟"

"شاید تم یہی راز بتانے والے تھے۔"

"اس لڑکی کے پیر بڑے حسین ہیں!"

"تو وہ اس کے پیر ہی چاٹتا رہا ہوگا۔"

"خوب اندازہ ہے تمہارا" وہ بے اختیار اچھل پڑا۔ "دایان کے پیکر میں صرف اس کے نرم نرم اور خوبصورت پیر ہی پسند ہیں۔ وہ کتے کی طرح انہیں چاٹتا اور اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے!"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے مہمانوں کی خلوت میں جھانکنے کے عادی ہو۔"

"ارے نہیں۔" وہ سرور کے عالم میں بولا۔ "یہ بات چونکا دینے والی سی تھی اس لیے ماریتا نے مجھے خود ہی بتائی تھی۔"

اور اسی وقت تینوں لڑکیاں باریک لبادے پہنے اندر آگئیں۔

پھر اس کیبن میں ایک شیطانی صحبت کا آغاز ہوا۔ انواع و اقسام کی شرابیں اور ڈبوں میں بند پھلوں اور خشک میوہ جات کے ساتھ ہی ساقیوں کی دل بری شروع ہو گئی۔

ابتداء میں محمود کا خیال میرے ذہن پر بری طرح چھایا رہا۔ اس نے قاضی ہادی کو رات نو بجے کا وقت دیا تھا اور میری نگاہیں چار بجے تک بار بار رسٹ واچ کا جائزہ لیتی رہیں مگر جب آتشیں سیال کی خاصی مقدار میرے معدے میں پہنچ گئی اور ماریتا کی جلوہ گری دھیمے دھیمے میرے اعصاب پر اپنا اثر جمانے لگی تو محمود کا خیال میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں دبک گیا۔

وہ نہ جانے کیا وقت تھا، مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔ کیبن میں کافی دیر سے تاریکی کا راج تھا اور مجھ پر سرور نے اتنی کاہلی طاری کی ہوئی تھی کہ میں رسٹ واچ کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔ قاضی ہادی اور تینوں لڑکیاں تھکن اور نشے میں چور برے احوال میں سو رہی تھیں کہ اچانک جہاز کے کسی حصے میں زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے مزید کئی دھماکے ہوئے۔

میں مشینی انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ میرا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا مگر قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے تجسس کو دفن کرنے کے بیٹھے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی وقت قاضی ہادی ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا اور اس کے حلق سے سہمی سہمی بے معنی آوازیں خارج ہونے لگیں جیسے کسی نے اس کی کھوپڑی پر ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی بالٹی الٹ دی ہو۔

اس کی بے تکی آوازیں سن کر لڑکیاں بھی بیدار ہو گئیں، ان کی دھیمی دھیمی آوازیں ضرور سنائی دیں مگر صاف پتہ چل رہا تھا کہ نشے نے ان تینوں کو ذہنی طور پر ناکارہ کیا ہوا ہے، جب کہ قاضی ہادی کے خوف سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہوش و حواس میں ہے۔

"صفدر، صفدر!" اچانک قاضی ہادی بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے، یہ آوازیں کیسی تھیں، ذرا روشنی تو کر لو۔"

"پتہ نہیں کیسی آوازیں تھیں" میں نے بڑبڑا کر جواب دیا۔ اس وقت مجھے بولنا بھی کڑی مشقت سے کم نہیں معلوم ہو رہا تھا مگر قاضی ہادی کی خواہش کے مطابق مجھے اندھیرے میں ہی سوئچ بورڈ ٹٹول کر روشنی کرنی پڑی۔

"ذرا باہر جا کر معلوم کرو، کیسے دھماکے تھے!"

"تم خود کیوں نہیں چلے جاتے!" میں نے بے زاری کے ساتھ کہا۔

"نو بجنے والے ہیں" وہ اچانک اپنی رسٹ واچ دیکھ کر خوف زدہ آواز میں بولا۔

"ہم کھلے سمندر میں ساحلوں سے میلوں دور ہیں۔"

"پھر کیا ... نشے میں دھت پڑی ہیں" قاضی ہادی یک بیک بہت زیادہ نروس ہو گیا۔ "ریوالور ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں"

"اگر وہ ... آ گیا ہے تو کیا ہوگا۔"

"کیسے آ ... " میں دل ہی دل میں اس کی بزدلی پر مسکراتے ہوئے بولا۔ "سمندر میں تیر کر تو وہ آنے سے رہا اور پھر تمہارے پندرہ آدمی اس جہاز پر پھیلے ہوئے ہیں۔"

"یہاں فیصلے صادر نہ کرو۔" موت کے بھیانک خوف نے اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ "ذرا باہر جا کر کھوج نکالو۔" مجھے ناچار کیبن سے باہر جانا پڑ گیا۔

میں راہداری میں چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ اچانک ایک بغلی راہداری سے کوئی بے آواز قدموں سے دوڑتا ہوا آیا اور مڑ گھومتے ہی پوری قوت سے مجھ سے ٹکرایا اور ہم دونوں ہی دبیز قالین پر گرتے چلے گئے۔

ٹکرانے سے پہلے مجھے بس ایک ثانیے کے لیے اس کی جھلک نظر آئی تھی اور اسی وقت میں نے اس کے داہنے ہاتھ میں لمبے پھل والا تیز دھار چاقو چمکتا دیکھ لیا تھا۔ اس نے سفید زمین اور سرخ چار خانے والا ایک سوتی رومال اپنے سر اور چہرے پر مضبوطی سے اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ آنکھوں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ اور وہ آنکھیں میں ہزاروں کی بھیڑ میں پہچان سکتا تھا۔ اور ان شناسا آنکھوں ہی کا کمال تھا کہ میں نے شدید ٹکر کے باوجود اپنے حلق سے کوئی آواز نہ ابھرنے دی۔

"ادھر!" میں نے اٹھتے ہوئے مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں اس کے کان میں سرگوشی کی اور اپنی راہ پر ہو لیا۔

جہاز پر ہر طرف سناٹا چھیلا ہوا تھا۔ میں کسی کی تلاش میں تھا کہ اچانک مجھے آسو اللہ نیچے سے سیڑھیاں طے کر کے گھبرایا ہوا آتا نظر آیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے بڑھ کر اس سے پوچھا۔

"ہولڈ میں ....!"

اس کا فقرہ کیبن کی جانب سے ابھرنے والی دہشت زدہ چیخوں کے سبب ادھورا ہی رہ گیا۔ وہ چیخیں پل بھر میں ایک آخری ادھوری چیخ میں ڈوب گئیں اور اسی کے ساتھ لڑکیوں کی ہذیانی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔

یہ واقعہ اس قدر اچانک سرزد ہوا کہ آسو اللہ کئی سیکنڈ تک پتھر کے کسی بت کی طرح آنکھیں پھاڑے اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ پھر ہم دونوں ہی تقریباً بیک وقت کیبنوں کی طرف لپکے۔ میں بکثرت شراب نوشی کے باوجود آسو اللہ سے آگے ہی تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ راہداری میں داخل ہوا اور پھر بڑھ کر قاضی ہادی کے کیبن کے کھلے ہوئے دروازے میں گھستا چلا گیا۔

یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ محمود چند سیکنڈ کی مہلت میں اپنا کام نمٹا کر کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

قاضی ہادی کا بے جان بدن قالین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بائیں پہلو میں دل کے مقام پر ایک چاقو کا پھل دستے تک پیوست تھا اور زخم سے بہنے والا خون بتدریج قالین پر پھیلتا جا رہا تھا۔ قاتل کا نشانہ اتنا سچا اور کاری تھا کہ قاضی ہادی کو شاید تڑپنے کی بھی مہلت نہ مل سکی کیوں کہ وہ فرش پر چاروں خانے چت پڑا ہوا تھا۔

وہ تینوں لڑکیاں شرمناک حالت میں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی مسلسل چیخے جا رہی تھیں اور موشے دایان کی دل پسند لڑکی بلند آواز میں روئے جا رہی

تھی۔

اپنے مالک کی لاش کو دیکھ کر آسوالڈ کو شدید ذہنی جھٹکا لگا اور وہ کرب آلود آواز میں کراہا۔ "یہ کس نے میرے چہرے پر سیاہی مل دی!"

"جہاز پر کوئی ڈاکٹر بھی ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ میں اسے وہاں الجھا کر محمود کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتا تھا۔

اس وقت میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ محمود کا سی ہاک پر پہنچ جانا میرے لیے بعید از قیاس تھا مگر اب مجھے وہ بچتا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جہاز بہت بڑا نہیں تھا اور اس وقت شراب زدہ لڑکیوں کے علاوہ پندرہ نفوس ایسے تھے جو تھوڑی ہی دیر میں جہاز کا چپہ چپہ چھان ڈالتے اور محمود ان کے ہاتھ لگ جاتا۔

"اگر مجھے اس منحوس گھڑی کا علم ہوتا تو میں ڈاکٹر کو بھی ضرور لاتا" وہ رو دینے والے انداز میں بولا پھر پلٹ کر بھرائی ہوئی آواز میں لڑکیوں پر برس پڑا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے، لباس پہن کر اور ٹھنڈے پانی سے نہا کر فوراً واپس آؤ۔"

لڑکیاں بری طرح گرتی پڑتی وہاں سے نکل گئیں اور اسی کے ساتھ جہاز کے عملے کے لوگ وہاں جمع ہونے لگے۔

میں پورے انہماک سے گھٹنوں کے بل قاضی ہادی کی لاش پر جھک گیا۔ کیبن کی فضا میں لوگوں کی دھیمی سرگوشیاں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونج رہی تھیں۔

میں نے چند ثانیوں تک اس کی نبض تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی پھر چاقو چھیڑے بغیر سینے سے کان لگا دیئے۔ سب امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"لاش پر کپڑا ڈال دو۔" چند ثانیوں بعد میں نے اٹھتے ہوئے دل گداز لہجے میں کہا۔

قاضی ہادی کے بدن پر اس وقت خاصے کم کپڑے موجود تھے۔ ایک شخص نے بڑھ کر اس کے سینے کے زخم سے چاقو کھینچنا چاہا مگر آسوالڈ نے چیخ کر اسے روک دیا۔

"جہاز کا کونہ کونہ چھان ڈالو۔" آسوالڈ کی رقت یک بیک غیض و غضب میں بدل گئی۔ "وہ جہاز پر ہی موجود ہوگا۔"

سب لوگ وہاں سے چلے گئے۔

"مجھے یہ حرکت عملے ہی کے کسی فرد کی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے آسوالڈ سے کہا جو کسی نوجوان بیوہ کی طرح دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر مسہری پر بیٹھ گیا تھا۔

"نہیں مسٹر صفدر!" اس نے پورے وثوق سے کہا۔ "سی ہاک کے عملے میں جو لوگ شامل ہیں وہ سب پرانے نمک خوار ہیں اور قاضی ہادی کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے!"

"پھر چلتے جہاز پر کون آسکتا ہے؟"

"چلتے جہاز پر کون آئے گا۔" وہ تاسف آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ سی ہاک کی روانگی کے وقت ہی سے وہ ہولڈ میں چھپا ہوا تھا۔"

"اس یقین کی وجہ؟"

"اس نے ہولڈ میں چوبی پیٹیوں کا ایک بار گرا کر ساری توجہ ادھر مبذول کرا دی۔ ہم دھماکوں کی آواز سن کر وہاں پہنچے تو ایک طرف آگ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس آگ کا مقصد سی ہاک کو تباہ کرنا نہیں بلکہ وہ ہمیں کچھ دیر تک وہاں روکے رکھنا تھا۔ اس نے سارا کام منصوبے کے تحت کیا ہے۔ ہم وہاں آگ بجھاتے رہے اور ادھر اپنا کام دکھا گیا۔"

"اگر وہ لڑکیاں ہوش میں ہوتیں تو شاید اس کا وار اتنا کارگر نہ ہوتا۔"

"تم بہت بہتر حالت میں تھے۔ تم بھی کیبن میں موجود ہوتے تو ... تم اسے ناکام بنا کر پکڑ بھی سکتے تھے!"

"مجھے تو قاضی ہادی نے زبردستی باہر بھیجا تھا۔" میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں تمہیں کیا بتاؤں، دراصل وہ اپنے کسی نامعلوم دشمن سے بہت زیادہ خائف تھا۔"

"دشمن سے خائف تھا؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں! اسی سے بچنے کے لیے وہ سی ہاک میں روانہ ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کھلے سمندر میں وہ محفوظ رہے گا۔" میں نے کہا۔

"قاتل کو پہلے سے یقین ہوگیا ہوگا کہ قاضی دھمکی سے خائف ہو کر سی ہاک میں پناہ لے گا، وہ کوئی بہت بڑا شاطر معلوم ہوتا ہے۔"

"تازہ واقعات تو یہی بتلاتے ہیں۔"

پھر خبر آئی کہ نہ صرف قاتل غائب ہوگیا ہے بلکہ عرشے سے پلاسٹک کی ہلکی لائف بوٹ بھی غائب ہے۔

یہ سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ محمود نے اپنا کام نہایت بے جگری سے انجام دیا تھا اور صاف بچ نکلا تھا۔

"ہم سب الو کے پٹھے ہیں۔" آخری اطلاع پر آسوالڈ نے اپنے بال [illegible] ڈالے۔ "یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ساری اضطراری حرکات اسی کے منشا کے مطابق کر رہے ہیں۔ وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا اور ہم جھک مار رہے ہیں۔"

"اب کیا کیا جائے!"

"ریڈیو اور وائرلیس فون پر کوسٹ گارڈ اور نیول اسٹیشن کو اطلاع [illegible]"

وہ دہاڑا۔ "پولیس کو مطلع کر دیا گیا؟"

"ابھی کیے دیتے ہیں۔" خبر لانے والے نے منہ لٹکا کر کہا۔

پھر سی ہاک کا رخ واپس موڑ دیا گیا۔ آسوالڈ تینوں لڑکیوں سے پوچھ گچھ میں مصروف ہوگیا تھا جو قدرے ہوش میں آچکی تھیں۔ قاضی ہادی کی لاش کیبن ہی میں سیل کر دی گئی اور میں دوسرے کیبن میں آرام کرنے لگا۔

مجھے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آسوالڈ بوکھلایا ہوا دوڑا وہاں آپہنچا اور آتے ہی بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آج بربادی کی رات ہے، ایسا منحوس وقت ہم پر کبھی نہ آیا تھا اور نہ آئندہ آئے گا۔"

"کوئی نیا واقعہ؟"

"کوسٹ گارڈ سے رابطے پر خبر ملی ہے کہ اب سے تھوڑی دیر پہلے دشمنوں نے آتش گیر بموں سے ہٹ پر حملہ کیا اور فرار ہوگئے۔ وہاں زبردست آگ لگی ہوئی ہے۔"

"نو بجے!" میں نے کہا۔ "یعنی کم و بیش اسی وقت ہٹ پر حملہ ہوا جب یہاں وہ قاضی ہادی کو قتل کر رہا تھا۔"

"یہ سب پہلے سے منصوبہ بندی تھی۔" وہ بولا۔ "اور نیول اسٹیشن کو خبر دینے کے بعد ہی تل ابیب کے گیریزن کمانڈر کا فون آیا تھا جو میں نے خود ریسیو کیا۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

"وہ اس بات پر سخت برہم تھا کہ قاضی ہادی سی ہاک پر پہنچ گیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس نے قاضی ہادی کی حفاظت اور قاتل کی گرفتاری کی تیاری مکمل کی ہوئی تھیں مگر قاضی ہادی انہیں دھوکا دے کر چھلاوے کی طرح نکل گیا۔ اس کے آدمی قاضی ہادی کی تلاش میں شہر کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔" آسوالڈ ان واقعات سے سخت آزردہ نظر آرہا تھا۔

یہ واقعات میرے لیے عجیب سی دلی مسرت کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ محمود نے اپنا سارا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا مگر اب میرے دل میں ایک ہی اندیشہ باقی تھا۔ محمود جس قسم کی کشتی میں فرار ہوا، وہ بہت سست رفتار تھی، دوسری طرف آسوالڈ نے بر وقت متعلقہ محکموں کو اس کے فرار سے باخبر کر دیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ تیز رفتار گشتی کشتیاں اسے ساحل پر پہنچنے سے پہلے کھلے سمندر ہی میں گھیر لیں گی۔

رات کے دس بجے کے قریب انٹرکام پر آسوالڈ کا پیغام ملا اور میں نیوی گیشن روم میں پہنچ گیا۔

شیشے کی وسیع شیلڈ کے اس پار ساحل پر آگ کے جھکڑ سے شعلے لپکتے نظر آرہے تھے اور ان شعلوں کے قرب و جوار میں تیز روشنیاں بھی موجود تھیں۔

"ہٹ ابھی تک جل رہا ہے!"

"ہم بہت جلدی ساحل کے قریب پہنچ گئے!" میں نے حیرت سے کہا۔

"جاتے وقت انجن ٹھنڈے تھے، ہم کم از کم رفتار سے روانہ ہوا تھا لیکن [illegible] واپسی میں ہم نے تیز رفتاری اختیار کی ہے۔"

قاضی ہادی کا ہٹ بیشتر لکڑی سے تعمیر کیا گیا تھا اور خاصا وسیع تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں لگی ہوئی آگ پر قابو پانا خاصا دشوار ثابت ہو رہا ہوگا۔ آسوالڈ کو اندیشہ تھا کہ آگ نے اس چوبی پلیٹ فارم کو بھی لپیٹ میں نہ لے لیا ہو جس کے سرے پر سی ہاک سمندر میں لنگر انداز ہوا کرتا تھا کیوں کہ آگ کے شعلے سمندر میں بھی پھیلے ہوئے نظر آرہے تھے۔

پھر میرین ڈپارٹمنٹ کی ہدایت پر جہاز کا رخ جلتے ہوئے ہٹ کے بجائے تل ابیب سے ملحقہ جفہ کی بندرگاہ کی طرف موڑ دیا گیا۔ تل ابیب کے ساتھ واقع یہ قدیم بندرگاہ قدرے جنوب میں اشدود ہاربر کی تعمیر کے بعد بند کی جا چکی تھی مگر حکام نے ہنگامی صورت حال کے تحت سی ہاک کو وہیں لنگر انداز ہونے کی اجازت دے دی تھی۔

اس ویران بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے تک میں عرشے پر ہی موجود رہا۔ بحیرۂ روم کے سینے پر جا بجا تیز رفتار جنگی کشتیاں اور پولیس لانچیں سرچ لائٹیں چمکاتی گھوم رہی تھیں۔ محمود کی تلاش کی مہم بظاہر نتیجہ خیز ہوتی نظر آرہی تھی۔

جفہ کی بندرگاہ پر بریگیڈیئر شیرون پولیس اور فوج کے دیگر اعلیٰ افسران کے ہمراہ موجود تھا۔ یہ پورا جلوس فوراً ہی سی ہاک پر آگیا۔

آسوالڈ کو اپنی رپورٹ مرتب کرنے کی ہدایت دے کر ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ لوگ مجھ سمیت عملے کے اراکین کے بیانات لینے لگے اور شیرون دوسرے افسروں کے ساتھ قاضی ہادی کی لاش کے معائنے کے لیے چلا گیا۔

جوں ہی بریگیڈیئر شیرون کو یہ علم ہوا کہ میں بھی جہاز پر موجود ہوں تو مجھے فوراً طلب کر لیا گیا۔ وہ میرا نام ضرور جانتا تھا لیکن میری صورت سے واقف نہیں تھا۔

قاضی ہادی کی لاش پر فوٹو گرافر اور نشانات انگشت کے ماہرین کام کر رہے تھے، مجھے اسی کیبن کے ایک گوشے میں گھیر لیا گیا۔

"تم شروع سے قاضی کے ساتھ تھے؟" اس نے مجھ سے حقارت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"شروع کا مطلب میں سمجھ نہیں سکا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے کہ میں اس کی پیدائش کا ذکر نہیں کر رہا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر سے تمہارے ساتھ ہی نکلا تھا؟" وہ اپنی چھڑی زور زور سے پنڈلیوں پر مارتے ہوئے بولا۔

"ہاں!"

"اس کے بھاگنے کی وجہ کیا تھی؟"

"اسے فوجیوں کے حفاظتی انتظامات پر بھروسہ نہیں تھا!"

"الو کا پٹھا!" وہ دانت پیس کر ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ "میں نے اسے کھلے الفاظ میں وارننگ دی تھی کہ وہ میری ہدایات پر سختی سے عمل کرے مگر اس کی موت اسے بحیرۂ روم کے نیلے پانی میں پکار رہی تھی۔ وہ نکلا کیسے وہاں سے؟"

"تاریک شیشوں کی کار میں۔" میں نے اس کی دریدہ دہنی کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

"اسلحہ لے کر چلا تھا؟"

"نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ فوجی حکام نے الیکٹرونک آلات کے ذریعے اسلحہ کا سراغ لگانے کا بندوبست کیا ہوا تھا!"

"اس کے قتل کے وقت تم کہاں تھے؟"

"جہاز پر ہی تھا۔" اس بار میں شیرون کی بدتمیزی کو نظر انداز نہ کر سکا۔

"کس جگہ؟" وہ دہاڑا۔ "اور کس کے ساتھ تھے؟"

"نچلے عرشے پر کپتان آسوالڈ کے ہمراہ تھا۔"

"شراب اسی کے ساتھ پی رہے تھے؟"

اس پر میں نے اسے پوری تفصیل بتا دی البتہ راہداری میں محمود سے ٹکرانے والا واقعہ حذف کر گیا۔

اس کے بعد مجھ پر چاروں طرف سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ وہاں

موجود ہر شخص مجھ سے کچھ نہ کچھ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔

سی ہاک کی سرسری سی تلاشی اور آسوالڈ کی تحریری رپورٹ کے بعد لاشیں اٹھوا لی گئیں اور عملے کو جہاز خالی کرنے کا حکم مل گیا۔

جس وقت میں نیچے آیا تو سامنے سے ایک شخص تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور دور ہی سے آرمی افسران کو مخاطب کر کے یہ خوش خبری سنائی کہ ایک گن بوٹ نے پلاسٹک کی سفید لائف بوٹ تلاش کر لی ہے۔

"اور محمود؟" کئی افراد نے بیک وقت سوال کیا۔

"وہ شاید تیز لہروں یا بحری جانوروں کا لقمہ بن گیا کیوں کہ لائف بوٹ خالی تھی۔ وہ ساحل سے تیرہ ناٹ کے فاصلے پر ملی ہے!" خبر لانے والے نے بتایا۔

یہ سن کر مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سینے پر بھرپور گھونسا رسید کیا ہو۔ محمود کی موت کی خبر میرے لیے غیر متوقع تھی۔

"خس کم جہاں پاک" بریگیڈیر رشیرون لسٹرٹ کا ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"مجھے تو افسوس ہے کہ اسے اتنی آسان موت نصیب ہوئی" کسی نے کہا۔ "اگر وہ ایک بار ہمارے ہاتھ لگ جاتا تو اپنے دل کی گہرائیوں سے موت کی آرزو کرنے کے باوجود نہ مر پاتا۔"

"وہ تو مر گیا مگر تشویش کی بات یہ ہے کہ اس کے سدھائے ہوئے فلسطینی بھیڑیے ابھی تک اسرائیل کی سرحدوں میں موجود ہیں۔"

"محمود کی موت کی بھرپور تشہیر ان کے حوصلے توڑ دے گی۔" وہ سب آپس میں تازہ صورت حال اور اس کے متوقع نتائج پر رائے زنی کرتے رہے۔

جفہ کی ویران بندرگاہ پر مختلف محکموں کی گاڑیوں کا خاصا بڑا جلوس جمع تھا۔ ان میں سے ایک ایمبولینس کے ذریعے قاضی ہادی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی۔ دو محافظ سی ہاک پر مامور کر دیے گئے اور باقی افراد کو قیدیوں کو لے جانے والی گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا۔

تل ابیب کے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں وہ رات سخت بے آرامی میں گذری۔ وہاں پہنچنے کے بعد ایک مرتبہ پھر سب کے بیانات لیے گئے، سوال جواب ہوئے اور جب مجھے وہاں جانے کی اجازت ملی تو میری رسٹ واچ صبح کے چار بجا رہی تھی۔

میں پچھلے دو دنوں سے اس قدر تھکا ہوا تھا کہ کارلٹن ہوٹل میں اپنے کمرے پر پہنچتے ہی نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سوتے ہوئے مجھے بڑے بھیانک خواب نظر آتے رہے اور جب میں دوپہر میں بیدار ہوا تو ذہن سخت پراگندہ تھا۔

قاضی ہادی کو مارنے میں محمود نے کامیابی ضرور حاصل کر لی تھی مگر اپنی اس ضد کی بھاری قیمت ادا کرتے ہوئے اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑ گئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ محمود کی بھرپور شخصیت کے بعد شاید ہی اس کا کوئی آدمی اسرائیل میں فلسطینی افواج آزادی کی سرگرمیوں کی موثر منصوبہ بندی کر سکے۔ عملی طور پر محمود کی موت کے ساتھ ہی اس تنظیم کی اسرائیلی شاخ کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ان سے میرے رابطے کے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔

اسرائیل میں ان سے میرا رابطہ ختم ضرور ہو گیا تھا مگر ماریا کو میرے تعلق کا محمود کی زندگی میں وہ موت کے خوف سے نہ صرف اس راز کو سینے میں چھپائے کے لیے ایک اہم انفارمر کار دل بھی ادا کرتی رہی۔ میں اسرائیلی قوم سے ماریا کا گواہ تھا۔ پھر میرے خلاف ماریا کے دو خطرناک کیسٹ بھی موجود تھے ... کر رہی تھی کہ ماریا اپنے بچاؤ کے لیے میری جان کے درپے ہو سکتی ہے۔

کھانے کے دوران میں مسلسل اسی موضوع پر سوچتا رہا اور ... ماریا سے ایک فیصلہ کن ملاقات کا ارادہ کر چکا تھا۔

"میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں" فون کا سلسلہ ملتے ہی ... میں براہ راست اپنے مطلب کا اظہار کر دیا۔

"مجھے فرصت نہیں ہے۔" دوسری جانب سے اس کی خشک آواز

"یہ ملاقات ضروری ہے!" میں نے اصرار کیا۔

"میں بعد میں تم سے رابطہ قائم کر دوں گی" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور میں بے جان ریسیور کو ہک سے لٹکا کر لوٹ آیا۔

میں ہوٹل سے نکلا تو شہر میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہاکر پاگلوں کی طرح اخباری ضمیمے فروخت کر رہے تھے جن میں قاضی ہادی کی موت کے سرسری تذکرے کے ساتھ محمود کی موت کی ایسی مربوط اور سنسنی خیز کہانی موجود تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ دینے والا شخص قاضی ہادی کے قتل سے محمود کے سمندر میں ڈوبنے تک پل پل ساتھ رہا ہو گا۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی درج تھی کہ محمود کے نقشے کے خاتمے کے لیے اسرائیل میں بیک وقت کارروائی کر کے ستاسی افراد محمود کی تنظیم سے تعلق رکھنے میں گرفتار کیے گئے تھے اور ان میں سے کئی نے اعتراف بھی کر لیا تھا۔ اخبار کے مطابق اعتراف کرنے والوں کی نشاندہی پر مزید دہشت پسندوں کی گرفتاریاں جاری تھیں۔

اسی رات آٹھ بجے ماریا خود کارلٹن آ پہنچی اور میرے ساتھ بیٹھ کر مجھے ساتھ لے کر ہینی آشٹن میں تل ابیب کے وسط میں واقع قومی عجائب گھر ویران پارک میں پہنچ گئی۔ پورے راستے ہم دونوں خاموش رہے۔

"کیا محمود واقعی مر گیا؟" گاڑی کا انجن بند کرنے کے بعد ماریا نے کیا۔

"یہ سوال تم پوچھ رہی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم شروع سے آخر تک قاضی ہادی کے ساتھ تھے، تمہاری معلومات بہتر ہوں گی"۔ اس نے وضاحت کی۔

"میں نے جہاز پر محمود کو دیکھا، نہ خالی لائف بوٹ دیکھی اور نہ لاش دیکھی۔ ایسی صورت میں میری معلومات کا دار و مدار بھی اسرائیلی اخبارات پر ہے"

"سرکاری ذرائع سے جاری ہونے والی خبریں اکثر قابل اعتماد نہیں ہوتیں" وہ بولی "شاید تمہیں یاد نہیں رہا کہ جب محمود کا آدمی یوسف گرفتار ہوا تو انہوں نے اس کی خودکشی کی خبریں اچھالی تھیں اور جب وہ واقعی خودکشی کر ... ہو گیا تو محمود پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی ناکام خودکشی کا افسانہ بنا دیا گیا۔"

"وہ میری اس ملاقات کی بنیاد اسی مفروضے پر ہے کہ محمود اب زندہ نہیں ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"وہ اس کی موت سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"وہ محمود کے مرنے کے بعد تم اس کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے سے آزاد ہو چکی ہو!"

"وہ ضروری تو نہیں" وہ بولی "ہو سکتا ہے کہ اس کا جانشین بھی مجھے بلیک میل کرتا رہے۔"

"بڑے پیمانے پر ہونے والی گرفتاریوں کے بعد شاید اس کے گروہ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔" میں نے کہا۔

"اخباری اطلاعات کے حوالے سے بات نہ کرو" وہ چڑ کر بولی "صاف صاف بتاؤ کہ تم مجھ سے کس لئے ملنا چاہتے تھے؟"

"وہ محمود کی موت کے بعد وہ کیسٹ تمہارے لئے بے کار ہو گئے ہیں"

"تم ان کے بارے میں اتنے فکر مند کیوں ہو؟"

"اس لئے کہ ان میں میری آواز ریکارڈ ہے!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "اور وہ کیسٹ مجھے برقی کرسی تک پہنچانے کے لئے کافی ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو" اس نے بھی اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے مسکرا کر کہا "جب تک میں زندہ ہوں وہ کیسٹ تمہارے خلاف استعمال نہ ہو سکیں گے۔"

"کیسٹ ضائع کر دو ماریا" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں ابھی کسی حادثے میں مر جاؤں۔ یہی تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور ایسی صورت میں میں ناگہانی موت مارا جاؤں گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ تمہارا مقدر اتنا خراب نہیں ہو سکتا" وہ سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے بولی "جس روز محمود اور اس کے آدمیوں کا خوف ختم ہو گیا میں بلا تردد کیسٹ ضائع کر دوں گی۔ اگر میری زندگی ہی میں وہ غلط ہاتھوں میں پڑ گئے تو میں برباد ہو جاؤں گی۔"

"تم بلا وجہ ایک خطرے کی پرورش کرنے پر تلی ہوئی ہو!"

"تم کیسٹ کے چکر میں نہ پڑو۔ فی الحال ایک اور خطرہ تمہارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس سے ہوشیار رہو" وہ بولی۔

"کیسا خطرہ؟"

"میرا بھائی چھٹی پر آیا ہوا ہے!"

"کون؟ میجر اسمتھ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں وہ غیر متوقع طور پر آیا ہے اور اس شخص کے لہو کا پیاسا ہو رہا ہے جو اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی فلورا کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے!"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے فلورا سے اپنی دشمنی کا بدلہ اس طرح لیا ہے!"

"مجھے تو آخر میں سارے قصے کا علم ہوا" وہ بولی "اسمتھ سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا۔ وہاں اس نے فلورا کی خواب گاہ میں تمہارے مردانہ ملبوسات وغیرہ دیکھے تو بپھر گیا۔ اس کی باز پرس کے جواب میں فلورا نے نادم ہونے کے بجائے اس گوالن کا حوالہ دیا جو اسمتھ کی کمپنی میں سارجنٹ ہے۔ اسمتھ لاکھ آزاد خیال سہی مگر اس سے بھی یہ برداشت نہ ہو سکا کہ اس کی بیوی اس کے حقوق میں خیانت کے بعد سینہ زوری بھی کرے۔ اس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ فلورا کی مرمت کی مگر فلورا نے تمہارا نام نہ اگلا۔ پھر اسمتھ نے تمہارا نام و نشان حاصل کرنے کی کوشش میں سارے مکان کی تلاشی لے ڈالی۔ جب اس میں بھی ناکامی ہوئی تو اس نے جھلا کر فلورا کو مزید تشدد کا نشانہ بنایا اور جب وہ بے چاری پٹتے پٹتے بے ہوش ہو گئی تو اسمتھ اسے ہسپتال میں ڈال کر میرے پاس چلا آیا اور اب وہ اس شخص کی تلاش میں ہے جس کی چاہت میں فلورا اس سے کھلی بغاوت پر تل گئی ہے۔"

میں آنکھیں پھاڑے حیرت سے یہ کہانی سنتا رہا۔ یہ رخ تشویش ناک ضرور تھا مگر میری ایک بہت بڑی الجھن رفع ہو گئی تھی۔ فلورا کے کاٹیج کی ابتری اور پراسرار ویرانی نے مجھے خاصا خوفزدہ کر دیا تھا اور میں مسلسل اس سوچ کا شکار تھا کہ اسرائیل میں میرا کون سا نیا دشمن پیدا ہو گیا۔ ماریا نے مجھے اس خیالی خطرے سے نجات دلا دی تھی۔

"تم نے اسے اپنی بھاوج کے دوست کا نام نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"پوچھتا تو ضرور بتا دیتی" وہ ہنس کر بولی "وہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں فلورا کی آوارگی سے قطعی لاعلم رہی ہوں۔"

"اگر اسے یہ پتہ چل جائے کہ فلورا کے ساتھ ہی میرے تعلقات تم سے بھی ہیں تو شاید وہ تمہیں بھی گولی مار دے گا۔"

"میرے معاملے میں وہ اتنا حساس نہیں ہے۔ خود مختار مردوں کی ساری خودداری بیویوں سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ سرکاری نرسریوں میں میرے دو خوبصورت بچے پروان چڑھ رہے ہیں۔"

"تم لوگوں کا اخلاقی فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"اگر ہمارے مرد تم لوگوں کی طرح حساس اور تنگ نظر ہو جائیں تو اس قدر خون خرابہ ہو گا کہ چار دن میں اسرائیل کی آبادی نصف رہ جائے گی۔"

"جب اسمتھ مجھ تک پہنچے گا تو دیکھا جائے گا" میں نے گفتگو کو انتشار دیتے ہوئے کہا "تم کیسٹ والے معاملے کا فیصلہ کرو!"

"میرا جواب وہی ہے!"

"تمہیں یہ یقین کرنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہے کہ تم ہر طرح کے دباؤ اور خطرے سے آزاد ہو چکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو حالات پر منحصر ہے!" اس نے کہا پھر کسی فوری خیال کے تحت اچانک پوچھ بیٹھی "وہ دھاکے والے پروگرام کا کیا رہا۔"

"میں محمود کی آخری ہدایات تم تک پہنچا چکا تھا۔ اب وہ مر ہی چکا ہے تو تم خود فیصلہ کر سکتی ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے!"

"یعنی اس کام کو ختم سمجھوں؟"

"اس طرح سوال نہ کرو کہ مجھے خود پر محمود ہونے کا شبہ ہونے لگے۔"

وہ زور سے ہنس دی "تم واقعی اوّل درجہ کے مکار ہو، تمہیں باتوں میں گھیرنا آسان نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

"تم میرے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو؟"

"مجھے یقین ہے کہ محمود زندہ ہے تو تم سے اس کا رابطہ ضرور قائم رہے گا" وہ کار کو چوراہے سے واپس گھماتے ہوئے بولی۔

"گوریلا کیمپ میں تربیت کے لئے روانگی کا کیا رہا؟"

"کسی بھی وقت اوپر سے احکام آسکتے ہیں۔"

وہ راستے بھر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے اس کا بلاؤز بھی اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں اس نے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ایک مرتبہ پھر گفتگو ریکارڈ کرنے کی کوشش نہ کی ہو مگر اس کے جسم کے ساتھ یا کار میں کہیں بھی ایسا بندوبست پوشیدہ نہیں تھا۔

"بدن ٹٹولنے کے لئے تم نے اچھا بہانہ سوچا۔"

"اس شوق کو پورا کرنے کے لئے تم سے تو شاید کسی بہانے کی ضرورت نہ پڑے!"

"میرے فلیٹ چلو گے؟"

"شاید مجھے تھالی میں سجا کر آسمتھ کے سامنے پیش کرنے کا خیال ہے تمہارا!؟"

وہ بے اختیار زور زور سے ہنسنے لگی "ہاں یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ فلورا ہسپتال میں پڑی ہے اور آسمتھ میرے یہاں براجمان ہے!"

"تمہارے پاس اسے کھانے پینے کا تو آرام ہو گا۔"

"اسے ہوٹلوں سے چڑ ہے۔"

اسی اثناء میں کارلٹن ہوٹل آگیا اور ربارا مجھے اتار کر کھڑکی سے ہاتھ لہراتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور میں جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوٹل کے برآمدے میں داخل ہو گیا۔

میں استقبالیہ لاؤنج میں داخل ہو رہا تھا کہ اچانک انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا ایک دراز قامت شخص تیزی سے اٹھا اور نکاسی کے راستے کی طرف آنے لگا۔

قریب سے گزرتے ہوئے وہ مجھ سے ٹکرایا مگر رکنے کے بجائے ... کرتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اچانک کوئی ضروری ... آگیا ہے جس میں تاخیر اسے مہنگی پڑ سکتی تھی۔

اپنے کمرے میں آکر میں لباس تبدیل کر رہا تھا تو وہ رقعہ ہاتھ میں آیا جو میری قمیض کی جیب میں اڑسا ہوا تھا اور یک بارگی بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی اور مجھے استقبالیہ لاؤنج میں ٹکرانے والا دراز قامت یاد آگیا۔

اس رقعہ پر کل دو سطریں تحریر تھیں پہلی سطر میں صرف چار ... تھے "فوراً وائلڈ کیٹ پہنچو" دوسری سطر میں گیدڑ کی کھال ... لکھا ہوا تھا اور یہ وہی شناختی فقرہ تھا جو میرے اور محمود کے ... طے پایا تھا۔

وہ پیغام پڑھ کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ... تھا کہ محمود کی موت اور بڑے پیمانے پر گرفتاریوں سے گھبرا کر کوئی قریبی ساتھی مجھ سے مشورہ کے لئے ملنا چاہتا تھا۔ محمود کی ... کچھ اور تھی۔ نہ جانے اس کے آدمی کس حد تک احتیاطی تدابیر ... کرنے کے اہل تھے مگر مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ اس پیغام کو نظر انداز کر دیا جائے۔

میں چونکہ طویل غیر حاضری کے بعد ہوٹل پہنچا تھا لہٰذا میری فوری روانگی ہوٹل کے عملے کے کسی فرد کی نگاہوں میں کھٹک سکتی ... اور اگر ایسے فرد کی قومی حمیت والی رگ بھڑک اٹھتی تو میرے ... دشواری پیدا ہونے کا امکان تھا جس کا ایک تلخ تجربہ مجھے ہو ... میں لفٹ کے بجائے ہوٹل کے عقبی زینوں سے نیچے اتر گیا۔

وائلڈ کیٹ میرے ہوٹل سے چند منٹ کی مسافت پر ... میں اس بار میں داخل ہوا تو موسیقی کے دھیمے سروں کے ساتھ فضا میں تیرتی ہوئی شراب کی تیز بو نے اچانک ہی میرا موڈ بدل دیا اور ... سیدھا کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔

بار پر کام کرنے والی ایک پستہ قامت خوبرو لڑکی مسکرا ... ہوئی میرے سامنے آگئی "ایک لارج پیگ کوئین این بیئر ..." میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے کر پلٹی ہی تھی کہ کسی ... پیچھے سے میرے داہنے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں تیزی سے گھوما تو مجھے متوجہ کرنے والے نے آنکھوں ... آنکھوں میں مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور میں نے کاؤنٹر ... چھوڑ دیا۔

"میز نمبر سترہ پر بھیج دو!" اس شخص نے بار گرل کو جھ... ہوئے کا اس کے ساتھ واپس آتے دیکھ کر کہا اور بار کے اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔

مجھے اس وقت حیرانی ہوئی جب وہ پورا ہال عبور کر کے اس راہداری میں داخل ہو گیا جدھر سے آنے والی ناگوار سی بو اس طرف پیشاب خانوں کی موجودگی کا اعلان کر رہی تھی۔

"چلے آؤ۔" مجھے جھجکتے دیکھ کر وہ شخص غرایا اور مجھے اس کی تقلید کرنی پڑی۔

اس تنگ کاریڈور میں دونوں طرف پیشاب خانے واقع تھے اور راہداری کے اختتام پر ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آ رہا تھا۔

وہ شخص اس عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہاں ستون کے ساتھ ہی سرمئی رنگ کی جیپ کھڑی ہوئی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص اسٹیئرنگ سے سر ٹکائے بڑے انہماک سے اونگھنے میں مصروف تھا۔

"جاؤ" مجھے لانے والے نے جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے حکم دیا۔ اس کی آواز سنتے ہی ڈرائیور ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا۔

"کوڈ؟" میں نے حکم دینے والے کے شانے کے قریب سرگوشیانہ لہجے میں کہا

"گیدڑ کی کھال کا جیکٹ" اس نے مجھے گھورتے ہوئے قہر آلود لہجے میں کہا اور میں دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

جیپ کا ڈرائیور ایک باریش نوجوان تھا جو بڑی خستہ حالت میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے میرے سلام کا جواب بھی گردن کی جنبش سے ہی دیا اور میرے بیٹھتے ہی جیپ واپس گھما کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ سفر کافی دیر بعد تل ابیب کے ایک مضافاتی سبزہ زار میں ختم ہوا جہاں گھنے درختوں سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا ویران اور بظاہر غیر آباد بنگلہ موجود تھا۔

جیپ کا انجن بند ہونے سے پہلے ہی اس مکان کا دروازہ کھل گیا اور وہاں محمود کو زندہ سلامت دیکھ کر میں حیرت اور خوشی سے ہکا بکا رہ گیا۔

"جلدی آجاؤ" وہ مسکرا کر نرم لہجے میں بولا "وہ جیپ کو جھاڑیوں میں کہیں دور لے جا کر چھپائے گا!"

میں دوڑ کر محمود سے بغل گیر ہو گیا۔

"تم کھلے سمندر میں بوٹ سے کہاں غائب ہو گئے تھے؟" میں نے اس کے ہمراہ اندر داخل ہوتے ہوئے مسرت سے سرشار لہجے میں سوال کیا

"میں سرے سے بوٹ پر سوار ہی نہیں ہوا تھا۔"

"واقعی؟" میں نے مومی شمع کی محدود روشنی میں کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"دراصل وہ لائف بوٹ عرشے کے نیم تاریک حصے میں تھی۔ اسے تو میں نے اصل کارروائی کے آغاز سے پہلے ہی سمندر میں اتار دیا تھا۔"

"یعنی جب سی ہاک حیفہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو تم اسی پر چھپے ہوئے تھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں شروع سے آخر تک جہاز پر ہی تھا۔ میں نے بہت خطرناک جوا کھیلا تھا جس میں میں کامیاب رہا۔ قتل کے بعد جب قاتل کی تلاش شروع ہوئی تو انہیں پہلی بار لائف بوٹ غائب ہونے کا پتہ چلا اور وہ یہی سمجھے کہ قاتل لائف بوٹ پر فرار ہو گیا ہے۔ اس مفروضے کے بعد کسی نے بھی جہاز کی تلاشی میں دلچسپی نہیں لی ورنہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ مجھے پکڑ سکتے تھے!"

"پھر تم سی ہاک سے کیسے نکلے؟"

"بہت آسانی کے ساتھ" وہ فخر اور اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولا "سب کچھ شروع سے آخر تک اسی طرح ہوا جس طرح میں نے سوچا تھا۔ دو آدمی سی ہاک کی نگرانی کے لئے قطعی ناکافی تھے۔ میں ان سے بچ کر رسّے کی مدد سے پانی میں اتر گیا۔"

"وہاں جھولتے ہوئے رسّے نے بعد میں انہیں ہوشیار نہ کر دیا ہو گا؟"

"خوش قسمتی سے رسّا آسانی ہک سے نکل آیا۔ ویسے وہ لٹکا بھی رہ جاتا تو وہ محافظ خود اسے غائب کر دیتے۔"

"مگر تم سی ہاک پر پہنچے کیسے؟"

"عام حالات میں وہ لوگ زیادہ چوکنا نہیں رہتے، تھوڑی سی احتیاط کے ساتھ میں ہولڈ میں چھپنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"

"یہ ضروری تو نہیں تھا کہ قاضی ہادی ادھر ہی کا رخ کرتا۔"

"قاضی ہادی نہیں اب اسے اس کے اصلی نام ڈان ہینڈرک سے یاد کرو۔ میرا منصوبہ یہی تھا کہ اسے حد سے زیادہ ہراساں کر دوں۔ کئی برس پہلے ایسے ہی حالات میں وہ سی ہاک پر پناہ لے چکا تھا مجھے یقین تھا کہ وہ بزدل اس بار بھی یہی راستہ اختیار کرے گا۔ اگر وہ نہ آتا تو میرا سارا منصوبہ دھرا رہ جاتا۔"

"اس کے ہٹ کی تباہی کا پروگرام بھی پہلے سے طے تھا؟"

"ہاں۔ اگر ڈان ہینڈرک ادھر نہ آتا تو کم از کم ہٹ کی تباہی میرے دل کو کچھ سکون پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی۔"

"مجھے تو یقین ہو گیا تھا کہ سی ہاک سے فرار کے بعد تم کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو" میں نے صاف دلی کے ساتھ کہا۔

"اس مہم کا سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ اب سرکاری طور پر

مجھے مردہ سمجھ لیا گیا ہے اور اب میری تلاش کا سلسلہ ترک کر دیا جائیگا۔"

"مگر ماریا کو شبہ ہے!"

"کیسا شبہ؟" اس بار اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔

میں نے اسے اختصار کے ساتھ ماریا سے ہونے والی تازہ ترین ملاقات سے باخبر کر دیا۔

"وہ بہت چالاک لڑکی ہے" میری بات ختم ہونے پر محمود نے تبصرہ کیا "میں نے تمہیں اسی لئے بلایا تھا کہ کل ماریا سے ایک اہم کام لینا ہے۔ تم اسے یہ تاثر دو گے کہ نئی ہدایات میرے کسی جانشین نے جاری کی ہیں۔"

"کیا پروگرام ہے کل کا؟"

وہ یک بیک اداس ہو گیا اور دھیمی آواز میں بولا "کل ۵ جون ہے۔ سترسٹھ کی تباہ کن جنگ کی سالگرہ کا دن جب عرب اپنے وسیع علاقے گنوا بیٹھے تھے!"

"کسی کارروائی کا منصوبہ ہے؟"

"ہاں، کل مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیلی انتظامیہ کے ٹھکانوں پر حملوں کے علاوہ تل ابیب میں کارروائی کا ارادہ ہے!"

"ان کے خلاف نفرت کا اظہار تو اسرائیل کے قیام کی سالگرہ پر بھی کیا جانا چاہیئے تھا۔"

"پچھلے ماہ ۱۴ مئی کو میرے بہت سے ساتھی ہنگامے کرنے کے حق میں تھے مگر اصول کی بنیاد پر میں ان سے متفق نہ ہو سکا" وہ کہنے لگا "ہمیں اسرائیل کے قیام سے نفرت نہیں ہے۔ گو یہ ملک ہماری زمین چھین کر قائم کیا گیا ہے مگر پھر بھی ہم اسے ماننے کو تیار ہیں۔ ہماری نفرت کا اصل سبب اسرائیل کے جارحانہ عزائم ہیں۔ کبھی وہ نقشے پر لکیر کھینچ کر سیدھی سرحدوں کی بات کرتا ہے اور کبھی سوئز پر سیادی کنٹرول کے لئے آزاد سینائی کی راگنی الاپتا ہے۔ ہم اس رویّے کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور ۵ جون اس ضمن میں بہت اہم دن ہے!"

"ماریا سے تم کیا کام لینا چاہتے ہو؟"

"کل آرمی انٹیلی جنس کے تفتیشی بیورو میں زبردست بربادی ہونی چاہیئے۔" اس نے سرد اور ٹھوس لہجے میں کہا۔

"ضرور ہوگی، تم تفصیل بتاؤ۔"

"ان عمارات میں دھماکہ خیز اور آتشگیر مادّوں اور اسلحہ کی جانچ پڑتال کی ایک چھوٹی سی مگر جدید ترین تجربہ گاہ بھی واقع ہے۔ وہاں جتنے بھی نمونے تجربے کے لئے آتے ہیں، ان کی باقیات اور بعض صورتوں میں مکمل یونٹ حوالوں وغیرہ کے لئے ایک اسٹور میں رکھے جاتے ہیں۔ اس مختصر سے اسٹور میں اس قدر طاقتور بارودی اور آتشگیر مادّے جمع ہیں کہ موقع پر گرنے والی معمولی سی چنگاری بھی تمام عمارات کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔ ماریا کو کسی مناسب جگہ پر ایک چھوٹا سا اسٹک رکھنا ہوگا جو مقررہ وقت پر پھٹ کر تجربہ گاہ کے پورے ذخیرے کو جہنم بنا دے گا۔"

"ماریا اس کام کے لیے تیار ہو جائے گی؟" میں نے کچھ توقف کے بعد جھجکتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"اسے زندگی عزیز ہے تو ضرور کرے گی ورنہ وہ ڈان کا حشر دیکھ ہی چکی ہے جسے کھلے سمندر میں بھی موت سے اماں نہ مل سکی۔"

"ایک ہی صورت میں وہ آمادہ ہو سکتی ہے!"

"وہ کیا؟"

"اسے دھماکے سے ہونے والے نقصان کی شدت کا اندازہ ہو۔"

"ایک فوجی ہوتے ہوئے وہ ایسی باتوں سے لاعلم نہیں ہو سکتی۔"

"میری گفتگو ریکارڈ کرنے کے بعد اس کے رویّے میں قدرے تبدیلی آگئی ہے۔ ایک مرتبہ تو وہ یہ بھی کہہ چکی ہے کہ جان کے خوف سے وہ ایک حد تک تمہارے ساتھ تعاون کرے گی اس سے آگے وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرے گی۔"

"لڑکی سمجھتی ہے کہ ہمارے خلاف ایک ثبوت حاصل کر کے وہ ہم سے سودے بازی کر سکے گی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"شاید یہی بات ہے!"

"تم اس سے کل صبح گیارہ بجے بات کرو گے!" اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا "اس وقت تک اس کا دماغ درست ہو چکا ہوگا۔"

"میں اس کا دماغ درست ہونے کی وجہ نہیں پوچھوں گا۔"

"مگر میں ضرور بتاؤں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا "میرے ایک آدمی نے اس بینک کا سراغ لگا لیا ہے جہاں ماریا نے کیسٹ محفوظ کئے ہوئے ہیں۔"

"نہیں!" میں حیرت اور بے یقینی سے اچھل پڑا۔

"وہ ہر روز گھر سے نکلنے سے پیشتر بلاناغہ گلف بنک کی نمبر اٹھارہ کے منیجر کو فون کرتی ہے اور وہاں اس نے ایک لاکر لے رکھا ہے۔" پر لیا ہوا ہے!"

"تو کل اس بنک سے کیسٹ حاصل کر لیتے جائیں گے!"

اس نے سر کو آہستہ آہستہ نفی میں جنبش دی "اس بنک میں دو سو سترہ لاکر ہیں اور ہمیں ماریا کے لاکر کے نمبر کا علم نہیں ہو سکا ورنہ اس کا کوئی قریبی لاکر کسی فرضی نام سے کرائے پر لے کر ایسی کوئی کوشش کی جا سکتی تھی۔ دوم یہ کہ تمام لاکرز میں ایسا انتظام ہے جو لاکر میں دھماکہ خیز اشیاء رکھنے کی صورت میں بج اٹھے گا۔ میں ڈکیتی کی کوشش بھی لاکر نمبر کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی لہٰذا اس پوری عمارت کو آگ لگا دی جائے گی!"

"یعنی کل تل ابیب میں دو اہم دھماکے ہوں گے!"

"ہاں" وہ بولا "گلف بنک کی وہ برانچ پہلے سے میرے پروگرام میں شامل تھی مگر میں وہاں چھٹی ہونے کے بعد حملہ کرانا چاہتا تھا۔ اب پروگرام میں کچھ تبدیلی کرنی ہوگی اور بنک کو کھلنے کے ساتھ ہی نشانہ بنانا ہوگا اور ماریا زیادہ دیر تک اس سے بے خبر نہیں رہ سکے گی۔"

"ایسی صورت میں تو وہ شاید پریمیر ہاؤس کو بھی اڑانے پر رضامند ہو جائے گی۔"

"تو میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں؟"

"ہاں۔ ماریا سے میں کام لے لوں گا۔"

"اس کے علاوہ کل مقبوضہ عرب علاقوں میں نابلس، جبرون، رملہ، سماریہ، العریش اور غزہ میں بھی اسرائیلی حکام کے ٹھکانوں پر زبردست حملے ہوں گے۔"

"اسرائیل میں آباد عربوں پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔"

"عرب ہنس کر ہر دکھ سہنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ ان ہی لوگوں کا عزم اور حوصلہ ہے کہ میں شیر کے دہانے میں بیٹھ کر بھی محفوظ ہوں۔" وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا "یہاں بہت سے عرب مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ میری کارروائیوں سے بدظن ہو جائیں تو مجھے بے خبری میں کسی بھی وقت اسرائیلیوں کے ہاتھ گرفتار کرا سکتے ہیں۔"

"میں تم سے اختلاف نہیں کر رہا، میں تو محض متوقع منفی نتائج کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"عزت کی موت ذلت کی سجدہ ریزی سے افضل ہے۔" محمود نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "موت کا ایک دن مقرر ہے پھر ہم مجبور و محکوم بن کر مظلومیت کے ساتھ دفاع کرتے ہوئے کیوں مریں؟ دشمن پر دلیرانہ وار کرتے ہوئے شہادت کیوں نہ حاصل کریں۔"

"موت تو واقعی برحق ہے، تم ٹھیک کہتے ہو!"

"اب چھیڑا ہے تو عبداللہ کی کہانی بھی سنو" وہ زخم خوردہ لہجے میں بولا "وہ ستر سالہ تہجد گزار اور متقی بوڑھا میرا ہم وطن تھا اور نابلس میں شہد کی مکھیوں کے ایک بڑے فارم کا مالک تھا۔ وہ بہت صلح پسند تھا اور اس نے کھلے دل سے اسرائیلیوں کی اطاعت قبول کرلی تھی اور دوسرے لوگوں کو بھی یہی رویّہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ وہ بدطینت یا ہمارا غدار نہیں تھا بلکہ اس کی فطرت میں مقابلے کا عنصر ہی نہیں تھا۔ ایک رات وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ نابلس کا یہودی کمانڈر نشے میں دھت اس کے گھر میں گھس آیا۔ جب کئی آوازیں دینے پر بھی عبداللہ نے نیت نہ توڑی تو کمانڈر نے اپنے اس دوست کی پیشانی ٹھوکر مار کر لہولہان کر دی اور اس سے مطالبہ کیا کہ اپنی دونوں لڑکیاں پوری رات کے لئے اس کے حوالے کر دے۔ عبداللہ نے گڑگڑا کر اس سے فریاد کی مگر نشے میں دھت کمانڈر اپنے مطالبے سے دست بردار نہ ہوا بلکہ اس نے زبردستی لڑکیوں کی طرف بڑھنا چاہا جو ہنگامے کی آوازیں سن کر اپنے زخمی باپ کو دیکھنے برابر کے کمرے میں آگئی تھیں۔ عبداللہ سینہ تان کر اس کمانڈر کی راہ میں حائل ہو گیا اور کمانڈر نے بے دریغ اس کے سینے پر اپنا پستول خالی کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر لڑکیاں بلک اٹھیں اور انہوں نے کمانڈر کو گھر سے باہر دھکے دے کر دروازے مقفل کر لئے۔ جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوا۔"

وہ ایک لحظے کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا "اگلی صبح ان بے سہارا لڑکیوں کے مکان پر بل ڈوزر چلا دیا گیا اور انہیں برہنہ کر کے ایک کمرے میں ان پر شہد کی لاتعداد مکھیاں چھوڑ دی گئیں اور وہ اسی کمرے میں چیخ چیخ کر مر گئیں۔ یہ تھا ایسے شخص اور اس کے گھرانے کا حشر جو اپنے دشمنوں تک سے دشمنی کرنے کا قائل نہیں تھا اور میں نے اپنے ہاتھوں سے یہودی کمانڈر کو اغوا کر کے اس کی لاش کے ٹکڑے ساتوں رات نابلس کے چوراہوں پر بکھیر دیئے اور میں تمہارے سامنے زندہ سلامت ہوں۔ پہلے نابلس میں آئے دن یہودی غنڈے مسلمان لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی کیا کرتے تھے مگر اس واقعہ کے بعد کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ مسلمان لڑکیوں کی طرف ٹیڑھی نظر ڈال سکے۔"

"بھائی میں پوری طرح تمہارا ہم خیال ہوں۔ میں جان گیا ہوں کہ یہ لوگ اسلحہ کی زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

"یہ تفصیل میں نے تمہیں صورتحال سے آگاہ کرنے کے لئے سنائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو لوگ میرے ساتھ کام کریں انہیں اپنے مقصد پر اتنا ہی یقین ہو جتنا اپنے زندہ ہونے کا۔ یقین کی پختگی کے بغیر انسان کبھی کسی مقصد کے لئے اپنی جان کی قربانی نہیں دیتا۔"

"تو اب میری چھٹی؟"

"ہاں تم جا سکتے ہو" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور جیب سے ایک مختصر سا پیکٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

ایک گرد آلود کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر اس نے آہستہ سے اپنے حلق سے کوئی مخصوص آواز نکالی جس کے جواب میں تھوڑی دور کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور یہ شور بتدریج قریب آنے لگا۔

میں باہر نکلا تو تاریکی میں جیپ کا ہیولا نظر آیا۔ اس کی تمام روشنیاں گل تھیں۔ میں پھرتی کے ساتھ ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور اس راستے سے پوری طرح واقف معلوم ہوتا تھا کیونکہ واپسی میں اس نے سڑک پر پہنچنے تک ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں۔

"تم کہاں جاؤ گے؟" واپسی میں ڈرائیور پہلی بار عربی میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کارلٹن ہوٹل!" میں نے اندھیرے میں اس باریش مگر نوجوان

ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"وائلڈ گیٹ پر ہی اتار دوں گا' وہاں سے ٹہلتے ہوئے چلے جانا۔"

بقیہ سفر خاموشی سے طے ہوا۔ وہ مجھے وائلڈ گیٹ کے قریب ایک تاریک مقام پر اتار کر تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

ہوٹل میں اپنے فلیٹ تک پہنچنے کے لئے میں نے دوبارہ عقبی زینہ ہی استعمال کیا اور لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

اس رات میں دیر تک اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا رہا اور اسی حوالے سے مجھے سینا یاد آنے لگی جو ہر دم میرے سانسوں میں بسی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی حماقت پر سخت غصہ آنے لگا کہ محمود سے ملاقات کے دوران میں نے باتوں میں ایسا کھویا کہ اس سے سینا کے بارے میں تازہ ترین صورتحال بھی دریافت نہ کی۔ مگر پھر یہ سوچ کر مجھے قرار آ گیا کہ اگر لاہور سے کسی فلسطینی طالب علم نے سینا کے بارے میں کوئی اُمید افزا اطلاع بھیجی ہوتی تو محمود میرے استفسار کے بغیر ہی مجھ سے اس کا تذکرہ کرتا۔

اگلی صبح میں جلد ہی بیدار ہو گیا اور غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر نیچے اتر آیا۔ میں نے ایکسچینج کے بجائے بوتھ سے ماریا کے گھر کا نمبر ملایا اور کئی گھنٹیوں کے بعد مجھے ریسیور پر ایک غنودہ مگر جھلائی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی۔

"ماریا پلیز!" میں نے نرمی سے کہا۔

"وہ باتھ روم میں ہے' تھوڑی دیر انتظار کرو۔" یہ کہہ کر دوسری جانب سے پُرزور آواز کے ساتھ ریسیور کسی چیز پر پٹخ دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ریسیور میں ماریا کی سریلی آواز سنائی دی۔

"صفدر بول رہا ہوں ماریا۔ گیارہ بجے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مشکل ہے' مجھے آج اسٹینو کے ساتھ ایک لنچ میں شرکت کرنی ہے۔"

"صبح سویرے مجھے تلخ گفتگو پر مجبور نہ کرو۔"

"میں تمہیں دس منٹ سے زیادہ نہ دے سکوں گی۔" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"پانچ منٹ بھی کافی ہوں گے!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں گوریلا تربیتی کیمپ کی طرف روانگی کے سلسلے میں تم سے کچھ باتیں معلوم کرنی چاہتا تھا۔"

میں نے گفتگو کو یہ اچانک موڑ محض اس شبہ کی بنیاد پر دیا کہ کہیں ماریا نے میری فون کال ریکارڈ کرنی نہ شروع کر دی ہو۔

"تو وہ ابھی معلوم کر لو!"

"وہ بھی تمہیں میں اپنے بھائی کی موجودگی میں شاید زیادہ جواب نہ دے سکوں ورنہ وہ تمہیں بھی فلورا کے پاس پہنچا دے گا۔"

"نیومون ہوٹل ہی مناسب رہے گا۔"

"چند منٹ کے لئے ہوٹل میں بیٹھ کر بات کر لیں گے۔ میں ... کے قریبی مین ہال ... انتظار کروں گا۔"

"ٹھیک ہے میں آؤں گی۔" اس نے وعدہ کر کے فون رکھ دیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں ہوٹل سے نکل ... وقت گلف بنک کی برانچ نمبر اٹھارہ کے آس پاس موجود ... کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

بنک کے مقابل مجھے ایک ایسا بک اسٹال نظر آیا ... کی نظروں میں آئے بغیر خاصا وقت گزار سکتا تھا۔

ٹھیک نو بجے بنک کے دروازے کھول دیئے گئے ... ہی سے اندر پہنچا ہوا تھا۔ ٹھیک نو بج کر تین منٹ پر بنک کے ... پر ایک ٹیکسی آ کر رکی جس کی عقبی نشست سے دو افراد ... ان میں سے ایک کے بدن پر کسی محافظ جیسی وردی تھی اور ... رائفل اور کارتوس کی پیٹی جھول رہی تھی۔

ان میں سے سادہ لباس والے نے بنک کے دربان ... اور وہ بڑھ کر مسلح محافظ کی مدد کرنے لگا۔ ان دونوں نے ٹیکسی ... سے سیاہ رنگ کا ایک خاصا وزنی مقفل صندوق نکالا اور اسے ... میں لے گئے۔

اس صندوق کی ساخت کسی کیش بکس جیسی تھی اور بظاہر معلوم ہو رہا تھا کہ کسی بڑے ادارے کا خزانچی مسلح محافظ کی معیت ... بنک میں بھاری رقم جمع کرانے آیا ہے۔ ڈکی بند کرنے کے بعد خزانچی ... آدمی بھی لپک کر بنک میں گھس گیا اور ٹیکسی تیزی سے آگے بڑھ ... میں کئی ثانیوں تک کنکھیوں سے بنک کے دروازے کی ... دیکھتا رہا مگر بنک کا دربان واپس نہ آیا اور میری چھٹی حس مجھے ... شروع ہو جانے کا سگنل دینے لگی۔

سیکنڈ گزرتے رہے' ایک منٹ پورا ہوا اور دوسرا ... لیکن اندر سے کسی کی واپسی کے آثار نظر نہ آئے۔ یہ خوش قسمتی ... کہ اس دوران میں کوئی نیا آدمی اندر داخل نہیں ہوا۔

آخر کار خزانچی نما شخص بوکھلائے ہوئے انداز میں ... بنک سے باہر نکلا۔ باہر آ کر اس نے دو تین بار آس پاس نظریں ... جیسے کسی سواری کی تلاش میں ہو پھر تیزی سے ایک ... کے آگے بڑھنے کے بعد بنک کا دربان اپنی جگہ پر آ ... مسلح محافظ لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور دربان ... اس سے کچھ کہا جس کے نتیجے میں دربان اندر لوٹ گیا ... اس طرح چاروں طرف نظریں دوڑاتا باہر نکلا جیسے اسے اپنے ...

یا سواری کی شدید تلاش ہو پھر وہ اپنے ساتھی کی مخالف سمت میں چل دیا۔

راہگیروں نے تو اس معاملے میں دلچسپی لینے کا کوئی جواز نہیں ... تھی مگر مجھے بڑی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ بنک میں کیا ہوا ہے۔ غالباً اندر پہنچنے کے بعد خزانچی اور محافظ نے صندوق کی چابی موجود نہ ہونے کا ڈرامہ رچایا اور پھر خزانچی چابی لانے کے بہانے باہر آ گیا۔ صندوق کی حفاظت کے لئے اس نے محافظ کو اندر چھوڑ دیا تھا مگر بعد میں محافظ نے کوئی اہم بات دریافت کرنے کا بہانہ تراش کر بنک کے دربان کی خوشامد کی اور اپنی جگہ اسے صندوق کی نگرانی پر چھوڑ کر ہجوم میں غائب ہو گیا۔

اگر اس صندوق میں ہی آتشگیر مادہ بنک میں پہنچایا گیا تھا تو وہ کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ تاخیر کی صورت میں بنک کا عملہ اس صندوق پر شبہ کرنے لگتا اور پھر شاید صندوق باہر رکھ دیا جاتا یا ماہرین طلب کر لئے جاتے۔

نو بج کر سات منٹ پر وہ علاقہ ایک ہولناک دھماکے سے گونج اٹھا۔ دور دور تک عمارات کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ فضا میں ہر طرف دھواں اور غبار پھیل گیا تھا۔

گلف بنک کی شاخ میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آ رہے تھے دھماکے کے بعد اندر سے کوئی بھی شخص باہر نہ نکل سکا' وہ پوری عمارت تنکوں کے کسی ڈھیر کی طرح ملبے میں تبدیل ہو چکی تھی اور آگ کے شعلے تیزی سے ہر طرف پھیلتے جا رہے تھے۔

آگ پھیلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اس پر آسانی سے قابو نہ پایا جا سکے گا۔ دھماکے کے ساتھ آگ کے شعلے دور دور تک پھیل گئے تھے۔

میرے لئے وہاں رکے رہنا خطرناک تھا لہٰذا میں بھی رسائل وغیرہ چھوڑ چھاڑ کر بھاگتے ہوئے ہراساں ہجوم میں شامل ہو گیا۔

وہ آگ اس قدر شدید تھی کہ کیسٹ تو درکنار آہنی لاکر تک اس میں پگھل کر رہ جاتے۔ بھاگتے ہوئے مجھے بہت دور سے فائر انجنوں کے تیز سائرن سنائی دیئے۔

اس علاقے سے تھوڑی دور نکلنے کے بعد میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ فلسطینی افواج آزادی کے اراکین کی جرأت و جانبازی کا مظاہرہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔

وہ دونوں اپنی موت کو سینے سے لگائے بنک تک پہنچے تھے۔ وہ نو بجکر تین منٹ پر بنک میں داخل ہوئے اور نو بجکر سات منٹ پر وہ صندوق مہیب دھماکے سے پھٹ گیا۔ اگر ان کی ٹیکسی ٹریفک کے ہجوم میں کہیں پھنس جاتی' یا اس کا ٹائر فلیٹ ہو جاتا یا انہیں بنک سے نکلنے میں تاخیر ہو جاتی تو ان کے جسموں کے چیتھڑے بھی نہ مل پاتے۔ بظاہر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر موت سے ہر دم پنجہ لڑانے کے لئے تیار رہتے ہوں۔

اس صندوق میں دھماکے کا وقت معین کرنے کے لئے غالباً کوئی جدید ترین طریقہ استعمال کیا گیا تھا ورنہ متحرک پرزوں کی مسلسل دھمک بنک کے دربان کو خطرہ کا پیشگی احساس دلا سکتی تھی۔

گلف بنک کی بربادی کا عبرتناک منظر دیکھنے کے بعد میں واپس ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں میں نے وہسکی کے دو پیگ پی کر اپنے بکھرے ہوئے اعصاب کی قوت کو یکجا کیا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد محمود کا دیا ہوا ننھا سا پیکٹ لے کر دوبارہ باہر چل دیا۔

ٹھیک گیارہ بج کر دو منٹ پر ماریا کی آسٹن مقررہ مقام پر آ رکی اور میں جلدی سے اس کے پہلو والی نشست پر بیٹھ گیا۔

ماریا کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا اور وہ کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھی مجھے صبح بخیر کہنے کے بعد اس نے نہایت خاموشی سے کار آگے بڑھا دی۔ "تم کچھ پریشان ہو؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"ان لوگوں نے بنک کو بُری طرح تباہ کر دیا!" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

"کون سا بنک؟"

"انہوں نے پتہ چلا لیا کہ میں نے کیسٹ کہاں محفوظ کئے ہیں اور آج صبح اس بنک کو ملبے کے ڈھیر میں بدل دیا گیا۔ وہاں ابھی تک آگ لگی ہوئی ہے!"

"نہ جانے تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"خدا کے لئے مجھ سے کھل کر بات کرو۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی "ورنہ میرا کلیجہ دہشت سے پھٹ جائے گا' مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں کھل کر بات کروں تاکہ تم نیا ریکارڈ تیار کر سکو" اس کی ابتر حالت کے پیش نظر جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مکاری نہیں کر رہی تو میں ملامت پر اتر آیا۔

"گاڑی میں کوئی ریکارڈر نہیں ہے۔ میں بنک کی طرف سے اس علاقے کا حشر دیکھتی ہوئی آئی ہوں وہ مجھ سے جو کچھ چاہیں گے' میں حرف بحرف اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

"تمہاری شرائط کا کیا ہوا؟"

"جہنم میں گئیں میری شرائط' میں بس زندہ رہنا اور طبعی موت مرنا چاہتی ہوں۔ ایسے سفاک لوگوں سے مخاصمت مول لینا میرے بس سے باہر ہے۔"

"تم نے یہ سمجھنے میں خاصی دیر لگائی۔"

"یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کس لئے بلایا تھا؟"

"محمود کے جانشین کا پیغام پہنچانے کے لئے۔"

"تو کیا وہ واقعی مر گیا۔"

"مرا نہیں تو لاپتہ ضرور ہے اور اس کا جانشین اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو بے رحمی سے روند ڈالنے کا عادی ہے۔"

"وہ کیا چاہتا ہے؟"

"تم نے مجھے دس منٹ دیتے تھے جو پورے ہونے والے ہیں' وہ ذرا تفصیلی بات ہے' بعد میں سکون سے سمجھ لینا۔"

"میں شام تک تمہارے ساتھ رہنے کو تیار ہوں' مجھے پوری بات بتاؤ۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ بنک کی تباہی نے اس کا سارا کس بل نکال دیا تھا۔

"تمہیں اپنے دفاتر میں واقع اسلحہ کی تجربہ گاہ سے ملحقہ اسٹور میں ایک چھوٹا سا ڈائنامیٹ رکھنا ہے!"

"اسٹور میں!" اس کی آنکھیں حیرت سے پیشانی پر جا پڑیں۔

"ہاں — وہ ہزار آنکھیں رکھتا ہے اور بہت قریب سے تم پر نظر رکھے گا۔ اگر آج شام چار بجے تک ڈائنامائٹ نے کام نہ کیا تو کل صبح تمہارے اعضا تل ابیب کی مختلف سڑکوں پر بکھرے ہوئے ملیں گے۔"

اس نے اچانک گاڑی فٹ پاتھ کے کنارے روک دی۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہا گیا تھا اور بدن پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی۔

"مم..... میں ڈرائیونگ نہیں کرسکوں گی" وہ ہانپتے ہوئے بولی "مجھے تھوڑی سی شراب کی شدید ضرورت ہے' مجھے کسی قریبی بار میں لے چلو۔"

"میرے کمرے ہی میں چلو' وہاں تمہیں سکون مل سکے گا" ایک بار اس کا گھمنڈ توڑ دینے کے بعد میں نے ضرورت کے تحت نرم رویہ اختیار کرلیا۔

"کہیں بھی چلو' مجھے آرام کی ضرورت ہے" وہ پشتگاہ سے سر ٹکا کر کراہتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے ہٹا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور واپس کارلٹن کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہاں شراب نوشی اور کافی دیر کے آرام کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوسکی اور اس نے ایک بار پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کردیا۔

"مجھے ڈائنامائٹ اسلحہ کے اسٹور میں رکھنا ہے؟"

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"تم جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"اس نے کچھ نہ کچھ نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ہی یہ ہدایت دی ہے ورنہ وہ تمہیں یہ حکم بھی دے سکتا تھا کہ ڈائنامائٹ کسی گٹر میں ڈال دو۔"

"اور دھماکہ چار بجے سے پہلے ہونا ہے" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

"مجھ سے یہی کہا گیا ہے۔"

"وہاں کم و بیش ساٹھ آدمی اور عورتیں کام کرتی ہیں جن کی چھٹی سوا پانچ بجے ہوتی ہے۔ ان میں سے بیشتر آج اپنے گھروں کو زندہ لوٹ سکیں گے اور جو بچ بھی گئے وہ معذور ہوچکے ہوں گے" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"مگر یہ سب اسرائیل کے تنخواہ دار فوجی ہیں۔"

"تنخواہ دار ضرور ہیں مگر سب فوجی نہیں۔"

"فوجی مقاصد کے لئے کام کرنے والا ہر شخص اس دور میں فوجی تصور کیا جاتا ہے۔ فوجی سے مراد وہی افراد نہیں ہوتے جو وردیاں پہن کر اور ہتھیار اٹھا کر محاذ پر جاتے ہیں۔"

"وہ جو بھی ہیں میرے ہم مذہب اور ہم وطن ہیں اور تم چاہتے ہو کہ میں ان سب کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کردوں۔"

"جذباتی باتیں نہ کرو ماریا" میں نے نرم لہجے میں کہا "یہاں تو بھائی اپنے مفاد کی خاطر بھائی بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ وہ مر گئے تو تم زندہ رہو گی لیکن تم نے اس ضدی شخص کے حکم کی تعمیل نہ کی تو تم ماری جاؤ گی اور ان ساٹھ افراد میں سے کسی کو احساس بھی نہ ہوسکے گا کہ تم نے ان کے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔"

"شاید اس طرح وہ محمود کی موت کا انتقام لینا چاہتا ہے"

"تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔"

اس نے خاموش ہو کر اپنا سر جھکا لیا۔ کئی منٹ تک کمرے میں ہم دونوں کے بوجھل سانسوں کی آواز گونجتی رہی پھر وہ بوجھل آواز میں بولی۔

"میری عمر صرف چوبیس سال ہے صفدر' میں نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ میں اپنی جان پر کھیل کر عظیم قربانی دے سکوں۔ وہ دو سو ہوں یا دو ہزار' مجھے اس کا حکم ماننا ہی پڑے گا۔"

"تمہارا یہ فیصلہ بہت دانشمندانہ ہے۔"

"مگر میں جلد ہی فوج سے استعفیٰ دے دوں گی" اس کی آواز میں شدت کے ساتھ مایوسی کے جذبات غالب آرہے تھے۔

"وہ کیوں؟"

"ماریا سے انہیں کوئی عداوت نہیں ہوگی' وہ تو فوج کے دشمن ہیں" وہ اسی لہجے میں بولی "جب میرے پاس کوئی اختیار نہیں ہوگا تو وہ مجھے کس لئے بلیک میل کریں گے!"

"ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں فوج چھوڑنے ہی نہ دے"

"خدا کے لئے تم اسے میرے ارادے سے آگاہ نہ کرنا" وہ چونک کر بولی "وہ تو مجھے اسی وقت روکے گا جب اسے پہلے ارادے کی بھنک مل جاتے!"

"میری حیثیت صرف پیغام بر کی ہے' تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ میری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہوں گی۔"

"میں فوج سے استعفیٰ دے کر خاموشی سے کسی یورپی ملک کی طرف نکل جاؤں گی۔ نہ جانے کس وقت اس کے مطالبات میری بساط سے باہر ہو جائیں اور کوئی نامعلوم قاتل مجھے کسی شارع عام پر ٹھکانے لگا دے!"

"ہوسکتا ہے کہ اسٹور تک رسائی حاصل کرنے میں تمہیں کچھ دشواری ہو لہٰذا تم جلد ہی واپس چلی جاؤ" میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہاں پہنچنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے' اس وقت میں اس قدر مضمحل اور دل گرفتہ ہوں کہ مجھے تمہاری بانہوں کے سہارے کی ضرورت محسوس ہورہی ہے!"

"پہلے تم ڈائنامائٹ اسٹک مجھ سے لے لو" میں نے محمود کا دیا ہوا چھوٹا سا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے لاپرواہانہ انداز میں کاغذ پھاڑ دیا جس کے اندر گتے کے ایک ڈبے میں سیاہ رنگ کی مستطیل نما ڈبیہ رکھی ہوئی تھی جس پر ایک ڈائل اور گھنٹی لگی ہوئی تھی۔

وہ ڈبیہ دیکھتے ہی ماریا ششدر رہ گئی "تو اب وہ لوگ اس قدر حساس اور نازک ہتھیار استعمال کرنے لگے ہیں۔"

"کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"اس ڈائل پر ایک سے ساٹھ تک نشانات بنے ہوئے ہیں جو ایک منٹ فی نشان کے حساب سے ایک گھنٹے کی مدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ شرخ گھنڈی کو گھما کر سوئی کو ڈائل پر کسی بھی جگہ فکس کیا جاسکتا ہے گھنڈی کو اوپر کھینچنے سے بیٹری سیل سے منسلک غیر متحرک الیکٹرونی سرکٹ کام شروع کردیتا ہے اور سوئی کی پوزیشن کے مطابق گھنڈی کھینچنے کی مقررہ مدت کے بعد یہ ڈبیہ ہولناک دھماکے سے پھٹ جاتی ہے۔ ایک مرتبہ گھنڈی اوپر کھینچنے کے بعد اسے دوبارہ دبا کر ڈائنامائٹ کو ناکارہ بنانا ناممکن ہے۔"

ماریا اس کے بارے میں بتا رہی تھی اور میرا ذہن گلف بنک کے واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہاں لائے جانے والے سیاہ صندوق میں بھی یقیناً ایسا ہی کوئی بے آواز سرکٹ نصب تھا جس کی مدت تین یا چار منٹ پر سیٹ کی ہوئی تھی۔ بعد میں نکلنے والے مسلح محافظ نے چلنے سے قبل کوئی سوئچ دبا کر سرکٹ آن کردیا ہوگا اسی لئے اس کے جانے کے چند منٹ بعد وہ بکس ہولناک دھماکے سے پھٹ گیا۔

"خاصا جدید ہتھیار معلوم ہوتا ہے۔"

"جدید ترین کہو" وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی "یہ نظام حال ہی میں امریکی کمانڈوز میں متعارف کرایا گیا ہے۔"

"غنیمت ہے کہ تم اس کے استعمال سے واقف ہو!"

"اب اسے بھول جاؤ' میں کچھ دیر کے لئے لطف و سرور کی دنیا میں کھو جانا چاہتی ہوں" اس نے وہ سامان ایک طرف رکھتے

ہوئے کہا۔

کارلٹن ہوٹل کے اس کمرے میں وہ یہودن میری مہمان تھی اور میں اخلاقی طور پر اس کی جائز خواہشات پوری کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے اس کی ناروا دعوت سے گریز کرنا چاہا لیکن وہ اپنے وجود کی تقاضا طلبی صلاحیت سے پوری طرح باخبر تھی۔ اس نے بڑے آرام سے مجھے رام کر لیا۔

وہ چلی گئی تو میں آرام کی نیت سے بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر سونے کے بعد میں چار بجے سے پہلے ہی آرمی انٹیلی جنس بیورو کی عمارت کے قرب و جوار میں پہنچ جانا چاہتا تھا تاکہ اپنی آنکھوں سے ان درندوں کی بربادی کا منظر دیکھ سکوں۔

اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق تین بجے میں ہوٹل سے چل دیا۔ سڑکوں اور بازاروں میں گلف بنک کی بربادی کا نمایاں اثر نظر آ رہا تھا دوکانوں اور بازاروں میں خریداروں کا رش کم ہو گیا تھا۔ ٹریفک میں بھی خاصی کمی آ گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس واردات کے سوگ میں بعض تجارتی مراکز صبح سویرے ہی بند کر دیئے گئے تھے۔ بنک اور شیئر مارکیٹ بھی بند کر دی گئی تھی اور سڑکوں پر جابجا مسلح فوجیوں کا گشت جاری تھا۔ اہم مقامات اور تنصیبات پر بھاری پہرہ عائد تھا۔

اس صورتِ حال نے مجھے قدرے خائف کر دیا اور میں بازار کا چکر لگا کر ہوٹل میں واپس آ گیا۔ آرمی انٹیلی جنس کی عمارت کے قرب و جوار میں میری موجودگی میرے حق میں مضر ثابت ہو سکتی تھی۔

ہوٹل میں آ کر میں ٹی وی لاؤنج میں جم گیا اور وہیں بیٹھ کر اپنے پسندیدہ مشروب کا آرڈر دے دیا۔ ٹی۔ وی کے ذریعے مجھے اسرائیل اور تل ابیب کے بارے میں زیادہ خبریں مل سکتی تھی۔

ٹی۔ وی پر اس وقت موسیقی کا پروگرام جاری تھا کہ سوا پانچ بجے نشریات روک کر ایک اہم اعلان کی خبر دی گئی۔

چند ثانیوں بعد اسکرین پر اناؤنسر کی شکل نظر آئی جس نے بتایا کہ صبح گلف بنک کی برانچ نمبر اٹھارہ پر آتشگیر مادے کے ذریعے حملہ کیا گیا جس میں سات افراد زندہ جل گئے۔ اس کے بعد پونے چار بجے شہر کی ایک اہم عمارت پر بھرپور حملہ کیا گیا جس سے کئی عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ دھماکوں کے وقت محتاط اندازے کے مطابق اس عمارت میں ساٹھ عورتیں اور مرد موجود تھے جن کی اکثریت کے مر جانے کا اندیشہ تھا۔

ان واقعات کے بعد انتظامیہ نے تاحکم ثانی شہر میں کرفیو نافذ کر دیا تھا تاکہ مشتبہ افراد کی تلاش میں فوجی حکام کو آسانی ہو۔

اس اعلان کے بعد ایک مبصر دہشتر کیا گیا۔ اسکرین پر نظر آنے والے مبصر کا چہرہ ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے چھاپہ مار اور دہشت پسند

سرگرمیوں پر شدید ملامت کے دوران میں بتایا کہ تل ابیب پر والے دو خون آشام دھماکوں کے علاوہ پچھلے آٹھ گھنٹوں میں چھ شہروں میں اسرائیلی حکام کے دفاتر پر بھی بموں اور راکٹوں سے حملے کیے گئے جن میں سات شہری ہلاک ہوئے جب کہ دو نوجوان جوابی کارروائی میں مارے گئے جو بعد میں فلسطینی ثابت ہوئے۔

پھر جب مبصر نے ان چھ شہروں کے نام گنوائے تو مجھ ہوئی فہرست کے عین مطابق تھے مگر مبصر نے انہیں مقبوضہ شہر قرار دینے کے بجائے اسرائیلی شہر کہا تھا۔

مجھے وہ اطلاعات مل گئی تھیں جن کے بارے میں مجھ بے چینی تھی لہٰذا میں کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کمرے کی کھڑکی سے تل ابیب کی سڑکوں پر افراتفری کا دکھائی دے رہا تھا۔ سارے بازار بند ہو چکے تھے اور لوگ گھروں کی راہ لے رہے تھے تاکہ کرفیو کے نفاذ سے پہلے ہی اپنے گھروں کو پہنچ جائیں۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے نصف گھنٹے میں بھری پری ویران ہو گئیں اور سناٹے میں فوجی گاڑیوں کی آسیبی گڑگڑاہٹ دور تک گونجنے لگی۔

میں بہت دیر تک یوں ہی کھڑکی کے سامنے بیٹھا پھونکتا رہا حتیٰ کہ سورج بھی غروب ہو گیا اور ہر سو اندھیرے کی چادر پھیل گئی۔

پھر یک بیک تل ابیب کی فضا جنگی طیاروں کی گھن لرز اٹھی اور میں نے میراج اور مسٹیر طیاروں کی کئی ٹکڑیاں [illegible] میں جاتے دیکھیں۔

ان خون آشام طیاروں کو فضا میں گرجتے بے اختیار مجھے فلسطینی بستیاں اور کیمپ یاد آ گئے۔ اگر فوری جنگی قدم نہیں بھی اٹھا رہا تھا تو اپنی سرحدوں سے ٹھکانوں کو ضرور نشانہ بنانے والا تھا۔

میں ان ہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک پر تیز دستک سنائی دی جس نے مجھے تصورات کی دنیا سے میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو میرا دل اچھل کر حلق میں اور آنکھوں کے سامنے بے شمار رنگین دائرے پھیلنے اور سکڑنے میرے دروازے پر دو مسلح اور باوردی فوجیوں کے اپنی یونیفارم میں موجود تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح زرد پڑا اس کے بدن سے لہو کی آخری بوند تک نچوڑ لی جا چکی ہو حالت دیکھ کر میرے ذہن میں ابھرنے والا پہلا خیال ناک تھا۔

دروازہ کھلنے پر ماریا تھکے ہوئے قدموں سے میرے کمرے میں آ گئی۔ دونوں مستعد فوجی بھی اس کے پیچھے قدم ملاتے اندر آ گئے۔

"پیسیو کیپٹن! اس وقت کیسے آئی ہو؟" میں نے کئی ثانیوں کے سکوت کے بعد قدرے سراسیمہ لہجے میں سوال کیا۔

دیا کا ستا ہوا زرد چہرہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید آرمی انٹیلی جنس کی عمارت میں ہولناک دھماکے اور بھاری جانی اتلاف کے بعد اس نے اپنے ضمیر کے دباؤ میں آ کر اوپر والوں کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے اور اب دو فوجی اسے حراست میں لینے کے بعد مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں مگر میرا یہ خیال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا کیونکہ ماریا کے ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی کمیشنڈ افسر نہیں تھا۔ وردی اور سالے پر لگے ہوئے نشانات کے اعتبار سے ایک اردلی تھا دوسرا سارجنٹ نظر آ رہا تھا علاوہ ازیں ماریا کے سامنے وہ دونوں ہی مؤدب نظر آ رہے تھے۔ میں نے یہ سارا تجزیہ خاموشی سے چند ثانیوں میں مکمل کر لیا تھا۔

"تمہاری فوری طلبی کا پروانہ آ گیا ہے۔" وہ صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔

"یہ اطلاع صبح بھی تو دی جا سکتی تھی!" میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"شہر میں کرفیو نافذ ہے لہٰذا تمہارا ہوٹل سے نکلنا ناممکن تھا۔" وہ بولی "ہمیں صبح نو بجے روانہ ہونا ہے اور اس سلسلے میں تمہاری بریفنگ کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے تمہیں دفتر میں طلب کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ عمارات برباد ہو چکی ہیں لہٰذا میں خود ہی چلی آئی۔"

"تمہارے دفتر کی عمارت برباد ہو گئی؟" میں نے حیرت سے کہا "یہ کیسے ہوا؟"

"دہشت پسند تخریبی عناصر کی کارروائی معلوم ہوتی ہے!" وہ اپنا چنگھاڑتا ہوا رخسار سہلاتے ہوئے افسوس کے ساتھ بولی "معلوم ہوتا ہے کہ تم ریڈیو یا ٹی وی میں دلچسپی نہیں لیتے۔"

"اس کا مجھے اعتراف ہے لیکن ان عمارات تک دہشت پسندوں کی رسائی کیسے ممکن ہوئی؟" میں نے اس کے ہمراہ آنے والوں پر اپنی حیرت واضح کرنے کے لیے سوال کیا۔

"یہ تلخ موضوع ماہرین کے لیے ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی "ویسے فلسطینی تخریب کاروں کو اس حادثے کی بھاری قیمت ادا کرنا ہوگی۔"

"تو کیا یہ ثابت ہو گیا کہ اس واقعے کی پشت پر فلسطینیوں کا ہاتھ ہے؟"

"عمارات پوری طرح ملبے کا ڈھیر بن گئی ہیں جس میں ابھی تک جابجا آگ لگی ہوئی ہے اور ملبے سے گیارہ لاشیں نکالی جا چکی ہیں۔ تل ابیب میں ایسی ظالمانہ کارروائی کوئی اسرائیلی نہیں کر سکتا۔ اس حادثے میں فلسطینی تنظیموں کا ملوث ہونا تو بالکل طے ہے!"

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ شہر میں کرفیو گلف بنک کی عمارت پر صبح ہونے والے حملے کے نتیجے میں لگایا گیا ہے سنا ہے کہ اس حادثے میں بھی کئی آدمی مرے ہیں۔"

"تمہیں یہ سمجھنا ہی چاہیے تھا!" وہ زہرخند کے ساتھ بولی۔

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہارے سامنے میز پر رکھی ہوئی وسکی کی بوتل نصف سے زیادہ خالی ہو چکی ہے۔" وہ میرے قریب رکھی ہوئی تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اور اتنی مقدار میں ایک ڈگ پینے کے بعد دماغ کا ترک جانا بالکل قرین قیاس نظر آتا ہے۔"

"یہ تو مہتدیوں کے لیے کہا جا سکتا ہے۔" میں نے اس کے ساتھ والوں سے نظر بچا کر اسے آنکھ مار کر کہا "تم بھی پی کر دیکھو..."

"صفدر پلیز!" وہ ہاتھ اٹھا کر خشک احتجاجی لہجے میں بولی "میں ڈیوٹی پر ہوں اور تمہیں میرے نرم رویے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔"

"آپ حکم فرمائیں کیپٹن ماریا۔" میں نے بھی اس کے بدلے ہوئے رویے کے جواب میں یک بیک سنجیدگی اختیار کر لی۔

وہ چند ثانیوں تک مجھے غضبناک نظروں سے گھورتی رہی۔ اس کیفیت میں وہ مجھے بہت زیادہ دلکش نظر آ رہی تھی اور نیم مردانہ فوجی وردی میں پوشیدہ چھپایا ہوا اس کا سراپا میرے حواس پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

"تم لوگ جاؤ، اگلی ہدایات ملنے تک تم لوگ فوری ریڈ کو چلے گئے۔" اس نے پلٹ کر اپنے ساتھ آنے والوں سے کہا۔

"اوکے مادام!" دونوں نے یک آواز کہا اور مزید انتظار کیے بغیر ماریا کو خاصا کرخت سلوٹ مار کر میرے کمرے سے نکلے چلے گئے۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" میں نے دروازہ بند کر کے واپس آتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" اس نے بے ساختہ سوال کیا۔

"وہ دونوں یہاں کباب میں ہڈی بنے ہوئے تھے!" میں صوفے پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے شوخ لہجے میں بولا۔

"میں بہت پریشان ہوں صفدر!" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھے نہایت شرمناک اور گھناؤنی سازش میں ملوث کیا ہے!"

"مجھے الزام نہ دو ماریا۔" میں خشک لہجے میں غرایا۔ اس کی زبان سے وہ الفاظ سنتے ہی ساری سرمستی رفوچکر ہو گئی اور میں غصے میں آ گیا "میری حیثیت صرف پیغام رساں کی تھی۔ وہ اقدام تم نے اپنی جان کے خوف سے کیا ہے۔"

"جب سے میں نے اس دھماکے کی تباہ کاری دیکھی ہے میرا حال بہت ابتر ہے مجھے اپنے وجود پر شرم آ رہی ہے۔"

"آنا چاہیے!" میں نے تلخ لہجے میں کہا "بہت سی انسانی جانوں کے عوض خریدی ہوئی زندگی پر تمہیں جتنی بھی شرم آئے کم ہے!"

"یہ تم کہہ رہے ہو!" وہ حیرت اور ملامت بھرے لہجے میں بولی۔

"میں تمہیں تو اور کون کہے گا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا "یہ تو صرف میں ہی جانتا ہوں کہ تمہاری زندہ رہنے کی خواہش کتنی شدید ہے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے صفدر۔" وہ صوفے کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر شکست خوردہ لہجے میں بولی "مجھے اس وقت تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔"

میں چند ثانیوں تک خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا "تم میری نگاہوں میں اپنا اعتبار کھو بیٹھی ہو۔"

"ایسا نہ کہو صفدر۔ میں نے کبھی اپنے دل کی بات تم سے نہیں چھپائی۔"

"مگر ریکارڈ کی ہے!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اوہ خدا۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ ایک طویل سانس لے کر اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی "میں نے اپنی اس حماقت کا انجام دیکھ لیا ہے۔ میں دوبارہ تم کو کراس کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکوں گی۔ مجھے صحیح معنوں میں اب اندازہ ہوا ہے کہ جن لوگوں سے میرا پالا پڑا ہے وہ اسرائیل میں بھی من مانی کارروائیاں کرنے پر قادر ہیں۔ تم میری جامہ تلاشی لے سکتے ہو۔ میں کوئی ٹیپ ریکارڈر چھپا کر نہیں لائی۔"

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے آہستگی سے کہا "مجھے تمہارے الفاظ پر اعتماد ہے۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں صوفے پر گر گئی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی "میں اس بھرے پُرے شہر میں اس وقت خود کو تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ میں اپنے دل کا کرب کسی کو نہیں سمجھا سکتی۔ میں ہمدردی اور محبت کی تلاش میں تمہارے پاس آئی تھی۔ تم یقین کرو کہ اب تم نے کوئی چبھتی ہوئی بات کی تو میں اپنی کنپٹی پر گولی مار لوں گی۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا "میں تمہارے لیے سراپا محبت ہوں ماریا۔ تمہیں سامنے پا کر میں اپنے دل کے درد میں کمی محسوس کر رہا ہوں مگر جن لوگوں سے ہمارا واسطہ ہے وہ بے شمار وسائل کے مالک ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری ذرا سی لغزش ہم دونوں کے لیے جہنم کے دروازے کھول دے۔ وہ لوگ نہ مرنے سے ڈرتے ہیں اور نہ مارنے میں تامل کرتے ہیں۔"

"وہ بھیڑیے ہیں بھیڑیے۔" ماریا جھرجھری لے کر میری باہنوں میں سمٹتے ہوئے بولی "نہ جانے وہ کون سا جذبہ ہے جس نے انہیں اتنا دلیر بنا دیا ہے۔"

"ان کے بارے میں زیادہ نہ سوچا کرو۔" میں نے ہولے ہولے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا "بس وہ جو کچھ کہیں اس پر آنکھ بند کر کے عمل کرتی جاؤ۔"

"اب تک یہی کرتی آئی ہوں۔ ایک بار آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی تو آج صبح اس کا ہولناک انجام بھی سامنے آ گیا۔"

"بن جیان کے بارے میں کیا معلومات حاصل ہوئی ہیں؟"

"تو اب شاید اسی کی باری ہے؟" اس کی سہمی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"وہ لوگ بن جیان کے بارے میں جلد از جلد اطلاعات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور میں صبح تربیتی کیمپ کی طرف روانگی سے پہلے انہیں مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے چلے جانے کے بعد ان کا عتاب تمہاری لاعلمی کا سبب بنے۔"

"بن جیان ان دنوں فرانس میں ہے۔"

"فرانس میں؟"

"ہاں وہ فرانس کی کھلی منڈی سے غیر سرکاری طور پر ہلکے اسلحے کی … مقدار حاصل کرنے گیا ہوا ہے۔"

"تو کیا وہ اسرائیلی وزارت دفاع کے لیے کام کرتا ہے؟"

"پچھلے دنوں وہ صحرائی کاشتکاری کے ادارے کے لیے کام کرتا ہوا سڈنی … گیا تھا۔ ہر اہم معاملے میں کہیں نہ کہیں اس کی ذات ضرور ملوث نظر آتی ہے۔"

"اگر وہ اسی قدر اہم آدمی ہے تو ہلکے اسلحے کے حصول کو محض … گیا ہوگا۔"

"شاید!"

"مجھے تمہاری حتمی رائے چاہیے ماریا۔" میں نے اسے ٹوکا کیونکہ مجھے پہلی بار … ہوا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہے۔

"وہ کسی اور چکر میں بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یقینی طور پر تو کچھ پتہ نہیں چل سکا مگر مجھے بھنک ملی ہے کہ وہ … جوہری فضلے کے حصول کی کوششوں میں شریک ہے جس سے جوہری ہتھیار … جا سکتے ہیں۔"

"مگر اسرائیل تو ایٹمی ملک نہیں ہے!" میں نے چونک کر کہا۔

"یہ قصہ پارینہ ہے۔" وہ ہنس کر بولی "اسرائیل ننھا سا ملک ہے … لوگ ہمیشہ ایسے اسلحے کی جستجو میں رہے ہیں جو مختصر مدت میں دشمن … بدترین جانی اور مالی نقصان پہنچا سکے اور اس ضمن میں ایٹمی ہتھیار …"

"تم خود بھی کسی ایٹمی ہتھیار سے کم مہلک نہیں ہو!" میں نے اس کے وجود پر اپنی گرفت مستحکم کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ذات میں مجھے عجیب سی کشش محسوس ہونے لگی ہے۔" … آمیز لہجے میں بولی۔

"میری خوش نصیبی ہے۔" میں نے کہا۔ اس کے کام کی بات … کے بعد میں نے خود ہی گفتگو کا رخ بدل دیا تاکہ وہ قدرے سکون … "تم کو صبح نو بجے تو روانہ ہو جانا ہے پھر تم محمود کے جانشین کے بارے میں اطلاعات کب تک پہنچاؤ گے؟"

"یہ بڑا مشکل ہے ہو سکتا ہے کہ خوش قسمتی سے اس کا کوئی … ہی مجھ سے آ ٹکرائے۔" میں نے جواب دیا۔

"کرفیو کے دوران تو چڑیا کا بچہ بھی پر نہ مار سکے گا۔ … نقل و حرکت پر مکمل پابندی ہے۔"

"وقفہ کب ہوگا؟"

"کرفیو کا مقصد محض مشتبہ فلسطینیوں کی تلاش … حکام پورے شہر کی آبادی کو بلاوجہ تنگ نہیں کریں گے … آبادیوں کے سوا باقی علاقوں سے آج رات ہی کسی وقت کرفیو ہٹا لیا …"

"اگر اس کا کوئی آدمی مجھ تک نہ آ سکا تو یہ بہت برا ہوگا۔" میں نے تفکر … لہجے میں کہا "فلسطینی آبادیوں سے کب تک کرفیو ہٹنے کی امید ہے؟"

"تل ابیب کا گیریژن کمانڈر بریگیڈیئر رشیدون بہت ظالم آدمی ہے … اسے معلوم ہے مجرم نہیں ملے تو وہ کئی دن تک کڑا محاصرہ کر کے انہیں گھر دوں … رکھے گا۔ پتہ نہیں کہ یہ لوگ تخریب کاری کرتے ہوئے حکام کے انتقامی … رویوں کو کیوں بھول جاتے ہیں۔"

"اس وقت سنجیدہ گفتگو اچھی نہیں لگتی۔ ان لمحات کو طریقے سے گزارنے کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں تم سے متفق ہوں مگر ابھی تو سنجیدہ گفتگو کا ایک حصہ باقی ہے۔" … ہنس کر مترنم آواز میں بولی۔

"وہ کیا؟"

"صبح روانگی کے بارے میں تمہاری بریفنگ!"

"اس فرض کا بار بھی ہلکا کر دو تو بہتر ہے۔"

"تمہیں صبح ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ رضاکاروں کے … کو لے جانے والا ٹرک مقررہ وقت پر یہاں پہنچے گا۔ اس دستے کا انچارج … رجنٹ میکوائے ہے تمہیں بہرحال اس کی اطاعت کرنی ہے۔" وہ مجھے … نے لگی "تمہاری تربیت گرم صحرائی موسم اور حالات میں ہوگی جہاں تمہاری … نی صلاحیت کے ساتھ اخلاقی قوت بھی جانچی جائے گی اور تمہیں فوجی قوانین … مطابق ہر حکم کی حرف بحرف تعمیل کرنا ہوگی ورنہ فوجی ضابطے کے مطابق تمہیں … سزا دی جا سکے گی۔ جس پر کوئی اپیل بھی نہ ہو سکے گی۔"

"گویا میں باقاعدہ فوجی شمار کیا جاؤں گا؟"

"خاصی حد تک!"

"مگر آج کل تو موسم بڑا اچھا ہے۔ صحرا کی راتیں تو بڑی خنک ہوتی … گی۔ میری تربیت کے لیے گرم موسم کہاں ملے گا؟"

"وہ تمہیں کیمپ میں پتہ چلے گا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیمپ افریقہ کے کسی استوائی خطے میں تو نہیں ہے؟"

"فکر نہ کرو، تمہیں اسرائیل کی سرحدوں سے باہر نہیں لے جایا جائے گا۔"

اس کے بعد ماریا کافی دیر تک میرے کمرے میں رکی رہی۔ وہسکی کی … اس کی روانگی تک آخری قطرے سے بھی محروم ہو گئی اور جب ماریا مجھ … رخصت ہوئی تو اس کے بشرے سے فکر اور ناامیدی کی پرچھائیاں غائب … ہو چکی تھیں۔

اسے الوداع کہہ کر میں نے کمرے کی روشنیاں گل کر دیں اور بستر پر … دراز ہو گیا۔ اس وقت میرے ذہن پر سرور کی ایک لطیف سی لہر طاری تھی … اپنے وجود میں مسرت کا سرچشمہ موجزن محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے بستر … پر لیٹے لیٹے دن بھر کے خون آشام واقعات پر غور کرنا شروع کر دیا مگر … اس ضمن میں میرا ذہن زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکا اور میں گہری نیند سو گیا۔

رات کے پچھلے پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا پورا بدن سن ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکن خاصی تیز محسوس ہو رہی تھی۔

میں اندھیرے میں کئی منٹ تک آنکھیں پھاڑے بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر یاد نہ آ سکا کہ میں کسی ڈراؤنے خواب کی وجہ سے بیدار ہوا تھا یا بلاوجہ ہی میری حرکت قلب تیز ہو رہی تھی۔

پھر اچانک مجھے تاریک فضا میں دھوئیں کا ایک تازہ مرغولہ آہستگی کے ساتھ پھیلتا اور بکھرتا ہوا نظر آیا اور میں کوئی حرکت کیے بغیر چوکنا ہو گیا۔

دھوئیں کی موجودگی بتا رہی تھی کہ میرے کمرے میں کوئی گھسا ہوا تھا اور شاید میری بیداری کی وجہ بھی یہی رہی تھی۔ چھٹی حس بعض اوقات بڑے کرشمے دکھاتی ہے اور میں بھی اس وقت شاید اپنی چھٹی حس کی للکار پر ہی بیدار ہوا تھا۔

چند ثانیوں تک میں یوں ہی لیٹا رہا مگر کمرے میں کوئی بھی آواز نہ سنائی دی۔ اگر فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے نہ تیر رہے ہوتے تو میرے لیے یہ شبہ کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔

پھر میں نے کسمسا کر آہستگی سے پہلو بدلا تاکہ دھوئیں کے مخرج کا جائزہ لے سکوں مگر وہ شخص میری توقع سے زیادہ چالاک تھا۔

میں نے جوں ہی کروٹ بدلی اسے اندازہ ہو گیا کہ میں بیدار ہو چکا ہوں اور پھر کمرے کی محدود فضا میں اس کی مدھم سی آواز گونجی۔

"بلاوجہ اپنے اعصاب پر زور نہ ڈالو، میں تمہارا دوست ہوں۔"

وہ آواز میرے لیے اجنبی تھی مگر اس کا لہجہ یقیناً دوستانہ تھا۔ اس کا ہیولا تاریکی کا ایک جزو بنا ہوا تھا مگر سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے کی بنا پر اس کی جگہ کا تعین کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

وہ میرے بستر سے تھوڑی دور دیوار کے سہارے رکھے ہوئے صوفے پر دراز تھا۔ پھر اس نے سگریٹ کا کش لیا تو سگریٹ کی مدھم سرخ روشنی کے انعکاس میں مجھے اس کے لبوں پر گھنی مونچھوں کا سایہ نظر آیا۔

میں نے اپنے سرہانے لگا ہوا سوئچ دبا کر کمرے میں روشنی کر دی۔

سیاہ پتلون اور گہری سرخ قمیص میں ملبوس وہ شخص بدستور اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہا اور بہت ہلکی آواز میں بولا "روشنی گل کر دو صفدر۔ کھڑکیوں سے چھننے والی روشنی کسی کو اس طرف متوجہ کر سکتی ہے۔"

"تم کون ہو؟" میں نے بستر سے اتر کر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"گیدڑ کی کھال کا جیکٹ!" وہ کرخت صورت شخص میرے قریب آ کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا "میں تمہارا دوست ہوں۔"

میں نے ایک طویل سانس لے کر کمرے کی روشنی گل کر دی پھر ہم دونوں صوفے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ گئے۔

"تم میرے کمرے میں کیسے داخل ہوئے؟"

"دروازے سے!"

"مگر وہ تو مقفل تھا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ اب بھی مقفل ہی ہے۔ مجھے نقب زنی میں خاص مہارت حاصل
ہے اسی وجہ سے مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔"
"کیا شہر میں کرفیو نہیں ہے؟"
"دو بجے کے بعد سے فلسطینی آبادیوں کے علاوہ باقی شہر سے کرفیو ہٹا
لیا گیا ہے۔" اس نے مجھے اطلاع دی۔
"تو اس وقت کیا بجا ہے؟" میں نے اپنی رسٹ واچ کے ریڈیم ڈائل
پر وقت دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔
"چار بجنے والے ہیں!"
میرے لیے یہ اطلاع حیرتناک ثابت ہوئی۔ اس کا تو مطلب یہ تھا کہ میں
کئی گھنٹے کی گہری نیند لے چکا تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری آنکھ لگتے
ہی مجھے دوبارہ بیدار کر دیا گیا ہو۔
"تمہیں کل دوپہر دو بجے قومی عجائب گھر کی گیلری میں پہنچنا ہے۔" اس
نے کہا "وہ تم سے کچھ اہم مسائل پر بات کرنا چاہتا ہے۔"
"مگر میں صبح نو بجے کو ریلا تربیتی کیمپ کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"
"کل صبح نو بجے؟"
"ہاں۔ اور میں خود روانگی سے پہلے ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں"
"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس بالکل وقت نہیں رہا ہے۔" وہ اٹھتے
ہوئے بولا "اجالا پھیلنے سے قبل ہی کچھ ہو سکتا ہے۔"
"تو تم کہاں جا رہے ہو؟"
"اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"
"اگر شہر سے کرفیو ہٹایا جا چکا ہے تو کیوں نہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں"
میں نے وقت کی کمی کے باعث تجویز پیش کی۔
"تمہاری مرضی ہے۔" وہ سگریٹ کا ٹکڑا فرش پر مسلتے ہوئے بولا "ویسے
مجھے تمہاری تجویز سے اتفاق نہیں ہے!"
"وہ کیوں؟"
"بس میری اپنی رائے ہے۔" وہ موضوع کو طول دینے سے گریز کرتے
ہوئے بولا۔
پھر میں نے دروازہ کھول کر راہداری کا جائزہ لیا جو دور تک ویران پڑی
ہوئی تھی میرا اشارہ پا کر وہ پھرتی سے راہداری میں چلا گیا اور میں نے دروازہ بند
کر کے اندر سے مقفل کر لیا اور دوبارہ اپنے بستر پر گر گیا۔
اس شخص کی بے وقت آمد نے میری آنکھوں سے نیند اڑا دی اور میں
سگریٹ پیتے ہوئے مختلف خیالات میں کھو گیا۔
میں اپنے کیمیاگری کے خبط کی تکمیل کی خاطر پاکستان سے نکلا تھا تاکہ
اپنے بنائے ہوئے سونے میں نرماہٹ پیدا کرنے کے لیے ہمالیہ کی وادیوں سے
بھاندر ناس حاصل کر سکوں۔ اس وقت میں حالات کے جنگل میں ایسا پھنسا ہوا
تھا کہ اپنی پیدا کردہ مالی دشواریوں کے دلدل سے نکلنا مجھے محال نظر آ رہا تھا میں
نے اپنے گھر بار کو چھوڑنے کے بعد کراچی میں ناقابلِ یقین کامیابیاں حاصل کی
تھیں اور جیسا ابتدائی دشواریوں سے گزرنے کے بعد مختلف [illegible]
ہو گیا تھا کہ پیسے سے خریدی جانے والی ہر آسائش مجھے [illegible]
شروع ہوا تو ایک طرف بس جوئے میں سب کچھ ہار [illegible]
پولیس میری غیر قانونی سرگرمیوں کی بو پا کر میری راہ [illegible]
آسائش کا ایک یادگار زمانہ گزارنے کے بعد پھر [illegible]
ایک مفرور اشتہاری مجرم کی حیثیت سے میں [illegible]
اس کی دردناک موت کے بعد اس کے ادھورے تجربے [illegible]
پاکستان کے راستے انڈیا ہوتا ہوا نیپال پہنچا۔ وہاں [illegible]
اور ہنگامہ خیز دور گزرا اور آخر کار ہمالیہ کی وادیوں [illegible]
کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر وہ بیش قیمت بوٹی ضائع [illegible]
میں پروان چڑھنے والی ایک حسین و جمیل لڑکی سیتا کو ساتھ [illegible]
گزرتا ہوا واپس تہذیب سے منور شہروں میں آ گیا۔
میں سیتا کے حسن اور اس کی دلفریب اداؤں کا اسیر تھا [illegible]
بیوی بنا چکا تھا اور پھر اس کی ماں سندری کی دی ہوئی ایک انگوٹھی [illegible]
ہوئے نگ کی اصلیت کے انکشاف نے مجھے خوشی سے [illegible]
میں تو تانبے، پارے، فولاد اور بے شمار جڑی بوٹیوں وغیرہ
کے چکر میں تھا مگر اس انگوٹھی میں جڑا ہوا پارس پتھر تانبے [illegible]
لوہے کو سونے میں بدل دینے کی قوت رکھتا تھا۔ اس وقت مجھے یوں
ہوا تھا جیسے قدرت نے مجھ پر مہربان ہو کر میری منزل میرے قدموں [illegible]
ہے۔ سیتا کے مل جانے سے میں زندگی کے ایک نئے روپ سے آشنا ہوا
ذہنی سکون اور مسرتیں ہی مسرتیں تھیں پھر مالی ضرورت پوری [illegible]
پارس پتھر بھی میرے قبضے میں تھا۔
مگر پھر حالات تیزی سے بدلے اور میں پارس پتھر کو ایک [illegible]
پر مجبور ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کے ایک شہر میں میری [illegible]
سیتا مجھ سے روٹھ کر انسانوں کے بے پناہ سمندر میں کہیں [illegible]
میں سیتا کی جدائی کا کرب اپنی ذات میں سمیٹے نگر نگر [illegible]
روشنیوں کے شہر بمبئی کی اندھیری گلیوں میں سکون تلاش کرتا [illegible]
ذات بکھر چکی تھی۔ سیتا کو دوبارہ حاصل کیے بغیر میری زندگی محض [illegible]
سایہ بن کر رہ گئی تھی۔
میں ہندوستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا تھا اور [illegible]
ہر قیمت پر مجھ سے پارس پتھر حاصل کرنا چاہتے تھے جو صدیوں سے [illegible]
کہانی بنا ہوا تھا جس کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ پارس پتھر کا [illegible]
کے ذہن کی پیداوار ہے۔
ان اہلکاروں کو دھوکہ دے کر کسی جائز طریقے سے پاکستان [illegible]
میرے لیے ناممکن ہو کر رہ گیا تھا لہٰذا میں نے ایک لانچ کے ذریعے [illegible]
میں مشرق وسطیٰ کا سفر اختیار کیا جہاں سے پاکستان کا سفر کرنا نسبتاً [illegible]
مگر مشرق وسطیٰ میں نئے مصائب میرے منتظر تھے جنہوں نے

[illegible] ایک دھندلائے ہوئے خواب میں بدلتی جا رہی تھی صحرائی
[illegible] مقدر کی گردش مجھے اسرائیل لے آئی اور یہاں میں حالات کے شکنجے
میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔
مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میری پیاری، میرے خوابوں کی ملکہ میری آرزوؤں
کی زندہ تعبیر، پہاڑوں کی بیٹی سیتا پاکستان میں موجود ہے اور میں جلد از جلد اپنے
ملک پہنچ کر اسے تلاش کرنا چاہتا تھا مگر اسرائیلی مجھے خصوصی تربیت دے کر
اپنے جنگی مہم کا ایندھن بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان حالات میں میری امید
کا مرکز محمود کی ذات تھی۔
اس کے لیے میں نے بدترین حالات میں ایسی خدمات انجام دی تھیں
کہ اسرائیلیوں کے حلقے سے نجات دلانے میں وہ مجھ سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا
اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک منصوبہ بھی بنا لیا تھا مگر عین وقت پر اپنے
ایک اہم کارندے کی گرفتاری کی وجہ سے اسے وہ منصوبہ ملتوی کرنا پڑا۔ میں چاہتا
تھا کہ تربیتی کیمپ کی طرف روانگی سے پہلے اسے پوری شدت کے ساتھ اپنی اس
خواہش سے آگاہ کر دوں کہ میں جلد از جلد پاکستان جانا چاہتا ہوں۔
میں ان ہی خیالات میں کھویا دل گرفتہ بستر پر دراز تھا کہ دروازے پر
ہلکی سی دستک سنائی دی میں نے اٹھ کر تصدیق کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔
بولٹ کھلتے ہی کوئی شخص تیزی سے اندر گھس آیا اور مجھے ذرا سی بھی
مہلت دیے بغیر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔
"کوئی حماقت نہ کرنا۔" دروازہ بند کرتے ہوئے اس شخص نے آہستہ
سے کہا اور میرے حلق سے ایک طویل سانس آزاد ہو گئی۔
محمود کی آواز میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔
"تم اس وقت؟" میں نے حیرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔
"فکر نہ کرو۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیا "میں عملے کی نظروں
سے بچ کر تم تک پہنچا ہوں مگر اس کے باوجود میرے دو ساتھی پورے ساز و سامان
کے ساتھ باہر موجود ہیں خطرے کی صورت میں یہ عمارت راکھ کا ڈھیر بنا دی جائے گی۔"
"مگر تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا ہے؟"
"گزشتہ شام اسرائیلی طیاروں نے لبنان اور شام میں واقع فلسطینی کیمپوں
پر دیوانہ وار بمباری کی ہے!"
"بہت جانی نقصان ہوا ہو گا؟" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
"نہتے پناہ گزینوں کی گنجان آبادیوں میں آج صفِ ماتم بچھی ہوئی ہو گی"
[illegible] آواز ابھری "شامی علاقے میں اسرائیل کے تین طیارے
[illegible] گرائے گئے ہیں مگر یہ اس خون کا انتقام نہیں ہے جو انہوں نے بہایا ہے۔"
"[illegible] تو ایک نئی جنگ چھڑ سکتی ہے محمود۔"
"فی الحال ہم اسرائیل کو اس کی آبادیوں میں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں
[illegible] ہے کہ جلد ہی اسرائیل پر باہر سے کاری ضرب لگائی جائے"
"تو کیا تمہارے انقلابات کی پشت پر کوئی منصوبہ بندی بھی ہوتی ہے"

میں نے حیرت کے ساتھ اس سے دریافت کیا۔
"ہم من مانی کارروائیاں نہیں کرتا۔" وہ بولا "ہمارے پاس ہدایات آتی
ہیں، طریقہ کار البتہ ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ ہم اپنے محسنوں کو مشکلات میں نہیں پھنسا سکتے
"مجھ سے تم کیوں ملنا چاہتے تھے؟"
"بن حیان کی روپوشی پر ہمارے ساتھیوں کو تشویش ہے اس کے بارے
میں تمہیں کیا معلوم ہوا ہے؟" اس نے کہا۔
"ان کی تشویش بالکل بجا ہے!"
"وہ ہے کہاں؟"
"فرانس میں!" یہ کہہ کر میں نے اسے ان تمام باتوں سے باخبر کر دیا جو
ماریا کے ذریعے پچھلی رات میرے علم میں آئی تھیں۔
"یہ بہت زبردست کام ہوا۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔
"وہ کیسے؟"
"اس کی مصروفیت کے بارے میں علم ہو گیا اور پھر اسرائیل سے باہر
اس کا نانکا بڑے مزے میں کیا جائے گا۔ اس علاقے میں ہمیں کافی قوت حاصل ہے"
"میں خود چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے تمہیں یہ اطلاعات پہنچا دوں۔"
"میرے بارے میں کیا تاثر ہے؟"
"سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم کسی بحری حادثے کا شکار ہو چکے ہو۔"
"اپنی کارروائی کا انجام دیکھنے کے بعد لڑکی کا کیا حال ہے؟"
"اس کی حالت بہت ابتر ہے مگر وہ اب پوری طرح ہماری مٹھی میں
آ چکی ہے۔"
"تمہارے جانے کے بعد اس سے ہمارا رابطہ ٹوٹ جائے گا۔" وہ پُر
خیال انداز میں بولا "جانے سے پہلے اس سے تمہاری ملاقات تو ہو گی نا؟"
"شاید۔"
"اسے بتا دینا کہ میرا آدمی اس سے ملے گا تو اپنا تعارف کالے عقاب کے
طور پر کرائے گا۔ اس مہرے پر ہمیں مضبوط گرفت رکھنا ہو گی۔"
"وہ بہت چالاک اور مکار ہے کسی ہوشیار آدمی کو ہی اس کے پیچھے لگانا۔"
"اس بات کا مجھے علم ہے!"
وہ اس گفتگو کے بعد میرے پاس نہیں رکا اور فوراً ہی واپس چلا گیا۔
سورج طلوع ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی لہٰذا میں ایک
کتاب پڑھنے لگا۔ سات بجے کے قریب میں نے ماریا کو فون کیا۔
"کون بول رہا ہے؟" تیسری گھنٹی کے بعد دوسرے سرے سے ماریا کی
بوجھل آواز سنائی دی جیسے یہ فون کال اسے ناگوار گزری ہو۔
"صفدر بول رہا ہوں۔"
"اس وقت کیسے یاد آ گئی میری؟" میرا نام سن کر اس کا لہجہ یکدم
شوخ ہو گیا۔
"مجھے الوداع کہنے آؤ گی نا؟"
"ارادہ تو نہیں تھا، آج فلورا کی چھٹیاں کھلنے والی ہیں۔ اسمتھ کے ساتھ

اسی طرف جانے کا خیال تھا۔" اس نے جواب دیا۔
"نہ آئیں تو مجھے افسوس رہے گا۔"
"تو پھر میں چکر لگاؤں گی ڈارلنگ۔" اس کی آواز میں پیار سمٹ آیا۔
"تم نہ آئیں تو میں سارجنٹ میکوائے کے ساتھ جانے سے صاف انکار کردوں گا۔" میں نے اس پر دباؤ ڈالنے کی نیت سے کہا۔
"ارے رے ایسا نہ کرنا۔" وہ ہنس کر جلدی سے بولی "ویسے میں ضرور آؤں گی بلکہ ناشتے سے فارغ ہو کر ابھی آجاتی ہوں۔"
"یہ مناسب ہے!"
فون کا سلسلہ منقطع کر کے میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ عورت کو اپنی راہ پر لگانے کے لیے اسے ایک بار یہ یقین دلانا ضروری ہوتا ہے کہ وہ دل و جان سے چاہے جانے کے قابل ہے پھر اسے موم کے پتلے کی طرح ہر سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔
تقریباً آٹھ بجے ماریا میرے پاس پہنچ گئی۔
"وردی کہاں ہے تمہاری؟" اسے سادہ کپڑوں میں دیکھ کر میں نے سوال کیا۔
"اس لباس میں بری لگتی ہوں کیا؟"
"بری تو تم لباس کے بغیر بھی نہیں لگتیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔
"فوجی وردی میں تمہارا انداز ہی کچھ بدلا بدلا نظر آتا ہے۔"
"یہاں سے مجھے فلورا کے پاس ہسپتال جانا ہے۔" وہ بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولی "ویسے بھی آج میں نے چھٹی لی ہوئی ہے۔"
"دفتر تباہ ہونے کے بعد تو خود بخود چھٹی ہوگئی ہوگی۔"
"وہ میری زندگی کا بدترین حادثہ تھا۔" وہ یک بیک افسردہ ہوگئی۔
"اس کا تذکرہ اتنی بیدردی سے نہ کرو۔"
"میرے جانے کے بعد اس کا آدمی تم سے کالے عقاب کے حوالے سے ملاقات کرے گا۔" میں نے فوراً مطلب کی بات کہہ ڈالی۔
"تو وہ تم سے ملا تھا؟" اس نے حیرت سے پوچھا "محمود کے بارے میں کوئی خبر ملی؟"
"محمود کے جانشین کا ہرکارہ آیا تھا۔" میں نے کہا "وہ لوگ غیر ضروری باتوں سے گریز کرتے ہیں ویسے محمود کی جانب سے شاید وہ بھی مایوس ہوچکے ہیں۔"
"تو کیا انہیں تمہاری رہائی کا علم ہوچکا ہے؟"
"ہاں۔ انہیں پہلے سے معلوم رہا ہوگا جبھی تو تمہارے لیے خصوصی پیغام بھیجا گیا۔"
"میں بہت جلد فوج کی ملازمت چھوڑ دوں گی۔" ان لوگوں کے تصور ہی سے اب مجھے دہشت آنے لگی ہے۔" وہ پھریری لے کر بولی۔
"یہ تو تم پہلے بھی کہہ چکی ہو!"
"یہ میرا فیصلہ ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی "اگر تم نے انہیں میرے خلاف نہ اکسایا تو جلد ہی میں یورپ کے کسی شاداب مقام پر پہنچ جاؤں گی۔"

وہ بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ ہوٹل کا ایک بیرہ/ اسرائیلی فوجی میرے کمرے میں آپہنچا۔
"صافد علی؟" اس نے آتے ہی مجھ سے سوال کیا۔
"تم غلط کمرے میں آئے ہو!" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ سپاہی نے الجھن آمیز نظروں سے بیرے کی طرف دیکھا اور پھر اس سے نظریں چرانے لگا۔
"یہ سارجنٹ میکوائے کا بھیجا ہوا آدمی معلوم ہوتا ہے۔" مجھے کو واپسی پر آمادہ پاکر ماریا خاموش نہ رہ سکی۔
"کوئی بھی ہو۔" میں نے لاپروائی سے کہا "مگر یہ کسی اور کی آواز میں ہے۔"
"تمہارا قیاس درست ہے مادام۔" سپاہی جاتے جاتے ماریا سے مخاطب ہونے کے بعد میری طرف متوجہ ہوگیا "کیا نام ہے؟" بدستور چڑھا ہوا تھا۔
"صفدر علی!" میں نے جواب دیا۔
"تو میں اور کسے پوچھ رہا ہوں؟" وہ حیرت اور غصہ کا شکار ہوگیا۔
"میری مادری زبان میں صافد علی بہت گندی گالی ہے۔ میں اس نام سے پکارا جانا بالکل پسند نہیں کرتا۔"
"اوہ۔" وہ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا "تم شاید ایرانی ہو، تلفظ کے معاملے میں مجھے تو اتنی رعایت ہونا چاہیے۔"
"نام کے معاملے میں رعایت نہیں چلتی۔"
"بہرحال۔" وہ شانے اچکا کر بولا "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"
میں خاموشی سے اٹھ گیا اور وہ سپاہی کچھ ماریا کی طرف متوجہ ہوا "آپ کا شکر گزار ہوں خاتون کہ آپ نے مجھے الجھن سے بچا لیا۔"
"یہ صرف خاتون نہیں کیپٹن ماریا ہیں!" میں نے کہا۔ ماریا اس وقت وردی میں نہیں تھی مگر اس کے لہجے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ اسرائیلی فوجی سے غیر ارادی طور پر سیلوٹ ہوگیا۔
"سارجنٹ میکوائے کہاں ہے؟" ماریا نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے اس فوجی سے دریافت کیا۔
"اپنے دفتر میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے!"
"تو کیا قافلہ وہیں سے روانہ ہوگا؟"
"اس بارے میں وہی جانتے ہیں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔
ہوٹل سے نکلتے ہوئے استقبالیہ کاؤنٹر والا ہمیں کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ ماریا کی نظر بھی میری طرف اٹھی مگر اس فوجی نے اسے فوراً پسپا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔
باہر ایک کھلی جیپ موجود تھی۔ سپاہی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔
جب تک میری نگاہیں عقب میں کام کرتی رہیں ماریا کی کار پر موجود نظر آتی رہی پھر سڑک کے پیچ و خم میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد جیپ سرسبز و شاداب چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ایک خوبصورت بیرک کے سامنے رک گئی۔ بیرک کے قریب تین فوجی ٹرک تیار کھڑے ہوئے تھے اور سائبان کے نیچے پندرہ سولہ جوان اور صحت مند لڑکے غیر فوجی لباس میں سستا رہے تھے۔
مجھے لانے والا جب ایک کمرے میں داخل ہوا تو میں نے بھی اس کی تقلید کی مگر اندر قدم رکھتے ہی ایک خونخوار غراہٹ سنائی دی جس کے نتیجے میں میں غیر یقینی طور پر نہایت پھرتی کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا۔
"تم تین نمبر کہاں مر رہے تھے؟" کمرے سے کسی کے دہاڑنے کی آواز آئی۔
"صفدر علی کو لینے گیا تھا سر!" مجھے لانے والے سپاہی کی آواز ابھری۔
"کس الو کے پٹھے نے بھیجا تھا تم کو؟ ہمارا پرمس کرنے والے کا پارہ بدستور چڑھا ہوا تھا۔
"آپ ہی نے بھیجا تھا سر!" سپاہی کے اس جواب پر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔
"میرے جوان روانگی کے لیے تیار ہیں اور تم میری جیپ لے کر غائب تھے۔ کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ نو بجے قافلہ روانہ ہونا تھا۔"
"سر آپ نے مجھے ساڑھے آٹھ بجے کارلٹن ہوٹل جانے کا حکم دیا تھا۔" وہ فوجی اپنے افسر کی بد دماغی کے مقابلے میں خاصے تحمل کا ثبوت دے رہا تھا۔
"کارلٹن ہوٹل۔" اچانک افسر کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی جیسے اچانک کوئی اہم بات یاد آگئی ہو "کہاں ہے وہ آدمی؟"
"باہر موجود ہے جناب!"
"وہاں کیوں جھک مار رہا ہے۔ اسے میرے سامنے بلاؤ۔"
میں اندر پہنچا تو ایک کرسی پر گوشت کا ایک پلپلا سا انبار رکھا ہوا تھا۔ وردی پر لگے ہوئے نشانات سے اس کا عہدہ ظاہر ہو رہا تھا جو سارجنٹ کے عہدے سے بڑا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ پورے اسرائیل میں اس وقت صرف ایک ہی سارجنٹ مجھے ایسے حاکمانہ اور ظالمانہ انداز میں اپنے حضور طلب کرنے کا مجاز تھا لہٰذا میں اسے دیکھ کر انکساری سے مسکرا دیا۔
"گڈ مارننگ سر!" میں نے اس سرخ و سفید سارجنٹ سے کہا۔
"دانت کیوں پھاڑ رہے ہو؟" وہ میز پر مکا مار کر غرایا۔
میں نے مسکینی انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اس کے اگلے بے چارگی کے مظاہرے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے دیکھنے کے بعد ہی میری سمجھ میں آیا کہ ماریا نے میری بریفنگ کرتے وقت سارجنٹ میکوائے کی بزرگی پر کیوں زور دیا تھا۔
"تمہارا نام؟" سارجنٹ میکوائے نے سوال کیا۔
"صفدر علی۔" میں نے ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی ادا نہ کیا۔
"گڈ۔" وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں یکدم یک شگفتگی آگئی تھی "مجھے تمہاری ہی آمد کا انتظار تھا۔"

میں نے جواب دینا چاہا مگر فوراً ہی چپ سادھ لی۔ سارجنٹ میکوائے کا پسینے میں بھیگا ہوا پھولا پھولا چہرہ اس کی تلون مزاجی کا اظہار کر رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میری کوئی بات دوبارہ اس کا مزاج برہم نہ کردے۔
"تمہارا سامان کہاں ہے؟" سارجنٹ میکوائے نے اپنی ناک سفید رومال سے بری طرح رگڑتے ہوئے اگلا سوال کیا۔
"تن کے لباس کے علاوہ میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔"
"یہ بہت اچھی بات ہے۔ تم باہر جاکر سائبان کے نیچے بیٹھو ہم ابھی روانہ ہونے والے ہیں۔" اس نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
میں سر جھکائے اس کمرے سے باہر آگیا۔
سائبان کے نیچے بیٹھے ہوئے تمام لڑکے جوان سال اور سفید فام تھے مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر ان میں بیشتر زیر لب مسکرانے لگے شاید وہ سارجنٹ میکوائے کے بارے میں وسیع تجربہ رکھتے تھے اور مجھے یقین تھا کہ میرے جواب انہوں نے بے شک نہ سنے ہوں مگر سارجنٹ کے سانسوں کی آواز ان تک پہنچتی رہی ہے۔
"ہیلو بوائز!" میں نے ان کے قریب پہنچ کر فضا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بے تکلفانہ انداز میں کہا اور ان کے قریب ہی کچی زمین پر بیٹھ گیا۔
"تم کرائے کے گوریلے ہو؟" ان میں سے کسی نے سوال کیا۔
"اگر ہماری منزل ایک ہی ہے تو بہت جلد تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔" میں نے پلٹ کر نرم لہجے میں کہا۔
"تم ایشیائی معلوم ہوتے ہو؟" میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک چست و چالاک لڑکے نے چیونگم چباتے ہوئے کہا "اور شاید تم ہی ہمارے ٹرینر ہوگے؟"
"ایشیائی ضرور ہوں مگر تربیت دینے نہیں، لینے جا رہا ہوں۔"
"تم تو صورت سے ہی خرانٹ گوریلے نظر آتے ہو۔" کسی نے کہا "تمہیں تربیت کی کیا ضرورت ہے؟"
ان سب کے لہجوں سے تجسس جھلک رہا تھا۔ ان کا چہچہاتا ہوا

جوان خون زندگی کا ایک نیا اور چونکا دینے والا روپ دیکھنے کے شوق میں ان کے چہروں پر چھلک رہا تھا۔ وہ چند ہی منٹ میں میرے ساتھ یوں بے تکلف ہو گئے جیسے میری ان سے برسوں کی شناسائی ہو مگر ان کے دلوں میں ایک جذبہ مشترک تھا جو شاید ان کے دلوں میں دیدہ و دانستہ ابھارا گیا تھا۔ ان کے الفاظ سے عربوں کے لہو کی پیاس ٹپک رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سارجنٹ میکوائے اپنے دفتر سے باہر آیا اور مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ وہ بہت موٹا ہونے کے باوجود کسی دبلے پتلے آدمی کی طرح پھرتی اور تیزی سے چل رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی سب لڑکے کھڑے ہو گئے۔

سارجنٹ میکوائے کے ہاتھ میں ایک فائل دبی ہوئی تھی اس نے اسے کھول کر باری باری نام پکارنا شروع کیے اور دو ٹرکوں میں آٹھ آٹھ لڑکے سوار کرا دیئے۔ تیسرے ٹرک کے عقبی حصے میں کافی سامان وغیرہ لدا ہوا تھا۔

آخر میں صرف میں اس کے مقابل کھڑا رہ گیا۔

”تم صفدر علی ہو؟“ اس نے فائل پر نظریں ڈال کر اسے بند کرتے ہوئے سوال کیا۔

”میں تمہاری تردید کی ہمت نہیں کر سکتا۔“ میں نے اس کے شگفتہ موڈ کا اندازہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”ویری گڈ!“ اس کا وزنی ہاتھ پوری قوت سے میرے بائیں شانے پر پڑا اور وہ قہقہہ مارتے ہوئے مجھے اسی طرح اپنے ساتھ لے گیا۔

پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا لیا جس کے بونٹ پر مخصوص نشان والا ایک نیلا پرچم لہرا رہا تھا۔ جو شاید فوجی روایات کے مطابق اس کارواں کی نوعیت اور منزل کی نشاندہی کرتا تھا۔

سارجنٹ میکوائے کا اشارہ پا کر قریب کھڑے ہوئے سنتری نے سیٹی بجائی اور جیپ کے ساتھ ہی تینوں ٹرکوں کے انجن بیدار ہو گئے۔

چند ثانیوں کے بعد سارجنٹ میکوائے کی قیادت میں وہ فوجی قافلہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

”تم ایک بہت بڑی مہم پر جا رہے ہو۔“ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میکوائے بولا۔ ”کچھ سنسنی سی محسوس ہو رہی ہے نا؟“

”تجسس ضرور ہے۔“

”شام کا دھندلکا پھیلنے سے پہلے تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔“ وہ اپنی بے ہنگم آواز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں اسلیئے ساتھ بٹھایا ہے کہ پورے گروپ میں بس تم ہی مجھے پختہ ذہن کے مالک نظر آئے ہو ورنہ باقی سب اٹھارہ سے بائیس سال تک کے جوشیلے لڑکے ہیں جو اپنی مذہبی

ریاست کے نام پر سر کٹانے کے لئے تیار ہیں۔“

”تم میرے افسر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میری کوئی بے تکلفانہ گو بری لگ جائے۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ارے میں کسی بات کا برا نہیں مانتا۔“ وہ قہقہہ مار کر بولا۔

”افسر اور ماتحت کے درمیان فاصلہ برقرار رہنا ضروری...“

”میں ایسی افسری کا قائل نہیں ہوں۔“

”مگر میں تمہارے خطرناک تیور دیکھ چکا ہوں۔“

”ارے وہ تو میرا پیشہ ورانہ راز ہے۔“ وہ ترنگ میں آ کر... بے موقع بپھرتے رہنے سے افسری کی شان دوبالا ہو جاتی ہے... ماتحت بھی ہر وقت سہمے رہتے ہیں۔“

”یہ راز تم نے میرے سامنے کیوں اگل دیا؟“

”اس لئے کہ تم میرے عارضی ماتحت ہو۔ تربیت ختم ہو... اسرائیل سے باہر بھیج دیئے جاؤ گے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ تم... کو دل چاہتا ہے۔“

”آخر تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو؟“ میں نے...

”تمہارے جو کوائف مجھ تک پہنچے ہیں۔ بہت دلچسپ... پہلا موقع ہے کہ کوئی ہندوستانی غیر یہودی باشندہ یہاں... تربیت پر جا رہا ہے!“

”ایسا نہ ہو کہ واپسی پر یہ بیچارہ ہندوستانی غیر یہودی... ساتھ نہ ہو۔“ اس کی شہہ پا کر میں بھی بے تکلفی پر اتر آیا۔

”تو تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں مار کر کہیں دبا دوں گا؟“

”زیادہ غصہ آیا تو شاید دبانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرو...“

”اگر تم نے دوسروں کے سامنے میرے درجے کا لحاظ... یہ مرحلہ کبھی نہیں آئے گا۔“ وہ اپنی جیب سے امریکی سگریٹ... نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”فکر نہ کرو، دوسروں کے سامنے تم مجھے اپنا غلام پاؤ گے۔“

سارجنٹ میکوائے بے تکان باتیں کرتا رہا اور ...

تل ابیب کو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس کی مضافاتی بستیاں بھی پیچھے رہ گئی تھیں اور کارواں کم و بیش شمال کی طرف جا رہا تھا۔ جب میکوائے کو جیپ ڈرائیو کرتے دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اس نے... کنارے جیپ روک دی۔ پیچھے آنے والے فوجی ٹرک بھی... پیچھے ایک قطار کی صورت میں رک گئے۔

میں سمجھ گیا کہ اب میکوائے آرام کرنا چاہتا ہے لہٰذا میں اپنی نشست سے نیچے آ گیا اور سارجنٹ میکوائے کے اتر... اس کی جگہ سنبھال لی۔

”بھاگ نہ جانا، میں پیشاب کر کے آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ... سے نیچے ڈھلان میں اُگی ہوئی جھاڑیوں میں اترتا چلا گیا۔

جوں ہی وہ جھاڑیوں میں روپوش ہوا کسی شریر لڑکے نے سیٹی بجائی اور پھر فضا ان سب کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔

ان آوازوں میں زندگی کی رونق رچی ہوئی تھی مگر میرا دل یک بیک اداس ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ کچے ذہنوں کے یہ نوجوان لڑکے جب چند ہفتوں بعد تربیت سے واپس لوٹیں گے تو ان میں سے ہر ایک سفاک درندہ بن چکا ہو گا جس کے سامنے انسانی زندگی اور انسانی لہو کی کوئی قیمت نہ ہو گی اور پھر یہ سدھائے ہوئے جنگی قزاق عربوں میں موت کی تقسیم پر مامور کر دیئے جائیں گے۔

ٹرکوں سے اتر کر کئی لڑکے سارجنٹ میکوائے کی تقلید میں گئے۔ پھر نیچے اتر کر خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ دو لڑکے میری طرف بھی آئے مگر میں ان کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ اس وقت میرے ذہن میں خیالات کی آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

سارجنٹ میکوائے کی واپسی پر دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔

دوپہر کے قریب ایک چھوٹی سی بستی سے گزرتے ہوئے ذیلی سڑک پر دو فوجی ٹرک نظر آئے جن کی رہنمائی میں کارواں ایک عارضی پڑاؤ پر پہنچا جو ایک حویلی نما مکان میں ڈالا گیا تھا۔ وہاں پہلے سے ایک لیفٹیننٹ کی سربراہی میں دس نفری فوجی ٹولی مقیم تھی اور ان لوگوں نے ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

وہاں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر ہم اپنی راہ پر ہو لیئے۔

اس سفر میں ہم نے دریائے یرقون عبور کیا۔ نطانیہ کے نواح سے گزرے، خدیدہ کی بستی عبور کی، پھر جب ایک جگہ میں نے نظارت نامی شہر کے نام کا بورڈ دیکھا تو میں چونک پڑا۔ یہ شہر اسرائیل کے شمالی علاقے میں کہیں واقع ہے اور نظارت پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ مزید چند گھنٹوں کا سفر ہمیں شامی سرحد کے قریب پہنچا دے گا۔

”مدھیہ پھیل رہا ہے سارجنٹ!“ میں نے آہستہ سے کہا۔ مسلسل اور سفر کی صعوبت سے اعصاب پر تکان طاری ہوتی جا رہی ہے ہم کب تک یونہی چلتے رہیں گے؟“

”منزل قریب آ گئی ہے۔ ایک گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس طویل سفر نے اس کی زندہ دلی بھی چھین لی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہمیں سڑک کے کنارے جا بجا فوجی علامات نظر آنے لگیں۔ اس کے ساتھ بھاری فوجی ٹرکوں کی نقل و حرکت بھی نظر آئی۔

ایک گاؤں کے قریب سارجنٹ میکوائے نے جیپ دائیں جانب کچے ریتیلے راستے پر اتار دی۔ شام کے دھندلکے میں سامنے دور تک صحرا کی ریت پھیلی ہوئی تھی اور خاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بے پناہ تکان کے عالم میں صحرا کی خنک ہوا لوریاں دے دے کر سلانے پر تلی ہوئی تھی۔ مگر میں مسلسل سگریٹیں پی کر نیند کو بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر خودرو اور خاردار جھاڑیوں نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور ہر طرف ریت ہی ریت نظر آنے لگی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم ریت کے سمندر میں کسی سمت کے احساس کے بغیر چلے جا رہے ہوں مگر یہ محض میرا قیاس تھا ورنہ سارجنٹ میکوائے کی نگاہیں بار بار سوئی قطب نما کا جائزہ لے رہی تھیں اور آخر کار ہمیں صحرا میں کافی دور چند روشن دھبے نظر آنے لگے جو بتدریج واضح ہوتے جا رہے تھے۔

”یہ روشنیاں کیسی ہیں سارجنٹ؟“

”یہی ہماری منزل ہے۔“ منزل قریب پا کر وہ تازہ دم ہو گیا ”اس کیمپ سے شامی سرحد صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔“

”بہت خطرناک فاصلہ ہے!“ میں نے پھریری لے کر کہا۔

”یہ جنگ سے پہلے کی بات ہے۔ جون ۱۹۶۷ میں جولان کی پہاڑیوں پر قبضے کے بعد شامی بہت دور دھکیلے جا چکے ہیں ان کی پہلی دفاعی لائن اب پہاڑیوں کے اس پار پرانی سرحد سے کم از کم دس کلومیٹر دور ہے۔“

”یہ کیمپ جنگ کے بعد ہی قائم کیا گیا ہو گا؟“

”ہاں! یہاں گرم صحرائی علاقوں کا بہترین ماحول مل جاتا ہے“ ”مگر آج تو موسم بہت خوشگوار ہے۔“

”یہ میں دو دن بعد پوچھوں گا۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”ہم لوگوں کی تربیت تمہاری نگرانی میں ہو گی؟“

”تم سب کو یہاں پہنچانے کے بعد عملاً میرا کام ختم ہو جائے گا اس کیمپ کا نگران بریگیڈیئر ہولڈن ہے۔“

”بریگیڈیئر؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ایک معمولی تربیتی کیمپ میں ایسے اعلیٰ افسر کو ضائع کیا جا رہا ہے!“

”معمولی نہیں، یہ بہت اہم کیمپ ہے برخوردار!“ وہ صحرائی پگڈنڈی پر جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”یہاں سے آدمی کندن بن کر ہی نکلتا ہے۔“

”لڑکیاں ہوتی ہیں یہاں؟“

”آبادی کم ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے۔“ وہ زوردار قہقہہ مار کر بولا۔ ”اسرائیلی فوج کے ہر شعبے میں تمہیں لڑکیاں ملیں گی۔ ان کی موجودگی سے لڑکوں کا مورال خاصا بلند رہتا ہے اور ہر شخص کوئی نہ کوئی کارنامہ دکھانے کے چکر میں لگا رہتا ہے۔“

”یہ تو بڑی فطری بات ہے۔“

اسی دوران میں جیپ ایک رسمی رکاوٹ کے سامنے ٹھہر گئی قریب ہی بنے ہوئے چوبی کیبن میں سے دو مسلح گارڈز تار چیں چمکاتے ہوئے ہماری طرف آئے اور سارجنٹ میکوائے انہیں کچھ کاغذات

دکھانے لگا۔

اس چیک پوسٹ پر قافلہ خلافِ توقع خاصی دیر رکا رہا۔ جب تک فہرست کے مطابق ہر شخص کو چیک نہیں کیا گیا ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت نہ مل سکی۔

جب یہ مختصر سا فوجی کارواں آگے سرکا تو میری رسٹ واچ رات کے ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔

چیک پوسٹ سے آگے ایک وسیع ریتیلا میدان پھیلا ہوا تھا اس سے آگے بڑے بڑے پہیوں اور آہنی فریموں پر بنے ہوئے وسیع چوبی کیبن قطار در قطار خاصے بڑے رقبے میں خاص ترتیب سے ایستادہ تھے جنہیں کسی ٹرک کے پیچھے ہک سے باندھ کر باآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔

ان چوبی کیبنوں میں سے بعض کی کھڑکیاں روشن تھیں اور باہر بھی ریت پر گڑے ہوئے چوبی ستونوں پر اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ ان کیبنوں سے کچھ دور ایک بڑا صحرائی ٹریلر کھڑا ہوا تھا جہاں تیز روشنیوں میں اکا دکا متحرک انسانی ہیولے بھی نظر آ رہے تھے اور ساتھ ہی کسی طاقتور ڈیزل انجن کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اس ٹریلر پر کوئی ڈیوہیکل ڈیزل جنریٹر نصب ہے جو اس مختصر سی صحرائی بستی کی برقی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہر دم چلتا رہتا ہوگا۔

ایک دوسرے سے ملے ہوئے دو ڈیوہیکل چوبی کیبنوں کے سامنے اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں تین فوجی افسر کھڑے ہوئے تھے۔

سارجنٹ میکوائے نے اپنی جیپ ان کے سامنے روک دی اور پھرتی سے نیچے اتر کر سیلوٹ کیا اور اٹینشن ہو کر کھڑا ہو گیا۔

پیچھے آنے والے تینوں ٹرک بھی رک چکے تھے ان کا عملہ بھی میکوائے کے پیچھے صف آرا ہو گیا اور تربیت کے لئے آنے والے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔

ان تینوں میں عہدے کے اعتبار سے دو کیپٹن تھے اور تیسرا میکوائے کا ہم عہدہ تھا۔

"یہ سارجنٹ اولڈ ہے۔" ایک کیپٹن نے سارجنٹ میکوائے سے کہا۔ "یہاں تم لوگوں کی دیکھ بھال کی براہِ راست ذمہ داری اسی پر ہوگی۔"

"اوکے سر!" سارجنٹ میکوائے نے سراپا احترام بن کر کہا اور پھر جیب سے چند فائلوں کا انبار نکال کر اس کیپٹن کے حوالے کر دیا۔

دونوں کیپٹن فائلیں سنبھالے اندر چلے گئے۔

دروازہ بند ہونے تک وہ دونوں مشینی انداز میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے رہے پھر دروازہ بند ہوتے ہی دونوں بیک وقت ایک دوسرے کی طرف لپکے اور بڑے جوشیلے انداز میں ایک دوسرے سے باہم بغلگیر ہو گئے۔ ٹرکوں کا عملہ ٹرک خالی کرنے ...

"تم یہاں کب آئے؟" رسمی فقروں کے تبادلے ... میکوائے نے اپنے پرانے دوست سے سوال کیا۔

"امریکی فضائیہ سے ریلیز ملتے ہی اس ... کا آرڈر ... پہلے ہی یہاں آ گیا۔ ویسے بھی میرے لئے فالتو بیٹھے رہنا ..."

"تو تم یہاں انسٹرکٹر ہو؟"

"میرا تقرر تو اسی حیثیت میں ہوا ہے۔"

پھر میکوائے نے مجھ پر اتنی مہربانی کی کہ نہایت ... سارجنٹ اولڈ سے میرا تعارف کرایا اور وہ مجھ سے خلوص ...

"یہاں اس مرتبہ دل بستگی کا بھی کوئی سامان ہے؟" آنکھ دبا کر رازدارانہ لہجے میں اولڈ سے پوچھا۔

"دو زبردست لڑکیاں ہیں۔" اولڈ سگار سلگاتے ...

"دونوں ہی بلا کی طرار ہیں اور ہاتھ نہیں رکھنے دیتیں ... افسران سے لفٹ ملنے کے باعث ہم لوگوں سے رکھائی ... ہیں ورنہ پہلے تو بات ہی دوسری تھی۔"

"جولیا اور کیتھی کی بات تو نہیں کر رہے؟"

"ہاں ہاں، وہی۔" سارجنٹ اولڈ بے تابانہ لہجے میں بولا ... کے ناموں سے کیسے واقف ہو؟"

"میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔" وہ معنی خیز لہجے میں ...

"تب تو ناموں سے آگے بھی تمہیں بہت کچھ معلوم ..." اولڈ حریصانہ انداز میں قہقہہ لگا کر بولا۔

"تم دیکھنا کہ اب وہ ہر وقت میرے کیبن کا طواف ..."

اسی وقت اچانک اولڈ کو میرا خیال آ گیا اور وہ خشک ...

"تم ان لڑکیوں سے دور رہو گے تربیت کے دوران یہاں ... ترین پابندی کرائی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جیب میں ... کرنے لگا۔

"تم فکر نہ کرو یہ بہت فرمانبردار لڑکا ہے۔" سارجنٹ ... آنکھ مار کر سارجنٹ اولڈ سے بولا۔

اسی اثنا میں ٹرک خالی کیے جا چکے تھے میکوائے ... ٹرکوں کے ساتھ آنے والے عملے کو ہدایات دینے لگا اور ... تربیت کے لئے وہاں آنے والوں کو ساتھ لے کر کیبن ...

دو چوبی کیبن اندر سے خاصے آرام دہ تھے۔ ... کے عقبی دروازے ہٹا کر انہیں اس طرح جوڑ دیا گیا تھا ... وہ ایک طویل ہال نظر آتا تھا۔ جس میں ایک سرے سے دو ... تک صاف ستھرے بستر لگے ہوئے تھے اور سرہانے ... ہر مسہری کے ساتھ ایک چھوٹی سی الماری موجود تھی ...

میرے سامنے دونوں کیپٹن اسی چوبی ہال سے ...

مگر اس وقت ان دونوں کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔ داخلی دروازے کے مقابل ایک اور دروازہ بھی تھا جس کی وجہ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ادھر سے نکل کر اپنے کیبن میں چلے گئے ہوں گے سارجنٹ میکوائے کی آمد پر ہر شخص کو بستر الاٹ کر دیا گیا اس کے بعد بھی وہاں تین بستر خالی رہے۔

اپنا سامان وغیرہ وہاں رکھنے کے بعد سب لوگوں کو مقابل والے دروازے سے باہر لے جایا گیا۔ تو پتہ چلا کہ اس طرف بھی کئی رہائشی کیبن ہیں۔ ان ہی میں سے ایک میں باورچی خانہ اور کھانے کی جگہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔

طویل سفر سے سب کے حال ابتر تھے لہٰذا کھانا لگتے ہی سب اس پر بری طرح ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے دوران ہی سارجنٹ میکوائے اٹھ کر باورچی خانہ میں گیا اور میں نے اسے ریفریجریٹر میں سے شیمپین کی ایک بوتل نکالتے ہوئے دیکھ لیا۔

کھانے سے فراغت پاتے ہی سب لوگوں کو بستروں پر جانے کا نادر شاہی حکم مل گیا مگر اولڈ اور میکوائے وہیں جمے رہے۔

وہاں پہنچتے ہی ایک لڑکے نے اپنے تھیلے سے ماؤتھ آرگن نکال لیا اور بجانے لگا۔ تین چار لڑکے جو اس کے دوست معلوم ہوتے تھے اس انداز میں اس کے گرد جمع ہو گئے جیسے وہ لوگ ساری رات اسی طرح ہی گزارنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

چند تھکے ہوئے چہروں پر اس شور کے نتیجے میں ناگواری کی علامات نظر آ رہی تھیں مگر بے فکرے دوسروں کو خاطر میں لاتے نظر نہیں آ رہے تھے اور میں خود بھی ان سے الجھنے کے نتائج کا جائزہ لینے میں مصروف تھا مگر یہ ہنگامہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔

اچانک ہی چوبی ہال کا عقبی دروازہ کھلا اور سارجنٹ اولڈ کسی زخمی درندے کی طرح غراتا ہوا اندر گھس آیا۔

اس کی آنکھوں سے ہلکا سا خمار جھلک رہا تھا مگر اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ اس نے فی البدیہہ ایسی ایسی گالیاں دینا شروع کر دیں جن پر تھوڑا سا غور کرنے سے آدمی کا پتہ پانی ہو جائے پھر وہ چنگھاڑتا ہوا آگے لپکا اور دائیں ہاتھ سے ماؤتھ آرگن بجانے والے کا گریبان پکڑ کر اسے مسہری سے نیچے پھینک دیا۔

اس کے ہاتھ سے ماؤتھ آرگن فرش پر گرا جسے اولڈ نے اپنے وزنی جوتے سے بری طرح کچل دیا اور فاتحانہ غصے کے ساتھ بولا۔ "اب اگر تم لوگوں نے اپنا میراثی پن کا اظہار کیا تو میں تمہاری کھوپڑیوں کو بھی اسی طرح پچکا دوں گا۔"

اس وقت تک موسیقار اپنے کپڑے جھاڑ کر فرش سے اٹھ چکا تھا گو اولڈ کے تیور بہت خطرناک تھے مگر وہ بھی کچھ کم تندی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تو ہمیں یہاں کسی بھی تفریح کی اجازت نہیں ہے؟"

سارجنٹ اولڈ پیچ و تاب کھا کر اس کی طرف گھوما اور پھر اسے تفریح کا ایک نہایت ظالمانہ اور فحش طریقہ بتا ڈالا۔ اس لڑکے نے بہت ضبط سے کام لیا مگر پھر بھی اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کر گزر گئی۔ جو اولڈ کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اور اس نے پھر اس لڑکے کے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے نسب کے بارے میں بلند آواز میں دہاڑنا شروع کر دیا۔

سارجنٹ اولڈ وہاں کافی دیر تک دہاڑتا رہا۔ اس کے کڑے رویے کو ان سب لوگوں نے دل ہی دل میں سراہا جو شدید تکان کے باعث فوراً سو جانا چاہتے تھے۔

آخر میں وہ یہ تادیب کر کے چلا گیا کہ اگر کسی نے دوبارہ کوئی حرکت کی تو پورے گروپ کو وہ رات کھلے آسمان تلے صحرائی ریت میں بسر کرنا پڑے گی۔

سارجنٹ میکوائے جی ٹی فور پہنچنے کے بعد پورے گروپ سے لاتعلق رہنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے وہاں چھٹیاں منانے بھیجا گیا ہو۔

پہلے دن سب لوگوں کو فوجی وردیاں فراہم کر دی گئیں یہ ابتدائی عرصہ جسمانی ورزشوں، اچھل کود اور پریڈ کے قواعد کی تربیت میں صرف ہونا تھا۔ اس دوران کیتھی اور جولیا کے دیدار بھی ہوئے ویسے تو وہاں اور بھی لڑکیاں کام کرتی تھیں جن میں لیفٹیننٹ ڈی میلو کو قدرت نے بے پناہ حسن سے نوازا تھا مگر سب ہی اتنے رکھ رکھاؤ سے کام لیتی تھیں کہ کسی کو پیش دستی کی ہمت ہی نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ کیتھی اور جولیا کا انداز مختلف تھا۔

وہ مردوں کو ایسی مسکراتی اور چیلنج کرتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ ہمت ہو تو ہمیں زیر کر کے دکھاؤ۔ وہ دونوں ہی جی ٹی فور کے سویلین عملے سے متعلق تھیں اور انہوں نے اپنی مخصوص یونیفارم میں قطع و برید کر کے جسمانی زاویوں کی تسلی بخش نمائش کا خاصا انتظام کر لیا تھا۔ ان کے جسم ہر وقت تیز اور بھڑکا دینے والی خوشبوؤں میں بسے رہتے تھے۔ اور وہ جدھر سے گزر جاتی تھیں، لوگ دیر تک فضا میں اونٹ کی طرح گردن اٹھائے گہرے گہرے سانس لیتے رہتے تھے۔

پانچویں شام میں ڈرل وغیرہ سے فارغ ہو کر آیا تو پتہ چلا کہ کسی وجہ سے جی ٹی فور میں پانی لانے والا کارواں نہیں پہنچا لہٰذا میں نہانے کا ارادہ ترک کر کے دو لڑکوں کے ساتھ چہل قدمی کے لئے نکل گیا۔

گھومتے گھامتے ہم لوگ خاصی دور ویران ریتیلے علاقے میں نکل گئے اور سورج ڈوبنے کے بعد ہم واپس روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک جگہ ایک جیپ کا ہیولہ نظر آیا۔

ہم لوگ تجسس کے پیش نظر اسی طرف ہو لئے۔ مگر ہم جیپ سے

تھوڑے فاصلے پر ہی تھے کہ ادھر سے کسی نے ہمیں دیکھ لیا اور پھر فضا میں سارجنٹ میکوائے کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون آرہا ہے ادھر؟ وہیں رک جاؤ؟"

تینوں کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔

"کوئی گڑبڑ معلوم ہوتا ہے" میرے ایک ساتھی نے کہا۔

"چلو آگے چلتے ہیں" میں نے انہیں تنبیہہ دی حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی بھی کسی قیمت پر میکوائے کی حکم عدولی نہیں کرے گا۔

"ہم تو ہرگز ادھر نہیں جائیں گے"

"مگر میں ضرور جاؤں گا۔!"

"تو ہمیں دُور نکل جانے دو۔ پھر جو جی میں آئے کرنا۔"

قدرے بحث کے بعد وہ چلے گئے۔ جب ان کے ہیولے تاریکی میں معدوم ہو گئے تو میں آگے بڑھنے لگا۔ جیپ میں سناٹا طاری تھا۔

"کون ہے؟" اچانک ادھر سے میکوائے کی آواز پھر سنائی دی

"صفدر!" میں نے اتنی اونچی آواز میں کہا کہ وہ میرا جواب سن لے۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ واپس جاؤ" وہ غضبیلی آواز میں بولا۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ سارجنٹ۔" میں نے رکے بغیر کہا۔

"مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں، دفع ہو جاؤ ورنہ میں شوٹ کر دوں گا۔" وہ جھلا کر بولا۔

"مجھے پتہ ہے تمہاری جیپ ریت میں دھنس گئی ہے۔ میری مدد کے بغیر تم اسے نہ نکال سکو گے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"بہت ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے" اندھیرے میں دھیمی نسوانی آواز سنائی دی۔

"شام بخیر مس جولیا!" میں نے اس کی آواز پہچان کر مسرت آمیز لہجہ میں کہا۔

"شام بخیر!" ادھر سے بلند آواز میں جواب ملا۔ "تم واپس ہی لوٹ جاؤ تو بہتر ہے ورنہ سارجنٹ اپنا بھرا ہوا پستول نکالے تمہارا انتظار کر رہا ہے!"

"مشورے کا شکریہ مس جولیا! میں واپس جا رہا ہوں" یہ کہہ کر میں واپس ہو لیا۔ مجھے میکوائے سے کسی بھی احمقانہ حرکت کی توقع تھی۔ اور اگر وہ واقعی فائر کر دیتا تو میرے اور اس کے درمیان دائمی تلخی پیدا ہو جاتی۔

"واپس نہیں، ادھر میرے پاس آؤ" میرے واپس چلتے ہی سارجنٹ میکوائے کی غصہ آلود آواز ابھری۔

"گولی تو نہیں مار دو گے؟"

"گولی کے بچے!" وہ شاید دانت پیس کر بولا تھا۔ "اگر تم نے کسی سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔"

"بہت بہتر!" میں نے نیم مردہ آواز میں کہا۔ "[illegible] چلا جاؤں۔"

"ہاں دفع ہو جاؤ۔"

میں دم دبائے وہاں سے واپس ہو لیا۔

اگلے روز کیتھی خود ہی مجھ سے آ ٹکرائی اور [illegible] "کیا روز تمہارا نام صفدر علی ہے۔ نا؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے خوشگوار حیرت کے ساتھ [illegible]

"جولیا نے تمہارا ذکر کیا تھا" وہ میرا بازو تھام کر [illegible] لے جاتے ہوئے بولی۔ "وہ موٹا سارجنٹ بالکل [illegible] ہوا ہے!"

"مگر وہ کہتا ہے کہ اس کے تم دونوں سے [illegible] ہیں۔" میں نے لفظ خصوصی پر زور دے کر کہا۔

"بکواس کرتا ہے!" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ "ہم تو [illegible] کے لئے آلہ کار بنائے تھے۔"

"بات ایک ہی ہے۔ وہ سمجھتا ہو گا کہ اس نے تمہیں اپنی [illegible] لئے آلہ کار بنایا ہوا ہے۔ خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزہ پر بات تو ایک ہی ہے!"

"تم گدھے ہو" وہ جھلا کر بولی۔

"ایسی بے تکلفی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ تین چار پیگ پی کر کسی کچھوے سے بھی [illegible] ہو جاتا ہے۔ پھر باتیں مزیدار کرتا ہے۔ ہمارے تعلقات اس حد [illegible]"

"پھر بھلا جولیا اندھیری رات میں اس کے ساتھ [illegible] باتیں کرنے گئی تھی!"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا، حالات خود [illegible]"

"پچھلی رات وہ چند پیگ پی کر سیٹ پر ہی [illegible] جولیا جیپ ڈرائیو کر کے اسے واپس لائی تھی۔ [illegible] ہو تو سنو کہ وہ عورتوں کے لئے قطعی بے ضرر ہے۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں۔ اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کے [illegible] وہ ہر [illegible] کے بارے میں کوئی بے ہودہ کہانی تراش لیتا ہے جو [illegible] بے تکلف رہی ہو۔"

"مگر تم مجھے کہاں لئے جا رہی ہو؟"

"عجیب بد ذوق آدمی ہو" وہ چڑچڑے [illegible] بولی۔ [illegible] اندازہ تھا کہ تم بہت زندہ دل ہو اور میری دعوت [illegible]

"اوہ! تو تم مجھے دعوت میں لے جا رہی [illegible]"

کے ساتھ کہا۔

اسی وقت کیتھی کا کیبن آگیا اور وہ مجھے ساتھ لے کر اندر گھس گئی۔ وہاں جولیا پہلے سے سارجنٹ میکوائے کے ہمراہ موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر میکوائے اس طرح چونکا جیسے میری آمد اس کے لئے غیر متوقع رہی ہو۔

"تو یہ ہے تمہارا نیا مہمان — جس کے بارے میں تم جوش و خروش کا اظہار کر رہی تھیں" سارجنٹ میکوائے نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"خاصا دلکش نوجوان ہے" کیتھی نے مسکرا کر کہا۔

"اگر سارجنٹ اولڈ کو تمہاری اس حرکت کا علم ہو گیا تو وہ تمہاری کھال کھینچ لے گا" اس بار میکوائے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کیتھی مجھے زبردستی یہاں لائی ہے"

"کیا جی۔ٹی۔فور میں کوئی مرد باقی نہ رہا جو تم اس رنگروٹ کو لائی ہو" میکوائے کو میری وہاں موجودگی سخت ناگوار گزر رہی تھی۔

"تین چار پیگ کے بعد ہر ایک کی مردانگی رفو چکر ہو جاتی ہے" کیتھی نے اس پر گہرا طنز کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ یہاں چند دن کا مہمان ہے۔ یہاں کام کرنے والوں کو منہ لگایا جائے تو وہ گلے کا ہار بن جاتے ہیں۔"

کیتھی کا تبصرہ سن کر میکوائے کا چہرہ اتر گیا اور اس نے فوراً ہی خاموشی سادھ لی۔

پھر وہاں شراب کا دور شروع ہوا۔ ہم چاروں کی رفتار خاصی سست تھی۔ میکوائے نے دوسرے پیگ میں چہکنا شروع کر دیا۔ چوتھا پیگ حلق سے اتارنے کے بعد وہ پرواز بینچ پر دراز ہو گیا اور مزید ایک پیگ نے اسے بالکل ناکارہ کر دیا۔

کیتھی نے مجھے اشارہ کیا اور ہم تینوں میکوائے کو وہیں چھوڑ کر اندرونی کمرے میں چلے گئے جہاں ان دونوں کے بستر موجود تھے۔

"اب وہ صبح تک بے سدھ پڑا بڑبڑاتا رہے گا" کیتھی خوابگاہ میں نیا گلاس تیار کرتے ہوئے بولی۔ "اور پھر سارجنٹ اولڈ کو اپنی غیر حاضری کے بارے میں کوئی ایسی پھڑکتی ہوئی کہانی سنائے گا کہ ہمیں دیکھ دیکھ کر وہ اپنے مقدر کو کوسے گا۔"

پھر وہاں خورد و نوش کا دور چلا اور سرور کے عالم میں وہ دونوں لڑکیاں تیزی کے ساتھ مجھ سے بے تکلف ہوتی چلی گئیں۔ مگر انہوں نے حد سے زیادہ بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ صبح چار بجے جب جولیا سو گئی تو کیتھی جامے سے باہر ہو گئی۔ اس کی تشنگی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ آزاد خیال ضرور تھی مگر اتنی بے راہرو نہیں تھی جتنا اس کا شہرہ تھا۔ اگر وہ اسی قدر رنگین مزاج ہوتی تو میرے ساتھ اس کے رویے میں ایسی بے ساختگی اور دیدہ دلیری نہ ہوتی۔

جی۔ٹی۔فور میں اپنی دانست میں میں نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی مگر مجھے اس کا خمیازہ یوں ادا کرنا پڑا کہ میرے وہاں قیام کی مدت مختصر ترین کر دی گئی۔ ابتدائی پروگرام کے مطابق مجھے آخری گروپ کے ساتھ کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہونا تھا مگر کیتھی کو جیت لینے کے فوراً بعد ہی میرا نام پہلے گروپ میں شامل کر دیا گیا۔

سارجنٹ میکوائے کے بدلے ہوئے رویے کی وجہ سے مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا کہ وہ تبدیلی میکوائے کے ایما پر کی گئی تھی۔

جی۔ٹی۔فور سے تین گھنٹے کی مشقت آمیز صحرائی مسافت پیدل طے کی گئی۔ گروپ میں کل چار لڑکے تھے اور ہر ایک کی پشت پر ستر پونڈ وزنی کِٹ لدی ہوئی تھی جس میں سفری ضروریات کا لازمی سامان موجود تھا۔ گروپ کی رہنمائی اور قیادت ایک اسرائیلی فوجی کر رہا تھا۔

ان دنوں موسم خاصا بہتر تھا لیکن صحرا میں دن کی گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ ہر طرف لہریئے دار ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا یا چھوٹی چھوٹی بنجر، پتھریلی پہاڑیاں۔

میں تو ممبئی سے الشیوخ پہنچنے تک ایک بار صحرائی عقوبتیں جھیل چکا تھا لہٰذا وہ سفر میرے لئے اتنا اذیت ناک ثابت نہ ہوا مگر دوسرے تین لڑکوں کی حالت بہت ابتر ہو گئی۔

آخر کار تپتی ہوئی دوپہر میں ہم لوگ ایک لق و دق ریگزار میں پہنچے جہاں زمین سے اٹھتی ہوئی گرمی کی لہروں کے باعث سراب کا منظر ہر طرف دکھائی دے رہا تھا۔

اس مقام پر ایک جگہ چند چھولداریاں نصب تھیں جن سے قدرے فاصلے پر سیمنٹ کی چادروں اور آہنی فریم سے ایک بڑا سا چوکور کمرہ بنا ہوا تھا۔

ہمیں لے جانے والے سپاہی کو شاید دُور ہی سے دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ ایک چھولداری کے دروازے پر کوئی افسر ہمارا منتظر تھا۔

وہاں پتہ چلا کہ جی۔ٹی۔فور اصل میں ابتدائی کیمپ ہے۔ اصل تربیتی کیمپ وہی تھا جہاں ہمیں چھولداریوں میں رہنا تھا۔

اس مقام کا نام ایس۔او۔ڈی تھا جسے وہ لوگ ملا کر سوڈ کہا کرتے تھے اور اس کی ظاہری ہیئت سے آنے والے دنوں کی سختی کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

سوڈ پر کل چار نفری عملہ متعین تھا جس کا سربراہ میجر موریسن تھا۔

ہم چاروں کی حالت زار دیکھ کر وہ دل کھول کر ہنسا اور ہمیں مژدہ سنایا کہ تربیتی پروگرام فوری طور پر شروع کیا جانے والا تھا مگر ہماری خستہ حالی کے پیش نظر اسے اگلے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔

شام کا خنک دھندلکا پھیلنے پر ہمیں لانے والا تنہا واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

رات کے وقت کئی مرتبہ فضا میں ہیلی کاپٹروں کا تیز شور سنائی دیا اور ہم لوگ باہر نکل آئے۔ ہیلی کاپٹر عین ہمارے کیمپ کے اوپر اتنی نیچی پرواز کرتے ہوئے گزرے کہ ان کی پنکھڑیوں کے عمودی

دباؤ سے نہ صرف چھولداریاں ہلنے لگیں بلکہ فضا میں بھی غبار کا طوفان امڈ آیا۔ میجر موریسین نے بتایا کہ وہ ہیلی کاپٹر اسرائیل کے سرحدی مورچوں کی دیکھ بھال پر مامور تھے جو سوڈ سے صرف دو میل کے فاصلے پر شامی علاقے میں جولان کی پہاڑیوں پر قائم تھے۔

اگلے روز ہماری تربیت کی ابتدا نہایت ہولناک طریقے پر ہوئی اور ہمیں سیمنٹ کی چادروں سے بنے ہوئے بغیر چھت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس کے فرش پر نرم ریت کی کئی فٹ موٹی تہہ بچھی ہوئی تھی۔ ہمیں سب سے پہلے بدترین صحرائی موسم میں بھوک اور پیاس کی حالت میں اپنی قوتِ مزاحمت میں اس حد تک اضافہ کرنا تھا کہ کم از کم بچاس گھنٹے بھوکے پیاسے سفر جاری رکھ سکیں۔

اس کمرے کے فرش پر ریت کی موٹی تہہ کے نیچے آہنی چادریں بچھی ہوئی تھیں جن کے نیچے طاقتور برقی ہیٹر نصب تھے جو بتدریج ریت کو اس قدر گرم کر دیتے تھے کہ ریت پر قدم رکھنا محال ہو جاتا تھا۔ میجر موریسین کے بیان کے مطابق ریتیلی سطح کا درجۂ حرارت مصر اور شام کے صحراؤں میں جون اور جولائی کے خشک موسمی حالات کے مطابق رکھا گیا تھا۔

اس کے علاوہ آہنی ستونوں کے ساتھ جالیوں والے قوی ہیکل پنکھے نصب تھے جو اس کمرے میں آندھی پیدا کر دیتے تھے۔ ان برقی آلات کو توانائی فراہم کرنے کے لئے وہاں جنریٹر موجود تھا مگر اس سے کوئی تیسرا کام نہیں لیا جاتا تھا۔

روشنی وغیرہ کے لئے مومی شمعوں یا مشعلوں پر انحصار کیا جاتا تھا۔ کھانا پکانے کے لئے مٹی کے تیل کے سفری چولہے فراہم کئے گئے تھے اور ہر شخص کو اپنا کھانا خود تیار کرنا ہوتا تھا۔

اس کمرے میں ہماری بریفنگ کے دوران میجر موریسین نے ہمیں کمرے میں اس وقت تک مسلسل دوڑتے رہنے کا حکم دیا جب تک وہ خود آکر رکنے کو نہ کہے۔۔۔ اور پھر وہ چلا گیا۔

چند ثانیوں بعد باہر سے جنریٹر چلنے کی تیز آواز سنائی دی جس کا مطلب تھا کہ ریت میں دفن برقی ہیٹر آن کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔

اس وقت سورج طلوع ہوئے خاصی دیر گزر چکی تھی مگر اس کی کرنوں میں ناقابلِ برداشت تمازت موجود نہیں تھی میں اپنے شانے پر اسٹین گن سمیت ساڑھے پینتیس پونڈ وزنی کٹ اٹھائے دیوار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ قدموں میں بچھی ہوئی ریت اتنی نرم اور گہری تھی کہ اس میں قدم دھنسے جا رہے تھے اور دوڑتے رہنے کے لئے غیر معمولی توانائی صرف کرنا پڑ رہی تھی۔

"یہ تو خاصی احمقانہ حرکت ہے۔" دوڑتے ہوئے میرا ایک ساتھی آہستہ سے بولا۔ "ہم اسی طرح بھاگتے رہے تو تھوڑی ہی دیر میں بے ہوش ہو کر گر جائیں گے۔"

"پھر کیا کیا جائے، حکم تو یہی ملا ہے۔" دوسرے نے بیچارگی سے کہا۔

"یہاں دیکھنے والا کون ہے، ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ [illegible] ہیں، دروازے پر آہٹ ہوئی تو دوڑ لگانا شروع کر دیں گے۔"

اس کی تجویز خاصی معقول تھی بے ضرر بھی۔ ہم چاروں ایک سائے میں بیٹھ گئے۔

مگر ہم زیادہ دیر سکون سے نہ بیٹھ سکے۔ فرش پر بچھی ہوئی ریت کا درجۂ حرارت غیر محسوس طریقے پر بڑھتا جا رہا تھا۔ تبھی اس کا احساس ہوا وقت ہوا جب ریت پر ایک جگہ بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔

جب بار بار پہلو بدلنے سے بھی جھلسا دینے والی ریت سے نجات نہ مل سکی تو یکے بعد دیگرے چاروں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند منٹ بعد اندازہ ہوا کہ مسلسل کھڑے رہنا بھی ناممکن ہے۔ ہر شخص بار بار بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بار بار قدم بدل رہا تھا۔ پھر یہ رفتار تیز ہو گئی اور ہم چاروں کو جلتی ہوئی ریت سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک ہی جگہ کھڑے رہ کر قدموں کو تیزی سے یوں اٹھانا اور رکھنا پڑا جیسے ہم تیزی سے دوڑ رہے ہوں۔

ایک لڑکے نے اپنی عرق آلود پیشانی کو صاف کرتے ہوئے اسرائیلی افواج کی والدہ کی شان میں گستاخی کی، دوسرے نے اپنی کٹ اور کٹ اتار پھینکی جس کی تقلید میں میں نے بھی اپنے بوجھ سے جان چھڑا لی۔

"اس سے تو بہتر ہے کہ ہم دوڑنا شروع کر دیں۔" تیسرا تربیتی پروگرام کے بارے میں قدرے سنجیدہ تھا۔

چاروں کے بدن پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ ریت سے خارج ہونے والی حرارت نے ریت پر قدم رکھنا محال کر دیا اور وہ گرمی فضا میں بھی پھیل رہی تھی۔ اس کمرے کی حالت کسی تندور سے مشابہ تھی اور ہمیں اگلے حکم تک اس میں دوڑتے رہنا تھا۔

اسی وقت ایک لڑکے کو انوکھی تجویز سوجھی اور وہ ایک ستون میں لٹک گیا۔ اس طرح اس کے ہاتھوں پر بوجھ ضرور آ گیا تھا مگر جلتی ہوئی ریت سے نجات مل گئی۔ اس کی تقلید میں سب نے ایسا کر کے گرم ریت سے نجات پا لی۔

"تم لوگوں کو بغور دیکھا جا رہا ہے۔" میں آنکھیں موندے ستون سے لٹکا ہوا تھا کہ اچانک موریسین کی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح چونکا کہ ستون ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں پورے قد سے ریت پر آ رہا۔

"تم لوگوں کو آج ہر قیمت پر مقررہ وزن اٹھا کر اس کمرے کی دیواروں کے ساتھ کم از کم اسّی چکر لگانے ہیں۔ اس کا یہ فاصلہ طے کئے بغیر تمہیں اس کمرے میں سے نجات نہیں ملے گی۔" موریسین کی آواز کسی اسپیکر سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔

"یہ سراسر ظلم ہے میجر!" ایک لڑکا چیخا۔

"شٹ اپ!" موریسین کی آواز آئی۔ "تمہیں ہر قیمت پر احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ اپنی کٹ اٹھاؤ اور فوراً دوڑنا شروع کر دو۔"

ناچار سب نے اپنی اپنی کٹ کمر پر لاد لی اور کمرے کا طواف شروع کر دیا۔ اسی دوران ایک بار چند سیکنڈ کے لئے ایک دیو ہیکل پنکھا حرکت میں آیا اور بند ہو گیا۔ مگر اس سے پیدا ہونے والے ہوا کے شدید جھونکے نے فضا میں ریت کے بگولے بکھیر دیئے اور آنکھیں کھلی رکھنا محال ہو گیا۔ اسی عالم میں میں کسی سے ٹکرایا اور زمین پر گر گیا۔

اس چوٹ کے مقابلے میں تپتی ہوئی ریت کا عذاب زیادہ شدید تھا کیونکہ میں چند ثانیوں میں ہی دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ مگر اٹھتے ہی پیچھے سے آنے والا کوئی رنگروٹ پوری طاقت سے مجھ سے ٹکرایا اور ریت پر ڈھیر ہو گیا۔

میں اس کی طرف دیکھنے کی زحمت کئے بغیر آگے دوڑ پڑا۔

پہلے روز یہ سلسلہ تین گھنٹے جاری رہا اور جب میں اس کمرے سے باہر آیا تو میرے برہنہ پیروں اور پنڈلیوں پر کئی آبلے پڑ چکے تھے۔

اس ریتیلی بھٹی میں تربیت کا دور ایک ہفتے جاری رہا۔ اس دوران کئی بار ایسا بھی ہوا کہ باہر صحرا کی خنک رات پھیلی ہوئی تھی مگر ہم چاروں اس ہولناک کمرے میں مسلسل دوڑے جا رہے تھے۔ ہم لوگوں نے کئی بار اس کمرے میں نصب کیمرہ تلاش کرنے کی بھی کوشش کی جس کی مدد سے موریسین کمانڈ کیبن میں بیٹھا ہماری پریشان حالی سے لطف اندوز ہوتا تھا مگر ہماری یہ کوششیں بے سود رہیں۔

پہلا ہفتہ گزرنے کے بعد جی۔ ٹی۔ فور سے دوسرا قافلہ آ پہنچا اور ہمیں اس کمرے سے نجات مل گئی۔ تربیت کا دوسرا دور ہلکے آتشیں اسلحہ کی تیاری اور استعمال سے متعلق تھا۔

جی۔ ٹی۔ فور سے آنے والے بدنصیب باری باری اس عقوبت کدے کا مزہ چکھتے رہے اور جس دن آخری گروپ فارغ ہونے والا تھا، ہیلی کاپٹروں کے ذریعے چالیس کڑیل اور سخت جان فوجی، سوڈ میں اتارے گئے۔ بعد میں سامان بردار ہیلی کاپٹروں سے خیموں اور اسلحہ سمیت بہت سا سامان بھی اتارا گیا اور یوں وادی دور تک آباد ہو گئی۔

اگلے روز سے اجتماعی تربیت کا آغاز ہوا اور نشانہ بازی، خنجر زنی سے لے کر بارودی سرنگیں عبور کرنے تک ہر چیز کی عملی تربیت دی جانے لگی۔

وہ تربیت بہت دشوار اور خطرناک تھی۔ آنے والے دنوں میں تین لڑکے بری طرح زخمی ہوئے۔ ایک کی داہنی پنڈلی کی ہڈی خندق میں گرا پیر پڑنے کے باعث ٹوٹ گئی، دوسرے کے پیٹ میں ایک گولی اتر گئی اور تیسرا ہتھیار چھیننے کی مشق کے دوران اپنے انسٹرکٹر کے خنجر سے پوری کلائی پر گہرا زخم کھا بیٹھا۔

معمولی زخمیوں کو فیلڈ پر ہی طبی امداد بہم پہنچا دی جاتی تھی مگر شدید زخمی ہونے والوں کو ہیلی کاپٹر طلب کر کے قریبی فوجی ہسپتالوں میں بھیج دیا گیا۔ دو لڑکے تو جلد ہی صحت یاب ہو کر ہم سے آملے البتہ پیٹ میں گولی کھانے والے کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ پوری توجہ کے باوجود جانبر نہ ہو سکا۔

ایک شخص کی موت نے ہر ایک کو سنجیدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا اور اس تربیت کے بارے میں لوگ توجہ سے کام لینے لگے کیونکہ میجر موریسین یہ بتا چکا تھا کہ سوڈ پہنچنے والے یا تو جانباز گوریلے بن کر واپس لوٹتے ہیں یا ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ابتدا میں موریسین کے ان الفاظ کو ہر ایک نے کھوکھلی دھمکی سے تعبیر کیا تھا لیکن بعد کے سنگدلانہ مظاہر نے موریسین کے الفاظ کی اہمیت کو ثابت کر دیا۔

جنگی ہتھیاروں کی وسیع مشقیں شروع ہونے کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹروں کے ذریعے رسد اور ہتھیاروں کی فراہمی کا تسلسل قائم ہو گیا تھا۔ صحرا کے اس حصے کو بھرا پرا دیکھ کر یقین بھی نہ آتا تھا کہ ابتدا میں وہاں چند خیموں، ایک ہولناک شیطانی کمرے اور چار نفوس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ رات کو جب خیموں میں مومی مشعلیں اور پیٹرومیکس جلا کر نئے اور پرانے گوریلے گانے بجانے اور دیگر تفریحات کی پُرشور محفلیں سجاتے تو گزرے ہوئے دن کی ساری تھکان اور کوفت غائب ہو جاتی اور اگلی صبح ہر ایک نئے مصائب جھیلنے کے لئے تازہ دم ہو جاتا۔

پھر ایک رات سوڈ میں قیامت سی آ گئی۔ اس وقت رات کے ڈھائی، تین بجے کا عمل تھا۔ سب لوگ تھکن سے نڈھال اپنے ٹھکانوں

میں دبکے بے خبر سو رہے تھے۔ یُوں تو سوڈ میں رات کو بھی محافظوں کا پہرہ ہوتا تھا مگر وہ مقام اس قدر محفوظ تصوّر کیا جاتا تھا کہ رات کی ڈیوٹی دینے والے مسلّح محافظ بھی لمبی تان کر سوتے تھے۔ محافظوں کے اس وطیرے سے میجر موریسن بھی واقف تھا مگر اس نے حفاظت کے اس پہلو کو کبھی قابلِ توجہ نہیں سمجھا اور غالباً اس کی یہی لاپرواہی سوڈ کے باسیوں کے لئے ہولناک تباہی کا باعث بن گئی۔

میری آنکھ کھلنے کا باعث ایک شدید دھماکہ تھا۔ میں ہڑبڑا کر کمبل پھینکتا ہوا چھولداری سے باہر آیا تو آسمان پر سُرخی پھیلی ہوئی نظر آئی۔ پھر پے درپے متعدد دھماکے ہوئے اور ایک طرف سے سیاہ دھوئیں کے کثیف بادل آسمان کی طرف اُمڈتے نظر آئے جو زرد اور نارنجی رنگ کے آتشیں شعلوں پر سوار تھے۔

سوڈ میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی اور ہر شخص جس حال میں تھا، چھولداری سے باہر نکل آیا۔ سب کی متوحش نگاہیں دھوئیں اور شعلوں پر مرکوز تھیں۔

آگ جس سمت میں لگی تھی، اُدھر وہی ہولناک کمرہ واقع تھا جس میں سیمنٹ کی چادروں کے عقب میں برقی توانائی کے سہارے صحرائی جہنم بھڑکایا جاتا تھا۔ آخری گروپ کی ابتدائی تربیت کے خاتمے پر جب گوریلا جنگ کی اعلیٰ تربیت کے لئے اسلحہ آنا شروع ہوا تو موریسن نے بغیر چھت والے اس کمرے پر ترپالیں تان کر اسلحہ کے چوبی کریٹ وہیں بھر دیئے تھے۔

اسلحہ خانے میں بھڑکی ہوئی آگ اور قیامت خیز دھماکوں نے موریسن کو بُری طرح بوکھلا دیا اور وہ ہذیانی انداز میں چلاتا ہوا ایک ریتیلے ٹیلے پر چڑھ گیا جہاں سے نشیب میں بنا ہوا اسلحہ خانہ صاف نظر آتا تھا۔

موریسن کی تقلید میں بہت سے تجربہ کار گوریلے بھی اسی طرف دوڑے اور صورتحال کا صحیح اندازہ کرتے ہی ٹیلے سے اُتر کر آگ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

چند ثانیوں میں سارا کیمپ اس آگ کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ کیونکہ آگ پورے علاقے میں پھیل چکی تھی اور دھماکوں کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا۔

اس وقت کیمپ میں پانی کا جو ذخیرہ موجود تھا، وہ اگلے بیس گھنٹوں کی ضروریات سے قطعاً زائد نہیں تھا۔ پھر اس آگ کو بجھا کر راکھ اور انگاروں کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوتا لہٰذا اسلحہ دھڑا دھڑ جلتا رہا اور سب لوگ تماشہ دیکھتے رہے۔

"یہ کیسے ہوا؟" موریسن شدید غصّے اور مایوسی کے عالم میں دہاڑا مگر وہاں سب کو سانپ سُونگھ چکا تھا۔ نیکروں اور بنیانوں میں ملبوس محافظ اپنی شاندار رائفلیں تھامے ملزموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔

"ہو سکتا ہے سر۔۔۔ کہ کسی دستی بم کی فیوز پن گرمی سے ... ہوا ور اس کے پھٹ جانے سے پورے ذخیرے نے آگ پکڑ لی ہو..." اُونچے شعلوں کے ہولناک انعکاس میں کسی کی سہمی ہوئی آواز اُبھری۔

"تم اُلو کے پٹھے ہو۔" میجر موریسن پلٹ کر غصّے میں دہاڑا۔ "... ہوتا ہے گرمی سے تمہارا دماغ پھر گیا ہے۔ یہاں آنے والا اسلحہ خاص ... پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی تخریبی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ سوڈ ... میں یہ پہلا واقعہ ہے۔"

موریسن کے ان الفاظ نے وہاں سنسنی پھیلا دی اور یک ... بہت سے لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔

ہر شخص کی زبان پر فلسطینی حریت پسندوں کا نام تھا۔ وہ لوگ ... بات پر حیران تھے کہ شامی علاقے سے اسرائیلی مورچے عبور کرکے فلسو ... سوڈ تک کس طرح پہنچے جبکہ وہ کیمپ اسرائیلی مورچوں اور جی۔ ٹی ... درمیان واقع ہونے کی وجہ سے بہت محفوظ سمجھا جاتا تھا۔

"یہ تماشا چھوڑو اور سرچ لائیٹس لے کر ہر طرف پھیل جاؤ..." آہستہ آہستہ میجر موریسن کا دماغ کام کرنے لگا تھا۔ "اگر کچھ تخریب کار یہاں ... میں کامیاب ہوئے تھے تو اب تک وہ زیادہ دُور نہ نکل سکے ہوں ..."

یہ بہت غنیمت تھا کہ تمام خیمے اس اسلحہ خانے سے کافی ... واقع تھے ورنہ وہاں بھڑکنے والی آگ ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ... ہوتی۔ میجر کا حکم پاتے ہی سب لوگ چھولداریوں کی طرف واپس ... اور تھوڑی ہی دیر میں کھوجی پارٹیاں ہر طرف پھیل گئیں۔

میجر موریسن نے وائرلیس پر اپنے متعلقہ کمانڈر کو اس ... واقعے کی اطلاع دے دی جس کے نتیجے میں تھوڑی ہی دیر بعد ... کاپٹر چنگھاڑتے ہوئے اس علاقے میں منڈلانے لگے۔ ان کی تیز ... لائیٹس سے دُور دُور تک صحرا میں روشنی پھیل گئی تھی۔

ہیلی کاپٹروں نے تھوڑی ہی دیر میں بہت کم بلندی سے ... چھان مارا مگر وہاں کوئی مشتبہ فرد یا نشان تلاش نہ کر سکے۔ ان ... لوٹ جانے کے بعد بھی کیمپ کی جماعتیں علاقے کی تلاشی میں مصروف ... رہیں مگر سورج طلوع ہونے کے بعد بھی وہاں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور یُوں تھک ہار کر سب واپس آ گئے۔

اس حادثے پر جہاں ہر شخص پریشان اور مضطرب تھا، وہاں ... دلی مسرّت کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ اتفاقی حادثہ رہا ہو یا تخریبی کارروائی کا نتیجہ، اس سے ... کے بارے میں یہودیوں کے تحفظ کے احساس اور غرور کو شدید شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اسی کے ساتھ مجھے فلسطینی افواجِ آزادی کے اسرائیلی گرفت ... کار رہنما محمود شدّت سے یاد آ رہا تھا۔

مجھے تل ابیب سے نکلے سات ہفتے گزر چکے تھے۔ اس ... میرا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ میری جملہ معلومات اور بیرونی دُنیا سے مشاغل کا محور جی۔ ٹی۔ فور یا پھر سوڈ تھا۔ میں محمود کے بارے میں جتنا سوچتا رہا، اسی قدر میری بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ نجانے کہاں اور کس حال میں تھا۔ ماریا کے ساتھ اس کا رابطہ کس حد تک برقرار تھا۔ بن حیان کے بارے میں وہ کیا منصوبہ بندی کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسرائیل سے میرے اخراج کے لئے اس نے کیا فیصلہ کیا تھا؟ ان سوالات پر میرے مستقبل کا تمام تر دار و مدار تھا۔

اسرائیل میں رہتے ہوئے میں دن بدن یہودی سرگرمیوں میں ملوّث ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی احتیاطی تدابیر کی وجہ سے میں نے خود کو اسرائیلی حکام کی نظروں میں شبہات سے بالاتر ثابت کر دیا تھا لیکن اب روز بروز میرے دل میں یہ رُوح فرسا احساس جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ میرا مقدر اسرائیلی حکام کے مزاج سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ لے دے کر ایک آخری اُمید یہی نظر آتی تھی کہ گوریلا تربیت کے خاتمے پر مجھے اسرائیلی سرحدوں سے باہر کسی مشن پر بھیجا جائے اور وہاں میں رُوپوشی اختیار کر لوں۔

اس روز سوڈ کی فضا پر ماتمی خاموشی طاری تھی۔ ہر شخص اعصابی کشیدگی اور اُلجھن کا شکار نظر آ رہا تھا اور میجر موریسن نے دو روز کے لئے ساری تربیتی مشقیں موقوف کر دی تھیں۔

تربیت کے لئے آئے ہوئے لڑکے اس غیر متوقع چھٹی پر بہت خوش تھے مگر اپنے افسروں کے ورم آلود چہرے دیکھ کر اپنی خوشی کا گلا گھونٹنے پر مجبور تھے۔

دوپہر کے وقت سوڈ کے شمال مشرقی علاقے سے مشین گنوں کی فائرنگ اور ہلکی توپوں کی گولہ باری کی گُونج سنائی دی جو تسلسل کے ساتھ شدّت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ سینئر فوجیوں نے وہ آوازیں سُنتے ہی رائے دے دی کہ شامی سرحدوں پر جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ ان کو یقین تھا کہ اس تصادم کا آغاز ان کے فوجیوں نے سوڈ میں ممکنہ تخریب کاری کا انتقام لینے کے لئے کیا ہو گا اور شامیوں کو بے خبری میں خاصا بھاری جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

شام کے دھندلکے میں بھی وہ آوازیں آتی رہیں اور جب اندھیرا پھیل گیا تو شمال مشرقی اُفق پر بے شمار آتشیں لکیریں اُبھرتی اور معدوم ہوتی نظر آنے لگیں۔ کیمپ سے دُور چھڑی ہوئی جنگ کا اندھیری رات کا سماں اس محفوظ فاصلے سے بڑا دلفریب اور حسین نظر آ رہا تھا۔ وہاں مجھے اسرائیلیوں سے معلوم ہوا کہ شمال مشرق میں اسرائیلی مورچے شامی علاقے میں پہاڑی علاقے کی بلندیوں پر قائم ہیں اور اسی وجہ سے وہاں سے کی جانے والی فائرنگ سوڈ سے بآسانی نظر آ رہی تھی جبکہ شامی اپنی سرحدوں سے کافی پیچھے نشیبی علاقے میں مورچہ زن تھے۔

وہ رات توپوں کی گھن گرج سُنتے گزری۔ کبھی کبھار چند منٹ کے لئے محاذ پر خاموشی چھا جاتی مگر فضا میں دھماکوں کی بازگشت بدستور گردش کرتی رہتی اور اس بازگشت کے دَم توڑنے سے پہلے محاذ آرائی کا نیا دَور شروع ہو جاتا۔

اگلے روز ڈرل شروع ہونے سے پہلے صبح سویرے میجر موریسن نے اعلان کیا کہ سوڈ کے حادثے کی تفتیش کے لئے تل ابیب سے چند فوجی افسران دوپہر سے پیشتر وہاں آنے والے ہیں اور ان کی آمد کے وقت ہر شخص کو اپنے خیمے میں موجود ہونا چاہیئے۔

ڈرل سوڈ کی تربیتی زندگی کا لازمی جزو تھی۔ گو موریسن سب کو دو دن کی چھٹی دے چکا تھا مگر بنیادی نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لئے ہر ایک کے لئے صبح پانچ بجے ڈرل میں شامل ہونا لازمی تھا۔ غیر حاضری کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ دیر سے آنے والوں کے ساتھ موریسن یُوں جلاد کی طرح پیش آتا تھا کہ جی۔ ٹی۔ فور کا سارجنٹ اولڈ اس کے مقابلے میں فرشتہ سیرت محسوس ہونے لگتا تھا۔

اس روز ڈرل سے نمٹنے کے بعد میں چھولداری میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ کسی نے کیمپ میں سارجنٹ میکوائے کی موجودگی کی خبر سنائی۔ میرے لئے یہ خبر اتنی حیرت ناک تھی کہ میرے ہاتھ سے دُودھ کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

"وہ یہاں کب پہنچا؟ شام تک تو اس کا کہیں پتہ نہیں تھا" میں نے خبر لانے والے لڑکے سے آہستہ سے سوال کیا۔



"وہ تو ہمیں اولڈ کے حوالے کرنے کے بعد سے عیش کر رہا تھا۔ سالا تفتیشی افسروں کی آمد کی خبر پا کر ادھر دوڑا ہوگا۔"

"جی ٹی۔ فور میں تو وہ جولیا پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ یہاں اسے تپتی ہوئی ریت اور کرخت مردانہ چہروں کے سوا کیا ملتا جو وہ ادھر آتا۔" میرے ساتھی نے تبصرہ کیا۔

"وہ ٹھہرا کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"موریسن نے اسے گھاس نہیں ڈالی' اپنے اردلی کا خیمہ دیا ہے اسے۔"

میں ناشتے سے فارغ ہوا تو سورج آسمان کے مشرقی گوشے سے سر ابھار چکا تھا لہٰذا میں سیدھا میکولائے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

میں اس کے خیمے میں پہنچا تو وہ اپنے سیاہ جوتے کی نوچمکا کر اس میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری آہٹ پر اس نے سر اٹھایا تو میرا خیال تھا کہ وہ نہایت تپاک سے میرا استقبال کرے گا مگر وہاں معاملہ ہی الٹ ہو گیا مجھے پہچانتے ہی اس نے جوتا زمین پر ڈال دیا اور پھاڑ کھانے والی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

"صبح بخیر سارجنٹ!" میں نے سپٹا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ غرّایا۔

"مجھے پتہ چلا کہ تم رات ہی آئے ہو تو ملنے چلا آیا۔"

"بڑی محبت ہے مجھ سے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"شاید تم وہ وقت بھول گئے جو ہم نے تل ابیب سے جی ٹی۔ فور تک ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے گزارا تھا۔"

"میرا حافظہ بہت مضبوط ہے۔ وہی نہیں' مجھے وہ رات بھی یاد ہے جو ہم نے لڑکیوں کے ساتھ گزاری تھی۔" وہ میرے قریب آکر پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"کیا اس رات مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی تھی؟"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر حرام زادے ہو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "کیتھی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"بتا دیا تھا تو تم خود جانتے ہو گے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا' اس نے خود ہی مجھے مجبور کیا تھا۔"

"اوہ' تو تم اس حد تک چلے گئے تھے۔" وہ حیرت اور غصے سے مغلوب لہجے میں بولا۔ "اس کتیا نے یہ قصہ تو بالکل ہی گول کر دیا۔"

یک بیک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کیتھی نے نجانے اسے کیا کہانی سنائی تھی اور میں سادگی میں اس موٹے احمق کے سامنے حقیقت کا اعتراف کر بیٹھا تھا۔ میں نے بات بنانے کے لئے جلدی سے کہا۔ "مجھے غلط نہ سمجھو سارجنٹ' کیتھی کے ساتھ میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس پر مجھے پشیمان ہونا پڑے۔ تمہارے سو جانے کے بعد اس نے مجھے اپنے ساتھ رقص کرنے پر مجبور کیا تھا اور ہم دونوں نشے میں دھت ہو کر صبح تک ناچتے رہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ آسودہ انداز میں اپنی وزنی گردن کو جنبش دے کر بولا۔ "کیتھی ایسی گئی گزری نہیں ہے کہ چند گھونٹ پی کر خود کو کسی کالی چمڑی والے کے قدموں میں ڈال دے۔ پھر اس نے اس کے سامنے میرے خلاف کیا زہر فشانی کی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"تو وہ جھوٹی ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں مجھ سے بھڑا کر تفریح لینے کی کوشش کی ہو۔"

"بالکل بکواس۔" وہ بولا۔ "ایسا ہوتا تو وہ اگلے ہی دن یہ باتیں کہہ ڈالتی۔ اس نے تمہارے چلے آنے کے بعد زبان کھولی تھی۔"

"کیا کہا تھا اس نے؟"

"میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔" یک بیک اس کا پارہ چڑھ گیا۔ شاید اسے ان خرافات کا خیال آ گیا تھا جو جولیا نے مجھ سے منسوب کر کے اسے سنائی تھی۔

"مجھے تمہاری دوستی گنوا کر دکھ ہوگا۔"

"جہنم میں گئی دوستی۔ اب میں یہاں آ ہی گیا ہوں تو دیکھو کیا درگت بناتا ہوں۔" وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔

"یہ کون مردود چلا رہا ہے؟" اچانک برابر والی چھولداری سے میجر موریسن کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سوری سر! ویری سوری۔" میجر موریسن کی آواز سن کر میکولائے کے اوسان خطا ہو گئے اور میں تیزی کے ساتھ واپس آ گیا۔

دوپہر کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے تفتیشی ٹیم سوڈا پہنچی میں نے تو ان لوگوں کو نہ دیکھ سکا مگر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے کیمپ میں گردش کر گئی کہ آنے والوں میں ایک حسین و جمیل لڑکی بھی شامل ہے۔ سوڈا میں آنے کے بعد ہر شخص حسن کے دیدار کو ترس گیا تھا۔ ریت اور چھولداریاں دیکھ دیکھ کر ہر ایک اکتایا ہوا تھا۔ اس خبر نے ہر ایک میں تجسس اور زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ تفتیش کے سلسلے میں اسے بھی طلب کیا جائے تاکہ وہ اس قتالہ کے جلووں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔

سہ پہر کو جب میجر موریسن کا اردلی میری طلبی کا حکم لایا تو قدرے پریشانی ہونے لگی۔ میرا خیال تھا کہ پورے کیمپ میں مختلف قومیت سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا تخریب کاری کا سراغ لگانے کے لئے میری ہی ذات کو سب سے بہتر نقطۂ آغاز سمجھا گیا تھا۔

میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا اردلی کے ہمراہ موریسن کے خیمے میں پہنچا تو وہاں ایک خوشگوار ذہنی جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔

کیمپ میں جس حسینہ اور دلربا کی آمد کی دھوم مچی ہوئی تھی' وہ میری دیرینہ رفیق کیپٹن ماریا تھی۔ اس وقت وہ خیمے میں میجر موریسن اور ایک کرنل کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر چند ثانیوں کے لئے اس کی آنکھوں میں خیرسگالی کی محبت آمیز چمک پیدا ہوئی جو فوراً ہی پیشہ ورانہ سختی میں معدوم ہو گئی۔

مزید دو افسران کی موجودگی کی وجہ سے میں بھی زبان نہ کھول سکا بس نگاہوں ہی نگاہوں میں پیغامات کا مختصر سا تبادلہ ہوا اور پھر میں موریسن کی ہدایت پر کرنل کے سامنے پڑے ہوئے ایک خالی چوبی کریٹ پر بیٹھ گیا۔

"یہ کرنل لیوک آرنلڈ ہیں یہ کیپٹن ماریا برگٹن ہیں۔" میجر موریسن نے خشک رسمی لہجے میں تعارف کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ "یہ دونوں افسران اے۔ آئی۔ بی سے تازہ واقعات کی تفتیش کے لئے یہاں آئے ہیں۔"

"کیپٹن ماریا سے میں تل ابیب میں آرمی انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹرز میں مل چکا تھا۔" میں انکسار آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "مجھے آپ دونوں سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔"

"مسرت کے اظہار کی ضرورت نہیں۔" میجر موریسن سخت لہجے میں ڈانٹ کر بولا۔ "تمہیں ان افسران کے مرتبے سے اس لئے آگاہ کیا گیا ہے کہ تم حتی الامکان ان کے ساتھ تعاون کرو۔ بریگیڈیئر ہولڈن نے تمہاری ذات کو تفتیش کے لئے نقطۂ آغاز مقرر کیا ہے۔"

"او کے سر!" میں نے سر جھکا کر کہا۔

تل ابیب سے سارجنٹ میکولائے کے ہمراہ جی۔ ٹی فور کی جانب آتے ہوئے میں نے ایک بار بریگیڈیئر ہولڈن کا نام سنا تھا۔ میکولائے کے مطابق بریگیڈیئر ہولڈن گوریلا تربیتی کیمپ کا نگران تھا۔ جی ٹی فور اور سوڈا میں ایک باہمی تعلق پایا جاتا تھا جس کی بنا پر میں نے بہت پہلے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ دونوں کیمپ ہی بریگیڈیئر ہولڈن کی عملداری میں ہوں گے۔ اس کے بعد کہیں بھی اس شخص کا تذکرہ نہیں آیا اور نہ ہی مجھے ان دونوں مقامات پر بریگیڈیئر کے عہدے کا کوئی آدمی نظر آیا۔

اس وقت اچانک میجر موریسن کی زبان سے بریگیڈیئر ہولڈن کا نام سن کر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ سوڈا میں پہلے ہی یہ افواہ گرم تھی کہ اسرائیلی فوج کی کوئی بانکی البیلی نار دو افسران کے ہمراہ وہاں پہنچی ہے اس طرح دار حسینہ سے تو میں پہلے اچھی طرح واقف تھا۔ کرنل لیوک آرنلڈ کو بھی دیکھ لیا تھا لہٰذا میرے ذہن نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ تفتیش کے لئے آنے والی ٹیم کا تیسرا ممبر بریگیڈیئر ہولڈن ہوگا۔

کرنل لیوک آرنلڈ اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "تمہارا نام صفدر علی ہے؟" چند ثانیوں تک میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"جی ہاں۔"

"اور تم ہندوستانی ہو؟"

"جی۔"

"اس کا کوئی ثبوت فراہم کر سکتے ہو؟" اس نے اپنی مونچھ کا داہنا سرا مروڑتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

"میں ہندوستان سے غیر قانونی طور پر خلیج کی ایک ریاست میں پہنچا تھا وہاں سے ابو خالد نے مجھے اسرائیل پہنچا دیا۔ میرے پاس اپنی قومیت کے ثبوت میں کچھ بھی نہیں ہے!"

"قاضی ہادی سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

"ابتدا میں اسرائیلی حکام کو میری وفاداری پر شبہ تھا انہی دنوں قاضی ہادی کے آدمی مجھے اغوا کر کے اس کے فارم پر لے گئے تھے اور انہوں نے مجھے کچھ غلط کاموں پر اکسانے کی کوشش کی مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد کے رویئے سے میں نے اندازہ لگایا کہ قاضی ہادی اسرائیل کا کٹر وفادار تھا اور شاید اس نے حکام کی ایما پر وہ چال چلی تھی اس کے بعد وہ میرا گہرا دوست بن گیا۔" میں نے جواب دیا۔ کرنل لیوک کے سوالات بہت پیمانے تلے تھے اور اس نے مجھے خاصا خوفزدہ کر دیا تھا۔

"اس کی موت کے وقت تم بحری جہاز پر اس کے ساتھ تھے؟"

"جہاز پر موجود ضرور تھا۔ اس کے ساتھ نہیں تھا۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ محتاط لہجے میں جواب دیا۔

"خوب!" کرنل لیوک نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "بہت زیادہ محتاط طبیعت کے مالک معلوم ہوتے ہو۔"

"بہت چالاک آدمی ہے!" میجر موریسن نے تحقیر آمیز لہجے میں تبصرہ کیا۔

"اور تم کرنل ریٹا سے بھی ملے تھے؟" کرنل لیوک نے سوال کیا۔

"اس محترم خاتون نے میری خواہش کو شرفِ قبولیت بخشا تھا۔"

"اور اس بدنصیب کی موت کے وقت بھی تم اس کے پاس موجود نہیں تھے؟"

"موت؟ تو کیا کرنل ریٹا فوت ہو گئیں؟" میں نے مصنوعی حیرت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اب نہیں وہ مہینوں پہلے ماری جا چکی ہے۔"

"اوہ خدایا!" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ "بھیانک صورت والی وہ عورت بڑی نرم دل اور خدا ترس تھی۔"

"اخبارات میں اس کی موت کی خبر مادام ایلیسی کے نام سے شائع ہوئی تھی اور وہ اپنے مکان پر فلسطینی دہشت پسندوں کے ایک منظم حملے کا شکار ہوئی تھی۔"

"مادام ایلیسی کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ مگر مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ کرنل ریٹا ہی مادام ایلیسی کے نام سے جنگی معذوروں کا محتاج خانہ چلاتی ہے!"

"تمہاری فائل بڑی دلچسپ ہے مسٹر صفدر!" کرنل لیوک سگار کا کش لے کر بولا۔ "تم جس اہم شخصیت سے ملے ہو، وہ قتل کر دی گئی۔ اسی طرح جس اہم مقام پر تمہارا سایہ پڑا وہاں تباہی اور بربادی پھیل گئی۔"

"میں... میں نہیں سمجھا کہ آپ کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "میری نقل و حرکت پر ہر وقت نظر رکھی گئی ہے۔ میں کسی تخریب کاری میں ملوث نہیں رہا۔ میری بدنصیبی کی آڑ لے کر مجھ پر ایسا الزام عائد نہ کیجئے۔"

"حقائق کو نہیں جھٹلایا جا سکتا مسٹر صفدر!" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "میں تم پر کوئی الزام عائد نہیں کر رہا محض حقائق دہرا رہا ہوں۔ کرنل ربیا تم سے ملی اور مار دی گئی۔ قاضی ہادی نے تم سے دوستی کی اور کھلے سمندر میں بے موت مارا گیا۔ کیپٹن مہدی تو بہر حال تمہارے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔ تم نے انٹیلی جینس کور کے ہیڈ کوارٹرز میں کچھ وقت گزارا تھا اور وہ عمارت راکھ اور ملبے کے ڈھیر میں بدل چکی ہیں اور اب تمہارے قدم سوڈ پہنچے تو یہاں ناقابل یقین تباہی پھیل چکی ہے۔"

"مگر ان واقعات سے میرا کوئی تعلق نہیں میرا کسی دہشت پسند سے رابطہ نہیں ہے!" میں نے بوکھلائے ہوئے مدافعانہ لہجہ میں کہا۔

"ریکارڈ بھی یہی کہتا ہے۔" وہ کرسی پر جھولتے ہوئے بولا۔ "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ تمہارے بارے میں کوئی اہم کڑی ابھی تک اسرائیلی حکام کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔"

"اسرائیل میں میری ایک ایک ماہ کی مصروفیات کھلی کتاب کی طرح ہر ایک کے سامنے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مجھ پر کسی قسم کا شبہ کیا جا رہا ہے تو یہ میرے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔" میں نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔

اسی وقت چھولداری کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر پردہ ہٹا کر ایک گرانڈیل شخص اندر داخل ہوا جس کے جسم پر بریگیڈیئر کی وردی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ تینوں اپنی جگہ سے اٹھے اور بریگیڈیئر کو سلیوٹ پیش کیا۔ میں بھی احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

آنے والا لاپروایانہ انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مورلین، لیوک اور ماریا نے بھی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔

"تو یہ ہے وہ فساد کا پتلا!" بریگیڈیئر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس کی قومیت پر شبہ ہے سر!" کرنل لیوک آرنلڈ نے پُرسکون لہجہ میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"وہ کیا؟" بریگیڈیئر نے پوچھا۔ اس کے بارے میں میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہی بریگیڈیئر ہولڈن ہے کیونکہ اس کے سامنے دوسروں کے مقابلے میں میجر مورلین زیادہ مؤدب نظر آ رہا تھا۔

"اس کا نام مسلمانوں جیسا ہے......" کرنل لیوک نے کہنا شروع کیا مگر میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ میرا اپنا نام نہیں ہے۔ جب میں الشوبخ پہنچا تو میرا نام دوبارہ رکھا گیا تھا۔ مگر وہاں ابو خالد نے مجھے اپنے جس ہرکارے کے سپرد کیا تھا اس نے مجھے اسلامی نام اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا اور یوں میں صفدر علی [illegible]" میں نے کہا۔ "اور اگر شروع سے میرا باقاعدہ ریکارڈ تیار [illegible] بھی فائل میں ضرور موجود ہوگا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ماریا نے پہلی بار زبان کھولی [illegible] پر موجود ہے۔"

"اس سے میرے نظریئے پر کوئی اثر نہیں پڑتا [illegible] میری معلومات کے مطابق ہندوستان ہندو اکثریت [illegible] میں ہندو اقلیت میں ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ شخص پاکستانی [illegible] خفیہ مقصد کے تحت اسرائیل میں داخل ہوا ہے۔"

"میں خود یہاں نہیں آیا۔" میں کرنل لیوک سے [illegible] خوفزدہ ہو گیا تھا۔ "مجھے الشوبخ میں ابو خالد نے اپنی [illegible] پھر مجھے تل ابیب بھیج دیا گیا۔ اسرائیل آنے میں میری مرضی کا [illegible]"

"آخر تم اس کی قومیت پر اس قدر زور کیوں دے رہے ہو" ہولڈن نے قدرے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "یہ صحرائی [illegible] پہنچا اور وہاں سے بن حیان نے اسے اسرائیل روانہ کر دیا [illegible] منصوبہ بندی مشکل نظر آتی ہے۔"

"قومیت کے حوالے سے اس کی ہمدردیاں معلوم [illegible] بولا۔ "ہندوستانی افراد مشرق وسطیٰ کے مسئلے سے جذباتی [illegible] پاکستانی اس معاملہ میں عربوں سے زیادہ جذباتی ہیں۔ اگر صفدر پاکستانی [illegible] اس امر کا قوی امکان ہے کہ تل ابیب آنے کے بعد خفیہ طور پر [illegible] دہشت فلسطینی گروہ کا آلۂ کار بن گیا ہو اور ان دنوں ہمیں مختلف ذرائع سے [illegible] خبریں مل رہی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عرب ممالک [illegible] فوجی ماہرین اور ہوا باز عربوں سے مل کر کام کر رہے ہیں۔"

"یہ بہت اچھا ہے۔" بریگیڈیئر ہولڈن بولا۔ "ہمارے [illegible] ہے کہ صفدر کے بارے میں ان شبہات کا اظہار [illegible] رہا ہے۔ میرا تو ایک ہی مطالبہ ہے کہ صفدر سوڈ کے لئے [illegible] شخص کو میں ہرگز یہاں نہیں رکھ سکتا۔ حادثے کی تفتیش [illegible] اس شخص کو تم فوراً اپنے ساتھ لے جاؤ!"

"آپ کے مشورے کا شکریہ بریگیڈیئر!" کرنل لیوک نے جواب [illegible] لوگ منصوبہ بندی پر فائز ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ کس وقت [illegible]

"تم مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہو؟" بریگیڈیئر ہولڈن [illegible]

"کیپٹن!" کرنل لیوک اسے جواب دینے کی بجائے [illegible] ہوا۔ "صفدر کو ساتھ لے جا کر اس مقام پر ایک نظر ڈال لو [illegible]"

"او کے سر!" ماریا غالباً اسی حکم کے انتظار میں تھی [illegible] جگہ سے اٹھ گئی اور میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ چھولداری سے نکلتے [illegible] کانوں میں لیوک اور ہولڈن کی درشت آوازیں آئیں [illegible] باہر نکلتے ہی شاید دونوں نے بیک وقت بولنا شروع [illegible]

چھولداری سے نکلنے پر فوراً ہی ہمیں ایک اور واقعہ پیش آیا [illegible] اور کرخت مردانہ چہروں سے اکتائے ہوئے تمام فوجی ڈیوٹی کی صورت میں اس خیمے کے گرد جمع تھے جہاں سے ہم دونوں باہر آئے اور ماریا پر نظر پڑتے ہی کئی سمتوں سے بے ساختہ انداز میں سیٹیاں بجائی گئیں۔ میرا خیال تھا کہ رنگروٹوں کا یہ اوباشانہ انداز ماریا کو برہم کر دے گا مگر وہ سیٹیاں سن کر ماریا کے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ جسے دور سے دیکھا جانا ناممکن تھا۔

"وہ سب تمہیں ہوٹ کر رہے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجہ میں ماریا کو اکسانے کی کوشش کی۔

"تم احمق ہو۔ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے بے قابو ہو رہے ہیں۔"

"تمہارے منہ سے یہ تاویل کچھ اچھی نہیں لگی۔"

"وہ کیوں؟"

"تم کوئی راہ چلتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک خالص فوجی کیمپ میں جب رنگروٹ کسی کیپٹن پر سیٹیاں بجانے لگیں تو اس کا مطلب ڈسپلن کی بربادی ہوتا ہے!"

"اس ویرانے میں وہ بے چارے کسی حسین چہرے کے دیدار کو ترسے ہوئے ہیں۔ انہیں ایک لڑکی نظر آئی ہے تو وہ مسرت کا اظہار کیوں نہ کریں۔ اس وقت ان کے نزدیک میں محض ایک لڑکی ہوں۔ میرا عہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔"

"بڑا عمدہ فلسفہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ایک آدھ گھنٹہ ہر رنگروٹ کے ساتھ گزارنا چاہیئے۔" میں نے جلے کٹے لہجہ میں کہا۔

"یہ کیمپ ہے مائی ڈیئر، محاذ ہوتا تو میں ان کا مورال بلند کرنے کے لئے یہ بھی کر گزرتی۔" ماریا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اس دوران میں چند بے خوف نوجوان فضا میں ہاتھ لہراتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے۔

"اب نمٹو ان سے!" میں نے منہ بنا کر آہستہ سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" ماریا اچانک چلتے چلتے رک کر ان کی طرف گھوم گئی ان میں سے جو جہاں تھا وہیں رک گیا اور انہوں نے کم و بیش ایک ہی وقت میں ماریا کو سلیوٹ پیش کر ڈالا۔

"ہمارا خیال تھا کہ کیمپ کے معائنے میں ہم تمہاری کچھ مدد کر سکیں" ایک تنومند اور سرکش شخص نے جلدی سے کہا۔

"اس خیال آرائی کا شکریہ!" ماریا طنزیہ لہجہ میں بولی "یہ تربیتی کیمپ ہے چڑیا گھر نہیں جہاں ہر ایک بے لگام ہو۔"

"آپ درست فرماتی ہیں۔" وہ لڑکا خاصا طرار تھا۔ "میجر مورلین کو دیکھ کر کبھی کبھی ہمیں بھی یہی شبہ ہونے لگتا ہے کہ ہم چڑیا گھر کے کسی نگران کی تحویل میں ہیں۔"

"ہوش میں رہ کر بات کرو۔" ماریا کرخت لہجہ میں اس پر برس پڑی۔ "اگر اب اپنے کمانڈر کی شان میں گستاخی کی تو فوراً کوارٹر گارڈ پہنچا دیئے جاؤ گے۔"

"مجھے افسوس ہے سر!" ماریا کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ ہکلانے لگا "مجھے احساس نہیں رہا تھا کہ میں ایک افسر سے ہم کلام ہوں۔"

"اپنی اپنی چھولداریوں میں جاؤ۔ جو باہر نظر آیا اس کے ساتھ میں سختی سے پیش آؤں گی۔" ماریا فضا میں ہاتھ لہرا کر دہاڑی۔

وہ سب تیزی کے ساتھ وہاں سے منتشر ہونے لگے اور ماریا میرے ساتھ اس طرف ہو لی جہاں اسلحہ میں ہولناک آتش زنی ہوئی تھی۔

"آج کل تل ابیب کے کیا حالات ہیں؟" چند ثانیوں تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"شہر پر خوف و ہراس کی فضا چھائی ہوئی ہے!" وہ دھیمے اور اداس لہجہ میں بولی۔ "ہر شخص دوسرے سے خوفزدہ نظر آتا ہے۔"

"کیا مزید واقعات پیش آئے ہیں۔!"

"تل ابیب کے شہری ۵ جون کے واقعات کو کبھی نہ بھول سکیں گے۔ جانتے ہو اس روز صرف تل ابیب میں کتنے شہری ہلاک ہوئے تھے؟"

"جاننے کا موقع ہی نہ مل سکا۔"

"اکتیس افراد ہلاک اور بائیس زخمی ہوئے۔ یہ تل ابیب کی تاریخ کا منحوس ترین دن تھا۔" وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

"محمود کا کوئی سراغ ملا؟"

"کچھ پتہ نہیں چلتا۔" وہ اضطراب آمیز لہجہ میں بولی "سمندر سے کوئی لاش برآمد نہیں کی جا سکی اور نہ ہی اس کا پتہ چلا ہے۔ مجھ سے اس کے آدمی کالے عقاب کے حوالے سے ملتے رہتے ہیں اور وہ ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔"

"تو تم ابھی تک ان کے لئے کام کر رہی ہو؟"

"جس دن زندگی سے اکتا گئی، انکار کی کوشش کر کے بھی دیکھ لوں گی"

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"فلسطینی دہشت پسندوں کے سارے معاملات ہمارا محکمہ ہی نمٹاتا ہے۔ اور سوڈ کے بارے میں ہر ایک کو پورا یقین ہے کہ یہاں نہایت منظم تخریب کاری کی گئی ہے اسی لئے ہمیں یہاں آنا پڑا ہے۔"

"کرنل لیوک تو شاید پہلے سے طے کر کے آیا ہے کہ سارے واقعات کی ذمہ داری میرے سر ہی تھوپ دے گا۔"

"تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ تمہارا ماہر ہے۔"

"ماہر؟ میں سمجھا نہیں!" میں نے حیرت سے کہا۔

"پچھلے دو ماہ سے وہ تمہاری فائل میں سر کھپا رہا ہے۔ اسے صرف یہ کام سونپا گیا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات جمع کرے۔"

"مگر وہ تو زیادہ بہکا ہوا ہے اور مجھے پاکستانی قرار دینے پر تلا ہوا ہے"

"تم نے الشوبخ میں بن حیان کے پرانے ملازم ابو مالک سے جو گفتگو

کی تھی وہ سب فائل میں موجود ہے۔ اس کی رُو سے تم دہلی کے رہنے والے ہو اور تمہارا اصلی نام ودیا ساگر ہے۔ ان خطوط پر جب کرنل لیوک نے چھان بین کرائی تو وہاں کوئی ایسا سراغ نہ مل سکا جس سے تمہارے بیان کی تائید ہوتی ہو۔"

"دہلی میں اتنا مشہور تو نہیں تھا کہ محض میرے نام کی بنا پر وہاں سے ساری معلومات جمع کی جا سکیں۔"

"دہلی میں اس نام کے کل ستر ہ آدمی رہتے ہیں۔ ایک پچھلے سال کے دوران میں وفات پا چکا ہے اور اسی نام سے شہر میں دو بچے بھی پل رہے ہیں۔" وہ اعداد و شمار پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "اور تمہاری بدنصیبی یہ ہے کہ تمہاری تصویر ان میں سے کسی سے مشابہ نہیں، ہر ایک کا پورا پورا سراغ مل چکا ہے اور دہلی میں کسی بھی علاقے سے ودیا ساگر نامی کسی شخص کی رپورٹ گمشدگی یا بیرون ملک ہجرت کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔"

"تم تو یہ باتیں اتنے اعتماد سے کر رہی ہو جیسے وہ دہلی نہ ہو بلکہ اسرائیل کی کوئی ڈسٹرکٹ ہو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہندوستان جیسے غریب اور پسماندہ ملکوں میں معلومات آسانی سے اور سستے داموں مل جاتی ہے۔" اس نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"مگر ہندوستان سے تمہارے سفارتی مراسم کہاں ہیں؟"

"نہ ہوا کریں۔" وہ ایک پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولی۔ "مگر وہاں ہمارے دوستوں کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ ہمارے لئے پاتال میں سے سوئی بھی ڈھونڈ کر لا سکتے ہیں۔"

"تو تم بھی لیوک کی ہم خیال ہو گئی ہو۔" میں نے بحث کو بڑھانے سے گریز کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"اس کی ہم خیال ہوتی تو یہاں تک نہ آتی۔"

"اس بات کا میں کیا مطلب اخذ کروں؟"

"وہ کٹر محبِ وطن ہے اور دشمن کا کھوج لگانے یہاں آیا ہے جب کہ میں اسرائیل کے دشمنوں کے اشارے پر کرنل لیوک کے ہمراہ یہاں آئی ہوں۔"

جلی ہوئی اسلحہ گاہ سامنے آ چکی تھی۔ میں رک کر حیرت سے ماریا کا منہ تکنے لگا۔ "یعنی تمہیں محمود کے جانشین نے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے"

"ہاں ___ وہ ہر حال میں تمہیں تل ابیب میں دیکھنا چاہتے ہیں!"

"اس لحاظ سے تمہارا کام تو بریگیڈیئر ہولڈن نے آسان کر دیا ہے!"

"کرنل لیوک ہرگز اس کی بات نہ مانے گا۔"

"بریگیڈیئر کے سامنے ایک کرنل کی یہ مجال؟"

"یہ کرنل لیوک کی شرافت ہے کہ اس نے تلخ گفتگو کے آغاز سے قبل مجھے بہانے سے باہر بھیج دیا ورنہ وہ میرے سامنے بھی بریگیڈیئر ہولڈن کی بے عزتی کر سکتا تھا۔"

"تمہاری یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"بریگیڈیئر ہولڈن اس کیمپ کا کمانڈنگ آفیسر ہے اور لیوک آرمی انٹیلی جنس کا ایک بااختیار افسر ہے۔ ہولڈن کا کام تربیت اور تفتیش کے سلسلہ میں مجھے اور لیوک کو تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کرنا ہے مگر لیوک کو اتنے اختیارات ہیں کہ وہ چاہے تو سوڈ کے سانحے میں حفاظتی انتظامات سے غفلت برتنے کے جرم میں بریگیڈیئر ہولڈن کا کورٹ مارشل کرا دے۔" ماریا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آخر لیوک کو ہولڈن کی بات ماننے سے گریز کیوں ہو گا؟"

"اسرائیل میں بن حیان کی ہدایات کو ٹالنے والوں کی تعداد کم ہے۔"

"بن حیان کا ذکر کہاں سے آ گیا درمیان میں؟"

"ہولڈن کے نزدیک تم ایک عام رنگروٹ ہو مگر لیوک تمہارے پورے پس منظر سے واقف ہے۔ بن حیان ایک خاص منصوبے کے تحت تمہیں اسرائیل لایا تھا اور تمہاری سپردگی کے کاغذات میں اس کی تفصیل درج ہے اور تم بن حیان کی ان تحریری ہدایات کے تحت یہاں موجود ہو۔ تمہارے خلاف ٹھوس ثبوت کے بغیر کرنل لیوک پر تمہاری تربیت کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دے گا۔"

"اگر میں تمہاری باتوں کو درست مان لوں تو پھر بھلا تم ان آدمیوں کی ہدایات پر کیسے عمل کر سکو گی؟" میرے ذہن پر الجھن طاری ہو گئی۔

"اگر تم تل ابیب واپس جانا چاہتے تو میرے ساتھ تعاون کرو۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھے کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ میں لیوک کو پورا یقین دلا دوں کہ تم سوڈ کے سانحے میں ملوث تھے۔" اس نے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں اتنا احمق نہیں ہوں کیپٹن ماریا!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ایک مرتبہ گردش میں آ گیا تو کوئی طاقت مجھے اسرائیل سے نکال سکے گی!"

"یہ ایک جوا ہو گا!"

"مجھے جوئے سے نفرت ہے۔ میں اپنا دامن مزید الجھانا نہیں چاہتا۔ میرے یہاں رکے رہنے یا تل ابیب واپس جانے کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم محمود کے جانشینوں کی بات کو کس قدر اہمیت دینے کو تیار ہو۔"

"میرے خدا!" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "تم جانتے ہو کہ میں روئے زمین پر ہر کام کر سکتی ہوں مگر ان کے حکم کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ مگر اس بار میرے لیے کچھ کرنا مشکل ہو گا۔"

"یہ تمہارا درد سر ہے۔" میں نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔ "تم مجھے اس آتش زدہ کھنڈر کے پاس کیوں لائی ہو؟"

"ملبے کا معائنہ کرنے۔" وہ یک بیک شوخ انداز میں مسکرا دی۔

"شاید مجھے کوئی ایسا کلیو مل سکے جو دوسروں کی نظروں میں نہ آ سکا ہو۔"

اسلحہ گاہ کی سیمنٹ اور پتھروں سے بنی ہوئی دیواریں شدید دھماکوں کے باعث ریزہ ریزہ ہو کر دور دور تک بکھر گئی تھیں۔ جلے ہوئے اسلحہ کے ٹکڑے بھی دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ مگر اس ابتری کے باوجود وہاں چوبی کریٹس کے ایسے انبار موجود تھے جن میں وزنی اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ بیشتر اسلحہ برباد ضرور ہو گیا تھا مگر دھماکوں سے بکھرا نہیں تھا۔ ماریا میرا ہاتھ تھام کر مجھے ان اونچے انباروں کے درمیان لیے چلی گئی۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے سرد غراتی ہوئی آواز میں اس سے سوال کیا۔ اس کی چمکدار نگاہیں اٹھیں اور میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں ___ میرے سوال کا جواب ماریا کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔

"تم یہاں تربیت پانے والے ہم لوریلوں کے جنونی مزاج سے واقف نہیں ہو۔" میں نے نظریں جھکا کر آہستگی سے کہا۔ "وہ اس وقت بھی اپنی چھولداریوں میں دیکے دور بینوں سے ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔"

"تلاش کر رہے ہیں تو کرتے رہیں۔" وہ ایک دم بپھر کر بولی۔ "میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دھماکوں کی ابتدا اس کمرے میں کہاں سے ہوئی تھی۔"

اس کے جھلائے ہوئے ردعمل پر میں بے اختیار مسکرا دیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "دھماکوں کی ابتدا رات کے ڈھائی تین بجے ہوئی تھی مائی لیڈی! اور اس وقت میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ویسے تمہارے سوال کا جواب تو شاید میجر مورلین کے وہ محافظ بھی نہ دے سکیں گے جو اس رات اس کمرے کی نگرانی پر مامور تھے!"

"مجھ سے دور رہ کر بات کرو۔" اس نے میرے ہاتھ اپنے شانے پر سے بری طرح جھٹک دیئے۔ "یونیفارم میں میں کیپٹن ماریا ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اپنے افسروں کے ساتھ ماتحتوں کا کیا رویہ ہونا چاہیئے۔" پل بھر میں اس کے تیور بالکل بدل گئے تھے۔

"اوکے کیپٹن۔" میں نے اس ٹھکرائی ہوئی دوشیزہ کو گھورتے ہوئے ہونٹ بھینچ لئے اور کہا۔ "تم مجھ سے اور کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟"

"وہ کونا صاف کر دو!" ماریا ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

اس وقت ماریا سے الجھنا بے سود تھا لہٰذا میں اس کے بتائے ہوئے کام میں مصروف ہو گیا اور جلے ہوئے تختے اور ہتھیار دور پھینکنے لگا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہی پھر گھوم پھر کر جائے واردات کا معائنہ کرنے لگی۔

مجھے سننے کی دھن میں [illegible] کام کر رہی ہو کیپٹن!" اس کی لاپروائی کے پیش نظر مجھے لوزبان کھولنا ہی پڑ گئی۔

"میں اپنا کام خوب جانتی ہوں۔" [illegible] "بہر حال ان ملبے کے ڈھیروں کے ماہرین کا کام مشکل ہو جائے گا۔ وہ جائے واردات کا ایک ایک تنکا بھی اصل حالت میں دیکھنا چاہیں گے۔"

"تم احمق ہو۔" وہ جھلا کر چیخی۔ "باہر نکل آؤ۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی لیکن اس نے سیدھی طرح میرے مشورے کو قبول نہیں کیا بلکہ اس قبولیت میں بھی حکم کا پہلو نکال لیا۔

سوڈ میں اس حادثے کے بعد ہی مورلین نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ ملبے کو بالکل نہ چھیڑا جائے کیونکہ گولہ بارود کے اسرائیلی اور امریکی ماہرین کی جماعت اس کا بغور جائزہ لے گی۔ پھر بعد میں پتہ چلا کہ ایک غیر ملکی اڈے سے بعض حساس آلات کی آمد میں تاخیر کے باعث وہ جماعت دو ایک روز بعد آئے گی۔ میں نے ان ہی معلومات کی روشنی میں ایک شوشہ چھوڑا تھا جس نے ماریا پر خاطر خواہ اثر کیا تھا اور میری گلو خلاصی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی ملبے سے باہر آ گئی۔

اسے دیکھتے ہی میں بے اختیار ہنس پڑا اور ماریا کی تیوریوں پر کئی بل پڑ گئے۔ "بلاوجہ دانت کیوں نکال رہے ہو؟"

"آئینہ دیکھ کر تم خود بھی اپنی ہنسی نہ روک سکو گی!" میں نے بجا طور پر کہا کیونکہ ماریا کے چہرے پر اور یونیفارم پر جا بجا کالک لگی ہوئی تھی۔

"میں کہتی ہوں خاموش رہو!" وہ چلائی۔

اسی وقت ایک قریبی ٹیلے کی اوٹ سے دو زیر تربیت سپاہی اچھل کر سامنے آ گئے۔ شاید وہ ہماری لاعلمی میں چھپتے چھپاتے وہاں تک آ گئے تھے۔

"یہ کالیا بڑا بدمعاش ہے مس!" ان میں سے ایک فاتحانہ شان سے بولا۔ "ہم تمہاری مدد کے لئے موجود ہیں۔"

"شٹ اپ!" ماریا دھاڑی اور اس کے منہ سے مغلظات کا ایک ایسا سیلاب جاری ہوا کہ وہ دونوں شدید بوکھلاہٹ کی حالت میں واپس دوڑتے چلے گئے۔

"دیکھ لی گورے بدمعاشوں کی حرکت!" اس کا غصہ کم ہونے پر میں نے کہا۔ "یہ لوگ پرلے درجے کے ڈھیٹ اور بے حیا ہیں۔"

"واپس چلو!" وہ اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔

"ہاں اب تو بریگیڈیئر ہولڈن اور کرنل لیوک کا جھگڑا بھی نمٹ چکا ہو گا۔" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔

ہم واپس پہنچے تو بریگیڈیئر ہولڈن وہاں موجود نہیں تھا اور کرنل لیوک تیز لہجے میں مورلین کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی کرنل لیوک خاموش ہو گیا پھر اس نے ماریا سے پوچھا۔ "معائنے میں کوئی کارآمد بات معلوم ہوئی ہے یا دو دام واپس آئی ہو؟" اس نے ماریا کے چہرے اور یونیفارم پر لگے ہوئے کالے نشانات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

"کوئی سراغ نہیں ملا۔ ویسے میں نے دھماکہ خیز مادوں کے ماہرین کی متوقع مدد کے پیش نظر زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔"

اسی وقت قریب سے کسی جیپ کا انجن چلنے کا تیز شور پیدا ہوا اور چند ثانیوں بعد وہ آواز تیزی کے ساتھ دور ہوتی چلی گئی۔

"یہ ہمارا جیپ کا پیٹر تھا سر؟" ماریا نے سوال کیا۔

"ہاں ــــ برگیڈیئر بولڈن کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی۔" کرنل لیوک نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔ "اسے جی ٹی فورجھوڑ کر ہیلی کا پٹر واپس آئے گا تو ہم فوراً روانہ ہو جائیں گے!"

"باقی لوگوں سے کچھ . . . !" میجر مورلین نے کہنا شروع کیا۔

"کسی سے پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں۔" کرنل لیوک اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "یہاں صرف صفدر علی مشکوک شخص ہے۔ یہ میرے ساتھ جائے گا۔"

"مگر سر! بریگیڈیئر بولڈن سے تو آپ صاف انکار کر چکے تھے۔" میجر مورلین نے سہمے ہوئے حیرت آمیز لہجہ میں کہا۔

"میں صفدر کو لے جانے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکا تھا مگر مسٹر بریگیڈیئر مجھ پر اپنی رائے مسلط کرنا چاہ رہے تھے جو میرے اصول اور مزاج کے خلاف ہے!"

"او کے سر!" میجر مورلین نے سر ہلا کر کہا۔ اس وقت وہ یوں سکڑا ہوا بیٹھا تھا جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔

"اتنی دیر میں تم اپنے چہرے کے نقوش درست کر لو!" کرنل لیوک نے ماریا سے کہا۔

"میں صفدر علی کی روانگی کے کاغذات تیار کر لوں سر!" میجر مورلین نے موقع پا کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی اور وہاں سے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

"تمہیں اپنا اسباب وغیرہ لینا ہو تو لے آؤ!" کرنل لیوک نے مجھ سے کہا۔

"میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے!" میں نے کہا۔ اتنی دیر میں میجر مورلین بھی خیمے سے جا چکا تھا اور میں وہاں لیوک کے مقابلے میں تنہا رہ گیا تھا۔

"تو پھر تم باہر ٹھہرو!" اس نے مجھ سے کہا۔

"اجازت ہو تو کچھ دریافت کر لوں؟"

"کیا؟" اس کی بھنویں پیشانی پر جا چڑھیں۔

"اسرائیل میں میں بالکل تنہا اور بے سرو سامان ہوں۔" میں نے دھیمے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "اس اجنبی ماحول میں وطن کی یاد کے علاوہ ہر چیز بیگانی ہے۔ مگر آپ کے شبہات نے میرا یہ سہارا وہ بھی چھین لیا ہے۔"

"اس قسم کی پرُ گفتگو کر کے میرا وقت برباد نہ کرو!"

"کم از کم مجھے یہ تو بتا دیں کہ میری قومیت پر آپ کیوں شبہ کر رہے ہیں۔"

وہ ہونٹ بھینچ کر مجھے گھورنے لگا۔ "کیا تم نے مجھے بیوقوف بنانے کا ارادہ ہی کر لیا ہے جو الٹی مجھ سے باز پرس کر رہے ہو۔"

"میں آخری حد تک سنجیدہ ہوں جناب!" میں نے روہانسے لہجے میں کہا۔ "ویسے تو آپ حاکم ہیں آپ کا ہر فیصلہ آخری ہے۔ مگر میں نے بڑی امید . . . اور توقعات کے ساتھ آپ سے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت کی تھی۔"

"تو سنو کہ تمہاری کہانی شروع سے آخر تک ایک سوچا سمجھا جھوٹ ہے!" وہ بولا۔ "تم اشکوخ پہنچے تو وہاں تمہارا نام وڈیا سا گر تھا اور تم دہلی کے رہنے والے تھے جبکہ اس شہر میں تمہارے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ بن حیان کے ملازم ابو مالک نے تمہیں مشرف بہ اسلام کرنے کی رسم ادا کرنا چاہی تو تم نے اس سے دامن بچا لیا۔"

"نہیں مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں!" میں نے یہ بات کہنے کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ ایک مرحلہ پر ابو مالک نے یہ کوشش کی تھی مگر میں نے اسے بتایا تھا کہ طبی ضروریات کی بنا پر میں ایسا کر چکا ہوں۔ وہ یاد آتے ہی میں نے تائید طلب لہجہ میں کرنل لیوک سے واقعہ کا تذکرہ کر ڈالا۔

"تمہارا حافظہ بہت تیز ہے۔" وہ طنزیہ لہجہ میں بولا۔

"مگر وہ حقیقت تھی!"

"ایک ہندو سے میں ایسے بیان کی توقع نہیں رکھتا جو بودا اور بے جان ہو!" وہ پنسل کا سرا چباتے ہوئے بولا۔

"مگر وہ بالکل حقیقت تھی جناب!"

"تمہارا مذہب وہی ہوا نا جو گاندھی کا تھا؟" اس نے اچانک سے ایک بونگا سا سوال کر ڈالا۔

"جی ہاں۔"

"اور گاندھی عدم تشدد کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ چیونٹی کو بے خبری میں مارنا اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا کہ انسان کو مارنا۔"

"غالباً آپ درست کہہ رہے ہیں۔"

"اور ہندو اسلامی رسم و رواج سے سخت متنفر ہیں؟"

"یہ بھی کسی حد تک درست ہے!"

"اور اسلامی رسوم سے بدظن اور عدم تشدد کا پیروکار کیسے ایک اسلامی رسم کو اختیار کر چکا ہے جس میں اپنی ذات سے تشدد شامل ہے تو میں اسے کس طرح مان سکتا ہوں۔" وہ پُرزور لہجہ میں بولا۔

"طبی ضرورت . . . . . !"

"بار بار اس بہانے کو نہ دہراؤ۔" وہ برہم ہو کر بولا۔ "مذہبی اصول کسی بھی ضرورت کے تحت نہیں توڑے جاتے۔"

"قدیم خیالات کے لوگوں کی حد تک آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن آج کے تعلیم یافتہ طبقے میں آپ کو بہت سے ایسے ہندو ملیں گے جو گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفے کا کھلا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے بزدلی قرار دیتے ہیں۔"

"مجھ سے بحث مت کرو۔" کرنل لیوک غرایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں ہونے والے فسادات اور جنگوں کا حوالہ دینے بیٹھ جاؤ گے مگر پر سکون بیٹھے ہوئے ایک فرد اور مشتعل ہجوم میں بڑا فرق ہے۔ میں اس موضوع پر مسلسل بول سکتا ہوں اور تم سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا۔"

اگر صرف اسی بنا پر آپ نے مجھ پر شبہ کیا ہے تو یہ میری بدنصیبی ہے۔"

"تمہیں اپنی بدنصیبی کا احساس تمہیں چند روز بعد ہو گا۔" وہ تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ تم دہلی میں اپنا کوئی ٹھکانہ بھی نہ بتا سکو گے۔ دربدر ٹھوکریں کھانے والا اپنا ٹھکانہ کہاں بتاتا ہے جناب!" میں بولا۔ "اگر روزی اور ٹھکانہ میسر ہوتا تو میں غیر قانونی طور پر خلیج کے علاقہ میں داخل ہوتا۔"

کرنل لیوک کی آنکھیں یک بیک کسی شکاری کی طرح چمکنے لگیں۔ "یہ دکھتی رگ ہے۔ یہ شخص کا اپنا ماضی ہوتا ہے۔ تمہارا ٹھکانا کیوں نہیں تھا؟ تمہارا باپ کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ تم پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔ تم نے تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ اگر ان سوالات کے تسلی بخش جواب مل گئے تو تم یقین رکھو کہ اسرائیل میں تمہیں کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھ سکے گا بلکہ میں خود تمہیں اپنے ملک کے حقوقِ شہریت دلاؤں گا۔"

اس بار مجھے سانپ سونگھ گیا۔ کرنل لیوک میری توقعات سے کہیں زیادہ چالاک تھا۔ اس نے واقعی میری دکھتی رگ پر ہاتھ ڈال دیا تھا اور اس سے مزید گفتگو کر کے میں دلدل ہی میں پھنستا چلا جاتا۔

"جواب دو میرے سوالات کا؟" مجھے خاموش پا کر وہ دہاڑا۔ "یا پھر شرافت کے ساتھ اپنی اصلیت کا اعتراف کر لو!"

"اگر میری فائل مکمل ہے تو ان سوالات کے جواب اسی میں مل جائیں گے۔"

"مکمل سکوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس کے لگائے ہوئے الزامات قبول کر لیے ہیں لہٰذا میں وقت حاصل کرنے کے لئے دیدہ دلیری پر اتر آیا۔

"اس میں کاغذ کے بیکار ٹکڑے ہیں۔" وہ فائل کو زور سے میز پر پٹخ کر بولا۔ "اس میں ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے!"

"انڈین نیشنل اسکول میرٹھ میں میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔" میں نے سر جھکا کر واس مگر پُراعتماد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میرے باپ کا نام موہن کانت تھا اور وہ شروع سے آخر تک مکان نمبر ستاسی محلہ رکاب میں رہتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان نکات کی تصدیق کے بعد آپ اپنے وعدے کا پاس کریں گے!"

"ایک ہفتہ گزرنے کے بعد نتیجہ سامنے آ جائے گا۔" وہ فائل کور پر پنسل سے کچھ نوٹ کرتے ہوئے بولا۔

اسی وقت میجر مورلین کچھ کاغذات لئے وہاں آ پہنچا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کرنل لیوک سے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے مجھ کو خوف سا تھا اور میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے اس کے خیمے سے جانے کے بجائے وہیں رک کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مجھے ہیلی کا پٹر کی واپسی تک انتظار مجھے بہت گراں گزرا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ ایک بار مجھ پر حاوی ہونے کے بعد کرنل لیوک وقت گزاری کے لئے مزید باز پرس کے لئے مجھے دوبارہ اپنے پاس طلب نہ کر لے۔

ہیلی کا پٹر واپس آیا تو اس کے لینڈ کرنے کے ساتھ ہی فضا میں ریت کا زبردست طوفان بلند ہوا جو کافی دیر تک فضا میں چھایا رہا۔ غبار چھٹنے کے بعد نہ جانے کہاں سے میلوٹ میرے پاس آ موجود ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"مسٹر! بھیب جا رہے ہو؟" اس نے گھگھیائی سی آواز لہجہ میں کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا قصہ ہے؟" اس کا لہجہ تجسس آمیز تھا۔

"قصہ تو بھی ہو گا مگر میں تمہاری رنگ رلیوں کا پول ضرور کھولوں گا۔"

"ششش آہستہ بولو۔" وہ بوکھلا کر گرد و پیش میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ مذاق ہی مذاق میں میری قلعی کھل جائے۔"

"مذاق؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے تمہاری مصروفیات کے بارے میں کرنل لیوک کو کچھ تو باتیں بتا ہی دی ہیں۔"

"دیکھو یار یہ لمبا معاملہ ہے۔" وہ میرا شانہ دباتے ہوئے خوشامدانہ لہجہ میں بولا۔ "اس میں جس کا نام بھی آ گیا وہ عمر بھر پچھتاتا رہے گا۔" پھر وہ ڈھونڈ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "اور میں نے تمہارا بگاڑا ہی کیا ہے؟ میری زبان ضرور خراب ہے مگر میں دل سے تمہاری عزت کرتا ہوں۔ خدا کے لئے اپنے ساتھ میرا بھی خانہ خراب نہ کرا دینا!"

مجھے اس بوڑھے مردود کا خون خشک کرنے کا زیادہ موقع نہ مل سکا، کیونکہ اس وقت کرنل لیوک اولڈ ماریا سمیت باہر آ گیا۔

ہیلی کا پٹر میں پائلٹ کے علاوہ چار مسافروں کا انتظام تھا۔ ہم تینوں کے سوار ہونے کے بعد انجن اسٹارٹ کیا گیا اور کھڑکیوں سے باہر فضا میں دور دور تک ریت ہی ریت پھیل گئی اور اسی ریتیلے بادل میں ہیلی کا پٹر بلند ہوتا چلا گیا۔

ایک لحاظ سے مجھے سوڈے سے جانے کی مسرت تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ محمود خود مجھے تل ابیب بلانا چاہتا تھا اور اس مقصد سے اس نے ماریا پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا ہوا تھا مگر غنیمت یہ ہوا کہ ماریا کی کوشش کے بغیر ہی لیوک مجھے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گیا تھا۔ ورنہ اس جیسے سخت گیر افسر کے سامنے ماریا شاید زبان بھی نہ کھول پاتی۔

البتہ جن حالات میں مجھے لے جایا جا رہا تھا وہ کچھ دل خوش کن نہیں تھے۔ ماریا کی گفتگو سے مجھے یہ پتہ چل چکا تھا کہ میری تربیت بن حیان کے منصوبے کے مطابق جاری تھی۔ مگر کرنل لیوک نے مجھے واپس لا کر بالواسطہ طور پر میرے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اس کے پاس میرے خلاف ٹھوس شہادتیں موجود ہیں۔

کرنل لیوک کی ذات چند گھنٹوں میں میرے لئے ایک چیلنج کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس سے نجات پانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ دہلی سے میری فراہم کردہ معلومات کی حتمی تردید سے قبل میں اسرائیل کی سرحد عبور کر جاؤں۔

کرنل لیوک کو محمود کی مدد سے راستہ سے ہٹایا جا سکتا تھا مگر وہ

یہ تیسرے مسئلہ کا کوئی تیت حل نہیں تھا کیونکہ لیوک اپنے تجزیہ اور معلومات کو فائل میں قلمبند کر دیتا اور اس کے بعد تو بھی وہ فائل دیکھنا میری رسائی سے دور تک جاتا۔

لیوک کو فائل سمیت ختم کرنے کی صرف ایک صورت تھی کہ تل ابیب کی جانب پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو کوئی حادثہ پیش آ جاتا۔ مگر اس میں میری ہلاکت کا بھی مساوی خطرہ موجود تھا۔

دورانِ سفر میرا ذہن اسی گتھی میں الجھا رہا۔ میں اپنے خیالات کی رو سے اس وقت باہر آیا جب ہیلی کاپٹر نے زمین چھوئی۔

تل ابیب کے نواح میں کئی فوجی ہیلی پیڈز ہیں۔ ہمارا ہیلی کاپٹر ان میں سے کسی ایک پر اترا تھا۔ وہاں شاید لیوک کی اتنی جلد واپسی کی امید نہیں تھی کیونکہ اس کے لئے سواری کے انتظام میں خاصی دیر لگ گئی اور جب وہ چلا گیا تو ماریا مجھے ساتھ لے کر اسٹاف کار میں شہر کی طرف چل دی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اسٹاف کار نے ہمیں شہر کے گنجان رہائشی علاقہ میں ایک آباد عمارت کے سامنے اتار دیا۔

اوپر فلیٹ میں پہنچنے پر میری یہ مسرت دوبالا ہو گئی کیونکہ میرے لئے مخصوص حفاظتی انتظام کرنے کے بجائے مجھے ماریا کے ہی فلیٹ میں بھیج دیا گیا تھا۔

اسرائیل میں طویل قیام کے دوران میں اس روز پہلی بار میں نے ماریا کا آراستہ و کشادہ فلیٹ دیکھا جہاں زندگی کی تمام گھریلو آسائشیں موجود تھیں۔

"میرا فلیٹ پسند آیا؟" ماریا نے دروازہ بند کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"وردی اتار دو تو بے تکلفی کے ساتھ پسندیدگی کا اظہار کر سکوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس وقت تو تم میری افسر ہو!"

"تم قطعی ایڈیٹ ہو!"

"تمہارے ساتھ رہ کر ہی تو ایک خاصیت پیدا ہوئی ہے۔"

"چرب زبانی میں تمہارا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"اسمتھ اور فلورا کہاں ہیں؟" میں نے اچانک سوال کر ڈالا۔

"اسمتھ چھٹی گزار کر واپس چلا گیا اور فلورا طویل عرصہ اسپتال میں رہنے کے بعد مر گئی۔" اس نے سکون کے ساتھ اطلاع دی۔

"فلورا مر گئی؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"شہید وفا کہلائے گی۔" وہ اپنی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے بولی۔ "تمہاری وجہ سے اس پر تشدد [illegible] میں نہ چلا کہ اس کی گردن کی ایک ہڈی چٹخ گئی تھی۔ اسمتھ نے اسے بہت بے رحمی سے مارا تھا اور وہ اس چوٹ سے جانبر نہ ہو سکی۔"

"دکھ ہوا اس کی موت کی خبر سن کر!"

"ہونا ہی چاہیے۔ تمہیں دکھ نہ ہو تو کیا اسمتھ کو ہونا چاہیے۔"

"اب وہ مر چکی ہے تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔" [illegible] نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔

"وہ تو میرا قیاس تھا!" وہ قہقہہ مار کر بولی۔

"یعنی وہ زندہ ہے؟"

"پچھلے ہفتے ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی مہمان ہے۔ اب وہ بھلا کیا زندہ ہو گی!"

"اور اس حال میں تم نے بھی پلٹ کر اس کی خبر نہ لی۔"

"میں کیا کرتی۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "تل ابیب کے بہترین ڈاکٹر اس کے معالج تھے اور اسمتھ ان کے بل ادا کر رہا ہے۔"

"اگر وہ زندہ ہے تو میں ایک بار اس سے ضرور ملوں گا۔"

"تمہیں ملنا ہی چاہیے تاکہ مرتے دم بھی سے بچنے کا [illegible]" کہہ کر وہ سیٹی بجاتی ہوئی غسل خانے کی طرف چل دی۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں آرام کر رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے ماریا کو چونکا دیا۔

وہ لپک کر فون ریسیو کرنے گئی پھر وہیں سے اس نے مجھے آواز دی۔ بے اختیار میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ تل ابیب میں اتنی رات گئے ہی نہ جانے کس نے مجھے یاد کیا تھا۔

اگر وہ کرنل لیوک تھا تو اسے میرے بجائے ماریا سے بات کرنی تھی اور اگر وہ کال محمود کی جانب سے تھی تو میری نقل و حرکت کے بارے میں اس کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔

"کالا عقاب!" میرے قریب پہنچنے پر ماریا ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سرسراتی ہوئی خوفزدہ آواز میں بولی۔

میں نے فوراً ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"صفدر اسپیکنگ!" میں نے کہا۔

"گیدڑ کی کھال کے جیکٹ والا!" دوسری جانب سے ایک کھردری اور مردانہ آواز سنائی دی۔ "لڑکی کو ختم کر کے فوراً نیچے آ جاؤ۔ اور سے داہنی جانب بجلی کے کھمبے کے پاس ایک سیاہ وین تمہاری منتظر ہو گی۔ ہتھیار استعمال نہ کرنا۔ گلے میں ڈوری پھنسا دینا!"

"کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا مگر دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

یک بیک میری ہتھیلیوں سے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے اور میں نے خالی خالی نظروں سے ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

[illegible]

"مجھے فوراً بلایا ہے۔" میں نے بدقت [illegible]

[illegible] اجازت کے بغیر تم فلیٹ سے [illegible]

سلوک [illegible] سے کہا پھر چونک کر [illegible] عجیب [illegible] تم بھی تو مجھے [illegible]

[illegible] جھٹک کر زبردستی مسکرا دیا۔ لیوک کا مسئلہ بھی دیکھا [illegible] نہیں [illegible] تو نہیں کیا جانا؟"

جب [illegible] تمہارا فون [illegible]

نہیں [illegible] خیال ہو سکتا [illegible]

[illegible] میں نے [illegible] کھڑکی کے پردے کی ڈوری سے کھیلتے ہوئے [illegible] بہت خطرناک بات ہے۔"

[illegible] بے ربط باتیں کر رہے ہو۔ سچ بتاؤ کیا کہا اس نے؟" وہ [illegible] کر بولی۔

[illegible] ماریا [illegible] میں نے اپنے لہجہ میں رومان [illegible] دلچسپی کی [illegible] مجھے خود احساس ہوا کہ میرے لہجہ میں [illegible] موت کی [illegible] تھی۔ قطعی غیر متوقع طور پر ملنے والی ہدایت نے مجھے خوفزدہ سا کر دیا تھا۔

[illegible] وہ تشویشناک لہجہ میں بڑبڑائی "تمہاری پیشانی پسینے سے بھیگ گئی ہے اور ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔"

[illegible] کر وہ میرے سینے سے آ لگی اور اپنا سر اس نے میرے داہنے شانے پر [illegible] میں نے آہستگی سے اسے بانہوں میں لے لیا۔ میری انگلیاں [illegible] مضبوط ڈوری سے الجھ رہی تھیں اور وہ اپنی پشت پر ملنے والے موت کے پھندے سے بالکل بے خبر تھی۔

پھر جیسے ہی میرے ہاتھ بلند ہوئے، ماریا نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "بتاؤ نا کیا بات کہی تھی اس حرامزادے نے فون پر؟"

[illegible] وقت [illegible] چہرہ میرے چہرے کے بالکل سامنے تھا۔ وہ دراز قامت تھی مگر مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ اس کا اوپر اٹھا ہوا چہرہ اس لمحہ بڑا معصوم لگ رہا تھا۔ بڑی بڑی ریشمی زلفیں اس کی پشت اور شانوں پر لہرا رہی تھی۔ [illegible] گرم معطر سانس میرے نتھنوں، ہونٹوں اور رخساروں پر جمی [illegible] پھسلا رہے تھے۔

[illegible] ہاتھ رک گئے۔ ماریا شروع ہی سے میرے لئے سراپا [illegible] رہی تھی۔ اس نے میرے ساتھ کچھ برائی کرنا چاہی مگر ناکام رہی۔ اسرائیل [illegible] کے بعد وہ دوسری شناسا تھی جس سے مجھے ہمیشہ محبت ملتی [illegible] تھی۔ میرے پاس [illegible] ہلاک کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

[illegible] میرے ذہن نے پلٹا کھایا اور اس کا روپ مجھے پھیکا نظر [illegible] ماریا [illegible] تھا اور اس نام نہاد [illegible] ضرور تھی مگر بنیادی طور پر [illegible] تو بہت حیوانی جذبوں کی تسکین کے لئے [illegible] سامنے بھی [illegible] تھی۔ وہ اس [illegible] انسانوں پر بے رحمی سے اپنی چنگل میں [illegible] وہ [illegible] غدار تھی مگر مجھ سے غداری کرنے سے بھی باز [illegible] میری اہم گفتگو ریکارڈ کر کے میرے حلقوم پر گرفت کس رہا تھا [illegible] کے ساتھ ایک مجبور کو موت کے جہنم میں [illegible] انجام دیتا تھا اس کی زندگی کا کوئی مقصد تھا نہ اصول۔ وہ ایک حسین ناگن تھی جو اپنے شباب کی سرفرونی کے لئے دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکنیں لوٹ لینے پر تلی ہوئی تھی [illegible] سے بڑھ کر یہ کہ میرے محسن محمود نے اس کی موت کی فرمائش کی تھی!

ماریا غالباً میرے پر بستے ہوئے محمود کے لئے کام کر رہی تھی۔ محمود کبھی ایسے مہرے کو گنوانا پسند نہ کرتا۔ اب اگر وہ اسے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا تو یقیناً اس کے پاس اس اقدام کے مضبوط محرکات موجود رہے ہوں گے۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟" اس بار ماریا میری خاموشی اور سرد نگاہوں سے دہشت زدہ ہو گئی اور اس نے تڑپ کر میری بانہوں سے نکل جانا چاہا، مگر میرے ہاتھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئے اور پردوں کی ڈوری نے زلفوں سمیت اس کی گردن کو جکڑ لیا۔

پھندا تنگ ہونے سے پہلے ماریا نے میرا گریبان اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ گرہ سخت ہوئی تو اس کی مٹھیاں کھل گئیں اور میرے سینے پر کئی کمزور مکے پڑے تو اس کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی اور میں نے رسی کے اسی مہلک پھندے کے سہارے ماریا کو قالین پر ڈال دیا اور قوت سے ڈوری کسی گئی تو ماریا کے کانوں اور نتھنوں سے خون بہہ نکلا۔ اس کا چہرہ بے حد بھیانک ہو گیا تھا۔

اگر اس کا جسم قالین پر تڑپتا تو نچلی منزل والے متوجہ ہو سکتے تھے۔ میں اس کے بدن پر سوار ہو گیا اور ڈوری کو اس کے گلے پر کئی گرہیں دے دیں۔ [illegible] منٹ میں ماریا کا جسم بے جان ہو گیا اور میں اس پر سے اتر گیا۔

دروازہ کھول کر باہر نکلا تو راہداری ویران تھی۔ فلیٹ کے دروازے کا تالا اس قسم کا تھا کہ اسے صرف اندر ہی سے کھولا جا سکتا تھا۔ باہر سے چابی کے بغیر دروازہ کھولنا ناممکن تھا۔

میں سیڑھیوں سے اترا تو داہنی جانب فٹ پاتھ کے سہارے بجلی کے کھمبے کے قریب ایک سیاہ وین کھڑی ہوئی تھی جس کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں وین میں چڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک کہیں سے ایک بے آواز گولی آئی اور مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر وین کی باڈی میں پیوست ہو گئی۔

میں اچھل کر سینے کے بل وین کے پائیدان پر جا گرا۔ اس وقت تک وین حرکت میں آ چکی تھی۔

وین پر نہ جانے کتنے بے آواز فائر کئے گئے ہوں گے۔ مجھے تو صرف ان دو فائروں کا علم ہوا جو وین کی آہنی چادروں پر لگے اور اس کے بعد سناٹا چھا گیا اور وین اسی طرح اچھلتی ہوئی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔

چند ثانیوں کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں تو ابھی تک دروازے میں سینے کے بل پائیدان پر پڑا ہوا تھا لہٰذا میں وہاں سے اٹھا اور نشست سنبھال لی۔

وین کے عقبی حصے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ اگلے حصے میں بھی ڈرائیور ہی نظر آ رہا تھا۔ میں جھک کر ونڈ شیلڈ سے باہر دیکھنے لگا تاکہ راستے کا کچھ اندازہ کر سکوں مگر میرے کچھ پلے نہ پڑ سکا۔

بظاہر مجھے بغیر کسی پابندی کے ماریا کے فلیٹ میں رکھا گیا تھا مگر میرے آواز [illegible]

فائرنگ سے صاف ظاہر تھا کہ باہر سے فلیٹ کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی اب یہ دوسری بات تھی نگرانی کرنے والے کو میری جانب سے کسی بے خوف پیش قدمی کی توقع نہیں ہو اور جب اس نے یہ سمجھا کہ میں فلیٹ سے نکل کر فرار ہو رہا ہوں تو مجھ پر بلا مقصد فائرنگ سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

کرنل بیوک کے اندیشوں درچہ بارنیک کے قتل کے بعد اب سرائیل میں رکے رہنا میرے لئے بہت زیادہ خدوش تھا۔

محمود تو اس لئے ان لوگوں سے بچا ہوا تھا کہ وہ محمود کے خدوخال اور قدوقامت تک سے ناواقف تھے چہ بعد میں اس نے اپنی موت کا ڈرامہ رچا کر اپنی ذات کو ان لوگوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل کر لیا تھا مگر میرا معاملہ بہت مختلف تھا۔

میرے بارے میں ان کے پاس مکمل ترین تصویری اور جسمانی ریکارڈ موجود تھا۔ اسرائیل ایک چھوٹا سا ملک تھا جس کے باشندے اپنے فرائض کے بارے میں بے حد حساس تھے۔ لہٰذا مجھے مقامی آبادی میں پناہ اور مدد ملنے کے امکانات یکسر موقوف تھے۔ اب میری زندگی کا تمام تر دارومدار اس بات پر تھا کہ محمود مجھے کتنی جلدی سرحد عبور کرا سکتا تھا!

"وین رکتے ہی نیچے کود کر میرے پیچھے دوڑتے چلے آنا!" اچانک وین کی ڈرائیونگ سیٹ سے تیز آواز آئی۔

میں نے جواب میں صرف ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

جوں ہی وین ایک جگہ رکی میں نے دروازہ کھول کر اندھا دھند نیچے چھلانگ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ ہم کسی سڑک پر سفر کر رہے تھے دریں سڑک کا ہی اندازہ کر کے نیچے کودا تھا مگر درحقیقت وہ ایک سرسبز میدانی علاقہ تھا۔ جس کے درمیان کچی ناہموار گزرگاہ بنی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف کھیت اور باغات تھے۔

وین کا ڈرائیور نیچے کودتے ہی خاردار خشک جھاڑیوں کی باڑھ میں الجھتا ہوا ایک باغ میں گھستا چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

نارنگیوں کے اس وسیع و عریض باغ میں ہم کافی دیر تک دوڑتے رہے۔ راستے میں ایک دو جگہ نگہبانی کرنے والے کتے ہماری طرف لپکے اور میری روح فنا ہونے لگی۔ مگر وہ کتے شاید وین ڈرائیور کی بو سے مانوس تھے کیونکہ اس کی بو پاتے ہی ان کے جارحانہ تیور فرمانبرداری میں بدل جاتے تھے۔ کتوں کے اس رویئے سے مجھے یہ امید بھی ہو گئی کہ بھاگ دوڑ کا سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہے گا۔

شام کے دھندلکے میں کسی مزاحمت یا خطرے کے بغیر ہم دونوں دوڑتے رہے۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ مجھے لانے والے نے اپنی کمین گاہ کے قریب وین چھوڑ کر سخت حماقت کی تھی۔ اگر اس کا تعاقب بھی نہیں کیا گیا تھا تو اسرائیلی حکام جلد ہی اس وین کا کھوج نکال لیتے اور پھر وین کے قرب و جوار کا چپہ چپہ چھان ڈالا جاتا۔

چند منٹ بعد اس سرسبز اور شاداب باغ کے وسط میں لکڑی کا بنا ہوا ایک مختصر سا مکان نظر آنے لگا جس کی آہنی [illegible] کی پتلی پتلی لکیریں نہایت کاہلی کے انداز میں مکان کی ڈھلوان [illegible] رہی تھیں۔

شاید ہم دونوں کو دور ہی سے دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ ہم خاصی دور تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور ہمیں [illegible] ایک فام شخص رائفل سنبھالے موجود نظر آیا جس کے [illegible]

جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے اس شخص کے خدوخال [illegible] چلے گئے۔ وہ ہر اعتبار سے کسی یورپی ملک کا باشندہ نظر آ رہا [illegible]

"اوہ سینور یوسف۔" اس رائفل بردار شخص نے [illegible] دور ہی سے پہچان کر مسرت آمیز انداز میں نعرہ [illegible] اس کا لہجہ [illegible] کھا رہا تھا کہ وہ نسلی اعتبار سے فرانس کا باشندہ ہے۔

یوسف کا گھبرایا ہوا انداز دیکھ کر وہ فرانسیسی معاملے [illegible] گیا اور رسمی تکلفات کے بغیر ہمیں اندر لیتا چلا گیا۔

دو کمروں کا وہ چوبی مکان اندر سے نہایت صاف [illegible] تھا۔ وہاں تموّل کی علامات ضرور نہیں مگر بے جا اسراف کہیں [illegible] آ رہا تھا۔

"موسیو زلیستاں! میں۔۔۔" اندر پہنچ کر یوسف نے [illegible] کچھ کہنا چاہا مگر زلیستاں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"تم دور سے بھاگتے ہوئے آ رہے ہو۔ اپنے ساتھی [illegible] آتشدان کی چمنی میں چڑھ جاؤ۔ چمنی میں سات فٹ تک [illegible] اس دیوار کے پیچھے اتر جانا۔ ادھر اندھیرا ہے اور جگہ بھی بہت [illegible] ذرا احتیاط سے کام لینا۔"

زلیستاں کا رویہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ اس نے [illegible] سبب جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی میرا [illegible] اس کے ابتدائی رویئے سے یہ بھی ظاہر ہو چکا تھا کہ یوسف کی آمد [illegible] غیر متوقع تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ زلیستاں محمود کے [illegible] میں شامل تھا۔

دوسرے کمرے میں آتشدان سرد پڑا ہوا تھا۔ ہم نے [illegible] چمنی سے دھواں نکلتے دیکھا تھا۔ وہ غالباً کچن میں واقع تھی۔

آتشدان کی چمنی سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور عقبی [illegible] نیم دائرے کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔

یوسف جھک کر آتشدان میں داخل ہوا اور جب وہ [illegible] کا نصف دھڑ چمنی میں غائب ہو چکا تھا۔ پھر اس نے اپنی ٹانگیں [illegible] طرف دیواروں پر جمائیں اور چند ہی ثانیوں میں چمنی میں غائب [illegible]

"گڈلک!" مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی زلیستاں نے [illegible] کے ساتھ کہا اور میں سر کو جنبش دے کر آتشدان میں داخل ہو [illegible]

میں نے سر اٹھا کر چمنی میں دیکھا تو یوسف چمنی کے اوپری حصے سے دیوار کے پیچھے اتر رہا تھا۔ اس کے غائب ہوتے ہی میں بھی کسی بندر کی سی پھرتی سے اپنی ٹانگوں کے سہارے چمنی میں اوپر چڑھنے لگا۔

فرش سے آٹھ دس فٹ کی بلندی پر چمنی کی عقبی دیوار ختم ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے ایک اور سپاٹ دیوار نظر آ رہی تھی جو چمنی کے گول حصے کے ساتھ اوپر تک چلی گئی تھی۔ اس طرح وہاں ایک خفیہ راستہ پیدا ہو گیا تھا جو نہ مکان کے اندر سے دیکھا جا سکتا تھا اور باہر سے تو اس کی موجودگی کا شبہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

باہر شام کا دھندلکا گہرا ہو چکا تھا۔ میں نے نگاہ اوپر کی تو چمنی کے نیم دائرہ نما دہانے میں سے سرمئی آسمان نظر آیا۔ اس تنگ دہانے سے آنے والی روشنی قطعی ناکافی تھی اور مجھے دیوار کے پیچھے گہری تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"سینہ اور پشت دیواروں کے رخ کر کے آہستہ آہستہ نیچے آ جاؤ۔" اندھیرے میں یوسف کی سرسراتی ہوئی مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور نتیجے میں میری کہنیاں دیوار سے رگڑ کھا کر بری طرح زخمی ہو گئیں۔

میں دونوں دیواروں کے درمیان پھسلتا ہوا ہلکے سے دھماکے کے ساتھ نیچے جا گرا۔ وہ جگہ اتنی تنگ تھی کہ میرے لئے سیدھا ہونا مشکل تھا۔ اس جگہ کی تنگی سے یک بیک میرا دل گھبرانے لگا تھا اور مجھے حرکت کرنا بھی محال نظر آ رہا تھا۔

یہ سوچ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ پولیس وغیرہ سے روپوشی کے لئے کہیں مجھے چند گھنٹے اس پختہ تابوت میں گزارنے پڑ گئے تو کیا ہو گا۔

"میری طرف چلے آؤ۔ آگے سیڑھیاں ہیں۔" مجھے داہنی جانب سے محمود کے ہرکارے کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔

میں اس تنگ راہداری میں آڑا چلتا ہوا آہستہ آہستہ داہنی جانب سرکنے لگا۔ چند قدم بعد ہی میرا داہنا پیر فضا میں معلق ہو گیا۔ میں نے آہستہ پیر نیچے کیا تو پتہ چلا کہ سیڑھیاں شروع ہو چکی ہیں۔

سیڑھیاں بھی اسی قدر تنگ تھیں۔ وہاں اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا فضا میں بھی سیلن زدہ بدبو رچی ہوئی تھی اور میں یوسف کے چڑھتے ہوئے سانسوں کی آوازیں بخوبی سن رہا تھا۔

وہاں مجھے اس قدر گھٹن محسوس ہو رہی تھی کہ کئی بار میری زبان پر سوال آتے آتے رہ گیا۔ میں یوسف سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ہمیں کتنی دیر ان ہولناک سیڑھیوں کو بھگتنا ہو گا مگر میں محض اس خیال سے خاموش رہا کہ وہ آگے ہونے کی وجہ سے مجھ سے ابتر حالت میں تھا۔

اس راہداری میں تنے ہوئے مکڑیوں کے جالے اور حشرات الارض کی فوج پہلے اسی کی راہ میں حائل ہوئی تھی۔ مکڑیوں کے بعض جالے اتنے پھیلے ہوئے تھے کہ یوسف کے گزرنے کے بعد بھی میں نے باریک ریشوں

کی سرسراہٹ اپنے چہرے اور بدن کے دوسرے کھلے ہوئے حصوں پر شدید ترین کراہیت کے ساتھ محسوس کی۔

چند ہی منٹ کے بعد میرا یہ حال ہو گیا جیسے میں گھنٹوں سے یہ سیڑھیاں اتر رہا تھا اور میرا یہ سفر تحت الثریٰ پر ہی ختم ہونے والا تھا۔ میرا بدن پسینوں میں بری طرح نہایا ہوا تھا اور کہنیوں کے زخموں میں بھی کافی سوزش ہونے لگی تھی۔

ایک جگہ سیڑھی کا کنارا ٹوٹا ہوا تھا جس پر سے میں بری طرح پھسلا مگر زیادہ دور تک نیچے جانے کے بجائے دیواروں کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ چوڑائی میں وہ جگہ اس قدر ناکافی تھی کہ وہاں سے نیچے لڑھکنا بھی ناممکنات میں سے تھا۔

"سنبھل کے اترو۔" یوسف نے دھیمی آواز میں مجھے تنبیہہ کی۔ "یہاں زخمی ہو گئے تو میں تمہیں نکال بھی نہ سکوں گا۔"

"تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔

"منکر نکیر سے ملاقات کرانے۔" وہ قدرے شوخ لہجے میں بولا۔

میں دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیج کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور بے اختیار میرے منہ سے اطمینان کا ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا کیونکہ اس تنگ جگہ سے ہم کھلی جگہ میں آ گئے تھے۔

"یہاں سے بائیں طرف مڑ جاؤ۔"

یوسف کی آواز مجھے بروقت آئی ورنہ میں سامنے مختلف چیزوں میں الجھ گیا ہوتا۔

وہ کنکریٹ کی پختہ قدآور سرنگ تھی جس میں جابجا بہت سی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں۔ زلیستاں کے مکان سے آنے والا تنگ زینہ سیدھا اسی سرنگ میں ملا تھا۔

"تاروں سے دور ہی رہنا۔"

"تار!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "یہاں تار کہاں سے آ گئے؟"

"یہ ٹیلیفون کے تاروں والی خندق ہے۔"

وہ راستہ کافی دور تک سیدھا چلا گیا۔ ایک جگہ میں تھک کر سستانے کے لئے رک گیا تو یوسف چوکنا ہو گیا۔

"کیا ہو گیا؟" میری آہٹیں معدوم ہوتے ہی اس کی آواز سنائی دی۔

"ذرا دم لینے دو۔"

"یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم تھوڑی دیر سو بھی سکتے ہو۔"

"نیند تو شاید مجھے رات کو بھی نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "البتہ سگریٹ کی طلب ستا رہی ہے۔"

"کیا نیند بھگانے کی کوئی دوا کھا کر آئے ہو؟" وہ آہستہ سے ہنس کر بولا۔

"میں نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا ہے۔ اس کی لاش مجھے خوابوں میں ڈراتی رہے گی۔" میں نے جھرجھری لے کر کہا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"جسے مارنے کے بعد میں تمہارے ساتھ فرار ہوا ہوں۔"

"اس غیر ضروری موضوع پر بولنے سے بہتر ہے کہ تم سو ہی جاؤ۔"
وہ سخت اور غصیلے لہجے میں بولا اور معاً مجھے یاد آگیا کہ میں افواج آزادی فلسطین کے ایک رکن سے ہمکلام تھا۔ اور ان لوگوں کا پہلا اصول یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور سرگرمیوں سے حتی الامکان لاعلم رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

"سگریٹ سلگالوں؟" میں نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس سے براہ راست سوال کر ڈالا۔

"ایک مجھے بھی دے دو۔"
دیا سلائی کی روشنی بھڑکتے ہی میری نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ چند سیکنڈ بعد جب نگاہیں روشنی کی عادی ہوئیں تو مجھے اس سرنگ میں لکڑی اور تار کے بہت سے ٹکڑے، پتھر اور لوہے کے ٹکڑے وغیرہ بکھرے ہوئے نظر آئے اور ہر طرف نمی بھی پھیلی ہوئی تھی۔

"یہاں تو ٹیلیفون کا کوئی کیبل نظر نہیں آرہا" میں نے بجھی ہوئی دیا سلائی ایک طرف اچھالتے ہوئے اس سے کہا۔

"اگر کیبل گزر رہے ہوتے تو وہ راستہ بننے کی نوبت ہی نہ آتی جس نے ہمیں زیبستان کے مکان سے یہاں پہنچایا ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کھلا راستہ ٹیلیفون کے عملے کی نظروں سے کیسے بچا ہوا ہے کیونکہ سرنگ کی ساخت ایسی ہے کہ اس میں معائنے کیلئے آدمی آتے رہے ہوں گے۔"

"یہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کی تعمیر ہے" وہ بولا۔ "اس وقت یہ سب چٹیل میدان تھا لہٰذا تار ادھر سے گزارے گئے تھے لیکن بعد میں یہاں نجی باغات لگائے گئے تو پانی رس کر اندر آنے لگا لہٰذا اس سرنگ کے تقریباً ڈھائی میل لمبے ٹکڑے کو دونوں طرف سے منہدم کرکے بند کر دیا گیا اور ٹیلیفون کے تار دوسرے راستوں پر بچھا دیئے گئے۔ اسی لئے ہم بے خوفی کے ساتھ اس ویران سرنگ کو استعمال کر رہے ہیں۔"

"تو کیا ہم اسی سرنگ کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کریں گے؟"

"ضروری نہیں ہے۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔
سگریٹ ختم کرنے کے بعد بھی ہم خاصی دیر وہیں بیٹھے رہے پھر یوسف کے ایماء پر سفر کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔
وہ پختہ سرنگ مشکل تین فٹ چوڑی اور پانچ فٹ اونچی تھی جس کی وجہ سے ہمیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔
خاصی دیر کے بعد میرے کانوں میں کہیں سے ہلکی سی غیر مانوس آواز آئی اور میرے اعصاب پر یک بیک تناؤ طاری ہوگیا۔

"رک جاؤ یوسف!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
"کیوں؟" میرے رازدارانہ انداز نے اسے بھی پریشان کر دیا۔

"آگے کوئی موجود ہے۔"

"ہمارے ہی آدمی ہوں گے۔ تم بے فکر ہو کر چلتے رہو۔ وہ بغیر فائر نہیں کریں گے۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔
میں خاموش ہوگیا مگر میرے اعصاب پرسکون نہ ہوئے۔ ہم گھور اندھیرے میں بڑھتے جا رہے تھے کہ اچانک کسی نے ہماری آہٹیں سن لیں۔

"کون آرہا ہے ادھر؟" سوال عربی میں کیا گیا تھا۔ آواز مگر بازگشت کے ساتھ وہ ہمیں بالکل واضح سنائی دی تھی۔

"اندھیرے کا مسافر۔" یوسف نے جواب دیا۔ اس کی آواز ہلکی تھی مگر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کا جواب دوسری طرف سن لیا گیا۔
اس کے پندرہ منٹ بعد ہمیں رک جانا پڑا کیونکہ سامنے چوبی دیوار حائل ہوگئی تھی۔
یوسف کے دستک دینے سے پہلے ہی آہٹیں سن کر دوسری طرف سے کسی نے وہ چوبی دروازہ کھول دیا اور اندھیری سرنگ میں روشنی رینگ آئی۔
آنکھوں پر اچانک روشنی پڑنے کے سبب وقتی طور پر بینائی مفلوج ہوکر رہ گئی اور میں دروازہ کھولنے والے کی صورت نہ دیکھ سکا مگر جب وہ بولا تو میں نے اس کی آواز پہچان لی۔
ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ دوسری طرف اس سرنگ نے کشادہ کمرے کی صورت اختیار کرلی تھی جس میں ایک موم بتی شمع جل رہی تھی۔ لمبائی چوڑائی میں وہ کمرہ سے مشابہ تھا مگر اس کی اونچائی بھی کسی طرح پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھی اور مجھے جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔
اس کمرے سے ملحق وہاں ایک کمرہ اور بھی تھا۔ دروازہ مجھے اور یوسف کو اسی میں لے گیا اور وہاں پہنچتے ہی مسرت سے باغ باغ ہوگیا۔
وہاں محمود ایک تپائی پر بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔

"میرا دوست!" کہہ کر محمود والہانہ انداز میں میری طرف بڑھا اور دونوں باہم بغل گیر ہوگئے۔ محمود کا ساتھی قہوہ دان سے پیالیوں میں اور یوسف کے لئے کھولتا ہوا سیاہ قہوہ انڈیلنے میں مصروف تھا۔
اس کمرے میں بھی موم بتی مشعل جل رہی تھی۔ ایک طرف کونے میں ضرورت کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں اور فرش پر چار بستر دیوار کے متوازی لگے ہوئے تھے۔ اس کمرے کی ایک دیوار میں ایک اور دروازہ لگا ہوا تھا جس قسم کے دروازے سے گزر کر ہم سرنگ سے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے بے اندازہ دلی مسرت ہوئی ہے۔" ٹانگیں پسار کر ایک بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں دوسرے کمرے میں جاؤ۔" محمود نے اپنے آدمیوں سے کہا اور وہ اپنی اپنی قہوے کی پیالیاں اٹھائے ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ ان دونوں کے جاتے ہی محمود نے تجسس آمیز سرگوشیانہ لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔ "ماریا کا کیا ہوا؟"

"اسے قتل کرکے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے محمود۔"

"حسین چہرے والی ناگنوں کو مارنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہوگا۔"

"میں بال بال بچا ہوں۔ ماریا کو تو میں نے ختم کر دیا مگر باہر نکل کر جب میں کار میں سوار ہو رہا تھا تو مجھ پر بے آواز فائر کئے گئے۔"
وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مسکرانے لگا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ دین کی باڈی پر تین گولیاں لگی ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"یہاں بیٹھ کر بھی باہر سے میرا رابطہ قائم ہے۔"

"حیرت کی بات ہے، ویسے یوسف نے ... ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اس نے دین زلیستان کے باغات کے قریب ہی چھوڑی ہے۔ تعاقب کرنے والے زلیستان کو ضرور ہراساں کریں گے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ تم اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر وہاں سے فرار ہوئے کہ وہ لوگ تمہارا تعاقب نہیں کر سکے۔ دوم یہ کہ یوسف کو دین ہر حال میں وہیں چھوڑنی تھی۔ تمہارے نکلتے ہی پہلے سے وہاں موجود ایک شخص دین کو آگے لیتا چلا گیا تھا۔ وہ ایک گہرے کھڈ میں گر کر تباہ ہو چکی ہے اور ابھی اس میں آگ لگی ہوئی ہے۔"

"آدمی سمیت تباہ ہوگئی؟"

"نہیں — آدمی نے اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے تباہ کر دیا۔ یہ خبر مجھے ابھی سے ... ہے۔"

"مگر وہ آدمی تم سے پہلے یہاں تک پہنچ گیا؟"

"جدید مواصلاتی رابطوں نے ہر چیز کو ممکن بنا رکھا ہے۔" وہ جیب سے ایک ٹرانسمیٹر ریسیور نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ مخصوص فریکوئنسی پر پچاس کلومیٹر کے دائرے میں اطمینان بخش طریقے پر کام کرتا ہے۔"

"تم کب سے یہاں روپوش ہو؟"

"یہ میرا سب سے محفوظ ٹھکانا ہے کبھی کبھار ادھر بھی آجاتا ہوں۔ آج تم سے ملنے کے لئے میں نے یہی جگہ مناسب سمجھی۔"

"یہ کمرے تو یقیناً بعد میں بنائے گئے ہوں گے۔"

"ہاں!" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پیچھے سرنگ پھر شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا آخری سرا یہاں سے تین سو فٹ دور ہے۔ اس مقام پر ہم نے سرنگ کو کشادہ کرکے اپنی کمین گاہ بنالی ہے۔"

"ان کمروں کے اوپر کیا ہے؟" میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک بہت بڑا گودام ہے جہاں سیبوں کے کریٹ رکھے جاتے ہیں۔"

"شاید اسی لئے یہاں سیبوں کی ہلکی سی بو رچی ہوئی ہے۔" میں نے فضا میں سونگھتے ہوئے ہنس کر تبصرہ کیا۔

"اس تہہ خانے سے نکاسی کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک زلیستان کے یہاں نکلتا ہے اور دوسرا سیبوں کے گودام میں۔"
یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور الماری کے اوپر چھت میں لگا ہوا آہنی جالی دار ایک گول فریم نیچے کھینچا جو کھل کر قبضوں پر جھولنے لگا۔ وہ فریم اس وقت تک میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ میں بھی اٹھ کر وہیں پہنچ گیا۔

"یہ اوپر جانے کا راستہ ہے۔" وہ چھت میں نظر آنے والے گول عمودی راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہاں دیوار میں ایک جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آہنی ہک لگے ہوئے تھے جن کے سہارے اس پتلے راستے میں پھرتی سے اوپر چڑھا جا سکتا تھا۔

"اس راستے کے اوپری سرے پر ربڑ اور لوہے کا بنا ہوا ایک بہت موٹا ڈھکن ہے تاکہ ادھر کی آوازیں اوپر نہ سنی جا سکیں۔ اوپر پہنچ کر اسے بآسانی سر پر اٹھا کر باہر ڈالا جا سکتا ہے۔ یہ راستہ گودام کے اس حصے میں کھلتا ہے جہاں ناکارہ اوزاروں کا ڈھیر پڑا رہتا ہے۔"

"اور گودام کس کی ملکیت ہے؟"

"گودام ایک بہت بڑے باغ سے ملحق ہے اور بظاہر ایک برطانوی یہودی کی ملکیت ہے مگر اس کی تمام آمدنی پر ہمارا تصرف ہے۔"
اس کی گفتگو سن کر میں ششدر رہ گیا۔ "برطانوی یہودی تمہارے ساتھ ملا ہوا ہے؟"

"وہ ایک مفلوک الحال عیسائی ہے اور درحقیقت آئرلینڈ کا رہنے والا ہے۔ ہمارے بیرونی رابطوں نے بھاری معاوضے کا لالچ دے کر اسے خریدا ہوا ہے۔ وہ یہودی مہاجر کا روپ دھار کر اسرائیل آیا اور پھر اس نے یہ باغ خرید لیا جس کے عوض اسے تین ہزار امریکی ڈالرز کے مساوی ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔"

"اور وہ تمہاری سرگرمیوں سے باخبر ہے؟"

"بہت کم۔ وہ تو ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔ ویسے باغ اور گودام میں کام کرنے والوں کو بھی اس تہہ خانے کا علم نہیں ہے۔ گودام کا چوکیدار البتہ ہمارا خاص آدمی ہے۔"

"اسرائیلی حکام نے اس آئرش کے بارے میں تحقیق کئے بغیر اسے اسرائیلی شہریت کیسے دے دی؟" میں نے پوچھا۔ میرے لئے محمود کی گفتگو سخت حیرت کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ وہ لوگ دشمن کی سرزمین پر بدترین حالات میں بھی ناقابل یقین منصوبہ بندی سے کام کر رہے تھے۔

"اسرائیل میں لاکھوں یہودی مہاجرین دنیا کے گوشے گوشے سے

آئے ہیں۔ وہ کس کس کے بارے میں تحقیق کریں گے۔ اسرائیلی عرب یہودیوں کے بارے میں ضرور چھان بین کرتے ہیں۔ یورپی مہاجرین کے بارے میں پاسپورٹ پر انحصار کیا جاتا ہے۔ ہمارا آدمی جس پاسپورٹ پر یہاں آیا۔ اس کے اندراجات کے مطابق وہ برطانوی قومیت کا حامل یہودی ہے اور یہ چیز اسرائیلی حکام کے اطمینان کے لئے کافی ہے"

"تم لوگوں کی زندگی کا ہر پہلو الف لیلہ کی داستان معلوم ہوتا ہے" میں نے واپس لوٹتے ہوئے طویل سانس لے کر کہا۔

"میں تربیتی کیمپ کے حالات سننے کا منتظر ہوں"

"وہ کیمپ آہنی حصار میں سمجھے جاتے ہیں اور وہاں تربیت پانے والے جھلستے ہوئے ریگزاروں میں بھی بڑی آسانی سے گزارا کر سکتے ہیں"

"وہ کیسے؟" محمود نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

اس پر میں نے مختصر الفاظ میں اسے جی۔ ٹی۔ فور اور سوڈ کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ جب گہری ریت میں دفن، بجلی سے گرم کی جانے والی آہنی چادروں کا ذکر آیا تو محمود کا چہرہ پُرجوش سے تمتمانے لگا۔

"سوڈ کے اس آہنی اسلحہ خانے میں تباہی کیسے آئی تھی؟" میری گفتگو ختم ہو جانے پر محمود نے عجیب سے انداز میں مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ علم نہیں، دھماکوں کے بعد وہ علاقہ دور دور تک چھان ڈالا گیا۔ ہیلی کاپٹروں سے نیچی پرواز کی گئی مگر کوئی بھی ہاتھ نہ آ سکا۔ اس کے باوجود اسرائیلی حکام اسے اتفاقی حادثہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں وہ اسے فلسطینی گوریلوں کی کارروائی قرار دے رہے ہیں"

"ماریا اور اس کے ساتھ جانے والوں نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟"

"پتہ نہیں۔ ویسے سوڈ میں کرنل لیوک نامی تفتیشی افسر نے پوری توجہ میری ذات پر مرکوز کی ہوئی تھی"

"وہ تمہاری راہ پر لگ گیا تھا" محمود گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا "میں یہ بات سمجھ چکا تھا کہ اب تمہارا جسم زیادہ دن قائم نہ رہ سکے گا اسی لئے میں نے ماریا کو ہدایت کی تھی وہ ہر قیمت پر تمہیں تل ابیب واپس لانے کا بندوبست کرے"

"ماریا کا نام سن کر میرے دل پر چوٹ سی لگتی ہے" میں نے افسردہ لہجے میں کہا "یقین نہیں آتا کہ میں نے اسے مار دیا ہے"

"اس لئے کہ تم پر مہربان تھی" وہ سنگدلانہ انداز میں ہنس کر بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ ایک وجہ یہ بھی ہو مگر وہ تمہارے مقاصد کے لئے بہت کارآمد تھی۔ اس کی موت سے تم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور شاید اب تمہاری سرگرمیوں کی وہ رفتار قائم نہ رہ سکے جو ماریا کے تعاون سے پیدا ہو گئی تھی"

"سفدر یہ بات یاد رکھو کہ کسی تحریک کے لئے افراد بے حقیقت مہرے ہوتے ہیں۔ ایک بار تحریک مضبوط بنیادوں پر چل پڑے اور لوگوں کے متعلقہ طبقے کو اس کی افادیت کا یقین دلا دیا جائے تو تحریک کے ان بھی اتنے اہم نہیں رہتے۔ ماریا ہماری مخبر تھی [illegible] اس کی موت کا [illegible] رہے ہو میں کہتا ہوں کہ اس جیسی پچاس لڑکیاں اور تم جیسے [illegible] مر جائیں تو بھی تحریک کی رفتار اور افادیت پر کوئی اثر نہیں [illegible] یہ یاد رکھو کہ ہمارے جیسا ناگزیر ضرورتوں کی کوکھ سے جنم لیتے [illegible]

"شاید تم میری بات کا بُرا مان گئے"

"بُرا نہیں مانا، البتہ مجھے افسوس ضرور ہو رہا ہے [illegible] سمجھے اور اہم فیصلے سے مطلق نہیں ہو"

"مطمئن نہ ہونے کی وجہ تو شاید یہ ہو کہ میں [illegible] منظر ہوں جس میں تم نے اسے راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کیا مگر میں نے [illegible] حکم سے گریز نہیں کیا"

"وہ ہم سب کے لئے بہت بڑی تباہی کا سبب بننے والی تھی [illegible] نے ہمارے بارے میں ساری معلومات اعلیٰ فوجی حکام کے حوالے [illegible] فیصلہ کر لیا تھا"

"نہیں" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"[illegible] کہ کلف بنک میں وسماکے کے بعد اس [illegible] کہا تھا کہ ہم سے جان چھڑانے کے لئے وہ فوج سے استعفیٰ دے کر کسی گوشے میں زندگی گزارے گی"

"ہاں اچھی طرح یاد ہے"

"تمہارے چلے جانے کے بعد اس نے واقعی استعفیٰ لے [illegible] اطلاعات کے مطابق چند ہفتوں میں اس کی منظوری متوقع تھی [illegible] میں چوکنا ہو گیا۔ ماریا کی تفتیش کے سبب روانگی تک اس کے [illegible] نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا مگر اس کی عدم موجودگی میں میں نے [illegible] کے فلیٹ کی تلاشی کا ارادہ کر لیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس نے [illegible] بارے میں کوئی ثبوت وغیرہ اپنے فلیٹ میں محفوظ نہ رکھ [illegible] خیر رہی۔ ماریا ڈائری لکھنے کی عادی تھی۔ وہ سارا دن اپنے مشاہدات واقعات کاغذ کے پرزوں پر تحریر کرتی رہتی تھی اور رات کو [illegible] تفصیل سے ڈائری میں منتقل کر دیتی تھی۔ خوش قسمتی سے میرا آدمی [illegible] اس کے فلیٹ سے اٹھا لایا۔ اس میں آری انتقلی [illegible] ماریا کے انتقامی جذبات تفصیل سے درج تھے [illegible] کے بعد [illegible] بے چینی اور یاسیت کا شکار رہی اور آخر کار اس نے [illegible] استعفیٰ دے دے گی تاکہ ہم لوگوں سے چھپ کر [illegible] بے فکری اور آرام کی زندگی گزار سکے"

اتنا کہہ کر وہ سگریٹ سلگانے کے [illegible] ساتھ اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"۲۷ جون کو اس نے اپنا استعفیٰ داخل [illegible] اس نے ان تمام اہم نکات کا احاطہ کیا جو وہ [illegible] ڈاک سے اپنے کمانڈر انچیف اور وزیر دفاع کو [illegible]

[illegible] الفاظ میں جنہیں ان حرکتوں پر عبرتناک سزا مل سکے اور اس کا نام [illegible] معلومات وہ ڈاک سے اس لئے روانہ کرنا چاہتی تھی [illegible] [illegible] اس وقت آئی جب [illegible] سے [illegible] ملک میں روکنا ناممکن ہو سکتا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر [illegible] میں روک لی گئی تو فلسطینیوں کے [illegible] تفتیش کے لئے [illegible] کا آغاز ہونے تک ہم جانب جائیں گے اور وہ [illegible] [illegible] سے بچ سکے گی"

محمود کے الفاظ کے ساتھ میرا دوران خون تیز تر ہوتا جا رہا تھا [illegible] نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈائری کے ان [illegible] باتوں سے ماریا کے عزائم بے نقاب ہو گئے [illegible] اس دن پچھلے [illegible] ضخیم ڈائری میں بہت سی اہم سرکاری [illegible] اور فوجی معلومات بھی درج تھیں۔ اس ڈائری کی گمشدگی کو چھپانے اور ماریا کے [illegible] سے بچنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ اسے تل ابیب لوٹتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ میرے دو مسلح آدمی فوری طور پر ماریا کے فلیٹ کی نگرانی پر لگا دیئے گئے۔ آج جب تم واپس لوٹے تو وہ دونوں ماریا کے پیٹ کو اڑانے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ انہوں نے [illegible] کے بجائے ماریا پر دستی بم پھینکنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ کوئی نہ تھا ہو تم دونوں داستان کار سے اترے تو وہ کسی نئی دلہن کی طرح تم تھی بعض تمہاری زندگی کے تحفظ کی خاطر میرے آدمیوں نے ماریا پر حملے کا ارادہ ترک کر دیا جس کے بعد میرے پاس آخری چارہ رہ گیا تھا کہ اسے تمہارے ہاتھوں ٹھکانے لگوا دیا جائے۔ فوجی حراست سے بچنے کے لئے تمہاری فوری روپوشی ضروری تھی کیونکہ لیوک [illegible] تمہارے گرد جال [illegible] تھا لہٰذا ماریا کے قتل میں [illegible] ہونے سے کوئی فرق بھی نہ پڑا"

"تمہارا فیصلہ درست تھا۔ میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں" میں نے خلوص دل سے اس کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

"اب تمہارے لئے کھلی فضا سخت مخدوش ہے۔ مناسب موقع آنے تک تم یہیں رہو گے۔ حالات سازگار ہوتے ہی میں تمہیں اسرائیل سے نکال دوں گا"

"اسرائیل میرے لئے ہولناک قید خانہ بن کر رہ گیا ہے۔ اگر تم مجھے اس منحوس سرزمین سے نکال دو تو یہ مجھ پر بڑا احسان ہو گا"

"انسان عاجز اور مجبور ہے میرے دوست! جب قدرت کو منظور ہو گا تو تمہارے لئے کامیابی کی راہیں خود بخود کھلتی جائیں گی"

"اور بن حیان کے بارے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟"

"کچھ نہیں" وہ مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر بولا "اسرائیل کا ایک شخص کئی دفعہ فرانس کا دورہ کر رہا ہے مگر ان میں سے کسی کا بھی نام بن حیان نہیں ہے"

"ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے نام سے سفر کر رہا ہو"

"مشکل تو یہی ہے کہ ہمارا کوئی آدمی اسے نہیں پہچان سکتا۔ صرف تم ہی اس مردود کی نشاندہی کر سکتے ہو"

"یہ بھی امکان ہے کہ وہ سرکاری وفد سے باہر رہ کر کام کر رہا ہو"

"یہی اندیشہ تو پیش قدمی سے روک رہا ہے۔ وہ بوں [illegible] ریڈ آرمی کے سولہ بہترین آدمی اس وقت فرانس میں ہمارے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ ہم چاہیں تو ان چھ افراد پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں لیکن بن حیان ان میں شامل نہ ہوا تو ساری محنت رائیگاں جائے گی اور وہ خطرہ بھانپ کر فرانس سے صاف نکل جائے گا"

"تم مجھے اسرائیل سے نکالنے کا بندوبست کر دو تو میں فرانس جانے کے لئے بھی تیار ہوں"

"میرے ذہن میں پورا خاکہ تیار ہے۔ بس ذرا تمہاری تلاش کا دائرہ وسیع ہو جائے تو میں آگے بڑھوں گا"

"زلیستان اس راستے کی نگہبانی پر مامور ہے۔ اس کی وہاں کیا حیثیت ہے؟" میں نے اچانک ہی اس سے پوچھ لیا۔

"اس طرف کے فروٹ فارم اعلیٰ سول افسروں کی ملکیت ہیں۔ زلیستان وہاں منیجر کے طور پر مامور ہے"

"وہ راستہ وہاں پہلے سے موجود تھا؟"

"وہ زلیستان نے خود تعمیر کیا ہے۔ وہ بہت اچھا معمار ہے۔ یہ دونوں کمرے بھی اس نے بے شمار راتیں گزار کر بنائے ہیں۔ دن بھر وہ فارم کی دیکھ بھال کرتا تھا اور راتوں کو چوری چھپے نکاسی کا دوسرا راستہ بناتا تھا"

"اور اگر کسی وجہ سے اس فارم پر کوئی اور آ جائے؟"

"زلیستان ہر فن مولا ہے۔ ریڈ آرمی نے اس کی خدمات مستعار دی ہوئی ہیں۔ اس نے دونوں راستوں پر طاقتور ڈائنامائٹ لگائے ہوئے ہیں۔ خطرے کی صورت میں محض ایک خفیہ بٹن دبا کر کسی بھی راستہ کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہے"

"ریڈ آرمی سے تمہارا بہت تعاون ہے"

"ہمارے اور ان کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں"

"تم سے ابتدائی ملاقاتوں میں مجھے اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ تم اس قدر وسیع وسائل پر اختیار رکھتے ہو"

"اسرائیل میں بے شک مجھے خود مختاری حاصل ہے مگر دوسری تنظیموں سے معاملات طے کرنے والے اور ہی لوگ ہیں"

"یاسر عرفات کے فلسطینی محاذِ آزادی سے تمہارا رابطہ کیسا ہے؟"

"نہ ہونے کے برابر" وہ بولا "البتہ ہمارے بعض اراکین پی۔ ایل۔ او کی عسکری تنظیم العاصفہ سے بھی وابستہ ہیں"

"اس کی وجہ بھی ضرور ہو گی"

یوں سمجھو کہ پی۔ ایل۔ او وسیع تر مقاصد کے لیے کام کر رہی ہے جبکہ ہم دشمن کو مار مار کر ادھ موا کرنے اور صرف اپنے علاقوں کی آزادی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یاسر عرفات کے کچھ اپنے سیاسی رجحانات بھی ہیں۔

"تم اس سے ملے تو ہو گے۔"

"ہم دونوں نے برسوں ساتھ کام کیا ہے۔"

"کس پلیٹ فارم سے؟"

"ملازمت کے سلسلے میں۔" اس نے بتایا۔ "شہرت پانے سے قبل یاسر عرفات کویت کی وزارت بجلی اور پانی میں انجینئر کے عہدے پر فائز تھا اور میں اس سے دو درجہ نیچے سپروائزر تھا۔ اس وقت میں اسے محض ایک جوشیلا نوجوان سمجھتا تھا۔"

اسی وقت اچانک محمود کو ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا اور اس نے پھرتی کے ساتھ اپنا سیٹ جیب سے نکال لیا۔

محمود نے ٹرانسمیٹر کی آواز کھولی تو دوسری جانب سے کوئی مسلسل الف، الف پکارے جا رہا تھا۔ محمود نے بٹن دبا کر جو جواب دیا وہ بھی عربی حروف تہجی پر مشتمل تھا۔

دونوں جانب سے چند منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور محمود نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ دن جس کا ڈر تھا آ گیا۔ [illegible] یہاں سے سات میل شمال میں [illegible] فوجیوں کی ایک ٹولی کتوں کے ساتھ ان نواح میں آ پہنچی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"شاید انہی دنوں کے نشانات کے ساتھ [illegible] کتوں کی موجودگی کا مطلب ہے کہ انہیں شدت سے تمہاری تلاش ہے۔"

"یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا تم نے؟"

"کتوں کو اسی شخص کی بو پر لگایا جا سکتا ہے جس کی ذاتی استعمال کی کوئی چیز حکام کے پاس ہو۔ یوسف تو مرا ہوا آدمی ہے اس کا مطلب ہوا کہ کتے تمہاری بو پر لگائے گئے ہوں گے۔ اگر وہ یہاں تک آ گئے ہیں تو یہ جگہ مخدوش ہو سکتی ہے۔"

"وہ یہاں ہرگز نہیں آ سکتے۔ اگر وہ صحیح راستے پر چلتے رہے تو زلیتان کے آتشدان تک کتے ان کی رہبری ضرور کریں گے اور پھر وہ عمارت گرانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

"وہ باغ یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"بمشکل ایک میل۔"

وہ ہنس پڑا۔ "یہ تو تم نے سرنگ کا راستہ بتایا ہے۔ اصل راستہ جو بہت سے باغات کے گرد طواف کرتا ہوا جاتا ہے بہت پُر پیچ ہے کم از کم دس کلو میٹر ہے۔"

"آج رات تم بھی یہیں گزارو گے؟"

"آج تو یہاں سے کوئی بھی نہیں جا سکے گا۔ اس علاقے میں آدمی کے سائے کو بھی وہ لوگ نہیں بخشیں گے۔"

"سیتا کی کوئی خبر آئی؟" میں نے پہلو کے بل بستر پر دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں سخت شرمندہ ہوں دوست، خبر آتی تو میں خود تمہیں بتاتا۔"

"وہ تمہارے مقاصد کے لئے بھی بہت [illegible]"

"بہت دلیر ہے۔"

"دلیر بھی اور خطرناک بھی مگر تمہارے لئے اس کی ایسی [illegible] کارآمد ہو سکتی ہے۔" میں نے سیتا کے ذکر کو طول دینے کی [illegible] اس کی باتیں کرنے سے میرے دل کو ایک عجیب سی راحت ملتی [illegible] کے سوا میں کسی سے دل کا بخار اس نہیں نکال سکتا تھا۔

"کون سی ہے وہ خوبی؟"

"[illegible] تو کتے سدھاتے ہیں مگر وہ بندروں اور لنگوروں [illegible] کہ وہ ان کے [illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] جب [illegible] مجھے ہمالیہ کی [illegible] جب سیتا کسی سرکش شیرنی کی طرح اپنی ماں سے [illegible] اور لنگوروں کے غول میں رہتی تھی اور وہ [illegible] ان دونوں [illegible] کی تعمیل کرتے تھے۔"

"بندروں کو سدھاتی ہے؟" محمود نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"مگر کیسے؟"

"میرا تو خیال ہے بندر اس کی بات سمجھ لیتے ہیں۔"

"وہ ان سے کیا کیا کام لے سکتی ہے؟" محمود نے پوچھا۔ میں سوال کیا۔

"ہر کام جو اس مخلوق کے بس میں ہو۔"

"اور سدھانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

"یہ پتہ نہیں لیکن میرا اندازہ ہے [illegible] کام کر سکتی ہے اور اس کی ہدایت کی تعمیل [illegible] جان سے جاتے بھی دیکھا ہے۔"

"حیرت ناک! واللہ یہ تو حیرت ناک خوبی ہے۔"

"وہ چند بندروں کے ساتھ [illegible]"

"وہ ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔"

اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی ہے [illegible] کو واڈ پر لگانے کے بجائے سدھائے ہوئے جانوروں [illegible]

اگر سیتا اچھی ٹرینر ہے تو وہ ہمارے سروں کا تاج بن کے رہے گی۔"

"مجھے اسے اسرائیل بلانا ناپسند نہیں کروں گا۔"

"مگر یہ کیسے؟"

"وہ کیوں اسرائیل آئے گی۔ میں تو اب تمہیں باہر نکالنے کے چکر میں ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"جانے وہ گھڑی کب آئے گی۔"

"تمہیں چند دن یہیں آرام کرنا پڑے گا تاکہ تمہارا حلیہ تبدیل ہو سکے۔" اس نے کہا۔ "یہاں تم آرام بھی کر لو گے اور تمہیں مرغن غذائیں بھی ملتی رہیں گی تاکہ اس عرصے میں تمہارا وزن بڑھ سکے۔ چہرے پر داڑھی آ جانے کے بعد ہی تمہاری روانگی کا کوئی یقینی منصوبہ بنایا جا سکے گا۔ اس سے پہلے کچھ سوچنا بیکار ہے۔"

اس موضوع پر گفتگو کے دوران محمود نے دوسرے کمرے سے یوسف اور دوسرے آدمی کو بلا لیا جس کو محمود وجدی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

مجھے پہلی مرتبہ بے فکری کے ساتھ محمود کے ہمراہ مل بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ ابتدا میں نے اس سے بے شمار نئے اور پرانے موضوعات پر گفتگو جاری رکھی اور جب مجھے تھکان کا احساس ہونے لگا تو میں [illegible] دراز ہو گیا۔

محمود چند کاغذات اور پنسلیں وغیرہ لے کر دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا زمینی نقشہ بھی موجود تھا۔

"تم کہاں چلے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ مجھے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔"

اگلی صبح میرے بیدار ہونے سے قبل محمود وہاں سے جا چکا تھا۔ میرے ساتھ صرف وجدی رہ گیا تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ محمود یوسف کو بھی ساتھ ہی لے گیا تھا۔

تہہ خانے میں صفائی کی ضرورت سے پیش نظر واش روم [illegible] کا خاصا کھونڈا سا انتظام تھا۔ [illegible] وجدی ناشتہ تیار کر چکا تھا اور میرا منتظر تھا۔

وجدی کے پاس محمود کے حلقے میں کام کرنے والا ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ [illegible] کے کام کے دوران نے دوپہر کو ایک بری خبر [illegible] میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

[illegible] کے بیان کے مطابق محمود باغات کے علاقے سے [illegible] بندر کے چھان بین کرنے والے فوجی حکام نے [illegible] پکڑ لیا تھا۔

یوسف [illegible] سے الگ روانہ ہوا تھا اور صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میرے لئے یہ خبر بہت روح فرسا تھی۔ میں خود بدترین حالات میں روپوش تھا اور باہر ہر قدم پر گرفتاری یا فائرنگ اسکواڈ میرا منتظر تھا۔

"میں ہر قیمت پر باہر جانا چاہتا ہوں۔" جب میرے دل پر گہرا غبار چھانے لگا تو میں نے وجدی کو گھیر لیا۔

"فکر نہ کرو۔ انہوں نے اسے محمود سمجھ کر نہیں پکڑا ہے۔"

"مگر وہ سفاک لوگوں کے نرغے میں پھنس گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے مشکوک سمجھ کر پکڑا گیا ہے اور وہ ان کے سامنے ہرگز زبان نہیں کھولے گا مگر وہ اسے اپاہج ضرور کر دیں گے۔"

"تم باہر جا کر کیا کرو گے؟"

اس سوال نے مجھے لاجواب کر دیا۔

رات گئے خبر آئی کہ محمود ان لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے لئے اس کی اتنی جلدی رہائی کی خبر اس کی گرفتاری کی اطلاع سے زیادہ حیرتناک ثابت ہوئی مگر مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ محمود نے ان کو کس طرح احمق بنایا۔

اسی طرح سسکتے ہوئے تین دن گزر گئے۔ میں کھلا آسمان اور قدرتی روشنی دیکھنے کو ترس گیا تھا مگر اپنا نوشتۂ تقدیر بھگتنے پر مجبور تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ منقطع تھا بس کبھی کبھار وجدی ٹرانسمیٹر پر [illegible] سے بات کر لیتا تھا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ مسلسل بے کاری اور آرام کی وجہ سے میرے وزن میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا کیونکہ کھانے پینے کے معاملے میں مجھے وہاں جملہ سہولتیں حاصل تھیں۔

وجدی کھانا وغیرہ بہت اچھا تیار کر لیتا تھا۔ ڈبل روٹی گوشت پھل اور روزمرہ ضرورت کی دوسری اشیاء گودام کا دربان رات کے کسی پہر پچھلوں کے گودام میں کھلنے والے سوراخ کے سہارے ایک ڈوری میں بندھی ہوئی ٹوکری کے ذریعے تہہ خانے میں پہنچا دیتا تھا۔

چوتھے روز میں نے باہر نکل کر کھلی فضا میں تبدیلی کا ارادہ کیا تو وجدی میری راہ میں حائل ہو گیا۔ وہ مجھے یہ سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے میری آزادی اور تنظیم کے مفادات خطرے میں پڑ سکتے تھے۔ جب میں نے ضد شروع کی تو وجدی اپنے اصل روپ میں آگیا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میں کوئی غیر ذمے دارانہ حرکت کروں گا تو اس کے نتائج کی تمام تر ذمے داری مجھ پر ہو گی۔

سات دن بعد ٹرانسمیٹر کے ذریعے محمود کا پیغام آیا۔ اس نے مجھے اپنی سہولت کے مطابق زیلستاں کے پاس پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

تہہ خانے میں دن اور رات کا احساس یکسر ختم ہو چکا تھا۔ ہم ہر وقت موم بتی جلائے رکھتے تھے جن کا وہاں وافر ذخیرہ موجود تھا۔ میں پیغام ملتے ہی روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔

"ہاں اب تم جا سکتے ہو۔" وجدی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب کیا خاص بات ہوئی ہے؟"

"اوّل تو محمود کی ہدایت آگئی ہے۔ دوئم یہ کہ اب داڑھی بڑھ جانے کے باعث تمہارا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔"

"اگر میں اسی طرف سے باہر نکل کر سڑک کے ذریعے زیلستاں تک جاؤں تو کیسا ہے گا؟" میں نے وجدی سے پوچھا۔

"سخت خطرناک خیال ہے۔ کسی کی رہنمائی کے بغیر تم وہاں نہ پہنچ سکو گے کیونکہ اس علاقے میں یکساں سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔"

"میں نکاسی کا یہ راستہ بھی دیکھنا چاہتا تھا۔"

"بلاوجہ کی مشقت کرنا چاہتے ہو تو اوپر ہو آؤ۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

وجدی کے پاس محدود روشنی والی پنسل ٹارچ موجود تھی جو میں نے لے لی اور پھر جس راستے سے میں تہہ خانے میں داخل ہوا تھا اسی سے گزر کر دوبارہ سُرنگ میں پہنچ گیا۔

اس راستے پر میرا سفر بہت تھکا دینے والا ثابت ہوا۔ تنہا ہونے کی وجہ سے مجھے وقت جُوں کی چال سے رینگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس بار مجھے کُبڑوں کی طرح جُھک کر چلنا بھی بہت گراں گزر رہا تھا مگر کھلا آسمان دیکھنے کی اُمید پر میں بڑھتا ہی رہا۔

اس دوران میرے ذہن میں یہ دہشت انگیز خیال بھی آیا کہ اگر زیلستاں تک پہنچنے سے پہلے مجھے بدقسمتی سے ... وجدی کے ... زیلستاں میں سے کسی کو اس کا ... وہ لوگ میری تلاش میں اسی وقت ... پہنچنے میں غیر معمولی تاخیر ہوتی اور اسی سے ... میں رابطہ قائم ہو جاتا۔

مگر اس معاملے میں میں خوش نصیب تھا۔ ... نہیں آیا اور میں ان بغلی سیڑھیوں تک ... کو سُرنگ سے ملاتی تھیں۔

سیڑھیاں عبور کرتا ہوا میں آتش ... گیا۔ اس وقت باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی ... آسمان نظر آ رہا تھا۔ تھوڑا ہی کے مقابلے ... آنے والی ہلکی سی روشنی بھی میرے لئے ... ماریا کے قتل کے بعد روپوشی اختیار کرنے ...

درمیانی دیوار سے آنکھیں بند کر کے نیچے ... کہنیاں زخمی ہو گئی تھیں مگر اس تنگ جگہ سے اچھل ... لئے ناممکنات میں سے تھا۔

ایک تو ویسے ہی جگہ کم تھی اور پھر میرا وزن ... قدرے باہر نکل آئی تھی جس کی وجہ سے مجھے سخت دقت ...

آخر کار میں نے وجدی سے لی ہوئی پنسل ٹارچ ... مجھے یقین تھا کہ اوپر چڑھنے کے لئے وہاں کوئی نہ کوئی ... ہو گا اور پھر مجھے دیوار کے سہارے جھولتی ہوئی نائیلون کی ... گئی جس کا اوپری سرا چمنی کی درمیانی دیوار کے اوپر لگے ہوئے ... میں مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

میں اس رسی کے سہارے تھوڑی سی دقت کے بعد ... کامیاب ہو گیا۔ وسطی دیوار پر بیٹھ کر میں نے آتشدان کے ... سناٹا طاری تھا۔

"زیلستاں!" میں نے آہستہ سے اسے پکارا۔

کئی منٹ گزر گئے مگر کوئی جواب نہ سنائی دیا۔ میں ... کے بعد دھڑکتے دل سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

قدم زمین سے لگتے ہی میں تیزی کے ساتھ آتشدان ... نکلا مگر وہاں مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں دوسرے کمرے میں ... سناٹا ہی تھا۔ البتہ نکاسی کا راستہ باہر سے بند تھا۔

میں اندرونی کمرے میں واپس آگیا ...

میں دروازہ بند کئے کافی دیر تک ... کثافت ہلکی کرنے کے بعد مجھے بے حد سکون ملا ... واپس آگیا۔

میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو دل ... کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ نئے حلیے میں مجھے صفدر کے نام سے پہچاننا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد زیلستاں آگیا۔ مجھے وہاں موجود دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوئی اور وہ دروازے ہی میں کھڑا رہ گیا۔

"تم کس قدر بدل گئے ہو۔" اس نے تحیر آمیز آواز میں کہا۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میری آمد اس کے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔

"داڑھی کی تراش خراش میں تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"داڑھی ـ" وہ ہنسا۔ "یہ تو تم نے خودرو جنگل اُگایا ہوا ہے۔"

"مجھے قرینے کا لباس بھی چاہیئے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری اجازت کے بغیر میں نے غسل تو کر ہی لیا ہے۔"

"تم میرا کوئی بھی لباس پہن لیتے۔ اب تو میری اور تمہاری جسامت بھی یکساں ہو گئی ہے۔"

میں نے الماری میں سے شوخ لباس نکالا اور پھر زیلستاں میری داڑھی تراشنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کام سے نمٹ کر میں دوبارہ نہایا اور جب لباس تبدیل کر کے میں باہر آیا تو زیلستاں وہسکی کے دو گلاس تیار کئے میرا منتظر تھا۔

"اسمارٹ" مجھے دیکھتے ہی وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر تم سفید شیشوں کی ایم ایس عینک لگا لو تو کسی یونیورسٹی کے پروفیسر نظر آؤ گے۔"

"عینک مل جائے گی تو وہ بھی لگا لوں گا۔"

"تم شراب تو پیتے ہو نا؟" اچانک اسے کچھ خیال آگیا۔

"یہ تو میرا شوق ہے۔"

"معاف کرنا مجھے تمہارے بارے میں پوری معلومات نہیں دی گئیں۔ میں تمہیں مسلمان سمجھ رہا ہوں۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "اور بیشتر مسلمان اسے بُرا سمجھتے ہیں۔"

میں نے اس کے چہرے پر اپنے دل میں خلش سی اُبھرتی محسوس کی مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں نے گلاس اٹھا کر فضا میں لہرائے اور وہسکی اپنے معدوں میں اُتارنی شروع کر دی۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ زیلستاں کو نہ میرے مذہب کا علم تھا نہ نام کا مگر وہ میرے ساتھ نہایت خلوص اور بے تکلفی سے پیش آ رہا تھا۔

"بہتر ہو گا کہ میں تم سے اپنا تعارف کرا دوں۔" میں نے شرمندگی کے احساس کے ساتھ کہا۔

"نہ نہ ایسا نہ کرنا۔" وہ گلاس لبوں سے ہٹاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "مجھے تو ابھی خود اپنا نام جاننے کی ضرورت ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اب سے تمہارا نام آسکر بینتھم ہے۔ تم اینگلو انڈین ہو اور برطانوی شہریت رکھتے ہو۔ لندن سے تمہیں یہاں آئے چند ہی روز گزرے ہیں۔"

"میرا تعارف کرانے کا شکریہ۔"

پھر زیلستاں نے اپنا ایک سوٹ پہنا کر سیاہ پردے کے سامنے اسٹوڈیو کے انداز میں میری نئی تصویریں اُتاریں۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ چند روز میں میرا برطانوی پاسپورٹ مجھے ملنے والا تھا اور وہ تصاویر اسی کے لئے اُتاری گئی تھیں۔

تصویریں اتارنے کے بعد زیلستاں مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ باہر سے دروازہ مقفل کر گیا تھا اور مجھے ہدایت کی تھی کہ میں نہ کسی ٹیلیفون کال کا جواب دوں نہ گھر آنے والے کسی ملاقاتی کے لئے سامنے آنے کی کوشش کروں۔

ان ہدایات سے اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں اُس کی غیر موجودگی میں کسی پریشانی سے دوچار نہ ہو جاؤں۔

زیلستاں شام کو سورج غروب ہونے سے ذرا دیر پہلے آیا اور آتے ہی اُس نے مجھے بتایا کہ اگلے روز شام کے چار بجے مجھے اس کے ہمراہ شہر جانا ہو گا۔

زیلستاں بہت خوش باش اور فراخ دل انسان تھا۔ اس کے یہاں میں نے جو مختصر سا وقت گزارا اس میں زیر زمین گزارے ہوئے سات دنوں کی کوفت بالکل دُور ہو گئی۔

اگلے روز روانگی سے پہلے زیلستاں نے مجھے مخصوص ساخت کا ایک بریف کیس دیا جس میں کچھ اخبارات، رسائل اور سادہ ڈائریاں پڑی ہوئی تھیں۔

میری درخواست پر اس نے ایک عدد عینک بھی میرے سپرد کر دی جسے لگانے کے بعد میری شخصیت یکسر بدل کر رہ گئی۔

جب زیلستاں کی کار مضافاتی علاقے سے تل ابیب کی شہری حدود میں داخل ہوئی تو یک بیک میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

اسرائیل پہنچنے کے بعد میں نے یہودیوں کے نقطۂ نظر سے بے شمار جرائم کئے تھے۔ بہت سی سازشوں میں شریک رہا تھا مگر ان لوگوں کے پاس میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا البتہ ماریا کے قتل کے بارے میں شاید ہر شخص کو علم ہو چکا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں ماری گئی ہے۔

اس سفر کا اختتام ملٹن ہوٹل پر ہوا۔

"کمرہ نمبر تین سو تیرہ۔" زیلستاں نے گاڑی کا انجن بند کئے بغیر کہا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میرا اور اس کا ساتھ ختم ہو چکا تھا۔

مجھے گاڑی سے اُترتے ہوئے زلیستاں پر بہت غصہ آیا کہ اس نے پہلے سے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں شروع سے اسی تاثر کا شکار رہا تھا کہ زلیستاں میرے ساتھ رہے گا اور پھر اس نے اچانک مجھے تنہا چھوڑ دیا۔

ہلٹن ہوٹل سے میری کچھ یادیں بھی وابستہ تھیں۔ وہیں میری ملاقات مسز فلورا اسمتھ سے ہوئی تھی جس کے بارے میں اس وقت مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ اسی ہوٹل میں پہلی بار میں نے غدار اعظم قانتی ہادی کو دیکھا تھا۔ اور پھر اس کا ایک آدمی اسی ہوٹل کی پارکنگ لاٹ کے قریب میرے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا تھا۔

بظاہر میں لاپروا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں اپنے گرد و پیش سے پوری طرح باخبر تھا اور کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔

زلیستاں نے جس طرح کمرہ نمبر ۳۱۴ کا ذکر کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے وہاں کسی سے ملنا تھا۔ اگر مجھے اس کمرے میں قیام کرنا تھا تو زلیستاں یقیناً چابی وغیرہ کے بارے میں بھی ہدایت کرتا۔

لفٹ کے ذریعے میں تیسری منزل پر پہنچا تو راہداری ویران پڑی ہوئی تھی۔ میں دبیز قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا ۳۱۴ نمبر کے سامنے رُک گیا۔

میری پہلی ہی دستک کے جواب میں دروازہ کھُل گیا اور مجھے دروازے میں ایک جھریوں بھرے چہرے والا ایک عمر رسیدہ جاپانی نظر آیا۔

اس بوڑھے کی آنکھوں میں شبہات کی پرچھائیاں لرزاں تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی چیز سے سخت خوفزدہ ہو مگر اس نے مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا۔

"ڈاکٹر آلمر سیمنز؟" اندر پہنچنے کے بعد اس نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس بوڑھے جاپانی نے کچھ کہے بغیر میرے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔ پھر وہ اپنے بستر کی طرف گیا اور مسہری کے نیچے چھپا ہوا اسی ساخت کا ایک دوسرا بریف کیس نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میرا بریف کیس اس نے لاپرواہی سے بستر پر ڈال دیا تھا۔

"اب تم ہالینڈے ان کے کمرہ نمبر بیاسی میں رہو گے۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

میں نے وہیں کھڑے کھڑے اس وزنی بریف کیس کو کھولنا چاہا مگر بوڑھے نے سختی سے مجھے روک دیا۔ "اب تم جاؤ یہاں سے۔"

"کمرہ میرے نام بک ہو چکا ہے؟"

"ہاں ہاں — تم جاتے کیوں نہیں؟"

وہ بہت ہی بدحواس نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے ... بھی نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا اور ...

کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہالینڈے ان وہاں سے خاصی دور واقع تھا اور ... وہاں پہنچ کر اس وزنی بریف کیس کا جائزہ لینا چاہتا تھا ... یقینی طور پر کچھ اہم چیزیں موجود تھیں۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ محمود سرے سے ... اور اس نے مجھے غیر ملکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا ... نجانے کیا کر رہے تھے۔

اس جاپانی بوڑھے کے بارے میں تو مجھے ... کسی بھی حالت میں افواجِ آزادیٔ فلسطین کا رکن نہیں ...

ہالینڈے ان کے کاؤنٹر سے میں نے کمرہ نمبر ۸۲ ... اُوپر پہنچ گیا۔

اندر پہنچ کر میں نے دروازہ مقفل کیا اور فوراً ہی بریف کیس کھول ڈالا۔ اس میں بھرا ہوا سامان دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے ... میں احتیاط کے ساتھ ہر چیز کو الگ الگ کرنے لگا۔

اس میں بہت سے کاغذات نقشوں اور دوسری ... علاوہ ایک بند لفافہ بھی تھا جس پر ... حروف میں ... ہوا تھا۔

میں نے سب سے پہلے وہی لفافہ کھول ڈالا۔

اس میں دو بڑے صفحات پر مشتمل ایک خط موجود تھا ... میرے لئے نئی نہیں تھی۔ وہ خط میرے فلسطینی دوست محمود ... سے تھا۔

خط کے مندرجات کے مطابق محمود تہہ خانے سے ... بعد پکڑا گیا تھا اور چھ گھنٹے کے تشدد کے بعد جب ... ٹھکانے کی تصدیق کر لی گئی تو اسے رہا کر دیا گیا۔ ماریا کے ... بعد حکام نے سینکڑوں فلسطینیوں کو گرفتار کیا اور پھر ... انہیں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد ان کا تعاقب کیا جاتا تھا ... کچھ مشکوک رابطے ہوں تو ان کا سُراغ لگایا جائے۔

محمود کو رہائی ضرور مل گئی تھی مگر اس کی پنڈلی ... نتیجے میں خاصا زخم آیا ہوا تھا اور اس کی نگرانی بھی جاری ... سے اس کی نقل و حرکت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

اپنی غیر حاضری کی وضاحت کے بعد اس نے لکھا ... نے اسرائیل سے میری نکاسی کی ایک راہ پیدا کی تھی ... ریڈ بریگیڈ نامی گروپ نے اسرائیل کی قومی فضائی کمپنی ... کو دوران پرواز اغوا کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس میں امکانی ... انہوں نے محمود سے مدد مانگی تھی اور محمود نے انہیں میرے ... آگاہ کر دیا تھا۔

یہ پڑھ کر میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی ... پڑھنے کے بجائے ان سطور کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔

محمود

کے خط میں ریڈ بریگیڈ کی جانب سے اسرائیلی مسافر بردار طیارے کے اغوا کے منصوبے کے تذکرے کے بعد جو متن درج تھا اس کے مطابق محمود کی نگرانی کی وجہ سے اسرائیل میں افواجِ آزادیٔ فلسطین کا مقامی گروپ تقریباً مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ماریا کے لرزہ خیز قتل کے بعد اسرائیلی حکام پوری تندہی سے میری تلاش میں تھے اور میرے لیے اسرائیل میں ٹھہرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

محمود کی تحریر کے مطابق بھیجنے والے نے مجھے جہاں بھیجا اور میں جس سے ملا اس کے درست اور قابلِ اعتماد ہونے کا ثبوت اس کا لکھا ہوا خط تھا جو اسی وسیلے سے مجھے ملا تھا اور میری سلامتی اسی میں تھی کہ ملنے والی ہدایات پر پوری طرح عمل کروں اور خط کو پڑھتے ہی نذرِ آتش کر دوں۔

وہ خط میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد نذرِ آتش کر دیا اور راکھ نالی میں بہا دی۔ اس کے بعد میں نے دیگر چیزوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

بریف کیس میں جھلی نما باریک دستانوں کی ایک جوڑی موجود تھی جس کے اندرونی حصّے پر انگلیوں اور ہتھیلیوں کی لکیریں بھی بنی ہوئی تھیں میرے لیے گو وہ نئی چیز تھی مگر اس کی ماہرانہ ساخت سے ظاہر تھا کہ اسے پہن لینے کے بعد کسی کو میرے ہاتھوں پر دستانوں کی موجودگی کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا اور اس کے استعمال سے جو نشانات انگشت وجود میں آتے، ان کی ترتیب اور ہیئت میری اپنی انگلیوں کے نشانات سے مختلف ہوتی!

علاوہ ازیں بریف کیس میں گتے کے ایک ڈبے میں بند پلاسٹک کی ایک لمبی سی شیشی تھی جس کے اوپری سرے پر ایک ننھا سا سوراخ موجود تھا اور شیشی پر لگے ہوئے لیبل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس میں کپڑوں سے داغ مٹانے والا کوئی خاص سیال بھرا ہوا ہے۔ اس شیشی کا ڈھکن بہت خوبصورت اور سنہری پلاسٹک کا بنا ہوا تھا اور اس میں ہی اسپرے والا باریک سا سوراخ موجود تھا۔

کپڑوں سے داغ مٹانے والے سیال کی شیشی کے علاوہ فرانس کے بنے ہوئے خوشبودار سگاروں کا ایک پیکٹ بھی میری توجہ کا مرکز بنا جس میں دس سگار موجود تھے اور ڈبہ پر ٹیپ سے ایک ننھا سا کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر سُرخ روشنائی سے انگریزی میں "خطرناک" لکھا تھا۔

کاغذ کا وہ پرزہ دیکھنے کے بعد میں نے سگار کے پیکٹ کو بہت احتیاط کے ساتھ ایک طرف رکھ دیا۔ یہ بات بہت واضح تھی کہ ریڈ بریگیڈ کے اراکین کو دورانِ سفر میری تمباکو نوشی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور سگاروں کی آڑ میں مجھے کوئی موثر ہتھیار فراہم کیا گیا تھا۔

ان اشیاء کے بعد میں کاغذات کی طرف متوجہ ہوا۔ گتّے کے ایک نفیس فولڈر میں کئی تہہ کیا ہوا بوئنگ ۷۰۷ طیارے کا اندرونی نقشہ تھا جس میں نشستوں سے لے کر فلائٹ کچن اور پائلٹ کیبن تک ہر چیز دکھائی گئی تھی۔ فرسٹ کلاس میں پائلٹ کے کیبن کے قریب راہداری کی طرف کنارے والی ایک نشست پر سرخ رنگ سے نمبر ایک لکھا ہوا تھا۔ اسی درجہ کی آخری قطار کی اس نشست پر جو کچن سے ملنے والے دروازے کے نزدیک تھی، سرخ رنگ سے نمبر ۲ لکھا ہوا تھا۔

اکانومی کلاس میں بھی ابتدائی اور آخری سرے کی دو نشستوں پر اسی طرح نمبر ۳ اور نمبر ۴ پڑا ہوا تھا۔

نقشے کے تفصیلی جائزے سے فارغ ہو کر میں دوسرے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جن میں میرے لیے تفصیلی ہدایات موجود تھیں اور ایک لفافے میں تین سو اسرائیلی پونڈ تھے۔

ہدایت نامہ بھونڈی اور گرامر سے آزاد انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ اس میں سب سے پہلے مجھے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر چیز کے بغور مطالعہ اور مشاہدے کے بعد سگار کے ڈبے، دستانوں، دھبے دور کرنے والا محلول اور اپنے سفری کاغذات کے علاوہ بریف کیس کی ہر شئے کو اس طرح نذرِ آتش کر دوں کہ بعد میں اس کا سایہ بھی نہ مل سکے۔

منصوبے کے مطابق دو روز بعد مقامی وقت کے مطابق نو بجے شب لندن کے لیے روانہ ہونے والی اسرائیلی ایئرلائنز کی پرواز نمبر اے ۲۱۱ ان لوگوں کا ہدف تھی۔ مجھے ٹھیک آٹھ بجے ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہو کر چند ثانیوں تک دروازے کے قریب رکنا تھا۔ اس لاؤنج میں میرے فرار کی راہیں مسدود کرنے کے لیے دو آرمی افسران ہر پرواز کے وقت سدھائے ہوئے کتوں کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی کسی ترکیب سے ان کتوں کو اشتعال دلایا جاتا، امکان یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ میرے استعمال شدہ کپڑوں کا ایک بنڈل لے کر کوئی شخص کتوں کے قریب سے گزرتا اور کتے جو میری بُو پر لگائے گئے تھے، اس شخص کے پیچھے ہو لیتے اور وہ خوفزدہ انداز میں لاؤنج سے ملحق پیشاب خانے میں داخل ہو کر خود کو اندر بند کر لیتا ——

اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر مجھے محکمۂ صحت اور امیگریشن

سے نمٹ کر اندر داخل ہو جانا تھا جہاں پر حفاظتی عملہ مامور تھا۔

مسافروں کو پونے نو بجے طیارے پر پہنچا یا جانا تھا اس وقت تک باہر لاؤنج میں کسی بھی طرح افراتفری برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اگر کتّوں کو الجھانے والے شخص کا معاملہ جلد نمٹ جاتا تو لاؤنج سے باہر پارکنگ لاٹ میں دستی بم کا دھماکہ کیا جاتا اور یوں کسی کی توجہ میری طرف مبذول نہ ہو پاتی اور میں طیارے میں پہنچ جاتا۔

طیارہ فضا میں بلند ہونے کے بعد جب پائلٹ یا کپتان حفاظتی بند کھولنے کا مشورہ دیتا تو نشست نمبر ا والی لڑکی کاک پٹ میں داخل ہو کر پائلٹ اور اس کے معاون کو کسی غیر آتشی ہتھیار کی زد پر بے بس کر دیتی، نمبر ۲ نشست والا اوّل درجے کے مسافروں پر مسلّط ہو جاتا اور عملے کے کسی فرد کو کاک پٹ کی طرف نہ جانے دیتا۔ تیسری نشست والے کے ذمے اکانومی کلاس تھی جب کہ چوتھی نشست میری تھی اور مجھے اسپیکر پر پائلٹ کی آواز ختم ہوتے ہی سگاروں کا پیکٹ اٹھا کر نشست سے باہر راہداری میں آنا تھا تاکہ آس پاس کے مسافر مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکیں۔ راہداری میں آنے کے بعد مجھے اعلان کرنا تھا کہ اگر ذرا بھی مزاحمت کی گئی تو میں جہاز کے فضا میں پرخچے اڑا دوں گا۔

وہ سگار درحقیقت غیر بارودی بم تھے جن میں دونوں سروں پر تمباکو تھا مگر درمیان میں خطرناک کیمیائی مادّوں سے بھری ہوئی دو شیشیاں موجود تھیں جو معمولی سے جھٹکے سے ٹوٹ کر شدید دھماکہ پیدا کر سکتی تھیں اور ان دونوں کا محلول جس چیز پر پڑ جاتا اسے جلا ڈالتا۔ طیارے میں سوار ہوتے ہی دھبّے مٹانے والے محلول کی شیشی میری جیب میں پہنچ جانا ضروری تھی، تاکہ وقتِ ضرورت میں اسے خاص ترکیب سے استعمال کر کے کسی بھی متوقع حریف کو ہلاک کر سکوں۔

اس شیشی کو دبانے سے جو محلول آتا تھا وہ واقعی کپڑوں سے دھبّے دور کر سکتا تھا۔ مگر اس کے سنہرے ڈھکن کو دبانے سے شیشی کی اندرونی تہہ میں بنی ہوئی اسپرنگ دار خفیہ نالی سے پوٹاشیم سائنائیڈ میں بجھی ہوئی باریک سوئیاں خاصی قوّت سے اڑ کر سیّال والے سوراخ سے باہر آتیں اور کسی بھی مقابل کو آناً فاناً ہلاک کر دیتیں۔

اس مہم کے جملہ اراکین کو غیر بارودی اور جدید ترین کیمیائی ہتھیار فراہم کیے گئے تھے، تاکہ حفاظتی عملے کی تلاشی کے دوران ان پر شبہ نہ کیا جا سکے۔

ان ابتدائی ہدایات کے بعد مقصد کے تیز تر لیے ہنگامی صورت میں تمام فیصلے میری ذات پر چھ مگر عمومی طور پر مجھے اس مہم کی نگران اولو وکے اح کرنا تھی۔ وہ لڑکی ہی کاک پٹ کا کنٹرول سنبھالنے ذمہ داری پر مامور کی گئی تھی۔

ان تفصیلات کے مطالعے کے بعد میں دیگر طرف متوجہ ہوا۔ جن میں میری تمام سفری دستاویزات تھیں۔

اپنا برطانوی پاسپورٹ دیکھ کر میں حیران رہ گیا پر میری سیاہ پردے کے سامنے اسٹوڈیو کی طرز پر تصویر چسپاں تھی جو فرانسیسی نژاد زلیستان نے اپنے پر دوسری تصاویر کے ساتھ اتاری تھی۔

پاسپورٹ کے اندراجات کے مطابق میں بر تھا۔ میرا پتہ لندن کا تھا اور پیشے کے سامنے ریسرچ لکھا ہوا تھا۔ پاسپورٹ میں میرا نام آسکر بینتھم جو مجھے زلیستان نے دیا تھا۔

اسرائیلی ویزا مجھے لندن میں جاری کیا گیا تھا صرف سترہ روزہ قبل اپنے تحقیقی سفر پر تل ابیب پہنچا تھا پاسپورٹ کے ساتھ ہی میرا ٹکٹ اور صحت کا سرٹیفکیٹ بھی موجود تھا۔

میں نے ہر نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد دستاویزات اور کیمیائی ہتھیاروں کے سارے کاغذات کر دیئے۔ بریف کیس پر پہلے ہی ابھرے ہوئے حروف میں ہالیڈے نام لکھا ہوا تھا، میں نے بقیہ چیزیں اس میں ڈال لیں۔

مجھے ہالیڈے ان میں دو دن گزارنے تھے اور تن پر موجود زلیستان کے کپڑوں کے سوا کوئی لباس بریف کیس سے ملنے والے تین سو پونڈ کے بعد میری کافی مستحکم ہو گئی تھی مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہالیڈے رخصت ہوتے ہوئے مجھے کتنی رقم ادا کرنا ہوگی۔ اس اطمینان کے بعد ہی میں بے فکری سے دوسری ضرور توجہ دے سکتا تھا۔

میں نے چند ملبوسات کی خریداری کے لیے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دروازے پر دھیمی سی دستک ہوئی اختیار میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"کون ہے؟" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر

"اسٹاف کلرک سر!" باہر سے ایک نرم مردانہ

میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے دبلا پتلا سنجیدہ سا نوجوان ایک رجسٹر لیے موجود تھا۔

"معاف کیجیے گا جناب، میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوا۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "دراصل مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ کھانے کے لیے نیچے آئیں گے۔ لہٰذا میں خود حاضر ہو گیا۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے اسے اندر داخل ہونے کا راستہ دیئے بغیر سوال کیا۔

"کچھ ضروری اندراجات کے لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔"

"اندراجات؟" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

میرے کمرے میں آکر وہ سکڑے سہمے انداز میں ایک کرسی پر ٹک گیا اور رجسٹر کھول کر اپنی گود میں پھیلا لیا اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ درحقیقت اتنا...... کلرک نہیں تھا جتنا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اندراجات کے لیے اس نے میرا پاسپورٹ مانگا جو میں نے اس کے حوالے کر دیا اور وہ چھپے ہوئے رجسٹر کے مختلف کالموں میں اندراجات کرنے لگا۔

"اس ہوٹل میں تشریف لانے سے قبل آپ کا قیام کہاں تھا؟" کئی منٹ کی مصروفیت کے بعد اس نے میرا پاسپورٹ مجھے لوٹاتے ہوئے سوال کیا۔

کلرک کے اس سوال نے مجھے بوکھلا دیا کیونکہ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ پاسپورٹ کے مطابق مجھے اسرائیل آئے سترہ روز ہو چکے تھے اور قاعدے کی رُو سے مجھے یہ بتانا لازمی تھا کہ ہالیڈے ان سے پیشتر میں کہاں مقیم تھا۔

"پتہ مجھے یاد نہیں ویسے میں تل ابیب کے نواح میں اپنے ایک دوست کے فارم پر رہ رہا تھا اس کے باہر چلے جانے کی وجہ سے مجھے ہوٹل آنا پڑ گیا۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میں معرفت مسٹر رونی ہان لکھے دیتا ہوں۔" وہ رجسٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "آپ کا کمرہ انہوں نے ہی بک کرایا تھا۔"

شدید آزمائش کا لمحہ خلاف توقع نہایت آسانی سے گزر گیا اور میں نے خاموشی سادھ لی جو ایسے مواقع پر اکثر مفید ثابت ہوتی ہے۔

"آپ کے تین روز کے جملہ اخراجات ہمیں آپ کے دوست سے پیشگی مل چکے ہیں۔" وہ رجسٹر سنبھال کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اطلاع کا شکریہ، مجھے اس کا علم ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

چابی دیتے ہوئے استقبالیہ کاؤنٹر والی لڑکی خالی کالموں کے سامنے پہلے ہی مجھ سے دستخط لے چکی تھی۔ ...لہٰذا اس کلرک کا کام ختم ہو گیا تھا۔ مگر اس نے مجھے اخراجات کی پیشگی ادائیگی کی جو اطلاع دی، اس پر وہ انعام کا مستحق تھا۔ میں نے فیاضانہ انداز میں بٹوے سے دو اسرائیلی پونڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

اس کے لیے انعام کی وہ رقم غیر متوقع تھی۔ اس نے جھک کر بڑے تپاک سے میرا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ "میرا نام راڈرک ہے اور میری ڈیوٹی شام کے سات بجے سے صبح کے سات بجے تک ہوتی ہے۔ آپ اپنی نجی ضروریات اور جملہ تفریحات کے لیے انٹرکام پر حکم دے سکتے ہیں!"

"ضرور — ضرور!"

اور اس کے بعد وہ بلا ٹل گئی۔

مجھ پر اپنے بجٹ کی صورتِ حال واضح ہو چکی تھی جو میری توقع سے زیادہ امید افزا تھی لہٰذا میں ہوٹل سے نیچے اتر گیا۔

ہالیڈے ان کے قریب ہی تل ابیب کا بڑا اور بارونق بازار تھا۔ میں نے چند دکانوں میں گھومنے کے بعد ایک جگہ سے چند ملبوسات اور دیگر ضروری اشیاء خریدیں اور واپس ہوٹل آگیا۔

ہالیڈے ان میں اگلے دو روز میں نے سنسنی اور اعصابی تناؤ کے عالم میں گزارے۔ اس دوران میں میں اپنے ہمدردوں سے بالکل لاتعلق ہو کر رہ گیا تھا۔ میری جملہ معلومات کا انحصار اخبار اور ٹیلی وژن پر تھا۔

میں پہچان لیے جانے کے روح فرسا خوف سے اپنے کمرے ہی میں محدود رہنے کی کوشش کرتا تھا مگر دوسری جانب ہوٹل کے عملے کا خوف بھی دامن گیر تھا۔ میرا غیر معمولی طور پر محتاط رویّہ کسی کو بھی میری جانب سے مشکوک کر سکتا تھا لہٰذا میں دن میں تین چار گھنٹے ہوٹل سے باہر گزارتا تھا۔ عام راستوں اور بھیڑ بھاڑ کے بجائے میں ہوٹل سے نکل کر سیدھا کنگ سولومن لائبریری میں پہنچ جاتا تھا جو تل ابیب بلکہ اسرائیل کا مشہور کتب خانہ ہے وہاں دنیا کے ہر موضوع پر بے شمار کتابیں موجود تھیں۔

میں لائبریری میں پہنچ کر حوالہ جات کے شعبہ کے پُرسکون ماحول میں جا بیٹھتا اور میری ڈیسک پر مشرقی تمدّن کے موضوع پر بہت سی کتابیں جمع ہو جاتیں اور میں کسی پیشہ ور محقق کی طرح ان کتابوں میں ڈوب جاتا۔ مطالعہ کے ساتھ ہی میں خانہ پُری کے لیے اپنی ڈائری پر نوٹ بھی لکھتا جاتا تھا مگر اس دوران میں ایک لحظہ کے لیے بھی اپنے گردوپیش سے غافل نہیں ہوتا تھا۔

وہ دو روز میرے اسرائیل میں قیام کے بدترین دن تھے۔ جب مجھے ہر آن اپنی آزادی اور زندگی خطرے کی سولی پر نظر آتی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے وہ بھیانک آسیبی لمحات بھی بیت گئے اور میری روانگی کا وقت آپہنچا۔

یہ میری قسمت کی خوبی تھی کہ اس روز راڈرک کی ڈیوٹی کاؤنٹر پر تھی۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت اور پھرتی کے ساتھ چند ہی منٹ میں میرا حساب بے باق کر دیا جس کی رُو سے روئی ہان کی ادا کی ہوئی پیشگی رقم میں سے سات پونڈ باقی تھے۔

میں نے پانچ پونڈ لے کر بقیہ رقم بخشش کے طور پر راڈرک کو دے دی اور اپنا بریف کیس سنبھال کر باہر ہو لیا راڈرک کے اشارے پر ایک پورٹر نے میرا سوٹ کیس اُٹھا لیا۔

باہر ٹیکسی موجود تھی۔ ڈرائیور نے ادب سے میرے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور میں بظاہر بڑی تمکنت سے اندر داخل ہو گیا مگر اس وقت میرے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز اور بے ربط ہو چکی تھیں۔

تل ابیب اس وقت رنگ و بو کے سیلاب میں کھویا ہوا تھا۔ اونچی عمارات پر لگے ہوئے جلنے بجھنے والے روشن برقی اشتہارات کی رنگ برنگ روشنیاں لحظہ بہ لحظہ گردو پیش کی فضا پر عجیب سا اثر ڈال رہی تھیں۔ حُسن کے بے حجاب جلوے، شہابی رنگتیں، گداز بدن، قاتل اور مخمور نگاہیں، سیاہ، سرمئی، سرخ، زرد اور سنہری زلفیں ہر طرف لہرا رہی تھیں مگر صفدر علی کے دل میں کوئی گدگدی پیدا نہ ہو سکی۔

"مجھے راستے سے کوئین این کی ایک بوتل لینا ہے" میں نے تیزی سے پیچھے بھاگتے ہوئے مناظر کے مشاہدے کے دوران ڈرائیور سے کہا۔ میری خواہش تھی کہ ایئرپورٹ پر ٹیکسی چھوڑنے سے قبل میں ذہنی طور پر پُرسکون رہوں تاکہ غیر ضروری طور پر اشتباہ آمیز نظریں میرا تعاقب شروع نہ کر دیں۔ وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری نئی مہم بہت خطرناک تھی۔

ڈرائیور نے ٹیکسی ہوٹل وینزمان سے ملحق ایک وائن اسٹور کے سامنے روک دی اور پلک جھپکتے میں میرے لیے میری پسندیدہ وہسکی خرید لایا۔

میں نے فوراً ہی بوتل کھول کر منہ سے لگا لی۔ دہکتا ہوا سیال میرے دہانے میں داخل ہوا اور پھر آنتوں تک میں آگ سی بھرتا چلا گیا۔ ساتھ ہی میری آنکھوں سے بے اختیار چند آنسو بہہ نکلے مگر اس کے بعد مجھے اپنی رگ رگ میں سکون کی لہریں سرایت کرتی محسوس ہونے لگیں۔

میں نے یکے بعد دیگرے خالص وہسکی کے بڑے بڑے گھونٹ اپنے معدے میں اتارے اور بوتل بند کر کے بریف کیس میں رکھ لی۔

وہسکی اور مختلف قسم کی شرابیں کبھی بھی مجھے ... بیگانہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں مگر ان سے لطف ... کے لیے ضروری تھا کہ ذہن کو آزاد چھوڑ دیا جائے ... اس وقت اسی ترکیب پر عمل کیا۔

جب دور سے ایئرپورٹ کی عمارت پر جگمگاتے روشن حروف نظر آئے تو میں اپنی آزادی کے لیے دنیا ... سے ٹکرا جانے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔

ایئرپورٹ پر ٹیکسی ڈرائیور کو میں نے کرائے کی رقم ادا کی اور اپنے سوٹ کیس کو پہیوں کے بل پختہ روش پر ... ہوا فٹ پاتھ پر پہنچ گیا۔

میں نے بظاہر کسی پورٹر کے انتظار کا انداز ... اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی جہاں آٹھ بجنے میں پانچ ... میں نے چند ثانیوں تک انتظار کے بعد ... انداز میں سوٹ کیس کو آہستہ آہستہ ڈپارچر لاؤنج ... دروازے کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔

تل ابیب ایئرپورٹ کا ڈپارچر لاؤنج بہت ... صاف ستھرا تھا اور شیشے کی دیواروں کے اس پار ... نظر آیا وہ خون خشک کر دینے کیلئے کافی تھا۔ اس ... نے میرے معدے میں موجود سیال کا تمام اثر کافور ... شیشے کے خودبخود بند ہو جانے والے درو... گزرنے کے بعد اندر نیلی رسیوں سے حد بندی کی ... وہی لوگ عبور کر سکتے تھے جو بذاتِ خود سفر پر جا... کام کرنے والے عملے میں شامل ہوں۔

ان رسیوں کے درمیان والی گزرگاہ ... دو عدد خونخوار کتوں کے پٹے تھامے کھڑے تھے ... قریب ہی ایک فوجی افسر اسرائیل کی قومی فضائی ... کی ایک خوبصورت میزبان سے باتیں کر رہا تھا۔

دونوں کتے بے حد صحت مند اور خوفناک ... جسامت تندرست پہاڑی بکروں سے کسی طرح کم ... ان کے خونی دہانوں سے سُرخ زبانیں باہر لٹکی ... اور وہ بار بار اپنے کان گھما کر بے چین انداز میں ... رہے تھے۔ جیسے اپنے شکار کی بُو پاتے ہی اس کے ... ڈالیں گے۔

میری نبض کی رفتار یک بیک تیز ہو گئی اور ... میں دھڑکنے لگا۔ ان خونخوار کھوجی کتوں کے دانتوں کا اذیتناک ... مس مجھے اپنے جسم پر محسوس ہونے لگا۔ اضطراری طور پر میری نگاہیں لاؤنج کی ایک دیوار گیر گھڑی کی طرف اُٹھ گئیں جہاں آٹھ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔

وقت کی رفتار بے حد سست تھی۔ میرے قدم لحظہ بہ لحظہ ڈپارچر لاؤنج کے داخلی دروازے قریب ہوتے جا رہے تھے جہاں حالات نہایت پُرسکون تھے۔ بظاہر ایسی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی جس کی بنا پر میں یہ امید کرنے لگتا کہ ٹھیک آٹھ بجے یعنی صرف تین منٹ کے اندر اندر کتوں کو اس جگہ سے ہٹا دیا جائے گا اور میں حفاظت کے ساتھ نیلی رسیوں والے علاقے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ان کتوں کے قریب سے ایک سفید فام جوڑا گزر کر اندر داخل ہوا پھر کسی فضائی کمپنی کی دو وردی پوش لڑکیاں باہر نکلیں مگر کتے بدستور اپنی جگہ کھڑے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ہانپتے رہے۔ ان کے ہیبت ناک جبڑوں سے باہر جھولتی ہوئی زبانیں ایک پل کے لیے بھی اوجھل نہ ہوئی تھیں۔

آخر کار میں داخلی دروازے پر پہنچ ہی گیا۔ اس وقت آٹھ بجنے میں تقریباً پونے دو منٹ باقی تھے اور میرے بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل چکے تھے۔

اس علاقے میں حفاظتی عملے کے کئی آدمی موجود تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب میری ہی نگرانی پر مامور ہوں اگر میں مشکوک انداز میں دروازے کے قریب رکتا تو افراتفری پھیلنے پر میری پیش قدمی مجھے جال میں پھنسانے کا باعث بن جاتی اور اگر میں بلا رکے بڑھتا رہتا تو وہ خونخوار کتے میری بُو پر جھپٹ پڑتے جب کہ واپسی کا خطرہ میں کسی قیمت پر مول نہیں لے سکتا تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اپنی مہم پر مامور افراد کی دیکھ بھال کے لیے اس علاقے میں ریڈ بریگیڈ کے چند اہم اور با اختیار کارندے ضرور منڈلا رہے ہوں گے تاکہ اس بات کا یقین کر سکیں کہ ان کے چاروں آدمی پرواز سے پہلے اندر پہنچ گئے۔ اگر ان میں سے کوئی مجھے واپس لوٹتے دیکھ لیتا تو اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آتا کہ میں بزدلی کے باعث جان بچانے پر اتر آیا ہوں اور مجھے بغاوت کی راہ پکڑتے دیکھ کر ان میں سے کوئی بھی مجھے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

بالیڈرے ان کے آرام دہ کمرے میں بیٹھ کر ال ال کے طیارے کے اغوا کے منصوبے کے کاغذات کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ تمام روح فرسا اندیشے میرے ذہن میں نہیں آئے تھے مگر عملی طور پر حالات بہت مخدوش تھے۔

میں بظاہر لاپروایانہ انداز اختیار کیے نہایت سست رفتاری کے ساتھ آگے سرکتا رہا جیسے اپنے سوٹ کیس کو پہیوں پر دھکیلنا مجھے شاق گزر رہا ہو اور جوں ہی میں اندر داخل ہوا، میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

فوجیوں والے کتے اس وقت مجھ سے کم و بیش ساٹھ فٹ دور تھے اور زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت ایک پستہ قامت اور خوبصورت کُتیا لاؤنج کے کسی دور افتادہ گوشے سے دوڑتی ہوئی آ رہی تھی اور یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان دونوں کتوں کے قریب سے گزرتی ہوئی سیدھی مجھ پر آ پڑے گی۔

فوری طور پر مجھے یہی گمان ہوا کہ وہ بھی کھوجی نسل سے تعلق رکھتی ہو گی اور اسی شبہ کی بنا پر میں نے اس پر نظریں جمائیں تو میرا شبہ کچھ ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

اس کُتیا کے دھڑ پر دُم سے گردن تک چرمی تسموں کے ذریعہ سرخ کپڑے یا چمڑے کا ایک غلاف کسا ہوا تھا جیسا کہ عام طور پر کتوں کے شوقین اپنے پالتو کتوں کو موسمی سختیوں سے بچانے کے لیے جاڑوں میں استعمال کرتے ہیں۔

اس پستہ قامت کُتیا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ان دونوں کتوں کے کان کھڑے ہو گئے، ان کی جھکی ہوئی دمیں تن کر دائرے کی صورت اختیار کر گئیں پھر جوں ہی وہ کُتیا قریب آئی، دونوں کتے بیک وقت غضبناک انداز میں غرّائے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔

ان قد آور کتوں کا وہ حملہ فوجیوں کے لیے اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ آہنی زنجیروں پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکے۔ ان میں سے ایک زنجیر دوبارہ تھامنے کی کوشش میں منہ کے بل فرش پر جا رہا اور دونوں کتے ہولناک قاتلانہ انداز میں غرّاتے ہوئے کُتیا کے پیچھے ہو لیے جو ان کے جارحانہ تیوروں سے دہشت زدہ ہو کر بُری طرح چیختی ہوئی برق رفتاری سے واپس ہو لی تھی وہ دونوں کتے ہر رکاوٹ کو عبور کرتے اسکے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔

بھڑکے ہوئے کتوں کی اس معرکہ آرائی نے وہاں شدید افراتفری پھیلا دی اور پورا لاؤنج خوفزدہ مردانہ اور نسوانی چیخوں سے گونجنے لگا۔ کئی افراد نے مجھے دھکیلتے ہوئے بدحواسی کے عالم میں باہر نکلنا شروع کر دیا مگر میں پُرسکون انداز میں دھیمی رفتار سے آگے ہی بڑھتا رہا۔

دونوں فوجی کتوں کو پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے ہی گئے تھے۔ ان کا کپتان بھی اب اس جگہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

کئی افراد اونچی آواز میں ان خبطی افسران کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے جن کے ایما پر وحشی کتوں کو ایئرپورٹ کے بھرے

پرے علاقے میں رکھ چھوڑا گیا تھا تاکہ وہ کسی بھی وقت انسانی جسم پر اپنے دانتوں کی تیزی کا امتحان لے سکیں۔

نیلی رسیوں والی گزرگاہ پر مامور محافظ نے میرا ٹکٹ دیکھ کر مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی اور میں امیگریشن کاؤنٹر پر چلا گیا۔ دو افراد کے بعد میری باری آئی اور کاغذات کی دیکھ بھال کے بعد مجھے کلیرنس مل گیا۔ صحت والوں کے پاس بھی مجھے چند سیکنڈ لگے اور میں نے ال ایل کے کاؤنٹر پر جا کر اپنا بورڈنگ کارڈ حاصل کر لیا۔

اس کے بعد مجھے ایک الیکٹرونک مشین کے قریب سے گزارا گیا جو آتشیں ہتھیاروں اور مادوں کا سراغ لگا سکتی تھی۔ اس سے آگے ایک فوجی افسر ایک ننھا سا کمپیوٹر لیے بیٹھا تھا جس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی اسکرین موجود تھی۔

اس افسر نے پہلے مجھے اپنی داہنی ہتھیلی اور انگلیاں اسکرین پر جما کر رکھنے کا حکم دیا۔ میرے ہاتھ رکھتے ہی اس نے ایک بٹن دبایا۔ ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اسکرین روشن ہوئی اور اس کے چند سیکنڈ بعد اسکرین کے اوپر لگا ہوا سبز بلب جل اٹھا جبکہ سرخ بلب بدستور تاریک رہا۔ یہی عمل میرے بائیں ہاتھ کے ساتھ ہوا اور ربوں میں فنگر پرنٹ چیک کرنے والے اس کمپیوٹر کو بھی دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ میرے دونوں ہاتھوں پر میری جلد کی رنگت کے باریک اور مضبوط دستانے چڑھے ہوئے تھے جنہیں دیکھنا محال تھا کیونکہ ان دستانوں کی بیرونی سطح پر جلد کے سے تمام نشانات موجود تھے جنہوں نے صفدر علی کے اصلی فنگر پرنٹ کو بخوبی چھپا لیا تھا۔

اسرائیلی ایئر لائنز ال ایل کی اس پرواز پر مسافروں کی تعداد بہت کم تھی اور وہ سب اس وقت روانگی کے اعلان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ کر ان سب کا جائزہ لینے لگا۔ تاکہ طیارے پر سوار ہونے سے پہلے اپنے متوقع ساتھیوں کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کر سکوں۔ مگر وہاں موجود مسافروں میں جاپانی خدوخال والا کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنے بھڑکے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے سگریٹ جلائی تھی کہ کافی دور سے یکے بعد دیگرے تین فائروں کی آواز آئی اور وہاں موجود سارے مسافروں میں انتشار اور بے چینی کی لہر سرایت کر گئی۔

"کیا ہوا؟ یہ آج یہاں کیا ہو رہا ہے؟" ایک مسافر نے ایئرپورٹ کے عملے کی ایک بوکھلائی ہوئی لڑکی کا بازو تھام کر ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"میں معلوم کر کے بتاتی ہوں۔" لڑکی نے اپنا بازو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ، جہنم میں جاؤ۔" اس شخص نے لڑکی کو بے رحمی سے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اور وہ تیزی کے ساتھ نکاسی کے راستے کی طرف دوڑتی چلی گئی۔

اس دوران کئی مسافر رن وے کی طرف کھلنے والے دروازے سے باہر نکل چکے تھے اور وہاں موجود سیکورٹی اسٹاف بھی انہیں واپس کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

"آج رات اس چھت کے نیچے کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔" قامت لڑکی سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "اس ملک میں کہیں بھی کا سانس نہیں لے سکتا۔"

"مادام!" اچانک ایک سیکورٹی افسر لڑکی کے قریب پہنچ لہجے میں بولا۔ "بلاوجہ مسافروں میں ہراس پھیلانے کی کوشش"

"اس کی باتوں کا خیال نہ کریں۔" لڑکی کا ساتھی دخل دیتے ہوئے بولا۔ "یہ ذرا جذباتی واقع ہوئی ہے۔ البتہ ایسی ترکیب ضرور بتا دیں جس کے سہارے ہم دونوں آج رات سلامت یہاں سے نکل سکیں۔"

سیکورٹی افسر اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا اس دوران میں ان تینوں کے گرد خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔

"پہلے باہر سے خونخوار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ہجوم میں چیخ و پکار مچ گئی۔ اب اس کے بعد یہ فائرنگ سنائی کم از کم یہ تو بتائیں کہ اس ہنگامے کا سبب کیا ہے؟ کہیں پسندوں کا کوئی گروپ تو اندر نہیں آگیا ہے۔" ایک اور مسافر لقمہ دیا۔

"دو کتے ایک کتیا کو دیکھ کر بھڑک گئے تھے اور وہ کتیا ایک طرف بھاگ نکلی اور ایک شخص نے غیر ضروری احتیاط کا کرتے ہوئے تینوں کتوں کو گولی مار دی۔ آپ لوگ اس واقعہ پر تشویش کا شکار ہیں۔" سیکورٹی افسر نے ملامت آمیز لہجے میں کو مخاطب کر کے جواب دیا جس نے اس سے آخری سوال

"مگر آوارہ کتوں کی یہ ٹولی کس کی اجازت سے لاؤنج ہوئی تھی؟" کسی نے برہم ہو کر سوال کیا۔

"وہ آوارہ کتے نہیں تھے۔" سیکورٹی افسر دانت پیس "ان میں سے دو بیش قیمت اور نایاب نسل کے تربیت یافتہ اور تیسری کتیا بھی یقیناً کسی معزز مسافر کے ساتھ رہی ہوگی کے گلے میں پٹا اور بدن پر لباس موجود تھا۔"

یہ کہہ کر سیکورٹی افسر مسافروں کی اس بھیڑ میں سے گیا اور میں دل ہی دل میں منصوبہ بندی کرنے والوں کی قصیدے کہنے لگا۔

مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ کتیا کے بدن پر جو تھا اس کی اندرونی تہہ میں میرے کسی پرانے لباس کا ٹکڑا

رہا ہوگا اور اسی بُو کے سہارے تربیت یافتہ فوجی کتے اس کتیا کے پیچھے لپکے ہوں گے جسے کسی شخص نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کتوں کی طرف بھیجا ہوگا اور جب وہ کتیا جان بچانے کے لیے اپنے مالک کی تلاش میں واپس بھاگی تو نہ صرف اسے بلکہ دونوں کتوں کو بھی گولی مار دی گئی تاکہ اس واقعہ کی پشت پر کارفرما واقعات کا پردہ فاش نہ ہو سکے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا کہ دونوں کتے جنس مخالف کی بو پر لپکے تھے اور کتیا ان کی وحشیانہ یورش سے بوکھلا کر بھاگ نکلی۔

اس مفروضے کی روشنی میں مجھے یہ بھی یقین تھا کہ تینوں کتوں کو گولی مارنے والا بھی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر بھیڑ میں مل گیا ہوگا اور اس کا سراغ بھی نہ مل سکے گا۔

سیکورٹی افسر کی وضاحت کے بعد مسافر دوبارہ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے مگر ان کے درمیان موضوعِ گفتگو وہی رہا۔

بعد میں اکا دکا مسافروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور ٹھیک پونے نو بجے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ ال ایل کی پرواز نمبر ۲۱۱ لندن روانگی کے لیے تیار تھی۔ مسافروں کو انتظارگاہ کے باہر کھڑی ہوئی بسوں پر سوار ہونے کی ہدایت بھی کی گئی۔

اور اس وقت پہلی بار میں نے ایک جاپانی چہرہ دیکھا۔ گھٹنوں تک کے سرمئی اسکرٹ اور بغیر آستینوں والے بلاؤز میں ملبوس وہ خوش شکل اور سبک اندام لڑکی دروازے کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اعلان ہوتے ہی وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سب سے پہلے باہر نکل گئی۔

میرے قدم بوجھل ہو گئے، زبان دہانے میں اینٹھنے لگی اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہی لڑکی ادتومو تھی۔

ال ایل کے بورڈنگ کارڈز پر نشستوں کا کوئی نمبر درج نہیں تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے چڑھنے والے مسافروں کو اپنی پسندیدہ نشست سنبھالنے کا موقع مل سکے گا اور پروگرام کے مطابق ادتومو کو فرسٹ کلاس میں کاک پٹ کے قریب ہی بیٹھنا تھا۔ لہٰذا وہ جلدی سے بس میں سوار ہو گئی تاکہ دروازے کے قریب بیٹھ کر پہلے اترنے کا موقع حاصل کر سکے۔

مجھے چونکہ اکانومی کلاس کے آخری سرے پر باتھ روم کے نزدیک جگہ سنبھالنا تھی لہٰذا میں نے پھرتی نہیں دکھائی کیونکہ تجربہ کار فضائی مسافر آخری قطاروں کو کبھی ترجیح نہیں دیتے جہاں پرواز کے عدم توازن کا سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔

بس روانہ ہوئی تو اس میں کل اکتالیس نفوس موجود تھے۔

ال ایل کا طیارہ عمارت سے کافی دور روشن رن وے پر کھڑا ہوا تھا۔ زمینی عملہ اپنا کام نمٹانے کے بعد سامان سمیٹ رہا تھا اور ایئر فریم مکینک آخری بار طیارے کے بازوؤں وغیرہ کے پاس اپنی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق سرمئی اسکرٹ والی سب سے پہلے بس سے اتری اور جب میں نیچے آیا تو وہ فرسٹ کلاس کی سیڑھیاں طے کر کے اندر داخل ہونے والی تھی۔

مسافروں کی قطار میں میں بھی اکانومی کلاس کی سیڑھیاں طے کر کے طیارہ میں داخل ہوا جہاں ایک ایئر ہوسٹس نے دلکش مسکراہٹ اور ترنم ریز "ہیلو" کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ میں نے اندر داخل ہو کر سب سے پہلے فرسٹ کلاس کے قریب والی اس نشست پر نگاہ ڈالی جہاں مجھے ملنے والے نقشے کے مطابق نمبر تین آدمی کو موجود ہونا تھا۔ اس وقت وہاں ایک لمبا تڑنگا سفید فام بیٹھا ہوا تھا جس کے خدوخال واضح طور پر اس کے یورپی ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اس کے برابر میں ایک بوڑھی عورت براجمان تھی۔

میں خراماں خراماں باتھ روم کے قریب اپنی نشست پر پہنچ گیا۔

چند منٹ بعد سیڑھیاں ہٹا دی گئیں اور دروازے بند کر دیئے گئے۔ جہاز کا عملہ اوپری خانوں میں رکھے ہوئے تکیئے اور کمبلوں کو درست کر کے خانے بند کرنے لگا۔

جہاز کے سامنے والی اسکرین پر عبرانی، عربی اور انگریزی زبانوں میں تمباکو نوشی کی ممانعت کے سرخ الفاظ روشن تھے۔

ایک ایک لمحہ سنسنی اور بے یقینی کے عالم میں گزر رہا تھا۔ مجھے ہر آن یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اچانک دروازے کھلیں گے اور چند مسلح فوجی افسران طیارے میں داخل ہو کر پرواز کے التوا کا اعلان کریں گے اور سارے مسافروں کو اس وقت تک حراست میں لے لیا جائے گا جب تک ان کے جملہ کوائف کی تصدیق نہ کر لی جائے اور یوں میں اسرائیل سے فرار ہونے کے خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر سکوں گا۔

آخرکار جہاز کے پورے ڈھانچے میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا جو چند منٹ بعد اور کم ہو گیا اسی کے ساتھ کیبن میں انجنوں کا مدھم سا شور سنائی دینے لگا۔

"کپتان جان ہنٹ آپ سب کو ال ایل کی پرواز نمبر ۲۱۱ پر خوش آمدید کہتا ہے۔" طیارے کے مواصلاتی سلسلے پر ایک نرم مردانہ آواز ابھری۔ "آپ اپنی نشست گاہیں سیدھی کر کے حفاظتی بند باندھ لیں۔ ہم اب سے چند منٹ بعد پرواز کرنے والے ہیں۔"

کپتان کی آواز معدوم ہوتے ہی طیارہ کسی دیوہیکل عفریت کی طرح حرکت میں آگیا۔ میں نے حفاظتی بند باندھتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب ٹٹولی جس میں زہریلی سوئیوں والی پلاسٹک کی خوبصورت

شیشی موجود تھی۔

طیارہ کچھ دیر تک مست خرامی کے انداز میں رن وے پر رینگتا رہا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے نظر آنے والی روشنیوں کو دیکھ کر طیارے کی رفتار اور سمتوں کی تبدیلی کا اندازہ ہو رہا تھا پھر رن وے کی سیدھ میں آ کر طیارہ ایک جھٹکے سے ساتھ رفتار پکڑنے لگا۔

کنکریٹ کے رن وے کے جوڑوں پر سے طیارے کے پہیے اس تیزی سے گزر رہے تھے کہ اندر بھونچال سا آیا ہوا تھا پھر یک بیک وہ تمام آوازیں ختم ہو گئیں۔ سینے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا اور طیارہ تیزی سے فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔

سینے پر دباؤ آہستہ آہستہ بڑھتا رہا پھر میرے دونوں کان سن ہوتے چلے گئے۔ یہ کیفیت بدستور قائم تھی کہ میں نے جھک کر اپنا بریف کیس اٹھایا اور احتیاط کے ساتھ سگاروں کا پیکٹ نکال کر گود میں رکھ لیا۔

میری نشست ضرورت کے تحت کھڑکی سے دور اور راہداری سے قریب تھی اس لیے میں فتنوں کی سرزمین تل ابیب کا فضائی نظارہ نہ کر سکا۔ مگر مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ طیارہ مقررہ بلندی پر پہنچ چکا تھا اور کسی بھی لمحہ پائلٹ کی آواز سنائی دے سکتی تھی۔

"خواتین و حضرات!" پائلٹ کی آواز کے ساتھ ہی میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے پھرتی کے ساتھ کوٹ کے جیب سے مہلک سوئیوں والی شیشی نکال لی اور کیمیاوی بموں کا سگاروں پر مشتمل پیکٹ بائیں ہاتھ میں لے لیا۔

"اب آپ اپنے حفاظتی بند کھول لیں۔" پائلٹ نے کہا۔ اسی کے ساتھ تمباکو نوشی کی مخالفت کے الفاظ اسکرین سے غائب ہو گئے۔

پائلٹ کے اعلان کے ساتھ مسافروں میں زندگی کی لہر سی پیدا ہوئی اور میں پُرسکون انداز میں اپنی نشست سے راہداری میں نکل آیا۔

مگر مجھ سے پہلے نمبر تین باہر آ چکا تھا۔ اسے شاید مقررہ نشست نہیں مل سکی تھی کیونکہ وہ تنومند سفید فام کی عقبی سیٹ سے اٹھا تھا۔

"سب لوگ سکون سے اپنی جگہوں پر بیٹھے رہیں۔" نمبر تین اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں بولا۔ "طیارہ اس وقت میرے ساتھیوں کے رحم و کرم پر ہے اور سب کی سلامتی اسی میں ہے کہ عملہ سمیت ہر فرد ہمارے احکام کی تعمیل کرے!"

اس شخص کی شکستہ انگریزی اور اس کا لہجہ صاف چغلی کھا رہا تھا کہ وہ مشرق بعید کے کسی ملک کا باشندہ تھا مگر اس کے خدوخال کسی طرح بھی اس کی قومیت کی چغلی نہیں کھا رہے تھے۔ اسی وجہ سے میں پہلے اسے نظر انداز کر گیا تھا۔

"میرے بائیں ہاتھ میں خوفناک کیمیاوی بم ہیں" اپنے بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے پیکٹ کو فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا اور کئی عورتوں کے حلق سے خوفزدہ چیخیں نکل گئیں۔ "ان بموں کو پھٹنے کے لیے معمولی سا جھٹکا درکار ہے۔ مجھے... کہ اس طیارے پر مسافروں کے بھیس میں دو اسرائیلی کمانڈوز کے طور پر سفر کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ حماقت... تمام مسافروں کی زندگیوں کو داؤ پر لگانے کی کوشش نہیں..."

"تم بھی اسی کے ساتھی ہو؟" میرے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے گردن گھما کر زہریلے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں طنز اور کینہ کی ایسی جھلک موجود... اسے نظر انداز نہ کر سکا۔ "تم کمانڈو ہو؟" میں نے سرد لہجے میں... اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سانپ جیسی بے رحم آنکھیں میرے ہر عضو کا جائزہ لے رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کیا... کا ارادہ رکھتا تھا۔

"ہاں..... ہاں یہ کمانڈو ہے۔" اچانک ایک ایئر ہوسٹس دہشت زدہ آواز میں چلائی۔ "اس سے ہوشیار رہنا کہیں یہ حماقت ہم سب کی تباہی کا سبب نہ بن جائے!"

"تھینک یو بے بی!" میں نے سرد لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی پلاسٹک کی شیشی کا رخ اس کمانڈو کی طرف گھما کر اس کا سنہرا ڈھکن نیچے دبا دیا جس کے ساتھ ہی زناٹے کے ساتھ ایک ننھی سی سوئی اڑتی ہوئی اس کے شانے میں پیوست ہو گئی۔

کمانڈو کا منہ کھلا اور کھلا ہی رہ گیا۔ اس کے چہرے کے نقوش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو کر رہ گئے۔ بوتا شیم سائنائیڈ میں بجھی ہوئی سوئی نے آناً فاناً اپنا کام دکھا دیا تھا اور کمانڈو بے جان مجسمے کی طرح اپنی نشست پر ہی بیٹھا رہ گیا۔

ایئر ہوسٹس کی چیخ کے ساتھ ہی سارے مسافر گردنیں... میری اور اس کمانڈو کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ہر چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں موت کی دہشت... ان میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ اس کمانڈو کو کیا ہوا ہے۔ انہیں اس کی موت کا علم ہو جاتا تو شاید دہشت سے کئی... بے ہوش ہو جاتے۔

اچانک میری نگاہ نمبر تین کے قریب بیٹھے ہوئے... پر پڑی جو نیچے سر جھکائے تیزی سے جھلی نما ایک غلاف... پر چڑھا رہا تھا۔

"اسے دیکھو!" میں دہاڑا۔ بیک وقت تمام نگاہیں اسی طرف گھوم گئیں۔ نمبر...

کام کے معاملے میں بہت چابکدست تھا۔ اس نے للکارے بغیر اس کا کام تمام کر دیا۔ زہریلی سوئی بدن میں اترتے ہی وہ شخص سر کے بل نشست سے راہداری میں لڑھک آیا۔

نمبر تین آگے بڑھا اور اس نے مرنے والے کی نشست سے کینوس کا ایک تھیلا اٹھا لیا۔ تھیلے کے اندر جھانکتے ہی اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

"یہ بھی یقیناً کمانڈو ہی تھا۔" وہ بولا۔ "اور اپنے چہرے پر ماسک چڑھانے کے بعد سیال گیس کی تھیلی کھولنے والا تھا۔ کیوں بے بی؟" آخری فقرہ اس نے اپنے قریب کھڑی ہوئی اس دہشت زدہ ایئر ہوسٹس کو مخاطب کر کے ادا کیا تھا جو ایک کمانڈو کی نشان دہی کر چکی تھی اور اس وقت اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔

"ہاں" وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بولی۔ "اس تھیلے میں ایک زود اثر بے ہوشی گیس ہے جو آناً فاناً سب کو بے ہوش کر سکتی ہے۔"

"سب بے ہوش ہو جاتے تو طیارے کا کیا بنتا؟"

"کمانڈو خود بھی طیارہ اڑانا جانتے ہیں اور کاک پٹ میں موجود عملہ ہر وقت گیس ماسک پہنے رہتا ہے۔ وہ لوگ گیس سے متاثر نہیں ہوتے۔"

"بڑا اچھوتا خیال ہے۔" نمبر تین تبصرہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ "ہر پرواز پر یہی حفاظتی انتظام کیا جاتا ہے؟"

"ہاں۔ ال ایل کی تمام مسافر بردار پروازوں پر پائلٹ اور اس کا معاون گیس ماسک پہنتا ہے اور کمانڈو دیگر ضروری چیزوں سے لیس ہوتے ہیں۔"

"کیا تم نے اسے مار دیا ہے؟" ایک بوڑھے نے پھنسی پھنسی آواز میں نمبر تین سے سوال کیا۔ اس کی نظریں راہداری میں پڑے ہوئے کمانڈو کے بے جان بدن پر مرکوز تھیں۔

"مارا نہیں، یہ خود مر گیا۔" نمبر تین نے بے رحمانہ ظرافت کے ساتھ کہا۔ "اس کا مرنا ہی بہتر ہوا ورنہ کسی بھی وقت اس کی کوئی حماقت ہمیں طیارے اور مسافروں کے ساتھ خودکشی پر مجبور کر دیتی۔ اب شاید ہمارا سفر سکون سے جاری رہ سکے گا۔"

"خواتین و حضرات!" کیبن میں ایک مرتبہ پھر کپتان کی آواز گونجی جو اس بار پژمردہ تھی۔ "مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے سخت افسوس ہے کہ ہمارا طیارہ اسرائیلی فضا عبور کرنے سے پہلے اغوا کیا جا چکا ہے اور اب ہم لندن کے بجائے برلن کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔"

چند ثانیوں بعد فرسٹ کلاس سے سرمئی اسکرٹ والی خوبرو اور سبک اندام جاپانی لڑکی نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ کامیابی کی مسرت سے دمک رہا تھا۔

نمبر تین نے اسے حالات سے آگاہ کیا اور وہ راہداری میں پڑے ہوئے مردہ کمانڈو کے بدن کو حقارت سے ٹھکراتی ہوئی میری طرف آئی۔

"سب ٹھیک ہے؟" اس نے مجھ سے مسکرا کر سوال کیا۔

"ٹھیک ہے، دو کتے طیارے پر موجود تھے جو مارے گئے۔ اب مسافروں کو نقل و حرکت کی اجازت مل جانا چاہئے!" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے کہا اور پھر مسافروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "جب تک اس طیارے کا عملہ اور سارے مسافر ہمارے ساتھ تعاون کرتے رہیں گے، میں پوری ذمہ داری کے ساتھ سب کو تحفظ اور نرم سلوک کا یقین دلاتی ہوں لیکن ہمیں کسی کی جانب سے شبہ بھی ہوا کہ وہ ہمارے ساتھ فریب کرنا چاہ رہا ہے تو اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا۔ ہم لوگ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر اس مہم پر نکلے ہیں ہم کچھ کر گزرنے یا شجاعت سے موت کو گلے لگانے پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر ہمیں اپنے مقصد میں ناکامی کا اندیشہ ہوا تو فضا میں اس جہاز کے پرزے بکھیر دیئے جائیں گے۔"

انجنوں کی یکساں گونج میں اندر ایک عجیب سنسنی آمیز فضا طاری تھی۔ ہر شخص خاموش تھا۔ اور ساری نگاہیں اس لڑکی پر مرکوز تھیں جو میرے قریب کھڑی زندگی اور موت کے درمیان حائل مختصر سے فاصلے کی وضاحت کر رہی تھی۔

اس کے خاموش ہوتے ہی طیارے کے کیبن میں دہشت میں ڈوبی ہوئی چند سسکاریاں گونج اٹھیں۔

پھر اس لڑکی نے میرے ہاتھوں مرنے والے کمانڈو کے سامان میں سے بے ہوش کرنے والی سیال گیس کی تھیلی نکالی اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے واپس چل دی۔

دو ایئر ہوسٹس فلائٹ کچن میں موجود تھیں۔ اس لڑکی نے انہیں وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اور وہ مشینی انداز میں اکانومی کلاس کی طرف چلی گئیں۔

"یہ تھیلیاں اپنے بریف کیس میں رکھ لینا۔" وہ مجھ سے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "ہو سکتا ہے کسی وقت کام آ ہی جائیں۔"

"میرا بریف کیس وہیں رکھا ہوا ہے۔"

"زہریلی سوئیوں والی شیشی فی الحال جیب میں رکھ لو اور یہ تھیلیاں کسی پیپر بیگ میں ڈال کر لے جاؤ۔ صورتحال پوری طرح ہمارے قابو میں ہے۔"

میں نے وہ تھیلیاں ایئر لائن کے کاغذی تھیلے میں ڈالیں اور واپس ہو لیا۔

طیارے میں سوگوار سا سکوت طاری تھا۔ دو کمزور دل عورتیں طیارے کے اغوا کی خبر سن کر بے ہوش ہو چکی تھیں جنہیں عملے کے افراد ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر مسافروں میں موجود ایک ڈاکٹر نے

اپنی خدمات پیش کیں اور نبر ٹین نے اسے امدادی کارروائی میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔

طیارے میں جملہ بتیس مسافر موجود تھے جن میں دو بچے بھی شامل تھے مگر وہ اتنے کم سن تھے کہ بدلی ہوئی صورتِ حال ان کی شوخیوں پر اثر انداز نہ ہوسکی تھی۔

مسافروں کے چہرے زرد پڑے ہوئے تھے' آنکھوں میں دہشت ناچ رہی تھی کیبن میں دو عدد اسرائیلی گوریلوں کی لاشیں صورتحال کو مزید روح فرسا بنا رہی تھیں۔ زندگی اور موت کے بارے میں ہر مسافر بدترین بے یقینی میں مبتلا تھا۔ لوگ اپنی نشستوں پر پتھر کے مجسموں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں جنبش کرتے ہوئے بھی یہ ڈر ستا رہا تھا کہ کہیں انہیں شورش پسند سمجھ کر ہم دونوں میں سے کوئی ہلاک نہ کردے۔

"میں باتھ روم میں جاسکتی ہوں؟" میں نشستوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ ایک خوبرو لڑکی کی دہشت زدہ آواز نے میرے قدم روک لیے۔

"ناگزیر نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں ہے خاتون' آپ ٹوائلٹ استعمال کرسکتی ہیں۔" میں نے نرم لہجے اور بلند آواز میں کہا۔

میرے الفاظ لوگوں کے لیے آزادی کا پیغام ثابت ہوئے۔ اور بیک وقت تقریباً تمام مسافر اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

طیارے کے عقبی حصے میں ٹوائلٹ کے سامنے بے چین مسافروں کی قطار لگ گئی مگر نظم و ضبط کے لیے مجھے دخل اندازی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس ہولناک صورتِ حال کے پیشِ نظر ہر مسافر اپنے رویے کے بارے میں بہت زیادہ محتاط تھا۔

اس وقت اکانومی کلاس میں نشستوں پر صرف دو بے ہوش مسافر رہ گئے تھے' تیسرا ان کا تیمار دار ڈاکٹر تھا جس کی مدد کے لیے عملے کی دو لڑکیاں بھی موجود تھیں۔

میدان خالی پاکر نبر ٹین میری طرف آگیا۔

"گڈ لک ڈاکٹر آسکر!" اس نے قریب آکر دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشیانہ لہجے میں مجھ سے کہا

"میں تمہارا نام نہیں جانتا!" میں نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ایشی کاوا!" اس نے دھماکہ خیز سگاروں کا پیکٹ اور زہریلی سوئیاں پھینکنے والی شیشی احتیاط سے کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ہماری نگران مس اوتومو ہے اور فرسٹ کلاس میں اس کے ساتھ بنجامن اسٹیوارٹ ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے لیے سگریٹ سلگانے لگا۔

"بنجامن تو یہودی ہوگا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے ایک سگریٹ مجھے دی اور اپنے لیے دوسری ... ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ پھر سگریٹ کا دھواں ... میں بکھیرتے ہوئے بولا۔ "وہ یہودی والدین کی اولاد ہے مگر خود ... مساوات اور آزادی کے نظریہ کا علمبردار ہے۔"

"اس طرف کیا حال ہے؟" میں نے فرسٹ کلاس کی ... کرتے ہوئے سوال کیا۔

"مکمل سکون ہے!"

پھر ٹوائلٹ سے یکے بعد دیگرے مسافروں کی واپسی ... ہوگئی اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔

دونوں بے ہوش مسافر اس وقت تک ہوش میں نہیں ... جاسکے تھے۔ میں نے کیبن میں پھیلے ہوئے مسافروں کو ہدایت ... وہ سب کیبن کے اگلے حصے کی نشستوں پر چلے جائیں ... کئی چہروں پر موت کی تاریکی ناچنے لگی۔ ہوسکتا ہے کہ ان ... خیال گزرا ہو کہ میں تمام مسافروں کو اکٹھا کرکے اجتماعی طور پر ... لگانے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر اس کے باوجود کسی نے چوں ... چند ہی منٹ میں اکانومی کلاس کی عقبی نشستیں خالی ہوگئیں۔

"فلائٹ کریو' اٹنشن پلیز!" اچانک اسپیکر زپر اوتومو ... اور تحکم آمیز آواز ابھری۔ "مسافروں کو قاعدے کے مطابق خورد ... کا سامان فراہم کرو' کوئی چیز ضائع نہ کی جائے۔ مسافروں سے ... ہے کہ کفایت سے کام لیں۔"

اوتومو کی اس ہدایت کے ساتھ ہی مسافروں میں ... پیدا ہوگئی۔ ان کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی کہ طیارہ اغوا ... والے ان کے ساتھ ہمدردانہ طور پر پیش آرہے تھے۔

میزبان لڑکیاں یہ حکم پاتے ہی فلائٹ کچن کی طرف چلی ... بے ہوش مسافر عورتوں کی حالت ڈاکٹر کی کوششوں سے بتدریج ... رہی تھی۔

کچن کے قریب راہداری میں پڑی ہوئی کمانڈو کی لاش آمد و رفت ... میں رکاوٹ پیدا کررہی تھی۔ لہٰذا ایشی کاوا اسے گھسیٹتا ہوا میرے ... لے آیا اور ہم دونوں نے اسے ایک نشست پر ڈال دیا۔ میرے ... مرنے والا اس انداز میں اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا جیسے ...

سریع الاثر زہر دونوں لاشوں پر اپنا رنگ دکھا رہا تھا ... کے جسم کے کھلے ہوئے حصوں کی رنگت نیلی اور سیاہ ہوچکی تھی ... ان کی طرف غور سے دیکھنے پر خوف آنے لگتا تھا۔

کمانڈو کی لاش راستے سے ہٹانے کے بعد ایشی کاوا ... کیس اور اپنا سفری تھیلا بھی پیچھے ہی لے آیا۔ اور ہم دونوں ... کے سروں پر ایک ہی قطار میں بیٹھ گئے۔

اس دوران میں فلائٹ کچن سے لڑکیاں وہسکی اور ...

... لگی تھیں۔ کھانا اس کے بعد کھانے کا دور چلنے والا تھا۔

... ساکی چلے گی؟" ایشی کاوا نے مجھ سے سوال کیا۔

"اپنا کوٹہ محفوظ رکھو۔" میں نے اسے مشورہ دیا کیونکہ میں جانتا ... مخصوص قومی شراب اس پرواز پر نہ مل سکے ... جب تک ہم کب تک طیارے سے باہر نہ جاسکیں' وہ بعد میں کام ... نہ جانے ... فی الحال وہسکی سے کام چلاؤ۔"

... وہ میری پیش بینی کا قائل ہوگیا۔

اس نے ایئر ہوسٹس سے بلیک ڈاگ کی دو بوتلیں منگوائیں ... اپنے ایئر بیگ میں ڈال لی اور دوسری کھول کر میرے ہمراہ ... نوشی میں مصروف ہوگیا۔

تین پیگ کے بعد اس نے دوسری بوتل بھی بند کرکے اپنے بیگ میں ڈال لی۔

اسی وقت کیبن میں لگے ہوئے اسپیکرز آن ہوگئے جن پر اوتومو کی چہری ہوئی آواز سن کر ہر شخص چونک پڑا۔

"واپس چلے جائیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" اوتومو کی غصیلی آواز سنائی دی۔

"مادام' میں ان سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوں۔" طیارے کے کپتان کی نرم آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ بدلی ہوئی صورتحال سے خائف تھا۔

"ال ایل اے ٹو ون ون کالنگ فینٹم فائٹرز' فینٹم فائٹرز!" کپتان کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ فینٹم فائٹرز کے الفاظ ہر شخص کے اعصاب پر بم کے دھماکے کی طرح گرے۔ میرے ساتھ ایشی کاوا بھی اچھل کر اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔

کپتان کی کئی منٹ کی کوششوں کے بعد وائرلیس کے شور میں ایک بھرائی ہوئی آواز اسپیکرز پر سنائی دی۔ "فینٹم رسیونگ' ال ایل اے ٹو ون ون' اوور!"

"میرا طیارہ اغوا کیا جاچکا ہے ......!" کپتان کی آواز سنائی دی جسے اوتومو نے بپھرے ہوئے لہجے میں منقطع کردیا۔

"کتو! فوراً اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ جاؤ' طیارے پر میرے ساتھیوں کا مکمل کنٹرول ہے اگر ہمیں ہراساں کرنے کی کوششیں جاری رہیں تو ہم طیارے کے فضا میں ٹکڑے اڑا دیں گے۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔" ایک مسافر دہشت زدہ ہذیانی انداز میں بے اختیار چیخ پڑا۔ "یہ اسرائیلی فینٹم اس بدنصیب طیارے کا تعاقب کیوں کررہے ہیں؟"

اس کے ساتھ بیشتر مسافروں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ ہر ایک پر موت کا لرزہ طاری تھا اور سب بری طرح چلا رہے تھے۔

"سب لوگ اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔" طیارے پر افراتفری کے آثار دیکھ کر میں دہاڑا۔

میری آواز کا ان پر حیرت ناک اثر ہوا اور ہر مسافر فوراً اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"تم طیارے کو غلط راستے پر لے جارہی ہو۔" فینٹم والے کسی ہواباز کی بھرائی ہوئی آواز اسپیکرز پر سنائی دی۔

"میں اپنا کام خوب جانتی ہوں' تم جہنم میں جاؤ۔"

"آفیسر! خدا کے لیے آپ لوگ لوٹ جائیں۔" اوتومو کے فوراً بعد بوئنگ کے کپتان جان ہنٹ کی آواز ابھری۔ "یہ لوگ پوری طرح لیس ہیں' طیارے کے محافظ کمانڈو مارے جاچکے ہیں۔ ہمارا تعاقب کرکے آپ ہمارے لیے سہولت کی بجائے پریشانیاں پیدا کررہے ہیں۔ اوور!"

"کنٹرول کالنگ بی فائیو سیونز!" اچانک اسپیکرز پر ایک تیسری کمزور آواز سنائی دی۔ اسی کے ساتھ ریڈیائی شور یک بیک بہت بڑھ گیا تھا۔

"بی فائیو سیونز رسیونگ!" فینٹم کے ہواباز کی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی تیسرا فریق ریڈیو سیٹ پر ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"بوئنگ کے کپتان اور اغوا کرنے والی سے تمہاری گفتگو سنی جاچکی ہے' تم اڈے پر واپس آجاؤ' اوور اینڈ آل۔" اجنبی آواز خاموش ہوگئی۔

چند ثانیوں تک اسپیکرز پر خاموشی طاری رہی پھر اوتومو کی پُرسکون آواز ابھری۔ "ٹھیک ہے اب وہ واپس جارہے ہیں۔"

غالباً وہ ریڈار اسکرین پر تعاقب کرنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔

لڑاکا طیاروں کے ذریعے بوئنگ کا تعاقب کرانا ایک احمقانہ سی بات تھی۔ یوں معلوم ہورہا تھا کہ اسرائیلی فضائیہ کے جنگجو کمانڈر نے بوئنگ کے اغوا کی خبر سنتے ہی اضطراری طور پر تعاقب کا حکم دے دیا ہوگا۔ مگر غنیمت یہ تھا کہ ان لوگوں نے بروقت اپنی حماقت محسوس کرلی تھی۔

اس واقعہ نے مسافروں کی طبیعتیں بہت زیادہ مکدر کردیں۔ مسافر اسرائیلی حکام کو برا بھلا کہہ رہے تھے جن کے نزدیک انسانی جانوں کے بجائے طاقت کی برتری زیادہ اہم تھی اور وہ لوگ مسافروں کی جانوں کی پرواہ کیے بغیر بھی طیارے کی بازیابی کی کوشش کرسکتے تھے۔

ان تبصروں میں مسافر اس توقع کا اظہار کررہے تھے کہ برلن کے ہوائی اڈے پر مغربی جرمنی کے حکام کسی اسرائیلی کمانڈو گروپ کو طاقت کے ذریعہ طیارہ چھڑانے کی کسی خون آشام کوشش کی اجازت نہیں دیں گے۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا' پرواز جاری رہی' خوفزدہ مسافر

لکان کے باوجود سونے کی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے البتہ دونوں بچے کھیلتے کھیلتے سو چکے تھے۔

الشتی کاوا اسرائیلی مسافر بردار طیارے پر مامور کمانڈوز کے مختصر تھیلوں پر قبضہ کر چکا تھا جن میں سے چاقو کے علاوہ [illegible] ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئیں جو نہ اس کی سمجھ میں آسکیں نہ ہیں اُن کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکا لہٰذا ایسی تمام اشیاء الشتی کاوا نے اپنے ائیر بیگ میں رکھ لیں تاکہ پہلی فرصت میں کسی ماہر سے ان کا تجزیہ کرا سکے۔

"لڑکو! میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں!" ایک بوڑھی عورت کی آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر ہماری طرف نگراں تھی۔

"چلی آؤ" الشتی کاوا نے کہا۔

بڑھیا نشستوں کا سہارا لیتی ہوئی ہماری طرف آگئی سب مسافر نشستوں سے اچک کر گردنیں گھمائے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میرا نام مسز جون آرلنگٹن ہے" عورت قریب آکر انگریزوں کے روایتی انداز میں بولی۔

"تم سے تعارف حاصل کر کے خوشی ہوئی، بیٹھ جاؤ" میں نے محفوظ خالی پر ایک نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ" وہ طویل سانس لے کر بیٹھتے ہوئے بولی "تم لوگ خاصے شریف النفس معلوم ہوتے ہو"

"ہم اس کارروائی پر مجبور کیے گئے ہیں ورنہ ہمیں اس بدنصیب پرواز کے تمام مسافروں سے اس حد تک ہمدردی ہے جہاں تک ہماری سلامتی متاثر نہ ہوتی ہو" الشتی کاوا سنجیدگی سے بولا۔

"یعنی تم اپنی مرضی سے طیارہ اغوا نہیں کر رہے؟" مسز آرلنگٹن تحیر آمیز سرگوشیانہ لہجے میں بولی "یہ ناقابلِ یقین سی بات ہے"

"اسرائیلی حکام کے وحشیانہ مظالم نے ہمیں اس فعل پر مجبور کیا ہے"

"تم عرب تو معلوم نہیں ہوتے" بوڑھی کے اداس اور پژمردہ چہرے پر دلچسپی کی علامات لحظہ بلحظہ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

"تم ہمارا شجرہ معلوم کرنے آئی ہو؟" الشتی کاوا منہ بنا کر بولا۔

"اوہ..... ہرگز نہیں" مسز آرلنگٹن بوکھلا گئی "دد..... دراصل کل میری لندن میں موجودگی بہت ہی ضروری اور ناگزیر ہے"

"اگر طیارہ اترتے ہی ہمارے مطالبات مان لیے گئے تو تمہیں فوراً نجات مل جائے گی"

"کل میری پینسٹھویں سالگرہ ہے" مسز آرلنگٹن دھیمی آواز میں بولی "میری بیٹی اور داماد نے لندن میں ایک بڑی پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ میرے نہ پہنچنے سے انہیں بڑی مایوسی ہوگی اور ویسے بھی انہیں پیشگی اطلاع دیئے بغیر جا رہی ہوں، مسافروں کی فہرست جاری ہونے سے پہلے انہیں علم بھی نہ ہو سکے گا کہ میں تمہارے یرغمالیوں [illegible] ان بے چاروں کو بہت پریشانی ہو جائے گی"

"میری عمر صرف تیس سال ہے" الشتی کاوا تلخ [illegible] "اور میری بیوی کسی بھی وقت میرے پہلے بچے کی ماں بن [illegible] میں یہاں زندگی اور موت کے دوراہے پر سفر کر رہا ہوں [illegible] سالگرہ میرے پہلے بچے کی ولادت سے زیادہ اہم ہے"

"اگر میرے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا جائے تو بہت [illegible]" مسز آرلنگٹن بحث میں اُلجھنے کے بجائے براہ راست خوشا[illegible]

"تمہیں برلن پر اتار بھی دیا گیا تو سیکورٹی حکام تمہیں [illegible] لیں گے۔ وہ تم سے اغوا کرنے والوں اور یرغمالیوں کے بار[illegible] ساری کہانیاں سنیں گے اور تم اپنی سالگرہ لندن میں [illegible] گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی نشست پر بیٹھ کر حالات کا انتظار [illegible]"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ انہیں تمہارے بارے میں [illegible] بھی نہ بتاؤں گی"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تمہیں رہا نہ کیا گیا تو میں [illegible] سے ایک قیمتی پرفیوم خرید کر تمہیں تحفے میں دوں گا تاکہ تمہیں [illegible] کا لطف آسکے" الشتی کاوا بولا "اب تم جاؤ"

بڑھیا مایوس ہو کر واپس چلی گئی۔

"اس وقت ہم چیکوسلواکیہ کی فضائی حدود عبور کر کے [illegible] میں داخل ہو چکے ہیں" اسپیکرز پر کپتان جان ہنٹ کی آواز [illegible] دی "اب طیارے پر قابض گروپ کی کمانڈر کے حکم کے مطابق [illegible] سلسلہ مسلسل آن رہے گا تاکہ مسافر تازہ ترین صورت حال [illegible] رہیں۔ سب لوگ حفاظتی بند باندھ لیں اور افراتفری اور انتشار کے [illegible] سکون سے کام لیں، کچھ دیر بعد ہم برلن ائیرپورٹ سے ریڈیائی [illegible] قائم کرنے کی پوزیشن میں آجائیں گے"

یہ اطلاع بہت سنسنی خیز تھی، مسافروں نے بلند [illegible] میں سرگوشیاں شروع کر دیں اور اپنی اپنی حفاظتی بیلٹس باندھ [illegible] میری اور الشتی کاوا کی آنکھیں چار ہوئیں اور اس نے [illegible] سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔

"تم کچھ متفکر ہو؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں تو"

"پھر کیا بات ہے؟"

"اب ہماری مہم کا اصل اور مشکل مرحلہ آنے والا [illegible]"

"حالات پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں"

"فضا میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کے دوران [illegible] مسافر بزدل ہو جاتا ہے" وہ آہستہ سے بولا "کیونکہ وہ جانتا [illegible] اس کی کوئی بھی پیش قدمی نہ صرف دوسروں بلکہ خود اس کے [illegible] [illegible] لینڈ کرنے کے بعد صورتِ حال اتنی خطرناک نہیں رہتی [illegible] اُٹھا سکتی ہے۔ [illegible] اور ہمیں ہر مسافر پر کڑی نگرانی رکھنا ہوگی"

"تو کیا اس بات سے خائف ہو؟"

"نہیں!" وہ قدرے چڑ کر بولا "میرے لیے موت بے حقیقت ہے، زندگی سے اتنی محبت ہوتی تو اس وقت تمہارے ساتھ نہ ہوتا۔ بس ذرا بیوی کا خیال آرہا ہے"

"اسے بھول جانے کی کوشش کرو، شاید ساکی تمہاری مدد کر سکے"

اس نے ایئر بیگ میں سے ساکی کی نئی بوتل نکال کر کھولی اور منہ سے لگا کر کئی گھونٹ اپنے معدے میں انڈیل لیے۔

جان ہنٹ وائرلیس پر مسلسل کسی جرمن اسٹیشن سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اسپیکرز پر ریڈیائی شور اور اس کے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

کم و بیش پینتالیس منٹ بعد اسپیکرز پر کرخت جرمن لہجہ سنائی دیا۔ اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ فیصلہ کن لمحات تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔

میں نے اسرائیل کی خون آشام سرزمین سے رہائی کا جو خواب دیکھا تھا وہ بڑی حد تک شرمندۂ تعبیر ہو چکا تھا۔ مگر اب دیکھنا یہ تھا کہ مکمل آزادی کب نصیب ہوگی۔

[illegible] جرمن [illegible] نہیں جانتے [illegible] مہربانی انگریزی میں جواب دیا جائے" طیارے کے چنگھاڑتے ہوئے دیوہیکل انجنوں کی دھیمی گونج میں جان ہنٹ کی آواز سنائی دی۔

"برلن ائیرپورٹ کنٹرول ٹاور تم سے مخاطب ہے، تم کون ہو؟" طیارے نے کسی دیو پیکر فضائی عفریت کی طرح انگڑائی لی اور تیزی سے داہنی طرف جھکتا چلا گیا۔

"میں ال ایل کے بوئنگ ... سے بول رہی ہوں جسے ہم نے تل ابیب اور لندن کے درمیان سے اغوا کیا ہے۔ ہم برلن ائیرپورٹ پر اترنا چاہتے ہیں براہ مہربانی ہماری مدد کی جائے"

دوسری جانب چند ثانیوں کے لیے سناٹا چھا گیا پھر آپریٹر کی آواز سنائی دی "اعلیٰ حکام کی ہدایت کے بغیر اجازت نہیں مل سکے گی"

اس وقت تک طیارہ بہت نیچے پہنچ چکا تھا اور روشنیوں سے جگمگاتا ہوا شہر نظر آرہا تھا۔

"فوراً اجازت لو۔ ہم زیادہ دیر تک فضا میں نہیں ٹھہر سکتے"

"تمہارا طیارہ دیکھ لیا گیا ہے تم ائیرپورٹ کی حدود میں داخل ہو چکے ہو اجازت ملنے تک اس علاقے سے ستاسی درجے مشرق میں چالیس میٹر [illegible]"

اور مجھے کھڑکی میں سے برلن ائیرپورٹ کی روشنی میں نہائی [illegible] عمارت اور روشن رن وے صاف نظر آنے لگے جن پر جا بجا کئی طیارے بڑے بڑے پرندوں کی طرح ٹھہرے ہوئے تھے۔

"بکواس بند کرو" اوتوموچلائی "ہم نیچے آرہے ہیں ہماری رہنمائی کرو"

"یہ جہاز برلن ائیرپورٹ پر نہیں اتر سکتا خاتون!" اچانک اسپیکر پر آپریٹر کی بجائے ایک اور بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"اگر ہماری رہنمائی نہ کی گئی تو ہم کریش لینڈنگ کریں گے"

اوتوموکی آواز غیظ آلود تھی "جہاز پر میرے ساتھیوں کے علاوہ بتیس مسافر اور عملے کے چھ افراد موجود ہیں۔ ان سب کی جانوں کی ذمہ داری اس وقت تم پر ہے فوراً اپنے کسی اعلیٰ افسر کو ریڈیو روم میں بلاؤ"

"میں اس ائیرپورٹ کا ڈائریکٹر جنرل بول رہا ہوں خاتون!" وہی آواز پھر سنائی دی "ہمیں پہلے سے طیارے کے اغوا اور اس کی ممکنہ منزل کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی۔ برلن ائیرپورٹ پر کریش لینڈنگ کی کوشش خودکشی اور بربادی پر منتج ہوگی اور ہم پوری قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کریں گے"

کئی کمزور دل مسافروں پر دہشت کے باعث ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ لوگ بلند آوازوں میں آفتوں اور مصائب سے نجات کی دعائیں مانگنے لگے۔

طیارہ ائیرپورٹ کی جگمگاتی عمارت سے گزر کر دائرے کی صورت میں پھر واپس لوٹ رہا تھا اور اس کی بلندی بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی

"یہ بربادی تمہیں بھی لے ڈوبے گی ہوا بند حسن کی ٹنکیوں سے طیارہ

ٹکرا دیں گے۔" اوتوموکا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔

اوتوموکے اِس اعلان کے ساتھ ہی طیارے میں قیامت برپا ہوگئی لوگ بے اختیار دھاڑیں مارنے لگے کئی مسافر نشستیں چھوڑ کر فرسٹ کلاس کی طرف لپکے مگر ایشی کاوا کی قہر میں ڈوبی للکار نے انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

طیارہ ایئرپورٹ پر منڈلا رہا تھا کہ اچانک ہر طرف تاریکی سی پھیل گئی۔ رن وے کے اطراف میں لگی ہوئی روشنیوں سے لے کر عمارات تک تاریکی میں ڈوب گئیں۔ فضا میں صرف وائرلیس انٹینا کی بلندی ظاہر کرنے والی سرخ وارننگ لائٹ روشن تھی۔

"سرچ لائٹ روشن کرو۔" اوتومو نے شاید کپتان کو حکم دیا کیونکہ فوراً ہی جہاز کے نچلے حصے سے تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار ایئرپورٹ پر پھیل گیا اِس متحرک روشنی میں رن وے پر ہر طرف بیشمار گاڑیاں یلغار کرتی نظر آئیں جنہیں بے ترتیبی کے ساتھ یوں کھڑا کیا جا رہا تھا کہ رن وے کو استعمال کرنا ناممکن ہو جائے۔

"ہم تشدد کی کارروائیوں کے لیے کسی کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے خاتون!" برلن ایئرپورٹ کے ڈائریکٹر جنرل کی آواز سنائی دی "تمہیں قرب و جوار میں اپنے ہمدرد بھی مل جائیں گے لہٰذا اپنا ایندھن اور وقت برباد نہ کرو۔"

"طیارے کا رخ اسپین کی طرف موڑ لو!" اوتومو کی پرسکون آواز سنائی دی۔ شاید اس نے برلن ایئرپورٹ سے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

بوئنگ کے نچلے حصے سے خارج ہونے والا روشنی کا مخروطی مینار غائب ہوگیا اور طیارہ تیزی سے اوپر اٹھنے لگا۔

طیارے کے اغوا کی اِس واردات میں براہِ راست ملوث ہونے کے بعد مجھ پر اس نفسیاتی جرم کے بہت سے پہلو واضح ہو رہے تھے۔

اِس نوعیت کے بین الاقوامی جرم کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہوئے رازداری کے اصول پر سختی سے کاربند رہنا ہوتا ہے اور محض اسی احتیاط کے پیشِ نظر کسی ہمدرد ملک سے اغوا شدہ طیارہ اتارنے کی پیشگی اجازت لینا ممکن نہیں ہوتا۔ اغوا کے بعد کی تمام کارروائیاں سراسر قیاس کی بنا پر عمل میں آتی ہیں اور پوری مہم میں اغوا کنندگان کے لیڈر کی ذہنی صلاحیتیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

اوتومو نے شاید طیارہ اتارنے کے لیے برلن کا انتخاب اِس لیے کیا تھا کہ اسے وہاں ہمدردانہ سلوک کی امید تھی پھر متوقع سمجھوتے کے بعد رہائی کی بھی قوی امید رہی ہوگی مگر پوری کڑیوں میں کہیں بے ربطی ہونے کے باعث وہ دھونس سے کام لینے میں بھی کامیاب نہ ہوسکی۔

مگر یہ بات اوتومو کی ذہنی برتری کی دلیل تھی کہ برلن ایئرپورٹ کے ڈائریکٹر جنرل سے تلخ کلامی کے بعد اس نے محض اپنی انا کی تسکین کے لیے طیارہ برلن میں اتارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کا رخ دوسرے ملک کی طرف پھیر دیا۔

میں ایشی کاوا کے ہمراہ اکانومی کلاس میں متعین تھا۔ میری خواہش شروع ہی سے فرسٹ کلاس اور کاک پٹ کے بارے میں تھی جہاں واقعات کی نبض یقیناً تیز تھی اور میں وہاں ہونے والی فیصلہ کن کارروائیوں میں شریک ہونا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی اِس خواہش کا اظہار ایشی کاوا سے کیا تو وہ بولا "اوتومو کی سربراہی میں یہ اندازِ فکر نہیں چلتا وہ حکم عدولی سے بے رحمی سے پیش آتی ہے تم جہاں متعین کیے گئے ہو وہیں اس کا انتظار کرو۔"

"اسے بلانا بھی مشکل ہے؟"

"موقع ملتے ہی وہ خود آئے گی۔" ایشی کاوا بولا "ویسے میں ایک مرتبہ پھر ہماری بریفنگ ضروری ہوگئی ہے۔"

اور وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔ شاید اسے اوتومو کے ساتھ کام کا کافی موقع ملا تھا کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہی اوتومو وہاں آپہنچی۔ ہم دونوں مسافروں سے الگ تھلگ اکانومی کلاس کے آخر میں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"جہاز میں ایندھن ختم ہو رہا ہے۔" اس نے آتے ہی سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہم اسپین......؟"

"خاموشی سے پوری بات سنو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "اسپین میں میڈرڈ ہماری منزل ہے مگر وہاں تک سفر جاری رکھنا ممکن ہے ہم فرانس میں رک کر ایندھن لیں گے۔"

"اگر وہاں بھی برلن والا سلوک ہوا؟" ایشی کاوا نے پوچھا۔

"اِس وقت یورپ کے تمام ہوائی اڈوں کو طیارے کے اغوا کا علم ہو چکا ہے۔ برلن والے جانتے تھے کہ ہم تل ابیب سے کتنا ایندھن لے کر روانہ ہوئے ہیں اسی لیے انہوں نے سخت رویہ اختیار کیا پیرس والے ایندھن دینے سے انکار نہ کرسکیں گے۔"

"ہمارے مطالبات کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دو ماہ قبل تل ابیب میں خفیہ پولیس نے فرانس کی سفارت سے چند اہم فوجی راز چرانے کے الزام میں ہمارے تین آدمیوں کو گرفتار کیا تھا ان میں ایک تشدد کی تاب نہ لا کر مر چکا ہے اور بقیہ دو کو ہم رہا کرانا چاہتے ہیں۔"

"تو کیا اسرائیلی یہ مطالبہ مان لیں گے؟"

"نہ مانا تو ہر بارہ گھنٹے بعد طیارے کے عملے کا ایک فرد مار دیا جائے گا اور بہتر گھنٹے گزرنے کے بعد طیارے کو مسافروں سمیت تباہ کر دیا جائے گا۔" اس نے یہ فقرے اتنی لاپروائی سے ادا کیے کہ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا۔ وہ حد سے زیادہ نڈر اور بے خوف معلوم ہوتی تھی۔

"مطالبہ تسلیم کیے جانے کی صورت میں ہماری رہائی کیسے ہوگی؟"

"ہسپانوی حکام اپنے معاہدے کا احترام کریں گے ورنہ ریڈ بریگیڈ کے ساتھی ان کے شہروں میں بربادی پھیلا دیں گے وہ یہ بات جانتے ہیں۔"

"اگر میں فرسٹ کلاس میں بنجامن سے اپنی جگہ کا تبادلہ کر لوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟" میں نے قدرے سکوت کے بعد پوچھا۔

"جو جہاں ہے وہیں رہے تو بہتر ہے اور تم لوگ ایسے مسافروں کو نظر میں رکھو جو پہلی فرصت میں رہائی کے مستحق ہیں۔"

"میں اس کے خلاف ہوں۔" ایشی کاوا بولا "رہا ہونے والے ہمارے بے چہرہ ہتھیار کرنے میں حکام کے معاون ہوسکتے ہیں۔"

"میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مسافر طبی امداد میں کمی کے باعث جہاز میں مر جائے۔ ہمیں رائے عامہ پر بھی یہ اثر ڈالنا ہے کہ ہم دہشت گرد ہونے کے باوجود بنیادی اخلاقی اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔" اس نے کہا۔ اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

طیارے کا سفر مزید کسی ہنگامے کے بغیر جاری رہا اور جب پیرس کا اورلی ایئرپورٹ قریب آیا تو صبح طلوع ہونے والی تھی۔

پیرس والے اوتومو کے اندازے کے مطابق بہت خلیق اور مہربان ثابت ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں ہوائی اڈے پر اترنے کی اجازت مل گئی۔

طیارہ بلندی سے نیچے آیا تو پیرس برسات میں نہا رہا تھا۔ تیز بارش کے باعث شہر کی روشنیاں دھندلائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

طیارہ طویل چکر کاٹ کر نیچے ہوتا چلا گیا اور آخر کار ایک خفیف جھٹکے کے ساتھ اس کے پہیوں نے اورلی ایئرپورٹ کی زمین چھو لی۔

طیارے کو بریک لگانے کے لیے جونہی انجن الٹے چلائے گئے پورا طیارہ کسی پتے کی طرح لرزنے لگا مگر رفتار سست ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت ختم ہوتی چلی گئی۔

آخر کار ہمارا طیارہ گیلے رن وے پر رینگتا ہوا ایئرپورٹ کے ایک دور افتادہ حصے میں جا کھڑا ہوا جہاں رن وے کی مدھم روشنیوں کے سوا کوئی نمایاں روشنی نہیں تھی۔

طیارے کے انجن بند ہونے کے بعد اس علاقے میں رن وے کی روشنیاں بھی بجھا دی گئیں اور ہر طرف گھور تاریکی پھیل گئی۔

میں راہداری میں کھڑا کھڑکی سے باہر ایئرپورٹ کی روشن عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا جو تیز بارش کے پس منظر میں نہایت خوابناک معلوم ہو رہی تھیں۔

چند منٹ بعد عمارات کی طرف سے کئی دیوہیکل گاڑیوں پر مشتمل کارواں ہمارے طیارے کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔

قریب آنے پر پتہ چلا کہ کیروسین کے ٹینکر اور ڈیزل جنریٹر وغیرہ کے ساتھ کئی وزنی فوجی ٹرک بھی آئے تھے جن کے رکتے ہی بے شمار فوجی نیچے کود کر بارش کی پروا کیے بغیر طیارے کے چاروں طرف پھیلتے چلے گئے۔

طیارے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تمام مسافر سانس روکے کسی ایسے معجزے کے منتظر تھے جو انہیں بے یقینی کی اس جانگسل کشمکش سے نجات دلا سکے اور ایشی کاوا اپنے ہتھیاروں سے لیس کسی عیار چیتے کی طرح ایک ایک فرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

طیارے سے ایئر ہینڈلنگ یونٹ، ڈیزل جنریٹر، ویکیوم کلیننگ یونٹ اور فیولنگ یونٹ وغیرہ جوڑے جا رہے تھے کہ فرسٹ کلاس سے کسی نے آسکر کہہ کر مجھے پکارا۔

میں اپنے ہتھیار اٹھائے پھرتی سے اُدھر پہنچا تو ایک سرخ و سفید تنومند نوجوان راہداری میں کھڑا نظر آیا۔ وہی بنجامن اسٹیوارٹ تھا اس کے علاوہ وہاں سات افراد موجود تھے۔

"مادام بلا رہی ہیں!" بنجامن نے گردن سے کاک پٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں آگے بڑھا ہی تھا کہ اوتومو خود باہر آگئی۔

"فرسٹ کلاس میں دو دل کے مریض ہیں اگر تمہاری طرف کوئی مریض ہو تو اسے ادھر لے آؤ۔ بچوں کو بھی لیتے آنا، اس طرف سیڑھی لگائی جا رہی ہے۔"

"دروازہ کھولا جا رہا ہے تو کیوں نہ دونوں لاشیں بھی نکال دی جائیں۔" میں نے کہا۔

"کسی مسافر کی مدد سے پہلے لاشیں ادھر لے آؤ۔ تم دروازے کے سامنے موجود رہو گے۔ اگر کوئی مشکوک شخص اندر آنے کی کوشش کرے تو بے دریغ اسے ٹھکانے لگا دینا۔ میں نے سفید یونیفارم میں دو میل نرسوں کو اندر آنے کی اجازت دی ہے۔"

میں سر ہلا کر واپس لوٹ گیا۔

مرنے والے یہودی کمانڈو خاصے وزنی ثابت ہوئے۔ میرے حکم پر دو تنومند مسافروں نے ان کی اکڑی ہوئی نیلی لاشیں مقررہ جگہ پر فرش پر ڈال دیں۔

اِس کے بعد میں دونوں بچوں سمیت چھ مسافروں کو فرسٹ کلاس میں لے گیا۔ ایشی کاوا کی سفارش پر میں نے مسز جون آرلنگٹن کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اِس مہربانی پر فرطِ مسرت سے اس بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اندر کی تیاریاں مکمل ہونے کے بعد اوتومو مسافروں کے درمیان ایسی جگہ پر بیٹھ گئی جہاں سے وہ پوری کارروائی کی نگرانی کرسکے۔ میں نے دروازے کے مقابل مورچہ سنبھال لیا۔ بنجامن بھی ایک طرف کھڑا ہوگیا اور اوتومو کے اشارے پر ایک ایئر ہوسٹس نے فرسٹ کلاس کا دروازہ اوپر اٹھا دیا۔

ٹرک پر نصب سیڑھی دروازے کے قریب ہی موجود تھی اور اس کے اوپری پائیدان پر دو سفید پوش کھڑے ہوئے بارش میں بھیگ رہے تھے۔

چند سیکنڈ میں سیڑھی طیارے سے آلگی اور وہ دونوں میل نرس ڈرتے

جھکتے اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھ خالی تھے اور لباس میں بھی بظاہر کسی ہتھیار کی موجودگی کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندر آ کر وہ لاشوں کے قریب رک گئے۔

"مریض بعد میں اتریں گے پہلے یہ لاشیں لے جاؤ۔" ایئر ہوسٹس نے ان سے کہا۔

انہوں نے ادب سے سر کو خم کر دیا اور اسٹریچر لیتے واپس چلے گئے۔

سیڑھی کے پاس چھ ایمبولنس گاڑیاں تیار کھڑی ہوئی تھیں جن کی چھتوں پر تیز سرخ روشنی دائرے کی صورت میں گردش کر رہی تھی۔

دونوں لاشیں نیچے جاتے ہی ان میں سے ایک ایمبولنس تیز بارش میں سائرن بجاتی عمارت کی طرف ہولی۔

پھر دو بچوں سمیت آٹھوں مسافر اتار دیئے گئے۔ دل کے مریضوں کو میل نرس باری باری اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔

یہ کارروائی پوری ہوتے ہی سیڑھی ہٹا کر طیارے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

طیارے کے پاس فرنچ ریڈ کراس کے کچھ اعلیٰ عہدے دار بھی موجود تھے جو قطعی غیر جانبدارانہ طور پر پھنسے ہوئے مسافروں سے ملنا اور ان کے عزیزوں کے لیے پیغامات وصول کرنا چاہتے تھے مگر ادتومو نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔

بوئنگ کم و بیش چار گھنٹے تک اورلی ایئرپورٹ پر رکا رہا۔ اس دوران میں ایندھن بھرنے کے ساتھ ہی کل پرزوں کی دیکھ بھال بھی کی گئی۔ آخر کار گراؤنڈ اسٹاف کی طرف سے طیارے کو پرواز جاری رکھنے کی کلیرنس مل گئی۔

باہر دن طلوع ہو چکا تھا مگر بارش اسی زور شور سے جاری تھی مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے ایئرپورٹ کی روشنیاں بدستور جل رہی تھیں۔

جب ادتومو نے کنٹرول ٹاور کو روانگی کے ارادے سے آگاہ کیا تو فوجیوں کا حفاظتی حصار ہٹا لیا گیا۔ وہ لوگ جیپوں اور ٹرکوں میں سوار ہو کر طیارے سے اتنی دور چلے گئے تھے کہ انجن کی زد میں نہ آ سکیں۔

دیگر مشینیں اور اسباب پہلے ہی ہٹایا جا چکا تھا۔

آخر کار بوئنگ کے خوابیدہ انجن یکے بعد دیگرے چلا دیئے گئے اور چند منٹ بعد طیارے نے رن وے کے وسط میں رینگنا شروع کر دیا۔

پختہ رن وے پر تیزی سے دوڑتے ہوئے طیارے کے ڈھانچے میں کوئی غیر معمولی آواز پیدا نہ ہوئی جو اس بات کی غماز تھی کہ اورلی ایئرپورٹ تل ابیب کے ہوائی مستقر سے بہت بہتر تھا۔

طیارہ زمین چھوڑ کر فضا میں بلند ہو گیا تو ادتومو کاک پٹ سے باہر آ گئی اس وقت پہلی بار اس نے چاروں کو ایک جگہ جمع کیا اور میڈرڈ ایئرپورٹ پر پیش آنے والے متوقع واقعات کی منصوبہ بندی سمجھانے لگی۔

پیرس سے میڈرڈ تک ڈیڑھ گھنٹے کا فضائی سفر غیر معمولی خاموشی کے ساتھ طے ہوا۔ یہ خاموشی کچھ ایسی ہی معلوم ہو رہی تھی جو خوفناک طوفانوں سے پہلے ماحول پر محیط ہو جاتی ہے۔

میڈرڈ ایئرپورٹ کا عملہ ادتومو کی توقع کے مطابق تعاون [illegible] اس وقت وہاں سے دس منٹ کے اندر اندر [illegible] لہٰذا بوئنگ کا ہوا باز طیارے کو شہر سے دور خوبصورت پہاڑی وادیوں [illegible] لے گیا۔

مقررہ وقت گزرنے کے بعد کنٹرول ٹاور سے کلیئرنس [illegible] لینڈنگ پوزیشن میں آ گیا اور اس بار بھی طیارے کو ایئرپورٹ کے [illegible] حصے میں ہی روکا گیا۔

طیارہ رکنے سے پہلے ایئرپورٹ سے گاڑیوں کا ایک [illegible] چل پڑا تھا جو انجن بند ہونے تک طیارے کے قریب آ گیا اور پھر [illegible] سیٹ پر رابطہ قائم کر لیا گیا۔

رابطہ قائم ہونے پر پتہ چلا کہ اسپین کی وزارتِ داخلہ اور خارجہ [illegible] حکام اسرائیلی سفیر سمیت باہر موجود تھے۔

"سب لوگوں کی اطلاع کے لیے میں اعلان کرتی ہوں کہ [illegible] نے ریڈ بریگیڈ کے ان دو بدنصیب ارکان کی رہائی کے لیے اغوا کیا ہے [illegible] میں نظارت کے ہولناک عقوبت کدے میں سسک سسک کر زندگی کے [illegible] گزار رہے ہیں۔" ادتومو نے ریڈیو سیٹ پر کہا۔ "ان کو دو اور سوچ لو [illegible] پر بارہ گھنٹے گزرنے سے قبل ہمارے پاس آ جانا چاہیے ورنہ نتائج کی ذمہ داری اسرائیلی حکام پر رہو گی۔"

"ہم اس موضوع پر تم سے بالمشافہ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

"کسی اسرائیلی افسر کو طیارے پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں [illegible]"

"مگر میں اسپین کی وزارتِ خارجہ سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"طیارے پر صرف دو آدمیوں کو آنے کی اجازت ملے گی۔"

"اس فراخدلی کا شکریہ، میں تو تنہا آنے کو بھی تیار تھا۔"

"میں منتظر ہوں۔"

چند منٹ بعد فرسٹ کلاس کا دروازہ ہٹا دیا گیا۔ میں اپنے [illegible] کو کپڑے میں لپیٹ کر دروازے کے سامنے گیا تو طیارے سے کافی دور [illegible] پولیس کے جوانوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ اس حصار میں دس بارہ [illegible] بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اور پولیس والوں کے پیچھے اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کا ایک ہجوم تھا جو طیارے کا دروازہ کھلنے کے بعد شاید [illegible] عدسوں کی مدد سے تصاویر بنانے میں مصروف تھے۔

سیڑھی لگنے کے بعد سوٹوں میں ملبوس دو افراد اپنے خالی ہاتھ اوپر اٹھائے طیارے میں آ گئے۔

"ہم بالکل غیر مسلح ہیں ہماری تلاشی لی جا سکتی ہے۔" طیارے [illegible] ہوتے ہی ان میں سے ایک نے کہا۔

ادتومو کے اشارے پر میں نے ان کی تفصیلی جامہ تلاشی لی پھر [illegible]

وقت کے مسافروں اور عملے کے تمام افراد کو اکانومی کلاس میں بھیج دیا گیا۔ ایشی کاوا اور بنجامن اسٹیوارٹ کو ان لوگوں کی نگرانی پر چھوڑ دیا گیا ایشی کاوا اکانومی کلاس کے آخری حصے میں تھا اور بنجامن کٹے ہوئے دروازے کے سامنے ہو گیا تھا۔

اس انتظام کے بعد ادتومو ان دونوں کو فرسٹ کلاس میں لے گئی۔ اوساکا میں ان کے ہمراہ ہو لیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ طیارے کے اغوا کے اس سنگین واقعہ میں میری ضرورت پیش آ گئی ہے کیونکہ اب مسافروں اور عملے کی سلامتی کی ذمہ داری مجھ پر ہے مگر ہم اس ناخوشگوار صورتحال کو اپنی بساط کے مطابق سلجھانے کے لیے تیار ہیں۔" آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ وہ راستہ شروع ہی سے خاموش تھا۔

"اگر ہمارا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو ہم تمہارے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بنیں گے۔" ادتومو نے اگلے لہجے میں کہا۔

"تمہارے مطالبے کا تعلق اسرائیلی حکومت اور اس کی پالیسی سے ہے جس میں ہمارا قطعی کوئی دخل نہیں ہے۔"

"تم ہمارا پیغام انہیں پہنچا سکتے ہو؟"

"اسرائیلی سفیر باہر موجود ہے۔" اس نے سات گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مطالبہ سننے کے بعد اس کا ردِ عمل منفی اور بہت سخت تھا۔"

"یہ معاملہ سفیر کی سطح پر طے نہیں ہو گا۔ اس کے لیے تل ابیب والوں کی رائے لینا ہو گی۔"

"تل ابیب سے رابطہ فوری قائم کر لیا گیا ہے اور وہاں شاید تھوڑی دیر میں کابینہ کا ہنگامی اجلاس شروع ہونے والا ہے جس کے بعد کوئی بات معلوم ہو سکے گی مگر اس سے قطع نظر میں اسپینی حکومت کی جانب سے ایک فراخدلانہ پیشکش لے کر آیا ہوں۔"

"ہم اپنے مطالبے پر کسی سمجھوتے پر تیار نہیں۔" ادتومو نے جذبات سے عاری سرد لہجے میں دو ٹوک جواب دیا اور میں اس لڑکی کی قوتِ ارادی پر حیران رہ گیا۔ وہ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ صورتحال سے نمٹنے کو تیار تھی۔

"ہم تم لوگوں کو منہ مانگی رقم دے کر تمہیں تمہارے پسندیدہ ملک میں بحفاظت پہنچانے کا ذمہ لیتے ہیں۔" اس نے ادتومو کے انکار کے باوجود اپنی بات مکمل کی۔

"ہمیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی آزادی عزیز ہے۔"

"اور اگر اسرائیلیوں نے تمہارے مطالبات تسلیم نہ کیے؟"

"تو یہ طیارہ ہم سب سمیت راکھ کا ڈھیر بن جائے گا۔" ادتومو نے [illegible] لہجے میں کہا۔

ان دونوں کے چہرے پسینوں میں تر ہونے لگے۔ "اپنے دو ساتھیوں کی خاطر اتنی انسانی جانوں سے نہیں کھیل سکو گی۔ تمہاری یہ کارروائی انسانیت سوز کہلائے گی۔"

"ہمیں اخلاقیات پر لیکچر نہ دو۔" ادتومو ترش لہجے میں بولی "اسرائیلی حکمرانوں کو ہم سے زیادہ ان تعلیمات کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوتا کہ تم خود اسرائیلی سفیر سے مذاکرات کرتیں۔"

"وہ طیارے کے قریب بھی نہ پھٹک سکے گا" ادتومو نے حقارت سے کہا

"ہو سکتا ہے کہ تمہارے اس توہین آمیز رویے سے اسرائیلیوں پر ضد سوار ہو جائے۔" اس نے گہرا سانس لے کر الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"ہم صورتِ حال سے نمٹنا جانتے ہیں!"

"کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم مسافروں کو رہا کر دو؟" چند ثانیوں کی بوجھل خاموشی کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

"آٹھ مسافروں کو ہم اورلی ایئرپورٹ پر چھوڑ چکے ہیں اور بقیہ لوگوں کا حشر ہمارے ساتھ ہو گا۔" ادتومو نے جواب دیا۔

"مگر ان میں سے بیشتر اسرائیل کے شہری نہیں ہیں۔"

"اگر ہمیں اسرائیل کے شہریوں کو قید کرنا ہوتا تو تل ابیب کی کسی رہائشی عمارت کے مکینوں کو یرغمال بناتے۔" ادتومو بولی "اس طیارے پر دوسرے شہریوں کی موجودگی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ایسے مسافروں کی حکومتیں بھی اسرائیل پر ہمارے مطالبات کی منظوری کے لیے دباؤ ڈال سکیں گی۔"

"ہمیں مسافروں سے ملنے کی اجازت ہے؟"

"بالکل!" ادتومو نے میری توقع کے بالکل برعکس جواب دیا۔ "اسی کے ساتھ میں تمہیں طیارے کے مسافروں کی فہرست تیار کرنے کی اجازت بھی دیتی ہوں۔"

پھر ہم چاروں اکانومی کلاس میں آ گئے۔

ادتومو ان دونوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور انہیں کسی مسافر سے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

تمام مسافر اپنے غیر یقینی مستقبل کی [illegible] بیشتر مسافر ان دونوں پر نظریں [illegible] کے مطالبات پورے کر کے تمام مسافروں کو جلد از جلد اس ناگہانی عذاب سے نجات دلائی جائے۔

مسافروں کی فہرست تیار کی گئی تو پتہ چلا کہ طیارے پر موجود [illegible] چوبیس مسافروں میں صرف سات اسرائیلی [illegible] طانوی، دو یونانی، ایک فرنچ اور ایک جرمن تھا۔

فہرست لے کر وہ دونوں واپس چلے گئے۔

طیارے کے ساتھ صفائی کا [illegible] مشینیں [illegible] کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی لہٰذا جہاز کے اندر کا ماحول بالکل بدبودار ہو چکا تھا البتہ حفاظتی حصار کے [illegible] کے علاوہ وہاں فوجیوں کی [illegible] تھی اور کچھ لوگ تیزی کے ساتھ نارنجی [illegible] کا

بندوبست کر رہے تھے تاکہ رات کے وقت وہاں اندھیرے میں غلط فہمی کے باعث کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔

اد تو مو نے طیارے کے دونوں دروازے کھلوا دیئے تھے تاکہ مسافروں کو تازہ ہوا ملتی رہے۔ فلائٹ کچن میں موجود خورد و نوش کا سامان بھی مسافروں کو دیا جا رہا تھا۔

تقریباً تین گھنٹے بعد وہ شخص واپس آتا نظر آیا جس نے پہلی بار اد تو مو سے بات چیت کی تھی۔

"اسرائیلی حکام ان دونوں کو رہا کرنے کے لیے تیار ہیں۔" اس نے آتے ہی بتایا۔

"وہ کب تک یہاں پہنچ جائیں گے؟"

"تم لوگوں کے طیارہ چھوڑنے کے بعد وہ انہیں رہا کریں گے۔ نکودا اور موچی موتو کی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ طویل فضائی سفر کر سکیں۔"

"وہ مکار ہیں۔" اد تو مو غصیلی آواز میں بولی "ان دونوں کو بارہ گھنٹے کے اندر اندر اس طیارے پر موجود ہونا چاہیئے ورنہ پہلی لاش دروازے سے باہر لڑھکا دی جائے گی۔"

"یہ معاہدہ سرکاری سطح پر طے پایا ہے....."

"ہم انہیں اسرائیل سے باہر آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔" اد تو مو اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولی "ہم ان یہودی بھیڑیوں کو خوب جانتے ہیں نکودا اور موچی موتو رہائی کے بعد اگر ٹریفک کے کسی اتفاقی حادثے میں کسی ٹرک کے نیچے کچلے گئے تو کیا ہوگا؟"

"ہم نے اس زاویے سے صورت حال پر غور نہیں کیا تھا۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"وقت تیزی سے گزر رہا ہے ہم مہلت میں اضافہ نہیں کریں گے۔" اد تو مو نے تادیبی لہجے میں کہا۔

"وقت کی قیمت کا مجھے خود اندازہ ہے مادام۔" وہ نرم لہجے میں بولا "تمہارا طیارہ اترنے کے بعد یہ ہوائی اڈہ ہر قسم کے ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ ہم یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔"

وہ دوبارہ واپس لوٹ گیا۔

"یہ بہت اچھا ہوا کہ ایئرپورٹ بند کیا جا چکا ہے۔" اس کے چلے جانے کے بعد میں نے علیحدگی میں اد تو مو پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ مسکرا کر بولی "مجھے ڈر تھا کہ یہاں خفیہ طور پر اسرائیلی چھاپہ مار دستہ نہ اتار دیا جائے۔ وہ بالکل جنونی قوم ہے۔ حملے کی ناکامی کی صورت میں ہونے والے خون خرابے کی پروا کیے بغیر وہ ایسی حماقت کر سکتے ہیں۔"

"مقامی حکومت ایسی کارروائی کی اجازت نہیں دے گی جس کے نتیجے میں اس کی سرزمین پر بلاوجہ خون خرابہ ہو۔"

"ان کتوں کے لیے اجازت ضروری نہیں۔ ہمیں بہت ..." اد تو مو بولی "یہ بھی ممکن ہے کہ موچی موتو اور نکودا کو وہ ... پر لائیں اور اسٹریچر لانے والے تربیت یافتہ اسرائیلی گوریلے ..."

یہ سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں رینگنے لگیں ... اندیشہ درست ثابت ہو جاتا تو اس طیارے میں قیامت کی خونریزی ...

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ ایلچی کئی ... پیغامات ... نے ہر بار ایک نئی پیشکش کی مگر اد تو مو اپنی جگہ سے ...

اس وقت مختلف ممالک میں ریڈ بریگیڈ ... ہمدرد ... اسپینی افسر نے بتایا کہ اسرائیل کے علاوہ دیگر ممالک تمام قیدیوں کو ... سلامتی کی خاطر رہا کرنے کے لیے تیار تھے مگر اد تو مو نے اس پیشکش کو ... دس گھنٹے اسی طرح گزر گئے تو اسپینی افسر پر ہیجانی کیفیت ... ہونے لگی۔

"ہمیں تھوڑی سی مہلت درکار ہے مادام۔"

"دس گھنٹے گزر چکے ہیں اور دو گھنٹے بعد طیارے کا ایک فرد ... کر دیا جائے گا۔"

"ہم تمام سفارتی ذرائع حرکت میں لا چکے ہیں ہمیں امید ہے ... سے پہلے ہماری ان کوششوں کے مثبت نتائج سامنے آ جائیں گے۔"

"اسرائیلی حکومت نے کیا موقف اختیار کیا ہے؟"

"وہ دہشت گردی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں مگر ہم ان کے دوستوں اور حلیفوں کا دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

"میں تمہاری حکومت کے ان افسروں سے براہ راست بات چاہتی ہوں جو یہ سلسلہ نمٹانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔"

"وہ بڑی خوشی سے طیارے پر آئیں گے۔"

"یہ ملاقات طیارے سے باہر رن وے پر ہوگی۔"

"انہیں اس میں بھی عذر نہ ہوگا۔" وہ اس پیشکش پر بہت خوش ... "مگر اس جھڑپ میں اسرائیلی سفارت خانے کا کوئی رکن شامل ... ہوگا۔ ان میں سے چار افراد میرے آدمیوں کی نظر میں ہیں۔"

"اس بات کی پوری احتیاط کی جائے گی۔"

"اور اگر کوئی خلاف ورزی ہوئی تو کوئی بھی ... ترین ..."

وہ اد تو مو کو پوری یقین دہانی کرا کے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد طیارے کے اطراف سے لوگوں کو ہٹایا جانے لگا ... دستوں کے اراکین گاڑیوں میں سوار ہو کر کافی دور چلے گئے اور رن وے ... کل سات افراد کھڑے رہ گئے۔

ان سانوں نے میدان صاف ہونے کے بعد منظر کے ... گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر اپنی جائیں ہتھیلیوں پر ... ہیئت کی ... اد تو مو بغور ان تمام اقدامات کا جائزہ لے رہی تھی ان لوگوں ...

... سوئیوں والی شیشی لیے سیڑھیوں سے اترنے لگی۔

... دونوں فریقوں کی ملاقات ہوئی جو ... سیڑھیوں کے قریب ... پھر وہ لوگ تیز تیز قدموں سے واپس چلے گئے۔

... اد تو مو نے طیارے پر واپس آ کر ہم لوگوں کو اطلاع دی کہ اسپینی حکام کو ... گھنٹے کا وقت دے دیا گیا تھا۔ اس سے ملاقات کرنے آنے والوں میں ... اسپین پارلیمنٹ بھی شامل تھے اور اد تو مو کو ان کی نیک نیتی ... یقین ہو گیا تھا۔

... مسافروں کی حالت وقت گزرنے کے ساتھ ابتر ہوتی جا رہی تھی انہیں ... پر سوار ہوئے چوبیس گھنٹے پورے ہونے والے تھے۔

ایشی کاوا اور بنجامن بھی بے خوابی کے باعث تھکے ہوئے تھے ... ہر بات پر کسی طرح بھڑک رہے تھے مگر غنیمت یہ تھا کہ انہوں نے ... مزید خونریزی نہیں کی۔

... دو بجے خوشخبری ملی کہ تل ابیب دونوں قیدیوں کو رہا کرنے ... یہ خبر سن کر مسافروں کے بے رونق چہروں پر زندگی کی لہر دوڑ ... گئی اور ان کی آنکھوں میں موت کی زردی کی جگہ زندگی کی چمک نظر آنے لگی۔

اگلی صبح آٹھ بجے کے قریب میڈرڈ ایئرپورٹ کی فضا میں کسی طیارے کے انجنوں کی چنگھاڑ سنائی دی اور اد تو مو دروازے سے باہر پائیدان پر پہنچ گئی۔

"اسرائیل کا ایک فوجی طیارہ ایئرپورٹ پر منڈلا رہا ہے۔" اد تو مو نے ... سے چلا کر کہا۔ اور مسافر بے چینی کے ساتھ کھڑکیوں سے جھانکنے لگے ان کی امید بھری بے چین نگاہیں آسمان کی وسعتوں میں اپنی نجات کے پیغامبر کو تلاش کر رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسرائیلی طیارہ میڈرڈ ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا اور رن وے پر رینگتا ہوا ہمارے مقبوضہ طیارے سے تقریباً ایک فرلانگ دور ٹھہر گیا۔ اس طیارے سے سیڑھی لگائی گئی تو اد تو مو نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگائی۔ چند منٹ بعد طیارے کے دروازے میں چند ہیولے نظر آئے تو اد تو مو کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا اور وہ مسرت سے بھری ہوئی آواز میں بولی "خدا کا شکر ہے کہ وہ دونوں اپنے پیروں پر چل رہے ہیں۔"

اسرائیلی طیارے سے اتارے جانے کے بعد چند منٹ وہ دونوں اسپینی حکام کی بھیڑ میں چھپے رہے۔ اس وقت ایئرپورٹ سے نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں کو غائب کر دیا گیا تھا۔

آخر کار اس طرف سے ریڈ کراس کی ایک کھلی ہوئی جیپ ہمیں اپنے طیارے کی طرف آتی ہوئی نظر آئی جس میں ڈرائیور کے علاوہ فقط دو نفوس تھے موچی موتو اور نکودا کی جسمانی حالت بہت ابتر تھی۔ ان کے چہرے ... بے رونق تھے اور جسموں پر جا بجا پٹیاں بندھی ہوئی تھیں مگر وہ طیارے پر آ کر گرمجوشی کے ساتھ اد تو مو سے بغل گیر ہوئے۔

طیارے کے سافر قریب سے ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین تھے مگر بنجامن اور ایشی کاوا نے کسی کو اپنی جگہ سے نہ اٹھنے دیا اور مسل اد تو مو ان دونوں بدنصیبوں کو فرسٹ کلاس کیبن میں لے گئی جہاں اس وقت سناٹا پڑا ہوا تھا۔

موچی موتو اور نکودا کی آمد کے دس منٹ بعد اسپینی وزارتِ خارجہ کا افسر طیارے پر آ گیا۔

"مسافروں کی رہائی میں کتنی دیر ہے؟" اس نے آتے ہی بے چینی کے ساتھ پوچھا۔

"ایک مسافر بس بھیج دو تو مسافروں کا انخلا شروع ہو جائے گا اور ان کا اسباب بعد میں ملے گا۔" اد تو مو نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"ہم اپنا سفر اسی طیارے پر جاری رکھیں گے۔"

"مگر تم لوگوں کے لیے ایک طیارہ تیار کھڑا ہوا ہے۔"

"اس کا شکریہ ہم اسی طیارے میں پرواز کو ترجیح دیں گے۔"

"اور تمہاری منزل؟"

"وہ پرواز کے بعد پائلٹ کو بتا دی جائے گی۔"

اس کے جانے کے بعد ایک خالی بس طیارے کی سیڑھی کے قریب آ لگی اور مسافر اپنے دستی سامان سمیت یکے بعد دیگرے اترنے لگے۔ بس کو طیارے کی طرف آتا دیکھ کر مسافروں میں بدنظمی اور ہڑبونگ پیدا ہوئی تھی مگر وہ جلد ہی قابو میں آ گئی۔

آخری مسافر کے انخلا کے بعد اد تو مو نے دروازے میں جا کر فضا میں ہاتھ لہرایا اور اندر لوٹ آئی۔

سیڑھی ہٹائے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا گیا اور طیارہ کا کپتان اپنے معاون سمیت اپنے کیبن میں چلا گیا۔

ایشی کاوا نے اپنا اسلحہ بنجامن کے حوالے کر دیا اور فرسٹ کلاس کی ایک آرام دہ نشست پر دراز ہو کر ایک ایئر ہوسٹس سے اپنا سر اور بدن دبوانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد طیارے کے انجن اسٹارٹ کر دیئے گئے اور کنٹرول سے کلیئرنس ملنے کے بعد طیارہ رن وے پر سرکنے لگا۔

میڈرڈ ایئرپورٹ سے ٹیک آف بہت سبک رہا۔ اد تو مو شروع ہی سے پائلٹ کے کیبن میں تھی باقی لوگ نشستوں پر براجمان تھے بنجامن موچی موتو اور نکودا سے ان کی لرزہ خیز کہانیاں سن رہا تھا جنہوں نے نطار کے قید خانے میں جنم لیا تھا۔

"اب ہم جنیوا کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔" اد تو مو پائلٹ کے کیبن سے باہر آتے ہوئے بشاش لہجے میں بولی۔

"وہاں کے حکام ہم سے تعرض نہیں کریں گے؟" نکودا نے نڈھال

لہجے میں سوال کیا۔

"تم ذہن پر زور نہ دو، اس کا بندوبست کیا جا چکا ہوگا۔" اوتومونے اس کے قریب ایک خالی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سوئٹزرلینڈ پہنچنے کے بعد میرا کیا مصرف ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"تم ایشی کاوا کے ساتھ فرانس جاؤ گے۔" اوتومو مجھ کو بتانے لگی۔

"سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی سرحد پر ویزا باآسانی مل جاتا ہے۔ فرانس میں داخل ہونے کے بعد لی مونونامی قصبے کے قریب ایشی کاوا گاڑی سے اتر جائے گا اور تم نیس جاؤ گے وہاں تمہیں نب ہاسٹ نامی ایک شخص سے ملنا ہے۔ جو ہوٹل ڈی ایس کا منیجر ہے وہ پاسپورٹ دیکھ کر تمہاری رہنمائی کرے گا۔ وہ تمہارے لیے صرف رابطے کا کام کرے گا۔ اور اس کے لیے ذرا سا کریڈٹ تم ہی پر رہے گا۔"

پھر وہ ایشی کاوا اور بنجامن کو ان کا پروگرام سمجھانے لگی۔ موچی موتو اور ملکو وا شاید اسی کے ساتھ رہتے کیونکہ جسمانی طور پر ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ آزادانہ طور پر کوئی طویل سفر اختیار کر سکے۔

جینوا پہنچنے پر ال ایل کے جہاز سے فوراً ہی لینڈنگ کلیرنس مل گئی۔

اوتومونے لینڈ کرنے سے قبل کنٹرول ٹاور کو پوری صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ لینڈنگ کے بعد طیارے کے پاس ایک مائکرو بس پہنچا دی جائے جس میں وہ طیارے کے عملے کو یرغمال کے طور پر لے جائے گی اور مناسب آزادی کا یقین ہونے پر عملے کے افراد کو رہا کر دیا جائے گا۔ لینڈنگ کے بعد کنٹرول سے پیغام آیا کہ سوئس حکام پوری حفاظت کے ساتھ اغوا کنندگان کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کے لیے تیار ہیں اس کے ساتھ استدعا کی گئی کہ یرغمال عملے کو مزید ہلکان نہ کیا جائے۔

اوتومونے ان کے تعاون پر شکریہ ضرور ادا کیا مگر وہ آخری مرحلے پر اپنی آزادی کے سلسلے میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھی۔

آخرکار ہم لوگ طیارے سے باہر آئے تو ایک مائیکرو بس ڈرائیور سمیت وہاں موجود تھی۔

بارہ افراد کا قافلہ خطرناک ہتھیاروں سمیت بس میں سوار ہوا اور آرام دہ بس تیزی کے ساتھ ایک طرف روانہ ہو گئی۔

ایئرپورٹ سے نکلنے میں کوئی قباحت پیش نہیں آئی۔ غالباً سارے عملے کو بازپرس نہ کرنے کی سخت ترین ہدایات دی جا چکی تھیں۔

ایئرپورٹ کے قریب ایک ویران سڑک آتے ہی اوتومونے بس رکوائی۔ پھر ال ایل کے عملے کے چھ افراد اور بس ڈرائیور کو ایشی کاوا نے کسی حیرت انگیز ترکیب سے آناً فاناً... بے ہوش کر دیا۔ اوتومونے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور بس دوبارہ آگے روانہ ہو گئی۔

یرغمال بنائے جانے والے اسرائیلی چھاپہ ماروں کے قبضے سے بے ہوش کرنے والی سیال گیس کی جو تھیلیاں برآمد ہوئی تھیں وہ اوتومونے مجھ سے واپس لے لیں۔ دھماکہ خیز سگارس کے پیکٹ بھی ایک جگہ جمع کر لیے گئے۔ البتہ زہریلی سوئیوں والی شیشیاں کسی سے بھی واپس نہ لی گئیں۔

پھر اوتومونے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھے اور ایشی کاوا کو ویران مقام پر اتار دیا اور مائیکرو بس تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میری زندگی کا ایک ہولناک اور لرزہ خیز باب مکمل ہو چکا تھا۔ ایک اسرائیلی طیارے کے کامیاب اغوا میں ملوث ہونے کے بعد میں پورے طور پر صاف بچ نکلا تھا۔

اسرائیل کی خون آشام سرزمین بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ میرے لیے اسرائیل کی نکاسی کا تصور بھی لرزہ خیز تھا لیکن تقدیر مجھ کو ناقابلِ یقین حالات اور واقعات میں گھرا ہونے کے باوجود اسرائیل کے کھلے زنداں سے نکل آیا تھا بلکہ میرے لیے تمام راستے کھل گئی تھیں۔

میری سیتا جو مجھ سے بچھڑ کر نگر نگر کی خاک چھانتی پھر رہی تھی جسے تلاش کرنے پر متعدد فلسطینی مامور تھے میری جستجو کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بار اسے پا لینے کے بعد میں ہندوستان کے شہر خرابات آباد کا رخ کرتا جہاں راجہ ہوٹل کے ایک تنگ کمرے کی الماری میں سامنے رکھے ہوئے میں چیونگم کے پیچھے نادر و نایاب پارس پتھر پوشیدہ تھا۔

سیتا اور پارس کو دوبارہ پا لینے کے بعد میں ایک مکمل زندگی گزار سکتا تھا۔ میں برسوں سے اپنے ٹھکانے کی آرزو لیے بدوش مجرم کی طرح قانون اور معاشرے سے بھاگتا پھر رہا تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری امیدیں پوری ہونے کا وقت بہت قریب آ چکا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" مجھے خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر ایشی کاوا نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"گزرے ہوئے واقعات ایک بھیانک خواب معلوم ہوتے ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"خوابوں سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آؤ ورنہ ہم دھر لیے جائیں گے۔"

"میرے لیے یہ ملک اجنبی ہے، تم جو کہو گے میں بلا چوں و چرا مان جاؤں گا۔"

"میں دو بار سوئٹزرلینڈ آ چکا ہوں مگر اس بار حالات بہت مختلف ہیں پہلے تو کسی طرح اس علاقے سے جلد از جلد دور نکلنے کی فکر کرنا چاہیے۔"

پھر ہم دونوں سڑک کے کنارے سے درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہمیں پولٹری کے سامان سے لدا ہوا ایک ٹرک نظر آیا اور ہم دونوں درختوں کی آڑ سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔

ٹرک ڈرائیور خاصا شریف آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں اس علاقے میں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا مگر ایشی کاوا نے اسے بتایا کہ سیاحت کے شوق میں ہم دونوں ایئرپورٹ سے شہر پہنچنے کے لیے پیدل چل پڑے تھے مگر سمت شاید غلط ہو گئی تھی۔

وہ سادہ لوح دیہاتی اس کہانی پر دل کھول کر ہنسا اور اس نے بتایا کہ ہم نے شہر جانے کے لیے غلط راستے کا ہی انتخاب کیا تھا۔ بہرصورت اس نے ہمیں کسی نزدیکی بس اسٹاپ تک پہنچانے کی فراخدلانہ پیشکش کی جو ہم نے قبول کر لی۔

"ہمارے پاس مقامی کرنسی بھی نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد ٹرک کے انجن کے شور میں ایشی کاوا نے مسکین سی آواز میں کہا۔

"کون سی کرنسی ہے تمہارے پاس؟"

"امریکی ڈالرز۔"

"لاؤ میں بدل دیتا ہوں۔"

اور یوں ہمارا ایک اور اہم مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

تقریباً سوا گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرک ڈرائیور نے ایک موڑ پر ٹرک روک دیا اور سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولا "سیدھے چلے جاؤ سامنے ہی ایک بس اسٹینڈ ہے جہاں سے ہر پندرہ منٹ بعد ریلوے اسٹیشن کے لیے بس چلتی ہے مجھے وہاں ایک اندرونی قصبے میں لے جانا ہے ورنہ میں خود تمہیں وہاں تک پہنچا دیتا۔"

ہم دونوں ٹرک سے اتر کر اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل دیے۔

"تمہارے پاس سوئس کرنسی نہیں تھی؟" میدان صاف دیکھتے ہی میں نے سوال کیا۔

"کرنسی تو تھی مگر کم تھی!" وہ مسکرا کر بولا۔

"کیا اغوا کا سارا ڈرامہ منصوبے کے مطابق طے پایا ہے؟"

"ہاں!"

"مگر برلن والوں کا رویہ؟"

"اگر ہم برلن میں اترنے میں کامیاب ہو جاتے تو موچی موتو اور ملکو وا کی رہائی کے بعد ڈنمارک کا رخ کرتے۔ زیادہ امکان اسی کا تھا اور میرے پاس اب بھی ڈنمارک کی کافی کرنسی موجود ہے۔ اسپین ہمارے منصوبے میں دوسرے نمبر پر تھا اور یہاں سے بہترین راستہ سوئٹزرلینڈ ہو سکتا تھا۔"

"مگر برلن والے اس قدر سخت کیوں ثابت ہوئے؟"

"یہ منصوبہ بندی کرنے والے سوچیں گے تم اس بارے میں اپنا دماغ خراب نہ کرو۔" وہ میرا شانہ تھپتھپا کر بولا۔

"اب تمہارا کیا منصوبہ ہے؟"

"سب سے پہلے ہمیں اپنا لباس اور حلیہ بدلنا ہے۔" وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم تو ڈاڑھی صاف کر کے اور چشمہ پھینک کر بالکل بدل جاؤ گے، مجھے شاید چشمہ لگانا پڑ جائے گا۔"

"تو کیا یہ کام جینوا میں ہوگا؟"

"ریلوے اسٹیشن کا مسافر خانہ کس کام آئے گا؟"

بارونق بس اسٹاپ قریب آ چکا تھا لہٰذا میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور ہم نے سیاحوں کی طرح گرد و پیش پر ہونقوں کی طرح نظریں ڈالتے ہوئے تبادلۂ خیال کرنے لگے۔

کھیتوں اور سرسبز باغات پر مشتمل وہ مضافاتی علاقہ بہت پرسکون تھا۔ سرسبز قطعات کے درمیان سے بہت سی نیم پختہ اور کچی سڑکیں آ کر بڑی سڑک سے مل رہی تھیں۔ مگر ان پر ٹریفک بالکل مفقود تھا۔

بس اسٹینڈ پر ایک سائبان کے نیچے چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر بے فکرے مسافر لاپروایانہ انداز میں سستا رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت بہت انہماک سے اخبار پڑھنے میں مصروف تھی۔ سائبان کے برابر میں ایک پک اپ کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے عقبی حصے میں مشروبات وغیرہ سجے ہوئے تھے اور ساتھ ہی کافی ذخیرہ کا بندوبست بھی تھا۔

"کافی پیو گے؟" ایشی کاوا نے آہستہ سے سوال کیا۔

"مجھے دہشت ہو رہی ہے!" میں نے جواب دیا۔ "ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں سے بات کر کے ہم کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں۔"

"یہ یاد رکھنا کہ ہم لوگ انگریزی اور فرنچ سے نابلد ہیں۔" اس نے مجھے ہدایت کی اور بے باکانہ انداز میں انتظار گاہ میں داخل ہو گیا۔

ہماری آہٹ پا کر سیٹوں پر اونگھتے ہوئے کئی مسافر چونکے اور ہمارا سرسری جائزہ لینے کے بعد ہماری طرف سے لاتعلق نظر آنے لگے البتہ بوڑھی عورت نے اخبار گود میں رکھ لیا تھا اور نہایت دلچسپی کے ساتھ بغور ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

ایشی کاوا نے اسی عورت کے قریب خالی پڑی ہوئی ایک کرسی سنبھال لی۔ میں نے بھی خاموشی کے ساتھ اس کی تقلید کی۔

جب کئی منٹ گزرنے کے باوجود اس عورت کی دلچسپی ختم نہ ہوئی تو ایشی کاوا نے بھی نہایت بے حیائی کے ساتھ اس بڑھیا کو گھورنا شروع کر دیا۔

ایشی کاوا کی یہ حرکت بہت زود اثر ثابت ہوئی اور بڑھیا نے گھبرا کر دوبارہ اخبار اٹھا لیا اور اسے اتنا بلند کر لیا کہ اس کا چہرہ اخبار کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کے بعد بڑھیا نے کئی مرتبہ اخبار نیچا کر کے کنکھیوں سے ہم دونوں کا جائزہ لیا مگر ہمیں بدستور اپنی طرف متوجہ پا کر اتنی تیزی سے اخبار اوپر کیا جیسے اس کے ہاتھوں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔

ایشی کاوا کی جارحانہ نظروں نے بڑھیا کو اس قدر بوکھلا دیا کہ وہ زیادہ دیر وہاں بیٹھی نہ رہ سکی۔ اور اٹھ کر پک اپ کی طرف چلی گئی۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ بڑھیا نے نیچے لہجے میں اس سے کچھ کہنا شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ وہ دونوں بار بار ہماری طرف بھی دیکھتے جا رہے تھے۔

اسی اثناء میں سڑک پر دھول اڑاتی ہوئی بس نظر آئی اور اس مختصر بس اسٹاپ پر اونگھتے ہوئے ماحول میں قدرے سرگرمی پیدا ہو گئی۔

ہم دونوں بس میں سوار ہوتے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بڑھیا نے بس میں سوار ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور دوبارہ انتظار گاہ میں جا بیٹھی سگریٹ نوش نوجوان لاپروایانہ انداز میں کچے راستے پر اتر کر کھیتوں کی ... ہو لیا تھا۔

اس بس میں گنتی کے چند مسافر موجود تھے۔ ڈرائیور نے نیچے ... مشروبات فروخت کرنے والے سے چند لمحوں تک باتیں کیں ... کوکنگ فروخت کرنے کے بعد دوبارہ اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

بس کا سفر پرسکون رہا۔ چھوٹی چھوٹی مضافاتی آبادیاں ... ہوئے سوئزرلینڈ کی دیہاتی زندگی کے حسین مناظر نظر آتے رہے ... گھڑ سوار چرواہے اپنے بڑے بڑے گلوں کو سرسبز چراگاہوں میں ... تھے اور کہیں کہیں کھیتوں سے مشینی شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ...

آخر کار بس مضافاتی علاقوں سے گزر کر شہری حدود میں داخل ... اور ایک جگہ ہم دونوں بس سے اتر گئے۔

جنیوا نہایت صاف ستھرا شہر تھا۔ بلند عمارتوں کے باوجود ... میں گھٹن نام کو نہ تھی۔ ٹریفک میں افراتفری مفقود تھی۔ پیدل چلنے ... کے ہجوم میں بھی عجیب سی طمانیت موجود تھی۔ مشینی عہد کے ... بھاگ دوڑ اور گھبراہٹ ابھی اس شہر کے باسیوں پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔

ہم دونوں نے بازار سے تھوڑی سی خریداری کی اور پھر ریلوے اسٹیشن کی طرف ہو لئے۔ جو اس علاقے سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ریلوے اسٹیشن بھی خلافِ توقع پر ہجوم نہیں تھا۔ ہم دونوں ... اُدھر ٹہلتے ہوئے انتظار گاہ میں داخل ہوئے اور تھکے ہوئے انداز ... نرم صوفوں پر بیٹھ گئے کیونکہ اس وقت وہاں چند مسافر پہلے ... اگر ان کے سامنے ہم غسل خانوں سے حلیے بدل کر برآمد ہوتے تو ... ہماری طرف متوجہ ہو جاتے۔

دس منٹ بعد انتظار گاہ میں کسی گاڑی کی آمد کا اعلان سنائی ... اور سب لوگ وہاں سے باہر چلے گئے۔

میدان صاف پاتے ہی ہم دونوں غسل خانوں میں جا گھسے ... میں نے نہایت بے دردی کے ساتھ اپنی خوبصورت داڑھی صاف ... کر دی۔ پھر بالوں پر ایک زود اثر لوشن لگایا جس کے اثر سے چند ... میں میرے سیاہ بالوں کی رنگت سنہری ہو گئی۔ اپنی عینک توڑ کر میں ... تھیلے میں اڑس لی۔

مختصر سے غسل سے فارغ ہو کر میں نے لباس تبدیل کیا اور ... نکل آیا۔

باہر آتے ہی میری نگاہ اس گنجے پر پڑی جو انتظار گاہ میں ... سکون سے ایک صوفے میں دھنسا اپنی کھوپڑی سہلا رہا تھا ... میں پہلی نظر میں اسے بالکل نہ پہچان سکا۔ وہ ہلکے سرمئی رنگ ... سوٹ اور سرخ پھولدار ٹائی میں ملبوس تھا۔ اس کا سوٹ جیسے ... فلیٹ ہیٹ گود میں رکھا ہوا تھا اور آنکھوں پر شفاف شیشوں ... عینک نظر آ رہی تھی۔

جب مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ نمودار ہوئی تو ذہن نے اسے پہچان لیا اور اس کے قریب ہی جا بیٹھا۔

"تم کو تو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ تمہیں تو شاید یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ تمہارا پاسپورٹ اصلی ہے۔"

"داڑھی نہ رکھنے کی وجہ سے مجھے اپنے سر کے بالوں کی قربانی دینا پڑی۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تمہاری شخصیت بھی بدل کر رہ گئی ہے مگر تمہارا چہرہ چغلی کھا رہا ہے کہ تم نے اپنی داڑھی حال ہی میں صاف کرائی ہے۔"

"نہیں؟" میرا ہاتھ بے اختیار اپنے چہرے پر چلا گیا۔

"داڑھی کے نیچے سے طلوع ہونے والی جلد کی رنگت قدرے صاف ہے، فکر نہ کرو، وہ بھی جلد ہی سانولی پڑ جائے گی۔"

پھر ہم دونوں باہر آ گئے۔ انتظار گاہ چھوڑنے سے قبل میں نے اپنا ٹوٹا ہوا چشمہ کوڑے دان میں پھینک دیا تھا۔

باہر دھوپ میں آتے ہی ایشی کاوا کے چشمے کے پولارائڈ شیشے تاریک ہو گئے اور اس کی شخصیت خاصی پُراسرار نظر آنے لگی۔

"تمہارے ہاتھوں پر کیا ہے؟" چلتے چلتے اچانک اس نے سوال کیا۔

"اوہ، مصنوعی نشاناتِ انگشت والے باریک دستانے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "انہیں تو میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

"انہیں پھینک ہی دو تو بہتر ہو گا۔"

"کھانے کے لئے ہوٹل میں چلو تو یہ کام بھی کر لوں گا۔"

پھر ہم دونوں ایک ریستوران میں جا گھسے۔ میں نے سب سے پہلے باتھ روم میں جا کر جعلی نما دستانوں کو نالی میں بہا دیا۔

"سوئزرلینڈ میں ہمارا داخلہ غیر قانونی ہے۔!" کھانے کے دوران میں نے ایشی کاوا پر اپنی تشویش کا اظہار کر ہی ڈالا۔

"یہاں سیاحوں کی بھاری تعداد کی وجہ سے داخلے کے قوانین بہت نرم ہیں۔"

"مگر ہمارے پاس تو شاید یہاں کا ویزا بھی نہ ہو گا۔"

"منصوبہ بندی کرنے والے پاگل نہیں تھے۔ تمہارے پاسپورٹ پر سوئزرلینڈ، اسپین، فرانس، ڈنمارک اور مشرقی جرمنی کا ویزا موجود ہونا چاہئے۔"

"مگر اوتومو نے کہا تھا کہ فرانس کا ویزا سرحد پر ہی بآسانی مل جائیگا۔"

"میرے پاسپورٹ پر تو فرانس کا ویزا بھی لگا ہوا ہے۔ تمہارے لئے شاید کسی دشواری کے باعث ویزا نہ لیا جا سکا۔"

"مگر کسی بھی ملک میں داخلے کے وقت پاسپورٹ پر بھی اندراجات کئے جاتے ہیں، ہمارے پاس ان کی عدم موجودگی کا کیا جواز ہو گا؟"

"میں نے کہا تو ہے کہ سوئز حکام اس معاملے میں بہت نرمی سے کام لیتے ہیں کیونکہ ان کے ملک کو سیاحوں کی آمد سے بہت بھاری آمدنی ہوتی ہے۔!"

"فرانس جانے کا کیا پروگرام ہے؟"

"ٹرین سے جائیں گے۔!"

"بس سے جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تم چاہو تو بس پکڑ لیں گے۔ یہاں سے بہت آرام دہ ٹورسٹ کوچ ملے گی۔"

میرا ذہن مستقبل کے بارے میں بہت سے غیر یقینی خطرات میں گھرا ہوا تھا جب کہ ایشی کاوا جنیوا میں ایک رات بسر کرنا چاہتا تھا اس ضمن میں اس نے مجھے بہت سی پُر نشاط کہانیاں بھی سنائیں۔ مگر میں وہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

آخر کار مقامی وقت کے مطابق تین بجے ہم بس اسٹینڈ سے فرانس جانے والی ایک نہایت آرام دہ بس میں سوار ہو گئے۔

سوئزرلینڈ کا چپہ چپہ سبزے سے لدا ہوا تھا۔ اور راستے میں جا بجا قدرت کے حسین شاہکار بکھرے ہوئے تھے۔ ایشی کاوا مجھے جنیوا کی جھیل کے کنارے گزاری ہوئی چند چاندنی راتوں کے رومان انگیز قصے سنا رہا تھا۔ جب ایملی کی نیلی آنکھوں کی خوابناک گہرائیوں کے سامنے اسے جھیل پایاب نظر آنے لگی تھی اور اس نے سبک اندام ایملی سے سچے دل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی سوئزرلینڈ آیا اس سے ضرور ملے گا مگر اس بار میری وجہ سے وہ اپنا عہد پورا نہ کر سکا۔

سرِ شام ہم نے سوئزرلینڈ کی سرحد عبور کر لی جہاں بس کے تمام مسافروں کے پاسپورٹ سرسری طور پر دیکھے گئے اور ملک سے اخراج کی مہر ثبت کرنے کے بعد ہی منزل کی جانب بڑھنے کی اجازت مل گئی۔

خوبصورت سڑک پر سفر کرتے ہوئے بس فرانسیسی چوکی پر جا رکی اور بس کے بیشتر مسافر نیچے جا کر ویزا فارم بھرنے لگے۔ میں بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہو گیا اور حیرت ناک طور پر بمشکل بیس منٹ میں تیرہ افراد کے پاسپورٹ تفریحی ویزا لگنے کے بعد لوٹا دیئے گئے۔

سوئزرلینڈ اور فرانس کی سرحدوں پر پھیلے ہوئے حسین پہاڑی سلسلوں کے درمیان وہ خوابناک سفر جاری رہا۔ اس دوران میں ایشی کاوا اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر میرا ذہن آزاد فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔

اب میرا اور ایشی کاوا کا مختصر سا ساتھ رہ گیا تھا۔ ہم فرانس کی سرحد میں سفر کر رہے تھے اور ایشی کاوا کو لی سوتو نامی قصبے پر مجھ سے جدا ہو جانا تھا جب کہ میری منزل نیس تھی جہاں مجھے ہوٹل ڈی ریجی کے منیجر ڈاکٹر آسکر بنینھم کے روپ میں ملنا تھا۔ مجھے ہوٹل ڈی ریجی کے منیجر سے ملنے کے بعد ہی اپنے مستقبل کا اندازہ ہو سکتا تھا۔

پھر جب وہ بس ایک جگہ رکی تو ایشی کاوا کھڑا ہو گیا۔ بس ایک دوراہے پر کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں سے داہنی طرف جانے والا راستہ

سینٹ کلاڈ نامی شہر کی نشاندہی کر رہا تھا۔ جب کہ بس کا سفر سیدھی سڑک پر جاری رہتا۔

"الوداع میرے دوست!" ایشی کاولنے جھک کر میری پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور تیزی سے بس سے اتر گیا۔

میں فرطِ جذبات سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔

ایشی کاول کے ساتھ میری رفاقت بہت مختصر تھی لیکن بدترین لمحوں کے ساتھی انسان کے دل و دماغ پر اپنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

بس آگے بڑھ گئی۔ ایشی کاول کا سایہ دھندلکے میں معدوم ہو گیا اور میں نے اپنا سر پشتگاہ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

قریئے آتے رہے اور گزرتے رہے، مسافر چڑھتے رہے اور اترتے رہے مگر بس کا سفر جاری رہا۔ رات کے نو بجے بس بیلے گارڈ پہنچی اور ڈرائیور نے وہاں ایک گھنٹے رکنے کا اعلان کیا تاکہ مسافر رات کے کھانے سے نمٹ لیں۔

بس اسٹاپ کے قریب ہی کئی اچھے ہوٹل موجود تھے جہاں موسیقی کے سُروں پر سبک اندام نسوانی ہیولے تھرک رہے تھے اور آنے والوں کی اشتہا پر تازیانے برسا رہے تھے۔ میں اداسی کے عالم میں ایک دور افتادہ گوشے میں جا بیٹھا۔

اس وقت بار بار میرا دل بھاری ہوا جا رہا تھا۔ میرے وجود پر تشکر اور بے یقینی کے جذبوں کی ایسی شدید یلغار ہو رہی تھی کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی تنہا گوشے میں منہ چھپا کر دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہوں۔

کھانے سے فراغت کے بعد پھر سفر شروع ہو گیا۔ بسیار خور مسافروں نے تھوڑی ہی دیر میں اونگھنا شروع کر دیا۔ مگر میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑے درختوں کے ہیولوں کو تیزی سے پیچھے بھاگتے دیکھتا رہا۔

اگلی صبح موتا ترز پر بس کا سفر ختم ہو گیا۔ اس مقام سے ٹل سینٹ برنارڈ پاس کے راستے سوئٹزرلینڈ جانے والی بس بھی تیار تھی۔ سوئٹزرلینڈ جانے کے لئے وہاں سے اس درّے کا راستہ کافی مختصر تھا۔

موتا ترز سے میں اسی روز ریل کے ذریعے ولارڈ بونوت نامی شہر جا پہنچا کیونکہ وہاں سے جہاز کے ذریعے نیس کا سفر اختیار کیا جا سکتا تھا۔ اور میں وہیں پہنچ کر اپنی شدید تکان سے نجات حاصل کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

اسرائیل سے نکلے مجھے دو روز ہو گئے تھے اور یہ تمام عرصہ انتہائی سنسنی خیز جدوجہد میں صرف ہوا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی آرام نہ مل سکا تھا بلکہ لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے غیر یقینی حالات کے باعث اعصابی انتشار بڑھتا ہی گیا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر میں نے ایک دو روز مکمل آرام نہ کیا تو میں بیمار پڑ جاؤں گا جب کہ فرانس میں اس وقت میں بالکل بے یار و مددگار تھا۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں نیس پہنچ کر ہوٹل ڈی ریمی کے منیجر سے مل لوں۔ اس طرح میری ذات سے دلچسپی رکھنے والوں کو میری خیریت کی اطلاع بھی مل جاتی اور میں کسی ناگہانی پریشانی کی صورت میں ڈی ریمی کے منیجر یا اس کے بتائے ہوئے رابطے پر اعتماد کر سکتا تھا۔

اس روز میں شام ڈھلے نیس جا پہنچا۔

ایئرپورٹ پر سیاحوں کی رہنمائی کے لئے قائم شدہ ایک کاؤنٹر سے جب میں نے درمیانہ درجے کے رہائشی ہوٹلوں کی فہرست لی تو اس میں ہوٹل ڈی ریمی کا نام چوتھے نمبر پر موجود تھا۔ جب کہ اس فہرست میں سب سے زیادہ کرایہ اسی ہوٹل کا تھا۔

گو مالی طور پر میں قدرے بہتر حالت میں تھا مگر میری جیب بھاری بھی نہیں تھی کہ ایک نئے ملک میں جہاں ابھی تک میرا کوئی شناسا نہیں تھا، میں آنکھیں بند کر کے پیسہ لٹانے میں مصروف ہو جاتا۔ بچت کے نکتۂ نظر سے فیصلہ کیا کہ مجھے کہیں اور ڈیرا ڈالنے کے بجائے ڈی ریمی پہنچنا چاہیے۔

ڈی ریمی چونکہ اقامتی ہوٹل تھا لہٰذا اس کے منیجر کو مجھے رہائش کی پیشکش کرنا چاہیے تھی اور میں لازماً اسے قبول کر لیتا۔

شام ہونے کے ساتھ ہی نیس کی سڑکوں پر زندگی کی حرارت اور رعنائیاں اپنا روپ نکھارتی جا رہی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے جا بجا بارز، کاسینو اور رقص گاہوں کے جلتے بجھتے روشن اشتہارات نظر آ رہے تھے جن کے قرب و جوار میں کاروں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔

"سینور آپ شاید تفریح کے لئے یہاں آئے ہیں؟" ٹیکسی ڈرائیور نے طویل سکوت کے بعد شکستہ انگریزی میں مجھے مخاطب کیا۔

"کسی حد تک تمہارا خیال درست ہے!"

"میں بہت سی ایسی جگہوں سے واقف ہوں سینور، جہاں ڈی ریمی سے کم اخراجات میں بہتر تفریح حاصل کر سکیں گے!"

"تفریح وہی ہوتی ہے جو اخراجات سے بے پرواہ ہو کر کی جائے" میں نے لاپرواہانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

"مجھے افسوس ہے سینور!" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا: "آپ بہت فراخ دل معلوم ہوتے ہیں ورنہ یہاں آنے والے بیشتر ایشیائی تفریح کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ڈی ریمی کو آپ اپنے مزاج کے مطابق پائیں گے!"

ڈی ریمی کی عالیشان عمارت کے سامنے ٹیکسی رکی تو مجھے ڈرائیور کے مشورے کی افادیت کا دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا۔

اس سات منزلہ عمارت کی سج دھج ہی بتا رہی تھی کہ وہاں کے اخراجات عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوں گے۔

ٹیکسی ڈرائیور کو معقول ٹپ دے کر میں ہوٹل کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک کار کی اوٹ سے ایک شائستہ اور خوش پوش نوجوان میری طرف بڑھا۔

"شام بخیر سینور!" اس نے میرے سامنے آتے ہی ادب سے کہا۔

"شام بخیر!" میں نے خشک لہجے میں کہا: "شاید میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں پیشہ ور گائڈ ہوں سینور!" وہ نرم لہجے میں بولا: "اس شہر کی پوشیدہ لذتوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے اکثر مہربان اس خادم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔"

"حُسن کے تاجر ہو؟"

"او سینور!" اس نے یوں طویل سانس لی جیسے میرے الفاظ سے اسے دلی تکلیف پہنچی ہو: "آپ مجھے غلط سمجھے ہیں۔ تجارت وہاں ہوتی ہے جہاں نرخوں کا مول چکایا جاتا ہے۔ اور آپ کا خادم آپ کی جیب پر ذرا بھی بار نہیں بنے گا۔"

"وہ کیسے؟" مجھے اس اداکار کی باتیں دلچسپ سی معلوم ہوئیں اور میں وہیں رک گیا۔

"میں اس شہر کی بہت سی معزز خواتین کا رازداں ہوں موسیو۔" وہ انکسار کے ساتھ اپنے سر کو قدرے خم دے کر بولا: "وہ اپنی محفلوں میں دلچسپ اور جواں سال مگر اجنبی چہروں کو جمع کرنے کی شوقین ہیں اور میں ان ہی سے اپنا انعام پاتا ہوں!"

"تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"ایک نہیں کئی ٹھکانے ہیں سینور!" وہ آہستہ سے بولا: "مگر میں آپ کو سینورا ہیلن سے متعارف کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ خاتون بہت لطیف ذوق کی مالک ہیں۔ دنیا کے کسی بھی موضوع پر آپ ان سے گھنٹوں بلا تکان بات کر سکتے ہیں۔"

"عمر کیا ہے ان کی؟" میں نے ازراہِ تجسس سوال کیا۔

"پچاس سال، مگر وہ خاتون اب بھی اتنی ہی زندہ دل ہیں جتنی تیس برس پہلے تھیں!" اس نے نہایت عقیدت اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"تو تم مجھے ایک بڑھیا کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ہیلن کی عمر معلوم ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کوہِ البیس کی کسی چوٹی سے مجھے اچانک ہوا میں اچھال دیا ہو مگر وہ بدبخت بدستور سنجیدہ تھا۔

"سینورا ہیلن کا گھر پرستان ہے سینور!" وہ مستقل مزاجی کے ساتھ کہنے لگا: "سینوریتا لیزلی جوان کی اکلوتی بیٹی ہے، کسی پری سے کم نہیں۔ اس کی عمر بمشکل بائیس برس ہے۔ نازک اندام، اُجلا اور بے داغ چہرہ، سمندر سے زیادہ گہری نیلی آنکھیں۔ پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، مرمر سے تراشی ہوئی مخروطی انگلیاں۔ ریشم کے لچھوں سے زیادہ ملائم اور چنبیلی کے پھولوں سے زیادہ مہکتے ہوئے سنہرے بال آپ کو اپنا اسیر بنا لیں گے اور پھر آپ اس خادم کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے یہ میرا عاجزانہ دعویٰ ہے!"

"یہ سینورا اور سینوریتا میں کیا فرق ہے؟" میں نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں کے درمیان سوال کیا۔

"سینورا فرانس میں مسز کی جگہ اور سینوریتا مس کی جگہ استعمال ہوتا ہے موسیو!" اس نے وضاحت کی۔

میرے لئے یہ صورتحال بڑی نامانوس اور حیران کن تھی۔ مجھے بے اختیار بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی یاد آ گئی، جس کا مرکزی کردار مایوسی کے عالم میں نگر نگر کی خاک چھان رہا ہوتا ہے کہ اچانک کچھ لوگ سر جھکائے اس کے سامنے آتے ہیں اور اسے اپنی حسین و جمیل شہزادی کا شوہر بنانے کی پیشکش کرتے ہیں اور وہ شخص خوشی سے گریبان پھاڑ کر سر کے بل چلتا ہوا ان لوگوں کے ساتھ ہو لیتا ہے۔

میرا قصہ تو اس فرضی کہانی سے بھی کئی قدم آگے تھا میرا گائڈ مجھے سینوریتا لیزلی کا شوہر بنانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اسے عارضی رفاقت کے لئے بلا معاوضہ میرے قدموں میں ڈالنے پر تُلا بیٹھا تھا اور میرے حواس کو مفلوج کئے ڈال رہا تھا۔

"کیا پورے نیس میں، میں ہی تمہیں اس قابل نظر آیا ہوں؟"

"یہ بڑی دردناک کہانی ہے سینور!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "سینورا ہیلن نے اپنی قوم کے مردوں سے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ اس کا شوہر اس پر بہت ظلم کرتا تھا۔ وہ مرا تو بہت سے لوگوں نے اس لکھ پتی بیوہ کو بے وقوف بنایا اور اب وہ سینوریتا لیزلی کی شادی نہ کرنے کا عہد کر چکی ہے مگر اس سیماب بدن دوشیزہ کے منہ زور جذبوں کو قابو میں رکھنے کے لئے اسے سیاحوں سے دوستی کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ سینوریتا لیزلی کو گندمی رنگ والے ایشیائی مرد بہت پسند ہیں اور اسی لئے میں آپ کے روبرو حاضر ہوا ہوں۔"

"اس طرح تو تم کھلے بازاروں میں اپنی مالکن اور اس کی بیٹی کو رسوا کرتے پھر رہے ہو!" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میری گستاخی معاف فرمائیں سینور، میں اتنا احمق بھی نہیں ہوں" وہ قدرے جھک کر بولا: "میں نے آپ کو ہر بات درست بتائی ہے۔ مگر ان دونوں کے نام فرضی ہیں۔ میں مدت سے ان کا نمک خوار ہوں، بھلا میں یہ نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں!"

"میں تمہارے ساتھ ضرور چلتا مگر میں طویل سفر طے کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ آج مجھے آرام کرنے دو کل میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"ان کی حویلی میں گرم پانی کا نہانے کا تالاب ہے، مجھے یقین ہے کہ سینوریتا لیزلی کے ساتھ تھوڑی سی تیراکی کے بعد آپ خود کو بالکل تر و تازہ محسوس کریں گے۔"

یہ کہتے کہتے اس نے میرے عقب میں کسی کو دیکھا اور میں نے اس کے بشرے پر یک بیک گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوتے دیکھے۔

میں نے گردن گھمائی تو ایک باوردی سپاہی میری طرف آ رہا تھا میں... گائڈ سے اس کی گھبراہٹ کا سبب پوچھنے کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اور میری لاعلمی میں کسی طرف کھسک گیا تھا۔

میں نے حیرت سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور آخر کار اس بدمعاش کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ہوٹل ڈی ریمی کی عمارت کے پہلو

میں ہی راہداری میں گھوم رہا تھا۔

اس اثنا میں پولیس کانسٹیبل میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے آتے ہی خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے فرنچ میں کچھ کہا۔

"میں فرنچ زبان سے نابلد ہوں۔" میں نے اس کے استفسار طلب لہجے کے پیشِ نظر جلدی سے انگریزی میں وضاحت کی۔

"وہ شخص تم سے کیا کہہ رہا تھا؟" کانسٹیبل نے اٹک اٹک کر انگریزی میں اپنا سوال دہرایا جو میرے لئے خاصا تعجب خیز تھا۔

"وہ مجھے تفریح کرانے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہا تھا۔" میں نے قدرے توقف کے بعد اسے سچ بات بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"اچھا کیا کہ تم نے اسے بھگا دیا۔" وہ میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "وہ پرلے درجے کا بدمعاش اور ٹھگ ہے کسی ویرانے میں لیجا کر تمہارے بدن کے کپڑے تک اتروا لیتا۔"

"شکریہ، شکریہ۔" میں نے جلدی سے کہا۔

میرے لئے تو وہ کانسٹیبل رحمت کا فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا کیونکہ وہ نام نہاد ٹھگ اسے دیکھتے ہی بھاگ نکلا تھا ورنہ اس کی رومان انگیز کہانی نے مجھ پر ایسا جادو کیا تھا کہ وہ کانسٹیبل مزید چند لمحوں تک نمودار نہ ہوتا تو میں ڈی ریمی پر لعنت بھیج کر اس لفنگے کے ساتھ سینورا میلین کی حسین و جمیل بیٹی سے ملنے روانہ ہو جاتا۔

"تم اس شہر میں نئے معلوم ہوتے ہو۔ ذرا بہروپیوں سے ہوشیار ہی رہنا۔ یہ لوگ قانون سے دامن بچا کر اس طرح سیاحوں کو لوٹتے ہیں کہ لٹنے والا اپنی کہانی بھی دہرانے میں شرم محسوس کرتا ہے۔" کانسٹیبل نے چلتے چلتے مجھے نصیحت کی۔

"شکریہ دوست، میں محتاط رہوں گا۔"

ڈی ریمی کے داخلی دروازے پر منی اسکرٹ میں ملبوس ایک قتالہ موجود تھی جس نے دلآویز انداز میں مسکرا کر میرے لئے دروازہ کھولا، اور میں دروازے سے گزر کر وسیع استقبالیہ لاؤنج میں پہنچ گیا۔

ڈی ریمی کا استقبالیہ لاؤنج بہت خوبصورت تھا۔ وہاں کاؤنٹر کے سامنے کئی صوفے پڑے تھے۔ فرش پر مصنوعی ریشے کا بنا ہوا دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور گول ستونوں کے ساتھ دو عدد پبلک فون کے بوتھ لگے ہوئے تھے۔

میں کاؤنٹر پر پہنچا تو ایک لڑکی رجسٹر پر کچھ اندراجات کر رہی تھی، دوسری فرنچ میں کچھ کہتی .... مسکراتی ہوئی میری طرف آئی۔

اس کے طویل فقرے میں موسیو کے علاوہ کوئی لفظ میرے پلے نہ پڑ سکا۔

"منیجر!" میں نے حتی الامکان اختصار سے کام لیتے ہوئے اس پر اپنے مدعا کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

میری یہ کوشش کامیاب رہی۔ اس نے کچھ کہتے ہوئے داہنی جانب اشارہ کیا اور میں سر کو ہلکی سی جنبش دے کر اسی طرف ہو لیا۔

اس طرف دیوار کے ساتھ تین کمرے بنے ہوئے تھے مگر راہداری میں کوئی موجود نہیں تھا۔

عہدوں کی تختیوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ درمیانی کمرے والی تختی پر منیجر بنا کوئی عہدہ درج ہے اور میں نے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔

"کم اِن۔" اندر سے کسی کی بھاری آواز سنائی دی۔ میرے لئے اس کا انگریزی بولنا خاصی حیرت کا باعث ثابت ہوا کیونکہ بیشتر فرنچ باشندے انگریزی سے نابلد تھے یا جانتے ہوئے بھی انگریزی بولنا پسند نہیں کرتے تھے۔

میں اندر پہنچا تو مہکتی ہوئی نیم تاریک فضا میں خود کو ایک سفید بالوں والے ایک ادھیڑ عمر شخص کے روبرو موجود پایا جس کی آنکھوں سے ذہانت کی مکاری ٹپک رہی تھی۔

وہ ایک بڑی سی منقش میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

"مجھے ڈاکٹر آسکر بنتھم کہتے ہیں۔" میں نے چند ثانیوں تک کمرے کا جائزہ لینے کے بعد ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

میرا نام سنتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی جو میں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔

"مجھے چارلس کہتے ہیں ڈاکٹر۔" وہ اپنی نشست سنبھالتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم مجھے اپنا پاسپورٹ دکھا دو؟"

میں نے خاموشی کے ساتھ بریف کیس سے اپنا پاسپورٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ جو اس نے سرسری طور پر دیکھنے کے بعد مجھے لوٹا دیا۔

"تم کہاں ٹھہرے ہو؟"

"میں ایئرپورٹ سے سیدھا یہیں آیا ہوں۔"

"اوہ۔ تو پھر تم کچھ آرام کر لو۔" وہ ایک بٹن دباتے ہوئے بولا۔ "ویسے تمہیں میرے ہوٹل ہی میں قیام کرنا ہے۔ وہ تم سے خود ہی رابطہ قائم کر لے گا۔"

"کون؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"تم اسے نہیں جانتے؟" چارلس نے حیرت سے پوچھا۔ "میرا تو خیال تھا کہ تم دونوں بہت پرانے دوست رہے ہو گے!"

میں دل ہی دل میں اپنی جلد بازی اور حماقت پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

"خیر یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔" چارلس نے زور سے کہہ کر میری الجھن رفع کر دی۔ "تم ڈی ریمی میں میرے مہمان ہو۔" اس نے دراز سے نکال کر ایک سنہرا چھپا ہوا کارڈ میری طرف بڑھایا۔ "یہ کارڈ دکھا کر تم ڈی ریمی کی سروس سے مفت استفادہ کر سکتے ہو۔ یہ نائٹ شو میں داخلے کے ٹکٹ کا کام بھی کرے گا۔"

"شکریہ!" میں نے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

اسی وقت گھنٹی کے جواب میں ایک اسٹیورڈ وہاں پہنچ گیا۔ چارلس نے فرنچ میں جلد جلد اسے کچھ ہدایات دیں اور اس کے جاتے ہی اسٹیورڈ واپس چلا گیا۔

دو چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چابی موجود تھی۔

"یہ تمہیں تمہارے کمرے میں پہنچا دے گا۔ رات کو تنہا نیند نہ آئے تو روم سروس کی نگراں مس اوڈیل کو بتا دینا۔" چارلس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

میرا بریف کیس اسٹیورڈ نے لے لیا اور چارلس مجھے چھوڑنے باہر آ گیا۔

لفٹ کے پاس ایک بڑے بورڈ پر انگریزی اور فرنچ میں ڈی ریمی کے مختلف حصوں کا تعارف درج تھا۔

اس کے مطابق گراؤنڈ فلور پر ڈائننگ ہال، بار، کیفے اور سوئمنگ پول تھا۔ دوسری منزل پر کیبرے ہال اور بار۔ تیسری منزل پر قمار خانہ اور اس سے اوپر اقامتی کمرے واقع تھے۔

"تم پہلے فرنچ ہو جس کی زبان سے میں نے براہ راست انگریزی میں پہلی بات سنی تھی۔" میں نے فوری خیال کے تحت کہا۔

"یہاں انگریزی جاننے والوں کی تعداد کم ضرور ہے۔ مگر مفقود نہیں۔ یہ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟" اس نے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہارے دروازے پر دستک دی تو تم نے مجھے انگریزی میں اندر آنے کے لئے کہا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"دراصل کاؤنٹر والی لڑکی نے انٹرکام پر مجھے بتا دیا تھا کہ کوئی ایشیائی میرے دفتر کی طرف آ رہا ہے۔" اس نے جاندار قہقہہ مار کر کہا۔

لفٹ آتے ہی میں اس میں سوار ہو گیا۔ چارلس ہاتھ لہرا کر واپس مڑ گیا۔ وہاں موجود دو خوبصورت لڑکیاں بھی لفٹ میں آ گئیں۔

چوتھی منزل پر میں لفٹ سے اتر گیا۔ اسٹیورڈ جس کمرے کے سامنے رکا اس کے دروازے پر تنالزے نمبر درج تھا۔

وہ کمرہ بہت قرینے سے سجا ہوا تھا۔ اور اندر دوہرا بستر لگا ہوا تھا۔ اسٹیورڈ کی انگریزی بہت ہی خفیف و نزار تھی۔ اس نے مجھے پردوں کے بارے میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی جو پوری طرح ناکام ثابت ہوئی اور وہ واپس چلا گیا۔

میں نہانے کے لئے غسل خانے میں داخل ہوا تو نفاست دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ میں نے باتھ ٹب کو گرم پانی سے لبریز کیا پھر اس میں کولون کی خاصی مقدار انڈیل کر ٹب میں داخل ہو گیا۔ اس خوشبودار پانی کا لمس میرے تھکے ہوئے اعصاب کے لئے اندازے سے زیادہ فرحت بخش ثابت ہوا۔

غسل کے بعد میں نے کمرے میں ہی خورد و نوش کا ہلکا پھلکا سامان طلب کیا۔ اس کے بعد دروازہ مقفل کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

بتی بجھانے سے قبل میں نے وہ سوئچ آن کر دیا جو داخلی دروازے کے بیرونی حصے پر "آرام میں خلل نہ ڈالیں" کے الفاظ روشن کر دیتا تھا۔

لیٹتے ہی نیند کی دیوی نے مجھے اپنی سکون پرور آغوش میں سمیٹ لیا۔ مگر اس کے بعد ساری رات میں ہولناک خواب دیکھتا رہا۔

پھر ایک ڈراؤنی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں پھیلی ہوئی مدھم سبز روشنی میری آنکھوں میں سوزش پیدا کر رہی تھی۔ پردوں کے پیچھے پھیلا ہوا گھور اندھیرا بتا رہا تھا کہ ابھی دن طلوع ہونے میں بہت دیر باقی ہے۔ اسی وقت میرے سرہانے رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اور میں بے اختیار اچھل پڑا۔ یقیناً وہی آواز میری نیند میں خلل ڈالنے کا سبب بنی تھی۔ میں نے زیر لب آپریٹر کو برا بھلا کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو، ڈاکٹر آسکر!" میں نے خمار آلود لہجے میں مادری زبان میں کہا۔

"او خدا شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔" مجھے ریسیور پر چارلس کی فکرمند آواز سنائی دی۔ "پچھلے پندرہ منٹ میں میں نے تیسری بار تمہیں رنگ کیا ہے!"

"اتنی رات گئے کیا کام پیش آ گیا!" میں نے اپنی ناگواری کو حتی الامکان چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔

"رات گئے؟" چارلس کی آواز تحیر آمیز تھی۔ "تو تمہارا خیال ہے کہ میں نے تمہیں کچی نیند سے اٹھا کر پریشان کیا ہے!"

"میرا بدن ٹوٹ رہا ہے چارلس۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی میں مزید کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔"

"اوہ خدا!" اس کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ "تمہیں سوتے ہوئے مسلسل چھبیس گھنٹے گزر چکے ہیں اور تم بغیر کھائے پیئے مزید سونا چاہتے ہو!"

"چھبیس گھنٹے؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں دہرا کر بتی روشن کر دی۔

"ہاں دوست، تم کل سے اپنے کمرے میں مقید ہو۔ ذرا باہر نکلو، آج ہفتے کی رات ہے۔ اس کا مزہ لیا تو آنے والا ہفتہ بالکل بے کیف گزرے گا۔"

"معاف کرنا چارلس، میرے حواس ابھی تک نیند کے خمار سے بوجھل ہیں، میں نہا کر نیچے آتا ہوں۔" میں نے رسٹ واچ پر دن کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تنہا رہ کر تم بہتر تفریح کر سکو گے۔ میں تو تمہاری خیریت کی طرف سے فکرمند تھا اور تمہیں ہفتے کی رات یاد دلانا چاہتا تھا۔" چارلس نے جلدی سے وضاحت کی۔

"شکریہ چارلس، میں تمہاری شام خراب نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

مجھے حیرت تھی کہ اتنی طویل اور گہری نیند لینے کے باوجود مجھ پر سستی سوار تھی۔ میرا معدہ بھی خوراک طلب کر رہا تھا۔ میں اچھل کر بستر سے باہر آ گیا۔

نہا دھو کر میں سیدھا گراؤنڈ فلور پر واقع ڈائننگ ہال میں گیا جہاں رنگ بکھیرتی ہوئی خوابناک روشنیوں میں، خوشبو میں بسے ہوئے بیرے سرگوشیوں

میں مصروف تھے۔ آرکسٹرا کی ہلکی آواز میں نیچے گلے والے بلاؤز اور منی اسکرٹ میں ملبوس لڑکیاں شوخ تتلیوں کی طرح میزوں کے درمیان گردش کرتی مہمانوں کو سرو کر رہی تھیں۔

مختلف شرابوں اور تمباکو کے دھوئیں کی ملی جلی بو نے اس ہال کی فضا کو کچھ اور خمار آلود کر دیا تھا۔

میں ہال میں داخل ہو کر ایک ایسی میز پر جا بیٹھا جہاں صرف دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

میں نے گوشت کے تلے ہوئے پارچوں کے ساتھ سرخ شراب طلب کی اور سگریٹ سلگا کر ہال کا جائزہ لینے لگا۔

شراب کا تیسرا پیگ خالی کرتے ہوئے مجھے شمپین کی بوتلوں کے کاگ اڑنے کی آوازیں سنائی دیں اور میں بے اختیار اپنی داہنی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

وہاں دو مرد اور تین عورتیں موجود تھیں اور ہر ایک نے اپنے لئے شمپین کی علیحدہ بوتل کھولی تھی مگر ان عورتوں کو دیکھ کر مجھ پر شدید حیرت طاری ہو گئی کیونکہ ان میں سے ایک چہرہ میرا آشنا سا تھا جسے میں اندھیرے میں بھی بخوبی پہچان سکتا تھا۔

وہ اسرائیلی فوج کے میجر اسمتھ کی بیوی اور کیپٹن ماریا کی بھابھی تھی جو مجھ سے مشکوک مراسم رکھنے کی وجہ سے اپنے شوہر کے ہاتھوں بری طرح پٹی تھی اور دو تین مہینے قبل تک تل ابیب کے ایک ہسپتال میں داخل تھی۔ اس کی حالت اس قدر ابتر تھی کہ ماریا نے تو قیاس کر لیا تھا کہ فلورا جانبر نہ ہونے پائے گی مگر وہ طرح دار اور خوبصورت یہودن تل ابیب سے ہزاروں میل دور میرے سامنے موجود تھی۔

میں نے اسے پہچانتے ہی خود کو اس کی نظروں سے بچانا چاہا مگر اس وقت تک وہ مجھے دیکھ چکی تھی اور شدید حیرت کے عالم میں اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

اچانک میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں مگر میں نے اپنے انداز پر گھبراہٹ طاری نہ ہونے دی اور لاپروایانہ انداز میں سرخ شراب کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

فلورا کے لباس کی سرسراہٹ اور نرم قالین پر اس کی اونچی ایڑی کی خفیف سی دھمک مجھے بہت زیادہ نمایاں ہو کر سنائی دے رہی تھی۔ پھر خوشبو کا ایک تیرتا ہوا جھونکا میرے سامنے آ کر مجسم ہو گیا۔

میں نے اپنی اجنبی نظریں اوپر اٹھائیں تو فلورا سکتے کے عالم میں میرے سامنے کھڑی تھی!

"صفدر! تم یہاں!" اس نے کھوئی کھوئی حیرت زدہ آواز میں کہا۔

"میں آپ کو نہیں پہچان سکا خاتون!" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا: "آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام وہ نہیں ہے جو آپ نے پکارا ہے!"

"ناممکن!" وہ بڑبڑاتی ہوئی میرے سامنے والی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں "تم بالکل ... سات جنم لے کر بھی میرے سامنے آ ؤ گے تو میں تمہیں پہچان لوں گی!"

"میں آپ کو نہیں پہچانتا خاتون، اگر آپ اس وقت مجھے تنہا ... تو یہ میرے حال پر آپ کی بہت بڑی نوازش ہو گی۔" میں نے ... لہجے میں کہا۔ مگر میں دل ہی دل میں فلورا کے اعتماد کی داد دیئے بغیر ...

"تم حیرت ناک خوبیوں کے مالک ہو صفدر!" وہ میری ... سنی ان سنی کرتے ہوئے کہنیوں کے بل میز پر میری طرف جھک کر ... لہجے میں بولی: "تم نے اس حرامزادی ماریا کو ٹھکانے لگا کر میرے ناسوروں کو امرت فراہم کی ہے۔ مجھے تم سے دوستی پر ناز تھا اور ... پندار کو برقرار رکھا ہے۔ یہ خوشخبری مجھے ہسپتال ہی میں مل گئی تھی ... تمہاری سلامتی کی بہت زیادہ فکر تھی۔ دو روز بعد میں ہسپتال سے ... ہوئی تو سیدھی یہاں اپنی بہن کے پاس آ گئی اور اسمتھ کو طلاق ... وہ بزدل بھیڑیا ہے۔ جو اپنے ہی عمل کے کمزوروں کو چبا ڈالتا ہے ... تو وہم بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر تم سے یوں اچانک ملاقات ہو جائے گی۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ میری وجہ سے تمہاری ذلت پر ... نہ آ سکے گی۔"

"میں نہ ماریا کو جانتا ہوں نہ اسمتھ کو۔" میں نے سرد نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا: "اگر صفدر آپ کا کوئی بچھڑا ہوا محبوب تھا تو ... آپ کی غلط فہمی کی تصدیق کر کے آپ کے شباب کو کھلونا بنا سکتا ... ایک بااصول آدمی ہوں۔ اپنا مارا ہوا شکار کھا کر خوش ہوتا ہوں ... کے لئے آپ کو بہت سے دوست مل جائیں گے!"

چند ثانیوں تک وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی۔ اپنی ... اس کی آنکھوں میں غصہ چھلک آیا تھا۔ پھر اچانک وہ بولی: "میں تمہا... کی ہی نہیں خلوت کی بھی ساتھی تھی۔ میں تمہارے پوشیدہ نشانات ... ہوں، تم مجھے جھٹلا سکتے ہو مگر ان کو نہ جھٹلا سکو گے!"

اس کی بات نہایت بے ہودہ مگر وزنی تھی۔ دوسری ... یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا کہ میں نے فلورا کو اعتماد میں نہ لیا تو وہ ... میں واپس جا کر اس حیرت انگیز مماثلت کا تذکرہ ضرور کرے گی ... میری ذات بلاوجہ لوگوں کی توجہ کا نشانہ بن جائے گی جب کہ میں ... کو تنازعہ بنانے پر تیار نہیں تھا۔

میں پہلی بار مسکرا دیا: "فرض کرو کہ میں یہ تسلیم کر لوں کہ ... ہوں تو پھر تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گی؟"

میری مسکراہٹ پر اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ ... میں بولی: "پرانے مراسم کی تجدید کے سوا میں اور کیا کروں گی ... ننھے سے بچے کی طرح تمہیں اپنی بانہوں میں لے کر سلایا کروں گی ... آرام کرو گے اور میں تمہارے اور اپنے لئے روزی کماؤں گی۔ میری ...

تمہاری ذات سے تحفظ کا ایک عجیب اور لازوال احساس وابستہ ہے ... جب ... مجھے بے دردی سے مار مار کر ہلاک کرنا چاہ رہا تھا تو مجھے بس یہی خیال تھا کہ تم اچانک آ پہنچو گے اور مجھے اس کے چنگل سے بچا کر اپنے ... غائب کر دو گے!"

"اپنے دوستوں سے کیا کہہ کر آئی ہو؟"

"ایک پرانے دوست کے اچانک نظر آ جانے کا تذکرہ کر کے آئی ہوں۔"

"میں اپنا ماضی بھول چکا ہوں۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا: "لہٰذا اب تمہیں بھی اسے دہرانے کی ضرورت نہیں!"

"مگر تمہارا نام تو صفدر ہی ہے نا؟"

"نہیں!" میں غیر ارادی طور پر غرایا: "ڈاکٹر آسکر بنیتھم، میں برطانوی شہری ہوں اور تم سے لندن سے میری دوستی ہوئی تھی!"

"یہ ٹھیک ہے، میں تین برس پہلے کافی عرصہ لندن میں گزار چکی ہوں۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کہاں مقیم ہو؟"

میرے دل میں بے ایمانی آئی کہ اسے کوئی فرضی پتہ بتا دوں، مگر اپنا موجودہ نام بتانے کے بعد پتہ چھپانا حماقت سے کم نہ تھا۔ فلورا کا اشتعال میرے لئے ناقابلِ تصور مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے اپنا کمرہ نمبر بتا دیا۔

"ڈی رینی بہت مہنگا ہے، تم چاہو تو میں اپنی بہن کے گھر میں تمہیں ایک علیحدہ کمرہ دلوا سکتی ہوں۔" اس نے پیشکش کی۔

"یہاں میرا قیام بہت مختصر ہے۔" میں نے بچاؤ کا پہلو اختیار کرتے ہوئے کہا: "ویسے بھی مجھے آزاد روی سے پیار ہے۔"

"میں کل دوپہر تمہارے پاس آؤں گی!"

"اسی لباس میں آنا۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"خاصا اشتعال انگیز ہے۔ جو اس کو زائل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔"

"میرے ساتھیوں سے نہیں ملو گے؟" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں چاہتا۔ جاؤ تمہاری شمپین گرم ہو رہی ہو گی۔"

اس نے تیکھی چتونوں سے میری طرف دیکھ کر اپنے گلابی ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکوڑا اور فضا میں ایک شرارہ سا بکھیرتی واپس ہو لی۔

کافی کے بعد ویٹر بل لایا تو میں نے چارلس کا دیا ہوا سبز کارڈ اس کے سامنے کیا اور وہ بلوں پر میرے دستخط لے کر واپس چلا گیا۔ البتہ میں نے اسے ٹپ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا جو بل کی رقم کا کم و بیش دس فیصد تھی۔

ڈائننگ ہال سے اٹھ کر میں دوسری منزل پر پہنچا تو کیبرے ہال میں اکا دکا نفوس نظر آئے۔ تیز موسیقی کے شور پر لہراتی ہوئی نیم عریاں سی ایک رقاصہ جو میزوں کے درمیان موجود تھی، اسٹیج پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہاں شو گیارہ بجے شب شروع ہو گا۔ اس رات وہاں اطالوی ڈانسرز کا پروگرام تھا۔ البتہ درمیان میں مصری رقاصاؤں کا ایک مختصر سا بیلے ڈانس کا پروگرام بھی تھا۔

وہاں کا جائزہ لینے کے بعد میں قمار خانے میں گھسا تو وہاں ہیجانی فضا نظر آئی۔ وہاں کسی کے چہرے پر سکون نہیں تھا۔ جو جیت رہے تھے ان کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے اور پھیپھے فقروں پر بھی بے ہنگم قہقہے لگا رہے تھے اور جو ہار رہے تھے ان کے چہرے پسینوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تیوریوں پر بے شمار لکیریں تھیں۔

لمبی لمبی خوشبودار سگریٹوں سے شغل کرتی ہوئی بہت سی عورتیں بھی قمار بازی میں شامل تھیں۔

اس منزل پر بینے اور لفٹ والی راہداری کے ایک جانب والا وسیع حصہ مشینی جوئے کے لئے مخصوص تھا۔ اور وہاں سے گھنٹیوں، کھٹکوں اور ٹارگٹ شوٹنگ کا تیز شور سنائی دے رہا تھا۔ دوسرے حصے میں کارڈز کے علاوہ بلیرڈ کی دو میزیں بھی مصروف تھیں۔

پوکر اور فلش کی میزوں پر ہنگامی صورتِ حال نظر آ رہی تھی۔ رقم کے انبار ایک طرف سے دوسری طرف سرک رہے تھے۔ البتہ برج کی میزوں پر عجیب کرب آمیز بے چینی نظر آ رہی تھی۔ چال دیتے ہوئے کھلاڑیوں کے ہاتھ یوں کانپنے لگتے جیسے وہ اپنی موت اور زندگی کی بساط پر آخری مہرہ کھسکا رہے ہوں ...... تاش ہمیشہ سے میری کمزوری رہے تھے۔ ان بے جان پتوں کے سہارے میں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا مگر جب مقدر میں گردش آئی تو اسی کھیل میں اپنی ساری پونجی ہارنے کے بعد آخری اور فیصلہ کن داؤ میں اپنا مکان ہار کر اپنے ہی شہر میں دربدر ہو گیا تھا۔ اور اس روز کے بعد سے کبھی میں اپنا گھر نہ بنا سکا۔ جب تک حکم کی بیگم مجھ پر مہربان رہی ہر طرف میرا حکم اور میرا سکہ چلتا رہا مگر جس روز حکم کی بیگم نے مجھ سے منہ موڑا میرا اپنا وجود ایک کھوٹے سکے کی طرح ٹھوکریں کھانے لگا جسے نہ چور چراتا ہے نہ ساہوکار قبول کرتا ہے۔ نہ جواری مانتا ہے نہ گداگر تسلیم کرتا ہے۔

میں تیزی کے ساتھ قمار خانے سے باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں ہوٹل ڈی رینی سے باہر کھلی فضا میں نکل آیا۔

نیس کی فضا میں اس روز شوخی رچی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر بنے سنورے جوڑے تفریح گاہوں کی سمت جا رہے تھے۔ میں نے نمایاں طور پر یہ بات محسوس کی تمام تر آزاد خیالی اور رنگین مزاجی کے باوجود عورتوں کے بارے میں فرانسیسی مردوں کا رویہ عمومی طور پر نہایت احترام آمیز اور سوداتی تھا اور یہ رویہ ان کے خمیر کا ایک جزو معلوم ہوتا تھا۔

میں اپنے خیالات کی رو میں ڈوبا سا میں ڈے نوائٹ نامی بار کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک کسی جانب سے چھوٹے چھوٹے بالوں والا ایک نوجوان میرے سامنے آ گیا۔

"شام بخیر موسیو آسکر!" اس نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"شام بخیر" میں نے خوش دلی سے کہا مگر میں کسرتی بدن والے اس نوجوان کی طرف دیکھ کر الجھن میں پڑ گیا تھا۔

میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا مگر اس کے باوجود مجھے وہ کسی حد تک شناسا نظر آ رہا تھا اور اس نے جس بے تکلفی سے مجھے مخاطب کیا تھا اس کی بنا پر میں یہی اندازہ لگا سکا کہ وہ شاید نہی شخص ہے جسے میں میں مجھ سے ملنا تھا۔

مگر اس اندازے کے باوجود میں نے غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ محتاط رویہ اختیار کیا کیونکہ میں پہلے کبھی اس سے نہیں ملا تھا مگر اس کے شناسا خدوخال اس بات کے غماز تھے کہ وہ کسی نہ کسی وقت مجھ سے ملے بغیر میرے قریب رہا ہے۔

"مجھے ہنری شوارٹ کہتے ہیں۔" وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "میں کافی دیر سے تمہارا پیچھا کر رہا تھا اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔"

"جاسوسی!" میں یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔ اس نے تعاقب کا تذکرہ کر کے میرے ذہن سے دھند صاف کر دی تھی۔ یقینی طور پر میں تھوڑی دیر پہلے اسے دیکھ چکا تھا اور اس کا بشرہ میرے لاشعور میں محفوظ رہ گیا تھا اور جب وہ براہ راست میرے سامنے آیا تو اسی موہوم سی شبیہ نے مجھے اس کے بارے میں منفی انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"مجھے امید ہے تم میرے ساتھ چلنے سے انکار نہیں کرو گے" اس نے کہا۔

"یہ شہر میرے لیے نیا ہے میں تمہاری تقلید ضرور کر سکتا ہوں رہنمائی سے البتہ معذور رہوں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"اوہ! میں بھی احمق ہوں۔" وہ خجالت آمیز لہجے میں بولا "آؤ میرے ساتھ، میری گاڑی یہاں سے تھوڑی دور موجود ہے۔"

میں بلاتعرض اس کے ساتھ ہو لیا۔

"تم یہاں کب پہنچے ہو؟" اس نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے سرسری لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"کب اور کیسے نہ پوچھو تو بہتر ہے بس پہنچ ہی گیا۔" اس پر اعتماد ہو جانے کے باوجود میں غیر ارادی طور پر محتاط رویہ ہی اختیار کیے رہا اور اسے جواب دینے کے بعد مجھے خود اپنے رویے پر حیرت ہوئی کہ میں اس شخص سے پردہ پوشی کر رہا تھا جو آنے والے دنوں میں میرا مددگار ہو سکتا تھا۔

"سفر کی تکان تو دور ہو ہی گئی ہو گی؟"

"میں ایک ہفتے بھی مسلسل سوتا رہوں تو شاید تکان دور نہ ہو سکے!"

"نیس کی آب و ہوا بہت اچھی ہے شاید تم تنہائی سے اکتا گئے ہو؟"

"تنہائی؟" میں ہنس پڑا۔ "یہاں تو لوگ مفلس سیاحوں کو بھی تنہا نہیں چھوڑتے، اس معاملے میں نیس قابل داد ہے۔"

"یعنی کوئی ایڈونچر ہو چکا ہے؟" وہ داہنی آنکھ دبا کر بولا۔ وہ نہایت ستھری اور رواں انگریزی بول رہا تھا۔

"ہوتے ہوتے رہ گیا، قسمت ہی تھی جو میں بچ گیا۔"

"وہ کیسے؟" وہ تحیر آمیز لہجے میں بولا۔

اور میں نے سینوریتا لیزلی کی فسوں خیز کہانی چھیڑ دی۔

"تم واقعی بال بال بچے ہو۔ وہ بہت خوش شکل ... ٹھگ سیاحوں کو لوٹنے میں تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے۔"

"میرا خیال ہے کہ پیا بھی اس سے واقف تھا۔"

"واقف ضرور رہا ہو گا مگر ثبوت کے بغیر ایسے لوگوں پر ہاتھ ... سکتا ہے۔"

"تو لٹنے والے پولیس سے رجوع نہیں کرتے؟"

"شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے اگر ... جیسے ... ملے پر ساکر وہ تمہیں کنگال کر دیتا تو کیا تم یہ بتا سکتے تھے کہ ... کے مزے لوٹنے کے لالچ میں اس کے ساتھ گئے تھے؟"

ہوٹل ڈی ریمی قریب آ گیا تھا۔ گو میں اس کے ساتھ ... رہا تھا لیکن میری دکھتی ہوئی پنڈلیاں بتا رہی تھیں کہ میں پیدل وہاں سے کافی دور نکل گیا تھا۔

ڈی ریمی کے قریب شوارٹ کی سرخ رنگ کی ... کے ہمراہ کار میں سوار ہو گیا اور ہم پارکنگ لاٹ سے باہر آ گئے۔

شوارٹ چند منٹ بعد ہی بارونق ... ہو گیا اور اس کے بعد تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ خود راستہ بھول ... اس کی کار ہر دو چار سو میٹر کے بعد کسی اور گلی میں داخل ہو جاتی۔

"تمہیں اپنے گھر کا راستہ یاد ہے؟" جب میرا صبر جواب ... تو میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"میں مضافاتی علاقے میں رہتا ہوں۔" وہ کار کو داہنی ... ہوئے بولا "اور تمہیں مختصر راستے سے لیے جا رہا ہوں۔ مین ... کے سامنے ٹریفک کا ایسا اژدحام ہو تا کہ ہم پھنس کر رہ جاتے۔"

"وہاں کیا خاص بات ہے؟"

"ایک اسپینی رقاصہ آج وہاں ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی ... رسی پر کوئی خاص رقص دکھانے والی ہے۔"

"رقاصہ ہے یا بازی گر؟"

"وہ بازی گروں کی ایک جماعت کے ساتھ آئی ہوئی ... اس نے قیامت کا سراپا پایا ہے۔" وہ عامیانہ انداز میں بولا "ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر سراپا ... بھی نظر نہیں ..."

... نے مسکرا کر کہا اور وہ بے اختیار ہنس دیا۔

تھوڑی دیر میں گاڑی واقعی آبادی سے باہر آ گئی ... ویران شاہراہ پر آتے ہی میں نے کھڑکی کا شیشہ ... اس طرف کھلی فضا میں خنکی کافی بڑھ گئی تھی۔

اسی راستے پر دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ... بڑے بڑے مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

... مکان کے گرد درختوں کا وسیع اور سیاہ جنگل سنسنا رہا تھا جن میں ... روشن کھڑکیاں بڑی پراسرار نظر آ رہی تھیں۔ شوارٹ نے مجھے بتایا ... پرانے امرا کی آبائی حویلیاں تھیں اور ہر دو حویلیوں کے درمیان ... یہ سب نہیں کے پرانے ... فاصلہ تھا کہ عام آدمی دوڑ لگا کر بھی دو منٹ سے کم عرصے میں عبور نہیں ... کر سکتا تھا۔

اور پھر سڑک پر ہیچ اس قسم کے ایک مکان کے کھلے ہوئے چوبی پھاٹک میں ... گھستی چلی گئی۔

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے بجری کی کشادہ روش پھیلی ہوئی تھی ... اور اس پر ... دندناتے ہوئے چوہے اور چھوٹے موٹے جانور روشنی سے گھبرا کر پناہ کی تلاش میں روش کے اطراف میں پھیلے ہوئے گھنے باغات کی طرف بھاگ رہے تھے۔

ٹائروں کے نیچے بجری کچلنے کی آواز انجن کے دھیمے شور پر حاوی تھی مگر روش کے اختتام پر شناسی روشنیوں میں لپٹی ہوئی رومن طرز کی ویران عمارت میں اس شور کے باوجود کوئی ردعمل نظر نہ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو۔

شوارٹ نے ویران پورچ میں کار روک دی اور دروازہ بند کر کے نیچے اتر گیا۔ عمارت اور احاطے میں ابھی تک موت کا سناٹا طاری تھا۔

"اتنی بڑی عمارت میں تم تنہا رہتے ہو؟" وہاں چھائی ہوئی گمبھیر خاموشی میرے اعصاب پر اس بری طرح سوار ہو رہی تھی کہ میں اپنی حیرت کو الفاظ میں ڈھلنے سے نہ روک سکا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پورچ میں پھیلی ہوئی ناکافی روشنی میں اس کی آنکھیں بلوری مانند چمک رہی تھیں۔

"دربان بھی نہیں ہے؟" میں نے اس کے ہمراہ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

"ابھی دیکھو!" یہ کہہ کر وہ چلتے چلتے رک گیا پھر اس نے مخصوص انداز میں ہونٹ سکوڑ کر سیٹی بجائی اور اچانک تناور درختوں کے درمیان سے کئی خوفناک غراہٹیں بلند ہونے لگیں۔

پھر آناً فاناً میں اس گھور تاریکی میں سے کئی قدآور اور خونخوار کتے غراتے ہوئے نکل آئے۔ وہ دمیں ہلاتے ہوئے آئے اور شوارٹ کے گرد پھیل گئے۔

"یہ میرے دربان ہیں۔" شوارٹ باری باری ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "انہیں میں نے خود سدھایا ہے۔ یہ مجھے اور میری کار کو پہچانتے ہیں ... میرے بغیر کوئی ملاقاتی اس احاطے میں داخل نہیں ہو سکتا ... اور خود کو پودوں اور جھاڑیوں میں چھپائے رکھنے کے ... بغیر وہاں سے نہیں نکلتے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ... اندر گھس آئے اور یہ اس کے چیتھڑے اڑا دیں۔"

... دوستوں اور مہمانوں سے ... بہت پیار سے ملتے ہیں انہیں ... اپنے گرد ٹہلتے ہوئے ان قدآور وحشیوں سے دور رہتے ہوئے کہا۔

"گو!" شوارٹ نے تاریکی میں ڈوبے ہوئے باغات کی طرف انگلی اٹھا کر تحکمانہ لہجے میں کہا اور وہ وحشی درندے لمبی لمبی چھلانگیں مارتے ایک بار پھر اس لامتناہی تاریکی کا جزو بن گئے۔

"خدا کا شکر ہے" میں نے طویل سانس لے کر کہا "انہیں تو دیکھ کر ہی کمزور دل کا آدمی موت کے منہ میں چلا جائے۔"

ہنری شوارٹ کو اپنے کتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ داخلی پھاٹک تو کھلا ہوا تھا مگر برآمدے سے عمارت میں داخلے والا دروازہ بھی مقفل نہیں تھا۔

"میرے گھر کا انتظام پسند آیا ڈاکٹر اسکر؟" اس نے وسیع اور آراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"تم بہت زیادہ انفرادیت پسند معلوم ہوتے ہو۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ میری نگاہیں دیواروں پر لگی ہوئی ان بڑی بڑی آئل پینٹنگز پر مرکوز تھیں جن میں حسن اور رومان کے ساتھ ہی وحشیانہ تشدد بھی نمایاں تھا۔

"مجھے دوسروں کو اذیت پہنچا کر بڑی تسکین حاصل ہوتی ہے ڈاکٹر اسکر" اچانک اس کی بدلی ہوئی سرد آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں کسی زخمی وحشی کی طرح اس کی طرف پلٹا تو اس کے داہنے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا جس کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا اور اس کے پتلے پتلے ستواں لبوں پہ سفاک سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"یہ کیا مذاق ہے ہنری؟" میں نے نشست چھوڑتے ہوئے بوکھلا کر کہا۔

"مذاق تو میں اب تک کرتا آیا تھا۔ یہ حقیقت کا آغاز ہے موسیو اسکر" وہ ریوالور سے بیب دبانے کو آہستہ آہستہ جنبش دیتے ہوئے بولا "اپنی جگہ بیٹھ جاؤ اور فیصلہ کر لو کر میرے سامنے صرف سچ بولو گے۔"

میں بے یقینی کے عالم میں اسے گھورتے ہوئے کسی بے جان مجسمے کی طرح صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور وہ میرے مقابل بیٹھ گیا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" شوارٹ نے پہلا سوال کیا۔

"ولارڈ بونوت سے۔"

"شہر نہیں، میں ملک کا نام پوچھ رہا ہوں۔"

"برطانیہ سے!"

"تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟"

"ہوٹل میں۔"

"بکواس مت کرو ڈاکٹر اسکر" وہ کسی بھیڑیے کی طرح غرایا "جس وقت تم ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے تو میں نے تمہارے کمرے کی تلاشی لی تھی۔ تمہارے بریف کیس میں ردی اخبارات اور رسائل کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔"

یہ سن کر میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ غنیمت تھا کہ میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے محض شناخت اور احتیاط کے پیش نظر اپنا جعلی پاسپورٹ اور زہریلی سوئیاں پھینکنے والی شیشی اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی تھی۔

"کمرے میں نہیں میرا پاسپورٹ ہوٹل میں جمع ہے۔" میں نے برجستہ جواب دیا۔

"یہ جھوٹ ہے، ڈی ریمی میں مسافروں کے پاسپورٹ نہیں لیے جاتے۔"

"پھر شاید میری گندمی رنگت کی وجہ سے یہ سلوک کیا گیا ہوگا۔" میں نے پیش بندی کے طور پر اپنا بیان برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے تو مسافروں کے رجسٹر پر دستخط بھی نہیں لیے گئے۔"

"تو پاسپورٹ کس نے لیا تمہارا؟"

"ڈی ریمی کے منیجر نے۔" میں نے کہا۔ اس طرح مجھے یہ امید تھی کہ اگر شوارٹ میرے بیان کی تصدیق کے لیے چارلس سے رابطہ کرے گا تو وہ فوراً خطرے کی بو سونگھ لے گا۔

"میرے ہاتھ بہت دراز ہیں، میں دیکھ لوں گا۔"

"آخر تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تم بہت بدنصیب ہو ڈاکٹر آسکر۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں نے بہت زبردست منصوبہ بندی کی تھی مگر تم بالکل آخری مرحلے پر کسی چوہے کی طرح خود میرے جال میں آپھنسے اور میں یہ موقع ضائع نہیں کروں گا۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو!" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"تم ال عال کے طیارے کے اغوا سے باخبر ہو؟" اس نے زہریلے لہجے میں سوال کیا۔

"چند روز قبل اخبار میں پڑھا تھا۔"

"وہ طیارہ تل ابیب سے روانہ ہوا تھا۔ اس کے آٹھ مسافر پیرس میں چھوڑے گئے۔ چوبیس کو میڈرڈ میں رہائی ملی اور چار اغوا کنندگان جنیوا میں غائب ہوگئے۔ تل ابیب میں موجود مسافروں کی فہرست کے مطابق اغوا کنندگان کے نام ایشی کاوا، ڈاکٹر آسکر بنیتھم، بنجامن اسٹیوارٹ اور مس اوتوموکیدا تھے۔ ریڈ بریگیڈ کے زیر حراست ارکین موچی سوتو اور نکوداکی رہائی کے فیصلے کے ساتھ ہی مغربی یورپ کے چار ممالک میں اسرائیل کے اسی بہترین سیکرٹ ایجنٹ بھی پہنچا دیئے گئے تھے جن کا کام یہ تھا کہ فرار کے بعد اغوا کنندگان کو گھیر لیں اور جب وہ طیارہ جنیوا میں اترا تو یہ تمام ایجنٹ ایک منظم پروگرام کے تحت اٹلی، فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں پھیل گئے۔ ان کی توجہ سرحدوں پر مرکوز تھی اور یہ قدم اس مفروضے کے تحت اٹھایا گیا تھا کہ مجرم کمیونسٹ ممالک کا رخ نہیں کریں گے کیونکہ مشرقی برلن نے طیارے کو اترنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا اور پھر قدرے تاخیر سے ہمیں یہ علم بھی ہوگیا کہ ایشی کاوا اور آسکر بنیتھم فرانس میں داخل ہوئے ہیں۔ ایشی کاوا ابھی تک نہیں مل سکا۔ ہوسکتا ہے اس نے اپنا نام اور حلیہ بدل لیا ہو مگر تم خود چوہے دان میں پھنسے ہو۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی احمق پیرس کا رخ بھی کرے گا۔"

"میرا نام آسکر بنیتھم ضرور ہے مگر طیارے کے اغوا سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔" میں نے اس کی پوری بات سننے کے بعد کہا۔

"اگر میں اپنے ملک میں ہوتا تو میں پولی گراف کی مدد سے تمہارا جھوٹ پکڑ لیتا مگر اس ملک میں میرا فیصلہ آخری ہوگا۔ اور میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ طیارے میں مارے جانے والوں کے لہو کا تاوان تمہارے گندے خون سے وصول کیا جائے۔"

"میرا ضمیر صاف ہے، میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں گا اور تمہاری زبان سے وہ سب کچھ اگلوا لوں گا جو تمہارے سینے میں دفن ہے۔"

"مجھے تو حیرت ہے کہ تم محض نام کی مشابہت پر یہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔"

"یہ نام ہی بہت کم سننے میں آتا ہے۔ اگر فلورا تمہیں نہ پہچانتی تو تمہاری رسی کچھ دن اور دراز رہتی۔ یہاں نام بدلنے کے بعد شاید تم باہر بھی ہو جاتے۔" وہ مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

فلورا کا نام آتے ہی میرے ذہن کے تاریک گوشے منور ہوگئے اور یاد آگیا کہ اس شخص کا چہرہ مجھے شناسا کیوں محسوس ہوا تھا۔ وہ فلورا کے ہمراہ ڈی ریمی کے ڈائننگ ہال میں موجود تھا مگر اس کے بعد میں نے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کر لی تھی اس لیے تفصیل سے اس مردود کا جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اگر مجھے بروقت یاد آجاتا کہ میں نے اسے فلورا کی میز پر دیکھا تھا تو میں کسی قیمت پر اس کے ہمراہ اس ویران جگہ نہ آتا۔

"تو یوں کہو کہ فلورا نے تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے۔"

"اسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں یہاں اسرائیلی مفادات کے تحفظ پر مامور ہوں۔ اس نے یہی بتایا تھا کہ تم اس کے لندن کے ساتھی ہو اور اس نے سرسری طور پر اپنی بہن کو تمہارا نام بھی بتا دیا اور نام سنتے ہی میں نے تمہارا کھوج نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ فلورا کو رخصت کرتے ہی میں نے تمہارے کمرے کی تلاشی لی تھی۔"

"تو کیا فلورا کی شہادت بھی تمہیں یقین نہیں دلا سکی کہ میں ابراہیم تمہیں لندن سے آیا ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ ایک آوارہ منش عورت ہے تمہاری ذات میں ایسی لڑکیوں کے لیے خاصی کشش ہے تم نے اسے جو بتایا وہ اس پر ایمان لے آئی۔"

"مجھ سے مزید بات کرنے سے قبل اگر تم ڈی ریمی سے میرا پاسپورٹ حاصل کر لو تو مناسب ہوگا۔ اس کے اندراجات سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کبھی اسرائیل نہیں گیا۔" میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آسکر بنیتھم، انگلولانڈریمن، ڈاکٹر اور یہودی نژاد، لندن میں مرجود... اتنے اتفاقات کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔"

"مگر ہوگئے ہیں۔"

"اوتوموکیدا، بنجامن، موچی سوتو، نکوداکی اور ایشی کاوا کہاں ہیں؟" شوارٹ نے سخت لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"تم جو جواب سننا چاہتے ہو مجھے بتا دو، میں وہی دہرا دوں گا۔" اس نے اچانک گولی چلا دی اگر میں بروقت ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو صوفے کی پشت گاہ کی بجائے میرا اپنا بازو ادھڑ گیا ہوتا۔

"غیر ضروری باتوں میں میرا وقت برباد نہ کرو۔" وہ غرایا۔

"اول تو میں ان لوگوں کا ساتھی نہیں ہوں اور بفرض محال میں ہوتا بھی تو ان میں سے کوئی اتنا احمق نہیں ہوگا جو دوسروں کو اپنی راہ فرار سے باخبر کرتا۔"

"تو ان میں سے اس وقت تمہارے کتنے آدمی موجود ہیں؟"

"اسرائیل میں اس وقت میری ہمدردیاں بھی اسرائیل کے ساتھ ہیں اور میں تمہیں کچھ سود مند باتیں بھی بتا سکتا ہوں مگر تم اپنے جاننے والوں سے بے سود ہے مسٹر شوارٹ!" میں نے کہا۔ "میرے بے اشتعال دلانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"مجھے اشتعال میں آکر تو دیکھو۔" وہ ریوالور کی نال میری پیشانی کی طرف کر کے حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

"میں مجسم جو واقع ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں بالکل نہتا ہوں۔"

"یہ جتانے کی ضرورت نہیں، میں راستے میں ہی تمہارا بدن ٹٹول چکا ہوں۔" وہ فخریہ انداز میں بولا۔ "کوٹ کی داہنی جیب میں شیشی کیسی ہے؟"

"او خدا، تو تم اپنا پورا اطمینان کر چکے ہو اور تمہیں اس شیشی کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا ہے!" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ شیشی کیسی ہے؟" اس نے غرا کر سوال دہرایا۔

"کپڑوں سے دھبے دور کرنے والے سیال کی شیشی ہے۔"

"اور تم اسے جیب میں لیے پھرتے ہو؟" وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "میں پوچھتا ہوں کیا بھرا ہوا ہے اس میں؟"

"تم چاہو تو اسے آزما سکتے ہو!" میں نے پیشکش کی۔ "تمہارے قالین پہ برانڈی وغیرہ کے دھبے نظر آرہے ہیں۔"

"تم بھی اس احمقانہ تجویز کو عملی جامہ پہنا دو تو بہتر ہوگا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "مگر کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش کی تو بے دریغ بھیجا اڑا دوں گا۔"

"اس کا مجھے اندازہ ہے، اجازت ہو تو شیشی نکال لوں؟"

اس نے سر کو جنبش دے کر مجھے اجازت دے دی۔

میں وہ بیش قیمت شیشی نکال کر قالین پر ایک دھبے کے قریب بیٹھ گیا پھر میں نے شیشی دبا کر دھبے پر ہلکا سا اسپرے کیا۔ چند سیکنڈ میں بخارات فضا میں تحلیل ہوگئے اور قالین کا وہ حصہ چمکنے لگا۔

پلاسٹک کی اس شیشی کا سنہرا ڈھکنا دبا کر میں اس وقت باآسانی پوٹاشیم سائنائیڈ میں بجھی ہوئی سوئیاں فائر کر سکتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے شوارٹ مجھ سے کافی دور تھا جبکہ فضا میں اڑنے والی ہولناک سوئیاں زیادہ سے زیادہ بارہ فٹ کے فاصلے تک کام کر سکتی تھیں۔

"اگر چاہو تو تمہاری پتلون کے پائینچے بھی صاف کر دوں۔" میں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اس سفاک بھیڑیئے سے کہا۔

"میری طرف قدم بڑھایا تو اچھا نہ ہوگا۔"

"تمہاری یہ احتیاط غیر ضروری سی ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں ساتھ لیے بغیر میں اس عمارت سے زندہ نہ جا سکوں گا۔"

"اس عمارت سے تمہیں شایان شان طریقے سے باہر بھیجا جائے گا۔"

"اور تم غلط فہمی کا شکار ہو مسٹر شوارٹ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں تمہیں کس طرح اپنی بے گناہی کا یقین دلا سکتا ہوں۔"

"یقین دلانے کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ اپنی جگہ اڑا ہوا تھا۔ "تم نہایت نڈر آدمی ہو اور موت سے ذرا بھی خائف نہیں ہو۔"

"میں اپنا دعویٰ واپس لیتا ہوں۔"

"میں اپنے فیصلے بدلنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"آخر تم میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"تمہیں طویل بے ہوشی کا انجکشن دینے کے بعد ایک مضبوط آہنی شکنجے میں کس دوں گا اور پھر وہ آہنی شکنجہ ایک چوبی کریٹ میں بند کر کے ایئر فرانس کی پیرکارگو سروس سے تل ابیب روانہ کر دوں گا۔ اور تمہیں وصول کرنے والے ہی تمہارے مقدر کا بہتر فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔"

"شاید میرے لیے ان لوگوں کو مطمئن کرنا آسان ہوگا۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا حالانکہ شوارٹ کے آخری الفاظ نے مجھے نہایت خوفزدہ کر دیا تھا۔

اسرائیل سے میں اپنی جان پر کھیل کر نکلا تھا مگر شوارٹ دوبارہ مجھے مقتل کی طرف بھیجنے پر تلا ہوا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد میرے لیے ناممکن تھا کہ میں اسرائیلی حکام کو کوئی فریب دے سکتا۔ ان کے پاس میرے بارے میں اتنی معلومات جمع تھیں کہ وہ فوراً ہی مجھے صفدر علی کی حیثیت سے پہچان لیتے اور پھر میرے پاس اپنے بہروپ اور اسرائیل سے اخراج کا کوئی معقول جواز نہ ہوتا اور میں ماریا کے قتل کے مسلمہ جرم میں ناقابل برداشت سزاؤں کا شکار ہو جاتا۔

"دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر اس طرف چلو۔" اس نے ریوالور کی نال سے مکان کے اندرونی حصے میں کھلنے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں پھر کہتا ہوں کہ مزید کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ڈی ریمی میں میرا پاسپورٹ دیکھ لو تو تمہیں میری بے گناہی کا یقین آجائے گا۔" میں نے اس کی ہدایت کے مطابق ہاتھ اٹھا کر اندرونی دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" وہ میرے پیچھے آتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔ "اور ابھی تو مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ فلورا تمہارے بارے میں کیا کچھ بتا سکتی ہے؟"

"تو تم اس پر بھی تشدد کرو گے؟"

"تشدد کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی، اس کی بہن سے میرے بہت پرانے اور مضبوط مراسم ہیں۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"اب تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟" دروازے سے گزر کر میں نے ایک راہداری کے وسط میں رکتے ہوئے سوال کیا۔

"داہنی طرف تیسرے کمرے میں داخل ہو جاؤ، وہاں تم اپنی تکان دور کر سکو گے۔ ایئر فرانس کی کارگو سروس منگل کو تل ابیب کے لیے روانہ ہوگی۔"

میں خاموشی کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے کمرے میں داخل ہوگیا میں نے کوشش کی تھی کہ کمرے میں گھستے ہوئے دروازے کی اوٹ میں چھپ جاؤں اور جب وہ کمرے میں داخل ہو تو زہریلی سوئی اس کے بدن میں اتار دوں مگر وہ بہت مکار تھا اور میرے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میرے

عقب میں پہنچ چکا تھا۔

"بالکل سیدھے جا کر کمرے کے وسط میں رک جاؤ۔" محدود فضا میں اس کی آواز گونجی پھر ننگے فرش پر اس کے نپے تلے قدموں کی آواز قریب آتی گئی۔

اس کمرے میں چودہ پندرہ فٹ بلند سپاٹ دیواروں میں دو روشندان بنے ہوئے تھے اس کے علاوہ ایک بند دروازہ نظر آ رہا تھا جو شاید ملحقہ غسل خانے میں کھلتا تھا۔ اس کمرے میں مسہری کے علاوہ ایک ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی جس پر غبار کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔

"تم اسرائیلی مفادات کے بارے میں کچھ سود مند انکشافات کا دعویٰ کر رہے تھے۔" اس نے مجھ سے دور دروازے میں رکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ میں تمہیں اپنی کسی بات کی معقولیت کا یقین نہ دلا سکوں گا۔" میں نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔

"خاصے سمجھدار ہو۔" اس نے یہ کہا اور باہر نکل کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر مجھے قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور اس کے بعد شوارٹ کے قدموں کی چاپ سناٹے میں معدوم ہوتی چلی گئی۔

میں شکست خوردہ انداز میں مسہری پر بیٹھ گیا۔ مسہری پر بیٹھتے ہی فضا میں غبار کی ہلکی تہہ اڑی اور میں بستر سے اٹھ گیا۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کمرہ طویل عرصے سے خالی پڑا تھا مگر گرد و غبار کے باوجود مکان میں نظر آنے والی صفائی حیرت ناک تھی۔

اگر شوارٹ اس وسیع و عریض حویلی میں تنہا رہ رہا تھا تو یہ بات حیرتناک تھی کہ وہ صفائی ستھرائی اور دیگر روزمرہ ضروریات کیسے پوری کرتا ہو گا جب کہ بظاہر وہ عمارت بالکل ویران نظر آ رہی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں شوارٹ کے مصرف میں آنے والے کمروں اور راستوں کی بتیاں ہمیشہ جلتی رہتی تھیں۔

پھر میرا ذہن کتوں کی طرف مبذول ہو گیا۔ اول تو اس کمرے کی ساخت ایسی تھی کہ فرار کا خیال ہی احمقانہ نظر آتا تھا۔ چھتوں کے قریب بنے ہوئے روشندانوں تک رسائی ناممکن تھی اور باتھ روم میں تو سرے سے کوئی کھڑکی ہی نہیں تھی۔ اگر بالفرض محال میں کمرے سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو میرے لیے عمارت سے باہر قدم نکالنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں زہریلی سوئیوں سے دو چار کتوں سے تو نمٹ سکتا تھا مگر وہ پورے سات تھے اور اس قدر خونخوار کہ مجھے مہلت دیئے بغیر چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔

اس کمرے میں چیخ پکار کر قرب و جوار کے لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش بھی بے سود ثابت ہوتی کیونکہ مکانات ایک دوسرے سے بہت زیادہ فاصلے پر واقع تھے اور درمیان میں جنگل نما گھنے باغات پھیلے ہوئے تھے اس قسم کی کوئی حرکت شوارٹ کو بھی بہت زیادہ مشتعل کر سکتی تھی۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال پیدا ہوا۔

شوارٹ کے پالتو کتے اس کی آواز اور بُو سے مانوس [illegible] شوارٹ کے ساتھ بآسانی باہر نکل سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری [illegible] شوارٹ زندہ ہی ہوتا۔ میں اس کی لاش کندھے پر لاد کر بھی [illegible] باہر نکل سکتا تھا۔

مگر میری خوش خیالی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ شوارٹ بلا کا [illegible] تھا۔ اسے زیر کرنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر غیر یقینی حالات میں گھر گیا تھا۔ [illegible] کے ساتھ بستر سے گرد صاف کی، کوٹ اور جوتے اتار کر [illegible] زہریلی سوئیوں والی شیشی تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر دراز ہو [illegible] نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ طبیعت [illegible] نوشی کی طرف مائل تھی مگر میرے پاس موجود پیکٹ میں [illegible] رہ گئی تھیں۔ اور اس ضمن میں مجھے شوارٹ سے کسی فیاضی کی [illegible] لہٰذا میں طبیعت پر جبر کیے رہا۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد جب طلب نے شدت [illegible] نے سگریٹ سلگائی۔ دو کش لگاتے ہی اچانک میرے ذہن [illegible] تدبیر آئی اور میں اچھل پڑا۔

میں نے کمرے میں جلتی ہوئی دونوں بتیاں بند کر دیں [illegible] قدر بھرپور اندھیرا پھیل گیا کہ میرے لیے چند فٹ دور کی چیز دیکھنا [illegible] کر رہ گیا۔

میرے لیے وہ تاریکی بہت خیال انگیز اور کارآمد تھی۔

میں نے ایک بلب روشن کر دیا اور دوسرا بلب ہولڈر [illegible] سے آگے ترکیب بہت سادہ تھی۔

میں نے بلب پر ایک سکہ رکھ کر بلب ہولڈر میں لگا دیا [illegible] نے اس بلب کا سوئچ آن کیا، کمرہ ایک مرتبہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا [illegible] میں ٹٹولتا ہوا مسہری پر جا پہنچا۔

اس حویلی نما عمارت کا طرز تعمیر جس دور کی ترجمانی کرتا تھا [illegible] مجھے قوی امید تھی کہ ساری عمارت کا برقی نظام ایک مشترکہ فیوز [illegible] مشترکہ فیوز کی صورت میں اس وقت پوری عمارت میں اندھیرا ہو [illegible] اور بلب سے سکہ نکالے بغیر فیوز باندھنے کی ہر کوشش ناکام ثابت [illegible] ایسی صورت میں شوارٹ کی آمد پر میرے لیے دفاع اور [illegible] موجود ہوتے۔ شام ڈھلے تو وہ کمرہ مکمل طور پر تاریک ہوتا مگر دن میں [illegible] کے بغیر دھندلکا ہی نظر آتا۔

لیکن اگر اس عمارت میں ہر کمرے کا علیحدہ فیوز تھا تو میرے [illegible] تاریکی کا بقیہ عمارت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

فیوز اڑانے کے بعد کافی دیر گزر گئی مگر کوئی ردِعمل سامنے [illegible] کان اس وقت عمارت میں کوئی خفیف سی آواز سننے کے تیار تھے [illegible]

[illegible] مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے وہ کسی بے جان مخلوق کا آسیبی مسکن ہو۔ اس روح فرسا ماحول میں انتظار کی گھڑیاں طویل ہونے کے ساتھ ہی میری بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔

آخر کار میں نے دروازہ پیٹ کر شور مچانا شروع کر دیا۔ "میرے کمرے میں اندھیرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

[illegible] میں وقفے وقفے سے شور مچاتا اور دروازہ پیٹتا رہا۔ آخر کار میری کوششیں بار آور ہوئیں اور حویلی کے کسی دور افتادہ حصے سے کسی کی خوابناک آواز سنائی دی۔ وہ شخص شاید گہری نیند سے بیدار ہوا تھا کیونکہ اس کے لہجے میں خمار کے ساتھ جھلاہٹ بھی نمایاں تھی مگر اس کا مفہوم میرے پلے نہ پڑا کیونکہ اس نے جو کچھ کہا تھا فرنچ میں کہا تھا۔ اور وہ یقینی طور پر شوارٹ کی آواز نہیں تھی۔

چند ثانیوں کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی لیکن در و دیوار میں گونج ابھی باقی تھی۔ میں نے جواب دینے والے کو اشتعال دلانے کے لیے ایک بار پھر چلانا شروع کر دیا۔

اس بار بھی وہ شخص فرنچ میں ہی دھاڑا تھا۔ میں مفہوم تو نہیں سمجھ سکا مگر ثقیل تلفظ اور چھوٹے فقروں کی بنا پر یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ وہ گالیاں بک رہا تھا۔ میرے لیے اس عمارت میں شوارٹ کے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا انکشاف نہایت حیرت ناک تھا۔ وہ جو بھی تھا نہایت صابر و شاکر معلوم ہوتا تھا۔

اس شخص کی آواز معدوم ہوتے ہی عمارت کے کسی حصے میں قدموں کی ہلکی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ ان پُرخطر حالات میں میری سماعت بہت حساس ہو چکی تھی اور میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آنے والا ربر کے سول والے جوتے یا سلیپر پہنے پیروں کو گھسیٹتے ہوئے چل رہا ہے۔

میں دروازے کے ساتھ لگا انتظار کر رہا۔ وہ آہٹیں بہت آہستگی کے ساتھ قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں۔

پھر مجھے کسی کی واضح بڑبڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ مکمل سناٹے میں آنے والے کی آوازیں بہت واضح تھیں پھر شاید وہ دروازے پر آ کر رک گیا۔

فرش اور دروازے کے درمیانی خلا میں سے اچانک روشنی اندر آنے لگی تھی جبکہ اس سے پیشتر وہاں بھی اندھیرا ہی تھا۔

تالے میں چابی گھومنے کے بعد آنے والے نے پوری قوت سے دروازے کے دونوں پٹ اندر دھکیل دیئے۔ اگر میں پھرتی کے ساتھ دیوار سے نہ جا لگتا تو دروازے کے پٹ سے میری کھوپڑی ضرور پچک جاتی۔ دروازے کے باہر سے ٹارچ کی روشنی [illegible] میرے خالی بستر پر گئی اور وہیں مرکوز ہو کر رہ گئی۔

[illegible] صورت حال بڑی غیر یقینی تھی جس کے لیے میں پہلے سے تیار نہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ آنے والا دروازہ کھولتے ہی جھلاہٹ میں اندر داخل ہو گا اور میں [illegible] گردن کا مگر وہ اتنا اناڑی نہیں تھا۔

[illegible] کھڑے کھڑے فرنچ میں غرانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ کچھ [illegible] دم سادھے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ میرا ہلاکت خیز ہتھیار [illegible] ضرورت پڑنے پر اسے استعمال کرنے کے لیے تیار تھا۔

ٹارچ کی محدود مگر طاقتور روشنی کا دائرہ آہستہ آہستہ کمرے میں گردش کر رہا تھا۔ میں نے آنے والے کی صحیح پوزیشن کا اندازہ لگانے کے لیے نہایت خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اپنی قمیض کی آستین سے ایک دھاتی بٹن نکالا اور روشنی کا دائرہ دور ہوتے ہی آہستہ سے مسہری کے عقب میں اچھال دیا۔

بٹن کے فرش پر گرتے ہی روشنی کا دائرہ تیزی سے حرکت میں آیا اور اسی کے ساتھ ایک طاقتور جھٹکے کے ساتھ بیرونی راہداری سے ایک شعلہ فضا میں تیرتا ہوا مسہری کے گدے میں پیوست ہو گیا۔ اور روشنی اس طرف مرکوز ہو گئی۔

میری اس حرکت نے آنے والے کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا۔ روشنی کی حرکت کا دائرہ مسہری کے اطراف میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے یہی خیال رہا ہو گا کہ میں مسہری کے عقب میں دبکا ہوا تھا۔

اس نے اپنے بے آواز ریوالور سے ایک اور فائر کیا۔ اس بار فائر شاید نیچے بیٹھ کر کیا گیا تھا کیونکہ شعلہ زمین سے چند انچ کی بلندی پر تیرتا ہوا مسہری کے نیچے داخل ہوا تھا مگر دوسری طرف نکلنے کے بجائے فرش میں گھس گیا تھا۔

میرے لیے مشکل یہ تھی کہ مسہری جس سمت میں رکھی ہوئی تھی میں اسی طرف والے پٹ کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔ اس شخص کی نگاہیں لازمی طور پر روشنی کے دائرے کے ساتھ گردش کر رہی تھیں جو مسلسل مسہری کا طواف کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں اگر میں اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے اپنی جگہ سے نکلتا تو میرے وار سے پیشتر وہ مجھے دیکھ لیتا۔ البتہ دروازے کے پٹ کی جانب سے روشنی کی زد میں آئے بغیر دبے پاؤں باہر نکل کر اسے شکار کیا جا سکتا تھا۔

پھر اس نے فرش سے قدرے قریب ہاتھ رکھ کر مسہری کے نیچے سے گولی گزار کر دوسری طرف مجھے نشانہ بنانے کے لیے فائر کیا اور جھٹکے کے ساتھ بے اختیار میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

وہ شاید میری کسی پوشیدہ حس کا کرشمہ تھا کیونکہ فرنیچر سے محروم اونچی چھت والے اس وسیع و عریض کمرے میں میری آواز کی گونج اس قدر گمراہ کن تھی کہ وہ میری موجودگی کی سمت کا اندازہ نہ کر سکا اور یہ سمجھ کر تیزی سے اندر لپکا کہ اس نے مجھے مار لیا۔

جیسے ہی اس کا تاریک ہیولا روشن ٹارچ کے پیچھے دروازے کے پٹ سے آگے نکلا، میں نے شیشی کا سنہری ڈھکن نیچے دبایا اور زہر آلود سوئی اس کے بدن کے کسی حصے میں پیوست ہوتی چلی گئی۔

سوئی بدن میں اترتے ہی وہ تیزی سے پلٹا مگر اس سے آگے وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کی شریانوں میں سرایت کرنے والا پوٹاشیم سائنائیڈ اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ وہ اندھیرے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پُرشور آواز کے ساتھ فرش پر آ رہا۔

میں نے بڑھ کر فرش پر گری ہوئی ٹارچ اٹھا لی اور اس کے داہنے ہاتھ سے سائلنسر چڑھا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور بھی نکال لیا اور پھرتی سے مسہری کے نیچے چلا گیا۔

اگلا قدم اٹھانے سے پیشتر میں اس بات کا پورا یقین کر لینا چاہتا تھا کہ

اس وقت عمارت میں میرا کوئی اور حریف نہیں ہے۔

تاریکی میں میری رسٹ واچ کے روشن ڈائل پر سوئیاں تین بجانے والی تھیں۔ مجھے سیڑھی کے عقب میں اندھیرے میں دبکے کئی منٹ گزر گئے مگر پوری عمارت میں کہیں بھی کوئی آواز سنائی دی۔ ہر طرف موت کا بھیانک سکوت طاری تھا البتہ کبھی کبھار احاطے میں ابھرنے والا جھینگروں کا شیشی شور فضا کا سینہ مجروح کر دیتا تھا۔

میں اپنی جگہ سے نکل آیا اور ٹارچ روشن کر کے اپنے تازہ شکار کا جائزہ لینے لگا۔

وہ کوئی فرنچ ہی تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب رہی ہوگی مگر اس کا بدن بہت مضبوط تھا اس کے چہرے پر پرانے زخموں کے کئی خوفناک نشانات بھی موجود تھے جو اس بات کے غماز تھے کہ وہ شرفا کے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس کے بدن پر ڈھیلا ڈھالا سلیپنگ سوٹ موجود تھا جس کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔

عمارت میں اتنے شور کے باوجود شوارٹ کے نظر نہ آنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا ورنہ اس جیسے تجربہ کار شخص کیلئے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے فائر کے کھٹکوں کو پہچان لینا بہت آسان تھا۔ اگر وہ عمارت میں موجود ہوتا تو تین فائروں کے بعد ابھرنے والی چیخ اسے جائے واردات پر کھینچ لانے کیلئے کافی تھی۔

پہلے میں نے مرنے والے کی لاش کو چارہ بنا کر کتوں کو ختم کرنے کا ارادہ کیا مگر اس طرح شوارٹ زندہ رہ جاتا اور میں اپنی آزادی کے اس مہیب خطرے کو مٹا دینا چاہتا تھا۔

میں نے اس لاش کو برآمدے میں ڈال کر خود ڈرائنگ روم میں گھس جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اگر کتے مرنے والے سے مانوس نہ ہوتے تو فوراً اس کی طرف لپکتے اور اگر مانوس ہونے کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو میں سیٹی بجا کر یا ہنکار کر انہیں اندھیرے سے نکلنے پر مجبور کرتا اور وہ لاش کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس کے بعد انہیں یکے بعد دیگرے ٹھکانے لگانا بہت آسان تھا اور باہر نکل سکتا تھا۔

مگر میرے لیے شوارٹ کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو گیا تھا۔ ابتداء میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری شامت مجھے جینوا سے ہیکیلی مینس کی اس ویران حویلی تک لائی ہے مگر اب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شوارٹ کی موت میرے ہاتھوں لکھی گئی تھی اتنی رات گئے اپنی قیام گاہ سے شوارٹ کی غیر حاضری اس بات کی غماز تھی کہ وہ کسی اہم مشن پر گیا ہوا تھا اور اس کی واپسی کسی بھی وقت ہو سکتی تھی۔

اسے پوری طرح بے بس کر کے موت کے منہ میں دھکیلنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی واپسی سے پہلے روشنی بجھا دی جاتی۔ لہٰذا میں نے ہونٹوں میں لگا یا ہوا سگار واپس نکالا اور فرش پر پڑی ہوئی لاش کی پشت دروازے کی طرف کر کے اسے بستر پر ڈال کر بچھی ہوئی چادر اس پر الٹ دی۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سونے والے نے خنکی سے بچنے کے لیے چادر کا ایک حصہ اپنے بدن پر

لپیٹ لیا ہو۔

اس ویران اور اندھیری عمارت میں ایک اکڑی ہوئی لاش کچھ ایسی خوشگوار نہیں تھی کہ میں زیادہ دیر تک وہاں رکا رہتا۔ کی ہول میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ مقفل کر کے چابی جیب میں ڈالی اور احتیاط سے عمارت کی تلاشی لینے لگا۔

کمرہ چھوڑنے سے پہلے میں نے اپنے جوتے وغیرہ کے نشانات وغیرہ بھی صاف کر دیئے تھے جن سے کسی بھی طرح میری ذات پر زد پڑتی ہو۔

عمارت میں مجھے کسی خاص چیز کی تلاش نہ تھی۔ میں بس یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہاں کوئی اور تو موجود نہیں تھا۔ قطار در قطار کمروں اور راہداریوں سے ہوتے ہوئے کچن میں مجھے بجلی کی تنصیبات نظر آ گئیں اور میں وہاں پہنچ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس دقیانوسی مکان میں عام فیوز کے بجائے سرکٹ بریکر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کا بٹن دبا یا اور فوراً ہی روشنی پھیل گئی۔

میں باہر نکلا تو ساری عمارت جابجا روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں باقی ماندہ کمروں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخلی دروازے کے قریب دیوار سے پشت لگا کر قالین پر اس طرح بیٹھ گیا کہ دروازہ کھلنے پر میں اس کی اوٹ میں آ جاؤں۔

وہاں بیٹھے بیٹھے میں گزرے ہوئے حالات اور واقعات پر غور کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اچانک ایک نئے پہلو نے سر ابھارا۔

ال ایل کے طیارے کے اغوا کے دوران میں جو دوا استعمال کی گئی تھیں ان پر زہریلی سوئیاں آزمائی گئی تھیں پھر اگر شوارٹ اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں بھی اسی حالت میں دریافت ہوتیں تو حکام یہی نتیجہ اخذ کرتے کہ اغوا کنندگان یا ان کے ہمدرد نیس میں موجود ہیں۔ لہٰذا وہ شہر پہلے سے زیادہ مخدوش ہو جاتا۔

شوارٹ کی غیر متوقع دخل اندازی کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ میں جلد از جلد نیس سے نکل جاؤں۔ اس ضمن میں مجھے یہ امید بھی تھی کہ زہریلی سوئیوں والے خون خرابے کا راز جلدی فاش نہ ہو سکے گا۔

شوارٹ کتوں کی تعریف کے دوران میں بتا ہی چکا تھا کہ اس کے ہاں بن بلائے مہمان کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ اب اگر وہ حویلی شوارٹ سمیت ویران ہو جاتی تو یہ امکان بھی تھا کہ لاشیں وہیں پڑے پڑے گل سڑ جاتیں اور کسی کو واردات کا علم نہ ہو پاتا۔ عمارت میں پیدا ہونے والا تعفن بھی یہاں کسی کو محسوس ہونا ناممکن تھا البتہ شوارٹ کی طویل غیر حاضری سے کوئی شناسا یا رشتہ دار ادھر آ نکلتا تو راز سے پردہ اٹھ جاتا اور اگر وہ کرایہ دار بھی تھا تو جب تک مالک جائیداد کا کوئی ہرکارہ واجبات کے لیے ادھر کا رخ نہ کرتا یہ گتھی اسی طرح پوشیدہ رہتی۔

میں آنکھیں پھاڑے مسلسل وہیں بیٹھا رہا مرنے والے

کی زہریلی سوئیوں والی شیشی میری گود میں رکھی ہوئی تھی کہ اچانک باہر سے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔

بالآخر وہ فیصلہ کن وار کا وقت قریب آ گیا اور میں دیوار سے چپک کر بالکل مستعد ہو گیا۔ میں نے شیشی جیب میں ڈال کر ریوالور تھام لیا۔

پورچ میں کار کا انجن تیزی سے غرایا پھر اگنیشن آف کر دیا گیا اور میرے کان باہر ابھرنے والی آہٹوں پر لگ گئے۔

چند ثانیوں بعد کسی کے کراہنے کی مدھم سی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ بجری کی روش سے قدموں کی آواز پختہ سیڑھیوں سے گزرتی ہوئی برآمدے میں آ گئی۔ وہ جو بھی تھا، اس کی چال ناہموار اور بہکی بہکی سی تھی۔

میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو وہاں سوا چار بج رہے تھے، آنے والا شاید مقتل کی رات کا جشن منا کر نشے میں دھت آ رہا تھا۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر قدموں کی چاپ ٹھہر گئی، دروازے کا ہینڈل گھمایا گیا مگر دروازہ نہیں کھولا گیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، کنپٹیوں میں سنسناہٹ ہونے لگی شاید آنے والے کو حالات کی کچھ بھنک مل گئی تھی اور وہ چوکنا ہو گیا تھا۔

میرا جی چاہا کہ اچانک دروازہ کھول کر اسے گریبان سے اندر گھسیٹ لوں مگر اس وقت ذرا سی بے احتیاطی کھیل بگاڑ سکتی تھی۔

آنے والے نے باہر چند ثانیوں کا توقف کیا پھر دروازہ کھول کر کراہتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل چھوڑا اور اسپرنگ کے زیر اثر دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا۔ وہ مڑے بغیر کراہتا اور لنگڑاتا ہوا اندر جا رہا تھا۔

میں اس کی پشت پر خاموشی کے ساتھ دیوار سے چپکا اسے دیکھتا رہا۔

اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ اس کا لباس گرد آلود ہو رہا تھا اور دائیں ران شاید بری طرح زخمی تھی کیونکہ پتلون کا داہنا حصہ خون میں تر ہو رہا تھا اور جوتے سے خون کی بوندیں قالین پر بھی ٹپک رہی تھیں۔

"شوارٹ!" میں نے ریوالور کی نال سیدھی کر کے اسے پکارا اور اپنی جگہ سے چند قدم بڑھ کر اس کی پشت پر پہنچ گیا۔

وہ بری طرح بھڑک کر پلٹا اور زخم میں اٹھنے والی ٹیس پر اس کے حلق سے دردناک کی آواز آزاد ہو گئی۔

اس کا چہرہ بری طرح ادھڑا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد اور ناک پر ورم ایسا تھا جیسے مل گئے ہوئے تھے جیسے اس کے چہرے پر بے تحاشا مکے برسائے گئے ہوں۔ اس کے ہونٹ اور رخسار کئی جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔

"تت.... تم!" مجھے دیکھتے ہی اس کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی اور اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے ناچنے لگے۔

"ہاں! میں!" میں نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "فرانسس کہاں ہے؟"

"اگر فرانسس زخم خوردہ چہرے والے کا نام ہے تو وہ میری جگہ ہو رہا ہے" وہ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر لگی ہوئی لنترانیوں والی تصاویر پر

شوارٹ کے بگڑے ہوئے چہرے کا موازنہ کرتے ہوئے بولا۔

"تو تم نے اسے مار دیا؟" وہ کراہتا ہوا میں قالین پر بیٹھ گیا "میری حالت بہت ابتر ہے خدا کے لیے مجھے تھوڑی سی برانڈی لا دو۔"

"تمہیں مارنے والے نے میری شدید حق تلفی کی ہے شوارٹ اب میں تمہیں ہلاک ہی کر سکتا ہوں تمہارا حلیہ بگاڑنے کی تو گنجائش ہی نہیں رہی۔"

"برانڈی، تھوڑی سی برانڈی!" وہ ہونٹوں کے زخموں کو زبان سے تر کرتے ہوئے بولا "میرا حلق سوکھ رہا ہے!"

"پیاسا مارنا میرے مسلک میں روا نہیں ہے!" میں نے کہتے ہوئے ایک تپائی پر رکھی ہوئی بوتل اس کی طرف بڑھا دی جس میں منی پلانٹ لگا ہوا تھا

"برانڈی نہیں دو گے؟" وہ کراہا۔

"بیل پھینک کر یہی پانی پی لو تم جیسے مکار اور ظالم شخص کو میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے بوتل میں سے بیل نوچ کر قالین پر پھینک دی اور سارا پانی اپنے معدے میں اتارتا چلا گیا۔

خالی بوتل قالین پر ڈال کر وہ چند ثانیوں تک ہانپتا رہا پھر بولا "خدا کے لیے مجھے مت مارو، میں خود تمہیں کتوں سے بچا کر نکال دوں گا اور کبھی تمہارے بارے میں زبان نہیں کھولوں گا۔ مجھے معاف کر دو۔"

"کتوں کی فکر نہ کرو، میں تمہاری لاش کندھے پر ڈال کر نکلوں گا تو وہ بھی خوش ہوں گے، یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ حشر کیسے ہوا؟"

”تمہارا ساتھی زندہ ہے، بالکل زندہ۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

”کس سے ٹکرا گئے تھے؟“

”میں سب کچھ بتا دوں گا مگر میری جان بخشی کر دو۔“

”اسرائیل کی خدمت نہیں کرو گے؟“

”جہنم میں گیا اسرائیل۔“ وہ جھلا کر بولا۔ ”آج میں نے اپنی زندگی کی بدترین زک اٹھائی ہے اور مرتے مرتے بچا ہوں۔“

”وہ کسر میں پوری کروں گا۔“

”خدا کے لیے میری حالت پر رحم کرو۔“ وہ گڑگڑایا۔ ”کیا میرے لیے اتنی سزا کافی نہیں ہے؟“

”اپنی کہانی شروع کرو۔“ میں غرایا۔

”میں ڈیوکزیم بیورو کا مصنوعی شناختی کارڈ لے کر ہوٹل ڈی ریجی کے منیجر کے پاس گیا تھا۔“ اس نے خوفزدہ نظروں سے ریوالور کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”ڈیوکزیم بیورو کیا بلا ہے؟“

”یہ فرانس کا محکمہ خفیہ ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”وہاں پہلے سے ایک شخص موجود تھا۔ میں نے منیجر سے تمہارے پاسپورٹ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ صاف مکر گیا اور اس نے کہا کہ آسکر بینتھم نام کا کوئی مسافر ڈی ریجی میں مقیم نہیں ہے۔ میں نے رجسٹر طلب کیا تو اس میں بھی کوئی اندراج نہ تھا اور کمرہ نمبر ننانوے خالی تھا۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا، پھر کہنے لگا۔ ”میں نے کمرہ نمبر ننانوے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ شخص اٹھ کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد میں منیجر کے ساتھ اوپر گیا تو تمہارا کمرہ خالی تھا۔ تمہارا بریف کیس وغیرہ وہاں سے غائب تھا۔ پھر میں وہیں کیبرے دیکھنے رک گیا۔ تین بجے واپس روانہ ہوا تو ویران شاہراہ شروع ہوتے ہی ایک سیاہ گاڑی نے آگے نکل کر میرا راستہ روک لیا اور پھر وہی شخص نیچے اترا جو ڈی ریجی کے منیجر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے گاڑی پیچھے لے جا کر بھاگنا چاہا لیکن اس نے مجھے موقع نہیں دیا اور میری گاڑی میں گھس آیا۔ وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا جب میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اس نے مجھے گھسیٹ کر مارنا شروع کر دیا۔ میں اسے زیر کر لیتا مگر اس کے پاس چاقو موجود تھا جس سے اس نے میرے پچھلے دھڑ پر کئی وار کر ڈالے۔ اسی دوران میں دور سے پولیس کی گشتی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ اور وہ مجھے اپنی گاڑی میں ڈال کر بھاگنے لگا لیکن میں کار چلتے ہی کود گیا اور بمشکل اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس شہر کی طرف بھاگ نکلا۔ میں گشتی پولیس سے بچتا بچاتا بہت لمبا چکر کاٹ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔“

”اسے میرے کمرے کی تلاشی کا علم تھا؟“

”ہاں اور اسے کسی طرح یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرا شناختی کارڈ جعلی تھا۔ بعض فلسطینی بہت چالاک ہوتے ہیں۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”وہ فلسطینی تھا؟“

”وضع قطع اور بول چال سے فرنچ معلوم ہوتا تھا مگر جب ویرانے میں ہاتھاپائی شروع ہوئی تو وہ عربی میں مغلظات بک رہا تھا۔“

اس کا قیاس درست معلوم ہو رہا تھا کیونکہ غصے کے بہترین اظہار کے لیے ہر شخص مادری زبان پر ہی انحصار کرتا ہے۔

”تو تم کو خود سے بڑا اشتدد پسند مل گیا آج؟“ میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

”میری حالت ۔۔۔۔۔۔!“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس وقت اسے ... سی قے آئی اور وہ نڈھال ہو کر قالین پر گر گیا۔

شاید اسے شدید اندرونی ضربات آئی تھیں۔ میں اس سے ... بھی معلوم کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت اس کا موقع نہیں تھا۔

”ابن حیان ان دنوں کہاں ہے؟“ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر ... ترین سوال دریافت کر ڈالا۔

”ڈاکٹر ۔۔۔۔ ڈاکٹر بلالو۔“ اس کے حلق سے ضعیف سی آواز نکلی۔

”میری بات کا جواب دو، ڈاکٹر بھی بلالوں گا۔“ میں نے نرم لہجے میں ...

اس نے امید اور بے یقینی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ ...

”.....کہ تم مجھے ہلاک نہیں کرو گے۔“

”یہ میرا وعدہ ہے۔“ میں نے خلوص دل سے کہا کیونکہ مجھے وہ چند لمحوں کا مہمان نظر آ رہا تھا۔

”پے ۔۔۔۔ پیرس!“ وہ ہچکی لے کر بولا۔

”کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟“ میں نے ریوالور رکھ کر اس کا سر دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر اوپر کرتے ہوئے سوال کیا۔

”میرڈیـ ۔۔۔۔۔!“ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک ہچکی کے ساتھ اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا اور میں نے اسے نیچے ڈال دیا۔

میں کچن میں برانڈی اور وسکی کی بوتلیں دیکھ چکا تھا۔ شوارٹ کے بے ہوش ہو جانے کے بعد میں کچن سے برانڈی کا ایک گلاس بھر لایا۔ اس سے قبل میں نے وسکی کی معقول مقدار اپنے معدے میں پہنچائی تھی۔

چمچے سے شوارٹ کے حلق میں میں نے تھوڑی سی برانڈی ٹپکائی۔ چند ثانیوں بعد اس نے بے ہوشی کے عالم میں وہ بھی خون کے ساتھ اگل دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شدید ضربات نے اس کو اندر سے ادھیڑ دیا تھا اور اس کا معدہ کوئی چیز قبول کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

میں اس کے اوپر جھکا دیر تک اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اس کی حالت سنبھلنے کے آثار نظر نہ آئے۔

وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا پھر اچانک اس کے نتھنوں سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔ اس کا پورا بدن ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کی نبضیں خاموش ہو گئیں۔

میں نے اس کی موت کا یقین کرنے کے بعد احتیاط سے اس کی لاش ڈرائنگ روم کے نزدیک برآمدے میں ڈال دی۔

کافی دیر تک مسلسل سیٹیاں بجانے کے بعد تنومند کتے متوجہ ہوئے۔ وہ شاید احاطے میں دور تک گشت کر رہے تھے۔

اپنے ساتھیوں کی محبت آمیز غراہٹیں سن کر جب ٹھٹکتے ہوئے کتے بھی ان سے آ ملے اور اپنے آقا کے بے جان بدن کو سونگھنے اور چاٹنے لگے تو میں نے جیب سے ہاتھ نکال کر ان کتوں پر زہریلی سوئیوں کی یلغار کر دی۔

وہ کتے جس حالت میں تھے اسی حالت میں گر کر ختم ہو گئے۔ تین نے بھاگنا چاہا اور چکراتے ہوئے مر گئے۔ دو کافی دور جا کر سیڑھیاں اترتے ہوئے دم توڑ گئے اور دبی دبی آواز نکال کر اپنے آقا کے شریک سفر ہو گئے۔

میں مزید چند منٹ تک ان کتوں کا جائزہ لیتا رہا لیکن وہ سخت جان جانور بھی اس سریع الاثر زہر سے نہ نپٹ سکے۔

میں خوف کی ایک ہلکی سی لہر کے ساتھ ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکل کر برآمدے میں ٹھہرا رہا۔ پھر شوارٹ کی لاش کو گھسیٹ کر اندر لے آیا۔

شوارٹ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ خون آلود تھی۔ اس طرف کا پائیدان بھی خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ پائیدان جھاڑیوں میں اچھال دیا اور کچن سے پانی لا کر نشست اچھی طرح صاف کر لی تاکہ اس کے خون کے دھبے میرے کپڑوں پر منتقل نہ ہو جائیں۔

گو میں نے گاڑی میں سے حتی الامکان خون کے تمام نشان صاف کر دیئے تھے مگر پھر بھی میں فوری طور پر روانہ ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ صبح سویرے ویران سڑکوں پر دوڑتی ہوئی گاڑی بآسانی پولیس کی کسی گشتی جماعت کی توجہ کا نشانہ بن سکتی تھی جبکہ دن طلوع ہو جانے کے بعد روانگی کی صورت میں ایسا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے معدے میں اتری ہوئی وسکی بھی اپنا اثر دکھا رہی تھی اور معدہ خوراک طلب کر رہا تھا۔ لہٰذا میں سیدھا کچن میں پہنچ گیا۔

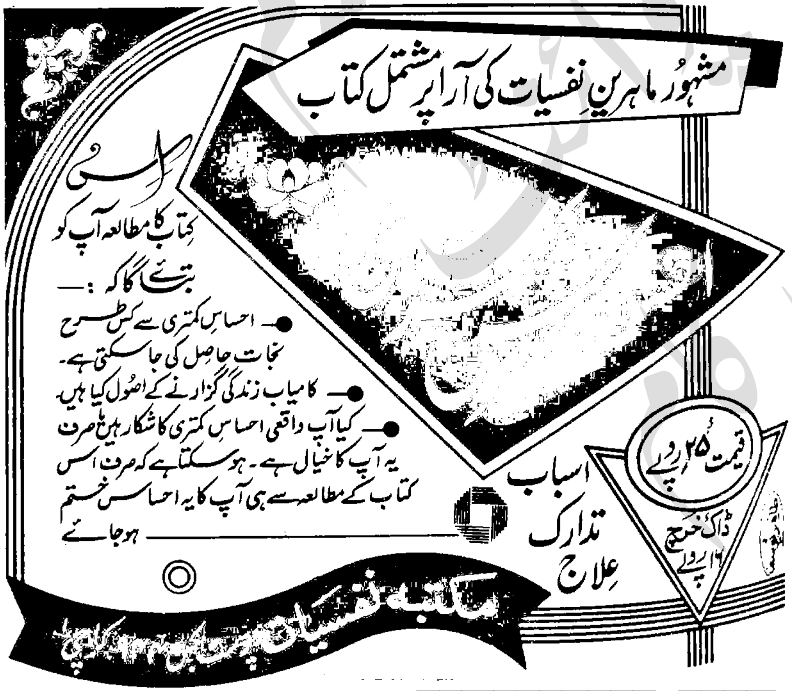
آملیٹ کے دو سینڈوچ اور چائے کی ایک پیالی کی تیاری میں مجھے خاصی دیر ہو گئی۔ جب میں ناشتے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ہلکا سا اجالا پھیل چکا تھا اور باغ بھانت بھانت کے پرندوں کی چہکار سے گونج رہا تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سات بجے میں شوارٹ کی گاڑی سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے شوارٹ سے ابن حیان کی فرانس میں موجودگی کی تصدیق کر لی تھی۔ شہر کا تعین بھی ہو چکا تھا اور شاید شوارٹ کے منہ سے نکلنے والا ادھورا لفظ میرڈیـن ہوٹل کی ہی نشاندہی کرتا۔

دوسری خوشی اس بات کی تھی کہ نیس میں میرا کوئی زبردست ہمدرد بھی موجود تھا جو میری سلامتی کے لیے دشمن کو لہولہان کر دینے کی ہمت رکھتا تھا۔

شہر میں داخل ہو کر میں نے شوارٹ کی سرخ بیجو ایک جگہ پارک کر دی اور چابی ڈیش بورڈ میں ڈال کر باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک ٹیکسی میں ہوٹل ڈی ریجی کی طرف جا رہا تھا جہاں ایک نیا ہنگامہ میرا منتظر تھا۔



ٹیکسی

میں سفر طے کرتے ہوئے میرا ذہن اپنے اس نادیدہ فلسطینی دوست میں الجھا رہا جس نے محض شبے کی بنا پر اپنی سلامتی کی پروا کیے بغیر ہنری شوارٹ کو صرف اس لیے گھیر لیا تھا کہ میں لاپتہ تھا اور ہنری شوارٹ میرے بارے میں معلومات جمع کرنے کی خاطر ہوٹل ڈی ریمی جا پہنچا تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ ہاتھ آیا ہوا شکار نکل جانے کے باعث میرا وہ نادیدہ فلسطینی دوست چین سے نہ بیٹھا ہوگا۔

ہنری شوارٹ گو میرے سامنے اپنے مکان میں سسک سسک کر دم توڑ چکا تھا مگر اس فلسطینی کی دانست میں وہ لہولہان ہونے کے باوجود بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسری طرف ڈی ریمی سے میں رات بھر لاپتہ تھا۔ یہ صورت حال میرے کسی بھی ہمدرد کو پریشان اور مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔

پھر اسی وقت اچانک مجھے یاد آیا کہ اوتومو نے اسرائیلی ایرلائن کے طیارے کے کامیاب اغوا کے بعد مجھے جو ہدایات دی تھیں ان کے مطابق ہوٹل ڈی ریمی کے منیجر کا نام بک ہارٹ تھا جب کہ مجھ سے ملنے والے شخص نے اپنا نام چارلس بتایا تھا۔

میں مسلسل تکان اور ذہنی صعوبتوں کے بعد اتنا بے حال تھا کہ ہوٹل ڈی ریمی اور منیجر کے عہدے کے بعد نام پر قطعی توجہ نہیں دی۔ جب کہ موجودہ صورتِ حال میں مجھے ہر احتیاطی تدبیر پر عمل کرنا ضروری تھا۔

میں چارلس کے بارے میں جتنا سوچتا گیا اسی قدر اس کی شخصیت مشکوک نظر آنے لگی۔ شاید میرے ڈی ریمی پہنچنے کا راز قبل از وقت فاش ہو گیا تھا اور بک ہارٹ کی جگہ چارلس نے ہوٹل کے منیجر کی جگہ سنبھال لی تھی۔ بھورے بالوں اور مکارانہ خدوخال کا مالک وہ فرانسیسی بہت خطرناک اور عیار معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ہفتے کی شام جس طرح مجھے سوتے سے بیدار کیا اس کی بنا پر میرے شبہات کو اور زیادہ تقویت مل رہی تھی۔

اس نے نیس کے رنگین ویک اینڈ کا بہانا تراش کر مجھے ہوٹل سے باہر ہانک دیا جہاں اس کے منصوبے کے مطابق شوارٹ نے مجھے اپنے دام میں الجھا لیا۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ ہنری شوارٹ نے مرنے سے قبل ڈی ریمی کے بارے میں جو کہانی سنائی وہ اس کی ذہنی اختراع تھی۔

وہ شاید کسی قمار خانے میں جھگڑے کا شکار ہوا تھا جہاں ذرا ذرا سی بے ایمانی پر خاصے معتدل مزاج جواری بھی خون خرابے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ شدید زخمی ہونے کی وجہ سے وہ سیدھا اپنے گھر دوڑا آیا لیکن ملازم فرانس کی موت کی خبر نے اسے پریشان کر دیا۔ اس کی اپنی حالت اس قدر ابتر تھی کہ اگر زندہ بھی بچ جاتا تو طاقت کے بل پر مجھے نہیں روک سکتا تھا۔

بنیادی طور پر شوارٹ نہ صرف یہودی تھا بلکہ اسرائیل کا کٹر وفادار بھی۔ محض انھی خواص کی بنا پر وہ فرانس میں اسرائیلی مفادات کے لیے سرگرم عمل تھا۔ مجھے ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر اس نے مجھے ڈی ریمی کے منیجر کے بارے میں ایک ایسی کہانی سنائی کہ میں رہا ہوتے ہی ہوٹل کا رخ کروں، چارلس مجھے دوبارہ کسی جال میں پھانس کر کسی مال بردار طیارے سے اسرائیل روانہ کر دے۔

میری دانست میں ہنری شوارٹ مرتے مرتے بھی اپنا وار کر گیا تھا۔ میں نے فوراً ٹیکسی رکوالی۔

ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے میں کسی پبلک فون بوتھ کی تلاش میں چل پڑا۔ اگلا قدم اٹھانے سے قبل میں ایک بار ہوٹل ڈی ریمی کے منیجر سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک جنرل اسٹور پر ٹیلی فون ڈائرکٹری سے ہوٹل ڈی ریمی کا فون نمبر حاصل کیا اور پھر فون بوتھ کی طرف ہو لیا۔

"ہوٹل ڈی ریمی۔" سلسلہ ملتے ہی دوسری جانب سے ایک سی نسوانی آواز سنائی دی۔

"میں منیجر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"منیجر اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔" دوسری طرف سے ادب آمیز لہجے میں جواب دیا گیا مگر بولنے والی کی انگریزی بہت کمزور تھی۔

"مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"آپ اپنا نام اور فون نمبر مجھے لکھوا دیجیے۔ منیجر آتے ہی آپ سے رابطہ قائم کر لے گا۔" اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"وہ جہاں بھی ہے اُسے تلاش کرو۔ میں دس منٹ بعد پھر فون کروں گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اسے بتا دینا کہ ہنری شوارٹ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔" بات ختم کرتے کرتے بھی میں نے ایک شوشہ چھوڑ دیا۔ مجھے یقین تھا وہ جہاں بھی ہوا، شوارٹ کا نام سنتے ہی ڈی ریمی بھاگا آئے گا۔

اپنی بات ختم کر کے میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس وقت بمشکل صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ شہر میں صرف جنرل اسٹور، ڈیری فارم کی مصنوعات کی دکانیں اور ہاکرز دکھائی دے رہے تھے، بقیہ دکانیں بند پڑی ہوئی تھیں۔

وہ نومبر کے ابتدائی ایام تھے اور فضا میں خاصی خنکی رچی ہوئی تھی۔ میں جیبوں میں ہاتھ اُڑس کر ایک طرف چل دیا۔

میں نے وہ دس منٹ نیس کی ویران سڑکوں پر چہل قدمی کرتے گزارے، پھر ایک فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔

"ہوٹل ڈی ریمی۔" اس بار بھی وہی مانوس اور دلربا آواز سنائی دی۔

"منیجر سے سلسلہ ملاؤ۔" میں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

"اوہ۔ مسٹر ہنری شوارٹ!" اس نے میری آواز پہچان کر گرمجوشی سے کہا۔ "مسٹر چارلس تمہارے فون کے منتظر ہیں۔"

"ہیلو۔" اس مرتبہ فون پر چارلس کی بھاری آواز سنائی دی۔ اس سے آگے اس نے جو کچھ کہا وہ میری فہم سے بالا تھا کیونکہ اس نے مدعا کے لیے فرنچ کا سہارا لیا تھا مگر اس کے لہجے سے برہمی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"کیا تم انگریزی نہیں بول سکتے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو؟" فون پر اس کی غراہٹ سنائی دی۔

"ہنری شوارٹ۔"

"بکواس۔" وہ دہاڑا اور میں نے جلدی سے ریسیور کان سے دور کر لیا۔

"تمہیں شبہ کیوں ہے میری جان؟"

"وہ فرنچ جانتا ہے۔ تم جو بھی ہو شوارٹ کو بتا دینا کہ البرٹو میرے قبضے میں ہے اور اگر میرا آدمی اتوار کا سورج غروب ہونے سے پہلے ڈی ریمی نہ پہنچا تو یہ بوڑھی ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔" وہ قہر آلود لہجے میں بولا۔

چارلس کی گفتگو سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ مجھ سے اندازے کی حماقت سرزد ہو گئی ہے۔ پھر بھی میں نے بات صاف کرنے کے لیے کہا۔ "تم جھوٹے ہو۔ البرٹو تمہارے بس میں آنے والا ہرگز نہیں ہے اور ہاں شوارٹ نے تمہارے کس آدمی کو چرا لیا ہے جو تم آپے سے باہر ہو رہے ہو؟"

جواب میں اس نے بے ساختہ فرنچ میں چند فقرے ادا کیے۔ اس کا لہجہ اور جملوں کی ساخت کچھ ایسی پیچیدہ تھی کہ وہ گالیوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر وہ انگریزی میں دہاڑنے لگا۔ "نیس میں اب شوارٹ جیسے کتوں کی یہ مجال ہو گئی کہ وہ میرے مہمانوں پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ اگر ڈاکٹر اسکر کو ذرا بھی نقصان پہنچا تو تم لوگ پاتال میں بھی میرے ہولناک انتقام سے نہ بچ سکو گے۔"

چارلس کے الفاظ پر میرا دل شیر ہو گیا اور میرے ذہن میں سر ابھارنے والے تمام وسوسے یک بیک دور ہو گئے۔

"تمہارا پورا نام کیا ہے میرے دوست؟" میں نے ہلکا سا قہقہہ مار کر سوال کیا۔

میرے اس رویے نے شاید اسے بھی بوکھلا دیا۔ "تم کون ہو؟"

"میں آسکر ہوں میرے دوست!"

"اوہ خدا!" اس کی آواز میں بلا کا تحیر سمٹ آیا۔ "تمہیں یہ ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ تم کہاں ہو؟"

"مجھے خود علم نہیں کہ میں کہاں ہوں مگر خیریت سے ہوں۔"

"عبداللہ اس وقت غصے سے پاگل ہو رہا ہے۔ اسے تمہاری سلامتی کے بارے میں سخت تشویش ہے اور تم بے فکری سے گھوم رہے ہو۔"

"میں بڑی مشکل میں گھر گیا تھا......"

"تم کہاں سے فون کر رہے ہو؟" اس نے میری بات کاٹ کر بے تابانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"ایک پبلک بوتھ سے۔"

"بوتھ کے دروازے پر باہر کی طرف ایک نمبر ہوگا۔ وہ دیکھ کر مجھے بتاؤ اور میرے آنے تک وہیں رکے رہو۔"

"میں ٹیکسی سے آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم نے نام نہیں بتایا اپنا؟"

"کیا تم سنجیدہ ہو ڈاکٹر؟"

"نام کے فتور ہی نے تو مجھے اس ڈرامے پر مجبور کیا تھا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"چارلس بک ہارٹ۔" ایک گہری سانس کے ساتھ اس کا جواب سنائی دیا۔

"اب میری الجھن رفع ہو گئی۔ میں آ رہا ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر فون کا سلسلہ فوری طور پر بند کر دیا۔

وقتی پریشانی کی بنا پر مجھ سے ایک نہایت احمقانہ حرکت سرزد ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ایک مخلص اور ہمدرد ساتھی کی نیت پر نہایت وثوق کے ساتھ شبہ کیا تھا جب کہ وہ بے چارہ اپنی اہم کاروباری مصروفیات کے باوجود میری سلامتی کے لیے فکرمند تھا۔

یہ درست تھا کہ مسٹر اوتومو نے مجھے ہوٹل ڈی ریمی میں جس شخص سے ملنے کی ہدایت کی تھی اس کا نام بک ہارٹ بتایا تھا۔ اصولاً اُسے مجھ کو ڈی ریمی کے منیجر کا پورا نام بتانا چاہیے تھا مگر اس کے بعد یہ میری ذمے داری تھی کہ ڈی ریمی پہنچنے کے بعد پہلے چارلس سے اس کا پورا نام دریافت کرتا پھر اپنی آمد کا مقصد بیان کرتا۔

ایک مرتبہ اس کی ذات پر اعتماد کرنے کے بعد میں نے جس انداز میں اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی اس کا ردِعمل میرے لیے خاصی شرمندگی کا باعث بننے والا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح چارلس بک ہارٹ کو اپنے اس رویے کے جواز کا یقین دلا سکوں گا۔

میں ٹیکسی سے ہوٹل پہنچا تو استقبالیہ کاؤنٹر پر چارلس نہایت بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی اور اس کی ورم آلود آنکھیں اس کی رات بھر کی بے خوابی کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس کی پیشانی پر بے شمار تفکر آمیز لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے دیکھتے ہی وہ دوستانہ انداز میں مسکراتا ہوا میری طرف لپکا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ ایک طرف لیتا چلا گیا۔

"میں اس فون کال پر شرمندہ ہوں چارلس!" میں نے اس کے ہمراہ راہداری عبور کرتے ہوئے کہا۔

"اس مختصر سے جملے سے کام نہیں بنے گا۔" وہ دوستانہ مگر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میں تم سے اس کی تفصیلی وجہ جاننا چاہوں گا۔"

"دراصل مجھے بتایا گیا تھا کہ ڈی ریمی میں مجھے منیجر سے ملنا ہوگا۔ جس کا نام بک ہارٹ ہے۔ بتانے والے نے مجھے تمہارا آخری نام بتایا جبکہ تم نے اپنا تعارف صرف پہلے نام سے کرایا تھا۔ اس عجیب اتفاق پر میں شاید کبھی غور نہ کرتا مگر جب شوارٹ نے مجھے گھیر لیا اور میں بمشکل اس سے نجات پانے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے یہی خیال گزرا کہ میں شاید ڈی ریمی میں کسی غلط آدمی سے ٹکرا گیا......"

"جس نے تمہیں شوارٹ کی طرف ہانک دیا۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔

"میں اپنی اس حماقت پر شرمندہ ہوں۔"

"مجھے تمہاری صاف گوئی پر خوشی ہے ڈاکٹر!" وہ میری پشت پر ہاتھ مار کر بولا۔ "یہ اچھا ہوا کہ تم نے خاموشی سے روپوش ہونے کے بجائے مجھے فون کر لیا۔"

"تم سے کٹنے کے بعد میں دشواریوں میں گھر جاتا۔"

"شوارٹ تمہاری راہ پر کیسے لگ گیا؟" اس نے دفاتر کے بعد ایک تنگ راہداری میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈائننگ ہال میں مجھے ایک شناسا لڑکی مل گئی تھی اور وہ شوارٹ کے ساتھ تھی۔ بس اس سے میرا نام معلوم ہوتے ہی وہ میرے پیچھے لگ گیا۔"

"تم نکلے کیسے؟"

"اسے کسی نے بہت بری طرح مارا تھا۔ میں اس کے ملازم کو ٹھکانے لگا کر آزادی تو حاصل کر چکا تھا مگر اس کے پالتو کتوں کی وجہ سے باہر نکلنا مشکل تھا۔" یہ کہہ کر میں نے مختصر الفاظ میں اپنی کہانی دہرا دی۔

"یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس نے تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے ڈی ریمی کا رخ کیا۔" وہ راہداری کے اختتام پر ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے علم تھا کہ وہ مشکوک سرگرمیوں میں ملوث رہتا ہے مگر وہ مجھ سے متعارف نہیں تھا۔ جب وہ محکمہ خفیہ کا جعلی شناختی کارڈ لے کر آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت عبداللہ بھی میرے پاس موجود تھا۔ اس نے مجھے شوارٹ کو باتوں میں لگانے کا اشارہ کیا اور خود کھسک گیا۔ میں خود بھی اپنے ہوٹل میں ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا۔ جب میں اسے لے کر کمرہ نمبر ننانوے میں پہنچا تو عبداللہ کمرہ صاف کر چکا تھا۔ جب شوارٹ ہوٹل سے روانہ ہوا تو میں بھی اس کے پیچھے نکلنا چاہتا تھا مگر کاؤنٹر کلرک نے بر وقت مجھے ایک بند لفافہ دیا جس میں عبداللہ کا پیغام تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ خود ہی شوارٹ سے نمٹے گا۔ رات گئے عبداللہ واپس آیا تو بہت جھلایا ہوا تھا کیونکہ شوارٹ اس کے ہاتھ آ کر نکل گیا تھا۔"

کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بولٹ کیا اور ختم ہوتی ہوئی سگریٹ سے نئی سگریٹ سلگانے کے بعد بولا۔ "عبداللہ کو ڈر تھا کہ شوارٹ تمہیں ہلاک نہ کر دے۔ جب کہ ہم لوگ شوارٹ کے ٹھکانے سے لاعلم تھے۔ پھر مجھے البرٹو کا خیال آیا۔ وہ ایک اطالوی یہودی ہے اور اکثر شوارٹ کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی عبداللہ البرٹو کے یہاں پہنچا اور اسے زبردستی یہاں لے آیا۔ ہم نے اس پر بے پناہ تشدد کیا مگر وہ شوارٹ کے بارے میں زبان کھولنے پر آمادہ نہ ہوا۔"

اس وقت ہم لوگ سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ گراؤنڈ فلور کے اس دور افتادہ اور ممنوعہ کمرے میں سیڑھیاں اترنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگ ڈی ریمی کے کسی خفیہ تہہ خانے میں جا رہے تھے۔

"عبداللہ کہاں ہے؟" میں اپنے اس نادیدہ محسن کے بارے میں اپنے تجسس پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔

"یہیں تہہ خانے میں ہے۔ وہ شاید البرٹو کو ہلاک کرنے کا قصد کر چکا ہے۔"

"ڈاکٹر کو خوفزدہ مت کرو چارلس!" اچانک تہہ خانے سے گمبھیر آواز سنائی دی۔ "یہ سالا اتنی آسانی سے نہیں مرنے والا۔"

"وہ ہماری باتیں سن رہا ہے۔" چارلس محبت آمیز انداز میں قہقہہ مار کر بولا۔

وہ تہہ خانہ چالیس فٹ لمبا اور اسی قدر چوڑا تھا۔ چھت کی بلندی بمشکل دس فٹ رہی ہوگی۔ وہاں دیواروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے چوبی کریٹ چنے ہوئے تھے اور تہہ خانے کی فضا میں ایک نامانوس سی بو رچی ہوئی تھی۔

تہہ خانے میں روشنی کا کافی انتظام تھا۔ کریٹوں کے سامنے سے آگے ایک دیو ہیکل اور تنومند نوجوان لاپروایانہ انداز میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کنکریٹ کے ستون سے ایک قوی الجثہ قیدی رسیوں سے کسا ہوا تھا۔

قیدی کے جسم پر لباس کے نام پر دھاگا تک موجود نہ تھا۔ اس کا بدن جا بجا زخموں سے چور تھا اور اس کی گردن ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ تشدد کی وجہ سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

ہم دونوں کو دیکھ کر وہ نوجوان اچھل کر دیوان سے اترا اور والہانہ انداز میں مجھ سے یوں بغل گیر ہو گیا جیسے میرا برسوں کا شناسا ہو۔

"تمہاری امانت تمہیں پہنچا دی، اب میری چھٹی۔" چارلس بڑی خوش دلی سے بولا۔ "میں کچھ دیر آرام کروں گا۔"

"تم رات بھر کے جاگے ہوئے ہو، جا کر سوؤ، میں ڈاکٹر کے ساتھ اسے سنبھال لوں گا۔" وہ نوجوان بولا۔

"ڈاکٹر آ گیا ہے اب اس کی جان چھوڑ دو۔"

"اسے گاڑی میں ڈال کر کہیں پھینک دیں گے، تم اس کی فکر نہ کرو۔" اس نے ہاتھ لہرا کر چارلس کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چارلس الوداعی انداز میں ہاتھ لہرا کر واپس چلا گیا۔

جب تک اس کے قدموں کی گونج سنائی دیتی رہی ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے رہے۔ جب اوپر کمرے کا دروازہ بند ہونے کے بعد سناٹا چھا گیا تو اس نوجوان نے ایک بار پھر مجھے سینے سے لگا لیا۔

"تم تو بالکل مجھ جیسے عام آدمی نظر آتے ہو یار!" وہ مجھے دیوان پر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بے تکلفانہ لہجے میں بولا۔

"تو یہ کس نے کہا کہ میں عام آدمی نہیں ہوں؟"

"تل ابیب سے بیروت اور دمشق کے راستے تمہاری جو کہانیاں مجھ تک پہنچی ہیں۔ ان سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تم کوئی عجیب شخصیت ہو۔"

"میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"عبداللہ المطعی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں یہاں محمود کی ڈیوٹی پوری کرتا ہوں مگر وہ میرا استاد ہے۔"

محمود کا نام آتے ہی میرا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ گنتی کے ان چند لوگوں میں سے تھا جن کو میں ساری زندگی نہ بھلا سکوں گا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا اس حریت پرست کا شیوہ تھا۔ وہ دشمن کی سرزمین پر بھی اپنی من مانی کارروائیاں اتنے سبک انداز میں کرتا تھا کہ دیکھنے کے باوجود یقین نہ آتا تھا۔

"میرا تو خیال تھا کہ تل ابیب میں ہماری سرگرمیاں خفیہ ہوتی تھیں۔" میں نے بوجھل سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دشمن کے لیے وہ یقیناً خفیہ ہوتی ہیں مگر ایک مخصوص حلقے میں وہ کہانیاں سینہ بہ سینہ پھیلتی رہتی ہیں۔"

"شوارٹ نے مجھ سے تمہاری سنگدلی کی شکایت کی تھی۔"

"ہوش میں آ کر شاید یہ بھی ایسی ہی بکواس کرے گا۔" اس نے برہنہ اور لہولہان البرٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ البرٹو اس کا شریک کار تھا؟"

"قطعی۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

"تو شوارٹ کی موت کے بعد اب اس کا کیا کرو گے؟"

"ہوش میں آئے گا تو خود کو کسی گندی نالی میں پڑا پائے گا۔"

"اسے چھوڑ کر تم غلطی کرو گے۔"

"تو پھر اسے بھی مارے دیتا ہوں۔" اس نے میرے مشورے کا سبب دریافت کیے بغیر نہایت سکون سے کہا۔

"شوارٹ میرے پیچھے کیوں لگا تھا؟"

میرے اس سوال پر عبداللہ سوچ میں پڑ گیا اور داہنے ہاتھ سے بوجھل ہوتے ہوئے اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔

"تم نے کوئی نہ کوئی نتیجہ تو اخذ کیا ہوگا؟" میں نے اسے خاموش پا کر نرمی کے ساتھ لقمہ دیا۔

"سچ پوچھو تو میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔" وہ جھینپے ہوئے انداز میں مسکرا کر بولا۔ "مجھے تو بس یہ فکر تھی کہ میرے ایک بے جگر مہمان کو اس کمینے نے مکاری کے ساتھ اپنے قابو میں کر لیا تھا۔"

"شوارٹ یہاں اسرائیل کے لیے کام کرتا تھا۔"

"نہیں۔" میرے الفاظ سنتے ہی وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اچھل پڑا۔

"جب بازی اس کے ہاتھ میں تھی تو خود اسی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔"

"میں نے کبھی اسے ایک لفنگے یا بلیک میلر سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کے بارے میں زیر زمین حلقوں میں اسی قسم کی باتیں مشہور تھیں۔"

"اب البرٹو کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دوں گا۔"

"اگر ہم اسے لے کر شوارٹ کے مکان پر منتقل ہو جائیں تو کیسا رہے گا؟" میں نے اس کے سامنے تجویز پیش کی۔

"وہ جگہ ہمارے لیے خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں میں البرٹو کو ذبح بھی کر دوں تو چارلس کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"وہ بہت بڑا مکان ہے اور اس وقت وہاں دو انسانوں اور سات کتوں کی لاشوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ شوارٹ وہاں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور اس کے اپنے بیان کے مطابق اس کا کوئی ملاقاتی کتوں کے خوف سے پیشگی پروگرام بنائے بغیر ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا اور ہمیں اس مکان کی تلاشی بھی لینا چاہیے۔"

"اس کا مکان کہاں ہے؟"

"یہ یاد نہیں۔ البتہ وہاں سڑک کے دونوں طرف کئی کئی ایکڑ کے رقبے پر مکانات بنے ہوئے ہیں اور وہیں ذہنی معذوروں کی انجمن کا دفتر بھی ہے۔"

"اوہ۔ یہ تو تم مارڈی بولیوار کی بات کر رہے ہو۔" وہ ذہنی معذوروں کی انجمن کا نام آتے ہی بول پڑا۔

"اس سڑک پر پہنچنے کے بعد میں اس کا مکان پہچان لوں گا۔"

"ہم البرٹو پر زیادہ وقت خراب نہیں کریں گے۔ وہاں جانے کے بعد اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا مسئلہ بھی نہیں رہے گا۔"

"اسے اس حالت میں ہوٹل سے باہر لے جانے میں دشواری ہوگی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ تہہ خانے میں لگے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"چارلس!" فون کا سلسلہ مل جانے پر شاید میری وجہ سے عبداللہ نے انگریزی میں بات کی۔ "میں شکار لے کر جا رہا ہوں، ادھر میدان صاف ہے نا؟"

چند ثانیوں تک وہ ہوں ہاں کرتا رہا پھر بولا۔ "پانچ منٹ بعد میں کارروائی شروع کروں گا۔" یہ کہہ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر عبداللہ نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بڑے پھل والا چاقو نکالا جو کھٹکے سے کھلتا تھا اور البرٹو کے بدن کے گرد بندھی ہوئی رسیاں کاٹنے لگا۔

اس نے رسیاں کاٹنے کا عمل نیچے سے شروع کیا تھا اور جب اس نے بازوؤں کے گرد بندھی ہوئی رسی ستون سے کاٹی تو البرٹو کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پرشور دھماکے کے ساتھ فرش پر آ گرا۔ عبداللہ نے اسے سہارا دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ مزید ایک گھنٹے تک ہوش میں نہیں آ سکے گا۔" عبداللہ نے چاقو بند کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"اس کی حالت تو بہت زیادہ ابتر ہے۔"

"تم نے شوارٹ سے کچھ معلوم کیا تھا؟"

"اس سے میں نے بہت اہم بات اگلوالی تھی۔"

"وہ کیا؟" عبداللہ کے مزاج میں بے صبری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"بن حیان سے تم واقف ہو؟"

"بندۂ خدا، تمہارے تعاون سے مجھے اسی کا کام تمام کرنا ہے۔"

"وہ پیرس میں موجود ہے۔ میں نے شوارٹ سے ہوٹل کا نام بھی پوچھا تھا مگر میریڈ کہتے ہی اس کا سانس ساتھ چھوڑ گیا۔"

"اور یہ خبر تم مجھے اب سُنا رہے ہو۔" وہ نیم شکایتی لہجے میں بولا۔ "اس طرح تو ہمارا آدھا کام آسان ہو گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ میریڈین ہوٹل کہنا چاہ رہا تھا۔"

"اب ہمارا نیس میں وقت ضائع کرنا بے سود ہے۔ آج البرٹو سے نمٹنے کے بعد کل ہم پیرس روانہ ہو جائیں گے۔"

"آج دوپہر کو ایک اہم لڑکی مجھ سے ملنے والی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کہاں ہے؟"

"وہ یہیں آئے گی، اسی وجہ سے شوارٹ میرے پیچھے لگا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے فلورا کے بارے میں اسے بتا دیا۔

"ڈی ریمی کا عملہ اسے ٹہلا دے گا۔"

"یہ مناسب نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گی کہ میں نے دانستہ اُسے غلط پتہ بتایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انتقام کے طور پر کسی اور کو میری یہاں موجودگی سے باخبر کر دے، تم عورتوں کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔"

"تمہاری وجہ سے اس کا گھر برباد ہوا، اس کا مزاج تم نہ سمجھو گے تو بھلا کون سمجھے گا۔" اس نے قہقہہ مار کر کہا۔ "پانچ منٹ پورے ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ اس لڑکی کے بارے میں تم کیا چاہتے ہو؟"

"اس سے ڈی ریمی میں میری موجودگی پوشیدہ نہ رکھی جائے اور اُسے میری طرف سے رات آٹھ بجے کا وقت دے دیا جائے۔"

"چارلس ہی کو اٹھانا ہوگا۔" وہ فون کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "ہوٹل کا عملہ ڈاکٹر آسکر بینتھم کا نام بھول چکا ہے۔"

اس مرتبہ قدرے تاخیر سے فون کا سلسلہ ملا اور عبداللہ نے فرنچ زبان میں گفتگو کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کام سے نمٹ کر عبداللہ نے سوئچ بورڈ پر لگا ہوا ایک سرخ بٹن دبایا اور بظاہر بے جوڑ نظر آنے والی دیوار کا ایک حصّہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر ایک طرف سرکتا چلا گیا۔ اس خلا کے بعد دوسری جانب بھی تہہ خانہ نظر آ رہا تھا اور وہاں سیاہ رنگ کی ایک کرسلر کھڑی ہوئی تھی۔

"گاڑی قریب لے آؤ۔" عبداللہ نے مجھ سے کہا۔

"چابی۔" میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔

"وہیں اگنیشن میں لگی ہوگی۔"

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو پیچھے لے آیا۔

کرسلر کی ڈکی بہت کشادہ تھی، البرٹو کا جسم اس میں بہ آسانی سما گیا۔

عبداللہ نے دوبارہ وہی دیوار گیر سوئچ دبایا مگر اس بار کچھ بھی نہ ہوا۔ عبداللہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی کو تیزی سے ... لیتا چلا گیا، جوں ہی کار نے وہ خلا عبور کی، دیوار کا کھسکا ہوا حصّہ ... اپنی جگہ لوٹنے لگا۔

"یہ کیا میکنزم ہے؟"

"دروازہ بٹن دبانے کے تیس سیکنڈ بعد بند ہونا شروع ہو ..."

گاڑی تہہ خانے کے دوسرے حصّے سے گزرتی ہوئی ڈھلوان ... چڑھنے لگی اور پھر ایک کشادہ راستے سے باہر نکل آئی۔

گودام کے طور پر استعمال ہونے والے وسیع تہہ خانے ... ڈی ریمی کے عقب میں نکلتا تھا۔ عبداللہ نے ماہرانہ انداز میں کار ... سڑک پر گھمایا اور پھر سورج کی پھیکی کرنوں کی روشنی میں ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

"رات آٹھ بجے فلورا سے ملاقات کیوں ضروری ہے؟" ... نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سکوت توڑنے میں پہل کی۔

"میں اسے اپنی جانب سے بدظن کرنا نہیں چاہتا۔"

"یا پُرانے تعلقات کی تجدید کی خواہش ستا رہی ہے؟"

"اسے تم ضمنی خواہش کہہ سکتے ہو۔" میں نے بلند آہنگ قہقہہ مار کر کہا۔

"شاید تم نے ڈی ریمی میں ردم سروس کی نگران مس اوڈیل کی خدمات سے استفادہ نہیں کیا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"وہ خاصی مشہور معلوم ہوتی ہے!"

"معلوم ہوتا ہے کہ نیس کی تمام بگڑی ہوئی لڑکیوں سے اس کے ... ہیں۔ خود چارلس بھی اس کے حلقۂ اثر سے بہت مرعوب ہے۔"

"اس کے جوہر بھی آزمانے ہی پڑیں گے!"

"یورپ کی طرح فرانس کی عورتیں بھی بڑی آزاد خیال ہیں مگر ان ... مردانگی کے جراثیم پیدا نہیں ہوئے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"واسطہ پڑنے پر تم کو اندازہ ہوگا کہ گوری چمڑی میں نسائیت ... فرانس میں نظر آتی ہے۔" اس نے کہا۔

"خاصے تجربہ کار ہو!"

"پہلے بہت رنگین مزاج ہوا کرتا تھا مگر تنظیم میں شمولیت کے بعد ... میں بہت محتاط ہو گیا ہوں۔ یہاں پیشہ ورانہ مہمات میں ہر حریف کے ... سب سے پہلا اور مؤثر ہتھیار ہے۔ یہاں کے ماحول کے مطابق شوارٹ ... کے ذریعے تمہیں گھیرنا چاہیے تھا۔"

اس وقت صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ... تھے، فضا میں بھی خاصی خنکی موجود تھی۔ مجموعی طور پر موسم کچھ خوشگوار ... ہونے کے باوجود سڑکوں پر سناٹا تھا، ... کی ...

... سب باشندے شاید اپنے گھروں پر آرام کر کے وقت گزار رہے تھے۔

شوارٹ کے برعکس عبداللہ کشادہ سڑکوں پر گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور ہم جلد ہی بارڈی بولیوار پر آ گئے۔ جس کے دونوں طرف تاحدِ نظر سرسبز میدان پھیلے ہوئے تھے۔ تارکول کی ہموار اور شفاف سڑک کسی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی دور تک چلی ہوئی تھی۔

"میں صحیح رستے پر ہوں نا؟" عبداللہ نے بارڈی بولیوار پر آنے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔ "یہ مضافاتی علاقہ یاد ہے؟"

"ہاں اسی سڑک پر دس بارہ کلومیٹر آگے ان دسیع آسیبی مکانات کا سلسلہ ہے۔" میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

سیاہ کرسلر کسی دیوہیکل اور سبک رفتار پرندے کی طرح سڑک کے پیچ و خم کے ساتھ ہلکورے لیتی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ڈکی میں سے کھڑکھڑاہٹ کی چند آوازیں آئیں اور البرٹو کی دبی دبی چیخیں سنائی دیں۔ شاید وہ ہوش میں آ چکا تھا۔

عبداللہ نے ہونٹ بھینچ کر عربی میں ایک گالی دی اور انگریزی میں بولا۔ "اُلو کا پٹھا بہت ہی سخت جان معلوم ہوتا ہے!"

"اس کی آوازیں قریب سے گزرنے والی کسی کار کے مسافروں کو متوجہ نہ کر لیں؟" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"اس کی مکروہ آوازیں اس حصّے میں ہمیں تو سنائی دے رہی ہیں مگر باہر نہ جا سکیں گی۔ اس کی ڈکی ہر طرف سے پوری طرح سیل ہے!"

"تو شاید اس کا دم گھٹ رہا ہوگا؟"

"پچھلی نشست کے قریب سے ہوا کا بندوبست ہے!"

میں نے گردن گھما کر دیکھا تو پیچھے سڑک صاف تھی البتہ سامنے سے ایک سُرخ کار تیزی کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

"اسے گزر جانے دو، پھر میں حرام زادے کو درست کرتا ہوں۔" عبداللہ کرسلر کو سڑک کے کنارے پر لے جاتے ہوئے بولا۔

کار کے دو پہیے سڑک سے نیچے کچی زمین پر اترے تو فضا میں غبار کا زبردست طوفان اُمڈ آیا اور کار تیز ہچکولے کھانے لگی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"غبار کی وجہ سے وہ ہماری کار کو بغور نہ دیکھ سکیں گے اور شاید ڈکی پیٹنے کا شور بھی انہیں متوجہ نہ کر سکے!" عبداللہ نے کہا۔

اسی اثنا میں سرخ کار ہمارے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گئی اور قدرے توقف کے بعد عبداللہ نے یک بیک گاڑی کے بریک لگا دیے۔

انجن بند کرنے کے ساتھ ہی اس نے ڈکی کا خودکار قفل کھولنے والا بٹن دبایا اور پھر اچھل کر اپنی نشست سے نیچے اتر گیا۔ میں بھی اس کی تقلید میں گاڑی سے باہر نکلا۔

باہر غبار کے طوفان میں ڈکی اٹھا ہوا ڈھکن اپنے زور میں اس وقت ... اسپرنگوں کے زور پر لرز رہا تھا اور برہنہ تن البرٹو کسی زخمی بھوت کی طرح ہم دونوں کے اترنے سے قبل ڈکی سے کود کر سڑک کے وسط میں دوڑنے لگا تھا۔

مگر البرٹو کا مقدر اس وقت گردش میں تھا۔ وہ تقریباً ایک ڈیڑھ منٹ تک پوری قوت سے سڑک کے وسط میں دوڑتا رہا اور اس دوران میں کسی بھی جانب سے کوئی گاڑی وغیرہ نمودار نہ ہوئی حتیٰ کہ عبداللہ نے کسی غضبناک شیر کی طرح اسے جا لیا۔

عبداللہ نے اس کے سر پہ پہنچ کر اس کی گردن پر ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ البرٹو بھاگتے بھاگتے منہ کے بل سڑک پر گرا اور کئی گز تک گھسٹتا چلا گیا۔

اس کی دردناک چیخ سے فضا لرز اٹھی اور پھر سکوت چھا گیا۔ وہ ایک بار پھر بے ہوشی کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

"تم گاڑی میں جاؤ۔" عبداللہ نے مجھ سے کہا اور بے ہوش البرٹو کا داہنا پیر تھام کر اسے بے رحمی سے سڑک پر گھسیٹتا ہوا داہنی طرف کے ڈھلان پر اترتا چلا گیا۔ جہاں اُگے ہوئے خودرو سبزے میں وہ قیدی سمیت بآسانی چھپ سکتا تھا۔

میں نے گاڑی میں واپس پہنچ کر انجن اسٹارٹ کر لیا مگر ڈکی کو کھلا رہنے دیا۔ میرا خیال تھا کہ عبداللہ جھاڑیوں کی اوٹ میں البرٹو کو لے کر کار تک آئے گا اور میدان صاف پاتے ہی اپنے شکار کو ایک مرتبہ پھر ڈکی میں مقفل کر دے گا۔

البرٹو دوڑتا ہوا گاڑی سے کم و بیش ڈیڑھ سو فٹ دور نکل گیا تھا۔ اس لیے عبداللہ کو واپس گاڑی تک پہنچنے میں تاخیر ہو گئی اس اثنا میں پیچھے سے آنے والی ایک کار میرے برابر سے گزرتے ہوئے دھیمی ہوئی اور پھر تیزی سے آگے لپکتی چلی گئی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک لڑکی براجمان تھی شاید تنہا ہونے کی وجہ سے آخری لمحات میں اس نے رک کر میری مشکل دریافت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میں دور ہوتی ہوئی اس کار پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ ڈکی میں ایک دھماکا ہوا پھر پُرشور آواز کے ساتھ ڈکی بند کی گئی۔ میں نے سر گھمایا تو عبداللہ برہمی کے عالم میں کیبر برابر والی نشست تک آ چکا تھا۔

"چلو!" اس نے میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"موڈ کیوں خراب ہے؟" گاڑی سڑک پر لاتے ہوئے میں نے عبداللہ سے دریافت کیا۔

"ابھی جو کچھ ہوا ہے شاید وہ تمہارے لیے ناکافی تھا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"غلطی تمہاری ہی تھی۔" میں نے کہا۔ "تم بہت جلد باز اور غصیلے ہو۔ ایک آدمی کے نیچے اترنے سے قبل ڈکی کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ بُری طرح زخمی تھا۔" عبداللہ جھنا کر بولا۔ "میرا تو خیال تھا کہ وہ اپنی ٹانگوں پہ کھڑا بھی نہ ہو سکے گا مگر وہ خبیث کسی بدروح کی طرح بھاگ نکلا۔"

اس کے جھلائے ہوئے لہجے پر میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اب دانت کیوں نکال رہے ہو؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے اس طرح

بولا جیسے وہ میرا برسوں پرانا بے تکلف شناسا ہو۔
"پھر بھی تحمل اچھی.... چینیرے ہمیں یہ کام لیتے تو یہ صورت حال پیدا ہی نہ ہوتی۔" میں نے تحمل کا عربی لفظ انگریزی فقرے میں استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "میرے سامنے یہ لفظ نہ دہرانا۔"

وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔
"اگر البرٹو دوبارہ ہوش میں آگیا تو کیا کرو گے؟" میں نے قہقہہ مار کر سوال کیا۔ اسے چڑانے میں مجھے لطف آ رہا تھا۔
"اس بار اس کا ہوش میں آنا مشکل ہے!" وہ ہونٹ سکوڑ کر بولا۔
"کیوں؟"
"میرا خیال ہے کہ اب ہم اس کی لاش اٹھائے پھر رہے ہیں، میری ضرب سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔"
"اگر تمہارا خیال درست مان لوں تو بارہ گھنٹے سے بھی کم عرصے میں تمہارے ہاتھوں یہ دوسرا قتل ہوگا۔"
"دوسرا کیسے؟"
"شوارٹ بھی تمہاری ہی ضربات سے مرا ہے۔"
"تو تم نے واقعی اس پہ ہاتھ نہیں اٹھایا تھا؟"
"تم نے اس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔"
"کراٹے میں بس یہی خرابی ہے۔"
"تم کراٹے جانتے ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔
"بیروت میں کچھ عرصے سے ہر فلسطینی کو یہ فن سکھایا جا رہا ہے!" اس نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "جو لوگ دوسرے کیمپوں میں تربیت پاتے ہیں وہ ابھی تک اس سہولت سے محروم ہیں۔"
ہم باتیں کرتے مارڈی بولیوار پہ بڑھتے رہے حتیٰ کہ گنجان اور وسیع باغات میں گھری ہوئی خاموش اور ہیبت ناک حویلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
شوارٹ کے مکان کے احاطے کا چوبی پھاٹک بدستور کھلا ہوا تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ کرسلر گھمائی اور روش پہ پھیلی ہوئی بجری پہ ٹائروں کا تیز شور سنائی دینے لگا۔ عبداللہ چوکنا انداز میں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔
کرسلر ویران پورچ میں پہنچی تو میں نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کار ایسے رخ پہ پارک کر دی جہاں وہ پھاٹک سے نظر نہ آ سکتی تھی۔
"چند ثانیوں کے لیے اندر رکے رہو!" دروازہ کھولنے کے لیور پہ میرا ہاتھ پڑتے ہی عبداللہ نے اضطراری طور پہ مجھے روک لیا۔
"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"میری چھٹی حس خطرے کی بو سونگھ رہی ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ جب تم اس عمارت سے روانہ ہوئے تو یہاں لاشوں کے سوا کچھ نہیں تھا؟"
"ہاں!"
"مگر اس وقت یہاں ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے جب گاڑی پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو میں نے ایک سایہ [illegible] کی طرف جھپٹتے دیکھا تھا۔" اس کے لہجے میں تشویش [illegible]
"یہاں کون آ سکتا ہے!" میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ میری نظریں برآمدے کے چبوترے کی طرف اٹھ گئیں۔
شوارٹ کے پانچ بلڈ ہاؤنڈ کتے زہریلی سوئیوں کا شکار ہو کر [illegible] بعد برآمدے پہ ہی مر گئے تھے اور کار کی نشست سے ان کا دکھائی [illegible] تھا جب کہ [illegible] پر مرنے والے دونوں کتے اس [illegible] ہوئے تھے جس حالت میں میں انہیں چھوڑ کر صبح سویرے وہاں سے [روانہ] ہوا تھا۔
"ریوالور وغیرہ ہے تمہارے پاس؟" میں نے پوچھا۔
عبداللہ نے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر اعشاریہ [illegible] کا وزنی ریوالور نکال لیا۔
"گاڑی میں بیٹھے رہے تو شاید ہم کبھی اپنے شبہات کی تصدیق [نہ کر] سکیں گے!" میں نے کہا۔
"وہ ادھر گیا تھا۔" عبداللہ نے داہنی طرف کے گنجان اور خود رو جنگل پہ نظریں جما کر پُراعتماد لہجے میں کہا۔
"شیشہ اتار کر ادھر اندھا دھند ایک دو فائر کر دو، شاید وہ گھبرا کر اپنی کمین گاہ سے نکل پڑے!"
"شیشہ نہ اتارنا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "اس گاڑی کے تمام شیشے بلٹ پروف ہیں۔ کہیں وہ شیشہ اتارتے ہی گولی نہ چلا دے!"
"اس احتیاط سے تو بہتر ہے کہ واپس لوٹ چلو۔"
"گاڑی اسٹارٹ کر کے داہنی طرف جھاڑیوں میں بڑھا لے چلو۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ زیادہ اندر نہ گیا ہوگا۔"
"درختوں سے بچنے کے باوجود کار برباد ہو جائے گی۔"
"اس کی پرواہ نہ کرو۔"
کرسلر کا بے آواز انجن اس وقت تک بند نہیں کیا گیا تھا۔ [illegible] نے خود کار گیئر کے لیور کو پارکنگ سے فارورڈ پوزیشن میں کھسکایا اور [illegible] اچھلتی ہوئی داہنی جانب جھاڑیوں میں گھستی چلی گئی۔
جا بجا درختوں کی موجودگی کی وجہ سے مجھے بار بار اسٹیئرنگ گھمانا پڑ رہا تھا جب کہ عبداللہ کی عقابی نظریں دشمن کو تلاش کر رہی تھیں۔
پھر اچانک ہی وہ سامنے آ گیا۔
اس وقت وہ گاڑی کی بالکل سیدھ میں پیٹ کے بل جھاڑیوں میں لیٹا ہوا تھا۔ اگر وہ اچھل کر اپنی جگہ سے نہ ہٹتا تو گاڑی کے نیچے روندا جاتا۔
وہ دبلا پتلا، دراز قامت سفید فام تھا۔ اس نے ایک درخت کی آڑ لیتے ہی کرسلر پہ فائر جھونک دیا۔
گولی ونڈ شیلڈ سے ٹکرا کر اچٹ گئی۔

"فائر کرو!" میں نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔
"اس پہ کار چڑھا دو!" عبداللہ نے ہیجان آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ درخت کے تنے کے پیچھے ہے۔"
"کار تنے سے لڑا دو!" وہ میرا بازو نوچتے ہوئے بولا۔
میں نے کار آگے بڑھائی اور بظاہر تنے کا نشانہ لیا مگر جوں ہی وہ ہماری کار پہ گولیاں برساتے ہوئے بوکھلا کر دوسرے درخت کی طرف لپکا، میں نے یک بیک کار کی رفتار تیز کر دی۔ کرسلر کا بمپر خاصی شدت سے اس کی پنڈلیوں سے ٹکرایا اور پھر گرنے سے قبل دوسرے جھٹکے میں گاڑی نے اسے خاصی دور اچھال دیا۔
عبداللہ بجلی کی سرعت سے چلتی گاڑی سے کود گیا۔ میں بھی انجن بند کر کے اس کے پیچھے لپکا۔ اس وقت تک وہ نامعلوم دشمن کے سر پہ سوار ہو چکا تھا۔ وہ زمین پہ پڑا ہوا کراہ رہا تھا اور ساتھ ہی فرنچ میں کچھ فریاد بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ٹکر کے نتیجے میں کوئی شدید زخم تو نہیں آیا تھا مگر وہ بہت زیادہ خائف نظر آ رہا تھا۔
عبداللہ نے کوٹ کا کالر تھام کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔
وہ عبداللہ کے سامنے گڑگڑانے لگا۔
"تم انگریزی نہیں بول سکتے!" میں نے غرا کر کہا۔
"ہاں جناب، میں بڑی اچھی انگریزی بول لیتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔"
"تم یہاں کیا کر رہے تھے؟" عبداللہ نے سرد لہجے میں سوال کیا۔
"میں تابوت بنانے والی ایک کمپنی میں ملازم ہوں، شوارٹ نے کل رات مجھے یہاں پہنچنے کا پیغام دیا تھا۔ میں حسبِ وعدہ گیارہ بجے گیٹ پہ پہنچ گیا اور کافی دیر تک ہارن دیتا رہا مگر شوارٹ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ جب کہ وہ ہمیشہ برآمدے میں موجود ہوتا۔ شوارٹ نظر نہ آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی پک اپ اندر داخل کر دی۔ میرا ارادہ تھا کہ شوارٹ موجود نہ ہوا تو پک اپ سے اترے بغیر واپس چلا جاؤں گا کیونکہ یہاں خونخوار کتے کھلے پھرتے ہیں۔ اندر پہنچنے پہ مجھے برآمدے میں کتوں کی لاشیں نظر آئیں تو مجھے کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا۔ مردہ کتوں کو دیکھنے کے باوجود میں کافی دیر اپنی گاڑی سے اترنے کی ہمت نہ کر سکا۔ پھر میں نے پک اپ میں ہارن بجاتے ہوئے مکان کا طواف کیا مگر ہر طرف موت کا بھیانک سکوت طاری تھا۔ کسی زندہ اور آزاد کتے کے نہ ہونے کا یقین کرنے کے بعد میں پک اپ سے اتر کر کتوں کی لاشیں دیکھ رہا تھا کہ آپ لوگ آ پہنچے اور میں جھاڑیوں میں چھپ گیا۔"
"تمہاری پک اپ کہاں ہے؟"
"مکان کے عقب میں موجود ہے، سارا سامان بھی اسی میں ہے!"
"یہاں کیوں بلائے گئے تھے؟"
"ایک آدمی کا ایئر پارسل تیار کرنا تھا جو شوارٹ تل ابیب بھیجنے والا تھا۔" اس شخص نے جواب میں انکشاف کیا۔
اس شخص کے بیان پہ میں نے فوراً ہی یقین کر لیا کیونکہ شوارٹ خود مجھے بتا چکا تھا کہ وہ مجھے بے ہوش کر کے ایک چوبی کریٹ میں ائیر فرانس کی سُپر کارگو سروس کے ذریعے تل ابیب بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے شاید مجھے قید کرنے کے بعد اور ڈی ریمی جانے سے پہلے اس شخص کو اگلی صبح پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔
"یہ کام تم اپنی کمپنی کی اجازت سے کرنے آئے تھے؟" عبداللہ نے ترش لہجے میں پوچھا۔
"نہیں چھٹی کے دنوں میں شوارٹ کبھی کبھار مجھ سے کام لیتا رہا ہے جس کا وہ مجھے بھاری معاوضہ دیتا ہے۔"
"تم غیر قانونی سرگرمیوں میں اس کا ساتھ دیتے رہے ہو؟"
"وہ میرا دوست ہے جناب!" وہ شخص رو دینے والے انداز میں بولا۔ "اس نے ابتدا میں اسرائیل کی خدمت کا واسطہ دے کر مجھے ایسے کاموں پہ مجبور کیا تھا پھر اس سے ملنے والے خطیر معاوضے نے مجھے اس کا غلام بنا دیا۔"
"تمہارا اسرائیل سے کیا واسطہ ہے؟"
"شوارٹ میرا ہم مذہب ہے۔ نظریاتی طور پہ ہم دونوں ہی اس عہد کے پابند ہیں کہ ہم دنیا میں جہاں بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں، اسرائیل کے بقا اور تحفظ کیلئے کام کرتے رہیں گے تاکہ یہودی قوم اور سلطنت کا کھویا ہوا وقار حاصل کیا جا سکے!"
"حالانکہ تم اسرائیلی نہیں ہو!" عبداللہ کا لہجہ تائید طلب تھا۔
"اسرائیلی تو نہیں مگر یہودی ضرور ہوں۔" اس نے قدرے فخریہ لہجے میں کہا "اور مذہبی اعتبار سے سولومن امپائر کے حصول کے لیے کام کرنے کا پابند ہوں۔"
"اور گولڈا میئر کو تم سلیمانی سلطنت کا پاسبان سمجھتے ہو؟" عبداللہ نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔
"عہدے کے اعتبار سے ہر اسرائیلی وزیراعظم اس منصب کا حامل سمجھا جاتا ہے۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔
"ڈکی کھول کر البرٹو کی خبر تو لو۔" اچانک عبداللہ میری طرف متوجہ ہو گیا اور میں اس کی نئی ہدایت کا سبب نہ سمجھ سکا۔
میں خاموشی سے واپس مڑا اور اگنیشن سے چابی نکال کر ڈکی کھولنے والا بٹن دبایا۔ چابی میں نے محض اس احتیاط کے پیش نظر نکالی تھی کہ عبداللہ کی کسی عجلت کے نتیجے میں اگر نیا شکار قابو سے باہر ہو جائے تو فوری طور پہ کرسلر لے کر فرار نہ ہو سکے۔
کرسلر کی ڈکی میں جھانکا تو البرٹو مادر زاد برہنہ اور زخمی حالت میں پہلو کے بل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ سڑک پہ منہ کے بل گرنے کے سبب اس کی ناک، پیشانی اور سینہ رگڑ سے بُری طرح چھل گیا تھا۔ مجموعی طور پہ وہ اس قدر ابتر حالت میں تھا کہ اس کی طرف دیکھ کر جھرجھری سی آنے لگتی تھی۔

میں نے شانے سے اسے ہلایا مگر بے سود۔ پھر میں نے اس کی نبض ٹٹولی جو کلائی پر معدوم تھی۔ شہ رگ کے قریب میں نے نبض تلاش کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ پھر میں نے اس کے بائیں پہلو پہ ہاتھ رکھا تو دل کی دھڑکن کا شائبہ تک محسوس نہ کر سکا۔

عبداللہ کے اندیشے کی تصدیق کیلئے میں نے اس کھوپڑی کو جنبش دی تو گردن کی ہڈی اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔

البرٹو کا جسم ضرور گرم تھا لیکن ساری علامات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے سبب مر چکا تھا۔

"اسے ڈکی سے باہر پھینک دو" عبداللہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ شاید میری خاموشی نے البرٹو کی موت کے بارے میں اس کا شبہ یقین میں بدل دیا تھا۔ "مر گیا ہے نا؟"

"ہاں۔ مر چکا ہے" میں نے کہا اور پھر البرٹو کا مردہ جسم ڈکی سے باہر نکالنے میں مصروف ہو گیا۔

"آؤ، تمہیں سولومن امپالہ، ایک خدمت گزار کا انجام دکھاؤں" عبداللہ اپنے نئے شکار سے کہہ رہا تھا۔

"تم نے البرٹو کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت زندہ دل آدمی تھا" تابوت ساز کمپنی کے مسکین ملازم کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تم اسے جانتے تھے؟" ان دونوں کے قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ میں عبداللہ کی استفسار طلب آواز سنائی دی۔

"ہاں۔ وہ شوارٹ کا گہرا دوست تھا"

"تم شوارٹ کے کتنے دوستوں سے واقف ہو؟"

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ شوارٹ کے اور کسی دوست سے میری ملاقات ہوئی ہو"

"البرٹو کی لاش دیکھو گے تو تمہارا حافظہ کام کرنے لگے گا"

اسی اثنا میں میں نے البرٹو کی وانددار لاش ڈکی سے نکال کر زمین پر ڈال دی اور جوں ہی اس کی نظر البرٹو کی بھیانک لاش پر پڑی وہ ہلکی سی چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اور چہرہ یک بیک یرقان زدہ نظر آنے لگا۔

میں اپنے خون آلود ہاتھ صاف کرتے ہوئے کرسلر کا جائزہ لینے لگا۔ سخت جھاڑیوں نے گاڑی کی مضبوط باڈی کو کئی جگہ سے پچکا دیا تھا، دونوں اطراف سے رنگ بھی اکھڑ گیا تھا اور مجموعی طور پر کرسلر کی ظاہری شوکت برباد ہو کر رہ گئی تھی۔

"ش ش...... شوارٹ کہاں ہے؟" قدرے توقف کے بعد قیدی نے دہشت سے ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ اندر مرا ہوا پڑا ہے۔ اس کی لاش دیکھ کر تمہیں خوشی ہوگی۔ وہ کپڑوں میں مارا گیا ہے۔ اس کا ملازم فرانسس بھی مارا جا چکا ہے" عبداللہ نے اس کی رہی سہی قوتِ مزاحمت کو برباد کرنے کی نیت سے کہا۔

"تت...... تم...... تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں عبداللہ سے سوال کیا۔

"تعاون کرو گے تو دوسروں کے تابوت بناتے رہو گے ورنہ خود تمہارے لیے تابوت کی ضرورت پیش آ جائے گی"

"نہیں نہیں۔ تم مجھے نہیں مار سکتے"

"تمہاری دُم میں سرخاب کا پر لگا ہوا ہے نا؟" عبداللہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں قہقہہ مار کر کہا۔

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا" وہ جلدی سے بولا۔

"تو سعادت مند بچوں کی طرح میرے سوالات کا انتظار کیے بغیر شروع کر دو" عبداللہ نے کہا۔

"شمالی افریقہ کے عرب ممالک خصوصاً لیبیا اور الجزائر کی دہشت گرد فلسطینیوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ اسی لیے ہم لوگوں نے نیس پر اس شہر کو اپنا مرکز بنا لیا ہے اور یہاں سے اسرائیل دشمن منصوبوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں" اس نے بتایا۔

"نیس میں تمہارے کل کتنے آدمی ہیں؟"

"سرکاری طور پر شوارٹ یہاں مامور ہے۔ مجھے اور البرٹو کو اس نے ملازم رکھا تھا۔ ویسے وہ بہت سے لوگوں سے معلومات خریدا کرتا تھا"

"ان دنوں تم لوگ کس منصوبے پر کام کر رہے تھے؟"

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا مگر تم وعدہ کرو کہ مجھے ہلاک نہیں کرو گے" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں وعدہ کر کے بھی تمہیں مار سکتا ہوں"

"میں جانتا ہوں کہ تم لوگ عموماً بات کے دھنی ہوتے ہو"

"تمہیں میری زبان پر اعتبار ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہلاک نہیں کروں گا" عبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کافی عرصے سے ہم لوگ میراج فور طیاروں کے حصول کے لیے لیبیا کی حکومت کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں"

"یہ ایم ڈی ایکس کا تذکرہ تو نہیں ہے؟" عبداللہ نے میراج فور کے تذکرے پر چونک کر سوال کیا۔

"ہاں" اس نے اعتراف کیا "یہ طیارے ساٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر جوہری بم لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے حصول کے بعد لیبیا کی جارحانہ قوت میں خوفناک حد تک اضافہ ہو سکتا ہے"

"اس منصوبے میں تم کن لوگوں سے کام لے رہے تھے؟"

"فرانسیسی وزارتِ دفاع کا ایک افسر ہمارے ساتھ ہے"

"اس کا نام؟"

"جولیس گریوی۔ وہ فرانسیسی فضائیہ کی ترجیحی ضروریات کے لیے اس سودے کے التوا کے لیے سرگرم ہے"

"اور تم نے ایک معصوم تابوت ساز کا روپ دھارا ہوا ہے"

نے بہ... تو دبے میں کہا۔ "...نے کا وعدہ کر چکے ہو" عبداللہ کے غضبناک تیوروں نے ... مجھے معاف کرنے ... سراسیمہ کر دیا۔

... الفاظ بار بار نہ دہرائے" عبداللہ دہاڑا "قسم ربُّ العزت کی! مجھے یقین ہوتا کہ تم اس حد تک شوارٹ کے شریکِ کار ہو گے تو میں ہرگز تمہیں جینے دینے ... کی سعادت سے دستبردار ہونے کا وعدہ نہ کرتا"

"کیا جولیس گریوی اتنا اہم ہے کہ وہ تنہا دو حکومتوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کو ناکام بنا سکتا ہے؟" میں نے اشتعال کا رخ موڑ کر ... اہم پہلو کی طرف کر دیا۔

"وہ شہادت کا ماہر ہے۔ اس نے سب لوگوں کو اعداد کے گورکھ دھندے میں الجھایا ہوا ہے۔ اس نے جو خاکہ پیش کیا ہے اس کے مطابق اگلے دو سال تک میراج فور طیاروں کی بیرونی فروخت تقریباً ناممکن ہو گی" اس نے جواب دیا۔ عبداللہ کی زبان سے اس کے وعدے کی تجدید سن کر وہ خاصا پرسکون نظر آ رہا تھا مگر میں عبداللہ کا مافی الضمیر سمجھ چکا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود تو اس تابوت ساز پر ہتھیار نہ اٹھائے گا مگر مجھے وار کرنے پر ضرور آمادہ کرے گا۔ دشمن کو معاف کرنے کا عنصر اس کی سرشت میں ہی شامل نہیں تھا۔

"تم لوگ اپنی معلومات کس کو پہنچاتے تھے؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"ہم دونوں شوارٹ کو جواب دہ تھے اور وہ تل ابیب میں وزارتِ خارجہ کے ڈیفنس انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کے سامنے ذمے دار تھا"

"یہ آرمی انٹیلی جنس کا ہی کوئی شعبہ ہے؟"

"نہیں۔ وہ وزارتِ دفاع سے متعلق ہے جبکہ دفاعی سراغرسانی وزارتِ خارجہ کا ایک خفیہ محکمہ ہے" وہ جان بخشی کا یقین ہو جانے کے بعد سکون سے جواب دے رہا تھا۔

"شوارٹ کا تل ابیب سے کیا رابطہ تھا؟"

"اس کے محکمے کی اپنی کرپٹو گرافی ہے جو اسرائیل کا کوئی دوسرا محکمہ استعمال نہیں کرتا" اس نے انکشاف کیا۔

"اس کی لغت کہاں ہے؟"

"شوارٹ کے پاس ہی ہونا چاہیے۔ سرخ چرمی جلد کی جیبی سائز کی کتاب ہے"

چند ثانیوں کے لیے اس خودرو ویران باغ میں سکوت چھا گیا۔

"البرٹو کی قیام گاہ کہاں ہے؟" اچانک عبداللہ نے سوال کیا۔

اس نے فوراً ہی پتہ بتا دیا۔ پھر عبداللہ نے خود اس کا بھی پتہ معلوم کیا۔ اچانک اس نے اپنا ریوالور میری طرف اچھال دیا۔

اس کی وہ حرکت بہت خطرناک تھی۔ ریوالور بھرا ہوا تھا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا مگر غنیمت ہوا کہ میرے ہاتھوں میں آنے تک گولی نہ چلی۔

"تمہیں زبان دے چکا ہوں مگر تم پابند نہیں ہو" عبداللہ کے ان الفاظ پر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کے بارے میں میرا قیاس بالکل درست ثابت ہوا تھا۔

"نہیں...... تم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ سراسر بدمعاشی ہے" تابوت ساز عبداللہ کا مفہوم سمجھ کر ہذیانی انداز میں چیختا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی جسمانی کمتری کے باوجود عبداللہ کی گردن دبوچنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

وہ عبداللہ سے چند ہی قدم دور تھا کہ میں نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی اور وہ چیخ مار کر زمین پر گر گیا۔

"کنپٹی پر گولی مارو" عبداللہ نے اس کے تڑپتے ہوئے بدن سے دور ہٹتے ہوئے عجلت آمیز لہجے میں کہا۔

میں قدرے آگے بڑھا اور دوسری گولی اس کی داہنی کنپٹی میں گھس کر بھیجے میں اتر گئی اور اس کے تڑپتے ہوئے بدن کو جدوجہد سے نجات مل گئی۔

"ہم یہاں کیوں آئے تھے ڈاکٹر؟" عبداللہ نے قریب آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔ اس کے لبوں پہ شریر سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"شاید حساب برابر کرنے" میں نے اس کا ریوالور اسے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا نہیں؟"

"تم نے دو مارے تھے۔ شوارٹ اور البرٹو جبکہ میں نے صرف فرانسس کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اب ہمارا اسکور برابر ہے"

میری وضاحت اسے بہت پسند آئی اور وہ دیر تک ہنستا رہا۔

"اب اگر عمارت کی تلاشی لے لی جائے تو......" میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میری بات درمیان سے اچک لی۔

"یہ تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے"

"کرسلر بُری طرح برباد ہوئی ہے" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"چارلس بک بارٹ ہر روز نئی گاڑی خرید سکتا ہے"

"تو یہ اس کی کار ہے؟"

"میں تو چھوٹی سی رینالٹ رکھتا ہوں"

"آخر یہ چارلس کیا شے ہے؟"

"ہوٹل ڈی ریجی کا مالک اور میرا جگری دوست" اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے واپس روِش پر لے جاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری سرگرمیوں سے وہ کس حد تک باخبر ہے؟"

"وہ میری خاص حرکات سے باخبر رہتا ہے مگر اسے میرے مقاصد کا علم نہیں ہوتا"

"اور نہ وہ جاننے کی کوشش کرتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی تو ہماری دوستی کی بنیاد ہے" وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے

بولا۔شاید اندر داخل ہونے سے پہلے وہ باہر سے عمارت کا طواف کرنا چاہتا تھا۔

"شاید اسی لیے مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ اس کے سامنے ڈاکٹر آسکر بینتھم ہی بنا رہوں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"تم نے تو ابھی تک مجھے بھی اپنا اصلی نام نہیں بتایا۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔

"واقعی مجھ سے غلطی ہوئی.....،،"

"ڈھکوسلے کی ضرورت نہیں۔" اس نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔"میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں مگر فرانس میں تم نہ صفدر رہو گے نہ آسکر۔ پیرس میں تم کوئی نیا نام اختیار کرو گے۔"

"میرا اصلی نام لے کر تم نے اپنی معلومات تو جتا دیں مگر اور کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی تم سے بچھڑی ہوئی ہے؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

اس کا ذکر آتے ہی میں مضطرب ہو گیا۔ سیتا اپنی تمام تر شوخیوں اور اداؤں سمیت میری چشم تصور کے سامنے مجسم ہو گئی۔

"کیا جانتے ہو تم اس کے بارے میں؟"

"کسی بھی وقت اس کے بارے میں کوئی اہم اطلاع آ سکتی ہے۔" عبداللہ نے کہا۔"پاکستان میں زیر تعلیم دو فلسطینی لڑکوں نے اُسے ڈھونڈ نکالا ہے۔"

"یہ کب کی خبر ہے؟"

"لیبیا سے کل رات اطلاع آئی تھی۔"

"لیبیا سے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں وہ وہیں پہنچے گی۔"

"مگر کیوں؟" میرے لہجے میں شدید اضطراب اور احتجاج نمایاں تھا۔"اُسے سیدھا میرے پاس آنا چاہیے۔"

"ہو سکتا ہے کہ اُسے پیرس بھیجا جائے یا تمہیں بن غازی بلا لیا جائے۔ ابھی اس بارے میں کوئی بات میرے علم میں نہیں۔"

"آخر اسے لیبیا کیوں بھیجا جا رہا ہے؟"

"سُنا ہے وہ بندروں اور لنگوروں کو تربیت دینے میں بے مثال مہارت رکھتی ہے۔" عبداللہ نے عمارت کے عقبی حصے میں گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میرے ہاتھوں مرنے والے تابوت ساز کے بیان کے مطابق اس کی سفید پک اپ اس طرف کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے حیرت کے ساتھ اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"لیبیا میں وہ ہمارے مقاصد کے لیے بندروں وغیرہ کو تربیت دے گی۔"

عبداللہ کے ان الفاظ کے ساتھ ہی بے اختیار مجھے محمود یاد آ گیا۔ سیتا کی شخصیت کے اس کمال کے بارے میں معلوم ہوتے ہی اس نے نہایت حسرت اور بے چینی کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر سیتا ان لوگوں کے لیے بندروں وغیرہ کو تربیت دے سکے تو وہ لوگ بہت سی پُرخطر مہمات پر انسانوں کے بجائے جانوروں سے کام لے سکتے تھے۔

شاید محمود نے اپنی ہائی کمان کو بھی اپنی اس رائے سے آگاہ کیا ہو اور اسی وجہ سے سیتا کو لیبیا بھیج دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

"مگر لیبیا تو نرا صحرائی علاقہ ہے، وہاں بندر کہاں ہوتے ہیں؟"

"بھارت سے مختلف نسل کے تین سو بندروں کی ایک کھیپ قبل طیاروں کے ذریعے طرابلس پہنچ چکی ہے۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"اور لیبیا والوں کو میری یہاں موجودگی کا بھی علم ہے؟"

"میں نے چارلس بک ہارٹ سے خبر ملتے ہی ٹیلکس پیغام روانہ کر دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنی بیوی کی جانب سے کتنے فکرمند ہو۔ یہ تو تمہارا بڑا احسان ہے کہ تم اپنی ذہنی الجھنوں کے باوجود ہمارا کام کر رہے ہو۔"

"اس موضوع پر میں تم سے تفصیل گفتگو کروں گا۔ فی الحال یہاں سے کام نمٹا کر نکلنے کی کوشش کرو۔" میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے سفید پک اپ کا تفصیلی معائنہ کیا جس کے عقبی حصے میں کافی تعداد میں مضبوط تختوں کے علاوہ ایک مستطیل نما صندوق بھی رکھا تھا۔ صندوق میں کچھ آہنی قبضے اور زنجیریں بھی موجود تھیں۔

"یہ تمہاری روانگی کا بندوبست معلوم ہوتا ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

"شاید خالی جگہ اس پلاسٹک فوم سے بھر دی جاتی۔" میں نے ادھر ادھر بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کریدتے ہوئے کہا۔

پک اپ کے ڈیش بورڈ وغیرہ کی تلاشی میں ہمیں کوئی قابل ذکر چیز نہ مل سکی اور ہم دونوں کرسلر میں عمارت کا طواف مکمل کر کے دوبارہ سامنے والے حصے میں پہنچ گئے۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر پڑی ہوئی کتوں کی اکڑی ہوئی لاشیں دیکھ کر عبداللہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رک گیا۔

"یہ تو شاید زہر خورانی کے باعث ہلاک ہوئے ہیں؟"

"ان پر افریقی ہتھیار بلو پائپ کی ایک ترقی یافتہ صورت آزمائی گئی ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"یعنی تمہارے پاس زہریلی سوئیاں برسانے والا کوئی ہتھیار ہے؟"

"ریڈ بریگیڈ والوں کے طفیل یہ مجھ تک پہنچا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے پلاسٹک کی سفید شیشی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"اس میں کتنی سوئیاں باقی رہ گئی ہیں؟" اس نے شیشی کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔

"یہ نہیں معلوم، بس کسی وقت اچانک جواب دے جائے گا۔"

کتوں کے بے جان جسموں کے قریب سے گزر کر ہم دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے جہاں دروازے کے قریب ہی شوارٹز کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

مرنے سے پہلے شوارٹز نے کمرے کے قالین پر خون آلود انگلیاں رگڑی تھیں جو کمرے کی فضا میں ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی۔

اس وسیع و عریض عمارت کی تلاشی میں کچھ ہاتھ نہ آ سکا البتہ ایک خواب گاہ کی دیوار گیر آہنی تجوری ہماری توجہ کا مرکز بن گئی۔

وہ بظاہر شوارٹز کی خواب گاہ نظر آتی تھی۔ ہمیں وہاں ایک حساس ٹیپ ریکارڈر بھی ملا جس کا مائیکروفون ٹائی پن کی صورت کا تھا۔ چند بیش قیمت اور حساس کیمرے بھی ملے مگر کوئی ایسی تحریر وغیرہ نہ مل سکی جو شوارٹز کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتی۔

آخر میں ہم نے اپنی توجہ آہنی تجوری پر مرکوز کر دی۔

مجھے بنارس وغیرہ میں اپنے بُرے ایام میں پیٹ بھرنے کے لیے قفل شکنی کی طرف بھی توجہ دینا پڑی تھی اور مجھے امید تھی کہ میں تجوری کھولنے میں کامیاب ہو سکوں گا مگر کافی محنت کے باوجود وہ تالا نہ کھل سکا۔

آخر عبداللہ نے تالے پر ریوالور کی نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا اور ایک زبردست دھماکے کے ساتھ تالے کے ٹکڑے اڑ گئے۔

عبداللہ نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہینڈل گھما کر دروازہ باہر کھینچا تو دروازہ کھلتے ہی تجوری کے اندر تیز شعلے بھڑک اٹھے۔

عبداللہ بوکھلا کر پیچھے سرک آیا۔

شاید تجوری میں کوئی ایسا خفیہ میکنزم تھا جس کے تحت دروازہ کھلتے ہی کیمیاوی یا برقی طریقے سے تجوری میں آگ لگ گئی۔ مخصوص احتیاطی تدبیر اختیار کیے بغیر تجوری میں رکھی ہوئی اشیا کا حصول نہایت چالاکی سے ناممکن بنا دیا گیا تھا۔

ہم دونوں تجوری کو جلتا چھوڑ کر سر جھکائے باہر آ گئے۔

جب ہم ہوٹل ڈی ریمی واپس پہنچے تو دوپہر کے تین بجے تھے اور بھوک کی شدت اپنے عروج پر تھی۔

چارلس بک ہارٹ اس وقت ہوٹل میں نہیں تھا مگر استقبالیہ کاؤنٹر والی لڑکی سے پتہ چلا کہ فلورا دوپہر بارہ بجے سے چار مرتبہ ہوٹل کا چکر لگا چکی ہے۔ اسے رات آٹھ بجے کے بارے میں بتایا گیا تھا مگر وہ اس کے باوجود مجھ سے ملنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"اس پر تمہارا پورا پورا جادو چلا ہوا ہے۔" لفٹ کی طرف جاتے ہوئے عبداللہ نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا اعلان کر رہی ہے۔"

"جب کوئی خوبرو عورت سپردگی کے جذبے میں ڈوب کر اپنے جوان محبوب کے دروازے کے پھیرے لگائے تو گڑبڑ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے کسی خطرے سے آگاہ کرنا چاہتی ہو۔" میں نے عبداللہ کے غیر سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"البرٹو وغیرہ کا معاملہ تو خلاف توقع جلد ہی نمٹ گیا ہے۔ کاؤنٹر والی لڑکی سے کہہ دو کہ اگر اب فلورا آئے تو اسے تمہارے کمرے میں بھیج دیا جائے۔"

"تمہاری موجودگی میں شاید وہ کھل کر بات نہ کرے۔" میں نے ڈی ریمی کی چوتھی منزل پر لفٹ سے اترتے ہوئے کہا۔

"اوہو تو صاف کہو نا۔" وہ بولا۔"تم تنہائی میں اس سے ملنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے سر پر سوار نہیں رہوں گا، کھانا کھا کر چلا جاؤں گا۔"

"تم احمق ہو۔"

"احمق ہی ہوں، ورنہ فلورا کا تذکرہ سنتے ہی مجھے تم سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔" وہ راہداری میں رُکتے ہوئے بولا۔

"مجھے تم سے بھی ضروری بات کرنا ہے، میرے ساتھ آؤ۔"

"وہ بات رات کو بھی ہو سکتی ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"میں دس گیارہ بجے کے قریب آؤں گا۔"

"میں سیتا کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

ہم نے کمرے میں ہی کھانا طلب کیا اور اس دوران میں عبداللہ نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ محمود اسرائیل میں اپنی تمام سرگرمیوں کی اطلاعات لبنان میں اپنے ہیڈ کوارٹر کو بھیجا کرتا تھا۔ اسی ضمن میں اس نے اپنی تحریک آزادی کے لیے میری خدمات کا بھی ذکر کیا اور بعد میں اسی حوالے سے سیتا کی تلاش کا سلسلہ شروع کرایا۔

اس وقت تک عبداللہ خود بیروت میں متعین تھا، بعد میں اس کا تبادلہ نیس کر دیا گیا کیونکہ اس کا پیش رو کسی نامعلوم قاتل کا نشانہ بن گیا تھا۔

عبداللہ نیس پہنچنے کے بعد اپنے پیش رو کے قاتل کا سراغ پانے میں قطعی ناکام رہا مگر اب اسے پورا یقین تھا کہ وہ کارروائی شوارٹز کے گروپ نے کی ہوگی۔

عبداللہ نے بتایا کہ بیروت والے شروع ہی میں یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ بازیابی کے بعد سیتا کو لیبیا بھیجا جائے گا جہاں وہ آزادانہ طور پر بندروں کی تربیت کرتی اور اس کی تازہ ترین اطلاعات کے مطابق سیتا کسی بھی وقت طرابلس یا بن غازی پہنچ سکتی تھی۔

اَل ایل کا طیارہ اغوا ہوتا یا نہ ہوتا، یہ بات پہلے سے طے پا چکی تھی کہ اسرائیل سے نکلتے ہی مجھے ڈاکٹر آسکر بینتھم کے نام سے ہوٹل ڈی ریمی پہنچنا ہوگا اور پھر عبداللہ میری مدد سے بن حیان کا کھوج لگائے گا۔

محض اسی پیشگی منصوبہ بندی کی وجہ سے میرے سفری کاغذات ڈاکٹر آسکر بینتھم کے نام سے تیار کرائے گئے اور شدید خطرے کے باوجود عبداللہ سے ملاقات ہونے تک مجھے وہی نام برقرار رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

عبداللہ چاہتا تھا کہ ہم لوگ وہ رات نیس میں گزار کر اگلی صبح پیرس کی طرف پرواز کر جائیں جہاں بن حیان موجود تھا۔

دوسری طرف میں سیتا سے ملے بغیر کسی نئی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں تھا اور سیتا سے ملاقات کے لیے نیس، پیرس سے بہت بہتر تھا۔ اس ساحلی شہر اور لیبیا کے درمیان صرف بحیرۂ روم حائل تھا جسے عبور کر کے میں سیتا تک یا سیتا مجھ تک پہنچ سکتی تھی مگر بن حیان کا مسئلہ بھی اہم تھا۔

اسے فرانس آئے کافی دن ہو گئے تھے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس وقت واپس اسرائیل جانے کا فیصلہ کر لے لہٰذا اسے جلد از جلد گھیرنا ضروری تھا۔

عبداللہ نے مجھے یقین دلایا کہ لیبیا میں جو لوگ سیتا کی دیکھ بھال کے ذمے دار مقرر کیے گئے تھے وہ اس سے وعدہ کر چکے تھے کہ سیتا کو فوری طور پر اپنے شوہر سے ملاقات کا موقع دیا جائے گا۔ خواہ میں نیس میں رہوں یا پیرس چلا جاؤں۔

بن حیان کے مسئلے میں ذاتی طور پر میں خود بھی دلچسپی لیتا رہا تھا اور اُسے جلد از جلد کیفرِ کردار کو پہنچانا چاہتا تھا۔ مجھے وہ لمحہ بخوبی یاد تھا جب صحرائے عرب کی الشوریخ نامی بستی میں درندہ صفت بن حیان نے ابو خالد کے روپ میں میرے چہرے پر سنگی دانوں والی تسبیح پھینک کر ماری تھی اور میرے ہونٹ بُری طرح لہولہان ہو گئے تھے۔

میں نے عبداللہ کے پروگرام سے اتفاق کر لیا۔

کھانے کے بعد عبداللہ روانہ ہو گیا اور میں کپڑے تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ پچھلے ہفتے میں مجھے بہت کم آرام ملا تھا اور میں پیرس روانگی سے قبل اپنی توانائی بحال کرنا چاہتا تھا۔

شام ڈھلے فون کی گھنٹی کی آواز نے مجھے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔

میں نے رسیور اٹھایا تو آپریٹر نے مجھے اطلاع دی کہ فلورا ایک بار پھر کاؤنٹر پر موجود تھی اور مجھ سے فوری طور پر ملنا چاہتی تھی۔

میں نے آپریٹر کو ہدایت کی کہ فلورا کو اُوپر بھیج دیا جائے اور خود باتھ روم میں جا گھسا۔

میں فوری طور پر لباس تبدیل کر کے باتھ روم سے نکلا تو فلورا دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

فلورا کو دیکھ کر مجھے حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ گلابی اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر میری توقع کے برعکس تازگی اور شادابی کے بجائے تفکر کے سائے لرزاں تھے۔ مجھے دیکھ کر اس کے لبوں پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ بھی پژمردہ سی تھی۔

"اندر آنے کو نہ کہو گے؟"

میں نے چونک کر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ "تمہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ کچھ فکر مند سی نظر آ رہی ہو۔"

"میں ایک پریشانی سے دوچار ہو گئی ہوں۔" اس نے اندر آ کر بے تکلفانہ انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا میجر اسمتھ نے طلاق دینے سے انکار کر دیا ہے؟"

"اس درندے کے بارے میں سوچ کر میں اپنا وقت برباد نہیں کرتی۔"

"درندگی میں اسمتھ کا کوئی قصور نہیں۔ تم جیسی عورت پر پوری شدت کے ساتھ قبضے کی خواہش بڑی فطری ہے۔"

"میری بہن کا شوہر کل رات سے لاپتہ ہے۔" اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پریشانی کا سبب بیان کر ڈالا۔

"پولیس کیا کہتی ہے؟"

"مشکل یہی ہے کہ پولیس سے رجوع کرنے میں مشکلات پیدا ہونے کا ڈر ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"کل رات کسی نے مکان پر آ کر ڈور بیل بجائی اور جب وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو کچھ لوگ اسے زبردستی ایک گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ اس کی چیخ پکار سن کر میری بہن دروازے پر آئی تو میدان صاف تھا اور سیاہ رنگ کی ایک گاڑی تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔"

فلورا کی بپتا سن کر میں چونک پڑا۔ "تمہارے بہنوئی کا نام کیا تھا؟"

"مائیک البرٹو۔" اس نے جواب دیا اور میرے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ عبداللہ کے ہاتھوں شوارٹ کی معاونت کے جرم میں مارا جانے والا البرٹو نامی شخص ہی فلورا کا بہنوئی تھا مگر میں کسی بھی طرح فلورا پر یہ راز ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

"پوری بات بتاؤ۔ آخر تم پولیس کے پاس جانے سے کیوں ڈرتی ہو؟"

"مجھے شبہ ہے کہ اس معاملے کا تمہاری ذات سے بھی تعلق ہے۔" اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے براہِ راست تبصرے نے میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔

"جب میں تم سے مل کر واپس اپنی میز پر پہنچی تو البرٹو کا ایک دوست شوارٹ بھی ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان دونوں کے استفسار پر جب میں نے تم سے لندن میں دوستی کی فرضی کہانی سناتے ہوئے تمہارا موضوع لیا تو وہ دونوں ہی چونک پڑے تھے۔ اس رات ہم لوگ جلدی واپس چلے گئے اور میری بہن کے گھر میں البرٹو اور شوارٹ سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر راز و نیاز کرنے لگے۔ انھیں وہسکی سرو کرتے ہوئے میں نے دو مرتبہ شوارٹ کے منہ سے ڈاکٹر آسکر بینتھم کا نام سنا تھا۔ اس وقت میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔"

"تمہارا خیال ہے البرٹو کو میں نے اغوا کیا ہو گا؟" میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"یہ مطلب نہیں۔" وہ بوکھلا کر جلدی سے بولی۔ "البرٹو بہت خوش حال زندگی گزار رہا ہے مگر میری بہن کو آج تک اس کے ذریعہ معاش کا علم نہیں۔ اکثر وہ کئی کئی ہفتوں تک بیوی بچوں میں رہتا ہے پھر اچانک بغیر اطلاع کے کئی روز کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی اگر میری بہن نے البرٹو کی چیخیں نہ سنی ہوتیں تو وہ یہی سمجھتی کہ البرٹو اچانک کسی اہم ملاقات کے ساتھ چلا گیا ہے۔ اس نے گھر میں سختی سے ہدایت کی ہوئی تھی کہ روپوشی اور گم شدگی کی صورت میں پولیس سے رابطہ ہرگز قائم نہ کیا جائے۔ اس نے اپنی بیوی کو کسی دوست کا فون نمبر دیا ہوا تھا مگر وہاں سے کوئی

آخر آج دوپہر کو میں ڈائرکٹری سے پتہ نکال کر وہاں پہنچی [illegible] مقفل تھا۔ پھر پڑوسیوں سے اس کے دفتر کا پتہ معلوم کیا تو پتہ چلا وہ ایک تابوت ساز کمپنی میں بڑھئی کا کام کرتا ہے۔ آج کمپنی کا کارخانہ بند ہے۔ ان کے سیلز آفس سے پتہ چلا کہ کارخانے میں کوئی اہم کام نہیں تھا جس کے لیے اسے اتوار کو بھی بلایا جاتا۔"

"شوارٹ کیا کہتا ہے؟"

"اس کا تو پتہ ہی نہیں معلوم' البتہ ہر رات دس بجے سے گیارہ بجے سینورائل میں ضرور ملتا ہے۔ دس بجے میں اس قمار خانے بھی جاؤں گی۔"

میں دل ہی دل میں تقدیر کی ستم ظریفی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے لیے دنیا مختصر سے مختصر تر ثابت ہوتی جا رہی تھی۔

شوارٹ' البرٹو اور وہ بڑھئی میرے اور عبداللہ کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ اسرائیلی حکومت کے تین اہم ایجنٹ ٹھکانے لگائے جا چکے تھے اور ان تینوں کا کسی نہ کسی طرح فلورا سے تعلق تھا جو اسرائیل کی سرزمین پر ہر لمحے میرے لیے اپنی آغوش وا کیے رکھتی تھی۔

فلورا کی بہن میری وجہ سے بیوہ ہو چکی تھی' تابوت ساز خود موت کا منظر تھا اور شوارٹ رقم کا جوا کھیلتے کھیلتے اپنی جان کی بازی بھی ہار چکا تھا۔

"تم نے البرٹو کی گم شدگی کو میری ذات سے کیسے ملا دیا؟"

"ہو سکتا ہے وہ تمہاری راہ پر لگ گیا ہو۔"

"نہیں میرے لیے اجنبی شہر ہے بے بی!" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں چند گھنٹوں کے قیام میں اتنی ہمت نہیں کر سکتا کہ کسی ہٹے کٹے آدمی کو اس کے دروازے سے اٹھا لے جاؤں۔"

"یہ کام تم اپنے دوستوں سے بھی لے سکتے ہو۔" وہ اپنے نرم اور گداز پیروں کو سینڈلز سے آزاد کرتے ہوئے بولی۔

"میرے دوست؟" میں استہزائیہ انداز میں ہنس دیا۔ "ایسی دوستی کے لیے وقت درکار ہوتا ہے فلورا! یہ شبہات اپنے ذہن سے جھٹک دو۔"

"نہیں یہاں تمہارا کوئی دوست نہیں ہے؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"تم جو ہو۔" میں نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے علاوہ؟"

"کوئی بھی نہیں ہے۔"

"اگر یہ درست ہے تو تم صبح سے کہاں غائب تھے؟ میں اس وقت [illegible] رہی ہوں۔" اس نے بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

"اس انداز میں باز پرس کرتی رہو گی تو تمہارے خدوخال اور سراپا کا خمار [illegible]" میں نے موضوع کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں [illegible] تھکا ہوا تھا اور کمرہ مقفل کیے سو رہا تھا۔ کاؤنٹر پر میں نے یہی بتایا [illegible] رہا ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ مجھے الجھاتی جا رہی تھی۔ "دوپہر بارہ بجے تم نے خود مجھے بلایا تھا اور میں کافی دیر تک تمہارے دروازے پر دستک دینے کے بعد کاؤنٹر پر گئی تھی۔"

"گہری نیند میں مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا۔ سونے کا پروگرام بناتے وقت یہ بات ذہن سے نکل گئی تھی کہ دوپہر میں تم آؤ گی۔"

"یہ اس سے کہنا جو تمہیں نہ جانتا ہو۔ تم کافی عرصے میری خوابگاہ میں سوتے رہے ہو اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ذرا سی آہٹ پر بھی بیدار ہو جاتے ہو۔"

"آخر تم کیا چاہتی ہو؟" اس کی حد سے تجاوز کرتی ہوئی جسارت نے بالکلیہ مجھے سنجیدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

"تم خود الٹی سیدھی باتیں کر کے میرے شبہ کو تقویت پہنچا رہے ہو۔ مجھے البرٹو کا پتہ درکار ہے۔ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟"

"البرٹو یا شوارٹ میرے پیچھے کیوں لگے ہوں گے؟"

"البرٹو کے مشکوک ذریعۂ معاش پر مجھے شبہ ہے کہ وہ یہاں اسرائیل کے لیے کام کر رہا ہے۔ تمہارا اسرائیل سے نکلنا ناممکنات میں سے تھا اور تم یہاں موجود ہو مجھے یقین ہے کہ تم غیر قانونی طور پر وہاں سے فرار ہوئے ہو گے اور تمہاری دوبارہ گرفتاری کیلئے اسرائیلی حکام نے ہر ایجنٹ کو ہوشیار کر دیا ہو گا۔" اس کی باتیں بہت مدلل تھیں ال ایل کے طیارے کے اغوا کنندگان کے ناموں کے بارے میں متعلقہ حکومتوں اور اسرائیل کو یقیناً علم ہو گیا تھا لیکن لوتومو سے ہونے والے معاہدے کی روشنی میں اغوا کنندگان کے ناموں اور حلیوں کی اخبارات اور ٹیلی وژن وغیرہ کے ذریعے تشہیر نہیں کی گئی تھی ورنہ فلورا شاید براہِ راست معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی۔

"تم بہت ذہین ہو تمہیں تو سیکرٹ سروس میں ہونا چاہیئے تھا۔" میں نے اسے اپنی باہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"پہلے یہ موضوع ختم کرو۔" وہ تڑپ کر میری باہوں سے نکل گئی۔

"تمہاری بہن تمہارے ان اندیشوں سے باخبر ہے؟" میں نے قدرے سکوت کے بعد اس سے ایک فیصلہ کن سوال کر ڈالا۔

"اسے البرٹو سے زیادہ شوارٹ کی فکر ہے۔ میں نے اس موضوع پر اس سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ میں تو اپنے طور پر البرٹو کو تلاش کر رہی ہوں!"

"وہ کیوں؟"

"میری بہن شوارٹ کو چاہتی ہے مگر البرٹو ان دونوں کے خفیہ میل جول سے بے خبر ہے۔ میری دانست میں شوارٹ خانگی ذمہ داریوں کے معاملے میں بالکل بودا ہے۔ اگر البرٹو کو کچھ ہو گیا تو میری بہن اور اس کے چار بچے برباد ہو جائیں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ البرٹو پر تمہاری نظر ہو!"

"میڈ! در اصل میری بہن حضور ہے مگر بے عقل ہے۔ شوہر کتنا ہی نکما اور بے حس کیوں نہ ہو اس کا وجود عورت کیلئے بڑے اعتماد کا سبب ہوتا ہے۔ شوارٹ اس کی حیوانی جبلت کی تسکین تو ضرور کر سکے گا مگر اسے اعتماد سے محروم ہونا پڑے گا۔"

"تم تو یہ طے کرنے پر تلی ہوئی ہو کہ البرٹو مارا جا چکا ہے۔"

"وہ زندہ بھی ہوا تو مرنے سے بدتر ہو گا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ تمہارے

ہی ساتھیوں کے قبضے میں ہے نا؟"

"زبردستی اقرار کرانا چاہتی ہو؟"

"میرا دل کہتا ہے کہ تم اس بارے میں ضرور جانتے ہو!"

"تمہارا دل پاگل ہے۔ دس بجے میں خود تمہارے ساتھ کاسینورائل چلوں گا شوارٹ اس بارے میں ضرور مدد کر سکے گا۔" میں نے کہا۔ اور یہ اتفاق بھی دیکھو کہ البرٹو کے ساتھ ہی وہ تابوت ساز بڑھئی بھی غائب ہے جبکہ میں اس سے بالکل واقف نہیں۔ ممکن ہے کہ شوارٹ نے ان دونوں کو کسی دھندے پر لگا رکھا ہو!"

"تم یہ بھول رہے ہو کہ البرٹو گھر سے اپنی مرضی سے نہیں گیا بلکہ اسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔" وہ بولی۔

"تم یقین کرو کہ اس معاملے میں میرے ہاتھ صاف ہیں۔ یہ کوئی بڑا چکر معلوم ہوتا ہے۔ البرٹو اور شوارٹ نے اپنی نجی گفتگو میں اگر میرا نام لیا تھا تو یہ میری بدقسمتی ہے۔"

"اگر آج رات شوارٹ سے بھی البرٹو کا سراغ نہ ملا تو میں ساری کہانی بلا کم و کاست پولیس تک پہنچا دوں گی۔"

"اور اس میں مجھ بے گناہ کا تذکرہ بھی ہو گا؟"

"چاہو تو اسے گول کر دوں گی۔"

"میرا نام درمیان میں آ گیا تو تفتیش مکمل ہونے یا البرٹو کی بازیابی تک میں یہیں پھنس کر رہ جاؤں گا جب کہ میرا یہاں بہت مختصر قیام ہے!"

"میں تمہارا نام نہیں لاؤں گی۔"

"اوہ۔ تو آخر تمہیں مجھ پر یقین آ ہی گیا۔" میں بے تکلفی کے اس ماحول میں اپنی بے ساختہ خوشی پر قابو نہ پا سکا۔

"تم نے مجھے یقین کرنے پر مجبور کیا ہے۔"

اور اسی وقت میں نے سرعت کے ساتھ ایک فیصلہ کر لیا جو فلورا کے رویے کی روشنی میں ناگزیر تھا۔

اس کے بعد میں نے کمرے کی روشنیاں گل کر دیں۔ ایک موضوع نمٹ چکا تھا۔ اور فلورا دوسرے موضوع سے انصاف کرنے کیلئے تیار تھی۔

فلورا کا سراپا آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔ تل ابیب کے تعلقات کی سرگرم تجدید میں وہ مجھے دو ہاتھ آگے تھی۔

جس وقت ہم دونوں تیار ہو کر کمرے سے نکلے تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں نے دروازہ مقفل کر کے فلورا کو ساتھ لیا اور نیچے چل دیا۔

لفٹ سے اترنے کے بعد میں چابی دینے کاؤنٹر پر گیا تو وہاں وہی لڑکی براجمان تھی جو دوپہر میں مجھے عبداللہ کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔

"عبداللہ آئے تو اسے کاسینورائل بھیج دینا!" میں نے لڑکی کو ہدایت کی۔ اس نے اپنے سر کو ہلکا سا خم دیا اور میں واپس فلورا کے پاس پہنچ گیا۔

فلورا اپنی بہن کی کار میں وہاں آئی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں سگریٹ سلگا کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"خاموش کیوں ہو؟" راستے میں میں نے اسے ٹوکا۔

"اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"عورتوں کیلئے بڑھاپے کا تصور سوہان روح ثابت ہوتا ہے!"

"اس لمحے... بڑھاپے کے درمیانی عرصے کے بارے میں سوچ رہی ہوں!" ذرا بلند آواز میں سوچتی کہ میں بھی کوئی شوہر ہوتی... میں نے ابھی تک رنگینیوں کی دلدل میں ڈوب کر زندگی گزاری ہے مگر سکون کی نعمت سے ہمیشہ محروم رہی ہوں۔"

"تمہارا شوہر بہت بدذات تھا۔"

"مجھے اگر کوئی سچا ساتھی مل جائے تو میں اب گھر بسانا چاہتی ہوں۔" اس نے پرخیال انداز میں کہا۔

"میڈ مورا کی طرح؟" میں نے طنز کیا۔

"وہ پاگل ہے جو البرٹو کی قدر نہیں کرتی۔ البرٹو جو کچھ بھی ہو مگر پارسا ہے۔ وہ عورتوں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔"

"تو کیا ہوا! تم تو اس کی قدردان ہو۔"

"کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے!" اس نے اداس لہجے میں سوال کیا۔

"کس سلسلے میں؟"

"مجھے کسی کی مضبوط باہوں کے حصار کی ضرورت ہے!"

"وہ تو تم ہر وقت تلاش کر سکتی ہو۔ ہر روز خود کو ایک نئے حصار میں بند پاؤ گی۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔

"میرے وجود میں ابھرنے والے ایک نیک جذبے کا یوں مذاق نہ اڑاؤ۔" وہ دھیمی اور شکستہ آواز میں بولی۔ "میری یہ خواہش ہے کہ میرا کوئی ایسا ہو جو میری ہر مرئی اور غیر مرئی شے پر حق جتانے کا عادی ہو!"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"آزاد زندگی بہت بے کیف ہوتی ہے۔ سچی خوشی تو اسی وقت ملتی ہے جب کوئی مرد عورت کو اپنی انا، آبرو اور وقار کا مسئلہ سمجھتا ہے!"

"یہ فلسفہ کب ذہن میں آیا؟"

"میں تل ابیب میں ہسپتال میں پڑے پڑے یہی سب سوچا کرتی تھی۔"

"اسمتھ نے بھی تم کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا تھا اور تمہاری ہڈیاں توڑ کر ہسپتال پہنچا دیا تھا مگر تم نے اسے طلاق دے دی۔"

"وہ خود بھی تو ہرجائی تھا!"

"اس بارے میں تم میری مدد کا ذکر رہی تھیں۔"

"تمہارے لیے میں اس زاویے سے شاید گندگی کا ڈھیر ثابت ہوں پھر بھی میں یہ پوچھوں گی کہ کیا تم میرا ہاتھ تھام سکو گے!"

"یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو گی۔"

"وہ کیوں؟"

"آزاد ہرنی جنگل ہی میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسے گھر میں قید کرنے سے اس کی فطرت میں غیر فطری تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم دامن بچاؤ گے!" اس نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ "تم سے ملاقات کے بعد میں نے کسی سے راہ و رسم نہیں رکھی تھی مگر میں تمہاری نظروں میں گر چکی ہوں۔"

"میرے بارے میں تم سنجیدہ کب سے ہو گئیں؟"

"ہسپتال میں مجھے سکون اور تنہائی میں سوچنے کا موقع ملا مگر جب واپس آئی تو معلوم ہوا کہ تمہارے اسمتھ کا گھر مقفل تھا اور وہ بار بار میری بدترین دشمن تھی لہٰذا میں یہاں چلی آئی۔ جب کل تمہیں اچانک یہاں دیکھا تو خیال ہوا کہ شاید قدرت مجھے شہ دے رہی ہے۔"

"شوارٹ سے تم کیا پوچھو گی؟"

بعد میں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"اس سے براہ راست بات کرنا ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ سخت لہجہ بھی اختیار کرنا پڑے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

کاسینورائل روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی عمارت کا نام تھا جہاں بڑے پیمانے پر قمار بازی کے ساتھ نائٹ شو بھی ہوتے تھے۔

ہم دونوں ٹکٹ لے کر قمار خانے کی طرف گئے تو وہاں ہیجان اور جنون کی ایک عجیب دنیا آباد تھی۔ کاسینورائل کے قمار بازوں میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ نظر آ رہے تھے مگر ان کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ عادی جواری ہیں۔

خوش جمال اور مست خرام لڑکیاں وحشت ناک پیرائے میں لباس پہنے مسکراہٹوں اور چتون کے تیر برساتی خریداروں کی تلاش میں پھر رہی تھیں۔ ان کے لباس ستر پوشی کے بجائے ستم زمانی کا کام سرانجام دے رہے تھے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے میزوں کے درمیان گھومتے رہے۔ اس وقت دس بج چکے تھے مگر شوارٹ کا کہیں پتا نہیں تھا۔

بے چاری فلورا کو کیا پتہ کہ شوارٹ جہاں بھیجا جا چکا ہے وہاں سے کسی کی واپسی ناممکن تھی مگر میں زبان بند کیے اس کی تلاش میں شریک تھا۔

وہاں سے نکل کر وقت گزاری کے لیے ہم نے نائٹ شو کے ٹکٹ خرید لیے۔ اندر گھسے تو کاسینورائل کا وسیع ہال تمباکو اور شراب کی بو سے بوجھل ہو رہا تھا۔ تاریکی میں تماشبینوں کے چڑھتے اترتے سانسوں کے زیر و بم صاف سنائی دے رہے تھے اور وسیع اسٹیج پر روشنیوں کے ہالے میں دو عورتیں اپنے فطری لباس پر رنگین مٹی سے نقش و نگار بنائے طاغوتی رقص میں مصروف تھیں۔ سازوں کے ساتھ ساتھ ان کی حرکات میں بھی اتار چڑھاؤ آ رہا تھا۔

اپنی نشست کی طرف جاتے ہوئے تاریکی میں میں نے دیکھا کہ تماشائیوں میں عورتیں بھی اسی قدر تھیں جس قدر مرد۔

میرے لیے زندگی میں وہ پہلا موقع تھا کہ میں اسٹیج پر برہنہ حوا کو شرم و حیا سے محروم حالت میں داد کا طلب گار دیکھ رہا تھا۔ اور پھر ایک مفسد نام نہاد مجھی ڈرم کی تیز تھاپ سنتے ہی اسٹیج پر آ گیا اور ان دونوں کے رقص میں شریک ہو گیا۔

پورا ہال سیٹیوں اور سسکاریوں سے گونج اٹھا اور میں نے فلورا کا ہاتھ تھام کر اپنی نشست چھوڑ دی۔

گو میں بھی کوئی پارسا نہیں تھا لیکن مسلمہ اخلاقی اقداروں کی اس سطحی پامالی کا تصور بھی میرے ذہن میں موجود نہیں تھا اور آثار بتا رہے تھے کہ اس ابتدا کی انتہا وہ ہو گی جس کے تصور سے خلوت میں بھی حساس ذہن شرما جاتے ہیں۔

"باہر کیوں آ گئے؟" دروازے سے نکلتے ہوئے فلورا نے سوال کیا۔

"تم اندر کیوں گئی تھیں؟" میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"شوارٹ کے انتظار میں وقت گزارنے کا اچھا بہانہ تھا۔" وہ بولی "کاسینورائل کے لائیو شو پورے فرانس میں شہرت رکھتے ہیں۔"

"اگر یہی رفتار رہی تو کچھ عرصے بعد عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے سے نفرت ہو جائے گی۔"

"یہ ناممکن ہے ان دونوں میں کشش ہے ازل سے ابد تک رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی تفریحات تمہارے نزدیک عجیب ہوں مگر یورپ والے اس کے عادی ہیں۔" میں خاموش رہا۔

اس بار ہم قمار خانے میں گئے تو شوارٹ تو کیا نظر آتا مجھے عبداللہ نظر آ گیا جو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح میزوں کے درمیان چکراتا پھر رہا تھا۔

"ذرا ایک منٹ یہیں رکو!" یہ کہہ کر میں نے فلورا کو وہیں چھوڑا اور عبداللہ کی طرف ہو لیا جس کی پشت میری جانب تھی۔

میرے لیکارنے پر وہ چونک کر میری طرف پلٹا۔ "کیا چکر ہے؟" اس کے لہجے سے بلا کا تجسس جھلک رہا تھا۔

میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک علیحدہ گوشے میں لے گیا۔

"البرٹو فلورا کا بہنوئی تھا اور وہ اس کی گمشدگی کیلئے مجھے ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ اب بھی اس کا ذہن میری طرف سے صاف نہیں ہے میرا خیال ہے کہ اسے بھی شوارٹ کے مکان پر پہنچا دیا جائے۔"

"قبرستان بنا دو اس مکان کو!" وہ آہستہ سے بولا "کہاں ہے وہ؟"

"شوارٹ کی تلاش میں میرے ساتھ آئی ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ شاید تم ہمیں البرٹو تک لے جا سکو گے!"

"یہ کچھ غلط بھی نہ ہو گا۔"

میں عبداللہ کو ساتھ لیے فلورا کی طرف آیا اور ان دونوں کا تعارف کرا دیا۔ رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد میں انہیں باہر لے آیا۔

"البرٹو کے بارے میں یہ شخص ہماری مدد کر سکے گا۔"

"تم اس سے واقف ہو؟" فلورا نے براہ راست عبداللہ سے سوال کیا

"سینورا! میں اس سے خوب واقف ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ اس کے لیے کام کیا ہے۔ ابھی ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔"

"تم اس کے کسی دشمن سے واقف ہو؟"

"نہیں میں ایک ہی شخص اسے اغوا کر سکتا ہے اور میں اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔" عبداللہ نے انکسار سے کہا۔

"تو پھر چلو!"

"میری رینالٹ آگے کھڑی ہے۔ آپ لوگ میرے پیچھے آئیں۔" عبداللہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں تیزی کے ساتھ شوارٹ کی مضافاتی حویلی کی جانب جارہی تھیں، جہاں بارہ گھنٹے سے بھی کم وقفے میں چار لاشیں جمع ہوچکی تھیں اور اب اس تعداد میں ایک کا اضافہ ہونے والا تھا۔

شوارٹ کا وہ مکان صحیح معنوں میں کھلے قبرستان کی حیثیت اختیار کرچکا تھا جہاں نہ تابوت کی ضرورت تھی نہ گورکن کے نخرے۔

"یہ کون ہے؟" خاصی دیر بعد فلورا نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا واحد دوست!" میں نے ہنس کر کہا۔

"پہلے تو تم انکار کررہے تھے۔"

"اس نے اغوا نہیں کیا لیکن یہ تمہاری مدد کرسکتا ہے۔"

"میں اور کیا چاہتی تھی۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "تم نے بلاوجہ بات الجھادی ورنہ میں تو صرف البرٹو کی بازیابی چاہتی تھی۔"

"مگر تمہارا رویّہ سخت قابلِ اعتراض تھا۔"

"میں نے تمہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا تھا۔ تم نے خود ہی اپنے مبہم جوابات سے مجھے اشتعال دلایا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ ہنسی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "شکر کرو کہ ہمیں ایک کارآمد شخص مل گیا۔ اگر مجھے پولیس سے رجوع کرنا پڑتا تو شاید میں اپنی کہانی سے تمہارا تذکرہ حذف نہ کرپاتی۔"

اس کے آخری فقروں نے میرا سر بلند کردیا۔ اس کے بارے میں میں نے جو فیصلہ کیا تھا اس کا جواب فلورا نے خود دے دیا تھا۔

"یہ بہت بھاری معاوضہ لے گا۔" میں نے کہا۔

"مگر میری حیثیت کے مطابق ہوا تو انکار نہیں کروں گی۔ اس سے آگے تمہاری ذمہ داری ہوگی کیونکہ عبداللہ تمہارا دوست ہے۔"

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر کار میں خاموشی چھاگئی۔ سرد رات کے سناٹے میں ویران سڑک پر دونوں گاڑیاں لحظہ بہ لحظہ مقتل سے قریب تر ہوتی جارہی تھیں۔

دونوں گاڑیاں ویران مضافاتی شاہراہ پر چند کلومیٹر ہی گئی ہوں گی کہ اچانک عقب سے فائر انجنوں کا تیز شور سنائی دیا۔

"نہ جانے کہاں آگ لگی ہے۔" فلورا بڑبڑائی۔

اسی وقت عبداللہ نے اپنی رینالٹ سڑک کے کنارے سے نیچے اتار کر فائر انجنوں کو راستہ دینے کے لیے روک دی۔ فلورا نے بھی اس کی تقلید کی۔

میں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا تو فائر انجن تیزی سے بڑھتے آرہے تھے۔ ان کی گردش کرتی ہوئی سرخ روشنیوں کا انعکاس آسمانی بجلی کی طرح چند ثانیوں کے لیے سڑک کے ایک حصے کو منور کرتا اور پھر اس کا رخ تبدیل ہوجاتا۔

فائر انجنوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں سب سے پہلا خیال شوارٹ کے مکان کے بارے میں آیا جہاں ہم تجوری میں آگ بھڑکتی چھوڑ آئے تھے۔

شوارٹ کی خواب گاہ میں اتنا سامان بھرا ہوا تھا کہ تجوری سے اڑنے والی چند چنگاریاں خطرناک آگ کی صورت اختیار کرسکتی تھیں مگر مجموعی طور پر اس عمارت میں اتنا سامان نہیں تھا جو آگ پوری عمارت کو لپیٹ میں لے لیتی۔

پوری عمارت میں آگ صرف بجلی کے تاروں کے ذریعے پھیل سکتی تھی جس کا مجھے کم ہی امکان نظر آرہا تھا۔

دو فائر انجن چیختے چنگھاڑتے آسیبی ہیولوں کی طرح ہمارے قریب سے گزرے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ انجنوں پر لدے ہوئے فائر مین آنے والے لمحات کی تیاریوں میں مشغول نظر آئے۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ کسی بڑے حادثے کی خبر پاکر نکلے ہوں۔

فائر انجنوں کے جانے کے بعد عبداللہ اپنی گاڑی سڑک پر لے گیا اور فلورا بھی خاموشی سے آگے چل پڑی۔

معاً میرے ذہن میں اپنی حماقت کا احساس بیدار ہوا اور میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ ہم لوگوں نے شوارٹ کے مکان میں جس وقت تجوری کو جلتے ہوئے چھوڑا اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے اور اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارہ گھنٹوں کا یہ وقفہ شوارٹ کے گھر میں آگ کے بارے میں میرے خیال کی مکمل تردید کے لیے بہت کافی تھا۔ اگر شوارٹ کے یہاں تجوری سے آگ پھیلی ہوتی تو اسے بہت پہلے خطرناک صورت اختیار کرلینا چاہیے تھی۔

اور پھر فائر انجنوں کی روانگی لازمی طور پر آتش زدگی کا نتیجہ نہیں ہوسکتی تھی۔ کسی عمارت کے گرنے یا شاہراہ پر ٹریفک کے کسی بھیانک حادثے کی صورت میں بھی وہ شعبہ جلنے حادثہ کا رخ کرسکتا تھا۔

اس نئے وسوسے سے نجات پاتے ہی میرا ذہن فلورا کی شخصیت میں الجھ گیا۔

عورت کے ساتھ تشدد کو میں ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا خواہ وہ مجرمانہ ہو یا دفاعی اور میں نے بارہا اپنی ذات کے ساتھ نسوانی جارحیت کو محض اسی وجہ سے نظرانداز کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے صرف ایک عورت ماری گئی تھی جو نہ صرف خود مجرم اور قاتل تھی بلکہ وہ اسرائیل کی سلامتی اور افواجِ آزادیٔ فلسطین کے لیے شدید ترین خطرے کا روپ اختیار کرچکی تھی اور اس کے رویّے میں تبدیلی ناممکن تھی۔

کیپٹن ماریا میری دلدار بھی تھی اور دلبر بھی مگر بیشتر وہ انتہا پسندوں کے ایک ایسے ٹولے میں شامل تھی جو عام فوجی سرگرمیوں کے علاوہ فلسطینی حریت پسندوں کا لہو بہانے پر مامور تھا۔ ان حالات میں اپنے اصول سے انحراف غیر فطری نہیں تھا۔

مگر فلورا کا معاملہ مختلف تھا۔ اس نے تل ابیب سے لے کر یہاں تک کبھی بھی اور کہیں بھی میرے ساتھ دیدہ و دانستہ چالبازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ میری خیرخواہ رہی اور اپنے آشنا کے طور پر میرا نام چھپانے کے لیے اس نے اپنے شوہر میجر اسمتھ کے ہولناک تشدد کا بھی نشانہ بنی۔ میرا ضمیر اسے قتل کرنے کے فیصلے پر مطمئن نہیں تھا۔

اس کی ذات سے مجھے ایک موہوم سا خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ البرٹو کی گمشدگی کے بعد پولیس کے روبرو یہ انکشاف نہ کر بیٹھے کہ اس نے شوارٹ کو کسی اجنبی سے البرٹو کے بارے میں رازدارانہ گفتگو کرتے سنا تھا۔

میں اب اسرائیل کی فتنہ پرور سرزمین سے باہر تھا اور چھوٹے موٹے خطرات کا پامردی سے مقابلہ کرسکتا تھا۔ وہ نیس میں میرے قیام کی آخری رات تھی۔ صبح میں پیرس روانہ ہوجاتا اور وہاں میرا نام بھی بدل جاتا۔ کسی طرح فلورا کو اپنی خفیہ روانگی تک پولیس سے رجوع کرنے سے روک کر اس کی ذات سے لاحق معمولی سا خطرہ بھی ٹل سکتا تھا۔

اس موضوع پر میں جس قدر غور کرتا رہا، فلورا کے قتل کا فیصلہ اسی قدر بے بنیاد محسوس ہونے لگا۔

"یہ کہاں لیے جارہا ہے؟" اچانک فلورا نے مجھے ٹوکا۔

"کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہی تمہارا دوست! کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"الملاّ!" میں نے اس کی بھول سے بے ساختہ فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک فرضی نام دہرا دیا جو صوتی اعتبار سے عبداللہ سے ملتا جلتا تھا اور اگر اس کے ذہن میں میرے بتلاتے ہوئے اصل نام کا موہوم سا تصور بھی باقی رہا ہوگا تو اس نے الملاّ پر فوراً یقین کرلیا ہوگا۔ "مجھے خود نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلا جارہا ہے۔"

"تمہیں بھروسہ ہے نا اس پر؟"

"بھروسہ نہ ہوتا تو اس کے پیچھے یوں دوڑا نہ آتا۔" میں نے کہا۔ "ذرا گاڑی آگے نکال کر اسے رکنے کا اشارہ کرو، میں بات کرتا ہوں اس سے!"

فلورا نے یک بیک ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھادیا۔ رینالٹ سے آگے نکلتے ہوئے میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر عبداللہ کو رکنے کا اشارہ کیا اور فلورا نے عقب نما آئینے میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے گاڑی روک لی۔

میں جوں ہی نیچے اترا، کھلے ہوئے میدان کی خنک ہواؤں نے میرا استقبال کیا اور میں جھرجھری لے کر عبداللہ کی طرف بڑھ گیا۔

"تم نے دیکھ لی ہے؟" میرے قریب پہنچتے ہی عبداللہ بول پڑا۔ فلورا اس خنک موسم میں گاڑی سے اترنے کی ہمت نہ کرسکی تھی۔

"کیا دیکھ لی ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ آسمان پر سرخی نظر آرہی ہے نا۔" اس نے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "فائر انجن بھی اسی طرف گئے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آگ اگر شوارٹ کے مکان میں نہیں تو اس کے اڑوس پڑوس میں ضرور لگی ہے۔"

میں نے پلٹ کر آسمان پر نظر ڈالی تو وہاں واقعی شعلوں کا لہورنگ انعکاس نمایاں تھا۔ شعلوں کے گھٹنے بڑھنے سے اس انعکاس کی شدت میں بھی کمی بیشی ہورہی تھی۔

"اس کی نشاندہی کا شکریہ! میں یہ بتانے آیا تھا کہ اب میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"کون سا فیصلہ؟"

"فلورا کو قتل نہیں کیا جائے گا۔" میں نے مدھم مگر ٹھوس لہجے میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں راضی ہوگئی ہے۔" وہ لفنگوں کے سے انداز میں ہنس کر بولا۔ "تم جو چاہوگے وہی ہوگا۔"

"اب اسے واپس کیسے لے جائیں؟"

"اس آگ تک چلتے ہیں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ "میں اس سے کہہ دوں گا کہ میں اسے وہیں لے جانا چاہتا تھا جہاں آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ آگ شوارٹ کے ہی مکان میں لگی ہو۔ بعد میں جب شوارٹ کی جلی ہوئی لاش کے ساتھ البرٹو کا جسم بھی وہیں سے ملے گا تو فلورا کو یقین ہوجائے گا کہ البرٹو کو اٹھوانے والا شوارٹ ہی تھا۔"

"بہت دیر لگادی، کیا کہہ رہا تھا؟" میرے واپس پہنچتے ہی فلورا نے سوال کیا۔

"وہ آسمان پر سرخی دیکھ رہی ہو؟" میں نے ونڈشیلڈ سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے پُراثر لہجے میں کہا۔

"اوہ خدا، یہ تو زبردست آگ لگی ہوئی ہے کہیں۔" وہ حیرت سے بولی۔ "شاید وہ دونوں فائر انجن وہیں گئے تھے۔"

"یہ آگ ہماری منزل کے قرب و جوار میں نظر آتی ہے۔ الملاّ اس بارے میں پریشان ہے۔" میں نے اپنے لہجے پر قنوطیت طاری کرتے ہوئے کہا۔

اسی اثنا میں عبداللہ ایک بار پھر آگے نکل گیا۔

"ایسا نہ ہو کہ البرٹو آگ میں گھر گیا ہو۔" وہ تشویش آمیز لہجے میں بولی۔ "خدا کرے کہ الملاّ کا وہم بے بنیاد ہو۔"

پھر فضا پر جانگسل خاموشی چھاگئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں یکے بعد دیگرے شوارٹ کے وسیع عریض مکان کے سامنے سڑک کے کنارے رک گئیں۔ دوسری طرف نیس جانے والا سارا ٹریفک رکا ہوا تھا اور بیشتر افراد آگ بجھانے کے کام میں عملے کو مدد دے رہے تھے۔

شوارٹ کا مکان اور اس کے گرد اگا ہوا جنگل نما خودرو باغ بری طرح شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ سامنے کے حصے میں چھ فائر انجن آگ بجھانے کے کام میں مصروف تھے جب کہ شعلوں کے عقب میں بھی کئی کئی سو فٹ بلندیاں کی موٹی موٹی چھ سات دھاریں چمکتی نظر آرہی تھیں۔ ہوا چلنے کے باعث آگ پر قابو پانا بےحد دشوار نظر آرہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے سینورا!" عبداللہ گاڑی سے اُتر کر ہمارے قریب آتے ہوئے بولا "پتہ نہیں وہ زندہ ہے یا جل گیا۔ اس وقت تو اندر داخل ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں، آگ تیزی سے ہر طرف پھیلتی جا رہی ہے۔"

"تمہارا نام الملآ ہے؟" میں نے جلدی سے عربی میں کہا اور عبداللہ مجھے یوں گھورنے لگا جیسے میں نے اس کی شان میں کوئی گستاخی کی ہو۔ فلورا کسی پاگل کی طرح آنکھیں پھاڑے آگ کی طرف دیکھ رہی تھی اس لیے وہ شاید میرا فقرہ نہ سن سکی۔

امدادی کام کرنے والوں کی چیخ و پکار، پمپوں کا تیز شور اور جلتے ہوئے سرسبز درختوں کی تیز چرچراہٹوں نے فضا کو سوگوار بنایا ہوا تھا۔ شعلے اپنی راہ میں حائل ہونے والی ہر چیز کو نہایت بے رحمی سے چاٹتے جا رہے تھے۔

"تمھیں یقین ہے کہ البرٹو یہاں نہیں تھا؟" فلورا نے اچانک عبداللہ سے سوال کیا۔

"البرٹو کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم سینورا!" عبداللہ نہایت مہذب انداز میں سر کو قدرے خم دے کر بولا "البتہ جو شخص اس کے بارے میں بتا سکتا تھا وہ آج کی رات ضرور اسی عمارت میں موجود تھا۔"

"آگ بجھانے والے عملے سے اندر والوں کی خیریت معلوم کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ سلامت باہر موجود ہو۔" فلورا اضطراری لہجے میں بولی۔

"معاف کیجیے سینورا، میں ان کے کام میں اس وقت دخل اندازی نہیں کر سکتا۔" عبداللہ نے جواب دیا "بہتر یہی ہے کہ اب کل کا انتظار کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک البرٹو خود ہی گھر پہنچ جائے۔"

شعلوں کی وجہ سے وہ سارا علاقہ روشن ہو گیا تھا۔ میں فلورا کے چہرے پر گہرے تاسف کی علامات ضرور دیکھ رہا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ ذہنی طور پر خود کو بدترین صورتِ حال کے لیے بھی تیار کر چکی تھی۔

میرے لیے شوارٹ کے اس حویلی نما مکان میں لگی ہوئی بھیانک آگ شدید حیرت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اگر تجوری سے وہ آگ بھڑکی تھی تو اسے اس قدر خطرناک نہ ہونا چاہیے تھا۔ اول تو اس عمارت میں کوئی ایسا قابلِ ذکر سامان موجود نہیں تھا جو آگ پھیلانے میں معاون ثابت ہوتا۔ اگر میں یہ فرض کر لیتا کہ وہ آگ بجلی کے تاروں سے پھیلی ہو گی تو بھی خودرو باغ تک آگ پھیلنی ناممکن تھی۔

"یہاں آگ کیسے لگ گئی؟" فلورا شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

"خشک جھاڑیاں کسی سگریٹ سے بھی آگ پکڑ سکتی ہیں۔" میں نے اس کا بازو تھام کر اسے گاڑی کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

"اتنی آگ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔" وہ پھریری لیکر بولی "یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ کل میری تم سے ملاقات ہوئی اور البرٹو تمھارے بارے میں باتیں کرتے ہوئے پائے گئے۔ کچھ دیدہ دلیر لوگ البرٹو کو گھر سے اٹھا کر لے گئے۔ البرٹو کا ایک اپنے گھر سے لاپتہ ہے اور تمھارا دوست البرٹو کے سلسلے میں مجھے یہاں تو یہ گھر جہنم بنا ہوا ہے۔"

"زندگی میں بعض اوقات اس سے بھی زیادہ عجیب باتیں ہو جاتی ہیں۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

"اس شخص کا نام کیا تھا؟" اس بار فلورا براہِ راست عبداللہ سے مخاطب ہو گئی۔

"کس کا؟" عبداللہ نے چونک کر سوال کیا۔

"وہی جس کے پاس تم آئے تھے۔" فلورا نے پلٹ کر جلتے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہنری شوارٹ۔" عبداللہ نے پُرسکون لہجے میں کہا اور فلورا چلتے رُک کر اس طرح عبداللہ کو گھورنے لگی جیسے اس کے سر پر یک بیک سینگ نکل آئے ہوں۔

"کیا ہوا سینورا!" عبداللہ نے ہڑبڑانے کی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہنری شوارٹ کو تم کیسے جانتے ہو؟" فلورا کے بجائے میں نے پوچھا کیا۔ فلورا کی نظروں میں اپنا اعتماد بحال رکھنے کے لیے میری دخل اندازی ناگزیر تھی۔

"وہ میرا بہت پرانا یار ہے۔" عبداللہ نے لاپروایانہ انداز میں کہا۔

"آخر تم دونوں اس کے نام پر کیوں چونک پڑے ہو؟"

"اس لیے کہ فلورا کی دانست میں البرٹو کی گمشدگی میں کسی نہ کسی طرح شوارٹ کا بھی دخل تھا۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تو یہ سیدھی یہاں کیوں نہ چلی آئیں؟" عبداللہ نے قدرے لہجے میں کہا "ہو سکتا تھا کہ یہ آتش زنی سے پہلے اس سے مل لیتیں۔"

"ضرور مل لیتیں۔" میں نے کہا "مگر فلورا کو شوارٹ کے گھر کا معلوم نہیں تھا۔"

"مگر اب میں ضرور اس سے ملوں گی۔" فلورا بولی۔

"کیا اسی وقت؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" وہ اٹل لہجے میں بولی "اور اگر فائر بریگیڈ کے عملے نے اندر داخل نہ ہونے دیا تو میں باہر گاڑی میں بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کروں گی۔"

"مناسب یہی ہو گا کہ یہ معاملہ صبح تک ملتوی کر دیا جائے۔" میں نے فلورا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "واقعات تیزی سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ صبح تک شوارٹ چاندی کی چڑیا بن کر پرواز کر جائے۔"

فلورا کے الفاظ میں چھپے ہوئے طنز کی تلخی میں نے بڑی شدت سے محسوس کی مگر بظاہر ہنس کر بولا "فکر نہ کرو، ہم عقاب بن کر اس کا پیچھا کریں گے۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم کسی خونخوار عقاب سے کم نہیں ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی "کیا تمھیں اب بھی پورا یقین ہے کہ ان تمام واقعات کا تمھاری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے؟"

"تم احمقانہ باتیں کر رہی ہو فلورا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو۔"

"تمھاری کمزوری۔" وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولی "مجھے تو حسرت ہی رہی کہ تمھاری کس کمزوری سے واقف ہو سکوں۔"

"اگر تم چاہو تو بلا تکلف پولیس کو بتا سکتی ہو کہ ڈاکٹر آسکر جینتھم کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ میری طرف سے تمھیں کھلی اجازت ہے۔" میں نے برہمی کے عالم میں کہا اور اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر عبداللہ کی سیاہ رینالٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"خدا حافظ سینورا۔" عبداللہ نے سر کو قدرے خم دے کر کہا اور لپک کر میرے ساتھ ہو لیا۔

"سنو۔" اچانک فلورا کی آواز آئی۔

میں اپنی جگہ رک کر اس کی طرف گھوم گیا۔

وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آ کر رُک گئی اور اپنے دونوں ہاتھ محبت آمیز نرمی کے ساتھ میرے سینے پر جما کر آہستہ سے بولی۔

"مجھے معاف کر دو صفدر، میں ذہنی پراگندگی میں مبتلا ہوں۔"

"میرا صحیح نام نہ لو فلورا۔" میں گرد و پیش میں نظریں دوڑاتے ہوئے دبی آواز میں کسی بھیڑیے کی طرح غرایا۔

وہ سہم کر میرے سینے سے آ لگی اور میں اسے سہارا دے کر اس کی گاڑی کی طرف لے گیا۔

"کیا میں جا سکتا ہوں ڈاکٹر؟" عبداللہ نے معصومیت سے سوال کیا۔

"ضرور جاؤ مگر کل شام سے پیشتر البرٹو کا سراغ مل جانا چاہیے۔" فلورا کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر میں نے اس کے پہلو میں نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ کہیں ہے اور زندہ ہے تو کل تک ضرور گھر پہنچ جائے گا۔" عبداللہ نے فدویانہ انداز میں سر جھکا کر بولا "میں کسی کیلئے ضروری کام میں مصروف ہوں مگر اب اسے چھوڑ کر پہلے تمھارا کام نمٹاؤں گا۔"

اس کے آخری فقرے کا مفہوم میں اس وقت سمجھا جب فلورا کی گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی وہ مسکین لہجے میں بولا "ذرا تخلیے میں میری ایک بات سن لو ڈاکٹر۔"

میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ فلورا نے مجھے روک دیا اور عبداللہ سے بولی "جو بات کرنا ہے میرے سامنے کرو۔"

"میں نجی باتیں خواتین کے سامنے نہیں کرتا سینورا۔" عبداللہ نے دانت نکال کر کہا "ڈاکٹر کو صرف ایک منٹ کی مہلت دے دیں۔"

عبداللہ کے خوشامدانہ لہجے سے فلورا نے وہی مطلب اخذ کیا جو عبداللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اور آہستہ سے بولی "اسے تلاش کرو، تمھیں بھرپور معاوضہ دیا جائے گا۔"

"نہیں سینورا! ایسا نہ کہو۔" عبداللہ تڑپ کر بولا "الملآ دوستوں سے معاوضہ لینا حرام سمجھتا ہے۔ بس ڈاکٹر کو ایک منٹ کیلئے چھوڑ دو۔"

"وہ بہت خوددار ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا "اس کی بات سن کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر گیا۔

"صبح سات بجے ہمیں پیرس کے لیے روانہ ہونا ہے۔" فلورا کی گاڑی سے دور آتے ہی عبداللہ نے کہا "ایسا نہ ہو کہ تم فلورا کی آغوش میں سوتے رہ جاؤ۔"

"میں اسے چھوڑ کر ڈیڑھی واپس آ رہا ہوں۔"

"تو پھر میں تمھارے کمرے میں ہی سوتا ہوا ملوں گا۔"

میں فلورا کی طرف آ گیا اور عبداللہ اپنی رینالٹ کی طرف چلا گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" فلورا نے گاڑی کو ٹرن دیتے ہوئے سوال کیا۔

"پانچ ہزار فرانک ادھار مانگ رہا تھا۔"

"ادھار؟" فلورا نے قہقہہ مار کر دُہرایا "صورت سے واپس کرنے والا معلوم نہیں ہوتا۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ رقم مانگے گا۔"

"وہ میرا دوست ضرور ہے مگر اس قماش کے آدمی اپنے مالی مفاد سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہوتے۔"

"اور تم اسے خوددار کہہ رہے تھے۔"

"اس نے تمھارے سامنے رقم نہ مانگ کر میری دانست میں خودداری کی آخری قسم کا مظاہرہ کیا ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا خودداری کی بھی اقسام ہوتی ہیں؟"

"ہاں، جو لوگ مر جاتے ہیں مگر اپنی ضرورت کیلئے دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے اوّل درجے کے خوددار ہوتے ہیں۔"

"احمق ہوتے ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ خوش مزاجی کے مظاہرے پر مائل ہوتی جا رہی تھی۔

"آج کل قدریں تیزی سے بدلتی جا رہی ہیں مگر میں ذہنی طور پر اسی مکتب سے وابستہ ہوں جسے تم جیسے روشن خیال لوگ فرسودہ قرار دیتے ہیں۔"

"اگر تم سچے دل سے اسی مکتب سے وابستہ ہوتے تو میری زندگی میں تمھارا نام شوخ اور چنچل لمحات کی کہانیاں لے کر شامل نہ ہوتا۔"

"کبھی کبھی انسان بھٹک بھی جاتا ہے۔"

"کبھی کبھی۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی "تم تو گمراہی کا شاہکار معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ تو سراسر الزام ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"ماریلبے چاری زندہ نہیں ہے ورنہ وہ بھی میری ہمنوا ہوتی۔ ہم دونوں کے علاوہ تم نہ جانے کتنی خلوتوں سے اُمنگوں کی خوشبو میں چُرا تے رہے ہو گے۔"

"تم خوبصورت الفاظ کے استعمال پر خاصا عبور رکھتی ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔

"سچ سچ بتاؤ کہ عورتوں کے بارے میں تمہارا تجربہ کتنا وسیع ہے؟"

"تمہارے نزدیک تجربے کا معیار کیا ہے؟"

"تعداد۔"

"پھر تو مجھے اناڑی ہی سمجھو میرا تجربہ ماریلا سے شروع ہو کر تم پر ختم ہو جاتا ہے۔" میں نے بلاتوقف جواب دیا۔

"میں مان ہی نہیں سکتی۔"

"نہ مانو۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "میں ضد بھی نہیں کرتا۔"

"اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد فلورا نے سوال کیا۔

"تمہیں چھوڑ کر ہوٹل واپس لوٹنا ہے۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ ہوٹل ہی میں رہنا چاہوں؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا مگر البرٹو کی گمشدگی پر تمہاری بہن پریشان ہوگی۔ اسے تمہارے سہارے کی ضرورت ہوگی۔"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ البرٹو کو پسند نہیں کرتی۔"

"ناپسندیدگی اور نفرت میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"تو پھر نفرت ہی سمجھ لو۔" وہ بولی۔ "وہ تو البرٹو کے اغوا کے بعد ہی سے سکون سے گھر میں بیٹھی البرٹو کے بارے میں کسی بُری خبر کی منتظر ہے۔"

"پھر تو اسے مر ہی جانا چاہیے۔"

"البرٹو بہت بے ضرر قسم کا شوہر ہے۔ اگر میری بہن نے اس کے ساتھ اپنا رویہ نہ بدلا تو شاید میں اسے بہنوئی کے بجائے شوہر کے طور پر قبول کرلوں۔"

"اب کی ہے تم نے صاف بات، مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ البرٹو کے بارے میں تمہاری تشویش بلاسبب نہیں ہے۔"

"تمہارے دو ٹوک جواب کے بعد مجھے کسی دکھی سہارے کی ضرورت ہے۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں جواب دیا۔

"نیس کی ویران گلیوں میں ہر نکڑ پر تمہیں دو چار سہارے مل جائیں گے، تم اسی ایک کے بارے میں کیوں فکرمند ہو؟"

"میں نے خود تمہیں یہ بات کہنے کا موقع دیا ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی جیسے میرے الفاظ سے اسے دلی تکلیف پہنچی ہو۔ "تم میرے دوست ضرور ہو مگر تمہیں میرے ذاتی معاملات میں ایسی جارحانہ دخل اندازی زیب نہیں دیتی۔"

"میں معذرت خواہ ہوں سینورا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آئندہ آپ کو مجھ سے اس قسم کی کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

"میں جانتی تھی کہ تم بُرا مان جاؤ گے۔"

"بھلا میں کیوں بُرا ماننے لگا۔ تم نے مجھے میری عدم آگہی ... میری ذات پر بڑا احسان کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

گاڑی شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ میں لاپروائی سے گرد و پیش لیتا رہا اور فلورا سڑک پر نظریں جمائے خاموشی سے کار ڈرائیو کرتی رہی۔ پھر اس نے ہوٹل ڈی ریمی کے سامنے گاڑی روک دی اور انجن بھی بند نہ کیا۔

"گاڑی پارکنگ لاٹ میں لے چلو۔" میں نے کہا۔

"میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "گھر جا کر آرام کروں گی۔"

"تو میرے کمرے میں رکنے کا ارادہ ترک کر دیا؟"

"تمہیں اپنے کمرے میں رات گزارنے والیاں بہت سی مل جائیں گی، میں جا رہی ہوں۔" وہ اس مرتبہ براہِ راست میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"میں تمہاری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں تمہیں زبردستی روکنا نہیں چاہتا مگر اپنی طرف سے تمہیں بدظن بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"اس کرم فرمائی کا شکریہ۔ میں کل شام آؤں گی۔ شاید اس وقت تک املا البرٹو کے بارے میں کچھ معلوم کرے۔"

میں جواب دیے بغیر گاڑی سے اتر گیا اور فلورا مڑ کر میری طرف دیکھے یا کوئی الوداعی اشارہ کیے بغیر تیزی سے گاڑی کو آگے بڑھا لے گئی۔

میں سر جھٹک کر ہوٹل کی طرف ہولیا۔

میں چونکہ پروگرام کے برعکس فلورا کے گھر جانے کے بجائے سیدھا کمرے میں پہنچ گیا تھا لہٰذا عبداللہ کو وہاں موجود نہ پا کر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد میں نے چارلس بک ہارٹ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نجی ضروریات کے لیے روم سروس کی نگراں اوڈیل کو فون کیا۔

سلسلہ ملنے پر ایک مہربان آواز نے فرنچ میں کچھ کہا جس کے جواب میں میں نے انگریزی میں بتایا کہ میں اوڈیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

"میں اوڈیل ہی بول رہی ہوں سر! آپ حکم فرمائیں۔" آواز نے صاف اور شستہ انگریزی میں کہا۔

"میں کمرہ نمبر ننانوے سے ڈاکٹر آسکر بول رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے سر کہ آپ چارلس کے خصوصی مہمان ہیں، آپ کی خدمت کر کے مجھے دلی مسرت ہوگی۔" وہ نہایت باتونی معلوم ہوتی تھی۔

"آج موسم بہت خراب ہے مس اوڈیل۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں ان بے کیف لمحوں کو سکون آور بنانا چاہتا ہوں۔"

"خوش ذوق اور خوبصورت خواتین کی رفاقت بدترین لمحوں کو بھی پُر کیف بنا دیتی ہے۔ سینورا سکر میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔" اس سوال کا نہایت موزوں جواب موجود تھا۔ "میرا خیال ہے آپ کسی کم گو مقامی لڑکی کو ترجیح دیں گے!"

"میں دس منٹ میں آپ کو اطلاع دیتی ہوں!"

"اتنی عجلت کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ابھی میرا ایک مہمان آنے والا ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں خود فون کروں گا۔"

فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں بستر پر دراز کافی دیر تک عبداللہ کا منتظر رہا مگر عبداللہ نہ آیا جس کے سبب مجھے تشویش ہونے لگی۔ لحظہ بہ لحظہ میری تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

"سر میں انکار کر رہی ہوں کہ ڈی ریمی میں ڈاکٹر آسکر نام کا کوئی شخص مقیم نہیں ہے مگر پھر بھی ایک لڑکی آپ سے بات کرنے پر مصر ہے، وہ کچھ خوفزدہ سی معلوم ہوتی ہے!" مجھے ریسیور پر آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

"سلسلہ ملا دو!" میں نے کہا اور غیرارادی طور پر ہینڈ سیٹ پر میری انگلیوں کی گرفت غیرضروری حد تک سخت ہو گئی۔

"ہیلو آسکر اسپیکنگ!" سلسلہ ملنے پر میں نے کہا۔

"تم خطرے میں ہو ڈاکٹر۔" اچانک ریسیور پر فلورا کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ "وہ میرا پیچھا کرتا ہوا آیا ہے اور تمہارے بارے میں ...!"

فلورا کی آواز یک بیک معدوم ہو گئی۔ ریسیور پر ایک دہشت زدہ چیخ سنائی دی اور پھر فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں کئی سیکنڈ تک بے جان ماؤتھ پیس پر اضطراری انداز میں ہیلو ہیلو کہتا رہا اور پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

فلورا کی اس فون کال نے میرے ذہن میں اندیشوں کا ایک ہنگامہ سا برپا کر دیا۔ نہ جانے وہ کون تھا جو فلورا کا تعاقب کرتا ہوا اس کے مکان تک جا پہنچا تھا۔ فون کا سلسلہ جس انداز میں منقطع ہوا اس سے پتہ چل رہا تھا کہ فلورا نے اس شخص کو کسی طرح فریب دے کر مجھے خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس مکار شخص نے فلورا کو دورانِ گفتگو دیکھ کر اسے اپنے تشدد کا نشانہ بنا ڈالا۔

شوارٹ کے آتش زدہ مکان سے ڈی ریمی تک ہم دونوں خیریت سے واپس آئے تھے لہٰذا تعاقب وغیرہ کی طرف توجہ کی ضرورت ہی نہیں آئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ڈی ریمی سے کوئی پیچھے لگا ہو۔

میں نے فلورا کا گھر تو نہیں دیکھا تھا مگر یہ اندازہ ضرور تھا کہ وہ ڈی ریمی سے زیادہ فاصلے پر نہیں رہتی تھی۔

اگر تعاقب کرنے والا اس کے پیچھے ہی اس کے گھر میں داخل ہوا تھا تو اس لحاظ سے فلورا کی وہ کال بہت تاخیر سے آئی تھی مگر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کافی دقت کے بعد اس شخص کو فریب دے کر فون تک رسائی حاصل کر سکی ہو۔

آخری نظریے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی تھی کہ وہ شخص فلورا کی طرف سے اتنا محتاط تھا کہ فون پر اس کی بات پوری ہونے سے قبل اس تک پہنچ گیا اور فلورا اپنی بات پوری کیے بغیر اس کے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بن گئی۔

میں دل ہی دل میں فلورا کے لیے ممنونیت کے جذبات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس شام فلورا نے کئی بار میں نے تلخ لہجے میں گفتگو کی تھی اور میرے پاس سے جاتے ہوئے وہ میری طرف سے اتنی دل برداشتہ تھی کہ اس نے مجھے رسمی طور پر الوداع کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ مگر اس کے باوجود میرے لیے خطرہ پیدا ہوتے ہی بظاہر اس نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے ہوشیار کرنے کا خطرہ مول لے ڈالا۔

سوال یہ تھا کہ نیس میں میرا نیا دشمن کون تھا؟

شوارٹ نے فلورا کی وجہ سے میری شخصیت کا کھوج لگایا۔ فلورا میری دوست اور ہمدرد تھی اور میں اس سے کسی غداری کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ پھر شوارٹ نے البرٹو کے ساتھ میرے شکار کا منصوبہ بنایا اور مجھے اپنی حویلی میں قید کرنے کے بعد ایک تابوت ساز بڑھئی کو میرا ایئر پارسل تیار کرنے کے لیے طلب کیا۔

نیس میں وہی تین افراد میری اصلیت سے واقف تھے اور شاید چوتھا آدمی فرانسس بھی شوارٹ کا ملازم ہونے کے ناطے اس سازش میں شریک تھا اور وہ چاروں میرے اور عبداللہ کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ اس کے بعد یہ نیا دشمن نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گیا تھا جب کہ چند گھنٹوں بعد میں ایک نئے نام سے پیرس روانہ ہونے والا تھا۔

فلورا کا لہجہ اور اس کے الفاظ اس بات کے غماز تھے کہ مجھے جو بھی خطرہ لاحق تھا وہ بدترین نوعیت کا تھا اور اگر میں فوری طور پر اپنے تحفظ کا انتظام نہ کرتا تو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے دشمن کے کسی کاری وار کا شکار ہو سکتا تھا۔

نیس میں میں ذاتی طور پر بالکل بے دست و پا تھا۔ شروع سے اب تک میرا تمام تر انحصار چارلس بک ہارٹ یا عبداللہ پر رہا تھا۔ عبداللہ کے ملنے کے بعد چارلس ایسا غائب ہوا تھا کہ دن بھر اس کا پتہ ہی نہ چل سکا اور اب عبداللہ بھی نہ جانے کہاں مر گیا تھا۔

فلورا کے فون کے بعد مجھے یہ شبہ بھی ہونے لگا تھا کہ کہیں عبداللہ بھی دشمن کے کسی جال میں نہ پھنس گیا ہو۔ بصورت دیگر وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو وعدہ خلافی کو اپنا معمول سمجھتے ہیں۔ اس نے مجھ سے پہلے ڈی ریمی پہنچنے کا وعدہ کیا تھا اور اگر وہ کسی ناگزیر چکر میں نہ اُلجھا ہوتا تو بہرصورت ہوٹل پہنچ گیا ہوتا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے آپریٹر سے سلسلہ ملایا اور اس سے چارلس سے بات کرنے کے لئے کہا۔

"وہ موجود نہیں ہیں جناب!" آپریٹر نے کہا۔

"گھر پر دیکھو!"

"وہ وہاں بھی نہ مل سکیں گے، چند منٹ قبل ان کی گھریلو خادمہ نے بھی یہاں فون کیا تھا۔"

"تم نمبر ملاؤ۔" میں تیز لہجے میں بولا۔

"آپ ہولڈ آن کریں جناب!" وہ سہم کر بولی۔

چند سیکنڈ بعد اس نے مجھے بتایا کہ چارلس بک ہارٹ گھر پر نہیں تھا۔ اس کی خادمہ لائن پر موجود تھی مگر وہ انگریزی سے نابلد تھی۔

میں نے فون بند کر دیا اور بے چینی کے ساتھ کمرے میں ٹہل قدمی کرنے لگا۔ چارلس بک ہارٹ اور عبداللہ المطعی کی غیر حاضری اس وقت بری طرح کھل رہی تھی وہ دونوں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چارلس کے بارے میں تو مجھے پورا یقین تھا کہ اپنی گزشتہ رات کی بےخوابی کی کسر پوری کرنے کے بعد وہ کسی عشرت کدے میں نازنینوں کی محفل جمائے شراب میں ڈوب کر نت نئی رنگین کہانیوں کو جنم دے رہا ہوگا۔

میں اس وقت نیس میں جس قسم کے حالات میں گھرا ہوا تھا ان کے پیش نظر فلورا کی کال کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ اگر اس وقت ان دونوں میں سے کوئی بھی مجھے مل جاتا تو میں اس کے ساتھ فلورا کے گھر پہنچ کر ساری صورتِ حال کا جائزہ لے سکتا تھا۔

اب میرے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ اپنے کمرے میں تن بہ تقدیر ہو کر دروازے پر اپنے خون کے پیاسوں کی دستک کا انتظار کرتا یا فوری طور پر ہوٹل چھوڑ کر نیس کی سڑکوں پر بہتے ہوئے انسانی سیلاب میں ڈوب کر خود کو اس وقت تک دشمنوں کی زد سے محفوظ کر لیتا جب تک عبداللہ یا چارلس سے ملاقات نہ ہو جاتی۔

نیس میں مجھے ڈی ریمی کے کمرہ نمبر ننانوے میں باآسانی گھیرا جا سکتا تھا لیکن وہ ٹھکانہ عارضی طور پر چھوڑ کر میں اپنا تحفظ کر سکتا تھا۔

پھر معاً مجھے اوڈیل کا خیال آیا اور میں فوری طور پر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں تم سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں!" میں فون پر مس اوڈیل کی آواز پہچاننے کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔

"آپ حکم فرمائیں ڈاکٹر!"

"کیا تم چند منٹ کے لئے میرے کمرے میں آ سکتی ہو؟"

"میں دس پندرہ منٹ میں حاضر ہوتی ہوں۔"

"مجھے فوری طور پر تم سے کچھ اہم بات کرنا ہے۔"

"اگر آپ مناسب خیال کریں تو فون پر ہی بتا دیں، کوئی شخص ہماری گفتگو سن نہیں سکے گا۔" وہ بہت تجربہ کار عورت تھی کیونکہ اس نے فوراً ہی میرے ذہن میں جنم لینے والے اندیشے کو بھانپ لیا تھا۔

"میں فوری طور پر کسی دوسرے کمرے میں منتقل ہونا چاہتا ہوں۔"

"شاید آپ کچھ پریشان ہیں۔" مجھے پہلی مرتبہ اس کی ذہانت کا احساس ہوا تھا۔ "میں سارے کام چھوڑ کر ابھی بندوبست کرتی ہوں۔"

"مگر تمہارے سوا کسی کو اس تبدیلی کا علم نہیں ہونا چاہئے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں جانتی ہوں کہ راز کو راز کیسے رکھا جاتا ہے۔"

"شکریہ مس اوڈیل۔ میں تمہارا منتظر ہوں۔ اس وقت ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے!" میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں نے اضطراری طور پر ادھ جلی سگریٹ فرش پر پھینک کر جوتے کی ایڑی سے مسل دی اور نئی سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگا۔ میں سگریٹ کا پہلا کش ہی لے پایا تھا کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور میں دل ہی دل میں اوڈیل کی مستعدی کی داد دیتا دروازے کی طرف لپکا۔

دروازہ کھلتے ہی میرا دل اچھل کر یک بیک حلق میں آ گیا۔ میرے سامنے نیم تاریک راہداری میں ایک قوی الجثہ سفید فام موجود تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ اوورکوٹ میں اس طرح پوشیدہ تھا کہ راہداری سے گزرنے والا کوئی شخص اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس اوورکوٹ میں چھپے ہوئے ریوالور کی نال براہِ راست میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلنے پر میں چند ثانیوں کے لئے سکتے کے عالم میں آ گیا۔

میں نے اپنی غلطی سے خود ہی شامت مول لی تھی۔

مس اوڈیل لاکھ فرض شناس اور مستعد سہی مگر نئے کمرے کا بندوبست حاصل کر کے اسے گراؤنڈ فلور سے لفٹ کے ذریعہ تیسری منزل پر میرے کمرے میں پہنچنے میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور لگتا جبکہ دروازے پر دستک فون بند کرنے کے بمشکل ایک منٹ بعد سنائی دی تھی اور میں اسے اوڈیل کی دستک سمجھ کر دروازے پر پہنچ گیا۔

سکتے کی کیفیت جس طرح طاری ہوئی تھی، اسی طرح ختم بھی ہو گئی اور میں نے فوراً دروازہ بند کرنا چاہا مگر اس وقت تک نامعلوم شخص اپنی بائیں ٹانگ دروازے میں اڑا چکا تھا۔ اس نے اپنے شانے سے دروازہ پر زور سے ٹکر ماری اور کھلے دروازے سے ہوا اندر گھس آیا اور پلٹ کر دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔

اس اثناء میں میں بھی فرش سے اٹھ چکا تھا۔

"میرے پاس بے آواز ریوالور ہے۔" وہ بے رحمانہ لہجے میں غرایا۔ "اگر تم نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو اپاہج کر دوں گا۔"

"تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پرسکون لہجے میں پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"سٹوارٹ کے مکان سے تم نے کیا چیزیں حاصل کی تھیں؟" اس نے ریوالور کی نال کے اشارے سے مجھے پیچھے کھسکنے کا حکم دیتے ہوئے سوال کیا۔

"تم یہ جان کر بھی کچھ نہ کر سکو گے۔" میں نے خوفزدگی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"میرے ہاتھ بہت دراز ہیں ڈاکٹر آسکر۔" وہ تنفر آمیز لہجے میں بولا۔ "سٹوارٹ اور اس کے تین ساتھیوں کے قتل کے بدلے اگر میں تمہارے چالیس ہمدردوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دوں تو شاید حساب برابر نہ ہو سکے گا۔ اگر تم نے میرے سوالات کے درست جواب نہ دیئے تو تمہاری کھوپڑی شانے پر تو کیا اس کمرے میں بھی نہ مل سکے گی۔"

"کیا مجھے ساتھ لے جاؤ گے؟" میں نے سوال کیا۔ میں اسے صرف ادھر ادھر کی باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا تھا کہ اوڈیل آ کر دروازے پر دستک دے اور وہ ایک لحظہ کے لئے میری طرف سے غافل ہو جائے!

"شرخ بننے کی کوشش نہ کرو ڈاکٹر۔" وہ کسی بھیڑیئے کی طرح غرایا۔ "میں تمہاری پیشانی میں چند گولیاں اتارنے میں تامل نہیں کروں گا۔"

"تمہاری کرپٹوگرافی کی کوڈ بک، چند تصاویر اور ڈائریاں ملی تھیں وہاں سے۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔

"یہ چیزیں کہاں ہیں؟"

"جہاں ان کی ضرورت تھی وہاں پہنچائی جا چکی ہیں۔"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ داروغۂ جہنم کو تمہاری اشد ضرورت ہے اور تمہیں جلد از جلد وہاں پہنچایا جانا چاہئے۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"صورت سے تو تم داروغۂ جہنم کے رشتہ دار معلوم ہوتے ہو۔"

"دیوار کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" وہ غرایا۔ "تمہیں تمہارے بل سے باہر نکالنے کے بعد میں تمہاری ساری ظرافت نرخرے میں اتار دوں گا۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ میری حکمتِ عملی سمجھ چکا تھا اور میرے لئے مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے اغوا کرنا چاہتا تھا تاکہ کسی خطرہ مول لئے بغیر میری زبان کھلوانے میں کامیابی حاصل کر سکے۔

"تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟" میں نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر پوچھا۔

"حکم کی تعمیل کرو۔" وہ غرایا۔

"بہتر جناب!"

یہ کہہ کر میں پلٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی اور میں دوبارہ اس سفید فام کی طرف گھوم گیا۔

اس وقت وہ کسی بھڑکے ہوئے سانڈ کی طرح ریوالور سیدھا کئے دروازے کی طرف متوجہ تھا۔ میرے لئے اسے زیر کرنے کا وہ سنہری موقع تھا مگر اس سے قبل کہ میں اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہناتا، وہ میری طرف گھورنے لگا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے تحکم آمیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"دروازہ کھولے بغیر میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اس کی نظریں تیزی کے ساتھ کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں، دروازہ پر دوبارہ وہی ہلکی... دستک ہوئی اور اس بار وہ اچھل کر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

مجھے کسی کارروائی کا موقع دیئے بغیر اس نے مجھے باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کرنے کا حکم دیا اور مجھے اس کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

باتھ روم میں داخل ہونے کے چند ثانیئے بعد میں نے دروازہ کھولا تو اس کی کھوپڑی کھلی ہوئی کھڑکی کے چوبی فریم کے عقب میں غروب ہو رہی تھی۔

میں بجلی کی سی سرعت سے باہر نکلا اور کمرے کا دروازہ کھول کر کھڑکی کے قریب جا پہنچا۔

اس وقت تک وہ مردود کھڑکی سے نیچے بیرونی سمت میں بنے ہوئے تین فٹ چوڑے چھجے پر اتر چکا تھا۔ وہ چھجا ہر منزل پر کھڑکیوں سے قدرے اوپر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلتا چلا گیا تھا اور وہ شخص اس وقت تیسری منزل کی کھڑکیوں پر بنے ہوئے چھجے پر دوڑ رہا تھا جو میری کھڑکی کے فریم سے کم از کم پانچ فٹ نیچے واقع تھا۔

اس اثناء میں سنہرے فریم والی عینک لگائے ادھیڑ عمر کی ایک عورت میری پشت پر پہنچ چکی تھی۔

"کیا ہوا ڈاکٹر؟ خیریت تو ہے؟" اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ مس اوڈیل ہو گی۔

سوال کرنے کے ساتھ ہی وہ تجسس آمیز انداز میں کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی اور پھر اس نے بھی تاریک چھجے پر وہ سایہ دوڑتے دیکھ لیا۔

وہ شخص اس طرح جھک کر دوڑ رہا تھا کہ چوتھی منزل کے کسی کمرے کی کھڑکی میں سے اسے نہ دیکھا جا سکے۔

"میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں، اگر نصف گھنٹے میں واپس نہ آؤں تو چارلس کو خبر کر دینا، پولیس سے رابطے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مجھے روکتی ہی رہ گئی مگر میں اپنی بات پوری کر کے چھجے پر کود گیا۔

اس وقت تک وہ شخص کافی آگے نکل گیا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے ہولیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہوٹل ڈی ریمی کی عمارت بہت لمبی تھی۔

وہ شخص دوڑتے دوڑتے پلٹ کر مجھے اپنے تعاقب میں دیکھ چکا تھا مگر اس نے مجھے روکنے کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی۔

عمارت کے کونے پر پہنچ کر وہ یکایک میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد میں اس مقام پر پہنچا تو کفِ افسوس مل کر رہ گیا۔

چھجا عمارت کی دوسری سمت پر بھی اسی تسلسل کے ساتھ پھیلا ہوا تھا اور وہ گھوم کر بہتر جگہ پر جا چکا تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ اندھیرے میں ریوالور سمیت دبکا میرے نمودار ہونے کا منتظر ہو اور اس کی ایک ہی گولی مجھے چوتھی منزل سے پختہ زمین پر گرا کر ہلاک کر دے۔

میں اسی کونے پر دیوار سے پشت لگا کر دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے بہت احتیاط کے ساتھ سر نکال کر دوسری طرف جھانکا تو چھجا ویران پڑا ہوا تھا۔

میں سر جھکائے اس طرف چلا گیا۔

چوتھی منزل کی بیشتر کھڑکیاں روشن تھیں اس طرف کھلنے والی چند کھڑکیوں میں تاریکی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ تیسری منزل پر واقع بلیرڈ روم سے آنے والی آوازیں اس سمت پر زیادہ صاف سنائی دے رہی تھیں اور یہ امکان کم ہی نظر آ رہا تھا کہ اس نے وہ حصہ عبور کر کے سامنے والے چھجے پر چلے جانے کا فیصلہ کیا ہو جہاں تیز روشنیوں اور برقی اشتہارات کے باعث اسے سڑک سے بھی باآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

لے دے کے ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ وہ موقع پا کر کسی تاریک اور کھلی ہوئی کھڑکی سے کسی کمرہ میں کود گیا ہو۔ اگر وہ کسی بند کھڑکی کو سرکاتا یا شیشہ توڑتا تو میں اس سے دُور رہنے کے باوجود وہ آوازیں بخوبی سن سکتا تھا۔

ہوٹل کے تمام رہائشی کمروں میں کھلنے والی فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں اور میرے لئے اس تین فٹ چوڑے چھجے سے یہ دیکھنا ناممکن تھا کہ کون سی تاریک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کونسی بند تھی۔

ایک بات بہرحال یقینی نظر آتی تھی کہ اس شخص نے کسی روشن کمرے میں داخل ہونے کی حماقت ہرگز نہ کی ہوگی جہاں روشنی کے باعث اندر اور باہر سے دیکھ لئے جانے کے ساتھ ہی مکین سے ٹکراؤ کا شدید خطرہ موجود تھا۔ البتہ تاریک کمرہ کی بہ صورت ... خطرناک تھی کیونکہ ایسا کمرہ غیر آباد یا خالی ہونے کے علاوہ ... بھی تھا کہ وہاں رہنے والا سو رہا ہو یا آرام کر رہا ہو۔

میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے تاریک کھڑکیوں کے ... احتیاط کے ساتھ ٹٹول کر کھڑکی کے کھلے ہونے کا یقین ... پھر ایسا پہلا مقام میرے دشمن کی کمین گاہ ثابت ہو سکتا تھا ... یہ سارا تجزیہ بہت تفصیلی اور وقت طلب تھا مگر ...

میں فیصلے پر پہنچ گیا اور سر کو بدستور جھکائے روشن کھڑکیوں ... عبور کر کے پہلی تاریک کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

میں بمشکل چار کمرے عبور کر سکا تھا کہ اچانک میرے ... ایک چیخ آزاد ہو گئی۔ پتہ نہیں اس چیخ کا سبب کسی ہاتھ ... پر اچانک محسوس ہونے والا آہنی لمس تھا یا سر کو پوری ... ساتھ دیوار سے ٹکرایا جانا کیونکہ جونہی کسی نے میرے بال ... جکڑ کر میرا سر کنکریٹ کی دیوار سے مارا میرا ذہن دھند میں ڈوب ... وہ نادیدہ ہاتھ میرے سر پر کاری ضرب لگانے کے بعد بھی ... پر جما رہا۔ پھر کوئی دونوں ہاتھوں سے بالوں کے سہارے ... اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

مگر اسی وقت میری چیخ کے جواب میں کسی قریبی کمرے ... ایک گھٹی ہوئی اور خوفزدہ نسوانی چیخ بھی سنائی دی جس ... کوئی مرد فرنچ میں دہاڑنے لگا۔

پھر وہ مردانہ آواز مجھے کمرے کی محدود فضا کے بجائے ... عاری کھلی فضا میں سنائی دی شاید وہ شخص صورت حال کا جائزہ ... لینے کھڑکی سے باہر جھک آیا تھا کیونکہ میرے بالوں سے گرفت ... یک ختم ہو گئی اور میں تقریباً بے ہوش ہو کر تنگ چھجے پر گر گیا ...

میں ہوش میں آیا تو اپنے کمرے میں موجود تھا۔ آنکھیں کھل... ہی مجھے سب سے پہلے مس اوڈیل کا دلکش چہرہ نظر آیا وہ ... بستر پر بیٹھی میری نبض دیکھ رہی تھی۔ اس کے برابر میں عبداللہ ... میں نے سر اٹھا کر عبداللہ کو دیکھنے کی کوشش کی تو میرے سر ... ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی اور میرے منہ سے بے اختیار آہ آزاد ہو گئی۔

رفتہ رفتہ میں اپنے سر کی تکلیف کو برداشت کرنے کے ... میں نے مسکرا کر عبداللہ کی مزاج پرسی کی۔ اس دوران میں عبداللہ ... کو باہر بھیج چکا تھا۔

"میری فکر نہ کرو، خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ بچ گئے ... بالشت بھر کے چھجے سے زمین پر گرتے تو شاید شناخت بھی نہ ... جاتی۔" وہ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ہوا کیا تھا؟" یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اپنی ...

... محسوس کیا۔

"... تم بتاؤ کہ یہ سب کیا چکر تھا۔ اوڈیل بتا رہی تھی کہ تم پہلے ہی ... جانتے تھے۔ کیا تمہیں خطرے کا پیشگی علم ہو گیا تھا؟"

... میں نے آہستہ آہستہ اُسے اپنی کہانی سنا دی جو فلورا کے فون ... اور میری بے ہوشی پر ختم ہوئی۔

"... دغا کے جرم میں وہ ماری گئی!" میرے خاموش ہونے ... میں نے فلورا کے بارے میں انکشاف کیا۔

"واقعی!"

"ہاں وہ میری آنکھوں کے سامنے قتل ہوئی تھی۔"

"بہت برا ہوا۔" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا "میں نے ... مہات میں اُسے معاف کر دیا مگر شاید اس کے مقدر میں ... موت لکھی ہوئی تھی۔"

"جب تم دونوں شوارٹ کے چلتے ہوئے مکان سے روانہ ... تو میری گاڑی کے اگنیشن سسٹم میں معمولی سا نقص پیدا ہو گیا ... سے میں وہاں سے چند منٹ کی تاخیر سے روانہ ہوا۔ تیز ... کرتا ہوا جب میں آگے آیا تو ایک کار بغیر روشنیوں کے شہر ... بڑھتی ہوئی نظر آئی اور اس چیز نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا۔ چند ... بعد میں نے اس سے آگے فلورا کی کار دیکھ لی اور مجھے یہ اندازہ ... وہ کار تمہارا تعاقب کر رہی تھی۔ لہٰذا میں مناسب فاصلے سے ... پیچھے ہو لیا۔ جب فلورا تمہیں ڈی ریمی چھوڑ کر گئی تو بھی یہ تعاقب جاری رہا۔" وہ مجھے اپنی کہانی سنانے لگا۔

اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے لئے حیرتناک ثابت ہوا۔

تعاقب کرنے والا فلورا کے چند منٹ بعد اس کے دروازے پر گھنٹی بجا کر قرینے سے مکان میں داخل ہوا۔ عبداللہ بھی کسی نہ کسی طرح مکان میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا اور ڈرائنگ روم ... ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو چھپ کر سننے لگا۔ اس ... وقت فلورا کی بہن مکان پر موجود نہیں تھی اور چاروں بچے شاید اپنے ... ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف تھے کیونکہ مکان کی نچلی منزل ... تنہا محسوس ہو رہی تھی۔

... اس شخص نے بتایا کہ وہ شوارٹ کا ہم پیشہ تھا اور اسی کے ... کئی بار البرٹو کا میزبان بھی رہ چکا تھا۔ چند دن پیشتر ... آیا ہوا تھا تو شوارٹ نے ایک پارٹی میں اُسے دُور سے البرٹو ... اور فلورا کے بارے میں خاصی باتیں بتائی تھیں۔

... صبح سویرے شوارٹ نے نیس سے فون پر اس سے ... بتایا کہ ال ایل کے طیارے کو اغوا کرنے والوں میں سے ... پکڑا گیا ہے جس کا نام ڈاکٹر آسکر بینتھم بتایا جاتا ہے ... چھڑانے کے چکر میں ہیں۔ شوارٹ نے ڈاکٹر آسکر کو زندہ پکڑنے کے لئے اسے اپنی مدد کے لئے فوراً طلب کیا تھا۔

وہ شخص فلورنس سے اپنے ایک بہترین ایجنٹ کے ساتھ نیس پہنچا تو شوارٹ اُسے کسی مقررہ ٹھکانے پر نہ مل سکا۔ آخر کار اس شام کو وہ تنہا شوارٹ کے مکان پر پہنچا تو وہاں بکھری ہوئی چار انسانی لاشوں نے اس کا استقبال کیا جن میں البرٹو بھی شامل تھا۔

فلورا کے لئے البرٹو کے قتل کی خبر بڑی افسوسناک ثابت ہوئی۔ اس شخص نے فلورا کو یقین دلایا کہ اگر وہ تعاون کرے تو وہ شخص چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر البرٹو کے قاتل کو عبرتناک سزا دے گا۔ شاید فلورا اس سے تعاون پر آمادہ ہو جاتی مگر جب اس شخص نے یہ کہا کہ اس کے پاس وقت کم تھا اور ان لاشوں اور مکان کو اسرائیلی مفادات کی خاطر فرانسیسی پولیس سے بچانا ضروری تھا لہٰذا اس نے لاشوں پر اور مکان میں پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تاکہ پولیس راکھ کے انبار میں سر کھپاتی رہ جائے تو فلورا کا انداز بدل گیا۔

اس نے کارڈیلو نامی اس اسرائیلی ایجنٹ کو بتا دیا کہ وہ اسے معلومات ضرور فراہم کرے گی مگر عملی مدد نہ دے سکے گی۔ کارڈیلو کی باتوں نے میری جانب سے فلورا کے شبہات کو تقویت دی اور اس نے اپنی تسکین کی خاطر ہم دونوں کو لڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی دانست میں میں البرٹو کا قاتل تھا اور کارڈیلو مقتول کی بے حرمتی کا ذمہ دار۔

اس نے کارڈیلو کو بتایا کہ ڈاکٹر آسکر بینتھم نامی شخص کہاں مقیم ہے کارڈیلو اس بات پر بہت خوش ہوا۔

وہ محض ایک موہوم سی امید کے سہارے شوارٹ کے جلتے ہوئے مکان کے قرب و جوار میں موجود رہا تھا کہ اسے لاشیں تازہ نظر آئی تھیں اور اس کے حساب سے قاتل یا قاتلوں کو اپنے کارنامے کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے جلد یا بدیر ادھر آنا چاہیئے تھا۔

اس نگرانی کے دوران جب اس نے فلورا کو وہاں دیکھا تو وہ اسے پہچان گیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اندر البرٹو کی لاش پڑی ملی تھی اور باہر البرٹو کی سالی کسی تماشائی کی طرح موجود تھی لہٰذا وہ اس کے تعاقب میں ہو لیا۔

گفتگو کے خوشگوار اختتام پر فلورا نے کارڈیلو سے دریافت کیا تو اس نے کافی پینے کی خواہش ظاہر کی اور جب وہ چلی گئی تو کارڈیلو نے پھرتی کے ساتھ اپنے اوورکوٹ کی جیبوں سے ایک ریوالور نکال کر اس کی نالی پر سائلنسر چڑھایا اور چیمبر لوڈ کرنے کے بعد دبے قدموں اسی طرف چل دیا جدھر فلورا گئی تھی۔

وہ واضح طور پر اسے قتل کرنے کا قصد کر چکا تھا اور کافی کی خواہش محض اس لئے ظاہر کی تھی تاکہ اسے تیاری کا وقت مل جائے اور معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹایا جا سکے۔

عبداللہ اس وقت سامنے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

وہ اپنی جگہ چھپا سارا تماشا دیکھتا رہا۔

کارڈیلو ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے پر پہنچا اور پھر اس نے اچانک گولی چلا دی۔ اندر سے فلورا کی ہلکی سی چیخ سنائی دی اور کارڈیلو دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کارڈیلو کے دوسرے کمرے میں جاتے ہی عبداللہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا اور پردے کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ فلورا ٹیلیفون کی تپائی کے قریب دونوں ہاتھوں سے اپنا خون میں نہایا ہوا سینہ دبائے بے حس و حرکت پڑی تھی اور فون کا ریسیور تپائی سے نیچے جھول رہا تھا جسے کارڈیلو نے کریڈل پر رکھ دیا۔

اسی اثنا میں فلورا کی چیخ سن کر اوپری منزل سے اس کی بہن کے چاروں بچے دہشت زدہ انداز میں نیچے آئے اور کارڈیلو ان کی آہٹ سن کر بھڑک کر نکاسی کے راستے کی طرف بھاگا اور عبداللہ پردے کی اوٹ سے اس پر ٹوٹ پڑا۔

کارڈیلو نے کسی بپھرے ہوئے درندے کی طرح عبداللہ کو دور اچھال دیا اور اس پر یکے بعد دیگرے تین بے آواز فائر کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دھینگامشتی اور فلورا کا خون آلود جسم دیکھ کر بچے ہذیانی انداز میں چلّانے لگے اور عبداللہ داہنی ران پر گولی کا ایک شدید زخم کھانے کے باوجود وہاں سے بھاگ نکلا۔

کارڈیلو کی چلائی ہوئی ایک گولی عبداللہ کی ران کا گوشت پھاڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی جس کے باعث نہ صرف زخم میں شدید تکلیف تھی بلکہ کافی خون بھی ضائع ہو رہا تھا لہٰذا وہ ڈی ریمی آنے کے بجائے سیدھا ایک ڈاکٹر کی طرف چلا گیا۔

ڈریسنگ سے فارغ ہو کر وہ ڈی ریمی پہنچا تو وہاں نیا ہنگامہ منتظر تھا۔ کمرہ نمبر سات میں مقیم جوڑے کا بیان تھا کہ چیخ سنتے ہی انہوں نے للکارتے ہوئے باہر جھانکا تو کمرہ نمبر چھ کی تاریک کھڑکی کے نیچے چھجے پر ایک شخص بیہوش پڑا ہوا تھا۔

سات نمبر والوں کا یہ بیان میرے دشمن کی ذہانت اور پھرتی کا غماز تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب میں آگے بڑھ رہا تھا تو کم از کم نوکمروں کی کھڑکیاں روشن تھیں اور پہلی تاریک کھڑکی دسویں نمبر پر تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اس مکار شخص نے تاریک کمرے میں داخل ہوتے ہی روشنی کر دی تھی تاکہ میں دھوکہ کھا جاؤں اور جب میری خفیف سی آہٹ یا اس کی اپنی چھٹی حس کے سہارے اسے نشانے پر میری موجودگی کا اندازہ ہوا تو اس نے روشنی گل کر کے اپنا وار کر دیا تاکہ باہر سے اسے نہ دیکھا جا سکے۔

چھجے پر میری موجودگی کا انکشاف ہوتے ہی ہر شخص کی توجہ اسی طرف مرکوز ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد کسی کو چھٹے کمرے کا خیال ... پڑا ہوا تھا۔ اس کا مکین کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

ہوٹل ڈی ریمی کے کسی بھی کمرے میں کھڑکی ... شخص بآسانی دروازے سے باہر جا سکتا تھا کیونکہ ... مقفل ضرور ہو جاتے تھے مگر اندر سے انہیں محض دستہ گھما کر ... سکتا تھا جبکہ باہر سے کھولنے کے لئے چابی ضروری تھی۔

"تمہارا زخم اب کیسا ہے؟" میں نے عبداللہ کی ... سننے کے بعد سوال کیا۔

"میری فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ آنے والے کا حلیہ کیا تھا؟"

میں نے یادداشت پر زور دے کر تفصیل ...

"پھر تو چھ نمبر والا بے قصور ہے۔" عبداللہ ... سہلاتا ہوا بولا۔ "وہ بے چارا تو دبلا پتلا پستہ قامت ..."

"اگر وہ خود ملوث ہوتا تو اس ناکامی کے بعد ..."

"کارڈیلو روپوش ہے!" اس نے مسکراتے ہوئے ...

"یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو؟"

"میں نے فلورا کے یہاں جس شخص کو دیکھا ... وہی تھا جو تم نے آنے والے کا بتایا ہے اور مزے کی بات ... کارڈیلو آج صبح ہی فلورنس سے یہاں پہنچا ہے وہ ساتویں ... کمرہ ۵۳۱ میں مقیم ہے۔"

"کیا واقعی؟"

"یہی نہیں بلکہ وہ اکثر ڈی ریمی میں قیام کرتا رہا ہے" ... بدستور مسکرائے جا رہا تھا۔ "میں نے یہ چیز پرانے ریکارڈ ... کی ہے۔ اس کا نام مس اوڈیل کے لئے خاصا پرانا ہے۔ اس ... شامیں بہت حسین گزرتی ہیں۔"

"وہ کمروں اور ہوٹل کے انتظام سے واقف تھا اسی ... اتنی آسانی سے صاف نکل گیا۔ مگر یہ بتاؤ تم مسکرا کیوں رہے ..."

"کل ہمارا دن تھا تو ہم نے چاروں دشمنوں کو اس طرح ... لگا یا کہ بدن پر خراش بھی نہیں آئی تھی اور آج دونوں زخمی ... ستاروں کا قارورہ بہت ملتا ہے!"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "میرے واقعہ سے چارلس ... پریشانی ہوئی ہو گی۔"

"وہ کنزرمیں یونان کی ایک شہزادی پیڈورے ..." عبداللہ نے انکشاف کیا۔ "تمہارا معاملہ اوڈیل نے خوش اسلوبی ... سنبھال لیا اور اس کی زیادہ پبلسٹی نہیں ہونے دی!"

"پھر بھی دس بیس مسافروں کو تو علم ہو ہی گیا ہو گا۔"

"انہیں بصد معذرت یہ بتایا گیا کہ تم سوتے میں چلنے ... عجیب حرکات کے مریض ہو اور دوسرے مسافروں کی ...

... ریمی سے نکال دیا گیا ہے۔"

... مگر میرا تو خیال ہے کہ میں اب بھی اپنے ہی کمرے میں ہوں۔" ... پیشانی پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

... ڈی ریمی میں ہو۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر اب ساتویں منزل پر کمرہ ... مقیم ہو!"

... یعنی کارڈیلو کے پڑوس میں؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔

... مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اب بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

... سر کے داہنے حصے پر شدید ضرب آئی تھی جو زیادہ دیر باتیں ... کے بعد پریشان کرنے لگی تھی۔ میں بے چین ہو کر سیدھا لیٹ گیا۔

... کیا بات ہے؟"

... چکرا رہے ہیں!" میں نے اپنی پیشانی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان ... دباتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے کب تک بستر پر دراز رہنا پڑے۔ مردود نے پوری ... قوت سے میرا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ چوٹ خطرناک نہیں تھی۔ اگر ایسی ہی ضرب بائیں ... طرف آئی ہوتی تو شاید اس وقت تم عالم بالا میں ہوتے۔"

... تین منزلوں کا فرق تو اب بھی پڑ گیا ہے۔"

میری بات پر اس نے بھرپور قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔ "اب تم دو تین ... دن آرام کرو۔ میں کارڈیلو کو کہیں نہ کہیں پکڑ ہی لوں گا۔"

... بھی میری فکر میں رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ خود سامنے ... آنے کے بجائے کرائے کے غنڈوں سے کام چلائے۔"

... چارلس اس شہر کا سب سے بڑا غنڈہ ہے۔ پیسے کا بڑے سے بڑا لالچ ... بھی معمولی غنڈوں کو ڈی ریمی کا رخ کرنے پر آمادہ نہ کر سکے گا۔"

... اور پیرس کے پروگرام کا کیا رہا؟"

... فی الحال ملتوی ہے۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "کارڈیلو سے ... نمٹے بغیر آگے بڑھنا مناسب نہ ہو گا۔ ویسے میں نے اپنے آدمی فرانسیسی وزارت ... کے ان ماہر تجارت کے پیچھے لگا دیتے ہیں جو اسمگلنگ کے لیے کام ... کر رہے ہیں۔"

... تم نے اچھا کیا جو لیس گری کی نگرانی بھی ضروری تھی۔"

... اب جا رہا ہوں۔ اوڈیل تمہارے لیے کل وقتی نرس کا بندوبست ... کر رہی ہے۔ تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

... خوبصورت نہ ہوئی تو میں واقعی بیمار ہو جاؤں گا۔"

... حسین ہوئی تو کہیں تم صحت یاب ہونے سے انکار ہی نہ کر دو۔" ... اور فون پر سلسلہ ملا کر اوڈیل کو بلانے لگا۔

... وقت صبح کے تین بج رہے تھے۔ جب سے میں نے ہوٹل ڈی ریمی ... میں قدم رکھا تھا میری راتیں مسلسل برباد ہو رہی تھیں اور یہی حال عبداللہ ... کا تھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ ہنگامے ہر وقت اور ہر جگہ ... ہمارا تعاقب کیا کرتے ہوں۔

مس اوڈیل آئی تو عبداللہ اس سے گفتگو کر کے رخصت ہو گیا۔ اس نے چلتے چلتے اوڈیل کو میری دیکھ بھال کی تاکید کی تھی۔

اوڈیل تیس بتیس سال کی گداز بدن اور دلکش عورت تھی۔ اس کی ذات میں خود اعتمادی اس طرح سمائی ہوئی تھی کہ ڈی ریمی میں اس کی ملازمت کی نوعیت جان لینے کے باوجود میں براہ راست اس سے کوئی مناسب موضوع نہ چھیڑ سکا۔

"تم چاہو تو اپنی ڈیوٹی پہ جا سکتی ہو۔ مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہے!"

"میری اسسٹنٹ خاصی باصلاحیت ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اگر اس حالت میں تمہیں تنہا چھوڑ دیا گیا تو میرے لیے چارلس کے سامنے جواب دہی کرنا مشکل ہو جائے گی۔"

"میں اس سے شکایت نہیں کروں گا۔"

"ہر بات کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ جاتی ہے۔"

"سنا ہے میرے لیے کوئی نرس آنے والی ہے؟"

"مستند نرس تو نہیں ہے البتہ تمہارے آرام کا خیال رکھے گی۔"

"اور اس لڑکی کا کیا ہوا جس کے لیے میں نے فرمائش کی تھی؟"

"آئی تھی مگر میں نے اسے دوسری جگہ بھیج دیا۔"

"اور اگر میں کوئی ذاتی فرمائش کرتا؟"

"میں اس ہوٹل میں مہمانوں کی ذاتی فرمائشوں کی تکمیل کیلئے ہی ملازم رکھی گئی ہوں۔" اس نے چشمے کی اوٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں نے تمہیں بلایا ہوتا؟" میں نے محض اس کو آزمانے کیلئے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تو میں خود سے بہتر لڑکی بھیجنے کی پیش کش کرتی۔" وہ پیشانی پر شکن لائے بغیر مسکراتے ہوئے بولی۔

"اور اگر میں اصرار کرتا؟"

"آخر کیوں اصرار کرتے؟ تم نے شاید مجھے دیکھا بھی نہیں تھا!"

"دیکھنے کے بعد ہی تو سوال کیا ہے۔"

"میں نرمی کے ساتھ کھلونا بننے سے انکار کر دیتی۔"

"حالانکہ تم لوگوں کو کھلونے فراہم کرنے پر مامور ہو۔"

"ضروری تو نہیں کہ آدمی جو کام دوسروں سے لیتا ہو اپنے لیے بھی وہی پسند کرنے لگے۔" اس نے لاپروایانہ انداز میں جواب دیا۔

"مگر اس سے اتنی نفرت بھی نہیں کرتا۔"

"میں نے نفرت کا لفظ استعمال نہیں کیا بس یوں سمجھو کہ بالواسطہ طور پر فرانس کا وزیر صحت لوگوں سے گندی نالیاں صاف کرانے کا بھی ذمہ دار ہے مگر وہ خود کبھی اپنے ہاتھ ڈال کر کوئی بند نالی کھولنا پسند نہیں کرے گا۔"

"گویا تم ڈی ریمی کی وزیر صحت ہو؟"

"اگر تم طنز کرنا چاہتے ہو تو میرا جواب اثبات میں ہے!"

"وہ کیوں؟" مجھے اس کے سکون اور استقلال مزاجی پر حیرت تھی۔

"یہ خشک اور لمبی بحث ہے۔ تمہارے سر میں تکلیف ہے، میں روشنی گُل کر دیتی ہوں۔ تم سونے کی کوشش کرو۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"وہ نرس کب تک آجائے گی؟"

"کسی بھی وقت پہنچ سکتی ہے، وہ آئے گی تو میں چلی جاؤں گی۔"

"تمہاری موجودگی میں مجھے نیند نہ آسکے گی۔"

"اگر بستر پہ تمہارے قریب رہوں تو سو جاؤ گے؟" اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ قطعی غیر جذباتی انداز میں بات کر رہی تھی۔

"شاید!" میں نے کہہ دیا حالانکہ اس کا سراپا اور اس کے خدوخال حسن کے اس معیار پہ پورے نہیں اترتے تھے جو میرے اعصاب پہ مسلط ہو کر رہ جاتے۔

"میرے بارے میں ذہن نہ تھکاؤ ڈاکٹر۔" وہ میرے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "تم چارلس کے مہمان ہو اور میں تمہاری دلآزاری نہیں کرنا چاہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں عورت نظر آنے کے باوجود عورت نہیں ہوں۔"

"کیا؟" اس کے الفاظ میرے ذہن پہ کسی بم کی طرح گرے اور میں حیرت سے دیدے پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ چارلس کے علاوہ اس حقیقت سے چند ہی لوگ واقف ہیں کہ میری صنف غیر متعین ہے اور تمہیں صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم فوری طور پہ میرا خیال ذہن سے جھٹک دو۔"

اس کے بعد کمرے کی فضا پہ یک بیک غیر فطری سناٹا چھا گیا جو کئی منٹ تک برقرار رہا۔ اوڈیل کے انکشاف پہ مجھے ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔

"بتی گل کر دوں؟" بالآخر اوڈیل نے نرم آواز میں سکوت توڑا۔

میں نے سر کی جنبش سے اسے اجازت دے دی اور کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اوڈیل میرے سرہانے کرسی پہ بیٹھی آہستہ آہستہ میرا سر دباتی رہی حتیٰ کہ مجھے نیند آگئی۔ ساری رات مجھے عجیب عجیب خواب نظر آتے رہے جن میں کہیں کہیں اوڈیل بھی اس صورت میں موجود تھی کہ اس کے بدن پہ بعض مردوں جیسے بڑے بڑے سیاہ بال اُگے ہوئے تھے اور وہ ہاتھ میں تیز دھار تیغہ لیے شیروں کے ایک غول سے برسرِپیکار تھی۔

صبح میں بیدار ہوا تو باہر سورج طلوع ہو چکا تھا اس کی روشنی پردوں سے چھن کر دیوار پر پڑ رہی تھی۔ اس موسم میں سورج کی چمکیلی کرنیں یہاں والوں کے لیے نعمت سے کم نہ تھیں اور میرے لیے اوڈیل اس کمرے میں ایک بڑا انعام ثابت ہو رہی تھی۔

اس سے میرا تعارف ہوا تو.... طبیعت خوش ہو گئی۔ اس کی صنف اوڈیل کے مقابلے میں بہت زیادہ متعین تھی اور وہ نہ صرف خوش شکل بلکہ خوش آواز بھی تھی۔

یہ نہ جانے اس لڑکی کی تیمارداری کا نتیجہ تھا یا اس کی میٹھی زبان کا اثر کہ دوپہر تک میں اپنے سر کی تکلیف کو اس حد تک فراموش کر چکا تھا کہ باہر نکلنے کیلئے تیار ہو گیا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" اس نے مجھے تیار ہوتے... میں انکار نہ کر سکا۔

ہم دونوں نے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا پھر... میں جانے کے لیے کہا کیونکہ میرا موڈ چارلس یا اوڈیل سے... یہ بھی کہ میں اسے ٹال کر تنہا باہر نکلنے کے موڈ میں تھا جب... اس لڑکی کو سختی سے اس بات کا حکم دیا تھا کہ وہ سائے کی... لگی رہے۔

میرے لیے یہ جبری تیمارداری خاصی خوشگوار تھی مگر ان... میں غیر ضروری طور پہ وقت ضائع کرنا حماقت سے کم نہیں تھا۔

میں اسے ساتھ لے کر اوڈیل کے دفتر میں پہنچ گیا... سے پتہ چلا کہ اوڈیل شام پانچ بجے سے صبح پانچ بجے تک...

"مسٹر چارلس یک ہارٹ موجود ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ وہ باہر ہیں۔" وہ بغور میرا جائزہ لیتے...

"کیا میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی؟"

"مجھے یہی اندیشہ ہے!"

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"کمرہ نمبر ۲۳ سے!" میں نے کہا۔

"اوہ! ڈاکٹر آسکر!" وہ فوراً کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "... فون آیا تھا کہ مسٹر چارلس کنسرٹ میں مصروف ہیں۔ انہوں نے آپ کے بارے... طور سے تاکید کی ہے کہ پورا خیال رکھا جائے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر کرسی پہ بیٹھ گیا اور اپنی... مخاطب ہو کر بولا۔ "تم کمرے میں جاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

اس کے جانے تک میں خاموش رہا پھر اس عورت سے...

"مجھے ہوٹل میں مقیم مسافروں کی فہرست درکار ہے۔"

"صرف نام؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں پورے کوائف چاہئیں۔" میں نے وضاحت کی۔ "... کمرہ نمبر اور کہاں سے آئے ہیں۔"

"رجسٹر منگوانا ہوگا۔" اس نے اجازت طلب لہجے میں...

"منگوالو!" میں نے کہا اور اپنے لیے سگریٹ سلگا لیا... کسی کو فرنیچ میں ہدایات دینے لگی۔

رجسٹر آنے تک خاموشی رہی پھر میں رجسٹر کی ورق گردانی میں... ہو گیا۔

ہوٹل ڈی رمی کی ہر رہائشی منزل پہ ڈیڑھ سو کمرے... جن میں سے بیشتر بھرے ہوئے تھے۔

میں اس رجسٹر پہ صرف کمروں کے نمبر ہی پڑھ سکا... کی بات سمجھ میں نہ آسکی کیونکہ سارے اندراجات فرنیچ میں تھے۔

...وکیل کی جگہ کام کرنے والی نے میری الجھن کا اندازہ لگا کر خود ہی میری... مدد کی پیش کش کی جو میں نے مسرت کے ساتھ قبول کر لی۔

"مجھے ہفتہ کی شام سے ڈی رمی میں مسافروں کی آمد کی تفصیل درکار... " میں نے رجسٹر اسکی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"...ہفتہ یعنی پرسوں سے؟" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور... رجسٹر کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔

"...ہفتے کو خاصی تعداد میں مسافر آئے ہیں، میں کہاں سے شروع کروں؟" ...چند منٹ کے سکوت کے بعد اس نے سوال کیا۔

"اٹلی سے آنے والے پہلے مسافر سے ابتدا کر دو۔"

اس نے سب سے پہلے جو نام لیا وہ خاصا طویل اور پیچیدہ تھا وہ شخص ...کسی کاروباری سلسلے میں اٹلی کی بندرگاہ جنیوا سے آیا تھا اور اتوار کو دوپہر ...سے جنیوا واپس چلا گیا تھا۔

میں نے اس کے نام کا اندراج نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے نام پڑھتی گئی حتیٰ کہ اس نے رائے کاردیلو کا نام لیا جو اتوار کو صبح نو بجے اٹلی کے شہر فلورنس سے پہنچا تھا اور رجسٹر کے مطابق اس وقت تک ڈی رمی کے کمرہ نمبر ۵۲۱ میں مقیم تھا۔

پہلے اطالوی اور کاردیلو کے درمیان گیارہ اطالوی مسافروں کا اندراج تھا جن میں سے نو ایئر فرانس کے مہمان تھے اور ڈی رمی میں چند گھنٹے قیام کے بعد اپنی مقررہ پروازوں سے آگے روانہ ہو چکے تھے۔ ایک شخص سینٹ کلاؤ جا چکا تھا۔ گیارہواں شخص کمرہ نمبر ۲۶ میں مقیم تھا۔

کاردیلو کے بعد جو اطالوی نام آیا اس پہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا کیونکہ وہ شخص کاردیلو کے ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈی رمی پہنچا تھا اور ابھی تک کمرہ نمبر ۶ میں مقیم تھا۔

رجسٹر سے مجھ کو مزید تین نام ملے جو میں نے اپنے پاس لکھ لیے۔

عبداللہ بے انتہا محنتی اور مخلص شخص تھا مگر جلد بازی اس کے مزاج کی بنیادی کمزوری تھی جس کی وجہ سے وہ بعض ضروری نکات کو نظر انداز کر کے براہِ راست نتائج پر چھلانگ لگانے کا عادی ہو چکا تھا۔

کمرہ نمبر ۶ میں رہنے والے شخص کو اس نے محض اس بنا پر شبہ سے بالاتر ...سمجھا تھا کہ وہ جسامت اور حلیے میں کاردیلو سے قطعی مختلف تھا حالانکہ ...اپنے کانوں سے یہ سن چکا تھا کہ کاردیلو فلورنس سے ایک ...شخص ساتھ لے کر پیرس پہنچا تھا۔ اگر وہ اس بات کو ذہن میں رکھتا اور کاردیلو کے دوسرے ساتھی کی جستجو کرتا تو اسے انطونیو سب سے زیادہ مشکوک نظر آتا جو ...ڈیڑھ گھنٹے بعد فلورنس سے ڈی رمی پہنچا تھا۔ اسے ...ملنے کیلئے یہ بات کافی تھی کہ مجھ پہ ناکام حملے کے بعد کاردیلو ...بنا لی تھی اور مجھ پہ بے خبری سے حملہ کر کے مجھے ہلاک ...چھوڑی تھی۔ دوسری طرف میں نے عبداللہ کی کہانی ...فیصلہ کر لیا تھا کہ میں چھ نمبر والے مسافر کو کاردیلو کا ساتھی تصور...

کر کے اپنی چھان بین کا آغاز کروں گا اور مجھے ابتدائی کوشش میں ہی ایسی کارآمد باتیں معلوم ہو گئی تھیں جو عبداللہ فرنیچ سے واقف ہونے کے باوجود ہوٹل کے رجسٹر سے معلوم نہ کر سکا تھا۔

کاردیلو نہ صرف فلورا کو قتل کرتے دیکھا جا چکا تھا بلکہ میں نے بھی اسے بخوبی دیکھ لیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ اسی صورت میں ہوٹل ڈی رمی میں اپنی رہائش برقرار رکھتا کہ اس کی کھوپڑی میں بھیجے کے بجائے بھوسا بھرا ہوتا۔ دوسری طرف میں اس کا اصل شکار تھا اور وہ یہ جان چکا تھا کہ میں ڈی رمی میں مقیم ہوں۔ اس کے لیے مجھ پہ جلد از جلد ہاتھ ڈالنے کا موقع ہوٹل ہی میں میسر آسکتا تھا کیونکہ اس کے نکتۂ نظر سے میں زخمی ہونے کے باعث ہوٹل سے نکلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ان حالات میں اس کا ساتھی انطونیو ہر قیمت پہ اسی ہوٹل میں رہنے پر مجبور تھا۔ اس طرح وہ یہ کھوج نکال سکتا تھا کہ کاردیلو کے ہاتھوں چوٹ کھانے کے بعد مجھے کمرہ نمبر ۹۹ سے کہاں منتقل کیا گیا تھا۔

علاوہ ازیں کاردیلو، انطونیو کی مدد سے اور اس کے کمرے کو مرکز بنا کر ڈی رمی میں میرے خلاف کوئی بھرپور کارروائی کر سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں ڈاکٹر؟" مجھے خیالات میں ڈوبا دیکھ کر اس نے بوجھل سکوت توڑتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا مجھے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ اتوار کو فلورنس سے کتنی پروازیں یہاں آئی تھیں؟" میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

"میں خود اپنی ماں سے ملنے اکثر فلورنس جاتی رہتی ہوں اور واپسی کے لیے اتوار بہترین دن ہوتا ہے۔ کیونکہ پیر سے مجھے یہاں آنا ہوتا ہے۔ فلورنس سے ایئر فرانس کی ایک پرواز صبح آٹھ بجے یہیں پہنچتی ہے اور دوسری الاطالیہ کی پرواز رات دس بجے پیرس اور لندن جاتے ہوئے یہاں ٹھہرتی ہے۔" اس کے پاس میرے سوال کا جواب موجود تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ رائے کاردیلو اور انطونیو ایک ساتھ ہی نہیں پہنچے تھے مگر سیکرٹ سروس کے مروجہ ضابطوں کے تحت کافی وقفے سے یکے بعد دیگرے ہوٹل پہنچے تاکہ انہیں ایک دوسرے کے حوالے سے نہ پہچانا جا سکے۔

میرے لیے اس عورت کا یہ انکشاف بھی خاصی حیرت کا باعث ہوا کہ اس کی ماں فلورنس میں رہتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر وہ کاردیلو یا انطونیو سے ملی ہوتی تو اس کی کچھ ہمدردیاں اس کے ساتھ بھی ہو سکتی تھیں۔

"اپنی ماں کے شہر سے آنے والے لوگوں سے تمہارے خاصے مراسم ہوں گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"ہر ایک سے تو نہیں ہاں مسٹر کاردیلو سے کچھ راہ و رسم ہے۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ "فلورنس سے آنے والوں میں وہ ہمارے مستقل گاہک ہیں۔"

"اس کے باوجود تم نے مجھ سے یہ جاننے کی خواہش ظاہر نہیں کی کہ میں اٹلی سے آنے والوں کے بارے میں کیا چھان بین کر رہا ہوں اور

مجھے فلورنس سے انوار کو آنے والی پروازوں کی تعداد جاننے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔" میں نے اسے ٹٹولنے والے لہجے میں سوال کیا۔

"چارلس ہم لوگوں کی خدمت کے معیار کے بارے میں بہت سخت ہے اور اگر کسی مسافر کی جانب سے جائز شکایت آجائے تو وہ ڈی ریمی میں ملازم لڑکیوں پر بھی ہاتھ اٹھانے سے نہیں چوکتا۔ ہم لوگ مسافروں کے نجی معاملات میں غیر ضروری دخل اندازی نہیں کرتے۔"

"مگر تمہارے ذہن میں خیال تو آیا ہوگا؟"

"یہ فطری بات ہے!" اس نے فوراً اعتراف کرلیا۔ "مگر میں اب بھی اپنی جانب سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔"

"اس بار تمہاری کارویلو سے ملاقات ہوئی ہے؟"

"ہفتے اور اتوار کو میری چھٹی ہوتی ہے۔ میں آج صبح ڈیوٹی پر آئی ہوں اگر آپ رجسٹر طلب کرتے تو شاید شام سے پہلے مجھے اس کی آمد کا علم بھی نہ ہو پاتا۔"

"شام کو کیسے علم ہوجاتا؟"

"وہ چھٹی سے پہلے مجھے فون کرتا یا اچانک ہی میرے گھر آجاتا۔"

"اور اسے تم معمولی راہ و رسم قرار دیتی ہو؟"

"یہ سب آپ نے زبردستی اگلوایا ہے۔" وہ جھینپی سکراہٹ کے ساتھ بولی "ازراہِ کرم آپ چارلس سے ان باتوں کا تذکرہ نہ کیجیے گا۔"

"وہ کیوں؟" اس کی باتوں میں میرے لیے دلچسپی کا عنصر بڑھتا ہی جارہا تھا۔

"چارلس دفتری عملے کی لڑکیوں کے مسافروں سے میل جول سے نفرت کرتا ہے۔ وہ مجھے نوکری سے بھی نکال دے تو حیرت نہ ہوگی۔"

"تم کتنے عرصے سے یہاں کام کررہی ہو؟"

"چار سال گزر چکے ہیں!"

"اور چارلس ذرا سی بات پر تمہاری اس سروس کو فراموش کردے گا۔"

"وہ صرف اتنی سی بات پر اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے کہ اس نے ایک پارٹی میں شراب پی کر اونچے لہجے میں بولنا شروع کردیا تھا۔"

"میں ایک شرط پر وعدہ کرسکتا ہوں۔"

"ہوٹل کی حدود سے باہر میں تمہاری ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ میری بات کا غلط مفہوم سمجھ کر بولی۔

"کارویلو سے رابطہ قائم ہوتے ہی تم مجھے تفصیل سے باخبر کروگی۔" میں نے اس کی دعوت آمیز آمادگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟" اس نے سہم کر پوچھا۔

"ایسا ہی سمجھو۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "ایک کاروباری معاملہ ہے اسے یہ معلوم نہ ہونا چاہیے کہ میں نے اس کے بارے میں تم سے بات کی ہے۔"

"میں کسی دشواری میں نہ پڑ جاؤں!"

"میری ہدایات کو نظر انداز کروگی تو خود کو دشواریوں میں گھرا پاؤ گی اور دوسری صورت میں شاید میں چارلس سے تمہارے لیے کوئی سفارش کرڈالوں۔"

"اگر مجھے کچھ تفصیلات معلوم ہوجائیں تو میں نادانستہ تم کو ... سکوں گی۔" وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔

"اس سے زیادہ جاننا تمہارے حق میں مضر ثابت ہوسکتا ہے یاد رکھو کہ تم ڈی ریمی میں میری موجودگی سے لاعلم ہو۔" یہ کہتے ہوئے میں وہاں سے اٹھ گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو میری تیمار دار نرس طویل ہوتی ہوئی ... سے خاصی پریشان تھی مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔

میں نے رائٹنگ ٹیبل پر پہنچ کر ایک رقعہ تحریر کیا اور اسے لفافے میں بند کرکے اس کے حوالے کیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اگر میں نصف گھنٹے تک واپس نہ آؤں تو یہ لفافہ کھول ... لکھا ہوا پیغام مس اوڈیل تک پہنچا دینا۔" میں نے کہا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟ اوڈیل تو پانچ بجے ڈیوٹی پر آئے گی۔"

"اس کے گھر فون کرلینا اگر وہ وہاں نہ ملے تو پانچ بجنے کا انتظار ... یا عبداللہ نامی شخص آئے گا یہ رقعہ اس کے حوالے کردینا۔"

"عبداللہ وہی فلسطینی تو نہیں جو اکثر چارلس کے ساتھ دکھائی ..."

"ہاں وہی!" میں نے کہا۔

"تمہارے سر میں شدید ضرب آئی ہوئی ہے اس حالت میں ... جارہے ہو؟" وہ تشویش آمیز لہجے میں بولی۔

"جو ہو وہی رہو۔ میری بیوی کا منصب سنبھالنے کی کوشش ... میں ..." یہ کہتے ہوئے ہاتھ لہرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

زہریلی سوئیاں برسانے والی پلاسٹک کی شیشی میری جیب ... تھی۔ شوارٹ سے حاصل ہونے والا ریوالور شاید عبداللہ لے گیا تھا ... میں کمرے میں اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔

جب میں نے چوتھی منزل پر کمرہ نمبر ۶ کے دروازے پر دستک ... تو دوپہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے اور راہداری بالکل ویران ... دستک کے جواب میں اندر سے فرنچ میں کسی نے کوئی جواب ... اور میں الفاظ نہ سمجھنے کے باوجود اس کا مدعا سمجھ گیا۔

"سینگوئینی!" میں نے فرانسیسی لہجہ بنانے کی کوشش کرتے ... کمروں کے قالین صاف کرنے والے کا نام دہرا دیا۔ فوری طور پر مجھے ... وہی فرنچ نام یاد آسکا تھا۔

قدرے توقف کے بعد آہستگی سے دروازہ کھول دیا گیا ... مختصر سی جھری میں ..... ایک اوسط قامت اور دبلے پتلے سفید ... چہرہ نظر آیا۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت ضرور نظر آئی تھی مگر ...

... کا عنصر غالب تھا۔ شاید کارویلو کو اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ اپنے ... کو فلیٹر اسکر بنیتم کا چہرہ دکھا دیتا۔

"... ہوجو انطونیو؟" میں نے استفسار کرتے ہوئے اپنا بایاں پیر چوکھٹ ... رکھ دیا کہ وہ اچانک دروازہ بند نہ کرسکے۔

... اس نے جوں ہی اثبات میں اپنا فارغ البال سر ہلایا میں اسے ... تیزی سے اندر گھستا چلا گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا۔

... انطونیو غصیلے لہجے میں تیزی سے کچھ کہنے لگا۔ اس کے بشرے ... کے بجائے سخت غصے کا اظہار ہو رہا تھا جو بے ساختہ ... خوف یا حیرت ... نظر آرہا تھا۔

"... ادھر بیٹھ جاؤ اور انگریزی بولنے کی کوشش کرو!" میں نے اس ... کے سینے پر ہاتھ مار کر اسے ایک صوفے پر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟" اس نے پہلی بار سہمے ہوئے لہجے میں دریافت کیا مگر ... کے چہرے پر غصے کے اثرات اس وقت بھی باقی تھے۔

"کیا تم مطلوبہ شخص کو نہیں پہچان سکتے مسٹر انطونیو؟" میں نے سخت ... لہجے میں کہا اور جیب سے زہریلی سوئیوں والی شیشی نکال لی۔

"... نہیں تم کون ہو اور کیا کہہ رہے ہو۔" وہ حیران و پریشان لہجے میں بولا۔ "... میری کھڑکی کے نیچے کوئی بے ہوش آدمی چھجے پر پڑا ہوا ملا اور آج ... تم میرے کمرے میں گھس آئے، پتہ نہیں اس ہوٹل کی انتظامیہ کہاں ... سوری ہے!"

"تم نے اس بے ہوش آدمی کو دیکھا تھا؟"

"میں اس کمرے میں ہوتا تو شاید وہ واقعہ ہی ظہور پذیر نہ ہوتا۔ وہ ... دہشت زدہ سا ہوا نظر آرہا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ کہیں میں نے ... اتفاقات کو بنیاد بنا کر ایک بے ضرر آدمی کو پریشانی سے دوچار تو نہیں کردیا تھا۔

"یعنی چھجے پر تم ہی نے اس کا سر پھوڑا تھا؟"

"ایسی بے مقصد باتیں نہ کرو۔" وہ بہت زیادہ پراگندہ نظر آرہا تھا۔ "تم اگر مجھے ... ثابت کرنے آئے ہو تو میری نقدی، گھڑی اور کیمرہ وغیرہ سمیٹ کر چل دو، ... زیادہ دیر تک اس ناخوشگوار صورتحال سے دوچار نہیں رہنا چاہتا۔"

اس کا رویہ مجھے سخت حیرت ناک نظر آرہا تھا۔

اگر وہ واقعی کارویلو کا ساتھی تھا تو اس نے میرے زبردستی داخلے پر اس ... حرکت سے کام نہیں لیا جو اس کے پیشے سے وابستہ لوگوں کا خاصہ ... اور اگر وہ اداکاری کررہا تھا تو بلا مبالغہ اسے ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا ... ہر حرکت اور چہرے کے تاثرات پر اتنا قابو تھا کہ اس کے ذہن کی تھاہ ... نہ تھا۔

"... تمہاری اداکاری زیادہ دیر نہ چل سکے گی۔" میں نے کہا۔ "میں ... چار گھونسوں میں تمہاری پسلیاں توڑ دوں گا۔"

"نہیں نہیں تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ آخر میں نے ... تمہارا کیا بگاڑا ہے اور تم خود بھی ایک معقول آدمی نظر آتے ہو!"

"اس غلط فہمی میں نہ رہنا، وقت پڑنے پر میں اول درجے کا نامعقول ثابت ہوتا ہوں، میرے ہاتھ میں جو شیشی دبی ہوئی ہے کسی بھی لمحے پوٹاشیم سائنائیڈ میں بجھی ہوئی سوئیاں تمہارے بدن میں اتار سکتی ہے۔"

"تم چاہتے کیا ہو دوست؟" وہ رو دینے والے انداز میں گڑگڑایا۔

"ریمنڈ کارویلو کا پتہ!"

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے وہ بیٹھے بیٹھے زقند لگا کر کسی بندر کی سی پھرتی سے میرے سینے سے آچمٹا اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پشت کے بل قالین پر گرا۔

اس مسکین صورت لنگور کا وہ حملہ میرے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ میں فوری طور پر سنبھالا بھی نہ لے سکا اور اس نے میری چھاتی پر سوار ہوکر میری کنپٹی پر دو بھرپور گھونسے بھی جمادیے جن کے سبب میری بھٹتی ہوئی کھوپڑی درد سے پھٹنے لگی۔

"کارویلو سے مل کر تمہیں بڑی خوشی ہوگی ڈاکٹر۔ وہ تمہارے دہانے میں انگلیاں ڈال کر تمہارے جبڑے چیر ڈالے گا۔" مکے برسانے کے ساتھ وہ کہتا جارہا تھا۔

کنپٹی بچانے کی کوشش میں میں نے اس کا تیسرا گھونسہ اپنی ناک پر کھایا اور چوتھا مکا راستے ہی میں تھا کہ میں نے پوری قوت سے اسکی ناک کی جڑ میں ایک زبردست ضرب لگائی اور وہ چیخ مار کر پیچھے الٹ گیا۔

گرتے گرتے اس کی گردن میری ٹانگوں کی گرفت میں آگئی اور میں اس کی گردن پر پنڈلیوں کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے سیدھا ہوگیا۔

میرا گھونسہ لگتے ہوئے اس کی عینک اس کے چہرے پر موجود تھی اور میرے گھونسے نے شاید فریم اور عدسے توڑ کر اس کی آنکھوں میں پیوست کردیئے تھے۔

اگر اس کی گردن بروقت گرفت میں نہ آتی تو شاید وہ لہولہان اندھا چیخ چیخ کر سارے ہوٹل کو وہاں جمع کرلیتا۔ اس کی اکلوتی چیخ اتنی مدھم اور نامکمل تھی کہ اسے سننے والوں نے بھی دوسری چیخ کے انتظار میں مایوسی کے بعد اپنا وہم سمجھ لیا ہوگا۔

اس کی قوتِ مزاحمت کو برباد کرنے کیلئے میں نے اس کے پیٹ اور پسلیوں میں مکے برسانے شروع کردیئے اور اس کا بدن ماہیٔ بے آب کی طرح قالین پر تڑپنے لگا۔

میرے لیے انطونیو کی اہمیت صرف اسی قدر تھی کہ وہ ایک اسرائیلی ایجنٹ تھا اور نیس میں میری موجودگی سے واقف ہوچکا تھا۔ یہی دو نکات اس کی موت کا فیصلہ صادر کرنے کیلئے کافی تھے۔ میں اسے مزید کوئی موقع دیئے بغیر فوراً ہلاک کردینا چاہتا تھا مگر دقت یہ تھی کہ انطونیو کے وحشیانہ حملے میں شیشی میرے ہاتھ سے دور جاگری تھی۔

وہ اپنی گردن کو میری پنڈلیوں کی آہنی گرفت سے نکالنے کیلئے پوری قوت صرف کرتا رہا مگر میں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا اور چند منٹ

کی روح ذرسا جدوجہد کے بعد اس نے اسی شکنجے میں ہاتھ پیر ڈال دیئے۔

جب مزید تین گھونسوں پر بھی اس کے جسم میں جنبش نہ ہوئی تو میں اسے چھوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

اس کی عینک جو ساری زندگی بینائی کو تقویت دیتی رہی... مرتے وقت اس کی دونوں آنکھوں کی بھینٹ لے چکی تھی۔

انطونیو کے جسم کے سرسری جائزے ہی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ زندگی سے محروم ہو چکا ہے۔ میں نے ایک حریف کا خاتمہ کر دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہی کمرہ کارڈیلو کیلئے بھی چوہے دان ثابت ہوگا۔

میں صوفے پر اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ نوشی کرتے ہوئے کارڈیلو کے استقبال کی حکمتِ عملی تیار کرنے لگا۔

میں اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک سنائی دی اور میں اچھل کر دروازے کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ شاید میرا دوسرا شکار آپہنچا تھا۔

میں چند سیکنڈ تک دروازے کی اوٹ میں کھڑا باہر کی سن گن لیتا رہا مگر ادھر گہرا سناٹا طاری تھا۔ پھر اچانک دروازے پر تیز دستک ہوئی۔

اس بار میں نے دستہ گھما کر تیزی سے دروازہ کھول دیا اس طرح دروازہ ضرور کھل گیا مگر میں پٹ کے پیچھے اس طرح چھپ گیا کہ اندر آنے والا فوری طور پر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا اگر وہ سیدھا اندر چلا جاتا تو اس کی پشت میرے ہتھیار کے نشانے پر ہوتی اور اگر وہ چالاکی کا مظاہرہ کرتا تو بھی میرے مقابل آئے بغیر مجھ پر وار نہیں کر سکتا تھا۔

اس وقت صورت حال نہایت خطرناک تھی۔ انطونیو میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اس کی لاش اندر پڑی ہوئی تھی اور مجھے توی امید تھی کہ کمرہ نمبر ۶ پر دستک دینے والا کارڈیلو ہی ہو سکتا تھا۔

"اندر کون ہے؟" اچانک باہر سے کسی کی غراہٹ ابھری اور میں ایک طویل سانس لے کر دروازے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔

عبداللہ ہاتھ میں ریوالور لیے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر فرطِ حیرت سے اس نے اپنا پورا منہ کھولا اور فوراً ہی بند کر لیا۔

"آجاؤ، اندر آجاؤ" میں نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اندر کھینچ لیا۔

"تم نے مجھے زچ کر دیا ہے!" وہ اندر آتے ہوئے منہ بنا کر بولا "تم یہاں کیا کرتے پھر رہے تھے؟ تمہیں تو بستر پر ہونا چاہیئے تھا۔"

"جس شخص کو تم نے معصوم سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے وہ کارڈیلو کا دوسرا ساتھی تھا۔ کارڈیلو میرے کمرے سے بھاگ کر محض اتفاقاً چھ نمبر میں نہیں پہنچا تھا۔"

"نہیں!" اس کے بشرے سے بے اعتباری عیاں تھی۔

"اندر اس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔"

اور تقریباً اسی لمحے عبداللہ کو انطونیو کی لاش نظر آگئی۔

"اوہ خدا!" وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرا خیال تھا کہ تم دو تین دن بستر سے نہ اٹھ سکو گے اور تم ایک دشمن کو ٹھکانے لگا چکے۔"

"اب درد سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے!"

"تمہاری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کہیں تمہیں مشکلات سے دوچار نہ کر دے" وہ ملامت آمیز لہجے میں بولا "تمہیں کسی نہ کسی کو بتا کر جانا چاہیئے تھا۔"

"میرے ساتھ کارڈیلو نے جو مکارانہ چال چلی تھی اس نے مجھے سب کچھ فراموش کر کے معاملے کا کھوج لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"تم یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"سیدھا سادا دو اور دو چار کا معاملہ تھا۔"

"تو میں کیوں اس نتیجے پر نہ پہنچ سکا؟" اس کے لہجے سے حیرت اور ہلکی سی جھلاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اس لیے کہ تم نے انطونیو کی آمد کی تفصیلات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ کارڈیلو کے ڈیڑھ گھنٹے بعد یہاں پہنچا تھا۔ وہ بھی فلورنس سے آیا تھا کہ فلورنس سے اتوار کی صبح صرف ایک پرواز بس آتی ہے۔ اس کا مقصد ایک ہی تھا کہ اس نے خود کو کارڈیلو سے بظاہر الگ رکھنے کیلئے وہ ڈیڑھ گھنٹہ بے مقصد کہیں ضائع کیا۔ اگر وہ کارڈیلو کے ساتھ ہی آ گیا ہوتا یا صرف دس پندرہ منٹ کا فرق ہوتا تو شاید میں انطونیو پر اتنے اطمینان سے ہاتھ نہ ڈال سکتا۔"

"تمہیں تو ایک کامیاب سراغرساں ہونا چاہیئے تھا۔"

"اور تم میری بات لکھ لو کہ کارڈیلو جلد یا بدیر یہاں ضرور آئے گا۔"

"اس وقت تمہاری بات کی تردید کی ہمت نہیں ہے۔" وہ انطونیو کی لاش پر جھکتے ہوئے بولا "یہ تو شایانِ شان طریقے پر مرا ہے۔"

"ایک مرحلے پر تو وہ مجھ پر تقریباً حاوی ہو گیا تھا۔"

"تم جیسے جن پر فتح پانا اتنا بھی سہل نہیں ہے کہ اس جیسا انسان یا آدمی کامیاب ہو جاتا۔" وہ میری پشت پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"اس لاش کا کیا ہوگا؟"

"چارلس کے آنے تک یہیں پڑی رہے گی۔"

"اور چارلس کنز میں عیش کر رہا ہے!"

"وہ اسپین کی ایک شہزادی کو فلسازی کے گر سکھا رہا ہے۔" وہ داہنی آنکھ دبا کر بولا "جس دن وہ چارلس کے گر سمجھ گئی وہ شہزادی نہیں نیس میں ہوگا۔"

"بہت ہی ندیدا شخص ہے۔ اسے اتنی بھاگ دوڑ کی کیا ضرورت ہے"

"تم اس کی فکر نہ کرو اور یہ لو اپنا رقعہ! تمہاری تیمار دار نہانے کے بعد بہت اداس اور فکر مند بیٹھی ہوئی ہے۔"

میں نے وہ رقعہ لے کر پھاڑ دیا جو میں لفافے میں بند کر کے ...

اس میں میں نے صاف لکھ دیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں... اس میں ... تھا۔ ... کے کیمین کے بارے میں میرے کیا شبہات تھے۔

... کمرہ نمبر چھ ... ہم دونوں میں سے ایک آدمی کو اسی کمرے میں رہنا چاہیئے!" کچھ دیر ... سوچنے کے بعد عبداللہ نے تجویز پیش کی۔

... یہ کمرہ بیک وقت میرے لیے چوہے دان ثابت ہوگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ باہر سے اس پر ہر وقت نگاہ رکھی جائے!"

"اور اگر کارڈیلو ایک ہفتے تک ادھر نہ آیا؟"

"یہ ناممکن ہے، وہ دونوں ایک اہم اور ہنگامی مشن پر بلائے گئے تھے۔ وہ اس طرح وقت ضائع نہیں کر سکتا جب انطونیو اس سے نہیں ملے گا اور نہ اس کے کمرے سے فون کا جواب ملے گا تو کارڈیلو کو لازماً تشویش ہوگی اور وہ سیدھا وہاں دوڑا آئے گا تاکہ اپنی نظروں سے صورتحال کا جائزہ لے سکے۔"

"تم ہر بات پر فوراً اعتراض جڑ دیتے ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا "میری توقع نہیں کو کچھ دیر تو قائم رہنے دیا کرو۔"

"تم چاہو تو میں آئندہ زبان بند رکھوں گا۔"

"ارے یار میں تو مذاق کر رہا تھا۔" اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا "میں دل کی گہرائیوں سے تمہاری قدر کرتا ہوں!"

"فی الحال اپنے کمرے میں چلتے ہیں، میرے پاس تمہارے لیے کچھ اور راز بھی ہے۔" میں نے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"وہ بے چاری تمہاری صورت دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔"

"وہ مجھے ایک حسینہ سے زیادہ پہریدار نظر آنے لگی ہے میں شام سے اس کی چھٹی کر دونگا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"مرضی کے مالک ہو!"

کمرے میں پہنچ کر عبداللہ نے اس لڑکی کو اوڈیل کے دفتر میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور پھر ہم دونوں اپنے لیے کافی کا آرڈر دے کر منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ میں خود کو ڈرمی میں محدود کر لوں تاکہ کارڈیلو باہر کامیابی کی امید نہ دیکھ کر اپنی ساری توجہ ہوٹل پر مرکوز کر دے جب کہ عبداللہ باہر ہی تلاش کر کے اس کا قصہ نمٹانے کے چکر میں تھا۔

اسی ضمن میں میں نے عبداللہ کو اوڈیل کی جگہ دن میں کام کرنے والی لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"مارلین قابلِ اعتماد لڑکی نہیں ہے۔ یہ برا ہوا کہ تم نے انطونیو کے بارے میں اس کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔"

"تم غائب تھے، اوڈیل شام میں ڈیوٹی پر آتی ہے جب کہ میں ہر قیمت پر جلد از جلد کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ ویسے تو وہ چارلس سے بہت خائف معلوم ہوتی تھی۔"

"چارلس کی صورت سے اس کے سارے ملازم کانپتے ہیں اور مارلین تو تین بار اس سے بری طرح پٹ چکی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"تینوں بار اس نے ملازمت کے قواعد کی خلاف ورزی کی تھی اور گاہکوں سے بہتر لڑکیوں کی فراہمی کے لیے ان کے معاوضے کے علاوہ اپنا کمیشن بھی حاصل کیا تھا۔"

"لالچی معلوم ہوتی ہے؟"

"اگر اسے یقین ہو گیا کہ کارڈیلو کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا کر بھاری رقم حاصل کر سکتی ہے تو وہ پہلی فرصت میں رقم سیدھی کر کے نیس سے فرار ہو جائے گی۔"

"تو کیوں نہ میں اسے کارڈیلو کو پھانسنے کے عوض بھاری انعام کا یقین دلا دوں؟"

"کیا تم اس بارے میں سنجیدہ ہو؟" عبداللہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس میں غیر سنجیدگی کی کیا بات ہے؟"

"اول تو اسے اس طرح معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ دوئم وہ جانتی ہے کہ تم چارلس کے چہیتے مہمان ہو اور تم سے رقم وصول کرنا آسان نہ ہوگا۔ وہ کارڈیلو کے سامنے تمہاری پیش کش دہرا کر بڑا فائدہ حاصل کرنے کو ترجیح دے گی۔"

"اس طرح تو ہم اعتماد میں مارے جائیں گے!"

"ہمیں مارلین پر کڑی نظر رکھنا ہوگی۔ وہ ہماری بازی الٹ سکتی ہے۔"

"اگر اسے کارڈیلو کا قصہ نمٹنے تک قید کر لیا جائے تو کیسا رہے گا۔"

"اس کا انحصار اوڈیل پر ہے کہ وہ مارلین کی کمی کیسے پوری کرے گی ورنہ میرے ذرا سے اشارے پر ہوٹل کا شریس منیجر بآسانی دوہری تنخواہ کا لالچ دے کر مارلین کو کسی ایسے کام پر لگا سکتا ہے جہاں گنے چنے لوگوں کے علاوہ وہ کسی سے نہ مل سکے گی۔"

"چھٹی کے بعد تو وہ آزاد ہوگی!"

"اس کا بندوبست ہو جائے گا۔" وہ بولا "مارلین ہوٹل سے نہ جا سکے گی۔ میں اوڈیل سے کہوں گا کہ وہ عارضی طور پر کسی اور کا بندوبست کرے۔"

"تم اس ہوٹل میں بے پناہ رسوخ کے مالک معلوم ہوتے ہو!"

"ایک بار چارلس دو ماہ کے لیے امریکہ گیا تھا تو اپنے تمام اختیارات مجھے سونپ گیا تھا۔ اسی وقت سے سارا عملہ میرا احترام کرتا ہے۔"

"یہ کام کر لو تو باہر نکلیں گے مگر تم کارڈیلو کو کہاں تلاش کرو گے؟"

"وہ عیاش آدمی ہے۔ چند مشہور قحبہ خانوں سے ہم اپنی مہم کا آغاز کریں گے۔"

اس دوران میں کافی آگئی اور ہم دونوں کافی پینے لگے۔ عبداللہ کو ویسے بھی پانچ بجنے کا انتظار تھا تاکہ وہ اوڈیل سے مارلین کے بارے

میں بات کر سکے۔"

کافی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فون کی گھنٹی نے ہم دونوں کو چونکا دیا عبداللہ نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

اس نے ماؤتھ پیس میں فرنچ میں کچھ کہا پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ "مارلین تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"آسکر!" میں نے ریسیور لے کر کہا۔

"سر اس نے ابھی مجھے فون کیا تھا۔" مارلین نے ہیجان آمیز لہجے میں کہا اور شاید اس خوشخبری پر میرے چہرے کے تاثرات اتنے واضح تھے کہ عبداللہ کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"کمرہ نمبر ۶ والا اس کا ساتھی ہے اور وہ مجھ سے اس کی خیریت معلوم کرانا چاہتا تھا۔ اسے انطونیو کے کمرے سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا جب کہ فون پر استقبالیہ کلرک نے کاردیلو کو بتایا ہے کہ چھ نمبر کی چابی وہاں موجود نہیں تھی۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ چابی جیب میں ڈال کر ٹہلنے نکل گیا ہو۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے بھی اس کمرے سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔"

"اس نے مجھے یہ شام اپنے ساتھ گزارنے کی پیش کش کی ہے جو میں نے حسب معمول قبول کر لی ہے۔" مارلین ہر مرتبہ ایک بڑی خبر سنا رہی تھی۔

"وہ تم سے کہاں ملے گا؟"

"سوا پانچ بجے وہ ریوا لی تھیٹر کی انتظار گاہ میں مجھے ملے گا۔"

"تم ضرور جاؤ۔ اس نے اور کوئی بات تو نہیں کی؟"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ملاقات ہونے پر وہ بہت کچھ جاننے کی کوشش کرے گا۔" مارلین کی آواز سنائی دی۔ "فون پر اس نے صرف چھ نمبر کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔"

"کاردیلو سے فارغ ہوتے ہی کہیں سے مجھے فون کر لینا، میں انتظار کروں گا۔" میں نے اس پر یہ واضح کرنے کیلئے کہا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جائے گا۔

میں نے ریسیور رکھ کر سر اٹھایا تو عبداللہ کا بُرا سا منہ بنا ہوا تھا۔ مارلین سے گفتگو کے آغاز پر اس کے چہرے پر جو جوش و خروش پیدا ہوا تھا وہ رخصت ہو چکا تھا۔

"منہ کیوں لٹکا ہوا ہے، معرکے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" میں نے مسرت سے سرشار لہجے میں کہا۔ "وہ سوا پانچ بجے ریوالی تھیٹر میں مارلین سے مل رہا ہے۔"

"خوشی سے ناچنے کی ضرورت نہیں، وہ حرافہ اپنا کام دکھا گئی ہے۔" عبداللہ تلخ لہجے میں بولا۔ "اس نے یہ فون کاردیلو ہی کے مشورے پر کیا ہو گا۔"

"سوا پانچ بجنے میں دیر ہی کیا ہے، ساری صورت حال سامنے آجائے گی۔" میں نے لاپروایانہ انداز میں کہا۔

"تم اندھے کنوئیں میں کودنے کی تیاری کر رہے ہو۔"

"اگر مارلین سچی ہے تو ہم براہ راست کاردیلو پر ہاتھ ڈالیں گے اگر مارلین چالبازی کر رہی ہے تو وہ ہمیں پھانسنے کی کوشش کرے گا دونوں صورتوں میں اس سے ٹکراؤ لازمی ہے۔ اس کا کھل کر سامنے آنا ہمارے حق میں مفید ہو گا۔"

"وہ جانتا ہے کہ مارلین کا فون سن کر تم ریوالی دوڑے جاؤ گے اور پھر کہیں سے چلائی ہوئی ایک گولی تمہارا قصہ صاف کر دے گی۔"

"مارنا چاہتا تو وہ میرے کمرے سے بھاگنے سے پہلے ہی کام تمام کر سکتا تھا، وہ دراصل مجھے زندہ پکڑنے کی کوشش میں ہے۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ وہ لمبا جواری ہرگز نہ کھیلے گا۔" عبداللہ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ "تم دونوں کمرے میں بند تھے اور باہر اوڈیل دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ریوالور لاکھ بے آواز سہی مگر دروازے پر کھڑا ہوا شخص گولی کی آواز سن سکتا تھا پھر تمہاری چیخیں پورے ہوٹل میں ہنگامہ کھڑا کر دیتیں اور وہ اتنی آسانی سے فرار نہ ہو پاتا۔ اس وقت کاردیلو نے اپنی جان بچانے کیلئے تمہیں زندہ چھوڑا تھا۔"

"اگر تم ساتھ دینے کو تیار نہیں ہو تو میں تنہا جاؤں گا۔"

"یہ تو خیر ناممکن ہے، میں تمہارے ساتھ آگ میں بھی کودنے کو تیار ہوں مگر میں چاہتا ہوں کہ ہم ریوالی جائیں تو یہ سوچ کر جائیں کہ وہاں موت ہماری منتظر ہے۔"

"چلو یہی سوچ کر چلتے ہیں۔ ہم دونوں الگ الگ جائیں گے۔ میں براہ راست کاردیلو کو تلاش کرے گا اور دوسرا دور رہ کر پہلے کی حفاظت کرے گا۔"

"تم پیچھے رہو گے، میں اسے تلاش کروں گا۔" اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم میری تجویز کے مخالف ہو لہٰذا تم کو دور رہنا ہو گا۔ میں کاردیلو کو کھوج نکالوں گا۔ تمہیں اس خطرے میں ڈالنا اصول کے خلاف ہو گا۔"

"دوستی میں اصول کام نہیں آتے۔" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "تم مجھ سے زیادہ ذہین اور باصلاحیت ہو اور تمہاری مدت سے بچھڑی ہوئی بیوی آج شام میں لیبیا پہنچنے والی ہے اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو اس بے چاری کے دل پر کیا گزرے گی اور پھر تنظیم کا کتنا نقصان ہو گا، میرا کیا ہے، مر گیا تو شاید رونے والے بھی دو چار دوست ہی ہوں گے۔ ماں باپ، بہن بھائی تو سب فلسطین کی سرحدوں پر اپنا خون نچھاور کر کے کب کے بچھڑ گئے ہیں۔ میں آزادی اور انتقام کے جذبوں میں ڈوب کر اپنا سر ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں۔ اگر قدرت نے کاردیلو کے ہاتھوں میں موت لکھ دی ہے تو وہ آ کر رہے گی۔ تم میری بات مانو، دور رہ کر میری حفاظت اور کاردیلو کی تلاش تم بہتر طور پر کر سکو گے۔"

سیتا کا نام لے کر اس ظالم نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا

مجھے سیتا کیلئے زندہ رہنے کی ضرورت تھی خود غرضی دل میں ٹھہر رہا تھا۔ میری زبان پر تالہ بن گئی اور میں سر جھکا کر باتھ روم کی طرف ہو لیا۔ عبداللہ اپنے ریوالور کا چیمبر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک ہولناک تیاری کے ولولہ انگیز ... بیک اُداسی کا شکار ہو گئی تھی۔ عبداللہ کی باتوں نے میرا دل بھاری کر دیا تھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ آنے والی رات میرے لیے جدوجہد اور تصادم کی ایک یادگار رات ثابت ہو گی جس میں عبداللہ میرا دل بن چکا تھا اور میں نے دفاع کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی۔

میری رسٹ واچ اس وقت ساڑھے چار بجا رہی تھی اور صرف چند منٹ بعد یہ معلوم ہونے والا تھا کہ مارلین نے دشمن سے مل کر ہمیں شکست دینے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا یا اسی کے نقش پا کے سہارے ہم ... کو زیر کرنے والے تھے!

ٹھیک پانچ بجے ہم دونوں ہوٹل ڈی ریمی سے باہر آ گئے۔ چونکہ فوری طور پر کسی دوسری گاڑی کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا لہٰذا ہم نے ہوٹل سے ایک ساتھ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور براہ راست ریوالی تھیٹر پہنچنے کے بجائے ہوٹل سے مارلین کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچنا تھا۔

ریوالی تھیٹر سے چند قدم کے فاصلے پر عبداللہ مجھے اپنی رینالٹ سے اتارتا ہوا سیدھا مارلین کے پیچھے چلا جاتا اور میں باقی ماندہ فاصلہ پیدل طے کر کے جلد از جلد ریوالی کی انتظار گاہ تک پہنچتا۔

"کہیں کاردیلو ہوٹل کے آس پاس ہی نہ منڈلا رہا ہو۔" میں نے پارکنگ لاٹ کے ایک ویران گوشے میں عبداللہ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے شبہ کا اظہار کیا۔

"تھوڑی دیر پہلے تو تم نے مارلین پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لیا تھا اب یہ وسوسے کیوں پریشان کر رہے ہیں؟"

"تم نے مجھے شبہ میں ڈال دیا ہے اور یہ اندیشہ میں نے محض اسی مفروضے کی بنا پر ظاہر کیا ہے کہ مارلین کاردیلو سے مل گئی ہے۔ دوسری صورت میں کاردیلو کو مقررہ جگہ پر ہی ہونا چاہیے۔"

"اب کام کا وقت ہے۔ بلاوجہ سوچ کر اپنا ذہن نہ تھکاؤ۔ تمہارا سر ابھی دکھ رہا ہو گا۔" عبداللہ نے کہا۔

"انطونیو کے گھونسوں نے درد میں اضافہ کر دیا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب دیکھنا ہے کہ کاردیلو کیا گل کھلاتا ہے۔"

"فلورا کے مکان پر ہونے والے ٹکراؤ میں مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ بہت پھرتیلا اور وحشی ہے۔ اس سے مقابلے میں ذرا ہوشیار رہنا ہو گا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم اس طرح سوچ رہے ہو ورنہ تمہاری جلد بازی ہر جگہ کوئی نہ کوئی شاہکار پیش کرتی رہی ہے۔"

پانچ بجکر دس منٹ پر مارلین عجلت آمیز انداز میں عمارت سے نکل کر پارکنگ لاٹ میں بڑھتی ہوئی نظر آئی۔

"بوکھلائی ہوئی نظر آتی ہے۔" عبداللہ نے مارلین کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"مجھے گھبرائے ہوئے حسین چہروں پر ٹوٹ کر پیار آتا ہے۔" میں نے اپنے اوور کوٹ کا کالر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

عبداللہ نے رینالٹ کا انجن اسٹارٹ کر لیا تھا۔ پھر جب مارلین کی مختصر سی کار شام کے یخ بستہ اور کہر آلود دھندلکے میں احاطے سے باہر نکل گئی تو عبداللہ نے بھی اپنی گاڑی قطار سے نکال اور پھاٹک پر آ کر داہنی طرف ہو لیا۔

چند موڑوں سے آگے نکلنے کے بعد مارلین کی سبز کار نظر آ گئی اور عبداللہ نے اپنی گاڑی کی رفتار دھیمی کر لی۔

ریوالی تھیٹر ہوٹل ڈی ریمی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فضا میں ریوالی تھیٹر کے بڑے بڑے روشن حروف نظر آنے لگے۔

تھیٹر سے تقریباً دو سو گز دور عبداللہ نے مجھے اتار دیا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔

نیچے اترتے ہی سمندر کی جانب سے آنے والی بھیگی ہوئی سرد ہواؤں نے مجھے اپنی گردن کالر میں دبکا لینے پر مجبور کر دیا اور میں دونوں ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں میں اڑس کر تیزی کے ساتھ آگے ہو لیا۔

داہنی جیب میں موجود ریوالور کا سرد آہنی دستہ میں نے اس طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر اسے فوراً استعمال کر سکوں۔

میں چند ہی منٹ میں ریوالی تھیٹر کے احاطے میں داخل ہو گیا، جہاں خاصی رونق نظر آ رہی تھی۔ میں عمارت میں داخل ہوا تو ملائم آوازوں اور مخملیں قہقہوں کے نسوانی ترنم نے میرے اعصاب پر خاصا خوشگوار اثر ڈالا۔ مگر اس وقت میں اپنی حس لطیف کو بے لگام چھوڑ دینے کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا بھیڑ میں اپنا راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔

ریوالی کی انتظار گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی مجھے عبداللہ نظر آ گیا۔ وہ انتظار گاہ کے دروازے کے عین سامنے دیوار کے سہارے کھڑا اپنے کسی شناسا سے باتیں کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں دروازے کے پار جمی ہوئی تھیں۔

میں سر جھکائے انتظار گاہ کے سامنے سے گذر کر اس نیم روشن تنگ راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ جدھر ٹوائلٹ کا نشان بنا ہوا تھا۔

میں ٹوائلٹ سے واپس ہوا تو عبداللہ بدستور اسی جگہ موجود تھا۔ میں نے دروازے میں سے انتظار گاہ پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی مگر مارلین مجھے نظر نہ آ سکی۔ عبداللہ کے پُرسکون انداز کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ مارلین اسی کمرے میں موجود ہو گی مگر اوٹ میں ہونے کی بنا پر میری نظریں اسے نہ دیکھ سکیں۔

انتظارگاہ اور اس کے سامنے بنی ہوئی وسیع لابی سے نکاسی کا ایک ہی راستہ تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اندر رُکے رہنے کے بجائے باہر سے اس راستے پر نظر رکھوں۔ اس طرح مارلین یا عبداللہ میری نظروں میں آئے بغیر باہر نہیں نکل سکتا تھا اور نہ ہی کاردیلو میری نگاہوں سے بچ کر اندر جاسکتا تھا۔

برآمدے کے بجائے باہر کی کھلی فضا میں کھڑے رہ کر نگرانی کا کام سرانجام دینا اس موسم میں نہایت صبر آزما مرحلہ تھا۔ مگر ان مخدوش حالات میں اس سے مفر بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے سکون کے ساتھ ایک ایسی جگہ سنبھال لی جو میرے لئے محفوظ تھی۔

وقت دھیمے دھیمے سست رفتاری سے رینگتا رہا۔ جب سردی اوورکوٹ کی دبیز تہہ عبور کر کے میری ہڈیوں میں سرایت کرنے لگی تو مجھ پر جھلاہٹ طاری ہونے لگی۔

ان دنوں ریوالی تھیٹر میں کوئی مشہور ڈرامہ اسٹیج کیا جارہا تھا جس کا پہلا شو چھ بجے شروع ہونے والا تھا۔

میری رسٹ واچ کی سوئیاں آہستہ آہستہ چھ بجنے کا اعلان کرنے لگیں۔ برآمدے وغیرہ میں پھیلی ہوئی رونق تیزی سے معدوم ہونے لگی۔ اور چند منٹ میں وہاں اتنا سناٹا ہوگیا کہ مجھے اپنی جگہ چھوڑنی پڑ گئی۔

اگر میں کچھ دیر مزید وہاں رُکا رہتا تو خواہ مخواہ ہر شخص کی اشتباہ آمیز نظریں مجھے ٹٹولنے لگتیں۔ مجھے حیرت تھی کہ مارلین اور عبداللہ اندر کیا کر رہے ہوں گے۔ ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ شاید کاردیلو میری آمد سے قبل وہاں پہنچ گیا ہو، اور ابھی تک مارلین کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف ہو۔ ایک موہوم سا امکان یہ بھی تھا کہ کاردیلو نے پہلے سے تھیٹر میں دو نشستیں مخصوص کر دالی ہوں اور ڈرامے کا آغاز ہونے پر مارلین کے ساتھ اندر داخل ہوگیا ہو، مگر اس صورت میں عبداللہ کو اندر رُکے رہنے کے بجائے باہر آکر مجھے صورتحال سے باخبر کرنا چاہئے تھا۔

چھ بجکر سات منٹ پر مارلین نکاسی کے راستے سے باہر نکلتی نظر آئی۔ وہ خاصی سراسیمہ نظر آرہی تھی۔ باہر آتے ہوئے اس نے اضطراری طور پر اپنی رسٹ واچ کا جائزہ لیا اور پھر اپنی موٹر کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد عبداللہ باہر آیا۔ اور دروازے پر رُک کر متجسّسانہ انداز میں اطراف کا جائزہ لینے لگا جس پر میں قدرے روشنی میں نکل آیا۔

مجھے دیکھتے ہی عبداللہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔

" ساری بھاگ دوڑ بے کار ہی ثابت ہوئی " اس نے آتے ہی بےزاری کے عالم میں کہا۔ " یہ میرے لئے وقت کی بربادی کا بدترین تجربہ تھا "

" مارلین کے تعاقب کے بارے میں کیا خیال ہے ..." مارلین کی رینگتی ہوئی موٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ " وہ جاتے ... بھی اس اُمید میں ہر طرف دیکھ رہی تھی کہ شاید اسے کہیں کاردیلو دکھائی دے جائے۔ "

" جہنم میں ڈالو اسے " عبداللہ جھنجھلا کر بولا۔ " معلوم ہوتا ہے ... ابھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی ہے "

" اسے گھر پہنچا کر ہم ہوٹل لوٹ جائیں گے " میں اس کا بازو ... کر اسے رینالٹ کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔

" ہرگز نہیں " وہ سخت لہجے میں بولا۔ " ہم سیدھے ہوٹل ... مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ اس حرامزادی نے تمہیں احمق بنایا ... گھر پہنچ کر وہ تمہیں کاردیلو سے ملاقات کی کوئی سنسنی خیز کہانی ... کے لئے مسنون کرے گی "

" اتنا غصہ نہ کرو میری جان " میں اس کی پشت پر ہاتھ ... بولا " جہاں اتنا وقت خراب کیا ہے، میری خاطر چند منٹ اور ... "

وہ غصیلی نظروں سے مجھے گھورنے لگا " اس کے پیچھے ... ہمیں کیا ملے گا "

" بس ایک وہم ہے میرے دماغ میں " میں نے اسے ... ہوئے کہا " جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ وہ دُور نکل جائے اور ہم اسے ... سکیں "

" معلوم ہوتا ہے کہ انطونیو نے تمہارے دماغ کے کسی نازک حصّے پر ضربات لگائی تھیں " وہ جلے کٹے لہجے میں بولا۔

" چلو تم فی الحال یہی سمجھ لو " اسے گاڑی کی طرف جلتے ... میں نے کہا۔

رینالٹ سڑک پر آئی تو مارلین زیادہ دُور نہیں نکلی تھی ... ٹریفک سگنل پر اسے دیکھ لینے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ ہماری ... والی قطار میں کافی آگے موجود تھی۔

ٹریفک کا اشارہ ہونے پر ساری گاڑیاں حرکت میں آگئیں ... چند کاروں کا فاصلہ چھوڑ کر ہم مارلین کے پیچھے ہو لئے۔

" کیا وہم ہے تمہارے دماغ میں " عبداللہ نے غصیلے لہجے ... سوال کیا۔

" مسکرا کر پوچھو گے تو بتاؤں گا " میں نے شرارت آمیز ... جواب دیا۔

" تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے " وہ منہ بنا کر بولا " اس وقت ... میں میری ہڈیاں تک سلگ رہی ہیں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے "

" دماغ کے نازک حصّے پر چوٹ آئی ہوئی ہے نا " اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ کر خاموشی اختیار کر لی اور ... سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سیاہ لیموزین کار میری نظروں میں کھٹکنے لگی جو شروع ہی سے ہمارے اور مارلین کے درمیان حائل تھی۔ پہلے ٹریفک سگنل کو عبور کرنے کے بعد مارلین نے کئی موڑ کاٹے تھے مگر وہ لیموزین مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

" اس کی نظروں میں آنے سے گریز کرو " میں نے کہا۔

" میں پہلے ہی اسے نوٹ کر چکا ہوں " وہ سست لہجے میں بولا۔ " ڈرائیونگ سیٹ کی اونچی پشتگاہ کے باعث ڈرائیور کو دیکھنا ناممکن ہوگیا ہے "

پھر جونہی مارلین کی گاڑی ایک یکطرفہ راستے پر گھومی یک بیک لیموزین کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس کے ڈرائیور نے مارلین کی کار کے پہلو سے نکلتے ہوئے کوئی اشارہ کیا اور پھر کافی آگے جاکر اپنی کار سڑک کے کنارے روک دی۔

مارلین نے بھی اس کے عقب میں اپنی گاڑی روک دی۔ یہ سب اس قدر غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہوا کہ ہمارے لئے قطعی مہلت نہیں تھی۔!

وہ سڑک خاصی کشادہ تھی اور اس پر دو رویہ عمارات بنی ہوئی تھیں جن پر سینکڑوں کاروباری اداروں اور دفاتر کے بورڈ آویزاں نظر آرہے تھے۔ دفاتر کا وقت ختم ہوئے چونکہ کافی دیر گذر چکی تھی، لہٰذا وہاں خاصی حد تک چہل پہل مفقود تھی اور یہی صورتحال وہاں پارک کی ہوئی گاڑیوں پر بھی صادق آتی تھی۔

ہمارے اور آگے والی دونوں کاروں کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں عبداللہ کو کوئی مشورہ دینے کے لئے زبان نہ کھول سکا اور پھرتی کے ساتھ نشست سے نیچے پائیدان پر چلا گیا تاکہ باہر سے مجھے دیکھا نہ جاسکے۔

اپنی نئی جگہ سے میں نے سر اٹھایا تو عبداللہ کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور وہ ہونٹ بھینچے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اسکا اپنا ہاتھ جیب میں سے ریوالور سمیت برآمد ہو رہا تھا۔

" یہ حماقت نہ کرنا " میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے غرّایا۔ " خاموشی سے سیدھے نکل جاؤ ورنہ وہ کبھی ہاتھ نہ لگ سکے گا "

اس نے نہایت بےزاری بلکہ جنون کے عالم میں ریوالور اپنے برابر والی خالی نشست ... پر پٹخ دیا اور ساتھ ہی رینالٹ کی رفتار بھی یکبارگی تیز کر دی۔

" کیا ہم آگے نکل آئے " چند ثانیوں کے بعد میں نے آہستہ سے سوال کیا۔

" عقب نما آئینے میں صرف دھند میں لپٹی روشنیاں نظر آرہی ہیں۔ سیدھی طرح بیٹھ کر مجھے بتاؤ کہ اب کدھر جانا ہے ورنہ چند منٹ بعد یہ گاڑی سیدھی چرچ کی دیوار سے جا ٹکرائے گی " اس نے خشک لہجے میں کہا۔

" کیا آگے سڑک بند ہے " میں نے احتیاط سے ریوالور اٹھا کر اپنی نشست سنبھالتے ہوئے ہنس کر پُوچھا۔

" آگے سہ راہا ہے، دائیں یا بائیں مڑا جاسکتا ہے۔ سامنے چرچ کی دیوار پھیلی ہوئی ہے " اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

" میری جان غصّہ تھوک دو، اس جیسے مکار آدمی کو تم یُوں بھری پُری شاہراہ پر بے بس نہیں کرسکتے تھے "

" اگر اسے یُوں ہی چھوڑنا تھا تو تعاقب کی کیا ضرورت تھی "

" ریوالی میں وقت دینے کے بعد بھی وہ محتاط رہا ہے۔ اس نے مارلین کو راستے میں روکا ہے اور وہ اسی طرف آئیں گے "

" اور اگر وہ وہیں سے واپس لوٹ گئے "

" یہ سڑک یکطرفہ ہے، انہیں واپسی کے لئے بھی آگے ہی آنا ہوگا " میں نے کہا " میں فرنچ تو نہیں جانتا مگر ٹریفک کی علامات ضرور سمجھ لیتا ہوں "

" وہ اپنی گاڑی سے اترا نہیں تھا " چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ بولا " اپنی گاڑی ریورس کر کے مارلین کی موٹر کے برابر لے آیا تھا "

" لیموزین میں وہی تھا "

" اس حرامزادے کو تو میں خواب میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ بڑے ٹھاٹھ سے سگار پی رہا تھا " عبداللہ نے کہا۔

" موڑ سے ذرا پہلے گاڑی روک لینا " میں نے کہا " وہ تمہاری موٹر کی طرف متوجہ تو نہیں ہوا تھا "

" بظاہر تو ایسی کوئی بات نہیں تھی " عبداللہ نے یہ کہتے ہوئے رینالٹ سڑک کے کنارے روک دی اور انجن بند کر دیا۔ " تم اسے کس طرح گھیرنا چاہ رہے ہو "

" وہ مارلین کے ہمراہ کسی ہوٹل میں یا اس کے فلیٹ پر جائے گا۔ اس پر وہاں بھرپور طریقے سے ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے "

" اور اگر اس نے فوراً ہی اسے ہوشیار کر دیا "

" میرا قیاس ہے کہ مارلین عام لڑکیوں کی طرح بزدل ہے۔ میری دھمکی اور بک ہارٹ کے خوف سے اپنی زبان بند رکھے گی "

" وہ بہت حریص فطرت کی مالک ہے......! "

" کاردیلو کے ساتھ شراب پیئے بغیر وہ ایک لفظ بھی نہ اگلے گی۔ اس بارے میں تم میرے قیاس پر بھروسہ کر سکتے ہو "

" ابھی تک تمہارے قیاسات پر ہی عمل کر رہا ہوں۔ تمہارے سامنے تو میں خود کو ایک بچہ محسوس کرنے لگا ہوں "

" تمہاری جلد بازی سے مجھے ڈر لگتا ہے ورنہ تم بھی کم نہیں ہو "

" مجھ سے صبر نہیں ہوتا یار " اس کا موڈ آہستہ آہستہ اعتدال پر آرہا تھا " ہونے والا کام جب تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے قرار نہیں آتا "

"انہیں خاصی دیر ہوگئی"
"ہوسکتا ہے کہ وہ وہیں کسی کیفے میں جا گھسے ہوں۔ اس علاقے میں نائٹ کلب اور اسنیک بار خاصی تعداد میں ہیں"
چند ثانیوں بعد عبداللہ نے عقب نما آئینے میں دیکھ کر ان کی آمد کا اعلان کیا اور میں ایک مرتبہ پھر پائیدان پر پھسل گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کاروبلو کی مجھ پر نظر پڑے اور وہ مجھے پہچان لے۔ وہ مجھ سے نہایت سکون اور اطمینان کے عالم میں ٹکرایا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ محض ایک جھلک دیکھ کر ہی مجھے پہچان لے گا جب کہ عبداللہ سے وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں ٹکرایا تھا۔ البرٹو کے مکان پر فلورا کو قتل کرنے کے بعد فرار ہوتے ہوئے وہ محض چند لمحات کے لئے عبداللہ سے الجھا تھا اور پھر گولیاں برساتا وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔
مجھے امید تھی کہ اوورکوٹ کے اونچے کالر کی بناء پر کاروبلو عبداللہ کو ہرگز نہ پہچان سکے گا۔
ان دونوں گاڑیوں کے آگے نکلتے ہی عبداللہ نے رینالٹ ان کے پیچھے لگا دی۔ اس بار اس نے موٹر کی کوئی روشنی نہیں جلائی تھی۔ بس اگلی کار کی عقبی سرخ روشنیوں کے سہارے سڑک پر چل رہا تھا۔
"اس بار ترتیب بدلی ہوئی تھی" عبداللہ نے مجھے اپنی جگہ سنبھالتے دیکھ کر کہا۔
"کیسی ترتیب؟"
"کاروبلو آگے تھا اور مارلین اس کے پیچھے گئی ہے"
"یہ اچھا ہوا۔ مارلین کا تعاقب نسبتاً آسان اور محفوظ ثابت ہوگا" میں نے کہا۔
"وہ مارلین کے فلیٹ کے بجائے اسے اپنی مرضی اور پسند کے کسی مقام پر لے جا رہا ہے جو شاید مارلین کے لئے غیر معروف ہو" عبداللہ نے تبصرہ کیا۔
سہ راہے پر پہنچ کر کاروبلو کی لیموزین داہنی جانب گھوم گئی جبکہ مارلین بائیں جانب مڑنے کا اشارہ دے رہی تھی۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" عبداللہ بوکھلا کر بولا۔
"مارلین کو جانے دو، ہمارے لئے کاروبلو کا ٹھکانہ بہت اہم ہے"
عبداللہ نے رینالٹ کے ہیڈ لیمپس روشن کر دیئے اور مارلین کے بائیں طرف جانے کے بعد اپنی موٹر داہنی طرف والے راستے پر گھما لی جدھر لیموزین گئی تھی۔
"پتہ نہیں یہ ولد الحرام شہر بھر میں کیا... کرتا پھر رہا ہے" عبداللہ کاروبلو کی عجیب و غریب حرکات سے سخت بدظن نظر آ رہا تھا۔
"وہ منجھا ہوا سیکرٹ ایجنٹ معلوم ہوتا ہے۔ اسے اندازہ ہو چکا ہوگا کہ نیس میں کچھ لوگ اس کے بھی چکر میں ہیں اور وہ خاموشی کے ساتھ اپنا وار نہ کر سکے گا۔ لہٰذا وہ ہر احتیاطی تدبیر پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے"
"وہ مجھ سے اور تم سے تو واقف ہو چکا ہے اور انطونیو کی طرف سے جواب نہ ملنے پر وہ اور زیادہ چوکنا ہو گیا ہوگا"
"انطونیو کی لاش کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"
"فی الحال کاروبلو کو اس کے پاس پہنچانے کے بارے میں ہی ... مجھے تو شبہ ہو رہا ہے کہ مارلین نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے ... اس نے مارلین کے ساتھ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب دیکھو کیا تماشا نکلے گا"
"یہ تعاقب ختم ہو تو مارلین کی بھی خبر لینی ہوگی"
"شاید اسے تعاقب کا شبہ ہو چکا ہے" عبداللہ نے
"تم شام ہی سے اس معاملے کے منفی پہلوؤں پر سوچے جا رہے ہو۔ تمہارے خیال میں تو ہم لوگوں کا یہ والی تعاقب جاہی بے سود تھا"
"یہ بات نہیں صفدر" وہ نرم لہجے میں بولا "اس نے اب جو راستہ اختیار کیا ہے وہ دوبارہ ہمیں اسی سڑک پر لے جائے گا جدھر سے ہم چند منٹ قبل گذرے تھے"
"بس خیال رکھو کہ وہ دھوکہ دے کر جانے نہ پائے"
"اس کے تیور خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔ دھوکہ دینا چاہتا تو کم شاہراہوں کے بجائے پر پیچ راستے اختیار کرتا۔ شاید وہ ہمارے بارے میں اپنے شبہات پختہ کرنے چاہتا ہے" عبداللہ نے ہیٹر آن کرتے ہوئے کہا۔
"شبہات پختہ کر کے ہمارا کیا بگاڑ لے گا"
"بگاڑنے کی بات نہیں۔ اسرائیلی اہلکار عام طور پر جنون کی حد تک قوم پرست ہوتے ہیں۔ ہر شخص خود کو ہیکل سلیمانی کا امین سمجھتا ہے اور یہ کاروبلو تو زیادہ ہی خبیث معلوم ہوتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ گاڑی روک کر اچانک اسٹین گن سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دے"
"وہ کسی جنگل میں نہیں، فرانس کے ایک ترقی یافتہ شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا ہے۔ ایسی حماقت کر کے وہ دو چار ہے گا۔ راہ گیر دل گر مارے تو اور بات ہے۔ ہمارا تو بال بھی بیکا نہ کر سکے گا" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔
نیس کی سڑکوں پر وہ بھاگ دوڑ کم و بیش پون گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران میں لیموزین بعض راستوں سے دو تین بار بھی گذری۔ آخر کار اس کا رخ شہر کے متوسط رہائشی علاقے کی طرف ہو گیا۔ جہاں کئی منزلہ عمارات پر مشتمل صاف ستھرے فلیٹ واقع تھے۔
سڑک کے کنارے ایک جگہ لیموزین پارک کر دی گئی۔ عبداللہ نے بھی اپنی رینالٹ اس سے محفوظ فاصلے پر روک دی۔
چند منٹ کے بعد لیموزین کی ڈرائیونگ سیٹ سے جو شخصیت برآمد ہوئی اسے دیکھ کر ہم دونوں ہی بھونچکے رہ گئے۔
لیموزین سے برآمد ہونے والی مارلین تھی اور وہ اپنا پرس تھامے ایک عمارت میں داخل ہو رہی تھی۔
"یہ کیا ہوا؟" اس تحیر آمیز سکون کو میں نے ہی توڑا۔
"تم نے خود دیکھا تھا کہ لیموزین میں وہ حرامزادہ موجود تھا"
"غالباً راستے میں رکنے کے بعد انہوں نے گاڑیاں بدل لی ہوں گی۔ جب وہ دونوں تمہارے قریب سے گذرے تو تم نے نہیں دیکھا تھا؟"
"میں نے دانستہ اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا تاکہ کاروبلو مجھے پہچان نہ سکے"
"اس نے ہمارے رویئے کے بارے میں بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ اسے یقین رہا ہوگا کہ ہم ساری توجہ گاڑیوں تک ہی محدود رکھیں گے"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسے شروع سے ہی تعاقب کا علم تھا"
"اس کا تو ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ مارلین نے اپنے آشنا کا ٹیلیفون موصول ہوتے ہی اسے بتا دیا ہو کہ تم اطالوی مسافروں کی چھان بین کے دوران میں اور انطونیو میں دلچسپی لے رہے تھے اور کاروبلو نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ تم انطونیو پر ہاتھ ڈال چکے ہو گے لہٰذا اس نے مارلین کو چارہ بنا کر ہمیں بری طرح بے وقوف بنایا ہے" عبداللہ پر اشتعال طاری ہونے لگا تھا۔
"ضروری نہیں کہ تمہارا نظریہ ہی درست ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مارلین بے قصور ہو، کاروبلو مکار آدمی ہے۔ اس نے مارلین کے بعد ریزال میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا ہو اور پھر اندر جانے سے قبل اس نے ہمیں دیکھ لیا ہو لہٰذا وہ باہر ہی مارلین کی واپسی کا منتظر رہا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے احتیاط کے پیش نظر مارلین کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے فلیٹ تک آنے کا فیصلہ کیا ہو مگر راستے میں اسے تعاقب کا شبہ ہو گیا لہٰذا وہ مارلین کو روک کر کسی بہانے اس سے گاڑی بدل کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا"
"اگر مارلین معصوم ہے تو سیدھی اپنے فلیٹ کیوں نہ آئی؟ وہ ضرور کاروبلو سے مل گئی ہے اور اس نے کسی خاص مقصد کے تحت ہمارا وقت ضائع کرایا ہے"
"اس کا جواب تو وہی دے سکے گی"
"تو یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ اوپر چل کر اس کی خبر لیتے ہیں"
"اس طرح ہم بالکل وہی کریں گے جو کاروبلو چاہتا ہے"
"وہ کیسے؟"
"ہو سکتا ہے کہ اس نے مارلین کے فلیٹ کی چابی لے لی ہو اور جتنی دیر وہ ہمیں سڑکوں پر چکر دیتی رہی، کاروبلو پوری طرح مسلح ہو کر اس کے فلیٹ میں پہنچ گیا ہو اور وہاں پہنچتے ہی ہم کو وہ گھیر لے"
"اس کے باوجود تم مارلین کی وکالت کر رہے ہو"
"ضروری نہیں کہ وہ کاروبلو کے منصوبے سے آگاہ ہو۔ کاروبلو نے اسے کوئی بہانہ ہی کیا ہوگا"
"تو اب کیا کیا جائے؟"
"آج کی رات بھی برباد ہوتی نظر آ رہی ہے"
"وہ کیوں؟"
"ہم لوگ باہر رہ کر باری باری اس عمارت کی نگرانی کریں گے جس میں مارلین داخل ہوئی ہے" میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"مجھے تو معاف ہی رکھو۔ میں کہیں سے اپنا پیٹ بھرنے کا انتظام کر کے موٹر کی پچھلی نشست پر سوتا ہوں۔ تمہاری طبیعت بھر جائے تو مجھے بیدار کر دینا۔ تم تو بالکل کتابی جاسوسوں کی سی باتیں کر رہے ہو"
"میں تنہا بھی ساری رات جاگ لوں گا مگر تم رینالٹ میں نہیں سو سکو گے" میں نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا "اگر کاروبلو تعاقب سے باخبر ہو گیا تھا تو یہ موٹر بھی اس کی نظروں میں آ چکی ہوگی۔ سوتا ہوا شکار دیکھ کر اسے دلی مسرت ہوگی"
"باہر شدید ٹھنڈ ہے۔ صبح تک ہم دونوں اکڑ کر رہ جائیں گے۔ یہ معاملہ صبح پر ہی ٹال دو۔ مارلین ڈیوٹی پر آئے گی تو دیکھا جائے گا"
"ہم صبر آزما ضرور ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آج کی رات کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ وہ ہمارے گرد جال بن رہا ہے اور میں اسے اسی کے بنائے ہوئے جال میں پھانسنا چاہتا ہوں۔ مارلین کے فلیٹ میں اعصاب شکن انتظار سے مایوس ہو کر وہ باہر آئے گا اور پھر رینالٹ اسے الجھن میں ڈال دے گی۔ ہمیں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہئے"
"تم اعصاب شکن انتظار کہہ رہے ہو، وہ سالا ساری رات گرم بستر میں مارلین کے ساتھ خرمستیاں کرتا رہے گا اور ہم یخ بستہ کھلی فضا میں اکڑتے رہیں گے۔ بازتقدیر پر بھروسہ کر کے مارلین کے فلیٹ پر دھاوا بول دو یا ہوٹل واپس چلو"
"مارلین کا مسئلہ تو ابھی حل ہو جاتا ہے" میں نے رینالٹ سے اترتے ہوئے کہا "ذرا تم بھی باہر نکل آؤ"
"چلو" عبداللہ نے باہر آ کر نہایت خلوص سے کہا۔
"تم تھوڑی دیر اس عمارت پر نظر رکھو۔ میں کسی بوتھ سے ہوٹل فون کر کے آتا ہوں"
"وہ کیوں؟"
"مارلین نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کاروبلو سے ملاقات کے بعد وہ مجھے فون پر صورتحال سے آگاہ کرے گی۔ اگر وہ بے قصور ہے تو اسے فوراً مجھ سے رابطے کی کوشش کرنی چاہئے"
"یہ تجویز معقول ہے۔ اگر اس نے تمہارے لئے فون کیا ہو تو ہوٹل ہی سے اس کے فلیٹ کا نمبر لے کر اسے بھی فون کر لینا تاکہ اس کی کہانی کا تو پتہ چلے"
عبداللہ کو اس عمارت کی نگرانی پر چھوڑ کر میں پبلک فون بوتھ کی تلاش میں چل دیا۔ اس دوران میں میں اپنے گرد و پیش سے پوری طرح

ہوشیار تھا۔

میں نے ایک کیمسٹ کی دکان میں لگے ہوئے بوتھ سے ہوٹل ڈی ریمی فون کیا تو آپریٹر سے یہ اطلاع پاکر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ پچھلے چند منٹ میں مارلین دو مرتبہ میرے لئے فون کر چکی ہے اور اس نے آپریٹر کو ہدایت کی تھی کہ مجھ سے رابطہ قائم ہونے ہی اس کا فون نمبر مجھے دے دے تاکہ میں اس سے بات کرلوں۔

میں نے سلسلہ منقطع کر کے مارلین کا نمبر ڈائل کیا۔

"میں ڈاکٹر آسکر بول رہا ہوں" میں نے فون پر نرم نسوانی آواز سن کر کہا۔

"اوہ ڈاکٹر! آج میں بہت پریشان ہوں" اس بار میں نے مارلین کی آواز پہچان لی۔

"وہ ملا تھا؟"

"ہاں۔ وہ نہ جانے کس چکر میں ہے" وہ رُکے بغیر مشینی انداز میں اگلنے لگی "وہ مقررہ وقت پر ریوالی تھیٹر نہیں پہنچا۔ جب میں شو شروع ہونے کے بعد مایوس ہو کر گھر لوٹ رہی تھی تو راستے میں وہ اچانک کہیں سے نمودار ہوا اور میری گاڑی رکوالی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک اہم کام کی وجہ سے ریوالی نہ آسکا۔ اسے نیس کے مضافاتی علاقے میں کسی سے ملنا تھا۔ مگر اس کے کہنے کے مطابق اس کی لیموزین کا ڈائنمو گڑبڑ کر رہا ہے۔ لہٰذا اس نے مجھ سے گاڑی بدلنے کی درخواست کی جسے میں نے قبول کر لیا کیونکہ مجھے شام میں کہیں نہیں جانا تھا۔ چلتے ہوئے اس نے ایک اور عجیب سی بات کہی کہ میں تیس چالیس منٹ تک شہر میں بے مقصد کار دوڑانے کے بعد اپنے فلیٹ کا رخ کروں اور راستے میں خریداری وغیرہ کے لئے کہیں نہ اتروں۔ میں نے اس سے اس حرکت کا سبب معلوم کرنا چاہا تو اس نے بدلے ہوئے خوفناک لہجے میں کہا کہ میں اس کی ہدایت پر عمل کروں کیونکہ اسی میں میری بہتری پوشیدہ ہے۔ میں اسی وقت سے سہمی ہوئی ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھ سے نرمی سے پیش آتا رہا ہے مگر آج تو اس کے لہجے سے خون کی بُو آ رہی تھی۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"اس نے کہا تھا کہ اپنے کام سے فارغ ہو کر میرے فلیٹ پر آئے گا۔ مجھے تو اس کے تصور ہی سے اب ہول اٹھ رہے ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ فلیٹ مقفل کر کے لیموزین کی چابی اگنشن میں چھوڑ دوں اور ٹیکسی سے ہوٹل ہی چلی آؤں" وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"میرے استفسار پر وہ کسی درندے کی طرح غرایا تھا ڈاکٹر، اس کا لہجہ اور تیور میرے اعصاب پر بُری طرح چھائے ہوئے ہیں۔"

"کیا لیموزین کا ڈائنمو واقعی خراب ہے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ صحیح کام کر رہا ہے۔ اس نے صرف گاڑی بدلنے کے لئے بہانہ تراشا تھا۔ میں تو ڈر رہی ہوں کہ کہیں وہ میری گاڑی ... کے لئے استعمال نہ کر بیٹھے۔"

"وہ ایسی ہمت نہ کر سکے گا۔"

"اس نے انطونیو کے بارے میں پوچھا تھا اور جب ... لاعلمی کا اظہار کیا تو کارڈیلو نے کہا تھا کہ انطونیو اگر ہوٹل ... میں ہی ہے تو زندہ نہ ہوگا" وہ کہنے لگی "میں نے اس کے ... کا سبب دریافت کیا تو وہ مصنوعی انداز میں ہنس کر کہنے لگا ... آتی مرتبہ انطونیو کو فون کیا کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو فون ضرور ریسیو کر ... پہلی بار اندازہ ہوا ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ اگر ... میری کار کی ڈگی میں کوئی لاش ٹھونس کر چابی مجھے لوٹا دی تو میں ... دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گی۔"

"میں تم تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر اس دوران ... لوٹ آئے تو دروازہ نہ کھولنا۔ روشنیاں گل کر کے دروازہ مقفل ..."

"خدا کے لئے جلدی آنے کی کوشش کرو ڈاکٹر۔ خوف سے ... کانپ رہا ہے۔ نہ جانے آج رات کیا ہونے والا ہے" وہ لڑکھڑاتی ... والی آواز میں بولی۔

اُسے تسلی دے کر میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

مارلین سے ہونے والی گفتگو نے میرے خیالات کی ... تائید کر دی تھی بلکہ مجھ پر یہ خطرناک حقیقت بھی واضح کر دی تھی کہ کارڈیلو کی نظروں میں مارلین مشکوک ہو چکی تھی اور وہ کسی بھی وقت اس لڑکی کی جان کے درپے ہو سکتا تھا۔

اس نے فون پر رازدارانہ طریقے پر مارلین سے ریوالی میں ملاقات کا وقت طے کیا تھا مگر جب اس نے ریوالی میں مجھے اور عبداللہ کو ... دونوں میں سے کسی کو مارلین کی نگرانی کرتے دیکھا تو لازمی طور پر اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ مارلین ہم لوگوں سے ملی ہوئی ہے۔ مگر ... میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کارڈیلو نے مارلین کو یہ ہدایت کیوں کی تھی ... تیس چالیس منٹ تک ہمیں نیس کی سڑکوں پر گھماتی رہے۔

اسے ملنے میں گاڑی سے اترنے کی ممانعت سے ظاہر تھا ... وہ ہمیں لیموزین کے ڈرائیور کی اصلیت سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا ... ہم کارڈیلو کے دھوکے میں اس کے پیچھے گھومتے رہیں۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن کے تمام دریچے یک بیک کھل ... کارڈیلو کو انطونیو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مارلین ... بھی اسے کوئی یقینی بات معلوم نہ ہو سکی لہٰذا اس نے ہمیں ... مارلین میں الجھائے رکھا اور خود ہوٹل ڈی ریمی کی طرف بھاگا ... انطونیو کی خیر خبر لے سکے۔ اس کام کے لئے اسے صرف نصف گھنٹہ ... تھا جو مارلین نے اُسے فراہم کر دیا۔

میں اور عبداللہ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ ڈی ریمی ...

... کے دوران میں کارڈیلو پہچان لئے جانے کے خوف سے ادھر ... نہیں کر سکتا تھا میدان صاف پا کر وہ نہایت آسانی سے انطونیو کی ... پہنچ گیا ہوگا۔

... پہنچنے ہی میں دوبارہ ٹیلیفون بوتھ کی طرف چل دیا تاکہ ... رازداری کے ساتھ کمرہ نمبر چھ کے بارے میں تازہ ترین ... معلوم کر سکوں۔

... فون پر میرا نام سنتے ہی مس لوڈیل کی آواز میں خوف سمٹ آیا "تت ... تم ہو ڈاکٹر، پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔"

"کیوں؟" یہ اطلاع میرے لیے شدید حیرت کا باعث ثابت ہوئی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ چند منٹ پیشتر تم نے کاؤنٹر پر فون کیا تھا۔ اس ... رات ایک پولیس انسپکٹر تین سراغ رسانوں سمیت میرے کمرے میں موجود ... تھا۔ وہ چارلس بک ہارٹ سے ملنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے سروس منیجر ... کے حوالے کر دیا۔"

"مگر ان سے میرا کیا تعلق؟"

"انھیں کسی گمنام شخص نے تھوڑی دیر قبل کسی پبلک بوتھ سے فون کر کے بتایا تھا کہ ڈی ریمی کے کمرہ نمبر ۶ میں ایک تازہ لاش پڑی ہوئی ہے جسے ڈی ریمی کے کمرہ نمبر ۹۹ میں مقیم ڈاکٹر آسکر بینیتھم نامی ایک مسافر نے قتل کیا ہے۔ وہ یہ اطلاع پاتے ہی ایمرجنسی ٹیم کے ساتھ ہوٹل آ پہنچا۔ ہم لوگ تم سے قطعی لاعلمی کا اظہار کر چکے ہیں مگر اس نے مسافروں کے اندراج کے رجسٹر پر قبضہ کر لیا ہے اور شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہو کہ کمرہ نمبر ۶ میں انطونیو موریلی نامی ایک اطالوی مسافر کی خون آلود لاش ملی ہے جو اتوار کی صبح ہی یہاں پہنچا تھا۔"

"چارلس بک ہارٹ کا کچھ پتہ چلا؟"

"کل سے اس کا ٹیلکس موصول ہوا ہے وہ صبح پہنچ رہا ہے۔"

"میں اب ہوٹل نہیں آؤں گا۔ تم بدستور میرے نام سے لاعلمی اختیار کیے رہو۔"

"یہ معاملہ ہم لوگوں کے بس سے باہر ہوتا جا رہا ہے اسے چارلس ہی سنبھال سکے گا۔" ایک گہرے سانس کے بعد لوڈیل کی آواز سنائی دی۔

"وہ کیوں؟"

"اگر وہ انسپکٹر چوتھی منزل کے مسافروں سے باز پرس کرے گا تو پچھلی رات کا واقعہ ضرور اس کے علم میں آئے گا۔ ہم نے مسافروں سے تو کہہ دیا تھا کہ چھٹے کمرے کے باہر چھجے پر بے ہوش پایا جانے والا مسافر نیند میں چلنے کا مریض تھا جسے ہم نے ہوٹل سے نکال دیا مگر انسپکٹر اس کے بارے میں تفصیل جاننا چاہے گا جو ہم فراہم ہی نہیں کر سکتے۔"

"اس معاملے میں تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ اسے کسی ایسے مسافر کا حوالہ دے دینا جو اسی روز ہوٹل چھوڑ کر ملک سے باہر روانہ ہوا ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس کا لہجہ پُر خیال تھا۔ "اس طرح کم از کم چارلس کی آمد تک ہم مشکلات سے بچے رہیں گے۔ تم چاہو تو میں تمھیں کچھ معتبر پتے دے سکتی ہوں جہاں تم تمام گھریلو آسائشوں کے ساتھ روپوشی اختیار کر سکو۔"

"اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو پھر فون کر لوں گا۔ فی الحال شکریہ!"

"مگر تم زخمی ہو۔ اگر تمہاری حالت بگڑ گئی تو چارلس کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔" وہ بے چارگی سے لبریز لہجے میں بولی۔

"وہ میں سنبھال لوں گا، تم فکر نہ کرو۔"

فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں تیزی سے واپس ہو لیا۔

راستے کارڈیلو میری توقع سے کہیں زیادہ مکار اور پھرتیلا ثابت ہوا تھا اور اس نے میری بھنک پاتے ہی میرے خلاف ہر طرف بھر پور محاذ کھول دیا تھا۔

وہ یقینی طور پر ہوٹل ڈی ریمی جا کر انطونیو موریلی کا حشر دیکھ چکا تھا اور پھر اس نے مجھے ڈی ریمی سے باہر ہانکنے کے لیے گمنام فون پر پولیس کو میری راہ پر ڈال دیا۔ اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو میں ڈی ریمی میں اپنا قیام جاری نہیں رکھ سکتا تھا، جہاں میں نسبتاً بہت زیادہ محفوظ بلکہ قلعہ بند تھا اور دوسری طرف ایک قتل کے سلسلے میں قانون کا خوف میری نقل و حرکت کو کارڈیلو کے مقابلے میں محتاط اور محدود کر دیتا۔

وہ جتنی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا تھا اس کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ وہ اسی رات مارلین کے فلیٹ کا رُخ ضرور کرے گا۔ اس طرح وہ اپنی دانست میں ہمیں عین موقع پر پکڑ بھی سکتا تھا اور اگر ہم لوگ نہ ملتے تو وہ اپنے شبہات کی روشنی میں تشدد کے ذریعے مارلین کی زبان کھلوا کر بہتر حکمت عملی ... تیار کر سکتا تھا۔

مارلین کا زندہ رہ جانا اس امر کا ثبوت تھا کہ کارڈیلو اپنے مشن کے لیے اس سے مزید کام لینا چاہتا تھا۔

میں مارلین کی قیام گاہ سے کچھ دور ہی تھا کہ اچانک اس علاقے میں سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی گاڑیوں کے درمیان ایک ہولناک دھماکہ ہوا جس کے ساتھ ہی کئی دردناک انسانی چیخیں بھی سنائی دیں اور پھر ایک گاڑی کا ڈھانچہ تیزی سے شعلوں میں گھرتا ہوا نظر آیا۔ میں غیر ارادی طور پر پوری قوت سے اس طرف دوڑ پڑا۔

وہ دھماکہ اتنا طاقتور اور شدید تھا کہ پورا علاقہ ہل کر رہ گیا اور کم و بیش ساری ہی عمارتوں کے مکین باہر نکل آئے تھے۔ میں نے سڑک کے دوسرے کنارے پر رُک کر جائزہ لیا تو میرا دل دہل گیا۔ جلنے والی گاڑی عبداللہ کی رینالٹ تھی۔

اس کے آس پاس کھڑی ہوئی گاڑیاں حیرت ناک سرعت کے ساتھ دور ہٹالی گئی تھیں۔ بہت سے لوگ آگ بجھانے والے گھریلو آلات سے شعلوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس سے ذرا دور ایک بہت

بڑا مضطرب ہجوم... تھا جس کے اجتماعی ردِ عمل سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہاں مرنے یا زخمی ہونے والوں کو ابتدائی طبی امداد دی جا رہی تھی۔

میں شدید خواہش کے باوجود جلتی ہوئی موٹر یا مجمع کی طرف نہیں گیا۔ مگر میری بے چین نگاہیں ہر طرف عبداللہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

میرے آس پاس بے شمار افراد بلند اور ہیجان آمیز لہجے میں غالباً اس حادثے کے بارے میں تبصرے کر رہے تھے مگر میں فرنچ سے نابلد ہونے کے باعث ان کی گفتگو سے کوئی بات معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

رینالٹ میں غالباً کوئی زبردست دھماکہ ہوا تھا کیونکہ اس کی نشستوں اور اندرونی حصے کے اس طرح چیتھڑے اڑ گئے تھے جیسے اس میں گھس کر کسی پاگل ہاتھی نے انگڑائی لی ہو۔ باڈی کی چادر اور چھت میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے تھے اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا اسے آناً فاناً میں شعلے چاٹ گئے تھے اور اس سوختہ ڈھانچے سے جڑے ہوئے ٹائر آہستہ آہستہ سلگ رہے تھے مگر علاقے کے رہنے والوں کی جدوجہد نے ٹائروں کے پھٹنے سے قبل آگ سرد کر دی اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ میں پھنسی ہوئی مسخ شدہ سیاہ لاش کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جب وہاں ایمبولنس کا سائرن سنائی دیا تو مجھے مخالف سمت میں عبداللہ نظر آیا جو مجمع کو چیرتا ہوا تیزی کے ساتھ ایک طرف لپکا جا رہا تھا۔

میں نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی مگر جتنی دیر میں بیس فٹ پاتھ کے دوسرے حصے پر پہنچا عبداللہ انسانوں کے اس ہجوم میں کہیں گم ہو چکا تھا مگر میرے لیے اتنا ہی کافی تھا ورنہ رینالٹ میں جلی ہوئی لاش دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔

کافی جستجو کے بعد میں ایک بوڑھے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا، جو دوسرے تماشائیوں کے برعکس پُرسکون انداز میں ایک دیوار کے سہارے تنہا کھڑا سگریٹ نوشی میں مصروف تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور لائٹر طلب کرنے کے بہانے اس تک پہنچ گیا۔

"یہاں کیا ہو گیا مونسیو؟" سگریٹ جلانے کے بعد میں نے سرد فضا میں دھواں اگلتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"میں نے سب کچھ دیکھا تھا۔" میری خوش نصیبی تھی کہ وہ نہ صرف انگریزی سے واقف تھا بلکہ عینی شاہد کے درجے پر فائز تھا۔

"شاید انجن میں آگ لگی ہوگی؟" میں نے بات بڑھانے کے لیے تبصرہ کیا۔

اس نے فیصلہ کُن انداز میں اپنے سر کو منفی جنبش دی۔ "کسی احمق نے یہ کار عمارت کے پھاٹک کے عین سامنے کھڑی کی ہوئی تھی۔ مسٹر ایڈورڈ اپنی گاڑی میں عمارت کے پھاٹک پر آئے تو بار بار ہارن بجانے کے باوجود اس کار کا مالک نہ آیا اور وہ غصے میں اپنی گاڑی سے اُتر کر رینالٹ کی طرف آئے وہ گاڑی شاید مقفل نہیں تھی اور اس کی چابی بھی اگنیشن میں موجود تھی کیونکہ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر رینالٹ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تاکہ اسے راستے سے ہٹا سکیں مگر اگنیشن آن ہوتے ہی ایک ہولناک دھماکے سمیت مسٹر ایڈورڈ کے پرخچے اڑ گئے اور تین آدمیوں کو میں نے آہنی پرزوں کے زخم کھا کر گرتے دیکھا۔ اس کے بعد یہاں بھگدڑ مچ گئی۔"

"اوہ۔ یہ تو بہت برا ہوا مسٹر ایڈورڈ تو نہ بچ سکے ہوں گے۔"

بوڑھے نے خشمناک نگاہوں سے مجھے گھورا۔ "لڑکے... میں تم بچنے کی بات کرتے ہو۔ مجھے تو شبہ ہے کہ ان کی بیوہ بھی پہچان سکے گی۔"

"تو کیا کار کا انجن پھٹا تھا؟"

"اگر تم انجینئرنگ کی ابجد سے بھی واقف ہوتے تو سمجھ لیتے کہ عمودی انجن پھٹنے کی صورت میں سارے پرزے ٹوٹ پھوٹ کر پرواز کر جاتے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نشستوں کے نیچے کوئی طاقتور ڈائنامیٹ پوشیدہ تھا جس کا سلسلہ اگنیشن سوئچ کے ذریعے بیٹری سے جوڑ دیا گیا تھا۔"

"معاف کیجیے محترم، میری فنی معلومات نہایت ناقص ہیں۔" میں نے ادب اور معذرت کے ساتھ نرم لہجے میں کہا۔ "موٹروں کے بارے میں آپ کا تجربہ قابلِ رشک معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ زندگی بھر صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکیں گے۔" وہ سپاہیوں کی طرف حقارت آمیز اشارہ کرتے ہوئے پُرغرور لہجے میں بولا۔ "عینی شاہد اگر محروم ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ پولیس کی مدد نہیں کرپاتا بلکہ عموماً انھیں غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔"

"تو کیا آپ گواہی دینے کا ارادہ نہیں رکھتے؟"

"ابھی نہیں۔" وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "بہت غور کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فی الحال مجھے خاموش رہنا چاہیے۔"

"مگر کیوں؟"

"ہر شخص ہیرو بننے کی کوشش میں اپنا راگ الاپے گا اور جب پولیس کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے گی تو اخبارات میں ان کی پگڑی اچھالی جائے گی، اس وقت میرا بیان ہر طرف سنسنی پھیلا دے گا۔ ابھی میں ایک عمر رسیدہ اور از کار رفتہ شخص ہوں جسے صرف ہمدردی کا مستحق سمجھا جاتا ہے مگر عزت نہیں کی جا سکتی۔ جب اخبارات میں میرا بیان اور تصویر چھپیں گی تو ہر طرف رشک اور احترام سے لبریز نگاہیں میرا تعاقب کریں گی۔ میں اس شہرت کا نشہ ابھی سے محسوس کر رہا ہوں۔"

"بے شک، بے شک۔" میں نے جلدی سے اعتراف کیا۔ "مگر اس کے نتیجے میں مجرم قانون کی دسترس سے دُور نکل جائے گا۔"

"وہ پولیس کا دردِ سر ہے۔" بوڑھا بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "ایک شہری کے طور پر میرا فرض ہے کہ میں اپنی ذکاوت اور قوتِ مشاہدہ سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بہرہ ور ہونے کا موقع دوں اور...

...وقت پر ایسا ضرور کروں گا۔"

"...تمام شہری آپ ہی کی طرح فرض شناس ہوں۔" میں نے ... اڑانے کے لیے سنجیدگی سے کہا اور سر کو قدرے خم دے کر ... چل دیا جدھر عبداللہ جاتا ہوا نظر آیا تھا۔

... وقت میرے ذہن میں عبداللہ کے وہ خدشات گھوم رہے تھے ... اس نے ریوالی جانے سے قبل ڈی ریمی میں کیا تھا۔

وہ شروع سے مارلین پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں تھا اور اسے ... تھا کہ اگر کارو یلو نے ریوالی کا رُخ بھی کیا تو معاملہ بڑی حد تک یکطرفہ ... اور کارو یلو روپوش رہ کر ہمیں شدید زک پہنچا سکے گا۔ مارلین کے بارے ... عبداللہ کا اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا تھا مگر اس کے باقی اندیشے درست ... ثابت ہو چکے تھے۔

کارو یلو ہمیں ریوالی تھیٹر میں شاید اس لیے نشانہ نہ بنا سکا کہ ہم ... دونوں پہلے سے بدترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ علاوہ ... ازیں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ لگے رہنے کے بجائے الگ الگ کام ... کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ حکمت عملی کارو یلو کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ... بن گئی تھی اور اب دونوں فریق بیک وقت ایک دوسرے کی گھات ... میں لگے ہوئے تھے۔

عبداللہ اس کہر آلود سرد شام کے گہرے دُھندلکے میں ایک بار ... نظر آنے کے بعد معدوم ہو چکا تھا۔ وہ جس انداز میں جاتا ہوا نظر آیا تھا اس سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے لگا ہوا تھا اور فوری طور پر اس سے ملنے کے امکانات مفقود تھے۔

میرے لیے ہوٹل ڈی ریمی کے دروازے حفاظتِ خود اختیاری کے تحت بند ہو چکے تھے۔ ادھر جا کر میں ناقابلِ بیان دشواریوں سے دوچار ہو سکتا تھا۔ عبداللہ کی کار ڈائنامیٹ سے برباد ہو چکی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان حالات میں عبداللہ کے ... کیا کر سکوں گا۔

سڑک پر جمع ہو جانے والوں میں شدید ہراس پایا جا رہا تھا۔ اس علاقے کے مکینوں کے لیے گنجان آباد علاقے میں وقوع پذیر ہونے والا ... یہ ہولناک حادثہ شدید اذیت کا باعث بنا ہوا تھا۔

پھر اچانک مجھے مارلین کا خیال آیا۔

پُرشور دھماکے اور خوفناک آتش زنی کے نتیجے میں میں اس ... لڑکی کو یکسر فراموش کر چکا تھا جو اپنے فلیٹ میں اندھیرا کیے مقفل ... دروازے کے پیچھے اپنے قاتل یا ہمدرد کی دستک کے رُوح فرسا انتظار ... میں مبتلا تھی۔

فون پر میں نے اسے لاحق خطرے کے پیشِ نظر یہ کہہ دیا تھا کہ میں ... جلد از جلد اس کے فلیٹ پر پہنچنے کی کوشش کروں گا مگر وہ عمارت میرے ... لیے موت کا پھندا بن سکتی تھی۔

میرے اور عبداللہ کے مقابلے میں کارو یلو تنہا رہ گیا تھا مگر اس نے میرا سراغ پانے کے بعد مختصر سے وقت میں یکے بعد دیگرے جو ہولناک انتقامی کارروائیاں کی تھیں ان کے پیشِ نظر مجھے بڑی حد تک یقین تھا کہ وہ کہیں چھپ کر ہمارے اس عمارت میں داخل ہونے کا انتظار کرے گا۔

عبداللہ کی کار کی تباہی نے میرے اس نظریے کی تائید کر دی تھی۔ اس کار میں فنی مہارت کے ساتھ اس طرح ڈائنامیٹ نصب کرنا کہ آدمی کچھ سمجھنے سے پہلے ہی ہلاک ہو جائے کارو یلو ہی کا کام ہو سکتا تھا اور وہ اس علاقے میں موجود تھا۔

جس وقت ہم دونوں مارلین کا پیچھا کرتے وہاں پہنچے تو لازماً کارو یلو نے ہمیں دیکھ لیا ہوگا مگر جب ہم دونوں نے الگ الگ راستے اختیار کیے تو اس نے وقت برباد کرنے کے بجائے کار پر توجہ مرکوز کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس طرح وہ ہم دونوں سے بیک وقت چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔

کار میں ڈائنامیٹ لگانے کے بعد وہ اپنی کارروائی کا جائزہ لینے کے لیے وہاں رُکا رہا ہوگا مگر عبداللہ کی فطری لاپروائی اس موقع پر ہماری جان بچانے کا بہانہ بن گئی اور بقول بوڑھے گواہ کے ایڈورڈ نامی ایک شخص نشانہ بن گیا۔

پیرس میں عام طور سے گاڑیوں کو تھوڑی دیر کے لیے پارک کرتے ہوئے دروازے مقفل کرنے کا رواج نہیں تھا مگر عبداللہ اس عادت کے ساتھ ہی چابی اگنیشن میں بھول جانے کے مرض کا شکار تھا۔ اس مرتبہ اگر چابی اس کی جیب میں ہوتی تو شاید ایڈورڈ گاڑی کو دھکیل کر اپنا راستہ بنا لیتا اور اس کی جگہ ہم دونوں دردناک موت کا شکار ہو چکے ہوتے۔

میں نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ آئندہ عبداللہ کو اس کی لاابالی حرکات پر کبھی نہیں ٹوکوں گا کیونکہ کبھی کبھی سمجھ بوجھ اور پیش بینی کے بجائے اندھا دھند بلکہ کسی حد تک غیر ذمہ دارانہ اقدامات بھی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔

مارلین والی رہائشی عمارت کے سامنے جا کر میں رُک گیا۔ اس کے قریب بھی لوگوں کی بھیڑ... تھی اور بیشتر برآمدوں میں عورتیں اور بچے نظر آ رہے تھے۔ اس دھماکے نے لوگوں کو خراب موسم کی پرواہ کیے بغیر بند کمروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس عمارت کی ساخت ایسی تھی کہ ہر فلیٹ کی حدود کا بہ آسانی تعین کیا جا سکتا تھا۔ اس حساب سے اس عمارت کے دو رہائشی فلیٹ تاریک پڑے ہوئے تھے اور شاید ان ہی میں سے کسی میں مارلین میری آمد کے انتظار میں دُبکی ہوئی تھی۔

میں دھڑکتے دل اور شدید اعصابی تناؤ کے عالم میں اس عمارت میں داخل ہو گیا۔ میرا داہنا ہاتھ اوور کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے ریوالور

کے دستے پر مضبوطی سے جما ہوا تھا اور بایاں ہاتھ بھی حالانکہ جیب میں تھا مگر مٹھی میں زہریلی سوئیاں برسانے والی پلاسٹک کی وہ شیشی دبی ہوئی تھی جو ریڈ بریگیڈ کے اراکین کے طفیل مجھ کو ملی تھی۔

اندر لفٹ کے قریب سناٹا طاری تھا اور لفٹ گراؤنڈ فلور پر ہی موجود تھی۔ ایک قریبی دیوار پر فریم میں لگی ہوئی چوبی تختیوں پر مکینوں کی فہرست درج تھی، گو ساری تحریر فرنچ میں تھی مگر انگریزی رسم الخط کی وجہ سے نام اور فلیٹ نمبر پڑھنا میرے لیے آسان تھا۔

اس کے مطابق مارلین کا فلیٹ نمبر ۱۳ تھا۔ مجھے اس عمارت میں نمبروں کی ترتیب وغیرہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لہٰذا میں نے لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے اوپر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ مطلوبہ نمبر آسانی سے تلاش کیا جا سکے۔

زینوں پر روشنی کا معقول انتظام تھا۔ ہر منزل پر دروازوں پر پیتل کے چمکتے ہوئے ہندسے نصب تھے اور نمبر ۱۳ تیسری منزل پر واقع تھا۔

اس فلور پر سیڑھیوں کے قریب کوئی موجود نہیں تھا لہٰذا میں مارلین کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے رک کر اندر کی سن گن لینے لگا تاکہ ڈور بیل بجاتے ہوئے مجھے اندر کی صورتِ حال کا صحیح احساس ہو۔

بظاہر اس فلیٹ کی ساخت اتنی عمدہ تھی کہ باہر سے اندرونی کیفیت کا اندازہ لگانا محال تھا۔ میں کم و بیش ڈیڑھ دو منٹ بے حس و حرکت اسی جگہ کھڑا رہا۔ پھر جیسے ہی مجھے ایک فلیٹ کا دروازہ کھلنے کی آہٹ سنائی دی میں نے مارلین کے فلیٹ کی ڈور بیل کا بٹن دبا دیا۔

فلیٹ میں گھنٹی کی ہلکی سی مترنم آواز سنائی دی۔ اس دوران میں کسی فلیٹ سے ایک تنومند نوجوان نکل کر میرے عقب میں آ پہنچا۔ اس کی آہٹوں پر میری ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور پستول کے دستے پر میری گرفت سخت ہو گئی۔

میں عجلت کا مظاہرہ کیے بغیر آہستگی سے مڑا تو وہ خودکار لفٹ کی طلبی کا بٹن دبانے کے بعد انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں اس نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور میں خفیف سا مسکرا دیا، اور دوبارہ بٹن پر انگلی رکھ دی۔

"کون ہے؟" اندر سے مارلین کی دہشت زدہ سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔

میرے لیے وہ بہت دشوار مرحلہ تھا۔ لفٹ کا انتظار کرنے والا مارلین کا سوال سن چکا تھا۔ اگر میں خاموش رہتا تو وہ میری طرف سے مشکوک ہو جاتا اور اگر میں جواب دیتا تو وہ شخص اگلی صبح کے اخبارات میں انطونیو موریلی کے قتل کے سلسلے میں ڈاکٹر بینتھم کا نام پڑھ کر سیدھا پولیس کے پاس پہنچ جاتا۔

ڈاکٹر آسکر بینتھم کے بجائے کوئی اور نام بتانے کی صورت میں مارلین دروازہ نہ کھولتی اور مزید خوفزدہ ہو جاتی۔

"رائے کارڈیلو!" اضطرار کی کیفیت میں میرے منہ سے پہلے ہی اس کا نام نکلا۔

"کس سے ملنا ہے؟" اندر سے مارلین کی جو آواز ابھری اس میں خوف کی کپکپاہٹ نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

سوال و جواب کا یہ سلسلہ دراز ہونے سے قبل ہی لفٹ آ گئی اور وہ شخص اس میں سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں مارلین، دروازہ کھولو۔" میدان صاف پا کر میں نے دروازے کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔

"تم جھوٹے ہو، مجھے دھوکا دے کر دروازہ نہیں کھلوا سکتے۔ یہاں سے جاؤ ورنہ میں برآمدے سے سڑک پر چھلانگ لگا دوں گی۔"

"میں ڈاکٹر ہوں مارلین! تمہارے پڑوسی کی وجہ سے مجھے یہ بولنا پڑ گیا تھا۔" میں نے اس کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر نرم لہجے میں کہا۔ "میری آواز کیوں نہیں پہچانتی ہو، میں تمہاری خاطر عجلت میں یہاں پہنچا ہوں۔"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اس لیے کہ تمہیں کارڈیلو سے خطرہ ہے اور میں نے فون پر تم سے وعدہ کیا تھا۔" میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

میرے آخری فقرے بارآور ثابت ہوئے اور دروازہ کھول دیا گیا۔

مارلین بھورے رنگ کے گاؤن میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑا ہوا تھا اور ورم آلود آنکھوں میں موت کا کرب نمایاں تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کافی دیر تک روتی رہی ہو۔

مجھے پہچان کر اس نے میرے لیے راستہ چھوڑا اور میرے اندر داخل ہوتے ہی اتنی تیزی سے دروازہ بند کیا جیسے اسے کسی اور کے اندر گھس آنے کا خدشہ ہو۔

دروازہ بند ہوتے ہی اندر گہرا اندھیرا پھیل گیا۔

"روشنی کر دو مارلین!" میں نے کہا اور سوئچ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرہ منور ہو گیا۔

"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر۔" وہ ممنونیت سے لبریز لہجے میں بولی۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم کارڈیلو سے پہلے یہاں پہنچ سکو گے۔ تم سے بات ہونے کے بعد نہ جانے باہر کیسا دھماکہ ہوا کہ میرا دل لرز کر رہ گیا۔ نیچے افراتفری اور ایمبولنس کے سائرن کا شور بھی سنائی دیا تھا مگر میں اتنی خوفزدہ تھی کہ برآمدے میں جانے کی ہمت بھی نہ کر سکی۔ مجھے ڈر تھا کہیں اس نے مجھے برآمدے میں لانے کے لیے دھماکہ نہ کیا ہو اور کہیں رائفل سے میرے تاریک برآمدے کا نشانہ باندھے بیٹھا ہو۔"

"کسی موٹر کا انجن پھٹا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شاید کچھ لوگ زخمی بھی ہوتے ہیں۔ اندر کسی ایسے کمرے میں چلو جہاں سے ہماری آواز باہر نہ سنی جا سکے۔"

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو ہے نا؟"

"تم فکر نہ کرو، میری موجودگی میں تم پر آنچ نہ آ سکے گی۔" میں نے ریوالور کی سرد آہنی نال سے مارلین کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم نہ آتے تو میں دہشت ہی سے مر جاتی۔" وہ مجھے نشستگاہ سے خوابگاہ میں لے جاتے ہوئے بولی۔ "اندھیرے میں تو مجھے اپنے سانسوں کی آواز سے بھی خوف آ رہا تھا۔"

خوابگاہ میں پہنچنے کے بعد اس نے اپنی تفصیلی کہانی چھیڑ دی جو زیادہ تر وہی تھی جو میں فون پر سن چکا تھا مگر اس کی تشفی کے لیے میں نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

"تو تم سے الگ ہونے کے بعد سے اس نے اب تک یہاں کا رخ نہیں کیا؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔ وہ ابھی تک لاپتہ ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ قرب و جوار میں کہیں موجود ہو؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "تمہارا فون آنے کے بعد سے میں اندھیرے میں مقفل دروازے کے قریب بیٹھی باہر سنائی دینے والی ہر آہٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ تنہائی اور اندھیرے میں کارڈیلو کے بارے میں سوچ سوچ کر مجھے وحشت ہو رہی تھی۔"

"وہ اس فلیٹ سے واقف ہے؟"

"اس سے پہلے وہ کئی راتیں یہاں گزار چکا ہے۔"

"بڑا خوش نصیب ہے۔"

"میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں ڈاکٹر!" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب سرک آئی۔

"میرا رنگ گندمی ہے۔"

"ہوا کرے۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ "تمہاری شخصیت میں مردانگی اور وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جو کسی بھی لڑکی کو پاگل کر سکتی ہے۔"

میں ہنس دیا۔ "میں شاید آج دوپہر پہلی بار تم سے ملا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اس مختصر سی ملاقات میں تم نے میری مردانگی بھی پرکھ لی اور وجاہت کا اندازہ بھی لگا لیا۔" میں نے اس کے ذہن پر طاری خوف کو کم کرنے کے لیے کہا۔

"وجاہت تو آدمی کے اطوار اور بشرے سے ٹپکتی ہے اور مردانگی کا ثبوت یہی کیا کم ہے کہ تم سرسری شناسائی کے باوجود مجھے بچانے کے لیے یہاں دوڑے آئے۔"

"میرا خیال ہے کہ فرانس میں بھی کسی عورت کے ایک مرد کے بارے میں ایسے شاندار خیالات کا ایک ہی مطلب اخذ کیا جاتا ہے۔"

"اتنا تکلف نہ برتو ڈاکٹر۔" وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ میرے وجود میں جذبات کی پیکار شروع ہو گئی۔ "میری ذات پر تمہیں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے۔"

"فی الحال ہم کارڈیلو کے منتظر ہیں۔" میں نے نرمی سے اسے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دروازے کے علاوہ اس فلیٹ میں داخلے کا امکان کہاں سے ہے؟"

"کہیں سے نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "تو کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ دروازے کے بجائے خفیہ طریقے سے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا؟"

"وہ اول درجے کا مکار اور خبیث ہے۔ اس سے ہر حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈی ریمی کے علاوہ اس کا اور ٹھکانا کہاں ہے؟"

"وہ تفریحات کا رسیا ہے۔ نیس کے سارے ہی رنگین تفریحی مقامات اسے مرغوب ہیں۔" مارلین نے انکشاف کیا۔

"فی الحال اسے بھول کر شکم پری کا کچھ انتظام کرو۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"میرے پاس عمدہ قسم کی سرخ شراب اور اعلیٰ وسکی موجود ہے۔"

"جو چاہو لے آؤ۔"

ہم دونوں نے وسکی کا ایک بڑا پیگ خاموشی سے ختم کیا پھر مارلین کچن میں چلی گئی۔ اور میں فلیٹ کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے ڈی ریمی کے بجائے ایک عارضی پناہ گاہ مل گئی تھی مگر وہ بھی مخدوش تھی۔ کارڈیلو مجھ کو ختم کرنے کی ذاتی کوششوں کے ساتھ ہی مقامی پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا چکا تھا۔ غالباً اسے یہ شبہ بھی ہو گیا تھا کہ مارلین مجھ سے مل چکی ہے لہٰذا اس ضمن میں وہ کسی بھی وقت پولیس کو دو اور دو چار کی بنا پر یہ اطلاع دے کر مارلین کو ہراساں کر سکتا تھا کہ مارلین کی قیام گاہ انطونیو موریلی کے قاتل کی ممکنہ پناہ گاہ ہو سکتی ہے۔

کارڈیلو کی طرف سے اس حرکت کا اندیشہ یوں بھی قوی تھا کہ وہ مارلین کی قیام گاہ کے قریب نہ صرف عبداللہ کی رینالٹ دیکھ چکا تھا، بلکہ ڈائنامیٹ کے ذریعہ ہم دونوں کو ہلاک کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ اس نے محفوظ فاصلے سے یقیناً دیکھا ہو گا کہ اس کے بچھائے ہوئے جال میں اصل شکار کے بجائے ایک بے گناہ مقامی پھنس کر مارا گیا۔

میں نے کچن کا دروازہ بند کر کے کمروں کی روشنیاں یکے بعد دیگرے گل کر دیں اور پھر دروازہ کھول کر کسی چوپائے کی طرح جھک کر برآمدے میں پہنچ گیا تاکہ باہر سے میرا ہیولا نہ دیکھا جا سکے مگر میں برآمدے کی جالی میں سے باہر کا جائزہ لے سکوں۔

رات کی چادر پھیلنے کے ساتھ ساتھ درجۂ حرارت تیزی کے ساتھ گرتا جا رہا تھا جس کے باعث جلی ہوئی رینالٹ کے قرب و جوار میں پھیلا

ہوا ہجوم دوبارہ عمارت میں سمٹ گیا تھا اور اس وقت وہاں پولیس کے تفتیشی عملے کے باوردی اور سادہ پوش اراکین کی بھیڑ مختلف کاموں میں مصروف نظر آ رہی تھی۔ میرے لیے انھیں دیکھنا محض اس وجہ سے ممکن ہوا کہ مختلف زاویوں سے پڑنے والی گشتی گاڑیوں کی ہنگامی روشنیوں نے اس علاقے کو منور کیا ہوا تھا ورنہ کہر کے باعث فٹ پاتھ کی دوسری سمت کا جائزہ لینا بھی ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

میں وہاں مزید وقت ضائع کیے بغیر اندر آ گیا۔

ہوٹل کی صورت حال معلوم کرنے کے لیے میں نے اوڈیل سے سلسلہ ملایا

"وہی ہوا ڈاکٹر! جس کا مجھے اندیشہ تھا۔" میری آواز پہچانتے ہی اس نے گہرا سانس لینے کے بعد تردد آمیز لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"کمرہ نمبر۹ کی کھڑکی کے نیچے والے چھجے پر تمھاری چیخ اور بیہوشی کی کہانی پولیس کے علم میں آ گئی اور اب وہ اس واقعہ کو انطونیو موریلی کے سلسلے کی اہم کڑی قرار دے رہے ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"تو تم نے کیا وضاحت کی؟"

"میں نے انھیں ایک ایسے مسافر کا نام دے دیا جو آج صبح ہی ذی ریمی... چھوڑ کر ٹوکیو کے لیے روانہ ہوا ہے مگر اس کے باوجود ان کی نظروں میں سارا معاملہ مشتبہ ہے۔"

"پوری بات بتاؤ مس اوڈیل۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "پہیلیاں بجھانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت میری سلامتی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

"انھوں نے ہم سے اس ڈاکٹر کے کوائف طلب کیے جسے ہم بیہوش آدمی کو طبی امداد پہنچانے کے لیے طلب کرنے کے پابند تھے مگر ہم نے بتایا کہ اس مسافر کو کوئی طبی امداد نہیں دی گئی۔ اپنے کمرے تک جاتے ہوئے وہ ہوش میں آ گیا تھا اور اس نے خود ہی نہایت شرمندگی کے ساتھ اپنے مرض کا اعتراف کر لیا۔ یہ معلوم ہونے پر اسے فوراً ہوٹل چھوڑنے کے لیے کہا گیا مگر اس نے صبح تک مہلت طلب کی کیونکہ اس وقت وہ ٹوکیو جانے والا تھا لہٰذا اسے مہلت دے دی گئی اور وہ حسبِ وعدہ صبح چلا گیا۔" مس اوڈیل محتاط لہجے میں بتانے لگی۔ "پولیس ہمارے اس اقدام کو مجرمانہ کوتاہی قرار دے رہی ہے۔ قانون کے مطابق ہر ہوٹل کی انتظامیہ اس امر کی پابند ہے کہ مریض مسافروں کو ہنگامی صورتِ حال میں طبی امداد فراہم کرے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاید انطونیو کے کمرے میں اس مسافر کے اور انطونیو کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا ہو اور انطونیو نے اسے بیہوش کر کے باہر پھینک دیا ہو مگر وہ خوش قسمتی سے زمین پر جانے کے بجائے چھجے پر اٹک گیا اور برابر والے کمرے سے ہونے والی دخل اندازی نے انطونیو کو مزید کارروائی سے روک دیا ہو۔ پھر جب بے ہوش آدمی ہوش میں آیا تو اس نے بیماری کی ایک فرضی کہانی تراش لی تاکہ جھگڑے کی پردہ پوشی کر سکے جس کا سبب غیر قانونی رہا ہوگا۔ اگلی صبح اس نے حسبِ معمول ہوٹل تو چھوڑ دیا مگر موقع پا کر خفیہ طریقے سے انطونیو تک پہنچا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اس بارے میں تمیں جواب دہی ... ہو گئی ہے۔"

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ انطونیو کی موت کے وقت کا تعین کر دے گی اور ائیرپورٹ سے اس شخص کی روانگی کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں تو وقت کے کا تعین ... ائیرپورٹ سے اس شخص کی روانگی کی تصدیق کر چکے ہیں اور وہ فوری طور پر ٹوکیو میں حکام بالا کو باخبر کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہاں تفتیش مکمل ہونے تک اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جا سکے۔ اس سب بیچارے ... فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ ہم لوگ اس کا نام کہاں استعمال کر بیٹھے ہیں۔ اس سے رابطہ قائم کیا گیا یا اسے یہاں لایا گیا تو وہ نہ صرف پوری کہانی ... دے گا بلکہ کمرہ نمبر۹ والے اور دیگر مسافر بھی پولیس کو بتائیں گے کہ چھجے پر بے ہوش پایا جانے والا شخص وہ نہیں کوئی اور تھا۔"

"میرے بارے میں کیا کارروائی کی گئی ہے؟" میں نے چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد سوال کیا۔

"ہم نے تمھارے نام سے لاعلمی ظاہر کی۔ کمرہ نمبر۹۹ کئی دن سے خالی پڑا ہے۔ ریکارڈ سے بھی انھیں کچھ نہ مل سکا کیونکہ تم نے ذی ریمی آنے پر پہلے روز رجسٹر پر جو اندراج کرایا تھا وہ چارلس کی ہدایت پر اس طرح مٹا دیا گیا تھا کہ اسے پڑھنا ناممکن ہے۔"

"مارلین شاید کل ڈیوٹی پر نہ آ سکے گی۔" اتنی معلومات مل جانے کے بعد میں نے فوری فیصلے کے تحت اسے اطلاع دی۔

"تو کیا وہ بھی تمھارے ساتھ لگی ہوئی ہے؟" مس اوڈیل کی آواز میں تحیر تھا۔

"حالات نے اسے میرے راستے پر لا ڈالا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں فی الحال اسی کے فلیٹ پر ہوں۔ یہ اطلاع تم چارلس اور......!"

"عبداللہ کے سوا کسی کو نہیں دو گی۔" اس نے میرا فقرہ مکمل کیا۔

"مگر میں احتیاطاً یہ بتائے دیتی ہوں کہ مارلین قابلِ اعتماد لڑکی نہیں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ تم چارلس کے مہمان ہو اس لیے شاید چھوٹا لالچ اسے آمادہ نہ کر سکے مگر بڑی رقم کے لیے وہ تمھارا سودا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ یہ بات ذہن میں رکھنا۔"

"مشورے کا شکریہ۔ میرے لیے اگر کوئی اہم اطلاع ہو تو تم مارلین کے نمبر پر رابطہ قائم کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"مگر مارلین کل صبح ڈیوٹی پر کیوں نہیں آ سکے گی؟"

"ہو سکتا ہے کہ آج کی رات پوری نیند میسر نہ آ سکے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس کے علاوہ میں مارلین کو تنہا باہر بھیج کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔"

میرا آخری فقرہ ذومعنی تھا۔ اوڈیل یہ سمجھی کہ میں مارلین کو اپنے دشمن سے رابطہ قائم کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا اور مارلین نے اگر کچن میں میری آواز سنی ہوگی تو وہ یہی سمجھی ہوگی کہ میں اسے باہر بھیج کر اس کی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

اوڈیل سے گفتگو ختم کر کے میں گھوما تو مارلین ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑی ممنون نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ایسے ہوشربا انداز میں کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟"

"تم میرے لیے بڑی تقویت کا باعث ثابت ہوئے ہو ڈاکٹر!" وہ اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے بولی۔ "ورنہ تھوڑی دیر قبل میں اس پُرسکون صورت حال کو محض موہوم سا خواب سمجھ رہی تھی جو تمھاری وجہ سے اس وقت برقرار ہے۔"

"اس خوشی میں گلاس دوبارہ لبریز کر لو۔ تھوڑا سا سرور طاری ہو تو آدمی بہت زیادہ دلیر اور بے باک ہو جاتا ہے۔"

"شاید تم اوڈیل سے بات کر رہے تھے؟"

"تو تمھارے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے؟"

"تم نے...... کل کی چھٹی دلا کر مجھے اُلجھن سے نجات دلا دی ہے۔"

"میں سنجیدگی سے اکتا گیا ہوں اور میرے کان تمھاری بہکی ہوئی دلآویز گفتگو کے منتظر ہیں۔" میں نے تپائی پر رکھی ہوئی وھسکی کی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں زیادہ پینے کی عادی نہیں ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "شاید یہ گلاس خالی کرنے کے بعد مجھے حدود کا خیال بھی نہ رہے۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

مارلین نے دونوں گلاس تیار کیے۔ میں نے مارلین کی صحت کا جام تجویز کیا۔ فضا میں بلور کے بلور سے ٹکرانے کی دھیمی سی جھنکار گونجی اور پھر آتشیں سیال لبوں کو تر کرتا آہستہ آہستہ معدے میں اترنے لگا۔

"اگر اس وقت کارویو آ جائے تو؟" مارلین نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں خمار کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور آنکھوں کی پتلیاں قدرے سکڑ گئی تھیں۔

"تو اپنے مقدر کو کوسے گا۔" میں نے دلچسپی سے اس کی حرکات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں اس کا ذہن عالمِ رنگ و بُو کی لطیف اور نرم دلدل میں ڈوب جائے گا۔

"وہ بہت کمینہ ہے۔" مارلین صوفے کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر بولی۔

"کس کی بات کر رہی ہو؟"

"اس وقت تمھارے سوا کس کی بات کر سکتی ہوں۔" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور وہ بار بار آنکھیں پھاڑ کر اپنی دھندلاتی ہوئی بصارت کو صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آؤ، کچھ کھا لیا جائے۔" میں نے بائیں ہاتھ میں وھسکی کی بوتل تھامی اور داہنے ہاتھ سے سہارا دے کر اسے اٹھا لیا۔

اس نے لڑھکتے ہوئے اپنے گداز سراپا کا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کے بدن سے پھوٹتی ہوئی بھینی بھینی مہکار میرے حواس پر چھانے لگی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے وقت گزاری کے لیے جس تفریح کا سہارا لیا تھا وہ مجھے مہنگی پڑنے والی تھی۔

کچن میں ٹیبل پر کھانے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں اسے لیے کرسی پر بیٹھ گیا۔ گائے کے گوشت کے تلے ہوئے نمکین پارچوں کی لذت کو دوبالا کرنے کے لیے میں نے اپنا پیمانہ لبریز کر لیا۔

"میرا گلاس بھی بھر دو۔" مارلین نے میرے شانے پر سر ٹکا کر کہا۔

"تمھارا کوٹہ پورا ہو چکا ہے بے بی!"

"مجھے آج وھسکی کے بیرل میں بھی غرق کر دو تو میرا کوٹہ پورا نہ ہوگا۔" وہ آنکھیں موند کر لذت آمیز لہجے میں گنگنائی۔ "مجھے اس وقت تھوڑا سا ہوش ہے، میں سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے بھرے ہوئے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو غلط اندازے کی بنا پر سلاد کی پلیٹ پر پڑا اور مارلین نے مٹھی میں ٹماٹر دبا لیے۔

"اب تمھیں ایک بوند بھی نہیں ملے گی۔"

"مجھے معلوم تھا۔" وہ ملامت آمیز لہجے میں بولی۔ "تم بھی کارویو سے ملے ہوئے ہو۔"

"تم رقص کر سکتی ہو؟" میں نے اس کی ذہنی رو کارویو کی طرف سے ہٹانے کے لیے کہا۔

"رقص!" وہ زور سے ہنس دی۔ "پہلے اس کمرے کو تو اس کی جگہ پر رہنے دو، یہ کیوں پینڈولم کی طرح جھول رہا ہے؟"

میں کافی دیر وہیں بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بے سروپا جوابات میں مجھے عجیب سی معصومیت محسوس ہو رہی تھی۔ شراب پینے کے بعد مارلین ذہنی طور پر دس بارہ برس کی بچی کی طرح باتیں کر رہی تھی۔

گیارہ بجے میں اسے خواب گاہ میں لے گیا۔ اس کی آنکھیں بار بار بند ہوئی جا رہی تھیں مگر اس کے باوجود وہ سونے پر آمادہ نہیں تھی۔

بارہ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اس وقت مارلین بستر پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔

میں نے فون اٹھایا تو فوراً ہی عبداللہ کی آواز سنائی دی۔

"تم کہاں ہو ڈارلنگ!" میں نے مسخر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکی تمھارے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔ تم وہاں کب اور کیسے پہنچے؟" اس کے لہجے سے فکرمندی عیاں تھی۔

"یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ ہم لوگ ایک ہولناک حادثے سے بال بال بچے ہیں۔"

"مجھے زبردست چوٹ ہوئی ہے۔ میں تمہارے پاس آرہا ہوں" وہ جلدی سے بولا۔

"اس وقت کہاں ہو؟"

"اپنے فلیٹ پر۔"

"تو کیا تم بھی کسی فلیٹ میں رہتے ہو؟"

"پیرس میں ذاتی مکان رکھنا بہت بڑی عیاشی ہے۔ تم لڑکی کو تیار کرلو۔ تمہیں میرے ساتھ آنا ہے۔ کہیں وہ تمہارے قدموں کی زنجیر نہ بن جائے۔"

"وہ تین ڈبل پیگ وسکی چڑھا کر بے سدھ سو رہی ہے مگر تم مجھے کیوں لے جانا چاہتے ہو؟"

"وہ جگہ مخدوش ہے۔ مجھے اوڈیل سے ساری معلومات مل چکی ہیں۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ اب بھی آس پاس ہی منڈلا رہا ہو۔"

"مشکل ہے۔" وہ یقینی لہجے میں بولا۔ "میں نے اسے دیکھ لیا تھا مگر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ ملنے پر میں زبانی پوری تفصیل بتاؤں گا۔"

"تو پھر جلدی آجاؤ۔"

فون کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد عبداللہ خلافِ توقع جلد ہی آپہنچا۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے سیدھا خوابگاہ میں لے گیا۔

سیمیں بدن مارلین کو بے حجابی کے عالم میں محوِ خواب دیکھ کر وہ اس طرح بوکھلا کر واپس بھاگا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

"کیا ہوگیا؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"میرے ساتھ آئندہ ایسا مذاق نہ کرنا۔ میں نے اپنا نفس مارنے کے لیے بڑی ریاضت کی ہے مگر مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں۔ اگر ایک بار بھی میں بہک گیا تو پھر سدھرنا مشکل ہے اور میں تنظیم کیلئے ناکارہ ہوکر رہ جاؤں گا۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے رینالٹ کیسے برباد ہوگئی؟"

"یہاں سے نکلو راستے میں بات کریں گے۔"

"اب کیسے آئے ہو؟"

"ایک کار کرائے پر لی ہوئی ہے۔"

مارلین کو سوتا چھوڑ کر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ فلیٹ کے دروازے کا ہضمی قفل ایسا تھا کہ ایک بٹن دبا کر دروازہ بند کرنے پر وہ خود بخود مقفل ہوگیا۔ اس طرح مارلین بلا روک ٹوک کارڈیلو کا نشانہ بننے سے بچ گئی۔

راستے میں عبداللہ نے اپنی کہانی چھیڑ دی۔

مجھ سے الگ ہونے کے بعد وہ مارلین والی عمارت کے قریب ایک مناسب جگہ پر کھڑا ہوکر نگرانی میں مصروف تھا کہ کچھ دیر بعد خوفناک دھماکے نے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ غیر ارادی طور پر جائے حادثہ کی طرف لپکا تو اسے رینالٹ جلتی ہوئی نظر آئی۔ اس وقت تک دھماکے کے باعث ڈرائیونگ سیٹ پر پھنسا ہوا شخص مر تو چکا تھا مگر اس کے خدوخال مسخ نہیں ہوئے تھے۔

عبداللہ کو کار کی بربادی کے بارے میں کوئی اندازہ نہ ہوسکا البتہ یہ ضرور پتہ چل گیا کہ مرنے والا رینالٹ کو ہٹانے کی نیت سے اس میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر فوراً ہی ایک دھماکے سے رینالٹ کے ٹکڑے اڑ گئے اور اس کے ڈھانچے نے آگ پکڑ لی۔

لاش دیکھ کر عبداللہ کو میری سلامتی کا یقین تو ہوگیا مگر اس نے اتنا اندازہ لگا لیا کہ رینالٹ کی تباہی اتفاقی نہیں تھی بلکہ کارڈیلو کی مکارانہ چال کا نتیجہ تھی۔

اسے خیال ہوا کہ کارڈیلو نے اسے دھماکے میں الجھا کر عمارت کی نگرانی سے ہٹانے کی کوشش کی تھی تاکہ خود مارلین تک پہنچ سکے۔ یہ خیال آتے ہی وہ تیزی سے عمارت کی طرف لوٹ آیا۔

چند منٹ تک وہاں رہنے کے بعد عبداللہ کو رینالٹ میں پھنسی ہوئی لاش کے باعث اپنا نظریہ غلط محسوس ہوا اور وہ ایک مرتبہ پھر سلگتے ہوئے ڈھانچے کی طرف چل دیا۔

اس بار وہ بہت چوکنا تھا لہٰذا جلد ہی مجمع میں کارڈیلو کو دیکھنے میں کامیاب ہوگیا جو اوورکوٹ کے کالر اور ہیٹ میں اپنے چہرے کا بڑی حد تک چھپائے تماشائیوں میں شامل تھا۔ عبداللہ اس کی طرف لپکا مگر عین موقع پر کارڈیلو نے بھی اسے دیکھ لیا اور ایک طرف بھاگ نکلا۔ وہ دونوں متحیر تماشائیوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے دور تک بھاگتے رہے۔ اس دوران میں کارڈیلو کافی دور نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ عبداللہ کی ناکامی میں کہرنے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا کیونکہ کارڈیلو نے پچاس ساٹھ فٹ کے بعد فٹ پاتھ بدل لی اور جب عبداللہ آگے پہنچا تو کارڈیلو مخالف سمت میں اپنی کار میں سوار ہوچکا تھا۔

اس نے عبداللہ پر دو فائر کیے جو خوش قسمتی سے خطا ہوگئے اور پھر وہ وہاں سے فرار ہوگیا۔ فائر بے آواز پستول سے کیے گئے تھے اور پھر سب لوگ سمٹ کر رینالٹ کے گرد جمع ہوچکے تھے لہٰذا اس ہنگامے پر کسی نے توجہ نہیں دی اور عبداللہ نامراد واپس لوٹ آیا۔

واپسی پر عبداللہ نے کافی دیر تک مجمع میں مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر ڈی ریمی کی طرف چل دیا۔

وہاں پولیس کی کارروائی اپنے عروج پر تھی۔ پولیس سے چھٹکارا پانے کے بعد اوڈیل نے موقع پاکر اسے میرے بارے میں بتا دیا اور وہ فون کرنے کے بعد سیدھا مارلین کی طرف دوڑ آیا۔

"کارڈیلو ہمارے لیے سنگین خطرہ بن چکا ہے۔" عبداللہ کی بات ختم ہونے پر میں نے کہا۔ "وہ بہت زیادہ گھاگ اور پھرتیلا ہے۔"

"اس کے مقابلے میں ابھی تک ہم دفاعی حکمت عملی پر گامزن ہیں لہٰذا ہمیں کھل کر اس کے سامنے آنا پڑے گا ورنہ وہ کسی بھی موقع پر اپنا وار کر جائے گا۔"

"اس کی قوتِ فیصلہ بہت تیز ہے عبداللہ! وہ انطونیو موریلی کے سلسلے میں پولیس کو میری راہ پر ڈال چکا ہے لہٰذا میں کھل کر سامنے نہیں آسکتا۔ ہاں اگر اس کی قیام گاہ کا سراغ مل جائے تو ہم اس کا انتظار کرنے کے بجائے اس پر کوئی کاری ضرب لگا سکتے ہیں۔"

"میں محض اس وجہ سے تمہیں اپنے فلیٹ پر لے جارہا ہوں کہ مارلین کی رہائش گاہ اس کی نظروں میں آچکی ہے اور وہ مردود پہلی فرصت میں ادھر کا ہی رخ کرے گا۔"

عبداللہ کے فلیٹ پر پہنچنے تک تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری رہا۔ اس بات پر ہم دونوں ہی متفق تھے کہ کارڈیلو ہمارے خاتمے کیلئے یکے بعد دیگرے نہایت سرعت کے ساتھ اقدامات کیے جارہا تھا اور ہمیں بچاؤ کے علاوہ کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اس کی رسائی سے دور رہ کر اپنا مربوط منصوبہ مرتب کرکے اس کے مقابلے میں جاتے۔

رات کافی گزر چکی تھی اور عبداللہ کے فلیٹ میں سردی کا مقابلہ کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا جو ہم کمرہ گرم کرکے سکون سے گفتگو جاری رکھتے لہٰذا ہم نے فوراً ہی بستر سنبھال لیے۔

اگلی صبح میں خاصی تاخیر سے بیدار ہوا۔ عبداللہ میرے قریب صوفے پر دراز اخبار بینی میں مصروف تھا اور تپائی پر ٹی کوزی میں چھپی ہوئی چائے کی کیتلی موجود تھی۔

میری آہٹ سن کر اس نے اخبار دور اچھال دیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "تم بیڈ ٹی کے عادی تو نہیں ہو؟"

"عادتیں صرف بیوی ہی برداشت کرسکتی ہے، یہ دوست تو کیا کسی کے بھی بس کا روگ نہیں ہے۔" میں نے گاؤن شانوں پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "تیار ہے تو بنادو۔"

"کارڈیلو کی کمینگی نے خاصا رنگ دکھایا ہے۔" وہ چائے بناتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا؟"

"اخبار میں ڈاکٹر آسکر بینیتھم کے بارے میں خاصی سنسنی خیز خبریں دی گئی ہیں۔ پولیس کے اعلیٰ حکام کا خیال ہے کہ پیرس میں مجرموں کے دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلے میں آگئے ہیں اور آنے والے چند روز شاید حکام کے لیے خاصے دشوار ثابت ہوں گے۔"

"اس کی وجہ؟"

"انطونیو کا قتل اور پھر تمہارے بارے میں گمنام فون۔"

"مگر ڈی ریمی سے تو میرے بارے میں کوئی بھی سراغ نہ مل سکا ہوگا۔"

"ہوٹل کے عملے نے بتایا ہے کہ جو شخص انطونیو کی کھڑکی کے نیچے بے ہوش ملا اس کا نام ایرک پیٹرسن تھا جو اگلی صبح ٹوکیو روانہ ہوگیا۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ آسکر بینیتھم کا دوسرا روپ تھا۔ اخباری نامہ نگار نے رینالٹ کے حادثے کو بھی پراسرار قرار دیا ہے اور شبہ ظاہر کیا ہے کہ وہ حادثہ بھی مجرموں کے تصادم کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔"

"خاصا ذہین آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ اس کے تجزیئے کی بنیاد یہ ہے کہ حادثے کے بعد رینالٹ کا مالک سامنے نہیں آیا اور پولیس کو جائے حادثہ سے ڈائنامیٹ کے کچھ ٹکڑے بھی ملے ہیں۔"

"یہ تو ذرا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ رینالٹ کے سہارے وہ بآسانی تم تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"نمبر پلیٹ پر اگر ابھرے ہوئے حروف نہ ہوں تو اچھا ہوتا ہے۔ نمبر پلیٹ جلنے کی وجہ سے معاملہ طول پکڑے گا۔ انجن کے نمبر کے سہارے موجودہ مالک کا سراغ لگنے میں ایک دو دن صرف ہوجائیں گے اور اس وقت تک ہم پیرس میں ہوں گے۔"

"ایسا نہ ہو کہ کارڈیلو پھر کوئی گمنام فون کرکے رینالٹ کے مالک کے طور پر تمہارا نام ظاہر کردے۔" میں نے چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔

"اس بار بڑے مکار دشمن سے واسطہ پڑا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں اس سے دو بار ٹکرایا ضرور ہوں مگر شاید ابھی تک اسے میرے نام کا علم نہیں ہوا ہوگا۔"

"دل کو بہلانے کے لیے اچھا خیال ہے۔" میں نے کہا۔

میں ناشتے میں مصروف تھا تو عبداللہ میرے لیے پیرس سے شائع ہونے والا ایک انگریزی اخبار لے آیا۔ "تم اخبار پڑھو، میں ذرا شہر کا چکر لگاتا ہوں۔"

"آج تو چارلس بھی آنے والا ہے۔"

"اس کی آمد بہت ضروری ہے۔ اس سے سارے ہی پولیس افسران گھبراتے ہیں کیونکہ وہ ان کی کمزوریوں سے واقف ہے۔"

"ایرک کے بارے میں کیا قدم اٹھایا گیا ہے؟"

"انٹرپول کو ابھی تک اطلاع نہیں دی گئی ہے ہوسکتا ہے کہ چارلس تفتیش کا رخ موڑنے میں نمایاں کامیابی حاصل کرلے۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا۔

میں نے دوپہر تک اپنا وقت بڑی مشکل سے گزارا۔ اس دوران میں نے کئی بار بلاوجہ فون پر... کچھ نمبر ملائے مگر دوسری جانب سے کوئی خوش مزاج آواز نہ سنائی دی جس سے باتیں کرکے میں وقت گزار سکتا لہٰذا میں نے ہر بار کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کردیا۔

پھر مجھے مارلین کا خیال آیا۔

ہوش میں آنے یا بیدار ہونے پر خود کو تنہا پاکر اس کو یقیناً شدید

حیرت ہوئی ہوگی۔ میں اس کا ازالہ کرنے کے ساتھ ہی اس سے کارویلو کے بارے میں دریافت کر سکتا تھا۔

"تم کہاں ہو ڈاکٹر؟" میری آواز پہچانتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ "تم فلیٹ سے کب گئے؟"

"تمہارے سونے کے بعد چہل قدمی کے لیے نکلا تھا پھر راستہ بھٹک گیا۔"

"چہل قدمی؟" وہ حیرت سے تقریباً چیخ پڑی۔ "اتنی سردی میں تمہیں چہل قدمی کی کیا سوجھی تھی اور تم نے رات کہاں بسر کی؟"

"میں نے کئی بار تمہیں فون بھی کیا مگر جواب نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر ایک دکان کی سیڑھیوں پر رات گزار دی۔"

"اوہ۔ یہ بہت برا ہوا ڈارلنگ! میں رات کو کچھ زیادہ ہی پی گئی تھی۔ مجھے فون کا بالکل ہوش نہیں تھا اور اب بھی میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں ایک پبلک بوتھ سے بول رہا ہوں۔"

"تم مجھے بوتھ نمبر بتاؤ، میں ابھی پہنچتی ہوں۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک اہم چیز ہے۔"

"باہر تمہیں خطرہ پیش آ سکتا ہے مارلین۔ رات والی صورت حال بدستور برقرار ہے۔ باہر نکلنے کی حماقت نہ کرنا، کیا چیز ہے تمہارے پاس؟"

"تھوڑی دیر پہلے مقامی ڈاک میں تمہارے نام ایک خط میرے پتہ پر آیا ہے۔"

"کیا؟" میں نے بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

"ہاں اس پر صرف ڈاکٹر آسکر لکھا ہوا ہے۔ خوبصورت اور بڑا لفافہ ہے۔ اس پر بھیجنے والے کا نام پتہ نہیں ہے۔"

"یہ اسی مردود کی حرکت معلوم ہوتی ہے، کوئی دھمکی روانہ کی ہوگی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے تو تم آ رہے ہو نا؟"

"فی الحال میرا آنا مشکل ہے، تم خط کھول کر اس کا متن مجھے سنا دو۔"

وہ مجھے بلانے کے لیے مصر تھی مگر میں بروقت اسے ٹالنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ مجھے ہولڈ آن کرانے کے بعد لفافہ کھولنے لگی۔

اس نے ریسیور شاید میز پر رکھ دیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ریسیور میں ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ اسی کے ساتھ پے در پے نسوانی چیخیں سنائی دیں۔

میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ کاروبلو کے مقابلے میں یہ اپنی نوعیت کا دوسرا روح فرسا تجربہ تھا۔ ایک مرتبہ فلورا مجھے فون پر خطرے سے ہوشیار کرنے کی کوشش میں کاروبلو کی گولی کا نشانہ بنی تھی اور اب مارلین کے ساتھ کوئی مہلک حادثہ پیش آ گیا تھا۔

ریسیور پر مارلین کی ایسی چیخیں سنائی دے رہی تھیں جیسے اس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی ہو۔

"میں مر گئی ڈاکٹر۔" چند منٹ بعد ریسیور پر مارلین کی کربناک آواز سنائی دی۔ "میں مر جاؤں گی۔ اس لفافے میں ... لفافہ کھولتے ہی پھٹ گیا۔ میرا چہرہ اور ہاتھ بری طرح جھلس ... لوگ میرا دروازہ پیٹ رہے ہیں۔ خدا کے لیے تم بھی آ جاؤ۔"

"تم فون بند کر دو، میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔" ... جلدی سے کہا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سن کر میں نے ... ریسیور رکھ دیا اور اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرنے لگا۔

خطوط اور پارسلوں میں پوشیدہ بموں کے بارے میں ... خبریں پڑھتا رہتا تھا مگر میرے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔

اس بار بھی قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے مجھے دردناک ... سے بال بال بچا لیا تھا۔ اگر رات میں عبداللہ مجھے مارلین کے ... نہ لاتا تو میں ڈاک سے موصول ہونے والا وہ خط خود ہی کھولتا ... طرح زخمی ہو جاتا۔

کاروبلو مجھ پر ہر طرف سے شدید ترین دباؤ ڈال رہا تھا ... کے تعاقب کے نتیجے میں فرار ہونے کے بعد اس نے شاید رات ہی ... سپرد ڈاک کر دیا تھا جو وہ اتنی جلدی مارلین کو اپنے پتے پر موصول ...

کاروبلو اس تیز اور خون آشام معرکے میں کوئی بھی پہلو نظر انداز ... کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ مارنے سے پہلے مجھے ہراساں کر دے۔

اگر میں اس لیٹر بم کا شکار ہو جاتا تو لازمی طور پر مجھے طبی امداد کے لیے ہسپتال بھیج دینا پڑتا اور بستر پر پڑے ہوئے زخمی حریف سے آسان نشانہ ملنا مشکل تھا۔

کاروبلو آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے امید تھی کہ مارلین دروازہ کھول کر اپنے پڑوسیوں کو اندر بلا لے گی یا وہ دروازہ توڑ کر خود ہی اندر گھس جائیں گے اور مارلین طبی امداد سے محروم نہیں رہے گی۔ میرا اس کے فلیٹ کا رخ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں نے اس سے محض اس لیے جھوٹا وعدہ کر لیا تھا تاکہ وہ ... بغیر فون کا سلسلہ منقطع کر دے اور اندر آنے والوں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ... ہونے کے وقت وہ فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھی۔

میں خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی نے ... چونکا دیا۔

میں نے ریسیور اٹھا کر خاموشی سے کان سے لگا لیا۔

"ہیلو!" کسی کی آواز سنائی دی جو میں نہ پہچان سکا ... ہی رہا۔

"بولتے کیوں نہیں؟" چند ثانیوں کے بعد وہی آواز دوبارہ ...

... پہچان لیا۔ بولنے والا عبداللہ تھا۔

"تم کہاں ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"... ڈی ہی میں ہوں۔ چارلس آ گیا ہے اور میں تم سے ایک بات ... چاہتا ہوں۔" عبداللہ اچھے موڈ میں معلوم ہو رہا تھا۔

"کیسی اجازت؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تمہارے نام ایک خط آیا ..."

"اسے پھینک دو۔" خط کا نام آتے ہی میں اضطراری انداز میں ...

"وہ لیٹر بم ہے۔ اس کے دھوکے میں نہ آنا۔"

"کیا واقعی؟" میرے انکشاف نے عبداللہ کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

"وہ سراسر فریب ہے۔ کاروبلو خاموش نہیں ہوا ہے۔ ایسا ہی ... کے پتے پر بھی پہنچا تھا اور وہ خط کھولتے ہوئے بری طرح جھلس ... گئی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے اسے فون کیا تھا۔ وہ خط کے لیے مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے اسے خط کھول کر متن سنانے کو کہا تو اس کی چیخیں سنائی دیں۔"

"وہ خط اسے دستی موصول ہوا تھا یا ڈاک سے؟"

"ڈاک سے آیا تھا۔"

"مجھے خود حیرت تھی کہ نیس میں تمہیں خط بھیجنے والا کون ہو سکتا ... یہ خط اسی شہر کے کسی علاقے سے پوسٹ کیا گیا ہے۔ میں تم سے ... لے کر اسے کھولنے کے چکر میں تھا۔"

"مجھے اب وحشت ہو رہی ہے۔ تم کتنی دیر میں آ رہے ہو؟" میں ... دریافت کیا۔ "میں باہر کھلی فضا میں نکلنا چاہتا ہوں۔"

"چارلس فارغ ہو جائے تو اسے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ کاروبلو ... معاملے میں وہ خود بھی بہت مشتعل ہے کیونکہ اس نے ڈی ریلی کی شہرت ... نقصان پہنچایا ہے۔"

"اگر تم نے زیادہ دیر لگائی تو میں تنہا باہر نکل جاؤں گا۔"

"ایسی حماقت نہ کرنا۔ اس وقت ہمیں چارلس کے مشورے کی ضرورت ... یونانی شہزادی کنز سے اس کے ساتھ آئی ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر پہلے ... نمٹنا چاہتا ہے۔ اگر ہم نے اسے نظر انداز کیا تو اسے دلی اذیت ...

"کاروبلو کو کافی وقت مل گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ تنہا نہیں ... اس نے اپنی مدد کے لیے مزید آدمی بلا لیے ہوں گے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ اب وہ نیس سے زندہ نہ لوٹ سکے گا۔"

"تم جلدی آنے کی کوشش کرو میں تمہارا منتظر ہوں۔"

... سے نئی نئی خبریں چلی آ رہی تھیں۔ کاروبلو بے پناہ ذہنی اور ... صلاحیتوں کا مالک معلوم ہوتا تھا اور بدترین صورت حال سے ... ہونے کے باوجود وہ نپے تلے اقدامات کر رہا تھا جن کی ناکامی میں میری یا عبداللہ کی صلاحیتوں سے زیادہ ہمارے ستاروں کا دخل تھا۔

فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ میری ذہنی رو اپنی سیتا کی طرف بھٹک گئی۔ میری خون آشام اور روح فرسا کہانی کا آغاز بہت معمولی انداز میں ہوا تھا۔

کراچی میں جوئے میں اپنا سب کچھ ہار جانے کے بعد جب میں پولیس سے بچنے کے لیے فرار کی راہ اختیار کر رہا تھا تو کلفٹن کے پل سے پہلے والے نیم تاریک چوراہے پر میری کرسچین سیکرٹری سوزی نے مجھے آبدیدہ نظروں سے الوداع کہا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حالات کی لہریں مجھے کراچی تو در کنار اپنے ملک سے دھکیلتی سمندر پار لے جائیں گی۔

قانون سے روپوشی کے دوران میں میں کیمیاگری کے خبط کا شکار ہوا اور پھر پارس کی تلاش میں بے پناہ مصائب جھیلتا ہوا مشرقی پاکستان اور بھارت کے راستے نیپال پہنچا جہاں ہمالیہ کی فلک بوس اور برف پوش پہاڑیوں میں زندگی اور موت کی ہولناک جنگ لڑتے ہوئے نہ صرف پارس پتھر پانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ انسانوں اور جدید تہذیب سے دور پہاڑی ویرانوں میں بندروں اور لنگوروں پر راج کرنے والی سیتا کا شوہر بھی بن گیا جو اپنی ماں کی آغوش میں برہنہ تن پروان چڑھی تھی۔

پھر واپسی کے سفر میں مجھ سے پارس چھیننے کی کوششیں کی گئیں مگر میں قانون کے خون آشام رکھوالوں سے لڑتا بھڑتا انبالہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے میرے وطن کی محبت بھری سرزمین مختصر سے فاصلے پر تھی۔

مگر اس آخری موڑ پر میری سیتا مجھ سے روٹھ گئی۔ میرے چند چبھتے ہوئے فقروں نے اس خوددار لڑکی کے وجود میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی اور وہ اپنی کوششوں کے بل پر سرحد پار کرنے کا عزم کر کے خاموشی سے فرار ہو گئی۔

سیتا کا فرار مجھے راس نہ آ سکا۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے پارس پتھر ... انبالہ کے راجہ ہوٹل کی ایک الماری میں چھپا دینا پڑا اور میں در بدر بھٹکتا ویرانوں، سمندروں، جزیروں اور ریگزاروں کی خاک چھانتا سمندر کی سرکش موجوں پر بہنے والے حقیر تنکے کی طرح اپنے وطن سے ہزاروں میل دور فرانس آ پہنچا تھا جہاں میرے لہو کے پیاسے میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

پارس جو اپنے دور کی ایک انقلاب آفریں دریافت تھی میری دسترس سے بہت دور تھا۔ افسانوں اور کہانیوں میں پایا جانے والا وہ نایاب پتھر جس کے لمس سے لوہا سونے میں بدل جاتا تھا، ایک مرتبہ پھر خواب بن کر رہ گیا تھا۔

دوسری طرف سیتا کے بارے میں کسی بھی لمحے خبر آ سکتی تھی۔ بحیرۂ روم کے اس پار بن غازی میں اس جرأت مند لڑکی کے استقبال کی تمام

تیاریاں مکمل تھیں اور وہ پاکستان سے کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتی تھی۔

میں نے یہ فیصلہ کر کے بہت بڑی جذباتی قربانی دی تھی کہ سیتا اگر بن غازی پہنچنے والی ہے تو بھی میں اس کا انتظار کیے بغیر پیرس روانگی کے لیے آمادہ تھا تاکہ اسرائیلی فرعون بن حیان کو اپنے جیسے انسانوں کی سفاکانہ تحقیر اور تذلیل کا عبرتناک مزا چکھا سکوں مگر کارویلو نیس میں اچانک وارد ہوا اور اس نے میرے لیے اتنی تیزی سے ایک عفریت کی حیثیت اختیار کرلی کہ اس وقت میں بن حیان اور سیتا کو بھول کر عبداللہ کے فلیٹ میں محصور بیٹھا تھا۔

اس وقت تنہائی میرے لیے عذاب سے کم نہیں تھی۔ میرے ذہن پر خیالات نے ہولناک انداز میں یلغار کی ہوئی تھی۔ میں اپنی دانست میں انتہائی سنگدل، سفاک اور سرد مزاج انسان تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ میں اپنے دشمنوں کو بے رحمی سے نیست و نابود کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا مگر اس وقت اپنے ماضی کے بارے میں سوچ کر میرا دل ڈھول ڈھول ہو رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں کسی مانوس پیکر یا دیکھی بھالی شے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رووں۔

میں بنیادی طور پر ایک انسان تھا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے کبھی مجھے اتنی مہلت نہیں دی کہ میں اپنے ماضی کے جذبات انگیز پہلوؤں پر غور کرتا مگر کارویلو نے جس انداز میں مجھے مفلوج کیا تھا ان حالات سے دوچار ہونے کے بعد میرے لیے اپنے پُرشوکت ماضی کو یاد کرنا ناگزیر تھا۔

ایش ٹرے میں رکھی ہوئی سگریٹ سلگ سلگ کر راکھ میں بدلتی رہی اور میں دھوئیں کے مرغولوں میں شناسا خدوخال ڈھونڈتا رہا۔

پھر اچانک ڈور بیل بجی اور میں اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

میری پیش قدمی سے پہلے ہی تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھل گیا اور عبداللہ کے ساتھ چارلس بک ہارٹ اندر گھس آیا۔

میں نے دل گرفتہ انداز میں ان دونوں کا استقبال کیا۔ چارلس بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے گلے ملا اور پھر میرے سرد جوابی رویے پر چونک پڑا۔

"تمھیں کیا ہوگیا ہے ڈاکٹر؟"

میں کچھ کہے بغیر ہونٹ بھینچے اسے گھورتا رہا۔

"تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم بیمار ہو۔" عبداللہ نے آگے بڑھ کر میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"شاید سر میں آنے والی چوٹ کا اثر ہے۔" چارلس بک ہارٹ نے میری ورم آلود پیشانی اور سر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی تکلیف کا احساس نہ دلاؤ چارلس۔" میں پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ دھیمے سے بولا۔ "اس وقت میں خود کو ایک ایسا انسان محسوس کر رہا ہوں جس کا وجود اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نادانستگی سے ایک ایسی دوڑ میں شامل ہوگیا ہوں جس میں ... والے اپنے ساتھیوں کے قدموں تلے روندے جاتے ہیں اور ... رہیں تو یہ مقابلہ ساری عمر ختم نہیں ہوتا۔"

"بیٹھ جاؤ۔" چارلس سختی سے میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ "تم ... کہہ رہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی جذباتی صدمے سے دوچار ہوئے ہو۔"

"یہ شخص ہمیشہ سے جیت کا عادی ہے۔ شاید کارویلو ... نے اسے پریشان کر دیا ہے۔" عبداللہ نے تبصرہ کیا۔

"میں نے دشمن کی قید میں بدترین صعوبتیں بھی اٹھائی ہیں۔ عبداللہ! کارویلو کا طعنہ نہ دو۔ اگر بازی اس کے ہاتھ میں رہی تو وہ ... یاد رکھے گا کہ کسی بےجگر دشمن سے واسطہ پڑا تھا۔"

"پھر تمہارے مسکراتے ہوئے چہرے پر کرب اور اضطراب ..." عبداللہ نے سوال کیا۔

"سیتا کہاں ہے؟"

عبداللہ کا سر بے اختیار جھکتا چلا گیا۔ "مجھے افسوس ہے ڈاکٹر ... اس جانب سے ابھی تک کوئی نئی اطلاع نہیں آئی اور نہ میں نے ... رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔"

"یہ کس کا تذکرہ ہے؟" چارلس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"مادام آسکر!" عبداللہ نے دھیمے اور احترام آمیز لہجے میں ...

"اوہو۔ تو تم شادی شدہ ہو۔" چارلس نے ماحول کے بوجھل پن کو ختم کرنے کے لیے جاندار قہقہہ مار کر کہا۔ "حرکتیں تو کنواروں جیسی کرتے ... رہے ہو۔"

میں ہنس دیا اور پھر بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم دونوں کو بھی اپنے ذاتی مسائل میں الجھا لیا۔ یہ بتاؤ کہ اس خط کا کیا رہا؟"

"وہ خط میرے پاس موجود ہے۔" چارلس نے اپنے بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارا حریف تمام جدید حربوں سے واقف معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

"نہیں۔" چارلس بے اعتباری سے بولا۔ "ان لوگوں سے تمہاری کیسے ٹھن گئی؟"

"شاید یہ پہلا موقع ہے کہ میں اپنی مصروفیات کی نوعیت کے بارے میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔" عبداللہ کہنے لگا۔ "مگر اس بار ... ہوگیا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ تم چاہو تو میں اپنا سوال واپس لیے لیتا ہوں۔" چارلس بک ہارٹ نے فراخدلی کے ساتھ فوراً پیشکش کی۔

"اگر تم یہ بات نہ چھیڑتے تو میں خود بات نکالتا۔" عبداللہ نے ... "ڈی ریمی کی شہرت پر انطونیو کے قتل سے جو داغ آیا ہے اس کے لیے ... شرمندہ ہوں۔"

"ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔" چارلس بولا۔ "وہ تو اچھا ہوا کہ ... کا والد مل گیا ورنہ یہ معاملہ الٹ بھی ہو سکتا تھا۔ ہاں اگر اس کی ... ان ہوں پر ٹھکانے لگا دی جاتی تو صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔"

"ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا مگر مجھے امید نہیں تھی کہ کارویلو اتنی جلدی پہنچ جائے گا۔" عبداللہ نے صحیح بات کہہ ڈالی۔

"جو کچھ ہوگیا اس پر خاک ڈالو۔ اب آگے کی بات کرو۔"

"ڈاکٹر اسرائیل کی قید میں تھا اور وہیں سے فرار ہو کر یہاں پہنچا ..." عبداللہ کہنے لگا مگر چارلس نے مسکراتے ہوئے بات کاٹ دی۔

"برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"ضرور کہو۔"

"ڈاکٹر آسکر کی یہاں آمد کے پس منظر سے میں واقف ہوں، اسی ... ہے میں نے ہوٹل کے ریکارڈ میں کہیں بھی اس کی آمد کا اندراج باقی نہیں رہنے دیا۔"

"تمہیں کیسے علم ہوا؟"

"ال ایل کے طیارے کے اغوا کرنے والوں کے ناموں کی اخبارات میں تشہیر نہیں کی گئی مگر ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندے نے تل ابیب سے ... بدے میں سوار ہونے والوں اور پھر بعد میں رہا ہونے والوں کے ... اغوا کنندگان کے نام معلوم کر لیے تھے۔ بعد میں ... تل ابیب والوں نے سختی کے ساتھ فہرست دبا لی مگر وہ اخباری نمائندہ کسی ... یہاں تک معلوم کر چکا ہے کہ ڈاکٹر آسکر نیس آنے والا تھا کیونکہ وہ ... سے ایک روز پہلے نیس کے تمام ہوٹلوں میں ڈاکٹر کو تلاش کرتا ... رہا تھا۔"

"اسے کیسے علم ہوا؟"

"اخباری نمائندے شکم مادر کا حال بھی جان لیتے ہیں۔ ان کے اپنے حربے اور ذرائع ہوتے ہیں۔" چارلس بک ہارٹ نے مسکرا کر کہا۔

"اسے ڈاکٹر سے کیا کام تھا؟"

"انٹرویو لینے کے علاوہ اور کیا کرتا۔"

"تمہاری معلومات بھی حیرت انگیز ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ تم پورے معاملے سے لاعلم ہو۔" عبداللہ کا لہجہ خفت آمیز تھا۔

"تو کیا اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ اسی وجہ سے آسکر کے پیچھے لگے ہوتے ہیں؟"

"ہاں، وہ ہر قیمت پر اسے مار ڈالنے پر تُل گئے ہیں مگر نیس میں اب تک ان کے پانچ آدمی صاف ہو چکے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ اسی اخباری نمائندے نے تلاش میں ناکامی کے بعد اپنی معلومات کسی ایجنٹ کو معقول معاوضے پر فروخت کر دی ہوں۔"

"نہیں۔ وہ تو شوارٹ نے ڈاکٹر کا نام سن کر اس کا پیچھا کیا تھا۔ اگر البرٹو کی ساتھی فلورا ڈاکٹر سے نہ ٹکراتی تو شاید کسی کو کانوں کان بھی ڈاکٹر کی آمد کا علم نہ ہوتا۔"

"پھر اب کیا کیا جائے؟"

"انتظار!" چارلس کا لہجہ پُرسکون تھا۔ "میں نے پال المیڈو کو کارویلو کی تلاش پر لگا دیا ہے۔ شام تک اس کی رپورٹ آجائے گی۔ اس دوران میں، میں مارلین کی خیریت دریافت کر لوں۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی؟"

"پہلے تو تمہارا خیال تھا کہ اسے ڈی ریمی کی ملازمت کے ضابطوں سے انحراف کی سزا ملی ہے۔ اب یہ تبدیلی کیسے آگئی؟"

"اگر وہ مر جاتی تو مجھے ذرا بھی ملال نہ ہوتا مگر ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کے لیے جھلسے ہوئے چہرے کے ساتھ پہاڑ سی زندگی گزارنا بڑا دشوار ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چارلس مارلین کی عیادت کے لیے چلا گیا۔ اس

نے آتش گیر مادے والا خط ہمارے پاس چھوڑ دیا تھا۔

وہ سفید رنگ کا خوبصورت لفافہ تھا جس پر میرے نام کا پہلا لفظ لکھا ہوا تھا اس کے نیچے کمرے کا نمبر دیئے بغیر ہوٹل ڈی ریمی کا نام درج تھا۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ اس کا جائزہ لیا مگر وہ ہر لحاظ سے عام لفافہ نظر آرہا تھا۔ اس کا وزن بھی معمول کے مطابق ہی تھا۔

"یقین نہیں آتا کہ اس میں کوئی بم ہو۔" میں نے لفافے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اس معاملے میں مارلین زیادہ تجربہ کار ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس میں زیادہ طاقتور دھماکے کی صلاحیت نہیں ہے۔ خط کھولتے ہوئے چونکہ لفافہ چہرے اور سینے کے قریب ہوتا ہے اس لیے ان حصوں کا جھلسنا قدرتی بات ہے۔"

"یعنی اسے دور رکھ کر کھولا جائے تو ہم محفوظ رہیں گے۔"

"میرا تجربے کا ارادہ نہیں ہے مگر خیال یہی ہے۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد عبداللہ مجھے ساتھ لیکر تفریح کے لیے نکل گیا۔ سارے راستے ہم دونوں پوری طرح مستعد رہے تاکہ بیخبری میں کسی حادثے کا شکار نہ بن سکیں۔

شام کو واپس آتے ہی عبداللہ نے ڈی ریمی فون کیا۔

چند ثانیوں بعد اس کی چارلس سے بات ہوئی اور وہ یہ سن کر ششدر رہ گیا کہ پال المیڈو اپنا کام شروع کرنے کے تین گھنٹے کے اندر اندر مار ڈالا گیا تھا۔

المیڈو کی لاش پولیس کی ایک گشتی جماعت کو مضافاتی علاقے میں کھیتوں کے کنارے پڑی ملی تھی۔ اس کے بدن پر اعشاریہ چار دو کے بور کے پستول کی گولیوں کے چار نشانات پائے گئے تھے۔ پولیس قاتل یا واردات کے سبب کا سراغ نہیں لگا سکی تھی کیونکہ مقتول کی تمام قیمتی اشیاء اور نقدی وغیرہ اس کی جیبوں میں موجود تھی۔

"اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔" عبداللہ فون سے فارغ ہوا تو میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس کا حربہ اسی پر آزمانا پڑے گا۔"

"وہ کیا؟"

"ایک خط کے دھماکے میں مارلین زخمی ہوئی اور دوسرے خط کے نتیجے میں مجھے کسی ہسپتال میں ہونا چاہیئے۔ اگر کسی اخبار میں ایسی خبر آجائے تو کارویلو ہر قیمت پر مجھے ہسپتال ہی میں ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"مگر دوسرے دھماکے کے سلسلے میں ہمیں ڈی ریمی کا نام ضرور لانا ہوگا جو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ابھی تک وہ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ مجھ سے دو بار تصادم ہونے کے باوجود میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔"

"میں نے خود اسے اپنے پیچھے لگایا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"میں نے اسے بتایا تھا کہ شوارٹ کے مکان سے مجھے [illegible] کی کوڈ بک، چند تصاویر اور کچھ خطوط ملے تھے۔ وہ ان چیزوں کے لیے [illegible] میں زیادہ بے چین ہے۔"

"یہ تم نے پہلے نہیں بتایا تھا۔"

"یاد نہیں رہا ہوگا۔"

میری تجویز پر خاصے جوش و خروش کے ساتھ تبادلہ خیال ہوا اور پھر یہی طے پایا کہ وہ تجویز عملی طور پر قابل قبول نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد چارلس بھی آپہنچا۔ اس کی آمد ہم دونوں کے لیے متوقع نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔" چارلس نے صوفے پر جگہ سنبھالتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"کیا کارویلو کا سراغ مل گیا؟" عبداللہ نے اضطراری طور پر پوچھا۔

"پال المیڈو غیر ضروری طور پر ضائع ہوا۔ کارویلو کی تلاش کا کام اس کے سپرد کرنے سے پہلے اگر میں مارلین سے مل لیتا تو بہتر ہوتا۔"

"کیا مارلین سے مزید کچھ معلوم ہوا ہے؟" اس بار میری چونکنے کی باری تھی۔

"اس سے ایک ایسے شخص کا نام معلوم ہوا ہے جو ہمیشہ کارویلو سے ملنے ڈی ریمی آتا رہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ہمیں کارویلو کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہو سکیں گی۔"

"کون ہے وہ؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"امریکی فضائیہ کا سابق ہوا باز سیموئیل بیرے۔"

"اوہ۔ وہ تو یہاں زیر زمین سرگرمیوں میں ہی مصروف رہتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ سیموئیل پیشہ ور انفارمر ہے۔ کارویلو اس سے اہم معلومات خریدتا رہا ہوگا۔" چارلس نے کہا۔

"اسے جتنی جلد گھیرا جا سکے اتنا ہی مفید رہے گا۔" عبداللہ نے کہا۔

"میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ یہ کام تو تم دونوں کو کرنا ہوگا۔"

"شاید تم یونانی شہزادی کے چکر میں ہو۔"

چارلس ہنس پڑا۔ "وہ اچھا وقت گزارنے کے شوق میں میرے ساتھ یہاں آئی ہے اور میں نیس میں آنے کے بعد سے مسلسل مصروف ہوں۔ اگر یہ صورت زیادہ دیر برقرار رہی تو وہ بھڑک کر واپس لوٹ جائے گی۔"

"تو تم جا سکتے ہو۔" عبداللہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں ابھی اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔"

ہم تینوں ساتھ ہی فلیٹ سے باہر نکلے۔ چارلس اپنی کار میں روانہ ہو گیا اور ہم دونوں کرائے کی کار میں سیموئیل کی تلاش میں چل دیئے جس سے کارویلو کا سراغ ملنے کی امید تھی۔

پارس

[illegible] بک ہارٹ کو انطونیو موریلی کے قتل سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نمٹنے کے لیے وقت درکار تھا۔ [illegible] متعلقہ حکام سے مل کر وقتی طور پر معاملے کو خاصا دبا دیا تھا مگر اس [illegible] سے قبل ہوٹل ڈی ریمی کے حوالے سے جو کچھ ریکارڈ پر آگیا تھا وہ [illegible] شہرت اور کاروبار کو برباد کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ مگر یہ اس کا خلوص تھا کہ اپنی ذاتی اور کاروباری الجھن کی پروا کیے [illegible] کارویلو کو نیست و نابود کرنے کی مہم میں عبداللہ کا ساتھ دینے [illegible] پوری طرح تیار تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میری آمد کے نتیجے میں چارلس [illegible] کے بعد دیگرے کئی بڑی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں مگر اس کے [illegible] باوجود چارلس کی پیشانی پر بل بھی نظر نہ آتا تھا۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر ہم دونوں نے سیموئیل بیرے کی تلاش کی [illegible] سے اس کا نام خارج کر دیا تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ ہوٹل کے معاملات [illegible] پر توجہ دے سکے۔ عبداللہ کا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ مل کر با آسانی اس [illegible] کو ڈھونڈ نکال سکے گا۔

"مجھے حیرت ہے کہ مارلین نے سیموئیل بیرے کا نام مجھ سے کیوں چھپایا؟" میں نے عبداللہ کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔

"وہ چارلس سے کسی خارش زدہ کتیا کی طرح گھبراتی ہے اگر وہ [illegible] تو شاید اب بھی مارلین اس کا نام ظاہر نہ کرتی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے اسے خوفزدہ حالت میں نہیں دیکھا مگر میں اس وقت مارلین کے ساتھ تھا۔ وہ [illegible] سے بہت زیادہ دہشت زدہ تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ وہ [illegible] موقع ملتے ہی اسے مار ڈالے گا۔ نفرت اور دہشت کی اس منزل [illegible] مارلین کے لیے کارویلو کے کسی راز کی حفاظت کرنا ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ دہشت کی وجہ سے اس کا ذہن اس پہلو پر غور [illegible] نہ کر سکا ہو۔" عبداللہ نے مارلین کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "ڈرپوک [illegible] لڑکیاں جان کے خوف سے اپنے محبوب تک سے کھلی بے وفائی پر تیار ہو جاتی ہیں اور کارویلو تو محض اس کا آشنا تھا۔"

"اسے جہنم میں ڈالو۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ذرا [illegible] عقب نما آئینے پر نظر رکھنا۔ وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ [illegible] کی صلاحیتوں کا مالک ہے ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے فلیٹ ہی سے ہمارے پیچھے ہو لیا ہو۔"

عبداللہ بے ساختہ زور سے ہنس پڑا۔

"کیا میں نے کوئی لطیفہ پیدا کر دیا؟"

"میں اپنی اور تمہاری ذہنی حالت پر ہنس رہا ہوں۔" وہ خوشدلی [illegible] وہ حرامزادہ کسی بدروح کی طرح ہمارے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے [illegible] سمجھا ہوا سیکرٹ ایجنٹ ہے اور ہر محاذ پر پہل کرنے کے فائدوں سے پوری طرح واقف ہے دیکھا جائے تو اس نے ہمارے خلاف نفسیاتی محاذ بھی کھول لیا ہے۔"

"اب کوئی اور بات کرو، اس کے بارے میں اتنا سوچو گے تو پراگندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔" اس نے عقب نما آئینے کا زاویہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"یہی بات میں نے کہی تھی تو تم نے دانت نکال دیئے تھے۔"

"تم بہت جلدی برا مان جاتے ہو۔"

"تمہاری باتوں کا برا مانا تو میں چند گھنٹے بھی نہ گزار سکوں گا۔" میں نے اس کے شانے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"ویسے تمہاری گفتگو بہت خوبصورت ہوتی ہے مجھے رشک آتا ہے تمہارے انداز پر!"

"مذاق نہ اڑاؤ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری گفتگو تو خاصی کرخت اور غیر رومانوی ہوتی ہے۔"

"جب ہی فلورا تمہاری وجہ سے اپنی جان پر کھیل گئی اور مارلین کسی جانثار پروانے کی طرح اپنے ملائم چہرے کا حسن تم پر قربان کر کے ہسپتال پہنچ گئی ہے۔"

"مارلین کو اگر شبہ بھی ہوتا کہ وہ لیٹر بم ہے تو وہ اسے ہرگز نہ کھولتی۔"

"مگر یہ بھی بڑی بات ہے کہ اس نے تمہارے غائب ہونے کی کہانی کو تسلیم کر لیا اگر وہ تمہاری زبان کے سحر کا شکار نہ ہوتی تو ضرور سوچتی کہ اتنی سرد رات میں باہر چہل قدمی کے لیے نکل پڑنے کی کیا تک تھی۔" وہ بحث پر اتر آیا۔

"ہم دونوں نے اس رات بڑی بے یقینی کے عالم میں شراب نوشی شروع کی تھی اگر میں گریبان چاک کر کے سڑکوں پر نکل پڑنے کا افسانہ بھی تراشتا تو وہ مان لیتی۔"

"یہی تو تمہاری زبان کی خوبی ہے!" وہ اونچے لہجے میں بولا۔ "میں نے بہت کم ایسا دیکھا ہے کہ رنگین مزاج عورتیں اور لڑکیاں اپنے کسی شناسا کو اتنے والہانہ انداز میں چاہتی ہوں۔"

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

ہمارے سفر کا اختتام نیس کے جس علاقے میں ہوا وہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہاں بیشتر مکانات مختصر اور ایک دوسرے سے ملحق بنے ہوئے تھے چھتوں پر پڑی ہوئی سال خوردہ کھپریل کا زردی مائل رنگ بتا رہا تھا کہ اس علاقے کو آباد ہوئے طویل مدت بیت چکی ہے۔

آبادی کے وسط میں ایک تنگ سڑک پر دو رویہ گنجان بازار تھا اور وہیں ایک سیلن زدہ عمارت میں وہ بار تھا جہاں سے ہمیں سیموئیل بیرے کی تلاش کا آغاز کرنا تھا۔

اس بار میں گھٹیا قسم کی شراب میسر تھی جو محض اس لیے معدے میں انڈیلنی پڑی کہ ہم وہاں اپنی موجودگی کا جواز پیدا کر سکیں۔

گلاس میں سوڈے کی وافر مقدار ملانے کے باوجود پہلے پیگ کے

خاتمے پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی بھی لمحے میری آنتیں حلق میں آجائیں گی۔

"منہ کیوں بنا رہے ہو؟" عبداللہ نے میری طرف جھکتے ہوئے سوال کیا۔

"پتہ نہیں یہ کس قسم کی وسکی ہے مجھ سے نہیں چلے گی۔"

"ایک پیگ پی کر ہم زیادہ وقت نہیں رک سکیں گے۔"

"تو پھر بیئر منگوا لو۔"

عبداللہ نے میری تجویز قبول کر لی۔ اس دوران میں وہاں موجود افراد کا جائزہ لینے کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص کو تاک چکا تھا جو اپنی میز پر تنہا تھا اور خاصے سرور میں نظر آ رہا تھا۔

ہم اپنے گلاس لے کر اس کی میز پر پہنچے تو وہ چند ثانیوں تک چندھیائی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر اس نے لڑکھڑائی ہوئی زبان میں کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔

میرے لیے وہاں فرنچ سے ناواقفیت بہت بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی کیونکہ عبداللہ کا جواب بھی میرے پلے نہ پڑ سکا۔

چند فقروں کے تبادلے کے بعد عبداللہ نے اپنی طرف سے اس کے لیے وسکی کا ایک لارج پیگ منگالیا جسے اس شخص نے ندیدے پن کے ساتھ سوڈا ملائے بغیر غٹاغٹ معدے میں اتار لیا۔

پھر یک بیک وہ انگریزی بولنے لگا۔ عبداللہ نے بتایا کہ زبان کی تبدیلی اس کی درخواست پر عمل میں آئی تھی اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ انگریزی جانتا تھا۔

"میرا نام لودیر ہے، لودیر کرسٹوف۔" وہ شخص ترنگ میں بولا "اور تم اپنے اطوار سے کسی پراسرار سرزمین کے سرمئی شہزادے معلوم ہوتے ہو۔"

"پراسرار نہیں خوابوں کی سرزمین کہو۔" عبداللہ میرے بولنے سے پہلے ہی مدھم لہجے میں بول پڑا۔ "یہ سرمئی شہزادہ تمہیں اعلیٰ اسکاچ سے غسل کرانے کی استطاعت رکھتا ہے۔"

بوڑھے کی حسرت بھری سرخ نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ "اگر مجھے یقین ہو کہ مرنے کے بعد میری لاش وسکی سے نہلائی جائے گی تو ہنستے کھیلتے مرنے کو تیار ہوں۔"

"تم کیا کرتے ہو؟" میں نے پہلی بار سوال کیا۔

"وسکی پیتا ہوں!"

"میرا مطلب ہے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟"

"وسکی پینا۔" اس نے خالی گلاس اٹھا کر اپنی انگلیوں پر نچاتے ہوئے کہا۔ "یہی میرا پیشہ ہے اور یہی میری تفریح۔"

"اور اس کے لیے اخراجات کہاں سے آتے ہیں؟"

"میں انہیں گمنام رکھ کر گاہک فراہم کرتا ہوں اور وہ ہر شام مجھے پچاس فرانک دے جاتی ہیں۔" اس نے شاہانہ بے نیازی سے کہا۔

"تم کن کی بات کر رہے ہو؟" مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں ان کے نام تمہیں بتاؤں گا۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا "مجھے اس رازداری کے صلے میں اپنا معاوضہ پاتا ہوں ورنہ اترائیں تو ہر راستے پر لوگ ان کے قدموں میں عقیدت سے بچھ جائیں گے۔"

اسی اثنا میں عبداللہ کی ہدایت پر اس شخص کے لیے وسکی آگیا جس کے ساتھ اس نے وہی پہلے جیسا سلوک کیا اور جب مشروب اس کے معدے میں اترا تو وہ ستاروں کے موضوع پر بولنے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں، زبان لڑکھڑانے لگی تھی اور آنکھیں غیر معمولی حد تک سکڑی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔

"یہ بتاؤ کہ مقدر کا ستاروں سے کیا تعلق ہے؟" عبداللہ مزید محنت کرنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

"جو ستارے آج چمکتے جگمگاتے نظر آتے ہیں کل وہ راکھ بن کر بکھر جائیں گے۔ انسان کا مقدر بھی اسی طرح عروج و زوال کا شکار ہوتا ہے۔ راکھ کے ستاروں کی طرح۔ ستاروں کی راکھ کی طرح۔ ایک پیگ منگا دو نا۔"

آخری جملہ اس نے التجا آمیز لہجے میں ادا کیا تھا اور میں اپنے لبوں پر زبان پھیر کر ذائقہ تازہ کر رہا تھا۔

عبداللہ نے فضا میں ہاتھ لہرا کر بیرے کو مزید آرڈر دیا اور بولا "تم نے کبھی کوئی بکھرا ہوا ستارہ دیکھا ہے؟"

"کسی اناڑی کو پندرہ منٹ میں یکے بعد دیگرے چار پیگ پلا دو، میرا دعویٰ ہے کہ اسے اپنے ارد گرد سمٹتے اور بکھرتے ہوئے ستاروں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔"

"تم ابھی اپنے کسی دوست کی بات کر رہے تھے۔" عبداللہ نے اس کی ذہنی حالت دیکھتے ہوئے براہ راست حملے کا آغاز کر دیا۔

"میں بہت بوڑھا آدمی ہوں میرے عزیز!" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جھومتے ہوئے بولا۔ "دوست دور کی بات ہے میں آج تک کسی کو اپنا دشمن بھی نہ بنا سکا۔"

"تو سیموئیل بریے کون ہے؟"

وہ بڑے فاضلانہ انداز میں تیوریاں چڑھا کر بولا "وہ بریے سیموئیل ہے۔ اتنی آسان سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"مگر تم سے اس کا کیا رشتہ ہے؟"

"میں ایک غریب آدمی ہوں، وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا ہے، میری اور اس کی رشتہ داری کیسے ہو سکتی ہے۔"

لودیر کرسٹوف کے اس جواب پر میرا اصل مقصد عیاں ہو گیا۔ ہم دونوں پہلی ہی کوشش میں ایک ایسا آدمی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو سیموئیل بریے سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا تھا۔

سیموئیل کا نام معلوم ہوا تھا اور بعد میں عبداللہ نے خیال ظاہر کیا کہ امریکی فضائیہ کا وہ سابق ہوا باز نیس میں زیر زمین گروپوں سے رابطہ رکھتا تھا۔

بہرحال بریے کے ٹھکانے کا ہم میں سے کسی کو بھی صحیح علم نہیں تھا اس لیے عبداللہ نے اس کی تلاش کی مہم کا آغاز کرنے کے لیے جو علاقہ منتخب کیا وہ جرائم پیشہ افراد کی سرگرمیوں کے لیے نیس میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور ہمیں اپنے مقصد میں پہلی کامیابی حاصل ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا ہے؟" عبداللہ نے تحیر آمیز لہجے میں لودیر سے سوال کیا۔ "کچھ عرصہ قبل تو وہ عسرت کی زندگی گزار رہا تھا۔"

"چند روز سے وہ غائب ہے شاید اسے کوئی موٹی اسامی مل گئی ہے۔ میرا گلاس خالی ہو گیا ہے کیا تم اسے بھروانے کا بندوبست نہیں کر سکتے؟"

"سیموئیل کہاں مل سکے گا؟" عبداللہ نے اس کی آخری درخواست نظر انداز کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہر رقم ہاتھ لگنے کے بعد وہ ہمیشہ مارجوری کے قحبہ خانے کا رخ کرتا ہے۔ وہ احمق مارجوری کو اپنی محبوبہ تصور کرتا ہے مگر مارجوری بہت ... سیموئیل کی جیب خالی ہو تو اسے ٹال دیتی ہے اور جب وہ لمبا ہاتھ مار کر ادھر کا رخ کرتا ہے تو اسے مارجوری اپنی خوابگاہ میں جگہ دیتی ہے۔"

عبداللہ نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں تعریفی انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

ہم دونوں مزید کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے اس دوران ... لودیر نے دو پیگ خالی کر دیئے اور عبداللہ اس سے غیر ضروری باتیں کرتا رہا تاکہ لودیر کے ذہن میں سیموئیل کا تصور باقی نہ رہ سکے۔

بل ادا کر کے ہم وہاں سے نکلے تو لودیر کی حالت بہت ابتر تھی وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائے میز پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟" شراب خانے سے باہر آ کر میں نے پوچھا۔

"مارجوری کا قحبہ خانہ بہت مشہور جگہ ہے۔ وہاں بیس بچیس خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں اور مارجوری خود بھی کسی فتنے سے کم نہیں ہے۔"

"تو کیا وہاں براہ راست سیموئیل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم، تم کوئی بہتر راہ نکالو۔"

پھر ہم گاڑی میں شہر کے شمالی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں ... کا علاقہ واقع تھا۔ میں خاموشی سے عبداللہ کے برابر میں بیٹھا ... کے لیے بنی ہوئی ستوازی سڑکوں کے درمیان لگی ہوئی ... اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے لگا۔ سڑک کی اس وسطی ... سدابہار پودوں کے جھنڈ بھی اگے ہوئے تھے جو بڑے بڑے ... سے لدے ہوئے تھے موسمی پودوں پر آہستہ آہستہ خزاں کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے دو رویہ سایہ دار درختوں پر بھی خزاں کی اداس تصویر ترتیب پا رہی تھی۔

"ہم دونوں وہاں گاہک کے طور پر جائیں تو مناسب رہے گا۔" میں نے کچھ دیر کی خیال انگیز خاموشی کے بعد کہا۔

"اس کے علاوہ وہاں داخلہ کا کوئی اور بہانہ ممکن ہی نہیں ہے۔"

"مارجوری انگریزی جانتی ہے؟"

"وہ یورپ کی پانچ زبانیں بڑی روانی سے بولتی ہے۔"

"تو کیا تم اس سے مل چکے ہو؟"

"ملا نہیں مگر سنا ہے کہ اٹھائیس تیس برس کی قتالہ ہے اور عموماً خود ہی گاہکوں کی پیشوائی کرتی ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ابھی وہ خورد ہی لڑکی ہے اس عمر میں اپنا دھندا کیسے سنبھالتی ہوگی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تھوڑی دیر میں خود ہی دیکھ لینا مگر ایک بات یاد رکھنا کہ میں عملی طور پر کسی طرح تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔"

"وہ کیوں؟ کیا اس منجدھار میں مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟"

"یہ بات نہیں۔" وہ ہنس کر بولا "مارجوری سے سوداگری اپنی ذات تک محدود رکھنا میں لڑکیوں کے چکر سے دور بھاگتا ہوں۔"

"سائے کاریو کو اگر تمہاری اس کمزوری کا علم ہو جائے تو وہ چار عورتوں کو ہی تمہارے پیچھے لگا دے۔" میں نے قہقہہ مار کر کہا۔

نصف گھنٹے کے انتہائی سفر کے بعد عبداللہ نے اپنی کار ایک وسیع احاطے میں موڑ دیا۔ روش کے کنارے کھلے ہوئے پھاٹک سے ملحق چوبی کیبن سے ایک وردی پوش سنتری پھرتی سے باہر آیا اور عبداللہ کے پاس رک گیا۔

"مادموزیل مارجوری!" عبداللہ نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر کہا۔

سنتری نے عمارت کی طرف ہاتھ اٹھا کر فرنچ میں جلدی جلدی کچھ کہا اور پھر اپنے سر کو احتراماً قدرے خم دے کر پیچھے ہٹ گیا۔

وسیع سبزہ زار اور پھولدار کیاریوں کے درمیان بنی ہوئی سرخ بجری کی طویل روش طے کر کے گاڑی پورچ میں جا رکی۔

ہم دونوں گاڑی سے اترے اور سیڑھیاں طے کر کے برآمدے میں داخل ہو گئے۔ برآمدے میں شیشے کا صرف ایک ہی دروازہ کھلتا تھا جس کے پار ایک کاؤنٹر پر خرانٹ سا مرد بیٹھا ہوا تھا۔

ہم دونوں اندر پہنچے تو بوڑھے کی گردن شانوں میں دھنس گئی اور وہ دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر ٹیک کر ہماری طرف جھک آیا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ گاہکوں کا استقبال خود کرتی ہے۔" میں نے مڑی ہوئی ناک والے اس بوڑھے گدھ کو دیکھ کر عبداللہ سے کہا۔

"مس مارجوری کہاں ہیں؟" عبداللہ نے مجھے جواب دینے کے بجائے بوڑھے سے انگریزی میں استفسار کیا تاکہ میں بھی گفتگو سے باخبر رہ سکوں۔

"وہ مصروف ہیں، بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

بوڑھے کا لہجہ گھناؤنے پن کی حد تک خوشامدانہ تھا۔

"کیا ہم صورت سے اس قدر بدذوق نظر آتے ہیں؟" میں نے لب گھورتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا اور وہ بُری طرح پٹپٹا گیا۔

"میں سمجھا نہیں جناب!۔۔۔"

"ہم یہاں کچھ دلربا چہروں کی تلاش میں آئے ہیں۔ یہ جگہ تمہاری موجودگی کے لیے انتہائی نامناسب ہے ہم مارجوری سے ہی بات کریں گے" میں نے ترش لہجے میں کہا۔

وہ شخص بالکل ہی بے حس نہیں تھا۔ میرے تبصرے پر اس کا بُرا سا منہ بن گیا۔ "اس عمارت میں میرے وجود سے مفر ممکن نہیں تم دونوں کہیں اور جا سکتے ہو۔"

"مارجوری کہاں ہے؟" عبداللہ بولا تو اس کی آواز میں عنفریاں تھا۔

"وہ مصروف ہے۔" بوڑھے نے ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔

"چاہو تو میں دوسری لڑکیاں دکھائے دیتا ہوں۔ وہ مارجوری سے کم سن بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔"

"مگر میں اسی کے لیے آیا ہوں۔" مجھے واقعی تاؤ آنے لگا تھا۔

"میں تمہارے فائدہ کی بات کہہ رہا ہوں۔" بوڑھا مصالحانہ لہجے میں بولا۔ "مارجوری ڈریسنگ روم سے آتی ہی ہوگی مگر وہ پہلے سے بک ہے۔"

"میں اسے دگنا معاوضہ دوں گا۔"

"بیٹھ جاؤ میں اسے خبر کرتا ہوں۔"

ہم دونوں وہاں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے اور بوڑھا شاید انٹرکام پر کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔

چند منٹ بعد مارجوری وہاں آ پہنچی۔ میں تو اسے دیکھتے ہی سکتے میں آ گیا۔ وہ بے حد حسین اور متناسب الاعضا تھی اور شاید اسے خود بھی اپنے حسن کا بھرپور احساس تھا کیونکہ میک اپ میں اس نے نہایت مہارت سے کام لیا تھا۔

"ڈیڈی نے بتایا ہے کہ تم لوگ میری ہی خاطر یہاں آئے ہو۔" اس نے نہایت فیاضانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میرے برابر میں بیٹھ گئی۔

"تو کیا یہ بوڑھا شخص تمہارا باپ ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ارے نہیں، میں تو اسے احتراماً ڈیڈی کہتی ہوں۔"

"سنا ہے کہ آج تم مصروف ہو؟" میں نے اس کے بدن کا اشتعال انگیز لمس محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہ درست ہے!"

"میں کسی کی سفارش پر یہاں آیا ہوں۔ بھیجنے والے نے کہا تھا کہ نیس میں اگر کسی نے مارجوری کی زلفوں کے سائے میں وقت نہ گزارا تو سمجھو کہ اس نے نیس میں وقت برباد کیا۔"

وہ کھنکتی ہوئی آواز میں ہنس پڑی "یہ قدرسدانوں کی حوصلہ افزائی ہے ورنہ اس چھت کے نیچے اور بھی لڑکیاں ہیں۔"

"میں کل چلا جاؤں گا!"

"میں ایک انتہائی جذباتی قسم کے گاہک سے مجبور ہوں ورنہ تمہارے لیے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکال لیتی۔" وہ محبوبانہ انداز میں بولی۔

"کل صبح؟"

"ناممکن ہے۔" وہ میرا بازو سہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ شخص ایک ماہ کے لیے میرا منہ مانگا معاوضہ دے چکا ہے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے کسی کام سے باہر گیا ہے اگر وہ موجود ہوتا تو شاید میں تم سے ملنے سے بھی محروم رہ جاتی۔"

"کوئی بے فکر رئیس زادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"ارے نہیں!" وہ ہنس پڑی۔ "یہ دو دن پہلے تک میرا ہمدرد تھا محض اسی غلط فہمی میں میں نے اسے اپنا ایک ماہ کا معاوضہ بتا دیا اور وہ رقم حوالے کر کے میرے سر پر سوار ہو گیا۔ اب میں اصولی طور پر اس کی پابند ہوں۔"

"کہاں رہتا ہے؟" عبداللہ پہلی بار اس سے مخاطب ہوا۔

"سستے رہائشی ہوٹلوں میں ٹھکانے بدلتا رہتا ہے اب تو پرسوں سے یہیں میرے کمرے پر قابض ہے۔" مارجوری نے بلاجھجک جواب دیا۔ "عجیب اتفاق ہے کہ اس مفلس کو پیسے بھی اسی وقت ملے جب میں نہیں آیا ہوا تھا۔" میں نے تاسف سے کہا۔ "تم نے نام کیا بتایا تھا اس کا؟"

"سیموئیل برگ!" گو میرا سوال نہایت سرسری تھا مگر برجستہ ہونے کی وجہ سے میں نے مارجوری کو شبہ میں ڈالے بغیر اس سے اپنے اندیشے کی تائید کرا لی۔

مارجوری نے بہت اصرار کیا کہ ہم دونوں دوسری لڑکیوں سے مل لیں مگر میں خود کو انتہائی کبیدہ خاطر ظاہر کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ مارجوری کو نہایت شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ ایک شیدائی اپنی فیاضی کے مظاہرے سے محروم ہو کر اس کے قحبہ خانے سے جا رہا تھا۔ وہ ہم دونوں کو الوداع کہنے باہر ہماری کار تک ساتھ آئی۔

"مجھے امید ہے کہ تم اگلی مرتبہ نیس آؤ گے تو ضرور مجھ سے ملو گے تاکہ آئندہ کبھی ایسے احمقانہ معاہدے کا اعادہ نہیں کروں گی۔" انجن اسٹارٹ ہونے پر اس نے کہا پھر پھاٹک سے داخل ہوتی ہوئی موٹر کو دیکھ کر بولی۔ "لو سیموئیل بھی آ گیا۔"

"اس رقیب سے مل لیا جائے۔" میں نے ہنس کر کہا اور عبداللہ نے میرا اشارہ سمجھ کر کار کا انجن بند کر دیا۔

"تم دونوں میرے پرانے ملاقاتی ہو۔" ہم دونوں کے اترتے ہی وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں جلدی سے بولی۔ "اس کے سامنے میری کوئی بات نہ دہرا دینا۔"

"دوستی ہو اس سے؟" میں نے پوچھا۔

"نن۔۔۔ نہیں تو۔" وہ بے ڈھنگے پن سے ہنستے ہوئے بولی "بس پوچھ لیا۔ نام نہیں بتائیے تم دونوں نے اپنے۔ ہاں تعارف ضرور چاہیے گا۔"

"میں جوئیل ایلازار اور یہ جمی کارٹر ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں عبداللہ کے لیے کوئی دوسرا نام نہ آ سکا تھا۔

اسی اثنا میں سیموئیل کی سرخ اسپورٹس کار نہایت تیزی کے ساتھ پورچ میں داخل ہوئی اور پھر پوری قوت سے بریک لگا کر اسے روک دیا گیا۔

"یہ گاڑی اس نے حال ہی میں خریدی ہے۔" مارجوری نے وضاحت کی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر سیموئیل کو اتنی بڑی رقم کہاں سے ہاتھ لگی کہ اس نے نہ صرف نئی کار خریدی بلکہ مارجوری کو بھی ایک ماہ کے لیے خرید لیا۔

پھر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ایک نیا اندیشہ ابھرا۔ اگر ہزاروں فرانک پر مشتمل وہ رقم سیموئیل کو مرائے کاردیلو سے ملی تھی تو یقیناً وہ دونوں ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعاون کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اس بات کا قوی امکان تھا کہ کہیں کاردیلو نے سیموئیل کو میرے اور عبداللہ کے حلیے سے آگاہ نہ کر دیا ہو یا کسی جگہ ہم دونوں کی رونمائی نہ کرا دی ہو۔ ایسا ہوتا تو سیموئیل ہمیں پہلی نظر میں پہچان لیتا اور اب کچھ کرنے کا موقع نہیں رہتا تھا۔ وہ انجن بند کر کے کار سے اتر رہا تھا اور اس کی نظریں ہم لوگوں پر مرکوز تھیں۔

"ہیلو جوری کدھر کا ارادہ ہے؟" وہ ہماری طرف آتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

"پرانے دوست ملنے آ گئے تھے!" مارجوری اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں دیکھ کر ملنے کے لیے رک گئے۔"

وہ دراز قامت دبلا پتلا شخص تھا۔ وہاں پھیلی ہوئی تیز روشنی میں اس کی آنکھیں اور پچکے ہوئے رخسار دور ہی سے چمک رہے تھے۔ سیموئیل مارجوری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہماری طرف آنے لگا۔ اس دوران میں وہ پلکیں جھپکائے بغیر عبداللہ کو گھورے جا رہا تھا۔

اس کے تیور دیکھ کر مجھے اپنے بدن میں سنسنی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔

"یہ جوئیل ایلازار اور یہ جمی کارٹر۔" مارجوری نے شوخ لہجے میں کہا "دونوں میرے پرانے دوست ہیں اور یہ سیموئیل برگ ہے!"

سیموئیل نے کچھ کہے بغیر ہم دونوں سے پرجوش طریقے پر ہاتھ ملایا۔ حالانکہ اس دوران میں اس نے ایک پل کے لیے بھی عبداللہ کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں اور میں سمجھ رہا تھا کہ ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے جس سختی سے کام لیا تھا اس کا مقصد جوش کے بجائے طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔

"اچھا مارجوری! ہم چلتے ہیں۔" عبداللہ بھی جوابی کینہ توز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ شاید وہ بھی خطرہ بھانپ چکا تھا۔

"ابھی کہاں جاؤ گے تھوڑی دیر میرے ساتھ بیٹھو نا۔" سیموئیل قہقہہ مار کر بولا۔ "بس یہ خیال رکھنا کہ آجکل مارجوری میری محبوبہ ہے۔" اس نے عبداللہ کے چہرے سے نگاہیں ہٹالی تھیں اور بالکل لاپرواہ نظر آنے لگا تھا۔

"پھر کسی وقت آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"جوئیل ایلازار۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم یہودی ہو نا؟"

میں نے غیرارادی طور پر اثبات میں سر ہلا دیا کیونکہ وہ نام ہی یہودی ہونے کا اعلان تھا۔

"تو پھر آؤ تم سے کچھ خاص باتیں ہوں گی۔" اس نے اپنا بایاں ہاتھ میرے شانے پر مضبوطی سے جما دیا۔ "آج کل ہمارے ہم مذہب لوگوں میں عبرانی نام رکھنے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ بیشتر لوگ عیسائیوں جیسے نام رکھتے ہیں مگر میرے باپ نے امریکی شہری ہونے کے باوجود کافی جستجو کے بعد یہ عبرانی نام رکھا تھا۔ تم بھی کسی قدامت پسند گھرانے کے فرد معلوم ہوتے ہو۔"

نہ جانے وہ مجھ پر طنز کر رہا تھا یا وہ سچ سے ہم لوگوں کی اصلیت ہی نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں اس کے رویّے سے شدید الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ اور میری چھٹی حس مجھے اس عمارت میں دوبارہ داخل ہونے سے روک رہی تھی۔

"وہ باتیں پھر کسی وقت کر لینا، اس وقت ہمیں ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد نرم لہجے میں کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" وہ جارحانہ انداز میں بولا۔ "جوری کے پاس صرف جسموں کے سوداگر آتے ہیں اور فرصت سے آتے ہیں جب تمہیں کوئی ضروری کام تھا تو تم یہاں کیوں رُکے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ بے تکلفی سے کام لے رہے ہو۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر خشک لہجے میں کہا۔

"میں تکلف کا قائل ہی نہیں ہوں اور پھر تم دونوں مارجوری کے پرانے شناسا ہو۔ اس رشتے سے مجھے بھی تم پر تھوڑا سا حق حاصل ہے۔" پھر وہ یک بیک مارجوری سے مخاطب ہوا۔ "کیا یہ دونوں واقعی تمہارے پرانے شناسا ہیں؟"

"ہاں ہاں! بھلا مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟" مارجوری بوکھلا کر بولی۔

"پھر یہ بھاگنے پر کیوں مُصر ہیں؟"

"تھوڑی دیر رک جاؤ نا!" مارجوری مجبوری کے عالم میں ہم دونوں سے مخاطب ہوئی۔

"اندر پندرہ بیس نرم، ملائم اور رسیلی لڑکیوں کے علاوہ ایک خستہ حال بوڑھا ہے ان سب سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے!" سیموئیل نے لقمہ دیا۔

"اس چھت کے نیچے ہم مارجوری کو اسی حالت میں دیکھتے رہیں گے جس میں پہلے ہماری ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اگر تم اسے برداشت کر سکتے ہو

تو ہمیں رکنے میں کوئی اعتراض نہیں ورنہ مناسب یہ ہوگا کہ باہر کہیں بیٹھ کر بات کی جائے۔"

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا اور میں نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں نفرت کی آگ بھڑکتی دیکھی۔

"میرے سامنے اس انداز میں اپنے پرانے مراسم کا تذکرہ نہ کرو۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "مارجوری اس وقت میری ملکیت ہے۔"

"تمہارے ساتھ ایک ماہ گزارنے کے بعد یہ طویل مدت کے لیے میری بانہوں میں آجائے گی۔ میں نے اسے پیشگی معاوضہ دے دیا ہے۔" میں نے اس کی دکھتی رگ کو پوری شدت سے دبا دیا۔ میں اسے اپنے خول سے باہر نکلنے پر مجبور کردینا چاہتا تھا۔

"کیا یہ درست ہے؟" سیموئیل نے مارجوری سے پوچھا۔

"کیوں ایسا تلخ مذاق کر رہے ہو جوئیل۔" مارجوری تقریباً کراہتے ہوئے بولی۔ "ہمارے درمیان ایسی بات کب ہوئی تھی۔"

"جس حالت میں ہو اسی طرح کھڑے رہو۔" اچانک عبداللہ کی خونخوار غراہٹ ابھری۔ اس کا داہنا ہاتھ جو کافی دیر سے اوورکوٹ کی جیب میں پڑا ہوا تھا باہر آچکا تھا اور اس میں دبے ہوئے ریوالور کا دہانہ سیموئیل کے سینے کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

"میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا لڑکے تمہیں یہ جسارت مہنگی پڑے گی۔" سیموئیل خوفزدہ ہوئے بغیر غضیلے لہجے میں بولا۔

اس اچانک موڑ پر مارجوری کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں اور اس کا دمکتا ہوا شہابی گلابی چہرہ میک اپ کی تہہ کے باوجود زرد نظر آنے لگا تھا۔

"میں مہنگے سودوں کا شوقین ہوں بڈھے۔" عبداللہ نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اب شرافت سے میری کار کی عقبی نشست پر بیٹھ جاؤ اور مارجوری تم اگلی نشست پر میرے پہلو میں بیٹھو گی۔"

"مگر کیوں؟ میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟" مارجوری نے روہانسے لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے اس عاشق نے ہماری توہین کی ہے اور ہم باہر لے جا کر اسے مزہ چکھائیں گے۔"

"خدا کے لیے یہ مہلک ہتھیار جیب میں رکھ لو۔ اگر اس وقت کوئی گاہک آنکلا تو میرے گھر کی نیک نامی پر دھبا آجائے گا۔"

"قحبہ خانے کی نیک نامی!" عبداللہ زہریلے لہجے میں بولا پھر غرایا۔ "سیموئیل! کیا میری ہدایت تمہارے کانوں میں نہیں پہنچی؟"

"کیا کہا تھا تم نے؟"

"میری کار کی عقبی نشست پر بیٹھو!"

"ذرا اونچی آواز میں کہو۔" سیموئیل تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ "دھمکیاں سننے کے معاملے میں میری سماعت انتہائی ناقص ہے۔"

میں اس دراز قامت مردود کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کا فقرہ پورا ہوتے ہی میرا داہنا ہاتھ حرکت میں آگیا اور کنپٹی پر پڑنے والے بھرپور گھونسے نے اسے کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر ڈھیر ہوجانے پر مجبور کردیا۔

مگر خرابی یہ ہوئی کہ مارجوری اپنی خوفزدہ چیخ نہ روک سکی اور اسی وقت کسی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔

عبداللہ نے جلدی سے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور مارجوری سے بولا۔ "اگر ہمارے لیے کوئی دشواری پیدا ہوئی تو تمہارا حشر بھی مختلف نہ ہوگا۔"

چند خوبصورت لڑکیاں، استقبالیہ کاؤنٹر والا بوڑھا اور ایک سنتری وہاں پہنچا تو عبداللہ نہایت ہمدردانہ انداز میں سیموئیل کا سر پکڑے بیٹھا اس کی پیشانی سہلا رہا تھا اور مارجوری میرے شانے سے لگی کھڑی تھی۔ آنے والوں کے تیور خاصے بگڑے ہوئے تھے اور گھورتی ہوئی نگاہوں کا ہدف میرا ہی چہرہ تھا مگر مارجوری نے فرنچ میں ان سے کچھ کہا تو تنی ہوئی تیوریاں نرم پڑ گئیں اور لوگ واپس چلے گئے۔

"تم بہت سمجھ دار ہو۔" لوگوں کے چلے جانے پر عبداللہ نے کہا۔

"یہ... یہ زندہ ہے نا؟" مارجوری نے خوف سے ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔

"ابھی تو زندہ ہی ہے۔" عبداللہ نے لاپروایانہ لہجے میں کہا پھر ہم دونوں نے اسے اٹھا کر اپنی کرائے کی کار کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔

"اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" مارجوری جو الگ کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکی۔

"اسے دریائے سین کے یخ بستہ پانی میں چند غوطے دیں گے۔ اگر اس نے ہوش میں آنے کے بعد معافی نہ مانگی تو اس کی کمر سے پتھر باندھ کر اسے دریا میں تہہ نشین کردیں گے۔" عبداللہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"یہ واقعی بہت بدتمیز آدمی ہے مگر خدا کے لیے اسے ہلاک نہ کرنا۔"

"جو کچھ ہوگا تمہارے سامنے ہوگا۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔"

"نن... نہیں، میرا تو دم نکل جائے گا۔ تم یقین رکھو میں اس معاملے میں زبان بند رکھوں گی۔" وہ معاملے کی نوعیت کو سمجھ چکی تھی۔

"مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیموئیل تم لوگوں کو پہلے سے جانتا تھا اور تمہارے درمیان شدید دشمنی ہے۔"

"فی الحال ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ اگر باہر نکل کر تم نے ہمیں مطمئن کردیا تو تمہیں بحفاظت واپس چھوڑ دیں گے ہمیں خود معلوم نہیں کہ سیموئیل ہم سے کیا چاہتا تھا۔ ہم نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔"

مارجوری نے خاصی خوشامد کی مگر اس کی گلو خلاصی نہ ہوسکی۔ بالآخر عاجز ہو کر اسے عبداللہ کے برابر بیٹھا دیا گیا اور میں سیموئیل کے برابر کار کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا اور گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

پھاٹک پر مارجوری نے سنتری کو کچھ ہدایات دیں۔ جو فرانسیسی زبان میں تھیں اس لیے میں انہیں نہ سمجھ سکا۔ البتہ یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ سنتری کو سیموئیل کے بارے میں جواز کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس پر عبداللہ نے اس کی عقلمندی کی داد دی۔

"اس مکان پر ہنگامے کی خبر پھیلنے سے تمہیں یا سیموئیل کو جو نقصان ہوگا وہ تو ہونا ہی ہے مگر میرے عزت دار سرپرست ادھر کا رخ کرنا بھی چھوڑ دیں گے۔" مارجوری نے کہا۔

"سیموئیل کے پاس کوئی ملاقاتی آتا تھا؟" میں نے جرح کا آغاز کیا۔

"نہیں۔"

"کوئی فون وغیرہ؟"

"نہیں۔ مگر وہ خود کئی بار باہر فون کرتا تھا۔ دن میں چار چھ گھنٹے وہ بھی باہر ہی رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بار اس کے مقدر نے یاوری کی ہے اور تھوڑے دن گزرنے کے بعد وہ اس قابل ہوجائے گا کہ مجھ سے باقاعدہ شادی کرکے عزت کی زندگی گزار سکے۔"

"اور تم نے تفصیل جاننے کی کوشش نہیں کی؟"

"آج کل اس کے پاس ہر وقت ہزاروں فرانک رہتے ہیں۔ میں اس تبدیلی پر حیران تھی اور میں نے اسے کریدنے کی بھی کوشش کی مگر وہ زبان کھولنے پر آمادہ نہ ہوا۔"

"لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ سیموئیل ان دنوں تمہارے پاس مقیم ہے اگر وہ ایک دو روز غائب رہا تو تمہارا کیا بنے گا؟"

"وہ کوئی شریف گھریلو آدمی نہیں ہے۔ ہر شخص اس کی سرگرمیوں سے واقف ہے میں باآسانی اپنی لاعلمی کا اظہار کرسکوں گی۔"

"مگر اس کی کار تمہارے یہاں ہے؟"

"وہ کار چھوڑ کر بھی کہیں جا سکتا ہے۔ تم یقین رکھو میری وجہ سے تم لوگوں پر آنچ بھی نہ آسکے گی۔ اگر تم اسے دو تین دن قید رکھ کر اس کا دماغ درست کرسکو تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ مجھے ان لوگوں کو منانے کا موقع مل جائے گا جو صرف میری وجہ سے وہاں آتے ہیں مگر سیموئیل کی وجہ سے دو روز سے میرے مہمان کے لیے ناقابل حصول ہوگئی ہوں۔" مارجوری کھل کر بات کر رہی تھی۔ وہ غالباً یہ فرض کرچکی تھی کہ ہم دونوں سیموئیل کو ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بلکہ اس کی کینہ پروری کا سبب جاننے اور اسے ذلیل کرنے کے بعد آزاد کردیں گے۔

"تمہاری باتیں خاصی معقول ہیں مگر ہم کیسے یقین کریں کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو اس پر عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہو؟"

"میں نے تمہیں ہر بات صاف بتادی ہے اگر تم نے مجھے بھی اس کے ساتھ روک لیا تو میرے آدمیوں کو فکر لاحق ہوجائے گی اور وہ شاید یہ بات پولیس تک پہنچا دیں کہ تم لوگ مجھے اور سیموئیل کو اٹھا لے گئے۔ اس طرح نہ صرف تم دشواریوں میں گھر جاؤ گے بلکہ میرا مستقبل بھی بالکل تاریک ہوجائے گا۔ پولیس کی نظروں میں آجانے کے بعد میں کبھی اپنی ساکھ نہیں بنا سکوں گی۔"

"ہم تمہیں چھوڑنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہیں۔" میں نے کچھ دیر کے توقف کے بعد کہا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ تم نے کسی کو بھی ہماری طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تو تمہیں کسی بھی پررونق شاہراہ پر تمہارے چہرے پر تیزاب پھینک کر تمہارے حسن کو برباد کردیا جائے گا۔"

وہ پھریری لے کر رہ گئی۔ "اتنی بے رحمانہ دھمکی نہ دو۔ میں وعدہ خلاف نہیں ہوں مگر تم بھی یہ وعدہ کرو کہ سیموئیل کو ہلاک نہیں کرو گے۔"

"وہ کیوں؟"

"میں کسی انسان کے قتل میں فریق بننے سے نفرت کرتی ہوں میرا ضمیر مجھ پر ہمیشہ لعنت کرتا رہے گا کہ میں... اپنی دولت نیوں کے عوض ایک آدمی کے قتل میں شریک ہوئی۔"

"ہاں ہاں... ہم اسے ہلاک نہیں کریں گے۔" مجھ سے پہلے عبداللہ بول پڑا۔ "اگر اس نے سیدھی طرح معافی مانگ لی تو تھوڑی دیر بعد رہا ہوجائے گا۔ ورنہ دو چار دن میں ہم اس کے کس بل نکال دیں گے۔ تم کم از کم چار دن انتظار کرو گی۔"

"کس بات کا؟"

"سیموئیل کی واپسی کا۔" عبداللہ بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ دو دن غائب رہے اور تم یہ سمجھ لو کہ ہم نے اسے مار کر کہیں دبا دیا ہے۔"

"تم دونوں چہرے مہرے سے تو قاتل نہیں لگتے۔"

ساری باتیں طے پاگئی تھیں۔ عبداللہ بھی میرا ہم خیال تھا لہٰذا مارجوری کو ایک ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب اتار دیا گیا اور ہم لوگ آگے بڑھ گئے۔

"آج زبردست شکار ہوا ہے۔" عبداللہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔ "سالا ہمیں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔"

"مگر آج تم نے طوائف کی اصلیت دیکھی۔ وہ مرد کو کیسے کیسے تازیانے لگاتی ہے۔ اسے سیموئیل سے زیادہ اپنے کام اور گاہکوں کی فکر لاحق ہے حالانکہ وہ اس سے شادی کے لیے تیار ہے۔"

"عورت کا یہ روپ دیکھ کر تو اس صنف سے کراہت ہونے لگتی ہے۔"

"عورت ہی نہیں تمہیں اس قماش کے مرد بھی ملیں گے اور ان کا تناسب شاید زیادہ ہی نکلے گا۔" میں نے اس کی یک طرفہ رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے چھوڑو اور اب یہ بتاؤ کہ اس مردود کا کیا کرنا ہے؟"

"اسے کسی ویرانے میں لے چلو، ہمارے محفوظ ٹھکانے تو پہلے ہی مخدوش ہوچکے ہیں۔"

"اپنے فلیٹ پر کیوں نہ چلوں؟"

"وہاں اس پر تشدد نہ ہوسکے گا، اگر یہ اودھم بازی پر اتر آیا تو ہم فلیٹ سے بھی ہاتھ دھو لیں گے۔"

"تشدد کی تو تم فکر نہ کرو، میرے دماغ میں بڑی اچھوتی تجویز ہے مسئلہ صرف یہ ہے کہ اگر اسے لے جاتے ہوئے کار ریلو میرے فلیٹ کے آس پاس

موجود ہوا تو سارا کیا دھرا چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔"

"مگر ابھی تک تمہارا فلیٹ اس کی نظروں میں نہیں آیا ہے۔"

"اس سے کچھ بعید نہیں۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ کام کرنے کا عادی ہے۔"

"چارلس بک ہارٹ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ سیموئیل ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"وہ اسے تمہارے فلیٹ تک پہنچانے کی کوئی صورت نکال لے گا۔"

"تمہاری کھوپڑی واقعی کارآمد ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ہنگامی صورتحال میں ذہن سے کام لینا خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

"سیموئیل فوری طور پر تو ہوش میں نہ آ سکے گا نا؟"

"بے فکر رہو فلیٹ پہنچنے کے بعد بھی کافی انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تو آؤ تم ذرا ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لو۔ مجھے کسی فون بوتھ پر اتار کر آگے نکل جانا۔ دس منٹ بعد آ گئے تو میں دوبارہ تمہارے ساتھ ہوں گا۔"

میں نے نیچے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو یخ بستہ ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔ گرم کار میں خاصا وقت گزارنے کے بعد وہ سردی ناقابل برداشت ثابت ہوئی تھی۔ کار اندر سے خاصی گرم تھی مگر اس کے شیشوں پر کہر کی سی تہہ جمی ہوئی تھی جس کے باعث کسی اور بھی گاڑی سے بھی اس وقت تک سیموئیل کے بے ہوش جسم کو پائیدان پر پڑا نہیں دیکھا جا سکتا تھا جب تک کار میں تیز روشنی نہ کی جائے۔

چند ہی منٹ بعد ایک فون بوتھ پر مخصوص روشنی نظر آئی اور میں نے عبداللہ کو اتار دیا۔ اور خود سڑک پر آگے بڑھتا چلا گیا۔

میں ایک لمبا چکر لگا کر واپس آیا تو عبداللہ میرا منتظر تھا۔

"میری تو قلفی جم گئی۔" وہ دروازہ کھول کر پھرتی سے اندر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مگر خوشی اس بات کی ہے کہ کام بن گیا۔"

"چارلس سے بات ہو گئی؟"

"ہاں اس نے ایک لاجواب ترکیب بتائی ہے۔ ہم سیموئیل کو ایک ڈاکٹر کے مطب پر چھوڑ دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے آدمی ایمبولینس میں میرے فلیٹ پر پہنچیں گے اور بے ہوش سیموئیل کو کسی مریض کی طرح اسٹریچر پر ڈال کر میرے فلیٹ میں لے آئیں گے، دیکھنے والوں کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہو سکے گا۔"

"واقعی لاجواب تجویز ہے مگر وہ کونسا ڈاکٹر ہے جو اس غیر قانونی کام میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہو جائے گا؟"

"وہ چارلس کے ذاتی معالج کا سیکرٹری ہے آج کل ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں محض رسماً کلینک کھولتا ہے۔ بہرحال ہمیں اس سے کوئی غرض نہ ہونی چاہیے یہ سب چارلس کا دردِ سر ہے۔" عبداللہ نے لاپرواہی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد عبداللہ نے ایک خوبصورت کلینک کے سامنے گاڑی رکوا دی۔ پھاٹک پر موجود شخص نے کار کا نمبر دیکھتے ہی ہاتھ ہلا کر گاڑی اندر لے جانے کا اشارہ کیا اور میں نے ایمبولینس گاڑیوں کے قریب کار روک دی۔ کلینک کے دروازے پر ایک قوی الجثہ شخص سوٹ پہنے موجود تھا وہ کسی ڈاکٹر کے سیکرٹری کے بجائے لڑاکا پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو میل نرس موجود تھے۔

"سیموئیل چارلس؟" قوی الجثہ شخص نے تیزی سے کھڑکی کے قریب آ کر سرگوشیانہ لہجے میں دریافت کیا۔

اثبات میں جواب ملتے ہی اس نے مریض کے بارے میں پوچھا۔ پھر اس کے اشارے پر بے ہوش سیموئیل کو پائیدان سے باہر کھینچ لیا گیا۔

بمشکل دو منٹ بعد ہم اپنے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کر کے واپس فلیٹ کی طرف جا رہے تھے۔

"وہ لوگ تمہارا فلیٹ کیسے تلاش کریں گے؟"

"اسے بھول جاؤ، میں نے کہا نا کہ یہ سب چارلس بک ہارٹ کا درد سر ہے۔" عبداللہ نے جواب دیا۔ "وہ کچے کام نہیں کرتا۔"

ہم دونوں کو فلیٹ پر پہنچے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ چارلس بھی وہاں آ موجود ہوا۔ اس کے چہرے سے خاصی شگفتگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ سیموئیل سائے کار ڈیلو کے لیے اب بھی کام کر رہا ہے؟" رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد چارلس نے دریافت کیا۔

"کئی باتیں ایسی ہیں جو ہمارے نظریے کی تائید کرتی ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"مثلاً؟" چارلس نے پوچھا۔

عبداللہ فوراً میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "ذرا چارلس کو تفصیل بتاؤ۔ میں تو ایک نتیجہ اخذ کرنے کے بعد دلائل بھول جاتا ہوں۔"

"اول تو ان دنوں سیموئیل کے پاس اچانک پیسے کی ریل پیل ہو گئی ہے اور جو کال گرل اسے مفلسی کی وجہ سے قریب نہیں پھٹکنے دیتی تھی اب ایک ملک کے لیے اسی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس نے ہم دونوں کو بظاہر پہلی بار دیکھا تھا اور ہم نے فرضی ناموں سے اپنا تعارف کرایا تھا مگر اس کے باوجود سیموئیل ہمیں پہچان گیا۔" میں نے کہا۔

"دوسرا نکتہ بہت اہم ہے۔" چارلس بولا۔ "کیا وہ کھل کر مقابلے پر آ گیا تھا؟"

اس پر میں نے اختصار کے ساتھ مارجوری کی قیام گاہ پر پیش آنے والے واقعات چارلس کے سامنے دہرا دیئے۔

"میرا خیال ہے کہ وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔" چارلس نے تبصرہ کیا۔ "تمہاری گفتگو سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ سیموئیل خاصا سخت جان ثابت ہوگا۔"

"میں اس پر تشدد کا ایک نیا طریقہ آزماؤں گا۔" عبداللہ نے مسکرا کر کہا۔

"اپنے طریقے کی وضاحت نہیں کرو گے؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"تم نے ایپاکسی اسٹیل کا نام سنا ہے؟"

"یہ میرے لیے نیا نام ہے۔"

"یہ دو قسم کے پیسٹ ملا کر بنایا جاتا ہے اور دھات کی ٹوٹی ہوئی یا تڑی مڑی چیزوں کو چند گھنٹے میں انتہائی مضبوطی سے جوڑ دیتا ہے۔"

"مگر تشدد سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں اس کے بازوؤں کو پیسٹ اور پسلیوں سے جوڑ دوں گا۔ اس کے کانوں کے سوراخ اور نتھنے بند کر دوں گا اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آیا تو اس کے ہونٹوں پر پیسٹ چپکا کر یکے بعد دیگرے اس کی دونوں آنکھوں پر بھی ایپاکسی اسٹیل کا لیپ چڑھا دوں گا۔"

"اور یہ لیپ آسانی سے نہ نکل سکے گا؟" میں نے پھریری لے کر سوال کیا۔

"اسے کوئی سرجن ہی آپریشن کے ذریعے نکالے تو نکالے ورنہ دو گھنٹے میں ایپاکسی اسٹیل سوکھ کر لوہے کی طرح سخت اور مضبوط ہو جائے گا۔"

"بڑی شاندار ترکیب ہے۔" چارلس تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر وہ زندہ ہاتھ آ جائے تو یہ ترکیب اس پر آزمانی چاہیے۔ کس قدر اذیت ناک صورتحال ہوگی کہ اس کی بینائی درست ہوگی مگر آنکھیں کھول کر کوئی چیز دیکھنے کے لیے اسے سرجری کے ذریعے اپنی جلد کے خاصے حصے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ ترکیب تو دشمن کو زندہ درگور کرنے کے برابر ہے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو وہ آدمی اسٹریچر پر کمبل میں لپٹے ہوئے ایک شخص کو لیے موجود تھے۔

کوئی بھی لفظ کہے بغیر وہ اندر آ گئے اور عبداللہ کی ہدایت پر سیموئیل کو اندرونی کمرے کے قالین پر ڈال کر واپس چلے گئے۔

عبداللہ کے پاس ایپاکسی اسٹیل کی خاصی مقدار موجود تھی۔ اس نے الگ الگ رنگ کے دو پیسٹ نما مادوں کو ملا کر لیپ تیار کیا اور پھر سیموئیل کی داہنی ہتھیلی اور انگلیوں کے درمیان ایپاکسی اسٹیل لگا کر اس کی مٹھی بند کی اور پھر اسی حالت میں اسے پٹیوں سے جکڑ دیا۔ چارلس سگریٹ سلگائے ہوئے دلچسپی کے ساتھ ساری کارروائی دیکھتا رہا۔

"یہ جب تک ہوش میں آئے گا، اس کی مٹھی اسی حالت میں جڑ چکی ہوگی۔" عبداللہ نے اپنا کام ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پہلے کبھی ایسا تجربہ کیا تھا؟" چارلس ایپاکسی اسٹیل جیسی بے ضرر چیز کے اذیت رساں استعمال سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔

"بڑے عشق ہے۔" عبداللہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

"میری یہاں موجودگی ضروری تو نہیں ہے؟" چارلس نے پوچھا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس وقت کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ میں شہزادی کو ٹالتے ہوئے حفاظتی عملے کو جل دے کر میرے ساتھ آئی ہے۔ اب وہ لوگ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ اس سے قبل کہ وہ لوگ اس کی بو سونگھتے یہیں پہنچ جائیں مجھے مہلت کا فائدہ اٹھا لینے دو۔"

"اللہ ہر شخص کو شہزادیوں کے عذاب سے محفوظ رکھے۔" عبداللہ باتھ روم سے نکلتے ہوئے بولا۔ "جاؤ ہم تمہاری مغفرت کی دعا کریں گے۔"

چارلس واپس چلا گیا اور ہم دونوں سیموئیل کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے جو قالین پر بے سدھ پڑا تھا۔

اچانک ہی عبداللہ کو سب سے اہم اقدام کا خیال آیا اور اس نے سیموئیل کی جیبوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

اس کی جیبوں سے سات ہزار فرانک کی رقم کے علاوہ ایک چھوٹا خودکار ریوالور اور بلیڈ پھل والا کھٹکے دار چاقو بھی برآمد ہوا۔ پیرس میں مارجوری کے ساتھ اس کی ایک پرانی تصویر موجود تھی۔ اس کے نیچے مارجوری کی مزید کئی تصاویر تھیں اور اسی خانے میں ایک کاغذ پر بہت سے الٹے سیدھے نام اور پتے درج تھے۔

عبداللہ نے غور سے اس کاغذ کا جائزہ لیا تو اس پر پتوں کے ساتھ دو فون نمبر بھی ملے اور وہ فوراً ہی فون کی طرف متوجہ ہوا۔

ان میں سے ایک نمبر مارجوری کے گھر کا ثابت ہوا۔ دوسرا کسی بار روم کے کاؤنٹر کا تھا۔

سیموئیل ہوش میں آیا تو خود کو ایک اجنبی جگہ پر ہم دونوں کے درمیان دیکھ کر بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

عبداللہ کے فلیٹ کا وہ اندرونی کمرہ اس طرح بنا ہوا تھا کہ وہاں سے باہر کا کوئی منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا محض اوپری فلیٹ میں ہونے والی آہٹوں سے یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کمرہ کئی منزلہ عمارت میں واقع ہے مگر عبداللہ نے اس امکان کو عارضی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے سیموئیل کو بتایا کہ وہ اس وقت ایک دور افتادہ، ویران دیہی علاقے میں قید ہے جہاں اسے ذبح بھی کر دیا جائے تو دور دور تک اس کی آواز بھی نہیں سنی جا سکے گی۔

اسی وقت سیموئیل کو اپنے داہنے ہاتھ کا ہوش آیا۔ جب وہ کافی کوشش کے باوجود اپنی مٹھی کھولنے میں ناکام رہا تو اس نے بائیں ہاتھ سے تمام پٹیاں نوچ ڈالیں مگر اس وقت تک ایپاکسی اسٹیل سوکھ کر لوہے کی سی مضبوطی اختیار کر چکا تھا۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟" وہ اپنا داہنا ہاتھ عبداللہ کی طرف پھیلا کر غرایا۔ "میرا ہاتھ کھولو۔"

"یہ معذور کرنے کا بے ضرر طریقہ ہے۔" عبداللہ خشک لہجے میں بولا۔ "تمہارا ہاتھ کوئی ماہر سرجن ہی کھول سکے گا۔"

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"تمہارا اچار ڈال کر تمہاری محبوبہ مارجوری کو بھجوائیں گے۔"

"مجھ پر ہاتھ ڈال کر تم بڑی مصیبت کو دعوت دے بیٹھے ہو۔"

اس کا لہجہ بدستور دھمکی آمیز تھا۔ شاید وہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

"پہلے بتایا ہوتا تو احتیاط کرتے، اب تو مجبوری ہے!"

"ڈاکٹر آسکر! میرا ہاتھ ٹھیک کردو" اس بار وہ مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوا۔

"اخاہ۔ تو تم میرے پرانے شناسا ہو" میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا" مارجوری کے گھر پر تو میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ تم مجھے جوئیل ایلازار سمجھ رہے ہو"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مارجوری کے گھر پر کوئی پیش قدمی کرو گے۔ اگر اس وقت میں محتاط رہتا تو وہی عمارت تمہارا مقبرہ بن جاتی"

"بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ کارڈیلو کہاں ملے گا؟"

"وہ تمہاری پہنچ سے باہر جا چکا ہے!"

"ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں، تم اس کا پتہ بتاؤ"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اس وقت نیس میں نہیں ہے"

اُسے کافی دھمکیاں دی گئیں مگر وہ اسی بیان پر اڑا رہا۔ آخر اُسے دھوکا دے کر تھوڑی سی جدوجہد کے بعد پھر بے ہوش کر دیا گیا۔ اس بار عبداللہ نے اس کے داہنے کان اور نتھنے میں ابلا کسی اسٹیل اچھی طرح بھر دیا اس کے بعد وہ سیموئیل کے دونوں بازوؤں کو سینے سے چپکانے پر مصر تھا مگر میں بمشکل اسے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ عبداللہ چاہتا تھا کہ سیموئیل جب تک زندہ رہے، اسرائیلی مفادات کے لئے کام کرنے والوں کے لئے عبرتناک مثال بنا رہے۔

اگر سیموئیل کے بدن کے تمام اعضا کو آپس میں جوڑ کر اُسے گوشت اور ہڈیوں کے ایک زندہ مگر اندھے، بہرے، لنگڑے اور لولے انبار میں بدل دیا جاتا تو وہ اسرائیلی اہلکاروں کے لئے عبرت کی روح فرسا مثال تو ضرور بن جاتا مگر اسرائیلی پریس اور حکام اس کے وجود کو فلسطینی بربریت اور درندگی کا ایک مظلوم شاہکار قرار دے کر عالمی رائے عامہ کی ہمدردیاں فلسطینی تحریک کے خلاف کرنے کی کوشش ضرور کرتے اور ان کی تشہیری مہم یقیناً کامیابی حاصل کرتی اس پہلو کے پیشِ نظر مناسب یہی تھا کہ دشمن کے ہرکاروں کو ہلاک ہی کر دیا جائے۔

رات کے دو بجے جب سیموئیل دوبارہ ہوش میں آیا تو شاید پہلی بار اسے خطرناک صورتحال کا اندازہ ہوا کیونکہ اس کا داہنا کان اور نتھنا بالکل ٹھوس مادے سے بند ہو چکا تھا۔

اور جب عبداللہ نے اس کارروائی کے اگلے حصوں پر روشنی ڈالنی شروع کی تو وہ وحشت زدہ انداز میں زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا۔

"اب تو میرا کان صاف کرنے کی صورت بتا دو۔ اس کان سے مجھے کچھ نہیں سنائی دے رہا!" رائے کارڈیلو کا ٹھکانا بتانے کے بعد وہ کراہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا دوسرا کان صحیح سلامت ہے جو تمہارے کان میں ڈالا گیا وہ اتنا گاڑھا تھا کہ بہہ کر تمہارے دماغ تک نہیں اترا ورنہ تمہاری زندگی عذاب ہو جاتی"

"کم از کم اتنا بتا دو کہ وہ تھا کیا؟"

"پگھلا ہوا لوہا!"

"نہیں!" وہ پھریری لے کر خوفزدہ انداز میں اُچھل پڑا اور اس کا بایاں ہاتھ بے اختیار داہنے کان کو ٹٹولنے لگا۔

عبداللہ ہنس پڑا" گھبراؤ نہیں۔ وہ پگھلا ہوا سرد لوہا تھا تمہارے جسم پر آبلے کہیں بھی نہ نکل سکیں گے، یہ ہمارا جدید ترین ہتھیار ہے"

"اب تم یہ بتاؤ کہ ہمارے بارے میں کارڈیلو تم سے کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے باز پرس کے دوسرے دور کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اسے چھپنے کا ٹھکانا میں نے فراہم کیا ہے اور دو مسلح آدمی اس کی حفاظت پر مامور ہیں وہ تم دونوں کے حلیئے مجھے بتا چکا ہے پیشہ ور قاتل میرے ایما پر شہر بھر میں تم دونوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں"

"وہ مجھے بھی مروانا چاہتا ہے"

"تمہارے ساتھی کو تو قتل ہی کرانا تھا اور تمہارے لئے اغوا کی کوشش میں ناکامی کے بعد ہی قتل کرنے کی ہدایت دی گئی تھی"

"اور ان انتظامات کے لئے اس نے تمہیں خطیر معاوضہ ادا کیا ہے؟"

"مجھے منہ مانگی رقم دی گئی تھی"

"دھماکا خیز خطوط کس نے بھیجے تھے؟"

"وہ میں نے فراہم کئے تھے اور کارڈیلو نے خود پوسٹ کئے تھے"

"تمہارے کرائے کے آدمی کس بنیاد پر ہمیں تلاش کر رہے ہیں؟"

"ان چاروں کو تمہارے نام اور حلیئے بتائے گئے ہیں۔ شاید ان میں سے کوئی ہوٹل ڈی ریمی بھی پہنچا ہو کیونکہ تمہارا آخری ٹھکانا وہی تھا"

"ڈی ریمی کا نام آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ انہیں بڑا اغوا ہو گا" عبداللہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں انہیں سات سو فرانک فی کس دیئے گئے ہیں" وہ اپنے نتھنے کو مسلتے ہوئے بولا" تمہیں مارنے والے کو منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا گیا تھا جب کہ ڈاکٹر آسکر کو اغوا کرنے والے کو ... فرانک تک اور مارنے والے کو ڈیڑھ ہزار فرانک تک ملتے"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کارڈیلو تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ زیادہ رقم ... وہ لوگ اغوا کی جان توڑ کوشش کریں گے ورنہ سراغ پانے ... گولی مار دینا تو بہت آسان بات ہے"

"تم یہودی ضرور ہو مگر خاصے عقلمند ہو" میں نے اس کی تعریف کر ڈالی "ان معلومات کے صلے میں تمہاری جان بچ گئی ہے مگر تم اس وقت تک ہماری قید میں رہو گے جب تک کارڈیلو کا قصہ نہیں نمٹ جاتا"

"میں یہودی والدین کی اولاد ضرور ہوں مگر صیہونی نہیں" وہ بولا "میں کارڈیلو کے لئے پیسے کی خاطر کام کر رہا تھا۔ اگر تم معقول معاوضے کی ادائیگی کے لئے تیار ہو تو میں تمہارے لئے کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے قید میں رکھ کر تم شاید ہی کارڈیلو کو گھیر سکو"

"وہ کیوں؟"

"اسے اب تک میرے اغوا کا علم ہو گیا ہو گا۔ وہ کسی چیتے کی طرح مکار ہے"

"اسے کیسے علم ہو سکتا ہے؟"

"میری ایک ڈیوٹی یہ بھی ہے کہ ہر روز دوپہر کے بارہ بجے اور رات کے دس بجے اسے فون کر کے تازہ ترین ہدایات لوں۔ آج رات دس بجے میں اُسے فون نہیں کر سکا لہٰذا وہ سمجھ گیا ہو گا کہ میرے ساتھ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے اور پھر اس نے میرے بارے میں مارجوری کو فون کیا ہو گا"

"مارجوری اُسے ایک لفظ بھی نہ بتائے گی، وہ پیشہ ور طوائف ہے اور خود کسی ہنگامے میں ملوث ہونا پسند نہیں کرتی"

"تو کیا تم نے اُسے مجبور کیا تھا؟" سیموئیل یہ سنتے ہی بے چین ہو گیا۔

"یہی سمجھ لو!"

"پھر مارجوری خطرے میں ہے" وہ مضطربانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ "کارڈیلو کو دھوکا دینا مارجوری جیسی لڑکیوں کے بس کی بات نہیں ہے اگر اُسے شبہ ہو گیا کہ مارجوری اُسے ٹال رہی ہے تو وہ اس پر اب تک ہاتھ ڈال چکا ہو گا"

"تم کارڈیلو کو ڈبل کراس کرنے کے لئے ہم سے کتنا معاوضہ چاہتے ہو؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا" پہلے میں مارجوری کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ کارڈیلو کے ہاتھ لگ گئی ہے تو پھر مجھے خود اس سے نمٹنا ہو گا۔ ایسی صورت میں تم جو دے دو گے وہ خوشی کے ساتھ قبول کر لوں گا"

اس کا داہنا ہاتھ انگلیاں جڑ جانے کے سبب ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا لہٰذا عبداللہ نے اس کا بتایا ہوا مارجوری کا نمبر ملا کر فون کا ریسیور اسے تھما دیا اور میں نے اسی لائن پر دوسرے انسٹرومنٹ کا ریسیور سنبھال لیا جو بعد میں عبداللہ نے لے لیا اور میں نے بھی تعرض نہ کیا کیونکہ گفتگو فرانسیسی میں ہو رہی تھی جو میرے لئے بے معنی تھی۔

فون پر بات شروع ہوئی اور دو تین ہی فقروں کے بعد سیموئیل کے لہجے میں تحیّر کے ساتھ پریشانی سمٹ آئی۔ مختصر سی گفتگو کے بعد اس نے ریسیور رکھا تو اس کا چہرہ اترا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جیسے اس نے کوئی بُری خبر سُن لی ہو۔

"سیموئیل کا خیال درست تھا، مارجوری غائب ہے" عبداللہ نے انکشاف کیا۔

"وہ کیسے؟"

"گیارہ بجے کسی گمنام شخص نے سیموئیل کے لئے فون کیا تھا جسے بتایا گیا کہ وہ سیموئیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ پھر اس نے مارجوری سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مارجوری نے اُسے بتایا کہ سیموئیل دوپہر سے واپس نہیں لوٹا" عبداللہ بتانے لگا" پھر ساڑھے گیارہ بجے قریبی پولیس اسٹیشن کے افسر کا فون آیا اس نے بتایا کہ ایک سڑک سے سیموئیل کی کچلی ہوئی لاش ملی ہے جس کی شناخت کرانی ہے مارجوری بوکھلائی ہوئی حالت میں روانہ ہوئی اور ابھی تک واپس نہیں لوٹی! اس کے آدمیوں نے پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کیا تو وہ لوگ کسی بھی فون کال سے یکسر لاعلم ہیں"

"تو بہتر صورت یہ ہو گی کہ سیموئیل اب کارڈیلو کو فون کرے" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ مارجوری اُسے دھوکا نہ دے سکے گی۔ اب تک اس نے اپنی زبان کھول دی ہو گی" سیموئیل کا لہجہ غم آلود تھا۔

پھر اس نے کارڈیلو سے بھی بات کی جو عبداللہ دوسرے فون پر سنتا رہا۔ کارڈیلو نے سیموئیل کا نام سننے کے بعد بس اس قدر کہا کہ وہ فوراً اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ سیموئیل نے دوبارہ سلسلہ ملاتے ہی مارجوری کے بارے میں دریافت کیا تو کارڈیلو نے اُسے بری طرح پھٹکار کر کہا کہ وہ کسی مارجوری کو نہیں جانتا اور اگر اُسے تیسری بار فون کیا گیا تو وہ سیموئیل کی زندگی برباد کر دے گا۔

تیسری بار میں نے نمبر ملایا جس کا جواب نہ ملا۔ میں کافی دیر تک مسلسل کوشش کرتا رہا مگر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ شاید کارڈیلو نے فون کا ریسیور ہی کریڈل سے ہٹا دیا تھا۔

"شاید وہ میری طرف سے بھڑک گیا ہے۔ اگر ہم نے تاخیر کی تو وہ مارجوری کو مار ڈالے گا" سیموئیل اپنا دکھ بھول کر اپنی بے وفا محبوبہ کے فراق میں بے چین ہوا جا رہا تھا۔

"تم سے بھڑکنے کی وجہ؟" میں نے سوال کیا

"وہ دو اور دو چار کرنے کا ماہر ہے۔ مارجوری سے تم دونوں کا حلیہ سن کر وہ سمجھ گیا ہو گا کہ میں اس کے حریفوں کے ہاتھ پڑ گیا ہوں

اگر میری وفاداری کی طرف سے مشکوک نہ بھی ہوا تو یہی سمجھا ہو گا کہ مجھے تم لوگ زبردستی اُسے فون کرنے پہ مجبور کر رہے ہو۔"

"پھر تو ہمارے پہنچنے تک اپنا ٹھکانا بھی چھوڑ چکا ہو گا۔"

"اتنی جلدی وہ مار خوری کو ساتھ نہ لے جا سکے گا۔"

"تو پھر تم یہیں رہو گے، ہم اُسے دیکھیں گے۔"

"خدا کے لئے مجھے ساتھ لے چلو میں تمہیں دغا نہیں دوں گا۔"

"تمہیں ساتھ لے جا کر ہم دوہرا جوا نہیں کھیل سکتے۔"

"اس کے دونوں محافظ تمہیں دُور سے دیکھتے ہی بھون ڈالیں گے مجھے ساتھ لے چلو گے تو وہ تم پر ہتھیار نہیں اٹھا سکیں گے۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے اسے ساتھ لے لو۔" عبداللہ نے کہا۔

ہم تینوں خاصا اسلحہ ساتھ لے کر نہایت عجلت کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ رات کا آخری پہر بیت رہا تھا۔ شہر پہ کہر کی گہری چادر چھائی ہوئی تھی اور سڑکیں ویران پڑی ہوئی تھیں۔ عبداللہ کار کو ہوا کے دوش پر اڑائے لیے جا رہا تھا۔

قلیل سے عرصے میں ہم شہر سے باہر نکل آئے اور پختہ سڑک کے بجائے پہاڑیوں کے دامن میں بنے ہوئے راستے پر آ گئے۔

وہاں گہری دھند کے باعث عبداللہ کو محتاط ڈرائیونگ کرنی پڑی۔ کیونکہ ہر چالیس پچاس گز کے بعد اچانک سامنے کوئی سرسبز گھری ڈھلان آ جاتی تھی اور پھر سفر کو جاری رکھنے کیلئے کار کو سیموئیل کی ہدایت پر موڑنا پڑ جاتا تھا۔

"اگر وہ اسی علاقے میں ہے تو میلوں دُور سے گاڑی کے انجن کی گونج سن کر ہوشیار ہو جائے گا۔" عبداللہ نے کہا۔

"میں تمہیں مختصر راستے سے لے جا رہا ہوں۔" سیموئیل بولا۔ "چند منٹ بعد ہم چٹانیں عبور کر کے ایک میدان میں جا نکلیں گے وہ میدان سے آگے ایک ویران زرعی فارم میں رہ رہا ہے۔"

"تو کیا وہاں تک کار ڈرائیو کرتے ہوئے جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے چونک کر اس سے دریافت کیا۔

"میں احمق نہیں ہوں۔ کار میں تین ہوئے دیکھ کر محافظ دور سے ہی اسٹین گن کا فائر کھول دیں گے۔ گاڑی ہم جھاڑیوں میں چھوڑ دیں گے۔"

پہاڑی سلسلہ عبور کرنے کے بعد گاڑی کی تمام روشنیاں بجھا دی گئیں اور تاروں کی مدھم چھاؤں میں سفر جاری رہا۔

ایک مقام پر سیموئیل کی ہدایت پر کار جھاڑیوں کی اوٹ میں روک دی گئی اور ہم لوگ کارتوسوں کی پیٹیاں کندھوں پر ڈال کر پیدل ہی آگے بڑھنے لگے۔ میں راستے میں ہی کئی چرمی پیٹیوں سے کارتوس نکال کر اوور کوٹ کی جیبوں میں بھر چکا تھا۔

"اگر مجھے اس ماحول کا اندازہ ہوتا تو کم از کم ایک رائفل ضرور ساتھ لے لیتا۔ ہمارے پستول زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکیں گے۔" چلتے چلتے میں بڑبڑایا۔

"ہم دشمن کو للکار کر مورچہ بند مقابلہ کرنے نہیں آئے۔ اگر ہم چپکے سے یہیں ان کے سروں پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو محض چاقو بھی کام دے جائے گا۔" سیموئیل بولا۔

"اور اگر وہ تینوں سوتے ہوئے مل گئے تو شاید چاقو کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔" عبداللہ جلے کٹے لہجے میں بولا اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں دھند میں روشنی کا ایک یرقان زدہ مدھم سا ہالہ نظر آنے لگا اور سیموئیل نے بتایا کہ پتھروں سے بنا ہوا وہی مکان کارویلو کی پناہ گاہ ہے۔

"تم لوگ پیچھے رکنا۔ پہلے میں تنہا آگے جاؤں گا اور اگر محافظ بیدار ہوئے تو مجھے پہچان لیں گے اور میں کسی طرح انہیں زیر کر لوں گا اور دو مرتبہ الو کی آواز کا سگنل سن کر تم آگے بڑھتے چلے آنا۔"

"اور اگر وہاں پہنچ کر تم کارویلو سے مل گئے تو سگنل ہمارے لئے موت کا پھندا بن جائے گا۔ نہیں میرے عزیز ایسی احمقانہ باتیں مت کرو۔" عبداللہ بولا۔

"مجھے ساتھ چلنے میں کوئی عذر نہیں مگر تین سائے ان کو فائرنگ کرنے پر اکسا دیں گے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔

"کوشش کرتے ہیں کہ ہم ان کی نظروں میں آئے بغیر عمارت تک پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں گہری دھند بھی ہمارا ساتھ دے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ سیموئیل کی بات مان لو۔" اس مرتبہ میں نے سفارش کی۔ "اگر یہ ہمیں فریب دینے کی کوشش کرے گا تو ہماری ہی گولی سے مارا جائے گا، ہم دس پندرہ فٹ کے فاصلے سے اس کے پیچھے چلیں گے۔"

"ہاں یہ تجویز درست ہے۔ اس دھند میں دس فٹ کا فاصلہ بھی کافی ہو گا۔ تم نہ صرف مجھے دیکھتے رہو گے بلکہ میری آواز بھی سن سکو گے اگر مجھے کوئی نظر آ گیا تو میں دُور ہی سے اسے پکار لوں گا اور تم بلاتکلف ردِ کر دو گے۔"

اس تجویز پر اتفاق رائے ہوتے ہی عمل درآمد شروع ہو گیا۔ سیموئیل کسی فاتح جنرل کی شان سے آگے نکل گیا اور ہم مناسب فاصلے سے اس کے پیچھے ہو لئے۔

رات کے پرہول سناٹے میں ہمارے قدموں کی دبی دبی چاپ بہت پراسرار محسوس ہو رہی تھی جیسے مجرم روحیں درختوں کے درمیان پھر رہی ہوں۔ ہمارا بڑھتا ہوا ہر قدم ہمیں موت یا کامرانی کی منزل سے قریب تر لے... جا رہا تھا اور میں شدید ٹھنڈ کے باوجود اپنی کنپٹیوں پہ عجیب سی حرارت محسوس کر رہا تھا۔

وہ سنسنی خیز پیش قدمی کافی دیر جاری رہی۔ یرقان زدہ روشن ہالے نے نمایاں ہو کر لیمپ کی صورت اختیار کر لی تھی مگر وہ عمارت اب بھی کہر آلود اندھیرے میں چھپی ہوئی تھی۔

اور پھر اچانک فضا اسٹین گن کے مہیب شور سے لرز اٹھی ہم دونوں بے اختیار سینے کے بل زمین پر گر گئے اور اسی وقت فائرنگ کے تسلسل میں سیموئیل بڑے کی لرزہ خیز چیخ سُنائی دی اور اس کا چھلنی بدن فضا میں اچھل کر زمین پر گر گیا۔

سیموئیل کا خاتمہ کرنے کے ساتھ ہی اسٹین گن کا رُخ نیم دائرے کی صورت میں آہستہ آہستہ بدلتا چلا گیا اور پھر ایک اور اسٹین گن چل پڑی جو دائرے کا دوسرا حصہ کور کر رہی تھی۔ بہت سی گولیاں زناٹے کے ساتھ ہمارے آس پاس سے گزریں مگر ہمیں کوئی خراش نہ آ سکی جس سے اندازہ ہوا کہ فائرنگ کسی بلند مقام کے بجائے سطح زمین سے کی جا رہی تھی۔

تقریباً نصف منٹ کے بعد دونوں اسٹین گنز خاموش ہو گئیں۔

ہم دونوں بدستور خاموشی سے زمین پر پڑے رہے۔ سیموئیل کی جانب سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی وہ جس انداز میں چیخ مار کر زمین پر ڈھیر ہوا تھا اس کے پیش نظر قوی امکان یہی تھا کہ وہ مر گیا ہو گا۔

"بُرے پھنسے ڈاکٹر!" عبداللہ میرے کان کے نیچے سرگوشیانہ آواز میں منمنایا۔

"چپ چاپ پڑے رہو۔" میں نے کہنی سے ٹھوکا دیا۔ "تم اپنا منہ پیچھے کر لو تاکہ ادھر سے بے خبری میں ہم پر کوئی نہ آ پڑے۔"

"اسی طرح، پیٹ کے بل۔"

"ہاں جلدی کرو۔" میں نے سرگوشی کی۔ "دو آدمیوں نے فائرنگ کی ہے جبکہ عمارت میں تین آدمی ہونے چاہئیں، ہو سکتا ہے کہ کارویلو نقل اور حرکت میں سنبھالے یہیں کہیں گھوم رہا ہو۔"

ہم دونوں کو اسی مضحکہ خیز حالت میں پڑے پڑے کافی دیر گزر گئی مگر وہاں پھیلے ہوئے موت کے سناٹے میں کوئی آواز تو درکنار کوئی سانس تک نہ سنائی دی۔

میرا خیال تھا کہ سیموئیل کو مارنے کے بعد کوئی نہ کوئی اپنے کارنامے کا جائزہ لینے اس کی لاش کے قریب ضرور آئے گا مگر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے فائرنگ کرنے والے ایک آدمی کے لہو کی بھینٹ لینے کے بعد اطمینان سے کہیں جا سوئے تھے۔

زمین کی خنکی اوور کوٹ کی موٹی تہہ عبور کر کے آہستہ آہستہ میری ہڈیوں میں سرایت کرنے لگی تھی مگر اسٹین گن کی ہیبت مجھے یونہی پڑے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

محاذ پر طاری سناٹے سے کم از کم ایک بات ثابت ہو گئی تھی کہ ہم کو دیکھا نہیں گیا تھا مگر پھر بھی دشمن انتہائی مکار تھا۔ وہ لاش کے بارے میں کوئی اقدام کرنے سے پہلے پورا یقین کر لینا چاہتے تھے کہ مرنے والے کے قرب و جوار میں اس کا کوئی ہمدرد موجود نہیں ہے۔

سیموئیل بیچارہ محض اعتماد کے باعث مارا گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اُس کے متعین کئے ہوئے مسلح محافظ اسے پہچان کر فائر نہیں کریں گے مگر کارویلو نے شاید انہیں حکم دے رکھا تھا کہ کسی بھی قیمت پر کوئی خطرہ مول نہ لیں اور شاید اسی طرح قدرت کو ہماری حفاظت بھی منظور تھی۔

اگر سیموئیل ضد نہ کرتا اور میں عبداللہ کی مخالفت کے باوجود اس کی تجویز کی حمایت نہ کرتا تو ہم تینوں ایک ساتھ پیش قدمی کرتے اور اس وقت ایک کی جگہ تین لاشیں پڑی ہوتیں۔

ایک ایک لمحہ میرے لئے کٹھن ثابت ہو رہا تھا مگر ہم دونوں اس وقت ایسی بُری صورت حال سے دوچار تھے کہ ذرا سی بے احتیاطی کا مظاہرہ کرتے تو چوہے دان میں پھنس جاتے۔

آخر کار ہمارا صبر آزما انتظار رنگ لے ہی آیا۔

کہر آلود اندھیرے میں عمارت کی طرف سے قدموں کی ہلکی سی دھمک قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آواز شاید عبداللہ نے بھی محسوس کر لی کیونکہ وہ پیٹ اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا پیچھے سرکنے لگا اور پھر اس کا چہرہ میرے قریب آ گیا مگر اس وقت بھی وہ میرے عقبی حصے ہی کی طرف نگراں تھا۔

"کوئی آ رہا ہے۔" عبداللہ نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر سرگوشی کی۔

"تم بھی اس طرف پوزیشن لے لو اور خاموش پڑے رہو۔" میری آواز انتہائی دھیمی مگر دفورِ جوش سے مرتعش تھی۔

"آنے والے کو پکڑنا ہے نا؟" اس نے میرے پہلو میں پوزیشن لیتے ہوئے سوال کیا۔

"تم میری ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرو گے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"بہت بہتر جناب۔"

قدموں کی دھمک نے آہستہ آہستہ واضح صورت اختیار کر لی۔ آنے والا جو کوئی بھی تھا نہایت لاپروائی اور سکون سے آ رہا تھا۔

پھر اندھیرے میں کہر سے اس کا ہیولا نمودار ہوتا نظر آیا وہ خاصا جسیم اور دراز قامت شخص تھا جس کے سر پر بڑے چھجے والا ہیٹ جما ہوا تھا۔

میں نے خود کو زمین سے چپکا لیا آنے والے کا مدھم ہیولا کہر میں ڈوبتا اُبھرتا تقریباً اس جگہ آ کر رک گیا جہاں سیموئیل بڑے کا بے جان بدن پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنا داہنا ہاتھ سیدھا کیا ہوا تھا جس میں دبے ہوئے پستول کی نال اس نامعلوم سائے کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور عبداللہ بھی میرا اشارہ پا کر فائر کرنے کے لئے تیار تھا۔

وہ سایہ زمین پر بیٹھ گیا پھر شاید وہ سیموئیل بریسے کے بدن کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کھڑے ہو کر کسی کو چارلی کہہ کر آواز دی۔

جواب میں کافی دور سے کسی نے اسے جواب دیا اور وہ چلا کر فرنچ میں چارلی کو کچھ بتانے لگا اس کے خاموش ہونے پر چارلی نے پھر کچھ کہا اور اس ہیولے نے جھک کر نہایت اطمینان سے سیموئیل بریسے کی لاش اپنے کندھے پر لاد لی اور واپس چل دیا۔

مجھے اس وقت شدید جھلاہٹ محسوس ہو رہی تھی کیونکہ میں فرنچ زبان سے قطعی نابلد تھا اور اس اہم موقع پر اپنے دو دشمنوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ اس شخص سے فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں عبداللہ سے بھی کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔

اچانک عبداللہ نے اپنی کہنی سے میری پسلیوں میں ٹھوکا دیا اور خود رینگتا ہوا تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ میں بھی چونک کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

تھوڑی دیر میں ہمیں عمارت کا تاریک خاکہ نظر آنے لگا اور ہم نے پیش قدمی روک دی۔ وہ شخص سیموئیل کی لاش لئے اس دروازے کی طرف جا رہا تھا جس کے چھجے پر عمارت کا واحد بلب روشن تھا اور اس روشنی میں ایک شخص کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

روشنی میں سیموئیل کو لے جانے والے کے بائیں شانے سے جھولتی ہوئی اسٹین گن صاف نظر آ رہی تھی جبکہ دوسرے شخص کے ہاتھ میں دبی ہوئی اسٹین گن کسی بھی لمحے شعلے برسانے کے لئے تیار نظر آ رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر ان دونوں میں ایک بار پھر چند فقروں کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ سیموئیل کی لاش سمیت عمارت کے اندر چلے گئے۔

"کیا باتیں کر رہے تھے؟" میں نے میدان صاف پا کر عبداللہ سے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"سیموئیل کی لاش لے جانے والے کا نام ایرک ہے اور اس کا ساتھی چارلی ہے۔ ایرک نے اسے بتایا تھا کہ سیموئیل مر چکا ہے اور وہاں اس لاش کے علاوہ کوئی نہیں ہے جس پر چارلی نے اسے یاد دلایا کہ اگر اس سے کوتاہی ہوئی تو کوئی تیسرا شخص ان دونوں کو معاف نہیں کرے گا۔ لہٰذا وہ اچھی طرح آس پاس کا جائزہ لے کر لاش اٹھا کر اور عمارت میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے بڑی خطرناک بات کی تھی۔" عبداللہ نے رک رک کر بتایا۔

"وہ کیا؟"

"مجھے ڈر ہے کہ سیموئیل کا اندیشہ درست ثابت ہوا ہے۔ شاید مارجوری ہلاک ہو چکی ہے۔" عبداللہ نے مدہم آواز میں کہا۔

"کیا انہوں نے ایسی کوئی بات کہی تھی؟"

"ہاں۔ ایرک کہہ رہا تھا کہ اب دونوں لاشوں کو ساتھ ہی ٹھکانے لگانا ہو گا۔"

"وہ دونوں محافظ ہی معلوم ہوتے تھے۔ کمال ہے کہ انہوں نے نہایت سرد مہری سے سیموئیل ہی کو مار ڈالا جس نے انہیں کارڈیلو سے کام دلایا تھا۔"

"کارڈیلو ہماری توقعات سے زیادہ ہوشیار ہے۔" عبداللہ بولا۔ "اسے یقین رہا ہو گا کہ فون پہ بات کرنے میں ناکامی کے بعد سیموئیل اپنی محبوبہ مارجوری کی تلاش میں ادھر آئے گا اور پھر اس نے محافظوں کو حکم دے دیا ہو گا کہ کسی بھی آنے والے کو زندہ نہ چھوڑیں خواہ وہ سیموئیل ہی ہو۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سیموئیل سے اتنا بدظن کیوں ہو گیا۔"

"سیدھی سی بات ہے۔" عبداللہ نے زمین پر چت لیٹتے ہوئے کہا۔ "سیموئیل نے مقررہ وقت پہ فون نہیں کیا جو نہایت غیر معمولی بات تھی۔ کارڈیلو جانتا تھا کہ سیموئیل مارجوری کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتا ہے لہٰذا اس نے مارجوری کو فون کیا۔ جب مارجوری نے اسے غیر تسلی بخش جواب دیا تو اس نے مارجوری کو گھر سے باہر آنے پر مجبور کر کے اغوا کر لیا اور پھر مارجوری کی زبان کھلوانا اس کے لئے مشکل نہیں رہا ہو گا۔ کارڈیلو سیموئیل کی فطرت سے بھی واقف ہے جب اس نے تمہارے فلیٹ سے کارڈیلو کو دوسری مرتبہ مارجوری کے لئے فون کیا تو وہ بھانپ گیا ہو گا کہ سیموئیل اپنی جان بچانے کے لئے ہم سے مل گیا ہے اور یہی چیز اس کی موت کا سبب بن گئی۔"

"اب کیا کریں؟"

"اندر گھسنے کی کوشش کرو۔"

"بے کار ہے۔" میں نے کہا۔ "حالات سے پتہ چل رہا ہے کہ وہ اندر موجود نہیں ہے۔"

"دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم جان بچا کر یہاں سے نکل جائیں اور گمنام فون پہ پولیس کو اس عمارت میں دو لاشوں اور قاتلوں کی موجودگی کی اطلاع دے کر خفیہ ریڈ کرا دیں۔"

"اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

"اس نے پولیس کو تمہاری راہ پہ لگا کر تمہارے اوپر ہوٹل بڈی نیل کے دروازے بند کر دیئے تھے تم اسے اس پناہ گاہ سے باہر ...."

میں اس بارے میں کافی دیر تک غور کرتا رہا مگر کوئی مناسب راستہ نہ سجھائی دیا۔ ہمارا اصل شکار رائے کارڈیلو تھا اور اس کی عدم موجودگی میں عمارت میں گھسنا غیر ضروری سنگین خطرات مول لینے کے برابر تھا ... ریڈ کی تجویز بھی غیر مؤثر نظر آتی تھی۔ ایک تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہم وہیں بیٹھے کارڈیلو کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے مگر یہ امکان بھی تھا کہ جب تک کارڈیلو سامنے آتا ہم دونوں شدید سردی میں پڑے پڑے منجمد ہو جاتے۔

جب میں نے عبداللہ کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو وہ برہم ہو گیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہم یہاں تک آنے کے بعد ہاتھ جھاڑ کر گھر لوٹ جائیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"تم پہ مایوسی طاری ہونے لگی ہے۔ اس وقت بہترین موقع تھا۔ ان دونوں کو عمارت میں گھسنے سے پہلے ہم گولی مار کر ہلاک کر سکتے تھے۔"

"ان کا خون بہانے سے کارڈیلو کا کیا بگڑتا؟" کمال ہے کہ آج تم ایسی بات کر رہے ہو۔ وہ بدحواس تو ضرور ہو جاتا اور پھر وہ دونوں محافظ پارسا نہیں ہیں انہوں نے سیموئیل کو مارا اور اگر ہم احتیاط نہ کرتے تو ان کی فائرنگ ہمیں بھی چاٹ گئی ہوتی۔"

"پھر اندر گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

سامنے سے پیش قدمی خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی لہٰذا ہم نے رینگتے ہوئے قدرے پسپائی اختیار کی اور پھر سیدھے کھڑے ہو کر طویل چکر کاٹتے ہوئے اندازے سے عمارت کی پشت پہ پہنچ گئے۔ ادھر گہری تاریکی اور دھند کا راج تھا۔

اس طرف ہمیں چند فٹ کے فاصلے سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا مگر پھر بھی ہم چوپایوں کا انداز اختیار کر کے عمارت کی عقبی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔

اس طرف زمین سے چار فٹ کی بلندی پہ مضبوط آہنی جالی والی کئی کھڑکیاں واقع تھیں جن کے عقب میں گھور تاریکی کا راج تھا۔

میں نے بہت آہستگی اور احتیاط سے پہلی کھڑکی کے چوبی پٹ پر ہلکا سا زور دیا۔ پٹ کو اندر کی طرف خفیف سی بے آواز جنبش ہوئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے اتنی تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ہاتھ ہٹایا جیسے اس میں طاقتور برقی رو دوڑ رہی ہو۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت آہستگی سے عبداللہ کا ہاتھ دبایا اور دیوار سے چپک کر دوسری کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ عقبی حصے میں تین تاریک کھڑکیاں واقع تھیں۔ میں نے یکے بعد دیگرے تینوں کھڑکیوں کا جائزہ لیا۔ اور ہر کھڑکی کے پٹ اندر سے غیر مقفل ثابت ہوئے۔

میں نے عبداللہ کا ہاتھ تھاما اور اسے عمارت سے دور جھاڑیوں میں لیتا چلا گیا۔

"کیا بات ہے؟" عمارت سے دور نکل آنے کے بعد عبداللہ نے سرگوشی کی آواز میں سوال کیا۔

"تینوں کھڑکیاں اندر سے کھلی ہوئی ہیں۔" میں نے ہیجان آمیز سرگوشی میں کہا۔

"یہ تو اچھی بات ہے ہمارا کام آسان ہو گیا۔"

"شاید ٹھنڈ تمہارے دماغ میں چڑھ گئی ہے!"

"کیا میں نے غلط بات کہہ دی ہے!"

"کیا یہ کھلی ہوئی، تاریک اور غیر محفوظ کھڑکیاں ان دو خون آشام مسلح محافظوں سے میل کھاتی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"تینوں کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں؟"

"ہاں۔ تینوں۔"

"پھر تو واقعی گڑبڑ ہے۔ ایک طرف دو محافظ اسٹین گنز لئے مسلسل پہرہ دے رہے ہیں، دوسری طرف کھڑکیاں کھلی رکھی گئی ہیں۔ پھر عقبی حصے میں مکمل اندھیرا ہے۔ جبکہ سامنے ایک بلب جل رہا ہے۔ یہ یقینی طور پہ چوہے دان بنایا گیا ہے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو شاید پہلی کھڑکی کو کھلا ہوا پا کر باقی کھڑکیوں کے بارے میں سوچے بغیر اندر کود جاتا۔"

"میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔"

"یعنی اس واضح جال کی پرواہ کئے بغیر اندر جاؤ گے؟"

"کارڈیلو میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ منصوبہ بندی میں ہر چھوٹے سے چھوٹے امکانی پہلو پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اس نے وہ تمام باتیں فرض کر لی ہوں گی جو ہم اب تک کرتے آئے ہیں یعنی ہم نے سیموئیل کو ڈھال بنا کر پیش قدمی کی اور وہ مارا گیا تو اب رخ بدل کر چور دروازے سے اندر جا رہے ہیں۔ اسے توقع ہو گی کہ ہم پہلی کھڑکی کو کھلا پا کر اپنے مقدر پہ رشک کرتے ہوئے اندر اس کی گود میں جا کودیں گے اور میں یہی ظاہر کروں گا۔"

"یہ...... یہ خودکشی ہو گی۔" عبداللہ بولا۔

"وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتا ہے تاکہ شوارٹ سے ملنے والی چیزیں واپس لے سکے۔ تمہیں تو شاید وہ دیکھتے ہی گولی مار دے مگر مجھے زندہ گھیرنے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا میں اکیلا اندر جاؤں گا اور تم باہر رہ کر حالات کے مطابق قدم اٹھاؤ گے۔"

"مگر مجھے اندر کے حالات کا علم کیسے ہو سکے گا؟" عبداللہ سخت الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

"کارڈیلو جیسے حریف سے نمٹنے کے لئے خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ میں اگر بالکل ہی بے بس نہ ہوا تو کوشش کروں گا کہ اسے باہر نکلنے پر مجبور کر دوں۔ وہ تمہارے لئے عملی اقدام کا وقت ہو گا۔"

ہم نے مختصراً اپنی ممکنہ ذمہ داریوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا پھر میں عمارت کی طرف جانے کے لئے مڑ گیا۔

اچانک عبداللہ پیچھے سے لپکا اور اس نے مجھے بانہوں میں دبوچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بے اختیار میرے رخسار چومنے لگا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم انشاء اللہ پھر ملیں

گے ؟" میں نے کہا۔

"تم موت کے منہ میں جا رہے ہو۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا اور میں بوجھل قدموں سے عمارت کی طرف چل دیا۔

میں نے اپنے داخلے کے لئے وسطی کھڑکی کا انتخاب کیا اور پستول داہنے ہاتھ میں سنبھال کر بائیں ہاتھ سے کھڑکی کے پٹ پر دباؤ ڈالا اور وہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر اندر کھلتا چلا گیا۔

میں چند ثانیوں تک نیچے جھکا اندر کی سن گن لیتا رہا پھر میں نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا اور گردن اندر ڈال کر تاریک کمرے کا جائزہ لیا۔ جہاں عجیب ناگوار سی بو رچی ہوئی محسوس ہوئی بظاہر وہ کمرہ ویران نظر آ رہا تھا۔

میں کھڑکی پر چڑھ کر آہستگی سے اس کمرے میں کود گیا۔ چند ثانیوں تک میں فرش پر اکڑوں بیٹھا چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا پھر میں نے کھڑکی کو دوبارہ بند کر دیا۔

باہر کھلنے والی تینوں کھڑکیاں اسی وسیع ہال میں واقع تھیں۔ اور ان کے سامنے والی دیوار میں نکاسی کا ایک ہی راستہ تھا۔ جو کھلا ہوا تھا۔

باہر کی کھلی فضا کے مقابلے میں اس کمرے میں خوشگوار سی حرارت کی موجودگی کا احساس وہاں پھیلی ہوئی ناگوار بو پر حاوی تھا اور میں آگے بڑھنے سے قبل ٹھنڈ کے اثرات کو کسی حد تک زائل کرنا چاہتا تھا تاکہ ٹکراؤ کی صورت میں میں اعصابی پھرتی سے کام لے سکوں۔

جونہی میں اس کمرے سے نکلا اچانک اندھیرے میں ایک کرخت آواز گونجی "ہینڈز اپ" اور اسی کے ساتھ وہاں روشنی پھیل گئی۔

میں نے پستول سمیت اپنے ہاتھ بلند کر دیئے اور پھر آواز کی سمت میں گھوما تو وہاں قدیم طرز کی ایک آرام کرسی پر راٹے کاردیلو ریوالور لئے بیٹھا ہوا تھا۔

میرے اندازے کے برعکس وہ کوئی راہداری نہیں تھی بلکہ نسبتاً چھوٹے سائز کا ایک کمرہ ہی تھا اور وہاں کاردیلو کے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم اسی راستے سے آؤ گے" وہ سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "آج میں تمہارا حساب بیباق کر دوں گا۔"

"تم میرے ساتھ من مانا سلوک نہیں کر سکو گے اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اب فرانس سے تمہاری نکاسی آسان ثابت نہ ہو گی۔"

"کیا امیگریشن کے سارے اختیارات تمہیں مل گئے ہیں؟" اس نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے ہاتھ کئی انسانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔"

"تمہارے منہ سے یہ الزام چھچھورا معلوم ہوتا ہے۔ اور ہاں یہ پستول نیچے گرا دو۔" اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"یہ بھرا ہوا ہے۔ جھٹکے سے گولی بھی چل سکتی ہے۔"

"پرواہ نہ کرو۔"

میں نے پستول فرش پر گرا دیا جس کی پرشور آواز سے گرد و غبار اٹھا مگر گولی پھر بھی نہ چل سکی۔

"اور کوئی ہتھیار ہے تمہارے پاس؟"

"جیبوں میں کارتوس بھرے ہوئے ہیں۔"

"مجھے امید ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو گے۔"

"جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"اس طرف چلو۔" اس نے ریوالور کی نال سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو میں بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

"وہ تو تم ہر حال میں مارو گے۔"

"نہیں۔ فی الحال میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔"

اندر ایک کمرہ نشستگاہ کی سی مشابہت رکھتا تھا۔ وہاں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ایک میز پر شراب کی دو بوتلیں اور تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہیں فرش پر ایک ترپال میں لپٹی ہوئی کوئی وزنی سی چیز پڑی ہوئی تھی۔

"اپنے ہاتھ سے ترپال کا کونہ ترپلٹو۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس میں کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے خاموشی سے ترپال کھولی تو اس میں مارجوری اور سیموئیل کی لاشیں پہلو بہ پہلو پڑی ہوئی تھیں۔

"تم نے اس لڑکی کو مار کر ظلم کیا ہے۔" میں نے ترپال لاشوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ادھر بیٹھ جاؤ۔" اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میری لغت میں غداری کی سزا صرف موت ہے۔"

"مگر وہ تمہارے ساتھ کب تھی؟"

"اس نے مجھے سیموئیل کے اغوا کے بارے میں گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی اور تمہاری یہاں موجودگی بتا رہی ہے کہ سیموئیل بھی مجھ سے منحرف ہو گیا تھا۔ یہ تو بتاؤ کہ تم نے اس کی داہنی ہتھیلی، کان اور ناک کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

"میرا وقت ضائع نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"جو وقت گذار رہے ہو وہ غنیمت ہے۔" کاردیلو چبا کر

...میں قہقہہ مار کر بولا۔ "وھسکی کے دو چار پیگ پی کر تھوڑی سی ...رت حاصل کر لو پھر میں اصل بات کروں گا۔"

پھر اس نے بلند آواز میں ایرک کو پکارا جو تقریباً فوراً ہی وہاں موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن دبی ہوئی تھی۔

کاردیلو نے فرنچ یا اسپینی زبان میں اسے کچھ ہدایت کی اور وہ ...کی روبوٹ کی طرح اسٹین گن تان کر دروازے پر جم گیا اور کاردیلو نے اپنا ریوالور گود میں رکھ لیا۔

"اس کی موجودگی میں میں شراب سے بہتر طور پر لطف اندوز ہو سکوں گا۔" اس نے کہا اور شراب کے دو گلاس تیار کر کے ایک میری ...طرف بڑھا دیا۔

"اس تواضع سے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو؟" دوسرا ...پیگ خالی کرنے کے بعد میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اپنی تمام چالاکیوں کے باوجود ...اس وقت تم میری مرضی کے پابند ہو اور پھر مجھے تین باتیں معلوم کرنی ہیں۔ شوارٹ سے ملنے والے کاغذات کہاں ہیں، تمہارے ساتھی عبداللہ کا ٹھکانا اور سیموئیل کا ہاتھ بیکار کرنے کی ترکیب۔"

"وہ کاغذات تم حاصل نہ کر سکو گے۔ عبداللہ ان کی جان سے ...بڑھ کر حفاظت کرے گا۔..."

"بکواس مت کرو۔" وہ برہمی کے عالم میں میری بات کاٹ کر ...بولا "میں طفلِ مکتب نہیں ہوں جو تمہاری باتوں میں آ جاؤں۔ عبداللہ ...معمولی چھوکرا ہے۔ تم اتنی اہم چیزیں اس کی تحویل میں نہیں دے سکتے۔ ...مجھے سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنا آتا ہے۔"

"شاید تم عبداللہ کے مقام سے بے خبر ہو۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ فلسطینیوں کے مقامی یونٹ کا سربراہ ہے مگر وہ اتنے اہم معاملات سنبھالنے کا اہل نہیں ہے۔"

"اسے ذمہ داریاں سونپنے والے تم نہیں، دوسرے لوگ ہیں۔"

"وہ کاغذات اور کرپٹوگرافی کی کوڈ بک کہاں ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ وہ سب چیزیں عبداللہ کے پاس ہیں۔ اگر تمہیں ماننے تو میں صرف اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ وہ چیزیں ...اور عبداللہ کی مشترکہ تحویل میں ہیں۔" میں اس کے سامنے مکمل ...راستگوئی کا مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"عبداللہ کہاں ہے؟"

"اسے یہاں تمہیں چاہیئے تھا مگر کسی وجہ سے نہ آ سکا۔ مجھے تم کو تنہا دیکھ کر افسوس ہوا تھا۔ میں خود تم دونوں کے استقبال ...کا منتظر تھا۔ کیا وہ کاغذات اسی کے مکان پر ہیں؟"

"نہیں۔ وہ ایک بریف کیس میں ہوٹل ڈی ریمی کے منیجر کے پاس امانتاً رکھے ہوئے ہیں اور وہ بریف کیس میرے یا عبداللہ کے سوا کسی کو نہیں مل سکتا۔"

"مگر مجھے وہ چیزیں فوری طور پر درکار ہیں۔"

"ہو سکے تو چارلس بک ہارٹ سے مطالبہ کر کے دیکھ لو۔"

"تم عبداللہ کو اسی عمارت سے فون کرو گے کہ وہ بریف کیس لے کر کسی خاص مقام پر پہنچ جائے۔" کاردیلو نے اپنے لئے سگریٹ جلا کر کہا۔

"اول تو عبداللہ اپنے کسی دوست کے پاس رہ رہا ہے جس کے پاس فون نہیں ہے اور اگر فون ہوتا بھی تو کیا تم اسے اتنا احمق سمجھتے ہو کہ وہ میری ہدایت پر عمل کر گذرے گا۔"

"اس کا اپنا مکان نہیں ہے؟" کاردیلو نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ان دنوں اس کا مکان میرے تصرف میں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم سے مقابلے کی ایک حکمتِ عملی یہ بھی تھی کہ ہم الگ الگ رہے تھے۔"

"تم اس خیال میں نہ رہنا کہ میں کاغذات کے حصول تک تمہیں زندہ رکھوں گا۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "میرے لئے تم شوارٹ اور انطونیو کے قاتل ہو اور تمہاری سزا صرف موت ہے۔"

"مجھے تمہارے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ اگر میں مرنے سے خوفزدہ ہوتا تو شاید اسرائیل سے نکلنے کی ہمت بھی نہ کرتا۔"

"تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

"ڈاکٹر آسکر بیلنتھم۔"

"طیاروں کو اغوا کرنے والے اپنے اصلی نام سے سفر نہیں کرتے۔"

"تم شاید پیشہ ور دہشت پسندوں کی بات کر رہے ہو۔ میں اتفاقاً اس مہم میں شریک ہو گیا تھا۔"

"اور پھر اتفاقاً ہی نیس پہنچ گئے اور یہاں فلسطینی تحریک کے تعاون سے مزید دہشت گردی کرنے پر مجبور ہو گئے۔"

"تم میرے بارے میں جو کچھ جان چکے ہو اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آخر کار تم مجھے ہلاک ہی کرو گے۔ میری قوتِ برداشت کا امتحان لینے کی بجائے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا دو تو بہتر ہو گا۔"

پہلی بار اس کے لبوں پر سفاکانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تم اتنی آسانی سے نہیں مر سکو گے۔ اس عمارت کے گرد دور تک کوئی موجود نہیں ہے۔ میں بریف کیس کے معاملے سے نمٹ کر تمہیں سسکا سسکا کر ختم کروں گا۔ اور تمہارے ہی ذریعے عبداللہ کا بھی کھوج نکالوں گا۔"

"ایک؟" خاموشی سے سگریٹ کے چند کش لینے کے بعد

کارویلو نے اپنا ریوالور سنبھال لیا۔ "تم جوڑ کھسکانے میں ماہر ہو۔ میں اس کے دونوں ٹخنے تمہارے حوالے کرتا ہوں تاکہ یہ اپنے قدموں پر اٹھنے کے قابل نہ رہے۔"

ایرک خوفناک انداز میں ہنسنے لگا۔ "یہ میری پسند کا کام ہے مونسیور۔" اس کی انگریزی بہت شکستہ اور قواعد سے براتھی۔ شاید وہ دونوں محض اس لئے انگریزی میں بات کر رہے تھے کہ مجھے وہ خوفزدہ کر سکیں۔

ایرک نے اپنی اسٹین گن رائے کارویلو کے قدموں میں فرش پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا کر میری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے پھرتی سے اپنی کرسی چھوڑ دی اور الٹے قدموں پیچھے سرکنے لگا۔

"خیال رکھنا، کہیں یہ پلٹ کر دوسرے کمرے میں نہ بھاگ نکلے۔" رائے کارویلو نے صورتحال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایرک کو خبردار کیا۔

اس وقت صورتحال کچھ یوں تھی کہ میں کارویلو کے ہمراہ جس راستے سے نشستگاہ میں آیا تھا۔ وہ راستہ کارویلو کی پشت پر تھا اور میں اس دروازے کی مخالف سمت پیچھے سرک رہا تھا۔

پیچھے ہٹتے ہوئے اچانک میرے پیر کسی چیز سے ٹکرائے اور میں بری طرح لڑکھڑا گیا۔ ایرک کے لئے وہ سنہری موقع تھا اس نے پورے زور میں آگے بڑھ کر مجھے بے بس کرنا چاہا۔ مگر میں نے گرتے گرتے بھی اس کی ناک پر بھرپور گھونسہ جما دیا۔

ایرک کے حلق سے خوفناک غراہٹ ابھری اور میرے فرش پر گرتے ہی اس نے پوری قوت سے میری پشت پر ٹھوکر رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں نے تیزی سے کروٹ لے کر خود کو ٹھوکر کی شدت سے تو بچا لیا۔ مگر پھر بھی کولہے پر خاصی ضرب آگئی۔ اور میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر دانستہ ایک چیخ ماری تاکہ عبداللہ میری آواز پہچان کر اندر کی صورتحال کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکے۔

اس وقت عبداللہ کے لئے حالات انتہائی سازگار تھے اگر وہ عمارت کے عقبی حصے سے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو بلا روک ٹوک کارویلو کی پشت پر بنے ہوئے دروازے پر پہنچ سکتا تھا۔ اور حاضر دماغی سے صورتحال اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔

ایرک کے جسم میں کسی وحشی سانڈ جیسی طاقت موجود تھی وہ میرے اٹھنے سے پیشتر ہی مجھ پر سوار ہو گیا اور اپنی کلائیوں سے میرا چہرہ رگیدنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنی پشت فرش پر جمائی اور پھر اپنے گھٹنوں سے یکے بعد دیگرے اس کے پیٹ میں دو ضربیں لگائیں اور اس کی گرفت مجھ پر ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر اس کی ناک اور پیشانی پر زبردست ٹکر رسید کی اور وہ بری انداز میں چیخ مار کر زور لگاتا ہوا میری گرفت سے نکل گیا۔

میں نے اس مہلت کو غنیمت جان کر فوراً اپنا اوورکوٹ اتار دیا جو میری نقل و حرکت میں حارج ہو رہا تھا۔

اوورکوٹ کی آستین پوری طرح نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایرک میری اس مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر میری طرف لپکا اور اس بار میں نے واضح طور پر بوکھلاہٹ کے عالم میں اپنا اوورکوٹ اس کے سر پر ڈال دیا۔

اسے مجھ سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے بوکھلا کر اپنا سر کوٹ سے نکالنا چاہا۔ مگر میں نے اس کی گردن اسی حالت میں اپنی بغل میں دبالی۔ پھر میں اسے گھسیٹتا ہوا ایک دیوار تک لے گیا اور اس کی اوورکوٹ میں لپٹی ہوئی کھوپڑی پوری قوت سے دیوار سے ٹکرا دی۔

ایرک کی چیخیں انتہائی غضب آلود تھیں۔ اوورکوٹ کے باعث شاید اسے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔

میں ایک دفعہ پھر اس کا سر دیوار سے ٹکرانے والا تھا کہ اچانک کارویلو کی سرد آواز گونجی۔

"اسے چھوڑ دو ڈاکٹر۔"

میں نے سر گھمایا تو وہ ریوالور میری طرف تانے سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایرک کو پوری قوت سے ایک طرف دھکیل دیا۔

ایرک اوورکوٹ دور پھینک کر میری طرف بڑھا مگر کارویلو نے اسے روک دیا۔

"بلاوجہ اپنی قوت صرف نہ کرو۔ اس کے دونوں گھٹنوں پر ایک فائر کرنا کافی ہوگا۔"

اچانک وہ کمرہ ایک فائر کی آواز سے گونج اٹھا اور کارویلو کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ریوالور اچھل کر دور جا گرا۔

وہ دونوں بوکھلا کر پلٹے تو دروازے میں عبداللہ اپنے پستول سمیت ان کے سروں پر موجود تھا۔

ایرک نے تیزی سے لپک کر کارویلو کے قدموں میں پڑی ہوئی اپنی اسٹین گن اٹھانے کی کوشش کی اور عبداللہ نے بارود کا سیسہ اس کی کھوپڑی میں اتار دیا۔ کارویلو اس کے تڑپتے ہوئے بدن سے بچ کر دور ہٹ گیا۔

میں نے بڑھ کر وہ اسٹین گن اٹھالی جو ایرک کے خون سے تر ہو گئی تھی۔

"تیسرا آدمی کہاں ہے؟" عبداللہ نے سرد اور سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے پیچھے۔" کارویلو نے کہا۔

عبداللہ اضطراری طور پر پیچھے گھوما اور کارویلو زور زور سے قہقہے مارنے لگا۔ ان قہقہوں میں فاتحانہ نشان نمایاں تھی میں نے اسٹین گن کی نال اٹھائی اور وہ کمرہ فائر کے شور سے لرز اٹھا۔ رائے کارویلو کا قہقہہ دلدوز چیخوں میں بدل گیا اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسٹین گن کے ہلکے سے برسٹ نے اس کی ٹانگیں چھلنی کر دی تھیں۔

"تیسرا آدمی کہاں ہے؟" عبداللہ نے اندر آ کر مجھ سے اپنا سوال دہرایا۔

"وہ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ اس کے پاس اسٹین گن بھی موجود ہے۔"

"اسے آواز دو کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔"

"وہ میرا قہر بن کر تم دونوں پر ٹوٹے گا۔ تم اس عمارت سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔" رائے کارویلو کراہتے ہوئے چیخا۔ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود وہ ہوش میں تھا۔

"چارلی ہتھیار ڈال دو۔ ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

ہم کافی دیر جواب کے منتظر رہے مگر دوسری طرف گہرے سناٹے کا راج تھا۔

پھر میں وہیں بیٹھ گیا اور عبداللہ جوتے اتار کر ننگے پاؤں عمارت کے اندرونی حصوں کی طرف چل دیا۔ اس نے ریوالور مجھے تھما کر اسٹین گن لے لی تھی۔

عبداللہ کو اندر گئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ باہر کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی جو تیزی کے ساتھ دور ہوتی چلی گئی۔

"وہ نکل گیا۔" تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ نے واپس آ کر تاسفانہ لہجے میں بتایا۔

"اب اس کا کیا کرنا ہے؟"

"میری مانو تو اس پر وہی حربہ آزماؤ جو سیموئیل پر آزمایا تھا۔ اس کی ٹانگیں تو ضائع ہو ہی گئی ہیں۔ باقی آنکھ، کان، اور ہاتھ ہم ناکارہ بنا دیں گے۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکو گے۔" کارویلو حلق پھاڑ کر چیخا۔

"تمہیں ہر حسِ لطافت سے محروم کر کے ہم ایک لوتھڑے کی مانند کسی سڑک پر ڈال دیں گے اور تم ہر آنے جانے والے کا راستہ پوچھتے پوچھتے کسی کوڑا ڈھونے والی گاڑی کے پہیوں کے نیچے کچلے جاؤ گے۔"

وہ ہونٹ بھینچ کر کرب آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

پھر بولا۔ "تم از کم میرے ایک احسان کا بدلہ تو چکا دو۔"

"تو تم نے مجھ پر کوئی احسان بھی کیا تھا؟"

"تم سردی سے اکڑے تو میں نے تمہیں شراب کی گرمی پہنچائی تھی اب ایک گلاس تم مجھے دے دو۔ مجھے معلوم ہے کہ فلسطینی اسرائیلیوں کے حق میں پرلے درجے کے موذی ہوتے ہیں۔ تمہارا ساتھی جو کچھ رہا ہے وہ کر بھی گزرے گا مگر پہلے میرا حلق تر کرا دو۔"

"ہم صرف دشمن کے حق میں سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تم نے تو اپنے محسنوں کو بھی نہیں بخشا سفید بھیڑیئے۔" عبداللہ نے دانت پیس کر کہا۔ "سیموئیل اور مارجوری کی لاشیں تمہارے کرتوت کی کھلی گواہی دے رہی ہیں۔"

میں نے وہسکی کا ایک گلاس بنا کر کارویلو کو دے دیا اور وہ نہایت آرام سے اس کا ایک ایک گھونٹ اپنے معدے میں اتارنے لگا۔ میں واپس اپنی کرسی پر آ گیا۔

گلاس میں آخری چند بوندیں باقی تھیں کہ کارویلو نے بالکل غیر متوقع طور پر گلاس کا پیندا سخت فرش پر مار کر توڑ دیا۔ ہم دونوں یہی سمجھے کہ وہ ٹوٹا ہوا گلاس ہم پر دے مارے گا لہٰذا ہم پھرتی سے میز کی آڑ میں ہو گئے۔ اور کارویلو نے ٹوٹے ہوئے گلاس کی دھاروں سے اپنی کلائی کی رگیں کئی جگہ سے کاٹ دیں اور ٹوٹا ہوا گلاس فرش پر لڑھکا دیا۔

عبداللہ نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب میں تمہاری دسترس سے باہر ہوں۔" وہ اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر نقاہت آلود آواز میں بولا۔ "معذوری کی زندگی کے مقابلے میں مجھے موت منظور ہے۔"

اس کی کٹی ہوئی رگوں سے تیزی کے ساتھ زندہ لہو بہہ کر فرش کو دلدار کر رہا تھا۔ آخر وہ خود نڈھال ہو کر فرش پر گر گیا۔

مجھے سگریٹ پیئے کافی دیر ہو گئی تھی لہٰذا میں نے سگریٹ سلگالی کیونکہ کارویلو کی آخری سانسوں تک تو ہمیں وہاں رکنا ہی تھا عبداللہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر عمارت کی تلاشی میں مصروف ہو گیا۔

اس کمرے میں چار لاشیں چھوڑ کر ہم واپس لوٹے تو کارویلو جیسے صفِ اول کے دشمن سے نجات پانے کی خوشی کے باوجود میرا دل بوجھل ہو رہا تھا۔

"وہ ہر قسم کی صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھا۔" کار کی طرف جاتے ہوئے عبداللہ مجھے بتانے لگا۔ "اندر ضروری اشیاء کے علاوہ کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو ہمارے لئے کارآمد ہوتی وہ ایسی چیزیں شاید پہلے تلف کر چکا تھا۔"

"مارجوری ناگہانی طور پر ماری گئی۔" میں نے کہا۔ "وہ طوائف ضرور

تھی مگر مجھے اس کی موت کا افسوس ہے اس نے محض اپنی نام نہاد وضع داری کی خاطر جان گنوائی ہے۔"

"مگر تمہیں اس کا قلق نہ ہونا چاہئے، ہم اس کے قتل سے بری الذمہ ہیں۔"

"یہ قانونی نکات کی بات نہیں۔ اس کا تعلق انسان کے احساس سے ہے۔"

"اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے ہیں۔ ساری رات بھاگ دوڑ میں گزر گئی۔"

"ہم اب آزادی کی نیند لے سکیں گے۔" میں نے کہا۔ "ارادہ کہاں چلنے کا ہے؟"

اس وقت تک ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ عبداللہ نے اس کا مقفل دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "چلنا تو ڈی ریمی ہی چاہئے۔ چارلس کو نہایت بے چینی سے ہمارا انتظار ہوگا۔"

"وہ عملی آدمی ہے، اس نے انتظار میں اپنی رات برباد نہیں کی ہوگی۔" میں نے معنی خیز لہجے میں تبصرہ کیا اور عبداللہ کے پہلو میں اپنی نشست سنبھال لی۔

"شاید تمہارا اشارہ یونانی شہزادی کی طرف ہے۔"

"چارلس اس کی زلفوں کی چادر میں چہرہ چھپائے گہری نیند سو رہا ہوگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ تمہارے فلیٹ سے فون کر کے مس اوڈیل کو حالات سازگار ہونے کا پیغام دے دیا جائے۔ ہم لوگ نیند پوری کرنے کے بعد چارلس سے مل لیں گے۔"

عبداللہ نے واپسی کے لئے جو راستہ اختیار کیا وہ بہت ہموار اور آرام دہ تھا۔ مگر اس طرف سے شہر پہنچنے میں ہمارا کافی وقت صرف ہوگیا۔

عبداللہ نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر روشنی کی تو قالین پر پڑا ہوا سفید لفافہ دیکھ کر اس کی پیشانی پر تحیر آمیز لکیریں ابھر آئیں۔

اس نے لفافہ کھولا تو اس میں سے عربی میں لکھا ہوا ایک مختصر سا رقعہ برآمد ہوا۔ عبداللہ نے لفافہ اور رقعہ پھاڑ ڈالا اور خوابگاہ کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا پیغام تھا؟" اسے خاموش پاکر مجھے اس سے سوال کرنا ہی پڑگیا۔

"بیروت میں فلسطینی گروہوں کے ایک اجلاس میں بم کا دھماکہ ہوا ہے۔ ایک لیڈر ہلاک اور دو بری طرح مجروح ہوئے ہیں۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"پیغام کس کی طرف سے تھا؟"

"نیس میں ہمارے تیرہ آدمی موجود ہیں۔"

اس کا یہ انکشاف میرے لئے حیرت کا باعث تھا کیونکہ شروع سے جس انداز میں وہ میرے ساتھ لگا ہوا تھا اس سے تو یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ نیس میں بالکل تنہا تھا۔

"چونکنے کی ضرورت نہیں۔" وہ میرے خیالات بھانپ کر بولا۔ "تمہارا ساتھ ہونے کے بعد میں نے تنظیم کے کسی اور آدمی کو زحمت کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ چاہو گے تو ان سب سے تمہاری ملاقات کا انتظام کرا دوں گا۔"

"وہ دھماکہ کس نے کیا ہوگا؟"

"یہودی دہشت پسندوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے!" وہ بولا۔ "ویسے پوری تفصیل تو مجھے اپنے نمبر دو عمل سے ملے گی۔ پیغام اسی کی طرف سے تھا۔"

مجھے خورد و نوش سے فارغ کرانے کے بعد عبداللہ الوداعی انداز میں اٹھ گیا۔

"تم کہاں چلے؟"

"وہ پیغام بہت اہم ہے۔ میں اپنے آدمیوں سے ملوں گا۔ تم گہری نیند لے لو۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے مقدر میں آرام ہی نہیں ہے۔"

میں نے اسے روکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ عبداللہ کے چلے جانے پر میں نے دروازے اندر سے مقفل کئے، اور عبداللہ کا شب خوابی کا لباس پہن اس کے بستر پر دراز ہوگیا۔

میں نیس میں پیدا ہونے والی تمام دشواریوں پر قابو پا چکا تھا۔ اور شہر میں میرے راز سے آشنا صرف ایک ہی دشمن باقی تھا۔ جو کاروبلو کی دیہی پناہ گاہ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ میں اس کے بارے میں عبداللہ ہی سے بات کر سکتا تھا۔ ویسے میری دانست میں چارلی پیشہ ور مجرم تھا اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کاروبلو کی ہلاکت کے بعد وہ میرا پیچھا کرنے کی کوشش کرتا۔

اب اگر سینا کی لیبیا آمد کی خبر آجاتی تو میں بلاتوقف ادھر کا رخ کر سکتا تھا۔ اور اس کی آمد میں تاخیر کی صورت میں، میں پیرس پہنچ کر بن حیان کا سراغ لگا سکتا تھا۔

ان ہی خیالات میں میری آنکھ لگ گئی۔ مگر گہری نیند کا سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور میں نے کسمسا کر اپنی ساری قوت اپنی سماعت پر مرکوز کر دی کیونکہ میرے لاشعور ذہن کے مطابق میری نیند کسی غیر معمولی آواز ہی سے ٹوٹی تھی۔

چند منٹ بالکل سناٹے کی کیفیت میں گزر گئے اور پھر معاً میں اچھل کر بستر سے نیچے اتر گیا۔ بیرونی کمرے کے فرش پر واضح طور پر کسی کے قدموں کی ہلکی سی دھمک سنائی دے رہی تھی۔

میں عبداللہ کی تاریک خوابگاہ میں کئی منٹ تک بستر کی اوٹ میں خاموشی سے دبکا بیٹھا رہا مگر آہٹ کی کوئی دوبارہ سنائی نہ دی۔ جب انتظار کے وہ اعصاب شکن لمحات طویل ہونے لگے تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ آہٹ کی وہ مدھم سی آوازیں میرے تھکے ہوئے اور وہم زدہ ذہن کی پیداوار نہ ہوں۔

اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ ہنری شوارٹ کو کیفر کردار پر پہنچانے کے بعد کاروبلو بیک سامنے آیا تھا اور پھر اس نے میرے خلاف پے در پے جارحانہ اقدامات کا سلسلہ شروع کر دیا کہ میں عبداللہ العلمی اور چارلس ... کی بھرپور حمایت کے باوجود مدافعانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔

چند دن کے ہولناک اعصابی مقابلے کے بعد میں رائے کاروبلو کو جہنم واصل کرنے میں کامیاب تو ہو چکا تھا مگر ذہن پر گزرے ہوئے واقعات کا اثر اس وقت بھی باقی تھا لہٰذا اس طویل سکوت پر دوبارہ شبہ کر کے اپنے ذہن کو مزید تھکانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ابھی میری آزادی کا آخری باب نامکمل تھا۔ جب تک میں پیرس پہنچ کر بن حیان سے اپنی توہین کا انتقام نہ لیتا اس وقت تک مجھے مکمل ذہنی آسودگی حاصل نہ ہو پاتی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دوبارہ بستر پر جانے ہی والا تھا کہ خوابگاہ کے کھلے ہوئے دروازے کے تاریک خلا میں ایک نسبتاً تاریک تر سیاہ ہیولا نمودار ہوا اور لمحہ بھر کیلئے وہیں رک گیا۔ میرا دل بے اختیار ہو کر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ... میں اپنے وجود ... مزید سمٹ گیا۔

میری تمام تر قوت بینائی میں تحلیل ہو چکی تھی اور میں گھور اندھیرے کے باوجود واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ بے آواز انسانی ہیولا کمرے کے وسط ... پھیلے ہوئے بستر کا جائزہ لے رہا تھا۔

گو میں بستر چھوڑ چکا تھا مگر وہاں وسط میں پڑا ہوا کمبل تکیوں کی بے ترتیبی سے مل کر کوئی بھی غلط تاثر پیدا کر سکتا تھا۔ آنے والے کیلئے خوابگاہ کا تاریک سناٹا اس قدر گمبھیر تھا کہ وہ کمبل کو اپنا شکار تصور کر سکتا تھا۔

اور غالباً ہوا بھی کچھ یوں ہی کیونکہ وہ تاریک ہیولا فرشی قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا کھلے دروازے سے خوابگاہ میں رینگ آیا اور پھر دروازے کے قریب رک کر واپس گھوما اور اپنی داہنی جانب کی دیوار پر کچھ ٹٹولنے لگا۔

اس کا وہ اقدام میرے لئے خاصا پرسکون ثابت ہوا۔ کم از کم وہ اپنی دانست میں مجھے تاریکی اور لاعلمی میں ہلاک کرنے کی نیت سے نہیں آیا تھا۔

کھٹکے کی خفیف سی آواز کے ساتھ کمرہ روشن ہوگیا اور وہ سلیٹی تیزی کے ساتھ بستر کی طرف گھوم گیا۔ مگر میں اسی کے ساتھ نیچے دبک کر مسہری کے پیچھے سرک گیا۔

روشنی میں بستر کو خالی پا کر اس کے منہ سے ایک غصیلی غراہٹ بلند ہوئی اور پھر وہ شاید بے دم سا ہو کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس کی پنڈلیاں اور سیاہ جوتے پہنے ہوئے پیر میرے چہرے سے بمشکل ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر اس طرح موجود تھے کہ پنجے میری طرف تھیں اور پنجے مخالف سمت میں نظر آرہے تھے۔

میرے لئے وہ موقع نہایت مناسب تھا۔ میں پیٹ اور کہنیوں کے بل آہستگی سے قدرے آگے سرکا اور اپنی تمام قوت جمع کر کے پھرتی سے اپنے ہاتھوں میں اس کی پنڈلیاں جکڑ لیں اور پوری قوت سے اس کے پیر موڑ کر مسہری کے نیچے گھسیٹنے لگا۔

اس کے لئے یہ ناگہانی افتاد انتہائی پریشان کن ثابت ہوئی اور وہ خونخوار غراہٹوں کے باوجود چند ہی سیکنڈ میں پہلے گھٹنوں کے بل نیچے گرا اور میری گرفت سے پنڈلیاں چھڑانے کی جان توڑ کوشش کی اور میرے دو تین وحشیانہ جھٹکوں میں وہ پیٹ کے بل نیچے گر گیا۔ اور میں اسے مسہری کے نیچے گھسیٹتا ہوا دوسری طرف سے باہر نکل گیا۔

باہر آتے ہی میں مسہری پر سوار ہوگیا اور اس کی پنڈلیاں موڑ کر پوری طاقت سے اوپر اٹھا لیں۔ اس شخص کے کولہے مسہری کی نچلی پٹی کے سہارے اٹھ گئے جب کہ اس کا دھڑ پیٹ کے بل مسہری کے نیچے تھا۔

یہ صورت حال اس کے حق میں نہایت مہلک تھی۔ وہ ذرا بھی زور آزمائی کی کوشش کرتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی کہیں سے بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ اپنی ابتر حالت کے باوجود وہ تیز غصیلے لہجے میں کچھ کہے جا رہا تھا۔ مگر میری نظریں اس کے جوتوں اور پتلون کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

اس کے جوتے اور پتلون پر مختلف چیزوں کے تازہ دھبے بکثرت ... تھے جن سے ملی جلی بو آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کوڑے کے ڈھیر ... اپنی تدفین کے بعد اس فلیٹ کی طرف آیا ہو اور کوڑے گھر کا خیال آتے ہی میرا ذہن اس کے نزول کی راہ کا تعین کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

بیشتر جدید عمارات کی طرح اس عمارت میں بھی ایک شوٹ بنی ہوئی تھی۔ یہ کنکریٹ کی بنی ہوئی ایک ایسی عمودی سرنگ ہوتی ہے جو ہر فلیٹ کے باورچی خانے سے گزرتی ہے اور اس میں اسپرنگ کے ذریعے خودکار طریقے پر بند ہونے والی ایسی کھڑکی لگی ہوتی ہے جسے فلیٹ کے مکین حسب مرضی اندر سے کھول کر کوڑا کرکٹ وغیرہ اس میں پھینک سکتے ہیں جو ہر منزل سے نیچے کوڑا گھر میں جمع ہو جاتا ہے جہاں سے صفائی کا عملہ اسے ٹرکوں میں اٹھا لے جاتا ہے۔

اس شخص کی حالت بتا رہی تھی کہ اس نے فلیٹ میں داخلے کیلئے قفل شکنی کے بجائے شوٹ کو اس فلیٹ کے کچن سے ملانے والی کھڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ ان کھڑکیوں کی ساخت عموماً ایسی ہوتی ہے کہ باورچی خانے سے تو کوئی بھی چیز باہر پھینکی جا سکتی ہے مگر شوٹ میں سے کھڑکی کا کھولا جانا نہایت دشوار ہوتا ہے۔

شوٹ میں عموماً باقاعدہ وقفوں سے جراثیم کش اور بدبو کو دبانے والی ادویات کا اسپرے کیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود اس عفونت زدہ عمودی سرنگ میں زنگ اور پھپھوندی لگے ہوئے آہنی کنڈوں کے سہارے کوڑا گھر سے اوپر تک آنا اور پھر کوئی اشتباہ آمیز کھٹکا پیدا کئے بغیر کھڑکی اٹھا کر فلیٹ میں داخل ہونا خاصے دل گردے کا کام تھا اور کوئی بھی شخص معمولی لالچ کے

لیے وہ پیچیدہ راہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ آنے والا یقینی طور پر کوئی اہم مقصد لے کر میری خوابگاہ تک پہنچا تھا۔

میں نے اس کی مضبوطی سے تھامی ہوئی پنڈلیوں کو اوپر کی طرف ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا: "بکواس مت کرو۔ ورنہ اسی حالت میں ریڑھ کی ہڈی کو ناکارہ کر دوں گا۔ اگر انگریزی بول سکتے ہو تو صرف یہ بتاؤ کہ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

ایک بے ساختہ کراہ کے ساتھ وہ خاموش ہو گیا اور قدرے سکوت کے بعد بگڑی ہوئی انگریزی میں بولا: "میری ٹانگیں چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

میں نے دوبارہ اس کی پنڈلیوں کو جھٹکا دیا: "میں رشتہ دار ہوں نا تمہارا! معلوم ہوتا ہے مجھے کوئی تحفہ پیش کرنے آئے ہو۔"

وہ اس بار درد کی شدید ٹیس محسوس کر کے بری طرح تڑپ اٹھا اور کراہتے ہوئے بولا: "خدا کیلئے مجھے چھوڑ دو ورنہ میں معذور ہو جاؤں گا۔"

"تمہارے پاس کتنے ہتھیار ہیں؟"

"میرے ہاتھ میں ایک بھرا ہوا ریوالور ہے۔ میں اس کا سیفٹی کیچ چڑھا کر اسے مسہری کے نیچے سے باہر پھینکے دیتا ہوں۔ تم میرے باہر نکلنے سے پہلے اس پر قبضہ کر سکتے ہو۔ یقین کرو کہ میں بھول کر بھی تم سے مکاری کی ہمت نہ کر سکوں گا۔"

اور اس کے خاموش ہوتے ہی مسہری کے نیچے سے ریوالور فرش پر آگرا۔ وہ شخص اس وقت بہت بری طرح میرے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ مگر خود میرے لیے وہ صورت حال خاصی مضحکہ خیز تھی۔ میں نہ اس کی صورت دیکھ سکتا تھا نہ اسے بے ہوش کرنے کی کوئی ترکیب آزما سکتا تھا لہٰذا جب اس نے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کی تو میں نے اسی وقت اس سے محدود مصالحت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے نہتا ہو جانے کے بعد میں ریوالور کی زد پر اس سے خاصے خوشگوار ماحول میں گفتگو کا آغاز کر سکتا تھا۔

میں نے اچانک اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں اور بستر سے اچھل کر قالین پر پہنچ گیا جہاں اس کا سیاہ منقش دستے والا ریوالور پڑا ہوا تھا۔

میں نے ایک نظر ریوالور کے چیمبر کا جائزہ لیا اور سیفٹی کیچ ہٹا کر ریوالور کی نال اس کی طرف سیدھی کر دی۔

وہ بدستور مسہری کے نیچے پیٹ کے بل بے سدھ پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"اداکاری کی ضرورت نہیں، باہر نکلو۔" چند ثانیوں کے انتظار کے بعد بھی اس نے باہر آنے کی کوئی کوشش نہ کی تو مجبوراً مجھے زبان کھولنا پڑی۔

"میری کمر میں ناقابل برداشت درد ہو رہا ہے!" وہ آہستہ آہستہ مسہری کے نیچے سے نکلتے ہوئے بولا: "مگر مجھے امید ہے کہ میری یہ تمام محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔"

باہر آ کر اس نے قالین پر پڑے پڑے کروٹ لی اور کراہتے ہوئے چت ہو کر لیٹ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر دبائی ہوئی تھی۔

اس کا حلیہ بہت ہی بگڑا ہوا تھا۔ اس کا سر، چہرہ اور سارا لباس رنگ برنگ متعفن چیزوں میں لتھڑا ہوا تھا۔

"شوٹ کے ذریعے اندر گھسے ہو؟" میں نے سخت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ راستہ اختیار کر کے میں نے شدید خطرہ مول لیا تھا۔" وہ اٹھنے کی کوشش کیے بغیر کراہتے ہوئے بولا: "اگر میری پیش قدمی کے دوران کوئی وزنی چیز شوٹ میں پھینکی جاتی تو میرا بچنا ناممکن ہو کر رہ جاتا۔"

"صبح کے ساڑھے چھ بجے شرفا بستروں میں پڑے ہوتے ہیں۔" میں نے رسٹ واچ کا جائزہ لیتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا: "راستہ خطرناک ضرور تھا مگر تم نے وقت بہت موزوں چنا تھا۔"

"میں پوری رقم کے لالچ میں یہاں آیا تھا مگر اب میں ایک تہائی پر سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوں۔ کیونکہ اس معاملے میں تمہارا ایک ساتھی بھی شریک تھا۔ اس رقم میں ہم تینوں برابر کے حقدار ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری اس تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کرو گے۔" وہ نہتا ہو جانے کے باوجود مجھ سے خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔

"تم کس رقم کی بات کر رہے ہو؟"

وہ ہولے سے ہنس دیا: "مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ میں تم کھلنے کو تیار ہوں کہ معاہدے پر عمل ہو جانے کے بعد کبھی بھول کر بھی اس کا تذکرہ نہیں کروں گا کیونکہ ہمارے مفادات مشترک ہیں۔ اس رقم کے لیے تم نے ... کی ہے اور میں بھی اس میں ملوث رہا ہوں۔ تمہیں پھنسانے کی کوشش میں میں خود کو محفوظ نہ رکھ سکوں گا۔"

"میں پھر پوچھتا ہوں کہ تم کس رقم کی بات کر رہے ہو؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دوغلا پن نہیں کر رہا تھا بلکہ مجھ سے وہی کچھ کہہ رہا تھا جو اس کے ذہن میں موجود تھا۔

"اگر تم بھول ہی گئے ہو تو پھر مجھے یاد دلانا پڑے گا کہ میں ان چھ لاکھ فرانک کی بات کر رہا ہوں جو تم اپنے ساتھی کی مدد سے رائے کاردیلو اور ایرک کو ہلاک کر کے اڑا لائے ہو۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"چارلی!" وہ بولا: "تم دونوں نے معاملہ ختم کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا۔ اگر مجھے تھوڑی سی اور مہلت مل جاتی تو میں کہیں نہ کہیں سے وہ رقم برآمد کر ہی لیتا مگر تم لوگوں کی للکار سن کر مجھے بدحواسی کے عالم میں ناکام و نامراد بھاگنا پڑا۔"

اس کی کہانی خاصی دلچسپ تھی اور میں بڑی حد تک اس کا پس منظر بھی سمجھ گیا مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ رائے کاردیلو کا خون آشام رکھوالا اس کے مکان سے فرار ہونے کے بعد اتنی جلدی عبداللہ کے فلیٹ تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہو گیا جبکہ کاردیلو نے خطیر رقم کا لالچ دے کر قاتلوں کی ایک ٹولی

[...] اور عبداللہ کے خاتمے پر مامور کیا ہوا تھا اور سیموئیل بریرے کے بیان کے [...] وہ قاتل خاصا وقت گنوانے کے باوجود خفیف سا سراغ بھی حاصل نہ کر سکے تھے۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم اس فلیٹ تک کیسے پہنچے؟"

"میں تمہارے ساتھی کو جانتا ہوں۔" وہ بولا: "اسے پہچانتے ہی میرے ذہن [...] ایک زبردست منصوبے نے جنم لیا تھا ورنہ وہ بآسانی میری اسٹین گن کا شکار ہو جاتا۔"

"اسے کیسے جانتے ہو؟ اور رائے کاردیلو کی کمین گاہ پر تم سامنے ہی نہیں آئے [...] تم نے اسے کیسے پہچان لیا؟"

"جس وقت ایرک تمہارے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا تو میں ایک دروازے [...] سے سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ تمہارا ساتھی میری نظروں کے سامنے رائے کاردیلو کے تعاقب میں پہنچا تھا۔ میں چاہتا تو بآسانی اسے مار دیتا مگر سچی بات یہ [...] میرے دل میں کاردیلو کی رقم کے بارے میں شروع ہی سے بے ایمانی موجود [...] اس کی شخصیت کا خوف میرے ارادوں کی تکمیل کی راہ میں حائل تھا۔ جب [...] ساتھی نے دخل اندازی کی تو میں نے سمجھ لیا کہ اب کاردیلو اور ایرک میں سے [...] نہ بچ سکے گا۔" وہ پرخیال انداز میں آہستہ آہستہ بتا رہا تھا: "میرا خیال تھا کہ تم دونوں [...] رقم کا پتہ حاصل کرنے کیلئے اس سے تشدد آمیز باز پرس کا طویل سلسلہ [...] کرو گے اور میں اس دوران رقم تلاش کر کے اس مکان سے دور نکل جاؤں [...] میں اندر کھسک گیا مگر تلاشی کی ابتدا کرتے ہی پہلے اسٹین گن سے کاردیلو [...] زخمی ہونے کا حادثہ ہوا اور تھوڑی دیر بعد تمہارے ساتھی نے مجھے للکارا تو میں [...] وہاں سے خالی ہاتھ فرار ہو گیا۔"

"اور اب اپنا حصہ وصول کرنے یہاں آگئے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ [...] نے یہ نہیں بتایا کہ عبداللہ کو کیسے جانتے ہو؟"

[...] باپ رے۔" وہ قالین پر لیٹے لیٹے ہی اچھل پڑا: "تو عبداللہ وہی ہے؟" [...] لہجے میں بے پناہ حیرت نمایاں تھی۔

"تو تم اسے کیا سمجھے تھے؟"

"میں صرف اس کی صورت اور ٹھکانے سے واقف تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ [...] نام عبداللہ ہے تو وہ تمہیں گھنٹے پہلے ہی کسی پیشہ ور قاتل کے ہاتھوں [...] ہو چکا ہوتا کیونکہ کاردیلو نے انعام کا لالچ دے کر کئی آدمی اس کے پیچھے لگائے [...] تھے اور اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم ڈاکٹر آسکر نیتیم ہو کیونکہ کاردیلو ان ہی [...] سے خائف تھا۔"

[...] کاردیلو کی رقم کے بارے میں تم پوری کہانی دہرا دو۔" میں ذہنی طور پر چارلی [...] بننے کیلئے تیار ہو چکا تھا۔

"کہاں سے سننا چاہتے ہو؟"

"کاردیلو سے تمہارا رابطہ کیوں اور کیسے ہوا؟"

[...] ہم چھ آدمیوں کو رائے کاردیلو کے اسی ٹھکانے پر لے گیا تھا۔ اس [...] بتایا تھا کہ ہمیں کاردیلو کے دو دشمنوں کا کھوج نکال کر انہیں اغوا یا ہلاک کرنا ہے جو نیس میں موجود ہیں۔ اس نے دونوں کے نام عبداللہ المطلعی اور ڈاکٹر آسکر نیتیم بتلائے تھے مگر ہم سے ملنے کے بعد کاردیلو نے مجھے اور ایرک کو اپنی حفاظت کیلئے چن لیا اور بقیہ چاروں آدمی شاید مقررہ کام پر لگا دیے گئے۔ ان چاروں کو علیحدگی میں ہدایات دے کر روانہ کرنے کے بعد کاردیلو نے سیموئیل بریرے کی موجودگی میں مجھے اور ایرک کو بڑی مالیت کے نوٹوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس دکھا کر بتایا تھا کہ وہ روم میں اسمگل شدہ ہیروں کی ایک بڑی کھیپ بیچ کر نیس پہنچا تھا اور راستے سے دو خطرناک لٹیرے اس کے پیچھے لگ گئے جو اسے ہلاک کر کے چھ لاکھ فرانک اڑانا چاہتے تھے۔ اس نے ہمیں تین تین ہزار فرانک فی ہفتہ مشاہرہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"مگر پہلا ہفتہ گزرنے سے قبل ہی وہ مارا گیا۔"

"دیکھا جائے تو محض میرے تعاون کی وجہ سے تم اسے ہلاک کر کے رقم حاصل کر سکے ورنہ میری اسٹین گن نہ صرف تمہیں اور عبداللہ کو بلکہ کاردیلو اور ایرک کو بھی ختم کر سکتی تھی۔" یہ کہتے ہوئے چارلی آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔

"غالباً پہلے ہفتے کی تنخواہ تمہیں پیشگی مل گئی ہو گی؟"

میرے اس سوال کا جواب اس نے اپنے سر کی جنبش سے اثبات میں دیا۔

"پھر اسی پر قناعت کرو۔" میں نے کہا: "کاردیلو نے تمہیں وہ سوٹ کیس صرف اس لئے دکھایا ہو گا کہ اپنی اصل سرگرمیوں کی پردہ پوشی کر سکے اور مجھے یقین ہے کہ اس سوٹ کیس میں نیچے سادے کاغذ کی گڈیاں بھری ہوں گی۔"

"نہیں!" اس کے منہ سے مایوسی اور بے اعتباری کے عالم میں نکلا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مارجوری اور سیموئیل کے قاتل ہو مگر پھر بھی میں تمہیں اس فلیٹ سے زندہ لوٹنے کی اجازت دینے کو تیار ہوں۔"

"مارجوری رائے کاردیلو کے ہاتھوں ماری گئی تھی البتہ سیموئیل ضرور میرے ہاتھوں مارا گیا تھا مگر مجھے اب بھی یقین نہیں ہے کہ تم سچ بول رہے ہو!"

"میرا خیال ہے کہ تم اب بھی اس ویران مکان کا رخ کرنے کی ہمت کر سکو تو وہاں تمہیں وہ سوٹ کیس ضرور مل جائے گا اور شاید اس میں سے چند ہزار فرانک ہی ہوں گے باقی تمام ردی ملے گی۔"

"تم مجھ سے پیچھا چھڑانے کیلئے بہانا تراش رہے ہو۔"

"میں نہایت سکون سے تمہیں بے ہوش کر کے شوٹ میں پھینک سکتا ہوں جب کوڑے گھر میں تمہاری مسخ شدہ لاش دریافت ہو گی تو یہی سمجھا جائے گا کہ شوٹ کے ذریعے نقب زنی کی کوشش کرتے ہوئے تم حادثے کا شکار ہو کر نیچے پھسل گئے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت بہتر پوزیشن میں ہو اور یقین نہ کرنے کے باوجود مجھے تمہاری ہر بات تسلیم کرنا ہو گی۔"

"پھر میری بات مانو اور فوراً واپس چلے جاؤ۔"

"شاید تمہارا ساتھی کوئی بہتر رائے دے سکے!"

"وہ بہت سفاک آدمی ہے، میری مانو تو اس کے آنے سے پہلے نکل جاؤ ورنہ وہ خدائی فوجدار سیموئیل کے قتل کے الزام میں تمہارا [...] کرے گا۔"

"باہر نکلنے سے پہلے مجھے اپنا حلیہ درست کرنے کی اجازت ہے؟"

"یہ حمام گھر نہیں ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس کہر آلود موسم میں اتنے سویرے کوئی تمہیں غور سے نہ دیکھ سکے گا۔"

میں نے چیمبر خالی کرکے ریوالور اس کی طرف اچھال دیا اور چند سیکنڈ بعد چور راستے سے آنے والا بدمعاش فلیٹ سے رخصت ہوگیا۔

دروازہ مقفل کرنے کے بعد میں نے باورچی خانے میں پہنچ کر شوٹ کی کھڑکی کا جائزہ لیا تو وہ اپنی جگہ صحیح حالت میں موجود تھی۔ غالباً چارلی نے کسی خاص ترکیب سے اندرونی کھٹکا سرکا کر کوئی نقصان پہنچائے بغیر کھڑکی کھولی تھی۔

روشنیاں گل کرکے میں دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔ چارلی کی نامناسب دخل اندازی کا سلسلہ ختم ہوتے ہی میرے اعصاب پر ایک مرتبہ پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی اور میں لیٹنے کے چند منٹ بعد ہی ایک مرتبہ پھر گہری نیند سوگیا۔

سہ پہر کے قریب فون کی مسلسل چیختی ہوئی گھنٹی نے دوبارہ بیدار کیا۔ میں نے بیڈ سوئچ آن کرکے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو ڈاکٹر!" دوسری جانب سے عبداللہ کی سرد اور سپاٹ آواز سنائی دی جو میرے لئے انتہائی غیر معمولی تھی۔

"تم کہاں ہو؟"

"میں ایک بکنگ ایجنسی میں بیٹھا ہوں تم سیدھے ڈی ریگی چلے جاؤ۔ وہاں سے ایک لفافہ لے کر سیدھے ایئرپورٹ پہنچ جاؤ۔" اس کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔

"کوئی خاص بات؟"

"تمہیں پانچ بجے سے پہلے ایئرپورٹ کے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچنا ہے۔" عبداللہ نے یہ کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

میرے لئے عبداللہ کا وہ انداز بالکل ناآشنا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کی آواز میں اس قدر سختی اور سنجیدگی محسوس کی تھی اور پھر وہ جو پیغام پارٹ سے روانہ ہوا تھا وہ بھی خاصا پریشان کن تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بیروت میں فلسطینی لیڈروں کے اجلاس میں کیا جانیوالا دھماکا اپنے اثرات کے اعتبار سے خاصا مہلک ثابت ہوا تھا جب کہ ایک شخص کی ہلاکت اور دو کے زخمی ہونے کی اطلاع عبداللہ کو ملنے والے رقعہ میں ہی موجود تھی۔

میں بعجلت تیار ہوکر فلیٹ سے نکلا۔ باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور شہر گہری دھند کی لپیٹ میں تھا۔ میں نے اپنے اوورکوٹ کے کالر کھڑے کئے اور دونوں ہاتھ جیبوں میں اڑس کر ٹیکسی کی تلاش میں ایک طرف چل دیا۔

ہوٹل ڈی ریگی پہنچا تو چارلس بک ہارٹ میرا منتظر تھا۔ میرے دفتر میں داخل ہونے ہی کرسی چھوڑ کر دونوں بازو پھیلائے میری طرف لپکا اور مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔

"مبارک ہو تم دونوں نے بڑی بے جگری سے کاردیلو کو مارا ہے۔" اس کا لہجہ دفورِ مسرت سے مرتعش تھا۔

"عبداللہ سے تمہاری ملاقات ہوئی؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ تو پچھلا وہ بنا ہوا ہے۔ پہلی بار فون کرکے اس نے کاردیلو کے ... کی خبر دی تھی۔ دوسری مرتبہ ذاتی کام سے فون کیا۔" یہ کہہ کر وہ چند ثانیوں کیلئے خاموش ہوکر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن رقصاں تھی جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ جو بات وہ کہنے والا ہے اسے زبان تک لائے یا خاموشی اختیار کرلے۔

"تم سے ایک بات پوچھ لوں؟" آخرکار اس نے کہہ ہی ڈالا۔

"ضرور پوچھو۔" میں نے فراخدلی سے مسکرا کر کہا۔

"مگر یہ صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔"

"وعدہ!" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم دونوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"پیرس جا رہے ہیں۔"

اس کے منہ سے بے اختیار ایک طویل سانس آزاد ہوگیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی بڑی مہم درپیش ہے، میرا مقصد نہیں کہ عبداللہ کی مصروفیت میں دخل اندازی کروں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر زندگی کا بوجھ اٹھا رہا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھو وہ نوجوان آدمی ہے۔" چارلس کہنے لگا۔ "ابھی اس نے دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہ یہاں خاصے معقول ذرائع آمدنی کا مالک ہے مگر اپنی ساری کمائی اپنی تنظیم پر صرف کردیتا ہے اور مجھے یہ بتلاتے ہوئے شرم آرہی ہے کہ وہ اکثر مجھ سے ادھار بھی لیتا رہتا ہے وہ ہمیشہ ایک ایک پیسہ لوٹا دیتا ہے۔ اور میری مدد بھی قبول نہیں کرتا۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات پر بہت زیادہ ذمہ داریاں لی ہوئی ہیں۔"

"یہ تو اس کی ایمانداری کی دلیل ہے۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "ورنہ وہ جس تنظیم کیلئے کام کر رہا ہے اس کے پاس فنڈز کی کوئی کمی نہیں۔ عبداللہ چاہے تو ہر ماہ خطیر رقم غبن کرسکتا ہے مگر وہ ایک باکردار اور اصول پرست شخص ہے۔"

"میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔" چارلس بولا۔ "اسے تم غبن نہیں بلکہ اختیارات کا مناسب استعمال کہوگے۔ وہ سکھ کی زندگی گزار سکتا ہے۔"

"تم فرنچ ہو چارلس! تمہارا ایک گھر اور وطن ہے جبکہ عبداللہ کا وطن تو درکنار گھر بار اور کنبہ بھی نہیں ہے۔ وہ جس آگ میں جل رہا ہے تم اس کا ... محسوس نہیں کرسکتے۔ تمہیں تو حیرت ہونا چاہیئے کہ اس قدر حساس دل رکھنے کے باوجود وہ مسکراتا کیسے ہے؟"

"تم تو اس کے ہم نوا نکلے!" وہ ہنس کر بولا۔

"میرا بھی ایک وطن ہے دوست!" میں نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "مگر میں ایک مدت سے خود ساختہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ کبھی کبھی میرے دل میں اپنے وطن کے لئے ایک ہوک سی اٹھتی ہے اسی لئے میں عبداللہ کی کیفیت کو تھوڑا بہت سمجھتا ہوں۔ کیا تمہیں یہ بات ... نہیں لگتی کہ وہ رنگین اور پُرآسائش ماحول میں گھرا ہونے کے باوجود ... بے کیف زندگی بسر کر رہا ہے؟"

"میرا تو خیال تھا کہ میں تمہارے ذریعے اسے سمجھانے میں کامیاب ہوسکوں ... تم الٹا مجھ ہی کو سمجھانے لگے ہو۔" وہ خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "بہرحال میری نظروں میں اس کا بلند مقام ہے اور ہم دونوں بے تکلفی کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ تمام گفتگو تم اپنی ذات تک ہی محدود رکھوگے!"

"تم بے فکر رہو۔"

"پیرس سے تم واپس یہیں آؤگے؟" اس نے ایک لفافہ میری سمت بڑھاتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اگلی منزل ضرور معلوم ہے، اس سے آگے کدھر کا رخ کرنا پڑے گا، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے لفافہ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بنجاروں جیسی باتیں کررہے ہو۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔

"قسمت نے بنجارہ بنا ہی دیا ہے تو باتیں ان جیسی کیوں نہ کی جائیں۔"

چارلس کے پاس میں نے آتشیں سیال کے چند پیالے اپنے معدے میں انڈیلے اور پھر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ چارلس نے نہایت گرم جوشی سے مجھے رخصت کیا۔

ٹیکسی میں ایئرپورٹ کے کہر آلود راستے پر سفر کرتے ہوئے میرا ذہن چارلس سے ہونے والی گفتگو میں الجھا رہا۔

چارلس مادی دور کا ایک کامیاب انسان تھا جو پیسوں سے ہر خوشی خریدنے کا فلسفے پر یقین رکھتا تھا اور ہر معاملے کو مادی نفع اور نقصان کے معیار پر پرکھنے کا عادی تھا۔ اسے انسان کے وجود میں چھپے ہوئے جذبوں کی پکار کا علم نہیں ورنہ وہ عبداللہ کے بارے میں زبان نہ کھولتا۔

انسان کی زندگی میں بہت سے مقام ایسے بھی آجاتے ہیں جہاں وہ سب کچھ کھو کر، لٹا کر بھی ایک لازوال آسودگی محسوس کرتا ہے اور عبداللہ اسی مقام پر فائز تھا۔ وہ اپنے وطن کے حصول کی ہولناک سرد جنگ لڑ رہا تھا اور اس مقصد کیلئے خندہ پیشانی کے ساتھ ہر قربانی دینے کیلئے تیار رہتا تھا۔ چارلس کے لئے تو ناقابل فہم ہوسکتی تھی۔ مگر میرے لئے نہیں۔

ٹیکسی ایئرپورٹ کے ایک کیٹرنگ ونگ کے سامنے ایک جھٹکے سے رکی تو میں نے کرایہ ادا کرکے باہر آگیا۔

سٹریٹ لائٹ کے بلند کھمبوں پر جلتی ہوئی زرد روشنیوں کے ہالے ... بڑے خوشنما نظر آرہے تھے۔ ایک دوسرے سے لاتعلق مسافر تیزی کے ساتھ آ جا رہے تھے۔ میں بھی ان کی بھیڑ میں شامل ہوکر ایک طرف چل دیا۔

اس وقت شام کے پونے پانچ بجے تھے مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ... اندھیری رات کے سائے پھیل چکے ہوں۔

... استقبالیہ کاؤنٹر والے وسیع ہال میں داخل ہوا جو شاید کسی مرکزی نظام سے گرم رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ باہر کے مقابلے میں وہاں کا درجہ حرارت خاصا خوشگوار تھا۔

باہر کے شدید موسم سے پناہ لینے کیلئے کافی لوگ وہاں گھسے ہوئے تھے اور ہال میں پڑی ہوئی تمام نشستوں پر لوگ براجمان تھے۔

میں سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگاتا دیوارگیر اشتہارات کا جائزہ لینے لگا۔ اسی اثنا میں میرے سامنے ایک صوفہ خالی ہوا اور میں ایک دلکش سی سفید فام لڑکی کے پہلو میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے وہاں بیٹھنے کے بعد اس لڑکی کا خیال کرتے ہوئے ادھ جلی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی تاکہ سگریٹ کا کثیف دھواں اس کے لئے پریشانی کا باعث نہ ہو۔

"پلیز آپ سگریٹ پیتے رہیں۔" لڑکی جو شاید میری طرف دیکھ رہی تھی، مجھے سگریٹ بجھاتے دیکھ کر التجا آمیز انداز میں بول پڑی۔

میں نے آہستگی سے سر گھما کر پہلی بار گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور دل ہی دل میں قدرت کی صناعی کی داد دینے لگا۔

دراز قامت، گداز اور متناسب بدن پر سرمئی رنگ کا گرم اسکرٹ اور فر کے کالر والا عنابی اوورکوٹ موجود تھا، پیروں میں سیاہ چرمی لانگ بوٹ تھے۔ فر دار کالر کی اوٹ سے بھرے بھرے شہابی شانے اور صراحی دار گردن نظر آرہی تھی۔ اس کی بلور کی طرح چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور پتلے پتلے ستواں ہونٹ انتظار آمیز انداز میں خفیف سے کھلے ہوئے تھے جن کی اوٹ سے اس کے اوپری دانتوں کی قطار سفید موتیوں کی پتلی سی لڑی کی صورت میں چمک رہی تھی۔

"میں نے سگریٹ تمہاری وجہ سے بجھائی ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"دوسری جلا لو، مجھے دھوئیں سے لطف آرہا تھا۔" اس نے برجستہ کہا۔

"اتنا ہی لطف آرہا تھا تو تم بھی ایک سگریٹ سلگالو۔" میں نے جیب سے فرنچ ساخت کی تیز سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"میں سگریٹ پیتی ہوں مگر اس وقت مجبوری ہے۔ تم پیوگے تو اس طرح میرا تھوڑا بہت نشہ پورا ہوتا رہے گا۔"

"کیسی مجبوری ہے؟" میں نئی سگریٹ ہونٹوں کی طرف لیجاتے ہوئے بولا۔

"ممی اور پاپا دونوں ہی یہاں موجود ہیں۔ وہ میری تمباکو نوشی سے سخت نفرت کرتے ہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کمال ہے کہ تم ان کی اتنی پرواہ کرتی ہو۔" میں نے اپنی دانست میں اس پر طنز کیا مگر وہ سمجھ ہی نہ سکی۔

"پرواہ کی بات نہیں، میرا باپ بہت ظالم شخص ہے۔ وہ ہجوم کی پرواہ کیے بغیر اسی جگہ مجھے دو تین تھپڑ جڑ دے گا۔"

"تو انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟" مجھے اس خوبصورت لڑکی سے گفتگو بڑھانے میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔ "بظاہر تم بالغ معلوم ہوتی ہو!"

"میری عمر اٹھارہ برس کی ہوچکی ہے مگر میں فی الحال انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

میں نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی کم سن تھی۔

اگر مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا تو میں یہ کہنے سے دریغ نہ کرتا کہ دنیا کی ہر لڑکی اٹھارہ برس کی عمر تک سال بہ سال عمر میں اضافہ کرتی جاتی ہے اور اگر شکل و صورت قبل از وقت دغا نہ دے جائے تو انتقال ہونے تک اٹھارہ برس کی ہی رہتی ہے۔

"کوئی نشہ بھی کرتی ہو؟" میں نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

"شوق تو بہت ہے، موقع نہیں ملتا۔" وہ بے خوفی سے بولی۔ "کبھی کبھار دعوتوں میں دو چار پیگ وھسکی پی لیتی ہوں۔"

"لڑکوں سے دوستی؟"

"میرے دو بوائے فرینڈ ہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر میرا اٹھا ہوا دھواں اپنے پھیپھڑوں میں اتارتے ہوئے بولی۔ "ان میں ایک مجھے پسند ہے مگر اس کے دوسری لڑکیوں سے بھی مراسم ہیں۔ وہ مجھ سے پیسے اینٹھ کر ان پر خرچ کرتا ہے اور دوسرا مجھے کانچ کی گڑیا سمجھتا ہے۔ اسے میرے جذبات سے زیادہ پاپا کی خوشنودی عزیز ہے تاکہ مجھ سے شادی کر کے ان کے ترکے پر قابض ہو سکے۔" پھر اس نے پہلی بار میرے بارے میں سوال کیا۔ "تم کون ہو؟"

"ایک آدمی ہوں۔" میں نے اس کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"وہ تو نظر آ رہا ہے۔" وہ پہلو بدل کر چڑچڑے لہجے میں بولی۔ "کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کیا نام ہے؟"

"ارے تم نے تو ایک دم اتنے سوالات کر ڈالے۔" میں درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ کر بول پڑا۔ "میں لندن سے آیا ہوں۔ فی الحال پیرس جا رہا ہوں۔ لندن میں معمولی سی نوکری کرتا ہوں اور میرا نام ڈان فرنانڈو ہے۔"

"شاید الیشیائی تارکِ وطن ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔ دو نسلیں لندن میں گزارنے کے بعد بھی تارکِ وطن ہی کہلاتا ہوں۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "اب اپنے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔"

"میرا نام ایلیزا جوناس ہے اور میں صرف خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ میرا باپ برطانیہ کا شہری اور لکھ پتی ہونے کے باوجود خاصے دقیانوسی خیالات کا مالک ہے۔"

"کہاں جا رہی ہو؟"

اسی وقت کسی کرخت مردانہ آواز نے اسے ایلیزا کہہ کر پکارا اور وہ لوکھلاہٹ میں اپنا پرس وغیرہ سمیٹ کر وہاں سے چل دی۔

اس کے تعاقب میں میری نگاہیں اس سفید فام جوڑے پر پڑیں جو اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مرد خاصی خوفناک شخصیت اور طاقت کا مالک معلوم ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ باور کرنا خاصا دشوار امر تھا کہ ایلیزا جیسی نرم و نازک لڑکی کی پیدائش میں اس کا قصور رہا ہوگا۔

پھر وہ تینوں عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چل دیئے۔ ایلیزا شاید دانستہ ان دونوں سے پیچھے رہ گئی اور موقع پاتے ہی اس نے پلٹ کر میری طرف الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ اور میں نے اسی انداز میں اس کو جواب دے دیا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میرے دل میں ایک چبھن سی ہوئی۔ ایلیزا جیسی لاابالی لڑکی اس قابل تھی کہ اس کے ساتھ خاصا وقت خوشگوار طریقے پر گزارا جا سکتا تھا۔

عبداللہ سوا پانچ بجے وہاں آیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک لگی ہوئی تھی۔ اس کے ہمراہ دو آدمی اور بھی تھے جو اپنے خدوخال کی بنا پر دور ہی سے فلسطینی نظر آ رہے تھے۔

عبداللہ نے ان سے میرا تعارف ڈاکٹر آسکر بنتھم کی حیثیت سے کرایا اور وہ دونوں مجھ سے نہایت گرم جوشی سے ملے۔ جب ان میں سے ایک نے عربوں کے روایتی انداز میں خلوص کے اظہار کیلئے میرے بائیں رخسار پر اچانک پھسلتا ہوا ایک بوسہ لیا تو میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

میں نے چارلس سے لایا ہوا لفافہ عبداللہ کے حوالے کیا جو اس نے اپنے ایک ساتھی کو دے دیا اور عربی میں اسے کام کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

میں اس کی ساری گفتگو بخوبی سمجھ رہا تھا مگر بظاہر لاتعلقانہ انداز اختیار کیے رہا۔ جب عبداللہ کے خاموش ہونے پر وہ دونوں روانہ ہونے لگے تو میں نے یک بیک عربی بولنا شروع کر دی۔ میری زبان سے عربی میں الوداعیہ فقرے سن کر ان پر خوشگوار حیرت کا حملہ ہوا اور اسی کیفیت میں وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔

"تم کہاں غائب ہو؟ اور یہ تاریک شیشوں کی عینک کیوں لگائی ہوئی ہے؟" میں نے خلوت میسر آتے ہی عبداللہ سے سوال کیا۔

"نیس کی بندرگاہ پر ایک اسرائیلی فلیگ شپ پر جنگی اسلحہ لادا جا رہا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ اہم اقدامات کر رہا تھا۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر اندرونی حصے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "اور عینک کا سبب تم ضرور دیکھ لو۔"

یہ کہہ کر اس نے چہرہ میری طرف گھما کر عینک ہٹائی اور فوراً ہی لگا لی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔

عبداللہ کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور ان پر طویل بے خوابی کے باعث شدید ورم آ گیا تھا۔

"تم اپنی ذات پر بہت ظلم کرتے ہو۔ پیرس جانے کا پروگرام ملتوی بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

"میرے وجود کے اندر انتقام کا جوالا مکھی انگڑائیاں لے رہا ہے۔" وہ آہستہ مگر مستحکم لہجے میں عربی میں بولا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ بیروت میں کیا ہوا؟"

"بتاؤ گے نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس اجلاس میں فلسطینی گروہوں کے اختلافات طے کرانے کیلئے یاسر عرفات کے آنے کا پروگرام تھا مگر آخری وقت پر دمشق سے پرواز میں تاخیر ہونے کے باعث وہ اجلاس میں نہ آ سکے۔ وہ بم اجلاس کی صدارتی کرسی کے گدے میں چھپایا گیا تھا اور اس پر بیٹھنے والے ایک اہم لیڈر عبدالغنی کی ٹانگیں ٹکڑے ہو گئے۔ دو زخمی بیروت کے امریکن ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔"

"یعنی ساری تیاری یاسر عرفات کیلئے کی گئی تھی۔"

"انہوں نے ہمارے اہم ترین آدمی کیلئے ناکام جال بچھایا اور ہم اس کا جواب یوں دے سکتے ہیں کہ بن حیان کو پیرس سے زندہ نہ نکلنے دیں۔"

"اسلحہ بردار جہاز کے بارے میں کیا کر آئے ہو؟"

"وہ نیس سے تل ابیب کے لئے روانہ ہوگا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "میرے آدمی اس جہاز کے عملے میں شامل ہو چکے ہیں اور بحیرۂ روم کے گہرے پانیوں میں وہ جہاز غرقاب کر دیا جائے گا۔"

"ہاں میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ پچھلی رات چارلی تمہارے فلیٹ میں گھس آیا تھا۔" میں نے کہا تو وہ چونک پڑا۔

"چارلی تورلے کا وہ بوکا وہی محافظ تھا نا جو بچ کر بھاگ نکلا تھا؟"

"ہاں۔ نادانستگی میں اس نے ہمارے ساتھ زبردست تعاون کیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے چارلی کی پوری کہانی سنا دی۔

"تم نے اچھا کیا کہ اسے زندہ جانے دیا۔ ویسے قدرت کے انتظامات بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہ چاہے تو غیب سے مدد کا سامان پیدا ہو جاتا ہے ورنہ چارلی ایک برسٹ بھی مار دیتا تو اس کے لئے پورا میدان صاف ہو جاتا۔"

"اس نے یہی سوچا ہوگا کہ بغیر خون خرابہ کیئے رقم ہاتھ آ سکتی ہے تو بلاوجہ قتل کیوں کئے جائیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ تمہارا نیا نام کیا ہے؟" اس نے کہا۔ "کاؤنٹر پر مجھے تمہارے نام کا اندراج کرانا ہوگا۔"

"ڈان فرنانڈو!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام تم پہلے سے سوچے بیٹھے تھے!"

"تھوڑی دیر پہلے انتظار گاہ میں ایک نازنین کو اپنا یہی نام بتایا تھا۔"

"شاید لڑکیاں ہر جگہ تمہاری تاک میں رہتی ہیں۔"

"طنز نہ کرو، یہ مقدر کی بات ہوتی ہے۔" میں ہنس کر بولا۔

"چارلس نے نازنین کے بارے میں کچھ بتایا نہیں؟"

"اس کا ذکر ہی نہیں آیا۔"

"اس کا پورا چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا ہے اور تین چار ہفتوں تک بحال ہونے کی صورت نظر آتی ہے۔ اس کی کوشش مسلسل نظر آتی ہے۔ مگر پھر بھی تمہاری آواز سننے کو بے چین ہے۔"

میں ہنس کر رہ گیا۔

رسمی کارروائیوں سے فراغت کے بعد وقت کم رہ گیا تھا لہٰذا ہم براہِ راست طیارے کی طرف چل دیئے جو چھ بجنے میں پانچ منٹ پر پرواز کر گیا۔

طیارے میں مسافروں کی تعداد خاصی کم تھی۔ عبداللہ نے طیارے کے پرواز ہونے کے بعد تاریک شیشوں کی عینک اتار لی تھی اور پشت گاہ کو ٹیک لگا کر آنکھیں موندے اونگھ رہا تھا۔ میں اس فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے دستے کے بارے میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا مگر میں نے اس کے آرام میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

سوا گھنٹے کی سبک پرواز کے بعد ہمارا طیارہ پیرس کے چارلس ڈیگال ایئرپورٹ پر جا اترا جبکہ ال ایل کے طیارے کے اغوا کی مہم کے دوران میں ہم لوگ اورلی ایئرپورٹ پر اترے تھے۔

باہر عبداللہ کا ایک فلسطینی دوست گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا۔ عبداللہ نے اسے میرے نئے نام سے ہی متعارف کرایا اور جب کار روانہ ہوئی تو عبداللہ نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تیسرا شخص بھی افواجِ آزادیٔ فلسطین کا رکن تھا۔

میں نے ان دونوں کی پیشہ ورانہ گفتگو میں دخل نہیں دیا مگر جب اس شخص نے فرانسیسی وزارتِ دفاع کے افسر جولیس گرلوی کا نام لیا تو میں نے ساری توجہ اس پر مرکوز کر دی۔

"جولیس گرلوی اپنی دنیا میں مگن رہنے والا انسان ہے۔ ابھی تک ہم اس کے خلاف کوئی ایسی بات معلوم نہیں کر سکے جس کی بنیاد پر اس پر دباؤ ڈالا جا سکے۔"

"اس کے ملاقاتیوں کی تفصیل جمع کی گئی ہے نا؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

"یہ ہے۔" اس شخص نے اپنی بائیں جیب سے ایک سفید لفافہ نکال کر عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ "بیشتر نام ایسے ہیں جو سرکاری کام سے صرف ایک مرتبہ تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس آئے۔ بار بار آنے اور دیر تک بیٹھنے والوں کے ناموں کے سامنے سرخ کراس لگے ہوئے ہیں۔ پوری فہرست میں صرف پانچ نام ایسے ہیں۔"

"اسرائیلی وفد اب بھی یہیں مقیم ہے؟"

"ہاں۔ سہ نفری وفد ہے۔ وہ لوگ ہوٹل میریڈین میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"بن حیان کا کوئی سراغ ملا؟"

"نہیں۔ وفد میں کوئی شخص بھی اس کے حلیے پر پورا نہیں اترتا۔"

"کوئی سعودی ٹیم بھی آئی ہوئی ہے یہاں؟"

"تین روز قبل ایک دو رکنی وفد آیا ہے۔ ان میں سے ایک فضائیہ کا اعلیٰ افسر ہے اور وزارتِ دفاع کا کوئی سکریٹری ہے۔"

"ان کی آمد کا سبب معلوم ہے؟"

"نہیں۔ ادھر توجہ ہی نہیں دی گئی۔ ویسے وہ دونوں بھی ہوٹل میریڈین میں ہی مقیم ہیں۔ اس وجہ سے پتہ چل رہا ہے کہ ان کا بیشتر وقت باہر گزرتا ہے۔"

"ان کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں۔ البتہ یہ ضرور بتاؤ کہ اسرائیلی وفد کے لئے حفاظتی اقدامات کی نوعیت کیا ہے؟" عبداللہ نے دریافت کیا۔

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ غیر سرکاری طور پر فرانس آئے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے سرکاری طور پر کوئی حفاظتی بندوبست نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اخبارات میں وفد کی آمد کی کوئی خبر شائع ہوئی اور نہ انہیں پچھلے دنوں ہونے والی سرکاری تقریبات میں مدعو کیا گیا۔ اس شخص کا تجزیہ اور مشاہدہ خاصا گہرا

معلوم ہوتا تھا مگر اس کے باوجود کچھ بدلے ہوئے سادہ پوش چہرے ان کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں جو مقامی طور پر کرائے پر حاصل کیے گئے افراد بھی ہو سکتے ہیں اور اسرائیل کے باقاعدہ تنخواہ دار ہونے کا امکان بھی ہے۔"

"تمہاری معلومات خاصی تفصیلی ہیں۔ دوطرہ در کل کسی وقت ہوگا۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ ہماری رہائش کا انتظام کہاں کیا ہے؟" عبداللہ اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"مادام نے نامی ایک معذور بوڑھی عورت کے گھر بندوبست کیا ہے۔ وہ یکہ بھال کے شریف لوگوں کو کرائے پر رکھتی ہے اور اس کے یہاں کھانا پکانے والی کا بھی انتظام ہے۔"

"اور کتنے لوگ رہتے ہیں وہاں؟"

"مادام نے اور اس کی منہ بولی بیٹی کے علاوہ صرف دو مہمانوں کی گنجائش ہے جو آپ کیلئے مخصوص کرائی جا چکی ہے۔"

تھوڑی دیر میں گاڑی پیرس کی ایک قدیم اور صاف ستھری آبادی میں واقع ایک منزلہ مکان کے سامنے رک گئی۔

ڈور بیل کے جواب میں دروازہ کھولا گیا تو میں اپنے سامنے وہیل چیئر پر ایک ادھیڑ عمر عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو دونوں ٹانگوں سے معذور تھی۔

ہمارے ساتھی کو پہچانتے ہی مادام نے کے ہونٹوں پر خلیقانہ مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے داہنے ہاتھ سے کرسی کے پہیے کو گردش دے کر ہمارے اندر داخل ہونے کیلئے راستہ چھوڑ دیا۔

مادام نے سے ہم دونوں کا تعارف کرانے کے بعد وہ شخص چلا گیا اور مادام نے نے باری باری ہمیں وہ دونوں کمرے دکھائے جو خوابگاہ کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔

"تمہاری منہ بولی بیٹی کہاں ہے؟" عبداللہ نے کمرے کو تجسس آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے انگریزی میں سوال کیا۔

"وہ کسی سے ملنے گئی ہے، آتی ہی ہوگی۔ سردی محسوس ہو تو گیس ہیٹر کھول لینا۔ کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو آواز دے لینا، یہ نہ سوچنا کہ میں معذور ہوں۔"

"ہماری وجہ سے تمہیں زیادہ زحمت ہوگی مادام۔"

"زحمت نہیں، مجھے تو صحت مند لوگوں کے لئے کام سرانجام دے کر دلی مسرت ہوتی ہے۔ میری صرف دونوں پنڈلیاں کسی وجہ سے سوکھ گئی تھیں اور میرا وزن سہارنے سے انکار کر دیا ورنہ میں پوری طرح صحت مند اور چاق و چوبند ہوں۔ اب تو وہیل چیئر کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اس پر بیٹھنے کے بعد مجھے اپنی سوکھی ہوئی بے جان پنڈلیاں یاد ہی نہیں رہتیں۔"

"بے شک بے شک!" عبداللہ سر ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ اس کے لئے بڑھیا کی وہ تقریر ضرورت سے زیادہ ثابت ہوئی تھی۔

مادام نے اپنی کرسی کو ٹھکاتی ہوئی واپس چلی گئی تو عبداللہ کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ "بڑی باتونی عورت ہے۔"

"اور انگریزی بھی جانتی ہے۔" میں کراہتے ہوئے بولا۔ "اگر اس کی منہ بولی بیٹی بھی انگریزی سے واقف اور اس قدر باتونی ہوئی تو ہمیں بیشتر وقت ادھر ہی گزارنا پڑے گا۔"

میں تو طویل نیند لینے کے باعث تازہ دم تھا مگر عبداللہ تکان کے باوجود کام کرنے پر آمادہ تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے آتشدان میں لگا ہوا گیس کا چولہا روشن کیا اور پھر جیب سے وہ لفافہ نکال لیا جس میں ہوم گریوی سے ملنے والوں کی فہرست تھی۔

فہرست کی ابتدا تین دن پہلے کی تاریخ سے ہوئی تھی۔ اس میں تم چار افراد کے نام ایک سے زیادہ بار آئے تھے اور ایک شخص کے نام کے آگے سرخ روشنائی سے لکھا ہوا تھا کہ وہ ایک گھنٹے دس منٹ بعد جوبیس گریوی کے گھر سے باہر آیا تھا۔ اس شخص کا نام بن لیوی تھا اس کے بارے میں مزید کوئی بات معلوم نہ ہو سکی تھی البتہ اس کے نام سے ظاہر تھا کہ اگر وہ اسرائیلی نہیں بھی تھا تو کم از کم عبرانی نسل سے ضرور تعلق رکھتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد باہر سے ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلنے پر پتہ چلا کہ مادام نے کی منہ بولی بیٹی برتھا سامان سے لدی پھندی آگئی۔

وہ لڑکی قبول صورت اور خوش اخلاق تھی۔ اور انگریزی سے واقف بھی۔ مادام نے نے اس سے تعارف کرانے کے بعد رات کے کھانے کیلئے ہمارا پروگرام دریافت کیا اور عبداللہ نے کہہ دیا کہ کھانے کا پروگرام باہر طے ہو چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم باہر نکلے تو عبداللہ مکان کے عقبی حصے کی طرف چل دیا۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہاں گاڑی اور دیگر لوازمات موجود ہیں۔"

"اور چابی؟"

"وہ عبدالعزیز نے راستے میں ہی مجھے دے دی تھی۔"

مکان کے عقب میں واقعی سفید رنگ کی ایک چھوٹی کار موجود تھی۔ اس کے ڈیش بورڈ میں کارتوس کے کئی ڈبے موجود تھے اور ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے دو خودکار پستول پڑے ہوئے تھے۔

"اندرون ملک پروازوں پر بھی اسلحہ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسی لئے یہاں یہ سارا انتظام کیا گیا ہے۔" عبداللہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل میریڈین جا رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"تم کہتے ہو تو ادھر ہی چلتے ہیں۔ شاید بن حیان کی زیارت ہو ہی جائے۔" وہ خوش دلانہ لہجے میں بولا۔

ہوٹل میریڈین روشنیوں کے اس دلفریب شہر میں مینارۂ نور کی مانند چمک رہا تھا۔ بین الاقوامی معیار کے اس عظیم الشان ہوٹل کے پرشکوہ ہال میں ایک ہولناک کہانی کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کا انجام نہ ہم دونوں کو معلوم تھا نہ ہمارے دشمنوں کو۔

ہم ایک جگہ بیٹھنے کے بجائے ہوٹل کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے۔ میری متلاشی نگاہیں ہر طرف بن حیان کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں مگر کافی وقت برباد کرنے کے باوجود ہمیں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو ہم نے جگمگاتی روشنیوں میں ڈوبے ہوئے ڈائننگ ہال میں نشستیں سنبھال لیں۔ شیمپین سے ہماری نشست کا آغاز ہوا۔ سوپ پر مشتمل پہلے ڈنر کورس کا انتظار کرتے ہوئے اچانک عبداللہ نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا سی سنسنی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔" وہ جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "ریمانڈ کے کسی رکن کو فون پر دھمکی دوں گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"یہ ہوگا کہ ان میں کھلبلی مچ جائے گی اور اگر بن حیان واقعی اس شہر میں موجود ہے تو وہ اپنی توجہ اس ہوٹل پر مبذول کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

عبداللہ وہاں سے فون کرنے کیلئے چلا گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں ڈنر کا سوپ آیا۔ اور میں عبداللہ کے انتظار میں سوپ کے مسالوں کا ذائقہ لینے لگا۔

میری توقع کے برعکس عبداللہ کو خاصی دیر ہو گئی مگر جب وہ واپس آیا اس کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ بن حیان کو دیکھ آئے ہو۔" میں نے اس کی طرف جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں تبصرہ کیا۔

"وفد میں افراہیم نام کا بھی کوئی آدمی ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "میری اسی سے بات ہوئی تھی اور میں نے کہا تھا کہ کسی بھی لمحے ان کے کمروں کو دھماکوں سے اڑا دیا جائے گا۔"

"تو وہ کیا بولا؟"

"بری طرح بوکھلا گیا۔" عبداللہ لذت آمیز انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے اپنا وہ آدمی بھی نظر آ گیا جو ان تینوں کی نگرانی پر مامور ہے۔ میں نے ہدایت کر دی ہے کہ ان میں سے جو بھی محافظوں کے بغیر باہر نکلنے کی جرأت کرے اس پر صحیح نشانہ لئے بغیر اندھا دھند فائرنگ کر دی جائے تاکہ اللہ شروع ہی سے دہشت کا شکار ہو جائیں۔"

"غالباً تم کارڈیلو والی حکمت عملی اختیار کرنا چاہتے ہو۔"

"تم درست سمجھے!" وہ اپنے لئے سوپ تیار کرتے ہوئے بولا۔ "اس مشن میں ناکامی کے باوجود مجھے بہت متاثر کیا ہے۔"

کھانے سے فراغت کے بعد عبداللہ کا ارادہ بن لیوی کی طرف جانے اور اس کے ٹھکانے کی نشاندہی عبدالعزیز سے ملنے والے رقعہ میں کی گئی تھی۔ میں نے سختی سے اس اقدام کی مخالفت کی کیونکہ میرا خیال تھا کہ کسی محفوظ مقام پر اگر ہمیں بٹنے تک ہم کسی کو اغوا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر بن لیوی اپنی بدقسمتی سے ہماری گرفت میں آ جاتا تو اسے قید رکھنا ہمارے لئے ناممکنات میں سے تھا اور اگر ہم اسے چھوڑ دیتے تو وہ اپنے حلیفوں کو ہماری طرف سے ہوشیار کر دیتا۔ لہٰذا ہمارے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا کہ اسے ہلاک کر دیتے جو فوری طور پر ہمارے لئے خطرات اور نقصان کا سبب ثابت ہو سکتا تھا۔

ہوٹل میریڈین سے ہم دونوں رات کے پونے بارہ بجے گھر پہنچے تو دروازہ برتھا نے کھولا۔ اندر پہنچنے پر پتہ چلا کہ مادام نے... ہمارے انتظار میں برتھا کے ساتھ شطرنج کی بازی جمائے بیٹھی تھی۔

ہم دونوں رسمی گفتگو کے بعد اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مادام نے نے ہم سے شطرنج کے بارے میں جاننا چاہا لیکن اپنی جان چھڑانے کیلئے دونوں نے ہی اس کھیل سے ناواقفیت کا اظہار کرنے میں عافیت سمجھی۔

اگلی صبح سات بجے مادام نے نے انتہائی محبت آمیز انداز میں مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ وہیل چیئر پر نصب مختصر سی میز پر بیڈ ٹی ساتھ لئے موجود تھی۔

"صبح بخیر مسٹر ڈان فرنانڈو!" مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی وہ مسکرا کر بولی۔ "میں تمہارے لئے بیڈ ٹی لے آئی ہوں۔"

"شاید میں نے پچھلی رات جگانے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔" میں نے بستر میں پڑے پڑے خشک لہجے میں کہا۔

"ہاں تم بھول گئے تھے لیکن میں اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہوں۔" وہ فخر آمیز لہجے میں بولی اور میرا خون سلگ اٹھا۔

"تم میرے پاس تو آ گئیں مگر عبداللہ کی نیند خراب نہ کرنا۔ وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا ہے۔" میں اسے گھورتے ہوئے بستر سے اٹھ گیا۔

"اسے جگانے کے بعد ہی میں تمہاری طرف آئی تھی۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولی۔ "اس نے تو مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔"

"ہم لوگ تفریح کی نیت سے یہاں آئے ہیں۔" میں نے بستر چھوڑ کر اس سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔ "اور دیر تک سونے کے عادی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ ایسی غلط فہمی پیدا نہیں ہوگی جو تلخی کا باعث بنے!"

"میں خیال رکھوں گی مگر صبح سویرے اٹھنا صحت کیلئے مفید ہوتا ہے میں خود چھ بجے اٹھ جاتی ہوں اور سات بجے تک برتھا کے ساتھ ناشتہ کر لیتی ہوں۔ سوچ رہی تھی کہ آج تم دونوں کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے تمہیں لی مونڈے کی خبریں سناؤں گی۔"

"میرا ساتھی فرنچ پر عبور رکھتا ہے۔ مجھے اگر ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ میری آمد سے تمہارے معمولات میں فرق پڑ رہا ہے تو میں ہوٹل میں رہنے کو ترجیح دوں گا۔"

"مگر میں ان چیزوں کی متلاشی تھی۔ کافی عرصے سے برتھا کے ساتھ ناشتہ کرتے کرتے میں اکتا گئی تھی۔ خبروں کے بارے میں اس کے تبصرے یکسانیت کے شکار ہوتے ہیں۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "میرا تو خیر معمول ہی یہی ہے مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں اتنی جلدی بیدار کیے جانے پر کوفت ہوئی ہے۔ میں آئندہ محتاط رہوں گی۔"

دیر سے سہی مگر اسے میرے ردعمل کا احساس ہو گیا تھا اور میرے لئے یہی ضمانت کافی تھی کہ آئندہ وہ میرے آرام میں خلل انداز نہ ہوگی۔

"عبداللہ کہاں ہے؟" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مسکرا کر

سوال کیا۔

"ورزش کر رہا ہے۔" مادام فے نے حسبِ معمول معصومیت سے کہا۔

"ورزش؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "کیا کر رہا ہے وہ؟"

"میں نے اسے جگا کر صبح بخیر کہا تو وہ چند ثانیوں تک پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک مسکراتے ہوئے کمرے کے وسط میں سر کے بل الٹا کھڑا ہو گیا۔"

"اور تم اسے ورزش کہہ رہی ہو۔" مادام فے کی سادہ لوحی پر مجھے سخت تاؤ آ رہا تھا مگر میں نے اس پر اپنی برہمی کا مزید اظہار کیے بغیر حیرت سے پوچھا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اچانک جس انداز میں الٹا کھڑا ہوا، اس پر میں بوکھلا گئی تھی مگر اس نے میرے استفسار پر خود ہی بتایا کہ وہ ورزش اس کے معمولات میں شامل ہے اور وہ روز صبح دو گھنٹے اسی طرح کھڑا ہوتا ہے۔"

"یہ تماشا تو میں بھی دیکھوں گا۔" میں چائے کی پیالی لے کر بستر سے اترتے ہوئے بولا۔ اور مادام فے بھی اپنی کرسی لڑھکاتی میرے ساتھ ہولی۔

عبداللہ کی خوابگاہ کا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ پہلے میں نے دروازے پر دستک دینے کا ارادہ کیا مگر میری نظر ایک کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی اور میں نے پردہ سرکا کر اندر کا جائزہ لیا تو بے اختیار طویل سانس لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا وہ ابھی تک اسی طرح کھڑا ہوا ہے؟" مادام فے نے حیرت اور تجسس سے مغلوب سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"وہ بستر پر کمبل اوڑھے بے خبر سو رہا ہے۔" میں نے اسے مطلع کیا۔

یک بیک مادام فے کا برا سا منہ بن گیا۔ جیسے حلوہ چباتے چباتے اس کے دانتوں کے نیچے اچانک کوئی بڑا سا کنکر آ گیا ہو۔

"آخر اسے وہ لونگی حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس کے لہجے میں پہلی بار غصے کا عنصر شامل ہو گیا۔ "وہ مجھ سے صاف کہہ سکتا تھا کہ اسے دیر تک سوتے رہنا پسند ہے۔"

دل ہی دل میں مجھے اس بات پر خاصی مسرت ہوئی کہ میرے برعکس عبداللہ مادام فے پر اپنا ردِعمل بھرپور طریقے پر ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر میں نے مادام پر اپنی اس خوشی کا بھی اظہار نہ ہونے دیا اور اسے نرمی سے نشستگاہ میں لے آیا۔

میری نیند تو برباد ہو ہی چکی تھی اور میرے لئے ایک بار بستر چھوڑ کر دوبارہ سو جانا ناممکنات میں سے تھا لہٰذا اس نے بہتر یہی سمجھا کہ مادام فے سے لی موندے کی سرخیوں کا انگریزی ترجمہ سنتے ہوئے ناشتے سے فراغت حاصل کر لوں۔

اس خیال کا محرک عبداللہ کا رات والا شوشہ تھا۔ اس نے ہوٹل میریڈین میں اپنے آدمی کو ہدایت کی تھی کہ اگر اسرائیلی وفد کا کوئی رکن داؤ پر چڑھ جائے تو اس پر اندھا دھند فائرنگ کر دی جائے۔ میرا خیال تھا کہ رات اگر اس فلسطینی کو اپنی کارگذاری دکھانے کا موقع ملا ہو گا تو لازمی طور پر لی موندے میں اس کی خبر آئے گی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو برتھا سفید براق ایپرن سے باندھے فرنچ ٹوسٹ فرائی کر رہی تھی اور باقی لوازمات قرینے سے میز پر سجے ہوئے تھے۔

"ہاں تو آج کالی موندے کیا کہتا ہے مادام؟" میں نے میز کے گرد اپنی نشست سنبھالتے ہوئے خوشدلی سے سوال کیا۔

"تم دونوں نے رات کا کھانا کہاں کھایا تھا؟" مادام فے نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے اخبار کا صفحہ الٹتے ہوئے سوال کیا۔

"ہوٹل میریڈین میں!" میں نے کہا۔ "کیا اخبار میں ہماری تصویریں شائع ہوئی ہیں؟"

"اس ہوٹل کے بارے میں ایک سنسنی خیز خبر ہے۔" مادام فے نے پُرجوش لہجے میں لوبی۔ "اگر تم مزید ایک ڈیڑھ گھنٹے وہاں رکے رہتے تو شاید میں اس واقعہ کی چشم دید کہانی تم ہی سے سن لیتی۔"

"کیا خبر ہے؟" میرے دل کی دھڑکن مادام فے کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی تیز ہو گئی۔

"ہوٹل کے احاطے میں ایک فلسطینی دہشت پسند مارا گیا۔" مادام فے کے یہ الفاظ میرے ذہن پر کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح گرے۔

"وہ کیسے؟"

"میں پوری خبر کا ترجمہ سنائے دیتی ہوں۔" مادام فے نے کہا اور بآوازِ بلند اخبار سے ایک ایک سطر پڑھ کر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے لگی۔

خبر کے مطابق ہوٹل میں مقیم تین اسرائیلی شہریوں میں سے ایک کو کسی گمنام شخص نے فون پر عبرانی زبان میں دھمکی دی تھی کہ ان کے کمروں کو بم کے دھماکے سے اڑا دیا جائے گا جس پر وہ تینوں بوکھلا گئے اور انہوں نے فوری طور پر پیرس میں اسرائیلی سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری سے رابطہ قائم کیا جس نے انھیں فوری طور پر اپنی رہائش گاہ پر منتقل ہونے کی ہدایت کی تاکہ وہاں ان سے مشورہ کر کے مقامی حکام کو اعتماد میں لیا جا سکے۔

جس وقت وہ تینوں ہوٹل کی عمارت سے باہر نکلے تو اچانک کسی طرف سے ایک فلسطینی نمودار ہوا اور اس نے دس فٹ کے فاصلے سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ان میں سے ایک بھیجے میں گولی اترنے سے اسی جگہ مر گیا۔ باقی دو بری طرح زخمی ہو کر واپس عمارت کی طرف بھاگے۔ اسی اثنا میں وہاں موجود کچھ نامعلوم لوگوں نے دو سمتوں سے گولیاں چلا کر اس فلسطینی کو ڈھیر کر دیا جن کا بعد میں کوئی سراغ نہ مل سکا۔

"واقعی بہت سنسنی خیز خبر ہے۔" میں نے مادام فے کے خاموش ہونے پر پھریری لیتے ہوئے کہا۔ "شاید وہ تینوں اسرائیلی سرکاری اہل کار رہے ہوں۔"

"نہیں۔ ایک جگہ اس بات کی وضاحت بھی درج ہے کہ وہ کبھی دورے پر آئے ہوئے عام اسرائیلی شہری تھے۔"

مادام فے نے ابتدا میں جس طرح ایک فلسطینی کی ہلاکت کا ذکر کیا تھا اس سے اندازہ ہوا تھا کہ عبداللہ کی حکمتِ عملی بری طرح ناکام ہو گئی تھی کرنل نا...

...نے کے بعد مجھے کم ازکم اس بات کی خوشی ہوئی کہ مرنے والا اپنا کام دکھا کر مرا تھا۔

یہ خبر اتنی اہم تھی کہ میں نے ناشتے سے فارغ ہو کر عبداللہ کو بیدار کر دیا۔

"وہ بے چارہ اندازے کی غلطی کی بنا پر مارا گیا۔" مجھ سے رات کے واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد عبداللہ نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اگر وہ ان تینوں کے سادہ پوش مسلح محافظوں کو پہچان لیتا تو شاید رات ان پر حملے کا ارادہ ملتوی کر دیتا۔"

"یہ امکان بھی ہے کہ اس نے دیدہ دانستہ وہ خطرہ مول لیا۔" عبداللہ دل گرفتگی سے بولا۔ "ہمارے آدمی ان کو ٹھکانے لگانے یا کم ازکم اغوا کرنے کے لئے بے چین تھے مگر انہیں صرف نگرانی کا حکم ہوا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی خواہشات کو دبانے پر مجبور تھے۔ مجھ سے شہ پاتے ہی وہ شخص خود پر قابو نہ رکھ سکا ہو گا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

"پُرجوش کارکن ہر تحریک کا بنیادی سرمایہ ہوتے ہیں۔ مگر حد سے زیادہ جذباتی کارروائیاں بعض اوقات تحریک کے لئے خطرات پیدا کر دیتی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "مگر ہمارے کارکن تحریک سے والہانہ جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے کام اور ذمہ داری سمجھتے ہوئے سرانجام دے تو تم اس پر زیادہ پابندیاں نہیں لگا سکتے کیونکہ ایسا ہر شخص خود کو اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ سمجھتے ہوئے ہی پیش قدمی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ہمارے کارکن ایسے اقدام بھی کر گزرتے ہیں جو ہماری وقتی پالیسی سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ کارروائی کرنے والوں کے خلوص پر یقین کرتے ہوئے ہم ہر اقدام کی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔"

"یہ بحث خاصی طویل ہے، میں اس میں الجھنا نہیں چاہتا مگر اب مجھے بتانا چاہیئے کہ تمھارا کیا پروگرام ہے؟"

"بن حیان کی تلاش۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر پیرس آ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ یہاں معاملات الجھے ہوئے ہیں اور اگر ہم ذرا بھی بھٹکے تو بن حیان اپنا کام دکھا کر واپس چلا جائے گا۔"

"میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں پھر ہم باہر چل کر باتیں کریں گے۔"

عبداللہ ناشتے کی میز پر پہنچا تو اس کی آواز سن کر مادام نے بھی جلدی ... کی۔

"تم نے ورزش جلدی ختم کر لی۔" مادام فے نے عبداللہ کا موڈ ... سنبھلتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

"اور ورزش میں نو بجے سے گیارہ بجے تک کرتا ہوں۔ تمہارے جانے کے ... تو وہ صبح کے سات بجا رہی تھی لہٰذا میں نو بجنے کے انتظار ... سو گیا۔"

"مجھ میں بہت فراخدل ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "تم جیسے مہمانوں سے میری روزی چل رہی ہے۔ اگر میری کوئی بات ناگوار گزرے تو فوراً مجھے ٹوک دیا کرو۔ میں اپنی اصلاح کر لوں گی۔"

"بار بار ٹوکنا بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

مادام فے شکایت آمیز نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ "کیوں؟"

"ہم لوگ بزرگوں کا خاصا احترام کرتے ہیں۔"

مادام فے نے ایک بار پھر برا سا منہ بنایا۔ "میں ٹانگوں سے معذور ہونے کے بعد شاید تمھاری نظر میں بزرگ ہو گئی ہوں مگر میری عمر صرف انتیس سال ہے۔ سترہ سال کی عمر میں شادی کی۔ دو سال بعد بیوہ ہو گئی اور سات سال سے اسی کرسی کے سہارے جی رہی ہوں۔"

"اوہ معاف کرنا۔" اس کی پوری کتھا سننے کے بعد مجھے معذرت کرنا ہی پڑ گئی۔ "تمھاری عمر کے بارے میں مجھے شدید دھوکا ہوا تھا۔"

"میں اپنے کمرے میں موجود ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو بلا لینا۔ ویسے برتھا تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دے گی۔" مادام فے نے اپنی کرسی گھماتے ہوئے کہا۔ میری دخل اندازی کے باعث وہ خاصی کبیدہ خاطر نظر آ رہی تھی۔

"تم سے ناراض ہو گئی ہے۔" اس کے چلے جانے پر عبداللہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"وہ مستقلاً ناراض ہی رہے تو بہتر ہے۔ جاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر ساری تلافی کر دوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا اور عبداللہ زور سے ہنس پڑا۔

ناشتے کے بعد ہم لوگ باہر نکلے تو کہر آلود سرد موسم ہونے کے باوجود سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر کے باسی صبح اٹھنے کے معاملے میں میری طرح کاہل واقع نہیں ہوئے تھے۔

ہم دونوں ایک کیفے کے دور افتادہ گوشے میں جا بیٹھے جہاں دفتر جانے والے کنوارے عجلت میں ناشتہ کرنے چلے آ رہے تھے۔

"میں خود الجھن محسوس کر رہا ہوں۔" عبداللہ نے وہاں بیٹھتے ہی بلاکسی تمہید کے کہا۔

"کس بارے میں؟"

"ہم یہاں بن حیان کی تلاش میں آئے مگر ابھی تک اس کا نام و نشان بھی نہیں ہے اور ہمارے سامنے ایک لمبی فہرست موجود ہے۔"

"یہی چیز مجھے پریشان کر رہی ہے۔"

"جولیس گریوی ہمارے لئے نقطۂ آغاز تھا مگر اس سے ملنے والوں کے پانچ مشکوک ناموں میں بن لیوی سرفہرست ہے جو نام ہی سے عبرانی معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہوٹل میریڈین میں مقیم اسرائیلی اور سعودی وفود نے معاملہ الجھا دیا ہے۔"

"تو تم کس فیصلے پر پہنچے ہو؟"

"فیصلہ تو تم ہی کرو گے۔"

"فرض کرو تم تنہا ہوتے؟"

"میں حقائق پر یقین رکھتا ہوں۔ مفروضات میں سر کھپاتا رہوں تو چار دن میں مجنوں ہو جاؤں۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔

"تو پھر سعودی اور اسرائیلی وفود کو بھول جاؤ۔ سعودیوں کو اس لئے کہ ان کی آمد کا منشا ہم پر ظاہر ہے۔ وہ لوگ میراج فور کی خریداری کے سلسلے میں ایم ڈی ایکس پر گفت و شنید کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ رہے اسرائیلی تو ان سے ہمارا حساب برابر ہے اور زندہ بچنے والوں میں کوئی بھی بن حیان سے مشابہت نہیں رکھتا۔ بن حیان کی تلاش کے لئے ہمیں جولیس گرلوی اور بن لیوی پر توجہ دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ یہاں کی کھلی منڈی میں جنگی ہتھیاروں کے بڑے تاجروں سے بھی مدد ملنے کا امکان ہے کیونکہ اسرائیل میں مَیں نے یہی سنا تھا کہ بن حیان غیر سرکاری ذرائع سے اسلحہ خریدنے کیلئے پیرس آنے والا تھا۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ اب کیا کرنا ہے؟"

"جولیس گرلوی اور بن لیوی میں سے کسی پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔"

"جولیس گرلوی کو چھیڑنے کی صورت میں فرانسیسی حکام ہماری طرف متوجہ ہو سکتے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ پہلے بن لیوی کو دیکھا جائے۔"

"مگر اسے تم کہاں لے جا سکو گے؟" میں نے سوال کیا۔ "مادام فے کے مکان پر تو ہم ایسی کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔"

"اس معاملے میں عبدالعزیز ہماری مدد کرے گا۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

پھر عبداللہ نے فون پر عبدالعزیز سے رابطہ قائم کیا اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد عبداللہ واپس آیا تو اس کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔

عبدالعزیز نے اسے دو ڈھکانوں کا پتہ دیا تھا جہاں ہم دونوں بےخطر کسی بھی وقت جا سکتے تھے۔ یہ اطلاع ایسی تھی کہ ہم وہاں سے فوراً ہی اٹھ گئے۔

راستے میں باتوں کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ اگر ہم نے بن لیوی سے کام کی ابتدا کی تو کامیابی کے [illegible] خاصی دشواری ہو سکتی تھی۔ البتہ جولیس گرلوی ہمارے لئے ایک بہتر شکار ثابت ہو سکتا تھا بشرطیکہ وہ دو چار گھنٹوں کے تشدد میں ہی زبان کھولنے پر آمادہ ہو جاتا۔

وہ وزارت دفاع کا ایک اہم رکن تھا اور اسرائیلی مفادات کے لئے جو کچھ کر رہا تھا وہ خفیہ طور پر اور ذاتی حیثیت میں کر رہا تھا۔ اگر اس کی حرکتوں کی اطلاع اس کے افسران بالا کو مل جاتی ہے تو وہ نہ صرف ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا بلکہ اپنے عہدے کے مجرمانہ استعمال کے سلسلے میں اسے طویل سزا بھی مل سکتی تھی۔

میرا خیال تھا کہ ہم دونوں اگر اسے وعدہ معاف گواہ کا درجہ دے دیتے تو شاید وہ اپنی گلوخلاصی کے لئے ہم سے تعاون پر آمادہ ہو جاتا۔

عبداللہ خاصی طویل بحث کے بعد مجھ سے متفق ہو گیا اور ہم دونوں وزارتِ دفاع کے دفاتر کی طرف روانہ ہو گئے۔

عبداللہ نے جولیس گرلوی کو پھانسنے کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔

وزارتِ دفاع کی پُرشکوہ عمارت کے ایک خاموش گوشے میں جولیس گرلوی کا دفتر واقع تھا۔ میں نے بیرونی کمرے میں اس کی سیکرٹری کو بتایا کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں تو اس نے کام کی نوعیت دریافت کئے بغیر ایک پرچی پر میرا نام لکھا اور اندر چلی گئی۔

"مسٹر ڈان فرنانڈو! آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟" چند منٹوں بعد لڑکی نے باہر آکر مجھ سے دریافت کیا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے واپس چلا جانا چاہیئے۔" میں نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

"آپ ناراض نہ ہوں جناب۔" وہ لوکھلا کر بولی۔ "دراصل مسٹر جولیس گرلوی بہت زیادہ مصروف ہیں۔ وہ آپ کو صرف دس منٹ دے سکیں گے۔ اس کے بعد انھیں ایک اہم اجلاس میں شرکت کے لئے جانا ہے۔"

"میں بھی مصروف ہوں۔" میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں ان کے دفتر میں قیام کی نیت سے نہیں آیا۔ میں باہر سے فون پر بات کر لوں گا۔"

"ذرا ایک منٹ ٹھہریں۔ میں انہیں مطلع کر دوں۔"

"بڑی دھونس دکھا رہے ہو۔" سیکرٹری کے اندر چلے جانے پر عبداللہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"اس میں ارادے کا دخل نہیں ہے بس اس کی بات پر ہونے والے ردِعمل کو میں الفاظ میں ڈھلنے سے نہ روک سکا۔"

دوسری بار وہ لڑکی باہر آئی تو اس نے بتایا کہ جولیس گرلوی اپنے کمرے میں ہم دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔

خوبصورت اور منظر فریب دفتر میں جولیس گرلوی نے نہایت رسمی انداز میں ہم دونوں کا استقبال کیا اور ہمیں بیٹھنے کی پیشکش کی جو ہم نے قبول کر لی۔

"میری سیکرٹری نے بتایا تھا کہ تم دونوں کسی ضروری کام سے آئے ہو۔" جولیس گرلوی نے باری باری ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کام واقعی نہایت ضروری ہے۔ دفتر سے چھٹی کے بعد ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

جولیس گرلوی پختہ عمر کا زم خو اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ میری بات پر اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

"ایسا کون سا کام ہے مسٹر ڈان فرنانڈو؟" اس نے اپنے قلم سے لیٹر پیڈ پر بے معنی لکیریں بناتے ہوئے سوال کیا۔

"تم ایک دشواری کا شکار ہو گئے ہو۔" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہمیں مطلوبہ معلومات نہیں ملی ہیں۔" میں نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔ "جب کہ ہمارے ذرائع کے مطابق تم اپنا کام پورا کر چکے ہو۔ تمہیں میرے بجائے بن لیوی سے رجوع کرنا چاہیئے۔" وہ [illegible] ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ ذاتی مفادات کیلئے ہم سے باغی ہو گیا ہے!" میرے یہ الفاظ [illegible]گرلوی کے اعصاب پر اس قدر اثر انداز ہوئے کہ وہ اضطراری انداز میں [illegible] پھینک کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے [illegible]م آواز میں کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ بن لیوی نے وہ معلومات کسی [illegible]ی گروپ کو فروخت کر دی ہیں۔"

"یہ تم لوگوں کا قصور ہے۔" وہ اپنی پیشانی ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے [illegible] "اس کام پر ایک غیر ذمہ دار شخص کو کیوں مقرر کیا گیا تھا؟"

"اس وقت تک وہ ہمارے بہترین اور مخلص آدمیوں میں تھا۔"

"میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔" اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے [illegible]ے کہا۔

"ایسا تم اپنی ذمہ داری پر کرو گے۔" میں نے انتباہ آمیز لہجے میں کہا۔ [illegible]ے تمہیں شدید ترین نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔"

اس کا فون کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا اور تھکے ہوئے لہجے میں [illegible] "میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے اس سے نجات کا راستہ بتاؤ۔"

"تم باہر کس وقت مل سکتے ہو؟"

"جب تم چاہو۔"

"کسی کو بھنک بھی نہ ملنے دو کہ تم پریشان ہو یا بدلے ہوئے حالات [illegible]واقف ہو چکے ہو۔ چھٹی کے بعد ہم مل کر صورتحال کا جائزہ لیں گے۔"

"شام کو پانچ بجے میرے گھر آجاؤ۔ وہاں ملازموں کے علاوہ کوئی نہیں [illegible]ا۔"

اس سے پروگرام طے کر کے ہم باہر آ گئے۔

"وہ تو پکے ہوئے پھل کی طرح تمھاری گود میں آگرا!" کار میں سوار ہوتے وقت [illegible]اللہ نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے اب بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ بن لیوی سے نہ اُلجھ پڑے۔"

"وہ خاصا خوفزدہ ہو گیا تھا۔" عبداللہ نے مجھے یاد دلایا۔

"شام کو سب کچھ سامنے آ جائے گا۔"

دن کا باقی حصہ ہم نے شہر میں گھومتے ہوئے گذارا اور مقررہ وقت [illegible]گرلوی کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

[illegible] کے مقابلے میں جولیس گرلوی اس وقت خاصا سنبھلا ہوا اور ہشاش بشاش [illegible] تھا۔ اس نے ہمارے ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی ہم سے ہماری [illegible] طلب کی۔

"ہم یہاں عام شہریوں کی طرح آئے ہیں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں [illegible] اعتماد کی فضا میں بات نہیں کر سکتے تو ہم بخوشی واپس جانے [illegible]۔"

"مجھے تم پر بھروسہ ہے۔" وہ بولا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ [illegible] سے میری گلوخلاصی کی کیا صورت ہوگی۔"

[illegible] لیوی پر ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم اس کی غداری سے واقف ہو گئے ہو اور مجھے بتاؤ کہ پچھلے دنوں تم اسے کیا کچھ دے چکے ہو؟"

"بعض فائلیں میں دفتر سے باہر نہیں لا سکتا۔ پچھلے دنوں بن لیوی نے میرے دفتر میں ہی ان کاغذات کی مائکروفلمیں تیار کیں تھیں۔"

"ان کے نگیٹو بھی اسی کے پاس ہوں گے؟"

"ہاں۔ وہ اپنا ہی کیمرہ لایا تھا۔"

"فائلیں کس معاملے کے متعلق تھیں؟"

"ایم۔ ڈی۔ ایکس اور جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے آئندہ منصوبوں کے بارے میں وہ بے حد دلچسپی لے رہا تھا۔"

"ایم۔ ڈی۔ ایکس۔ تو ختم ہو گیا نا؟"

"ختم ہی سمجھو۔" وہ بولا۔ "میں نے اس پر اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔"

"اگر سعودی عرب کو میراج فور طیاروں کی کھیپ مستقبل قریب میں نہیں ملتی تو ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے مگر دوسرا معاملہ اہم ہے۔"

"ان فائلوں تک دوبارہ رسائی حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے"

"پہلے ہم بن لیوی کو دیکھیں گے مگر تم سے اتنا ضرور دریافت کریں گے کہ تم بن لیوی کے کن رابطوں سے باخبر ہو۔"

"اس سے میرا زیادہ میل جول نہیں ہے اور میں صرف ایک ہی شخص کو جانتا ہوں جس کے ذریعے بن لیوی مجھ سے متعارف ہوا تھا۔"

"کون ہے وہ؟"

"جوناس۔ عذرا جوناس۔" اس نے بتایا۔ "وہ ایک مالدار برطانوی ہے جو بیشتر وقت فرانس ہی میں گزارتا ہے۔"

جوناس کا نام آتے ہی میں بُری طرح چونک پڑا۔ "یہ وہی جوناس تو نہیں جس کی خوبصورت بیٹی کا نام ایلیزا ہے؟"

"ہاں وہی۔" جولیس گرلوی نے تائید کی۔ "ایلیزا کی ہی وجہ سے میں نے جوناس سے تعلقات بڑھائے تھے۔ وہ اچھی لڑکی ہے مگر اپنے باپ سے بہت ڈرتی ہے۔"

"پچھلے دنوں بن لیوی نے تمہیں کسی اور سے ملوایا تھا؟" میں نے ایک اور پانسہ پھینکا۔

"وہ بتا رہا تھا کہ کوئی بڑا آدمی اسرائیل سے آیا ہوا ہے مگر میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

"تمھارے لئے بہتر یہی ہوگا کہ تم ایک آدھ ماہ کی چھٹی لے کر یورپ کے کسی دور افتادہ مقام پر چلے جاؤ۔ جب تک تم واپس آؤ گے یہ معاملہ صاف ہو چکا ہوگا۔"

"اس وقت میری موجودگی ضروری ہے۔" وہ بولا۔ "میں کاغذی طور پر یہ واضح کر چکا ہوں کہ آئندہ دو سال تک ہم میراج فروخت نہیں کر سکیں گے مگر دفاع اور محکمہ خارجہ کے کچھ لوگ سعودی تیل کے لالچ میں ایم۔ ڈی۔ ایکس پر جزوی عمل درآمد کرانا چاہتے ہیں۔ اگلے ہفتے اس معاملے

پر آخری اجلاس ہونا ہے جس میں حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔ میری غیر موجودگی میں شاید کوئی اور میرے اعداد و شمار کی بہتر وضاحت نہ کر سکے۔"

"یعنی ایم۔ ٹی۔ ایکس پر عمل درآمد کا خدشہ ہے؟"

اس نے مایوسی سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "اگر ایسا ہوا تو بن لیوی مجھ سے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے گا جو اب تک وہ اس مد میں دیتا آیا ہے جب کہ میں مالی طور پر ایسا کوئی خسارہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تم خسارے کی پرواہ نہ کرو۔" عبداللہ بول پڑا۔

"یہ صرف خسارے کی بات نہیں ہے۔" میں نے عبداللہ کو سرزنگا ہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اصل خرابی یہ ہے کہ ایم ٹی ایکس کے مردے میں جان پڑ جائے گی اور یہ پیرس میں موجود سعودی وفد کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔"

"پھر بتاؤ نہ میں کیا کروں؟" جولیس گریوی نے کہا۔

"مجھے ان لوگوں کے نام اور محکمے بتاؤ جو سعودی عرب کو طیاروں کی فروخت کے حامی ہیں۔" میں نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔

"تم انہیں نہ خرید سکو گے۔ دراصل ساری خرابی پالیسی میں ہے۔ ہماری حکومت ملکی ضروریات کے بعد سعودی اور ایرانی حکومت کی ضروریات ہر قیمت پر پوری کرنا چاہتی ہے۔ وہ لوگ صرف اس پالیسی کے بھرپور نفاذ کی بات کرتے ہیں۔"

"ان میں سے کسی کے ساتھ ناگزیر اور خوفزدہ کرنے والے واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "اگر وہ اجلاس تمہاری چھٹی سے واپسی تک ملتوی ہو سکے تو اس دوران ہم بن لیوی کا معاملہ سنبھال لیں گے۔"

"تم بن لیوی کو مار کیوں نہیں دیتے؟ وہ اپنی جان بچانے کے لئے آخری حد تک جانے کے لئے تیار نظر آتا تھا۔" اس کے راہ سے ہٹ جانے کے بعد میں بھی یکسوئی سے کام کر سکوں گا اور اجلاس کے التوا کی کوشش بھی نہیں کرنی ہوگی۔"

"واقعی یہ آسان راستہ ہے مگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کس کی خاطر ہم سے بغاوت پر آمادہ ہوا ہے اور کتنے عرصہ سے ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے؟"

اس بات پر وہ سوچ میں پڑ گیا اور خاصے طویل سکوت کے بعد بولا۔ "تم اسے قید کر کے تشدد کے ذریعے اس کی زبان کھلوا سکتے ہو۔"

"شاید تمہارے لئے یہ ممکن ہو مگر ہم پیرس میں محدود وسائل کے مالک ہیں۔ ہم اسے ہلاک ضرور کر سکتے ہیں مگر اسے قید کر کے ہم مشکلات میں گھر جائیں گے کیونکہ ہمارے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا نہیں ہے۔"

"اگر تم میرا گھر استعمال کرو تو کیسا رہے گا؟" اس نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہاری پیش کش واقعی عمدہ اور فراخدلانہ ہے مگر پھر بھی تمہیں رخصت پر جانا ہی ہوگا۔" عبداللہ بولا۔ "وہ ایم۔ ٹی۔ ایکس کے احیا کی صورت معلوم ہو جانے کے بعد اس بات کے لئے بے چین [illegible] تھا کہ کسی بھی طرح جولیس گریوی کو عارضی طور پر راہ سے ہٹا کر [illegible] کی فروخت کے معاہدے کے لئے حالات کو سازگار بنایا جائے۔

"میں جانے کے لئے تیار ہوں۔" جولیس گریوی جھنجھلا [illegible] "معاہدے کی ساری ذمہ داری تم پر ہوگی اور میں ایک پیسہ بھی واپس نہیں کروں گا۔"

"شاید تم وہ رقم جوئے میں ہار چکے ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ میری رقم تھی اور مجھے حق ہے کہ میں اپنا پیسہ جس طرح چاہوں استعمال کروں۔"

"تم نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔" میں بولا۔ "اگر ہم صرف بن لیوی جیسے غدار کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے تو وہ رقم معاف کرنے کے علاوہ بھی تمہیں بھاری معاوضہ دیں گے۔"

"پھر تم جو چاہو، میں اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تمہارے بیوی بچے کہاں رہتے ہیں؟"

"میں اس جنجال سے آزاد ہوں۔ اس مکان میں صرف ایک بوڑھا مالی اور ایک ادھیڑ عمر خادمہ رہتی ہے جو کھانا پکانے کے علاوہ گھر کی صفائی کی بھی ذمہ دار ہے۔ وہ دونوں تمہارے لئے کسی دشواری کا باعث نہیں بنیں گے۔"

"تو پھر تم بن لیوی کو فون کر کے یہیں بلا لو اور خود روانہ ہو جاؤ۔ اگر اتفاق سے جوناس سے ٹکراؤ ہو جائے تو اس پر بھی اپنے شبہات کا اظہار نہ کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ بن لیوی اس سے مل کر اپنی مکروہ سازش پر عمل کر رہا ہو۔"

"میرا یوں اچانک دفتر سے غائب ہونا میرے محکمے کو شبہات میں ڈال دے گا۔"

"تم کل چھٹی کی درخواست دے سکتے ہو مگر اس صورت میں یہ رات تمہیں باہر بسر کرنی ہوگی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تم بن لیوی سے میرے سامنے باز پرس کیوں نہیں کرتے؟"

"ہم تمہیں آپس کے معاملات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ [illegible] اصرار کرتے ہو تو موجود رہو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔"

"مگر میرا گھر استعمال کر کے تو تم مجھے گردن تک غرق کر دو گے۔ میں الگ کیسے رہ سکوں گا؟"

"تمہارا گھر صرف جال کا کام کرے گا۔ ایک بار وہ گرفت میں آگیا تو ہم اسے کہیں اور منتقل کر دیں گے۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ پیرس میں تمہارے پاس ایسا کوئی محفوظ ٹھکانا نہیں ہے جہاں تم اسے قید میں رکھ سکو؟" وہ مشتبہ آمیز لہجے میں بولا۔

"ہمارے پیشے میں غیر ملکی سرزمین پر سرکاری اور سفارتی سہولتیں ...

[illegible] استعمال سے حتی الامکان گریز کیا جاتا ہے مگر یہ مسئلہ اسرائیل کی [illegible] سلامتی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم بن لیوی کو اسرائیلی سفارت خانے [illegible] کی رہائش گاہ پر لے جائیں گے۔"

"[illegible] وہ اس قصے سے باخبر ہے؟"

"[illegible] نہیں۔ اور نہ ہم اس کے سامنے جوابدہ ہیں مگر وہ اپنے فرائض [illegible] کے لحاظ سے پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں ہمیں ہر ممکن مدد دینے کا [illegible] ہے۔" میں نہایت اعتماد اور بے خوفی سے جولیس گریوی کے گرد [illegible] جال مضبوط کرتا جا رہا تھا۔

"میں کچھ کچھ سمجھتا جا رہا ہوں۔" وہ سست آواز میں بولا۔ "بن لیوی [illegible] سے باز پرس میں ایسے موضوعات بھی چھیڑے جا سکتے ہیں جن کا [illegible] سے کوئی تعلق نہ ہو اور تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے راز غیر [illegible] دارانہ طور پر میرے علم میں بھی آجائیں۔"

"ایک پہلو یہ بھی ہے اور غنیمت ہے کہ تم نے خود ہی اس کا اندازہ لگا لیا۔"

"تو پھر اسے ابھی بلا لوں؟"

"پہلے ان لوگوں کے نام لکھوا دو جو سعودی عرب کو میراج طیارے [illegible] فروخت کرنے کے حامی ہیں۔" میں نے اپنی ذات کو شبہات سے بالاتر [illegible] رکھنے کے لئے کہا۔

جولیس گریوی نے مجھے تین نام نوٹ کرا دیئے۔ ان میں ایک قومی [illegible] کا عدالتی مشیر تھا۔ دوسرا محکمہ خارجہ کا ایک افسر اور تیسرا اس [illegible] الاتت تھا۔

جولیس گریوی نے فون پر بن لیوی سے نہایت مختصر سی [illegible] بات کی اور اسے فوری طور پر اپنے مکان پر پہنچنے کی ہدایت کی۔ [illegible] اس کے فوراً بعد وہ اپنے مکان سے رخصت ہو گیا۔ جاتے ہوئے [illegible] اس نے ہمیں بتا دیا کہ وہ رات گئے واپس آئے گا۔

تھوڑی دیر بعد بن لیوی وہاں پہنچا تو منصوبے کے مطابق [illegible] گریوی کے ملازم نے اسے اپنے آقا کی غیر موجودگی کی خبر [illegible] نشستگاہ میں بھیج دیا۔

عبداللہ باہر کار کے انجن کی آواز سنتے ہی داخلی دروازے کی [illegible] چھپ چکا تھا لہٰذا جب بن لیوی نشستگاہ میں داخل ہوا تو [illegible] اور وہ ٹھٹھک کر دروازے کے وسط میں ہی [illegible]

[illegible] انداز میں اپنی جگہ بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش [illegible] جیسے مجھے صاحب خانہ کے نزول کا انتظار ہو۔

[illegible] بن لیوی مضبوط بدن مگر قدرے خمیدہ کمر کا مالک تھا اس کے [illegible] بال اور کشادہ پیشانی کے نیچے چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں سے [illegible] محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ چند ثانیوں کے لئے وہاں رک کر اندر داخل ہوا اور اسی وقت عبداللہ کسی عقاب چیتے کی طرح بے آواز اپنی کمین گاہ سے نکلا اور اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کا دستہ پیچھے سے بن لیوی کی کنپٹی پر دے مارا۔

کھٹاک کی آواز کے ساتھ ہی بن لیوی کے حلق سے ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر آرہا۔

ایک شکار ہاتھ آچکا تھا لہٰذا ہم نے نہایت عجلت کے ساتھ بن لیوی کے بے ہوش جسم کو عبداللہ کی کار کے عقبی پائیدان پر ڈالا پھر عبداللہ نے ہیجو سنبھال لی اور میں بن لیوی کی کار اسٹارٹ کر کے اس کے پیچھے ہو لیا۔

شہر کے ایک پرہجوم علاقے میں میں نے بن لیوی کی کار ایک جگہ پارک کی اور اسٹیرنگ وہیل اور دروازے کے ہینڈل کو رومال سے صاف کر کے آگیا۔ بن لیوی کی کار کی چابی میں نے اگنیشن میں ہی لگی چھوڑ دی تھی۔

تھوڑے فاصلے پر عبداللہ کار روکے میرا منتظر تھا جونہی میں نے عقبی نشست سنبھالی اس نے کار آگے بڑھا دی۔

"جوناس اسی لڑکی کے باپ کا نام تو نہیں ہے جسے تم نے نیس کے ہوائی اڈے پر اپنا نام ڈان فرنانڈو بتایا تھا؟" عبداللہ نے مجھ سے سوال کیا۔

"وہی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ بیوی اور بیٹی سمیت نیس میں کیا کر رہا تھا؟"

"اگر وہ اسرائیل کے لئے کام کر رہا ہے تو یقیناً اسلحہ کی خریداری کے لئے وہاں گیا ہوگا اور نیس کی بندرگاہ پر جہاز کی لدائی شروع ہونے پر وہاں سے چل دیا ہوگا۔"

"اور اسے شوارٹ یا رائے کاردیلو کے معاملے کی بھنک بھی نہ مل سکی؟" میں نے تعجب آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"شوارٹ تو خود معاملہ سمجھنے سے پہلے مارا گیا اور کاردیلو باہر کا آدمی تھا۔ اگر جوناس کا ان دونوں سے تعلق ہوتا تو نیس میں مزید قیام ضرور کرتا۔"

"کاردیلو کی موت کے بعد وہ وہاں کیا کرتا؟"

"کاردیلو کو ہم نے ایک ویران مضافاتی کاٹیج میں ہلاک کیا تھا چارلی اس کی موت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ سکتا۔ اگر کاردیلو نے کسی کو بلایا بھی ہوگا تو وہ اس وقت تک اسے زندہ یا روپوش تصور کرتا رہے گا جب تک سڑی ہوئی لاشیں کسی کی توجہ اس ویران کاٹیج کی طرف مبذول نہ کرا لیں۔"

"نیس ایئرپورٹ پر ایلیزا سے میری ملاقات بڑی عجیب تھی۔" میں نے دل ہی دل میں ایلیزا سے ہونے والی گفتگو کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے دیکھا ہے کہ تمہارے ساتھ بہت سے ایسے اتفاقات رونما ہوتے رہتے ہیں جن سے میرا کبھی بھول کر بھی واسطہ نہیں پڑتا۔"

"مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی ایلیزا یا جوناس سے سامنا ہوا تو وہ دونوں پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیں گے۔"

"جوناس سے تو شاید بھڑنا ہی پڑے گا۔" عبداللہ نے کہا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ بن لیوی ہوش میں آنے کے بعد کیا کہانی سناتا ہے۔"

"جولیس گریوی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"وہ رخصت پر چلا جائے گا۔" عبداللہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "وہ مجرم ضرور ہے مگر ڈرپوک طبیعت کا مالک ہے۔ اگر ایم۔ ٹی۔ ایکس پر عمل ہو جائے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ سعودی سرزمین پر ان خوفناک طیاروں کی موجودگی اسرائیل کو لگام دینے کے لئے کافی ہوگی۔"

اس کے بعد نصف گھنٹے تک سفر خاموشی سے طے ہوا اور ہم دونوں اپنے اپنے خیالات کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے اور کار شہر سے نکل کر ایک دیہی راستے پر بڑھ رہی تھی۔

مویشیوں کے ایک بہت وسیع باڑے سے ملحق نیم پختہ مگر وسیع مکان کے پھاٹک پر عبداللہ نے کار روک کر ہارن دیا۔ چند ثانیوں بعد دروازہ کھول کر اوورکوٹ میں ملبوس ایک شخص کار کے قریب آیا اور ٹھٹھرتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

"میں کالے گلاب کا سوداگر ہوں۔ مشرق سے آیا ہوں۔" عبداللہ نے عربی میں شناختی کوڈ ورڈز ادا کئے اور فوراً کار اندر لے جانے کی اجازت مل گئی۔

اس عمارت میں نگہبان کے علاوہ مزید دو فلسطینی موجود تھے جن میں سے ایک عبداللہ کا پرانا جاننے والا تھا۔ دوسرا اس سے کم سن مگر نہایت شہ زور معلوم ہوتا تھا۔

ان دونوں کی مدد سے بے ہوش بن لیوی کو اس عمارت... میں بنے ہوئے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا جہاں فرش پر مویشیوں کے چارے کی گانٹھوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور فضا میں بھی سردی کے اثرات خاصے کم تھے۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" نوجوان فلسطینی نے بے ہوش شخص کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے عبداللہ سے سوال کیا۔

"اس کی دونوں ٹانگیں چیر کر چار فٹ لمبی ایک لکڑی کے دونوں سرے اس کے گھٹنوں سے کس دو اور پھر ٹخنوں کے سہارے.... اسے الٹا لٹکا دو تاکہ ہوش میں آتے ہی اسے اپنی بے بسی کا پورا پورا احساس ہو سکے۔" عبداللہ نے کہا۔

"اس سے پہلے اس کے لباس کی تلاشی لے لینا۔" میں نے جلدی سے عربی میں ہی لقمہ دیا۔

"تلاشی بعد میں لیتے رہنا۔" عبداللہ بولا۔ "بہتر یہ ہوگا کہ اس کے بدن سے انڈر ویئر کے علاوہ سارا لباس اتار دو۔"

نوجوان فلسطینی انہماک اور پھرتی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ دوسرا فلسطینی جس کا نام یوسف تھا عبداللہ سے باتیں کرنے لگا تھا۔

"اس کی آوازیں سناٹے میں دور تک سنی جائیں گی۔" عبداللہ اس سے کہہ رہا تھا۔

"اگلے مویشی خانے سے ملحق رہائش گاہ یہاں سے کافی دور ہے اور پھر اس تہہ خانے سے بہت کم آواز باہر جائے گی۔"

پندرہ منٹ سے بھی کم عرصے میں بن لیوی کو لباس سے محروم کرکے تہہ خانے کی چھت سے الٹا لٹکایا جا چکا تھا مگر پھر بھی وہ ہوش میں نہیں آیا تھا۔

"مہدی! ذرا اس کے رخساروں پر تھپڑ لگاؤ تاکہ یہ جلدی ہوش میں آ سکے۔" عبداللہ نے جواں سال فلسطینی کو ہدایت کی اور تہہ خانہ طمانچوں کے شور سے گونج اٹھا۔

یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی اور بن لیوی تھوڑی ہی دیر میں ہوش میں آ گیا۔

خود کو فضا میں سر کے بل معلق اور پھر برہنہ تن پا کر وہ شدید بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا اور ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے جھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے۔ کون ہو تم لوگ؟"

"ہم لوگ اسرائیلی سیکرٹ سروس کے اراکین ہیں اور تمہاری ضیافت پر مامور کرکے یہاں بھیجے گئے ہیں۔" عبداللہ نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لرزاں نظر آنے لگے تھے۔

"جولیس گریوی سے حاصل کی ہوئی مائیکرو فلمیں کہاں ہیں؟"

"وہ میں آگے بڑھا چکا ہوں۔" اس مرتبہ اس کا لہجہ خاصا سکون آمیز تھا۔ شاید وہ صورتحال کا اندازہ لگا کر خود کو آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر چکا تھا۔

"پیرس میں تمہارے کتنے ساتھی موجود ہیں؟"

"ایک کو پکڑ ہی لائے ہو۔ باقی کا سراغ لگاؤ۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کی کھوپڑی کے نیچے آگ روشن کر دو۔" عبداللہ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ [illegible]

اس نے غرا کر عبداللہ کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی [illegible] ہاتھ سے اپنی پیشانی سہلانے لگا جہاں زخم سے خون کی پتلی سی دھار بہ[illegible]

[illegible] سخت جانی کا مظاہرہ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔" عبداللہ نے [illegible] بہتر یہی ہوگا کہ جو کچھ پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دیتے چلے جاؤ۔"

"مجھے اپنا حشر معلوم ہے۔" وہ بے خوفی کے ساتھ بولا۔ "سب کچھ [illegible] دیا تو آرام سے ایک گولی میرے دل میں اتار دو گے اور اگر زبان [illegible] نہ کھولی تو شاید تشدد کے ساتھ میرا خاتمہ ہوگا اور جب ہر طرح مرنا ہی [illegible] ہے تو میں دوسری صورت کو ترجیح دوں گا۔"

اتنی دیر میں مہدی بجلی کا ہیٹر آن کرکے اس کے سر کے نیچے رکھ [illegible] رہا تھا۔ مہدی کے ہٹتے ہی بن لیوی نے ہاتھ مار کر ہیٹر دور پھینک دیا۔

مہدی غراتا ہوا آگے لپکا اور اس نے بن لیوی کا چہرہ اپنی [illegible] رانوں کے درمیان دبا کر اس کی پسلیوں پر گھونسوں کی یلغار کر دی۔ [illegible] گرفت میں ہونے کے باعث بن لیوی پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ مگر اس کے منہ سے کوئی چیخ آزاد نہ ہو سکی۔ اس نے اپنے آزاد ہاتھوں سے مہدی کا بدن نوچنے کی کوشش بھی کی جو فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

اپنے دل کا غبار نکالنے کے بعد مہدی نے رسی کا ٹکڑا اٹھایا [illegible] بن لیوی کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر جکڑ دیئے۔ یوسف نے [illegible] ہیٹر دوبارہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا تھا۔

"تم درندے ہو، بھیڑیے، قاتل اور خونی ہو۔" بن لیوی ہانپتے ہوئے نفرت سے بولا۔ "تمہیں اس سلوک کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

"کتنے فرانک لوگے؟" عبداللہ نے سفاکانہ تمسخر کے ساتھ پوچھا۔ [illegible] معاوضہ بتا دینا۔ کیونکہ ہم گرم سلاخوں سے تمہارا بدن بھی داغیں [illegible]"

بن لیوی کے چہرے پر کرب کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔

"جولیس گریوی ہم سے مل گیا ہے۔ اس نے ہمیں سب کچھ [illegible] ہے۔" عبداللہ کہتا رہا۔ "تم نے اسے غداری پر اکسایا اور [illegible] تمہارا سرپرست بھی یہیں آنے والا ہے۔"

بن لیوی کی سرخ آنکھوں میں قہر کے شعلے بھڑک رہے تھے [illegible] اندر دیشانی نہایت بھیانک لگ رہی تھی مگر وہ بالکل [illegible] خاموش تھا۔

عبداللہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس تہہ خانے میں [illegible] موجود تھے مگر سب کی زبانیں بند تھیں اور فضا بوجھل [illegible] کے آہنگ سے گونج رہی تھی۔

"ہمارا جوناس کون ہے؟" اس گمبھیر سکوت کو توڑنے کی خاطر [illegible] سوال کیا۔

بن لیوی کی آگ اگلتی نظروں نے جنبش کی اور میرے چہرے [illegible] [illegible]، اس بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اس کا منہ لوبہ لو۔" عبداللہ نے مہدی سے کہا اور مہدی نے پھرتی سے بن لیوی کے حلق میں اپنا رومال ٹھونس کر اس کا منہ دبا لیا۔

عبداللہ نے ہیٹر کا سوئچ آف کیا اور دہکتے ہوئے تاروں کا جال بن لیوی کے داہنے کولہے سے ٹکا دیا۔ بن لیوی کا بدن پوری قوت سے تڑپا اور مہدی لڑکھڑا کر دور آ گرا۔ عبداللہ نے دوبارہ ہیٹر اس کے سر کے نیچے رکھ کر آن کر دیا اور فضا میں گوشت جلنے کی ناگوار بو پھیلنے لگی۔

"مجھے صرف دو سوالوں کے جواب درکار ہیں۔" عبداللہ بولا۔ "کاغذات کی مائیکرو فلمیں کہاں ہیں اور بن حیان کہاں مل سکے گا؟"

مہدی پھر آگے بڑھا اور اس نے بن لیوی کے منہ سے اپنا رومال نکال لیا۔

بن لیوی نے مہدی کے چہرے پر تھوکنے کی ناکام کوشش کی پھر درد میں ڈوبی ہوئی نفرت آمیز آواز میں بولا۔

"میں نے جس دن یہ پیشہ اختیار کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ تم میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ اگلوا سکو گے۔ میں بدترین تشدد کے لئے بھی تیار ہوں اور جانتا ہوں کہ تم کس حد تک جا سکتے ہو۔"

"یہ ابھی تازہ دم ہے۔" مہدی بولا۔ "اسے دو تین روز میری تحویل میں دے دو۔ بھوکا پیاسا رہے گا تو سارے کس بل نکل جائیں گے۔"

"یہ بھی کر دیکھو۔" بن لیوی طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم لوگ دس روز بعد بھی مجھے اسی حالت میں پاؤ گے۔ میری قوتِ ارادی بہت مضبوط ہے۔"

مہدی اس کے سامنے فرش پر جھکا اور ایک مرتبہ پھر رومال بن لیوی کے حلق میں پہنچ گیا اور مہدی نے اس کے چہرے پر گھونسوں کی برسات کر دی۔

مہدی سیدھا ہوا تو بن لیوی کا چہرہ کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد نیل پڑ گئے تھے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ہوش میں تھا۔

اس کے منہ سے رومال نکالے بغیر عبداللہ نے ہیٹر آف کیا۔ اور ہم چاروں تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔ مہدی اپنی ناکامی پر خاصا جھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"یہ بہت خطرناک اسرائیلی ایجنٹ ہے۔ خیال رکھنا کہ فرار نہ ہونے پائے۔" عبداللہ نے یوسف سے کہا۔ "اب یہ تم دونوں کی تحویل میں رہے گا کیونکہ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اگر یہ زبان کھولنے پر آمادہ ہو جائے تو پیغام بھجوا دینا۔"

"اگر تشدد کے دوران مر جائے تو ہرج تو نہیں ہوگا؟" مہدی

نے پوچھا۔

"خود سے مر جائے تو مجبوری ہے ورنہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اس کی سسکتی ہوئی زندگی کا سلسلہ دراز کیا جائے تاکہ یہ بولنے پر مجبور ہو جائے۔"

اس کے بعد ہم دونوں کا وہاں رکنا بے سود تھا لہٰذا واپس روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچے تو مادام... اپنی تمام تر مردانہ تشویش کے ساتھ ہماری منتظر تھی اور برتھا کے ساتھ ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ رہی تھی۔

ہمارے پہنچتے ہی اس نے ٹیلی ویژن آف کر دیا اور بولی "میرا ارادہ آج تمہیں شطرنج سکھانے کا تھا۔ یہ کھیل آدمی میں تحمل اور درگزر کا جذبہ اُجاگر کرتا ہے۔"

"کیا ہم دونوں میں اس چیز کی کمی ہے؟" عبداللہ نے سوال کر ڈالا۔

"کمی تو نہیں، تم دونوں بہت اچھے آدمی ہو۔" مادام نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"کھانا لگا دوں؟" برتھا نے اس نازک موقع پر اپنی منہ بولی ماں کی مدد کرتے ہوئے خوشدلی کے ساتھ سوال کیا۔

"لگا دو۔" عبداللہ نے بے نیازی سے کہا اور کمرے میں جا گھسا۔

کھانے کے دوران مادام بھی میز پر موجود تھی اور بڑے شوق سے ہوٹل میریڈین والے واقعہ کا ذکر کر رہی تھی۔ ہم دونوں بھی خوش مزاجی... کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے باتیں کرتے رہے مگر کھانے کے اختتام پر جب اس نے شطرنج سکھانے کی پیش کش دہرائی تو ہم دونوں ہی تکان کا بہانہ کر کے اپنے کمروں میں جا گھسے۔

میں بستر میں لیٹنے کے بعد سبیتا کے بارے میں دل خوش کن خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک عبداللہ آموجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلیفون ڈائرکٹری دبی ہوئی تھی۔

"کیا لے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں عذرا جوناس کا نام اور پتہ موجود ہے۔" وہ ڈائرکٹری سمیت میرے بستر پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

"تو کیا اس سے بھی براہِ راست ٹکرا جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟"

"اگر ایلیزا سے کہیں اتفاقاً ملاقات ہو جائے تو کیسی رہے؟"

"اس میں وقت برباد ہو گا۔" عبداللہ بولا۔ "وہ تمہیں اپنے باپ سے ملوائے گی اور پھر تم اس کے ذریعے جوناس کی سرگرمیوں کا کھوج لگاؤ گے جب کہ ہم جلد از جلد بن حیان تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری سست روی کے باعث وہ صاف بچ نکلے۔"

"بن لیوی کا تجربہ سامنے ہے۔" میں نے کہا۔ "میری رائے یہ ہے کہ بن لیوی ہرگز زبان نہیں کھولے گا اور شاید جوناس بھی اسی قدر سخت جان نکلے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ایلیزا سے دوستی گانٹھ کر اسی سے براہِ راست کچھ معلوم کیا جائے۔"

"یعنی تم اسے اعتماد میں لو گے؟"

"اعتماد میں لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے باپ سے بدظن معلوم ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ میں اسے یہ بتاؤں کہ ایک آدمی نے اس کے باپ کی زندگی تلخ کی ہوئی ہے اور وہ اسے جعلی کی کچھ کوتاہیوں کی بنا پر بلیک میل کر کے بے رحمی سے اپنے اشاروں پر نچاتا ہے تو وہ لازماً ان لوگوں پر نظر دوڑائے گی جن سے اس کا سخت گیر باپ احترام سے پیش آتا ہے پھر وہ اس شخص کا نام جاننا چاہے گی اور میں نام سے لاعلمی ظاہر کر کے بن حیان کا حلیہ دہرا دوں گا اور اگر بن حیان جوناس سے ملتا رہتا ہے تو ایلیزا مجھے اس کا نام بھی بتا دے گی۔"

"خاصا طویل منصوبہ ہے۔"

"مختصر راستہ نظر بھی نہیں آتا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جوناس کو تم اغوا کر کے قتل تو کر سکتے ہو مگر اس سے کچھ اگلوا نہ سکو گے۔"

"تو چند روز اسی کی نگرانی کیوں نہ کی جائے۔"

"تم اس کی نگرانی کرتے رہو میں ایلیزا پر کام کرتا ہوں شاید کسی کو کامیابی ہو ہی جائے۔"

"ہاں، یہ ممکن ہے۔"

اگلی صبح کا پروگرام طے کرنے کے بعد عبداللہ چلا گیا۔

دوسرے روز میں عبداللہ کو گاڑی میں چھوڑ کر جولیس گریفا کے دفتر میں پہنچ گیا۔ اس نے فوراً ہی مجھے اندر بلوا لیا۔

"اس نے کچھ بتایا؟" جولیس گریوی نے سامنا ہوتے ہی سوال کیا۔

"جو کچھ بتایا وہ بہت خوفناک ہے۔ وہ سعودیوں کے ساتھ مل گیا ہے۔" میں نے اسے دہشت زدہ کرنے کے لئے کہا۔ "ان دنوں ایک سعودی وفد یہاں آیا ہوا ہے۔ بن لیوی نے بہت بڑی رقم لے کر ساری معلومات انہیں فروخت کر دی ہیں۔"

"اور یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ میں اسرائیلی مفادات کے تحت ایم۔ ٹی۔ ایکس کو سبوتاژ کر رہا ہوں۔" اس نے اضطرابی کیفیت میں پوچھا۔

"خطیر معاوضہ تو اسی بات پر ملا ہے۔ پھر تو وہ لوگ مذاکرات میں یقیناً یہ سوال بھی اٹھائیں گے میں تو بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاؤں گا۔"

"خود کو تم اس معاہدے سے لاتعلق کر لو اور جو ہوتا ہے ہونے دو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہم تم سے رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ ہمارے لئے تمہاری ملازمت زیادہ اہم ہے۔ اگر تم برطرف کر دیئے گئے تو ہم بڑے خسارے سے دوچار ہو جائیں گے۔"

"بس یہی ایک صورت ممکن ہے کہ میں رخصت پر چلا جاؤں اور تم بھی اجلاس کے التوا کی کوشش نہ کرو۔ اگر معاہدہ ہو جاتا ہے تو شاید سعودی میرے اس معاملے کو نظر انداز کر دیں۔"

"تم تو چھٹی پر چلے جاؤ گے مگر ہم التوا کی پوری کوشش کریں گے۔ ایم۔ ٹی۔ ایکس سے اسرائیلی مفادات پر کاری ضرب لگتی ہے۔"

"خدا کے لئے اس وقت یہ معاہدہ ہو جانے دو۔" وہ مرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر کسی بھی وجہ سے میرا نام اچھالا گیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا اور اپنی کنپٹی میں گولی مار کر خودکشی کر لوں گا۔"

میں نے اسے خاصا چکر دیا اور وہ گڑگڑانے لگا۔ آخرکار میں نے اس سے حتمی وعدہ تو نہیں کیا البتہ اپنی سی کوشش کرنے کا وعدہ کر لیا تاکہ طیاروں کی فراہمی کا معاہدہ ہو جائے اور اس کے نام پر پردہ پڑا رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ چھٹی کی درخواست دے چکا تھا جس کی زبانی منظوری مل گئی تھی اور وہ اگلے روز لاس ویگاس کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔

واپس آ کر میں نے عبداللہ کو تفصیل سنائی تو وہ فرطِ مسرت سے میرے گلے لگ گیا۔

"شاید سعودیوں کو علم بھی نہ ہو سکے کہ ہم نے ان کے لئے کتنی بڑی خدمت سرانجام دی ہے مگر میرا سر فخر سے بلند ہے کہ ہم نے ایک بڑا کام کیا ہے۔"

جولیس گریوی کے بعد اگلی منزل بن لیوی کی رہائش گاہ تھی۔ عبداللہ کے پاس اس کے فلیٹ کی چابی موجود تھی، لہٰذا ہم نہایت سکون سے اس عالی شان فلیٹ میں داخل ہو گئے۔

دیگر کمروں کے سرسری معائنے کے بعد جب ہم خواب گاہ سے ملحق کمرے میں داخل ہوئے تو ہمارا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہاں جدید ترین جاسوسی میں استعمال ہونے والے بہت سے اہم آلات موجود تھے جن میں مختصر مگر حساس جیبی ٹیپ ریکارڈر اور مائکرو فلمیں بنانے والے دو بیش قیمت کیمرے موجود تھے۔

تلاشی لینے پر ایک میز کی دراز میں سے مائکرو فلموں کے استعمال شدہ دو رول بھی برآمد ہوئے مگر جب عبداللہ نے پہلے رول کو کھولا تو بوکھلا کر اسے واپس لپیٹ دینا پڑا کیونکہ فلم پر لی ہوئی باریک ترین عبارت روشنی پڑتے ہی غائب ہونے لگی تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ وہ تازہ فلم تھی اور ابھی تک ڈیویلپ بھی نہیں کی گئی تھی۔

اسی کمرے سے ایک رقعہ بھی ملا جس پر چند پتے درج تھے مگر اس مکار شخص نے کسی بھی پتے کے ساتھ نام نہیں لکھا تھا۔

ہم فلیٹ سے نکلے تو بہت سی کارآمد چیزوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا ہمارے ساتھ تھا۔ مائیکرو فلموں کے رول عبداللہ نے احتیاط سے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں رکھ لئے تھے جبکہ پتوں والا کاغذ میرے پاس تھا۔

اس تھیلے کو کار کی ڈکی میں منتقل کرنے کے بعد ہم دونوں ایک فون بوتھ پر پہنچے اور عبداللہ نے سکّہ ڈال کر جوناس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

چند فقروں کے تبادلے کے بعد عبداللہ نے ریسیور رکھ دیا۔ "اس کے باپ نے ریسیور اٹھایا تھا۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔

"ایلیزا کہاں ہے؟"

وہ سالا میرے منہ سے ایلیزا کا نام سنتے ہی کٹکھنے کتے کی طرح غرّانے لگا تھا۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں اس کی سہیلی کا شوہر ہوں تو ذرا نرم پڑا اور بتایا کہ ایلیزا خریداری کے لئے بازار گئی ہوئی ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ پیرس کے بازاروں میں اسے کہاں کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بن لیوی کو ہی دیکھ لیا جائے۔"

"جانے سے پہلے فون کر لو۔ کہیں مہدی نے اس کا کام تمام ہی نہ کر دیا ہو۔"

عبداللہ نے اسی بوتھ سے فون کیا اور اپنا نام بتا کر صرف اتنا دریافت کیا کہ مہمان کا کیا حال ہے اور جواب سن کر ریسیور رکھ دیا۔

"وہ زندہ ہے۔ آؤ اسی طرف چلتے ہیں۔"

ہم لوگ مویشی خانے پر پہنچے تو وہاں سناٹا طاری تھا۔ عبداللہ کی گاڑی کا ہارن سن کر یوسف آیا اور اس کے چہرے سے مسرت ظاہر ہو رہی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ گونگا بول پڑا ہے۔" عبداللہ نے اس کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے زوردار قہقہہ مار کر کہا۔

"بڑبڑا رہا ہے۔" یوسف نے کہا۔ "اس کی حالت بہت ابتر ہو گئی ہے۔"

"ایک ہی رات میں یہ حال ہو گیا؟" عبداللہ نے حیرت سے کہا۔

"یہ مہدی کا کارنامہ ہے۔" یوسف ہنستے ہوئے بولا۔ "اس نے طویل کارروائی سے بچتے ہوئے اختصار کی راہ تلاش کی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس نے پچھلی رات گھونسے مار مار کر بن لیوی کا داہنا جبڑہ توڑ دیا مگر پھر بھی اس کے تیور ماند نہ پڑے تو مہدی نے دست آدر دھا دے کر باتھ روم میں بند کر دیا۔ آج صبح چار بجے نکال کر دوبارہ تہہ خانے میں الٹا لٹکا دیا گیا ہے۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہے اور کمزوری کے باعث چوٹیں بھی اپنا اثر دکھا رہی ہیں۔"

"یہ تو واقعی اچھی ترکیب ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھوکا رہ کر تو شاید وہ کئی روز میں بھی اس حالت کو نہ پہنچ سکتا تھا۔"

ہم لوگ تہہ خانے میں پہنچے تو مہدی جو بھوسے کے ایک پیال پر بے فکری سے لیٹا ہوا تھا پھرتی سے اٹھ کر ہماری طرف آ گیا۔

بن لیوی کے گھٹنوں کے درمیان بدستور ڈنڈا کسا ہوا تھا ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور ٹخنوں کے سہارے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا پورا جسم ورم آلود اور نیلا ہو رہا تھا۔ چھلی ہوئی جلد پر جمنے والے گاڑھے خون نے سیاہی مائل رنگت اختیار کر لی تھی اور داہنا جبڑا نہایت کریہہ انداز میں لٹکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔

ہم دونوں نے اسکے قریب بیٹھ کر اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی کوئی آواز سننے کی کوشش بھی کی جو بے سود رہی۔

"اسے اتار کر پیال پر ڈال دو۔" عبداللہ نے ترحم آمیز نظروں سے بن لیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مہدی سے کہا۔

"لٹکا رہنے دو نا۔" میں نے کہا۔

"اس کی حالت بہت خراب ہے، دیکھا بھی نہیں جا رہا۔ ایسی اذیت سے تو بہتر ہے کہ اسے مار ہی دو۔" عبداللہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

عبداللہ خاصے سخت دل کا مالک تھا مگر اس وقت شاید اس کی کوئی رگ پھڑک اٹھی تھی جو وہ اپنے ایک دشمن کے لئے نرمی کرنے پر تل گیا تھا۔ میں نے بھی اس سے بحث کرنی مناسب نہ سمجھی اور بن لیوی کو کنڈے سے اتار کر بھوس پر ڈال دیا گیا۔

دوران خون اعتدال پر آیا تو چند منٹ بعد بن لیوی کے بڑبڑانے کی آواز آئی اور ہم چاروں لپک کر اس کے سرہانے پہنچ گئے۔

ابتدا میں وہ مبہم آوازیں تھیں جنہوں نے بتدریج بے ربط الفاظ کی صورت اختیار کر لی۔ وہ جو کچھ بڑبڑا رہا تھا وہ عربی میں تھا

اس کی آنکھیں بند تھیں مگر پپوٹوں کے نیچے ڈھیلے بہت تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ ... وہ میرا انتقام لے گا۔ سب کو فنا کر دے گا۔" آخر اس کے بے ربط الفاظ نے ایک شکستہ جملے کی صورت اختیار کر ہی لی۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ اور آنکھیں بدستور بند تھیں۔

"وہ کون ہے بن لیوی؟" عبداللہ نے نرمی سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر عربی میں پوچھا۔

نہایت آہستگی سے اس نے سر گھمایا پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی سرخ اور غضبناک نگاہوں میں عجیب سی بے رونقی رچی ہوئی تھی۔ چند ثانیوں تک اس کی آنکھوں کی پتلیاں ایک ہی نقطے پر مرکوز رہیں پھر انہوں نے آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حرکت کی اور وہ بڑبڑانے لگا۔ "مجھے نظر کیوں نہیں آتا؟ تم کون ہو؟" یہ الفاظ اس نے اٹک اٹک کر سسکیاں لیتے ہوئے ادا کئے اور یکلخت آنکھیں موند لیں۔

"ہم تمہارے دوست ہیں بن لیوی۔" عبداللہ نے اپنی آواز کو بھاری بناتے ہوئے کہا۔ "تم آزاد کرائے جا چکے ہو، ہمیں پہچاننے کی کوشش کرو۔"

ایک مرتبہ پھر خوابناک انداز میں اس کے پپوٹے وا ہوئے اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں گردش میں آ گئیں۔ چند ثانیوں بعد وہ پپوٹے بند کر کے کربناک آواز میں بڑبڑایا۔ "مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ میری آنکھوں کے سامنے صرف اندھیرا ہے۔"

"وہ تمہیں کیوں لے گئے تھے؟" عبداللہ اس کے اندھے ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد اس کے خون آلود بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ عبداللہ اس فریب کو اس کے آخری سانسوں پر فریب دے کر اس کی زبان کھلوانے کا ارادہ کر چکا ہے لہٰذا میں اس کے گھٹنوں سے بندھی ہوئی لکڑی کھولنے میں مصروف ہو گیا اور عبداللہ نے سر کی جنبش سے میرے اقدام کی تائید کر ڈالی۔

"وہ بھیڑیے تھے، گریوی ان سے مل گیا۔" وہ رک رک کر کہنے لگا۔ "انہوں نے میری رگوں سے زندگی کی ہر رمق نچوڑ لی۔ وہ ... میرا انتقام لے گا۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو، ہمیں بتاؤ، ہم اسے خبر کر دیں گے۔"

"جوناس ان کی بوٹیاں کتوں سے نچوائے گا۔ وہ میرا

اسے میرا انجام ضرور بتا دینا۔ میں نے آخر تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔" وہ غشی کے عالم میں بولا۔

"ہم بن حیان کو بتائیں گے، وہی ان سے نمٹ سکتا ہے۔" عبداللہ بولا۔

"تمہیں کچھ نہیں معلوم۔" وہ سر پٹک کر کرب آمیز آواز میں کراہا۔ "بن حیان ہے، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

عبداللہ نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میں نے بن حیان کو بھی بہت قریب سے دیکھا تھا اور جوناس کو بھی۔ ان دونوں میں دور دور تک جسمانی مماثلت نہیں تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بن لیوی کا دماغ چل گیا ہے۔

"عزرا جوناس تو بزدل ہے، وہ کہاں انتقام لینے کا اہل ہے۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد عربی میں کہا۔

"وہ اس کا بڑا بھائی ابراہام جوناس ہے۔ وہی بن حیان ہے جو صحراؤں کا قہر ہے جو مجھے اس حال کو پہنچانے والوں پر ٹوٹ پڑے گا۔" اس نے فرطِ جذبات سے کانپتی ہوئی، رقت آمیز آواز میں شکستہ الفاظ کے سہارے کہا اور کراہنے لگا۔

بن لیوی کے الفاظ پر میرا دل مسرت سے اچھل پڑا۔ میرا دشمن ابراہام جوناس تھا جس کی بھتیجی نیس ایئرپورٹ پر کافی دیر میرے برابر میں بیٹھی رہی تھی۔ اپنے دشمن سے انتقام کا یہ پہلو بہت لذت انگیز اور پُرسرور تھا۔

عبداللہ بن لیوی کے سرہانے سے اٹھ گیا اور مہدی سے بولا۔ "اس پر جانکنی کی کیفیت طاری ہے۔ میرے لئے اب یہ بیکار ہو چکا ہے۔ بہتر ہو گا کہ اسے اذیت سے نجات دلا کر کسی گڑھے میں دبا دو۔"

بن لیوی نے ایک ہلکی سی چیخ مار کر اپنی بے نور آنکھیں کھولیں اور پیال سے اٹھنا چاہا مگر مہدی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ کر اسے دوبارہ پیال پر ڈال دیا۔

مہدی کے ہاتھوں کے سکڑتے ہوئے حلقے میں بن لیوی بری طرح تڑپا اور پھر چند ہی سیکنڈ میں بے جان ہو گیا۔ عبداللہ میرا ہاتھ تھام کر تہہ خانے سے نکاسی کے راستے کی جانب چل دیا۔ مہدی اور یوسف بن لیوی کی لاش کے پاس ہی رک گئے۔

صورتِ حال

نے نہایت تیزی کے ساتھ ایک سنسنی خیز رخ اختیار کیا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ بن لیوی کی زبان سے کوئی بھی کارآمد نکتہ اگلوانے کی امید نہیں تھی کیونکہ وہ اور اس کے ساتھی اسرائیلیوں کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ان مکار لوگوں کو کس طرح زیر کرنا ممکن ہے یہی وجہ تھی

کہ مہدی جیسے جواں سال اور جوشیلے لڑکے نے بن لیوی جیسے خرانٹ کو ایک ہی رات میں حواس سے اس قدر بیگانہ کر دیا کہ وہ دوست اور دشمن کی تمیز کھو بیٹھا اور پھر اس نے عبداللہ کے بہلاوے میں آ کر اس راز سے پردہ اٹھا دیا جس کا تجسس مجھے ہمیشہ پریشان کئے ہوئے تھا۔

وہ ابوخالد کے روپ میں مشرقِ وسطیٰ کی سرزمین پر میرے سامنے آیا۔ وہاں وہ حکمران کا ایک سفاک اور عیار مشیر تھا اور مجھے اس نے اپنے زرخرید غلام کی طرح استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں میں نے ناسازگار حالات کے باوجود اس کے گرگوں کے لئے خفیہ طور پر ایسی دشواریاں پیدا کیں کہ میری روانگی کے بعد وہاں ان کا شیرازہ بری طرح بکھر کر رہ گیا۔ مگر میں پھر بھی اپنی مشکلات پر حاوی نہ ہو سکا اور چند مخصوص مقاصد کے آلۂ کار کے طور پر اسرائیل کی سرزمین پر پہنچا دیا گیا۔

وہاں ابوخالد کا ایک نیا روپ میرے سامنے آیا۔ وہ اسرائیل کے بارسوخ حلقوں میں بن حیان کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور کم و بیش ہر ایک اہم معاملے میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح اس کا نام ضرور شامل ہوتا تھا۔

اسرائیل میں بن حیان محض ایک سایہ تھا جسے اس کے ہم وطن عقیدت کی حد تک چاہتے تھے کیونکہ وہ فلسطینی باشندوں کی لاشوں کے انبار پر تعمیر کئے جانے والے جدید اور وسیع تر اسرائیل کے معماروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ لوگ محض اس کا نام اور نام سے وابستہ ناقابلِ یقین دہلا دینے والی کہانیاں ہی سنا کرتے تھے۔ اس کو دیکھنے والوں کی تعداد لاکھوں کی آبادی میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

وہ حریت پسندوں کے لئے بلا سا تھا اور میری تمام تر ہمدردیاں محبِ وطن ہونے کے ناتے سے حریت پسندوں کے ساتھ تھیں۔ لہٰذا بن حیان کے لئے میری ذاتی نفرت اور عداوت میں انا کے ساتھ ایک مقصد بھی شامل ہو گیا مگر وہ مکارِ اعظم کہیں بھی میرے سامنے نہ پڑ سکا۔

اور اب میں اس تک اپنے مسکن سے ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد پیرس پہنچا تو وہاں بن لیوی نے اس کے تیسرے روپ کا انکشاف کیا۔

پیرس میں وہ نہ ابوخالد رہا تھا نہ بن حیان بلکہ وہاں وہ ابراہام جوناس تھا۔ بن لیوی کے الفاظ میں ابراہام جوناس اس کا آقا تھا، صحراؤں کا قہر تھا اور میرے لئے موقع پیدا ہو چکا تھا کہ میں آقائیت کے غرور میں مبتلا اس چلتے پھرتے فتنے کو مٹی میں مسل دوں اور صحراؤں کے قہر کو بے وطنی کی حالت میں کسی بنجر اور ویران ٹیلے میں دفن کر دوں۔ تاکہ اس کا شیطانی دماغ انسانی لہو کی ہولی کھیلنے کے نت نئے منصوبوں کو جنم نہ دے سکے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" موسیقی خانے کے تہہ خانے سے باہر آنے کے بعد عبداللہ نے میری خاموشی پر مجھے ٹوک ہی دیا۔

"ابراہام جوناس کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔" میں نے سادگی سے کہہ ڈالا۔

وہ زور سے ہنس پڑا "یار کیوں بیوقوف بناتے ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس کی لڑکی ایلیز ابوناس کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"وہ ہے تو اسی قابل کہ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر کافی وقت خوشگوار طریقے پر گزارا جا سکتا ہے مگر فی الحال میں اسے بھولا ہوا ہوں۔"

"اسے نہ بھولنا۔" وہ جلدی سے بولا "اپنی جمالیاتی حس کو انتقامی جذبے سے مغلوب نہ ہونے دو ہو سکتا ہے کہ ہم اس لڑکی کے سہارے ابراہام تک رسائی حاصل کر سکیں۔"

"بہت معصوم اور بیباک لڑکی ہے!"

"بالکل غلط!" وہ کار میں بیٹھتے ہوئے پُر زور لہجے میں بولا "تم نے محض اس کے حسن سے متاثر ہو کر یہ سمجھ لیا ہے ورنہ وہ نہ معصوم ہے اور نہ بے باک!"

"تم تو یوں دعویٰ کر رہے ہو جیسے مدت سے اسے جانتے ہو۔"

"معصوم ہوتی تو ماں باپ کی لاعلمی میں سگریٹ نوشی کی علت کا شکار نہ ہوتی اور اگر بے باک ہوتی تو اپنے باپ کے سامنے ڈنکے کی چوٹ پر دھوئیں کے مرغولے اڑاتی۔" عبداللہ نئی کامیابی کے بعد موج میں آیا ہوا تھا۔

"تم قلندر ہو اور قلندر ہی رہو تو بہتر ہے۔ میں لڑکیوں کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں اور ان کے بارے میں میرے اندازے اکثر درست ثابت ہوتے ہیں۔"

"تمہیں تو عورت خور کہا جانا چاہیئے۔ تم نے فلورا سے دوستی کی اور وہ بیچاری پروانے کی طرح تم پر نثار ہو گئی۔ مارلین سے محبت کے دو بول بولے تو وہ نیس کے ہسپتال میں گھائل پڑی ہے یار جونس پر ہمدردی کی نگاہ ڈالی تو وہ بھی جان پر کھیل گئی۔ بھلا تم سے زیادہ تجربہ کس کو ہو سکتا ہے اور اب شاید ایلیزا کی باری ہے!"

"تم نے صبح ڈائرکٹری میں اس کا فون نمبر دیکھا تھا نا؟" اس نے عبداللہ کی بکواس پر کان دھرے بغیر سوال کیا۔

"ہاں۔ دیکھا تو تھا۔"

"پتہ یاد ہے؟"

"پورا پتہ تو یاد نہیں۔ چاہو تو کسی ہوٹل سے ڈائرکٹری سے تلاش کئے لیتے ہیں۔ ویسے وہ سینٹ جرمین کے علاقے کا نمبر تھا۔"

"راستے میں پڑے گا؟"

"نہیں وہ علاقہ دریائے سین کے اس پار شہر کے جنوبی حصے میں ہے جبکہ ہم دریا عبور کئے بغیر نادام نے کے مہمان خانے پر پہنچ سکتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو یاد پڑتا ہے۔ تم نے ادھر آتے ہوئے دریا عبور کیا تھا۔ میں نے محض پیرس کے راستوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے۔"

"مادام نے پرنسس پارک کے علاقے میں رہتی ہے۔ وہاں سے ہم نے پونٹ ڈی آطونتیل پر دریا عبور کیا تھا اور سیل پیڈرے متوازی وکٹر بولیوار سے شہر کے جنوبی حصے کا طویل چکر لگاتے ہوئے گرانڈ پیلس کے قریب چیمپ شمالی حصے میں آ گئے تھے۔"

"مجھے اب تنہا شہر کی خاک چھاننی ہو گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "میرے لئے یہ تمام جغرافیہ اور تفصیلات نہایت ضروری ہو گیا ہے۔"

"چاہو تو ان مقامات کا تعارف بھی کرا دوں جہاں تم ایلیزا کے ساتھ خوشگوار وقت گزار سکو۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"ابھی خاصا دن پڑا ہے۔ ایلیزا کا رخ کرنے سے پہلے تھوڑی سی تفریح ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ نائٹر ڈیم کیتھڈرل، سینٹ چیپل، قدیم شاہی محلات اور ایفل ٹاور وغیرہ کا شمار پیرس کے قابل دید مقامات میں ہوتا ہے۔"

"ایفل ٹاور کے علاوہ یہ سب مقامات ایک دوسرے کے قریب ہی واقع ہیں اور وہ سامنے بلند گنبد اور ان کے دمکتے ہوئے کلس دکھائی دے رہے ہوں گے وہ سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ سیکرے سیور کے حسین ترین گنبد ہیں جو شہر کے ہر حصے سے دیکھے جا سکتے ہیں۔"

"پیشہ ور گائیڈ معلوم ہوتے ہو۔"

"تم بھی میری ہی طرح مسافر ہو۔" وہ یک بیک اداس ہو گیا۔ "آج یہاں میرے ساتھ پیرس کی سڑکوں پر گھوم رہے ہو۔ چند روز بعد انسانوں کے بے کراں سمندر میں نہ جانے کہاں گم ہو جاؤ گے۔ مقدر نہیں ادھر لے ہی آیا ہے تو یہاں جی بھر کر تفریح کرنا۔ نہ جانے دوبارہ ادھر آنا بھی ہو گا یا نہیں۔"

"جدید دور کی علامتوں کے دامن میں یہاں روایتی قدیم عمارتیں بھی پر شکوہ انداز میں اسی سج دھج سے کھڑی ہیں۔ ایسا منظر کسی اور شہر میں مشکل ہی سے ملے گا۔" میں نے اس کے لہجے کی اداسی بھانپتے ہی موضوع بدلنے کے لئے کہا۔

"اس شہر کا سارا حسن دریائے سین کے ٹھنڈے اور شفاف پانی سے جو دھیمے دھیمے اس شہر کے وسط میں بہتا ہے۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا "اور اسی شہر تک کئی دریائی جزیرے بھی ہیں جنہوں نے اس مہربان دریا کے ترنم سے کو دو ندیوں میں بانٹ رکھا ہے۔"

"تم تو شاعری کرنے لگے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کی نظریں بدستور سامنے جمی تھیں اور وہ خوابناک لہجے میں بولا تو میرے تبصرے کے جواب کے بجائے اس کی زبان سے عجیب سی باتیں سننے میں آئیں۔ "کیمپیس ایلاسس کی خوبصورت شاہراہ سے

ایک روز یہ رستان میں رہتی تھی۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے درختوں کے سائے میں سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتے رہتے اور پھر سڑک کے کنارے کسی قہوہ خانے میں جا بیٹھتے یا یہاں سے ملحقہ حسین باغات میں چلے جاتے۔ اس نے مجھ سے بے لیا وعدے کئے مگر پھر ایک روز وہ مجھے کچھ بتائے بغیر چپ چاپ چلی گئی۔"

اس کا سب لہجہ ایسا تھا کہ میں بھی چونک پڑا گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آ سکا کہ عبداللہ جیسا پتھر دل اور کٹر شخص بھی کسی سے محبت کر سکتا ہے۔

"کون تھی وہ؟"

"اب تو بس ایک بے وفا لڑکی ہی سمجھو۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "اس وقت اس کا ایک نام بھی ہوا کرتا تھا مگر یار وہ اس قدر حسین تھی کہ اگر میں مسلمان نہ ہوتا تو شاید اسے کسی دیوی کا انسانی روپ ہی سمجھتا۔" اور اس سے مجھے اس پر پڑنے والے اچانک جذباتی دورے کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ ہم جس سڑک سے گزر رہے تھے اس پر دونوں طرف گھنے سایہ دار درخت ایستادہ تھے اور ایک بہت بڑے سنگین محراب سے گزرنے والا ٹریفک ڈھلوان سڑک پر تیزی سے بہا جا رہا تھا اور یہ وہی شاہراہ تھی جس کے متعدد گوشوں میں بنے ہوئے قہوہ خانوں میں کسی البیلی نازنین نے عبداللہ سے پیمانِ وفا کیا تھا۔

"تمہاری زبان سے یہ باتیں اجنبی معلوم ہوتی ہیں!"

"کیوں؟" اس نے ایک لحظہ کے لئے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور پھر سڑک کی طرف متوجہ ہو گیا "کیا میں انسان نہیں ہوں؟"

"میں تو شروع ہی سے تمہیں فوق البشر سمجھتا آ رہا ہوں۔"

"میرے سینے میں بھی دل ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار کسی کو چاہا تھا۔ اب تو نسوانی چہروں سے طبیعت فرار ڈھونڈتی ہے۔"

"مگر وہ کہاں گئی؟"

"جاتی کہاں۔ یہیں کی رہنے والی تھی۔ کسی اور سے شادی رچا کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔"

"تمہیں اس کا سبب تو پتہ نہیں چلا؟"

"اس کا سبب تو پتہ ہی کیا تھا۔ ویسے وہ مجھ سے واقعی محبت کرتی تھی اور یہ دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ تہذیبیں اور الیاس اب بے معنی ہو چکی ہیں۔ محبت ایک سے کرتی ہیں۔ شادی کسی دوسرے سے اور وصال شاید کسی تیسرے سے!"

"اس قدر بد دل ہو گئے ہو؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ساتھ خوش وقت گزار رہی ہو گی ——— کسی مناسب لڑکے کی تلاش میں۔"

"محبت الفاظ میں تولی جاتی ہے اور آنکھوں میں پڑھی جاتی ہے

مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ مگر وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔"

"تو چوروں کی طرح فرار کیوں ہو گئی؟" میں نے سوال کیا۔ "تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"وہ کٹر پروٹسٹنٹ تھی اور میں مسلمان۔ وہ مجھے اپنے مسلک پر لانا چاہتی تھی اور میں اسے مسلمان بنانا چاہتا تھا۔ ہمارے درمیان یہ سرد جنگ جاری تھی اور شاید اس نے سمجھ لیا کہ میں اپنی جگہ سے نہیں ٹلوں گا۔ لہٰذا اچانک ترک تعلق کر بیٹھی۔"

"اور یہ قصہ کب کا ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پرانی کہانی ہے جبکہ نیس میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے ہیش روکے قتل کے بعد تھوڑے عرصے قبل ہی یہاں بھیجا گیا تھا۔

"دو سال پہلے کی بات ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے کسی کام کے سلسلے میں چند ماہ کے لئے پیرس میں مامور کیا گیا تھا۔"

"اور اسی وقت سے تم لڑکیوں سے متنفر ہو گئے ہو؟"

"بس دامن بچاتا ہوں!"

"یہ پارسائی کب تک چلے گی؟"

"جب تک تنظیم سے وابستہ ہوں یا یوں سمجھ لو کہ جب تک زندہ ہوں کیونکہ اب میں زندگی میں تو تنظیم سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔"

"تنظیم کا لڑکیوں سے کیا تعلق!"

وہ دھیمے سے یوں ہنس دیا جیسے کوئی عالم کسی بچے کی جہالت پر مسکرا دیتا ہے اور بولا۔ "میری پارسائی کا سبب میری ناکام محبت نہیں ہے۔ جب میں زیر تعلیم تھا تو پرلے درجے کا اوباش تھا مگر تنظیم میں شامل ہوتے ہوئے میں نے عہد کیا تھا کہ ہر گناہ سے بچوں گا اور آج تک اس عہد پر قائم ہوں۔"

"تو وہ......!" میں نے حیرت سے زبان کھولی مگر عبداللہ نے میرا فقرہ درمیان ہی سے اچک لیا۔

"ہاں وہ میرے عہد کے لئے سخت امتحان ضرور ثابت ہوئی مگر میں بھٹک نہ سکا۔"

"اور تم شراب بھی نہیں پیتے؟"

"کبھی دیکھا تم نے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم نے کسی سوچے سمجھے فیصلے کے تحت گریز کرتے ہو۔" میں نے اپنے دل میں ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب گاڑی کہیں چھوڑ دی جائے۔" اس نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ وہ جانتا تھا کہ میں شراب نوشی کا عادی ہوں لہٰذا اس نے نازک موضوع کو اسی مقام پر ختم کر دیا۔

"ہم ابھی تمہاری محبوبہ والی سڑک سے ہو کر آئے ہیں۔ اگر وہ مل گئی تو؟"

"اسے میری محبوبہ نہ کہو اب وہ کسی کی بیوی ہے۔ ممکن ہے کہ بوڑھے

جھکائے کسی اجنبی کی طرح آگے بڑھ جاؤں گا"

"اور اگر اس نے پکار لیا؟"

"فرض کر لوں گا کہ میں عبداللہ نہیں ہوں۔"

میں لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا، وہ بظاہر ایک لاابالی سا شخص اور مخلص شخص نظر آتا تھا جو دوستوں کی خاطر آنکھیں بند کر کے خطرات میں کود پڑنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس کے بارے میں خاصے اثرانگیز تجربات ہوئے تھے وہ سب کچھ تھی مگر لاابالی اور بے فکر انہیں تھا، وہ شخص انتہائی سادہ انداز میں اپنے سخت اصولوں کے تحت زندگی گزار رہا تھا اور خوبی کی بات یہ بھی کہ اپنی اصول پرستی کا ڈھنڈورا پیٹے بغیر وہ ان حدود کا احترام کئے جا رہا تھا جبکہ اس کی آزادی پر قدغن عائد کرنے والا کوئی نہ تھا۔

اس روز ہم نے جی بھر کر شہر کے وسطی علاقے میں دریائے سین کے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے بے شمار تاریخی اور تفریحی مقامات کی سیر کی۔

سینٹ چیپل اور ایوانِ انصاف کی حسین عمارات سے فارغ ہو کر ہم دریا کے بائیں کنارے پر آئے تو ماحول میں یک بیک تبدیلی کا احساس ہوا۔ داہنی طرف پرشکوہ جدید عمارات اور کشادہ سڑکوں کی فراخی تھی جو اس طرف ماند پڑ گئی تھی اور وہیں سینٹ جرمین کا علاقہ واقع تھا۔ جہاں ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ابراہام جوناس مقیم تھا۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے ایک کیفے میں کافی سے شغل کرتے ہوئے عبداللہ سے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟"

"ایلیزا کے گھر سے اتنے قریب ہو کر بھی میں کچھ نہ کر سکا تو یہ کاہلی کی انتہا ہو گی۔"

"اوہ!" وہ ہونٹ سکیڑ کر ترحم آمیز انداز میں مسکرا دیا۔ "ذرا یہ خیال رہے کہ آج موسم زیادہ ہی سرد ہے اور ہوائیں بھی چل رہی ہیں۔"

"یہ موسم تو یونہی رہے گا۔ کام بھی ہونا چاہیئے!"

"ایسا نہ ہو کہ تم دونوں ساری رات کسی کھلے پارک ہی میں باتیں کرتے رہو اور صبح تمہارے اعصاب اس قابل بھی نہ ہوں کہ تم وہاں سے روانہ ہو سکو۔"

"پتہ نہیں وہ ملتی بھی ہے یا نہیں ـــــ ذرا ڈائرکٹری سے اس کا پتہ اور فون نمبر تو دیکھو!"

عبداللہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک رقعہ موجود تھا۔ جو اس نے میری طرف بڑھا دیا۔

"اگر ایلیزا سے بات ہو گئی تو تمہیں ٹیکسی سے واپس جانا ہو گا۔" میں نے ایلیزا کا پتہ پڑھتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔ "کار میں رکھوں گا۔"

"تم اکیلے مادام فے کے گھر پہنچ سکو گے؟"

"نہ پہنچ سکا تو فون کر کے تمہیں بلا لوں گا۔"

کافی ختم کرنے کے بعد میں نے اسی کیفے میں لگے ہوئے پبلک فون سے ایلیزا کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" وہ غراتی ہوئی بھاری مردانہ آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ اسے میں نیس ایئرپورٹ پر بھی ایلیزا کو پکارتے سن چکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ عذرا جوناس اپنے گھر کے کسی اور فرد کو فون پر بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔

"موسیو ابراہام جوناس موجود ہیں؟" میں نے مسٹر کی جگہ مسیو کا متبادل ضرور استعمال کیا۔ مگر اس سے آگے فرنچ جواب دینے کا در کھلے انگریزی کا ہی سہارا لینا پڑا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" یہ شاید ابراہام کے نام کا اثر تھا کہ عذرا جوناس کی آواز یک بیک نرم پڑ گئی۔

"مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ باہر کسی دعوت میں گئے ہوئے ہیں، دس بجے تک واپس آئیں گے، کوئی پیغام ہو تو مجھے نوٹ کرا دیں۔ میں ان کا چھوٹا بھائی عذرا جوناس بول رہا ہوں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ تم اسی وقت مجھ سے کہیں مل لو؟" میں نے ایک فوری فیصلے کے تحت رازدارانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"بہتر یہی ہو گا کہ تم میرے بھائی سے بات کرو، نہ جانے تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو!" اس کے لہجے میں یک بیک بیزاری عود کر آئی۔

"میرا بھی یہی خیال تھا، ویسے اس معاملے کا تعلق اسی کام سے ہے جس کے لئے تم پچھلے دنوں نیس گئے ہوئے تھے۔"

"کیا تم سیدھی طرح بات نہیں کر سکتے جو پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟" وہ اضطراری لہجے میں برس پڑا۔

"مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں ہے ورنہ میں تمہیں بتاتا کہ نیس میں تم کیا تیر مار کر آئے ہو۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "میں پوری کہانی اس کو بتاؤں گا جس کے سامنے میں جوابدہ ہوں۔"

"وقت ضائع مت کرو، یہ معاملہ بہت اہم ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "ابراہام کو بھی بتا دینا مگر مجھے بھی بتا دو تاکہ میں صورتِ حال سنبھالنے کیلئے فوراً کوئی کارروائی کر سکوں۔"

"مجھے افسوس ہے عذرا!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم ابراہام کے سگے بھائی ہی سہی، مگر کام کے بارے میں ضابطوں سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو تم اسی سے مل لو۔ وہ سینٹ جیکوئس کے علاقے میں کاؤنٹ لوئیس فلپ کے مکان پر ہونے والی دعوت میں موجود ہے!

"کاؤنٹ کا نام میرے لئے اجنبی ہے اس کا پتہ یا فون نمبر بتاؤ۔"

عذرا جوناس نے مجھے فوراً ہی کاؤنٹ لوئیس کے دونوں نمبر بتا دیئے جو میں نے سگریٹ کے پیکٹ پر نوٹ کر لیے۔

فون کا سلسلہ منقطع کر کے میں واپس آیا تو عبداللہ بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ "کہاں رہ گئے تھے؟ بہت دیر لگا دی!"

"آؤ باہر چلیں!" میں اسے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "آج ستارے ہم دونوں پر بہت زیادہ مہربان ہیں۔"

عبداللہ بل پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں فوراً باہر آ گئے "فوراً جوناس کے مکان کی طرف چلو!" میں نے باہر آتے ہی کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"وہ بھی بتاتا ہوں۔" میں نے اس کا بازو تھام کر اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے عذرا عجلت میں گھر سے نکلے گا۔"

ہماری کار دور کھڑی ہوئی تھی اور ویسے بھی ہم اس وقت سینٹ جرمین کے علاقے میں ہی موجود تھے لہٰذا اپنے اوورکوٹ کے کالر کھڑے کئے تیزی سے پیدل ایک طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں میں نے عبداللہ کو عذرا جوناس اور اپنی گفتگو سنا دی۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ عذرا بھی ابراہام کا شریکِ کار ہے؟" میرے خاموش ہونے پر عبداللہ نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"خیال کیا معنی ـــــ اب تو اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ فون رکھتے ہی کاؤنٹ لوئیس فلپ کے مکان کی طرف روانہ ہوا ہو گا۔"

"وہاں جا کر وہ کیا کرے گا؟" عبداللہ بولا۔ "اگر وہ مدعو ہوتا تو اپنے بھائی کے ساتھ ہی جاتا۔ مدعو نہ کئے جانے کی صورت میں وہ ہرگز وہاں نہیں جائے گا۔ یہاں کے لوگ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ان سے انحراف کو پسند نہیں کرتے!"

"مگر عذرا جوناس کو فرنچ نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ کاؤنٹ اس کی دخل اندازی کو رنگ میں بھنگ پڑنا سمجھے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی خدمت گار ہی عذرا کو دروازے سے لوٹا دے!"

"وہ باہر رک کر بھی ابراہام یا اس کے ملاقاتی کا انتظار کر سکتا ہے۔"

"اگر تمہارا خیال درست ہے تو ہمارا اس کے گھر جانا بے سود ہو گا وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے نکل جائے گا۔" عبداللہ نے کہا۔

"ورنہ تو نکل ہی چکا ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔ "ابراہام پہلے سے ہی غائب ہے۔ اب گھر پر صرف ایلیزا یا اس کی ماں ہو گی"

"تو تم ان دونوں سے ملو گے؟"

"ہاں وہاں پہنچ کر ہی دیکھا جائے گا۔"

عبداللہ کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی اور وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "میں نے اب تک تمہاری کسی بھی رائے سے اختلاف نہیں کیا مگر اس مرتبہ مجھے معاملہ ہاتھ سے نکلتا نظر آتا ہے!"

"وہ کیوں؟"

"نیس کا حوالہ دے کر تم نے اسے ہوشیار کر دیا ہے اور اب اگر تم نے ابراہام سے بات نہ کی تو وہ چوکنا ہو جائے گا اسے یہ رائے قائم کرنے میں دقت نہ ہو گی کہ کچھ لوگ اس کی پیرس میں موجودگی سے باخبر ہیں اور اس کی راہ پر لگ گئے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم۔" میں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ "نیس کا حوالہ آنے پر وہ جس طرح چونکا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیس میں اسرائیلی فلائنگ شپ پر اسلحہ کی لدائی سے اس کا گہرا تعلق تھا اور اب وہ لوگ اس جہاز پر سخت حفاظتی اقدامات کر سکتے ہیں۔"

"وہ جہاز تو خیر اب تک ساحل سے بہت دور نکل چکا ہو گا کسی بھی لمحے اس کی ہولناک غرقابی کی خبر آ سکتی ہے مگر اس طرح ابراہام یا بن جبالن کو ہماری قوت کا صحیح اندازہ ہو جائے گا اور عین ممکن ہے کہ وہ فوراً کہیں روپوش ہو جائے۔"

"اس کا تدارک ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ ابراہام کو دوبارہ فون کر دوں اور اسے کوئی ذہنی خبر سنا ڈالوں۔"

"ہاں یہ مناسب ہو گا۔" وہ میری اس تجویز پر خوش ہو گیا۔ "اور اس سے پہلے ایک بار پھر عذرا جوناس کے گھر فون کر لینا۔ پتہ چل جائیگا کہ وہ موجود ہے یا باہر چلا گیا ہے۔"

اس شہر میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر مصروف علاقے میں جابجا پبلک فون موجود تھے لہٰذا مجھے نئے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

عذرا جوناس کے گھر فون کی پہلی گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا گیا اور میرے کانوں میں ایک مترنم نسوانی آواز رس گھولنے لگی۔

"مسٹر جوناس موجود ہیں؟" میں نے اس سے براہِ راست گفتگو شروع کرنے کی شدید خواہش کو ضبط کرتے ہوئے پہلا سوال عذرا کے بارے میں ہی کیا۔

"اس گھر میں دو جوناس رہتے ہیں۔" شگفتہ انگریزی میں وہی مترنم آواز ابھری۔ "اور اس وقت دونوں باہر ہیں۔"

"اور مس ایلیزا جوناس؟" میں نے دل میں امڈتے ہوئے خوشی کے احساس سے مغلوب لہجے میں سوال کیا۔

"بول رہی ہوں، تم کون ہو؟"

"اوہ ـــ معاف کرنا ایلیزا، میں تمہاری آواز پہچان نہ سکا۔ میں

ڈان فرنانڈو بول رہا ہوں۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ڈان فرنانڈو" اس کی آواز میں تحیر اور مسرت کا ارتعاش نمایاں تھا۔ "تمہارا میرے باپ سے کیا تعلق ہے اور تمہیں میرا فون نمبر کیسے ملا؟"

"تمہارے باپ جیسے خونخوار آدمی سے تعلق رکھنا میرے بس کا روگ نہیں مگر تم سے دوبارہ ملنے کی شدید خواہش تھی۔"

"مگر میں نے تو تمہیں اپنا نمبر نہیں دیا تھا، پھر یہ کیسے آیا تمہارے پاس؟"

"ڈائرکٹری بڑی کارآمد شے ہے۔ غنیمت یہ ہے کہ مجھے تمہارا پورا نام معلوم تھا۔ میں آج ہی پیرس پہنچا ہوں۔ میں نے یہاں آتے ہی ڈائرکٹری سے ان تمام لوگوں کے فون نمبر درج کیے حاصل کیے جن کا آخری نام جوناس ہے اور آخر ساتویں کوشش میں مجھے کامیابی حاصل ہو گئی۔ اب یہ بتاؤ کہ میں تم سے کیسے مل سکتا ہوں گھر آجاؤں تمہارے؟"

"نہیں نہیں۔ ادھر کا رخ بھی نہ کرنا۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا باپ باہر ضرور گیا ہوا ہے۔ مگر اس کا کچھ بھروسہ نہیں کہ کب نازل ہو جائے۔ ممی دل کی مریضہ ہیں اور سکون آور دوا کے زیر اثر بے خبر سو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم کل کسی وقت مل سکتے ہیں۔"

"ابھی آجاؤ نا۔ میں تمہارے گھر کے قریب ہی موجود ہوں۔"

"ممی کو ملازمہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے یہ بتاؤ کہ تم اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہارا انتظار!"

"میں کل دوپہر ایک بجے تمہیں ہوٹل ڈی وائل میں ملوں گی۔"

"یہ کہاں ہے؟"

"ریوڈی ریوالی پر مشہور جگہ ہے۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

جواب میں ریسیور پر بوسے کی ہلکی سی جھنکار سنائی دی اور ایلیزا نے الوداع کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے کریڈل دبا کر کاؤنٹ نویلیس قلب کا نمبر ڈائل کیا۔ فون وصول کرنے والا کوئی خدمت گار تھا جو انگریزی سے قطعی نابلد تھا۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنا منشا نہ سمجھا سکے تو وہ کچھ کہہ کر غائب ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد شاید کاؤنٹ خود فون پر آگیا۔

"مسٹر ابراہام جوناس سے بات ہو سکے گی جناب؟" میں نے نرم لہجے میں اپنا مدعا ظاہر کیا۔

"میں ابھی بھیجتا ہوں آپ انتظار کریں۔"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس آواز کا انتظار کرنے لگا جو صحرائے عرب کی ایک بستی میں طاقت، اقتدار اور ظلم کی علامت تھی۔

"ہیلو!" طویل انتظار کے بعد میرے کانوں میں آواز آئی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ابو خالد کی وہ سرد اور سفاک آواز میں برسوں بعد بھی پہچان سکتا تھا۔

"مسٹر ابراہام جوناس؟" میں نے سوال کیا تو دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے باعث میری آواز میں خاصی لکنت تھی اور لہجہ میں نے دانستہ بدل لیا تھا۔

"بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

"میں نیس سے آیا ہوں۔ میرے پاس تمہارے لئے ایک ضروری پیغام ہے!" میں نے اپنے لہجے میں ادب اور احترام کا عنصر شامل کرتے ہوئے کہا۔

"جلدی کہہ ڈالو، میرے پاس وقت نہیں ہے!" اس کی آواز بدستور سرد اور مستحکم تھی۔

"نیس میں ہنری شوارٹ نے فلسطینیوں کے ہاتھوں مارے جانے سے قبل اٹلی سے رائے کارویلو کو اپنی مدد کے لئے بلایا تھا۔" میں کہنے لگا۔ اور وہ بالکل خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ "مگر رائے کارویلو بھی ان کے ہاتھوں بری طرح زخمی ہو گیا۔ وہ میرے پاس آیا تو قریب المرگ تھا۔ مرنے سے قبل اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کی موت کی خبر تم تک پہنچا دوں!"

"بس یا کچھ اور؟" اس نے جذبات سے عاری سرد لہجے میں سوال کیا۔

"بس مجھے یہی ہدایت ملی تھی۔"

"اور تم نے تھوڑی دیر پہلے عذرا کو بھی فون کیا تھا؟" اس بار اس کے لہجے میں کسی تلوار کی دھار جیسی کاٹ تھی۔

"ہاں مجھے وہی پتہ دیا گیا تھا۔"

"اس معاملے کا عذرا کی نیس میں موجودگی سے کیا تعلق تھا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں!" میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"مگر تم نے عذرا سے یہی کہا تھا۔"

"وہ رائے کارویلو کا خیال تھا جناب!" میں نے کہا۔ "میرے لئے تو وہ بالکل اجنبی ہیں۔ کارویلو نے انہیں نیس میں دیکھا تھا اور یہی سمجھا کہ عذرا جوناس کو بھی شوارٹ کی مدد کے لئے بھیجا گیا ہے۔"

میں نے تو بس وہی بات دہرا دی۔"

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" ابراہام نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ مگر اس کے لہجے میں خون کی بو آرہی تھی۔

"نہیں جناب میں آپ سے نہیں مل سکتا۔ میں تو آج ہی پیرس سے بھاگ جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں کارویلو کی خواہش کے احترام میں کسی بڑی مصیبت سے دوچار ہونے والا ہوں۔"

نے مزید بوکھلانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے تم ہو کون؟" ابراہام نے مکاری اختیار کرتے ہوئے اچانک نرمی سے کام لینا شروع کر دیا۔

"کارویلو نے میری خدمات معاوضے پر حاصل کی تھیں اور اس نے مرنے سے قبل اپنی جو جمع پونجی میرے حوالے کی وہ اس کی تدفین کے اخراجات نکالنے کے بعد بھی تم تک پیغام پہنچانے کے معاوضے کے طور پر کافی ہے۔ میں نے اپنا کام پورا کر دیا اور اب میں اپنی چھٹی حس کی تنبیہہ کو نظر انداز کر کے آگ میں کودنے کیلئے تیار نہیں۔"

"تم عذرا کے پاس جا کر میرا انتظار کرو۔ میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچتا ہوں۔ بلاوجہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کارویلو کے قاتلوں کی نشاندہی میں تم سے مدد مل سکی تو میں تمہیں بھاری انعام بھی دوں گا۔" مجھے وہ پھانسنے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو زندہ دیکھنا ہرگز پسند نہیں کرے گا جو اس کی شخصیت کے بھیانک پہلو سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہو۔

"میں قناعت پسند آدمی ہوں جناب۔ لالچ میں پڑ کر اپنی گردن کٹوانی نہیں چاہتا۔" میں نے اس کی بات پوری ہوتے ہی کہا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا اب تک۔" اس کے لہجے میں پہلی حد تک نرمی سمٹ آئی تھی، جو میرے لئے اس کے خوفناک عزائم کی غماز تھی۔

"کارویلو کے ساتھ چند روز کام کر کے میں تم لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔ میں نے تمہیں اپنا نام بتا دیا تو شاید مرنے کے بعد تم قبر میں بھی مجھے چین نہیں لینے دو گے۔ نہیں مسٹر ابراہام مجھے اس قدر کند ذہن اور احمق نہ سمجھو۔"

یہ کہہ کر میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"بڑے طویل مذاکرات ہوئے۔" میرے بوتھ سے باہر آتے ہی عبداللہ نے تبصرہ کیا۔

"عذرا جوناس گھر سے غائب ہے۔ ایلیزا کل دوپہر ہوٹل ڈی وائل میں مجھ سے مل رہی ہے اور ابراہام مجھے پھانسنے کے چکر میں تھا۔"

"ابراہام سے بات ہوئی تمہاری؟"

"ہاں۔ اس کی آواز بالکل نہیں بدلی۔ میں فوراً ہی اسے پہچان گیا۔ اس کے بن حیان یا ابو خالد ہونے میں اب کوئی شبہ نہیں رہا۔"

"اور اگر اس نے تمہاری آواز پہچان لی ہو؟"

"میں نے اپنی آواز بدل لی تھی اور میں اس کا ذہن اسلحہ بردار بحری جہاز کی طرف سے ہٹانے میں بھی کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"ایلیزا سے ملاقات کیلئے ہوٹل ڈی وائل کی تجویز کس کی تھی؟" عبداللہ نے کار کی طرف واپسی کی راہ اختیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اسی کی تجویز تھی۔"

"وہ بھی تمہاری دشمن معلوم ہوتی ہے!" عبداللہ نے قہقہہ لگایا۔

"ملے بغیر رائے قائم کر رہے ہو۔"

"کچھ جان کے دشمن ہوتے ہیں اور کچھ مال کے۔" وہ کہنے لگا۔ "ہوٹل ڈی وائل میں گاہکوں کی اچھی طرح کھال اتاری جاتی ہے۔ پوری تیاری کے بغیر ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے بتا دیا۔ اب پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی ہوگی۔"

"تبدیلی کی بھی گنجائش رکھی ہے تم نے؟"

"اب مقررہ وقت سے نصف گھنٹے پہلے مجھے ہوٹل ڈی وائل پہنچنا ہوگا تاکہ اسے داخلی دروازے پر ہی روک کر کہیں اور لے جا سکوں۔"

"ایسا نہ کرنا کہیں وہ اسے تمہاری بدذوقی سمجھتے ہوئے بددل نہ ہو جائے۔ میں خاصی رقم ساتھ لے کر آیا ہوں۔"

"پہلی ہی ملاقات اتنی مہنگی رہی تو آگے کیا ہوگا؟"

"فکر نہ کرو ـــــ بن حیان کا شکار ہر قیمت پر سستا ہی ثابت ہوگا۔"

عبداللہ کا ارادہ تھا کہ ہم لوگ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد گھر کا رخ کریں۔ مگر مجھے مادام فے کا بھی خیال تھا۔ وہ کھانے کی میز سے مسلسل غیر حاضری پر کافی ناخوش نظر آتی تھی اور مجھے بھی یہ پسند نہیں تھا کہ اس کی منہ بولی بیٹی برتھا محنت سے پکائے ہوئے کھانوں کو ڈسٹ بن میں ڈالنے پر مجبور کر دی جائے۔

ہم دونوں گھر پہنچے تو برتھا نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوئے تو ٹیلی ویژن چل رہا تھا اور مادام فے اس کے سامنے اپنی پسندیدہ کرسی پر براجمان تھی اور سامنے ہی میز پر شطرنج جمی ہوئی تھی۔

"شام بخیر مادام!" ہم دونوں نے مادام فے سے سامنا ہوتے ہی ہم آواز ہو کر کہا۔

"شام بخیر۔ مجھے اتنی جلدی تمہیں گھر میں پا کر دلی مسرت ہوئی ہے!" اس کے بشرے سے خوشی چھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ہم آج برتھا کے ہاتھ کا ذائقہ چکھنے کی نیت سے جلدی گھر لوٹے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ پوچھو تو مجھے امید نہیں تھی کہ تم رات کا کھانا یہاں کھاؤ گے مگر برتھا نے احتیاط کے طور پر تیاری کی ہوئی ہے۔" وہ گفتگو کے دوران میں ایک سفید پیادے کو غیر محسوس طریقے سے اس کی جگہ سے دوسرے خانے میں سرکاتے ہوئے بولی۔

"کیا پکایا ہے تم نے؟" میں نے برتھا سے مسکرا کر سوال کیا۔

"کیکڑوں کا شوربا اور بھنی ہوئی مرغی۔" وہ لجا کر بولی۔ اس وقت پہلی بار مجھے اس لڑکی کے چہرے میں حسن اور کشش کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"کیکڑوں کا شوربا تم پی لینا، مجھے تو مرغی پسند ہے۔" عبداللہ بوکھلا کر مجھ سے بولا۔

میں مسکرا کر رہ گیا۔ میری نگاہیں اس سفید پیدل پر جمی ہوئی تھیں جسے مادام فے نے اس کی جگہ سے کھسکایا تھا۔ سفید مہرے مادام کے ہی تھے اور اس ایک پیدل کی جگہ بدل جانے سے بازی کا رُخ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں شطرنج سے بھی شوق ہے۔" مادام فے کے لہجے میں ایسی مسرت پنہاں تھی جو کسی پرندے کے جال میں پھنس جانے پر مایوس شکاری کی آواز میں عود کر آتی ہے۔ "کوشش کروگے تو جلد ہی دنوں میں پورا کھیل سمجھا دوں گی۔"

"مادام کے ساتھ ہرگز نہ کھیلنا مونسیور۔" بریتھا جلدی سے بولی۔ "انہیں ہرانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے جو میں آج تک سرانجام نہ دے سکی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دلچسپی کے ساتھ پوچھا مگر عبداللہ قدرے توقف کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"مادام ہارنے لگتی ہیں تو حریف کی نظر چُوکتے ہی مہرے کھسکا دیتی ہیں۔" وہ ترنم ریز آواز میں ہنستے ہوئے بولی پھر جھک کر بساط کا جائزہ لینے لگی۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہے لڑکی؟" مادام فے نے غصیلے لہجے میں بولی۔ "میں تجھ جیسی اناڑی لڑکی کے ساتھ بے ایمانی کروں گی؟"

"یہ دیکھو مونسیور!" بریتھا ہنسی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔ "مادام یہ بازی ہار رہی تھیں اور عادت کے مطابق ڈور بیل کی آواز پر انہیں جانا چاہیئے تھا مگر انہوں نے خاص طور سے مجھے بھیجا اور ادھر اپنا کام کر لیا۔ بساط پر کم از کم تین مہرے اپنی جگہ سے ہٹائے گئے ہیں اور یہ پیدل تو یہاں آنے سے پہلے ہی میرے رُخ کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا مگر اب یہ ایک دو چالوں میں شہ کا راستہ ہموار کر دے گا۔"

مادام فے نے غصے سے بساط الٹ دی۔ "بریتھا۔ تم کھیل کے معاملے میں ہمیشہ جھوٹ بولتی ہو تم نے یہ کھیل مجھ سے سیکھا ہے مگر آج تم نے میرے کھیل کی خوبصورتی اور برتری کو تسلیم نہیں کیا۔"

"غصہ تھوک دو مادام۔ کھانے کے بعد میں تم سے کھیل سیکھوں گا۔" میں نے اس معذور عورت کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

"یہ اچھا کھانا پکا سکتی ہے۔ میری خدمت کر سکتی ہے مگر شطرنج میں اپنا اناڑی پن تسلیم نہیں کر سکتی۔ مجھ سے سیکھو کر دو گھنٹے بعد تم باسانی اسے ہرادو گے۔"

بریتھا زمین سے مہرے سمیٹ کر کچن میں چلی گئی اور میں مادام فے کے قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں کیوں برا ماننے لگی! کہہ ڈالو جو کہنا ہے۔" وہ سنبھلتا خوشگوار لہجے میں بولی۔

"میں نے تمہیں وہ پیدل کھسکاتے ہوئے خود دیکھا تھا۔"

میرے اس انکشاف پر مادام فے کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں جیسے اُسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ "ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بے خیالی میں میرا ہاتھ لگ گیا ہو، میں دانستہ ایسی حرکت نہیں کر سکتی۔ کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟"

"میں ایسا نہیں سمجھتا مگر بریتھا کی شکایت بھی جائز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم غیر ارادی طور پر حریف کی لاعلمی میں اپنے مہروں کی جگہ بدل دیتی ہو۔" میں نے نرم لہجے اور مدھم آواز میں کہا۔ نہ جانے کیوں میں اس سے بے ایمانی کا اعتراف سننے پر تل گیا تھا۔

"غیر ارادی طور پر؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرایا پھر چونک کر یوں بولی جیسے اسے کوئی سہارا مل گیا ہو۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے میں یہ بات مان سکتی ہوں۔ گو یہ بھی یقینی بات نہیں، محض تمہارا خیال ہے مگر ایسا ہو جانا ممکنات میں سے ہے اور اسے تم کسی طرح بے ایمانی نہیں کہہ سکتے۔ میں صاف ستھرا کھیل پسند کرتی ہوں۔"

"مگر میں تمہاری غیر ارادی عادت کا چشم دید گواہ ہوں، یہ محض میری رائے ہے۔" میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ بُری عادت ہے۔ مگر اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں۔" وہ بیچارگی کے ساتھ بولی۔

"مگر تم اس کھیل پر حاوی معلوم ہوتی ہو۔" میں نے اعتراف کے بعد اسے اخلاقی سہارا دینے کی نیت سے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"میں کئی ماہ پہلے عالمی شہرت یافتہ روسی کھلاڑی پولاسکی کو بھی خط کے ذریعے چیلنج کر چکی ہوں تاکہ اسے مات دے کر اپنا لوہا منوا سکوں مگر وہ مقابلے سے گریز کر رہا ہے۔" مادام فے نے فخر آمیز لہجے میں مجھے اطلاع دی۔

"ہو سکتا ہے کہ اُسے تمہارے اعلیٰ کھیل کی بھنک مل گئی ہو۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس نے مجھے جو جواب دیا ہے وہ خاصا مضحکہ خیز ہے۔"

"جواب دیا ہے اس نے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ مصروفیت کا بہانا کرتے ہوئے دو بدو مقابلے سے معذرت کی ہے البتہ خطوط کے ذریعے ایک مقابلے کا متمنی ہے۔"

"تو ایسا ہی سہی۔"

"کھیل کا مزا اسی وقت آتا ہے جب دو حریفوں کے درمیان بساط بچھی ہو۔ خط و کتابت تو وقت کی بربادی ہوگی۔"

"میں کھانا لگا رہی ہوں۔" بریتھا نے کچن سے آواز لگا کر مجھے مادام فے کی بسیار گوئی سے نجات کا بہانہ فراہم کر دیا۔

"چند منٹ توقف کرو، ذرا... میں لباس تبدیل کر لوں۔" میں کہتے ہوئے اپنی خوابگاہ کی طرف چل دیا۔

میں لباس تبدیل کر کے باہر آیا تو کھانے کی میز تیار تھی اور عبداللہ ان دونوں کے ہمراہ میرا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر خاصی تشویش نمایاں تھی۔

عبداللہ نے واقعی کیکڑے کے شوربے کو ہاتھ نہیں لگایا البتہ میں نے اس سے پرہیز نہیں کیا۔

"ابھی دس بجے ٹیلی ویژن پر ایک خصوصی فلم رپورٹ آنے والی ہے اُسے دیکھے بغیر بستر میں نہ گھس جانا۔" مادام فے نے کھانے کے دوران میں کہا۔

"کس بارے میں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"بحیرہ روم میں نیس کے ساحل سے چالیس ناٹ کے فاصلے پر ایک اسرائیلی بحری جہاز ہولناک حادثے کا شکار ہوا ہے۔ اس کی فلم دکھائی جائے گی۔"

"اسرائیلی بحری جہاز؟" عبداللہ کا منہ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔

"ہاں۔ اس پر شاید اسلحہ لدا ہوا تھا اور وہ نیس سے بحیرہ روم اور قبرص کے راستے تل ابیب کے لئے روانہ ہوا تھا۔"

"حادثہ کب پیش آیا؟" میں نے پوچھا۔

"ٹیلی ویژن کے مطابق چند گھنٹے قبل یعنی سات بجے کے قریب۔" مادام فے نے کہا۔ "ٹیلی ویژن والوں کی ایک جماعت اس جلتے ہوئے جہاز کی غرقابی کی فلم تیار کرنے میں مصروف ہے جو دس بجے دکھائی جائے گی۔ جہاز پر بیالیس افراد کا عملہ تھا اور دھماکے سے میلوں دور اڑنے والے جلتے ہوئے ٹکڑوں نے تین کشتیوں کو بھی غرقاب کر دیا۔ جو ان ہی اطراف میں موجود تھیں۔"

"ہولناک حادثہ ہے!" میں نے کنکھیوں سے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس بدنصیب جہاز کے عملے پر کیسی قیامت بیت رہی ہوگی۔" مادام فے پھریری لے کر بولی۔ "انہیں تو گہرے سمندر میں کہیں اماں نہ مل سکے گی اور اگر واقعی اس جہاز پر اسلحہ لدا ہوا تھا تو شاید امدادی جماعتیں بھی ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں۔"

"پانی پر تیرتے ہوئے مہیب شعلوں میں گھرے وہ مدد کے لئے پکارتے رہ جائیں گے اور کوئی ان کے قریب جانے کی ہمت نہ کر سکے گا۔" عبداللہ لقمہ لگاتے ہوئے بولا۔ "جہاز کا ڈھانچہ تباہ کن آتش زدگی میں جلتی ہوئی انسانی اعضا بریدہ لاشیں آہستہ آہستہ سمندر کی تہہ میں بیٹھ جائیں گی۔"

"اس قدر خوفناک منظر کشی نہ کرو۔" مادام فے سہمی ہوئی آواز میں بولیں۔ "مجھے بستر میں رات بھر نیند بھی نہ آسکے گی۔"

"فلم تو اس سے بھی زیادہ ڈراؤنی ہوگی مادام۔" میں نے کہا۔ "اور پھر تبصرہ نگار نہایت اندوہناک الفاظ اور لہجے میں ان مناظر کی وضاحت بھی کرتا جائے گا۔"

"میں آواز بند کر دوں گی مگر فلم ضرور دیکھوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس دور کا بدترین تاریخی حادثہ شمار کیا جائے میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔"

"یہ حادثہ ہی تھا یا تخریبی کارروائی؟" عبداللہ نے مادام فے سے سوال کیا۔

"کچھ معلوم نہیں۔ ٹیلی ویژن والوں کو وہ اطلاع اسی وقت ملی تھی۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "مرنے والے تو مر گئے یہ سب تحقیقاتی موشگافیاں ہیں جو کچھ عرصے تک ہوتی رہیں گی اور پھر کوئی نیا حادثہ اسے بھلا دے گا۔"

"تو کیا کوئی اور حادثہ بھی ہونے والا ہے مادام؟" بریتھا نے معصومیت سے سوال کیا۔

"ایسے برے کلمات منہ سے نہ نکالو۔" مادام فے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "میں نے تو یونہی ایک سرسری بات کہی تھی۔"

وہ باتونی ضرور تھی مگر ہمارے لئے نہایت کارآمد ثابت ہو رہی تھی۔ معذور ہونے کے باعث وہ بیرونی تفریحات میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا اس کی تمام دلچسپیاں اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں جس کے ذریعے اس نے بیرونی دنیا سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہوا تھا اور عمر کے تقاضوں کے عین مطابق سنسنی خیز خبریں اس کی توجہ کا مرکز ہوتی تھیں۔

لی مونڈے میں شائع ہونے والی وہ خبر بھی مادام فے کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی جس میں ہوٹل میریڈین کے خونریز حادثے کی تفصیل موجود تھی اور اب اسی عورت کے ذریعے نیس کی بندرگاہ سے روانہ ہونے والے اسلحہ بردار اسرائیلی جہاز کی بربادی کی خبر ملی تھی جس کا بندوبست عبداللہ کر آیا تھا۔

عبداللہ کی زبانی اس جہاز کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد میں ہر لمحے اس خبر کا منتظر تھا جو آخر کار اس معذور خاتون کی مبارک زبان سے مل ہی گئی تھی۔

عبداللہ کے بیان کے مطابق نیس کی بندرگاہ سے دو فلسطینی اس جہاز کے عملے میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اور انہیں اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر گہرے پانی میں کسی بھی مناسب موقع پر اسلحہ اور بارود کے اس متحرک بحری پہاڑ کے چیتھڑے اڑا دینے تھے۔

بیروت کے اجلاس میں یاسر عرفات کے خلاف ناکام قاتلانہ سازش کا بھرپور انتقام لیا جا چکا تھا مگر میرا ذہن ابراہام ہوناس میں الجھ گیا تھا۔ جس وقت بحیرہ روم میں اسرائیلی اسلحہ بردار جہاز ہولناک دھماکے ہو رہے تھے کم بخت اس وقت میں فون پر ابراہام کو یقین دلا رہا تھا کہ میں نے عمداً یونانس کی نیس میں موجودگی کا حوالہ محض کاریلو کے بیان کی بنا پر دیا تھا اور شاید اسے میرے الفاظ پر شک بھی نہ ہوا ہو

مگر اسرائیلی جہاز کی بربادی کی خبر ملنے کے بعد وہ اس گفتگو پر نئے زاویئے سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا اور شاید اسی نتیجے پر پہنچتا کہ اس کے دشمن اس کے گرد اپنا جال مضبوط کر رہے ہیں۔

ابراہام جوناس یا ابن حیان ذہین ضرور تھا مگر اس کی ذات میں دلیری سے زیادہ مکاری کے جراثیم پلائے جاتے تھے۔ وہ اپنے لئے خطرہ سامنے پا کر فوری طور پر فرار یا روپوشی کی راہ اختیار کر سکتا تھا۔ مجھے اس سے اس بات کی بہت کم توقع تھی کہ وہ ڈنکے کی چوٹ پر سامنے رہ کر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی احمقانہ کوشش کرتا۔

دوسری طرف تمام تر سرگرمیوں کا مرکز ایک مرتبہ پھر نیس منتقل ہونے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ ان لوگوں کو شوارٹ کی موت کی اطلاع مل ہی گئی تھی اور رائے کارڈیلو کی ہلاکت کی خبر میں نے سنا دی۔ نیس فلسطینی چھاپہ ماروں کا بہت مضبوط اور اہم گڑھ تھا اور پھر اسرائیل کی بہترین افرادی قوت جدید ترین آلات سے لیس ہو کر اس ساحلی شہر میں اپنے دشمنوں کی تلاش میں سرگرم ہو جاتی۔

کھانے کے بعد عبداللہ اپنے کمرے میں گیا تو میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

"مبارک ہو..... میرے ساتھیوں نے اپنے مقدس لہو سے آج سمندر کے سینے پر حریت کی ایک نئی داستان کو جنم دیا ہے۔" وہ فرطِ جذبات سے کانپتی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں بولا۔

"نیس میں تمہارے آدمیوں کو اب شدید خطرات کا سامنا ہے۔" میں نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"میں اس پہلو پر بھی غور کر چکا ہوں، وہ جہاز کی تباہی کی خبر پاتے ہی کم از کم پندرہ دن کے لئے اپنی تمام سرگرمیاں ترک کر دیں گے۔" وہ بولا۔ "مگر مجھے مادام فے کی طرف سے ایک خلش ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اس نے نہ ہوٹل میریڈین والے واقعہ پر رائے زنی کی اور نہ ہی اسرائیلی جہاز کی تباہی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اگر ہماری طرف سے اس کا ذہن صاف ہوتا ہے تو وہ کھلے لفظوں میں اپنی رائے کا اظہار کرتی۔ یہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان واقعات کے پس پشت فلسطینی اور اسرائیلی مفادات کام کر رہے ہیں۔ مادام فے کو دونوں میں سے کسی ایک فریق سے ہمدردی ہونی چاہیئے آخر کار ہمارے سامنے وہ اس کے اظہار سے گریز کیوں کر رہی ہے؟"

"اوہ۔ بہت دور کی سوجھی ہے تمہیں۔" میں دل ہی دل میں اس کی پیش بینی کی داد دیتے ہوئے بولا۔ "وہ ہمارے بارے میں محتاط ہے یعنی ہمیں ایک فریق سے وابستہ سمجھ رہی ہے وہ تجھے ڈان

فرنانڈو ہی سمجھتی ہے مگر تمہارا اصل نام اسے بتایا گیا ہے۔ عبداللہ نامی شخص یہودی تو ہونے سے رہا اور اتنا وہ بھی جانتی ہوگی۔"

"یہی الجھن مجھے مار رہی ہے۔"

"شکل و صورت سے تو مقامی لگتے ہو، نام بیشک عربی ہے مگر وہ تمہیں فلسطینی کیسے سمجھ لے گی؟" اس کے نکتے نے مجھے بھی مشکل سے دوچار کر دیا تھا۔

"میریڈین کے بارے میں لی مونڈے کی خبر اس نے تمہیں خود سنائی۔ پھر آج جہاز کی تباہی کی فلم دکھائے جانے کی اطلاع بھی اس نے از خود دی کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ہمارے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"تم نے یہ سوال بروقت اٹھایا ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "اگر اسے واقعی شبہ ہو گیا ہے تو پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیئے۔ میں فلم دیکھتے ہوئے اس سے بات شروع کروں گا۔ وہ مجھے زیادہ دیر تک دھوکہ نہ دے سکے گی۔"

"اس وقت تک اس پر نظر رکھو۔" عبداللہ کہہ کر غسل خانے میں گھس گیا۔

میں باہر نکلا تو مادام فے ٹیلی ویژن پر بچوں کا ایک پروگرام دیکھنے میں مصروف تھی۔ میری آہٹ سنتے ہی اس نے گردن گھمائی اور پر مسرت لہجے میں بولی۔ "آؤ تمہیں شطرنج کے کچھ بنیادی اصول سکھا دوں۔"

میں انکسار آمیز انداز میں اس کے مقابل بیٹھ گیا اور میز پر پڑی ہوئی بساط کھول دی۔

وہ مہرے لگا کر مجھے ابتدائی چالوں کے بارے میں تفصیل سے سمجھانے لگی۔ میری نگاہیں شطرنج پر مرکوز تھیں اور ذہن نئے حالات کے تحت ایلیزا سے ملاقات کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا جو میرے لئے بہت اہم تھی۔

"آؤ اب ایک بازی ہو جائے۔" تقریباً دس منٹ تک بولتے رہنے کے بعد اس نے دوبارہ مہرے سجانے شروع کئے تو میں سیدھا ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مادام فے کے مہرے یکے بعد دیگرے پٹنے لگے تو وہ خاصی پریشان نظر آنے لگی۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لئے بھی غفلت اختیار نہیں کی جو اسے کھیل کا توازن تبدیل کرنے کا موقع ملتا۔

"کیا تم واقعی پہلی بار کھیل رہے ہو؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"ابھی ابھی تم ہی سے سیکھا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"مگر تم بہت سی ایسی چالیں چل گئے ہو جو میں نے تمہیں نہیں بتائی تھیں۔"

"میں نے تمہاری گفتگو سے چالوں کے بجائے اصول اخذ کئے اور ان ہی کی روشنی میں کھیل رہا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوبارہ لگاؤ۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم زبانی سب کچھ سیکھ لوگے۔" اس نے تمام مہرے ملا دیئے۔

دوسری بار بھی بازی نامکمل رہی اور تیسری بار بھی اس نے شکست سامنے دیکھ کر بساط الٹ دی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"باقی کل سکھاؤں گی۔ آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔" وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر شدید کوفت کے آثار نمایاں تھے۔

"مگر میں تو پورا کھیل سیکھ چکا ہوں، یہ بہت آسان اور دلچسپ ہے۔ تم بازی پوری کیوں نہیں ہونے دیتیں؟"

"ہارنے کے بعد تمہارا حوصلہ پست ہو جاتا۔"

"مگر میں تو جیت رہا تھا، تینوں بار میں حاوی تھا۔" میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔

"یہی تو تمہاری خام خیالی ہے۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی۔ "ہر مرتبہ تم دو تین چالوں کے بعد ہار ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ کل سے تم تھوڑی دیر برتھا کے ساتھ مشق کیا کرو۔ وہ بھی خاصا اچھا کھیل لیتی ہے۔"

مادام فے اس معاملے میں شاید اپنی انا کے ہاتھوں مجبور تھی۔ شکست کا اعتراف اس کے لئے انتہائی اذیت ناک امر تھا اور پھر اس نے برتھا کا نام لے کر آئندہ کے لئے بھی اپنی جان بچالی تھی۔ میں نے بھی مزید اصرار مناسب نہ سمجھا۔ اتنا سبق مل جانے کے بعد وہ آئندہ کبھی مجھے شطرنج کھیلنے کی دعوت دینے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی اور میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

وہیں کافی کا دور شروع ہوا تو عبداللہ بھی شریک ہو گیا۔ "شطرنج کا کیا رہا؟" اس نے بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"مادام سے تین مرتبہ ہارتے ہارتے بچا ہوں۔" میں نے مادام فے کے ذہن سے خفت کا بوجھ ہٹانے کے لئے کہا تاکہ وہ پروگرام کے دوران بھی جوش و خروش سے تبصروں میں حصہ لے سکے۔

ٹھیک دس بجے ٹیلی ویژن کے اسکرین پر موسیقی کے دلدوز الاپ کے ساتھ ایک گمبھیر چہرہ طلوع ہوا اور ساز تھمتے ہی وہ مغموم لہجے میں اسرائیلی جہاز کی تباہی سے ہونے والے نقصانات کی تفصیل بتانے لگا جس کا نام میڈوسا تھا۔

چھیالیس افراد کی ہلاکت اور لاکھوں فرانک کی مالیت کے اسلحے کی بربادی کی تفصیل بتاتے ہوئے اس کا چہرہ آہستہ آہستہ پس منظر میں معدوم ہو گیا اور اسکرین پر سمندر کی لہروں پر تیرتے ہوئے شعلوں کے انبار نظر آنے لگے جو دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ پھر اس وسیع منظر سے کیمرے کی آنکھ اصل جہاز پر مرکوز ہو گئی جو فلک بوس شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ فلم شاید کسی ہیلی کوپٹر وغیرہ سے فلمائی گئی تھی کیونکہ سارے مناظر اوپر سے لئے گئے تھے۔ کیمرہ آہستہ آہستہ پورے جہاز کا طواف کرتا رہا اور تقریباً دس منٹ بعد سرخ شعلوں اور کثیف دھوئیں میں لپٹا ہوا باقی ماندہ ڈھانچہ اپنی جگہ پر مہیب دائرے پیدا کرتے ہوئے چکر کاٹنے لگا۔ مبصر کی آواز جہاز کے نچلے حصے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جانے کی اطلاع دے رہی تھی جس سے بحیرۂ روم کا پانی تیزی سے جہاز میں داخل ہونے لگا تھا۔

پھر کیمرے نے شعلے میں گھرے ہوئے ایک حصے میں دو انسانی ہیولوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ وہ بمشکل چند سیکنڈ تک نظر آتے رہے اور پھر جلتے ہوئے ملبے کی برسات نے انہیں نظروں سے اوجھل کر دیا۔

"اف خدا ۔ کیسی بھیانک موت ہوگی ان کی!" مادام فے نے گہرا سانس لے کر پہلی مرتبہ اس سنسنی خیز فلم پر تبصرہ کیا۔

"امدادی جماعتوں کو ابھی تک عملے کا کوئی فرد زندہ نہیں ملا ہے ان بیالیس میں سے شاید ہی کوئی بچ سکا ہو۔" میں نے کہا۔

"اور حادثے کی زد میں آنے والی تین کشتیوں کے بھی چار مسافر مارے گئے ہیں۔" مادام فے نے جھرجھری لے کر بولی۔ "وہ بیچارے تو ناگہانی موت مارے گئے۔"

"یعنی تمہاری دانست میں عملے کے آدمی صحیح مارے گئے۔" مجھے اپنی گفتگو آگے بڑھانے کے لئے ایک عمدہ نکتہ مل گیا۔

"موت تو ان کی بھی افسوسناک ہے مگر وہ اسلحہ بردار جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ ان کا مقدر جہاز کی قسمت سے وابستہ تھا مگر وہ چاروں تو بلا سبب مارے گئے۔" مادام فے بولی۔

"ابھی تک حادثے کا کوئی سبب نہیں بتایا گیا۔" عبداللہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر جہاز کا دیوہیکل آتشی ہیولا آہستہ آہستہ غرقاب ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"اتفاقی حادثے کا امکان کم ہی ہے۔" مادام فے نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ میڈوسا اسرائیلی جہاز تھا اور اسلحہ لے جا رہا تھا۔"

"تو اس سے کیا ہوا؟" عبداللہ نے معصومانہ حیرت سے سوال کیا۔

"اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کی خونریز دشمنی کوئی راز نہیں ہے۔"

مادام نے سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے بولی"۔ ہوٹل میریڈین کا واقعہ ابھی تازہ ہی ہے۔ ان دونوں کے نزدیک انسانی خون کی کوئی قیمت نہیں یہ لوگ انتقام سے اندھے ہوچکے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ فلسطینیوں کی تخریب کاری بھی ہوسکتی ہے!" میں نے کہا۔

"جب محاذ پر دو ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں تو اس سے زیادہ آدمی انتہائی بھیانک موت کا شکار ہوتے ہیں۔ مگر ان مرنے والوں پر کسی کو دکھ نہیں ہوتا کیونکہ سپاہی جب ہتھیار سجا کر محاذ پر جاتے ہیں تو فتح یا موت کے لئے پوری طرح تیار ہوتے ہیں۔" مادام نے آہستہ آہستہ کہنے لگی۔" مگر میڈوسا پر موجود لوگ تو اسرائیل پہنچنے کے بعد بیوی بچوں یا رشتہ داروں سے ملنے کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔ ان کی موت پر ہر شخص کا دل خون کے آنسو روئے گا اور پھر وہ بیچارے چار بدنصیب تو نہ اسرائیلی تھے نہ فلسطینی، ان کی موت کس حساب میں جائے گی۔"

"واقعی یہ انتہائی سفاکانہ کارروائی تھی۔" بریتھا نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"فلسطینی جس مقصد کے لئے تشدد کا سہارا لیتے ہیں اس کے پیش نظر کوئی بھی کارروائی سنگدلانہ قرار نہیں دی جاسکتی۔" مادام نے فلسفیانہ لہجے میں بولی۔" ویت نام اور دنیا کے بیشتر محکوم علاقوں میں یہی سب ہورہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ غریب قومیں ہیں لہٰذا اپنی جغرافیائی سرحدوں میں رہتے ہوئے جنگ کررہی ہیں اور فلسطینیوں کو عربوں کی بے اندازہ دولت کی پشت پناہی حاصل ہے لہٰذا وہ ہر بار اپنی پسند کا محاذ چنتے ہیں اور دشمن پر وار کر جاتے ہیں۔"

"تم تو ان کی حامی معلوم ہوتی ہو!" میں ...

"میں کسی کی ہمدرد نہیں۔ یہ تو میری غیر جانبدارانہ رائے ہے۔ مگر بربریت سے مجھے نفرت ہے۔ ایک چیونٹی کے مرنے پر بھی مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"پھر تو تم بھی بریتھا کی ہم خیال ہی ہو۔"

"بریتھا واقعات کو پیش نظر رکھے بغیر اسے سفاکانہ کارروائی قرار دے رہی تھی مگر میں فلسطینیوں کو تھوڑی سی رعایت دینے کو تیار ہوں۔ وہ جہاز کو غرق کرنے کے لئے کوئی ایسی کارروائی کر بھی سکتے تھے کہ عملے کو اپنی جان بچانے کا موقع مل جاتا۔" ٹیلی ویژن پر ڈوبتے ہوئے بحری جہاز کی تصویر معدوم ہوگئی تھی اور ایک مرتبہ پھر مبصر کا مبتسم چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ حادثے کے مختلف امکانی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے خون آشام تخریبی کارروائیاں کرنے والوں کی بھرپور مذمت کررہا تھا۔

مادام کے اشارے پر بریتھا نے ٹیلی ویژن بند کردیا۔

"تم باہر کی دنیا میں رونما ہونے والے اہم واقعات کا خاصا شعور رکھتی ہو۔ مگر حیرت ہے کہ ہمارے ساتھ تم سطحی باتوں سے آگے نہیں بڑھتیں" میں نے مادام سے کہا۔

"میری صرف ٹانگیں معذور ہیں، ذہن معذور نہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔" مگر تم میرے مہمان ہو اور میں متنازعہ مسائل پر گفتگو چھیڑ کر باہمی تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی۔"

"متنازعہ مسائل؟" عبداللہ نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں — اب میڈوسا کی تباہی کو ہی لے لو۔" اس نے کہا۔" اس بارے میں تمہاری اپنی بھی کوئی رائے ہوگی۔ اب یا تو میں تمہاری خوشنودی کی خاطر ایک کٹھ پتلی کی طرح تمہاری تائید کرتی رہوں یا اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار کرکے کدورت آمیز بحث چھیڑ دوں۔ اسی احتیاط کی وجہ سے میں عموماً سرسری مسائل پر گفتگو پسند کرتی ہوں۔"

"مگر ہم خاصے فراخ دل ہیں۔" عبداللہ قہقہہ مار کر بولا۔" ہم برا منائے بغیر تمہارے اختلاف کا پورا پورا احترام کریں گے۔"

"مجھے شبہ ہے مونسیور عبداللہ۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"کیا شبہ ہے؟"

"تمہارے فراخ دلی کے دعوے پر!"

"آزمائش شرط ہے!" عبداللہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"تو اپنے دل کی بات کہہ دوں؟"

"بلا جھجک کہہ ڈالو۔"

"ہوٹل میریڈین والے حادثے کی خبر پڑھنے کے بعد کئی بار مجھے خیال ہوا ہے کہ کہیں تم بھی فلسطینی ہی نہ ہو!"

ہم دونوں نے بیک وقت مادام کی بات پر قہقہہ لگایا۔ مگر مجھے شدت سے اپنی آواز کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔

"شاید اس شبے کی وجہ یہ ہے کہ حادثے والی رات ہم دونوں اسی ہوٹل میں موجود تھے۔" عبداللہ نے اس کے تبصرے کا اثر لئے بغیر کہا۔

"اسی بات نے تو مجھے شبہ میں ڈال دیا ہے۔" وہ بولی۔" اگر تم وہاں اپنی موجودگی مجھ سے چھپاتے تو شاید میرا شبہ پختہ ہوجاتا۔"

"مگر اس شبہ کی بنیاد بھی تو معلوم ہو۔" عبداللہ نے بغض کر پوچھا۔

"میرے یہاں بہت سے عرب مہمان بھی قیام کرتے رہے ہیں تمہارا نام ان سے ملتا جلتا ہونے کی بنا پر مجھے خیال گزرا تھا۔"

"تو کیا خدوخال سے میں عرب لگتا ہوں۔"

"نہیں۔ ویسے تو مقامی ہی معلوم ہوتے ہو۔"

"بات صرف اتنی ہے کہ میں مسلمان ہوں اور ایسے نام تمہیں یورپ میں بھی ملیں گے۔"

"تم کب مسلمان ہوئے تھے؟"

"پیدائشی مسلمان ہوں۔"

"اور مونسیو ڈان فرنانڈو؟"

"وہ اپنے مذہب کے بارے میں بات کرنی پسند نہیں کرتا۔" عبداللہ مجھے صاف بچا گیا۔

"بہرحال تم دونوں اچھے آدمی ہو۔ اب میں تم سے کھل کر باتیں کروں گی۔ بریتا الو رونوٹ کی طرح میری ہاں میں ہاں ملاتے ملاتے مجھے بیزار کرچکی ہے۔"

"سونے سے پہلے شطرنج کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے نشست کے اختتام کی کوشش کرتے ہوئے مادام سے دریافت کیا۔

"اس وقت تو تھک گئی ہوں، کل دیکھا جائے گا۔" مادام کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ اور یوں محفل برخاست ہوگئی۔

اس رات میں کافی دیر تک میڈوسا کی ہولناک بربادی کے بارے میں سوچتا رہا فلسطینی بے وطن ضرور تھے مگر مادام کے تجربے کے مطابق عربوں کی بے اندازہ مالی اعانت ان کے ساتھ تھی۔ رقم کی یہ فراوانی ان میں عیاری اور ذاتی تحفظ کا احساس پیدا کر سکتی تھی جس کے نتیجے میں وہ پُرخطر مہمات کیلئے کرائے کے پیشہ ور افراد کی خدمات حاصل کرسکتے تھے اور یوں کوئی بھی فلسطینی اپنی جان خطرے میں ڈالے بغیر اپنا کام آگے بڑھا سکتا تھا۔

مگر کرائے کے آدمیوں ... سے اس بے جگری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی جو فلسطینی حریت پسندوں کا خاصہ تھی۔ وہ لوگ مستحکم مالی حیثیت کے باوجود سر سے کفن باندھ کر آگ کے سمندر میں کود کر بھی کام کرنے پر تیار رہتے تھے۔ اور یہ جذبہ ان کے دلوں میں موجود اس تڑپ کا غماز تھا جو آزاد وطن کی آرزو بن کر ہر دھڑکن میں کوندتی رہتی ہے۔

میڈوسا پر دو فلسطینی خطیر رقوم صرف کرکے عملے میں شامل ہوگئے تھے اور میڈوسا پر کوئی کارروائی کرتے ہوئے انہیں پورا احساس رہا ہوگا کہ وہ میڈوسا کو اسلحہ سمیت تباہ تو کر ہی دیں گے مگر ان کا اپنا بھی نام و نشان مٹ جائے گا۔ ان لوگوں کا یہ جوش اور جذبہ میرے لئے قابل رشک تھا۔

اگلے دن کا آغاز خاصے خوشگوار طریقے پر ہوا۔ اس روز مادام نے شاید اخبار لانے والے سے سارے ہی اخبارات لے لئے تھے۔ کیونکہ ناشتے کی میز پر لی موندے، لی فیگارو، پیرس پریس اور کمبات کے تازہ شمارے موجود تھے۔ جن کے اوّل صفحے میڈوسا کے حادثے کی سرخیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں آخرالذکر دو اخبار انگریزی زبان میں تھے۔

ان اخبارات کے مطابق جہاز پر مکمل بربادی نازل ہونے سے قبل میڈوسا کے زیرآب ہولڈ میں ایک خوفناک دھماکہ سنائی دیا تھا۔ جس پر کپتان نے بوکھلا کر اسکی مواصلاتی نظام پر قریب ترین ساحلی نگران چوکی سے رابطہ قائم کیا تھا۔

اس چوکی پر کپتان کی محض آواز ہی سنی جاسکی۔ پھر ریڈیو ریسیور پر پے در پے چند لرزہ خیز دھماکے سنائی دیئے اور اس کے ساتھ میڈوسا سے ریڈیو رابطہ منقطع ہوگیا۔

امدادی جماعتوں کو سمندر سے سترہ لاشیں مل سکی تھیں جن میں سے صرف تین قابل شناخت تھیں، باقی لاشوں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

میں وہاں سے چلنے لگا تو عبداللہ باہر کار تک میرے ساتھ آیا اور میدان صاف پا کر بولا" اس واقعہ پر اپنی زبان بند رکھنا۔"

"کس واقعہ پر؟" میں نے سوال کیا۔

"میڈوسا کی تباہی میرے ذاتی فیصلے پر عمل میں آئی ہے۔ اس معاملے سے میرے اور تمہارے سوا وہ دونوں واقف تھے جو اس حادثے میں شہید ہوگئے۔"

"تو تم اسے چھپانا چاہتے ہو؟"

"اس کی تشہیر نہیں کرنی چاہتا۔ تنظیم کی تمام کارروائیاں محدود ہوتی ہیں اور مخصوص مقاصد کے لئے کی جاتی ہیں جن کی ذمہ داری بھی قبول کی جاتی ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر کوئی کارروائی تنظیم کی پالیسی میں شامل نہیں ہے۔ مگر میری دانست میں اس جہاز کا تباہ کیا جانا ضروری تھا۔ اس پر آبدوزوں کے لئے خصوصی ہتھیار اور چند ایسے جدید ترین ریڈار یونٹ تھے جو سطح سمندر یا زمین سے بیس فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے والے طیاروں کا بھی سراغ لگا سکتے تھے۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"شاید تم نے یہ فیصلہ اچانک کیا ہے؟"

"میں ساری رات چین سے نہیں سو سکا۔ میں جو نخ میں میڈوسا پر وار کرنے کا منصوبہ تو بنا گیا مگر رات کو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر اس میں ہمارے ملوث ہونے کی تصدیق ہوگئی تو اسرائیل کو کسی محاذ پر بھرپور جنگی کارروائی کا بہانا مل جائے گا اور ایک مرتبہ ہتھیار اٹھا لئے جائیں تو کوئی نہیں جانتا کہ جنگ کا دائرہ کہاں تک پھیلے گا۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم بے فکر رہو۔" میں نے جواب دیا اور گاڑی میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔

شہر میں پہلا بک اسٹال نظر آتے ہی میں نے وہاں سے پیرس کے راستوں کا نقشہ لیا جس پر فرنچ کے ساتھ انگریزی میں بھی سڑکوں کے نام درج تھے۔ اور پھر اس کے سہارے سینٹ جرمین کے رہائشی علاقے کی طرف روانہ ہوگیا۔

میرے پاس عذرا جو ناس کا فون نمبر بھی تھا اور اس کے مکان کا پتہ بھی۔ مگر میں اسے چھیڑ کر کوئی نیا فتنہ جگانا نہیں چاہتا تھا۔ میں کافی دیر تک سینٹ جرمین کے علاقے میں بھٹکتا رہا۔

میری کوشش یہ تھی کہ کسی سے دریافت کئے بغیر عذرا جوناس کے مکان کا محل وقوع دیکھ لوں مگر ایسا ہونا دشوار نظر آرہا تھا۔ لہٰذا میں یہ ارادہ ترک کر کے ایفل ٹاور کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت دوپہر قریب تھی۔ شہر میں زندگی کی جولانیاں اپنے شباب پر تھیں اور ایفل ٹاور کے گرد بھانت بھانت کے سیاحوں کا ہجوم تھا ان میں بیشتر اپنے کیمروں سے مختلف تصاویر بنانے میں مصروف تھے۔ اور انہی میں پیشہ ور فوٹوگرافر بھی گھوم رہے تھے جو ایک فرانک میں فوری طور پر پوسٹ کارڈ کے سائز کی رنگین تصویر بنا کر دے دیتے تھے۔

میں جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک بنچ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک حرارت اور خوشبو کا ایک لطیف جھونکا ہوا کے دوش پر تیرتا ہوا میری طرف لپکا اور جب میں نے ہیلو کی آواز کے ساتھ نظریں اٹھائیں تو اسے سنہرے بالوں والی ایک حسین اور نوجوان لڑکی کے روپ میں اپنے سامنے مجسم پایا۔

"میرا نام میگی ہے۔ تم تنہا نظر آئے ہو، چاہو تو تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار سکتی ہوں۔" اس نے میری تحیر آمیز نظروں کا سامنا کرتے ہوئے مسکرا کر پیشکش کی۔

"کس قیمت میں؟" میں نے غور سے اس کے دلکش سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔" وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ فرنچ لب و لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے وہ اور زیادہ حسین محسوس ہو رہی تھی۔

"میں تو تمہارا روسٹ بنانا پسند کروں گا۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "اذیت پہنچا کر خوش ہونے والوں میں سے معلوم ہوتے ہو۔"

"میں جس لڑکی کو پسند کرتا ہوں اس کے برہنہ جسم پر چابک برسا کر لذت حاصل کرتا ہوں۔" میری نگاہیں اس کے حسین چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ جس بے حجابی کے ساتھ خود کو میرے سامنے پیش کر رہی تھی اس کی بنا پر میرا رویہ غیر ارادی طور پر جارحانہ ہو گیا تھا۔

"واقعی؟" اس کی نیلگوں بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میرے الفاظ پر اسے یوں جھرجھری آگئی جیسے اس نے اپنی پشت پر نرم چرمی چابک کا زہرہ گداز لمس محسوس کر لیا ہو۔

"تھوڑی دیر بعد تمہیں یقین آجائے گا۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"میں نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔"

"تو تم میرے بدن پر چابک برساؤ گے؟" وہ میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔" میں نے اس کی کمر پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔ "اور ابھی تم خود کو میری مرضی پر چھوڑ چکی ہو۔"

"وہ تو میں نے مروجہ مفہوم میں کہا تھا۔" وہ کسی چکنی مچھلی کی طرح میری باہوں سے پھسل کر آزاد ہو گئی۔ "میں خفیف سا تشدد بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"مجھے اشتعال دلا کر تو تم یوں نہ جا سکو گی۔" میں نے لب و لہجے کی حد تک بے حد سنجیدگی اختیار کر لی۔ "مجھے مشکل ہی سے کوئی لڑکی پسند آتی ہے اور تم میرے معیار پر پوری اترتی ہو۔ نیلی، خون آلود دھاریوں کے بعد تمہیں خود اپنا جسم پیارا نظر آنے لگے گا۔"

"خدا کے لئے مجھ سے ضد نہ کرو۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ "تمہیں مجھ سے بہتر لڑکیاں مل جائیں گی جو خود تشدد پسند کرتی ہیں۔"

"پھر تم نے مجھے چھیڑا کیوں تھا؟"

"غلطی ہو گئی، معاف کر دو۔ میں تمہیں ایسا ٹھکانا بتا سکتی ہوں جہاں تمہیں اپنے ذوق کے مطابق حسین و جمیل لڑکیاں مل سکیں گی۔"

"وہ ٹھکانا کہاں ہے؟"

"تم میٹرو میں ایفل ٹاور سے روانہ ہو گے تو صرف پندرہ منٹ میں وہاں جا پہنچو گے۔ میں خود تمہیں وہاں پہنچا سکتی ہوں۔"

"یہ میٹرو کیا بلا ہے؟"

"پیرس میں نئے معلوم ہوتے ہو؟" اس کی خود اعتمادی رفتہ رفتہ بحال ہو چلی تھی۔ "زیرزمین مقامی ریلوے سروس یہاں میٹرو کہلاتی ہے۔"

"تم جا سکتی ہو۔ مطلوبہ ٹھکانا میں خود دریافت کر لوں گا۔"

"میرے بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"وہ چلو، جلدی بتا ڈالو۔"

اس نے بولیوارڈ ایڈگر کوئینٹ کا ایک پتہ خاصی تفصیل سے سمجھایا جو میں بیزاری کے عالم میں سنتا رہا۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئی میں اس کا شکریہ ادا کر کے قریبی راستے پر مڑ گیا۔

"میری فیس مونسیور!" وہ لپک کر میرے قریب آگئی۔

"کیسی فیس؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے ابھی تمہیں ایک پتہ بتایا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"اگر میں فیس ادا کرنے سے انکار کر دوں؟"

"میں مایوس ہو کر کسی اور کو تلاش کر لوں گی۔"

یہ اندازہ کر لینے کے بعد کہ وہ مجھے دھمکی دے کر پیسے لینا نہیں چاہتی، میں نے کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے جو اس نے بے تابی سے میرے ہاتھ سے چھین لئے اور نوٹوں کو بوسہ دے کر ہاتھ

...ہجوم سے بھیڑ میں شامل ہو گئی۔

ایک بجے تک میں نے کافی علاقہ دیکھ ڈالا۔ ایفل ٹاور سے ...نے ڈی لینا نامی پل سے دریائے سین کو عبور کیا اور شیلوٹ ...ملحقہ ٹروکیڈیرو کے باغات میں پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس آیا ...ٹیڈیرو اسکوائر سے جانے والی ایونیو کیلبر کے آخری سرے ...پہیل سے سائے نظر آئے اور میں اسی طرف چل پڑا۔

ایونیو کیلبر سے میں انسانوں اور سواریوں کے ہجوم میں رنگ و بو ...جائزہ لیتا ایک چوراہے پر پہنچا جہاں پتھر کی ایک عظیم الشان ...سڑک کے دونوں جانب بنے ہوئے بلند و بالا ستونوں پر ایستادہ تھی جیسے وہاں سڑک کے آر پار ٹانگیں پھیلائے کوئی ...کھڑا ہو۔ سارا ٹریفک اس کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ اس ...ایونیو کئی آ رہی تھیں جن میں سب سے بڑی شاہراہ گرانڈ ...ہوتی تھی جو پتھر کی محراب سے گزرنے کے بعد شیمپس ایلی سس کہلاتی تھی۔ اس سڑک کی سایہ دار ڈھلان پر اترتے ہوئے مجھے اندازہ ...انسان چاہے تو قدرت کے عطیات سے کیسے کیسے فیض حاصل کر سکتا ہے۔ اس سڑک پر گھنے اور سایہ دار درختوں کی صاف ستھری قطاریں موجود تھیں۔ انسانی کاوشوں نے قدرت کی صناعی سے اس شاہراہ پر عجیب ہی روپ اختیار کیا ہوا تھا۔

اس شاہراہ کا اختتام مشہور عالم کانکرڈ اسکوائر پر ہوا جہاں اس کے وسط میں پتھر کے مخروط محرابی چبوترے پر نکسر کا اوبلسکو ...نصب تھا اور اس کے گرد پتھر ہی کی آٹھ بلند و بالا یادگاریں ...تھیں جو فرانس کے مشہور شہروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

وہ مقام بھی نہایت دلفریب تھا۔ شمال میں قدیم اور جدید عمارتوں کا ایک گنجان سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف طیولریز کے باغات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور جنوب کی طرف تھوڑے فاصلے پر دریائے سین کا سرد اور شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ پل عبور کر کے میں نے دریا کے کنارے بنسی کے سہارے مچھلی کا شکار کرنے والے ان بے فکروں کو دیکھا جنہوں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے اس پُرشور مقام کا انتخاب کیا تھا۔ جہاں صبح سے ...مشکل ہی سے کوئی مچھلی پھنستی ہو گی۔ مگر انہیں نہ دنیا و مافیہا کی ...زندگی کی بربادی کا افسوس۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ...سے آزاد پیدا ہوئے ہیں اور قبر تک وہی انداز اپنائے ...رہتے ہیں۔

...پُرہجوم اور حسین علاقوں کا ایک چکر کاٹ کر میں ہوٹل ...پہنچا تو ایک بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

مجھے وہاں رکے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک کار کی ڈرائیونگ ...سیٹ پر ایلیزا کا شوخ چہرہ نظر آیا۔ وہ سست رفتاری سے کار چلاتے ہوئے پارکنگ کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔

میں نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے اس کے پہلو میں جا پہنچا۔ اس نے چونک کر غصیلے تیوروں سے میری طرف دیکھا اور مجھے پہچانتے ہی ہاتھ لہرا کر مسکرا دی۔

ہم نے اپنی گاڑیاں ایک جگہ پہلو بہ پہلو پارک کر دیں۔

میں نے پھرتی سے اتر کر ایلیزا کی کار کا دروازہ کھول دیا اور اس کے برابر میں جا بیٹھا۔ وہ اپنے اسکرٹ کی شکنیں درست کرتے ہوئے اترنے کی تیاری کر رہی تھی۔

"تمہیں دیکھ کر بے اندازہ مسرت ہوئی ہے!" میں نے اس پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیا۔

"مجھے تو خیال بھی نہیں تھا کہ نیس ایئرپورٹ کے بعد کبھی تم سے ملاقات ہو سکے گی۔ محض آخری نام کے سہارے پیرس جیسے شہر میں کسی کا کھوج نکالنا بہت بڑا کام ہے!"

"جو میں نے تمہاری خاطر کر دکھایا۔" میں نے جلدی سے اس کا فقرہ آگے بڑھا دیا۔

"اب نیچے بھی اترو گے یا یہیں سب کچھ کہہ ڈالو گے؟" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ جیسے کسی نے اس کی پسلیوں میں اچانک گدگدی کر دی ہو۔

"یہاں کا پروگرام بدل ہی ڈالو تو بہتر ہو گا۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟" اس کے چہرے پر حیرت کی تمام علامات ابھر آئیں اور دونوں رخساروں پر خفیف سے گڑھے نمایاں ہو گئے جو ہونٹ بھینچ لینے کا نتیجہ تھے۔

"تمہارا باپ بہت ہی خونخوار ہے کہیں وہ ادھر نکل آیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔" میں نے اس کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"ارے وہ انتہائی غیر سوشل آدمی ہے۔ تفریح گاہوں سے دور بھاگتا ہے اور ویسے بھی وہ انکل کے ساتھ رات ہی سے غائب ہے۔"

"تو تمہارا کوئی انکل بھی تمہارے ساتھ رہتا ہے؟" میں نے کام کی بات سامنے آتے ہی مصنوعی حیرت کے ساتھ سوال کر ڈالا۔

"ہاں۔ اچھا خاصا راہب ہے۔" وہ سگریٹ نکالتے ہوئے منہ بنا کر بولی۔ "نہ جانے ہر وقت کہاں مصروف رہتا ہے۔ جہنم میں ڈالو اور یہ بتاؤ کہ تمہارا نیا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے اپنے لائٹر سے اسے سگریٹ سلگانے میں مدد دی اور کہا "اگر کسی ہاؤس بوٹ میں دریا کی سیر کی جائے تو کیسا رہے گا؟"

"خیال برا نہیں ہے۔" وہ سگریٹ کا دھواں ناک سے خارج کرتے ہوئے بولی۔ "مگر کشتی بان عموماً بلیک میلر ہوتے ہیں۔ ہمیں پتہ بھی نہ چل سکے گا کہ کب کسی حساس کیمرے نے ہماری تصاویر لے لیں۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ وہ خاصی بیباک اور آزاد خیال معلوم ہوتی تھی جو پہلی ملاقات میں ہی خاصا طویل پروگرام بے کرائی تھی۔

"اوہ۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔"

"تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"میں ایک دوست کے ساتھ مقیم ہوں۔"

"کیسے مزاج کا مالک ہے؟" اس نے سگریٹ کا دوسرا کش لیکر سوال کیا۔

"ذرا اکھڑ مزاج اور لڑکیوں کے بارے میں حریصانہ طبیعت کا مالک ہے فی الحال گاڑی یہیں چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو، راستے میں کوئی نہ کوئی پروگرام طے ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"غنیمت ہے کہ تم کچھ بولے تو سہی!" وہ الہڑ انداز میں ہنستی ہوئی کار سے اتر گئی۔

میری کار میں سفر کرتے ہوئے وہ ایک پل کے لئے بھی خاموش نہیں ہوئی۔ اس کے بے تکلفانہ انداز گفتگو کے باعث میرے وجود میں دھیمی دھیمی سی آگ سلگنے لگی اور مجھے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں ایلیزا مجھے اپنی راہ سے نہ ہٹا دے۔

سینٹ جیکوبس کے علاقے میں ایک اوسط درجے کا ہوٹل دیکھ کر میں نے کار روک دی۔ ایلیزا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور ہم دونوں ہوٹل کے ایک محفوظ گوشے میں جا بیٹھے۔

پہلا دور شیمپین کا چلا۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی ایلیزا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شاید وہ اپنے باپ کی عاید کی ہوئی ناروا پابندیوں کو پامال کرتے ہوئے اپنے بارے میں احساس برتری کا شکار ہو گئی تھی۔

"تمہارا وجود شراب سے کم نشہ انگیز نہیں ہے۔ اسے پی کر تو تم مردوں کی محفل میں فساد کا سبب بن سکتی ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے اپنی نرم مگر حرارت آفریں ہتھیلی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ "تم بہت اچھے اور مہربان آدمی ہو ڈان، نہ جانے کیوں میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔"

"تمہارے باپ کو علم ہو گیا تو مجھے شوٹ کر دے گا۔"

"میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی۔ میرا بس چلے تو اسے چھوڑ کر کہیں فرار ہو جاؤں!"

"تم بالغ ہو۔ وہ زبردستی تو تمہیں نہیں روک سکتا۔"

"مگر مجھے ماں سے اسی قدر محبت ہے۔ میں محض اسی کی خاطر اپنے باپ کو برداشت کرتی ہوں۔ میرے ساتھ وہ جلاد بنا رہتا ہے مگر ممی کے آرام اور سکون کا ہر وقت خیال رکھتا ہے۔"

"تمہاری ماں بیمار ہے اور وہ رات سے غائب ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"جب سے اس کا بھائی آیا ہے وہ بے اعتدالیاں کرنے لگا ہے۔" ایلیزا نے اپنے باپ کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ وہ اس وقت ممی کے پاؤں داب رہا ہوتا۔"

"تمہاری ماں کا اتنا خیال رکھتا ہے؟"

"ہاں۔ مگر ممی نے کبھی میرے بارے میں اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا خیال ہے وہ جو کچھ کرتا ہے اس میں آخرکار میری ہی بہتری ہو گی۔"

"تمہارا انکل فرانس ہی میں رہتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" وہ شیمپین کا گلاس ختم کرتے ہوئے منہ بنا کر بولی۔ "آنے سے پہلے ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ وہ مدتوں بعد اچانک ہی نازل ہوتا ہے اور ساری دنیا کی کہانیاں سناتا ہے جیسے وہ سارا عرصے سفر میں رہا ہو۔ اس کے مطابق اس کا نہ گھر بار ہے اور نہ بیوی بچے۔"

"بڑا عجیب آدمی ہے!"

"وہ جب بھی یہاں آیا میرے باپ کی مصروفیات اچانک بڑھ گئیں اور مزے کی بات یہ کہ وہ دونوں اپنی مشترکہ حرکات کے بارے میں بے انتہا رازداری سے کام لیتے ہیں۔"

"تمہاری ماں بھی کچھ نہیں جانتی؟"

"وہ دونوں ان سے بھی بے سروپا بہانے بنا دیتے ہیں۔"

"میرا تو خیال ہے کہ تمہارا انکل کوئی جرائم پیشہ شخص ہے۔"

"بالکل ممکن ہے۔" اس نے پُرزور لہجے میں تائید کی۔ "وہ باتیں ضرور راہبوں جیسی کرتا ہے مگر اس کی حرکتیں نامناسب سی ہیں۔"

"وہ آخری مرتبہ کب آیا تھا؟" میں نے ایلیزا کا گلاس لبریز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"شاید دو ڈھائی برس پہلے!" وہ پشت گاہ سے سر ٹکا کر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "اس کی آمد و رفت ختم ہونے سے میری اور ممی کی خاصی پریشانیاں ختم ہو سکتی ہیں۔"

"اس کی مصروفیات کا کچھ پتہ چلاؤ تو میں کچھ کر سکتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تم نے تو مجھے جاسوس سمجھ لیا ہے۔ وہ گھر میں رہتا ہے تو تاریخ اور فلسفے کی ضخیم کتابوں میں سر کھپاتا رہتا ہے۔"

"باہر سے آ کر کیا بتاتا ہے؟"

"کبھی وہ ہپیوں کی اصلاح کرنے لگتا ہے، کبھی اسے کوئی بلا دارث ...ل جاتا ہے۔ کچھ روز پہلے وہ تین دن بعد گھر آیا تو بتا رہا تھا کہ ایک ہم جنس ... منوا الفت کو تائب کر کے اس کی شادی کرانے کے بعد لوٹا ہے مگر مجھے یقین ہے وہ ہر بار جھوٹ بولتا ہے!"

"نام کیا ہے اس کا؟"

"چھوڑو اس تذکرے کو!" وہ پُرسرور لہجے میں بولی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اسی کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے یہاں آئے ہیں۔"

"وائن چلے گی؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"سرخ شراب کی تو میں رسیا ہوں۔"

"پہلے کیوں نہ بتایا، شیمپین کے بجائے اسی سے آغاز کرتے۔"

"مجھے شیمپین کا کاگ اڑانے میں مزا آتا ہے اور پھر اس کا ذائقہ بھی پسند ہے اسی لئے خاموش رہی۔" اس نے پوری وضاحت کر ڈالی۔

ہم نے نہایت سکون اور اطمینان سے اپنا کھانا ختم کیا۔ شراب کا ہلکا سا سرور گندم کے خمار سے مل کر ایلیزا پر اپنا رنگ جمانے لگا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خمار کے سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ مگر وہ اپنے لب و لہجے پر پوری طرح قادر تھی۔

"اب یہاں سے چلو ڈان!" کھانے کے بعد اس نے اپنی سگریٹ ختم کرتے ہوئے بھرائی ہوئی مدھم آواز میں کہا۔

"کہاں چلا جائے؟"

"یہاں بہت سے لوگ موجود ہیں کسی ایسی جگہ چلو جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ میں بے فکری کے ساتھ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"میرے مکان پر چلو!"

"نہیں۔" اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ "میں اس وقت خود فراموشی کی حسین وادیوں میں ڈوب جانا چاہتی ہوں، تمہارے بدقماش دوست کی موجودگی میں میں اپنے ذہن کو آزاد نہ چھوڑ سکوں گی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں!" میں نے آہستہ سے کہا اور جیب سے بٹوا نکال کر بل کی رقم پلیٹ میں ڈالنے لگا۔

"نہیں۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم میرے مہمان ہو۔ میں بے مخلص دوستوں پر عذرا جو نا اس کی آمدنی لٹا کر خوشی محسوس کرتی ہوں اور تم بہت بے لوث معلوم ہوتے ہو۔ مجھے اس خوشی سے محروم نہ کرو۔"

"میری موجودگی میں تم بل دیتے ہوئے اچھی نہیں معلوم ہو گی۔"

"تو چلو اپنا دل خوش کر لو میں جاتے ہوئے تمہارے قدموں میں اپنا پرس الٹ دوں گی۔" اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

ہم دونوں وہاں سے روانہ ہوئے تو ایلیزا کے ایما پر میں نے کار وسیع شاہراہ پر ڈال دی جو جنوب میں نیم دائرے کی شکل میں ... کے گرد پھیلتی ہوئی مشرق میں ایک اور سڑک سے جا ملی تھی۔ اس شاہراہ کا اختتام دریائے سین پر آسٹرلٹز کے پل پر ہوا تھا۔ دریا کے کنارے دور دور کئی ہٹ بنے ہوئے تھے وہ مقام نہایت پُرسکون اور فرحت انگیز تھا۔

گاڑی سے اترنے کے چند منٹ بعد ہی ہمیں مناسب کرائے پر پتھر کا بنا ہوا ایک ہٹ مل گیا جس میں موسم کے لحاظ سے کم و بیش تمام ضروریات میسر تھیں۔

ایلیزا صاف ستھری خوابگاہ میں پہنچتے ہی اوورکوٹ سمیت بستر پر دراز ہو گئی اور میں اس ہٹ کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔

وہاں دو کمرے اور ایک کچن واقع تھا۔ دوسرا کمرہ نشست گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ دونوں کمروں میں حرارت کے لئے قدیم وضع کے دیوار گیر آتشدان بھی موجود تھے۔ خوابگاہ کی عقبی کھڑکی دریائے سین کی طرف کھلتی تھی اور اسی طرف واقع دروازے سے کشادہ پتھریلی سیڑھیاں تھوڑے فاصلے پر دریا کے پانی میں اترتی چلی گئی تھیں۔

میرے جائزے کے دوران خدمت گار دستک دے کر اندر آیا اور دونوں آتشدان روشن کر کے لاتعلقانہ انداز میں سر جھکائے باہر چلا گیا۔

"دریا کا پانی شاید مجھ سے زیادہ حسین ہے ڈان!" ایلیزا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اور میں خوابگاہ کا عقبی دروازہ بند کر کے اندر لوٹ آیا۔

"تم اوورکوٹ اور جوتے نہیں اتارو گی۔"

"ذرا کمرہ گرم ہونے دو۔" وہ مسکرا کر بولی اور لیٹے لیٹے اپنے چرمی سینڈل اتار کر مسہری کے پہلو میں اچھال دیئے۔

"تمہیں اب بھی گرمی کی ضرورت ہے؟"

"میں غنودگی محسوس کر رہی ہوں، تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔" وہ انگڑائی لے کر اوورکوٹ اتارتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم سو جاؤ میں دریا کے سرد پانی میں دو چار غوطے مار کر آتا ہوں۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔ "اگر ابھی میرا باپ یہاں آنکلے تو تمہارا نشہ دریا میں غوطے لگائے بغیر ہرن ہو جائے گا اور تم کئی دن تک میرے بارے میں سوچنے کی ہمت نہ کر سکو گے۔"

"میں اتنا بودا بھی نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ امکان بھی ہے کہ وہ تمہاری سرپرستی سے ہمیشہ کیلئے دستبردار ہو جائے۔"

"یہ تو بتاؤ تم پیرس میں کب تک مقیم ہو؟" اس نے پہلو کے بل کروٹ لیتے ہوئے سوال کیا اور میں اطمینان سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"تمہارے اوپر منحصر ہے چاہو تو کل ہی چلا جاؤں گا۔ لندن میں مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ وقت سے پہلے ڈیوٹی پر پہنچ گیا تو کچھ نمبر بڑھ جائیں گے۔"

"میں سوچ رہی ہوں کہ یہ ہٹ ایک ہفتے کے لئے کرائے پر لے لیا جائے۔ یہاں ہم خاصی بے فکری سے اپنا وقت گزار سکیں گے۔"

"خاصا معقول خیال ہے لیکن تم ہر روز سونے کا پروگرام بنا کر

آتی رہیں تو میری موجودگی کی کیا ضرورت ہو گی۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "وائن نے خلافِ معمول میرے اعصاب کو خاصا متاثر کیا ہے آج مجھے معاف کر دو، میں چاہتی ہوں کہ گھر واپس جاؤں تو میری حالت اعتدال پر ہو۔"

"پھر کسی خوفناک موضوع پر باتیں کرو تاکہ میرے ذہن سے رومان آفریں دھند صاف ہو جائے۔" میں نے بستر سے اُٹھ کر صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"مثلاً؟" اس نے شوخ لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے لئے عذرا جونا سے زیادہ خوفناک موضوع اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"ابراہام اس سے بھی زیادہ پُراسرار اور خطرناک معلوم ہوتا ہے۔" وہ کہنی کے سہارے ہتھیلی پر دا ہنا رخسار ٹکا کر بولی۔

میری وحشت زدہ نگاہیں اس کے سراپا کے پُر پیچ نشیب و فراز میں الجھنے لگیں اور میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ "تو پھر اسی کی بات کرو۔"

"تم نے کبھی راسپوٹین کا نام سنا ہے؟"

"اس رسوائے زمانہ روسی درویش سے کون واقف نہ ہو گا۔"

"بس تو یہ سمجھو کہ ابراہام مجھے اسی کی نسل سے معلوم ہوتا ہے۔"

"پھر تو تم بھی راسپوٹین کی رشتہ دار ہوئیں۔"

"ابراہام جونا میں راسپوٹین جیسی خصلتیں پوشیدہ ہیں۔" وہ کہنے لگی۔ "وہ بے حد سخت جان اور ڈھیٹ ہے اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ کئی روز پلک جھپکائے بغیر اپنے کمرے میں بیٹھا اہم مقالے لکھتا رہا ہے مگر میں آج تک اس کا ایک بھی مقالہ نہ دیکھ سکی۔ کبھی وہ گھنی ڈاڑھی رکھ لیتا ہے، کبھی سر صاف کرا دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایسی خوفناک قوت پوشیدہ ہے کہ اس سے نظریں چار کرنا مشکل ہے۔ تم اس کے خلاف جو چاہو سوچتے رہو مگر اس کا سامنا ہونے پر زبان تمہارے خیالات کا ساتھ نہ دے سکے گی۔"

"اس کا پسندیدہ موضوع کیا ہے؟"

"وہ خود کو تاریخ اور فلسفے کا طالب علم کہتا ہے۔ مگر اس کے کمرے میں مشینی زراعت میں جدید ترین تجربات سے لے کر عالمی سیاسی رجحانات تک پر کتابیں موجود ہیں۔"

"تم نے کبھی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہ دن رات کیا لکھتا رہتا ہے؟"

"کوشش تو بہت کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔"

"یہ تو ناممکن سی بات ہے۔ وہ دن رات گھر ہی میں تو رہتا ہے نا؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہی لکھتا ہے اور وہیں لکھنے کی میز کے پہلو میں کھانے پینے کی دوسری اشیاء سے بھرا ہوا ریفریجریٹر رکھا رہتا ہے وہ کوئی اہم کام شروع کرنے سے پہلے اندر سے دروازہ بند کر دیتا ہے اور اپنا کام ختم کرنے کے بعد دروازہ کھولنے سے قبل وہ سارے ردی کاغذ جلا کر تلف کر دیتا ہے اور مسودہ بریف کیس میں منتقل کر لیتا ہے!"

"پھر تو وہ کوئی غیر ملکی جاسوس ہی معلوم ہوتا ہے۔"

اس کی خمور نگاہیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"وہ ساری دنیا کی سیر کرتا رہتا ہے، اس کا کوئی گھر بار نہیں ہے پھر وہ نہایت رازداری کے ساتھ اپنی رپورٹیں تیار کرتا ہے۔ بغیر بتائے اچانک گھر سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں اسی طرف اشارہ کرتی ہیں۔" کارآمد موضوع چھڑ جانے کے بعد میں خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگا تھا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میرا باپ بھی اس کا شریک کار ہے۔" وہ مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر سیدھی بیٹھ گئی۔

"ان کے باہمی گٹھ جوڑ سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے!"

"مگر وہ لوگ کس ملک کے لئے کام کرتے ہوں گے؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"بے ضمیر لوگ کسی بھی ملک کے لئے کام کر سکتے ہیں، ان کی ہمدردیاں صرف اپنے مالی مفادات تک محدود ہوتی ہیں۔"

"شاید یہ انکل کے لئے درست ہو مگر میرا باپ اپنی مردم بیزاری کے باوجود بہت کٹر آدمی ہے۔ وہ فری میسن کے ہر اجتماع میں عبادت کے جذبے سے شریک ہوتا ہے اور عالمی صیہونی فنڈ میں بھی خطیر رقم کے عطیات دیتا رہتا ہے۔"

"تو کیا تم یہودی ہو؟" میں نے مصنوعی حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

"ہاں ہمارے پاس فرانس کے علاوہ اسرائیل کی بھی شہریت ہے!" اس نے فخر آمیز لہجے میں انکشاف کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہارا باپ اسرائیل کے لئے کام کر رہا ہو؟"

"یہ تو بڑے فخر اور خوشی کی بات ہے۔" ایلیزا کے ان الفاظ پر مجھے خاصا صدمہ ہوا اور اس کے حسن اور معصومیت کے بارے میں میرا پندار بری طرح زخمی ہو گیا۔ "ان دونوں کو یہ بات مجھ سے اور ممی سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں چند ثانیوں کے لئے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جس طرح فخر کے ساتھ اپنے مذہب اور مذہبی دشمن کا تذکرہ کر رہی تھی، میں بھی اسی طرح ڈنکے کی چوٹ پر اسے اپنے مذہب اور اپنی ہمدردیوں کے بارے میں بتا دوں مگر میں پوری کوشش کر کے اپنے اس جذباتی ابال پر غالب آنے میں کامیاب ہو گیا۔

"پھر تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ دونوں یقیناً اسرائیل کے لئے کام کرتے ہوں گے۔" ...پُرسکون لہجے میں کہا۔

"مگر انہیں فرانس کے خلاف کام کرنے کی کیا ضرورت ہے فرانس کا شمار تو اسرائیل کے خیر خواہوں میں ہوتا ہے؟"

میں نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ فرانس میں خفیہ سرگرمیوں کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ وہ فرانس کے خلاف کام کر رہے ہوں۔ اپنے مشن کے لحاظ سے وہ دونوں کسی کے خلاف نہیں بلکہ اپنے مفادات کے لئے سرگرم عمل تھے اور جو کوئی اس راہ میں حائل ہوتا تھا وہ ان کے لئے دشمن کا درجہ رکھتا تھا خواہ وہ فرانس ہو یا سعودی عرب!

"یہ سب عوامی سطح کی جذباتی باتیں ہیں۔" میں نے اس کی خود اعتمادی پر کاری ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ "سرکاری سطح پر اپنے مفادات کے لئے دوستوں کے گلے پر بھی چھری پھیر دی جاتی ہے۔"

"آج تم سے باتیں کر کے میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔" وہ بولی۔ "وہ دونوں واقعی اسرائیلی جاسوس ہیں تو قابلِ قدر لوگ ہیں۔ میں بلاوجہ ان کی طرف سے بدظن رہتی ہوں۔"

"یہ تو صرف ایک امکانی پہلو ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سرکاری راز حاصل کر کے اونچی بولی دینے والے کسی بھی ملک کو بیچ دیتے ہوں خواہ وہ اسرائیل ہو یا الجزائر۔"

"یہ پتہ چلانا تو بڑا مشکل کام ہے!" وہ یہ کہتے ہوئے دوبارہ بستر پر دراز ہو گئی۔ "پھر میرے باپ کے پاس دولت کی کمی نہیں آخر وہ ایسا گھٹیا کام کیوں کرے گا؟"

"تمہارا باپ تو محض آلۂ کار معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابراہام ...اسے اپنے مقصد کے بارے میں لاعلم رکھ کر اس کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاتا ہو اور پھر تمہارا باپ بھی اتنا زیادہ اسرائیل دوست معلوم نہیں ہوتا ورنہ وہ اپنی صلاحیتوں سے اسرائیل کو محروم نہ رکھتا ...ابیب میں رہ کر مؤثر طور پر اسرائیل کی خدمت کر سکتا تھا۔"

"تمہاری ان باتوں نے مجھے کچھ اور بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔" ...کیا؟

"مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ میرا باپ جاسوس ہی ہے۔ کیونکہ ...اس کی لاعلمی میں جب بھی کسی لڑکے سے ملی ہوں اسے علم ہو ...اس نے سختی کے ساتھ مجھ سے باز پرس کی۔ ہو سکتا ہے ...اس نے میری نگرانی پر کسی کو مامور کیا ہو۔"

"...اس کے باوجود تم بے خوفی سے میرے ساتھ چلی آئیں۔" میں ...کر کہا۔ اس کا نیا انکشاف میرے لئے پریشان کن تھا۔ ...نگرانی کرنے والے سے خبر پا کر عذرا جونا کسی بھی لمحے مجھے بال ...سکتا تھا۔ یہ کوئی معمولی خطرہ نہیں تھا۔

...تو میں اپنے باپ کی ایسی باتوں کو اس کی قیاس آرائی سمجھتی رہی جو ہمیشہ درست ثابت ہوتی تھی مگر اب تم سے باتیں کرنے کے بعد میرے ذہن نے نئی راہ پر سوچنا شروع کیا ہے۔"

"اگر تمہارا اندیشہ ایک فیصد بھی درست ہے تو ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے ورنہ رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں گے۔"

"اس قدر گھبرانا بے سود ہے۔ اسے آنا ہوتا تو آ چکا ہوتا۔ ہم جتنا وقت اس ہٹ میں گزار چکے ہیں وہ بڑے بڑے مراحل طے کرنے کے لئے کافی تھا۔"

میں ایک سفاک شکاری کی نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ نہ صرف دشمن کی صفوں سے تعلق رکھتی تھی بلکہ اس کے خیالات بھی ان ہی جیسے تھے۔ اس دوشیزہ کو اس کے زہر آلود خیالات کی بھرپور سزا دینی تو ممکن نہ تھی مگر میں اسے پامال کر کے اس حوالے کو عارضی طور پر سر کر سکتا تھا جو اس کے خیالات سے واقفیت حاصل ہونے کے بعد میرے وجود میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔

ایلیزا میرے لئے شطرنج کی بساط ثابت ہوئی جس کے ہر خانے سے میں بخوبی واقف تھا۔ چند مہروں کو ادھر اُدھر کرتے ہی بساط میرے حق میں پلٹ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں فاتحانہ احساس کے ساتھ واپسی کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

ایلیزا سونا چاہتی تھی اور نہ سو سکی۔ مگر واپسی کے وقت اس کا سارا نشہ کافور ہو چکا تھا اور وہ نہایت آسودہ انداز میں میرے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئی۔

روانگی سے قبل اس نے خدمتگار کو طلب کر کے اسے خاصی معقول ٹپ دی اور پھر چار دن کا پیشگی کرایہ ادا کر کے وہ ہٹ اپنے لئے مخصوص کرا لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کم از کم چار دن کیلئے میری رفاقت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کر چکی تھی۔

واپسی میں میں خاموش تھا اور وہ مسلسل بولے جا رہی تھی اس کے لہجے میں ندامت یا پشیمانی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ مگر اس کا بولتے رہنا میرے لئے اس لحاظ سے کارآمد ثابت ہوا کہ مجھے پوری طرح اسے سمجھنے کا موقع مل گیا۔

پیرس میں اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور ہر طرف روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ جلتے بجھتے حسین برقی اشتہارات کے نیچے سے گزرنے والے ٹریفک پر ان روشنیوں کے وہی اثرات پڑ رہے تھے جو اسٹیج پر اداکاری کرنے والے کے چہرے پر رنگین روشنیوں کے بدلتے ہوئے ہالوں سے مرتب ہوتے ہیں۔

میں نے کار ہوٹل ڈی وائل کے راستے پر موڑ دی تو ایلیزا نے حسب ارادہ اپنے پرس سے سابق رقم نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

"...رکھ لو ایلیزا۔" میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"تم میرے دوست ہو ڈان، ہم ایک دوسرے کے بہت

قریب آ چکے ہیں، مجھے اس خوشی سے محروم نہ کرو۔" اس نے نرم لہجے میں التجا کی۔

"میرے لئے اس رقم کا کوئی مصرف نہیں، عذرا جوناس کا پیسہ لٹانا ہی چاہتی ہو تو اسے دیا سلائی دکھا دو یا کسی ضرورت مند کے حوالے کر دو۔"

"مگر میں دوستوں پر پیسہ بہا کر خوشی محسوس کرتی ہوں۔"

"اپنی خوشی کی خاطر میرے جذبات کو نظر انداز نہ کرو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ خاموش ہو گئی۔

ہوٹل ڈی وائل کے احاطے میں اپنی کار رکتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک ہی ایک نئے خیال نے جنم لیا اور میں ایلیزا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم نے بتایا تھا کہ عذرا جوناس کو تمہاری تمام سرگرمیوں کا علم ہو جاتا ہے؟"

"کم و بیش!"

"ذرا سوچ کر بتاؤ کہ کبھی ایسا بھی ہوا کہ تم اپنی کار سے باہر کسی تفریح گاہ میں کسی سے ملی ہو اور تمہارے باپ کو اس کا بھی علم ہو گیا ہو؟"

یقین سے بتانا تو ذرا مشکل ہے مگر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔" وہ کار میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں اپنی چمکدار نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے بولی۔" یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا خیال آ گیا؟"

"بڑا اچھوتا خیال آیا ہے جو اگر درست نکلا تو تمہیں ہمیشہ کے لئے عذرا جوناس کی سراغ رسانی سے نجات دلا دوں گا۔"

"کیا خیال ہے؟"

"تمہاری کار کا جائزہ لینے کے بعد بتاؤں گا۔"

میں ایلیزا کے ساتھ اس کی کار تک پہنچا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست کو اٹھا کر اس کے نیچے جھانکتے ہی میری نظر ڈور لائٹ کی روشنی میں دو تاروں پر پڑی جو نشست کے فریم کے ساتھ ساتھ پائیدان کے نیچے غائب ہو گئے تھے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" ایلیزا میرے شانے پر سے آگے جھانکتے ہوئے بولی۔

"کوئی ٹارچ ہے تمہارے پاس؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔" یہ کہہ کر اس نے ڈیش بورڈ سے تیز روشنی والی ٹارچ نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

ٹارچ کی روشنی میں میں نے تاروں کا جائزہ لیا۔ اور میری نگاہیں سیٹ کے اسپرنگوں کے ساتھ لگے ہوئے اس حساس سوئچ پر جا رکیں

جو میری انگلی کے خفیف سے دباؤ سے آن ہو گیا اور انگلی ہٹتے ہی اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔

"کیا ہے یہ؟" ایلیزا نے حیرت سے پوچھا۔

"عذرا جوناس کا جاسوس جو تمہارا پیچھا کرتا رہتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"اپنی کار کو کسی ویران مقام پر لے چلو تو سب سامنے آ جائے گا۔"

"وہ تار کیسے ہیں؟"

"اس نشست میں ایک سوئچ لگا ہوا ہے۔ تمہارے پہلو میں جیسے ہی کوئی اس نشست پر بیٹھے گا وہ سوئچ آن ہو جائے گا۔"

"مگر اس سے ہو گا کیا؟"

"وہ سوئچ غالباً کسی پوشیدہ ٹیپ ریکارڈر سے منسلک ہے اور ڈیش بورڈ میں کہیں مائیکرو فون بھی موجود ہو گا۔"

"او خدا۔ تو وہ مجھ پر ذرا بھی اعتماد نہیں کرتا۔"

"یہ باپ بیٹی کا معاملہ ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

ایک جگہ گاڑی روک کر میں نے تار کا سلسلہ تلاش کرنا شروع کیا اور پھر پچھلی نشست بھی جگہ سے ہٹانی پڑ گئی۔

اس نشست میں کوئی سوئچ تو نہیں تھا مگر سیٹ کے نیچے ایک نمدے پر جاپانی ساخت کا ایک کیسٹ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔

میرے ایما پر ایلیزا نے انگلی سے اگلی نشست کے نیچے لگا ہوا سوئچ دبایا اور ریکارڈر چل پڑا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر ایلیزا کو اپنے قریب بلا لیا۔ اس ریکارڈر پر کئی سوئچ موجود تھے۔ میں نے کیسٹ نکال کر اس کا جائزہ لیا تو اس کا ایک رخ نوے منٹ کی ریکارڈنگ کر سکتا تھا اور اس کا تقریباً چوتھائی حصہ ریکارڈ کیا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے کیسٹ کو ریکارڈر میں رکھ کر الٹا چلا دیا۔ اس ریکارڈر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اس پر مروجہ تمام سوئچ موجود تھے مگر ریکارڈنگ کا کوئی سوئچ نہیں تھا۔ غالباً ریکارڈنگ کا پیچیدہ نظام اگلی نشست میں لگا ہوا سوئچ دبتے ہی حرکت میں آ جاتا تھا۔

پورا ٹیپ واپس ہو جانے کے بعد میں نے دھیمی آواز میں اسے بجانا شروع کر دیا۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے بے اندازہ مسرت ہوئی ہے۔" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کار میں میری آواز گونجی تو ایلیزا حیرت سے اچھل پڑی۔

"یہ تو وہی الفاظ ہیں جو تم نے مجھ سے ملاقات ہوتے ہی کہے تھے۔"

"اس کار میں ہونے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہو جاتی ہے۔"

ٹیپ چلتا رہا اور میری اور ایلیزا کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ آخر کار میں نے اسے بند کر دیا۔

"اسے نکال دو۔ میں راستے میں کسی کوڑا گھر پر پھینک دوں گی۔" ایلیزا اپنے باپ کی کمینگی ظاہر ہو جانے پر خاصی برافروختہ نظر آنے لگی تھی۔

"اسے پھینکنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "وہ اسے غائب پائے گا تو تم پر کڑی نظر رکھنے کے لئے کوئی اور صورت نکال لے گا۔ اسے یونہی رہنے دو۔"

"اسے میری نجی زندگی میں اس حد تک دخل اندازی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"ابھی تم کنواری ہو۔ شاید تمہاری شادی کے بعد باز آ جائیگا۔"

"میں اس گاڑی میں سفر کرنا چھوڑ دوں گی۔ اسے آگ لگا دوں گی۔"

اس اثنا میں میں ٹیپ سے آوازیں صاف کرنے کا طریقہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں نے پورا ٹیپ صاف کرنا شروع کر دیا۔

"تمہارا باپ بہت مکار آدمی ہے۔ اس نے صرف اگلی نشست میں سوئچ لگایا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ تم جس سے بے تکلف ہو گی اسے اپنے ساتھ بٹھاؤ گی یا ڈرائیونگ سیٹ دے کر خود اس کے پہلو میں بیٹھو گی اور ٹیپ ریکارڈر چل پڑے گا۔ نشست سے وزن ہٹنے کے علاوہ کیسٹ ختم ہونے پر بھی یہ ریکارڈر خود بخود بند ہو جاتا ہے اور نوے منٹ کی مسلسل ریکارڈنگ تمہارے باپ کو تمہاری جملہ مصروفیات سے باخبر کر دیتی ہے۔"

"آخر وہ مجھے قیدی کیوں سمجھتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ کسی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو۔"

"مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ترکیب بتاؤ۔"

"اگر تم کسی ایسے دوست سے ملنے جاؤ جس کو تمہارا باپ نہ پسند کرتا ہو تو اسے اپنی کار میں عقبی نشست پر بٹھاؤ اور اگر آگے ہی بٹھانا ہو تو سیٹ اٹھا کر کلپ میں پھنسا ہوا سوئچ نکال دو۔ بعد میں اسے دوبارہ کلپ میں لگا دو گی تو جوناس کے فرشتوں کو بھی تمہاری مصروفیات کا علم نہ ہو سکے گا۔" میں نے اسے عملی تجربہ کرتے ہوئے بتایا۔

"اور اگر کبھی ایسا کرنا بھول جاؤں تو؟"

"تو ذرا زیادہ محنت کرنی ہو گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پھر پچھلی سیٹ اٹھا کر کیسٹ صاف کرنا ہو گا۔"

"یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ وہ یہی سمجھتا رہے گا کہ میری ایک ایک لمحے کی مصروفیات اس کی نظر میں ہیں۔"

"اب کب ملاقات ہو گی؟"

"آؤ تمہیں تمہاری کار تک چھوڑ آؤں!" اس نے پیش کش کی تو میں نے قبول کر لی۔

"تمہارے باپ کی شخصیت اور سرگرمیوں میں میری دلچسپی بے انتہا بڑھ گئی ہے۔"

"پتہ نہیں میری اور اس کی شخصیت میں اتنا تضاد کیوں ہے!"

"کیا یہ ممکن ہے کہ میں اس کی لاعلمی میں تمہارے گھر آ کر اس کی چیزوں کا جائزہ لے سکوں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔

"آ تو ضرور سکتے ہو مگر اس کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب آ جائے۔ اور پھر آج کل تو دوسرا بھی آیا ہوا ہے!" اس نے کہا۔

"اس موضوع پر کل بات ہو گی۔"

مجھے ہوٹل ڈی وائل کی پارکنگ لاٹ پر چھوڑ کر رخصت ہوتے ہوئے اس نے اگلے روز شام کو سبٹ پر ملنے کا وعدہ کیا اور میں اپنی کار میں واپس روانہ ہو گیا۔

میں گھر پہنچا تو عبداللہ مادام فے کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"تم کہاں رہ گئے تھے ڈارلنگ!" مادام فے نے اپنی کرسی کا رخ میری طرف گھماتے ہوئے سوال کیا۔ "تمہارا ساتھی تمہارے لئے بہت پریشان تھا۔"

"راستہ بھٹک گیا تھا۔"

"دیکھا، میں نہ کہتی تھی۔" مادام فے عبداللہ کی طرف مخاطب ہو کر فخریہ لہجے میں بولی۔

"مادام فے کا خیال تھا کہ تم راستہ بھٹکے ہو گے یا کسی خوش اخلاق اور خوبصورت فرانسیسی لڑکی کی دلجوئی کر رہے ہو گے۔" عبداللہ نے کہا۔

"کاش کہ یہ دوسرا خیال درست ہوتا۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ اور مادام فے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"شطرنج کے بارے میں کیا خیال ہے مادام؟" میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے جارحانہ انداز میں سوال کر ڈالا۔

"سارا دن باہر گزار کر آئے ہو، تھک گئے ہو گے، پھر کسی وقت کھیلیں گے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

"کھانا کس وقت لگا دوں!" اچانک برتھا نے کسی طرف سے نمودار ہو کر سوال کر ڈالا۔

"میں نہیں کھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد لگا دینا۔" عبداللہ نے ہدایت کی۔ اس اثنا میں مادام فے اپنی کرسی لڑھکاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی شاید

اُسے اندیشہ سا ہو گا کہ میں کہیں اُسے زبردستی شطرنج کھیلنے پر مجبور نہ کر دوں۔

"کیا رہا؟" میدان صاف پا کر عبداللہ نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اسرائیل فتح ہو گیا۔" میں نے داہنی آنکھ دبا کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ایلیزا بھی اسرائیل سے کم نہیں ہے۔"

وہ زور سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہنس دیا۔ "تمہارے سامنے بھلا وہ کتنی دیر ٹک سکتی تھی۔"

"اور کل پھر ملنے کا وعدہ کر کے گئی ہے۔"

"کہیں اس کا باپ تمہاری طرف متوجہ نہ ہو جائے؟"

"اس کا بھی بندوبست ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایلیزا کی کار میں کیسٹ ریکارڈر کی دریافت کی کہانی سنا ڈالی۔

"قدرت نے تمہیں بال بال بچایا ہے۔" وہ خوابگاہ کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ کیسٹ اس تک پہنچ جاتا تو شاید کل ہی وہ تم پر بھی ہاتھ ڈال دیتا۔"

"ایلیزا اس سے بہت زیادہ بدظن ہے مگر بنیادی طور پر وہ بھی یہودی ہے اور اس کی ساری ہمدردیاں اسرائیل کے ساتھ ہیں۔"

"ہونی ہی چاہئیں۔" وہ بولا۔ "اسرائیل سے ہمدردی اور عربوں سے نفرت دو متضاد چیزیں ہیں اگر وہ اسرائیل کی ہمدرد ہے تو ہمیں اس سے کوئی پرخاش نہ ہونی چاہیئے۔"

میں داہنے ہاتھ سے ہولے ہولے اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔ وہ خاصی معقول بات کہہ رہا تھا جب کہ میں ایلیزا کی زبان سے اسرائیل کے لئے اچھے الفاظ سنتے ہی اُسے دشمن شمار کرنے لگا تھا۔

پھر میں نے عبداللہ کو آہستہ آہستہ وہ تمام باتیں بتا دیں جو میرے اور ایلیزا کے درمیان ہوئی تھیں۔

"یار مجھے یہ بتاؤ۔" میرے خاموش ہوتے ہی عبداللہ بول پڑا۔

"وہ کیا؟"

"تم لڑکیوں کو شیشے میں کیسے اتارتے ہو؟"

"وہ خود ہی اتر جاتی ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔"

"یہ غلط ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "اس نے تم سے دل کی باتیں کہہ ڈالیں۔ بیاڈان کے لئے سیٹ مخصوص کرا لیا اور تمہیں گھر میں خفیہ طور پر بلانے پر بھی آمادہ ہے۔ یہ سب معمولی باتیں نہیں ہیں۔ میں شروع سے دیکھتا آیا ہوں کہ تم لڑکیوں کو زیر کرنے میں مہارت رکھتے ہو۔"

"تم جو چاہو کہہ لو۔ مگر اب مسئلہ یہ ہے کہ ابراہام پر ہاتھ کیسے ڈالا جائے؟" میں نے اسے راہ پر لاتے ہوئے کہا۔

"اسے زندہ پکڑا جائے تو کیسا رہے گا؟"

"فرانس سے باہر لے جا سکو گے اُسے؟"

"اس کی تم پرواہ نہ کرو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "بیروتی سفارت میں ترکیب بتا ہی چکا ہے۔ ایئر کارگو سے اس کا پارسل روانہ کر دیں گے۔"

"ایلیزا کے تعاون کی وجہ سے یہ کام اب بہت آسان نظر آنے لگا ہے۔ اگر وہ ایک بار بھی مجھے اپنے گھر میں آنے کا موقع دیتی ہے تو ابراہام کو اس کی خوابگاہ سے بے ہوش کر کے باہر لے آؤں گا۔"

"تم یہ بھول رہے ہو کہ ابراہام اسرائیل کے لئے نہایت اہم آدمی ہے وہ عذرا کے گھر ضرور رہ رہا ہے مگر اس مکان کے گرد خاصا مضبوط حفاظتی حصار ہو گا۔"

"وہ حصار حملہ آوروں کے لئے ہے۔ گھر کے ایک فرد کے ساتھ مل کر ہم کارروائی کریں گے تو اس میں کوئی خطرہ نہ ہونا چاہیئے۔" میں نے کہا۔

"اس بارے میں بہت احتیاط سے فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔" عبداللہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "اسے زندہ پکڑنا یقیناً بہتر ہو گا مگر خطرہ ہونے کی صورت میں اسے مار دینا بھی اسی قدر اچھا ہے۔"

"ایلیزا سے کل کی ملاقات کے بعد میں کوئی فیصلہ کن رائے دے سکوں گا۔ فی الحال ......" میں درمیان ہی میں خاموش ہو گیا کیونکہ خوابگاہ کے بند دروازے پر دستک سنائی دے رہی تھی۔

"ڈان ــــ باہر آؤ۔ کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔" مادام فے کی آواز میرے اعصاب پر بڑی طرح اثرانداز ہوئی اور میں فوری طور پر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" عبداللہ نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔ اور میں نے لاعلمی کے اظہار میں سر ہلا دیا۔

پھر عبداللہ دروازے کی اوٹ میں ہو گیا اور میں دروازہ کھولنے کے لئے تیار ہو گیا۔ دروازے کے باہر مادام فے کسی سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی یعنی آنے والا ہو بھی تھا۔ مادام فے کے ہمراہ میری خوابگاہ کے دروازے تک آ پہنچا تھا۔

دروازہ کھولنے تک مادام فے سے صبر نہ ہو سکا اور

میرٹے

اس نے مزید ایک بار دروازے پر دستک دے ڈالی۔

"میں آ رہا ہوں ذرا توقف کرو۔" میں نے کنڈی کھولنے میں دانستہ تاخیر کرتے ہوئے جھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"دونوں ہر وقت سر جوڑے رہتے ہیں۔" باہر سے مادام فے کی آسودہ آواز سنائی دی۔ شاید وہ میرے نامعلوم ملاقاتی کو میرے اور عبداللہ کے بارے میں بتا رہی تھی۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہوئے عبداللہ کا چہرہ غصے سے سرخ

...اور وہ تاؤ کھانے میں حق بجانب تھا۔ آخر اس بڑھیا کو کیا ضرورت تھی ...ے غیر کے سامنے ہماری نجی باتوں پر اتنی بے تکلفی سے اظہارِ خیال ...ا ہے۔

میں نے اچانک دروازہ کھول دیا۔ مادام فے اپنی وہیل چیئر پر سامنے ...جود تھی مگر آنے والا دروازے اوٹ میں تھا۔

وہ دراز قامت اور کشادہ جسم کا مالک تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ...بی سگریٹ دبی ہوئی تھی اور بایاں ہاتھ پہلو میں خالی جھول رہا تھا جس کا ...لب تھا کہ وہ فوری طور پر کوئی جارحانہ اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مادام فے کے چہرے پر نمودار ہونے والی استقبالیہ مسکراہٹ نے شاید ...ے میری طرف گھومنے پر مجبور کیا اور اسے پہچانتے ہی میرے دل سے ایک گہرا ...انس آزاد ہو گیا۔

"معاف کرنا ڈان میں مہمان کو تمہاری خواب گاہ کے دروازے پر لے ...آئی۔ دراصل یہ بہت عجلت میں ہیں اور مجھے معلوم تھا کہ ان سے تمہارے گہرے ...اسم ہیں۔" مادام فے خاصی لونگی خاتون تھی مگر پھر بھی اسے میزبانی کے آداب ...ے خاصی واقفیت تھی۔

"بہت اچھا کیا۔" میں نے مادام فے سے کہا اور پھر اپنے مہمان سے مخاطب ...ہوا۔ "آؤ اندر آ جاؤ۔ اس وقت تم نے کیسے زحمت کی؟"

مادام فے میرا خوشگوار ردعمل دیکھ کر اپنی کرسی لڑھکاتی ہوئی واپس جا ...چکی۔ وہ مسکراتے ہوئے میرے ساتھ کمرے میں آ گیا۔

عبداللہ اسے دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ "ارے عبدالعزیز تم؟"

"ہاں معاملہ اہم تھا اس لئے مجبوراً مجھے آنا ہی پڑ گیا۔" عبدالعزیز میری طرف ...دیکھتے ہوئے انگریزی میں بولا۔

پیرس پہنچنے پر عبدالعزیز ہی نے چارلس ڈیگال ایئرپورٹ پر میرا اور عبداللہ ...کا استقبال کیا تھا اور اسی نے عبداللہ کو جولیس گرلوی کے ملاقاتیوں کے ...بارے میں اہم معلومات بہم پہنچائی تھیں جن کی بنا پر ہم لوگ بن لیوی پر ...اور کرن سیان یا ابراہام جو ناس کا سراغ حاصل کر سکتے تھے۔ اس ...سے محض ایک ہی ملاقات ہونے کے باوجود میرے ذہن پر اس کی شخصیت ...کا خوشگوار تاثر تھا اور مادام فے تو شاید اس کی پرانی شناسا تھی کیوں کہ ...ہم لوگوں کے پیرس پہنچنے سے قبل ہی مادام فے کے ہاں ہماری ...رہائش کا بندوبست کرا لیا تھا۔

"کوئی خبر لائے ہو؟" عبداللہ بے تابانہ لہجے میں عبدالعزیز سے پوچھ ...رہا تھا۔

عبدالعزیز کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی معنی خیز مسکراہٹ گہری ہو ...گئی۔ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے اپنے اوورکوٹ کی اندرونی ...جیب سے کوئی چیز نکالنے کیلئے ہاتھ بڑھایا مگر عبداللہ نے سرعت سے روک دیا۔

"ٹھہرو اتنی جلدی نہ کرو۔" عبدالعزیز کو روک کر وہ میری طرف مخاطب ...ہوا۔ "شام کا کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

"ایلیزا سے اہم ملاقات کرنا ہے۔" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "یہ اچانک میرا پروگرام کیسے یاد آ گیا؟"

"پھر دوپہر کو تم میری شاندار دعوت کرو گے۔"

عبداللہ کے یہ الفاظ سنتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا اور میرا تمام صبر و سکون درہم برہم ہو گیا۔ "کیا خبر لائے ہو۔ جلدی بتاؤ۔" میں نے سنسنی اور ہیجان کے عالم میں عبدالعزیز کے شانے پکڑ کر اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

"پہلے وعدہ کرو۔" عبداللہ نے نعرہ لگایا۔ عبدالعزیز کوئی جواب دیئے بغیر بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"وعدہ وعدہ وعدہ۔" میں نے عبداللہ کی طرف گھومے بغیر اضطراری کیفیت میں کہا اور پھر عبدالعزیز سے بولا۔ "لاؤ، تم کیا لائے ہو ورنہ میں زبردستی تمہاری جیبیں اُلٹ دوں گا۔"

عبدالعزیز نے اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے ہلکے نیلے رنگ کا ایک لفافہ نکال کر خاموشی سے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے لفافے کے اندراج پر توجہ دیئے بغیر اندر سے رقعہ نکالا تو اس پر چھپی ہوئی سطر دیکھتے ہی خوشی کے بے پناہ جذبات سے میری حالت غیر ہو گئی۔ یک بیک میری آنکھوں کے گوشے تیزی سے نمناک ہونے لگے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود پرندوں سے بھی زیادہ ہلکا ہو کر فضا کی بیکراں وسعتوں میں اوپر ہی اوپر پرواز کرتا جا رہا ہے۔

کاغذ کا وہ رقعہ میرے ہاتھ میں بدستور کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نمی آ جانے کے باعث الفاظ دھندلا گئے تھے مگر اس ٹیلکس کے ذریعے آنے والا پیغام میرے دل کی گہرائیوں میں نقش ہو چکا تھا۔ "سیتا طرابلس میں خیریت سے ہے۔"

یہ وہ عظیم خوشخبری تھی جس کا میں مدت سے منتظر تھا۔ سیتا میری زندگی کی جملہ میراث تھی۔ جسے میں نے برسوں طویل جلاوطنی کے دوران میں حاصل کیا تھا۔ ہمالیہ کی برفانی وادیوں میں بندروں اور لنگوروں کے غول میں پروان چڑھنے والی اس وفا شعار لڑکی کو میں نے اپنی بقا کی ہولناک اور خون آشام جنگ لڑتے ہوئے حاصل کیا تھا اور اس کی بن بیاہی ماں نے اسی ہمالیہ کی سنگلاخ وادیوں میں رخصتی کے گیتوں کے بجائے اپنی بھرائی ہوئی تنہا آواز اور پُرنم آنکھوں سے اسے میرے ساتھ روانہ کیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ سیتا کی ماں سندری نے اس موقع پر اپنی یادگار کے طور پر بھونڈے پتھریلے نگ والی چاندی کی ایک بظاہر حقیر سی انگوٹھی بھی میرے حوالے کی تھی اور بعد میں اس انگوٹھی کا وہ نگ پارس پتھر ثابت ہوا تھا جس کے تذکرے صرف پرانی کتابوں میں ملتے ہیں مگر روئے زمین پر کوئی بھی اس امر کا دعویدار نہیں تھا کہ اس نے پارس پتھر دیکھا یا آزمایا ہو۔

وہ رقعہ میرے ہاتھ میں تھا۔ عبداللہ اور عبدالعزیز بھی میرے سامنے موجود تھے مگر میں ان کو فراموش کر چکا تھا۔ میں جدید دنیا، پیرس کی پرفسوں فضاؤں اور مادام فے کے پرآسائش مکان کو بھی بھول چکا تھا اور اس وقت خود کو سیتا،

سندری اور پارس پتھر کے نگ والی انگوٹھی کے ساتھ فلک بوس ہمالیہ کے فسوں خیز ماحول میں محسوس کر رہا تھا جہاں ہر لحظہ سنجارات سے بوجھل سرمئی بادل جسم کو چھوتے ہوئے گزرتے رہتے ہیں۔

"کہاں کھو گئے؟" عبداللہ کی شریر آواز نے مجھے تصور کی خوابناک دنیا سے باہر کھینچ لیا اور میں پلکیں جھپکاتے ہوئے باری باری ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

"یہ پیغام کب آیا تھا؟" میں نے عبدالعزیز سے سوال کیا۔

"شام چار بجے پیرس میں موصول ہوا تھا اور شاید نصف گھنٹے پہلے مجھ تک پہنچا تھا۔" اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس کے بارے میں تمھیں کچھ اور پتہ ہے؟" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اس ٹیلکس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"بے چارے کو بیٹھنے کو بھی نہیں کہو گے؟" عبداللہ نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

"میں کہنے سے پہلے خود ہی بیٹھ جاتا ہوں۔" عبدالعزیز یہ کہہ کر مسہری پر دراز ہو گیا۔ اس وقت وہ عبداللہ کا دوست محسوس ہو رہا تھا جب کہ پہلی ملاقات پر وہ عبداللہ کا کوئی محتاط ماتحت معلوم ہو رہا تھا۔

"اس کے بارے میں اطلاع پا کر میرے لئے خود پر قابو پانا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔" میں نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"بے قابو تو تم ہمیشہ ہی نظر آتے ہو!" عبداللہ بولا۔

میں مسکراتے ہوئے وضاحت طلب نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگا۔

"حسین اور نوجوان لڑکیوں کے معاملے میں تم ہمیشہ ہی بے قابو ہو جاتے ہو۔" عبداللہ نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات کی وضاحت کر ڈالی۔ "اور پھر سیتا تو تمھاری بیوی ہے جو طویل مدت سے تم سے ایسی بچھڑی ہوئی تھی کہ تمھیں اس کی خیریت اور ٹھکانے تک کا علم نہیں تھا۔"

"اگر تم اجازت دو تو ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھ لوں۔" عبدالعزیز نے اچانک مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"اس وقت میں سیتا کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو کے لئے تیار نہیں ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"سوال اسی کے بارے میں ہے۔ میں بھلا موضوع بدلنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر اجازت ہے۔"

"تمھاری بیوی تم سے کیسے بچھڑ گئی؟"

"خاصی احمقانہ کہانی ہے!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"پھر بھی کچھ تو پتہ چلے!"

"بعض اوقات مقدر کا لکھا پورا ہونے میں آدمی خود دیدہ دانستہ تعاون کرتا ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا تو میرے ذہن میں بنارس کے راجہ ہوٹل کے ان شب و روز کی یادیں یاد ہو گئیں جو میں نے سیتا کے فراق میں نیم دیوانگی کے عالم میں گزارے تھے۔ "میری بیوی بہت سادہ لوح اور نیک دل لڑکی ہے۔ ہندوستان میں کسی غلط فہمی کی بنا پر پولیس ہم دونوں کے پیچھے لگ گئی اور دوسری طرف زیر زمین دنیا کے کچھ لوگ ہمارے درپے ہو گئے۔ میں تو بھیس بدل کر صاف نکل جاتا مگر سیتا کے رنگ اور خدوخال کی بنا پر ہر جگہ دشواریوں سے دوچار ہوتا تھا۔ بس ایک رات میاں بیوی کی روایتی نوک جھونک کے دوران میں میں نے کہہ دیا کہ اگر میں تنہا ہوتا تو بآسانی پاکستان پہنچ جاتا۔ اس کی وجہ سے میری راہ میں مشکلات حائل ہو رہی تھیں۔ اسے میری یہ بات بُری لگی۔ اس وقت تو وہ خاموش رہی لیکن اگلی صبح وہ ہوٹل سے لاپتہ تھی اور پوری کوششوں کے باوجود اس کا سراغ نہ لگا سکا۔ اگر مجھے شبہ بھی ہوتا کہ وہ میرے تبصرے کا اتنا گہرا اثر لے گی تو میں اپنی زبان ہی نہ کھولتا مگر شاید مقدر میں اسی طرح کی مشکلات لکھی تھیں جو سامنے آ کر رہیں۔"

"واقعی عجیب کہانی ہے۔" عبدالعزیز نے کہا۔

"تلوار کے گھاؤ بھر جاتے ہیں مگر زبان کے لگائے زخم زندگی بھر تازہ ہی رہتے ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔ "کیا تمھیں یقین ہے کہ سیتا نے تمھیں معاف کر دیا ہو گا؟"

عبداللہ کے اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ سیتا کے بچھڑنے کے بعد میں ضرور اس کے فراق میں تڑپتا رہا تھا مگر مجھے اس کے ردعمل کا کوئی علم نہیں تھا۔ ویسے میرا دل ضرور گواہی دیتا تھا کہ سیتا مجھ سے بچھڑنے کے بعد ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے دل سے میری یاد نہ مٹا سکی ہو گی۔ وہ میری متلاشی رہی ہو گی اور میں اسے دوبارہ پانے کی آرزو میں دربدر بھٹک رہا تھا۔

"وہ ضدی اور لاابالی طبیعت کی مالک ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اس کا فوری ردعمل تھا۔ مجھے یقین ہے کہ بعد میں میری چاہت اس کے غصے پر غالب آ گئی ہو گی ویسے تمھیں معلوم ہے کہ اسے لیبیا لانے میں کسی قسم کا جبر تو نہیں کرنا پڑا؟"

"اس معاملے میں میں بھی اسی قدر لاعلم ہوں جس قدر تم۔" عبداللہ بولا۔ "اس سے ملنے کے بعد ہی تم کو صحیح صورت حال کا علم ہو سکے گا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ فون پر لیبیا میں اس سے بات ہو سکے؟"

"ممکن ضرور ہے مگر میں یہ خطرہ مول لینے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"اس میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"ہم لوگ اس وقت ایک بڑا خطرناک کھیل رہے ہیں۔ مقامی فون کال کے مقابلے میں غیر ملکی مواصلاتی رابطہ بآسانی سنا جا سکتا ہے۔ اگر لیبیا کے چینل پر ہمارے دشمنوں کا کوئی آدمی مامور ہوا تو ہم دشواریوں سے دوچار ہو سکتے ہیں۔"

"ایسا امکان کم ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ نہ کہو۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "لیبیا اس معاملے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے ہم لوگوں کو کرنل قذافی کی اس قدر حمایت حاصل ہے کہ ہمارے حریف لیبیا کے ہر سیاسی اور فوجی معاملے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہاں فون کرنے کا خیال تو ترک ہی کر دو۔"

"اور اگر میں چند گھنٹوں کے لئے اس سے ملنا چاہوں؟"

"تم خود مختار ہو کسی کی مجال نہیں جو تمھارے فیصلے پر اعتراض کر سکے۔" عبداللہ گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

"یہاں سے طرابلس کتنی مسافت ہے؟"

"بغیر رکے کوئی پرواز مل جائے تو تین گھنٹے ورنہ مارسیلز یا نیس رکنے والی پروازیں مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ لے لیتی ہیں۔"

"اس وقت تو پرواز مل بھی جائے تو میرا جانا ناممکنات میں سے ہے۔" میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" عبداللہ نے سوال کیا۔ "جانے کا ارادہ ہو تو ابھی طرابلس جانے والی پروازوں کا شیڈول معلوم کیے لیتا ہوں۔"

"اب سے تقریباً بیس گھنٹے بعد مجھے ایلیزا سے ملنا ہے اور آمد و رفت میں کسی طرح دس بارہ گھنٹے سے کم وقت صرف نہیں ہو گا اور پھر میرے پاس سفری دستاویزات بھی تو نہیں ہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔

"پرانے کاغذات کہاں ہیں؟"

"ڈاکٹر اسکر بیتھم کے نام پر بنے ہوئے سارے کاغذات میں نے جلا دیئے۔ اب تو ڈان فرنانڈو کے نام سے از سر نو ساری کارروائی کرنا ہو گی۔"

"اس وقت تو کچھ کرنا ناممکن ہے۔" عبدالعزیز معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "ہاں اگر تم کہیں گے تو چند گھنٹوں میں کاغذات تیار کرا دوں گا۔"

"اس کے بعد وقت بہت کم رہ جائے گا۔" عبداللہ بولا۔

"تم میرے سفر کے کاغذات مکمل کرا لو۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر عبدالعزیز سے کہا۔ "ایلیزا سے کل کی ملاقات تک تو میرا جانا مشکل ہے اس کے بعد ہی جاؤں گا۔"

"ایلیزا کون ہے؟ بار بار اس کا نام آ رہا ہے؟" عبدالعزیز نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کا پورا نام ایلیزا جوناس ہے۔" عبداللہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ایلیزا جوناس؟" عبدالعزیز نے حیرت سے دہرایا۔ "یعنی ابراہام جوناس کی بیٹی!"

"ابراہام جوناس کو تم کیسے جانتے ہو؟" عبداللہ نے تعجب آمیز لہجے میں پوچھا اور وہ ایسا کرنے میں قطعی حق بجانب تھا کیونکہ عبدالعزیز سے فرانسیسی خفیہ ادارے کے بارے میں شماریات جو نیس گریوی کے مشکوک ملاقاتیوں کی جو فہرست ملی تھی اس میں بن لیوی کا نام نمایاں تھا اور عبداللہ کو بن لیوی کی زبان سے ابراہام جوناس کی پراسرار شخصیت کا علم ہوا۔ یہ تو ممکن تھا کہ مضافاتی مویشی خانے میں جہاں بن لیوی پر تشدد کیا گیا۔ مزید دو فلسطینی موجود تھے اور انہوں نے دونوں کو ابراہام کے بارے میں بتا دیا ہو مگر عبدالعزیز کی زبان سے عذرا جوناس کا نام نکلنا میرے لئے بھی خاصی حیرت کا باعث ثابت ہوا تھا۔

"پیرس میں مختلف ناموں سے کئی متعصب صیہونی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ ان کا مقصد سماجی میل جول اور فلاحی خدمات ہوتا ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ دراصل وہ لوگ تل ابیب کی ہدایات کے مطابق اپنی عالمگیر برادری کے لئے نہایت اہم سیاسی اور معاشی فائدے حاصل کرتے رہتے ہیں۔" عبدالعزیز بتلانے لگا "اور عذرا جوناس ان تمام صیہونی تنظیموں کا سرگرم رکن ہے۔ اسی وجہ سے ہم لوگ اس پر نظر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اور اس نگرانی کا نتیجہ؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"وہ پہلی مرتبہ جتنا اہم نظر آیا بعد میں اس کی نگرانی سے ویسے نتائج حاصل نہ ہو سکے تو ہم نے نگرانی کا سلسلہ ترک کر دیا۔"

"کاش کہ تم نے ایسا نہ کیا ہوتا۔" عبداللہ تاسف آمیز لہجے میں بولا۔

"کیوں؟" عبدالعزیز نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"وہ بن حیان کا سگا بھائی ہے اور ان دنوں بن حیان اسی کے مکان پر رہ رہا ہے۔"

عبدالعزیز یہ سن کر حیرت سے اُچھل پڑا۔ "یہ کیسے پتہ چلا تم کو؟"

"مجھے نہیں۔ یہ سب ڈان فرنانڈو کو معلوم ہوا ہے۔ بن حیان یہاں ابراہام جوناس بنا ہوا ہے اور ایلیزا اس کی بھتیجی ہے۔"

"یعنی یعنی تم اس لڑکی سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو گئے؟"

"وہ اپنے باپ کی دولت اور اپنی آبرو ڈان کے قدموں میں لٹانے پر تلی ہوئی ہے۔" عبداللہ نے قہقہہ مار کر بدستور ہلکی آواز میں کہا۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہوا۔" عبدالعزیز اس بار بھی پر سخت حیران تھا۔ "تم لوگوں کو تو یہاں آئے بمشکل چند روز ہی گزرے ہیں۔"

"ایک بہت ہی معمولی واقعہ اس کامیابی کی بنیاد بنا ہے۔" عبداللہ نے کہا اور میں لاتعلقانہ انداز میں اپنے لئے سگریٹ سلگانے لگا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"ایلیزا سگریٹ نوشی کی عادی ہے مگر اپنے باپ کے سامنے سگریٹ پینے سے ڈرتی ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ نیس ایئرپورٹ پر ڈان نے اس کی درخواست پر سگریٹ پینا شروع کر دی اور وہ ڈان کے اگلے ہوئے دھوئیں کو اپنے پھیپھڑوں میں جذب کر کے اپنے نشے کی تسکین کرتی رہی۔" عبداللہ نے اس کے بعد عبدالعزیز کو پوری تفصیل سنا ڈالی۔

"بعض اوقات سرسری طور پر پیش آنے والے واقعات بھی کس قدر اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔" اس کے خاموش ہونے پر عبدالعزیز تحسین آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مگر تم نے بھی پیرس میں اس کا خوب کھوج نکالا۔"

"ایسے واقعات بھی ہر ایک ساتھ پیش نہیں آتے۔" عبداللہ بولا۔ "مجھے ہنگامہ خیز زندگی بسر کرتے اتنی عمر بیت گئی ہے مگر ایسا اتفاق میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آیا۔ ڈان کے بارے میں میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی ہے کہ اس کو عورتوں کے ذریعے خاصی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے لئے اس کی ذات میں کوئی نہ کوئی سحر ضرور پوشیدہ ہے۔"

اسی وقت کھانے کے کمرے سے برتھا کی آواز سنائی دی۔ "کھانا لگ گیا ہے۔"

ہم تینوں ساتھ ہی کمرے سے نکلے اور لذیذ کھانوں سے سجی ہوئی

میز کے گرد جا بیٹھے جہاں مادام نے اپنی وہیل چیئر پر پہلے سے موجود تھی۔

"آج کی تازہ خبریں کیا ہیں مادام؟" میں نے محض ان لوگوں کا ساتھ دینے کیلئے تلی ہوئی مچھلی اور پنیر کے چند پارچے اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے ہنس کر دریافت کیا۔

"تم سارا دن باہر گزار کر آئے ہو۔ خبریں تو تمہارے پاس ہونی چاہئیں۔" برتھا اپنی چمکدار آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے بولی۔

"مقامی زبان سے ناواقفیت نے مجھے بالکل مفلوج اور ناکارہ بنایا ہوا ہے۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "زبان جانے بغیر تو تفریح میں بھی مزا نہیں آتا۔"

"بعض لوگ تفریح کے معاملے میں زبان کے محتاج نہیں ہوتے۔" یہ تبصرہ مادام نے کیا تھا۔

"ان میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟" میں نے ایک نہایت ہی جارحانہ سوال داغ دیا۔ برتھا لوکھلا کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تم نرے بے وقوف ہو۔" مادام نے کھسیانے انداز میں ہنستے ہوئے بولی "میرا مطلب تھا تاریخی عمارات خوبصورت باغات اور دوسرے مقامات سے لطف اندوز ہونے کے لئے زبان فہمی ضروری نہیں۔ بہار کے ابر آلود موسم سے فرانس میں بھی دبی لطف اُٹھایا جا سکتا ہے جو تھائی لینڈ کے کسی قصبے میں!"

"مجھے سپاٹ چہرے اور ورم آلود سکڑی ہوئی آنکھوں سے کوئی رغبت نہیں لہٰذا تھائی لینڈ میں تو میرے لئے تفریح ہی بے معنی ہے۔"

"آخر تم چہروں پہ اتنا زور کیوں دے رہے ہو؟" مادام نے کے چڑچڑے لہجے پر عبداللہ زیر لب مسکرانے لگا۔

"تفریح کے لئے حُسن کا وجود ضروری ہے مادام۔" میں نے کہا۔

"پھر وہی رٹ لگا رہے ہو۔" اس بار وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی "آخر تمہارے سر پر لڑکیاں کیوں سوار رہتی ہیں؟"

"یہی سوال میں بھی پوچھنا چاہ رہا تھا۔" عبداللہ نے قہقہہ مار کر مادام کو اکسایا۔

"لڑکی کا ذکر کہاں سے آ گیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تو حُسن سے تمہاری کیا مراد تھی؟" مادام نے بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"حُسن موسم کا بھی ہو سکتا ہے، ماحول کا بھی اور پھر ایک چٹان یا صحرا میں اگا ہوا کوئی تنہا درخت یا کسی سانڈ کے چمکیلے سینگ بھی حُسن کا مظہر ہو سکتے ہیں حُسن کو محض لڑکیوں تک محدود کر دینا تو ظلم ہے مادام۔"

میری اس قلابازی پہ مادام نے بوکھلا گئی "تم... تم باتیں بنانے میں خاصا ملکہ رکھتے ہو۔ تم سے بحث میں جیتنا خاصا مشکل کام ہے۔"

"شطرنج میں البتہ مادام نے دیکھتے ہی دیکھتے تم کو ہرا دیں گی۔" برتھا نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔

"مادام شکست کے خوف سے میرے سامنے بساط ہی نہیں بچھاتیں!"

"رہنے دو لڑکے۔" اس بار مادام نے کا لہجہ قدرے چبھا ہوا تھا۔ "اتنی ناک اُونچی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ نہ بھولو کہ شطرنج میں نے ہی تم کو سکھائی ہے۔"

"اس کا تو میں اعتراف کرتا ہوں۔" میں نے تلخی میں اضافے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

چند سکینڈ کے لئے میز پر خاموشی چھا گئی اور اس سکوت سے گھبرا کر میرا ذہن ایک بار پھر سیتا کی طرف بھٹک گیا۔

اس کے بعد وہ چاروں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے کھانے میں مصروف رہے۔ میں ان کے لبوں کو جنبش کرتا دیکھ رہا تھا۔ ان کی آوازیں بھی سن رہا تھا لیکن میرا ذہن کہیں اور کھویا ہوا تھا میرے نزدیک انکی گفتگو بے معنی آوازوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔

کھانے اور کافی کے دور کے بعد میں اپنی خوابگاہ میں گیا تو میرے ذہن پر بیک وقت مسرت اور اُداسی کے جذبات غالب تھے۔

رات دھیمے دھیمے گزر گئی۔ اگلی صبح عبداللہ مجھے ساتھ لے کر باہر نکلا تو اخبارات کے ذریعے اندازہ ہوا کہ بحیرہ روم میں اسلحہ بردار اسرائیلی جہاز میڈوسا کی تباہی نے مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال پر شدید اور فوری اثرات مرتب کئے تھے۔

اخبارات میں میڈوسا کی ہولناک بربادی پر اسرائیلی حکومت اور افسران کے تیز و تند بیانات شائع ہوئے تھے اور ان میں اس اندیشے کا اظہار بھی کیا گیا تھا کہ جہاز کی بربادی میں فلسطینی دہشت پسندوں کی تخریب کاری کا دخل تھا مگر خلافِ معمول اسرائیل کے جنونی حکمرانوں نے فلسطینی آبادیوں پر انتقامی حملے کی کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ عبداللہ کا خیال تھا کہ اسرائیل نے تخریبی کارروائی کا قوی اندیشہ ہونے کے باوجود انتقامی کارروائی سے گریز کر کے بہت ہی مبہم طور پر اپنے خطرناک عزائم کا اعلان کیا تھا۔ شاید وہ لوگ فرانس اور یورپ کی اسلحہ کی کھلی منڈی سے بھاری پیمانے پر اسلحہ حاصل کر رہے تھے اور اپنے ایک جہاز کے اسلحے و عملے سمیت بربادی کو برداشت کر کے انہوں نے اسلحے کی اگلی کھیپوں کے تحفظ کی کوشش کی تھی۔ انتقامی کارروائی کے نتیجے میں فلسطینی حریت پسند مشتعل ہو کر مزید اسرائیلی جہازوں کو غرق کر سکتے تھے جبکہ اسرائیل کی خاموشی انھیں سوچنے پر مجبور کر دیتی کہ کہیں دوسرا جہاز برباد ہونے کے بعد اسرائیل فلسطینی مہاجرین کے افلاس زدہ کیمپوں پر آگ اور لوہے کی ہولناک یلغار کا آغاز نہ کر بیٹھے۔

ہم لوگوں نے مختصر سی خریداری اور ایک کیفے سے خورد و نوش کے بعد ایوانِ انصاف کے قریب واقع عبدالعزیز کے دفتر کا رُخ کیا۔

قدیم طرزِ تعمیر پر مشتمل ایوانِ انصاف کے قرب و جوار میں بنی ہوئی جدید عمارات میں سے ایک میں ساتویں منزل پر عبدالعزیز کا دفتر واقع تھا۔ اس کی میز پر اور دیواروں کے سہارے ہاتھ کے بنے ہوئے بیش قیمت ایرانی قالینوں کے نمونے موجود تھے جن سے پتہ چلا کہ وہ پیرس میں ایرانی قالینوں کی درآمد کا کام کرتا تھا۔

عبدالعزیز نے نہایت تپاک سے ہم دونوں کا خیر مقدم کیا اور رسمی تعارف کے تبادلے سے فارغ ہوتے ہی اپنی میز کی دراز سے ایک زنی لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"تمہاری سفری دستاویزات!" میری استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں اس نے دھیمی آواز میں کہا اور میں نے عبداللہ کا اشارہ پا کر وہ لفافہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں اُڑس لیا۔

"شاید تم نے ڈان کو اپنے کاروبار میں کچھ نہیں بتایا؟" عبداللہ نے قالین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے کھیلتے ہوئے عبدالعزیز سے کہا۔

"اوہ ہاں۔ شاید ڈان ان لوگوں سے واقف بھی ہو۔"

"کس سے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں یہاں ایرانی قالینوں کی تجارت کرتا ہوں مگر میرا بیشتر مال پاکستان سے آتا ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"تو پھر تم ایرانی قالینوں کے تاجر کیسے ہوتے؟"

"یہی تو مزے کی بات ہے۔ پاکستانی قالین ان دنوں ایرانی قالینوں سے معیار اور ڈیزائن میں کسی طرح کم نہیں اور پھر سستے بھی ہوتے ہیں مگر پاکستان کے نام پر انھیں بیچنا دشوار ہوتا ہے۔"

"گر تم تو تھوک فروشی کرتے ہو گے۔ اس میں درآمدی کاغذات تو دکھانے پڑتے ہوں گے۔" میں نے سوال کیا۔

"اس خطے میں یہی تو مزے کی بات ہے۔ ہاتھ کے بنے ہوئے قالین سستے ہونے کے باوجود اس قدر مہنگے ہوتے ہیں کہ بسا اوقات تو میں ایک قالین بھی منگواتا ہوں اور وہ سب براہِ راست گاہکوں تک پہنچائے جاتے ہیں۔"

"تم کس سے میری شناسائی کی بات کر رہے تھے؟"

"کراچی میں دستی قالینوں کا ایک برآمد کنندہ ہے جس سے میں مال منگواتا ہوں۔"

"قالین والوں سے میری کوئی شناسائی نہیں۔"

پھر عبدالعزیز بھی ہمارے ساتھ ہو لیا اور اپنا دفتر اس نے لیڈی سکریٹری کے حوالے کیا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا ایک اچھے کیفے میں لنچ کیا گیا۔ اس کے بعد ہم نے شوقین تفریح کرنے میں خاصا وقت گزار دیا۔ عبدالعزیز شوقین معلوم ہوتا تھا مگر اس نے عبداللہ سے اجازت لئے بغیر شیمپین کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"آج ہم دونوں اس ہٹ کی حفاظت کریں گے۔" روانگی سے کچھ دیر پہلے عبداللہ نے پروگرام کے بارے میں زبان کھولی۔

"کیوں؟"

"معاملہ اب بہت نازک موڑ پر پہنچ گیا ہے اور ہم تمھیں تنہا کسی خطرے میں نہیں جھونک سکتے۔" عبداللہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میرا کوئی خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"امکان یہی ہے کہ غدراجوناس کا کوئی ٹک نوار ایلیزا کا تعاقب کرتا ہو اور تم بے خبری میں کسی کے وار کا شکار ہو جاؤ۔"

"تمہاری خوشی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ورنہ اس کی ضرورت نظر نہیں آتی۔" میں نے لاپروائی سے شانے اُچکا کر کہا۔

"ڈون براہِ راست بن حیان سے بات کر کے اسے شبہ میں ڈال چکے ہیں۔ وہ لوگ تمہاری فون کالوں سے پریشان ہوں گے اور بن حیان بہت مکار آدمی ہے۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنے حفاظتی حصار میں کوئی دراڑ برداشت نہیں کر سکے گا۔ مجھے تو کوئی تعجب نہ ہو گا اگر اس نے ایلیزا تو درکنار جوناس کے ملازمین کی نقل و حرکت کی بھی نگرانی شروع کرا دی ہو۔"

"احتیاط اچھی چیز ہے۔ اگر ایک خطرہ تمہارے ذہن میں سر اُبھار رہا ہے تو بہتر ہے کہ اس کا پیشگی تدارک کر لیا جائے۔"

وہاں سے نکلتے ہوئے ہمارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ عبداللہ کو عبدالعزیز کے ہمراہ اسی کی کار میں میرے پیچھے روانہ ہونا تھا اور ایک بار دریائے سین کے کنارے میرا اور ایلیزا کا عشرت کدہ دیکھنے کے بعد وہ دونوں اپنے لئے محفوظ مورچوں کا انتخاب کر لیتے۔

میں نے منزل کی طرف روانگی کے لئے دریائے سین کے داہنے یا شمالی کنارے کے ساتھ بنی ہوئی اس عظیم الشان شاہراہ کا انتخاب کیا جو امریکہ کے مقتول صدر کینیڈی کے نام سے موسوم ہے۔ وہ دونوں کسی پیدائشی ہمزاد کی طرح ایک مقررہ فاصلے سے میرے تعاقب میں بڑھتے آ رہے تھے۔

آطیوئل کے پل سے ذرا آگے دریا کے پُرسکون شفاف پانی کے کنارے دور تک پھیلے ہوئی چوبی اور پتھریلے مکانوں کا آغاز ہوتے ہی میں نے دانستہ کار کی رفتار سست کر دی۔ تاکہ وہ دونوں میرا ہٹ دیکھ سکیں۔

جب میں نے اس خوبصورت ہٹ کے سامنے کار پارک کی تو عقب نما آئینے میں عبدالعزیز کی کار تیزی سے آگے جاتی نظر آئی اور میں نے اطمینان کے ساتھ ہارن بجا کر کار کی نشست چھوڑ دی۔ کار کے دروازے مقفل ہونے سے پہلے ہی ہٹ کا فرانسیسی نژاد محافظ ہارن کی آواز سن کر پیشہ ورانہ مستعدی کے ساتھ باہر آ گیا۔

اس نے سر کو خم دے کر مجھے خوش آمدید کہا اور پھر میرے داخلے کیلئے بجری کی روش پر راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ ایلیزا کی کار موجود تھی مگر خدمت گار سے گفتگو جاری رکھنے کی نیت سے میں نے سوال کیا۔ "وہ خاتون نہیں آئی تھی؟"

"وہ نہیں آئے گی موسیو!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟" میں دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے اس کی طرف گھوم پڑا۔

"وہ صبح گیارہ بجے آئی تھی اور ہدایت دے گئی تھی کہ آپ آئیں تو میں آج کی ملاقات کی منسوخی کی اطلاع دے دوں۔" اس نے نظریں جھکا کر ایسے تاسف آمیز لہجے میں کہا جیسے وہ ایلیزا کی عدم موجودگی کا خود کو ذمہ دار تصور کرتا ہو۔

"مگر کیوں؟" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"میں کیا عرض کر دوں موسیو!" وہ لجاجت سے بولا "مجھے جو حکم دیا گیا وہ میں نے بجنسہٖ تم تک پہنچا دیا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" میں اس کا ہاتھ تھام کر داخلی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اضطراری لہجے بولا۔ ایلیزا کی آمد کی تنسیخ کی اطلاع میرے لیے شدید کوفت اور پریشانی کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایسی لاابالی اور ضدی لڑکی معلوم ہوتی تھی کہ کسی چھوٹے موٹے معاملے کی وجہ سے اپنی تفریح غارت کرنے

پر ہرگز تیار نہ ہوتی۔ نہ جانے وہ کن حالات سے دوچار ہوئی تھی کہ اسے یہ کڑوا فیصلہ کرنا پڑ گیا۔

"وہ تنہا آئی تھی؟" میں نے نشست گاہ میں پہنچتے ہی اس سے سوال کیا۔

"ہاں موسیو۔"

"کچھ پریشان معلوم ہوتی تھی؟"

"ہاں اور عجلت میں بھی معلوم ہوتی تھیں۔"

"آئندہ پروگرام کے بارے میں کچھ بتایا؟"

"جی نہیں۔" اس نے غمناک انداز میں اپنے سر کو جنبش دے کر کہا۔

"ایسی کوئی بات کہی ہوتی تو میں گفتگو کا آغاز اسی خوشگوار پیغام سے کرتا۔"

"اگر وہ پریشان اور عجلت میں تھی تو خود یہاں کیوں آئی۔ فون پر بھی تم کو ہدایت دے سکتی تھی۔" میں نے تپائی پر رکھے ہوئے فون کو دیکھ کر کہا۔

"اس ہٹ میں ننانوے فیصد جوڑے فرضی ناموں سے قیام کرتے ہیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اور پھر تم دونوں تو کل پہلی بار آئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ مادام نے سوچا ہو کہ میں اس کی آواز نہ پہچان سکوں اور پیغام کو اہمیت نہ دوں لہٰذا وہ خود ہی دوڑی چلی آئی۔"

"اچھا تم باہر ٹھہرو۔ میں کچھ دیر رکوں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ اسے زیادہ منہ لگایا تو وہ تکلیف دہ حد تک بے تکلفی پر اتر آئے گا۔

وہ نہایت سعادت مندی سے باہر نکل گیا اور میں فون ڈائرکٹری سے عذرا جوناس کے مکان کا فون نمبر تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

پہلی ہی گھنٹی پر دوسری جانب سے ریسیور اٹھایا گیا اور میرے کانوں میں عذرا جوناس کی غراتی ہوئی کرخت آواز آئی اور میں نے فوراً ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے اٹھ کر ریفریجریٹر سے وہسکی کی بوتل نکالی اور ایک گلاس فوری طور پر معدے میں انڈیلنے کے بعد بوتل اور گلاس لے کر فون کے قریب آبیٹھا۔

میں سگریٹ اور شراب نوشی کے دوران میں کافی دیر تک ایلیزا کے اچٹ جانے کے اسباب پر غور کرتا رہا۔ مگر میرے ذہن میں کوئی بات نہ آسکی۔ وہ مجھ سے عذرا اور ابراہام کی لاعلمی میں ملی تھی اور یہ محض حسن اتفاق کی کرشمہ سازی تھی کہ میں ایلیزا کی کار میں خفیہ ٹیپ ریکارڈر کا سراغ لگا کر ٹیپ میں بھرے ہوئے اپنے اور ایلیزا کے قابل گرفت مکالمے مٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا لہٰذا یہ امکان بھی نہیں رہا تھا کہ عذرا کو اپنی بیٹی کی مجھ سے ملاقات کا علم ہو گیا ہو اور اس نے ایلیزا سے بازپرس کی ہو جس کے نتیجے میں ایلیزا نے مجھ سے وقتی کنارہ کشی اختیار کرنے میں عافیت سمجھی ہو۔

ہٹ پر محض پیغام دینے کے لئے ایلیزا کی آمد بہت عجیب معلوم ہو رہی تھی مگر دوسری طرف بھی ثابت ہو رہا تھا کہ پروگرام کی تنسیخ میں میری ذات سے ایلیزا کی ناراضگی کا دخل نہیں تھا۔ پچھلی رات ہم دونوں نہایت خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں رخصت ہوئے تھے اور اگر وہ مجھ سے بدظن ہی ہو گئی ہوتی تو اس کے لئے بہتر راستہ یہ تھا کہ اطلاع دیئے بغیر غائب ہو جاتی اور میں طویل انتظار سے اکتا کر اس کی طرف سے از خود مایوس ہو جاتا۔

بن حیان کے خلاف فیصلہ کن آخری معرکے میں ایلیزا کا کردار نہایت اہم تھا اور اس کا تعاون کھو دینے کے بعد ہمارے پروگرام میں خاصی تاخیر ہو سکتی تھی۔

خاصی دیر کے انتظار کے بعد میں نے ایک بار پھر ایلیزا کو فون کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ مجھے موہوم سی امید تھی کہ شاید عذرا جوناس گھر میں کہیں مصروف ہو اور اس بار ایلیزا کو بذات خود فون وصول کرنے کا موقع مل جائے۔

پہلی گھنٹی پر جواب نہ آیا تو میرے دل کو خاصی ڈھارس ہوئی۔ اس تاخیر کا مطلب تھا کہ عذرا جوناس فون کے قریب نہیں تھا۔

تیسری گھنٹی پر ریسیور میں ایلیزا کی ترنم ریز آواز سنائی دی تو یک بیک میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔

"میں ڈان فرنانڈو بول رہا ہوں ایلیزا۔" میں نے خوشی سے سرشار محبت آمیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"کون؟" اس نے سرد اور جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

"ڈان فرنانڈو۔" میں نے ماؤتھ پیس منہ کے قریب لا کر قدرے اونچی آواز میں کہا۔ اس کا اجنبی لہجہ سن کر مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ میرا نام صحیح طور پر نہیں سن سکی تھی ورنہ اتنی سرد مہری اختیار نہ کرتی۔

"میں تمہیں نہیں جانتی۔" اس کا لہجہ بدستور سپاٹ اور اجنبی تھا۔ "لڑکیوں سے دوستی پیدا کرنے کا یہ طریقہ فرسودہ ہو چکا ہے۔ اگر تم نے دوبارہ فون کرنے کی جسارت کی تو میرا باپ پاتال میں بھی تمہیں کتوں سے نچوائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور میں حیرت اور کوفت کے عالم میں ریسیور کو یوں گھورنے لگا جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

میں نے ایلیزا کی آواز واضح طور پر پہچانی تھی مگر میرے لئے یہ معمہ بن گیا تھا کہ اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کر دیا جبکہ اس کا باپ غالباً فون کے آس پاس موجود نہیں تھا۔

تھوڑی دیر تک اس پیچیدہ معاملے پر غور کرنے میں نے فیصلہ کیا کہ میرا ہٹ میں رکے رہنا بالکل بے سود ہے۔

میں وہاں سے خاموشی سے روانہ ہوا اور ہٹ کو شاہراہ سے ملانے والی پختہ پگڈنڈی عبور کر کے شاہراہ پر کار روک دی۔

عبداللہ یا عبدالعزیز کا دور تک پتہ نہیں تھا اور نہ ہی عبدالعزیز کی کار نظر آ رہی تھی مگر چند ثانیوں بعد میں نے ایک دوکان سے عبداللہ کو تیزی سے باہر آتے دیکھا۔ وہ بظاہر میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ساتھ گاڑی میں کوئی اور بھی موجود ہے۔

میں نے ہارن بجا کر فضا میں ہاتھ لہرایا تو عبداللہ نے فوراً ہی جواب دیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا میری طرف آ گیا۔

"عبدالعزیز کہاں ہے؟"

"وہ ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لے کر دریا کی سمت سے تمہارے ہٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ مگر وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ واپسی کی تیاری کرو۔" میں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

"تو کیا وہ نہیں آئے گی؟" عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "وہ دن میں خود یہاں آ کر ہٹ کے کیئر ٹیکر کو بتا گئی تھی کہ شام میں وہ نہ آسکے گی۔"

عبداللہ کے چہرے پر یک بیک مایوسی عود کر آئی۔ "ذرا انتظار کرو۔ میں عبدالعزیز کو روانگی کے لئے کہہ آؤں۔"

اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی۔ وہ دریا کی جانب سے تنہا ہی چلا آ رہا تھا۔

"وہ تھوڑی دیر میں نکل جائے گا، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ میرے پہلو والی نشست سنبھالتے ہوئے بولا۔

"کل کی ملاقات تو بہت حوصلہ افزا تھی۔ آج اسے کیا ہو گیا؟" کچھ دیر توقف کے بعد عبداللہ نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایلیزا سے فون پر ہونے والی گفتگو سے بھی آگاہ کر دیا۔

"غالباً تم دونوں کی تمام تر احتیاط کے باوجود عذرا جوناس کو کل کی سرگرمیوں کی معرفیات کی بھنک مل گئی ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"ہو سکتا ہے کہ عین روانگی کے مرحلے پر کسی نے تم دونوں کو دیکھ لیا ہو اور اس اطلاع کی بنا پر عذرا نے ٹیپ کا جائزہ لیا ہو گا تو وہ صاف تھا لہٰذا اس نے براہ راست اپنی بیٹی سے بازپرس کی ہو گی۔"

"اگر عذرا جوناس کے آدمی ایلیزا پر اتنی ہی کڑی نگرانی رکھتے ہیں تو اس صورت میں اس ہٹ سے زندہ سلامت واپس نہ لوٹ رہا ہوتا۔"

"ہٹ تو ابھی تک ان کی نظروں میں نہ آیا ہو گا۔"

"تم بھول رہے ہو کہ اپنے باپ سے مفروضہ جھڑپ کے بعد ایلیزا آج صبح ہٹ پر آئی تھی اور اس کا پیچھا کرنے والے نے ہٹ بھی دیکھ لیا ہو گا۔"

"وہ عذرا جوناس کی بیٹی ہے اور اسے اچھی طرح جانتی ہے، ہو سکتا ہے وہ اپنے نگران کو جل دے کر ہٹ پر پہنچی ہو۔"

"اسی لئے کہتے ہیں کہ بعض اوقات ایک اور ایک گیارہ بن جاتے ہیں۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت مسرت آمیز لہجہ میں کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہاری اداسی تو دور ہوئی۔" وہ بولا۔ "بھلا کیا بات ہے تمہارے ذہن میں؟"

"تمہارا خیال درست ہے کہ ایلیزا نگرانی کرنے والے کو چکمہ دے کر آئی اور اسی سے اس کے ناقابل فہم رویئے کا جواز بھی ملتا ہے!"

"وہ کیسے؟"

"اس کے گھر میں یقینی طور پر ایک ہی نمبر پر دو متوازی ٹیلیفون موجود ہوں گے کیونکہ اس سے گفتگو کے دوران میں ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ ایلیزا کی آواز دھیمی ہو گئی تھی اور اس نے محض اسی وجہ سے فون پر مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا کہ کہیں دوسرے فون پر اس کا باپ میری اور اس کی باتیں نہ سن رہا ہو۔"

"ایلیزا سے تمہاری ملاقات بہت ضروری ہو گئی ہے!"

"مگر اس سے رابطہ قائم کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔"

"کوئی نہ کوئی صورت تو نکالنا ہو گی ورنہ بن حیان بالکل صاف نکل جائے گا اور ہم محض کف افسوس ملتے رہ جائیں گے۔"

کافی بحث کے بعد طے پایا کہ فوری طور پر عذرا جوناس کے مکان کی خفیہ نگرانی شروع کرا دی جائے اور جوں ہی ایلیزا باہر نکلے تو اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر عذرا کا کوئی شخص ایلیزا کے پیچھے لگا ہو تو اس کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔

مجھے ایلیزا کے نہ ملنے کی وجہ سے شدید کوفت ہوئی تھی اور دوسری طرف سیتا کا خیال مجھے بار بار ستا رہا تھا لہٰذا میں نے وہ شام کسی پرہجوم تفریح گاہ میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور عبداللہ مجھے گرانڈ پیلس کے پاس چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔

وہ عذرا جوناس کے مکان بلکہ ایلیزا کی نگرانی کا انتظام کر کے آٹھ بجے ایک بیلے تھیٹر میں ملنے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔

تھوڑی دیر کی بے مقصد آوارہ گردی کے بعد میں اوسط درجے کے ایک بار میں داخل ہو گیا۔ جہاں مدھم برقی روشنی میں تیز سُروں والی ہنگامہ خیز مغربی موسیقی کی دھیمی سی گونج پھیلی ہوئی تھی۔

بار کے وسیع ہال کی بیشتر میزیں آباد تھیں البتہ کاؤنٹر کے سامنے لگے ہوئے اونچے اسٹول خالی پڑے ہوئے تھے۔ بس کیشئر کے سامنے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی اپنے گلاس سے شغل کرنے کے ساتھ کیشئر سے بھی باتیں کرتی جا رہی تھی۔

میں نے جیسے ہی اپنا اسٹول سنبھالا گنجے سر والا اخرانٹ بارٹنڈر تیزی سے میری طرف لپکا اور مسکراتے ہوئے سر کو قدرے خم دے کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"ڈبل اسکاچ مع سوڈا۔" میں نے اپنے دونوں بازو کاؤنٹر پر پھیلا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمائش کی اور وہ مستعدی سے الماریوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے اپنی آنکھوں کے گوشوں سے دیکھا کہ وہ لڑکی کیشئر سے باتیں ختم کر کے میری طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

بارٹینڈر نے میرے سامنے پیگ رکھا تو اسی وقت دو ویٹر گاہکوں کی فرمائشیں لے آئے۔ وہ ان سے فارغ ہوا تو لڑکی نے اشارے سے اسے بلایا اور اس کی طرف جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہا۔ جس کا جواب بارٹینڈر نے سر کے اشارے سے اثبات میں دیا۔ اس دوران میں بارٹینڈر کا ایک

مددگار ان دونوں کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔

میں نے اپنے پیمانے میں موجود آتشیں سیال کو چند لمبے لمبے گھونٹ لے کر اپنے معدے میں اتار لیا اور طور کے پیمانے کو ساگوان کے کاؤنٹر پر آہستہ سے پٹخ کر بارٹینڈر سے کہا۔ "ایک اور ڈبل۔"

"اور ایک شیری۔" میرے عقب سے ایک شوخ نسوانی آواز آئی۔

میں نے تیزی کے ساتھ اسٹول کو گردش دینا چاہی مگر اس وقت تک وہ میرے برابر والے اسٹول پر بیٹھ چکی تھی۔

"ہیلو بوائے۔" نگاہیں چار ہوتے ہی اس نے مسکرا کر معصوم لہجے میں کہا اور غیر ارادی طور پر میں بھی مسکرا دیا۔

سیاہ آنکھیں، گھنے سرخ بال، گداز جسم، تیکھے خدوخال، بھرے بھرے رخسار اور ادھ کھلے تپلے تپلے ہونٹوں کے ساتھ وہ خاصی دلکش اور معصوم نظر آ رہی تھی۔

"شیری پیئو گی؟" میں نے سوال کیا۔

"وہسکی لی تو شاید تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔" وہ اپنا سیاہ پرس کاؤنٹر پر رکھ کر اپنے لیے سگریٹ جلاتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟" میں نے تو ابھی ابتدا کی ہے۔"

"میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم نے پہلے پیگ کا کیا حشر کیا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "مجھے ایسے لوگ پسند ہیں جو شراب کو پانی سمجھ کر پیتے ہیں۔"

"اسی بار میں ملازم ہو؟"

"فکر نہ کرو، میں تمہارا بل بڑھوانے نہیں آئی ہوں۔ تمہیں تنہا دیکھا تو دل بہلانے کے خیال سے ادھر آ گئی۔" وہ میرا طنز سمجھ کر بولی۔

اسی وقت بارٹینڈر میرے لیے وہسکی اور اس کیلئے شیری لایا۔

"تمہاری فیس کیا ہے؟"

"جو چاہو دے دینا۔" وہ بھرے پیمانے سے اپنا گلاس ٹکراتے ہوئے ہولے سے بولی۔

"میں بعد کے جھگڑے کا قائل نہیں ہوں۔"

"میں خود صلح پسند ہوں، تمہیں صرف ایک گھنٹہ دے سکتی ہوں۔" وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

"پھر تو یہاں وقت ضائع کرنا بے سود ہے۔"

ہم دونوں نے خاموشی سے اپنے گلاس خالی کیے اور میں نے پرس نکال کر بل کی رقم طشتری میں ڈال دی۔ پرس جیب میں رکھتے ہوئے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ وہ لڑکی میرے پرس میں موجود خاصی رقم دیکھ چکی تھی۔

باہر آ کر اسی کے مشورے پر ہم نے ایک اقامتی ہوٹل کا رخ کیا۔ کاؤنٹر پر ساری گفتگو لڑکی نے ہی کی جو فرنچ میں ہونے کے باعث میری فہم سے بالاتر تھی پھر اس نے پہلی بار میرا نام دریافت کیا جو کاؤنٹر کلرک نے نوٹ کر لیا اور وہ کنجی لے کر میرے ساتھ ہو لی۔

تیسری منزل پر راہداری میں موجود فلور اٹینڈنٹ نے چابی دیکھ کر کمرے تک ہماری راہنمائی کی اور پھر ہم وہیں محفل سجا لی۔

وہ خوبصورت باتیں کرنے میں خاصی مہارت رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ وقت اس قدر غیر محسوس طریقے پر گزرا کہ مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا اور وہ سر ہڑ بڑا کر اٹھ گئی۔ اسے میں نے محض پچاس فرانک دیئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مزید مطالبہ کرے گی مگر اس کی پیشانی پر بل بھی نہ آیا۔ اور وہ اپنا حلیہ درست کر کے رخصت ہو کر نکل گئی۔

میری رسٹ واچ میں سوا سات بجے تھے اور عبداللہ سے ملاقات میں پون گھنٹہ باقی تھا۔ لہٰذا میں مزید کچھ دیر وہیں کام کرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد میں باہر نکلا تو یوں محسوس ہوا جیسے ڈیسک کے پیچھے بیٹھا ہوا فلور اٹینڈنٹ میرا ہی منتظر تھا۔

اس نے لپک کر میرا استقبال کیا اور شکستہ انگریزی میں دریافت کیا کہ میں ہوٹل میں مزید قیام کروں گا یا جاؤں گا۔

میری روانگی کی اطلاع پا کر اس نے مجھے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ویٹر کے حوالے کیا جو مجھے ساتھ لے کر نیچے کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔

کلرک نے نہایت مستعدی کے ساتھ حساب تیار کر کے بل میرے سامنے رکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس مردود نے ہوٹل میں بمشکل ایک گھنٹہ قیام کے سات سو اسی فرانک بنائے تھے۔

کلرک کی انگریزی نہایت ناقص تھی۔ میں نے بل کی رقم پر احتجاج کیا تو اس نے مجھے منیجر سے بات کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے ایک شخص کے حوالے کر دیا۔

منیجر کا کمرہ ہوٹل کے ایک پرسکون گوشے میں واقع تھا اور وہاں میز کے پیچھے جو شخص براجمان تھا وہ اپنے چہرے اور آنکھوں سے خاصا سفاک اور متکبر نظر آ رہا تھا۔

مجھے لانے والے نے فرنچ میں جلدی جلدی کچھ کہا اور فوراً واپس چلا گیا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ آتے ہوئے منیجر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ملا تھا مگر مجھے لانے والے نے باہر نکل کر اسے احتیاط سے بند کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" منیجر نے مجھے بیٹھنے کیلئے کہے بغیر اکڑ کر خشک لہجے میں سوال کیا۔ میں نے ڈھٹائی کے ساتھ اس کے سامنے کرسی سنبھال لی اور بل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "صرف ایک گھنٹے کے قیام کے لیے مجھ سے سات سو اسی فرانک کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو سراسر ناجائز ہے۔"

"تمہیں کمرے کی چابی لینے سے پہلے دام معلوم کرنے چاہئے تھا۔ اب تو تمہیں یہ رقم ہر حالت میں ادا کرنا ہو گی۔" وہ سرد نظروں سے میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"میں اگر اعلیٰ درجے کے ہوٹل کا بھی رخ کرتا تو وہاں بھی اتنا بل نہ بنتا۔"

"بحث مت کرو۔" وہ تحکم آمیز کرخت لہجے میں بولا۔ "یہ تمہارا بل ہے جو تمہیں ادا کرنا ہے ورنہ میرے آدمی تمہاری جیبیں خالی کر کے تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

"یہ صریحاً دھاندلی ہے۔"

"سنو مسٹر!" وہ سخت اور تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ "تم ایک شریف لڑکی کو بہلا پھسلا کر اس ہوٹل میں لائے تھے اور وہ بڑی مشکل سے تمہارے چنگل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی ہے اگر تم نے بل کی رقم ادا کرنے میں پس و پیش سے کام لیا تو میں زبردستی یہ رقم تم سے وصول کر لوں گا کیونکہ تم اس کی ادائیگی کی استطاعت رکھتے ہو اور پھر وہ لڑکی بھی پولیس کے سامنے تمہارے ظلم کی کہانی سنائے گی لہٰذا بات بڑھانے کی کوشش نہ کرو۔"

وہ بلیک میل کی کھلی دھمکی تھی۔ میرا جی تو چاہ رہا تھا کہ چند ہی گھونسوں میں اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دوں مگر میں اس وقت خاصی مخدوش صورتحال سے دوچار تھا۔ دنیا کے مختلف ممالک کی جبری سیاحت کے دوران وہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اس قدر توہین آمیز انداز میں بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ شاید بھولے بھٹکے سیاحوں کو لوٹنا اس ہوٹل کا وطیرہ تھا ورنہ منیجر مجھ سے اس قدر دوٹوک انداز میں بدکلامی کی ہمت نہ کرتا۔ اسے یہ بھی یقین رہا ہو گا کہ میں لٹنے کے باوجود پولیس کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ ایسی صورت میں وہ اس شریف لڑکی کو میرے خلاف گواہی میں پیش کر دیتا جو مجھ سے محض پچاس فرانک لے کر ہنستی کھیلتی چلی گئی تھی۔

مجھے یہ یقین کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ بار میں میرے پرس کی رقم دیکھنے کے بعد ہی... لڑکی نے مجھے ٹھگنے کا منصوبہ بنا لیا تھا اور ہوٹل کو ادا کیے جانے والے تاوان میں اس کا خاصہ حصہ رہا ہو گا۔

میں نے اپنا پرس نکالا تو اس میں کل سات سو چوالیس فرانک موجود تھے جو میں نے بل کے ساتھ منیجر کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہ تو کم ہیں۔" منیجر نے رقم گننے کے بعد کہا۔

"میرے پاس بس یہی ہے۔" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بگڑے لہجے میں اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

"خیر تھوڑی سی رقم کی بات ہے۔ آئندہ آؤ تو ادا کر دینا۔" وہ رقم دراز میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ پیسے کی تنگی ہو تو پیرس میں قدم بھی عیاشی کے بارے میں نہ سوچنا ہر ایک میری طرح نرم دل نہیں ہوتا۔"

"مشورے کا شکریہ۔" اس بار میں اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہ رکھ سکا اور ہاتھ اٹھا کر اس کے سامنے سے بل اٹھانے لگا۔

"میں نے پھرتی سے بل پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔" اب تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے تمہیں۔"

"اس کے سہارے لوگوں کو یہ یقین تو دلا سکوں گا کہ میں نے بھی پیرس میں عیاشی کرنے کی ہمت کی تھی۔"

"اس وقت تم نے پورے پیسے ادا نہیں کیے بعد میں باقی رقم دینے آؤ گے تو بل بنوا دوں گا۔" اس نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

میں نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا اور پھر ایک لفظ بھی کہے بغیر اس ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں پیشہ ور عورتوں کے بارے نفرت اور انتقام کا ایک جوالا مکھی انگڑائیاں لے رہا تھا۔

آٹھ بجے میں مقررہ مقام پر پہنچا تو عبداللہ پہلے تھیٹر کے باہر منتظر تھا۔

"کیا کر آئے؟" میں نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"بہت کچھ کر آیا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"چہرے سے تو بے زاری ٹپک رہی ہے۔"

"آج میرے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے اور مجھے اس شہر سے نفرت ہو گئی ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تفصیل تو بتاؤ یار۔"

اور میں نے اسے ہوٹل میں اپنے لٹنے کا واقعہ سنا ڈالا۔

"بعض ہوٹلوں میں سیاحوں کو اسی طرح لوٹا جاتا ہے مگر تم فکر نہ کرو، ہم اس حرام زدے سے تمہاری توہین کا بھرپور بدلہ لیں گے۔"

"وہ ضمنی معاملہ ہے، اصل قصے کا کیا ہوا؟" میں نے اس کے ہمراہ پہلے تھیٹر کی انتظار گاہ میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"جوناس ولا اس وقت کسی قلعے کی طرح سخت محاصرے میں ہے اور اس علاقے میں کوئی مشکوک آدمی نہیں پھٹک سکتا۔"

"کیا سرکاری طور پر حفاظت کا انتظام کیا گیا ہے؟"

"نہیں جوناس ولا چار مکانوں کے ایک بلاک میں واقع ہے اور بلاک کے اطراف میں میں نے کم از کم پانچ ایسے سادہ پوش آدمی دیکھے جو غالباً پوری طرح مسلح ہیں اور شاید کسی فلسطینی کو تو دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔"

"پھر تم کیسے بچ نکلے؟"

"میں فلسطینی ہونے کے باوجود خدوخال اور لب و لہجے سے فرنچ معلوم ہوتا ہوں، یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے کسی کی ڈیوٹی لگانے سے پہلے خود جائزہ لینے کا فیصلہ کیا ورنہ بلا وجہ ہمارا ایک آدمی ان کے ہاتھوں مارا جاتا۔"

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا!"

"پوری بات سنتے جاؤ۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس مخدوش صورت حال کے بعد میں نے وہاں دو آدمی لگا دیئے ہیں کیونکہ اس محلے سے نکاسی کے دو ہی راستے ہیں۔ وہ دونوں مکان سے محفوظ فاصلے پر ایسی جگہ رہیں گے جہاں وہ پانچوں محافظ ان کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں اس علاقے سے نکلنے والی کوئی گاڑی ان کی نظروں سے نہ بچ سکے گی۔"

"اس کہر آلود موسم میں شیشے چڑھا کر سفر کیا جائے تو رات کے وقت کوئی بھی کار کے اندر کا جائزہ نہیں لے سکتا پھر تمہارے آدمی عذرا، ابراہام یا ایلیزا کو کیسے پہچانیں گے۔ انھوں نے تو ان کی صورت بھی نہ دیکھی ہو گی۔"

"فی الحال وہ آدمیوں کی بجائے گاڑیوں کے نمبر پر نظر رکھیں گے۔ میں نے جوناس کے گھر موجود دونوں گاڑیوں کے نمبر دیکھ لیے ہیں۔ ان میں سے جو بھی گاڑی باہر نکلی، میرے آدمی اس کا پیچھا کرنے والے محافظ کو ختم کر کے گاڑی کے مسافر یا مسافروں کو گھیرنے کی کوشش کریں گے۔"

"ہر راستے پر تمہارا صرف ایک آدمی ہے۔ اگر وہ کئی ہوئے تو تنہا شخص ان

کا کیا بگاڑ سکے گا۔" میں نے سوال کیا۔

"وہ دونوں سمجھدار ہیں۔ کامیابی کا امکان دیکھے بغیر عجلت میں کوئی اوچھا وار نہیں کریں گے اور کل مزید چھ مقامی افراد ان سے جا ملیں گے۔"

"وہ مقامی افراد تنظیم کے اراکین ہیں؟"

"نہیں کرائے کے قاتل۔ ان کی مدد کے بغیر ہم اپنے محدود وسائل سے بن حیان کو شاید زیر نہ کر سکیں گے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

عبداللہ مجھے بیلے ڈانس دکھانے پر مصر تھا مگر میرے ذہن پر اتنا بوجھ طاری تھا کہ طبیعت کسی بھی تفریح کی طرف مائل ہی نہ ہوتی تھی لہٰذا ہم دونوں کھانا کھانے کے بعد گھر روانہ ہو گئے۔

"ایک اور بھی ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔" واپسی کے سفر کے دوران میں عبداللہ نے طویل سکوت کے بعد کہا۔

"کس بارے میں؟"

"جوناس ولا میں گھسنے کا منصوبہ ہے۔" اس نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"اس سے اچھی صورت اور کیا ہو گی۔" میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارا ایک لڑکا ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم ہے۔ اس کی مدد سے ہم تاروں کے برقی نظام میں گڑبڑ کر کے جوناس کے فون میں خرابی پیدا کر سکتے ہیں اور پھر اس لڑکے کے ہمراہ سرکاری گاڑی میں ٹیلی فون کی مرمت کے بہانے جوناس ولا میں داخل ہو سکتے ہیں۔"

"اور اگر اس نے شکایت درج نہ کرائی؟"

"ضروری نہیں کہ وہی شکایت کرے۔ مسلسل جواب نہ ملنے پر اس کا کوئی دوست یا شناسا بھی محکمہ کو متوجہ کر سکتا ہے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ جوناس محکمے سے تصدیق کیے بغیر ہمیں اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دے کیونکہ آج کل وہ بہت محتاط ہو گا۔"

"اس کا بھی تدارک کیا جا سکتا ہے۔" عبداللہ شاید ذہنی طور پر پورے منصوبے کی جزئیات طے کر چکا تھا۔ "اس لڑکے کی ڈیوٹی کل صبح شروع ہو گی۔ ڈیوٹی کے آغاز سے پہلے ہم اپنا کام کریں گے پھر ہم دونوں میں سے کوئی متعلقہ نمبر پر فون کر کے شکایت درج کرا دے گا۔ اس سے آگے اس لڑکے کا کام ہو گا کہ وہ اپنے سپروائزر کو شبہ کا موقع دیئے بغیر جوناس ولا کی شکایت دور کرنے کے لئے خود روانہ ہو جائے۔"

"یہ صورت قابل عمل ہے۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "اگر ہم مناسب ہتھیار لے کر ایک بار بحفاظت جوناس ولا میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تو بن حیان کو یرغمال بنا کر ہم بڑی آسانی سے واپس ہو سکیں گے۔"

مادام فے کے پہنچنے کے کچھ وقفے بعد عبداللہ نے وہیں سے فون پر اس شخص سے رابطہ قائم کیا جو ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم تھا۔

چند منٹ کی گفتگو کے بعد اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں اطلاع دی کہ سارا کام حیرت ناک طور پر سہل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ لڑکا سینٹ جرمین کے علاقے سے ہی وابستہ تھا اور اپنے دفتر میں کسی کو شبہ کا موقع دیئے بغیر آسانی سے جوناس ولا جا سکتا تھا۔

اگلے دن کا آغاز ہمارے لئے معمول سے پہلے ہی ہو گیا۔ عبداللہ اس لڑکے کو جوناس ولا کا فون نمبر رات ہی کو دے چکا تھا اور اس نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے کہ وہ ڈیوٹی کے آغاز سے پہلے ہی کسی نہ کسی طرح جوناس ولا کا فون بے جان کر دے گا۔

صبح آٹھ بجے ہم دونوں سینٹ جرمین کے علاقے کے آس پاس موجود تھے۔ عبداللہ نے سب سے پہلے جوناس ولا کا نمبر ڈائل کیا۔ چوتھی بار ناکامی کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا ساتھی اپنا کام پوری طرح سرانجام دے چکا ہے تو اس نے ڈائرکٹری سے تلاش کر کے متعلقہ محکمے میں جوناس ولا کے فون میں کسی فنی نقص کی شکایت درج کرا دی۔

اس کام سے نمٹ کر عبداللہ اپنی کار میں دریائے سین کے بائیں کنارے پر سینٹ مائیکل کے پل کے قریب پہنچا اور گاڑی ایک جگہ پارک کر دی۔

داہنی جانب کچھ فاصلے پر دریائے سین کے دو دھاروں کے درمیان ابھرے ہوئے وسیع جزیرے پر ناٹرڈیم کی عظیم الشان عمارت کے کھنڈر پیلے ہونے خوابناک آثار نظر آ رہے تھے۔ اس سرد موسم میں صبح سویرے اس علاقے کا منظر نامانوس مگر حسین تر نظر آ رہا تھا۔

سرد ہواؤں نے ہمیں زیادہ دیر تک مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا اور ہم گاڑی میں دبک کر بیٹھ گئے۔

سوا نو بجے ہمیں سامنے سے ٹیلی فون کے محکمے کی ایک گاڑی آتی نظر آئی۔ پیلس بولیوارڈ سے گزر کر وہ گاڑی پل عبور کرتی ہوئی سیدھی سینٹ مائیکل بولیوارڈ میں داخل ہوئی اور قدرے آگے جا کر رک گئی۔

"آؤ!" عبداللہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور ہم دونوں اپنی کار وہیں چھوڑ کر اس اسٹیشن ویگن کی طرف بڑھے۔

اسٹیشن ویگن کی ڈرائیور سیٹ پر بیس بائیس سال کی عمر کا ایک توی الجثہ فلسطینی لڑکا اپنے محکمے کی وردی میں ملبوس بیٹھا تھا۔

اس نے کھڑکی سے سر نکال کر عبداللہ کو دیکھتے ہوئے دور ہی سے عربی میں خوش آمدید کہا اور عبداللہ اسے جواب دیتے ہوئے اس کے برابر میں جا بیٹھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کرنے میں خاصی پھرتی دکھائی اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

اس وقت میرے اور عبداللہ کے پاس بڑے بور کے خودکار پستول موجود تھے جو میری دانست میں اس مہم کے لئے ناکافی تھے۔

مگر اس لڑکے نے میری الجھن فوراً ہی رفع کر دی اور عبداللہ سے بولا۔ "نشست کے نیچے چرمی بیگ میں دھوئیں کے بم اور گرینیڈ موجود ہیں۔ دو پلاسٹک بم بھی ساتھ لیتا آیا ہوں۔ ذرا ایک نظر ان چیزوں پر ڈال لو۔"

عبداللہ نے نشست کے نیچے سے چرمی بیگ نکال کر اپنی گود میں رکھا اور احتیاط سے اسے کھول دیا۔

پلاسٹک بم اور ہینڈ گرینیڈ چھوٹے تھے جو ہم دونوں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے اور دھوئیں کے بم اسی بیگ میں چھوڑ دیئے۔

"ہم لوگ گاڑی کے عقبی حصے میں چھپ جائیں تو بہتر رہے گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔" عبداللہ کے بجائے وہ لڑکا بولا۔ "ہمارے ساتھ بعض اوقات ہمارے نگران بھی شکایات کی درستگی کیلئے آ جاتے ہیں تاکہ ہماری کارکردگی کے بارے میں صارفین سے براہ راست معلومات حاصل کر سکیں۔"

آگے چل کر اس نے اسٹیشن ویگن داہنی جانب سینٹ جرمین بولیوارڈ پر گھما دی۔

"ادھر والا تو موجود ہے۔" عبداللہ نے ایک گلی میں گاڑی مڑواتے ہوئے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اپنے آدمی کی طرف ہے جسے اس سمت میں عذرا جوناس کی گاڑیوں کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔

عبداللہ نے اس صاف ستھرے رہائشی علاقے کی کشادہ گلیوں میں گاڑی کے چکر لگوائے اور پھر ایک بیکری کے سامنے گاڑی رکوا دی۔

گاڑی چلانے والے نے جوناس ولا کے بارے میں بیکری والے سے دریافت کیا اور پھر گاڑی اس کے بتائے ہوئے موڑ پر گھمائی۔

"اس وقت جوناس ولا کے محافظوں کی تعداد کم ہے۔" عبداللہ بولا۔

"تو یہ اندازہ لگانے کیلئے تم گلیوں میں چکر لگا رہے تھے؟"

"ہاں۔ شیر کی کچھار میں گھسنے سے پہلے حفاظتی اقدامات بہت ضروری ہوتے ہیں۔" وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا کیونکہ جوناس ولا سامنے آ گیا تھا۔

دوسرے بارن پر ایک دربان نے پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھول کر گاڑی کا جائزہ لیا اور پھر وہیں سے سوال داغ دیا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔

ڈرائیور کا جواب سن کر دربان کھڑکی بند کر کے اندر چلا گیا۔

"ایک شخص ہماری گاڑی کے پیچھے گلی کی نکڑ پر چوکنا کھڑا ہوا ہے۔" ڈرائیور نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

"ہرمن سوٹ اور کالے اوورکوٹ والا؟" عبداللہ نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں۔ کیا وہ تمہیں بھی نظر آ رہا ہے؟" ڈرائیور نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ کل شام کو یہاں موجود تھا اور ابھی میں نے گلیوں کا طواف کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔" عبداللہ نے بتایا۔ "مگر اس وقت اس کے ہمراہ ساتھی نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

اسی وقت دربان نے پھاٹک کھول کر گاڑی اندر لے جانے کا اشارہ کیا اور جوں ہی اسٹیشن ویگن پختہ راہداری میں داخل ہوئی اس نے پھاٹک بند کر دیا۔

اندر برآمدے کے سامنے صرف ایلیزا کی کار موجود تھی جبکہ عبداللہ دو گاڑیوں کی موجودگی کی خبر لایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عمارت سے کوئی باہر گیا ہوا تھا۔

فلسطینی ڈرائیور انجن بند کر کے شکایات کے اندراج والا رقعہ لے کر اترا۔ ہم دونوں بھی نیچے آ گئے۔ اس وقت میرا دل کھوپڑی میں دھک دھک کر رہا تھا اور میں کسی بھی لمحے اپنی جیبوں میں موجود آتشگیر اسلحے سے تباہی پھیلانے کے لئے تیار تھا۔

ہم تینوں کے برآمدے تک پہنچنے سے قبل ہی عمارت کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آئی جسے میں نیس ایئرپورٹ پر ایلیزا اور عذرا جوناس کے ہمراہ دیکھ چکا تھا۔

اس عورت سے گفتگو کی ذمہ داری عبداللہ نے سنبھالی اور خلاف توقع ان دونوں میں کئی مکالموں کا تبادلہ ہوا۔ ایک بار عورت کے لہجے میں تحیر جھلک آیا۔ اور عبداللہ کا جواب سن کر وہ ہنسنے لگی۔

اس انٹرویو کے بعد ہمیں اندر داخلے کی اجازت مل گئی۔ ایلیزا کی ماں ہمیں فون دکھا کر اندر چلی گئی۔ فلسطینی مکینک ماہرانہ انداز میں فون کی جانچ پڑتال میں مصروف ہو گیا۔ اور عبداللہ مجھے مسز جوناس سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنانے لگا۔

ان لوگوں کا فون خراب ضرور تھا مگر عورت کے مطابق اس کی شکایات درج نہیں کرائی گئی تھیں۔ اس نے طنز بھی کیا کہ ٹیلی فون والے اتنے فرض شناس کب سے ہو گئے کہ اپنے طور پر خرابی کا سراغ لگا کر صارفین کے گھروں پر پہنچنے لگے۔ مگر عبداللہ نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا۔

ہم دونوں بہت تیزی کے ساتھ ماحول کا جائزہ لے رہے تھے اور اپنی کارروائی کے لئے نقطۂ آغاز تلاش کر رہے تھے۔

جوناس ولا میں چھائی ہوئی خاموشی ہماری توقعات کے بالکل برعکس تھی۔ سب سے زیادہ حیرانگی اس بات کی تھی کہ عذرا اور ابراہم کے ہوتے ہوئے ایلیزا کی ماں باہر آئی تھی۔ اس نکتے کو ایک گاڑی کی عدم موجودگی سے مربوط کرنے کے بعد صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا جو ہمارے لئے خاصا حوصلہ شکن تھا۔

میں سامنے والے دروازے پر نظریں جمائے اوورکوٹ کی جیب میں پستول کا دستہ تھامے کسی کی آمد کا منتظر تھا کہ اچانک قالین پر دبے قدموں سے چلتی ہوئی ایلیزا نمودار ہوئی اور میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی بھونچکا رہ گئی۔

"تت ...... تم یہاں کیسے آ گئے؟" وہ حیرت سے ہکلاتے ہوئے بولی۔

"ٹیلی فون درست کرنے آیا ہوں۔" میں نے اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمہارا باپ کہاں ہے؟"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ اپنے بھائی کے ساتھ صبح سویرے کہیں گیا ہے اور کسی بھی وقت لوٹ آئے گا۔"

"میں اس کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"چلے جاؤ، خدا کے لئے چلے جاؤ۔" وہ میرے قریب آ کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "وہ تمہاری بوٹیاں کر کے چیلوں کو کھلا دے گا۔"

میں نے اچانک جیب سے مہیب آہنی نال والا پستول نکال لیا۔
"اپنا اعصاب پر قابو رکھو اور مجھے ابرام کے کمرے میں لے چلو۔"
"اسے جیب میں رکھ لو،" وہ سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "ممی نے یہ پستول دیکھ لیا تو دہشت سے ان کا دم ہی نکل جائے گا۔"
میں نے پستول جیب میں ڈال لیا۔ اور عبداللہ کو مکینک سمیت وہیں چھوڑ کر ایلیزا کے ہمراہ اندر کی طرف چل دیا۔
"میرا باپ بہت چالاک ہے اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں تم سے ملی تھی اس کا خیال ہے کہ تم اس کے نامعلوم دشمنوں سے ملے ہوئے ہو اور میرے ذریعے اسے کوئی بڑی زک پہنچانا چاہتے ہو۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔
"مگر اسے کس طرح علم ہوا؟"
"ہوٹل ڈی وائل سے ہٹ تک جاتے ہوئے ہم دونوں کی جگہ جو ٹیپ ہوئی تھی تم نے اپنی دانست میں اسے صاف کر دیا تھا مگر میرا باپ بہت چالاک ہے۔ وہ ہر نیا ٹیپ لگانے سے پہلے ابتدا میں ایک ڈیڑھ سیکنڈ کی کوئی مخصوص آواز بھر دیتا تھا۔ جب اس نے حسب معمول وہ ٹیپ چیک کیا تو اس کا پہلے سے بھرا ہوا خاص اشارہ بھی غائب تھا۔ شبہ ہو جانے پر اس نے وہ ٹیپ ایک انتہائی حساس ریکارڈر پہ چلایا۔ اور بڑی حد تک میری اور تمہاری گفتگو سننے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے کسی جلاد کی طرح مجھ سے باز پرس کی مگر میں نے زبان نہ کھولی تو اس نے وہی ٹیپ میرے سامنے اپنے جاپانی کے حساس ترین ریکارڈر پہ چلایا۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ نئے ٹیپ سے آوازیں مٹانا کس قدر مشکل ہے۔"
"اور تم نے اعتراف کر لیا۔؟"
"نہیں — میں نے پھر بھی اس ٹیپ سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا جس پر جھلا کر اس نے نہایت بے رحمی سے مجھے زدوکوب کیا مگر میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے ہاتھوں مر جاؤں گی مگر اعتراف ہرگز نہیں کروں گی۔"
"تمہیں پٹتے دیکھ کر تمہاری ماں پر دل کا دورہ نہیں پڑا۔؟"
"وہ بہت مکار ہے۔ اس نے ممی کو خواب آور دوائیں دے کر پہلے ہی گہری نیند سلا دیا تھا۔" یہ کہہ کر ایلیزا ایک مقفل دروازے کے سامنے رک گئی۔ "یہ ابراہام کا کمرہ ہے جو اس کی غیر موجودگی میں ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔"
"مگر فون پر تم نے مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کیا تھا؟"
"تم نے شاید اس سے پہلے بھی فون کیا تھا اور میرے باپ کی آواز سنتے ہی خاموشی سے سلسلہ منقطع کر دیا تھا لہٰذا دوبارہ گھنٹی بجی تو اس نے مجھے فون وصول کرنے کا حکم دیا اور خود دوسرے فون کا ریسیور کان سے لگا کر بیٹھ گیا۔ اگر میں تم سے پیچھا چھڑانا چاہتی تو جائی ہوئی ہٹ تک کیوں جاتی۔ محض ٹیلی فون کی دوسری لائن کی وجہ سے مجھے خود باہر جانا پڑا۔ اور شاید میرے باپ نے کسی کو میری نگرانی پر بھی لگا دیا تھا مگر میں بھی اسی کی سگی بیٹی ہوں، پیچھا کرنے والا مجھے کھو کر اپنا سر پیٹتا رہ گیا ہوگا۔"
"اسے کس طرح دھوکا دیا تم نے؟" میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا میرے دل میں ایلیزا کے لئے وقعت اور ہمدردی کے جذبات ابھرنے لگے تھے۔
"بہت آسان ترکیب تھی۔" وہ اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "میں نے ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے کار روکی اور اسٹور میں داخل ہو کر عقبی راستے سے نکل گئی جب میں ٹیکسی سے ہٹ کا چکر لگا کر واپس لوٹی تو وہ وہیں موجود تھا۔"
"اب میں ابراہام کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"
"اس پر لعنت بھیجو، میں اس ماحول سے گھبرا گئی ہوں اور تمہارے ساتھ کہیں نکل جانا چاہتی ہوں۔"
"اور تمہاری ماں کا کیا ہوگا؟"
"ممی کی وجہ سے میں اب تک بہت ظلم سہتی آئی ہوں مگر میں یوں ہی اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔
"تمہاری ماں تمہارے فرار کا صدمہ نہ سہہ سکے گی۔" میں نے اس کی دکھتی ہوئی رگ کو دباتے ہوئے کہا کیونکہ میں اسے اپنے گلے کا ہار بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اور ویسے بھی بن حیان کے خاتمہ تک وہ عذرا کے ساتھ رہ کر میرے لئے زیادہ کارآمد تھی۔
"میں جانتی ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مگر ممی نے کبھی میرے باپ کو ظلم سے روکنے کی کوشش نہیں کی ورنہ شاید وہ اپنا رویہ درست کر لیتا۔ ممی نے اپنی خاموشی سے شہہ دے کر اسے مجھ پر مسلط کیا ہے۔"
"اس وقت بھی عذرا جوناس کا ایک آدمی تمہارے مکان کے باہر موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر تمہارے بھاگ جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ باہر کی دنیا بہت بے کیف اور دشوار ہے تم اس سے سمجھوتہ نہیں کر سکو گی۔"
"پھر بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟"
"میرے ساتھ باہر لان پر چلو ورنہ تمہاری ماں ہماری گفتگو سن لے گی۔" میں نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔
"لائن میں باہر سے خرابی ہے۔" میرے قریب سے گزرنے پر عبداللہ نے کہا۔
"تم دونوں اسے درست کر آؤ، میں یہیں رکتا ہوں۔" میں نے ایلیزا کو لان کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔
عبداللہ نے ایلیزا کی آنکھ بچا کر مسکراتے ہوئے انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا اور پھر ہمارے پیچھے باہر آ گیا۔
"ابراہام اور عذرا کہاں گئے ہوئے ہیں؟" لان پر پہنچنے کے بعد میں نے سوال کیا۔
"میں بتا چکی ہوں کہ وہ دونوں اپنے پروگرام کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔" اس نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا۔
"مجھے ایک بات کا علم ہوا ہے جو تمہارے سامنے دہراتے ہوئے جھجکتا ہوں۔" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"کہہ ڈالو — میں ہر بات سننے کے لئے تیار ہوں!"
"مجھے معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ اسرائیلی اسلحہ بردار جہاز میڈوسا کی تباہی کا ذمہ دار تمہارا باپ ہے!" میں نے اس کے یقین کی بنیادیں مسمار کرنے کے لئے اس پہ آخری اور بھرپور وار کیا۔
"نہیں —" بے یقینی سے اس کی آنکھیں کشادہ ہو گئیں "تمہیں کیسے پتہ چلا —؟"
"فرانس میں میرے بھی کچھ دوست ہیں تم نے دیکھا کہ میں کیسی آسانی سے تمہارے گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ بالکل اسی طرح یہ بات میرے علم میں آئی ہے!"
"تو پچھلے دنوں وہ اسی انتظام کے لئے نیس گیا تھا۔" وہ بڑبڑائی۔
"اس کام کے لئے تمہارے باپ کو خطیر معاوضہ دیا گیا ہے۔"
"لعنت ہو اس پر۔" وہ نفرت آمیز لہجہ میں بولی "اور پھر وہ فخر سے خود کو یہودی کہتا ہے اور یہودی تنظیموں کی سرپرستی کرتا ہے۔"
"میں محض تمہاری وجہ سے عذرا میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوا ہوں اور اب چاہتا ہوں کہ اس کے چہرے سے اس طرح نقاب ہٹاؤں کہ اسے اور اپنے چہرے سے نفرت ہو جائے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اپنے مفاد کے لئے قوموں کے درمیان نفرت کی بنیادیں تعمیر کر رکھی ہے صرف پیسے سے محبت ہے۔"
"اس جیسے موذی کو تو مر ہی جانا چاہئے۔" وہ دانت پیس کر نفرت بھرے لہجہ میں بولی "وہ تو رشتوں تک کے احترام کا قائل نہیں ہے۔"
میں خاموش رہا اور وہ خالی الذہنی کے عالم میں میری صورت تکتی رہی۔
"یہ بتاؤ کہ اتنے جتن کر کے تم میرے گھر کس لئے آئے ہو؟" اچانک اس نے سوال کیا۔
"صرف یہ معلوم کرنے کہ تم اچانک مجھ سے منحرف کیوں ہو گئیں جبکہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔"
"اس کا جواب تو مل گیا تم کو —؟"
میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔
"اب تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو —؟"
"تمہارے باپ کی طرف سے خواہ مخواہ میرے دل میں عناد پیدا ہو گیا ہے اگر تم اسے کسی طرح زیر کرنا چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"
"تم اسے مار کیوں نہیں دیتے،" چند ثانیوں کے بعد اس نے رازدارانہ لہجہ میں سرگوشی کی اور میں یوں اچھل پڑا جیسے مجھے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو —
آزاد مغربی معاشرہ کی پروردہ ایک جوان سال لڑکی اپنے عارضی آشنا سے اپنے باپ کے قتل کی فرمائش کر رہی تھی۔
"قتل میرے بس سے باہر ہے ایلیزا — میں تو بس اسے ذلیل و خوار کر کے خوشی سمیٹنی چاہتا ہوں —" میں نے اپنے دلی جذبات پر پردہ ڈالتے ہوئے کہا۔
"تم میری مدد کرو — میں نے سنا ہے کہ پیرس میں ایسے غنڈے موجود ہیں جو پیسہ لے کر دنیا کا ہر کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔"
"میں ایسے معاملہ میں فریق نہیں بن سکتا۔" میں نے اس کے ارادے کی مضبوطی پرکھنے کے لئے انکار کی تکرار جاری رکھی۔
"میں منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔" وہ فرط جذبات سے لرزتی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں بولی "اس کی موت سے میری تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور میں عملی زندگی کی ہولناک ذمہ داریوں سے دوچار ہوئے بغیر اپنی مرضی کی زندگی گزار سکوں گی۔"
"ایک بار معاوضہ ادا کر کے تم اپنی جان نہیں چھڑا سکو گی۔" میں نے اپنے پیکٹ سے ایک سگریٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔
"وہ کیوں؟" ایلیزا سگریٹ سلگا کر بولی۔
"غنڈے زندگی بھر تمہیں بلیک میل کرتے رہیں گے!"
"اسی لئے تو میں تمہاری مدد چاہتی ہوں — تم میرا نام درمیان میں لائے بغیر یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہو۔"
"اس سے تو بہتر ہوگا کہ میں خود ہی اسے ٹھکانے لگا دوں۔"
"میں زندگی بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔"
"تمہیں مجھے یہ موقع فراہم کرنا ہوگا کہ میں عذرا کے قریب رہ سکوں!"
"اس کی ضرورت ہی کیا ہے کسی بھی مناسب موقع پر تم بھرپور طریقہ سے اپنا کام کر سکتے ہو جو باہر بھی ہو سکتا ہے اور گھر میں بھی!"
اسی وقت پھاٹک کھلا اور عبداللہ مکینک کے ہمراہ فون درست کر کے گاڑی میں واپس لوٹ آیا۔
"تم کسی وقت باہر ملو تو اس معاملے پہ بات ہوگی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"میں کل شام کو ہٹ پہ آؤں گی۔" اس نے کہا "ہمارے ملنے کے لئے وہی سب سے زیادہ محفوظ مقام ہے!"
"ٹیپ میں اس کا ذکر تو نہیں تھا؟"
"نہیں — وہ نہ جانے کیسے رہ گیا۔" وہ ہنس کر بولی "اس میں تمہاری آواز کم تھی اور میری بجائے اس زیادہ — میں اس وقت شاید ضرورت

سے زیادہ تر تنگ ہی تھی۔"

فلسطینی مکینک نے ٹیلی فون کی مرمت کے رقعے پہ ایلیزا کے دستخط کرائے اور ہم تینوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

"بڑے رازونیاز ہو رہے تھے!" باہر نکلتے ہی عبداللہ نے قہقہہ مار کر کہا۔

"رازونیاز ہی ہوتے رہے' باپ سے بہت ڈرتی ہے" میں نے نوجوان مکینک کی وجہ سے اصل بات نہیں چھیڑی۔

سینٹ مائیکل بولیوارڈ کے چوراہے پر اس مکینک نے گاڑی روکی تو عبداللہ آتشگیر مادوں والے چرمی بیگ سمیت اتر گیا۔ ہم دونوں کو چھوڑ کر وہ لڑکا یوں لاپرواہانہ انداز میں آگے بڑھ گیا جیسے اس نے سارے کام معمول کے مطابق سرانجام دیئے ہوں۔

"ابراہم اور عذرا صبح سویرے ہی کہیں نکل بھاگے ہیں" میں نے عبداللہ کو بتایا" نہ جانے انہیں کیا کام پیش آ گیا۔"

"مجھے اپنے آدمی کی فکر ہو رہی ہے۔ ان دونوں کے پیچھے شاید چار محافظ گئے ہوں گے اور اس نے تنہا ان سب کا تعاقب کیا ہو گا اب سب سے پہلے اس کی خیر خبر لینی ہے"۔ عبداللہ تشویش آمیز لہجہ میں بولا۔

سفر کے دوران میں نے اسے اپنی اور ایلیزا کی گفتگو سنا ڈالی۔

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا" میرے خاموش ہوتے ہی وہ خوشی سے سرشار لہجہ میں بولا" تمہارے ہاتھ چڑھنے والی لڑکیاں تمہارے اشاروں پہ ناچنے لگتی ہیں اور یہ تو سب سے آگے نکلی کہ خود اپنے باپ کو مروانا چاہتی ہے۔"

"غنیمت یہ ہے کہ اس نے مجھ سے شادی کی فرمائش نہیں کی۔"

"اگر دولت کی فراوانی اور آزادی میسر ہو تو نوجوان لڑکے لڑکیاں شادی سے گریز ہی کرتے ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔

صبح ہی صبح ہم لوگوں نے جوناس ولا میں داخل ہو کر بڑی کامیابی حاصل کی تھی اور مجھے ایلیزا کے بارے میں حقائق جاننے کا موقع مل گیا تھا۔

عذرا اور ابراہم کے گھر پہ موجود نہ ہونے سے ہمارا ہنگامہ آرائی کا پروگرام نامکمل ہی رہ گیا تھا مگر اس میں بھی شاید کاتب تقدیر کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی۔ ورنہ کسی گنجان آبادی میں خونریز تصادم کے بعد ہم لوگوں کا بچ نکلنا بڑا دشوار ہو جاتا۔

عبداللہ شہر کے مختلف حصوں سے ہوتا ہوا مزدور طبقے کی ایک بستی میں پہنچا۔ وہاں تیسری کوشش میں اسے مطلوبہ شخص مل گیا۔

اسے عقبی نشست پر بٹھا کر عبداللہ نے سست رفتاری سے گاڑی چلانی شروع کی تو اس دبلے پتلے فلسطینی نے عربی میں اپنی کہانی چھیڑ دی۔

اس کے بیان کے مطابق جوناس ولا سے صبح چھ بجے ایک گاڑی برآمد ہوئی اور تیزی کے ساتھ اس کے سامنے سے گزری۔ اس کے فوراً بعد مزید دو نامعلوم گاڑیاں کم و بیش اسی رفتار سے روانہ ہوئیں اور وہ ان تینوں کے پیچھے ہو لیا۔

اس بھاگ دوڑ کا اختتام اورلی ایئرپورٹ پر ہوا اور وہاں تینوں گاڑیوں میں سے کل چھ افراد برآمد ہوئے ان میں سے دو مرتبے کے اعتبار سے بقیہ چاروں پر پوری طرح حاوی معلوم ہوتے تھے۔

ان سب نے ہوائی اڈے سے ہی نیس جانے کے لئے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لئے اور سات بج کر دس منٹ پر پرواز کرنے والے طیارے سے روانہ ہو گئے جبکہ ان کی مقفل گاڑیاں ایئرپورٹ پر ہی کھڑی رہیں۔

اس سے تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد عبداللہ نے اسے واپس چھوڑ دیا۔ اس نے خاص طور پر ان تینوں گاڑیوں کے نمبر لئے تھے جو ایئرپورٹ پر کھڑی ہوئی تھیں۔

"اب تمہارے لئے میدان صاف ہے!" عبداللہ نے مجھ سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"وہ دونوں نیس چلے گئے۔ اب جوناس ولا میں ہی ایلیزا کے ساتھ عیش کرو۔"

"یہی کرنا ہو گا۔ شاید ابراہم یا عذرا کے سامان میں سے کوئی کارآمد چیز مل جائے مگر ادھر کا رخ کرنے سے پہلے جوناس ولا کے باہر موجود آدمی کو ہٹانا ہو گا۔"

"اس محلے کے مشرقی راستے پر اب بھی میرا آدمی موجود ہے تم ایلیزا سے کہو کہ وہ اسی راستے سے نکل کر شہر کے کسی ویران علاقے کی طرف چل دے۔ اس شخص کو ہم لوگ وہیں چھاپ لیں گے۔"

میں نے تجویز پیش کی کہ ایئرپورٹ پہ کھڑی ہوئی تینوں گاڑیوں کو بموں سے اڑا دیا جائے۔ مگر عبداللہ نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کی دانست میں یہ غیر ضروری اور بے فیض دہشت گردی ہوتی جس سے بہت سی دوسری کاروں کو بھی شدید نقصان پہنچتا۔

میں نے ایک جگہ سے فون کر کے ایلیزا کو خوشخبری سنائی کہ اس کا باپ اپنے بھائی کے ساتھ نیس چلا گیا۔ تو وہ خاصی مسرور ہوئی کہ اسے بہانے لے تھوڑی سی چھوٹ مل جائے گی۔ اور جب میں نے اسے نگرانی کرنے والے کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً ہی نہ صرف آمادہ ہو گئی بلکہ اس نے ایک سہل تر تجویز پیش کر ڈالی۔

"اسے باہر گھیرنے کے بجائے جوناس ولا میں ہی کیوں نہیں بلا لیتے" اس نے کہا "ہم لوگوں کو اس خبیث کے لئے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے!"

"تم اسے پہچانتی ہو؟"

"میں صرف ایک ہی کو پہچانتی ہوں جسے میں نے چکمہ دیا تھا اگر وہ

ں کے علاوہ کوئی اور ہے تو میرے لئے مشکل ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر ہم اسے ساتھ ہی لاتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ
قطع کر دیا۔

سینٹ جرمین کے علاقہ میں پہنچ کر عبداللہ نے پہلا کام یہ کیا۔ کہ
اں کے مشرقی راستے پر مامور اپنے آدمی کی چھٹی کر دی۔ اور پھر گلیوں میں
پ ہونے کے بعد اپنی کار عین اس درخت کے پاس روک دی جس کے سائے
ں مرتی سوٹ والا سستا رہا تھا۔

کار کو اپنے قریب رکتے دیکھ کر وہ خاصا بوکھلا گیا۔ اور مشینی انداز میں
ہ جگہ سے اٹھتا چلا گیا۔

"ادھر آؤ۔" عبداللہ نے محض مجھے سنانے کے لئے انگریزی میں
حکم دیا۔ اور وہ جھجکتا ہوا کار کے قریب آ گیا۔

"پیچھے بیٹھ جاؤ۔" عبداللہ نے اگلا حکم دیا۔

"تم کون ہو۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔" وہ اپنی پھولی ہوئی جیب
ہاتھ ڈالتے ہوئے سست لہجہ میں بولا۔

"تمہیں جوناس ولا میں طلب کیا جا رہا ہے" عبداللہ نے منہ بنا کر
ت لہجے میں کہا۔

"تم جاؤ۔ میں پیدل آتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اور عبداللہ
تیزی سے کار جوناس ولا کی طرف بڑھا دی۔

اس بار دربان نے ہارن سنتے ہی پھاٹک کھول دیا کار کے انجن
ی آواز سن کر ایلیزا بھی مکان سے باہر آ گئی۔

وہ بے ساختہ انداز میں کچھ کہنے والی تھی مگر عبداللہ پر نظر پڑتے
ی خاموش ہو گئی۔ اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد شائستہ لہجہ میں بولی۔
"یوں کھڑے ہو؟ اندر آ جاؤ نا!"

"تمہارے محافظ کا انتظار ہے!" میں نے کہا۔

وہ خود بھی باہر نکل کر ہمارے قریب آ گئی۔

"مجھے چارلس وریتھ کہتے ہیں۔" میرے بولنے سے قبل ہی عبداللہ
لیک سے اپنا تعارف کرا دیا۔ شاید اسے اندیشہ رہا ہو گا کہ میں کہیں
ا اصل نام نہ بتا دوں۔

"میرا نام ایلیزا جوناس ہے!" اس نے عبداللہ سے ہاتھ ملاتے
ے کہا۔

ہیں اندر آنے خاصی دیر گزر گئی مگر وہ کسر مئی سوٹ والا نہ
ا مجھے تشویش ہوئی۔ اور میں نے ذیلی کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔
لہٰذا صاف پڑا ہوا تھا۔ شاید وہ آخری وقت پہ خطرہ بھانپ کر
نکلا تھا۔

"آج کی پہلی چوٹ!" میں نے واپس آ کر کہا تو وہ دونوں میری
ف متوجہ ہو گئے۔" وہ یہاں آنے کے بجائے بھاگ گیا۔" میں نے اپنی
ناکامی کر ڈالی۔

"اسے بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے میرے باپ کی آمد سے قبل وہ کچھ نہ کر سکے گا۔" ایلیزا برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"تو تمہارا باپ بھی ہے؟" عبداللہ نے ایلیزا سے سوال کیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے پھاٹک تک جانے اور آنے کے دوران ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔

"باپ کے بغیر اولاد کا تصور ممکن ہے؟" ایلیزا نے قہقہہ لگاتے ہوئے جوابی سوال کر ڈالا۔ اور عبداللہ خفت آمیز انداز میں ہنسنے لگا۔

"میرا مطلب تھا کہ تمہارا باپ زندہ ہے؟"

"فی الحال تو زندہ ہی ہے۔" ایلیزا نے شوخ لہجہ میں کہا۔

میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا تو وہ سٹپٹا گئی۔ عبداللہ کی حد تک تو ایلیزا کی وہ غیر محتاط گفتگو نقصان دہ نہیں تھی لیکن وہ کہیں اور ایسا تبصرہ کر بیٹھتی تو خاصی دشوار صورتحال پیدا ہونے کے امکانات تھے۔

"تم دونوں میں بہت جلد دوستی ہو گئی۔؟" میں نے نشست گاہ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"زبان کی بات ہے، تم سے انگریزی بولنی پڑتی ہے اور چارلس وریتھ مجھ سے اچھی فرنچ بولتا ہے۔" ایلیزا نے وضاحت کی۔

"تمہیں قریب پا کر بولنے لگا ہو گا ورنہ تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون درست کرنے آیا تھا تو بالکل ہی گونگا تھا۔" میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو، میں تمہاری حق تلفی نہیں کروں گا۔" عبداللہ نے برجستہ جواب دیا۔

"اب ان دونوں کی فوری واپسی کا امکان نہیں ہے لہٰذا میں ابراہم کا کمرہ دیکھ ڈالوں۔ تم چارلس وریتھ کے ساتھ بیٹھو۔" میں نے ایلیزا سے کہا۔

"مگر وہ تالا کیسے کھولو گے۔؟"

"مضبوط تار کے کچھ ٹکڑے دے دو شاید کوئی کام کر جائے ورنہ تالا توڑ دوں گا۔"

"تالا نہ توڑنا۔" وہ جلدی سے بولا۔" وہ واپس آ کر قیامت کھڑی کر دے گا۔" وہ میرے ساتھ اس کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ پھر مڑ کر عبداللہ سے فرنچ میں کچھ بولی اور میرے ساتھ ہو لی۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"وہ بے خبر سو رہی ہے۔ ہاں تو یہ بتاؤ کہ چارلس وریتھ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"دوست ہے میرا۔"

"میرے معاملہ کے بارے میں اسے کیا معلوم ہے؟"

"اس کے سامنے زبان بھی نہ کھولنا۔" میں بوکھلانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔" وہ بس اسی قدر جانتا ہے کہ تم میری مظلوم محبوبہ ہو جس پر اس کے باپ نے ناروا پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔"

"کیا تم اسی کے ساتھ رہتے ہو۔؟"

"ہاں ۔۔" میں روانی میں اقرار کر گیا۔

وہ چلتے چلتے رک کر مجھے گھورنے لگی "پہلے تو تم نے بتایا تھا کہ تم جس دوست کے ساتھ رہتے ہو۔ وہ بہت اجڈ اور عورتوں کے معاملے میں حریص ہے مگر چارلس ورتھ تو نہایت نفیس مزاج کا مالک معلوم ہوتا ہے۔"

"تمہاری غلط فہمی جلد ہی دور ہو جائے گی۔" اپنا جھوٹ نباہنے کے لئے میرے پاس اس سے بہتر جواب نہیں تھا۔

اس نے باورچی خانے اور اسٹور سے تلاش کر کے کئی تار میرے حوالے کئے اور مجھے ابراہم کے مقفل کمرے کے سامنے چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

طویل عرصے کے بعد ایک مرتبہ پھر مجھے قفل شکنی کا سامنا تھا مشق بے شک چھوٹ چکی تھی۔ مگر کچھ بنیادی باتیں ذہن میں محفوظ تھیں۔ لہٰذا دو تین مرتبہ تار گھمانے کے بعد جب مجھے اس تالے کے اندر کی ساخت کا اندازہ ہو گیا۔ تو پہلی ہی کوشش میں تالا کھل گیا۔

وہ کمرہ ابراہم سونے کے ساتھ مطالعہ کے لئے بھی استعمال کرتا تھا کیونکہ وہاں بستر کے ساتھ بے شمار موضوعات پہ کتابوں سے بھری ہوئی دیوار گیر الماریاں اور ایک لکھنے کی میز بھی موجود تھی۔

تلاشی کا آغاز میں نے بستر سے کیا جو بالکل صاف تھا پھر میز کی طرف توجہ دی مگر وہاں بھی سادے کاغذات، لفافوں کے بنڈل اور لکھنے کی چیزوں کے سوا کچھ نہیں مل سکا۔ میز کے نیچے رکھی ہوئی آہنی چادر سے بنی ہوئی ردی کی ٹوکری کی کاغذی لڑکریاں ابراہم کی محتاط طبیعت کی گواہی دے رہی تھیں۔ کیونکہ ان میں مکمل طور پہ جلے ہوئے کاغذات کی سیاہ راکھ موجود تھی جسے شاید عجلت کے باعث وہ نالی میں نہ بہا سکا تھا۔

میں نے بہت احتیاط کے ساتھ کتابوں کا بھی جائزہ لینا شروع کیا لیکن کہیں بھی کوئی کارآمد چیز نہ مل سکی جس سے بن حیان کی تازہ مصروفیات کا علم ہوتا۔

پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ایلیزا نے ٹیپ کے معاملے میں ابراہم کے کسی حساس ریکارڈر کا حوالہ دیا تھا۔ جو عام ریکارڈر کے مٹائے ہوئے ٹیپ کو بھی بجانے کا اہل تھا۔ مگر اس کمرے میں ریکارڈر کی قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

میں کمرہ کھلا چھوڑ کر ایلیزا کے پاس گیا اور اس سے ریکارڈر کے بارے میں دریافت کیا۔ تو اس نے بتایا کہ ابراہم کا وہ ریکارڈر عذرا، اپنی ایک آہنی تجوری میں رکھتا تھا۔ اس انکشاف کے بعد میری ساری دلچسپی اس تجوری کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور ایلیزا نے بلا تکلف مجھے اس دیو ہیکل فولادی تجوری کے سامنے پہنچا دیا۔

"اب تم چارلس ورتھ کے پاس بیٹھو، میں ذرا اس تجوری پہ قسمت آزما لوں۔" میں نے مسکرا کر اس کے رخسار پہ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"چارلس ورتھ بہت زیادہ شرمیلا ہے۔"

"وہ ایک وقت میں ایک عشق کا قائل ہے اگر تم اسے اپنا...... اصول توڑنے پر مجبور کر سکیں تو مجھے خوشی ہو گی۔" میں نے اسے ٹالنے کے لئے شوشہ چھوڑا۔

وہ ایک ادا کے ساتھ ہاتھ لہرا کر چلی گئی۔

اس تجوری کے مضبوط فولادی دروازے میں دوہرا قفل لگا ہوا تھا۔ جسے کھولنا مجھے بہت دشوار نظر آ رہا تھا۔ مگر نصف گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد میری برسوں پرانی مہارت کے سامنے قفل کا نظام جواب دے گیا۔ اور میں نے دستہ گھما کر دروازہ کھول دیا۔

تجوری کا دروازہ کھلتے ہی اچانک مکان کے کسی حصے میں الارم کی پُرشور آواز گونجنے لگی اور میں نے بوکھلا کر فوراً دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ باہر سے جائزہ لینے پر مجھے کوئی ایسا تار نہ مل سکا جو تجوری کے دروازے میں چھپے ہوئے سوئچ سے منسلک ہو۔ میں اس تلاش میں مصروف ہی تھا۔ کہ ایلیزا عبداللہ کے ہمراہ بوکھلائی ہوئی اس کمرے میں آ پہنچی۔

"یہ الارم کیسا تھا؟" اس نے آتے ہی متوحش لہجہ میں سوال کیا۔

"شاید اس کا تعلق تجوری کے دروازے سے ہے۔"

"تو تجوری بھی کھول لی تم نے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ کار کے دروازوں کی طرح اس الارم کا سوئچ تجوری کی آہنی چوکھٹ میں نصب ہے۔ وقت ضائع کرنے کے بجائے میں دروازہ کھول کر اسے ہاتھ سے دبا کر الارم کو ناکارہ کر دوں گا۔"

میرے ایما پر عبداللہ نے تجوری کا وزنی دروازہ کھولا اور فوراً ہی الارم بجنے لگا۔ مگر اسی وقت میری نگاہ الارم کے سوئچ پر پڑ گئی جو میرے اندازے کے مطابق آہنی چوکھٹ میں ہی نصب تھا۔ میں نے پھرتی سے سوئچ کو انگلی سے دبا دیا۔ اور الارم کی آواز یک لخت معدوم ہو گئی۔ ایلیزا نے مجھے ٹیپ دیا اور میں نے بآسانی ٹیپ چپکا کر اس سوئچ کو غیر مؤثر کر دیا۔ الارم کی مصیبت سے نجات ملتے ہی ہم دونوں تجوری کے جائزے میں مصروف ہو گئے جو مختلف چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔

"تم لوگ ڈرائنگ روم میں جاؤ اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔" میں نے عبداللہ کو آنکھ مارتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔

"اس میں تو خطیر رقم بھی موجود ہے۔" ایلیزا نے تجوری میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالتے ہوئے ہیجان آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے رقم سے کوئی سروکار نہیں، اسے نہ چھیڑو!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ نوٹوں کی گڈیاں قالین پر گراتے ہوئے ضدی لہجہ میں بولی "تمہیں نہ ہو، مجھے تو اس رقم سے سروکار ہے۔"

وہ تجوری سے رقم نکالتی رہی اور میں دور کھڑا لاتعلقانہ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ میرے نزدیک ایلیزا کا رویہ ناقابلِ فہم تھا وہ اپنے باپ کو زک پہنچانے کا کوئی موقع...... ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تجوری خالی کرنے کے بعد اس نے ساری رقم ایک چادر میں باندھی اور عبداللہ کی مدد سے اسے لے کر چلی گئی۔

میدان صاف ہونے کے بعد میں تجوری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

تجوری میں ابراہم جوناس کا وہ حساس ریکارڈر نمایاں نظر آ رہا تھا جس کے ذریعے اس مردود نے میری اور ایلیزا کی ملاقات کا سراغ لگایا تھا۔ اس کے پیچھے چرمی گرد پوش میں ایک ضخیم سی کتاب موجود تھی اس کے پہلے صفحے پہ نظر پڑتے ہی مجھ پہ عذرا جوناس کے مذہبی جنون کی شدت واضح ہو گئی کیونکہ وہ یہودیوں کے میثاقِ مقدس کا انگریزی ترجمہ اور تشریح تھی۔ وہ لوگ اسی مقدس عہد کے مطابق قبلۂ اول کی بنیادوں پر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا دعویٰ کرتے تھے۔

ایک خانے میں تین ضخیم ڈائریاں ملیں جن میں تاریخوں کے تسلسل کے ساتھ شاید عذرا نے اپنی یادداشتیں قلم بند کی ہوئی تھیں مجھے اندازہ تھا کہ وہ ڈائریاں میرے دوستوں کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوں گی مگر میں اس وقت ان کا تفصیلی مطالعہ کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ ان کی سرسری ورق گردانی سے یہ عقدہ سامنے ضرور آیا کہ ان یادداشتوں میں لوگوں کے ناموں کی جگہ محض ابتدائی حروف استعمال کئے گئے تھے۔

بہت سی دوسری چیزوں کے علاوہ جس چیز نے مجھے چونکایا وہ ایک سیاہ بریف کیس تھا۔ جس پر سنہرے رنگ میں اسرائیل کا سفارتی نشان کندہ تھا۔

اس بریف کیس میں مختلف کاغذات کی فوٹو کاپیاں موجود تھیں ان میں جوہری توانائی کے عالمی کنٹرول کمیشن کی کچھ ابتدائی خفیہ دستاویزات کے علاوہ فرانس کے ایک شہرہ آفاق ادارے کے کسی جوہری منصوبے کی تفصیلات موجود تھیں۔

میں سائنسی علوم میں خاصی حد تک بے بہرہ تھا مگر ان کاغذات نے مجھ پہ ایک بھیانک صورتحال واضح کر دی تھی کہ اسرائیلی اہلکار ہر ذرائع سے جوہری رازوں کے حصول کے لئے کوشاں تھے اور شاید بن حیان اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ان دنوں فرانس پہنچا ہوا تھا۔ اسرائیل اسلحہ کی حد تک اپنے ہمسایوں پر نمایاں برتری کا حامل تھا مگر اس کا محدود رقبہ اور محدود تر افرادی قوت اس کی بقا کی راہ میں رکاوٹ تھی۔

یہودی مختصر عرصہ کے لئے اپنے تمام وسائل داؤ پہ لگا کر تباہ کن جنگ تو جیت سکتے تھے مگر ان کا ملکی ڈھانچہ کسی طویل المیعاد جنگی معرکہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جبکہ یہودی مملکت کی بنیاد ہی اس نظریے پہ رکھی گئی تھی کہ عارضی طور پہ ایک مختصر قطعۂ زمین حاصل کرنے کے بعد میں فوج کشی کے ذریعے اس کی توسیع کی جائے۔

اپنی مرضی سے جنگ کے آغاز اور خاتمے کے لئے جوہری اسلحہ اسرائیل کی ناگزیر ضرورت تھی۔ وہ ہولناک ایٹمی تباہی کی دھمکی دے کر مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے بعد اپنے دشمنوں کو اپنی ہی چھیڑی ہوئی جنگ کو طول دینے سے روک سکتا تھا۔

اور پھر مجھے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ اسرائیل نے اپنے بنجر ریگزاروں کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کرنے کے لئے اپنے جنوبی ساحل پر ایٹمی توانائی سے سمندری پانی کو میٹھے پانی میں بدلنے کے پلانٹ لگانے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں وہ کاغذات مزید اہم ہو گئے تھے۔

اس ناقابلِ تصور کامیابی نے میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں اور میں پورے انہماک سے تجوری خالی کرنے لگا۔

پھر مجھے ایک لفافہ ملا جس میں عذرا جوناس کے نام اسرائیلی وزارتِ دفاع کے مطبوعہ لیٹر پیڈ پر ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط موجود تھا۔ خط کے اختتام پر لکھنے والے کے نام کے بجائے دستخط تھے جنہیں قدرے دشواری کے ساتھ دایان پڑھا جا سکتا تھا۔ یعنی عذرا جوناس اس قدر اہم تھا کہ اسرائیلی وزیرِ دفاع موشے دایان اس سے نجی سطح پر خط و کتابت کرتا تھا۔ لفافے پہ کوئی مہر موجود نہیں تھی نہ ڈاک کے ٹکٹ لگائے گئے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ خط اسرائیل کی کسی سفارتی ڈاک یا کسی قاصد کے ذریعے عذرا جوناس تک پہنچایا گیا تھا۔

ایلیزا اس تجوری سے ساری رقم لے گئی تھی اور میں نے تقریباً سارے کاغذات باہر جمع کر لئے۔

تھوڑی دیر بعد عبداللہ کی مدد سے میں نے وہ تمام کاغذات کار کی ڈگی میں منتقل کر دیئے اور الارم سوئچ پر سے ٹیپ ہٹا کر تجوری کا وزنی دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی بات ٹھان چکے ہو۔" عبداللہ نے میرے تیور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت ایلیزا عمارت کے اندر تھی اور ہم دونوں کار کے قریب موجود تھے۔

"میں نہیں چاہتا کہ یہ تمام کاغذات ہمارے قبضہ سے نکل جائیں لہٰذا تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم۔۔؟"

"میں ان دونوں بھائیوں کی واپسی تک یہیں رہوں گا۔ ایلیزا بڑی خوشی سے میری میزبانی کرے گی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پاگل پن کی باتیں نہ کرو، میں تمہیں تنہا یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ انہیں بھنک بھی مل گئی تو تمہیں مہلت دیئے بغیر بے رحمی سے ذبح کر ڈالیں گے۔"

بس یہ پتہ لگا کر عذرا جوناس کا چھوڑا ہوا پانچواں محافظ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب ہو گیا۔ تم اسے تلاش کر کے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرو۔ اور جوناس ولا کے گرد دس پندرہ بے جگر آدمیوں کو مامور کر دو۔ میں ایلیزا کے ساتھ ہی مقیم رہوں گا۔ اور ان دونوں کی واپسی پر اسی عمارت میں روپوشی اختیار کر لوں گا۔"

"وہ ایلیزا سے سب کچھ اگلوا لے گا اور تم کسی چوہے کی طرح بآسانی دھر لیے جاؤ گے۔" اس نے اضطراری انداز میں میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ان کے خاتمے کے لئے اندر سے وار کرنا ضروری ہے۔ باہر والے آدمی تو صرف میری زندہ سلامت واپسی کے لئے درکار ہوں گے۔"

"تم بہت خطرناک فیصلہ کر رہے ہو۔ اس پہ ایک بار پھر نظر ثانی کر لو۔" وہ میری طرف مترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس کے ہر پہلو پہ غور کر لیا ہے۔" میں مسکرا کر بولا۔

"تو تم کاغذات لے کر نکل جاؤ، میں یہیں رہ جاتا ہوں۔"

"تم اس لڑکی کو نہ سنبھال سکو گے۔ وہ ایک بار بدک گئی تو ہم اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے رہ جائیں گے۔"

"باہر والے آدمیوں سے تمہارا رابطہ کیسے ہو گا؟" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد اس نے سوال کیا۔

"مجھے کسی رابطے کی ضرورت نہیں وہ لوگ۔۔۔ جوناس ولا میں پہلے فائر یا دھماکے کی آواز سنتے ہی عمارت سے نکاسی کے تمام راستوں پر قبضہ کر لیں گے۔ اور فرار کی کوشش کرنے والے ہر شخص کو بغیر للکارے گولی مار دیں گے۔"

"اس افراتفری میں وہ تمہیں کیسے پہچانیں گے؟"

"انہیں احتیاطاً میرے حلیئے سے آگاہ کر دینا۔"

"یہ ناکافی ہو گا۔" وہ تشویش آمیز لہجہ میں بڑبڑایا۔ "ہیجان اور خونریزی کے درمیان وہ کسی پر اتنی توجہ نہ دے سکیں گے۔"

"تم کب تک آدمیوں کا انتظام کر لو گے۔؟"

"شاید شام سے پہلے۔" وہ بولا۔ "پیرس میں کئی گروپ موجود ہیں جن سے میں رابطہ قائم کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر تم ان آدمیوں کو شام کو شہر میں کہیں جمع کر لو۔ میں ایلیزا کے ساتھ تفریح کے بہانے باہر نکل کر اپنی رونمائی کرا دوں گا۔"

"تو ابھی میرے ساتھ چلو، شام تک لوٹ آنا۔ اس وقت تک تو ان دونوں کو بھی نیس سے واپسی کی پرواز نہ مل سکے گی۔"

"تیر کمان سے نکل چکا ہے اور میں ایلیزا کو ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اگر اس کے دل میں باپ کی محبت عود کر آئی تو ہمارے منصوبے پر پانی پھر جائے گا۔"

"تو تم شام کے سات اور ساڑھے سات کے درمیان ایفل ٹاور پر موجود رہنا۔ میرے آدمی وہیں سیاحوں میں مل کر تمہارا جائزہ لے لیں گے۔۔؟"

"یہ مناسب رہے گا۔"

"سارا اسلحہ اپنے پاس ہی رکھ لو۔" وہ خطرناک بموں والا بریف کیس اور اپنے پستول کے فاضل راؤنڈز میرے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔ یہ تجویز بہت معقول ہے۔"

اسے وہیں چھوڑ کر میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ایلیزا وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے بموں والا بریف کیس احتیاط سے ایک صوفے کے نیچے کھسکا دیا۔ اور ایلیزا کو پکارنے لگا۔

دوسری آواز پر وہ آئی تو میں اسے باہر لے گیا۔

"تم جا رہے ہو؟" وہ عبداللہ کو کار کے پاس تیار دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"ڈان فرنانڈو میری رقابت سے خائف ہے۔" عبداللہ ہنس کر بولا۔

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی اور جب عبداللہ وہاں سے روانہ ہو گیا تو وہ میرے ساتھ مکان میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "رقابت تو دور کی بات ہے میرا خیال ہے کہ تمہارا دوست لڑکیوں سے رسمی میل جول بھی پسند نہیں کرتا۔"

"اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے میرے باپ کی پرواہ کئے بغیر ٹیلی فون کے ملکہ کی گاڑی میں یہاں آنے کی ہمت کیسے کر ڈالی؟"

"عورت اگر ذہن پر سوار ہو تو آدمی پہاڑوں سے بھی ٹکرا جاتا ہے۔" میں اس کے ہمراہ ڈائننگ روم سے گزر کر اس کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تو میں واقعی تمہارے سر پر سوار ہوں؟" اس نے میٹھی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ناز کے ساتھ سوال کیا۔

"ہٹ کے خدمتگار سے تمہارا پیغام ملنے کے باوجود میں صدیاں گزرنے تک تمہارا انتظار کیا تھا۔" میں نے اس کی انا کو تھپکی دینے کی نیت سے کہا۔

"اگر میرا باپ واقعی نیس چلا گیا ہے تو شاید ہم ایک دو روز بے فکری میں گزار سکیں گے۔" اس نے اپنی خوابگاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اس مکان میں اور کون رہتا ہے؟" میں نے اس کی سادہ سی خوابگاہ کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک بوڑھی خادمہ، خانساماں اور چوکیدار ہر وقت رہتا ہے دو مالی شام کو تھوڑی دیر کے لئے آتے ہیں۔"

"یہ لوگ تمہارے باپ کو میرے بارے میں ضرور بتائیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ پُرغرور مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "خادمہ اور خانساماں تو مجھ پر ہونے والی زیادتیاں دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں اور چوکیدار کو تمہاری موجودگی کا علم ہی نہ ہو سکے گا۔"

"یہ تو ناممکن ہے۔ میں اسی کے سامنے پھاٹک سے اندر آیا تھا۔ اور راستے میں اس نے چارلس ورتھ کو اکیلا جاتے بھی دیکھا ہو گا۔"

"کسی وقت میں تمہیں اپنی گاڑی میں باہر لے جاؤں گی۔ اور واپسی میں تم عقبی نشست کے پائیدان پر دبک کر اندر آؤ گے تو اس کے فرشتے بھی شبہ نہیں کر سکیں گے۔"

اس نے مسہری پر دراز ہو کر اپنے لئے سگریٹ سلگائی اور دھویں کے کثیف مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے بولی۔ "اس ملاقات کا جشن نہیں مناؤ گے۔؟"

میں خرافات میں الجھنے سے قبل اپنا اسلحہ کسی مناسب مقام پر محفوظ کرنے کے لئے بے چین تھا مگر مجھے ایلیزا کی دلداری بھی مقصود تھی لہٰذا اس کی خوابگاہ کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے چھوٹے ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گیا۔

وہسکی کی نصف بوتل اور دو خالی گلاس لے کر میں واپس پلٹا تو خوابگاہ سے باہر والی راہداری سے کسی کی منمناہٹ سنائی دی۔

ایلیزا نے لیٹے لیٹے بلند آواز میں فرنچ میں کچھ کہا پھر میرے چہرے پر اضطراب کی لہریں دیکھتے ہوئے انگریزی میں بولی۔ "فکر مت کرو میرا خانساماں ہے۔"

اس کا فقرہ ختم ہونے سے پہلے ہی سفید ایپرن میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص خوابگاہ کے دروازے پر آ کر رک گیا۔ اور منمناتی ہوئی آواز میں ایلیزا سے کچھ کہنے لگا۔

ایلیزا اچھل کر بستر پہ سیدھی ہو گئی اور قدرے تیز لہجے میں کچھ دریافت کیا۔ ان دونوں میں کئی فقروں کا تبادلہ ہوا۔ اور میں بدستور اپنی جگہ کھڑا باری باری ان کے چہروں کے تاثرات دیکھتا رہا۔ خانساماں شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اور ایلیزا کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔

پھر اچانک ہی باہر والی راہداری میں کوئی بے آواز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا میں نے خانساماں کے عقب میں ایک ہیولا سا آگے بڑھتا دیکھا اور پھر خانساماں کو ایپرن کی ڈوری تھام کر باہر کھینچ لیا گیا۔ اس وقت پہلی بار میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے کرخت چہرے پر سفاکی برس رہی تھی اور اس کے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے اعشاریہ چار دو کے ریوالور کی سیاہ آہنی نال میری جانب اٹھی ہوئی تھی۔ خانساماں کو درمیان سے ہٹا کر وہ براہ راست ہمارے سامنے آ گیا تھا۔

اس غیر متوقع منظر کو دیکھتے ہی میرے ہاتھ سے وہسکی کی بوتل اور گلاس قالین پر گر گئے۔ بوتل تو لڑھک کر ایک طرف چلی گئی۔ مگر گلاس آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

اس نے میری طرف ریوالور کی نال لہرا کر حقارت آمیز لہجہ میں فرینچ میں کچھ کہا اور میں استفسار طلب نظروں سے ایلیزا کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے؟" ایلیزا بستر سے اچھل کر نیچے اترتے ہوئے غرائی "تم کون ہو اور اس طرح میرے گھر میں گھسنے کی جسارت کیسے کی —؟"

ایلیزا نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے انگریزی کا سہارا لیا تھا اور آنے والے کے پتلے پتلے لبوں پر ابھرنے والی استہزائیہ مسکراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فرینچ بولنے کے ساتھ ہی انگریزی سمجھنے پر بھی قادر تھا۔

ایلیزا کے رویّے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آنے والا اس کے لئے اجنبی تھا جب کہ میں نے اسے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔

وہ سرمئی سوٹ والا جوناس ولا کا وہی پانچواں مسلح محافظ تھا جو اپنے چار ساتھیوں کی جوناس برادران کے ساتھ نیس روانگی کے بعد وہاں تنہا رہ گیا تھا۔

چھوٹے ہوئے چہرے پر اس کی چندھیائی ہوئی آنکھیں عجیب سی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صورتحال سے پوری طرح مطمئن تھا۔

"میں اس مکان کا محافظ ہوں مسّی!" وہ ریوالور کی نال کو جھکائے بغیر جذبات سے عاری لہجہ میں بولا۔ اس بار اس نے بھی انگریزی ہی استعمال کی تھی۔

"محافظ!" ایلیزا نے مٹھیاں کس کر غصے اور حقارت سے دہرایا۔ "اور تم جانتے ہو کہ میں اس مکان کی مالکن ہوں۔"

"میں مونسیور عذرا جوناس کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا۔" اس مرتبہ اس کا لہجہ محتاط اور نہایت رسمی تھا۔

"میں عذرا جوناس کی اکلوتی بیٹی ہوں اور تمہیں حکم دیتی ہوں کہ فوراً اس مکان سے نکل جاؤ۔" ایلیزا غصے کے عالم میں دھاڑی اس کا بوڑھا خانساماں سرمئی سوٹ والے کے پیچھے کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ اگر اس میں جوانی کے حوصلے کی ذرا بھی رمق ہوتی تو وہ سرمئی سوٹ والے کو پیچھے سے دبوچ کر آناً فاناً میں مفلوج کر سکتا تھا۔ مگر وہ عمر کی اس منزل پر پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جہاں انسان اپنی بدترین توہین کو بھی تحمل کے خوبصورت نام سے برداشت کر جاتا ہے۔

"میں نہیں جا سکتا مسّی!" وہ سرد لہجے میں بولا "میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ میرے فرائض میں شامل ہے۔"

"تم...... تمہاری یہ مجال۔" ایلیزا غصے سے ہکلانے لگی "تم خود کو محافظ کہتے ہو اور کسی ڈاکو کی طرح میری خوابگاہ میں گھس آئے ہو۔" وہ بپھرتی اس کی طرف بڑھی مگر جب اس نے ریوالور کی نال کو جارحانہ انداز میں جنبش دی تو ایلیزا کے قدم منجمد ہو کر رک گئے مگر زبان پھر چل پڑی۔ "کیا میرے باپ نے تمہیں اسی ذلیل کام پر مامور کیا تھا؟"

"اگر تم واقعی عذرا جوناس کی بیٹی ہو تو مجھے تم سے کوئی پرخاش نہیں۔ تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور اگر اپنے باپ کے ایک نمک خوار کی مدد نہیں کر سکتیں تو کم از کم دور رہ کر تماشا ہی دیکھتی رہو!"

"یہ میرا گھر ہے یہاں میری مرضی چلے گی۔ مجھے راستے سے ہٹا کر کیا تم دیواروں سے اپنا سر ٹکرانا چاہتے ہو۔"

"میرا شکار وہ ہے!" اس نے ریوالور کی نال سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا دوست اور مہمان ہے، مجھ پر گولی چلائے بغیر تم اسے چھو بھی نہ سکو گے۔" ایلیزا یہ کہتے ہوئے جارحانہ تیوروں کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے لگی۔

"رک جاؤ" میں نے پہلی مرتبہ مداخلت کرتے ہوئے لپک کر ایلیزا کا بازو تھام لیا۔ "مجھے معلوم تو کرنے دو کہ یہ کیا چاہتا ہے۔"

"ہٹ جاؤ...... مجھے بزدلی کا سبق نہیں پڑھاؤ" ایلیزا جنون کے عالم میں خود کو میری گرفت سے آزاد کرانے کی وحشیانہ جدوجہد کرنے لگی۔ "میں اپنے باپ کی طرح بزدل اور مکار نہیں ہوں۔ اس چھت کے نیچے میرے اختیار کو چیلنج کرنے والے کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

ایلیزا کو قابو میں رکھنے کے لئے مجھے خاصی محنت کرنی پڑ رہی تھی، جس کے نتیجے میں اسے کوئی جسمانی گزند بھی پہنچ سکتی تھی۔ دوسری طرف اس محافظ کے رویّے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ وہ ایلیزا کو کوئی نقصان پہنچانے سے گریز کرے گا۔ لہٰذا میں نے ایلیزا کو چھوڑ دیا تاکہ اس کے اور محافظ کے الجھاؤ سے فائدہ اٹھانے کی راہ تلاش کر سکوں۔

ایلیزا غصے میں بپھری ہوئی تیر کی طرح اس شخص کی طرف گئی۔ اور اس محافظ نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی نال بائیں ہاتھ میں تھامی اور اس کا دستہ ایلیزا کی داہنی کنپٹی پر رسید کر دیا۔

محافظ کا یہ اقدام جس قدر میرے لئے غیر متوقع تھا اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ ایلیزا کے لئے ناگہانی ثابت ہوا اور وہ بالکل مشینی انداز میں کوئی آواز نکالے بغیر پہلو کے بل فرشی قالین پر ڈھیر ہو گئی۔

ایلیزا کے گرتے ہی راہداری میں سے ایک قدرے بلند اندوہناک سی آواز ابھری اور ایلیزا کا بوڑھا خانساماں بلند آواز میں روتا ہوا محافظ کو دھکیلتا ہوا اندر گھس آیا۔

دھکا لگتے ہی وہ شخص بھڑکا تھا مگر جب اس نے رقّت زدہ

خانساماں کو سسکیاں باندھ کر اپنی مالکن کے بے حس و حرکت جسم کے قریب بیٹھتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ تمام واقعات پلک جھپکتے میں اتنی سرعت کے ساتھ رونما ہوئے کہ مجھے پیش قدمی کا کوئی موقع نہ مل سکا۔

بوڑھا خانساماں نہایت فیاضی سے آنسو بہاتے ہوئے ایلیزا کا سر اپنی گود میں رکھے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس لڑکی پر ہاتھ اٹھا کر تم نے اپنی کمینگی کا ثبوت دیا ہے —!" میں نے تلخ لہجے میں محافظ سے کہا جو زبان کھولنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ وہ بے رحمانہ انداز میں ہنس پڑا "تمہیں یہی کہنا چاہئے کیونکہ میں نے آکر رنگ میں بھنگ ڈال دیا ورنہ اس وقت وہ خانساماں کی لوری بجائے تمہارے سینے پر سر رکھے تم سے لوری سنانے کی فرمائش کر رہی ہوتی۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"دوسرے کمرے میں چل کر بات کروں گا!"

"یہیں بات کرو، میں ایلیزا کو اس احمق کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"فکر نہ کرو خانساماں عمر رسیدہ اور از کار رفتہ ہے۔ بے ہوش لڑکی کے بدن کا لمس اسے نہ اکسا سکے گا۔"

"میں اس کمرے سے نہیں جاؤں گا۔" میں نے اس کے بیہودہ فقرے کو برداشت کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"لڑکی کو میں نے صرف بے ہوش کرنے پر اکتفا کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ عذرا کی بیٹی ہے مگر تم پر میں ریوالور کے دستے کے بجائے نال استعمال کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھوکر سے خانساماں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور فرینچ میں اسے کوئی ہدایت کی۔ جس کے نتیجہ میں خانساماں بوکھلائے ہوئے انداز میں ایلیزا کے بے حس و حرکت جسم کو دروازے کے سامنے سے ہٹانے لگا۔

"تو تم یہیں بات کرو گے؟" مجھے اپنی جگہ جما دیکھ کر اس نے تپتے ہوئے لہجہ میں سوال کیا۔

"تمہیں اس توہین آمیز سلوک کی قیمت ادا کرنی ہوگی —" میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے دھمکی دی۔ "اگر تمہیں واقعی عذرا جوناس نے جوناس ولا کی حفاظت پر مامور کیا تھا تو تمہیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ یہاں کے انتظام کا نگراں کون ہے!"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو —؟" اس کے چہرے پر الجھن کی کوئی علامت نہیں تھی۔ مگر اس کے اس سوال سے یہ ظاہر ہو گیا کہ میں اس کے دماغ کو الجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میری بات چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"وہ بھی جوناس ولا کے اطراف میں موجود ہوگا۔"

"کیوں —؟"

"اس لئے کہ عذرا جوناس نے بھاری معاوضے پر اسے ملازم رکھا ہے۔"

"تم بکواس کرتے ہو!"

"اب اگلا سوال کرو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تم دونوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

"تمہیں کسی سمت سے آئی ہوئی گمنام گولی سے بچانے کے لئے مشورہ دینا تھا۔" میں نے ایسا لہجہ اختیار کیا ہوا تھا جیسے میرے نزدیک اس شخص یا اس کے سوالات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

"وہ کیسے؟"

"تم کسی پیدائشی یتیم کی طرح جوناس ولا کے اطراف میں منڈلا رہے تھے اور معمولی سمجھ بوجھ والا کوئی بھی شخص تمہاری چند منٹ کی نگرانی کے بعد اندازہ لگا سکتا تھا کہ تم اپنے اوور کوٹ کی پھولی ہوئی جیب میں ریوالور لئے جوناس ولا کی نگرانی کر رہے ہو۔ عذرا جوناس کے دشمن آج صبح سے دو بار اس علاقے کا طواف کر چکے ہیں اور شاید آج رات وہ آ ہی پہنچیں جس کی تیاری کے لئے عذرا جوناس ہمیں پال رہا تھا۔ اگر آج رات یہاں کوئی حملہ ہوا تو اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے تم دشمنوں کا پہلا اور سہل ترین نشانہ بنو گے۔"

"یعنی تم یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہو کہ جوناس ولا کے حفاظتی انتظامات کے نگراں تم ہو؟" اس نے میرے خاموش ہونے پر طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میری مرضی کی بات نہیں حقیقت ہے!"

"مگر میں تمہارے وجود سے لاعلم ہوں جب کہ اپنے ساتھیوں سمیت دو روز سے جوناس ولا کی حفاظت کر رہا ہوں۔"

میں نے اس کی بات پر زور سے قہقہہ لگایا "ساتھی! کہاں ہیں تمہارے ساتھی؟"

میرے پُراعتماد لہجہ نے اسے بوکھلا دیا "وہ...... وہ بھی باہر ہی ہیں۔"

"تم خوردبین لے کر بھی شام تک ان چاروں میں سے کسی ایک کو پیرس میں تلاش کر سکو تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

"تو کیا وہ لوگ پیرس سے باہر گئے ہوئے ہیں؟" اس نے بے اختیار سوال کر ڈالا۔

"وہ چاروں صبح چھ بجے عذرا اور ابراہام کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے اس کے بعد تم نے انہیں دیکھا؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی "میں خود اس بارے میں پریشان ہوں۔"

"شاید عذرا کو بھنک مل گئی کہ آج رات جوناس ولا پر بھاری پڑنے والی ہے۔ اسی لئے وہ صبح سویرے اپنے بھائی اور چار محافظوں کے ساتھ سات بج کر دس منٹ پر میس کی طرف پرواز کر گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ اب اس کا صرف ایک آدمی جوناس ولا کے باہر موجود ہے اور میں نے پہلی ہی نظر میں تمہیں تاڑ لیا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے حفاظتی انتظام کی ہدایت کی تھی اور اس وقت میرے دس آدمی باہر موجود ہیں۔"

اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ "عذرا نے جانے سے قبل مجھے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے الہام تو ہونے سے رہا۔۔!"

"وہ جان کے خوف سے عجلت میں فرار ہوا ہے۔"

"مگر اپنی بیٹی کو یہاں کیوں چھوڑ گیا؟"

"بیٹی اس سے بغاوت کرتی رہتی ہے وہ خود تو اسے نہیں مار سکتا، ہاں اس حملے میں ماری گئی تو وہ اس سے نجات کا جشن منائے گا۔"

"وہ اپنی بیٹی سے واقعی بہت نالاں ہے۔" اس نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں کو جوناس ولا کی حفاظت کے ساتھ ہی ایلیزا کی نگرانی پر بھی مامور کیا گیا تھا۔"

"سرسری طور پر اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔"

"نگرانی کے آغاز کے بعد ایلیزا تین بار باہر نکلی اور تینوں مرتبہ اس کا تعاقب کیا گیا ہمیں ہدایت ملی تھی کہ اگر وہ کسی کے ساتھ بے تکلفی کے ساتھ عیاشی میں ملوث ہونے کی کوشش کرے تو ایسے شخص کو ہلاک یا کم از کم معذور کر دیا جائے اور جب تم نے مجھے جوناس ولا میں طلبی کا پیغام دیا تو میں یہی سمجھا کہ تم ایلیزا کے کوئی بے تکلف دوست ہو اور شاید ایلیزا نے اپنی نگرانی کا اندازہ کرنے کے بعد تمہیں اپنے گھر بلا لیا ہے تاکہ نئی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔"

وہ ایلیزا کے دوسرے آرام دہ بستر پر بیٹھ گیا۔ میں بھی لاپرواہانہ انداز میں مسہری پہ دراز ہو گیا میرا ذہن نہایت تیزی کے ساتھ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت میں کسی بھی لمحے نہایت آسانی کے ساتھ اسے دبوچ سکتا تھا۔ مگر اس پہ کاری وار کرنے سے پہلے میں کچھ باتیں صاف کرنی چاہتا تھا۔

"تم جوناس ولا کی عمارت میں رہو گے یا باہر سے حفاظت کرنی پسند کرو گے۔؟" میں نے گفتگو کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے سوال کیا۔

"پہلے بتایا ہوتا تو شاید اندر اچھا وقت گزارنے کی کوشش کرتا مگر میرے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد ایلیزا تو مجھے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گی۔"

"یعنی تم باہر ہی رہو گے؟"

"ویسے لڑکی نمکین ہے" وہ ایلیزا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ اپنی طرف سے اس کا دل صاف کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"میں ڈیوٹی کے وقت بے اعتدالیاں برداشت نہیں کرتا" میں نے سخت لہجہ میں کہا۔

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا" وہ قہقہہ مار کر بولا۔ "اپنا تر لقمہ کوئی بھی دوسروں کے حوالے کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور تم تو ویسے بھی میرے افسر ہو گئے ہو" پھر وہ چونک کر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "مگر یہ بات حیرتناک ہے کہ تم فرنچ سے نابلد ہو کیا عذرا جوناس کو اپنے مکان کی حفاظت کے لئے کوئی مقامی نہیں ملا تھا؟ تمہارا تعلق کس علاقے سے ہے؟"

"میں عذرا جوناس کا پرانا نمک خوار ہوں" میں نے کہا۔ "اسے یہاں کی سوسائٹی میں خاصا مقام حاصل ہے اور وہ زیرِ زمین دنیا سے رابطہ قائم کر کے بدنامی مول لینی نہیں چاہتا۔ اسی لئے اس نے مجھے خاص طور پہ لندن سے بلایا ہے۔"

"اور تمہارے دس آدمی؟"

"وہ بھی میرے ساتھ ہی آئے ہیں مگر پیرس ان کے لئے نیا نہیں ہے!"

"اگر اسے اپنے مرتبے کا اتنا ہی خیال تھا تو تمہارے آنے سے پہلے ہم لوگوں کو کیوں استعمال میں لیا تھا؟" اس نے سوال کیا۔

"حالات برخوردار!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں پروگرام کے مطابق ہی یہاں پہنچا ہوں، مگر عذرا جوناس ہم لوگوں کی آمد تک حالات پہ قابو نہ رکھ سکا۔ اور متوقع خطرات کے پیشِ نظر تم لوگوں کے پاس جا پہنچا۔"

"اگر تم میرا حساب کر دو تو میں ابھی واپس لوٹنے کے لئے تیار ہوں۔ جوناس ولا کی حفاظت کا سہرا بلا شرکتِ غیرے تمہارے سر رہے گا۔"

"میں عذرا کے فیصلوں کو نظر انداز کرنے کا اختیار نہیں رکھتا" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہاں اگر تم خطرات سے خائف ہو تو تمہیں زبردستی نہیں روکوں گا۔"

"میرا نام البرٹونیو ہے اور میں خطرات سے ٹکرا کر ہی اپنی روزی کماتا ہوں۔" اس نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہاری اب تک کی کارکردگی کیا ہے؟"

"کم و بیش پندرہ قتل کر چکا ہوں اور کبھی دو ہفتے سے زیادہ حوالات یا جیل میں نہیں رہا میرے ساتھی ہمیشہ میرے مقدر پہ رشک کرتے ہیں۔"

"میں تمہارے ماضی کو نہیں کریدنا چاہتا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ جوناس ولا کی اب تک کی نگرانی سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ جوناس کے دشمن محض اس کے وہم کی پیداوار ہیں اس کی اصل اور اکلوتی دشمن خود اس کی بیٹی ہے۔ مگر تم نے تو کچھ زیادہ ہی گمبھیر تصویر پیش کی ہے۔"

"عذرا جوناس پاگل نہیں ہے جو ہم لوگوں کو منہ مانگا معاوضہ دے رہا ہے!" میں نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"چلو آج رات یہ بھی پتہ چل جائے گا۔"

"اپنے ساتھیوں میں سے اب تم اکیلے ہی باہر رہ گئے ہو؟"

"ہاں ـــ جوناس نے جیراڈ سے صرف پانچ آدمیوں کا معاہدہ کیا تھا، چار کو وہ ساتھ لے گیا تو اب میں تنہا ہی رہ گیا ہوں۔"

"جیراڈ؟" میں نے چونک کر سوال کیا ـــ "وہ کون ہے؟"

"پیرس کا نامی گرامی گروہ بند ہے، میں اسی کے لئے کام کرتا ہوں" اس نے فخریہ انداز میں کہا ـــ "ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے میں نے اس سے براہِ راست بات کی ہے۔"

"انتظامات کا جائزہ لینے آیا ہو گا؟"

"ایسے چھوٹے موٹے معاملے وہ اپنے آدمیوں پر ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اگر وہ یوں ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑاتا پھرے تو اپنے آدمیوں کو لمبی لمبی تنخواہیں بھی وقت پر نہ دے سکے گا۔"

میرے لئے مزید کوئی سوال کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مگر جیراڈ کے نام نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، میرے دشمن کا دوست تھا اور میں البرٹونیو کا قصہ پاک کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا۔ کہ اس نے جیراڈ سے کیا بات کی تھی۔

"جوناس سمیت ان چاروں کی اتنی طویل غیر حاضری میرے لئے تشویشناک تھی" قدرے توقف کے بعد وہ خود ہی بولنے لگا "میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ سب جوناس ولا سے باہر ہی کہیں دشمنوں کے نرغے میں پھنس گئے، اسی لئے میں نے جیراڈ کو فون کر ڈالا۔ وہ شہر میں ان کا کھوج لگانے کے ساتھ ہی تھوڑی دیر میں میری مدد کے لئے دو آدمی بھی بھیج دے گا۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمہارے سامنے آ جانے کے بعد مجھے کسی کمک کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"تم ان دونوں کو جانتے ہو؟"

"گروہ کے سارے آدمی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اندازاً کب تک پہنچیں گے وہ؟" میں نے اس کے سامنے رک کر پُرسکون لہجہ میں سوال کیا اور وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"یہ تمہارا لہجہ کیوں بدل گیا ہے؟" اس نے قدرے تشویش کے ساتھ سوال کیا۔ میں نے پُرسکون رہنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن کسی بھی انسان کے قتل کا فیصلہ اتنا سہل نہیں ہوتا کہ اس سے لہجہ بھی متاثر نہ ہو۔

البرٹونیو کو مزید حیرت یا تشویش کا موقع دیئے بغیر میں نے پوری قوت سے اس کی بائیں کنپٹی پہ گھونسہ رسید کیا اور وہ تیز چیخ مار کر ایلیزا کی مسہری پہ پیچھے الٹ گیا۔ عین اسی وقت میرے عقب میں دوسری مردانہ چیخ گونجی۔ میں نے گردن گھما کر ایک لحظہ کے لئے ایلیزا کے بوڑھے خانساماں کو دیکھا جو اپنی بے ہوش مالکن کو چھوڑ چھاڑ کر دیوار سے ٹکا بری طرح کانپ رہا تھا۔

میری شدید ضرب نے البرٹونیو کے حواس زائل کر دیئے تھے مگر اس کے باوجود اس کا داہنا ہاتھ اوورکوٹ کی وہ جیب تلاش کر رہا تھا جس میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔

میں نے اسے مسہری کی دوسری جانب پہنچنے کا موقع دیئے بغیر اس کے اوورکوٹ کا دامن پکڑ کر پوری قوت سے اسے مسہری سے نیچے اپنے قدموں میں گھسیٹ لیا۔

میرے غیر متوقع اور بھرپور حملے نے اس کی ساری مدافعانہ صلاحیتیں کند کر دی تھیں اور وہ کسی مظلوم بیوہ کی طرح اپنی مادری زبان میں بری طرح چنگھاڑنے لگا تھا۔ موقع کی مناسبت سے میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ مغلظات پر اتر آیا تھا۔

میں فوری طور پر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری قوت اس کے نرخرے پر صرف کرنے لگا۔

البرٹونیو نے میرے عزائم کا اندازہ لگاتے ہی میری پسلیوں میں چند طاقتور مکّے رسید کئے مگر ملقوم پہ میری انگلیوں کی گرفت سخت ہوتے ہی اس نے اپنا سارا زور میری گرفت سے نکلنے پر صرف کر دیا۔

اس وقت مجھے ایلیزا کے بوڑھے خانساماں کی طرف سے خاصی فکر لاحق تھی۔ اس نے البرٹونیو کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور دیکھ کر نہایت پست ہمتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور اپنی مالکن کی بے ہوشی ہی اس کے مفلوج قدموں میں جان ڈال سکی تھی۔ مگر اس وقت معاملہ ایک قتل کا تھا۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس جدوجہد کے دوران اس بوڑھے کی بزدلی اچانک بے خوفی میں نہ بدل جائے۔ اگر وہ واقعی میری بے خبری میں پشت سے کوئی ضرب لگا بیٹھتا تو ساری صورتحال آناً فاناً میں تبدیل ہو کر میرے لئے روح فرسا رخ اختیار کر سکتی تھی۔

میری انگلیاں البرٹونیو کے نرخرے میں پیوست ہو چکی تھیں اور اس کی جانکنی جدوجہد اپنے عروج پر تھی کہ اچانک مجھے اپنے داہنے بازو پر کسی کی استخوانی انگلیوں کی لرزہ آمیز مگر مضبوط گرفت محسوس ہوئی اور میری رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل گئے اور اس ایک ہی لحظہ میں ہی میں لباس کے نیچے، اپنی جلد پہ پسینے کی ٹھنڈی ٹھنڈی دھاریں بہتی محسوس کرنے لگا۔

البرٹونیو کی موت کی دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں میں اچانک امید اور التجا کی کرنیں چمکنے لگیں اور ان کا رخ میرے چہرے کے بجائے میرے عقب میں کسی اور شے کی طرف ہو گیا۔

ایلیزا کا لرزہ براندام بوڑھا خانساماں مجھے کھینچ کر البرٹو نیو کے سینے سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے البرٹو نیو کی گردن پر گرفت نرم کئے بغیر موت کے قہر میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھا اور چیخ کر انگریزی میں اسے دور ہٹنے کا حکم دیا۔

بوڑھے نے اچانک یوں اپنا ہاتھ میرے شانے سے ہٹایا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

پندرہ افراد کے قاتل البرٹو نیو کا دمکتا ہوا چہرہ تاریک پڑ گیا اس کا پورا جسم دھیمے دھیمے مگر پوری شدت سے لرز رہا تھا۔ اور چند ہی ثانیوں میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

میں البرٹو نیو کی لاش سے اترا تو خانساماں بھی خوف کی شدت سے بے ہوش پڑا نظر آیا۔

جوناس ولا کی چھت کے نیچے مجھے پہلی کامیابی حاصل ہو چکی تھی مگر فوری مسئلہ البرٹو نیو کی لاش سے نجات کا تھا۔

ایلیزا کی ماں خواب آور ادویات کے زیرِ اثر سو رہی تھی اور کسی بھی لمحے بیدار ہو کر سامنے آ سکتی تھی۔ اس سے زیادہ اور فوری خطرہ بوڑھی خادمہ کی طرف سے تھا جس کے لئے ایلیزا کی خوابگاہ سے ابھرنے والی چیخیں تشویش کا باعث بن سکتی تھیں۔

جوناس ولا کا پھاٹک ایلیزا کی خوابگاہ سے اتنی دور واقع تھا کہ ایلیزا کی ناتمام چیخ اور پھر البرٹو نیو کی چیخ اپنے پورے تاثر اور شدت کے ساتھ چوکیدار تک نہ پہنچ سکی ہو گی ورنہ اتنی دیر میں وہ وہاں آ موجود ہوتا۔

فوری طور پر مجھے کوئی اور راہ نظر نہ آئی تو میں البرٹو نیو کی لاش کو گھسیٹتا ہوا خوابگاہ سے ملحق غسل خانے میں لے گیا اور اسے فرش پر چھوڑ کر دروازہ بند کر دیا۔

میں ایلیزا کو ہوش میں لانے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا کیونکہ وہی مجھے البرٹو نیو کی لاش سے نجات کی راہ بتا سکتی تھی۔

اسی اثنا میں مجھے آتش گیر اسلحے سے بھرے ہوئے اس بریف کیس کا خیال آیا جو میں نے عبداللہ سے لے کر ڈرائنگ روم میں ایک صوفے کے نیچے ڈال دیا تھا۔ میں فوری طور پر ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔

وہاں پہنچتے ہی میری نظر ایک ادھیڑ عمر عورت پر پڑی، جو اضطراری کیفیت میں ڈرائنگ روم میں ٹہل رہی تھی اس وقت اس کی پشت میری جانب تھی اور اپنی وضع قطع سے وہ خادمہ نظر آ رہی تھی۔ میں خاموشی سے دروازہ میں رک کر اس کے گھومنے کا انتظار کرنے لگا۔

جوں ہی وہ پلٹی اور اس کی نگاہ میرے مسکراتے ہوئے چہرے پر پڑی تو بے اختیار اس کا دہانہ کھلا مگر اس نے فوراً ہی اپنا ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی اضطراری چیخ کو حلق میں دفن کر دیا۔ اور اپنی جگہ پر رک کر خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

شاید میرے ہونٹوں پر سجی ہوئی دوستانہ مسکراہٹ نے اسے خاصی تقویت پہنچائی تھی۔

"تم انگریزی جانتی ہو؟" میں نے خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے سوال کیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"مسز جوناس کہاں ہیں؟"

"وہ اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ہیں۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں مس ایلیزا کا دوست ہوں" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"وہ دوسرا کون تھا؟"

"کون ——؟" میں نے انجان بن کر سوال کیا۔

"وہی، جس کے سینے پر تم سوار تھے؟" اس نے جھجکتے ہوئے کہا ——

"تو تم وہ ناخوشگوار منظر دیکھ چکی ہو ——!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"میں اس کی چیخ سن کر وہاں پہنچی تھی" اس کے اوسان آہستہ آہستہ بحال ہوتے جا رہے تھے" اس وقت تم سینے پر سوار اس کا گلا دبوچ رہے تھے —— وہ زندہ ہے نا؟"

"شاید بے ہوش ہو گیا ہے" میں نے مبہم سا جواب دیا۔ "چوکیدار یا کوئی اور تو اس طرف نہیں آیا تھا؟"

"نہیں ——" وہ بولی" اگر میں دوپہر میں تمہیں ایلیزا کے ساتھ نہ دیکھ چکی ہوتی تو شاید سب ہی کو اس کمرے میں جمع کر لیتی۔"

"ایلیزا کے ہوش میں آنے تک اس معاملے پر اپنی زبان بند رکھو اور جا کر اپنے معمولات سکون کے ساتھ پورے کرنے کی کوشش کرو۔"

"ایلیزا کیسے بے ہوش ہوئی؟"

"وہ شخص کسی بری نیت سے اندر داخل ہوا تھا۔ ایلیزا اسی کے تشدد کا شکار ہوئی ہے۔"

"پولیس کو طلب نہیں کرو گے؟"

"ایلیزا ہوش میں آنے کے بعد خود فیصلہ کرے گی کہ اسے کیا کرنا چاہئے، تم اپنے ذہن پر بلاوجہ زور نہ دو!"

"بہتر جناب!" اس نے سر جھکا کر کہا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے صوفے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے جھک کر صوفے کے نیچے دیکھا اور پھر یکے بعد دیگرے ڈرائنگ روم کے تمام فرنیچر کی تلاشی لے ڈالی مگر اسلحے سے بھرا ہوا بریف کیس کہیں نظر نہ آیا۔

بریف کیس کی گمشدگی میرے لئے تشویشناک تھی کیونکہ وہ ہتھیار میں ایلیزا کی لاعلمی میں وہاں چھپانے چاہتا تھا۔ ایلیزا شروع ہی سے خوابگاہ میں میرے ساتھ رہی تھی۔ البرٹو نیو جس وقت وہاں پہنچا تو اس کے پاس صرف ایک ریوالور تھا۔ یعنی بریف کیس کی گمشدگی کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لے دے کر خانساماں یا خادمہ رہ جاتی تھی اور بظاہر خانساماں بھی بری الذمہ معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ البرٹو نیو اسے اپنے ساتھ لے کر خواب گاہ میں پہنچا تھا اور اس مخبوط الحواس کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی ہو گی کہ ڈرائنگ روم کی تلاشی لیتا۔

میں خادمہ کو تلاش کرتا ہوا کچن میں پہنچا تو وہ ایک ڈبے سے پنیر کے ٹکڑے نکال کر کھانے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے عجلت میں پورا ٹکڑا نگل کر پانی کے چند گھونٹ لئے اور پھر معذرت آمیز انداز میں میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"معاف کرنا، مجھے دہشت سے فوراً ہی بھوک لگنے لگتی ہے یہ بچپن ہی سے میری کمزوری ہے ——" وہ جھینپے ہوئے انداز میں مسکرا کر بولی۔

"بہت اچھی بات ہے، اس طرح کھوئی ہوئی توانائی فوراً بحال ہو جاتی ہے" میں نے کہا" یہ تو بتاؤ کہ تمہیں ڈرائنگ روم سے کوئی چیز تو نہیں ملی ——؟"

"کس قسم کی؟" اس نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کر ڈالا۔

"کسی بھی قسم کی ——!" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"نہیں...... مجھے تو وہ دہشت ناک منظر دیکھنے کے بعد اتنا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ کسی اور چیز پر توجہ دیتی" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا" کیا تمہاری کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟"

"ہاں —— اپنی عقل کی تلاش میں ہوں" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور باورچی خانے سے باہر نکل آیا۔

میں خواب گاہ میں واپس پہنچا تو خانساماں ہوش میں آ چکا تھا۔ مگر قالین سے اٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

میں نے اس سے بریف کیس کے بارے میں بازپرس کرنی چاہی مگر وہ میرا مدعا نہ پا سکا۔ آخر کار میں اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اور وہاں اشاروں کی مدد سے چند ہی سکنڈ میں اسے اپنا سوال سمجھا دیا۔

اس نے نہایت مسرت سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور وہاں سے چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں میرا وزنی بریف کیس جھول رہا تھا۔

بریف کیس دیکھ کر مجھے اس کی کھوجی فطرت پر خاصا تاؤ آیا مگر میں نے کوئی بُرا ردِ عمل ظاہر کئے بغیر اسے رخصت کر دیا اور خود ایلیزا کی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔

البرٹو نیو نے ایلیزا کی کنپٹی پر خاصی شدید ضرب لگائی تھی جس کی وجہ سے وہاں ورم نمایاں تھا اور ایک جگہ سے تھوڑی سی جلد بھی چٹخ گئی تھی۔ جب اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں بارآور نہ ہوئیں تو میں نے اسے مسہری پر ڈال کر اس کے چہرے پر گیلا تولیہ ڈال دیا اور خود سگریٹ سلگا کر نئی صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔

البرٹو نیو کی دخل اندازی نے میرے حق میں صورتحال خاصی بگاڑ دی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اس کی لاش کو ٹھکانے لگانا ایک دشوار مرحلہ تھا بلکہ اس قتل کے دو چشم دید گواہ بھی تھے اور ان کے ذریعے ایلیزا کو بھی پوری تفصیل کا علم ہو جاتا۔ اس طرح میرا کردار خانساماں اور خادمہ کے سامنے کھل کر بے نقاب ہو گیا تھا۔

اس وقت مجھے شدت سے عبداللہ کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے مشورہ کر کے صورتحال کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر اسے یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ عذرا جوناس نے اپنے تحفظ کے لئے لاوارث غنڈوں کے بجائے جیرالڈ نامی شخص کے گروہ کی خدمات حاصل کی تھیں جو افرادی قوت اور وسائل کے اعتبار سے خاصا مضبوط معلوم ہوتا تھا۔

میں چاہتا تو جوناس ولا سے مادام فے کے مکان پر فون کر کے عبداللہ کے لئے پیغام چھوڑ سکتا تھا مگر میں وہاں کا فون استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ عذرا جوناس نے جس مکاری کے ساتھ ایلیزا کی کار میں ٹیپ ریکارڈر نصب کیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر مجھے پورا یقین تھا کہ نہ صرف وہ اپنے فون سے کی جانے والی ساری گفتگو ٹیپ کرتا ہو گا بلکہ مکان کے دیگر حصوں اور بالخصوص ایلیزا کی خواب گاہ میں بھی ڈکٹافون وغیرہ لگا ہو گا۔

اور اس پیچیدہ ماحول میں بے ہوش ایلیزا کو البرٹو نیو کی لاش کے ساتھ چھوڑ کر میرا باہر جانا اور وہاں سے عبداللہ سے رابطہ قائم کرنا بھی نامناسب ہی تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ یہ تمام معاملات سات بجے شام تک ملتوی کر دیئے جائیں جب مجھے اپنی رہنمائی کے لئے الفل ٹاور جانا تھا اپنے آدمیوں کے ساتھ عبداللہ کی وہاں موجودگی بھی ضروری تھی اور میں تھوڑی دیر کے لئے ایلیزا سے جان چھڑا کر عبداللہ سے مشورہ کر سکتا تھا۔

کافی دیر بعد ایلیزا کو ہوش آیا تو وہ کنپٹی میں درد کی شدت سے کراہ رہی تھی۔ حواس بحال ہونے کے بعد اس نے مجھے زندہ سلامت اپنے قریب موجود پایا تو اس کے خوبصورت لبوں پر ایک خفیف مگر آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"وہ کہاں ہے ——؟" ایلیزا کا پہلا سوال البرٹو نیو کے بارے میں تھا۔

میں نے ہاتھ سے غسل خانے کی طرف اشارہ کر دیا۔

"میں اس کی دونوں کنپٹیاں اپنے ہاتھوں سے کھولوں گی۔" وہ مسہری کی پشت گاہ کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی "اس نے مجھے بڑی بے رحمی سے ضرب لگائی تھی۔"

"فکر نہ کرو، میں نے اس سے بھرپور بدلہ لیا ہے۔"

"بے ہوش پڑا ہے کیا؟"

"وہ کبھی ہوش میں نہ آسکے گا۔"

"اسے مار دیا تم نے؟" وہ سہمے ہوئے انداز میں اپنی تکلیف بھول کر اچھل پڑی۔

"اب اپنی خادمہ اور خانساماں کو سنبھالنا تمہارا کام ہے۔ میں نے مجبوراً اسے ہلاک کیا ہے ورنہ وہ مجھے یا تمہیں مار دیتا۔"

"ان دونوں کی فکر نہ کرو، وہ اس واقعے کو بالکل بھول جائیں گے۔" وہ پرجوش لہجے میں بولی "تم بہت دلیر آدمی ہو۔ میری خاطر تم بلاوجہ پریشانیوں میں گھرتے جا رہے ہو۔"

"یہ نہ سمجھ لینا کہ شادی کرلوں گا تم سے!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اول تو میں شادی کرتی نہیں اور اگر کسی سے کر بھی لی تو تم سے ہمیشہ اسی طرح ملتی رہوں گی۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

اس کے ہوش میں آنے سے پہلے میں اپنا بریف کیس اسی کمرے میں چھپا چکا تھا۔ اور البرٹو نیو کے ریوالور پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے اسے ریوالور تو دکھا دیا مگر بریف کیس کے بارے میں سرسری سا تذکرہ کر ڈالا۔ کیونکہ میرے بجائے اسے خانساماں کی زبان سے بریف کیس کی کہانی کا علم ہوتا تو وہ وہم کا شکار ہو سکتی تھی۔

"وہ بریف کیس رکھا کہاں تم نے؟" اس نے سوال کیا۔

"اس میں ضروری کاغذات اور کچھ تجارتی نمونے وغیرہ ہیں اسی لئے مجھے اس کی فکر تھی اب وہ باہر جھاڑیوں میں چھپا دیا ہے!"

"یہاں کمرے میں ہی رکھ دیتے ___!"

"اول تو تمہارا کمرہ بہت مخدوش ہے اور اگر مجھے ہنگامی طور پر یہاں سے بھاگنا پڑا تو تمہارے کمرے کے بجائے ان جھاڑیوں تک میری رسائی آسان ہوگی۔"

گفتگو کی حد تک تو ایلیزا اس قتل سے خوش تھی مگر غسل خانے میں البرٹو نیو کی لاش دیکھ کر اسے بھی تشویش لاحق ہوگئی۔

لاش کو جوناس ولا سے باہر لے جا کر ٹھکانے لگانے کی کوئی بھی کوشش مہنگی پڑ سکتی تھی۔ جب کہ اسے زیادہ دیر تک ٹالا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد ایلیزا نے بوڑھے خانساماں سے مشورے کا فیصلہ کیا بعد میں خادمہ بھی شریک ہوگئی۔

اور جب ایلیزا نے مجھے نتیجہ سے آگاہ کیا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ خانساماں دو جز وقتی مالیوں کی مدد سے مکان کے عقبی حصے میں سبزیوں کے قطعے کی بھی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے البرٹو نیو کی لاش وہاں دفن کرنے کی پیشکش کی تھی۔ گہری قبر کی تیاری سے لاش کی منتقلی تک سارے مراحل اس نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔

زندہ انسان کے سامنے کیچوے سے زیادہ بدتر نظر آنے والا خانساماں دشمن کی لاش پر شیر سے زیادہ حوصلے کا مظاہرہ کرنے پہ آمادہ تھا۔

اس وقت تک مالی اپنے کام پہ آچکے تھے خانساماں نے انہیں اپنے طور پر قبل از وقت رخصت کر دیا۔ اور مکان کے عقبی حصے میں بنے ہوئے کچن گارڈن میں گورکن کا کام سرانجام دینے لگا۔ خادمہ بھی پورے انہماک اور تجسس کے ساتھ اس کی مدد کر رہی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ جگہ چوکیدار کی عقابی نظروں کی زد سے بالکل محفوظ و مامون تھی۔

زمین نرم تھی مگر خانساماں کی عمر اور رفتار کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ قبر رات کے نو دس بجے سے پہلے تیار نہ ہو سکے گی میرے لئے تو سردی کے اس شدید موسم میں گیلی مٹی کو چھونا بھی ناگوار عمل تھا۔

اس کام کے اطمینان بخش آغاز کے بعد میری فرمائش پر ایلیزا نے باہر چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے اسے یہی بتایا۔ کہ چوکیدار کو میری روانگی سے مطمئن کرنے کے لئے باہر جانا لازمی تھا جبکہ واپسی میں میں کار کے پائیدان میں چھپ کر اندر آتا۔ اس کام کی آڑ لے کر میں سات اور ساڑھے سات بجے کے مقررہ وقفے کے دوران ایفل ٹاور کے آس پاس موجود رہ سکتا تھا۔ اور یوں ایلیزا کو کسی شبہ کا موقع دیئے بغیر میں اپنا کام کر سکتا تھا۔

ایلیزا اپنی روشن خیالی کے ساتھ ہی غیر ضروری آرائش کی بھی قائل نہیں تھی۔ اور پھر اپنی خوابگاہ سے ملحق غسل خانے میں ایک تازہ لاش کی موجودگی میں کوئی دلیر سے دلیر لڑکی بھی اپنی آرائش و زیبائش پر توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ لہٰذا وہ بمشکل دس منٹ میں میرے ساتھ روانگی کے لئے تیار ہوگئی۔

غسل خانے اور خواب گاہ کی تمام کھڑکیاں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ایلیزا نے خواب گاہ کے دروازے میں نصب دوہرا قفل لگایا اور میں اس کا جائزہ لینے کے بعد ایلیزا کے ساتھ باہر آگیا۔

"یہ میری زندگی کا بھیانک ترین تجربہ ہے!" راہداری میں ایلیزا نے پھریری لے کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں بھی پیشہ ور قاتل نہیں ہوں، میں نے انتہائی مجبوری کے عالم میں اسے ہلاک کیا ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہی، جو ہوا وہ اچھا ہی ہوا ___

وہ جلدی سے بولی۔

"ابھی وقت ہے، ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔" میں نے باہر آکر اس کی موٹر کی طرف جاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کس فیصلے پر؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم اپنے باپ کے ساتھ بھی وہی کرنا چاہتی ہو جو البرٹو نیو کے ساتھ ہوا ہے، وہ سب کچھ سہی مگر پھر بھی تمہاری ولدیت کے خانے میں اسی کا نام آتا ہے۔"

"وہ فیصلہ میرے لئے بعد میں تکلیف دہ ہو سکتا ہے مگر فی الحال ناگزیر ہے میری زندگی کی مسرتوں کے لئے اسے راہ سے ہٹنا ہو گا۔" اس کا لہجہ پرعزم تھا۔

ایلیزا کی کار میں ہم دونوں جوناس ولا سے روانہ ہوئے تو فضا میں ہلکی سی کہر کا ریچاؤ شروع ہو چلا تھا دربان نے جھک کر خاصی توجہ سے میرا جائزہ لیا اور اسی لمحے میرے ذہن میں ایک نئی پریشانی نے جنم لے ڈالا۔

"مجھے چوکیدار کی نظروں سے بچا کر اندر لے جانے کا منصوبہ تو تم نے بنا لیا مگر البرٹو نیو کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" باہر نکلنے کے بعد میں نے ایک سگریٹ سلگا کر ایلیزا کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی الجھن میں اسے بھی شریک کر لیا۔

"تمہارا ذہن بہت دور تک کام کرتا ہے،" وہ تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "چوکیدار میرے باپ کا خاص معتمد ہے۔ وہ اسے ضرور بتلائے گا۔ کہ دو افراد جوناس ولا میں داخل ہوئے تھے جن میں سے ایک کی واپسی نہیں ہوئی۔"

"یہ امکان بھی تو ہے کہ ہم دونوں کی روانگی کے بعد وہ اس شخص کے فراق میں اندر کا گشت لگائے اور خانساماں کو قبر تیار کرتا دیکھ لے ___!"

"وہ اندر پر بھی نہیں مار سکتا" وہ موٹر داہنی جانب موڑتے ہوئے بولی "اس کی جملہ ضروریات پھاٹک سے ملحق کوارٹر میں ہی پوری کی جاتی ہیں۔ اسے چوبیس گھنٹے وہیں جمے رہنے کا حکم ملا ہوا ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔"

"موٹر کسی بار کے سامنے روک لینا،" میں نے کہا "وقت گزاری کے لئے دو تین پیگ لے لئے جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہم ایک خوبصورت بار کے نیم تاریک گوشے میں پہلو بہ پہلو بیٹھے وہسکی سے شغل کر رہے تھے۔ بار میں خاصی میزیں آباد تھیں لیکن اس کے باوجود ماحول پر شائستگی کا خول چڑھا ہوا تھا پینے والوں میں کوئی بھی بے فکرا نہیں تھا۔ شاید ہر شخص نیا گھونٹ لیتے ہوئے اس خوف میں مبتلا تھا کہ کہیں وہ دوسروں کے سامنے تماشہ نہ بن جائے۔ یا پھر ہر ایک ہی پیدائشی بلانوش تھا۔

"کسے تلاش کر رہے ہو؟" ایلیزا نے میری گردش کرتی ہوئی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"لوگوں کا جائزہ لے رہا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سزا کے طور پر ان سب کو یہاں بند کر کے زبردستی شراب پلائی جا رہی ہے۔"

وہ اتنی زور سے ہنسی کہ اس کے گلاس سے تھوڑی سی وہسکی میز پر چھلک گئی "تمہاری ہر بات انوکھی ہوتی ہے بھلا ان لوگوں میں کیا کمی نظر آئی تمہیں؟"

"زندگی اور زندہ دلی کے بجائے گھٹن سی ہے!"

"زندگی تو تمہیں سستے شراب خانوں میں ہی مل سکتی ہے یہاں پیرس کے معززین اور شرفاء آتے ہیں جو صرف اسی قدر پیتے ہیں۔ جتنی ہضم کر سکیں۔ ہاں نجی محفلوں میں جب یہ خمار میں ڈوب کر اپنے خول سے باہر آتے ہیں تو ہر شخص اپنی جگہ شاہکار ہوتا ہے۔"

تلے ہوئے جھینگوں کی پلیٹ خالی ہونے تک ہم دونوں ہی خاموش رہے اور یہ سکوت توڑنے کا شرف بھی مجھ کو ہی حاصل ہوا۔

"یہاں سے جانے کے بعد ہمیں ایک مرتبہ پھر جوناس ولا سے باہر آنا پڑے گا۔"

"میری خواب گاہ میں آج تم پہلی رات بسر کرو گے!" اس نے اپنے شانوں کا بوجھ میرے بدن پر ڈالتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے۔ صبح وہ دونوں بھائی واپس آجائیں۔"

"اس مرتبہ میں البرٹو نیو کے لباس میں باہر نکلوں گا اور واپسی پائیدان میں ہوگی تاکہ چوکیدار کو یقین ہو جائے کہ دونوں آدمی باہر نکل گئے ہیں۔"

"یہ تو واقعی مجبوری ہے!" وہ بولی "غنیمت ہے کہ تم نے اس مسئلے سے نجات کی راہ بھی تلاش کر لی۔ اب ہم سکون سے اس کی تدفین کا جشن منا سکیں گے!"

پونے سات بجے ہم اس بار سے اٹھ گئے۔ ایلیزا نے خاصی پی لی تھی۔ مگر اس کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے البتہ وہ کوئی اعصابی دباؤ برداشت کرنے کے لئے فوری طور پہ تیار نہیں تھی لہٰذا میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اس علاقے کے ایک دو چکر کاٹنے کے بعد ایفل ٹاور کے قریب گاڑی پارک کر دی۔

"یہاں کیا کرو گے؟"

"ذرا تازہ ہوا میں چہل قدمی کروں گا۔" میں نے کہا اور وہ مزید جرح کئے بغیر میرے ساتھ اتر آئی۔

سرد موسم کی وجہ سے ایفل ٹاور کے نواح میں زیادہ ہجوم نہیں تھا مگر پھر بھی سیاحوں وغیرہ کی خاصی تعداد نظر آرہی تھی۔

ایلیزا کے ہمراہ ایفل ٹاور کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ہر طرف نگاہیں دوڑائیں مگر مجھے عبداللہ کہیں نظر نہ آیا اور نہ ہی اپنے

افراد نظر آئے جو کسی کے متلاشی ہوں۔

میں ایلیزا کے ہمراہ ایفل ٹاور کے سامنے دریائے سین پر بنے ہوئے ڈی لینا کے پل پر پہنچ گیا۔ اور وہاں ریلنگ کے سہارے جھک کر دریا کے پُرسکون پانی میں پڑنے والے روشنیوں کے انعکاس سے لطف اندوز ہونے لگا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ایلیزا پر شراب کا خمار گہرا کر رہے تھے اور اس کے لہجہ میں رومان کی شدت بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اسی رَو میں اس نے ایک ایسا انکشاف بھی کر ڈالا جو میرے لئے نہایت سنسنی خیز ثابت ہوا اور بوڑھے خانساماں کی اس سے ہمدردی کا سبب بھی سامنے آ گیا۔

اس خانساماں نے اپنی عمر کا بہترین دَور اسی گھرانے کی خدمت میں گزارا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر ایلیزا کو اپنی ماں اور خانساماں کے ایسے مراسم کا علم ہوا جو عذرا جوناس سے پوشیدہ تھے پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب مسز جوناس نے اپنی بیٹی سے اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا اس وقت تک ایلیزا اپنے باپ کے آمرانہ رویئے سے متنفر ہو چلی تھی۔ اور گھر کی چار دیواری سے باہر زندگی کے نئے اور ہیجان خیز تجربات سے گزر رہی تھی۔ ایلیزا کو خود بھی اپنے باپ کے مقابلے میں ابتدا ہی سے خانساماں سے زیادہ لگاؤ تھا اور آخر کار ایک روز اس نے اپنی ماں سے وہ شرمناک سوال کر ہی ڈالا جس کے جواب میں انکار کے ساتھ ہی اس کی ماں پر دل کا بدترین دورہ پڑ گیا جس کے اثرات بعد میں بھی زائل نہ ہو سکے۔ مگر ایلیزا کو عذرا جوناس سے اتنی شدید نفرت تھی کہ شاید انتقام کے طور پر اس نے اپنے ذہن میں خانساماں کو اپنے باپ کا درجہ دیا ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی رگوں میں عذرا جوناس جیسے درندہ صفت انسان کے لہو کا کوئی قطرہ شامل نہیں تھا۔

میں اسے ڈی لینا سے واپس ایفل ٹاور کی طرف لایا۔ اور خراماں خراماں گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت آٹھ بج رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ عبداللہ نے میری نگاہوں سے دُور رہ کر ان لوگوں کو میری شناخت کرا دی ہو گی جو جوناس ولا کے باہر گندے خون کی ہولی کھیلنے پر مامور کئے جانے والے تھے۔ اس وقت میرے ساتھ ایلیزا کی موجودگی میرے لئے قباحت کا باعث بن گئی تھی۔ ورنہ عبداللہ ضرور سامنے آ کر مجھ سے ملاقات کرتا اور میں اسے جیراڈ کے بارے میں باخبر کر دیتا۔

ایلیزا کو گاڑی میں بٹھانے کے بعد میں نے ایک اہم فون کال کے لئے اس سے معذرت کی اور پبلک بوتھ کی طرف چل دیا۔

میں نے مادام فے کے مکان کے ابتدائی نمبر ہی ڈائل کئے تھے کہ مجھے اپنی پشت پر بوتھ کے دروازے کے شیشے پر دستک سنائی دی۔ میں چونک کر پلٹا تو باہر عبداللہ کا مسکراتا ہوا محبت آمیز چہرہ نظر آیا اور میں ریسیور ہک سے لٹکا کر باہر آ گیا۔

"کسے فون کر رہے تھے؟" میرے باہر نکلتے ہی اس نے سوال کیا۔

"مادام فے کے یہاں تمہارے لئے پیغام چھوڑنے کا ارادہ تھا۔" میں نے عجلت آمیز لہجے میں کہا "جوناس ولا کا پانچواں محافظ جو ہمیں جل دے کر بھاگا تھا، ایلیزا کی خوابگاہ میں میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اس سے پتہ چلا کہ عذرا جوناس نے اپنے مکان کی حفاظت کے لئے جیراڈ نامی کسی بدمعاش سے آدمی لئے ہوئے ہیں۔"

"وہ بہت خوفناک آدمی ہے اس کے آدمیوں پر تو سرکاری اہلکار بھی ہاتھ نہیں ڈالتے کیونکہ سرکاری حکام کے لئے وہ بلیک میلر ہے اور ان کی کمزوریوں کی تشہیر کی دھمکی دے کر اپنے خلاف ہر کارروائی کو سرد خانے میں ڈلوا دیتا ہے۔"

"اس کو بھول جاؤ، فی الحال صرف جوناس برادران ہمارا نشانہ ہیں اور اس وقت تک جوناس ولا کے باہر شاید جیراڈ کے مزید دو آدمی پہنچ گئے ہوں گے۔"

"تم نے اندر اپنا انتظام کر لیا؟"

"جوناس ولا کے چوکیدار کے علاوہ سب لوگ ایلیزا کے وفادار ہیں میرا خیال ہے کہ عذرا اور ابراہم کے خلاف وہ میرا ساتھ دیں گے۔" میں نے پارکنگ لاٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "موقع ملے تو افراتفری میں چوکیدار کا پتہ بھی صاف کرا دینا۔ ایلیزا کار میں میری منتظر ہے ورنہ میں تمہیں اور بھی بہت سی خبریں سناتا۔ اب انشاءاللہ آخری کامیابی کے بعد ہی ملاقات ہو گی۔"

"تم فکر نہ کرو۔ تمہیں یہاں پہنچتے ہی دیکھ لیا گیا تھا اور اب تک وہ لوگ جوناس ولا کے گرد اپنے مورچے سنبھال چکے ہوں گے۔ میں مادام فے کے پاس ہی رہوں گا۔"

اس سے رخصت ہو کر میں کار کے قریب پہنچا تو ایلیزا اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے ہوئے ہولے ہولے کوئی نغمہ گنگنا رہی تھی۔

"کسے فون کرنے گئے تھے؟" میرے بیٹھنے کے بعد اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے خوابناک لہجہ میں سوال کیا۔

"دفتر سے چھٹی بڑھوانے کے لئے ایک دوست کو ہدایات دینی تھیں۔"

"تو کیا لندن فون کیا ہے؟"

"میرا دفتر ضرور لندن میں ہے مگر میرا دوست ابھی یہاں سے تار روانہ کر دے گا، تمہارے ساتھ اگر بے فکری کے دو چار دن بھی نہ گزارے تو ساری جدوجہد بے کیف رہے گی۔"

"تم مجھے کتنا چاہتے ہو ڈان؟" چند ثانیوں تک خاموشی سے موٹر چلانے کے بعد اس نے سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

"شادی شدہ نہ ہوتا تو تمہیں اپنی بیوی بنائے بغیر باز نہ آتا۔"

"جھوٹے ہو۔" اس نے منہ بنا کر کہا "پتہ نہیں تم شادی کو کیا ... شادی تو کسی بھی محبت کا بدترین انجام ہوتی ہے۔ اصل چاہت ... ہوتی ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو بانہوں میں سمیٹ کر سرور سے آنکھیں ... لے تو اسے اپنی محبوبہ کا پیکر نظر آئے۔"

اس کی کیفیت کے پیشِ نظر میں نے بحث کو طول دینا مناسب ... اور اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اسے خاموش کر دیا۔

ایلیزا نے کار سینٹ جرمین کے علاقے میں موڑی تو میں سیٹ ... کر پائیدان پر ڈیش بورڈ کے نیچے دبک گیا۔

میں اپنی جگہ سے اسی وقت اٹھا جب ایلیزا نے کار جوناس ولا ... روشن پورٹیکو میں روک دی۔ پہلے میں نے سر اٹھا کر گرد و پیش کا ... جائزہ لیا۔ اس وقت کہر کی چادر اتنی دبیز ہو چکی تھی کہ چند فٹ کے ... فاصلے تک بھی دیکھنا محال تھا۔ لہٰذا میں دروازہ کھول کر اطمینان سے ... اور ایلیزا کے ہمراہ برآمدے سے گزر کر مکان میں داخل ہو گیا۔

مکان کے عقبی حصے میں خانساماں کی کارکردگی کا جائزہ لینے سے ... میں نے مناسب سمجھا کہ ایلیزا کی خوابگاہ میں موجود لاش پر ایک نظر ڈال ... لئے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایلیزا بھی پھٹی پھٹی ... نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنی خواب گاہ کے کھلے ہوئے دروازہ ... رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا ڈان ---؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ... صورت حال کو دیکھ کر اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

"تم ریوالور چلا سکتی ہو؟" میں نے چوکنا نظروں سے اِردگرد کا جائزہ ... لیتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"نن ... نہیں لے سکوں گی ---" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ... میں نے اوورکوٹ کی جیب سے وہ ریوالور نکال کر اسے تھما دیا۔ جو ... البرٹو نیو کی لاش سے حاصل کیا تھا۔ اور اسے عقب میں نظر رکھنے کی ... ہدایت کر کے بے آواز قدموں سے خوابگاہ کے کھلے ہوئے دروازے ... تک پہنچ گیا۔

چند ثانیوں تک میں سانس روکے اندر کی سن گن لیتا رہا مگر تاریک ... کمرے میں ہیبت ناک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

"اندر جو بھی ہے باہر آ جائے ورنہ اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا ... جائے گا۔" میں نے دھیمی مگر سخت آواز میں کہا مگر اندر بدستور سناٹا ... رہا۔

میں نے پلٹ کر ایلیزا کی طرف دیکھا، وہ بری طرح نروس ہو ... رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا مجھے ... خدشہ تھا کہ اضطراری طور پر وہ گولی چلا کر بلاوجہ ہنگامہ نہ کھڑا کر دے۔ ... احتیاط کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ میں تنہا ایلیزا ... کی خواب گاہ میں کسی چوپائے کی طرح داخل ہوا اور دیوار کے ... ساتھ ریوالور سیدھا کرتے ہوئے اچانک کمرہ روشن کر دیا مگر

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ کمرے میں ابتری کے خاصے آثار نظر آ رہے تھے۔ اور باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

باتھ روم کے سامنے پہنچتے ہی مجھ پر اچانک چودہ طبق روشن ہو گئے۔ باتھ روم کا خالی فرش میرا منہ چڑا رہا تھا۔ اور البرٹو نیو کی لاش غائب تھی۔

اگلے ہی لمحے میں خواب گاہ کے اس گوشے کی طرف متوجہ ہوا۔ جہاں میں نے اپنا اسلحے سے بھرا ہوا بریف کیس چھپایا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون حاصل ہوا کہ میرا بارودی خزانہ اپنے ٹھکانے پر موجود تھا۔

پھر فوراً ہی میں ایلیزا کو اندر لے آیا۔

"کیا ہوا؟ یہ سب کیسے ہوا؟" ایلیزا نے دہشت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"لاش فرار ہو گئی!" میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں ---" اس کے لبوں سے بے یقینی کے عالم میں نکلا۔

"شاید وہ مرا نہیں تھا" میں نے خواب گاہ کے دروازے کے ٹوٹے ہوئے تالے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "مجھ سے اپنی زندگی کی بدترین غلطی سرزد ہوئی ہے ---" یہ کہتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ آئندہ اپنے کسی دشمن کو محض گلا گھونٹ کر نہیں ماروں گا۔

"اب کیا ہو گا؟" وہ کانپتی ہوئی میرے بازو سے آ لگی۔ "کہیں وہ ہماری تاک میں آس پاس ہی نہ چھپا ہوا ہو ---؟"

"وہ موت کی دہلیز سے لوٹا تھا، نجات حاصل کرتے ہی سیدھا اپنے گرو کے پاس پہنچا ہو گا۔ مجھے افسوس ہے ایلیزا کہ میری حماقت کی وجہ سے یہ رات تم اپنی مرضی کے مطابق نہ گزار سکو گی۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ ذرا خانساماں کی خبر لیں، شاید اسے بعد کے واقعات کا کچھ علم ہو۔"

ہم دونوں سگریٹوں کے کش لگاتے فکرمند انداز میں مکان کے عقبی حصے میں پہنچے تو بوڑھے خانساماں کو خادمہ کے ساتھ مٹی کے ایک اونچے انبار کے پاس بیٹھے دیکھا۔ ان کے چاروں طرف سبزیوں کے پودے اور بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ خانساماں کے سامنے مٹی کے تیل سے جلنے والی ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی اور مٹی کے تودے میں زمین کھودنے والے آلات دھنسے ہوئے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ دونوں ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے ایلیزا فرنچ میں خانساماں سے باتیں کرنے لگی۔ اور میں بڑھ کر گڑھے کے قریب پہنچ گیا۔

"خانساماں نے بہت محنت کی ہے جناب!" مجھے اپنے قریب ہی خادمہ کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی میرے پاس ہی آ گئی تھی۔

"قبر واقعی چوکور اور صاف ستھری بنائی ہے۔"

"شام سے ایک منٹ کے لئے اس کا ہاتھ نہیں رکا۔ مرنے والا خوش نصیب ہے کہ اسے ایسا محنتی گورکن میسر آیا۔"

مجھے اس کا اندازِ گفتگو پسند نہیں آیا۔ ایسے روح فرسا حالات میں عورت تو درکنار، قوی اعصاب کے مالک مرد بھی مزاح کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں جب کہ وہ نہایت روانی سے اپنی شگفتہ مزاجی کے مظاہرے پہ آمادہ تھی۔

"کس کی بات کر رہی ہو؟ کون مر گیا ۔۔۔ ؟" میں نے خشک لہجہ میں سوال کیا۔

"وہی...... وہی جس کا تم نے گلا گھونٹا تھا" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"وہ صرف بے ہوش ہوا تھا۔ اور ہوش میں آنے کے بعد چلا گیا" میں چبھتے ہوئے لہجہ میں بولا "ہمارا خیال تھا کہ وہ بے ہوشی سے جانبر نہ ہو سکے گا مگر اب یہ قبر بے کار ہے۔"

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

"اسے کچھ نہیں معلوم، یہ دونوں تو شام سے یہیں لگے ہوئے ہیں" ایلیزا اپنی باز پرس ختم کرنے کے بعد مجھ سے بولی۔

"میں ایک مرتبہ اندر گئی تھی ۔۔" خادمہ ایک دم بول پڑی ۔۔ "مگر میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی ۔۔"

"کچن میں کچھ کھانے گئی تھیں ۔۔ ؟" میں نے سوال کیا۔

"مالکن کو سات بجے بیدار رہنا تھا ۔۔" اس نے کہا "مگر ان حالات میں ان کی بیداری دشواریاں پیدا کر سکتی تھی۔ اس لئے میں ساڑھے چھ بجے انہیں نیند کے دوران ہی ایک دوسری خوراک دے آئی تھی۔ تاکہ وہ صبح ناشتے تک آرام سے سوتی رہیں ۔۔"

"وہ شخص میری خواب گاہ کا تالہ توڑ کر فرار ہو گیا۔" ایلیزا نے اسے آگاہ کیا۔

"تو اب یہ قبر بے کار ہو گئی ۔۔ ؟"

"ہاں ۔۔ اسے بند کر کے تازہ کیاری کی شکل دے دو۔" ایلیزا اس گہری قبر میں جھانکتے ہوئے بولی ۔۔ "مجھے حیرت ہے کہ اس نے کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر تالہ کیسے توڑ دیا ۔۔"

"چوکیدار سے کچھ معلوم کیا ۔۔ ؟" خادمہ نے پوچھا۔

"بے سود ہے ۔۔" ایلیزا مایوسانہ لہجے میں بولی ۔۔ "جب تم دونوں کچھ نہ سن سکے تو وہ تو پھاٹک پر رہتا ہے ۔۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ پھاٹک سے ہی واپس گیا ہو ۔۔" خادمہ بولی اس اثنا میں خانساماں نے مٹی قبر میں بھرنی شروع کر دی تھی۔

"وہ میں دیکھ لوں گی ۔۔ مگر تم چوکیدار سے اس بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔"

ہم دونوں واپس خواب گاہ میں پہنچے تو ایلیزا بہت زیادہ ہراساں تھی۔ میری پریشانی کا اس پہ زیادہ اظہار تو نہیں ہوا تھا۔ مگر میں فضا میں بدترین خطرات کی بُو سونگھ رہا تھا۔

البرٹو نیو کو ابتدا میں مَیں نے جس طرح چکمہ دیا اس کے نتیجہ میں ایلیزا کی ذات شبہات سے بالا ہو گئی تھی۔ مگر اپنے ناکام قتل کے بعد البرٹو نیو نے سمجھ لیا ہو گا کہ ایلیزا میرے ساتھ ملی ہوئی تھی اور جو کچھ ہوا اس کی تائید و حمایت سے ہوا۔

عذرا اور ابراہم کی غیر موجودگی میں جیراڈ اگر البرٹو نیو کے ساتھ ہونے والی سازش کا انتقام لینے کے لئے جوناس ولا پہ چڑھ دوڑتا تو مجھے قطعی حیرت نہ ہوتی۔

میں نے فون ٹیپ ہونے کے متوقع خطرہ کی پرواہ کئے بغیر ایلیزا کی خواب گاہ سے مادام فنے کے نمبر ڈائل کر ڈالے۔ اس وقت ایلیزا باتھ روم میں تھی۔

بریتھا نے فون وصول کیا اور بتایا کہ عبداللہ وہاں نہیں ہے۔

دس منٹ بعد میں نے دوسری کال کی تو عبداللہ نے ہی فون اٹھایا۔

میں نے کسی تمہید کے بغیر اشاروں کنایوں میں اسے بدلی ہوئی خطرناک صورتحال سے آگاہ کر دیا" تاکہ وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکے۔

"جوناس ولا پر کسی بھی لمحے جیراڈ دھاوا بول سکتا ہے ۔۔" اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا ۔۔ "وہ اپنے آدمیوں پر ہاتھ اٹھانے والوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے، بہتر یہی ہے کہ تم ایلیزا اور اس کے ہمدردوں کو لے کر فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔"

"اس کے دو آدمی تو پہلے سے باہر موجود ہیں ہو سکتا ہے کہ خبر ملتے ہی اس نے نفری بڑھا دی ہو اور باہر نکلتے ہی ہمیں چھلنی کرنے کی کوشش کی جائے۔"

"ابھی اندر آتے ہوئے تمہیں کسی مزاحمت کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا ۔۔ ؟"

"اندر آنے والوں سے وہ کوئی تعرض نہیں کریں گے اور جوناس ولا کو ہمارے لئے چوہے دان بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہاں سے نکلنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔"

"پھر تم وہیں ٹھہرو ۔۔" اس کی فیصلہ کن آواز سنائی دی ۔۔ "میں خود وہاں پہنچ رہا ہوں۔ ہمارے آدمی اب عذرا اور ابراہم کے علاوہ کسی کو جوناس ولا میں زندہ نہیں گھسنے دیں گے۔"

میں ریسیور رکھ کر مڑا تو میری پشت پر ایلیزا کھڑی ہوئی تھی۔

"اب صورت حال بہتر ہو جائے گی۔" میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا اور چونک پڑا کیونکہ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ "تمہارے ہاتھ کیوں ٹھنڈے ہیں؟" میں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آج میری زندگی کی آخری رات ہے ۔۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اپنے باپ سے انتقام کے جوش میں مَیں نے بھیڑیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو، میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔" میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا بندوبست کر لیا ہے؟" وہ رندھی ہوئی آواز میں پھٹ پڑی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم کچھ بھی نہ کر سکو گے، تم شریف آدمی ہو اور کسی کو ڈھنگ سے قتل بھی نہیں کر سکتے۔ میرا باپ اور اس کے حواری پیدائشی کمینے ہیں۔ فساد اور خونریزی میں بھی وہ تمہیں مات کر دیں گے۔"

"پانی سر سے اونچا ہو جائے تو شریف آدمی بھی بھوکا درندہ بن جاتا ہے ایلیزا ۔۔" میں نے نرمی سے کہا "تم دیکھو گی کہ تمہارے دشمنوں کو کیسی ذلت اٹھانی ہو گی۔"

"تم اکیلے کیا کر لو گے؟ تمہارے پاس تو دوسرا پستول بھی نہیں جو مجھے مسلح کر سکو ۔۔" وہ تڑپ کر میرے بازوؤں سے نکل گئی۔ اور سامنے آ کر براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"میں نے اسی لئے فون کیا تھا، اس شہر میں میرے بھی کچھ جاں نثار دوست ہیں ۔۔" اسے تحفظ کا یقینی احساس دلانے کے لئے میں نے خندہ پیشانی سے کہا "آج کی رات جوناس ولا میں کوئی اجنبی پھٹک بھی نہ سکے گا۔"

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ڈارلنگ ۔۔" یک بیک اس کا مزاج اعتدال پہ آ گیا "یہ مصیبت تو خود میں نے کھڑی کی ہے میرے اکسانے پر ہی تم اس میں ملوث ہوئے ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہر خطرے کے سامنے ہم دوش بدوش ہوں گے۔ خدا کرے کہ تمہارے دوست باہر سے مدد کے لئے تیار ہو جائیں۔ مگر یوں گھر میں بیٹھ کر خطرات کا انتظار کرنا بھی بے وقوفی ہے۔ ہم ممی، خانساماں اور خادمہ کو ساتھ لے کر اسی وقت کسی ہوٹل کا رخ کر سکتے ہیں۔"

"البرٹو نیو کے ساتھی شام سے باہر موجود ہیں وہ پاتال میں بھی ہمارا سراغ نکال لیں گے ۔۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تو کیوں نہ پولیس سے مدد لی جائے؟" اس نے کسی فوری خیال کے تحت کہا۔

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ "کوشش کر لو ۔۔" میں نیم دلانہ لہجہ میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

ایلیزا نے لپک کر فون اٹھایا۔ ریسیور کان سے لگائے چند ثانیے انتظار کرتی رہی۔ پھر اضطراب کے عالم میں کئی بار کریڈل دبایا اور بے بسی کے ساتھ ریسیور میری طرف بڑھا دیا ۔۔ "اسے بھی اسی وقت خراب ہونا تھا۔"

میں نے ریسیور کان سے لگایا تو وہ بالکل بے جان تھا بکیرے وجود میں کروڑوں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اور اعصاب پر تناؤ طاری ہو گیا۔ شاید باہر کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ دشمن ہم سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اور اس نے جوناس ولا میں دراندازی سے قبل فون کی لائن منقطع کر دی تھی۔

میں نے ایلیزا پر اپنے شبہات کا اظہار کئے بغیر ریسیور رکھ دیا اور سرسری لہجہ میں صرف اتنا کہا ۔۔ "خانساماں اور خادمہ کو اندر بلا کر تمام دروازے کھڑکیاں بند کر لو۔"

"کیا فون کے ساتھ کوئی شرارت ہو گئی ہے؟" اس نے شاید میرے دل میں جنم لینے والے اندیشے کی تحریر میرے چہرے کی لکیروں میں پڑھ لی تھی۔

"پتہ نہیں ۔۔" میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا اور باہر سے ان دونوں کو بلانے چل دیا جو قبر بھرنے میں مصروف تھے ایلیزا بھی خاموشی سے میرے پیچھے ہو لی۔

میرے طلب کرنے پر وہ دونوں کدال، پھاوڑا، بیلچہ اور لالٹین لے کر اندر آ گئے۔ اور پھر ہم چاروں نے مل کر عمارت کے وہ تمام دروازے مقفل کر دیئے جو باہر کھلتے تھے۔ کھڑکیوں کے پٹ بھی بند کر کے اندر سے چٹخنیاں چڑھا دی گئیں۔

ایلیزا کے لئے اس کی اپنی خوابگاہ نفسیاتی طور سے خوف آور تھی کیونکہ وہاں نہ صرف وہ زخمی ہو چکی تھی۔ بلکہ وہاں ایک ادھورا قتل بھی ظہور پذیر ہوا تھا۔ لہٰذا ہم چاروں ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ گئے۔ ہم چاروں میں سے خانساماں زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی دھن میں مگن تھا۔ جبکہ خادمہ بار بار بولنے کا ارادہ کر کے منہ کھولتی اور آخری لمحہ پر اپنا ارادہ بدل دیتی۔

"ہم لوگ کب تک یوں ہی بیٹھے رہیں گے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ رات تو شاید یوں ہی گزارنی پڑے گی۔" ایلیزا نے کہا۔ "الگ الگ رہ کر ہم میں سے کوئی بھی یکسوئی حاصل نہ کر سکے گا۔"

یہ گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی جو خانساماں کے پلے نہ پڑ سکی مگر خادمہ کو زبان کھولنے کا بہانہ مل گیا ۔۔ "کیا آج رات کوئی خطرہ ہے ۔۔ ؟"

البرٹو نیو کی قبر تیار کرتے ہوئے وہ پُرسکون نظر آ رہی تھی لیکن اندر کی افراتفری نے اسے بھی کافی خوفزدہ کر دیا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ آج رات جوناس ولا پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی جائے۔" ایلیزا نے خود کو خادمہ کے مقابلے میں پُراعتماد بناتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی دھمکی آمیز فون یا خط ملا تھا؟" خادمہ کی زبان چل پڑی۔

"دوپہر کو آنے والا یہی پیغام دینے آیا تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا اور ایلیزا مجھے کڑی نظروں سے گھور کر رہ گئی۔

"تو اسے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر دیا؟" اس چرب زبان عورت کے پاس فوری طور پر ایک نیا سوال تیار تھا۔

"آئندہ آیا تو ایسا ہی کریں گے۔ اس بار بے وقوفی سرزد ہو گئی۔"

"تلخ گفتگو کر کے ماحول کشیدہ نہ کرو ڈان۔" ایلیزا نے مجھ سے کہا اور پھر خادمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "دراصل ڈیڈی نے کچھ آدمی میرے پیچھے لگائے ہیں اور خود روپوش ہو گئے تا کہ وہ لوگ مجھے اغوا کر کے تشدد کے ذریعے میرا دماغ درست کر سکیں۔ ڈان فرنانڈو کی موجودگی کی وجہ سے آج دوپہر ان کی پہلی کوشش ناکام ہو گئی۔ ہم نے اپنی دانست میں حملہ آور کو مار دیا تھا۔ مگر وہ سخت جان صرف بے ہوش ہوا تھا۔ اور ہماری غیر موجودگی میں تالا توڑ کر میرے کمرے سے فرار ہو گیا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ڈان کو ختم کرنے اور مجھے اغوا کرنے کی آج رات بڑے پیمانے پر کوشش کریں گے۔"

"مسٹر جوناس بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں جوان اولاد سے آمرانہ انداز میں احکام نہیں منوائے جا سکتے۔ ان میں اخلاقی جرأت ہو، تو وہ خود تمہارے ساتھ بیٹھ کر سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔" خادمہ ملامت آمیز لہجے میں بولی۔ "یہ کس قدر بے عزتی کی بات ہے کہ ایک باپ کے اشارے پر بازاری غنڈے اس کی بیٹی کے ساتھ شرمناک تشدد کریں!"

"حالات اظہارِ افسوس سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔" ایلیزا نے اتنے اعتماد سے کہا جیسے اس کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہو۔ "ڈان کے پاس ایک بھرا ہوا ریوالور موجود ہے اور ادھر کا رخ کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دیا جائے......!"

اس سے آگے ایلیزا کے الفاظ ایک سریلی چیخ میں تبدیل ہو گئے اور میں نے اندھیرے میں محض اندازے کی بنا پر اس کا منہ دبوچ کر چیخ بلند ہونے سے قبل روک دی۔

پوری عمارت یک بیک اندھیرے میں ڈوب چکی تھی — فون کی لائن کاٹنے کے بعد برقی رو کی فراہمی بھی منقطع کر دی گئی تھی۔

اور پھر اچانک قریب سے فائر کی ہولناک گونج سنائی دی جس کے ساتھ ایک طویل کربناک چیخ سرد رات کے سناٹے کا سینہ مجروح کرتی چلی گئی۔

میں نے اپنے وجود میں سکون کی میٹھی میٹھی لہریں سرایت ہوتی محسوس کیں۔ وہ فائر جس کا بھی رہا ہو — یہ ثابت کر گیا تھا کہ جوناس ولا کے باہر دو حریف موجود تھے۔ اور ان کے درمیان خونریز معرکے کا آغاز ہو چکا تھا۔

پہلے فائر اور موت کے کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ کے بعد بمشکل چند سیکنڈ تک سکوت قائم رہا اور پھر چھ سات فائر سنائی دیئے آوازوں کے درمیان عدم تسلسل کی وجہ سے میرے لئے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں تھا۔ کہ وہ فائر مختلف ہتھیاروں سے کئے گئے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے مس جوناس —!" سرد رات کے گھور اندھیرے میں خادمہ کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"قسمت پر شاکر رہو جوڈی" ایلیزا کی آواز پر بھی دہشت کا اثر غالب تھا مگر وہ اپنی خادمہ کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر قدرے سکوت کے بعد اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "عمارت کے مقابلے میں باہر کی کھلی فضا کیسی رہے گی ڈان؟"

"سردی کے علاوہ بھٹکی ہوئی گولیاں بھی ہم میں سے کسی کو چاٹ سکتی ہیں۔ یہاں دروازہ توڑے بغیر کوئی نہ آ سکے گا۔" میں نے کہا۔

"شاید تمہارے ہمدرد بھی باہر موجود ہیں!" اس نے کہا۔

"بہت جلدی اندازہ لگا لیا۔"

"پتہ نہیں اس خون آشام ٹکراؤ کا انجام کیا ہو گا؟" اس کی آواز میں خوف اور تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

"کم از کم ہم لوگ محفوظ رہیں گے۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔ "اس گنجان آباد علاقے کے مکین اتنے بے حس نہیں ہیں۔ کہ ان کے دروازوں کے باہر گولیاں چل رہی ہوں اور وہ پولیس کو طلب نہ کریں۔"

"کسی پولیس کار کا سائرن ہی اس خونریزی کو ختم کرا سکے گا۔" جوڈی نے گہرا سانس لے کر تبصرہ کیا۔

اسی وقت اندھیرے میں خانساماں کی منمناہٹ سنائی دی جس کے جواب میں ایلیزا نے میرا نام لے کر فرنچ میں کچھ کہا اور مجھ سے بولی "اندھیرے سے اور زیادہ خوف آ رہا ہے۔ لالٹین ہی روشن کر لی جائے۔"

"اندھیرے میں ہمیں امان ملی رہے گی۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر بجلی کی فراہمی منقطع نہ ہوتی تو باہر ہتھیاروں کی گونج سنتے ہی میں ساری روشنیاں گل کرا دیتا۔"

"سگریٹ بھی کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر پیو ورنہ وہ ہمارا سراغ پا لیں گے۔" جوڈی پورے معاملے میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔

خاصے طویل سناٹے کے بعد اچانک باہر اسٹین گن کا نغمہ گنگنا اٹھا۔ ہوا کے دوش پر زیر و بم اختیار کرتی ہوئی آواز گن کے دہانے کی مسلسل حرکت کا اعلان کر رہی تھی اور پانچ سیکنڈ بعد ہی فضا دو پے در پے انسانی چیخوں سے لرز اٹھی۔ شاید گن نے اپنے لئے نشانوں کا انتخاب کر لیا تھا۔

اور وہ آواز معدوم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مختلف ریوالوروں کے ہولناک دھماکے بھی گونجنے لگے۔ آتشیں اسلحہ کے بے دھڑک استعمال سے دونوں حریفوں کی بے خوفی ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ جوناس ولا کے گرد واقع مکانات کی ایک ایک اینٹ کو چھلنی کئے بغیر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔

اسٹین گن مختصر سے وقفے کے لئے خاموش ہوئی اور پھر شاید میگزین لوڈ کرتے ہی اسے دوبارہ چلا دیا گیا۔

ایلیزا دہشت کے باعث میرے بدن سے چپکی بُری طرح کانپ رہی تھی، جوڈی اور خانساماں کو تو شاید سانپ سونگھ گیا تھا مگر کمرے کی تاریک فضا ان کے چڑھتے ہوئے بے ربط سانسوں سے گونج رہی تھی۔

ہولناک دھماکوں کے درمیان وقفے وقفے سے انسانی چیخیں بھی گونجتی رہیں۔ پھر جوناس ولا کے احاطے میں کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سن کر میرا دل حلق میں آ گیا۔

قدموں کی دھمک کے بعد احاطے میں پے در پے دو گولیاں چلیں اور ایک چیخ کے ساتھ کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی مگر ایک حریف کے زخمی یا ہلاک ہونے کے باوجود احاطے کے محاذ پر زیادہ دیر خاموشی نہ رہ سکی اور ڈرائنگ روم کی دیواروں سے چند گز کے فاصلے پر بھی گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

پھر باہر سے فائرنگ کی آوازیں بتدریج قریب آتی گئیں اور ایک مرحلے پر یوں محسوس ہونے لگا جیسے دونوں فریق جوناس ولا میں گھس آئے ہوں۔

پورا احاطہ فائرنگ کے شور سے لرز رہا تھا۔ آدمیوں کے چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ چند گولیاں چوبی دروازے سے ٹکرائیں اور ایک گولی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی ڈرائنگ روم کی دیوار میں آ گھسی۔

پہلے فائر کے بعد بمشکل دو تین منٹ کا عرصہ گزرا تھا مگر وقت کی رفتار یوں ماند پڑ گئی تھی۔ کہ آتش فگن ہتھیاروں کی وہ [illegible] مدتوں طویل محسوس ہونے لگی تھی۔

پھر دور کہیں پولیس کار کے سائرن کی موہوم سی آسیبی گونج سنائی دی اور حیرت انگیز طور پر دونوں طرف سے یک بیک فائرنگ بند کر دی گئی۔

فائرنگ کے یک لخت تھمنے کے بعد باہر ایسی دھما چوکڑی سنائی دی گویا پندرہ بیس وحشی سانڈ احاطے کو روندتے پھر رہے ہوں۔

گنجان آباد شہری علاقوں میں مسلح گروہوں کے منظم تصادم میرے لئے نیا نہیں تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ دنیا بھر کے قانون شکن اپنے اختلافات خود طے کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور بدترین حالات میں بھی قانون کا سہارا نہیں لیتے ان کے سارے باہمی معرکے قانون کی نظروں سے دُور رونما ہوتے ہیں اور اگر مقابلے کے دوران کسی مرحلے پر پولیس وغیرہ بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہو جائے تو ہر دو فریق اپنی پوزیشن سے قطع نظر فوری طور پر جنگ بندی کر لیتے ہیں۔

پولیس کار کے سائرن کی واضح ہوتی ہوئی گونج کے ساتھ باہر جو آوازیں سنائی دے رہی تھیں ان سے جنگ بندی تو ثابت ہو ہی چکی تھی مگر یہ امکان بھی واضح ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اپنے زخمیوں تک کو وہاں چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

اور جب پولیس کی تین گاڑیوں کے تیز سائرن سینٹ جرمین کی آبادی میں گونجنے لگے تو باہر بالکل سناٹا ہو چکا تھا۔

پولیس کی آمد کے باعث میں ایک نئے خطرے سے دوچار ہو گیا تھا مجھے قوی امید تھی کہ پولیس کے کسی ذہین افسر کو ہنگامے کا مرکز دریافت کرنے میں دشواری نہیں ہو گی۔ اور جب ان کی کھیپ جوناس ولا میں داخل ہوتی تو میرا وہاں پایا جانا مشکوک ثابت ہوتا۔

"میں اوپری منزل میں جا رہا ہوں" میں نے اندھیرے میں ہی اپنی نشست چھوڑتے ہوئے کہا "تم تینوں کے علاوہ اس مکان میں صرف تمہاری بیمار ماں ہے اور عذرا جوناس کی غیر موجودگی میں تمہارے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔"

"مگر تم کیوں جا رہے ہو؟" ایلیزا نے احتجاج آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

"اس جھگڑے میں میرا نام ملوث ہو گیا تو ہر عدالتی پیشی پر مجھے لندن سے پیرس پہنچنا پڑے گا۔ اور فرم میں میری ملازمت پر اثر پڑے گا۔" میں نے ایلیزا کو دروازے کے قریب لا کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا —

"اور اگر وہ احاطے کا جائزہ لیتے ہوئے کچن گارڈن تک پہنچ گئے تو کیا ہو گا—؟" ایلیزا مجھے اجازت دینے سے قبل ہر امکانی مسئلے کا حل معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"وہ خانساماں نے تیار کیا ہے تاکہ اس میں خشک پتے اور شاخیں دبا کر سبزیوں کی کاشت کے لئے [illegible] کھاد تیار کر سکے۔"

"مگر وہ گڑھا تو قبر سے ہو بہو مشابہ ہے!"

"ہوا کرے — بس یہ دعا کرو کہ دونوں جماعتیں زخمیوں کے ساتھ اپنے مردے بھی اٹھا لے گئی ہوں۔ جب پولیس کو یہاں کوئی لاش نہیں ملے گی تو وہ قبر کے بارے میں تمہاری کہانی پر یقین کر لے گی۔"

"خدا کرے کہ وہ اپنے سوالات اسی حد تک دریافت کریں جہاں تک تم نے مجھے سمجھایا ہے اگر بے تکے سوالات کئے گئے تو شاید

میں زیادہ دیران کا سامنا نہ کر سکوں۔" وہ آہستہ سے یہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

میں اندھیرے میں راہداری کی دیواریں ٹٹولتا ہوا تیزی سے ایلیزا کی خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ کمرہ میرا دیکھا بھالا تھا اس لئے تاریکی کے باوجود مجھے اپنے بریف کیس تک پہنچنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

بریف کیس لے کر میں اوپر والے زینوں کی طرف بڑھ لیا — ان مخدوش حالات میں میں ایک لحظہ کے لئے بھی بریف کیس کو اپنی ذات سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس میں موجود ہتھیاروں کی مدد سے میں اپنے آخری معرکے میں سرخروئی حاصل کر سکتا تھا۔

اوپری منزل میرے لئے نئی تھی۔ آخری سیڑھی عبور کرتے ہی میں نے اندھیرے میں بری طرح ٹھوکر کھائی اور بمشکل سیڑھیوں پر واپس لڑھکنے سے بچ سکا۔ اوپر مجھے پہلا دروازہ بند ملا۔ میں نے چوبی پٹ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ دروازہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر اندر کھل گیا۔

چند ثانیوں تک اندر کی سن گن لینے کے بعد میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ نہایت محتاط پیش قدمی کے بعد میں یہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ مسز جوناس کی کشادہ خواب گاہ تھی۔ جہاں بجلی فیل ہونے سے قبل شاید برقی ہیٹر جلتا رہا تھا کیونکہ اس کمرے کا درجۂ حرارت نہایت خوشگوار تھا۔

میں نے کمرے میں رچی ہوئی حرارت کے تحفظ کے پیش نظر داخلی دروازہ دوبارہ بند کر دیا اور اسی وقت مجھے پولیس کی گاڑیوں کے سائرنوں کا شور جوناس ولا کے بہت قریب دم توڑتا سنائی دیا۔ شاید پولیس جائے واردات پر آ پہنچی تھی —

مسز جوناس کی لٹکنے والی اونچی مسہری پر اتنی بڑی چادر ڈالی گئی تھی جس نے دو سمتوں سے مسہری کے نیچے براہ راست دیکھنا ناممکن بنا دیا تھا۔

میرے لئے مسہری کے نیچے کی جگہ نہایت مناسب تھی کیونکہ پولیس والے افسران بھی اس مریضہ کو چھیڑنے سے گریز ہی کرتے۔

میرے کان نیچے سے آنے والی آوازوں کے منتظر رہے لیکن اس جانب لامتناہی سناٹے کا راج تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جوناس ولا اپنی پوری اہمیت کے ساتھ پولیس کی نظروں میں نہیں آ سکا تھا۔

تقریباً چالیس منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد مجھے نیچے کچھ آہٹیں اور آوازیں سنائی دیں جو واضح نہیں تھیں۔ کچھ دیر تک وہ آوازیں ایک ہی جگہ محدود رہیں پھر مجھے سیڑھیوں پر کم از کم تین افراد کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔

"میرے لئے یہ بڑی درد ناک ذمہ داری ہے کہ اپنے ایک وفادار ملازم کی موت کے باوجود آپ لوگوں کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔" سیڑھیوں سے ایلیزا کی اونچی آواز سنائی دی۔ شاید وہ بلند لہجے سے مجھے اپنی آمد سے آگاہ کر رہی تھی۔

"یہ صرف رسمی کارروائی ہے مس جوناس، ہم آپ کی حفاظت کے پیش نظر یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی لاعلمی میں کوئی شر پسند اوپر نہ چھپ گیا ہو۔" اس لہجے میں نمایاں طور پر افسری کی بو موجود تھی "آپ کے ٹرک کے دو مکانات کی دیواروں اور احاطے کی زمین پر خون کے تازہ دھبے پائے گئے ہیں اور آپ کا مکان بھی اس بے مقصد خونریزی سے نہیں بچا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمیں آپ کے چوکیدار کی لاش کے علاوہ پورے علاقے میں کوئی زخمی تک نظر نہیں آ سکا۔"

"ذرا احتیاط سے!" ایلیزا کی آواز سنائی دی "اس خوابگاہ میں میری بیمار ماں آرام کر رہی ہے۔"

مسہری سے نیچے لٹکی ہوئی چادر سے چھن کر کہیں سے روشنی کا انعکاس میرے چہرے پر آیا غالباً وہ لوگ ٹارچ استعمال کر رہے تھے۔

مسز جوناس کی خوابگاہ کا دروازہ کھولا گیا اور پھر چند ثانیوں تک کسی ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے میں گردش کرتا رہا۔ اور پھر وہ سب دروازے سے ہی واپس لوٹ گئے۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد جوناس ولا میں بجلی کی فراہمی بحال ہو گئی اس کا اندازہ مجھے مسز جوناس کی خوابگاہ میں برقی ہیٹر کے کام شروع کرنے سے ہوا۔

دو بجے کے قریب ایلیزا سیڑھیاں عبور کر کے اوپر آئی اور اس نے مجھے پولیس والوں کی جماعت کے چلے جانے کی خوشخبری سنائی اور میں اس کے ہمراہ نیچے چل دیا۔ اپنے بریف کیس کو اس کی نظروں سے بچانے کے لئے میں نے مسز جوناس کی مسہری کے نیچے ہی چھوڑ دیا تھا۔

پولیس افسران نے ایلیزا اور اس کے دونوں ملازمین سے خاصے پیچیدہ سوالات کئے تھے مگر وہ ان تینوں سے کوئی ایسی بات اگلوانے میں کامیاب نہ ہو سکے جس کی بنا پر جوناس ولا کو فساد کی جڑ قرار دیا جا سکتا۔

مگر کچن گارڈن میں کھدی ہوئی قبر نے خاصی مشکل صورتحال پیدا کر دی تھی۔ جس وقت خانساماں کو باہر سے طلب کیا گیا تھا اس وقت تک وہ کافی مٹی دوبارہ قبر میں ڈال چکا تھا۔ بعد میں وہ مٹی ایک افسر کے لئے شبہ کا سبب بن گئی۔ اس کے شبہ کو

...ائی کے ان اوزاروں سے بھی تقویت ملی جو کچن میں رکھے ہوئے ...ان پر لگی ہوئی تازہ اور نرم مٹی کے جائزے کے بعد پولیس ...دو جوان قبر سے نرم مٹی نکالنے پر مامور کر دیئے گئے اور جب ...سخت زمین آ جانے کے باوجود وہاں سے کوئی لاش برآمد ...ئی تو پولیس والوں کو خاصی خفت اٹھانا پڑی اور انہوں ...یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ گڑھے کے بارے میں ایلیزا کی کہانی ...یقین کر چکے تھے۔

جوناس ولا کا چوکیدار اسٹین گن کے حملے کا شکار ہوا تھا۔ ...اس کی لاش جوناس ولا کے پھاٹک کے قریب احاطے میں پڑی ...پائی ملی تھی۔ گولیوں کے کاری زخموں کے واضح نشانات ...باوجود رسمی کارروائی کے لئے وہ لاش پولیس نے پوسٹ مارٹم ...کے لئے اپنی تحویل میں لے لی تھی۔

ایلیزا کی خوابگاہ کے دروازے کا ٹوٹا ہوا قفل بھی پولیس ...توجہ کا مرکز بنا تھا۔ مگر ایلیزا نے اس موضوع کو خوبصورتی سے ...ٹال دیا۔ اس بارے میں اس نے چابی کھونے کی کہانی سنائی ...جس کے سبب اسے خود تالا توڑنا پڑ گیا تھا۔

اس واقعے کے بارے میں ان تینوں کے بیانات لینے کے ...بعد پولیس کی جماعت واپس چلی گئی تھی۔

خانساماں اور خادمہ کو وہ رات ڈرائنگ روم میں گزارنے ...کی ہدایت کر کے ایلیزا میرے ہمراہ اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔

میرے لئے جوناس ولا میں مزید رہنا بے سود ہو چکا ...ابراہم جوناس جیسے مکار شخص سے یہ امید کرنی خود فریبی ...سے زیادہ نہیں تھی۔ کہ جوناس ولا کے باہر خونریز تصادم کے ...بعد وہ نیس سے واپسی پر وہیں قیام کی حماقت کرے گا۔

بظاہر یہ مشکل ہی معلوم ہوتا تھا کہ بن حیان کو نیس میں ...ہنگامے کی اطلاع مل جائے اور لی ایئر پورٹ سے سینٹ جرمین ...پہنچنے تک بھی وہ سارے معاملے سے بے خبر ہوتا لیکن اس بار ...ولا پہنچنے کے بعد جب اسے جیراڈ کی معرفت سارے واقعے کا علم ...ہوتا وہ فوری پر پیرس ہی میں روپوشی اختیار کر لیتا یا وہاں سے فرار ...ہو جاتا اور میں جوناس ولا میں کسی احمق کی طرح مناسب موقع کا ...انتظار کرتا رہ جاتا۔

اس تجزیے کی روشنی میں مناسب یہی تھا کہ میں عبداللہ کے ساتھ ...اپنی توجہ پیرس کے دونوں ہوائی اڈوں پر مرکوز کر دیتا اسی طرح ...ابراہم کو پیرس پہنچتے ہی بے خبری میں نشانہ بنایا جا سکتا تھا ...کیونکہ ہوائی اڈوں سے جوناس ولا تک کا راستہ بہترین موقع ...فراہم کرتا تھا۔ اگر وہ دونوں اس راستے پر ہمیں کوئی موقع دیئے بغیر اپنے ...ٹھکانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمارے منصوبے دھرے رہ جاتے۔

"اب میرا یہاں رہنا بے کار ہوگا" میں نے کافی دیر تک غور کرنے کے بعد ایلیزا سے کہا۔

"میں تنہا تو یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ اور پھر میرے باپ کا کیا ہوگا؟ اس کی غیر موجودگی میں پیش آنے والے واقعات نے مجھے اس سے متنفر کر دیا ہے۔"

"تم عذرا کی واپسی تک ہوٹل میں منتقل ہو جاؤ" میں نے اسے مشورہ دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اندر رہ کر میں اس کے خلاف کچھ نہ کر سکوں گا۔"

"ہوٹل میں تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"مجھے عذرا کے سلسلے میں مصروفیت کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ اس کی واپسی تک شاید دونوں ہوائی اڈوں کی نگرانی بھی کرنی پڑ جائے۔"

"میں سمجھ گئی" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تم میری وجہ سے میرے باپ کے خلاف صف آرا نہیں ہوئے بلکہ اس سے تمہاری کوئی ذاتی پرخاش بھی چلی آ رہی ہے!"

میں نے ایک ثانیے کے لئے اس کے سوال پر غور کیا اور پھر اس کے خیال کی کامل تردید کرتے ہوئے بولا "اس بے چارے نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میری اس سے پرخاش ہو گی۔ تم چاہو تو میں ابھی بلکہ اسی وقت لاتعلقی اختیار کئے لیتا ہوں۔"

"میں یہ تو نہیں چاہتی مگر تم سے یہ توقع ضرور کرتی ہوں کہ اگر میرے باپ سے تمہاری دشمنی کا کوئی سبب ہے تو تم مجھے اندھیرے میں نہیں رکھو گے۔" اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "مجھے بھی کم از کم ذہنی طور پر یہ سکون ملے گا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی تمام تر ذمہ داری میری نہیں ہے بلکہ اس فیصلے کا کوئی دوسرا سبب بھی موجود تھا۔ تم خود ہی غور کرو کہ اس دور میں کون ایک لڑکی کے لئے ایسے خون خرابے کو دعوت دینا پسند کرے گا جس کے نتیجہ میں اس کی ساری عمر قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے گزر سکتی ہے اور لڑکی بھی ایسی جس سے شادی وغیرہ کا کوئی ارادہ نہ ہو۔"

"تم میرے خلوص پر شبہ کر رہی ہو ایلیزا" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا "میں نے تمہیں قریب سے دیکھا اور مظلوم سمجھ کر تمہاری مدد پر آمادہ ہو گیا اب اگر تم میری اس ہمدردی کو کوئی اور معنی پہنانے کی کوشش کرو تو یہ سراسر تمہاری زیادتی ہو گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ میرا ابھی کسی مخلص دوست سے واسطہ نہیں پڑا۔ میرے ذہن میں جو بات تھی وہ میں نے تم کو بتا دی اور امید کرتی ہوں کہ تم بھی مجھے اس صاف گوئی پر معاف کر دو گے۔"

"میں صبح چلا جاؤں گا" میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔

"اس کے بعد تم آزادی سے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکو گی۔"

"تو تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟"

"تمہاری گفتگو نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں نے تمہیں معاف ضرور کر دیا ہے مگر میں اپنی امکانی ناکامی کی صورت میں عمر قید کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"تمہارے سہارے میں اس قدر آگے بڑھ چکی ہوں کہ اب اپنے باپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہ کر سکوں گی۔ میں تنہا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی مگر اپنی زندگی کا خاتمہ ضرور کر سکتی ہوں اور تمہاری ہمدردی کھونے کے بعد میرے لئے بس وہی راستہ رہ جائے گا۔"

میں خاصی دیر اپنی جگہ اڑا رہا۔ ایلیزا نے ہر طرح مجھے سمجھانا چاہا۔ اور آخر کار میرے سینے پر سر رکھ کر سسک کر رو پڑی۔

عذرا جوناس تو ویسے بھی میرا منفی شکار تھا جبکہ میری اصل بھاگ دوڑ ابراہام جوناس کے خلاف تھی اور میں اسے کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایلیزا پر یہ ظاہر کیا کہ میں اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو گیا ہوں اور وہ خوش ہو گئی۔

اس رات میں ایک لحظے کے لئے بھی نہ سو سکا۔ ایلیزا سے سمجھوتہ کے بعد میں اس کی ناز برداریوں میں الجھ گیا۔ اور جب وہ تھک ہار کر گہری نیند سو گئی تو میرا ذہن عبداللہ میں الجھ گیا۔

عبداللہ نے نہایت کامیاب طریقے سے جوناس ولا پر جیراڈ کے آدمیوں کے حملہ کا منصوبہ ناکام بنا یا تھا۔ ان لوگوں کے لئے باہر سے کی جانے والی مخالفانہ کارروائی اس قدر غیر متوقع تھی کہ پناہ کے لئے انہوں نے جوناس ولا کے قرب و جوار میں بنے ہوئے مکانات میں بھی گھسنے سے دریغ نہیں کیا۔ اور اسی بنا پر جوناس ولا پولیس کیمپ میں تبدیل ہونے سے بچ گیا۔

مجھے یہ اندازہ تھا کہ پولیس کی آمد کے بعد جیراڈ کے آدمیوں کے ساتھ ہی عبداللہ کی ٹولی بھی اس علاقے سے فرار ہو گئی ہو گی اور ان کی بہتری بھی اسی میں تھی۔

ایلیزا کو گہری نیند کی آغوش میں دیکھ کر میں دبے قدموں اس کی خوابگاہ سے نکلا اور دروازے کی اوٹ سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بعد اوپر چل دیا۔

خانساماں اور خادمہ دن بھر کی محنت کے بعد صوفوں پر بے خبر سو رہے تھے۔ اور میرے لئے مسز جوناس کی خواب گاہ سے اپنا بریف کیس نکالنے کا وقت آ گیا تھا۔

میں اوپر والے کمرے میں پہنچا تو دبیز کمبلوں میں لپٹی ہوئی ایلیزا کی ماں کی حالت پر مجھے بہت رحم آیا۔ بظاہر وہ اس گھر کی مالکن تھی اور اس کا شوہر اس سے بے حد محبت کرتا تھا مگر عملی طور پر وہ ایک ناکارہ عضو کے طور پر اس گھر میں رہ رہی تھی۔ پچھلے چودہ گھنٹوں سے کچھ کھائے پئے بغیر وہ خواب آور دواؤں کے زیرِ اثر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اور گھر میں کسی کو اس کے بارے میں ذرا بھی تشویش نہیں تھی۔

لیکن میں وہاں باہر کا آدمی تھا اور اس بے بس عورت کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا جسے اس کی زندگی میں ہی مُردوں سے بدتر بنا دیا گیا تھا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ اس کی مسہری کے نیچے سے اپنا بریف کیس نکالا اور ایلیزا کی خواب گاہ میں واپس آ گیا۔

بریف کیس چھپانے کے بعد میرا ذہن طویل توقف کے بعد پیتا کی طرف بھٹک گیا اور اس کے بارے میں سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز ایلیزا نے مجھے نہایت محبت آمیز اور نرم انداز میں بیدار کیا۔ اس کا مسکراتا ہوا شاداب چہرہ اپنے قریب پا کر میرا جی چاہا کہ دوبارہ نیند کی وادیوں میں کھو جاؤں۔ مگر تحت الشعور میں موجود خطرات نے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

"منہ ہاتھ دھو کر اس کمرے سے باہر نہ آنا، میں ناشتہ یہیں لے آتی ہوں۔" ایلیزا نے میرے الجھے ہوئے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا تمہارا باپ آ گیا ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"نہیں — ممی نیچے آئی ہوئی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی نظر تم پر پڑے۔"

"انہیں رات کے ہنگامے کا علم ہوا یا نہیں؟"

"ابھی تو نہیں ہوا — موقع دیکھ کر آہستہ آہستہ بتاؤں گی۔"

"میں ناشتے کے فوراً بعد باہر جانا چاہتا ہوں۔ کہیں تمہاری ممی کی موجودگی میں گڑبڑ نہ ہو جائے!" میں نے غسل خانے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"میں ممی کو مالش کے لئے جوڈی کے ساتھ اوپر بھیج دوں گی۔"

وہ یہ کہہ کر خواب گاہ سے چلی گئی۔

میں گرم پانی سے طویل غسل کرنے کے بعد کمرے میں آیا تو ایلیزا ناشتہ لئے موجود تھی۔ لباس اور جوتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ فوری طور پر باہر جانے کے لئے تیار تھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی ممی کو اوپر بھیج کر آئی ہو!" میں نے اس کے سراپا پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں — مگر یہ بتاؤ کہ فوری طور پر تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہاں سے نکلنے کے بعد کہیں بھی چھوڑ دینا۔"

"ایئرپورٹ کا ارادہ کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ انتظام کرنا ہو گا۔ میں اکیلا تو دو ہوائی اڈوں کو نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے ابلے ہوئے انڈوں سے انصاف کرتے ہوئے

کہا—

"میرے باپ کو چارلس ڈیگال ایئرپورٹ بالکل پسند نہیں ہے وہ آمدورفت کے لئے ہمیشہ اورلی ایئرپورٹ کو ترجیح دیتا ہے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کیونکہ میری معلومات کے مطابق بیناس برادران اورلی ایئرپورٹ سے نیس روانہ ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی گاڑی بھی وہیں چھوڑ دی تھی اور اگر پسند کا معاملہ نہ بھی ہوتا تو گاڑیوں کی وجہ سے وہ لوگ یقینی طور پر اورلی ایئرپورٹ کا رخ ضرور کرتے اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک شاندار تجویز آگئی۔ نیس میں رائے کارڈیو سے مقابلے کے دوران عبداللہ کی کار ہولناک دھماکے کے ساتھ اڑا دی گئی تھی جو اگنشن سے منسلک کسی طاقتور ڈائنامیٹ سے ہوا تھا۔ اورلی ایئرپورٹ کے باہر دو گاڑیاں موجود تھیں ایک میں عذرا اور ابراہام وہاں پہنچے تھے۔ اور دوسری گاڑی میں ان کے باڈی گارڈ محافظ سوار تھے۔

اگر کسی طرح ان دونوں موٹروں میں اگنشن سوئچ کے ساتھ طاقتور ڈائنامائٹ لگا دیئے جاتے تو سارا کام نہایت خود کار اور سہل طریقے پر پورا ہو سکتا تھا۔

"کس خیال میں کھو گئے؟" مجھے خاموش پا کر ایلیزا نے ٹوکا۔

"اگر تمہارا مشورہ مان لیا جائے تو بھی مجھے آدمی درکار ہوں گے کیونکہ عذرا اور ابراہام کے ساتھ چار مسلح محافظ بھی سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔"

"ایک گھنٹہ بھی کافی ہو گا۔"

"تو میں تمہیں چھوڑنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد اورلی ایئرپورٹ کے تیسرے لاؤنج میں ملوں گی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تمہارا وہاں آنا مناسب نہ ہو گا۔"

"میں تمہارے ساتھ رہ کر اپنی آنکھوں سے اس کا انجام دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اگر اس کی نگاہ تم پر پڑ گئی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اور تمہاری وجہ سے میں بھی اس کی نظروں میں آ جاؤں گا۔"

"تم بے فکر رہو، میں جاسوسی فلمیں بکثرت دیکھتی ہوں، اپنی وجہ سے تم کو کسی دشواری میں نہیں ڈالوں گی۔"

ناشتے سے فراغت کے بعد پہلے ایلیزا باہر نکلی اور چند منٹ کے توقف کے بعد میں اپنا بریف کیس لے کر تیزی سے باہر نکلا اور برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی کار کی عقبی نشست پر دھنس گیا میرے سوار ہوتے ہی ایلیزا نے انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔

اس وقت باہر کی فضا پر خاصی دھند چھائی ہوئی تھی مگر میں کوئی بے احتیاطی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا لہٰذا کار کے سرکتے ہی نشست سے لڑھک کر پائیدان میں لیٹ گیا۔

کافی دیر کی خاموش ڈرائیونگ کے بعد آخر کار ایلیزا نے ہی زبان کھولی "اب ہم کافی دور نکل آئے، اوپر آ جاؤ۔"

"ہم کس علاقے میں ہیں؟" میں نے عقبی نشست پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"بولیوارڈ سینٹ مارسل پر جا رہے ہیں، تم کہاں اترو گے؟"

"بس کہیں بھی اتار دو۔"

ایلیزا نے کار کی رفتار بتدریج کم کی اور فٹ پاتھ کے سہارے مجھے اتار دیا۔ "میں ڈیڑھ گھنٹے بعد پہنچ رہی ہوں، یاد رکھنا۔" یہ کہہ کر اس نے کار بڑھا لی۔

ایلیزا کی کار بمشکل تھوڑی دور گئی ہو گی کہ ایک سیاہ مورس تیزی کے ساتھ میرے قریب سے گزری اور پھر پوری طاقت سے بریک لگا کر اسے روک لیا گیا۔ میں کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ وہ کار پیچھے کی طرف رینگتی ہوئی میرے قریب آ رکی۔

اس وقت تک بریف کیس میرے بائیں ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا اور دایاں ہاتھ اوور کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے اعشاریہ چار دو کے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اس کا ٹریگر گرفت میں لے چکا تھا۔

سیاہ مورس میرے بالکل قریب آ کر رک گئی اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اجنبی چہرہ موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ اُمڈ آئی۔

"مسٹر ڈان فرنانڈو ہو؟" اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دوستانہ لہجے میں سوال کیا۔ اور میرا سر غیر ارادی طور پر اثبات میں ہل گیا۔

"آ جاؤ —" اس نے اپنے برابر والی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں دعوت دی۔

"تم کون ہو —؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"راڈرک!" اس نے جواب دیا "میں نے کل شام تمہیں ایفل ٹاور پر دیکھا تھا۔ شاید اس لڑکی نے گاڑی روک کر تمہیں ہی اتارا ہے۔"

اس کا جواب جامع اور تسلی بخش تھا۔ میں سکون سے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"لڑکی کا تعاقب کیا جائے —؟" اس نے گیئر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"تم پیچھا کر رہے تھے اس کا؟"

"ہاں — " وہ قہقہہ مار کر بولا "عبداللہ نے یہی ہدایت دی تھی۔ وہ تو میں نے تمہیں اتفاقاً پہچان لیا ورنہ سیدھا نکل جاتا۔"

"عبداللہ کہاں ہے؟"

"جوناس ولا کے سامنے۔"

"پولیس کی واپسی کے بعد تم لوگ دوبارہ وہاں پہنچ گئے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"پولیس کی موجودگی میں بھی ہم تماشائیوں کی بھیڑ میں شامل تھے۔" وہ بولا "ہمارا ایک ساتھی زخمیوں کو گاڑی میں اٹھالے گیا تھا۔"

"مجھے فوراً عبداللہ سے ملنا ہے" میں نے اسے گاڑی بڑھانے کا اشارہ دیتے ہوئے کہا "رات کو ہمارے کتنے آدمی زخمی ہوئے؟"

"اس وقت ہم چار سمجھ رہے تھے۔" وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا "آج صبح معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک اسی وقت مر چکا تھا۔"

"اور دشمن کے نقصانات کا کچھ پتہ چلا؟"

"چند سیکنڈ اور پولیس سائرن نہ سنائی دیتا تو ان کا ایک آدمی زندہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہوتا۔ ویسے انہیں کافی نقصان پہنچا ہے انہیں شاید کسی مزاحمت کی امید نہیں تھی۔" اس نے بتایا "ہمارے خیال میں ان کے کم از کم سات آدمی ہلاک یا بری طرح زخمی ہوئے تھے۔"

"اور بھاگنے والے ان سب کو اٹھالے گئے؟"

"دور سے سنائی دینے والے پولیس سائرن کا یہی فائدہ ہے کہ دونوں فریقوں کو اپنے آدمی سمیٹنے کا موقع مل جاتا ہے۔" وہ خاصا زندہ دل معلوم ہوتا تھا۔

"رات کا ہنگامہ شروع کیسے ہوا تھا؟"

"وہ لوگ اس علاقے میں پہنچتے ہی ہماری نظروں میں آگئے تھے شاید انہیں اندازہ نہیں تھا کہ باہر سے جوناس ولا کی کڑی نگرانی کی جارہی تھی۔ پھر جیسے ہی جوناس ولا کی روشنیاں گل ہوئیں ہمارے ایک آدمی نے اسٹریٹ لائٹ کی کہر زدہ روشنی میں دو آدمیوں کو مکان کے احاطے کی دیوار پہ چڑھتے دیکھ کر فائر کردیا۔ اس کے بعد تو کھلی جنگ چھڑ گئی تھی۔"

میں دل ہی دل میں اس شخص کی دلیری اور بے خوفی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اس خونریز معرکے کے بارے میں ایسے لاپروایانہ انداز میں گفتگو کررہا تھا۔ جیسے اس کی نظروں میں موت کی کوئی وقعت نہ ہو اور نہ ہی وہ عبداللہ سے نالاں نظر آرہا تھا۔ جس نے محض میرے اشارے پر اس جیسے کئی جوانوں کو جان لیوا مہم میں جھونک دیا تھا۔

"عبداللہ کی سخت ہدایت تھی کہ جوناس ولا سے نکلنے والی کسی بھی سواری کو ایک پل کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ پہ برس پڑے!" اس نے قدرے خاموشی کے بعد فکرمندانہ لہجہ میں کہا۔

"میرا نام سن کر وہ کچھ نہیں کہے گا۔"

کار سینٹ جرمین کے علاقے میں داخل ہوچکی تھی۔ راڈرک نے ایک کیفے کے سامنے اسے روک دیا۔ "تم یہاں انتظار کرو، میں اسے لے آتا ہوں۔"

کیفے میں داخل ہوتے ہوئے مجھے راڈرک کی ذہنی صلاحیتوں پر رشک آرہا تھا۔ اس نے مجھے براہِ راست عبداللہ تک نہ لے جاکر بہت عقل مندی کا کام کیا تھا۔ جب کہ میں نے اس پہ توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔

کافی کی پیالی خالی ہونے سے قبل عبداللہ غول سے بچھڑے ہوئے کسی مضطرب پرندے کی طرح میری میز پہ آپہنچا۔

اس کیفے میں گفتگو کرنی مناسب نہیں تھی لہٰذا میں پیالی ختم کر کے فوراً اٹھ گیا۔ باہر عبداللہ کی عجیب ساخت کی جیپ کھڑی ہوئی تھی جس میں ہم دونوں وہاں سے روانہ ہوگئے۔

"خدا نے تمہیں امان دی ہے صفدر!" وہ موقع میسر آتے ہی بولا "اگر تم نے خطرے سے مجھے پیشگی طور پہ آگاہ نہ کیا ہوتا تو وہ لوگ جوناس ولا میں کسی کو زندہ نہ چھوڑتے۔"

"ان کی تعداد کا اندازہ بھی ہوا یا نہیں؟"

"پندرہ سے تو کسی طرح کم نہیں تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ جیراڈ خود ان کی رہنمائی کررہا تھا۔" اس نے ہیجان آمیز لہجے میں کہا "وہ تو ان کی بے خبری ہمارے کام آگئی ورنہ انہیں روکنا ہمارے بس سے باہر ہوجاتا۔"

"اسٹین گن کس کے پاس تھی؟"

"وہ جیراڈ خود چلا رہا تھا۔"

"یعنی جوناس ولا کا چوکیدار اسی کے ہاتھوں مارا گیا ہے؟"

"جیراڈ میرے ہاتھ سے زخمی ہوگیا تھا۔ اور اس کی اسٹین گن بھی میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ مگر وہ میری آنکھوں میں ریت جھونک کر بچ نکلا، چوکیدار کو میں نے اسی اسٹین گن سے مارا تھا۔"

"تم نے اور تمہارے آدمیوں نے واقعی بڑی بے جگری سے کام لیا۔ راڈرک بتا رہا تھا کہ ہمارا ایک آدمی ہلاک بھی ہوا ہے!"

"ایسے مقابلوں میں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے!" وہ اداس لہجے میں بولا۔

"ان آدمیوں کو معاوضہ پر حاصل کیا ہے؟"

"پیسہ لینے والے اتنی بے خوفی نہیں دکھا سکتے۔" اس نے کہا۔ "یہ سب فرینڈز آف فلسطین نامی تنظیم کے اراکین تھے۔"

"میری حماقت سے اب کھیل کا رخ بدل گیا ہے، رات کے ہنگامے کے بعد بن حیان کے خلاف نئی حکمتِ عملی اختیار کرنی پڑے گی۔"

"کیا سوچا ہے تم نے؟"

میں نے اسے تفصیل سے اپنا نیا منصوبہ سنا دیا ساتھ ہی پرانی اسکیم کو ترک کرنے کے اسباب بھی واضح کردیئے۔

"یہی صورت بہتر ہے" میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا "مگر اب وقت بہت قیمتی ہے، ایسا نہ ہو کہ ہمارے پہنچنے سے قبل وہ

ائیرپورٹ پر اتر جائیں۔"

"تو پھر اپنے آدمیوں کو چھٹی دے کر اسی طرف نکل چلو!"

"راڈرک کو ساتھ لینا ہوگا" وہ بولا "وہ برقی سوئچ سے اڑنے والے آتش گیر ہتھیاروں کو نصب کرنے میں اعلیٰ مہارت رکھتا ہے اور وہی ان دونوں گاڑیوں کو بھی پہچان سکتا ہے۔"

"مجھے کہیں اتار کر اسے لے آؤ۔"

"تمہارے ساتھ چلنے میں کیا حرج ہے؟"

"ایسا نہ ہو کہ ایلیزا وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لے۔ ہمارے بارے میں اسے جس قدر کم معلومات حاصل ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔"

"وہ ابھی تک اپنے باپ کی جانی دشمن ہے؟"

"اب تو وہ میرے ساتھ رہ کر عذرا کا آخری انجام دیکھنا چاہتی ہے۔"

"بڑی خونخوار لڑکی ہے، پتہ نہیں وہ تمہارے ساتھ کیوں موم ہوگئی ہے۔" وہ ہنس کر بولا "باپ اور بیٹی کے درمیان ایسی خونی عداوت میرے لئے نئی چیز ہے۔"

"وہ تو عذرا کو اپنا باپ ہی نہیں مانتی، اس کا خیال ہے کہ اپنی ماں اور خانساماں کے عشق کے نتیجہ میں عذرا جوناس کے گلے پڑگئی ہے۔"

اس انکشاف پر عبداللہ بھونچکا رہ گیا اور جب میں نے اسے جوناس ولا کے مکینوں کے بارے میں مزید تفصیلات بتائیں۔ تو وہ ان پر بمشکل یقین کرسکا۔

خاص طور پہ خانساماں اور خادمہ کی ایلیزا سے وفاداری اس کے نزدیک ایک عجوبہ تھی۔ اس کی رائے میں اس طبقے کے لوگوں کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ موقع دیکھ کر اپنے مالکان کی نجی زندگی میں دخل حاصل کرتے ہیں اور پھر ان کی کمزوریوں کی سینہ بہ سینہ تشہیر کرکے اپنی انا کے کسی مظلوم پہلو کی تسکین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

راستے میں ایک اسٹال پر مجھے اتار کر عبداللہ جوناس ولا کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور میں کاؤنٹر پر سجے ہوئے اخبارات کا جائزہ لینے لگا۔

فرنچ اخبارات کی قطار میں مجھے ایک انگریزی روزنامہ بھی نظر آگیا جو میں نے رقم ادا کرکے خرید لیا تاکہ رات کے واقعے کے بارے میں اخباری رجحان کا اندازہ کرسکوں۔

اخبار کے آخری صفحے پر "پراسرار مقابلہ" کی دو کالمی سرخی کے نیچے واقعے کی تفصیلات درج تھیں۔ اور مختلف ذرائع کے حوالے سے یہ بتایا گیا تھا کہ گنجان آباد علاقے میں ہونے والی وہ خونریز فائرنگ جرائم پیشہ افراد کی کسی باہمی چپقلش کا نتیجہ تھی۔ جس میں زخمی ہونے والوں کی تعداد تو یقیناً کافی رہی ہوگی کیونکہ بہت سے مقامات پر خون کے دھبے پائے گئے تھے مگر کوئی ہلاک نہیں ہوا تھا۔ خبر میں سینٹ جرمین کے رہائشی علاقے کا حوالہ ضرور تھا۔ مگر جوناس ولا کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔

عبداللہ کی واپسی خاصی دیر میں ہوئی۔ راڈرک اس کے ہمراہ تھا۔ میرے سوار ہوتے ہی عبداللہ نے گاڑی آگے بڑھادی۔

عبداللہ کی ہدایت پر میں نے بارود کی اسلحہ سے بھرا ہوا بریف کیس احتیاط سے راڈرک کے حوالے کردیا۔ اور وہ بریف کیس کھول کر ہتھیاروں کا جائزہ لینے لگا۔

"یہ چیزیں تو ائیرپورٹ کی پوری عمارت کو نقصان پہنچانے کے لئے کافی ہیں۔" اپنے جائزے سے فارغ ہوکر راڈرک بولا "مگر ان میں مطلوبہ نوعیت کا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

"ضروری نہیں کہ اگنشن ہی کام میں لایا جائے، تم کوئی دوسرا طریقہ بھی اختیار کرسکتے ہو۔" عبداللہ نے کہا۔

"اس بات کا خطرہ پھر بھی رہے گا کہ دھماکہ قبل از وقت نہ ہو جائے، مجھے دس پندرہ منٹ کی مہلت مل جائے تو میں ضروری چیزوں کا بندوبست کرسکتا ہوں۔"

"تو ہم لوگ اورلی ائیرپورٹ جارہے ہیں، تم سامان لے کر وہیں آجاؤ۔"

"مجھے بنکرز پلازہ کے نکڑ پہ اتار دینا۔"

راڈرک کو اس کی بتائی ہوئی جگہ پر اتارنے کے بعد عبداللہ نے گاڑی برق رفتاری سے اورلی ائیرپورٹ جانے والے راستوں پر ڈال دی۔

"جوناس ولا سے اپنے آدمیوں کو رخصت کردیا؟"

"ہاں — تمہیں ایک نئی بات تو بتانی ہی بھول گیا۔" عبداللہ چونک کر بولا "چند منٹ پہلے اس علاقے میں ایک مشکوک گاڑی دیکھی گئی ہے جس میں دو آدمی سوار تھے میرے آدمی تو کسی نئے مقابلے کی امید میں تھے مگر میں نے انہیں رخصت کردیا۔"

"جیراڈ اتنی جلدی دوسرے وار کی ہمت نہ کرسکے گا۔"

"پیشہ ور لوگوں کے معاملے میں تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر ایک بار وہ لوگ ملاقاتی کے روپ میں اندر گھسنے میں کامیاب ہوگئے تو انہیں من مانی کرنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔"

"ایلیزا تو شاید باہر ہی وقت گزار کر اورلی ائیرپورٹ پہنچے گی۔ اس کے ملازم بلاوجہ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

"ان کی فکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ صرف جوناس برادران کی کار اڑانے کا ارادہ ہے یا محافظوں کی کار کو بھی ٹھکانے لگاؤ گے؟"

"محافظوں کو نہ چھیڑا جائے تو بہتر ہوگا" میں نے کہا "جیراڈ کے آدمیوں کے لئے پچھلی رات کا سبق ہی کافی رہے گا۔"

"اگر بن حیان کے بہلنے پیرس کو چار غنڈوں سے نجات ملتی ہے تو کیا برا ہے؟" عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید تم اسی طرح اپنے آدمیوں کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔"

"میرے ایک آدمی کے بدلے میں ان کے دس بھی مارے جائیں تو حساب برابر نہ ہوسکے گا۔" وہ یک بیک سنجیدہ ہوگیا۔ "مخلص حریت پسندوں کے مقابلے میں یہ لوگ تو محض اٹھائی گیرے ہیں۔"

"اگر راڈرک ویسٹ سے آیا تو محافظوں کو بھی دیکھ لیں گے۔"

سبک رفتاری سے دوڑتی ہوئی جیپ اچانک تیزی سے داہنی طرف بھاگنے لگی۔ اگر عبداللہ خاصی قوت صرف کرکے اسٹیئرنگ نہ سنبھالتا تو جیپ ڈھلان سے اترتی ہوئی الٹ جاتی۔ اس نے رفتار توڑ کر چند ہی ثانیوں میں جیپ روک لی۔

نیچے اتر کر جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ جیپ کا آگے والا داہنا ٹائر ہوا سے محروم ہوچکا تھا۔ عبداللہ کو اس بے وقت پنکچر پر غاصا تاؤ آیا اور میں اس کے غصے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ٹائر تبدیل کرنے میں مصروف ہوگیا۔

ٹائر بدلنے کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا اور لی ایئرپورٹ پر پارکنگ کے لئے مختلف مقامات پر بڑے بڑے قطعات مخصوص تھے اپنی جیپ ایک جگہ روکنے کے بعد ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ کاروں کے اس سمندر میں عذرا جوناس اور اس کے محافظوں کی گاڑیاں کہاں تلاش کی جائیں۔ عبداللہ نے مجھے صبر کی تلقین کرتے ہوئے راڈرک کے انتظار کا مشورہ دیا۔ جو آتے ہی ہمیں مطلوبہ گاڑیوں تک لے جاتا۔

میری رسٹ واچ کے مطابق ایلیزا کو مجھ سے جدا ہوئے سوا گھنٹہ ہوچکا تھا۔ جب کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے اس سے ایئرپورٹ کی عمارت میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے اضطراب کے پیش نظر مجھے یقین تھا کہ وہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچے گی۔ مگر میں راڈرک کا کام مکمل ہونے سے قبل ایلیزا کے ساتھ الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم دونوں ٹہلتے ہوئے عمارت کی طرف چل دیئے۔ عبداللہ کا خیال تھا کہ اس فاضل وقت میں نیس سے آنے والی پروازوں کا شیڈول معلوم کرلیا جائے۔

شیڈول کے مطابق اس روز نیس سے تین پروازیں آچکی تھیں۔ آخری پرواز صرف پچیس منٹ پہلے پیرس پہنچی تھی۔ اگلی پرواز کی آمد میں ایک گھنٹہ بائیس منٹ باقی تھے۔ یعنی ہمارے پاس اپنا کام کرنے کے لئے کافی وقت تھا۔

تھوڑی دیر بعد راڈرک بھی ایک ٹیکسی میں وہاں آپہنچا۔ اس کے ہاتھ میں مستریوں کے کام آنے والا ایک خستہ حال چرمی تھیلا موجود تھا۔ جو اس کے بدلے ہوئے حلیئے سے خاصی مطابقت رکھتا تھا اور بادی النظر میں اسے میکینک ظاہر کرتا تھا۔

ٹیکسی سے اتر کر راڈرک ہم دونوں کو ہمراہ لے کر ایک طرف چل پڑا۔

"وہ گاڑیاں کس طرف ہیں؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی ورنہ پہلے ہی تمہیں بتا دیتا۔ اب ہمیں کافی دُور پیدل جانا ہوگا۔" راڈرک نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

تقریباً دس منٹ کی مسافت کے بعد ہم اس حصے میں پہنچ گئے جہاں راڈرک کے بیان کے مطابق دونوں گاڑیاں موجود تھیں۔

پارک کی ہوئی گاڑیوں کی باقاعدہ قطاروں کے درمیان سامان سے لدے پھندے مسافر اور ملاقاتیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہم تینوں اس بھیڑ میں اپنا راستہ بناتے تیزی سے آگے بڑھتے جارہے تھے کہ اچانک راڈرک کے قدم زمین میں جم کر رہ گئے۔ اس کی آنکھیں سکتے کے عالم میں ایک طرف جمی ہوئی تھیں۔

اور اس کی نظروں کے تعاقب میں میں بھی وہ منظر دیکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایک کار کے قریب مجھے ابراہام جوناس کھڑا نظر آرہا تھا۔ شاید وہ اندر سے دروازے کا قفل کھولے جانے کا منتظر تھا اور اس کے قریب ہی چار دیوہیکل افراد چوکنا انداز میں کھڑے اپنی گردنیں چاروں طرف گھما رہے تھے۔

نیس سے پچیس منٹ پہلے وارد ہونے والی پرواز نے ہمارے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔

ہم تینوں جلدی سے گاڑیوں کی اوٹ میں ہوگئے۔

ابراہام جوناس کے سوار ہونے کے بعد وہ کار حرکت میں آئی اور چند قدم آگے جاکر رک گئی۔ ابراہام کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ سے عذرا جوناس اترا تھا۔ وہ دونوں جھک کر اپنی اپنی سمت کے ٹائروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس وقت تک ان کے چاروں محافظ اپنی گاڑی میں سوار ہوکر پھرتی سے اسے آگے بڑھا چکے تھے مگر ان کے ساتھ بھی کوئی دشواری پیش آئی اور چند فٹ بڑھنے کے بعد ان کی گاڑی بھی روک دی گئی۔

پہلے مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ عذرا اور ابراہام کی مدد کرنے کے لئے رکے تھے۔ مگر جب ان میں سے ایک شخص اتر کر گاڑی کے نیچے جھانکنے لگا تو پتہ چلا کہ ان کی کار بھی مقدر کی خرابی کا شکار ہوئی تھی۔

قدرت نے ہمارے لئے کچھ کر گزرنے کی مہلت فراہم کردی تھی۔ ہمارے چھ دشمنوں کے پاس دو تیز رفتار کاریں تھیں جو کچھ دیر کے لئے ناکارہ ہوگئی تھیں اور ہماری جیپ جو راستے میں ہمیں دغا دے چکی تھی۔ کافی دُور کھڑی تھی۔ مگر ہمارے پاس مہلک ہتھیاروں کا ذخیرہ موجود تھا۔ جو آناً فاناً میں ان سب کو دردناک موت کی آغوش میں پہنچا سکتا تھا۔

دونوں بھائی اپنی گاڑی کے جائزے سے مایوس ہوکر دوسری کار کی طرف پلٹے تو ان کی نگاہوں سے بچنے کے [illegible]دونوں تیزی سے ایک پارسل وین کی اوٹ میں ہوگئے۔

[illegible]ہم لوگوں کا مقدر یاوری کر رہا ہے؟" عبداللہ مسرت آمیز لہجے میں [illegible]عجیب اتفاق ہے کہ بیک وقت ان کی دونوں گاڑیوں میں ہی [illegible]پیدا ہوگئی ہے۔"

[illegible]مقدر کی یاوری پر بغلیں نہ بجاؤ۔" میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔ [illegible]وہ اگلی پرواز سے آئے ہوتے تو گاڑیوں کے حرکت [illegible]نے سے قبل ہی جہنم واصل ہوجاتے۔"

[illegible]تم ان سب کے لئے اجنبی ہو۔" عبداللہ نے راڈرک کے شانے پر [illegible]رکھ کر کہا: "ذرا ادھر جاکر جائزہ تو لو کہ ہوا کیا ہے؟"

راڈرک بلاتامل پارسل وین کی اوٹ سے نکل کر جوناس برادران [illegible]ہو لیا۔ اپنا چرمی تھیلا بھی وہ ساتھ ہی لے گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے قریب سے گزرنے والے افراد [illegible]میں خود کو مشکوک بنائے بغیر کسی کی تلاش کا انداز اختیار کرتے [illegible]اپنے دشمنوں کی ٹولی پر نگاہ ڈالی تو ان سب کو ایک جگہ جمع پایا [illegible]سے ایک اپنا ہاتھ فضا میں لہرا لہرا کر کچھ بول رہا تھا۔ شاید ان کی [illegible]میں پیچیدہ نقص پیدا ہوگئے تھے۔

اپنی پشت پر کسی کے ہاتھ کا نرم لمس محسوس کرکے میں پھرتی سے [illegible]اپنے عقب میں ایلیزا کو موجود پایا۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے [illegible]خلاف معمول اسکارف میں سنبھالے ہوئے تھے اور نہایت دلفریب [illegible]میں مسکرا رہی تھی۔

شاید وہ عبداللہ کی بے لاعلمی میں ہمارے سروں پر پہنچی تھی کیونکہ [illegible]بے چارہ نہایت بے بسی کے عالم میں کبھی اسے اور کبھی مجھے دیکھ رہا [illegible]تھا۔

"تم لوگوں نے بہت دیر کردی!" ایلیزا نے ملامت آمیز لہجے [illegible]میں کہا۔

"وہ ہمارا اپنا معاملہ ہے، یہ بتاؤ کہ تم مقررہ مقام کے بجائے [illegible]یہاں موجود ہو؟" میں نے روکھے لہجے میں دریافت کیا۔ درحقیقت [illegible]اس وقت اچانک آمد مجھے سخت ناگوار گزری تھی اور میں بھرپور [illegible]سے اپنی ناراضگی سے باخبر کرنا چاہتا تھا۔

[illegible]میں مقررہ مقام سے ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔" [illegible]مگر کیوں؟ تمہیں وہیں رک کر میرا انتظار کرنا تھا۔"

[illegible]میرے لئے ایک فیصلے پر پہنچ جانے کے بعد ایک ایک لمحہ [illegible]دوبھر ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں تمہیں چھوڑنے کے بعد سیدھی ادھر آگئی۔ [illegible]ایک پرواز میرے پہنچتے ہی آئی تھی۔ میں نے گیلری سے سارے [illegible]کو جہاز سے برآمد ہوتے دیکھا اور پھر ریستوران میں جاکر کافی [illegible]آدھے گھنٹے پیشتر نیس سے دوسری پرواز آئی تو میں پھر گیلری میں جا پہنچی اور جہاز سے اترنے والے مسافروں میں اپنے باپ کو دیکھ کر میں مضطرب ہوگئی۔ تمہارے وعدے کے مطابق تمہاری آمد میں دیر تھی جب کہ میں انہیں تمہارے آنے تک روکنا چاہتی تھی لہٰذا میں نے وقت ضائع کئے بغیر گاڑیوں کی تلاش شروع کردی اور پھر اپنے بالوں سے تمام پن نکال کر دونوں گاڑیوں کے ٹائروں کے نیچے اس طرح پھنسا دیں کہ انہیں آگے یا پیچھے حرکت دینے میں ٹائر پنکچر ہوجائیں اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔"

"تو یہ کارگزاری تمہاری تھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ اور اس کام کے لئے میں نے اپنے بالوں کی ترتیب بگاڑ کر انہیں اسکارف میں سمیٹا ہے ورنہ اب تک وہ نکل گئے ہوتے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔

"تم ٹائروں سے ہوا بھی نکال سکتی تھیں۔" عبداللہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہوا نکلنے کی تیز آوازیں لوگوں کو میری طرف متوجہ کردیتیں۔ بال پن لگاتے ہوئے بھی ایک شخص میری طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ مگر میں نے گری ہوئی انگوٹھی تلاش کرنے کا بہانہ کرکے اسے مطمئن کردیا۔ میری کوشش یہ تھی کہ ہر گاڑی کے ایک سے زیادہ ٹائر ناکارہ ہوں تاکہ وہ فاضل ٹائر سے بھی کام نہ نکال سکیں اور اس اثنا میں تم پہنچ جاؤ۔"

"تم نے واقعی زبردست کام کیا ہے مگر اب فوراً دور چلی جاؤ۔ عذرا یا ابراہام نے تمہیں دیکھ لیا تو بازی الٹ جائے گی۔"

اسی وقت راڈرک ایک طویل چکر کاٹ کر واپس آپہنچا۔ آتے ہی اس نے بولنے کے لئے زبان کھولی مگر ایلیزا کو دیکھ کر اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔

"بولو۔ بولو یہ ہماری ساتھی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ایک گاڑی کے دو اور دوسری کے تین ٹائر ناکارہ ہوگئے ہیں سب ٹائروں کے نیچے سے انہیں زنانہ بال پنیں ملی ہیں۔" راڈرک نے کہا۔

"تو ان کا کیا پروگرام ہے؟"

"دونوں گاڑیوں کے ماڈل اور میک میں فرق کی وجہ سے وہ ایک گاڑی کے ٹائر دوسری میں نہیں لگا سکتے لہٰذا دو آدمیوں کو وہاں چھوڑ کر باقی لوگ ٹیکسی سے روانگی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ لوگ اس واقعہ سے بھڑکے ہوئے ہیں اور سرگوشیوں میں تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ میں ان کے پاس زیادہ دیر نہ رک سکا۔"

"یہ تو بتاؤ کہ تم نے دوسری گاڑی کیسے پہچان لی تھی؟" میں نے فوری خیال کے تحت راڈرک کو نظرانداز کرکے ایلیزا سے سوال کر ڈالا۔

"ان لوگوں کی بدقسمتی کہ اسی گاڑی میں ایک بار میرا پیچھا کیا گیا تھا جب میں تعاقب کرنے والے کو ایک اسٹور پر دھوکہ دے کر ہٹ پر پہنچی تھی۔" وہ اپنے کارنامے پر بہت زیادہ نازاں معلوم ہو رہی تھی۔

"اچھا اب تم فوراً چلی جاؤ یہاں کسی بھی لمحے خطرناک کھیل کا آغاز

ہو سکتا ہے۔" میں نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں سے تھوڑی دور اپنی کار میں انتظار کروں گی۔" وہ ہاتھ لہرا کر ایک طرف جاتے ہوئے بولی اور میں اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ اونچی گاڑیوں کی آڑ میں میری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

"وہ سب تو اسی جگہ جمے ہوئے ہیں۔" عبداللہ نے پارسل وین کی اوٹ سے جائزہ لیتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "شاید انہیں کسی سازش کا شبہ ہو گیا ہے۔"

"بے یقینی میں زیادہ آسانی سے مارے جائیں گے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور پھر راڈرک سے بولا۔ "تم فوراً عبداللہ کی جیپ ادھر لے آؤ۔"

عبداللہ نے اسے جیپ کی پارکنگ کا مقام بتا کر چابی سمیت رخصت کر دیا اور میں دل ہی دل میں ان لوگوں کے اس وقت تک رکے رہنے کی دعائیں مانگنے لگا جب تک راڈرک جیپ نہ لے آتا۔

عذرا اور ابراہام جوناس کو وہ چاروں محافظ خونخوار بھیڑیوں کی طرح اپنے محفوظ اور مضبوط حصار میں لئے کھڑے تھے اور وہ دونوں بھائی باتوں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

پھر اچانک عذرا جوناس ایک جھٹکے کے ساتھ ان چاروں کی طرف مڑا اور ہاتھوں کے پُرجوش اشاروں کے درمیان انہیں کچھ بتانے لگا۔

ابراہام جوناس یا ابن حیان لاتعلقانہ انداز میں الگ کھڑا نہایت سکون کے ساتھ آہستہ آہستہ چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

ان دونوں کے رویئے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ نئی صورتحال کے بارے میں وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکے تھے اور چہرے ہوئے تاثرات کے نیچے سے زنانہ بال پنوں کی بازیابی کے باوجود ان کے استقلال میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا تھا۔

"روانگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔" عبداللہ اس ٹولی کی سرگرمیاں دیکھتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں بڑبڑایا۔

"وہ سمجھ چکے ہیں کہ ان کی گاڑیاں اتفاقی حادثے کے نتیجے میں ناکارہ نہیں ہوئی ہیں بلکہ اس طرح کوئی انہیں روکے رکھنا چاہتا ہے ایسی صورت میں اگر وہ فوری طور روانگی کا فیصلہ نہ کریں تو مجھے حیرت ہوگی۔"

"لو۔ وہ چل دیئے۔" وہ مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر بولا۔ "نہ جانے راڈرک کہاں رہ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نگاہیں مسلسل ان پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ جوناس برادران اپنی موٹروں کے پاس سے اس شان سے روانہ ہوئے کہ ان کے چاروں محافظ شانے سے شانہ ملائے ایک قوس کی صورت میں ان کے پیچھے چل رہے تھے جس کے نتیجے میں وہ دونوں بھائی عقب اور پہلوؤں سے کسی حملے کا براہِ راست نشانہ نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ ان محافظوں کی کھوپڑیاں مستقل اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے گردنوں کے بجائے انہیں نازک اسپرنگوں کے سہارے شانوں پر جمایا گیا ہو۔

مختصر سا غیر محفوظ فاصلہ انہوں نے اسی فارمیشن میں عبور کیا اور جب وہ پارک کی ہوئی گاڑیوں کے بند ہجوم میں داخل ہوئے تو دو محافظ ان کے آگے اور دو پیچھے ہو لئے تھے۔

"یہ لوگ شاید ٹیکسی سے روانہ ہوں گے۔" عبداللہ ہانپتے ہوئے شکار کو یوں آسانی سے نکلتا دیکھ کر ناقابلِ برداشت اعصابی ہیجان کا شکار ہوا جا رہا تھا۔

"محافظوں کے ہاتھ شروع سے اب تک ایک لمحے کے لئے بھی جیبوں سے باہر نہیں آئے ہیں۔ اپنے جوش پر قابو رکھو ورنہ سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔"

اور پھر نیلے رنگ کی ایک لمبی سی بیوک کے قریب وہ لوگ رک گئے۔ میں نے بس اتنا دیکھا کہ اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے سے کوئی موجود تھا اور جوناس برادران کے آگے چلنے والے محافظوں میں سے ایک اپنی کہنی کھڑکی پر ٹکا کر اس شخص کی طرف جھکا تھا۔ اتنا دیکھنے کے بعد مجھے اور عبداللہ کو فوراً ہی ایک طرف گھومنا پڑ گیا کیونکہ پیچھے والے محافظ چوکنا انداز میں ایک دم واپس پلٹ پڑے تھے۔

چند ثانیوں کے سنسنی خیز سکوت کے بعد بیوک کے چھ سلنڈروں والے انجن کی غضبناک غراہٹ سن کر ہم دونوں کے لئے مزید انتظار ناممکن ہو گیا۔ جتنی دیر میں ہم کاروں کی اس قطار کے سامنے پہنچے نیلی بیوک سبک رفتاری سے اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی اور سات چھ افراد میں سے بس ایک محافظ وہاں کھڑا بیوک کے سائلنسر سے خارج ہونے والے سرمئی آبی بخارات کا جائزہ لے رہا تھا۔

ہم دونوں محافظ کے برابر والی قطار سے پنجوں کے بل دوڑتے ہوئے سڑک کی طرف ہو لئے۔ جب ہم پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک تک پہنچے تو نیلی بیوک کہر آلود ماحول میں کہیں روپوش ہو چکی تھی۔

"آؤ۔" عبداللہ میرا ہاتھ تھام کر پوری قوت سے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف دوڑ پڑا۔

اسی لمحے فضا میں ریوالور کی ہولناک گونج سنائی دی جس کے ساتھ ایک دلدوز انسانی چیخ بھی ابھری۔ میں بھڑک کر پلٹا مگر مجھے تاحدِ نظر کوئی زخمی نظر نہ آیا۔

فائر کی آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی اور اس کے نتیجے میں وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی اور فضا میں لوگوں کے زور زور سے بولنے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

اس فائر کے نتیجے میں ہم دونوں اپنی انفرادیت کھو بیٹھے تھے۔ اور سڑک پر ہمارے ساتھ بہت سے لوگ مختلف سمتوں میں بھاگنے لگے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ وہ سب سوچے سمجھے بغیر پناہ کی تلاش میں ناک کی سیدھ میں ہو لئے تھے جبکہ عبداللہ مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامے سراسیمہ ہجوم میں راستہ بناتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ علاقہ دور تک بھانت بھانت کی انسانی آوازوں اور بولیوں سے گونج اٹھا تھا مگر کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ دوبارہ نہ سنائی دی۔ نہ جانے ریوالور کا زخم کھانے والا مر چکا تھا یا بے ہوش ہوا تھا اور پھر حملہ آور نے بھی دوبارہ گولی نہیں چلائی۔

دوڑتے دوڑتے عبداللہ اچانک سڑک کے وسط میں رک گیا اور فضا میں زور زور سے ہاتھ لہرانے لگا۔ میں نے بھی وقت ضائع کئے بغیر عبداللہ کی جیپ دیکھ لی تھی جس کی آگے کی زرد روشنیاں جل رہی تھیں اور راڈرک مسلسل ہارن بجاتا ہوا آہستہ آہستہ جیپ کو بھاگنے والوں کی بھیڑ میں آگے لیتا آ رہا تھا۔

ہمارے قریب آ کر وہ جیپ رک نے بھی نہ پایا تھا کہ عبداللہ کسی بندر کی سی پھرتی سے اچھل کر اس کے پہلو والی نشست پر جا بیٹھا اور دبے دبے ہیجانی لہجے میں بولا۔

"دوڑاؤ۔ گاڑی دوڑاؤ۔ وہ لوگ نکل گئے ہیں۔"

میں نے اگر مستعدی سے کام نہ لیا ہوتا تو جیپ کی رفتار پکڑتے ہی منہ کے بل سڑک پر گرتا۔

جیپ پارکنگ لاٹ کے گرد بنے ہوئے دائرے کے متوازی دوڑتی ہوئی جونہی اس مقام پر پہنچی جہاں سے شہر جانے والی سیدھی سڑک کا آغاز ہوتا تھا تو راڈرک کو فوری طور پہ بریک لگا کر جیپ روکنی پڑی۔

میں پھرتی کے ساتھ جیپ سے کود کر اس ہجوم کی طرف لپکا جو سڑک کے وسط میں کسی چیز کے گرد جمع تھا۔ عبداللہ نے بھی نہایت پھرتی سے میری تقلید کی۔

مگر بھیڑ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کسی نے عقب سے مضبوطی سے میرے اوورکوٹ کا کالر پکڑ لیا۔ میں جھٹکا محسوس کرتے ہی غصے اور سنسنی کی ملی جلی کیفیت کے زیرِ اثر تیزی سے واپس پلٹا اور ایلیزا کو اپنے عقب میں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

میں چند ثانیوں تک تحیر آمیز نظروں سے اس فتنہ گر دوشیزہ کو دیکھتا رہا۔ پھر عبداللہ کا خیال آتے ہی سر گھمایا لیکن اس دوران ... وہ ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ شاید اسے علم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ مجھے راستے میں روک لیا گیا تھا۔

"وہ چلا گیا۔" میرے کانوں میں ایلیزا کی ہیجان آمیز سرگوشیانہ آواز ابھری۔

"تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟" میں اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں بولا۔

"ادھر آؤ۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لیتی چلی گئی۔ اس مخصوص علاقے میں ہر طرف افراتفری نظر آ رہی تھی۔ بھیڑ بھاڑ سے محفوظ مقام پہ پہنچتے ہی ایلیزا رک گئی۔

"ہاں اب بتاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے اسے گولی مار دی۔" ایلیزا کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"کسے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یہ میں نہیں دیکھ سکی۔" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔ "وہ لوگ تم کو جھکہ دے کر نیلے رنگ کی بیوک میں فرار ہو رہے تھے میرے پاس فائر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اسی جگہ اپنی کار روکے کھڑی تھی۔ کیونکہ یہاں سے گزرے بغیر شہر جانا ناممکنات میں سے ہے۔ میں فائر کرتے ہی اپنی گاڑی کو آگے لیتی گئی تھی۔ میں نے بس اتنا دیکھا کہ اگلی نشست پر کوئی بری طرح اچھلا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مر ہی گیا ہو۔"

"تمہارے پاس ریوالور کہاں سے آیا؟" میں نے اس کے شانے تھام کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے تیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم سے رخصت ہو کر یہاں آتے ہوئے راستے میں اعشاریہ دو آٹھ کا اسمتھ اینڈ براؤنی خریدا تھا۔"

"تو یوں کہو کہ تمہارے سر پہ صبح ہی سے خون سوار ہے۔"

"میری وجہ سے وہ اب تک یہاں موجود ہیں ورنہ بہت دیر پہلے تمہیں جل دے کر صاف نکل گئے ہوتے۔" اس کے خوبصورت اور تیکھے خدوخال پر اس وقت خشونت طاری تھی۔

"لوگوں نے تمہاری گاڑی سے فائر ہوتے ضرور دیکھا ہوگا۔ تم مشکل میں پھنس گئی ہو ایلیزا۔" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

"دیکھا ہوتا تو مشتبہ کار کی اب تک ... تلاش شروع ہو جاتی۔" وہ دلآویز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم عذرا جوناس سے واقعی اتنی شدید نفرت کرنے لگی ہو؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس نے مجھے نفرت کرنے پر مجبور کیا ہے ڈان۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ "وہ ایک آزاد معاشرے میں رہتے ہوئے مجھے اپنا قیدی بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ اپنے لامحدود مالی وسائل کے باوجود مجھے ایک ایک فرانک کے لئے ترساتا ہے۔ میں اپنے جذبات کو فنا کر کے اس کی مرضی اور مزاج کے مطابق رونا اور ہنسنا نہیں سیکھ سکتی۔ وہ مجھے ایک مشین سمجھتا ہے جس کا کوئی بھی بٹن دبا کر وہ اپنی مرضی کا کام لے سکتا ہے میرے دل میں اس کے لئے رحم یا ہمدردی کی رمق تک باقی نہیں رہی ہے۔"

"اب تم یہاں سے چلی جاؤ اور وہ ریوالور رومال سے اچھی طرح صاف کر کے کسی ویرانے میں پھینک دینا ورنہ تم دشواریوں سے دوچار ہو جاؤ گی۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ کون میری گولی کا نشانہ بنا ہے۔"

میں اسے قہر آلود نظروں سے گھور کر رہ گیا۔

"مجھے اس طرح نہ دیکھو ڈان۔" وہ لاپرواہانہ لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھے ہمت دلا کر اپنے خول سے باہر آنے میں مدد ضرور دی ہے مگر اب

مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں اگر اندھی بازی کھیلنے کا ارادہ کر لوں تو اپنا معاملہ خود نمٹا سکتی ہوں۔"

میں نے عبداللہ کے ساتھ ایک یقینی منصوبے کے تحت بن حیان کو بے خبری میں گھیرنے اور راہ سے ہٹانے کی کوشش کی تھی مگر ہمارے فعال ہوتے ہی حالات اتنی تیزی کے ساتھ نئے رخ اختیار کرتے جا رہے تھے کہ ہماری پیشگی منصوبہ بندی بے سود ہو کر رہ گئی تھی اور نہ صرف یہ کہ ہمارا مکار حریف پیرس میں اپنے دشمنوں کی موجودگی سے باخبر ہو چکا تھا بلکہ کسی بھی لمحہ ہماری نگاہوں میں دھول جھونک کر فرار ہو سکتا تھا۔

"اگر تم اپنا معاملہ خود نمٹا سکتی ہو تو پھر میں تمہاری مدد سے دستبردار ہو جاتا ہوں۔ دوسروں کے پیدا کردہ خطرات سے نمٹنا میرے لئے بہت دشوار ہوگا۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد خشک لہجے میں کہا۔

"برا مان گئے؟" وہ مجھے پیار بھری مسکراہٹ سے گھائل کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے بولی "میں نے محض ایک مفروضہ بیان کیا تھا۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو میں کوئی اندھی بازی کھیلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرے لئے تمہاری ذات تحفظ کی علامت اختیار کرتی جا رہی ہے۔"

"تو پھر تم وہی کرو گی جو میں بتاؤں گا ورنہ اپنے ساتھ تم مجھے بھی ساری عمر کے لئے فرانس کے کسی قید خانے میں سڑوا دو گی۔"

"میں کسی قیمت پر ایسا نہ ہونے دوں گی۔"

"اگر تمہاری من مانی کارروائیاں اسی رفتار سے جاری رہیں تو کسی بھی لمحہ وہ برا وقت آ سکتا ہے۔" میں اس کے بڑھتے ہوئے حوصلے کو سختی سے لگام دینا چاہتا تھا۔

"مگر ہم کو کوئی طاقت قید نہ کر سکے گی۔" وہ سکون سے بولی۔ "اگر قانون کے ہاتھ میری یا تمہاری طرف بڑھے تو میں بلا تامل تمہیں گولی مار کر دوسرا فائر اپنی کنپٹی پر کر دوں گی۔"

"بکواس مت کرو ایلیزا۔" میں غصیلے لہجے میں غرایا۔ "زندگی اور موت کے فیصلے اتنے آسان نہیں ہوا کرتے۔ میں نے کہا کہ تم شہر جاتے ہوئے اپنا ریوالور کسی ویرانے میں پھینک دو گی۔ اگر اس کے بعد میں نے تمہارے پاس اسے دیکھا تو میں تھپڑ مار مار کر تمہارا چہرہ سجا دوں گا۔"

"ہائے" وہ آنکھیں موند کر سرشاری بھرے لہجے میں بولی۔ "تھپڑ مار مار کر میرا چہرہ سجا دو گے کس قدر دلنشین ہے تمہارے الفاظ اور لہجے میں۔" پھر آنکھیں کھول کر وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولی "مگر تمہارے اٹھتے ہوئے ہاتھ کانپ کر رہ جائیں گے۔"

"وقت آیا تو تم دیکھو گی کہ میں کبھی بے رحمی سے پیش آتا ہوں۔" میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔

وہ ہنس پڑی "اب کیا وقت آئے گا۔ میرا تو روآں روآں تمہاری بے رحمی کا گواہ ہے۔"

میں زچ ہو کر خاموش ہو گیا اور نیا سگریٹ سلگا کر ہجوم کی طرف دیکھنے لگا۔

"ڈان!" چند ثانیوں کے بعد اس نے آہستہ سے مجھے پکارا مگر میں نے سنی ان سنی کر دی۔

"ناراض ہو گئے؟" وہ قریب آ کر اپنا رخسار میرے شانے سے ٹکاتے ہوئے بولی۔

"بھلا تم جیسی خود سر لڑکی سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے؟" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

"غصہ تھوک دو، میں وہ ریوالور کسی نالے وغیرہ میں پھینک دوں گی۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "کسی کسی وقت تم سے بحث کرنے اور تمہیں چڑانے میں مزہ آتا ہے مجھے۔"

میں پھنکار کی صورت میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

چند منٹ تک وہاں رکے رہنے کے بعد یک بیک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ عبداللہ ہجوم میں شامل ہو کر مجھ سے بچھڑ چکا تھا اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں اور کس کے ساتھ رکا ہوا تھا لہٰذا وہ مطلوبہ معلومات کے حصول کے بعد جیپ کا رخ اختیار کرتا اور مجھے وہاں نہ پا کر بلاوجہ تشویش کا شکار ہو جاتا۔

میرے لئے مناسب تو یہی تھا کہ ایلیزا سے پیچھا چھڑا کر سیدھا جیپ میں جا بیٹھتا لیکن وہ جانے سے قبل یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھی کہ اس کے فائر کا کون نشانہ بنا تھا مگر میں اسے راڈرک سے متعارف نہیں کرانا چاہتا تھا۔ ابتدا ہی سے میری کوشش یہ تھی کہ ایلیزا کو عبداللہ یا اس کے دوستوں کے بارے میں حتی الامکان کچھ معلوم ہی نہ ہونے پائے۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں معلوم کر کے آتا ہوں کہ کون زخمی ہوا ہے۔" آخر کار میں نے اس سے کہا۔

"میرے پاس ہی کھڑے رہو تو کیا حرج ہے؟ تمہارا دوست آ کر بتا ہی دے گا۔"

"اسے الہام نہیں ہوگا کہ میں تمہارے ساتھ یہاں اس جگہ کھڑا ہوں۔ اگر وہ مل گیا تو اسے بھی ادھر ہی لے آؤں گا۔"

ایلیزا کو چھوڑ کر میں بھیڑ میں شامل ہوا اور ایک بار پھر فرنٹ سے لاعلمی میرے آڑے آ گئی۔ ہجوم کے تقریباً وسط میں نیلی بیوک موجود تھی۔ اس کے گرد پولیس والوں نے مضبوط رسّی سے حصار قائم کر لیا تھا۔ آپ وقت عذرا، ابراہام یا ان کے محافظوں میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا دور ڈرائیور کا ٹوٹا ہوا شیشہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔

بے موقع پر غیر مقامی زبان میں کسی سے گفتگو کرنے کی کوشش بے ساختہ لوگوں کی بھیڑ میں نمایاں کرنے کا سبب بن سکتی تھی لہٰذا میں جائے واردات کے خاموش جائزے کے بعد باہر نکل آیا اور جیپ کی طرف چل دیا۔

راستے میں ہی میری مڈبھیڑ عبداللہ سے ہو گئی۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے؟ مجھے دیکھتے ہی" وہ چڑچڑے لہجے میں بول پڑا۔

"لڑکی مل گئی تھی۔"

"ہمارے علاوہ بھی کوئی ان کے پیچھے تھا۔" عبداللہ میرے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "گولی ابراہام کے جبڑے کو چیرتی ہوئی نکل ہے۔"

میں یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا "یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب وہ تیز نقل و حرکت نہ کر سکے گا۔ مگر وہ ہے کہاں؟"

"عذرا اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مصر تھا مگر ایمبولنس اسے سرکاری ہسپتال لے گئی ہے۔ دراصل وہ لوگ ریوالور کی زد پر نیلی بیوک والے کو لے کر جا رہے تھے۔ ابراہام کے زخمی ہونے پر بیوک کے ڈرائیور نے بھی واویلا شروع کر دیا اور اب وہ دونوں بھائی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔" عبداللہ نے بتایا "ہو سکتا ہے کہ عذرا کو حراست میں لے لیا جائے۔"

"اور محافظ کہاں گئے؟"

"وہ تو مخدوش صورتحال کا اندازہ کرتے ہی بھاگ نکلے۔ عذرا سارا قصور ان ہی کے سر ڈال رہا ہے کہ وہ تینوں قتل کی دھمکی دے کر اسے اور ابراہام کو اغوا کر رہے تھے۔"

"بہت مکار ہے وہ بھی۔" میں نے کہا۔ "اس طرح وہ خود کو بیوک کے اغوا کے الزام سے صاف بچا لے گا۔"

"ہاں۔ یہ تو ظاہر ہے۔" عبداللہ نے اس پہلو پر شاید پہلے غور نہیں کیا تھا۔

پھر میں نے اسے ہدایت کی کہ ایلیزا کو فائر کے جملہ نتائج سے آگاہ نہ کیا جائے ورنہ وہ شیر ہو کر کوئی خطرناک حرکت بھی کر سکتی ہے۔

مجھے اور عبداللہ کو دیکھتے ہی وہ بے تابانہ انداز میں ہماری طرف لپکی "کیا ہوا؟"

"ایک شخص زخمی ضرور ہوا ہے مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھا۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "ہر تماشائی مختلف حلیہ بتا رہا ہے۔"

"تم نے زخمی کو دیکھا تو ہوگا؟" وہ براہ راست عبداللہ سے مخاطب ہو گئی۔

عبداللہ نے اداسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور بولا۔ "میرے پہنچنے سے پہلے پولیس زخمی کو لے گئی تھی۔"

"یہ برا ہوا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ شکار ہونے والا کون ہے۔" وہ اضطراری کیفیت میں بولی۔

"ویسے نشانہ بہت اچھا تھا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "یہ بتا رہا ہے نیلی بیوک کی اگلی نشست خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔"

"کسی نے مجھے فائر کرتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا؟" ایلیزا نے عبداللہ کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر عبداللہ ہکا بکا رہ گیا۔ پہلے حیرت سے اس کا منہ کھلا اور چند ثانیوں بعد اس نے احمقانہ انداز میں جبڑے بھینچ لئے اور تحیر آمیز سرگوشیانہ لہجے میں بولا "تو نیلی بیوک پر وہ فائر تم نے کیا تھا؟"

"ہاں۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی "کیا ڈان فرنانڈس نے تمہیں نہیں بتایا ہے؟"

"ڈان اپنی مصلحتوں کو خود ہی سمجھتا ہے۔" عبداللہ میری طرف دیکھ کر نیم دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ اسے وہ انکشاف میرے بجائے ایلیزا کی زبان سے سن کر صدمہ ہوا تھا حالانکہ اس نے ملتے ہی مجھ سے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اس کی دانست میں ہمارے علاوہ اور کوئی بھی جوناس برادران کے پیچھے لگا ہوا ہے، مگر میں اس کے باوجود اسے یہ بتانا بھول گیا کہ فائر کسی تیسرے فریق نے نہیں بلکہ ایلیزا نے کیا تھا۔

"ویسے تمہیں کسی نے نہیں دیکھا ہوگا کیونکہ وہاں ہر شخص کسی نامعلوم مقام سے چلائی ہوئی نادیدہ گولی کا ذکر کر رہا ہے۔" عبداللہ نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ایلیزا سے کہا۔

"اب تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا باپ تم سے پہلے گھر پہنچ جائے اور پھر پولیس بھی ساری جزئیات کا گہرا جائزہ لے گی۔ تمہیں اس وقت جوناس ولا میں موجود ہونا چاہئے۔" میں نے انتقام کی آگ میں سلگتے ہوئے اس حسین پیکر سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا اور اس نے میری بات مان لی۔

"تم کب ملو گے؟" اس نے جاتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال کوئی پروگرام مناسب نہ ہوگا۔ جوناس برادران پر کئے جانے والے اس قاتلانہ حملے کے بعد پولیس جوناس ولا اور اس کے اطراف میں گزشتہ روز کی خونریزی پر بھی نئے زاویے سے تفتیش شروع کر دے گی اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری نگرانی شروع ہو جائے۔ ویسے میں کسی بھی وقت موقع محل دیکھ کر تم تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

پھر ایلیزا وہاں سے رخصت ہو گئی۔

"یہ کیا ہوا؟" اس کے دور چلے جانے کے بعد عبداللہ نے پوچھا۔

"ایلیزا ضرورت سے زیادہ بے خوف ثابت ہوئی ہے۔" میں نے اس کے ہمراہ جیپ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "اور محض اس کی وجہ سے حالات یک بیک نہایت تیزی سے رخ بدل رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اب تک کے حالات ہمارے حق میں ہیں۔"

"تو ایلیزا نے وہ فائر اپنی مرضی سے کیا تھا؟"

"ہاں۔ وہ اس کی اضطراری حرکت تھی مگر میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں اس کے بارے میں بتانا یاد نہیں رہا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "اصل بات صرف یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مخلص ہیں۔"

"ابراہام کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہوگی؟"

" مجھے نہیں معلوم" اس نے شانے اچکا کر کہا۔ "البتہ اس کے زخم سے خون زیادہ مقدار میں خارج ہوا ہے۔"

" اس زخم کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہونے کا بھی امکان ہے یا نہیں؟"

" ہم امکانات کے ظہور پذیر ہونے کا انتظار کرنے کی عیاشی نہیں کر سکتے۔ ہمیں یقینی طور پر اسے موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔"

" مگر کس طرح؟" میں نے سوال کیا۔ "ہمیں اپنے نئے اقدامات سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسے ہسپتال میں ہی رکھا جاتا ہے یا گھر جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔"

" اگر اسے مرہم پٹی کے بعد رخصت کر دیا گیا تو تم یقین کرو کہ وہ کوئی طیارہ چارٹر کر کے فوری طور پر فرانس سے نکل جائے گا کیونکہ اب اسے اپنے طاقتور دشمنوں کی موجودگی کے بھرپور ثبوت مل گئے ہیں۔ وہ سامنے رہ کر مقابلہ کرنے کے بجائے ہماری رسائی سے باہر بیٹھ کر سازشیں کرنے کو ترجیح دے گا۔"

ہم دونوں اپنی آئندہ حکمت عملی پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے جیپ تک جا پہنچے جہاں راڈرک کسی قناعت پسند درویش کی طرح اسٹیئرنگ کے پیچھے نہایت سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔

" خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے؟" ہمیں دیکھتے ہی وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "مجھے تو یقین ہو چلا تھا کہ پولیس نے تمہیں بھی تفتیش میں شامل کر لیا ہوگا۔"

" جیپ واپس لے لو؟" عبداللہ اس کے مزاح کے جواب میں گہری سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "ہمیں ایئرپورٹ پر کچھ کام ہے۔"

" کیا میری موجودگی اب بھی ضروری ہے؟" راڈرک نے جیپ واپس پارکنگ والے علاقے کی طرف گھماتے ہوئے پوچھا۔

" جانا چاہتے ہو؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

" دھماکہ خیز آتشیں اسلحے کے ساتھ میری یہاں موجودگی مناسب نہ ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ میرا تھیلا تمہارے لئے دشواریاں پیدا کر دے۔"

" تم چلے ہی جاؤ" عبداللہ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہم دونوں اپنے کام سے فارغ ہو کر ٹیکسی وغیرہ پکڑ لیں گے۔"

راڈرک نے جیپ چھوڑنے کی پیشکش کی جو عبداللہ نے مسترد کر دی اور راڈرک ہمیں ایئرپورٹ کی عمارت کے قریب اتار کر چلا گیا۔

" ابراہام کے ٹھکانے کا سراغ لگانا ہے" وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

" میں یہیں کہیں بیٹھتا ہوں اس کا سراغ مل جائے تو آ کر مجھے بتا دینا۔"

" میں تمہیں ڈھونڈنے کے لئے نہیں رکھ رہا ہوں۔ کسی پبلک بوتھ سے فون کر کے ابراہام کا پتہ معلوم کریں گا۔"

اس کا جواب معقول اور شائستہ تھا میں خفت آمیز خاموشی اختیار کئے اس کے ساتھ ایئرپورٹ کی ایک قریبی عمارت میں داخل ہو گیا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد ہم عمارت کے ایک حصے میں اس کمرے تک جا پہنچے جہاں چار پبلک فون ایک قطار میں نصب تھے۔ عبداللہ مجھے آنکھ مار کر ایک بوتھ میں جا گھسا اور میں سگریٹ سلگا کر وہیں ایک ستون کے گرد لگی ہوئی چوبی بنچ پر بیٹھ گیا۔

بوتھ کے دروازے میں لگے ہوئے شیشے میں سے عبداللہ کی پشت مجھے نظر آ رہی تھی اور مجھے یہ سوچ کر قلق ہو رہا تھا کہ بہت جلد میں اس جیسے مخلص دوست اور مہربان انسان سے جدا ہونے والا تھا۔

یوں تو تل ابیب سے پیرس تک بہت سے فلسطینی فدائین سے ملا تھا اور ان میں سے ہر ایک کو بے جگر اور حساس پایا تھا مگر تل ابیب میں زیر زمین سرگرمیاں دیکھ کر مجھے محمود کی ذات سے عجیب والہانہ لگاؤ ہو چلا تھا۔ اس شخص نے موت کے دہانے میں ہوتے ہوئے بھی اپنے دشمنوں کے گرد نادیدہ خطرات کا ایک ایسا بے پناہ حصار قائم کیا ہوا تھا کہ وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے اپنے سائے تک کو شبہ کی نظر سے دیکھنے پر مجبور تھے مگر دوسری طرف میرے ساتھ وہ اپنی تمام احتیاطی تدابیر بالائے طاق رکھ کر ملتا تھا اور اگر وہ دلیر شخص اس شہر غدار میں میری رہبری نہ کرتا تو شاید میں اسی سرزمین پر تنہائی کا عذاب جھیلتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا۔

میرے ذہن پر محمود کی شخصیت کا بہت گہرا اور بہترین تاثر تھا اور اس سے جدا ہونے کے بعد عبداللہ کو میں نے کم از کم دوستی اور رفاقت کی حد تک اسی اعلیٰ معیار پر پایا تھا۔ عبداللہ کام کے بارے میں اکثر اوقات جلد باز اور لاابالی ثابت ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ اسرائیل کے بجائے فرانس میں سرگرم تھا جہاں ہزاروں کی بھیڑ میں ایک آدھ ہی دشمن کی موجودگی کا امکان تھا مگر اس کی ذات کی انسانی خوبیاں بے مثال تھیں۔

اپنا ملک چھوڑنے کے بعد سے میرا تو یہ حال تھا کہ ہر جگہ خونخوار بھیڑیوں کے غول میں رہ کر اپنی بقا کی ہولناک جنگ لڑتا رہا تھا اور رفتہ رفتہ ہر معاملے کے منفی پہلوؤں کا جائزہ لینے میں مہارت حاصل کر گیا تھا اس اعتبار سے ہنگامہ خیز زندگی کے عملی معرکوں میں عبداللہ میرے سامنے طفل مکتب تھا اور وہ کھلے دل سے بار بار اس کا اعتراف بھی کرتا رہتا تھا مگر اس کے باوجود اسے الوداع کہنے کا تصور کرتے ہوئے میرا دل بھاری ہونے لگتا تھا۔

وہ فون بوتھ میں خاصی دیر مصروف رہا اور جب وہ بوتھ سے باہر آیا تو اس کا چہرہ اندرونی مسرت سے دمک رہا تھا۔

" کیا اسی سے بات کر آئے ہو؟" میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے لگا

" وہ سینٹ انطوئین ہسپتال میں پولیس کی تحویل میں موجود ہے۔" اس کمرے سے باہر آ کر عبداللہ نے بتایا۔

" پولیس کی تحویل میں کیوں ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔ "اور تمہیں اتنی تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟"

" ڈیوکزیم بیورو کے ایک شعبہ سے یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ میں نے خود کو ابراہام جوناس کا چچا ظاہر کیا تھا۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "اس کو ٹیلی ہیوک کے ڈرائیور کے بیان کی وجہ سے حراست میں لیا گیا ہے!"

" قدرت نے ہمارے لئے یہ آخری موقع فراہم کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ ہسپتال سے صحت یاب ہو کر باہر آنے میں کامیاب ہو گیا تو ہم سے کھو بیٹھیں گے۔"

" ہسپتال جا کر ہی ہم کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔"

" اب فیصلے کی ضرورت نہیں میرے پاس زہریلے تیر پھینکنے والا وہ ننھا سا ہتھیار موجود ہے جو ال ایل کا طیارہ اغوا کرنے سے قبل مجھے دیا گیا تھا۔ ہم چند سیکنڈ کی مہلت پاتے ہی اسے با آسانی موت کے گھاٹ اتار سکیں گے۔"

" بظاہر تو تمہاری تجویز قابل عمل ہے لیکن ہسپتال جانے سے پہلے میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ فرانس کے بیشتر ہسپتالوں میں زخمیوں کے لئے سخت نظام رائج ہے۔"

پھر ایک ٹیکسی پکڑ کر ہم دونوں سینٹ انطوئین ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستہ خاموشی کے ساتھ طے ہوا ٹیکسی سے اترتے ہوئے معاً مجھے جیراڈ نامی بدمعاش کا خیال آیا اور ایک فوری خطرے کے تحت میں عبداللہ کو تیزی کے ساتھ ایک دیوار کی اوٹ میں لیتا چلا گیا اور وہ بلا جھجک بغیر میرے ساتھ ہو لیا۔

" ہمیں نہایت ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا" میں نے عبداللہ سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اب تک عذرا نے جیراڈ کے آدمی ہسپتال کے گرد پھیلا دیئے ہوں۔"

" تم فکر نہ کرو۔ میں صورتحال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔ تم ریمبراں میں میرا انتظار کرو۔"

" ریمبراں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

وہ ہنس دیا۔ "ہاں ہاں ریمبراں" پھر ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر اوسط درجے کا ایک ریستوران ہے۔ ہم لوگوں کے لئے زیادہ دیر تک وہاں رکے رہنا خود کو مشکوک بنانے کے مترادف تھا لہٰذا میں اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل دیا۔

مجھے ریمبراں کے معنی تو معلوم نہیں تھے لیکن اس نام کا صوتی تاثر بہت خوشگوار تھا اور جب میں ریستوران میں داخل ہوا تو اس مقام کو نام کے صوتی تاثر سے بھی بہتر پایا۔

سیاہ کافی سے شغل کرتے ہوئے میرے لئے خالی الذہن رہنا ناممکنات میں سے تھا اور اس بار میرے ذہن کے دریچوں میں داخل ہونے والی شخصیت ایلیزا کی تھی۔

میں ایک نہایت عجیب اتفاق کے تحت نیس ایئرپورٹ پر اس سے متعارف ہوا تھا۔ اس کی فرمائش پر اپنی سگریٹ نوشی جاری رکھتے ہوئے یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ میرے اور عبداللہ کے اس مشترکہ شکار سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہوگی جسے ٹھکانے لگانے کے لئے ہم دونوں نیس سے پیرس جا رہے تھے۔

پیرس میں فرانسیسی وزارت دفاع کے افسر جولیس گریوی کی نگرانی کے نتیجے میں بن لیوی نامی ایک یہودی ہمارے ہاتھ آیا اور طویل تشدد کے بعد ایک مویشی خانے کے گودام میں دم توڑتے ہوئے جب اس نے یہ انکشاف کیا کہ اسرائیل میں بن حیان کے طور پر پوجا جانے والا شخص پیرس میں ابراہام جوناس کے نام سے موجود ہے تو اس لمحہ میرے ذہن میں ایلیزا جوناس کا بھولا ہوا پیکر ایک مرتبہ پھر مجسم ہو گیا۔

ابتداء میں ایلیزا اپنے باپ سے تنگ آئی ہوئی ایک مظلوم اور باغی دوشیزہ نظر آئی جو اپنے باپ کی انا کو لہولہان کرنے کے لئے اپنے دوستوں کے بھڑکے ہوئے سفلی جذبات کا کھلونا بننے کے لئے بھی تیار رہتی تھی مگر عذرا اور ابراہام کی غیر موجودگی میں جوناس ولا اور اس کے گرد ہونے والے خونریز تصادم نے اس بزدل اور مظلوم لڑکی کو اس قدر دلیر بنا دیا تھا کہ وہ ایئرپورٹ کے بارونق علاقے میں اپنے باپ پر فائر کر بیٹھی۔

یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اسے گولی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور یہ شاید میری خوش بختی تھی کہ عذرا کے بجائے ابراہام اپنی بیٹی کے فائر کا نشانہ بنا۔

ایلیزا میرے اتنے قریب آ چکی تھی کہ میں چاہتا تو زہریلے تیر برسانے والا ہتھیار اس کے حوالے کر سکتا تھا اور وہ زخمی ابراہام کی عیادت کرتے ہوئے نہایت خاموشی سے اس پیدائشی خبیث کو جہنم واصل کر سکتی تھی۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں نے ایلیزا کو شروع ہی سے اپنے عزائم سے بے خبر رکھا تھا اور خود کو اس کے حسن کا شیدائی ظاہر کیا تھا اور پھر اس نے اپنے باپ سے نفرت کی کہانی سنائی تو میں بظاہر اس کی ہمدردی میں عذرا کا دشمن ہو گیا یعنی میرے اور ایلیزا کے روابط میں شروع سے آخر تک کہیں بھی ابراہام جوناس کا ذکر نہ آتا تھا۔

اگر میں اسے زہریلے تیر کے ذریعے عذرا کو ہلاک کرنے کا مشورہ دیتا تو وہ بے چون و چرا بلکہ نہایت خوشی کے ساتھ اس پر عمل کرتی۔ لیکن ابراہام کے قتل کی فرمائش اسے بھڑکانے کا بہانہ بن سکتی تھی۔ وہ فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتی تھی کہ میں نہ اس کی زلف کا اسیر تھا اور نہ اس کا ہمدرد بلکہ شروع ہی سے ابراہام کو گھیرنے کے لئے اس کے پیچھے لگا تھا اور وہ اس قدر سیماب صفت لڑکی تھی کہ ایسے نتیجے پر پہنچنے کے بعد میرے خلاف

کسی بھی بدترین ردِ عمل کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔

ایلیزا سے جس حد تک کام لینا ممکن تھا وہ میں لے چکا تھا اور میری عافیت اسی میں تھی کہ اسے مزید بے وقوف بنانے کا ارادہ ترک کر کے ابرہام کو خود ہی ٹھکانے لگاتا۔

میں نے کئی بار اس پورے معاملے پر غور کیا اور ہر بار اسی ایک نتیجے پر پہنچا کہ ایلیزا میرے لئے اپنی افادیت کھو چکی ہے۔

تھوڑی دیر بعد عبداللہ ریسٹوران میں داخل ہوا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلالیا۔

"میرے لئے بھی کافی منگواؤ" اس نے کرسی سنبھالتے ہی تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اداس نظر آ رہے ہو" میں نے ویٹرس کو کافی لانے کی ہدایت کرتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔

"حوصلہ شکن خبریں لایا ہوں" وہ انگلیوں سے میز بجا کر بولا۔

"ان سے بھی نمٹا جائے گا، یوں دل چھوٹا نہ کرو" میں نے اس کی طرف جھک کر نرم لہجے میں کہا۔ "مشورے سے بہت سی مسدود راہیں کھلنے کی صورت بھی نکل آتی ہے"

"بدترین اطلاع یہ ہے کہ ابھی سات خطرناک آدمی ہسپتال پہنچے ہیں اور میں نے عذرا جوناس کو ان کے ساتھ مصروفِ گفتگو دیکھا ہے"

"شروع سے بتاتے چلو تو مناسب ہوگا"

"گولی ابرہام کے زخم میں موجود ہے اور اس کا آپریشن کیا جا رہا ہے۔ عذرا نے اپنے زخمی بھائی کو ساتھ لے جانے کی شدید کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ جائے واردات پر پہنچنے والے پولیس افسر نے نیلی بیوک کے ڈرائیور کے بیان پر دونوں بھائیوں کو حراست میں لے لیا تھا۔ مگر ہسپتال پہنچنے کے بعد عذرا اپنے رسوخ کی بنا پر اعلیٰ حکام سے ضمانت پر رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی پاتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر ابرہام کو ہسپتال سے گھر لے جانے کی جدوجہد شروع کی مگر اس بار ہسپتال کے چیف نے ابرہام کی مخدوش حالت کے پیشِ نظر انکار کر دیا اور اب شاید ابرہام مکمل صحت یابی تک ہسپتال سے نہ جا سکے گا" عبداللہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"تم نے عذرا جوناس کو کہاں دیکھا تھا؟"

"وہ ہسپتال کے بیرونی سبزہ زار پر موجود تھا اور وہ ساتوں اسے گھیرے ہوئے تھے"

"ہسپتال میں داخلے میں تو کوئی دشواری نہیں ہوگی"

اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "عذرا تک کو استقبالیہ ہال سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مقررہ اوقات کے علاوہ کوئی بیرونی شخص ہسپتال میں داخل نہیں ہو سکتا"

"مریض کی دیکھ بھال کے لئے اس کے کسی عزیز یا خدمتگار کو بھی رہنے کی اجازت نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ ہمارے یہاں کا فرسودہ تصور ہے" وہ منہ بنا کر بولا۔ "لوگ بیماروں کی عیادت کے بہانے ہسپتالوں کو پکنک اسپاٹ میں بدل دیتے ہیں۔ یہاں مریض کی دیکھ بھال صرف ہسپتال کے عملے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور یہ لوگ اس میں کسی کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دیتے"

"ہمارے یہاں کی بات نہ کرو" میں نے عبداللہ کو ٹوکا۔ "مشرق اور مغرب کی علیحدہ علیحدہ روایات ہیں۔ ہمارے یہاں فرد اور معاشرے کا دو طرفہ گہرا تعلق ہے جب کہ مغرب میں فرد کو معاشرے سے تعلق رکھنا پڑتا ہے اور معاشرہ اسے زیادہ گھاس نہیں ڈالتا"

"معاشرتی مباحثے کے لئے تمہیں یہی وقت ملا ہے" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"چلو پھر کبھی سہی" میں نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "تم نے جو تصویر کھینچی ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عذرا کے بلائے ہوئے آدمی باہر ہی سے ابرہام کی حفاظت کریں گے اور شاید عذرا خود بھی باہر یا ہسپتال کی انتظارگاہ میں موجود رہے گا"

"مجھے اور تم کو جوناس ولا کا وہ پانچواں محافظ دیکھ چکا تھا جو تمہارے ہاتھوں مرنے کے باوجود غسل خانے سے فرار ہو گیا تھا۔ ان ساتوں میں وہ بھی لازماً موجود ہوگا اور شاید اسے ہسپتال کے داخلی دروازے کے قریب ہی مامور کیا جائے" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "اگر ہسپتال کے عملے میں کسی کو رشوت کے ذریعے خریدنے کی کوشش کی جائے تو بھی ہم دونوں میں سے کوئی اس بدمعاش محافظ کی نظروں سے نہ بچ سکے گا"

"البرٹو نیو کی وجہ سے ہمارے لئے واقعی دشواری پیدا ہو گئی ہے" میں تشویش آمیز لہجے میں بڑبڑایا۔

"اب صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے"

"وہ کیا؟"

"ابرہام کا آپریشن جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ ہم دونوں مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع ہونے پر اندر گھس سکتے ہیں"

"ان ساتوں کو نہ بھولو" میں نے اسے یاد دلایا۔ "اس وقت وہ ضرور باہر نظر آ رہے ہیں مگر ملاقات کا وقت شروع ہونے پر وہ ابرہام کے کمرے کے گرد ہی منڈلاتے نظر آئیں گے اور اگر ہم اندر ان کی نظروں میں آ گئے تو زندہ باہر آنا مشکل ہو جائے گا"

عبداللہ کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے اور وہ خیالات کی رو میں کھو گیا۔ میں بھی خاموشی کے ساتھ سگریٹ کو دھوئیں میں تحلیل کرنے لگا۔

"اس مرحلے پر ایلیزا کام آ سکتی ہے" کچھ دیر کی خیال انگیز خاموشی کے بعد عبداللہ بولا۔

"میں اس امکان پر پہلے ہی غور کر چکا ہوں۔ میرا اور اس کا

...دان عذرا کے خاتمے کے لئے جاری ہے۔ ابرہام کا نام درمیان میں ...ا تو وہ بھڑک جائے گی"

"تو اس کے ہاتھوں عذرا جوناس ہی کو ختم کرا دو۔ اس کی ...گرمیاں سامنے آنے کے بعد تو وہ بھی موت کا حقدار نظر آنے لگا ہے"

"یہی مناسب ہے۔ اس طرح ابرہام تنہا رہ جائے گا" میں نے ...اگر ہمیں عذرا کو راہ سے ہٹانے میں دشواری نظر آئی تو ایلیزا کو ...ے کر دیں گے"

"مگر ابرہام کو بھی یوں نہیں چھوڑا جا سکتا"

"میرے ذہن میں ایک تجویز ابھری ہے" میں نے براہِ راست ...کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

عبداللہ پہلو بدل کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"اگر مجھے بیمار بنا کر اس ہسپتال میں داخل کر دیا جائے تو کیسا ...ہے گا"

یک بیک عبداللہ کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ ستائش آمیز لہجے ...ں بولا۔ "اس صورتحال سے نمٹنے کی یہ واحد ترکیب ہے اور یہ سوچنا ...ارا ہی کام تھا"

"مگر مرض کا انتخاب بہت احتیاط سے کرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ ...بلاوجہ مجھے کہیں سے کاٹ پیٹ کر رکھ دیں" میں ہنس کر بولا۔

"اپنڈکس سب سے بہتر رہے گا" عبداللہ بولا۔ "جب تک تم ...درد کا اظہار کرتے رہوگے وہ آپریشن نہیں کریں گے اور یہ مرض ایسا ہے ...تمہیں دوا دے کر رخصت نہیں کر سکیں گے بلکہ ہسپتال میں داخل ...نے پر مجبور ہوں گے"

"مجھے ہسپتال میں داخل کون کرائے گا؟"

"میں کسی کا بندوبست کر دوں گا، میرا آنا تو خطرناک ہوگا" وہ میرے ...ال کا مقصد سمجھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں مریض ہونے کے باعث ایسے ...اس میں چھپایا جا سکتا ہے جو تمہیں ابرہام کے محافظوں کی نظروں ...سے محفوظ رکھ سکے"

"ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد میں اپنی پوری کوشش کروں ...لیکن یہ امکان بھی ہے کہ اپنڈکس کے شدید درد میں مبتلا مریض کو ہسپتال ...انتظامیہ کمرے سے باہر ہی نہ آنے دے اور اگر میرا کمرہ ابرہام سے دور ...ہوا تو کام دشوار ہو جائے گا"

"اب یہاں سے چلو، میں چاہتا ہوں کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی تمہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے" عبداللہ بہت زیادہ پُرجوش ...نظر آ رہا تھا۔

"ابھی ایک بات باقی ہے"

"کیا اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے"

"میں ایک بار ہسپتال میں داخل ہو گیا تو شاید وہ اپنڈکس کا ...آپریشن کئے بغیر باہر نہ آنے دیں گے۔ اس صورتحال کا تدارک کیسے ہوگا"

"مریض یا اس کے ورثاء کے تحریری اجازت نامے کے بغیر فرانس میں کسی سرجن کو آپریشن کا اختیار نہیں ہے۔ جب تک ابرہام تک رسائی حاصل نہ ہو تم درد کا بہانہ کرتے ہوئے آپریشن کے لئے زبانی رضامندی کا اظہار کرتے رہنا اور جب باہر آنا چاہو تو درد کا ڈھونگ ختم کر کے آپریشن کی اجازت دینے سے انکار کر دینا" پھر قدرے توقف کے بعد ہنستے ہوئے بولا۔ "اگر آپریشن ہو بھی جائے تو کیا حرج ہے۔ انگلستان کے شاہی خاندان میں تو ہر نومولود کی فاضل آنت پہلی فرصت میں نکال دی جاتی ہے۔ اللہ پھر بن حیان کے عوض اگر یہ کانٹ چھانٹ ہو جائے تو سودا بُرا نہیں رہے گا"

"چلو اس طرح شاہی خاندان کی ہی برابری ہو جائے گی"

ہم دونوں ریسٹوران سے باہر نکلے تو خاصے مطمئن تھے بگڑی ہوئی صورتحال بظاہر قابو میں آتی معلوم ہو رہی تھی۔

"اب ہم اپنی پرانی قیام گاہ کی طرف جا رہے ہیں" عبداللہ نے ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کرتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔ "مادام فے تمہارے لئے تڑپ رہی ہے"

"کیا میرا وہاں جانا ضروری ہے؟"

"عبدالعزیز اپنے مہمانوں کے لئے اسی بڑھیا سے رجوع کرتا ہے تم بلا اطلاع کے وہاں سے غائب ہوئے تو مادام فے کو ہمیشہ ایک خلش رہے گی"

"پھر تین دن کی روپوشی کے بارے میں کیا بتاؤں گا؟"

"میں نے اسے بتایا تھا کہ تم کسی دوست کے ساتھ چند روز کے لئے فاؤنٹین بلیو چلے گئے ہو"

"اور اگر اس جھکی بڑھیا نے فاؤنٹین بلیو کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے تو میں کیا کروں گا؟"

"تم وہاں زیادہ دیر نہیں رکو گے" وہ رِسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ "بڑھیا کے ہاتھ کا آخری لنچ کھانے کے بعد تم ان دونوں کو الوداع کہہ دو گے"

"ہسپتال میں اسلحہ کیسے پہنچے گا؟" چند منٹ بعد میں نے پوچھا۔

"تو کیا زہریلے تیروں والا ہتھیار ناکافی ہوگا؟"

"وہ تو بے انتہا مؤثر ہے" میں نے کہا۔ "اور میں اس میں سے پوٹاشیم سائنائیڈ میں بجھے ہوئے کئی تیر استعمال میں لا چکا ہوں مگر اس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ مزید کتنے تیر باقی رہ گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عین وقت پر جواب دے جائے"

"کوئی ہتھیار ساتھ لے جانا تو خطرناک ہوگا۔ بعد میں کسی ملاقاتی کے ہاتھ بھجوا دوں گا"

"یعنی آج کوئی کارروائی نہ کی جا سکے گی"

"آج کے دن تو تمہیں ہسپتال کے انتظامات کا مشاہدہ کرنا ہوگا کیونکہ ذرا سی بھی غلطی تمہارے لئے مشکلات پیدا کر دے گی"

"ابھی تم نے کہا کہ مریض یا اس کے ورثا کی مرضی کے بغیر سرجن کو آپریشن کا اختیار نہیں ہے تو عذرا کی مرضی کے خلاف ابرہام کو ہسپتال میں کیوں روکا گیا؟" میں نے ذہن میں ابھرنے والے سوال کو فوری طور پر الفاظ میں ڈھال دیا۔

"میں نے جو کچھ بتایا وہ کسی مرض کی صورت میں ہوتا ہے۔ حادثے کے زخمیوں کی جان بچانے کے لئے ہر ڈاکٹر اور سرجن کو تمام تر اختیارات ہوتے ہیں۔ ویسے مجھے ایک بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تم ہر بات میں بال کی کھال نکالتے ہو اور پورا اطمینان کئے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔"

"میں ہسپتال میں ابرہام سے نمٹوں گا اور تم عذرا کو ٹھکانے لگانے کے بعد ایلیزا سے ملنے کی کوشش کرو گے ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی کارآمد بات بتا سکے۔"

"عذرا کو شاید اب تک جوناس ملا پر ہونے والے رات کے حملے کی خبر مل چکی ہوگی اور وہ بہت زیادہ چوکنا ہوگا۔ اس سے ٹکرانے میں بھی مزا آئے گا۔"

اس اثنا میں ہم ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ گئے اور وہاں سے مادام فے کے گھر کی طرف چل دیئے۔

مادام فے کے گھر پر گھنٹی بجائے جانے کے چند سیکنڈ بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ کھلے ہوئے پٹ کے سامنے مادام فے اپنی وہیل چیئر پر موجود تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تحیر آمیز مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ پلٹ کر اونچی آواز میں بولی۔

"برتھا، ڈان آگیا ہے۔"

"تو کیا تمہیں میری واپسی کی امید نہیں تھی؟" میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"تم میں لوگوں کو جلد دوست بنانے اور جلد بھول جانے کے خواص ہیں۔" وہ دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی کرسی میرے ساتھ لڑھکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم واپس جاتے ہوئے یاد رکھو گے مگر برتھا تمہاری واپسی کے بارے میں پُر امید تھی۔"

"شاید اسی کی خواہش مجھے یہاں لائی ہے۔ اس کے ہاتھ کا لذیذ کھانا مجھے فاؤنٹین بلیو میں بھی یاد آتا رہا تھا۔"

"تم اسے پسند تو نہیں کرنے لگے ہو؟" مادام فے نے اپنی وہیل چیئر روک کر مجھے گھورتے ہوئے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"پسند تمہیں بھی کرتا ہوں۔" میں نے اس کی کرسی آگے دھکیلتے ہوئے کہا اور مادام فے کے چہرے پر حیا کی سرخی تیر گئی۔

"تم بہت بدتمیز ہو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "اگر تمہارے یہ الفاظ کسی کے کان میں پڑ گئے تو وہ میرے اور تمہارے بارے میں کیا سوچے گا۔"

"بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا؟" میں عبداللہ سے مخاطب ہو گیا۔

"تم مادام سے اپنا معاملہ خود ہی نمٹاؤ۔" عبداللہ نے شریر لہجے میں کہا۔

مادام فے نے سر اٹھا کر مجھے چند ثانیوں کے لئے ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خاموش نظروں سے شکایت کر رہی ہو کہ اگر تم مجھے پسند ہی کرتے ہو تو اس کا اظہار تنہائی کے بجائے عبداللہ کے سامنے تم نے کیوں کیا۔

مادام فے کے گھر میں میری گنتی کی چند چیزیں تھیں جو میں نے ایک بیگ میں سمیٹ لیں اور گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد نشستگاہ میں عبداللہ کے ساتھ آبیٹھا۔

کھانے کی میز لگنے تک ایک ڈیڑھ گھنٹے کا عرصہ دلچسپ انداز میں گذرا۔ شاید مادام فے اظہارِ پسندیدگی کے بارے میں میرا مذاق نہ سمجھ سکی تھی۔ اور مجھے تنہائی میں گھیرنے کے چکر میں میرے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔

اس کے چہرے پر پائی جانے والی سنجیدگی نے مجھے خاصا بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور میں جانتے ہوئے مادام فے کو کسی شدید جذباتی صدمے سے دوچار کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ مادام فے کا وہ بدلا ہوا رویہ اتنا واضح تھا کہ عبداللہ نے بھی میری الجھن بھانپ لی اور اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح مادام فے ایک بار تنہائی میں مجھے پکڑ سکے۔

کھانے کی میز پر خلافِ معمول گمبھیر خاموشی طاری رہی اور جب میں وہاں سے عبداللہ کے ساتھ رخصت ہو رہا تھا تو مادام فے کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہو رہے تھے اور اس کے ہونٹ یوں لرز رہے تھے جیسے وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔

عبداللہ کی کار مادام فے کے مکان پر موجود تھی۔ ہم دونوں اس کے ذریعے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کچھ دور تک خاموشی سے کار ڈرائیو کرنے کے بعد عبداللہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"کیا ہوا تمہیں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تم نے مادام فے کا دل توڑ کر اچھا نہیں کیا۔"

"یہ کیا بکواس شروع کر دی تم نے؟" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ایک معذور عورت کو تمہاری میٹھی باتوں سے چند لمحوں کی خوشی میسر آجاتی تو تمہارا کونسا نقصان ہو جاتا۔"

"میری اور اس کی عمر کا فرق دیکھا ہے تم نے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ "اصولاً مجھے آنٹی کہہ کر مخاطب کرنا چاہئے تھا اسے۔"

"مگر وہ تو تمہیں اپنا جوڑ سمجھنے لگی تھی۔"

"اس کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "میں تو مذاق میں ایک جملہ کہہ کر چور ہو گیا۔"

"یہ ایک جملے کا فتور نہیں تھا جنابِ عالی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "وہ پہلے روز ہی سے تمہاری ذات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی

فی الحال بہتر تھا کو تم سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" وہ انکشاف سن کر میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ مجھ سے تمہارے بارے میں اکثر بات کیا کرتی تھی۔"

"مگر تم نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ مجھے تو شک ہے کہ اسے تم نے ہی اکسایا ہوگا۔"

اس پر وہ فراخدلی سے کافی دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ "میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم اس کے لئے خود کو دکھی محسوس کرتے ہو مگر احترام کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کرتے۔"

میں عبداللہ پر دانت پیس کر رہ گیا۔

ہمارے سفر کا اختتام راڈرک کے فلیٹ پر ہوا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا لیکن دروازے کے قفل کی چابی عبداللہ کے پاس موجود تھی۔ لہٰذا ہم فلیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد راڈرک بھی سامان سے لدا پھندا واپس آ گیا۔ ہم دونوں کو دیکھ کر اسے خاصی حیرت ہوئی۔

"میں سپر مارکیٹ سے خریداری کرنے چلا گیا تھا۔" راڈرک نے اپنی غیر حاضری کی وضاحت کرتے ہوئے کہا اور سامان میز پر رکھنے لگا۔

"تم مصروف تو نہیں ہو؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"میری مصروفیات اتنی اہم نہیں ہوتیں۔" وہ مجھے آنکھ مار کر بولا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں؟"

"ہمارا شکار سینٹ انطونین ہسپتال میں ہے۔"

"تو پھر اسے وہیں کیوں نہ آنجہانی کر دیا جائے۔"

"ہم اسی لئے تمہارے پاس آئے ہیں۔"

"آج شام پانچ سے سات بجے کے علاوہ میں خالی ہوں۔"

"کوئی ضروری کام ہے؟"

"بہت ضروری۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "تم دیکھ نہیں رہے کہ میں خشک پھل کے کتنے ڈبے خرید لایا ہوں۔"

"تمہیں تو شاید پھل سے الرجی ہے۔" عبداللہ نے کہا۔ "مگر خشک پھل کا تمہاری آج شام کی مصروفیت سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "سپر مارکیٹ میں ایک بے حد حسین لڑکی نظر آئی جو مختلف اقسام کی پھلیوں کے ڈبے لے رہی تھی اور میں اس کے گرد منڈلانے لگا۔ چند منٹ بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اسٹور کے چند ملازمین میرے ارادے بھانپ چکے ہیں۔ لہٰذا میں نے اس لڑکی کے قریب موجود رہنے کے لئے پھل کی خریداری شروع کر دی۔ اس میں دو ڈبے میں نے خود لئے اور تین درجن اس لڑکی کے مشورے پر خریدے۔"

"اس کا مشورہ کہاں سے آگیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"گفتگو شروع کرنے کے لئے پھل کے انتخاب میں اس کی مہارت کا انتخاب کرنا پڑا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اور باہر آنے تک وہ میری دوست بن چکی تھی۔ آج شام ہم ایک کلب میں مل رہے ہیں۔"

"پھل کا کیا کرو گے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"کوڑے میں پھینکوں گا۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"لڑکیوں کے بارے میں بہت باذوق معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔

"عبداللہ اس معاملے میں بالکل کورا ہے مگر تمہارے طور طریقوں سے رنگینی ظاہر ہوتی ہے۔" وہ اپنے لائے ہوئے سامان میں سے پھل کے سربند ڈبے الگ کرتے ہوئے بولا۔

"ان خرافات کو ختم کرو۔ تم اس لڑکی سے ملنے کے بعد بھی کام کر سکتے ہو۔" یہ کہہ کر عبداللہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔

"آج اس سے پہلی ملاقات ہے۔ میں پانچ بجے نہ گیا تو سپر مارکیٹ کی ساری خریداری رائیگاں جائے گی البتہ ٹھیک سات بجے ڈان کو ہیکاک کے آس پاس ضرور ملوں گا۔"

"اس وقت تک تم کیا کرو گے؟" عبداللہ نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہم دونوں عذرا کا قصہ نمٹانے کی کوشش کریں گے۔" میں نے جواب دیا۔

راڈرک سے شام کا پروگرام طے کر کے ہم دونوں اس کے فلیٹ سے روانہ ہو گئے۔

باہر آنے کے بعد ہم دونوں نے عذرا جوناس کے بارے میں مشورہ کیا جو ہماری معلومات کے مطابق اس وقت تک سینٹ انطونین ہسپتال میں موجود تھا اور اسے وہاں سے ہٹائے بغیر اس پر کامیابی سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

ہم دونوں کے لئے عذرا کو فوری طور پر ہسپتال سے ہٹانا ناممکن تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی ہسپتال فون کر کے عذرا کو کوئی پریشان کن خبر سنانے کی کوشش کرتا تو شبہ ہونے کی صورت میں وہ نہ صرف اپنے بارے میں چوکنا ہو جاتا بلکہ ابرہام کی حفاظت کے انتظامات بھی سخت تر کر دیئے جاتے۔ لہٰذا میری دانست میں صرف ایک ہی تجویز قابلِ عمل تھی کہ عذرا کو ہسپتال سے باہر لانے کے لئے اس کی بیٹی ایلیزا کو چارہ بنایا جاتا۔

خاصی بحث کے بعد عبداللہ نے جوناس ملا فون کیا اور بمشکل تین فقروں کے بعد سلسلہ منقطع کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ ایلیزا گھر پر موجود نہیں تھی بلکہ ابرہام کو دیکھنے ہسپتال کی طرف گئی ہوئی تھی۔ شاید اس نے بھی کسی نہ کسی طرح یہ کھوج لگا ہی لیا تھا کہ ابرہام شہر کے کس ہسپتال میں تھا۔

"فی الحال اسے بھول جاؤ۔" عبداللہ نے نرمی سے مجھے مشورہ دیا۔ "اور یکسوئی کے ساتھ ابرہام کا قصہ پاک کرو۔ عذرا کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔"

"میرے لئے ایک ایک لمحہ بھاری ہے" عبداللہ نے قدرے خشک لہجے میں کہا "میں مختصر ترین مدت میں اپنے سارے کام ختم کرنا چاہتا ہوں"

"میں جانتا ہوں دوست" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا "تمہاری مدت سے بچھڑی ہوئی بیوی لیبیا میں تمہاری منتظر ہے اور تم جلد از جلد وہاں جانا چاہتے ہو۔ میں ابراہام کے خاتمے کے بعد تمہیں نہیں روکوں گا۔ اس خبیث سے نمٹنا میرے بس سے باہر ہے۔ ہاں عذرا کو میں اپنے وسائل کی مدد سے ٹھکانے لگا دوں گا"

"اگر تم عذرا کی ذمہ داری قبول کرتے ہو تو پھر ٹھیک ہے" میں زبردستی مسکراتے ہوئے بولا "مجھے تو ویسے بھی اپنڈکس کا مریض بننے کی مشق کرنی ہے"

"چاہو تو تمہیں اپنے ایک دوست سے ملا دوں" عبداللہ نے کہا "اس نے دو ماہ پہلے ہی اپنا اپنڈکس کا آپریشن کرایا ہے"

مجھے یہ علم ضرور تھا کہ اپنڈکس کا درد کس جگہ ہوتا ہے مگر درد کی نوعیت وغیرہ کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا جبکہ ہسپتال کے تجربہ کار ڈاکٹر کو اپنے مریض ہونے کا یقین دلانے اور ساتھ ہی فوری آپریشن سے بچنے کے لئے یہ معلومات ضروری تھیں لہٰذا میں نے عبداللہ کی پیش کش قبول کر لی۔

وہ مجھے ساتھ لے کر پیرس کی ایک متوسط بستی میں پہنچا جہاں خوبصورت باغات کے وسط میں قدیم وضع کے دلکش مکانات واقع تھے۔ اس علاقے کے مکین یقینی طور پر مالی اعتبار سے ایسے متوسط طبقے کے ملک نظر آتے تھے کہ ان میں سے کسی کا غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونا محال نظر آتا تھا مگر عبداللہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی کار ایک کھلے ہوئے پھاٹک میں لیتا چلا گیا۔

دروازے میں لگا ہوا اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبانے کے چند ثانیوں کے بعد اندر سے ایک فربہ اندام اور خوش مزاج شخص برآمد ہوا۔ وہ شخص تقریباً دوڑتا ہوا اس طرح باہر آیا کہ دو چھوٹے چھوٹے بچے پوری قوت سے شور مچاتے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

عبداللہ کو پہچانتے ہی وہ شخص نہایت بے تکلفی کے ساتھ اس سے بغلگیر ہو گیا اور اس اثنا میں وہ دونوں بچے اس کی ٹانگوں سے چپٹ کر گھونسے برسانے لگے۔

اس شخص نے فرنچ میں ان دونوں بچوں کو کچھ کہا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور جب وہ شخص عبداللہ سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوا تو بچے پوری قوت سے اسے دھکیل کر واپس لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

"صفدر علی اور یہ ڈینی" عبداللہ نے انگریزی میں ہم دونوں کا تعارف کرایا۔

میرے فرانس میں داخلے کے بعد عبداللہ نے پہلی بار کسی کو میرا اصل نام بتایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈینی اس کے لئے نہایت قابل اعتماد شخص تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ڈینی جیسا خوشحال اور آسودہ شخص کس طرح عبداللہ کا معتمد بن گیا تھا

"معاف کرنا میرے پوتے بہت شریر ہیں۔ جب تک میں تھوڑی دیر کے لئے انہیں باہر لے جانے کا وعدہ نہیں کروں گا یہ مجھے تم سے بات نہیں کرنے دیں گے" ڈینی نے دونوں بچوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔

"ان کا باپ کہاں ہے؟" عبداللہ نے بے تکلفی سے سوال کیا۔

"دونوں میاں بیوی باہر گئے ہوئے ہیں"

ہمیں نشستگاہ میں بٹھا کر ڈینی بچوں کو مناتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اکیلا واپس آیا تو اس کا چہرہ معصوم سی مسرت سے جگمگا رہا تھا۔

"تم کیا پیو گے؟" اس نے نشستگاہ میں بنی ہوئی ایک چھوٹی سی الماری کا پٹ کھولتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"جو مل جائے" میں نے مسکرا کر ذو معنی جواب دیا۔

"یہ تو پارسا بنا پھرتا ہے" ڈینی عبداللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تم میرا ساتھ دو تو وہسکی نکال لوں"

"نیک کام میں دیر اچھی نہیں ہوتی" میں نے آہستہ سے کہا اور وہ دیر تک میرے فقرے سے محظوظ ہوتا رہا۔

"نئے دوست کا جام صحت" ڈینی نے پہلا گلاس فضا میں میری طرف لہرا کر دیکھتے ہی دیکھتے خالی کر دیا۔ اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

"مے نوشی کے مقابلے کی ضرورت نہیں" عبداللہ نے فوری طور پر مداخلت کرتے ہوئے کہا "صفدر کو آج شام کچھ ضروری کام درپیش ہے"

"ہنگامہ آرائی" ڈینی نے سائفن سے دونوں گلاسوں میں سوڈے کی دھار مارتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈولفن کا سراغ مل گیا ہے" عبداللہ نے نسبتاً دھیمے لہجے میں بتایا۔

"نہیں" ڈینی کے منہ سے بے اختیار نکلا "کہاں ہے وہ؟"

"سینٹ انطوئین ہسپتال میں زخمی پڑا ہے اور صفدر اس کے شکار پر جانے والا ہے" عبداللہ نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

اقلیم علیم

"عبدالعزیز اور مہدی سے مجھے معلوم تو ہو گیا تھا کہ کسی چکر میں ایک ہندوستانی کے ساتھ پیرس آئے ہوئے ہو، مگر یہ معلوم نہیں تھا۔" ڈینی وہسکی سے لبریز دونوں گلاس لے کر ہمارے درمیان بیٹھتے ہوئے بتانے لگا۔

"میں ہندوستانی نہیں، پاکستانی ہوں۔" میں نے اس کی بات پوری ہوتے ہی تصحیح کر ڈالی کیونکہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ عبداللہ کا اس درجہ رازداں تھا کہ بن حیان کو ڈولفن کے کوڈ سے فوراً پہچان گیا تھا۔

اس نے فوراً ہی مجھ سے معذرت کی اور عبداللہ سے بولا۔

"عبدالعزیز جس انداز میں مجھ سے رقوم لے جاتا رہا ہے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم کسی لمبے چکر میں ہو۔" پھر گلاس سے ایک طویل گھونٹ لے کر کہنے لگا۔ "سعودی حکومت کو میراج طیاروں کی فراہمی کا معاہدہ ہو گیا ہے اور میں نے سعودی سفیر کو تمہاری پس پردہ کارروائیوں سے آگاہ کر دیا ہے، اسے بڑی مشکل سے یقین آیا کہ جولیس گرہوی اسرائیلی گماشتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔"

"وہ معاملہ تو اتفاقاً ہی سامنے آ گیا تھا۔" عبداللہ نے کہا۔ "ورنہ ہم بن حیان کے چکر میں تھے اور اس سلسلے میں میرے ہاتھ سے ستر ہزار فرانک خرچ ہو چکے ہیں۔"

"فکر نہ کرو، صبح شام میں کئی جگہ سے فنڈز موصول ہونے والے ہیں۔"

ان دونوں کی گفتگو سے میرے معدے میں گرانی سی ہونے لگی۔ عبداللہ مجھے اس طرح وہاں لایا تھا جیسے وہ اس کا کوئی عام دوست ہو مگر ڈینی بے انتہا سورس کا مالک نظر آ رہا تھا اور اسے افواج آزادیٔ فلسطین کی کارروائیوں میں گہرا دخل حاصل تھا۔

کچھ دیر بعد عبداللہ نے ڈینی پر اپنی آمد کا مدعا ظاہر کیا تو اس کی خمار آلود نگاہوں میں تحیر کی جھلکیاں تیرنے لگیں۔

"تم خودکشی کرنے جا رہے ہو میرے دوست۔" وہ وہسکی کے پورے گلاس سے شغل کرتے ہوئے بولا۔ "اگر تم ڈولفن کے گھر میں گھستے یا وہاں سے نکلتے دیکھ لیے گئے تو اسرائیلی تم سے اس کا ہولناک انتقام لیں گے۔"

"شراب تو آدمی کو دلیر بناتی ہے۔ تم بزدل کیوں ہو گئے؟" میں نے اسے نشے میں محسوس کر کے بے تکلفی سے ایک چبھتا ہوا سوال کر ڈالا۔

"بزدلی نہیں دوراندیشی ہے۔" اس نے میری توقع کے برعکس معقول جواب دیا۔ "اس وقت بے شمار خفیہ نگاہیں اس کی حفاظت کر رہی ہوں گی۔ شاید تم نہیں جانتے کہ اسرائیلیوں کی نظر میں ڈولفن کا کیا مقام ہے؟"

میں بولنا چاہتا تھا مگر عبداللہ نے میز کے نیچے میرا پیر دبا کر مجھے خاموش کر دیا اور خود بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ صفدر وہاں گھومنے کے بعد حالات کا جائزہ لے گا۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو اس منصوبے پر عمل کیا جائے گا ورنہ صفدر صحت یاب ہو کر باہر آ جائے گا۔"

ڈینی کو عبداللہ کا جواب بہت پسند آیا اور وہ اپنے پیٹ پر سے گاؤن ہٹا کر مجھے اپنڈکس کے بارے میں سمجھانے لگا۔ اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں داہنی طرف ٹانکوں کے نشانات اس کے تازہ تجربے کا اعلان کر رہے تھے۔

ڈینی سے بھرپور ملاقات کے بعد ہم باہر آئے تو عبداللہ میری ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے خود ہی بولنے لگا۔

• ہماری تنظیم کے عملی منصوبوں میں ڈینی کی کوئی حیثیت نہیں، مگر یورپ میں کام کرنے والے ہمارے تمام یونٹوں کو اسی کے ذریعے مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔"

• میں نے بن حیان کے لئے ڈولفن کا کوڈ پہلی بار سنا ہے، مگر ڈینی تو شاید مدت سے اس سے واقف تھا۔"

• بہت سی باتیں ہمارے ہی ذریعے اس تک پہنچتی ہیں اور وہ ہم سے ملنے والی معلومات اپنے سینے میں ہی دفن رکھتا ہے۔"

• میں نہیں مان سکتا۔" میں نے سختی سے اس کی تردید کی۔ "نصف بوتل وہسکی پی کر بہکنے والا شخص کسی راز کی حفاظت نہیں کر سکتا۔"

• یہی تو ایک کمال ہے اس میں کہ زیادہ نشہ ہونے کی صورت میں اس کے جبڑے بُری طرح اینٹھ جاتے ہیں اور وہ بولنے کے قابل نہیں رہتا اور نشہ اترنے پر اس کے جبڑے معمول پہ آجاتے ہیں۔" عبداللہ نے مجھے بتایا۔

• مگر جبڑے اینٹھنے سے پہلے وہ بہت کچھ اگل سکتا ہے۔"

• تم نے شاید محسوس نہیں کیا کہ اس کے حواس بدستور کام کر رہے تھے مگر اس کی زبان میں لکنت آگئی تھی۔ شراب کا نشہ اس کے حواس سے پہلے گویائی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے سامنے ایک دو گلاس اور لے لیتا تو تم وہ تماشہ بھی دیکھ لیتے۔"

• ڈینی مقامی باشندہ ہے؟"

• ارے نہیں۔" عبداللہ ہنس دیا۔ "وہ فلسطینی مسلمان ہے اور بڑی فصاحت سے عربی بولتا ہے۔"

• مگر اس کا نام تو مسلمانوں جیسا نہیں۔"

• ترکیا دان فرنانڈو اسلامی طرز کا نام ہے۔ دراصل وہ سات برس کی عمر سے فرانس میں مقیم ہے اور ہماری تنظیم میں شرکت کے بعد اس نے اپنا نام بھی بدل لیا تاکہ کسی کو شبہ کا موقع دیئے بغیر اپنا کام جاری رکھ سکے۔"

• اصل نام کیا ہے اس کا؟"

• میرا ہی ہم نام ہے۔"

شہر کے بارونق علاقوں سے سست رفتاری سے گزرتے ہوئے ہم دونوں راڈرک سے طے کئے ہوئے مقام پہ پہنچے تو سات بجنے والے تھے۔ عبداللہ نے اپنی موٹر وہیں فٹ پاتھ کے سہارے پارک کر دی۔

• ایک بات بتاؤ گے عبداللہ؟" کچھ دیر بعد میں نے سکوت توڑتے ہوئے، اپنے ذہن میں چبھنے والے ایک نکتے کو صاف کرنے کے لئے کہا۔

• بھلا تم کو کیوں نہ بتاؤں گا۔"

• بن حیان کے معاملے میں دو تین روز میں تم ستر ہزار فرانک خرچ کر چکے ہو اور دنیا میں نہ جانے کہاں کہاں تمہارے آدمی ایسے کاموں میں مصروف ہوں گے، پھر اسرائیل کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کے لئے تمہیں بیش قیمت اسلحہ بھی خریدنا پڑتا ہے، یہ تمام اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟"

• تم یہ کیوں بھول گئے کہ ہمارے دوست دنیا کے ایک تہائی سے زیادہ توانائی کے ذخیرے کے مالک ہیں۔" اس نے قدرے سکوت کے بعد جواب دیا۔

• مگر دوسروں کے پیسے کے بل پر یہ جنگ کب تک جاری رہے گی؟"

• انہیں دوسرا نہ کہو۔" وہ تڑپ کر بولا۔ "ہم ان میں سے اور وہ ہم میں سے ہیں۔ ہمارے اور ان کے مفادات مشترک ہیں۔ جس دن انہیں اس کا احساس پیدا ہو گیا ہماری تحریک چند منٹ بھی جاری نہ رہ سکے گی۔"

• تم اسرائیل کے چار فوجی مارتے ہو اور وہ تمہارے کیمپوں پر بمباری کرکے چار سو فلسطینی مہاجروں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس طرح تو یہ جنگ پچاس برس میں بھی ختم نہ ہو سکے گی۔ دوسری طرف تمہارے دوستوں کے تیل کے ذخائر کیا جواب نہ دے جائیں گے۔"

• یہ دوسرا پہلو ہے دوست۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "اور اس بارے میں تو شاید وہ لوگ بھی نہیں سوچتے ہوں گے جو اس دولت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ وہ ایک ایک رات میں لاس ویگاس کے قمار خانوں میں کئی کئی سو ملین ڈالر ہار کر اخباری شہ سرخیوں کو جنم دے رہے ہیں مگر ہم اس طرف سے غافل نہیں ہیں۔ ہم اپنی بقا کی آخری جنگ لڑنے کی بھرپور تیاریاں کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۵ء تک اگر عالمی رائے عامہ اسرائیل کو راہ راست پر نہ لاسکی تو تم دیکھو گے کہ اس سرزمین کے ہر گھر سے آگ اگلے گی اور اس وقت ہمیں کوئی طاقت اپنی کھوئی ہوئی مقدس سرزمین واپس لینے سے نہ روک سکے گی۔ ہم اپنے دوستوں سے ملنے والی رقم کا بڑا حصہ سرمایہ کاری میں لگا رہے ہیں۔ اگر ہم اپنی تنظیم کے نام سے بین الاقوامی اداروں میں سرمایہ کاری کریں تو چند ہی روز میں ہم پہ پابندی عائد کر دی جائے گی۔ اسی وجہ سے ہم مختلف ناموں سے بین الاقوامی بازاروں میں اپنا پیسہ پھیلا رہے ہیں اور آج اس سے ملنے والا منافع ہماری ضروریات کا ساٹھ فیصد حصہ فراہم کر رہا ہے اور ایک روز یہی سرمایہ ہماری جنگی ضروریات پوری کرے گا۔"

• آج میری بہت بڑی خلش دور ہو گئی۔" میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے ۱۹۸۵ء کا تذکرہ کیوں کیا ہے؟"

• ہمیں اسرائیل سے اپنی جنگ خود لڑنی ہو گی اور اس کے لئے وسائل کا تسلسل بہت ضروری ہے۔ آج ہم محدود وسائل کے ساتھ اپنے دشمن سے محدود جنگ لڑ رہے ہیں۔ وسائل میں اضافے کے ساتھ ہمارے حملوں میں شدت آتی جائے گی مگر ۱۹۸۵ء سے قبل شاید ہم دوسروں کی پرواہ کئے بغیر اپنی جنگ لڑنے کے قابل نہ ہو سکیں۔"

• اس کا مطلب ہے کہ تمہارے اوپر والے بھی ہر طرف نظریں رکھتے ہیں۔"

• اس کے علاوہ اتنی بڑی تحریک کیسے چل سکتی ہے جس میں ہر سال ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔ "یہ باتیں کسی فلسطینی کے سامنے نہ چھیڑنا۔ ہم میں سے ہر ایک قہر اور انتقام کا ایک چلتا پھرتا جوالا مکھی ہے جو صرف وقت کا انتظار کر رہا ہے اور جب وقت آئے گا تو دنیا دیکھ لے گی کہ ہم آزاد وطن میں سرفراز ہو کر رہیں گے یا . . . ."

اس کی آواز رندھ گئی اور میں نے ہولے سے اسے سینے سے لگا لیا۔

سات بجے راڈرک مجھے ڈھونڈتا ہوا کار تک پہنچا تو عبداللہ دل گرفتہ اور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اندھیرے کے باعث راڈرک اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا ورنہ فوراً ہی کسی گڑبڑ کا اندازہ لگا لیتا۔

"کوئی بات رہ تو نہیں گئی؟" میں نے کار سے اترتے ہوئے عبداللہ سے پوچھا۔

"ریوالور اور چاقو وغیرہ کل شام تک تمہیں مل جائے گا۔" عبداللہ بھاری لہجے میں بولا۔ "تم اپنی جان کا پورا خیال رکھنا۔"

• تم بے فکر رہو۔" میں نے یہ کہہ کر اندھیری کار میں عربوں کے روایتی انداز میں اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور تیزی سے کار سے اتر گیا۔

• فی امان اللہ۔" کار میں سے عبداللہ کی مدھم آواز ابھری اور میں مڑ کر دیکھے بغیر راڈرک کے ساتھ ایک طرف ہو لیا۔

راڈرک نے ایک عقلمندی یہ کی تھی کہ جیپ کے بجائے کوئی دوسری کار منگوایا تھا جو اندر سے تیز خوشبو سے مہک رہی تھی۔

• یہ تم نے اچھا کیا کہ جیپ نہیں لائے۔"

• جیپ میں کسی نئی لڑکی کو ساتھ لے کر گھومنا بُرا محسوس ہوتا۔" راڈرک نے یہ کہہ کر میرا سارا تاثر برباد کر دیا ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ جیپ ہنگام کے حادثے کے وقت ائیرپورٹ پر موجود تھی اور ہسپتال میں اس کے پہچانے جانے کا موہوم سا اندیشہ تھا جس کے سدباب کے لئے راڈرک نے گاڑی بدل لی تھی مگر اس شخص کے سر پہ تو پھیل والی دوشیزہ سوار تھی۔

• وہ ملی بھی یا جل دے گئی؟" میں نے پوچھا۔

• میرے لبوں کو چھو کر دیکھو، ابھی تک سلگ رہے ہیں۔" وہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔

• خشکی کا نتیجہ ہے۔"

• اگر تم اس جیسی تر لڑکی کو خشکی کہتے ہو تو میں اسی خشکی پر تمام زندگی گزارنے کے لئے تیار ہوں۔"

• تم گاڑی روک کر تھوڑی دیر کھلی ہوا میں چہل قدمی کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہسپتال جا کر بھی یہ رنگین گفتگو شروع کر دو۔" میں نے کہا۔

• یار وہ بڑی چٹخارے دار لڑکی نکلی۔" وہ اپنی رو میں بولتا رہا۔ "ذرا ذرا سی بات پہ روٹھتی ہے اور پھر خود ہی من جاتی ہے۔"

• شادی کر لو اس سے۔"

• یہی تو مصیبت ہے۔" وہ اسٹیئرنگ پر ناخن بجاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔ پوری
• وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو اس وقت کسی گرجا گھر میں رشتہ ازدواج میں منسلک کر رہا ہوتا۔"

• پھر تو تم جیسے مہمل کو رجانے کے فر... بانی کی تھی۔" وہ اس ہسپتال

• بہتر یہی ہے کہ میں تم سے اس کے بارے ہنگامی ضرورت کے تحت وہ بڑا مان کر بولا۔ "وہ نہایت شریف اور معزز لڑکی اور وہ بلاوجہ ہر ایک آبی حیوانات پر تحقیق کر رہی ہے۔"

• شاید اس نے تمہیں اپنی تحقیق کی ضرورت پیدا ہو گئی تھی۔" میں نے میں مسلسل اس کی حوصلہ شکنی پر تلا ہوا تھا۔

• تم واقعی اپنڈکس کے مریض ہو۔" پھر کہا۔ ہے۔ میں اس سے ملاقات کا سر برکرے میں ایک سو آئی پی آیا ہوا کرنا نہیں چاہتا۔" بر گولی مار دی تھی۔ اس کی وجہ سے

• ہسپتال آنے سے پہلے مجھے ہوش آیا تا آنے کی ممانعت کر دی گئی

• سونے کا وقت نہیں ہے بس ہم پہنچنے والے ہیں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میں ایک بار میں آگیا، مگر میں سنے رہ گیا۔

جس وقت راڈرک کی کار تیز رفتاری سے سینٹ انطونین ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوئی تو میں اداکاری کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اوور کوٹ کے ملبے کالر کھڑے کرکے اپنے سر پہ ایک ہلکا سا کمبل اس طرح ڈال لیا تھا کہ میرا چہرہ جزوی طور پہ چھپ گیا تھا۔

راڈرک نے کسی بوکھلائے ہوئے پیدائشی تیماردار کی طرح اپنی کار ہسپتال کے برآمدے میں روکی اور پھرتی سے میری طرف کا دروازہ کھول کر مجھے نیچے اترنے میں مدد دینے لگا۔ میں کنکھیوں سے قرب وجوار کا جائزہ لیتے ہوئے دردناک آواز میں ہولے ہولے کراہنے لگا۔

• تمہاری آوازیں اپنڈکس کے مریض کے بجائے دردِ زہ میں مبتلا کسی حاملہ کی کراہیں معلوم ہو رہی ہیں۔" راڈرک نے میرے کان کے نیچے سرگوشی کی۔

مجھے اس کا جواب دینے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ کسی مریض کی آمد کا اندازہ کرتے ہی دو نرسیں اسٹریچر سمیت ہماری طرف لپکی تھیں۔

ایک نرس نے قریب آکر راڈرک سے فرنچ میں کچھ . . . . . دریافت کیا اور وہ بیزاری کے عالم میں بولا۔

• مجھ سے انگریزی میں بات کرو۔ اس پریشانی میں میری فرنچ جواب دے گئی ہے۔"

• اسے کیا ہوا؟" نرسوں نے اسٹریچر کھولتے ہوئے تقریباً بیک آواز سوال کیا۔

راڈرک نے غور سے ایک نرس کو دیکھا اور پھر نسبتاً خوبصورت نقوش والی دوسری نرس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "صبح سے اس کے پیٹ میں شدید درد ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے لیبر روم میں لے جا کر

" ہماری مجبوری ہے۔"

مگر یو پ میں بھی بے ساختہ ہنس پڑیں اس اثنا میں میں ہسپتال اعداد فراہم تے اسٹریچر پر لیٹ چکا تھا۔

میں نے اسٹریچر اٹھا کر عمارت کی طرف چل دیں اور میں ڈیفی تو شاید مدت لے ساتھ اپنی آوازوں کا آہنگ بلند کر دیا۔

" بہت سی باقی لیبر روم میں لے جانے کی ضرورت پیش آجائے سے ملنے والی معاوضہ رقم صرف ہوتی ہے۔" ایک نرس شاید باڈرک

" میں نہیں جان سکے موڈ میں تھی

بوتل وہسکی پی کر بہکنے والا شخص یقیناً تمام اخراجات کا ذمہ دار

" یہی تو ایک کمال ہے" اس نے جواب دیا اور وہ دونوں کھکھلا

اس کے جبڑے بُری طرح اینٹھ جاتے

اور نشہ اترنے پر اس سے بہا ہوا تھا اس لئے خاموشی کے ساتھ باڈرک کرنے پڑے اور اس وقت پہلی بار مجھے شبہ ہوا بتایا۔

" مگر جبڑے پر شراب کا ہلکا سا سرور طاری تھا جس نے اسے

" چہرے پر نیند یہ چھوا تھا۔

انتظار گاہ میں باڈرک کو روک دیا گیا اور نرسیں میرا اسٹریچر ایک مسہری نما ٹرالی پر رکھ کر اسے دھکیلتی ہوئی ہسپتال کے روشن اور خاموش راہداری میں داخل ہو گئیں۔

مجھے جس کمرے میں پہنچایا گیا وہ طبی آلات سے مزین تھا اور وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص جو وضع قطع سے ڈاکٹر نظر آ رہا تھا۔ ایک میز کے عقب میں بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

میرے پہنچنے کے چند سیکنڈ بعد ہی وہ شخص اپنا کام چھوڑ کر میری طرف آیا اور نرسوں سے مختصر سی گفتگو کے بعد میری طرف متوجہ ہو گیا۔

اپنی علالم تعمیل اس نے میری پیشانی پر جا کر مسکراتے ہوئے مجھ سے کچھ دریافت کیا جو میرے پلے نہ پڑ سکا اور میں نے کراہتے ہوئے اسے بتایا کہ انگریزی کے علاوہ کوئی اور زبان میرے لئے قابل فہم نہیں تھی۔

اس نے مجھ سے تکلیف کی نوعیت دریافت کی اور پھر نہایت انہماک سے میرے پیٹ کے اس حصے کا جائزہ لینے لگا جہاں میں نے تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے درد میں شدت کے تاثرات بھی دیتا رہا اور دوسری بار جوں ہی ڈاکٹر نے درد کی نوعیت کے بارے میں اگلا سوال کیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے وہ علامات دہرانا شروع کر دیں جو ڈیفی نے اپنڈکس کے بارے میں بتائی تھیں۔

وہ ڈاکٹر تقریباً دس منٹ تک میرا معائنہ کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے حلق، آنکھیں، نبض کی رفتار اور خون کا دباؤ بھی دیکھا اور پھر الجھن آمیز لہجے میں انکشاف کیا کہ میں اپنڈکس کے درد میں مبتلا تھا

ڈاکٹر نے جب بھی میرے پیٹ پر فاضل آنت کی جائے وقوع پر انگلیوں سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی میں نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا جو ڈیفی کی ہدایات کے عین مطابق تھا۔

اس اثنا میں ایک لڑکا باہر سے ایک فائل لایا اور ڈاکٹر بغور اسے پڑھنے لگا۔ شاید اس کے اندراجات باڈرک نے استقبالیہ کاؤنٹر پر کرائے تھے اور وہ فائل میری ہی ذات سے متعلق تھی۔

" مسٹر ہیٹ براؤن" ڈاکٹر نے فائل سے میرا نیا نام پڑھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پہلے کبھی اس قسم کی تکلیف ہوئی تھی؟"

" کبھی نہیں۔"

" تمہاری تکلیف سے پتہ چلتا ہے کہ تمہاری فاضل آنت پر بہت زیادہ ورم آ چکا ہے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ تمہارے پیٹ کی نرمی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔" وہ کہنے لگا۔ "زیادہ ورم آنے کی صورت میں یہ معمولی مرض مہلک ہو جاتا ہے اور پھولی ہوئی آنت کسی بھی لمحے پھٹ کر مریض کی فوری ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے۔"

" نہیں۔" میں کراہتے ہوئے تقریباً چیخ پڑا۔ "مجھے خوفزدہ مت کرو۔ مجھے ایسا کوئی مرض نہیں ہے۔"

" مسٹر براؤن! تم سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔" وہ ملامت آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر تم چند گھنٹے پیشتر ہسپتال آ گئے ہوتے تو شاید فوری آپریشن کر کے تمہیں اس خطرے سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دی جاتی مگر اب ورم اور تکلیف کم ہونے تک کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ فی الحال تم کو چند دوائیں اور انجکشن دے رہا ہوں۔ اس کے ساتھ تم کو مکمل آرام کرنا ہوگا تاکہ جلد از جلد تمہاری حالت آپریشن کے قابل ہو سکے۔"

وہ خاموش ہو کر نہایت سرعت کے ساتھ فائل میں لگے ہوئے کاغذات پر کچھ لکھنے لگا اور اس سے فارغ ہو کر نرمی سے بولا۔ "تم اپنے دستخط کر سکتے ہو؟"

" ہاں۔" بلا سوچے سمجھے میرے منہ سے نکل گیا۔

" خوب۔" وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "تو ذرا ہمت کر کے اس فارم پر دستخط کر دو تاکہ میں ابھی سے ہدایات جاری کر دوں۔"

" کیا ہے یہ؟" میں نے نقاہت زدہ آواز میں پوچھا۔

" تمہارا آپریشن بہت معمولی ہوگا مگر یہ رسمی کارروائی ہے۔ مریض کی تحریری اجازت کے بغیر ہم اس کے جسم کے کسی حصے پر نشتر نہیں لگا سکتے۔"

مجھے ناچار اس مطبوعہ فارم پر دستخط کرنے پڑ گئے جس کے اندراجات میں صرف ہیٹ براؤن ہی میرے پلے پڑ سکا۔

اس کارروائی کے بعد مجھے فوری طور پر ایک صاف ستھرے اور ہوادار کمرے میں پہنچا دیا گیا جو دوسری منزل پر واقع تھا۔ چند منٹ بعد ہی لیبارٹری سے ایک ادھیڑ عمر نرس اپنی معاون کے ساتھ آئی اور میری کلائی کی شریان سے سرنج میں خون کی خاصی مقدار نچوڑ کر لے گئی تاکہ دیگر تجزیوں کے ساتھ ہی خون کا گروپ بھی معلوم کیا جا سکے

اس کے بعد ایک مرد نے شکر کی بیماری کی تحقیق کے لئے دوسرا نمونہ حاصل کیا اور اس کے جاتے ہی سفید ایپرن میں ملبوس ایک متوسط قامت اور کمسن عورت گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکائے آ پہنچی

" سسٹر! میری دوائیں کہاں ہیں؟" میں اسے دیکھتے ہی دردناک آواز میں کراہا۔

اس کے چہرے کی مسکراہٹ یکلخت غائب ہو گئی اور وہ مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں بولی۔ "مسٹر باہر رائونڈ پر ہے، وہ آئے تو پوچھنا۔ چلو جلدی سے اپنا سینہ برہنہ کرو۔"

اس کے لہجہ پر میں پیچ و تاب کھا کر۔۔ رہ گیا مگر گریبان کے بٹن مجھے کھولنے ہی پڑ گئے ورنہ وہ مزید بدتمیزی کر سکتی تھی۔

اس نے سینے کے مختلف مقامات پر اسٹیتھسکوپ سے میرے دل کی دھڑکنیں سنیں جو خاصی حد تک فرضی بیماری کی وجہ سے اور قدرے اس خاتون کے ہتک آمیز رویئے کی وجہ سے بے ربط ہو رہی تھیں اور پھر اس نے دانستہ میرے پیٹ کے مختلف حصوں کو باری باری نہایت بے دردی سے یوں دبانا شروع کیا کہ اگر واقعی میری فاضل آنت ورم زدہ ہوتی تو فوراً پھٹ گئی ہوتی۔

جانے سے قبل اس نے سفید کوٹ کی جیب سے ایک چارٹ نکال کر اس پر کچھ لکھا اور مجھ سے کچھ کہے بغیر واپس چلی گئی۔

میں اس متکبر عورت کو سبق دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب میرے اندازے کے مطابق میرے کمرے سے وہ خاصی دور چلی گئی تو میں نے سرہانے لگا ہوا گھنٹی کا بٹن کئی بار دبا ڈالا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہو، میں درد میں شدت کا بہانہ کر کے اس پر بُری طرح برس پڑوں۔

گھنٹیوں کا ردعمل فوری طور پر ہوا اور باہر کی راہداری میں کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دی اور جونہی میرے کمرے کا دروازہ کھلا میں نے آنے والی کو سخت سست کہنے کی ابتدا کرنی چاہی مگر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

آنے والی کوئی اور عورت تھی۔

" میں درد سے تڑپ رہا ہوں سسٹر۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کہا۔ "ابھی ابھی ایک اور خود سر نرس آئی تھی مگر وہ مجھے دوا دیئے بغیر نہایت بے ہودہ انداز میں واپس چلی گئی۔"

" وہ نرس نہیں ڈاکٹر تھی مسٹر ہیٹ۔" وہ ملامت آمیز لہجے میں بولی۔ "باہر راہداری میں وہ مجھ سے تمہاری بدمعاشی کی شکایت کر رہی تھی۔"

" میں غیر ملکی ہوں سسٹر۔" میں نے کراہ کر اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ "محض لباس کی وجہ سے ڈاکٹر اور نرس میں تمیز نہیں کر سکتا میں نے غلطی سے اسے سسٹر کہہ دیا جس پر وہ یوں بھڑکی جیسے میں نے اسے کوئی غلیظ گالی دے دی ہو۔"

" حالانکہ اس کی ماں خود ایک نرس تھی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ پوری صورتحال معلوم ہونے کے بعد وہ میری ہمنوا بن گئی تھی۔ "وہ اس ہسپتال کی سب سے جونیئر ڈاکٹر ہے اور اتفاق سے اسے ہنگامی ضرورت کے تحت آج دوسری منزل کا مکمل چارج دے دیا گیا ہے اور وہ بلاوجہ ہر ایک سے الجھتی پھر رہی ہے۔"

" آخر آج ہی ایسی کونسی ہنگامی ضرورت پیدا ہو گئی تھی؟" میں نے اپنے سوال کی اہمیت کا اندازہ کئے بغیر کہا۔

" آج دوپہر سے پانچ نمبر کمرے میں ایک وی آئی پی آیا ہوا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "کسی نے اس کو گولی مار دی تھی۔ اس کی وجہ سے اس فلور پر عملے کے آدمیوں کو بھی بلا اجازت آنے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور وہ یہاں دھمکتی پھر رہی ہے۔"

اس کا جواب سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگر میں نے اپنی مسرت چھپاتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔ "کیا ہسپتال میں کسی نے گولی ماری تھی اسے؟"

" اسے نہیں۔ باہر سے زخمی ہو کر آیا تھا۔" وہ بے زاری کے عالم میں بولی۔ "سینٹ انطونین میں ہر مریض پر مساوی توجہ دی جاتی ہے اور اسے بھی عام مریضوں کی طرح رکھا گیا تھا مگر اسرائیلی سفیر نے بذات خود یہاں آ کر اس پر دوسرے ممکنہ قاتلانہ حملے کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے خاص احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی استدعا کی تو ہمارے چیف نے اپنی روایات سے انحراف کرتے ہوئے اس کے لئے بہت سی مراعات فراہم کر دیں۔"

" پھر تو اس فلور پر کچھ مسلح محافظ بھی ہوں گے۔" میں نے تجسس اور حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

" اسرائیلی سفیر کا بس چلتا تو واقعی یہ فلور میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا ہوتا۔" وہ بولی۔ "سنا ہے وہ اپنے چند مسلح آدمی پانچ نمبر کی حفاظت پر مامور کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اجازت نہیں دی گئی۔"

" کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے کسی دوسری منزل پر منتقل کر دیا جائے؟" میں نے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا۔ "اس اسرائیلی وی آئی پی اور تمہاری بدمعاش ڈاکٹر کی وجہ سے میری طبیعت کہیں اور زیادہ نہ بگڑ جائے۔"

" ڈر گئے؟" وہ کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں پوری توجہ سے تمہاری دیکھ بھال کروں گی۔ اب یہ بتاؤ کہ گھنٹی کیوں بجائی تھی؟"

" تم واقعی مہربان اور نرم دل لڑکی ہو۔" میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارے ہمدردانہ رویئے سے مجھے بہت سکون ملا ہے۔ اور میں اپنی تکلیف بھول کر اتنی دیر تک تم سے باتیں کرتا رہا ہوں۔ میں نے تکلیف اور تنہائی سے گھبرا کر پے در پے گھنٹی بجائی تھی۔ میں آئندہ تمہیں زحمت نہیں دوں گا۔"

وہ میرے بستر سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور ہولے ہولے میرا بازو سہلانے لگی: "دل گھبرائے تو گھنٹی بجا دینا۔ میں چلی آؤں گی۔ بتانے کیوں میں تم سے ہمدردی محسوس کر رہی ہوں۔"

"کیا اس فلور پر تم تنہا ہو؟"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے سوال کیا: "آٹھ نرسیں اور بھی ہیں اسی فلور پر۔"

"اگر میرے گھنٹی بجانے پر کوئی ڈاکٹر جیسی بد دماغ نرس آگئی تو مجھے وحشت ہونے لگے گی۔"

"ہر نرس پانچ کمروں کی ذمہ دار ہے۔" وہ ملائم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"پانچ نمبر تو تمہارے پاس نہیں ہے نا؟"

وہ پھر ہنس پڑی: "وہاں کوئی نرس نہیں جا سکتی۔ اسے ڈاکٹر لیونورا خود دیکھتی ہے۔"

"وہاں اسے نرس کا کام کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میرے منہ سے نرس کا خطاب ہی تیر کی طرح لگا تھا۔"

"وہاں کیوں شرمائے گی۔ اسی کے طفیل تو اسے دوسرے فلور کا پہلی بار چارج ملا ہے۔"

وہ مزید چند منٹ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کے بعد فلور ڈسپنسری سے میری دوائیں لینے چلی گئی۔ اور میں بستر پر لیٹے لیٹے اپنے مقدر کی غیر متوقع یاوری پر غور کرنے لگا۔

پچھلے کئی دن سے حالات اس قدر ناساز گار تھے کہ پوری کوشش کے باوجود بن حیان یا ابراہام جوناس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو رہی تھی۔ مگر اب یہ خوش نصیبی کی انتہا تھی کہ میں اور ابراہام جوناس نہ صرف اس کیشر المنزلہ ہسپتال کے ایک ہی فلور پر موجود تھے بلکہ اس باتونی نرس نے اندرون خانہ رونما ہونے والے ان واقعات سے بھی خود بخود آگاہ کر دیا تھا جن سے ناواقفیت میرے لئے تازہ ترین منصوبہ کو ناکام بنا سکتی تھی۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ اس نرس سے دوستانہ فضا میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک بڑی بداخلاقی کی تھی اور اس کا نام تک دریافت نہیں کیا تھا۔ جب کہ وہ اپنے اطوار سے سرزمین فرانس پر ایک نئے رومان کی دعوت دیتی رہی تھی۔ اس سے میری دوستی میں ڈاکٹر لیونورا کے بارے میں میری غلط فہمی کو تو بنیادی حیثیت حاصل تھی ہی مگر اس نرس کے حسن کا بھی کچھ کم دخل نہیں تھا۔ جس کی ہم پیشہ عورت کی کوکھ سے جنم لینے والی، اس سے کم عمر لڑکی اس پر حکم چلا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ نرس ٹرالی لئے میرے کمرے میں آئی تو میں نے اوپر ہی اپنی وہ کیس فائل دیکھی جو معائنے کے بعد ڈاکٹر نے مکمل کی تھی۔

"اٹھو، میں دوا دے دوں۔" اس نے ٹرالی سے میری دوائیں مسہری سے ملحق چوبی شیلف پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"اٹھنے کی ہمت ہوتی تو اسٹریچر پر ہسپتال نہ آتا۔"

"شرارت تو نہیں کر رہے؟" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر شوخ لہجے میں بولی۔

"بھلا شرارت کیسے کروں گا۔"

"بعض مریض خوبصورت نرسوں کو سامنے پا کر چلنے پھرنے تک سے معذوری کی اداکاری کرنے لگتے ہیں۔" وہ لحظہ بہ لحظہ میرے ساتھ بے باک ہوتی جا رہی تھی۔

"اور تم تو خوبصورت کے ساتھ خوش اخلاق بھی ہو۔" میں نے اس کی تعریف کی اور اس کے چہرے پر میرے الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

"پتہ ہے ڈاکٹر لیونورا کے ساتھ تمہارا قصہ سن کر ڈسپنسر کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے نہایت اشتیاق سے دریافت کیا اور میں نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

"کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر لیونورا کی وضع قطع پر اپنی ماں کی چھاپ بہت گہری ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی: "وہ خود کو ڈاکٹر سمجھتی ہے تو سمجھا کرے، دیکھنے والے تو اسے نرس ہی کہتے ہیں۔"

مصلحت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس بار بھی میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا مگر اس کی بات مجھے کچھ ناگوار سی گذری۔

"نہ ماں کی چھاپ ہونا بری بات ہے اور نہ نرسنگ کوئی حقیر پیشہ ہے ...."

اس نے میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے میری بات اچک لی اور بولی: "میں خود بھی نرس ہوں۔ میری بات کو غلط نہ سمجھو۔ اصل مسئلہ ڈاکٹر لیونورا کی ذہنیت کا ہے۔ وہ اپنے ماضی سے فرار چاہتی ہے اور اس کی اسی کوشش نے اس کے لئے ان دونوں باتوں کو گالی بنا دیا ہے جن کی تم تعریف کر رہے ہو۔"

باتیں کرتے ہوئے اس نے سہارا دے کر مجھے بستر سے اٹھنے میں مدد دی اور پھر میرا سر اپنے شانے پر ٹکا کر مجھے دو کیپسول اور ایک بے کیف سیال معدے میں اتارنے پر مجبور کیا اور آخر میں میرے داہنے بازو میں ایک انجکشن لگا کر چلی گئی۔

دوران گفتگو میں نے اس کا نام معلوم کر لیا تھا۔ وہ ایلی کہلاتی تھی اور ان دنوں اس کی ڈیوٹی تین بجے سہ پہر سے لیکر رات کے دس بجے ختم ہو جاتی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میرا ذہن کچھ بھاری ہونے لگا جسے ابتدا میں میں نے کوئی اہمیت نہیں دی مگر بعد میں جب میرے اعصاب پر اضمحلال طاری ہونے لگا تو مجھے تشویش نے آگھیرا۔

مجھے دی جانے والی ادویات میں یقینی طور پر کوئی جزو خواب آور بھی تھا۔ جو مجھے درد کی مفروضہ شدت کے احساس سے نجات دلانے کے لئے شامل کیا گیا تھا اور میرے لئے اس کے اثرات بہت پریشان کن تھے۔

ہسپتال کی اسی منزل پر میرا پرانا اور مکار حریف مجھ سے تھوڑی دور خصوصی انتظامات کے حصار میں خاصی مخدوش حالت میں پڑا ہوا تھا اور میرے لئے اس رات کا ایک ایک لمحہ بیش قیمت تھا۔ رات کے آسیبی سناٹے میں جب دوسری منزل کے مکین نیند یا غنودگی کی حالت میں ہوتے تو میں اپنے کمرے سے راہداری میں نکل کر پانچویں کمرے کے محل وقوع اور اس میں جارحانہ داخلے کے امکانات کا عملی جائزہ لے سکتا تھا تاکہ اسی رات یا اگلی شب اپنے دشمن پر کاری وار کر سکوں مگر خواب آور دوا کے اثرات نے میرے ان تمام عزائم پر پانی پھیر دیا تھا۔ میں بستر پر پڑا ابن حیان کے ساتھ ماضی کے مختصر مگر یادگار معرکے اور اس کے بارے میں گشت کرنے والی افواہوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس کا شمار یہودی سلطنت کے چند بہترین دماغوں میں ہوتا تھا اور اسرائیل کے قومی مفادات سے وابستہ ہر فیصلے میں کہیں نہ کہیں اس کا نام ضرور موجود ہوتا تھا۔ اس کی زندگی اس قدر اہم سمجھی جاتی تھی کہ اسرائیل میں بن حیان صرف ایک نام ہی نام تھا جس کو دیکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور اس ان دیکھے آسیبی سائے سے ہر وہ شخص خوفزدہ رہتا تھا جسے اسرائیل کی سلامتی کے رازوں تک ذرا بھی رسائی حاصل تھی۔

وہ پراسرار شخصیت جو بن لیوی کے الفاظ میں صحراؤں کا قہر کہلاتی تھی، میری رسائی میں تھی اور میری بوجھل پلکیں آنکھوں پر جھکی پڑ رہی تھیں۔

مجھے سوچتے ہوئے کافی دیر گذر گئی۔ میرے لئے اپنے جسم کے کسی حصے کو جنبش دینا مشکل ہو گیا تھا مگر مضبوط قوت ارادی کے باعث میرے حواس کام کر رہے تھے البتہ کمرے میں پھیلی ہوئی دودھیا روشنی میں مجھے دھندلے پن کا احساس ہونے لگا تھا اور نیم وا آنکھوں سے کسی چیز کو پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میرے اعصاب میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس وقت کھلا ہوا دروازہ میری نظروں کے سامنے نہیں تھا اور نہ مجھ میں اتنی سکت تھی کہ میں اپنی گردن کو خفیف سی حرکت دے کر دروازے کا جائزہ لیتا۔ وہ تو بس تیل سے محروم قبضے کی اچانک مگر مانوس چرچراہٹ تھی جس نے مجھے اس بارے میں چوکنا کیا۔

میں نے پکارنا چاہا لیکن میری زبان کئی من وزنی ہو چکی تھی زہریلے تیر برسانے والا مہلک ہتھیار میں نے مسہری کے گدے کے نیچے رکھا ہوا تھا مگر اس وقت ہاتھ ہلانا بھی ممکن نہیں تھا جو میں اپنی حفاظت کے لئے تیار ہو پاتا۔

میرے دل کی دھڑکنیں تواتر کے ساتھ تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ دروازے کے قبضے کی چرچراہٹ صرف ایک بار سنائی دی تھی جس کا مطلب تھا کہ دروازہ کھولے جانے کے بعد بند نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی کمرے میں کوئی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

وہ جو بھی تھا دروازے پر کھڑا خاموشی سے اندر کا جائزہ لے رہا تھا یا مجھے غافل پا کر دبے قدموں میری طرف آ رہا تھا۔ آنے والا اگر دوست ہوتا تو یوں چوروں کی سی مانندگی سے کام نہ لیتا۔ بلکہ بے خوفی سے بستر تک آجاتا۔ یہ سوچ کر میرے بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل گئے اور بمشکل چند ثانیوں میں پسینے کی پتلی پتلی دھاریں میرے بدن پر زندہ سانپوں کی طرح رینگنے لگیں۔

پھر اچانک عقب سے کوئی ہاتھ میری گردن پر آیا اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بن حیان کی خون برساتی، خون آشام آنکھیں میرے تصور میں کوند گئیں۔ وہ آنکھیں اور وہ تیور میں نے صحرائے عرب کی ایک بستی الشیخ میں اس وقت دیکھے تھے جب بن حیان ایک عرب شیخ کے روایتی روپ میں ابو خالد کا نام اختیار کئے میرے سامنے موجود تھا اور میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے پتھر کے دانوں والی وزنی تسبیح میرے منہ پر مار کر میرا چہرہ اور ہونٹ لہولہان کر دیئے تھے اور میں نے اسی وقت اپنے دہانے میں زندہ اور گرم خون کا ذائقہ محسوس کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے عہد کیا تھا کہ زندگی رہی تو ابو خالد سے اپنی اس تذلیل کا کہیں بھی اور کسی بھی قیمت پر انتقام ضرور لوں گا اور میرا وہ عہد محمود کی ہولناک تحریک کے سہارے سینٹ انطوئین ہسپتال کے اس کمرے تک لے آیا تھا۔ جہاں میں جسمانی طور پر مفلوج حالت میں پڑا تھا۔

عقب سے اپنی گردن پر ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی بن حیان کی جو آنکھیں چشم زدن میں میرے لاشعور سے ابھری تھیں وہ نفرت اور انتقام کے شعلوں کی صورت اختیار کر کے میرے پورے وجود پر چھا گئیں۔ میں نے چیخنا چاہا مگر آواز مفقود تھی۔ اس سے آگے میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے اور ذہن تیزی کے ساتھ تاریکی کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو خواب آور انجکشن کے اثرات کافی حد تک زائل ہو چکے تھے۔ کمرے کی تیز روشنی بند تھی ....
.... اور دھیمی روشنی والا ایک سبز بلب جل رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو حرکت دے کر اپنی سلامتی کا یقین کیا پھر گردن کو جنبش دی جو بالکل صحیح سلامت تھی۔

خود کو قطعی محفوظ پا کر مجھے مسرت کے ساتھ ہی شدید حیرت بھی ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اپنی گردن پر کسی ہاتھ کا لمس جاگتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اگر آنے والا دوست تھا تو وہ چوروں کی طرح کیوں آیا تھا اور اگر دشمن تھا تو مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر کیوں چلا گیا تھا۔

پھر جوں ہی میری نظر رسٹ واچ پر پڑی میں بستر سے ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے وہ ایسا مناسب وقت تھا کہ مریض تو درکنار صحت مند لوگ بھی نیند کی یلغار سے نہیں بچ سکتے تھے۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور مسہری کے گدے کے نیچے سے زہریلے تیروں والا ہتھیار نکال کر ننگے پاؤں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چل دیا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ میرے چلنے سے آہٹ تو درکنار، فرش پر دھمک تک پیدا نہ ہو کیونکہ اس صورت میں نچلی منزل پر کوئی ہوشیار ہو سکتا تھا۔

دروازے کے پاس رک کر میں کئی منٹ تک بالکل خاموشی کے ساتھ باہر کی راہداری کی سن گن لیتا رہا مگر ادھر موت کا سا پر ہول سکوت چھایا ہوا تھا۔

میں نے دروازے کے قریب دیوار میں نصب سوئچ بورڈ سے اپنے کمرے کی جلتی ہوئی سبز روشنی بھی گل کر دی اور مکمل تاریکی میں آہستہ آہستہ دروازہ کھولنے لگا۔

دروازہ کھلتے ہی راہداری سے روشنی کا ایک مستطیل کمرے میں در آیا اور دروازے کی جنبش کے ساتھ فرش پر بننے والے اس مستطیل کی چوڑائی میں بھی اضافہ ہونے لگا اور جونہی دروازے کے خشک قبضے میں چرچراہٹ کی ابتدا کا شبہ ہوا۔ میں نے پٹ وہیں روک دیا۔

قبضے کی خطرناک آواز پیدا کئے بغیر دروازے میں اتنی جگہ پیدا ہو چکی تھی کہ میں آسانی سے اس میں سے گذر سکتا تھا۔

میں نے گردن نکال کر روشن راہداری کا جائزہ لیا جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ویران پڑی ہوئی تھی اور سبک قدموں کے ساتھ باہر آ گیا۔

سفاک شکاریوں کے غول میں گھرے ہوئے کسی درندے کی طرح میں نے سامنے والی قطار کے دروازوں پر لگے ہوئے نمبر دیکھے اور پھر اس طرف بڑھنے لگا۔ جدھر پانچواں کمرہ ہونا چاہئے تھا۔

ایلی کے بیان کے مطابق دوسری منزل پر کل نو نرسیں تھیں اور ان میں سے ہر ایک پانچ کمروں کی ذمہ دار تھی۔ اس اعتبار سے اس منزل پر کل پینتالیس کمرے تھے جبکہ تیسرے کمرے کے دروازے پر پینتالیس نمبر پڑا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے کم و بیش پوری راہداری عبور کرنی تھی۔

میں نہایت احتیاط مگر تیز رفتاری سے ننگے پاؤں آگے بڑھتا رہا تاکہ کم از کم وقت میں اپنا جائزہ یا کام مکمل کر کے کسی سے ٹکرائے بغیر واپس لوٹ سکوں۔

پھر دور چلنے کے بعد ایک دروازے کی چوکھٹ پر فرنچ میں تختی لگی نظر آئی۔ جسے شاید راہداری کی مخالف سمتوں سے پڑھا جا سکتا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ نیچے سے اوپر تک شیشے کا تھا اور اندر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس دروازے کے سامنے راہداری کا پورا حصہ اندر سے آنے والے انعکاس سے منور تھا۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ ڈیوٹی اسٹاف کا کمرہ تھا یا پھر ڈسپنسری اور وہاں نظر آنے والی تیز روشنی اس بات کی دلیل تھی کہ اندر والے سو نہیں رہے تھے۔ میرے لئے اس کمرے کے سامنے سے گزرنا خطرناک تھا۔ مگر وہ خطرہ مول لئے بغیر پانچویں کمرے تک رسائی ناممکن تھی لہٰذا میں چلتے چلتے اس روشن دروازے کے قریب پہنچا اور سانس روکے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

کئی منٹ گزر گئے مگر اندر سے کوئی خفیف سی آواز بھی نہ سنائی دی فضا میں بس ایک غیر محسوس سی گونج رچی ہوئی تھی جو شاید حرارت کو گرم رکھنے کے مرکزی نظام کے پنکھوں کی تیز گردش سے پیدا ہو رہی تھی۔

اندر مکمل سکوت کا یقین ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ دیوار اور دروازے کے بالکل قریب جا کر کسی چھلاوے کی طرح سرعت سے دوسری طرف گزر جاؤں اور پل بھر میں میں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنا چکا تھا۔ شیشے کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کوشش کی تھی کہ اس کمرے کا جائزہ لے سکوں اور مجھے سفید کپڑوں میں ملبوس تین سائے آرام کرسیوں پر دراز نظر آئے جن میں سے دو تو شاید سو رہے تھے مگر تیسری عورت دروازے کی طرف پشت کئے نہایت سکون سے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

وہ مرحلہ عبور کرتے ہوئے میرا دورانِ قلب تیز ہو چکا تھا راہ میں حائل ہونے والی ایک رکاوٹ دور ہو چکی تھی۔ اور میرا ہر قدم مجھے اپنے دشمن سے قریب تر لے جا رہا تھا۔

آگے نکلنے کے بعد میں راہداری کے وسط میں آ گیا اور اس کمرے کو بھول کر آگے جا رہا تھا کہ اچانک عقب سے ایک نسوانی آواز آئی اور میرا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔

جو کچھ کہا گیا وہ فرنچ میں تھا مگر زبان اس وقت اپنی اہمیت کھو چکی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ میں صبح سویرے مشکوک انداز میں کسی اور کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔

میرے ذہن میں ابھرنے والا پہلا خیال نہایت خطرناک تھا میں نے سوچا کہ پلٹ کر ایک زہریلے تیر کے ذریعے پکارنے والی کا خاتمہ کر دوں لیکن ذہن نے فوراً ہی یہ خیال مسترد کر دیا اگر اس کمرے میں کوئی اور بھی جاگ رہا تھا تو پکارنے والی کی موت پر ہنگامہ کھڑا کر دیتا اور یوں ہسپتال میں ایک قتل کے بعد بن حیان کے سر پرستوں کے لئے با آسانی وہاں سے لے جانے کا جواز پیدا کر لیتے۔ اور میں اپنے منصوبے میں ناکام رہ جاتا۔

پہلے سے خیالات نہایت سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں آ کر گزر گئے اور میں غیر ارادی طور پر کراہتے ہوئے واپس مڑ گیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے عمل میں آیا کہ آواز دینے والی کو شبہ بھی نہ ہو سکا ہو گا۔ کہ اس کی آواز سننے کے بعد مجھے سوچنے کی مہلت ملی تھی۔

"ڈسپنسری ——— ڈسپنسری کدھر ہے؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا کر کراہتے ہوئے دھیمی آواز میں اس سے سوال کیا اور اسی اثنا میں زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی اپنے لباس میں چھپا لی۔

"ادھر آؤ!" اس نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس مرتبہ وہ بھی انگریزی ہی بولی تھی۔

میں پیٹ تھامے لنگڑاتا اور کراہتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔

"تمہارا کمرہ نمبر کیا ہے؟" اس نے مجھے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"پینتالیس!" میں نے اس پر توجہ دیئے بغیر شدید درد کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "میں درد سے مرا جا رہا ہوں مجھے بتاؤ کہ ڈسپنسری کدھر ہے؟" یہ کہتے ہوئے میں نے شیشے کے پار دیکھا تو وہاں بدستور خوابناک سناٹا طاری تھا البتہ ایک کرسی پر کھلی ہوئی کتاب اوندھی رکھی ہوئی تھی۔ شاید کتاب پڑھتے ہوئے اسے کسی طرح میرے سائے کے انعکاس کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ دوسروں کو چھیڑے بغیر اپنے شبہ کی تصدیق کے لئے باہر آ گئی تھی۔

"اپنے کمرے میں جاؤ" وہ سخت لہجے میں بولی "میں تمہاری حالت دیکھ کر ڈاکٹر کو رپورٹ کرتی ہوں، تم نے گھنٹی کیوں نہیں بجائی؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ گھنٹی کہاں ہے" میں ہانپتے ہوئے راہداری کے فرش پر ہی اکڑوں بیٹھ گیا۔ "مجھے دوا چاہئے۔"

"تم اس کمرے کے سامنے سے گزرے تھے تو اندر کیوں نہیں چلے آئے؟"

پہلی بار اس کا لہجہ کچھ نرم ہوا۔ اور میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں میرے لئے ترحم کا جذبہ ابھر آیا تھا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کہاں سے گزرا تھا" میں نے سر جھکا کر بے زاری کے عالم میں کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں یہیں سسک سسک کر مر جاؤں!"

"تھوڑی سی ہمت کر کے اپنے کمرے تک چلو، میں ڈاکٹر کو لاتی ہوں" وہ میرا بازو تھام کر مجھے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ وہ میری اداکاری سے کافی متاثر نظر آ رہی تھی۔ لہٰذا میں تھوڑے تامل کے بعد کراہتا ہوا فرش سے اٹھ گیا اس نے چند قدم دور تک مجھے سہارا دیا اور ڈاکٹر کو میرے کمرے میں لانے کا وعدہ کرتے ہوئے لوٹ گئی۔

میں خراماں خراماں اپنے کمرے میں پہنچا اور مطالعہ کی شوقین اس نرس کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔ دروازہ بند کرنے سے قبل میں کمرے میں سبز بلب روشن کرنا نہیں بھولا تھا۔

پھر دیر بعد وہ نرس واپس آئی تو اس کے ہمراہ ایک ادھیڑ عمر مرد بھی موجود تھا۔ وہ بے چارہ کافی دیر تک میرے ساتھ سر کھپاتا رہا اور پھر ایک انجکشن لگا کر واپس چلا گیا۔

اس انجکشن کے زیرِ اثر میں دن چڑھے بیدار ہوا۔ غیر ضروری ادویات کے باعث مجھے اپنا جوڑ جوڑ دکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور پھر یہ وہم بھی سر پر سوار تھا کہ ہسپتال میں داخلے کے وقت ڈاکٹر نے آپریشن کے اجازت نامے پر میرے پیشگی دستخط لے لئے تھے یعنی بن حیان تو مرتا یا نہ مرتا مگر میرا ایک عدد آپریشن طے پا چکا تھا اور میرے سامنے اس ناگہانی مصیبت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

دوپہر کو ایلی کی آمد سے قبل میں نے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک نرس نے بتایا کہ ہسپتال کے مریضوں کو کمرے سے باہر چہل قدمی کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں اگر ڈاکٹر تجویز کرتا ——— تو چہل قدمی وغیرہ کے لئے مریض کو کسی نرس کی نگرانی میں چھت پر واقع ورزش کے شعبے میں بھیجا جاتا تھا۔

ایلی آئی تو میرے ذہن میں پچھلی رات کا ہولناک تجربہ تازہ تھا مجھے یہ خیال بھی تھا کہ شاید ایلی جاتے ہوئے مجھے الوداع کہنے آئی ہو۔ مگر مجھے بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر میری گردن اور چہرے وغیرہ کو چھو کر لوٹ گئی ہو مگر ایلی نے یہ کہہ کر میرے خیال کی تردید کر دی کہ پچھلی رات وہ عجلت میں براہِ راست گھر چلی گئی تھی اور اسے مجھ سے الوداعی ملاقات

کا وقت نہیں مل سکا تھا۔

ایملی کے جواب نے مجھے شدید الجھن کا شکار کر دیا۔ میرے لئے یہ پتہ چلانا ضروری ہو گیا تھا کہ اس رات میرے کمرے میں آنے والا کون تھا؟

اس روز ایملی تھوڑے تھوڑے وقفوں سے میرے پاس آتی رہی اور اس کی رفاقت میں مجھے ہسپتال کی بے کیف قید میں بھی دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ ایملی اس روز مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی مگر اس بے تکلفی سے بھرپور استفادے کے لئے بھی مجھے اس کو یہ یقین دلانا پڑا کہ میری اپنڈکس کی تکلیف میں نمایاں کمی واقع ہوئی تھی۔

اس سے سرسری طور پر پانچویں کمرے کے مریض کے بارے میں بھی بات ہوئی اور پتہ چلا کہ بن حیان کی حالت تشویشناک تھی اور اسے آکسیجن دی جا رہی تھی کیونکہ گولی جبڑے سے ہوتی ہوئی سانس کی نالی کو پھاڑتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اور اسے کم از کم ایک ہفتے تک ہسپتال سے چھٹی ملنے کے آثار نہیں تھے۔

شام کو ملاقات کا وقت شروع ہونے پر راڈرک پھولوں کا ایک حسین گلدستہ لئے آیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس گلدستہ میں بڑے بور کا ایک خود کار پستول نہایت خوبصورتی سے چھپایا گیا تھا اور بیس فاضل راؤنڈز وہ سگریٹ کی ڈبیوں میں لے کر آیا تھا۔ سات انچ لمبے پھل والا تیز دھار چاقو اس نے اوورکوٹ کی جیب سے نکال کر میرے حوالے کیا۔ پھر اسلحہ پستول گلدستے میں اس طرح رکھا گیا تھا کہ میں بوقتِ ضرورت آسانی سے نکال سکتا تھا اور موقع آنے سے قبل مجھے پستول چھپانے کے لئے کوئی جگہ تلاش نہ کرنی پڑتی۔

میں نے راڈرک سے پچھلی شام کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور نہ ہی اسے احساس تھا کہ روانی میں وہ کیا بکواس کر گیا تھا۔

مجھ سے بن حیان کے بارے میں تفصیلات سن کر اسے خاصی مایوسی ہوئی۔ اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ میں اس کے کمرے تک پہنچنے کی ایک ناکام کوشش کر چکا تھا۔ تو اس نے واضح الفاظ میں میرے منصوبے سے ناامیدی کا اظہار کر ڈالا۔

"وہ اسی ہسپتال میں میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔" میں نے پُراعتماد لہجہ میں کہا۔ "لیکن اس کے لئے باہر سے تم دونوں کو مدد کرنی ہو گی۔"

"باہر سے ہم کیا کر سکیں گے؟"

"وہی جو جوناس ولا میں ہوا تھا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"یعنی ہم باہر سے حملہ کریں؟"

"رات دس بجے یہاں نرسنگ اسٹاف کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ دیر کے لئے انتظامی سختیاں یقیناً کم ہو جاتی ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "اگر ٹھیک پونے دس بجے ہسپتال کا برقی نظام ناکارہ کر دیا جائے تو بے خوف و خطر بن حیان کا صفایا ہو سکتا ہے۔"

میری تجویز سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "بس یہی ایک صورت ہے ورنہ یہ موقع ضائع ہو جائے گا۔"

"ابھی ملاقات کا کافی وقت باقی ہے، تم عبداللہ سے بات کر کے واپس آؤ۔ اگر یہ کام آج رات ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"وہ ریمیراں میں موجود ہے، میں جلد از جلد واپس آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میرے کمرے سے چلا گیا اور میں عبداللہ کی رضامندی کی صورت میں آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

اس پروگرام میں وقت کی بہت اہمیت تھی۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ سینٹ انطوئین میں بجلی فیل ہونے کی صورت میں بجلی کی فراہمی کا متبادل انتظام تھا اور میری کامیابی کا سارا انحصار میری پھرتی پر تھا کہ میں متبادل نظام سے فراہمی بحال ہونے سے قبل اپنا کام پورا کر لیتا ورنہ بن حیان کا کمرہ میرے لئے بھی پہلے دن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

اسی اثنا میں ایملی بھی آ پہنچی اور میدان صاف پا کر آتے ہی بولی "کچھ سنا تم نے؟"

"میں تو صرف تم ہی سے سنتا آ رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اس فلور پر دو وی آئی پی اور آ گئے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال بھی براہ راست ڈیوٹی ڈاکٹر کریں گے۔" وہ اس طرح بولی جیسے اسے ان انتظامات میں تبدیلی کا اختیار ہو۔

"کن کمروں میں آئے ہیں؟"

"اسی کے سامنے بائیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "پتہ نہیں ہمارے چیف کو کیا ہو گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی میرا ذہن دور تک چلا گیا۔ وہ بولتی رہی مگر میں مزید ایک لفظ بھی نہ سن سکا۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ بن حیان کے سرپرست آخر کار مریضوں کی صورت میں اپنے دو آدمی بن حیان کی حفاظت کے لئے ہسپتال میں پہنچانے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے۔

ایملی کی لائی ہوئی اس خبر نے پورا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک زخمی اور نیم جان دشمن کے علاوہ اب مجھے دو اور حریفوں کا بھی سامنا تھا جو میری دانست میں نہ صرف صحت مند بلکہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔ میرے مقابلے میں نہ صرف افرادی طاقت بلکہ اسلحہ کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

ایملی کے الفاظ آخر کار درست ثابت ہو رہے تھے۔ اسرائیلی سفیر کا بس چل گیا تھا اور سینٹ انطوئین ہسپتال کسی بھی لمحے میدانِ جنگ میں تبدیل ہو سکتا تھا۔

نرس ایملی

نہ جانے کیا کیا کہتی رہی مگر میرا ذہن اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سینٹ انطوئین ہسپتال میں بن حیان کو بسترِ علالت پر موت کے گھاٹ اتارنے کا آسان منصوبہ تعطل کا شکار ہوتا نظر آ رہا تھا۔

قدرت نے اس ہسپتال میں ایملی کی صورت میں میرے لئے ایک مددگار پیدا کر دیا تھا جس کے ذریعے مجھے باہر کی تازہ ترین اور رازدارانہ خبریں مل رہی تھیں ورنہ بن حیان کو خصوصی درجہ ملنے کے بعد اس عمارت کی دوسری منزل پر عملاً کرفیو کا نفاذ عمل میں آ چکا تھا اور کسی مریض کی مجال نہیں تھی کہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا۔

ایک طرف وہ سخت رویہ تھا اور دوسری طرف بن حیان کے کمرے کے دونوں طرف دو ایسے مریض لائے گئے تھے۔ جن کے مرض کی نوعیت تک کا کسی کو علم نہیں تھا اور بن حیان کی طرح ان دونوں کی دیکھ بھال کلی طور پر دوسری منزل پر متعین ڈیوٹی ڈاکٹر کے ذمے تھی۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ بن حیان کے سرپرستوں نے اس کی حفاظت کے لئے بالکل وہی حکمتِ عملی اختیار کی تھی جو اسے ٹھکانے لگانے کے لئے میں نے اپنائی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان لوگوں کو ہسپتال کے اعلیٰ انتظامی عملے کا تعاون حاصل تھا اور میں بڑی مشکل سے بیماری کی اداکاری کرنے کے بعد اس عمارت میں داخل ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ اور اس کامیابی کی قیمت کے طور پر اپنے ایک عدد ناگہانی آپریشن کے پروانے پر پیشگی دستخط کرنے پڑے تھے۔

ایملی کو بے شک ان دو نئے مریضوں پر شبہ نہ ہوا ہو گا لیکن میں اس کی زبانی سینٹ انطوئین ہسپتال کی قدیم روایات سے باخبر ہو چکا تھا۔ جن سے بمشکل انحراف کرتے ہوئے ابراہام جوناس یا بن حیان کو خصوصی مراعات دی گئی تھیں اور پھر اس کے ہسپتال پہنچتے ہی مزید دو ایسے پُراسرار مریض وہاں لائے جا چکے تھے جن تک کسی کی رسائی نہیں تھی۔

نئے پُراسرار مریضوں اور بن حیان کے درمیان تعلق قائم کر لینے کے بعد یہ مفروضہ خود فریبی ہی ہوتا کہ وہ دونوں غیر مسلح ہوں گے۔

میرے اندازے کے مطابق عذرا جوناس کو اپنی غیر موجودگی میں پیش آنے والے ان خونریز واقعات کا علم ہو چکا تھا جو جوناس ولا کے حملے اور اس کے اطراف میں پیش آئے تھے اور اس کے بعد نیس سے پیرس پہنچتے ہی ان دونوں بھائیوں کی گاڑیوں کے ٹائر ناکارہ کر کے ایئر پورٹ سے ان کی روانگی میں تاخیر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی اور جب وہ پستول کی زد پر ایک کار کو ڈرائیور سمیت اغوا کر کے ایئر پورٹ سے فرار ہونے لگے۔ تو کسی سمت سے چلائی ہوئی ایک نادیدہ گولی نے ابراہام جوناس کو بری طرح زخمی کر ڈالا۔

ان کڑیوں کو ملانے کے بعد عذرا جوناس کی جگہ اگر کوئی احمق بھی ہوتا تو یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ پیرس میں اس کے جو دشمن موجود تھے وہ حملے سے زیادہ بے خوف اور دلیر تھے اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ہر حفاظتی حصار کو توڑنے کے اہل تھے اس خطرے کے پیشِ نظر سینٹ انطوئین ہسپتال کے خصوصی انتظامات بھی بن حیان کی حفاظت کے لئے ناکافی سمجھے گئے اور ان لوگوں نے اسرائیلی سفیر کے رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے جس طرح ہسپتال میں مورچہ بندی کی تھی اس کی وجہ سے طاقت کا توازن ان کے حق میں ہو گیا تھا اور مجھے غالب امکان نظر آنے لگا تھا کہ شاید میں ایک بے سود آپریشن کے لئے ہسپتال پہنچا تھا اور ابراہام جوناس کسی چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ آتے آتے ایک بار پھر پھسل کر انسانوں کے بیکراں سمندر میں کہیں روپوش ہونے والا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" مجھے ذہنی طور پر غیر حاضر پا کر ایملی نے مجھے شانے سے جھنجھوڑا۔

"میں بنیادی طور پر امن پسند طبیعت کا مالک ہوں ایملی۔" میں نے نحیف آواز میں کہا۔ "تم نے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چل رہا ہے کہ اس ہسپتال کی دوسری منزل پر کسی بھی وقت گولیاں چلنے لگیں گی۔ اور میں بے موت مارا جاؤں گا۔"

"امن پسندی!" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ "یہ تو صریحاً بزدلی ہے۔"

"میرے لئے ایسا ناشائستہ لفظ استعمال نہ کرو۔" میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ "میں اپنڈکس جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوں.....۔"

"بس بس! رہنے دو۔" وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے میری بات کاٹ کر بولی۔ "جدید طبی سائنس میں اپنڈکس کوئی قابلِ ذکر مرض نہیں ہے مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ تم نے آپریشن کے خوف سے اپنے مرض کو اس درجے پر پہنچایا ہے۔"

"اپنڈکس کی تکلیف تو آہستہ آہستہ مندمل ہوتی جا رہی ہے مگر میری موت شاید اسی ہسپتال میں کسی گولی سے لکھی ہے۔" اس کی بھرپور ہمدردی حاصل کرنے کے لئے میں نے خود پر آخری درجے کی قنوطیت طاری کر لی۔

"اول تو ہسپتال میں ایسے ہنگامے کا خیال ہی لغو اور بے ہودہ ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "اور اگر تم مرد ہو کر بھی کسی خطرے سے اپنا دفاع نہیں کر سکتے تو میں تمہاری حفاظت کروں گی۔"

"تم!" میں تھکے ہوئے انداز میں آہستہ سے ہنس دیا۔ "تمہارے نازک سراپا کو تو خود کسی محبوب کی مضبوط باہوں کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

میری باتوں پر اس کا ردِ عمل میری توقع کے عین مطابق تھا اور میں غیر محسوس طریقے پر اسے بتدریج اپنی مرضی کے موضوع پر لانا چاہتا تھا۔

"بتاؤ..... بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

"نہیں ــــ تم کچھ نہیں کر سکو گی۔" میں نے قدرے توقف کے بعد مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ "تمہاری تو ان کمروں تک رسائی بھی نہیں ہے!"

"پھر بھی پتہ تو چلے کہ تم کیا سوچ رہے ہو!"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ دونوں واقعی مریض ہیں یا اداکاری کر رہے ہیں۔؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔
"مریض نہ ہوتے تو یہاں داخلہ کیسے ملتا؟" وہ ہنس کر بولی۔ "اس ہسپتال کے ڈاکٹر اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔"
"ہو سکتا ہے کہ وہ ڈاکٹروں کو اپنے بیمار ہونے کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر وہ اسرائیلی سفیر کی معرفت ہسپتال کے چیف تک پہنچے ہوں گے تو ان کے معائنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی ہوگی۔ تاکہ وہ پانچ نمبر کی حفاظت کر سکیں۔"
"مگر یہ معلوم کر کے تم کیا کرو گے؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔
"میں یہ فلور چھوڑ دوں گا یا مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ اس منزل پر مسلط کئے ہوئے گھٹن آمیز ماحول میں کوئی ہنگامہ پروان نہیں چڑھ رہا ہے۔"
"تم تو یوں پریشان ہو رہے ہو جیسے پانچ نمبر والا اور اس کے مددگار تمہارے خاص دشمن ہوں آخر اس منزل پر اور مریض بھی تو ہیں؟"
"وہ بے خبری کی وجہ سے مطمئن ہیں مگر تم نے پل پل کی خبریں سنا کر میرا سکون چھین لیا ہے۔" میں نے اسی کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ اس منزل پر کسی بھی وقت اندھا دھند مار دھاڑ شروع ہو سکتی ہے۔"
"کیا احمقانہ خیال ہے۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ "تم اپنی ننھی سی جان ہلکان مت کرو، میں ان دونوں کا بندوبست کر لوں گی۔"
"تم میں واقعی ان سے نمٹنے کی صلاحیت ہے۔" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ مسکرا کر انہیں آنکھ مارو گی تو بے چارے خود ہی ادھ موئے ہو جائیں گے۔"
وہ چند ثانیوں تک دانت پیستے ہوئے مجھے گھورتی رہی پھر سر جھٹک کر بولی۔ "ان کے لئے ڈاکٹر لیونورا خود دوا لے جائے گی، میں ڈسپنسر سے کہہ کر اس میں خواب آور دوا ملوا دوں گی۔ اور وہ ساری رات گھوڑے بیچ کر سوتے رہیں گے۔"
"ترکیب تو اچھی ہے لیکن سیال کے بجائے کیپسول وغیرہ دینا پڑا تو کیا ہوگا۔"
"وہ سب ایک ہی بات ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔ "کیپسول خالی کر کے اس میں کسی خواب آور گولی کو سفوف بنا کر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔"
"اور ڈسپنسر تمہاری بات مان لے گا؟"
"میں اسے زہر دینے کو نہیں کہوں گی۔" ایملی نے کہا۔ "خواب آور دوا سے مریض کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا مگر ڈاکٹر لیونورا اپنے خاص مریضوں کی گہری نیند سے پریشان ضرور ہو جائے گی اور اس وقت ہسپتال کے عملے کا ہر فرد اسے پریشان کرنے کے موقع کی تلاش میں ہے۔"
"خیر وہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔" میں نے لاپرواہانہ لہجے میں کہا "ان سے جو سلوک چاہو کرو میری تو اب یہی دعا ہے کہ یا تو پانچ نمبر والا جلدی صحت یاب ہو کر یہاں سے دفع ہو یا چند گھنٹوں میں میرے درد میں اتنی کمی آ جائے کہ میں اس قید خانے سے نکل سکوں۔"
"تم اپنڈکس کے آپریشن کے لئے داخل کئے گئے ہو!" وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔
"میرے بجائے آپریشن تم کرا لینا میرے لئے اتنا ہی کافی ہے!"
"میری موجودگی بھی تمہارے لئے اہمیت نہیں رکھتی؟"
"رکھتی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "مگر تم سے تو میں ہسپتال کے باہر بھی مل سکتا ہوں۔ یہاں تو تم ہر وقت میری ورم زدہ فاضل آنت کے پھٹنے کا خدشہ ظاہر کر کے راشننگ افسر کا کام سرانجام دینے لگتی ہو۔"
راشننگ افسر کا خطاب سن کر اس نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور میری ناک اپنی چٹکی سے دبا کر کمرے سے چلی گئی۔
میں بستر پر دراز ہو کر اپنی ناک سہلاتے ہوئے آنے والی رات کے بارے میں سوچنے لگا اسی اثنا میں راڈرک واپس آ گیا۔
اس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی بنا کر انگوٹھا فضا میں بلند کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ عبداللہ سے میرے منصوبے کی توثیق کرا لایا تھا۔
"آج رات سارا کام تمہاری مرضی کے مطابق انجام پائے گا۔" وہ میرے بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی سنبھالتے ہوئے رازدارانہ لہجہ میں بولا۔ "تمہارے جانے کے بعد کچھ نئی خبریں ملی ہیں۔"
میرے لہجہ کی سنجیدگی نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ "کیسی خبریں؟ خیریت تو ہے؟"
"ابراہم جوناس کے دو تندرست محافظ بیماروں کے بھیس میں ہسپتال میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب مقابلہ ذرا سخت ہو گیا ہے!"
"یہ ہونا تھا، مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر اضطراری انداز میں بولا "میں نے عبداللہ کو منع کیا تھا کہ بن حیان کے خاتمے سے پہلے عذرا جوناس کو نہ چھیڑے مگر وہ نہ مانا اور اب تم نے میرے شبہات کی تصدیق کر دی ہے۔"
"یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" میں نے ترش لہجے میں سوال کیا "کیا عذرا کے معاملے میں عبداللہ نے کوئی قدم اٹھایا ہے!"
"اگر تم ہسپتال کے بدلے ہوئے حالات کا ذکر نہ کرتے تو شاید اب بھی میں تمہیں کچھ نہ بتاتا۔" وہ مدھم آواز میں بولا۔ "آج صبح ایک شاہراہ پر عذرا جوناس کی کار پر آتش گیر بموں سے حملہ کیا گیا تھا اور اس کی کار شعلوں کے ونڈ تے ہوئے الاؤ میں تبدیل ہو کر ایک میڈیکل اسٹور میں جا گھسی۔ یہ سب اسی کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔"

"عذرا کا کیا ہوا؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔
"ہونا کیا تھا" وہ منہ بنا کر بولا "اس کی تو لاش بھی جل کر بری طرح مسخ ہو گئی مگر عبداللہ نے چھوٹا شکار مار کر بڑے شکار کو دشوار تر بنا دیا ہے!"
"شاید عذرا کی موت کے بعد ہی وہ دونوں آدمی یہاں داخل ہو گئے ہیں۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا "اس کا مارا جانا بھی ضروری تھا میرا خیال ہے کہ عذرا کی موت سے میرے کام پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا، بس ذرا احتیاط کرنی پڑے گی۔"
"اثر نہیں پڑے گا؟" راڈرک نے حیرت سے دہرایا۔ "ارے بندۂ خدا! وہ مٹی کے پتلے نہیں ہیں۔ اب تمہیں ابراہام کے علاوہ اس کے دو محافظوں سے بھی نمٹنا ہوگا۔"
"وہ میرا کام ہے" میں نے ناگواری سے کہا۔ مجھے عبداللہ کے بارے میں راڈرک کا تنقیدی لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔
"یہ تو بتاؤ کہ بن حیان کے بارے میں یہ تمام خبریں تمہیں کیسے مل رہی ہیں؟" راڈرک نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد چونک کر سوال کیا۔
"ایک نرس سے دوستی ہو گئی ہے۔" میں نے اپنے ذہن سے تلخی جھٹکنے کی کوشش میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "ورنہ مجھے ان باتوں کی ہوا بھی نہ لگتی۔"
"تم ایک مرتبہ پھر غور کر لو۔" وہ بولا۔ "عبداللہ ابھی ریمبراں میں ہی موجود ہے، میں اسے نئے حالات سے آگاہ کر سکتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس وقت ہسپتال کے باہر بھی مسلح افراد کی کثیر تعداد کسی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے تیار ہوگی۔"
"مجھے بس ایک اندیشہ ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس کا عذرا جوناس کی موت سے کوئی تعلق نہیں ہے!"
"وہ کیا؟" اس نے کرسی میرے بستر کے قریب کھسکا لی۔
"کہیں اس ہسپتال میں بجلی کی فراہمی کا متبادل انتظام موجود نہ ہو، اگر میرے فارغ ہونے سے پہلے ایمرجنسی جنریٹر چل پڑا تو میں رنگے ہاتھوں دھر لیا جاؤں گا۔"
"اس ہسپتال میں ایمرجنسی جنریٹر موجود ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "عبداللہ بتا رہا تھا کہ اسے برقی نظام کو ناکارہ بنانے کے لئے ہسپتال کے عقبی احاطے میں لگے ہوئے ڈیزل جنریٹر کو بھی اپنے دائرۂ کار میں شامل کرنا ہوگا۔"
"وہ واقعی بہت ہوشیار آدمی ہے۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "عجلت کے باوجود ہر معاملے کی جزئیات پر بھی نگاہ رکھتا ہے! ملعون پھر......!"
راڈرک کا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ ایملی میرے لئے پھلوں کے رس کا گلاس لے آئی تھی۔
"یہ میرا دوست راڈرک ہے!" میں نے ایملی سے کہا اور پھر راڈرک سے مخاطب ہو کر بولا "اور میں تم سے اسی خوش اخلاق خاتون کا ذکر کر رہا تھا۔"
ایملی نے تیکھی نظروں سے راڈرک کے حلیہ کا جائزہ لیا، پھر میری طرف دیکھا اور روکھے انداز میں سر کو خفیف سی جنبش دے کر میرے قریب آ گئی۔
"تمہارے رویے کی وجہ سے ہیف کافی افاقہ محسوس کر رہا ہے۔" راڈرک نے کرسی سے اٹھ کر خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔
"میں صرف اپنے مریضوں سے دوستانہ رویہ رکھنے کی عادی ہوں۔" ایملی نے پلٹ کر خشک لہجہ میں کہا اور راڈرک کے لبوں پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ فوراً ہی تحلیل ہو گئی مگر عورتوں کے معاملہ میں وہ انتہائی ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا، اس نے ہتھیار نہ ڈالے اور سنجیدگی سے بولا۔
"تم جیسے تیماردار میسر ہوں تو اچھے خاصے صحت مند آدمیوں کو مریضوں کے مقدر پر رشک آنے لگتا ہے۔ اجازت ہو تو میں بھی ہسپتال میں داخلہ لے لوں۔"
"دماغی خلل کے مریضوں کو یہاں داخلہ نہیں دیا جاتا۔" ایملی نے پلٹ کر جواب دیا اور خالی گلاس لے کر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اس کے برجستہ جواب پر راڈرک ہونٹ چاٹتا رہ گیا۔
"سالی بڑی منہ پھٹ ہے۔" راڈرک تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر گرتے ہوئے بولا۔
"منہ پھٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چھوڑ بیٹھتی ہے۔" میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ "کم از کم اس وقت تو سنجیدگی اختیار کر لو، ہم لوگ خاصی مشکل صورتحال سے دوچار ہیں۔"
"یعنی آج رات کا پروگرام اٹل ہے؟" اس نے سوال کیا۔
"ہاں۔۔۔ اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اگر اسرائیلی سفارت خانہ عذرا کی موت کے بعد اس ہسپتال کے چیف کو دو مصنوعی مریضوں کے داخلے پر مجبور کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ جلد ہی بن حیان کو یہاں سے لے جانے کی کوشش نہ کریں۔"
"تو پھر میں چلتا ہوں۔" وہ طویل سانس لے کر اٹھ گیا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ ٹھیک پونے دس بجے اپنی کارروائی شروع کر دیں اگر اس میں کوئی تاخیر ہو تو سمجھ لینا کہ کوئی ناگزیر مجبوری پیش آ گئی ہے!"
"اور اگر تم ملاقات کا وقت ختم ہونے پر واپس جانے کے بجائے میرے کمرے سے ملحق باتھ روم میں چھپ جاؤ تو کیسا رہے گا۔" میں نے فوری خیال کے تحت کہا۔
"تجویز معقول ہے مگر اس ہسپتال میں اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔" اس نے مایوسانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے جیب سے زرد رنگ کا ایک مطبوعہ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔
"یہ کیا ہے؟" میں نے فرنیچر میں چھپے ہوئے اس کارڈ کو دیکھتے

ہوئے سوال کیا۔ جس پر عبارت کے پس منظر میں پھیکی سیاہی سے پینتالیس نمبر چھپا ہوا تھا۔

"ملاقاتیوں کے لئے اس ہسپتال میں بہت سخت انتظام ہے۔" وہ بولا "استقبالیہ کاؤنٹر والے ملاقات کا وقت شروع ہونے پر بھی کسی کمرے کے لئے بیک وقت تین سے زیادہ ملاقاتی نہیں چھوڑتے اور اس کارڈ کے بغیر کوئی ملاقاتی بھی اندر نہیں گھس سکتا۔ جاتے ہوئے یہ کارڈ کاؤنٹر پر واپس دینا ہوتا ہے اگر میرا کارڈ واپس نہیں پہنچا تو ملاقات کا وقت ختم ہونے پر انہیں با آسانی پتہ چل جائے گا کہ پینتالیس نمبر کمرے میں آنے والا ایک مہمان اندر ہی موجود ہے اور پھر فوراً ہی میری تلاش شروع کر دی جائے گی۔"

"یہ تو اچھا خاصا قید خانہ ہے۔" میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ اس ہسپتال کا چیف یہاں آنے سے پہلے جنگی قیدیوں کے کسی کیمپ کا نگراں ضرور رہا ہوگا۔"

"مجھے افسوس ہے دوست کہ میں تمہیں خطرناک صورتحال میں تنہا چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" وہ یک بیک اداس ہو گیا۔ "اگر میرے بس میں ہوتا تو تمہیں باہر بھیج کر خود بستر سنبھال لیتا۔"

"میں موت سے نہیں ڈرتا راڈرک!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "دو آدمی زیادہ سرعت سے کام پورا کر سکتے ہیں ویسے تو میں تنہا بھی اپنا کام کر سکوں گا۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا اور میں نے بستر پہ دراز ہو کر نئی سگریٹ سلگائی۔

بن حیان کے ساتھ میرے آخری معرکے کے سنسنی خیز لمحات لحظہ بلحظہ قریب تر آتے جا رہے تھے اور میں خود اپنے وجود میں اعصابی کشیدگی کی ابتدا محسوس کر رہا تھا۔

سسٹر ایملی میری حکمتِ عملی کے تحت ڈاکٹر لیونورا کو پریشان کرنے کے لئے بن حیان کے دونوں محافظوں کو خواب آور دوا دینے کا ارادہ کر چکی تھی مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ خونخوار و مکار محافظ ایملی کی چال کا شکار ہو سکیں گے۔

میرا ذہن مسلسل سوچ بچار میں ڈوبا ہوا تھا کہ کمرے کی کسی دیوار میں پوشیدہ اسپیکر پر ایک نرم سی نسوانی آواز ابھری۔ چند منٹ تک فرنچ میں اعلان کرنے کے بعد اس نے انگریزی میں اپنی بات دہرائی تو مجھے پتہ چلا کہ مریضوں کی عیادت کا وقت ختم ہو چکا تھا اور وہ ملاقاتیوں سے فوری طور پہ واپسی کی درخواست نشر کر رہی تھی۔

وہ اعلان سن کر نہ جانے کیوں میرا ذہن پچھلی رات کے واقعے میں الجھ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا وہ خواب نہیں تھا بلکہ خواب آور دوا کے حقیقی اثرات کے تحت میرے جاگتے ہوئے کوئی نامعلوم شخص چوروں کی طرح دبے قدموں میرے کمرے میں داخل ہوا تھا اور پھر میں اپنی گردن پر اس کے ہاتھ کا نامانوس لمس محسوس کر کے بیہوش ہو گیا تھا۔

اس سلسلے میں جب میں نے ایملی سے دریافت کیا تو اس نے کمرے میں آمد سے صاف انکار کر دیا تھا اس کے علاوہ کوئی اور شخصیت میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ آنے والا اس قدر پراسرار طریقے پر میرے کمرے میں داخل ہو کر مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر واپس چلا گیا تھا کہ میں اسے نہ دوست سمجھ سکتا تھا اور نہ ہی دشمن!

جب میرا ذہن اس مسئلے پہ غور کرتے کرتے تھک گیا تو میں نے یہ فرض کرنے میں ہی عافیت سمجھی کہ آنے والا رات کا ڈیوٹی ڈاکٹر رہا ہوگا جو شاید ضرورت سے زیادہ فرض شناس تھا اور اسی وجہ سے دبے قدموں اندر آیا۔ اور مجھے بظاہر خوابیدہ دیکھ کر واپس چلا گیا۔

اس مفروضے کا سہارا لینے سے مجھے کافی ذہنی سکون میسر آیا اور میں چند گھنٹوں بعد درپیش مہم کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔

زہریلی سوئیاں پھینکنے والا ہتھیار میرے پاس موجود تھا مگر مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ اس میں مزید سوئیاں باقی تھیں یا اس ترکش کا ہر تیر استعمال کیا جا چکا تھا۔ ہسپتال میں اندھیرا پھیلنے کے بعد وہی آلہ میرا پہلا اور مؤثر ترین ہتھیار بنتا۔ اس کے خراب ہونے کی صورت میں راڈرک کا لایا ہوا پستول اپنے فاضل راؤنڈز سمیت میرے کام آتا اور دو دھاری دھار والا چاقو اس سنسنی خیز معرکے میں میرا آخری ہتھیار تھا۔

راڈرک کا لایا ہوا پستول میں نہیں دیکھ سکا تھا اور نہ راڈرک نے اس کے بارے میں کچھ بتایا تھا مگر اس کے لائے ہوئے گلدستے کے وزن سے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ یقیناً بڑے بور کا کوئی خوفناک پستول ہوگا۔

سرکتے سرکتے میری رسٹ واچ کی سوئیاں ساڑھے آٹھ بجانے لگی تھیں اور میرے وجود پہ ناقابلِ بیان اضطراب طاری ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گلدستے کے نچلے حصے کو کرید کر اندر ہاتھ ڈالا تو میری انگلیاں سرد لوہے سے ٹکرائیں اور میرا ہاتھ باہر آیا تو سیاہ رنگ کا لمبی نال والا ایک مہیب پستول میرے ہاتھ میں آ چکا تھا جو اس سے پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

پستول باہر آ جانے کے باوجود گلدستے کی بناوٹ یا سائز پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں نے پستول اپنی قمیص کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا اور گلدستے کو اس کی جگہ رکھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ تاکہ کسی کی دخل اندازی کے بغیر اس کا جائزہ لے سکوں۔

وہ جاپانی ساخت کا بیس یا تیس پستول تھا جو یکے بعد دیگرے مسلسل نو گولیاں چلا سکتا تھا۔ اس کا چیمبر بھرا ہوا تھا۔ اور صرف سیفٹی کیچ ہٹا کر فائر کیا جا سکتا تھا۔ جدید ساخت کے اس پستول کے سائز وغیرہ کو دیکھنے کے بعد میرا اندازہ تھا کہ اس سے چلائی ہوئی گولی با آسانی دو انسانوں کے جسموں سے آر پار نکل جانے کی قوت رکھتی ہوگی۔

پستول بیلٹ میں اڑس کر میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو یک بیک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ڈاکٹر لیونورا ایملی کے ساتھ کمرے میں میرا انتظار

کر رہی تھی اس کا چہرہ میری ہی جانب تھا اور اس پہ بیزاری کی علامات نمایاں تھیں۔

مجھے لیونورا کی صورت دیکھتے ہی یاد آ گیا کہ وہ اس کے آخری معائنے کا وقت تھا۔ پچھلے روز بھی وہ کم و بیش اسی وقت آ کر میرا تفصیلی معائنہ کر کے فائل میں اپنی رپورٹ درج کر چکی تھی۔ اور اس معائنے کے سلسلے میں وہ حسبِ معمول میرے پورے بدن کو قصاب کی سی بے رحمی سے ٹٹولتی جس کے نتیجے میں میری بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول اس کی نظروں میں آ جاتا۔

میں نے باتھ روم کے دروازے پہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر اپنی حکمتِ عملی کے بارے میں فیصلہ کیا اور قدرے لنگڑاتا ہوا بستر پہ جا کر بیٹھ گیا۔

"لیٹ جاؤ مسٹر سیف!" ایملی نے چند سیکنڈ کے توقف کے بعد کہا۔

"کس لئے؟" میں نے جارحانہ لہجے میں سوال کیا۔

"ڈاکٹر تمہارا معائنہ کرے گی۔" ایملی میری غیر متوقع بد دماغی پر بوکھلا گئی۔

"کیا میں تمہیں لومڑی نظر آتا ہوں؟" میں نے مضحکانہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" ڈاکٹر لیونورا پیر پٹخ کر درشت لہجے میں غرائی "معلوم ہوتا ہے کہ اپنڈکس کے ساتھ تمہارا دماغ بھی خراب ہو گیا ہے!"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"تت..... تم۔" ڈاکٹر لیونورا غصے کی شدت سے ہکلانے لگی۔ "اگر تم نے اسی وقت اپنی بدتمیزی پر معافی نہ مانگی تو بہت برا ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اپنے لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "آپریشن کے وقت تم فاضل آنت کے ساتھ میرے گردے بھی نکلوا کر ڈسٹ بن میں پھنکوا دو گی۔"

"شٹ اپ!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں چیخی اور پیر پٹختی ہوئی میرے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

"یہ تم نے کیا کر دیا۔" ایملی بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی اس کے حسین چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں "وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔"

"تو تم یہاں کیا کر رہی ہو۔" میں اس کا بازو پکڑ کر اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا "جلدی سے جا کر اسے سنبھالو، میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔"

"میں اسے سمجھاتی ہوں، خدا کے لئے اس سے معافی مانگ لینا، ورنہ تمہیں فوری طور پر ڈسچارج کرانے کے ساتھ ہی وہ مجھے بھی معطل کرا دے گی۔"

"یہاں سے تو جاؤ، اگر بات پھیل گئی تو شاید میری معافی بھی کام نہ آ سکے۔"

ایملی تیزی کے ساتھ میرے کمرے سے چلی گئی اور میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ پستول دوبارہ گلدستے میں چھپا دیا اور آرام سے بستر پہ دراز ہو گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد ایملی واپس آئی۔ اس کے بشرے سے اکتاہٹ عیاں تھی۔

"تم نے اس کے ساتھ آج بہت زیادتی کی ہے وہ اپنے دفتر میں بیٹھی آنسوؤں سے رو رہی تھی۔" اس نے قریب آ کر کہا۔

"اسے لے آؤ، میں خلوصِ دل سے معافی مانگ لوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بعد میں مجھے خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے۔"

"وہ اب یہاں نہیں آئے گی، تمہیں ڈیوٹی ڈاکٹر کے کمرے میں جانا پڑے گا۔"

"میرا درد آہستہ آہستہ پھر بڑھ رہا ہے ملیانہ ہو کہ واپسی میں اسٹریچر پر ڈالنے کی نوبت آ جائے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند ثانیوں تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی "اچھا تو میں کوشش کرتی ہوں، اگر وہ یہاں آنے پر رضامند نہ ہوئی تو تم ہی کو چلنا ہوگا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایملی خاصی جتن کر کے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر لیونورا کو میرے کمرے میں لے ہی آئی۔ میں اسے دیکھتے ہی بستر سے اٹھ گیا اور نہایت مؤدب انداز میں اس سے اپنے نامناسب رویے پر معذرت کی جسے اس نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ تکلیف کے باعث میں نے اس سے تلخ کلامی کی تھی ورنہ وہ میرے لئے ہر اعتبار سے محترم تھی۔

معافی تلافی کے بعد لیونورا خاصی دیر میرے پاس رکی رہی اور اس نے نہایت توجہ سے میرا جائزہ لیا۔ وہ میرے کمرے میں آئی تو اس کی پلکوں میں آنسوؤں کی نمی باقی تھی۔ اور ناک کا سرا ابھی سرخ ہو رہا تھا مگر جاتے ہوئے اس کے بشرے پر خود اعتمادی بحال ہو چکی تھی اور میں اس بددماغ عورت سے معافی مانگ لینے کے باوجود مسرور تھا کہ اس بہانے ایک ناگزیر حادثہ وقوع پذیر ہوتے ہوتے ٹل گیا تھا۔

مجھے امید تھی کہ ایملی بعد میں میرے پاس آئے گی مگر وہ نہ آئی اور جب ساڑھے نو بج گئے تو میں نے اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔

جوں جوں کارروائی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا میری تشویش میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سب سے اہم بات جس پر میں نے غور نہیں کیا تھا وہ یہ تھی کہ میں نے بن حیان کا کمرہ نہیں دیکھا تھا صرف اس کا نمبر معلوم تھا۔ اور ہسپتال میں مکمل اندھیرا پھیل جانے کے بعد کسی کمرے کا نمبر دیکھنا ممکن نہیں تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اندھیرا ہوتے ہی مجھے دوڑ کر راہداری کے آخری سرے پر پہنچنا تھا اور پھر واپس لوٹتے وقت داہنے ہاتھ پر تیسرے دروازے میں گھسنا تھا۔ جدید طاق نمبر کے تمام کمرے ایک دوسرے سے ملحق تھے

اور پھر ایک نئے اندیشے نے مجھے مضطرب کر دیا۔ اگر راہداری کی اس قطار میں آخری سرے پہ کوئی اسٹور وغیرہ تھا تو اس صورت میں پانچویں کمرے کے بجائے غلطی سے تیسرے کمرے میں گھس سکتا تھا اور اگر میں اسٹور کی رعایت سے چوتھے دروازے پر قسمت آزمائی کرتا اور اسٹور کا مفروضہ غلط ثابت ہوتا تو میری مڈبھیڑ ساتویں کمرے کے مریض سے ہو جاتی اور دھماکے ہی کرے

بن حیان کے محافظوں کے تصرف میں تھے۔

ایملی نے گو تیسرے اور ساتویں کمرے کے مریضوں کو دوا میں خواب آور دوا کی آمیزش کرکے بیہوش کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا مگر میں اس پر زیادہ انحصار نہیں کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر لیونارڈ کے ساتھ میری غیر متوقع مڈبھیڑ کے بعد اس کے لئے ایملی کا رویہ قدرے ہمدردانہ ہو گیا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ ایملی اس کی ذہنی پراگندگی پر رحم کھا کر اپنا منصوبہ اگلے روز کے لئے ملتوی نہ کردے۔ اس مرحلہ پر مجھے ایملی کی تھوڑی سی مدد درکار تھی تاکہ اسے شبہ کا موقع دیئے بغیر میں اس سے پانچویں کمرے کا صحیح محل وقوع معلوم کرسکوں۔

میں نے ایملی کو بلانے کا اضطراری فیصلہ کرکے جیسے ہی گھنٹی کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا، ہسپتال کی عمارت ایک ہلکے سے دھماکے سے گونج اٹھی اور دھماکے کے ساتھ ہی میرا کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے بستر چھوڑ دیا اور اندھیرے میں ٹٹول کر گلدستے میں سے پستول نکال لیا، پھر گدے کے نیچے سے سگریٹ کے خالی پیکٹوں میں بھرے ہوئے فاضل راؤنڈز، چاقو اور زہریلے تیر پھینکنے والا ہتھیار جیبوں میں ڈال کر باہر راہداری میں نکل آیا جو گھور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور فضا میں بہت سی خوفزدہ ملی جلی آوازیں گونج رہی تھیں۔

تاریکی میں حرکت کرتے ہوئے تاریک تر انسانی ہیولوں کی زد سے بچ کر میں چند سیکنڈ تک اپنے کمرے کے دروازے پر ہی کھڑا رہا مگر فضا میں ابھرنے والی سرگوشیوں سے کوئی مطلب اخذ نہ کرسکا کیونکہ وہ سب ہی انگریزی کے علاوہ دوسری یورپی زبانیں استعمال کر رہے تھے۔

میں باہر کے حالات سے مطلق بے خبر تھا مگر مجھے یہ اندازہ ضرور تھا کہ عبداللہ یا اس کے ساتھیوں نے کسی ناگزیر مجبوری کے تحت ہی اپنی کارروائی مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے کی ہوگی اور شاید اس ہلکے دھماکے کے ذریعے ہنگامی طور پر بجلی کی متبادل فراہمی کے ذرائع کو ناکارہ بنا دیا گیا تھا۔

میں نے اپنے دروازے پر چند سیکنڈ کے جائزے کے بعد اپنی جگہ چھوڑ دی اور تیزی کے ساتھ لمبے لمبے قدم اٹھاتا طویل راہداری کے آخری سرے کی طرف بڑھنے لگا۔

ہسپتال کے عملے کو اپنے برقی نظام پر اتنا اعتماد تھا کہ اس طور پر شاید کسی کے پاس ٹارچ تک نہیں تھی البتہ کئی مقامات پر لوگ ماچس یا لائٹر روشن کرکے قرب و جوار کا جائزہ لیتے اور پھر فوراً ہی وہاں بھی اندھیرا پھیل جاتا۔ بیشتر مریض اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے اور ڈیوٹی اسٹاف کے کمرے کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔

میں اچانک ابھرنے والی ماچس وغیرہ کی روشنی سے اپنا چہرہ بچاتا ہوا ڈیوٹی اسٹاف کے کمرے کے سامنے سے بھی گزر گیا اور اس وقت میں نے ایک پنسل ٹارچ کی پتلی سی روشن لکیر کو گردش کرتے دیکھا جو شاید ڈاکٹر کے تصرف میں رہتی تھی۔

راہداری میں بہت گمبھیر اندھیرا پھیلا ہوا تھا مگر اس نصف منٹ کے عرصہ میں میری آنکھیں اس اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں اور مجھے دیوار اور دروازے کا فرق صاف نظر آرہا تھا۔

راہداری کے اختتام پر میں واپس پلٹا اور داہنے ہاتھ پر تیسرے دروازے سے تھوڑے فاصلے پر رک کر سگریٹ سلگانے لگا۔

ماچس کے شعلے کی روشنی میں یہ دیکھ کر مجھے پھریری آگئی کہ اس بند دروازے پر تین نمبر پڑا ہوا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس سمت کا آخری دروازہ کسی اسٹور وغیرہ کا تھا۔

تین نمبر کا دروازہ بند تھا اور وہاں باہر کوئی موجود نہیں تھا۔۔۔ اور سگریٹ سلگانے کے اس مختصر سے وقفے میں میں پانچویں اور ساتویں کمرے کا بھی جائزہ لے چکا تھا جو دونوں ہی بند اور ویران پڑے ہوئے تھے۔

سگریٹ سلگا کر میں نے دو گہرے کش لئے اور پھر سگریٹ کو فرش پر پھینک کر ایڑی سے مسل دیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ سگریٹ کے سلگتے ہوئے سرے کی بنا پر دور سے کوئی میری نقل و حرکت کا اندازہ کرسکے۔

میں پلٹ کر پانچویں کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اندر کی سن گن لیتے ہوئے زہریلے تیر برسانے والا ہتھیار داہنے ہاتھ میں لے لیا اور پستول جیب میں اس طرح رکھ لیا کہ ضرورت پڑتے ہی اسے فوراً نکال سکوں۔

اس کمرے میں گہرا سناٹا طاری تھا میں نے دروازے کے ہینڈل پر زور دے کر اسے گھمایا اور پٹ کو اندر دھکیل کر تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کرنے سے قبل میں نے وحشیانہ پھرتی سے اس تاریک کمرے کا جائزہ لیا اور پھر شدید حیرت کے عالم میں دروازہ بند کر دیا۔

میں نے دیا سلائی جلا کر بھی کمرے کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا سہری کا بے شکن سفید بستر بتا رہا تھا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے بھی وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

اس کمرے کی صورتحال واضح ہوتے ہی میرا دماغ چکرا کر رہ گیا بن حیان میری لاعلمی میں نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔

بستر کی حالت سے سب کچھ واضح تھا پھر بھی میں نے اپنے اطمینان کی خاطر باتھ روم بھی دیکھ ڈالا لیکن مکمل مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑا۔

اگر بن حیان اس ہسپتال سے جا چکا تھا تو اس کمرے کے برابر میں آنے والے دونوں پراسرار مریضوں کو بھی غائب ہونا چاہئے تھا اور اگر وہ دونوں موجود تھے تو بن حیان بھی اسی ہسپتال کے کسی محفوظ گوشے میں منتقل کیا جا چکا تھا۔

اس کمرے کا بستر شکن آلود ہوتا تو شاید میں یہ بھی فرض کر لیتا کہ بن حیان نازک صورتحال کے باوجود زخموں کی پرواہ کئے بغیر اندھیرا ہوتے ہی کمرے سے نکل گیا تاکہ راہداری میں عام مریضوں اور عملے میں مل کر بہتر طور پر خود کو محفوظ رکھ سکے مگر کمرے کے ماحول نے اس خود فریبی کا امکان بھی ختم کر دیا تھا۔

میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ہسپتال کے خطرناک صورتحال کا اندازہ لگاتے ہی بجلی کے بجائے روشنی کے دوسرے ذرائع بروئے کار لا سکتے تھے اور مجھے ہر قیمت پر اپنا کام اندھیرے میں ہی ختم کرنا تھا۔

باہر آکر میں نے برابر والے تین نمبر کمرے پر طبع آزمائی کی کوشش کا آغاز کر دیا جب بند دروازے سے کان لگانے کے باوجود مجھے اندر موت کا ہولناک سناٹا محسوس ہوا تو میں نے دروازے کے ہینڈل کو احتیاط سے گھمایا اور پھر حیرتناک طور پر دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میری حیرت اس وقت دور ہوئی جب کھلے ہوئے دروازے میں سے اندھیرے میں ایک ہاتھ تیزی سے باہر آیا اور پھر میرا گریبان پکڑ کر مجھے نہایت بے رحمی سے اندر گھسیٹ لیا گیا۔

وہ جو کوئی بھی تھا کسی سانڈ جیسی وحشیانہ قوت کا مالک تھا اور غالباً اندھیرا ہونے کے سبب سے ہی اندر دروازے کے پاس کھڑا کسی بن بلائے مہمان کا منتظر تھا۔

اس نے مجھے اندر کھینچ کر میرا گریبان چھوڑا تو شدید جھٹکے کے باعث میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط میں جا گرا اور اسی وقت میری نظر اس شخص پر پڑی جو ایک ٹارچ روشن کئے بستر پر دراز ایک مریض پر جھکا ہوا تھا۔

ٹارچ کی روشنی کا دائرہ حرکت کرکے جتنی دیر میں میرے چہرے تک آیا، میں اپنی بوکھلاہٹ کے باوجود اس اثنا میں کمرے کی خاصی جزئیات کا جائزہ لے چکا تھا۔

بستر پر پڑا ہوا شخص بالکل بے حس و حرکت تھا۔ میرے گرنے کی دھمک پر بھی اس کی حالت میں سرِ مو فرق نہیں آیا تھا اس کے سرہانے ایک چوبی یا آہنی اسٹینڈ سے خون کی تھیلی لٹکی ہوئی تھی۔ جس سے نکلنے والی پتلی سی نلی مریض پر پڑی ہوئی چادر میں چھپ گئی تھی اور شاید تیسرا شخص ٹارچ کی روشنی میں چادر کے نیچے اسی نلی کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہ ناگہانی طور پر میں اس کمرے کے وسط میں پھینک دیا گیا۔

میں فرش پر گرتے ہی پھرتی سے اٹھا۔ اس وقت تک مجھے کمرے میں گھسیٹنے والا دروازہ بند کرکے عقب سے میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔

وہ غراتے ہوئے مجھے دوبارہ دبوچنے کی نیت سے جھکا ہی تھا کہ میں نے داہنے ہاتھ کو جنبش دی اور محض اندازہ کرکے اپنی مٹھی میں دبی ہوئی شیشی کا سنہرا ڈھکنا دبا دیا۔ ایک خفیف سی سنسناہٹ ہوئی اور وہ شخص اپنی غضبناک غراہٹ پوری کئے بغیر سر کے بل فرش پر جھکتا ہی چلا گیا۔

ٹارچ والا سرعت سے پیش آنے والے واقعات کو شاید سمجھ ہی نہیں سکا تھا کیونکہ اس نے دھیمی مگر بھاری آواز میں مجھے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا تھا۔

اس کی ٹارچ کی روشنی مسلسل مجھ پر مرکوز تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ مجھے حکم عدولی پر آمادہ پاکر وہ بلا تامل فائر کر دے لہٰذا میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔

"داہنے ہاتھ میں جو کچھ ہے اسے نیچے پھینک دو۔ ورنہ میرا بے آواز ریوالور تمہیں جہنم واصل کر دے گا۔" اس نے اگلا حکم بھی انگریزی میں ہی دیا اور اس کے لہجے سے مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کوئی غیر مقامی تھا۔

"یہ میری دوائی کی شیشی ہے!" میں نے نحیف آواز میں کہا۔ "میں اندھیرے کے باعث غلطی سے اسے اپنا کمرہ سمجھ بیٹھا تھا۔"

"اس کی تلاشی لو جوئیل۔" اس نے کہا۔

دوسری طرف سکوت طاری رہا اور میں سانس روکے ٹارچ والے کے ردِ عمل کا انتظار کرتا رہا۔ جوئیل مجھ پر حملہ کرتے ہوئے اتنے غیر محسوس طریقے پر پوٹاشیم سائنائیڈ میں بھی ہوئی سوئی کا شکار ہوا تھا کہ شاید ٹارچ والا اسے ڈھیر ہوتے نہیں دیکھ سکا تھا۔

"تم کہاں ہو جوئیل؟" اعصاب شکن سکوت سے دہشت زدہ ہوکر اس نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا اور اسی کے ساتھ ٹارچ کی روشنی میرے وجود سے ہٹ کر جوئیل کی تلاش میں کمرے میں بھٹکنے لگی۔

اسی وقت ہسپتال کے باہر کی پُرسکوت فضا سب مشین گن کے ہولناک شور سے لرز اٹھی اور میں نے بھی روشنی کی زد سے محفوظ ہوتے ہی ٹارچ والے کی طرف زہریلی سوئی پھینکی جو فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث نشانے پر پہنچنے سے پہلے ہی اندھیرے میں کہیں گر گئی۔

ہسپتال کے احاطے میں خونریز فائرنگ کے آغاز سے ہسپتال کا اندرونی ماحول بُری طرح متاثر ہوا تھا۔ اور راہداری میں دہشت زدہ آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ میں اگر اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش کرتا تو ٹارچ والا جو کسی حد تک میری طرف بھی متوجہ تھا، کوئی کارروائی کرسکتا تھا۔ لہٰذا مجھے جو کچھ کرنا تھا اپنی جگہ چھوڑے بغیر کرنا تھا۔

میں نے پھرتی سے شیشی جیب میں ڈال کر اپنا مہیب پستول نکال لیا میں اس کا سیفٹی کیچ ہٹا رہا تھا کہ ٹارچ والے نے فرش پر پڑا ہوا جوئیل کا بے حس و حرکت جسم دریافت کر لیا۔

"ارے! اسے کیا......؟"

ٹارچ والے کو جوئیل کے حشر پر حیرت کے اظہار کا پورا موقع نہ مل سکا اور اس کا فقرہ مکمل ہونے سے قبل ہی میری چلائی ہوئی گولی اس کے جسم کے کسی حصے کو چاٹ گئی۔

وہ چیخ مار کر بری طرح اچھلا اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے فرش پر گر کر بند ہو گئی۔ میں سینے کے بل فرش پر گر کر تیزی سے ایک صوفے کی آڑ میں ہو گیا۔ میرے ہاتھوں زخمی ہونے والے نے اپنے بے آواز ریوالور سے اندھیرے ہی میں فائر کیا۔ کھٹکے کی آواز کے ساتھ تاریکی میں ابھرنے والا شعلہ ایک دیوار میں پیوست ہو گیا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر جوئیل کے بال پکڑے اور اسے بھی صوفے کی اوٹ میں گھسیٹ لیا۔ میں جنون کے عالم میں جاپانی پستول سے گولی تو چلا گیا

تھا۔ مگر مجھے ہر لمحے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ راہداری میں جمع ہونے والے اس کمرے پر دھاوا بول دیں گے۔

جوئیل کی لاش میں نے جس امید پر گھسیٹی تھی وہ پہلی ہی کوشش میں پوری ہو گئی اور میں نے اس کے لباس میں پوشیدہ بے آواز ریوالور نکال لیا۔

میرا اصل شکار بن حیان میرے سامنے بستر پر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے کمرے میں ایک خونریز معرکہ چھڑ چکا تھا۔ اس کا ایک جاں نثار اس کی حفاظت کرتے ہوئے جہنم واصل ہو چکا تھا اور دوسرا زخمی ہونے کے باوجود حق نمک ادا کر رہا تھا۔

میں نے بن حیان کے بستر کا نشانہ لے کر بے آواز فائر کر دیا۔ میں کسی بیرونی دخل اندازی سے قبل اپنے اصل شکار کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ یکسوئی کے ساتھ اپنی نجات کی راہ تلاش کر سکوں۔

میری گولی بستر کی طرف ضرور گئی مگر نشانے پر نہیں لگی۔ میں نے دوسرا فائر کیا اور اس بار میں نے تاریکی کے باوجود بستر پر پڑے ہوئے بے ہوش جسم کو کراہ کر اوپر اچھلتے دیکھا اور میرا حوصلہ بلند ہو گیا۔

باہر کے محاذ پر پہلی گولی چلتے ہی فائرنگ کا نہ رکنے والا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان دھماکوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ دونوں جانب سے بھانت بھانت کے ہتھیار استعمال کئے جا رہے تھے اور دونوں ہی فریقوں پر خون سوار تھا جو وہ نشانے وغیرہ کی پرواہ کئے بغیر اندھا دھند اپنا اسلحہ برباد کئے جا رہے تھے۔

باہر سے ابھرنے والے اس ہلاکت خیز شور میں بستر پر بن حیان کا تڑپتا اور سسکتا ہوا آسیبی ہیولا بہت خوشنما نظر آ رہا تھا۔ اپنے آقا کو زخمی دیکھ کر اس کے زندہ بچ جانے والے محافظ پر جنون طاری ہو گیا اور اس نے عیاری سے اپنی پوزیشن بدلتے ہوئے میری طرف یکے بعد دیگرے تین فائر کر ڈالے جو سب ہی خطا ہو گئے۔

چوتھا فائر کرتے ہوئے وہ میری نظر میں آ گیا اور میں نے ایک ہلکی سی غراہٹ بلند کی جیسے میں زخمی ہو گیا ہوں۔ وہ سرک کر مسہری کی اوٹ سے باہر آ گیا اور پیٹ کے بل فرش پر چپکے چپکے اس نے پانچواں فائر کیا اور اسی کے ساتھ میری چلائی ہوئی گولی اس کے بھیجے میں سے گزرتی چلی گئی۔

وہ جان لیوا زخم کھا کر اس کا پورا بدن فرش سے کئی فٹ اوپر اچھلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور میں اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آیا۔

صحرائے عرب میں ابوخالد کے روپ میں مجھ سے ملنے والا۔۔۔۔ ابراہام ہولم اپنے بستر پر پڑا غفلت اور مدہوشی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔

دیا سلائی کی روشنی میں میں نے اس کا جائزہ لیا اور میرا رواں رواں لرز اٹھا۔ بن حیان کے نام سے آسیبی کردار رکھنے والا وہ شخص صحراؤں کا قہر کہلاتا تھا۔ مگر اس وقت وہ بستر مرگ پر قدرت کا قہر جھیل رہا تھا۔

میری گولی نے اس کی داہنی ران بری طرح ادھیڑ دی تھی جب کہ جبڑے پر ایلیزا کی گولی سے آنے والے زخم کے باعث اس کا نقاہت زدہ چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ران پر زخم کھا کر اچھلنے کے باعث اس کی شریانوں میں خون پہنچانے والی سوئی کلائی سے نکل کر اس کی پسلیوں میں پیوست ہو گئی تھی۔ اور شاید اس عمل میں کلائی کی شریان بھی پھٹ گئی تھی کیوں کہ سفید بستر اس کی کلائی اور ڈرپ سے بہنے والے خون میں تر ہو رہا تھا۔

تنفس کے نظام میں کسی نقص کے باعث بن حیان کی ناک میں آکسیجن کی نلی بھی لگائی گئی ہوگی۔ کیونکہ اس کا سرا ناک سے نکل کر اس کے سینے پر پڑا ہوا تھا۔ آکسیجن کی ناکافی مقدار اور جسم سے خون کے بھاری اخراج کے سبب اس کے جسم پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ کلائی کی شریان پھٹ جانے کی وجہ سے اس کے بدن سے اس قدر خون بہہ چکا تھا کہ کوئی معجزہ ہی اسے زندگی بخش سکتا تھا۔ مگر میں اس خبیث آسیب کے معاملے میں کوئی خفیف ترین خطرہ بھی مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کی گردن کے قریب سے ایک نہرلی سوئی فائر کی اور اس کے لرزتے ہوئے جسم کو یک بیک قرار آ گیا۔

ادھر سے فارغ ہو کر میں نے ٹارچ والے کا جائزہ لیا تو وہ مر چکا تھا۔ میرا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ چند منٹ کا وہ وقفہ صدیوں طویل محسوس ہو رہا تھا اور اب میرے سامنے اپنی سلامتی کا مسئلہ تھا۔ اس کمرے میں ایک فائر کر کے میں باہر والوں کو اس طرف متوجہ کر چکا تھا اور وہ لوگ شاید اپنی جانوں کے خوف سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے مگر اس کے باوجود میں دروازے سے باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

ہسپتال میں بن حیان کے قتل کا معاملہ میری توقع سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہو چکا تھا اور میں تین لاشوں کے ساتھ اس کمرے میں زیادہ دیر رک کر اپنی آزادی کے مواقع محدود سے محدود تر کر لیتا جس کے نتیجے میں میری زندگی کا بیشتر حصہ فرانس کے کسی قید خانے میں گزرتا۔

میں نے بڑھ کر کمرے کی عقبی دیوار میں لگی ہوئی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کھلتے ہی باہر سے آنے والا فائرنگ کا شور تیز ہو گیا اور جب میں نے باہر جھانکا تو پتہ چلا کہ سارا معرکہ تاریک احاطے کے اسی رخ پر جاری تھا۔ تاریکی میں مختلف سمتوں سے شعلے تیرتے پھر رہے تھے اور بظاہر اس مقابلے کے اختتام کے کوئی آثار نہیں تھے۔

مگر دوسری منزل کی اس کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جس چیز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی وہ باہر کی فائرنگ سے زیادہ اہم تھی۔ کھڑکی سے تقریباً تین فٹ نیچے ڈیڑھ فٹ چوڑا چھجا آگے بڑھا ہوا تھا۔ جو عمارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا اور اس پر بآسانی دور تک دوڑ لگائی جا سکتی تھی۔ میں وقت ضائع کئے بغیر کھڑکی سے اس پختہ چھجے پر اتر گیا اور کھڑکی کے پٹ دوبارہ اس طرح بند کر دیئے

کہ تین نمبر کمرے میں داخل ہونے والوں کو فوری طور پر ادھر شبہ نہ ہو۔

کہر آلود سرد موسم کی ہوائیں میرے جسم پر موجود ناکافی لباس سے گزر کر میری ہڈیوں تک پر اثر انداز ہو رہی تھیں اور میں دل ہی دل میں فرانس کے ماہرین تعمیرات کو دعائیں دیتا اس سمت میں بڑھ رہا تھا جدھر کسی کمرے سے گزر کر میں راہداری کے ایسے مقام پر نکل سکتا تھا۔ جہاں سے میرا کمرہ قریب ہوتا۔

اس سے قبل ایک مرتبہ نیس کے ہوٹل ڈی ایریمی میں بھی میں کم و بیش ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہو چکا تھا۔ اور وہاں بھی کھڑکی کے نیچے بنا ہوا چھجا میرے کام آیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں میں اپنے بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا کرنے کے لئے کھڑکی سے اترا تھا۔ اور اس بار میں اپنے تین دشمنوں پر برتری حاصل کرنے کے بعد راہ فرار اختیار کر رہا تھا۔

فرانس میں بڑی عمارات کی کھڑکیوں کے نیچے بنائے جانے والے ان چھجوں پر مجھے رہ رہ کر پیار آ رہا تھا۔ جو دوسری بار میرے کام آ رہے تھے میں یہی سب سوچتا ہوا سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک جگہ میرے پیر کسی چیز سے ٹکرائے اور جب میں نے جھک کر ان اشیاء کا جائزہ لیا تو بے اختیار میرے منہ سے ایک طویل سانس آزاد ہو گیا۔

وہ شیشوں کی صفائی اور کھڑکیوں کی مرمت کے آلات تھے ہسپتال کا عملہ ایک کمرے سے اس طرف اتر کر مریضوں کے آرام میں زیادہ خلل ڈالے بغیر پوری قطار کے کمروں پر باہر سے کام کر سکتا تھا اور اونچی عمارات میں اس نظام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

ہسپتال میں اندھیرا ہونے سے اس وقت تک بمشکل آٹھ منٹ گزرے تھے۔ اور میری رسٹ واچ کے منور ڈائل پر سوئیاں پونے دس بجے کا اعلان کر رہی تھیں۔ یعنی کارروائی کے آغاز کے لئے جو وقت طے پایا تھا اس وقت تک اصل کام پورا ہو چکا تھا۔

میں اس قطار کی آخری کھڑکی کے قریب پہنچ کر رک گیا اور اسی وقت حیرتناک طور پر پیچھے گونجنے والی فائرنگ یک بیک رک گئی اور نیچے کہر آلود اندھیرے میں دوڑتے ہوئے بہت سے قدموں کی گونج سنائی دینے لگی۔ میرے لئے وہ خاموشی خطرے کی علامت تھی لہٰذا میں نے فوری طور پر اس آخری کھڑکی کو دباؤ ڈالا مگر وہ نہ کھل سکی۔

شیشہ توڑ کر میں نہایت آسانی سے چٹخنی گرا سکتا تھا مگر شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے اندر گرنے کا شور کسی کو اس طرف متوجہ کر سکتا تھا ایک موہوم سی امید یہ تھی کہ تاریکی اور پھر فائر کے باعث اس فلور پر موجود سارے افراد کمرہ نمبر تین کے قریب سمٹے ہوئے ہوں گے جو راہداری کے مخالف سرے پر واقع تھا۔ اگر ایسا ہوتا اور وہ آخری کمرہ بھی خالی مل جاتا تو میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنے کمرے میں پہنچ سکتا تھا۔

میں نے جوئیل کی لاش سے حاصل کئے ہوئے ریوالور کے دستے کی محتاط ضرب سے شیشہ توڑ دیا جب کمرے میں شیشے کے ٹکڑے گرنے پر کوئی ردعمل نہ ہوا تو میں نے ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھول دی اور نہایت اطمینان سے کمرے میں اتر گیا۔

کھڑکی بند کرنے سے قبل میں نے بستر کی طرف دیکھا جو خالی پڑا ہوا تھا میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے تیزی سے کھڑکی بند کی اور دروازہ کھول کر تاریک راہداری میں نکل گیا۔

میری توقع کے عین مطابق پوری راہداری ویران پڑی ہوئی تھی۔ اور سب لوگ ڈیوٹی اسٹاف کے کمرے سے آگے جمع تھے۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر روشنی کا بندوبست کر لیا تھا جو ناکافی ہونے کے باوجود غنیمت تھی۔

اپنے کمرے کی طرف بڑھتے بڑھتے مجھے اپنے اسلحہ کا خیال آیا اور میں واپس لوٹ کر دوبارہ اسی کمرے میں گھس گیا جس کے ذریعے میں راہداری میں پہنچا تھا میرے دوبارہ داخلے پر کمرے میں ہلکی سی دھمک سنائی دی جسے میں نے اپنے وہم سے زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ بستر بدستور خالی پڑا ہوا تھا۔ کھڑکی کے قریب آ کر میں نے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے یکے بعد دیگرے چاقو، اپنا پستول اور جوئیل سے حاصل کیا ہوا ریوالور فضا میں اچھال دیا۔ گرنے کے سبب اگر جوئیل کا پستول چل بھی جاتا تو سائلنسر کی وجہ سے اس کی گونج مجھ تک نہ پہنچی مگر ہین یاننی کا دھماکا بہت ہولناک تھا۔ ان ہتھیاروں سے نجات حاصل کر کے میں کسی پریشانی سے دوچار ہوئے بغیر اپنے کمرے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میں نے راڈ کر کا لایا ہوا گلدستہ کھول ڈالا تاکہ تفتیش کے دوران گلدستے کا کھوکھلا حصہ مجھے مشکوک نہ بنا دے اور اس کے بعد میں نہایت سکون کے ساتھ بستر پر دراز ہو گیا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ ایسے روح فرسا حالات میں میرا یوں کمرے میں پڑے رہنا بھی نامناسب ہے۔ لہٰذا میں ہولے ہولے کراہتے ہوئے کمرے سے نکلا اور غیر محسوس طور پر مریضوں وغیرہ کی ہراساں بھیڑ میں شامل ہو گیا۔

وہاں لوگ تین جلتی ہوئی موم بتیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جن کی لرزتی زرد روشنی میں مجھے کوئی شخص بدرجہ کم نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہاں پہنچنے کے چند ہی ثانیوں بعد مجھے ایملی نظر آئی جس کا چہرہ خوف سے زرد پڑا ہوا تھا اور آنکھوں میں بے رونقی رچی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی ایملی تیر کی طرح میری طرف آئی اور کانپتی ہوئی خوفزدہ آواز میں پوچھنے لگی۔ "تم کہاں غائب تھے اتنی دیر سے؟"

میرا دل اچانک کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میں نے کنکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لیا مگر بظاہر کوئی بھی ہم دونوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"میں خود تمہیں تلاش کر رہا تھا" میں نے اس کا بازو تھام کر اسے بھیڑ سے باہر لے جاتے ہوئے کہا "تم تو بری طرح سہمی ہوئی ہو۔"

"تم سچ کہتے ہو" وہ مجھ سے باہر آ کر رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "ان تینوں میں سے کسی کمرے میں سے فائر اور دھینگا مشتی کی......."

"وہ سب میں نے بھی سنا ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "آخر تم لوگوں میں سے کوئی ان کمروں میں جاتا کیوں نہیں ہے؟"

"وہ تینوں کمرے ہمارے لئے ممنوعہ ہیں، مریضوں میں سے کوئی اُدھر جانے کے لئے تیار نہیں اور ڈاکٹر ڈیولوزا تو فائر کی آواز سنتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی....... میں تمہیں اسی لئے تلاش کر رہی تھی۔ ذرا تم ہی کچھ ہمت کر لو۔"

"میں پاگل نہیں ہوں ایملی ــــ اگر دروازے پر دستک کے نتیجے میں میری کھوپڑی میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا گیا تو مجھے پچھتانے کی بھی مہلت نہ مل سکے گی"

"تمہیں سامنے پا کر میری ہمت بندھی ہے، یہ بتاؤ کہ تم کہاں تھے؟" اس نے ایک مرتبہ پھر وہی احمقانہ سوال کر ڈالا۔

"جس وقت فائر ہوا، میں وہیں موجود تھا"

"اور اس کے بعد؟"

"اس کے بعد کمرے میں آ گیا تھا!"

"غلط، اس کے بعد تین مرتبہ تو میں تمہارے کمرے کے چکر لگا چکی ہوں" وہ مجھے جھوٹا ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"ہوش کے ناخن لو ایملی" میں نے قدرے برہمی سے کہا کیونکہ اس اثنا میں ہم لوگوں سے کافی دور آ چکے تھے "میں بھلا کہاں جاتا؟ میں کمزور دل انسان ہوں۔ فائر کی آواز نے میرے اوسان خراب کر دیئے تھے اور میں باتھ روم میں تھا"

"اوہ! وہ میں دیکھنا بھول گئی تھی" اس نے فوراً ہی میری بات پر یقین کر لیا "تمہیں اندازہ ہے کہ وہ فائر کس کمرے میں ہوا تھا؟"

"ان ہی تینوں میں سے کوئی کمرہ تھا مگر مجھے زیادہ فکر باہر کی فائرنگ کی ہے!" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"باہر سے آنے والی آوازیں تو اب بند ہو گئیں نا؟"

"یہی پریشانی کی بات ہے ایملی ڈارلنگ" میں نے نرم لہجے میں کہا "ایسا نہ ہو کہ وہ سب ایک دوسرے کا پیچھا کرتے اسی فلور پر آ رہے ہوں"

"نہیں ـــــ مجھے خوفزدہ مت کرو" وہ سہم کر بولی "اگر وہ سیڑھیاں یہاں آ گئے تو ہم میں سے شاید کوئی نہ بچ سکے گا"

"باہر کے حالات مخدوش ہیں" میں نے آہستہ سے کہا "اس وقت کمرے میں رہنا ہی بہتر ہے ورنہ بلاوجہ پولیس کے چکر میں وقت برباد ہوگا"

"پتہ نہیں اس بند کمرے میں کیا ہوا ہوگا؟" وہ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بڑبڑائی۔

"ہو سکتا ہے کہ آپس ہی میں لڑ پڑے ہوں" میں نے کہا۔

"اگر وہ آپس میں لڑے ہیں تو باہر ہونے والی فائرنگ کو تم کیا کہو گے" اس نے میرے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا "اگر مجھے کسی اور فلور پر منتقل نہ کیا گیا تو میں آپریشن کے بغیر ڈسچارج لے لوں گا"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو" وہ میری تائید کرتے ہوئے بولی "اگر ان تینوں مریضوں کو یہاں سے نہ نکالا گیا تو عملہ ڈیوٹی سے انکار کر دے گا"

"یہ بجلی کو اچانک کیا ہو گیا؟"

"ہسپتال کی برقی فراہمی کے ساتھ ہی ایمرجنسی جنریٹر بھی برباد کر دیا گیا ہے۔ اب کسی موبائل جنریٹر کی آمد پر ہی روشنی بحال ہو سکے گی"

"بجلی کا سلسلہ منقطع ہونے سے کئی مریض تو موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے ہوں گے؟" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ اس وقت کوئی آپریشن نہیں ہو رہا تھا ورنہ واقعی مشکل پیدا ہو جاتی" اس نے یہ کہہ کر میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ ہسپتال کے چیف اور سینئر عملے کی آمد کے موقع پر وہ اپنے ڈیوٹی روم میں موجود رہنا چاہتی تھی جن کی آمد کسی بھی لمحے متوقع تھی۔

ایملی کے جانے کے بعد میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران میں ایک بار پھر اس سے گفتگو کا موقع ملا۔ اور اس نے بتایا کہ ہسپتال سے کسی فرد کو نکلنے کی اجازت نہیں تھی اور پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔

کچھ دیر بعد پولیس والوں کی ایک مسلح جمعیت طاقتور روشنی والی سرچ لائٹس روشن کیے اس فلور پر آ پہنچی۔ ان کے ساتھ ہسپتال کا چیف بھی تھا۔

ان لوگوں نے پہنچتے ہی سب سے پہلے تمام مریضوں کو اپنے کمروں میں جانے کا حکم دیا تاکہ عملہ ان کی دیکھ بھال کا دوبارہ آغاز کر سکے مگر بیشتر مریضوں نے روشنی ہونے سے قبل اپنے کمروں کا رُخ کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد انکار کرنے والے مریضوں کو ایک سرچ لائٹ سمیت ڈیوٹی اسٹاف کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

تینوں مشکوک کمروں کے سامنے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد پولیس بیک وقت تینوں کمروں میں گھس گئی۔ اسی اثنا میں ملٹری ایٹلی جنس کے دو اعلیٰ افسران شدید بوکھلاہٹ کے عالم میں وہاں آ پہنچے اور انہیں کمرہ نمبر تین میں پہنچا دیا گیا۔

ایملی کے ذریعے مجھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے خبریں مل رہی تھیں اور وہ اپنے طور پر یہ رائے قائم کر چکی تھی کہ ساری گڑبڑ کا مرکز تیسرا کمرہ تھا

جہاں اعلیٰ افسران کا ہجوم تھا۔ پانچویں اور ساتویں کمرے میں سب خیریت تھی۔

میں ایملی سے یہ سنتا رہا اور خود کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ایملی یا کسی اور فرد کو شاید یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کمرے میں تین لاشیں دریافت ہوئی ہیں۔ ہسپتال کی دوسری منزل پر رات کی ڈیوٹی والا عملہ آ چکا تھا۔ مگر جانے والوں کو بیانات وغیرہ لینے کے لئے روک لیا گیا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے شب برقی رو کی فراہمی بحال کر دی گئی اور مریضوں کو اس گھٹن سے نجات مل گئی جو اندھیرے کے سبب بڑھتی جا رہی تھی روشنی کے ساتھ ہی سارے مریض اپنے اپنے کمروں میں بھیج دیئے گئے۔

دس منٹ بعد ایملی یہ سنسنی خیز خبر لائی کہ کمرہ نمبر تینتالیس والی مریضہ اپنے بستر کے نیچے بے ہوش پائی گئی تھی اور اس کے کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ پولیس کے ماہرین نے مریضہ کو دوسرے کمرے میں منتقل کر کے کمرہ نمبر ۴۳ پر قبضہ کر لیا تھا۔

پولیس کے عملے نے بیانات لینے کی ابتدا اسی عملے سے کی اور پھر باری باری مریضوں کے بیان لیتے ہوئے دو افسر میرے کمرے میں بھی آ وارد ہوئے میں نے ان کی آمد سے پہلے ہی خود پر نقاہت طاری کر کے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے انہیں صرف اسی قدر بتایا جو میں ایملی کو بتا چکا تھا اور وہ مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔

اگلی صبح ہسپتال میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھی کہ دوسرے فلور پر موجود تین اسرائیلی وی آئی پی سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود فلسطینی گوریلوں کے ہاتھوں پُراسرار طریقے پر ہلاک کر دیئے گئے اور شہر کے ایک بدمعاش کی لاش پولیس کو ہسپتال سے ملحق پارک میں جھاڑیوں کے درمیان پڑی ہوئی ملی تھی۔

مجھ تک یہ خبر صبح والی نرس کے ذریعے پہنچی جب میں نے اس سے ایملی کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ رات کو ایک بجے کے قریب واپس گئی تھی۔

"قاتل اس فلور پر کدھر سے آئے تھے؟" میں نے اس نرس سے سوال کیا۔

"کچھ پتہ نہیں چل سکتا" نرس نے میرا درجۂ حرارت نوٹ کرتے ہوئے کہا "کمرہ نمبر تینتالیس کی مریضہ کے بیان نے سب کو الجھا دیا ہے۔"

"وہ کیا کہتی ہے؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"دراصل خفقان کی مریضہ ہے اور ابھی تک یہی فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ اس کے بیان پر کسی حد تک اعتبار کیا جائے۔"

"پھر بھی اس کی کہانی تو معلوم ہو؟"

"وہ کہتی ہے کہ تین نمبر کمرے میں فائر ہونے کے چند منٹ بعد اسے کھڑکی پر آہٹ سنائی دی اور وہ خوفزدہ ہو کر مسہری کے نیچے چھپ گئی۔ جس کے بعد شیشہ توڑ کر باہر سے کھڑکی کھولی گئی اور اندر میرے میں ایک دیوہیکل آدمی اندر کود آیا کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ شخص دروازے سے باہر راہداری میں گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا مگر وہ مسہری کے نیچے سے نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ بہت تیزی سے دوبارہ اندر گھسا اور اس بار اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ان تینوں کے قدم دیکھتے ہی وہ دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔"

اس عورت کا بیان ضرورت سے زیادہ بھرپور اور ڈرامائی تھا۔ مجھے دیکھ لینے کے باوجود اس نے بیان میں جس قوی ہیکل شخص کا تذکرہ کیا تھا وہ میرے جثہ سے قطعی مختلف تھا اور پھر رہی سہی کسر تین افراد کی واپسی نے پوری کر دی تھی۔

"اس کے بیان پر یقین نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اول تو اس کا مرض اور پھر وہ تین آدمی ـــــ آخر وہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے۔؟" اس نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

"خیر وہ تو پولیس معلوم ہی کرے گی۔ ان تین لاشوں کی موجودگی میں اگر کوئی شخص ڈریکولا کی موجودگی کا ذکر کرے تو اس پر بھی غور کرنا ہی پڑے گا۔"

"فائر ہونے کے بعد سے پولیس کی آمد تک سارے مریض عملے سمیت تین نمبر کمرے کے سامنے موجود تھے اور انہوں نے وہاں سے کسی کو نکلتے ہی نہیں دیکھا۔ قاتل جو بھی تھا، کمرے میں ہی تھا اور وہاں سے باہر کودنے کے بعد اسے کسی اور کمرے میں گھسنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی تھی "تم تو خود چشم دید گواہ ہو!"

"میں اپنی نابکار تکلیف کی وجہ سے بار بار اپنے کمرے میں آ رہا تھا"

"پھر تو تمہیں ضرور ان تینوں میں سے کسی کو دیکھنا چاہئے تھا" وہ میری بات درمیان سے اچک کر بولی "تم تو اس کے قریب ترین پڑوسی ہو"

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس بے چاری کو جھٹلانے لگوں" میں نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اہمیت حاصل کرنے کے لئے جھوٹ بول رہی ہے پوری کہانی اس کے بیمار ذہن کی پیداوار ہے اور میرا تو خیال ہے کہ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے اس نے اپنی کھڑکی کا شیشہ بھی خود ہی توڑا ہوگا"

میرا جی چاہا کہ نرس کے خیالات کی اس ندرت پر ایک بھرپور قہقہہ لگاؤں کیونکہ وہ تو اپنی باتوں سے قاتل کے ہسپتال میں داخلے کے امکانات ہی مسترد کر رہی تھی مگر میں نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا "یہ تو بڑی آسانی سے ثابت ہو جائے گا۔ اگر اس نے شیشہ خود ہی توڑا تھا تو سارے ٹکڑے باہر گرے ہوئے ملیں گے"

"تم کھڑکی کا پٹ کھول کر شیشہ توڑ دو، میں دیکھتی ہوں کہ کیسے ایک ذرہ بھی باہر جاتا ہے" وہ مجھ ہی سے الجھنے پر آمادہ ہو گئی۔

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، تم یہ بتاؤ کہ میرا آپریشن کب ہو

گا۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔"

"اگر تمہاری حالت اسی قدر بہتر رہی تو شاید کل ہی باری آجائے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے آلات سمیٹتے ہوئے واپس چلی گئی۔

قدرت حالات کو میرے حق میں بہتر بنا رہی تھی لہٰذا اس موقع پر میں عجلت میں کوئی غلط فیصلہ کرنے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔

میں خونریزی سے پیدا ہونے والی اعصابی کشیدگی کا بہانہ کرتا تو شاید مجھے آپریشن کے بغیر بآسانی چھٹی مل جاتی مگر اس مرحلے پر میری روانگی پولیس کو میری طرف متوجہ کر سکتی تھی کہ ایک مریض آپریشن کی نیت سے ہسپتال میں داخل ہوا اور پھر قتل کی وارداتوں کے بعد عجلت میں بغیر آپریشن کرائے رخصت ہو گیا تو اس کے اصل عزائم کیا تھے؟ وہ کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ کن لوگوں سے ملتا تھا؟ اور اگر ایک مرتبہ پولیس کی توجہ میری طرف مبذول ہو جاتی تو انہیں مجھے حوالات میں پہنچانے کے لئے خاصا مواد مل جاتا۔

اس خطرہ کا تدارک اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں خاموشی سے ہسپتال میں پڑا رہتا۔ اور بن جیان کے خاتمے کے عوض اپنڈکس کا آپریشن قبول کر لیتا۔

دوپہر کو ایملی ڈیوٹی پر آئی تو اس پچھلی رات کی تکان کے اثرات اس کے بشرے پر باقی تھے۔ مگر تازہ خبروں نے اسے بھی ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیونکہ پچھلی رات ہسپتال سے جاتے ہوئے بھی اسے علم نہیں ہو سکا تھا کہ تیسرے کمرے کے بند دروازوں کے پیچھے کیا ہوا تھا۔

"آخرکار تمہارے اندیشے درست ہی نکلے" ایملی نے کمرے میں آتے ہی کہا تھا۔

"میری چھٹی حس نہایت کارآمد ہے، تم میرے اندیشوں کو اہمیت دینے کو ہی تیار نہیں تھیں۔" میں نے کہا۔ "مگر اب لوگوں کے سامنے میری پیشین گوئیوں کا ذکر نہ کرنا ورنہ میرے لئے بہت سی دشواریاں کھڑی ہو جائیں گی۔"

"میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچویں کمرے کا مریض تین نمبر کمرے میں کیسے پہنچ گیا۔ جب کہ لیونورا کے بیان کے مطابق وہ چلنے پھرنے تک سے معذور تھا۔"

"انہوں نے کسی متوقع خطرے سے نمٹنے کے لئے تین کمروں پر قبضہ کیا تھا مگر دو محافظوں کی آمد کے بعد ہسپتال کے افسران بالا کی مدد سے خفیہ طور پر اسے تین نمبر میں منتقل کر دیا گیا ہوگا تاکہ کوئی اس پر وار کرنا چاہے تو پانچ نمبر کمرے کو خالی پا کر اپنا سر پیٹ کر رہ جائے۔"

"مگر قاتل بہت چالاک تھا، اس نے نہ صرف ان تینوں کا کھوج لگا لیا بلکہ انہیں مار کر صاف بچ نکلنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔"

ایملی کی اس تعریف پر اصولاً تو مجھے تشکر کا اظہار کرنا چاہئے تھا مگر میں نے اس سے نیا سوال کر ڈالا۔ "آخر قاتل کہاں سے آیا تھا۔ اور کدھر غائب ہو گیا؟" اس سے اس سوال کا جواب سن کر میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پچھلی رات کی واردات کے بارے میں لوگوں کی عام رائے کیا تھی اور پولیس کس سمت میں کام کر رہی تھی۔

"وہ سو فیصدی باہر کا آدمی تھا!"

"پھر اندر کیسے آیا؟ نظم و ضبط کے اعتبار سے یہ جگہ ہسپتال سے زیادہ جیل خانہ محسوس ہوتی ہے۔"

"تم نے کمرہ نمبر پینتالیس والی مریضہ کا بیان بھی سنا ہوگا۔؟"

"بالکل بے سروپا اور لغو کہانی ہے!"

"رات تک اس کی دیکھ بھال میرے ہی ذمے تھی اور پچھلے ایک ہفتے کے تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ غبی عورت نہیں ہے۔ کل رات ہسپتال میں روشنی آنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں مسہری کے نیچے بے ہوش پڑی ہوئی ملی تھی۔"

"اسے تم اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہو؟" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

"پولیس بھی اس کے بیان پر یقین کر چکی ہے۔ اور تین نمبر کمرے میں وہ تینوں جس طرح مارے گئے اس کی بنا پر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ کسی تنہا آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا۔" ایملی نے کہا۔

"مگر وہ تو باہر سے ایک ہی آدمی کی آمد کی کہانی سنا رہی ہے۔"

"وہ یقیناً چار یا پانچ آدمی تھے۔" ایملی نے پرشوق لہجے میں کہا۔ "اندھیرا ہونے کے بعد ان میں سے دو دوسری منزل پر گھس کر ہم لوگوں میں مل گئے تاکہ ہم لوگوں کی طرف سے اسرائیلی مریضوں کے کمرے میں مداخلت کی کسی کوشش کو طاقت کے بل بوتے پر روک سکیں۔ اور دو یا تین آدمی چھجے سے جائزہ لینے کے بعد یہ یقین کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے تینوں شکار تیسرے کمرے میں موجود تھے اور پھر انہوں نے کسی طرح اندر گھس کر تینوں کا خاتمہ کر دیا۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد ان میں سے ایک کمرہ نمبر ۴۵ کی کھڑکی کے ذریعے اندر گھسا ہوگا اور پھر راہداری میں موجود اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر واپس ہو گیا۔"

"اس کہانی میں سقم ہے ایملی۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "اول تو وہ پانچ آدمی چھجے پر پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہوئے؟ اور دوسری بات یہ کہ اگر قاتلوں کے دو ساتھی۔ چھجے سے راہداری تک پہنچے تھے تو انہوں نے یقیناً کوئی نہ کوئی کمرہ ہی استعمال کیا ہوگا۔ لہٰذا بعد میں ۴۵ نمبر میں کودنے والے قوی ہیکل شخص کو بھی وہی کمرہ استعمال کرنا چاہئے تھا۔ اسے ایک نئے کمرے کی کھڑکی توڑنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ اور اگر وہ دونوں بھی کمرہ نمبر ۴۵ ہی سے اندر گھسے تھے تو بعد میں وہ کھڑکی کس نے بند کی اور اس مریضہ نے ان دونوں کو اندر کود کر راہداری میں جاتے ہوئے کیوں نہیں دیکھا؟"

"تم تو کسی وکیل کی طرح جرح کر رہے ہو۔" وہ بولی۔ "میں تو تمہیں لوگوں کی رائے سے آگاہ کر رہی تھی۔"

"تم نے پولیس کا بھی ذکر کیا ہے!"

"یہ پانچ قاتلوں والا نظریہ پولیس نے نہیں، ہسپتال والوں نے قائم کیا ہے۔ البتہ پولیس اس مریضہ کے بیان کو بہت اہم قرار دے رہی ہے۔"

"اس نے اندر گھسنے والے کو تو خود بھی دیکھا ہوگا۔۔۔؟"

"کیا بات کرتے ہو، بھلا اندھیرے میں دیکھنا ممکن ہے؟" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "اس کے لئے یہی کافی ہے کہ اس نے اندر کودنے والے کی جسامت کا اندازہ کر لیا۔"

"غنیمت ہے کہ یہ قتل کمرہ نمبر تین میں ہوئے، پینتالیس نمبر میں ہوتے تو قیامت ہی برپا ہو جاتی۔" میں نے گفتگو کو موڑ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"تین نمبر میں تین مارے گئے، پینتالیس نمبر میں پینتالیس مقتول دستیاب ہوتے اور شاید مریضوں کے ساتھ ہی عملے کا بھی نمبر آ جاتا۔"

"بڑا بے رحمانہ مذاق کرتے ہو!" وہ پھیکے انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔

"تم مذاق کا موقع ہی کب دیتی ہو۔"

وہ فوراً ہی مجھ سے دور سرک گئی۔ "تکلیف ختم ہونے تک اپنے ہاتھ پیروں پر قابو ہی رکھو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

"تم یقین کرو کہ اب بہت معمولی تکلیف رہ گئی ہے کل شاید میرا آپریشن بھی کر دیا جائے گا۔"

"میں ہر روز ڈیوٹی پر آتے ہی اپنے مریضوں کی فائلیں دیکھتی ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے!"

"کیا میرے علاوہ بھی تمہارا کوئی مریض ہے؟"

"منہ لگاؤں تو بہت سے پیدا ہو جائیں گے!"

"مگر آج تم نے مجھے بھی منہ نہیں لگایا!"

"تمہاری بس زبان ہی چلتی ہے ورنہ عملی طور پر پرلے درجے کے بزدل ہو کر پانچ نمبر والے کے خوف سے ہسپتال سے ہی بھاگے جا رہے تھے!"

"وہ میرے ایک کو جانا ہی تھا، وہ چلا گیا تو اب میں سکون سے تمہاری مسیحائی کا لطف اٹھاؤں گا۔" میں نے ملفوف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میرے پاس کچھ وقت گزار کر اس کی پریشانی دور ہو گئی اور اس کی رفاقت سے مجھے بھی تازگی کا احساس ہونے لگا اگر اسے میرے کمرے میں ڈاکٹر وغیرہ کی مداخلت بے جا کا خوف نہ ہوتا تو شاید وہ اسی روز مجھے اپنے سراپا سے تفصیلی طور پر متعارف کرا دیتی۔۔۔ مگر پھر بھی اس روز ایملی نے تکلفات کے کئی مراحل طے کر ڈالے۔

جب وہ میرے کمرے سے نکل رہی تھی۔ تو اچانک مجھے ایک بھولی ہوئی بات یاد آ گئی اور میں نے فوراً ہی اس سے سوال کر ڈالا۔ "کل تم نے تو تین اور سات نمبر والے مریضوں کو دوائیں خواب آور دوا دینے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ وہ بے چارے تو بے ہوشی میں ہی مارے گئے ہوں گے؟"

"تم سے جھڑپ کے بعد مجھے لیونورا پر رحم آ گیا تھا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں معدے سے خواب آور دوا کے اجزا برآمد ہوتے تو پولیس فوری طور پر یہی نتیجہ اخذ کرتی کہ اس ظالم کے عملے کا کوئی فرد قاتلوں سے ملا ہوا تھا۔"

"گردن تو ڈاکٹر لیونورا کی ہی پھنستی!"

"وہ ان تینوں کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ضرور تھی مگر دوا تیار کرنا ڈسپنسر کا کام ہے وہ بری طرح عتاب میں آ جاتا اور پھر وہ میرا نام بھی اگل دیتا۔ اور شاید میرے ذریعے تم بھی پھنس جاتے!"

"ڈسپنسر اتنا بودا آدمی ہے؟"

"تین لاشوں کا معاملہ سامنے آنے کے بعد اسے بھی گردن بچانے کی فکر ہوتی اور پھر پولیس کے ماہرین پولی گراف کے ذریعے ایک بار اس کا جھوٹ پکڑ لیتے تو پھر تھرڈ ڈگری کے ذریعے اس سے سب کچھ اگلوا لیتے۔"

"میرا تو خیال تھا کہ فرانس کی پولیس خاصی مہذب ہے!"

"شبہ نہ ہونے تک وہ مہذب ہی رہتے ہیں، مگر ایک مرتبہ شبہ ہو جائے تو باز پرس کرنے والے نرم خو افسران بھیڑیوں کو بھی شرما دیتے ہیں اور جھوٹ سچ کا یقین کرنے کے لئے انہیں جدید ترین سائنسی آلات کی مدد حاصل ہوتی ہے جن کے نتائج ننانوے فیصدی درست ثابت ہوتے ہیں۔"

"مقامی پولیس کے بارے میں تمہیں کافی معلومات ہیں۔"

"وہ میرا ماضی کا تجربہ ہے" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"کمال ہے" میں نے حیرت سے کہا۔ "میں تو تمہیں سیدھی سادی لڑکی سمجھتا رہا ہوں۔"

"پیرس میں نرسنگ کا پیشہ اپنانے کے بعد میں سب کچھ بھول چکی ہوں، اس سے پہلے اورلینز میں کافی عرصہ تک میں منشیات فروشوں سے منسلک رہی ہوں۔"

اس کی صاف گوئی مجھے پسند آئی مگر اسی کے ساتھ مجھے خطرے کے آثار بھی محسوس ہونے لگے شاید ایملی میری سطحی چھیڑ چھاڑ سے کوئی دوسرا نتیجہ اخذ کر رہی تھی اور اسی وجہ سے مجھے تدریجاً اپنی ذات کے خفیہ گوشوں سے بھی آگاہ کر رہی تھی۔ تاکہ اس کی دانست میں کوئی بڑی پیش رفت ہونے کے بعد میں اس کی طرف سے بے اعتمادی کا شکار نہ ہو سکوں۔

ایملی کے چلے جانے کے بعد بھی میں خاصی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اور آخرکار اسی نتیجے پر پہنچا کہ آئندہ مجھے اس کے ساتھ محتاط رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ بگڑی ہوئی لڑکیاں جب سدھار کی راہ اختیار کرتی ہیں تو ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتی ہیں۔ اور اس حالت میں اگر کوئی ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے تو ان کی مجروح انا انہیں دوبارہ بربادی کی راہوں پر اڑا لے جاتی ہے اور میں فقط وقتی مسرتوں کی خاطر ایملی کی پرسکون زندگی میں داخل ہو کر اسے عذاب بنانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ دن سکون سے گزرا۔ سینٹ انطونین ہسپتال پولیس کیمپ بنا ہوا تھا مگر رات کو میرا بیان لینے کے بعد شاید مجھے واردات کا ناکارہ ترین گواہ فرض کر لیا گیا تھا کیونکہ کسی بھی پولیس افسر نے دوبارہ میرے کمرے کا رخ نہیں کیا۔۔۔

مجھے شدت سے ملاقات کا وقت شروع ہونے کا انتظار تھا۔ تاکہ راڈرک سے باہر ہونے والی خونریز لڑائی کی تفصیلات معلوم کر سکوں۔

ملاقات کے وقت کا آغاز ہوا تو میری نظریں بار بار اپنی رسٹ واچ کی طرف اٹھنے لگیں۔ وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا اور میں بستر پر پڑا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

میری دانست میں میرے کمرے میں کسی ملاقاتی کا نہ آنا پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔ اس روز پولیس افسران یقینی طور پر ملاقاتیوں کا گہرا جائزہ لے رہے ہوں گے اور ملاقات کا وقت ختم ہونے پر جب انہیں دوسری منزل پر کسی لاوارث مریض کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تو شاید وہ میری طرف متوجہ ہو سکتے تھے تاکہ میرے بارے میں تفصیلی معلومات جمع کر سکیں۔

ملاقات کا وقت ختم ہونے سے چند منٹ پہلے میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میں قبضوں کی چرچراہٹ سن کر اضطراری انداز میں بستر سے اٹھ گیا۔

مجھے اس وقت راڈرک یا ایملی میں سے کسی ایک کی آمد کی امید تھی مگر جو شخص کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے طلوع ہوا وہ میرے لئے اجنبی تھا۔

وہ پتلے پتلے ہونٹوں اور ستے ہوئے چہرے والا ایک مغنی سا۔ سفید فام نوجوان تھا جس کی خوابیدہ سی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

پہلی نظر میں وہ شخص پولیس کے محکمے کا کوئی سنگدل سراغرساں محسوس ہوا مگر جب نگاہیں چار ہونے پر اس کے لبوں پر دوستانہ مسکراہٹ ابھری تو میری جان میں جان آئی۔

”شام بخیر مسٹر سیف براؤن“ قریب آ کر اس نے دھیمی آواز میں کہا ”تمہاری کامیابی کی خبر اخبارات کے ذریعے مل چکی تھی مگر اوپر والے تمہاری طرف سے فکر مند ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں یہ بتاؤ کہ راڈرک کہاں ہے؟“ میں نے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

”یہ میرے لئے نیا نام ہے۔“ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا ”مجھے صرف یہ بتا کر بھیجا گیا ہے کہ باہر کے حالات فی الحال خراب ہیں۔ ہسپتال کے بعد شہر میں بھی کئی جگہ خونریزی ہوئی ہے، حالات سدھرتے ہی تم سے دوبارہ رابطہ قائم کیا جائے گا۔“

”تم عبداللہ سے واقف ہو؟“ میں نے اضطراب کی کیفیت میں دریافت کیا۔

”میں شرمندہ ہوں۔“ اس نے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

”پھر تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟“ میں نے یہ سوال کرتے ہوئے اپنے وجود میں خوف کی ایک سرد سی لہر سرایت کرتی محسوس کی اس کی مسلسل لاعلمی پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں کسی سرکاری ایجنسی کی طرف سے اس شخص کے ذریعے مجھ پر جال نہ ڈالا گیا ہو۔

”میں یہ بھی نہیں بتا سکتا مگر یقین رکھو کہ میں تمہارے بہی خواہوں میں سے ہوں۔“ اس نے شاید میرے دل کی بات بھانپتے ہوئے کہا۔

”شہر میں کس قسم کی خونریزی ہوئی ہے؟“

”مقامی بدمعاشوں نے آج شہر کے تین نیم معروف علاقوں میں دن دہاڑے چاقو گھونپ کر چھ فلسطینیوں کو زخمی کر دیا اور صبح گیارہ بجے عراق کی ایئر لائن کے دفتر پر نامعلوم حملہ آوروں نے دو آتش گیر بم پھینکے جس کے نتیجے میں عملے کے چار افراد شدید زخمی ہو گئے۔“ اس نے حادثات کی تفصیل بتانے میں کوئی تامل نہیں کیا۔

”کوئی جوابی اقدام؟“

”پتہ نہیں۔“ اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ویسے شہر کے شمالی حصے میں جیراڈ نامی ایک مقامی بدمعاش کے کیسینو میں ہولناک آگ لگی ہوئی ہے جسے بجھانے کی کوششیں جاری ہیں۔ جیراڈ نے لاکھوں فرانک کی لاگت سے حال ہی میں وہ کیسینو تعمیر کرایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ شہر میں پیش آنے والا یہ اہم حادثہ کسی جوابی کارروائی کا نتیجہ ہو۔“

اسی وقت دیواروں میں پوشیدہ اسپیکرز پر ملاقات کے وقت کے خاتمے کا اعلان کیا جانے لگا۔

”اپنا نام نہیں بتایا تم نے؟“ میں نے الوداعی مصافحہ کے لئے اس کا داہنا ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

”دوست بس دوست ہوتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ویسے میں نے استقبالیہ کاؤنٹر پہ اپنا نام جوزف السیڈا لکھوا کر داخلہ کارڈ لیا تھا۔“

یہ کہہ کر وہ بھی چلا گیا۔

اس شخص کے ذریعے ملنے والی خبریں نہایت سنسنی خیز اور خاصی حد تک پریشان کن تھیں اور اس سے ملنے والی اطلاعات کی روشنی میں باقی کڑیاں میں خود ملا سکتا تھا۔

عبداللہ کے لئے ہسپتال کا رخ کرنا خطرناک تھا کیونکہ وہ بآسانی پہچانا جا سکتا تھا۔ مگر اس شام راڈرک کی غیر حاضری تشویشناک تھی اس کے نہ آنے کا ایک ہی سبب ہو سکتا تھا۔ کہ وہ پچھلی رات کے حادثے میں یا العبد میں کسی حملے کے نتیجے میں زخمی ہو گیا ہو۔

راڈرک کی غیر حاضری کے بعد گمنام حملہ آوروں کی طرف سے تین مقامات پر خنجر زنی کی وارداتیں اور عراقی ہوائی کمپنی کے دفتر پہ حملہ بھی میری پریشانی میں اضافے کا سبب تھا اور اس کے بعد جیراڈ کے کیسینو کی ہولناک آگ اس بات کی غماز تھی کہ عبداللہ نے عذرا جوناس اور ابراہام جوناس کے خاتمے کے بعد اپنے ہم نسلوں پہ ہونے والے اندھا دھند حملوں پہ جھلا کر جیراڈ کے خلاف انتقامی کارروائی کا آغاز کیا تھا تاکہ جارحیت کے بجائے اسے دفاعی حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔

میں ہسپتال میں ایک مریض کا روپ دھارے آپریشن کا منتظر تھا اور باہر میرے ساتھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک نئے محاذ پر برسرپیکار تھے۔

اگلے روز صبح ناشتے میں مجھے سیال خوراک دی گئی اور میرے استفسار پر بتایا گیا۔ کہ اسی روز دن کے دو بجے آپریشن کیا جانے والا ہے میں نے نرس سے خواہش ظاہر کی کہ میں آپریشن سے قبل ایک مرتبہ اپنے سرجن سے ملنا چاہتا ہوں۔ اور میرے اظہار مدعا کے نصف گھنٹے میں نرس کے ہمراہ میرا ادھیڑ عمر سرجن وہاں آ پہنچا۔

”کیا بات ہے مسٹر سیف؟“ اس نے کمرے میں آتے ہی مسکرا کر نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”آپریشن سے خائف تو نہیں ہو؟“

”مجھے آپریشن کے تصور ہی سے بخار چڑھنا شروع ہو گیا ہے۔“ میں نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔ ”اس سے گلو خلاصی نہیں ہو سکتی؟“

”ان آخری لمحات پر تمہاری درخواست بے سود ہے۔“ وہ قریب آ کر میرے پیٹ کے داہنے حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”اپنڈکس کا آپریشن بہت معمولی ہوتا ہے۔ چھوٹا سا نشتر لگا کر فاضل آنت نکالنے میں بمشکل دس منٹ صرف ہوں گے اور آدھے گھنٹے بعد تم اپنے کمرے میں واپس پہنچا دیئے جاؤ گے۔ تمہارے لئے اس آپریشن کا کیا جانا ہی بہتر ہو گا۔“

”تم سرجری کی اصطلاح میں اسے معمولی قرار دے رہے ہو مگر پیٹ کاٹے جانے کا تصور ہی میرے لئے اذیت ناک بنتا جا رہا ہے!“

”اپنڈکس کی تکلیف آج کل ساڑھے ننانوے فیصد کیسوں میں قابل علاج ہوتی ہے مرنے والوں کی تعداد نصف فیصد سے بھی کم ہے اور تمہاری فائل دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا ہے کہ درد کی شدت کے اعتبار سے تم کو نصف فیصد میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ یہ معجزہ ہی ہے کہ انتہائی تاخیر سے رجوع کرنے کے باوجود ڈاکٹروں نے محض دوا سے تمہاری حالت پر قابو پا لیا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے سمجھانے لگا۔ ”تمہارے بارے میں میرا تجربہ بتاتا ہے کہ اگر اس بار تمہارا آپریشن نہیں کیا گیا تو اگلے دورے میں شاید تم چند گھنٹوں میں ہی آنت پھٹنے کے باعث مر سکتے ہو۔“

”مجھے خوفزدہ نہ کرو ڈاکٹر“ میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”موت کا خوف ہی تو مجھے آپریشن سے ڈرا رہا ہے۔“

سرجن کافی دیر تک میرے ساتھ سر کھپاتا رہا اور آخر کار مجھے آپریشن کے حق میں قائل کر کے واپس لوٹ گیا۔

دوپہر کو ٹھیک دو بجے مجھے چوتھی منزل پر واقع مرشکوہ آپریشن تھیٹر میں میز پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں سارا عملہ سر سے پیر تک سفید لبادوں میں تھا۔ کپڑے کی سفید ٹوپیاں، منہ اور ناک پر سفید نقاب اور پیروں تک میں جوتوں کے بجائے دبیز قسم کے سفید موزے چڑھے ہوئے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری موت واقع ہو چکی ہو اور میرے گرد قدیم روحیں منڈلاتی پھر رہی ہوں۔

مجھے بے ہوشی کا انجکشن دینے کے چند منٹ بعد سو تک گنتی گننے کی ہدایت کی گئی۔ جس پر میں نے فوراً عمل شروع کر دیا۔ مگر تیس تک پہنچتے ہی میری زبان تیزی سے بھاری ہونے لگی۔ اور ذہن پر خوابناک دھند گھرنے لگی اور چالیس سے آگے میرے لئے گنتی جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔

میرا ذہن ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈگمگا رہا تھا کہ مجھے اپنے چاروں طرف روشنی کا سیلاب امڈ پڑنے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی موزوں وزنی پلکیں اٹھا کر آپریشن ٹیبل پر لگے ہوئے دیو قامت برقی ریفلیکٹرز پر نگاہ ڈالنی چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں موجود تھا اور ایملی میرے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ اضطراری انداز میں مجھ پر جھک پڑی اور آہستہ آہستہ مجھے آپریشن کے بارے میں بتانے لگی۔

اس نے مجھے ٹسٹ ٹیوب میں پڑی ہوئی وہ فاضل آنت دکھائی جو میرے پیٹ سے جراحی کے ذریعے نکالی گئی تھی۔ اس سیاہی مائل سرخ لوتھڑے کی لمبائی کسی طرح دس گیارہ انچ سے کم نہیں تھی اور جب ایملی نے مجھے یہ بتایا کہ میری آنت ورم زدہ ہونے کے ساتھ ہی غیر معمولی طوالت بھی اختیار کر چکی تھی تو میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ وہ میری فرضی تکلیف کا ٹھوس ثبوت پیش کر رہی تھی۔

اس کے بیان کے مطابق عام حالات میں وہ آنت تین چار انچ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی تھی اسے حیرت تھی کہ میں ایسی خراب حالت کے باوجود آپریشن تک زندہ کیسے رہ گیا اور مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ تکلیف کے بغیر میری آنت کا وہ حال کیسے ہو گیا۔

مجھے بے ہوشی کا انجکشن دیئے جانے کے ساتھ ہی مقامی طور پر جلد کو سن کرنے والی دوا بھی لگائی گئی تھی جس کا اثر ختم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اپنے پیٹ پر ڈریسنگ کے نیچے چھپے ہوئے تازہ زخم میں شدید تکلیف محسوس ہونے لگی۔

ہسپتال میں میرے اگلے دو دن سخت بے آرامی میں گزرے پھر اس کے بعد آہستہ آہستہ ٹانکوں میں تکلیف کم ہونے لگی۔

آپریشن سے ایک روز قبل السیڈا کے فرضی نام سے ایک شخص مجھے بیرونی حالات سے ضرور آگاہ کر گیا تھا مگر اس کے بعد چار روز تک مجھ سے کوئی ملنے نہ آیا۔

ایملی سے میں اخبار کے حوالے سے کوئی گفتگو کرنے سے گریز کرتا تھا۔ کیونکہ وہ خاصی چالاک لڑکی تھی اور اگر میری زبان سے فلسطینیوں کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی نکل جاتا تو وہ اس کی روشنی میں ہسپتال میں ہونے والی قتل کی وارداتوں پر از سر نو غور شروع کر دیتی جس کا نتیجہ میرے حق میں بہتر نہ ہوتا۔

پانچویں دن غیر متوقع طور پر راڈرک میرے کمرے میں داخل ہوا تو وفور مسرت سے میرا دل بلیوں اچھل پڑا ورنہ میں تو اس کے بارے میں یہ فرض کر چکا تھا۔ کہ وہ جیراڈ کے غنڈوں میں سے کسی کے مہلک وار کا نشانہ بن گیا ہو گا۔

جب وہ آیا تو ایملی بستر پر میرے قریب بیٹھی گیلے تولئے سے میرا چہرہ صاف کر رہی تھی۔ راڈرک کی آمد اسے خاصی گراں گزری اور وہ

نجات میں اپنا کام پورا کر کے واپس چلی گئی۔

"تو تمہارا آپریشن ہو ہی گیا!" ایملی کے جانے کے بعد راڈرک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نے اپنا کام شاندار طریقے پر انجام دیا تھا جس کے نتیجے میں ہر طرف تہلکہ مچ گیا۔"

"اس کا ذکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ پانچ روز سے تم کہاں تھے؟" میں نے سنجیدگی سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"لمبا چکر ہو گیا تھا، اسی میں مچھلی والی لڑکی بھی ہاتھ سے نکل گئی۔"

"عالم بالا چلے گئے تھے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"چند انچ کی کسر رہ گئی" وہ ہنس کر بولا۔ "میری دونوں ٹانگوں میں چار زخم آئے تھے۔ اور آج میں پہلی بار لنگڑائے بغیر چلنے کے قابل ہوا ہوں، پٹیاں بندھوا کر لاٹھی ٹیکتا تمہارے پاس آتا تو اپنے ساتھ ہی تمہیں بھی پولیس کی نظروں میں مشتبہ بنا دیتا۔"

"زخم کیسے آئے تھے؟"

"اسی رات کا تحفہ تھا" اس نے جواب دیا۔ "باہر سیکڑوں راؤنڈز کا تبادلہ ہوا تھا۔ عبداللہ کا بایاں شانہ بھی ادھڑ گیا تھا۔ وہ تو مقدر ہی ساتھ تھا ورنہ ہمارے وہ تین آدمی مارے جاتے تو تعجب نہ ہوتا ایک موقع پر ہم بری طرح ان کے نرغے میں آ گئے تھے!"

"جھاڑیوں میں کس کی لاش ملی تھی۔؟" میں نے سرگوشیانہ لہجہ میں سوال کیا۔

"ان ہی کا آدمی تھا اور وہ لوگ اپنی کثرت کے باوجود بری طرح بھونے گئے تھے۔ سنا ہے کہ ان کے دو زخمیوں نے بعد میں دم توڑ دیا۔"

"اور وہ خنجر زنی کی وارداتیں کیسی تھیں؟"

"تو تمہیں یہاں پڑے پڑے بھی ساری معلومات ملتی رہی ہیں۔" وہ طویل سانس لے کر بولا "عبداللہ کا خیال ہے کہ چند اسرائیلی گوریلے جیراڈ کے آدمیوں سے مل کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتے پھر رہے ہیں ان تینوں کے قتل پر یہودی پریس بری طرح چیخ اٹھا ہے اور موت کے بعد اسرائیل نے پہلی بار اخباری سطح پر بن حیان کی شخصیت کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے سینٹ انطوئین کے واقعہ پر اسرائیل میں اگلے روز عام تعطیل کر کے سوگ منایا گیا تھا۔"

"اب تک کا نتیجہ کیا ہے؟"

"پیرس میں فلسطینیوں نے ویران مقامات پر سے اکیلے گزرنا ترک کر دیا ہے اب تک بارہ آدمی خنجر زنی سے زخمی ہوئے ہیں جن میں سے دو زخموں کی تاب نہ لا کر مر چکے ہیں عراقی ایئرلائن کے دفتر پر بھی بم پھینکے گئے تھے۔ آج کل پیرس کی شاموں کا حسن ماند پڑا ہوا ہے اور شہر میں سخت بے چینی پائی جا رہی ہے۔"

"اور تم لوگ خاموش ہو؟"

"جیراڈ کا نیا کیسینو جلے ہوئے ملبے کے انبار میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور ہمارے آدمی شکاری کتوں کی طرح اس کی بو پر لگے ہوئے ہیں۔"

"کاش کہ اس وقت میں خود بھی باہر تم لوگوں کے ساتھ ہوتا!"

"تمہیں چھٹی کب مل رہی ہے؟"

"ساتویں دن ٹانکے کھولے جائیں گے، اس کے بعد پتہ چلے گا، یہ سلسلہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے!"

"نہیں چھٹی کے بعد بھی احتیاط کرنی ہوگی، اگر کچے ٹانکے کھل گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!"

"چھٹی کے بعد مجھے کہاں جانا ہوگا؟"

"تم فکر نہ کرو، اب میں روز آتا رہوں گا۔"

"وہ المیڈا کون تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم، شاید عبداللہ نے خود اس کا بندوبست کیا تھا۔" اس نے کہا اور پھر میری طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا "پستول مجھے دے دو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے لئے کوئی دشواری پیدا کر دے!"

"میں اتنا احمق نہیں ہوں راڈرک۔" میں نے جواب دیا۔ "اپنا کام نمٹاتے ہی میں نے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔"

"یہ تو بتاؤ کہ تم نے ان تینوں کو ایک کمرے میں کیسے جمع کر لیا تھا۔؟"

"میری سہولت کے لئے انہوں نے خود ہی وہ بندوبست کیا تھا اگر ایملی سے مجھے مزید دو آدمیوں کی آمد کی اطلاع بروقت نہ ملتی تو میرا کام ناممکن ہو جاتا کیونکہ بن حیان کا کمرہ خالی تھا۔ اور وہ تینوں برابر والے کمرے میں روپوش تھے۔" میں نے کہا۔ "اخبارات نے تو ہسپتال میں خونریزی پر بھی شدید ملامت کا نشانہ بنایا ہوگا؟"

"اس معاملے میں اسرائیلی حکام کی حماقت ہمارے کام آ گئی۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اگر وہ بن حیان کی شخصیت پر پردہ پڑا رہنے دیتے تو شاید ہسپتال کے برقی نظام کی تباہی پر کافی لے دے ہوتی مگر بن حیان کے رتبے کا علم ہونے پر پیرس کے تین بڑے اخبارات نے سخت حفاظتی انتظامات اور سیکرٹ گارڈز کی موجودگی میں اسرائیلی وی آئی پی کے قتل کی سرخی جمائی اور سارا زور اس بات پر دیا گیا کہ سخت ترین انتظامات کے باوجود قاتل مقررہ نشانے پر اپنا کاری وار کر کے صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"پولیس کیا کہتی ہے؟"

"ان کا رویہ بہت پُراسرار ہے انہوں نے ابھی تک اس معاملے میں پریس کو اعتماد میں نہیں لیا ہے اور اب ہمارے بجائے وہ ملامت کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔"

میں راڈرک سے ریتا کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنی چاہتا تھا۔ جو لیبیا میں میری منتظر تھی، مگر وہ شخص افواج آزادیٔ فلسطین کا رکن نہیں تھا جو اسے اس بارے میں معلومات ہوتیں۔ لہٰذا میں نے عبداللہ سے ملاقات ہونے تک خاموش رہنے کو ہی ترجیح دی۔

فلسطینی تحریک سے قریبی تعلق کے دوران مجھے کئی دوسری تنظیموں سے ان کے روابط کا علم ہوا تھا۔ مگر ان میں فرینڈز آف فلسطین نامی گروپ میرے لئے بالکل نامانوس تھا۔ جس کے اراکین محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر معاوضہ لئے بغیر فلسطینیوں کے لئے کام کرتے تھے۔ حالانکہ اس گروپ کے کسی بھی رکن کا فلسطین کے خطے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

راڈرک تو مقررہ وقت پورا ہونے پر واپس چلا گیا مگر مجھے ذہنی طور پر مصروف رکھنے کے لئے بہت سا مواد فراہم کر گیا۔

جیراڈ نے زرخرید غنڈہ ہونے کے باوجود جوناس برادران کی عبرتناک موت کو جس طرح اپنی انا کا مسئلہ بنایا تھا۔ وہ مجھے کھٹک رہا تھا ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بن حیان کی دردناک موت کے بعد اسرائیلیوں نے اسے مزید معاوضہ دے کر اپنے ساتھ لگائے رکھا ہو مگر یہ نکتہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی پیشہ ور غنڈہ اپنے کسی خریدار کے لئے اپنے پورے وسائل اس طرح داؤ پر لگا دے کہ اس کے اپنے مفادات بری طرح تاراج ہونے لگیں۔

پچھلے چند روز میں جیراڈ کا کردار کچھ اس طرح ابھر کر سامنے آیا تھا کہ میرے دل میں اسے زیر کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر لیبیا جانے سے قبل ذرا بھی مہلت ملی تو جیراڈ کے درشن ضرور کروں گا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ساتویں روز میرے زخم کے ٹانکے کھول دیئے گئے اور ڈریسنگ کے بعد مجھے اجازت دے دی گئی کہ میں اپنی سہولت کے مطابق ہسپتال چھوڑ دوں۔

اسی شام راڈرک آیا تو اس نے میری چھٹی کی خبر مسرت سے سنی اور سید ھا حساب صاف کرنے چلا گیا۔ غنیمت یہ تھا کہ دو روز قبل ایملی اپنا ہفتہ مکمل کر کے رات کی شفٹ میں جا چکی تھی۔ ورنہ میرے لئے اس سے گلوخلاصی خاصی دشوار ہو جاتی۔

خاموشی سے نکل جانے میں فائدہ یہ تھا کہ میں نے اسے اپنا جو رہائشی پتہ دیا وہ ایک ہوٹل کا تھا جہاں میرا جانے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔

میں ہسپتال کے عملے سے الوداعی ملاقات کر کے باہر آیا تو راڈرک مجھے ایک بیوک کے پاس لے گیا اور میرے استفسار پر پتہ چلا کہ اس کے پاس کوئی ذاتی کار نہیں تھی بلکہ اس نے کسی دوست کی شرکت میں گیراج کھولا ہوا تھا۔ اور حسب ضرورت مرمت کے لئے آنے والی گاڑیاں استعمال کرتا رہتا تھا۔

"عبداللہ کا قیام کہاں ہے؟" گاڑی کے روانہ ہوتے ہی میں نے سوال کیا۔

"وہ کسی مادام فے کا نام لیتا ہے۔"

"اوہ — تو وہ ابھی تک وہیں ٹکا ہوا ہے؟"

"تم جانتے ہو اسے؟" راڈرک نے سوال کیا اور میں نے محض اثبات میں سر ہلا کر اس موضوع کو وہیں ختم کر دیا۔

راڈرک نے اپنے فلیٹ کا رخ کرنے سے پہلے مجھے جیراڈ کے کیسینو کا جلا ہوا ملبہ دکھایا جو واقعی خاکستر ہو چکا تھا۔

عمارت کا بیشتر حصہ آتشزنی کے بعد زمین بوس ہو چکا تھا لیکن باقی رہ جانے والے آثار پھر بھی بتا رہے تھے کہ آگ لگنے سے پہلے وہاں تین منزلوں پر محیط کوئی عظیم الشان عمارت رہی ہوگی۔

"جیراڈ کے ٹھکانے سے واقف ہو؟"

"اس کے دس ٹھکانے ہیں، وہ کہیں بھی ہو سکتا ہے!"

"تو کیوں نہ اسی کو تلاش کیا جائے۔"

"عبداللہ بتا رہا تھا کہ جیراڈ کا ایک آدمی اسے اور تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے" راڈرک نے معنی خیز لہجے میں کہا اور میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

جوناس ولا میں میرے ہاتھوں سے بچ کر فرار ہونے والا جیراڈ کا ایک آدمی واقعی مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا اور میں اسے فراموش کر بیٹھا تھا اگر راڈرک مجھے یاد دہانی نہ کراتا تو میں جیراڈ کے اڈے پر چھاپے والے دن میں پھنس سکتا تھا۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ چند دن کے لئے زندگی کی ہنگامہ خیز جدوجہد سے نکل کر ہسپتال کے بستر پر پڑے رہنے سے میرا ذہن قدرے زنگ آلود ہو گیا تھا۔ اور خود کو دوبارہ پرانے معیار پر لانے کے لئے مجھے فوری طور پر کچھ مشق درکار تھی۔

فرانس میں ایلیزا نے میرے ساتھ جو تعاون کیا اسے میں زندگی بھر نہیں بھلا سکتا تھا اپنے باپ کے ساتھ اس کا رویہ آزاد مغربی معاشرے کے بھیانک معاشرتی تضادات کا ایک شاہکار تھا اور میں فرانس کی سرزمین سے رخصت ہونے سے قبل ایک بار ایلیزا سے ضرور ملنا چاہتا تھا۔

اورلی ایئرپورٹ پر ایلیزا کی گولی سے بن حیان کے زخمی ہونے کے بعد اس لڑکی سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے اس سے دوبارہ ملاقات کا بھی وعدہ کیا تھا۔ اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ ضرور میری منتظر ہوگی اور آخری ملاقات پر بے حزنی کے ساتھ میرے ہمراہ اپنی نجات کا یادگار جشن منائے گی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" راڈرک کے سوال نے مجھے خوشگوار تصورات کی دنیا سے یک لخت باہر کھینچ لیا۔

"اس شہر میں میری بھی ایک دوست رہتی ہے" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"یہاں کی لڑکیوں میں پیدائشی طور پر ہرجائی پن کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ تمہاری دس بارہ روز کی غیر حاضری میں اس نے نئے عاشق پیدا کر لئے ہوں گے۔"

"دوست اور عاشق میں بڑا فرق ہوتا ہے!"

"بالکل ہوتا ہے" اس نے پرزور انداز میں تائید کی۔ "عاشق بے چارہ تو ہجر کے لمحات وصال کے تصورات میں گزار دیتا ہے اور دوست کی لغت میں

تو ہجر کا لفظ ہی نہیں ہوتا بشرطیکہ اسے تمہاری شکل یاد رہ گئی ہو۔۔۔ تو ابھی جاؤ گے اس کے پاس۔۔؟"

"پہلے فون کروں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ زیادہ مناسب ہے، کسی رقیب سے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا۔" وہ خاصے خوشگوار موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ "ویسے کون ہے وہ؟"

"عبداللہ جانتا ہے اسے!" میں نے یہ کہہ کر جواب گول کر دیا۔

"اس سے ملنے جاؤ گے تو یہ یاد رکھنا کہ تمہارے آپریشن کا زخم ابھی تازہ ہے!" راڈرک نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تمہارے ٹانکے ڈھیلے ہو گئے تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

میرے جواب دینے سے قبل راڈرک کا فلیٹ آ گیا۔ اس نے مجھے گاڑی سے اتار کر چابی دیتے ہوئے کہا۔ "تم اوپر چلو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"مچھلی خریدنے کا ارادہ ہے؟"

"مچھلی تو پھسل گئی تمہارے چکروں میں" وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "یہ گاڑی گیراج پر چھوڑنی ہے کام مکمل کر کے صبح ڈلیوری دینی ہے!"

میرے لئے راڈرک کی غیر حاضری غنیمت تھی۔ لہٰذا میں نے اس کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی جوناس والا فون کر ڈالا۔

دوسری جانب سے شاید ایلیزا کے خدمتگار نے ریسیور اٹھایا۔ میں اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اور نہ ہی وہ میرا فقرہ سمجھا ہوگا۔ مگر مس ایلیزا کے الفاظ سن کر اس نے فرنچ میں کچھ کہا اور چند ثانیوں بعد ہی مجھے ریسیور پر ایلیزا کی ترنم ریز آواز سنائی دی۔

"ڈین فرنانڈو بول رہا ہوں ایلیزا۔" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"اوہ ڈان۔" اس کی تحیر آمیز پرجوش آواز سنائی دی۔ "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"پیرس کا کوئی رہائشی علاقہ ہے!" میں نے جواب دیا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا حال ہے؟"

"میں تمہاری تلاش میں تھی ڈان!" اس کی آواز ہیجان انگیز تھی مگر لہجہ یک بیک مدھم ہو گیا تھا۔

"کیوں خیریت تو ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں!" اس نے جلدی سے کہا۔ "بس تم سے ملنے کے لئے میری طبیعت بہت بے چین تھی۔"

"ملاقات ہوئی تو ہم طویل جشن منائیں گے!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تم ملو تو سہی!"

"میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔"

"یہاں نہ آنا۔" اس نے فوراً ہدایت کی۔ "ہنگامے کے سلسلے میں آج کل ہر وقت پولیس کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ہم کہیں باہر ہی ملیں گے۔"

نصف گھنٹے بعد ایک بار کے قریب ملنے کا پروگرام طے کر کے میں نے ریسیور رکھ دیا۔

راڈرک سے میری شناسائی مختصر ہی تھی مگر وہ خاصا یار باش آدمی تھا لہٰذا میں نے اس سے اجازت لئے بغیر ہی وارڈروب میں سے اس کا ایک نفیس سوٹ نکالا اور ایلیزا سے آخری ملاقات کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

راڈرک آیا تو مجھے دیکھتے ہی حیران رہ گیا۔ "یہ کس پر ستم ڈھانے کی تیاریاں کر رہے ہو؟"

"کسی سے ملنے جا رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا، ہو سکتا ہے کہ پوری رات ہی باہر گزر جائے۔"

"مجھے اس کے بارے میں بے شک نہ بتاؤ لیکن عبداللہ کے لئے تو کچھ بتا دو، وہ پہلی فرصت میں تم سے ملنا چاہے گا۔"

"اسے بتا دینا کہ میں بھتیجی سے ملنے گیا ہوں!"

"کس کی بھتیجی؟"

"بس وہ سمجھ لے گا۔ اس لڑکی کے لئے یہ کوڈ اس کے لئے نیا نہیں ہے!"

میں راڈرک کو حیران و پریشان چھوڑ کر اس کے فلیٹ سے باہر آ گیا۔

"بلڈنگ کا محل وقوع اچھی طرح ذہن نشین کر لینا!" اس نے دروازہ بند کرنے سے پہلے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ واپسی میں کہیں اور پہنچ جاؤ۔"

"فکر نہ کرو، بھٹک گیا تو تمہیں فون کر لوں گا۔"

میں مقررہ مقام پر طے شدہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی پہنچ گیا مگر ایلیزا مجھ سے پہلے وہاں موجود تھی مجھے دیکھتے ہی وہ گاڑی سے اتری اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

"گاڑی میں بیٹھو، یہ شارع عام ہے" میں نے خفت آمیز انداز میں اسے کار کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تم پیرس میں ہو، بغداد کی کسی گلی میں نہیں!" وہ منہ بنا کر بولی۔

"بغداد کیسے یاد آ گیا؟"

"سنا ہے کہ وہاں عورت اور مرد کا جسم ایک دوسرے سے مس ہونا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے" وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ خود اعتماد نظر آ رہی تھی۔

"زندگی کیسے گزر رہی ہے؟" گاڑی روانہ ہونے کے بعد میں نے جوناس برادران کی موت کے تذکرے سے دانستہ گریز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے باپ کو بڑی بے رحمی سے مارا گیا ہے ڈان!" اس نے ایک یا دو ثانیے کے سکوت کے بعد جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"تمہارا باپ بہت ہوشیار آدمی تھا ایلیزا" میں نے موضوع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے محتاط لہجے میں کہا۔ "اس پر آسانی سے ہاتھ ڈالنا ناممکنات میں سے تھا۔"

"میں خود اس کی موت کی خواہاں تھی۔" وہ بولی۔ "مگر پھر بھی وہ میرا باپ کہلاتا تھا۔ اگر اس کی لاش قابل شناخت رہتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں!"

"کیوں؟" ڈرائیو کرتے کرتے اس نے ایک لحظے کے لئے گردن گھما کر بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کیا وہ تمہارا نشانہ تھا۔"

"مگر اس کارروائی کے لئے میں بھی ذمہ دار ہوں!"

"اس کی زندگی میں میں اس سے نفرت کرتی تھی مگر اس کی لاش دیکھنے کے بعد مجھے تھوڑا سا ملال ہوا تھا۔ اگر اس کی موت تھوڑی سی آسان بنا دی جاتی تو بہتر ہوتا۔ بہرحال اب تو وہ ہو چکا اور میں اپنے فیصلے کے بارے میں ذرا بھی ملامت محسوس نہیں کرتی" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن ابراہام کس کی دشمنی کا شکار رہا۔ اس کی موت بھی کم و بیش اسی قدر وحشیانہ تھی!"

میرے لاشعور کی گہرائی میں کہیں خطرے کی مدھم سی گونج پیدا ہوئی اور میں نے فوراً ہی ایک حکمت عملی اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ "اس کے بارے میں میں نے بھی اخبار میں پڑھا تھا یہ محض اتفاق ہے کہ دونوں بھائی کم و بیش ایک ہی وقت میں مارے گئے۔"

"تو وہ تمہارا کام نہیں تھا؟"

میں ہنس پڑا۔ "بھلا اس بے چارے سے میری کیا دشمنی تھی جو میں اسے ہسپتال میں گھس کر ملتا۔ تم نے بھی سن لیا ہوگا کہ وہ اسرائیل کا ایک اہم ترین آدمی تھا مگر تمہارے سامنے ایک لاابالی آوارہ گرد کے روپ میں آتا تھا۔ اس کے تو بے شمار دشمن ہو سکتے تھے۔"

"ختم کرو اس ناخوشگوار موضوع کو!" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ بتاؤ کہ تم غائب کہاں تھے؟"

"اسی شہر میں تھا!"

"تو مجھ سے کیوں نہیں ملے؟"

"احتیاطاً ڈارلنگ" میں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارے ولا پر بھی پولیس کی گہری نظر رہی ہوگی۔ اور میں کسی دشواری میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔"

"اور تمہارا ساتھی کہاں ہے؟" اس نے یک بیک عبداللہ کے بارے میں سوال کیا۔

"میرے ساتھ ہی رہتا ہے!" ایلیزا کا یہ سوال بھی میرے لئے غیر متوقع تھا۔ میری چھٹی حس اس لڑکی کے رشتے کے بارے میں کسی گڑبڑ کی نشاندہی کر رہی تھی مگر بظاہر اس کا طرز عمل خاصا معقول تھا۔ وہ طویل وقفے کے بعد اپنے ایک ایسے شناسا سے مل رہی تھی جس کے ساتھ اس نے اپنے باپ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور عذرا جوناس کے قتل کے بعد ہم دونوں کی وہ پہلی ملاقات تھی۔ جس میں ایلیزا گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی فطری کوشش کر رہی تھی۔

"چاہو تو اسے بھی بلا لو۔" اس نے کہا۔ "آج کے جشن پر اس کا بھی حق ہے۔ اگر وہ آنا چاہے تو میں اس کے لئے بھی کسی کا بندوبست کر سکتی ہوں۔۔۔"

"تمہارے خوبصورت لبوں سے ایسی پختہ باتیں اچھی نہیں لگتیں بے بی" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "وہ تجرد پسند آدمی ہے اس سے بہت جلد اکتا جاؤ گی۔۔۔"

ہمارے سفر کا اختتام دریائے سین کے کنارے اسی ہٹ پر ہوا جہاں ایک بار ایلیزا کا انتظار کرنے کے بعد میں نامراد واپس لوٹا تھا۔

کہر آلود شام کے دھندلکے میں دریا کے کنارے پر کہیں کہیں جلتی ہوئی خوابناک روشنیاں ماحول کو نہایت نشاط انگیز بنا رہی تھیں۔ میں نے کار سے اتر کر ہٹ میں داخل ہوتے ہوئے ایلیزا کے متناسب اور مرمریں پیکر کا جائزہ لیا اور آنے والے لمحات کا خمار میرے ذہن پر طاری ہونے لگا۔

ایلیزا نے شاید مجھ سے بات کرتے ہی فون پر ہٹ کے نگہبان کو ہدایات دے دی تھیں۔ کیونکہ آتشدان روشن تھا۔ اور باہر کے یخ بستہ ماحول کے مقابلے میں اندر خوشگوار حرارت موجود تھی۔

اندر پہنچ کر ایلیزا نے سیاہ گاؤن اتار کر اپنے لئے سگریٹ سلگائی اور پھر دو بوتلیں لے کر مختصر سی میز پر میرے سامنے بیٹھ گئی۔

ایلیزا نے میرے ساتھ وہسکی سے آغاز کیا مگر دوسری بار گلاس لبریز کرتے تو میرے لئے وہسکی اور اپنے لئے شیری کا انتخاب کیا۔

"یہ کیوں؟" میں نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہیں بہکا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے سلگتے ہوئے ہونٹوں پر دعوت انگیز مسکان کھیل رہی تھی۔

"تمہیں مایوسی ہوگی!" میں نے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "اسی طرح قطرہ قطرہ کر کے پیتے رہے تو دو بوتلیں بھی نہ بہکا سکیں گی۔"

"تو تم چاہتی ہو کہ بوتل کو منہ لگا لوں؟"

"یہ مشکل کام ہے، میں تمہیں امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"خواتین کی موجودگی میں میں نفاست کا قائل ہوں ورنہ پوری بوتل بھی معدے میں اتار لیتا۔" یہ کہہ کر میں نے گلاس خالی کر دیا۔

"مجھے تو تیسرے پیگ کے بعد گنتی کا بھی ہوش نہیں رہتا۔" وہ میرے خالی گلاس میں کافی مقدار انڈیلتے ہوئے بولی۔ "اس معاملے میں خاصی کمزور ہوں۔"

"تو تین ہی پورے کر لو پھر شہزوری بھی دیکھ لوں گا۔"

وہ نہایت چالاکی سے مجھے باتوں میں الجھا کر بوتل خالی کرانے میں کامیاب ہو گئی میرے حواس بدستور کام کر رہے تھے مگر شراب کے زیر اثر ایلیزا کی ادائیں ان پر حاوی ہوتی جا رہی تھیں۔ اور میں عالم سرور میں اس کی شوریدہ سری سے پوری طرح محظوظ ہو رہا تھا۔

کمرے کی روشن فضا میں یکں آہستہ آہستہ اپنے گردوپیش سے لاتعلق ہوتا جارہا تھا اور پھر میرے سامنے ایلیزا کے علاوہ کسی چیز کا تصور باقی نہیں رہا۔ میرے اشتعال سے پہلے وہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پھر سہمنے لگی۔ اور جب میں صوفے پر نہایت بے فکری سے پیر پھیلائے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا تو وہ بستر کے سرے پر جا بیٹھی اور غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"تمہاری آنکھوں میں چھپا ہوا جھوٹ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

میں چونک پڑا۔ اس لڑکی کا لہجہ سرد اور عجیب سا تھا۔ "کس جھوٹ کی بات کر رہی ہو۔۔۔؟"

"ابراہام کو کس نے مارا تھا؟" اس نے سوال کیا تو یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ چند لمحے پہلے والی شوخ و شنگ دوشیزہ ہے۔

"اس وقت ابراہام کا ذکر کہاں سے آگیا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں صرف اسی لئے تمہیں یہاں لے کر آئی ہوں۔"

"تو پھر جو کچھ اب تک ہوتا رہا وہ فریب تھا؟"

"فریب ہی کہہ لو، میں ابراہام اور عذرا کو مارنے والے کے مقابلے میں اپنی قوت آزمانا چاہتی تھی۔" اس نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔

میری کنپٹیوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ "اگر ابراہام کو میں نے مارا ہو تو اس سے کون سی حقیقت بدل جاتی ہے؟"

"حقیقت نہیں، یہ اعتماد کی بات ہے، ڈان۔" وہ اپنے لئے نئی سگریٹ سلگا کر ملامت آمیز لہجے میں بولی۔ "تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"اس موضوع پر میں تم سے پھر کسی وقت بات کروں گا۔" میں نے تفریح کا لطف غارت ہونے پر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بات تو ابھی ہوگی۔" ایلیزا کا لہجہ اٹل تھا۔ "تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا تعلق بھی اعتماد سے ہے۔ تم میرے ساتھ تفریح کے لئے یہاں آئے تھے مگر میرے دل میں کچھ اور منصوبہ تھا اور تم بھی کسی سازش کی نیت سے میرے قریب آئے تھے فرق یہ ہے کہ تم میری کمزوریوں کی قیمت وصول کر چکے ہو اور میرا حساب باقی ہے!"

"تمہیں کوئی زبردست غلط فہمی ہوئی ہے ایلیزا۔"

"غلط فہمی ہوئی ضرور تھی مگر اب دور ہو چکی ہے، میں کئی دن سے تمہاری تلاش میں تھی مگر یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم آج خود ہی مجھ سے آ ٹکرائے۔"

"تو پھر کھل کر بات کرو کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"پہلے تو میں چاہتی ہوں کہ تم ایک شریف آدمی کی طرح ہر بات کا اعتراف کر لو۔"

"عذرا کے قتل میں جس قدر میرا حصہ ہے اسی قدر تم بھی شریک تھیں۔ اس کے علاوہ تم کس بات کا اعتراف سننا چاہتی ہو؟"

"تو پھر مجھ ہی سے سنو!" وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولی۔ "تم شروع ہی سے ابراہام کے چکر میں تھے اور کسی طرح یہ پتہ چلانے میں کامیاب ہو گئے کہ میں اس کی بھتیجی ہوں اور پھر تم نے مجھ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اور میں نے لاعلمی میں تمہیں اس حد تک قبول کر لیا کہ اپنے باپ سے نفرت کی کہانی بھی تمہیں سنا ڈالی اور تم بظاہر مجھے عذرا کی ہلاکت کی تسلی دیتے رہے مگر میری آڑ میں ابراہام کے گرد اپنا جال تیزی سے مضبوط کرتے رہے اور مجھے آخر تک اصل معاملے کی ہوا نہ لگنے دی!"

"یہ سب غلط ہے ایلیزا!" میں نے کہا۔

"نہیں صفدر علی! یہ بالکل درست ہے!" اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ پُراعتماد لہجے میں کہا اور میں اس کے منہ سے اپنا اصل نام سن کر حیرت سے اچھل پڑا۔

"مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولی۔ "میں تمہارے فلسطینی دوست عبداللہ کے بارے میں بھی جان چکی ہوں۔ تم دونوں تیس میں کئی اسرائیلی ایجنٹوں کو مارنے کے بعد صرف بن حیان کی تلاش میں پیرس آئے تھے مجھے سخت افسوس ہے صفدر علی کہ میں نادانستگی میں تمہاری آلۂ کار بن گئی!"

"یہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟" میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پہلے میری تائید نہیں کرو گے؟" اس نے مسکرا کر کہا۔ اس کے الفاظ میں اعتماد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "کیا میرے فرانس سے نکلنے تک تم یہ تمام باتیں اپنی ذات تک محدود رکھو گی؟"

"کب جا رہے ہو؟"

"شاید میں کل ہی نکل جاؤں؟"

وہ مضحکانہ انداز میں زور سے ہنس پڑی۔ "اتنی عجلت تم نہیں۔ ابھی تو تمہارے ذریعے عبداللہ کو یہاں لانا ہے۔"

"اپنی کھال میں رہو ایلیزا!" میں غصیلی آواز میں بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ میں اپنی روانگی تک تمہیں اپنے آدمیوں کی تحویل میں رکھنے کا فیصلہ کر لوں؟"

"بیٹھ کر پوری بات سنو مسٹر صفدر۔" وہ یک بیک سنجیدہ ہوگئی۔ "بن حیان کے قتل کے بعد اسرائیل کی قومی دفاعی کونسل کا چیئرمین خود میرے پاس آیا تھا۔ اسے کسی طرح شبہ ہوگیا تھا کہ عذرا اور ابراہام کے قتل میں کہیں نہ کہیں میرا ہاتھ ہے اور پھر اس نے مجھے تمہارے اور عبداللہ کے بارے میں بتایا۔ اسرائیلی ایجنٹ دلاسے کا دیلہ نے تمہارے ہاتھوں مرنے سے قبل تمہاری سرگرمیوں کی اطلاع اسرائیل بھجوا دی تھی اور پھر قومی دفاعی کونسل کے چیئرمین نے تم دونوں کی تصاویر دکھا کر مجھے بتایا کہ تم دونوں بن حیان وغیرہ کے ممکنہ قاتل ہو سکتے ہو۔ تصویریں دیکھنے کے بعد میں نے اسے بلاکم و کاست ساری کہانی سنا دی اور اب میں نے معاوضہ دے کر جیراڈ کو خرید لیا ہے اور وہ ہر فلسطینی کے لہو سے میرا انتقام لے رہا ہے۔ اس کے خنجر بردار آدمی پیرس میں فلسطینیوں کا رہنا ناممکن بنا دیں گے۔"

میں نے خطرہ بھانپ لیا۔ ایلیزا نہ صرف ہر بات سے واقف ہو چکی تھی بلکہ حیرتناک طور پر اپنی غلطی کے عمل اتالے کی کوششوں میں مصروف تھی اور شاید اسی لئے وہ مجھے شراب کے نشے میں مدہوش کرنا چاہتی تھی تاکہ مجھے بے بس کر کے اسرائیلی یا مقامی حکام کے حوالے کر دے اور یوں اپنے ضمیر کی مجرمانہ خلش کو دور کر سکے۔

میرے لئے سب سے بہتر تو یہی تھا کہ میں اسے ختم کر دیتا مگر اس نے میرے ساتھ ہمیشہ تعاون ہی کیا تھا لہٰذا میرا دل اس کے قتل پر آمادہ نہ ہو سکا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہاں سے جا کر فوری طور پر پیرس چھوڑ دیتا اور جلد از جلد فرانس کی سرحد عبور کر لیتا۔

میں نے جانے کا ارادہ کر کے اپنا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ "میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا ایلیزا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ایسے ناخوشگوار ماحول میں ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہیں۔"

"تم اس ہٹ سے نہیں جا سکتے صفدر۔" وہ یہ کہتے ہوئے بستر سے اٹھ کر ہینگر کے قریب پہنچ گئی، جہاں اس کا گاؤن لٹکا ہوا تھا۔

"ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو ایلیزا۔ مجھے روک کر تم کسی کی خوشنودی حاصل نہ کر سکو گی۔"

"اس ہٹ کے باہر گیارہ تجربہ کار اور مسلح اسرائیلی ایجنٹ میرے اشارے کے منتظر ہیں مسٹر صفدر! اگر تم نے تنہا باہر جانے کی کوشش کی تو وہ دور سے دیکھتے ہی تمہارا بدن چھلنی کر دیں گے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میں ساکت کھڑا قہربار نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم بکواس کر رہی ہو۔"

"میرے بغیر باہر قدم نکال کر دیکھ لو، یہ ہٹ ہر وقت ان کے محاصرے میں رہتا ہے کیونکہ تم جب بھی ملنے میں تمہیں اسی چور دروازے سے لے کر آتی، انہوں نے یہ ضرور دیکھا ہوگا کہ میرے ساتھ ایک مرد اندر داخل ہوا ہے۔ اگر انہیں بھنک بھی مل جائے کہ تم صفدر علی ہو تو دروازہ توڑ کر اندر گھس آئیں گے۔"

"اور تم میرے ساتھ ہو تو وہ تعرض نہیں کریں گے۔۔؟"

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور بولی۔ "میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آتی رہتی ہوں۔ ہم ساتھ آتے ہیں اور ساتھ جاتے ہیں مگر تم۔۔۔۔!" وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

"پھر تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا بے بی!" میں نے یہ کہہ کر اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر اس نے نہایت پھرتی سے اپنے سیاہ گاؤن کی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی نال میری طرف اٹھا دی۔

"وہیں رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گی۔"

میں اپنی جگہ رک گیا۔

"اورلی ایئرپورٹ سے آتے ہوئے اگر میں تمہاری ہدایت کے مطابق اسے گٹر میں پھینک دیتی تو آج غیر مسلح ہوتی۔" اپنی دھمکی کا مناسب اثر دیکھ کر وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"فائر کرتے ہوئے تمہارے ہاتھ کانپ جائیں گے۔"

"پہلی گولی میں نے کامیابی سے اپنے ایک بزرگ پر چلائی تھی اور آج تو ایک ہرجائی آشنا سامنے ہے۔" اس نے کھڑکی کی طرف الٹے قدموں سرکتے ہوئے کہا۔ "نشانہ خطا بھی ہو گیا تو فائر کی آواز پر باہر والے بھوکے بھیڑیوں کے غول کی طرح تم پر آ پڑیں گے۔"

"تو تم مجھے قید کرنا چاہتی ہو؟"

"قید!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی۔ "وہ اسرائیلیوں کی خواہش ہے مگر میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے سسکا سسکا کر ماروں گی۔"

میں بدترین مشکل سے دوچار ہو چکا تھا۔ سامنے ایلیزا ریوالور لئے موجود تھی اور باہر گیارہ خونخوار سیکرٹ ایجنٹوں کا ناقابل شکست حصار قائم تھا۔ ایلیزا کے ہمراہ ادھر آتے ہوئے میں نے عبداللہ کے لئے بھی مبہم سا پیغام ہی چھوڑا تھا۔ لہٰذا اس سے بھی مدد کی کوئی امید نہیں تھی۔ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے میری زندگی واقعی اسی پاگل لڑکی کے رحم و کرم پر رہ گئی ہو۔

"میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا، ریوالور رکھ لو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"مجھے نادان نہ سمجھو۔" وہ میرا تمسخر اڑاتے ہوئے بولی۔ "یہ درست ہے کہ میں نے تمہارے ہی طفیل جرأت اور بے باکی سیکھی ہے مگر اس سے آگے تمہاری استادی نہیں چلے گی۔"

اسی وقت اچانک ہٹ کے دروازے پر تیز دستک ہوئی اور ایلیزا کسی بھڑکے ہوئے وحشی کی طرح کبھی میری طرف اور کبھی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

چند سیکنڈ کے بعد آنے والے نے مسلسل دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

ایلیزا

چند سیکنڈ تک کسی غضب ناک شیرنی کی طرح ہٹ کے داخلی دروازے کی طرف دیکھتی رہی جو مسلسل پیٹا جا رہا تھا مگر اس دوران میں وہ ایک لحظہ کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ دروازے کی جانب تھا جب کہ میں اس طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ اور ایلیزا مجھے نظروں میں رکھتے ہوئے بآسانی میرے شانوں کے پیچھے دیکھ سکتی تھی۔

"کون ہے؟" چند ثانیوں تک خاموش رہنے کے بعد ایلیزا نے خونخوار لہجے میں غرا کر سوال کیا۔

میں اس دستک کو اپنے لیے غیبی امداد تصور کر رہا تھا۔ ایلیزا میری طرف سے ذرا بھی غافل ہوتی تو میں ایک ہی زقند میں اسے بے بس کر کے اس کے ریوالور پر قابض ہو سکتا تھا اور پھر تمام صورتحال میرے حق میں ہوتی۔ میں ریوالور کی نال اس کے پہلو سے لگا کر بآسانی اسی کی گاڑی میں ہٹ سے فرار ہو سکتا تھا اور باہر کھڑے ہوئے گیارہ اسرائیلی اسی غلط فہمی میں مبتلا رہ جاتے کہ ایلیزا ہٹ کی محفوظ دیواروں کے پیچھے اپنے کسی بے تکلف دوست کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر واپس جا رہی ہے۔

مگر چند روز پیشتر حماقت کی حد تک سادہ لوح نظر آنے والی ایلیزا اس وقت بیشہ ور لڑاکا نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور کی سیاہ نال مسلسل میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور ایلیزا پوری مستعدی کے ساتھ میری ہر حرکت کی نگرانی کر رہی تھی۔

"دروازہ کھولو مسّی! میں ابی غیل ہوں۔" بند دروازے کے عقب سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"چند ثانیوں کے لیے توقف کرو ابھی کھولتی ہوں۔" ایلیزا نے کہا۔ باہر والے کا نام سننے کے بعد میرے لیے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ آنے والا نہ صرف یہودی بلکہ اسرائیلی تھا کیونکہ ایسے قدیم عبرانی نام اسی سرزمین پر سننے میں آتے تھے۔

"اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر دروازے کی طرف چلو میں تمہارے پیچھے رہوں گی۔ اگر تم نے ذرا بھی مکاری دکھانے کی کوشش کی تو میں بے دریغ گولی چلا دوں گی۔" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر سرد لہجے میں کہا۔

"اسے دروازے ہی سے رخصت کر دو۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ معاملہ اگر میرے اور تمہارے درمیان ہی رہے تو بہتر ہوگا۔"

"میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں، جو کہہ رہی ہوں اس پر عمل کرو ورنہ پچھتاؤ گے۔" وہ میری کسی بات کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

میں ایک گہرا سانس لے کر ہٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اپنے عقب میں ایلیزا کے قدموں کی چاپ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔

"دروازہ کھولو۔" ایلیزا نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور میں نے ہاتھ نیچے گرا کر دروازے کا بولٹ نیچے سرکا دیا۔

ہٹ کا دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا اور میں بولٹ گرانے کے ساتھ ہی اگر تیزی سے پٹ اندر کھینچ کر اس کی اوٹ میں ہو جاتا تو چند ثانیوں کے لیے ایلیزا کے ریوالور کی زد سے بچ سکتا تھا مگر اس قسم کی کارروائی مجھے باہر نکلنے میں کوئی مدد نہ دیتی۔ ایلیزا اپنے ساتھیوں کی مدد سے فوراً ہی مجھے دوبارہ گھیر لیتی۔ اس سے ملنے کے لیے روانہ ہوتے وقت میرے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی خطرے کا احساس نہیں تھا اور اسی وجہ سے میں وہاں غیر مسلح حالت میں آیا تھا۔ لے دے کر زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی میرا واحد سہارا تھی مگر وہ بھی زیادہ فاصلے سے نشانہ لگانے کے معاملے میں قطعی ناکارہ تھی۔

دروازے کا بولٹ گرانے کے بعد میں چند قدم پیچھے سرک گیا۔ میرا چہرہ بدستور دروازے کی ہی طرف تھا۔

باہر والے نے بولٹ گرنے کی آواز سن کر دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور پٹ بے آواز اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

وہ خوفناک صورت والا تنومند شخص گندمی چہرے کا مالک تھا۔ اندر کا ماحول نظر آتے ہی اس کے بشرے پر حیرت کی پرچھائیاں نظر آئیں اور وہ چوکھٹ میں ایک قدم بڑھا کر وہیں ٹھٹھک کر رک گیا جیسے مزید پیش قدمی اس کے لیے مہلک ہو سکتی ہو۔

"اندر آ جاؤ ابی غیل!" میری پشت سے ایلیزا کی آواز ابھری۔

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں مسّی؟" ابی غیل نے آگے بڑھے بغیر متعجب لہجے میں پوچھا۔

"اس کے ساتھ میرا ذاتی جھگڑا ہے۔" ایلیزا نے لاپروائی سے کہا۔ "تم اندر آ کر دروازہ بند کر دو!"

"ہم تمہارے جانثار ہیں مسّی!" ابی غیل کا لہجہ شکایت کا انداز لیے ہوئے تھا۔ "تم کو آتشیں اسلحہ کے کھیل زیب نہیں دیتے۔ تم اشارہ بھی کر دیتیں تو ہم اس مردود سے نمٹ لیتے۔ یہ ہے کون؟ اور تم سے اس کا کیا جھگڑا ہے؟"

"تم جس کام کے لیے میرے ساتھ لگائے گئے ہو خود کو اسی تک محدود رکھو۔" ایلیزا کے لہجے میں قدرے ناگواری نمایاں تھی۔ "اگر یہ میرے لیے خطرہ بن جاتا تو میں یقیناً تم لوگوں کو ہی مدد کے لیے بلاتی۔ بتاؤ کہ تم کیوں ایسی بوکھلاہٹ میں یہاں آئے ہو؟"

ابی غیل نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

"تم واپس خواب گاہ میں چلو۔" ایلیزا نے مجھے للکارا اور میں کچھ کہے بغیر واپس خواب گاہ کی طرف چل دیا اور ابی غیل میرے عقب میں ایلیزا کے ساتھ ہو لیا۔

خواب گاہ کے وسط میں پہنچ کر میں ایلیزا کی طرف گھوما تو وہ ابی غیل کے ساتھ سرگوشیانہ لہجے میں کچھ بات کر رہی تھی مگر اس کی نگاہیں بدستور مجھ پر مرکوز تھیں اور تیوریوں پر برہمی کے آثار نمایاں تھے۔

"مجھے بتاؤ مسّی! ورنہ ہم سب کو ناقابل بیان دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔" قدرے توقف کے بعد ابی غیل نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ اس بار ابی غیل کی آواز اتنی بلند تھی کہ میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ سنے۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور تمہیں اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" ایلیزا نے ترش لہجے میں جواب دیا۔

ایلیزا کے جواب نے مجھ پر تمام صورتحال واضح کر دی۔ غالباً وہ شخص اس سے میری اصلیت دریافت کرنی چاہ رہا تھا اور ایلیزا میرے ساتھ اپنے تنازعہ کو ذاتی معاملہ قرار دے رہی تھی۔ وہ لڑکی یقینی طور پر مجھ سے تنہا نمٹنے کے چکر میں تھی اور جانتی تھی کہ اگر یہ بھنک ابی غیل کو مل گئی کہ صفدر علی ہٹ میں موجود ہے تو وہ شکار کو قابو میں کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرے گا اور وہ ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔

میرے لیے ایلیزا کا وہ رویہ بہت حوصلہ افزا تھا۔ وہ باتوں ہی باتوں میں مجھے یہ جتا چکی تھی کہ وہ مجھے سسکا سسکا کر مارے گی لہٰذا اسرائیلی ایجنٹوں سے نجات پانے کے بعد میں اس کا قیدی ہوتا اور اسرائیلی سیکرٹ سروس کے اراکین کے مقابلے میں ایلیزا کو چکمہ دے کر رہائی حاصل کرنا بہت آسان تھا۔ میری بہتری اسی میں تھی کہ ان دونوں کی بحث سے لاتعلقی اختیار کر لوں۔

"تم پہلے بھی اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آتی رہی ہو، مگر میرے آدمیوں نے کبھی دخل اندازی نہیں کی۔" ابی غیل نے تائید طلب لہجے میں کہا۔

"تو پھر اب کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟" ایلیزا نے تنگ آ کر سوال کیا۔

"پچھلے دس منٹ میں سرمئی رنگ کی ایک سیڈان کار ہٹ کے سامنے والی شاہراہ کے تین چکر لگا چکی ہے۔" ابی غیل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "یہ کیا عجیب اتفاق ہے کہ آج تم اپنے ہاتھ میں ریوالور اٹھائے اس ہٹ میں ایک ذاتی معاملہ نمٹا رہی ہو اور ہم لوگ پہلی بار ایک مشتبہ کار کو یہاں منڈلاتا دیکھ رہے ہیں۔"

"وہ مقامی پولیس بھی ہو سکتی ہے۔" ایلیزا کی آنکھوں میں یک بیک تشویش کے سائے نظر آنے لگے۔

"پولیس کو ادھر کون متوجہ کر سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ تمہارا ہی کوئی آدمی شہر سے کسی سراغرساں کو اپنے پیچھے یہاں تک لے آیا ہو اور اسے آخر تک تعاقب کا علم نہ ہوا ہو۔" ایلیزا کے پاس ہر بات کا مسکت جواب موجود تھا۔ "تم اپنے اقدامات کو لاکھ درست سمجھو مگر مقامی پولیس فلسطینیوں پر کیے جانے والے مہلک حملوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ شہر میں امن و امان قائم رکھنا اسی کی ذمہ داری ہے۔"

"اگر تمہارا نظریہ درست ہے تو سمجھ لو کہ جیراڈ پکڑا جا چکا ہے۔" ابی غیل پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "صرف وہی اس ٹھکانے سے واقف ہے۔"

"تم نے رقم کی ادائیگی کے لیے اس ہٹ کا تعین کر کے شروع ہی میں غلطی کی تھی اور اب اس کے نتائج کا سامنا کرنا تمہاری ذمہ داری ہے!"

"میں ذمہ داری سے انکار نہیں کرتا مسّی!" ابی غیل نرم اور خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "اور نہ میں تمہاری نجی زندگی میں مخل ہونا چاہتا ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہ شخص تمہارا دوست ہونے کے ساتھ ہی ہمارے دشمنوں کا آلۂ کار ہو اور تم خود بھی اس کے دوہرے کردار سے لاعلم ہو۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" ایلیزا ابی غیل کی دلیل سن کر الجھن کا شکار ہو گئی۔

"تھوڑی دیر کے لیے مجھے اس سے بازپرس کی اجازت دے دو۔"

"اس پر تشدد کرنا چاہتے ہو؟"

"ضرورت پیش آئی تو کرنا ہی پڑے گا۔" ابی غیل میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "میں محض چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی طب کے جھوٹ اور سچ میں امتیاز کر لیتا ہوں۔"

"تم اپنا اطمینان کر لو۔" ایلیزا گہرا سانس لے کر بولی۔ "مگر یہ خیال رہے کہ میں تمہیں اس کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دے رہی۔"

ابی غیل کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

"موت تو بہت معمولی چیز ہے مسّی! تم دیکھنا کہ اس کے لبوں سے سچ یوں بہہ نکلے گا جیسے کسی مشکیزے کے ٹوٹے ہوئے پیندے سے پانی خارج ہوتا ہے۔"

"پھر تو یہ دلچسپ تماشا ہوگا۔"

"میں درخواست کروں گا کہ تھوڑی دیر کے لیے تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ، جب یہ بولنے لگے گا تو میں خود تمہیں بلاؤں گا۔"

"فکر نہ کرو، میں دخل اندازی نہیں کروں گی۔" ایلیزا نے یہ کہہ کر اپنا ریوالور والا ہاتھ نیچے گرا لیا اور خود صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگی۔

ابی غیل اپنی جگہ سے چند قدم آگے آیا اور میرے مقابل رک کر چبھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے ڈارلنگ؟"

میں دونوں ہاتھ گرا کر خوفزدہ انداز میں پیچھے سرک گیا اور

سہم جانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ”تم میری زبان سے جو کچھ سننا چاہتے ہو، بتادو میں وہی دہرادوں گا۔ ہاتھاپائی سے مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔“

”غیر ضروری بکواس کرکے میرا وقت خراب نہ کرو۔“ وہ مٹھیاں بھینچ کر غرآیا۔ ”جو پوچھوں مختصر ترین الفاظ میں اس کا جواب دو۔“

”میرا نام چارلس سکیڈ ہے۔“

”کہاں رہتے ہو؟“

”لندن!“

”ذریعہ معاش؟“ اس کی پھاڑ کھانے والی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”عاشقی۔“

میرا جواب سن کر اس نے غراتے ہوئے اپنی جگہ سے زقند لگائی اور میری مدافعت کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے میرے داہنے جبڑے پر گھونسہ مارتا ہوا آگے نکل گیا۔

جتنی دیر میں وہ پلٹتا میں نے اسے یا ایلیزا کو شبہ کا کوئی موقع دیتے بغیر پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے وہ ننھی سی ہلاکت خیز شیشی نکال لی جس سے پھینکے ہوئے تیر کی زد میں آنے والے کو اپنا سانس پورا کرنے کی بھی مہلت نہیں ملتی تھی۔

میں نے فوری طور پر ابی غیل کو زہریلے تیر کا نشانہ بنانا چاہا مگر اس کی پوزیشن دیکھتے ہی ہاتھ روک لیا کیونکہ وہ مجھ سے خاصی دور نکل گیا تھا اور اگر میں اس پر وار کر بھی دیتا تو زہریلی سوئی اس تک پہنچنے سے پہلے کہیں گر جاتی۔

میں نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر بائیں ہاتھ سے اپنا جبڑا سہلایا تو ہونٹوں کے کنارے پر کسی سیال کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے انگلیاں نگاہوں کے سامنے کیں تو وہ میرے لہو میں تر تھیں۔ ابی غیل کی لگائی ہوئی ضرب سے میری جلد پھٹ گئی تھی۔

”میرے سوالات کے جواب ہوش میں رہ کر دو۔“ ابی غیل کسی بپھرے ہوئے درندے کی طرح غرایا۔ ”ورنہ مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گا۔“

”دولت مند لڑکیوں سے عشق کرکے ان کی دولت سے عیش اڑانا ہی میرا پیشہ ہے۔ میں نے تمہیں درست جواب دیا تھا۔“ میں نے پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”لندن سے پیرس کیوں آئے ہو؟“

”ایک نوجوان بیوہ مجھ سے شادی کرنے پر تل گئی تھی، اس سے جان بچا کر یہاں آیا تھا۔“

”عورتوں کے ساتھ فراڈ کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟“ وہ غرایا۔

”اخلاقیات پر لیکچر دینے کے بجائے کام کی بات کرو، تمہارے بعد مجھے ایلیزا کو بھی مطمئن کرنا ہے۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں ایسی بہت سی لڑکیوں سے بھی واقف ہوں جو نہایت بے شرمی کے ساتھ ایک وقت میں چھ چھ مردوں کو بیوقوف بناتی ہیں۔“

”پیرس میں کہاں رہتے ہو؟“ وہ غیرارادی طور پر آہستہ آہستہ میرے قریب آتا جا رہا تھا اور میں اسے چونکائے بغیر اس لمحہ کا منتظر تھا جب وہ میرے ہتھیار کی زد میں آتا اور میں نہایت آسانی کے ساتھ اسے جہنم واصل کر دیتا۔

”میں سینٹ جرمین کے علاقے میں ہی ایک دوست کے ساتھ مقیم ہوں۔“

”اوہ!“ اس نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ ”تمہیں رہنے کی جگہ بھی جوناس ولا کے قریب ہی ملی تھی۔“

”میں کسی جوناس ولا سے واقف نہیں۔“

”تو مسّی سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟“

”پیرس میں بچھڑے ہوئے دل زیادہ تر ایفل ٹاور کے سائے میں ملتے ہیں۔“ خود کو خائف ظاہر کرنے کی پوری کوشش کے باوجود میں اپنی جارحانہ گفتگو پر قابو نہ رکھ سکا۔

”تم صورت سے نہایت کمینے نظر آتے ہو، مجھے یقین نہیں کہ تم اتنی آسانی سے سچ بولتے چلے جاؤ گے۔“ وہ غصے میں بل کھاتے ہوئے بولا۔

”صورت کے اعتبار سے تو تم سینئر نظر آتے ہو۔“ میں نے دانستہ اسے تاؤ دلایا اور وہ بے چارہ میرے داؤ میں آگیا۔

وہ دانت پیستے ہوئے جیسے ہی میری طرف لپکا میں نے اپنا داہنا ہاتھ سیدھا کرکے شیشی کا سنہرا ڈھکن دبا دیا۔ دنیا کے مہلک ترین زہر میں بجھا ہوا ایک تیر سنسناتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور وہ مجھ سے تین چار قدم دور فرش پر منہ کے بل گر پڑا۔

میری طرف آتے آتے وہ جس انداز میں نیچے گرا تھا اس سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ وہ ٹھوکر کھانے کے سبب گرا ہے لیکن زمین بوس ہو جانے کے بعد جب وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر غیر فطری انداز میں بے حس و حرکت پڑا رہا تو میرے عقب میں صوفے پر بیٹھی ہوئی ایلیزا پریشان ہو گئی۔

”اسے کیا ہو گیا ہے؟“ وہ بوکھلاتے ہوئے انداز میں یہ کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”شاید کوئی دورہ پڑا ہے۔“ میں نے اس کی طرف گھوم کر لاپروائی سے کہا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ مجھے اپنی طرف گھومتے دیکھ کر اس نے تیزی سے کہا۔ ابی غیل کی پُراسرار حالت سے لاحق ہونے والی تشویش کے باوجود وہ میری طرف سے ذرا بھی لاپروائی برتنے پر آمادہ نہیں تھی۔

”تم بلاوجہ مجھ سے خوفزدہ ہو۔“ میں نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اگر تم اپنا ریوالور وینٹی بیگ میں واپس رکھ لو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔“

”وعدہ!“ اس نے طنز اور حقارت کے ساتھ کہا۔ ”میرے لیے اب یہ لفظ اپنی وقعت کھو بیٹھا ہے اور رہی نقصان کی بات تو وہ تم پہنچا ہی چکے ہو۔ میں تو صرف حساب بے باق کرنا چاہتی ہوں۔“ قدرے توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔ ”ابی غیل کو کیا ہوا ہے؟“

”خود دیکھ لو۔“ میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

”تم اسی حالت میں داہنے گوشے میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جاؤ۔“

”کیا لباس تبدیل کرنے کا ارادہ ہے؟“

”غیر ضروری باتیں نہ کرو۔“ وہ پیر پٹخ کر غصیلے لہجے میں بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ ذرا بھی رعایت سے کام نہیں لوں گی۔“

”زیادہ پرانے نہ سہی تو کچھ دیر پہلے کے مراسم کا ہی خیال کر لو۔“

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑی۔ ”میں مردوں کو کھلونا سمجھتی ہوں صفدر علی! اور کھلونا حسب خواہش توڑا یا بدلا جا سکتا ہے۔“

”بڑے خوبصورت خیالات ہیں۔“ میں دانستہ گفتگو کو طول دے رہا تھا تاکہ کسی بھی مرحلے پر وہ اکتا کر کوئی غلطی کرے اور میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکوں۔ ”اگر باہر والوں کو اس کا علم ہو جائے تو ابی غیل کے باقی ماندہ دس آدمی ابھی ہٹ کے دروازے پر قطار لگا کر تمہارا کھلونا بننے کو تیار ہو جائیں گے۔“

”دیوار کی طرف چلو۔“ وہ اعتماد کے ساتھ ریوالور کی نال کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔

میرے لیے اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا میں دونوں ہاتھ بلند کیے ایک گوشے میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو گیا۔

چند ہی ثانیوں بعد میرے کانوں میں ایلیزا کی تحیر آمیز آواز آئی۔ ”ارے اسے کیا ہوا ہے؟ اس کا تو سارا بدن نیلا ہو گیا ہے۔“

”غصے میں رنگ بدل رہا ہوگا۔“ میں نے پلٹے بغیر کہا۔

”اوہ! یہ تو شاید مر چکا ہے۔“ اس مرتبہ ایلیزا کی آواز میں بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔ ”تم نے اس کے ساتھ کیا حرکت کی تھی؟“

”گرتے ہوئے وہ مجھ سے کافی دور تھا اور میں تمہاری نظروں کے سامنے تھا۔“

”تمہارے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں کیا ہے؟“ اس بار میری مٹھی ایلیزا کی نگاہوں سے نہ بچ سکی جس میں دبی ہوئی زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی میں ایلیزا کی فوری مداخلت کے باعث اپنی جیب میں منتقل نہ کر سکا تھا۔

”تم سے نگاہیں چار کرکے بات کرنے میں مزہ آتا ہے! اجازت ہو تو تمہاری طرف گھوم جاؤں۔“ میں نے اس کے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔

”اسی طرح کھڑے رہو۔“ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”میں تم پر گولی چلا کر باہر پھیلے ہوئے آدمیوں کو ادھر متوجہ کرنا نہیں چاہتی لیکن یہ یاد رکھنا کہ تم نے مجھے مجبور کیا تو میں بلاتامل تمہیں معذور کر دوں گی۔“

”بہت بہتر۔“ میں نے سوال ٹل جانے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔

”ہاتھ میں کیا ہے؟ میری بات کا جواب دو۔“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد ایلیزا کی تحکمانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”ایک بے ضرر سی شیشی ہے۔“

”مگر یہ تمہارے ہاتھ میں کیسے آئی؟“

”ابی غیل نے میری طرف اچھالی تھی۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”میں خود دیکھ لیتی ہوں کہ یہ کیا ہے۔ تم کمرے کے وسط میں شیشی فرش پر رکھ کر واپس اسی کونے میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جاؤ۔“

”تم غیر ضروری طور پر کسی سخت گیر استانی کا رویہ اختیار کر رہی ہو۔“ میں نے کمرے کے وسط میں آتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ ”میں بتا چکا ہوں کہ تم سے مجھے کوئی پرخاش نہیں ہے اور میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

”میرے دیکھتے ہی دیکھتے تم نے ابی غیل کو ہلاک کیا ہے۔“ وہ اپنے لہجے میں درشتگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر تمہارا اصل روپ واضح ہوتا جا رہا ہے۔“

وہ ریوالور ہاتھ میں تھامے الٹے قدموں پیچھے ہٹتی جا رہی تھی اور میں اس کی ہدایت کے مطابق کمرے کے وسط میں ابی غیل کی اکڑی ہوئی نیلی لاش کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لاش کے قریب پہنچ کر میں نے شیشی فرش پر رکھ دی۔

”ابھی تک تم جو کچھ کہتی رہی ہو اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم مجھے اپنی نجی قید میں رکھنا چاہتی ہو جبکہ اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ میری اصلیت معلوم ہونے پر تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی مجھے روکنے کی اجازت نہیں دیں گے اور پھر ابی غیل کی

لاش کی موجودگی کا تمہارے پاس کیا جواز ہوگا؟ ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھ تم خود کو دشواریوں میں مبتلا کرو۔" میں نے شیشی رکھ کر اس سے چند قدم دور ہٹتے ہوئے کہا۔

"تمہاری باتیں معقول ہیں مگر مجھ سے ہمدردی جتا کر تم کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "تم کونے میں چلے جاؤ۔"

میں الٹے قدموں گوشے میں ضرور چلا گیا مگر میں نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف نہیں گھمایا۔ ایلیزا نے بھی اس پر اصرار نہیں کیا۔ اس نے میرے سامنے شیشی اٹھا کر اس کا سرسری جائزہ لیا اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ پلاسٹک کی وہ شیشی فرش پر لڑھکتی ہوئی ایک صوفے کے نیچے چلی گئی۔ اس کی ساخت اس قدر معمولی تھی کہ بادی النظر میں اس کے پوشیدہ میکانزم کا موہوم سا سراغ بھی لگانا مشکل تھا۔

"اب تم میرے ساتھ پہلو بہ پہلو اس طرح باہر نکل کر کار تک جاؤ گے کہ میرے ریوالور کی نال تمہارے جسم سے لگی رہے گی۔ اگر تم نے ذرا بھی مکاری کرنے کی کوشش تو میں بے دریغ گولی چلا دوں گی۔" چند ثانیوں تک خاموشی سے مجھے گھورتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"اور ابی غیل کی لاش؟"

"وہ میرا دردِ سر ہے، تم اس کی فکر نہ کرو۔"

"اور سرمئی سیڈان؟"

"وقت برباد نہ کرو۔" وہ تحکمانہ لہجے میں غرائی۔ "اگر تمہاری جیبوں میں کوئی ہتھیار ہے تو شرافت سے اسے میرے حوالے کر دو۔"

"ہتھیار تو سارے تمہارے قبضے میں ہیں۔" میں نے اس کے سراپا پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "مردوں کی قسمت میں ہتھیار کہاں۔"

"چلو۔" اس نے ریوالور کی نال سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں سر جھکائے اسی طرف ہو لیا۔

اس وقت میرے ذہن پر باہر والوں کا خوف سوار تھا۔

ابی غیل کی نامناسب دخل اندازی اور پھر موت نے صورتِ حال کو میرے حق میں مزید بگاڑ دیا تھا اور میں ایلیزا سے پوری طرح تعاون کرنے کو تیار تھا۔ وہ اپنی دانست میں مجھے گھیر کر لے جا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس چوہے دان سے نکلنے کے بعد میں ایلیزا کو آسانی سے چکر دے سکوں گا۔

دروازہ کھولنے سے قبل ایلیزا پھرتی سے میرے بائیں پہلو میں آ گئی اور اپنے ریوالور کی آہنی نال میری پسلیوں میں اڑا دی۔

"اگر چند پونڈ وزنی یہ بے رحم فولاد میان میں نہ ہوتا تو میں تمہیں بانہوں میں سمیٹ لیتا۔" میں نے جھک کر اس کے بال چومتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد عاشقی کے سارے جراثیم جھڑ جائیں گے۔" وہ غرائی۔

میں مزید کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ گرد آلود فضا میں روشن پورچ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کی کار کی طرف بڑھتا رہا۔ ہٹ کا نگہبان اس وقت نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا اور ہٹ کے اطراف میں تاحدِ نظر ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔

ایلیزا کے حکم پر میں نے اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور وہ ریوالور سمیت پھرتی سے میرے برابر والی نشست پر آ بیٹھی۔ وہ اپنے رویے سے ہر قدم پر احتیاط، خود اعتمادی اور مہارت کے حیرتناک ثبوت دے رہی تھی مگر پھر بھی کار میں سوار ہوتے وقت میرے لیے اسے زک پہنچانے کا سنہرا موقع میسر آیا تھا جسے میں نے اپنی حکمتِ عملی کے پیشِ نظر ضائع ہو جانے دیا۔

میں نے کار کا انجن اسٹارٹ کر کے کار کا رُخ سیدھا کیا اور پھر سبک رفتاری کے ساتھ اسے کچی سڑک پر چلاتا شاہراہ تک لے آیا۔

ہٹ سے آنے والی ذیلی سڑک سے شاہراہ پر مڑتے ہوئے میں نے دونوں طرف کا جائزہ لیا مگر مجھے وہ سرمئی سیڈان کہیں نظر نہ آئی جس کی خبر ابی غیل لایا تھا۔

ایلیزا کی ہدایت پر میں نے کار کا رُخ شہر کی طرف کر دیا۔ میری نگاہیں سامنے پھیلی ہوئی سڑک کے ساتھ ہی عقب نما آئینے پر بھی جمی ہوئی تھیں۔

ہٹ سے ڈیڑھ دو میل آگے نکل آنے کے بعد عقب نما آئینے میں اچانک کسی کار کے ہیڈ لیمپس کا انعکاس نظر آیا تو میں چونک پڑا۔ یہی حالت ایلیزا کی بھی ہوئی۔

چند ثانیوں قبل تک عقب نما آئینے میں وہ شاہراہ دور تک ویران نظر آ رہی تھی جبکہ راستے میں شاہراہ سے کوئی دوسری ذیلی سڑک بھی ملتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی جس کی بنا پر یہ سمجھا جاتا کہ وہ ادھر سے شاہراہ پر مڑی ہوگی۔

ان حالات میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہ کار ہم سے زیادہ فاصلے پر ہیڈ لیمپس روشن کیے بغیر آ رہی ہوگی اور ہم کہر کی وجہ سے اسے نہ دیکھ سکے مگر جب قریب آ کر اس کے ہیڈ لیمپس جلائے تو ہم چونک پڑے۔ دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ وہ کار شاہراہ کے کنارے درختوں وغیرہ کی اوٹ میں ہماری منتظر رہی ہو اور جونہی ہم وہاں سے گزرے وہ کار بھی ہمارے تعاقب میں رینگ کر پیچھے سڑک پر آ گئی۔

"یہ کون ہے اچانک کہاں سے آ نکلا؟" ایلیزا نے مڑ کر دیکھے بغیر بوکھلاتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "ذرا اپنی رفتار کم کرو۔"

"کہو تو گاڑی روک کر پوچھ لوں۔" میں نے رفتار گھٹاتے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ہٹ کے باہر پھیلے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے ابی غیل کی لاش دیکھ لی ہو۔"

"ان میں سے کسی کی مجال نہیں کہ خطرے یا طلبی کے بغیر ہٹ میں جھانک بھی سکے۔"

"وہ کوئی معمولی ہٹ تو نہیں، بن حیان کی بھتیجی کا عشرت کدہ ہے۔" میں تلخ لہجے میں بولا۔ "ویسے وہ آگے نکلنے کو تیار نہیں۔ پیچھے والی کار کی رفتار بھی کم کی جا چکی ہے۔"

"رفتار بڑھا دو۔"

"مجھے کم از کم اتنا تو بتا دو کہ اگر وہ اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ ہوئے تو تم کیا کرو گی؟" میں نے رفتار میں بتدریج اضافہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ایسی صورت میں میرا منصوبہ گڑبڑ ہو جائے گا۔" وہ ریوالور کی نال میری طرف سے ہٹائے بغیر بولی۔ "تمہیں قید کرنے کے بعد میں انہیں ایک خوبصورت کہانی سنا سکتی تھی کہ تم محض میرے دوست تھے۔ ابی غیل کے ساتھ تمہاری تکرار ہوئی اور تم نے اسے ہلاک کر کے ریوالور کی زد پر مجھے تحفظ فراہم کرنے پر مجبور کیا اور میری آڑ میں ہٹ سے فرار ہونے کے بعد ویران شاہراہ پر ایک جگہ مجھے کار سے نیچے دھکیل کر فرار ہو گئے۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے بتا دیا، اگر پیچھے والی کار سے جلدی نجات مل گئی تو میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے دھیمے سے ہنس کر کہا۔

"بے دریغ گولی مار دوں گی اگر ذرا بھی چالاکی اختیار کرنے کی کوشش کی۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"میں اتنا احمق نہیں ہوں بے بی۔" میں نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔ "ہٹ میں تمہارے ساتھ دادِ عیش دیتے ہوئے میں اپنی حفاظت کے امکانات سے غافل نہیں ہوا تھا۔"

"تمہارے الفاظ کھوکھلے ہیں صفدر علی! میں کسی نئی چالبازی میں نہیں آؤں گی۔"

اسی لمحہ پیچھے آنے والی کار کی رفتار یک بیک تیز ہو گئی۔ اس وقت دونوں گاڑیاں شاہراہ کے ویران اور تاریک علاقے سے گزر رہی تھیں۔ میں نے پیچھے والی کار کو آگے نکلنے کا راستہ دیتے ہوئے اپنی کار سڑک کے کنارے پر کر لی مگر پیچھے آنے والی کار اپنا رخ بدلے بغیر تیزی سے قریب آتی رہی اور پھر فضا دو ہولناک دھماکوں سے لرز اٹھی۔

"یہ کیا ہوا؟" ایلیزا اچھلتے ہوئے بولی کیونکہ فائروں کے ساتھ ہی ٹائروں کے پھٹنے کے دھماکے سنائی دیے تھے اور ہماری کار پچھلے پہیوں کے ناکارہ ہو جانے کے سبب بری طرح اچھلنے لگی تھی۔

میں نے ایک نظر ایلیزا کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی نال پر ڈالی جو اس وقت پائدان کی طرف جھکی ہوئی تھی اور ایک ہی جھپٹا مار کر ایلیزا کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

ایلیزا ریوالور چھیننے کے لیے گالیاں بکتے ہوئے میرے اوپر ٹوٹ پڑی۔ ایلیزا کا بوجھ آ جانے کے باعث کار تیزی سے سڑک پر لہرانے لگی۔ اس وقت کسی بھی لمحے کار اونچی سڑک سے کچی ڈھلان پر بہک کر ہولناک حادثہ کا شکار ہو سکتی تھی۔

ایلیزا وحشیانہ قوت کے ساتھ میرے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی اور میرے لیے ان بھیانک حالات میں ریوالور کو اپنے قبضے میں رکھنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے ریوالور چلتی کار سے باہر پھینک دیا۔ اس طرح میں نے کم از کم ایلیزا کے خطرے پر بڑی حد تک قابو پا لیا تھا ورنہ وہ مسلح حالت میں کسی بھی لمحے میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

ریوالور باہر جانے کے بعد ایلیزا دیوانگی کے عالم میں اپنی نشست پر گر گئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے میرے بدن پر مکے برسانے لگی اسی وقت پچھلی کار کا غراتا ہوا انجن میرے بالکل قریب آ پہنچا اور پھر اس کار سے ہارن کا شور ابھرنے لگا۔

وہ کار تیزی سے میری کار کے برابر میں آئی اور پھر آگے نکلتے ہوئے اس کے ڈرائیور نے اس طرح اسٹیئرنگ کاٹا کہ اس کار کا عقبی حصہ ایلیزا کی کار کے اگلے مڈگارڈ سے بری طرح رگڑ کھا گیا۔ اور مجھے شدید تصادم سے بچنے کے لیے کار کو کچے میں اتار کر روک دینا پڑا۔

اگلی کار بھی ترچھی کر کے سامنے اس طرح روک دی گئی کہ میں ایلیزا کی

کار کو براہِ راست آگے نہیں لے جاسکتا تھا۔

میں نے ہیڈلیمپس کی روشنی میں آگے والی سرمئی سیڈان کے دروازے کھلتے دیکھے اور میرے کچھ سمجھنے سے پیشتر ہی دو مسلح آدمی اس کار سے اتر کر ایلیزا کی کار کے دونوں طرف پہنچ گئے۔

وہ دونوں نہایت تندخو اور بے رحم نظر آرہے تھے۔ انہوں نے نہایت بے دردی سے مجھے اور ایلیزا کو کھینچ کر گاڑی سے نیچے اتار لیا۔

"لے آؤ، دونوں کو جلدی ادھر لے آؤ"۔ سیڈان سے ایک تیسری کرخت آواز ابھری اور ایک شخص میرا بازو تھام کر مجھے آگے دھکیلنے لگا۔ جبکہ دوسرے نے ایلیزا کو محض زبانی دھمکی دینے پر ہی اکتفا کیا۔ اور ایلیزا بھی خاموشی سے آگے چل پڑی۔

سیڈان کی کشادہ عقبی نشست پر وہ دونوں مجھے اور ایلیزا کو درمیان میں لے کر بیٹھ گئے اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے نہایت تیزی سے کار آگے بڑھا دی۔

"اس ہٹ میں اب کون کون موجود ہے؟" میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص نے کار چلتے ہی غرا کر سوال کیا۔

"ہمت ہے تو خود جا کر دیکھو!" مجھ سے پہلے ایلیزا زہریلے لہجے میں بول پڑی۔ وہ اس ناگہانی مصیبت سے خائف نہیں معلوم ہو رہی تھی۔

"بکواس بند رکھو لڑکی ورنہ تھپڑ مار مار کر تمہارا چہرہ لہولہان کر دوں گا"۔ ایلیزا کے برابر والے کے لہجے سے درندگی ٹپک رہی تھی۔

"عورت ذات سے مہذب لہجہ میں بات کرتے ہیں"۔ کار چلانے والے نے مڑے بغیر تادیبی لہجے میں کہا۔ "ویسے شاید یہی براہام جوناس کی بھتیجی معلوم ہوتی ہے!"

"تم لوگ کون ہو اور ہمیں کس لیے اغوا کیا جارہا ہے؟" میں نے کار میں بیٹھنے کے بعد پہلی بار زبان کھولی۔

"یہ لڑکی تھوڑی دیر پہلے جس شخص کو بہلا پھسلا کر ہٹ میں لائی تھی وہ کہاں ہے؟" میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص نے سوال کیا۔

"اس کی لاش وہیں تدفین کی منتظر ہے!" اس بار پھر ایلیزا مجھ سے پہلے بول پڑی اور مجھے دل ہی دل میں اس کی خود اعتمادی کا اعتراف کرنا پڑا۔ "ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں مسکیڈو، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے"۔ اس بار ایلیزا کا مخاطب میں تھا۔

ایلیزا کے الفاظ پر ڈرائیونگ سیٹ والے کے منہ سے بے اختیار تاسف آمیز آواز خارج ہوگئی اور پھر وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "اگر یہ سچ ہے تو ہم تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ جلا کر ڈالیں گے!"

ایلیزا جو چند روز پہلے تک میرے سامنے ایک شوخ اور کھلنڈری دوشیزہ کے روپ میں آتی رہی تھی، ان خطرناک حالات میں ناقابلِ یقین حاضر دماغی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ سرمئی سیڈان دیکھنے کے بعد میرے بارے میں پوچھے جانے والے سوال پر وہ فوری طور پر معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اور اس نے سمجھ لیا کہ وہ تینوں میرے حمایتیوں میں سے تھے مگر مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھے لہٰذا انہیں بے یقینی میں مبتلا کر کے کچھ مہلت حاصل کرنے کے لیے اس نے فوری طور پر میری ہلاکت کا اعلان کر دیا۔ اور مجھے مسکیڈو کہہ کر اس طرح مخاطب کیا کہ وہ تینوں مجھے اسی کا ساتھی سمجھ لیں مگر خود کو دوستوں میں پا کر مجھے خاصا سکون حاصل ہوا تھا۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایلیزا کو اس سرد اور اندھیری رات میں کسی خارش زدہ کتیا کی طرح اس ویران شاہراہ پر چھوڑ کر میں ان لوگوں کے ہمراہ نکل جاؤں گا۔

"یہ لڑکی بکواس کر رہی ہے۔ ہٹ میں اسرائیلی سیکرٹ سروس کے ایک اہلکار کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ جو میرے ہاتھوں مارا گیا تھا، یہ لڑکی مجھے اسرائیلیوں کی تحویل میں دینے کے بجائے اپنی قید میں رکھ کر ختم کرنے کے چکر میں تھی!" میں نے کہا۔

"خوب! کار میں پھیلے ہوتے اندھیرے میں ایلیزا کی طنزیہ آواز ابھری۔ "تو تم مجھے اکیلا چھوڑ کر ان کی ہمدردیاں جیتنے کے چکر میں ہو! مگر یہ یاد رکھنا کہ انہیں زیادہ دیر دھوکا نہ دے سکو گے، اگر یہ عبداللہ کے آدمی ہیں تو عبداللہ دیکھتے ہی تمہارے چہرے پر تھوک دے گا۔ کیونکہ وہ مرنے والے سے بخوبی واقف تھا!"

"سیدھی طرح بتاؤ کہ تم کون ہو؟" میرے برابر والا ایلیزا کی چال میں آگیا۔

"لڑکی! تم یہ بتاؤ کہ اگر یہ تمہارا ہی ساتھی ہے تو اپنی کار کے پچھلے ٹائر پرسٹ ہو جانے کے بعد تم اس سے ہاتھا پائی کیوں کر رہی تھیں"۔ ڈرائیونگ سیٹ والے نے دخل دیتے ہوئے سوال کیا۔ کیونکہ اس نے اپنی کار کے ہیڈلیمپس کی روشنی میں شاید میرا اور ایلیزا کا مقابلہ دیکھا تھا۔

"میں اسے اچانک بریک لگا کر تمہاری کار سے ٹکرا جانے کا موقع دے رہی تھی مگر یہ بھاگنے پر تلا ہوا تھا"۔ ایلیزا کے پاس جواب موجود تھا۔

"تمہارے پاس اپنے دعوے کا کوئی ثبوت موجود ہے؟" اس ڈرائیو کرنے والے نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

"اگر تم عبداللہ کے پاس جارہے ہو تو وہ خود ہی ثبوت فراہم کر دے گا"

"فی الحال ہم تمہیں قید کر دیں گے، اس وقت عبداللہ تک رسائی ناممکنات میں سے ہے!"

"پھر میں کسی بحث میں نہیں پڑوں گا۔ تم جو سلوک چاہو روا رکھو"

"یہ اداکاری کر رہا ہے۔ یہ مسکیڈو ہے چارلس مسکیڈو۔ میرا منگیتر" ایلیزا غصیلے لہجے میں بولی۔ ڈرائیو کرنے والے کا بدلا ہوا رویہ اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

"تم خاموش بیٹھو لڑکی ورنہ تمہاری کنپٹی پر ضرب لگا دی جائے گی"۔ میرے برابر والے نے کرخت لہجے میں کہا اور ایلیزا ہمہمنا کر رہ گئی۔

"تمہیں عبداللہ کے علاوہ اور کون جانتا ہے؟" ڈرائیو کرنے والے نے خاصے طویل بوجھل سکوت کے بعد مجھ سے سوال کیا۔

"بہت سے لوگ جانتے ہیں مگر ضروری تو نہیں کہ تم بھی ان سے واقف ہو!"

"اگر تم واقعی وہی ہو جس کی ہمیں تلاش ہے تو ہمیں غیر ضروری امتحان میں نہ ڈالو، ایسا نہ ہو کہ ہم عبداللہ کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں"۔ وہ نیم دوستانہ لہجے میں بولا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تم چند نام دہراؤ۔ اگر ان میں سے ایک بھی میرا واقف ہوا تو میں اس سے تمہاری شناخت کرا لوں گا اور پھر تم مجھے اپنا غلام پاؤ گے!"

میں نے پہلا نام راڈنک کا لیا جو اس کے لیے اجنبی تھا مگر عبدالعزیز کا نام سنتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ "بس ٹھیک ہے۔ میں اسے بلا لوں گا"۔

میرے برابر والے شخص نے میرے بدن پر سے اپنا جارحانہ دباؤ ختم کر دیا۔ مگر اس کی مستعدی میں کوئی فرق نہ آیا۔

"مگر مجھے تم لوگ کہاں لیے جارہے ہو؟" چند ثانیوں تک بے چینی سے پہلو بدلنے کے بعد ایلیزا نے سوال کیا۔

"میرا بس چلے تو تمہیں ایسے مردوں کے غول میں بھیجوں جو عورت کو صرف کھلونا سمجھتے ہیں اور اسے مسل کر فنا کر دیتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"تم لوگ اس نمک حرام کو خاموش نہیں رکھ سکتے"۔ ایلیزا نے جھنجھلا کر ان لوگوں کو للکارا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو ایلیزا ڈارلنگ!" میں نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر اس کے سر کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "یہ نہ بھولو کہ میں تمہارے نمک کے علاوہ بھی بہت کچھ چکھ چکا ہوں"۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے نہ الجھو!" میرے برابر والے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اور پھر وہ مجھے کونے میں کھسکا کر خود میرے اور ایلیزا کے درمیان بیٹھ گیا۔

"تم لوگوں کے درمیان اب میری کیا حیثیت ہے؟" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سوال کیا جو خاصی دیر سے میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

"عبدالعزیز کی تصدیق یا تردید تک ہم تمہارے دعوے پر بھروسہ کیے لیتے ہیں!" یہ جواب کار ڈرائیو کرنے والے نے دیا تھا جو اپنے اطوار سے بقیہ دونوں سے برتر نظر آرہا تھا۔

"تو پھر اس غلاظت کی ٹوکری کو کہاں اٹھائے پھر رہے ہو؟"

"دیکھو مسٹر صفدر یا جو کچھ بھی تم ہو، ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ لڑکی ہمارے ایک اہم آدمی کو بہکا کر ہٹ میں لے گئی ہے"۔ اس نے ٹھہرے ہوئے مصالحانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "لہٰذا ہم ہٹ پر پہنچ گئے اور اگر مزید چند منٹ تک ایلیزا کی کار وہاں سے روانہ نہ ہوتی تو ہم طاقت کے بل پر ہٹ میں گھس جاتے۔ کار کے تعاقب کے نتیجے میں تم دونوں کو پکڑ کر ہمیں خوشی ہوئی ہے۔ اگر تم وہی شخص ہو جس کی ہمیں تلاش ہے تو عبدالعزیز کی تصدیق کے بعد لڑکی کے مقدر کا فیصلہ تم پر ہوگا اور اگر تم ہمارے ساتھ کوئی فراڈ کر رہے ہو تو مطلوبہ شخص کی بازیابی تک تم دونوں روح فرسا مصائب میں مبتلا ہو گے۔ لہٰذا اس وقت میں کوئی بڑا فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں!"

"تمہیں میرے ہٹ میں پہنچنے کی اطلاع کیسے ملی تھی؟"

"ہمارے اپنے بھی کچھ مؤثر وسائل ہیں"۔ اس کا جواب گول مول تھا۔

"اور عبداللہ کہاں ہے؟"

"فی الحال میں اس بارے میں زبان نہیں کھول سکتا۔ میں نے تمہاری موجودہ حیثیت کی وضاحت کر دی ہے۔ لہٰذا تم صبر سے اپنی شناخت کا انتظار کرو!"

"یعنی اپنی چمڑی سے باہر آنے کی کوشش نہ کرو"۔ ایلیزا قہقہہ مار کر زہریلے لہجے میں بولی اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

ویران اور نیم پختہ راستوں سے گزرنے کے بعد اس سفر کا اختتام خاردار تاروں کی باڑھ والے ایک احاطے میں ہوا۔ جہاں فضا میں مویشیوں کی موجودگی کی گہری بو رچی ہوئی تھی۔ وہاں گھپ اندھیرے میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے جو کار کا انجن بند ہوتے ہی ٹارچیں چمکاتے کار کی طرف بڑھ آئے۔

"کسے لائے ہو؟" باہر کسی نے عربی میں سوال کیا۔

"اتار کر دیکھو!" کار کے ڈرائیور نے اپنی نشست سے اترتے ہوئے عربی میں ہی جواب دیا۔ جس پر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ اس سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے باوجود اس کے لہجے سے میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ عربی نژاد ہوگا۔

کئی ریوالوروں اور رائفلوں کے سائے میں مجھے اور ایلیزا کو کار سے نیچے اترنے کا حکم ملا اور ہم دونوں مختلف سمتوں کے دروازوں سے نیچے آگئے۔

نیچے اترنے تک میں وہ جگہ پہچان چکا تھا۔ بن لیوی کو اغوا کرنے کے بعد عبداللہ نے اسے اسی مویشی خانے میں قید کیا تھا۔ اور اس کے تہہ خانے میں قریب المرگ بن لیوی کی زبان سے پہلی بار براہام جوناس اور بن حیان کی دوہری شخصیت کا راز فاش ہوا تھا۔ اور بن لیوی کو تشدد کے ذریعے زبان کھولنے پر مجبور کرنے والوں میں ایک مہدی نامی جواں سال فلسطینی لڑکا اور دوسرا یوسف نامی ایک پختہ کار عرب شامل تھا۔

"مہدی اور یوسف کہاں ہیں؟" میں نے کار سے اترتے ہی عربی

میں سوال کر ڈالا۔

اچانک ایک ٹارچ کی روشنی تیزی سے میرے چہرے پر مرکوز ہوگئی اور پھر اس روشنی کے عقب میں مجھے یوسف کی تحیر آمیز آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحہ یوسف پرجوش انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو رہا تھا۔

"میں نادم ہوں دوست!" تاریکی میں کسی جانب سے سرمئی سیلان کے ڈراتیور کی آواز ابھری۔ "مجھے اس حرافہ نے شبہ میں ڈال دیا تھا۔"

"یہ سب کیا ہے، تم قیدی کیسے بن گئے؟" یوسف نے فرطِ مسرت سے میرے رخسار چومتے ہوئے عربی میں سوال کیا۔

"بات صرف اتنی ہے کہ بن حیان کی بربادی کی کہانی کا آغاز اسی مویشی خانے کے ایک تہہ خانے میں ہوا تھا اور اس باب کے خاتمے کے لیے مقدر نے ہمیں پھر یہیں یکجا کر دیا ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"یہ چھوکری کون ہے؟"

"یہ بن حیان کی سگی بھتیجی ہے اور اسی کی وجہ سے میں اس فتنے کو گھیرنے میں کامیاب ہوا تھا مگر اب یہ میرے خون کی پیاسی ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے مارنا ہے یا ....؟" یوسف نے اپنا سوال انگریزی میں کیا اور دانستہ اسے ادھورا چھوڑ دیا۔

"فی الحال اسے تہہ خانے میں بند کر دو، اہم معاملات سے نمٹ کر اس بارے میں سوچیں گے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

یوسف نے وہاں موجود لوگوں کو لڑکی کو قید کرنے اور باڑے کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں ہدایات دیں اور مجھے ساتھ لے کر مویشی خانے سے ملحق اس مختصر سے مکان میں داخل ہو گیا جس کا ایک دروازہ باڑے میں بھی کھلتا تھا۔

"تمہارے ساتھ کیا حادثہ پیش آگیا تھا؟" اس مکان کے دیہاتی طرز کے کمرے میں بیٹھتے ہوئے یوسف نے مجھ سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں، بس اپنی حماقت سے اس لڑکی کے چکر میں پڑ گیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"عورت واقعی بہت خطرناک چیز ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "پچھلے دو گھنٹے سے ہمارے آدمیوں نے بلاشبہ پورے پیرس کی خفیہ ناکہ بندی کی ہوئی ہے!"

"ارے نہیں —" میں نے بے اعتباری سے کہا۔ "مجھے اس لڑکی سے ملے مشکل سے ساڑھے تین گھنٹے ہی ہوتے ہوں گے۔ بھلا یہ خبر اتنی تیزی سے کیسے پھیلی ہوگی؟"

"جو لوگ تمہیں لائے ہیں صرف وہی ہٹ کی طرف نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ ان کی پشت پناہی کے لیے العاصفہ کے چار خطرناک کمانڈو بھی اُدھر روانہ کیے گئے تھے اور سیڈان کی واپسی کے باوجود وہ ابھی تک وہیں چھپے ہوئے ہوں گے!"

"انہیں فوراً واپس بلواؤ۔" میں اضطراری لہجے میں بولا۔ "اس ہٹ کے اطراف میں دس اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ بھی موجود ہیں۔ کہیں وہ ہولناک خونریزی کا شکار نہ ہو جائیں۔"

"فکر نہ کرو، گاڑی بھیجی جا چکی ہے۔"

"مگر یہ خبر کیسے ملی کہ ایلیزا مجھے ہٹ کی طرف لے گئی ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"بن حیان کی موت کے بعد ہمارے ہم وطنوں پر پیرس کی تیرہ و تاریک گلیوں میں جو پے در پے قاتلانہ حملے کیے جا رہے تھے، عبداللہ نے ان کا کھوج نکال لیا تھا۔ اور اس نے یہ بات چند خاص آدمیوں کو ہی بتائی تھی کہ وہ تمام حملے ایلیزا جونا س کے ایما پر کیے جا رہے ہیں۔ مگر وہ تم سے مشورہ کیے بغیر ایلیزا کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے آدمی ایلیزا کی نگرانی پر لگا دیئے جو ہر نصف گھنٹے بعد عبداللہ کو فون پر ایلیزا کی نقل و حرکت سے باخبر کرتے رہتے ہیں۔" وہ مجھے بتلانے لگا۔ "آج شام اسے کسی آدمی سے علم ہوا کہ تم ہسپتال سے رہائی پاتے ہی کسی سے ملنے گئے ہو۔ تمہارا یہ پیغام نامکمل تھا مگر عبداللہ نے اندازہ لگا لیا کہ تم بن حیان کی بھتیجی سے ملنے گئے ہو گے۔ اور وہ تمہاری سلامتی کی طرف سے فکرمند ہو گیا۔ کیونکہ ایلیزا تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی اور اسرائیلی اس کے ذریعہ تمہیں پھانسنا چاہتے تھے لہٰذا آناً فاناً میں ہمارے آدمی پورے شہر میں تمہاری تلاش میں پھیلا دیئے گئے اور جوں ہی عبداللہ کو ایلیزا کا تعاقب کرنے والے سے یہ خبر ملی کہ ایلیزا ایک شخص کو ساتھ لے کر ہٹ میں پہنچی ہے تو عبداللہ نے اپنے بہترین آدمی اُدھر دوڑا دیئے —— یہ ہے ساری کہانی!"

"مگر وہ خود کہاں ہے؟"

"اس بھاگ دوڑ کے دوران وہ اپنی حفاظت کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اور چند گھنٹے پہلے جبرالڈ کے کسی آدمی نے اس کے پیٹ میں چاقو اتار دیا۔"

"نہیں!" میں بے اختیار چیخ اٹھا۔

"گھبراؤ نہیں —— وہ ایک نجی کلینک میں ہے۔ اس کے پیٹ میں پانچ انچ لمبا زخم آیا ہے جو زیادہ گہرا اور کاری نہیں ہے!"

میں تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر گر گیا۔ "میں فوراً اسے دیکھنا چاہتا ہوں!"

"اب خاصی رات گزر گئی ہے۔ ایسے وقت میں کلینک جانا ... سے وہ جگہ لوگوں کی نظروں میں مشکوک ہو جائے گی۔ میں صبح تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔"

"یہ صرف مقدر کی خرابی ہے۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "بن حیان کی موت کے بدلے ہسپتال سے اپنے پیٹ پر ... لگوا کر باہر آیا اور اب عبداللہ کا پیٹ سیا گیا ہے۔"

"تم آرام کرو —— عبداللہ کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ڈاکٹر سے بات کر چکا ہوں، وہ خطرے سے باہر ہے!"

میں یک بیک تکان اور نقاہت محسوس کرنے لگا۔ عبداللہ کے زخمی ہونے کی خبر سن کر مجھے شدید صدمہ ہوا تھا۔

میری رسٹ واچ اس وقت رات کا ایک بجا رہی تھی مگر عبداللہ کے بارے میں بُری خبر سننے کے بعد میری رہی سہی نیند بھی اڑ چکی تھی اور مجھے صبح تک جاگ کر وقت گزارنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے یوسف سے شراب نوشی کی خواہش کا اظہار کیا اور وہ وہسکی کی بوتل دو پیمانوں کے ساتھ لے کر میرے سامنے جم گیا۔

شراب پیتے ہوئے میرا ذہن عبداللہ سے پھسل کر ایلیزا میں الجھ گیا۔ اسرائیل کے معزز ترین اور برسرِ اقتدار طبقہ سے وابستہ یہودی، بن حیان کی وہ آبرو باختہ بھتیجی جس جارحانہ انداز میں کھل کر سامنے آئی تھی اس کی بنا پر میرے دل میں رہ رہ کر یہ خواہش سر ابھار رہی تھی کہ اس لڑکی کو اس طرح رسوا کر دوں کہ وہ اپنی ذات تک سے شرمانے لگے اور پھر اسی جوش میں میں نے اپنا گلاس اتنی زور سے میز پر پٹخا کہ اس کے ریزے بکھر گئے۔

یوسف کی خمار میں ڈوبی ہوئی بوجھل آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور اس نے مسکرا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم اب بس کرو!"

"یہ نشہ نہیں طیش ہے یوسف!" میں نے گلاس کے بکھرے ہوئے ریزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکی میرے دل میں آگ بھڑکا رہی ہے!"

"وہ حسین ضرور ہے۔" یوسف صوفے کی پشت گاہ سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔ "مگر میں تمہیں اس کی بے آبروئی کی اجازت نہیں دوں گا اور نہ اس پر تشدد ہونے دوں گا —— اسے تو رہا کر دو یا ہلاک کر دو، ان کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے!"

وہ قدرے سرور میں آ چکا تھا مگر اس کے ٹھوس الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ حالانکہ وہ میرا مدعا غلط سمجھا تھا مگر میں نے اسے مزید ٹٹولنے کی نیت سے کہا۔ "وہ ہماری اور ہمارے دوستوں کی جانی دشمن ہے یوسف!"

"ہوا کرے۔" وہ بے نیازی سے فضا میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ "مگر وہ عورت ہے اور ہم عورتوں کی حرمت کے لٹیرے نہیں ہیں۔ یہ میرا اٹل اصول ہے دوست، اسے بھول جاؤ۔"

"قابلِ رشک اصول ہے۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "ویسے وہ لڑکی میرے دل میں انتقام کی ہولناک آگ بھڑکا رہی ہے۔ اب لطیف جذبوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"لڑکی سے انتقام لو گے؟" اس کا لہجہ قدرے استہزائیہ تھا۔ "اسرائیلی دنیا کے ہر خطے میں ہمارے ہاتھوں بھاری زک اٹھاتے ہیں اور پھر ان کے جھلائے ہوئے ہوا باز نیپام بموں کے ذخائر بیروت کے نواح میں پھیلے ہوئے ہمارے پناہ گزینوں کے کیمپوں پر برسانے لگتے ہیں جہاں کثرت عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں کی ہے۔ یہ کام ان ہی کے لیے چھوڑ دو تو بہتر ہے!"

"تو اسے رہا کر دو، جب تک وہ ہماری قید میں رہے گی میں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر جھلاہٹ کا شکار ہوتا رہوں گا۔"

"ضرور کر دیتا۔" وہ بھرائی ہوئی مگر متوازن آواز میں بولا۔ "وہ ہمارا یہ ٹھکانا دیکھ چکی ہے اور پھر ہمارے چند نام بھی اس کے علم میں آ گئے ہیں۔ اس کی رہائی اتنی آسانی سے ممکن نہ ہوگی!"

"تو اچار ڈالو گے اس کا؟"

میری جھلاہٹ پر وہ دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ "کاش یہ ممکن ہوتا۔" اس کے بعد سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "اسے مرنا ہی ہوگا ورنہ وہ بچ گئی تو پیرس میں ہمارے لئے ناسور کی صورت اختیار کر لے گی۔"

"تم اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو مگر مجھے میرا بستر دکھا دو۔" میں یہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ گیا کیونکہ چند پیگ لینے کے بعد یوسف کا انداز بالکل ہی بے کیف ہو گیا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ مزید وقت برباد کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

یوسف نے مجھے سونے کے لئے جو کمرہ دیا وہ چاروں طرف سے بند اور گرم تھا مگر میں آرام دہ بستر پر دراز ہونے کے باوجود فوری طور پر سونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس باڑے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے مویشیوں کے ڈکارنے کی آوازیں ابھرنے لگتی تھیں تھوڑی دیر بعد جب میرا ذہن ان بے ہنگم آوازوں کے تواتر کا عادی ہو گیا۔ تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

اگلی صبح مجھے تقریباً زبردستی بیدار کیا گیا۔ ہوش آنے پر پتہ چلا کہ بستر پر میرے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا۔ اور میرے ساتھ خاصی زور آزمائی کر رہا تھا۔

حواس پوری طرح بحال ہوئے تو جسم میں فرحت انگیز لطافت محسوس ہوئی۔ اور پھر اس کا سبب بھی سامنے آ گیا۔ وہ دیہاتی وضع قطع کا کوئی ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جو نہایت چابکدستی سے میرا بدن داب رہا تھا۔

مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی اور اس کے حلق سے بے معنی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ اور چند ہی منٹ میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بے چارہ گونگا ہونے کے ساتھ بہرہ بھی تھا مگر اپنے مالکان کا نہایت وفادار اور محنتی تھا۔

میرے اٹھنے کے باوجود وہ نہایت مہارت سے میری پشت، شانے اور سر دباتا رہا اور میں کسی مدہوش شرابی کی طرح بستر پر بیٹھا جھومتا رہا۔ آخرکار مجھے اس بے زبان پر رحم آیا اور میں بستر سے نیچے آ گیا۔ دن کے گیارہ بجے یوسف مجھے ساتھ لے کر وہاں سے روانہ

تھا اور بدر نامی ایک کویتی کے مکان پر چھوڑ کر چلا گیا۔

بدر کا کویت میں خاصا بڑا تجارتی ادارہ تھا اور وہ وہاں بھیجے جانے والے یورپی سامان کی خریداری، پیکنگ اور روانگی کے انتظامات کے لئے اپنا بیشتر وقت اپنے پیرس آفس میں گزارتا تھا۔ یوسف نے راستے میں مجھے بتا دیا تھا کہ بدر تحریک کے ہمدردوں میں شامل تھا۔ اور عبداللہ کو جس ڈاکٹر کے نجی کلینک میں خفیہ طور پر داخل کیا گیا تھا وہ بدر کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔

میں بدر کے ہمراہ اس کلینک میں پہنچا جو ایک کثیر المنزلہ عمارت کی نچلی منزل پر کئی کمروں پر مشتمل تھا۔ وہاں انتظار گاہ میں دو مریض اپنی باری کے منتظر تھے اور جب ہم دونوں کو ڈاکٹر کے کیبن میں داخلے کی اجازت ملی تو مزید تین مریض وہاں آ چکے تھے۔

ڈاکٹر نے نہایت گرمجوشی سے بدر کا استقبال کیا۔ بدر نے مجھے ایک فرضی نام سے عبداللہ کے جگری دوست کے طور پر متعارف کرایا۔ اور جوں ہی ڈاکٹر کو یہ علم ہوا کہ میں فرنچ سے نابلد ہوں تو اس نے انگریزی میں گفتگو کرنی شروع کر دی۔

"وہ بالکل خیریت سے ہے اور اب خطرے سے باہر ہے، اس کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر نے دھیمی رازدارانہ آواز میں کہا تاکہ وہ الفاظ باہر کسی غیر متعلقہ فرد کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں ڈاکٹر!" میں نے کہا۔

"ابھی؟" میری خواہش سن کر ڈاکٹر کی پیشانی پر تشویش آمیز لکیریں ابھر آئیں۔

"تھوڑی دیر انتظار کر لیں گے۔" میں نے اپنی دانست میں اسے تسلی دی۔

"وہ ایک ہی بات ہے۔" ڈاکٹر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "دراصل وہ سیدھا سادا پولیس کیس تھا۔ اور میں اس کے علاج کی ذمہ داری قبول کرنے کا مجاز بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرا صرف مطب ہے، اور آپریشن تھیٹر کے بغیر شدید زخمیوں کا مناسب علاج ناممکن ہے.....!"

"وہ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر!" میں نے اس کی طویل تمہید منقطع کرتے ہوئے بے صبری سے کہا۔

"میرے پانچ آدمیوں کے عملے میں صرف ایک نرس عبداللہ کی یہاں موجودگی سے باخبر ہے۔ اور میں اپنے عملے کے دیگر اراکین کو اس راز میں شریک کر کے اپنی ساکھ کے لئے کوئی غیر ضروری خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔" ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں دو بجے اپنا کلینک بند کر دیتا ہوں۔ اگر تم اس وقت تک انتظار کر سکو تو میرے لئے سہولت ہو گی۔"

"تو تم نے اسے یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا ہے۔" بدر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ یہیں ہے۔" ڈاکٹر خجالت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اس جیسے دلیر آدمی کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ بے چارہ شدید تکلیف کے باوجود دوائیوں کے مقفل اسٹور میں ایک پرانے اسپکشن کوچ پر گزارا کر رہا ہے!"

"تو یوں کہو کہ تم نے اسے چھپایا ہوا ہے۔" بدر مسکرا کر دھیمی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے ہم دو بجے آ جائیں گے۔"

"چند منٹ بعد ہی آنا۔ میں ضروری کام کا عذر کر کے خود رک جاؤں گا اور نرس کے علاوہ باقی اسٹاف کو چھٹی دے دوں گا۔"

ہم لوگ اس کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے۔

"اگر کسی سرکاری ایجنسی کو اس معاملے کی بھنک بھی مل جائے تو اس ڈاکٹر کا لائسنس عمر بھر کے لئے منسوخ کیا جا سکتا ہے اور سزا یا جرمانہ تک ہو سکتا ہے۔" باہر آ کر بدر نے فخر آمیز لہجے میں کہا اور میں اپنے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دے کر رہ گیا۔

باقی وقت ہم دونوں نے ایک عمدہ ریستوران میں گزارا۔ بدر سے گفتگو کے دوران مجھے پتہ چلا کہ زخمی ہونے کے بعد عبداللہ کو نہایت پریشانی کے ساتھ اس کلینک میں پہنچایا گیا تھا۔

کلینک کے عقبی حصے میں ایک رہائشی کمرہ بھی تھا جو ڈاکٹر کی معتمد نرس کے تصرف میں تھا اور وہ کلینک بند ہو جانے کے بعد وہیں رہتی تھی۔ اس کمرے سے نکاسی کا راستہ عمارت کے عقبی رخ پر تھا۔ اور ایک چھوٹا سا دروازہ اس کمرے کو کلینک سے ملاتا تھا۔ زخمی عبداللہ کے زخم کو صاف کر کے ٹانکے وغیرہ لگائے تھے مگر بعد میں حفاظتی اقدام کے طور پر عبداللہ کو دوائیوں کے اسٹور میں منتقل کر کے مقفل کر دیا گیا اس طرح وہ نرس کے کمرے میں ناگہانی طور پر نازل ہونے والے کسی مہمان کی نظروں میں آنے سے بچ گیا تھا۔

کلینک بند ہونے کے بعد وہاں رہنے والی نرس عبداللہ کی مرہم پٹی وغیرہ کا خیال رکھ سکتی تھی۔

ہم دونوں دو بج کر پانچ منٹ پر کلینک پر پہنچے تو داخلی دروازہ بند کیا جا چکا تھا۔ مگر ڈسپنسری میں داخلے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ڈاکٹر ہمارا منتظر تھا۔ نرس بھی اس کے کمرے میں موجود تھی۔۔۔

ہم چاروں دوائیوں کے اسٹور کا مقفل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو عبداللہ کو نہایت سکون کے ساتھ ایک کوچ پر دراز پایا۔ دیوار کے سہارے لگی ہوئی چوبی الماریوں کے درمیان پڑا ہوا تھا اس کمرے میں بھانت بھانت کی دوائیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

عبداللہ نے محبت آمیز مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا مگر ڈاکٹر، بدر اور نرس کی موجودگی میں کوئی اہم موضوع نہیں چھیڑا۔

بدر میری توقع سے زیادہ سمجھدار آدمی ثابت ہوا چند منٹ رسمی گفتگو کے بعد وہ ڈاکٹر اور نرس سمیت وہاں سے چلا گیا اور مجھے عبداللہ سے تنہائی میں گفتگو کا موقع فراہم کر دیا۔

"یہ کیسے ہو گیا عبداللہ؟" میدان صاف پا کر میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے پیٹ پر ٹانکے آئے تو میں کیوں پیچھے رہتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"سنا ہے تمہارا زخم خاصا کاری ہے!"

"قسمت تھی کہ بچ گیا ورنہ انہوں نے بے خبری میں ہلاک ہی کر ڈالا ہوتا۔" اس کے زرد چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "یہ بتاؤ کہ تم ایلیزا کے پاس کیوں دوڑے چلے گئے تھے۔۔۔؟"

"میں تو اس بدذات لڑکی کو اپنا محسن سمجھ رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے۔"

"مجھے جیراڈ کے آدمیوں سے مراسم رکھنے والے ایک شخص کو بھاری رشوت دینے کے بعد یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نئی کارروائیوں کے پس پشت ایلیزا کا سرمایہ کارفرما ہے۔ یہ علم ہوتے ہی میں نے اپنے آدمی اس کے پیچھے لگا دیئے تھے۔"

"بھتیجی کا کوڈ تم سمجھ گئے تھے۔۔۔؟"

"پورے فرانس میں ایک ہی تو بھتیجی ہے۔ اگر راڈرک سے وہ پیغام نہ ملتا تو میں اپنے آدمی کی اطلاع پر یہی سمجھتا کہ وہ حسب معمول اپنے کسی نئے دوست کے ساتھ عیش اڑانے اس ہٹ میں گئی ہو گی۔۔۔ وہ تم سے کیا چاہتی تھی۔۔۔؟"

"اس نے میرے ساتھ بہت مکاری سے کام لیا۔ اسرائیلی سیکرٹ سروس کے گیارہ کمانڈو صرف مجھے پکڑنے کے لئے ایلیزا کے ہٹ کے گرد چھپے ہوئے تھے۔ اس نے ان کی موجودگی میں دھمکی دے کر مجھ سے اپنی اصلیت کا اعتراف کرایا اور پھر وہ انہیں جل دے کر مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہ رہی تھی۔ تاکہ مجھے سسکا سسکا کر ختم کر سکے۔!"

"اب وہ خود کہاں ہے۔۔۔؟"

"یوسف کی قید میں ہے۔" میں نے کہا۔ "ایلیزا نے تو تمہارے آدمیوں کو بھی میری طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ اس دھوکے میں آ گئے تھے کہ میں دراصل ایلیزا کا ساتھی ہوں مگر اپنی جان بچانے کے لئے خود کو صفدر علی بنا رہا ہوں۔"

"کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ان لوگوں نے؟"

"نہیں۔۔۔ مگر یہ بتاؤ کہ اب تم ایلیزا کے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔۔۔؟"

"وہ ہماری قیدی رہے گی۔" عبداللہ نے لیٹے لیٹے احتیاط سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میں اسے قتل کرنے کا مخالف ہوں۔"

"مگر تم کب تک اسے قید رکھ سکو گے؟"

"اسے بیروت کے قریب واقع ایک ہسپتال میں بھیج دیا جائے گا جہاں وہ مستقل نگرانی میں کسی کام پر لگا دی جائے گی۔"

"اور میرے لئے اب کیا حکم ہے۔۔؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

"میں تمہیں بن حیان کے خاتمے کی مبارکباد تو دینی ہی بھول گیا۔ تم نے واقعی ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور اس بے نظیر کارنامے کے بعد تمہیں لیبیا میں کچھ دن آرام کرنا چاہیئے۔"

"میرے کاغذات کا کیا ہو گا۔۔؟"

"ان میں رہ جانے والی کمی دور کی جا چکی ہو گی اور تم عبدالعزیز سے کسی بھی وقت وہ کاغذات لے سکتے ہو۔" اس نے کہا۔

"تم یہاں کب تک رہو گے؟"

"شاید دو دن بعد چلنے پھرنے کے قابل ہو سکوں گا۔"

"اگر میں یہ دو دن تمہارے ساتھ ہی گزاروں تو کیسا رہے گا؟"

"ڈاکٹر ہرگز اجازت نہ دے گا۔ میرے یہاں آنے کے بعد تم میرے پہلے اور شاید آخری ملاقاتی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر فرانس سے چلا جاؤں۔ جہاں اتنے عرصے رکا رہا دو دن اور بھی گزر جائیں گے۔"

"یہ تمہارا خلوص ہے ورنہ میری تو خواہش ہے کہ تم جلد از جلد نکل جاؤ۔"

"رکا رہا تو ایک اور معاملہ نمٹا لوں گا۔"

"وہ کون سا؟"

"جیراڈ کو بھی تو سبق دینا ہے۔"

"ارے اسے بھول جاؤ۔" وہ ہنس کر بولا۔ "جیراڈ پیسے کا بھوکا ہے۔ ایلیزا کے غائب ہونے کے بعد ایک دو روز اسے مال نہیں ملے گا تو خود ٹھنڈا پڑ جائے گا۔"

"ہو سکتا ہے کہ اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ اسے خرید لیں میرے ہاتھوں ان کا سرغنہ بھی مارا جا چکا ہے اور اب تک وہ اس قتل سے باخبر ہو چکے ہوں گے۔"

"مارا جا چکا ہے۔۔۔؟" عبداللہ حیرت سے اچھل پڑا۔۔۔ "وہ کیسے۔۔۔؟"

اس پر میں نے اسے ایلیزا کے ہمراہ ہٹ پر پیش آنے والے واقعات سنا ڈالے۔ ابی غیل کا نام سنتے ہی عبداللہ گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبانے لگا۔

"ابی غیل اسرائیلی سیکرٹ سروس کا مایہ ناز ایجنٹ تھا۔ کئی بار تم نے ان لوگوں کو زبردست نقصانات پہنچائے ہیں۔"

"مگر اس چکر میں زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی ہٹ میں ہی رہ گئی۔" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "وہ میرا بہترین ہتھیار تھا۔ اور میرے اندیشوں کے باوجود آخر تک اس نے کہیں دھوکا نہیں دیا۔"

"طرابلس میں فواد میرا گہرا دوست ہے، اگر تم اس سے فرمائش کرو گے۔ تو وہ کہیں نہ کہیں سے تمہیں وہی یا دوسری قسم کا بلو پائپ فراہم کر دے گا۔"

"ابھی تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی!" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کہا۔

"کیا ایسی بھی کوئی بات ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"فرانس کی حکومت اپنی سرزمین پر اس قدر خون خرابہ کس طرح برداشت کر رہی ہے؟" میں نے طویل عرصے سے اپنے ذہن میں کھٹکنے والا سوال کر ہی ڈالا۔

"مقامی حکومت تو پہلی فرصت میں شر پسندوں کا صفایا کرنا چاہتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دونوں فریق ہر مقام سے اپنے نشانات مٹا دیتے ہیں۔"

"حکومت یہ تو جانتی ہے کہ اس کشت و خون میں اسرائیلی اور فلسطینی ملوث ہیں۔؟"

"حکومت ضرور جانتی ہے مگر کچھ کر نہیں سکتی۔"

"وہ کیوں۔۔۔؟"

"سرکاری سطح پر دونوں فریق بیشتر کارروائیوں سے نہ صرف لاتعلقی کا اظہار کرتے رہتے ہیں بلکہ ضروری ہو تو اپنے ہی اقدام کی مذمت تک کر ڈالتے ہیں۔"

"اپنے ملک میں ان لوگوں کے داخلے پر پابندی تو لگا سکتے ہیں۔"

"وہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ناممکن ہے۔" عبداللہ نے جواب دیا۔ "اسرائیلی حکومت اپنے مذہبی اور سیاسی عزائم کی بنا پر یورپی ممالک کی منظورِ نظر سمجھی جاتی ہے اور دوسری طرف فرانس اپنے تیل کی ضروریات کی وجہ سے ہر وقت عربوں کی خوشنودی کا خیال رکھتا ہے لہٰذا وہ اس معاملے میں بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔ ورنہ فلسطینیوں کے داخلے پر تو ضرور ہی پابندی لگ جاتی۔"

"یہاں سے چھٹی کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے۔۔۔؟"

"میں واپس جاؤں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہاں مجھے خلافِ توقع کافی دن ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر الیزا کے معاملے میں ابھی ابھی ایک نیا سوال میرے ذہن میں ابھرا ہے۔" آخری فقرہ اس نے قدرے توقف کے بعد جھجکتے ہوئے ادا کیا تھا۔

"پوچھ لو ورنہ پھر نجانے کب ملاقات ہو!"

"اگر الیزا کو یہ علم ہو چکا تھا کہ تم اسرائیل کے دشمنوں سے تعلق رکھتے ہو تو پھر تمہیں تلاش کر کے براہِ راست ختم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔"

"کوششیں تو جاری تھیں مگر انہیں میرا سراغ ہی نہیں مل سکا۔" میں نے کہا۔ "اور اگر اسرائیلی قومی دفاعی کونسل کا سربراہ الیزا کو میری تصاویر نہ دکھاتا تو شاید ابراہام جونز اس کی موت کے بعد بھی اسے مجھ پر شبہ نہ ہو پاتا۔"

"بن حیان کی ہلاکت کے بعد وہ لوگ ہسپتال میں تمہارا سراغ نکال سکتے تھے۔"

میں اس کی سادہ لوحی پر ہنس دیا۔ "اول تو پولیس سے لے کر اسرائیلی سراغرسانوں تک کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکا ہو گا کہ ہسپتال میں مصنوعی مریض کے طور پر گھسے ہوئے کسی تنہا شخص نے وہ کارروائی کی ہو گی۔ ہر کہانی میں بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ کچھ لوگ ہسپتال کا برقی نظام تباہ کرنے کے بعد کسی طرح اندر گھسے اور اپنا کام پورا کر کے خاموشی کے ساتھ ہسپتال کی حدود سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لہٰذا ان کی ساری توجہ باہر ہی مرکوز رہی اور الیزا اس وقت کا انتظار کرتی رہی۔ جب میں اس سے رابطہ قائم کرتا۔"

"یعنی الیزا نے تم سے جو کچھ کہا وہ سچ تھا۔"

"اپنی دانست میں وہ مجھے پوری طرح بے بس کر چکی تھی۔ لہٰذا اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔"

"میں اپنے دل میں اس کے لئے ہمدردی محسوس کرتا ہوں، پیرس چھوڑنے سے پہلے ایک بار اس سے ملاقات ضرور کر لینا۔ ہو سکتا ہے وہ تم سے کوئی قابلِ عمل سمجھوتہ کر سکے۔"

"مگر وہ تمہارے چند آدمیوں اور ایک ٹھکانے سے واقف ہو چکی ہے اور اپنی زندگی کی خاطر فی الحال وہ تمہاری شرائط پر ہر سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ اور اس نے آزادی حاصل کرتے ہی اگر اپنے آقاؤں کو تمہارے پیچھے لگا دیا تو کیا ہو گا۔؟"

"یہ ساری باتیں تمہاری صوابدید پر ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں تمہاری رپورٹ ملنے کے بعد اس کے بارے میں فیصلہ کروں گا۔"

میں نے مزید کچھ دیر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر آواز دے کر نرس کو بلا لیا۔

نرس کے ساتھ اس کے صاف ستھرے رہائشی کمرے سے گزر کر میں عمارت کے عقبی حصے پر نکل آیا اور ٹیکسی کے ذریعے راڈرک کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

راڈرک مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ اور اس نے دروازہ میں کھڑے کھڑے ہی مجھ سے دبی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں کئی سوال کر ڈالے۔

"اندر تو جانے دو، ساری باتوں کے جواب بھی لے لینا۔"

"اندر میری ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔" وہ آواز کو بلند کئے بغیر بولا۔ "اس کے سامنے دنگے فساد کی کوئی بات نہ چھیڑنا۔"

"تم فکر نہ کرو، مگر مجھے راستہ تو دو۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میرے لئے راڈرک کے ڈرائنگ روم سے گزرے بغیر خوابگاہ میں داخل ہونا ناممکن تھا۔ مگر جب میں نے وہاں ایک بے حد حسین نسوانی چہرہ دیکھا۔ تو فوری طور پر خوابگاہ میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور سر کو قدرے خم دے کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"مجھے شاہدہ کہتے ہیں!" اس لڑکی نے ترنم ریز لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ اور میں فرنچ لہجے میں بولی جانے والی انگریزی میں اس کا نام سن کر چونک پڑا۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اور میں نے اپنا نام ژان فرنانڈو بتاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "معاف کرنا میں تمہارا نام صاف طور پر نہیں سن سکا۔"

"شاہدہ!" اس نے مسکرا کر دہرایا۔ اسے براہِ راست مجھ سے مخاطب پا کر راڈرک کے چہرے پر یتیمی برسنے لگی تھی۔ اور وہ بے بسی سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے اندر چلے جانے کی التجا کر رہا ہو۔

"خوبصورت مغربی خدوخال پر یہ مشرقی نام عجیب سا لگتا ہے۔" میں نے اپنے لہجے میں مٹھاس پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "پہلی بار میں سمجھا کہ شاید میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔" نام کے بہانے میں نے اس کی خوبصورتی کی تعریف کا موقع بھی پیدا کر لیا تھا۔

"مشرق کے بارے میں تمہاری خاصی معلومات ہیں۔" اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "ورنہ اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کس زبان کا نام ہے۔"

"اگر نام ہی معلومات کا معیار ہے تو تم مجھے مشرق پیا تصاسنی سمجھ سکتی ہو۔" میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

"وہ کیسے؟" شاہدہ کے لہجے میں دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں تمہارے نام کے ماخذ تک سے واقف ہوں۔"

"نہیں!" اس نے بے اعتباری سے کہا۔

"اور یہ نام عربی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔"

"تم اردو جانتے ہو؟" شاہدہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"بہت اچھی طرح!" میں نے اردو میں ہی جواب دیا اور وہ "اوہ خدا" کہہ کر حیرت سے اچھل پڑی۔

"کیا کہا۔۔۔؟ اس نے ابھی ابھی تم سے کیا کہا تھا؟" راڈرک نے شاہدہ کے سامنے تن کر کھڑے ہوتے ہوئے قدرے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

"بیٹھ جاؤ ڈارلنگ، اس نے اظہارِ عشق نہیں کیا تھا بلکہ اردو بول کر میرے سوال کا جواب دیا تھا۔" وہ منہ بنا کر ناز کے ساتھ بولی اور راڈرک مجھے گھورتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں اردو پر خاصا عبور ہے۔ ایسے بے ساختہ انداز میں اوہ خدایا کہنا کسی فرنچ لڑکی کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔" میں نے ایک ہم زبان میسر آجانے کی بے اندازہ خوشی میں اردو ہی بولنی شروع کر دی۔

"میرے والد پاکستانی تھے۔" شاہدہ نے سر جھکا کر کہا۔

"یہ تم دونوں نے کس زبان میں باتیں شروع کر دیں۔" راڈرک جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ایسی زبان بولو جو میں بھی سمجھ سکوں!"

"ذرا سی زبان کی ہیرا پھیری نکال لینے دو پھر تم شاہدہ کے ساتھ فرنچ ہی باتیں کرتے رہنا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"تو تمہیں فرنچ نہیں آتی۔۔۔؟" شاہدہ میری بات پوری ہوتے ہی بول پڑی۔

مجھے اپنے سر کو محض نفی میں جنبش دینے کی مہلت ہی مل سکی۔ کیونکہ راڈرک فوراً ہی کسی لڑاکا مرغے کی طرح کڑکنے لگا تھا۔ "اس چھت کے نیچے انگریزی، فرنچ اور اسپینی کے علاوہ کسی زبان میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔"

"یہ شخص میرے باپ کی زبان جانتا ہے، اتنے تنگ نظر نہ بنو راڈرک! ہم تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہے۔" شاہدہ نے کہا۔

"تم یہیں رکو گے! یا فوری طور پر کہیں باہر جاؤ گے؟" راڈرک نے شاہدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"فی الحال تو رکنے کا ارادہ ہے!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر آؤ ہم باہر چلتے ہیں۔" راڈرک نے اٹھ کر شاہدہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"مگر کہاں۔۔۔؟" شاہدہ کے لہجے میں احتجاج نمایاں تھا۔ "تم تو رات کے کھانے تک فلیٹ میں گپ شپ لڑانے کا پروگرام بنا کر مجھے لائے تھے۔"

"وہ پروگرام چوپٹ ہو گیا۔" راڈرک اپنے غصے پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اب باہر نکل کر دوسرا پروگرام بنائیں گے۔"

"میری وجہ سے اپنا موڈ برباد نہ کرو راڈرک!" میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔ "مجھے نہا دھو کر دس پندرہ منٹ بعد پھر باہر جانا ہے۔"

"کیوں اچھا خاصا ماحول خراب کر رہے ہو راڈرک! اتنی سی بات پر بچوں کی طرح بپھرنا اچھی بات نہیں ہے۔" شاہدہ بھی میری ہمنوا بن گئی تھی۔

اس کے جواب میں راڈرک نے غصیلی آواز میں کچھ کہنا شروع کیا جو فرنچ میں تھا میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی کو میرے بارے میں گمراہ کر رہا تھا۔

اس کے خاموش ہوتے ہی شاہدہ میری طرف دیکھتے ہوئے بے اعتباری سے انگریزی میں بولی۔ "مجھے یقین نہیں۔۔۔۔۔۔!"

"شٹ اپ!" اسے انگریزی میں انکشاف پر آمادہ پا کر راڈرک شاہدہ کی طرف تقریباً جھپٹتے ہوئے بولا۔ اور اس سے آگے اس نے پھر

فرنچ شروع کردی۔

پھران دونوں کے مابین فرنچ میں بحث کا آغاز ہو گیا۔ میں چند ثانیوں تک تو کسی سمجھوتے کا منتظر رہا۔ مگر جب لڑکی کا پارہ چڑھنے لگا تو میں مسکراہٹ بھول کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"میں جا رہا ہوں راڈرک!" میں نے ان کی بحث میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے یہاں کا ماحول خراب ہو گیا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں" شاہدہ نے انگریزی میں کہا۔ "یہ شخص مجھے نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا ہے جو ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہوا جا رہا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے خاتون کہ میں اپنے دوست کی مرضی کے خلاف آپ کو ساتھ نہ لے جا سکوں گا۔" میں نے معاملے کی نزاکت جانتے ہوئے اسے دو ٹوک جواب دے دیا۔

میرے اس جواب پر راڈرک نے حیرت سے پلکیں جھپکا کر میری طرف دیکھا اور پھر شاہدہ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "سن لیا۔ میرے دوست اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔"

"اور ابھی تم اسے بردہ فروش بتا رہے تھے۔!" شاہدہ نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ بکواس کر رہی ہے۔" راڈرک اس کے بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شاید خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ لے جانے کی عادی تھی۔"

"میں جا رہی ہوں اور آئندہ کبھی تمہاری صورت بھی نہیں دیکھوں گی!" شاہدہ غصیلے لہجے میں وینٹی بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو گا تو کل میں خود منالوں گا۔" راڈرک نے اسے روکنے کی کوشش کئے بغیر بولا اور وہ دروازہ کھول کر چلی گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں کی نگاہیں بار بار ملیں اور راڈرک فوراً ہی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم دونوں نے دیر تک کوئی بات کئے بغیر خاموشی سے صوفوں پر بیٹھے اور دونوں نے ہی سگریٹیں سلگالیں۔

"اچھا ہوا سالی چلی گئی۔" چند کش لینے کے بعد راڈرک نے لاپرواہانہ لہجے میں بوجھل سکوت توڑنے کی کوشش کی۔ "ورنہ یہ بھی ہمیشہ کو سنایاں ہونے سے نہ رک سکا۔"

"کون تھی یہ لڑکی ـــ؟" میں نے لڑکی کے ساتھ اس کے رویے پر تبصرہ کرنے سے گریز کرتے ہوئے سرسری انداز میں دریافت کیا۔

"اسپینی ماں اور پاکستانی باپ کی اولاد ہے۔" راڈرک مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "پیرس کے سب سے بڑے ڈرگ ریکٹ کی اہم رکن ہے!"

"اس کا باپ کیا کرتا ہے ـــ؟"

"پاکستان، افغانستان اور نیپال وغیرہ سے غیر قانونی طور پر منشیات لاتا تھا۔" راڈرک کے انداز سے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ پہلے محض میری نا وقت آمد کے سبب اس کے ہاتھ آئی ہوئی ایک خوبرو لڑکی نکل گئی تھی۔

"مگر اب کیا کرتا ہے ـــ؟"

"کچھ نہیں ـــ اس نے آٹھ سال پہلے جیل میں خودکشی کر لی تھی۔"

"کیوں ـــ؟"

"منشیات لاتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ عدالت سے دس سال قید اور دو لاکھ فرانک جرمانے کی سزا ہوئی تھی۔ مگر اس نے تین برس بعد جیل میں خودکشی کر لی۔"

"اور اس کی ماں ـــ؟"

"وہ ہیروئن کی عادی تھی۔ مقدمے کے دوران میں ہی مر گئی تھی۔ ایک مقامی سنڈیکیٹ نے خفیہ طور پر مقدمے کے دوران اس کی بھاری مالی اعانت کی اور اسی وقت سے یہ اس گروہ میں شامل ہے۔"

"صورت سے تو بڑی معصوم لگتی ہے۔"

"ڈرگ ریکٹ کے علاوہ بھی ذاتی طور پر خاصے خطرناک کام کرتی رہتی ہے۔"

"تمہیں کہاں ٹکرا گئی ـــ؟"

"ہماری ڈرگ ٹرانسفر بھی ہے۔" وہ مردہ لہجے میں بولا۔ "ویسے اس وقت تمہارے لئے ہی ایک پیغام لائی تھی۔"

"کیا تھا وہ پیغام؟" میں اس کے الفاظ سنتے ہی بے چین ہو گیا۔

راڈرک اپنی جگہ سے اٹھا اور کتابوں کے مختصر سے ریک پر پڑا ہوا ایک سادہ لفافہ لا کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے فوری طور پر لفافہ کھول کر اندر رکھا ہوا خط نکالا اور اس کی تحریر پڑھتے ہی میں حیران رہ گیا۔ وہ تحریر عبدالعزیز کی جانب سے تھی اور اس کے مطابق مجھے اگلے روز شام کو خود شاہدہ کے ہوٹل کے پتے پر پہنچنا تھا۔ جس کے بعد باقی ہدایات مجھے اسی سے ملنی تھیں۔

"تم نے اس وقت گرمی دکھا کر بہت برا کیا۔" میں نے خط ختم ہونے پر راڈرک سے کہا۔

"تم اس میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگتے ورنہ مجھ پر شک ہو جاتا" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"صحیح معنوں میں تو مجھے اب اس میں دلچسپی لینی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "کل سے میں اس کے ساتھ رہنے جا رہا ہوں۔"

"نہیں ـــ" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی مایوسانہ آواز نکلی۔

"مجھے یہی ہدایت ملی ہے۔"

"اپنا تو مقدر ہی خراب ہے، جلد بازی کی وجہ سے ہر لڑکی ہاتھ آتے آتے نکل جاتی ہے اور تمہارے لئے پرستان کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔"

"ابھی تک تو کسی پرستان میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ ایلیزا اکیلی پورے پرستان پر بھاری تھی۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "عبداللہ نے تمہارے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا ہے۔ جس میں تو کئی لڑکیاں تمہاری باتوں میں آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

"اسی لئے تم مجھے شاہدہ سے دور رکھنا چاہتے تھے!" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"اگر پہلے پتہ چل جاتا کہ وہ تمہارے لئے بھیجی گئی ہے تو کم از کم تلخ کلامی کی نوبت نہ آتی۔"

"خوبصورت لڑکیوں کے سامنے تم بالکل ہی چغد بن کر رہ جاتے ہو ـــ!"

"بس اسی وجہ سے تو ہر بار مار کھاتا ہوں۔" وہ ٹھنڈا سا سانس لے کر بولا۔ "ہر ناکامی کے بعد عہد کرتا ہوں کہ آئندہ دماغ پر قابو رکھوں گا مگر پھر کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

"چاہو تو اس سے تمہاری سفارش کر دوں۔"

"نہیں!" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "میں دوستوں کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھا سکتا ہوں مگر لڑکیوں کے معاملے میں شراکت کا قائل نہیں۔"

"اور وہ مچھلی والی بھی دغا دے گئی۔"

"ہو گئی سو گئی۔ اب اس کا ذکر نہ کرو۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اب شام کو شکار پر نکلنا ہو گا۔"

"عبداللہ کہاں ہے؟" میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے سوال کیا۔

"پتہ نہیں!" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان لوگوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کم علم ہو پاتا ہے۔"

"مگر مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ تم سارا اپنا وقت عبداللہ کے کاموں میں ہی صرف کر دیتے ہو۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ محض اتفاق ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "میرا شمار مرغبانی کے ماہرین میں ہوتا ہے اور میرے چند مستقل گاہک ہیں جو کسی پریشانی کی صورت میں فون کر کے مشورے کے لئے مجھے طلب کر لیتے ہیں ورنہ ـــ فرینڈز آف فلسطین گروپ کے اراکین زیادہ تر مالی اور اخلاقی اعانت سے آگے نہیں بڑھتے!"

"جب کہ اس گروپ میں تم جیسے بے خوف لڑنے والے بھی ہیں۔"

"پیرس میں ایسے لوگوں کی تعداد صرف پندرہ ہے ویسے فرینڈز آف فلسطین کے صرف پیرس میں اٹھارہ ہزار اراکین ہیں۔"

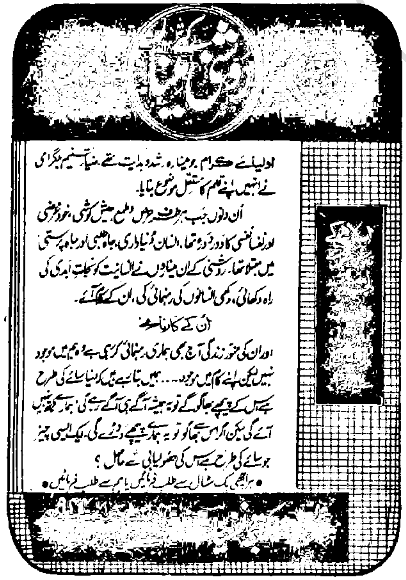
"اٹھارہ ہزار؟" میں وہ تعداد سن کر حیران رہ گیا۔

"ہاں ـــ اور شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ یہ گروپ نہر سوئز کے بارے میں مصر سے ہونے والی جنگ کے دو سال بعد قائم کیا گیا تھا۔"

راڈرک ان لوگوں میں سے تھا جو ذرا سی بات پر لڑ مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر چند ہی لمحوں بعد سب کچھ بھول جانے کی خداداد صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ جب تک شاہدہ موجود رہی وہ میرے ساتھ لڑنے پر تلا رہا۔ لیکن اپنی حماقت سے اسے بھگانے کے بعد وہ میرے ساتھ نہایت دوستانہ رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

مگر میرے پاس اس کے لئے زیادہ وقت نہیں رہا تھا عبداللہ کی خواہش تھی کہ میں فرانس چھوڑنے سے قبل ایک بار ایلیزا سے مل لوں اور عبدالعزیز نے اپنے طور پر مجھے اگلے روز شاہدہ سے ملنے کی ہدایت کی تھی۔ شاہدہ سے ملنے کے بعد مجھے اس کی ہدایات پر عمل کرنا تھا اس اعتبار سے میں وہ رات ایلیزا کے سلسلے میں مویشی خانے پر بسر کر سکتا تھا۔

میں گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر راڈرک کے فلیٹ سے روانہ ہو گیا۔



میں نے ٹیکسی یوسف کے فارم سے تھوڑی دور ہی چھوڑ دی اور خود پیدل آگے چل دیا۔ فارم کے احاطے پر پہنچنے کے بعد مجھے علم ہوا کہ بظاہر ویران نظر آنے والا وہ احاطہ سخت حفاظتی پہرے میں تھا کیوں کہ مجھے دیکھتے ہی مختلف سمتوں سے بیک وقت تین افراد میری طرف لپکے جن کی پھولی ہوئی جیبیں آتشیں اسلحے کی موجودگی کی چغلی کھا رہی تھیں۔

غنیمت یہ ہوا کہ ان میں سے دو افراد مجھے پہچان گئے اور میں فوری طور پر عمارت میں پہنچا دیا گیا جہاں باہر سے آنے والے مویشیوں کی آلودہ آوازیں خاصی خوابناک محسوس ہو رہی تھیں۔

چند منٹ بعد یوسف ڈھیلے ڈھالے لباس میں میرے سامنے آ موجود ہوا۔

"تم نے اس وقت یہاں آ کر میری بڑی مشکل آسان کر دی ہے۔" وہ مجھے دیکھتے ہی بول اٹھا۔

"خیریت تو ہے ۔۔؟"

"کیسی خیریت! " اس نے منہ بنا کر کہا۔ "وہ لڑکی میرے لئے عذاب بن گئی ہے!"

"ہاتھ پیر باندھ کر تہہ خانے میں پھکوا دیتے۔"

"میں نے یہی کیا ہے، وہ فرار میں مدد دینے کے عوض میرے پانچ ملازموں کو اپنے جسم کی رشوت کی پیش کش کر چکی ہے۔"

"اس کا یہی آخری ہتھیار رہ گیا تھا۔"

"وہ پچھلی رات سے اب تک میرے آدمیوں کے دماغ پر چھا چکی ہے، جب سے اسے تہہ خانے میں ڈالا ہے ہر شخص کو ذرا ذرا سی دیر میں وہاں کام یاد آ رہا ہے۔"

"اور اب مجھے وہاں بہت ضروری کام ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"حبیداللہ اس کے بارے میں کیا کہتا ہے؟"

"اس لڑکی سے بات کرنے کے بعد ہی کچھ بتاؤں گا۔"

"اس کی گمشدگی نے جیرالڈ کی کمر توڑ دی ہے!" وہ بولا۔

"حملوں میں کمی آ گئی ہوگی۔؟"

"حملے تو بالکل ختم ہو چکے ہیں اور جیرالڈ نے آج صبح صلح کا پیغام بھیجا ہے!"

"تو کیا یہ جگہ اس کی نظروں میں آ گئی ہے ۔۔؟"

"نہیں!" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "زیرِ زمین دنیا میں بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہمیں بھی جانتے ہیں اس نے ایسے ہی ایک شخص کی خدمات حاصل کی ہیں۔"

"مبارک ہو، یہ تو بہت اچھی بات ہے!"

"صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے اس نے مجھے آج رات مضافاتی علاقے میں بلایا ہے میرے نہ جانے کی صورت میں صبح سے حملے پہلے سے زیادہ شدت سے شروع کر دیئے جائیں گے۔"

"یہ تو صلح سے زیادہ بلیک میلنگ معلوم ہوتی ہے!"

"اب جو بھی ہو، ہم نے خونریزی رکوانے کے لئے اس سے ملنے کا فیصلہ کیا ہے!"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں یرغمالی بنا کر ایلیزا کی رہائی کا مطالبہ کرے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے بعد میں اغوا کرائے مگر مذاکرات کی دعوت دے کر دھوکا نہیں دے گا۔ یہ اس کی خوبی ہے!"

"تنہا جاؤ گے ۔۔؟"

"زیادہ بھیڑ بھاڑ سے معاملہ خراب ہی ہوتا ہے۔ اور تمہارا کھل کر سامنے آنا مناسب نہ ہوگا۔"

"اگر تمہیں اس پر اسی قدر اعتماد ہے تو ضرور جاؤ، میں یہاں اپنا کام ختم کر لوں گا۔"

یوسف نے میری شب گزاری کے لئے تہہ خانے میں ہی آرام دہ بستر وغیرہ بچھوا دیا اور پھر وہاں خورد و نوش کی بھی کافی اشیاء جمع کرا دیں جن کے بعد مجھے نیچے جانے کی اجازت مل گئی۔

تہہ خانے میں ناکافی روشنی ہونے کے باوجود ایلیزا نے دور ہی سے مجھے پہچان لیا۔ وہ گھاس کے پیال پر سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ اور ایک دیوار گیر کھونٹے کے ساتھ بندھی ہوئی ہتھکڑی کے باعث زیادہ دور تک آنے کے قابل نہیں تھی۔

"یہ مذاق کب ختم ہوگا؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے پیال سے اٹھ کر اکتائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ وہ خود کو بے خوف ظاہر کرنے کی کوشش میں خاصی کامیاب تھی۔

مویشیوں کے چارے سے دور اور ایلیزا سے محفوظ فاصلے پر میرا بے داغ بستر موجود تھا۔ میں نہایت سکون سے اس پر جا بیٹھا۔ "مذاق تو اب شروع ہوگا۔ تمہارے بدن کو گرم گرم سلاخوں سے داغا جائے گا اور پھر تم مجھے سسکا سسکا کر ہلاک کرو گی۔"

"میں نے تم سے سچ اگلوانے کے لئے خطرناک مذاق کیا تھا ورنہ مجھے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا تھا۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "جبھی مجھے ابی غیل کے خونخوار حواریوں کے نرغے میں لے گئی تھیں۔"

"وہ لوگ واقعی تمہاری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں، مگر میں تمہیں ہرگز ان کے حوالے نہ کرتی۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو ۔۔۔ اگر ابی غیل میرے ہاتھوں نہ مارا جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان بھیڑیوں سے نہیں بچا سکتی تھی۔"

"چلو جھوٹ ہی سہی مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"یعنی مجھے ہلاک نہیں کرو گی ۔۔" میں نے مضحکانہ لہجے میں کہا۔

"دراصل میں ایک ٹھوس نتیجے پر پہنچ چکی ہوں۔" وہ ہتھکڑی والے ہاتھ سے اپنا رخسار سہلاتے ہوئے بولی۔

"اس تہہ خانے کا آسیبی ماحول ہر قیدی کو چند ہی گھنٹوں میں ٹھوس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔" میرے تیور بدستور جارحانہ تھے۔

"میرے نزدیک اب ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہا۔ تم مجھے چارہ بنا کر اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے مذاق میں تھے۔ اور وہ مجھے داؤ پر لگا کر تمہیں پکڑنا چاہ رہے تھے۔ میرے لئے تم لوگوں کے جھگڑے میں پڑنا ہی حماقت تھی۔"

"جان بچانے کے لئے اچھی کہانی بنائی ہے!"

"میں موت سے نہیں ڈرتی۔" وہ بے باکی سے بولی۔ "میں نے اپنے باپ کی ظالمانہ پابندیوں کے باوجود اس عمر میں اس قدر عیش کئے ہیں کہ اب کوئی حسرت نہیں لیکن زندگی کو اگر تھوڑا سا طول مل سکے تو کیا بُرا ہے!"

"آزادی پانے کے بعد شاید تمہارے خیالات میں کوئی اور تبدیلی آ جائے۔"

"تم سے نفرت ہو جائے تو اور بات ہے مگر ان بھیڑیوں سے کبھی ہمدردی نہ ہو سکے گی۔" وہ حقارت سے بولی۔ "تم نے مجھ سے ناجائز فائدہ اٹھایا تو وقت آنے پر مجھے بھرپور تحفظ بھی فراہم کیا مگر وہ تو مجھے خطرات میں دھکیل کر یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ میں اپنے جسم کے سہارے تمہیں ہٹ کے کسی کمرے میں قید کر کے انہیں تحفے میں پیش کر دوں گی۔"

"میرے بارے میں اس وقت کیا رائے ہے تمہاری؟"

"دنیا کے تمام مردوں کی طرح تم بھی خود غرضی کا ایک شاہکار ہو۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔ "اور ہاں یہ بھی سن لو کہ مجھے ہلاک کر کے تم دوہرے قتل کے مرتکب ہو گے!"

"تمہیں مار کر تو میں نہ جانے کتنے دلوں کا خون کروں گا۔ تمہارے پانچ تازہ عاشق تو اسی چھت کے نیچے موجود ہیں ۔۔۔"

"میری ماں میری محتاج ہے۔" وہ میری بات پر توجہ دیئے بغیر بولی۔ "میری موت کے صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکے گی۔ میری زندگی کا کوئی موہوم سا مقصد جاننا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ میں اپنی ماں کی خدمت کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں ۔۔"

"میں جوناس ولا میں اس کا حشر بھی دیکھ چکا ہوں۔ تم لوگوں نے اسے ایک زندہ لاش بنایا ہوا ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے جیب سے ریوالور نکال کر اپنے سرہانے رکھ دیا۔

"اسے میرے باپ نے اپنی آزادی کی خاطر مسکن دواؤں کا عادی بنا لیا ہے۔" وہ اس وقت بالکل دوٹوک بات کرنے کے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ "ہوش میں رہتے ہوئے وہ اسے ہر غلط کام پر ٹوکتی تھی اور وہ میری ماں کے سامنے کسی خارش زدہ چوہے کی طرح سہما رہتا تھا مگر اسے خواب آور دواؤں کا عادی بنانے کے بعد وہ خود مختار ہو گیا تھا۔"

"بڑی عجیب سی بات ہے کہ خون آشام سرگرمیوں میں ملوث رہنے والا ایک شخص بیوی سے اتنا خوفزدہ رہتا ہے!"

وہ زہریلے انداز میں ہنس دی۔ "لکھ پتی عورتوں کے کنگال شوہر عموماً اسی طرح گزارا کرتے ہیں میرے باپ کے پاس جو کچھ تھا وہ میری ماں کے طفیل تھا۔"

"تو تمہارے باپ کے لکھ پتی ہونے کے افسانے جھوٹ تھے۔؟"

"وہ میری ماں کا ایک ادنیٰ کارکن تھا۔ میری ماں نے آرٹ کے لئے لندن میں کچھ کاروبار کیا ہوا تھا۔ مگر اس کی اصل آمدنی یورپ میں منشیات کی اسمگلنگ سے تھی۔ مادام لواری کا نام آج بھی پورے یورپ میں چلتا ہے مگر وہ خود بستر پہ بے کشش پڑی رہتی ہے!"

"تو تمہاری ماں اسمگلر ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی کہانی اتنی دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ کہ میں وقتی طور پر اپنی بازپرس کا اصل مقصد فراموش کر بیٹھا۔

"ہاں ۔۔۔ جوناس ولا کی شان و شوکت اسی کے دم سے ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "شادی کے بعد نام اسی کا چلتا رہا مگر ساری باگ ڈور عملاً عذرا کو سونپ دی گئی اور اس شخص نے اپنے مقاصد کے لئے میری ماں کو علاج کے بہانے خطرناک دواؤں کا عادی بنا دیا اور اب وہ مارفیا کے بغیر شاید چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔"

"اور مادام لواری کی اصلیت سے اب صرف تم واقف ہو؟"

"میں ہی نہیں کوئی اور بھی ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ "اور اب وہی مادام لواری کے نام کو زندہ رکھے گی۔"

"تو وہ بھی کوئی عورت ہے؟" ایلیزا کا ہر نیا انکشاف میری حیرت میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

"میری ماں کی نائب اپنی گناہ آلود زندگی سے تائب ہونے کے بعد مفلسی کے عالم میں مر گئی مگر اس نے اپنی بیٹی کو اپنا ماضی بتا دیا۔ اور آج میرے علاوہ وہ لڑکی بھی اس راز سے واقف ہے بلکہ وہ بھرپور طریقے پر منصوبہ سازی بھی کرتی رہی ہے، تم مجھے زندہ رکھو یا مار دو، مگر وہ لڑکی تمہیں دنیا کے کسی گوشے میں زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"یعنی وہ بھی میری راہ پر ہے؟"

"شادی کے بعد میری ماں نے پہلی بار عذرا اور ابراہام کی موت پر اس لڑکی سے فون پر بات کر کے اسے تمہارے بارے میں ہدایت دی تھی۔ اور یقین رکھو کہ وہ کبھی نہ کبھی تمہیں تلاش کر لے گی، تم اس قدر عیار اور مکار ہو کہ اسرائیلی ایجنٹ تو شاید تاقیامت تمہیں زیر نہ کر سکیں گے۔"

"نام کیا ہے اس لڑکی کا ۔۔؟"

"قانون سے ٹکرانے والوں کا کوئی نام نہیں ہوتا مسٹر صفدر!" وہ زہریلی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "ان کی ذات محض ایک خوف آور سایہ ہوتی ہے اور وہ سایہ ہر بار ایک نئے نام سے پہچانا جاتا ہے!"

"تو یہ تمہاری نئی دھمکی ہے ۔۔!"

"دھمکی نہیں ــــ میں حقائق بتا رہی ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "بلکہ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہئے کہ میں نے تمہیں ایک گمنام دشمن سے ہوشیار کر دیا ہے!"

"تو پھر میں تمہاری ماں سے اس لڑکی کا کھوج نکالوں گا!"

"پچھتے سر مار کر نقصان میں رہوگے، میری ماں کی زبان سے تم ایک لفظ بھی نہ اگلوا سکو گے۔ شوہر کی موت کی خبر پانے کے بعد اس کی آنکھوں میں قہر اور نفرت کا ایک ہولناک جہنم بھڑک اٹھا تھا اور جب ہرام کی موت کے بعد مجھے تمہاری تصاویر دکھائی گئیں اور میں نے تمہیں پہچان لیا تو اسی وقت میری ماں نے تم سے اپنی بیوگی کا انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سب کچھ جاننے کے باوجود اپنے شوہر کی سچی پرستار رہی کہ اس کی خاطر اپنا عظیم الشان ماضی فراموش کر کے بے کیف زندگی کو خوشی خوشی گلے لگا لیا۔"

"اور اگر میں تمہیں رہا کر دوں؟" میں نے اس کے الفاظ کی گہرائی پرکھنے کے لئے سوال کیا۔

"مجھے رہا کرو یا نہ کرو مادام بولری کے انتقام پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اسے تو شاید ابھی تک میرے اغوا کی خبر بھی نہ دی گئی ہوگی۔"

ایلیزا کی دو ٹوک بات مجھے بے حد پسند آئی اور میں نے فوری فیصلے کے تحت اٹھتے ہوئے کہا "میں تمہیں ضرور رہا کروں گا تاکہ تم اپنی آنکھوں سے اس بے نام سائے کا حشر دیکھ سکو!"

"تم میری ماں پر ہاتھ نہیں ڈالو گے۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"میں ہر قیمت پر اس لڑکی کا سراغ نکالوں گا ــــ اور اگر تم درمیان میں حائل ہوئیں تو میں نہایت بے رحمی سے تمہارے چیتھڑے اڑا دوں گا!" میں نے چابی لگا کر اس کی ہتھکڑی کھولتے ہوئے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

"وہ ایک تیر تھا جو کمان سے نکل چکا۔" وہ ہتھکڑی سے نجات پانے کے بعد بولی "میری ماں نے نہ اس لڑکی کو دیکھا ہے اور نہ اس کے ٹھکانے سے واقف ہے۔"

"یہ بکواس ہے!" میں نے اپنی جگہ پر لوٹتے ہوئے کہا۔

"یہ درست ہے، میری ماں فون پر اس کی آواز پہچانتی ہے اور اسے لڑکی کا ایک فون نمبر معلوم ہے جو وہ کسی قیمت پر تمہیں نہیں بتائے گی۔ مگر میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گی ــــ"

"اگر تم نے بچھو کی خصلت نہ دکھائی تو تم اور تمہاری ماں میری دسترس سے بچی رہے گی۔ اس لڑکی کا تو میں خود کھوج نکالوں گا۔"

"تو کیا میں جا سکتی ہوں؟" اس نے بے اعتباری سے سوال کیا۔

"ابھی تمہیں صرف ہتھکڑی سے رہائی ملی ہے، صبح کے اجالے میں جانے کی اجازت بھی مل جائے گی۔"

"تم دشمن ضرور ہو مگر بہت عظیم ہو!" وہ شکست خوردہ لہجے میں یہ کہتے ہوئے میرے بستر پر ہی آ بیٹھی اور پٹر یکس کی روشنی میں وہسکی کے دو گلاس بنانے لگی۔

"میرے الفاظ یاد رکھنا ایلیزا! اگر میری ذات کو تمہاری جانب سے کوئی خطرہ لاحق ہوا تو میں تمہاری زندگی عذاب بنا دوں گا۔"

"آج میں نے بھی تمہارے سامنے اپنے دل کا سارا غبار اگل دیا ہے۔" اس کا لہجہ بدلا ہوا اور نرم تھا۔ "میری ذات سے خطرہ تو دور کی بات ہے تم مشکل میں نظر آئے تو مجھے اپنا ہمدرد پاؤ گے!"

وہسکی کا پہلا پیگ اس نے بخوبی ہضم کر لیا۔ دوسرے پیگ کے بعد وہ بہکنے لگی۔ اور مجھ سے اپنے پرانے مراسم کی تجدید پر مائل ہونے لگی اور تیسرے پیگ نے اسے آزاد کلامی پر مجبور کر دیا۔

وہ میرے قریب بیٹھی بڑے انداز سے سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگا رہی تھی میرے سرہانے رکھا ہوا ریوالور اس کی رسائی میں تھا۔ اور اگر تحت الشعور میں میرے بارے میں ذرا بھی بدنیتی ہوتی تو وہ نشے کی حالت میں کسی بھی لمحے ریوالور اٹھا کر مجھ پر فائر کر سکتی تھی۔

اسے مزید موقع فراہم کرنے کے لئے میں پیشاب کے بہانے وہاں سے اٹھ گیا۔ واپس آیا تو وہ میرے بستر پر دراز ریوالور سے کھیل رہی تھی۔

"اسے رکھ دو ایلیزا!" میں نے دور ہی سے ہیجان آمیز لہجے میں اسے للکارا۔

"آج کی رات اسے کہیں دفن کر دو صفدر!" اس نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں یہ کہہ کر ریوالور بے اعتنائی سے ایک طرف ڈال دیا۔ "آج میں بہت خوش ہوں، ایسا نہ ہو کہ خوشی سے بے قابو ہو کر خودکشی کر بیٹھوں۔"

میں نے ریوالور اٹھا کر احتیاط سے گدے کے نیچے رکھ دیا۔ اس میں بھری ہوئی پلاسٹک کی نقلی اور بے ضرر گولیاں میرے منصوبے کے مطابق ایلیزا کی نیت کا امتحان لے چکی تھیں اور میں پوری بے خوفی کے ساتھ اسے آزاد کر سکتا تھا۔

اس لڑکی نے مجھے قید کرنے کی ایک ناکام کوشش کے علاوہ پیرس میں میرے قیام کے دوران میری بے انتہا مدد کی تھی۔ اور اگر اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی بے رحمانہ فیصلہ کیا جاتا تو شاید ضمیر کی خلش مجھے ہمیشہ پریشان رکھتی مگر میں نے اسے اپنی کسوٹی پر پرکھ کر بہترین فیصلہ کر لیا تھا۔ اور ایلیزا نے اپنی گفتگو سے خود میرے فیصلے کا بیشتر جواز فراہم کر دیا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی ماں کا ماضی میرے سامنے رکھ دیا تھا بلکہ مادام بولری کی جواں سال جانشین کے عزائم سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

مجھے وہ دن حیرت ناک واقعات کا محور محسوس ہو رہا تھا اس روز دوسرے واقعات کے علاوہ راڈرک کے فلیٹ میں شاہدہ سے اچانک ملاقات اور پھر ایلیزا کی طویل کہانی میں ناقابل یقین حد تک مماثلت موجود تھی۔

شاہدہ کا باپ اسمگلر تھا اور اس نے اپنی بیوی کو بہر دین کا عادی کر انجام کار قبر میں پہنچا دیا اور عذرا جونا نے بھی اپنی اسمگلر بیوی کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا میرے ذہن میں ایک ثانیے کے لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں

شاہدہ ہی مادام بولری کی پراسرار جانشین نہ ہو مگر دوسرے ہی لمحے یہ خیال از خود ہی ذہن سے تحلیل ہو گیا۔ کیونکہ شاہدہ کا نام عبدالعزیز کے حوالے سے سامنے آیا تھا اور وہ لڑکی کسی بھی زاویے سے مجرمانہ منصوبہ سازی کی اہل نظر نہیں آتی تھی!

تیسرے پیگ کے بعد ایلیزا کو واقعی گنتی بھی یاد نہ رہی اور وہ کیف و مستی کے عالم میں باآواز بلند سوچنے لگی۔ اس کے الفاظ آتشی لہروں میں ڈھل کر میرے اعصاب میں سرایت کرنے لگے اور میں نے نرمی کے ساتھ اسے وہ حیوانی آغوش فراہم کر دی جس کے تصور سے اس کے تپتے ہوئے بدن پر نشاط آمیز لرزہ طاری ہوا جا رہا تھا۔

رات کے دو بجے باتھ خانے کے دروازے پر تیز دستک کی وجہ سے میری نیند ٹوٹ گئی ایلیزا کمبلوں میں لپٹی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی میں نے اٹھ کر آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔

"میں نے تمہاری نیند خراب کر دی۔" وہ میری خمار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں دیکھ کر معذرت آمیز انداز میں بولا تو مجھے علم ہوا کہ آنے والا شخص یوسف تھا۔

"جیرالڈ سے مل کر آئے ہو؟" میں نے اس کے ہمراہ بستر کی طرف لوٹتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"وہ لڑکی کی واپسی کے عوض پانچ لاکھ فرانک کا تاوان دینے کو تیار ہے۔" یوسف نے دھیمی آواز میں کہا۔

"بے فکری سے بات کرو، وہ شراب میں نہا کر بے خبر سوئی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر تم اسے کیا جواب دے آئے؟"

"شروع میں میں لڑکی کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتا رہا مگر ہماری سرمئی سیڈان ہٹ کے قریب دیوار میں منڈلاتی دیکھ لی گئی تھی، میں اس سے مشورے کی مہلت لے کر آیا ہوں۔"

"میں اسے رہا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"پھر تاوان کی خطیر رقم کیوں چھوڑی جائے۔ تنظیم کے فنڈز میں یہ خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔"

"رقم کون دے رہا ہے؟"

"جیرالڈ کے پاس رقم سے بھرا ہوا بریف کیس موجود تھا۔"

"اور اگر اس نے کوئی شرارت کی؟"

"وہ وعدے کا پاس کرنے والا آدمی ہے۔" یوسف نے اپنے ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "وہ کہتا ہے کہ اسرائیلی جو چاہیں کرتے پھریں، اس کا کوئی آدمی ہمارے خلاف صف آرا نہیں ہوگا۔"

"اسے جواب کب دینا ہے؟"

"وہ صبح چار بجے تک میرا انتظار کرے گا۔"

"تو پھر لڑکی کو ساتھ ہی لے جاؤ اس نے اتنی شراب پی ہے کہ دن چڑھے تک سوتی ہی رہے گی۔" میں نے ایلیزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یوسف نے فوری طور پر دو آدمیوں کو طلب کیا جن کے شانوں سے لٹکتی ہوئی رائفلیں اور ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مسلح پہرے پر مامور تھے۔

ان دونوں کی ہی یہ کوشش تھی کہ ایلیزا کو کندھے پر لاد کر لے جایا جائے۔ ایلیزا کا چہرہ دیکھ کر ان کی نگاہوں میں ابھرنے والی چمک دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ ایلیزا دن میں ان پر بھی اپنی اداؤں کے ڈورے ڈالنے کی کوشش کر چکی تھی۔

یوسف کے حکم پر ایلیزا کو ایک کمبل پر لٹا کر ان دونوں نے کمبل کے گوشے تھامے اور پھر اسے عمارت کے باہر احاطے میں موجود کار کی عقبی نشست پر لٹا دیا گیا۔

"احتیاطاً محافظوں کو ساتھ لیتے جاؤ۔" میں نے یوسف کو تنہا جانے پر آمادہ پا کر کہا۔

"وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے!"

"جیراڈ جیسے آدمی پیسے کے معاملے میں بہت حریص ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اپنی ساکھ رکھنے کے لئے وہ تمہیں رقم دے دے مگر راستے میں اس کے آدمی تمہیں گھیر کر لوٹ لیں۔ پانچ لاکھ فرانک کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی" میں نے اسے سمجھایا۔

مجھے مُصر پا کر وہ دونوں محافظوں کو ساتھ لے گیا۔

اس سرد رات میں باہر کے مقابلے میں تہہ خانے کی فضا خاصی بہتر تھی۔ لہٰذا میں دوبارہ وہیں جا کر بستر میں گھس گیا۔ مگر میری نیند اڑ چکی تھی مجھے رہ رہ کر اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں جیراڈ ایلیزا کو حاصل کرنے کے بعد یوسف کے لئے دشواریاں کھڑی نہ کر دے۔

یوسف نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے میں ہو گی جب اس کا دیا ہوا وقت گزر گیا تو بے چینی کے باعث میرے لئے بستر پہ پڑے رہنا دشوار ہو گیا۔

میں نے وہسکی کا ایک ڈبل پیگ اپنے معدے میں انڈیلا اور اوپر ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

باہر کی فضا پر جاڑوں کی اندھیری رات کا پُر ہول سکوت چھایا ہوا تھا جسے وقفے وقفے سے مویشیوں کی آوازیں مجروح کر رہی تھیں اور پھر آخر کار میرے کان بہت دور کسی کار کے انجن کی ہموار گونج سننے میں کامیاب ہو گئے۔

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو وہاں سوا پانچ بج رہے تھے یعنی یوسف کی واپسی ایک گھنٹے کے بجائے تین گھنٹے میں ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب آنے والی کار احاطے میں داخل ہوئی اور اس کے ہیڈ لیمپس بجھائے گئے تو میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ وہ ایک جیپ تھی۔ میرے اعصاب پر یک بیک تناؤ طاری ہو گیا مگر جب اس میں سے یوسف اور اس کے محافظ برآمد ہوتے نظر آئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

یوسف نے اندر آ کر جھکے ہوئے انداز میں ایک وزنی چرمی بیگ میرے سامنے ڈال دیا۔

"کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟" میں نے بیگ کھول کر اس میں بھرے ہوئے نوٹوں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"جیراڈ کی روایتی صاف گوئی نے موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا ورنہ اس وقت میری لاش کسی ویرانے میں پڑی ہوتی۔" یوسف نے کہا۔

"واقعی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ رقم ایک اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ کے ذریعے جیراڈ کو ملی تھی اور مجھے پیغام بھیجے جانے کے بعد جیراڈ کو لالچ دیا گیا تھا کہ ایلیزا کو حاصل کرنے کے بعد اگر وہ مجھے اس ایجنٹ کے حوالے کر دے تو ساری رقم اسے دے دی جائے گی۔" یوسف معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہو گا۔"

"معاملہ سیدھا ہی ثابت ہوا۔" یوسف ہنس کر بولا۔ "تم جیراڈ کی خوبیوں سے واقف نہیں ہو۔ اس نے ہمارے ہاتھوں بھاری نقصان اٹھائے مگر اس معاملے میں کی گئی پیشکش کو صاف ٹھکرا دیا۔ پھر اس سے کہا گیا کہ اس کے ٹھکانے سے مجھے رقم سمیت نکلنے دیا جائے مگر راستے میں اس کے آدمیوں کی مدد سے پکڑ لیا جائے۔ جیراڈ نے سختی سے کہہ دیا کہ معاہدہ کی کارروائی پوری ہونے کے بعد اس کا کوئی آدمی میرے خلاف نہیں جائے گا اس کے بعد اسرائیلی ایجنٹوں نے جیراڈ کے ٹھکانے سے نکاسی کے تینوں راستوں پر کڑی ناکہ بندی کر دی اور جب میں پہلی بار وہاں گیا تو شاید قریب سے نگرانی کر کے میری کار کا ماڈل اور نمبر وغیرہ نوٹ کر لیا گیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر میں دوسری بار ادھر آیا تو معاہدے کے مطابق ایلیزا میرے ساتھ ہو گی وہ کسر چکر میں مجھے پکڑنے کے لئے انہوں نے جیراڈ کے ٹھکانے سے دور دیران علاقوں میں مورچے بنائے تھے مگر جیراڈ نے مجھے ان کی طرف سے نہ صرف ہوشیار کر دیا۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ پہلی بار اس نے اپنی زبان اس لئے بند رکھی تھی۔ کہ کہیں میں خوفزدہ ہو کر واپسی کا ارادہ ہی ترک نہ کر دوں۔"

"پھر تو وہ واقعی شاندار آدمی ہے!"

"ہاں! اگر وہ مجھے رقم دینے کے بعد محض اپنی زبان بند رکھتا تو اس پر کوئی حرف گیری نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے آدمیوں کا ضرور ذمہ دار ہے مگر کسی تیسرے فریق کو روکنا اس کا کام نہیں ہے اس کا تو خیال تھا کہ اگر ایلیزا پچھلی نشست پر سونے کے بجائے بیٹھی ہوتی تو شاید وہ لوگ مجھے جیراڈ کے ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی روک لیتے اور پھر جیراڈ سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کر ڈالتے۔" یوسف جیراڈ کے اصولوں سے بڑا متاثر نظر آ رہا تھا۔

"پھر تم یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"جیراڈ کے مشورے کے مطابق اپنی کار اس کے ٹھکانے سے دو بلاک آگے چھوڑ دی اور پھر کچے راستوں سے اندھیرے میں گرتے پڑتے پیدل شہر پہنچے جہاں ایک دوست کو سوتے میں جگا کر یہاں تک لانا پڑا۔" اس نے بتایا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ طویل انتظار کے بعد جب ان پر حقیقت منکشف ہو گی تو اپنے بال نوچتے رہ جائیں گے۔"

"بس کار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" وہ الماری سے اپنے لئے برانڈی کی بوتل نکالتے ہوئے بولا۔ "وہ میرا سراغ نکالنے کے لئے کار کی نگرانی کریں گے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ کار کے لالچ میں میرا کوئی آدمی یا ٹھکانا ان کی نگاہوں میں آ جائے!"

"رجسٹریشن پلیٹ سے بھی وہ بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں!"

"وہ کار میں نے کباڑی سے خریدی تھی اور اس کی نمبر پلیٹ جعلی تھی۔" وہ اپنی چالاکی پر قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ "چھاپے کے کاموں میں اگر ہم لوگ ان باتوں کا خیال نہ رکھیں تو دشمنوں سے پہلے ہی مقامی قانون کی بے رحم گرفت میں آ جائیں۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"لمبی تان کر بے فکری سے سوؤں گا۔"

"پھر میں تمہاری نیند خراب نہیں کروں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے صبح ضروری کام پہ روانہ ہونا ہے!"

"واپسی کب تک ہو گی؟"

"مشکل ہے، میں اب فرانس سے نکلنے کے چکر میں ہوں۔"

وہ مجھ سے نہایت گرمجوشی سے رخصت ہو گیا۔

صبح نو بجے تک میں نے باڑے میں صحت مند مویشیوں کے درمیان گھوم کر اپنا وقت گزارا اور پھر وہاں سے شہر روانہ ہو گیا۔

عبدالعزیز کی تلاش میں مجھے دوپہر ہو گئی چوتھے ٹھکانے پر آخر کار وہ مل ہی گیا۔

"رات تم کہاں تھے؟" اس نے رسمی گفتگو ختم ہوتے ہی بے تابی سے سوال کیا۔

"یوسف کے فارم پر تھا!"

"پھر تو تمہیں معلوم ہو گا کہ رات وہاں کیا ہوا تھا؟" اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ جیراڈ سے بات کرنے گیا تھا۔ اور پانچ لاکھ فرانک کے عوض ایلیزا کو اس کے حوالے کر آیا۔"

"وہ تمہارے سامنے واپس آیا تھا؟"

"ہاں ہاں" میں نے حیرت سے کہا۔ "تم اس کے بارے میں اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"آج صبح سویرے شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں ایک کار بری طرح جلتی ہوئی پائی گئی تھی مجھے خبر ملی ہے کہ وہ یوسف کی کار تھی۔"

"شاید انہوں نے جھلاہٹ میں خالی کار کو ہی آگ لگا دی ہو گی۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے یوسف کی کامیابی کی کہانی سنا دی۔

"تو تم نے اس لڑکی کو زندہ ہی چھوڑ دیا!" میرے خاموش ہونے پر وہ بولا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ لبنان میں زیادہ مناسب رہتی۔"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔" میں نے قدرے سختی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "عبداللہ نے مجھے فیصلے کا اختیار دے دیا تھا۔"

"اوہ! میں تنقید نہیں کر رہا تھا — تمہارے فیصلوں کا تو ہم سب ہی احترام کرتے ہیں!" وہ بوکھلا کر بولا۔

"میں تم سے شاہدہ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

"اس سے ملنے کے بعد تم ہم لوگوں سے لاتعلق ہو جاؤ گے۔ اور لیبیا کے لئے روانگی میں وہ تمہاری رہنمائی کرے گی۔"

"وہ ہے کون؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ پیشہ ور کارکن ہے کبھی کبھار ہمارے لئے بھی کام کرتی رہتی ہے۔"

"تمہارے نزدیک وہ قابلِ اعتماد ہے؟"

"قابلِ اعتماد نہ ہوتی تو تمہارے ساتھ نہ لگائی جاتی۔ بس اس کے ہمراہ منشیات سے بچ کر رہنا وہ ہر ایک کو بہت جلدی دھندے سے لگا دیتی ہے۔"

"ان دنوں وہ اور کہاں کام کر رہی ہے؟"

"میرے کارندی — ایک ڈرگ ریکٹ اسے کیریئر کے طور پر استعمال کرتا ہے مہینے میں ایک دو بار وہ منشیات لے کر وہ باہر جاتی رہتی ہے تم اس کے بارے میں اتنا کیوں کرید رہے ہو؟"

"وہ منشیات والوں کے کس گروہ کے لئے کام کرتی ہے؟"

"یورپ میں نشہ آور ادویات کی تجارت پر عملاً ایک ہی گروپ کی اجارہ داری ہے۔ چھوٹی موٹی پارٹیاں بھی اپنا منگوایا ہوا مال اسی کو دے دیتی ہیں۔"

"اور وہ مادام لواری کا گروپ ہے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے کہاں سنا اس کے بارے میں؟" میرے منہ سے مادام لواری کا ذکر سن کر وہ بھونچکا رہ گیا۔

"اس عورت کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"اس کے آدمی خود اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو میں کیسے بتا سکوں گا۔"

"یہ نام کب سے سننے میں آرہا ہے؟"

"مجھے تو خود فرانس آئے چھ سال ہوئے ہیں۔ ویسے سنا ہے کہ مادام لواری دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہی میدان میں کودی تھی۔"

میں خاموش رہ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ مگر عبدالعزیز مجھ سے کچھ پوچھنے کے لئے بے چین تھا۔ اور آخر کار وہ بول ہی پڑا: "شاہدہ سے تم مادام لواری تک کیسے پہنچ گئے۔؟"

"مادام لواری کو میرا سر مطلوب ہے!"

"نہیں!" وہ بے اعتباری کے عالم میں بولا: "اسے تم سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے!"

"ہو ہی گئی ہے اور کسی کو میری تلاش پر بھی لگا دیا گیا ہے۔"

"اوہ خدا ۔۔۔" وہ حیرت سے بولا: "کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ شاید مادام لواری کے اشارے پر ہم لوگوں میں گھسی ہے!"

"مجھے یہی شبہ ہے اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ اسے کس کے ایما پر میرے ساتھ لگایا گیا ہے!" میرا لہجہ کافی سنجیدہ تھا۔

عبدالعزیز کا چہرہ پھیکا پڑ گیا: "اگر تمہیں اس پر شبہ ہو گیا ہے تو آج اس سے ملاقات منسوخ کر دو میں کوئی دوسرا انتظام کر دوں گا۔"

"اب تو میں اس لڑکی سے ضرور ملوں گا۔ مگر ملنے سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسے کس بنا پر میرے معاملے میں اعتماد میں لیا گیا ہے؟"

"وہ ابھی تک تمہاری اصلیت سے واقف نہیں ہے۔" عبدالعزیز کا لہجہ مدافعانہ تھا: "میں نے صبح ہی تمہارے کاغذات اسے پہنچائے ہیں جن میں تمہارا نام پیٹر سائمن درج ہے اور اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں جانتی کہ تم کو طرابلس پہنچانا ہے!"

"تمہارے درمیان میں ہونے کے باعث وہ یہ بھی جانتی ہے کہ میرا تعلق افواجِ آزادیٔ فلسطین سے ہے اور پھر وہ پیغام لے کر راڈرک کے پاس گئی تھی جو فرینڈز آف فلسطین کا سرگرم رکن ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ جان چکی ہے!" عبدالعزیز کا مدافعانہ رویہ میرے شبہات کو تقویت پہنچا رہا تھا: "مجھے یہ بتاؤ کہ میرے لئے اس کا نام کس نے تجویز کیا تھا اور نام تجویز کرنے والا میرے بارے میں کیا جانتا تھا؟"

"شاہدہ کا نام علی نقی نے تجویز کیا تھا۔" وہ اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"وہ کون ہے؟" میں نے آنکھوں پر پٹی رکھ کر سخت لہجے میں سوال کیا۔

"پیرس میں ساوک کا چیف ایجنٹ ہے جو شاہِ ایران کی ذاتی خفیہ فورس ہے!" عبدالعزیز کی پیشانی پر سخت سردی کے باوجود پسینے کے قطرات چمکنے لگے: "میں نے اس سے سرسری طور پر ذکر کیا تھا۔ کہ مجھے ایک اہم مشن کے لئے کسی کی خدمات درکار ہیں تو اس نے شاہدہ کا نام تجویز کیا جو میں نے اس لئے قبول کر لیا کہ وہ پہلے بھی ہمارے لئے کام کرتی رہی تھی!"

"علی نقی کیسے کردار کا آدمی ہے؟"

"خاصا بدنام ہے!" عبدالعزیز نے مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

"مادام لواری سے اس کا کوئی تعلق ہے؟"

"مجھ سے زبردست چوک ہوئی ہے، زبردست چوک ہوئی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں پھٹ پڑا: "وہ مادام لواری کا مال سفارتی سہولتوں کی آڑ میں درآمد کرتا ہے جس سے اسے بھاری مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے مگر میں حلف اٹھا سکتا ہوں کہ میں نے علی نقی کو تمہارے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے عبدالعزیز کہ تم نے ایک بہت غلط کام کیا ہے۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا: "کاش کہ میرے اندیشے غلط ہوں۔ میں ابھی اور اسی وقت علی نقی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مگر مجھے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے اندیشے کیا ہیں؟" وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔

میں چند ثانیوں تک ترحم آمیز نظروں سے اس کے عرق آلود چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر پرسکون لہجے میں بولا: "مجھے اپنے گرد بہت تنگ گھیرا محسوس ہو رہا ہے۔ میرے سفری کاغذات تازہ تصویر سمیت شاہدہ تک پہنچ چکے ہیں۔ بن حیان کے قتل کے بعد زیرِ زمین دنیا میں اسرائیل سے ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کو یہ معلوم ہے کہ میں پیرس میں موجود ہوں۔ مادام لواری کی ایک رکن علی نقی کے ذریعے تمہارے گروپ میں محض اس لئے گھسائی گئی ہوگی تاکہ وہ قریب رہ کر میرا سراغ نکال سکے۔ مگر یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔ تم نے اسے براہِ راست میرے ساتھ ملوث کر دیا۔ اور دوسری طرف اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ بھی یہاں موجود ہیں۔ لواری جانتی ہے کہ وہ بھی میرے لہو کے پیاسے ہیں لہٰذا وہ شاہدہ سے ملنے والی معلومات انہیں بڑھا دے گی۔ اور مجھے تو چھوڑو اگر علی نقی بدنیتی پر اتر آیا تو وہ چند سکوں کے عوض تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اسرائیلیوں کے ہاتھوں کٹوا دے گی۔۔۔؟"

"میری نظر اتنی گہرائی تک نہیں پہنچی تھی۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا: "تمہارے لئے اب بھی وقت ہے، میں شاہدہ سے تمہارے کاغذات لے آتا ہوں، تم فوراً کار سے روانہ ہو جاؤ اور پیرس سے دور نکلنے کے بعد پہلی پرواز سے فرانس سے بھی نکل جاؤ۔"

"میرے لئے اس وقت علی نقی زیادہ اہم ہے، میں اسی وقت اسے پکڑنا چاہتا ہوں۔ میرے فرار کی راہ تو ہر وقت کھلی رہے گی۔" میری دانست میں عبدالعزیز کی واحد غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنی عقل کے بجائے علی نقی کے مشورے پر انحصار کیا تھا۔

وہ اپنی کوتاہی پر اس قدر شرمسار تھا کہ مزید کچھ کہے بغیر میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور چند ثانیوں بعد ہم اپنے اپنے خیالات میں کھوئے علی نقی کی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔

"مجھے اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ اسرائیلی سیکرٹ سروس کے علاوہ مادام لواری سے بھی تمہاری ٹھن گئی ہے تو علی نقی کو ہرگز اعتماد میں نہ لیتا۔" کافی دیر تک خاموشی سے سفر کرنے کے بعد عبدالعزیز نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

"مادام لواری مارفیا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا تمام وقت بستر پر گزرتا ہے مگر اس کا شوہر میری وجہ سے مارا گیا اور اب وہ میری دشمن ہو گئی۔ یہ خبر مجھے کل رات ہی ملی تھی۔" میں نے اس کا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنے کے لیے نرم لہجے میں کہا۔

"تم بتا رہے ہو کہ وہ اس قدر بے بسی کی زندگی گزار رہی ہے مگر منشیات کی دنیا میں اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔" عبدالعزیز نے حیرت سے کہا۔

"مادام لواری اب صرف ایک نام ہے جسے اس کا شوہر استعمال کر رہا تھا۔ شوہر کی موت کے بعد ایک ایسی لڑکی رکیٹ کی سربراہی کر رہی ہے جس سے اصلی مادام لواری خود بھی واقف نہیں ہے۔ صرف اس کا ایک فون نمبر جانتی ہے۔" میں نے ایلیزا سے ملی ہوئی معلومات اس تک پہنچا دیں۔

"یہ سب عبداللہ کے علم میں ہے؟"

"میں تمہیں اسی لیے ساری باتیں سنا رہا ہوں کہ تم اسے بتا سکو۔ مجھے تو شاید جانے سے پہلے اس سے ملنے کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

"اب تم علی نقی کے پاس کیوں جا رہے ہو؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں خود کہاں تک ملوث ہے اور شاہدہ کا نام اس نے کس کے ایما پر تجویز کیا تھا؟"

"وہ بہت خود سر اور بے رحم آدمی ہے۔ آسانی سے راہ پر نہ آئے گا۔"

"اس کا مجھے اندازہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ مادام لواری کی جانشین نے علی نقی کا انتخاب محض اس وجہ سے کیا کہ اس کے فلسطینیوں سے روابط ہیں۔ اسے براہِ راست یہی ہدایت ملی ہوگی کہ تمہاری صفوں میں گھس کر صفدر علی کا سراغ لگاتے مگر مقدر نے اسے ایک موقع فراہم کر دیا اور اس نے شاہدہ کو تم سے ملوا دیا۔ شاہدہ کا نام تجویز کرنے کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری تلاش کے بارے میں مادام لواری کی ہدایات شاہدہ نے ہی علی نقی تک پہنچائی ہوں مگر ان سوالات کے واضح جوابات وہ خبیث خود ہی دے گا۔"

"ایسا نہ ہو کہ اس معاملے کی وجہ سے ساوک سے بھی ہماری محاذ آرائی شروع ہو جائے۔" اس کا لہجہ تشویش آمیز تھا۔

"تو اس وقت ساوک سے تمہاری تنظیم کے کیسے مراسم ہیں؟"

"بظاہر ساوک ہمارے اور اسرائیلیوں کے معاملے میں قطعی غیر جانبدار ہے مگر ایران واحد مسلم ملک ہے جس کے اسرائیل سے دوستانہ سفارتی تعلقات ہیں۔ اگر ہم نے انہیں کوئی بہانہ فراہم کر دیا تو وہ سارے وسائل کے ساتھ ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔"

"ساوک کے معاملے میں تمہارے بڑوں کی پالیسی کیا ہے؟"

"سوتے ہوئے آدم خور شیر کے دہانے میں ہاتھ نہ ڈالا جائے۔" وہ مرعوب لہجے میں بولا: "ساوک بہت منظم ہے۔ ان کے پاس سرمائے و وسائل اور افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں اور وہ جدید ترین خطوط پر کام کرنے کے عادی ہیں۔ اگر ہماری ان سے ٹھن گئی تو اسرائیل کا مقابلہ تو دور کی بات ہے۔ ہمارا دفاع تک مشکل ہو جائے گا۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے میری بریفنگ کر دی۔" میں طویل سانس لے کر بولا: "تم فکر نہ کرو میں علی نقی کا معاملہ بگڑنے نہیں دوں گا۔"

"وہاں جانے کے بعد بگاڑ تو لازمی ہے۔ وہ شرافت سے تمہاری کوئی بات نہیں سنے گا۔" وہ بار بار اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کر رہا تھا۔

"وہ فرانس میں ساوک کا چیف ایجنٹ ضرور ہے مگر میرے بھی اپنے حربے ہیں۔ اگر وہ تعاون پر آمادہ نہ ہوا تو اس کی لاش کا بھی سراغ نہ مل سکے گا۔"

"تم اسے ختم کر دو گے؟" میرے عزائم کا تذکرہ سن کر عبدالعزیز سہما جا رہا تھا۔

"صرف اسی طرح ساوک اور پی ایل او کے تعلقات خراب کیے بغیر میں موجودہ گتھی کو سلجھا سکتا ہوں۔"

میرے جواب پر عبدالعزیز نے یوں تھوک نگلا جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو مگر اس نے مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"تم کچھ پریشان ہو گئے ہو۔" میں نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اسے ٹوکا۔

"علی نقی پیرس میں شاہانہ ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ اس کی حویلی میں ملازمین اور محافظوں کی ایک پوری فوج موجود ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ اس کے استقبالیہ ہال میں جا بجا خفیہ کیمرے نصب ہیں جو اس کے پاس جانے والے ہر ملاقاتی کی پوری فلم بناتے ہیں اور علی نقی کا سیکورٹی کمانڈر ہر فلم خود دیکھتا ہے۔" اس نے کہا۔

"یعنی اس کی کچھار میں ہم بے بس ہوں گے؟"

"وہاں اس سے الجھ کر ہم نہ صرف نقصان میں رہیں گے بلکہ رازداری بھی برقرار نہ رہ سکے گی۔" عبدالعزیز نے کھل کر اپنے خدشے

کا اظہار کر ڈالا۔

"تو اسے باہر بلالو۔"

"فون پر گفتگو کی تو ٹیپ کیے جانے کا خدشہ ہے۔ ایک بار اس نے خود بتایا تھا کہ وہ ہر فون ٹیپ کرتا ہے اور چوبیس گھنٹے بعد غیر ضروری ٹیپ ضائع کر دیے جاتے ہیں۔"

"ایسے انتظامات تو شاید فرانس کے ایوانِ صدارت میں بھی نہ ہوں گے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ بہت سے سربراہانِ مملکت سے زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی بلٹ پروف رولس رائس میں بھی بے شمار شعبدے نصب ہیں۔"

"اس کے باوجود وہ منشیات کی اسمگلنگ جیسا گھناؤنا کام کرتا ہے۔"

"وہ تمام آسائشیں تو اسے ساوک کے چیف ایجنٹ کے طور پر سرکاری خرچ پر ملی ہوئی ہیں اور غیر قانونی دھندوں کے ذریعے وہ ذاتی بینک بیلنس بڑھا رہا ہے۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کار سڑک کے کنارے روک دی اور عبدالعزیز سے پوچھا۔ "تم اس سے عموماً کہاں ملتے ہو؟"

"وہ ہر شام چند مخصوص ہوٹلوں میں ضرور جاتا ہے۔"

"تو پھر ہم شام ہونے کا انتظار کریں گے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ بہت مناسب فیصلہ ہے۔" عبدالعزیز میری بات سن کر خوش ہو گیا۔

"مگر یہ وقت برباد کرنے کے بجائے میں دور سے علی نقی کی رہائش گاہ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔" میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس وقت شام کے چار بجے تھے مگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے فضا میں گرد آلود دھند لکا پھیلا ہوا تھا اور سرد ہواؤں میں بھی قدرے شدت پیدا ہو گئی تھی جس کے باعث ٹریفک میں تو شاید کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی مگر پیدل چلنے والے خال خال ہی نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری کار ایک نہایت نفیس رہائشی علاقے میں داخل ہوئی جہاں ہر مکان بلا مبالغہ کئی ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔

"اس وقت ہم پرشین پیلس کی فصیل کے قریب ہیں۔" تھوڑی دیر بعد عبدالعزیز نے داہنی جانب کچھ فاصلے پر نظر آنے والی بلند دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کار کی رفتار قدرے کم کر دی تاکہ اس پرشکوہ عمارت کا تفصیلی جائزہ لے سکوں۔

شاہراہ کی جانب احاطے کی وہ دیوار بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ دیوار کی بلندی کم از کم دس فٹ تھی اور اس پر سبز سنگِ مرمر کی چمکتی ہوئی بڑی بڑی سلیں نصب تھیں۔ اس دیوار کے ساتھ والی فٹ پاتھ پر بھی شاید پرشین پیلس کے مکینوں نے اپنے خرچ سے عمدہ ٹائل لگوائے ہوئے تھے تاکہ عمارت کے حسن کو چار چاند لگ سکیں۔ فٹ پاتھ کے سرے پر سفید گملوں کی قطار سجی ہوئی تھی جس میں رنگ برنگے پھول بہار دکھا رہے تھے۔

سبز پتھر کی دس فٹ بلند دیواروں پر مزید چار پانچ فٹ بلند الومینیم کا جنگلہ نصب تھا جو بڑی فن کاری کے ساتھ بنایا گیا تھا اور پھر ہماری کار اس دیوار کے وسط میں نصب دیو ہیکل پھاٹک کے سامنے سے گزری۔ پھاٹک پر پیتل کی دمکتی ہوئی چادروں پر ابھرا ہوا ایران کا شاہی نشان نصب تھا اور پھاٹک کے ایک ستون کی جگہ سائرس اعظم کا پندرہ سولہ فٹ بلند پتھر کا مجسمہ ایستادہ تھا۔

"علی نقی اس محل میں رہتا ہے؟" میں نے حیرت کے ساتھ عبدالعزیز سے سوال کیا۔

عبدالعزیز نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ احاطے پر لگے ہوئے الومینیم کے جنگلے میں ہر وقت برقی رو دوڑتی رہتی ہے تاکہ کوئی دیوار پھاند کر اندر داخل نہ ہو سکے۔ پرشین پیلس کے بارے میں سفارتی حلقوں میں بھی پراسرار کہانیاں گشت کرتی رہتی ہیں مگر حقائق بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

"اس رازداری کی کیا ضرورت ہے؟"

"بظاہر تو ساوک شاہ ایران کی خفیہ پولیس فورس ہے مگر شاہ کے مخالفین کا دعویٰ ہے کہ ساوک شاہ کے مخالفین کو اغوا کر کے ہلاک کر دیتی ہے۔ وہ اسے خونی بھیڑیوں کا غول قرار دیتے ہیں۔"

"اتنے سنگین الزام کی کوئی بنیاد تو ہو گی؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ شاہ کے ہوتے ہوئے ساوک کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں کی جا سکتی مگر وہ شاہ کے ان سینکڑوں مخالفین کا حوالہ ضرور دیتے ہیں جو اچانک غائب ہو جاتے ہیں اور ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سیاسی مخالفوں کی گمشدگیوں کا یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور آج تک ان میں سے کسی کی لاش بھی نہیں مل سکی ہے۔"

"ایران ہمارے گہرے دوستوں میں شامل ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ان قصوں میں کوئی صداقت بھی ہو گی۔"

"یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں اور ان کا تعلق ایران سے

نہیں بلکہ ساوک سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ الزامات سرے سے ہی بے بنیاد ہوں مگر سرکاری طور پر کبھی بھی ساوک پر عاید کیے جانے والے الزامات کی تردید نہیں کی گئی۔"

اس اثنا میں ہماری کار پرشین پیلس سے آگے نکل چکی تھی اور مجھے یہ اندازہ قائم کر کے شدید کوفت ہوئی تھی کہ ساوک کے چیف ایجنٹ علی نقی کی رہائش گاہ پر چیدری چھپے [illegible] گھسنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

عبدالعزیز کی زبان سے ساوک کے مقامی چیف ایجنٹ کا نام سننے کے بعد میں سمجھا تھا کہ وہ کوئی زیادہ غیر معمولی شخص نہ ہو گا اور میں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس کی زبان سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوا سکوں گا مگر بعد میں سامنے آنے والی صورتِ حال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ علی نقی کسی بھی طرح بن حیان سے کم نہیں تھا اور غالب امکان یہ نظر آ رہا تھا کہ علی نقی سے الجھنے کے بعد میرے لیے فرانس سے فوری نکاسی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائیگا۔

پرشین پیلس سے واپسی کے دوران میں نے اس بارے میں ہر پہلو پر غور کیا اور آخر کار اسی نتیجہ پر پہنچا کہ فوری طور پر مجھے علی نقی کو بھول جانا چاہیے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق شاہدہ سے مل کر فرانس سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اور شاید عبدالعزیز بھی اس وقت ان ہی خطوط پر سوچ رہا تھا کیونکہ طویل خاموشی کے بعد اس نے پرخیال لہجے میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ تم علی نقی کو بھول کر فرانس سے نکلنے پر اپنی توجہ مرکوز کرو!"

"نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہی صورت زیادہ مناسب بھی ہے مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔" میں نے اس کی رائے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟"

"اگر تم نے میری سفری دستاویزات تیار کرا ہی لی تھیں تو پھر شاہدہ یا کسی اور کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس کا صحیح علم تو مجھے بھی نہیں ہے مگر یہ پیچیدہ طریقہ کار شاید تمہیں خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔"

"فرضی نام سے رازدارانہ طریقے پر سفر کرنے میں کون سا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا؟"

"بن حیان کا قتل ایسا معاملہ نہیں تھا جسے اسرائیل فراموش کر سکیں۔ پیرس کے علاوہ مضافات میں بھی تمہاری تلاش کی مہم جاری ہے۔ شاید ہائی کمان ہمیں تمہاری روانگی کے معاملے سے اس لیے لاتعلق رکھنا چاہتی تھی کہ بعد میں اگر ہم میں سے کوئی اسرائیلیوں کے ہاتھ لگ بھی جائے تو انہیں تمہاری اگلی منزل کا علم نہ ہو سکے۔"

"میری اگلی منزل تو ایک کھلا ہوا راز ہے۔ ظاہر ہے کہ میں لیبیا کے علاوہ کہاں جا سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"میں اپنی تنظیم کے طریقہ کار سے بخوبی واقف ہوں۔" عبدالعزیز بتانے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں براہ راست لیبیا کے بجائے کہیں اور ہی پہنچایا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیوی بھی اس وقت تک اس نامعلوم مقام پر منتقل کی جا چکی ہو۔"

"مگر پہلے تو تم نے بتایا تھا کہ شاہدہ لیبیا جانے کے معاملے میں میری رہنمائی کرے گی؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تمام حالات میں ہم لوگ صرف احکام کی تکمیل کرتے ہیں۔" وہ خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اس وقت تک تم نے شاہدہ یا علی نقی کے بارے میں اپنے شبہات کا اظہار نہیں کیا تھا لہٰذا میں نے اپنی ذاتی رائے کے اظہار سے گریز کرتے ہوئے تم سے وہی کچھ کہا جس کے لیے مجھے ہدایات ملی تھیں مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور میں کھل کر بات کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہاری نئی منزل کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے۔"

"پھر تو اب تک شاہدہ کو میرے بارے میں ہدایات مل چکی ہوں گی؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس کا انحصار روانگی کے پروگرام پر ہی ہو سکتا ہے۔"

"ایسی صورت میں شاہدہ کے بغیر میں ایک قدم نہیں بڑھا سکتا۔" میں نے کہا۔ "پتہ نہیں میری بیوی اس وقت کہاں ہے اور اگر میں شاہدہ کو چھوڑ کر براہِ راست طرابلس ہی نکل جاؤں تو میں وہاں کس سے اور کس حیثیت میں ملوں گا۔ یہ شاہدہ تو میرے لیے گلے کی ہڈی بن گئی ہے۔"

"ہاں۔ اگر تم روانگی میں تاخیر نہیں چاہتے تو پھر اس لڑکی سے ملنا ہی پڑے گا۔" عبدالعزیز نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"تم متضاد باتیں کر رہے ہو عبدالعزیز!" میں نے سخت نادیبی لہجے میں کہا۔

"نہیں، نہیں۔" وہ بوکھلا کر بولا۔ "بخدا میں پوری نیک نیتی کے ساتھ تمہیں اس الجھن سے نکالنا چاہتا ہوں جو میں نے خود پیدا کی ہے۔"

"علی نقی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے تم نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں شاہدہ کے بغیر خاموشی سے فرانس سے نکل جاؤں اور تھوڑی دیر پہلے بھی تم نے علی نقی کو بھول کر فرانس سے نکلنے کا مشورہ دیا تھا مگر اب اچانک ہی تمہیں شاہدہ کی اہمیت کا احساس ہونے

لگتا ہے۔"

"پہلا مشورہ تو شاید میری اضطراری حماقت تھی۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "شاہدہ کے بغیر تم فرانس سے نکلنے تو صحیح لوگوں میں پہنچنے کے باوجود اپنی شناخت نہ کرا سکو گے البتہ یہ مزید کہوں گا کہ اس وقت علی نقی کو بھول ہی جاؤ۔ مجھ سے ایک خطرناک غلطی ہوئی تھی اور وہ ہو گئی۔ میں دامن بچا کر کسی بھی وقت اس سے اپنا حساب برابر کروں گا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ میں عبداللہ سے کوئی خطرے کر براہِ راست طرابلس ہی چلا جاؤں اور تم اپنے اوپر والوں کو نئے پروگرام سے باخبر کر دو؟"

"طرابلس میں عبداللہ کے ہی نہیں میرے بھی کئی دوست ہیں اور وہ سب تمہارے بہترین میزبان ثابت ہوں گے مگر تنظیم کے معاملات میں میری یا عبداللہ کی کوئی بھی تحریر بے اثر ہو گی لیبیا والے براہِ راست بیروت کے مرکز سے ہدایات حاصل کرتے ہیں اور تمہیں اس وقت تک فرانس ہی میں رکنا ہو گا۔ جب تک بیروت تمہارے نئے پروگرام کی منظوری نہ دیدے۔"

"اب تم سب کچھ بھول جاؤ۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم نے شاہدہ کو میرا رہنما مقرر کیا ہے بعد میں اسی کی ہدایات پر عمل کروں گا۔"

"میں نے بیروت کو شاہدہ کے بارے میں اطلاع دیدی تھی اور اب اسے وہیں سے احکام ملیں گے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"براہِ راست؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ تو ناممکن ہے۔ عارضی کارندوں کو کسی درمیانی رابطے کے ذریعے احکام ملتے ہیں مگر یہ یقینی بات ہے کہ ایسے رابطے عام طور پر ہمارے لیے بھی اجنبی ہی ہوتے ہیں۔" کچھ دیر کے سکوت کے بعد عبدالعزیز نے شرمسار لہجے میں کہا۔ "اگر شاہدہ کی وجہ سے تم کو کوئی نقصان پہنچا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کر سکوں گا۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "جو کچھ ہوا اس میں تمہاری بدبختی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اب آگے میرے مقدر کی بات ہے۔"

"میں عبداللہ کے سامنے اپنا سر بھی نہ اٹھا سکوں گا۔ اس نے تمہارے بارے میں مجھے خاص طور پر محتاط رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی تھی۔"

"تم عبداللہ یا کسی اور سے ان تمام باتوں کا ذکر نہیں کرو گے۔" میں نے سختی سے کہا۔ "اور میں بھی اس بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔"

"میں کسی بھی قیمت پر جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بس میری اور اپنی ملاقات کا ذکر ہی نہ کرنا۔" میں نے کہا اور وہ تشکر آمیز انداز میں سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔

شہر کے بارونق علاقہ میں پہنچ کر میں نے کار چھوڑ دی عبدالعزیز نہایت گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہوا مگر اس کا ہر ندامت کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔

عبدالعزیز کی روانگی کے بعد میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور چند منٹ میں ہوسٹلری ڈی الفانسو جا پہنچا جس کے کمرہ نمبر چودہ میں شاہدہ مقیم تھی۔

ہوسٹلری ڈی الفانسو صاف ستھرا اور وسیع اقامتی ہوٹل تھا اور شاید کسی قدامت پرست مقامی کی ملکیت تھا کیونکہ ہوٹل کے نام سے کر معلوماتی کتبوں تک ہر جگہ صرف فرنچ ہی نظر آ رہی تھی اور جب میں نے استقبالیہ کاؤنٹر پر کمرہ نمبر چودہ کے بارے میں معلوم کیا تو وہاں بیٹھی ہوئی لڑکی بے بسی سے مسکرا کر رہ گئی۔

پھر اس نے شانے اچکا کر فرنچ میں کچھ کہا جس کے جواب میں میں انگریزی ہی بولتا رہا۔

چند فقروں کے تبادلے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کی مجبوری کے قائل ہو گئے۔ میں تو اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا مگر وہ شاید چودہ نمبر سمجھ گئی اور اس نے اشارے سے مجھے ایک طرف چلے جانے کا مشورہ دے ڈالا۔

اندر سے اس ہوٹل کی عمارت خاصی کشادہ اور خوشنما تھی وسط میں بے حد خوبصورت لان تھا جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں جدھر سے داخل ہوا ادھر سے نمبروں کی ترتیب شروع ہوئی تھی۔ خاصی دور گزرنے کے بعد میں نے کمرہ نمبر بارہ دیکھا اور پھر اس سے ملحق دروازے پر چودہ نمبر دیکھ کر چونک پڑا۔

میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر بارہ نمبر کو بغور دیکھا اور یقین کرنا پڑا کہ وہاں تیرہ نمبر کمرے کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔

میں نے چودہ نمبر پر ہلکی سی دستک دی اور فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا۔ ادھ کھلے پٹ کے پیچھے شاہدہ کا حسین چہرہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا مگر وہ شاید مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی ہے تم کو؟" میں نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ سوال کیا۔ اس سے بات کرنے کے لیے میں نے اردو ہی کا انتخاب کیا تھا اور اس وقت پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ اردو زبان میں مخاطب کے لیے آپ اور تم کے الفاظ موجود ہونے کے باعث بے تکلفی کا فوری اظہار ممکن تھا جبکہ

انگریزی زبان اس سعادت سے محروم تھی۔ انگریزی میں بے تکلفی ظاہر کرنے کے لیے الفاظ کے ساتھ ہی دیگر حرکات بھی لازمی تھیں جو مخاطب پر مدعا واضح کر سکیں۔

"تت... تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" اس نے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے حیرت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"جذبہ صادق ہو تو آدمی ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "کیا مجھے اندر آنے کو نہ کہو گی؟"

"شاید تم کل کے واقعے پر معذرت کرنے آئے ہو؟" اس نے عجلت آمیز اور بھونڈے طریقے پر کہا۔ "میں اس تلخی کو فراموش کر چکی ہوں۔"

میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ مجھے صرف ڈان فرنانڈو کے طور پر ہی جانتی تھی اور اسے یہ علم نہیں تھا کہ پہلے روز اس نے ایک خط کے ذریعے جس شخص کو ملاقات کا پیغام دیا تھا وہ میں خود ہی تھا۔

"میں تم سے تفصیلی گفتگو کرنے آیا ہوں۔" میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میں اس وقت مصروف ہوں، تم کل شام کو آ سکتے ہو۔" مجھے ٹلتے نہ دیکھ کر اس نے خشک لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"گھر بلا کر مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک تو کوئی بھی تہذیب نہیں سکھاتی مس شاہدہ!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

میرے جواب پر وہ الجھن میں پڑ گئی۔ "میں نے تمہیں کب بلایا تھا؟"

"تو پھر راڈک کو وہ بند لفافہ دے کر تم نے مذاق کیا تھا؟"

"اوہ خدا۔ تو تم ہی وہ آدمی ہو؟" وہ تحیر آمیز لہجے میں بولی۔ اور دروازہ کھول کر اس نے مجھے تقریباً اندر گھسیٹ لیا۔ "میں تمہارا ہی تو انتظار کر رہی تھی۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔" میں نے کمرے میں داخل ہو کر ایک کرسی پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ جیمس بائرن نامی کوئی شخص پیغام کے نتیجے میں مجھ تک پہنچے گا اور ایک کوڈ بتائے گا۔"

"اور تم کوڈ سنے بغیر مجھے واپس کر رہی تھیں۔"

"نام کے بعد ہی کوڈ کی نوبت آتی۔" وہ جھینپتے ہوئے انداز میں ہنس کر بولی۔ "میں تو تمہیں ڈان فرنانڈو کے نام سے جانتی ہوں۔"

"کیا میرے سفری کاغذات پر کوئی تصویر نہیں ہے؟"

"تصویر تو اب لگائی ہو گی۔" اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نے ابھی تک کوڈ نہیں دہرایا ہے۔"

"تم نے راڈک کو وہ لفافہ کیا کہہ کر دیا تھا؟" میں نے مقررہ کوڈ دہرانے کے بعد اس سے سوال کیا۔

"اسے وہ لفافہ عقاب کو دینا تھا۔"

"خوشی کی بات ہے کہ میرے لیے عقاب کا خطاب چنا گیا۔" میں نے کمرے کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے بالکل صحیح نشانے پر غوطہ لگایا ہے۔"

وہ دلفریب انداز میں مسکرا دی۔ "بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شکاری نشانے کے دھوکے میں خود جال میں آ پھنستا ہے۔"

اس کا ذومعنی جواب سن کر میری چھٹی حس بھڑکی مگر میں نے بظاہر پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔ "اس وقت معاملہ چھری اور خربوزہ کا ہے جو بھی چاہے کہو حقیقت میں کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہو گا۔"

"یہ ڈبل بیڈ کمرہ ضرور ہے مگر یہاں تم میرے سرپرست کی صورت میں رہو گے۔" وہ تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو الگ کمرہ ہی کیا برا تھا۔" میں نے کہا اور پھر چونک کر سوال کیا۔ "باہر مجھے تیرہ نمبر کی تختی کہیں نظر نہیں آئی؟"

"یہی ہوٹل نہیں، تمہیں بہت سی جگہ تیرھواں کمرہ یا تیرھویں منزل نہیں ملے گی۔"

"اس کی وجہ؟"

"تیرہ نمبر کی نحوست!"

"نمبر نہ ڈالنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہارا کمرہ ترتیب میں تیرھویں نمبر پر ہے۔ تم اس پر کوئی بھی نمبر ڈالو اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔"

"یہ انگریز کا پھیلا ہوا توہم ہے اور اس کے اثرات تمہیں پورے یورپ میں ملیں گے لہٰذا اس بارے میں سوچ کر اپنا دماغ خراب نہ کرو۔"

"میرے بارے میں کیا پروگرام ہے؟" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ابھی تک کوئی پروگرام موصول نہیں ہوا۔ کوئی پیغام آنے تک تم میرے ساتھ جیمس بائرن بن کر رہو گے۔ تمہیں حرکات سکنات کے ذریعے خود پر بزرگی طاری کرنی ہو گی تاکہ لوگ تمہیں میرے سرپرست کے طور پر قبول کر سکیں۔"

"سرپرستی میرے بس کی بات نہیں۔" میں نے موضوع کو غیر محسوس طریقے پر تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کام کسی چچا سی کے لیے زیادہ مناسب ہوتا۔"

میری بات پر شاہدہ کے چہرے پر کوئی تبدیلی رونما نہ

ہوئی اور اس نے قدرے حیرت سے پوچھا "چرس کا بھلا سرپرستی سے کیا واسطہ؟"

"چرس پینے کے بعد آدمی پر جو قنوطیت طاری ہوتی ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تم جیسی دس بارہ منہ زور لڑکیوں کا سرپرست ہے۔"

میری بات پر اس نے زور سے قہقہہ لگایا "اگر یہی بات ہے تو فکر نہ کرو۔ میں تمہارے لیے چرس کا بندوبست بھی کردوں گی۔"

"یہ شوق بھی کرتی ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"کبھی کبھی۔ ویسے میرا اصل دھندا ہی منشیات فروشی ہے جس میں چرس سرفہرست ہے۔ تمہیں اتنا تو راڈرک نے ہی بتادیا ہوگا۔"

"تمہارے معاملے میں وہ میرا رقیب بن گیا ہے۔" میں نے کہا "مجھے حیرت ہے کہ تم جیسی خوبصورت اور صاف ستھری لڑکی ایسے کاموں میں ملوث ہے۔"

"طبیعت مائل ہو تو عصمت فروشی بھی کرلیتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر لاپرواہی سے کہا "چاہو تو کبھی گاہک بن کر بھی مل سکتے ہو۔"

"تمہاری زبان سے یہ باتیں زہر لگ رہی ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ تمہاری مادری زبان بول رہی ہوں۔ نام بھی شاہدہ ہے اور پھر میرا باپ ایک پاکستانی تھا۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "اگر یہ تینوں باتیں یکجا نہ ہوتیں تو شاید تم خود میرے امیدوار بن جاتے۔"

"کبھی پاکستان گئی ہو؟"

"اکثر جاتی رہتی ہوں۔"

"وہاں جانے کے بعد کبھی شرم محسوس کی؟"

"ہمیشہ ہی اپنے اوپر شرم آئی۔" وہ بولی "وہاں ایسی ایسی عورتوں سے ملاقات ہوئی جن کے سامنے میں خود کو طفلِ مکتب محسوس کرتی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ گزارا کرنے کے لیے ایسے موضوعات سے گریز ہی کرنا پڑے گا۔" میں نے شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"ناصحانہ گفتگو تم ہی نے شروع کی تھی۔" وہ اپنے ریشمیں بالوں کو شانوں پر جھٹک کر بولی "مجھے تو نصیحتوں سے چڑ ہوتی ہے۔"

"کوشش کروں گا کہ آئندہ تمہیں نہ چڑایا جائے۔"

"یہ تو بتاؤ کہ تمہارا سامان کہاں ہے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"مجھے صرف یہاں پہنچنے کی ہدایت ملی تھی اور ویسے بھی میرا سامان تن کے کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔" میں نے اس پر اپنی بے خبری جتانے کے لیے کہا۔

"مگر مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگلی ہدایات تک تم میرے ساتھ رہوگے۔" اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہارے ساتھ کیوں لگایا گیا ہے؟"

"اس بارے میں تمہیں زیادہ معلومات ہونی چاہئیں۔ مجھے تو بس تمہاری خبرگیری کرنی ہے اور شاید تمہارے ساتھ فرانس سے باہر بھی جانا پڑے۔"

"یعنی ہم دونوں ہی کسی اور کے احکام پر عمل کررہے ہیں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے اتنا احمق نہ سمجھو۔" وہ اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے بولی "اگر تم انجان بن کر میرا امتحان لینا چاہ رہے ہو تو دوسری بات ہے۔"

"جسے تمہارا امتحان لینا تھا لے چکا۔ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"تمہارے لیے جمیس کے علاوہ میرا اور کوئی نام نہیں ہے۔"

"اگر تم راڈرک کے فلیٹ پر نہ ملے ہوتے تو ضرور مان لیتی۔ وہاں تم ڈان فرنانڈو بنے ہوئے تھے۔ میں تمہارا اصل نام پوچھ رہی ہوں۔"

"ڈان فرنانڈو میں کیا خرابی ہے۔"

"تم بہت اچھی اردو بولتے ہو اور لہجہ بھی اجنبی نہیں ہے میری دانست میں تو تمہارا اصلی نام مشرقی طرز کا ہی ہونا چاہیے۔"

"جو نام دینا چاہو گی اپنالوں گا۔"

"تمہارے خدوخال بھی جنوب مشرقی ایشیا کے باشندوں جیسے ہیں۔"

"حالانکہ میں نے خواب میں بھی ایشیا نہیں دیکھا۔" میں نے قہقہہ مار کر کہا۔

"پھر تم نے اتنی اچھی اردو کہاں سے سیکھ لی؟" وہ میرے ماضی کے بارے میں گمشدہ کڑیاں تلاش کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"شاید تم کبھی برمنگھم نہیں گئیں۔ وہاں اردو کے باقاعدہ مشاعرے ہوتے ہیں۔"

"برمنگھم تو ایشیائی تارکینِ وطن کا گڑھ ہے۔ اگر تم ایشیا سے تعلق نہیں رکھتے تو پھر برمنگھم میں کیا کرتے ہو؟"

"پہلے تو جو کرتا تھا سو کرتا تھا مگر تمہاری جرح کے بعد جھک مارا کروں گا۔" میں نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں تمہیں میرے ماضی سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے؟"

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "اصل قصور میری ماں کا تھا۔ اگر وہ اسپین یا یورپ کے کسی ملک کے بھنگی سے بھی شادی کرلیتی تو کم ازکم میں اپنے خاندان کو تو تلاش کرلیتی مگر اب میں بالکل یک و تنہا رہ گئی ہوں۔ میرے باپ کی موت کے بعد اس کے رشتہ داروں نے اس کی جائیداد خرد برد کردی اور اپنا آبائی شہر چھوڑ کر انسانوں کے سمندر میں کہیں گم ہوگئے۔ نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ تمہارے ذریعے میں اپنے باپ کے خاندان کا پتہ چلالوں گی۔ اگر تم ناراض ہوتے ہو تو میں آئندہ تم سے ایسی باتیں نہیں کروں گی۔ شاید غلاظت کے انبار میں زندگی گزارنا ہی میرا مقدر قرار دیا جاچکا ہے۔"

"کس غلاظت کی بات کررہی ہو؟" میں نے اس کے آنسوؤں کا زیادہ اثر لیے بغیر حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"منشیات کی اسمگلنگ اور عصمت فروشی کو غلاظت نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔" اس کی بھوری آنکھوں میں لرزتی ہوئی نمی قطروں کی صورت میں اس کے شہابی رخساروں پر ڈھلک آئی۔

"مگر یہ تو تمہارے شوق ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس کی آنکھوں میں غصہ سمٹ آیا اور وہ کچھ کہے بغیر چند ثانیوں تک مجھے گھورتی رہی اس کے بعد رومال سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔

شاہدہ کے بارے میں میرے ذہن میں یہ بات اچھی طرح جاگزیں ہوچکی تھی کہ وہ ایلیزا کی ماں یعنی مادام بولری کی ممکنہ جانشین تھی اور اس کی جانب سے انتقام پر مامور کی گئی مگر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شاہدہ کو صفدر علی کی تلاش تھی جب کہ میں ڈان فرنانڈو تھا۔ ایلیزا نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کی ماں اپنی نئی جانشین سے محض ایک فون نمبر کے حوالے سے متعارف تھی لہٰذا مادام بولری یا مسز عذرا جوناس کے ذریعے میری مکمل تفصیلات کی منتقلی بھی خاصی دشوار تھی اور اسی وجہ سے شاہدہ میرے بارے میں اپنے شبہات کی توثیق کرنے کی سرتوڑ کوشش کررہی تھی۔

مگر اس نے پُر اعتماد گفتگو کے بعد جس غیر متوقع انداز میں آنسوؤں کے روایتی نسوانی حربے کا سہارا لیا اس کے باعث شاہدہ کے بارے میں میرے شبہات خاصے کمزور پڑنے لگے۔ ایک ایسی عورت جو ذرا سی بات پر رونے لگے، کسی بہت بڑے اور منظم گروہ کی سربراہی کے قابل نہیں ہوسکتی تھی۔

اس کے بارے میں یہ بات تو طے شدہ تھی کہ وہ عام طور سے مادام بولری کے گروہ کے لیے کام کرتی تھی اور شاید علی نقی کے ذریعے محض صفدر علی کا سراغ نکالنے کے لیے فلسطینیوں کے ایک گروپ میں پہنچائی گئی تھی۔ اگر یہ مفروضہ درست تھا تو شاہدہ میرے بارے میں بلکہ صفدر علی کے بارے میں معلومات حاصل کرکے کسی اور کو بڑھا دیتی اور اس کی روشنی میں مادام بولری کی جانشین اپنی پرانی مالکن کا انتقام لینے کے قابل ہوجاتی۔

اگر شاہدہ محض ایک درمیانی رکن تھی تو میں اس سے خاصی بے فکری سے دوستی بڑھا سکتا تھا اور شاید میں اسکی زبان سے حقائق اگلوانے میں کامیاب بھی ہوجاتا۔

اس کے بارے میں میں جس قدر غور کرتا رہا اسی قدر یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا کہ شاہدہ میری اصل دشمن نہیں تھی بلکہ دشمن کی آلۂ کار تھی اور میں کچھ محنت کرکے اس کی ہمدردیوں کا صحیح سراغ حاصل کرسکتا تھا۔

گفتگو کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تلخی کو دور کرنے کیلئے میں نے کمرے میں ہی شراب طلب کرلی۔ ابتدا میں وہ برہمی کا اظہار کرتی رہی مگر تھوڑی سی کوشش کے بعد میرے ساتھ شریک ہوگئی۔ اس وقت وہ ایک جلد باز اور جذباتی لڑکی جیسی حرکات کررہی تھی جو ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے اور پھر خود ہی ہر بات فراموش کردیتی ہے۔

رات کا کھانا ہم دونوں نے الفانسو کے ڈائننگ ہال میں ہی کھایا۔ اس وقت تک شاہدہ پچھلی تلخی کو بالکل فراموش کرچکی تھی۔

"کل تم نے راڈرک کے فلیٹ سے مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کیوں کردیا تھا؟" کھانے کے دوران اس نے خوش مزاجی کے ساتھ سوال کیا۔

"لڑکیوں کے بارے میں وہ نرا احمق اور جلد باز ہے۔ اگر میں اس وقت احتیاط کا مظاہرہ نہ کرتا تو وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے ناراض ہوجاتا۔"

"میرے چلے آنے کے بعد تو تم سے خوب لڑا ہوگا؟"

"میرے مصالحانہ رویے نے اسے نادم کردیا تھا۔"

"عجیب آدمی ہے۔ عبدالعزیز سے اس کے کیسے مراسم ہیں؟" اس نے سرسری انداز میں بڑا نازک سوال کرڈالا۔

"عبدالعزیز؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ کون ہے؟ نام سے تو پاکستانی لگتا ہے۔"

وہ تلے ہوتے گوشت کا پارچہ توڑتے توڑتے رُک کر میری طرف دیکھنے لگی "کیا واقعی یہ نام تمہارے لیے نامانوس ہے؟"

"پہلی بار سُن رہا ہوں۔ ویسے بھی راڈرک کے دوستوں سے میری قطعی شناسائی نہیں ہے۔" میں نے لاپرواہانہ لہجے میں کہا۔

"کمال ہے۔" وہ شانے اچکا کر تحیر آمیز لہجے میں بولی۔ "حالانکہ عبدالعزیز کی ہدایت پر ہی میں نے تم سے رابطہ قائم کیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"ایک فلسطینی ہے۔ بہت ملنسار اور صلح جو طبیعت کا مالک ہے اور شاید کسی فلسطینی گروپ کے لیے کام کرتا ہے۔"

"فلسطینیوں سے میں عموماً دور ہی رہتا ہوں۔"

"یہ میرے لیے حیرت کی بات ہے۔" وہ بولی۔ "اگر میں تمہاری بات درست مان لوں تو پھر اس بات کا کیا جواز ہوگا کہ تم عبدالعزیز کا بھیجا ہوا پیغام ملتے ہی اس پر عمل کر بیٹھے؟"

"بات عبدالعزیز کی نہیں تھی۔ مجھے اس پیغام کا انتظار تھا جو عقاب کے حوالے سے مجھ تک پہنچایا جاتا، اب یہ اتفاق ہے کہ یہ پیغام تمہارے بارے میں تھا۔"

"اتنے اتفاقات کا یکجا ہونا بہت مشکل ہے۔" وہ اشتباہ آمیز لہجے میں بولی۔ "یہ اتفاق ہے کہ عبدالعزیز فلسطینی ہے اور یہ بھی شاید اتفاق ہی ہے کہ تمہارا دوست راڈرک فرینڈز آف فلسطین کا نہایت پُرجوش رُکن ہے۔ آخر تم مجھ سے اس قدر رازداری کیوں برت رہے ہو جبکہ ہم ایک ہی کشتی کے مسافر بن چکے ہیں۔"

میرے مدافعانہ رویّے کی وجہ سے شاہدہ مجھے گھیرتی جا رہی تھی۔ لہٰذا اسے خاموش کرنے کے لیے میں نے اپنی گفتگو کا انداز بدل ڈالا۔ "ہماری کشتیاں مختلف ہیں شاہدہ! تم اس بارے میں زیادہ دماغ سوزی نہ کرو۔"

"میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"کچھ لوگ تمہارے تجربے کو میرے لیے ڈھال بنانا چاہتے ہیں اس سے زیادہ جان کر تم کیا کرو گی؟"

"تم کس تجربے کی بات کر رہے ہو؟"

"مادام بواری!" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں محض وہ نام دہرانے پر ہی اکتفا کیا مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شاہدہ کے سکون میں قطعی فرق نہیں آیا۔

"شاید تم منشیات کے کاروبار کا حوالہ دینا چاہتے ہو۔" اس نے میری طرف جھک کر مدھم لہجے میں کہا۔ "یہ گفتگو ہم کمرے میں ہی کریں تو بہتر ہوگا۔"

کھانے کا اختتام خاموشی کے ساتھ ہوا۔ میرے ساتھ ہی شاہدہ بھی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

"مادام بواری کے نام سے تم نے منشیات کے کاروبار پر کیوں چھلانگ لگا دی؟" کھانے کے بعد کمرے میں پہنچ کر میں نے سوال کرنے میں پہل کر دی۔

"یورپ میں یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔" وہ لبِ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم کچھ اور کہنا چاہ رہے تھے؟"

"میں فرانس سے پہلی بار منشیات باہر لے جا رہا ہوں اور تم منزلِ مقصود تک مجھے تحفظ فراہم کرو گی۔" میں نے کہا۔

"یہ میں مان ہی نہیں سکتی۔"

"اس ہٹ دھرمی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

"جس کام میں فلسطینی ملوث ہوں وہ قتل سے دہشت گردی تک کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر منشیات سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "ان کے پاس مالی وسائل کی بہتات ہے اور وہ منشیات کی تجارت سے یوں بھاگتے ہیں جیسے یہ طاعون کا پھیلاؤ ہو۔"

"فلسطینیوں کا حوالہ تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔ میں دوسرے لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

"پھر اپنا منصوبہ ترک کر دو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "تم ہیروئن سے چرس تک جو کچھ بھی لے جا رہے ہو وہ میں اسی وقت تمہارے منہ مانگے داموں پر خریدنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مادام بواری نے تمہیں اتنے اختیارات دیتے ہوئے ہیں؟"

"وہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔"

"اور اگر میں کہوں کہ تم خود بھی مادام بواری ہو سکتی ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا اور وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "صرف کہنے سے بات نہیں بنتی اگر تم مارکیٹ میں مجھے کا درجہ دلا دو تو میں تمہارے ساتھ برابری کی شراکت کے لیے تیار ہوں۔"

"سارا قصہ دراصل یہی ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "کچھ لوگ مارکیٹ سے مادام بواری کے نام کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ احمقوں کی جنّت میں رہتے ہیں۔" شاہدہ مضحکانہ لہجے میں بولی۔ "مادام بواری محض ایک نام نہیں بلکہ حقیقت ہے۔"

"وہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سرگرم ہوئی تھی۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اب تک اگر وہ مر چکی ہو تو کسی محتاج خانے میں معذوروں کی سی زندگی گزار رہی ہوگی۔ مگر اس کے پرانے رفقا اس کے نام اور پرانی ساکھ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"تم نے اپنے بارے میں کچھ بتانے کے بجائے مجھے ایک نئی بحث میں الجھا دیا۔" وہ قدرے اُکتاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہم ایک دوسرے کے بارے میں تجسّس کے بجائے اپنے کام سے کام رکھیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔" میں نے سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔

"چلو اور کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ مگر یہ تو مان لو کہ تم میری آڑ میں منشیات نہیں لے جا رہے۔"

"تم خود بہت زیادہ نشہ آور ہو۔ اگر نارکوٹک کنٹرول والے غور سے تمہاری آنکھوں میں جھانک لیں تو تمہارے ہی ساتھ ہمراہی کے جرم میں مجھے بھی اندر کر دیں گے۔"

اور یوں گفتگو کا رُخ بدل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ شاہدہ مادام بواری کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اسے مادام بواری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا یا پھر وہ بہت کچھ جانتی تھی۔

وہ رات میں نے شاہدہ کے ہمراہ الفانسو کے اسی کمرے میں بسر کی۔ میں نے اس سے نجی زندگی کے بارے میں کئی مرتبہ بات چھیڑنے کی کوشش کی مگر شاہدہ اپنے باپ یا اپنے ماضی کے بارے میں بات کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔

ہم دونوں گہری نیند سوتے ہوتے تھے کہ دروازے پر دستک سن کر میں ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ مجھ سے پہلے شاہدہ کی آنکھ کھل چکی تھی اور وہ دروازے پر جانے سے قبل شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہن رہی تھی۔

"کون آیا ہے؟" میں نے خوابگاہ میں پھیلی ہوئی ناکافی روشنی میں پلکیں جھپکاتے ہوئے شاہدہ سے سوال کیا۔

"پتہ نہیں! ابھی دیکھتی ہوں۔" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ آنے والا بلاوجہ نہیں آیا ہوگا۔"

اگر وہ خود ہی دلیری کے مظاہرے پر تُلی ہوئی تھی تو مجھے پیش قدمی کی کیا ضرورت تھی۔ میں چوکنّا ہو کر بستر پر دراز رہا اور وہ گاؤن کی ڈوری کستی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

آنے والا کوئی مرد تھا کیونکہ دروازہ کھلنے کے بعد مجھے مردانہ آواز سنائی دی تھی۔ پھر اس ڈبل روم سے ملحق مختصر سی نشست گاہ سے شاہدہ نے مجھے آواز دی۔

میں چند ثانیوں بعد وہاں پہنچا تو عبدالعزیز کو وہاں دیکھ کر حیرانی ضرور ہوئی مگر میں نے اپنے تاثرات پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی۔ دوسری طرف شاہدہ غور سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

عبدالعزیز کو غیر متوقع طور پر وہاں موجود دیکھ کر میں سخت الجھن میں پڑ گیا۔ اس سے پیشتر میں شاہدہ کے سامنے عبدالعزیز سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کر چکا تھا مگر اب وہ خود ہی میرے پاس آ پہنچا تھا۔

"یہ کون ہے؟ میں اسے نہیں جانتا۔" میں نے شاہدہ سے انگریزی میں کہا۔

"مگر میں تم سے واقف ہوں۔" عبدالعزیز شاہدہ سے پہلے بول پڑا۔ "اور ایک ضروری کام سے ایسے نامناسب وقت پر یہاں آیا ہوں۔"

"کیا کام ہے؟" میں نے عبدالعزیز کو گھورتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"اپنی بات سنانے کے لیے مجھے تخلیہ درکار ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے شاہدہ کی طرف دیکھا اور وہ جلدی سے بولی۔ "یہ وہی عبدالعزیز ہے جس کے بارے میں میں تم سے دریافت کر رہی تھی۔"

"اوہ۔ پھر تو تم میرے دوستوں میں ہو۔" میں نے بڑھ کر تپاک سے ہاتھ بڑھایا اور عبدالعزیز نے نہایت پُرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کر ڈالا۔

"اس وقت صرف بار روم کھلا ہوگا۔" شاہدہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "اور مجھے وہاں جانے کے لیے لباس اور حلیہ درست کرنا ہوگا۔"

"تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، میں جمیس کو باہر لے جاؤں گا۔" عبدالعزیز نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

شاہدہ کا فراہم کیا ہوا شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے میں مجھے بمشکل چند منٹ صرف ہوئے اور میں عبدالعزیز کے ساتھ کمرے سے باہر راہداری میں آ گیا۔

"کیا چکر ہے؟" راہداری کا خاصہ حصہ خاموشی سے طے کرنے کے بعد میں نے تجسّس آمیز لہجے میں عبدالعزیز سے سوال کیا۔

"اب تم یہاں واپس نہیں آؤ گے۔"

"پھر میری روانگی کا کیا ہوگا؟"

"ابھی باہر نکل کر پوری بات بتاؤں گا۔"

باہر کُہر آلود ماحول میں سردی اپنے عروج پر تھی۔ مجھے اپنے جسم پر اوور کوٹ کی موجودگی کے باوجود یخ بستہ ہوائیں اپنی

ہڈیوں میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ عبدالعزیز نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا تو ڈیش بورڈ سے گرم ہوا کی آمد کا احساس ہوا شاید اس کی کار کا ہیٹر پہلے سے ہی آن تھا۔

"اب تم کل اکیلے یہاں سے جاؤ گے۔" عبدالعزیز نے اپنی کار پارکنگ لاٹ سے نکالتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

"یہ تبدیلی کیسے ہو گئی؟"

"مجھے اپنے بڑوں سے بات کرنے کا موقع مل گیا اور میں نے تمہارے معاملے میں کی جانے والی ساری کارروائی بلاکم و کاست انہیں شادی اور تمہارے شبہات سے بھی باخبر کر دیا۔" وہ اداس لہجے میں بتانے لگا۔ "اور انہوں نے تمہارے شبہات پر صاد کرتے ہوئے مجھے فوری طور پر حکم دیا کہ تمہیں شاہدہ سے بچایا جائے۔"

"مگر میرے کاغذات وغیرہ تو اسی کے پاس ہیں۔"

"ہوا کریں وہ جعلی اور نامکمل تھے۔ آج دوپہر تک تمہیں نئے کاغذات مل جائیں گے۔"

"مگر میں کدھر کا رُخ کروں گا؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ تمہارے کاغذات لانے والا بقیہ ہدایات بھی پہنچائے گا۔"

"تو کیا وہ تمہارا آدمی نہیں ہو گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔" میں نے اس کے لہجے میں چھپی ہوئی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہارے معاملے میں غفلت برتنے پر مجھے دو ماہ کے لیے جبری رخصت دے دی گئی ہے۔" وہ غمگین لہجے میں بولا۔ "تم تک پیغام پہنچانا میری آخری سرکاری ذمہ داری تھی اور اب میں دو ماہ کے لیے بالکل بے کار ہوں۔"

"یہ بہت برا ہوا.....!"

"جو ہوا ہے وہ ٹھیک ہی ہوا ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اب کم از کم میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہ ہو گی۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگا۔ "میں نو برس کی عمر سے تنظیم سے وابستہ ہوں اور بائیس سال کی مدت میں یہ پہلا موقع آیا ہے کہ میرے بارے میں کوئی تادیبی کارروائی کی گئی ہے مگر اس کی ساری ذمہ داری میری اپنی ہے۔ میں تو اس سے بھی بدتر سزا کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔"

"تم جو چاہو کہو مگر میری دانست میں یہ بہت برا ہوا ہے؟"

"پی ایل تمہیں ایک نجی گیسٹ ہاؤس میں ... تمہارے جملہ اخراجات پیشگی ادا کیے جا چکے ہیں۔" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"اور اگر میں تمہارے ساتھ رہنا چاہوں؟"

"میں معذرت کر لوں گا۔ دو ماہ کے لیے میں بالکل ... بنا دیا گیا ہوں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ عرصہ کس طرح گزار سکوں گا۔"

"میرے ساتھ چلو۔"

"تم ایک باقاعدہ مشن پر ہو۔" وہ بولا۔ "تمہارے ساتھ ... مطلب یہ ہو گا کہ میں کام میں رخنہ اندازی کر رہا ہوں۔ تم ... سخت قواعد سے واقف نہیں ہو ورنہ ایسی دعوت نہ دیتے۔" میں خاموش ہو گیا اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے سگریٹ سلگائی۔

عبدالعزیز نے مجھے صبح چھ بجے کے قریب ایک مکان پر پہنچا دیا جو ایک ادھیڑ عمر اور لاولد فرنچ جوڑے کی ملکیت تھا اور مجھے ان سے متعارف کر کے خود واپس چلا گیا۔

وہ میاں بیوی اس بات سے تو خوش تھے کہ انہیں ... صورت میں ایک ایسا گاہک میسر آیا تھا جس کے جملہ اخراجات انہیں پیشگی ہی مل چکے تھے مگر صبح چھ بجے میری آمد انہیں ناگوار گزری تھی۔

خاتون خانہ نے مجھ سے ناشتہ کے بارے میں دریافت ... مگر میں نے خواہش ہونے کے باوجود انکار کر دیا اور وہ اظہار ... کرتی ہوئی واپس چلی گئی۔

میں اپنے کمرے کی روشنی گل کر کے انہی کپڑوں میں ... پر دراز ہو گیا۔ مگر نیند کا دور تک پتہ نہیں تھا اور میں ذہن ... پر مسلسل شاہدہ کی ذات میں الجھا ہوا تھا جو میرے لیے پہیلی بن گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ واقعی مادام ... جانب سے صفدر علی کی تلاش پر مامور کی گئی تھی یا خود ... پوار تھی تو ایک مرتبہ مجھے دیکھ لینے کے بعد میری طرف ... ختیہ ہو چکی تھی اور میری طرف سے کسی اطلاع کے بغیر ... اسے بے چین کر دیتی۔ پھر وہ اپنے طور پر میری تلاش کی مہم ... رکھ سکتی تھی۔

مجھ سے ملاقات کے بعد سے یہ منطقی فائدہ بھی ... ہو تا کہ محض نام کے بجائے وہ ایک جانے پہچانے شخص کی ... میں زیادہ آسانی محسوس کرتی۔

نو بجے خادمہ نے آ کر مجھے ناشتے کی اطلاع دی اور دس منٹ میں تازہ دم ہو کر میز پر پہنچ گیا۔ دونوں میاں بیوی نے روایتی انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔ وہ دونوں ہی اپنے مہمانوں سے غیر ضروری میل جول کے قائل نہیں تھے لہٰذا میز پر تمام تر گفتگو پیرس کے موسم اور ہوٹلوں کی مہنگائی تک محدود رہی۔

گیارہ بجے میرا ایک ملاقاتی آ پہنچا جو میرے لیے قطعی اجنبی تھا اور اپنے خدوخال سے مقامی باشندہ نظر آتا تھا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" اس نے تخلیہ میسر آتے ہی انگریزی میں اپنا مدعا ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟"

"پی ایل ایک خفیہ ٹھکانے پر جانا ہے۔"

"تمہارا نام؟"

"جو چاہے سمجھ لو مگر روانگی میں تاخیر نہ کرو۔" پہلی بار اس کے پتلے پتلے ستواں ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

"چلو میں تیار ہوں۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

باہر اس کی ٹو سیٹر کار موجود تھی۔ ہم دونوں اس میں روانہ ہو گئے۔ اس سفر کا اختتام پیرس کے ایک تنگ و تاریک علاقے میں ہوا جہاں کئی منزلہ عمارات میں چھوٹے چھوٹے رہائشی فلیٹ بنے ہوئے تھے۔

ایک بوسیدہ سی عمارت کی نچلی منزل پر اس شخص نے ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے لے کر اندر گھس گیا۔

اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کیا تو کوٹھڑی میں گھور اندھیرا پھیل گیا وہاں کے سیلن زدہ ماحول میں سردی کا احساس بھی بہت بڑھ گیا تھا۔

دیوار گیر سوئچ آن کرنے پر اس کوٹھڑی میں روشنی ہو گئی اور مجھے اندرونی سمت پر بھی ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ پہلے کمرے میں دو بوسیدہ کرسیوں، ایک میز اور دھول سے اٹے ہوئے کرم خوردہ قالین کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کا بظاہر کوئی مصرف ہو۔ اور جب وہ مجھے اندرونی کمرے میں لے گیا تو مجھے خاصی حیرت ہوئی

اپنی ہیئت کے ساتھ وہ کمرہ بھی قابل تعریف حالت میں نہیں تھا مگر بیرونی کوٹھڑی کے مقابلے میں وہاں صاف ستھرا بستر، ایک صوفہ سیٹ، ڈریسنگ ٹیبل اور ایک خوبصورت ... الماری بھی موجود تھی اور اسی کمرے سے ملحق باتھ روم ... واقع تھا۔

"شاید یہ جگہ تمہارے معیار پر پوری نہیں اتری؟" وہ میرے جائزے کے اختتام پر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تحفظ کے مقابلے میں معیار کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ الماری سے وہسکی کی بوتل نکالتے ہوئے زور سے ہنسا۔ "بڑی اچھی بات کہی ہے تم نے، تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے پورے شہر کا طواف کیوں کیا ہے؟"

"پیرس میرے لیے نیا شہر ہے۔"

"تمہاری قیام گاہ کی نگرانی کی جا رہی تھی۔" اس کا انکشاف سن کر میں ششدر رہ گیا۔ "میں تمہیں لے کر روانہ ہوا تو سبز رنگ کی ایک کار میرے پیچھے لگی ہوئی تھی جس سے میں نے بمشکل اپنا پیچھا چھڑایا ورنہ میں کافی پہلے تمہیں یہاں لے آتا۔"

"کار کون ڈرائیو کر رہا تھا؟"

"کہر کی وجہ سے میں صاف طور پر نہ دیکھ سکا مگر غالباً کوئی لڑکی تھی۔" اس نے وہسکی گلاس میں ڈالی اور یخ بستہ پانی کا تھرماس میری طرف بڑھا دیا۔ "اس وقت اسی سے کام چلا لو سوڈا لینے باہر جانا پڑے گا۔"

"تمہیں راستے میں ہی مجھے تعاقب کے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ لڑکی کا تذکرہ سنتے ہی مجھے شاہدہ کا خیال آیا تھا۔ اس کا کردار شروع ہی سے میری نظروں میں مشکوک تھا اور اس کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کے باوجود میں نہ اپنے شبہات کی تصدیق کر سکا تھا اور نہ ہی شاہدہ کا دامن صاف نظر آیا تھا۔

صبح سویرے عبدالعزیز جس طرح مجھے ہوسٹلری ڈی الفانسو سے لے کر نکلا اس کی بنا پر شاہدہ کا متجسس ہونا بعید از قیاس نہیں تھا اور یہ امکان بھی تھا کہ اس نے عجلت میں باہر آ کر موسم اور وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مکان تک عبدالعزیز کا تعاقب کیا ہو جہاں اس نے مجھے چھوڑا تھا۔ عبدالعزیز کو تنہا واپس جاتے ہوئے دیکھ کر شاہدہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی ہو گی اور پھر وہ اس مکان کے قرب و جوار ہی میں منڈلاتی رہی تھی تا کہ میں اس شخص کے ساتھ باہر نکلا اور وہ ٹو سیٹر کے تعاقب میں ہو لی۔

اگر تعاقب کرنے والی شاہدہ ہی تھی تو اس کی ذات شبہات کے دھندلکے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اپنے بیان کے مطابق وہ عبدالعزیز کی ہدایت پر مجھ تک پہنچی تھی۔ اگر میری ذات میں وہ کسی اور وجہ سے دلچسپی نہیں لے رہی تھی تو اسے عبدالعزیز کا اور پھر میرا تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ناکام تعاقب کے ذریعے اس نے اپنی نیت کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

"راستے میں تمہیں بتا کر کیا کرتا۔ اب تو ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرنا میری ذمہ داری ہے۔ ہاں اگر اسے دھوکا دینے میں کامیابی نہ ہوتی تو شاید تم سے مشورہ کر لیتا۔"

"پھر اب کیوں بتا رہے ہو؟" مجھے اس شخص کی گفتگو میں چھپا ہوا برتری کا احساس خاصا ناگوار محسوس ہوا تھا۔

"ہرگز نہ بتاتا۔" وہ بولا۔ "بس اس لیے زبان چل پڑی کہ کہیں بے خبری میں تم کسی چوزے کی طرح نہ مار لیے جاؤ۔"

میں نے اس کے تبصرے کی تلخی اپنے دل کی گہرائی سے محسوس کی اور اس کے فضا میں اٹھے ہوئے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرا کر ساری وہسکی اپنے معدے میں انڈیلتا چلا گیا اور خالی گلاس میز پر رکھ کر سوال کیا۔

"تم اپنی زبان سے کوئی فرضی نام ہی بتا دو اگر اصل نام بتانے سے شرم آتی ہو۔"

وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خطرناک انداز میں مسکرایا۔ "وہ اصل نام بتانا اس لیے غیر ضروری ہے کہ اب تم میرے گونگے خدمت گار کے طور پر میرے ساتھ سفر کرو گے۔ ویسے میرے سفری کاغذات ٹام میکفرسن کے نام سے ہیں۔"

"اور میرا کیا نام ہوگا؟"

"اب تم ڈان فرنانڈس کے بجائے مونی ہان کہلاؤ گے۔" وہ اپنے قریب ایک تپائی پر رکھے ہوئے کاغذات کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔

"گونگا رہنا ضروری ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"فرنچ سیکھ لو تو زبان بھی عطا کر دوں گا۔" اس نے یوں کہا جیسے میری قوت گویائی واقعی اس کے اختیار میں ہو۔

"سفر کا آغاز کب ہوگا؟"

"تھوڑی سی حرارت پہنچا لوں۔" وہ اپنے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "پھر تمہاری صورت درست کر دوں گا تاکہ مونی ہان کے پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر کی بنا پر پکڑے نہ جاؤ۔"

"میک اپ کرو گے؟"

"میک اپ ہی کہہ لو مگر وہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہ چل سکے گا۔" خلافِ عادت اس معاملے میں اس نے اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کیا۔

دوسرا گلاس خالی کرنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے میرے مقابل بیٹھ گیا اور تیز بدبو والے مختلف محلول میری جلد پر آزمانے لگا۔ اس کے پاس گوشت کی طرح کے نرم اور لچک دار پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی موجود تھے جنہیں چپکا کر کوئی خاص شکل دی جا سکتی تھی۔

محلول کی آزمائش کے بعد میکفرسن نے مجھے بلیچنگ لوشن کی ایک شیشی دی۔ اور اس کی ہدایت پر میں نے وہ لوشن اپنی کلائی کے اندرونی حصے پر لگا لیا۔ چند منٹ تک میری جلد میں سوزش سی ہوتی رہی اس کے بعد میری جلد پر نکھار کے ساتھ ہی سرخی بھی آ گئی۔ تب میکفرسن نے اسی مقام پر ایک لوشن لگایا جس سے سوزش کا خاتمہ ہو گیا۔

ان آزمائشوں کے بعد میکفرسن نے مونی ہان کے پاسپورٹ والا تصویر والا صفحہ سامنے رکھ کر میرے چہرے پر کام شروع کر دیا۔

مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ میرے اور مونی ہان کے چہرے میں کیا شباہت تھی کیونکہ اس کی تصویر میں داڑھی زیادہ نمایاں تھی۔ مگر میکفرسن کا کہنا تھا کہ وہ تصویر میرے خدوخال سے بہت قریب ہے اور تھوڑی سی محنت کے بعد وہ مجھے مونی ہان کا ہم شکل بنا سکتا تھا۔

کم و بیش دو گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو حیران رہ گیا۔ گندمی رنگ کی گردن پر بھوری سی داڑھی سے سجا ہوا سرخ و سفید چہرہ پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر سے حیرت ناک حد تک مماثل تھا۔ میں نے آئینے کے قریب اپنے چلتے ہوئے چہرے کا جائزہ لیا اور دل ہی دل میں میکفرسن کی صلاحیت کا معترف ہو گیا کیونکہ بادی النظر میں میرے چہرے پر میک اپ کا شبہ کرنا بہت مشکل تھا۔

"یہ فن میں نے سرکس میں ملازمت کے دوران سیکھا تھا۔" میری تعریف پر میکفرسن نے فخر کے ساتھ کہا۔ "عمر زندگی میں میں پہلی بار اس سے کام لے رہا ہوں۔"

"مگر تم نے کہا کہ یہ میک اپ چند گھنٹوں سے زیادہ چل سکے گا۔" میں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میک اپ کے لیے تمہارے چہرے کو بلیچ کرنے نے بلاشک لوشن کی تہہ جمائی ہے جو مساموں سے خارج ہونے والے پسینے اور نمی کے باعث ایک خاص مرحلے پر اپنی گرفت چھوڑ دے گا اور ڈاڑھی سمیت سارا خول گر جائے گا۔"

"یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔"

"اوّل تو اس موسم میں مسامات بہت سست رفتاری سے کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے تمہاری جلد پر پسینہ روکنے والا محلول بھی لگا دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آٹھ دس گھنٹے تک یہ میک اپ بآسانی قائم رہ سکے گا۔"

"مگر چہرے اور گردن کی رنگت کا فرق؟"

"یہ دوسرا مرحلہ ہے۔" وہ مسکرا کر بولا اور پھر اس نے میرے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر بلیچنگ لوشن کا اسپرے شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد کلائیوں تک دونوں ہاتھ، گردن اور کان وغیرہ چہرے کی طرح اپنا رنگ تبدیل کر چکے تھے۔

"ہمارا سفر کب شروع ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"دو بجے ٹرین روانہ ہوگی۔" وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹرین؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مجھے یہی ہدایت ملی ہے۔ یہاں سے بروسلز تک کا سفر بمشکل تین گھنٹے کا ہے، وہاں تک تمہارا میک اپ بآسانی قائم رہ سکے گا۔"

"تو پھر فوراً نکلو۔" میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "وقت کم رہ گیا ہے۔"

میکفرسن نے مسہری کے نیچے سے اپنا چرمی سوٹ کیس کھینچا اور پھر ہم دونوں اس تنگ و تاریک فلیٹ سے باہر آ گئے۔

میک اپ اور خصوصاً داڑھی کی وجہ سے مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی مگر مستقل بے خوفی کے عوض چند گھنٹوں کی وہ الجھن گوارا تھی۔

راستے میں میکفرسن نے گاڑی روک کر میرے لیے چند ضروری اشیاء کے علاوہ تاریک شیشوں کی عینک خریدی اور پھر ہم اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔

ریلوے اسٹیشن پر صفائی اور نظم و ضبط دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ ہی خوشی بھی ہوئی۔ میں اس وقت تک یورپ میں اپنا خاصا وقت گزار چکا تھا مگر سفر کے معاملے میں میرا تعلق ہوائی اڈوں یا بس اسٹاپس سے ہی رہا تھا۔ یا پھر پیرس میں ایک دو بار میٹرو میں سفر کرنا پڑ گیا تھا۔ اس اعتبار سے یورپ کے کسی مقام کی باقاعدہ ریلوے سروس سے وہ میرا پہلا واسطہ تھا۔

ٹھیک دو بجے ٹرین روانہ ہو گئی۔ ہم دونوں چار نشستوں والے ایک کوپے میں سوار تھے جہاں ہمارے علاوہ ایک عمر رسیدہ شخص موجود تھا۔

سفر کا اختتام نہایت خوشگوار طریقے پر ہوا۔ راستے میں ایک مقام پر بروسلز کے لیے ٹرین تبدیل کرنی پڑی اور ساڑھے چار بجے ہم دونوں بروسلز میں موجود تھے۔

ریلوے اسٹیشن کی پُرشکوہ عمارت سے باہر آ کر ہم نے ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور میکفرسن کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی ڈرائیور نے منمناتی ہوئی آواز میں کچھ کہا اور میکفرسن بے اختیار سر گھما کر پیچھے دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی مگر پیچھے آنے والی ناکافی ٹریفک میں کوئی خاص بات محسوس نہ کر سکا۔ میرا دل چاہا کہ میکفرسن سے صورتحال کے بارے میں کچھ دریافت کروں مگر اس نے مجھے سختی کے ساتھ ہدایت کی ہوئی تھی کہ میں اس سے اجازت لیے بغیر اپنے گونگے پن کا خاتمہ نہ کروں، لہٰذا مجھے خاموش ہی رہنا پڑا۔

میکفرسن اس وقت کسی غضب ناک بھیڑیئے کی طرح بار بار پہلو بدل کر پیچھے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ڈرائیور کو بھی ہدایات دیتا جا رہا تھا۔

پھر اچانک ٹیکسی کی رفتار بڑھ گئی اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے مختلف گلیوں میں گھومنے لگی۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ ٹیکسی کا تعاقب کیا جا رہا تھا اور تھوڑی دیر بعد میں اس سیاہ کار کو پہچاننے میں بھی کامیاب ہو گیا، جو مسلسل ٹیکسی کا پیچھا کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہماری ٹیکسی شہر کے بارونق علاقے سے نکل کر ایک ویران مضافاتی شاہراہ پر دوڑنے لگی۔ سیاہ کار مسلسل تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔

ایک جگہ میکفرسن نے ڈرائیور سے کچھ کہا اور پھر جیب سے خاصی رقم نکال کر ڈرائیور کے حوالے کر دی۔

ڈرائیور نے رقم لے کر اپنی جیب میں اڑسی اور چند ثانیوں بعد پوری قوت سے بریک لگا کر کار روک دی۔

میکفرسن میرا ہاتھ تھام کر تیزی سے داہنی جانب پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں کود گیا۔ ہمارے باہر کودتے ہی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

ہمارے قدم زمین سے ٹکے ہی تھے کہ وہ ویرانہ یکے بعد دیگرے دو فائروں کے شور سے گونج اٹھا۔ وہ فائر چونکہ چلتی ہوئی سیاہ کار سے کیے گئے تھے لہٰذا گولیاں ہم سے بہت زیادہ فاصلے سے گزر گئیں مگر ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ ہمارے نامعلوم دشمن مسلح تھے۔

مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ بلجیم کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمارے دشمن کہاں سے پیدا ہو گئے جبکہ فرانس سے ہماری روانگی نہایت رازداری کے ساتھ عمل میں آئی تھی۔

"تمہارے پاس کوئی فاضل ہتھیار ہے؟" میں نے جھاڑیاں عبور کرتے ہوئے سوال کیا۔

جواب میں اس بدتمیز شخص نے نہایت واہیات الفاظ استعمال کیے اور مجھے خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہ جانا پڑا۔ کیونکہ اس اجنبی سرزمین پر وہ میرا واحد ہمدرد اور شناسا تھا۔

ہمیں اپنے عقب میں ایک کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ پھر

جھاڑیوں میں قدموں کی دھمک بھی گونجنے لگی۔ وہ جو بھی تھا، تنہا ہی تھا۔ پھر اس نے اجنبی زبان میں شاید ہمیں للکارا۔ میکفرسن ایک لمحے کے لیے رکا اور اس نے اپنے اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بھاری ہوا خودکار ریوالور نکال لیا۔

تعاقب میں آنے والے نے شاید قدموں کی آہٹ پر نشانہ لے کر تیسرا فائر کیا مگر گولی ہم سے گزوں دور نکل گئی۔ مگر وہ صورتحال ہمارے لیے سخت خطرناک تھی اور کوئی بھولی بھٹکی گولی ہم میں سے کسی کو چاٹ بھی سکتی تھی۔

شاید میکفرسن بھی وہ خطرہ بھانپ چکا تھا کیونکہ ان قدآدم گنجان جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بائیں جانب اسے ایک ٹیلہ سا ابھرا ہوا نظر آیا۔ اور وہ دوڑتا ہوا اسی کے پیچھے چلا گیا۔ ٹیلے کے عقب میں ہم دونوں ہی بیٹھ گئے۔ اور اپنے سانس درست کرنے لگے۔ میکفرسن ریوالور کی نال اٹھائے دشمن کی راہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جس کے قدموں کی آوازیں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد اس کی آہٹیں بھی غائب ہو گئیں۔ شاید اس نے ہماری عیاری بھانپ لی تھی اور آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔

"میں یہیں اس کا انتظار کرتا ہوں۔ تم اسے دھوکہ دینے کے لیے آگے بڑھتے رہو!" میکفرسن نے ہیجان آمیز لہجے میں میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر دبے قدموں آگے چل دیا۔ چند گز آگے بڑھنے کے بعد میں نے جھاڑیوں میں اپنے دوڑنے کی تیز آوازیں پیدا کرنی شروع کر دیں۔ تاکہ نادیدہ دشمن غفلت میں پیش قدمی شروع کر سکے۔

فوراً ہی عقبی سمت سے آوازیں ابھرنے لگیں۔ اس بار تعاقب کرنے والے نے انگریزی میں رکنے کا حکم دیا مگر میں سست رفتاری سے بڑھتا ہی رہا۔

یہ صورتحال بمشکل ایک ڈیڑھ منٹ قائم رہی۔ پھر وہ جنگل ایک فائر اور انسانی چیخ سے گونج اٹھا۔ فائر کی وہ آواز پہلے تین فائروں سے زیادہ بھاری اور مختلف تھی جس کا مطلب تھا کہ میکفرسن کی حکمت عملی کامیاب رہی تھی۔

"مونی ہاں!" وہ گنجان جنگل میکفرسن کی قدرے تیز آواز سے گونجا اور اس کے قدموں کی تیز دھمک بھی چند ثانیوں کے لیے سنائی دی۔ شاید وہ دوڑ کر زخمی دشمن کے قریب پہنچا تھا۔

میں چند منٹ کی کوشش میں میکفرسن کے پاس پہنچ گیا۔ جھاڑیوں میں زمین پر ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص اپنی ران دبائے بری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں، پتلون اور زمین کا خاصا بڑا حصہ اس کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

"یہ رونالڈ ہے، میرا خاصا پرانا شناسا!" میکفرسن نے ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول کی نال سے کراہتے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

میں نے میکفرسن سے نگاہیں چار کر کے اپنے حلق سے بے معنی آوازیں نکالنی شروع کر دیں کیونکہ میکفرسن کی ہدایت کے مطابق مجھے گونگا بنا رہنا تھا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے۔ سیدھی طرح بات کرو۔" میکفرسن جھلا کر بولا۔

"مگر میں تو گونگا ہوں۔" میں نے بے چارگی سے کہا اور میکفرسن اکتائے ہوئے انداز میں ہنس پڑا۔

"تم نے کبھی مادام لواری کا نام سنا ہے؟" میکفرسن نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت جھاڑیوں کے درمیان روشنی کی آخری کرنیں بھی ماند پڑتی جا رہی تھیں۔ اور مجھے میکفرسن کے چہرے پر عجیب سی درشتگی نظر آ رہی تھی جسے ابتدا میں میں نے ناکامی کا نتیجہ سمجھا تھا۔ مگر اس کے منہ سے مادام لواری کا نام سن کر میں چونک گیا۔

"نہیں۔" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ "یہ کون عورت ہے؟"

"سن لیا!" میکفرسن میرا جواب سن کر رونالڈ سے مخاطب ہوا۔ "میں مان ہی نہیں سکتا کہ تمہیں اس جانب سے ایسا کوئی حکم ملا ہو گا۔"

"تم خود سوچو!" رونالڈ کراہتے ہوئے انگریزی میں بولا۔ "بھلا مجھے کیسے الہام ہو سکتا تھا کہ تم اس ٹرین سے برسلز آ رہے ہو!"

"تو یہ خبر بھی تمہیں پیرس سے ملی تھی؟" میکفرسن نے استہزائیہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم یقین کرو، میں ہر قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔" رونالڈ جلدی سے بولا۔ "مجھے دو گھنٹے قبل خبر ملی تھی کہ تم اس ٹرین سے برسلز جا رہے ہو، مجھے تم سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ البتہ تمہارے ساتھی کا جاننا بہت ضروری تھا۔" آخری فقرہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ حکم تمہیں مادام سے ملا تھا؟" میکفرسن کا لہجہ نرم اور متزلزل ہو گیا تھا۔

"بھلا میری یہ مجال ہو سکتی ہے کہ ذاتی مفاد کے لیے مادام کو استعمال کروں۔" رونالڈ نے جلدی سے کہا۔

میری چھٹی حس مجھے کسی خوفناک صورتحال سے آگاہ کر رہی تھی۔ ان دونوں کی گفتگو جس ڈھب سے چل رہی تھی اس سے میرے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ میکفرسن بھی کسی طرح مادام لواری کے ٹولے سے متعلق تھا اور پیرس میں اس کی کڑی نگرانی کی گئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ میری اور مادام لواری کی پرخاش سے لاعلم تھا اور محض اسی وجہ سے کچھ نامعلوم لوگوں کے ایما پر مجھے فرانس کی سرحدوں سے باہر نکالنے پر آمادہ ہو گیا مگر بلجیم کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مادام لواری کا ایک کتا اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔

میکفرسن کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر رونالڈ کی بات پر یقین آ گیا تو وہ خود ہی مجھے مادام لواری کا قیدی بنا دے گا۔

"اگر میں تمہاری بات درست مان لوں تو تمہاری گلوخلاصی ناممکنات میں سے ہے۔ رونالڈ ڈارلنگ!" میکفرسن پرخیال لہجے میں بولا۔

"میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا کہ میں تمہاری گولی سے زخمی ہوا ہوں۔" رونالڈ زمین سے اٹھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں بلاوجہ خطرات مول نہیں لیتا۔" میکفرسن عجیب سے لہجے میں بولا۔

"نہیں ― تم مجھے نہیں مار سکتے!" رونالڈ دہشت زدہ آواز میں چیختا ہوا میکفرسن کی طرف جھپٹا۔ اور اس نے اپنے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی چند فٹ کے فاصلے سے رونالڈ کے بائیں پہلو میں پیوست ہو گئی۔ اور وہ ایک گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

میکفرسن نہایت دلچسپی سے اپنے دوست رونالڈ کو دم توڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور میرا ذہن تیزی کے ساتھ سوچنے میں مصروف تھا۔ میکفرسن کے رویے سے صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ مادام لواری کے نمک خواروں میں سے تھا اور اس سے بے انتہا خائف بھی تھا۔ لہٰذا میرے لیے کوئی خوش فہمی بالکل بیکار تھی۔ مجھے یقین تھا کہ رونالڈ سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح میرے معاملے میں مادام لواری کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلے پر غور کیا۔ میکفرسن مجھ سے بے خبر سسکتے ہوئے رونالڈ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اپنے ریوالور کی نال اس نے داہنے رخسار سے لگائی ہوئی تھی۔

میں نے پوری طاقت سے میکفرسن پر زقند لگائی۔ اور وہ میرے بوجھ تلے غراتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ ریوالور اس کی گرفت سے نکل کر میرے قبضے میں آ چکا تھا مگر میں ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسے بغیر فائر کر سکوں۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میکفرسن اپنا انجام محسوس کر کے بے حد غضبناک ہو گیا تھا اور جونک کی طرح میرے بدن سے لپٹ گیا تھا۔ میرا داہنا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا جسے وہ مسلسل مروڑنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ریوالور میرے قبضے سے نکل سکے۔

چند ثانیوں تک میری اور میکفرسن کی وہ جانگسل کشمکش جاری رہی مگر مجھے پیش قدمی کا بھرپور فائدہ حاصل تھا لہٰذا میں اس کے پیٹ میں اپنے گھٹنے اڑا کر اٹھنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر میں نے داہنے پیر سے اس کے پیٹ پر ضرب لگا کر اس کے سینے پر فائر کر دیا۔ میکفرسن نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنے جسم کو حرکت دی اور اس کے سینے پر لگنے والی گولی اس کے بازو میں پیوست ہو گئی۔

بازو میں پگھلا ہوا سیسہ اترنے کے باعث میکفرسن پر چند لمحوں کے لیے بدحواسی طاری ہوئی اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس کے دل میں گولی اتار دی۔

یہ تمام ہنگامہ مضافاتی شاہراہ سے بہت کم فاصلے پر ہوا تھا اور اس دوران میں ادھر سے کسی کار یا ٹرک وغیرہ کے گزرنے کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ مگر میں ادھر کا رخ کرتے ہوئے خوف محسوس کر رہا تھا کہ مبادا کسی کی نظروں میں نہ آ جاؤں۔

میکفرسن نے ٹیکسی سے اترنے سے قبل خدا جانے کیا سوچ کر اس کی ڈگی میں سے اپنا سوٹ کیس بھی نہیں نکالا تھا مگر یہ غنیمت تھا کہ میرے سفری کاغذات میرے اوورکوٹ کی جیب میں تھے۔ اور ان کے ساتھ خاصی رقم بھی موجود تھی جو کچھ عرصے کے لیے میرا ساتھ دے سکتی تھی۔

میں نے یہ سب سوچتے ہوئے میکفرسن کا جائزہ لیا جس پر نزع کا عالم طاری تھا جب کہ رونالڈ کا جسم پہلے ہی بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ میکفرسن کی حالت سے ظاہر تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے موت سے نہ بچا سکے گی۔

میں نے جلدی جلدی رونالڈ کی جیبوں کی تلاشی لے کر ساری رقم اپنی جیبوں میں منتقل کر لی۔ پھر یہی عمل میکفرسن کے ساتھ دہرایا۔ ان کی گھڑیاں یا دوسری قیمتی نجی چیزوں کو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا کیونکہ انہیں فروخت کرنے میں خطرات کا سامنا ہو سکتا تھا

پھر میکفرسن کے ریوالور کے ساتھ میں شاہراہ کی طرف جانے کے بجائے اس کی مناسبت میں شاہراہ کے متوازی چلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد آسمان پر سیاہی پھیلنے لگی۔ اور میرے لیے اس خودرو جنگل میں سفر جاری رکھنا دشوار ہو گیا۔ تو میں نے شاہراہ پر نکلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

مجھے وہاں بھٹکتے ہوئے کافی دیر گزر گئی مگر شاہراہ نظر نہ آ سکی۔ تاریکی میں پورا جنگل جھینگروں کے تیز شور سے گونج رہا تھا اور پوری توجہ مرکوز کرنے کے باوجود فضا میں کسی انجن کا مدھم سا شور بھی سننے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جس کے دو ہی اسباب ہو سکتے تھے۔ اول تو وہ شاہراہ مستقل طور پر ویران پڑی رہتی تھی اور کوئی بھولی بھٹکی سواری ہی ادھر آتی تھی۔ دوئم یہ کہ میں بھٹکتے ہوئے اس شاہراہ سے اتنی دور نکل چکا تھا کہ ادھر سے آنے والی آوازیں میرے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

اس صورتحال کی وجہ سے میرے ذہن پر تشویش مسلط ہونے لگی۔ ہر طرف گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور میرے پاس ماچس کے علاوہ روشنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس سرد موسم میں اگر مجھے پوری رات اسی طرح گزارنی پڑ جاتی تو میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ماؤف ہو کر رہ جاتیں۔

اس کے علاوہ مجھے اپنے میک اپ کی بھی فکر تھی اور میں بار بار اپنے چہرے کو چھو کر اطمینان کرتا جا رہا تھا۔ میرے چہرے کے مختلف حصوں پر چپکے ہوئے پلاسٹک کے ٹکڑے مصنوعی ڈاڑھی سمیت کسی بھی وقت جگہ چھوڑ سکتے تھے اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے بعد میری موت پر کیا کچھ باقی رہ جائے گا اور اسے کس طرح صاف کیا جا سکے گا اور نہ ہی مجھے اپنے چہرے، گردن اور ہاتھوں کی رنگت کو معمول پر لانے کی ترکیب کا علم تھا۔

میں پیرس بلکہ فرانس سے تو بحفاظت باہر نکل آیا تھا مگر مادام بواری کا سایہ یہاں بھی میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میکفرسن جس انداز میں مادام بواری کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس کی بنا پر یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ پیرس کی زیر زمین دنیا کا ہر فرد نہیں تو بیشتر افراد مادام بواری کے لیے کام کرتے تھے اور فرانس سے باہر بھی ان کے خاصے مضبوط روابط تھے۔

میں یہی سب سوچتا ہوا اس جنگل میں بھٹکتا رہا اور جب وہ جنگل گھنا ہونے لگا تو میں رک گیا۔ اس وقت میری ریڈیم ڈائل رسٹ واچ سوا دو بجا رہی تھی۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس آسیب زدہ ماحول سے نکلنے کے لیے کون سی راہ اختیار کروں۔ دوسری طرف یہ لالچ بھی تھا کہ اس وقت میں خاصی حد تک تازہ دم تھا۔ اگر وہ رات بے عملی میں ہی گزار دیتا تو صبح راستہ تلاش کرنے کی مہم سست پڑ جاتی۔ لہٰذا میں گنجان جنگل میں داخل ہونے کے بجائے راستہ بدل کر جھاڑیوں کے درمیان ہی بڑھنے لگا۔

کئی گھنٹے کی جدوجہد کے بعد آخر کار میں اس آسیب زدہ جنگل سے نکل کر ایک ایسے میدان میں داخل ہو گیا جس میں جا بجا ٹیلے وغیرہ موجود تھے ماحول کی وہ تبدیلی میرے لیے انتہائی خوشگوار تھی۔ کھلے علاقے میں نکل آنے کے سبب کم از کم میری بینائی زیادہ دور تک کام کر سکتی تھی۔ کئی ٹیلوں کو عبور کرنے کے بعد میں نے آخری چڑھائی عبور کرنی شروع کی۔ اس وقت تکان سے میری حالت غیر ہو رہی تھی اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ چڑھائی طے کرنے کے بعد بھی دوسری طرف ویرانہ ہی نظر آیا تو اپنی مہم موقوف کر کے چند گھنٹوں کے لیے آرام کروں گا اور میک اپ سے حتی الامکان نجات کے بعد آگے بڑھوں گا۔

مگر قدرت کو میری بے بسی پر رحم آ گیا اور جب میں اوپر پہنچا تو یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ڈھلان کے نیچے بل کھاتی ہوئی سیاہ سڑک پھیلی ہوئی تھی اور سڑک کی دوسری جانب ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں کسی مختصر سے قصبے کی موجودگی کا اعلان کر رہی تھی۔

میں نے ایک نئے جذبے کے ساتھ سڑک کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس وقت رات کے دو بج چکے تھے۔ اور سڑک کے قریب پہنچنے تک مجھے اس شاہراہ پر صرف تین ٹرک گزرتے ہوئے نظر آئے جن کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مجھے لفٹ لینے کے بارے میں غور کرنا پڑ گیا۔ ورنہ پہلے میں سوچ رہا تھا کہ ڈرائیور کے علم میں لائے بغیر کسی ٹرک کے عقبی حصے میں چھپ کر اپنا سفر طے کر لوں گا۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد آبادی قریب نظر آنے لگی۔ اور اسی قدر چلتے چلتے میری ڈاڑھی اپنی جگہ چھوڑ کر زمین پر گر گئی۔

یہ صورتحال بہت مخدوش تھی۔ میں آبادی کی طرف بڑھنے لگا اور ٹٹول ٹٹول کر اپنے چہرے سے ہر وہ چیز چھڑانے لگا جو آسانی ہٹائی جا سکتی تھی۔

اتنی رات گئے مشتبہ حالت میں ایک نئے ملک کی کسی آبادی میں داخل ہونا سنگین خطرات سے خالی نہیں تھا مگر اس وقت میں حالات کے شکنجے میں پھنس کر اس قدر مجبور ہو چکا تھا کہ خطرات مول لینا ناگزیر ہو گیا تھا۔

وہ دیہی بستی چھوٹے چھوٹے نیم پختہ مکانات پر مشتمل تھی اور وہاں بھرپور سناٹے کا راج تھا۔ میں نے جائزہ لے کر ایک مکان کا انتخاب کیا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد کسی بندر کی سی پھرتی کے ساتھ اس کے احاطے کی دیوار پر چڑھ گیا۔ دیوار سے چھت پر پہنچنا بہت سہل ثابت ہوا۔ پیٹ کے بل چھت پر لیٹ کر میں سرے پر پہنچا اور جھک کر روشندان میں سے ایک کمرے کا جائزہ لیا جہاں ایک عورت تنہا محو خواب تھی۔

کمرے میں صرف عورت کی موجودگی اس بات کی غماز تھی کہ مکان میں کوئی اور نہیں تھا اور یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔

میں آہستگی اور احتیاط کے ساتھ مکان میں کود گیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے قبل احاطے میں ایک طرف غسل خانہ نظر آ گیا۔ جہاں آئینہ بھی موجود تھا وہ سہولت میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور میں نے اندر کی بتی جلا کر آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو پھریری لے کر رہ گیا۔ میرے چہرے پر رہ جانے والے پلاسٹک کے ٹکڑوں نے بڑی شکل بہت ناک بنا دی تھی۔

پہلے میرا خیال وہیں رات بسر کرنے کا تھا مگر آئینہ دیکھنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ رات گزارنے کی صورت میں اس مختصر سے قصبے سے دن کی روشنی میں نکلنا میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا اور قصبے کے لوگ اپنے درمیان ایک اجنبی کی اچانک موجودگی کسی طرح نظر انداز نہ کر پاتے جبکہ قیام کے لیے مجھے عورت پر بھی [illegible]

دھو نہیں جا رہی تھی۔

میں نے اپنا میک اپ صاف کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ چند گھنٹوں میں چہرے کی جلد پر جو بال بڑھ آئے تھے انہوں نے میک اپ کی تہیں چھڑانے میں بہت تنگ کیا اور جب میں اپنے اصل خدوخال دیکھنے میں کامیاب ہوا تو میرے رخسار لال سرخ تھے اور جگہ جگہ خون کی بوندیں ابھرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں جس رازداری کے ساتھ اس مکان میں داخل ہوا تھا اسی احتیاط اور رازداری کے ساتھ باہر بھی نکل گیا اور میری راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوئی۔ نکاسی کے لیے میں نے دیوار کے بجائے مکان کا دروازہ استعمال کیا تھا جو میرے لیے زیادہ محفوظ تھا۔

میک اپ کے غیر ضروری بوجھ سے نجات پانے کے بعد میں شاہراہ پر جا پہنچا۔ اور ایک طرف بڑھنے لگا۔ قصبے کے نزدیک لفٹ لینے کی صورت میں میری ذات زیادہ مشکوک ٹھہرتی لہٰذا میں نے وہاں سے ایک ڈیڑھ میل آگے کسی سواری کو روکنے کا فیصلہ کیا تھا۔

آبادی سے کافی دور سڑک کے ایک کشادہ موڑ پر میں کسی سواری کے انتظار میں ٹھہر گیا۔ مجھے آنے والی دشواریوں کا بخوبی اندازہ تھا مگر میں ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

نصف گھنٹے بعد مجھے سڑک پر ایک ٹرک کی روشنیاں نظر آئیں اور میں کنارے پر کھڑا ہو کر بے تابی سے دونوں ہاتھ ہلانے لگا۔ ٹرک ڈرائیور نے دو تین مرتبہ ہیڈ لیمپس کی روشنیاں ہلکی اور تیز کیں مگر میرے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور ٹرک کی رفتار سست ہونے لگی۔

میرے قریب آ کر وہ دیوہیکل ٹرک ٹھہر گیا۔ ڈرائیور کا کیبن غیر معمولی بلندی پر واقع تھا اور اندھیرے میں وہاں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیبن میں سے کسی نے سر باہر نکال کر شاید فرنچ میں مجھ سے کچھ دریافت کیا جو میرے پلے نہ پڑ سکا۔

"میں صرف انگریزی جانتا ہوں اور بروسلز پہنچنا چاہتا ہوں۔" میں نے چیخ کر انگریزی میں کہا۔

میری بات سن کر ٹرک ڈرائیور کی تحیر آمیز آواز ابھری۔ "بروسلز؟"

"آجاؤ ___ آجاؤ!" کیبن میں موجود کسی دوسرے شخص نے انگریزی میں کہا اور میں لپک کر پائیدان کے سہارے اوپر چڑھ گیا۔

اس دیوہیکل ٹرک کے کشادہ کیبن میں دو تنومند آدمی موجود تھے۔ دوسرے شخص نے تھوڑی سی جگہ بنا کر مجھے اپنے برابر میں بٹھا لیا اور ڈرائیور نے ٹرک آگے بڑھا دیا۔

ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص نے ایک بٹن دبا کر کیبن روشن کر دی اور غور سے میرا جائزہ لینے لگا۔

"تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیا کر رہے تھے؟" ڈرائیور نے گیئر بدلتے ہوئے شکستہ انگریزی میں مجھ سے سوال کیا۔

"سیاح ہوں اور کچھ لوگوں کے بے رحمانہ مذاق کا نشانہ بنا ہوں۔" میں نے انکسار کے ساتھ کہا۔ "اگر تم لفٹ نہ دیتے تو شاید اسی سڑک پر منجمد ہو کر رہ جاتا۔"

"تمہارے چہرے پر خون کیسا ہے؟" دوسرے شخص نے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"خون؟" میں نے چونک کر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا پھر ہنستے ہوئے وضاحت کرنے لگا۔ "دراصل مجھے بڑھی ہوئی ڈاڑھی سے نفرت ہے، شاید بے خیالی میں اپنے بال نوچتا رہا ہوں گا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ تم سڑک کی کس سمت پر کھڑے ہوئے تھے؟" دوسرا مجھ سے قطعی مطمئن نہیں تھا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ علاقہ میرے لیے اجنبی ہے!"

وہ دونوں آپس میں فرنچ میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈرائیور کے ساتھی نے سہارا دینے کے بہانے میرے بازوؤں کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا کہ میں ذرا سی بھی جنبش کرتا تو اسے علم ہو جاتا۔

کافی دیر کی مسافت کے بعد ٹرک ایک آبادی میں داخل ہوا اور پھر ایک عمارت کے احاطے میں گھستا چلا گیا۔

احاطے میں ایک سائرن کار اور چند باوردی سپاہی دیکھنے کے بعد ہی میں سمجھ سکا کہ وہ خبیث مجھے پولیس اسٹیشن میں لے گئے تھے۔

ٹرک روک کر ان دونوں نے نہایت بے رحمی کے ساتھ مجھے نیچے اتارا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کئی سپاہی بھی آ گئے۔ اور ڈرائیور سے اس کی روداد سننے کے بعد دو سپاہیوں نے مجھے شانوں سے جکڑ لیا۔ تیسرے نے جامہ تلاشی شروع کر دی۔

میکفرسن کے ریوالور کی نال سونگھنے کے بعد سپاہیوں کا رویہ سخت ہو گیا اور مجھے اندر ایک افسر کے سامنے پہنچا دیا گیا۔

ٹرک ڈرائیور اور اس کے ساتھی کو بیان قلمبند کراتے ہی روانگی کی اجازت مل گئی۔ اس اثنا میں انگریزی جاننے والا ایک پولیس والا مجھ سے بازپرس کے لیے آیا۔

"یہ کاغذات کس کے ہیں؟" اس نے میرے قبضے سے برآمد ہونے والے پاسپورٹ وغیرہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے ہیں!" میں نے اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔

"اور یہ [illegible]؟" اس نے مونی ہان کی تصویر والا صفحہ میری آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے ڈاڑھی صاف کرا دی ہے!"

"اور تمہارے قبضے سے برآمد ہونے والے ریوالور سے کہاں فائر کئے گئے تھے؟"

"مجھے علم نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ ریوالور مجھے سڑک کے کنارے پڑا ہوا ملا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ آزادی کے چکر میں میں بدترین صورتحال سے دوچار ہو چکا تھا اور کوئی معجزہ ہی مجھے ننے مصائب سے نجات دلا سکتا تھا۔ لہٰذا پولیس افسر کے ہر سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دینے کی ضرورت تھی۔

"تم اس طرف کیا کرتے پھر رہے تھے؟"

"میرا ایک دوست مذاق ہی مذاق میں برسلز سے باہر ایک ویران شاہراہ پر چھوڑ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ کب کا قصہ ہے؟"

"شام.... رات کے آٹھ نو بجے کا۔" میں نے جلدی سے وقت میں تاخیر کرتے ہوئے کہا۔

"اور رات نو بجے سے صبح چار بجے تک تم اسی شاہراہ پر چہل قدمی کرتے رہے؟" پولیس افسر نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ "برسلز میں اپنی قیامگاہ کا پتہ بتاؤ ساتھ ہی اپنے مسخرے دوست کا بھی نام پتہ لکھواؤ۔"

"میں آج ہی برسلز پہنچا تھا۔ میرے دوست کا نام جیمز ہیکاک ہے وہ مجھے لینے ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا اس کے بعد وہ بے مقصد مجھے شہر میں گھماتا رہا اور آخر کار شاہراہ پر اتار کر بھاگ گیا۔" میں نے پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میں اس بے ہودہ کہانی پر یقین کر لوں گا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"خاصی مضحکہ خیز کہانی ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن جیمز ہیکاک مل جائے تو وہ میری بھرپور تائید کرے گا۔"

"میرا دعویٰ ہے کہ جیمز ہیکاک تمہارے دماغ کی پیداوار ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "کان کھول کر سن لو کہ تم بہت خطرناک صورتحال سے دوچار ہو چکے ہو اور اس وقت دوہرے قتل کی ایک واردات کے مشکوک ملزم کے طور پر حراست میں ہو!"

"قتل؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں — جس مقام سے تم ٹرک میں سوار ہوئے تھے اس سے برسلز کی جانب کلومیٹر دور جھاڑیوں میں دو لاشیں پائی گئی ہیں۔ لاشوں میں سے برآمد ہونے والی گولیاں تمہارے بارے میں بہتر گواہی دے سکیں گی۔"

میں نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے سارا زورِ بیان صرف کر دیا مگر اس کے سامنے میری ایک نہ چلی۔ اس نے میرا بیان لیا جو میں نے ڈونی ہان کے نام سے ہی دیا۔ بیان پر دستخط لینے کے بعد اس نے مجھے حوالات میں بھجوا دیا۔

وہ کوٹھری خاصی صاف ستھری اور گرم تھی جہاں فرش پر ایک گدا کمبل سمیت موجود تھا مجھ پر اس قدر تکان طاری تھی کہ بستر دیکھ کر میں صبر نہ کر سکا اور فوراً ہی لمبی تان کر سو گیا۔

مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کیا گیا تو میں خاصی نیند لے چکا تھا اور اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

مجھے منہ ہاتھ دھونے کا موقع دیئے بغیر ہتھکڑیاں لگا کر حوالات سے نکال لیا گیا۔ چند منٹ بعد میں کانفرنس ہال نما ایک وسیع و عریض کمرے میں پولیس کے باوردی اعلیٰ حکام کے روبرو موجود تھا جو مجھ سے باز پرس کے لیے بے چین تھے۔

باز پرس کا آغاز خلافِ توقع نہایت شرافت اور نرمی سے ہوا۔ کافی دیر کی جرح کے بعد مجھے بتایا گیا کہ جھاڑیوں سے ملنے والی دونوں لاشوں میں سے کل چار گولیاں برآمد کی گئی تھیں جبکہ میرے پاس سے برآمد ہونے والے ریوالور کے چیمبر میں چار گولیاں کم تھیں اور دونوں کی موت اسی کلیبر کے ریوالور سے واقع ہوئی تھی جو میرے قبضے میں تھا۔ میں اپنے اوسان پر قابو رکھتے ہوئے اپنی مدافعت کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ میرے ذاتی کوائف اور پھر آلۂ قتل کی برآمدگی ایسے مضبوط ثبوت تھے کہ میں دوہرے قتل کے الزام سے کسی طرح نہیں بچ سکتا تھا۔

مجھ سے سوال و جواب کا سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ وہ میرے ماضی کے بارے میں کریدتے رہے۔ مگر میں نے اس سے آگے کچھ نہ بتایا کہ میں فرانس کا شہری تھا اور میری رہائش پیرس میں تھی۔ جب وہ اس سے آگے نہ اگلوا سکے تو مجھے چند ماہرین کے حوالے کر دیا گیا جو میری تصاویر بنانے اور نشاناتِ انگشت لینے میں مصروف ہو گئے۔

دوپہر کے قریب مجھے دوبارہ حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد مغربی طرز کا بے ذائقہ کھانا دیا گیا جو ان حالات میں من و سلویٰ سے کم نہ تھا۔ پھر شام کو ایک حیرتناک خبر کے ساتھ محافظ نے حوالات کا دروازہ کھولا۔ میری ضمانت پر رہائی کے احکام آ گئے تھے۔

اس خبر پر مجھے اس وقت تک یقین نہ آ سکا جب تک محافظ نے دروازہ کھول کر مجھے ملاقاتی کمرے میں نہ پہنچا دیا گیا۔

وہاں تھانے کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ گھومنے والی کرسی پر ایک دراز قد مقامی موجود تھا جس کے انداز سے ہی رعونت نمایاں تھی۔

"چلو!" اس شخص نے مجھے دیکھتے ہی تحکم آمیز سخت لہجے میں کہا اور پولیس افسر سے ہاتھ ملا کر نکاسی کے راستے کی طرف چل دیا۔

میں حیران و پریشان اس کے پیچھے ہو لیا۔ میرے لیے وہ اجنبی تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرا ضامن کیوں بنا۔ تھانے کی عمارت کے باہر ایک بڑی سفید کار موجود تھی جس میں باوردی شوفر بھی موجود تھا۔ وہ شخص مجھے ساتھ لے کر عقبی نشست پر بیٹھ گیا اور کار روانہ ہو گئی۔

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا اپنے محسن کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

وہ بے فکری سے سگار سلگا کر کسی سوچ میں ڈوب گیا تو مجھے پہل کرنی پڑ گئی۔

"میں اپنے محسن کا نام جان سکتا ہوں؟" میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"خاموش بیٹھو!" وہ قہر آلود لہجے میں غرایا۔

اس کا انداز اس قدر حوصلہ شکن تھا کہ میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

سفید کار سبک رفتاری سے ہموار سڑک پر دوڑتی رہی۔ کافی دیر تک ویران سڑک پر سفر کرنے کے بعد کار شہر کے پُرہجوم علاقے میں داخل ہوئی اور مختلف سائن بورڈ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ہم برسلز میں داخل ہو چکے ہیں۔

برسلز کا ایک وسیع و عریض مکان ہماری منزل ثابت ہوا۔ وہاں گٹھے ہوئے جسم والا ایک سفید فام ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے دراز قامت کو نہایت احترام سے خوش آمدید کہا اور وہ مجھے گٹھے ہوئے جسم والے کے حوالے کر کے اندر چلا گیا۔

گٹھے ہوئے بدن والا اس وقت تک برآمدے میں رکا رہا جب تک دراز قامت اندر نہ چلا گیا۔ پھر مجھے آنکھ مارتے ہوئے مسکرا دیا۔

"تم انگریزی جانتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تھوڑی بہت مگر گالیاں بہت ساری جانتا ہوں!" اس کی انگریزی واقعی قابلِ رحم تھی۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" میں اس شخص کو پہلی ہی نظر میں پسند کرنے لگا تھا۔

"صورت سے کیا لگتا ہے؟"

"گینڈا ہونا چاہیے۔" اس سے شہہ پا کر میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"بندق ہو۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "مجھے بُل کہتے ہیں۔"

"بُل بھی بہت مناسب ہے۔ بس سینگوں کی کسر ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم خوش مزاج ضرور ہو مگر پہلی ملاقات میں اتنی بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

"پہلی ملاقات کیسی، میں تو اب شاید یہیں قیام کروں گا۔"

"آؤ تمہارا کمرہ دکھا دوں۔" وہ اندر چلتے ہوئے بولا۔ "اس عمارت میں میرے علاوہ کسی کے سامنے خوش مزاجی نہ دکھانا ورنہ کسی دن تک جبڑوں کی مالش کراتے رہو گے۔"

"بڑے خونخوار لوگ ہیں۔"

"باس اپنے علاقہ کا بہترین باکسر رہا ہے اور اس چھت کے نیچے تمہیں مالی سے باورچی تک سب ہی اعلیٰ درجے کے باکسر ملیں گے!"

"تمہارا باس کیا کرتا ہے؟" میں نے آراستہ راہداری سے گزرتے ہوئے سوال کیا۔

"اسی سے پوچھ لینا۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

مجھے جو خوبصورت اور آراستہ کمرہ دکھایا گیا وہاں خوابگاہ کے تمام لوازمات موجود تھے اور سرہانے ایک خوبصورت سا ریڈیو بھی موجود تھا۔

"یہاں خورد و نوش کا کیا انتظام ہے؟" میں نے بُل سے سوال کیا۔

"سب کچھ ملے گا۔ ناشتہ سات بجے، لنچ دو بجے اور ڈنر آٹھ بجے!" وہ یہ کہتے ہوئے واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"وقت ملے تو دوبارہ چکر لگا لینا۔" میں نے چلتے چلتے اس سے درخواست کی جسے اس نے مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا۔

خوابگاہ کے جائزے سے فارغ ہو کر سب سے پہلے میں نے گرم پانی سے کافی دیر تک غسل کیا پھر بستر پر لیٹ گیا۔

بُل کا باس میرے لیے شدید ذہنی الجھن کا سبب بنا ہوا تھا۔ اس نے بالکل غیر متوقع طور پر میری ضمانت کرا کے حوالات سے مجھے نجات دلائی تھی مگر میرے ساتھ اس کا رویہ قطعی مربیانہ تھا جس کے باعث میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اسے دوستی کے خانے میں فٹ کروں اگر اس کا تعلق میرے دشمنوں سے ہوتا تو وہ مجھے ضمانت پر رہائی دلانے کے بجائے حوالات میں ہی سڑنے دیتا مگر دوسری طرف معاملہ اس سے بھی پیچیدہ تھا۔

فرانس سے میری روانگی انتہائی رازداری کے ساتھ عمل میں آئی تھی۔ اگر معاملہ اسی قدر ہوتا کہ مجھے برسلز پہنچ کر کسی سے رابطہ قائم کرنا تھا تو اس کے لیے میکفرسن کی شمولیت غیر ضروری تھی۔ لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہوا کہ میری گرفتاری کے فوراً بعد برسلز میں کسی کو یہ علم ہو گیا کہ اس کا ایک دوست دشواری سے دوچار ہے۔

اور اگر وہ میرے دوستوں میں سے ہی تھا تو اسے جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ راستے میں ہی مجھے اعتماد میں لے سکتا تھا۔

میں اس بارے میں جس قدر سوچتا رہا اسی قدر الجھتا چلا گیا۔ وہ شخص اپنی روش کے اعتبار سے نہ دوست سمجھا جا سکتا تھا نہ دشمن!

رات کے کھانے پر دربان کے علاوہ اس عمارت کے جملہ مکین میز پر موجود تھے۔ وہ سب ہی مردِ تھے اور کسرتی جسموں کے مالک بھی!

کھانے کی میز پر کل سات افراد تھے اور سب ہی اجنبیوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے لوگوں سے میرا تعارف کرانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی تھی۔

"ڈونی ہان!" کھانے کے دوران باس نما شخص نے اچانک مجھے پکارا اور میں لقمہ چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ باقی افراد مشینی انداز میں سر جھکائے کھانا کھاتے رہے جیسے وہ آواز ان کے کانوں میں نہ پہنچی ہو۔

"کھانے کے بعد تم میرے کمرے میں آ جانا!" اس نے اپنا فرمان سنایا۔

"بہتر جناب!" میں نے سعادت مندی سے کہا اور کھانا کھانے میں

معروف ہوگیا۔ مجھے خوشی تھی کہ جمود ٹوٹنے کے آثار پیدا ہوتے تھے۔ اس سے بات کر کے میں بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے پر پتہ چلا کہ بل میرے غائب تھا باس کہلانے والا شخص بھی نشے کر ایک طرف چل دیا۔ باقی لوگ میرے لیے اجنبی تھے اور نہ ہی مجھے اس خود ساختہ باس کے کمرے کا علم تھا۔

چند ثانیوں تک تذبذب کا شکار رہنے کے بعد میں نے قریب جا کر نرمی سے شوفر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس نے پھرتی سے پلٹ کر میری ناک پر ایک زوردار ٹکر جڑ دیا۔ فوری طور پر میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ بقیہ لوگ زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔

شاید لوگ نہ ہنستے تو میں چوٹ سہہ جاتا مگر اتنی کھلی توہین کو برداشت کر جانا سراسر بزدلی تھی۔ لہٰذا میں نے پلٹ کر پوری قوت سے شوفر کے پیٹ پر لات رسید کی اور وہ کراہتا ہوا دوہرا ہوگیا۔ میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے دونوں جبڑوں پر یکے بعد دیگرے (...) تی سکے بجائے وہ پیٹ تھامے قالین پر گر گیا۔

ہنسنے والے فرطِ حیرت سے اپنی ہنسی بھول گئے! اسی وقت بل کہیں سے آ نکلا اور اس نے میرا اپنا ہاتھ یوں فضا میں اٹھا دیا جیسے میں نے کوئی باقاعدہ مقابلہ جیتا ہو۔

میری فتح کے اس احمقانہ اعلان کے بعد وہاں موجود سب لوگوں نے پہلی بار مجھ سے ہاتھ ملائے۔ بل مجھے ہر ایک کا نام بتاتا جا رہا تھا گویا وہ پہلی رسمی تقریبِ تعارف تھی۔

آخر میں شوفر بھی قالین سے اٹھ کر میری طرف آیا اور بڑے تپاک سے مصافحہ کر کے ایک طرف چل دیا۔

بھیڑ چھٹنے کے بعد میں بل کے ساتھ تنہا رہ گیا تو اس پر برس پڑا۔

"یہ کیا بیہودگی تھی۔ یہ مکان ہے یا اچھا خاصا پاگل خانہ؟"

"آہستہ بولو!" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں باس کی مرضی شامل ہے وہ تمہاری صلاحیتیں آزمانی چاہتا ہے!"

"خواہ میں زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتا۔" میں اپنی ناک سہلاتے ہوتے بولا۔

"ناک کی ہڈی ٹوٹنے سے کوئی معذور نہیں ہوتا۔" وہ میرے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "چلو باس کے کمرے میں جاؤ ورنہ وہ بھی آتے ہی شروع ہو جائے گا۔"

"کمرہ کدھر ہے اس کا؟" میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے سوال کیا۔

بل مجھے دور ہی سے اس کا مطالعہ کا کمرہ دکھا کر واپس چلا گیا۔

کمرے میں میرے قدموں کی آہٹ سن کر باس نے سر اٹھایا اور مجھے اپنے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" اس نے سگار کا کش لیتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے ابھی تک یہی پتہ نہیں چل سکا کہ میں دوستوں میں ہوں یا دشمنوں میں!" میں نے اپنے لہجے کی تلخی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"دشمن دوہرے قتل کے ملزموں کی ضمانت نہیں کراتے۔" اس وقت وہ خلافِ توقع پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

"پھر بھی میں تمہارے بارے میں مزید جاننا چاہتا ہوں!"

"بس یہ یاد رکھو کہ میرا نام شین مارکیڈو ہے!" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "اور اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس دوہرے قتل کا کیا قصہ ہے؟"

"شین مارکیڈو!" میں نے اس کا نام زیرِ لب دہرایا پھر سوال کیا۔ "تمہارا کس تنظیم سے تعلق ہے؟"

"شاید یہاں میسر آنے والے سکون نے تمہارے اعصاب پر خوشگوار اثرات مرتب کیے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں نے تم سے دوہرے قتل کے بارے میں دریافت کیا ہے!"

"اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں!" میں نے اس کے انداز کے نتیجے میں ہٹ دھرمی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"پھر شاید میں نے تمہاری ضمانت کرا کے غلطی کی ہے۔ میں قاتل کے تحفظ میں دلچسپی رکھتا ہوں۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

اس حد تک بات ہونے کے بعد میں یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا (کہ وہ) جو بھی ہو کم از کم فلسطینیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن (سوال) پیدا ہوگیا تھا کہ اگر وہ فلسطینیوں کا دوست نہیں تھا تو اسے میکا(فرسن) اور رونالڈ کے قاتل سے کیوں ہمدردی ہوگئی تھی!

"اگر تمہاری ہمدردیاں اصلی قاتل کے ساتھ ہیں تو تمہیں عالم (...) رنج کرنا ہوگا۔" میں نے خائف ہوتے بغیر جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میرے جواب نے اسے چونکا دیا۔

"رونالڈ اور میکفرسن نے ایک دوسرے کو ہلاک کیا تھا۔ میرے (پاس) تو سرے سے ہی اسلحہ موجود نہیں تھا۔"

"مگر چار فائر تمہارے ریوالور سے ہی کیے گئے ہیں۔"

"وہ ریوالور میں نے میکفرسن کی لاش سے حاصل کیا تھا۔" (...) اعتماد سے جواب دیا۔

"پوری کہانی سناؤ!"

میں نے بروسلز کے اسٹیشن پر اترنے سے پولیس اسٹیشن (تک کی) پوری کہانی سن و عن دہرا دی۔ البتہ میکفرسن اور رونالڈ کے (...) اپنا تذکرہ گول کر دیا۔ اور اسے یہی تاثر دیا کہ وہ دونوں آپس میں (لڑتے) ہوتے مارے گئے جبکہ میں محض ایک تماشائی بنا رہا کیونکہ (میرے) بارے میں ان کے عزائم یکساں نہ تھے۔

"تمہارے بارے میں عزائم یکساں تھے؟" شین مارکیڈو نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں — رونالڈ کسی مادام بواری کے حوالے سے مجھے پکڑنا چاہتا تھا جبکہ میکفرسن کا کہنا تھا کہ وہ مجھے خود اس خاتون تک پہنچائے گا۔"

"میکفرسن تمہیں بروسلز کیوں لایا تھا؟"

"یہاں آنے تک تو میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ میری مدد کر رہا ہے!" میں نے جواب دیتے ہوئے اپنے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی سرایت کرتی محسوس کی کیونکہ تمام تر احتیاط کے باوجود شین مارکیڈو نے اپنے اس سوال سے اپنی اصلیت کا اظہار کر دیا تھا۔

فلسطینیوں سے تعلق رکھنے والے فرد کی حیثیت سے اس کو میری بروسلز آمد کا مطلب معلوم ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس بارے میں لاعلم تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مادام بواری یعنی ایلیزا کی ماں کی جانشین اپنے عہد پر عمل کر رہی تھی۔ وہ مجھے پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے اپنی قید میں سسکا سسکا کر ہلاک کرنا چاہتی تھی۔

شین مارکیڈو یقیناً مادام بواری کا ہی آدمی تھا اور اس نے محض اپنی مالکن کے حکم پر میری ضمانت کرائی تھی تاکہ مجھے طشتری میں سجا کر مادام بواری کو پیش کر سکے۔

"مادام بواری کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"بہت کچھ جانتا ہوں۔" میں نے نئی صورتحال کے پیشِ نظر حوصلہ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پیرس میں میرے ذاتی مراسم رہے ہیں۔"

"تم بکواس کرتے ہو!" وہ بے اعتمادی سے بولا۔

"تمہیں یقین نہیں آسکتا کیونکہ تم اس کا حکم بجا لانے والے غلام ہو اور میں اس کا خلوت کا بہترین دوست تھا۔"

"تمہاری یہ ساری لاف و گزاف کل تک دھری کی دھری رہ جائے گی!" وہ مٹھیاں بھینچ کر غصیلے لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے خصوصی احکام نہ ملے ہوتے تو تمہاری پسلیاں اپنے ہاتھوں سے توڑ دیتا۔"

"عورت کی سربراہی میں کام کرنے کا یہی نقصان ہے اور میری ضمانت لے کر تم ویسے بھی مجبور اور معذور ہو چکے ہو۔"

"اس خیال میں بھی نہ رہنا — میں من مانی پر اترتا تو ضمانت بھی آڑے نہ آسکے گی۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"شاید بلجیم کی وزارتِ قانون تمہارے ہی تابع ہے۔"

"اس مکان پر حملہ کر کے کچھ لوگ تمہیں اغوا کر سکتے ہیں۔" وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "پڑوسی حملے کی گواہی دیں گے اور پولیس میری رپورٹ پر تمہیں تلاش کرتی رہے گی جبکہ تم کسی خفیہ مقام پر اپنے مقدر کا لکھا جھیل رہے ہوگے!"

میرے لیے بس یہی جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے دشمن کی چھت کے نیچے رہ رہا ہوں وقت آیا تو اور باتیں بھی بھگت لی جائیں گی۔"

"مگر یہ یاد رکھنا کہ اس مکان سے فرار کی کوشش تمہیں اپاہج کر دے گی۔" وہ یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گیا۔ "شرافت سے رہو گے تو وقت پورا ہونے تک کسی چیز کی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"یہ مجھے اس مکان میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوگیا تھا۔" میں یہ کہہ کر شین مارکیڈو کے مطالعہ کے کمرے سے نکل آیا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو وہاں بل میرے بستر پر دراز ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"تمہارا منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے سوال جڑ دیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ باس سے بھی مقابلہ ہوا ہے۔"

"یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بیزاری کے عالم میں کہا۔

"ضرور آرام کرو مگر رات کو ذرا ہوشیار سونا۔" وہ میرے بستر سے (اٹھ)تے ہوئے مضحکہ خیز صورت بنا کر بولا۔ "خواب میں ٹکر بازی کرنے (والا) نہ کا۔"

میں سنجیدگی سے اسے دبوچنے کے لیے آگے بڑھا مگر وہ تیزی کے ساتھ میرے کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

شین مارکیڈو سے ہونے والی گفتگو میرے لیے اس اعتبار سے نہایت پریشان کن تھی کہ پیرس میں لاکھ جتن کرنے کے باوجود میں مادام بواری کے چنگل سے نہ بچ سکا تھا۔ مجھے رہ رہ کر ایلیزا کے الفاظ یاد آتے تھے کہ اس کی ماں کی جانشین مجھے دنیا کے کسی بھی گوشے میں ڈھونڈ نکالنے کی اور ان الفاظ کے ساتھ ہی جب میرے ذہن میں شاہدہ کی تصویر ابھری تو میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا کہ شاہدہ ہی مادام بواری تھی یا اس نام کے پردے میں کوئی اور شخصیت پوشیدہ تھی۔

وقت رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ میں فرانس سے نکلنے میں ضرور کامیاب ہوگیا تھا مگر اب بلجیم میں حالات میری راہ میں حائل ہوگئے تھے اور اپنے ہمدردوں سے میرا رابطہ یکسر ختم ہو چکا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میری سینا کہاں اور کن حالات میں میری منتظر تھی۔

وہ لیبیا ضرور پہنچائی گئی تھی مگر میرے مخدوش حالات کے پیشِ نظر میری اور اس کی ملاقات کے لیے کسی محفوظ تر مقام کا تعین کیا گیا تھا اور جن لوگوں کو اس مقام کے بارے میں علم تھا وہ رونالڈ کی بے وقت دخل اندازی کے سبب مجھ سے بچھڑ چکے تھے۔

ان ہی خیالات میں غلطاں میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری نیند نہ جانے کتنی دیر قائم رہی کہ میرے کانوں میں فائرنگ کا شور گونجنے لگا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو آناً فاناً میں غنودگی رفو چکر ہوگئی۔

عمارت کے مختلف حصوں میں فائرنگ اور دھما چوکڑی کا شور گونج رہا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً شین مارکیڈو کے الفاظ گونجنے

لگے۔ شاید میری آزادی کی مہلت پوری ہو چکی تھی اور ملازم پولیس کے جاری مصنوعی حملے کی آڑ میں مجھے اغوا کرنے آ پہنچے تھے تاکہ شین مارکیڈو کی ضامن کی حیثیت پر حرف لاتے بغیر مجھ سے بھرپور انتقام لیا جا سکے۔

مصنوعی حملے کا خیال آتے ہی فائرنگ کا خوف جاتا رہا اور میں اطمینان سے کمرے سے باہر نکلا مگر اسی وقت کسی طرف سے گولی آئی اور میرا بازو ادھیڑتی ہوئی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ میں بازو تھام کر واپس کمرے میں گھس گیا۔

وہ یقینی طور پر کوئی مصنوعی حملہ نہیں تھا۔ اندر سے ابھرتی عالی دردناک انسانی چیخیں بتا رہی تھیں کہ اس عمارت میں کوئی حقیقی خون آشام معرکہ چھڑا ہوا ہے۔

اچانک تاریکی میں کوئی سایہ دوڑتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ نہ جانے یہ آنے والے کی بینائی کا کمال تھا یا میری سمت رفتار حرکت کا اس نے بستر سے بیٹھتے بیٹھتے میرا بازو تھام لیا اور سرگوشیانہ آواز میں بولا۔ "جلدی نکلو، اس وقت پوری عمارت نرغے میں ہے۔"

وہ ہیجان آمیز سرگوشیانہ آواز پہچان کر میں چونک پڑا اور مشینی انداز میں آنے والے کے ساتھ نکاسی کے راستے کی طرف دوڑ پڑا۔

میں اس کے ہمراہ تاریکی میں دوڑتا ہوا دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اچانک دو گولیاں اس طرف آئیں۔ ایک دروازے کی چوبی چوکھٹ میں پیوست ہو گئی اور دوسری ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔ میں بھڑک کر واپس ہو لیا اور کھلے دروازے کے سامنے ہٹ کر دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

"کہاں چلے گئے؟" تاریکی میں بل کی جھلائی ہوئی سرگوشیانہ آواز ابھری۔

"تم بھی ادھر آ جاؤ۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں تو دائیں بازو پر زخم کھا چکا ہوں۔ اندھیرے میں تم بھی ناگہانی مارے جاؤ گے۔"

وہ تاریکی میں ٹٹولتا ہوا میرے پاس آ پہنچا۔

"یہ فائرنگ کیسی ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"سارا فساد تمہاری وجہ سے ہے۔ تمہیں شین مارکیڈو کے قبضے سے نکال لے جانے کے لئے اس عمارت پر بھرپور حملہ کیا گیا ہے۔"

"تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ آج کی رات کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔" اس نے ہیجان آمیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے پہلے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ رات کو ہوشیار سونا۔"

"میں تو اسے مذاق ہی سمجھا تھا۔ تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ خواب میں لگے بازی کرنے لگو گے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس فائرنگ کو بھی مذاق ہی سمجھتے رہو۔" اس کے لہجے سے بےزاری عیاں تھی۔

"شین مارکیڈو نے مجھے اپنا منصوبہ سمجھایا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے میری ضمانت لی ہوئی ہے اس لئے قانونی طور پر وہ میری سلامتی کا بھی ذمہ دار ہے۔ اس ذمہ داری سے پہلو بچانے کے لئے اس نے اپنے مکان پر مصنوعی حملے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ اس کے آدمی ہنگامہ کر کے مجھے یہاں سے اٹھا لے جاتے اور شین مارکیڈو پولیس میں میرے اغوا کی رپورٹ درج کرا دیتا۔ درحقیقت میں اسی کی خفیہ قید میں اس کے رحم و کرم پر ہوتا۔"

"تو تمہاری دانست میں یہ حملہ مصنوعی ہے؟"

"اندھا دھند فائرنگ سے شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ مصنوعی حملہ ہوتا تو گولیاں محفوظ بلندی پر چلائی جاتیں مگر اب تو خون سوار معلوم ہوتا ہے۔"

"تم نرے احمق ہو۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں شین مارکیڈو کے لئے کام ضرور کرتا ہوں مگر میری وفاداریاں کسی اور کے لئے وقف ہیں۔ وہ لوگ تمہارے ہمدرد ہیں۔ یہ حملہ انہوں نے شروع کیا ہے۔"

"واقعی!" میں نے تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔ اس حملے کی حقیقت کو میری رگ و پے میں سنسنی سرایت کر گئی تھی۔

"وہ بہت بھاری تعداد میں حملہ آور ہوئے ہیں اور اس عمارت کے مکینوں پر کڑا وقت آیا ہوا ہے۔ تم یہاں چھپ کر وقت برباد کر رہے ہو۔"

"تو کیا وہ لوگ اندر گھس آئے ہیں؟"

"ابھی باہر ہی مورچے جمے ہوئے ہیں۔ کسی بھی لمحے عمارت کے اندر گھمسان کا آغاز ہو جائے گا۔ ہمیں اس سے پہلے ہی باہر نکل جانا چاہئے۔"

"پھر میرے اوپر دو بار۔۔۔ فائر کس نے کیا تھا؟"

"وہ شین مارکیڈو کا ہی کوئی آدمی ہو گا۔ اس چھت کے نیچے رہنے والے ہر شخص کو تم پر کڑی نظر رکھنے کا حکم ملا ہوا ہے۔"

"اگر وہ ہتھیار سنبھالے باہر اندھیرے میں ہی موجود ہے تو ہم اس سے باہر کیسے نکلیں گے؟"

"حملہ آوروں نے عمارت کا مین سوئچ تباہ کر دیا ہے ورنہ روشنی میں کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا زخم کتنا کاری ہے؟"

"زخم خاصا گہرا ہے مگر تم اس کی فکر نہ کرو۔ باتھا پائی کی بھی ازخود تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"پھر میں اسے آواز دیتا ہوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

"وہ ادھر آئے تو پہلے ہی ہلے میں اس کا کام تمام کر دینا۔" اس نے سرگوشیانہ انداز میں کہا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"باہر کون ہے؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد دروازے سے بل کی آواز سنائی دی۔ اس نے سوال بگڑی ہوئی انگریزی میں ہی کیا۔

"سامنے تو آؤ بتاتا ہوں۔" باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں شین مارکیڈو کی زہر میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی اور بل آواز پہچان کر مضطرب ہو گیا۔

"میں باہر آ رہا ہوں باس۔" اس نے لکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ضرور آؤ۔ میرا نشانہ اندھیرے میں بھی بے خطا ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔

"مجھ سے کیا قصور ہوا ہے باس؟" بل کی آواز میں دہشت نمایاں تھی۔

"وہ سب آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے ہیں اور تم اس مردود کے کمرے میں گھسے ہوئے ہو۔" اس بار شین مارکیڈو کی آواز قدرے قریب سے ابھری۔

"میں بدحواسی میں ادھر دوڑا آیا تھا۔" بل کا لہجہ رو دینے والا تھا۔ "سوتے میں فائرنگ کا شور سن کر ادھر ہی خیال گیا کہ کہیں قیدی نے فرار کی کوشش نہ کر ڈالی ہو۔"

"تو ابھی تک اندر کیوں مرے ہوئے ہو؟" شین مارکیڈو کا لہجہ بپھرا ہوا تھا۔ "اسلحہ سنبھال کر باہر نکلو۔ وہ اندر گھسنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔"

شین مارکیڈو کا فقرہ پورا ہونے سے پیشتر ہی بل نے زور سے میرا بازو دبایا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

میں اندھیرے میں وہاں ششدر کھڑا رہ گیا۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ بل نے میرا بازو اضطراری طور پر دبایا تھا یا اس طرح مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں نے ایک لحظے کے لئے سوچا اور پھر میرے قدم نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گئے۔

میں دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اندھیرے میں کسی پستول کی آہنی نال پوری سختی سے میرے سینے سے آ لگی اور اسی کے سہارے مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے سامنے شین مارکیڈو کا دراز قامت اور دبلا پتلا ہیولا دیکھا اور پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔

میں عجلت اور گھبراہٹ میں تھا جبکہ وہ پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے اپنا پستول والا داہنا ہاتھ پھرتی سے پیچھے کھینچ لیا اور اسی کے ساتھ پوری قوت سے میرے چہرے پر بائیں ہاتھ کا مکا رسید کیا اور میں کراہ کر پیچھے الٹ گیا۔

مگر شین مارکیڈو نہایت پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے مجھے زمین بوس ہونے سے قبل ہی گریبان کے سہارے تھام لیا۔ شاید اس اثنا میں پستول وہ اپنی جیب میں منتقل کر چکا تھا۔ کیونکہ اس نے ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑا ہوا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ مشینی انداز میں میرے چہرے پر مکے برسانے لگا تھا۔

مکوں کی اس وحشیانہ بوچھاڑ نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ اس وقت پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ غلط موقع پر کسی باکسر کے نرغے میں آ جانا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔

اس عمارت کے مختلف حصوں میں فائرنگ جاری تھی۔ اکا دکا انسانی چیخیں بھی اسلحہ کے خون آشام آہنگ میں شامل ہو جاتی تھیں اور پھر شین مارکیڈو کے ہاتھوں مکے کھاتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے باہر یکے بعد دیگرے متعدد دستی بم پھٹ رہے ہوں۔

میں نے اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کرتے ہوئے شین مارکیڈو کے پیٹ میں پوری قوت سے ضرب لگائی۔ اس کے حلق سے ایک آواز ضرور برآمد ہوئی مگر وہ پیٹ کی ضرب باسانی سہہ گیا۔ میں نے دو تین مرتبہ اس کے چہرے کو مجروح کرنے کی بھی کوشش کی مگر وہ خبیث کسی سائے کی طرح اپنے قدموں پر جھولتے ہوئے میرے وار خالی دیتا رہا۔

تب اس نے میرا گریبان چھوڑ کر دونوں ہاتھ استعمال کرنے شروع کئے تو میرے گرد کہکشاں رقص کرنے لگی۔ اور میں لہراتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلنے کا سبب تکلیف کا شدید احساس تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں آنکھ میں درد کے باعث ہوش میں آیا تھا مگر چہرہ چھونے پر پتہ چلا کہ شین مارکیڈو کے وحشیانہ مکوں نے میرا پورا چہرہ سُجا ڈالا تھا۔ میں نے تاریکی میں کسی کو پکارنا چاہا تو جبڑوں میں درد سے میری جان نکل کر رہ گئی۔ اندھیرے اور تکلیف کے باوجود یہ احساس قدرے تسلی بخش تھا کہ میری کمر کے نیچے ننگے فرش کے بجائے نرم بستر موجود تھا۔ اور بدن پر اونی کمبل بھی پڑا ہوا تھا۔

میں کئی منٹ تک بستر پر خاموش پڑا انگلیوں سے اپنے جبڑوں کی مالش کرتا رہا۔ اس دوران مجھے اپنے چہرے پر خاصی ٹوٹ پھوٹ کا بھی علم ہوا۔ کئی جگہ سے جلد ادھڑی ہوئی تھی جس پر خشک خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

شین مارکیڈو نے مجھے سونے کے لئے آرام دہ بستر تک تو پہنچا دیا تھا مگر میرے زخموں کی مرہم پٹی کو ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میرے لئے گردن گھمانا دشوار تھا لہٰذا میں نے بہت آہستہ آہستہ کروٹ بدل کر اس کمرے کا جائزہ لیا تو ایک دیوارگیر بلب کی مدھم روشنی میں کمرے کی ابتر حالت سامنے آئی۔

وہ کمرہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ اس کی دیواروں کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ اور چوبی دروازے پر سے وارنش کی پپڑیاں اتری ہوئی تھیں۔ لے دے کر میرا بستر ہی قدرے بہتر حالت میں تھا اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کمرہ کافی عرصہ سے ویران پڑا ہوا تھا مگر میری وجہ سے اسے ہنگامی طور پر قابل استعمال بنایا گیا تھا۔

میں نے بے ہوشی سے قبل کے واقعات یاد کئے تو یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ میں شین مارکیڈو کا ہی قیدی تھا یا اس کے مکان پر حملہ آور ہونے والے مجھے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اسی ضمن میں مجھے بل اور شین مارکیڈو کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد آئی جو انگریزی میں ہوئی تھی۔

بل کی انگریزی بہت کمزور تھی جب کہ ڈچ زبان وہ نہایت روانی سے بولتا تھا۔ اس کی جانب سے انگریزی کا استعمال تو جواز رکھتا تھا لیکن اس طرح وہ مجھے ساری صورتحال سے واقف رکھنا چاہ رہا تھا مگر شین مارکیڈو کی زبان سے مسلسل انگریزی کا استعمال حیرت ناک تھا۔ اسے فطری طور پر کوئی ایسی زبان استعمال کرنی چاہئے تھی جو بل بہتر طور پر سمجھ سکتا مگر میرے لئے اس کا ہر لفظ اجنبی ہوتا۔

اسی وقت کسی جانب سے قدموں کی چاپ سنائی دی جو بتدریج واضح

ہوتی چلی گئی اور پھر دروازہ کھول کر ایک لڑکی میرے کمرے میں آ گئی۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

میں نے اس کی مسکراہٹ کا کوئی اثر لئے بغیر غور سے اس کا جائزہ لیا۔ خاصی خوبصورت اور متناسب بدن کی مالک تھی۔ سیاہ آنکھوں پر شفاف شیشوں کی رِم لیس عینک موجود تھی اور اوور کوٹ کے نیچے اس نے نیچے گلے کا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔

میرے بستر سے چند قدم کے فاصلے پر وہ رک گئی اور ملائم آواز میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

"انگریزی کے سوا کوئی زبان نہیں چلے گی" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"بہت بیزار نظر آتے ہو" اس نے مسکرا کر سلجھی ہوئی انگریزی میں کہا۔

"چہرہ اُدھڑا ہوا ہو تو شاید تم بھی اپنی خوش مزاجی برقرار نہ رکھ سکو گی" میں نے منہ بنا کر تلخ لہجے میں کہا۔

"کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟" اس نے سادگی سے سوال کیا۔

"اگر تمہارا تعلق اسی عمارت سے ہے تو تمہیں میرے بارے میں خاصی معلومات ہونی چاہئیں" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میرا اس عمارت سے تعلق ضرور ہے مگر میں تھوڑی دیر پہلے ہی ڈیوٹی پر آئی ہوں" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

اس کی زبان سے ڈیوٹی کا لفظ سن کر میں چونک پڑا اور محتاط لہجے میں سوال کیا۔

"یہ کونسی جگہ ہے؟"

"ذہنی معذوروں کا شفاخانہ ہے" اس نے آگے بڑھے بغیر کہا۔

"پاگل خانہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے؟" میں نے زہرآلود لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ مجھے یہاں کون لایا تھا؟"

"مجھے چیف میٹرن سے معلوم کرنا ہوگا" اس کا لہجہ بدستور مصالحانہ بلکہ معذرت آمیز تھا۔ "مجھے خود حیرت ہے کہ تم یہاں کیوں ہو؟"

"تمہاری دانست میں کہاں ہونا چاہئے تھا؟"

میرے جارحانہ لہجے پر وہ مغموم سی ہو گئی۔ "گفتگو سے تو صحیح الدماغ لگتے ہو، پتہ نہیں یہاں کس چکر میں پہنچا دیئے گئے ہو۔ یہاں آنے والے مریض ذہنی طور پر خطرناک ہوتے ہیں اور عام طور پر ان کے ورثا اسی وقت اِدھر کا رُخ کرتے ہیں جب انہیں اپنی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگتی ہے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ "بیٹھ جاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے تلخ کلامی کرتا رہا۔ تم مجھے بے گناہ نظر آتی ہو۔"

اس کا چہرہ یکبارگی کھل اٹھا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں دیکھوں گی کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں۔"

"اور کچھ نہیں، مجھے بس اس پاگل خانے سے چھٹی دلا دو۔"

"یہ میرے بس سے باہر ہے۔ کسی بھی مریض کو رخصت کرنا تو درکنار اس کے قانونی ورثا کے علاوہ کسی اور کے حوالے بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

"تو تم فرار میں میری مدد کر سکتی ہو؟" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے میرے دشمنوں نے یہاں تک پہنچایا ہے۔"

وہ یوں ہنس دی جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ "یہ عمارت ایک وسیع احاطہ کے وسط میں واقع ہے اور باہر چوبیس گھنٹے مسلح محافظوں کا گشت جاری رہتا ہے تاکہ کوئی پاگل فرار ہو کر شہریوں کے جان و مال کے لئے خطرہ نہ بن جائے۔ وہ محافظ تمہیں للکار کر بے دریغ گولی مار دیں گے۔"

"تو کیا سرکاری ہسپتال ہے؟"

اس نے نفی میں جنبش دی۔ "یہ نجی شفاخانہ ہے۔ اسے حکومت سے گرانٹ ضرور ملتی ہے مگر بیشتر اخراجات عطیات سے پورے ہوتے ہیں۔"

"تو کم از کم مجھے اتنا ہی بتا دو کہ مجھے یہاں لانے والا کون ہے؟"

"رجسٹر میں لانے والے کا نام ضرور درج ہوگا۔ میں چیف میٹرن کا رجسٹر دیکھنے کی کوشش کروں گی" اس نے خلوص دل سے کہا۔

"تو کیا رجسٹر بھی اسی کی تحویل میں رہتا ہے؟"

"یہاں بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوتا۔ بھاری تنخواہ کا لالچ ہمیں یہاں روکے ہوئے ہے۔"

"کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے تفصیلی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میٹرن نے یہاں بیٹھے دیکھ لیا تو ساری خوش کلامی مجھ پر ختم کر دے گی۔ ایسے ہی باتیں کرتے رہو۔ وہ آنکلی تو میں چلی جاؤں گی۔"

"تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا تھا؟"

"کسی نے نہیں، خود ہی آئی تھی" اس نے مسکرا کر کہا۔ "برا نہ ماننا۔ لوگ نئے پاگلوں کا بڑے شوق سے دیدار کرتے ہیں۔"

"پھر تو تمہیں مایوسی ہوئی ہوگی۔"

"حیرت کہہ سکتے ہو" وہ بولی۔ "تم سے بات کرنے سے قبل تو میں سمجھی تھی کہ شاید تم نے دیواروں وغیرہ سے ٹکر مار مار کر اپنا چہرہ بگاڑا ہے۔"

"یہ ایک باکسر کا کمال ہے۔"

"باکسر؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تم شین مارکیڈو کے کسی ملازم کا ذکر تو نہیں کر رہے؟"

"بروسیلز میں خاصا مشہور ہے وہ" میں نے جوابی حیرت کا

"میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے" وہ پہلو بدلتے ہوئے سے بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ شین مارکیڈو کا نام آتے ہی اس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔

میں نے فوراً ہی صورتحال کا تجزیہ کر ڈالا۔ وہ لڑکی نہ صرف شین سے واقف تھی بلکہ اس سے خوفزدہ بھی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ پاگل خانے میں کیوں اور کس نے پہنچایا تھا۔ لڑکی کے تیور بتا رہے تھے شین مارکیڈو سے اپنی دشمنی کا اعتراف کر لیتا تو شاید وہ مزید کوئی بات وہاں سے رخصت ہو جاتی۔ اور میں کسی بھی صورت میں اسے دوبارہ

متوجہ نہ کر پاتا۔

میرے لئے بہتر یہی تھا کہ اس لڑکی کے سامنے شین مارکیڈو سے دشمنی کی تردید کر ڈالتا اور پھر اسے باتوں میں الجھا کر مارکیڈو اور اس پاگل خانے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

اس لڑکی کو شبہ کا موقع دیئے بغیر میں نے قلیل ترین توقف کے بعد کہا۔ "شین مارکیڈو کا نام میرے لئے اجنبی ہے۔ تم نے تو اس طرح اس کا نام لیا تھا جیسے وہ بلجیم کا کوئی نامور شخص ہو۔ کیا وہ بھی باکسر ہے؟"

"شکر ہے کہ تم اس کے معتوب نہیں ہو ورنہ میرا تو خون خشک ہو کر رہ گیا تھا" وہ اطمینان کا گہرا سانس لے کر بولی۔

"اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"وہ اس پاگل خانے کا ٹرسٹی ہے اور عملاً سارے معاملات اسی کی مرضی سے طے پاتے ہیں۔ اس کے دشمنوں سے ہمدردی کر کے ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے" لڑکی بولی۔

"کیا وہ اپنے دشمنوں کو یہاں بھیجتا رہتا ہے؟"

"کئی مریضوں کی رخصت یا پراسرار روپوشی کے بعد ہی ہمیں علم ہوا کہ وہ مارکیڈو کے دشمنوں میں سے تھے۔ وہ بہت خونخوار آدمی ہے بابا۔"

"کھلاڑی تو عام طور پر بڑے صلح پسند ہوتے ہیں۔"

"تو وہ کھلاڑی کب ہے؟"

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ وہ باکسر ہے۔"

"باکسر؟" اس نے حقارت سے کہا۔ "باکسنگ سے مجھے ویسے ہی وحشت ہوتی ہے۔ آدمی آدمی کو ادھیڑتا رہتا ہے اور شین مارکیڈو کی تو باکسنگ بھی سراسر فراڈ ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"چھوڑو — کیوں اپنا دماغ خراب کر رہے ہو" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"فراڈ باکسر ہونے کے ساتھ ہی وہ اس ادارے کا بھی ٹرسٹی ہے جہاں میں اس وقت پناہ گزیں ہوں اور پھر ہمارے پاس کوئی موضوع بھی تو نہیں ہے بابا۔"

"یہ بتاؤ کہ تم کس باکسر کے ہاتھوں زخمی ہوئے؟"

"وہ تو ازراہ مذاق کہا تھا میں نے" میں نے کہنیوں کے سہارے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "دو لٹیروں میں پھنس گیا تھا۔ ان میں سے ایک کو پکڑا تو وہ مردود نہایت پھرتیلا نکلا اور مار مار کر چند ہی سیکنڈ میں ناک آؤٹ کر دیا۔"

"ارے۔ تمہارا تو بایاں بازو بھی زخمی ہے" میرے بیٹھنے پر اس کی نگاہ زخم پر پڑ گئی۔

"معمولی چوٹ ہے" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "تم مجھے شین مارکیڈو کے بارے میں بتاؤ۔"

"اس کی کہانی تو بروسیلز میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔"

"مگر میں اس سرزمین پر اجنبی ہوں۔ مقامی عجائبات سے واقفیت حاصل کرنا میرا حق ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اسے ہمیشہ سے ہی باکسنگ کا خبط تھا مگر وہ کبھی مقامی مقابلوں سے آگے کامیابی حاصل نہ کر سکا" وہ بتانے لگی۔ "چھ سات برس پہلے معاشی طور پر وہ اچانک خوشحال ہوتا چلا گیا۔ پیسہ آنے کے بعد اس نے لائٹ ہیوی ویٹ کے ڈسٹرکٹ چیمپئن سے بروسیلز کے ایک اسٹیڈیم میں مقابلہ کیا اور تیسرے ہی راؤنڈ میں اسے ناک آؤٹ کر دیا جس کی وجہ سے اسے خاصی شہرت ملی۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے کئی اور نامور باکسروں کو شکست دی مگر برا ہو ایک شخص کا جو اپنے حصے کی پوری رقم نہ ملنے کی وجہ سے باغی ہو گیا۔ اس نے ایک کانفرنس میں شین مارکیڈو کا بھانڈا پھوڑ دیا کہ وہ بھاری رقوم ادا کر کے مشہور باکسروں کو رنگ میں شکست قبول کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ اس الزام کی تحقیق کی گئی تو وہ درست ثابت ہوا لہٰذا مارکیڈو سمیت سارے رشوت خور باکسروں کو باکسنگ کی قومی کونسل نے بلیک لسٹ کر دیا اور اب ان میں سے کئی شین مارکیڈو کے تنخواہ دار ملازم ہیں۔"

"واقعی بہت بڑا فراڈ ہے وہ!"

"یہی نہیں بلکہ اس مردود نے مصنوعی مقابلوں میں کامیابی کے بعد عالمی شہرت کے باکسروں کو بھی للکارنا شروع کر دیا تھا اور جب وہ خود ہیوی ویٹ کلاس میں شامل ہوا تو جانتے ہو اس نے کسے چیلنج دیا تھا؟"

"جارج فورمین؟"

"نہیں — کاشس کلے اس کا نشانہ بنا تھا۔ اس وقت وہی عالمی چیمپئن تھا۔"

"تو وہ مقابلہ نہیں ہوا؟"

"ہوتا کیسے" وہ منہ بنا کر بولی۔ "ورلڈ باکسنگ ایسوسی ایشن یا ورلڈ باکسنگ کونسل کی فہرستوں میں شین مارکیڈو کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ البتہ کاشس کلے نے شین مارکیڈو کے چیلنج کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چیلنج اس تک پہنچا ہی نہ ہو۔"

"اوّل درجہ کا مداری معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے تو اب یہ الجھن ہونے لگی ہے کہ تم اس پاگل خانے میں کیسے پہنچائے گئے۔ تم پر تو پاگل ہونے کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"ان لٹیروں نے مار مار کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے ویران فٹ پاتھ پر اس حالت میں بے ہوش پڑا دیکھ کر کسی نے مجھے پاگل ہی سمجھ لیا ہو۔"

"یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"کیوں؟"

"پاگل پن کا شبہ تو بعد کی بات ہے۔ دیکھنے والے نے یہ بھی تو دیکھا ہوگا کہ تم زخمی ہو۔ ایسی صورت میں اسے پولیس یا کسی ہسپتال سے رجوع کرنا چاہئے تھا جہاں تمہیں ابتدائی امداد مل سکے" اس نے چیونگم کا پیکٹ پھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ میرے ساتھ وہ واقعہ اسی پاگل خانے کے قرب و جوار میں پیش آیا ہو اور لانے والا مجھے محض طبی امداد کے لئے ادھر لایا ہو۔"

وہ ہنس پڑی اور چیونگم کا ایک پیس اپنے منہ میں ڈال کر دوسرا میری طرف بڑھا دیا۔

"میرے جبڑے چیونگم کھینے کے قابل نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی تھی جس پر تمہیں ہنسی آرہی ہے؟"

"اس عمارت کے قرب و جوار میں کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے ہیں اور یہ برو ویلز سے کم از کم تیس کلومیٹر دور واقع ہے لہٰذا یہ خیال ہی فضول ہے کہ قریب ہونے کی وجہ سے تم یہاں لائے گئے۔" وہ کہنے لگی۔ "پھر اگر تم طبی امداد کے لیے لائے گئے ہوتے تو تمہاری مرہم پٹی بھی کی جانی چاہیے تھی اور آخری بات یہ ہے کہ تمہیں یہ کمرہ نہ دیا جاتا۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ شانے اچکا کر سنجیدگی سے بولی۔ "مریضوں کی آمد کے اندراجات والا رجسٹر دیکھے بغیر میں کوئی رائے ظاہر نہیں کرسکتی۔"

"تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا!"

"مجھے سومی کہتے ہیں۔"

"بڑا مختصر اور خوب صورت نام ہے۔" میں نے اسے رام کرنے کے لیے کہا۔ "تم خاصی نرم دل اور سمجھ دار معلوم ہوتی ہو۔ مجھے امید ہے کہ اس وحشت کدے سے نکلنے میں تم میری بھرپور مدد کرسکو گی۔"

"پتہ نہیں رات والی نرس نے تمہارے مرہم پٹی کیوں نہیں کی۔ میں پہلے تمہاری ڈریسنگ وغیرہ کراؤں گی اس کے بعد ہی باقی باتوں کا جائزہ لے سکوں گی۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ چلی گئی۔

سومی سے بات آگے بڑھانے کے لیے میں نے شین مارکیڈ سے اپنی ناواقفیت کا اظہار تو کر ہی ڈالا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ اس سے یہ بات زیادہ دیر تک نہ چھپی رہ سکے گی۔

سرن سے گفتگو کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ میری رہائی کے لیے شین مارکیڈ کی قیام گاہ پر کیا جانے والا حملہ ناکام ہوا تھا اور میں بدستور شین مارکیڈ کی ہی قید میں تھا۔

اس نے پولیس کی حراست سے مجھے اپنی ضمانت پر رہا کرایا تھا اور اپنی ضامن کی حیثیت کو مجروح کیے بغیر مجھے اپنا ذاتی قیدی بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی رہائش گاہ پر مصنوعی حملے اور پھر میرے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا مگر میرے ہمدردوں کے ناکام حملے نے اس کا کام نہایت سہل کر دیا تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ شین مارکیڈ نے مجھے پاگل خانے کے حفاظتی حصار میں پہنچانے کے بعد پولیس کو یہی اطلاع دی ہوگی کہ مسلح افراد کی ایک بھاری تعداد اس کے مکان پر حملہ آور ہو کر مونی خان کو یعنی مجھے اغوا کر کے لے گئی۔

شین مارکیڈ دلبیمہ میں مادام لواری کا کارندہ تھا اور مختصر سے عرصے میں اس کے بارے میں جو معلومات میرے سامنے آئی تھیں ان کی روشنی میں اسے زک دے کر رہائی پانا میرے لیے ایسا مسئلہ تھا کہ مجھے دانتوں تلے پسینہ آسکتا تھا۔

شین مارکیڈ کی قیام گاہ پر پیرول کی صورت میں مجھے اپنا ایک ایسا ہمدرد میسر آگیا تھا جو اس اجنبی سرزمین پر میرے اور فلسطینیوں کے درمیان واحد رابطہ تھا مگر مارکیڈ نے مجھے پاگل خانے میں قید کر کے وہ رابطہ بھی ختم کر دیا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں غلطاں تھا کہ سومی ایک ڈسپنسر کو لے کر میرے کمرے میں آپہنچی۔ دواؤں کی ٹرالی کو میرے بستر کے پہلو میں رکھ کر ڈسپنسر میرے زخموں اور چوٹوں کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے اس سلسلے میں سومی سے آنکھیں چار کرنا چاہیں مگر وہ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر ہی دوسری طرف گھوم گئی۔

میں نے اس مختصر سے وقفے میں اس کے چہرے پر [illegible] کی علامات دیکھی تھیں۔ شاید اسے میٹرن کے رجسٹر سے یہ معلوم ہوگیا کہ میری یہاں موجودگی میں کسی نہ کسی طرح مارکیڈ کا بھی ہاتھ تھا اور اس کی دہشت اسے مجھ سے اجنبیت اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ڈسپنسر کوئی تبصرہ کیے بغیر کافی دیر تک پورے انہماک سے مرہم پٹی کرتا رہا۔ اس دوران سومی اس کی مدد کرتی رہی لیکن اس نے ایک بار بھی میری طرف متوجہ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے آدھ بار ڈھٹائی اختیار کرتے ہوئے اس سے اپنی تکلیف کے بارے میں سوالات بھی کیے مگر ہر بار اس نے حوصلہ شکن انداز میں مختصر ترین جواب دے کر مجھے خاموش کر دیا۔

زخموں کی صفائی اور ڈریسنگ کے بعد میں نے کافی سکون محسوس کیا اور کمرے سے باہر نکلنے کے امکانات کا جائزہ لینے لگا۔

میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے کمرے تک محدود رہنے کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی لہٰذا میں بے فکری سے بستر سے اُتر گیا۔

باہر آکر میں نے خود کو ایک کشادہ راہداری میں موجود پایا۔ راہداری میں ایک طرف ٹھوس دیوار تھی جب کہ میرے کمرے کے پہلو میں دروازے کمروں کی نشاندہی کر رہے تھے۔ راہداری کے اختتام پر سرکنے والا آہنی دروازہ تھا جو دور ہی سے مقفل نظر آرہا تھا۔ البتہ کمرے سے تو نکل سکتا تھا مگر راہداری سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

راہداری کے دروازے کے بعد سیڑھیاں تھیں جن سے آگے میدان پھیلا ہوا تھا۔ میدان کے آخری سرے پر احاطے کی اونچی فصیل پھیلتی چلی گئی تھی۔

میں نے پڑوس کے کمروں کا جائزہ لینا چاہا تو ان میں مریض بے خبر سوتے نظر آئے۔ ان کمروں کے دروازے مقفل [illegible] اور کھڑکیوں میں شیشے کی جگہ مضبوط آہنی جالیاں لگی ہوئی تھیں تاکہ کوئی دیوانہ شیشہ توڑ کر خود کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

میں راہداری کے مقفل آہنی دروازے کے قریب فرش پر بیٹھ گیا اور اس جنگلے سے باہر کا جائزہ لینے لگا مگر سرد ہواؤں نے مجھے زیادہ دیر وہاں رکنے نہ دیا اور میں کپکپاتا ہوا اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

دوپہر کے قریب سومی میرے لیے رقیق غذا لے کر آئی تو بہت زیادہ سہمی ہوئی تھی۔ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے تم سے جو کچھ باتیں کی تھیں انہیں بھول جاؤ۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو کہ میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہاری رجسٹر تک رسائی ہوئی یا نہیں؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" وہ کرب آلود لہجے میں بولی۔ "آئندہ تم مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کرو گے!"

"تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں سومی!" میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور تڑپ کر بولی۔

"میرا نام نہ لو۔ میں نرس ہوں صرف نرس!" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر بولی۔ "صرف آج کا دن اور ہے، کل میں اپنا تبادلہ کسی دوسرے وارڈ میں کرالوں گی!"

"آخر وجہ کیا ہے؟"

"وجہ کچھ بھی ہو، اسے جہنم میں ڈالو اور اپنا کھانا ختم کرو تاکہ میں برتن واپس لے جاؤں!" اس نے بے چینی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"تم نہ اپنا تبادلہ کراؤ گی اور نہ چھٹی کرو گی سومی!" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد گمبھیر لہجے میں کہا۔

"تم دھمکی دے رہے ہو مجھے!" وہ مجھے گھورتے ہوئے ملامت آمیز لہجے میں بولی۔

"میں تمہارا بہی خواہ ہوں سومی!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اپنی وجہ سے تم پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے!"

"میں کچھ نہیں کرسکتی۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے پہلے ہی علم ہو جاتا کہ شین مارکیڈ سے تمہارا کوئی تعلق ہے تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی!"

"میرا کیا تعلق ہے اس سے؟"

"کچھ بھی ہو مجھے اس سے مطلب نہیں مگر میں آئندہ اس طرف کا رخ بھی نہیں کروں گی۔" وہ خوف کے باعث بُری طرح بھڑکی ہوئی تھی۔

"اگر تم نے میری ہدایات سے روگردانی کی تو میں اس پاگل خانے میں ایک ایک فرد کو وہ تمام باتیں سناؤں گا جو تم نے مجھے بتائی ہیں۔" میں نے کوئی اور راہ سامنے نہ پا کر آخری حربہ داؤ پر لگا دیا۔ "اور اگر تم مجھ سے تعاون کرتی رہیں تو تمہاری کہی ہوئی ہر بات ہمیشہ کے لیے میرے سینے میں ہی دفن رہے گی۔"

وہ چند ثانیوں تک غصے اور بے بسی کے ملے جلے احساسات کے تحت مجھے گھورتی رہی پھر اس کی عینک کے عقب میں آنکھوں میں نمی لرزنے لگی۔ "تم سنگدل اور مکار ہو۔" وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "غلطی میری ہی ہے کہ بے سوچے سمجھے تمہارے سامنے زبان کھول بیٹھی!"

"وہ تمہاری غلطی نہیں بلکہ میری خوش نصیبی تھی!"

"پھر اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"صرف معلومات!" میں نے کہا۔ "تمہیں کس طرح یہ پتہ چلا کہ میرا اس فراڈ باکسر سے بھی کوئی تعلق ہے؟"

"رجسٹر میں تمہاری آمد کا کوئی اندراج نہیں ہے۔" وہ نیم دلی کے ساتھ بتلانے لگی۔ "مگر پتہ چلا ہے کہ شین مارکیڈ تمہیں لاوارث پاگل سمجھ کر یہاں لایا تھا۔"

"بڑا عجیب اتفاق ہے کہ مجھ کو فٹ پاتھ سے لانے والا وہ خود تھا!"

"اب زیادہ صفائی پیش نہ کرو۔ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تم اب تک مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔ تمہاری شین مارکیڈ سے پرانی دشمنی معلوم ہوتی ہے۔"

"پرانی دشمنی!" میں ہنس دیا۔ "میرے لیے تو اس کا نام تک نیا تھا۔ پہلی بار تمہاری زبان سے اس مردود کا تذکرہ سنا تھا۔"

"تمہیں جو پوچھنا تھا وہ پوچھ چکے اب برتن خالی کرو تاکہ میں یہاں سے جاؤں!"

"میرے علاج کے بارے میں تمہیں کیا ہدایات ملی ہیں؟" میں نے بے ذائقہ دلیہ کھاتے ہوئے اس سے اگلا سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ اور نہ ہی تمہاری میڈیکل فائل بنائی گئی ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "تمہاری ڈریسنگ بھی میں نے اپنے طور پر کرادی ورنہ ہمیں صرف کھانا پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔"

"رات کا کھانا کب لاؤ گی؟"

"وہ دوسری نرس ہوگی۔" وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں دو گھنٹے بعد چھٹی کرلوں گی۔"

"برابر والے کمروں میں کون لوگ مقیم ہیں؟"

"سب ہی خونخوار پاگل ہیں اگر انہیں چوبیس گھنٹے بے ہوش نہ رکھا جائے تو سامنے آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالیں۔"

"پھر تو مجھے اپنا کمرہ مقفل رکھنا چاہیے!"

"اس کی ضرورت نہیں، وہ اندر سے اپنے کمروں کے دروازے نہیں کھول سکتے!"

"تمہارے آنے کا راستہ کون سا ہے؟ راہداری کے اختتام پر تو

میدان پھیلا ہوا ہے۔" میں نے فوری خیال کے تحت آخری سوال کیا۔
"یہ ایک بلاک کا آخری حصہ ہے تم تک آنے کے لیے مجھے ان ہی میں سے ایک کمرے میں سے گزرنا پڑتا ہے!"
میں کھانے سے فارغ ہو چکا تھا لہٰذا وہ برتن سمیٹ کر واپس چلی گئی۔

اس عمارت کے نزدیکی اور دُور افتادہ حصّوں سے سارا دن پاگلوں کی کرب اور وحشت میں ڈوبی ہوئی چیخوں کا شور گونجتا رہا۔ ایک ہنگامہ فرو ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے فضا پر سکوت طاری ہوتا پھر اچانک کسی اور سمت میں فتور پیدا ہو جاتا۔

تنہائی، ماحول کی قنوطیت اور زندگی کی لطافت سے محروم پاگلوں کی آسیبی چیخ و پکار سے جلد ہی میرا دل اڑنے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر مجھے مسلسل چند روز اسی طرح گزارنے پڑ گئے تو شاید میری آوازیں بھی اس شور میں شامل ہو جائیں گی۔

شام والی نرس کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب وہ میرے لیے کھانا لائی۔ وہ نہ صرف ادھیڑ عمر اور بے روپ تھی بلکہ ڈچ زبان کے علاوہ کچھ اور نہیں جانتی تھی۔ رات والی نرس اپنی صورت اور خدوخال کے اعتبار سے خاصی دلکش تھی مگر زبان کے معاملے میں قطعی مجبور تھی لہٰذا چند مسکراہٹوں اور اشاروں کے تبادلے کے بعد رات ساڑھے گیارہ بجے وہ بھی راؤنڈ مکمل کر کے چلی گئی۔

وہ رات میں نے نہایت کرب اور بے چینی کے عالم میں گزاری۔ اس وقت میں خود کو کسی اندھے کنویں کی تہہ میں قید محسوس کر رہا تھا جس کے دہانے پر زہریلے ناگوں کا پہرہ ہو۔

اگلے دو روز مکمل جمود کی کیفیت میں گزر گئے۔ جس وقت فضا پر سکوت ہوتا میرے ذہن میں اس وقت بھی پاگلوں کی کربناک چیخوں اور دیوانہ وار قہقہوں کی بازگشت گونجتی رہتی تھی اس دوران میرے زخموں کی حالت میں کافی افاقہ ہوا تھا اور میں اپنے جبڑوں کی مدد سے ٹھوس غذا کھانے کے قابل ہو چکا تھا مگر سومی کا رویہ میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ وہ جتنی دیر میرے پاس رُکی رہتی، مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نادیدہ شیطانی سایوں سے خوف زدہ ہو۔

سومی سے مجھے کوئی نئی بات بھی معلوم نہیں ہوئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی کامیابی نہ ہو سکی کہ میرے معاملے میں وہ واقعی بے خبر تھی یا دیدہ و دانستہ میرے سامنے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتی تھی مگر اس رویے کے باوجود پاگل خانے کی چار دیواری میں میرے لیے سومی کا دم غنیمت تھا۔ یہ اُسی کی دیکھ بھال اور دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ دو تین روز میں ہی مجھے اپنی تکالیف سے بڑی حد تک نجات مل گئی تھی اور پھر وہ میرے کہے بغیر روزانہ میرے لیے بازار سے سگریٹ اور پھل وغیرہ بھی لانے لگی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے بدظن ہونے کے باوجود خائف ہو اور اپنی مرضی کے خلاف میری دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہو۔

چوتھے روز شام کے وقت میں اس وقت ششدر رہ گیا جب اچانک شین مارکیڈو میرے سامنے آ موجود ہوا۔

اُس کے دانتوں کے گوشے میں سگار دبا ہوا تھا اور پتلے ہونٹوں پر ایسی مضحکانہ مسکراہٹ رقصاں تھی کہ میری تیوریاں سکڑ گئیں۔ میں نفرت اور قہر میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اُس کو گھورنے لگا۔

"تمھارے جبڑے کیسے ہیں؟" اُس نے تحقیر آمیز لہجے میں توڑتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"عبرت کے لیے!" وہ سگار کا کثیف دھواں خاص انداز میں فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا۔ "میں چاہوں تو تم ساری عمر یہیں رہ سکتے ہو۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"لڑکی ہوتے تو بہت سے مطالبات ہو سکتے تھے!" اُس نے خوش مزاجی سے داہنی آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ "ویسے تمھارے چاہنے والوں کی تعداد یہاں بھی خاصی ہے!"

میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا کیونکہ اس عمارت میں شین مارکیڈو سے الجھنا بدترین انجام کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

"کن چاہنے والوں کی بات کر رہے ہو؟"

"انھوں نے میرے مکان کی تمام بیرونی آرائش برباد کر دی۔" وہ سنجیدہ اور سخت لہجے میں بولا۔ "تمام دیواروں کا پلاسٹر اور رنگ روغن تباہ ہو گیا، کھڑکیوں کے شیشے بھی بکھر کر رہ گئے۔"

"پتہ نہیں تم کیا بک رہے ہو!"

"بک نہیں رہا، فرما رہا ہوں برخوردار۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "اس روز تمھیں چھڑا لے جانے کے لیے میرے مکان پر حملہ کیا گیا۔"

"وہ تو تمھارا ہی منصوبہ تھا۔ اُسی کی آڑ میں تم مجھے قانون کی زد سے نکال کر یہاں پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہو۔"

"خاصے عقل مند ہو۔" وہ ہنسا۔ "مجھے تو اپنے آدمی استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور تمھارے دو جاں نثار مفت میں مارے گئے۔"

"کون مارے گئے؟" میں نے اضطراری طور پر سوال کیا۔

"مارا تا محبت نے جوش!" وہ قہقہہ مار کر بولا۔ "اگر آدمی حاضر دماغی سے کام نہ لیتے تو انھوں نے ایک دروازہ توڑ ہی دیا ہوتا مگر دھوئیں کے بم استعمال ہوتے ہی نہ صرف اُن کے قدم اکھڑ گئے بلکہ دو بھگوڑے بھی مارے گئے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ تھے۔ اگر وہ واقعی مجھے چھڑانے آئے تھے تو مجھے ان دونوں کی موت پر دُکھ ہوا ہے!"

"جانتے ہو اُن کا تعلق کس تنظیم سے تھا؟"

"یہ انکشاف تم ہی کرو تو بہتر ہے!"

"دونوں مرنے والے اطالوی باشندے تھے اور اُن کا تعلق ریڈ بریگیڈ سے تھا۔ شاید بلجیم میں فلسطینیوں کی تنظیم کمزور ہے جو اُن کی مدد لینی پڑی!"

"میں بہت معمولی آدمی ہوں مسٹر مارکیڈو" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اتنی بڑی تنظیموں سے میرا کوئی واسطہ نہیں میرے بارے میں تم کسی غلط فہمی کا شکار معلوم ہوتے ہو۔"

"میرے لیے تمھاری کہانی ابھی تک ادھوری ہے!" اُس نے تپائی پر بیٹھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم پیرس سے بروسیلز کیوں آئے تھے؟"

"فرانس میں پولیس میری راہ پر تھی!" میں نے کہا۔ "میکفرسن نے بھاری معاوضہ لے کر مجھے بحفاظت سرحد عبور کرانے کی ذمہ داری لی تھی مگر جب رونالڈ سے اُس کا ٹکراؤ ہوا تو مجھے علم ہوا کہ وہ دونوں ہی مجھے مادام بواری کا قیدی بنانے کے چکر میں تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھنے کے چکر میں تھا!"

"لہٰذا تم نے ان دونوں کو مار دیا۔" میرے خاموش ہونے پر اُس نے ٹکڑا لگایا۔

"میرے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"پولیس کو پورا یقین ہے کہ ان دونوں کو تم ہی نے ہلاک کیا تھا لہٰذا مجھے چھوڑ کر تم بلجیم میں پولیس سے نہ بچ سکو گے لیکن میرے احکام پر عمل کر کے تم بروسیلز میں بے فکری اور عیاشی کی زندگی بسر کر سکو گے!"

"اس پاگل خانے سے نکلنے کے لیے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں!" میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم بروسیلز میں ایک عام شہری کی طرح زندگی گزارو گے اور اگر میری جانب سے کوئی ہدایت ملی تو اُس پر پوری طرح عمل کرو گے۔"

"کیسی ہدایت؟"

"کچھ بھی ہو سکتی ہے!"

"پولیس سے میں کیسے بچ سکوں گا؟"

"داڑھی خاصی بڑھ گئی ہے اس کی تراش خراش اور لباس بدلنے کے بعد تمھاری شناخت خاصی مشکل ہو جائے گی۔ آنکھوں میں تم ایسے کنٹیکٹ لینس لگاؤ گے کہ سیاہ پتلیاں نیلی نظر آئیں گی اور سر بھی منڈوا دو تو ایک بار فرشتے بھی دھوکا کھا جائیں گے!"

"مگر میرے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟"

"میرا دیا ہوا کریڈٹ کارڈ دکھا کر تم بوتڑے کلب سے ایک خطیر رقم ہر ماہ حاصل کر سکو گے مگر یہ یاد رکھنا کہ میرے آدمی ہر قدم پر تمھاری نگرانی کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے اُس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ "اور اگر تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دے کر فرار یا روپوشی کی کوئی کوشش کی تو میرے آدمی بھرے مجمع میں تمھیں گولی مار دیں گے اور کسی میں جرأت نہ ہوگی کہ اُن کے خلاف گواہی دے کر اپنی موت کو دعوت دے!"

"آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"تمھیں عیاشی کرانی چاہتا ہوں؟" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "میرے آدمی نہ صرف تمھاری نگرانی کریں گے بلکہ تمھیں تحفظ بھی فراہم کریں گے!"

"اور میری نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہ ہو گی؟"

"بروسیلز کی حدود میں کوئی نہیں" وہ بولا۔ "چاہو تو میرے گھر بھی آ سکتے ہو!"

"اور اگر میرے خود ساختہ ہمدردوں میں سے کوئی مجھ سے آ ٹکرائے؟"

"وہی تمھارے امتحان کی گھڑی ہو گی۔ یہ یاد رکھنا کہ میری نگاہوں سے بچنے کی کوشش میں تمھیں اپنی جان گنوانی پڑے گی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھاری پیش کش کو کیا سمجھوں" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "ایک طرف تم نے مجھے اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے دو آدمی مار ڈالے اور اب مجھے اتنی کھلی چھوٹ دے رہے ہو۔ جیسے بروسیلز کے چپے چپے پر تمھارے آدمی مامور نہوں!"

"کوئی تمھاری اُلجھنوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔" وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"اور تم اُس کے ماتحت ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"شین مارکیڈو ہر کس و ناکس کا حکم نہیں مانتا۔" وہ پُرغرور لہجے میں بولا۔

"آخر مادام بواری مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟"

"وقت آیا تو وہ تمھارے بدن پر جونکیں لگوا کر خون کا آخری قطرہ بھی کھینچ لے گی۔"

"کھلی فضا میں وہ بھی برداشت کر لوں گا۔ یہ بتاؤ کہ یہاں سے کب نجات ملے گی؟" میں نے اپنے خوف کا اظہار کیے بغیر اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ابھی لیے چلتا ہوں!" اُس نے کہا اور ایک جھٹکے سے تپائی چھوڑ دی۔

میں اُس کے پیچھے باہر نکلا تو راہ داری میں ایک اور شخص موجود نظر آیا جو شین مارکیڈو کے ساتھ ہو لیا۔ اُس کے شانوں سے دو چرمی ہولسٹرز جھول رہے تھے اپنے انداز سے وہ شین مارکیڈو کا محافظ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کریپ سول والے بے آواز جوتوں کے سہارے میرے برابر والے کمرے میں سے گزرتے چلے گئے۔

پھر شین مارکیڈو ہسپتال کے جس حصے سے گزرا وہاں ڈاکٹروں سے نرسوں تک سب ہی نے اُسے تعظیم دی۔

اور جب ہم اس عمارت سے باہر آئے تو شین مارکیڈو کی سفید کار ہماری منتظر تھی۔ محافظ نے شوفر کے برابر والی نشست سنبھال لی اور میں مارکیڈو کے ہمراہ عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

مکان پر ہمارا استقبال کرنے والا بل تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرا چہرہ کھل گیا۔ شاید باہر سے واپسی پر شین مارکیڈو کو خوش آمدید کہنا اُسی کی ذمہ داری تھی کیونکہ حوالات سے ضمانت پر رہائی کے بعد جب میں وہاں پہنچا تھا تو اس مرتبہ بھی بل نے برآمدے میں اپنے آقا کا استقبال کیا تھا۔

شین مارکیڈو نے برآمدے میں رُک کر ڈچ زبان میں بل کو جلدی جلدی کچھ ہدایات دیں اور مجھ سے کچھ کہے بغیر اندر گھستا چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس عمارت میں پہنچنے کے بعد اُس کے رویے میں اچانک سرد مہری اور بے رُخی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید اپنے ماتحتوں پر رعب قائم رکھنے کے لیے وہ گھر میں اکھڑ مزاجی کے مظاہرے کا عادی ہو گیا تھا۔

شین مارکیڈو کے جانے پر میرے قدم بھی غیر ارادی طور پر اُسی کی تقلید میں اُٹھے تھے مگر بل نے بازو تھام کر مجھے روک لیا۔

"ادھر نہیں، تم مرمت کے لیے میری تحویل میں دیے گئے ہو!" بل نے میرے کان میں سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"پہلے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ کسی محفوظ گوشے میں چلو۔" میں نے رازدارانہ سرگوشی کی۔

"ڈریسنگ ہال میں تم بے فکری سے بات کر سکو گے!" اُس نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا اور مجھے لے کر ایک طرف چل دیا۔

ڈریسنگ ہال کی طرف جاتے ہوئے راستے میں میرے قدم ایک جگہ رُک گئے۔ تھا تو وہ بھی ایک وسیع ہال ہی مگر اُس کا حلیہ باکسنگ کے پریکٹس رنگ سے مشابہ تھا۔ چھت میں نصب آہنی کنڈوں سے ریت کی مختلف وزن کی بوریاں اس طرح لٹک رہی تھیں کہ اُن کی بلندی حسبِ خواہش تبدیل کی جا سکتی تھی۔ ایک کونے میں موٹے موٹے رسّوں کے درمیان اسپنج کا گدا پڑا ہوا تھا دوسری طرف جمناسٹک کی مشقوں کے لیے چند چھوٹے فریم نصب تھے۔

"آگے بڑھو۔" بل نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "یہ وہ مقام ہے جہاں باس ہر روز اپنی جھوٹی انا کو تسکین پہنچانے کے لیے تنخواہ دار باکسرز کو ناک آؤٹ کرتا ہے!"

"یقین نہیں آتا کہ شین مارکیڈو جیسا آدمی باکسنگ کے معاملے میں اس قدر سطحی سوچ رکھتا ہوگا۔"

چند منٹ بعد ہم دونوں ڈریسنگ ہال میں داخل ہوئے جہاں چاروں طرف ملبوسات سے بھری ہوئی دیوار گیر الماریاں موجود تھیں۔

ایک طرف قدِ آدم آئینے کے سامنے شیونگ چیئر پڑی ہوئی تھی جس میں بہت سے برقی آلات نصب تھے۔

بل نے مجھے اُسی کرسی پر بٹھا کر میرے سینے پر تولیا ڈالا اور میرے چہرے پر شیونگ کریم لگاتے ہوئے بولا "تین روز سے کہاں تھے تم؟"

"ایک پاگل خانے میں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو بتاؤ کہ اس رات کیا ہوا تھا؟"

"وہ لوگ تم تک پہنچنے میں تو کامیاب نہ ہو سکے مگر دو آدمی ضرور مارے گئے!"

"شین مارکیڈو نے بتایا تھا، بڑا افسوس ہوا سُن کر!"

"افسوس ہوا؟ کس بات کا؟" بل نے حیرت سے پوچھا۔

"ریڈ بریگیڈ کے دو اراکین میری وجہ سے موت مارے گئے!"

"یہ کس نے کہا؟" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "وہ سب تو بموں کے استعمال کے بعد صاف بچ نکلے مگر مارکیڈو کے دو آدمی کام آگئے۔" پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "ایک کو تو میدان صاف پا کر میں نے ہی گولی ماری تھی!"

"بہت جھوٹا ہے وہ حرام زادہ۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "مجھے اُلٹی ہی کہانی سُنا رہا تھا۔ ویسے حملہ آور واقعی ریڈ بریگیڈ کے اراکین تھے؟"

بل نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "بلجیم میں ہم لوگ فلسطینی افواجِ آزادی کے مفادات کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں!"

"تم شین مارکیڈو کے ساتھ کب سے ہو؟"

"سات برس ہو گئے۔" وہ خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "شین مارکیڈو سے بھاری رشوت لے کر باکسنگ کا ایک مقابلہ ہارا تھا جس پر بعد میں مجھے نااہل قرار دے دیا گیا اور مجھے شین مارکیڈو کی ملازمت کرنی پڑ گئی۔"

"تو تم بھی باکسر ہو؟"

"شین مارکیڈو سے لڑنے سے ایک سال قبل میں بلجیم کا قومی چمپئن تھا۔" اُس نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔

پھر میں نے بل کو ان باتوں سے آگاہ کیا جو شین مارکیڈو نے مجھے مشروط آزادی کے بارے میں بتائی تھیں۔ وہ میری کہانی دلچسپی آمیز انداز میں سُنتا رہا اور جوں ہی میں خاموش ہوا اس نے غیر متوقع طور پر بے تحاشا گالیاں بکنی شروع کر دیں۔

"کس پر برس رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ تمہارے ساتھ لمبا کھیل کھیل رہا ہے۔" بل نے کہا۔ "بلجیم میں فلسطینی تنظیم کا صرف ایک عہدیدار موجود ہے جو ہمارے ساتھ رابطہ بھی رکھتا ہے۔ اُس کی زبانی ہمیں تمہاری اہمیت کا کسی حد تک علم ہو چکا ہے اور ہاں اُس نے ایک خبر بھی دی تھی تمہارے لیے۔"

بات کرتے کرتے وہ چونک کر بولا۔

"وہ کیا؟"

"پیرس میں عبدالعزیز نامی تمہارا کوئی دوست تھا؟"

"ہاں۔ کیا ہوا اُسے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"اُس نے اپنی کنپٹی پر گولی مار کر خودکشی کر لی!"

"نہیں!" بل کے منہ سے وہ خبر سُن کر مجھے اپنے دل پر گھونسا سا لگتا محسوس ہوا۔ وہ شخص اپنی تنظیم کے صفِ اول کے کارکنوں میں سے تھا اور اپنی تمام صلاحیتیں اس نے تنظیم ہی کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ اُس نے مختصر سی مدت میں ہی اپنے خلوص، متانت اور ذہانت سے میرا دل جیت لیا تھا مگر پیرس سے میری نکاسی کے معاملے میں شاہدہ سے متاثر ہو کر اُس نے ایک غلطی کی اور پھر خود ہی اپنے بڑوں کے سامنے اُس کا اعتراف بھی کر لیا۔

اس کوتاہی کے نتیجے میں اُس کی بائیس سالہ بے لوث خدمات کے باوجود اُسے دو ماہ کے لیے تنظیم سے معطل کر دیا گیا تھا جس روز وہ آخری بار مجھ سے پیرس میں ملا اس کی مایوسی دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور وہ خود بھی اپنی معطلی کا صدمہ نہ جھیل سکا۔ میرے لیے اُس کی خودکشی کی خبر دردناک ضرور تھی مگر اُس کے کسی گوشے میں کسی نہ کسی طرح طمانیت کا ایک پہلو بھی پوشیدہ تھا جسے میں صرف محسوس کر رہا تھا مگر اُس کی وضاحت میرے اختیار میں نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے جس دلیری کے ساتھ اپنی جان دے کر اپنی کوتاہی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی تھی میرے نزدیک وہی قابلِ تعریف رہی ہو۔

عبدالعزیز مر گیا تھا مگر اس مخلص انسان سے سرزد ہونے والی ایک موہوم سی غلطی نے میری جدوجہد کے فاصلے طویل تر کر دیے تھے! سادک کے ہرکارے علی نقی نے عبدالعزیز کو شاہدہ تک پہنچایا اور میں شاہدہ کے چنگل میں پھنس کر ایک بار نکلنے کے باوجود مادام لواری کے سحر سے نجات نہ پا سکا تھا۔ فرانس کی سرحد عبور کرنے کے بعد بلجیم کی سرزمین پر میں اُس کا باقاعدہ قیدی بن چکا تھا۔

اس وقت مجھے بن حیان کی بھتیجی ایلیزا بھی یاد آئی جس نے پہلی بار مجھے مادام لواری کے ہولناک انتقام سے باخبر کیا تھا۔ مادام لواری خود اُس کی سگی ماں اور عذرا جو اس کی بیوہ تھی جو معذوری کی حالت میں بسترِ مرگ پر اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی مگر جب اسرائیلی اہلکاروں نے اُسے بن حیان اور اُس کے شوہر کے قاتل کے بارے میں بتایا تو اُس کا رواں رواں انتقام کی آگ سے سلگنے لگا۔ وہ خود تو جرائم کی دُنیا میں بے مثال شہرت پانے کے بعد بستر پر محتاجی کی زندگی بسر کر رہی تھی مگر زیرِ زمین دُنیا میں اُس کا نام پوری قوت کے ساتھ زندہ تھا اور مادام لواری کی کسی سہیلی کی بیٹی مادام لواری بن کر لاکھوں کے غیر قانونی کاروبار کو کنٹرول کر رہی تھی۔

اس لڑکی کا وجود ایک راز تھا جو کبھی شاہدہ کی طرف اشارہ کرتا تھا اور کبھی کسی اور طرف لیکن میرا تجربہ یہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ جو بھی تھی اُس کے ہاتھ بہت دراز تھے اور کم از کم یورپ کی حد تک وہ سرحدوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنے شکار کو کہیں بھی اسیر کر سکتی تھی۔

جس خطرہ کو ٹالنے کے لیے عبدالعزیز نے اپنی معطلی قبول کی اور پھر جان گنوائی وہ میرا مقدر بن کر سامنے آ چکا تھا اور میں سیتا سے ملنے کی آرزو کو ایک مرتبہ پھر اپنے سینے میں دبانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

"کس سوچ میں کھو گئے!" مجھے خاموش پا کر بل نے ریزر سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے عبدالعزیز کی موت کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔ اُس کی خودکشی میں کسی حد تک میرا بھی ہاتھ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو مر کر اس زندگی کے جھمیلوں سے آزاد ہو گیا مگر تم اپنی فکر کرو تم خود بھی اس وقت زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑے ہو!"

"ایسے حادثات کے بعد زندگی بے کیف لگنے لگتی ہے!"

"تم یہاں سے کب جاؤ گے؟" قدرے توقف کے بعد اُس نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔ اب تو میرا انحصار شین مارکیڈو کی مرضی پر ہے!" میں نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اگر تم نے یوں دل چھوڑا تو پھر شاید پوری بٹالین بھی تمہاری کوئی مدد نہ کر سکے گی۔" اُس نے میرا خط بناتے ہوئے کہا۔

"تم نے یہ منصوبہ سُننے کے بعد گالیاں شروع کر دی تھیں؟"

"بالکل بے سر و پا باتیں ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "اگر تم اُسے زک پہنچانے پر تُل ہی جاؤ تو اُس کے آدمی بھی تمہارا سراغ نہ لگا سکیں گے!"

"یہی میں سوچ رہا تھا کہ وہ آخر کس برتے پہ مجھے اتنی چھوٹ دے رہا ہے!"

"بس تمہیں چوکنا رہنا ہوگا۔ اگر دل مضبوط کر کے یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش بھی کر ڈالو تو میرا خیال ہے کہ کامیابی ہی ہوگی۔"

"آزادی کے دو تین روز بعد ہی میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں گا۔"

بل باتیں کرتے ہوئے میرا خط بناتا رہا پھر اُس نے میرا سر بھی مونڈ ڈالا۔ اُسی کمرے میں آنکھوں کے لیے کنٹیکٹ لینس بھی موجود تھے جنہیں کئی مرتبہ کی کوشش کے بعد گھس کر بل نے میری آنکھوں میں لگا دیا۔ تھوڑی سی نقل و حرکت کے نتیجے میں میری ایک آنکھ سے لینس نکل گیا تو بل نے دوسرا بھی واپس لے لیا۔ "یہ کام مہارت کا ہے، مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

اُس کے بعد مجھے اُسی کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں میں پچھلی بار ٹھہرا تھا۔

اگلی صبح مجھے سات بجے بیدار کردیا گیا۔ میں تیار ہوکر ناشتے کی میز پر پہنچا تو شین مارکیڈو میرا منتظر تھا۔

"اس بریف کیس میں اتنی رقم ہے کہ ایک ماہ تک جوئے کے علاوہ تمھاری تمام ضروریات بآسانی پوری ہوسکیں گی۔" اس نے میز پر ایک سیاہ بریف کیس میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "تم ناشتے کے بعد یہاں سے چلے جاؤ گے۔"

"بہت بہتر!" میں نے کریڈٹ کارڈ کے بارے میں کچھ پوچھنے کے بجائے اُس کی ہدایات سننے میں ہی عافیت سمجھی۔

"اور تم ادھر کا رُخ بھی نہیں کرو گے، نہ تم اس عمارت کے مکینوں میں کسی کو یاد رکھو گے۔" اس نے اگلا حکم صادر کیا۔

میں ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ وقفے وقفے سے دس بارہ ہدایات دے چکا تھا۔

"اس کے ساتھ جاؤ۔" شین مارکیڈو نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرکے کہا اور میں بریف کیس سنبھال کر وہاں سے اُٹھ گیا۔

شین مارکیڈو کے آدمی نے ایک ویگن میں مجھے بروسیلز کے مرکزی علاقے میں چھوڑ دیا جہاں اس کہر آلود موسم میں سناٹا ہی تھا۔

ویگن کے آگے بڑھ جانے کے بعد میں نے رسٹ واچ دیکھی تو وہ پونے آٹھ بجا رہی تھی۔ سردیوں میں اتنی صبح سڑکیں ناپنے کے تصور ہی سے مجھے تاؤ آنے لگا مگر آزادی کے خیال نے فوراً ہی میرا غصہ سرد کردیا۔

اس وقت کہر اتنی گہری تھی کہ چند گز دُور تک دیکھنا بھی ناممکنات میں سے تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر آگے پیچھے نظریں دوڑائیں مگر وہاں "تاحدِ نظر" کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میری نگرانی نہیں کی جارہی تھی اور اگر کوئی وہاں موجود بھی تھا تو اُسے بآسانی چکمہ دیا جاسکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی گردن اوورکوٹ کے اُٹھے ہوئے کالر میں دبکائی اور تیز قدموں سے آگے ہولیا۔

پھر مجھے جو پہلا موڑ نظر آیا میں اُسی پر گھوم گیا اُس کے بعد میں پے بعد دیگرے کہر آلود گلیوں میں بڑھتا رہا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک ذیلی شاہراہ پر نکل آیا جہاں میں نے اپنی رفتار سُست کردی۔

اس جگہ اکا دکا افراد کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا مگر مجھے اُن میں کوئی ایسا چہرہ نظر نہیں آیا جس پر شُبہ کیا جاسکتا۔

اُسی سڑک پر کچھ دُور ایک رہائشی ہوٹل نظر آیا اور میں اندر گھس گیا۔ وہاں کمرہ دینے کے لیے غیر ضروری سوالات نہیں کیے گئے جس کے نتیجے میں مَیں خوشگوار حرارت سے پٹے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ بلجیئم میں میری آزادی کا پہلا دن تھا جو میں نے اپنے کمرے میں شراب نوشی اور آرام کرتے ہوئے گزار دیا۔ شام کو میں تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا اور ایک خوش ذوق اسپینی خاتون کے ساتھ کچھ دیر میں لوٹ آیا۔ صنفِ لطیف کی صحبت میسر آئی تو دن بھر کی مے نے یک بیک رنگ جمانا شروع کردیا اور میں کیف و سرور کی دُنیا میں کھوتا چلا گیا۔

اس ہوٹل میں مَیں نے دو روز گزارے جو کسی اہم واقعے کے بغیر بیت گئے۔ شین مارکیڈو نے جس کڑی نگرانی کی دھونس دی تھی اس کی تصدیق کا کوئی موقع میسر نہ آسکا اور میرے ذہن میں بلجیئم سے نکلنے کا منصوبہ جنم لینے لگا۔

اُس کی بہترین صورت یہ تھی کہ میں بروسیلز سے براہِ راست بیرونی پرواز پکڑنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ کسی ساحلی شہر کی راہ اختیار کرتا اور وہاں سے بحری راستہ اختیار کرکے کسی اور طرف نکل جاتا۔

اس وقت مجھے اپنی ایک حماقت پر شدید غصہ آیا۔ بل سے گفتگو کرتے ہوئے فلسطینی افواجِ آزادی کے کسی اہم رکن کا تذکرہ تھا جو ہمیشہ بروسیلز میں مقیم رہتا تھا مگر میں نے اُس سے یہ دریافت نہیں کیا کہ تنظیم کے اس نمائندے سے کہاں اور کس طرح رابطہ ہوسکتا تھا۔ اگر میرے پاس اُس کا فون نمبر ہوتا تو میں کوئی خطرہ مول لیے بغیر اُس سے تفصیلی بات کرسکتا تھا۔

تیسرے دن میں شام کے وقت باہر سے گھوم پھر کر واپس آیا تو تکان مٹانے کے لیے بار روم کی طرف ہولیا تاکہ وہسکی کے دو تین پیگ لے سکوں۔

اس وقت بار روم میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ دو تین میزیں خالی تھیں اور کچھ لوگ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر ایک لڑکی موجود تھی۔ عقب سے وہ خاصی تیکھے اندام نظر آرہی تھی اور اُس کے ایک طرف اسٹول بھی خالی تھا لہٰذا میں وہیں جا بیٹھا۔

اپنے پہلو میں آہٹ محسوس کرکے لڑکی بوجھل انداز میں میری طرف گھومی اور میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لڑکی کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہوئی کیونکہ وہ شاہدہ تھی۔

"تم یہاں کیا کررہے ہو؟" وہ اپنا گلاس کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولی۔

"تمھارے نینوں میں جھانک رہا ہوں!" میں نے اُس کی طرف جھک کر کہا "یہ دُنیا کتنی مختصر ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بھٹک کر پھر یکجا ہوگئے۔"

"بھٹکنے کا نام نہ لو۔" وہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم مجھ سے فرار ہوکر یہاں آئے تھے اور ابھی کچھ معلوم ہے نہیں کیا؟"

"جو شخص تمھیں میرے پاس لے گیا تھا اُس نے خودکشی کرلی۔"

"ہر روز بہت سے لوگ خودکشی کرتے ہیں۔" میں نے بے پروا لہجے میں کہا۔ "اُس نے کرلی تو کون سا کمال کیا!"

"تم اب بھی مصر ہو کہ وہ تمھارے لیے اجنبی تھا؟" اُس نے میرے بازو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟" میں نے بار ٹنڈر کو اپنے لیے وہسکی کا ڈبل پیگ لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم یہی اعتراف کرانے کے لیے پیرس سے میرے تعاقب میں یہاں آئی ہو!"

"تعاقب!" وہ کھنکتی ہوئی آواز میں ہنس پڑی۔ "سچ پوچھو تو میں تمھیں بھول ہی چکی تھی۔"

"بھولنا ہی چاہیے۔" میں نے وہسکی کا چھوٹا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "آخر کس کس کو یاد رکھو گی! مگر یہ عجیب بات ہے کہ تم کو شراب نوشی کے لیے بروسیلز میں یہی بار پسند آیا۔"

"دنیا مختصر ہے نا۔" وہ اپنے بھیگے ہوئے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ "اور پھر اس بار میں کون سی خاص بات ہے؟"

"میں اسی ہوٹل میں مقیم ہوں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے مگر یہ بتاؤ کہ تم نے حلیہ کیا بنایا ہوا ہے؟" وہ میری بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور منڈے ہوئے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"شناساؤں سے بچنے کی کوشش تھی مگر تم نے پھر بھی پہچان لیا۔"

"اگر مجھ سے اجنبیت کا اظہار کرتے تو شاید میں پیچھا چھوڑ دیتی۔"

"حسین چہروں سے بے رخی کا اظہار میرے بس سے باہر ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی مارا گیا تو میری قاتلہ کوئی تم جیسی طرحدار لڑکی ہی ہوگی۔"

"بکواس کرتے ہو۔" وہ اپنے گلاس سے لبوں کو تر کرتے ہوئے بولی۔ "اتنے شائستہ ہوتے تو پیرس سے چوروں کی طرح نہ بھاگتے۔"

"پیرس میں تو چوری کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ شاید میرے ستارے یہاں یاوری کرجائیں۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ "تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟"

"میرے ساتھ ہی چلو۔" اس نے پیشکش کی۔

"لیکن تمھارا بزرگ نہیں بنوں گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چاندی کے ننھے ننھے گھنگھرو کھنک اٹھے ہوں۔ "وہ مجبوری تھی۔ اس بار تمھارے ستارے واقعی عروج پر ہیں!"

"پھر اٹھو۔" میں نے اس کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں وقت کیوں برباد کررہی ہو۔ کچھ دیر میرا کمرہ بھی دیکھ لو۔"

میں نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔

اس وقت شاہدہ ایک الہڑ، خوش مزاج اور فراخدل دوشیزہ کے روپ میں تھی اور میں اس کے ہر فعل کا گہرا مشاہدہ کررہا تھا تاکہ اس کے بارے میں اپنے شبہات کی کُلّی تائید یا تردید کرسکوں لیکن میں اس کی حرکات و سکنات میں کوئی مشکوک نکتہ تلاش نہ کرسکا۔

مے نوشی کا دور میرے کمرے میں بھی چلتا رہا۔ جوں جوں سرور بڑھتا گیا میری پیش قدمی جاری رہی اور شاہدہ بھی معترض نہ ہوئی۔ میری کوشش یہ تھی کہ وہ اس قدر پی جائے کہ اسے اپنے ذہن پر قابو نہ رہے اور اس وقت میں مادام بواری کا ذکر چھیڑوں مگر وہ لڑکی ہونے کے باوجود خاصی محتاط اور بلانوش تھی۔

محتاط اس لیے کہ وہ بہت آہستہ آہستہ شغل کررہی تھی اور بلانوش اس لیے کہ چار بڑے پیگ معدے میں پہنچ جانے کے باوجود اس کی زبان پر لکنت یا گفتگو میں بے ربطی نہیں آئی تھی۔

شراب کا اشتعال دھیما اور لطیف تھا مگر جب شاہدہ نے اپنی شوخیوں کے پیمانے لنڈھانے شروع کیے تو مجھ پر وحشیانہ اشتعال طاری ہونے لگا مگر وہ بھی کم مکار نہیں تھی۔ شاید اسے بھی میری مدہوشی کا انتظار تھا اور جب دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں صحیح اندازہ ہوگیا تو شاہدہ نے سپر ڈال دی۔

وہ لڑکی جو کچھ بھی تھی اس کا دامن صاف نہیں تھا۔ اگر وہ خود مادام بواری کا کردار ادا نہیں کررہی تھی تو اس کی نمائندگی ضرور کرتی تھی۔ پیرس کے بعد بروسیلز میں اس کی موجودگی میرے لیے تشویش کا باعث تھی اور اس سے سامنا ہونے کے بعد مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ شین مارکیڈو کے آدمی واقعی میری نگرانی کررہے تھے اور اسے میرے ٹھکانے کا علم تھا۔

مگر پھر یہی سوال پیدا ہوتا تھا کہ شاہدہ اور شین مارکیڈو یا بالفاظِ دیگر مادام بواری مجھ سے کیا چاہتی تھی؟

اب تک تو یہی ظاہر ہوا تھا کہ وہ لوگ مجھے ہلکان کررہے تھے۔ شاہدہ سامنے آئی تو مجھے صورتحال کے بگڑنے کا اندیشہ ہوا مگر وہ میرے سامنے بالکل موم بن گئی اور میں وہ حسرت پوری کرنے میں کامیاب ہوگیا جو پیرس میں دل ہی دل میں دفن رہ گئی تھی۔

میں آزاد تھا۔ میرے پاس معقول رقم موجود تھی اور پھر رفاقت کے لیے شاہدہ خود میرے پاس آپہنچی تھی۔ ان میں سے کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ناگوار یا ظالمانہ ہوتا۔

شاہدہ میرے کمرے میں سوئی ہوئی تھی اور میں سگریٹ پھونک پھونک کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔

تین روز میں وہ میرا پہلا فون تھا۔

"مسٹر ٹیلر؟" ریسیور اٹھاتے ہی ایک استفسار طلب مردانہ آواز میرے کانوں میں آئی۔

"بول رہا ہوں۔" میں نے اپنے نئے نام کے حوالے سے کہا۔

"فوراً لیما ڈرگ اسٹور پہنچو جو تمہارے ہوٹل کے قریب ہی واقع ہے۔" پُراعتماد لہجے میں اتنا کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

میں نے بستر پر سوئی ہوئی شاہدہ کا جائزہ لیا۔ سوتے ہوئے وہ بے حد حسین اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ اس وقت میرے دل نے پہلی بار مجھے ملامت کی کہ میں اس پر مادام بواری جیسے ہولناک اور روح فرسا کردار کا شبہ کیوں کر رہا تھا۔

میں اسے چھیڑے بغیر دبے قدموں کمرے سے نکل آیا اور باہر سے دروازہ مقفل کر کے چابی جیب میں رکھ لی۔ وہ قفل ایسا تھا کہ شاہدہ اندر سے بآسانی دروازہ کھول سکتی تھی۔

میں ہوٹل سے نکل کر سیدھا لیما ڈرگ اسٹور کی طرف چل پڑا۔ اس وقت میرے اوپر عجیب سی بے یقینی طاری تھی اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے وہاں بلانے والا کون ہو سکتا تھا۔

میں ڈرگ اسٹور کے سامنے پہنچا تو ایک پستہ قامت مخنی سا شخص تیر کی طرح میری طرف آیا اور آہستہ سے بولا "میں ہیکزی ہوں مسٹر ٹیلر! میرے پیچھے چلے آؤ۔"

میں نے اس کی آواز پہچان لی جو میں چند منٹ قبل فون پر سُن چکا تھا لہٰذا مزید استفسار کیے بغیر اس کے پیچھے چل دیا۔

قریب کی پارکنگ لاٹ میں ہیکزی کی کار موجود تھی جس میں ہم دونوں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد مجھ سے مزید صبر نہ ہو سکا اور میں سوال کر ہی بیٹھا "ہم کہاں جا رہے ہیں اور تم کون ہو؟"

"چند منٹ بعد ہم منزل پر پہنچ جائیں گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا اور میں ہیکزی ہوں۔" اس شخص نے میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اتنا مجھے بھی معلوم ہے، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارا کن لوگوں سے تعلق ہے؟" میں نے اسکے بے ہودہ جواب پر تلخ لہجے میں کہا۔

"خالد عبدالفتاح نے مجھے اس کام پر مامور کیا ہے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔

اس بار میں نے خاصا سکون محسوس کیا۔ نام سے اس شخص کی عرب قومیت کا اظہار ہو رہا تھا اور امکان یہی تھا کہ وہ خود تنظیم کا مقامی نمائندہ ہو۔

پندرہ منٹ بعد ایک مختصر سے کاٹیج کے سامنے ہیکزی نے کار روک دی "اتر کر سیدھے اندر چلے جاؤ وہ تمہارا منتظر ہوگا۔"

"تم ساتھ نہیں چلو گے؟" میں نے اشتباہ آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ دیر مت کرو، تم کو اکیلے اندر جانا ہے۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

میں کار سے اترا اور ہیکزی فوراً ہی آگے بڑھ گیا۔

میں کاٹیج کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اچانک سیاہ کار میرے قریب آ کر رکی۔ بریکوں کا شور سن کر میں پلٹا تو شاہدہ ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی سے سر نکالے مجھے بلا رہی تھی۔ اسے وہاں دیکھ کر یک بیک میری کھوپڑی بھڑک اٹھی۔

"تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟" میں اس کے قریب جا کر غرایا۔

"مجھے سوتا ہوا چھوڑ کر تم کہاں آئے ہو، اگر بروقت میری آنکھ نہ کھلتی تو تم نکل ہی گئے تھے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"اگر آنکھ کھل گئی تھی تو وہیں روک کر پوچھ لیتیں مجھ سے کیوں نگرانی کر ڈالی، میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"یہاں کس سے ملنے آئے ہو؟" وہ ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی پھر اچانک وہ نیچے جھک گئی۔ اسی وقت میرے عقب سے فائر کی آواز آئی اور گولی شاہدہ کی کار کی باڈی میں پیوست ہو گئی۔

میں بوکھلا کر پیچھے پلٹا تو چند فٹ کے فاصلے پر ایک شخص ریوالور سنبھالے دوسرے فائر کی تیاری کر رہا تھا مگر جب تک وہ دوسری گولی چلاتا، شاہدہ اپنی کار تیزی سے آگے بڑھا لے گئی اور میں حیران و پریشان وہیں کھڑا رہ گیا۔

"آ جاؤ، وہ بھاگ گئی۔" فائر کرنے والا نہایت اطمینان سے اپنا ریوالور جیب میں اڑستے ہوئے بولا اور میں غیر ارادی طور پر کاٹیج کی طرف بڑھ گیا۔

اسی اثنا میں قرب و جوار سے کئی آدمی گھر کی چادریں میں نمودار ہوئے اور مقامی زبان میں ہم دونوں سے استفسار کرنے لگے۔ فائر کرنے والے نے بیزاری کے عالم میں ہاتھ لہرا لہرا کر ان سے کچھ کہا اور مجھے ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔

"اس چڑیا کو کہاں سے پیچھے لگا لائے ہو؟" کاٹیج میں داخل ہوتے ہی اس شخص نے نہایت فصیح عربی میں سوال کیا۔

"ہوٹل میں میرے ساتھ ہی موجود تھی، خاموشی سے پیچھے لگی چلی آئی۔" میں نے اسے عربی میں ہی جواب دیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"خالد عبدالفتاح!" اس نے کہا۔ "تنظیم میں اپنے گروپ کی نمائندگی کرتا ہوں۔"

"اس لڑکی کو کہاں سے جانتے ہو؟"

"نہایت واہیات لڑکی ہے۔ عام طور پر شین مارکیٹ کے لیے منشیات لاتی اور لے جاتی ہے۔" اس نے نشست گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس پر فائر نہیں کرنا چاہیے تھا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا اضطراری عمل تھا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ میرے دروازے پر سے تمہیں اسلحہ کے بل پر اٹھا لے جانا چاہتی ہے۔"

"مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟"

"کل سے تمہارے بارے میں معلومات مل رہی تھیں مگر تمہارا ٹھکانہ آج معلوم ہوا ہے۔ اب تم میرے ساتھ رہو گے۔"

"برسلز میں میرا قیام بہت مختصر تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"بعد میں حالات تبدیل ہوئے ہیں۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔

"تمہاری بیوی میلان میں تین روز تک تمہارا انتظار کرتی رہی پھر اسے انتہائی مجبوری کے عالم میں شام بھیج دیا گیا۔ وہ کچھ روز وہاں بہت زیادہ مصروف رہے گی۔"

"وہ لڑکی اپنے ساتھ کمک لے کر واپس آ سکتی ہے۔ یہاں ہم خطرے میں ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے حقیقی خدشات سے آگاہ کر دیا۔

"وہ اتنی اہم نہیں ہے۔ پھر بھی ہم یہاں سے نکل چلتے ہیں کیوں کہ آج کل میں دوسری جگہ ٹھہرا ہوا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

کاٹیج سے نکلنے کے لیے جوں ہی اس نے دروازہ کھولا اچانک کوئی دروازہ دھکیل کر اندر گھس آیا اور ساتھ ہی نسوانی آواز میں ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم ملا۔

آنے والی شاہدہ تھی اور اس کے ہاتھ میں خودکار ریوالور دبا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر خالد غصے سے بے قابو ہونے لگا مگر شاہدہ نے اسے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ریوالور کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا اور اگر وہ ایک دو گولیاں چلا بھی دیتی تو اس کاٹیج سے باہر کسی کو علم بھی نہ ہو پاتا کہ اندر کیا ہوا ہے۔

"دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" شاہدہ نے سرد اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

خالد نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ "میں تم سے اس جسارت کا بھرپور انتقام لوں گا۔"

"جسے تم انتقام کہہ رہے ہو وہ تو میرے لیے انعام ہوتا ہے۔" وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تھوڑی دیر پہلے تمہارا چیتا بھی مجھ سے انتقام لے چکا ہے۔" آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے اس نے میری طرف اشارہ کیا تھا۔

"تم جیسی آوارہ لڑکیوں کے خیالات سے میں خوب واقف ہوں۔" خالد غصے سے پھنکارا۔

اس کا فقرہ پورا ہوتے ہی کمرے میں کھٹکے کی آواز گونجی اور خالد اپنا داہنا پیر تھام کر کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کے گرتے ہی شاہدہ نے حیرتناک پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے زقند لگائی اور خالد پر سوار ہو گئی جو اپنی جیب سے ریوالور نکال رہا تھا۔

اسی وقت میں بھی اس طرف لپکا مگر پلک جھپکتے میں شاہدہ خالد سے ریوالور چھین کر دور ہٹ چکی تھی اور اس کے ریوالور کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

میرے ہاتھ مشینی انداز میں اوپر اٹھتے چلے گئے۔ شاہدہ کا وہ روپ میرے لیے بہت حیرت ناک تھا۔ اس نے ریوالور چھیننے کے ساتھ ہی خالد کی پسلیوں پر بھی کوئی کاری ضرب لگائی تھی کیونکہ وہ اذیت کے عالم میں تڑپتے ہوئے اسے عربی میں بے تحاشا مغلظات سنا رہا تھا۔

"اسے خاموش رہنے کا مشورہ دو ورنہ ایک گولی اس کے بھیجے میں بھی اتار دوں گی۔" شاہدہ نے سرد اور جارحانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"اسے شدید چوٹ آئی ہے۔" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"اسے چیخنے کا شوق نہیں ہے۔"

وہ سرد نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے خالد کی طرف بڑھنے لگی جو فرش پر اکڑوں بیٹھا درد سے کراہ رہا تھا۔

سرکتے سرکتے وہ جوں ہی خالد سے تین چار فٹ کے فاصلے پر پہنچی، خالد نے اچھل کر اسے دبوچنا چاہا مگر شاہدہ اس سے کہیں زیادہ پھرتیلی تھی۔ اس نے فضا میں اچھل کر نہ صرف خود کو صاف بچا لیا بلکہ خالد کی کنپٹی پر بائیں پیر سے ایسی ضرب لگائی کہ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

شاہدہ کے جارحانہ تیور اور پھرتی دیکھتے ہوئے میں اس مرتبہ بھی دخل اندازی نہ کر سکا اور وہ خالد کا ریوالور اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "تمہارے پاس کون سا ہتھیار ہے؟"

"تم واقف ہی ہو۔" میں نے ماحول کی تلخی کم کرنے کے

لیسے بے چارگی سے کہا۔

"تم گدھے ہو۔" وہ مختصر سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جاؤ۔ میں خود تمہاری تلاشی لوں گی۔"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ گراتے ہوئے کہا مگر اس نے فوراً ہی مجھے ٹوک دیا۔

"میں خود اپنا اطمینان کروں گی۔ تم دیوار کی طرف منہ کرلو۔"

مجھے ناچار اس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور اس نے نہایت ہوشیاری سے میرا پورا بدن ٹٹول کر اپنا اطمینان کرلیا۔

"اب میرے ساتھ چلے آؤ۔" اس نے اپنا ریوالور رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا کیا ہوگا؟"

"خود ہوش میں آجائے گا۔ یہ بتاؤ اس فلسطینی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ پیرس میں تو تم ہر بات کو اتفاق قرار دیتے رہے تھے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اور میں اس کی طبی امداد کا بندوبست کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

"باہر جاکر پولیس کو فون کردیں گے وہ خود ہی طبی امداد کا بندوبست کرے گی۔ میں یہاں زیادہ وقت برباد نہیں کرسکتی۔"

"اور اگر میں اڑ جاؤں؟"

"تم سمجھدار ہو، مجھے معلوم ہے کہ خطرناک ضد نہیں کرو گے۔" وہ سنجیدہ تھی۔

مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ کاٹیج سے تھوڑے فاصلے پر اس کی کار موجود تھی۔ اس نے مجھے ڈرائیو کرنے کا حکم دیا اور خود میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔

"اب شرافت سے بتاؤ کہ تم کون ہو اور کیا کرتے پھر رہے ہو؟" کار روانہ ہونے کے چند منٹ بعد اس نے سوال کیا۔

"اگر میں مسلح ہوتا تو اس وقت یہی سوال تم سے کر رہا ہوتا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ مفروضہ ہے جبکہ میری برتری حقیقت ہے۔"

"میں ایک آدمی ہوں اور مقدر کی گردش جھیل رہا ہوں۔" میں نے اسی کے انداز میں جواب دے ڈالا۔

"مجھے تمہارے نام سے دلچسپی ہے ڈارلنگ!"

"میرا نام ڈان فرنانڈو ہے۔"

"شین مارکیڈو نے تمہیں تین چار دن بلاوجہ پاگل خانے میں نہیں رکھا تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا اور میں اس کے الفاظ پر چونک پڑا۔

"اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "وہ مجھے اپنی ادنیٰ ماتحت سمجھ کر کئی بار زبردستی پامال بھی کرچکا ہے مگر وہ [illegible] وہ میرے احکام کی بجا آوری پر مامور ہے۔"

"یعنی تم مادام بواری ہونے کا اعتراف کر رہی ہو؟"

"تمہارے اعصاب پر بس یہی ایک نام سوار ہے۔" وہ [illegible] کر بولی۔ "ہماری تنظیم بہت بڑی ہے۔ شین مارکیڈو جیسے لوگوں [illegible] دوسرے لوگ بیٹھے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ رو میں آکر مجھ پر اپنی بڑائی کا اظہار کرتے کرتے احتیاط کے پیش نظر رک گئی تھی۔

"تم پاگل خانے کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"اس سے پہلے اور باتیں بھی سن لو، بعد میں حسرت نہ رہ جائے۔" وہ بولی۔

"تو کیا کچھ اور بھی ہے سنانے کے لیے؟"

"پیرس میں اسرائیل کا ایک ممتاز شہری بن حیان اور اس کا بھائی عذرا جوناس مارا گیا تھا۔" اس نے بات شروع کی۔ میرا دل اچھل کر یک بیک حلق میں آگیا۔ "اس کے قتل کے بارے میں تفتیش کے لیے اسرائیلی اہلکار بھی پیرس پہنچے اور انہوں نے مخصوص حلقوں میں انکشاف کیا کہ وہ دونوں قتل صفدر علی نامی ایک ایشیائی نے کیے تھے جو اسرائیل سے فرار ہوکر کسی نہ کسی طرح فرانس میں روپوش ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ان کے مطابق صفدر علی کو فلسطینیوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور وہ ان کے لیے کام کرتا تھا۔ اسرائیلی صفدر علی کی گرفتاری کے لیے منہ مانگا [illegible] دینے کے لیے تیار تھے۔ صفدر علی کی تلاش میں اسرائیلی سیکرٹ سروس کے علاوہ ساوک کا ایک چیف ایجنٹ علی نقی بھی شامل تھا اور جب عبدالعزیز نے ایک اہم کام کے لیے علی نقی سے قابل اعتماد آدمی طلب کیا تو اس نے میرا نام پیش کردیا تاکہ میں فلسطینیوں میں گھس کر صفدر علی کے بارے میں معلومات حاصل کرسکوں۔ عبدالعزیز کے حوالے سے تم سامنے آئے تو میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ اس سے پیشتر کہ تمہارے بارے میں اپنے شبہات کی توثیق کرتی عبدالعزیز کو اپنی حماقت کا احساس ہوگیا اور وہ تمہیں اپنی دانست میں ہمارے قبضے سے نکال لے گیا مگر میں نے تم دونوں کا پیچھا کیا اور جب میکفرسن کے ساتھ بروسیلز کے لیے روانہ ہوئے تو شین مارکیڈو تمہارے استقبال کے لیے تیار تھا۔ تم اس کی توقع سے زیادہ عیار ثابت ہوئے اور میکفرسن کے ساتھ ہی رونالڈ کو بھی ختم کردیا مگر اس سے نہ بچ سکے اور شین مارکیڈو نے ضامن بن کر تمہیں قید کرلیا۔ اس نے تمہیں پاگل خانے میں رکھ کر تمہاری تصاویر اور [illegible] پرنٹ فرانس بھیجے جو میں نے تصدیق کے لیے اسرائیلی سفارتخانے تک پہنچا دیئے۔ اسرائیلیوں نے نہ صرف تمہارا راز فاش کردیا بلکہ ضرورت سے زیادہ بے صبری کے ساتھ تمہاری حوالگی کا مطالبہ کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ ان کے سیکرٹ ایجنٹ یہاں بھی آپہنچے اور تمام مشکوک ٹھکانوں پر تمہیں تلاش کرنے لگے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ تم ہمارے قبضے میں ہو اس لیے شین مارکیڈو کے ٹھکانے مخدوش تھے لہٰذا ہنگامی طور پر تمہیں آزاد کردیا گیا مگر اب میں خود تمہارا سودا چکانے یہاں آئی ہوں۔"

"خاصی دلچسپ کہانی ہے مگر اس میں مادام بواری کا کہیں ذکر نہیں ہے۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے بے فکری کے اظہار کی نیت سے کہا۔

"وہ ایسے چھوٹے موٹے معاملات سے بالاتر ہے۔"

"خوب!" میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "اگر وہ اپنی بیوگی کے معاملے کو چھوٹا موٹا سمجھتی ہے تو بہت سنگدل عورت ہے!"

ان الفاظ پر شاہدہ چونک پڑی۔ "تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"مادام بواری، مسز عذرا جوناس یا منشیات کی ماری ایک آفت زدہ عورت کی بات کر رہا ہوں جو خود تو بستر مرگ پر دراز ہے مگر اس کا نام جرائم کی دنیا میں ہوا بنا ہوا ہے۔" میں نے اس کے بتائے ہوئے راستے پر کار گھماتے ہوئے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ سراسر بکواس ہے۔" وہ اپنی حیرت اور بے یقینی پر قابو نہ رکھ سکی۔

"اسرائیلی تو بعد میں متوجہ ہوتے ہوں گے بنیادی بات تو یہ ہے کہ مادام بواری اپنے بے وفا شوہر کے قاتل سے ہولناک انتقام لینا چاہتی ہے جس کے لیے اس نے اپنی کسی خوبصورت اور جواں سال جانشین سے فرمائش کی ہوئی ہے۔"

"تم بہت کچھ جان چکے ہو صفدر علی!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "مادام بواری آج بھی بستر مرگ پر تمہارے سر کی منتظر ہے۔"

"اور دوسری طرف اسرائیلی میرے عوض خطیر رقم کی پیشکش کر رہے ہیں۔" میں بے رحمانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ "تم بڑے امتحان سے دوچار ہوگئی ہو۔"

"مادام بواری کی جانشین کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس کے لہجے سے رعونت اور تحکم کا خاتمہ ہوچکا تھا۔

"اس کے باپ نے قید کے دوران جیل میں خودکشی کرلی تھی اور ماں اپنے شوہر پر مقدمہ چلنے کے دوران مرگئی تھی مگر مرنے سے قبل اس نے اپنی بیٹی کو یہ ضرور بتادیا تھا کہ وہ عمر بھر مادام بواری کے لیے کام کرتی رہی تھی۔"

شاہدہ بے چینی سے نشست پر پہلو بدلنے لگی۔ "نام نہیں بتاؤ گے اس کا؟"

"اگر تم شروع سے میری طرف سے مشکوک تھیں تو میں بھی تم سے مطمئن نہیں تھا شاہدہ۔" میں نے کہا۔ "تمہارا ماضی میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔"

"تمہاری باتیں سراسر مفروضوں پر مبنی ہیں۔" وہ بولی۔ "مادام بواری تمہارے لہو کی پیاسی ہے مگر اس کا جانشین صرف تمہارے ذہن میں ہی بستا ہے۔"

"میں جوناس ولا میں کئی دن مقیم رہا تھا شاہدہ!" میں نے اسے بے بسی کا احساس دلانے کے لیے کہا۔ "مادام بواری کی سسکتی ہوئی زندگی کا چشم دید گواہ ہوں اور اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے خود ہی مجھے یہ تمام باتیں بتائی تھیں۔"

"تم جھوٹے ہو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنے چہرے کے تاثرات کے اعتبار سے معمولی سی لڑکی نظر آئی۔ اس کا سارا دبدبہ اور جلال آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں میں تحلیل ہوچکا تھا۔

"تمہاری نمناک آنکھیں میرے الفاظ کی صداقت کا اعلان کر رہی ہیں شاہدہ! اگر تم نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میرے ساتھ ہی وہ سحر انگیز حصار بھی برباد ہوجائے گا جو تم نے اپنی ذات کے گرد کھڑا کیا ہوا ہے۔"

"ہاں میں مادام بواری ہوں۔" وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرائی۔ "تم میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے۔"

"تم درست کہتی ہو۔" میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "میں خواتین کے بالوں کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔"

"تم جھوٹے اور کمینے ہو۔" وہ میرا بازو نوچتے ہوئے غرائی۔

شاید میرے بڑھتے ہوئے اعتماد نے اس پر جھلاہٹ طاری کردی تھی۔ "ان معاملات میں تم آگے ہو!!"

"میں دیکھوں گی تمہاری خودسری۔" وہ سانسوں کے زیروبم میں بولی۔ "میرے پیچھے کسی کتے کی طرح دم ہلاتے پھرو گے۔"

"زبان درست رکھو شاہدہ!" میں نے پوری قوت سے بریک لگاکر کار روکتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ "دوبارہ بدزبانی کی تو تھپڑ مار مار کر تمہارا چہرہ لہولہان کردوں گا۔"

"گاڑی چلاؤ ورنہ گولی ماردوں گی۔" وہ اپنے بے آواز ریوالور کی نال میری طرف اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ماردو۔ گولی ہی ماردو۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "میں گاڑی نہیں چلاؤں گا۔"

"میں سنجیدہ ہوں صفدر علی!" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

جواب میں میں نے اسے ایک خاصی ثقیل گالی سنائی اور اسی لمحہ میری کنپٹی پر اس لڑکی نے اپنی ہتھیلی سے ایک جچا تلا وار کیا اور میں

ڈرائنگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی بے ہوش ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک پر تعیش خواب گاہ میں موجود پایا جہاں کپڑے کی دریافت سے پہلے کے دور کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔

کمرہ میں پھیلی ہوئی حرارت اور کسی پنکھے کی مدھم سی گونج سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں کمروں کو گرم رکھنے کا نظام موجود تھا مگر دروازے پر قوت آزمائی کے بعد یہ جان کر کوفت ہوئی کہ نکاسی کی راہ مسدود تھی۔

کمرے میں موجود ایک الماری میں مختلف شرابیں موجود تھیں اور ٹھنڈے پانی کے لئے کولر بھی میسر تھا لہٰذا میں وقت گزاری کے لئے شراب نوشی میں مصروف ہو گیا۔

مے نوشی کے دوران میرا ذہن مسلسل شاہدہ میں الجھا رہا۔ وہ میرے رازوں سے واقف ہو چکی تھی اور میں اس کی اصلیت جان چکا تھا مگر ان دو طرفہ انکشافات کے بعد اس لڑکی کا رویہ بہت حیران کن تھا۔

میں سوچتا رہا اور پیتا رہا حتیٰ کہ میرے لئے اپنے قدموں پر اٹھنا دشوار ہو گیا۔ نگاہوں کے سامنے ہر شے جھومتی اور ڈگمگاتی ہوئی نظر آ رہی تھی ایک خالی بوتل قالین پر لڑھکی ہوئی تھی اور دوسری نصف رہ گئی تھی۔

میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ شراب نوشی کے بعد میں اتنی شدید ذہنی ابتری کا شکار ہوا تھا۔

سفید بوتل میں بچا ہوا نیم آتشیں سیال مجھے للکار رہا تھا۔ میں نے لہراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور وہ بوتل پوری قوت سے ایک طرف اچھال دی۔

بوتل دیوار سے ٹکرائی تو دھماکا ہوا۔ شیشے کے پرزے بکھرے تو زبردست چھناکا ہوا اور اسی کے ساتھ کہیں سے ایک سریلی چیخ ابھری!

ٹوٹی ہوئی بوتل میں سے وہ چیخ کیوں ابھری تھی؟ میں اس احمقانہ سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے بمشکل اپنی جگہ سے اٹھا اور صوفوں اور دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے وہاں پہنچ گیا جہاں قالین پر شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

سفید شیشے کے وہ ٹکڑے کبھی پھیل رہے تھے اور کبھی سکڑ جاتے تھے پھر ان میں سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ "اندر کون ہے؟"

وہ آواز کچھ شناسا سی تھی مگر مجھے یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کدھر سے آئی تھی پھر یکے بعد دیگرے دو مرتبہ نامانوس زبانوں میں اسی آواز نے کچھ کہا اور اس بار مجھے اندازہ ہو گیا کہ باہر کوئی موجود تھا۔

"اندر میں ہوں!" میں نے زور سے کہا۔ میری آواز بھاری اور لڑکھڑائی ہوئی تھی۔ میں باہر سے آنے والی نسوانی آواز کے بارے میں ذہن پر زور دیتا رہا مگر اس وقت دماغ بالکل نکما ہو کر رہ گیا تھا۔

"تم کون ہو؟" اس بار آواز کے ساتھ ہی دروازے پر دستک بھی سنائی دی۔

"میں بے ضرر آدمی ہوں پیاری لڑکی، دروازہ کھول کر اندر آ جاؤ!"

"مگر تم ہو کون؟ یہ دروازہ تو مقفل ہے!" لڑکی کی آواز میں خوف کے ساتھ ہی جھلاہٹ بھی نمایاں تھی۔

"دروازہ توڑ دو!" میں نے کہا۔

"مرد ہو کر مجھ سے کہہ رہے ہو؟" اس مرتبہ نسوانی آواز میں چیلنج تھا "ہمت ہے تو کچھ کر گزرو۔ اس وقت عمارت میں میرے سوا کوئی نہیں ہے!" قدرے توقف کے بعد وہ تشویش زدہ لہجے میں بولی "معلوم ہوتا ہے کہ تم نشے میں ہو!"

"غصے میں ضرورت سے زیادہ پی گیا ہوں" میں نے لڑکھڑائی ہوئی زبان سے کہا "ویسے تمہاری آواز مجھے مانوس لگ رہی ہے"

"میں ایلیزا ہوں۔ ایلیزا جوناس!" اس بار وہ آواز خاصی جذباتی تھی۔

"اوہ!" میرے حلق سے ایک طویل آواز نکلی "تمہیں پورا یقین ہے کہ عمارت میں کوئی اور چھپا ہوا نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں!" ایلیزا کی آواز جھلائی ہوئی تھی "تم بحث میں وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔ اپنا نام بتاؤ نا"

"میں صفدر علی ہوں ڈارلنگ" میں نے سرد مہری کے عالم میں کہا "میرا ذہن پوری طرح کام کر رہا ہے لیکن اعضا ساتھ نہیں دے رہے۔"

"ارے صفدر علی" لڑکی تحیر آمیز آواز میں تقریباً چیخ پڑی "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہاری ماں کا انتظار کر رہا ہوں!"

"میری ماں تو کئی گھنٹے پہلے چل بسی، وہ سب اسی کی تدفین کو نکل گئے ہوئے ہیں!" ایلیزا کی آواز آئی۔

"تم کیوں نہیں گئیں؟"

"ایک لڑکی نے مجھے سختی سے روک دیا تھا"

"شاہدہ کی بات تو نہیں کر رہیں؟"

"مجھے اس کتیا کا نام نہیں معلوم" وہ بولی "ویسے اب ساری بات میری سمجھ میں آتی جا رہی ہے۔ شاید میری ماں کو یہاں سے پیغام ملا ہو کہ تم پکڑ لئے گئے ہو اور وہ انتقام میں اندھی ہو کر سفر کا خطرہ مول لینے کو تیار ہو گئی۔ وہ صبح نو بجے والی پرواز سے یہاں پہنچی اور پونے گیارہ بجے..."

"اس وقت کیا بجا ہے؟" میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"چار بجے ہیں" باہر سے آواز آئی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس وقت تک میں سمجھتا رہا تھا کہ شاہدہ نے مجھے کچھ دیر پہلے بے ہوش کیا تھا مگر یہ معلوم کر کے پریشان ہوا کہ وہ پچھلے روز کا قصہ تھا اور میں کم از کم اٹھارہ بیس گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ صورت حال کی سنگینی سامنے آئی تو میرے حواس بتدریج بحال ہونے لگے۔

"کیا تم سو رہے ہو؟" میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ایلیزا غصیلے لہجے میں بولی۔ "تم اس مکان میں کیوں موجود ہو؟"

"پھر کیا کروں؟"

"باہر فرار ہو سکتی ہو۔ تمہیں پناہ دینے والے ہزاروں مل جائیں گے!"

"اس نے مجھے بھی ایک کمرے میں قید کیا ہوا تھا۔ میں روشندان توڑ کر باہر نکلی ہوں لیکن باہر احاطے میں خونخوار کتے کھلے پھر رہے ہیں کوئی دروازہ وغیرہ توڑ کر باہر نکلی تو وہ مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے!"

"اس مکان میں کوئی اسلحہ تلاش کرو!"

"تم خود باہر نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے" ایلیزا کا لہجہ جھلایا ہوا تھا "گیدڑ کی طرح اندر چھپے وقت برباد کر رہے ہو!"

"کوئی ریوالور مل جاتا تو اس کمرے کا دروازہ بھی بآسانی کھل جاتا اور کتے بھی مارے جاتے!" میں نے کسلمندانہ لہجے میں کہا۔

"اس عمارت میں تم شدید خطرات میں گھرے ہوئے ہو" اس نے شاید دانت پیس کر میرے مخمور اعصاب کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی "تم ہماری آمد سے پہلے ہی اس عمارت میں لائے گئے ہو گے لیکن اس حرامزادی نے میری ماں کو تمہاری موجودگی کی ہوا بھی نہ لگنے دی اور پھر دوپہر سے دو اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ یہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ تمہارے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر رضامند تھے لیکن وہ ان سے بھی فراڈ کرتی رہی کہ تمہارے بارے میں اسے کچھ علم نہیں ہے"

"اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ کہاں ہیں؟"

"وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ میری ماں کے تابوت کے ساتھ ہی یہاں سے نکلے تھے!"

"اچھا میں دروازہ توڑتا ہوں۔ تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"شاباش" اس کی آواز میں مسرت سمٹ آئی "تھوڑی سی ہمت سے کام لو میں ریوالور تلاش کرتی ہوں اگر ہمارے نکلنے سے پہلے وہ لوگ واپس آ گئے تو ہم چوہے دان میں پھنسے رہ جائیں گے"

میں اپنی جگہ سے اٹھا مگر میرا سر گھوم رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازہ دیکھنا چاہا لیکن وہ مسلسل ہلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے دوڑ کر اس دروازے پر شانے سے ٹکر مارنی تھی۔ مگر دوڑنا تو درکنار میرے لئے چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں جھومتا ہوا چند قدم آگے بڑھا اور بستر پر گر گیا۔

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو بے فکری سے آرام کرنا چاہئے" میں نے دل ہی دل میں سوچا اور آنکھیں موند لیں۔

مجھے چند منٹ سے زیادہ سکون میسر نہ آ سکا کیونکہ بند دروازے کے باہر سے ایک بار پھر ایلیزا کی بپھری ہوئی آواز سنائی دی "کہاں مر گئے تم۔ تمہیں شراب میں بھی آج ہی غرق ہونا تھا"

"مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو ایلیزا!" میں نے بیزاری کے عالم میں کہا "تاکہ میرے اعصاب اعتدال پر آ سکیں"

"مجھے ایک ریوالور مل گیا ہے" اس بار ایلیزا نے تیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا "میں دروازے کے قفل پر نال رکھ کر گولی چلا رہی ہوں"

وہ خوشخبری سنتے ہی میں بستر سے اٹھ گیا "نال پر کوئی تکیہ یا موٹا سا کپڑا وغیرہ لپیٹ لینا تاکہ آواز دب سکے"

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے فلموں سے یہ سب ترکیبیں سیکھی ہوئی ہیں"

اس کا جواب میرے لئے حوصلہ افزا تھا۔

باہر سے ایلیزا نے تالے پر فائر کیا اور میرا کمرہ دھماکے کے ساتھ بارود کی بو سے بھر گیا۔ ساتھ ہی دروازہ کھول کر ایلیزا اندر گھس آئی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ والہانہ انداز میں مجھ سے بغل گیر ہوئی مگر اپنے شانوں پر میرا پورا بوجھ محسوس کر کے وہ الگ ہٹ گئی اور ملامت آمیز لہجے میں بولی "تم جیسے بلانوش کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے دکھ ہوا ہے۔ صفدر!"

"مجھے خود دکھ ہو رہا ہے" میں نے اس کے سہارے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ایک ڈیڑھ بوتل مجھے اتنا مفلوج نہیں کر سکتی۔ اس شراب میں شاید کچھ اور بھی ملا ہوا تھا"

"ایک ڈیڑھ بوتل" وہ غرائی "اس حالت میں تو تم تابوت یا اسٹریچر کے بغیر نہ جا سکو گے۔ لعنت ہو تم پر!"

"میری زبان اور قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ بصارت کچھ دھندلا گئی ہے مگر ذہن کام کر رہا ہے۔ میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گا" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"دماغ تو میرا ابھی کام کرنے لگا ہے مگر میں تمہیں کندھے پر لاد کر چار قدم بھی نہ چل سکوں گی" وہ ریوالور دکھاتے ہوئے بولی۔

"ایسا کرو کہ تم نکل جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اگر ان لوگوں کی واپسی سے پہلے میری حالت سنبھل گئی تو خاموشی سے کھسک جاؤں گا ورنہ تم خالد عبدالفتاح کو اس عمارت کا پتہ بتا دینا"

"خالد عبدالفتاح کون ہے؟"

"ایک فلسطینی!" میں نے کہا "وہ میری رہائی کا کوئی نہ کوئی انتظام کرے گا"

"بشرطیکہ اس وقت تک تمہیں اسرائیلیوں کے ہاتھ فروخت نہ کر دیا جائے" اس نے مجھے گھورتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔ "تم نے شاہدہ کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے۔ وہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ وہ کسی لمبے چکر میں ہے ورنہ وہ لوگ اسے منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں"

"نہیں۔ میں تمہیں اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ اور پھر میں خالد عبدالفتاح کو تلاش بھی نہ کر سکوں گی"

"بچوں کی سی ضد نہ کرو!"

"ضد نہیں۔ میں تمہاری حالت سدھرنے یا ان کی واپسی کا انتظار کروں گی اور اگر وہ میرے سامنے آہی گئے تو ایک بھی زندہ نہ بچ سکے گا۔"

"اگر گوریوں سے زیادہ افراد ہوئے تو کیا کرو گی!"

"آخری گولی اپنے بھیجے میں اتار لوں گی۔" وہ چڑ کر بولی۔

"تمہیں اپنی ماں کی موت کا دکھ نہیں ہے۔" میں نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ مسلسل بولتے رہنے سے میری حالت پر بہتر اثرات مرتب ہو رہے تھے۔

"اس کی زندگی موت سے بدتر تھی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اگر وہ مجھے فرانس سے اپنی روانگی کا مقصد بتا دیتی تو میں اسے سفر پر روانہ نہ ہونے دیتی اور اس کی موت کچھ عرصہ کے لئے ٹل جاتی۔ وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا شکار ہوئی ہے۔"

"آؤ! وقت برباد کرنے کے بجائے نکاسی کی راہ تلاش کریں۔" میں نے اس کے سہارے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں کچن کی کھڑکی سے کئی سلاخیں نکال چکی ہوں۔ ادھر سے ہم بآسانی باہر نکل سکتے ہیں۔" اس نے اپنے کارنامے سے آگاہ کیا۔

"کمال ہے کہ ریوالور کے فائر پر کوئی ادھر متوجہ نہیں ہوا۔" میں نے اس کی رہنمائی میں آہستہ آہستہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"فائر کا شور تکئے نے جذب کر لیا تھا۔" وہ بولی۔ "باہر کوئی غیر معمولی دھماکہ نہیں ہوا تھا اور پھر یہاں آبادی بھی بہت کم ہے۔"

ہم دونوں کچن میں پہنچے تو وہاں نکاسی کا شاندار راستہ تیار تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکالا ہی تھا کہ کسی جانب سے دو کتے دبی دبی خونخوار غراہٹوں کے ساتھ کھڑکی کے نیچے آپہنچے اور میری طرف لپکنے لگے۔

میں نے خوف سے پھریری لے کر اپنا سر اندر کر لیا مگر کتے بدستور وہیں کھڑے غراتے رہے۔

"ان پر فائر کئے گئے تو دھماکے دور تک سنے جائیں گے۔" ایلیزا نے کہا۔ "یہ امکان بھی تو ہے کہ لوگوں کو علم بھی نہ ہو سکے کہ فائرنگ کس احاطے میں ہوئی ہے۔ دونوں فائر کم و بیش تواتر سے ہی کئے جائیں گے!"

"میرا نشانہ کچا ہے۔" اس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ان کے لئے دو گولیاں ناکافی ثابت ہوں اور مزید فائر کرنے پڑ جائیں۔"

"منفی امکانات پر اتنا دھیان نہ دو۔" میری حالت بڑی حد تک سدھرتی جا رہی تھی۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کتوں کے علاوہ یہاں دربان بھی ہو!"

"میں اپنی ماں کے ساتھ آئی تو کھلے ہوئے پھاٹک پر کوئی نہیں تھا۔ بس کتے بندھے ہوئے تھے جو شاہدہ کی وجہ سے خاموش رہے!"

"تم شاہدہ کے ساتھ آئی تھیں؟"

"ہاں وہی ہمیں لینے ایئرپورٹ پہنچی تھی۔ میری ماں کا بہت احترام کرتی تھی۔"

"تو پھر فائر کرو نا!" میں نے سوال کیا۔

"تمہارے ہاتھ تو نہیں کانپیں گے!"

"اس حالت میں بھی تم سے بہتر نشانہ لگا لوں گا۔" میں نے سگریٹ ... اور ایلیزا نے ریوالور مجھے تھما دیا۔

میں نے بایاں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر جما کر اپنا دھڑ اور دایاں ہاتھ باہر نکالا۔ آہٹ محسوس کرتے ہی دونوں کتوں نے کان کھڑے کر کے فضا میں سونگھا اور پھر بیک وقت کھڑکی کی طرف آئے۔ میں نے ریوالور کی نال سیدھی کر کے ٹریگر دبا دیا اور کتے کی پیشانی چکنا چور ہو گئی۔ پہلے کو خون میں نہا کر کرب سے تڑپتے دیکھ کر دوسرا کتا بہت زیادہ ... گیا اور اگلے ہی ثانیے میں دوسری گولی اسے بھی ٹھکانے لگا چکی تھی۔

"آؤ!" میں نے ایلیزا کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"کتوں کو ٹھنڈا تو ہونے دو۔" وہ ان کے تڑپتے ہوئے خون آلود ... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہ کاٹیں گے نہیں۔" میں یہ کہہ کر کھڑکی سے باہر کود گیا۔ ابھی میرے اعصاب کشیدہ تھے مگر حالات کے بے پناہ دباؤ کے تحت اس قابل ہو چکا تھا کہ کسی کا سہارا لئے بغیر اپنے قدموں پر چل سکوں۔ ایلیزا باہر آئی تو میں اس کے ہمراہ ایک طرف چل پڑا۔ وہ عمارت کا عقبی حصہ تھا اور ہمیں باہر نکلنے کے لئے چکر کاٹ کر عمارت کے سامنے والے رخ پر جانا تھا۔

ہم دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے عمارت کے کونے پر پہنچے اور گھوم کر ویران احاطے سے سیدھے پھاٹک کی طرف ہو لئے۔

پھر ہم پھاٹک سے بھی نکل گئے اور ہمارا کسی سے ٹکراؤ نہیں ہوا۔ میں نے باہر آتے ہی ریوالور اپنے اوورکوٹ کی جیب میں ڈالا اور کالر اس طرح کھڑا کر لیا کہ دور سے میرا چہرہ صاف نظر نہ آ سکے۔ ایلیزا نے کالر کھڑا کر کے اپنے سر پر کپڑے کا ہیٹ جما لیا تھا۔

سڑک دور تک ویران پڑی ہوئی تھی۔ اس پر لگے ہوئے درختوں کے سائے میں سردی کا احساس کچھ زیادہ ہی شدید تھا۔ گو یہ تھا کہ وہاں مکانات بہت دور دور بنے ہوئے تھے جس کی وجہ سے فائروں کی گونج پر کوئی متوجہ نہ ہو سکا تھا۔

"کہاں تک پیدل چلو گے؟" ایلیزا نے تھوڑی دیر بعد کپکپاتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ذرا سے پہلے پوچھا ہوتا تو مناسب رہتا۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ پیو تو سردی کا احساس جاتا رہے گا۔"

ہم دونوں نے چند ثانیوں کے لئے رک کر اپنی سگریٹیں سلگائیں اور پھر خراماں خراماں آگے چل پڑے۔

"اگر ہمیں پیدل ہی برسیلز جانا پڑ گیا تو رات ہو جائے گی۔" ... نے ناک سے دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "یہاں تو دور دور تک کسی ٹیکسی وغیرہ کا ملنا بھی محال نظر آتا ہے۔"

"ذرا ایک منٹ ٹھہرو۔" اچانک ایلیزا بولی۔ "تمہیں یقین ہے کہ ہم برسیلز کی طرف ہی جا رہے ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم! میں تو تمہاری تقلید کر رہا ہوں!" یہ کہتے ہوئے مجھے بلجیم میں اپنا پہلا تجربہ یاد آ گیا جب غلط سمت میں کھڑے ہو کر لفٹ لینے کی پاداش میں مجھے حوالات کی سیر کرنی پڑ گئی تھی۔

"خیر کہیں نہ کہیں تو پہنچیں گے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "اس قید خانے سے نجات مل چکی ہے اور پھر تم میرے ساتھ ہو۔"

"ٹھنڈی ہوا میرا نشہ پھر تازہ کر رہی ہے!"

"فکر نہ کرو تھوڑی دیر کے لئے جھاڑیوں وغیرہ میں سستا لیں گے۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ "اگر کوئی کار نظر آئے تو بلا تکلف روک لینا، لفٹ مل گئی تو ہم خاصی کوفت سے بچ جائیں گے۔"

"مجھے معاف ہی رکھو تو بہتر ہے۔ زبان کی وجہ سے ہر شخص مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔ تم خود ہی بات کرنا۔"

ہم باتیں کرتے کافی دور نکل چکے تھے کہ مخالف سمت سے ایک کار آتی ہوئی نظر آئی اور ایلیزا نے میرا ہاتھ تھام کر پھرتی سے سڑک عبور کر ڈالی۔

"کیا واپس اسی قید خانے میں پہنچنے کا ارادہ ہے؟" میں نے کہا۔

"اگر اس نے لفٹ دے دی تو چند ہی منٹ میں ہم اس مکان سے میلوں دور نکل جائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آنے والی کار کو روکنے کے لئے ہاتھ لہرانا شروع کر دیا۔

دور سے یوں محسوس ہوا جیسے آنے والی کار کا ڈرائیور ایلیزا کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو مگر قریب آنے پر اس نے اچانک اپنا فیصلہ بدل دیا اور کار کے بریک لگنے سے چاروں ٹائر چیخ اٹھے۔

فضا میں اٹھنے والے ہلکے سے غبار میں ایلیزا ڈرائیور کی نشست کی طرف گئی اور میری نگاہیں بھی اسی طرف مرکوز ہو گئیں۔

جوں ہی ایلیزا میری نظروں اور ڈرائیونگ سیٹ کے درمیان سے ہٹی میرے فرشتے کوچ کر گئے کیونکہ اس کار سے شاہدہ ریوالور تھامے نیچے اتر رہی تھی۔

میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے ریوالور نکالنا چاہا مگر شاہدہ کی للکار سن کر میرا ہاتھ جیب سے خالی نکل آیا۔ میری کسی حرکت کے جواب میں اس نے ایلیزا کو شوٹ کرنے کی دھمکی دی تھی اور ایلیزا ہذیانی انداز میں اسے گالیاں دینے لگی تھی۔

بھرپور جدوجہد کے بعد شاہدہ کی قید سے ہمارا فرار بری طرح ناکام ہو چکا تھا۔ ایلیزا نے اپنی تھوڑی سی کاہلی کے نتیجے میں ہم دونوں کو ایک بار پھر اسی سفاک لڑکی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا جو میرے اور ایلیزا کے بارے میں کوئی خوفناک منصوبہ بندی کر رہی تھی۔

صورتحال بالکل ہی غیر متوقع طور پر خطرناک ہو گئی تھی۔ شاہدہ نے قریب آنے پر جس طرح اچانک کار روکی تھی اس سے یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ ہم دونوں کی طرف متوجہ نہیں تھی اور اگر لفٹ لینے کے لالچ میں ایلیزا اسے ہاتھ نہ دکھاتی تو شاہدہ ہمیں عام راہگیر وغیرہ سمجھ کر نظر انداز کرتی ہوئی اس سڑک سے گزر جاتی۔

مگر یہ مقدر کی خرابی ہی تھی کہ ہم نے اپنے دشمن کو خود اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اب دونوں ہی شاہدہ کے ریوالور کی زد میں تھے۔

"تمہاری جیب میں کیا ہے صفدر؟" شاہدہ نے سرد اور سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"کیا بک رہی ہے؟" ایلیزا نے فوراً ہی مجھ سے مخاطب ہو کر سوال کیا کیونکہ اردو اس کے پلے نہیں پڑ سکی تھی۔ اردو جملے کے تسلسل میں میرا نام بھی اس کے پلے نہیں پڑ سکا تھا ورنہ وہ مزید حیران ہوتی۔

"آپس کی باتیں ہیں۔" میں نے بے خوفی کے اظہار کے لیے ہنس کر ایلیزا سے کہا پھر انگریزی میں ہی شاہدہ سے مخاطب ہو گیا۔ "نکال کر دکھاؤں؟"

"اپنا اوورکوٹ اتار کر فٹ پاتھ پر ڈال دو اور دس قدم دور ہٹ جاؤ۔" شاہدہ کسی رعایت کے لیے آمادہ نہیں تھی۔

"اس کے بعد دوسرے کپڑوں کی بھی باری آئے گی؟" ایلیزا تحقیر آمیز لہجے میں بولی۔

"سرد ہوائیں ہڈیوں تک میں اتر رہی ہیں۔ کچھ تو موسم کا خیال کرو۔" میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔

"سردی سے مر نہیں جاؤ گے۔" وہ غرائی۔ "وقت ضائع نہ کرو، اگر کوئی دوسری کار ادھر آ نکلی تو میں فائر کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔"

"سارے ہی حسین تمہاری طرح سنگدل ہوتے ہیں۔" میں نے سرد سانس لے کر کہا اور اپنا اوورکوٹ اتار کر اس کی ہدایت کے مطابق فٹ پاتھ پر ڈال دیا۔

میرے دور ہٹنے کے بعد شاہدہ نے قریب آ کر ہم دونوں پر سے نظر ہٹائے بغیر اوورکوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"خوب تو یہ بھی میرے ہی گھر سے چوری کیا ہے!" ریوالور کا جائزہ لیتے ہوئے وہ دور ہٹ گئی اور مجھے اشارے سے اوورکوٹ پہننے کی اجازت دے دی۔

"تم جیسی کمینی لڑکی پر خریدا ہوا ہتھیار استعمال کرنا حماقت ہوگا۔" ایلیزا نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"صفدر کی پرانی داشتہ معلوم ہوتی ہو!" شاہدہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"یہ کتیا تمہارا اصلی نام بھی جانتی ہے؟" ایلیزا نے حیرت کے ساتھ مجھ سے سوال کیا۔
"بہت کچھ جانتی ہے، انجان ہوتی تو میں اس کا قیدی نہ ہوتا۔" میں نے ٹھنڈا سانس لے کر تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔
"گاڑی تم ڈرائیو کرو گے۔" شاہدہ نے بحث کو اختصار دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "اور ایلیزا تمہارے پہلو میں بیٹھے گی۔ اگر تم دونوں میں سے کسی نے بھی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں اس کا حلیہ بگاڑ دوں گی۔"
میں نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ایلیزا بھی بڑبڑاتی ہوئی اگلی نشست پر بیٹھ گئی اور شاہدہ نے عقبی نشست سنبھال لی۔
"یہ تمہیں کہاں سے جانتی ہے؟" کار میں بیٹھنے کے بعد بھی ایلیزا اپنی الجھن پر قابو نہ رکھ سکی۔
"پیرس سے میرے پیچھے ہے!" میں نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔
"پیرس سے؟" ایلیزا کا لہجہ تحیر آمیز تھا "لیکن تم نے تو کبھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا!"
"مجھے تمہاری حرکتیں بتاتا رہتا تھا۔" شاہدہ نے اسے جلانے کے لیے سفید جھوٹ بولا۔ "تم جیسی دس بارہ لڑکیوں کو یہ بڑی بے دردی سے استعمال کرتا رہا ہے!"
"خاموش کمینی!" ایلیزا غصے کے عالم میں دہاڑی۔ "میں تجھ جیسی حرافہ عورتوں سے اچھی طرح واقف ہوں!"
"اگر تم مادام کی بیٹی نہ ہوتیں تو شاید میں گولی مار کر تمہاری لاش اسی ویران سڑک پر کتوں کے لیے چھوڑ جاتی۔" شاہدہ اس کی بھرپور تحقیر پر تلی ہوئی تھی۔
"یہ تمہاری ماں کی نمبر دو ہے!" میں نے جھگڑا ختم کرانے کے لیے جلدی سے زبان کھولی۔ "اس کے منہ نہ لگنا ہی بہتر ہے!"
"نمبر دو؟" ایلیزا کی آواز میں حیرت نمایاں تھی جیسے وہ میرے فقرے کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی ہو۔
"مادام لوازی کے نام سے آج کل یہی زیرِ زمین دنیا پر راج کر رہی ہے۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"ہم نہیں، اب میں خود مادام لوازی ہوں" شاہدہ کے لہجے میں تکبر سمٹ آیا۔ "اس کی مفلوج اور مجبور ماں تو اب منوں مٹی کے نیچے ابدی نیند سو رہی ہے!"
"ہوسکتا ہے کہ اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے میری ماں کو اس نے خود ہی ہلاک کیا ہو!" ایلیزا پلٹ کر شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

جواب میں شاہدہ نے فرنچ میں کچھ کہا اور ایلیزا غصے سے باہر ہوگئی۔ اس نے اپنی نشست سے اچک کر شاہدہ پر [illegible] کرنا چاہا مگر وہ بہت پھرتیلی تھی، نہ صرف خود بچ گئی۔ بلکہ فضا ایلیزا کے رخسار پر پڑنے والے طاقتور تھپڑ کی آواز سے گونج اٹھی۔
تھپڑ کھا کر ایلیزا اور بپھر گئی۔ میں نے کسی ناگہانی حادثے سے بچنے کے لیے بریک لگا کر کار ایک کنارے پر روک دی مگر ایکشن کرنے سے قبل ہی شاہدہ نے کراٹے کا کوئی بھرپور وار کر کے ایلیزا کو سیٹ پر لڑھک جانے پر مجبور کر دیا۔
"گاڑی چلاتے رہو" ایلیزا کی آواز معدوم ہوتے ہی شاہدہ کی تحکمانہ آواز ابھری اور میں نے گیئر ڈال کر کار آگے بڑھا دی۔
چند ثانیوں بعد شاہدہ کا مکان آگیا اور میں نے گاڑی گھماتے ہوئے پھاٹک میں داخل کر دی۔
"کتے کہاں گئے؟" احاطے میں سناٹا پاکر شاہدہ تشویش ناک انداز میں بڑبڑائی۔
"گھومنے گئے ہوں گے!" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔
"شاید تم نے ان ہی پر گولیاں چلائی ہوں گی" وہ غالباً میرے پاس سے برآمد ہونے والے ریوالور کی نال سے اٹھنے والی بارود کی بو کا خیال آتے ہی بولی۔
"قیافہ شناسی میں بھی ملکہ رکھتی ہو۔"
"میرے کان اب تمہاری بکواس کے عادی ہوتے رہے ہیں!"
"بڑی خطرناک بات ہے!" میں نے کار روک کر اترتے ہوئے کہا مگر وہ مجھ سے پہلے باہر موجود تھی۔
"اسے کندھے پر اٹھاؤ" شاہدہ نے ریوالور کی نال سے سیٹ پر لڑھکی ہوئی ایلیزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے تمہارے کیسے مراسم تھے؟" وہ چند ثانیوں تک خاموشی سے میری آنکھوں میں دیکھنے کے بعد بولی۔
"خاصے اچھے!"
"اس کا رویہ تو ایسا تھا جیسے تم سے شادی کر چکی ہو!" اس کا لہجہ ذومعنی تھا۔
میں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "اس جیسی لڑکی کو اپنا قیدی بنانا حسن کی سراسر توہین ہے!"
"تمہیں کہاں ٹکرائی تھی؟"
"سارے سوالات یہیں کرو گی" میں جھلا کر بولا۔ "شاید تمہیں سردی کا احساس نہیں ہو رہا!"

"سردی!" وہ ہنس پڑی۔ "سردی تو خوف اور شکست کی علامت ہوتی ہے۔ میرے لیے یہ موسم بڑا خوشگوار ہے!"
"اگر ایلیزا الفت کے چکر میں تمہیں روکنے کی حماقت نہ کرتی تو اس وقت تم اپنے کتوں کی لاشوں سے لپٹی ماتم کر رہی ہوتیں!"
"سچ..... سچ!" اس نے مجھے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "سردی واقعی تمہارے دماغ میں چڑھ رہی ہے۔ چلو اٹھاؤ اسے!"
میں نے قہر آلود نظروں سے شاہدہ کو گھورا پھر ایلیزا کے بے ہوش بدن کو اپنے کندھے پر لاد لیا۔
پہلے شاہدہ اسی کمرے کی طرف گئی جس میں مجھے مقید رکھا گیا تھا مگر ٹوٹا ہوا قفل دیکھ کر وہ ایک دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔
وہ کمرہ بھی بہت خوبصورت اور آراستہ تھا، میں نے شاہدہ کی ہدایت کا انتظار کیے بغیر ایلیزا کو بستر پر ڈال دیا۔
میں شاہدہ کی طرف پلٹا تو وہ خالی ہاتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ شاید ریوالور اس نے اپنے وینٹی بیگ میں ڈال لیے تھے۔
"اب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے جھلاتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
"پہلے اپنا موڈ درست کرو!" وہ آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔ "اس الماری میں عمدہ قسم کی شرابیں موجود ہیں اور فرج میں سوڈے کی ٹھنڈی بوتلیں ملیں گی۔"
"میرا وقت برباد مت کرو، میں جانا چاہتا ہوں!" اس کے سکون کو دیکھ کر میرا پارہ تیزی سے چڑھتا جا رہا تھا۔
"تمہارے غصے پر مجھے پیار آرہا ہے۔" وہ مسلسل میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ "آرام سے بیٹھو، ہم تھوڑی دیر باتیں کریں گے!"
میں ایک جھٹکے کے ساتھ اسی مسہری پر بیٹھ گیا جس پر ایلیزا بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔
وہ مجھے مزید چھیڑے بغیر خاموشی سے اٹھی اور وہسکی کے دو گلاس لبریز کر کے لے آئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک گلاس لے لیا۔
تلخ لاوے کی لکیر حلق سے گزرتی ہوئی معدے میں اتری تو میں نے برا سا منہ بنا کر غیر ارادی طور پر سگریٹ سلگا لی۔
"پہلی بار پی رہے ہو؟" شاہدہ نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔
"ایسے حالات میں شاید پہلی بار ہی پی رہا ہوں۔"
"کن حالات کی بات کر رہے ہو؟"
"ریوالور بدست ساقی سے پہلی بار واسطہ پڑا ہے!"

"اسی لیے میں دونوں ریوالور بیگ میں ڈال چکی ہوں، اس وقت ہم دوستوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"آخر تم مجھے اپنی دوستی کا یقین دلانے پر کیوں مصر ہو؟" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
"میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں ڈارلنگ!" وہ اپنی مخمور نگاہیں اٹھا کر محبت آمیز لہجے میں بولی۔
"تو پھر میری ممی بنا کر اسی خوابگاہ کے کسی خالی گوشے میں سجا لو" میں نے جل کر کہا۔ "تمہارے دوسرے عاشقوں کو بھی عبرت ہوگی!"
"ایلیزا کی ماں ہمیشہ سے میرے لیے محترم رہی ہے، میں نے کبھی اسے فریب دینے کی کوشش نہیں کی تھی" اس نے گلاس سے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
"اسی لیے تم نے اسے بلجیم بلا کر مار ڈالا!" میرا لہجہ زہریلا تھا۔
"وہ فطری موت کا شکار ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پیرس سے برسلز تک کے مختصر ہوائی سفر کی تکان ہی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی ہو!" وہ اب سنجیدہ ہو چکی تھی۔ "مگر اس کی ہلاکت میں میرے کسی منصوبے یا ارادے کا دخل نہیں تھا۔ وہ بات جو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں، یہ ہے کہ میں نے آخری لمحات پر تمہیں ایلیزا کی ماں کے ہولناک انتقام سے بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسے بتایا کہ تم کسی بھی لمحے پکڑے جا سکتے ہو حالانکہ اس وقت تم اسی عمارت کے ایک کمرے میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے!"
"اس مہربانی کی وجہ؟"
"تمہارے لیے میری پسندیدگی!" اس نے کہا اور اس وقت میں پہلی بار اس کے الفاظ کی صداقت پر یقین کر سکا۔
"تم نے شروع ہی سے میرے دل کے نازک گوشوں میں اپنے لیے جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "مگر مجھ پر اپنی چاہت کا یہ عقدہ اس وقت کھلا جب میں نے ایلیزا کی ماں کو برسلز آنے کا مشورہ دے دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ تم اس وقت زندہ سلامت میرے سامنے بیٹھے شراب نوشی سے لطف اندوز ہو رہے ہو!"
"ہوسکتا ہے کہ تم نے براہِ راست مجھے مروانے کے بجائے خطیر رقم کے عوض اسرائیلی ایجنٹوں کے ہاتھ فروخت کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہو!"
"ایسا کرنا چاہتی تو دوپہر کو ہی یہاں دو اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ موجود تھے۔ وہ ایلیزا کی ماں کی آمد کی خبر پاکر یہاں پہنچے تھے مگر میں نے ان کی ہر پیشکش یہ کہہ کر ٹال دی کہ جب تک تم میرے قبضے میں نہیں آجاتے کوئی بات نہیں کی جا سکتی!"
"اور انہوں نے تمہاری بات پر یقین کر لیا ہوگا؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی!"
"حالانکہ پیرس میں تم میری تصاویر اور فنگر پرنٹ تصدیق کے لیے اسرائیلی سفارت کاروں کے حوالے کر چکی تھیں۔"
"میں ایسی معمولی باتوں کو بھلا جانتی ہوں۔" وہ اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے مسہری پر بستر قریب آ بیٹھی۔ اپنا وینٹی بیگ اس نے آرام کرسی پر ہی چھوڑ دیا تھا جس میں دو بھرے ہوئے ریوالور موجود تھے۔
"اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"
"اپنائیت کا اظہار...... بھرپور اظہار!" یہ کہتے ہوئے اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔
"خوبصورت خواتین کی ایسی پیش کش میں کبھی نہیں ٹھکراتا۔" میں نے سرد مہری کے ساتھ جواب دیا۔
"مگر میں خود کو تمہارا پابند کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے پر بتدریج جذباتیت غالب آتی جا رہی تھی۔
"میں آزاد پنچھی ہوں شاہدہ ...... میرا پیچھا کر کے تمہیں افسوس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ اسے بتا دوں کہ میں شادی شدہ ہوں اور اپنی بیوی کے فراق میں آگ اور خون کے ہولناک سمندروں میں کسی گمنام منزل کا سفر کر رہا ہوں جہاں میرے خوابوں اور ارمانوں کی حسین شہزادی — میری سیتا، سپنوں کے حسین محل سجائے میری منتظر ہوگی مگر میں شاہدہ پر اس حقیقت کا اظہار نہ کر سکا۔ وہ ایک بد طینت اور جرائم پیشہ لڑکی تھی اور اگر اسے سیتا کے سلسلے میں میری ایک نئی کمزوری کا علم ہو جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ حسد اور رقابت سے بے قابو ہو کر سیتا کی راہ پر لگ جاتی اور اسے کوئی شدید نقصان پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لیتی جب کہ میں طویل اور جاں گسل جدوجہد کے بعد اس کی سلامتی کی خبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔
"میں نے اپنی زندگی میں افسوس کرنا نہیں سیکھا۔ صفدر علی۔" وہ پرعزم لہجے میں بولی" اور محض اسی وجہ سے میں مادام بواری کے لقب کی امین بنی ہوں۔"
"تم مجھے اپنا قیدی بنا سکتی ہو، دیوانہ نہیں!"
"قیدی تو تم ہو ہی۔" وہ نپے تلے لہجے میں بولی" اگر آزادی چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ میرے بارے میں سنجیدگی سے سوچو۔"
ایک جرائم پیشہ لڑکی کے بارے میں سوچنا حماقت ہے!" میں نے اپنا گلاس دوبارہ لبریز کرتے ہوئے کہا۔
"وہ میرا ماضی بن سکتا ہے، تمہیں اپنانے کے بعد میں اپنا ماضی فراموش کر دوں گی۔" وہ لحظہ بہ لحظہ سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

"ماضی کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ بھیانک سائے کی طرح تعاقب کرتا ہے مادام بواری!"
"مادام بواری نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "تمہارے لیے میں صرف شاہدہ ہوں اور تمہیں اتنی بے رحمی کے ساتھ میرے ماضی کا تذکرہ زیب نہیں دیتا۔ تمہارے اپنے ہاتھ نہ جانے کس کس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔"
"تمہارا ماضی!" میں سنگدلانہ انداز میں ہنسا۔ "ابھی تک تو تمہارے ماضی اور حال کے درمیان مجھے کوئی حدِ فاصل نظر نہیں آئی!"
"میں دوستانہ انداز میں ہنستی تمہارے ساتھ بیٹھی ہوں!" وہ ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے بولی۔ "یہ تبدیلی بلاوجہ نہیں آئی ہے!"
"یہ تمہارا حد سے بڑھا ہوا اعتماد ہے۔ ورنہ اب بھی تم وہی شاہدہ ہو جو علی نقی کے سہارے میری بو پر لگی تھی!"
"تم سکون سے اس مسئلہ پر غور کرو گے تو تمہاری رائے یقیناً تبدیل ہوگی۔" وہ تاسف آمیز انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔
"مجھے صرف کھلی فضا میں ہی سکون میسر آ سکتا ہے!"
"اس چار دیواری میں کھلی فضا بھی ہے اور بند کمرے بھی!"
"میں اس عمارت سے باہر کی بات کر رہا ہوں!"
"باہر نکلنے میں تمہاری سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی مگر چار دیواری میں تمہیں پورا پورا تحفظ حاصل رہے گا۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔
"میں تمہاری زبان سے دوستی کا فریب نہیں کھا سکتا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر میرا ذہنی توازن ہی بگڑ جائے تو اور بات ہے!"
"میں تمہیں کس طرح اپنے خلوص کا یقین دلا سکتی ہوں؟" چند ثانیوں تک الجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سوال کیا۔
"مجھے رہا کر دو!" میں نے بلا تامل جواب دیا۔
"تمہاری سلامتی ......!"
اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میری سلامتی کا اس طرح تذکرہ نہ کرو۔ میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں اور اپنی راہ میں حائل ہونے والوں کے چھکے چھڑانے میں ملکہ رکھتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے!" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "تم جب چاہو یہاں سے جا سکتے ہو، واپس آؤ گے تو یہ در و دیوار والہانہ انداز میں تمہارا استقبال کریں گے!"
"میرا پیچھا نہیں کیا جائے گا؟" میں نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔
"نہیں!" اس نے یہ کہہ کر ایک ہی سانس میں اپنا پورا گلاس خالی کر دیا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اس وقت نشے کے باعث بلور کی طرح چمک رہی تھیں۔

"اس لڑکی کا کیا ہوگا؟" میں نے ایلیزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔
"اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔" وہ بوجھل لہجے میں بولی۔ "یہ لڑکی میرے راز سے واقف ہو چکی ہے۔ اس کا مقدر اب میری مرضی سے وابستہ ہے۔"
"ہلاک کر دو گی اسے؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
شاہدہ کے پتلے پتلے حسین لبوں پر سفاکانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اس کی ماں عالم بالا میں تنہائی محسوس کر رہی ہوگی!"
اس وقت شاہدہ اپنے وینٹی بیگ کی طرف سے غافل تھی اور میں ایک ہی زقند میں اس پر قبضہ کر سکتا تھا۔ میں نے پہلو بدل کر اپنا زاویہ درست کیا اور اچانک ہی اس کرسی کی طرف جست لگا دی جس پر شاہدہ کا وینٹی بیگ رکھا ہوا تھا۔
مگر وہ لڑکی نشے کی حالت میں ہونے کے باوجود نہایت مستعد اور پھرتیلی ثابت ہوئی۔ میں اس کی حرکت تو نہ دیکھ سکا مگر جست لگاتے ہی مجھے اپنی داہنی پنڈلی کی ہڈی پر شدید ضرب کا احساس ہوا اور میں چیخ مار کر کرسی سے کافی دور قالین پر منہ کے بل گر گیا۔
میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والی دھند کو جھٹک کر سر اٹھایا تو شاہدہ کرسی کے قریب پہنچ کر اپنا وینٹی بیگ اٹھا چکی تھی۔
"بہت چھوٹے اور مکار ہو!" مجھ سے نگاہیں چار ہوتے ہی وہ ملامت آمیز لہجے میں بولی اور پھر اس نے دونوں ہی ریوالور میری طرف اچھال دیئے۔ "یہ لو، اور اپنے سر پر مار لو — گولیاں تو میں راستے میں ہی نکال چکی تھی۔"
دونوں ریوالور میرے قریب آ کر گرے اور میں نے اپنی پنڈلی سہلانی شروع کر دی۔ جس میں بے پناہ درد ہو رہا تھا۔
پھر میں نے اچانک ہی ایک ریوالور اٹھا کر پوری قوت سے شاہدہ پر دے مارا مگر وہ کسی چھلاوے کی طرح اچھل کر اپنی جگہ سے کئی فٹ دور جا کھڑی ہوئی۔ میں نے جھلاہٹ میں دوسرا ریوالور بھی اٹھایا اور شاہدہ کی طرف پھینکا مگر اس بار اس نے نہایت مہارت کے ساتھ اپنے جسم کو ہلکورا دے کر نہ صرف خود کو بچایا بلکہ اچھلتے ہوئے ریوالور کو بھی داہنے ہاتھ میں تھام لیا۔
"کچھ اور پھینکو!" مجھے چڑانے کے لیے اس نے مسکرا کر کہا اور میں خفت مٹانے کے لیے اپنی زخم خوردہ پنڈلی کا جائزہ لینے لگا۔
اس تھوڑے سے وقفہ میں میری داہنی پنڈلی پر خاصا ورم آ گیا تھا اور اسے ہاتھ لگانے سے جان نکل جا رہی تھی۔
اس اثنا میں شاہدہ ٹہلتی ہوئی میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"بہت تیزی سے ورم آیا ہے۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی ہے!"
اس کی تاسف آمیز آواز سن کر میں نے سر اٹھایا تو وہ ہمدردانہ انداز میں میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ "یہ چوٹ تم نے ناگہانی مول لی ہے!"
"کیا مارا تھا تم نے؟" میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے تکلیف ضبط کرتے ہوئے مسکرا کر سوال کیا۔
اس نے اپنا برہنہ پیر میرے سامنے رکھ دیا۔ "میرا کچھ نہیں بگڑا۔ تمہارے بدن کی جھونک سے ہڈی ٹوٹی ہے!"
"اگر دونوں ریوالور خالی تھے تو اس حرکت کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے درد کی ٹیسوں کو ضبط کرتے ہوئے سوال کیا۔
"تمہیں جتانا مقصود تھا کہ میں غافل کبھی نہیں رہتی۔"
"اب کوئی اور کرتب دکھا کر اس پنڈلی کو گھٹنے سے الگ ہی کر دو تاکہ اذیت سے نجات مل سکے۔" میں نے پھولی ہوئی پنڈلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "بہت ضدی ہو، اب بھی مدد کی التجا نہیں کرو گے!"
میں خاموش رہا اور وہ قالین پر اکڑوں بیٹھ کر میری ٹانگ کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "چلو اب کم از کم آٹھ دس روز تو یہاں سے ہل بھی نہ سکو گے!"
شاہدہ دیکھنے میں دھان پان سی لڑکی تھی۔ اس کے حسین خدوخال میں رچی ہوئی دوشیزگی اتنی نظر فریب تھی کہ اس پر لڑاکا ہونے کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر وہ ایک بار میرے سامنے خالد عبدالفتاح کو بری طرح زیر کر چکی تھی اور اب میں خود اس کے ہاتھوں معذور ہو گیا تھا۔ اس کی شخصیت کے پیچ آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے!
اس مکان میں کوئی اور موجود نہیں تھا جس کی مدد سے وہ مجھے کار تک پہنچاتی۔ اس نے ایک دو بار خود ہی مجھ کو اپنی پشت پر لادنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ آخر کار اس نے مجھے چائے والی ٹرالی پر بٹھا کر کشاں کشاں برآمدے تک پہنچایا۔ اس مختصر سے سفر میں ٹرالی کے کئی حصے اپنی جگہ چھوڑ بیٹھے مگر مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ شاہدہ کی کار مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی!
مجھے ٹرالی سے کار میں منتقل کرنے کے بعد شاہدہ نے اندر جا کر شاید وہ کمرہ مقفل کیا جس میں ایلیزا بے ہوش پڑی ہوئی تھی پھر مجھے کار میں لے کر ایک طرف روانہ ہو گئی۔
"سٹین مارکیڈو کے پاگل خانے کا ارادہ ہے کیا؟" میں نے پنڈلی میں درد کا احساس مٹانے کے لیے سکوت توڑا۔

"وہاں کا ماحول پسند ہے تو اُدھر ہی لیے چلتی ہوں!" وہ ہنس کر بولی۔

"شین ملز کینڈو نے دیکھ لیا تو تمہیں وہیں گھیر لے گا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میری مرضی کے خلاف کوئی میرے بدن کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا، میں تو خود ہی اسے ڈھیل دیتی رہی ہوں۔ ویسے وہ وہاں کبھی کبھار ہی جاتا ہے!"

"جس معاملے میں اسے ڈھیل دیتی رہی ہو اب اسی معاملے میں میرے گرد حلقہ تنگ کیوں کر رہی ہو — اسی سے کام چلاتی رہو!"

"اب تو میرے قریب آنے والے اپنی پسلیاں ہی تڑواتیں گے۔ میں تمہارے بارے میں حد سے زیادہ سنجیدہ ہوں!"

"تمہارے رنگین ماضی سے واقف ہونے کے بعد میں تو کیا، کوئی بھی مرد تمہیں قبول نہ کر سکے گا۔"

"صرف اپنی بات کرو۔ مقامیوں میں تو سب چلتا ہے بلکہ شادی کے بعد بھی مرد تیوری میں بل ڈالے بغیر اپنی بیویوں کے پرانے دوستوں کی مدارات کرتے ہیں"۔

"مگر تم تو نہ مقامیوں میں سے ہو نہ ہی مشرقی کہی جا سکتی ہو!"

"تمہارے دل میں جگہ پالی تو مثالی مشرقی لڑکی بن کر دکھاؤں گی۔"

"اور اگر میں کہوں کہ میں شادی شدہ ہوں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ مبہم سا سوال کر ہی ڈالا۔

"تمہیں جھوٹوں کا بادشاہ مان لوں گی"۔ وہ قہقہہ مار کر بولی۔ "شادی شدہ مرد ہزاروں کی بھیڑ میں بھی الگ پہچانا جاتا ہے — تم جیسے بے فکرے تو جنم جنم سے تنہا ہوتے ہیں"۔

"میری پنڈلی ورم کی آخری منزل پر ہے۔ ہسپتال تک پہنچتے پہنچتے پھٹ ہی نہ جائے"۔ میں نے بدقت تمام پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"مضافاتی علاقے کے اختتام پر ہی ہسپتال ہے، وہاں یہ یاد رکھنا کہ تم میرے شوہر ہو اور زینوں سے پھسل کر زخمی ہوئے ہو"

میں خاموش رہ گیا۔ اگر ہسپتال کے ریکارڈ میں مجھ کو اپنا شوہر ظاہر کر کے شاہدہ کے کسی جذبے کی تسکین ہوتی تھی تو میرا کیا بگڑتا تھا۔

ہسپتال مختصر مگر صاف ستھرا اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھا۔ وہاں فوری طور پر میری پنڈلی کے تین ایکسرے لیے گئے۔ جن کے معائنے سے پتہ چلا کہ ہڈی ٹوٹی نہیں تھی بلکہ تقریباً تین انچ کی لمبائی میں چٹخ گئی تھی لہٰذا پلاسٹر چڑھانے کے بعد چند ادویات دی گئیں اور شاہدہ مجھے لے کر واپس چل دی۔

ہماری واپسی اسی مکان میں ہوئی۔ احاطے سے عمارت تک ہر سو گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ جو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تحلیل کر رہ گیا۔

شاہدہ نے کار روک کر انجن بند کر دیا مگر ہیڈ لیمپس گل نہ کیے تاکہ ان کی روشنی میں برآمدے کے بلب جلا سکے۔

میں ویران احاطے میں ان جھینگروں کو تلاش کرنے کی کوششیں کرنے لگا جن کے شور سے فضا گونج رہی تھی۔

اچانک برآمدے کی طرف سے ایک مدھم سی مردانہ آواز ابھری اور میں چونک پڑا۔ اپنا سر برآمدے کی طرف گھمایا تو جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

وہاں السٹرز میں ملبوس دو دراز قامت اجنبی شاہدہ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور دبے ہوئے تھے اور ایلیزا ان ہی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم اسے نہیں لے جا سکو گے۔ وہ میرا دوست ہے" ایک کی احتجاج آمیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید اس نے مجھے سنانے کے لیے دانستہ انگریزی زبان استعمال کی تھی۔

گاڑی برآمدے سے چند فٹ ہی دور تھی اور کہر کے باوجود روشنی میں وہ چاروں انسانی ہیولے صاف پہچانے جا رہے تھے مگر میں نسبتاً اندھیرے میں تھا اور شاید ابھی تک وہ دونوں مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ وہ دونوں وہی اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ تھے جنہیں ایلیزا کے بقول شاہدہ نے دوپہر کو ٹال دیا تھا۔ شاہدہ کی غیر موجودگی میں وہ شاید ایلیزا کے پاس پہنچ گئے۔ اور اس احمق لڑکی نے اپنی دانست میں بہتری سمجھ کر انہیں میرے بارے میں آگاہ کر دیا۔ اور وہ مکان کی ناکام تلاشی کے بعد برآمدے میں چھپ کر شاہدہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

میرے لیے شاہدہ کے مقابلے میں نیا خطرہ زیادہ ہولناک تھا۔ انہیں میرا سایہ بھی نظر آ جاتا تو وہ ہر قیمت پر مجھے زندہ لے جانے کی کوشش کرتے جب کہ شاہدہ اپنی یک طرفہ محبت کی روانی میں مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہو گئی تھی۔

میری داہنی ٹانگ میں شدید تکلیف تھی مگر ایکسرے کے بعد مجھے یہ اطمینان تھا کہ معمولی سی نقل و حرکت سے درد تو ضرور ہوگا مگر ٹوٹی ہوئی ہڈی کے سرکنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

میں نے پھرتی سے اپنی سمت کا دروازہ کھولا اور باہر...

"دیکھو، کار سے کوئی نکلا ہے!" اچانک برآمدے کی طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری اور میں اپنی حماقت پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ میں نے کار کے اندرونی حصے میں موجود روشنی کا سوئچ آف نہیں کیا تھا جس کے نتیجے میں دروازہ کھلتے ہی اندرونی بتی روشن ہو گئی اور اسی کے سہارے ان کو کار کا دروازہ کھولے جانے کا علم ہو گیا۔

برآمدے سے وہ مردانہ للکار ابھرتے ہی بھاری قدموں کے دوڑنے کی آواز آئی۔ میرے لیے وقت بہت کم تھا۔ احاطے میں پھیلی ہوئی قریب ترین جھاڑیاں بھی مجھ سے کم از کم دس بارہ گز دور تھیں جن میں پناہ لے سکتا تھا۔ دوسری طرف کار سے عجلت میں کودنے کے نتیجے میں میری زخمی پنڈلی میں درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ اور مجھے دس بارہ گز کا وہ فاصلہ ناقابل عبور نظر آ رہا تھا لہٰذا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پھرتی کے ساتھ کار کے نیچے رینگ گیا۔

نیچے گھستے ہی میری انگلیاں گرم سائلنسر سے ٹکرائیں اور میں خفیف سی سسکاری لے کر اپنے ہی وجود میں سکڑ کر رہ گیا۔ جسم پر گرم لباس ہونے کی وجہ سے باقی حصے سائلنسر کی زد سے بالکل محفوظ تھے۔

بھاگتے ہوئے قدموں کی بھاری گونج کے ساتھ ہی برآمدے کی طرف سے شاہدہ کی ہذیانی آواز سنائی دی "خبردار، گولی نہ چلانا اس پر!"

قدموں کی وہ آواز کار کے قریب آ کر تھمی اور پھر آنے والے کی بوکھلائی ہوئی بلند آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "ارے! اتنی جلدی غائب ہو گیا!"

"پھاٹک پر پہنچو!" برآمدے سے اس کا ساتھی غرّایا "وہ جھاڑیوں کی آڑ لے کر اسی طرف نکلنے کی کوشش کرے گا"

کار کے قریب والا فوراً ہی دوڑتا ہوا پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ میں سانس روکے کچی زمین پر پڑا اس کے قدموں کو کہر کی چادر میں ڈوبتے دیکھتا رہا۔

"اسے پکارو" برآمدے میں رہ جانے والا شاید شاہدہ پر غرّا رہا تھا "اگر اس نے خود کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے"!

"وہ تو اب تک پھاٹک سے باہر جا چکا ہوگا" شاہدہ کی آواز میں طنز کی چبھن تھی "اس کہر میں تو اسے ڈھونڈنا بھی دشوار ہوگا"۔

"اگر وہ ہاتھ نہ آیا تو میں تمہارا حشر خراب کر دوں گا" بولنے والے کا لہجہ بے حد وحشت اور خون آشام تھا "وہ ہمارے لیے بے حد اہم ہے"۔

"مگر میرے ساتھ کوئی اور تھا" شاہدہ کی آواز آئی "میں اسے شب گزاری کے لیے ایک شراب خانے سے ساتھ لائی تھی۔ مگر وہ شاید تم لوگوں سے ڈر کر بھاگ نکلا ہے۔ میرا سارا پروگرام برباد کر دیا تم لوگوں نے"!

"بے شرم کتیا" یہ غراہٹ واضح طور پر ایلیزا کی تھی "یہ معنوں ہی تیرا ریواں رواں ادھیڑ کر رکھ دیں گے"!

"ان کے آنے کا علم ہوتا تو اسے لینے شہر نہ جانا پڑتا" شاہدہ کا لہجہ ہذیان تک سلگا دینے کے لئے کافی تھا"

"صفدر علی کہاں ہے"؟ مرد کی غراہٹ ابھری۔

"پتہ نہیں، میں اسے لڑکی کے ساتھ ہی یہاں بند کر کے گئی تھی"۔ شاہدہ کا لہجہ لاپرواہانہ تھا۔ وہ صورت حال سے خائف نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"کمرہ مقفل تھا اور لڑکی دروازہ پیٹ رہی تھی، وہ اندر نہیں تھا"۔ مرد کی برہمی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

"تو میں کیا بتاؤں؟ پوچھو اسی ترافہ سے"۔ شاہدہ چڑچڑے پن کا اظہار کرتے ہوئے بولی "نکل گئی ہوگی اس کو، ہر وقت اسی کا دم بھرتی رہتی تھی"!

اس خوفناک اور روح فرسا صورت حال کے باوجود میں شاہدہ کے جلے کٹے جواب پر زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"میری کار کے ہیڈ لیمپس آف کر دو ورنہ بیٹری ڈاؤن ہو جائے گی"۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد پھر شاہدہ کی آواز سنائی دی۔

"اگر وہ کوئی آوارہ گرد ہی تھا تو تمہارے ساتھ کار سے کیوں نہیں اترا"؟ مرد نے شاہدہ کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ نشے میں تھا اور اندھیرے سے ڈر رہا تھا"۔ شاہدہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اگر تم......!"

مرد کی آواز ایک دبی دبی چیخ میں بدل کر معدوم ہو گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا میں کئی منٹ سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شاہدہ موقع پا کر اس پر مارشل آرٹ کا کوئی ایسا کاری وار کرے گی کہ اسے سنبھلنے کی مہلت بھی نہ مل سکے گی۔

اور غالباً ہوا بھی کچھ اسی طرح کیونکہ پہلی چیخ کے بعد ایک لہراتی ہوئی نسوانی چیخ سنائی دی جس کے ڈوبنے سے قبل ہی یکے بعد دیگرے مرد کی زخم خوردہ غراہٹیں اور چیخیں ابھرنے لگیں!

برآمدے میں یہ ساری دھما چوکڑی چند سیکنڈ میں ہی ختم ہو گئی اور ادھر ایسا گمبھیر سکوت چھا گیا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"نیچے سے نکلو!" چند ثانیوں کے بعد اپنے قریب شاہدہ کی آواز سن کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ نہ جانے وہ بے آواز قدموں سے کب وہاں آ پہنچی تھی۔

"تم نے مجھے کار کے نیچے گھستے دیکھا تھا"؟ میں نے اس کی ہدایت پر کار میں سوار ہوتے ہوئے حیرت سے سوال کیا۔

"قیاس!" وہ مسکرا کر بولی "اتنے کم وقفے میں تو ایک عام صحت مند آدمی بھی کار سے دوڑ کر جھاڑیوں میں روپوش نہیں ہو سکتا تھا جب کہ تم تو معذور ہو"!

"اب کہاں جا رہی ہو"؟ میں نے کار کو واپس پھاٹک کی طرف گھومتے ہوئے دیکھ کر اس سے سوال کیا۔

"ابھی دوسرا شکار باقی ہے، وہ بچ نکلا تو برسلز میں ایسا خون خرابا ہوگا کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے!" وہ سرد لہجے میں بولی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ واپس اندر ہی آ جائے۔"

"ناممکن!" اس کا لہجہ پُر یقین تھا۔ "اپنے ساتھی کی چیخ سننے کے بعد وہ جلد از جلد یہاں سے دور نکلنے کی کوشش کرے گا، سیکرٹ ایجنٹ بھیڑیوں کے خواص رکھتے ہیں۔ ایک کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر دوسرے اپنی سلامتی کی فکر کرتے ہیں۔ وہ ہرگز ادھر آنے کی حماقت کا ارتکاب نہیں کرے گا۔"

شاہدہ کی کار برق رفتاری کے ساتھ پھاٹک عبور کر کے سڑک پر آئی پھر اس نے کار کو کسی طرف موڑنے کے بجائے اسی حالت میں بریک لگا کر روک لیا۔ اس کی عقابی نظریں تیزی سے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

داہنی طرف ہم دونوں نے تقریباً بیک وقت ہی کسی کار کی سرخ بریک لائٹس پل بھر کے لیے چمک کر معدوم ہوتے دیکھیں۔ وہ کار روشنیاں جلائے بغیر کسی ویران پلاٹ سے ریورس گیئر میں سڑک پر لائی جا رہی تھی۔ اس کا ڈرائیور بہت محتاط معلوم ہوتا تھا مگر شاید غیر ارادی طور پر اس کا پیر بریک پیڈل پر جا پڑا تھا ورنہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ وہ کار کب سڑک پر آئی اور کب آگے بڑھ گئی۔

شاہدہ نے تیزی کے ساتھ اپنی کار داہنی طرف گھمائی مگر وہ شخص بہت زیادہ حاضر دماغ تھا۔ اس نے سڑک پر آتے آتے پھرتی سے کار کا رُخ بدلا اور آگے جانے کے بجائے اپنی کار شاہدہ کے مکان کی طرف دوڑا دی۔

شاہدہ نے بے تحاشا گالیاں دیتے ہوئے پوری قوت سے بریک لگاتے اور یوٹرن لے کر واپس ہوئی مگر اس اثنا میں وہ کار بہت دور نکل چکی تھی۔ بھاگنے والے نے گہری دھند کے باوجود اپنی کار کی بتیاں نہ جلا کر بھیانک خطرہ مول لیا تھا۔

شاہدہ کی کار نے آناً فاناً میں طوفانی رفتار اختیار کر لی۔

ڈیش بورڈ سے ابھرنے والی مدھم سی روشنی میں اس وقت شاہدہ کے بشرے پر عزم اور انتقام کے خوفناک تاثرات نمایاں تھے اور وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رہی تھی۔

"یہ سڑک آگے دوراہے میں بدل جاتی ہے۔" اپنی کار کو ماہرانہ انداز میں سڑک کے وسط میں دوڑاتے ہوئے وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

"سمجھ میں نہیں آتا وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو گیا!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ آٹھ سلنڈر والی اسپورٹس کار تھی۔" شاہدہ نے میری طرف سر گھما کر کہا۔ "تم نے اس کے طاقتور انجن کی آواز نہیں سنی تھی؟"

"پھر تو اس کا ہاتھ آنا مشکل ہی ہے!"

اس کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ گئی۔ پھر اس نے کچھ کہے بغیر ڈیش بورڈ کا ایک بٹن دبایا اور موٹر کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کار کے اگلے مڈگارڈ پر ایک اینٹینا ابھرنے لگا۔ پورا اینٹینا باہر آنے کے بعد موٹر خود بخود بند ہو گئی۔ اسی شاہدہ نے جھک کر اپنی نشست کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک ٹرانسمیٹر اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

شاہدہ نے داہنے ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور بائیں سے ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔

"ٹی نائین...... مادام بواری کالنگ!" ٹرانسمیٹر منہ لا کر وہ بار بار یہی فقرہ دہرانے لگی۔

"ٹی نائین مادام!" ٹرانسمیٹر کے ریڈیائی شور میں ایک مردانہ آواز ابھری جس میں احترام سے زیادہ خوف اور حیرت کا نمایاں تھا۔

"شمالی شاہراہ سے سرمئی رنگ کی ایک بڑی اسپورٹس شہر کی طرف آ رہی ہے۔ اس میں بظاہر صرف ایک آدمی موجود یہ شاہراہ وسط میں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ فوراً راستوں کی ناکہ بندی کر لو۔ اس کار کا روکا جانا بہت ضروری ہے...... اوور!" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"اور اگر وہ مزاحمت پر آمادہ ہو مادام؟ اوور!" مرد کی ہوئی آواز میں بلا کی عجیب سمٹ آئی تھی۔

"تم الو کے پٹھے ہو ٹی نائین اوور!" شاہدہ کے حلق سے غراہٹ ابھری۔

"یس مادام!" شاہدہ کا فقرہ مکمل ہونے پر وہ بوکھلا میں بولا۔ "میں معافی چاہتا ہوں، اوور!"

"زندہ یا مردہ —— اسے یہ راستہ عبور کرنے سے روکا آل۔" شاہدہ نے بیزاری کے عالم میں یہ کہہ کر ٹرانسمیٹر آف کر

"اور کیا کیا ہے اس کار میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالو۔" وہ ہنس کر بولی اور دوبارہ اس کے اصل مقام پر پہنچا دیا۔

میں نے نشست کے نیچے ہاتھ ڈالا تو ایک آہنی صندوق کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"کھینچ لو، اسے باہر کھینچ لو۔" شاہدہ نے مجھے تردد دیکھ کر کہا۔

"اور اپنی زخمی ٹانگ کو کہاں لے جاؤں؟" میں نے لہجے میں سوال کیا۔

وہ پھر ہنس پڑی۔ "تمہاری ان ہی جھلاہٹوں پر تو

آتا ہے...... اسے وہیں پڑا رہنے دو۔ وہ اشارے سے باہر آتا ہے اور اس میں کئی قسم کے دستی بم موجود ہیں جو دھواں پھیلانے سے خوفناک آتش زدگی تک کئی کام کر سکتے ہیں۔"

"اور تم ہر وقت انہیں ساتھ لیے پھرتی ہو؟"

"میرا پیشہ ہی ایسا ہے، ہر روز کئی بار موت کے منہ سے زندہ نکلتی ہوں۔"

"یہ ٹی نائین کون تھا؟"

"شین مارکینڈو!" وہ قہقہہ مار کر بولی۔ "سامنے جاتی ہوں تو معمولی کارکن سمجھ کر زبردستی عشق جھاڑنے لگتا ہے مگر اس وقت میری آواز سن کر اس کا پیشاب خطا ہو گیا ہو گا۔"

"کمال ہے کہ وہ تمہاری آواز نہیں پہچانتا، تم اس سے اپنے اصلی لب و لہجے میں بات کر رہی تھیں۔" میں نے بے اعتباری سے کہا۔

"میرے ٹرانسمیٹر کا نشریاتی حصہ خاص ساخت رکھتا ہے۔ نیچے سے مائیکروفون میں دوہرا ڈایافرام میری آواز میں گونج اور بھاری پن پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف تم بھی میری آواز سنو تو یہی سمجھو گے کہ ساٹھ برس کی کوئی قوی ہیکل عورت بول رہی ہے۔"

"اپنے کام میں خاصا ملکہ رکھتی ہو!" میں آہستہ آہستہ اس لڑکی کی صلاحیتوں سے متاثر ہوتا جا رہا تھا۔

"جن لوگوں سے میں کام لیتی ہوں وہ سب خونخوار درندے ہیں۔ میں بھگوڑے اسرائیلی ایجنٹ کو صرف اسی وجہ سے ختم کرنا چاہتی ہوں کہ کہیں ایلیزا نے اسے میرے اصل روپ سے باخبر نہ کر دیا ہو!"

"تو کیا ایلیزا......؟"

اس نے میرا فقرہ درمیان ہی سے اچک لیا اور لاپروائی سے بولی۔ "ہاں وہ بھی اپنی ماں کے پاس جا چکی ہے اور محض تمہاری حماقت کی وجہ سے وہ موت کے گھاٹ اتاری گئی ہے!"

ایلیزا کی موت کی خبر سن کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا۔ "وہ اچھی لڑکی تھی، تم نے اسے مار کر بہت برا کیا شاہدہ! اس کی موت میں میرا کوئی دخل نہیں ہے!"

"تم ہی نے اسے بتایا تھا کہ میں اس کی ماں کی قبر دو ہوں۔" وہ بولی۔ "مادام بواری کی اصلیت جان لینا بجائے خود ہلاکت کی نشانی ہے!"

"پھر میرے بارے میں کیا خیال ہے!"

"تمہیں تو سسکا سسکا کر ماروں گی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ابتدا میرے جسم کے نہایت غیر رومانی حصے سے کی ہے!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"پستول کی ضرب نے تمہیں کچھ دنوں کی فرصت فراہم کر دی ہے۔ اس دوران تم میرے بارے میں سنجیدگی سے غور کر سکو گے!"

شاہدہ کی کار تیز رفتاری سے ایونیوٹیس نامی اس مضافاتی شاہراہ پر بڑھتی رہی۔ راستے میں وہ دوراہا بھی ملا جس کا شاہدہ نے ذکر کیا تھا مگر وہ سیدھی بڑھتی چلی گئی۔

"اور اگر وہ دوسرے راستے پر نکلا ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"فکر نہ کرو، ادھر سے شہر میں داخل ہو کر ہم دوسرے راستے سے دوبارہ ایونیوٹیس پر آ گئیں گے!" وہ لاپروائی سے بولی۔ "ٹی نائین اسے کسی قیمت پر شہر میں نہیں گھسنے دے گا۔"

"مگر اسے بہت کم وقت ملے گا۔"

"اسے خود نہیں بھاگنا پڑے گا، وائرلیس پر ہدایات ملتے ہی آدمی دونوں راستوں پر پہنچ گئے ہوں گے!"

شہر میں داخلے تک ہمیں وہ شاہراہ بالکل صاف اور ویران ملی۔ وہاں کہیں بھی کسی ہنگامے کے آثار نہیں تھے۔

شہر کے مختصر سے علاقے کو عبور کر کے شاہدہ نے کار ایک طرف گھمائی اور بولی۔ "اب ہم دوبارہ ایونیوٹیس کی طرف جا رہے ہیں، وہ یقیناً اسی راستے پر گھیر لیا گیا ہو گا۔"

"اور اگر وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا؟"

"ہم اس عمارت کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا جائے گا، جہاں اس کے پناہ لینے کا خفیف سا امکان بھی موجود ہو!" شاہدہ کا لہجہ سخت اور بے رحمانہ تھا۔

پھر اس کہر آلود دھندلکے میں کافی دور سے ہی شعلے نظر آنے لگے۔ ایونیوٹیس سے آنے والی اس ذیلی شاہراہ پر یقیناً کوئی بڑا ہنگامہ جنم لے چکا تھا۔

"دیکھ لیا!" شاہدہ کی آواز میں فخر کا احساس نمایاں تھا۔

"شاید تمہارے آدمیوں نے کار کو ہی اڑا دیا!" میں نے آہستہ سے کہا۔ شاہدہ کے وسائل جوں جوں سامنے آتے جا رہے تھے میں اپنے مستقبل کی طرف سے زیادہ فکر مند ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے خود بتا چکی تھی کہ اس کی اصلیت سے واقف ہو جانے والوں میں سے میرے سوا کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ اور وہ اپنی ذات کا میرے سامنے بھرپور اظہار کرتی جا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ میرے بارے میں کوئی اٹل فیصلہ کر چکی تھی۔

اگر میں اس کی خواہشات کے سامنے اپنا سر خم کر دیتا تو ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہوتے اور پھر ہمارے راز بھی مشترکہ ہی ہوتے مگر میں سینا سے یہ بے وفائی کسی قیمت پر نہیں کر سکتا تھا خواہ اس کے نتیجے میں شاہدہ مجھے ختم کرنے کا فیصلہ ہی کیوں نہ کر لیتی۔ شاہدہ سے انحراف کے بعد میری سلامتی شدید خطرے میں پڑ سکتی تھی کیونکہ میں اس کے دوسرے راز سے واقف تھا اور وہ اس راز کی حفاظت کے لیے سب کچھ کر گزرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔

شاہدہ کی کار چند ہی منٹ میں جلتی ہوئی کار تک پہنچ گئی اور

پھر بے اختیار اس کے حلق سے ایک وحشیانہ غرّاہٹ آزاد ہوگئی۔

شاہدہ کا اضطراری ردِعمل سامنے آتے ہی مجھ پر ساری صورتحال روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔

اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ جس کار میں فرار ہوا وہ آٹھ سلنڈرز والی سرمئی رنگ کی ٹرکش اسپورٹس کار تھی جبکہ شعلوں میں گھری ہوئی گاڑی سفید رنگ کی ڈیلکس سیلون کار تھی جو میں پہلے شین مارکیڈو کے تصرف میں دیکھ چکا تھا!

شاہدہ اپنی کار کا انجن بند کر کے برق رفتاری سے سفید کار کے جلتے ہوئے ڈھانچے کی طرف لپکی اور خود کو شعلوں کی زد سے بچاتے ہوئے کار کے اندرونی حصے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی بے تابی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شین مارکیڈو کی سلامتی کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند تھیں۔

جلتی ہوئی کار کے اندرونی حصے کا جائزہ لے کر وہ تیر کی طرح اپنی کار میں واپس آئی اور فوراً ہی انجن اسٹارٹ کر کے شہر کی طرف واپس روانہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سخت چوٹ ہوگئی، یہاں کوئی بڑا ہنگامہ ہوا ہے"!

"جلتی ہوئی کار تو شاید شین مارکیڈو کی ہے"! میں نے کہا۔

"ہاں"! وہ ایک جھٹکے سے بولی۔ "کار اسی کی ہے مگر خالی پڑی ہے۔ شاید وہ بروقت باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا"۔

"حادثہ تازہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ پھر شین مارکیڈو اور اس کے ساتھی کہاں غائب ہوگئے"؟ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ لوگ یہاں کئی گاڑیوں میں اپنے شکار کے منتظر رہے ہوں گے اور شاید شین مارکیڈو ان ہی کے ساتھ شکار کے تعاقب میں بھاگا ہے"۔

"وہ اکیلا اتنے آدمیوں کو کیسے چوٹ دے گیا"؟ میں نے دانستہ شاہدہ کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔

"ایسا بھی ہوتا رہتا ہے"۔ خلاف توقع وہ پُرسکون آواز میں بولی۔ "اور پھر ابھی فیصلہ کہاں ہوا ہو سکتا ہے۔ وہ شہر میں گھیر لیا گیا ہو!"

"شہر میں نہ سہی، عالم بالا میں تو تمہارے ہاتھ آ ہی جائے گا"۔

"ایسی عامیانہ گفتگو سے تم مجھے اشتعال نہیں دلا سکتے"۔ اس کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ "میں تو چوٹ اس وقت تسلیم کروں گی جب شین مارکیڈو مجھ سے رابطہ قائم کر کے اپنی پسپائی کی کہانی سنائے گا"۔

"مگر یہ ہوا کیسے ہوگا"؟ میں نے گفتگو کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "تمہارے آدمی نہ صرف تعداد میں زیادہ رہے ہوں گے بلکہ وہ اس کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ اور وہ بدحواسی کے عالم میں فرار ہو رہا تھا"۔

"پسپائی اختیار کرنا بھی ایک فن ہے"۔ وہ بولی۔ "فرار ہونے والا کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ اسرائیلی سیکرٹ سروس کا ایک اہم رکن تھا"۔

"اپنے دشمنوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا اچھی بات ہے"۔

"بروغیل بوچ شہرۂ آفاق سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ اس کے مخالف اس سے ہمیشہ بہت خائف رہتے ہیں"۔

"اگر بھاگنے والا بروغیل بوچ ہی تھا تو میرے معاملے میں اس نے انتہائی کچے پن کا ثبوت دیا ورنہ اصولاً اسے تمہاری کار کے پیچھے تطرضرور ڈالنی چاہیے تھی"!

"شاید اس وقت تمہارے ستارے عروج پر تھے ورنہ وہ تم کو کسی بے بس چوزے کی طرح پکڑ لے جاتے"!

"اب شہر میں کہاں سرمارتی پھرو گی"؟

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو"۔ وہ قدرے توقف کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے فوراً مولن بیک جانا چاہیے"!

"یہ کون سی جگہ ہے"؟

"اسی قصبے کا نام ہے جہاں سے ہم آ رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔ "ایلیزا اور بروغیل بوچ کے ساتھی کی لاشیں خطرات پیدا کر سکتی ہیں"!

"تو تم نے واقعی ان دونوں کو ختم کر دیا تھا"؟

"ہڑبونگ میں غور سے دیکھنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ ویسے میں نے دونوں کی ہی گردنیں توڑنے کی کوشش کی تھی"!

"حسن اور درندگی کا ایسا بہیمانہ امتزاج میری نظروں سے نہیں گزرا"! میں نے حقیقت میں پھریری لیتے ہوئے کہا۔

وہ میرے الفاظ سن کر زور سے ہنس پڑی۔ "تمہاری مصروفیات کے قصے میں بروغیل بوچ سے سن چکی ہوں۔ صبح اس نے بتایا تھا کہ اسرائیل میں تم نے کیسے وسیع پیمانے پر دہشت اور بربریت پھیلائی تھی"!

"وہ فرضی کہانیاں رہی ہوں گی تاکہ تم مجھ سے اتنی متنفر ہو جاؤ کہ خود ہی مجھے ان بھیڑیوں کے حوالے کر دو"!

"مگر انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ تم میری قید میں ہو"۔ یہ کہتے ہوتے شاہدہ نے اپنی کار ایک چوراہے سے واپس گھمالی۔

مولن بیک کی طرف جاتے ہوئے ہم شین مارکیڈو کی جلتی ہوئی کار کے قریب سے گزرے تو وہاں دو کاریں اور ایک فائر بریگیڈ موجود تھا۔ آگ بجھائی جا چکی تھی مگر مختلف حصوں سے کثیف دھواں اٹھ رہا تھا۔

شاہدہ نے چند ثانیوں کے لیے وہاں رک کر ان لوگوں سے آتش زدہ کار کے بارے میں چند رسمی سوالات کیے اور پھر انجانی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

سارے راستے وہ مجھ سے مسلسل باتیں کرتی رہی۔ اس کی ساری گفتگو کا محور میری اور اس کی ذات تھی اور وہ مجھے تال

چاہتی تھی کہ میں اسے اپنا کر حقیقی معنوں میں سکون اور مسرت حاصل کر سکوں گا۔

مگر زخمی پنڈلی کے ساتھ اس طویل بھاگ دوڑ نے مجھے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ میں درد سے نجات پانے کے لیے اپنی ٹانگ کو حرکت دیے بغیر ایک ہی حالت میں رکھے ہوئے تھا جس کے باعث ٹیسوں میں خاصی کمی آگئی تھی مگر اس کے باوجود آرام کی ضرورت بدستور باقی تھی لہٰذا میں نے فیصلہ کن انداز میں شاہدہ سے بحث نہیں کی۔ اسے الجھن میں چھوڑ کر میں وقت حاصل کر سکتا تھا۔ اس دوران میں نہ صرف میری زخمی ٹانگ کی حالت سنبھل جاتی۔ بلکہ میں حالات کا جائزہ لے کر اپنی گلوخلاصی کی ٹھوس تدابیر پر بھی غور کر سکتا تھا۔

میرے لیے سیتا تک پہنچنا غیر متوقع طور پر ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں شاہدہ کی قید سے نجات کیسے حاصل کروں۔ اس کی شخصیت کا جو انداز میرے سامنے آیا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ معمولی سی باتوں پر بھی انسانی خون بہانے سے گریز نہیں کرتی تھی۔ دوسری طرف بناجائز ذریعے سے پیسہ کمانا اس کا بنیادی مقصد تھا لیکن پھر بھی اس نے نہ صرف مجھے زندہ رکھا تھا بلکہ میرے لیے کی جانے والی اسرائیلی پیش کش کو بھی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

بلجیم کی سرزمین پر شاہدہ کی وہ یک طرفہ محبت میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں اس کا قیدی ضرور بنا ہوا تھا مگر وہ مجھے اسرائیلی کتوں سے بھرپور تحفظ بھی فراہم کر رہی تھی جو کسی اور صورت میں میسر نہ ہوتا۔

بلجیم میں فلسطینی افواجِ آزادی کی تنظیم محض خالد عبدالفتاح تک محدود تھی۔ اس نے شین مارکیڈو کے مکان پر ریڈ بریگیڈ کے اراکین کا حملہ منظم کر کے بے حد جرأت کا ثبوت دیا تھا مگر اس سے مزید بڑے اقدامات کی امید عبث تھی۔

شاہدہ اور اسرائیلیوں کے سامنے خالد عبدالفتاح کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور۔۔ تھا کہ اس کے ذریعے مجھے سیتا کی خیر خبر مل سکتی تھی اور اگر وہ زیادہ کھل کر کسی محاذ پر سامنے آنے کی کوشش کرتا تو شاہدہ نہایت آسانی کے ساتھ اس کا پتہ صاف کرا سکتی تھی۔

میرے خیالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب شاہدہ نے کار اپنے مکان میں برآمدے کے سامنے روک کر انجن بند کر دیا۔

برآمدے میں ایلیزا اور اسرائیلی ایجنٹ، دونوں ہی بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ شاہدہ نے ان کا مکمل جائزہ لے کر فخر آمیز لہجے میں بتایا کہ وہ مر چکے تھے اور پھر لاشیں وہیں چھوڑ کر وہ مکان میں داخل ہوگئی۔

"یہ لاشیں کیا یہیں برآمدے میں پڑی سڑتی رہیں گی"؟ میں نے شاہدہ کی پُرتکلف خوابگاہ میں بستر پر دراز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"اس موسم میں لاشیں تو تین دن تک بھی خراب نہیں ہوں گی۔ مگر کتوں کی ہلاکت کے بعد میں انہیں یونہی نہیں چھوڑ سکتی، یہی فکر اس وقت مجھے یہاں واپس لائی ہے"!

"تو اب ان کا کیا ہوگا"؟

"دیکھتے جاؤ"! وہ ایک ادا کے ساتھ مسکرا کر بولی۔

پھر اس نے ایک الماری میں سے ایک بکس نکالا جو سیاہ چرمی غلاف میں پوشیدہ تھا اور مسہری پر آکر اسے کھول دیا۔

اس بکس میں اسی ساخت کا ایک ٹرانسمیٹر موجود تھا جو میں شاہدہ کی کار میں دیکھ چکا تھا۔ شاہدہ نے اس کا فریکوئنسی ڈائل وغیرہ دیکھنے کے بعد بٹن دبایا اور کہنی کے بل میرے قریب دراز ہو کر وقفے وقفے سے اپنا کوڈ دہرانے لگی۔

"ٹی نائین مادام"! چند ثانیوں بعد ہی شین مارکیڈو کی پھنکارتی ہوئی آواز ریسیور پر سنائی دی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا کام پورا نہ کر سکا اوور"!

"مجھے معلوم ہے مگر یہ ہوا کیسے اور تمہارا کیا حال ہے؟ اوور"!

"میں اسے زندہ پکڑنے کے چکر میں مار کھا گیا۔ اس نے خطرہ محسوس کرتے ہی آتشگیر بم پھینکنے شروع کر دیے۔ اگر میں اپنی کار سے کودنے میں ذرا بھی تاخیر کرتا تو شعلے میرا بدن بھی چاٹ گئے ہوتے۔ ہم نے اسے گھیرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ سینٹ ہیوبرٹ کے علاقے میں ہمیں جُل دے گیا ۔۔۔ اوور"! شین مارکیڈو کی آواز پریشان ہو رہی تھی۔

"تم خود کو ریٹائرمنٹ کا مستحق ثابت کرتے جا رہے ہو ٹی نائین"! شاہدہ کا لہجہ سرد اور جذبات سے یکسر عاری تھا۔ "اگر چوبیس گھنٹوں میں وہ تمہارے ہاتھ نہ لگا تو تم میری سرپرستی سے محروم کر دیے جاؤ گے ۔۔۔۔ اوور"!

"نہیں مادام"! شین مارکیڈو کی آواز میں یکلخت موت کی دہشت سمٹ آئی۔ "میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں، مہلت ختم ہونے سے پہلے میں اپنا کام پورا کروں گا، میرے آدمی مسلسل اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں ۔۔۔۔ اوور"!

"کل رات نو بجے کے بعد میں کوئی عذر نہیں سنوں گی"۔ شاہدہ کا لہجہ بدستور سپاٹ تھا۔ "اس وقت تمہیں فوری طور پر مولن بیک کے اسٹیشن پر پہنچنا ہے، تم اپنے ساتھ ایک بند گاڑی لے کر جاؤ گے۔ باقی ہدایات وہاں موجود لڑکی سے ملیں گی ۔۔۔۔ اوور اینڈ آل"۔

یہ کہہ کر شاہدہ نے اس کا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اسے کیوں بلایا ہے یہاں"؟ میں نے فوراً ہی سوال داغ دیا۔

"مردے ڈھونے کے لیے برسلز میں اس سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہے"۔ وہ اپنی داہنی آنکھ دبا کر ہنستے ہوئے بولی۔

شاہدہ نے مکان کو گرم کرنے کا نظام آن کر دیا اور لباس تبدیل کر کے میرے ساتھ شراب نوشی میں مصروف ہو گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس لڑکی کو باہر پڑی ہوئی دونوں لاشوں کی کوئی فکر نہ ہو۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد کمرے کی محدود فضا میں بزر کی آواز سن کر میں چونک پڑا اور شاہدہ اپنا گلاس ہاتھ میں لے کر ایک دیوار گیر آلے کے قریب پہنچ گئی۔

"کون ہے؟" اس نے ایک بٹن دبا کر انگریزی میں سوال کیا۔

"ٹی نائین!" اسپیکر پر ابھرنے والی آواز سو فیصدی شین مارکیڈو کی ہی تھی۔

"کمرہ نمبر تین میں چلے آؤ۔" شاہدہ نے یہ کہہ کر سوئچ آف کیا اور میرے سامنے آ بیٹھی۔ "دیکھنا کہ وہ میرے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔"

چند ثانیوں بعد خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور شین مارکیڈو کا کرخت چہرہ سامنے آ گیا۔ اس کے بشرے سے تشویش اور فکرمندی ہویدا تھی مگر شاہدہ کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اوہ.... تو یہاں تم موجود ہو۔" وہ نہایت لاپروایانہ انداز میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھا اور مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ بن گیا۔

"یہ تمہارے پاس کیسے پہنچ گیا؟"

"اس کی فکر مت کرو، یہ میرا مہمان ہے اور تم باہر پڑی ہوئی لاشیں لے کر فوراً واپس چلے جاؤ۔" شاہدہ ترش لہجے میں بولی۔

"ادائیں دکھانے میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے۔" وہ بے تکلفی سے شاہدہ کے شانے پر ہاتھ مار کر اسی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ "رستا بھی پینے کو نہیں کہو گی۔"

پھر شاہدہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے الماری سے خالی گلاس نکالا اور دوبارہ شاہدہ کے قریب بیٹھ کر اسے لبریز کر لیا۔

"تم کوئی بدتمیزی نہیں کرو گے۔" شاہدہ اس سے دور سرکتے ہوئے بولی۔ "مادام کا حکم ہے کہ دونوں لاشیں اسرائیلی سفارت خانے کی عمارت میں یا اس کے قرب و جوار میں ڈال دی جائیں۔"

"کام کے لیے تو ساری رات پڑی ہے، تم کہاں کھسک رہی ہو۔" وہ شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

شاہدہ کے گلاس سے شراب چھلک کر اس کے لباس پر گر گئی اور وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "تم کمینے ہو، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔"

"کوئی نئی بات نہیں ہے۔" وہ ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے بولا۔ "آغاز ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے مگر محفل کے اختتام پر ہم دونوں ہی خوش و خرم ہوتے ہیں۔"

"کم از کم تیسرے شخص کی موجودگی کا خیال کرو۔" شاہدہ اسے خود سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"لنگڑا ہے بے چارہ ورنہ اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیتا۔" وہ بے حیائی سے بولا۔ اس کی خباثت سے بھرپور نگاہیں شاہدہ کے جسم پر مرکوز تھیں۔

"میں مادام سے تمہاری شکایت کروں گی۔"

"برسیلز میں مادام میرے علاوہ کسی کی نہیں سنتی، تمہاری شکایت بھی میرے ہی ذریعے اس تک جائے گی نا۔" وہ شاہدہ پر اپنی برتری کا رعب جماتے ہوئے بولا۔

"مادام اس وقت اسی عمارت کے کسی حصے میں موجود ہیں۔"

"تم بکواس کر رہی ہو۔" شین مارکیڈو نے بے اعتباری سے کہا۔ اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات قابل دید تھے۔

"وہ دونوں لاشیں آسمان سے نہیں ٹپکی ہیں۔" شاہدہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

شین مارکیڈو کی چمکتی ہوئی آنکھیں ماند پڑ گئیں اور اس کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ "میں یقین نہیں کر سکتا، تم کتیا ہو۔"

"میں یقین کرنے پر مجبور تو نہیں کر رہی۔" شاہدہ نے اطمینان سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ مادام کے ہاتھ سے جوتے کھا کر تمہاری عقل ٹھکانے آ سکے۔"

"لڑکی!" شین مارکیڈو حلق کے بل غراتے ہوئے اس پر جھپٹ پڑا اور دونوں ہاتھوں سے شاہدہ کے رخسار نوچ ڈالے۔ "میں ایسا لہجہ استعمال کرنے والوں کی زبانیں کھینچ لیتا ہوں۔"

"میں تمہاری ماتحت نہیں ہوں۔" شاہدہ اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔ "پیرس میں میں بھی بہت اختیارات کی مالک ہوں، وہاں تم نے ایسی بدتمیزی کی جسارت کی ہوتی تو تمہیں مار مار کر کسی کوڑا گھر میں پھنکوا دیتی۔"

"حقیر کتیا!" وہ غرا کر پیر پٹختا ہوا اس کمرے سے چلا گیا اور شاہدہ مسکراتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"اس تماشے سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟" میں نے ملامت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"انا کی تسکین۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "میں چاہتی تو دو دن میں اسے قالین چاٹنے پر مجبور کر سکتی تھی مگر اپنے ماتحتوں کے سامنے میں ایک کمزور اور بے بس سی لڑکی بنے رہنے میں تسکین محسوس کرتی ہوں۔"

"مظلومیت کی انتہا اختیار کرنے کے بعد تحکم میں زیادہ مزا آتا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مگر پیرس کے بارے میں تم نے اس سے کیا کہا تھا؟"

"وہ میرے الفاظ کے کھوکھلے پن سے واقف تھا۔ وہاں جیکوس ویڈین مادام بوادی کا مقامی نمائندہ ہے۔ میں اسی کے احکام پر عمل کرتی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ان معاملات میں تم مجھے کیوں ملوث کرتی جا رہی ہو؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"تاکہ تم جلد ہی کوئی فیصلہ کر سکو۔" وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے آج پہلی بار شین مارکیڈو کو دھتکارا ہے۔"

"اسے دھتکارنے سے حقائق نہیں بدلے۔" میں نے چبھتے ہوتے لہجے میں کہا۔ "اس سے پہلے وہ شرمناک حد تک تم پر حاوی رہا ہے۔"

"وہ ماضی ہے صفدر! اسے بھول جاؤ۔" وہ میری طرف جھک کر بولی۔ "میں اسے فراموش کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔"

"شین مارکیڈو کو دھتکار کر تم آغاز کر ہی چکی ہو، مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"خلوص اور چاہت۔"

"میں ان الفاظ سے اجنبی بنا رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے لاتعلقانہ انداز میں کہا۔ "کسی خود غرض کی زبان سے ویسے بھی یہ الفاظ اچھے نہیں لگتے۔"

"میں نے کیا خود غرضی کی ہے تمہارے ساتھ؟"

"شروع سے کرتی آ رہی ہو اور اب بھی تمہیں میری تکلیف کا ذرہ برابر احساس نہیں ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

وہ زور سے ہنس پڑی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ پنڈلی میں زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔"

"پلاسٹر کے ساتھ ہی ہسپتال سے کچھ دوائیں بھی دی گئی تھیں۔"

شاہدہ نے اپنے دستی بیگ سے لفافہ نکالا اور چند گولیاں اور کیپسول سمیت میری طرف بڑھا دیں۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور شین مارکیڈو اندر گھس آیا۔

"اب کیا مصیبت ہے؟" شاہدہ نے جھلاتے ہوئے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"دونوں لاشیں میں نے گاڑی میں لاد لی ہیں۔" وہ شاہدہ کو گھورتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ "اور اب جا رہا ہوں۔"

"تو کیا مجھ سے شاباشی لینے آئے ہو؟"

شین مارکیڈو نے غرا کر اسے ایک غلیظ سی گالی دی۔ "میں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں نے پوری عمارت کا طواف کیا ہے، مگر مادام کہیں موجود نہیں ہیں۔"

"اگر مادام اندھوں کو یوں نظر آنے لگے تو تنظیم چلانے کے بجائے وہ یتیم خانہ کھولنے کو ترجیح دے گی۔" شاہدہ اس سے بالکل مرعوب نہیں تھی۔

"میں دیکھ لوں گا، تم کو دیکھ لوں گا۔" وہ پیر پٹخ کر بولا۔

"تاریک شیشوں کی عینک لگا کر دیکھنا، زیادہ حسین نظر آؤں گی۔" شاہدہ کھنکتا ہوا قہقہہ مار کر بولی۔ "ویسے مجھے موقع ملا تو مادام کو تمہاری حرکتوں سے ضرور آگاہ کروں گی۔"

وہ اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچے چند ثانیوں تک شاہدہ کو گھورتا رہا پھر خلافِ توقع نرم لہجے میں بولا۔ "یہ لنگڑا یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"ان معاملات میں ٹانگ اڑا کر اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں مادام کی مرضی شامل ہے۔" اس بار شاہدہ نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اسے مشورہ دینے کی کوشش... کی تھی۔

"میں تم سے علیحدگی میں کچھ بات کرنی چاہتا ہوں۔" شین مارکیڈو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"یہیں بات کر لو، مجھے اس کے پاس سے ہلنے تک کا حکم نہیں ہے۔" شاہدہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

شین مارکیڈو نے تذبذب کے عالم میں کچھ کہنا شروع کیا، جو میری سمجھ میں نہ آ سکا کیونکہ اس نے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لیے کسی اجنبی زبان کا سہارا لیا تھا۔

شاہدہ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے سکون سے اس کی بات سنتی رہی اور جب وہ خاموش ہوا تو انگریزی میں بولی۔ "تم فکر نہ کرو، میں ذاتی معاملات میں مادام کو نہیں الجھاؤں گی مگر آئندہ تمہارا رویہ مہذب ہونا چاہیے۔"

شاہدہ کو انگریزی بولتے دیکھ کر اضطراری طور پر مارکیڈو کا ہاتھ احتجاجی انداز میں فضا میں بلند ہوا اور اس کے ہونٹ بھی وا ہوئے مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ اس کے بشرے پر غصے اور بے بسی کے ملے جلے آثار ابھر آئے تھے۔

شاہدہ کے جواب میں مزید کچھ کہے بغیر وہ خاموشی سے وہاں سے چلا گیا، اور شاہدہ فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"اپنی دکھ بھری داستان سنا رہا تھا۔" وہ آسودہ لہجے میں بولی۔ "کہہ رہا تھا کہ ان دنوں وہ مادام کے عتاب میں ہے، اور اگر میں نے اس کی شکایت کی تو اس کے بارے میں کوئی روح فرسا فیصلہ بھی صادر کیا جا سکتا ہے۔"

"اور اس کی زبان سے یہ سن کر تمہیں خوشی ہوئی ہے؟" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہونی ہی چاہیے۔ انسان کے اگر دو متضاد روپ ہوں تو وہ ہر روپ میں دوسرے بہروپ کے کمالات دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔"

"تمہارے منہ سے یہ الفاظ حقیر لگتے ہیں۔"

"مادام بواری کی شخصیت سے میل نہیں کھاتے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟"

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"اس وقت تمہارے سامنے میں محض شاہدہ ہوں اسی لیے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی ہوں۔ کبھی کبھی تو میں اپنے موجودہ حالات سے شدید گھٹن محسوس کرنے لگتی ہوں اور جی چاہتا ہے کہ کھل کر اپنے مادام بواری ہونے کا اعلان کر دوں۔ تم پہلے آدمی ہو جسے میں نے بے خوف و خطر اس راز میں شریک کیا ہے اور اسی وجہ سے تم سے بے تکلفی سے باتیں کرتی جا رہی ہوں۔" وہ میرے قریب سرک کر بولی۔

"تم مادام بواری ہو یا شاہدہ مگر ہو نری احمق ہی۔"

"بڑا اچھوتا خیال ہے۔" وہ دلفریب انداز میں مسکرائی۔

"تم بروغیل بورچ کو بھول رہی ہو۔"

"میرے آدمی اس کی بو پر لگے ہوتے ہیں۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"شین مارکیڈو کو تو میں نے دیکھ ہی لیا، دوسرے بھی کہیں اپنی ناکامی کا غم غلط کر رہے ہوں گے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے دیکھ کر عارضی طور پر بہک گیا تھا، بعد میں نے اس کا بدلا ہوا روپ نہیں دیکھا۔"

"اور اگر بروغیل بورچ ان سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہیں پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو؟"

شاہدہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ "تم درست کہہ رہے ہو۔ یہ مکان اس کی نظروں میں آ چکا ہے، کہیں وہ زیادہ نفری کے ساتھ دوبارہ یہاں دھاوا نہ بول دے۔" اس کا لہجہ تشویش آمیز تھا۔

"اب وقت کے زیاں کا احساس ہو رہا ہے نا؟"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بروغیل بورچ اس مکان کو بھول ہی جائے۔ وہ یہ بھی تو سوچ سکتا ہے کہ یہ مکان اس کی نظروں میں آنے کے بعد اپنی حیثیت اور اہمیت کھو بیٹھا ہو۔" وہ مدافعانہ انداز میں بولی۔

"پھر تم آرام کرو ان حالات میں مجھے تو اس چھت تلے نیند نہیں آ سکتی۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر تم اس بات کو اتنی اہمیت دے رہے ہو تو میں ابھی سے تازہ ترین صورتِ حال معلوم کرتی ہوں۔" وہ ٹرانسمیٹر والے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"وہ تو ابھی تک لاشوں کے ہی چکر میں ہو گا۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اور ٹرانسمیٹر پر شین مارکیڈو سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"رپورٹ! اوور۔" رابطہ قائم ہوتے ہی شاہدہ نے سوال کیا۔

"وہ سینٹ ہیوبرٹ کے علاقے میں ایک عمارت سے نکلتے دیکھا گیا تھا مادام!" شین مارکیڈو کی آواز سنائی دی۔ "خطرہ بھانپ کر وہ دوبارہ اندر جا گھسا، وہ عمارت اس وقت آدمیوں کے نرغے میں ہے.... اوور۔"

"اور تم کہاں ہو؟ اوور۔"

"اطلاع ملتے ہی میں بھی موقع پر پہنچ چکا ہوں۔ پارسل میری گاڑی میں موجود ہیں، ہم نے عمارت میں آنے والی لائنیں منقطع کر دی ہیں.... اوور۔"

"تم محاصرہ کب تک قائم رکھو گے؟" ... کا لہجہ زہریلا تھا۔

"مجھے مزید آدمیوں کا انتظار ہے مادام۔" وہ جلدی ...

"ان کے آتے ہی میں خود ایک ایک فلیٹ کی تلاشی لوں گا۔"

"اسے پہچان سکو گے؟ اوور۔"

"لباس اور جسامت سے یقیناً پہچانا جائے گا...."

"لباس بدلا جا سکتا ہے اور اس کی جسامت ... ہے کہ ہر دس آدمیوں میں دو چار اس جیسے ہوں گے...."

"میری رہنمائی کریں مادام.... اوور۔" شین مارکیڈو ... تفکر آمیز ہو گئی۔

"عمارت سے نکاسی کے کتنے راستے ہیں؟ اوور۔"

"دو۔ مگر اس کے اندر گھستے ہی میرے آدمی ... دوسری طرف پہنچ گئے تھے کہ وہ ادھر سے نہ نکل سکا ہو گا۔"

"وہ چھلاوہ ہے۔" شاہدہ غرائی۔ "تمہارے آدمی ..."

"اسے بند کر دو مادام!" اچانک دروازے کی طرف سے بھاری مردانہ آواز سنائی دی اور شاہدہ ہلکی سی چیخ مار کر ... اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا تھا۔ میں بھی پورے انہماک سے متوجہ تھا اس لیے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ شخص کب دراندر ...

آ گھسا تھا۔

شاہدہ نے پلٹ کر چند ثانیوں کے لیے تحیر اور خوف کے عالم میں اس دراز قامت سفید فام کو دیکھا اور ٹرانسمیٹر پر اختتامی فقرہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تم بہت بے خوف عورت ہو مادام!" اس شخص نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول کی مہیب نال سے شاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم میری توقعات پر پوری اتری ہو۔ ایک جھڑپ کے بعد یہاں رُک کر دھنا دل گردے کا کام ہے!"

"تم اس کمرے میں کب سے موجود ہو؟" شاہدہ نے سرد اور سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ وہ اپنے ابتدائی ردِعمل پر قابو پا چکی تھی۔

"جب تم نے دیکھ لیا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "تم نے شاید مجھے چھلاوہ کہا تھا۔ تمہارے آدمی ابھی تک ایڈولف مینشن سے میری نکاسی کا انتظار کر رہے ہوں گے!"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" شاہدہ کے لہجے میں تحکم سمٹ آیا۔

"بنیادی مقصد ابھی تک برقرار ہے!"

"تمہارا مطلوبہ شخص میرے پاس نہیں ہے!"

"پھر یہ کون ہے؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں میرے بارے میں سوال کیا۔

"یہ میرا ایک دوست ہے!"

"میں بچہ نہیں ہوں مادام۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "اس شخص نے اپنی ظاہری وضع قطع ضرور بدلی ہوئی ہے مگر میں بلا مبالغہ صفدر علی کی سینکڑوں تصاویر دیکھ چکا ہوں جو میرے محکمے کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ یہ فریب مجھ پر نہ چل سکے گا۔"

"اگر تمہیں اپنی نگاہوں پر اسی قدر اعتماد ہے تو اٹھاؤ اسے کندھے پر اور نکل جاؤ یہاں سے۔" شاہدہ نے اس بار خاصی بیزاری کا اظہار کر ڈالا۔

"میں کوئی بے جان جنس نہیں ہوں جو تم دونوں اس طرح میرے بارے میں سودے بازی کر رہے ہو۔" میں نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔

"خاصی اچھی انگریزی بولتا ہے۔" وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا، اس کا تخاطب بدستور شاہدہ سے ہی تھا۔ "اس کی ٹانگ میں کیا ہوا ہے؟"

"میرا وقت اور موڈ برباد مت کرو، اسے لے جانے کے بعد اس کا علاج کرتے رہنا۔"

"میرا ساتھی اور ایلیزا کہاں ہے؟"

"ڈھونڈ لو، اسی عمارت میں ہوں گے!"

"عورتوں پر تشدد کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے مادام۔" وہ تنفر آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھ سے ہوش میں رہ کر بات کرو!"

"تشدد!" شاہدہ تلخ انداز میں ہنس پڑی جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ "اگر تم یہ جان ہی چکے ہو کہ میں کون ہوں تو مجھ سے ایسی بچکانہ باتیں نہ کرو!"

"مجھے اپنا ساتھی ہر حالت میں درکار ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ!"

"کاش میں نے اسے مار ہی دیا ہوتا۔" وہ تاسف آمیز لہجے میں بولی۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟" وہ شخص غرایا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ شاہدہ کے رویے پر وقار آہستہ آہستہ مشتعل ہوتا جا رہا تھا۔

"اسے مادام کے حکم پر یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔" وہ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔

"کہاں؟" اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔

"یہ مادام کو یا لے جانے والوں کو معلوم ہو گا۔"

"تم پھر اپنی اصلیت سے انحراف کر رہی ہو!"

"میں مادام بواری کی ایک ادنیٰ جاں نثار ہوں مسٹر بروغیل بورچ۔" شاہدہ سنجیدگی سے بولی۔ "اگر میں مادام بواری ہوتی تو اس کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے تمہارا بدن چھلنی کر دیا گیا ہوتا۔"

"تم جھوٹی ہو، ایلیزا نے مجھے پوری کہانی سنائی تھی۔"

"زبردستی کا تو کوئی علاج نہیں ہے!"

"میں دیکھوں گا تمہیں۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "پہلے تم صفدر کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر لے جا کر باندھو! تمہیں یہاں ڈوری نہیں ملے گی۔"

"وقت برباد مت کرو۔" اس مرتبہ وہ غیض آلود لہجے میں غرایا اور شاہدہ نے فوراً ہی اپنے گاؤن کی ڈوری کھول لی۔

میرے ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ نرمی سے میرا ہاتھ دبایا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ صورتحال سے بالکل ہی مایوس نہیں ہوئی تھی۔

"اب کیا کیا جائے؟" میرے ہاتھ باندھنے کے بعد شاہدہ نے سوال کیا۔

"صفدر اپنے پیروں پر چل سکتا ہے؟" بروغیل نے سوال کیا۔

"یہ مجبوری نہ ہوتی تو اس وقت نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔" شاہدہ کے بجائے اس بار میں بول پڑا۔

"اگر یہ درست ہے تو پھر صفدر کو تم اپنے کندھے پر لاد کر میری کار تک لے جاؤ گی!" بروغیل بورچ نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ شاہدہ نے اس مشقت پر شدید احتجاج کیا مگر وہ کوئی بات سننے یا ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

شاہدہ نے جھک کر نہایت دقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنی پشت پر لاد لیا۔

"اپنے بدن کو ڈھیلا ہی رکھنا۔" توازن درست کرتے ہوئے شاہدہ اردو میں ہولے سے بڑبڑائی اور میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔ بظاہر بری طرح زیر ہونے کے باوجود وہ دلیر لڑکی شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی!

شاہدہ نرم و نازک سی لڑکی ضرور تھی مگر کم از کم طاقت کے استعمال سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کے گُر سے بھی واقف تھی۔ اس نے جس قدر چابک دستی سے میرے بدن کو اپنے کندھے پر لادا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا بوجھ اٹھا کر تھوڑی دور تک چلنا اس کے لیے معمولی کام تھا مگر جب اس نے قدم آگے بڑھائے تو ایسی اداکاری شروع کر دی جیسے اس کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا دشوار ہو رہا ہو۔

"یہ مجھ سے نہیں سنبھلے گا۔ گر گئی تو اس کے ساتھ ہی مجھے بھی شدید چوٹ آسکتی ہے۔" دو تین قدم بڑھنے کے بعد شاہدہ ہانپتے ہوئے بولی۔

"فکر نہ کرو، میں فرسٹ ایڈ پہنچانے میں تاخیر نہیں کروں گا۔" بروغیل بوچ کی آواز میں طنز کی کاٹ نمایاں تھی۔

بروغیل بوچ ریوالور تھامے اپنی جگہ کھڑا رہا اور شاہدہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ساتھ ہی وہ انگریزی میں اول فول بکتی جا رہی تھی۔ اپنے شدید ردِعمل کی بناء پر اس وقت شاہدہ کوئی ستم رسیدہ عورت نظر آ رہی تھی۔

بروغیل بوچ کے قریب سے گزرتے ہوئے پل بھر کے لیے اس کا جسم ایک طرف کو قدرے جھکا اور کچھ سمجھنے سے پہلے میں فضا میں اچھل کر بروغیل بوچ پر جا گرا۔

اس اچانک حرکت کا نہ مجھے اندازہ تھا اور نہ ہی بروغیل بوچ کو شاہدہ سے ایسی مہارت کی امید تھی۔ لہٰذا کمرے کی محدود فضا میں دو چیخیں گونج اٹھیں۔ میری چیخ خاصی کربناک تھی کیونکہ گرتے ہوئے میری زخمی پنڈلی بھی مڑ گئی تھی مگر بروغیل کی آواز میں قہر اور غصہ رچا ہوا تھا۔

بروغیل بوچ نے گرتے ہی نہایت پھرتی سے مجھے اپنے اوپر سے اچھال دیا مگر اس اثنا میں شاہدہ کسی غضبناک شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی تھی۔

شاہدہ کی بھرپور ٹھوکر بروغیل کی داہنی کلائی پر پڑی اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول فضا میں اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ بروغیل بوچ اذیت سے تڑپ کر قالین پر دوہرا ہو گیا۔ دوسری بار جوں ہی شاہدہ اس پر جھکی، اس نے پوری قوت سے شاہدہ کے پیٹ پر لات مارنی چاہی جو شاہدہ کے شانے پر پڑی اور وہ پیچھے جا گری۔

پھر وہ دونوں تقریباً بیک وقت قالین سے اٹھے اور ایک دوسرے کے سامنے جم گئے۔ بروغیل بوچ کا داہنا ہاتھ بے جان انداز میں جھول رہا تھا جس سے اندازہ ہوا کہ شاہدہ کی ٹھوکر نے اس کا وہ ہاتھ ناکارہ کر دیا تھا۔

ان دونوں نے جنون کے عالم میں ایک دوسرے پر کئی وار کیے جو مجموعی طور پر بے کار ہی ثابت ہوتے کیونکہ وہ دونوں ہی اپنی مدافعت کے سلسلے میں بہت زیادہ چالاک تھے۔

میری پنڈلی میں اٹھنے والی درد کی ٹیسیں بہت شدید تھیں مگر کمرے میں ہونے والا روح فرسا مقابلہ اس قدر سنسنی خیز تھا کہ میں اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی فکر میں سب کچھ بھول کر آہستہ آہستہ ادھر سرکنے لگا۔ جدھر بروغیل کا پستول پڑا ہوا تھا۔

میری نگاہیں ان دونوں پر مرکوز تھیں۔ ایک بار بروغیل کسی خونیں عقاب کی طرح شاہدہ پر جھپٹا تو وہ نہ صرف اسے غچہ دے گئی بلکہ اس کے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔

مار کھانے کے بعد بروغیل پلٹا تو اس کے رخسار کی جلد ایک جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ شاہدہ واقعی بچی ہی نہیں جانتی تھی بلکہ اس کے بدن میں غیر معمولی طاقت بھی موجود تھی۔

شاہدہ اپنے حریف پر فیصلہ کن برتری حاصل ہونے کے باوجود خاصی پُرسکون نظر آ رہی تھی مگر بروغیل بوچ اس کے سامنے خود کو بے بس پا کر غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اگلی کوشش میں وہ شاہدہ کا لباس پھاڑنے سے زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اور پھر اس نے اپنی بلٹ سے تیز دھار والا ایک چھوٹا سا خنجر نکال دیا۔

اس کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر شاہدہ پریشان ہو گئی۔ بروغیل بوچ بائیں مٹھی میں خنجر دبا کر حملہ آور ہوا تو شاہدہ اس کی زد سے پوری طرح نہ بچ سکی۔ خنجر کی نوک نے اس کے داہنے بازو پر خون کی ایک لکیر ابھارنے کے ساتھ ہی اس کی قمیص بھی تار تار کر دی!

میں بروغیل کے پستول کی طرف ضرور بڑھ رہا تھا مگر پنڈلی میں اٹھنے والی ٹیسوں کے باعث میری رفتار بہت سست تھی۔ شاہدہ کا خون دیکھ کر میں نے اپنی جدوجہد کچھ اور تیز کر دی۔ بروغیل کے بڑھتے ہوئے حوصلے کو فوری لگام دینا ضروری تھا۔ بروغیل شروع سے ہی اس کوشش میں تھا کہ شاہدہ کو لیٹ کرا کے زیر کرے مگر وہ لڑکی اس سے دور رہ کر اس کے ارادوں کو انجام تک پہنچانے میں کوشاں تھی۔ ان دونوں کی پوزیشن بدل رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے بروغیل کو میری پیش قدمی کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

جب میں پستول تک پہنچا تو شاہدہ کے جسم پر کئی زخم آ چکے تھے۔ وہ دونوں خون میں تر تھے مگر ان کے وحشیانہ حملوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر قالین پر سے بروغیل بوچ کا وزنی پستول اٹھا لیا۔ اس وقت بروغیل کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے نال سیدھی کر کے اس کے جسم کے بائیں حصہ کا نشانہ لیا اور خاموشی سے ٹریگر دبا دیا۔

وہ نہ جانے بروغیل بوچ کی چھٹی حس کا کرشمہ تھا یا محض اتفاق کہ جوں ہی میں نے ٹریگر دبایا وہ شاہدہ کو بھول کر بجلی کی سی سرعت سے پیچھے پلٹا اور میری چلائی ہوئی گولی اس کے دل میں اترنے کے بجائے اس کے داہنے بازو میں پیوست ہو گئی اور اسی ہاتھ کی کلائی ابتدا میں شاہدہ توڑ چکی تھی۔

گولی کا زخم کھا کر بروغیل نے کسی غضبناک درندے کی طرح دھاڑتے ہوئے میرا رُخ کیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں خنجر بدستور موجود تھا۔

میں نے فوری طور پر بروغیل کے چہرے کا نشانہ لیا مگر میرے فائر کرنے سے پہلے شاہدہ جست لگا کر عقب سے بروغیل پر ٹوٹ پڑی۔

اپنے اپنے لہو میں نہائے ہوئے دو دشمن ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کی ہولناک پیکار میں مصروف تھے۔ شاہدہ عورت ہوتے ہوئے بھی بلا کی پھرتیلی، دلیر اور طاقتور تھی۔ بلکہ اس میں طاقت سے زیادہ ذہانت موجود تھی اور وہ جانتی تھی کہ دشمن پر کب اور کس جگہ کاری ضرب لگائی جا سکتی تھی۔

دوسری طرف بروغیل بوچ تھا جو اپنی جسمانی برتری کے باوجود داہنے ہاتھ پر دو مہلک زخم کھا چکا تھا۔ غصے اور جنون کے عالم میں وحشیانہ طاقت ضرور آزما رہا تھا مگر شاہدہ کے سامنے وہ بہت حقیر نظر آ رہا تھا۔

اس پر خاصی حد تک قابو پانے کے بعد جوں ہی شاہدہ کو ذرا سی مہلت ملی، اس کا داہنا ہاتھ فضا میں بلند ہو کر بجلی کی سی سرعت سے نیچے آیا اور ان دونوں کے چڑھے ہوئے سانسوں کے تیز آہنگ میں میں نے بروغیل کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے یا کھسکنے کی خفیف سی آواز واضح طور پر سنی۔

بروغیل کے حلق سے ایک پھنسی پھنسی سی آواز نکلی اور وہ ریت کے بُت کی طرح اسی حالت میں قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

"خاصا سخت جان تھا!" شاہدہ اس کے بے جان بدن پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولی۔ "تم تو محفوظ ہو نا؟"

"تمہارا چہرہ اور جسم کئی جگہ سے زخمی ہے!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "پہلے ان کی ڈریسنگ کر لو!"

"ڈریسنگ تم نہیں کرو گے؟" اس کے خون آلود چہرے پر مسکراہٹ بڑی عجیب اور لرزہ انگیز محسوس ہو رہی تھی۔

"حکم دو گی تو انکار نہیں کر سکوں گا۔"

"خوفزدہ ہو گئے!" وہ شہادت کی انگلی سے اپنا رخسار سہلاتے ہوئے قہقہہ مار کر بولی۔

"خون آشام عورتوں سے ڈرنا ہی چاہئے، چند گھنٹوں میں تمہارے ہاتھوں سے یہ تیسرا خون سرزد ہوا ہے۔"

"پہلے تم بستر پہ آؤ!" وہ قریب آ کر مجھے سہارا دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے بے رحمی سے تمہیں اس پر پھینک دیا تھا مگر وہ میرا آخری موقع تھا اگر میں اسے گنوا دیتی تو ہم دونوں ہی اس کے قیدی بن چکے ہوتے!"

"اس وقت تم نے مجھے نہتا کرنے کی کوشش نہیں کی۔" بستر پہ پہنچنے کے بعد میں نے بروغیل بوچ کا پستول اس کے چہرے کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔

"تم بنیادی طور پر بے خوف آدمی ہو اور ایسے لوگ اعتماد کو کبھی فریب نہیں دیتے۔" وہ بستر پہ بیٹھے ہوئے وینٹی بیگ میں سے آئینہ نکالتے ہوئے بولی۔ "تم للکارے بغیر مجھ پہ کوئی وار نہ کر سکو گے—!"

"بڑا اعتماد ہے تمہیں اپنی مردم شناسی پہ!"

"خوشی اس بات کی ہے کہ اگر کبھی اندازے کی غلطی ہوئی تو پچھتانے کے لئے زندہ نہ رہ سکوں گی، ایسی خود فریبی مجھے پسند ہے!" وہ کاغذی رومال سے خون کی لکیریں صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"تم نے براہِ راست اسے ہلاک کر کے اچھا نہیں کیا۔" میں نے پہلی بار اس کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "بروغیل بوچ نے میرے بارے میں کسی اور کو اعتماد میں لیا ہوتا تو اس وقت وہ تنہا یہاں نہ آیا ہوتا۔"

"پھر بھی یہ جگہ تمہارے لئے مخدوش ہو گئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، احتیاط مناسب رہے گی۔ مگر پہلے میرے زخموں کی معمولی سی ڈریسنگ کر دو تاکہ خراشوں میں سوزش کم ہو سکے۔"

"تم سے دوستی خطرناک ثابت ہو رہی ہے، اب تو تم میری اور میں تمہاری مرہم پٹی کرتا رہوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

اس نے اچانک جھک کر میری پیشانی چوم لی۔ "آخر کو تم نے میرے لئے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ تلاش کر ہی لیا۔"

اس نے میرے ایک سطحی تبصرے سے کچھ اور مفہوم اخذ کر لیا تھا میں نے چاہا کہ اس کی فوری تردید کر ڈالوں مگر مصلحت کے پیشِ نظر

خاموش ہی رہی۔

جراثیم کش محلول میں روئی تر کر کے اس کے زخم صاف کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خاصی ہمت کی مالک تھی۔ بروغیل نے خنجر کی نوک سے خاصے گہرے زخم لگائے تھے مگر شاہدہ نے ذرا سی تکلیف کی شکایت نہیں کی تھی۔

"زخم بھرنے کے بعد تمہارے حسین رخساروں پہ بدنما نشان باقی رہ جائیں گے۔" میں نے مرہم لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"آخری نشانیاں ہیں، اور اگر تم پستول پر قبضہ کرنے کی ہمت نہ کرتے تو شاید ان کی تعداد میں اور اضافہ ہو جاتا۔"

تھوڑی دیر بعد شاہدہ بمشکل تمام مجھے ہمراہ لے کر باہر آئی تو پتہ چلا کہ اس بار بھی بروغیل نے اپنی پرانی کار ہی استعمال کی تھی۔ شاہدہ نے مکان کا بیرونی دروازہ مقفل کیا اور پھر اپنی کار کے بجائے بروغیل کی کار میں وہاں سے روانہ ہو گئی۔

"یہ کار کس لئے لی ہے۔؟" میں نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔

"تاکہ باہر کسی کو علم نہ ہو سکے کہ بروغیل یہاں آیا تھا۔"

"اور اس کی لاش کا کیا ہو گا۔؟"

"شین مارکیڈو آج شاید ساری رات مُردوں کو ہی ٹھکانے لگاتا رہے گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تو مارکیڈو ہی بروغیل کی کار بھی لے جاتا۔" میں نے مشورہ دیا جو اس نے فوراً قبول کر لیا۔

واپس اپنے مکان پر پہنچ کر اس نے کار میں نصب ٹرانسمٹر پر شین مارکیڈو سے رابطہ قائم کر کے اسے بروغیل بوچ کی لاش اور کار کے بارے میں ہدایات دیں تو شین مارکیڈو کی آواز میں تحیر سمٹ آیا۔

"بروغیل بوچ ہمارے محاصرے میں نہیں ہے مادام؟ اوور!"

ٹرانسمٹر پر اس کی حیرت آمیز آواز سنائی دی تھی۔

"تم سب احمق ہو نائن ـــــ اگر میں اپنی آنکھوں کو کھلا نہ رکھوں تو تم لوگ مجھے ناقابلِ بیان دشواریوں سے دوچار کر دو ـــــ اب اپنے آدمیوں کی چھٹی کر دو، بروغیل کا مسئلہ نمٹانے کے بعد تم بھی آرام کرو گے، اوور!"

"میں شرمندہ ہوں مادام، آج میرے ستارے ہی گردش میں معلوم ہوتے ہیں، اوور!" شین مارکیڈو کی آواز میں ندامت کا تاثر تھا۔

"پیرس سے آئی ہوئی لڑکی ہمارے دشمنوں کی نظر میں آئی ہوئی ہے اور میں اسے چارہ بنا کر بڑا شاندار کھیل رہی ہوں، وہ کہیں نظر آئے تو تم اس سے لاتعلقی کا اظہار کرو گے، اوور!"

"شاہدہ تھوڑی دیر پہلے ڈان فرنانڈو کے ساتھ مولن بیک کے اسٹیشن پر ہی موجود تھی، اوور!" شین مارکیڈو نے جلدی سے کہا۔

"اسے بھی بھول جاؤ۔" شین مارکیڈو کے تبصرے پر شاہدہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "وقت آنے پر وہ حوالات میں نظر آئے گی، اوور اینڈ آل۔"

سلسلہ منقطع کر کے شاہدہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "کم از کم وہ میرا پیچھا نہیں کرے گا۔"

"تم خود کو غیر ضروری طور پر اس کی نظروں میں مشکوک کر رہی ہو، آج مولن بیک کے مکان میں تین لاشیں پائی گئیں اور اس نے خود وہاں دیکھا تھا۔ وہ سوچ سکتا ہے کہ کہیں شاہدہ اور مادام بواری ایک ہی شخصیت کے دو روپ نہ ہوں!"

یہ سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ "اگر میں اس کے سامنے کر خود اعتراف بھی کر لوں تو وہ یقین نہیں کرے گا کہ میں ہی مادام ہوں ـــــ"

"پھر تو وہ واقعی احمق ہے!"

"اس کی حماقت سے زیادہ یہ میری ذہانت ہے۔" وہ لہجے میں بولی۔ "میرے دونوں کرداروں میں زمین آسمان کا فرق ہے وہ کیسے مان لے گا کہ وہ بے خبری میں مدت سے ایک ایسی لڑکی کا مانتا رہا ہے جسے اس نے زبردستی کئی بار پامال کیا ہے!"

"خیر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔" میں خشک لہجے میں بولا۔ "یہ بتاؤ کہ اس بھاگ دوڑ کا اختتام کب تک ہو گا۔؟"

"ہوٹل موریس پہنچ کر تم سکھ کی نیند سو سکو گے!"

"ہوٹل؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "اس حالت میں ہم دونوں ہی وہاں تماشا بن جائیں گے اور شاید پولیس بھی ہم میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے!"

"وہ صرف نام کا ہوٹل ہے ورنہ درحقیقت بروسیلز میں میرا کنٹرول سینٹر ہے، میرے آدمیوں کے سوا وہاں کوئی نہیں۔"

"تم وہاں کس حیثیت میں جاتی ہو؟"

"شاہدہ کے علاوہ اور کس حیثیت میں جا سکتی ہوں؟"

"اور اگر وہاں مادام بواری کی موجودگی ضروری ہو جائے تو؟ ...گی۔؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"وہاں چل کر سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ لو گے۔" مسکرا کر بولی۔

"تمہارا قرب تو حاصل رہے گا نا؟"

"میرے ساتھ رہے تو کچھ بھی نہ معلوم ہو سکے گا۔ ہوٹل میرا ایک ناقابلِ شکست قلعہ ہے۔!"

جب شاہدہ نے اپنی کار ایک ویران سی عمارت کے سامنے روکی تو میں چونک پڑا۔ شاہدہ نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر ڈیش بورڈ کے خانے میں سے ایک چھوٹا سا چوکور نکالا جس پر تین بٹن نصب تھے۔ شاہدہ نے ان میں سے ایک آہنی پھاٹک کرب آواز پیدا کئے بغیر خود بخود کھلتا چلا گیا۔

شاہدہ اپنی کار ایک تاریک احاطے میں لیتی چلی گئی وہاں ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ عمارت کی بھی تمام کھڑکیاں ویران پڑی ہوئی تھیں مگر پورچ میں دو کاریں موجود تھیں۔

شاہدہ نے مجھے سہارا دے کر سیاہ رنگ کی ایک بڑی کار میں منتقل کیا اور اپنی کار وہیں مقفل کر کے نئی گاڑی میں باہر روانہ ہو گئی۔ پھاٹک سے باہر آ کر اس نے گود میں پڑے ہوئے چوکور ڈبے کا دوسرا بٹن دبایا اور آہنی پھاٹک بتدریج بند ہوتا چلا گیا۔

"یہ کیا چیز ہے۔؟"

"معمولی سی چیز ہے۔" وہ بولی۔ "پھاٹک برقی موٹر کے ذریعے کھلتا اور بند ہوتا ہے اور موٹر کو چلانے کے لئے میرے پاس ریموٹ کنٹرول یونٹ موجود ہے۔"

"یہ کتنے فاصلے تک کام کرتا ہے۔؟"

"پچاس میٹر کے فاصلے تک تو میں نے اسے آزمایا ہوا ہے۔"

"یہ مکان کس کی ملکیت ہے؟"

"یہ میرا خفیہ ٹھکانا ہے، یورپ کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں میرے ایسے ٹھکانے موجود ہیں۔ جن کا کسی کو علم نہیں ہے۔"

"مگر کار تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"یہ مادام بواری کی مخصوص کار ہے" اس کے لہجے میں تکبر سمٹ آیا۔ "یہ کار مکمل طور پر بلٹ پروف ہے۔ شیشوں سے ٹائروں تک پر گولی اثر نہیں کر سکتی۔ اس کا سارا نظام خودکار ہے اور اس کے تمام شیشوں کی ساخت ایسی ہے کہ باہر سے اندر کی جھلک بھی نہیں دیکھی جا سکتی۔!"

"کار کے نمبروں کے ذریعے تمہارا سراغ لگایا جا سکتا ہے!" ...ملانے کہا۔

"ایک نمبر پلیٹ میں دو بار استعمال نہیں کرتی اور اس کی اگلی پچھلی نمبر پلیٹیں خاص طور پر نصب کی گئی ہیں اور میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے محض ایک بٹن دبا کر چند لمحے بعد دیکھے چار قطعی مختلف نمبر تبدیل کر سکتی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا کیونکہ اس سے بات کرتے ہوئے اس کی شخصیت کا تاثر ہر بار کچھ زیادہ ہی گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔

"اس کار میں تین اسٹین گنیں بھی نصب ہیں جو کار چلاتے ہوئے بھی میں نہایت آسانی سے بیک وقت چلا سکتی ہوں ـــــ" مجھے خاموش پا کر وہ خود بولنے لگی۔

"کہاں لگی ہوئی ہیں؟" میں غیر ارادی طور پر سوال کر بیٹھا۔

"پچھلے ایکسل پر اس طرح نصب ہیں کہ دیکھنے والا ان کی نالیں سائلنسروں کے ڈھانچے ہی سمجھے گا۔"

"اس موسم میں دھوکا کھانا مشکل ہے کیونکہ باہر کے سرد موسم میں سائلینسر سے خارج ہونے والے آبی بخارات سرمئی بادل کی شکل اختیار کریں گے اور سائلنسر الگ نظر آئے گا۔"

"عام طور پر ان نالوں کے سامنے ایک آہنی چادر گری رہتی ہے جو فائرنگ بٹن دباتے ہی خود بخود نیچے گر جاتی ہے۔" اس کے پاس ہر اعتراض کا مدلل جواب موجود تھا۔

تھوڑی دیر کے سفر کے بعد کار شہر کے ایک سنسان علاقے میں ایک احاطے میں داخل ہوئی جس کے وسط میں ایک کئی منزلہ عمارت موجود تھی۔

احاطے کے پھاٹک سے ملحق چھوٹے سے کمرے میں مسلح سنتری موجود تھا جو کار کے انجن کا مدھم سا شور سن کر پہلے ہی باہر آ چکا تھا۔ وہ کار شاید مادام بواری کے ماتحتوں میں شہرہ رکھتی تھی کیونکہ میں نے اسے کار پہچانتے ہی ایڑیاں بجا کر سیلوٹ مارتے دیکھا اور شاہدہ اس پر توجہ دئے بغیر اپنی کار اندر لیتی چلی گئی۔ شاہدہ نے کار عمارت کے داخلی دروازے کی طرف لے جانے کے بجائے بغلی سمت کا رخ اختیار کیا اور اس طرف ایک پختہ ڈھلان کے سامنے کار روک لی جو ایک بند دروازے کی طرف نشاندہی کر رہی تھی۔ شاید وہ کسی گیراج وغیرہ کا دروازہ تھا۔

شاہدہ نے جس ریموٹ کنٹرول یونٹ سے اپنے خفیہ ٹھکانے پر کام لیا تھا، وہاں بھی اس کی مدد سے خودکار طریقے پر گیراج کا دروازہ کھولا، جو سرکنے کے بجائے اوپر اٹھنے والا تھا اور جگہ پیدا ہوتے ہی کار ایک تیز جھٹکے سے ڈھلان پر اچھلتی ہوئی اس دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

شاہدہ نے انجن بند کرنے سے پہلے ہی بٹن دبا کر دروازہ بند کر دیا۔

کار جہاں موجود تھی میرے اندازے کے برعکس گیراج نہیں تھا بلکہ اچھا خاصا کمرہ تھا جہاں فرش کے خاصے بڑے حصے پر قالین بچھا ہوا تھا۔ غنیمت یہ ہے کہ جس جگہ کار روکی گئی تھی وہاں پختہ فرش ننگا تھا۔

اس کمرے میں بہت خفیف سی روشنی تھی جو کار کے ہیڈ لیمپ گل ہونے کے بعد خاصی نامانوس سی نظر آئی۔ اسی روشنی میں ایک طرف لفٹ نظر آ رہی تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔

شاہدہ پر نظر پڑی تو وہ پلک جھپکتے میں اپنی ہیئت میں نمایاں تبدیلی کر چکی تھی۔ اس کی آنکھوں پر بہت بڑے فریم والی تاریک شیشوں کی عینک کا اضافہ ہو گیا تھا جس نے آنکھوں کے علاوہ ناک، پیشانی اور چہرے کے خاصے حصے کو چھپا لیا تھا۔ وہ عینک شاہدہ کے چہرے پر ایک نقاب کی طرح نظر آ رہی تھی۔

نیچے آکر اس نے مجھے کار سے اترنے میں مدد دی اور سبک خراماں خراماں مجھے خودکار لفٹ میں لے گئی۔

لفٹ تیز رفتاری سے اوپر روانہ ہوئی اور جب وہ رکی، تو دروازہ کھلنے پر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لفٹ کسی راہداری وغیرہ میں رکنے کے بجائے ایک وسیع و عریض اور خوابناک کمرے میں رکی تھی جہاں ایک طرف بہت بڑا آرام دہ بستر بھی نظر آ رہا تھا۔

اس کمرے میں دیگر چیزوں کے علاوہ جو چیز میرے لئے حیرت کا باعث بنی وہ معذوروں والی ایک خوبصورت کرسی تھی جو شاہدہ فوری طور پر لفٹ کے دروازے پر لے آئی۔ میں لفٹ سے نکل کر کرسی کے ذریعے بستر پر جا پہنچا۔

وہ وسیع کمرہ اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے کسی محل ہی کا گوشہ نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف ساگوان کا بڑا سا منقش سنگھار دان موجود تھا جس پر بھانت بھانت کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں دوسری طرف ایک چھوٹی سی نشست گاہ کے لوازمات موجود تھے اور سب سے بڑھ کر حیرت کی بات یہ تھی کہ لفٹ اس کمرے میں موجود دو بند دروازوں کے درمیان آ کر رکی تھی اور اگر اس کا دروازہ بند کر دیا جاتا تو یہ کہنا مشکل تھا کہ وہاں لفٹ بھی موجود تھی یا نہیں!

اچانک کمرے میں ایک نامانوس سی آواز گونج اٹھی اور میرا دل بے اختیار شدت سے دھڑک اٹھا مگر آواز کا تعاقب کرنے پر میری حیرت رفع ہو گئی کیونکہ ایک گوشے میں رکھے ہوئے ٹیلی ویژن کی روشن اسکرین پر ایک مرد کا خونخوار چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ کوئی ایک ہی فقرہ بار بار دہرا رہا تھا اور اس میں مادام کے علاوہ باقی الفاظ میرے لئے اجنبی تھے۔

"میری گفتگو ختم ہونے تک تم خاموش ہی رہنا۔" شاہدہ نے اپنا کوٹ اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا اور ٹیلی ویژن کے قریب جا کر ایک سوئچ دبانے کے بعد اس شخص سے بات کرنے لگی چند ثانیوں بعد سوئچ آف کر کے وہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے جوتے اتار کر بستر پر دراز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"شین مارکیڈو اسرائیلی سفارتخانے کے قریب لاشیں ڈالتے ہوئے پولیس کی نظروں میں آ چکا ہے!" وہ تشویش زدہ آواز میں بولی۔

"بروفیل کا قصہ پاک ہونے کے بعد شین مارکیڈو کو ادھر بھیجنا ہی حماقت تھا، آخر اس کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔"

"پولیس اس کا تعاقب کر رہی ہے۔" وہ بولی۔ "وہ بہت غلط موقع پر پولیس کی نظروں میں آیا ہے، اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو عمر قید سے نہ بچ سکے گا۔ اور جیسے آدمیوں کے لئے نہ جانے کیا کیا دشواریاں پیدا کر سکے گا۔"

"خبر دینے والا کون تھا ——؟"

"کلوزڈ سرکٹ ٹیلی ویژن پر اس عمارت کا ریڈیو ابھی ابھی اسے چند منٹ پہلے ٹرانسمٹر پر بی ٹی نائین نے خود صورتحال سے آگاہ کیا تھا۔"

"پھر تو خبر درست ہی ہو گی، تم نے کیا سوچا ہے۔"

وہ پھیکے انداز میں مسکرا دی۔ "مادام لیواری اپنے ملک میں فوری فیصلوں کے لئے شہرت رکھتی ہے، میں نے انتہائی کرب کے عالم میں بی ٹی نائین پر کڑی نظر رکھنے کا حکم دیا ہے اگر وہ خود کو پولیس کی گرفت سے نہ بچا سکا تو مار دیا جائے گا۔"

"کرب اور شین مارکیڈو کے لئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ بہت کام کا آدمی ہے۔" وہ بولی۔ "بی ٹی نائین کو اس عمارت میں رسائی حاصل نہیں ہے۔ مگر اسے ناقابل تسخیر بنانے بلکہ قائم کرنے میں اس کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔"

"اب اسے جہنم میں ڈالو، میں سونا چاہتا ہوں۔"

"ٹھہرو، میں تمہارا لباس تبدیل کرا دوں۔" وہ الماری کی طرف بڑھ گئی۔

"اس کمرے میں تمہاری جملہ ضروریات پوری ہوتی رہیں گی، بس یہ احتیاط رکھنا کہ جس وقت میں ٹیلی ویژن پر گفتگو میں مصروف ہوں تو تمہاری زبان بند رہے!"

"تو کیا تمہارے مخاطب کو اپنے سیٹ پر اس کمرے کا منظر نظر نہیں آتا ——؟"

"نہیں، تصویر کا نظام یک طرفہ ہے!"

"اور یہ لفٹ ساری رات یہیں رکی رہے گی؟"

"یہ صرف میرے استعمال کے لئے ہے۔" وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "اس وقت تم آرام کرو، صبح میں تمہیں ہر چیز دکھاؤں گی۔"

میں شدید تکان محسوس کر رہا تھا مسلسل بھاگ دوڑ سے میری دونوں کنپٹیاں بری طرح دکھ رہی تھیں لہٰذا جب وہ اپنے زخموں پر دوبارہ مرہم وغیرہ لگا کر واپس آئی تو میں زیادہ دیر خود پر قابو نہ رکھ سکا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک گہری نیند سوتا رہا پھر ایک چیخ سن کر میں بیدار ہو گیا۔ کمرے کی فضا پر گہری تاریکی مسلط تھی اور میرے خوابیدہ اعصاب تیزی سے کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھے، مگر پھر بھی غیرارادی طور پر میرے ہاتھ بستر پر شاہدہ کو ٹٹولنے لگے اور یہ احساس ہوتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کہ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

کمرے کی محدود فضا میں گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اسی کے ساتھ مکمل سکوت بھی طاری تھا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنے آرام دہ بستر پر پڑا اپنے غنودہ اعصاب کی توانائیاں مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ میں چیخ کی جس آواز پر نیند سے ہڑبڑا کر بیدار ہوا تھا وہ اس عمارت میں واقعی کہیں سے ابھری تھی یا میں نے خواب میں سنی ہوئی کسی آواز کا غیر معمولی اثر قبول کیا تھا۔

اگر وہ کوئی خواب ہی تھا تو پھر شاہدہ کو بستر پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس کی غیر حاضری کا مطلب تھا کہ اگر یہ چیخ کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو وہاں کوئی نہ کوئی اہم واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا جس کے باعث شاہدہ کو آرام دہ بستر چھوڑ کر کہیں جانا پڑ گیا تھا۔

اپنے حواس کو نیند کے خمار سے نجات دلانے کے بعد میں نے بستر سے اترنے کی کوشش کرنی چاہی مگر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکا کیونکہ میری پنڈلی میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

میں نے کراہ کر ایک گہرا سانس لیا اور اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر لیٹ گیا۔ اسی لمحہ وہ کمرہ اچانک روشنی سے بھر گیا اور مجھے شاہدہ بھی نظر آ گئی۔

وہ غالباً میرے سرہانے دیوار سے چپکی ہوئی کھڑی تھی اور اندھیرے میں میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے بدن پر شب خوابی کا لبادہ موجود تھا

مسہری کے مقابل ایک اونچے فریم پر کوئی بڑی سی سیاہ مشین موجود تھی جو اس سے پہلے میں نے وہاں نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی تاریکی میں اس کا ہیولا مجھے نظر آ سکا تھا۔

"وہ چیخ کیسی تھی؟" میں نے شاہدہ کو گھورتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری نیند میں خلل ڈالا۔" شاہدہ کے لہجے میں شرمندگی رچی ہوئی تھی۔

"مگر کیوں؟" میں نے چڑچڑے انداز میں دریافت کیا۔

"میری حماقت۔" وہ فریم پر نصب سیاہ مشین کو ایک گوشے میں دھکیلتے ہوئے بولی۔ مشین جس انداز میں سرک رہی تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے فریم میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے اس قوی ہیکل ڈھانچے کو بآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا۔

"صرف حماقت کا اعتراف ہی کافی نہیں ہو گا۔" میں شاہدہ کے مختصر جواب پر اور زیادہ چراغ پا ہو گیا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ چیخ کیسی تھی اور یہ سیاہ مشین میرے سامنے کیسے آ پہنچی۔"

"غصہ مت کرو، ابھی بتاتی ہوں۔" وہ پلٹ کر دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی پھر اس نے لفٹ کے بائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھول کر ٹرالی اندر داخل کی اور دروازہ دوبارہ بند کر کے بستر پر آ گئی۔ بستر پر دراز ہونے کے بعد شاہدہ نے سرہانے لگا ہوا سوئچ دبا کر کمرہ دوبارہ تاریک کر دیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"ان ڈھکوسلوں سے مجھے نہ بہلاؤ۔" میں نے اس کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔ "میں معقول جواب سنے بغیر مطمئن نہ ہو سکوں گا۔"

"تم تو بستر پر دراز ہوتے ہی گہری نیند سو گئے تھے مگر میں ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکی۔ میرے ذہن پر مسلسل ایک وہم سوار تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بغیر رکے بولتی جاؤ۔" اسے خاموش پا کر میں نے ٹوکا۔ "اگر سچ بول رہی ہو تو تمہیں سوچنے کے لیے وقفوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بہت بے صبر ہو۔" وہ ملامت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں شروع سے ہی تمہارے ساتھ مخلصانہ رویہ اختیار کرتی آئی ہوں مگر اس کے جواب میں تم نے کسی بھی وقت حوصلہ افزا جواب نہیں دیا۔ تمہیں یہاں لانے کے بعد اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ کہیں تم کسی اور لڑکی کی اداؤں کے اسیر نہ ہو۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میں نے اپنے شبہ کی تصدیق کے لیے کیا تھا جس کے لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔"

"شبہ کی تصدیق!" میں نے تیزی سے دہرایا۔ "آخر تم کس طرح اپنے شبہ کی تصدیق کرنے کی کوشش کر رہی تھیں؟"

"ایک جدید سائنسی طریقہ ہے۔" وہ بولی۔ "تم نے جو سیاہ مشین دیکھی وہ بیش قیمت انڈکشن یونٹ ہے جس سے مخصوص قسم کی ایسی مقناطیسی لہریں خارج ہوتی ہیں جو پانچ فٹ کے دائرے میں ہر ذی روح کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتی ہیں۔ کمزور قوت ارادی کے مالک افراد اس کا سہل شکار ہوتے ہیں، ذہنی فالج کے دوران ان سے جو کچھ دریافت کیا جائے اس کا جواب بالکل درست ملتا ہے۔"

"پھر تمہیں کچھ معلوم ہوا؟"

"انڈکشن یونٹ میں کوئی خرابی تھی کیونکہ اسے آن کرتے ہی ایک ہلکے سے دھماکے سے مشین کا کوئی حصہ جل گیا۔"

"شاید میرے ذہن سے خارج ہونے والی مقناطیسی لہروں نے مشین کو ہی مفلوج کر دیا۔" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

"اس غیر متوقع دھماکے پر میں اپنی اضطراری چیخ نہ روک سکی۔ ورنہ تمہارے سامنے یہ سب دہرانے کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"یہ مشین پہلے بھی آزمائی گئی تھی کسی پر؟" پوری وضاحت سامنے آجانے کے بعد میرا لہجہ جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔

"چند روز پہلے ہی آئی تھی۔" شاہدہ بولی۔

"مجھے حیرت ہے کہ تم اس شعبدے پر یقین کر بیٹھیں۔" میں نے کہا۔ "اگر واقعی ایسی کوئی مشین ایجاد ہو جاتی تو دنیا میں تہلکہ مچ جاتا اور جھوٹ کا سراغ لگانے کے لیے پیچیدہ قسم کے پولی گراف یونٹوں کو خیرباد کہہ دیا جاتا۔"

"اب اس کو بھول جاؤ، مشین تو برباد ہو ہی چکی ہے۔" شاہدہ کا لہجہ خفت آمیز تھا۔

"مشین ضرور برباد ہو گئی مگر مجھے ایک آسان نسخہ سکھا گئی۔" میں نے اندھیرے میں اپنے لیے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" شاہدہ پوچھ بیٹھی۔

"ایک ٹیپ میں چند چوہوں اور جھینگروں کی آوازیں ریکارڈ کر کے خلائی مخلوق کی پُراسرار گفتگو کے نام سے تمہارے ہاتھ فروخت کر سکوں گا۔"

"تم احمق ہو۔" شاہدہ میرے بازو میں چٹکی لے کر بولی۔ "برین انڈکشن پر دنیا کے کئی ممالک میں کام ہو رہا ہے اور جانوروں پر اس کے تجربات کامیاب بھی ہوتے ہیں۔"

"تو شاید تم مجھے جانوروں میں شمار کرتی ہو۔"

"بعض اوقات تمہارے سامنے سچ بولنا تکلیف دہ بن جاتا ہے۔"

"مجھے احمق نہ سمجھو مادام پواری!" میں یک بیک سنجیدہ ہو گیا۔ "میں کسی مشین کی مدد کے بغیر بھی جھوٹ اور سچ میں تمیز کر سکتا ہوں۔"

"تو تمہیں واقعی میری کہانی پر یقین نہیں آیا؟"

"تمہارا عاشق ہوتا تو اس سے زیادہ بے سروپا داستان پر بھی یقین کر لیتا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم سے جیتنا واقعی مشکل ہے۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "دراصل وہ فزیوتھراپی مشین تھی جس کے ذریعے میں تمہاری زخمی پنڈلی کو کچھ حرارت پہنچانا چاہتی تھی تاکہ تم آرام سے سوتے رہو مگر بجلی کے ایک ننگے تار سے میرا ہاتھ چھو جانے کے باعث کام خراب ہو گیا۔"

"پھر برین انڈکشن یونٹ کا قصہ کیوں تراش لیا تھا؟"

"محض تمہیں مرعوب کرنے کے لیے تاکہ تم آئندہ جھوٹ بولنے کا ارادہ نہ کر سکو۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم پولی گراف مشینوں کے بارے میں بھی جانتے ہو تو شاید اتنا اوچھا وار نہ کرتی۔"

"شین مارکیڈو کے ہاتھوں تمہاری درگت دیکھنے کے بعد کوئی بھی شریف آدمی تم سے مرعوب نہ ہو سکے گا۔"

"شاید تم اس کی طرف سے رقابت محسوس کرنے لگے ہو؟" وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ "تم یقین کرو کہ اگر وہ اس بار زندہ بچ بھی گیا تو میری طرف نظر اٹھانے کی بھی ہمت نہ کر سکے گا۔"

"شاہدہ کے روپ میں تم لوٹ کا مال ہوتی ہو، جس کا ہاتھ لگو وہی اڑا لے جاتا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میری تحقیر کر کے اگر تم کو خوشی ہوتی ہے تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ اداس لہجے میں بولی۔

"رات کے دو بجے یہ گفتگو کچھ نامناسب سی محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے اپنی رسٹ واچ کے روشن ڈائل پر وقت دیکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"رازونیاز کے لیے یہی لمحات سب سے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں یہ کہتے ہوئے میرے قریب سرک آئی۔

"دور رہ کر بات کرو۔" میں نے اسے دور دھکیلتے ہوئے کہا۔ "اور اگر بات کرنی ہی چاہتی ہو تو مجھے یہ بتاؤ کہ شین مارکیڈو کا کیا ہوا؟"

"آخر تم بار بار اس کا ذکر کیوں لے بیٹھتے ہو؟" وہ چڑچڑے لہجے میں بولی۔

"میرا رقیب ہے نا! اور پھر اب تو تمہاری سلامتی بھی اسی کے تحفظ سے وابستہ ہو گئی ہے۔" میں نے لاپروایانہ انداز میں کہا۔

"وہ پولیس کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا۔"

"اب کہاں ہے؟"

"اس نے کچھ عرصے کے لیے روپوشی اختیار کر لی ہے۔"

"ان دونوں لاشوں کا کیا بنا؟"

"بروغیل بورچ کے ساتھی کی لاش وہ اسرائیلی سفارت خانے کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ڈال چکا تھا کہ پولیس کی گشتی جماعت کے اچانک نمودار ہونے کی وجہ سے اسے بھاگنا پڑا۔ ایلیزا کی لاش اس نے بعد میں ٹھکانے لگا دی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بروغیل بورچ کی لاش اور گاڑی ابھی تک سولن بیک والے مکان میں موجود ہو گی۔" میں نے سوال کیا۔

"تم ان معاملات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

"تمہیں باتوں میں لگا کر سلانا چاہتا ہوں۔"

میرا جواب سنتے ہی اس نے تنگ آ کر دوسری طرف کروٹ لے لی اور میں تاریکی میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے سگریٹ کے

گہرے کش لگانے لگا۔

"شاید میں تم پر اپنا وقت برباد کر رہی ہوں۔" طویل سکوت کے بعد اندھیرے میں شاہدہ کی بوجھل آواز ابھری۔

"یہ تو تم ہی سمجھ سکتی ہو۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا مگر فوراً ہی میری رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر سی سرایت کر گئی۔

اس وقت میں زخمی ہونے کے باعث پوری طرح اس کے رحم و کرم پر تھا اور وہ میرا دل جیت لینے کی امید پر مجھ پر مہربان تھی۔ اگر اسے یہ یقین ہو جاتا کہ میں اس کے بارے میں سوچنے کے لیے ہی تیار نہیں تھا تو وہ مایوس ہو کر میرے بارے میں کوئی خطرناک فیصلہ کر سکتی تھی لہٰذا میری اپنی سلامتی اسی میں تھی کہ پوری طرح صحت یاب ہونے تک اسے اپنے بارے میں بے یقینی میں مبتلا رکھتا اور اپنی نجات کے لیے موقع کا متلاشی رہتا۔

"تو میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں؟" اس نے دوبارہ میری طرف پہلو بدل کر سرد لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میں نے کب کہا۔"

"بعض باتیں کہے بغیر بھی واضح ہو جاتی ہیں۔"

"تم اپنے نتائج اخذ کرنے کا اختیار رکھتی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک میں تم سے محبت کرنے کی کوئی وجہ تلاش نہیں کر سکا۔" میں نے ایک دم ہتھیار ڈالنے کے بجائے مصلحت آمیز جواب دیا۔

"محبت کے لیے کسی وجہ کا ہونا بھی ضروری ہے؟" اس کے لہجے میں تھوڑی سی دلچسپی دوبارہ عود کر آئی۔

"وجہ کے بغیر تو محبت ہو ہی نہیں سکتی۔"

"میرا تو خیال ہے کہ محبت اس منطق سے بالاتر جذبے کا نام ہے۔"

"اردو شاعری میں محبت کو اسی طرح اچھالا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی حسن پر فدا ہوتا ہے، کسی کو رخسار کا ایک تل بھا جاتا ہے، کوئی اداؤں کا شکار ہوتا ہے اور کوئی کردار سے متاثر ہو کر محبت کرنے لگتا ہے۔"

"اور مجھ میں ان میں سے کوئی خوبی نہیں ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ میرے سامنے نہ آئی ہو اور پھر یہ امکان بھی تو ہے کہ میں لاشعوری طور پر کسی خاص چیز کا متلاشی ہوں اور اچانک ہی تمہاری ذات میں وہ خاص پہلو ابھر آتے۔"

"تم مبہم باتیں کرتے ہو۔" وہ قدرے شگفتہ لہجے میں بولی۔ "نہ اقرار پر آمادہ ہو اور نہ انکار پر تیار ہو۔"

"مختصر بات یہ ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"خیر کسی وقت تو سچ بولو گے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ سارا مسئلہ زبان کا ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"تم مجھ سے اردو والی محبت چاہتی ہو اور میں انگریزی میں مثبت جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ذرا سے نرم خو ہو ورنہ اپنے خول کے اندر تم بھی شین مارکیڈو سے مختلف نہیں ہو۔" وہ میری گردن میں چٹکی لے کر بولی۔

"اس سے تو بدرجہا بہتر ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ مادام پواری سے کانپتا ہے اور شاہدہ پر رعب گانٹھتا ہے جبکہ میں دونوں سے یکساں سلوک کا قائل ہوں۔"

"تم اس عمارت کے انتظامات سے متاثر نہیں ہوئے؟" مادام پواری کا ذکر آتے ہی شاید اس کی خودپسندی کی رگ بھڑک اٹھی۔

"خاصا محفوظ نظام ہے۔"

"اس عمارت میں الیکٹرونکس کا بڑی فراخدلی سے استعمال کیا گیا ہے۔" اس نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔

"ضرور کیا گیا ہو گا، برین انڈکشن یونٹ تو میں نے دیکھ ہی لیا۔"

"میرا مضحکہ مت اڑاؤ، وہ سراسر مذاق تھا۔"

"تو کیا اب سنجیدہ ہو؟" اندھیرے میں گفتگو خود بخود بڑھتی جا رہی تھی۔

"اس عمارت میں یہ کمرہ ایسی جگہ واقع ہے کہ تینوں راہداریاں اس طرف آتی ہیں اور تینوں راہداریوں میں مناسب مقامات پر خفیہ فوٹو سیل اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اگر ایک چوہا بھی ان کے سامنے سے گزرے گا تو میرے اس کمرے میں مخصوص الارم بج اٹھے گا اور نکاسی کے راستے خود بخود مقفل ہو جائیں گے۔"

"نکاسی کے راستے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، اس کمرے سے نکلنے کے لیے دو دروازے ہیں۔ ان کے مقفل ہو جانے کی صورت میں کوئی زبردستی اندر نہیں گھس سکتا، انہیں میں خود ہی بٹن دبا کر کھول سکتی ہوں۔"

"شاید یہ کوئی ہوٹل ہے؟"

"نام کا ہوٹل ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بروسیلز میں یہ میرا کنٹرول سنٹر ہے۔ میرے تصرف میں آنے سے قبل یہ عمارت ہوٹل کے مصرف میں تھی اور اب بھی اسی نام سے پہچانی جاتی ہے۔"

"کچھ دیر کے لیے سو لینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"سو جاؤ، میں نے روکا کب ہے۔"

"ہاتھا پائی مت کرو، میری پنڈلی زخمی ہے۔" میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"میں دیکھوں گی کہ یہ بہانے کب تک تمہارے کام آتے ہیں۔"

میں ایک سرد سانس لے کر رہ گیا۔

اس رات شاہدہ کے پہلو میں مجھے نیند تو بہت دیر سے آئی مگر میں نے چند منٹ بعد ہی ایسی اداکاری شروع کر دی جیسے مجھے فوراً ہی نیند نے آلیا ہو، مقصد صرف اتنا تھا کہ شاہدہ کو مزید گفتگو سے روک کر ذہنی سکون حاصل کر سکوں۔

اگلی صبح میں خاصی دیر سے بیدار ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میں شاہدہ کے کمرے کے بجائے کہیں اور موجود تھا۔

اس نئے کمرے میں ایک صاف ستھرے بستر، ڈریسنگ ٹیبل اور صوفہ سیٹ کے علاوہ کچھ موجود نہیں تھا۔ میں اس بدلی ہوئی صورتِ حال پر حیران ہو ہی رہا تھا کہ کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس کر کے چونک پڑا۔

سر گھمایا تو کھلے ہوئے دروازے پر ایک مسکراتا ہوا خوبرو نسوانی چہرہ موجود تھا۔

"صبح بخیر!" مجھ سے نگاہیں چار ہوتے ہی اس نے ترنم ریز دلکش آواز میں کہا۔

میں نے مسکرا کر سر کو خفیف سی جنبش دی اور سوال کیا۔ "میں اس وقت کہاں ہوں اور تم کون ہو؟"

"تم دوستوں میں ہو اور میرا نام کلاڈیا ہے۔" وہ میرے بستر کے قریب آکر مجھے اٹھنے میں مدد دیتے ہوئے بولی۔

"تم کن دوستوں کا ذکر کر رہی ہو؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے اس سے آگے بتانے کی اجازت نہیں ہے۔" وہ مسلسل مسکراتے جا رہی تھی۔

"یہ عمارت کون سی ہے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکوں گی۔"

"تو پھر میرے سر پر کیوں مسلط ہو؟" میں یک بیک بپھر گیا۔

"تمہاری خدمت گار ہوں۔" اس کی خوش دلی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"دفع ہو جاؤ، مجھے کسی خدمت گار کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے غصے میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر کے لیے جا سکتی ہوں مگر دوبارہ تم مجھے یہیں موجود پاؤ گے۔ تمہاری ٹانگ زخمی ہے اور تمہیں منہ ہاتھ دھونے کے لیے میرے سہارے کی ضرورت ہو گی۔" وہ انتہائی ڈھیٹ لڑکی تھی کہ میری برہمی کا کوئی اثر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

میں کچھ دیر تک اسے غصیلی نظروں سے گھورتا رہا پھر [illegible] کے ساتھ سوال کیا۔ "کم از کم یہ تو بتا سکو گی کہ مجھے یہاں کون لایا ہے؟"

"تم یہیں موجود تھے، مجھے تو بس اتنی ہدایت ملی کہ [illegible] اس کمرے میں موجود شخص کی تندہی سے دیکھ بھال کرنی ہے۔"

میں گہرا سانس لے کر اس کے سہارے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

میری زخمی پنڈلی میں درد کی ٹیسیں بدستور موجود تھیں مگر [illegible] اس قابل تھا کہ لڑکی کا سہارا لے کر لنگڑاتا ہوا باتھ روم تک پہنچ [illegible] وہ میرے ساتھ اندر تک جانے پر آمادہ تھی مگر میں نے بوکھلا کر اسے روک دیا۔ "تم باہر ہی ٹھہرو، میں دیوار کے سہارے بھی چل سکتا ہوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے شاید انکار سننا سیکھا ہی نہیں تھا۔

میں تازہ دم ہو کر نکلا تو ناشتہ میرا منتظر تھا۔

"تم بہت نرم دل اور مہربان لڑکی ہو۔" میں نے ناشتے کے لیے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کلاڈیا سے کہا۔ "میری کسی بات کا برا نہ ماننا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم دماغ کے بہت گرم ہو۔" اس کے [illegible] پتلے گلابی ہونٹوں پر وہی سدا بہار مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

"یہ کس نے بتایا تھا؟"

"ہدایات دینے والے نے۔"

"اور اس کے بارے میں تمہیں بتانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم خود ہی میری مجبوری کا احساس کرنے لگے ہو۔"

ناشتے کے اختتام پر وہ برتن سمیٹ کر چلنے لگی تو میں نے اس سے سگریٹ کی فرمائش کی اور وہ چلی گئی۔

چند ثانیوں بعد کلاڈیا کے بجائے اچانک شاہدہ وہاں پہنچی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟" میں اسے دیکھتے ہی بھڑک گیا۔

"شش!" وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کراتے ہوئے تیزی سے میرے قریب آگئی۔ "یہ میں نے تمہاری بہتری کے لیے کیا ہے، یہاں تمہیں بہتر طبی امداد مل سکے گی۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"اسی عمارت کا ایک کمرہ ہے، تم مادام بواری کے [illegible] قیدی کی حیثیت میں یہاں مقیم ہو۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"اور تم کہاں ہو؟"

"آتی جاتی رہوں گی۔" وہ بولی۔ "اس وقت میں شاہدہ ہوں اور میں بلا امتیاز ہر ایک سے مل جل سکتی ہوں۔"

"یہ چکر کب تک چلے گا؟"

"صحت مند ہو جاؤ تو کچھ اور سوچا جائے گا۔" وہ میرا ہاتھ دبا کر بولی۔

اسی اثنا میں کلاڈیا سگریٹ لے کر آگئی۔ اسے دیکھ کر شاہدہ مجھ سے دور سرک گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" کلاڈیا نے شاہدہ کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ اس کے ہونٹوں پر سے پہلی بار مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔

"مم... میں اس سے ملنے آئی تھی۔" اس وقت شاہدہ کی اداکاری قابلِ دید تھی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ اس شخص سے کوئی نہیں ملے گا۔" کلاڈیا ڈپٹ کر بولی اور شاہدہ سہمے ہوئے انداز میں وہاں سے چلی گئی۔

"یہ کون تھی؟" اس کے چلے جانے کے بعد میں نے کلاڈیا سے سوال کیا۔

"تم نہیں جانتے اسے؟" کلاڈیا نے الٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی نرم اور محبت آمیز مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"اتنا جانتا ہوں کہ شاہدہ نام ہے اور خاصی آوارہ مزاج لڑکی ہے۔ مگر یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی ہم میں سے ہے۔"

"مزاج کے اعتبار سے؟" میں نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔

"میں کام کی بات کر رہی تھی۔" وہ جلدی سے بولی۔ "ویسے تمہارے بارے میں مجھے خصوصی احکام ملے ہوتے ہیں۔"

"ان کی نوعیت کیا ہے؟"

"میں تمہاری ہر خواہش کا احترام کروں گی۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"اگر میں اس عمارت سے جانا چاہوں؟"

"یہ ناممکنات میں سے ہے۔" وہ اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "اب اس قدر تجاہلِ عارفانہ سے کام نہ لو۔"

"اعلیٰ قسم کی شراب لا سکو گی؟"

وہ فوراً ہی چلی گئی اور چند منٹ بعد ایک چھوٹی بوتل لے کر واپس آگئی۔ میں نے اسے قریب بٹھا کر شراب سے شغل شروع کر دیا۔

کلاڈیا خوبرو، جواں سال اور شائستہ لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرتا رہا۔ شاہدہ کے مقابلے میں وہ مجھے اس لحاظ سے بھی پسند آئی تھی کہ ہر وقت بحث میں الجھنے کے بجائے نہایت سعادت مندی کے ساتھ میرے مزاج اور ضروریات کا خیال رکھتی تھی اور میرے بارے میں کسی تجسس کا شکار نہیں تھی۔

چوتھے روز اس عمارت کے کسی دور افتادہ گوشے سے یکے بعد دیگرے تین فائروں کا شور سنائی دیا تو میرے ساتھ ہی کلاڈیا بھی پریشان ہو گئی۔

"یہ کیسی آوازیں تھیں؟" فائرنگ کے بعد سکوت چھا جانے پر میں نے تشویش زدہ لہجے میں کلاڈیا سے سوال کیا۔

"میں خود پریشان ہوں۔" وہ تفکر آمیز لہجے میں بولی۔ "باہر شاید نہایت غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے ہوں گے۔"

"تو کیا ایسے واقعات یہاں کے معمولات میں شامل نہیں ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے باوثوق لہجے میں جواب دیا۔ "اس عمارت کے مکین آتش گیر اسلحہ کے شور سے ناآشنا ہیں۔"

"بڑی عجیب بات ہے حالانکہ تم لوگوں کا تعلق کسی نہ کسی جرائم پیشہ تنظیم سے ہی معلوم ہوتا ہے۔" مجھے بات بڑھانے کا موقع مل گیا۔

"میں معلوم کر کے آتی ہوں۔" وہ میری بات سنی ان سنی کر کے اٹھی اور تیر کی طرح باہر نکلتی چلی گئی۔

اس کی واپسی خلافِ توقع جلد ہی ہو گئی۔ اس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ بحال ہو چکی تھی مگر چہرے سے کچھ عجیب سی کیفیت ہویدا تھی۔

"کہیں سے ایک بندر گھس آیا تھا۔" اس نے اندر آکر کہا اور اس کے الفاظ سنتے ہی میرا دل اچھل کر یک بیک حلق میں آگیا۔

"بندر؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "بروسیلز میں بندر کہاں سے آگئے؟"

"ان اطراف میں تو دور دور بندر کا سایہ تک نہیں پایا جاتا مگر وہ کہیں سے آنکلا، بہت پھرتیلا اور چالاک تھا۔ عمارت کے مسلح محافظوں نے اسی پر گولیاں چلائی تھیں۔" کلاڈیا نے کہا۔

"تو وہ مر گیا؟" میں نے غیر ارادی طور پر سوال کیا۔

"تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے وہ تمہارا کوئی عزیز تھا۔" کلاڈیا ہنستے ہوئے بولی۔ "اگر تیسری گولی سے بھی نہ مرتا تو پھر چوتھے اور پانچویں فائر کی آوازیں بھی ضرور سنائی دیتیں۔"

کلاڈیا میرے سامنے موجود تھی مگر میری نگاہوں سے اس کا چہرہ اوجھل ہو گیا۔ میرے تصور میں میری اپنی سیتا ہنستی مسکراتی میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی جس نے ہمالیہ کی برف پوش اور سنگلاخ وادیوں میں پرورش پائی تھی۔ ان علاقوں میں پلتے

جانے والے بندروں اور لنگوروں کے غول اس کی اطاعت کرتے تھے اور اس کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب بندروں کے ایک بہت بڑے غول نے مجھے گھیر کر ایک مخصوص راستے پر دوڑنے پر مجبور کیا تھا اور پھر ایک مرتبہ سیتا نے مجھے قید کر کے بندروں کی نگرانی میں چھوڑا تھا اور میں ہر طرف کھلے راستے موجود ہونے کے باوجود وہاں سے بھاگنے کی جرأت نہ کر سکا تھا کیونکہ ان راستوں کی طرف قدم اٹھاتے ہی نگرانی پر مامور بندر غراتے ہوئے میری طرف لپکتے تھے اور کنکر مار مار کر مجھے پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے تھے۔

بندروں پر حکمرانی کرنے والی وہ الہڑ اور شوخ دوشیزہ میری بیوی بن جانے کے بعد مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ میں مدت سے اس کے فراق میں اپنا نوشتۂ تقدیر پورا کرنے کے لیے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدائشی مفرور کی طرح بھاگتا چلا جا رہا تھا اور پھر مجھے خبر ملی کہ میری سیتا پاکستان میں زیرِ تعلیم چند فلسطینی طلبا کے ذریعے تلاش کر لی گئی۔ فلسطینی میرے ہمدرد تھے اور سیتا کو مجھ سے ملوانا چاہتے تھے لہٰذا اسے لاہور سے لیبیا پہنچا دیا گیا جہاں میرے انتظار کے ساتھ ہی وہ بندروں کو گوریلا تربیت دینے لگی۔

ادھر میری سیتا فلسطینیوں کے فوجی مقاصد کے لیے بندروں کو تربیت دیتی رہی اور ادھر میں حالات کے بے پناہ دباؤ سے مجبور ہو کر مادام پواری کے قفس میں آ پہنچا۔ مجھے پورا الیقین تھا کہ ہوٹل موریس میں گھسنے والے بندر کا سیتا سے ضرور کوئی تعلق تھا ورنہ اس شہر میں بندر جیسے جانور کا وجود ہی ناقابلِ یقین تھا۔

میرے ذہن میں تصویر چلتی رہی۔ سیتا فلسطینیوں کی حفاظت اور تحویل میں تھی اور وہ لوگ میری نقل و حرکت سے پوری طرح واقف تھے۔ اور پھر برسیلز میں افواجِ آزادیٔ فلسطین کے مقامی نمائندے خالد عبدالفتاح کے ٹھکانے سے شاہدہ نے جس طرح بزورِ طاقت مجھے اپنا قیدی بنایا تھا اس کی کہانی بھی خالد عبدالفتاح کے ذریعے اعلیٰ فلسطینی حلقوں میں ضرور پہنچی ہوگی۔

برسیلز میں میں بدترین مشکلات سے دوچار تھا اور وہاں فلسطینیوں کی تنظیم بے حد کمزور تھی۔ خالد سے میرا رابطہ مکمل طور پر منقطع تھا لہٰذا غالب امکانات یہی تھے کہ شاید سیتا نے کسی بندر کو میری بو پر سدھا کر برسیلز بھیجا اور وہ بے زبان پورے شہر کی خاک چھاننے کے بعد جیسے ہی ہوٹل موریس میں گھسا اسے بے رحمی سے ہلاک کر دیا گیا۔

اگر اس بندر کا سیتا سے ذرا بھی تعلق تھا تو مجھے پورا یقین تھا کہ خالد عبدالفتاح یا اس کے کسی آدمی نے بندر کا تعاقب کیا ہوگا اور اس طرح وہ عمارت فلسطینیوں کے .... علم میں آ گئی ہوگی۔

میرے ان قیاسات کی تصدیق یا تردید کرنے والا وقت کر سکتا تھا۔ اگر میرا قیاس درست تھا تو ہوٹل موریس جلد ہی کر بھیانک اور خونریز تصادم کا مرکز بننے والا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" کلاڈیا کی آواز نے مجھے تصورات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

"اپنی بے بسی پر غور کر رہا تھا۔"

"تم بے بس تو نہیں ہو۔" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"جب تک پنڈلی پر پلاسٹر باقی ہے یہ احساس نہیں جا سکتا۔"

"یہ پلاسٹر کبھی پریشانی کا باعث تو نہیں بنا، تم آسانی سے چل پھر سکتے ہو۔"

"مگر میں زندگی بھر تو یہ فالتو بوجھ اٹھاتے نہیں پھر سکتا۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"میں آج معلوم کروں گی۔" اس نے ہنس کر کہا۔

اور شام کو اس نے اطلاع دی کہ اگلے روز مجھے ہسپتال لے جایا جائے گا۔

بندر والے واقعے کے بعد میرے پورے وجود پر سنسنی اور ہیجان کی ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی۔ اس رات میں پل بھر کے لیے بھی چین سے نہ سو سکا۔

اگلی صبح دس بجے کے قریب کلاڈیا مجھے ساتھ لے کر باہر نکلی تو میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی جا چکی تھی۔ طویل اور پرپیچ راہداریوں سے گزرنے کے بعد کلاڈیا کی رہنمائی میں میں نے چند سیڑھیاں اترنی شروع کیں تو سرد ہوا نے میرا استقبال کیا۔ چہرے اور جسم سے ٹکرانے والی یخ بستہ ہوا بتا رہی تھی کہ ہم عمارت سے کھلی فضا میں آ چکے تھے۔

پانچ سیڑھیوں کے بعد میں ایک کار کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں میں نے پہلی بار شاہدہ کی آواز سنی جو کلاڈیا سے کچھ دریافت کر رہی تھی۔

مجھے لے کر کار روانہ ہوئی اور چند سیکنڈ بعد ہی شاہدہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "اب چاہو تو پٹی کھول دو۔"

میں نے پٹی نوچ کر پائیدان میں ڈال دی۔ "اب تو تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔" میں نے اسے دیکھتے ہی تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا کلاڈیا زیادہ پسند آئی تھی؟"

"وہ مزاج شناس ضرور ہے۔"

"ہوگی۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "یہ بتاؤ کہ پنڈلی اب کیسی ہے؟"

"پلاسٹر اتروانا چاہتا ہوں۔"

"ہسپتال ہی چل رہے ہیں، یہ بتاؤ کہ اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟"

"آزاد کر دو گی تو مڑ کر دیکھے بغیر الاسکا تک دوڑتا چلا جاؤں گا۔"

"تم سے نئے ٹھکانے پر باتیں ہوں گی۔"

"کیا اب بھی کوئی ٹھکانا نیا ہے؟"

"میں نے پرسوں ہی ایک حسین کاٹیج خریدا ہے۔ تمہارے ساتھ چند روز وہیں گزاروں گی۔" اس نے کہا۔

یہ سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر بندر والے معاملے میں میرا اندازہ درست تھا تو مجھے ہوٹل موریس میں ہی رہنا چاہیے تھا کیونکہ وہ عمارت بندر کا تعاقب کرنے والے کی نگاہوں میں آ چکی ہوگی۔ دوسری جگہ منتقل ہونے کا مطلب تھا کہ میرے ہمدرد میرے بارے میں ایک بار پھر اندھیرے میں بھٹکتے رہ جاتے۔

"ہوٹل موریس کے خاص کمرے سے باہر آنے کے بعد تمہاری شخصیت سکڑ کر رہ جاتی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کس کمرے کی بات کر رہے ہو؟"

"مادام پواری والا کمرہ۔" میں نے کہا۔ "وہاں تم نے مجھے تھوڑا بہت متاثر کیا تھا۔ باہر آنے کے بعد تم میں حسین جسم کے سوا کوئی اور کشش نہیں رہ جاتی۔"

"تم چاہو گے تو وہیں چلیں گے مگر میں اب اس عمارت سے دور رہنا چاہتی ہوں۔" وہ سنجیدہ اور تفکر آمیز لہجے میں بولی۔

"وہ کیوں؟"

"شین مارکیڈو کا معاملہ مشکوک ہو گیا ہے۔ اس نے آخری بار یہ اطلاع دی تھی کہ وہ پولیس سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور کچھ عرصے کے لیے روپوشی اختیار کر رہا ہے، اس کے بعد اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا، نہ ہی ٹرانسمیٹر پر جواب ملتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ بلجیم سے ہی بھاگ گیا ہو۔"

"ایسا ہوتا تو وہ پیغام ضرور چھوڑتا۔" شاہدہ تشویش آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ پولیس کے قبضے میں نہ ہو۔"

"شبہ کی وجہ؟"

"اس کی اتنی طویل روپوشی اور مسلسل خاموشی ہمارے طریقۂ کار کے خلاف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس نے ہمیں غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس سے زبردستی روپوشی والا پیغام دلوایا ہو اور مزید معلومات کے لیے شین مارکیڈو پر تشدد کیا جا رہا ہو۔"

"اگر وہ زبردستی پیغام دے سکتا ہے تو اب تک زبان بھی کھول چکا ہوگا۔"

"وہ تنظیم کے لیے جان دے دینے والوں میں سے ہے، ویسے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" وہ بولی۔ "البتہ میں نے احتیاط کے طور پر ٹرانسمیٹرز کا استعمال ترک کر دیا ہے اور خود ہوٹل موریس سے دور رہ کر چند روز تک جائزہ لینا چاہتی ہوں۔"

"پولیس کے محکمے میں تمہاری رسائی نہیں ہے؟"

"یہاں سب سے بڑی خرابی یہی ہے۔ پولیس کے علاوہ ہر محکمے کو پیسے کے بل پر خریدا جا سکتا ہے۔" اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"پھر اپنے آدمیوں کو کیوں مرواتی ہو؟ چند روز کیلئے ہوٹل موریس کو ویران ہی چھوڑ دو۔" میں نے رائے پیش کی۔

"شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔" وہ بولی۔ "ہوٹل موریس میرا مضبوط ترین قلعہ ہے اگر ایک مرتبہ میرے آدمی بے اعتمادی اور عدم تحفظ کا شکار ہو گئے تو میں کچھ بھی نہ کر سکوں گی۔"

"مگر تم تو اس زندگی سے تائب ہونے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

"تم ابھی مجھ کو اپنے دامن میں سمیٹ لو تو میں ابھی سارا قصہ نمٹا دیتی ہوں۔ تمہارے فیصلے کے بغیر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔" وہ اپنے پسندیدہ موضوع پر آ گئی۔

"کل ہوٹل موریس میں فائرنگ کیسی ہوئی تھی؟" میں نے فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

"کہیں سے ایک بندر گھس آیا تھا۔ حالانکہ یہاں میلوں دور تک بندر سونگھنے کو بھی نہیں ملتے۔" اس کا لہجہ سرسری نہیں تھا۔

"تو کیا بندر نے فائرنگ کی تھی؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "تم ہر بات انوکھی کرتے ہو۔ بندر پر محافظوں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ میں اس بارے میں بھی پریشان ہوں۔ ایک دو محافظوں کا خیال ہے کہ وہ کوئی تربیت یافتہ بندر تھا کیونکہ وہ کافی لوگوں کے درمیان سے بےخوف و خطر گزرا تھا جبکہ جنگلی بندر انسان کے سائے سے بھی بھڑک کر دور بھاگتے ہیں۔"

"تمہاری تلاش میں ہوگا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ کس بنا پر کہہ سکتے ہو؟"

"تمہاری فراخدلی کے قصے سن لیے ہوں گے۔"

"تم ہر وقت اوٹ پٹانگ گفتگو پر تلے رہتے ہو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"اس بندر کے بارے میں کیا کر رہی ہو؟"

"کیا کیا جا سکتا ہے۔" وہ شانے اچکا کر بولی۔ "اگر محافظ عجلت میں اسے ہلاک نہ کر دیتے تو واپسی میں اس کا تعاقب کیا جا سکتا تھا۔"

"تم نے تو بتایا تھا کہ ہوٹل موریس میں بہت سخت حفاظتی انتظامات ہیں پھر وہ بندر گھسنے میں کیسے کامیاب ہوا؟"

"وہ پانچ منزلہ عمارت ہے اور اس کی زیریں منزلوں پر متعدد

اور بجر بہ کار حفاظتی عملہ متعین ہے۔ وہ لوگ آدمیوں پر توجہ دیتے ہیں اور پھر بندر جیسا جانور تو زقندیں لگا کر ایسے راستے بھی اختیار کر سکتا ہے جو عام حالات میں محفوظ سمجھے جاتے ہیں۔"

"مگر تم نے کہا تھا کہ ہوٹل ہورلیس میں حفاظتی انتظامات کے لیے الیکٹرونکس کا بے دریغ استعمال کیا گیا ہے۔"

"وہ صرف پانچویں منزل کا ذکر تھا جہاں مادام بواری کا کمرہ ہے۔"

"اس بارے میں بھی تم وعدہ خلافی کی مرتکب ہوئی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"تم نے مجھے وہاں چھپے ہوئے شعبدے دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔" میں نے یاد دلایا۔

"وعدہ ضرور کیا تھا مگر اس وقت تم معذور تھے اور تمہیں بہتر دیکھ بھال کے خیال سے میں نے نیچے بھیج دیا تھا۔"

"اور اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو تم نے اُدھر کا رُخ کرنے پر ہی تیار نہیں ہوئیں۔"

"فکر نہ کرو، جیسے ہی حالات سازگار ہوں گے میں تمہیں وہاں لے جاؤں گی۔"

"تمہاری بکتر بند کار کہاں ہے؟"

"خفیہ ٹھکانے پر، اسے میں مادام بواری کی حیثیت میں ہی استعمال کرتی ہوں جبکہ اس وقت میں مادام کی ایک ادنیٰ کارکن ہوں۔"

آپس کی نوک جھونک میں راستہ بہت جلدی کٹ گیا اور ہم ہسپتال جا پہنچے۔

وہاں ایکسرے لیا گیا تو رپورٹ تسلی بخش تھی لہٰذا فوری طور پر وہ پلاستر کاٹ دیا گیا جس نے مجھے معذور بنایا ہوا تھا۔

ہسپتال سے واپسی پر میں خوش تھا۔ شاہدہ نے ہوٹل ہورلیس کا رُخ نہ کرنے کا فیصلہ کر کے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا مگر صحت مندی کی نوید پانے کے بعد میرا اعتماد بحال ہو چکا تھا اور میں اس کے نئے کاٹیج میں رہتے ہوئے بھی مؤثر طور پر اپنی آزادی کی راہ نکال سکتا تھا۔

"سامنے دیکھ رہے ہو؟" شاہدہ نے ایک پُرہجوم شاہراہ پر کار کی رفتار قدرے سست کرتے ہوئے کہا اور چوک کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہے وہاں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"مینی کن پیس فاؤنٹین۔" وہ مسکرا کر خالص مقامی لہجے میں بولی۔

"چوک کے وسط میں جو کانسی کا مجسمہ نصب ہے اسے عالمی شہرت حاصل ہے۔"

"کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"ایک لڑکے کا مجسمہ ہے جو ہر وقت پیشاب کرتا رہتا ہے"

"تمہارے ذوق سے مطابقت رکھتا ہے۔"

"میرا ذوق تو بعد کی پیداوار ہے، یہ فولادہ نما مجسمہ فرانکوئیس کے ماڈل پر بنایا گیا تھا، تاریخی اہمیت کی چیز ہے۔ مقامیوں میں قدیم ترین شہری کے نام سے مشہور ہے۔"

"اس وقت مجھے تاریخ سے زیادہ جغرافیے سے دلچسپی" مجھے اس کی ہر بات کی بے رحمانہ تردید میں لطف آنے لگا تھا۔

"جغرافیہ سے زیادہ واہیات مضمون ایجاد ہی نہیں" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی "پہاڑ، میدان، جنگل اور دریا کو پھیلا کر بنا ڈالا ہے۔"

"اپنے سراپا پر نظر ڈالو تو خود کو بھی شاہدہ کے بجائے ... ہی پاؤ گی۔"

"اب اپنی ذہنیت کے بارے میں کیا خیال ہے" وہ مجھے گھورتے ہوئے جلے کٹے لہجے میں بولی۔

"نہایت اعلیٰ ہے۔"

"پلاستر پنڈلی سے اتارا گیا ہے اور اثر دماغ پر ہوا ہے"

"دماغ پر تو واقعی اثر ہوا ہے۔" میں نے اس کی طرف ... ہوتے کہا۔

"میرے بارے میں کوئی احمقانہ فیصلہ نہ کرنا۔" وہ ... سے بولی۔

"کس احمقانہ فیصلے کی بات کر رہی ہو؟" میں نے ... میں سوال کیا۔ میری نگاہیں اس وقت شاہدہ کا تفصیلی ... لے رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کسی ویران سڑک ... ہوتے ہی۔۔۔ اسے دبوچ کر بآسانی بے قابو کیا جا سکتا تھا جس ... میری آزادی کی راہ کھل سکتی تھی اور میں خالد عبدالفتاح سے ... قائم کر کے سیتا تک پہنچنے کی صورت تلاش کر سکتا تھا۔

"تم صحت مند ہو چکے ہو، کہیں مجھے نہتا یا بے خبر سمجھ کر ... بیٹھنا۔" اس نے کہا اور میں دل ہی دل میں اُسے گالیاں دیتا ...

"فرض کرو کہ میں ایسا کر ہی بیٹھوں!" میں نے اسے ٹٹولنے ... سے سوال کیا۔

"اول تو تم مجھے آسانی سے زیر نہ کر سکو گے اور اگر کامیاب ... گئے تو پیچھے والا تمہیں کسی قیمت پر برقرار نہ ہونے دے گا۔"

"کون پیچھے والا؟" میں نے اضطراری طور پر گردن ... کی طرف گھماتے ہوئے شاہدہ سے سوال کیا۔

وہ مترنم آواز میں ہنس پڑی۔ "اس کار میں کوئی تیسرا ... میں نے جس کا ذکر کیا وہ ایک سیاہ کار میں شروع ہی سے ..."

کر رہا ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے غصیلے لہجے میں احتجاج کیا۔ "ایک طرف تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی ہو اور دوسری طرف ایسی چھچھوری حرکتیں کرتی جا رہی ہو۔"

"صرف احتیاط میرے سرتاج۔" وہ چڑانے والے لہجے میں بولی "محبوب اگر ہرجائی ہو تو ایسی تدابیر لازمی ہو جاتی ہیں مجھے ابھی تک تم پر اعتماد نہیں ہو سکا ہے۔ نہ جانے تم کس وقت کیا کر گزرو اور میں سر پیٹتی رہ جاؤں۔"

"اس طرح تم مجھے اپنی طرف راغب کرنے کے بجائے متنفر کر رہی ہو۔"

"تم مجھے قبول کرنے کا عملی ثبوت فراہم کر دو گے تو یہ تمام سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"زنجیروں سے باندھ کر کسی کو محبت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا شاہدہ" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اب تک میں نے کوئی منفی بات نہ سوچی ہو مگر اب میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ موقع ملتے ہی تمہارے چنگل سے نجات پانے کی کوشش کروں گا۔"

"تو قصہ ختم؟" اس نے اچانک بریک مار کر کار ایک کنارے پر روک لی۔ اس کا لہجہ سرد اور خطرناک تھا۔

"ختم ہی سمجھو!" میں اس کے لہجے پر ہوشیار ہو گیا تھا مگر اپنے جواب سے میں نے کوئی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی۔

"تو کار سے اترو اور جہاں سینگ سمائیں، چلے جاؤ، کوشش کرنا کہ اتنی دور نکل سکو جہاں میرے ہاتھ تمہاری گردن تک نہ پہنچ سکیں۔" اس کی کار کا انجن بدستور چل رہا تھا۔

"قتل کی دھمکی دے رہی ہو؟"

"اگر تمہیں اپنا نہ سکی تو کسی اور کے لئے زندہ بھی نہیں چھوڑوں گی۔" وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ "تمہیں کھو کر وہ شاہدہ مر جائے گی جو شریفانہ زندگی کی معصوم آرزو رکھتی ہے اور اگر تم زندہ رہے تو مادام بواری کے رازوں کو الم نشرح کر کے اسے ساری زندگی کے لئے کسی قید خانے میں سڑنے پر مجبور کر دو گے لہٰذا شاہدہ کے ساتھ تمہیں بھی مرنا ہو گا۔"

شاہدہ نے کھل کر اپنے عزائم کا اظہار کر دیا تھا اور بات بالکل تل گئی تھی۔ میرے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے کہ اس لڑکی کے سامنے شکست تسلیم کر کے اپنی سیتا کی وفاؤں کا خون کر دیتا یا پھر اس کا ہولناک چیلنج قبول کر کے خاموشی سے اس کی کار سے اتر جاتا۔

مجھے یقین تھا کہ اس کی کار سے اترنے کے بعد پیچھے لگا ہوا شخص مجھے زندہ پکڑنے کی کوشش کرے گا اور اگر وہ کمزور پڑا تو بے دریغ مجھے ہلاک کر دے گا جبکہ میں اتنی جلدی ایسی ہولناک صورت حال کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جس میں میری سلامتی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

"کار سے اتارنے کی کیا ضرورت ہے، ابھی گولی کیوں نہیں مار دیتیں!" میں نے کمال ہوشیاری سے درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ ہونٹ بھینچے مجھے مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ اس کی آنکھوں میں خفیف سی نمی بھی ابھر آئی تھی۔

"میں تمہیں گولی نہیں ماروں گی۔" وہ کسی زخم خوردہ شیرنی کی طرح غرائی۔ "اگر تمہارا فیصلہ اسی قدر اٹل ہے تو میں یہ کام اپنے کسی بدترین کارکن سے لوں گی۔"

"کاٹیج پہنچ کر اپنے کارکن کو وہیں بلا لینا، مجھے معلوم ہے کہ آس پاس ہی تمہارا کوئی خونی کارندہ منڈلا رہا ہے جو میرے باہر نکلتے ہی گولی چلا سکتا ہے۔ جب مرنا ہی ہے تو میں فٹ پاتھ کے بجائے تمہارے نئے کاٹیج کو ترجیح دوں گا جہاں میری لاش کی حرمت تو پامال نہ ہو سکے گی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"موت اتنی آسان اور خوشگوار نہیں ہوتی۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔

"میں ہمیشہ موت سے لڑ کر ہی زندگی حاصل کرتا رہا ہوں اگر اس بار لڑے بغیر تمہاری سازش کے ذریعے موت میرا مقدر بن چکی ہے تو میں اسے بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"سازش"، اس نے غصے اور حقارت سے دہرایا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے وجود میں آگ سی بھڑک اٹھی ہو۔ "سازشی کمینے اور خود غرض تم ہو۔"

"سازشی کمینے اور خود غرض کہنے سے بات نہیں بنتی شاہدہ۔" میرا لہجہ غصیلا اور قدرے ملامت آمیز تھا۔ "مادام بواری کے راز میں نے معلوم نہیں کئے بلکہ تم نے زبردستی مجھے ان رازوں میں شریک کیا تاکہ ایسے ہی کسی موقع پر مجھے مارنے کا جواز پیدا کر سکو جنہیں چاہا جاتا ہے۔ ان کے لہو سے غسل نہیں کیا جاتا۔"

"اخلاقیات کے اصول میری ٹھوکر پر رہتے ہیں۔" وہ غرا کر بولی۔ "تم شروع سے مجھے اس فریب میں مبتلا رکھتے آئے ہو کہ شاید کسی وقت تمہارا دل پگھل جائے گا۔ تم نے شین مارکیڈ کے طعنے دے دے کر مجھے اپنی ذات میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا مگر یہ بتاؤ کہ تم کیا ہو؟ تم شین مارکیڈ سے بھی بدتر ہو۔ وہ صرف وقتی تفریح کے لئے میری طرف رخ کرتا تھا مگر تم مجھے ایک خوبصورت وہم میں مبتلا کر کے پامال کرتے آ رہے ہو اور اب مجھے ٹھکرا کر تم میری بدترین تذلیل کر رہے ہو جسے میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔" اس کی آنکھیں بتدریج سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میں نے کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ میرا قصور بس اتنا ہے کہ اب تک تمہاری خواہشات کا احترام کرتا آ رہا ہوں۔"

"میری خواہشات!" اس کی آواز کانپ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے دو قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے اور اس نے جلدی سے منہ

سامنے کرکے گیئر ڈالا اور تیزی کے ساتھ کار آگے بڑھا دی۔

میں نے وہ کٹھن گھڑی ٹل جانے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا مگر اس وقت شاہدہ کے رویّے نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

تازہ ترین واقعہ سے قبل میں نے شاہدہ کے معاملے پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک رنگین مزاج تتلی تھی جو بہت جلد ہر پھول سے اکتا کر نئے ٹھکانے کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ لہٰذا تھوڑے دنوں کی رفاقت کے بعد اس کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور با آسانی اسے چکمہ دے کر کسی طرف نکل سکوں گا مگر اب پتہ چلا کہ وہ معاملہ نہایت سنگین ہو چکا تھا۔

میرے ساتھ چند روز گزارنے کے بعد اس کا جوش سرد ہونے کے بجائے جنون میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنے کا تہیہ کر چکی تھی اور واقعی اپنے دل کی گہرائیوں سے مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ اسی پر بس نہیں تھا بلکہ وہ میری فطرت سے اس حد تک واقف ہو چکی تھی کہ اس نے میرے گرد ایسا مضبوط حصار کھڑا کر دیا تھا کہ میں اسے دھوکہ دے کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔

شاہدہ سے پیشتر جتنی عورتوں سے میرے مراسم رہے، وہ سب ہی تفریح اور سکون کی متلاشی ہوتی تھیں مگر شاہدہ نے کھل کر مجھ سے اپنی بھرپور چاہت کا اظہار کیا تھا۔ اس کی جذباتی گفتگو سننے سے قبل یہ بھی ممکن تھا کہ اگر وہ میرے فرار کی راہ میں حائل ہونے کی کوئی مؤثر کوشش کرتی تو شاید میں اسے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر کے آگے بڑھ جاتا مگر اب میرے لئے یہ ممکن نہیں رہا تھا۔

شاہدہ بُری عورت تھی، اس نے مجھے براہِ راست قتل کی دھمکی بھی دی تھی جو محض چاہت کی خاطر اپنی کائنات بدل دینے پر آمادہ تھی مگر میں اس پر اپنی مجبوریوں کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔

بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آپس کے بھرپور تصادم کے بعد وہ معاملہ غیر معینہ مدت کے لئے تعطل کا شکار ہو گیا تھا۔ شاہدہ بھی اپنی سخت دھمکیوں سے پسپائی اختیار کرتی نظر آ رہی تھی اور میرے لئے تو کوئی بھی قدم اٹھانا بے حد دشوار ہو گیا تھا۔

میرے پاس وقت کی کمی تھی مگر حالات کا تقاضا یہ تھا کہ چند روز کے لئے خالی الذہن ہو کر میں شاہدہ کے ساتھ تھوڑی سی ذہنی ہم آہنگی پیدا کرتا اور پھر اسی فضا میں اسے کوئی نقصان پہنچائے بغیر خاموشی کے ساتھ روپوشی کی کوشش کرتا۔ اگر میرے ہاتھوں سے شاہدہ کو ذرا بھی نقصان پہنچ جاتا تو شاید میرا ضمیر عمر بھر مجھے ملامت کرتا رہتا۔

میں نے اپنی زندگی میں اس وقت تک قتل سے چوری تک بے شمار جرائم کئے تھے جو دنیا کے کسی بھی قانون کے تحت جائز قرار نہیں دیئے جا سکتے تھے مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی مسلّم تھی کہ میں نے جو کچھ کیا، وہ حالات کے زبردست دباؤ اور ضرورت کے تحت کیا تھا اور ان فیصلوں کو میں نے ہمیشہ سوچ سمجھ کر عملی جامہ پہنایا تھا اور میرے ضمیر نے کبھی ان اقدامات پر مجھے ملامت نہیں کی تھی۔ میں شاہدہ کے بارے میں کوئی عجلت آمیز کارروائی کر کے زندگی بھر کے لئے ایسا کوئی روگ مول لینے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا۔

میں خیالات کی رو سے اس وقت چونکا جب شاہدہ نے اپنی کار یک منزلہ خوبصورت کاٹیج کے احاطے میں گھمائی۔

کاٹیج کی بیرونی وضع قطع اور تزئین سے خوب صورتی کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاہدہ نے پختہ روش پر کار روک کر انجن بند کیا تو میں خاموشی سے کار سے اتر گیا۔ شاہدہ بھی ہارن بجا کر نیچے آ گئی۔ اس طرح شاید اس نے کاٹیج میں موجود کسی خدمت گار کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔

"کیسا مکان ہے؟" شاہدہ نے جیبوں میں ہاتھ اڑس کر میرے ساتھ آتے ہوئے سوال کیا۔ وہ تلخ کلامی کے بعد پہلی مرتبہ مخاطب ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے اس وقت بھی حزن و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔

"خوبصورت ہے۔" میں نے اس کی دلجوئی کے لئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بالکل اپنے مکین کی طرح!"

"مگر بے وفا ہے اپنے مہمان کی طرح۔" وہ داخلی برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ مجھ پر طنز کر رہی تھی۔ اس کی عادت کچھ ایسی تھی کہ برجستہ جوابات سوجھنے پر خاموش رہنا اس کے لئے دشوار تھا۔

"مکان کب سے بے وفا ہونے لگے؟"

"اس کاٹیج کی بات کر رہی تھی۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"یہ کیسے بے وفا ہو گیا؟"

"چند روز پہلے تک کسی اور کو اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا اور آج مجھے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

"تلخ باتیں دوبارہ چھیڑ کر دوستانہ فضا کو برباد نہ کرو۔"

"زندگی اور اس کے تلخ حقائق ہی ہوتے ہیں۔" وہ برآمدے میں نمودار ہونے والے بوڑھے خادم کے سلام کے جواب میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تمہیں یہ اندازہ ہو گیا ہے!" "تم پہلے مل گئے ہوتے تو یہ تجربہ پہلے ہی حاصل ہو گیا ہوتا۔" وہ کہیں بھی بخشنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

میں خاموش ہو گیا اور وہ خادمہ کو مقامی زبان میں ہدایات دیتی ہوئی کاٹیج میں داخل ہو گئی جس کی اندرونی آرائش اور آسائشوں کی فراہمی پر بے دریغ پیسہ بہایا گیا تھا۔

پیش قدمی کا اختتام خواب گاہ میں ہوا، خادمہ راستے سے واپس چلی گئی تھی۔

"تم میرے ساتھ کیوں لگے ہوئے ہو؟" وہاں تھکے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"تمہارا قیدی جو ٹھہرا!"

"میری طرف سے تمہیں آزادی ہے، جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔"

"تعاقب کرنے والا اب بھی باہر میرا منتظر ہو گا۔" میں نے بستر پر بے تکلفی سے دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بغیر باہر نکلا تو اس سے نہ بچ سکوں گا۔"

"وہ تمہاری اپنی احتیاط ہے۔"

"نگرانی کرنے والے کو ہٹا کیوں نہیں دیتیں!" میں نے ڈھٹائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"جب مناسب سمجھوں گی ہٹا دوں گی!"

"میرے ساتھ بھی اب تم شاہدہ کے بجائے مادام برلوی بنتی جا رہی ہو!"

"اب یہ نام لینا۔" وہ یک بیک برہم ہو گئی۔ "اس بارے میں اب تک جو کچھ تمہارے علم میں آ چکا ہے اس کا ذکر بھی زبان پر نہ آنے پائے ورنہ مجھے بہت کچھ سوچنا پڑ جائے گا۔"

"آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی شاہدہ صاحبہ۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔

میں کافی دیر تک اپنے خیالات میں کھویا بستر پر پڑا رہا پھر یک بیک مجھے خیال آیا کہ شاہدہ کو غسل خانے میں گئے بہت دیر ہو چکی ہے لہٰذا میں نے لیٹے ہی لیٹے ایک دو بار اسے پکارا مگر جواب نہیں ملا۔

غور کرنے پر غسل خانے میں بھی مکمل سکوت ہی محسوس ہوا، شاور سے پانی گرنے کی آواز تو شاید شروع ہی سے نہیں ابھری تھی۔

میں تیزی سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف گیا اور ہینڈل گھما کر دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر اندر کی جانب کھل گیا۔

دروازے کا یوں کھلنا میرے لئے مزید حیرت کا باعث ثابت ہوا، میں نے اندر جھانکا تو بتی روشن تھی اور غسل خانہ ویران پڑا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے پر ایک اور دروازہ نظر آیا جو شاید غسل خانے کو کسی اور کمرے سے ملاتا تھا۔ میں نے اس دروازے پر زور آزمائی کی تو وہ دوسری جانب سے مقفل تھا۔

شاہدہ اپنی کسی فوری ضرورت کے تحت مجھے دھوکہ دے کر اس دروازے سے نکل گئی تھی مگر میرے لئے اس کی وہ حرکت ناقابلِ فہم تھی۔ اگر وہ مجھے بتا کر جاتی تو میں اسے رُکنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مجھے اس کاٹیج میں قید کر کے فرار نہ ہو گئی ہو لہٰذا میں تیزی سے واپس پلٹا مگر کمرے سے نکاسی کا راستہ کھلا پا کر میری تشفی ہو گئی۔

باہر نکلنے کے بعد میں اس کمرے میں جا گھسا جو میری دانست میں دوسرے دروازے کے ذریعے غسل خانے سے ملحق تھا مگر وہ بھی خالی ہی تھا۔

پورے مکان کا چکر لگانے پر شاہدہ کا بوڑھا خدمت گار ہی ہاتھ آ سکا۔ میرے لئے اس کا رویہ احترام آمیز تھا مگر زبان کے معاملے میں دونوں ہی مجبور تھے، نہ میں اسے اپنا مدعا سمجھا سکا اور نہ وہ مجھے کچھ بتا سکا۔

جھلاہٹ کے عالم میں میں اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا خواب گاہ میں لایا تب کہیں اسے اندازہ ہو سکا کہ میری الجھن کا سبب کیا تھا مگر اس کے باوجود وہ بالکل بے کار ثابت ہوا اور میں اپنا اوور کوٹ پہن کر باہر نکل پڑا۔

شاہدہ ضرور غائب ہو چکی تھی مگر باہر اس کی کار موجود تھی۔ میری عقل چکرا کر رہ گئی۔ اگر وہ کہیں گئی ہی تھی تو اسے اتنا پُراسرار رویہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی پھر مجھے گمان گزرا کہ اس نے مجھے بھگانے کے بجائے خود ہی مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس نظریے کی تائید بہت سہل تھی اور میں نے اس طریقے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت دوپہر ہو چلی تھی۔ فضا پر کہر کی چادر بہت ہلکی رہ گئی تھی مگر مطلع ابر آلود تھا اور سرد ہوائیں ہڈیوں تک میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ میرا بدن اوور کوٹ میں محفوظ ہونے کے باوجود سردی سے کانپ رہا تھا جب کہ شاہدہ نے غسل خانے میں جاتے ہوئے اپنے گرم ملبوسات کمرے میں ہی چھوڑ دیئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس حالت میں چند سو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی اس کی ہڈیاں ٹھٹھر کر رہ گئی ہوں گی۔

میں احاطے کے وسط میں ہی پہنچا تھا کہ کسی نے کرخت آواز میں مجھے رُکنے کا حکم دیا۔ میں تیزی سے آواز کی سمت میں مڑا تو عمارت کے نکڑ سے ایک قوی الجثہ شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے تیور خاصے جارحانہ تھے۔

میرے قریب آ کر اس نے اپنے اوور کوٹ کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں بڑے دہانے والا ایک مہیب پستول موجود تھا جس کی نال پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔

"اس بار حماقت کی ہے اگر آئندہ لڑکی کے بغیر عمارت سے باہر قدم نکالا تو جسم میں پورے چھ سوراخ کر دوں گا۔" وہ گرامر سے آزاد ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں غرایا۔

"مگر لڑکی ہے کہاں؟" میں نے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔

جواب میں اس نے جو پتہ بتایا وہ سمجھ میں نہ آنے والا اور نہایت بے ہودہ تھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "میں کہتا ہوں اندر جاؤ، یہ تمہارا مسئلہ

نہیں ہے جو یہاں تمھارا کوئی لحاظ کیا جائے گا۔"

اُس کے ہتک آمیز رویے پر میرا خون کھول اُٹھا مگر میں نہایت مایوسانہ انداز میں سر جھکا کر عمارت کی طرف مڑ گیا۔ پہلا قدم اُٹھاتے ہی وہ بھی میرے پیچھے بڑھا اور میں پھرتی سے پلٹ کر اُس پر جھپٹ پڑا۔

میری وہ کارروائی اس کے لیے اس قدر غیر متوقع تھی کہ وہ اپنے جبڑے پر میرے گھونسے کی شدید ضرب کسی آواز کے بغیر سہہ گیا اور اپنا پستول میرے ہاتھ میں چھوڑ کر خاموشی سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

پستول کا سیفٹی کیچ پہلے ہی سے ہٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنا داہنا ہاتھ سیدھا کیا اور چند فٹ کے فاصلے سے گولی اس کی پیشانی کے وسط میں اتار دی۔

گولی کھانے کے بعد اس شخص نے جو بھیانک صوتی اثرات دیے انھوں نے اس کی ابتدائی خاموشی کی بھی بھرپور تلافی کر دی اور چند ہی سیکنڈ میں اس کا جسم تڑپ تڑپ کر بے جان ہو گیا۔

پستول کی نال پر سائلنسر ہونے کی وجہ سے گونج پیدا نہ ہو سکی تھی بس ایک تیز کھٹکا ضرور پیدا ہوا تھا مگر مجھے امید نہیں تھی کہ وہ آواز کسی نے سنی ہو گی۔

شاہدہ غائب تھی اور میری نگرانی پر مامور شخص خلافِ توقع سہولت کے ساتھ جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس طرح قدرت نے مجھے حیرت انگیز طور پر آزادانہ فرار کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا تھا۔ میں چاہتا تو کاٹیج میں واپس جا کر شاہدہ کی کار کی چابی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا مگر میں نے اس کوشش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس بات کو ترجیح دی کہ جلد از جلد اس عمارت سے اتنی دور نکل جاؤں کہ شاہدہ میرا سایہ بھی نہ ڈھونڈ سکے!

مگر میری مسرت کے وہ لمحات بہت مختصر ثابت ہوئے۔ میں نے پھاٹک کی طرف دوڑ لگانے سے قبل عمارت پر الوداعی نگاہ ڈالی تو شاہدہ تیز تیز قدموں سے میری طرف چلی آ رہی تھی۔

"اُسے کیا ہوا؟" شاہدہ نے دور ہی سے زمین پر پڑی ہوئی لاش کے بارے میں سوال کیا۔

"سو رہا ہے!" میں نے پستول جلدی سے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے فرار کا ارادہ فوری طور پر ملتوی کر دیا تھا۔

قریب آ کر اس نے خون دیکھا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ چند گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔ "بارود کی بو آ رہی ہے۔ اسلحہ کہاں سے آیا تمھارے پاس؟"

"اُس نے خود ہی دیا تھا۔" میں نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"تم باہر کیوں نکلے تھے؟" وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بولی۔

"ایسی کوئی پابندی تو نہیں لگائی تھی تم نے، اور ویسے بھی میں تمھیں ڈھونڈنے ہی نکلا تھا مگر یہ بلاوجہ بدزبانی پر اُتر آیا!"

"اسلحہ میرے حوالے کر دو!" وہ میرے اوور کوٹ کی پھولی ہوئی جیب کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔

"نہیں!" میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ "بہت دنوں بعد میں نے کسی ہتھیار کا وزن اپنے لباس میں محسوس کیا ہے۔"

"میں کہتی ہوں دے دو!"

"تم بے فکر رہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ پستول تم پر نہیں اٹھے گا۔"

"بہت ضدی ہو!" اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر وہ فضا میں یوں اچھلی جیسے اس کے پیروں میں یک بیک طاقتور اسپرنگ نکل آئے ہوں۔ اچھل کر اس نے پوری قوت سے دونوں لاتیں میرے سینے پر رسید کرنی چاہیں مگر میں پلک جھپکتے میں ہوشیار ہو چکا تھا۔ میں نے خود کو بچا کر اس کی ایک ٹانگ پکڑی اور اُسے اپنے ہی زور میں دور اچھال دیا۔

وہ بُری طرح زمین پر گری۔ چیخ روکنے کی بھرپور کوشش کے باوجود اُس کے حلق سے نہایت کربناک غراہٹ اُبھری تھی۔

"بے خبری میں ایک بار پینٹلی ترُوا بیٹھا تھا، تمھارے لیے وہی اعزاز کافی ہے۔ یہ کرتب نمائشی مقابلوں اور سرکس میں ہی اچھے لگتے ہیں۔" میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے کہا۔

وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے سیدھی کھڑی ہو گئی اور جھلاہٹ آمیز نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔ یہ حقیقت شاید اس نے ایک ناکام وار میں محسوس کر لی تھی کہ اس کی صلاحیتوں سے بھرپور واقفیت کے بعد میرے لیے اس کے کسی دام میں آنا مشکل تھا۔

"تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟"

"اندر ہی تھی، اور کہاں جاتی!" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"مگر میں نے تو مکان کا چپہ چپہ چھان مارا، تمھارا کہیں پتا نہیں تھا۔"

"میرے پاس چند بری خبریں ہیں۔" وہ میری بات کو ان سنا کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولی۔

"تمھارے خفیہ معاملات سے میرا کوئی سروکار نہیں۔"

"برسلز کی پولیس اپنے پورے وسائل کے ساتھ میرے اور تمھارے خلاف حرکت میں آ چکی ہے۔" وہ اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"پولیس نے میری اور تمھاری رشتے داری کا سراغ کیسے لگا لیا؟" میرا لہجہ طنز آمیز تھا۔

"پولیس کو صفدر علی اور شاہدہ خان کی تلاش ہے۔ وہ دونوں

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میرے لیے اس نے اپنے پہلو والے دروازے کا قفل کھول دیا تھا۔ "پولیس کو تمھارے بارے میں پوری تفصیلات کا علم ہو چکا ہے مگر میری دوہری شخصیت کے راز سے وہ شاید ابھی تک ناواقف ہیں۔" میرے بیٹھنے کے بعد شاہدہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"یہ قصہ اچانک کیسے شروع ہو گیا؟"

"مخبری کی گئی ہے۔" وہ کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ "پیرس میں اسرائیلی سفارت خانے کا ملٹری سیکریٹری خود یہاں پہنچا ہوا ہے۔ اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ میں نے شروع ہی سے ایک بڑی اہم حقیقت کو فراموش کیا ہوا تھا۔"

"سارے حقائق سے آگاہ ہوئے بغیر میں کوئی رائے نہ دے سکوں گا!"

"پیرس میں ساوک کے چیف ایجنٹ علی نقی کے اسرائیلیوں سے بہت قریبی مراسم ہیں۔ اُسے شروع سے ہی علم تھا کہ میں مادام بواری کے حکم پر صفدر علی کو پکڑنا چاہتی ہوں اور یہ خبر علی نقی کے ذریعے اسرائیلیوں کو بھی مل گئی ہو گی۔ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ تم اسرائیلیوں کے لیے کس قدر اہمیت رکھتے ہو۔" وہ سڑک پر آنے کے بعد سست رفتاری سے کار چلاتے ہوئے بولی۔ "اس اثنا میں تم مجھے جُل دے کر برسلز آ گئے۔ اسی روز جب مجھے اسرائیلیوں کی پیش کش موصول ہوئی وہ صفدر علی کی زندہ یا مردہ تحویل کے عوض مادام بواری کو منہ مانگا معاوضہ دینے کے لیے تیار تھے۔ اس دوران میں تم میکفرسن اور رونالڈو کے قتل کے الزام میں بلجیئن پولیس کی حراست میں پہنچ چکے تھے لہٰذا شین مارکیڈو نے تمھیں اپنی ضمانت پر رہا کرا لیا اور پاگل خانے میں قید کر کے تمھاری تصاویر اور فنگر پرنٹ میرے پاس بھیج دیے۔ میں نے وہ چیزیں اسرائیلی سفارت خانے کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ تصدیق کر دی کہ تم صفدر علی ہو بلکہ انھوں نے یہ یقین بھی کر لیا کہ تم مادام بواری کے قیدی بن چکے ہو۔ پھر میں برسلز پہنچی تو شاید پیرس میں موجود اسرائیلیوں کے ایما پر بروغیل بوچ اپنے ساتھی سمیت میرے پاس آ پہنچا کیونکہ تمھارے بارے میں اسرائیلی میرے ذریعے ہی مادام بواری سے بات کر رہے تھے!"

"یہ سب تو میں جانتا ہوں، آگے کی بات کرو۔" طویل سکوت کے بعد مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اسی طرف آ رہی ہوں۔"

"دوبارہ بات شروع کرنے سے پہلے یہ بتاؤ کہ اب کہاں جا رہی ہو؟" میں نے اس پر اپنی خلش کا اظہار کر ہی دیا۔

"ہوٹل مولیس!"

"مگر تم تو اس عمارت سے دور رہنا چاہتی تھیں؟"

"وہ پرانی بات تھی۔ موجودہ مخدوش حالات میں ہم دونوں وہیں محفوظ رہ سکیں گے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اور ابھی تک مخدوش حالات کی وضاحت باقی ہے!"

"یہ سب بروغیل بوچ اور اُس کے ساتھی کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔" وہ بولی۔ "وہ دونوں پیرس میں اسرائیلی سفارت خانے والوں کے ایما پر ہی میرے پیچھے برسلز پہنچے ہوں گے لہٰذا اُن کی موت کے بعد پیرس والوں نے سمجھ لیا ہو گا کہ تم برسلز میں موجود ہو اور اپنے دشمنوں کے خلاف بھرپور کارروائی بھی کر سکتے ہو!"

"ایسی صورت میں انھیں تم سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے؟"

"یہ کیوں بھول رہے ہو کہ شین مارکیڈو بروغیل کے ساتھی کی لاش اسرائیلی سفارت خانے کے پاس پھینکنے کے بعد پولیس کی نظروں میں آیا تھا۔ اس لاش سے شین مارکیڈو کا تعلق ہی انھیں میری طرف سے بدظن کرنے کے لیے کافی ہے کیونکہ زیرِ زمین دنیا میں بیشتر بڑے لوگ یہ جانتے ہیں کہ شین مارکیڈو برسلز میں مادام بواری کا نائب ہے!"

"پیرس والے اسرائیلی سفارت خانے سے ملٹری سیکریٹری کی یہاں آمد کا مطلب ہے کہ اس بار وہ ہمیں فنا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے!"

"وہ پوری طرح سرگرم ہیں۔ انھوں نے نہ صرف پولیس کو اطلاعات فراہم کی ہیں بلکہ خود بھی ہماری تلاش میں لگے ہوئے ہیں!"

"شین مارکیڈو کا پتہ نہیں چلا؟"

اس نے مایوسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اسرائیلیوں کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو!"

"پھر تو تم ہوٹل مولیس کا رُخ کر کے حماقت کر رہی ہو۔ چند روز کے لیے اپنی کسی خفیہ قیام گاہ پر روپوش ہو کر تم زیادہ سکون سے حالات کا جائزہ لے سکتی تھیں!"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" وہ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد بولی۔ "شاہدہ کی حیثیت سے میرا باہر نکلنا نہایت مخدوش ہے!"

"مادام بواری والی کار میں بھی تم مشکلات سے دوچار ہو سکتی ہو۔" میں نے اُس کے خیالات پڑھ کر کہا۔ "شین مارکیڈو مادام بواری کے بارے میں صرف اسی قدر جانتا ہے کہ وہ کون سی مخصوص کار استعمال کرتی ہے!"

"مگر مجھے ایک بار ہوٹل مولیس جانا ہی ہو گا!" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"ادھر جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ امکان بھی تو موجود ہے کہ وہ عمارت اُن کی نظروں میں آ چکی ہو اور وہ وہاں گھیر ڈالے مادام بواری کی کار کی وہاں آمد کا انتظار کر رہے ہوں تاکہ رنگے ہاتھوں کامیابی حاصل کر سکیں۔"

"تم مجھے بلاوجہ خوف زدہ کر رہے ہو۔" وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "صبح میں تمھیں لینے وہاں گئی اور پھر واپس آئی مگر باہر میں نے کوئی مشکوک بات محسوس نہیں کی۔"

"اس وقت تم شاہدہ کے رُوپ میں تھیں۔ اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ تم مادام لواری ہی ہو۔ بروغیل لورچ کے ساتھی کی لاش سے شین مارکیڈو کے تعلق کی وجہ سے اب اسرائیلیوں کی ساری دشمنی کا رُخ مادام لواری کی طرف ہوگیا ہوگا۔ اُن کی نظروں میں شاہدہ تو مادام لواری کی ادنیٰ کارکن ہے جس کا دماغ مقامی پولیس ہی درست کرے گی!"

"تمھارے خدشات خاصے معقول ہیں مگر پھر بھی مجھے ایک بار ہوٹل موریس جانے کا خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"آخر وہاں تمھاری کیا ضرورت ہے؟" مشترکہ خطرات کو سامنے پاکر وہ ذہنی خلیج دُور ہوچکی تھی جو صبح کی تلخ کلامی کے بعد پیدا ہوگئی تھی۔

"دراصل وہاں میرے کمرے میں کچھ ایسی دستاویزات موجود ہیں جن سے نہ صرف میری دوہری شخصیت کا راز ظاہر ہوتا ہے بلکہ میرے بہت سے ایسے ہمدردوں کے نام بھی روشنی میں آتے ہیں جو معاشرے میں نہایت عزت اور احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "برا وقت آنے سے پہلے میں وہ تمام کاغذات برباد کردینا چاہتی ہوں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ ہوٹل موریس تمھارا مقامی مرکز ہے!"

"نہیں۔" وہ دھیمے سے ہنس دی۔ "بروسیلز میرا ہیڈکوارٹر ہے یورپ میں ہونے والی سرگرمیاں ہوٹل موریس سے ہی کنٹرول کی جاتی ہیں۔"

"تو پھر پچھلے دنوں تم پیرس میں کیا کررہی تھیں؟"

"گروہ میں سارے کام بٹے ہوئے ہیں اس لیے میرے یا کسی ایک فرد کے ہونے نہ ہونے سے رخنہ پیدا نہیں ہوتا اور اس وقت میں ایلیزا کی ماں کی خواہش پر وہاں موجود تھی تاکہ عذرا جونا اس کو گروہ سے بالکل لاتعلق کیا جاسکے۔ ایک برس پہلے تک وہ اپنی بیوی کا نام استعمال کررہا تھا مگر جب سے میں نے اختیارات سنبھالے، وہ مجھے بلیک میل کرنے لگا تھا۔"

یہ طے ہوچکا تھا کہ شاہدہ کو ہوٹل موریس جانا تھا مگر وہ یہ فیصلہ نہیں کرپائی تھی کہ اُسے کس حیثیت میں اُدھر کا رُخ کرنا چاہیے۔

اگر وہ شاہدہ کے روپ میں اُدھر جاتی تو ہوٹل موریس کے مخصوص کمرے تک رسائی ناممکن ہوجاتی جہاں دستاویزات موجود تھیں اور اگر وہ مادام لواری کے طور پر وہاں داخل ہوتی تو باہر پھیلے ہوئے دشمنوں کی فوری کارروائی کا امکانی خطرہ پیدا ہوجاتا۔ وہ مادام لواری کی کار پہچانتے ہی ہوٹل موریس پر دھاوا بول سکتے تھے!

تفصیلی گفتگو کے بعد آخرکار اُس نے اپنے خفیہ ٹھکانے سے کار بدل ہی لی۔

بلٹ پروف سیاہ کار میں ہوٹل موریس کی طرف جاتے ہوئے میں عجیب سی سنسنی کا شکار ہوتا جارہا تھا مگر اس کی تاویل تلاش کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہورہی تھی۔

ہوٹل موریس اس وقت تین ہولناک خطرات میں گھرا ہوا تھا۔

ایک طرف اسرائیلی سیکرٹ سروس مادام لواری کی راہ پر تھی دور... شاہدہ کے باعث پولیس بھی ادھر متوجہ ہوسکتی تھی اور تیسرا... نے ہوٹل موریس میں گھسنے والے تربیت یافتہ بندر کی ہنگامی... سے جنم لیا تھا:

میسرا خطرہ شاہدہ کے لیے بہت مبہم تھا مگر میں اس... سے پوری طرح آگاہ تھا اگر وہ واقعی کوئی سدھایا ہوا بندر... امکانات ہی تھے کہ وہ سیتا کا بھیجا ہوا تھا۔ وہ بندر ضرور... اس کے طفیل میرے ہمدردوں کو یہ علم ضرور ہوگیا ہوگا کہ میں... میں رکھا گیا تھا۔

مجھے ہوٹل موریس سے نکالنے کے لیے وہ کیا اقدام کرتے... لگانا میرے بس کا روگ نہیں تھا کیونکہ میں بروسیلز میں... عبدالفتاح کی مجبوریوں سے واقف تھا۔

"ہوٹل موریس کی عمارت کی اس وقت کیا حیثیت..." میں نے اپنے خیالات کے تسلسل کو سہارا دینے کے لیے شاہدہ سے... "صبح سے اب تک اس میں کیا فرق پیدا کیا جاسکتا..." اُس نے تحیرآمیز لہجے میں سوال کرڈالا۔

"شاید میں اپنا سوال واضح نہیں کرسکا۔" میں نے خفت... لہجے میں کہا۔ "عام شہریوں کے لیے اس عمارت کی نوعیت کیا..."

"وہ ایک مشہور تجارتی ادارے کا مقامی دفتر ہے!"

"کیا اس میں حقیقت بھی ہے؟"

"ہاں۔" اس نے فوراً ہی اثبات میں جواب دیا۔ "ہوٹل موریس سے ہونے والی جائز تجارتی سرگرمیاں اتنی... تجارتی ادارے کے نام پر پوری عمارت کی ملکیت مشکوک...

"پھر تو وہاں ملاقاتیوں کی آمدورفت بھی رہتی ہوگی!"

"لازمی بات ہے!" اُس نے کہا۔

"پھر تو ملاقاتیوں میں شامل ہوکر کوئی غیرمتعلقہ شخص بھی... ہوسکتا ہے!"

میری بات سُن کر وہ ہنسنے لگی۔ "اس عمارت کا دفتر... ہے۔ ادھر آنے والا کوئی شخص ممنوعہ حصے میں داخل نہیں ہو..."

سفر کا باقی حصہ تشویش آمیز خاموشی کے ساتھ طے... دُور سے ہوٹل موریس کی عمارت نظر آنے لگی تو بے اختیار... کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

بے یقینی کے ان لمحات میں میرے ذہن میں خیال... وقت شاہدہ میری طرف سے قطعی غافل تھی اور میرے... جیب میں بھرا ہوا پستول موجود تھا، میں چاہتا تو اسے... نشانہ بنا کر اس کے تسلط سے چھٹکارا حاصل کرسکتا تھا... نے یہ گوارا نہ کیا۔ میں اس یقین دلا چکا تھا کہ اس پر ہتھیار نہیں اٹھاؤ...

کی پاسبانی میرا اولین فرض تھا!

شاہدہ نے اپنی کار جوں ہی ہوٹل موریس کی جانب گھمائی کسی جانب سے یکے بعد دیگرے چار فائر ہوئے اور گولیاں کار کے مختلف حصوں سے ٹکراکر اُچٹ گئیں۔

"حقیر کیڑے!" شاہدہ دانت پیس کر اضطراری انداز میں بولی اور یک بیک کار کی رفتار تیز کردی۔

احاطے کے اندر داخل ہونے کے بعد بھی کئی گولیاں کار کے تعاقب میں آئیں مگر اس وقت تک ہوٹل موریس کے محافظ حرکت میں آچکے تھے اور اُن کی جوابی فائرنگ کا شور فضا میں تواتر کے ساتھ گرجنے لگا تھا۔

دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں اسی اثنا میں شاہدہ نے گیراج کا دروازہ کھولا اور اپنی کار اندر لے جانے کے بعد دروازہ بند کردیا۔

"تمھارے اندیشے درست تھے۔" وہ مخصوص عینک لگاتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"وہ تعداد میں کئی معلوم ہوتے ہیں!"

"اب اُن کی پرواہ نہیں۔" وہ لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "میرے آدمی اُن کو پیس کر رکھ دیں گے!"

اُوپر اپنے کمرے میں پہنچ کر شاہدہ نے ایک کھڑکی کھول دی میں بھی باہر کے جائزے کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔

دوپہر کے گردآلود اُجالے میں گولیاں روشن لفظوں کی طرح فضا میں تیر رہی تھیں۔ دونوں ہی فریق جم کر لڑنے پر آمادہ نظر آرہے تھے۔

مجھے وہیں کھڑا چھوڑ کر شاہدہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

گولیوں کا رُخ بتارہا تھا کہ ہوٹل موریس کے محافظوں نے ہتھیار کے قریب جوار میں ہی مورچے سنبھال رکھے تھے اور حملہ آوروں کو اندر گھسنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

اچانک اسپیکر پر ایک ناقابلِ فہم مردانہ آواز سنائی دی۔ میں چونک کر پلٹا تو ٹیلی وژن اسکرین پر ایک بوکھلایا ہوا چہرہ نظر آرہا تھا۔

شاہدہ کاغذات تلف کرتے ہوئے ٹیلی وژن کی طرف گئی اور ایک بٹن آن کردیا۔ وہ چند ثانیوں تک بات کرتی رہی اور چند مکالموں کے تبادلے کے بعد اسکرین تاریک ہوگئی۔

دوسری طرف باہر کا معرکہ سرد پڑچکا تھا۔ باہر سے اِکا دُکا گولیاں ہی چلائی جارہی تھیں جبکہ ہوٹل موریس والے آگ برسائے جارہے تھے! پھر حملہ آوروں کی جانب سے فائرنگ رُک گئی مگر حفاظتی عملا اندھا دھند گولیاں چلاتا رہا پھر شاید کسی کو اس حماقت کا احساس ہوا اور تدریج اُدھر بھی سکوت چھا گیا۔

میں مزید کچھ دیر تک کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باہر کا جائزہ لیتا رہا جب کچھ نظر نہ آیا تو کھڑکی بند کرکے اندر لوٹ آیا۔

"بھاگ گئے؟" شاہدہ نے ہاتھ میں موجود کاغذات کو پُرزوں میں تبدیل کرتے ہوئے سوال کیا۔

"شاید وقفہ ہوا ہے!" میں نے بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنے آدمیوں کو پوری طاقت استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔ چند ہی گھنٹوں میں اسرائیلی سفارت خانے پر جوابی کارروائی کی جائے گی۔"

"تمھیں یقین ہے کہ یہ حرکت اسرائیلیوں کی ہی ہے؟"

"کمال ہے!" وہ حیرت سے بولی۔ "ساری پیشین گوئیاں تو تم نے اس اعتماد سے کی تھیں جیسے اسرائیلیوں کی منصوبہ بندی میں تمھارا دخل بھی ہو اور اب خود سوال کررہے ہو۔ اُن کے سوا اور کون اِدھر کا رُخ کرسکتا ہے!"

"اس کا مطلب ہوا کہ شین مارکیڈو ان ہی کی تحویل میں ہے!"

"ضروری نہیں۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔ "اگر کوئی سرپھرا مادام لواری کے پیچھے لگ رہی ہے تو زیرِ زمین دُنیا میں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد معلوم کرسکتا ہے کہ ہوٹل موریس مادام لواری کے استعمال میں رہتا ہے!"

"اور کار کی شناخت؟"

"اُس کا بھی کم و بیش وہی مسئلہ ہے، مادام لواری کی کار کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اگر کوئی راز ہے تو وہ صرف مادام لواری کی شخصیت" وہ لاپرواہانہ انداز میں بولی۔ "کوئی نہیں جانتا کہ مادام لواری کون ہے!"

"شین مارکیڈو کی طرف سے تمھیں کوئی تشویش نہیں ہے؟" میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا تو وہ ایک الماری میں سے کاغذات نکال کر نکالتے رُک کر میری طرف متوجہ ہوگئی۔

"میں ایسے کتے کے پلے کو بھی کبھی بے سروسامانی کا احساس ہونے دیتی جس نے میرے لیے کام کیا ہو پھر وہ تو شین مارکیڈو ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "میرے آدمیوں نے اُسے ہر ممکنہ ٹھکانے پر تلاش کیا ہے اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود ابھی تک اس کی بازیابی سے ناامید نہیں ہوئے ہیں۔"

"پولیس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ کہیں نہیں ہے۔" وہ اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "اس معاملے میں صرف اطلاعات پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ میرے چند آدمی معمولی جرائم کرکے دانستہ گرفتار ہوئے ہیں تاکہ اندر جاکر جیل اور حوالات میں سراغ لگا سکیں۔"

"ویسے بھی اگر وہ پولیس کے قبضے میں ہوتا تو پولیس اس کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کے سلسلے کچھ بڑی کارروائیاں کرچکی ہوتی۔"

"یہاں کے نظام میں یہ بات ناممکن ہے کہ اُسے گرفتار کرنے والے پولیس افسر نے دوسروں کو مطلع کیے بغیر اُسے ذاتی یا خفیہ قید میں رکھا ہو۔" یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"یہاں کب تک رکو گی؟"

"پہلے تو کھانا کھایا جائے گا۔" وہ ہنس کر بولی۔ "مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔ ویسے بھی میں اسرائیلی سفارت خانے پر کیے جانے والے حملے کے نتائج کا بھی انتظار کروں گی۔"

"تو تم نے کمل کران کے سامنے آنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"ابتدا خیر سگالی سے ہوئی تھی مگر انھوں نے جھلاہٹ میں خود ہی محاذ کھولا ہے۔ اب پتہ نہیں اس سلسلے کا اختتام کہاں ہو!"

"تمھارے کلچ پر میرے ہاتھوں جو آدمی مارا گیا وہ وہی تھا نا جسے تم نے اپنے تعاقب پر مامور کیا تھا؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت چونک کر سوال کیا۔

"وہ نہ ہوتا تو اتنی آسانی سے گاڑی بدل کر مادام بواری بننا ممکن نہ ہوتا۔" وہ بدستور خوش مزاجی کا مظاہرہ کیے جارہی تھی۔ "یہ تو بتاؤ کہ تم نے اٹافاٹا میں اس دیو کو کیسے زیر کرلیا تھا۔ وہ خاصا خونخوار شخص سمجھا جاتا تھا۔"

"زخم کھایا ہوا شخص [illegible] ہوتا ہے[illegible]"

"شخص نہیں، یہ محاورہ تو شیر کے لیے ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"جو چاہے کہہ لو، اس وقت میری وہی حالت تھی اور وہ اپنی ذات کے گھمنڈ میں مبتلا تھا۔ اس کا انجام نہایت مناسب ہوا۔"

"گھمنڈ تو اس وقت تمھیں بھی تھا!"

"مجھ میں صرف اسی چیز کی کمی ہے!"

"جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے مجھے بھی چیلنج دیا تھا!"

"تم سے تو جیت کر بھی ہار ہی ماننی پڑتی ہے!" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ میں نے بے خبری میں تمھاری پنڈلی زخمی کی تھی مگر اب تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکوں گی۔" اُس نے مجھے اپنے الفاظ یاد دلائے۔

"وہ حقیقت کا اظہار تھا۔"

"کیوں نہ اسی وقت آزمائش ہوجائے۔"

"دونوں ہی احمق نظر آئیں گے!"

اُسی وقت ایک دیوار گیر بورڈ پر شیشے کے عقب میں بلب روشن ہوگیا اور کمرے میں کسی برقی گھنٹی کی مدھم سی جھنجھناہٹ گونجنے لگی۔ روشن شیشے پر تین کا ہندسہ نمایاں نظر آرہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

مگر شاہدہ جواب دینے کے بجائے دوڑ کر ٹی وی کی طرف پہنچ گئی۔ میں بھی پھرتی سے اُس کے قریب جا پہنچا۔ وہ ٹی وی آن کرکے چینل بدل رہی تھی۔

"وہ الارم ہے!" شاہدہ ٹی وی اسکرین پر نظریں جما کر بولی۔ "تین نمبر راہداری میں کوئی داخل ہوا ہے!"

"کوئی داخل ہوا ہے؟" میں نے حیرت اور بے یقینی سے دُہرایا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" وہ میری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "کوئی کھانا لے کر آرہا تھا۔ ابھی اسکرین پر تم [illegible] دیکھ لوگے!"

"تو کیا اس راہداری میں بھی کیمرہ نصب ہے؟"

"تینوں راستوں پر کیمرے نصب ہیں چوتھا کیمرہ [illegible] ہے اور ہر کیمرہ اس ٹی وی سیٹ کے علیحدہ چینل سے منسلک ہے۔ اس وقت ہمیں تیسری راہداری نظر آرہی ہے۔ آنے والا جیسے ہی راہداری کے آغاز پر لگے ہوئے فوٹو سیل کے سامنے سے گزرا، فوراً اس سے منسلک الارم سسٹم آن ہوگیا۔"

روشن اسکرین پر ویران مگر کشادہ راہداری نظر آرہی تھی جس کے اختتام پر بند دروازہ نظر آرہا تھا۔

"یہ شاید تمھارے کمرے کا دروازہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس طرف براہ راست میرے کمرے کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ کمرے سے ملحق سروس روم کا دروازہ ہے!"

تیسری راہداری میں کیمرہ ایسی جگہ نصب تھا کہ خاصا [illegible] اس کے عدسے کی زد میں تھا مگر مجھے ایک خرابی یہ محسوس ہورہی تھی [illegible] اس کیمرے کے ذریعے کمرے کی طرف آنے والے کی پشت ہی نظر آسکتی تھی اور اس طرح دھوکے کا شدید احتمال تھا مگر مجھے فوراً ہی اپنی اُلجھن کا جواب مل گیا۔

کیمرے کے سامنے اچانک ایک انسانی سر کا عقبی حصہ نظر آیا۔ چند ہی ثانیوں میں وہ پورا ہیولا واضح ہوگیا۔ بھاری اور ڈھلکے [illegible] جسم والا ایک اوسط قامت شخص ٹرالی دھکیلتا ہوا سروس روم کی طرف آرہا تھا۔ راہداری کے فرش پر بنی ہوئی ایک چوڑی سی لکیر پر پہنچ کر وہ شخص واپس گھوم گیا۔

اب اُس کا چہرہ اسکرین پر پوری طرح واضح تھا۔ اس نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور پلٹ کر دوبارہ ٹرالی آگے دھکیلنے لگا۔

"میرا جو آدمی اجازت پاکر ادھر آتا ہے وہ اس لکیر پر [illegible] رونمائی ضرور کراتا ہے اور جو شخص اس پابندی کی تعمیل نہ کرے [illegible] ہی ہوسکتا ہے!" اُس نے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔

"بہت مضبوط انتظام ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ ملحقہ کمرہ سروس روم [illegible] کہلاتا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"کھانے سے دیگر ضروریات تک ہر چیز اسی کمرے [illegible] جاتی ہے۔ ملازم کے رخصت ہونے کے بعد وہیں کھانا کھائیں گے۔"

"ایک بات اور چبھ رہی ہے!"

"وہ بھی پوچھ ہی ڈالو!"

"اس ترقی یافتہ فضا میں تمھارا دوڑ کر ٹی وی تک [illegible] سا لگتا ہے!"

"مجھے خوا[illegible] الجھن ہو رہی ہے؟" وہ میری بات سمجھ کر [illegible]

"اس کے ریموٹ کنٹرول میں کوئی نقص پیدا ہوگیا ہے۔ وہ آجائے گا تو بستر پر پڑے پڑے ہی سارے کام ہوجائیں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے مسہری کے سرہانے لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار گیر بورڈ پر جلتا ہوا بلب بجھ گیا۔

"اس بٹن سے صرف بلب ہی نہیں بجھا بلکہ تیسری راہداری میں کھلنے والے دروازے کا برقی قفل بھی کھل گیا ہے۔" مجھے بورڈ کی طرف متوجہ پاکر اس نے خود ہی بٹن دبانے کے اثرات کی پوری وضاحت کر ڈالی۔

"سروس روم میں گھسنے والا ملازم اگر چاہے تو اس کمرے میں داخل ہوکر تمھاری ذات کا بھرم توڑ سکتا ہے!" میں نے چند ثانیوں تک غور کرنے کے بعد اپنی دانست میں ایک خامی تلاش کر ہی لی۔

"ایسی کوشش اُسے موت کے منہ میں ہی لے جائے گی۔" وہ آسودہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "ادھر داخلہ تو دور کی بات ہے اگر وہ سُن گن لینے کے لیے بھی مشترکہ دروازے کے قریب آئے گا تو دروازے کے سامنے فرش کا خاصا حصہ آہنی چادر کا بنا ہوا ہے مگر بادی النظر میں فرش کا حصہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے وزن سے وہ آہنی چادر خفیف سی نیچے جائے گی اور اس میں طاقتور برقی رَو دوڑ جائے گی جو جوتے کی کیل سے بدن میں سرایت کرکے اُسے خاکستر کرسکتی ہے اسی کے ساتھ میرے کمرے میں ایک تیز الارم گونج اٹھے گا!" اُسے اپنے نظام پر پورا اعتماد تھا۔

"سارا بجلی کا کھیل ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "حملہ آور اُسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب اندر گھسنے سے قبل وہ برقی نظام تباہ کردے!"

"کامیاب پھر بھی نہ ہوگا۔" وہ پُریقین لہجے میں بولی۔ "وہ صرف فرش میں دوڑنے والی بجلی کا توڑ کرسکے گا، سارا الارم اور ٹی وی سسٹم بیٹریوں سے کام کرتا ہے جو خودکار چارجز کے ذریعے ہر وقت بجلی سے چارج ہوتی رہتی ہیں۔ بجلی کی مکمل ناکامی کے باوجود بیٹریاں چالیس گھنٹے تک حفاظتی نظام کی جملہ ضروریات پوری کرسکتی ہیں۔"

"یہ درست ہے کہ اس عمارت میں کسی اجنبی کا تم تک پہنچنا ناممکنات میں سے ہے لیکن اگر تمھارا اپنا ہی کوئی آدمی باغی ہوجائے تو وہ ہر رکاوٹ عبور کرسکتا ہے!"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر یہ ایک موہوم سا مفروضہ ہے۔" وہ بولی۔ "[illegible] میرا کوئی آدمی بغاوت کیوں کرے گا؟ میرے آدمیوں کے بھڑکنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ میرے آدمی مالی اعتبار سے شاہانہ زندگی گزارتے ہیں مجھے کوئی زک پہنچے گی تو ان سب کا مستقبل تاریک ہوجائے گا اور وہ تیسرے درجے کے معمولی غنڈے رہ جائیں گے جنھیں معمولی معاوضے پر دنیا کا ہر کام کرنا پڑتا ہے!" وہ معقولیت کے ساتھ بحث کے لیے تیار تھی۔ "اور پھر بغاوت کسی شخصیت کے خلاف ہوتی ہے کسی نام کے خلاف نہیں۔ میرے آدمیوں کے لیے مادام بواری ایک آسیبی نام ہے۔"

"تمھیں اپنے درمیان بلکہ اس عمارت میں موجود پاکر ان میں ہیجان پیدا ہوسکتا ہے۔ اس وقت تمھاری آسیبی شخصیت دوراہے پر ہوتی ہے!"

"تم مفروضوں پر اتنا کیوں اُلجھ رہے ہو؟" وہ سروس روم کو ملانے والے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس وقت تو تمھیں میرا ساتھ میسر ہے لیکن مادام بواری کا بھرم قائم رکھتے ہوئے تمھارا تنہا یہاں آنا بہت دل گردے کا کام ہے!"

"میری دونوں چیزیں مضبوط ہیں۔"

"ایک کا تجربہ ہے، دوسری کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"بعض اوقات تمھاری گفتگو کا رُخ ہی پلے نہیں پڑتا۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُلجھن آمیز لہجے میں بولی۔ "پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہو!"

"دل تو واقعی مضبوط ہے تمھارا۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "گردوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ بڑی سیدھی سی بات کہی تھی میں نے!"

"کاش کہ تم اسی قدر سیدھے ہوتے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "چلو کھانا لگ چکا ہے پہلے پیٹ پوجا کرلو!"

میری نظر سروس روم والے دروازے پر پڑی تو اُس کی چوکھٹ کے کسی خانے میں سبز بلب جلا ہوا تھا۔ بلب روشن ہونے سے قبل وہ چوکور خانہ چوکھٹ ہی کا ایک حصہ معلوم ہورہا تھا۔

میں شاہدہ کی رہنمائی میں سروس روم میں داخل ہوا تو اس وسیع کمرے میں مختصر لیکن خوب صورت ڈائننگ ٹیبل بھانت بھانت کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔ ڈشوں سے اُٹھنے والی گرم گرم بھاپ اور خوشبو بھوک کے لیے تازیانے کا کام کررہی تھی۔

"تم نے بتایا کہ ٹیلی وژن کا ریموٹ کنٹرول خراب ہے مگر چند روز پہلے جب تم مجھے پہلی بار اپنے کمرے میں لائی تھیں تو اس وقت بھی تم نے ٹیلی وژن کے سوئچ ہاتھ ہی سے دبائے تھے۔" کھانے کے دوران سکوت توڑنے کے لیے میں نے پھر ایک شوشہ چھوڑ دیا۔

"اتفاق سے اس روز ٹیلی وژن میں خرابی تھی، ریموٹ کنٹرول سے وہ کام نہیں کررہا تھا۔" وہ لقمہ نگلتے ہوئے بولی۔

"مرمت کون کرتا ہے؟"

"ایک تجربہ کار الیکٹرونک سپروائزر میرا تنخواہ دار ہے۔ تمھیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ ایک ریٹائرڈ فوجی سرجن بھی میرے باقاعدہ عملے میں شامل ہے!"

"وہ کہاں سے ہاتھ لگ گیا؟"

"ایک حادثے میں اس کی داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی جو بعد

میں کولہے پر سے کاٹنی پڑ گئی۔ وہ صحت یاب ہو کر ہسپتال سے نکلا تو اُسے ریٹائرمنٹ دے دیا گیا۔ میں نے ڈیڑھ لاکھ فرانک خرچ کر کے اُسے مشینی ٹانگ فراہم کی اور اب تم اُسے چلتے دیکھو تو کہہ نہیں سکتے کہ وہ لنگڑا ہے۔ اہم معاملات میں زخمیوں کا علاج وہی کرتا ہے!"

کھانے کے بعد میں شاہدہ کے کمرے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ مرغن غذائیں معدے میں پہنچ کر اپنا اثر دکھا رہی تھیں مگر مجھے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ شاہدہ میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر مجھے ایک بار پھر نشانہ نہ کر دے۔ اس وقت تک شاہدہ کے مقتول نگراں سے چھینا ہوا بے آواز پستول میری ہی تحویل میں تھا اور میں اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد ریڈیو روم سے یہ اچھی خبر ملی کہ ہوٹل موریس کے احاطے سے دو موٹریں باہر روانہ ہوئی تھیں اور ایک اندر آئی تھی مگر ان تینوں موٹروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ شاہدہ نے اس اطلاع سے براہِ راست یہی نتیجہ اخذ کیا کہ حملہ آور شدید مزاحمت کے باعث اپنے مورچے چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے مگر مجھے اس سے اختلاف تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ لوگ چھوٹی جھڑپوں میں اُلجھ کر غیر ضروری دشواریوں میں پڑنے کے بجائے مادام لواری کی مخصوص کار کی روانگی کے منتظر تھے اور شاہدہ کو واپسی میں زیادہ خوفناک حملے کا سامنا کرنا پڑتا اس لیے بہتر یہی تھا کہ کسی اور کار میں خاموشی سے ہوٹل موریس سے روانہ ہو جاتی مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں تھی۔

"وہ ڈرائیونگ سیٹ پر عورت کو دیکھتے ہی حملہ کریں گے۔"

وہ کہنے لگی: "اگر وہ واقعی باہر موجود ہیں تو کار بدل کر میں خودکشی کروں گی۔ میری اپنی کار کم از کم اسلحہ کو بیکار تو کر دیتی ہے دوسری کار میں تو ایک ہی گولی کام کر جائے گی!"

"تم نشستوں کے درمیان چھپ سکتی ہو۔ ڈرائیونگ میں کر لوں گا۔" میں نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوّل تو کار بدلنے کی صورت میں مجھے اپنے کئی آدمیوں کی نگاہ میں آنا پڑے گا۔" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "جسے میں نقاب کے باوجود پسند نہیں کرتی اور پھر چوروں کی طرح دبک کر بھاگنے میں اپنے آدمیوں کے سامنے میری تحقیر ہو گی۔ میں اپنے آدمیوں کی خود اعتمادی اور انا کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔ وہ میرے اشاروں پر صرف اسی لیے ناچتے ہیں کہ میری بے خوفی اور حوصلے کی لرزہ انگیز کہانیاں اُن کے علم میں ہیں!"

بحث کے نتیجہ خیز ہونے سے پیشتر ہی ریڈیو روم سے ٹیلی فون پر پیغام آ گیا اور شاہدہ اس طرف متوجہ ہو گئی۔

اس کی تمام تر گفتگو میرے سر پر سے گزرتی رہی مگر ایک دو بار اُس کے لہجے میں نمودار ہونے والے ہیجان اور گفتگو کی طوالت نے موضوع کی اہمیت واضح کر دی تھی۔

"اسرائیلی سفارت خانے کی عمارت ملبے کا ڈھیر بنا دی گئی!" ٹیلی فون آف کرتے ہی شاہدہ فتح کے نشے میں سرشار لہجے میں بولی۔

"تمھارا یہ فیصلہ جنون کا مظہر تھا۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"جنون!" وہ بپھر گئی۔ "اگر تم بھرپور انتقام کو جنون کہتے ہو تو مجھے فخر ہے کہ میں اوّل درجے کی جنونی ہوں۔ اگر میرا بس چلتا تو یہی کارروائی تل ابیب میں اسرائیلی وزیرِ اعظم کی قیام گاہ پر کراتی تاکہ اسرائیلیوں کو مادام لواری کے مرتبے کا احساس ہوتا۔"

"تمھارا نام بھی نہیں آئے گا۔ یہ تخریبی کارروائی بھی ہمیشہ کی طرح فلسطینیوں کے سر ڈال دی جائے گی۔"

"وہ جو چاہیں پروپیگنڈہ کریں مگر اُن کے بڑوں کو اصل نوعیت سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی۔ حملے میں میرا ایک آدمی بھی پکڑا گیا ہے!" وہ بدستور برہم تھی۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم نے میری موثر انتقامی کارروائی کو جنون کا نام کیوں دیا!"

"اس اندھا دھند حملے میں بے گناہ بھی مارے گئے ہوں گے!"

"بے گناہ۔" وہ زہریلے انداز میں مسکرا دی۔ "سانپ کے بچے سپولیے ہونے میں صفدر صاحب! زبانی حد تک یہودیوں سے بڑا نرم دل [illegible] عملی طور پر اُن سے زیادہ سنگدل تمھیں روئے زمین پر ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ وہ تو سفیر کی قسمت اچھی تھی کہ حملے کے وقت عمارت میں نہیں تھا ورنہ وہ بھی جہنم داخل ہو گیا ہوتا۔"

"کتنے آدمی مرے ہوں گے اس حملے میں؟"

"میرے آدمی وہاں مردم شماری کے لیے نہیں گئے تھے۔ یہی غنیمت سمجھو کہ حملے سے نصف گھنٹے پیشتر ملاقاتیوں کا وقت ختم ہو چکا تھا اور اس وقت وہاں صرف سفارت خانے کا عملہ ہی رہ گیا تھا۔ تفصیل اخباروں میں آ جائے گی!"

"اس چکر میں فیس مار کیڈو کے بعد تم نے اپنا دوسرا آدمی کھویا ہے!"

"میں نے اپنے آدمیوں کو اسرائیلی سفیر کی گھات میں لگا دیا ہے۔" وہ بولی۔ "ہم اُسے یرغمال بنا کر اپنا آدمی چھڑائیں گے!"

شاہدہ کو مطلوبہ اطلاعات مل چکی تھیں۔ اُس نے اپنی ہدایات بھی تلف کر دی تھیں لہٰذا وہ روانگی کے لیے تیار ہو گئی۔

شاہدہ کے ہمراہ لفٹ سے نیچے آ کر میں اس کی کار میں بیٹھا تو مجھ پر ایک بار پھر بے چینی سی طاری ہونے لگی۔ میری دانست میں شاہدہ ہوٹل موریس سے روانگی میں عجلت سے کام لے رہی تھی۔ وہاں حملہ کرنے والے اسرائیلی ہی تھے تو انھیں اتنی مہلت ضرور ملنی چاہیے تھی کہ انھیں اپنے سفارت خانے کے عبرتناک انجام کی خبر مل سکے اور وہ ذہنی طور پر پسپائی اختیار کرنے پر قائل ہو سکیں۔

میں نے یہی بات شاہدہ کے سامنے رکھی تو اس نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔ "اپنے سفارت خانے کے بارے میں خبر ملنے کے بعد وہ زیادہ خونخوار ہو جائیں گے۔ اگر وہ واپس جا چکے ہیں تو ایک بار پھر ہوٹل موریس پر لوٹ پڑیں گے اور میں اندر پھنس کر رہ جاؤں گی جب کہ میں یہ معاملات ختم ہونے تک حتی الامکان ہوٹل موریس سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں!"

مجھے یاد آگیا کہ وہ مجبوراً ہوٹل موریس آئی تھی تاکہ وہاں لکھے ہوئے ایسے کاغذات تلف کر سکے جن سے اُس کی اپنی ذات یا اس کے معزز دوستوں پر روشنی پڑتی ہو!

وہ اسرائیلیوں کے مقابلے میں خائف نہیں تھی مگر دو کر دو نکات نے اُس کے اعصاب پر واقعی اثر ڈالا تھا۔

اوّل تو شین مارکیڈو کی پُراسرار روپوشی تھی اور دوئم مقامی پولیس کی وہ سرگرمیاں جو میری اور شاہدہ کی تلاش کے ضمن میں جاری تھیں ہر بڑے مجرم کی طرح شاہدہ کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ قانون کے محافظوں سے براہِ راست تصادم سے گریز کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اپنی بقا کی جنگ جاری رکھی جائے!

اس نے اپنی کار اسٹارٹ کر کے گیراج سے نکالی اور باہر نکل کر گیراج کا دروازہ بند کیا تو مجھے ہوٹل موریس کے احاطے میں کئی مسلح محافظ گھومتے نظر آئے جو پہلے وہاں نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے شانے سے رائفل یا اسٹین گن جھول رہی تھی اور وہ سب نیم فوجی قسم کی وردیوں میں ملبوس تھے۔

شاہدہ نے پہلے گیئر میں اپنی کار نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھائی جس کے نتیجے میں پچھلے ٹائر پختہ راستے پر چیخ اٹھے اور پھر اس کی کار زنّاٹے کے ساتھ ہوٹل موریس کے پھاٹک سے گزر گئی۔

مجھے خاصا یقین تھا کہ شاہدہ کی کار پر دوبارہ حملہ ہوگا مگر جب ہوٹل موریس سے کافی دور نکل آنے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا تو تھوڑی سی مایوسی کے باوجود میں نے اطمینان کا سانس لیا کم از کم ایک فوری خطرہ ٹل گیا تھا۔

راستے میں ایک جگہ شاہدہ نے کار کی رفتار سست کی تو میں چونک پڑا کیونکہ میری دانست میں اس کی خفیہ قیام گاہ ہوٹل موریس سے خاصے فاصلے پر تھی۔

"کیا ارادہ ہے؟"

"ذرا اسرائیلی سفارت خانے پر بھی ایک نظر ڈال ہی لی جائے!" اس نے دبے لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"اگر تم مصائب کو دعوت دینے پر ہی تلی ہوئی ہو تو ضرور اُدھر چلو!"

"وہاں رکیں گے نہیں، بس گزرتے چلے جائیں گے" وہ راستہ تبدیل کرنے سے قبل میری رضامندی حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔

"یہ نہ بھولو کہ تمہارا ایک آدمی پکڑا گیا ہے اور تمہاری کار ہزاروں میں بھی الگ سے شناخت کی جا سکتی ہے!" میں نے اسے تنبیہ کی۔

"تمہاری مرضی!" اس نے مایوسانہ لہجے میں یہ کہہ کر کار کی رفتار تیز کر دی۔

اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ کر شاہدہ نے مخصوص کار پرائیویٹ گیراج میں بند کر دی اس کی دوسری کار بدستور پورچ میں موجود تھی۔

اس مکان میں وہ میرا تیسرا چکر تھا۔ پہلے دو بار شاہدہ باہر ہی سے کار تبدیل کر کے واپس روانہ ہو گئی تھی مگر اس روز ہمیں وہاں قیام کرنا تھا۔

وہ مکان اندر سے نسبتاً سادہ مگر پُرآسائش تھا۔ شاہدہ نے اندر پہنچتے ہی سب سے پہلے برقی ہیٹرز آن کئے تاکہ یخ بستہ کمروں میں اتنی حرارت پیدا کی جا سکے کہ لباس تبدیل کرتے ہوئے جھرجھریاں نہ لینی پڑیں پھر وہ فون پر ایک کال کرنے لگی۔

اپنے جسموں کو حرارت پہنچانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہوئے میں نے بے تکلفانہ فضا کا فائدہ اٹھا کر تھوڑی سی پیش قدمی کی مگر شاہدہ نے اس ضمن میں کسی رعایت سے کام نہیں لیا شاید اس طرح وہ مجھے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اس کی دلجوئی کرنے کے بجائے آرام کرنے کو ترجیح دی۔

شام کو اس مکان میں پہلی بار ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز ابھری گفتگو جو بھی رہی ہو مگر شاہدہ کے حلق سے ابھرنے والی خرخراہٹیں اس بات کی غماز تھیں کہ فون کرنے والا کوئی اچھی خبر نہیں سنا رہا تھا۔

"وہ مل گیا۔" فون رکھتے ہی وہ میری طرف گھوم کر بولی۔

"کس کا ذکر ہے؟" میں نے سکون سے پوچھا۔

"پولیس نے کسی نامعلوم شخص سے فون پر اطلاع پا کر ایک کوڑے دان سے شین مارکیڈو کی لاش برآمد کی ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "اسرائیلی مقابلے پر تُل گئے ہیں، شاید اس طرح انہوں نے سفارت خانے پر حملے کا جواب دیا ہے۔"

"چلو کم از کم یہ تو طے ہو گیا کہ وہ پولیس کی قید میں نہیں تھا۔"

"اتنی بے رحمی سے ذکر نہ کرو اس کا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "وہ میرے بہترین آدمیوں میں سے تھا۔ اس کی موت کا قلق ہے۔"

"فطری بات ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "اطلاع دینے والا کون تھا۔۔۔؟"

"میں نے یہاں منتقل ہونے سے پہلے مادام لواری کی جنبش ہدایت جاری کرا دی تھی کہ شین مارکیڈو کی بازیابی تک مقامی معاملات شاہدہ کے مشورے سے طے کئے جائیں گے مگر اس کی جگہ سنبھالتے ہی اسی کی موت کی خبر سننی پڑی ہے!" اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ شین مارکیڈو کی موت کا صدمہ تھا جو شاہدہ کے لئے بجو کا بن رہا تھا مگر مادام لواری سے کسی خارش زدہ کتے کی طرح لپٹا رہا تھا۔

"اب بات بڑھ جانے کے بجائے چند روز تک سکون سے حالات کا جائزہ لینا چاہئے۔" میں نے اسے تجویز پیش کی۔

"تاکہ کسی کوڑے دان پر ایک اور لاش ملے!"

"تمہارے آدمی موم کے پُتلے تو نہیں ہیں۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "کہ وہ جب اور جسے چاہیں، ذبح کر کے کوڑے پر پھینک دیں۔"

"ہمارا دوسرا آدمی بھی ان ہی کے قبضے میں ہے!"

"مگر اسے تو پولیس نے گرفتار کیا تھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "ہمارے آدمی کو سفارت خانے کے محافظوں نے پکڑا تھا مگر ان لوگوں نے پولیس کو اس کی رپورٹ نہیں دی!"

"الجھاوے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔" میں تشویش آمیز لہجے میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

"اسرائیلی سفیر اور اس کے زندہ بچ جانے والے عملے کو مقامی حکام نے مسلح محافظ فراہم کر دیئے ہیں اور سفارت خانے کی تباہی کے بعد سفیر کی قیام گاہ پر بھاری پہرہ لگا دیا گیا ہے ورنہ آج رات وہاں بھی دو چار دستی بم پھینکے جا سکتے تھے۔" وہ بولی۔ "یہ تحفظ زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکتا، میں برسلز میں اسرائیل کے سفارتی دفاتر اور عملے کا قیام ناممکن بنا دوں گی۔"

"انہیں بھی تمہاری قوت کا اندازہ ہوگا پھر آخر وہ تصادم پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟" میرے لئے یہ سوال واقعی اہم تھا۔

"ان کی دانست میں تمہیں ان کے حوالے نہ کر کے میں نے ناقابلِ تلافی جرم کیا ہے اور پھر وہ بریگیل بورچ اور اس کے ساتھی کے لہو کا انتقام بھی لے رہے ہوں گے۔"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی بڑی غلط فہمی کارفرما ہے!" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہیں کسی یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد ہونا چاہئے تھا۔" وہ جھلا کر لہجے میں بولی۔ "ہر بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور تم غلط فہمی لئے بیٹھے ہو، مجھے بتاؤ کہ تمہیں غلط فہمی کہاں نظر آتی ہے؟"

"تم اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق فیصلے کئے جاؤ۔" میں نے اکتا کر کہا۔ "میں تمہیں دوستی کی بنا پر صرف مشورے ہی دے سکتا ہوں۔"

"نادان دوست سے بڑا دشمن آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔" وہ مضحکانہ لہجے میں بولی۔ "میں نے آج رات اسرائیلی ایئر لائن کے مقامی دفتر کی تباہی کا بندوبست کر لیا ہے، میں ان کے ہر مفاد کو نشانہ بنانے پر تُل گئی ہوں۔"

"اسرائیلی سفیر کے سامنے جا کر صرف مسکرا بھی دو گی تو وہ تمہارے قدموں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے گا۔" میں نے موضوع کی تلخی کو کم کرنے کے لئے کہا اور وہ بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔

اس روز کافی دیر تک شاہدہ کے لئے فون آتے رہے اور وہ خود بھی وقفے وقفے سے فون کرتی رہی۔ اس کی کیفیت کسی زخمی شیرنی سے مشابہ تھی جسے اس کے دشمن کے سامنے آہنی پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔

اس نے کئی بار کہا کہ وہ پولیس سے نہیں ٹکرانا چاہتی تھی اور اگر پولیس اس کی راہ پر نہ ہوتی تو وہ چند گھنٹوں میں ہی اسرائیلیوں کو برسلز سے بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیتی۔

شاہدہ کے لئے آخری فون کال رات کے دو بجے آئی جب وہ بھاری مے نوشی کے بعد سرور کے عالم میں نہایت بلیغ انداز میں زندگی کے کلیدی رموز پر بات کر رہی تھی۔

پیغام سن کر شاہدہ فرطِ مسرت سے اچھل پڑی۔ اس کے آدمیوں نے ال ایل کے دفتر کو راکھ اور ملبے کے ڈھیر میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اسرائیلی فضائی کمپنی کے دفتر کو برباد کرنے کے بعد ان میں سے کسی نے پبلک فون بوتھ سے اسرائیلی سفیر کی رہائش گاہ پر یہ پیغام دے ڈالا تھا کہ اگر صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل خفیہ قیدی زندہ و سلامت رہا نہ ہوا تو اگلا دن اسرائیلیوں کے لئے نہایت ہولناک ثابت ہوگا۔

شاہدہ کے بیان کے مطابق وہ پیغام اس احتیاط کے ساتھ دیا گیا تھا کہ اگر مقامی حکام اسرائیلی سفیر کا فون ٹیپ بھی کر رہے ہوں تو یہ نہ سمجھ سکیں کہ پیغام کس کی طرف سے اور کس بارے میں دیا گیا تھا مگر متعلقہ افراد کے لئے ہر بات واضح ہو جاتی۔

"اب میں سکون سے سو سکوں گی۔" شاہدہ نے تفصیل دہرانے کے بعد کہا۔ "لیکن تم وعدہ کرو کہ مجھے سوتا ہوا چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟"

"احمقانہ باتیں نہ کرو۔" میں نے وعدے سے گریز کرتے ہوئے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "باہر کے مخدوش حالات میں میں زیادہ خطرات مول نہیں لے سکتا۔"

"خطرات سے لڑ کر تو تم زندگی حاصل کرتے ہو۔" اس نے فوراً ہی میرے الفاظ دہرا دیئے۔ "اگر تم وعدہ نہیں کرو گے تو میں خواب گاہ کے دروازے مقفل کر دوں گی۔"

"جو چاہے کرتی پھرو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" میں نے

لاپرواہی سے کہا۔

اس نے سونے سے پہلے واقعی دروازہ مقفل کر دیا اور چابی اپنے شب خوابی کے لباس میں اس طرح چھپالی کہ میں اس کی لاعلمی میں چابی پر قابض نہ ہو سکوں۔

اگر میں نے سکون کے لئے مے نوشی کا سہارا نہ لیا ہوتا تو ان بدترین حالات میں تھوڑی دیر کے لئے بھی سونا محال ہوتا مگر میں بستر پر دراز ہوتے ہی گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلنے کا سبب ٹیلی فون کی گھنٹی کا مسلسل شور تھا۔

اس سے پیشتر کہ میں بستر چھوڑ کر فون کی طرف جاتا، شاہدہ بھی بیدار ہو گئی اور کمبل اچھال کر تیزی سے فون پر پہنچ گئی۔

فون پر وہ کافی دیر تک مصروف رہی اور جب واپس آئی، تو اس کے حسین چہرے پر تفکر کی گہری پرچھائیاں نمایاں تھیں۔

میں اسے چھیڑنے کے بجائے خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

"تمہارے شبہات درست ثابت ہو رہے ہیں!" وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر بیٹھتے ہوئے فکرمندانہ لہجے میں بولی۔

"کیسے شبہات؟" میں کچھ نہ سمجھ سکا تھا۔

"اسرائیلیوں نے ہمارا آدمی رہا کر دیا ہے انہوں نے صلح کا پیغام بھیجنے کے ساتھ ہی اس شخص کے ذریعے یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے، کہ مادام لواری یا اس کا کوئی بااختیار نمائندہ ان سے براہ راست رابطہ قائم کرے۔"

"بڑی اچھی بات ہے، اس میں میری تشویش کا کون سا پہلو ہے؟" میں نے لاپروایانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے رسٹ واچ پر نظر ڈالی جو صبح کے چھ بجا رہی تھی۔

"تم نے پہلے ہی کسی غلط فہمی کی نشاندہی کی تھی۔ انہوں نے حیرت ظاہر کی ہے کہ میں ان کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہوں۔ ان کی دانست میں میرا سارا عتاب بروغیل بوچ کے رویئے کا نتیجہ ہے۔ انہیں شین مارکیڈو کی لاش کی دستیابی کی اطلاع مل چکی ہے اور انہوں نے خاص طور پر اس کے قتل سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔"

"نادان دوستوں کو اعتماد میں لینا حماقت ہوتا ہے بے بی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "میں سنجیدگی سے فلسفہ پڑھانے کے امکانات پر غور کر رہا ہوں۔"

"غلطی معاف کر دو۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب تک کیا ہوتا رہا ہے۔ پولیس اگر ان معاملات میں ملوث ہوتی تو آنکھ مچولی کے بجائے کھل کر سامنے آتی، اسرائیلی خود کو معصوم بتا رہے ہیں پھر تیسرا کون پیدا ہو گیا۔۔۔؟"

"تمہاری کار پر حملے کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔۔۔؟"

"اس واقعے سے شاید وہ یکسر لاعلم ہیں۔ ایسا ان سے مل کر ہی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے!"

"ان سے کون ملے گا؟ مادام لواری یا شاہدہ؟"

"شاہدہ ہی ملے گی۔" وہ بولی۔ "مگر یہ خطرہ بھی ہے کہ کہیں اسی طرح میں چوہے دان میں نہ پھنس جاؤں۔"

"اسرائیلی پہلے تمہارے دشمن نہ رہے ہوں مگر اب وہ جانی اور مالی نقصانات کو یوں ہنستے کھیلتے برداشت نہیں کریں گے"

"وقتی طور پر وہ سب کچھ کر سکتے ہیں" وہ بولی "انہیں اندازہ ہے کہ میری مخاصمت مول لے کر وہ یورپ کے کئی ممالک میں کام نہ کر سکیں گے۔"

"تم سوچتی رہو، مجھے تو نیند آرہی ہے!" میں نے اپنے اوپر کمبل تان لیا۔

"میں ان کے کسی آدمی کو یہاں کیوں نہ بلالوں؟" اس نے کمبل کھینچتے ہوئے سوال کیا۔

"ضرور بلاؤ مگر پہلے مجھے رخصت کر دو!"

"تم دوسرے کمرے میں رہو گے!" وہ بے بسی سے بولی "اور میرے آدمی اس مکان کے گرد سخت محاصرہ قائم رکھیں گے کہ کوئی چالبازی نہ ہو سکے!"

"یعنی تم اس خفیہ ٹھکانے کی تشہیر کرو گی؟" میں نے کہا "اگر ملاقات کرنا ہی چاہتی ہو تو پھر کسی غیر گنجان علاقے میں کوئی جگہ منتخب کرو تاکہ نگرانی کرنے والوں کو سہولت ہو!"

"یہ بندوبست نئے کاٹیج میں بھی ہو سکتا ہے، ویسے تم کس کے حامی ہو؟"

"میری حمایت کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟" لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"کبھی کبھی آدمی دیواروں سے بھی مشورہ کر لیتا ہے!" وہ بولی۔

"میں حامی ضرور ہوں مگر تم یہ بتاؤ کہ پہلے اپنے فیصلے کیا کرتی تھیں؟"

"میرے فیصلے انفرادی ہوا کرتے تھے مگر تم رفتہ رفتہ ضرورت بنتے جا رہے ہو اور پھر تمہاری رائے خاصی معقول ہوتی ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کے بعد وہ ٹیلی فون پر مصروف ہو گئی۔ ایک دو ہدایات دینے اور پھر پیغامات وصول کرنے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ اسرائیلی سفارت خانے سے آیا ہوا ملٹری سیکرٹری نو بجے کے ساتھ کاٹیج پر پہنچے گا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد شاہدہ اپنی ماں کا ساتھ روانہ ہو گئی۔ ٹھیک پونے نو بجے ہم دونوں ایک مرتبہ پھر کاٹیج میں موجود تھے جہاں میرے ہاتھوں شاہدہ کا ایک آدمی مارا گیا تھا۔

مقررہ وقت پر ڈور بیل کی آواز سنتے ہی شاہدہ مجھے خوابگاہ میں چھوڑ کر باہر چلی گئی اور میں دروازہ بند کر کے کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا جہاں ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو بآسانی سنی جاسکتی تھی!

چند لمحوں بعد شاہدہ کسی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور دونوں ہنس ہنس کر موسم پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

چند رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد آنے والے نے براہ راست اصل موضوع چھیڑ دیا "میری حکومت کو موجودہ حالات پر سخت تشویش ہے، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ تمہاری کارروائیوں کا نشانہ کیوں بن رہے ہیں؟"

"تلخیوں کی ابتداء بروغیل بوچ کے رویئے سے ہوئی تھی" شاہدہ کا لہجہ نپا تلا اور پروقار تھا "یہ اتفاق ہے کہ مادام کی جانب سے میں اس معاملے پر مامور تھی اور بروغیل نے بزور طاقت مجھ سے ان چیزوں کا اقرار کرانا چاہا جن سے میں خود لاعلم تھی!"

"بروغیل کے رویئے پر میں اپنی اور اسرائیلی حکومت کی طرف سے معافی کا خواستگار ہوں!" اس کی آواز میں خلوص جھلک رہا تھا "جس روز بروغیل کے ساتھی کی لاش ہمارے سفارت خانے کے پاس ڈالی گئی اور شین مارکیڈو نامی شخص پولیس کی نظروں میں آیا، ہم لوگ سمجھ گئے تھے کہ بروغیل تم لوگوں کے ساتھ دوستانہ مراسم برقرار رکھنے میں ناکام رہا ہے۔ دراصل اسرائیلی سیکرٹ سروس کے لئے صفدر علی کے حصول کا معاملہ خاصی جذباتی اہمیت رکھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بروغیل بوچ جیسا پرانا اور تجربہ کار شخص بھی حدود سے تجاوز کر گیا مگر ہمیں اس کی سلامتی کی بھی فکر ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کرنل ڈیوڈ! بروغیل بوچ اپنی ہٹ دھرمی کے باعث اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مادام سرکشوں کو قطعی برداشت نہیں کرتیں!" شاہدہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"اوہ!" کرنل ڈیوڈ کی طویل آواز ابھری۔ چند ثانیوں کے لئے سکوت رہا پھر اس کی بوجھل آواز سنائی دی "بروغیل کا معاملہ جب افسوسناک انداز میں طے ہو گیا تو پھر ہمارے خلاف کارروائیوں کا کیا سبب تھا؟"

"مادام لواری کے فیصلوں میں ہم لوگ شریک نہیں ہوتے۔" شاہدہ نے نہایت خوبصورتی سے بات ٹال دی "ویسے میرا خیال ہے کہ ان کے محرکات بھی تمہاری جانب سے پیدا ہوئے تھے!"

"مجھے کل رات باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ ہوٹل موڈیس کے مقابل مادام لواری کی کار پر اندھا دھند گولیاں چلائی گئی تھیں۔" کرنل ڈیوڈ نے مذبذب سے کہا "کہیں تم اس واقعہ کا حوالہ تو نہیں دے رہی ہو کیونکہ اس کے بعد ہمارے سفارت خانے پر شدید ترین حملہ کیا گیا تھا!"

"یہ میرا اپنا خیال ہے" شاہدہ نے کہا "ہو سکتا ہے کہ سفارت خانے کو نشانہ بنانے کے دوسرے اسباب بھی رہے ہوں"

"اس حملے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا" کرنل ڈیوڈ کی آواز سنائی دی

"یہ وضاحت میں مادام تک پہنچا دوں گی!"

"اور شین مارکیڈو کی ہلاکت سے بھی ہم لاتعلق ہیں" کرنل ڈیوڈ نے کہا "ہم نے سفارت خانے پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک آدمی ضرور پکڑا تھا مگر جب ہمیں علم ہوا کہ اس کا تعلق مادام سے ہے تو ہم نے اس شخص کو پولیس کے حوالے نہیں کیا، اس کے ذریعے ہم مادام سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بے چین تھے مگر ہمارے اس اقدام کو بھی بدقسمتی سے غلط سمجھا گیا"

"شین مارکیڈو کا قصہ تازہ تھا" شاہدہ نے کہا "دوسرے شخص کا بھی اسی جیسا حشر ہو سکتا تھا"

"میں بتا چکا ہوں کہ شین مارکیڈو کے قتل میں ہمارا ہاتھ نہیں تھا" کرنل ڈیوڈ کے لہجے میں دبا دبا احتجاج نمایاں تھا۔

"وہ تمہاری اپنی بات ہے" شاہدہ نے اس کے احتجاج کا اثر لئے بغیر بے رحمانہ لہجے میں کہا "اگر تم ہماری جگہ ہوتے تو ان ہی اندیشوں کو محسوس کرتے!"

"بہرحال میں نے اپنی حکومت کی طرف سے ساری وضاحت کر دی ہے اور ہم فوری طور پر محاذ آرائی کا خاتمہ چاہتے ہیں" کرنل ڈیوڈ کے لہجے سے اضطراب نمایاں تھا۔

"یہ معاملہ اب تین فریقوں کے درمیان ہے" شاہدہ اس سے نہایت سکون سے گفتگو کر رہی تھی "ہم پولیس کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے!"

"اپنے قوی شبہات کے باوجود ہم نے سفارت خانے اور آل ایل کے دفتر کی تباہی کے سلسلے میں مادام لواری کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا بلکہ ان تخریبی کارروائیوں کو فلسطینیوں سے ہی منسوب کرنے کی کوشش کی ہے" کرنل ڈیوڈ کہہ رہا تھا "اور پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پولیس ساری عمر بھی تفتیش میں سر کھپاتی رہے تو تم لوگوں تک نہیں پہنچ سکے گی!"

"میں تمہاری نیک خواہشات مادام تک پہنچا دوں گی!"

"مگر میں جواب چاہتا ہوں۔ تل ابیب ان مذاکرات کے نتیجے کا منتظر ہے میں نے اسی لئے کسی بااختیار نمائندے کی شرط رکھی تھی!" کرنل ڈیوڈ کی آواز میں بے چینی کا عنصر بڑھتا ہی جا رہا تھا اور میں اس کی گفتگو سن کر حیران ہوا جا رہا تھا۔

اسرائیلی حکومت اپنی تمام تر غیر اخلاقی سرگرمیوں کے باوجود مہذب جمہوریت ہونے کی دعوے دار تھی مگر اس کے کرتوت انتہائی گھناؤنے تھے۔ وہ لوگ امن اور قانون کی بالادستی قائم کرنے کے لئے کام کرنے کے بجائے جرائم پیشہ لوگوں سے اعلیٰ سرکاری سطح پر مذاکرات کرنے میں بھی عار نہیں سمجھتے تھے۔ اسی پر بس نہیں تھی بلکہ وہ دیدہ و دانستہ ان جرائم کی ذمہ داری بھی نہایت بے حیائی سے فلسطینیوں پر تھوپنے کو تیار رہتے تھے جن میں دور دور تک ان کا دخل بھی نہ ہو مگر مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میرا نام رفتہ رفتہ ان سازشی اور مکار اہلکاروں کی بدترین کمزوری بنتا جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، دو طرفہ بنیاد پر محاذ آرائی سے گریز کیا جائے گا" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد شاہدہ کی آواز ابھری۔

"میں اس فیصلے کے لئے شکر گزار ہوں" کرنل ڈیوڈ کا لہجہ واقعی تشکر آمیز تھا۔ "اور اب میں صفدر علی کے معاملے پر آنا چاہوں گا۔"

"بروغیل کی پیدا کی ہوئی تلخی کے بعد اس معاملے میں پیش رفت نہ ہو سکے گی۔" شاہدہ کا جواب قطعی دو ٹوک تھا۔

"ہمیں شبہ ہے کہ صفدر علی ابھی تک بروسیلز میں ہی ہے۔" کرنل ڈیوڈ نے شاہدہ کے جواب کا اثر لئے بغیر ڈھٹائی سے کہا "وہ اسرائیل کی قومی سلامتی کے خلاف سنگین جرائم کا مرتکب ہوا ہے اور ہم اسے ہر قیمت پر اپنا قیدی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"اس موضوع پر بات نہیں ہو سکتی کرنل!" شاہدہ نے اعتماد سے اپنی بات دہرائی۔

"ہم ہر شرط تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں جو ہمارے اختیار میں ہو۔" کرنل ڈیوڈ نے بے صبری میں احتیاط کا دامن بھی چھوڑ دیا "میرا خیال ہے کہ وہ بروسیلز میں جس طرح روپوش ہے اس کے پیشِ نظر قوی امکان ہے کہ اسے مادام کا تحفظ حاصل ہے۔"

"مادام اپنی مرضی کی مالک ہیں۔"

"میں اپنے خیال کی تائید یا تردید چاہتا ہوں" کرنل ڈیوڈ نے کہا "ایسا نہ ہو کہ صفدر علی کے معاملے میں ہم ایک بار پھر نادانستہ طور پر ایک دوسرے کے مقابل آجائیں۔"

"مجھے امید ہے کہ تم لوگ ایسی کوئی صورتِ حال پیدا نہیں کرو گے!"

"تو میں سمجھ لوں کہ صفدر علی کو مادام کی سرپرستی حاصل ہے؟" کرنل ڈیوڈ نے زچ آ کر براہِ راست سوال کر ڈالا۔

"فی الحال یہی مناسب ہوگا" شاہدہ غالباً دل ہی دل میں کرنل ڈیوڈ کی حالت زار سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"اس جواب کے ساتھ میں اپنے ساتھیوں کو منہ نہ دکھا [illegible] گا۔"

"اس کی ذمہ داری بروغیل پر ہے جسے شاید تم [illegible] بروسیلز بھیجا تھا۔"

کرنل ڈیوڈ گفتگو کرتے کرتے خوشامد پر اتر آیا مگر [illegible] اپنی بات پر اڑی رہی اور کرنل بے نیل و مرام واپس [illegible] گیا۔

شاہدہ اسے باہر چھوڑ کر واپس آئی تو اس کا چہرہ [illegible] کے احساس سے دمک رہا تھا "تم نے سن لیا کہ وہ تمہارے [illegible] لئے کتنے بے چین ہیں؟"

"تمہارا رویہ میرے لئے ناقابلِ فہم ہے تم یہاں [illegible] پر کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس سے بہتر یہ ہوگا کہ منہ مانگے معاوضے پر تمہیں [illegible] ہاتھ فروخت کر دوں" وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی "کوئی [illegible] شخص اپنی پسندیدہ چیز فروخت کرنا گوارا نہیں کرتا اور میں بھی [illegible] زمرے میں شامل ہوں۔"

"تو پھر اپنے ہاتھوں سے میرا کام تمام کر دو۔" میں نے جھلا کر [illegible]

"یہ اختیار میں ہوتا تو اب تک میں تمہیں بھول بھی چکی ہوتی" کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔

کاٹیج سے دوبارہ اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد شاہدہ [illegible] تھی۔ اس کی دانست میں اسرائیلیوں کا خطرہ نمٹ چکا تھا اور بروغیل کی سرگرمیاں پریشانی کا باعث تھیں اس کو پورا یقین تھا کہ شین بھی اسرائیلیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اس پر حملہ بھی ان ہی سے کیا گیا تھا مگر جب شاہدہ نے فوری اور سخت ترین ردِ عمل [illegible] کیا تو وہ فوراً ہی جھک گئے!

ان دونوں واقعات کے بارے میں کرنل ڈیوڈ کے بیان [illegible] نے سفید جھوٹ قرار دیا تھا اس کی دانست میں کرنل ڈیوڈ نے [illegible] بول کر خیر سگالی کا ماحول برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی مگر میں [illegible] پر کسی اور ہی زاویئے سے غور کر رہا تھا۔

شام کو شاہدہ مادام لیواری والی کار میں مجھے ساتھ [illegible] نکلی اور خراماں خراماں ہوٹل موریس کی طرف روانہ ہو گئی [illegible] سے صلح ہو جانے کے بعد وہ وہیں رہنا چاہتی تھی۔ مجھے [illegible] کہ وہ ہوٹل موریس میں محض میری وجہ سے رہنا چاہتی تھی کیونکہ [illegible] سے فرار ہونا میرے لئے بہت مشکل تھا مگر میں حالات [illegible] کر کسی انتہائی اقدام کے لئے بھی تیار تھا۔ مجھے محسوس ہو [illegible] شاہدہ پر ہاتھ یا ہتھیار اٹھائے بغیر خوش اسلوبی سے [illegible] گلو خلاصی ممکن نہیں تھی میں اپنی شرافت کے حصار میں خود [illegible]

جا رہا تھا۔

راستے میں شاہدہ کی کار جس وقت مست خرامی کے ساتھ ایک نسبتاً ویران اور تنگ سڑک پر دوڑ رہی تھی، پیچھے سے ایک بڑی کار [illegible] بجاتی ہوئی تیزی سے نمودار ہوئی اور آگے نکلتی چلی گئی۔ اس میں چار افراد موجود تھے!

"یہ سست کیوں ہو گئی؟" شاہدہ تشویش زدہ لہجے میں [illegible] کیونکہ آگے جانے والی کار کی رفتار کم کی جا چکی تھی اور وہ شاہدہ کی کار سے ایک مستقل فاصلے پر رواں تھی۔

میں نے پیچھے سر گھمایا تو اس طرف بھی دو گاڑیاں دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"پیچھے بھی دو گاڑیاں ہیں۔" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

"میں عقب نما آئینے میں دیکھ رہی ہوں۔"

پھر اچانک ہی آگے جانے والی کار سڑک پر ترچھی کر کے روک دی گئی اور دروازے کھول کر اندر والے چاروں آدمی باہر آگئے۔

شاہدہ کے لئے آگے نکلنے کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ اس نے جوں ہی بریک لگائے پیچھے سے گولیوں کی ایک باڑھ آئی اور پوری کار جھنجھنا اٹھی۔

شاہدہ نے انجن بند کئے بغیر ایک سوئچ پر انگلی رکھ دی اور فضا سب مشین گنوں کے ہولناک شور سے لرز اٹھی اسی کے ساتھ شاہدہ کی کار کو بھی جھٹکے لگ رہے تھے۔

شاہدہ نے اپنی کار گیئر میں ڈالی اور بالکل غیر متوقع طور پر داہنی جانب کچی زمین پر پھیلی ہوئی قدِ آدم جھاڑیوں کی طرف بڑھلوتی۔ ادھر ایک حملہ آور سینے کے بل زمین پر پڑا گولیاں چلا رہا تھا اس نے دیو ہیکل سیاہ عفریت کو وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا تو رائفل چھوڑ کر سڑک کی طرف بھاگا مگر شاہدہ نے اسٹیئرنگ کاٹ کر اسے بمپر سے کاری ضرب لگائی اور وہ اچھل کر جھاڑیوں میں جا گرا اور اگلے ہی لمحے شاہدہ کی کار قدِ آدم جھاڑیوں کے ساتھ ہی اس شخص کو بھی بے رحمی سے روندتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

فائرنگ کا رخ بدلتا رہا۔ ایک گولی ونڈ اسکرین پر ایسے خطرناک زاویئے سے لگی کہ میرے سامنے والے حصے میں شیشے پر مکڑی کے جالے سے جال جیسی لکیریں نمودار ہو گئیں مگر شاہدہ اس وقت ہر چیز کو فراموش کر چکی تھی۔ اس کی کار شدید جھٹکوں اور ہچکولوں کے درمیان آگے بڑھتی رہی۔

سڑک پر ترچھی کھڑی ہوئی کار سے آگے نکلتے ہی شاہدہ اپنی کار دوبارہ سڑک پر لے آئی۔ اس کی کار کے عقبی حصے سے نکلنے والی گولیوں نے راستہ مسدود کرنے والی کار کو بھی چھلنی کر دیا تو اس نے بٹن پر سے انگلی ہٹالی۔

قدرے آگے بڑھ کر شاہدہ نے اچانک بریک لگا دیئے اور پھر ریورس گیئر میں کار پیچھے کی طرف لے جانے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں!" وہ ان کی عددی برتری سے قطعی خائف نہیں تھی۔

اس اثنا میں شہر کی جانب سے کئی گاڑیاں آکر دوسری جانب رک گئی تھیں اور ساتھ ہی ترچھی کھڑی ہوئی کار کا انجن بھی بیدار ہو چکا تھا لہٰذا شاہدہ کو اپنی کار روکنی پڑ گئی حملہ آور شاید اسی ایک کار میں سمٹ کر فرار ہو رہے تھے۔

ان کی کار نے جیسے ہی جنبش کی، شاہدہ نے کسی بھی چیز کی پرواہ کئے بغیر ایک مرتبہ پھر فائرنگ پش بٹن پر انگلی رکھ دی اور اس بار فضا یکے بعد دیگرے دو ٹائر پھٹنے کے دھماکوں سے لرز اٹھی ان کی کار لہراتی ہوئی دوبارہ رک گئی اور شاہدہ نے اپنی کار آگے دوڑا دی۔!

مجرموں کی تعداد تشویشناک حد تک زیادہ تھی اور اس وقت اپنی کار سے باہر قدم رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا لہٰذا شاہدہ نے ان کے بارے میں تجسس کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

"اپنے آدمیوں کو جائے واردات پر بھیجو!" میں نے چند ثانیوں کے بعد کہا "ان کی تینوں گاڑیاں برباد ہو چکی ہیں اور پیچھے سے ٹریفک آجانے کے باعث وہ اتنی جلدی اپنے زخمیوں اور خاص طور پر کچل کر مرنے والے کو نہ لے جا سکیں گے۔"

"ٹرانسمیٹر استعمال کرنا پڑے گا۔"

"اب تو شین مارکیٹڈو کے بارے میں پتہ چل ہی چکا ہے کہ وہ پولیس کے قبضے میں نہیں تھا اگر اسرائیلی سنتے ہیں تو پیغام سن لیں، فرق کیا پڑے گا۔"

میرے ایما پر اس نے ٹرانسمیٹر پر ہوٹل موریس کے ریڈیو روم سے رابطہ قائم کیا اور ہدایات دینے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

بوجھل خاموشی اور ذہنی تناؤ کے عالم میں ہم لوگ ہوٹل موریس پہنچے۔ وہاں گیراج کا دروازہ بند کرنے کے بعد شاہدہ نے کار کا جائزہ لیا تو باڈی پر سے جا بجا رنگ اکھڑا ہوا تھا۔ گولیاں چادر پھاڑ کر دوسری طرف تو نہ گزر سکی تھیں مگر انہوں نے کار کی ہیئت بگاڑ دی تھی!

اوپر پہنچ کر شاہدہ نے جوں ہی لفٹ سے کمرے میں قدم رکھا میں نے عقب سے دبوچ لیا میرا داہنا ہاتھ پوری قوت سے اس کے دہانے پر جم گیا تھا۔

وہ وحشیانہ طاقت صرف کرکے میرے قبضے سے نکلنے کی سرتوڑ کوشش کرتی رہی اس نے میری داہنی ہتھیلی کا ایک گوشہ بھی وحشیانہ انداز میں دانتوں سے نوچ ڈالا مگر میں نے نہ ہی ہاتھ ہٹایا اور نہ گرفت کمزور ہونے دی البتہ اسے پوری طرح قابو میں رکھنے کے لئے مجھے اپنے اندازے سے زیادہ طاقت استعمال کرنی پڑی۔

چند ہی ثانیوں میں ہم دونوں بری طرح ہانپ گئے۔ مجھے سب سے زیادہ خوف یہ تھا کہ کہیں وہ کسی ایسے خفیہ بٹن تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو جائے جس کے دبلتے ہی کچھ لوگ اس کی مدد کو پہنچ جائیں۔ خطرے کو اس قدر قریب پاکر وہ اپنی شخصیت کا بھرم بھی توڑ سکتی تھی!

مگر ایسا خطرناک لمحہ آنے سے قبل ہی مجھے ایک موقع مل گیا اور میں نے اس کی کنپٹی پر بائیں ہاتھ سے یکے بعد دیگرے دو شدید ضربات لگائیں اور وہ کسی بے جان تنے کی طرح میرے بازوؤں میں جھول گئی۔

میں نے نرمی سے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا کر بستر پر ڈال دیا۔ اس وقت مجھے شاہدہ سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی پھر میں لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچ گیا۔

کار کا انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد میں نے آسانی کے ساتھ گیراج کا دروازہ کھول لیا کیونکہ میں کئی بار شاہدہ کو ریموٹ کنٹرولر سے کام لیتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

کار باہر نکالنے کے بعد میں نے شاہدہ کے معمول پر عمل کرتے ہوئے ۔۔۔ گیراج کا دروازہ دوبارہ بند کر دیا اور تیزی سے باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گو مجھے معلوم تھا کہ شاہدہ کی کار کے شیشے خصوصی ساخت کے تھے جن سے باہر کی چیزیں صاف نظر آتی تھیں مگر باہر سے اندر والوں کو دیکھنا ممکن نہیں تھا مگر پھر بھی مجھے یہی خدشہ تھا کہ باہر والے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے!

سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے میں پُرپیچ گلیوں میں کار ڈرائیو کرتا ہوا جب کافی دور نکل آیا تو میں نے موقع پاکر کار ایک جگہ پارک کر دی اور تیزی کے ساتھ اس گلی سے نکل کر شاہراہ پر آ گیا۔

وہاں سے ٹیکسی حاصل کر کے میں سینٹ ہیوبرٹ کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ سارے راستے میرا ذہن تیزی کے ساتھ سوچنے میں مصروف رہا۔ میں نہایت غیر متوقع طور پر مادام بواری کے ہولناک چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب مجھے جلد از جلد خالد عبدالفتاح کا سراغ لگانا تھا تاکہ اس کے تعاون سے نئی منزل کی طرف روانہ ہو سکوں جہاں میں سیتا سے مل سکتا تھا۔ برسیلز جیسے بھرے پرے شہر میں خالد عبدالفتاح کا پتہ لگانا آسان کام نہیں تھا خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ میرے خلاف تین محاذ کھلے ہوئے تھے مقامی پولیس اور اسرائیلیوں کے ساتھ ہی اب شاہدہ بھی میری دشمن ہو چکی تھی۔!

سینٹ ہیوبرٹ میں ٹیکسی سے اترتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتی ترکیب ابھر ہی آئی۔

شین مارکیڈو کی قیامگاہ کا نمبر میرے پاس تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ اگر میں اس نمبر پر بل سے گفتگو کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال سکے گا۔

ایک پبلک بوتھ سے میں نے شین مارکیڈو کے مکان کا نمبر ملایا تو دوسری جانب سے ایک کرخت مردانہ آواز میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

"مسٹر بل!" میں نے حتی الامکان اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنا مطلوبہ نام دہرایا۔ طویل فقرہ استعمال کرنے میں خطرہ تھا کہ وہ الفاظ کی بھول بھلیوں میں بل کا نام ہی نہ سمجھ سکے۔

بل کا نام سن کر اس نے مزید کچھ کہا جس پر میں نے صرف اتنا کہا "انگلش ۔۔۔۔ نو ڈچ مسٹر بل!"

اس بار لائن پر سکوت طاری ہو گیا اور چند ثانیوں بعد ہی بل مجھ سے مخاطب تھا۔

"تم فوراً مجھ سے ملو ڈارلنگ!" میں نے اس سے رابطہ ہو جانے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے براہ راست کہا۔

"او خدا ۔۔۔ تم کہاں مرے ہوتے ہو؟" میری آواز سن کر شاید وہ اپنی بے پناہ حیرت پر قابو نہ رکھ سکا۔

"میں شدید خطرات سے دوچار ہوں اور سینٹ ہیوبرٹ گیلریز میں موجود ہوں!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"تم وہیں کیفے ڈی مائیکال میں بیٹھو، میں بس ابھی آیا!" اس نے ہیجان آمیز لہجے میں اتنا کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ریسیور کریڈل پر ڈال کر بوتھ سے باہر نکلا تو کیفے ڈی مائیکال تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

میں نے کیفے کے ایک دور افتادہ گوشے میں ایسی نشست سنبھال لی جہاں سے ہوٹل میں داخل ہونے والوں پر بآسانی نگاہ رکھی جا سکتی تھی!

میں کافی منگوا کر اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پانے کے لئے سگریٹ پینے لگا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ بل کے آنے تک حالات جوں کے توں رہیں تاکہ میں مزید خطرات سے محفوظ رہ سکوں۔

میں اپنی پیالی میں کافی تیار کر رہا تھا کہ اپنی میز پر ایک سایہ دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ سر اوپر اٹھایا تو میرے سامنے خطرناک صورت والا ایک دراز قامت شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور میں غیر ارادی طور پر اپنی کرسی چھوڑ کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے کافی ختم کر لو" مجھے بوکھلاتا ہوا دیکھ کر اس نے صاف ستھری انگریزی میں کہا اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر لاپروایانہ انداز میں بیٹھ گیا۔

"تم کون ہو؟" میں نے کھڑے کھڑے ہی سرد لہجے میں سوال کیا۔

"دوست" وہ بولا "بل باہر تمہارا منتظر ہے!" اس کے الفاظ سن کر میری جان میں جان آئی اور میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کافی سے زیادہ ضروری میری اور اس کی ملاقات ہے!" میں نے اپنی کرسی چھوڑنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

"عجلت کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں" وہ محتاط لہجے میں بولا "یہاں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اسے پہچانتے ہیں ورنہ وہ خود ہی اندر آتا!"

میرے لئے سکون سے پیالی خالی کرنی مشکل ہو گئی۔ میں نے جیسے تیسے کر کے وہ تلخ سیال اپنے معدے میں منتقل کیا اور بل ادا کر کے اس کے ہمراہ باہر آ گیا۔

"ادھر!" میری رہنمائی کرنے والے نے ایک سفید کار کی طرف اشارہ کر کے کہا اور خود وہاں سے گزرنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔

میں سفید کار کے قریب پہنچا تو ڈرائیونگ سیٹ پر بل بذات خود موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فرط مسرت سے اس کی باچھیں کھل گئیں اور میں اس کے برابر والی نشست کا دروازہ کھول کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

میرے بیٹھتے ہی اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

"تم اتنی مدت سے کہاں غائب ہو؟" اس نے میری ران پر زور سے ہاتھ مار کر اپنی بانہ پرسی کی مخلصانہ ابتدا کی۔

"تمہاری مادام سے بندھا بندھا پھر رہا تھا!"

"مادام بواری کے ساتھ تھے؟" اس کی آنکھیں فرط حیرت سے یک بیک پیشانی پر جا چڑھیں "تم نے دیکھ لیا اسے؟"

"میری پرانی شناسا ہے" یہ تو اب پتہ چلا کہ وہی مادام بواری ہے" میں نے حقیقت بتانے کے بجائے نرم الفاظ اختیار کئے۔ اگر میں اسے بتا دیتا کہ مادام بواری میری پکی عاشق تھی تو شاید حیرت سے اس کی حرکت قلب ہی رک جاتی۔

"کمال ہے، کمال ہے" وہ اپنی گول مٹول کھوپڑی کو جھٹکتے ہوئے بڑبڑایا "تم پہلے آدمی ملے ہو جسے مادام بواری سے ملاقات کا دعویٰ ہے!"

"یہ بتاؤ کہ اب کہاں جا رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ماسٹر تمہارے لئے پاگل ہوا جا رہا ہے، اسی کے پاس چل رہا ہوں" اس نے پیکٹ پھاڑ کر چیونگم کا ایک پیس اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کس ماسٹر کی بات کر رہے ہو؟"

"برسیلز میں ایک ہی تو ماسٹر ہے، خالد عبدالفتاح کے علاوہ اور کس کے لئے میں ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہوں؟"

"تمہارا باکسنگ چیمپئن کہاں ہے؟" میں نے دانستہ انجان بن کر سوال کیا۔

"ارے تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں" وہ چیونگم کچلتے ہوئے موج میں آیا "میں نے اسے ایسا چونا لگایا ہے کہ عالم بالا میں بھی مدتوں یاد رکھے گا!"

"تو کیا وہ مر گیا؟" انجان بننے کے بعد میرے لئے حیرت کا اظہار ضروری ہو گیا تھا۔

"تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے اس نے تابوت میں لیٹ کر خود ہی سانس روک لیا ہو!" وہ برا سا منہ بنا کر بولا "وہ ایک زبردست سازش کا شکار ہوا ہے!"

"کیا تم مسلسل نہیں بول سکتے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"تجسس پیدا کرنا میری ہابی ہے" مجھ سے غیر متوقع ملاقات پر وہ بہت زیادہ مسرور نظر آ رہا تھا "شین مارکیڈو کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چل سکا کہ وہ اچانک ماسٹر کی قید میں کیسے پہنچ گیا اور یہ تجسس سینے میں لئے وہ مر گیا!"

"میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا!"

"ارے ناراض کیوں ہوتے ہو میری جان، میں خود ہی بتائے دیتا ہوں" وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بکر بکر کئے جا رہا تھا۔ "شین مارکیڈو کسی طرح پولیس کی نظروں میں آ گیا تھا اور چھپتا پھر رہا تھا۔ اس کی کار میں ایک لڑکی کی لاش بھی موجود تھی۔ وہ خود تو شہر کے ایک گندے علاقے میں سستے سے مکان میں چھپ گیا مگر لاش ٹھکانے لگانی بھی ضروری تھی لہٰذا اس کام کے لئے اس کی نظر انتخاب اس خادم پر پڑی۔ شین مارکیڈو سے خفیہ پیغام ملتے

ہی میں اس کی کمین گاہ پر جا پہنچا اور لڑکی کی لاش ایک گٹر میں غائب کر دی۔ واپسی پر اس نے مجھ سے شراب منگوائی اور میں نے موقع غنیمت جان کر بوتل میں سرنج کے ذریعے بے ہوشی کی دوا کی بھاری مقدار ملا دی پھر میں ماسٹر کو شین مارکیڈو کا پتہ بتا کر گھر جا پہنچا نتیجہ یہ ہوا کہ بے ہوشی کے بعد شین مارکیڈو ہوش میں آیا تو ماسٹر کے ایک ٹھکانے پر رسیوں میں جکڑا ہوا پڑا تھا۔"

"تم نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔"

"مشکل یہ تھی کہ اس سے زیادہ برا سلوک میرے بس میں نہیں تھا۔ اس کی بدزبانی سے نجات ملنے پر سارے ہی ملازم خوش ہیں مگر انہیں اپنی ملازمت کی فکر سوار ہے کسی اور جگہ اتنی تنخواہ ملنی ناممکن ہے!"

"پھر آگے کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، ماسٹر نے اسے دو چار کرتب دکھائے تو اس نے اپنا کھایا پیا تک اگل دیا اور کل مجھے پتہ چلا کہ ماسٹر نے اسے مار کر کسی کوڑے دان پر پھنکوا دیا۔ تم یقین کرو کہ اس کی موت کی خبر ملنے پر میں اس کے ورثا کے ساتھ زبردستی گلا پھاڑ پھاڑ کر خوب رویا بلکہ اب تک میرے گلے میں خراش ہو رہی ہے۔"

"تمہارا ماسٹر سے کیا تعلق ہے؟"

"جو تم سے ہے" اس نے برجستہ جواب دیا۔ "مخلص لوگوں کے لئے میں بغیر پیسے کا غلام ثابت ہوتا ہوں۔ اپنی تنظیم کے ذریعے ایک بار ماسٹر کے لئے کام کیا تھا بس اسی وقت سے اس کا گرویدہ ہوں۔"

"ریڈ بریگیڈ کے آدمی ہو؟"

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا پھر کسی معصوم بچے کی طرح ہنس دیا "معلوم ہے تو پوچھ کیوں رہے ہو؟"

"شین مارکیڈو کے سارے گھریلو ملازم مادام بواری سے وابستہ ہیں؟" میں نے ایک امکانی خطرے کے پیش نظر سوال کیا۔

"چار کے علاوہ باقی سب اس کے نجی ملازم ہیں۔"

"میرا فون کس نے ریسیو کیا تھا؟"

"اس کا مادام بواری سے کوئی تعلق نہیں، اس چھت کے نیچے پایا جانے والا احمق ترین شخص قرار دیا جا سکتا ہے۔" یہ کہنے کے بعد اس نے موضوع بدل دیا "میری کہانی میں تمہارے لئے اب کچھ نہیں رہا، یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کیوں فون کیا تھا؟"

"ماسٹر کا پتہ مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"آج کل اس کے دوست بھی اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہتے ہیں۔"

وہ تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ویسے تم مادام بواری کے ہاتھ کیسے لگے؟"

"شین مارکیڈو سے رہائی پانے کے بعد اس نے مجھاپ ... کیسی طبیعت ہے؟" اس نے نڈھیلے پن سے پوچھا۔

"عورت خاصی لذیذ اور خوبرو ہے۔" میں نے مسکرا کر ...

"اوہ خدا ..." اس نے اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا ...

"اور تم کہہ رہے تھے کہ اتنے روز تک اس کے قیدی تھے!"

وہ مجھ سے کرید کرید کر مادام بواری کے بارے میں سوال کرتا رہا۔ اور جوابات سن کر اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوتا رہا ... میں نے اسے یہ یقین نہیں دلایا کہ مادام بواری کو شاہدہ کے روپ ... کہیں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

اسی اثنا میں بل نے ایک جگہ کار روک دی اور ہم دونوں ... ہواؤں کا مقابلہ کرتے پیدل ہی تنگ و تاریک گلیاں عبور کرنے لگے ... چند منٹ بعد بل ایک بوسیدہ کوٹھری کے دروازے ... مخصوص انداز میں دستک دے رہا تھا۔ دستک کے جواب میں ... ہی دروازہ کھول دیا گیا۔

بل کے ساتھ مجھے دیکھ کر خالد عبدالفتاح ہکا بکا رہ گیا۔ جب اس کی حیرت کچھ کم ہوئی تو اس نے والہانہ انداز میں مجھے اپنے ... سے لپٹا لیا۔

"بیروت، بن غازی اور پیرس سمیت ہمارے ہر اسٹیشن ... تمہارے بارے میں سخت تشویش پھیلی ہوئی ہے اور میں خود کو ... سمجھ رہا ہوں۔" بغل گیر ہوتے ہوئے اس نے جذبات سے ... ہوئی آواز میں کہا۔ "تم خیریت سے تو ہو نا ...؟"

"اس نے عیش کئے ہیں ماسٹر۔" میرے بجائے بل ... پڑا۔ "یہ تمہیں بتائے گا کہ مادام بواری کون اور کیسی ہے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ تم اس کے قیدی ہو مگر میں اپنی ... کے باوجود تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا۔" خالد عبدالفتاح بولا۔

اس وقت بل واپسی کے لئے اٹھ گیا "میرا کام پورا ہو ... تم دونوں آپس میں دل کھول کر گلے شکوے کرتے رہو۔" خالد عبدالفتاح نے اسے روکنے کی بہتیری کوشش کی ... بل واپس چلا گیا۔

"بل نے مجھے شین مارکیڈو کی کہانی سنائی ہے۔ تم نے ... مگر زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ مادام بواری اس کے قتل کی ... ذمہ داری اسرائیلیوں پر ڈال رہی ہے۔" میں نے تجسس آمیز لہجے ...

"واقعی؟" وہ حیرت سے بولا "یہ بات تو میرے ... بھی نہ تھی۔"

"یہ بتاؤ کہ ہوٹل موریس میں ایک تربیت یافتہ بندر ... تھا؟" مجھے اچانک ہی اپنی قید کے دوران پیش آنے والا ... یاد آ گیا۔

"تمہاری تلاش کی مہم میں معاونت کے لئے تمہاری بیوی نے وہ بندر یہاں بھیجا تھا۔ اس کے ہوٹل موریس میں داخلے سے مجھے یقینی ہوا کہ تم وہاں قید ہو!"

"ہوٹل موریس تک تمہاری رسائی کیسے ہوئی؟"

"طویل کہانی ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا "شین مارکیڈو کو پکڑنے کے بعد میں نے خود کو یہیں محدود کر لیا تھا۔ اس نے کئی روز بعد زبان کھولی اور اقرار کیا کہ تم مادام بواری کی ہدایت پر شاہدہ کی تحویل میں تھے مگر وہ شاہدہ کا ٹھکانہ نہ بتا سکا جب تمہاری سلامتی کے بارے میں ہر طرف سے استفسارات ہونے لگے تو میں نے شین مارکیڈو پر مزید تشدد کیا اور اس نے اگل دیا کہ ہوٹل موریس مادام بواری کا پوائنٹ ہے۔ اسی اثنا میں بن غازی سے طیارے کے ذریعے تربیت یافتہ بندر آ پہنچا۔ میں نے اس بندر کو ہوٹل موریس کے پاس چھوڑ دیا پھر وہ نہایت مکاری کے ساتھ چار دیواری پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بعد ہی عمارت کے کسی حصے سے فائرنگ کی آوازیں آئیں اور میں سمجھ گیا کہ وہ بندر اندر گھستے ہی محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بنا ہے۔ ہوٹل موریس میں تمہاری موجودگی کا یقین ہونے کے بعد میں آدمیوں کو جمع کرنے کی کوششیں کرنے لگا تاکہ وہاں بھرپور حملہ کر کے تمہیں چھڑایا جا سکے لیکن" اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لئے رکا اور اپنے لئے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

"مگر اس وقت ریڈ بریگیڈ کے بیشتر اراکین اٹلی میں کسی اہم مشن پر تھے۔" وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا۔ "بدقسمتی سے دوسرے لوگوں سے بھی مدد نہ مل سکی اور مجھے نشے کے عادی چند مفلوک الحال لڑکوں کا سہارا لینا پڑا۔ شین مارکیڈو نے مجھے مادام بواری کی مخصوص کار کے بارے میں بتا دیا تھا لہٰذا میں ان لڑکوں کے ساتھ ہوٹل موریس کے قریب مورچہ بند ہو گیا طویل انتظار کے بعد مادام بواری کی کار آئی تو ہم نے اس پر فائرنگ کی مگر وہ کار شاید بلٹ پروف تھی پھر ہم پر جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ جب جوابی فائرنگ نے شدت اختیار کی تو سارے لڑکے اسلحہ لے کر بھاگ نکلے اور میں تنہا رہ گیا۔ یوں میرا دوسرا منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ واپس آ کر میں نے مایوسی کے عالم میں شین مارکیڈو کو قتل کر ڈالا۔ کیونکہ اس وقت وہ میرے لئے بے کار بلکہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی لاش ایک کوڑے دان پر پھینکنے کے بعد مجھے اسرائیلی سفارتخانے کی تباہی کا علم ہوا پھر کل رات کسی نے ال ایل کا دفتر تباہ کر دیا اخبارات نے اسرائیلی سفارتی عملے کے حوالے سے ان دونوں واقعات کی ذمہ داری فلسطینیوں پر ڈالی ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس تفتیش کے لئے میری تلاش شروع نہ کر دے۔"

میں حیرت سے اس کی کہانی سنتا رہا میرے دل میں یک بیک اس کے لئے بے حد احترام پیدا ہو گیا۔ وہ بروسیلز میں تنہا اور بے سروسامان تھا مگر اس نے پس پردہ رہتے ہوئے ایسے کارنامے سرانجام دیئے تھے کہ کسی کا ذہن اس کی طرف نہ جا سکا بلکہ ان ہی واقعات کی وجہ سے مادام بواری اور اسرائیلیوں میں معرکہ چھڑ گیا۔

"اور ابھی تھوڑی دیر پہلے بواری کی کار پر کس نے حملہ کیا تھا؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"کیا کوئی اور حملہ بھی ہوا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، میں خود اس کے ساتھ تھا، حملہ آوروں نے تین کاروں میں تعاقب کر کے گھیرا تھا۔" میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اسرائیلی ہی ہو سکتے ہیں۔" خالد عبدالفتاح نے غور کرتے ہوئے کہا "مقامی بدمعاشوں میں سے کسی میں اتنی جرات نہیں ہے کہ اس پر ہاتھ ڈال سکے۔"

"مگر اسرائیلیوں نے تو آج صبح ہی بواری سے صلح کا معاہدہ کیا تھا!"

"صلح؟ کس بات کی؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"بواری کا خیال تھا کہ اس پر پہلا حملہ اور شین مارکیڈو کی ہلاکت اسرائیلیوں کی شرارت کا نتیجہ ہے لہٰذا اس نے سفارتخانہ اور فضائی کمپنی کا دفتر تباہ کرا دیا ساتھ ہی فون پر دھمکیاں بھی دی تھیں جس کے نتیجے میں آج صبح ہی ان کا ایک آدمی صلح کا پیغام لے کر آیا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

اتنے اختصار سے پوری بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی اور جب میں نے اسے تفصیلات سنانی شروع کیں تو حیرت سے اس کا دہانہ کھلتا چلا گیا۔

"مجھے تو وہم بھی نہ تھا کہ میری کارروائیاں اتنے دوررس نتائج کی حامل ہوں گی۔ جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا ہے، قدرت ہم پر مہربان معلوم ہوتی ہے!" وفور مسرت سے اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا "شاہدہ کو دیکھ کر تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ مادام بواری ہے!"

"یہ راز تم اپنی ذات تک محدود رکھو گے!"

"تم فکر نہ کرو۔" وہ کرسی کی پشتگاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا "تم بڑی زبردست خبریں لائے ہو۔ بروعنیل بوچ کی موت اسرائیلی سیکرٹ سروس مدتوں نہ بھلا سکے گی۔ اس معاملے میں کرنل ڈیوڈ کی دخل اندازی بتاتی ہے کہ اسرائیلی سخت دشواریوں سے دوچار ہیں اور ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم کرنل ڈیوڈ کو جانتے ہو؟"

"انتہائی مکار اور کینہ پرور آدمی ہے مگر اپنے مخاطب کو مرعوب

کرنے کے فن پر پوری طرح عبور رکھتا ہے!"

"شاہدہ نے تو اسے لاجواب کر دیا تھا!"

"اب مجھے یقین ہے کہ شاہدہ کی کار پر تازہ حملہ اسرائیل سے آئے ہوئے گوریلوں نے کیا ہوگا۔" وہ بولا "اس نے شاہدہ سے صلح ضرور کر لی تھی مگر جب اس نے تمہارے بارے میں کھل کر کہا کہ تم اس کے تحفظ میں ہو تو ڈیوڈ نے اسی وقت فیصلہ کر لیا ہوگا کہ اچانک کارروائی کر کے شاہدہ کو یرغمال بنائے بغیر تم پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔"

"میرے لئے یہ موقع غنیمت ہے، میرے دو بدترین دشمن آپس میں الجھے ہیں، صرف پولیس سے بچ کر میں بآسانی بروسیلز چھوڑ سکتا ہوں!"

"مگر جاؤ گے کہاں؟"

خالد عبدالفتاح کے اس سوال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میں چند ثانیوں تک زبان ہلائے بغیر اس کا چہرہ تکتا رہا۔ میں تو اس وقت تک یہی سمجھتا آ رہا تھا کہ نئی منزل کے بارے میں خالد میری رہنمائی کرے گا مگر وہ الٹا مجھ ہی سے سوال کر رہا تھا!

"میرے ردعمل پر خالد سٹپٹا کر رہ گیا تھا!"

"سیتا کہاں ہے؟" میں نے آہستہ سے سوال کیا۔

"بروسیلز میں تمہارے لاپتہ ہو جانے کی خبر ملنے پر وہ خود یہاں پہنچنے پر تل گئی تھی مگر اسے بمشکل لیبیا میں روکا گیا۔ آج کل وہ وہیں ہے اور پہلے تمہیں بھی وہیں بھیجنے کا پروگرام تھا۔" خالد عبدالفتاح کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"پھر اب کیا ہو گیا؟" میرا لہجہ قدرے ترش ہو گیا۔

"لیبیا سے ہمارے تعلقات خراب ہو گئے ہیں۔" وہ نظریں جھکا کر بولا۔

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ میرے لئے بن غازی والے بھی۔۔ پریشان تھے!" خوشگوار گفتگو کے بعد ملنے والی اس اطلاع نے میری طبیعت مکدر کر دی تھی۔

"وہ پرسوں کی بات تھی، کل سے لیبیا کے حکام نے فلسطینیوں کو فوجی ٹرکوں میں بھر بھر کر سرحدوں سے باہر چھوڑنا شروع کر دیا ہے!"

"اور سیتا؟" میرا لہجہ بے حد زہریلا ہو گیا۔

"جب تک کوئی مصدقہ اطلاع نہ ملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" خالد عبدالفتاح اداس ہو گیا۔ وہ مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مگر اب میں یہاں نہیں رک سکتا، اگر کہیں شاہدہ سے سلنا ہو گیا تو میں ناقابلِ تصور مشکلات سے دوچار ہو جاؤں گا۔"

"اس کا مجھے اندازہ ہے، لیبیا میں حالات سدھارنے کے لئے سرتوڑ کوششیں جاری ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ روز میں موجودہ پیچیدگیاں دور ہو جائیں۔۔"

"میں یہاں رہ کر انتظار کرنے کے بجائے کہیں اور قیام کرنا پسند کروں گا۔۔" میں نے کہا۔

خالد سوچ میں پڑ گیا۔۔ اور میں سگریٹ پھونکنے میں مصروف ہو گیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ جب بھی سیتا سے ملنے کا موقع پیدا ہوتا، عین آخری لمحات پر کوئی نہ کوئی ایسی رکاوٹ سامنے آجاتی تھی کہ میرے سارے منصوبے دھرے رہ جاتے تھے۔

"پھر تم بیروت چلے جاؤ۔" آخرکار خالد نے کہا۔

"میں یونان کو ترجیح دوں گا۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ بیروت پہنچنے کے بعد میں دوسری مصروفیات میں بھی الجھ سکتا تھا۔ اور پھر بیروت فلسطینیوں کا گڑھ ہونے کے باعث اسرائیلیوں کی بھی توجہ کا مرکز تھا جب کہ میں ان کی نظروں میں آئے بغیر ایک بار اپنی سیتا تک پہنچنے کے لئے بے قرار تھا۔

"میں کل ہی انتظام کرتا ہوں، دیکھنا پڑے گا کہ وہاں آج کل کون ہے اور وہ تمہاری کتنی مدد کر سکے گا!" اس نے کہا۔

"میں وہاں تنہا بھی رہ لوں گا!" میں نے جلدی سے کہا "بس یہاں سے نکلنے کی فکر ہے!"

"تنہا رہنا بڑی بات نہیں ہے، تم سے رابطہ برقرار رہنا بھی ضروری ہے تاکہ حالات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے تمہیں بروقت آگاہ کیا جا سکے!"

تھوڑی سی بحث کے بعد یہ طے ہو گیا کہ خالد مجھے یونان بھیجنے کا بندوبست کرے گا مگر وہ رات مجھے اسی کے مکان میں بسر کرنا تھی۔ وہ مکان دو کمروں اور باتھ روم پر مشتمل تھا۔ خالد نے اندر والے کمرے کے ایک کونے میں میز پر چولہا وغیرہ لگا کر صاف ستھرا کچن بنایا ہوا تھا۔

وہ مکان بہت مختصر ہونے کے ساتھ ہی بروسیلز کے گندے علاقے میں واقع تھا مگر خالد نے اندر صفائی کا خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس کے مکان میں سیلن کی وہ مخصوص بو تک مفقود تھی جو ایسے علاقوں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔

کھانے وغیرہ سے نمٹنے کے بعد خالد نے اپنا بستر میرے حوالے کر دیا اور خود کمبل لے کر صوفے پر دراز ہو گیا۔ گو وہاں کمرہ گرم کرنے کا بندوبست تھا مگر اس مکان کی ساخت میں کچھ ایسی خامیاں تھیں کہ حرارت میں بھی رہ رہ کر سردی کی لہر محسوس ہوتی تھی۔

مدھم روشنی میں خالد کو سگریٹ نوشی میں مصروف دیکھ کر میں نے اسے مخاطب کر لیا۔ "ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"ہاں نیند نہیں آرہی!" میرے استفسار پر اس نے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

"شراب پیتے ہو؟"

"نہیں، کیا تمہارے لئے بندوبست کروں؟" اس کی آواز میں مستعدی عود کر آئی۔

"تم کیوں نہیں پیتے؟"

"بس ایسے ہی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"پھر بھی کوئی وجہ تو ہوگی!" میں جواب پر مصر ہو گیا۔

"شراب حرام ہے!" اس نے آہستہ سے جواب دیا "میں ممنوعات سے مکمل پرہیز کرتا ہوں!"

اس کا جواب سن کر میں دل ہی دل میں خاصا شرمسار ہوا اس وقت میں نے سوچا کہ کاش اس سے جواب پر اصرار نہ کیا ہوتا۔ جیس میں عبداللہ ملا تھا اور وہ بھی شراب سے دور بھاگتا تھا، عورتوں کے تو نام سے بھی اسے چڑ تھی اور خالد عبدالفتاح بھی اس سے کم نہیں تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

"تم نے میری کسی بات کا برا تو نہیں مانا تھا؟"

"اپنوں کی بات کا برا مانا جائے تو زندگی عذاب بن جاتی ہے!" اس کے لہجے میں گداز تھا۔

"مجھے معاف کر دینا دوست! سیتا کے معاملے میں میں کبھی کبھی جذباتی ہو جاتا ہوں!"

"میں تمہارے کرب کو سمجھتا ہوں!" وہ بولا "پچھلے دنوں سیتا کو تین روز تک میلان میں تمہارا انتظار کرنا پڑا تھا پھر اسے ایک اہم مشن پر شام بھیج دیا گیا۔ وہ اپنا کام قبل از وقت پورا کر کے بن غازی واپس نہ پہنچتی تو شاید اس وقت تم براہِ راست شام جا کر اس سے مل سکتے تھے مگر مقدر کی گردش پر کسی کا اختیار نہیں ہے!"

"تم شادی شدہ ہو؟"

"میرے تین بچے ہیں۔ بیوی بیروت کے ایک پرائمری اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے!" اس نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہماری نسل فلسطین کی آزاد ریاست کا خواب دیکھتے دیکھتے بڑھاپے کی دہلیز پر دستک دے رہی ہے۔ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کم از کم ہمارے بچے اپنے وطن پر فخر کر سکیں گے بس یہی ایک خیال ہمیں اپنے کاموں میں مصروف رکھتا ہے!"

"بیوی بچے یاد نہیں آتے؟" میں اس کی کہانی سن کر وقتی طور پر اپنا دکھ بھول گیا۔

"بیوی بچے اس دنیا میں خدا کا انعام ہوتے ہیں!" اس کے لہجے میں بلا کی سادگی اور معصومیت رچی ہوئی تھی "انہیں فراموش کرنا تو کفرانِ نعمت ہے!"

"ان سے آخری بار کب ملے تھے؟"

"ایک سال ہونے والا ہے!" یہ کہہ کر وہ ہنس دیا "میرا قصہ کہاں لے بیٹھے، کچھ اپنے دل کا غبار ہلکا کرو، برا نہ ماننا، اگر تمہیں عادت ہو تو میں چند منٹ میں بوتل لے آؤں گا!"

"میں بھی نہیں پیتا خالد!" میں نے پہلی بار اس بارے میں جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے میں خفت مانع ہو گئی تھی۔

پھر باتیں کرتے کرتے ہم دونوں ہی سو گئے۔

اگلی صبح خالد نے دن چڑھے مجھے بیدار کیا۔ جب میں منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا تو اس نے ایک مقامی اخبار میرے سامنے رکھ دیا۔

خبروں کا متن تو میں پڑھ نہ سکا مگر پہلے صفحے پر چھپی ہوئی دو تصاویر میں نے فوراً پہچان لیں۔ وہ ان ہی تباہ شدہ کاروں کی تصاویر تھیں جنہوں نے شاہدہ کو گھیرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ تیسری تصویر جھاڑیوں کے پس منظر میں ایک بھیانک لاش کی تھی۔

"پولیس جائے واردات پر پہنچی تو وہاں صرف تین کاروں کے مسافر تھے جو راستہ بند ہونے کی وجہ سے وہاں موجود تھے، فریقین کا کوئی آدمی ہاتھ نہ آسکا۔" وہ چائے تیار کرتے ہوئے مجھے بتانے لگا "البتہ عجلت میں وہ لوگ ایک کچلی ہوئی لاش نہ لے جا سکے۔ جانتے ہو کہ وہ لاش کس کی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پرسوں اسرائیل سے دس سیاحوں کی ایک ٹولی آئی تھی، وہ ان ہی میں سے ایک تھا مگر پولیس تمام ہوٹلوں وغیرہ کا ریکارڈ۔۔ چھاننے کے باوجود اس کی یا اس کے دوسرے نو ساتھیوں کی قیام گاہ کا سراغ نہیں لگا سکی!"

"پولیس نے بہت جلد مرنے والے کی اصلیت کا سراغ لگا لیا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"پولیس کو یہ اطلاع ایک گمنام فون کے ذریعے ملی تھی پھر پولیس نے ائیرپورٹ کے ریکارڈ سے یہ تصدیق تو کر لی کہ پرسوں اسرائیل سے دس سیاحوں کی جماعت بروسیلز آئی تھی مگر شہر میں ان میں سے کسی کا سراغ نہیں مل سکا۔ اگر وہ خبر درست تھی تو جلد ہی مرنے والے کی شناخت ہو جائے گی!"

"پھر تو یہ بات بھی تقریباً طے ہے کہ کرنل ڈیوڈ نے شاہدہ سے کئے ہوئے معاہدے کی دانستہ خلاف ورزی کی ہے!"

"وہ پیدائشی جھوٹا ہے لو اب تم دیکھنا کہ نادام پوار ی اس شہر میں اسرائیلیوں کا کیا حشر کرتی ہے!"

"میں دوبارہ اس چکر میں ملوث نہ ہو جاؤں!"

"میں ابھی جا رہا ہوں، میری غیر موجودگی میں کوئی بھی دستک یا آواز دے تو جواب نہ دینا، میں باہر سے تالا لگا کر جاؤں گا۔"

میرے لئے ناشتہ لگا کر خالد رخصت ہو گیا۔

وہ خلافِ توقع دوپہر کو ہی واپس آ گیا اور آتے ہی خوش خبری سنائی کہ اسی رات وہ مجھے نکالنے کا بندوبست کر چکا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد خالد بہت احتیاط کے ساتھ مجھے لے کر مکان سے نکلا۔ تھوڑی دور پر اس کی کار موجود تھی۔

"کہاں چل رہے ہو؟" کار روانہ ہونے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"ہوائی سفر کا خطرہ مول لینے کے بجائے میں نے تمہیں بار برداری کے ایک ٹرک پر مددگار کے طور پر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔" اس نے کہا۔

میں جواب میں خاموش ہی رہا۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد جب خالد نے اپنی کار ایک ایسے وسیع احاطے کے قریب روکی جہاں اندر سے باہر تک لمبے لمبے بند باڈی والے ٹرک کھڑے ہوئے تھے تو میں چونک پڑا۔

ان میں سے بہت سے ٹرک اسٹارٹ تھے اور اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہونے والے تھے مگر مجھے جس بات نے چونکایا وہ یہ تھی کہ سارے ہی ٹرکوں پر ایک ہی کمپنی کا نام بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا اور سرخ رنگ کے تین دائروں کی صورت میں کمپنی کا نشان بھی نمایاں تھا!

یہ وہی نشان تھا جو میں نے اس ٹرک پر دیکھا تھا جس سے لفٹ لے کر میں بروسیلز پہنچتے ہی حوالات میں جا پہنچا تھا!

"کیا بات ہے؟ تم پریشان نظر آ رہے ہو!" خالد نے انجن بند کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے لئے یہ جگہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔" میں نے تشویش زدہ لہجے میں یہ کہہ کر اسے پورے پس منظر سے آگاہ کر دیا۔

میری بات سنتے ہی وہ ایک لمحے کے لئے بھی وہاں نہیں رکا اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔

"بہت کم امکان ہے کہ تمہیں لفٹ دینے والا ڈرائیور تم سے ٹکرا سکے مگر ہم اس وقت کوئی بھی خطرہ مول نہیں لے سکتے!" اس نے کہا۔

کار ڈرائیو کرتے کرتے ایک جگہ وہ میری طرف متوجہ ہوا مگر اس سے قبل کہ وہ کوئی بات شروع کرتا ایک گلی میں سے کوئی پک اپ تیزی سے باہر نکلی پھر خالد کے ساتھ ہی پک اپ کے ڈرائیور نے بھی حادثے کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سڑک کے عین وسط میں دونوں گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ پک اپ نے میری طرف سے ٹکر ماری تھی لہٰذا میں اچھل کر خالد کی گود میں جا پڑا۔

تصادم کی آواز اتنی شدید تھی کہ فوراً ہی ہر طرف سے لوگ گاڑیوں کی طرف دوڑ پڑے۔

اس حادثے کے نتیجے میں خالد عبدالفتاح دوہری مشکل کا شکار ہوا تھا۔ ایک طرف اس کی کار ٹکر کھا کر بے قابو ہو گئی تھی دوسری طرف میرا سارا بوجھ اچانک اس پر منتقل ہو گیا تھا۔ کار تیزی کی لپیٹ میں ... فٹ پاتھ کی طرف بڑھی تو راہگیر چیختے ہوئے بھاگ پڑے مگر خالد نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے پوری قوت سے بریک لگا کر کار کو روک لیا اور یوں کوئی شخص کار کا نشانہ نہ بن سکا۔

کار رکتے ہی ہم دونوں ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے سے نیچے اتر آئے۔ دوسری گاڑی کا ڈرائیور بھی بوکھلایا ہوا ... آ پہنچا۔ اسے حادثے سے زیادہ ہم دونوں کی سلامتی کی فکر تھی اور ... وہ خاصا شریف نظر آ رہا تھا۔

خالد کی کار کا ایک دروازہ پچک کر اندر گھس آیا تھا مگر ... کے قابل تھی جب کہ دوسری کار کے انجن وغیرہ کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ ریڈی ایٹر انجن میں گھس جانے کے باعث کار کا انجن ... اسٹارٹ کرنا ناممکن تھا مگر اس نے نہایت فراخ دلی سے ... غلطی تسلیم کرتے ہوئے ہم لوگوں کو جائے حادثہ سے رخصت ہونے کی اجازت دے دی!

خالد نے اسے نقصان زدہ کار کسی قریبی گیراج تک پہنچانے کے سلسلے میں کسی مدد کی پیشکش کئے بغیر اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔

"اس شریف آدمی کی جگہ کوئی خر دماغ ہوتا تو ہم بڑی دشواری سے دوچار ہو جاتے۔" کار روانہ ہوتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"آج کا دن ہی کچھ نامبارک ثابت ہوا ہے!" وہ اپنی پسلیاں سہلاتے ہوئے بولا۔

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے!"

"بروسیلز میں خشکی کے ذریعے مال کی نقل و حمل کے کم از کم دس بارہ بڑے ادارے ہیں مگر اتفاق دیکھو کہ میں نے تمہاری روانگی کا بندوبست اسی ادارے میں کیا جس کے ایک ٹرک سے لفٹ لے کر تم بروسیلز میں پہلی دشواری کا شکار ہوئے تھے!"

"اگر میں اس ٹرک سے لفٹ نہ لیتا تو آج حالات یکسر مختلف ہوتے۔" میں نے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ٹرک والے نے تمہیں پولیس کے حوالے کیا، وہاں سے شین مارکیڈ ضامن بن کر تمہیں لے اڑا اور پھر شاہدہ نے تمہیں بچا لیا۔ اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا تو شاید تم اس وقت اپنی بیوی کی تلاش کر رہے ہوتے!"

"پھر میرے بارے میں اب کیا سوچ رہے ہو؟"

"ابھی دماغ قابو میں نہیں ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "دوسری گاڑی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی یا میرے اوسان خطا ہو جاتے تو ہماری گاڑی الٹنے کے قوی امکانات تھے، میں تو اس بارے میں سوچ سوچ کر ہی کانپ رہا ہوں!"

"اتنے بڑے حادثے سے یوں بچ نکلنا کہ معمولی اندرونی ضربات کے سوا ہمارے بدن سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا، اس بات کا ثبوت ہے کہ قدرت ہم پر مہربان ہے!"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "بعض معجزے اس طرح رونما ہوتے ہیں کہ ساری تدبیریں اور دلائل دھرے رہ جاتے ہیں!"

"مجھے بروسیلز میں ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا ہے!"

"مجھے پورا احساس ہے۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "مگر میری رائے میں تم دو تین دن صبر کر لو تو بے سروسامانی کے عالم میں بھاگتے پھرنے سے نجات حاصل کر لو گے!"

"یعنی تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ موجود ہے!"

"بغیر کاغذات کے تم ہر جگہ خطرات محسوس کرتے رہو گے، میری خواہش ہے کہ تم بروسیلز سے اب مکمل سفری دستاویزات کے ساتھ روانہ ہو۔"

"جعلی کاغذات بھی کم خطرناک نہیں ہوتے، ان کے لئے اتنا وقت برباد کر کے بھی مجھے سکون حاصل نہ ہو سکے گا!"

"جعلی نہیں، میں کسی دوست ملک کے سفارت خانے سے اصل کاغذات بنواؤں گا۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے!" میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "کاغذات بننے کے بعد تو میں خود بھی اپنا سفر جاری رکھ سکوں گا۔"

"اس صورت میں بھی تم یونان ہی جاؤ گے؟"

"خوابناک اور رومان پرور سرزمین ہے، وہاں میں انتظار کے صبر آزما ایام قدرے سکون سے گزار سکوں گا۔"

"رومان کی تلاش ہے تو سویڈن جانا چاہئے۔" اس نے مشورہ دینے کے برعکس کہا۔ "وہ لوگ تقریباً ہر قسم کی معاشرتی پابندیوں سے آزاد زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں!"

"رومان اور جنس میں بڑا فرق ہے، ایک انسانی احساس ہے اور دوسرا حیوانی جذبہ۔ میرا نفس ابھی اتنا سرکش نہیں ہوا!"

وہ ہنس پڑا۔ "ہم لوگ اتنے سکون سے باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں جیسے کسی دعوت سے گھر لوٹ رہے ہوں!"

"آج صبح سے دوپہر تک تم باہر رہے تھے۔ مادام بواری اور اسرائیلیوں کے ٹکراؤ کے بارے میں کوئی نئی خبر نہیں لائے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"اپنے چکروں میں تمہیں بتانا بھول گیا۔" وہ بولا۔ "شاہدہ پہلے میں استعمال کی جانے والی تینوں کاریں چوری کی تھیں، ابھی تک نہ مرنے والے کی شناخت ہوئی ہے اور نہ دس اسرائیلی سیاحوں کی ٹولی کا سراغ ملا ہے مگر آج شہر کے دو بھرے پرے بازاروں میں اسرائیلی مشن کے دو ملازموں کو خریداری کرتے ہوئے بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا!"

"پیرس میں میرے لئے یہ سوچنا بھی ممکن نہ تھا۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"کیا؟" اس نے سوال کیا۔

"وہاں بن حیان پر ناکام قاتلانہ حملوں کی پاداش میں مادام بواری کے شوہر نے شہر میں فلسطینیوں کا باہر نکلنا دشوار کر دیا تھا، روزانہ چھ سات قاتلانہ حملے ہوتے تھے!"

"میں نے اخبارات میں پڑھا تھا۔" وہ بولا۔ "مگر مجھے ان واقعات کا پس منظر معلوم نہیں ہو سکا تھا اور اس کا شوہر کہاں سے آ گیا، میں نے تو سنا ہے کہ شاہدہ کنواری ہے!"

"پارسا تو خیر شاہدہ بھی نہیں ہے مگر میں اصل مادام بواری کے شوہر کا ذکر کر رہا تھا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تو اصل مادام بواری کوئی اور ہے؟" اس کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"ہے نہیں بلکہ تھی۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "اصلی مادام بواری بن حیان کی سگی بھاوج تھی اور پچھلے دنوں بروسیلز میں ہی مری ہے!"

اس اطلاع پر خالد بھونچکا رہ گیا اور پھر مجھے مادام بواری کے بارے میں تفصیلات بتانی پڑ گئیں۔ وہ بے یقینی کے عالم میں منہ پھاڑے میری کہانی سنتا رہا۔

"فلسطینی بلاوجہ تمہارے شیدائی نہیں ہیں۔" پوری کہانی سننے کے بعد اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں چھپی ہوئی شخصیتوں کو بے نقاب کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے!"

"جان پر بن جائے تو سب کچھ ہی کرنا پڑ جاتا ہے — ویسے بھی بات یہ ہے کہ میں اب مسلسل بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں اور اپنی بیوی کو حاصل کرنے کے بعد بے فکری سے زندگی کا باقی حصہ گزارنا چاہتا ہوں!"

"میں نے کسی سے سنا تھا کہ تم پاکستان میں بھی کسی وجہ سے قانون کو مطلوب تھے، پھر اب کہاں آباد ہونے کا ارادہ ہے؟"

"تم فلسطین کے لئے لڑ رہے ہو نا؟" میں نے اس سے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

" مجھ سے زیادہ تو تم نے ہمارے کاز کی خدمت کی ہے !"

" تم ایک ایسی ریاست کے لئے آگ اور خون میں نہا رہے ہو جس کا صرف تصور ہی چل رہا ہے مگر میں تو پاکستان کا شہری ہوں۔ قانون میرے ساتھ جو چاہے سلوک کرے میں اپنی سرزمین سے منہ نہیں پھیر سکتا، کتنی حقیر ہی سہی مگر اس ملک کے لئے میری بھی کچھ خدمات ہیں "

" میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں لیکن برا نہ مانو تو ایک بات کہہ ڈالوں ؟"

" یہی باتیں نہ کہنا منافقت ہے !"

" دراصل ہم اور تم ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں " اس نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا " تم نے بھی پاکستان بنانے کے لئے ناقابلِ فراموش قربانیاں دی تھیں جو تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں لیکن ملک قائم ہوا تو جذبہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جا رہا ہے، تمہاری طرح سوچنے والے لوگ کم ہی ملیں گے اور شاید یہی حال ہمارا بھی ہو۔ ابھی ہم ... فلسطین کے لئے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک ہولناک پیکار میں مصروف ہیں لیکن فلسطین قائم ہوگیا تو شاید ہمارا بھی اندازِ فکر بدل جائے۔ یہ اندیشے کبھی کبھی مجھے مضطرب کر دیتے ہیں !"

" بقا کی جنگ لڑنے والوں کے جذبات انتہا کو پہنچے ہوئے ہوتے ہیں " میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا " اور ان دنوں میں اسی مرحلے سے گزر رہا ہوں مگر میرے ذہن میں یہ خیال ہمیشہ جاگزیں رہا ہے کہ میرا بھی کوئی وطن ہے جس کی خاک پر میرا حق ہے !"

" میرا بڑا لڑکا ثانوی مدرسے میں پڑھ رہا ہے " وہ دھیمی آواز میں بولا " دو سال کے بعد میری بیوی اسے پاکستان ہی بھیجنا چاہتی ہے۔ سنا ہے کہ مسلم ممالک میں وہاں فنی تعلیم کا معیار سب سے بہتر ہے۔ اگر حالات سازگار رہے تو وہ پاکستان پہنچ کر تم سے ضرور ملے گا "

" میں اسے اپنا مہمان رکھوں گا " میں نے فراخدلی کے ساتھ پیشکش کر ڈالی اور شاید کاتبِ تقدیر اس وقت میری خوش فہمیوں پر خندہ زن تھا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم واپس اس تنگ و تاریک علاقے میں پہنچ گئے جہاں خالد عبدالفتاح کا قیام تھا۔

" تم یہاں کب سے مقیم ہو ؟" مکان میں داخل ہونے کے بعد میں نے سرسری طور پر خالد سے ایک ذاتی سوال کر ڈالا۔

" شین مارکیڈو کو قید کرنے کے ساتھ ہی میں یہاں منتقل ہوا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اصل قیام گاہ کا رخ کیا تو شین مارکیڈو کے حامی مجھ تک پہنچ جائیں گے !"

" مگر شین مارکیڈو کے سلسلے میں تو شاہدہ کو بھول کر بھی تمہارا خیال نہیں آیا "

" مقدر کی یاوری ہے !" وہ مسکرا دیا۔

" یہ تنگ و تاریک مکان تمہاری شخصیت سے میل نہیں کھاتا۔ میں شروع سے ہی اس بارے میں الجھن کا شکار تھا "

" تو پھر میرے مکان پر ہی چلو !"

" اب ادھر کا رخ کرنا خطرناک ہوگا " میں نے جلدی سے کہا " میرے فرار کے بعد شاہدہ ہر ممکنہ ٹھکانے کا رخ کرے گی اور اس کا پہلا خیال یہی آئے گا کہ میں نے رہائی پاتے ہی تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہوگی "

" میرے مکان سے اسے مایوسی ہی ہوگی " وہ بولا " پڑوسیوں سے اسے یہی پتہ چلے گا کہ چند روز کے لئے ملک سے باہر گیا ہوں "

" تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ یونان میں میرا رابطہ کس سے رہے گا "

" وہ بندوبست میں بعد میں کر لوں گا۔ مگر تم ایتھنز پہنچ کر عدنان فاخوری سے ضرور ملنا جو ہوٹل ڈلیکارڈو میں سپروائزر ہے !"

" اور اگر وہ سرد مہری سے پیش آیا ؟"

" تم تو اس طرح سوال کر رہے ہو جیسے صبح ہی روانہ ہونے والے ہو " وہ ہنس کر بولا " جب جاؤ گے تو میں ایک تعارفی رقعہ دے دوں گا "

اگلے روز خالد نے میرے حلیے میں چند نمایاں تبدیلیاں کیں پہلے میری بڑھی ہوئی سیاہ ڈاڑھی صاف ہوئی پھر نمودار ہونے والے بال بھی مونڈ دیئے گئے۔ میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا چمکتی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر مسکرا دیا۔

بروسیلز میں سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی کہاوت درست ثابت ہوئی تھی پہلی بار شین مارکیڈو کے اسیر ہونے سے پہلے رہائی سے قبل میرا سر مونڈا تھا اور میں دو روز بھی آزادی کے نہ لے پایا تھا کہ شاہدہ مجھ پر مسلط ہوگئی۔ اب دوسری بار خالد نے میرا سر صاف کیا تھا۔ اس مرتبہ نہ جانے کس طرف سے اولے ہونے تھے !

ان تبدیلیوں کے بعد خالد نے دیوار پر سیاہ چادر لٹکا کر فلیش کی مدد سے میری تصویریں اتاریں جو پاسپورٹ کے لئے ہوتیں اور کیمرے میں سے رول نکال کر وہ رخصت ہوگیا۔ جاتے ہوئے اس نے احتیاطاً دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

اس روز خالد بہت دیر سے واپس آیا۔ اس کے چہرے سے تکان اور مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

" تمہارا اندازہ درست ثابت ہوا !" اس نے آتے ہی بجھے ہوئے لہجے میں کہا اور میں چونک پڑا۔

" تم کس اندازے کی بات کر رہے ہو ؟" میں نے پوچھا۔

" تمہاری تلاش شروع ہو چکی ہے " اس نے جوتے اتارتے ہوئے کہا " کل رات کئی نقاب پوش اس دو منزلہ عمارت میں گھس گئے تھے جہاں نچلی منزل میرے تصرف میں تھی۔ جب انہیں اوپر والوں سے میری کار آمد بات معلوم نہیں ہو سکی تو انہوں نے عورتوں اور مردوں کو بے رحمی سے زدوکوب کر کے باہر نکال دیا اور مکان کو آگ لگا دی "

" تم ادھر گئے تھے ؟" میں نے دریافت کیا۔

" اخبار میں تفصیلات پڑھنے کے بعد ادھر سے گزرا تھا۔ پوری عمارت جل کر خاکستر ہو چکی ہے " اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

" تمہیں بھی فوری طور پر اپنی نقل و حرکت محدود کر لینی چاہئے !"

" تم نقل و حرکت کی بات کر رہے ہو ؟ میں نے تو اخبار دیکھتے ہی اپنی کار ایک غیر معروف گیراج میں مرمت کی غرض سے چھوڑ دی اور ایک کار کرائے پر لے لی۔ وہ کار کے نمبروں سے بھی مجھے پہچان سکتے تھے " وہ خود کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔

" پولیس کا کیا ردِ عمل ہے ؟"

" بوکھلائی ہوئی ہے " اس نے بتایا " تشدد کی پے در پے وارداتوں کے نتیجے میں پورے شہر میں دہشت اور سنسنی پھیل گئی ہے آج بڑے بڑے بازاروں میں بھی ویرانی ہی چھائی رہی !"

" اخبارات میں تمہارا نام بھی اچھالا گیا ہوگا ؟"

" شہ سرخیوں میں چھاپا گیا ہے " وہ بولا " اور یہی ساری تشویش کی جڑ ہے۔ اسرائیلیوں کے خلاف کارروائیوں کے بعد نامعلوم نقاب پوشوں کی طرف سے میری تلاش سے ہر ایک یہی نتیجہ اخذ کر رہا ہے کہ بروسیلز فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کی چپقلش کا مرکز بن گیا ہے "

" مادام لواری کا نام کہیں نہیں آیا ؟"

" نقاب پوشوں نے میرے مکان کی اوپری منزل والوں سے باز پرس کرتے ہوئے کھل کر کہا تھا کہ مادام لواری مجھے کسی خارشی زدہ کتے کی طرح پکڑ لے گی۔ اخبارات نے اس بات کو اہمیت دی ہے مگر عام لوگوں کا خیال ہے کہ نقاب پوشوں نے رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لئے بھونڈے طور پر مادام لواری کا نام استعمال کیا ہے !"

" ویسے استعمال تو بھونڈا ہی ہے " میں نے کہا " شاید اس طرح شاہدہ نے کھل کر مجھے جتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ میرے پیچھے لگی ہے "

" اس طرح وہ غصے میں بے اعتدالی کر بیٹھی ہے۔ قانون کے محافظوں سے کھلے تصادم سے اس نے ہمیشہ گریز ہی کیا ہے "

" ہو سکتا ہے کہ اسی بہانے اس کا فتنہ بھی ختم ہو جائے !"

" وہ تو جب ہوگا سو ہوگا مگر اس نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے " وہ صوفے پر لیٹتے ہوئے بولا " اگر میں اس وقت سامنے نہیں آیا تو بعد میں شدید قانونی پیچیدگیوں میں گھر جاؤں گا۔ اور اگر اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے سامنے آتا ہوں تو کئی دن بلکہ ہفتوں تک میری نگرانی ہوتی رہے گی۔ شاہدہ کے حملے کا خطرہ الگ رہے گا۔ اور تمہارے لئے بھی کچھ نہ کر سکوں گا "

" آج کیا رہا ؟"

" کل تمہارا پاسپورٹ مل جائے گا میں نے تمہارا نام ڈان پرک درج کرایا ہے "

" تمہیں پولیس کے سامنے آ جانا چاہئے ورنہ بعد میں کسی طرح یقین نہ دلا سکو گے کہ اسرائیلیوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں میں تمہارا دخل نہیں تھا "

" اسرائیلیوں نے محاذ کھول لیا ہے میرے مکان پر ہونے والی غنڈہ گردی اور آتش زدگی کو انہوں نے سوچی سمجھی سازش قرار دیا ہے تاکہ اس طرح میں اپنی مدافعت کے ساتھ ہی انہیں مشکوک بنا سکوں "

" فی الحال تم میرا پاسپورٹ بھول جاؤ اور اپنی فکر کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہیں آئندہ کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے !"

" تمہارا مطلب ہے کہ میں پولیس کے سامنے حاضر ہو جاؤں ؟"

" تم اسی طرح خود کو بچا سکتے ہو !" میں نے کہا " تم یہاں ایک فلسطینی گروپ کی نمائندگی ضرور کرتے ہو مگر تمہاری حیثیت سرکاری طور پر صفر ہے !"

" پھر میں ابھی اپنے دوست کے پاس جاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارا پاسپورٹ تیار کر کے اپنے گھر لے آیا ہو اس کے بعد ہی میں کچھ سوچوں گا "

" تمہارے دفاع کے لئے وقت کی بڑی اہمیت ہے !" میں نے اسے یاد دلایا۔

" میں گیارہ بجے تک لوٹ آؤں گا " وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا " کام بن گیا تو آدھے گھنٹے بعد ہی کسی پولیس اسٹیشن پر جا کر بیان دے دوں گا " وہ دوبارہ اپنے جوتے کستے ہوئے افسردہ لہجے میں بولا۔

" میں بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گا "

وہ مجھے تسلی دے کر چلا گیا۔

میں اس کے انتظار میں سگریٹیں پھونکتا رہا۔ حالات جس تیزی کے ساتھ رخ بدل رہے تھے۔ اس کی وجہ سے میں بھی اعصابی

دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ اور بروسیلز بلکہ بلجیئم سے نکلے بغیر اس ہیجان سے چھٹکارا مشکل نظر آرہا تھا۔

وقت نہایت سست رفتاری سے رینگتا رہا اور جب میری رسٹ واچ نے گیارہ بجائے تو میرے کان باہر گلی میں ابھرنے والی ہر آہٹ کا تعاقب کرنے لگے۔

ساڑھے گیارہ بجے میرے لئے بستر پر پڑے رہنا دشوار ہو گیا اور میں نے بے چینی کے ساتھ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا، میری حالت غیر ہوتی گئی۔ میں کافی دیر تک کرسی لئے دروازے کے پاس بھی بیٹھا رہا باہر اِکا دُکا قدموں کی چاپ سنائی دیتی جو بند دروازے پر رکنے کے بجائے مجھے مایوس کرتی کہیں اور معدوم ہو جاتی۔

میرا ذہن مستقل جوڑ توڑ کر رہا تھا جس کا مقصد خالد عبدالفتاح کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر کا جواز فراہم کرنا تھا۔

پہلے میں یہ سوچتا رہا کہ شاید اس کا دوست میرا پاسپورٹ تیار کر کے گھر لانے کے بجائے دفتر میں ہی چھوڑ آیا ہو گا مگر خالد کے شدید اخلاقی دباؤ کے تحت اسے ساتھ لے کر اتنی رات گئے اپنے دفتر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو گا۔

یہ کام بہت بڑا تھا۔ اگر میرا قیاس درست تھا تو ایسے وقت میں سفارت خانے کے کسی بھی اہل، کار کے لئے سفیر یا سفارت خانے کے کسی اعلیٰ افسر کی اجازت لئے بغیر عمارت میں داخل ہونا... ناممکنات میں سے تھا اور اجازت کا حصول بجائے خود ایک معرکہ ہوتا۔

دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ خالد کا دوست سرے سے اپنے گھر ہی نہ پہنچا ہو بلکہ دوستوں کی کسی محفل میں بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا ہو اور خالد اس کی تلاش میں یکے بعد دیگرے مختلف ٹھکانوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہو یا اس کے گھر کے آس پاس سرد رات میں فٹ پاتھ وغیرہ پر ڈیرا جمائے اس کی واپسی کا منتظر ہو!

میں دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا میرے ایک ذاتی کام کی وجہ سے خالد کو اس سرد رات میں گرم گرم بستر کی راحت قربان کر کے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑ رہا تھا مگر میرے لئے یہ بات تسلی بخش تھی کہ میں نے اسے اپنے کاغذات لانے پر مجبور نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود ہی اس کام کے لئے روانہ ہوا تھا میرا کوئی قصور ہو سکتا تھا تو وہ صرف اتنا تھا کہ میں نے اسے روکنے کی کوئی مخلصانہ کوشش نہیں کی تھی!

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو تین بج رہے تھے۔ یکایک میرے بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل گئے اور میں مٹھیاں بھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

باہر گلی میں مکمل ویرانی کا راج تھا۔ قدموں کی اِکا دُکا آوازیں بھی بہت دیر سے نہیں سنائی دے رہی تھیں۔

خالد واپسی میں اتنی دیر نہیں لگا سکتا تھا اسے جہاں بھی جانا تھا وہاں سے واپسی کے لئے اتنا وقت ضرورت سے زیادہ تھا۔ وہ یقینی طور پر کسی دشواری کا شکار ہو گیا تھا۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میں اس گنجان آباد علاقے میں ایک تنگ سے کمرے میں قید تھا ـــــ جہاں لوگ معمولی معمولی باتوں کو بھی شبہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہاں سے نکاسی کا ایک ہی دروازہ تھا جو خالد نے میرے تحفظ کے خیال سے باہر سے مقفل کر دیا تھا اگر خالد کو خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو میرے لئے دروازہ توڑے بغیر باہر نکلنا ناممکنات میں سے تھا اور دروازہ توڑنے کی کوشش کا نتیجہ یہ تھا کہ میں اس علاقے کی پوری آبادی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا اور جب میں شدید مشقت کے بعد دروازہ توڑ کر باہر نکلنے میں کامیاب ہوتا تو سیکڑوں اشتباہ آمیز نظریں میرے جسم میں چبھنے لگتیں بھانت بھانت کے سوالات میری قوتِ گویائی سلب کر لیتے اور اگر اس استقبالی ہجوم میں پولیس بھی موجود ہوتی تو مجھے آہنی زیورات کی خوفناک جھنکار کے ساتھ زنداں کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جاتا جہاں سے میری رہائی ناممکن تھی کیونکہ مجھے سزایاب کرانے کے لئے... پولیس کو کسی نئی فردِ جرم کی ضرورت ہی پیش نہ آتی میرے خلاف میکفرسن اور رونالڈ کے دوہرے قتل کے الزامات پولیس کے ریکارڈ پر موجود تھے اور میں ان کا مفرور مجرم تھا۔ میکفرسن اور رونالڈ کا خون آسیب بن کر برسلز میں قدم قدم پر میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں ماضی کو فراموش کر کے ایک ہی زقند میں آگے بڑھ جانا چاہتا تھا مگر یہ آسیب گردن دبوچ کر بار بار مجھے پیچھے کھینچ لینے پر تلا ہوا تھا۔

اس مکان میں ٹیلی فون کی کمی کا شدید احساس مجھے اسی وقت ہوا۔ اگر وہاں فون موجود ہوتا تو میں شین مارکیڈ کا نمبر ملا کر اس سے بات کر سکتا تھا۔ وہ میری پیتا سُن کر بامقصد اور مؤثر بندوبست کر سکتا تھا مگر اس وقت میں اس موقع سے محروم تھا۔

میں نے اضطراری طور پر مقفل دروازے پر دباؤ ڈالا اور اپنی جگہ پر سانس سادھ کر رہ گیا۔ خالد عبدالفتاح بہت مخلص اور فرض شناس آدمی تھا۔ پریشانی کے عالم میں باہر جاتے ہوئے وہ مہمان کی حفاظت کے پیشِ نظر دروازہ مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔ خود کو ہولناک اور روح فرسا خطرات میں گھرا محسوس کرتے ہوئے میں خالد عبدالفتاح اور اس کی دشواریوں کو قطعی بھول گیا تھا بس میری راہ میں حائل وہ مقفل دروازہ ہی تھا جو مجھے اپنے محسن کی یاد دلانے نہیں دے رہا تھا۔

کمرے میں وقفے وقفے سے ابھرنے والی سردی کی شدید لہروں کے باوجود میرا جسم ٹھنڈے پسینوں میں ڈوبا ہوا تھا میرے سانسوں کا آہنگ بکھرا بکھرا سا تھا اور دل اپنی پوری قوت کے ساتھ میری کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

میرے لئے وہ زندگی کا بدترین اعصابی بحران تھا میں ناہموار قدموں سے کمرے میں مسلسل ٹہلے جا رہا تھا پھر اچانک مجھے وہ پستول یاد آیا جو میں نے سٹاڈ کے نئے کاٹیج میں اس کے ایک نمک خوار کو ہلاک کر کے حاصل کیا تھا اور میں نے لپک کر وہ مہلک آتشیں ہتھیار نکال لیا۔

اس پستول کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا جو دھماکے کی گونج کو تو بڑی حد تک تحلیل کر سکتا تھا مگر ٹریگر کے پُر شور کھٹکے کو معدوم کرنا اس کے بس سے باہر تھا اور وہ بستی ویسے بھی بروسیلز کے غنڈوں کی بستی تھی جن میں جرائم پیشہ آسانی سے سما جاتے ہیں کوئی بھی تجربہ کار شخص کھٹکے کے ساتھ دبی دبی گونج سن کر یہ سمجھ سکتا تھا کہ قریب ہی کوئی گولی چلائی گئی ہے اور بارود کی بُو کا تو کوئی علاج ہی نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر مجھے شدید مایوسی ہوئی کہ دروازے میں مضبوط قفل نہیں تھا بلکہ اس میں باہر سے کنڈی لگا کر لٹکنے والا تالا لگایا تھا یعنی تالا توڑنے کے لئے پستول بھی بے کار تھا۔

اندرونی کمرے کی عقبی دیوار میں چھت کے قریب ایک روشندان تھا جو پٹ اکھاڑنے کے بعد بھی کسی آدمی کی نکاسی کے لئے ناکافی تھا پھر بھی میں نے مختلف اشیاء کو اوپر تلے رکھ کر ایک کمزور سی سیڑھی بنائی اور روشن دان سے باہر جھانکا تو اس طرف بھی مکانوں کی قطاریں نظر آئیں جن کے دروازے بھی اسی سمت میں کھلتے تھے اور ادھر کی گلی بھی پتلی تھی یعنی روشن دان کو بڑا کرنے کے لئے دیوار پر لگائی جانے والی پہلی ضرب ہی لوگوں کو اس طرف متوجہ کر دیتی۔

مجھے تشویش اور اضطراب کے عالم میں پانچ بج گئے مگر میں نکاسی کی کوئی راہ تلاش نہ کر سکا، خالد بدستور غائب تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ساری رات گزارنے کے بعد میں اس کی واپسی کی طرف سے مایوس ہی ہو گیا تھا۔

رات بھر کے سکوت کے بعد اگلی گلی میں کسی گاڑی کے انجن کا ہلکا سا شور سنائی دیا تو میں چونکا مگر پھر جھکولوں کے ساتھ بوتلوں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازوں نے صورتحال واضح کر دی وہ شاید ڈیری فارم کی گھر گھر دودھ پہنچانے والی گاڑی تھی جو رُک رُک کر بڑھتی رہی اور آخر کار اس کی آواز بھی معدوم ہو گئی۔

رفتہ رفتہ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ قرب و جوار کے مکانات سے بھی لوگوں کے بولنے اور بچوں کے رونے کی اِکا دُکا آوازیں سنائی دینے لگیں۔

گلی میں چہل پہل شروع ہونے کے بعد کچھ کر گزرنے کا موقع نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے تیسری بار غور سے دروازے کا جائزہ لے ڈالا۔ اس بار میں نے توڑنے کے بجائے دروازے کو اکھاڑنے کے امکانات کا جائزہ لیا جو نہ ہونے کے برابر تھے۔

میں جانتا تھا کہ کم از کم اگلے سولہ گھنٹے تک مجھے اسی طرح قید رہنا ہو گا۔ رات کو گلی میں سناٹا ہونے کے بعد ہی میں کوئی کارروائی کرنی چاہتا تھا جس کا فیصلہ قبل از وقت ہونا ضروری تھا۔

تھک ہار کر میں بستر پہ گر گیا۔ نیند کا کوسوں دور پتہ نہیں تھا۔ مگر رات بھر کی بے خوابی کے باعث میری آنکھوں میں شدید سوزش ہو رہی تھی۔ میں نے روشنی گُل کر کے سکون کی غرض سے اپنی آنکھیں موند لیں۔

وہ کیفیت خاصی دیر برقرار رہی پھر اچانک مجھے ایک تجویز سوجھ گئی جس پر احتیاط سے عمل کر کے میں بارہ چودہ گھنٹوں میں اپنی رہائی کی صورت پیدا کر سکتا تھا۔

کمرے میں روشنی کر کے میں نے دو چھریاں، خالد کے سارے کارآمد اور ناکارہ بلیڈ اور دوسری دھار والی چیزیں جمع کیں اور کمبل بچھا کر دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔

اس چوبی دروازے کی موٹائی بہت زیادہ نہیں تھی اور میں اسے چھیل چھیل کر اتنا کمزور کر سکتا تھا کہ رات میں کسی بھی وقت احتیاط سے اسے توڑ کر باہر نکل سکوں۔

اپنے کام کے آغاز کے لئے میں نے فریم کے نچلے حصے میں جڑے ہوئے تختوں کے ڈیڑھ فٹ چوڑے اور اسی قدر لمبے ٹکڑے کا انتخاب کیا اور چھری کی دھار سے لکڑی چھیلنی شروع کر دی۔ اس کام کی ابتدا کرتے ہی مجھے وہ قوم یاد آئی جو اپنی کمزور سی زبانوں سے چٹانوں کو چاٹ چاٹ کر سنگریزوں میں تبدیل کر دیتی تھی ـــ میرا کام بھی اسی طرح طویل اور صبر آزما تھا مگر مجھے یقین تھا کہ اس کا نتیجہ حوصلہ افزا ہو گا۔

لکڑی کے پتلے پتلے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے میرے سامنے فرش پر جمع ہوتے رہے ان کی بتدریج بڑھتی ہوئی مقدار دیکھ کر مجھے خاصی تقویت ہو رہی تھی۔

گیارہ بجے تک میری کارکردگی بہت عمدہ تھی۔ نجات کی ایک راہ نظر آ جانے کے باعث فطری تقاضے بھی عود کر آئے اور میں یہ

سوچ کر بستر پر دراز ہو گیا کہ تھوڑے سے آرام کے بعد ہی رات بھر تازہ دم رہ کر کام کر سکوں گا اور پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کوٹھری سے نکلنے کے بعد حالات غیر یقینی ہوں گے اور شاید میں طویل عرصے تک نیند تو درکنار، آرام کے بارے میں بھی نہ سوچ سکوں گا۔

ذہنی دباؤ کم ہونے کے سبب مجھے جلد ہی نیند آگئی مگر پھر بھی مجھے ہڑبڑا کر بیدار ہونا پڑ گیا چند ثانیوں تک تو میں کچھ سمجھ ہی نہ سکا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا مگر پھر ساری بات واضح ہو گئی کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ساتھ ہی باہر سے کوئی شخص شاید مقامی زبان میں کچھ پکار بھی رہا تھا۔

وہ آواز اور دستک قطعی طور پر غیر دوستانہ تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اندر سے جواب نہ ملنے پر وہ دروازہ توڑنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

فوراً ہی میری نیند کافور ہو گئی اور میں سرہانے سے پستول اٹھا کر دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ باہر تالا موجود ہونے کے باوجود دستک دینے والوں کو امید کیونکر ہوئی کہ انہیں اندر سے جواب مل سکے گا ـــــ ان کے اس رویئے کا بظاہر ایک ہی جواز ہو سکتا تھا کہ خالد عبدالفتاح نہ صرف ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا بلکہ اس نے زبان بھی کھول دی تھی۔ تالے کی چابی شاید مقابلے کے دوران خالد سے کہیں گر گئی ہو گی۔ اسی لئے ان لوگوں نے وحشیانہ دستکوں کا سلسلہ شروع کیا تھا ورنہ وہ تالہ کھول کر براہ راست اندر آ گئے ہوتے۔

دروازے پر دستکوں کا تسلسل برقرار تھا۔ بولنے والے کی آواز میں غرّاہٹ پیدا ہو چکی تھی۔ اور میں پستول سنبھالے دروازے کی اوٹ سے کسی بھی لمحے فائر کرنے کے لئے تیار تھا۔

میں مقفل دروازے کی اوٹ میں پستول سنبھالے بدترین صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ میرے تھکے ہوئے اعصاب میں رچا ہوا نیند کا خمار لرزہ انگیز اندیشوں کے ریلے میں فوراً ہی بہہ چکا تھا۔

دوسری طرف چوبی دروازے پر تیز دستکوں کا سلسلہ بھی بلاتوقف جاری تھا۔ ساتھ ہی ایک بھاری مردانہ آواز کی غراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا ڈچ میں کہہ رہا تھا لہٰذا اس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

یہ تمام سلسلہ بمشکل ایک منٹ سے بھی کم عرصے تک جاری رہا۔ پھر یک بیک موقوف ہو گیا مگر اس وقت میرے لیے وہ قلیل سی مدت صدیوں جیسی طوالت اختیار کر گئی تھی۔

دستکیں جاری تھیں تو میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا، خاموشی طاری ہوئی تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرا دل سینہ پھاڑ کر کسی بھی لمحے باہر آ جائے گا۔ سکوت کے باعث باہر والوں کی حکمتِ عمل کا اندازہ لگانا دشوار ہو گیا تھا۔

میں چونکہ دروازے سے بالکل چپکا ہوا کھڑا تھا۔ لہٰذا دروازے پر ہونے والی سرگوشیاں سن لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ دو مردانہ آوازیں تھیں پھر آہنی کنڈے میں تالے کی حرکت کرنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ شاید اندھا دھند دستکوں کے آغاز کے بعد ہی ان میں سے کسی کو دروازے کا جائزہ لینے کا ہوش آیا تھا اور وہ تالا دیکھنے کے بعد کسی تذبذب کا شکار ہو گئے تھے۔

تالے کی کھڑکھڑاہٹ کچھ دیر تک جاری رہی اور جوں ہی وہ آواز موقوف ہوئی کنڈی سرکا دی گئی اور پھر دروازہ کھول دیا گیا۔ پٹ کھلنے کے بعد میں اس کی اوٹ میں آ گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول تیار تھا اور نگاہیں دروازے سے گزر کر فرش پر پڑنے والی روشنی پر جمی ہوئی تھیں تاکہ آنے والا اپنے سائے کی بنا پر میری نظر میں آ سکے۔

فرش چند ثانیوں تک روشن رہا پھر اس روشنی میں کسی دبلے پتلے شخص کا لمبا سا سایہ پڑنے لگا۔ وہ جو بھی تھا دروازے کے سامنے آ کر چند ثانیوں تک رکا رہا۔ اس کے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر جھول رہے تھے اور بظاہر خالی نظر آ رہے تھے۔ اس مشاہدے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔

پھر وہ محتاط انداز میں چلتا ہوا اندر آ گیا۔

دروازے کی اوٹ سے نکل کر وہ میری نگاہوں کے سامنے آیا تو اس کی کھوپڑی عقبی سمت کے علاوہ ہر طرف گھوم رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر وہ جیسے ہی پیچھے کی طرف پلٹا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہوتی چلی گئیں۔

”اسی طرح کھڑے رہو۔“ میں نے تیز سرگوشیانہ آواز میں کہا۔

میرے بھرے ہوئے پستول کی نال اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”ہاتھ اٹھانے کی ضرورت نہیں!“

میری دھمکی سنتے ہی وہ اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ وہ کوئی دبلا پتلا، دراز قامت مقامی تھا۔ اس کی وضع قطع سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ کسی بدترین مجرمانہ کارروائی سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

اس کی حالت میں تغیر دیکھ کر شاید باہر والے کو شبہ ہو گیا تھا اور اس نے باہر سے فرنچ میں کچھ دریافت کیا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر بائیں ہاتھ کی انگلی رکھ کر پستول کی نال کو سختی سے جھٹکا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا شکار خاموش ہی رہا۔

اس نے ہاتھ گرائے رکھ کر جس طرح میری ہدایات پر عمل کیا تھا اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ انگریزی سے نابلد نہیں تھا۔

”اپنے ساتھیوں کو بھی اندر بلا لو۔“ میں نے دانستہ جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے سرد تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”باہر میرا صرف ایک ساتھی ہے۔“ اس نے پہلی بار پُراعتماد لہجے میں زبان کھولی۔ ”اور وہ اندر نہیں آئے گا۔“

میں نے لات مار کر دروازہ بند کر دیا، اس بار میں اندر سے چٹخنی لگانا نہیں بھولا تھا۔

باہر والے نے فوری طور پر زور لگا کر دروازہ کھولنا چاہا مگر میں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا بلکہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اس نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو اس کا ساتھی مشکلات سے دوچار ہو جائے گا۔

”تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم کون ہو؟“ میرے قیدی نے درمیان میں دخل انداز ہوتے ہوئے مصالحانہ لہجے میں کہا۔

”سوال کرنے کا حق صرف فاتح کو ہوتا ہے۔“ میں نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا

”اس وقت ہماری مساوی حیثیت ہے۔“ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا: ”میں تمہارا قیدی ہوں اور تم عملاً میرے ساتھی کی قید میں ہو۔ مجھے نقصان پہنچا کر تم بھی یہاں سے زندہ سلامت نہ نکل سکو گے۔“

”تم یہاں کس کی تلاش میں آئے تھے؟“ میں نے اس کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

”میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا مگر مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم کون ہو؟“

”کالا چور ہوں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟“

اس نے کھڑے کھڑے بے چینی سے پہلو بدلا اور کہا: ”مجھے تمہارے شجرے سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم خالد کے دوست ہو یا دشمن؟“

”اگر میں دشمن ہوں تو کیا ہو گا؟“

”ہماری راہیں متضاد ہوں گی اور میں بھرپور مدافعت کروں گا۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”یعنی تم خالد کی دوستی کے دعویدار ہو۔“ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کیا پیش کرو گے؟“

”اتنا ہی کافی ہے کہ میں خالد کی اس قیام گاہ سے واقف ہوں، اس نے یہ کوٹھری میری معرفت ہی کرائے پر لی تھی۔ البتہ تمہیں اپنی دوستی ثابت کرنی دشوار ہو گی۔“

میں نے اس کے چہرے پر سچائی کا اعتماد دیکھ کر اپنے پستول کی نال گرا لی۔ ”سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے اور پھر میں اس مکان میں موجود ہوں۔“

”مگر تم فرار کی کوشش میں مصروف تھے۔“ اس نے مسکرا کر چھلے ہوئے چوبی پٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بظاہر تم یہاں قید تھے۔“

”خالد میری حفاظت کے خیال سے باہر سے دروازہ مقفل کر کے گیا تھا۔“ میں یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”اندر خیریت ہے راڈنی!“ میرا ارادہ بھانپ کر اس نے بلند آواز میں انگریزی میں کہا۔ ”خاموشی سے اندر چلے آؤ۔“

میں نے دروازہ کھولا تو وحشت زدہ چہرے والا دوسرا نوجوان سر جھکائے اندر آ گیا۔ اس کی چرمی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب میں ریوالور کی نال کا ابھار صاف نظر آ رہا تھا۔

”خالد کہاں ہے؟“ راڈنی کے ساتھی نے دروازہ بند ہونے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پی رہا تھا۔

”میں خود پریشان ہوں۔ اسے یہاں سے گئے ہوئے سترہ گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں جب کہ اسے دو تین گھنٹوں میں لوٹ آنا چاہیئے تھا۔“ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کہیں وہ کسی دشواری میں نہ گھر گیا ہو۔“

”تم نے بُری خبر سنائی۔“ راڈنی مایوسانہ انداز میں جوتے کی نوک سے فرش کریدتے ہوئے بولا۔ ”ہم اسے خطرات سے آگاہ کرنے ہی آئے تھے۔“

”خطرات سے وہ باخبر تھا، ورنہ اس غلیظ بستی میں یوں چھپ کر گزارا نہ کر رہا ہوتا۔“ میں نے بالواسطہ انداز میں انہیں کریدا۔

”راڈنی نئے خطرات کی بات کر رہا ہے۔“ دوسرا الو لا پھر چونک کر سوال کیا۔ ”تمہارا نام کیا ہے اور تم کب سے خالد کے ساتھ ہو؟“

”میرا نام ڈان بروک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کل ہی خالد سے ملا تھا۔“

”مجھے ایشلے کہتے ہیں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ”تم شاید خالد کے طویل انتظار سے اکتا کر فرار کا منصوبہ بنا رہے تھے!“

”مجھے اس کی سلامتی کی فکر لاحق ہے۔“ ایشلے کے جواب میں میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں باہر نکل کر اسے تلاش کرنا چاہ رہا تھا۔“

”باہر اس کا نام بھی نہ لینا۔“ راڈنی جلدی سے بولا۔ ”کل رات سے اب تک سات آدمی اغوا کئے جا چکے ہیں۔ انہیں کسی نامعلوم مقام پر لے جا کر بُری طرح زدوکوب کیا گیا اور پھر شہر کے مختلف علاقوں میں پھنکوا دیا گیا۔“

”ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ خالد کے دوستوں میں سے تھے۔ اغوا کرنے والے تشدد کے ذریعے ان سے خالد کا پتہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔“ ایشلے نے راڈنی کی بات اچک کر جلدی جلدی کہا۔

”اغوا کرنے والے کون تھے؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہی تو سب سے بُری خبر ہے کہ انہیں مادام بواری کا نام لے کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ان ساتوں میں سے کوئی بھی رہائی کے بعد پولیس کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔“ راڈنی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

”مادام بواری تو کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔“ میں نے سادگی

سے کہا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے انہیں میرے صحیح الدماغ ہونے پر شبہ ہو پھر ایشلے بے اعتباری سے بولا۔ "تم واقعی اس نام سے واقف نہیں ہو؟"

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"پھر تم کوئی شریف آدمی معلوم ہوتے ہو۔" راڈنی نے فتوے صادر کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ "ورنہ یورپ کے تمام جرائم پیشہ افراد اس ہولناک نام سے ڈرتے ہیں اگر تمہارا زیر زمین دنیا سے ذرا بھی تعلق ہوتا تو ہماری لائی ہوئی خبر کو اتنے سکون سے نہ سنتے۔"

"شاید تم اسی لیے تالا دیکھے بغیر دروازہ توڑنے پر تلے ہوئے تھے۔" میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"خالد جب سے یہاں آیا ہے، دن کے اجالے میں اندر ہی گھسا رہتا ہے، روزمرہ ضروریات کی چیزیں خریدنے بھی غروب آفتاب کے بعد نکلتا ہے۔ اسی لیے تالے کی طرف دھیان نہیں دیا مگر اندر سے جواب نہ پا کر ہمیں تشویش ہونے لگی۔ اگر تالے پر بروقت نظر نہ پڑ جاتی تو شاید ہم دروازہ توڑ ہی ڈالتے۔" ایشلے نے کہا۔

"تم خالد کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ہماری دوستی پرانی ہے ویسے باقاعدہ معاوضے پر اسی روز سے کام شروع کیا ہے۔ جس روز وہ یہاں آیا تھا۔"

"آج سے پہلے بھی اس سے یہاں ملے تھے؟"

"کئی بار۔" ایشلے کا جواب مختصر تھا۔

"پھر اب اس کے بارے میں کیا کیا جائے؟" میں نے تشویش آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اگر وہ مادام بواری کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گیا ہے تو اس کی تلاش میں وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ویسے تو پولیس بھی کئی روز سے اس کی گرفتاری کے وارنٹ لیے گھوم رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پولیس کو وہ کیوں مطلوب ہے؟"

"اسرائیلی سفارت خانے کی عمارت اور ایئر لائن کے دفتر کی تباہی کے سلسلے میں فلسطینیوں پر شبہ کیا جا رہا ہے اور برسیلز میں جب بھی فلسطینیوں کا ذکر آتا ہے پہلا نام خالد عبدالفتاح کا ہی ہوتا ہے۔"

"کیا اس شبہ میں صداقت ہے؟" میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے سوال کیا۔

"صداقت" ایشلے استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "جب وہ وارداتیں ہوئیں تو خالد اسی کوٹھری میں روپوش تھا۔ ویسے یہاں فلسطینی اتنی ہمت کر بھی نہیں سکتے، خالد جو کچھ بھی کرتا ہے، اپنا دامن بچا کر کرتا ہے۔"

"تم دونوں خالد کی واپسی تک یہیں رکو گے یا واپس جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"تم کیسے شخص ہو کہ اسے دشمنوں میں لوٹ آنے کا انتظار ہے۔ کیا اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟" راڈنی نے سوال کیا۔

"اس کا کوئی دوست کسی سفارت خانے میں ملازم ہے، اس کے گھر کا ارادہ کر کے یہاں سے نکلا تھا۔" میں نے قدرے سوچ بچار کے بعد انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ انہیں خالد کی تلاش میں سہولت ہو سکے۔

"یہ سراغ شرلک ہومز کے کام تو آسکتا تھا مگر ہمارے لیے بیکار ہے۔" راڈنی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"مادام بواری سے براہِ راست ابتدا کی جائے تو کیسا رہے گا؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے ان دونوں سے سوال کر دیا۔

"شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" راڈنی میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے بولا۔ "مادام بواری کا نام پہلی بار سنا ہے۔ اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر خالد مادام بواری کے قبضے میں ہے تو تم لوگ اس کی طرف سے صبر کر کے بیٹھ جاؤ گے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہوا سے کون لڑ سکتا ہے۔" راڈنی مایوسانہ انداز میں شانے اچکا کر بولا۔ "اگر تم میں دم خم ہے تو ٹکرا جاؤ اس سے۔"

"ضروری تو نہیں کہ تم مادام بواری ہی پر ہلہ بولو۔ اس کے کسی اہم آدمی سے بھی ابتدا کی جا سکتی ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ہم دونوں میں سے ایک ضرور احمق ہے۔" راڈنی جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مادام بواری کو تو آج تک کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ لہٰذا اس سے براہِ راست الجھنا ہی ناممکن ہے مگر یہ یاد رکھو کہ مادام بواری کسی خونخوار کتیا کی طرح اپنے آدمیوں کا خیال رکھتی ہے۔"

"تم مجھے کسی ایسی جگہ لے جا سکتے ہو جہاں سے میں پوری رازداری کے۔۔۔ ساتھ فون کال کر سکوں؟" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سوال کیا۔

"تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" ایشلے نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ وہ راڈنی کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار نظر آ رہا تھا۔

"برسیلز میں ہوٹل موریس نامی عمارت میں کسی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میری بات سنتے ہی دونوں کے چہرے فرطِ حیرت سے قابلِ دید ہو گئے۔

"ہوٹل موریس تو مادام بواری کے آدمیوں کا گڑھ ہے۔ اس نام سے تم کب سے واقف ہو؟" ایشلے نے کہا۔

"ابھی مادام بواری کے نام سے ناواقف تھے اور اب اس کے ٹھکانے پر اپنے کسی شناسا کی موجودگی کی خبر دے رہے ہو۔" راڈنی کا لہجہ تحیّر آمیز تھا۔

"یہ سب مجھے نہیں معلوم۔" میں نے طوالت سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "ہوٹل موریس سے ہی خالد کا کھوج ضرور نکال سکتا ہوں۔"

"اپنے ساتھ تمہیں بھی نہ مروا دینا۔" راڈنی کراہا۔ "اگر مادام بواری یا خالد کی کھل کر ٹھن گئی تو ہم تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"میں صرف ایک فون کال کرنا چاہتا ہوں اگر تم اس میں بھی تعاون نہیں کر سکتے تو میں اپنا سر پیٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پبلک بوتھ سے بات کرنے میں یہ امکان بھی ہے کہ میری گفتگو کسی غیر متعلقہ شخص کے کانوں میں نہ پڑ جائے ورنہ میں تم لوگوں کو اتنے کڑے امتحان میں نہ ڈالتا۔"

"چبا چبا کر باتیں نہ کرو۔" راڈنی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "ہم لوگ اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ ایک فون کال سے ڈرنے لگیں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تو پھر چلیں۔"

ایشلے نے مزید کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھ کر میری راہنمائی کی اور ہم تینوں باہر نکل آئے۔ راڈنی نے کنڈی لگا کر اپنی جیکٹ کی جیب سے تالا نکالا اور دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

"فکر نہ کرو، یہ وہی تالا ہے۔" ایشلے میرے چہرے سے الجھن بھانپ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "خالد آیا تو اسے چابی سے با آسانی کھول سکے گا، راڈنی کو قفل شکنی میں مہارت حاصل ہے، وہ تالوں کے میکنزم کو بہت کم خراب کرتا ہے۔"

اس وقت شام کے تین بجے تھے مگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے ان تنگ گلیوں میں خاصا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ رہی سہی کسر کہر نے پوری کر دی تھی۔ سرد ہواؤں کے باعث لوگوں کی آمدورفت بھی بہت کم تھی، جو لوگ گھروں سے باہر تھے ان پر بھی اپنا کام ختم کر کے گھر کی آرام دہ فضا میں واپس پہنچنے کی عجلت سوار تھی۔ لہٰذا ہم تینوں کسی کی توجہ کا مرکز بنے بغیر با آسانی اس کشادہ گلی میں پہنچ گئے جہاں ان دونوں کی نسواری رنگ کی کار موجود تھی۔

"میں اپنے فلیٹ پر ہی لیے چلتا ہوں۔" راڈنی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے ایشلے سے مشورہ طلب انداز میں کہا۔

"وہاں سوزی تو نہ ہوگی؟" ایشلے نے سوال کیا۔

"ہوگی تو ہوا کرے، میں اسے ساتھ لے کر ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی طرف چلا جاؤں گا۔ میری واپسی تک یہ فون سے فارغ ہو جائے گا۔"

"کیا تمہارے فلیٹ پر فون نہیں ہے؟" میں نے ایشلے سے سوال کیا۔

"وہاں فون کے ساتھ ایک عدد بیوی، پانچ بچے اور بچوں کی نانی بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔" راڈنی نے قہقہہ مار کر کہا۔

"بیوی بچے تو بے چارے میری ہر بات مانتے ہیں مگر اس بڑھیا کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔" ایشلے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسے ہر وقت یہی غم لگا رہتا ہے کہ میں اس کی بیٹی کے علاوہ دوسری لڑکیوں میں بھی دلچسپی لیتا ہوں۔ ہم ادھر گئے تو وہ چھپ کر ہماری باتیں سننے کی کوشش ضرور کرے گی۔"

"پتہ نہیں تم لوگوں نے ساس کو رشتوں کی بدترین علامت کیوں بنا رکھا ہے؟" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔

"کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟"

"یورپی یا شاید سارے ہی سفید فام؟" میں نے کہا۔

"دراصل ہم لوگ ازدواجی زندگی میں بھرپور آزادی کے قائل ہیں اور ساس اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور پھر کم و بیش ہر ساس یہی سمجھتی ہے کہ داماد کی صورت میں اسے ایک بلامعاوضہ خدمت گار ہاتھ لگا ہے جس کو اپنے نخروں، دھونس اور دھمکی کا نشانہ بنانا اس کا پیدائشی حق ہے۔" ایشلے کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟" اچانک راڈنی پوچھ بیٹھا۔

"تارکینِ وطن کا کوئی ملک نہیں ہوتا، ویسے میں برطانوی شہریت رکھتا ہوں۔" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

"برطانوی بڑھیاں اس معاملے میں زیادہ عذاب ثابت ہوتی ہیں۔" ایشلے نے کہا۔ "شادی کے بعد تمہارا حشر قابلِ دید ہوگا۔"

ہنستے بولتے ہم تینوں بخیر و عافیت راڈنی کے فلیٹ پر پہنچ گئے خوش قسمتی سے فلیٹ کا دروازہ مقفل تھا جس کا مطلب تھا کہ راڈنی کی محبوبہ سوزی کہیں گئی ہوئی تھی۔

صاف ستھرے فلیٹ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا خاصا دشوار تھا کہ وہاں راڈنی جیسے وحشت زدہ شخص کی رہائش ہوگی۔

راڈنی تینوں کے لیے وائن تیار کرنے لگا، اسی اثنا میں ایشلے نے ٹیلی فون ڈائرکٹری سے ہوٹل موریس کے تین نمبر تلاش کر لیے۔

"کم از کم یہ تو بتا دو کہ تم وہاں کس سے اور کیا بات کرو گے" ایشلے نے ایک سادہ کاغذ پر تینوں نمبر لکھتے ہوئے سوال کیا۔

"سنتے رہنا۔" میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر ڈائل کیا تو دوسری گھنٹی پر ہی ریسیور میں ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"ہوٹل موریس؟" میں نے اس کے فقرے پر توجہ دیے بغیر سوال کیا کیوں کہ وہ ڈچ زبان میں مخاطب ہوا تھا۔ "میں صرف انگریزی سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے ماؤتھ پیس دانستہ منہ سے دور رکھا تھا۔

"ہاں، کس سے بات کرنی چاہتے ہو؟" اس نے انگریزی میں سوال کیا۔

"میں پیرس سے بول رہا ہوں، مس شاہدہ سے ملاؤ۔"

"شاہدہ سے بات کرنے کے لیے تمہیں لمبا ہولڈ آن کرنا پڑے گا۔"

"تم اسے بلاؤ، میں دس منٹ بعد دوبارہ رنگ کروں گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام غیر ضروری ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ کسی گمنام مرد سے بات کرنی پسند نہ کرے۔" دوسری طرف سے بولنے والے کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

ڈوان فرنانڈو کہہ سکتے ہو۔" میں نے اپنا ایک پرانا مفروضہ نام دہرا دیا جو شاہدہ کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

اور وہ نام شاید میرے مخاطب کے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ کیوں کہ مجھے ریسیور پر اس کی بے ساختہ تحیر آمیز آواز سنائی دی تھی۔

میں نے فوراً ہی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یہ کیا چکر چلا رہے ہو تم؟" ریسیور کریڈل پر رکھتے ہی میرے کانوں میں راڈنی کی تحیر آمیز آواز آئی۔

"اور یہ تم ڈوان فرنانڈو کب سے ہو گئے؟" ایشلے نے بھی مجھے مہلت دیے بغیر سوال جڑ دیا۔

"شاہدہ سے میرے پرانے مراسم تھے اور وہ مجھے ڈوان فرنانڈو کے نام سے پہچانتی ہے۔" میں نے لمبے سے وائن کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو اب ڈوان بروک کیوں ہو گئے؟" راڈنی کے پاس اگلا سوال تیار تھا۔

"میرا اصل نام یہی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "شاہدہ مجھ سے شادی کرنی چاہتی تھی مگر میں اس سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت میں نے براہِ راست ڈائلنگ کی سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے ورنہ اسے پتہ چل جاتا کہ میں برسلز میں ہی ہوں تو وہ میری تلاش میں شہر کا کونہ کونہ چھان مارتی۔"

"یہ تو تمہاری پیرس میں موجودگی کا جواز ہو گیا۔" ایشلے وائن کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ "مگر تم خالد کے بارے میں اس سے کیا بات کرو گے؟"

"دیکھتے جاؤ، اسی کی باتوں سے کوئی موقع نکلے گا۔"

"شاہدہ کب سے مادام بواری کے لیے کام کر رہی ہے؟" ایشلے نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے آسودہ لہجے میں سوال کیا۔

"میں یہ سب نہیں جانتا، نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ ہوٹل موریس مادام بواری کے آدمیوں کا گڑھ ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ شاہدہ اس ہوٹل میں ملازمت کرتی ہو گی۔"

"کمال ہے کہ اتنی دوستی کے باوجود تم نے ادھر کا رخ نہیں کیا ورنہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ سرے سے ہوٹل ہی نہیں ہے۔"

"جب روز خود ہی چلی آتی تھی تو میرے جانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی، پھر نہ اس نے کبھی مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی نہ میں نے اصرار کیا۔"

"کیا وہ یقین کرے گی کہ تم پیرس ہی سے بول رہے ہو؟"

"براہِ راست ڈائلنگ کے ہوتے ہوئے یقین نہ کرنے کی وجہ ہی نہیں ہے۔" میں نے ٹانگیں پسار کر کہا۔ "اور پھر اس سے میری پہلی ملاقات بھی پیرس میں ہوئی تھی۔ آخری احتیاط کے طور پر میں نے ماؤتھ پیس کو منہ سے کافی دور رکھا ہوا تھا۔"

دس منٹ بعد میں نے دوبارہ ہوٹل موریس کا نمبر ملایا تو وہ دونوں انتہائی اشتیاق کے عالم میں میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔

سلسلہ ملنے پر۔۔ جوں ہی میں نے شاہدہ کا نام لیا، ریسیور پر اس کی رسیلی آواز سنائی دی۔ "میں بول رہی ہوں۔ کیا جاننے کے لیے فون کیا ہے مجھے؟" وہ اردو میں بول رہی تھی۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔" میں نے اردو ہی میں کہا۔ ایشلے اور راڈنی ناقابلِ فہم زبان میں گفتگو شروع ہو جانے پر احمقوں کی طرح منہ پھاڑ کر رہ گئے۔

"تم نے مجھے پیرس میں اپنی موجودگی کی خبر دے کر حماقت کی ہے۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "میرے آدمیوں نے تمہاری تلاش شروع کر دی ہے ورنہ ابھی تک میں برسلز میں ہی سر کھپا رہی تھی۔ تم بلجیم سے کیسے نکلے؟"

"ایک کارگو کنٹینر میں گھس کر سرحد پار نکلا تھا۔ میں نے جاتے ہوئے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا اس پر معذرت خواہ ہوں۔"

"تم نے میرے اعتماد کا خون کیا ہے۔" شاہدہ کی آواز بدستور بے لچک اور عاری تھی۔ "مگر اب اس کمرے سے کوئی اس طرح مجھے چھوڑ کر نہ نکل سکے گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم کسی اور کے بارے میں سوچنے لگی ہو۔"

"میں نے صرف تمہارے بارے میں سوچا تھا اور تم یقین کرو کہ تمہارے بارے میں میرا عزم اب بھی تازہ ہے۔"

"ایک معمولی سے آدمی کے لیے اس طرح جذباتی انداز میں سوچ کر تم اپنی صلاحیتیں برباد کر لو گی۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"معمولی آدمی مجھے یوں زک پہنچانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔" اس کی آواز میں عجیب سی کسک سمٹ آئی۔ "میرا تو خیال تھا کہ پہلی بار میں اپنے معیار کے ایک مرد سے ملی ہوں۔ تمہاری جرأت اور بے خوفی میں کبھی نہ بھول سکوں گی۔"

"وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "قدرت نے اگر انسان کو بھول کے عطیے سے نہ نوازا ہوتا تو شاید آج دنیا اتنی وسیع نہ ہوتی۔ ہزاروں آدمی محض صدموں سے ہی مر جاتے۔"

"یہ تمہارا فلسفہ ہے، میرا نظریہ مختلف ہے۔" اس کی آواز سنائی دی۔ "بس تم میرے الفاظ یاد رکھنا۔"

"کن الفاظ کا حوالہ دے رہی ہو؟"

"تمہیں اپناؤں گی اور اگر نہ اپنا سکی تو کسی اور کا بھی نہ ہونے دوں گی۔" اس کے لہجے سے عزم جھلک رہا تھا۔

"میں کوشش کروں گا میری اور تمہاری راہیں ہمیشہ جدا رہیں۔"

"مگر میں تمہارا پیچھا کروں گی۔" اس نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم نے فون کیوں کیا ہے؟"

"بس معذرت کے لیے... اور وہ بھی یوں کہ میرے دل میں تمہارے لیے عزت موجود ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے پیرس میں اپنی موجودگی کی خبر دے کر بہت سے لوگوں کو مشکل سے بچا لیا ہے۔" اس نے افسردہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"برسلز میں ہر اس شخص کی شامت آئی ہوئی ہے جس سے تمہارے بارے میں کوئی بھی اطلاع مل سکتی ہے۔"

"خالد عبدالفتاح کو تو تم نے پھر گولی ہی مار دی ہو گی۔" میں نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔ "اگر اسے میرے بھیجے پر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔"

"اس کی تلاش ضرور تھی مگر وہ میرے آدمیوں کے ہاتھ نہیں لگ سکا، سنا ہے کل رات اسے اسرائیلیوں نے پکڑ لیا ہے۔ تم چاہو تو اس کے لیے کچھ کر سکتے ہو۔"

"پیرس میں رہ کر میں کیا کر سکوں گا؟"

"برسلز آ جاؤ، میں تمہاری مدد کروں گی۔" شاہدہ کی آواز میں یک لخت اشتیاق سمٹ آیا۔

"تم سے سامنا کرنے کی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔" میں نے خوبصورتی کے ساتھ اس کی پیش کش ٹالتے ہوئے کہا۔ "ویسے خالد کہاں قید ہے؟"

"کرنل ڈیوڈ کی قیام گاہ پر بدترین عتاب جھیل رہا ہو گا۔"

"تو تم ہی اسے رہا کرا دو، تمہاری تو ویسے بھی اسرائیلیوں سے چلی ہوئی ہے۔" میں نے کسی قسم کے جوش کا اظہار کیے بغیر کہا۔

"میرا احسان مانو گے؟"

"میں تمہارا احسان مند تو اسی وقت سے ہوں جب تم نے کرنل ڈیوڈ کی پیش کش ٹھکرا کر اسے اپنے کاٹیج سے بے نیل و مرام واپس لوٹا دیا تھا۔"

"فراخ دلی بھی تمہاری ایک خوبی ہے ورنہ زیادہ لوگ احسان فراموش ہوتے ہیں۔"

"میں جس شخص کے گھر سے فون کر رہا ہوں وہ اتنا بھاری بل ادا نہ کر سکے گا۔" میں نے اسے یاد دلایا کہ میں دوسرے ملک سے بول رہا ہوں۔

"اپنا نمبر دے دو، میں رنگ کرتی ہوں۔"

میں دل ہی دل میں اس کی مکاری پر ہنس دیا مگر بظاہر انجان بنتے ہوئے بولا۔ "میں ریسیور رکھ کر یہاں سے نکل جاؤں گا، یہ بتاؤ کہ تم خالد کے سلسلے میں کچھ کر رہی ہو؟"

"وہ زندہ ہوا تو نصف گھنٹے میں رہا کرا دیا جائے گا... اور کچھ نہ سہی تم پر احسانات کا بوجھ ہی بڑھتا رہے گا۔ آئندہ سامنا ہوا تو کم از کم تمہاری آنکھوں میں تھوڑا سا لحاظ تو ہو گا۔" اس کی آواز میں افسردگی عود کر آئی۔

"شکریہ۔ پھر کبھی موقع ملا تو فون کروں گا۔"

"میں شاید آج ہی برسلز چھوڑ دوں گی۔ آئندہ مجھے فون نہ کرنا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ خدا حافظ۔" میں نے اس کے الوداعی کلمات سن کر ریسیور رکھ دیا۔

ریسیور رکھتے ہی یک بیک میرا دل اداس ہو گیا۔

"کیا باتیں ہوئیں؟" ایشلے اور راڈنی نے تقریباً ایک ہی ساتھ سوال کیا۔

"خالد اسرائیلیوں کی قید میں ہے۔"

"کہاں؟" راڈنی نے دہشت زدہ انداز میں میز پر مکا مار کر سوال کیا۔

"پیرس کے اسرائیلی سفارت خانے سے کرنل ڈیوڈ نامی ملٹری سیکرٹری یہاں آیا ہوا ہے۔ خالد اسی کی قیام گاہ پر قید ہے۔"

"تو پھر چلو، یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو!" وہ میرا بازو تھام کر مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے غصے سے بولا۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ ابھی تک زندہ ہے تو نصف گھنٹے میں آزاد کرا لیا جائے گا۔"

"کون آزاد کرائے گا؟" ایشلے نے بے اعتباری سے پوچھا۔

"مادام بواری کے آدمی یا شاہدہ کے دوست۔"

"یہ شاہدہ کیا بلا ہے؟"

"مجھے خود نہیں معلوم، ویسے موہوم سا وعدہ کیا ہے اس نے۔"

"تم کس زبان میں گفتگو کر رہے تھے؟" راڈنی نے پوچھا۔

"ایک قبائلی زبان تھی۔" میں نے اردو کے نام سے دانستہ گریز کرتے ہوئے کہا۔ "شاہدہ اس زبان میں بات کر کے خوش ہوتی ہے۔"

"میرے لیے تمہاری شخصیت بتدریج مشکوک ہوتی جا رہی ہے۔" ایشلے نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہونی ہی چاہیے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کیوں کہ میں بے چون و چرا تمہارے ساتھ تعاون کرتا چلا آ رہا ہوں۔"

"جس شخص کی خواہش پر مادام بواری کے کارندے کام کرنے لگیں وہ کوئی معمولی شخص نہیں ہو سکتا۔" ایشلے نے کہا۔

"میرے لیے تمہارے ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیوں کہ مادام بواری میرے لیے ایک نامانوس سا نام ہے۔"

"کیا فضول بحث لے بیٹھے۔" راڈنی نے دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "وہ لوگ کچھ کریں یا نہ کریں۔ ہمیں کرنل ڈیوڈ کے مکان کا سراغ لگا کر وہاں جلد از جلد دھاوا بول دینا چاہیے۔"

"تم یہیں رکو۔" ایشلے اٹھتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "اسے چار گلاس سے آگے نہ بڑھنے دینا ورنہ یہ اس فلیٹ کو میدانِ جنگ میں بدل کر رکھ دے گا۔ میں خالد کے مکان پر جاتا ہوں اگر وہ ادھر پہنچا تو میں اسے ساتھ لے آؤں گا۔"

"چار گلاس کیا، میں بوتل بھی خالی کر دوں تو میرا کچھ نہیں بگڑتا۔" راڈنی نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک کر تیسرا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان پھسڈیوں میں سے نہیں ہوں جو شراب کی محض بو سے ہی نشے میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔"

"واپسی میں تعاقب کا خیال رکھنا۔" میں نے راڈنی کی ہرزہ سرائی پر کان دھرے بغیر ایشلے سے کہا جو جاتے جاتے رک کر راڈنی کو گھورنے لگا تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور راڈنی نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

چند ثانیوں تک وہ ہوں ہاں کرتے ہوئے کچھ سنتا رہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے بولا۔ "تمہارا فون ہے، کوئی لڑکی بول رہی ہے۔"

"لڑکی!" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ میری کون سی شناسا پیدا ہو گئی؟"

"آواز سے نوجوان لگتی ہے۔" راڈنی ریسیور کو آنکھ مار کر بولا۔

"ہیلو!" میں نے ریسیور پر دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔" میرے کانوں سے شاہدہ کی آواز ٹکرائی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "اب فلیٹ سے نکلنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ چاروں طرف سے بھون دیئے جاؤ گے۔ میں خود ادھر آ رہی ہوں۔"

مایوسی کی شدید لہر نے میرے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا مگر میں نے اپنے لہجے پر پوری طرح قابو رکھا۔ "تم مجھے نہیں پا سکو گی شاہدہ۔"

"میری بات سنو۔" وہ جلدی سے بولی۔ "تمہاری دوسری فون کال کے وقت میرا ریڈیو آفیسر تیار تھا اس نے دوسری بار ایکسچینج سے باآسانی معلوم کر لیا کہ تم مانیکرو ویو رابطے پر نہیں بلکہ برسیلز کے ہی ایک نمبر سے بات کر رہے تھے اور اس نے نہ صرف نمبر بلکہ اس فلیٹ کا پتہ بھی لے لیا اور اب تک میرے دس بارہ آدمی اس عمارت کا محاصرہ کر چکے ہوں گے۔ لہٰذا کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔ میں ہر حال میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس کا آخری فقرہ تاکیدی تھا۔

میں نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ راڈنی اور ایشلے شاید میرے بشرے کی بدلی ہوئی کیفیات دیکھ کر بوکھلائے ہوئے تھے۔

"بھاگو ــــ چوٹ ہو گئی!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا اور اوور کوٹ کی داہنی جیب میں پڑے ہوئے پستول کے سرد آہنی دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے تیزی سے نکاسی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"خطرہ ہے تو ادھر سے آؤ!" راڈنی جلدی سے بولا اور میں فوراً ہی واپس آ گیا۔

کچن کا ایک دروازہ مختصر سی ویران راہداری میں کھلتا تھا اور اس طرف تنگ زینوں کا سلسلہ بھی موجود تھا۔

ہم لوگ جونہی نیم تاریک زینوں کی طرف بڑھے، دیوار کی اوٹ سے ایک دراز قد شخص اچانک سامنے آ گیا اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔

موت کے بھیانک خطرے کو سر پہ منڈلاتے دیکھ کر اس وقت میرے وجود میں ناقابلِ یقین سرعت سرایت کر چکی تھی میں نے پھرتی کے ساتھ سائیلنسر چڑھا ہوا پستول نکال کر سیدھا کیا اور راستے میں حائل ہونے والے کا بھیجہ پاش پاش کر دیا۔

پستول کے کھٹکے کی آواز کے ساتھ ہی وہ نامعلوم شخص لہرا کر سیڑھیوں پر گرا اور نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ میرے پستول کی گولی نے اسے اس قدر سہل موت سے ہمکنار کیا تھا کہ اسے چیخنے یا تڑپنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

اس عقبی زینے پر ویرانی کا راج تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے عمارت کے مکین وہ راستہ شاذ و نادر ہی استعمال کرتے

ہوں گے۔ یہ صورتحال ہم تینوں کے لئے حوصلہ افزا تھی ہم ... کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے جا پہنچے!

"کالر کھڑے کر لو!" آخری سیڑھی پر ایشلے کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی اور اس ہدایت پر فوراً ہی عمل ...

میرے لئے شاہدہ کے آخری الفاظ بہت اہم تھے ... نے کہا تھا کہ وہ مجھے ہر قیمت پر زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس ... اضطراری طور پر اپنی دلی خواہش کا اظہار کر دیا تھا اور مجھے ... تھا کہ اس نے اپنے آدمیوں کو بھی میرے بارے میں احتیاط ... ہدایت کی ہو گی۔ ان لوگوں کی جھجک اور احتیاط تصادم کے ... پر میری کامیابی کا سبب بن سکتی تھی۔

پھر اس کہر آلود موسم میں کالر کھڑے کر لینے کے بعد ... شناخت بھی بہت دشوار ہو چکی تھی لیکن پھر بھی میں ہر ... صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

"سامنے!" عمارت کے عقبی دروازے سے باہر نکلتے ... راڈنی نے میرے کان کے نیچے کہا اور میری نگاہیں بے اختیار اسی طرف اٹھ گئیں۔

کہر کے دھندلکے میں اس دروازے کے عین سامنے ... دیوار کے ساتھ سرخ رنگ کی ایک ٹوسیٹر کھڑی ہوئی تھی ... ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص بے فکری کے ساتھ سگریٹ پھینے میں معروف تھا۔ اس کے سر پہ فلٹ ہیٹ موجود تھی ... کے باعث اس کے چہرے کے رُخ کا اندازہ لگانا دشوار تھا ... اس نے سگریٹ کا کش لیا تو سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے ... بنا پر پتہ چلا کہ وہ اسی دروازے کی طرف متوجہ تھا۔

"تم رکو ــــ میرا پستول بے آواز ہے!" میں نے ... کا ہاتھ جرمی جیکٹ کی طرف جاتے دیکھ کر سختی سے ...

ہم لوگ عمارت سے نکل کر فٹ پاتھ پر آئے تو وہاں ... کا راج تھا۔ میں رکے بغیر سڑک عبور کر کے ٹوسیٹر کی طرف ... چلا گیا۔ ان دونوں نے بھی میری تقلید کی۔

ٹوسیٹر والے نے تین آدمیوں کو یوں دیوانہ وار اپنی ... آتے دیکھا تو شاید بوکھلا گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر نیچے ... کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہم تینوں اس کے سر پر ... اور میں نے سختی کے ساتھ دروازے پر بایاں ہاتھ رکھ کر ... دروازہ کھولنے سے روک دیا۔

اس سے پیشتر کہ میں اس کے ردِ عمل کا اندازہ کر کے ... کارروائی کرتا، میری پشت سے بجلی کی سی سرعت سے ... کا ہاتھ نمودار ہوا جس میں ریوالور کی نال دبی ہوئی تھی ... ریوالور کا وزنی دستہ پوری قوت سے ٹوسیٹر والے کی ...

... بینی حصے پر پڑا۔ اس کا جسم یکبارگی سیٹ سے اچھلا، اس کے حلق سے ایک دبی دبی سی چیخ بلند ہوئی اور پھر اس کا بدن ڈھیلا ہو کر سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

ایشلے نے کار کا دروازہ کھول کر اس کے بے جان بدن کو کالر کے سہارے بے رحمی سے باہر گھسیٹ کر سڑک پر ڈال دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ پھرتی کے ساتھ میں راڈنی کے ہمراہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ ایشلے نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور کار تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔

اس کار میں صرف دو نشستیں ہونے کی وجہ سے ہمیں بیٹھنے میں خاصی دشواری ہوئی مگر اس وقت وہ مختصر سی کار بھی ہمارے لئے نعمتِ غیر مترقبہ تھی جو ہمیں تیزی کے ساتھ اپنے دشمنوں سے دور لے جا رہی تھی۔

اس علاقے سے کافی دور نکل آنے کے بعد ایک پارک کے قریب وہ کار چھوڑ دی گئی کیونکہ زیادہ دیر تک اس میں گھومنے کی صورت میں ہمارا پکڑا جانا یقینی تھا۔

"یہ سب ہوا کیسے؟" بھاگ دوڑ کا خاتمہ ہونے کے بعد ایشلے کو اس اچانک فرار کے اسباب جاننے کا خیال آ ہی گیا۔

"وہ لڑکی میری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔" میں نے ذلت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس نے مجھے باتوں میں لگائے رکھا اور اس کے کسی ساتھی نے دوسرے فون پر ایکسچینج سے یہ معلوم کر لیا کہ میں پیرس کے بجائے برسیلز سے ہی بات کر رہا تھا۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری دوست ہے!"

"دوست ضرور ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مادام بواری کی اتنی وفادار ہو گی۔" میرا لہجہ بدستور مدافعانہ تھا۔

"مگر مادام بواری سے تمہاری کیا دشمنی ہے کہ تمہارا سراغ ملتے ہی اس کے آدمی راڈنی کے فلیٹ پر چڑھ دوڑے؟"

"شاید یہ بھی خالد سے واقفیت کا شاخسانہ تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالد بدستور خطرے میں ہے!"

"خالد کو چھوڑو ــــ سوزی کا کیا ہو گا؟" راڈنی چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ "میرے فلیٹ پر پہنچتے ہی وہ بے خبری میں دھر لی جائے گی!"

"ڈان فرنانڈو نے ہم دونوں کو ہی مشکل میں ڈال دیا ہے۔" ایشلے تشویش زدہ انداز میں بڑبڑایا۔

"تمہارا تو کچھ بھی نہیں بگڑا، میرا فلیٹ ان خونخوار درندوں کی نظر میں آ گیا ہے پھر وہاں ان کا ایک آدمی مارا بھی گیا ہے لہٰذا وہ پاتال میں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے!"

راڈنی کا خوف بجا تھا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میں نے اس بے چارے کو بدترین حالات سے دوچار کر دیا تھا۔

"تم اس وقت سوزی سے کہیں رابطہ قائم کر کے اسے روک نہیں سکتے؟" میں نے جھجکتے ہوئے راڈنی سے سوال کیا۔

"وہ کہیں بھی ہو سکتی ہے، میں اسے کہاں کہاں تلاش کروں گا۔" راڈنی بہت زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ "اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک فلیٹ پر پہنچ ہی گئی ہو!"

کافی دیر تک غور و خوض کے بعد بھی راڈنی کی پریشانیوں کا کوئی حل دریافت نہ ہو سکا اور آخر کار میں نے ایک بار پھر فون کا سہارا لینے کا فیصلہ کر لیا۔

راڈنی تو اس وقت ذہنی طور پر قطعی ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا مادام بواری سے دشمنی کی دہشت نے اس کی ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔ ایشلے نے ابتداء میں میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا مگر متبادل راستہ سامنے نہ ہونے کے باعث اسے میرا ساتھ دینا ہی پڑا۔

میں نے ایک قریبی پبلک بوتھ سے راڈنی کے فلیٹ کا نمبر ڈائل کیا اور کافی دیر کے بعد جواب پانے میں کامیاب ہو سکا۔

ایشلے باہر کھڑا اقرب و جوار کی نگرانی کر رہا تھا اور راڈنی کسی دوسرے بوتھ سے سوزی کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم کون ہو؟ میں صرف انگریزی سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے فون پر سہمی ہوئی نسوانی آواز سننے کے بعد کہا۔

وہ شاید انگریزی سے بالکل ہی نابلد تھی۔ میں اپنی کہتا رہا اور وہ رک رک کر اپنی کہتی رہی اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی کے مشورے پر جوابات دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند فقروں کے بے معنی تبادلے کے بعد دوسری طرف سے ریسیور کسی اور نے لے لیا۔ اس بار ایک کرخت مردانہ آواز سنائی دی۔ "تم کون ہو ــــ؟"

"میں شاہدہ سے بات کرنی چاہتا ہوں۔"

"شاہدہ؟" اس کی آواز سے بلا کی حیرت نمایاں تھی۔ "تم نے کہاں فون کیا ہے؟"

"اگر تم اس کے آدمی ہو تو مجھے پہچان سکتے ہو، اس وقت تم لوگ شاید میری ہی تلاش میں سرگرداں ہو؟"

"ہولڈ کرو، میں اسے بلاتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہیلو۔" چند ثانیوں بعد مجھے شاہدہ کی زیر میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اب شاید تم لندن سے بول رہے ہو؟"

"پہلے کس لڑکی نے فون وصول کیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"دہشت سے اس بے چاری کی آدھی جان نکلی ہوئی ہے۔" وہ بولی۔ "شاید اس کا دوست تمہارے ساتھیوں میں ہے!"

"کس دوست کی بات کر رہی ہو؟"

"لڑکی نے اس کا نام راڈنی بتایا ہے!"

"مجھے ایک محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی، میں نے نقب زنی کے لئے چند گھنٹے پیشتر اس فلیٹ کا انتخاب کیا تھا میں کسی پارٹی کو نہیں جانتا۔"

"یہ تو میں راڈنی سے ہی پوچھوں گی!"

"کیوں بلاوجہ بے گناہوں کو رگیدنے پر تلی ہوئی ہو؟"

"سوزی بے گناہ ہے اور محفوظ ہے، اگر راڈنی کے بارے میں مجھے اطمینان ہو گیا تو اسے بھی بھول جاؤں گی۔"

"مجھے اس آدمی کی موت کا قلق ہے جو سیڑھیوں پر میرے ہاتھوں مارا گیا۔"

"بڑی چال چلی جاتی ہے تو پیدل پٹتے ہی ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ وہ حق نمک ادا کرتے ہوئے مارا گیا۔" شاہدہ کا لہجہ سرسری تھا۔

"میں خالد سے بات کرنی چاہتا ہوں۔"

"وہ اب تک اپنے گھر پہنچ چکا ہوگا، جا کر مل لو اس سے!"

"تو تم نے اسے واقعی رہا کرا دیا——؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے الفاظ اٹل ہوتے ہیں ڈارلنگ!" اس نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم پر احسان کرنے کے ساتھ ہی میں نے کرنل ڈیوڈ کو بھی زک پہنچائی ہے...... گمشدہ اسرائیلی تیاحوں کی ٹولی اسی کے گھر مقیم تھی۔ ان میں سے تین کم کر دیئے گئے ہیں۔"

"تم سے میرا واسطہ دن بدن عجیب رُخ اختیار کرتا جا رہا ہے!"

"میں ایسا محسوس نہیں کرتی!"

"دشمنی کے باوجود یہ باتیں عجیب نہیں لگتیں——؟"

"دشمنی؟" وہ ہنس پڑی۔ "دشمنی ہوتی تو شین مارکیڈ کے پاگل خانے سے ہوٹل موریس تک کہیں بھی با آسانی مارے جا سکتے تھے۔"

"جاتے جاتے میں بھی تمہیں ختم کر سکتا تھا، مگر تمہارے سلوک نے ہی مجھے درگزر پر مجبور کیا تھا۔" میں نے بھی اس پر اپنا طرزِ عمل واضح کر دیا۔

"تم اب کدھر کا رُخ کرو گے؟"

"جدھر منہ اٹھ گیا۔" میں نے کہا۔ "میری کوئی منزل نہیں ہے!"

"منزل تمہارے قدموں میں ہے، تم ہی اسے ٹھکرانے پر تلے ہوئے ہو!"

"اس بار مجھے باتوں میں لگا کر تم میرا سراغ نہ لگا سکو گی۔"

میں نے کہا۔ "میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ خالد تمہارا... میں تو نہیں ہے کیونکہ مجھے اس تک ایک اہم بات پہنچانی تھی۔"

"وہ تمہیں اپنے ٹھکانے پر ملے گا۔"

"اور وہاں میرے لئے تمہارا جال تیار رہے گا؟"

وہ پھر ہنس پڑی۔ "اتنا گھبراتے ہو تو وہ پیغام مجھے بتا دو تمہاری خاطر نامہ بری بھی منظور ہے۔"

"اس طرح تو شاید تم مجھے واقعی اسیر کر لو گی۔" میں نے بھی ہنس کر کہا۔ "ہو سکے تو اس سے یہ کہلوا دینا کہ وہ اسرائیلیوں سے دور ہی رہے۔"

"عجیب سی بات کہہ رہے ہو!"

"زخم خوردہ اسرائیلی اس وقت بہت خونخوار ہو چکے ہیں —— خالد دلیر مگر سادہ لوح ہے۔ اب ان کے شکنجے میں آیا تو بچ نہ سکے گا۔"

"تو آخر تم نے تسلیم کر ہی لیا کہ تمہاری ہمدردیاں فلسطینیوں کے ساتھ ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ خالد میرا گہرا دوست ہے!"

"یہ اسے بتانا جس نے کرنل ڈیوڈ سے تمہاری اصلیت نہ سنی ہو!"

تھوڑی سی گفتگو کے بعد میں نے خوشگوار انداز میں فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

باہر آ کر جب میں نے ایشلے کو بتایا کہ سوزی فلیٹ پر ان لوگوں کے قبضے میں تھی تو وہ پریشان ہو گیا مگر میں نے اسے بتایا کہ نہ صرف سوزی محفوظ تھی بلکہ راڈنی نے بھی بازپرس کے جواب میں اعتماد سے کام لیا تو اس پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔

ہم دونوں وہاں کھڑے سگریٹ پیتے رہے ایشلے کو اس بیان پر یقین نہیں آ سکا کہ شاہدہ نے خالد کو رہا کرا دیا تھا۔ خود مجھے یہ بات عجیب سی محسوس ہو رہی تھی کہ جس فریق کے آدمی میری گولیوں کا نشانہ بنے ہوں وہ میرے ایک دوست کو غیر معمولی امداد پہنچا رہا تھا مگر حقائق اپنی جگہ برقرار تھے۔ یہ بات ضرور تھی کہ خالد کی آزادی کی تصدیق تک میں شاہدہ کے بیان پر پوری طرح یقین کے لئے تیار نہیں تھا۔

چند منٹ بعد متوحش اور پریشان حال راڈنی بھی آ گیا اس کے ڈھلکے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ حالات سے مایوس تھا۔

"کہیں نہیں ملی۔" وہ دور ہی سے مایوسانہ آواز میں بولا۔

"ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، وہ خیریت سے ہے۔" ایشلے نے میدان صاف پا کر خوش دلی کے ساتھ تبصرہ کیا۔

"کہاں ہے؟" راڈنی کے ڈھلکے ہوئے شانے یک لخت اٹھ گئے۔

"اپنے فلیٹ میں تمہاری منتظر ہے، میری اس سے بات ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ بے اعتباری سے بولا۔

"ڈان کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟" ایشلے اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"وہ انگریزی سے نابلد ہے اور ڈان ڈچ یا فرنچ نہیں جانتا، پھر ان دونوں کی بات کیسے ہو گئی؟" راڈنی اس وقت صورت سے نرا گاؤدی نظر آ رہا تھا۔

"ہم ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکے۔ رانہ فون اسی نے اٹھایا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے...... سوزی کی خیریت سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ اسے شاہدہ کے آدمیوں کے نرغے میں پہنچ کر کیا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

"ان بھیڑیوں کا سامنا میرے بس سے باہر ہے۔" شاہدہ کے ساتھیوں کا ذکر آتے ہی وہ ایک دم بھڑک گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے شرافت سے پیش آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"شرافت!" اس نے حقارت سے دہرایا۔ "وہ تمہارے پیچھے ہتھیار لئے گھوم رہے ہیں، تم ان کا ایک آدمی میرے سامنے مار چکے ہو اور پھر بھی ان سے شرافت کی توقع رکھتے ہو!"

"تم تو سارے معاملے سے لاتعلقی کا اظہار کر دو گے، ان باتوں سے تمہیں کیا لینا ہے۔" ایشلے نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم میری جگہ ہوتے پھر پوچھتا۔" وہ جل کر بولا۔ "لاتعلقی کا اظہار اتنا آسان کام نہیں ہے اگر سوزی کا قصہ نہ اٹکا ہوتا تو میں فلیٹ کو ہی لات مار دیتا۔"

"خالد سے تمہیں اتنا معاوضہ تو نہیں مل سکے گا۔"

"زندہ رہا تو دس گنا کما لوں گا۔" راڈنی کسی طرح ملنے پر آمادہ نہیں تھا۔

پارک میں یخ بستہ ہواؤں کی کاٹ برداشت کرتے ہوئے ہم دونوں ہی اس کے ساتھ کافی دیر تک سر کھپاتے رہے اور آخر راڈنی اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ وہ پہلی بار ایشلے کے ساتھ اپنے فلیٹ جائے گا تاکہ دونوں مل کر صورتِ حال سے نمٹ سکیں۔

"اور تم کہاں جاؤ گے؟" ایشلے کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

"میری فکر نہ کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "انسانوں کے سمندر میں کہیں بھی گم ہو جاؤں گا۔"

"تمہیں خالد کی رہائی کی تصدیق سے دلچسپی نہیں ہے؟"

اس نے سوال کیا۔

"ضرور ہے مگر میں کسی نئے پھندے میں گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"گردن تو میری ہی پتلی ہے۔" راڈنی جلے بھنے لہجے میں بولا۔ "تمہارے پرانے سارے ہی پھندے بالکل ٹھیک فٹ ہوتے ہیں۔"

"اس وقت تم کسی عیال دار بیوہ کی طرح نظر آ رہے ہو!"

ایشلے اس کی جھلاہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

"اگر مجھے پتہ ہوتا کہ ڈان بے خبری میں مجھے دام لواری کا چارہ بنا دے گا۔ تو میں بھول کر بھی اسے اپنے فلیٹ پر لانے کی حماقت نہ کرتا۔"

"حماقت ہو ہی گئی تو اب مردانگی کے ساتھ اس کے نتائج بھی بھگتو!" میں نے کہا۔

"مردانگی کا نام نہ لینا اب۔" وہ میری طرف پلٹ کر غرایا۔ "انفرادی مقابلہ ہو تو میں بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا سکتا ہوں۔"

"جب ساری بات طے ہو گئی تو اب بحث کیوں کر رہے ہو؟" ایشلے نے منہ بنا کر کہا۔

ان دونوں سے نہایت خطرناک انداز میں میری ملاقات ہوئی تھی مگر جلد ہی ان سے بے تکلفی بھی ہو گئی تھی ان کے مزاج بالکل مختلف تھے ایشلے ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا جبکہ راڈنی کی کھوپڑی میں بارود بھری ہوئی تھی مگر ان کا خلوص قابلِ داد تھا۔

رخصت ہوتے ہوئے ایشلے نے تو پُرتپاک مصافحے پر ہی اکتفا کیا مگر تیغ گر راڈنی بغل گیر ہوئے بغیر نہ ٹل سکا۔

میں وہیں کھڑا ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب ان کے ہیولے شام کی سرمئی کہر میں معدوم ہو گئے تو میں سستانے کی غرض سے جھاڑیوں میں گھری ہوئی ایک بینچ پر جا بیٹھا۔

سردیوں کے ان ایام میں وہ پارک عموماً ویران ہی پڑا ہوا تھا بس کہیں کہیں چڑھتے خون کی گرمی کھاتے ہوئے اکا دکا جوڑے مست خرامی کرتے نظر آ رہے تھے ورنہ بھانت بھانت کے پرندوں کی چہکار میں بس آوارہ ہواؤں کا شور ہی سنائی دے رہا تھا۔

خالد عبدالفتاح سے ملاقات ہونے کے بعد میں بروسیلز میں ایک بار پھر تنہا رہ گیا تھا وہ شخص میری سفری دستاویزات کے حصول کی نیت سے باہر نکلا تھا مگر شاہدہ کے بقول کرنل ڈیوڈ کے آدمیوں کے چنگل میں جا پھنسا اور اب شاہدہ نے مجھے اس کی آزادی کی نوید ضرور سنا دی تھی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ مجھے دوبارہ گھیرنے کے چکر میں اس نے خالد کے گرد اپنے آدمیوں کا جال پھیلا یا ہوا ہوگا۔ لہٰذا میں ادھر کا رخ کر کے کوئی نیا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

خالد مجھے ڈان بروک کے نام سے مکمل سفری دستاویزات

کے ساتھ بیلجیم سے روانہ کرنا چاہتا تھا مگر حالات بتا رہے تھے کہ مجھے برسیلز سے بھی غیر قانونی طور پر ہی فرار ہونا پڑے گا۔

شام کے سائے دراز ہونے لگے تو مجھے شب گزاری کی فکر لاحق ہو گئی۔ کھلے آسمان کے نیچے اس موسم میں رات بسر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لہٰذا میں نے بینچ چھوڑ دی اور خراماں خراماں پارک سے باہر نکل آیا۔

کچھ دیر تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد میں کسی لاابالی سیاح کے انداز میں ٹہلتا ہوا ایک ۔۔۔۔ بارونق علاقے میں جا نکلا جہاں شہر کے دیگر علاقوں کی نسبت ہپیوں کا زیادہ ہجوم تھا۔

تھوڑی دیر کی سرگردانی کے بعد میں ایک ایسا ہوٹل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں ایک قلیل سی رقم دے کر رات گزاری جا سکتی تھی۔

ہپیوں کی بھیڑ میں مجھے اپنا وجود نہایت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ مگر حالات کے تحت میرے لئے وہ ٹھکانا سب سے زیادہ محفوظ تھا۔

کمرے کے حصول کے بعد میں نے باہر ایک اسنیک بار سے آتشِ شکم سرد کی اور آٹھ بجے اپنے کمرے میں واپس مقید ہو گیا۔

بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ کے بعد موقع ملا تو میں جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

کافی رات گئے اپنے دروازے پر تیز دستکوں کا شور سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی بے چینی کے ساتھ میرا دروازہ پیٹے جا رہا تھا۔

بستر پر پڑے پڑے اچانک میرا لہو سن ہو گیا۔ میرا سب سے پہلا خیال اپنے دشمنوں کی طرف گیا جو شہر میں ہر طرف میری تلاش میں تھے۔

"دروازہ کھولو...... پلیز دروازہ کھولو!" اچانک باہر سے میرے کانوں میں دبی دبی سرگوشیانہ آواز آئی۔

اس سہمی ہوئی نسوانی آواز میں نہ جانے کیا تاثیر تھی، کہ میں نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا پستول میرے ہاتھ میں موجود تھا!

دروازہ کھلتے ہی سیاہ آنکھوں اور ریشم جیسی سرمئی زلفوں والی ایک سبک اندام لڑکی کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح اندر گھس آئی اس کا سینہ کسی لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا جیسے بہت دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے پھرتی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا اور چوبی پٹ سے کمر ٹکا کر یوں گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے کافی دیر بعد اسے تازہ ہوا میسر آئی ہو۔

میں نے نظر بھر کر اس کا جائزہ لیا، تو میرے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

وہ الفاظ کی وسعت سے زیادہ حسین تھی اس کے سیب جیسے گلابی رخساروں پر کئی تازہ خراشیں پڑی ہوئی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف کے ساتھ ہی ایسی دہشت رچی ہوئی تھی جیسے سوتے سوتے کوئی بھیانک سپنا دیکھ کر اچانک بیدار ہو گئی ہو۔

اس کے جسم پر معمولی سا لباس تھا مگر اپنی معصومیت کے پیشِ نظر اسے کسی طرح آوارہ گرد ہپیوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"تم مجھے رات بھر کے لئے پناہ دے سکتے ہو؟" اس نے براہِ راست میری طرف دیکھتے ہوئے معصومانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟" میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔

"شکریہ!" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میں تمہارے برابر والے کمرے میں مقیم ہوں اور میرا نام لوسیلا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے وینٹی بیگ سے ایک کاغذی رومال نکالا اور اس سے اپنے چہرے کی خراشیں سہلانے لگی۔

"تم اکیلی ہو۔۔۔؟"

"نہیں ۔۔۔ ایک دوست کے ساتھ تھی مگر وہ انتہائی [illegible] نکلا مجھے امید ہے کہ تم میرے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ گے۔"

"تم فکر نہ کرو ۔۔۔ میرا بستر تمہارے لئے حاضر ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ گھبرا کر جلدی سے بولی۔ "مجھے ایک کمبل [illegible] دو میں فرش پر پڑ کر سو جاؤں گی۔"

"تمہارے چہرے پر خراشیں کیسی ہیں؟"

"لیپی بالکل درندہ نکلا۔ اگر مجھے شبہ بھی ہوتا تو اس کے ساتھ سیاحت کا پروگرام نہیں بناتی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم یہاں بالکل محفوظ ہو ۔۔۔ مجھے اپنی پوری کہانی سناؤ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں!" میں نے نرمی سے کہا۔

"ہم آج صبح ہی اٹلی سے یہاں پہنچے ہیں۔" وہ [illegible] لگی۔ "لیپی میرا گہرا دوست ہے وہ ہپیوں میں [illegible] اس کے اطوار بہت شائستہ تھے۔ اس کے مشورے پر میں نے [illegible] کا پروگرام بنایا مگر اس وقت وہ شراب کے نشے میں [illegible] دھت ہے۔ اس پر بری طرح خباثت سوار ہے میں بمشکل [illegible] سے نکل سکی ہوں!"

"غنیمت ہے کہ اس نے تمہارا تعاقب نہیں کیا۔"

"وہ اس بری طرح پئے ہوئے ہے کہ شاید دروازے [illegible] میں ہی اسے صبح ہو جائے گی۔" اس نے اپنی داہنی پنڈلی [illegible] جہاں ایک گہری خراش پڑی ہوئی تھی۔

"چاہو تو میں اسے گھسیٹ کر یہاں لے آؤں، تم اس کمرے میں آرام سے رات گزار سکو گی!" میں نے پیشکش کی۔

"میں اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنی چاہتی۔" وہ جلدی سے بولی۔ "صبح میں پہلی پرواز سے میلان روانہ ہو جاؤں گی۔"

"چاہو تو میں میلان تک تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔" میں نے کہہ ڈالا۔

اس نے سر اٹھا کر حیرت سے میری طرف دیکھا مگر میرے چہرے پہ خراشوں کی دبیز تہہ دیکھ کر اس کی حیرت رفع ہو گئی۔۔۔

"کیا تم بھی اٹلی ہی جا رہے ہو؟"

"یہ کوشش ضرور کر رہا ہوں مگر شاید کافی عرصہ نہ نکل سکوں!"

"اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہاری مالی اعانت کر سکتی ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"مالی اعانت نہیں، میرے تمام سفری کاغذات گم ہو گئے ہیں۔"

"تو دوسرے بنوا لو، تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟"

"برطانوی شہریت ہے مگر بنیادی طور پر ایشیائی تارکِ وطن ہوں۔" میں نے سفید جھوٹ نہایت اعتماد کے ساتھ بولا ۔۔۔ "تارکینِ وطن کے معاملے میں مقامی برطانوی حکام بہت سخت گیر ہیں جب تک برطانیہ سے میری فراہم کی ہوئی اطلاعات کی تصدیق نہیں ہو جاتی، دوسرا پاسپورٹ جاری نہیں کریں گے۔"

"اوہ۔" اس کے دونوں ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ "میرا خیال ہے کہ میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں گی، تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو!"

"تم خود یہاں اجنبی ہو، میرے لئے کیا کر سکو گی۔" میں نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"کچھ عرصہ پہلے تک میرے باپ کا ایک قریبی دوست برسیلز کے اطالوی سفارتخانے میں ٹریڈ کمشنر ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ اب بھی یہیں ہے تو میں تمہیں کھڑے کھڑے اطالوی پاسپورٹ دلوا سکتی ہوں۔"

یہ خوشخبری سن کر میرا دل اچھل پڑا۔ کئی ناکامیوں کے بعد قدرت مجھ پر مہربان ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں لیپی کو دعائیں دینے لگا جس کی زیادتیوں کے باعث لوسیلا مجھ تک پہنچی ہے۔

"اگر تم میرا یہ کام کرا سکو تو واقعی ایک مسئلہ سر سے اتر جائے گا۔"

"صبح ساتھ ہی چلیں گے۔" وہ بستر پر سے کمبل اٹھا کر فرش پر ڈالتے ہوئے بولی۔ "اگر وہ موجود ہوا تو بس تمہاری چار چھ تصاویر ہی درکار ہوں گی۔"

"تم بستر پر آ جاؤ، میں نیچے بھی گزارا کر لوں گا۔" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور مجھے بستر پر ہی دراز ہونا پڑا۔

"اگر لیپی نے ہوش میں آ کر تمہارے لئے ہنگامہ کھڑا کر دیا، تو کیا ہو گا؟" میں نے مدھم روشنی میں کروٹ بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"فکر نہ کرو، شراب کے نشے میں دھت ہونے کے بعد وہ دن چڑھے تک سوتا رہتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"میلان میں تم کیا کرتی ہو؟"

"اپنے باپ کی فیکٹری میں اکاؤنٹس کلرک ہوں!"

"باپ کی فیکٹری میں اکاؤنٹس کلرک؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"چونکو نہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "میں اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہوں، وہ چاہتا ہے جب میں اس کی کرسی پر پہنچوں تو مالیات کا ہر پہلو میری نظر میں ہونا چاہئے!"

"لیپی، تمہاری فیکٹری میں کام تو نہیں کرتا؟"

"تمہیں کیسے معلوم؟" وہ میری قیاس آرائی پر حیران رہ گئی۔

"ہماری طرف یہ فلموں کا کامیاب ترین فارمولا ہے، سارے تماشائیوں کی ہمدردیاں تو اس ہیرو کے ساتھ ہوتی ہیں۔"

"میں نے تو بہت کم ایسی انگریزی فلمیں دیکھی ہیں، تم کہاں کی بات کر رہے ہو؟" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"تم اچھی انگریزی بولتی ہو، یہ زبان تم نے کہاں سے سیکھی تھی؟" میں نے جلدی سے موضوع بدل ڈالا۔

"میرے باپ نے مجھے انگریزی سیکھنے کے لئے خاص طور پر چار ماہ کے لئے امریکا بھیجا تھا۔" اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

اس سے باتیں کرتے کرتے مجھے غنودگی نے آ لیا اور میں جلد ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ آخر کار اسی کو مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کرنا پڑا۔

میں نے ہڑبڑا کر بستر پر پڑے پڑے اپنی رسٹ واچ کا جائزہ لیا تو وہ صبح کے ساڑھے دس بجا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے بستر چھوڑ دیا۔

لوسیلا اس وقت بالکل تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔ وہ نہ جانے کب کی اٹھی ہوئی تھی کیونکہ اس نے لباس کے ساتھ ہی اپنے بال وغیرہ بھی قرینے سے سنوارے ہوئے تھے۔ چہرے کی خراشوں کو چھپانے کے لئے اس نے ہلکے سے میک اپ کا سہارا لیا تھا مگر اس کے سرخ و سفید رخساروں پر وہ لمبے لمبے نشان واضح نظر آ رہے تھے۔

"بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔" میں نے ہولے ہولے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔

"غنیمت ہے کہ تم نے اس رائے کا اظہار رات کو نہیں کیا تھا۔" وہ خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا کر بولی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ؟" میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کھڑا مسلسل حسن کے اس شاہکار کو دیکھتا رہوں۔

"میں اپنے کمرے میں واپس چلی جاتی۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔ "مجھے ان مردوں سے خوف آتا ہے جو لڑکیوں پر اپنے حملے کی ابتدا خوبصورت الفاظ سے کرتے ہیں۔"

"حسن کی تعریف نہ کرنا تو سراسر بد ذوقی ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے کمرے میں واپس جاتیں تو لیمی کو برداشت کرنا پڑتا۔"

"رات میں کمرے کی چابی ساتھ لے آئی تھی۔ اٹھنے کے بعد میں کمرے میں گئی تو جانتے ہو وہ کیا کر رہا تھا ؟"

"تمہارے ساتھ ہوتا تو ضرور جان لیتا۔"

"منہ کے بل فرش پر پڑا ہوا سو رہا تھا اور دلہنے رخسار پر خون جما ہوا تھا۔ شاید مدہوشی کے عالم میں گرتے ہوئے مسہری کا کونا لگ گیا تھا۔"

"اگر تم واقعی ایک صنعت کار کی بیٹی ہو تو تمہیں کسی بہتر ہوٹل کا رخ کرنا چاہئے تھا۔" اس سے باسی منہ بھی باتیں کرنے میں مزا آرہا تھا۔

"میں میلان میں بھی ایک معمولی کلرک کی طرح رہتی ہوں دفتر سے ملنے والی تنخواہ کے علاوہ باپ مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیتا !"

"پھر معاف کرنا، تمہارا باپ خبطی معلوم ہوتا ہے !"

"مہا خبطی !" اس نے میری توقع کے برعکس پُرزور انداز میں میری تائید کی۔ "دفتر میں وہ مجھ سے بیٹی کے بجائے عام ملازم کی طرح پیش آتا ہے۔"

"محبت سے پیش آنے والوں کو تم کمرے میں چھوڑ کر نکل بھاگتی ہو !"

"تم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"غلطی ہوگئی مادام !" میں نے مزاحیہ انداز میں اپنے کان تھام لئے۔ "آئندہ تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

میں منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو وہ تیار بیٹھی ہوئی تھی۔

"لیمی کو دیکھو گی ؟" میں نے اس کے ہمراہ کمرے سے نکلتے ہوئے دریافت کیا۔

"اس کا ذکر نہ کرو تو بہتر ہوگا۔" اس کے لہجے میں تلخی عود کر آئی۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے اپنا حساب بے باق کیا تو لوسیلا نے ایک مرتبہ پھر پیسے دینے کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک دیا۔

"تمہارا باپ تمہیں تنخواہ کے علاوہ کچھ نہیں دیتا مگر پھر بھی تم نے مجھے مالی امداد کی پیش کش کی تھی۔" باہر آ کر میں نے کہا۔

"تم یقین کرو کہ میں اکثر کسی فضول خرچ کلرک ہی کی طرح قلاش رہتی ہوں۔ مگر اس بار روانگی سے قبل میری ماں نے مجھے کچھ رقم دے دی تھی۔"

"اور تم اسے ٹھکانے لگانے کے لئے بے تاب ہو !"

باتیں کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے پھر ایک جگہ میں نے خود کار مشین میں سکے ڈال کر اپنی چھ عدد تصاویر حاصل کریں جو لوسیلا کے بیان کے مطابق اطالوی سفارت خانے میں کام آسکتی تھیں۔

اطالوی سفارت خانے کی طرف جاتے ہوئے میں راستے بھر چوکنا رہا۔ میرے ذہن سے شاہد کے خونخوار آدمیوں کا خیال ایک لمحے کے لئے بھی دور نہیں ہوا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ ان سے ٹکراؤ ہو گیا تو میرے لئے نکاسی محال ہو جائے گی۔

اطالوی سفارت خانے میں پہنچنے کے بعد میں استقبالیہ کمرے میں بیٹھ گیا اور لوسیلا نے کاؤنٹر پر گفتگو شروع کر دی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ لوسیلا کے باپ کا دوست نہ صرف اسی سفارت خانے میں تھا بلکہ دفتر میں موجود تھا۔

لوسیلا نے سادہ کاغذ پر اپنا نام لکھوا کر اندر بھجوایا تو وہ بے چارہ استقبال کے لئے خود ہی باہر نکل آیا۔

وہ کوزہ پشت مگر خوش پوش آدمی تھا اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے اور بڑی بڑی چمکدار آنکھوں پر عدسوں کی عینک نظر آرہی تھی۔

وہ لوسیلا سے بہت تپاک سے ملا پھر لوسیلا نے مجھے اس سے متعارف کرا ڈالا۔ "یہ میرا دوست ڈان بروک ہے اور یہ انکل نیکلانشی ہیں، ہمارے خاندانی دوست !"

نیکلانشی نے میری طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے مصافحہ کے بعد میرا ہاتھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔

اس کے تیور دیکھ کر میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس بار پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

پھر شاید نیکلانشی کو اچانک ہی لوسیلا کی موجودگی کا خیال آیا اور اس نے جلدی سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔" وہ ہنستے ہوئے لوسیلا سے بولا۔

"تمہارا دوست خاصا دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہے !"

"تم نے بات کئے بغیر کیسے اندازہ کر لیا انکل ؟" لوسیلا نے ہنستے ہوئے سوال کیا اور نیکلانشی اس کے جواب میں محض بلکہ کر رہ گیا پھر خفت مٹانے کے لئے خود بھی ہنسنے لگا۔

نیکلانشی کا دفتر نہایت پرشکوہ اور آراستہ تھا اس کے کمرے میں تین طرف بڑے بڑے دیوار گیر شوکیس لگے ہوئے تھے جن میں اٹلی کی بہت سی درآمدی اور برآمدی مصنوعات تعارفی تختیوں کے ساتھ سجی ہوئی تھیں اس کی پشت والی دیوار پر بہت بڑا عالمی نقشہ آویزاں تھا اور اسی دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا جو شاید اس دفتر کو کسی اور کمرے یا راہداری سے ملاتا تھا۔

"تم یہاں کب پہنچی تھیں ؟" نیکلانشی نے ایش ٹرے پر رکھا ہوا سگار اٹھا کر گہرا کش لیتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی نظریں بار بار میرے چہرے سے الجھ رہی تھیں۔

"کل صبح آئی تھی۔ تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔"

"ڈان بروک کو کب سے جانتی ہو ؟" نیکلانشی میری موجودگی میں لوسیلا کی باتوں پر پوری طرح توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ اور آخر کار اس نے زبردستی میرے بارے میں بات شروع کر ہی دی۔

"تم اس میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہو !" وہ قدرے ناگواری کے ساتھ بولی۔ "کیا تم اس پر کسی قسم کا شبہ کر رہے ہو؟"

"اس کا نام آشنا معلوم ہوتا ہے۔" وہ سگار کی خیالی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "اگر تم مجھے چند منٹ کی اجازت دو تو اس سے تخلیئے میں کچھ بات کر لوں !"

"بات میرے سامنے بھی ہو سکتی ہے۔" لوسیلا اشتباہ آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مناسب نہ ہوگا۔" وہ بزرگانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا اور سر کی جنبش سے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میری اور لوسیلا کی نگاہیں چار ہوئیں تو میں نے لاعلمی کے انداز میں اپنے شانے اچکائے اور نیکلانشی کی میز کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کیونکہ وہ اسی دروازے میں داخل ہوا تھا۔

دروازہ عبور کرنے کے بعد میں نے خود کو ایک نشست گاہ میں پایا۔

"تم خالد عبدالفتاح کو جانتے ہو ؟" نیکلانشی نے دروازہ بند کر کے سوال کیا۔

اس کے منہ سے خالد کا نام سن کر میں ششدر رہ گیا۔ "تم سے اس کا کیا تعلق ہے ؟"

"پرسوں رات وہ تمہارے پاسپورٹ کے لئے میرے گھر آیا تھا۔"

"اوہ !" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس آزاد ہو گیا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی عرب سفارت خانے سے میرا پاسپورٹ بنوا رہا ہوگا۔"

"تمہارا پاسپورٹ میرے دفتر میں تھا لہٰذا میں نے اسے کل صبح بلایا تھا۔" اس نے سگار کا کش لے کر کہا۔ "اسے پاسپورٹ حاصل کرنے کی عجلت تھی جب وہ کل صبح نہیں پہنچا تو مجھے فکر لاحق ہو گئی وہ کہاں ہے اور لوسیلا تمہارے ساتھ کیسے ہے ؟"

"وہ شاید تمہارے گھر سے واپسی میں اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور اب ہسپتال میں ہوگا ورنہ تم سے ضرور ملتا۔ میری اس سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔"

"پھر تم یہاں کیسے پہنچے ؟"

"محض اتفاق !" میں نے کہا۔ "لوسیلا نے مجھے پاسپورٹ دلانے کی پیش کش کی تھی اور میں اس کے ساتھ یہاں چلا آیا۔"

"میں خالد کی بہت عزت کرتا ہوں۔" وہ میرے قریب آ کر دھیمے مگر سخت لہجے میں بولا۔ "مگر میں یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ لوسیلا کو غلط کاموں میں ملوث کیا جائے، وہ میرے عزیز ترین دوست کی اکلوتی بیٹی ہے !"

"اس سے میری کل رات ہی ملاقات ہوئی ہے۔" میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے خراب حالات میں اس کی مدد کی تھی اور وہ میری احسان مند ہے !"

"میں کیسے مان لوں ؟" وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"خود اسی سے پوچھ لو۔" میں نے تیزی سے کہا اور پھر اسے بلا کم و کاست اپنی اور لوسیلا کی کہانی سنا دی۔

"اگر یہ کہانی درست ہے تو تم واقعی عظیم آدمی ہو !" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"مگر پاسپورٹ کے بغیر یہ عظیم آدمی دو کوڑی کا ہو کر رہ گیا ہے !"

"میں دے دوں گا، تمہارا پاسپورٹ میرے پاس تیار پڑا ہوا ہے اس پر ضروری اندراجات بھی کرا لئے گئے ہیں۔ مگر میری ایک شرط ہے !"

"مجھے وہ سنے بغیر منظور ہے !"

"کیا منظور ہے ؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"یہی نا کہ میں پاسپورٹ لے کر لوسیلا کے بغیر یہاں سے چلا جاؤں ؟"

"آدمی سمجھ دار ہو۔" وہ پہلی بار مسکرا کر بولا۔ "نہ صرف لوسیلا کے بغیر بلکہ اس سے ملے بغیر بھی میں اسے دشواریوں سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے منظور ہے !" میں نے ہنس کر کہا۔ میرے دل میں یک بیک نیکلانشی کی عزت بڑھ گئی وہ صحیح معنوں میں لوسیلا

کا خیر خواہ ثابت ہو رہا تھا۔

"یہیں ٹھہرو، میں ابھی آیا۔" وہ درمیانی دروازہ کھول کر دوبارہ اپنے دفتر میں چلا گیا دروازہ کھلتے ہی مجھے لوسیلا کی آواز سنائی دی جو دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی معدوم ہو گئی۔ غالباً وہ کمرہ ساخت کے اعتبار سے مکمل ساؤنڈ پروف تھا۔

چند منٹ کے بعد نیکلانشی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نیلا لفافہ موجود تھا جو اس نے میری طرف بڑھا دیا۔

"خالد نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں صرف بلجیئم سے نکلنے کے لئے ان دستاویزات کی ضرورت ہے مقصد پورا ہوتے ہی یہ کاغذات جلا کر تلف کر دینا اور ان کے اتلاف سے قبل ذرا اپنا دامن بچائے رکھنا ورنہ میں دشواریوں میں پڑ جاؤں گا۔"

"تم فکر نہ کرو، میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا مگر تم پر آنچ نہ آنے دوں گا۔" میں نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

اس کمرے میں ایک اور دروازہ موجود تھا جو اندرونی راہداری میں کھلتا تھا۔ نیکلانشی نے برآمدے تک بذاتِ خود میری راہنمائی کی۔ پھر پُرجوش انداز میں ہاتھ ملا کر مجھے رخصت کر دیا۔

میں اطالوی سفارتخانے کی عمارت سے باہر نکلا تو خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے جیسے مجھے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔

بلجیئم کی سرزمین میرے لئے ایک وسیع قید خانے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مگر لوسیلا کے ذریعے قدرت نے میری ناقابلِ یقین طریقے پر رہنمائی کی اور میں براہِ راست اس شخص تک جا پہنچا جس سے ملنے کے لئے خالد کو اپنی آزادی داؤ پر لگانی پڑ گئی تھی۔

بلجیئم سے نجات کا پروانہ میں نے اپنی جیب میں رکھا اور ہجوم میں اپنا راستہ بناتا ہوا پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔

میرے چاروں طرف انسان بکھرے ہوئے تھے، زندہ مشینوں کے کارواں کشادہ سڑکوں پر وحشیانہ غراہٹوں کے ساتھ دوڑے جا رہے تھے مگر میں اس ہجوم میں بھی بالکل تنہا تھا میرا ذہن اس وقت سیتا کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ جو میری زندگی کی سب سے زیادہ زندہ اور رنگین حقیقت تھی مگر حالات نے مجھے اس سے دور پھینکا ہوا تھا۔

یہ غنیمت ہی تھا کہ میں نے آخری مرحلے پر خالد سے اپنے مستقبل کے بارے میں چند باتیں کر لی تھیں اور اب ان ہی نکات کے سہارے میں اپنی سیتا تک پہنچ سکتا تھا۔

سیتا کسی اہم مشن کی تکمیل کے بعد شام سے لیبیا پہنچ چکی تھی مگر کسی وجہ سے فلسطینی لیبیا میں زیرِ عتاب آ گئے تھے وہاں ان کے دفاتر سر بمہر کر دیئے گئے تھے اور فوجی ٹرکوں کے ذریعے ہزاروں فلسطینی سرحدوں پر چھوڑے جا رہے تھے جبکہ لیبیا میں سیتا کی موجودگی فلسطینیوں کی وجہ سے تھی لیبیا اور فلسطینیوں کے مواصلاتی روابط ختم ہو جانے کے باعث سیتا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔

خالد عبدالفتاح نے مجھے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ ایتھنز کے ہوٹل ڈیسکا رڈو میں عدنان فاخوری نامی سروس سپلائر میرا مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ گو میں خالد سے عدنان کے لئے کوئی تعارفی رقعہ نہ لے سکا تھا مگر مجھے امید تھی کہ عدنان سے ملاقات ہونے پر میں اسے باآسانی دوست بنا سکوں گا۔

عدنان فاخوری سے سیتا کے بارے میں کوئی خبر ملتے ہی میں ایتھنز سے سیدھا اس کے پاس پہنچ سکتا تھا اور سیتا کو پالینے کے بعد میں اسی سرزمین پر واپس پہنچ جاتا جس کی مٹی سے میرا خمیر اٹھا تھا۔ اور جس دھرتی کے سینے میں میرے بزرگوں کے جسم منوں مٹی کے نیچے ابدی روشنی سے منور تھے۔

سیتا میری پہلی کمزوری تھی اس کے بعد مجھے اپنا ملک یاد آتا تھا جہاں میں قانون اور اس کے محافظوں کو مطلوب تھا مجھے وطن سے فرار ہوئے ایک مدت بیت چکی تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میرا واپسی کا عزم پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا تھا اور آخری کمزوری وہ تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے اناپالہ کے راجہ ہوٹل کے سترہویں کمرے کی چوبی الماری کے ایک چور سوراخ میں چھپایا تھا۔

پارس پتھر پالینے کے بعد میں سیتا کے ہمراہ اپنی ساری عمر بے فکری کے عالم میں گزار سکتا تھا۔ سیتا کی ماں، سندری کا دیا ہوا وہ بھونڈا سا تحفہ نہ صرف بیش قیمت تھا۔ بلکہ عجوبۂ روزگار بھی تھا جس کا ذکر صرف کتابوں اور کہانیوں میں ہی ملتا تھا مگر میں اس پتھر کو اپنے ہاتھوں سے بارہا آزما چکا تھا۔

میں ان ہی خیالات میں کھویا ہوا کوچ سروس اسٹیشن پہنچ گیا جہاں سے بروسیلز کے نواحی قصبات کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام دہ گاڑیاں روانہ ہوتی تھیں۔

اوسٹنڈ بروسیلز سے وہ قریب ترین شہر تھا جہاں سے میں کسی براہِ راست پرواز کے ذریعے بلجیئم سے باہر جا سکتا تھا لہٰذا میں نے کاؤنٹر سے اوسٹنڈ جانے والی کوچ کا ٹکٹ خرید لیا اور مختلف اسٹالوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا کیونکہ کوچ کی روانگی میں خاصی دیر باقی تھی!

کوچ روانہ ہوئی تو اس کی گیارہ نشستوں پر صرف پانچ مسافر تھے میں ایک سیٹ پر آرام سے ٹانگیں پھیلا کر دراز ہو گیا۔

ڈرائیور خوبصورت راستوں پر بڑی مہارت سے گاڑی دوڑاتا رہا راستے میں مزید چند مسافر اٹھائے گئے مگر میں بدستور دوہری نشست پر قابض رہا۔

پھر میری نظر اس بیگ پر پڑی جو شاید اگلی نشست والے کی ملکیت تھا مگر جھٹکوں کے باعث سیٹ کے نیچے سے سرکتا ہوا میری طرف آ پہنچا تھا۔

پہلی نظر میں مجھ پر اس بیگ کے حسن کا انکشاف نہیں ہوا۔ مگر جب میں نے بغور اس کا جائزہ لیا تو مجھے اپنا پہلو بدلنا پڑ گیا۔

میں اس وقت خاصی تنگدستی کا شکار تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ایتھنز تک کے ہوائی ٹکٹ کی رقم ادا کرنے کے بعد میں کنگال ہو جاؤں گا۔ ایسی حالت میں اگر بیگ میں اڑسے ہوئے پھولے ہوئے پرس نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا!

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ اگر اگلی نشست والے کو دورانِ سفر ہی میری کارروائی کا علم ہو گیا تو سب سے پہلے مجھ پر ہی شبہ کیا جاتا اور کوئی عجب نہ ہوتا اگر غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔

وہ خطرہ اپنی جگہ بجا تھا مگر سیاہ رنگ کا پرس میرے لئے انتہائی عزیز ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ نیچے لٹکا کر نہایت ملائمی اور صفائی کے ساتھ وہ پرس نکال لیا۔

ٹانگوں کی آڑ لے کر میں نے پرس کی زپ کھولی تو دل باغ باغ ہو گیا اس میں بڑی مالیت کے نوٹوں کی خاصی بڑی تعداد نہایت بے رحمی سے ٹھونسی گئی تھی۔

میں نے اس پرس میں سے چند نوٹ اپنی جیب میں منتقل کئے اور زپ بند کر کے پرس دوبارہ اسی بیگ میں ڈال دیا۔ [illegible] حالات میں شاید میں بیگ کو وہیں پڑا رہنے دیتا مگر ایک [illegible] کے بعد وہ بیگ مجھے کاٹنے لگا اور میں ٹانگیں [illegible] کر سیدھا بیٹھ گیا۔

گاڑی کے ہچکولے غیر محسوس طریقے پر بیگ کو پیچھے ہوا ایسے تھے۔ مگر میں نے جوتے کی نوک سے اس بیگ کو آہستہ آہستہ آگے دھکیلنا شروع کر دیا اور اسے محفوظ فاصلے پر پہنچانے کے بعد دوبارہ نشست پر دراز ہو گیا۔

اوسٹنڈ میں کوچ نے ایئرپورٹ کے قریب ہی اتارا اور بہار [illegible] وقت ضائع کئے بغیر لاؤنج میں داخل ہو گیا جہاں مختلف فضائی کمپنیوں کے بارونق کاؤنٹر نظر آ رہے تھے۔

کسی سے بات کئے بغیر میں لاابالی انداز میں پروازوں کے مختلف شیڈول دیکھتا رہا۔ مگر ہندسوں کی بھول بھلیوں میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کون سی پرواز کہاں جائے گی۔

آخر کار میں نے سوئس ایئر کے کاؤنٹر کا انتخاب کیا جہاں ایک دبلی پتلی سراپا انکسار لڑکی عینک لگائے کام میں مصروف تھی۔

اس کاؤنٹر سے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ شام کے سات بجے الاطالیہ کی ایک پرواز وہاں سے میلان کے لئے روانہ ہو گی۔

الاطالیہ کے کاؤنٹر پر تین مرد موجود تھے جن میں سے ایک بہت زیادہ طرار نظر آ رہا تھا مگر میرے لئے کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا لہٰذا میں وہاں پہنچ گیا۔

ان میں سے ایک نے تیزی سے میرے پاسپورٹ کی ورق گردانی کی اور پھر میرا میلان تک کا ٹکٹ تیار کر دیا۔

ٹکٹ بنوانے کے بعد میں نے باہر کی دوکانوں سے ایک بریف کیس اور چند ضروری اشیاء خرید ڈالیں کیونکہ خالی ہاتھ مسافر بلاوجہ حفاظتی عملے کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا۔ اگلی پریشانی اس بے آواز پستول کے بارے میں تھی جس میں صرف دو گولیاں باقی رہ گئی تھیں۔

اس ہتھیار نے شروع ہی سے میرا بہت ساتھ دیا تھا اور میں اسے ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا مگر طیارے پر جانے سے قبل الیکٹرونک آلات میرے قبضے میں اس آتشیں ہتھیار کی موجودگی کی نشاندہی کر دیتے لہٰذا میں ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں وہ پستول پھینک سکوں تلاشِ بسیار کے بعد میں نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کر ہی لیا جہاں پرواز سے قبل میں پستول بحفاظت ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

چھ بجے میں نے پستول سے پیچھا چھڑا لیا اور بریف کیس لے کر مسافروں والے ممنوعہ علاقے میں داخل ہو گیا۔

ہر نئے مرحلے پر میرے سانسوں کا آہنگ بے ربط ہوتا رہا مگر کہیں بھی گرفت نہ ہو سکی۔ تمام مراحل یکے بعد دیگرے بحسن و خوبی طے ہو گئے اور ساڑھے چھ بجے میں الاطالیہ کے دیو ہیکل طیارے میں موجود تھا۔

انجنوں کے اسٹارٹ ہونے تک مجھے ہر آن دھڑکا لگا ہوا تھا میری نگاہیں بار بار رسٹ واچ کا جائزہ لے رہی تھیں مگر سوئیوں کی رفتار شاید سست ہو چکی تھی اور میری نبض اس سستی کا بھرپور ازالہ کر رہی تھی!

حفاظتی بند باندھے گئے، تمباکو نوشی بدستور ممنوع تھی جہاز کے کپتان کی مختصر سی خیر مقدمی تقریر سنائی دی جس میں وزنی الفاظ

منزل سے مگر جذبہ مفقود تھا پھر وہ دیو ہیکل عفریت کنکریٹ کے رن وے پر دوڑنے لگا۔

کھڑکی سے نظر آنے والی روشنیوں کی جلتی بجھتی قطاریں اس وقت نہایت حسین نظر آ رہی تھیں طیارے نے رن وے کا ایک طویل چکر لگایا اور فضا میں اوپر اٹھتا چلا گیا۔

اوسٹنڈ سے پرواز کے بعد طیارہ بلجیئم کی سرحد پار کر گیا تھوڑے تھوڑے وقفے سے عملے کا کوئی رکن پرواز کے علاقے کی نشاندہی کرتا جا رہا تھا۔

میں نے حفاظتی بند کھول لینے کے بعد سگریٹ سلگا لی تھی اور نئی حکمت عملی کے بارے میں غور شروع کر دیا تھا۔

اوسٹنڈ کے بعد طیارے کی اگلی منزل پیرس تھی یہ وہ شہر تھا جو تل ابیب سے فرار کے بعد ہر سفر میں ایئرپورٹ کی حد تک میرا خیر مقدم کرتا رہا تھا۔ پیرس سے پرواز کے بعد اگلی لینڈنگ منزل مقصود پر ہوئی۔

میں نے اٹلی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تصور کیا۔ مادام لواری، اس کے خطرناک غنڈے اور کرنل ڈیوڈ کے سفاک گوریلے سب پیچھے رہ گئے تھے میرے لئے اطمینان کی بات یہ تھی کہ میں نہ صرف ان سب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ ان کے لئے کوئی سراغ بھی نہیں چھوڑا تھا جس کے ذریعے وہ میرے ٹھکانے کا کھوج نکال سکتے۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ میلان پہنچ کر لانسے محسن لیکلانشی کے دیئے ہوئے کاغذات پاسپورٹ سمیت جلا دوں گا مگر اس شہر میں پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میلان میں میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار تھا میرے لئے وہاں رکنا وقت برباد کرنے کے مترادف ہوتا۔ بہتر یہی تھا کہ میں اسی پاسپورٹ پر جلد از جلد ایتھنز پہنچنے کے بعد ان کاغذات کو برباد کر دیتا۔

میرے پاسپورٹ پر یونان کا ویزا نہیں تھا مجھے اتنا تجربہ تو ہو چکا تھا کہ یورپ کے بیشتر ممالک میں ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد بھی ویزا کا حصول آسان تھا مگر میں کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اگلے روز نصف گھنٹے کے اندر اندر ساری کاغذی کارروائیاں مکمل کر کے میں نے یونان کی سیاحت کے لئے ویزا حاصل کر لیا اور اسی روز میلان سے ایتھنز کے لئے روانہ ہو گیا۔

ایتھنز پہنچنے کے بعد میری جیب میں قلیل سی رقم رہ گئی تھی لہٰذا میں نے ایئرپورٹ سے شہر جانے کے لئے بس کا انتخاب کیا اور اس مختصر سے سفر میں دو مسافروں کے صحت مند بٹوے ضرورت کے تحت میری جیبوں میں منتقل ہو چکے تھے۔

سامان وغیرہ کا بکھیڑا ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے شہر پہنچتے ہی ہوٹل ڈیسکارڈ کی تلاش کی مہم کا آغاز کر دیا۔

یونان مجموعی طور پر غریب لوگوں کی ترقی پسند سرزمین ہے۔ یہاں جاہ و حشمت کے مظاہروں کے ساتھ ہی عسرت و فاقہ کی مثالیں بھی جابجا موجود تھیں مانگنے والوں کے انداز بھی نت نئے اور خاصے مؤثر تھے جس کا سبب شاید یہ رہا ہو گا کہ ان کا زیادہ تر انحصار سیر و سیاحت کے لئے آنے والے غیر ملکی سیاحوں پر تھا۔

میں نے شہر میں جس کسی سے بھی ہوٹل ڈیسکارڈ کا پتہ دریافت کرنے کی کوشش کی وہی میرا گائیڈ بننے پر تل گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی مرتبہ یہی صورت حال پیش آئی تو میں نے لوگوں سے مدد لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس طرح میں تنہا شہر گھوم کر اس کے ساتھ ہی اپنا مقصد بھی حاصل کر سکتا تھا۔

کئی گھنٹوں تک ایک سے دوسری جگہ بھٹکنے کے بعد بالآخر مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

میرا خیال تھا کہ ہوٹل ڈیسکارڈ جدید طرز کا کوئی بڑا سا ہوٹل ہو گا مگر وہ ایک اوسط درجے کا ریستوران نکلا جو بے شمار ستونوں پر مشتمل ایک دیو قامت مگر یک منزلہ عمارت میں قائم تھا۔

جس وقت میں وہاں پہنچا، شام ہو رہی تھی اور ریستوران میں آنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔

میں استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا تو میری نگاہ ڈنر جیکٹ نما لباس میں ملبوس ایک دراز قد شخص پر پڑی جو میری طرف پشت کئے نہایت احترام سے بار بار لہرا کر جسم کو خم دے کر کسی لڑکی سے بات کر رہا تھا۔

اپنے پُراعتماد رویئے کی وجہ سے وہ شخص ہوٹل کے عملے سے متعلق نظر آ رہا تھا لہٰذا میں اس سے چند قدم دور رک گیا تاکہ وہ لڑکی سے فارغ ہو تو میں اسے متوجہ کر سکوں۔ نہ جانے کیوں میں نے استقبالیہ کاؤنٹر کے بجائے معلومات کے حصول کے لئے اس شخص سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس شخص کی پشت میری جانب تھی لہٰذا وہ تو مجھے نہ دیکھ سکا مگر اس سے بات کرنے والی لڑکی نے میری موجودگی محسوس کر لی۔

وہ بہت حسین اور خوش پوش لڑکی تھی اور اس کے سراپے سے واضح طور پر اس روایتی جمال کا اظہار ہو رہا تھا جو سرزمین یونان کا خاصہ ہے۔ مجھ سے ایک بار نگاہیں چار ہوتے ہی وہ دلفریب انداز میں مسکرائی اور سیاہ جیکٹ والے سے کچھ کہہ کر تیر کی طرح میری طرف آئی۔ لڑکی کے تعاقب میں وہ شخص آہستہ آہستہ گھوما اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے خدوخال عربوں جیسے تھے۔

اسی اثنا میں لڑکی میرے سر پر آ پہنچی اور نہایت دلکش انداز میں بولی۔ "میں تمہاری کوئی خدمت کر سکتی ہوں؟" انگریزی پر اسے عبور حاصل نہیں تھا لیکن لہجے میں مٹھاس اور دلفریب مسکراہٹ نے اس میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

"مجھے عدنان فاخوری کی تلاش تھی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ وہ بے ساختہ انداز میں میری طرف لپکی تھی۔ اس کے پیش نظر طبیعت تو یہی چاہ رہی تھی کہ اس سے کہا جائے کہ میں مدتوں سے صرف اسی کا متلاشی تھا۔

"عدنان!" لڑکی نے پلٹ کر اسی جیکٹ والے کو آواز دی جو چند قدم آگے جا چکا تھا۔

لڑکی کی آواز سن کر وہ متحیر انداز میں پلٹا اور جب لڑکی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا تو وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ہماری طرف چلا آیا۔

"عدنان فاخوری یہی ہے۔" لڑکی نے مسکرا کر کہا اور ایک طرف چل دی۔ عدنان کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سن سکا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گیا۔ اس کی تجسس آمیز نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"میرا نام ڈوان ہے۔" میں نے عربی میں کہا۔ "میں آج ہی برسلز سے یہاں پہنچا ہوں۔"

میرے منہ سے عربی سن کر وہ حیران رہ گیا مگر اس نے نہایت پرتپاک انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا تھا۔

"میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟" اس نے نرم لہجے میں سوال کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچلنے لگی تھی۔

"خالد عبدالفتاح نے!"

میرا جواب سنتے ہی وہ پرجوش انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور عربوں کے روایتی انداز میں اس نے میرے داہنے رخسار کا بوسہ بھی لے ڈالا۔

"خالد عبدالفتاح میرا جگری دوست ہے، اس کے بھیجے ہوئے مہمان میرے سر کا تاج ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ایک طرف چل دیا۔

"مقامیوں میں مہمانوں کے اس طرح استقبال کا رواج نہیں ہے۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے شوخ لہجے میں سوال کیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ رسمی تکلفات میں پڑے بغیر اس سے براہ راست بے تکلفی پیدا کی جا سکے۔

"نہیں، کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"وہ کالے نینوں والی، تمہاری طرح نہیں ملی تھی۔"

میری پشت پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس پڑا۔ "وہ اس ہوٹل کی مالکن ہے۔ بس اس کے چکر میں نہ پڑنا۔ نہ جانے ایتھنز میں کتنے لوگ اس کے دیوانے ہیں۔" وہ مجھے لے کر ایک کمرے میں گھس گیا جو غالباً اس کا دفتر تھا۔

"شادی شدہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیوہ ہے۔" وہ میرے لئے ایک کرسی گھسیٹتے ہوئے بولا۔ "اس کی عمر پینتالیس سال سے اوپر ہے مگر کم سن نظر آتی ہے۔"

"مگر ہے خوبصورت۔"

"اس کی خوب صورتی میں انداز اور اداؤں کا زیادہ دخل ہے۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔ "ڈیسکارڈ میں ہر شام بہت سے گاہک صرف اسی لئے کھنچے چلے آتے ہیں کہ وہ خود ہال میں موجود رہ کر سروس کی نگرانی کرتی ہے۔ اسے گولی مارو اور یہ بتاؤ کہ میرا یار کیسا ہے؟"

"مزے میں تھا۔" میں نے کہا۔ "تین روز پہلے تھوڑی سی دشواریوں میں پڑ گیا تھا۔"

"اسے کب سے جانتے ہو؟"

"چار پانچ ہفتے پہلے ملا تھا۔ بہت منکسر المزاج آدمی ہے۔"

"تم سے دوستی کیسے ہوئی اس کی؟" اس نے کرسی پر جھولتے ہوئے سوال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کرید کرید کر مجھ سے کوئی خاص بات اگلوانی چاہ رہا تھا۔

خالد سے عدنان فاخوری کے بارے میں تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکی تھی مگر اس نے جو کچھ کہا تھا اس کی روشنی میں یہ بات یقینی تھی کہ وہ فلسطینی تنظیم سے منسلک تھا اور شاید وہ میرے بارے میں بھی یہی جاننا

چاہتا تھا۔

"تنظیم کے معاملات میں دوستی ہوئی میں پیرس سے وہاں پہنچا تھا۔" میں نے کہا۔

"پیرس سے؟" وہ ایک دم چونک پڑا۔ "تم نے نام کیا بتایا تھا اپنا؟"

"عنوان بتایا تھا مگر اصل نام صفدر علی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ چند ثانیوں تک حیرت اور سکتے کے عالم میں مجھے گھورتا رہا پھر کسی پاگل کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ "مجھے تم سے ملنے کی بڑی آرزو تھی، بڑی تمنا تھی۔ تمہارا نام ہمارے حلقوں میں دلیری اور بے خوفی اور ذہانت کی علامت بن کر رہ گیا ہے، یہ میری عزت افزائی ہے کہ خالد نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔"

مکرر معانقہ خاصا طویل ثابت ہوا اس کے اختتام پر وہ بولا۔ "تم سے تو بہت سی باتیں ہوں گی مگر پہلے تمہیں آرام کی ضرورت ہے، طویل سفر سے آئے ہو۔"

"اس ہوٹل میں اقامت کا بندوبست ہے؟"

"نہیں... پھر میرے ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں کیا کرو گے؟ میرے مکان میں تمہیں آسائش کی ہر چیز ملے گی۔"

"تم تنہا ہی رہتے ہو؟"

"تنہا رہنا ہی پڑتا ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا سامان کہاں ہے؟"

میں نے بریف کیس اس کے سامنے لہرا دیا۔ "کل کائنات یہی ہے۔ اس میں شب خوابی کا لباس موجود ہے یار۔"

"حیرت ہے۔" وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "تم بھی سپاہیوں جیسی زندگی گزارنے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔"

وہ میرے ہمراہ باہر آیا جہاں اس کی ہلمین کار موجود تھی۔ مختصر سی ڈرائیو کے بعد اس کا مکان آگیا۔

تین کمروں اور کشادہ صحن پر مشتمل وہ یک منزلہ مکان واقعی رہائش کے قابل تھا میں نے تعریف کی تو عدنان کا سینہ مسرت سے پھول گیا۔

"تم ہوٹل واپس جاؤ گے؟"

"ایسی جلدی نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ تم اپنی ضرورت کی کوئی چیز تلاش نہ کر سکو۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو لیکن وقت ہے تو یہ ضرور پوچھوں گا کہ آج کل لیبیا میں کیسے حالات چل رہے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک پریس کانفرنس سے ساری خرابی کا آغاز ہوا تھا۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "متعلقہ گروپ کے سربراہ نے واقعے کے ذمہ داروں کو معطل کر کے بن غازی سے بیروت طلب کر لیا ہے جس کے بعد حالات سنبھلے ہیں۔"

"فلسطینیوں کے انخلا کا کیا رہا؟"

"وہ روک دیا گیا شاید ایک آدھ روز میں ان لوگوں کی واپسی شروع ہو جائے جنہیں زبردستی سرحدوں پر ڈال دیا گیا تھا۔"

"لیبیا سے تمہارا آخری رابطہ کب ہوا تھا؟"

"گڑبڑ سے پہلے کی بات ہے۔"

"تو ابھی وہاں تمہارے دفاتر نے کام شروع نہیں کیا؟"

"وہاں کے حکام نے سارے دفاتر سربمہر کر دیئے ہیں۔ ... یہی تھی کہ جس کا جی چاہتا تھا ایک گروپ بنا کر غازی یا طرابلس میں ... کھول لیتا تھا۔ اب لیبیا میں صرف وہی گروپ یا دفاتر کام کر سکیں گے جن کی سفارش یاسر عرفات کریں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ حالات پوری طرح معمول پر آنے میں ... لگیں گے۔" میں نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "لیبیا کے بارے میں تمہاری فکرمندی کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا، ابھی تو تم واپس جاؤ، تمہیں ... ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔" میں نے کہا اور وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔

جاتے ہوئے بیرونی دروازے کی ایک چابی وہ خود لے گیا ... میرے حوالے کر دی تاکہ میں باہر نکلنا چاہوں تو کوئی دقت نہ ہو۔

سب سے پہلے میں نے گرم پانی سے طویل غسل کیا پھر عدنان ... فاخوری کی فرمائش کے مطابق اسی کا ایک جوڑا پہن لیا جو میرے ... بالکل فٹ آگیا۔ غسل کے بعد طبیعت پر کسلمندی طاری ہونے لگی ... میں بستر میں گھس کر سو گیا۔

اگلے روز میں دن چڑھے گہری نیند سے بیدار ہوا تو عدنان ... بستر کے قریب کرسی ڈالے اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا ... بیدار ہوتا دیکھ کر اس نے فوراً اخبار چھوڑ دیا اور خود کچن میں ... میں منہ ہاتھ دھو کر واپس لوٹا تو کچن میں ناشتے کی میز ... ناشتے کے دوران عدنان میرے ساتھ پیش آنے والے ... کا ذکر کرتا رہا جن سے فلسطینیوں کے مفادات کو خاصی تقویت ... اس کا رویہ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ بعض فلسطینی مجھے دیکھے بغیر ... کی طرح چاہنے لگے تھے۔

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ برسیلز سے یہاں کس ... ہو؟" کچھ دیر کے بعد اس نے سوال کر ڈالا۔

"یہاں مجھے صرف انتظار کرنا ہے۔" میں نے مسکرا کر ... "میری بیوی لیبیا میں ہے اور اس کا سراغ ملتے ہی میں ... ہو جاؤں گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں آئے ہو مگر ...

... پیرس تمہارے لئے بہترین جگہ تھی۔"

"... برسیلز میں میری زیر زمین دنیا کے کچھ لوگوں سے ٹھن گئی تھی ... بھی خاصے وسائل کے مالک ہیں۔ اس لئے میں ادھر نکل آیا۔"

"ایسے کون لوگ تھے وہ؟"

"شاید عبدالعزیز کا واقعہ تمہارے علم میں نہیں۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"اس کی خودکشی کی خبر سن کر میں دو روز تک عجیب حالت میں رہا تھا۔" وہ چونک کر بولا۔ "مگر اس کی خودکشی کی وجہ آج تک معلوم نہ ہو سکی۔"

"عبدالعزیز کا خیال تھا کہ اس کی کسی... کوتاہی کی وجہ سے وہ لوگ میرے پیچھے لگے تھے لہٰذا اس نے اپنی معطلی سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی اوپر والوں نے اسے معطل کر کے اس کے ساتھ سنگین زیادتی کی تھی۔"

"مگر وہ لوگ تھے کون؟"

"ہو سکتا ہے کہ تم نے بھی نام سنا ہو، وہ مادام بواری کے گروہ کے آدمی تھے۔" میں نے کہا۔

"مادام بواری!" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "تو تم اس سے بھی ٹکرا گئے تھے؟"

"حالات نے اس کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔"

"یونان میں بھی اس کے خاصے آدمی ہیں۔ یہاں بحری جہازوں کے ماؤں کے ذریعے وہ منشیات کی غیر قانونی درآمد اور برآمد کا دھندا چلا رہے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے گروہ کو کنٹرول کرنے والی عورت کو کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے مجھے بتا دیا، میں اب مادام بواری کے آدمیوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو مگر میں ایک درخواست ضرور کروں گا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"اگر تمہاری مادام بواری سے واقعی ٹھنی ہوئی ہے تو اب ہوٹل ڈیسکارڈ کا رخ نہ کرنا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"وہاں کیا ہو جائے گا؟"

"ڈیسکارڈ کی مالکن مادام بواری کے لیے کام کرتی ہے۔" وہ بولا۔ "مادام بواری اپنے دشمنوں کو پاتال میں بھی ٹھکانے لگانے کے لئے شیطانی شہرت رکھتی ہے اور اس کے آدمی نہایت منظم طریقے پر کام کرتے ہیں اگر وہ تم سے انتقام لینے پر تل گئی تو اس کے ہر رکن تک تمہاری تصویر یا خاکہ پہنچا دیا جائے گا۔"

اس کے الفاظ سن کر میں اپنے ہی وجود میں کانپ کر رہ گیا۔ "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ تمہاری مالکن بواری کے لیے کام کرتی ہے۔"

"اس کے ارکین اپنی وفاداری کی خود ہی محدود تشہیر کرتے ہیں تاکہ چھوٹے موٹے جرائم پیشہ لوگ ان کے راستے میں حائل ہونے کی جرأت نہ کر سکیں۔"

"تمہاری مالکن نے مجھ پر غیر ضروری توجہ تو نہیں دی تھی؟"

"یہاں سے واپسی پر سوالات کئے تھے مگر میں نے صرف اتنا بتایا کہ تم میرے قریبی دوست ہو پھر..." اچانک وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"مجھے اگر پہلے سے مادام بواری کا قصہ معلوم ہوتا تو میں ٹال سکتا تھا مگر میں نے بے خبری میں تمہارے لئے اپنی مالکن کی آج دوپہر کی دعوت بھی قبول کر لی۔ دوپہر کا کھانا وہ ہوٹل میں تمہارے ساتھ کھانا چاہتی تھی مگر اب میں تمہیں وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

میرے بدن میں چیونٹیاں سنسنانے لگیں۔ "اگر میں تمہارے وعدے کے باوجود کھانے پر نہ گیا تو بلاوجہ مزید مشکوک ہو جائے گی۔"

"میں کوئی بہانہ بنا دوں گا۔" اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

"نہیں،" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں اس سے مل کر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہے۔"

"میں ضد نہیں کر رہا مگر میری دانست میں تم وہاں ... پریشانیاں ہی مول لو گے۔" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں وسوسوں میں مبتلا رہ کر سسکتے رہنے کے بجائے بڑھ کر خطرے کے مقابلے کا قائل ہوں اگر وہ میری طرف سے مشکوک ہو ہی گئی ہے تو پھر ایتھنز میں بھی مادام بواری کو اپنے زخم چاٹنے ہوں گے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" عدنان نے سر تسلیم خم کر دیا۔

اس نئی صورتحال نے وہ ذہنی سکون برباد کر دیا جو میں نے ایتھنز پہنچنے کے بعد محسوس کیا تھا۔ عدنان بھی خاموش تھا اور میرے ذہن میں تو شیطانی کارخانہ ہی چل پڑا تھا۔

میرے دیر میں سو کر اٹھنے کے باعث لنچ میں زیادہ وقت نہیں تھا لہٰذا ہم تیار ہونے لگے اور ٹھیک سوا بارہ بجے ہوٹل ڈیسکارڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔

کار میں بیٹھنے سے قبل عدنان نے دبے لفظوں میں مجھے ایک مرتبہ پھر روکنا چاہا مگر میں نے نرمی سے اس کا مشورہ ٹال دیا۔

ہم ہوٹل پہنچے تو ڈیسکارڈ کی مالکن دو آدمیوں کے ساتھ برآمدے میں ہم دونوں کی منتظر تھی۔

راستے میں عدنان فاخوری نے مجھے ہوٹل ڈیسکارڈو کی خوبرو مالکن کے بارے میں خاصی باتیں بتا ڈالیں۔۔۔

اس کا نام ہیلن نوسس تھا۔ اس کا باپ الکزینڈر نوسس ایتھنز کا ایک معزز اور آسودہ حال شخص تھا مگر ہیلن کسی طرح ایک ایسے شخص کی محبت میں مبتلا ہو گئی جو جائز ذرائع سے اپنی روزی کمانے کی کوششوں کو بے سود سمجھتا تھا۔ ہیلن کو اس شخص سے بے پناہ پیار تھا مگر اس کی مصروفیات سے نفرت تھی۔

مگر ہیلن پوری کوششوں کے باوجود اسے بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکی بلکہ اس نے ہیلن کو بھی اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کرا دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ پُراسرار حالات میں ایک بحری جہاز پر مردہ پایا گیا اور پولیس سرتوڑ کوششوں کے باوجود قاتل یا قتل کے سبب کا سراغ نہیں لگا سکی۔

بیوگی کے بعد ہیلن نے اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لکھنا ترک کر دیا اور دوبارہ مس ہیلن نوسس بن گئی۔ اس بارے میں بھی اس کا فلسفہ عجیب تھا۔ وہ کہتی تھی کہ ایک بُرے آدمی کی بیوی کہلانا اسے گوارا تھا۔ کیونکہ وہ اس کا محبوب تھا مگر محبوب کی وفات کے بعد اس بُرے آدمی کی بیوہ کہلانا اسے گراں گزرتا لہٰذا اس نے شادی سے قبل کا نام اختیار کر لیا۔

اپنے شوہر کے قاتل کی تلاش میں وہ مقتول کے دوستوں سے ملتی رہی جو مستند طور پر بدقماش لوگ تھے اور پھر ان ہی دنوں کسی طرح اس کا رابطہ مادام بواری کے گرگوں سے ہو گیا اور وہ حیرت ناک طور پر اس کے لئے کام بھی کرنے لگی۔

عدنان فاخوری کو ہیلن نوسس کے پرانے ملازمین سے یہ ساری کتھا معلوم ہوئی تھی ورنہ ہوٹل ڈیسکارڈو میں آنے والے بہتیرے منچلے اسے کنواری دوشیزہ سمجھ کر ہر شام وہیں کھنچے چلے آتے تھے۔ مگر ہیلن نے اپنی تمام تر خوش خلقی کے باوجود ان میں سے کسی کو حد سے تجاوز کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

مگر اس نے جس انداز میں یک بیک میری ذات میں دلچسپی لینی شروع کی تھی اس کی بنا پر میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ میرے لئے ہیلن کی قائم کردہ حدود میں رہنا تقریباً ناممکنات میں سے ہو گا!

اس وقت وہ سادہ سے لباس میں ہوٹل کے برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی مگر اس سادگی کے باوجود اس کے سراپا کا ایک ایک نقش قابلِ دید تھا۔ خدوخال، رنگت، قامت اور جسامت تو خیر اس کے حسن کے مرئی پیمانے تھے مگر اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمکنے والی مقناطیسیت میں بھی عجیب غیر مرئی حسن موجود تھا۔

"ذرا ہوشیار ہی رہنا!" عدنان نے کار کا انجن بند کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "یہ دونوں ہی شہر میں خاصے بدنام ہیں۔"

"اگر ہمارے پاس......!" میرا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ اس اثناء میں ہیلن سیڑھیاں اتر کر کار کے قریب آ چکی تھی۔

"خوش آمدید مسٹر ڈان بروک!" اس نے [illegible] سے کار کا دروازہ کھول کر رسیلی آواز میں کہا۔

"قدرت نے حسن کے ساتھ ہی اخلاق سے بھی نوازا ہے۔" میں نے فوری فیصلے کے تحت قدرے جارحانہ الفاظ کا انتخاب کر کے نرم لہجے میں کہا۔

میرے الفاظ پر چند ثانیوں کے لئے وہ سٹپٹا سی گئی مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ "نئے لوگوں سے ملنا میرا شوق ہے!"

"خوش قسمتی ہے میری۔" میں نے سر کو قدرے خم دے کر کہا۔ "حسین لوگوں کے ساتھ وقت گزار کر سرور حاصل ہوتا ہے!"

"حسن صرف دیکھنے والے کی نظر کا فریب ہوتا ہے۔" وہ قہقہہ مار کر بولی۔ "ایسا نہ ہو تو بدصورت لوگ زندگی بھر تنہائیوں کا زہر ہی جھیلتے رہیں!"

وہ میری رہنمائی کرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اسی وقت عدنان فاخوری نے میرے پہلو میں آ کر کہنی سے ہلکا سا ٹہوکا دیا مگر میں پہلے ہی ان دونوں کا جائزہ لے چکا تھا۔ جو جیبوں میں ہاتھ ڈالے پوری سنجیدگی سے ہم تینوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

برآمدے میں ان دونوں کے قریب پہنچ کر ہیلن رک گئی۔

"یہ میرے دوست پاپاگوس اور جیری ہیں۔" وہ باری باری ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اور یہ میرے مہمان ڈان بروک ہیں، عدنان کو تو تم دونوں جانتے ہی ہو۔!"

پاپاگوس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے خاصی قوت کا مظاہرہ کیا شاید اس طرح وہ مجھے مرعوب کرنا چاہتا تھا اگر میں پہلے ہی سے ہوشیار نہ ہوتا تو وہ گرمجوشی کے بہانے میرے دائیں ہاتھ کی ایک آدھ انگلی ناکارہ کر ڈالتا۔

"عدنان اس وقت میزبان ہے یا مہمان؟" مجھ سے [illegible] بعد پاپاگوس نے بے تکلفی سے عدنان کے شانے پر ہاتھ مار کر سوال کیا۔

"مہمان ہی سمجھو! ڈان بروک کو اسی کی معرفت مدعو کیا [illegible]" فقرہ ختم کرتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مجھے یوں لگا جیسے کانسی کی بے شمار ننھی ننھی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔

"بڑی اچھی بات ہے۔" جیری ہم لوگوں کے ساتھ ہال کی طرف بڑھتے ہوئے بزرگانہ انداز میں بولا۔ "محض اسی لئے ڈیسکارڈو کا کوئی ملازم اپنی خوشی سے استعفیٰ دے کر نہیں جاتا۔ تم نے انہیں ایک کنبے کا سا احساس دیا ہوا ہے!"

"دوسری جگہ کام کرنے والے تو خود کو یتیم ہی سمجھتے ہوں گے۔"

کسی کو بھی چھوٹ دینے پر آمادہ نہیں ہو۔ تم کہاں کام کرتے ہو؟"

جیری نے برا سا منہ بنا کر تلخ انداز میں مجھے گھورا۔ "میں نے پوری سنجیدگی اور نیک نیتی سے کہا ہے!"

"سنجیدگی سے خالی معدے میں السر ہو جاتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ایسی باتیں کھانے کے بعد رہیں گی۔"

"خوش مزاج بھی ہو۔" پاپاگوس اچانک ہنس پڑا، شاید وہ کسی قسم کی تلخی سے بچنا چاہتا تھا۔ "فکر نہ کرو، میرے ہاں تمہارا معدہ محفوظ رہے گا۔"

"میں ان لوگوں کے بارے میں ہمیشہ متفکر ہو جاتا ہوں جو جوان کاندھوں پر بوڑھی کھوپڑیاں لادے پھرتے ہیں۔" میں نے جیری کو جارحانہ انداز میں نظر انداز کرتے ہوئے براہِ راست پاپاگوس سے کہا۔ "ایسے لوگ تدفین کے مواقع پر شدت سے درکار ہوتے ہیں۔"

"میرا مضحکہ اڑا رہے ہو؟" جیری نے کہنیوں کے بل میری طرف جھک کر غصیلے لہجے میں کہا۔

"میں بزرگوں کا احترام کرتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اور تم سے ویسے بھی میری بے تکلفی نہیں ہے۔"

"احترام کی ایسی کی تیسی!" وہ آپے سے باہر ہو کر غرایا۔ "میں تمہیں کہاں سے بزرگ نظر آ رہا ہوں؟"

"میں نے تمہیں کب بزرگ کہا؟ ابھی تو تم مونچھیں ہی چھو کر رہ گئے ہو!" میں اسے سلگانے میں لذت محسوس کر رہا تھا۔

میرے اس تبصرے پر شاید بات بڑھ جاتی مگر ہیلن نوسس نے فوراً ہی جیری کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم اس قدر چڑچڑے پن پر کیوں بضد ہوئے ہو؟"

جیری غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات نگاہوں میں لئے ثانیوں تک اسے گھورتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "تم بھی مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہی ہو، اسے نہیں دیکھتیں کہ کبھی مجھے بڈھا اور کبھی چھوکرا کہہ رہا ہے!"

"اگر تم گرمی کھائے بغیر اسے مناسب جواب دے سکو تو مجھے خوشی ہو گی، ہم یہاں اپنا موڈ برباد کرنے کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں۔" ہیلن نے کہا۔

"میں اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "اس سے کہہ دو کہ اب یہ مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہ کرے۔"

"سن لیا تم نے مسٹر ڈان بروک؟" اس کا فقرہ پورا ہوتے ہی پاپاگوس نے شریر لہجے میں کہا۔

"بکواس سننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "میں اس میز پر شام تک بھوکا بیٹھ سکتا ہوں مگر خاموش رہنا دشوار ہو گا۔"

"بات کرنے کے لئے یہاں تین افراد اور بھی ہیں۔" اس بار عدنان فاخوری نے درمیان میں دخل اندازی کی تھی۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" پاپاگوس نے فوراً ہی سوال داغ دیا۔

"عدنان کے گھر سے!" میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے ازراہِ تمسخر جواب دیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ ایتھنز سے پہلے تم کہاں تھے؟"

"بات اگر واضح نہ ہو تو میری سمجھ میں ذرا دیر سے آتی ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تم نے آئن اسٹائن کا مشہور قصہ سنا ہے۔؟"

"کیا؟" ہیلن نے غیر ارادی طور پر سوال کر کے مجھے موضوع بدلنے کا بہانہ فراہم کر دیا۔

"اس سے کسی نے سوال کیا تھا کہ سونے کا ایک نازک سا زیور اگر خاصی بلندی سے نیچے گر جائے تو کیا ہو گا؟ اور آئن اسٹائن نے کہا کہ کچھ بھی نہیں۔" میں نے رک کر سگریٹ کا کش لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس جواب پر سائل سٹپٹا گیا اور قدرے سوچنے کے بعد اس نے دوسری طرح سوال دہرایا کہ گرے ہوئے زیور پر اگر بیس سیر وزنی ہتھوڑے سے زوردار ضرب لگائی جائے تو کیا ہو گا اور اس بار بھی آئن اسٹائن نے نہایت معصومیت سے اپنا جواب دہرا دیا وہ شخص بری طرح چراغ پا ہو گیا کہ ہتھوڑے کی ضرب تو درکنار گرنے سے ہی زیور ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا مگر آئن اسٹائن اتنی معمولی سی بات نہ بتا سکا۔"

"وجہ کیا تھی۔؟" عدنان شاید میرا مدعا بھانپ گیا تھا لہٰذا اس بار اسی نے سوال کر ڈالا۔

"آئن اسٹائن نے اس شخص سے اپنی کم فہمی پر معذرت کر لی۔" میں نے کہا۔ "دراصل اس کا ذہن سونے کے جوہر اور اس کی ماہیت میں الجھ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے زیور کی ٹوٹ پھوٹ جیسے جواب کی توقع رکھی جائے گی۔ مگر سوال کرنے والا میرا ہی کوئی بھائی تھا۔"

ہیلن، پاپاگوس اور عدنان نے دل کھول کر قہقہے لگائے مگر جیری منہ بنائے مجھے گھورتا رہا۔

"یہ قصہ تمہارے دماغ کی پیداوار ہے۔" قہقہے رکنے پر جیری خشک لہجے میں بولا۔ "آئن اسٹائن کے ساتھ کبھی ایسا قصہ پیش نہیں آیا۔"

"اب یہ خود مجھے دعوت دے رہا ہے۔" میں نے ہیلن سے کہا۔ "اس سے پوچھو کہ کیا یہ آئن اسٹائن کے ساتھ ہی کھیلتا رہا تھا۔"

"مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ قصہ کہاں پڑھا ہے؟" وہ مصر ہو گیا۔

"اگر تم آئن اسٹائن کے ہم عصروں میں سے ہو تو میرے لئے آثارِ قدیمہ کا ایک عبرتناک اشتہار رہو اور اگر تم علمی قابلیت جھاڑنی چاہتے ہو تو پہلے اپنا مطالعہ وسیع کرو پھر میرے پاس آنا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اگر تم خاموش نہیں بیٹھ سکتے تو یہاں سے چلے جاؤ!" اس بار ہیلن کا لہجہ سخت اور تحکم آمیز تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں مس فوسس!" وہ ایک دم بھیگی بلی بن گیا۔ "اس وقت میری طبیعت کچھ ناساز ہے اگر اجازت ہو تو چلا ہی جاؤں ۔۔۔؟"

"تم چلے ہی جاؤ تو بہتر ہوگا۔" ہیلن نے ترش لہجے میں کہا اور جیری مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھورتا ہوا میز سے اٹھ گیا۔

"اگر تم ایسا نہ کرتیں تو مجھے سوچنا پڑ جاتا کہ آدابِ میزبانی کسے کہتے ہیں؟" میں نے جیری کو سنانے کے لئے ہیلن سے کہا۔

"ڈیسکارڈو کی بارونق شامیں اس بات کی گواہ ہیں کہ مادام اتھینز کی سب سے کامیاب مہماندار ہیں۔" پاپاگوس نے کہا۔

"مادام!" میں نے چونک کر دہرایا۔ "یہ خطاب کچھ ادھورا محسوس ہوتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" پاپاگوس کا لہجہ معتدل تھا میرے معنی خیز تبصرے پر ان دونوں کے بشرے سے کسی غیر معمولی ردِ عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

"سنگاپور میں یہ خطاب ایک گردہ بند خاتون کے لئے استعمال ہوتا تھا۔" میں دفاعی رویّے کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کرتا جا رہا تھا۔

"تو کوئی نام نہیں تھا اس کا ۔۔۔؟"

"مادام ریناتے کہلاتی تھی!"

"تو تم سنگاپور سے آئے ہو؟" ہیلن کو ایک مرتبہ پھر موقع مل گیا۔

"میں ایک سیّاح ہوں اور اچھے سیّاح نئی منزل پر پہنچ کر پرانا ٹھکانا بھول جاتے ہیں۔ اگر تمہاری میزبانی نے کچھ مسحور کیا تو شاید یہاں پڑاؤ کچھ لمبا ہو جائے۔"

"تم چھپانا چاہ رہے ہو۔" ہیلن دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ہو سکتا ہے!" میں نے کہا۔

"مگر کیوں ۔۔۔؟"

"میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم اسی سوال کا جواب سننے کے لئے کیوں بے چین ہو؟" میرا لہجہ یک بیک خشک ہو گیا۔

"برا کیوں مان رہے ہو۔" عدنان جلدی سے بولا۔ "ہم لوگ ایک میز پر اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں اور ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں تھوڑا بہت جاننے کا حق ہے!"

"مس ہیلن کے اصرار سے تو یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ مجھے اسی سوال کا جواب دینے کے لئے مدعو کیا گیا ہے!"

"برا مان گئے۔" ہیلن اچانک ہی ہنس پڑی۔ "اگر تمہارا کوئی راز ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کرتی لیکن یہ بتانا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے تمہیں صرف اسی وجہ سے مدعو کیا ہے کہ تم عدنان فاخوری کے دوست ہو!"

اسی اثنا میں بیرا مشروبات کی ٹرالی لے آیا اور ہیلن نے جام میرے نام تجویز کیا جو بوجھل سی فضا میں خالی کر لیا گیا۔ وائن بہت عمدہ اور حقیقی معنوں میں اشتہا انگیز تھی کھانے کا دور شروع ہوا تو فضا پر چھایا ہوا جمود ٹوٹ چکا تھا۔

وہاں سے چار بجے کے قریب گلو خلاصی ہو سکی۔ کھانے کے بعد گفتگو نہایت خوشگوار اور دوستانہ رہی ایک بار میں نے اپنے رویّے پر بھی معذرت کی جس کے نتیجے میں جیری کو وہاں سے جانا پڑا لیکن ان دونوں نے ہی اعتراف کیا کہ جیری نہایت خودسر اور بدمزاج تھا جسے برداشت کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں تھا۔

ہیلن پاپاگوس کے ہمراہ مجھے کار تک چھوڑنے آئی۔

"میں ڈان کو چھوڑ کر تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔۔۔" عدنان فاخوری نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے ہیلن سے کہا۔

"آج تم چھٹی کر لو۔" ہیلن فراخدلی کے ساتھ بولی۔ "ڈان کو شہر کی سیر میں اکیلے لطف نہ آ سکے گا۔"

"آج رات ہال ایک بڑی ڈنر پارٹی کے لئے بک ہے میرا آنا ضروری ہے۔" عدنان نے نرم لہجے میں کہا۔

"اوہ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔" ہیلن نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "تم واپس چلے آنا، شام کو میں ڈان کو شہر دکھاؤں گی۔"

"تفریح کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور پھر ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

واپسی میں چند منٹ تک خاموشی رہی جسے عدنان ہی نے توڑا۔ "تم کچھ سمجھے کہ ہیلن نے تمہیں کیوں مدعو کیا تھا؟"

"اس کا رویّہ بڑا مبہم سا تھا، پتہ نہیں وہ کس چکر میں ہے؟"

"ہیلن سے زیادہ مجھے جیری کی فکر ہے، وہ نہایت خطرناک آدمی ہے!"

"شاید میں نے اس کے ساتھ زیادتی کر ڈالی!"

"ارے نہیں۔" وہ ہنسا۔ "تم نے یہی تماشا تو نہیں دیکھا!"

"کیسا تماشا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ہیلن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور کن انکھیوں سے اس کی ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔" وہ بتلانے لگا۔ "جیری کو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں الجھنے کی شہہ دے رہی تھی!"

"کمال ہے ۔۔۔ اور پھر خود ہی اسے اٹھا بھی دیا۔"

"وہ سب ملی بھگت تھی۔" وہ بولا۔ "اگر تم ابتدا سے انکسار سے کام لیتے تب بھی شاید وہ موقع پاتے ہی تم سے الجھ بیٹھتا۔"

"مگر کیوں؟" عدنان نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔

"میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے!"

"ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں کو ڈیسکارڈو میں الجھا کر جیری نے مکان کی تلاشی لے ڈالی ہو۔" میں نے چونک کر کہا اسی کے ساتھ مجھے اپنے دوسرے سفری کاغذات یاد آ گئے جو برسیلز میں نیکلا نشی کے ساتھ میرے حوالے کئے تھے کہ ضرورت ختم ہونے پر تلف کر دوں مگر میں ایتھنز پہنچنے کے بعد اس کی ہدایت بھول بیٹھا تھا۔

"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" عدنان بولا۔ "اسے اگر تلاشی ہی مقصود تھی تو تمہارے سامنے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرا امکان شناخت کا تھا مگر یہ کام بھی دور رہ کر کیا جا سکتا تھا۔ مجھے تو اس معاملے کی تہہ میں کچھ اور ہی نظر آ رہا ہے!"

راستے بھر ہم دونوں اس معاملے پر تبادلۂ خیال کرتے رہے مگر کسی مثبت نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اگر ہیلن فوسس ایتھنز میں مادام اولاری کے لئے کام کر رہی تھی تو یہ سمجھنا نادانی ہوتی کہ وہ مجھ پر شبہ نہیں کر رہی تھی۔

اوّل تو وہ ابتدا ہی سے میری طرف سے مشکوک تھی اور پھر میں نے سنگاپور کے حوالے سے ایک فرضی مادام ریناتے کا قصہ چھیڑ کر اس کے شبہ کو تقویت دی تھی اس سلسلے میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی کہ ایتھنز سے پہلے والے مقام کا نام چھپانا بھی نامناسب تھا میں با آسانی یورپ کے کسی بھی شہر کا نام لے کر بات ختم کر سکتا تھا مگر یہ سب لا یعنی باتیں تھیں۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا تھا اور مجھے اس کے نتائج بھگتنے کی تیاری کرنی تھی۔

"یہ آئن اسٹائن کا قصہ کیا تھا؟" عدنان نے سوال کر کے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

"اسی وقت تازہ تازہ تیار کیا تھا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں ٹالنا چاہ رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ہیلن دوبارہ وہی سوال کر بیٹھے گی۔"

"مجھے ایسی برجستگی پر بڑا رشک آتا ہے۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "میرا ایک ہکلا دوست بیٹھے بیٹھے ایسے مربوط اور جامع قصے گھڑتا ہے کہ شبہ بھی نہیں کر پاتے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ہکلاہٹ کی آڑ میں سوچنے کا کافی وقت نکال لیتا ہے۔ کسی عیب کو خوبی میں ڈھال لینا تو واقعی کمال ہے مگر میں اکثر سچ بولنا پسند کرتا ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

عدنان نے اپنے مکان کے سامنے کار روکی تو اچانک کہیں سے گہرے سبز رنگ کی ایک کار تیزی سے نمودار ہوئی۔ اور اس کے قریب آ رکی!

بریکوں کی چرچراہٹ سن کر ہم دونوں ہی اچھل پڑے اور اسی وقت ہمیں جیری کا غصے سے تپتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"یہ یاد رکھنا کہ میں تم سے بدلہ لئے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا" وہ اپنی کار کی کھڑکی میں سے سر نکال کر مکا فضا میں لہراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"انجن بند کر کے ابھی نیچے آ جاؤ۔" میں نے عدنان کی کار سے اترتے ہوئے تضحیک آمیز لہجے میں کہا میں اس وقت واقعی اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں تھا۔

"جیری اپنی پسند کے موقع پر وار کرتا ہے!" یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن اندر سمیٹی اور اس کی کار برق رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

"معاملہ خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔" عدنان میرے قریب آ کر بڑبڑایا۔

"تم فکر نہ کرو، اس طرح للکارنے والے عموماً دلیر نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "لاؤ چابی مجھے دے دو تمہیں دیر ہو رہی ہے!"

"تھوڑی دیر کمر بھی سیدھی نہیں کرنے دو گے!" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مکان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم جاؤ گے تو وہ آئے گی۔"

"تم خوش نصیب ہو کہ وہ تمہیں اتنی لفٹ دے رہی ہے۔ موقع ملے تو کسی قسم کی رعایت سے کام نہ لینا۔"

"اب تو وہ میرے دشمن کی حامی ہے!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس وقت تک ملنے والے فلسطینیوں میں عدنان فاخوری بہت مختلف تھا۔ دوسروں کے برعکس وہ شراب سے بھی رغبت رکھتا تھا، عورتوں کے بارے میں بھی جارحانہ سوچ کا مالک تھا اور انفرادی فیصلوں کا اہل بھی معلوم ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہونے پر عدنان کی رائے کی تائید ہو گئی۔ ہر چیز جوں کی توں موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ ہماری غیر حاضری میں مکان کی تلاشی نہیں لی گئی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنا پاسپورٹ اور دوسرے سفری کاغذات نکالے اور فرش پر ایک جگہ رکھ کر انہیں آگ دکھا دی۔

عدنان نے غسل خانے سے آ کر مجھے کاغذات پر آگ تاپتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

"اصولاً مجھے یہ کام کل ہی کرنا تھا۔"

"مگر کیوں؟" اس کی نگاہیں بدستور سلگتے ہوئے پاسپورٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

جب میں نے اسے اختصار سے اپنی اس کارروائی کا پس منظر بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی دانست میں وعدے کی پابندی نہایت مردانہ خصوصیت تھی۔

ہوٹل واپس جانے سے پیشتر عدنان نے اپنا ایک پستول میرے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ خفیہ جگہ بھی دکھا دی جہاں چند مختصر مگر مؤثر ہتھیار پوشیدہ تھے جن سے انتہائی نازک صورتِ حال میں کام لیا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر سستا کر عدنان واپس چلا گیا اور میں دروازہ اندر سے مقفل کر کے کسلمندانہ انداز میں بستر پر دراز ہو گیا۔

خوش خوراکی اور شراب نوشی کا اثر یہ ہوا کہ بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ اور میں دوبارہ اس وقت بیدار ہوا جب ڈوربل کی تیز آواز نے خلل اندازی کی۔

دروازہ کھولنے پر میں نے ہیلن کو سامنے موجود پایا۔

"ارے تم سو رہے تھے؟" وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"تنہائی میں نیند سے بہتر اور کیا شغل ہو سکتا تھا؟" میں نے اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم تیار بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہو گے۔"

"بڑی خوش فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں!" میں نے مسکرا کر اس کے سراپا پر ناقدانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت منہ پھٹ ہو!" وہ خفت آمیز ہنسی کے ساتھ بولی "اگر تم سیاح ہی ہو تو تمہیں کمرے میں بند رہنے کے بجائے گھومنے پھرنے سے دلچسپی ہونی چاہیئے۔"

"سیاحت کے شوق سے دوسرے انسانی تقاضے ختم نہیں ہو جاتے!"

"اب بیٹھ کہاں رہے ہو؟ منہ ہاتھ دھولو تو ذرا باہر کی دنیا بھی دکھا لاؤں۔"

"تم ساتھ ہو تو تفریح کے لئے باہر نکلنا ایسا ہی ہے جیسے برسات میں پودوں کی آبیاری کرنا۔" میں اس سے بتدریج بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ نہ سمجھنا کہ میں یہاں آ گئی ہوں تو بس اب تمہارے ہی اشاروں پر ناچوں گی۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں شریف عورتوں سے اشارے بازی نہیں کرتا۔" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے، ہسپتالوں سے نیچے رہتے ہو!"

"اجازت ہو تو منہ ہاتھ دھولوں؟"

"میں تو خود یہی کہہ رہی تھی!"

"اس کے بعد بھی ہم یہیں بیٹھیں گے!" میں نے اٹھتے ہوئے...

"اس سے تو بہتر تھا کہ تمہیں ہوٹل ہی بلا لیتی، کم از کم وہاں تو... کی فکر تو نہ ہوتی۔" اس نے ایک ادا سے منہ بنا کر کہا۔

"فکر نہ کرو، بھوک لگے گی تو ادھر ہی چلیں گے، وہ لبنانی... کھانے واقعی بہت لذیذ ہوتے ہیں۔"

میں منہ دھو کر واپس آیا تو ہیلن ایک صوفے پر دراز نہایت... اطمینان سے شیری کا گلاس خالی کر رہی تھی۔

"پہلے بھی یہاں آتی رہی ہو۔۔۔؟"

"کبھی کبھار!" وہ پیمانے سے اپنے لبوں کو تر کرتے ہوئے بولی...

"پھر تو بڑا امکان ہے عدنان۔" میں نے کہا۔ "تمہارے زم زم... پر مجھے اس طرح مبارک باد دے رہا تھا جیسے مجھ میں سرخاب کے پر لگے ہوئے ہوں۔"

"تم الو ہو۔" وہ خوشگوار سی جھلاہٹ کے ساتھ بولی۔ "پہلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی کام سے آئی ہوں، آج پہلی بار یہاں بلا وجہ آئی ہوں..."

"یعنی عدنان درست ہی کہہ رہا تھا۔"

"تمہارے اگر کبھی سرخاب کے پر رہے بھی ہوں گے تو اب جھڑ چکے ہیں۔" وہ بولی۔ "اگر آج پنچ پر جیری تمہارے ساتھ زیادتی نہ کرتا تو شاید یہ نوبت ہی نہ آتی۔"

"میں جیری کا ممنون ہوں، مگر تم یہ تو بتاؤ کہ رہتی کہاں ہو؟" میں اس سے جیری کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی چاہتا تھا۔

"بیس گھنٹے ہوٹل پر اور دو چار گھنٹے گھر پر رہتی ہوں۔ ڈیلی... قائم کر کے میں نے نئی زندگی حاصل کی ہے۔"

"کوئی حادثہ ۔۔۔؟"

"جو چاہو کہہ لو۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ بعد میں میرے ذہن سے نکل جائے۔ تم جیری سے ذرا ہوشیار ہی رہنا... تم سے کہیں بھی بدلہ لینے کی بھرپور کوشش کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں وہ پورا اونٹ ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں ۔۔۔؟" ہیلن کی حیرت بالکل فطری اور بے ساختہ تھی۔

"جوش میں کسی کے کہنے پر چل پڑا تھا، بعد میں عقل آ گئی۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔" وہ حیرت اور بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں اسے مدت سے جانتی ہوں۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ اس نے مجھ سے مل کر اپنے رویے... کی ہے!" میں نے بغور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ...

...نے کہا۔

"میں ابھی اس سے بات کئے لیتی ہوں۔" وہ قریب ہی رکھے ہوئے فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"یعنی تم کو پورا یقین ہے کہ میرے ساتھ اس کا رویہ مخالفانہ ہی..." میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ میں اسے جانتی ہوں۔ اس کے معذرت کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کل صبح سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔"

"اور تم اس کے مخالفانہ رویئے کی فوری تصدیق بھی کرنا چاہتی ہو۔ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

"کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ میرے ایما پر تم سے الجھا ہے؟" اس نے چونک کر مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

"اگر تم میری جگہ ہوتیں تو اس کے علاوہ کیا سوچ سکتی تھیں؟"

وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ "وہ میرا ملازم نہیں، محض دوست ہے۔"

"ملازم سے زیادہ وفادار معلوم ہو رہا تھا۔"

"تمہارے آجانے کے بعد اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ مجھ پر بُری طرح برس رہا تھا اور اب کبھی نہ ملنے کی دھمکی دی ہے!"

"اور مجھے تو اس نے عدنان کے دروازے کے باہر براہِ راست دھمکی دی تھی۔"

"مگر تم تو معذرت کا ذکر کر رہے تھے؟"

"وہ مذاق تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے جیری سے ملاقات کی تفصیل سنا ڈالی۔

"میں دیکھوں گی کہ اس سلسلے میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں۔" بہت خاموش ہونے پر وہ تشویش زدہ انداز میں بولی۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے ساتھ تم نے اسے اور پاپاگوس کو کیوں مدعو کیا تھا۔" میں نے اس سے پوچھ ہی ڈالا۔

"اتفاق ہی سمجھو، وہ دونوں مجھ سے ملنے آ گئے تھے اور میں نے انہیں بھی کھانے کے لئے روک لیا۔ خاص طور پر انہیں بلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

اس کی گفتگو سے میں نے کم از کم یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ بہت زیادہ مکار عورت نہیں تھی۔ اسے ذرا سی محنت سے راہِ راست پر لایا جا سکتا تھا۔ جیری کے معاملے میں میرا اندازہ تھا کہ ہیلن نے کسی وجہ سے مختصر میں میرے ایک دشمن کی موجودگی کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کے لئے نہایت بھونڈا انداز اختیار کیا گیا تھا۔

ایک طرف تو دشمن کی موجودگی میں میں ہیلن سے زیادہ قریب ہو جاتا اور پھر اس سے مدد بھی طلب کر سکتا تھا۔ دوسری طرف اس کے ذریعے مجھے ایتھنز میں کافی دنوں تک الجھایا جا سکتا تھا۔

کم از کم یہ شبہ پختہ ہو چکا تھا کہ ہیلن کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو چکا تھا اور اگر وہ مادام لواری سے متعلق تھی تو اس شبہ کی نوعیت بھی واضح تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ میں عدنان فاخوری سے ملنے کے لئے ہوٹل ڈیسکارڈو پہنچا تو براہِ راست ہیلن ہی سے ملاقات ہوئی۔

اگر اس نے میری تصویر دیکھی ہوئی تھی یا میرا حلیہ اسے بتایا جا چکا تھا تو مجھے دیکھ کر اس کا مشتبہ ہونا لازمی تھا۔

پھر اس نے اپنے شبہے کی تصدیق یا تردید کے لئے میرے اعزاز میں دعوت دے ڈالی تھی۔ میں وہ ایسے افراد اور بھی بلائے جنہیں میرے حلیئے کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم رہا ہوگا اور جب ان تینوں نے متفقہ طور پر یہ طے کر لیا کہ مجھے فوری طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا تو جیری نے مجھ سے مفت کا جھگڑا مول لے لیا۔

عین ممکن تھا کہ ہیلن فوری مجھے فوری طور پر نقصان پہنچانا نہ چاہتی ہو اور مجھے اس وقت تک ایتھنز میں روکنا چاہتی ہو جب تک کوئی ایسا شخص وہاں نہ پہنچ جائے جو میرے بارے میں کوئی یقینی رائے دے سکے۔

اس نتیجے پر پہنچ کر میں نرم پڑ گیا۔ "اگر تم واقعی میری خیر خواہ ہو تو یہ میری خوش نصیبی ہے اور اگر دشمن ہو تو حسینوں کی دشمنی بھی لطیف تجربات سے دوچار کرتی ہے۔"

"آخر مجھے تم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"اگر دوستی کا سبب معلوم ہو جائے تو دشمنی کا تذکرہ ہی چھوڑ دوں گا۔۔۔"

"میں نے بتایا نا کہ اجنبیوں سے دوستی کرنا میرا مشغلہ ہے۔"

"اگر یہ بات درست ہوتی تو تمہاری غیر متوقع دعوت پر عدنان مجھے اس طرح مبارک باد نہ دیتا جیسے میں نے کے ٹو کی چوٹی سر کی ہے!"

"تو اس نے تمہیں میری طرف سے بھڑکایا ہے؟" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"اسے بلاوجہ ملوث نہ کرو، جیری نے اس مکان کی چوکھٹ پر مجھے بذاتِ خود للکار کر چیلنج دیا ہے۔"

"میں اس سے تمہاری صلح کرانے کی کوشش کروں گی۔" وہ زچ آ کر بولی۔ "اگر مجھے تم سے پرخاش ہوتی تو اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے تھی اور اگر تم وجہ بھی تلاش کر لو تو آسان صورت یہ ہوتی کہ اتنے چکروں میں پڑنے کے بجائے براہِ راست تمہارے پیچھے لگا دیتی اور تم میرے بارے میں سوچ بھی نہ پاتے!"

"جیری اتنا بدخو اور اجڈ نہیں ہے جتنا اس نے پہلی ملاقات پر ظاہر کیا تھا اس تک یہ پیغام ضرور پہنچا دینا کہ میں اپنے دشمنوں سے نہایت

بے رحمی سے پیش آتا ہوں۔"

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف کی ایک ہلکی سی لہر ابھر کر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ "پھر تو میں بھی خطرے میں ہوں۔"

"وہ کیوں ۔۔۔؟"

"تم مجھے بھی تو اپنے دشمنوں میں ہی شمار کرتے ہو۔"

"تمہاری دشمنی میں تو ہر طرح میرا ہی نقصان رہے گا۔"

"میرے کان ایسی باتوں کے عادی ہیں!" وہ لاپروایانہ انداز میں بولی۔ "ابھی کہہ رہے تھے کہ حسینوں کی دشمنی میں لطیف تجربات ہوتے ہیں۔"

"ایسے ویسے!" میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ "زبردست ایڈونچر جنم لیتے ہیں۔"

"شاید ذاتی تجربے کی بات کر رہے ہو!"

"ذاتی تجربے کی تمنا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک خوبصورت لڑکی اپنے لکھ پتی مگر بدصورت کزن سے سخت نفرت کرتی تھی اور اس کی اکلوتی وارث بھی تھی۔ قتل کا حوصلہ نہیں تھا لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر اس نے اپنے مدقوق کزن پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہونا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شخص بکثرت خرچ ہو کر بہت جلد قبر میں پہنچ جائے گا۔ مگر جانتی ہو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟"

"لڑکی ہی مر گئی ہو گی!"

"وہ مر جاتی تو صبر آ جاتا مگر ہوا یوں کہ اس شخص کو چارہ راس آ گیا۔ اور اس کی صحت روز بروز قابلِ رشک ہوتی چلی گئی۔" میں نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

"لڑکی نے ضرور خودکشی کر لی ہو گی۔" اس نے نہایت وثوق سے کہا۔

"وہ سنگاپور میں اب بھی موجود ہے اور اپنے کزن سے شادی کر چکی ہے۔"

"کسی امریکی رسالے کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تمہاری زبان سے دوسری بار سنگاپور کا ذکر سنا ہے!"

"میری عمر کا بیشتر حصہ وہیں گزرا ہے!"

"ماں باپ بچپن میں ہی وہاں لے گئے ہوں گے!"

اسے تو جو کہنا تھا وہ بڑی روانی سے کہہ گئی مگر ماں باپ کا ذکر آتے ہی میرے وجود میں ایک خلا سا پیدا ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک کھوکھلا انسانی پنجرہ ہوں جس کے اندر دل و دماغ سے لے کر خون تک کچھ بھی نہ ہو۔

اس روز پہلی بار مجھے پوری شدت سے احساس ہوا کہ سیتا کے علاوہ بھی میری زندگی میں کچھ لوگ تھے جن سے میرے جذباتی رشتے تھے اور جن کے بے شمار اخلاقی قرضے مجھ پر واجب الادا تھے، مگر میرے دل میں بھول کر بھی ان کا خیال نہ آتا تھا۔

مجھے اپنا وہ بڑا بھائی یاد آیا جس نے مجھے دکان کی تجوری سے رقم نکالنے سے روکنے کی پاداش میں پہلی اور آخری بار تھپڑ کھا کر اپنا سر جھکا دیا تھا۔ اس کی نمناک اور ملامت آمیز نگاہیں میرے تصور میں ابھر کر پورے وجود پر چھا گئیں۔

پھر ان آنکھوں کی اوٹ سے ابا کا غضب ناک اور پُر جلال چہرہ نمودار ہوا۔ میری بڑھتی ہوئی فضول خرچیوں اور آوارگی کے سلسلے میں وہ عرصے تک بدظن رہے مگر جب میں اپنے مطالبات کی خاطر سرکشی پر اتر آیا تو انہوں نے مجھے ہر چیز سے عاق کر کے گھر سے نکال دیا اور اس صدمے کو خود بھی نہ جھیل سکے۔ بگڑے ہوئے جوان بیٹے کو گھر سے نکال کر انہوں نے اپنے دل کے نہاں خانے میں روگ پال لیا اور دل کے دورے میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مگر ممتا سے تڑپتی ہوئی ماں زندہ رہی اس نے نکالے جانے کے پھاٹک پر اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا مگر اسے چوکھٹ عبور کرنے دی اور اپنی روتی ہوئی ورم آلود آنکھوں سے اپنے بگڑے بیٹے کو شہر کے انبوہ میں واپس لوٹتے صبر سے دیکھتی رہی۔ بھائی کی التجائیں بھی میری ماں کو اپنے شوہر کی آخری وصیت سے انحراف پر آمادہ نہ کر سکیں اور گھر سے ٹھکرایا ہوا صفدر علی حالات کے سمندر میں تنکے کی طرح جھولنے لگا۔

شاہ خرچ اور اوباش صفدر علی کو شب و روز گھیرے رہنے والے دوست مفلسی کی بُو پا کر یوں غائب ہوئے جیسے ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں دوسری ٹھوکر اس وقت لگی جب اپنی محبوبہ کو لاہور کے ایک بالاخانے پر ناز و انداز کے ساتھ اپنے حسن کی سوداگری کرتے دیکھا۔

عورت میری زندگی کا جہنم تھی!

اسی گلنار کو تحفہ دینے کی خاطر میں نے اپنے باپ کی نافرمانی اور بڑے بھائی کے ساتھ پہلی زیادتی کی تھی۔ گلنار ایک دوست کی معرفت معزز دوشیزہ کے روپ میں بہت عرصے تک مجھ سے تحائف کے ذریعے پیسہ بٹورتی رہی مگر میری قلاشی کے بعد وہ اصلیت کی طرف لوٹ چکی تھی۔ اور اسے متعارف کرانے والا دوست گلنار کا تقسیم کنندہ بنا ہوا تھا ۔۔۔!

میں انہیں پہچان گیا مگر وہ بڑھی ہوئی داڑھی اور ... میں چھپے ہوئے صفدر علی کو شناخت نہ کر سکے تھے!

وہ پہلا موقع تھا جب صفدر علی کے دل کی گہرائیوں سے ... پہلا شرارہ لپکا ۔۔۔

محبوبہ بنا کر جس فاحشہ کا قرب حاصل نہ ہو سکا تھا ... چکا کر صفدر علی اس کی خلوت میں جا پہنچا اور جب گلنار ... ہونے والی نار اپنے فطری ملبوس میں سامنے آئی تو اس نے یک بیک پہچاننے کا اعلان کر دیا۔

زخم خوردہ محبوب کو بھوکے درندے کے روپ میں پہچان کر گلنار دہشت زدہ ہو گئی مگر صفدر کے سر پہ اس روز انسان اور اس کا احترام کھو بیٹھا تھا۔ اس کو ہر طرف خونی دھند لہراتی نظر آ رہی تھی اور اس نے نہایت سفاکی کے ساتھ اپنی زندگی کا پہلا قتل کر ڈالا۔ دوسرا مقتول گاہک کو منزل پر پہنچانے کے بعد سویا ہوا تھا صفدر علی نے اس کی نیند کو دائمی رنگ دے دیا!

اس چھت کے نیچے دو خون کرنے کے بعد صفدر علی ایک خوفناک قاتل بن گیا جو اپنے دشمنوں کو معاف کرنا نہیں جانتا تھا۔

میں سوچتا رہا اور میرا دل بھاری ہوتا چلا گیا۔ ہیلن نے اس کے منہ سے ماں باپ کا ذکر سن کر پورا ماضی نگاہوں میں گھوم گیا۔ مجھے وہ ہستی یاد آنے لگی جو سامنے ہوتی تو میرے تمام گناہوں کو بھول کر بیٹا کہہ کر مجھے گلے سے لگا لیتی۔

"کیا سوچ رہے ہو ۔۔۔؟" ہیلن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں ۔۔۔!" میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے کہا اور محسوس کیا کہ میری آواز نمایاں طور پر بھرائی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری آنکھوں میں نمی تیر رہی ہے۔" وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔

"نہیں!" میں نے بوجھل مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن آنکھوں کو چھوا تو وہاں واقعی نمی موجود تھی۔

اپنے اس شدید ردِ عمل پر خاصی حیرت ہوئی۔ میرا اندازہ تھا کہ کشت و خون کے ماحول میں طویل مدت گزارنے کے بعد میرا دل نرم گوشوں سے محروم ہو چکا تھا۔ مگر اس روز ہیلن کی بدولت ہونے والا وہ تجربہ بہت خوشگوار تھا۔

"جھوٹ نہ بولو، کہاں کھو گئے تھے؟" وہ میرے شانے سے جھک کر ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ "تم جیسے کرخت انسان کی آنکھوں میں آنسو آنے کا مطلب ہے کہ یاد آنے والی بات بہت زیادہ دردناک اور جذبات انگیز تھی!"

"کچھ لوگ یاد آ گئے تھے۔" میں نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"بیوی بچے؟" اس کے لہجے میں تجسس سمٹ آیا۔

"بیوی ضرور ہے مگر اس کی یاد میں آنسو نہیں بہا سکتا۔"

"پتہ نہیں مرد کیا سمجھتے ہیں۔" وہ قدرے تنک کر بولی۔ "اگر عورتیں شوہروں کی یاد میں رو سکتی ہیں تو مرد بیوی کی یاد میں دو آنسو بہانے کو مردانگی کی توہین کیوں سمجھتے ہیں۔"

"میں تمہاری رائے سے متفق ہوں مگر اس وقت معاملہ کچھ اور ہی تھا۔"

"کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں بجھواتے رہو گے۔"

"تمہارا سوال سن کر اپنی ماں یاد آ گئی تھی!"

اس نے چند ثانیوں تک مجھے گھورا پھر آہستہ سے بولی۔ "اگر تم میری بات کا برا نہ مانو تو کچھ کہوں؟"

"ضرور کہو ۔۔۔"

"تمہارے منہ سے اس انداز میں ماں کا ذکر سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بیس بائیس برس کا شخص رال گدی باندھے، بوتل سے دودھ پیتا چلا آ رہا ہو۔"

"ہو سکتا ہے کہ اپنے معاشرے کے اعتبار سے تمہارا خیال درست ہو مگر تم مجھ پر اس کا اطلاق نہیں کر سکتیں۔"

"تم معاشرے سے باہر کے آدمی ہو ۔۔۔؟"

"کم از کم تمہارے معاشرے سے باہر ہی ہوں، مشرق میں قدروں کا معیار بہت مختلف ہے۔" میں نے کہا۔

"کس مشرق کی بات کر رہے ہو؟" وہ مضحکانہ لہجے میں بولی۔ "میں نے تو سنا ہے کہ سنگاپور نہ مشرق ہے اور نہ مغرب!"

"میں نے آج تک وہاں قدم نہیں رکھا۔" میں نے پہلو بدل کر پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ وقتی ہیجان تو آ کر گزر چکا تھا مگر میں ہیلن کے بارے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

"پھر بات بات پر وہاں کا حوالہ کیوں دے رہے تھے؟"

"لوگ سورج پر پہنچے بغیر وہاں کی باتیں کرتے ہیں!"

"تم نے اپنا وطن بھی نہیں بتایا؟"

"پہلے چھپانا چاہتا تھا مگر اب ضرور بتاؤں گا، میں پاکستانی ہوں!" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"اس وقت تم بہت عجیب اور بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہے ہو!" وہ پُر تشویش انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔۔۔

"سچ کا لہجہ ذرا مختلف ہی ہوتا ہے!"

"تو آخر کار تم پر سچ سوار ہو ہی گیا!" وہ ہنس پڑی۔ "اب میں دل کھول کر سارے سوالات پوچھوں گی۔"

"تمہارے بیشتر سوالات سے میں واقف ہوں!" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تمہارا محتاط رویہ بتا رہا تھا کہ میری طرف سے تمہارے ذہن میں اندیشے کلبلا رہے ہیں مگر وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "سب سے پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس فروخت کے لئے چرس یا حشیش وغیرہ تو نہیں ہے؟"

"ان دھندوں سے مجھے نفرت ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔ "تمہیں بیٹھے بٹھائے یہ بے ہودہ خیال کیسے آ گیا۔؟"

"ایتھنز میں بہت سے پاکستانی ہیں۔ تمہاری طرح کے بے خوف لوگ، وطن سے واپسی میں اکثر یہ چیزیں لاتے ہیں اور انہیں فروخت کر کے اخراجات نکالنے کے علاوہ بھاری منافع بھی کما لیتے ہیں۔ ادھر کی منشیات یہاں بہت مقبول ہیں۔"

"مادام لواری کے لئے تم یہی کام کرتی ہو؟"

میرے منہ سے مادام لواری کا نام سنتے ہی وہ یوں اچھل پڑی جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ "یہ تمہیں کس نے بتایا ۔۔۔؟"

"سنگاپور کی مادام ریناتے کا نام میں نے بلاوجہ نہیں لیا تھا۔" میں نے ٹانگیں پھیلا کر تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تت ..... تم واقعی خطرناک آدمی ہو۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کے چہرے سے یک بیک نقاہت کا اظہار ہونے لگا تھا۔

میں نے اس کے خالی گلاس میں بوتل سے شیری انڈیل دی اور دھیمی آواز میں بولا۔ "تم بلاوجہ درمیان میں نہ آؤ ورنہ چیونٹی کی طرح پس کر رہ جاؤ گی۔ مادام لواری کو کمزور مہرے پٹوا کر ملال بھی نہیں ہوتا ۔۔۔"

"میں کسی کے درمیان نہیں آرہی!" وہ گلاس سے گھونٹ لیتے لیتے رک کر بوکھلائے ہوئے انداز میں بولی۔

"شاید میرے بارے میں تمہیں مادام لواری کی جانب سے عمومی مگر اہم نوعیت کی ہدایات ملی ہوئی ہیں؟" میں نے اس کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر نرمی سے سوال کیا۔

"میرا اس سے براہ راست رابطہ نہیں ہے!" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

"کسی کا بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہدایات سب کو ملتی ہیں ۔۔۔"

"یونان میں میگورا مادام لواری کا چیف آپریٹر ہے، مجھے ابھی یہ معلوم ہوا تھا۔" وہ گلاس سے باقی ماندہ شیری اپنے معدے میں انڈیلتے ہوئے بولی۔

"میگورا کہاں رہتا ہے؟ کیا کہا تھا اس نے؟"

"وہ ایتھنز میں ہی ہے۔" وہ بولی۔ "اس نے زبانی تمہارا حلیہ بتایا تھا۔ نام کے بارے میں کہا گیا تھا کہ نام بدلتے رہتے ہو۔"

"سراغ مل جانے پر کیا کرنا تھا ۔۔۔؟"

"میں نے میگورا کو اطلاع دے دی ہے، وہ کل کسی وقت خود تمہیں دیکھے گا۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "مجھے یہ معلوم نہیں، کہ میگورا تم میں خود دلچسپی لے رہا ہے یا مادام کی ہدایت پر یہ احکام جاری کئے گئے ہیں ۔۔۔!"

"کیا وہ کسی اور کے لئے بھی کام کرتا ہے؟"

"وہ بہت لالچی اور خود غرض شخص ہے، مادام لواری کی آڑ میں بہتیرے نجی کام بھی کر گزرتا ہے!"

"میرے لئے میگورا کا نام اجنبی ہے۔ یہ ٹکراؤ براہ راست میرا اور مادام لواری کا ہے۔" میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا۔

"اب کل تم کیا کرو گی؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میں نے ہی سوال کیا۔

"جو تم کہو گے۔" وہ بولی۔ "اب تو میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں ۔۔۔"

"وہ اکیلا آئے گا یا دو چار آدمی ساتھ لگائے پھرتا ہے؟"

"امکان تو اکیلے کا ہی ہے لیکن وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اس نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی طرح اسے یہاں گھیر لاؤ۔" میں نے چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد کہا۔

"تم کیوں میری جان کے دشمن ہو رہے ہو؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"فکر نہ کرو، تمہیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔" راہ راست پر آجانے کے بعد میں اس کے لئے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

"اگر وہ بچ نکلا تو مجھ پر کتے چھڑوا دے گا۔ تم نہیں جانتے وہ لومڑی کی طرح مکار اور بھیڑیئے کی طرح بے رحم ہے۔"

"اگر تم نے پاپاگوس اور جیری کو اس معاملے میں ملوث نہ کیا ہوتا تو شاید اس کی نوبت نہ آتی۔ تم بآسانی بہانا کر سکتی تھیں کہ مشکوک شخص کہیں روپوش ہو گیا۔"

"یہ بہانا تو اب بھی کیا جا سکتا ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اب نہیں چلے گا۔"

"وہ عام طور پر نیچے والوں سے براہ راست رابطہ نہیں رکھتا" وہ بولی۔ "بس ایک ہی خطرہ ہے کہ وہ کوتاہیوں کو معاف نہیں کرتا اس کی واضح ہدایت ہے کہ مشکوک شخص کو ایک پل کے لئے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے!"

"جیری مجھ سے کیوں الجھا تھا ۔۔۔؟"

"وہ اب تمہیں بھول جائے گا۔" اس نے انگشت شہادت سے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ کسی دشمن کا ہوا کھڑا کر کے میں آسانی سے تمہارا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں گی"

"اور وہ دونوں اس پر راضی ہو گئے؟"

"پاپاگوس نے مخالفت کی تھی مگر بعد میں وہ بھی میرا ہمنوا ہو گیا ۔۔۔"

"اسے لو جیری کو ابھی فون کر دو کہیں وہ جوش میں کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔" میں نے کہا اور ہیلن نے بے چون و چرا۔ میری بات مان لی۔

جتنی دیر وہ فون پر ان دونوں سے بات کرتی رہی میں نے ہیلن کے دو پیگ اپنے معدے میں اتار لئے۔

ہیلن سے براہ راست اور دو ٹوک گفتگو میں مجھے زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اور جن واقعات نے تیزی کے ساتھ خطرناک روپ دھارا تھا۔ وہ حقیر بلبلوں کی طرح معدوم ہوتے نظر آ رہے تھے۔

اس سلسلے میں بس ایک ہی دشواری رہ گئی تھی۔ وہ یہ کہ مجھے اپنے تحفظ کے لئے میگورا کو خاموشی سے ٹھکانے لگانا تھا لیکن اس منصوبے کی کامیابی کا تمام تر انحصار ہیلن کے رویئے پر تھا۔

"تم اس گینڈے کو کب تک قید رکھو گے ۔۔۔؟" فون سے فارغ ہو کر ہیلن نے مجھ سے پوچھا۔

"اگر تم اس کے ہاتھوں مرنا چاہتی ہو تو اپنے نکلنے تک اسے قید رکھوں گا۔" میں نے لاپروائی سے شانے اچکا کر کہا۔

"مگر ابھی تو تم میرے تحفظ کی بات کر رہے تھے ۔۔۔؟"

"تمہارے تحفظ کے لئے اسے ختم کرنا ہو گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "کسی کو خبر تک نہ ہو سکے گی کہ قاتل کون تھا۔"

اس کا حسین چہرہ ایک مرتبہ پھر دھواں ہو گیا۔ "میں خون خرابے سے بہت ڈرتی ہوں۔ مجھے اس چکر میں نہ ڈالو۔"

"مجبوری ہے ڈارلنگ ۔۔۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ میرے پاس آنے سے پہلے کسی کو بتا کر آئے ایسی صورت میں اس کی لاش ملے گی تو اس کے آدمی ضرور مجھ پر دھاوا بول دیں گے۔"

اس کا خدشہ بجا تھا۔ میں نے کچھ دیر تک سوچا پھر کہا۔ "وہ تمہارے پاس آئے تو تم اسے ٹال دینا۔ میں اس کا پیچھا کروں گا۔ اس طرح تمہارا نام شبہ سے بالاتر ہو جائے گا مگر تم نے اسے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ میں عدنان کے ساتھ مقیم ہوں۔"

"بتاتی تو وہ چھوٹتے ہی یہ الزام دیتا کہ میں نے اپنی آستین میں سانپ پالا ہوا ہے، وہ فلسطینیوں کو ناپسند کرتا ہے۔"

"تم اس سے کیسے ٹکرا گئیں ۔۔۔؟"

"بدنصیبی ہی کہہ لو۔" وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔ "میرا شوہر قتل کیا گیا تھا وہ بھی برا آدمی تھا میں اس کے قاتلوں کی تلاش کے چکر میں میگورا تک پہنچی تھی۔ اس نے دلاسہ دے کر مجھ سے چند غلط کام کرائے۔ کچھ عرصہ بعد میں منشیات کی باقاعدہ تجارت میں ملوث ہو چکی تھی اور اس مقصد کے حصول کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ جس کے لئے میں میگورا کے پاس پہنچی تھی!"

"تو کیا مادام لواری صرف منشیات کی تجارت ہی چلاتی ہے؟"

"میں اس کی جانب سے ایتھنز کی لوکل آپریٹر ہوں اور آج تک میں نے منشیات کی خرید و فروخت کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا۔"

"پیشہ ورانہ رقابتیں ۔۔۔؟"

"متعلقہ لوگ جانتے ہیں کہ میں کس کے لئے کام کرتی ہوں، یہاں کوئی بھی مادام لواری سے ٹکرانا پسند نہیں کرتا۔" اس نے کہا۔ "کچھ عرصہ پیشتر ایک شخص نے مارفیا سستے داموں پر بازار میں پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے میگورا کو اطلاع دے دی اور اگلے ہی دن اس کی کار ایک ٹریلر سے ٹکرا کر ایسی پاش پاش ہوئی کہ وہ نہ بچ سکا۔"

"شاید یہاں ٹریفک کے قوانین بہت نرم ہیں۔"

"قوانین تو خاصے سخت ہیں، بعد میں سنا گیا کہ کیمیکل ایگزامنر نے متوفی کے معدے سے برآمد ہونے والی اشیاء کا تجزیہ کر کے رپورٹ دی تھی کہ مرنے والا ضرورت سے زیادہ شراب پی کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اور ٹریلر کا ڈرائیور بری ہو گیا۔"

"پھر تو میگورا سے تصادم دلچسپ رہے گا۔"

"کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "ابھی فون کر کے میں نے تمہیں ایک ناگہانی پریشانی سے بچایا ہے۔"

"جیری کا کوئی منصوبہ تھا ۔۔۔؟"

میری قیاس آرائی پر وہ ششدر رہ گئی۔ "تمہارے اندازے حیران کن ہوتے ہیں وہ واقعی آج رات ایک مصنوعی قاتلانہ حملے کی تیاری کر چکا تھا۔"

"میگورا نے مجھے مارنے کا حکم کیوں نہ دے ڈالا؟"

"یہ تو تم ہی بتا سکو گے۔" اس نے کہا۔ "ہمیں صرف نگرانی کی ہدایت کی گئی تھی مار دھاڑ کا چکر ہوتا تو شاید بات مجھ تک نہ آتی ۔۔۔"

"وہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ اس معاملے میں تم اناڑی ہو!"

"منشیات کی بات دوسری ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "نارکوٹک کنٹرول کے سخت قوانین کے ہوتے ہوئے بھی حکام عملاً آنکھیں بند رکھتے ہیں کیونکہ یونان کو سیاحت سے زبردست آمدنی ہوتی ہے ان سیاحوں میں منشیات کے متلاشی یورپی باشندوں کی بھی بڑی تعداد ہوتی ہے سختی کے نتیجے میں سیاحوں کی تعداد میں کمی ہو سکتی ہے۔"

"اور اگر عورت سامنے ہو تو قانون خود ہی نرم پڑ جاتا ہے۔"

"مجھے قانون سے زیادہ میگورا کا خوف لاحق رہتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے!"

"مجھے امید ہے کہ میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ تم اپنی ذات تک ہی محدود رکھو گے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو، یہاں میرا کوئی دوست نہیں ہے!"
"عدنان کو بھی ان باتوں کا علم نہ ہونا چاہیئے۔"
اس کے بعد بھی وہ خاصی دیر تک بے تکلفانہ ماحول میں میرے پاس رکی رہی اس دوران ... اس نے میرے بارے میں کرید کرید کر بہت سے سوالات کئے۔ جن میں سیتا کا ذکر بھی تھا میں نے اسے سیتا کے نام کے علاوہ ہر بات بتادی کیونکہ قریب سے وہ نہایت قابلِ اعتماد نظر آرہی تھی!
میرا اصل نام سن کر اس نے کسی خاص ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور میرے لئے یہ بات بہتر ہی تھی۔
میگورا ایتھنز کے جرائم پیشہ لوگوں میں بڑا آدمی تصور کیا جاتا تھا اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے ہر چیز کو داؤ پر لگا دینے کا عادی تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ شاید یا مادام لواری اپنے ایک آدمی کی نمک حرامی کو کیسے برداشت کرتی تھی۔
ہیلن سے اس کا جواز بھی مل گیا۔ میگورا مادام لواری کی آڑ میں جو ذاتی کام کرتا تھا ان سے مقامی کارندے تو واقف ہوتے تھے مگر وہ اطلاعات باہر نکلنی محال تھیں کیونکہ میگورا نے اپنی تنظیم بہت سخت رکھی ہوئی تھی۔
یونان سے باہر کے تمام روابط قائم رکھنے کی ذمہ داری اس نے اپنے کاندھوں پر لی ہوئی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ اگر گروہ کے کاموں کے سلسلے میں باہر سے مادام لواری کا کوئی ہرکارہ آتا تھا تو اس کی دیکھ بھال میگورا خود کرتا تھا اور اسے اپنے آدمیوں سے بالکل الگ رکھتا تھا۔ ہیلن کے بیان کے مطابق ایک دو بار باہر سے آنے والوں کو کچھ آدمیوں کی ضرورت پیش آئی تو میگورا نے اپنے باقاعدہ اراکین کے بجائے باہر سے کرائے کے آدمی فراہم کردیئے۔
ہیلن نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ ڈیسکا رڈو ہی چلوں اور واپسی میں عدنان کے ساتھ آجاؤں مگر میں نے یہ پیشکش خوبصورتی سے رد کردی۔ اس مرحلے پر میرا اور ہیلن کا ساتھ دیکھا جانا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔
ہیلن کے چلے جانے کے بعد میں بھی مکان مقفل کرکے باہر نکل گیا۔
باہر ایتھنز کی رات کی رعنائیاں شباب پر تھیں۔ سب سے پہلے میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کھانا کھایا پھر چہل قدمی کرتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔
ایتھنز کا موسم سرد ضرور تھا مگر وہ سردی ناقابلِ برداشت نہیں تھی دوسری اہم بات یہ تھی کہ فضا میں دھند نہ ہونے کی وجہ سے کھلی فضا میں گھومنے سے الجھن نہیں ہو رہی تھی۔
گھومتے ہوئے میں شہر کے ایک ایسے علاقے میں جانکلا جہاں درمیانے درجے کے اقامتی ہوٹلوں کے درمیان سے ایک کشادہ گلی دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ گو اس گلی میں روشنی ناکافی تھی مگر وہاں خاصی بھیڑ نظر آرہی تھی۔
گلی میں دکانوں وغیرہ کی غیر موجودگی میں وہ بھیڑ ناقابلِ فہم تھی مگر ایک ہی ثانیے میں بھیڑ کا سبب بھی واضح ہوگیا۔
وہاں کی فضا نسبتاً خاصی کثیف تھی اور اس میں چرس کی ہلکی سی بُو بھی دُور سے ہی محسوس کی جاسکتی تھی۔
اس گلی میں لوگوں کے سست رو ہجوم میں سے گزرتے ہوئے انکشاف ہوا کہ وہاں طوائفوں کی بھاری تعداد موجود تھی اور دھندلکے میں خریدار اپنی اپنی پسند کا مول چکانے میں مصروف تھے ان ہی کے درمیان میں ایسے لوگوں کی موجودگی بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔ جو گھوم پھر کر جیبوں میں موجود منشیات فروخت کر رہے تھے۔
ایک سائبان کے نیچے مجھے دو وردیاں نظر آئیں۔ میں ان کے قریب سے گزرا تو وہ دونوں سپاہی دیوار سے ٹیک لگائے نہایت انہماک سے چرس کو دھوئیں میں تحلیل کرنے میں مصروف تھے مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر ایک سپاہی نے مسکرا کر خوابناک انداز میں مجھے آنکھ ماری اور دوبارہ کاہلوں کے سے انداز میں عالمِ سرور میں کھو گیا۔
"پی شور!" چند قدم آگے اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔
اس کے گرد دو تین آدمی رکے ہوئے تھے اور وہ اپنی ہتھیلی پر پولی تھین کی چھوٹی تھیلیوں میں تار سیل کی ہوئی چاکلیٹ جیسی چند ٹکیاں لئے کھڑا تھا۔
بیچنے والا لمبی ستواں ناک اور گندمی رنگت والا کرد لگتا تھا جو اپنے خریداروں کو بگڑی ہوئی انگریزی میں یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے پاس پشاور کی بہترین چرس موجود ہے۔
چند سیکنڈ میں وہ شخص کئی ٹکیاں فروخت کرکے آگے بڑھ چکا تھا۔
میں نے لپک کر اسے روک لیا۔
"پشاور کی بہترین چرس!" وہ پلٹ کر رٹے رٹائے انداز میں بولا اور اپنی ہتھیلی کھول کر میرے سامنے کردی اس کی انگریزی ناقص تھی لہجہ اس سے بھی زیادہ ناقص تھا۔
"پشاور...؟" میں نے ٹکیہ اس کی ہتھیلی سے اٹھا کر اس سے سوال کیا۔ "یہ کیا بلا ہے...؟" میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ پشاور کے بارے میں کچھ جانتا بھی تھا یا محض ایک رٹا ہوا نام دہرا رہا تھا۔
"چرس پیتے ہو اور پشاور نہیں جانتے!" اس نے طنزیہ

لہجے میں کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے چرس کی ٹکیہ واپس لینے کی کوشش کی شاید اسے کسی بدذوق سے سودا کرنا گوارا نہ تھا۔
"تم بتادو" میں نے اس کا ہاتھ واپس دھکیلتے ہوئے کہا۔ "ویسے مال اچھا معلوم ہوتا ہے۔"
"خیبر کا مال بہترین ہوتا ہے، اصلی سبز چرس ہے" میرے جملے نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا۔ "پاکستانی مال نمبر ایک ہوتا ہے پھر کابل کی باری آتی ہے، کتنی چاہیئے؟"
دام پوچھے تو میرے ہوش اڑ گئے وہ چھوٹی سی ٹکیہ جس سے بمشکل دس سگریٹیں تیار ہوسکتی تھیں آٹھ سو روپے کے مساوی رقم میں فروخت ہورہی تھی۔
"بہت مہنگی ہے!" میں نے ٹکیہ اسے لوٹا دی۔
"کیا دوگے؟" اس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔
میں سنی ان سنی کرکے آگے بڑھ گیا۔
اس نے مجھ پر اپنی زبان میں شاید کوئی فقرہ چست کیا مگر میں مڑ کر دیکھے بغیر آگے ہی نکلتا چلا گیا۔
وہ جگہ اپنے دقیانوسی ماحول کے باوجود نہایت پرکشش تھی وہاں تلاش سیاحوں کی ٹکڑیاں بھی مول تول کے بہانے ایسی ایسی دوشیزاؤں سے چھیڑ چھاڑ کرکے مفت دل بہلا رہے تھے جو اس ماحول سے باہر ہوتیں تو بڑے بڑے پارسا اپنا دل دست بستہ ان کے قدموں پہ نچھاور کردیتے۔
ایسی چھیڑ چھاڑ وہاں معیوب بھی نہیں تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کرچۂ خرابات میں ہیجان اور جوش و خروش تو ہر جگہ نمایاں تھا مگر فساد یا ہنگامے کے آثار کہیں بھی نہیں تھے۔
میں واپس لوٹا تو تھکان سے میرا بدن دکھ رہا تھا اور عدنان فاخری بے چینی کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔
"کہاں غائب تھے؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کر ڈالا۔
"منڈی میں جانکلا تھا۔" میں نے بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے ہنس کر کہا۔
"تو کیا ہیلن شیشے میں نہیں اتری؟"
"وہ قابلِ احترام عورت ہے۔ خوش اخلاق ضرور ہے مگر بدکردار نہیں ہے۔" میں نے ہیلن کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔
"تمہاری باتوں سے عاشقی کی بُو آرہی ہے۔"
"تم نکمے مرد ہو، میں عاشقی کی منزل سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔"
"اس نے شاید کافی وقت گزارا ہے تمہارے ساتھ یا کہیں اور ملی تھی...؟" اس نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔
"نہیں تھی اور اس نے ہر بات سچ سچ بتادی ہے۔"
"واقعی؟" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔
میں نے اسے مختصراً اپنی اور ہیلن کی گفتگو کی تفصیل سنائی۔
"میں نے کہا تھا نا کہ تمہاری ذات میں لڑکیوں کے لئے عجیب سی کشش ہے!" وہ وفورِ مسرت سے بے قابو ہوکر وہسکی کے گلاس بنانے لگا۔
"بنیادی طور پر وہ نیک نفس عورت ہے!"
"اتنا نہ چڑھاؤ کہ میں اسے کچھ اور ہی سمجھنے لگوں!" یہ کہتے ہوئے اس نے گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ پیو، تمہاری کامیابی کی خوشی کا جام۔"
"میگورا کو صاف کئے بغیر کامیابی ادھوری رہے گی۔" میں نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
"اگر اس کے ستارے گردش میں نہ ہوئے تو اس پر ہاتھ ڈالنے میں دانتوں پسینے آجائیں گے!"
"یہ سب مجھ پر چھوڑ دو اور میرے لئے ایک کار کا بندوبست کردو!"
"میری کار رکھ لینا، ہوٹل میں بیکار ہی کھڑی رہتی ہے!"
"وہ پہچانی جاسکتی ہے!"
"یہ خطرہ تو کرائے کی کاریں بھی ہوگا۔"
"وہ چلے گی۔" میں نے کہا۔ "دراصل میں نہیں چاہتا کہ میگورا عقب نما آئینے میں دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ کوئی جانی پہچانی کار اس کا پیچھا کر رہی ہے!"
"تمہارا منصوبہ کیا ہے؟"
"اسے تنہائی میں گھیر کر ہلاک کرنا ہوگا۔"
"اور تم یہ کام اکیلے سرانجام دوگے؟"
"کسی اور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔"
"وہ کسی گینڈے سے زیادہ شہ زور ہے۔ اگر تم ذرا بھی چوک گئے تو وہ تمہیں دوبارہ سنبھلنے کی مہلت نہیں دے گا۔"
"ہتھیار کے سامنے طاقت بے معنی چیز ہے!"
"میں چوک کی بات کر رہا تھا، اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"ہیلن نہیں چاہتی کہ اس کا معاملہ تمہارے علم میں آئے۔ اگر کل تم نے ہوٹل سے چھٹی کی اور کل ہی ہمیں کامیابی ہوگئی تو ہیلن سمجھ لے گی کہ میں نے اس معاملے میں تمہیں اعتماد میں لیا ہے میں اس کا پندار مجروح کرنا نہیں چاہتا۔"
"کل اتوار ہے اور اتوار کو مجھے صبح دو گھنٹے ڈیوٹی دینی ہوتی ہے۔ ہیلن کو معلوم بھی نہ ہوسکے گا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"
"پھر کوئی حرج نہیں ہے ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں اور پھر ایتھنز میرے لئے ویسے بھی اجنبی جگہ ہے۔" میں نے کہا۔

"ایتھنز بہت عزیب پرور شہر ہے، اجنبیوں کو بھی اپنی مہربان آغوش میں سمیٹ لیتا ہے۔" اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"شہر کی بات کر رہے ہو یا شہر والیوں کی؟"

"دونوں کی ہی سمجھ لو۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔ "اب ہیلن ہی کو دیکھ لو، چلی تھی تم سے دشمنی کرنے مگر ایسی دوستی ہوئی کہ تم اسی کے گن گا رہے ہو۔"

"یعنی یہاں کے لوگ دشمنی کرنے کے معاملے میں اناڑی ہیں؟"

"میگورا سے ملاقات کے بعد تمہاری رائے پوچھوں گا۔"

"یہاں گائیڈ بکثرت پائے جاتے ہیں۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "بعض اوقات تو لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

"لوگ شوقیہ اس کام میں دلچسپی لیتے ہیں پیشہ ور گائیڈ تو گنے چنے ہی ملیں گے۔" اس نے بتایا۔ "اکثر نوعمر لڑکے گھر سے سودا لینے نکلتے ہیں لیکن کوئی فیاض سیاح ٹکرا جائے تو سودا بھول کر اس کی رہبری کرنے لگتے ہیں اور شام کو خاصی رقم ان کی جیب میں آ جاتی ہے جہاں بھی غربت ہوگی وہاں یہی ماحول ملے گا۔"

"تم یہاں کب سے ہو؟"

"نو سال ہو گئے۔" اس نے کہا۔ "پہلے میں بے تحاشا ہر لڑکی کے پیچھے بھاگتا تھا مگر اب دو چار پر ہی قناعت کرتا ہوں، اس اعتبار سے بھی یہاں کی فضا رنگین ہے!"

"مگر اوناسس کو یہاں کوئی لڑکی نہ مل سکی۔"

"اس ارب پتی بوڑھے کے ذاتی جہاز پر ہونے والی دعوتیں عالمی شہرت رکھتی ہیں اس نے شاید ذاتی افتخار کے لئے کینیڈی کی بیوہ کو منتخب کیا ہے ورنہ یونان میں جیکولین سے زیادہ حسین اور باذوق لڑکیاں اس سے شادی کی متمنی تھیں۔"

"بڑھاپے میں خود نمائی کا جذبہ کچھ شدت سے ہی ابھرتا ہے!"

"بڑھاپے میں ابھرتا تو کچھ بھی نہیں بس اظہار ہی ہوتا رہتا ہے۔"

باتیں کرتے کرتے ہم دونوں نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

اگلی صبح عدنان فاخوری آٹھ بجے ہوٹل چلا گیا اور میں فون پر ہیلن ونسس سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" مجھے پہچانتے ہی ہیلن نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"اپنے ٹھکانے پر ہوں، کیا بات ہے؟"

"رات کو تمہاری جیری سے مڈبھیڑ تو نہیں ہوئی تھی؟"

"نہیں، کیا ہو گیا؟"

"پچھلی رات کسی رہزن نے اسے بہت بری طرح مارا ہے اور پھر اسے لوٹ لیا، وہ ہسپتال میں ابھی تک بے ہوش پڑا ہے۔"

"اس معاملے میں تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا؟"

"پاپا گوس تم پر شبہ کر رہا ہے۔"

"اس کے دماغ میں فتور آ گیا ہے، جیری ہوش میں آ کر خود ہی میری پوزیشن صاف کر دے گا۔"

"دراصل اس کی حالت نازک ہے۔" وہ بولی۔ "اسے آکسیجن ٹینٹ میں رکھا گیا ہے اور اگر وہ چار گھنٹے میں ہوش میں نہ آ سکا تو... ڈاکٹروں کے مطابق اس کے زندہ بچنے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔"

"میرے ہاتھ صاف ہیں، تم یہ بتاؤ کہ وہ کب آ رہا ہے؟"

"جیری کی خیریت لینے کے لئے میں نے اسے فون کیا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں دریافت کر رہا تھا میں نے اس سے کہہ دیا کہ تم اچانک روپوش ہو گئے ہو۔"

"بہت جھنجلایا ہوگا۔۔؟"

"اس بارے میں زیادہ بات نہیں کی اس نے!"

"کہیں جیری ہوش میں آ کر اسے نہ بتا دے کہ میں عدنان کے ساتھ مقیم ہوں۔" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"مشکل ہے، میں نے بتایا نا کہ ڈینیچے والوں سے رابطہ رکھنا پسند نہیں کرتا، اس نے کسی شخص کو جیری کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا ہے۔"

"یعنی اب مجھے خود ہی انتظار کرنا ہوگی۔"

"یہ تم پر منحصر ہے!"

میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میگورا کے سلسلے میں ایک نیا خیال بھی مجھے پریشان کرنے لگا تھا۔ یہ درست تھا کہ اس نے ہیلن ونسس سے میرے بارے میں اطلاع پانے کے بعد اس نے شبہات کی تصدیق نہیں کی تھی مگر یہ خیال پھر بھی باقی تھا کہ کہیں اس نے وہی ادھوری اطلاع مادام لواری کو نہ بڑھا دی ہو۔ اگر ایسا تھا تو شاید وہ کسی بھی وقت ایتھنز پہنچ سکتی تھی اور اس کے آنے کے بعد میری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

اسی سوچ بچار میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا اور عدنان فاخوری ڈیسکارڈ سے واپس آ پہنچا۔

"میں کار ساتھ ہی لیتا آیا ہوں۔" اس نے آتے ہی کہا۔

"پھر نکلنا چاہئے۔" میں فوراً ہی اٹھ گیا۔

باہر سیاہ رنگ کی ایک پولش کار موجود تھی۔ عدنان نے اپنی کار ایک سروس اسٹیشن پر چھوڑ دی تھی۔

راستے میں میں نے اس سے تبادلۂ خیال کیا تو اس نے بتایا کہ میگورا کا سراغ لگانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا مگر اس بارے میں وہ وثوق سے کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ میگورا نے مادام لواری کو مکمل اطلاع بھیجی ہوگی یا نہیں۔

"اگر میں فوری طور پر یونان چھوڑنا چاہوں تو کیا صورت ہوگی۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں۔۔؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"یہاں مجھے صرف انتظار ہی کرنا تھا اور میں اپنا وقت کسی جھگڑے میں الجھے بغیر سکون سے گزارنا چاہتا تھا، ایسا نہ ہو کہ میگورا کا چکر طول پکڑ جائے!"

"اگر تم مادام لواری کی آمد کے خیال سے ایسا سوچ رہے ہو تو اس کا کم ہی امکان ہے میگورا ادھوری اطلاع بڑھا کر مضحکہ اڑوانے والوں میں سے نہیں ہے!"

"مگر میں اپنی نکاسی کے امکان پر بھی نظر رکھنی چاہتا ہوں!"

"یہاں سے نکلنا بہت آسان ہے۔ فوراً جانا چاہو تو کسی بھی بحری جہاز کے عملے میں شامل ہو کر نکل سکتے ہو!"

"قرب و جوار میں بہت سے جزائر بھی تو بکھرے ہوئے ہیں!"

"ان میں بہت سے آباد ہیں۔ دو تین پر محض تفریحی انتظامات ہیں وہ ان دنوں عملاً ویران پڑے ہوں گے۔ وہاں موسم گرما کے اوائل میں رونق شروع ہوتی ہے!"

"اگر آج ہم میگورا کو تلاش نہ کر سکے تو میں ان جزائر میں سے کسی کا رخ کرنے کو ترجیح دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اس معاملے میں ہیلن تمہاری مدد کر سکتی ہے۔ کیوس نامی جزیرے پر اس کے کئی ہٹ بھی موجود ہیں!"

"اگر جانا پڑا تو میں اس سے ضرور بات کروں گا۔"

میگورا کی تلاش کے سلسلے میں عدنان سب سے پہلے ایتھنز کے ایک بڑے نائٹ کلب میں پہنچا جو اس وقت ویران پڑا ہوا تھا۔

نائٹ کلب میں اسے مطلوبہ شخص مل گیا اسے گہری نیند سے بیدار کرنا پڑا تھا۔ وہ عدنان سے بہت احترام سے پیش آیا۔

عدنان مقامی زبان میں کچھ دیر تک اس سے بات کرتا رہا پھر واپس ہو لیا۔

"اس کا بھائی میگورا کا خدمت گار ہے۔" باہر آ کر عدنان نے مجھے بتایا۔ "یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل میگورا اپنا زیادہ وقت اصطبل میں گزارتا ہے۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "اصطبل میں کیا کرتا ہوگا۔"

"اسے جنون کی حد تک گھوڑے پالنے کا شوق ہے اور یورپ کی ہر بڑی ریس میں اس کے گھوڑے دوڑتے ہیں۔"

"بڑا صبر آزما شوق ہے!"

"پچھلے چند دنوں میں یکے بعد دیگرے اس کے دو گھوڑے مر چکے ہیں۔ میگورا سمجھ رہا ہے کہ یہ کارروائی اس کے کسی دشمن نے کی ہے اسی وجہ سے وہ زیادہ وقت وہاں گزار رہا ہے۔"

"گھوڑوں کے پوسٹ مارٹم کا رواج نہیں ہے؟"

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ "اس نے کوئی کسر تو نہ چھوڑی ہوگی!"

"اصطبل جانا تو خطرناک ہوگا، کیوں نہ اسے دھوکا دے کر کہیں بلایا جائے!"

"وہ اکیلا ہی دوڑا آئے تو مزا آ جائے۔"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے!"

اس فیصلے کے بعد کار دوبارہ گھر کی طرف دوڑنے لگی۔

میگورا نے اپنے دھندوں کی آڑ کے لئے میگورا ملٹی ٹریڈرز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہوا تھا۔ عدنان نے ٹیلی فون ڈائرکٹری میں دیکھ کر اس ادارے کے ایک نمبر کا انتخاب کیا اور میرے حوالے کر دیا۔

پہلے نمبر پر جس شخص سے میری بات ہوئی اس نے میگورا کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی مگر جب میں نے اسے بتایا کہ معاملہ بہت اہم ہے تو اس نے مجھے ایک فون نمبر لکھوا دیا۔ جہاں میگورا کے موجود ہونے کے امکانات تھے۔

"ایک دفعہ پھر سوچ لو کہ تم اس سے کیا کہو گے؟" دوسرا نمبر ڈائل کرنے سے پہلے عدنان نے اضطراری انداز میں کہا۔

"کام کی بات سب سے آخر میں بتائی ہے تم نے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب اس سے گھوڑوں کے ہی بارے میں بات ہوگی۔"

"گھوڑوں کی پیشکش کرو گے؟"

"اس کے دو گھوڑوں کی پراسرار موت کے بارے میں اسے اہم انکشافات سے باخبر کروں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بہت مناسب خیال ہے!" اس نے میری تائید کی۔

میں نے نمبر ڈائل کئے تو ایک برہم سی غراہٹ کانوں میں سنائی دی۔

"میں مسٹر میگورا سے بات کرنی چاہتا ہوں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"بول رہا ہوں۔" وہی خونخوار غراہٹ سنائی دی۔

"میں تم سے ایک اہم سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہاری کال کا منتظر تھا۔" ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ معتدل لہجے میں بات کرنی ہی نہ جانتا ہو۔ "میرا آدمی مجھے بتا چکا ہے کہ کوئی میری تلاش میں تھا۔"

"تم مجھ سے کہیں مل سکتے ہو؟"

"معاملہ کیا ہے؟"

"شاید پچھلے چند دنوں میں تمہارے دو گھوڑے مر چکے ہیں؟"

"شاید کیا، یہ تو پوری دنیا جانتی ہے۔"

"مگر یہ تمہیں بھی معلوم نہ ہوگا کہ تیسرے کی بھی جلد ہی باری آنے والی ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں جہنم واصل کردوں گا، میں دیکھتا ہوں کہ اب کون ایسی حرکت کرسکتا ہے؟" وہ بُری طرح برس پڑا۔

"میں تمہاری کامیابی کے لئے دعاگو رہوں گا۔ خدا حافظ۔"

"سنو!" وہ جلدی سے بولا۔ "اس بارے میں تم کیا۔۔۔ جانتے ہو۔۔۔؟"

"بہت کچھ۔" میں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ "ان معلومات کے عوض میں دس ہزار ڈالر چاہتا ہوں جو تمہارے لئے قلیل رقم ہے۔"

"یہ بہت زیادہ ہے۔" اس کے لہجے میں پہلی بار نرمی کا مبہم سا احساس ہوا۔ "اگر تمہاری اطلاعات اس قابل ہوئیں تو صرف پانچ ہزار ڈالر دے سکوں گا۔"

"تمہارا ایک ایک گھوڑا ہزاروں ڈالر کی مالیت کا ہے۔"

"فکر نہ کرو، وہ سب بیمہ شدہ ہیں، مجھے مالی نقصان کا کوئی خطرہ نہیں۔ بات صرف ساکھ کی ہے اور اسی لئے میں نے اتنا آفر دیا ہے۔"

"تمہیں بیمے کا ایک دھیلا بھی نہ مل سکے گا۔ ایسے حالات پیدا کئے جارہے ہیں کہ انشورنس والے مردہ گھوڑوں کا طبی معائنہ کرائیں اور یہ ثابت ہو جائے کہ گھوڑوں کو خوراک میں کچھ ملا کر محض اس لئے ہلاک کیا گیا ہے کہ ان کے نکما ہونے سے پہلے بیمے کی خطیر رقم وصول کی جاسکے۔"

"میں تم سے ابھی مل رہا ہوں۔" وہ بے چین آواز میں غرایا۔ "ان حرام زادوں کی بھنک بھی مل جائے تو میں ان کے چیتھڑے اڑوا دوں گا۔" میرا اندھیرے میں برجستہ طور پر چلایا ہوا تیر نازک نشانے پر بالکل ٹھیک بیٹھا تھا۔

"میں رقم میں کمی قبول نہ کرسکوں گا۔"

"وہ میں مل کر طے کرلوں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تمہیں اس سودے پر افسوس کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔"

"میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں مسٹر میگورا!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم میری پیشانی میں ایک گولی اتار کر بھی اپنے الفاظ پورے کر سکتے ہو کیونکہ افسوس اور مسرت صرف زندہ انسانوں کے روگ ہیں!"

"میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا!" وہ شاید دانت پیس کر غرایا تھا۔

"پھر میں الحیدرہ کے قریب تمہارا انتظار کررہا ہوں!"

"میں تمہیں کیسے پہچانوں گا؟" اس کی غراہٹ میں تیز اشتعال آمیز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

"میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ قریب آکر تمہیں سُرخ سلام کے الفاظ سے متوجہ کردوں گا!" میں نے کہا۔

"میرے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش تمہیں مہنگی پڑے گی!" اس نے زور دیکر کہا۔ "یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینا!"

"میں اس کے نتائج سے واقف ہوں۔"

"میں سوا گیارہ بجے سُرخ کار میں وہاں پہنچوں گا!" میگورا نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔

"تم نے بڑے اعتماد سے بات کی ہے!" عدنان نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "محض اس کی آواز سن کر ہی بہتیرے لوگوں کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بولنے سے زیادہ وہ کسی بھیڑیئے کی طرح غراتا ہے!"

الحیدرہ کا مشورہ عدنان کا ہی تھا۔ وہ شہر کا ایک مشہور مقام تھا جہاں دن میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی۔ سڑک بھی نہایت کشادہ تھی جو کسی ہنگامے یا خطرے کی صورت میں فرار میں بہترین معاون تھی۔ عدنان کے پاس اسلحے کی صورت میں جو کچھ بھی موجود تھا، وہ گاڑی میں ڈال لیا گیا۔ اس سامان میں تین دستی بم بھی تھے جو دوہری خصوصیت کے حامل تھے۔ ان سے عام بارودی نقصانات کے علاوہ۔۔۔ بے ہوش کردینے والی گیس بھی خارج ہوتی تھی۔ کمی اگر تھی تو کسی ایسے پستول کی جس کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا ہو۔

گیارہ بجے ہم دونوں الحیدرہ پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں پارکنگ لین میں دو گاڑیوں میں جوان سال جوڑے بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے، ساتھ ہی کسی مشروب سے بھی شغل کرتے جارہے تھے۔

اس وقت عدنان نے شناخت کے خطرے سے بچنے کیلئے سر پر بڑے بالوں کی وگ لگا کر ملاحوں جیسی ٹوپی اوڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں پر بھی رنگین شیشوں والی سیاہ عینک لگائی ہوئی تھی جب کہ میں نے اپنے دائیں ابرو پر سیاہ رنگ سے بڑے سے قطر کا ایک نمایاں نشان بنالیا تھا جو بادی النظر میں سیاہ مسّہ معلوم ہو رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے کوئی بھی مجھے صفدر علی کے طور پر نہ پہچان سکے گا!

اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے اس وقت ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ پارکنگ لین کے قریب ایک زیر تعمیر عمارت میں بھی کام بند تھا۔ مجھے ہر اعتبار سے وہ عمارت ہی بہترین کمین گاہ نظر آئی اور میں کار سے اتر کر ٹہلتا ہوا اس میں جا گھسا۔ میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ ایسا کرتے ہوئے میں کسی کی نگاہوں میں نہ آسکوں۔

عدنان فاخوری اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تنہا کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ میرے اوورکوٹ کی جیبوں میں دو دستی بم اور اعشاریہ تین آٹھ کے بور کا بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔

میں نے زیر تعمیر عمارت کا محتاط جائزہ لیا تو ادھورے ڈھانچے

کے اندرونی حصے میں ایک کمرہ آباد نظر آیا۔ اور جلد ہی یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ یہاں عمارت کے دو چوکیدار موجود تھے۔ ان کے اطوار سے پتہ چلتا تھا کہ وہ فی الحال کچھ دیر تک باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں ایک دیوار کی اوٹ میں جا بیٹھا جو پارکنگ لین سے بمشکل پندرہ فٹ دُور تھی۔ مورچہ سنبھالنے کے بعد میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی جو گیارہ بجکر آٹھ منٹ کا وقت بتارہی تھی۔

میں اپنی کمین گاہ سے عدنان کو بخوبی دیکھ رہا تھا۔ وہ کھلی ہوئی کتاب پر کچھ اس زاویئے سے بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں زیر تعمیر عمارت پر مرکوز تھیں مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ٹھیک سوا گیارہ بجے پارکنگ لین کے آخری سرے سے سُرخ رنگ کی بڑی سی کار تیز رفتاری کیساتھ اندر داخل ہوئی، پھر اس کی رفتار سست ہوگئی۔

میرا دل یک بیک تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر کسی قوی الجثہ شخص کا ہیولا صاف نظر آرہا تھا جس کا مطلب تھا کہ میگورا وہاں تنہا ہی آیا تھا۔

میں نے وزنی ریوالور جیب سے نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹادیا۔ رینگتی ہوئی کار کے رُخ سے پہلے یہ گمان ہوا کہ وہ شاید عدنان کی کار کے پیچھے رکے گی۔ اگر ایسا ہوجاتا تو مجھے بہترین نشانہ لگانے کا موقع میسر آجاتا مگر عین وقت پر سُرخ کار قدرے لہرائی اور عدنان کی کار سے آگے نکل کر کنارے سے رک گئی۔

مجھے فوری طور پر اپنی جگہ بدلنی پڑ گئی۔ میگورا کی پشت میرے نشانے پر تھی اور فاصلے میں بھی خاصا اضافہ ہوچکا تھا۔ جگہ بدلنے کے بعد میں نے عدنان پر نگاہ ڈالنی چاہی مگر ستون اور دیوار کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔ میں نے پھرتی سے اپنا ہاتھ سیدھا کرکے نشست باندھی اور یکے بعد دیگرے دو فائر کر ڈالے۔

گولیاں کہاں لگیں، یہ میں نہ دیکھ سکا۔ البتہ ملبے کی اوٹ میں دبکتے ہوئے میں نے سُرخ کار کو اچھل کر تیزی سے آگے بڑھتے ضرور دیکھا۔ پختہ سڑک پر سُرخ کار کے ٹائروں کی چیخوں سے ظاہر تھا کہ میگورا نے کار کو نہایت برق رفتاری سے آگے دوڑایا تھا۔ اسی اثناء میں مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ بھاگنے والے زور زور سے کچھ کہتے بھی جارہے تھے!

پھر اس زیر تعمیر عمارت کے اندرونی حصے سے بھی قدموں کی دھمک ابھرنے لگی اور آناً فاناً میں دونوں چوکیدار دوڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔

فائروں کے ہولناک دھماکوں سے شاید ہر ایک کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ اندر سے جانے والے بھی اتنے بوکھلائے ہوئے تھے کہ انہوں نے ملبے کی اوٹ میں دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ شاید ان کے ذہنوں پر یہی ایک خیال طاری تھا کہ باہر کوئی خون ہوگیا تھا جس کا ان سے یا ان کی عمارت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

چوکیداروں کے دُور نکل جانے کا یقین ہونے کے بعد میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور دھڑکتے دل کے ساتھ دوبارہ اسی جگہ جا پہنچا جہاں سے کم و بیش پوری پارکنگ لین کا محفوظ جائزہ لیا جاسکتا تھا!

پارکنگ لین ویران پڑی ہوئی تھی۔ شاید عدنان بھی اجتماعی ردّعمل کا ساتھ دینے کے خیال سے اپنی کار نکال لے گیا تھا مگر وہاں موجود افراد کی بوکھلائی ہوئی بھیڑ میں وہ دُور ہی سے نمایاں نظر آرہا تھا اور شاید انہیں کچھ بتلانے کی یا ان سے پوچھنے کی کوشش کررہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے عدنان کی کار بھی نظر آگئی جسے اس نے پارکنگ لین سے باہر نکال کر سڑک کے کنارے لگا دیا تھا!



اگر وہاں کافی بھیڑ بھاڑ ہوتی تو میرا باہر نکلنا سہل ہوتا مگر اس وقت زیرِ تعمیر عمارت سے باہر جانے کا مطلب خود کو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانا ہوتا۔ دوئم یہ کہ میرے لباس پر بارود کے ذرات موجود ہوتے اور کوئی بھی تجربہ کار شخص ریوالور کی نال میں اور میرے لباس میں رچی ہوئی بارود کی تازہ بُو کے سہارے بآسانی یہ کہہ سکتا تھا کہ فائر کرنے والا اس کے آس پاس ہی موجود ہے!

میں لپک کر عمارت کے اندرونی حصّے کی طرف ہو لیا۔ چھت پر جانے والی سیڑھیاں چوکیدار کے کمرے سے دُور تھیں اور اس وقت وہ موجود بھی نہیں تھے۔ لہٰذا میں سیڑھیاں عبور کر کے اوپر جا پہنچا۔ اوپری منزل پر بھی تعمیر کے آثار تھے مگر اس وقت میں عمارت سے زیادہ اپنی نکاسی کے بارے میں پریشان تھا!

میگورا پر حملے کا منصوبہ بناتے ہوئے میں اس امکان کو بالکل نظر انداز کر گیا تھا۔ میں نے عدنان سے یہ طے کیا تھا کہ فائر کرنے کے ساتھ ہی میں اوٹ سے نکل کر حیران اور خوفزدہ تماشائیوں میں مل جاؤں گا اور پھر دونوں وہاں سے ساتھ ہی روانہ ہو جائیں گے۔ مگر تماشائیوں کی قلیل تعداد نے منصوبہ کا آخری حصّہ ناکام کر دیا تھا!

میرا خیال تھا کہ عدنان وہاں رُک کر اپنا وقت برباد کر رہا تھا اور غیر ضروری طور پر ان لوگوں کی نگاہوں میں آ رہا تھا جو حادثے کے عینی شاہد تھے۔

میرے لئے اس زیرِ تعمیر عمارت میں چھپے رہ کر اپنے فرار کے لئے اندھیرے کا انتظار کرنا بھی ناممکن تھا۔ یہ یقینی بات تھی کہ قرب و جوار میں رہنے یا کام کرنے والے پولیس کو اس طرح اندھا دھند فائرنگ سے باخبر کرتے اور پولیس آتے ہی ان تمام مشکوک مقامات کا تفصیلی جائزہ لیتی جہاں سے گولی چلائے جانے کے امکانات تھے!

اس اعتبار سے زیرِ تعمیر عمارت ان کی توجہ کا پہلا مرکز ہوتی اور میں بُری طرح قانون کے چنگل کا اسیر ہو جاتا!

میں نے بہت احتیاط سے عقبی سمت کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر میری مسرّت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں دُور تک کولتار کی چمکتی ہوئی سڑک نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے اس پار بلند و بالا درختوں سے گھرا ہوا کوئی وسیع پارک تھا جہاں اس وقت بادی النظر میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں نے نجات کی راہ نظر آنے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور پیچھے کو طے کر کے کچی فٹ پاتھ پر کود گیا۔

باہر نکلنے کے بعد رُکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ نہ میں اس لق و دق سڑک کے کنارے زیادہ دُور تک پیدل جا سکتا تھا لہٰذا میں نے پھرتی سے سڑک عبور کی اور خاردار تاروں کی باڑھ عبور کر کے پارک میں گھس گیا۔

پارک میں گھسنے کے بعد میں سڑک کے متوازی اس طرف چلنے لگا جدھر سے کوئی موڑ نظر آتے ہی میں جلد از جلد عدنان کی کار تک پہنچ سکتا تھا!

ایک ڈیڑھ فرلانگ چلنے کے بعد مجھے سڑک کی دوسری جانب ایک گلی نظر آئی اور میں پارک سے نکل کر سڑک پر دوڑتا ہوا اس گلی میں داخل ہو گیا۔ اس گلی میں دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بند تھیں۔

وہ مختصر سی گلی آگے چل کر اس سڑک سے مل گئی جو الحیدرہ کے سامنے سے گزرتی تھی۔ اس سڑک پر آ کر میں الحیدرہ کی طرف بڑھنے لگا۔

خلافِ توقع الحیدرہ سے کافی پہلے ہی مجھے عدنان کی گاڑی کھڑی ہوئی نظر آ گئی۔ اور شاید اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ کیونکہ وہ فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا لایا۔

”میں پریشان ہو گیا!“ میرے قریب کار روک کر اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”زیادہ دیر وہاں رک سکتا تھا نہ تمہیں پھنسا ہوا چھوڑ کر واپس لوٹ سکتا تھا!“

میرے بیٹھتے ہی اس نے کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔

”میگورا کا کیا ہوا؟“

”دونوں گولیاں اس کی پشت پر لگیں!“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”اس نے اپنی کار کا انجن تک بند نہیں کیا تھا!“

”اس نے کار بہت غلط زاویئے پر پارک کی تھی۔ اگر ذرا بھی نال اوپر کرتا تو گولیاں کھڑکی کے فریم سے ٹکرا جاتیں!“

”وہ تو جو ہونا تھا سو ہو گیا، یہ بتاؤ کہ تم اس چوہے دان میں کیسے پھنسے رہ گئے؟“ اس نے چھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

میں نے اسے اپنی روداد سُنا ڈالی۔

”یہ بہت اچھا کیا کہ تم فوراً ہی نکل آئے!“ اس نے کہا۔ ”وہاں پولیس پہنچنے ہی والی ہو گی!“

”پولیس کو کس نے اطلاع دی؟“

”شاید الحیدرہ والوں نے دی ہو! میں تو یہ سنتے ہی وہاں سے کھسک لیا تھا کہ پولیس کو خبر دے دی گئی ہے!“

اس وقت سامنے سڑک ویران پڑی ہوئی تھی اور عدنان بڑی تیزی سے کار دوڑا رہا تھا۔ وہ میری کارکردگی پر مطمئن تھا مگر میں جھنجلایا ہوا تھا کہ میرے اوچھے وار کے نتیجے میں سکاّر حریف بچ نکلا ہو چکا تھا!

”ارے! اچانک عدنان کے منہ سے متحیر آمیز آواز سُن کر میں چونک پڑا۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ بے یقینی کے عالم میں عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

بے اختیار میری نگاہیں پیچھے مڑ گئیں اور میرے وجود میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اسی ساخت کی ایک گاڑی تیزی سے ہمارے قریب آتی جا رہی تھی جس میں میگورا وہاں تھا!

”یہ اسی ساخت اور رنگ کی دوسری کار ہو گی!“ عدنان تشویش کے عالم میں بڑبڑایا۔ ”میگورا تو بُری طرح زخمی ہوا تھا!“

”اگر وہ اتنی دیر تک اپنی کار میں کہیں رُکا ہوا کسی مشکوک فرد کا منتظر تھا تو اسے زیادہ خون بہہ جانے کے سبب مر جانا چاہئے تھا۔ تم میگورا کے بارے میں کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ قوتِ برداشت کے معاملے میں وہ سانڈ جیسی شہرت رکھتا ہے!“ اس نے کہا۔

”وہی ہے، خدا کی قسم وہی ہے!“ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد عدنان بے اختیار چیخ پڑا۔ شاید پچھلی کار اتنے فاصلے پر آ گئی تھی کہ عقب نما آئینے میں ڈرائیو کرنے والے کو بخوبی پہچان سکتا تھا!

”تم رفتار کم کرو۔ میں کھڑکی سے اس پر دستی بم پھینکنے کی کوشش کرتا ہوں!“ میں نے اپنی جیب سے دستی بم نکالتے ہوئے کہا۔

ٹھیک اسی وقت عقبی کار سے یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلیں، دو خطا ہوئیں اور تیسری نے ایک پچھلا ٹائر ناکارہ کر دیا۔ کار ایک طرف جھکنے کے ساتھ ہی بُری طرح اچھلنے لگی اور میں نے دستی بم دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں پن لگی ہونے کے باوجود وہ گر کر ہماری کار میں نہ پھٹ جائے۔

عدنان کار کو سنبھال رہا تھا کہ سُرخ کار بجلی کے کوندے کی طرح ہمارے برابر سے گزر گئی۔ گزرتے ہوئے اس میں سے دو گولیاں چلیں جن میں سے ایک نے عقبی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا اور دوسری بانٹ پر پڑ کر اچٹ گئی۔

میں نے نیچے جھکنے سے پیشتر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی۔ اس کے بدن پر موجود ہلکے فیروزی کوٹ کا پشت کا نظر آنے والا حصّہ خون میں تر تھا۔ اگر آستین کا اصلی رنگ نظر نہ آتا تو شاید خون کا دھبّہ پہچاننا بھی محال ہوتا!

ہماری کار سے آگے نکلتے ہوئے اس نے اچانک رفتار کم کر کے ہمیں سڑک سے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا۔ ایک بار عدنان نے اسٹیئرنگ کاٹنے میں ذرا سی تاخیر کی اور فضا آہنی چادروں کی جھنکار سے لرز اٹھی۔ دونوں گاڑیاں الگ ہوئیں تو سڑک پر کچھ آہنی حصّوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیں!

میں نے دانتوں میں دبا کر دستی بم کی پن کھینچ لی اور کھڑکی سے نصف دھڑ باہر نکال کر وہ بم میگورا کی کار پر اچھال دیا۔

بم میگورا کی چھت کے کسی حصّے پر گرا اور فضا ایک ہولناک دھماکے سے لرز اٹھی۔ سامنے کثیف دھواں اور ملبے کی خون آشام آندھی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

عدنان فاخری نے اس خطرناک مرحلے پر نہایت مہارت کے ساتھ اپنی کار سڑک سے کئی گز نیچے اتار کر محض اندازے کی بنا پر آگے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کے مقدر نے یاوری نہیں کی اور میگورا کی کار سے اڑنے والا کوئی آہنی حصّہ عدنان فاخری کی کار کے انجن کے کسی نازک حصّے میں پیوست ہو گیا۔ اس کی کار کے انجن نے پے در پے دو تین ہچکیاں لیں اور پھر آخری جھٹکے کے ساتھ کار رک گئی!

کار کے رکتے ہی میں نے اپنی سمت کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ عدنان نے بھی اُترنے میں تاخیر نہیں کی۔ مگر ہم دونوں جونہی اپنی اپنی سمت سے باہر آئے کہیں سے اچانک دو گولیاں چلیں۔ ان میں سے ایک میرے جسم سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی اور میں بے اختیار زمین پر گر کر عدنان کی کار کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اس وقت تک میگورا کی کار بُری طرح شعلوں میں گھر چکی تھی، اور اس سے شعلوں کے ساتھ ہی کثیف دھوئیں کے گہرے بادل بھی بلند ہو رہے تھے!

مگر میرے لئے زیادہ تحیّر خیز بات یہ تھی کہ زخم خوردہ اور لہو میں نہایا ہوا میگورا پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے اپنی کار کی تباہی کے باوجود حاضر دماغی سے کام لیا تھا اور شعلوں کے پیشِ نظر میں دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھامے کسی دیو ہیکل عفریت کی طرح جھومتا ہوا عدنان کی کار کی طرف آ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر قہر اور نفرت کا ایک سمندر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کے کوٹ کا بیشتر حصّہ پشت پر لگے ہوئے زخموں سے بہنے والے خون میں آلودہ تھا۔ ان بڑے بڑے تازہ دھبوں کو دیکھتے ہوئے میگورا کی ہمت اور برداشت پر عقل چکرا کر رہ گئی۔ وہ جو کچھ بھی رہا ہو، کم از کم ایک عام آدمی سے بہت بالا تھا!

”اس سے بچنا!“ کار کی دُوسری جانب سے عدنان کی اضطراری آواز ابھری۔ اس نے مجھے متنبہ کرنے کے لئے عربی کا سہارا لیا تھا۔ ”وہ اس حالت میں بھی ٹکرا گیا تو محض دبوچ کر ہماری پسلیوں کو سرمہ کر ڈالے گا!“

میگورا کی حیوانی قوتِ برداشت اور اس کا عزم دیکھ کر میں ہل کر رہ گیا۔ اگر لوگ اسے سانڈ یا گینڈے سے تشبیہ دیتے تھے تو اس میں مبالغے سے زیادہ ان کی حقیقت پسندی کا دخل تھا۔

اس کے ہاتھوں میں جو ریوالور دبے ہوئے تھے، ان دونوں کی نالوں پر سیاہ رنگ کے سائلنسر چڑھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے ان ہتھیاروں کی ہیبت میں اضافہ ہو گیا تھا اور یہ یقین کرنا محال

نظر آ رہا تھا کہ مجھے اور عدنان کو اس زخم خوردہ اور مسلح درندے سے نجات مل سکے گی۔

اچانک میگورا کے دونوں ہاتھوں کو جھٹکے سے لگے اور لمحہ بھر کی خفیف سی تاخیر کے بعد فضا میں دو کھٹکوں کی آواز ابھری اور عدنان فاخوری ایک غضب ناک غراہٹ کے ساتھ اچھل کر کئی فٹ دُور جا گرا۔ دوسری گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے زناٹے کے ساتھ گزرتی چلی گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے اضطراری انداز میں اپنے جسم کو پوری طرح عدنان کی کار کی اوٹ میں سمیٹتے ہوئے سوال کیا۔

میگورا کے جان لیوا خطرے کے ساتھ ہی مجھے عدنان فاخوری کی سلامتی کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی!

"گولی سے معمولی زخم آیا ہے، میری فکر نہ کرو!" عدنان کی کرب اور غضب میں ڈوبی ہوئی آواز سُنائی دی۔ "کوشش کرکے کار کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے ہتھیار نکالنے کی ہمت کرو!"

یہ بات اس نے عربی میں کہی تھی۔ عربی سے میری واقفیت کا یہ فائدہ تھا کہ ہم دونوں میگورا کی موجودگی میں بھی بآوازِ بلند تبادلہ خیال کر سکتے تھے اور وہ ہمارے عزائم کی بھنک بھی نہ پا سکتا تھا!

میں نے کار کے نیچے گردن گھما کر میگورا کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور اس کے قدم مجھے ایک جگہ جمے ہوئے نظر آئے۔

وہ دونوں ٹانگوں کو شاید کھولے کھڑا تھا۔ کیونکہ اس کے پیروں کے درمیان کم از کم تین فٹ کا فاصلہ نظر آ رہا تھا اور اس کی پتلون کے پائنچوں پر شاید پشت کے زخم سے بہنے والے خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

غالباً ان زخموں سے زیادہ مقدار میں خون بہہ جانے کے باعث میگورا نقاہت کا شکار ہونے لگا تھا اور اسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسی لئے وہ اپنی پیش قدمی ترک کرکے اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا!

میں نے اندازہ لگایا کہ میگورا جس جگہ کھڑا ہوا تھا وہاں سے ڈرائیونگ سیٹ کی سمت والا دروازہ براہِ راست اس کے نشانے میں رہا ہو گا جب کہ دوسرا دروازہ غالباً قدرے محفوظ تھا۔

میں اس وقت نہایت جانگسل صورتِ حال سے دوچار تھا۔ ایک تو دن کا اُجالا میرے تحفظ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا، دوسری طرف اس شاہراہ پر کسی بھی جانب سے کوئی گاڑی نمودار ہو سکتی تھی۔ وہ سڑک لاکھ ویران اور نسبتاً غیر مستعمل سہی، مگر آسمان کی طرف لپکتے ہوئے لہو رنگ شعلے اور کثیف دھوئیں کے بادل کسی بھی نرم خو اور قانون پسند شہری کو حادثے کے متاثرین کی امداد کی طرف متوجہ کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں میگورا کے لئے کوئی دشواری کھڑی نہ ہوتی کیونکہ ظاہری حالات میں اسے مظلوم کی طرح مظلوم معلوم ہوتا۔ اور چہرہ وہ تھا بھی مستند قسم کا غنڈہ۔ لہٰذا بات بڑھنے کی صورت میں اپنے رسوخ اور روایتی ہتھکنڈوں سے کام لے کر بآسانی جان چھڑا سکتا تھا جب کہ میں کسی بھی قیمت پر قانون کے محافظوں سے سامنا نہیں چاہتا تھا!

میں بہت آہستگی کے ساتھ کار کے نیچے سے نکلا اور بجلی کی سی پھرتی سے اٹھ کر کار کا دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔

میگورا اس وقت بھی پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے پھرتی سے فائر کیا مگر گولی کار کی چھت میں گھس گئی۔

کار کی نشست کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہی میری طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ وہاں سب سے پہلے میری انگلیوں نے جس مہلک ہتھیار کا لمس محسوس کیا وہ مخصوص ساخت کی ایک چھوٹی ٹامی گن تھی جس کے ساتھ ہی میگزین کی پیٹی جھول رہی تھی!

اس کے بعد مجھے مزید کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نہایت احتیاط کے ساتھ کار کا دروازہ کھول کر باہر کود گیا۔

اس اثناء میں میں نے میگورا کو لڑکھڑا کر ایک دو قدم آگے بڑھتے دیکھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے زمین پر گر پڑے گا۔ مگر جونہی اس نے مجھے دروازے سے کودتے دیکھا، ایک بار پھر گولی چلا دی اور اس بار میری داہنی کلائی کی جلد ادھڑ گئی۔

گو وہ زخم گہرا نہیں تھا، مگر اس کے بعد مجھ پر جھلاہٹ طاری ہو گئی۔ میں اسی جگہ کار کے متوازی سینے کے بل لیٹ گیا اور ٹامی گن درست کرنے کے بعد قدرے پیچھے کھسک کر اگلے دونوں ٹائروں کے درمیان سے جائزہ لیا تو ایک مرتبہ پھر میگورا کے قدم زمین پر جمے ہوئے نظر آئے۔

میں نے بے دریغ ایک برسٹ مار کر اس کی دونوں ٹانگیں چھلنی کر دیں اور فضا میگورا کی قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی چیخ سے لرز اٹھی۔

پنڈلیاں ہڈی کے ریزوں اور لوتھڑوں میں تبدیل ہونے کے بعد میگورا تو کیا کوئی سانڈ بھی اپنے قدموں پر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا دیو ہیکل جسم کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا!

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ٹامی گن ایک شدید جھٹکے کے ساتھ میری گرفت سے نکل گئی۔

وہ جھٹکا انتہائی درشت اور غیر دوستانہ تھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کی للکار بلند کی اور میں حیرت ناک سرعت کے ساتھ زمین سے اٹھ گیا۔

پیچھے پلٹا تو ٹامی گن کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک باوردی شخص موجود تھا جس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں حقارت رچی ہوئی تھی! عدنان کی سیاہ کار سے چند گز دُور پولیس کی مخصوص موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ وہ المحیدیرہ کی سمت سے نہ جانے کب نمودار ہوا اور کتنی دیر سے میری طرف متوجہ تھا!

اپنے سامنے ایک پولیس افسر کو موجود پا کر میرے دل کی دھڑکنیں یکبارگی تیز ہو گئیں۔ مگر میں نے اپنے رویے سے خوف کا اظہار نہ ہونے دیا اور تشویش زدہ انداز میں اس طرف دیکھنے لگا جہاں خون میں نہایا ہوا اور زخموں سے چور میگورا خاک پر بُری طرح تڑپ رہا تھا!

میرا رویہ پولیس افسر کو سلگانے کے لئے کافی تھا۔ اس نے نہایت تحقیر آمیز انداز میں میری گردن پر ٹامی گن کے دہانے سے ٹھوکا دے کر عربی زبان میں کچھ کہا۔ مگر میں نے لاپرواہانہ انداز میں داہنے ہاتھ سے ٹامی گن کی نال کو دُور جھٹک دیا۔

"میں بھاگا نہیں جا رہا، اسے دیکھو، وہ مرنے والا ہے!" میں نے نہایت اعتماد سے غرا کر انگریزی میں کہا۔

"تم نے جس طرح اس کی ٹانگیں چھلنی کی ہیں، وہ بچ نہ سکے گا!" ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے ٹامی گن سے دوبارہ کور کرتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے اس میں اُلجھا کر فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتے! اُلو کے پٹھے!" میں ایک فوری خیال کے تحت دانت پیس کر غرایا۔ "شاید تمہاری شامت ہی تمہیں یہاں تک لائی ہے۔ میگورا تمہاری کھال میں بھوسہ بھروا دے گا!"

یکایک اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور ٹامی گن کا دہانہ لاشعوری طور پر زمین کی طرف جھکتا چلا گیا!

"تت... تم میگورا کے آدمی ہو؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل تمام سوال کیا۔ میگورا کے نام نے اس کا سارا دم خم رخصت کر دیا تھا!

"تھوڑی دیر رکے رہو، کہیں سے وہ خود بھی آ نکلے گا!" میں نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"نن... میں جا رہا ہوں!" وہ ٹامی گن میری طرف اچھالتے ہوئے عجلت میں بولا۔ "میں تو ادھر آیا ہی نہیں ہوں!" پھر یک بیک ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ "تم بھی میگورا سے میری مداخلت کا ذکر نہ کرنا۔ وہ مجھے کولہو میں پلوا دے گا! دیکھو نا مداخلت سے پہلے مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں کون اُلجھا ہوا ہے۔ مجھے تو اگر دُور ہی سے پتہ چل جاتا تو فوراً اپنا راستہ بدل لیتا!"

اس نے گدی پر بیٹھ کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور یو ٹرن لے کر اتنی تیزی سے واپس روانہ ہوا جیسے موت اس کا تعاقب کر رہی ہو۔

ادھر میگورا کا بدن تڑپ تڑپ کر ساکت ہو چکا تھا۔

میگورا خون اور زخموں میں نہایا ہوا تھا پھر خاک میں آلودہ ہونے کے بعد وہ مکمل طور پر ناقابلِ شناخت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے محض اس یقین کی بناء پر پولیس افسر پر رعب گانٹھنے کی کوشش کی تھی کہ مجھ سے ٹامی گن چھیننے سے قبل اس نے غور سے میگورا کو دیکھا اور پہچانا نہ ہو گا۔

یہ میرے مقدر کی یاوری ہی تھی کہ میرا یقین درست ثابت ہوا۔ یہی نہیں بلکہ میرے حد سے بڑھے ہوئے مصنوعی اعتماد اور میگورا کے نام نے پولیس افسر کی سٹی بٹی ایسی گم کی کہ وہ فریقین کی شناخت کے بجائے اپنی عافیت کی فکر میں مبتلا ہو کر بوکھلاہٹ میں واپس بھاگ کھڑا ہوا۔ بصورتِ دیگر میں موقع پاتے ہی اسے کم از کم بے ہوش کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا!

فوری طور پر مجھے عدنان فاخوری کا خیال آیا جس کی آواز تک سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھا...!

میں نے دوبارہ اسے پکارا مگر جواب نہ ملا۔

عدنان فاخوری کی تلاش شروع کرنے سے پہلے میگورا کے انجام کا یقین کرنا ضروری تھا!

میں اس کے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے ساکت جسم کے قریب پہنچا تو اس کے سینے کے نمایاں زیر و بم زندگی کا اعلان کر رہے تھے!

گرتے ہوئے داہنے ہاتھ کا ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا تھا مگر بائیں ہتھیلی میں بے آواز ریوالور بدستور دبا ہوا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ گھما کر بے آواز ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھی۔ پھر اس کی ٹریگر میں پھنسی ہوئی انگلی پر دباؤ بڑھا کر ریوالور چلا دیا۔

ریوالور کی نال سے نکلنے والا شعلہ اس کے بھیجے کے کسی حصے میں پہنچ کر سرد ہو گیا۔ اس کا بدن ایک بار پوری شدت سے تڑپا اور پھر ہمیشہ کے لئے بے جان ہو گیا!

میگورا کی کار پر دستی بم پھینکے جانے سے اس کے خاتمے تک کی ساری کارروائی بمشکل چند منٹوں میں مکمل ہو گئی مگر واقعات کے اعتبار سے وہ چند منٹ مجھے گھنٹوں پر بھاری محسوس ہو رہے تھے۔

میگورا سے فراغت کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر عدنان کو پکارا اور جواب نہ ملنے پر اس طرف بڑھ گیا جدھر وہ زخمی ہو کر گرا تھا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد جھاڑیوں کے درمیان وہ نظر آ گیا، زخم اس کے شانے پر آیا تھا!

آستین اتارنے پر پتہ چلا کہ بظاہر گولی سے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ وہ جلد اور گوشت کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس چوٹ کو عدنان جیسا مضبوط آدمی نہ سہہ سکا اور بے ہوش ہو گیا مگر تفصیلی جائزے کے بعد بے ہوشی کا حقیقی سبب بھی دریافت ہو گیا۔

اس کی بے ہوشی کا سبب گولی کا زخم ضرور تھا مگر صرف اس حد تک کہ گولی لگنے کے بعد عدنان اضطراری طور پر اچھل کر دُور جا گرا تھا۔ اور گرتے ہوئے اس کا سر کسی پتھر وغیرہ سے ٹکرایا تھا جس کا اظہار سر کے عقبی حصے کے تازہ ابھار سے ہو رہا تھا۔ یقینی طور پر وہی بے تکی چوٹ اس کی بے ہوشی کا سبب بنی تھی!

میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں عدنان کو ہوش میں لانے کی کئی تدابیر کیں جو یکے بعد دیگرے ناکامی پر منتج ہوئیں اور مجھ پر تشویش غالب سوار ہونے لگی!

میگورا کی کار کا بیشتر حصہ جل کر راکھ ہو چکا تھا اور اس کے رہے سہے اجزائے ترکیبی بھی بھیانک شعلوں کی لپیٹ میں آئے ہوئے تھے۔ عدنان فاخوری کی سیاہ پوش کار کا انجن بھی ناکارہ ہو چکا تھا اور وہ خود مجھے دشواریوں میں گھرا چھوڑ کر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

میرے لئے وہاں رک کر عدنان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ کیونکہ ادھر آ نکلنے والے ایک پولیس افسر کو تو میں نے حاضر دماغی سے کام لے کر بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس سڑک پر زیادہ دیر تک سناٹا رہنے کی توقع بے سود تھی۔ اگر اس بار کوئی عام شہری آ جاتا تو اسے کسی بے ضرر انداز میں دھمکانا مشکل ہوتا جبکہ میں بے قصور اور غیر متعلقہ لوگوں پر ہتھیار اٹھانے سے ہمیشہ گریز ہی کرتا رہا تھا!

ایتھنز میرے لئے اور میں ایتھنز کے لئے اجنبی تھا۔ اگر میں بے ہوش عدنان کو کندھے پر لاد کر جھاڑیوں میں چلنا شروع کر دیتا تو مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں پہنچتا اور کن حالات سے دوچار ہوتا!

کافی غور و خوض کے بعد میں نے میگورا کی لاش کے قریب سڑک پر گرا ہوا بے آواز ریوالور اپنی جیب میں ڈالا۔ ٹامی گن کندھے سے لٹکائی اور عدنان کو پشت پر لاد کر ڈھلان میں پھیلی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں اترتا چلا گیا۔

سڑک سے کافی دُور نکلنے کے بعد میں اندازے اور شعلوں کے سہارے سڑک کے متوازی چلنے لگا اور تصادم کے مقام سے تقریباً ڈیڑھ سو گز دُور آنے کے بعد دوبارہ سڑک کی طرف ہو لیا۔

سڑک سے مناسب فاصلے پر گھنی جھاڑیوں کے درمیان میں نے عدنان کو ایسی جگہ مٹی پر لٹا دیا جہاں سڑک سے اس کا دیکھا جانا ناممکنات میں سے تھا!

اس مرحلے سے فارغ ہو کر میں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں میگورا کی کار جل رہی تھی۔

قدرت کو شاید میری بے بسی پر رحم آ گیا تھا کیونکہ میں نے دُور ہی سے وہ کار دیکھ لی جو لحیلدہ کی سمت سے آتے ہوئے وہاں رک گئی تھی۔

کار دیکھ کر میں پنجوں کے بل جھاڑیوں میں دوڑنے لگا۔ مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں میرے پہنچنے سے قبل اس کار کا ڈرائیور میگورا کی لاش سے خوفزدہ ہو کر اپنی راہ پر روانہ نہ ہو جائے۔

مگر وہ ادھیڑ عمر شخص میرے اندیشے کے برعکس خاصا دلیر تھا کیونکہ خاص جستجو کے بغیر وہ مجھے نظر آ گیا۔

سر پر فلٹ ہیٹ جمائے اور اپنے اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سڑک پر پڑی ہوئی میگورا کی لاش اور جلتی ہوئی کار کے درمیان سکون سے کھڑا سگار پی رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے سے سگار اس طرح لگا ہوا تھا جیسے وہ اس کے دہانے کا کوئی پیدائشی حصہ ہو۔

میں جھاڑیوں میں کوئی آواز پیدا کئے بغیر ایسے مقام پر رک گیا جہاں سے میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ مختصر ترین تھا!

دو تین بار اس کے ہونٹوں سے جھولتے ہوئے سگار نے جنبش کی اور فضا میں دھوئیں کے مرغولے بکھرتے نظر آئے، وہ جو کوئی بھی رہا ہو نہایت انہماک سے اپنے طور پر حادثے کی کڑیاں ملانے کی ذہنی مشقت جھیل رہا تھا!

پھر جب وہ وہاں سے ہٹ کر میگورا کی لاش کے قریب پہنچا تو میں نے بھی پھرتی سے جھاڑیوں میں اپنی جگہ تبدیل کر لی۔

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ اس وقت تک سڑک پر کوئی دوسری کار نمودار نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا جب وہ ادھیڑ عمر شخص اپنا رخ بدل کر میگورا کی لاش پر جھکا تو اس کی پشت میری طرف ہو گئی۔

میرے لئے وہ لمحات قیمتی اور فیصلہ کن تھے۔ میں تیزی کے ساتھ جھاڑیوں سے نکلا اور پنجوں کے بل بے آواز دوڑتا ہوا کسی شکاری عقاب کی طرح اس ہیٹ پوش شخص کے سر پر پہنچ گیا!

میں نے میگورا کے ریوالور کے آہنی دستے سے اس شخص کی گردن پر ایک تلی تلی ضرب لگائی اور وہ ایک تیز آمیز گھٹی گھٹی سی چیخ کے ساتھ سڑک پر لڑھک گیا۔ اس کا ہیٹ سر سے اتر کر دُور جا گرا اور جلد ہی میگورا کی لاش کے قریب پھیلے ہوئے خون میں آلودہ ہو گیا۔

میں نے اس بے ہوش شخص کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کار کی طرف گھسیٹنا شروع کیا اور پھر اسے اسی کار کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔

کار کی چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی لہٰذا میں نے وقت ضائع کئے بغیر انجن اسٹارٹ کیا اور اس کار کو پیچھے میں اتار کر آگے لیتا چلا گیا۔

بے ہوش عدنان کے قریب میں نے کار روک دی اور انجن بند کئے بغیر جھاڑیوں میں گھس کر اسے نکال لیا۔ اس پر بدستور گہری بے ہوشی طاری تھی مگر میں نے اسے بھی پچھلی نشست پر ڈال دیا اور کار دوبارہ آگے بڑھا دی۔

میں کار کو نہایت تیزی سے دوڑاتا رہا۔ پھر پہلی ذیلی سڑک نظر آتے ہی میں نے کار کا رخ ادھر موڑ دیا۔ میں اس شاہراہ سے جلد از جلد دُور ہو جانا چاہتا تھا جس پر میگورا میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

سڑکوں کی بھول بھلیوں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک جگہ خود کو بالآخر ایک مصروف سڑک پر موجود پایا۔

میرے لئے وہ صورتِ حال خطرناک تھی۔ پچھلی نشست پر دو بے ہوش آدمیوں کی موجودگی ہر شخص کو میری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

میں نے کار واپس گھمائی اور کافی دیر تک بھٹکنے کے بعد آخر کار ایک ایسے علاقے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں دُور تک سناٹا چھایا ہوا تھا!

اس جگہ میں نے کار کے بے ہوش مالک کو کار سے نکال کر ایک درخت کے نیچے ہی کچی زمین پر ڈال دیا اور عدنان فاخوری کو اس انداز میں نشست پر بٹھا دیا کہ بادی النظر میں وہ سوتا ہوا مسافر نظر آئے۔

اس بندوبست کے بعد میں خود کو کافی محفوظ محسوس کرنے لگا۔ یہ تھا کہ میں اس مسروقہ کار میں کب تک ایتھنز کی سڑکوں پر بھٹکتا رہوں گا۔ کار کا مالک جلد یا بدیر ہوش میں آ کر پولیس کو اپنی کہانی سُنا سکتا تھا اور میری عافیت اسی میں تھی کہ پولیس کی جانب سے کار کی تلاش کا آغاز ہونے سے قبل کار چھوڑ دوں۔

میگورا کے قتل اور اس کی کار کی تباہی کے معاملے میں پولیس ابھی تک مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی اور ہیٹ پوش بھی میری شکل دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس کے باوجود میرے تحفظ کا انحصار اس بات پر تھا کہ عدنان جلد از جلد ہوش میں آئے تاکہ چھینی ہوئی کار سے نجات مل سکے!

میں اپنی تشویش میں گھرا کار ڈرائیو کرتا رہا۔ ایندھن کی ٹنکی کافی دیر تک میرا ساتھ دے سکتی تھی اور اب مجھے راستوں کے بارے میں بھی زیادہ تشویش نہیں رہی تھی۔

ایک جگہ کسی کار کا تیز ہارن سن کر میں چونک پڑا۔ آواز کی سمت نگاہیں دوڑائیں تو مخالف سمت سے آتی ہوئی ہیلن کی کار سڑک سے لگی ہوئی تھی اور وہ ہارن بجانے کے ساتھ ہی کھڑکی سے جھانک کر میری طرف دیکھ رہی تھی!

لمحہ بھر کے لئے ہماری نگاہیں چار ہوئیں، میں نے چاہا کہ اسے نظرانداز کر کے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ جاؤں۔ مگر اس نے نظریں ملتے ہی پُرجوش انداز میں اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ میں نے ایک لحظے کے لئے سوچا اور پھر کار کی رفتار یک بیک تیز کر دی۔

اگر میں رُک جاتا تو وہ رنگے ہاتھوں میری اور عدنان کی حالت دیکھ لیتی اور مجھے لامحالہ اس سے سچ بولنا پڑتا تاکہ جب اگلے روز کے اخبارات میں میگورا کے قتل کے ساتھ اس کار کی چوری کا تذکرہ بھی چھاپا جائے تو ہیلن کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہوں۔ مگر بھاگ نکلنے میں یہ فائدہ تھا کہ شام تک کسی بھی وقت میں اس سے دوبارہ مل سکتا تھا اور جب وہ میرے رویئے کی شکایت کرتی تو میں اس کا مذاق اڑاتے ہوئے سرے سے اس بات سے ہی انکار کر دیتا کہ میں دن کے وقت گھر سے نکلا تھا۔

اس سڑک پر صرف اکا دکا کاروں کی آمد و رفت جاری تھی اس لئے مجھے رفتار بڑھانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی مگر عقب نما آئینے میں یہ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا کہ ہیلن یا پاگوس کی کار یوٹرن لے کر میرے پیچھے بڑھتے آ رہی تھی۔

میں نے میگورا سے ملاقات کے لئے روانہ ہوتے وقت اپنے داہنے ابرو پر پختہ سیاہ رنگ سے ایک بڑا اور نمایاں نشان بنا لیا تھا جو بظاہر سیاہ مسّہ معلوم ہو رہا تھا مگر ہیلن نے اس کے باوجود مجھے پہچان کر دشواری میں ڈال دیا تھا!

اگر معاملہ یہیں تک محدود ہوتا تو میں ہیلن سے دوبدو ہونے کے باوجود اپنی شناخت سے انکار کر سکتا تھا۔ مگر مزید مشکل یہ تھی کہ عدنان نے اس مہم میں اپنا حلیہ بدلنے کے لئے تین چیزوں کا سہارا لیا تھا اور وہ تینوں ہی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ لمبے بالوں کی وگ، ملاحوں والی ٹوپی سمیت اس وقت بھی غائب تھی جب میں نے میگورا سے نمٹنے کے بعد پہلی بار اسے جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے دیکھا تھا اور رنگین شیشوں والی عینک مجھے اس کے قریب سے اٹھانی یاد نہ رہی!

ان عناصر کی غیر موجودگی میں ہیلن، عدنان فاخوری کو بآسانی شناخت کر لیتی اور میری مزاحمت مضحکہ خیز ہو کر رہ جاتی۔

دوسری طرف میری کار کا انجن اپنی رفتار کی ان سرحدوں کو چھو رہا تھا جہاں پوری کار میں شدید قسم کی لرزش سرایت کر گئی تھی، اور ہیلن کی فوکس کی طاقتور انجن والی کار لحظہ بہ لحظہ قریب تر آتی جا رہی تھی!

میں نے تن بہ تقدیر ہو کر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی کار کی رفتار قدرے کم کر دی۔

ہیلن کی کار آناً فاناً... میرے برابر میں آ گئی۔ اس نے رفتار کم کر کے اپنی کار میرے برابر میں دوڑاتے ہوئے جھک کر دیکھا اور میں نے خشک نگاہوں سے اسے گھورنے پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی کار سڑک کے کنارے روک دی۔

ہیلن نے بھی آگے نکل کر اپنی کار کھڑی کر دی جب اس کا سڈول سراپا کار سے برآمد ہوا تو میں بھی اس کے قریب پہنچ چکا تھا!

"اجنبیوں کی طرح کیوں گھور رہے تھے؟" اس نے سامنے ہوتے ہی بے اختیار سوال کیا جیسے میری ذات پر اس کے بہت سے حقوق واجب ہوں!" اور یہ تمہارے داہنے ابرو پر سیاہ دھبہ کیسا ہے؟"

"اپنی کار ذرا پیچھے کر لو!" میں نے اپنا زخمی ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔" عدنان کو تمہاری کار میں منتقل کرنا ہے!"

"وہ باہر کیوں نہیں نکلا؟ کیا ہوا اسے؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔ میری داہنی کلائی پر پھیلے ہوئے خون نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا!

"وہ بے ہوش ہے!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوہ خدا!" وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کرب آلود لہجے میں کراہی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم اس سے ٹکرا ہی گئے ہو!"

یہ کہتی ہوئی وہ اپنی نشست پر بیٹھی اور کار کو پیچھے لا کر تقریباً مسروقہ کار سے ملا دیا اور میں نے نہایت اطمینان سے عدنان فاخوری کو اس کی کار کی عقبی نشست پر منتقل کر دیا۔ وہ میری کارروائی کو حیرت اور تشویش کے ساتھ دیکھتی رہی۔

پچھلا دروازہ بند کر کے جب میں بھی اگلی نشست پر بیٹھ گیا تو اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے حیرت سے سوال کیا۔" اس کار کا کیا ہوگا؟"

"یوں ہی کھڑی رہے گی!" میں نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"کوئی بھی اڑا لے جائیگا!" وہ دوسرا گیئر بدلتے ہوئے بولی۔

"کوئی حرج نہیں!" میں پہلی بار مسکرایا۔"جس طرح آئی ہے، اسی طرح چلی جائے گی!"

"تو کیا تم دونوں نے بھی وہ کار چرائی تھی؟"

"عدنان بے ہوش تھا لہٰذا یہ ناخوشگوار فرض اسی خادم کو سرانجام دینا پڑا!" میں نے سگریٹ کا دھواں اس کے گلابی رخساروں پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"مگر... مگر یہ سب کیسے ہوا؟" وہ میری طرف دیکھ کر الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ کسی بارے میں شدید بے چینی میں مبتلا ہے!

"میکورا سے ملاقات ہو گئی تھی!"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ خود تمہارے مقابل تھا؟" اس کے لہجے سے انتہائی درجے کی بے اعتباری مترشح تھی۔

"بالکل اسی طرح جیسے اس وقت تم ساتھ ہو!"

"پھر وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔" اگر تم... اسے للکارنے کی حماقت کر ہی بیٹھے ہو تو پھر تمہارا میرے ساتھ دیکھا جانا مجھ بے چاری کے لئے مصائب کے آغاز کا سبب بن سکتا ہے....!"

"اگر وہ یونان میں ملوام بوآری کا چیف آپریٹر ہے تو تم کو ایتھنز کی لوکل آپریٹو ہو، اس سے اس قدر کیوں ڈرتی ہو؟"

"یہ ناواقفیت کی باتیں ہیں!" وہ پھیکے انداز میں ہنس کر بولی۔

"اس نے دوبارہ گھیر لیا تو شاید بولنا بھی بھول جاؤ گے!"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں مرد سے بھی گیدڑ کی کھال کا جگر لگتے ہیں!" میں نے لاپروائی سے کہا اور وہ میرے الفاظ پر اس طرح اچھلی جیسے بے خیالی میں اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔ میں نے پھرتی سے اسٹیئرنگ تھام کر اس کی کار کو فٹ پاتھ پر چڑھنے سے روکا اور اسی کوشش میں مجھے اس سے قریب ہونا پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا آخری فقرہ سن کر اس کے بدن پر کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی تھی!

"تم نے کیا کہا تھا؟" اس نے چند ثانیوں بعد نقاہت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہم دونوں زخمی ضرور ہوئے ہیں مگر پہلے ہی معرکے میں میکورا کا فتنہ ہمیشہ کے لئے دفن کر آئے ہیں!"

"یقین نہیں آتا، یقین نہیں آتا!" وہ بڑبڑائی۔

"مجھے سڑک کا نام نہیں معلوم، ورنہ اس ویران شاہراہ پر ابھی تو اس کی بے گور و کفن لاش اٹھائی بھی نہ گئی ہو گی!"

"ویران شاہراہ؟ وہی سڑک تو نہیں جو الیکزنڈر پیلس کے سامنے سے گزرتی ہے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"الیکزنڈر پیلس تو نہیں دیکھا، ہاں اس سڑک پر الحمراء نام کا اسنیک بار ضرور ہے!" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، ہاں وہ دونوں ایک ہی شاہراہ پر ہیں!" وہ جلدی سے بولی۔" تم نے اسے وہاں کیسے قابو کر لیا؟"

"لمبی کہانی ہے!"

"مگر میں پوری تفصیل سننا چاہتی ہوں!" اس نے میری بات درمیان ہی سے اچک کر اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔

"گھوڑوں کے چکر میں مارا گیا بے چارہ!" میں نے یہ کہہ کر تمام واقعات من و عن سنا ڈالے۔

"تم نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا تھا!" میرے خاموش ہونے پر وہ بولی۔" میں نے سنا ہے کہ ان دنوں وہ واقعی مرنے والے گھوڑوں کے بارے میں پریشان تھا۔ ویسے عام حالات میں بھی گھوڑوں کے معاملات طے کرنے کے لئے وہ قطب شمالی بھی جا سکتا ہے!"

"یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ تنہا آیا، ایک آدمی بھی اس کے ساتھ ہوتا تو معاملہ بہت زیادہ طول پکڑ جاتا!

"مگر تم اب بھی خطرے میں ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ تم فوری طور پر ایتھنز سے کسی جزیرے وغیرہ پر منتقل ہو جاؤ!"

"مگر کیوں؟" میں نے سوال کیا حالانکہ میرے لئے یہ خوشی کی بات تھی کہ جزائر کے بارے میں اس نے خود ہی تجویز پیش کر دی تھی!

"ایک پولیس افسر نے تمہیں جائے واردات پر بہت قریب سے دیکھا تھا، اس وقت تو تم نے حاضر دماغی سے کام لے کر اسے بھگا دیا مگر اب ایتھنز کی پولیس چاروں طرف اس کے بتائے ہوئے حلیئے کے آدمی کی تلاش شروع کر دے گی۔"

"وہ زبان کھولنے کی ہمت ہی نہ کر سکے گا!" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری!" وہ منہ بنا کر بولی۔" وہ بعد میں جلنے والا تھا پھر ضرور گیا ہوگا اور میکورا کی لاش دیکھنے کے بعد سمجھ گیا ہوگا کہ اسے بے وقوف بنانے والا شخص ہی میکورا کا قاتل تھا، وہ بھلا تم سے کیوں ڈرے گا؟"

"زیادہ سوچ کر اپنی ننھی سی جان کو ہلکان نہ کرو!" میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔" اگر وہ حقائق بیان کر دے یا اس میں یہ اضافہ بھی کر دے کہ قاتل نے اسلحے کے بل پر اسے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا تو قانون کے اس نااہل محافظ سے یہ سوال ضرور کیا جائیگا کہ اس نے فوری طور پر اپنے اوپر والوں کو باخبر کیوں نہیں کیا اور بفرض محال وہ قانون کے شکنجے سے اپنی گردن بچا بھی گیا تو میکورا کے ہمدرد اس کے خون کے پیاسے بن جائیں گے کیونکہ ان کے نزدیک قاتل اس شخص کی بزدلی اور نااہلی کی وجہ سے واردات کے بعد صحیح سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا!"

"اس وقت تم چوری کی کار میں کہاں جا رہے تھے؟"

"سڑکوں پر گھوم کر عدنان کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا!"

"تم نے عدنان کو اعتماد میں لے کر بُرا کیا!"

"تمہارا نام کہیں نہیں آیا۔ اسے تو بس یہ معلوم ہے کہ میری میکورا سے ٹھن گئی تھی!" میں نے نرمی سے کہا۔

"تم نے اس کی کوئی وجہ بھی بتائی ہو گی؟"

"میرے اور اس کے تعلقات کی نوعیت عجیب سی ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو اسی قدر باخبر رکھتے ہیں، جتنا مناسب سمجھیں، دوسرا کوئی اس سے آگے جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا!" میرے لئے اس کا اطمینان بھی خاصا اہم تھا۔

"تو کیا تم بھی یاسر عرفات کے لئے کام کرتے ہو؟" اس نے بڑی سادگی کے ساتھ براہ راست سوال کر ڈالا۔

"یاسر عرفات کے لئے کوئی کام نہیں کرتا!"

"اس کے ایک اشارے پر سر پھرے فلسطینی نوجوان موت کے دہانے میں چھلانگ لگا دیتے ہیں!"

"وہ یاسر عرفات کے لئے نہیں اپنے وطن اور اپنے نصب العین کے لئے قربانیاں دیتے ہیں!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔" آج اگر کوئی اور انسان اس تحریک کی راہ نمائی شروع کر دیتا ہے، تو وہ اس کے احکام پر بھی اسی طرح عمل کریں گے!"

"ان کا دفاع کر رہے ہو!" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

میں چونک پڑا، میرا لہجہ واقعی جانبدارانہ ہو گیا تھا مگر میں نے مسکرا کر کہا۔" یہ میں صرف اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انہیں تھوڑا قریب سے دیکھا ہے!"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم یونان سے پہلے کہاں تھے، میرا تو خیال ہے کہ سیدھے مصر یا شام سے چلے آ رہے ہو!"

"میں بیروت میں تھا جو ایک طرح سے تمہاری ملوام بوآری کا ہیڈ کوارٹر ہے اور وہیں اس سے میری جنگ شروع ہوئی!" مجھے اپنے دفاع کی خاطر کہنا پڑا۔

"ملوام بوآری کو تم سے کیا پرخاش ہے؟"

"پوچھا تھا مگر اس نے جواب نہیں دیا!" میں نے کہا۔" میں معاوضے پر مختلف ملکوں کے لئے کام کرتا ہوں، شاید کسی موقع پر ملوام بوآری کو میرے ہاتھوں زک اٹھانی پڑی ہو اور وہ اسی کا انتقام لینا چاہتی ہے!"

"سیکرٹ ایجنٹ ہو؟" اس کی آنکھیں یک بیک چمکنے لگیں۔

"ایک قوم کے ہیرو اور دوسری قوم کے جلاد کے لئے اس سے زیادہ مناسب نام ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے!"

"کبھی فلسطینیوں کے خلاف بھی کام کیا ہے؟" اس کے ذہن میں شاید میرے اور عدنان کے تعلقات کے بارے میں کوئی شبہ جڑ پکڑ گیا تھا!

"کوشش کی تھی، مگر کامیاب نہ ہو سکا!"

"مجھے تو نفی میں جواب ملنے کی توقع تھی، تم نے ذرا گھما کر انکار کیا ہے!" اس کی آواز میں طنز کی ہلکی سی کاٹ تھی۔" میرا قیاس کہتا ہے کہ شاید تم کبھی فلسطینیوں کے خلاف جانے کی نہ سوچ سکو گے!"

"پیشہ ور لوگ کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے ڈارلنگ!" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔" ہم لوگ پیسے کے لئے سارے جذبات کو خیرباد کہہ کر جہنم کی آگ میں کودتے ہیں اور ہر لمحے ہماری وفاداریاں اس فریق کے ساتھ ہوتی ہیں جو سب سے اونچی بولی لگاتا ہے۔ یہ تمہارے فلسطینی دوستوں کی خوش قسمتی ہے کہ آخر میں ان کی بولی ہمیشہ سب سے زیادہ رہی اور میں نے ان کے راز انہی کو فروخت کر دیئے!"

میرے اس جواب نے اسے مطمئن کر دیا۔" بڑی سنسنی خیز اور رنگین زندگی گزارتے ہو تم لوگ .... ہر وقت زندگی اور موت کا دوراہا سامنے ہوتا ہے!"

"رنگینی کی بات نہ کرو، نگاہیں تمہارے لباس کے پار دیکھنے لگتی ہیں!"

"کیا نظر آتا ہے؟" اس کے لہجے میں حوصلہ افزائی کا عنصر موجود تھا!

"اپنی ہی آگ میں تپتا ہُوا ایک بے آب وگیاہ صحرا جو نہ کسی کو فیض یاب کرسکتا ہے اور نہ خود ہی بہار آشنا ہوتا ہے!"

"شاعری اچھی کرلیتے ہو!"

"مجسم شعر سامنے موجود ہو تو پتھر بھی شعر کہنے لگتے ہیں۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ ان لمحات سے پہلے تم نے اپنی ذات پر نفس کُشی کا خول کیوں چڑھایا ہُوا تھا؟"

"شوہر کے خون کا انتقام لینے نکلی تو جوش میں منشیات کا لین دین بھی کرنے پر آمادہ ہوگئی اور آج مادام بواری کی لوکل آپریٹر ہوں، اگر اپنے نفس کو نہ کچلتی تو شاید کسی بڑے قحبہ خانے کا انتظام چلا رہی ہوتی!"

"تو کیا اب یہ خطرہ ٹل گیا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ میگورا کی موت کے بعد بے شمار خطرات ٹل گئے ہیں۔ میں ایک طویل مدت کے بعد آزادانہ زندگی سے لطف اندوز ہوسکوں گی!"

"اس پروگرام میں میری گنجائش کہاں ہوگی؟"

"کھلی اجازت ہے۔ جہاں چاہو گنجائش نکال لو!" وہ ہلکا سا قہقہہ مار کر بولی۔ "میگورا کے قاتل کو اتنا حق ضرور ملنا چاہیئے!"

"میں عدنان کو اپنا شریک نہیں بنا سکتا کیونکہ میگورا کا قاتل مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھا!" میں نے بھی بے حجاب لہجہ اختیار کرلیا۔

"عدنان میرے قریب بھی نہ پھٹک سکے گا۔ یہ پیش کش تو صرف صفدر علی کے لئے ہے!" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"یعنی جشنِ بہاراں کا آغاز مجھ سے ہوگا؟" میں بھی بتدریج ہیلن کے سحر میں گرفتار ہوتا جارہا تھا!

"یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟"

"پہلے عدنان کو ہوش میں لاؤ تاکہ اسے گھر چھوڑ کر میں تمہارے ساتھ کوئی پروگرام بنا سکوں!" میں نے کہا۔

"میں ہوش میں ہوں!" اچانک پچھلی نشست سے عدنان کی آواز آئی اور میں اچھل پڑا۔

ہیلن کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا... اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کا ایک ماتحت پیچھے بیٹھا ساری گفتگو سُن رہا ہے تو شاید وہ میرے ساتھ اس قدر فیاضانہ لہجہ اختیار نہ کرتی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا!

"تم کب سے ہماری باتیں سن رہے ہو؟" میں نے عقبی نشست کی طرف گھوم کر فیصلے لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں کہ تم کیا باتیں کررہے ہو اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ میری تو حالت ہی خراب ہے۔ ابھی ابھی کچھ سُننے اور دیکھنے کے قابل ہُوا ہوں!" عدنان فاخوری نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے پپوٹے خوابناک انداز میں آنکھوں پر جھکے پڑ رہے تھے اور بشرے سے شدید کرب کے آثار ہویدا تھے!

"اس وقت ہم مس ہیلن فوسٹن کی کار میں سفر کررہے ہیں!" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہیلن!" وہ بڑبڑایا۔ "وہ خود تو نہیں ہے نا اس کار میں؟"

"میں کار ڈرائیو کررہی ہوں!" ہیلن نے مسترنم مگر دھیمی آواز میں کہا۔

"اوہ.... میں شرمندہ ہوں مس ہیلن!" یہ کہتے ہوئے عدنان بدقت تمام کہنیوں کے بل نشست پر سیدھا ہوگیا۔ "پتہ نہیں وہاں کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے اچانک مجھ پر کس قسم کا دورہ پڑ گیا تھا!"

میں نے ہیلن کی طرف دیکھا تو وہ زیرِلب مسکرا رہی تھی۔ "تم مرگی کے مریض معلوم ہوتے ہو، بہت خطرناک مرض ہے، میں تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گی!"

"نن... نہیں... نہیں... میرے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے!" عدنان بوکھلا کر بولا۔ "مجھے اس وقت علاج سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر میں غشی کے سارے اثرات زائل ہوجائیں گے!"

"اداکاری مت کرو!" میں نے سخت لہجے میں عدنان سے کہا۔ "میں نے مس ہیلن کو ہر بات من وعن بتادی ہے!"

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے چند ثانیوں تک بے یقینی کے عالم میں میری طرف تکتا رہا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "میگورا کیا ہُوا؟"

"اس وقت اُس کی لاش پر کام ہورہا ہوگا!"

"تو آخرکار وہ مارا ہی گیا!" وہ پُرخیال انداز میں بڑبڑایا۔

"اس کے زندہ رہنے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں اس کے ہاتھوں مارا جاتا!" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں کار کا رُخ عدنان کے مکان کی طرف کررہی ہوں!"

"فی الحال یہی مناسب ہوگا!" میں نے کہا۔ "عدنان کا زخم معمولی ہے، اسے علاج سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے!"

"مس ہیلن تمہیں کہاں مل گئیں؟" عدنان نے سوال کیا۔ اس کے حواس رفتہ رفتہ اعتدال پر آتے جارہے تھے۔

"مقدر کی یاوری کہہ لو کہ ہیلن نے ایک جگہ مجھے خود ہی پہچان لیا، ورنہ میں تو تمہیں ایک چوری کی کار میں لے کر روانہ ہُوا تھا!" میں نے کہا۔

"ہماری کار کا کیا ہُوا؟"

"وہ تو جواب دے چکی تھی۔ پولیس اسی کے سہارے میگورا کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گی!"

پہلی بار وہ ہنس پڑا۔ "فکر نہ کرو، کل رات ہی ایک بھلے مانس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی گئی ہوگی؟"

عدنان کے مکان پر پہنچ کر سب سے پہلے اس کے اور میرے زخم کی مرہم پٹی کی گئی اور اس کے بعد ایک جگہ ہیلن نے مجھے تخلیے میں گھیر لیا۔

"یہ بہت بُرا ہُوا، عدنان کے ہوش میں آجانے سے مجھے پریشانی لاحق ہوگئی ہے!" اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"وہ نمک حرام نہیں ہے!" میں نے اسے اطمینان دلایا۔ "کچھ باتیں علم میں آجانے کے بعد بھی تم اسکے رویے میں تبدیلی نہیں پاؤ گی!"

"مجھے ڈر ہے کہ وہ کافی دیر پہلے ہوش میں آگیا تھا!" ہیلن نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مجھے نارساتی کے خول سے باہر نکلنے کے بعد پہلی بار پیش قدمی کی جسارت کی، تو بہت بُرا ہوگا! لڑکیوں کے بارے میں اس کی شہرت بہت خراب ہے!"

"تم فکر نہ کرو، ایسا کوئی مرحلہ نہیں آئے گا!"

"اس نے کوئی بدتمیزی کی تو میں اسے گولی مار دوں گی!"

"مار دینا... وہ تمہارے ہاتھوں بخوشی مرجائے گا!" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اب کیا پروگرام ہے؟"

"میں آرام کروں گی، اس وقت ذہن خاصا پراگندہ ہے!"

"پھر میں شام کو ہوٹل آؤں گا!"

"اکیلے ہی آنا!" وہ دھیمے سے بولی۔

"تم فکر نہ کرو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اس وقت کہاں سے آرہی تھیں؟"

"گھر سے نکلی تھی اور ایک سہیلی کے پاس جارہی تھی کہ تم نظر آگئے!" اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت اچھا ہُوا!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اوّل تو نوبت نہیں آئے گی اور اگر کسی وقت پولیس رجوع کرے تو تم یہی کہنا کہ صبح دس بجے سے دو بجے تک تم میرے اور عدنان کے ساتھ شہر کا سرسری تفریحی چکر لگا رہی تھیں!" میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"شُبہ کسی پر ہو یا نہ ہو، مگر پولیس میری طرف ضرور رجوع کرے گی!" ہیلن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا اور اس کا تعلق!" وہ دوبارہ ہنس پڑی۔ "غیرسرکاری طور پر ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ میگورا مادام بواری کا چیف آپریٹر تھا اور میں لوکل آپریٹر تھی!"

"شاید میگورا کی موت کے بعد تمہارا ہی نام چیف آپریٹر کے طور پر آجائے!" میں نے اپنی دانست میں ایک نازک سوال کر ڈالا۔

"یہ ناممکن ہے!" وہ یقینی لہجے میں بولی۔ "میں تو شاید اب کنارہ کشی ہی اختیار کرلوں گی۔ مار دھاڑ تو دُور کی بات ہے، کوئی بھی غیرقانونی دھندا میرے بس سے باہر ہے!"

"بہت شریف ہو!" میں نے بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا اور اس نے میری جسارت پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اسے تعاون پر آمادہ پاکر میرے وجود میں یک بیک ایک جوالا مکھی پھٹ پڑا مگر وہ میری گستاخ جسارتوں پر بوکھلا اٹھی۔

"عدنان تمہارا منتظر ہوگا!" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولی۔

"میں شام کو آؤں گا!" میں نے اسے یاد دلایا اور اس نے دلربایانہ انداز میں اپنی گردن کی ایک نازک سی جنبش سے پروگرام کی توثیق کردی۔

"یہ کیا ہُوا؟ ہیلن درمیان میں کہاں سے آکودی؟" اس کے رخصت ہونے کے بعد عدنان نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"فکر نہ کرو، اس کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی!" میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"یہ نہ بھولو کہ وہ دونوں مادام بواری کے نمک خوار ہیں!"

"یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ پورے واقعات سے لاعلم ہو!" میں نے صوفے پر دراز ہوکر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں نے اسے میگورا کی ہلاکت سے لے کر ہیلن سے ٹکراؤ تک کے تمام واقعات تفصیل سے سُنا ڈالے۔

"یعنی گولی کان پر سے گزر گئی؟" میرے خاموش ہونے پر اس نے مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا!"

"میگورا تمہاری اصلیت کے بارے میں شبہات کا شکار ہوگیا تھا اور اسے تم نے راہ سے ہٹادیا۔ اب تو تم یہاں محفوظ ہو۔"

"پاپا گومس اور جیری کو تم بھول رہے ہو!" میں نے اسے یاد دلایا۔

"وہ ہیلن کے تنخواہ دار ہیں!" وہ اطمینان سے بولا۔ "انہیں تو اصل قصے کے سر پیر کا ہی علم نہیں تھا۔ آج ہیلن تمہاری دوست ہے تو وہ بھی تمہارے پیچھے دُم ہلاتے پھریں گے!"

"مگر ان کے ذہن میں شبہات سر ابھار سکتے ہیں!"

"اتنے دُوساز کا ونکات پر غور کروگے تو زندہ رہنا دشوار ہوجائیگا!" اس کا جواب مجھے بے حد پسند آیا۔

عدنان کا زخم معمولی تھا مگر گرتے ہوئے سر میں آنے والی ضرب کافی شدید تھی جس کے باعث اس کا سر چکرا رہا تھا!

تھوڑی دیر بعد وہ گھر میں نہ صرف گھومنے پھرنے لگا بلکہ اس نے میرے ساتھ شیمپین کے کئی گلاس بھی خالی کئے۔

"کچھ دیر کے لئے تم گھر میں تنہا رہ سکوگے؟" موقع پاکر میں نے مے نوشی کے دوران اس سے سوال کیا۔

"میں تمہاری جانب سے اس سوال کا منتظر تھا!" اس نے معنی خیز اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تو اپنے ہوش میں آنے کے بارے میں تم نے جھوٹ بولا تھا؟"

"جھوٹ نہ بولتا تو نہ صرف ڈیلکارڈو کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑتے بلکہ وہ تم سے بھی بدک جاتی" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اگر اس نے بلایا ہے تو تم ضرور جاؤ، میں رات بھی آرام سے گزار لوں گا!"

"تمہاری تو اس پر نظر نہیں ہے؟"

"اب وہ تمہاری ملکیت ہے، دوستوں کی پسند پر نگاہ ڈالنا بھی بُرا سمجھتا ہوں!" اس نے فراخدلی سے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک فقرے میں بہت بڑا فلسفہ بیان کر ڈالا۔ اور میرا ذہن بے اختیار اس دور میں بھٹکنے لگا جب میں کراچی میں ——— عیش و نشاط کے نت نئے افسانے تراش رہا تھا۔

شعیب میرا اس دور کا ایک گہرا دوست تھا۔ ہم دونوں نے ایک لڑکی کو ایک ساتھ دیکھا اور شاید دل ہی دل میں ایک ساتھ پسند بھی کیا۔ میں نے اس کے دل کا چور بھانپ لیا اور اس لڑکی کے بارے میں پہل کرتے ہوئے اپنی پسند کا اظہار بھی کر ڈالا جسے سن کر وہ خاموش ہوگیا اور آخر تک ایک لفظ بھی زبان پر نہ لایا!

میری ناکام کوششیں جاری رہیں اور اس روز میں حیران رہ گیا جب میں نے اس لڑکی کو شعیب کی بغل میں سمٹے کراچی کی ایک تفریح گاہ میں دیکھا۔

وہ میرا گہرا دوست تھا اور میری پسند پر جال ڈال چکا تھا اور دوسری طرف عدنان فاخوری تھا جو دوست کی پسند پر نگاہ ڈالنا بھی بُرا سمجھتا تھا!

"فکر نہ کرو، میں تمہارا تعاقب نہیں کروں گا!" عدنان نے مجھے خاموش پاکر شیمپین کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "تم جب چاہو ہیلن سے ملنے جاسکتے ہو!"

"شام کو جاؤں گا!" میں نے کہا۔ "مگر تم واقعی عظیم آدمی ہو!"

"میں بہت گھٹیا شخص ہوں۔ میرا دماغ خراب کرنے کی کوشش نہ کرو!" اس نے ایک جاندار قہقہہ لگا کر کہا۔

"دوست کی آزمائش مصیبت، محبت یا نفرت میں ہوتی ہے۔ ہیلن تمہارے بارے میں خاصی پریشان تھی۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں مثبت یقین دہانی کرا کے غلطی نہیں کی تھی!"

"تو وہ پریشان تھی میرے بارے میں؟" وہ میرے انکشاف پر لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "موقع ملے تو اس سے کہہ دینا کہ عدنان سڑک پر پڑی ہوئی ایک جھوٹی پلیٹ میں تو کھانا کھا سکتا ہے مگر جانے بوجھے دوستوں کے جھوٹے برتن میں کھانا تو درکنار ہاتھ دھونا بھی پسند نہیں کرتا!"

"وقت آنے پر خود ہی سمجھ لے گی، مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں!" "یہ بات مصدقہ ہے کہ بیوگی کے بعد سے وہ پارسائی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اب اگر وہ تم پر مہربان ہوئی ہے تو تکلف سے کام نہ لینا!"

"میں ایسے مرحلوں سے نمٹنا خوب جانتا ہوں!" میں نے ذرا جھینپ کر قدرے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے حیرت تو اس بات کی ہے کہ پارسائی کا بھرم توڑنے کیلئے اس نے ڈیلکارڈو میں آنے والے عاشقوں کو چھوڑ کر تمہارا انتخاب کیا ہے!"

وہ اپنی روانی میں بولتا رہا اور میں تحمل سے اس کی باتیں سُنتا رہا اور اسی ہنسی مذاق میں شام ہوگئی!

"میری کار قریبی گیراج پر تیار ہوگی، وہاں سے لیتے جانا!" اس نے جیب سے ایک رسید نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہاں کس لئے چھوڑی تھی؟" میں نے رسید لیتے ہوئے کہا۔

"سروسنگ اور دیکھ بھال کے لئے!" وہ بائیں آنکھ دبا کر بولا۔ "کوئی تو مناسب بہانہ ہونا چاہیئے تھا!"

میں وہاں سے روانہ ہوا اور عدنان کی کار لے کر دس پندرہ منٹ میں ہوٹل ڈیلکارڈو جا پہنچا، جہاں اتوار کی وجہ سے عام دنوں کے مقابلے میں گاہکوں کی زیادہ بھیڑ...... منڈلاتی نظر رہی تھی!

ہیلن نوس استقبالیہ کاؤنٹر کے قریب ہی چند لوگوں سے رسمی گفتگو کر رہی تھی۔ جونہی اس نے مجھے دیکھا ان لوگوں سے معذرت کرکے تیر کی طرح سیدھی میری طرف بڑھی چلی آئی۔

"بہت خوبصورت لگ رہی ہو!" میں نے اس سے پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"کیا یہ تعریف ضروری تھی؟"

"ایسی غیر ضروری بھی نہیں ہے! آج شاید تم نے کچھ غیر معمولی میک اپ کیا ہوا ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"بعض باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی سرزد ہوجاتی ہیں!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "یہی بات ہوٹل میں آنے والے کچھ خاص گاہکوں نے بھی کہی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ ہی اپنی چرب زبانی کے دکھانے کی تلاش میں رہتے ہیں، اس لئے میں نے ان کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی!"

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟"

"میرے ساتھ چلے آؤ!" یہ کہہ کر وہ اندر مڑ گئی۔

ڈیلکارڈو کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ایک تنگ لیکن روشن راہداری میں آگئے جس کے اختتام پر ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔ ہیلن نے وہاں رُک کر اپنے وینٹی بیگ میں سے چابی نکالی اور دروازہ کھول دیا!

میرے پیچھے اندر آکر اس نے دوبارہ دروازہ مقفل کر دیا۔ وہ تھا تو اسی عمارت کا کوئی حصہ، مگر دروازہ بند ہونے کے بعد ہوٹل سے آنے والی ملی جلی انسانی آوازیں اور موسیقی کا شور ایکدم معدوم ہوگیا تھا اور میں خود کو کسی مکان کے آراستہ داخلی لاؤنج میں محسوس کر رہا تھا!

"کیا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو، یہاں میں تنہا رہتی ہوں!" اس نے میری ہچکچاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے چٹکی لے کر شوخ لہجے میں کہا۔

میں نے چٹکی کا جواب چٹکی سے ہی دیا اور وہ بھڑک کر چند قدم دور ہوگئی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ خاصی چڑھا کر آئے ہو!"

"تمہاری زبان سے تنہائی کا ذکر سن کر بے قابو ہوگیا تھا!" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ہیلن کا مکان اندر سے نہایت آراستہ اور پُرآسائش تھا، فرنیچر اور دیگر اشیاء کے انتخاب سے اس کے ذوقِ لطیف کی بھرپور عکاسی ہو رہی تھی!

اس کے مکان کی نشست گاہ ہر اعتبار سے واجبی سی تھی، مگر بیڈروم کے تیور ہی کچھ اور تھے۔ فنونِ لطیفہ کے بہت سے نمونے نہایت قرینے کے ساتھ مختلف گوشوں میں سجے ہوئے تھے اور دوسری ضروری اشیاء کے ذریعے ان میں نہایت ذوق سے ایک خفیف سا ربط پیدا کر دیا گیا تھا!

"بہت ستھرے ذوق کی مالک ہو!" میں نے وہاں پڑے ہوئے نرم دیوان پر بیٹھتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔

"تمہارے پاس سے واپسی کے بعد ڈیلکارڈو میں پولیس کی ایک تحقیقاتی جماعت سے سامنا ہوچکا ہے!" وہ میری بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

"وہ کن خطوط پر سوچ رہے ہیں؟"

"اس کی موت کو ریس میں دو ڈرٹ والے دو گھوڑوں کی ہلاکت سے ملا رہے ہیں۔ اس کے گھوڑوں کے ٹرینر نے بتایا ہے کہ میگورا ایک فون کال وصول کرنے کے بعد کسی ایسے شخص سے ملنے گیا تھا جو گھوڑوں کی ہلاکت کے بارے میں معلومات معقول معاوضے پر فراہم کرنے کے لئے تیار تھا!"

"اگر وہ ان خطوط پر کام کر رہے ہیں تو تمہارے پاس کس لئے آئے تھے؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"رسمی خانہ پُری!" اس نے لاپرواہی سے کہا۔ "تحقیقاتی جماعت کا سربراہ سوالات سے زیادہ معذرت میں ہی مصروف رہا!"

"دوبارہ آمد کی راہ ہموار کر رہا ہوگا!"

"تم ان نکیلے تبصروں سے گریز نہیں کرسکتے!"

"میں نے محض اپنا خیال ظاہر کیا تھا!"

"میگورا کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہے!" وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ "اخبارات نے اس بارے میں خصوصی ضمیمے چھاپے ہیں!"

"اخبارات والے عموماً پولیس سے زیادہ ذہین ثابت ہوتے ہیں!" میں نے اس کی طرف جھک کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مجرم تمہاری طرح چالاک ہو تو ساری ذہانت دھری رہ جاتی ہے۔ ویسے بُزدل پولیس افسر کے بارے میں تمہارا قیاس درست نکلا، خبروں میں دُور دُور تک کوئی تذکرہ نہیں تھا!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارے حلقے میں میگورا کی موت پر کیا ردِعمل پایا جاتا ہے؟"

"میرا حلقہ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"مادام لواری کے گرگوں کی بات کر رہا ہوں!"

"دیکھا جائے تو سب ہی خوش ہوں گے!" وہ بولی۔ "میگورا بہت سفاک اور خود غرض شخص تھا۔ میرے پاس تین شہروں کے لوکل آپریٹرز کے فون آچکے ہیں، انہیں میگورا کی موت سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اب چیف آپریٹر کون بنے گا؟"

"اگر مادام لواری نے یہ طوق تمہارے گلے میں لٹکا دیا؟"

"میں تو اب گروہ کو ہی خیرباد کہنے کا تہیہ کر چکی ہوں، اور مادام لواری ویسے بھی کسی ڈرپوک لڑکی کو سربراہی سونپنے کی ہمت نہ کرسکے گی۔" وہ بولی۔ "دیکھا جائے تو میں نے اتنے عرصے محض میگورا کے سہارے اپنا کام چلایا ہے!"

"اس کار کے بارے میں کیا خبریں ہیں جس میں تم نے مجھے دیکھا تھا؟" میں ماحول بدلنے سے قبل ہی اس سے ساری باتیں معلوم کر لینی چاہتا تھا!

میرا سوال سُن کر وہ بے ساختہ ہنس پڑی "جیسے تم نے بے ہوش کیا وہ ففمائیہ کا ایک معزول افسر تھا۔ اس نے اپنی کوتاہی پر پردہ ڈالنے کے لیے تمہاری پھرتی، دلیری اور سینہ زوری کے افسانے تراشے ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق وہ مجرم سے مقابلہ کرتا ہوا سو، ڈیڑھ سو گز دُور نکل گیا جہاں آخر کار مجرم اس پہ غالب آ گیا اور اسے بے ہوش کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا!"

"مقابلے کے ساتھ تو اسے مجرم کا حلیہ بھی بتانا پڑا ہوگا!"

"اس نے بڑی ڈھٹائی سے حلیہ بتایا ہے، مگر مجرم کے چہرے پہ مکمل نقاب کی موجودگی کا ذکر کر کے خدوخال سے جان بچا گیا۔"

"یہ بہت اچھا ہُوا، وہ خبطی پولیس والوں کا دماغ خراب کر ڈالے گا! ایسے بے ایمان گواہ مقدر ہی سے پیدا ہوتے ہیں!"

میگورا والے معاملے میں اپنے تحفظ کا یقین ہو جانے کے بعد میرے وجود پہ چھایا ہُوا بے نام سا اعصابی اضطراب یک بیک ختم ہو گیا اور مجھے ہیلن نوسس کے پیکر میں حد سے زیادہ کشش نظر آنے لگی۔

وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا۔ آتشیں مشروب معدے میں پہنچ کر ذہن میں سرور پیدا کرتا رہا۔ پھر گوشت کے تلے ہوئے گرم گرم اور نمکین پارچوں سے شکم پُری کی گئی جس کے بعد دوبارہ جام و سبو کی سمت رو محفل جم گئی۔

ہیلن نوسس حسین تھی، مگر اس روز اس نے خود کو زیب و زینت کے سہارے حسین تر بنایا ہُوا تھا اور جب میری نگاہیں خمار کا لطیف سا بوجھ محسوس کرنے لگیں تو نشے میں بہکی ہوئی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے والی ہیلن نوسس مجھے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق نظر آنے لگی۔

ساقی گری کرتے کرتے ہیلن کے حواس جواب دے گئے تو میں نے اس کا کام بھی خود سنبھال لیا اور صرف کام ہی نہیں بلکہ ہیلن کو بھی سنبھالنا پڑا۔

خواب گاہ کے بدلتے ہوئے اندھیرے ماحول میں اس وقت میرا ذہن اپنے پروں کو سمیٹ کر وہیں تک محدود ہو چکا تھا!

مجھے کچھ علم نہ ہو سکا کہ میں کب سویا اور کب جاگا۔ اور اگر سویا بھی تو خواب میں آگ اگلتے ہیولوں کی ہولناک بیکار ہی دیکھتا رہا۔ جو موقع ملنے پہ ایک دوسرے کو نگل جانے کے لیے بے تاب تھے، مگر ان میں سے کسی کو کامرانی حاصل نہ ہو سکی اور وہ لڑتے لڑتے نڈھال ہو کر اندھیرے میں ہی کہیں تحلیل ہو گئے۔

اگلی صبح گھر پہ عدنان فاخوری سے ملاقات ہوئی تو وہ خوش اور مسرور نظر آ رہا تھا!

"ناشتہ تو ضرور کرو گے!" اس نے معانقے کے بعد پُر یقین لہجے میں سوال کیا۔

"آج ڈیسکا روڈ کا ناشتہ چکھا ہے!" میں نے صوفے پر جوتوں سمیت دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "تم سُناؤ، بہت خوش نظر آ رہے ہو!"

"دوستوں کی کامیابی پہ خوش ہی ہوتا ہوں!"

"اب تک ملنے والوں میں تم سب سے زیادہ چرب زبان فلسطینی ہو!" میں نے ہنستے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"فلسطینی، عربوں سے باہر عام طور پہ شرمیلے اور کم گو ثابت ہوتے ہیں، اس اعتبار سے شاید تمہارا الزام درست ہے!"

"تم دوسری عادتوں میں بھی مبتلا ہو!"

"نفس تو ہر ایک کے ساتھ لگا ہُوا ہے!"

"تحریک کے لیے کام کرنے والوں میں بے نفس لوگ بھی دیکھے ہیں میں نے!"

"ان کے ساتھ کوئی مجبوری ہو گی!" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "بہت سے لوگ اپنی کمزوری کو پاکیزگی کی آڑ میں چھپا لیتے ہیں!"

"زندگی کے ان پہلوؤں پر بڑی گہری نظر رکھتے ہو!"

"سچ پوچھو تو میں ہر وقت بدی کا متلاشی رہتا ہوں۔ نیکیاں تو ہر جگہ خودبخود پوری قوت سے ابھر کر خود کو متعارف کراتی ہیں!" اس کے لبوں پہ عجیب سی پُراعتماد مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"کسی کچے ذہن کے لڑکے یہ سُن لیں تو تمہارا فلسفہ ان کی زندگیاں برباد کر دے گا!" میں نے زچ آ کر کہا۔

"تمہارے بارے میں بھی میں اپنے فلسفے پر کاربند رہا اور آخر کار آج تم نے خود کو منوا لیا!" اس نے کہا۔

"اگر تمہارا اشارہ ہیلن کی طرف ہے، تو اسے بھول جاؤ میں ایسے حوالوں سے خود کو منوانا نہیں چاہتا!" میرا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔

"غصہ ہو گئے!" وہ قریب آ کر میرے پیٹ پہ ہاتھ مارتے ہوئے ہنسا، پھر جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ آج ہی خالد عبدالفتاح کی طرف سے موصول ہوا ہے۔ میں نے اس سے تمہارے کوائف کی تصدیق طلب کی تھی!"

میں خود کو یک بیک عدنان کے سامنے حقیر محسوس کرنے لگا۔ گو اس نے شروع سے ہی میری مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور ہر طرح میری مدد کرتا رہا تھا مگر اس نے میرے کوائف کی تصدیق کر کے میری انا کو شدید ٹھیس پہنچائی تھی۔

اگر اسے مجھ پہ کامل بھروسہ نہیں تھا اور اس نے خالد عبدالفتاح سے تصدیق ضروری سمجھا تھا تو وہ اس کی اپنی ذمہ داری تھی، مگر اس توثیق کے باوجود اس کا جتانا مجھے سخت ناگوار گزرا تھا۔ اگر خالد عبدالفتاح میرے بارے میں کسی موہوم سے شبہ کا بھی اظہار کرتا تو شاید عدنان کو یہ حق ہوتا کہ وہ مجھے خالد کی رائے سے آگاہ کر دے!

اس شخص نے ایک ہی فقرے میں میری نگاہوں میں اپنی قدر کم کر دی تھی!

میں غصّے اور صدمے کے ملے جُلے اثرات کے تحت صوفے سے اٹھ گیا۔ میں نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ سے لفافہ لینے کی زحمت نہیں کی تھی!

"کیا ہُوا؟" مجھے یوں اٹھتے دیکھ کر اس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔ شاید میرے چہرے کے گھمبیر تاثرات سے اس نے صورت حال بھانپ لی تھی!

"میں جا رہا ہوں!" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تم نے تصدیق کر لی کہ تمہارے پاس صحیح آدمی پہنچا ہے، مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں ٹھیک آدمی سے ہی ملا ہوں! اب اس وضاحت کے بعد ہماری ملاقات ہو گی!"

"مگر کیوں؟" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر میری راہ میں حائل ہو گیا۔ "آخر اچانک اس وضاحت کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"مسٹر عدنان!" میں نے اسے گھورتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "اگر تم خود مختار رہو تو میں بھی اسی زمرے میں آتا ہوں۔ ایسے بحث کر کے تم صرف تلخی میں ناگوار اضافہ ہی کر سکو گے، بہتر یہی ہے کہ مجھے جانے دو!"

"جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ!" وہ اُداس لہجے میں کہتا ہُوا میرے راستے سے ہٹ گیا۔ "میرا مقصد تمہیں کچھ جتانا نہیں تھا۔ اگر یہ بات ہوتی تو میں بے چون و چرا تمہارے ہر حکم کی تعمیل نہ کرتا!" اس بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا!

"پھر کیا مقصد تھا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"تم نے تار دیکھا ہی نہیں!" وہ پُرملال لہجے میں بولا۔ "ویسے تمہارے لیے تو شاید مطلب اخذ نہ کر پاتے کیونکہ وہ خفیہ زبان میں ہے، برسلز سے جس طرح نکلے، اس کی بنا پہ خالد پریشان تھا، اسے علم نہیں تھا کہ تم کہاں اور کس حال میں ہو۔ میں تو تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے اپنی دانست میں تصدیق طلب کرنے کے لیے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ خالد کے لیے بہت بڑا سہارا ثابت ہُوا کیونکہ اُسے تمہاری خیریت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم میرے پاس مقیم ہو۔ اس کے جواب میں تمہاری بیوی کے بارے میں ایک اہم پیغام بھی دن سے پڑا ہُوا تھا جو وہ تم تک پہنچانا چاہتا تھا!"

"کہاں ہے؟ کیا ہے وہ پیغام؟" سیتا کا ذکر آتے ہی میں ایکدم بے چین ہو گیا اور عدنان کے ہاتھ سے لفافہ جھپٹ لیا۔

لفافے میں تار کی صورت میں ایک مختصر سی عبارت درج تھی:

"نمونہ دیکھ کر خوشی ہوئی مال ناصر کو بھیج دو!"

"یہ کیا ہے؟" میں نے وہ دو سطریں پڑھ کر سر اٹھایا تو ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ عدنان فاخوری کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اور وہ ویران نظروں سے میری جانب دیکھے جا رہا تھا۔

"تم رو رہے ہو عدنان!" میں نے اس کے قریب بیٹھ کر مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے معاف کر دو میرے دوست!" وہ رقت زدہ آواز میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میرے ڈرامائی انداز سے تمہاری دلآزاری ہوئی۔"

"میں تو خود تم سے معذرت خواہ ہوں کہ بلاوجہ تمہیں غلط سمجھ بیٹھا۔" میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میں صرف برابری کی دوستی کا قائل ہوں۔ میرے تھکے ہوئے ذہن میں وہم آ گیا تھا کہ تم مجھ پہ اپنی برتری جتانا چاہ رہے ہو!"

"میں تمہاری کیا برابری کروں گا، میں تو تمہارے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوں!" وہ سراپا انکسار بنا ہُوا تھا!

"جو کچھ ہُوا اسے بھول جاؤ اور یہ بتاؤ کہ اس تار میں میرے لیے کیا خفیہ پیغام بھیجا گیا ہے؟" میں نے تکدر کے خاتمے کے لیے کہا۔

"تمہیں بن غازی بھیجنا ہے!" اس نے آہستہ سے کہا۔

اس وقت فضا انتہائی نازک اور جذباتی ہو گئی تھی جس میں سراسر میرا قصور تھا۔ میں نے بہ وقت تمام عدنان فاخوری کو منایا اور پھر اس کے ساتھ پینے بیٹھ گیا۔

دو تین گلاس خالی کرنے کے بعد کہیں ماحول اس قابل ہُوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ بے تکلفی سے بات کرنے لگے۔

سیتا کے بارے میں عدنان نے جو کچھ کہا، وہ اس کے اندازے پہ مشتمل تھا اور میں نے خود بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میرے بن غازی جانے کا مقصد محض مجھے اپنی عزیز از جان سیتا سے ملوانا ہی رہا ہوگا۔

"اب میری روانگی کا کیا ہوگا؟" موقع پا کر میں نے اپنے کام کی بات چھیڑ دی۔

"وہ بندوبست میری ذمہ داری ہے!"

"مجھے پتہ چلا تھا کہ تم تنظیم کے رکن نہیں ہو، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کسی باقاعدہ رکن سے زیادہ ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہو۔"

"تنظیم کے لیے تو کام ہر شخص سے لیا جا سکتا ہے!" وہ مسکرا کر بولا۔ "مگر اس کی رکنیت ایک اعزاز ہے جو مجھے میری کوتاہیوں کی

وجہ سے نہ مل سکا!"

"شاید ایتھنز بلکہ یونان میں تم ہی تنظیم کے مفادات کی دیکھ بھال کرتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پھر رکنیت سے کیوں محروم ہو؟"

"تم پوچھے بغیر نہیں مانو گے؟" وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "تنظیم کی باقاعدہ رکنیت حاصل کرنے سے پہلے ہر امیدوار کو حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ عمر بھر شراب اور دوسری تمام اخلاقی آوارگیوں سے دور رہنا پڑے گا، مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں تو زندگی کے ایک ایک لمحے سے مسرتیں نچوڑ لینے پر یقین رکھتا ہوں!"

"یعنی مقصد تمہارے لئے ثانوی درجہ رکھتا ہے؟"

"یہ الزام نہ دو!" وہ جلدی سے بولا۔ "مقصد تو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے، ورنہ اتنی ذمہ داریاں قبول نہ کرتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنا فاضل وقت اپنی مرضی کے مطابق مسرور رہ کر گزارنا چاہتا ہوں۔"

"آج تم نے میری ایک بڑی الجھن حل کر دی!" میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے ممنون لہجے میں کہا۔

"تو کیا اس بارے میں بھی کوئی الجھن تھی تمہاری؟"

"میں دیکھتا آ رہا تھا کہ تنظیم کے ارکین عام طور پر خرافات سے گریز کرتے ہیں جب کہ تم ان ہی کو قرار رکھتے ہو۔ یہ تضاد میرے ذہن میں اکثر چبھتا تھا!" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

اس روز باتوں کا دور بہت طویل ہوتا مگر عدنان کو ہوٹل جانا تھا، اس لئے وہ معذرت کر کے اٹھ گیا۔

روانہ ہونے سے پہلے اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میری روانگی کے بارے میں بھی کام کا آغاز کرے گا۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا لہٰذا عدنان کے جاتے ہی لمبی تان کر سو گیا۔ میں شاید شام ڈھلے بھی بیدار نہ ہوتا مگر ٹیلی فون کے مسلسل شور نے مجھے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔

ریسیور اٹھانے پر دوسری جانب سے ہیلن فوس کی سریلی آواز سنائی دی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ سو رہے تھے۔ کافی دیر تک گھنٹی بجتی رہی ہے!"

"فون تنگ نہ کرتا تو شاید اب بھی سوتا رہتا!"

باہر نکلنے کا ارادہ ہے؟"

"نہا دھو کر سوچوں گا!" میں نے کہا۔ "ویسے میرے پاس سواری کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے!"

"تم نہا لو۔ اتنی دیر میں میں آ جاتی ہوں!"

اور میں واقعی ریسیور کریڈل پر ڈال کر غسل خانے میں جا گھسا۔ تھکے ہوئے اعصاب کے لئے گرم پانی اس قدر فرحت انگیز ثابت ہوا کہ غسل ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا اور اس دوران میں ہیلن آ پہنچی۔ کیونکہ اس بار فون کی گھنٹی کی بجائے ڈور بیل بجی تھی!

میں عجلت میں غسل خانے سے نکلا اور دروازہ کھول دیا۔ لا... ہیلن میری ہیئت کذائی پر دل کھول کر ہنستی ہوئی اندر آ گئی۔ قرینے کا لباس تبدیل کرنے تک وہ سکون سے میری منتظر رہی اور جب میں اس کے پاس واپس آیا تو اس نے شام کے پروگرام کی بات چھیڑ دی۔

"پروگرام ضرور بنے گا، مگر بعد میں!" میں نے ایک فیصلے کے زیر اثر مسکراتے ہوئے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ میرے لئے ایک عدد پاسپورٹ فراہم کر سکتی ہو!"

"پاسپورٹ؟ کس لئے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تم سوال بہت کرتی ہو، جرح کرنے سے عورتوں کے حسن میں کمی آ جاتی ہے!" میں نے اسے چھیڑنے کی نیت سے کہا۔

"مگر میں مقصد جانے بغیر کیا کر سکتی ہوں۔ ویسے تو تم میرے کسی پرانے پاسپورٹ پر بھی اپنی تصویر چسپاں کر سکتے ہو!" وہ قہقہہ مار کر بولی۔

"پاسپورٹ صرف سفر کے لئے ہی درکار ہوتا ہے!"

"تو تم جا رہے ہو؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"چند روز کے لئے!" میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے جھوٹ بولا۔ "یونان سے باہر ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے!"

"برسلز کیسے آئے تھے؟"

"بغیر پاسپورٹ کے سفر کیا تھا۔ ستارے اچھے تھے کہ ہر جگہ سے صاف نکلتا چلا گیا، ورنہ اس وقت کسی قید خانے میں ہوتا!"

"تو دوبارہ وہی تجربہ کر ڈالو!"

"ضروری تو نہیں کہ ہر بار قسمت ساتھ دے جائے!" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم میرا کام کر سکتی ہو یا نہیں؟"

میں نے اس کے بارے میں شروع ہی میں ایک اندازہ قائم کر کے اپنے بارے میں فلسطینیوں سے مراسم کی نوعیت اور سیتا کے نام کے علاوہ سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ لڑکی میری توقعات پر پوری اتری تھی۔ لہٰذا پاسپورٹ کے بارے میں بھی اس سے بات کر لینے میں میں نے کوئی مضائقہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ ایک مشہور ہوٹل کی خوبرو مالکن تھی اور امکان بھی تھا کہ ڈیسکارڈو آنے والوں میں اس محکمے کا کوئی رکن بھی شامل ہو!

"اس مرتبہ شاید ملوام بواری کے خوف سے بغیر پاسپورٹ کے بھاگے ہو گے!" ہیلن ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی!

"جو چاہو سمجھ لو!"

"پاسپورٹ کے محکمے کے دو افراد باقاعدگی سے ڈیسکارڈو آتے ہیں، ان میں سے ایک تو محض مجھ سے بات کرنے کے خبط میں مبتلا ہے۔ میں پاسپورٹ کے لئے کہوں گی تو وہ انکار تو نہ کر سکے گا مگر ... پاگل بن جائیگا!

... بکرو۔ بعد میں اپنے دوست کی حیثیت سے میرا تعارف ... اس کا خبط سرے سے غائب کرا دوں گا!"

"کل اس سے بات کروں گی!"

"آج ہی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"اگر معاملہ اس قدر اہم ہے تو لاؤ، تصاویر دے دو۔ وہ ... ہوا تو فوراً ہی اسے پکڑا دوں گی!"

تصاویر نہ ہونے کی وجہ سے معاملہ اگلے روز پر ٹالنا پڑ گیا اور ... پھر ہم دونوں مکان مقفل کر کے باہر روانہ ہو گئے۔

راستے میں ہیلن کی زبانی معلوم ہوا کہ میگورا کے قتل کے معاملے میں پولیس اس بزدل سورما پر بھرپور انحصار کر رہی تھی جو قاتل کو دیکھنے کا واحد شخص ہونے کا خود ساختہ دعویدار تھا اور اسی کی شہ پر ایسے بے گناہ شہری حوالاتوں میں پہنچا دیئے گئے تھے جن کے حلیے اس جھکی کے بیان سے مطابقت رکھتے تھے۔ جب کہ میری جھلکی دیکھ کر بھاگ جانے والا پولیس افسر بدستور خاموش تھا!

رات کو عدنان سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ بن غازی ... ٹیلکس پر رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہاں ایئر پورٹ پر طالب نامی ایک مقامی شخص میری راہ نمائی کے فرائض سنبھالنے والا تھا!

سفری دستاویزات کے بارے میں عدنان کا ارادہ جعلسازی کا تھا۔ مگر جب میں نے اصلی کاغذات پر اصرار کیا تو کافی سوچ بچار کے بعد اس نے بھی ہیلن سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا اور پھر وہ بہت خوش ہوا کہ میں پاسپورٹ کے فوری حصول کے لئے ہیلن کو شیشے میں اتار چکا تھا!

میرے لئے اگلے دو روز انتہائی بے چینی کے عالم میں گزرے۔ ہیلن کی وجہ سے شامیں ذرا مصروف ہو جاتی تھیں مگر سیتا سے ملنے کی امید پیدا ہونے کے بعد ہیلن میرے لئے اپنی کشش کھو بیٹھی تھی!

تیسرے روز ہیلن نے رینی فاس کے نام سے میرا پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا۔ اس میں میری تمام کوائف وہی درج تھے جو ہیلن ایک سادہ کاغذ پر لکھ کر لے گئی تھی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ درخواست وغیرہ کے بغیر ہی وہ پاسپورٹ کیسے جاری کر دیا گیا مگر ہیلن کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو ساری حیرت رفع ہو گئی۔ اس کے چہرے پر مچلتی ہوئی دعوت انگیز مسکان اچھے اچھے مردوں کے ایمان خطا کر دینے کے لئے کافی تھی!

اگلے روز عدنان نے ٹیلکس پر ہی بن غازی پیغام بھیج کر طالب سے پروگرام طے کیا اور اسی شام میں نے ڈیسکارڈو میں ہیلن کے ہمراہ الوداعی ڈنر کھایا۔ وہ اس خیال میں تھی کہ ہم چند روز بعد پھر یکجا ہوں گے۔ مگر بعد میں اس سے بچھڑ جانے کے تصور سے اپنا دل بھاری محسوس ہو رہا تھا!

دوسرے روز میں نے اپنا مختصر سا رخت سفر سمیٹ لیا۔ عدنان کے ساتھ ہی ہیلن بھی مجھے الوداع کہنے آئی ہوئی تھی!

میں نے عدنان کو بتا دیا تھا کہ میں نے چند روز میں واپسی کا پروگرام ظاہر کر کے ہیلن سے پاسپورٹ بنوایا تھا اور اس آخری ملاقات میں بھی آپس کی گفتگو میں عدنان کو یہی تاثر دیتا رہا کہ میری لامتناہی غیر حاضری کی صورت میں ہیلن عدنان سے بدظن نہ ہو جائے!

خدا خدا کر کے وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب میں ایئر پورٹ کی عمارت سے فارغ ہو کر پورے اعتماد کے ساتھ کنکریٹ کے رن وے پر آگے بڑھا اور دیگر مسافروں کے ساتھ لاؤنج کے قریب کھڑے ہوئے طیارے میں سوار ہو گیا!

طویل اور تھکا دینے والی پرواز کے بعد جب طیارے میں کپتان کی آواز گونجی تو اونگھتے ہوئے مسافروں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی!

اس وقت طیارہ بن غازی کے نواح میں موجود تھا، اور مسافروں کو حفاظتی بند باندھنے کی ہدایت دی جا چکی تھی!

طیارے نے اترنے کے لئے بلندی کم کرتے ہوئے شہر کا چکر لگایا تو جہاز کی کھڑکی میں سے شہر کی روشنیوں کا منظر بہت بھلا معلوم ہوا۔ رات کے وقت بڑے شہروں پر نیچی پرواز ویسے بھی حسین ہوتی ہے مگر سیتا کے حوالے سے بن غازی میرے لئے حسین تر ہو چکا تھا۔

مدت سے مجھ سے بچھڑی ہوئی سیتا اسی جگمگاتے شہر کے کسی حصے میں ہر آہٹ پر کان لگائے میری منتظر تھی اور میں پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ طالب سے ملاقات ہوتے ہی براہ راست سیتا کے پاس جاؤں گا۔

وہ مجھ سے میرے وطن کی سرحدوں سے چند سو میل دور بچھڑی تھی اور اب طویل فراق کے بعد ملاقات وطن سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی سرزمین پر ہونے والی تھی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ میں بہت جلد اسے ساتھ لے کر اپنے وطن لوٹ سکوں گا جہاں میں اپنے خوابوں اور آرزوؤں کے مطابق زندگی گزار سکتا تھا۔

وہ ہمالیہ کی برف پوش وادیوں میں پہلی بار نظر آئی، تو لباس کے تصور سے ناآشنا ایک وحشت زدہ حسین ہرنی تھی جو اپنی آوازوں اور اشاروں سے ان وادیوں میں بسنے والے بندروں

اور بستگوؤں پر حکمرانی کرتی تھی۔

انسانی تہذیب سے دور حیوانی معاشرے میں پروان چڑھنے والی سرکش سیتا کو میں اپنی چاہت بنا کر شہروں کی جانب چلا تو میں نے اسے لباس کے ساتھ ہی زبان سے بھی آشنا کیا اسے نت نئے الفاظ سکھائے اور پھر ہم دونوں حالات سے خوفناک جنگیں لڑتے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔

ہم دونوں ہر طرف سے لٹیروں کے نرغے میں رہتے۔ کچھ بیش قیمت پارس پتھر کی گھات میں رہتے۔ اور کچھ لوگوں کی نگاہیں سیتا پر مرکوز رہتیں جو میرے لئے پارس سے زیادہ عزیز تھی!

ان خون آشام درندوں کی ٹولیاں مجھ سے نہ سیتا کو جدا کر سکیں اور نہ پارس پتھر کو! مگر جب مقدر کی گردش کا آغاز ہوا تو سیتا خود مجھ سے روٹھ کر کہیں گم ہو گئی اور پارس پتھر میں اپنے ہاتھوں سے انبالہ کے راجہ ہوٹل میں چھپا کر چھوڑ آیا۔

سیتا کی تلاش کی مہم کے ساتھ ہی میں اپنی بقا کے لئے بھی لڑتا رہا کیونکہ حالات نے چاروں طرف سے میرے لئے خطرے پیدا کر دیئے تھے۔

میں ہر مرحلہ پر اپنی بقا کی جنگ جیتتا رہا مگر سیتا کی تلاش کے ہر مرحلے پر ناکامیوں کو اپنے قدموں کی زنجیر پایا اور اب ایک طویل مدت کے بعد وہ مبارک ساعت آنے والی تھی جب میری سیتا دوبارہ میرے سامنے ہوتی۔

سیتا میرا پندار تھی اس پر مجھے شروع سے ناز تھا مجھے پورا یقین تھا کہ اس نے وحشت اور تنہائی کا وہ پُرہول دَور نہایت بے جگری سے گزارا ہو گا وہ متمدن علاقوں میں ایک طویل عرصہ گزار چکی تھی اور میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کن اطوار کی عادی بنی ہو گی میرے ذہن میں اس کی تصویریں بنتی رہیں اور بکھرتی رہیں اور طیارہ بتدریج زمین سے قریب تر ہوتا رہا۔

پھر اچانک جہاز کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا اور وہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ اسی کے ساتھ میرے خیالات کا سارا تسلسل ٹوٹ گیا۔

جہاز رکا اور میں مسافروں کی قطار میں شامل ہو کر نشستوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نکاسی کے راستے پر پہنچا تو سب سے پہلے میری نگاہ رن وے کے ایک حصے میں کھڑی ہوئی چند فوجی گاڑیوں پر پڑی پھر مجھے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہوئے چاق و چوبند فوجی بھی نظر آئے جو شاید پہرے پر مامور تھے۔

سیڑھیوں سے اترتے ہی تمام مسافروں کو بس میں سوار کر دیا گیا۔ میں نے بس میں بیٹھتے ہوئے امید بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا مگر وہاں گراؤنڈ اسٹاف کے علاوہ کوئی ایسا آدمی نظر نہ آیا جسے میں طالب سمجھ سکتا۔

رن وے پر عجیب سا سناٹا طاری تھا اور تقریباً ہر فرد فوجی بکھرے ہوئے تھے۔ عمارت کی طرف بھی کوئی چہل پہل نہیں تھی پھر میں نے اس گفتگو پر کان لگا دیئے جو بس کے عرب مسافر اور بس ڈرائیور کے درمیان ہو رہی تھی۔

لاؤنج تک پہنچنے سے پہلے میں یہ معلومات اخذ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس رات ایئرپورٹ پر سخت ترین حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے وہ بے وقتی پسلی ہوئی ہے۔

اس رات کسی دوست ملک کا ایک اہم وفد بن غازی پہنچنے والا تھا جس کی حفاظت اور راز داری کی خاطر ایئرپورٹ پر مسلسل کرفیو نافذ تھا اہم ترین خدمات انجام دینے والوں کے علاوہ کسی کو اَن ویز پر آنے کی اجازت نہیں تھی بن غازی سے روانہ ہونے والی تمام پروازیں غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دی گئی تھیں اور آنے والی پروازوں کو بھی محض اس شرط پر اترنے کی اجازت دی جا رہی تھی کہ انہیں ہنگامی صورتِ حال کے خاتمے سے قبل دوبارہ پرواز کی اجازت نہیں ملے گی۔

معاملہ اس قدر اہم تھا کہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وفد کس ملک سے آنے والا تھا البتہ آنے والوں کے استقبال کے لئے اعلیٰ ترین حکام ایئرپورٹ پر موجود تھے۔

میں مسافروں کے ہمراہ بس سے اتر کر امیگریشن ہال میں داخل ہوا وہاں بھی دروازے پر دو مسلح فوجی موجود تھے تاکہ کوئی امیگریشن ہال میں گھسنے کے بجائے دائیں بائیں نہ کھسک جائے اور اندر والا عملہ بھی بہت زیادہ چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

میں نے پورے ہال کا تفصیلی جائزہ لے ڈالا مگر طالب وہاں بھی نظر نہ آیا۔ ہال میں صرف مسافر تھے یا باوردی اہلکار۔ طالب کی غیر حاضری اس وقت مجھے پہلی بار کھٹکی اور میں اس کے نہ ملنے کی صورت میں اپنے اقدامات کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ایک قطار میں سب سے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

قطار تیزی سے آگے سرکتی رہی کھڑکی کے پیچھے بیٹھا ہوا افسر نہایت پھرتی سے اپنا کام نمٹانے میں مصروف تھا۔

اور پھر میں کھڑکی پر تنہا رہ گیا۔

اس نے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ لے کر تیزی سے اس کی ورق گردانی کی پھر ایک صفحہ کھول کر اس پر مہر ثبت کر دی۔

پاسپورٹ بند کر کے اس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں تو بے اختیار میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کی نگاہوں میں نشتر کی سی چبھن تھی۔

"تم یونانی ہو؟" اس نے ایک مرتبہ پھر پاسپورٹ پر نظر ڈالتے ہوئے شکستہ انگریزی میں سوال کیا۔

"ہاں، میں یونانی ہوں" میں نے انگریزی میں اس کی دشواری کو سمجھتے ہوئے شستہ عربی میں جواب دیا۔

اس کی سیاہ آنکھوں میں شبہ کا سایہ گہرا ہو گیا "عربی کیسے سیکھی ہے؟" اس بار اس نے بھی عربی میں ہی سوال کیا تھا۔

"شوقیہ سیکھی تھی" میں نے اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس کیا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" اس نے میرا پاسپورٹ داہنے ہاتھ میں دبا کر اپنی جانب کھینچ لیا اس دوران میں برابر والی کھڑکی والا بھی فارغ ہو کر اسی کے پاس آ گیا۔

"تفریحاً ___"

"واللہ ___" دوسرا شخص میرا جواب سن کر طنزیہ انداز میں بولا۔ "لیبیا میں ریت، تیل اور اونٹ کے علاوہ کیا ہے جو دیکھو گے؟"

"میں نے سنا ہے کہ عرب مہمان نواز ہوتے ہیں" مجھ پر اس کے خوف کے ساتھ غصہ بھی طاری ہونے لگا تھا لہٰذا میں نے بہت ہی دو چبھتی ہوئی بات کہہ ہی ڈالی۔

"جسے مہمان سمجھ لیں اس کے جوتے بھی اٹھاتے ہیں" وہی شخص بولا۔ "اگر کوئی ڈاکو گھر میں گھس کر مہمانی کا دعویٰ کرے تو اسے کون مانے گا"

"تم میری توہین کر رہے ہو!" میں نے احتجاج کیا "میرے کاغذات درست ہیں، آخر مجھے اس کھڑکی پر کیوں روکا گیا ہے؟"

"اس سے بحث نہ کرو!" پہلے شخص نے خشک لہجے میں دوسرے سے کہا پھر وہ آہستہ آہستہ بات کرنے لگے مگر ان کی سرگوشیاں پھر بھی میرے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔

مجھے روکنے والے کا خیال تھا کہ میں کوئی جاسوس تھا۔ جو یونانی سیاح کے بھیس میں جعلی کاغذات کے سہارے لیبیا میں گھس رہا تھا۔ جاسوس ہونے کی دلیل یہ تھی کہ مقامی ماحول میں ضم ہونے کے لئے میں نے عمدہ عربی سیکھی ہوئی تھی اور جعلی کاغذات اس لئے تھا کہ میرے خدوخال غیر یونانی تھے جبکہ پاسپورٹ پر شہریت یونانی درج تھی۔

آپس کے مشورے سے نمٹ کر پہلا شخص تلخ لہجے میں میری طرف متوجہ ہوا "تم سامنے بیٹھ جاؤ، تھوڑی دیر میں فیصلہ ہو گا"

"باہر کوئی میرا منتظر ہو گا مجھے جلدی فارغ کر دیں!"

"بیٹھ جاؤ" وہ کڑک کر بولا "باہر کوئی نہیں ہو گا چار گھنٹے ایئرپورٹ آنے والے سارے راستے بند پڑے ہیں"

"دس پانچ دینار بھی دے سکتا ہوں" تنگ آ کر میں نے سرگوشیانہ لہجے میں بارہا آزمایا ہوا نسخہ دہرایا۔

میرے الفاظ پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ ان دونوں نے اودھم مچا دیا وہ چیخ چیخ کر مجھے رشوت پیش کرنے کی جسارت پر بدترین لعن طعن کر رہے تھے۔

شور سن کر ایک فوجی افسر دو حوالوں سمیت دوڑتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ ہر شخص کی ملامت آمیز نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

"کیا ہوا؟ یہ کیسے رشوت دے رہا تھا؟" فوجی افسر نے کھڑکی کے پیچھے والوں سے سوال کرتے ہوئے مجھے یوں گھورا جیسے کچا چبا جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

"مشکوک آدمی ہے" وہ دونوں ہی ساتھ ساتھ بولنے لگے "جاسوس معلوم ہوتا ہے، ہمیں کلیئرنس ...... دینے کے لئے دس پانچ دینار کی رشوت دے رہا تھا"

"اس کے تھیلے کی تلاشی لو" کسی کی حقارت آمیز آواز ابھری۔

"میں بالکل ......" میں نے زبان کھولنی چاہی مگر فوجی افسر نے پیر پٹخ کر مجھے خاموش کر دیا۔

"بکو مت ___" پھر وہ اپنے حوالوں سے مخاطب ہو گیا۔ "اس وقت تلاشی کے چکر میں نہ پڑو اسے لاک اپ میں ڈال دو، صبح دیکھیں گے"

میں نے بہت احتجاج کیا مگر میری ایک نہ سنی گئی۔ فوجی افسر اپنا حکم صادر کر کے واپس چلا گیا میرے پاسپورٹ پر لگی ہوئی مہر منسوخ کر کے پاسپورٹ مجھے تھما دیا گیا۔ اور دونوں فوجی مجھے رائفلوں کی نالوں سے ایک طرف دھکیلنے لگے۔

"سنو! ذرا میری بات سنو!" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بے بسی کے عالم میں کہا "یہاں طالب نام کا کوئی شخص ہے؟ وہ مجھ سے تھوڑا سا واقف ہے!"

"میں خود طالب ہوں!" ان دونوں میں سے ایک فوجی بولا۔ "میں تو تمہیں نہیں جانتا، چلو آگے بڑھو!" اس کی رائفل کی نال ایک مرتبہ پھر میری پسلیوں میں گھسنے لگی۔ اور مجھے خون کے گھونٹ پی کر خاموشی سے پیش قدمی کرنی ہی پڑ گئی۔

"حرکت کر!"

"یا اللہ!"

وہ دونوں وقفے وقفے سے کرخت آوازوں میں غرا غرا کر میری پسلیوں میں اپنی رائفلوں کی نال سے ٹھوکے مارتے جا رہے تھے، حالانکہ میری رفتار نہایت مناسب تھی اور میں اپنے رویّے سے خفیف سی مزاحمت کا بھی اظہار نہیں کر رہا تھا مگر شاید وہ دونوں ہی تحکم کے غیر ضروری اظہار کے عادی تھے!

امیگریشن ہال سے نمٹنے کے بعد شاید تمام مسافروں کو کسی سرکاری سواری میں کہیں روانہ کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہاں عملے اور محافظوں کی گنی چُنی تعداد کے سوا کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔

مسافروں کو نامعلوم مقام یا شاید کسی قریبی قیام گاہ تک بھیجنے میں اتنی عجلت سے کام لیا گیا تھا کہ سامان تک کی بازی نہیں آ سکی تھی بلکہ مجھے تو گمان ہونے لگا کہ شاید اس طیارے سے سامان ہنگامی صورتِ حال کے خاتمے کے بعد ہی اتارا جا سکے گا۔ اور مسافروں کو وہ تمام مدت اپنے سامان اور آزادی کے انتظار میں محبوس رہ کر گزارنی ہوگی۔

ان دونوں کے غیر ضروری نعرے میرے صبر کے لئے کڑا امتحان بنتے جا رہے تھے۔ جب پتھر پر گرنے والی ننھی ننھی مسلسل بوندیں پتھر کے سینے میں شگاف ڈال سکتی ہیں تو پھر وہ رعونت آمیز انداز بھلا کب تک مجھ پر اثر انداز نہ ہوتا!

ایک راہداری پر گھومتے ہوئے میں نے اپنی بائیں پسلیوں میں آہنی نال کی ہلکی سی ضرب محسوس کی اور ساتھ ہی ان میں سے کوئی سخت عربی لہجے میں غرایا: "جلدی کرو!"

وہ الفاظ اونٹ کی پشت کا آخری تنکا ثابت ہوئے، اور میرے قدم اٹھتے اٹھتے غیر ارادی طور پر فرش پر جم کر رہ گئے۔

میرے غیر متوقع طور پر رُک جانے کے سبب وہ دونوں اپنی جھونک میں تقریباً میری پشت سے آ ٹکرائے!

میں نے پلٹنے میں نہایت پھرتی سے کام لیا اور ان میں سے ایک کی گردن پر میرا ہاتھ چل گیا۔ وہ کمزور سی چیخ مار کر پیچھے الٹ گیا اور میں نے اس کے ہاتھ سے بآسانی رائفل چھین کر اپنے قبضے میں کر لی!

دوسرا میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا جتنی دیر... میں اس کی طرف متوجہ ہوا، وہ رائفل کی نال سیدھی کر کے مجھے زخمی کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر اپنے قبضے میں آئی ہوئی رائفل کی نال تھام کر اسے وحشیانہ انداز میں گھما ڈالا۔ رائفل کا کندہ شاید اپنا کام دکھا گیا کیونکہ دوسرے شخص کا کیا ہوا فائر چھت کی طرف گیا تھا اور ساتھ ہی وہ بھی کراہنے لگا تھا!

وہاں جو کچھ ہوا وہ شاید ضرورت سے زیادہ ہی تھا کیونکہ فوراً ہی بظاہر ویران نظر آنے والا وہ حصہ جو بوکھلائے ہوئے پُرجوش اہلکاروں سے بھرتا چلا گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے در و دیوار نے آدمی اگلنا شروع کر دیے ہوں!

آنے والوں کو وہاں پیش آنے والے واقعات کا کوئی علم نہیں تھا اور وہ نہایت افراتفری کے عالم میں راہداری کی دونوں سمتوں سے نمودار ہوئے تھے لہٰذا مجھے فوری طور پر اس بھیڑ میں مل جانے کا موقع مل گیا!

ان میں روایتی عربی لباس میں ملبوس افراد بھی تھے باوردی اہل کار بھی اور مغربی طرز کا لباس پہنے ہوئے لوگ بھی تھے لہٰذا فوری طور پر کسی کی توجہ میری طرف مبذول نہ ہو سکی۔ ہر شخص ان دونوں سے براہِ راست معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو میرے ردِعمل کا نشانہ بنے تھے!

میں وقتی اشتعال کے تحت وہ کارروائی تو کر گزرا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت ایئرپورٹ اور اس سے ملحقہ عمارات میں جو سخت حفاظتی انتظامات تھے، ان سے بچ کر میرا باہر نکلنا ناممکنات میں سے تھا اور نہ ہی میں زیادہ دیر تک خود کو وہاں روپوش رکھنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

میں ایک فیصلے کے تحت راہداری سے واپس ہو لیا۔

ہجوم سے الگ ہوتے ہی میری نگاہ فوجی وردی میں ملبوس ایک شخص پر پڑی جو عجلت آمیز انداز میں جائے واردات کی طرف جا رہا تھا!

"برادر!... آپ مجھے چند منٹ عنایت کریں گے؟" میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے اسے مخاطب کرنے کے لئے انگریزی کے بجائے عربی زبان کا ہی سہارا لیا تھا!

اس نے رُک کر خشمناک نگاہوں سے مجھے گھورا اور پھر داہنے ہاتھ سے مجھے دھکیل کر آگے بڑھنا چاہا۔ لیکن میں اتنی آسانی سے ہٹنے والا نہ تھا!

"مجھے بہت ضروری کام ہے..." میں نے نرم اور دھیمے لہجے میں کہا۔

"میرے پاس دوسرا اہم کام ہے!" وہ درشت لہجے میں غرایا "میرے فرائض میں دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرو!"

"میرا کام اہم ترین ہے!" میں نے کہا۔

"اندر گڑبڑ ہو گئی ہے، اس وقت میں کوئی خرافات نہیں سن سکتا، چلو میرا راستہ چھوڑ دو!"

"میں اسی بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں!"

اس کے بشرے پر پہلی بار کرختگی کی جگہ حیرت عود کر آئی۔

"اسی بارے میں؟ کیا ہوا ہے وہاں؟"

"وہاں ایک مشتبہ قیدی دو محافظوں کی بدتمیزی پر مشتعل ہو گیا تھا!..." میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تو کیا وہ قیدی فرار ہو گیا؟"

"فرار نہیں ہوا، تمہارے سامنے موجود ہے!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دونوں میری حد سے زیادہ تذلیل پر تُلے ہوئے تھے، نتیجتاً میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، مگر میں قانون شکنی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا!"

"اس سرزمین پر قانون شکن افراد سے نہایت بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہے!..." وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا، مگر پھر بھی اپنی نگاہوں میں سمائی ہوئی حیرت پر مناسب حد تک قابو نہ پا سکا۔

"بشرطیکہ قانون کے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچ سکیں!" میں نے اس پر اپنے اعتماد کا بھرپور اظہار کرنے کی نیت سے کہا۔ "میں چاہتا تو بھیڑ میں شامل ہو کر بآسانی کہیں بھی روپوش ہو سکتا تھا، مگر میرا ضمیر صاف ہے، میں نے تمہیں نرم خو اور معتدل مزاج افسر سمجھتے ہوئے خود کو تمہارے حوالے کر دیا!"

"تم نے میری سات پشتوں پر احسان کیا ہے!" وہ زہریلے لہجے میں بولا اور پھر اچانک ہی اس نے اپنے ویسٹ ہولسٹر سے ریوالور نکال کر میرے سینے پر تان لیا۔

"اور اب تم حراست میں ہو!"

"اس حقیقت کے اظہار کے لئے تم چاہو تو میں سر کے بل کھڑا ہو سکتا ہوں!" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اس طرف میرے آگے آگے چلو!" اس نے واپس مڑتے ہوئے اشارے سے مجھے حکم دیا۔

میں نے مزید کچھ کہے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی، اور آگے چل پڑا۔

راہداری میں تھوڑی دور بڑھنے کے بعد اس نے مجھے داہنی جانب مڑنے کا حکم دیا۔ اور پھر آخرکار میں ایک پُرتکلف کمرے میں داخل ہو گیا!

اس کمرے کا پورا فرش نیلے رنگ کے دبیز قالین کی تہہ کے نیچے چھپا ہوا تھا اور سامنے ہی سفید رنگ کا خوبصورت دفتری فرنیچر ایک بڑی سی سفید میز کے گرد قرینے سے سجا ہوا تھا!

دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پھیلے ہوئے تھے اور ایک گوشے میں بھی آتشدان کا پنکھا مدھم سی گونج کے ساتھ چل رہا تھا!

میز کے عقب میں دیوار کے اوپر لیبیا کے صدر کرنل قذافی کی ایک بڑی سی مسکراتی تصویر آویزاں تھی جس میں لیبیا کے حکمران کے جسم پر فوجی وردی سجی ہوئی نظر آ رہی تھی!

میں کمرے کی جزئیات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا، اور اسی دوران میں مجھے لانے والا فوجی افسر سفید میز کے عقب میں اپنی گھومنے والی کرسی پر جا بیٹھا!

"بیٹھ جاؤ!..." کمرے کی محدود فضا میں اس کی تحکمانہ آواز گونجی تو میں اپنی محویت سے چونک پڑا اور خفت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس شخص نے اپنا سفید دستے والا اعشاریہ تین آٹھ کا اسمتھ اینڈ ویسن میز کی چمکیلی سطح پر رکھ دیا تھا!

"اب بتاؤ کہ انہوں نے تمہیں کس جرم میں گرفتار کیا تھا؟" اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"جرم کا تو شاید انہیں بھی علم نہیں تھا جو مجھے کسی چوپائے کی طرح ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"داستان گوئی کی ضرورت نہیں!" وہ غرایا... "میں حقائق جاننا چاہتا ہوں، اور یہ یقین رکھو کہ اگر تم خود کو مظلوم ثابت کر سکے تو تمہارے ساتھ بُرا سلوک کرنے والوں کو اپنی بے اعتدالی کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑے گا!"

"امیگریشن کاؤنٹر پر موجود ایک شخص نے ان قانونی سفری دستاویزات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا!" یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے یونانی پاسپورٹ سمیت اپنی تمام سفری دستاویزات اس کے آگے ڈال دیں۔

"ریئی فاس!" وہ پاسپورٹ کے ابتدائی اوراق کی سرسری ورق گردانی کرتے ہوئے زیرِلب بڑبڑایا۔ "تمہارے کاغذات تو درست ہی معلوم ہوتے ہیں!"

"معلوم نہیں ہوتے بلکہ قطعی درست ہیں!" میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "اس شخص کا اعتراض یہ تھا کہ میرے خدوخال غیر یونانی ہیں، جبکہ پاسپورٹ میں میری قومیت یونانی درج ہے!"

"احمقانہ اعتراض ہے!" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "یہ دیکھنا یونانی حکام کا کام تھا، اگر انہوں نے پاسپورٹ جاری کر دیا تو

ہم کیا کر سکتے ہیں اور پھر یونان میں لاکھوں تارکینِ وطن بھی رہتے ہیں؟

اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں تک پاسپورٹ کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بولا: "اور اس پر تو تمہارے ایتھنز کے سفارت خانے کے ویزا کا بھی باقاعدہ اندراج ہے۔ اسے یقیناً کوئی اور قانونی سقم نظر آیا ہوگا، ورنہ تمہارے ساتھ اتنا بُرا سلوک نہ کیا جاتا!"

میں نے بہتر افہام و تفہیم کے لئے اس سے عربی میں گفتگو شروع کی تو وہ مزید برہم ہوگیا۔ اس کی دانست میں میرا عربی جاننا بھی شبہات پیدا کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ کافی تھا۔

"اگر تمہارا بیان درست ہے، تو مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ میرے وطن کی سرزمین پر بُرا رویہ اختیار کیا گیا!" اس کا لہجہ بے حد نرم، شریفانہ اور دوستانہ تھا۔

"شاید مجھ پر رشوت دینے کا الزام بھی عائد کیا جائے!" میں نے نہایت شائستہ اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ!" اس نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہا: "تم اس شبہے کا اظہار کیوں کر رہے ہو؟"

"میں نے اس شخص کو شرارت پر آمادہ پاکر چند دینار کی پیشکش کی تھی اور اس نے رشوت کا شور مچا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا!" اس کا ہمدردانہ رویہ دیکھتے ہوئے میں نے اس سے صاف صاف بات کہہ ڈالی۔

"یہ تم نے بُرا کیا!" وہ تأسف آمیز لہجے میں بولا۔ "رشوت لینا یا دینا ہمارے معاشرے میں ایک سنگین جُرم سمجھا جاتا ہے!"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے نادانستگی میں اس جُرم کا ارتکاب کیا!" میں نے ندامت کے ساتھ کہا۔ "میں نے پہلی بار لیبیا کی سرزمین پر قدم رکھا ہے اور میں یہاں کے رواج سے قطعی لاعلم ہوں۔ باہر کے تجربات نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ جب کوئی سرکاری اہلکار غیر ضروری قانونی باریکیوں میں اُلجھانے کی کوشش کرتا ہے تو درحقیقت وہ ضرورت مند سے رشوت کا طلب گار ہوتا ہے!"

"تم کس کاؤنٹر پر روکے گئے تھے؟"

"امیگریشن کاؤنٹر پر!"

"ہال میں امیگریشن کی تین کھڑکیاں ہیں، تم کس پر تھے؟" اس نے میشنر کی چمکدار سطح پر ہاتھ مار کر اپنی بات کی وضاحت کی۔

"دوسری کھڑکی پر!"

"وہاں عقابی آنکھوں اور جھکے ہوئے کاندھوں والا دراز قد آدمی بیٹھا ہُوا تھا؟" اس نے تائیدطلب لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں، وہی تھا!"

"حمزہ بہت بدمعاش آدمی ہے، وہ تقریباً روز ہی ایک دو مسافروں کو بلاوجہ تنگ کرنے کا عادی ہے۔ پھر بعد میں اپنے دوستوں کو ان کے قصّے سُنا کر خوش ہوتا ہے!" وہ ہونٹ سکیڑ کر بولا۔

"یہ بتانا میرا کام تو نہیں، مگر ائیرپورٹ کے ایک ایسے کاؤنٹر پر جہاں روزانہ سینکڑوں غیر ملکی بھی آتے ہوں، ایسے آدمی کا ہونا ملک کی بدنامی کا باعث ہوتا ہے!"

"تم ٹھیک کہتے ہو، مگر وہ ایک بارسوخ آدمی کا چہیتا بھانجا ہے۔ اسے چھیڑنے کا مطلب کسی کے لئے بھی ملازمت سے محرومی ہی ہو سکتا ہے!"

"پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"فی الحال یہیں رکو، تمہیں چھوڑنے سے پہلے مجھے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنی ہوگی۔ تم نے اپنے محافظوں میں سے کسی کو زخمی تو نہیں کیا ہے؟"

"چوٹ سے زیادہ وہ اپنی بوکھلاہٹ کا شکار ہوئے تھے!"

"گولی کس نے چلائی تھی؟"

"محافظ نے! اگر میں بروقت کارروائی نہ کرتا تو شاید وہ گولی چھت کے بجائے میرے جسم کے کسی حصّے میں اتری ہوتی!"

"میں اس ائیرپورٹ کا سیکیورٹی کمانڈر ہوں۔ آج رات میرے آدمیوں کو مشکوک افراد پر گولی چلانے کے خصوصی اختیارات ملے ہوئے ہیں، ورنہ شاید فائر کی نوبت ہی نہ آتی!"

اسی وقت میشنر پر رکھے ہوئے سرخ رنگ کے فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اس شخص نے بوکھلا کر جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔

"السلام علیک یا معلم!" اس نے ماؤتھ پیس میں فوراً ہی کہا تھا۔

چند ثانیوں تک وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر اس نے جو کچھ جواب دیا وہ بے حد مؤدبانہ اور فائر کے بارے میں تھا۔

اس نے بتایا کہ فائر ضرور ہُوا تھا مگر کوئی خطرناک بات نہیں تھی، صورتِ حال پُوری طرح قابو میں تھی اور مہمانوں کے تحفظ کا انتظام بھرپور تھا!"

ریسیور رکھ کر وہ غیر ارادی طور پر کاغذی رومال سے اپنی خشک پیشانی رگڑنے لگا۔

"صدر کا فون تھا، وہ اس وقت وی آئی پی لاؤنج میں موجود ہیں اور فائر کی خبر سے متفکر تھے!" اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"صدر قذافی!" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ ایسے معاملات میں بھی اس قدر دلچسپی لیتے ہیں؟"

اہم سرکاری اور رفاہی اداروں میں سرخ فون ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ صدر کسی بھی وقت کہیں بھی بات کرنے لگتے ہیں۔ ابتدا میں تو وہ عام قہوہ خانوں میں بھی اچانک ہی جا نکلتے تھے!"

اس اثناء میں باہر بہت سے افراد کی ملی جلی آوازیں اور قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی جو بتدریج واضح ہوتی جا رہی تھی!

"شاید وہ لوگ اسی طرف آرہے ہیں!" میں نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"آنے دو!" وہ سرسری لہجے میں بولا: "جب تک میں تمہیں مخاطب نہ کروں، ان کے اور میرے درمیان بولنے کی کوشش نہ کرنا!"

"مجھے حیرت ہے کہ فائر اور ایک قیدی کے فرار کے باوجود باہر کسی افراتفری کے آثار نہیں ہیں!" میں اس شخص سے گفتگو کرنے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کر رہا تھا جو عموماً دو اجنبیوں کے درمیان موجود ہوتا ہے۔

"میرے پاس الارم سوئچ ہیں!" وہ اپنی میشنر سے ملحق ایک ڈیسک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "جب تک میں یہاں سے بٹن دبا کر سرخ روشنی کا الارم نہ دوں، کوئی محافظ اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا خواہ چاروں طرف کیوں نہ گولیاں چلنے لگیں۔ عام حالات میں ہر الارم پینل پر سبز بلب جلتے رہتے ہیں جو اس وقت بھی آن ہوں گے!"

کچھ دیر بعد آنے والوں کی بھیڑ سیکیورٹی کمانڈر کے دروازے پر رک گئی اور میرے ہاتھوں زک اٹھانے والے دونوں محافظ اندر چلے آئے۔

میری پُشت دروازے کی طرف تھی، مگر میں نے گردن گھما کر کنکھیوں سے انہیں دیکھ لیا اور دوبارہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

انہوں نے شاید میری طرف توجہ بھی نہیں دی اور قالین پر ایڑیوں کی مدہم سی دھمک کے ساتھ اپنے کمانڈر کو سلام پیش کر ڈالا۔

"حمزہ نے ایک مشکوک قیدی ہمارے سپرد کیا تھا جو ایک راہداری میں ہم پر حملہ کر کے کہیں روپوش ہونے میں کامیاب ہوگیا، ہم نے سنبھلتے ہی آس پاس کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا!" ان میں سے ایک کی آواز مشینی انداز میں سُنائی دینے لگی۔

"یہ شخص تو نہیں تھا؟" سیکیورٹی کمانڈر نے میری طرف اشارہ کر کے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

وہ دونوں آگے بڑھے، میں نے بھی اپنا چہرہ قدرے ان کی طرف گھمایا اور وہ حیرت میں تقریباً اچھل پڑے۔

"یہی ہے... یہی ہے وہ نابکار!" دونوں کے حلق سے بیک وقت پُرجوش آوازیں بلند ہوئیں اور انہوں نے میری طرف جھپٹنے کے لئے پر تولے ہی تھے کہ سیکیورٹی کمانڈر نے للکار کر انہیں روک دیا۔

"حمزہ نے اسے کس جُرم میں تمہارے حوالے کیا تھا؟" سیکیورٹی کمانڈر کا لہجہ تحکم آمیز اور خاصا سخت تھا!

اس سوال پر وہ دونوں سٹپٹا گئے۔ "وہ اس پر غیر ملکی جاسوس ہونے کا الزام لگا رہا تھا!" ان میں سے ایک نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اس کی تحریری رپورٹ کہاں ہے؟"

"نہیں سارجنٹ محمد نے اسے لاک اپ میں ڈالنے کا حکم دیا تھا!" ان میں سے ایک کی پژمردہ آواز ابھری۔

سیکیورٹی کمانڈر نے میز پر رکھے ہوئے سفید رنگ کے ماسٹر فون کا سوئچ آن کیا جو شاید پیجنگ سسٹم سے منسلک تھا اور پھر سارجنٹ محمد کو فوری طور پر اپنے کمرے میں پہنچنے کا حکم نشر کر کے سوئچ آف کر دیا!

سارجنٹ محمد چند ثانیوں میں ہانپتا ہُوا وہاں آپہنچا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ اسی کے حکم پر فوجیوں نے مجھے حراست میں لیا تھا۔

سیکیورٹی کمانڈر کے استفسار پر محمد نے میری گرفتاری کے وہی دو اسباب بتائے جو محافظ بتا چکے تھے۔

"حمزہ کی رپورٹ کہاں ہے؟" سیکیورٹی کمانڈر میشنر پر ہاتھ مار کر دہاڑا۔ "ہم لوگ ایک قانون کے پابند ہیں، اگر ہم غیر ملکیوں کی اسی طرح تذلیل کریں گے تو ہمارا قومی وقار خاک میں مل کر رہ جائیگا!"

"مگر ہم لوگ اپنے شبہات کی بناء پر بھی تو کسی مشکوک شخص کو حراست میں لینے کا اختیار رکھتے ہیں!" سارجنٹ نے دبے لہجے میں کہا۔

"بحث مت کرو سارجنٹ!" سیکیورٹی کمانڈر قہر بار لہجے میں بولا۔ "تم خود اعتراف کر چکے ہو کہ اس معزز غیر ملکی کے ساتھ جو کچھ ہُوا وہ حمزہ کی شکایت پر ہُوا، اگر تم اپنی صوابدید پر عمل کرتے تو شاید میرا رویہ مختلف ہوتا، میں نے اس شخص کے کاغذات دیکھے ہیں جو مکمل اور درست ہیں!"

"مجھے افسوس ہے!" سارجنٹ سر جھکا کر بولا۔

"میں اپنے ماتحتوں کے غیر ذمہ دارانہ رویّے پر معذرت خواہ ہوں مسٹر رینی فاس!" کمانڈر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں ممنون ہوں کہ اس اجنبی سرزمین پر کم از کم ایک شخص کو تو میری بے گناہی کا یقین آیا!"

"سارجنٹ! تم مسٹر رینی فاس کو چیف امیگریشن آفیسر کے پاس لے جاؤ تاکہ وہ اس کے کاغذات کی پڑتال کرے، اور اگر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو تو مسٹر رینی فاس کو ایمرجنسی کے خاتمے تک ریٹائرنگ روم میں رکھو!"

یہ کہہ کر سیکیورٹی کمانڈر نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور سارجنٹ محمد کے ساتھ باہر نکل آیا۔

دونوں فوجی پہلے ہی باہر نکل چکے تھے۔ وہاں جمع لوگوں نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ سیدھے چلے گئے اور دروازے میں، سیکیورٹی کمانڈر کا چہرہ دیکھتے ہی ساری بھیڑ کائی کی طرح

چھوٹتی چلی گئی۔

راستے میں سارجنٹ محمد نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن اس کے تیور سخت جارحانہ تھے جیسے وہ مجبوری کے تحت کوئی ناگوار کام سرانجام دے رہا ہو!

چیف امیگریشن آفیسر عام طور پر بہت بڑا عہدہ ہوتا ہے مگر لیبیا میں قدم رکھتے ہی میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ بڑے افسروں کے دروازوں پہ اردلی وغیرہ کی موجودگی کا رواج نہیں تھا۔ ہر شخص بلا روک ٹوک کہیں بھی گھس سکتا تھا، مگر مراتب کا احترام پھر بھی ہر جگہ دیکھنے میں آ رہا تھا!

چیف امیگریشن کو سارجنٹ نے اختصار کے ساتھ میرے بارے میں بتایا۔ پہلے اس نے سرسری طور پر سارے اندراجات کا جائزہ لیا پھر محدب عدسے کی مدد سے کئی صفحات کو دیکھتا رہا۔ مہر ثبت کرنے سے پہلے شاید وہ پوری طرح یقین کرنا چاہتا تھا کہ میں نے کہیں جعل سازی تو نہیں کی تھی!

اور آخرکار مجھے لیبیا میں داخلے کا قانونی حق دے دیا گیا۔

چیف امیگریشن آفیسر کے دروازے سے نکلنے کے بعد ریٹائرنگ روم کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اچانک حمزہ کہیں سے آ ٹکرایا۔

"یہ تمہارے ساتھ کہاں لگا پھر رہا ہے؟" مجھے دیکھتے ہی حمزہ نے تضحیک آمیز انداز میں سارجنٹ سے سوال کیا۔

"آج تمہاری وجہ سے میری بے عزتی ہوئی ہے برادر!" سارجنٹ قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ "یہ شبہات سے بالاتر تھا مگر تم نے اسے لاک اپ میں ڈلوا دیا۔ ابھی یہ چیف امیگریشن آفیسر سے کلیئرنس لے کر آ رہا ہے!"

"یہ وہاں گیا کیسے؟" حمزہ غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ "میں اسے دیکھ لوں گا۔ مجھ سے ٹکر لینے والا منہ کی کھاتا ہے!"

"تم کچھ بھی نہ کر سکو گے!" سارجنٹ کے لہجے سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حمزہ کو اشتعال دلانا چاہتا ہو۔ "اسے سیکیورٹی کمانڈر نے وہاں بھیجا تھا اور اس نے ہم سب کے رویئے پہ اس سے معذرت بھی کی ہے!"

حمزہ بہت ہی مشتعل مزاج شخص تھا۔ سارجنٹ کا فقرہ مکمل ہوتے ہی دانت پیستا ہوا میری طرف لپکا اور صرف دو قدم کے فاصلے پر رک کر تحقیر آمیز انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غرایا۔ "میں تمہیں دیکھ لوں گا ۔۔۔ اگر کسی خارش زدہ کتے کی طرح لیبیا سے باہر نہ پھینکوا دیا تو میرا نام بدل دینا!"

"ابھی نام بدل دو تو بعد کی ندامت سے بچ جاؤ گے!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ویسے اب سے پہلے کیا نام تھا تمہارا؟"

اس نے حسبِ توقع طور پر میرا گریبان پکڑ لیا مگر مکّہ مارنے سے قبل سارجنٹ نے پھرتی سے اسے دبوچ کر الگ ہٹا دیا۔

"ارے یہ کیا غضب کر رہے ہو؟" سارجنٹ بدقت تمام اسے مجھ سے دور لے جاتے ہوئے بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "ابھی یہ میری تحویل میں ہے اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری مجھ پر ہے!"

"میں اس کی آنتیں باہر نکال دوں گا!" حمزہ بُری طرح بپھرا ہوا تھا۔ "اس نے یقیناً سیکیورٹی آفیسر سے میری شکایت کی ہو گی!"

"وہ تمہارا کیا بگاڑے گا؟" سارجنٹ ہانپتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "فی الحال میری نوکری پر رحم کرو۔ رینی فاس سے تم بعد میں بھی بدلہ لے سکتے ہو!"

سارجنٹ کی خوشامد نے اسے نرم کر دیا۔ "ٹھیک ہے، لے جاؤ اسے! میں دیکھوں گا کہ یہ کتنے گھنٹے لیبیا میں آزاد رہ کر گزارتا ہے!"

وہ مجھے چیلنج کرتی ہوئی تحقیر آمیز نگاہوں سے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور سارجنٹ مجھے دوبارہ ریٹائرنگ روم کی طرف لے جانے لگا۔

"ابو محمد!" میں نے راستے میں عربوں کے مروجہ تکریمی انداز میں سارجنٹ کو مخاطب کیا۔ "تم حمزہ سے کچھ خائف تھے!"

"تم تو کچھ دیر بعد چلے جاؤ گے، ہمیں تو ساتھ کام کرنا ہے؟" وہ بے زاری کے عالم میں بولا۔ "وہ بہت کینہ پرور شخص ہے۔ اپنی ذرا سی بھی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ آئے دن کسی نہ کسی سے لڑتا رہتا ہے!"

"غنڈہ ہے؟"

"بڑے گھرانے کا لاڈلا لڑکا ہے!" سارجنٹ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "اگر قتل بھی کر گزرے تو اس کے اہلِ خاندان خون بہا ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں!"

سارجنٹ محمد مجھے ریٹائرنگ روم میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میرا پاسپورٹ اس نے یہ کہہ کر لے لیا تھا کہ ہنگامی صورتِ حال کے خاتمے پر مجھے پاسپورٹ واپس لوٹا کر شہر میں داخلے کی اجازت دے دی جائے گی!

ریٹائرنگ روم آراستہ اور آرام دہ تھا۔ عمارت کو گرم رکھنے کے مرکزی نظام سے منسلک ہونے کے باعث وہاں نہایت خوشگوار سی حرارت کا رچاؤ بھی محسوس ہو رہا تھا!

میں نے اس وسیع کمرے میں کافی وقت تنہا رہ کر گزارا۔ اس دوران ۔۔۔ وہاں پڑے ہوئے عربی رسائل نے مجھے بہت سہارا دیا۔

ریٹائرنگ روم میں میرا قیام ضرورت سے زیادہ طوالت اختیار کرنے لگا تو مجھ پہ اکتاہٹ طاری ہونے لگی۔ کئی بار میرے دل میں آئی کہ باہر نکل کر تھوڑی دیر چہل قدمی کر ڈالوں، مگر گزرے ہوئے تلخ تجربات نے ہر بار میرے قدم روک دیئے۔ خدا خدا کر کے مجھے ایک بدترین الجھن سے نجات ملی تھی اور میں اتنی قلیل مدت میں کسی دوسرے معرکے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا جب کہ حمزہ مجھے براہِ راست چیلنج کر چکا تھا۔

مجھے اتنا یقین تو تھا کہ میں جب تک ریٹائرنگ روم میں موجود ہوں، حمزہ مجھ پہ کوئی وار نہیں کرے گا، مگر اس یقین کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفے سے اندیشوں کا ہجوم ذہن کی گہرائیوں میں سر ابھارنے لگتا تھا!

لیبیا میں میرا استقبال نہایت واہیات انداز میں ہوا تھا، میں جس جوش اور ولولے کے ساتھ وہاں پہنچا تھا، حمزہ کے رویے نے اسے برباد کر کے رکھ دیا تھا اور میں ائیرپورٹ سے نکلنے کے بعد اپنی سلامتی کے بارے میں فکرمند تھا۔ حمزہ نے جن تیوروں کا مظاہرہ کیا تھا ان کے پیشِ نظر مجھے قدم قدم پر محتاط رہنا تھا!

ایک طرف حمزہ میرا ناگہانی دشمن پیدا ہو گیا تھا اور دوسری جانب وہ شخص لاپتہ تھا جو لیبیا میں نہ صرف میری رہنمائی کر سکتا تھا بلکہ حمزہ کے مقابل بھی میری سپر بن سکتا تھا۔

لیبیا میں کسی ہمدرد اور رہنما کے بغیر مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ سیتا تک پہنچنا تو بعد کی بات تھی، اس وقت تو سلامتی کے بھی لالے پڑتے نظر آ رہے تھے اور مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ ابن طیب کا سراغ کیسے پا سکوں گا!

رات کے پونے تین بجے ریٹائرنگ روم میں مجھے دوسری انسانی صورت نظر آئی، وہ کوئی ہونق سا مقامی تھا!

ریٹائرنگ روم کے دروازے پہ رک کر وہ چند ثانیوں تک پریشان نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے ہوتے ہوئے اپنی کھوپڑی سہلانے لگا، جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے!

اس دوران میں اس نے مجھے یوں نظر انداز کیا تھا جیسے اس کی دانست میں میں بھی اس کمرے کی آرائشی ترتیب کا کوئی بے جان حصہ ہوں!

میری آواز سن کر وہ یوں چونکا جیسے اس وقت تک میری موجودگی سے قطعی لاعلم رہا ہو!

چند ثانیوں تک وہ کسی ایسے الّو کی طرح دیدے جھپکاتا رہا جسے اندھیری کوٹھڑی سے اچانک تیز دھوپ میں پھینک دیا گیا ہو پھر ... کے بل اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں سٹپٹا کر رہ گیا کیونکہ وہ گلے پڑتا نظر آ رہا تھا پھر بھی میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام رینی فاس ہے اور مجھے سارجنٹ محمد یہاں چھوڑ کر گیا ہے!"

"کیا نام بتایا؟" وہ داہنے کان پہ ہتھیلی کی اوٹ بنا کر جھکتے ہوئے بولا ۔۔۔!

"رے ۔۔۔ نی ۔۔۔ فاس!" میں نے ایک ایک جزو کی تقطیع کر کے کہا۔

"نام تو وہی ہے!" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ پھر اندر آ کر بلند لہجے میں مجھ سے بولا۔ "مگر مجھے کیسے پتہ چلے کہ تم ہی رینی فاس ہو؟"

وہ آدمی منحنی اور ہونق سا تھا مگر اس کا سوال سن کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ میرا پاسپورٹ سارجنٹ لے گیا تھا اور اس وقت میرے پاس اپنی شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مجھے بے اختیار حمزہ کے الفاظ یاد آ گئے جس نے مجھے لیبیا میں آزاد نہ رہنے کی زبردست دھمکی دی تھی۔

اگر وہ آدمی حمزہ کا ہی فرستادہ تھا تو نہایت آسانی سے مجھے دوبارہ گرفتار کروا سکتا تھا اور اس مرتبہ تو شاید مجھے سیکیورٹی آفیسر سے بھی رجوع کرنے کی مہلت نہ ملتی!

میری زبان خشک ہو کر حلق میں اینٹھنے لگی میرے لئے وہ صورتِ حال کسمپرسی اور بے بسی کا شاہکار بن کر رہ گئی تھی۔

"رینی فاس نہیں مانتے تو جو چاہے کہہ لو!" میں نے اپنے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیر کر آہستہ سے کہا۔

"شناخت ضروری ہے، اجنبی!" لہجہ گمبھیر بنانے کے چکر میں اس کی آواز مضحکہ خیز ہو کر رہ گئی۔ "تم خود کو کالا چور بھی کہو گے تو میں اس کا ثبوت مانگوں گا!"

"جواب دینے سے پہلے میں تمہاری شناخت دیکھنی چاہوں گا!" میں نے ہمت کرتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کر ڈالی۔

وہ عجیب انداز میں مسکرا دیا۔ "میں تمہارا پاسپورٹ واپس لایا ہوں اور وہ لے کر تم باہر جا سکتے ہو، مگر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ میں پاسپورٹ صحیح آدمی کو واپس کر رہا ہوں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے میرا پاسپورٹ نکال لیا۔

اس کے احمقانہ رویئے پر میں بھنّا کر رہ گیا۔ مگر اس وقت غصّے کا اظہار قرینِ مصلحت نہیں تھا۔

"پاسپورٹ پہ میری تصویر دیکھ کر تم اپنا اطمینان کر سکتے ہو!" میری بات سن کر وہ یوں اچھلا جیسے میں نے کوئی محیرالعقول ترکیب بتا ڈالی ہو۔ اسی کے ساتھ اس نے پاسپورٹ کے اوراق کھول لئے۔

دو تین بار اس کی نگاہیں تصویر سے اچٹ کر میرے چہرے پہ مرکوز ہوئیں اور آخرکار اسے میری بات پر یقین آ گیا۔

"واقعی تم رینی فاس ہی ہو!" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ تم اس کمرے میں پاسپورٹ کے منتظر ہو گے!"

یہ کہتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا۔

"تم بہت نیک اور مہربان آدمی معلوم ہوتے ہو!" میں نے اس سادہ لوح بلکہ احمق شخص سے دوستی گانٹھنے کی نیت سے کہا۔ "اگر تم پاسپورٹ کسی کے بھی حوالے کر کے چلے جاتے تو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، مگر مجھے ضرور قید خانے کی ہوا کھانی پڑتی!"

وہ نہایت معصومانہ انداز میں ہنس دیا۔ "میرے ساتھی مجھے بے وقوف کے خطاب سے یاد کرتے ہیں، مگر تم نے دیکھ ہی لیا کہ میں اپنے فرائض کے بارے میں کس قدر محتاط اور سنجیدہ رہتا ہوں!"

"یہ دور ہی بہت خراب ہے۔" میں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم جیسے سادہ لوح اور فرض شناس لوگوں کے لئے تو زندگی گزارنا بھی مشکل ہے!"

"تم کون ہو؟" اس نے میرے ہمراہ ویٹنگ روم سے نکلتے ہوئے سوال کیا۔

"رینی فاس!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میرا مطلب تھا کرتے کیا ہو اور آئے کہاں سے ہو؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا اور چلتے چلتے رک گیا۔

"سیاحت کرتا ہوں اور یونان سے آیا ہوں!"

"پہلے بھی یہاں آتے رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"پہلی بار لیبیا کی سرزمین پر قدم رکھا ہے!" میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے جواب دیا۔

"واقعی؟" اس کی آنکھوں میں حیرت عود کر آئی۔

"ہاں!... تمہیں حیرت کیوں ہو رہی ہے؟"

"اگر تم یہاں اجنبی ہو تو تمہارے دشمن کیسے پیدا ہو گئے؟" وہ ترحم آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔

"میرے دشمن؟" میں نے اضطراری طور پر اس کا بازو تھام لیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو، مجھ سے کس کو دشمنی ہو گئی؟"

"اس وقت اس عمارت کے باہر حمزہ تین آدمیوں کے ہمراہ تمہارا منتظر ہوگا!" وہ آہستہ سے بولا۔ "مجھے اس کے تیور اچھے نہیں لگتے، ویسے بھی وہ عام طور پر ایک برے آدمی کے نام سے پہچانا جاتا ہے!"

اس کے الفاظ سن کر میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہر سرایت کر گئی۔ "تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا؟"

"اس نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ باہر رینی فاس کا انتظار کرے گا!" وہ جھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر تم مجھے اس سے بچا کر باہر نکال دو تو میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھول سکوں گا!" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"نہ، نہ!" وہ ہڑبڑا کر بولا۔ "میرے ساتھ باہر نکلے تو ضرور مصیبت میں پڑ جاؤ گے! حمزہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی طرح تمہیں سمجھا کر باہر نکلوں، باقی کام وہ خود سنبھال لے گا!"

میرے وجود پر خوف آلود سی بے چینی طاری ہو گئی۔ "مجھے کوئی ترکیب بتاؤ، میں اس خبیث سے ٹکرانا نہیں چاہتا!"

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟" اس نے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"امیگریشن کاؤنٹر پر اس سے میری جھڑپ ہوئی تھی، اس کے نام کا علم کافی دیر بعد ہوا تھا!" میں نے کہا۔

"تمہارے ستارے یقیناً گردش میں ہیں!" وہ تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ "حمزہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے!"

"یعنی تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟"

"یہی کیا کم ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ باہر نہیں لے جا رہا، ورنہ بے خبری میں چوہے کی طرح مارے جاتے!"

"ایئرپورٹ پر ہنگامی صورتِ حال ختم ہو چکی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ختم نہ ہوئی ہوتی تو شاید تمہیں جانے کی اجازت نہ ملتی!"

"ہنگامی صورتِ حال کا سبب کیا تھا؟" میں نے سرسری طور پر پوچھ لیا۔

"کسی کو علم نہیں، افواہ ہے کہ روس کا کوئی اعلیٰ سطحی فوجی وفد آیا ہے!" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"میں لیبیا میں اجنبی ہوں!" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "جس شخص کو ایئرپورٹ پر میرے استقبال کے لئے آنا تھا، وہ کرفیو کی وجہ سے شاید نہیں پہنچ سکا۔ اب مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ مجھے کدھر جانا چاہئے۔" میں اس سادہ لوح لیبی کی پوری ہمدردیاں جیتنی چاہ رہا تھا!

"تمہارا میزبان کون تھا؟" میرے بارے میں وہ بے چارہ بھی دفتہ رفتہ پریشانی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

"میں صرف اس کا نام جانتا ہوں، وہ طیب کہلاتا ہے!"

"اس کا پتہ ٹھکانا؟"

میں نے مایوسانہ انداز میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"اگر تمہیں اس کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اس تک تمہارا پیغام پہنچا سکتا تھا!" وہ داہنے ہاتھ سے اپنا کان سہلاتے ہوئے بولا۔ "موجودہ صورتِ حال میں تو وہ چاہتے ہوئے بھی تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا...!"

"یہاں کھڑا رہنے کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ویٹنگ روم میں بیٹھ کر سکون سے مشورہ کریں۔"

"مجھے تمہارے پاس آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں!" وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

وہ مرنجان مرنج قسم کا آدمی تھا، لہٰذا میں اس کا ہاتھ تھام کر ویٹنگ روم میں داخل ہو گیا اور اس نے بھی کوئی تعرض نہ کیا۔

راستے میں تیزی سے سوچتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ انتہائی سادہ انداز میں فلسطینیوں کے بارے میں اس شخص کی رائے سے نیت حاصل کی جائے۔ اور اگر وہ فلسطین کے حامیوں میں سے ہو، پھر بتا دیا جائے کہ میرے گمشدہ میزبان کا تعلق افواجِ آزادیٔ فلسطین سے تھا۔ اس طرح شاید وہ باآسانی طیب تک میری رہنمائی کر سکتا تھا!

"تم بن غازی میں کسی سرگرم فلسطینی سے واقف ہو؟" ویٹنگ روم میں بیٹھنے کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"کیوں؟ یہ ایک دم فلسطینی کیسے یاد آ گئے تمہیں؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"اس طرح شاید میں باآسانی طیب تک پہنچ سکوں گا!"

"تو کیا وہ فلسطینی ہے؟"

"مجھے اس کے نام کے سوا کچھ معلوم نہیں، لیکن وہ فلسطینیوں سے رابطہ ضرور رکھتا ہوگا!" میں نے کہا۔

"اگر تم لیبیا میں واقعی کچھ روز سکون سے گزارنا چاہتے ہو تو فلسطینیوں کو بھول ہی جاؤ!" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"کیوں؟"

"آجکل فلسطینیوں سے لیبیا کے سرکاری مراسم بدترین بحران سے گزر رہے ہیں!" وہ غیرمعمولی طور پر سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "اگر کسی اہلکار کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تمہارا فلسطینیوں سے کوئی تعلق ہے تو چشم زدن میں تمہارا ویزا منسوخ کر کے تمہیں قریب ترین پرواز سے باہر نکال دیا جائے گا!"

"مجھے طیب کے ذریعے ایک اور شخص سے ملنا تھا!" میں نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ "میری یہاں آمد کا تعلق فلسطینیوں سے نہیں ہے!"

"طیب کے معاملے میں میں کچھ نہیں کر سکتا!" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ "تم ایسا کرو کہ مخازن الکبریٰ میں حامد العزیز سے مل لو، شاید وہ تمہارے کسی کام آ سکے!"

"مخازن الکبریٰ کوئی ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے؟"

"ہاں... حامد العزیز وہاں کیش رجسٹر پر بیٹھتا ہے!" یہ کہتے ہوئے وہ آرام وہ صوفے پر سے اٹھ گیا۔

"حمزہ کے بارے میں کیا کروں؟" میں نے اس کے ہمراہ باہر نکلتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے وہ انسانی روپ میں کوئی فرشتہ نظر آ رہا تھا!

"میرے ساتھ نکلنے کی کوشش کرو گے تو بے موت مارے جاؤ گے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ تم کسی طرح چوری چھپے اس عمارت سے نکل جاؤ۔ ایک بار شہر کے ہجوم میں گم ہو جاؤ گے تو حمزہ کے فرشتے بھی تم تک نہ پہنچ سکیں گے، تمہیں اس سے ہر حال میں بچنا چاہئے!"

میں نے بھرپور انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اپنی راہ پر ہو لیا۔ میں ایئر بیگ پر مشتمل اپنا سامان کندھے پر لٹکا کر ایک طرف چل دیا۔

ایئرپورٹ کی اس عمارت میں چھائی ہوئی بے رونقی دور ہو چکی تھی اور لوگ لاپروایانہ انداز میں اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔

میں نے اسکرین پر پروازوں کی آمد و رفت کے شیڈول کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ بیس منٹ بعد یعنی صبح کے سوا پانچ بجے لفت ہنسا کی ایک پرواز بن غازی ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والی تھی۔

سنگل میں باہر نکلنے میں میرے لئے بے شمار خطرات موجود ہوتے، مگر کسی پرواز سے آنے والے مسافروں کی بھیڑ میں شامل ہو کر میں خود کو درپیش خطرات میں کمی کر سکتا تھا!

اس وقت میرے بدن پر شوخ لباس موجود تھا جس پر میں نے ونڈی اوورکوٹ پہنا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لباس میں نمایاں تبدیلی بھی مجھے حمزہ کی نگاہوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی!

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد میں ٹوائلٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کے بعد میں نے سفید قمیص کے ساتھ سیاہ رنگ کا سوٹ زیب تن کیا اور اس پر ٹائی باندھ کر باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہوئے میں نے اپنے بالوں کی ترتیب میں بھی نمایاں تبدیلی کر لی تھی اور اوورکوٹ اسی ٹوائلٹ روم میں چھوڑ دیا تھا۔ ان تمام تبدیلیوں کے بعد مجھے اطمینان تھا کہ حمزہ تو کیا اس کے فرشتے بھی مجھے رینی فاس کے طور پر نہ پہچان سکیں گے۔

ان امکانی تبدیلیوں کو اختیار کرنے کے بعد میں ریستوران سے ملحقہ اسٹور میں داخل ہوا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد قدرے تاریک شیشوں والی ایک عینک خریدنے میں کامیاب ہو گیا گو اس عینک میں سادہ شیشے لگے ہوئے تھے مگر دیکھنے والوں کو میرے بارے میں یہی گمان ہوتا کہ میں نے اپنی کمزور بینائی کو سہارا دینے کے لئے عدسوں کا سہارا لیا ہوا تھا!

عینک کی خریداری کے دوران ہی پبلک ایڈریس سسٹم پر عربی اور شاید فرنچ میں لفت ہنسا کی پرواز کی آمد کا اعلان کیا گیا اور میں اضطراری انداز میں مختلف اشیاء کا جائزہ لے کر اپنا وقت گزارنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے رکاوٹوں کے پار امیگریشن ہال میں پچیس تیس مسافر نظر آئے اور میں ان کے نکلنے کے انتظار میں

چہل قدمی کرنے لگا!

ایئرپورٹ پہنچا تو صورتِ حال ختم ہوئے کم و بیش چالیس منٹ گزر چکے تھے، مگر مجھے کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا جسے طیّب سمجھا جا سکتا!

مجھے ابتدا ہی سے یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر کرفیو اور غیر معمولی انتظامات کے باعث طیّب بروقت ایئرپورٹ پر نہ پہنچ سکا تو صورتِ حال کے اعتدال پر آتے ہی ایئرپورٹ پہنچے گا اور کسی نہ کسی طرح مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر کرفیو وغیرہ کا خاتمہ ہوئے تقریباً ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے اور مجھے وہاں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا تھا جسے میں طیّب سمجھ سکتا!

امیگریشن کاؤنٹر سے نمٹ کر مسافر اپنے سامان کے منتظر رہے اور پھر چھ بجے کے قریب ان میں سے اکا دُکا مسافر باہر آنے لگے۔

پھر ایک مرتبہ جونہی تین مسافر تقریباً ایک ساتھ نکاسی کے راستے کی طرف بڑھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کیونکہ حمزہ دو آدمیوں کے ساتھ نہایت بے چینی سے اسی برآمدے میں چہل قدمی کرنے میں مصروف تھا!

میں ٹھٹکنے یا واپس لوٹنے کے بجائے اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ اور حمزہ سے چند میٹرز کے فاصلے سے گزر کر ٹیکسی اسٹینڈ تک جا پہنچا۔ حمزہ یا اس کے ساتھیوں کو گمان بھی نہ ہو سکا کہ وہ لوگ جس شخص کے منتظر تھے، وہ ان کے قریب سے گزر چکا تھا۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کے ادھیڑ عمر ڈرائیور کو کسی متوسط درجے کے ہوٹل میں چلنے کے لئے کہا اور وہ ہیکل ٹیکسی مست خرامی کے ساتھ رینگ کر قطار سے نکل آئی۔

لیبیا کے بارے میں میرے تمام خوبصورت منصوبے اور خواب پاش پاش ہو چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں بن غازی کے نواحی ہوائی اڈے پر اترنے کے چند گھنٹوں بعد ہی اپنی سیتا سے ملنے میں کامیاب ہو سکوں گا! مگر وہاں دُور دُور تک ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

سیتا سے ملنا تو درکنار مجھے وہاں کوئی یہ بتانے والا بھی نہ تھا کہ میں عدنان فاخوری کی دی ہوئی رقم میں زیادہ سے زیادہ دن کیسے گزار سکتا تھا؟

تقریباً بیس منٹ کے بعد ٹیکسی ایک جگہ رک گئی۔ باہر سرد اور ویران ماحول میں ہوٹل کارلٹن کے روشن حروف چمکتے نظر آ رہے تھے!

اس ٹیکسی میں میٹر قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے سفر کی طوالت کے پیشِ نظر ڈرائیور کو دو دینار دیئے تو اس نے حقارت سے اپنی تیوریاں چڑھا لیں اور نوٹوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

"یہی دینے تھے تو ایئرپورٹ سے پیدل آ جاتے!" اس نے شانے اچکا کر کہا۔ "ایئرپورٹ سے یہاں تک کے دس دینار ہوتے ہیں!"

"دس دینار؟" حیرت سے میری آنکھیں پیشانی پر جا پہنچیں۔ "مجھے مسافر سمجھ کر ناجائز مطالبہ کر رہے ہو؟"

اس سے تھوڑی سی بحث ہوئی اور آخر کار وہ پانچ دینار پر جم کر رہ گیا۔ اس بارے میں قصور میرا بھی تھا کہ میں نے ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے اس سے کرایہ طے نہیں کیا تھا، لہٰذا اسے پانچ دینار ادا کرتے ہی بنی۔ پیسے لے کر اس نے اتنی بیزاری کا مظاہرہ کیا جیسے میں نے اس کی شان میں کوئی ناقابلِ معافی گستاخی کی ہو۔

میرے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ دس کے بجائے پانچ دینار پر راضی ہو گیا تھا۔ اگر وہ مصالحت پر آمادہ نہ ہوتا تو میں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا تھا!

یہ سویرے ۔ ۔ ۔ کا وقت تھا۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ سبھی ویران پڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل کارلٹن کے شیشے کے بڑے سے دروازے کے عقب میں پڑے ہوئے صوفوں پر دو باوردی پورٹر نہایت اطمینان سے سوئے ہوئے تھے۔ ٹیکسی کی آمد نے بھی انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا!

قدرے آگے بڑھا تو ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر بھی ایک لڑکی کہنیوں کے بل ۔ ۔ ۔ جھکی خوابِ خرگوش میں مصروف نظر آئی اور میں بلاتکلف آگے بڑھتا چلا گیا۔

اوّل تو اس ہوٹل کا عملہ بادی النظر میں نہایت لاپروا نظر آ رہا تھا اور دوئم مجھے یہ خدشہ تھا کہ اگر حمزہ نے زک کا احساس ہونے کے بعد میرے بارے میں ٹیکسی ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کی تو وہ باآسانی ہوٹل کارلٹن تک پہنچ سکتا ہے!

میرے لئے بہتر یہی تھا کہ کارلٹن کے بجائے کسی سستے اور گمنام ہوٹل کا رُخ کرتا جہاں حمزہ کی رسائی مشکل ہوتی!

میں نے چند قدم آگے بڑھ کر سردی کا احساس زائل کرنے کے لئے سگریٹ سلگائی اور پھر آگے چل دیا۔

اس وقت سارا بازار بند تھا اور دُور دُور تک میرے سوا کوئی دوسرا متنفّس نظر نہیں آ رہا تھا مگر آثار سے پتہ چل رہا تھا کہ سورج طلوع ہونے کے بعد وہ بازار خاصا بارونق ہوتا ہو گا!

تھوڑی دُور چلنے کے بعد مجھے بس کے مسافروں کے لئے بنی ہوئی سایہ دار انتظار گاہ نظر آئی اور میں سائبان کے نیچے بینچ پر بیٹھ گیا!

صبح کے کہر آلود ملگجے اجالے میں تنہا سڑکیں ناپتے ہوئے میں کسی بھی شخص کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا لہٰذا میں نے [illegible] اسی بینچ پر بیٹھ کر سورج طلوع ہونے کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہاں بیٹھے بیٹھے مجھ پر اونگھ سوار ہو گئی اور میں بتدریج پیش سے غافل ہوتا چلا گیا۔ جب دوبارہ آنکھ کھلی تو فضا انسانوں اور مشینوں کے ملے جلے شور سے گونج رہی تھی اور ہر طرف سورج کی چمکیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی!

میں نے ہڑبڑا کر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو وہ دس بجا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں کم و بیش تین گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔

میں نے کسلمندانہ انداز میں انگڑائی لی اور وہاں سے چل پڑا۔

سڑکوں پر اس وقت کافی چہل پہل تھی۔ جدید ترین ساخت کی گاڑیاں مسافروں کا بوجھ اٹھائے رواں دواں تھیں، فٹ پاتھوں پر لمبے لمبے لبادے پہنے ہوئے مقامی نظر آ رہے تھے اور ان کی بھیڑ میں اِکا دُکا غیر ملکی بھی نظر آ رہے تھے!

میری نگاہیں ہر طرف کسی اقامتی ہوٹل کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور میں اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا کہ اچانک اپنے شانے پر کسی ہاتھ کا دوستانہ دباؤ محسوس کر کے میں چونک پڑا۔

واپس پلٹا تو مشرقی خدوخال سے مرصّع گندمی رنگ کے ایک چہرے پر محدّب عدسوں والی عینک کے پیچھے دو آنکھیں دوستانہ انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

میں نے حوصلہ شکن انداز میں کرخت نگاہوں سے اس شخص کے بھاری ڈیل ڈول کا تفصیلی جائزہ لیا پھر خشک لہجے میں سوال کیا۔ "فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" یہ سوال میں نے عربی میں کیا تھا۔

"آپ کا نام صفدر علی تو نہیں ہے؟" اس نے میرے شانے سے ہاتھ ہٹا کر صاف ستھری اُردو میں سوال کیا۔

اس کے الفاظ میرے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح گرے۔ وہ نہ صرف میرے اصلی نام سے واقف تھا بلکہ اسے یہ یقین بھی تھا کہ میں اُردو سے واقف تھا۔

"صفدر علی؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، مگر میں اس غلط فہمی کا سبب ضرور جاننا چاہوں گا!"

"میرا نام عظیم ہے ... عظیم قریشی!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "صفدر علی برسوں پہلے میرا جگری دوست ہوا کرتا تھا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اسی کا گمان ہوا تھا۔ کافی دیر سے تمہارے پیچھے چلا آ رہا ہوں۔"

اس کا نام سنتے ہی یک بیک میرے ذہن میں ماضی کی بہت سی دھندلائی ہوئی تصویریں واضح ہو گئیں۔

جن دنوں میں لیاقت آباد میں فردوس سینما سے ملحق رنگ [illegible] کی ایک گلیوں میں جمال سیناسی سے کیمیاگری سیکھ رہا تھا، ان دنوں عظیم سے میری دوستی ہوئی تھی اور پھر یہ تعلق کافی دنوں تک قائم رہا!

رفتہ رفتہ اعتماد کی فضا قائم ہونے کے بعد میں نے اسے اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا دیا تھا اور اس نے مجھے کیمیاگری کے خبط کو خیرباد کہنے کے لئے بہت مجبور کیا مگر ان دنوں مجھ پر جنون سوار تھا، میں نے اس کی ایک نہ مانی اور پھر میں جمال سیناسی کے ہمراہ سجاندر ناس کی تلاش میں مشرقی پاکستان کے راستے نیپال کی طرف روانہ ہوا تو میں نے عظیم سمیت اپنے کسی بھی شناسا کو کوئی خبر نہ دی ...! اتنے طویل ترکِ تعلق کے بعد کسی پرانے شناسا کا یوں ملنا میرے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ مگر اس مصروف شاہراہ پر میں کسی گرمجوشی کا اظہار ابھی نہیں کرنا چاہتا تھا!

میں نے ان حوالوں کے بعد عظیم کو پہچان لیا تھا مگر مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ زمانے کے انتہائی سرد و گرم سے گزرنے کے بعد میری شخصیت میں جو ظاہری انقلابات رونما ہوئے تھے، عظیم ان سے بھی دھوکا نہیں کھا سکا تھا!

"میں صفدر علی نہ سہی پھر بھی تمہارا ہم زبان تو ہوں!" میں نے قدرے توقف کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس بھری ہوئی جگہ کے بجائے کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر باتیں کر سکیں ...!"

"چاہو تو میرے گھر چل سکتے ہو، میرے بیوی بچے آج کل پاکستان گئے ہوئے ہیں!" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"ملاقاتیوں کو زحمت نہ ہو!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں!" وہ یک بیک بے حد مسرور نظر آنے لگا تھا۔ "ملاقاتیوں میں اپنے کسی ہم وطن سے زیادہ عزیز اور کون ہو گا!" یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ تھام کر واپس ہو لیا۔

"بیوی بچے وطن گئے ہوئے ہیں تو ان کا خلا بھی پورا کر رہے ہو گے!" اسے پہچان لینے کے بعد میں بے تکلفی پر اتر آیا۔

اس نے سر گھما کر غور سے میری طرف دیکھا اور مدھم آواز میں بولا! "میں اس قدر رنگین مزاج نہیں ہوں!"

"تم یہاں بن غازی میں کیا کر رہے ہو؟"

"طرابلس میں وزارۃ الکہرباء میں ملازم ہوں، دو تین ہفتے سے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں یہاں مقیم ہوں!"

باتیں کرتے ہوئے ہم اس کی کار تک پہنچ گئے اور جب ہم کار میں ایک پُرسکون راستے سے گزر رہے تھے تو میں نے اس سے اپنے صفدر علی ہونے کا اعتراف کر لیا۔

میرے اعتراف پر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "مجھے یقین تھا کہ میری نگاہیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں! تم نے جب انکار کیا تھا تو میرا دل بجھ گیا تھا!!"

"میں اس وقت بہت زیادہ پریشان تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے مل جانے سے مجھے بہت سکون ملا ہے!"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے تو سُنا تھا کہ تم ہمالیہ کی طرف چلے گئے ہو!" اس نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"نوشتۂ قسمت جھیل رہا ہوں!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ تمہارے تعاون سے میری مشکلات کچھ کم ہو سکیں!"

"مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا، کروں گا!" اس نے کہا۔ "لیکن میرا کوئی بھروسہ نہیں، جس وقت بھی خروجیہ مل گیا، پاکستان* روانہ ہو جاؤں گا!"

راستے میں جو گفتگو ہوئی، اس سے پتہ چلا کہ ان دنوں شاید لیبیا اور پاکستان* کے تعلقات میں سرد مہری آئی ہوئی تھی کیونکہ وہاں کام کرنے والا جو بھی پاکستانی مقررہ مدت کے بعد پاکستان جانے کے لئے چھٹی کا طلبگار ہوتا تھا، اسے ایک ہی جواب ملتا تھا کہ اگر وطن جانا ہے تو حساب کتاب صاف کر کے اس طرح جاؤ کہ واپسی کی نوبت ہی نہیں آئے۔ یہی مسئلہ عظیم کے ساتھ بھی تھا مگر اس کا محکمہ کوشش کر رہا تھا کہ اسے چھٹی گزارنے کے بعد واپسی کی اجازت مل جائے، اور اسی بندوبست کے انتظار میں وہ بن غازی میں اپنا وقت گزار رہا تھا۔

اس کا مکان مختصر اور صاف ستھرا تھا۔ اس وقت میں شدید تکان اور بے زاری کا شکار ہو رہا تھا، لہٰذا گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد عظیم کے بستر پر دراز ہو گیا اور وہ مجھے چھوڑ کر اپنے کام پر چلا گیا۔

بن غازی میں عظیم میرے لئے بہت بڑا مددگار ثابت ہو رہا تھا، اگر میں کسی ہوٹل میں قیام کرتا تو حمزہ نام کے سہارے جلد یا بدیر میرا سراغ لگا تا اور شاید مجھے شدید مشکلات میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو جاتا مگر عظیم کے گھر پر قیام کرنے کے بعد مجھے اس بیجا خوف سے نجات مل چکی تھی!

اس طرف سے سکون کے بعد دوسرا مرحلہ سیتا تک رسائی کا تھا، اس سلسلے میں طیب کا ملنا بہت ضروری تھا، کیونکہ وہی میری رہنمائی کر سکتا تھا۔ مگر ایئر پورٹ سے ملنے والی معلومات کے مطابق ان دونوں فلسطینی بھی حکومت کے عتاب میں تھے، اس لئے طیب کے بارے میں کھل کر کوئی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی۔

مجھے قوی امید تھی کہ اگر عظیم کو اپنے ملک جانے کے لئے پروانۂ راہداری نہ ملا تو وہ بن غازی میں میرا بہترین معاون ثابت ہو سکے گا!

پاکستان* سے نکلنے کے بعد طویل مدت میں وہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کوئی ایسا شخص ٹکرایا تھا جو پاکستان* میں میرا شناسا تھا۔ اس اعتبار سے میرا دل چاہا تھا کہ میں عظیم کو اپنے سارے حالات بلا کم و کاست سُنا ڈالوں مگر میں غیر ارادی طور پر تمام تر تفصیلات سے گریز کر گیا اور اسے صرف اتنا ہی بتایا کہ میں ایک کاروباری سلسلے میں طیب نامی ایک فلسطینی کا متلاشی ہوں!

اسی ضمن میں اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ میں رینجی فاس کے نام سے یونانی پاسپورٹ پر لیبیا پہنچا تھا!

عظیم نے اس ہیر پھیر کی وجہ دریافت کرنی چاہی تھی، مگر میں شدید تکان کا بہانہ کر کے اس موضوع سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں عظیم کے بستر پر نرم کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک میں نے اپنے اوپر ایک متحرک بوجھ محسوس کیا اور ہڑبڑا کر کمبل دُور اچھال دیا۔

پلکیں جھپکاتے ہوئے میں نے اس حسین چہرے کا دیدار کیا جو بیداری سے قبل مجھے اپنے سراپا کے گداز بوجھ تلے کچل ڈالنے کی کوشش میں مصروف تھا!

وہ متوسط قامت والی ایک خوبرو دوشیزہ تھی جو میرا چہرہ دیکھتے ہی ایک خوفزدہ سی چیخ مار کر دُور جا کھڑی ہوئی تھی۔

"مہندس عظیم کہاں ہے؟" میری تشنہ نگاہیں اپنے چہرے پر مرکوز پا کر اس نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور اندر کیسے داخل ہوئیں؟" میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں یہاں برتن اور کپڑے دھونے آتی ہوں، میرے پاس باہر والے دروازے کی چابی موجود رہتی ہے!" وہ سمٹتے ہوئے بولی۔

"تو کیا پہنے ہوئے کپڑے بھی اتار کر دھوتی ہو؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"میرے منہ نہ لگو!" وہ تند لہجے میں بولی۔ "اگر مجھے علم ہوتا کہ بستر پر کوئی اجنبی سویا ہوا ہے تو ادھر منہ کر کے تھوکنے سے بھی پرہیز کرتی، میں کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں!"

"عظیم سے خاصی بے تکلف معلوم ہوتی ہو!"

اس نے ایک ادا سے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے، میں نے غسل خانے میں گھس کر دوبارہ غسل کیا اور پھر دوست کے کمرے میں آ بیٹھا!

گھر میں کام کرنے والی جواں سال ملازمہ کو علم تھا کہ میں بیدار ہو چکا تھا، لہٰذا وہ غیر ضروری طور پر کچن میں پُر شور آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح وہ میری توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہ رہی تھی، مگر ایک بار عظیم کے ساتھ اس کے تعلق کا علم ہو جانے کے بعد وہ میرے لئے اپنی ساری کشش کھو بیٹھی تھی۔

ساڑھے تین بجے عظیم واپس آ پہنچا۔ اس کے ساتھ گھنی مونچھوں والا ایک سرخ و سفید عرب نژاد شخص بھی تھا۔

عظیم نے مجھے اس شخص کا حامد کے طور پر تعارف کرایا۔

"تمہارا پورا نام حامد عزیز تو نہیں ہے؟" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے تکلفانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ میری زبان سے اپنا پورا نام سُن کر حیران رہ گیا۔ کم و بیش یہی کیفیت عظیم کی ہوئی۔

"خازن الکبریٰ میں کام کرتے ہو!" میں نے اس کی حیرت میں اضافہ کرنے کے لئے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"تمہیں میرے بارے میں یہ سب کس نے بتایا؟" میرے پے در پے سوالات پر حامد ہکا بکا رہ گیا۔

"میں نے تو تم سے حامد کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا!" عظیم نے بلا طلب انداز میں اپنی صفائی پیش کی۔

"تم نے تو یقیناً کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ خازن الکبریٰ میں کام کرنے والا حامد فلسطینیوں کا سرگرم رکن ہے!" میں نے حامد کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا۔

میری معلومات کے بارے میں انہیں اس قدر تجسس پیدا ہوا کہ بات کی وضاحت کے بغیر سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا اور جب میں نے انہیں بتایا کہ وہ معلومات مجھے ایئر پورٹ پر ہی حاصل ہوئی تھیں تو حامد حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی سرگرمیوں کی اس قدر تشہیر ہوتی رہی تھی۔

"تم طیب سے ملنا چاہتے ہو؟" ماحول معمول پر آ جانے کے بعد حامد نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"لیبیا میں میری منزل کا تعین اسی کے ذمے تھا!" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اسے ایئر پورٹ پر میرا استقبال کرنا تھا!"

"شاید وہ تمہارے چکر میں ہی مارا گیا ہے!"

"مارا گیا؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"گھبراؤ نہیں، وہ زندہ ہے!" حامد جلدی سے بولا۔ "پچھلی رات اسے ایئر پورٹ کی حدود میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا اور اب بھی وہ فوجی حکام کی تحویل میں ہے!"

"کل رات تو ایئر پورٹ پر کرفیو تھا!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے بھی سُنا ہے!" حامد نے میری تائید کی۔ "کل رات شاید روس کا کوئی فوجی وفد صدر سے ملنے آیا ہے!"

"طیب کو کن لوگوں سے احکامات ملتے ہیں؟"

"ان تک میری رسائی نہیں ہے!" حامد نے انکسار کے ساتھ اعتراف کر لیا۔ "میں تو تنظیم کا بہت ادنیٰ کارکن ہوں۔ لیبی حکام کی سختیوں کی وجہ سے ہمارے بیشتر اہم اراکین آج کل زیر زمین چلے گئے ہیں!"

"مگر میں نے تو سُنا تھا کہ اب حالات بہتر ہو گئے ہیں؟"

"اسی حد تک بہتر ہوئے ہیں کہ مجھ جیسے بے ضرر لوگ رہا کر دیئے گئے ہیں۔ چار دن پہلے میں بھی قید میں تھا!"

"میرا خیال ہے کہ تم بھی فلسطینیوں کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ ملوث ہو!" عظیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، وہ میری اور حامد کی گفتگو شروع ہی سے نہایت حیرت کے ساتھ سُن رہا تھا۔

"اتفاق کہہ دو!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ورنہ میں تو یہاں ایک بیحد نجی کام سے آیا تھا!"

"تمہارا اصل نام کیا ہے؟" حامد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"عظیم نے کیا بتایا ہے؟"

"رینجی فاس!"

"میں نے لیبیا میں داخلے کے حقوق اسی نام پر حاصل کئے ہیں، مگر میرا اصل نام صفدر علی ہے جو تم اپنی ذات تک محدود رکھو گے!" میں نے کہا۔

"صفدر علی؟" اس نے مضطربانہ انداز میں بے یقینی سے دہرایا۔ "کیا واقعی تمہارا نام صفدر علی ہے!"

"تم عظیم سے تصدیق کر سکتے ہو!" اسے جواب دیتے ہوئے میں نے اپنے دل کی گہرائی میں مسرت کی ایک لہر سی ابھرتی محسوس کی۔

میرا نام سُن کر اس نے جس ردِ عمل کا مظاہرہ کیا اس سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں خاصا کچھ جانتا ہے اور طیب کے قید ہو جانے کے باوجود سیتا کے معاملے میں میری رہنمائی کر سکتا ہے۔

"تم سیتا سے واقف ہو؟" حامد نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں احترام سمٹ آیا تھا اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں!

"وہ میری بیوی ہے... تم اس کے بارے میں جانتے ہو؟" اس مرتبہ حامد کے الفاظ نے مجھے بے چین کر دیا۔

"لیبیا میں وہ بدنصیبی کا شکار ہوئی ہے!" حامد نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

اس کے منہ سے وہ بُرے الفاظ سن کر میں اپنے وجود کی گہرائیوں میں لرز اٹھا اور میں نے اسے شانوں سے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہ شاید میری بدنصیبی ہے کہ اس کی کہانی مجھے سُنانا پڑ رہی ہے۔" حامد افسردہ لہجے میں بولا۔ "وہ صحرائے اعظم کے ایک نخلستان میں کافی دنوں سے ہندوستانی باغیوں کو فوجی تربیت دے رہی تھی، ان باغیوں نے بعض ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ صدر قذافی نے تمہاری بیوی کو لیبیا کے اعلیٰ ترین شہری اعزاز سے نوازا، مگر پھر

اسی مرکز کے ایک بندر نے طبروق کے ایٹمی تحقیقاتی مرکز میں بعض اہم تنصیبات کو بُری طرح تباہ کر ڈالا۔ سننے میں آیا ہے کہ سیتا نے . . . اس حادثے کو بندر کے ذہنی اختلال کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی، مگر اس کے حاسدوں نے ایک نہ چلنے دی اور اسے مختصر سے کورٹ مارشل کے بعد چودہ[14] سال کی قید بھگتنے کے لئے ایک ریگستانی قید خانے میں ڈال دیا گیا؟"

"کہاں ہے، اب وہ کہاں ہے؟" حامد کی زبانی سیتا کی دردناک کہانی سُن کر میں بُری طرح تڑپ اٹھا۔

"یہ کئی ہفتے پُرانا قصہ ہے!" حامد بولا۔ "فلسطینیوں کی تقریباً تمام تنظیموں نے اپنے سارے ذرائع داؤ پر لگا دیئے، مگر صدر قذافی کو یہ باور کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے کہ اس المناک سانحے میں سیتا کے ارادوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ مگر سیتا شاید حالات کے سامنے جھکنا نہیں جانتی، تین روز قبل وہ اس ہولناک ریگستانی قید خانے سے فرار ہو چکی ہے اور لیبیا کے شہری اور فوجی ادارے سر توڑ کوششوں کے باوجود اس کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں!"

"تم جھوٹے ہو!" میں نے بے اختیار اس کا گریبان دبوچ لیا۔ "تم لوگ مجھے سیتا سے دُور رکھنا چاہتے ہو تاکہ اس سے حسبِ مرضی کام لیتے رہو!"

"خود پر قابو رکھو صفدر علی!" عظیم نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں سے حامد کا گریبان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "حامد یہاں مہمان اور میرے دوست کی حیثیت میں آیا ہُوا ہے!"

"ہم لوگ سیتا کے بارے میں تم سے زیادہ متفکر ہیں!" حامد نے گریبان چھوٹنے کے بعد چند گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اس کے تربیت دیئے ہوئے بندروں نے مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کے خلاف ایسے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں کہ کئی انسانی جانوں کی قربانی دینے کے بعد بھی ان کا تصور ممکن نہ ہوتا!"

"میں یہاں صرف اپنی بیوی کو لینے آیا تھا!" مجھ پر یک بیک محرومی کا احساس غالب آ گیا۔ "تم لوگوں نے اسے اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھایا ہے، اور اب تمہیں ہی اسے تلاش کر کے میرے حوالے کرنا ہوگا!"

"تم چاہو تو میں تمہیں ہاشم سے ملوا سکتا ہوں!" حامد نے میری دلی کیفیات کو بھانپ کر پیش کش کر ڈالی۔

"ہاشم کون ہے؟"

"جن لوگوں تک میری رسائی ہے، ان میں وہ سب سے برتر ہے!" حامد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں پہلی فرصت میں اس سے ملنا چاہوں گا!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے فلسطینی مفادات کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا مگر تم لوگوں سے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ میری آمد تک میری بیوی کو اپنی نگاہوں میں رکھتے!"

"اسے لیبیا کی بدترین جیل میں رکھا گیا تھا اور یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ عورت ذات ہوتے ہوئے وہاں سے فرار ہونے کی کوئی کامیاب یا ناکام کوشش کر سکے گی!"

"ہاشم سے کب ملاقات ہو گی؟"

"میں یہاں سے جاتے ہی اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا، وہ پہلی فرصت میں تم سے ملے گا!" اس نے کہا۔

اسی اثنا میں کپڑے دھونے والی دروازے پر آ گئی۔

"قہوہ تیار ہے!" اس نے شاید عظیم سے کہا اور میں اس کی مترنم آواز سُن کر چونک پڑا۔

"قہوہ پیو گے؟" عظیم نے مجھ سے سوال کیا۔

"تم اس کے ہمراہ کچن میں جا کر پی لو تو بے چاری خوش ہو جائے گی!" میں نے کہا اور عظیم جھینپے ہوئے انداز میں ہنس دیا۔

وہ قہوہ لائی اور ہم تینوں خاموشی سے اس سے شغل کرنے لگے۔ حامد بار بار عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"سُنا تھا کہ پچھلے دنوں سیتا کچھ عرصہ کے لئے شام بھی گئی تھی؟" میں نے قہوہ پیتے ہوئے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے، مجھے علم نہیں . . . میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں ایک بہت معمولی کارکن ہوں اور بہت سی اہم باتیں میرے علم میں بھی نہیں آتیں؟"

"مگر سیتا کی قید اور فرار کے بارے میں ساری تفصیلات سے واقف ہو!" میں نے ہنس کر کہا۔

"اس کے بارے میں ساری خبریں اخبارات میں آتی رہی ہیں جس روز وہ جیل سے فرار ہوئی تھی، اس سے اگلے دن سارے اخبارات میں اس کی تصاویر کے ساتھ بڑے بڑے اشتہارات شائع ہوئے تھے جن میں لوگوں سے اس کی دوبارہ گرفتاری میں امداد کی اپیل کی گئی تھی!"

"اس کے تربیت یافتہ بندر اب کہاں ہیں؟"

"ایٹمی تحقیقاتی مرکز کے حادثے کے بعد حکام نے ایک ایک بندر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ مستقبل میں اسی نوعیت کی کسی تخریب کاری کا اعادہ نہیں کرانا چاہتے تھے!"

"سیتا کو ان بندروں کی موت کا بہت دکھ ہُوا ہو گا!"

"یقیناً ہُوا ہو گا!" وہ بولا۔ "یہ صدمہ تو ہم سب کو بھی ہُوا تھا کیونکہ اس کے سدھائے ہوئے بندروں نے اسرائیل کے خلاف تین بہت اہم اور کامیاب کارروائیاں کی تھیں جو شاید ہمارے رضاکار نہ کر پاتے!"

کچھ دیر بعد حامد چلا گیا۔ برتن دھونے والی خادمہ اس سے پہلے ہی جا چکی تھی لہٰذا میں عظیم کے ساتھ وہاں تنہا رہ گیا۔

"سیتا تمہاری بیوی کا نام ہے؟" تنہائی میسر آتے ہی عظیم نے لبوں پر مچلتا ہُوا وہ سوال دہرا ہی دیا۔

"ہاں! صرف بیوی ہی نہیں، تم اسے میری دوست بھی کہہ سکتے ہو!" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کے بچھڑ جانے کے بعد میں اپنی زندگی میں ایک بھیانک خلا محسوس کرتا ہوں!"

"مجھے تمہارے کرب کا احساس ہے!" وہ بولا۔ "کیا تمہاری بیوی ہندو ہے؟"

میں سوگوار انداز میں مسکرا دیا۔ "ہندو زادی ضرور ہے، مگر اب مسلمان ہو چکی ہے، البتہ میں نے اس کا نام تبدیل نہیں کیا!"

"وہ تم سے بچھڑ کر یہاں کیسے پہنچ گئی؟" عظیم کے ذہن میں سیتا کے بارے میں بہت زیادہ تجسس موجود تھا۔ "تمہاری اور حامد کی باتوں سے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ بہت مدت سے بچھڑی ہوئی ہے!"

"بہت طویل کہانی ہے!" میں نے کہا۔ پھر اچانک موضوع تبدیل کر دیا۔ "یہ بتاؤ کہ کپڑے اور برتن دھونے والی عورت سے تمہارے کیسے مراسم ہیں؟"

"کک . . . کیسے ہو سکتے ہیں؟" اس غیر متوقع سوال پر وہ بوکھلا گیا۔ "بس وہ یہاں کام کرنے آتی ہے!"

"ہاتھ پائی بھی کرتی ہوگی؟" میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"میں ان خرافات سے بہت گھبراتا ہوں!" اس نے پارسائی کا اظہار کرتے ہوئے معصومانہ لہجے میں کہا۔

"وہ سوتے ہوئے مجھے عظیم سمجھ کر میرے سینے پر نہ چڑھ گئی ہوتی تو شاید میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا!"

میری بات سُن کر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا اور وہ پھیکے دانشمندانہ لہجے میں بولا۔ "تم مذاق کر رہے ہو!"

"شرمانے کی ضرورت نہیں!" میں اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "بھری تجرد انسان کو ایسے راستوں پر لگا ہی دیتا ہے . . . !"

"میں بس اس سے زبانی حد تک دل بہلا لیتا ہوں!" وہ مجھ سے نظریں چُراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"وہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے، یہ بڑی بات ہے کہ وہ یہاں خوش رہتی ہے!"

عظیم سے میرے پُرانے مراسم میں وضعداری کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ ہم دونوں نے اپنے لئے کچھ حدود مقرر کی ہوئی تھیں اور ہمیشہ ان ہی حدود میں رہ کر گفتگو کرتے تھے، مگر طویل مدت کے بعد دیارِ غیر میں اچانک ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کسی حد تک ستم رسیدہ تھے، اور اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے کسی قابلِ اعتماد ساتھی کے متلاشی تھے اور جب مقدر نے دونوں کو یکجا کر دیا تو رات گئے تک کھل کر باتیں ہوتی رہیں!

عظیم میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی صبح سویرے اپنے دفتر چلا گیا۔ میں دن چڑھے بیدار ہُوا تو کچن میں میرا ناشتہ تیار تھا!

میں نے غسل کے بعد چائے کی پیالی سے پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ دروازے پر دستک سُنائی دی اور میں پیالی چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے بولٹ کھولتے ہی باہر والے نے انتظار کئے بغیر دونوں پٹ اندر دھکیل دیئے اور یکے بعد دیگرے دو مقامی افراد اندر گھس آئے۔

پہلا چہرہ میرے لئے نامانوس تھا اس لئے میں کچھ نہ سمجھ سکا مگر دوسرے نے جب اندر گھستے ہوئے میرے پیٹ میں اپنا گھٹنا مارنے کی ناکام کوشش کی تو مجھ پر ساری صورتِ حال عیاں ہو گئی۔

ائیرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر والا حمزہ نامی شخص اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ساتھی کے ہمراہ میرا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں پھرتی سے ان دونوں کی طرف پلٹا مگر اس اثنا میں حمزہ اپنی جیب سے ریوالور نکال چکا تھا!

"اندر چلو!" اس نے مجھے گھورتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں حکم دیا۔ پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ "اسے اس طرح جکڑ کر باندھنا کہ یہ پوری طرح ہل بھی نہ سکے!"

پوری کا نام سُن کر میں بوکھلا گیا۔ وہ شخص واقعی ضرورت سے زیادہ کینہ پرور اور سفاک معلوم ہوتا تھا!

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟" میں نے آہستہ آہستہ کمرے کی طرف جاتے ہوئے مصالحانہ لہجے میں سوال کیا۔

"بگاڑ لیا ہوتا تو باندھنے کے بجائے گولی ہی مار دیتا!" وہ زہریلی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "تمہارا خیال تھا کہ میں اس مکان میں تم تک نہ پہنچ سکوں گا!"

"تم میرے ساتھ جو سلوک کرو، مگر میں یہ بات ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے!" میں نے اس کی اَنا کی تسکین اور اسے تھوڑی دیر تک گفتگو میں اُلجھائے رکھنے کی نیت سے کہا۔

وہ وحشیانہ انداز میں زور سے ہنس پڑا۔ "وہ بڈھا بہت دوغلا اور لالچی ہے جس نے تمہیں بچ نکلنے کی ترکیبیں بتائی تھیں۔ اسے امید تھی کہ ان مشوروں کے طفیل وہ تم سے چند دینار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مگر جب تم نے اُسے سوکھے شکریئے پر ٹرخا دیا تو وہ تمہیں کوستا ہُوا گھر بھاگ گیا؟" اتنا کہہ کر اس نے رومال سے اپنا منہ صاف

کیا اور پھر کہنے لگا۔ کل میں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کی تو سب سے پہلے اس سے یہی شکایت کی کہ تم نے اس کی بھلائی کے عوض ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ پھر بتا ڈالا کہ تم طیبت نامی کسی فلسطینی کی تلاش میں تھے اور بڈھے کے مشورے کے مطابق مخازن الکبریٰ کے حامد العزیز سے ضرور ملوگے۔ اور کل شام میں نے حامد سے ایک اہم کام کے حوالے سے تمہارے بارے میں دریافت کیا تو اس نے یہ پتہ بتا دیا اور تم جو ہے وان ہی پھنس گئے۔"

"مگر مجھ سے تمہیں کیا پرخاش ہے؟"

"تم نے میرے اختیار کی توہین کی تھی!" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "اور میں تمہیں لیبیا سے نکلوا کر ہی دم لوں گا!"

اس نے فقرہ مکمل کرتے ہی اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب میں سے کپڑے کی ایک لمبی سی تھیلی نکالی جس میں شاید تھوڑی سی ریت بھری ہوئی تھی۔ پھر وہ تھیلی ایک زنّاٹے کے ساتھ میری کھوپڑی کے عقبی حصے پر پڑی اور میں کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

خوابناک دھند میں ڈوبتے ہوئے ذہن میں جو آخری آوازیں پہنچ سکیں، ان میں حمزہ کے قہقہے کی گونج نمایاں تھی!

میری بے ہوشی خاصی طویل ثابت ہوئی۔ آنکھ کھلی تو دوپہر ہو چکی تھی اور میں پھوس کے ایک جھونپڑے میں پیال پر پڑا ہوا تھا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ پھر باہر مجھے بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ گو اس جھونپڑے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، مگر میں نے باہر کا جائزہ لینے کے لئے کھڑکی کا انتخاب کیا اور دیکھا کہ باہر چھ سات آدمی مختلف کاموں میں مصروف ہیں

باہر پھیلے ہوئے سرسبز درختوں اور ان کی آبیاری کے نظام کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ میں اس وقت کسی صحرائی نخلستان میں قید تھا جو شاید حمزہ کی ملکیت تھا!

باہر کام کرنے والوں میں سے اچانک کسی نے کھڑکی کی اوٹ میں میرا چہرہ دیکھ لیا اور وہیں سے للکار کر مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔

باہر والوں میں سے ہر ایک مجھ پر اپنی برتری جھاڑنے کے چکر میں تھا۔ انہوں نے مجھے بیک وقت کئی کام کرنے کے احکام دے ڈالے۔

"حمزہ کہاں ہے؟" چند ثانیوں تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

اسی وقت اچانک کسی نے اچھل کر میری گردن دبوچ لی اور کئی آدمیوں نے مل کر مجھے کسی مویشی کی طرح زمین پر گرا لیا اور پھر میرے جسم پر چاروں طرف سے گھونسوں اور لاتوں کی یلغار کرنے لگے۔

ان لوگوں کی یہ وحشیانہ مشقِ ستم اس وقت تک جاری رہی، جب تک میرے جسم کے کئی حصّوں سے خون رواں نہ ہو گیا!

شاید خون دیکھ کر ہی ان صحرا نشینوں کی وحشیانہ جبلت کو تسکین ملی تھی ورنہ وہ مجھے ہلاک کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے!

اس نخلستان میں تین روز تک میرا قیام رہا اور شاید پانچ چھ مرتبہ ان لوگوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے میری بری طرح مرمت بھی کی۔ اس مرمت اور مشقت کے بعد مجھے وہاں جَو کی نیم پختہ روٹی اور اونٹنی کا پھیکا دودھ شکم پری کے لئے دیا جاتا تھا اور جو میں آنکھیں بند کر کے پی جاتا تھا!

چوتھے روز وہاں ایک جیپ آئی اور جب اس سے اترنے والوں نے اپنے چہروں سے رومال ہٹائے تو پتہ چلا کہ ان میں حمزہ بھی موجود تھا!

"بودے اور مسکین دشمنوں کو میں عموماً معاف کر دیتا ہوں!" حمزہ نے قریب آ کر میری پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اس کا ہاتھ ایک زخم پر پڑا تھا لہٰذا میں کراہ کر آگے جھک گیا۔ "اگر تم یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیتے تو میرا بدن زخموں سے بچ جاتا!"

"یہ ضروری تھے!" وہ سفاکانہ انداز میں بولا۔ "میں چاہتا تو تمہاری لاش صحرا کے کسی دور افتادہ حصّے میں پھینکوا دیتا، مگر مجھے تم پر رحم آ گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں تم سے زیادہ قصور سیکورٹی افسر کا تھا!"

"مجھے خوشی ہے کہ اب تم میرے بارے میں ہمدردانہ انداز میں سوچ رہے ہو!" میں نے اپنی کہنی کا زخم سہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ یاد رکھنا کہ یہاں سے جانے کے بعد اگر تم نے پولیس وغیرہ سے رجوع کرنے کی حماقت کی تو تمہارا عبرتناک انجام ہو گا!"

"میں جانتا ہوں!" میں نے جلدی سے کہا۔

"اسے شہر چھوڑ آؤ!" حمزہ نے اپنے کسی آدمی کو حکم دیا اور میں اپنے نام نہاد محسن سے ہاتھ ملا کر جیپ میں سوار ہو گیا۔

وہ نخلستان بہت مختصر سا تھا۔ کیونکہ جیپ چند منٹ بعد ہی اس کچے راستے پہ آ گئی جو کچھ دور جا کر صحرائی شاہراہ سے مل رہا تھا!

اس وقت سورج اپنے شباب پر تھا اور صحرا میں چاروں طرف تاحدِ نظر ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی اور ریت کے اس زرد سمندر کے درمیان تارکول کی چمکتی ہوئی سیاہ سڑک دور تک کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آ رہی تھی!

پختہ شاہراہ پر وہ صحرائی سفر تسلسل کا سفر تھا۔ جیپ کے انجن کا شور، صحرا کی ریت، سورج کی چمک اور سیاہ سڑک — ہر چیز میں ایک بھیانک تسلسل موجود تھا اور میں ان عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے حمزہ کی زندگی کا تسلسل منقطع کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا!

اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، وہ اس اعتبار سے بہتر تھا کہ میں زندہ سلامت بن غازی کی طرف جا رہا تھا۔ مگر میرے بدن پر لگے ہوئے زخم حمزہ کی بھرپور کمینگی کا کھلا اشتہار تھے اور صفدر علی نے ابھی دشمن کی کمینگی کو معاف کرنا نہ سیکھا تھا!

بات صرف حمزہ تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اس وقت تک میں جن تجربات سے دوچار ہوا تھا، ان کے پیشِ نظر مجھے اپنا قیام [illegible] رہا تھا۔ وہاں کی ہر شے میں مجھے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا، میں نے یہ کیفیت اپنی طویل سیاحت میں پہلی بار محسوس کی تھی۔

صحرا میں ہمارا سفر تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا جس کے بعد شہر [illegible] نظر آنے لگے۔ وہ جاڑوں کا موسم تھا، اگر گرمیاں ہوتیں تو وہ [illegible] گھنٹہ عذاب سے کم نہ ہوتا!

جیپ کے ڈرائیور کو شاید حمزہ نے منزلِ مقصود کے بارے میں [illegible] دیا تھا کیونکہ اس نے مجھے عظیم کے مکان کے سامنے ہی اتارا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کر دیا مگر دروازے [illegible] زمانے کی توا سے مقفل پا کر یاد آیا کہ عظیم اس وقت ڈیوٹی پر [illegible]!...

میں بہت احتیاط کے ساتھ راستے کی نشانیوں کا تعین کرتے ہوئے [illegible] کی طرف چل دیا۔ وہاں کافی وقت گزار کر میں پانچ بجے کے قریب [illegible] لوٹا تو عظیم کا مکان بدستور مقفل تھا۔

گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں سے استفسار پر پتہ چلا کہ عظیم ایک [illegible] پاکستان رَوانہ ہو چکا ہے اور وہ مکان کرائے کے لئے [illegible] ہے!

میں وہاں سے چل پڑا۔ اس مرتبہ میرا رُخ مخازن الکبریٰ کی طرف [illegible] کیونکہ میرے لئے معلومات کا اصل منبع وہی تھا۔

مجھے دیکھ کر حامد نے اپنے کاؤنٹر پر قطار میں کھڑے ہوئے [illegible] کو تیزی سے نمٹایا اور اپنا کیش رجسٹر مقفل کر کے باہر آ گیا۔

"میرے پاس بہت سی باتیں ہیں!" میں نے اسے دیکھتے ہی کہنا [illegible] مگر اس نے حیرت سے میری بات کاٹ دی۔

"تم غائب کہاں تھے؟ اور یہ تمہاری کیا حالت بنی ہوئی ہے؟" [illegible] حالت دیکھ کر وہ واقعی متفکر نظر آ رہا تھا!

"اغوا کر کے قیدی بنا لیا گیا تھا، زندگی تھی کہ ان لوگوں نے [illegible] چھوڑ دیا، ورنہ لاش کا بھی سراغ نہ ملتا!" میں نے کہا۔

"سات بجے میری چھٹی ہو گی!" وہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے [illegible] "اگر یہ وقت تم کہیں گزار لو تو میں تمہیں اپنے فلیٹ پر لے [illegible] چلوں گا!"

"میں سات بجے یہیں واپس آؤں گا!" میں نے کہا اور وہ معذرت [illegible] انداز میں مسکراتا ہوا واپس اسٹور میں گھس گیا۔

سات بجے تک میں بازار میں بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ [illegible] جب میں مقررہ وقت پر واپس لوٹا تو حامد پہلے ہی باہر آ چکا تھا۔

"اب بتاؤ کہ تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" اس نے اپنی کار میں [illegible] بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے اُسے اختصار سے پوری کہانی سُنا دی۔

"او خدا! میری بات سُن کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "مجھے تو شبہ بھی نہیں تھا کہ تمہارا پتہ معلوم کرنے والے تمہارے دشمن ہوں گے، ورنہ میں ان کا خانہ خراب کر دیتا!"

"اب اسے بھول جاؤ، یہ بتاؤ کہ نئی خبریں کیا ہیں؟"

"خبریں تشویشناک ہیں!" وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ "سیتا کے بارے میں پولیس کو اپنے وسائل سے ملنے والی خبروں کی بنا پر پورا یقین ہے کہ وہ جیل سے فرار ہو کر جنوب مشرق کی طرف گئی ہے جدھر ہولناک صحرا پھیلا ہوا ہے اور پچھلے دو روز سے صحرا میں اس کی تلاش جاری ہے۔"

"اُدھر تو وہ بھٹک کر مر جائے گی!" میں نے بے چینی کے ساتھ کہا۔ "خدا کرے کہ اس نے اُدھر جانے کی حماقت نہ کی ہو!"

"اور دوسری بات یہ کہ پولیس کو یہ شبہ بھی ہو گیا ہے کہ سیتا کا شوہر اس وقت لیبیا میں موجود ہے!"

"نہیں!" اس کے الفاظ سُن کر میں حیرت اور خوف سے اچھل پڑا۔ "انہیں سیتا کے شوہر کے بارے میں کیسے علم ہوا؟"

"سیتا کی قید تو بعد کا واقعہ ہے، پہلے اسے مقامی حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی اور اس کے بارے میں تمہارے لئے کئی پیغامات لیبیا کی سرکاری ایجنسیوں کی معرفت بھیجے گئے تھے، اس وقت کا اعتماد اب نقصان پہنچا رہا ہے!" اس نے شرمسار لہجے میں اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"پھر میرے بارے میں سرکاری رویّہ کیا ہے؟"

"انتہائی خونخوار!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "وہ لوگ سیتا کے ساتھ اب تمہیں بھی لیبیا کا دشمن سمجھتے ہیں!"

"یہ باتیں اخبارات میں بھی آئی ہوں گی؟"

"نہیں!" اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "اخبارات میں آئی ہوتیں تو حمزہ بھی باخبر ہوتا اور شاید تمہیں رہا کرنے کے بجائے مشکوک سمجھتے ہوئے پولیس کے حوالے کر دیتا!"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا یہاں رکنا بھی اب میرے حق میں مضر ثابت ہو سکتا ہے!" میں نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"تشویش صرف ایک بات کی ہے کہ سیتا کے فرار کے معاملے کی تحقیقات کے لئے پیرس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ سے ماہر سراغرساں بلائے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بیرونی امداد کے بغیر اس جیل سے کسی عورت کا فرار ہونا ناممکنات میں سے ہے اور اس بارے میں بنیادی مفروضہ یہ رکھا گیا ہے کہ سیتا کو فرار میں فلسطینیوں سے مدد ملی ہو گی!" اس نے اُلجھے اُلجھے لہجے میں کہا۔

"تمہاری باتوں سے مجھے وحشت ہو رہی ہے!"

"سرگرم فلسطینیوں سے بازپرس کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے،

ایک شخص پر تشدد بھی کیا گیا ہے، شاید کسی وقت وہ لوگ مجھ تک بھی آ پہنچیں! وہ اس بدلی ہوئی صورتِ حال پر خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

"پھر مجھے الگ رہنا چاہیئے!"

"پچھلے ایک ہفتے میں لیبیا آنے والے غیر ملکیوں کی کڑی جانچ پڑتال کی جا رہی ہے اور وہ تم تک بھی پہنچیں گے۔ خاص بات یہ ہے کہ مقامی حکام سے صفدر علی اور سیتا کا رشتہ معلوم ہونے کے بعد اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے اپنے طور پر تل ابیب سے تمہارے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی ہیں!"

"گھیرا تنگ ہو گیا ہے!" میں ہونٹ بھینچ کر بڑبڑایا۔ "مگر میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اگر سیتا اس ملک کی سرحدوں میں ہے تو میں اسے حاصل کئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا!"

"لیکن تم قانون کے محافظوں کا سامنا کرنے سے گریز ہی کرتے رہو تو بہتر ہے۔ بازاروں میں بھی راہ چلتے غیر ملکیوں کو روک کر ان کے کاغذات وغیرہ دیکھے جا رہے ہیں۔ اگر تم ان کے ہاتھ لگ گئے تو نجات مشکل ہو جائے گی!"

"قانون!" میں تلخ انداز میں ہنس پڑا۔ "قانون اندھا ہوتا ہے اور میں برسوں سے اس اندھے سے لڑتا چلا آ رہا ہوں۔ میں آج ہی اپنا پاسپورٹ تلف کر دوں گا۔ مجھے ریئی فاس کے ڈھکوسلے کی ضرورت نہیں!"

"دیکھو سیتا ضرور مشکلات میں مبتلا ہے!" وہ جھجکتے ہوئے ناصحانہ انداز میں بولا۔ "مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی غیر ضروری مسائل میں ٹانگ اڑا بیٹھو!"

"میں یہ سب باتیں جانتا ہوں!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم دیکھو گے کہ اب حالات کچھ اور ہوں گے۔ میں اس ملک کو جائے امان سمجھ کر یہاں آیا تھا، مگر یہاں ہر طرف سے مجھ پر مصائب نازل کئے جا رہے ہیں، ان کا حساب چکانا میری ذمّہ داری بنتا جا رہا ہے۔ میں حمزہ کے آدمیوں کے لگائے ہوئے زخموں کو بھی بھول جانے پر آمادہ تھا، مگر اب میں اپنے لہو کی ایک ایک بوند کا حساب لوں گا۔ اگر تم اس ہولناک معرکے میں میرا ساتھ نہ دے سکو تو اپنی کار روک کر مجھے یہیں اتار دو، میں اپنا حساب خود چکا لوں گا!"

"تم جذبات کی رو میں آ کر بہک رہے ہو!" میرے لہجے پر حامد پریشان ہو گیا...

"بہک نہیں رہا بلکہ اپنی اصلیت کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ میں اب تک اس سرزمین پر مظلوم بنا رہا لیکن حالات مجھے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر رہے ہیں اور میں حالات کی اس پکار پر لبّیک کہنے کو تیار ہوں....!!"

میرے تیور دیکھ کر حامد خاموش ہو گیا اور اس کی کار اپنے مسافروں کے بوجھل سکوت میں منزل کی طرف بڑھتی رہی۔

پھر حامد نے جونہی اپنی کار ایک گلی میں گھمائی، اس کا پیر بے اختیار بریک پیڈل پر جا پڑے۔

اس گلی میں پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں اور باوردی مسلح سپاہی فٹ پاتھ پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

"میرا فلیٹ شاید محاصرے میں ہے!" حامد اضطراری لہجے میں بڑبڑایا اور اسی کے ساتھ اس نے ریورس گیئر ڈال دیا۔

مگر وہ دیکھا جا چکا تھا یا شاید اس کی کار پہچان لی گئی تھی کیونکہ کئی سپاہی اپنی رائفلیں سیدھی کرتے ہوئے اس کی طرف دوڑ رہے تھے!

حامد نے جونہی اپنی کار کو پیچھے لے جانے کی کوشش کی اچانک کہیں سے دو فائر ہوئے اور اس کی کار کا ایک اگلا ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا۔

میں نے اپنی سمت کا دروازہ کھول کر اندھا دھند نیچے چھلانگ لگا دی!!!

حامد العزیز نے بھی اپنی مجروح کار سے نیچے آنے میں تاخیر نہیں کی تھی بلکہ وہ توانا تر ثابت ہوا کیونکہ میرے اترنے تک پوری کار کا چکر لگا کر میرے قریب ہی آ موجود ہوا تھا۔

"بھاگو!" میرا داہنا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر وہ ہذیانی انداز میں چیخا مگر میں اس کے بولنے سے قبل ہی اپنا توازن درست کر کے دوڑ پڑا تھا۔

اس تنگ سی گلی میں دونوں طرف کئی منزلہ اونچی رہائشی عمارات بنی ہوئی تھیں اور وہاں خاصے بچوں اور افراد کی آمد و رفت بھی جاری تھی کار کے ٹائروں پر کئے جانے والے فائروں کے دھماکوں کے سبب وہاں بھگدڑ سی مچ گئی اور لوگ خوفزدہ انداز میں چیختے چلاتے ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔

اس اثنا میں شاید مجھے اور حامد کو کار سے کودتے دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ مختصر سے وقفوں کے بعد یکے بعد دیگرے تین ہوائی فائر کئے گئے مگر میں بھاگنے والوں کے بدحواس ہجوم میں شامل ہونے کے بعد خود کو بہت زیادہ محفوظ اور مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس رات کے آٹھ بجے فضا پر چھا جانے والا اندھیرا میرے لئے اس ہولناک صورتحال میں آغوشِ مادر کی طرح مہربان ثابت ہوگا۔

غنیمت یہ تھا کہ افراتفری اچانک ہی پیدا ہوئی تھی اور بھاگنے والوں میں کسی کو یہ جاننے کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ ابتدائی فائر کیوں اور کس پر کئے گئے تھے لہٰذا کوئی بھی میری یا حامد کی طرف

زبہ نہیں ہوا تھا۔

دوسری سہولت پولیس والوں نے اپنی حماقت سے پیدا کی
فی انہوں نے حامد کی رہائش گاہ پر دھاوا بولا تھا اور شاید اس
رت کو بھی کڑے محاصرے میں لیا ہوا تھا جس میں حامد کا فلیٹ واقع
، مگر انہوں نے اس عمارت کو آنے والے راستوں کی ناکہ بندی پر توجہ
نہیں دی تھی۔

میرا ارادہ تو یہی تھا کہ ہم دونوں سیدھے بھاگتے ہوئے اس
سے نکل جائیں گے اور پولیس اپنی ناکامی پر سر پیٹتی رہ جائے گی مگر
مدالعزیز کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔

اس نے میرا داہنا ہاتھ نہایت مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ ہم
دونوں شانے سے شانہ ملائے پوری قوت سے دوڑ رہے تھے
ہاہر بھی زیادہ بدحواس قسم کے راہگیروں نے دو مرتبہ ہم دونوں
کے درمیان سے گزرنے کی کوشش میں اپنے سینوں پر میری داہنی
ی یا حامد کے بائیں ہاتھ کے نیچے کی براہِ راست ضرب محسوس
اور پھر عربی میں مغلظات بکتے ہوئے اپنا راستہ بدلنے پر مجبور
گئے پھر اچانک ہی حامد العزیز میرا ہاتھ تھامے ہوئے اچانک
عمارت کے داخلی راستے میں گھس گیا۔

کشادہ راہداری روشن تھی اور وہاں بہت سے خوفزدہ مرد
ور عورتیں تجسّس آمیز انداز میں ستونوں وغیرہ کی اوٹ میں موجود تھے۔
"کیا ہوا؟" اسی راہداری میں ایک جگہ ایک بے حد متجسّس
بوکھلائے ہوئے مقامی نے حامد کا بازو تھام کر اسے روکنے کی
کوشش کرتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔
"قتل!" حامد اپنی رفتار میں فرق لائے بغیر بولا۔ "راستے
اور گلی میں لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے!"
اپنا فقرہ پورا کرنے تک وہ سوال کرنے والے سے کافی دور نکل
آیا مگر اس کے الفاظ پوری طرح دوسروں تک پہنچ گئے تھے۔

"دونوں طرف سے دروازے بند کر دو!"
"کسی کو اندر نہ گھسنے دو!"
"گولیاں چل رہی ہیں، ہم بھی مارے جائیں گے"
بیک وقت بہت سے لوگ بولنے لگے۔

چند ثانیوں بعد ہم دونوں اس عمارت کے عقبی راستے سے گلی میں نکلے تو میں حامد کی عقل کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے بلڈنگ کی راہداری سے گزرتے ہوئے وہاں ایسا ہراس پھیلا دیا تھا کہ ہمارے نکلتے ہی عقبی راستہ بھی بند کر دیا گیا اس طرح ہم دونوں کو سانس لینے کی مہلت مل گئی تھی۔

رائفلوں کے فائر دوسری گلی میں بھی سنے گئے تھے مگر وہاں زیادہ افراتفری نہیں تھی البتہ لوگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے اپنی اپنی تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ جو دو تین افراد پہلی گلی سے فرار ہو کر ادھر آئے تھے ان کے گرد زیادہ بھیڑ نظر آ رہی تھی۔

عقبی گلی میں قدم رکھتے ہی ہم دونوں نے بیک وقت اپنی رفتار معتدل کر دی ہمارے سینے دھونکنی کی طرح چل رہے تھے مگر میرا خیال تھا کہ اپنی رفتار کم کر کے ہم نے خود کو لوگوں کی توجہ کا نشانہ بننے سے بچا لیا تھا۔

"اس گلی میں وہ ایک ہی عمارت ایسی ہے جو دونوں گلیوں کو ملاتی ہے ورنہ ادھر آنے کا راستہ خاصا طویل ہے!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد حامد نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا۔

"عجیب بات ہے!" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ "شاید یہاں کے لوگ دوسرے راستے کی افادیت سے بے خبر ہیں!"

اعصاب شکن خوف اور سنسنی کے باوجود وہ مسکرا دیا۔ "وہ عمارت دو قطعاتِ اراضی کو ملا کر بنائی گئی ہے باقی سب عمارات کی عقبی دیواریں ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں!"

فضا میں وقفے وقفے سے ابھرنے والی فائرنگ کی آوازیں دم

توڑ چکی تھیں۔ شاید پولیس والوں کو یہ خوف آ گیا تھا کہ اس طرح وہ اصل ملزمان کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر مقامی آبادی میں خوف و ہراس پھیلا رہے تھے۔

اس علاقے کی ہر گلی میں اِکّا دُکّا ایسی عمارات بنی ہوئی تھیں جن میں نکاسی کے دو راستے تھے اور حامد ایسی ہر عمارت سے بخوبی واقف تھا ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہمیں اگلی سمت میں جانے کے بجائے واپس چلنا پڑا کیونکہ وہ عمارت پیچھے رہ گئی تھی جو پانچویں گلی کو چھٹی گلی سے ملاتی تھی!

اور آخر کار ہم چھٹی گلی سے ایک روشن شاہراہ پر نکل آئے۔

"تمہیں تو یہ ساری مخصوص عمارتیں اس طرح یاد ہیں جیسے تم مدت سے آج کے واقعے کی تیاری کرتے رہے ہو!" میں نے پہلی بار خود کو پُرسکون محسوس کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"جذباتیت یہاں کا قومی مزاج ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا "فلسطینی تو یہاں کئی بار مقامیوں کے عتاب کا شکار ہو چکے ہیں لہٰذا حالات بگڑنے سے قبل ہی ہم لوگ نکاسی کی راہوں پر اپنی نگاہ رکھتے ہیں!"

"یہاں بہت محتاط ہو تم لوگ؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چند ثانیوں بعد ہم دونوں ایک ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

حامد العزیز نے ٹیکسی ڈرائیور کو جس مقام پر چلنے کی ہدایت کی اس کا نام میرے لئے اجنبی تھا مگر میں خاموش ہی رہا اور یہ دو طرفہ خاموشی ڈرائیور کی موجودگی کے باعث سارے راستے میں برقرار رہی!

اس سفر کا اختتام بن غازی کے ایک بارونق اور ستھرے بازار میں ہوا۔

ٹیکسی کے آگے بڑھ جانے کے بعد میں حامد کی طرف متوجہ ہو گیا "میں تم سے کہیں بیٹھ کر بات کرنی چاہتا ہوں، تم نہ جانے کیا سوچے بیٹھے ہو؟"

"یہاں ہم ایک قہوہ خانے میں چند منٹ گزاریں گے اس کے بعد ٹیکسی میں دس بارہ منٹ کا ایک سفر اور ہو گا پھر ہم کھل کر باتیں کر سکیں گے!" اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ساتھ ہی اب تم بھی روپوشی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے؟"

"ایک سے دو ہوں تو ہر کام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔"

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟" میں نے اس کے ہمراہ ایک طرف بڑھتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا "تمہارے فلیٹ پر جس بھاری نفری کے ساتھ انہوں نے دھاوا بولا ہوا تھا اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ فیصلہ کافی پہلے کیا گیا ہو گا ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ تمہیں مخازن الکبریٰ میں ہی دھر لیتے!"

"یہ لیبیا ہے دوست!" وہ پھر مسکرا دیا "یہاں والوں کے کام کرنے کے اپنے انداز ہیں جو تمہارے لئے حیران کن ہو سکتے ہیں مگر میں ان کا عادی ہوں!"

"میں کچھ نہیں سمجھا۔"

"اوّل تو یہاں والے نہایت تیزی میں سب کچھ کر گزرنے کے عادی ہیں۔" وہ بولا "پھر دوسری بات یہ ہے کہ پولیس، سراغرسانی اور آرمی انٹیلی جنس کے افسران کو مشکوک افراد کے گھروں پر اچانک دھاوا بول کر خانہ تلاشی لینے اور پھر انہیں گرفتار کرنے کا طریقہ بہت مرغوب ہے، اگر وہ مخازن الکبریٰ کا رُخ کرتے تو شاید میرے ساتھ تمہارے ستارے بھی گردش میں آ گئے ہوتے ویسے مجھے پورا یقین ہے کہ جو بھی فیصلے ہوئے وہ سات بجے کے بعد ہی ہوئے ورنہ مخازن الکبریٰ سے نکلنے کے بعد میری نگرانی ضرور کی جاتی۔"

"تو یہ ساری تیاری تمہارے لئے تھی؟"

"یقیناً!" اس نے بڑے اعتماد لہجے میں کہا "تیاری میرے ہی لئے تھی، یہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری تلاش کی مہم کا ایک حصہ ہی ہو!"

"سات بجے کے بعد فیصلہ کرنے کے بعد اتنی قلیل مدت میں کارروائی کر گزرنے کا معاملہ بھی میرے حلق سے نہیں اترتا!"

"جب اَنا کی پشت پر سرمایہ کارفرما ہو تو یہی کچھ ہوتا ہے" اس نے کہا "تم بتا سکتے ہو کہ لیبیا کی فضائیہ کے تمام لڑاکا اور بمبار طیارے کم از کم کتنی مدت کے نوٹس پر فضا میں آ سکتے ہیں؟"

"پوری فضائیہ کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں — !"

"دو گھنٹے!" میں نے اپنی دانست میں نہایت کم وقت کا اظہار کیا مگر حامد العزیز میرا جواب سن کر ہنس دیا۔

"صرف نصف گھنٹے کے نوٹس پر لیبیا کے تقریباً ساڑھے تین سو طیارے اپنی فضاؤں میں بلند ہو سکتے ہیں!"

"زبانی بات ہے۔" میں بے اعتباری سے ہنس دیا "کبھی عمل کی نوبت آ گئی تو شاید ایندھن لینے میں ہی پورا دن گزر جائے!"

"اس معیار کی آزمائش کے لئے ہر دو ہفتے بعد ..... صدر قذافی کی نگرانی میں عملی مشقیں کی جاتی ہیں اور طیارے ہنگامی اطلاع ملنے کے بعد نصف گھنٹے سے بھی کم مدت میں عقابوں کی طرح فضاؤں میں پھیل جاتے ہیں۔"

"دیکھنے میں تو یہاں کے لوگ خاصے کاہل نظر آتے ہیں۔"

"اپنے اپنے مشاہدے کی بات ہے۔" وہ بولا "لیبیا کام کرنے سے زیادہ کام لینے میں ماہر ہیں طرابلس میں دو ماہ کی قلیل مدت میں چار ہزار میگاواٹ کے ایک پاور ہاؤس نے کام شروع کر دیا تھا جو ماہرین کی رائے کے مطابق گیارہ ماہ سے کم عرصے میں کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔"

"جن لگائے گئے ہوں گے!"

"کام کرنے والے وہی تھے جو گیارہ ماہ کی بات کرتے تھے فرق صرف یہ ہوا کہ مزدوروں اور فنی ماہرین کو دو ماہ میں تکمیل کی صورت میں سرکاری خزانے سے چار گنا معاوضہ دینے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔"

"اگر وہ تم ہی کو پکڑنے آئے تھے تو اس کا جواز کیا تھا؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

"میں نے کہا نا کہ میری تلاش شاید تمہارے شکار کی مہم کا ہی ایک حصہ ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا "اور پھر تمہارے بارے میں ایک سرگرم فلسطینی پہلے ہی مقامی حکام کے تشدد کا نشانہ بن چکا ہے!"

"اگر میں تمہارے ساتھ نہ ہوتا تو کیا اس وقت بھی تم فرار کی راہ اختیار کرتے یا خود کو حکام کے حوالے کر دیتے؟"

"لیبی بازپرس کے سلسلے میں بہت نپے تلے اصولوں پر عمل کرتے ہیں جو بیس گھنٹے تک مشکوک ترین افراد سے بھی ایسے احترام کے ساتھ سوالات کئے جاتے ہیں کہ وہ خود کو معزز شہری سمجھنے لگتے ہیں پھر دو روز تھرڈ ڈگری میں بسر ہوتے ہیں اگر اس مرحلے پر حکام کو ملزم کی بے گناہی کا یقین ہو جائے تو اسے رہا کر دیا جاتا ہے اعتراف کرلے تو مقدمہ شروع اور اگر حکام یہ سمجھ لیں کہ ملزم سخت جان ہے اور اس نے اپنی زبان بند رکھنے کا تہیہ کیا ہوا ہے تو اسے غیر معینہ مدت کے لئے کہیں گمنام جگہ پر قید کر دیا جاتا ہے!" اس نے بتایا۔

"پھر مقدمہ چلاتے ہیں؟"

"سال چھ ماہ بعد مقدمہ بھی شروع ہوتا ہے اور اس وقت ملزم میں مزاحمت کی ذرا سی صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی!"

"بہت ہولناک طریقۂ کار ہے۔" میں پھریری لے کر بولا "ملزم کے مقدر کا انحصار تفتیشی حکام کے آمرانہ فیصلوں پر ہوتا ہے!"

"حیرت کی بات ہے کہ اس طریقۂ کار کے تحت کم و بیش ستانوے فیصد یقینی مجرم سزایاب ہوتے ہیں، صرف تین فیصد کے بارے میں بے گناہی کا نہایت موہوم سا شبہ کیا جا سکتا ہے!"

"میں یقین نہیں کر سکتا۔"

"مگر یہ حقیقت ہے!"

"اسی وقت کی بات لے لو، اگر ہم مقابلے میں ناکامی کے بعد گرفتار کر لئے جاتے تو ہمیں پکڑنے والے تفتیش کے دوران ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتے!"

"اس طریقۂ کار کی کامیابی کا راز ہی یہی ہے کہ تفتیش کرنے والے ادارے علیحدہ ہیں اور ان میں نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کے منجھے ہوئے افراد ملازم ہیں پولیس کو بیانات لینے کے لئے تشدد کا کوئی اختیار نہیں ہے!"

"پھر سیتا کے ساتھ کیا ہوا؟" میں نے اس کی پُرزور وکالت کو ناپسند کرتے ہوئے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

حامد العزیز کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا ندامت سے بچنے کے لئے وہ بوکھلاہٹ میں ایک سبزی قہوہ دکان میں گھس گیا۔

وہاں سے اس نے غیر ضروری طور پر سگریٹ کے دو پیکٹ کچھ چیونگم اور ایک عدد شیونگ سیٹ خریدا۔ اور جب ہم باہر نکلے تو وہ مجھے بولنے کا موقعہ دیئے بغیر لیبیا کے موسم پر نہایت روانی سے بولے جا رہا تھا۔

میں قہوہ خانے میں داخل ہونے تک نہایت تحمل سے اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرتا رہا، اور پہلا موقعہ میسر آتے ہی میں نے اس سے سوال کر ڈالا۔

"یعنی اکیلے ہونے پر بھی تم وہی کچھ کرتے جو آج کیا ہے؟"

"کیا غضب کر رہے ہو؟" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں میز پر کہنیاں جما کر میری طرف جھک آیا "یہاں ایسی باتیں خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں!"

"یہ میں بھی جانتا ہوں۔" میں نے اسے سرد نگاہوں سے گھورتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "نپے تلے الفاظ میں ہر بات ہر جگہ کی جا سکتی ہے!"

"تم پر میری طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔" وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولا "میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیئے تھا۔"

"بس میں یہی جاننا چاہتا تھا۔" اس کے الفاظ سن کر میرے دل و دماغ پر سے کوئی بہت بڑا وزن ہٹ گیا۔

تلخ قہوے کی تین ننھی ننھی پیالیاں اپنے اپنے معدوں میں اتارنے کے بعد ہم دونوں وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" باہر آنے کے بعد میں نے سوال کیا۔

اس نے محتاط انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر دھیمی آواز میں بولا "میں تمہیں اس وقت ہاشم کے مکان پر لے جا رہا ہوں .....!"

"وہ میرے لئے کیا کر لے گا؟"

"ایسی باتیں نہ کرو۔" وہ میرا شانہ تھپتھپا کر بولا "میری کار تو خیر پہچان ہی لی گئی تھی مگر دونوں طرف کے دروازے کھلنے کے سبب اندھیرے کے باوجود انہوں نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ کار میں دو آدمی تھے

دیکھا جائے تو انہیں تمہارے بارے میں بہت اہم سراغ مل چکا ہے ایسا نہ ہو کہ ہم سے الگ ہونے کے بعد تم بڑی دشواریوں سے دوچار ہو جاؤ اور ہم کچھ بھی نہ کر سکیں!"

"انہیں گمراہ کرنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ میں فلسطینیوں سے اپنے تمام روابط منقطع کر لوں اور اپنی جنگ تنہا لڑوں!" مجھ پر اس وقت بگڑے ہوئے حالات کے سبب انتہا پسندی غالب آتی جا رہی تھی۔

"یہ تمہاری بھول ہے میرے دوست!" وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "عربوں پر قوم پرستی کے جنون میں مبتلا ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے مگر لبتی اس معاملے میں بہت کٹر ہیں تم خود کو ان میں کسی طرح مدغم نہ کر سکو گے اور کسی بھی مرحلے پر کوئی لبتی ہی تمہیں مروا دے گا۔"

"میں اپنے لائحہ عمل کے بارے میں فیصلہ کروں گا فی الحال تم جہاں چاہو میں چلنے کے لئے تیار ہوں!"

"ہاشم تمہارے بارے میں فکرمند ہے۔" وہ بولا۔ "اگر حمزہ نے تمہیں اغوا نہ کر لیا ہوتا تو شاید تم اب تک اس سے مل کر کوئی راہ تلاش کر چکے ہوتے۔"

"راہ" میں تلخ انداز میں ہنس پڑا۔ "راہ تو بے چاری سیتا تلاش کر رہی ہو گی۔ جسے حالات نے ریت کے ہولناک سمندر میں ہانک دیا ہے۔"

"ضروری نہیں کہ وہ ادھر ہی گئی ہو۔" حامد العزیز مدافعانہ لہجے میں بولا۔ "اس کے بارے میں ابھی تک کہیں سے خفیف سا سراغ بھی نہیں مل سکا ہے اور اگر وہ صحرا میں ہی نکل گئی ہے تو جاڑوں کا یہ موسم وہاں اتنا خوفناک نہیں ہوتا۔"

میں زہریلے انداز میں پھر ہنس پڑا۔ "یہ اسے بتانا جو صحراؤں کا تجربہ نہ رکھتا ہو، میں مشرقِ وسطیٰ کے ریگزاروں میں طوز کلمزا چکھ چکا ہوں ان ہولناک صحرائی آندھیوں میں سینکڑوں فٹ بلند ریت کے تودے ایک سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہاں شاید تم ان آندھیوں کو گیلی کہتے ہو اور پھر جاڑوں میں صحرا کی یخ بستہ ہوائیں ہڈیوں میں پیوست ہو کر براہِ راست نلیوں کے گودے کو جما دینے کی طاقت رکھتی ہیں نہ جانے وہ بے چاری اس وقت کن مشکلات سے دوچار ہو گی۔"

"شجاعت اور بے خوفی کے سلسلے میں ہم نے سیتا کی جو کہانیاں سنی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے اسے بے پناہ قوتِ برداشت سے بھی نوازا ہے اور......!"

"اور تم سب مل کر اس قوتِ برداشت کا امتحان لے رہے ہو!" میں نے اس کا فقرہ درمیان سے ہی اچک لیا۔

"تلخ باتیں نہ کرو برادر!" وہ چلتے چلتے رک کر گمبھیر لہجے میں بولا۔ "میں ہی نہیں، ہر فلسطینی کا بال بال تمہارا احسان مند ہے چاہو تو حکم دے کر آزما لو، تمہارے ایک اشارے پر کسی تیز رفتار کار کے سامنے کود کر جان نہ دے دوں تو میرے سر پہ پھٹے ہوئے جوتوں کی برسات کر دینا۔"

"سیتا کی مشکلات کے ذمہ داروں کے ساتھ شاید میں اس سے بھی بدتر سلوک کروں گا مگر تمہارے ساتھ میں کوئی برائی نہیں کر سکتا۔"

"سیتا تمہاری بیوی ہی نہیں، میں اسے اپنی بہن سمجھتا ہوں۔" اس نے جذباتی لہجے میں بات شروع کی مگر حیرت کے باعث میں نے اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔ "تم ملے تھے اس سے؟"

"اس سے ملنا ہر کس و ناکس کے لئے ممکن نہیں تھا۔" وہ حسرت زدہ لہجے میں بولا۔ "کاش میں اس سے ملا ہوتا، مگر اس کی ذات کے گرد تو ایسا ناقابلِ شکست حفاظتی حصار تھا کہ مجھ جیسے عام آدمی کے لئے وہ جیتی جاگتی عورت سے زیادہ ایک نادیدہ علامت بن کر رہ گئی تھی مگر اس کے بارے میں جو کچھ ہم نے سنا اس کے باعث ہمارے دلوں میں اس کے لئے بے پناہ احترام ابھر آیا۔"

"تمہارا ایک ایک لفظ میرے زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہے حامد العزیز!" میں کرب آلود لہجے میں بولا۔ "جب تک وہ مجھے نہیں مل جاتی میں اس عالمِ خرابات کی گہرائیوں میں غرق ہو کر اسے بھولے رہنا چاہتا ہوں مگر لوگوں کے پُرعقیدت اور خلوص آمیز تبصرے میرے زخموں کو تازہ کر دیتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے!" وہ بس اسی قدر کہہ سکا کیونکہ اس اثناء میں ایک ٹیکسی نظر آ گئی تھی جو حامد کے اشارے پر ہمارے قریب رک گئی۔

"کہاں جانا ہے؟" ادھیڑ عمر مقامی ڈرائیور نے ہماری سمت والی کھڑکی کا شیشہ اتار کر کرخت لہجے میں سوال کیا۔

"شارع بحرین!" حامد العزیز نے جواب دیتے ہوئے دروازے کے لیور پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر ٹیکسی ڈرائیور نہایت تیزی کے ساتھ اپنی ٹیکسی آگے بڑھا لے گیا۔ جیسے حامد العزیز نے اسے کوئی گندی گالی دے ڈالی ہو۔

"اسے ہماری منزل پسند نہیں آئی۔" حامد العزیز نے نفرت آمیز انداز میں ہنستے ہوئے تبصرہ کیا۔

اس وقت مجھے اپنا وطن یاد آ گیا۔ میں نے تلخی کو کم کرنے کی نیت سے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہاں اگر تم مشرق کی طرف جانا چاہو تو ٹیکسی ڈرائیور نہایت بے تکلفی سے کہہ ڈالتا ہے کہ وہ تمہیں مغرب کی طرف لے جا سکے گا۔"

"بیروت اور پیرس کے ڈرائیور بہت مسکین ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ "...رغامی مسافروں کو ترجیح دیتے ہیں اور انہیں پوچھے بغیر کسی... کی چوکھٹ پر اتار دیتے ہیں خواہ مسافر کٹر مذہبی آدمی ہی... ...نہ ہو!"

"...خاصے تجربہ کار ہو!"

"...بنیادی خرابی یہ ہے کہ میں شراب کا عادی ہوں۔" وہ ...ٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "شراب کے بعد عورت کی طلب ہوتی ...اگر یہ بھی بآسانی پوری ہونے لگے تو طبیعت تبدیلیوں کی متلاشی ...ہے۔ یہ تبدیلیاں کسی نہ کسی مرحلے پر انسان کو اس بازار میں ...جاتی ہیں جہاں خوابناک دھندلکوں میں مخمور ذہن اپنی پسند ...وں کی اونچی بولیاں لگانے کے لئے جمع ہوتے ہیں!"

"...پھر یہاں کیسے زندہ ہو؟"

"...قانون سخت ہو تو ذرا دام بڑھ جاتے ہیں۔" وہ اپنی داہنی آنکھ ...بولا۔ "شکر خورے کو شکر ہر جگہ ملتی ہے!"

"...آج کی رات......!"

اس مرتبہ میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ دوسری ٹیکسی آ ...تی۔ وہ خاصا حلیم الطبع انسان معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ شارع بحرین ...سن کر نہ صرف تحمل کے ساتھ برداشت کر گیا بلکہ ہمیں سوار ہونے ...کی اجازت بھی عطا کر دی۔

سفر کا آغاز ہوتے ہی ہم دونوں کو ایک بار پھر چپ لگ گئی ...ہاغازی کی روشنیاں تیزی سے پیچھے دوڑنے لگیں۔

روشن، نیم روشن اور تاریک علاقے تیزی سے گزرتے رہے ...ہ بیکل ٹیکسی کسی سبک رفتار شکاری درندے کی طرح دھیمی ...غراہٹوں کے ساتھ ہموار سڑک پر تیرتی رہی۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو یا تمہارا ساتھی ...ملبہ ہے؟" خاصے طویل سکوت کے بعد ڈرائیور نے بظاہر حامد العزیز ...سے مخاطب کرتے ہوئے ظریفانہ لہجے میں سوال کیا۔

"...میں نے بولنا شروع کیا تو تمہیں خارش شروع ہو جائے ...گی۔" ...نے فوری طور پر تند لہجے میں کہا۔ اس کا بے تکلفانہ طرز ...مجھے پسند نہیں آیا تھا۔

وہ قلقاری مار کر یوں ہنسا جیسے مجھے چڑا کر خاصا محظوظ ...ہوا ہو۔ "مجھے وہ مسافر بہت پسند آتے ہیں جو سارے راستے آپس میں ...لڑتے رہیں اس طرح مجھے مفت میں تجربات کا نچوڑ حاصل ہوتا ...رہتا ہے۔"

"...تم کار رفتہ معلوم ہوتے ہو جو دوسروں کے تجربات نچوڑنے ...کی فکر میں رہتے ہو۔" میں نے خوش دلانہ انداز میں کہا۔

"تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی!" اس نے یہ کہتے ہوئے ...آواز میں اسٹیریو آن کر دیا اور فضا اشتعال انگیز مغربی موسیقی کے سروں سے گونج اٹھی۔

"کنوارے معلوم ہوتے ہو!" میں نے ذہن پر یلغار کرتے ہوئے تفکرات سے چھٹکارا پانے کے لئے اس سے بات جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" اضطراری طور پر اس نے گردن پیچھے گھمالی۔

"سامنے دیکھو ورنہ گاڑی کہیں لڑا دو گے۔" میں نے بوکھلا کر کہا اور اس نے دوبارہ اپنی گردن سیدھی کر لی۔ "تمہارے ایک ایک لفظ سے ناآسودگیوں کی بو آ رہی ہے......کوئی بھی تمہاری باتوں سے اندازہ لگا سکتا ہے۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ "میں نے ایک فرانسیسی لڑکی کو چاہا تھا اور اسے اپنے ساتھ پیرس سے یہاں لایا تھا مگر وہ دو ہفتے بعد ہی مجھے چھوڑ کر اپنے وطن بھاگ گئی۔" فقرے کے اختتام پر اس نے دوسرا ٹھنڈا سانس لیا۔

"کیوں بھاگ گئی؟" میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔

"اسے چھپ کر شراب پینے سے نفرت تھی وہ شراب کی رسیا تھی اور ہر وقت سرور میں رہتی تھی اس پر یہ دہشت سوار ہو گئی کہ کہیں کسی روز اس حالت میں پکڑی گئی تو اس پر حد جاری نہ کر دی جائے!"

"اس کا ڈر سچا تھا۔" میں نے اس کی ہرجائی محبوبہ کی تائید کی۔

"یہاں کا ماحول بھی عجیب پُراسرار سا ہے، یوں لگتا ہے جیسے سب لوگ کسی تنویمی اثر کے تحت چل پھر رہے ہوں یا ایک دوسرے کی سراغرسانی پر مامور ہوں......!"

حامد العزیز نے میرا پیر دبا کر مجھے بات آگے بڑھانے سے روک دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا۔ "باہر سے آنے کے بعد میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے مگر پھر میں اس ماحول کا عادی ہو گیا... ہوں، شاید وہ بے چاری اس گھٹن کو قبول نہ کر سکی۔"

"مگر یہ گھٹن کیوں ہے؟"

"لیبیا پر اس وقت اس نسل کی گرفت مضبوط ہے جو آزادی کی جدوجہد میں بہت زیادہ تھک گئی تھی یہ اسی تھکی ہوئی نسل کے اثرات ہیں جب نئی نسل اپنا مقام سنبھالے گی تو شاید معاشرہ اتنا مضمحل نہ رہے!"

"بڑی گہری نظر ہے تمہاری!" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"یہ جو اجتماعی سست روی یا پُراسراریت تم دیکھتے ہو، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ نسل کو یہ احساس ہو رہا ہے

کہ وہ اپنے حصے سے کہیں زیادہ کام سرانجام دے چکی ہے لہٰذا ہر شخص کچھ اوپن کرہ گیا ہے۔" وہ نہایت واضح اور صاف سوچ کا مالک معلوم ہو رہا تھا۔

"اپنی زبان کو لگام دو برادر!" حامد العزیز نے تادیبی لہجے میں پہلی بار دخل اندازی کی۔ "ہر شخص تمہارے ان خیالات سے اتفاق نہیں کرے گا۔"

"نہ کرے۔" وہ اداس ہو گیا۔ "میرے دوست بھی یہی کہتے ہیں کہ کسی روز مجھے نفرت اور مایوسی پھیلانے کے جرم میں مقدمہ چلا کر سزائے موت دے دی جائے گی مگر میں اس سے پہلے ہمیشہ کے لئے پیرس چلا جاؤں گا، میری نے مجھے خط لکھا ہے کہ وہ بس اگلے موسمِ بہار تک میرا انتظار کرے گی۔"

"تمہارے لئے پیرس چلے جانا ہی بہتر ہو گا۔" میں اس شخص سے یک بیک بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ "اپنے ہی وطن میں اجنبی بنے رہنے سے بہتر ہے کہ آدمی ہجرت کی راہ اختیار کر لے۔"

"تم بہت سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔" وہ عقیدت آمیز لہجے میں بولا۔ "اپنے ہی وطن میں اجنبی ــــ تم نے پہلی بار میرے احساس کو الفاظ میں ڈھالا ہے، کون ہو تم؟"

"مسافر ہوں!"

"چاہو تو کبھی میرے پاس چلے آنا، مجھے اچھا دوست پاؤ گے۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر ڈیشن بورڈ کے ایک خانے سے اپنا عربی میں چھپا ہوا وِزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "میں دن بھر گھر پہ رہتا ہوں، سورج غروب ہونے کے بعد ٹیکسی لے کر نکلتا ہوں اور رات گئے تک آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں۔"

"میرا نام ریبی فاس ہے اور میں یونان سے آیا ہوا ہوں۔" میں نے اپنی اخلاقی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کہا اور اس کا کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا۔

شارع بحرین رہائشی عمارات کے درمیان سے گزرنے والی شاہراہ تھی جو شاید کہیں سمندر سے بھی ملتی ہو گی جب حامد العزیز نے ایک جگہ ٹیکسی رکوائی تو وہ بھی انجن بند کر کے نیچے آ گیا جو اس کی جانب سے احترام کے بے پایاں اظہار کی علامت تھی۔

حامد العزیز نے اسے کرایہ ادا کرنے کی کوشش کی، جو بُری طرح ناکام ہوئی۔

"میں نے ریبی فاس کو دوست کہا ہے میرے نزدیک دوستوں سے کسی بھی قسم کا معاوضہ لینا حرام ہے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔ "اگر واپسی کا ارادہ ہو تو میں تمہارا انتظار بھی کر لوں گا۔"

اسے یہ یقین دلا کر بہ دقتِ تمام واپس لوٹا دیا گیا کہ ہمارا [illegible] کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور اس سے پُرجوش معانقے کے بعد ہم [illegible] کے مکان کی طرف چل دیئے جسے حامد العزیز نے البتہ کچھ پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

"یہ آدمی تو ٹھیک ہی نکلا لیکن تمہیں ہر ایک سے ایسی گفتگو سے بچنا چاہیئے۔ یہاں اس طرح تم عدم تحفظ کی فضا پیدا کر دو گے۔" راستے میں حامد العزیز نے مجھے نصیحت کی جو خاموشی سے سن لی گئی۔

وہ ایک کثیر المنزلہ عمارت کی زمینی منزل کا ایک دروازہ تھا جس پر حامد العزیز نے ڈوربل بجائی۔

لفٹ سے ملحقہ وہ دروازہ کھلا تو مجھے عربی لباس میں ملبوس گھٹے ہوئے جسم والا ایک پستہ قد اور گنجا شخص نظر آیا جس کی آنکھوں میں عجیب سی سرد مہری رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

پہلے اس کی آنکھیں میرے چہرے پر پڑیں اور وہ یک بیک بھڑکا ہوا نظر آنے لگا مگر یہ کیفیت پل بھر سے زیادہ قائم نہ رہی کیونکہ وہ حامد العزیز کو دیکھتے ہی نہ صرف مطمئن ہو گیا بلکہ اس نے بڑھ کر مجھے سینے سے لپٹا لیا۔

اس نے ہم دونوں سے باری باری معانقہ کیا جہاں اس وقت خاصی سردی تھی جبکہ اس کے فلیٹ کے کھلے ہوئے دروازے میں سے گرم ہوا کے خوشگوار جھونکے آ رہے تھے۔ شاید اندر مکان کو گرم رکھنے کا معقول انتظام تھا۔

حامد نے نہ رسماً مجھے اس شخص کا نام بتایا اور نہ اسے میرا نام بتایا پھر بھی پُرتپاک معانقے کے بعد وہ محبت آمیز انداز میں ہم دونوں کو اندر لے گیا۔

ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ فرشی قالین سے ضرور مزین تھا مگر وہاں صوفوں کے ساتھ ایک گوشے میں مسہری بھی پڑی ہوئی تھی۔ داخلی دروازے کے علاوہ اس کمرے کی ایک دیوار میں پہلو بہ پہلو دو بند دروازے اور بھی تھے جن کا بھرم زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

ایک دروازہ کھول کر حامد پیشاب کرنے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا اور دوسرا دروازہ کھول کر ہمارے میزبان نے باورچی خانہ سامنے کر دیا گویا اس فلیٹ میں کل وہی ایک کمرہ تھا جس سے بیک وقت سارے کام لئے جا رہے تھے۔

وہ فلیٹ دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ حامد مجھے ہاشم کے پاس لے جانے کے ارادے سے اس علاقے میں آیا تھا۔ اور اس کے بیان کے مطابق ہاشم ان فلسطینیوں میں سب سے برتر تھا جن تک اس کی رسائی تھی۔ اگر رہائش گاہ کے معیار سے ہاشم کے رسوخ کا اندازہ لگایا جاتا تو تم نزدیک وہ بہت ہی بے بس انسان تھا مگر میں نے فوری طور پر ان دونوں میں سے کسی پر بھی اپنے احساسات کا اظہار نہیں کیا۔

"تم قہوہ پیو گے یا لیبز دودھ کی چائے۔۔؟" باورچی خانے سے میزبان نے عربی میں سوال کیا۔

"یہ بعد میں ہوتا رہے گا پہلے کچھ کام کی باتیں کر لی جائیں!" میں نے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔

وہ دوستانہ انداز میں مسکراتا ہوا باورچی خانے سے باہر آ گیا [illegible] وقت حامد بھی باتھ روم سے نکل آیا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم یہاں کے سرکردہ فلسطینیوں میں شمار کئے [illegible]" میں نے اس سے سوال کیا تو غیر ارادی طور پر میرے لہجے [illegible] ہلکی سی تلخی عود کر آئی جسے اس نے بھی محسوس کیا ہو گا۔

"[illegible] شش!" ہاشم کے جواب دینے سے پہلے ہی حامد العزیز سراسیمہ ہو کر بول پڑا۔ "فلسطین کا نام اونچی آواز میں نہ لو، یہاں اس کا [illegible] ہے، کامل حسنین! اور یہ مصری نژاد ہے!"

"اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" میرا میزبان حامد کی پشت پہ [illegible] کر نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "یہاں نیچی آواز میں تم ہر بات کر [illegible]" اتنا کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "شاید تم نے درست ہی [illegible] یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور میرے پاس کس سلسلے میں آئے ہو؟"

"یہ صفدر علی ہے.....!" حامد العزیز نے کہا۔

اور وہ شخص اسے مزید بولنے کا موقع دیئے بغیر والہانہ انداز [illegible] ایک مرتبہ پھر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

"تم کہاں تھے میرے دوست؟ میں تو تین دن سے تمہارا [illegible]" کامل حسنین یا ہاشم مجھ سے گلے ملتے ہوئے مسرت آمیز [illegible] لہجے میں بولا۔

"ایک لفنگے کا قیدی تھا۔" میں نے بمشکل کہا۔ کیونکہ اس نے [illegible] سے دبوچ کر میرا سانس لینا تک دشوار کر دیا تھا۔

"ائیرپورٹ پر قدم رکھتے ہی صفدر علی کی العلاوی خاندان والوں [illegible] لڑکے سے ٹھن گئی تھی۔" حامد العزیز نے وضاحت کی۔

ہاشم کے استفسار پر میں نے اسے پوری تفصیل سنائی تو وہ [illegible] حمزہ کا نام اور کردار اس کے لئے اجنبی نہیں تھا لہٰذا [illegible] کے اختصار کے باوجود وہ پوری صورتحال سمجھ گیا۔

"اگر طیب ائیرپورٹ پہنچ جاتا تو شاید تم ان ناگہانی دشواریوں [illegible]" میرے خاموش ہونے پر ہاشم نے کہا۔

"میں نے تو سنا ہے کہ وہ فوجی حکام کی تحویل میں ہے!"

"وہ پرانی بات ہے۔" ہاشم اداس لہجے میں بولا۔ "طیب کو [illegible] ورزی کرتے ہوئے ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے کی [illegible] کی پاداش میں دو سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی ہے۔" "معلوم ہوتا ہے کہ لیبیا کی سرزمین مجھے راس نہیں آ سکی!" [illegible] نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"مایوسی بُری چیز ہے!" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "یہاں کے لوگ بہت مخلص اور مہمان نواز ہیں، تم مقدر کی ستم ظریفی کا شکار ہوئے ہو۔"

"اور سیتا؟" میں نے بے رحمانہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

چند ثانیوں کے لئے فضا پر موت کا سا بوجھل سکوت طاری ہو گیا۔ حامد العزیز ایک دیوار گیر تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا اور ہاشم پر خفت طاری تھی۔

"سیتا کے معاملے میں کچھ نئی چیزیں موصول ہوئی ہیں!" آخر کار اس سکوت کو ہاشم کی مرجھائی ہوئی آواز نے ہی توڑا۔

"امید افزا؟" میں نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں تم اسے کس زاویے سے دیکھو۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "سیتا کے جیل سے ناقابلِ یقین فرار کے سلسلے میں مقامی حکام کو پختہ ثبوت ملے ہیں کہ اس معاملے میں البرٹو کاستیلا نو نامی ایک شخص بھی پوری طرح ملوث ہے!"

"البرٹو کاستیلا نو۔" میں دانت جما کر غصیلے لہجے میں بولا۔ "کون ہے وہ اور اس کا مستقل ٹھکانا کہاں ہے؟"

"کاستیلا نو ایک پیشہ ور سیکرٹ ایجنٹ ہے اور بہت سے ملکوں کے لئے کام کرتا رہا ہے اس مرتبہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کن لوگوں کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔" ہاشم کے الفاظ نے ہم دونوں کو ہی چونکا دیا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ اس نے سیتا کو جیل سے نکالا ہے؟"

"یہ ضروری نہیں۔" ہاشم مدافعانہ لہجے میں بولا۔ "ویسے بھی یہ رائے نیشنل سیکیورٹی بیورو کے چیف کی ہے ان لوگوں کو کاستیلا نو کے بارے میں ناقابلِ تردید شہادتیں ملی ہیں اور سیتا کے فرار کے بعد سے وہ روپوش ہے اس وقت پورے لیبیا میں سیتا کے ساتھ ہی اس کی تلاش بھی جاری ہے!"

"تمہارے اپنے ذرائع اطلاعات کیا کہتے ہیں؟"

"خدا کے لئے مجھ سے ایسے بے رحمانہ انداز میں گفتگو نہ کرو۔" ہاشم تڑپ کر بولا۔ "پچھلے کچھ عرصے سے میں بھی یہاں ایک مجبور و مسکین تارکِ وطن کی طرح اپنا وقت گزار رہا ہوں۔"

"مگر نیشنل سیکیورٹی چیف تک رسائی رکھتے ہو!" میں اس پر پوری طرح اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتا تھا۔

"تم نہیں سمجھے، تم سمجھ ہی نہیں سکتے!" وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔ "تم لفٹ سے ملحق اس مختصر ترین فلیٹ کی حقیقت ہی نہیں جانتے میرے دوست! میں اس عمارت کا چوکیدار بن کر..... کامل حسنین کے نام سے اپنا وقت گزار رہا ہوں ورنہ ہاشم کے لئے

تو پندرہ روز قبل ہی ملک بدر کئے جانے کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔"

"تمہاری مجبوریاں اپنی جگہ سچا ہیں، طیب میری وجہ سے پکڑا گیا۔ حامد العزیز میری وجہ سے پریشان ہے، میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے پیچھے دھکیلتے دھکیلتے دیوار سے لگا دینے کے بعد ہر شخص مجھے چھوڑ دینا چاہتا ہے!"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" ہاشم پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ہم تمہارے ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہیں مگر حالات اس وقت.... سازگار نہیں ہیں۔"

"اگر تم تعاون کے لئے تیار ہو تو یہ تمہارا مجھ پر احسان ہے مگر میں اب تنہا ہی کچھ کر گزرنا چاہتا ہوں۔ تم سیتا کے بارے میں جو کچھ بتانا چاہتے ہو، مجھے بتا ڈالو، اس کے بعد میں خود ہی اپنی راہ تلاش کر لوں گا۔"

"تم ہماری طرف سے بے اعتمادی کا شکار ہوتے جا رہے ہو۔" ہاشم نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"اس میں مجھ سے زیادہ حالات کا دخل ہے برادرم!"

"یہ بتاؤ کہ ہمیں چھوڑ کر تم کیا قدم اٹھانا چاہتے ہو؟" اس نے چند ثانیوں تک میری طرف گھورتے رہنے کے بعد سوال کیا۔

"مجھے تو خلا میں پھینک دیا گیا ہے، آنے والا وقت ہی بتا سکے گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، پیشگی منصوبہ بندی میرے بس سے باہر ہے!"

"پھر میں مشورہ دوں گا کہ غصہ ترک کر دو اور چند روز بعض چند روز کے لئے ہماری کوششوں پر اعتماد کر لو۔"

"مگر تم کر کیا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "تم تو خود اپنے حصار میں سمٹے ہوئے ہو اور تم پر انحصار کرنے کے بعد تو شاید مجھے مقدر کے لکھے کا پورا ہونے کا ہی انتظار کرنا ہو گا جب کہ میں مقدر سمیت کسی بھی معاملے میں بے عملی کا قائل نہیں ہوں۔"

"یہ بے عملی اور بے بسی میری اپنی ذات تک محدود ہے ورنہ میرے چند بہترین آدمی اپنی تمام تر صلاحیتوں کے سہارے پولیس سے قبل البرڈلو کا سٹیلانو یا سیتا تک پہنچنے کی کوششوں میں بھی مصروف ہیں۔"

"تمہارا ان سے رابطہ قائم ہے؟"

"فی الحال نہیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن کامیابی حاصل ہوتے ہی وہ مجھ کو اطلاع پہنچانے کے پابند ہیں!"

"تمہیں ملک بدر کئے جانے کے احکام جاری ہو چکے ہیں، پولیس میری تلاش میں ہے اور حامد العزیز تو ابھی ابھی پولیس کے نرغے سے بمشکل نکل کر بیٹھا ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہم تینوں مل کر کیا کر سکیں گے!" میں نے الجھن آمیز لہجے میں اپنے حقیقی خدشات اگل دیئے!

"حامد کو تو بھول جاؤ، اسے فی الحال بالکل گوشہ نشین ہو جانا ہو گا۔ اس کا بہنوئی ایک عرب سفارت خانے میں اہم عہدے پر فائز ہے، اگر یہ وہاں روپوش ہو گیا تو کوئی ادھر کا رخ نہیں کر سکے گا!"

"میرے لئے کیا کہو گے؟"

"تمہارے لئے بھی کوئی جگہ مل ہی جائے گی۔ تم جس لب و لہجے میں عربی بول لیتے ہو اس کے پیش نظر یہ کام آسانی سے ہو جائے گا!"

"میں اپنے بہنوئی کے پاس جانے کے بجائے صفدر کے ساتھ رہنے کو ترجیح دوں گا۔" حامد نے موقع پاتے ہی کہا۔

"کیا اس سے کچھ اَن بَن ہو گئی ہے؟" حامد نے ہاشم کے اس سوال کو سنا اَن سنا کر دیا۔

"اسی عمارت میں پہلی منزل پر ایک فلیٹ خالی ہے" کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد ہاشم بولا۔ "کرائے دار طرابلس سے چھ مہینے بعد آئیں گے مگر انہوں نے فلیٹ بک کرا یا ہوا ہے، میرا خیال ہے کہ تم دونوں وہاں آرام سے رہ سکو گے اور اس طرح ہمارا رابطہ بھی برقرار رہے گا۔"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو!" حامد العزیز بولا۔

"ایک اور اہم بات!" ہاشم ہاتھ اٹھا کر بولا۔ اس کا ذہنی توازن آہستہ آہستہ سنبھال ہوتا جا رہا تھا۔ "اب نہ تم حامد ہو اور نہ یہ صفدر یا یینی خان ــــ تم لوگ اپنے لئے دوسرے ناموں کا انتخاب کرو!" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہارا عربی لب و لہجہ بہت اچھا ہے مگر ٹی کے تلفظ کی ادائیگی میں تمہیں محتاط رہنا ہو گا۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"تم بار بار کاسٹیلانو کہہ رہے تھے، میں خود بہت عرصے مغرب میں رہا ہوں اور یہی تلفظ ادا کر سکتا ہوں مگر عرب قومیت کے اظہار کے لئے کاستیلانو کہنا ضروری ہے۔ آئندہ تم اس کی احتیاط کرو گے۔"

"تو کیا مجھے عرب بن کر رہنا ہو گا؟"

"صرف لباس کی حد تک!" ہاشم جلدی سے بولا۔ "تلفظ کے بارے میں میں نے جو کچھ کہا وہ صرف احتیاط پر مبنی ہے!"

"اس عمارت کا مالک کون ہے؟"

"اس کی طرف سے بے فکر رہو، وہ ایک مقامی ہے مگر ہمارے ہمدردوں میں سے ہے اس نے مجھے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے یہاں رہنے کی پیشکش کی تھی وہ تمہارے لئے کوئی دشواری پیدا نہیں کرے گا۔"

ہاشم نے تینوں کے لئے قہوہ تیار کیا چونکہ باورچی خانہ کمرے سے ملحق تھا لہٰذا ہم نے اپنی کرسیاں دروازے کے قریب سرکا لیں۔ ہاشم نے میرے سوالات کے جواب میں نہ صرف البرڈلو کا مکمل حلیہ بتا ڈالا بلکہ قہوہ نوشی کے دوران میں اس نے اپنے کاغذات کی تلاشی لے کر البرڈلو کا ایک چند برس پرانا فوٹو بھی میرے حوالے کر دیا جس کے ذریعے البرڈلو کاسٹیلانو کے خدوخال کی بخوبی شناخت ہو سکتی تھی۔

البرڈلو اپنے چہرے کے خدوخال سے ایک سفاک اور بے رحم قاتل نظر آ رہا تھا۔ جو اپنے چند کوڑیوں کے مفاد کی خاطر سگے بھائی کو بھی قتل کر سکتا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم البرڈلو کی تلاش میں باہر نکلنے کا قصد رکھتے ہو؟" البرڈلو کی تصویر میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے ہاشم نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

"ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ کسی نہ کسی سمت میں کام شروع کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"البرڈلو کے جوزف سے شاید گہرے مراسم تھے؟" حامد العزیز نے استفسار طلب لہجے میں ہاشم سے کہا۔

"وہ ان دنوں کی بات ہے جب بن غازی میں شراب کسی قیمت پر نہیں ملتی تھی۔" ہاشم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اس وقت تو البرڈلو گھنٹوں جوزف کے قہوہ خانے کے عقبی کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اب جوزف شاید ہی اسے یاد رکھ سکا ہو!"

"پھر بھی اس سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔" میں اس میں نئی دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔ "مشکل وقت میں آدمی اکثر پرانے راستوں کا رخ کرتا ہے۔"

"تمہاری مرضی ہے۔" ہاشم لاپرواہی سے بولا۔ "بس یہ خیال رکھنا کسی نئی دشواری کو دعوت نہ دے بیٹھو!"

اس وقت خاصی رات ہو گئی تھی۔ ہاشم نے ہمارے لئے اپنے ہی ہاں کھانے کا بندوبست کیا اس سے پہلے شراب کا ایک ہلکا سا دور بھی چلا جس نے کھانے کا لطف دوبالا کر دیا۔ کھانے کے بعد ہاشم نے ہمیں پہلی منزل کے خالی فلیٹ میں پہنچا دیا۔

وہ فلیٹ ضروریاتِ زندگی سے پوری طرح آراستہ تھا، بستر تکیوں اور صوفوں سے لے کر نفیس کراکری تک ہر شے میسر تھی..... حامد العزیز نے بتایا کہ بن غازی میں ایسے آراستہ فلیٹ اتنے بھاری کرایوں کے باوجود بہت مقبول تھے کیونکہ دو چار ماہ کے لئے وہاں آنے والے ماہرین گھریلو ساز و سامان کی خریداری کے بکھیڑوں میں پڑے بغیر نہایت پُرسکون انداز میں رہ سکتے تھے اور پھر عیال دار لوگوں کے لئے وہ فلیٹ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں سے بدرجہا سستے پڑتے تھے۔

بٹن دبا کر کمرے گرم کرنے کے نظام کو حرکت میں لانے کے بعد ہم دونوں اس بوتل کو خالی کرنے میں مصروف ہو گئے جو ہاشم کے کمرے میں پہلے ہی نصف رہ گئی تھی۔

لیبیا پہنچنے کے بعد وہ میری پہلی رات تھی جو نہایت سکون کے عالم میں گزری صبح دیر سے بیدار ہوا تو ہاشم پہلے ہی ریفریجریٹر میں خورد و نوش کی اشیاء بھر چکا تھا اور حامد اخبار پڑھتے ہوئے میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی میز پر بیٹھا تو حامد العزیز نے تپائی پر پڑے ہوئے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہاشم تمہارے لئے لایا ہے!"

"کیا ہے؟"

"مقامی وضع کے دو لباس۔" حامد مسکرا کر بولا۔ "تمہیں ان کے پہننے میں الجھن نہ ہوئی تو مزید آ جائیں گے۔"

"موجودہ حالات میں ہمارے لئے لباس سے زیادہ ہتھیار اہم ہیں۔" میں نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کھانے کے بعد کپڑوں کی الماری میں دیکھنا۔" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

ناشتہ ختم کرنے کے بعد میں نے کپڑوں کی الماری کھولی تو میرا دل باغ باغ ہو گیا وہاں بڑے بور والے دو خودکار پستول مع سائیلنسرز موجود تھے فاضل راؤنڈز سے بھرے ہوئے دو ڈبے بھی موجود تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ضرورت کے تحت انتخاب کے لئے کمر سے باندھے جانے والے ویسٹ ہولسٹرز کے ساتھ ہی بغلی ہولسٹرز بھی موجود تھے۔ ان سے بڑھ کر مجھے جو چیز پسند آئی وہ زہریلے تیر برسانے والی پلاسٹک کی دو شیشیاں تھیں جنہیں میں کبھی بھی نہ بھول سکا تھا۔

وہ شیشی نما مہلک ہتھیار مجھے تل ابیب میں ریڈ بریگیڈ کے ایک رکن سے ملا تھا اور اسی گروپ کی مدد سے میں نے ال ایل کے طیارے کے اغوا میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ان سے جدا ہونے کے بعد وہ شیشی میرے ہی قبضے میں رہی اور میں نے اس سے انتہائی نازک مواقع پر خوفناک کام لئے مگر ایک معرکے میں وہ شیشی مجھ سے گم ہو گئی اب غیر متوقع طور پر اس ہتھیار کو دوبارہ پا کر مجھے بے اندازہ خوشی ہوئی تھی۔

"یہ شاید تمہارا فرمائشی ہتھیار ہے۔" حامد العزیز نے میرے چہرے سے مسرت بھانپ کر کہا۔ "نہ ہاشم کو اس کے استعمال کا علم ہے اور نہ مجھے مگر وہ کہہ رہا تھا کہ اسے کچھ عرصے قبل پیغام ملا تھا کہ تم جب بھی لیبیا پہنچو، یہ ہتھیار تمہیں ضرور دیا جائے!"

"یہ دونوں میرے لئے ہیں؟"

"ہاں ــــ مگر یہ ہے کیا بلا؟" حامد میرے قریب اٹھ آیا۔ اور جب میں نے اس ننھی سی بے ضرر شیشی کے خواص بیان کئے تو وہ حیران رہ گیا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کپڑوں سے داغ دور کرنے والی دوا کے لیبل کی آڑ میں ایسی ہلاکت پوشیدہ ہے!"

حامد العزیز کے خریدے ہوئے نئے شیونگ سیٹ سے شیو کر کے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور مسکرا دیا۔ کیونکہ میرے لئے بھی خود کو پہچاننا دشوار ہو گیا تھا۔

ہم نے اپنے پستول کوٹ کے نیچے بغلی ہولسٹرز میں چھپا لئے اور میں زہریلے تیروں والی ایک شیشی لے کر باہر آ گیا۔

نیچے آنے کے بعد ہم نے دھوپ کے چشمے بھی لگا لئے اور ٹیکسی میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔

نصف گھنٹے کے بعد ہم دونوں مقہی الیوسف کے سامنے موجود تھے۔

"اس کا اصل نام کیا ہے؟" میں نے بورڈ پڑھتے ہوئے حامد سے سوال کیا۔

"جوزف! پیدائشی عیسائی ہے مگر عربی میں جوزف کو یوسف ہی لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔" اس نے کہا۔

اندر میزوں کے گرد گنتی کے افراد موجود تھے اور کاؤنٹر پر چندھیائی ہوئی آنکھوں والا پختہ عمر کا ایک شخص براجمان تھا۔

"رائل سیلوٹ ہے؟" حامد العزیز نے کہنیاں کاؤنٹر پر جما کر اس شخص کی طرف جھکتے ہوئے سوال کیا۔

"ضرور ہو گی، ادھر چلے جاؤ۔" اس نے عقبی راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "جوزف وہیں بیٹھا ہے!"

حامد العزیز نے پلٹ کر نہایت اعتماد اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں کاؤنٹر والے کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھتے چلے گئے۔

اس پتلے سے راستے کا اختتام بند دروازے پر ہوا۔ میں نے دروازے پر زور ڈالا تو وہ اندر سے مقفل تھا۔

میں نے اضطراری کیفیت میں دروازے پر دستک دی اور فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا بلکہ اس میں تھوڑی سی جھری پیدا کی گئی جس کی اوٹ سے ایک گندمی رنگ کا نسوانی چہرہ جھانکنے لگا تھا۔

"جوزف! مجھے جوزف سے ملنا ہے۔" میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش میں ایک پٹ پر زور دیتے ہوئے کہا مگر وہ عورت شاید دروازے کے پیچھے اپنی ٹانگ اٹکائے کھڑی تھی کیونکہ دروازہ نہ کھل سکا۔

"زور آزمائی نہ کرو، یہ بتاؤ کہ اس سے کیا کام ہے؟"

میرے کانوں میں کرخت سی سرگوشیانہ آواز آئی اور ساتھ ہی کوئی مردانہ ہاتھ پشت سے میرے شانے پر جم گیا۔ میں بڑبڑا کر پلٹا، تو میرے اور حامد کے درمیان چندھیائی ہوئی آنکھوں والا وہی شخص کھڑا تھا جس سے ہم کاؤنٹر پر مل چکے تھے!

پل بھر کے لئے میری اور حامد کی نگاہیں چار ہوئیں وہ کاؤنٹر والے کے بارے میں مجھ سے زیادہ حیران تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ شخص ہم دونوں کی لاعلمی میں دبے قدموں وہاں تک پہنچا تھا۔

صورتِ حال کی نزاکت محسوس کر کے میں مسکرا دیا اور عورت کی طرف پلٹ کر نرم لہجے میں بولا: "دو بوتلیں درکار ہیں!"

"کون سی؟" وہ ہمیں اندر گھسنے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھی: "تم یہیں ٹھہرو، میں لائے دیتی ہوں!"

"رائل سیلوٹ!" میں نے کن انکھیوں سے کاؤنٹر والے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ستر دینار!" عورت نے خالص کاروباری انداز میں اپنی ہتھیلی میری طرف پھیلا دی۔ میں نے کاہلوں کے سے انداز میں اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹوے کی اوٹ میں چھپا کر زہریلے تیروں والی شیشی بھی نکال لی۔

کاؤنٹر والا حریصانہ انداز میں میرے بٹوے میں موجود رقم کے دیدار کا متمنی تھا اور حامد کو بھول کر میری ہی طرف متوجہ تھا!

میں نے شیشی کا رخ درست کیا، نہایت خفیف سے زناٹے کے ساتھ ایک سوئی شیشی سے اڑ کر کاؤنٹر والے کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ اور وہ ادھوری کراہ کے ساتھ فرش پر لڑھکنے لگا۔

حامد العزیز اگر پھرتی سے اسے اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر فرش پر نہ ڈالتا تو اس کی لاش کے گرنے کا دھماکا خاصے لوگوں کو ادھر متوجہ کر دیتا۔

"کیا ہوا اسے؟" عورت بوکھلا کر دروازے سے باہر آ گئی۔

مجھ پر اس وقت درندگی سوار ہونے لگی تھی۔ میں نے نہایت پھرتی سے بایاں ہاتھ عقب سے اس کے منہ پر جمایا اور داہنے ہاتھ کی دوسری ہی ضرب میں اس کا مزاحمت کرتا ہوا جسم بے جان سا ہو گیا۔

اس نے بے ہوشی سے قبل اپنی گلو خلاصی کے لئے بری طرح پھڑکنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی مگر میرے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔

میں نے اس کے بدن کو فرش پر ڈالا تو حامد العزیز بغلی ہولسٹر سے اپنا پستول نکال کر اندر گھس چکا تھا۔

میں نے پھرتی سے یکے بعد دیگرے مرد اور عورت کو دروازے سے اندر گھسیٹ کر دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اس طرح ہم دونوں قہوہ خانے کی طرف سے کسی مداخلت کے خطرے سے محفوظ ہو گئے تھے۔

"چیخے تو گولی مار دوں گا۔" اسی لمحے اندر سے حامد العزیز کی پھنکارتی ہوئی سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔

میں نے لپک کر وہ چھوٹی سی کوٹھڑی عبور کی اور ایک کشادہ

کمرے میں جا پہنچا جہاں حامد العزیز نے ایک صحت مند شخص کو اپنے ہولناک پستول کی نال کی زد میں لیا ہوا تھا۔

اس شخص کے سامنے فرش پر مختلف مالیتوں کے بہت سے نوٹوں کی گڈیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ایک بڑا بریف کیس بھی کھلا ہوا رکھا تھا جس میں گڈیاں قرینے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

شاید ہمارے پہنچنے سے قبل وہ اس عورت کے ساتھ مل کر رقم گن کر بریف کیس میں رکھ رہا تھا۔

اس شخص کے اعصاب قابلِ رشک تھے اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے ہوئے تھے۔ مگر اس کی نگاہوں میں غصے اور تحقیر کے کوندے لپک رہے تھے۔

میں نے اس پر مزید نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لئے اپنا پستول بھی نکال لیا۔

"میں ان کھلونوں سے نہیں ڈرتا" وہ پیر پٹخ کر بولا "یہ بتاؤ کہ ماریا کہاں ہے، وہ تم سے دروازے پر بات کر رہی تھی"

"وہ باہر پولیس کی گاڑی میں بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔!" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا "تمہارا چنڈو خانہ اس وقت پولیس کے محاصرے میں ہے"

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے سراسیمگی کے آثار نظر آئے مگر وہ سنبھل گیا اور تحقیر آمیز لہجے میں بولا "پولیس؟ وہ یہاں کیا لینے آئی ہے؟ میں انہیں ہمیشہ مقررہ وقت سے پہلے ان کا حصہ پہنچا دیتا ہوں!"

پھر ایک دم چونک کر بولا "لیکن تمہارے جسموں پر تو پولیس کی وردیاں نہیں ہیں۔ اور نہ پولیس افسروں کو اتنے بڑے بور کے پستول ملے ہوئے ہیں؟"

"خاصے گھاگ ہو!" میں زہریلے انداز میں مسکرا دیا "پولیس ہماری مدد کر رہی ہے اور ہمارا تعلق نیشنل سیکورٹی بیورو سے ہے!"

میرے الفاظ پر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا "مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہمیں تمہاری شراب فروشی اور اس کی کمائی سے کوئی غرض نہیں، ہم یہاں دوسرے معاملے میں آئے ہیں!"

"واقعی؟" اس کی آنکھوں سے بے اعتباری مترشح تھی "تم اس رقم کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے؟"

"اگر تم سچ بولتے رہے تو جیسے آئے ہیں، ویسے ہی چلے جائیں گے ورنہ وہ ہو گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے!" میں ٹھوکر سے بریف کیس ایک طرف سرکاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ حامد بدستور دروازے پر جما رہا۔

"مجھے یقین نہیں آتا" وہ بڑبڑایا "اگر محض سچ بول کر میری گلو خلاصی ہو سکتی ہے تو میں جھوٹ کیوں بولوں گا!"

"البرٹو کاسٹیلانو کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے سرد لہجے میں سوال کیا اور اس کے چہرے پر موت کی سی زردی پھیلتی چلی گئی۔

"میں نے اسے برسوں سے نہیں دیکھا" چند ثانیوں کے توقف کے بعد وہ بولا تو اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی "جب شراب بندی کے قانون پر سختی سے عمل ہوتا تھا تو وہ میرا گاہک تھا۔"

"جھوٹ مت بولو جوزف!" میں نے پستول کی مہیب نال کو جنبش دیتے ہوئے غضب ناک لیکن دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس نے مجھے کبھی اپنی سرگرمیوں کے بارے میں نہیں بتایا مگر میں نے سنا تھا کہ وہ اکثر مختلف ملکوں کے لئے جاسوسی کرتا رہتا تھا" وہ ڈرتے ڈرتے رک رک کر بول رہا تھا جیسے البرٹو کہیں قریب ہی چھپا ہوا ساری گفتگو سن رہا ہو۔

"اتنا ہم بھی جانتے ہیں" میں طنزیہ لہجے میں بولا "اور یہی معلومات ہمیں تم تک لائی ہیں یہ بتاؤ کہ وہ اب کہاں ہو گا اور آخری بار تم سے کب ملا تھا؟"

"میرے ساتھ ظلم نہ کرو" وہ ستم زدہ انداز میں کراہا "جن باتوں کا مجھے علم ہی نہیں ان کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں"

"ظلم" میں بے رحمانہ انداز میں ہنس پڑا "اگر یہ ظلم ہے تو پھر انگلیوں کے ناخن اکھاڑنے اور کانوں میں کھولتا ہوا تیل ڈالنے کو کیا کہو گے؟"

"نہیں!" وہ ہذیانی انداز میں پیچھے سرک گیا "تم میرے ساتھ ایسی بربریت اختیار نہیں کر سکتے، مجھے اس شہر کے معزز لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہے، وہ ہر حالت میں میرا ہی ساتھ دیں گے!"

"انہیں علم ہو گا تو تم ساری اذیتیں جھیل کر اپنی جان سے گزر چکے ہو گے!" میرا لہجہ نہایت پُراعتماد اور مستحکم تھا۔

"یہ ہو ہی نہیں سکتا" اس نے بے اعتباری سے کہا "تم مجھے یہاں سے لے کر نکلو گے اور پورے شہر کو میری گرفتاری کی خبر مل جائے گی اور......"

"تمہیں لے کر نکلیں گے" میں نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ مار کر کہا "ہم مردے ڈھونے کے قائل نہیں ہیں"

"تو تم مجھے یہیں مار ڈالو گے؟" اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"اگر تمہیں خود اپنی زندگی بوجھ معلوم ہونے لگی ہے تو ہم بھی بے بس ہو کر رہ جائیں گے" میں اس سے گفتگو کرنے کے ساتھ ہی اپنا لائحہ عمل بھی طے کرتا جا رہا تھا۔

"لیبیا کا کوئی قانون سرکاری اہل کاروں کو بے گناہ شہریوں کے کشت و خون کی اجازت نہیں دیتا" وہ احتجاج آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے دانت پیس کر اسے چند کافی وزنی گالیاں دیں پھر حامد سے بولا "اس بے گناہ شہری کو ذرا اس کے بے گناہ ساتھی کا حشر دکھاؤ جو ہمیں روکنے کے لئے کاؤنٹر سے یہاں تک دوڑا آیا تھا؟"

حامد العزیز نہایت فرمانبرداری کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"تم جھوٹے ہو" جوزف ہذیانی لہجے میں بولا "تم لاپرواہی ... خون کی باتیں کر کے میرے اعصاب کو تباہ نہیں کر سکتے!"

"البرٹو تو ضرور جہنم واصل ہو گا مگر تم کو شاید اس سے پہلے ہونا ... ہے" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اسی اثنا میں حامد العزیز ... کے کاؤنٹر والے کی ... ہوئی نیلی لاش کو گھسیٹتا ہوا اس کمرے میں لے آیا۔

اس کی لاش دیکھتے ہی جوزف کا چہرہ ستا گیا اور وہ مردہ سی ... میں بولا "تو تم نے واقعی اسے مار دیا ...؟"

"ہماری راہ میں مزاحم ہونے والوں کا حشر یہی ہوتا ہے"

"سچ سچ بتاؤ کہ ماریا کہاں ہے؟" وہ اعصابی طور پر ہر لمحہ ... ت سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔

"... وہ تمہاری کون ہے؟"

"بیوی!" میں بولا "اور میں اسے دیوانہ وار چاہتا ہوں اگر ... ہو گیا تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا"

"اچھا ہوا کہ تم نے بتلا دیا، اب تشدد کا آغاز ناخن اکھاڑنے ... اسی سے ہو گا" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

"میری لاش پر سے گزرے بغیر تم اسے ہاتھ بھی نہ لگا سکو گے" ... بہک بپھر گیا۔

"ہم بھی عزت دار لوگ ہیں، پرائی عورتوں کو ہاتھ لگانا معیوب ... تے ہیں" میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا "اگر تم نے ... مولی تو اسے تمہارے سامنے گولی مار دیں گے۔ اس کی بجائے پڑ ... ملنا پڑے گی"

... نے دونوں ہاتھ گرا کر بے اختیار اپنے بال نوچ ڈالے۔

"... دلدل میں پھنس گیا۔ اے خداوند! میری مدد فرما!"

"... کاری نہیں چلے گی" میں تیز لہجے میں بولا "اگر اگلے ایک ... تم نے زبان نہ کھولی تو میں ماریا کو یہاں طلب کر لوں گا!"

"تم...... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے تقریباً ہانپتے ہوئے ... کی آنکھوں سے شکست کا احساس جھلکنے لگا تھا۔

"... البرٹو کاسٹیلانو کا پتہ!" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا "وہ ... تم سے کب اور کیوں ملا تھا؟"

... بال نوچنے کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں ... ستے اور میں نے بھی اسے دوبارہ ہاتھ اٹھانے کا حکم نہیں دیا ... کے جارحانہ تیور سرے سے ہی غائب ہو چکے تھے اور وہ ... کی طرف سے تشویش میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔

... چند ثانیوں تک بے بسی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر ... طور پر جوتے کی ٹھوکر سے نوٹوں کی گڈیاں سرکانے لگا۔

"تم البرٹو میں کیوں دلچسپی لے رہے ہو؟" طویل سکوت کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس مرتبہ وہ ایک سنگین جرم میں ملوث ہے!"

"اگر اسے پتہ چل گیا کہ میں نے البرٹو کے بارے میں زبان کھول کر عہد شکنی کی ہے تو میری نسلیں بھی لیبیا کا رخ نہ کر سکیں گی" وہ تشویش زدہ بلکہ تقریباً روہانسے لہجے میں بولا "آخر تم البرٹو کے معاملے میں سیدھے میرے پاس ہی کیوں چلے آئے اس شہر میں اس کے ہزاروں شناسا ہیں"

"تمہاری بدنصیبی" میں نے سخت لہجے میں کہا "اب بکواس بند کرو اور وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کی بات کرو۔ البتہ یہ اطمینان رکھو کہ البرٹو بھی تم جیسا ایک انسان ہے اور اگر ہم اس تک پہنچ گئے تو وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا"

"مجھے البرٹو سے زیادہ دوسرے کا خوف ہے!" وہ کراہا۔

"دوسرا کون؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"حمزہ العلاوی!" وہ آنکھیں موند کر تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس نے مجھ سے قسم لی تھی وہ بچھو کے خواص رکھتا ہے جو کسی کو سامنے نہ پائے تو پتھر کو ہی ڈنک مارتا ہے خواہ اسے خود ہی کیوں نہ زخمی ہونا پڑے!"

اس کی زبان سے حمزہ کا نام سن کر میرے ساتھ ہی حامد العزیز بھی چونک پڑا۔

"حمزہ کا البرٹو سے کیا واسطہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"پچھلے مہینے البرٹو اسی حرامزادے سے ملنے یہاں آیا تھا" اس کی اعصابی شکست و ریخت کے سارے مراحل پورے ہو چکے تھے اور بظاہر وہ سوال کا سیدھا سیدھا جواب دینے پہ آمادہ نظر آ رہا تھا۔

"تو کیا حمزہ بھی تمہارے گاہکوں میں شامل ہے۔؟"

وہ نہایت الم رسیدہ انداز میں ہنسا "یہ قہوہ خانہ اسی کے سرمائے سے چلتا ہے شراب کے دھندے میں بھی پیسہ اسی کا ہے محنت میری ہے اور میں نفع میں پچیس فیصدی کا شریک ہوں۔ وہ حسابات دیکھنے بلاناغہ ایک آدھ گھنٹے کے لئے ہر روز یہاں آتا ہے اور یہ بات البرٹو کو بھی معلوم تھی!"

"پچھلے ماہ البرٹو یہاں کیوں آیا تھا؟"

"مجھے کچھ علم نہیں" وہ فریادی لہجے میں بولا۔ "وہ دونوں اسی کمرے میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے اور میں ماریا کو ساتھ لے کر خریداری کے لئے نکل گیا۔ اس روز میں نے کئی برس کے بعد البرٹو کو دیکھا تھا واپسی پر میں نے حمزہ کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے مجھ سے یسوع مسیح کی قسم لی کہ میں اس کی اور البرٹو کی ملاقات کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ حمزہ کسی بڑے معاملے میں اپنی

ٹانگ پھنسا رہا تھا۔"

"اس ملاقات میں ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی؟"
میں نے پُرتجسس لہجے میں جوزف سے سوال کیا۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے کچھ علم نہیں۔" اس کی مدافعانہ صلاحیتیں یکسر دم توڑ چکی تھیں اور وہ مجھ سے گلوخلاصی کا متمنی تھا۔

"حمزہ کی دوسری سرگرمیاں کیا ہیں؟"

"سنا ہے کہ ائیرپورٹ پر کسی سرکاری محکمے میں معمولی سی تنخواہ پر ملازم ہے مگر وہ تو اس کی وقت گزاری ہے۔ وہ گھر بیٹھ کر بھی کھاتا رہے تو اس کی اولاد کو پیسے کی کوئی کمی نہ ہو گی۔"

"اب کان کھول کر سنو کہ یہاں آنے والی پولیس کی تمام نفری سادہ پوشوں پر مشتمل ہے اور تمہاری بیوی باہر والی کوٹھڑی میں بے ہوش پڑی ہے تم دونوں بعد میں جو کہانی چاہو تراش سکتے ہو لیکن اس میں حمزہ یا البردلو سے ہماری دلچسپی کا ذکر نہ ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا بلکہ اس طرح تم خود کو محفوظ رکھ سکو گے، بولو کیا کہتے ہو؟"

"ماریا، میری ماریا بے ہوش ہے۔" میرے اور حامد کے للکارنے کے باوجود وہ دوڑتا ہوا اندرونی کوٹھڑی میں جا گھسا جہاں ماریا فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی اور پھر جوزف اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر کسی ننھے سے بچے کی طرح بلک کر رو پڑا۔

ہم دونوں نے اسے دلاسہ دینے کی بہتیری کوششیں کیں مگر اس کے دل کا غبار ہلکا نہ ہو سکا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید ہم نے ماریا کو بھی ہلاک کر دیا مگر اس کے دل کی دھڑکنیں سننے کے بعد اس کو تھوڑی سی تسلی ہوئی اور ہم دونوں اس کی بیوی کو اٹھا کر بستر پر لے آئے۔

اس وقت جوزف بدترین قسم کے جذباتی بحران میں مبتلا تھا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے باہر نکلنے کے بعد وہ کیا رویہ اختیار کرے گا لہٰذا میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حامدالعزیز سے مشورہ کیا اور پستول کے آہنی دستے کی ایک ناگہانی ضرب نے جوزف کو بھی بے ہوش کر دیا۔

جوزف اور ماریا بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور کاؤنٹر والے کی لاش نیلی ہو کر بہت زیادہ اکڑ چکی تھی۔

کمرے کے فرش پر بکھری ہوئی رقم کے بارے میں میرے عزائم نیک نہیں تھے جب میں نے حامد سے اس معاملے میں مشورہ کیا تو اسے بھی اپنا ہم نوا پایا۔

"ہم دروازہ کھلا چھوڑ کر ہی جائیں گے۔" اس نے اپنی رائے کی حمایت میں غیرضروری طور پر دلیل دیتے ہوئے کہا۔ "قہوہ خانے کا کوئی بھی ملازم اگر جوزف کے ہوش میں آنے سے قبل ادھر آ نکلا تو یہ رقم اڑا لے گا اور سارا الزام ہمارے سر آجائے گا۔"

"ہاشم جس انداز میں رہ رہا ہے اس کے پیش نظر اس سے زیادہ مالی اعانت کی امید نہیں کی جا سکتی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

حامدالعزیز میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی نوٹوں کی گڈیاں بریف کیس میں بھرنے میں مصروف ہو چکا تھا: "اس پیسے کا تعلق حمزہ سے بھی ہے اور دشمن کے مال پر قبضہ ہر اعتبار سے جائز ہے!"

"یہ رقم کسی چادر میں لپیٹ کر کسی کونے میں ڈال دو۔" بریف کیس بھر جانے کے بعد بچی ہوئی رقم کے بارے میں میں نے کہا۔

"جیبوں میں نہ ٹھونس لیں؟"

"یہ نہ بھولو کہ دن دہاڑے پھولی ہوئی جیبوں کے ساتھ ہم خود کو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا لیں گے، ہمیں باہر جا کر ٹیکسی بھی تلاش کرنی ہے اور بغلوں میں وزنی پستول جھول رہے ہیں۔"

"تو چلو!" اس نے بقیہ نوٹ ایک چادر میں لپیٹ کر مسہری کے نیچے پھینک دیئے اور بریف کیس بند کر کے روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔

جائزہ لینے پر عقبی سمت پر بھی ایک بند دروازہ دریافت ہوا جو ہمارے فرار کے لئے ہر اعتبار سے بہترین تھا اس طرح ہم دوبارہ قہوہ خانے سے گزرے بغیر عقبی سمت میں نکل سکتے تھے!

ہم نے ایک دوسرے کے حلیئے کا ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیا اور پھر مطمئن ہو کر اس دروازے سے نکل گئے باہر جانے کے بعد میں نے دونوں پٹ ملا کر پھرتی سے اس طرح دروازہ بند کر دیا کہ بادی النظر میں وہ اندر سے بولٹ معلوم ہو۔

وہ ایک خاصی گندی، تنگ سی گلی تھی جس میں اکا دُکا غلیظ بچے کھیلتے ہوئے نظر آرہے تھے، ہم دونوں بلا جھجک ایک طرف چل دیئے۔

دو رویہ تنگ و تاریک رہائشی مکانات کے درمیان سے گزر کر ہم چند ہی منٹ میں ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گئے۔

ٹیکسی میں سوار ہو کر حامد نے اسے شارع بحرین کے بجائے کوئی اور پتہ بتایا جس پر پہلے میں چونکا مگر پھر اس کی تقلید پر قائل ہو گیا۔

پچھلی بار بھی اس نے جائے واردات سے گھر تک کا سفر قسطوں میں کیا تھا اور شاید اس بار بھی وہ یہی سوچ رہا تھا۔

مرکزی بازار میں پہلی ٹیکسی چھوڑ کر ہم اتر گئے اور چند گلیوں سے گزرنے کے بعد دوسری ٹیکسی میں سوار ہو گئے اس بار ہم نے چشمے اتار لئے تھے تاکہ ہمارا سراغ لگانے کی کسی بھی کوشش میں تلاش کا تسلسل برقرار نہ رہ سکے۔

اس بار ہم سیدھے شارع بحرین پہنچے۔ ٹیکسی کو فلیٹ سے دور خیر باد کہنے کے بعد ہم پیدل چلتے ہوئے اپنی عمارت پہنچے۔ تو ہاشم پانی کے ٹینکر کے پائیدان پر کھڑا ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا۔

ٹینکر کا انجن اسٹارٹ تھا۔ شاید کلچ کے ذریعے پمپ کو انجن سے چلایا جا رہا تھا لیبیا کی نئی بستیوں میں میٹھا پانی پہنچانے کا وہ بہت مقبول نظام تھا اور ہاشم اس عمارت کے حارس یا چوکیدار کے فرائض ادا کرنے والے کی فرمائش کی تعمیل کرا رہا تھا اس نے دور سے ہمیں دیکھا تو چونک پڑا مگر اس نے ہم میں سے کسی سے مخاطب ہونے کی غلطی نہیں کی بلکہ دوبارہ ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا۔

ہم دونوں ٹینکر کی دوسری جانب سے گزر کر لفٹ کے ذریعے فلیٹ پر پہنچ گئے۔

فلیٹ میں داخل ہو کر حامدالعزیز نے گہرا سانس لیتے ہوئے بھرا ہوا بریف کیس یوں صوفے پر پھینکا جیسے اس میں کوئی خزانہ پوشیدہ ہو۔

"تم زیادہ تھک گئے؟" میں نے ہیٹر آن کرتے ہوئے مسکرا کر اس کی حالت پر طنز کیا۔

"واللہ! میرے لئے یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔" وہ اپنے کانوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پورا شہر جوزف اور بریف کیس کو پہچانتا ہو۔ ہر دوسرا آدمی اسی کو گھورتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔"

"اناڑی ہو، کچھ عرصے بعد اعتماد بھی آجائے گا۔" میں اس بات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "اب جلدی سے رقم نکال کر بریف کیس کو تلف کر دو۔"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایسے معاملات میں بھی نمایاں دخل رکھتے ہو!"

"حالات سے سمجھوتے کی بات ہے، ضرورت پیش آنے پر نقب زنی جیسا حقیر کام بھی کیا ہے!"

"بعض کام جنہیں حقیر سمجھا جاتا ہے، بڑے لوگ کر گزریں تو ان کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔" وہ بریف کیس سے نوٹوں کی گڈیاں قالین پر الٹتے ہوئے بولا۔

نوٹوں کو ایک الماری میں ڈال کر ہم نے بریف کیس کو پھاڑ کر چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کیا اور پھر ان ٹکڑوں کو احتیاط سے کچن میں لے گئے تاکہ انہیں جلا کر بالکل ہی نیست و نابود کر دیں۔

دوسرا ٹکڑا ہی جلانے کی نوبت آئی تھی کہ اچانک فلیٹ کی ٹیلیفون کی گھنٹی کے مانوس ارتعاش سے گونج اٹھی۔

ہم دونوں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر دونوں ہی بیک وقت نشست گاہ میں نکل آئے۔

دوسری گھنٹی بجی تو سمت کا تعین کر لیا گیا۔

آواز ایک صوفے کے نیچے سے آئی تھی اور پھر میں نے ہاتھ ڈال کر گرد آلود فون باہر نکال لیا۔

وہ وقفہ بہت قلیل تھا مگر ہم دونوں فون کو یوں گھورتے رہے جیسے وہ کوئی آسیبی چیز ہو پھر جوں ہی تیسری گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھا کر خاموشی سے کان سے لگا لیا۔

"میں کامل حسینین بول رہا ہوں!" ریسیور پر مجھے ہاشم کی گھٹی گھٹی ہیجان آمیز آواز سنائی دی۔ "تم دونوں کیا کر رہے ہو؟"

میں حامدالعزیز کو آنکھ مار کر مسکرا دیا اور مجھے مسکراتا دیکھ کر اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت یک بیک دور ہو گئی۔

"ہم شتر مرغ کے انڈوں میں سے شتر برآمد کر رہے ہیں، موقع ملے تو تھوڑی دیر کے لئے آجاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں آرہا ہوں۔"

اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"کون تھا؟" میرے ریسیور رکھتے ہی حامدالعزیز نے مشینی انداز میں وہ سوال کر ڈالا جس کی مجھے پہلے سے توقع تھی۔

"تمہارا قیاس کیا کہتا ہے؟"

"ہاشم کے علاوہ تم اور کسے اتنی بے تکلفی سے یہاں بلا سکتے ہو؟" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"وہی تھا۔" میں ہنس پڑا۔ "کتنی عجیب بات ہے کہ انسان بہت سی باتوں کے بارے میں پُریقین ہوتا ہے مگر جب تک کسی دوسرے سے ان کی تائید نہ کرا لے اس کا یقین پختہ نہیں ہوتا۔"

"یہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی تائید کرنے والے کو خود سے بہتر سمجھتا ہو۔" اس کے پاس فوری جواب تیار تھا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور حامدالعزیز نے لپک کر دروازے کا بولٹ کھول دیا۔

اندر آنے والا میری توقع کے مطابق ہاشم ہی تھا۔

"تم دونوں بہت جلدی واپس لوٹ آئے۔" دروازہ بند ہونے کے بعد ہاشم نے تحقیر آمیز لہجے میں سوال کیا پھر اچانک اپنے نتھنے سکوڑتے ہوئے بولا۔ "یہ کس چیز کے جلنے کی بو ہے؟"

میں خاموشی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے باورچی خانے میں لے گیا۔

"اوہ!" وہ بریف کیس کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہی حیرت سے بول پڑا۔ "اگر میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہیں تو یہ اسی بریف کیس کے ٹکڑے ہیں جو واپسی میں حامد کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔"

"تمہاری قوتِ مشاہدہ واقعی قابلِ داد ہے۔" میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "آؤ اب ان ٹکڑوں کو جلانے میں ہماری مدد کرو۔"

"اس کی ضرورت نہیں، انہیں اسی طرح کوڑے دان میں ڈال دو!" اس نے بے فکری کے ساتھ کہا۔

"یہ ٹکڑے ہمارے لئے پھانسی کا پھندہ بن سکتے ہیں!"

"تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس عمارت کے چوکیدار کی حیثیت میں مجھے ہر فلیٹ سے تین دینار ماہانہ معاوضے پر سڑی ہوئی خورد و نوش کی اشیاء سے بھرے ہوئے کوڑے دان قریبی برقی بھٹی پر خالی کر کے واپس لانے ہوتے ہیں وہاں یہ خود بخود جل جائیں گے!"

لمحے بھر کے لئے مجھ پر جذباتیت غالب آ گئی۔ ہاشم واقعی بہت عظیم شخص تھا جو بُرا وقت آنے پر محض اپنے مقاصد کی خاطر اپنے رتبے اور مقام کی پرواہ کئے بغیر، اپنے سے کم تر اور عیش کوش لوگوں کے کوڑے دان پیشانی پر بل لائے بغیر صاف کر رہا تھا اور اس میں اپنی تحقیر محسوس نہیں کر رہا تھا۔

مگر اس سے پیشتر کہ میں الفاظ میں اپنی جذباتیت کا اظہار کرتا ہاشم نے ایک سوال کر ڈالا۔

"تم لوگ اس بریف کیس میں کیا لائے تھے؟"

اور حامد العزیز نے نہایت ڈرامائی انداز میں مقہی الیوسف کی کہانی چھیڑ دی جو ہاشم کے لئے بے حد سنسنی خیز ثابت ہوئی۔

"جو کچھ ہوا، درست ہی ہوا۔" حامد العزیز کے خاموش ہونے پر ہاشم میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس ایک قتل کے بعد تم تلوار کی دھار پر آ گئے ہو، ذرا سی لغزش بھی تمہارے لئے مسائل پیدا کر سکتی ہے۔"

اس کے تبصرے پر میں نے اپنی رگ و پے میں سنسنی کی لہر سی سرایت کرتی محسوس کی۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اور اس نے وہی جواب دیا جس کی مجھے امید تھی۔ "ایک قتل کے دو گواہ بہت بھاری پڑتے ہیں۔" اس کا لہجہ نرم اور آواز دھیمی تھی۔ "جب آدمی اپنی زندگی کے لئے لڑ رہا ہو تو اصول بڑے سخت ہو جاتے ہیں اور راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کے بے رحمی سے چیتھڑے اڑانے پڑ جاتے ہیں۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تمہیں یہ بات بتانی پڑ رہی ہے۔" میں سر تھام کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا، جوزف اور ماریا واقعی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں!"

"جوزف پارسا نہیں ہے، سنا ہے کہ اس نے ماریا کے ہمراہ لبنان میں ایک یہودی کو قتل کر کے اس کی دولت سنبھالی تھی، جوزف اس کے بعد بھی ایسی حرکتوں میں ملوث رہا اور جب التعلقی نے اس کے گرد جال بُننا شروع کیا تو وہ لیبیا بھاگ آیا۔ اگر تم اسے ٹھکانے لگا دیتے تو کچھ برا نہ کرتے!"

"میں اس کا ازالہ کروں گا۔" میں نے خفت آمیز لہجے میں کہا۔

"مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ حمزہ کا نام دونوں جگہ مشترک نکل آیا۔" ہاشم نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں — ایئرپورٹ پر جھڑپ کے نتیجے میں میرا دشمن بنا اور شاید اس سے پہلے ہی البرولنو کی معاونت کر کے سیتا کے معاملے میں ملوث ہو چکا تھا۔"

"البرولنو کو تم کس خانے میں رکھ رہے ہو؟"

"اگر نیشنل سیکیورٹی بیورو والوں کے انداز میں سوچا جائے تو البرولنو سیتا کا ہمدرد ہے لیکن میرا خیال مختلف ہے، اوّل تو اس جیسا رسوائے زمانہ شخص ذاتی مفاد کے بغیر کسی سے ہمدردی نہیں کر سکتا، اگر اس نے سیتا کو واقعی فرار میں مدد دی ہے تو اب یقیناً اسے کسی نئے چکر میں پھنسانے کے درپے ہو گا۔"

"یہ امکان بھی تو ہے کہ سیتا خود ہی فرار ہوئی ہو مگر بعد میں البرولنو سے جا ٹکرائی ہو۔" حامد العزیز نے کہا۔

"پھر ایک ماہ قبل مقہی الیوسف میں اس کی اور حمزہ کی ملاقات کو کہاں فِٹ کرو گے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہی چکر ہو!"

"حمزہ العلادی سے ملے بغیر تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔" ہاشم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ویسے تو وہ ادباکس قسم کا آدمی ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "لیکن یہاں سے تقریباً چالیس کلومیٹر دُور صباحیہ نام کا ایک چھوٹا سا نخلستان اس کے چچا کی ملکیت ہے وہ ہر روز وہاں محفلیں سجاتا ہے۔"

"یہ وہی نخلستان تو نہیں جہاں اس نے مجھے قید کیا تھا؟"

"وہ شاید کوئی اور جگہ تھی، بن غازی کے نواح میں العلادی خاندان کی بے شمار جاگیریں ہیں، صباحیہ نواب سے کئی برس پہلے بھی بہت خوبصورت اور صاف ستھری جگہ ہوا کرتی تھی، وہاں کھجور کے جھنڈ دن یا کچے مکانات کے بجائے باغات میں گھری ہوئی ایک پختہ حویلی ہوتی تھی!"

"تم وہاں جا چکے ہو؟"

"العلادی والے اپنی خاندانی تقریبات عموماً وہیں منعقد کرتے ہیں، اگر تم ادھر گئے تو اندر داخل ہونا تمہارے لئے بہت دشوار ہو گا۔"

"داخل تو ہونا ہی پڑے گا۔"

"اس حویلی نما مکان کے گرد سات آٹھ فٹ اونچی چار دیواری...

بنی ہوئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں کئی دروازے ہوں مگر عام طور پر شاید ایک ہی دروازہ استعمال میں رہتا ہے جہاں شاید محافظ موجود رہتے ہیں۔"

ہم تینوں مزید کچھ دیر اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے پھر میرے اصرار پر حامد نے جوزف کے مکان سے حاصل کی ہوئی تمام رقم ایک بیگ کے غلاف میں ڈال کر ہاشم کے حوالے کر دی ـــــ

"میں اس کا کیا کروں گا؟" ہاشم نے حیرت سے سوال کیا۔

"اسے تم ہی رکھ لو، تمہاری اپنی ضروریات بہت زیادہ ہوں گی۔"

"فی الحال تم رکھ لو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہمیں جو ضرورت ہو گی وہ لیتے رہیں گے بچنے والی رقم تنظیم کے فنڈ میں ڈال دینا۔"

"اسے یہیں رہنے دو، اگر کسی وقت میرے خلاف مخبری ہو گئی تو میرے لئے اس خطیر رقم کے بارے میں جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔"

اس کی دلیل معقول تھی لہٰذا حامد نے تکیے کا وہ بھرا ہوا غلاف اسی طرح الماری میں ڈال دیا۔

ہاشم کے جانے کے بعد حامد العزیز نے صوفے کے نیچے سے ٹیلی فون ڈائرکٹری نکال لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ حروفِ تہجی کی ترتیب میں العلاوی کے ساتھ سارے نام ایک ہی جگہ جمع تھے۔

اس فہرست میں حمزہ کے نام کے آگے دو فون نمبر تھے جبکہ صباحیہ کے پتے پر سلطان العلاوی کے نام سے دو فون نمبر تھے!

"کمال ہے!" میں نے صباحیہ کے نمبر سننے کے بعد کہا۔ "محض دو نمبروں کے لئے فون کی لائنیں اس صحرائی نخلستان تک لے جائی گئی ہوں گی۔"

"وہ وائرلیس فون ہوں گے۔" حامد العزیز نے کہا۔ "یہاں صاحبِ حیثیت لوگ اپنی موٹروں میں بھی فون لگانے کے خبط میں مبتلا ہیں، ان کی دانست میں یہ چیزیں سماجی مرتبہ بلند کرتی ہیں اسی وجہ سے یہاں وائرلیس فون بکثرت فراہم کئے جانے کا انتظام ہے۔"

"الو کے پٹھے ہیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "سماجی مرتبہ ذاتی کردار اور اوصاف سے ہوتا ہے اگر اوپر سے ٹھونسی ہوئی چیزیں اس میں اضافہ کر سکیں تو سارے درویش صفت لوگ ... ٹھوکروں میں پڑے نظر آئیں!"

"یعنی کھوپڑیوں کو تم اپنے سانچے میں نہیں ڈھال سکتے!" وہ مسکرا دیا۔

"یہ نخرے اسی وقت تک چلیں گے جب تک ان کے بنجر صحرا

تیل اگل رہے ہیں جس روز قدرت نے زمین کے سوتے خشک کر دیئے اس روز انہیں اپنے ملک میں زندہ رہنا دوبھر ہو جائے گا!

"مغربی قوموں نے سوچی سمجھی سازش کے تحت تیل کے مالک عربوں میں انا کے اظہار کے مہنگے طریقوں کو رواج دیا ہے شاید کبھی انہیں اپنی اس فضول خرچی کا احساس ہو جائے۔" وہ ... لہجے میں بولا۔ "ان خرافات میں ضائع ہونے والا سرمایہ اگر ... کاز کو تقویت پہنچاتا تو آج ہم اپنے وطن میں ہوتے۔"

گفتگو کا انداز تلخی کی طرف مائل تھا لہٰذا میں نے موضوع بدل دیا۔ "حمزہ کے بارے میں اب کیا کرو گے ـ؟"

"پہلے صباحیہ سے رابطہ قائم کیا جائے!" ہاشم نے کہا اور میری کھوپڑی کی تائیدی جنبش کے ساتھ ہی فون پر نمبر ملانے لگا۔

"حمزہ موجود ہے؟" سلسلہ مل جانے کے بعد حامد العزیز نے ... نرم لہجے میں سوال کیا۔

وہ چند ثانیوں تک فون پر بات کرتا رہا اس دوران میں اس نے ایک نمبر بھی دہرایا پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کوئی لڑکی تھی۔" وہ ریسیور رکھ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"وہ تو تمہارے فدویانہ لہجے سے ہی ظاہر ہو رہا تھا۔"

"آج کل وہ شاذو نادر ہی صباحیہ کا رخ کرتا ہے۔" حامد نے کہا۔ "جب میں نے حمزہ سے اپنے قریبی تعلق کا اظہار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ان دنوں صفیہ نامی ایک عراقی لڑکی کے چکر میں ہے۔"

"اس کا پتہ؟"

"پتہ نہیں معلوم، فون نمبر بتایا ہے۔" وہ بولا۔ "ویسے کہہ رہی تھی کہ صفیہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے!"

"اگر اچھی لڑکی نہیں ہے تو میں اس سے بات کروں گا۔" میں نے یہ کہہ کر کریڈل سے ریسیور اٹھا لیا۔

حامد العزیز نے نمبر ملایا اور دوسری گھنٹی پر ہی دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا اور میرے کانوں میں ایک مترنم نسوانی آواز سنائی دی۔

"خاتون، میں حابر بول رہا ہوں۔" میں نے نہایت فصیح و بلیغ عربی میں کہا۔ "مجھے تمہارے ایک قدردان نے یہ فون نمبر دیا ہے!"

"کس لئے دیا ہے؟" اس کی آواز میں شوخی اور دلچسپی عود کر آئی۔

"اس شہر میں سینکڑوں دینار برباد کر کے بھی میں تنہائی کے احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا، اس کا خیال تھا کہ شاید تم میری مدد کر سکو گی ـ؟"

سینکڑوں دینار کا تذکرہ کر کے میں نے اس پر اپنے تمول کا اظہار کرنا چاہا تھا اور شاید میں اس میں کامیاب بھی رہا۔

"تم چاہو تو اسی وقت چلے آؤ، آمنے سامنے کچھ باتیں

ہے۔

کیا شام کا سہانا وقت مناسب نہ ہوگا؟"

"چھ بجے کے بعد تو تمہیں ایک پل کے لئے بھی نہ رکنے دوں ...ں نے نرمی سے کہا مگر میں اس کی آواز میں ابھرنے والی ...کھوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں وجہ جان سکتا ہوں خاتون؟" میں اپنے لہجے سے یہ ...ہا تھا جیسے میں اس کی آواز پر ہی فریفتہ ہو گیا ہوں۔

"میری کچھ ذاتی مجبوری ہے شیخ!" اس مرتبہ اس کی آواز میں ...تھی!

"میں دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتا۔" میں نے ...تے دل کے ساتھ کہا۔ "اگر تم ان دنوں کسی کی پابند ہو تو میں تم ...ارا اپنی فلش میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔"

"نہیں، نہیں۔" اس کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ...بلا نہ سمجھو، دراصل اس شہر کا ایک بدمعاش ان دنوں میرے ...پڑا ہوا ہے۔ اور ہر شام ساڑھے چھ، سات بجے میرے فلیٹ ...پس آتا ہے اور شراب پی کر میرے ساتھ بدزبانی اور ہاتھا پائی ...ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی وجہ سے تم کسی دشواری میں ... پاؤ۔"

اس کے الفاظ سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا وہ بنیادی ...ہ ایک لالچی عورت معلوم ہوتی تھی اور مجھ جیسی مالدار اسامی ...آسانی دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔

"اگر وہ ایسا ہی ناپسندیدہ اور مردود شخص ہے تو میں اس کے ...ہر گز کر تمہارے فلیٹ سے باہر پھینک دوں گا۔"

"کاش کہ ایسا ہو سکے۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ...میں تمہیں اس سے الجھنے کا مشورہ نہیں دوں گی، وہ بڑے ...ا لڑکا ہے اور ہر طرف بے پناہ اثر و رسوخ رکھتا ہے۔"

"میرے ایک اشارے پر اسے زندگی بھر جیل میں سڑایا جا ...ہے۔" میں نے خود سر عربوں کے انداز میں غصیلے لہجے میں کہا۔ "اس ...ے میرا موازنہ مت کرو۔"

"میں معافی چاہتی ہوں شیخ!" شاید وہ سہم گئی تھی۔ "تم جب ...آ سکتے ہو، تمہاری موجودگی میں مجھے بڑی تقویت رہے گی!"

"میں ابھی آ رہا ہوں، مگر وہیں اس کا انتظار کروں گا!"

"میں منتظر ہوں۔"

"اگر تم اجازت دو تو میں اپنے سیکرٹری کو ساتھ لیتا آؤں؟" ...ں نے حامد العزیز کو آنکھ مارتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"... سمجھ سکتے ہو۔" اس نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ "...فلیٹ دو کمروں پر مشتمل ہے اس کی موجودگی میں ہم خواب گاہ ...تک محدود ہو کر رہ جائیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔" اس پر پوری طرح غالب آنے کے بعد میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "ضرورت محسوس ہوئی تو میں اسے واپس لوٹا دوں گا ـــــ تم اپنا پتہ بتاؤ!"

حامد العزیز نے جیب سے قلم نکال کر میرے حوالے کر دیا اور میں نے سگریٹ کے پیکٹ پر اس کا پتہ لوٹ کر کے خوشگوار الوداعی فقروں کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔

حامد العزیز جو یک طرفہ گفتگو سننے کے باوجود معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا، یک بیک میرے گلے سے لپٹ گیا۔

"تم واقعی عظیم ہو۔" وہ میرے رخسار کا بوسہ لیتے ہوئے بولا۔ "اس لڑکی کو ایسے بھرپور انداز میں شیشے میں اتارنا میرے بس سے باہر تھا۔"

"حمزہ کی شامت ہی آ گئی ہے۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "اگر ہم نے جاتے ہی لڑکی کو سو دو سو دینار دے دیئے تو اگر ہم حمزہ کو وہاں ذبح بھی کر ڈالیں تو وہ مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔"

اس وقت دن کے دو بج رہے تھے، ہم دونوں تیزی کے ساتھ اس اہم معرکے کی تیاری کرنے لگے جس کے نتائج پر ہمارے آئندہ اقدامات کا انحصار تھا۔

میں اپنے کمرے میں دوسرا لباس پہننے کے بعد سر پر رومال باندھ رہا تھا کہ اچانک باہر فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ اور میں یوں اچھل پڑا جیسے بے خیالی میں بجلی کا ننگا تار میرے برہنہ شانے پر آ گرا ہو ـــــ!

مشینیئے پیک کر نشست گاہ میں پہنچا تو حامد العزیز مجھ سے پہلے ریسیور اٹھا چکا تھا۔ اس کے بشرے سے تشویش کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں جو لحظہ بھر کے بعد ہی سکون اور مسکراہٹ میں تحلیل ہو گئیں!

"اس فون نے تو میرا دم ہی نکال دیا تھا!" وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ "ہم ابھی باہر جا رہے ہیں، کچھ اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں....!"

"ایک منٹ ٹھہرو، ذرا گرد سے ہی بات کر لو!" قدرے توقف کے بعد اس نے ماؤتھ پیس میں کہا اور ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

حامد العزیز کے انداز سے میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کال ہاشم کی تھی، لہٰذا میں نے بلا تامل اس سے ریسیور لے لیا۔

"تم کیا کر رہے ہو برادر!" میں نے ریسیور لیتے ہی کہا۔

"فی الحال اوپر آنا مخدوش ہے!" مجھے حسب توقع ریسیور میں ہاشم کی آواز سنائی دی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"فون پر گفتگو خطرناک بھی ہو سکتی ہے!" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ایسی خطرناک بھی نہیں ہے۔ میرے لئے اس وقت اوپر آنا محال ہے، دوسری منزل والے دس منٹ سے اپنے مہمانوں کو الوداع کہنے کے لئے میرے کمرے کے سامنے موجود ہیں، اور ان کی الوداعی ملاقات جلد ختم ہوتی نظر نہیں آتی!"

"فساد کے عناصر ثلاثہ کیا ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا ــــ

"تمہاری طرف کا علم نہیں، ہمارے یہاں زن، زر اور زمین ہوتے ہیں!" اس کی آواز میں بھی شوخی تھی۔

"اس بارے میں دونوں متفق ہیں!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس بار فساد کا باعث عورت کی ذات ہے!"

"کیسی عورت؟" اس کی آواز میں حیرت امڈ آئی۔

"خوبصورت ہی ہو گی!" میں نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔ "ان دنوں تمہارا دوست اس پر عاشق ہو گیا ہے!"

"مذاق بعد میں کر لینا!" وہ میری زبان سے معاملے کی نوعیت جاننے کے لئے بہت زیادہ بے تاب ہو رہا تھا!

"وہ شام کو ساڑھے چھ سات بجے اس لڑکی کے پاس آتا ہے، اس وقت ہم وہیں جانے کے لئے پر تول رہے ہیں!"

"اس کا سراغ کیسے ملا؟"

"لمبی کہانی ہے، واپسی پر بتائیں گے!"

"واپسی کے بارے میں پُر یقین ہو نا؟" اس کی دھیمی آواز میں تشویش کی علامات نمایاں ہو گئیں!

"آخری لمحے پر بھی شبہ ہو گیا تو واپس چلے آئیں گے!"

"دونوں جا رہے ہو؟"

"ہاں! تم بے فکر رہو....!"

"میں بے چینی سے تمہارا منتظر رہوں گا!" یہ کہہ کر اس نے رابطہ کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے وہیں حامد العزیز کو اپنی اور ہاشم کی گفتگو سے آگاہ کیا اور پھر ہم دونوں فلیٹ مقفل کر کے باہر آ گئے۔

ہم دونوں اس موقعہ پر پوری طرح مسلح تھے کیونکہ مقابلہ حمزہ جیسے عیار اور راسخ دشمن سے تھا!

فلیٹ سے نکلنے کے بعد خاصی دور تک میں حامد العزیز کی رہنمائی میں پیدل ہی راستہ طے کرتا رہا، مگر جب اس کے رکنے کے آثار نظر نہ آئے تو مجھے مجبوری کے عالم میں بولنا پڑا۔

"کیا پورا راستہ پیدل ہی طے کرنے کا ارادہ ہے؟"

وہ میری طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ "اس وقت میں خیالات کی رو میں ڈوبا ہوا تھا، تم نہ ٹوکتے تو نہ جانے کہاں جا نکلتا!"

"صفیہ کے فلیٹ پر ہی ہوتے؟" میں بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"ارے نہیں!" وہ میرے شانے پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔ "ہم اس سے مخالف سمت میں جا رہے ہیں!"

"کیا میں اس وحشت کا سبب دریافت کر سکتا ہوں؟" میں نے اسے خشمناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"برسوں کے تجربے کے بعد میں نے چند اصول وضع کئے ہیں" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ منزل کی طرف سفر کی ابتدا مخالف سمت میں پیدل چل کر کی جائے تو بعد میں سراغ پانا دشوار تر ثابت ہوتا ہے!" وہ خاموش ہو کر اپنے لئے سگریٹ سلگانے لگا۔

"ابتدا اگر یہ ہے تو انتہا کے بارے میں کیا اصول وضع فرمایا ہے جناب نے!" میں نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "وضع ہونے والی چیز کچھ اور ہی ہوتی ہے، اصول وضع نہیں کئے جاتے، بلکہ وہ خود کو منواتے ہیں!"

"تو اور کس اصول نے خود کو منوایا!"

"کسی اہم منزل کی جانب سفر دو یا تین قسطوں میں کیا جانا ضروری ہے۔ یہ ترکیب ہمیشہ معاون رہی ہے!"

"تو اب بھٹکنے کا سلسلہ شروع ہو گا؟"

"پتہ نہیں، تمہیں کیا ہو رہا ہے!" وہ خوش دلی کے ساتھ بولا۔ "صفیہ کے مکان کا پتہ ہمارے پاس موجود ہے، پھر حمزہ دس بجے کے بعد ہی پہنچے گا۔ ہمارے پاس کافی وقت ہے، اور ہم تھوڑی سی وقت گزاری کے بعد بآسانی صفیہ کے فلیٹ پر پہنچ جائیں گے!"

پہنچ گئے!

میں نے جو کچھ کہا اسے چڑانے کے لئے کہا تھا، ورنہ میں اس کے طریقہ کار سے بخوبی واقف ہو چکا تھا اور میری دانست میں اس کی احتیاطی تدابیر معمولی ہونے کے باوجود تحفظ فراہم کرتی تھیں!

ایک ٹیکسی کے ذریعے ہم نے تقریباً دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور اس مقام پر تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد دوسری ٹیکسی کے ذریعے شہر کے ایک صاف ستھرے رہائشی علاقے میں جا پہنچے جہاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کشادہ اور ہوادار عمارات بنی ہوئی تھیں۔

ان میں بیالیسویں عمارت تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی جو وسیع سڑک کے کنارے پر ہی واقع تھی!

دوپہر کا وقت ہونے کے سبب سے عمارت میں چہل پہل کے آثار مفقود تھے۔ ہم دونوں کسی کی نظروں میں آئے بغیر چوتھی منزل پر پہنچ گئے۔ اس فلور پر دو فلیٹ واقع تھے۔ میں نے دروازے پر پیتل کے چمکتے ہوئے ہندسے دیکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ سات نمبر فلیٹ کی ڈوربیل کا بٹن دبا دیا۔

وہ شاید میری منتظر ہی تھی، کیونکہ فوری طور پر دروازہ کھول دیا گیا اور مجھے اپنے مقابل بے حد دلکش لیکن استفسار طلب چہرہ.... نظر آیا!

"صفیہ!" میں نے دھیمی مگر بھاری آواز میں سوال کیا۔

اس دراز قامت اور سبک اندام دوشیزہ نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی، مگر مجھے اندر داخلے کا راستہ دینے پر تیار نہ ہوئی!

"میں جابر الاحمد ہوں، اور یہ میرا سیکرٹری ہے تھوڑی دیر پہلے فون پر میری تم سے بات ہوئی تھی!"

میرا نام سنتے ہی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دلربایانہ مسکراہٹ عود کر آئی اور اس نے ہم دونوں کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

"اندر آ جاؤ، مجھے امید ہے کہ تمہیں یہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی ہو گی!" اس کی مترنم آواز سن کر مجھے خاصی خوشی ہوئی۔

"یہ تو شہر ہے اگر تم صحرا کے وسط میں مقیم ہوتیں تو میں وہاں پہنچ جاتا!" میں نے ہلکا سا قہقہہ مار کر کہا۔

دروازہ عبور کرتے ہی ہم ایک بیٹھک میں داخل ہوئے جہاں ایک بیش قیمت صوفہ سیٹ موجود تھا اور باہر کے سرد موسم کے مقابلے میں وہاں خاصی سکون آمیز حرارت بھی رچی ہوئی تھی۔

بیٹھک سے ملحق کشادہ ڈرائنگ روم تھا جو نہایت صاف ستھرے انداز میں قرینے سے سجایا گیا تھا۔ صفیہ کے ہمراہ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

ڈرائنگ روم محض ایک پردے کے ذریعے ایک پتلی سی راہداری سے منسلک تھا اور اسی راہداری میں کچن واقع تھا، کچن سے متصل ایک دروازہ بند تھا جو شاید اس کی خوابگاہ کے مصرف میں رہا ہو گا۔

"کیا پینا پسند کرو گے؟" صفیہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا ــــ تعارف ہو جانے کے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے انگ انگ سے مسرت پھوٹی پڑ رہی ہو۔ مزاج اور خدوخال کے اعتبار سے وہ عورتوں کی اس قسم میں شامل تھی، جو بہت جلد دوسروں کو دوست بنا لیتی ہیں اور ان سے چند ثانیوں کی گفتگو کے بعد ہی پرانی رفاقت کا ایک بھرپور احساس ذہن پر طاری ہو جاتا ہے!

"ساقی کی مرضی پر منحصر ہے!" میں نے آہستگی سے کہا۔

اس نے بے چینی سے پہلو بدل کر حامد العزیز کی طرف دیکھا جو نہایت سعادت مندانہ انداز میں چھت پر کوئی داغ دھبہ تلاش کرنے کی سعی لاحاصل میں مصروف تھا!

"گفتگو کی حد تک یہ قطعی بے ضرر ہے!" میں نے صفیہ کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

"یہ بھی پیئے گا!"

"صبر بھی کر سکتا ہے!" میں نے اس کے بدن سے اٹھنے والی بھینی بھینی مہکار کو اپنے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ "بہتر یہی ہو گا کہ اسے ایک گلاس لیمن سکواش بنا کر دے دو تاکہ بیٹھک میں خود کو مصروف رکھ سکے!"

"بولتا بھی ہے یا گونگا ہے؟" صفیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اتنے بلند لہجے میں سوال کیا کہ حامد العزیز بھی سن سکے۔

مگر وہ اس وقت ایک وفادار سیکرٹری کا رول بخوبی نبھا رہا تھا۔ صفیہ کے الفاظ سننے کے باوجود اس کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا!

"یا سکرتیر!" میں نے خالص عربی لب و لہجے میں اسے پکارا...

وہ انتہائی مؤدب انداز میں میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"صفیہ کے کان تمہاری آواز سننے کو ترس رہے ہیں!"

حامد العزیز بے چارگی کے عالم میں دانت نکال کر رہ گیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ فرشتہ ٹوٹ رہا ہو، تو مجھے چپ لگ جاتی ہے!" شاید اس نے صفیہ کا ابتدائی فقرہ سن لیا تھا اور موقع ملتے ہی اپنی خاموشی کا جواز مستحکم کرنا چاہ رہا تھا!

"چھت میں کیا تلاش کر رہے تھے؟" صفیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دلچسپی سے سوال کیا!

"جب دوسری سمتوں میں دیکھنا قابل مواخذہ ہو تو چھت عموماً

بہتر ثابت ہوتی ہے؟" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"بہت حاضر جواب ہے!" میں نے ہلکا سا قہقہہ مار کر کہا۔ "پچھلے سات برس سے یہ میرے ساتھ ہے اور بے پناہ خوبیوں کا مالک ہے!"

"چہرے سے ہی معلوم ہو رہا ہے۔" وہ یوں ہنس پڑی جیسے بے خیالی میں کسی نے اسے گدگدا دیا ہو!

وہ اٹھی اور راہداری کی طرف چلی گئی۔

حامد العزیز نے میدان صاف دیکھ کر مجھے آنکھ ماری اور کسی لفنگے کی طرح بازاری انداز میں مسکرانے لگا!

چند ثانیوں بعد صفیہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک مختصر سی ٹرے تھی جو اس نے حامد العزیز کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ اس ٹرے میں وہسکی کا ایک کوارٹر، سوڈے کی بوتل اور برف کی کچھ ڈلیاں موجود تھیں!

"بہت بہت شکریہ خاتون!" حامد العزیز نے ندیدوں کے سے انداز میں ٹرے اپنے قریب سرکاتے ہوئے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔ "اس شہر میں تم جیسے مہمان نواز لوگ خال خال ہی ملتے ہیں!"

"ایک دم نہ چڑھا جانا!" صفیہ کو شاید اسے چڑانے میں لطف آ رہا تھا۔ "اس کے بعد کچھ نہ دے سکوں گی!"

"دو چار انڈے بھی نہ دے سکو گی؟" حامد العزیز بے ساختہ کہہ گیا۔

یک بیک صفیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ میری طرف دیکھ کر پلٹ پڑی۔ "یہ کیسا بے ہودہ آدمی ہے، اسے عورتوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے!"

"تم غلط سمجھی ہو!" میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "جاڑوں میں وہسکی کے ساتھ یہ اُبلے ہوئے انڈے شوق سے کھاتا ہے!"

میری وضاحت معقول تھی، جس کے نتیجے میں وہ لڑکی خود کو ندامت محسوس کرنے لگی۔ میں نے اس کے بشرے پر پھیلی ہوئی خفت بھانپ کر نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے اندر لے گیا!

اس کی خواب گاہ ڈرائنگ روم کے مقابلے میں بہت زیادہ خوبصورت اور آراستہ تھی۔ مسہریوں سے الماریوں تک ہر چیز نفاست سے سجی ہوئی تھی!

میں المونیم کے بنے ہوئے آرام دہ صوفے پر بیٹھا تو صفیہ نے بڑے انداز سے قالین پر بیٹھ کر میرے جوتے اتار دیئے۔ میں نے اسے باز رکھنا چاہا لیکن وہ نہ مانی۔ جوتے مسہری کے نیچے سرکانے کے بعد اس نے مصری موسیقی کا ایک ٹیپ چلا دیا جس کی مدھم لیکن ولولہ انگیز گونج کمرے کے در و دیوار سے ابھرتی محسوس ہو رہی تھی۔

ٹیپ چلا کر وہ مسکراتے ہوئے میری طرف پلٹی تو میں نے سو دینار کے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے!

اس نے کسی تکلف کا اظہار کئے بغیر خوش گوار حیرت کے ساتھ میرے ہاتھ سے وہ نوٹ لے لئے۔

"پورے مہینے تک آتے رہنے کا ارادہ ہے؟" اس نے سرسری نظر ڈال کر نوٹوں کی مالیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ آج کا انعام ہے!" میں نے لاپرواہانہ انداز میں کہا۔ "دل کے معاملات میں نہ ادھار کرتا ہوں اور نہ پیشگی ادائیگی کا قائل ہوں!"

میرے ان الفاظ سے وہ یک بیک بہت زیادہ مرعوب ہو گئی۔ شاید میری لگائی ہوئی بولی اس کی توقع سے بہت زیادہ تھی۔

"تمہارا تعلق کس علاقے سے ہے؟" وہ میرے پہلو والے صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ میری ذات کے بارے میں اس کا رویہ بہت زیادہ نجی اور ہمدردانہ ہو گیا تھا!

"عاشقوں کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا!" میں نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کی نرم زلفوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔

"نہ بتانا چاہو تو میں اصرار نہیں کروں گی! ویسے میرا تعلق عراق سے ہے!" وہ سپردگی کے انداز میں بولی۔

میں زور سے ہنس پڑا۔ "تم نے کوئی انکشاف نہیں کیا، تیکھے نسوانی خد و خال اور چمکتی ہوئی بڑی بڑی پرکشش سیاہ آنکھیں عربوں میں صرف عراقی عورتوں کو ہی میسر ہیں اور وہ دور سے پہچانی جا سکتی ہیں!"

"مصری حسن کو کہاں لے جاؤ گے؟"

"حسن وہاں بھی ہوتا ہے، مگر خد و خال کی نزاکتیں بہت کم ملتی ہیں، پھر دوسری چیز حیا بھی ہے۔ مصری عورتیں حیا سے بے اعتنائی برتتی ہیں۔ جب کہ عراقی عورت میں مشرق کی حیا پائی جاتی ہے!"

"عورتوں پر بڑی گہری نظر ہے تمہاری!"

"مجھے یہ بتاؤ کہ تم عراق چھوڑ کر یہاں کیوں پڑی ہو؟" میں نے اچانک ہی اس سے سوال کر ڈالا۔

"یہاں ذرا آزادی ہے!" وہ سر جھکا کر بولی۔

"آزادی!" میں استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "میرا تو خیال ہے کہ اسباب کی پرواہ کئے بغیر ملتی قانونی اخلاقی بے راہ روی پر پڑنے والوں کو پیسے ڈالنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے جب کہ عراق میں شراب اور شباب کے بارے میں بہت سی قانونی رعایتیں حاصل ہیں!"

"وہاں قانونی رعایتیں ضرور حاصل ہوتی ہیں، مگر متوسط درجے کی عورتوں پر معاشرتی پابندیاں بہت سخت ہیں!" وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔ "میں بصرہ میں رہتی تھی اور ہر جمعرات کو

...رد کی عورتیں بناؤ سنگھار کیے ساتھ کویتی سرحد کے قریب خیموں میں بازار سجا لیتی تھیں جہاں کویت سے آنے والے شراب کے نشے میں دھت شباب کو روندتے تھے اور پھر جمعہ کے روز وہ محفل ویران ہو جاتی تھی، مگر ان عورتوں کو بصرہ میں انتہائی تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا!"

"تو یہاں کیا فرق ہے؟"

"یہاں مول ہے!" وہ آہستہ سے بولی۔ "وہاں دو تین دینار بمشکل سے ملتے تھے، یہاں پچاس دینار تک مل جاتے ہیں، پھر یہاں میں ایک ادارے میں ٹائپسٹ بھی ہوں۔ عراق میں عورتیں تو درکنار مردوں کو... ملازمتیں نہیں ملتیں!"

"معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہارے یہاں پینے کے لئے کچھ نہیں رہا ہے!" میں نے اچانک اسے یاد دلایا اور وہ بوکھلا کر اٹھ گئی۔

مے نوشی کے دوران کچھ دیر تک رنگین باتیں ہوتی رہیں، تھوڑا سا فاصلہ سمٹ گیا اور پھر میں نے حمزة العلاوی کی بات چھیڑ دی۔

"آخر وہ بدمعاش تمہارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟"

"اسے شاید میرے پاس آنے والے کسی شخص سے میرے بارے میں علم ہوا ہو گا کیوں کہ وہ بڑے اطمینان سے یہاں آیا تھا!"

"تم اس سے کیوں بدظن ہو؟"

"میں اسے غائبانہ طور پر جانتی ہوں، اگر ایک بار میں نے اس کے سامنے سپر ڈال دی تو وہ مجھے اپنی باندی بنا لے گا اور میں اس کے کسی نخلستانی حرم میں پہنچا دی جاؤں گی!" وہ قالین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہ ہو گی!"

"میری ذات کا معاملہ ہو تو میں کسی کے بھی گھر پڑ سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں کرب امڈ آیا۔ "بصرہ میں میری تین بہنیں، دو بھائی، اور معذور، بیوہ ماں ہر ماہ میری بھیجی ہوئی رقم کا انتظار کرتے ہیں ان سب کو فخر ہے کہ میں لیبیا میں آبرومندانہ ملازمت کے ذریعے ایک خطیر رقم کما رہی ہوں!"

"پھر تو حمزہ واقعی بہت موذی ہے!"

"بات یہی نہیں، جس روز وہ مجھ سے اکتا جائے گا مجھے تن کے کپڑوں کے ساتھ باہر ہانک دے گا۔ یا پھر اپنے خوشامدیوں کے حوالے کر دے گا جو حمزہ کے جھوٹے دسترخوان پر بڑے فخر سے جمع ہوتے ہیں!"

"تم دیکھو گی کہ آج کے بعد وہ ادھر کا رخ بھی نہ کر سکے گا!" میں نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں مہمان ہو، آج نہیں تو چند روز یا چند ماہ بعد واپس چلے جاؤ گے، پھر وہ میری زندگی عذاب بنا دے گا!"

"اس کی تو پھر ایک ہی صورت ہے!"

"میں ہر صورت کے لئے تیار ہوں!"

"میں اس کی آمد سے قبل لوٹ جاتا ہوں۔ تم بالکل بھول جاؤ گی کہ تم نے حمزہ کے بارے میں مجھ سے کوئی بات کی ہے۔ وہ یہاں سے واپس ہو گا تو میرے آدمی اسے گھیر لیں گے، اس طرح وہ تم پر شبہ نہیں کر سکے گا!"

"یہاں تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟"

"سیکرٹری کے علاوہ نو ملازمین ہیں!"

"ان میں کسی اضافے کی گنجائش ہے؟" اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"گنجائش ضرور ہے، مگر میں اپنے خاندان کے سربراہ کے بنائے ہوئے ضابطوں سے انحراف نہیں کر سکتا!"

"وہ کیا؟"

"اس کی جانب سے لڑکیوں سے دوستی کی اجازت ہے مگر انہیں ملازم رکھنے پر سخت ترین پابندی ہے، جس سے انحراف کرنے والے کو آنافانا میں وراثت سے محروم کر دیا جائے گا!" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "اگر یہ پابندی نہ ہوتی تو بہت سے حسین چہرے میری جماعت میں شامل ہوتے!"

"بڑا عجیب ضابطہ ہے!"

صفیہ جس قدر خوبصورت تھی، اسی قدر ذہین بھی تھی مجھے اس کے ساتھ وقت گزار کر عجیب سی مسرت اور آسودگی کا احساس ہو رہا تھا جو میرے لئے ایک مدت سے اجنبی بنا ہوا تھا!

حامد العزیز ہم دونوں کی سرگرمیوں میں مخل ہوئے بغیر نشست گاہ میں جما رہا اور مجھے تو کافی دیر تک یہ یاد ہی نہ رہا کہ اس فلیٹ میں میرے اور صفیہ کے علاوہ کوئی تیسرا فرد بھی موجود ہے!

الجھے ہوئے مشتعل اور مخمور سانسوں کے دھیمے آہنگ پر نہ جانے ہم دونوں کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں۔ اور وہ ہر موضوع پر بہکے ہوئے ترنم ریز لہجے میں میرا ساتھ دیتی رہی!

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شراب کا گہرا خمار اتر آنے کے باعث جلال اور جمال کا ایک سنسنی خیز امتزاج پیدا ہو گیا تھا جس کے تصور ہی سے انسان کے بدن میں شرارے کوندنے لگیں اور جب میرے پانچوں حواس صفیہ کے حسن کی نزاکت اور لطافت سے پوری طرح آشنا ہو گئے تو یک بیک مجھے صفیہ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔

اس نے مجھے بتایا تھا کہ کویت کے باسی ہفتہ وار تعطیل

کا آغاز ہوتے ہی دیوہیکل گاڑیوں میں طوفانی رفتار سے اڑتے ہوئے بصرہ یا سرحد سے ملحق خیموں پر مشتمل ان عراقی نشاط گاہوں کا رُخ کرتے تھے جہاں شراب میں شباب تحلیل کر کے حسین نسوانی پیکروں میں مہمانوں کو پیش کی جاتی تھی!

عراق دجلہ اور فرات کی وادی تھی اور ان دریاؤں کے کناروں پر زراعت نے قدیم انسانی تہذیب کو ایک مسکن عطا کیا تھا۔ پھر قلوپطرہ کے مصر کا خیال آیا جو نیل کی زرخیز وادی تھی اور وہاں۔۔۔ بھی عرب تمدن کی قدیم ترین تاریخ پوشیدہ تھی اور جب میرے سرور میں ڈوبے ہوئے ذہن نے دریاؤں سے محروم، بے آب وگیاہ عرب ریاستوں سے ان دونوں ممالک کا موازنہ کیا تو نتیجہ تحیرآمیز تھا!

بنجر صحراؤں کے بسنے والے کرخت مزاج، تند خو اور منتقم طبیعتوں کے مالک تھے جب کہ زرخیز علاقوں کے عرب نرم خو، حلیم الطبع اور ملنسار تھے جس کی بنا پر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کسی بھی خطے میں کلچر کے ارتقا کے لئے ایگریکلچر کا ہونا لازمی تھا!

صفیہ کو میں نے اپنے نئے فلسفے سے آگاہ کیا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ہنس پڑی۔ "ثقافت اور زراعت میں بڑا عجیب نکتہ نکالا ہے تم نے!"

"عربی میں یہ تعلق اچھا نہیں لگتا، کلچر اور ایگریکلچر ہی مناسب ہے!" میں نے کہا۔ "کیا تم اسے جھٹلا سکتی ہو؟"

اور عراق کی زرخیز زمین سے جنم لینے والی وہ نوخیز لڑکی مجھ سے اختلاف کی جرأت نہ کر سکی!

آٹھ بجے کے قریب صفیہ کے حواس بحال ہوئے تو اس نے مجھے اپنا منصوبہ یاد دلایا اور میں وہاں سے اٹھ گیا!

صفیہ نے مجھے اپنا حلیہ درست کرنے میں نہایت جارحانہ انداز میں مدد دی اور جب میں ڈرائینگ رُوم میں پہنچا تو میری جلد پر آئی ہوئی کئی خراشوں میں میٹھی میٹھی سوزش سی ہو رہی تھی!

حامد العزیز اپنا کوارٹر ختم کر چکا تھا اور صوفے پر دُنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا!

"بڑا مظلوم شخص ہے بے چارہ!" صفیہ نے اس کی حالت دیکھ کر مترنم ہنسی کے ساتھ کہا۔

"مظلوم؟" میں اس کی طرف گھوم گیا۔

"بیداری کی مایوسیوں سے نجات پانے کے لئے اس نے نیند کا سہارا لیا ہے۔ عیاش لوگوں کے معتمد عموماً قابلِ رحم ہوتے ہیں!" وہ بدستور ہنستے ہوئے بولی۔ "ان کی ناک کے نیچے دریا بہتے رہتے ہیں مگر یہ پیاسے ہی رہتے ہیں!"

"یہ ان میں سے نہیں ہے، کسی بھی وقت اکیلا یہاں آ سکے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے حامد العزیز کو جھنجھوڑ ڈالا۔

وہ ہڑبڑا کر بیدار ہُوا اور ہکلاتے ہوئے اپنے سو جانے پر معذرت کرنے لگا!

"چلو!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "پہلے منہ پر پانی ڈال کر سستی دُور کر لو، پھر ہم روانہ ہوں گے!"

"مم .... مگر ہم تو شاید یہاں کسی معرکے کی تیاری کر کے آئے تھے؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"اسے بھول جاؤ، وہ میرا وہم تھا!"

حامد العزیز کو صفیہ نے اپنی خواب گاہ میں سے جانے کے بجائے کچن کا راستہ دکھایا اور واپس میرے پاس آ گئی۔

"آج میں حمزہ کو یہ سمجھ کر برداشت کروں گی کہ وہ آئندہ ادھر کا رُخ نہیں کر سکے گا!" اس نے میرے شانے سے سر لگا کر کہا۔ "کوشش کرنا کہ یہاں سے جاتے ہوئے وہ نشے میں بُری طرح دھت ہو!"

"میری کوشش کی ضرورت ہی نہیں، اپنی ناکامی کی جھلاہٹ کو بھلانے کے لئے وہ روز ہی بے تحاشا پیتا ہے!"

"یہ بہت اچھی بات ہے!"

"یہ بتاؤ کہ تم اسے ہلاک تو نہیں کرو گے نا؟" میرے لہجے پر اس نے چونک کر ایک چبھتا ہُوا سوال کر ہی ڈالا۔

"اگر اس کے دن پُورے ہو چکے ہیں تو دُنیا کی کوئی طاقت اسے نہ بچا سکے گی!" میں نے لاپروایانہ انداز میں کہا۔

"وہ مارا گیا تو پولیس اس کے قاتل کی تلاش میں پورے شہر کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گی اور شاید میرا نام بھی اچھالا جائے!"

"وہ صحیح سلامت رہے، زخمی ہو، یا مارا جائے، تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اب مجھول کر بھی اس کے بارے میں میرا ذکر نہ کرنا!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اس سے نمٹنا میرا کام ہے، وہ بھول کر بھی تمہارا رُخ نہ کر سکے گا!"

اسی اثناء میں حامد العزیز منہ دھو کر واپس آ گیا اور ہم دونوں صفیہ سے پُرتپاک انداز میں رخصت ہو گئے!

"یہ کیا ہُوا!" نیچے اترتے ہوئے حامد العزیز نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا!

"عیاشی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ حمزہ کو باہر گھیرا جائے ورنہ صفیہ بھی گھیرے میں آ جاتی!"

"ہمارے پاس نہ اپنی سواری ہے اور نہ کوئی ایسا ٹھکانا جہاں ہم اسے اغوا کر کے لے جا سکیں!"

"حمزہ کی گاڑی کس کام آئے گی؟"

"اگر تم نے کچھ سوچ رکھا ہے تو اب میں خاموش ہی رہوں گا!" اس نے چڑ کر کہا۔ وہ نشے میں تو نہیں تھا، مگر اس پر قدرے غنودگی

...ی تھی۔

ہم اسی کی گاڑی میں گھسیں گے اور جب وہ حسبِ معمول ...نیہ کے فلیٹ سے ناکام و نامراد واپس ہو گا تو اسے کسی ویران راستے ...پ لیں گے!

اس عمارت میں ملاقاتیوں کے لئے پارکنگ کی کوئی جگہ مخصوص ...ں تھی۔ البتہ ملحقہ خالی پلاٹ پر بہت سی کاریں بے ترتیبی سے ...ڑی ہوتی تھیں۔

ہم دونوں نے عمارت سے باہر آ کر چند منٹ ادھر اُدھر کی چہل قدمی میں ...ئے کہ اور اسی دوران میں ایک سرخ رنگ کی بیوک کار کی ڈرائیونگ ...یٹ پر حمزہ العلاوی کا چہرہ نظر آ گیا!

میرے ذہن میں اس صورتِ حال کے پیشِ نظر فوراً ہی ایک نئے منصوبے نے جنم لیا اور اس سے چھپنے کے بجائے میں حامد کا ہاتھ تھام ...س کی رینگتی ہوئی کار کے عین سامنے پہنچ گیا!

وہ اپنی کار پارک کرنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا، ...ہمیں سامنے دیکھ کر اس کی تیوریوں میں بے شمار شکنیں پڑ گئیں، مگر ...نیمت ہُوا کہ اس نے مجھ پر کار چڑھانے کے بجائے بریک لگا دیئے۔

"کیا مصیبت ہے؟" وہ کھڑکی سے سر نکال کر غصیلے لہجے میں ...لا تو میں نے آن واحد میں اندازہ لگا لیا کہ وہ خاصے سرور میں تھا!

"تم حمزہ العلاوی ہی ہو نا؟" میں نے لپک کر اس کے قریب ...اتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے کیسے جانتے ہو؟" وہ شام کے دھندلکے میں مجھے پہچاننے ...کوشش کرتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"میرا نام رینی فاس ہے!" میں نے مسرت آمیز سرگوشیانہ لہجے ...میں کہا۔ "مجھے کئی دن تک تم نے اپنے ایک نخلستان میں مہمان ...رکھا تھا!"

"ہاں... آں...!" اسے یک بیک یاد آ گیا۔ "تم یہاں کیا کر ...رہے ہو؟"

"دو آدمی سیاہ رنگ کی ایک کار میں ابھی ابھی میری محبوبہ کو ...اٹھا کر لے گئے ہیں!" میں نے ستم رسیدہ لہجے میں کہا۔ "کسی سے لفٹ ...لے کر ان کا پیچھا کرنا چاہ رہا تھا!"

"تمہاری محبوبہ؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دیا۔

"ہاں، ایک عراقی نژاد پیشہ ور لڑکی ہے!"

"تم صفیہ کی بات تو نہیں کر رہے؟" وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔

"ہاں، ہاں!" میں نے جلدی سے کہا۔ "کیا تم بھی اسے ...جانتے ہو؟"

"ارے لعنت ہو تم پر!" وہ دانت پیس کر غرایا۔ "کھڑے منہ کیا ...دیکھ رہے ہو، جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔ وہ دُور نکل گئے تو انہیں پکڑنا دشوار ہو جائے گا!"

میں نے پھرتی سے اس کے پہلو والی نشست سنبھال لی۔ حامد العزیز مجھ سے پہلے ہی عقبی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔

"کدھر گئے ہیں وہ؟" حمزہ العلاوی نے کار دوبارہ سڑک پر لاتے ہوئے بے چینی کے ساتھ سوال کیا۔

"کسی صحرائی علاقے کی طرف گئے ہیں!" اسے یہ جواب دے کر میں اچانک حامد کی طرف مخاطب ہو گیا۔ "کیا نام لے رہے تھے وہ؟"

میں نے اپنی دانست میں حامد العزیز کو اشارہ دے دیا تھا، وہ فوراً ہی بولا۔ "صلالہ کے نواحی علاقے کا منصوبہ بنا رہے تھے!"

"صلالہ!" حمزہ العلاوی... دانت پیس کر غرایا اور اس نے اپنی کار کی رفتار یک بیک تیز کر دی۔ "آج چاندنی رات ہے، شاید وہ صحرا کی نرم اور ٹھنڈی ریت پر سیج سجانے کا منصوبہ بنا کر گئے ہیں، مگر میں اس ریت کو ان کے لہو سے رنگین کر دُوں گا!"

چند ثانیئے تک بیوک وحشیانہ رفتار سے سڑک پر دوڑتی رہی پھر حمزہ کسی خیال کے تحت چونک پڑا۔ "تمہارا صفیہ سے کیا تعلق ہے اور اسے لے جانے والے کون لوگ تھے؟"

"پچھلے چند روز سے میری اس سے دوستی ہوئی ہے، آج رات وہ میرے ساتھ ساحل پر گزارنے کے ارادے سے باہر آئی تھی مگر اچانک دو آدمیوں نے اسے زبردستی اپنی کار میں ڈالا اور فرار ہو گئے۔"

"اور تمہارے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا!" اس کا لہجہ معنی خیز تھا!

میرے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی سرایت کر گئی۔ کیوں کہ حمزہ العلاوی نے اس سوال کے ساتھ ہی کار کی رفتار کم کرنا شروع کر دی تھی!

"پارکنگ لاٹ تو ابھی تک ویران ہی تھی، تم نہ آتے تو... یہ تم کار کیوں روک رہے ہو؟" میں نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ابھی بتاتا ہوں!" وہ ریورس لینے کے لئے انڈیکیٹر جلاتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا مگر حامد العزیز اپنے محاذ پر مستعد تھا!

حمزہ العلاوی کی کنپٹی پر پستول کے وزنی دستے کی ضرب پڑی اور وہ کراہ کر سیٹ پر ہی لڑھک گیا، میں نے پھرتی سے اگنیشن آف کر کے اسٹیئرنگ فٹ بائیں کی طرف کاٹا اور ہینڈ بریک کھینچ لیا!

اس وقت سڑک پر اکا دکا گاڑیاں ہی تھیں۔ پھر حمزہ کی کار کے تمام شیشے رنگین تھے، لہٰذا ہم دونوں نے لحظہ بھر میں حمزہ کے بے ہوش جسم کو پشت گاہ سے اوپر اٹھا کر عقبی نشست کے پائیدان میں پھینک دیا اور حامد العزیز اسی طرح پشت گاہ پھلانگ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

ایک قلیل سے وقفے کے بعد سرخ پیوجو پہلے سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اس وسیع شاہراہ پر موڑنے لگی۔

"تم نے اچانک پروگرام تبدیل کر کے خاصا بڑا خطرہ مول لیا تھا!" اپنے سانسوں پر قابو پانے کے بعد حامد العزیز نے کہا۔

"یہ صلالہ کیسی جگہ ہے؟" میں نے اس کی بات اَن سُنی کر کے کہا۔

اس نے اندھیرے میں گردن گھما کر شاید مجھے گھورا پھر بولا،

"میں تمہارا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ صلالہ ایک گاؤں ہے اور اس سے آگے تا حدِ نظر ریت کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا!"

"چاندنی رات میں حمزہ کو وہاں دوڑانے میں خاصا لطف آئے گا!"

"دوڑانے کی بات نہ کرو!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "اس پر تمہارا احسان بھی واجب الادا ہے، اور پھر تم نے جس دیدہ دلیری سے اس پر ہاتھ ڈالا ہے، اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ اسے ذبح کر ڈالا جائے!"

"ہمارا صفیہ کے فلیٹ پر جانا غیر ضروری تھا!" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کا پتہ معلوم ہو جانے کے بعد ہم مقررہ وقت پر حمزہ العلاوی کو گھیر سکتے تھے!"

"اس وقت تمہاری بات معقول معلوم ہوتی ہے، لیکن پہلے صفیہ سے ملے بغیر اس کی کہانی کی صداقت پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دو سو دینار کی رقم اور خود اس کے ملوث ہونے کا خطرہ اسے خاموش رکھنے کے لیے کافی ہو گا، مگر ہم غیر ضروری طور پر اپنے خلاف گواہ پیدا کرتے جا رہے ہیں!"

"صفیہ کو جوزف اور مآریا کے ساتھ شمار نہ کرو!" وہ بولا۔ "اس کے بارے میں میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہرگز دغا نہیں کرے گی!"

"اس میں کیا دیکھ لیا تم نے؟" میں نے مڑ کر عقبی پائیدان پر نگاہ ڈالتے ہوئے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

"دیکھا تو تم ہی نے ہے! مجھے پوتے پر ٹہلا دیا!" وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

"پتہ نہیں حمزہ کو مغنی الیوسف کے واقعات کا علم ہوا یا نہیں؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

"اس واقعہ کو چھ سات گھنٹے گزر چکے ہیں، رقم غائب پاتے ہی جوزف نے حمزہ سے رابطہ قائم کیا ہو گا!"

پھر بھی اس نے البرونو کاستیلانو کا حوالہ نہیں دیا ہو گا! میں نے رائے زنی کی۔ کیوں کہ اس طرح وہ قسم توڑنے کا اعتراف کرتا...!

"وہ ہر اعتبار سے پکا یہودی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس نے سب کچھ بتا دیا ہو، مگر زیبِ داستان کے لیے یہ کہہ ڈالا ہو کہ حملہ آوروں کے تشدد کے باوجود اس نے البرونو کے بارے میں زبان نہیں کھولی!"

"تھوڑی دیر کی بات ہے، پھر سب کچھ سامنے آ جائے گا!"

صلالہ سے آگے کا سفر خاصا طویل ثابت ہوا۔ شہر کی روشنیوں سے گزرنے کے بعد کئی قصبے بھی گزر گئے، پھر صلالہ کی مختصر سی آبادی بھی گزر گئی!

پیوجو کے طاقتور ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تار کول کی چکنی ہموار سڑک زرد ریت کے درمیان کسی دیو پیکر اژدہے کی طرح خوابیدہ نظر آ رہی تھی!

صلالہ سے کم از کم تین میل آگے نکلنے کے بعد حامد العزیز نے ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے قطب نما نکالا اور اس کی مدد سے کار کو داہنی طرف ریت میں اتار کر جنوب کی سمت میں ڈال دیا۔

ریت پر سفر کے دوران حامد العزیز مسلسل قطب نما کو دیکھ رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحرا کی پُرسکون راتوں کی آغوش میں کتنے تلاطم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اگر صحرا میں داخل ہونے کے بعد کسی وقت تیز ہوا چل گئی تو واپسی میں ٹائروں کے نشان لاپتہ ہو جائیں گے اور پھر قطب نما کی مدد کے بغیر صحرا سے نکلنا دشوار ہو جائے گا۔ محض اسی خدشے کی وجہ سے وہ جنوب کی سمت میں خطِ مستقیم میں سفر کر رہا۔

جب شاہراہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو حامد العزیز نے سرخ پیوجو ایک بڑے سے ریتیلے تودے کی اوٹ میں روک دی!

میں نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا تو سردی کے باعث پھریری سی آ گئی۔ شہر کے مقابلے میں کھلا صحرا زیادہ سرد تھا!

گاڑی میں حمزہ کے دیر تک ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا، لہٰذا اسے عقبی پائیدان سے گھسیٹ کر ٹھنڈی ریت پر ڈال دیا گیا اور ہم دونوں کار میں بیٹھ کر سگریٹیں پینے میں مصروف ہو گئے۔

خنک ہوا کے تھپیڑوں نے آٹھ دس منٹ میں ہی حمزہ کے اوسان درست کر دیئے اور وہ ہولے ہولے کراہتے ہوئے کسمسانے لگا!

"ہوش میں آ کر بھاگنے کی کوشش نہ کرے!" حامد العزیز نے کہا۔ "گولی سے بچ کر کہاں جائے گا۔ ویسے اسے بتائیں گے کہ ہم صحرا میں پندرہ میل اندر گھسے ہوئے ہیں، بھٹکنے کے خوف سے وہ چاروں سالوں سے چمٹا رہے گا!" میں نے بے رحمانہ انداز میں کہا۔ مجھے رہ رہ کر وہ دن یاد آ رہے تھے جب حمزہ کے ایک نخلستان میں اس کے بے رحم بدو ملازمین بات بے بات پر مجھے کسی چوپائے کی طرح لاتوں، گھونسوں اور ڈنڈوں سے ادھیڑ کر رکھ دیتے تھے!

میں کار سے اتر کر اس تک پہنچا اور پھر اس کی جامہ تلاشی لے ڈالی جس کے نتیجے میں ایک بھرا ہوا ریوالور اور ایک خاصی بھاری رقم برآمد ہوا۔ جو میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ دوسری طرف حامد العزیز نے

کار کی تلاشی لینی شروع کر دی تھی!

چند لمحوں تک کسمسانے کے بعد حمزہ کا بدن پھر ساکت ہو گیا تو میں نے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر رسید کی اور اس نے کسی اونٹ کی طرح بلبلا کر آنکھیں کھول دیں۔ چند ثانیوں تک وہ کراہتے ہوئے اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا، پھر مجھے پہچان کر تیزی سے اٹھ گیا۔

"تم؟ ولد الحرام!" وہ غراتا ہوا میری طرف لپکا، مگر اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا بلکہ بائیں رخسار پر میرا بھرپور تھپڑ کھا کر پیچھے الٹ گیا۔

اسے زمین سے اٹھنے کا موقع دیئے بغیر میں اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر رسید کی۔ اس کے حلق سے تکلیف میں ڈوبی ہوئی دردناک چیخ بلند ہوئی اور اس نے میری ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا!

"اپنی زبان پر قابو رکھو گندے کیڑے!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ورنہ محض ٹھوکروں سے تمہارے بدن کا ریشہ ریشہ اُڑا کر رکھ دیں گے!"

اسی وقت اس کا ہاتھ پہلے ریوالور والی جیب کی طرف گیا، پھر اس نے چاقو کا رُخ کیا اور دونوں طرف ناکامی کے بعد اس کا چہرہ اتر گیا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے پھٹے ہوئے ہونٹ سے خون صاف کرتے ہوئے تیش نہ بلکہ پہلے سے بہتر لہجے میں سوال کیا۔

"البرونو کا سٹیلانو کہاں ہے؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ وہ میری ٹھوکر سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ کہنیوں کے بل قدرے سرک کر تیزی کے ساتھ سیدھا کھڑا ہو گیا!

"تو وہ حرامزادہ مجھ سے جھوٹ بولا تھا!" وہ اٹھ کر تلخ لہجے میں بولا۔

"اپنی کس اولاد کا تذکرہ کر رہے ہو!"

"اسے ذرا یہ دیکھو!" اچانک حامد العزیز کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔ میں اس کی طرف مڑا تو وہ حمزہ العلاوی کی کار کی کھلی ہوئی ڈکی میں جھکا ہوا تھا!

صورتِ حال کے پیشِ نظر مجھے حامد العزیز کا وہ لاتعلقانہ انداز بہت پسند آیا۔ اس طرح حمزہ کو یہ احساس دلایا جا سکتا تھا کہ ہم اسے بالکل بے ضرر سمجھ رہے تھے!

میں سرخ ہیوجو کے قریب پہنچا تو ڈکی میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں مجھے سوڈے اور بیئر کی کہر آلود سبز بوتلیں نظر آئیں جو حامد العزیز نے کار کی عقبی نشست کی پشت گاہ سے لگے ہوئے مختصر سے کار ریفریجریٹر سے برآمد کی تھیں!

میرے لئے وہ ریفریجریٹر نئی چیز تھی، اس کی بیرونی سطح پر کار کے رنگ کی مناسبت سے سرخ رنگ کی تام چینی چڑھی ہوئی تھی، مگر اس سے زیادہ دلکش وہسکی کی وہ چار بوتلیں تھیں جو ڈکی میں پلاسٹک کریٹ میں رکھی ہوئی تھیں!

ہمیں غافل پا کر حمزہ نے حامد العزیز پر جست لگائی، مگر پیٹ میں گھٹنے کی شدید ضرب کھا کر کافی دُور جا گرا۔

میں نے دو کاغذی گلاسوں میں وہسکی انڈیل کر سوڈا ملایا اور ہم دونوں وہیں ریت پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ گلاس خالی کرنے لگے۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" کافی دیر تک جب ہم اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے تو وہ پوری قوت سے ہذیانی انداز میں چیخ پڑا!

"پکنک منانے!" حامد العزیز نے قہقہہ مار کر کہا۔ "سارا انتظام سامان تو تمہاری کار سے ہی برآمد ہو گیا ہے!"

"چارلی کو کس نے مارا تھا؟" قدرے توقف کے بعد اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سوال کیا۔

"کس چارلی کی بات کر رہے ہو؟" حامد نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے سوال کیا اور اپنے لئے دوسرا گلاس بنانے لگا!

"مقبی الیوسف کے کاؤنٹر والا!" وہ غصے اور بے بسی کے عالم میں بولا۔

"ہو سکتا ہے کہ ہم ہی نے مارا ہو!" حامد العزیز تیزی کے ساتھ پہلا گلاس چڑھا جانے کے باعث قدرے ترنگ میں آ گیا تھا!

"تمہیں البرونو کے بارے میں جوزف نے کیا بتایا تھا؟" حامد العزیز کے اندازِ گفتگو پر وہ اندر ہی اندر جل بھن رہا تھا!

"بتاتا کیا، اسے تو تم نے البرونو کے آتے ہی باہر روانہ کر دیا تھا!"

"وہ یہودی کی اولاد، خائن، کمینہ...!" غصے کی شدت سے حمزہ کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "اس نے قسم کھا کر مجھے یقین دلایا کہ البرونو کے معاملے میں اس نے اپنی زبان بند رکھی تھی، میں اسے اور مار کر زندہ نہیں چھوڑوں گا!"

"پہلے یہاں سے اپنے زندہ واپسی کی فکر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی حماقت سے تم اسی صحرا کو اپنا مدفن بنا بیٹھو!" میں نے کہا۔

وہ ریت پر اکڑوں بیٹھا چند ثانیوں تک ہم دونوں کو گھورتا رہا، پھر بولا۔ "تم لوگوں کو البرونو سے کیا دلچسپی ہے؟"

"بہت سوال کر چکے، اب شرافت سے جواب دو۔ ورنہ سوڈے کی خالی بوتل کا پیندا مار مار کر سارے دانت ہلا دوں گا!" میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"میں کسی البرونو کو نہیں جانتا!" وہ حقارت سے ریت پر تھوکتے ہوئے بولا۔ "یہ یاد رکھنا کہ میں نے تم دونوں کو بن غازی کے کسی چوراہے پر درّے نہ لگوائے تو اپنا نام بدل دوں گا!"

حامد العزیز اس ہرزہ سرائی پر مشتعل ہو گیا اور اپنے کاغذی گلاس میں بچا ہوا آتشیں سیال ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیل کر... غراتا ہوا حمزہ العلاوی پر جا پڑا۔ کچھ حامد کا نشہ اور کچھ حمزہ کی پھرتی کہ حامد اس کو پچھاڑنے کے بجائے منہ کے بل ریت پر جا رہا اور حمزہ پھرتی سے اس کی پشت پر سوار ہو گیا!

حمزہ نے حامد کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ ریت میں رگڑنے کی کوشش کی، مگر حامد آسانی سے قابو میں نہ آ سکا!

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس نے حمزہ کو اپنے اوپر سے اچھال دیا اور پھر وحشیانہ انداز میں اس پر سوار ہو گیا۔

حامد العزیز کے گھونسوں اور ٹکروں نے چند ہی ثانیوں میں حمزہ کا پورا چہرہ لہولہان کر دیا اور وہ بوکھلا کر کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگا!

حامد العزیز نے اس پر سے اٹھتے اٹھتے بھی دو چار زوردار ضربیں لگا ہی دیں اور ہاتھ جھاڑتا ہوا میری طرف آ گیا!

حامد کا چہرہ بھی خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے بوکھلا کر اس کی پیشانی اور چہرے کو ٹٹولا تو یہ معلوم کر کے مجھے خوشی ہوئی کہ حامد العزیز شدید قسم کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ تھا اور اس کے چہرے پر نظر آنے والا خون حمزہ کا تھا!

میرے مشورے پر حامد العزیز کار میں چلا گیا اور اندرونی بلب روشن کر کے عقب نما آئینے کی مدد سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔ اس کام میں گاڑی میں رکھے ہوئے ٹشو پیپرز بہت کام آئے!

"مجھے وہ وقت یاد ہے جب تمہارے آدمیوں نے نخلستان میں قید کر کے مجھے کسی جانور کی طرح شب و روز مارا تھا!" میں نے آتش صفت سیال کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے زبان نہ کھولی تو ہم تمہیں نیم مردہ کر کے یہیں چھوڑ جائیں گے اور تم اسی صحرا میں بھٹک بھٹک کر بھوکے پیاسے مر جاؤ گے۔ اس وقت ہم صحرا میں پچاس، ساٹھ کلومیٹر اندر گھسے ہوئے ہیں۔ یہ یاد رکھو گے تو غصہ نہیں آئے گا!"

اس نے اپنا خون آلود بھیانک چہرہ اوپر اٹھایا اور وحشت لہجے میں بولا۔ "مجھے بھی وہسکی کا ایک گلاس دو!"

"نشے میں تم پھر بہکنے لگو گے!"

"میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے ایک گلاس دو، اس وقت میں خالص پیوں گا، اس میں سوڈا نہ ملانا!..." وہ پٹنے کے باوجود رعونت کے مظاہرے پر تلا ہوا تھا!

میں اپنا گلاس رکھ کر اس کے لئے انڈیلنے لگا تو مجھے ہاتھ رُکتے دیکھ کر وہ بے تابانہ انداز میں غرایا... "بھر دو، اسے پورا بھر دو، میں قطرے گن کر نہیں پیتا!"

میں نے اس گلاس میں دو تہائی بڑے پیگ کے قریب مقدار انڈیلی اور قریب جا کر گلاس اسے تھما دیا!

اس نے فوراً ہی بے تابی سے دو لمبے لمبے گھونٹ لئے، پھر منہ سے گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔ "تم نیک آدمی ہو، تمہارا ساتھی تو درندہ ہے، پورا درندہ!" اتنا کہہ کر اس نے گلاس دوبارہ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"یہ جوتے کھا کر ہی زبان کھولے گا، اس سے ہمدردی نہ کرو!" حامد العزیز میرے قریب آ کر بلند آواز میں بولا۔ شاید اس نے حمزہ کا تبصرہ سُن لیا تھا اور خود کو اسی معیار پر برقرار رکھنا چاہتا تھا!

"ذرا سی نرمی بھی برت لینے دو، شاید راہِ راست پر آ جائے!" میں نے حمزہ کو سُنانے کے لئے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"وقت برباد کرو گے!" حامد العزیز شانے اچکا کر بولا۔ "اگر تم جوزف کو حمزہ کی لاش دکھا سکو تو وہی تمہیں البرونو کے بارے میں بہت کچھ بتا ڈالے گا!"

"اسے خاموش رکھو!" حمزہ کاغذی گلاس فضا میں اچھالتے ہوئے بولا۔ "اس کی بیہمانہ گفتگو میرا سرور تباہ کر دے گی... ذرا ایک گلاس اور دے دو!"

"دوسرا گلاس بھی ملے گا، مگر تم پہلے اپنی کہانی شروع کرو!"

"اگر... اگر میں نے البرونو کاسٹیلانو کے بارے میں تمہارے سوالات کے جوابات دے دیئے تو مجھے ہلاک تو نہیں کرو گے؟" اس کی زبان پر نشے کی ہلکی سی لکنت طاری ہونی شروع ہو گئی تھی!

"تم یقین رکھو کہ پھر ہم تمہیں ذبح نہیں کریں گے!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"وعدہ کرتے ہو!"

"پکا وعدہ!" میں نے پورے وثوق سے کہا۔

"لاؤ، پھر مجھے دوسرا گلاس بھی دے دو اور جو چاہو پوچھتے چلے جاؤ!" اس نے لہک کر کہا۔

"البرونو ایک ماہ پہلے تم سے کیوں ملا تھا؟" میں نے سست رفتاری سے اس کے لئے دوسرا گلاس بھرتے ہوئے سوال دہرایا۔

"وہ اس کا ذاتی معاملہ تھا!" حمزہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ ایک ایسی لڑکی کے عشق میں مبتلا تھا جو صدر کے حکم سے قصرِ ضیاء کے بدترین جیل خانے میں قیدِ تنہائی کی سزا بھگت رہی تھی!"

"کیا بک رہے ہو!" میں طیش کے عالم میں غرایا۔

وہ بہکے ہوئے انداز میں ہنس دیا۔ "تم تو یوں بھڑک رہے ہو جیسے البرونو تمہارا رقیب رہا ہو!"

حمزہ کے الفاظ نے یک بیک مجھے مشتعل کر دیا، مگر حامد العزیز نے زور سے میرا شانہ دبا کر مجھے خاموش کر دیا۔

"وہ تم سے کیا چاہتا تھا؟" حامد العزیز نے میرے ہاتھ سے وہسکی سے بھرا ہُوا دوسرا گلاس لے کر حمزہ کو تھماتے ہوئے سوال کیا۔

"قصرِ ضیاء سے فرار میں اس لڑکی کی مدد کرانی چاہتا تھا!" حمزہ نے دوسرے گلاس سے پہلا گھونٹ لیتے ہوئے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"اس سلسلے میں تم کیا کر سکتے تھے؟"

"قصرِ ضیاء کا سینیئر وارڈن میری تیسری بیوی کا سرپرست ہے اور میں اس سے اپنی ہر بات منوا سکتا تھا!"

"پھر کیا ہُوا؟"

"البرونو سے زبردست سودے بازی کے بعد ساٹھ ہزار دینار میں معاملہ طے ہُوا اور میں نے ساری رقم پیشگی وصول کر لی!" اتنا کہہ کر اس نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا تو اس پر ہچکیوں کا دورہ پڑ گیا۔

میں بے چینی کے ساتھ اس کی حالت اعتدال پر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ ذہن پر غصّے کے ساتھ ہی جھلاّہٹ اور بے بسی بھی طاری تھی۔ اس وقت حمزہ العلاوی کی زبان سے مجھے اپنی چہیتی بیوی کے بارے میں ایسی خرافات سننی پڑ رہی تھیں جو عام حالات میں میری برداشت سے قطعی باہر ہوتیں مگر اس وقت میں صبر کے ساتھ حمزہ کی کہانی کی تکمیل کا انتظار کر رہا تھا!

حامد العزیز کی مدد سے کئی منٹ بعد حمزہ کی حالت سنبھل سکی مگر اس دوران میں شراب کا نشہ اس پر اپنا رنگ جما چکا تھا!

"پھر قصرِ ضیاء میں کیا ہُوا؟" اسے خاموشی کا مناسب وقفہ دینے کے بعد مجھے ہی بات چھیڑنی پڑ گئی۔

"میں بہت چالاک ہوں!" حمزہ جھومتے ہوئے فخریہ انداز میں ہنس پڑا۔ "میں نے البرونو سے ساٹھ ہزار نقد وصول کئے مگر بے چارہ سینیئر وارڈن دس ہزار کی جھلک دیکھ کر ہی رال ٹپکانے لگا۔ اس کے ذریعے لڑکی تک پیغامات جانے لگے اور تین ہفتے کی تیاری کے بعد فرار کا ایک ایسا جامع منصوبہ بنا لیا گیا کہ بعد میں کسی پر بھی شبہ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ مقررہ وقت پر البرونو کار، اسلحہ اور دوسرا ضروری سامان لے کر جیل کے احاطے کے عقب میں پہنچا، مگر دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھی کچھ نہ ہُوا تو اس نے سینیئر وارڈن سے براہِ راست رابطہ قائم کیا اور اس وقت پتہ چلا کہ وہ چالاک لڑکی سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مقررہ وقت سے کم از کم دس گھنٹے قبل جیل کو خیرباد کہہ چکی تھی!"

"پھر؟ پھر کیا ہُوا؟" میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

"البرونو نے سینیئر وارڈن سے ساٹھ ہزار کی فوری واپسی کا مطالبہ کیا، وہ بے چارہ دس کے ساٹھ سن کر چکرا گیا اور سمجھا کہ البرونو اس کے گرد جال بن رہا ہے۔ نتیجتاً اس نے البرونو کو گرفتاری کی دھمکی دی تو وہ بوکھلاہٹ میں کار چھوڑ کر فرار ہو گیا، جو بعد میں پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی!"

"اب البرونو کہاں ہے؟"

"وارڈن سے جھڑپ کے بعد اس کا کچھ پتہ نہیں، وہ میرے پاس بھی نہیں آیا!" وہ بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساٹھ ہزار دینار بھی بھول گیا ہے!"

"لڑکی جیل سے قبل از وقت کیسے فرار ہوئی؟"

"کسی کو علم نہیں!" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "لڑکی کے ساتھ فرار کا پورا منصوبہ طے ہو چکا تھا اور وہ جانتی تھی کہ مقررہ وقت پر اسے کن خامیوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہے، اب یا تو وہ بہت چالاک تھی یا اس کے ستارے اچھے تھے کہ وہ ان خامیوں سے مقررہ وقت سے پہلے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو گئی۔"

"تمہیں لڑکی کے بارے میں البرونو کی کہانی پر یقین تھا؟" میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے سوال کیا!

"میں اتنا احمق نہیں ہوں!" وہ غیر ارادی طور پر فضا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔ "اس لڑکی کے بارے میں اخبارات میں اتنا چھپ چکا تھا کہ میں اس کا جھوٹ سمجھ رہا تھا، مگر ساٹھ ہزار دینار کے لئے میں جھوٹ تو کیا قتل سے بھی چشم پوشی کر سکتا تھا!" پھر وہ حیرت سے یک بیک اچھل پڑا اور اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ "اوہ خدا ۔۔۔! کہیں تم ہی تو اس کے گمشدہ شوہر نہیں ہو جس کے انتظار میں وہ مدت سے دربدر بھٹک رہی تھی!"

میں نے اپنے سر کو مثبت انداز میں جنبش دی۔ "کیا میرے بارے میں بھی اخبارات میں کچھ شائع ہُوا تھا؟"

وہ بدستور مجھے گھورے جا رہا تھا۔ "جب سیتا پر سرکاری عتاب نازل ہُوا تو تمہاری گرفتاری کے لئے دو بار دس ہزار دینار کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا!" اس نے دوسرا گلاس بھی خالی کر کے ریت پر پھینک دیا۔ "کاش کہ یہ سب مجھے اس وقت یاد آ جاتا جب تم میری قید میں تھے۔ مگر اس وقت تو تم ایسے مسکین، بزدل اور نکمے بنے ہوئے تھے کہ میں تمہاری ذات کے اس خول کے پیچھے دیکھ ہی نہ سکا!"

"اس وقت یاد آ جاتا تو کیا ہوتا؟"

"میں صحرا میں تمہارا لہولہان قیدی نہ ہوتا۔ کیا مجھے اور شراب نہیں دو گے؟ ۔۔۔" اس نے حریصانہ انداز میں اپنا ہاتھ آگے پھیلا کر کہا۔

"اب تم مجھے پہچان ہی چکے ہو تو یہ بھی سن لو کہ میں اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا!" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔ "پیش قدمی کرتے ہوئے میں اپنے پیچھے سارے سراغ بھی مٹاتے چلے جانے کا

عادی ہوں!"

"تت ۔۔۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ خوفزدہ لہجے میں گھگھیایا۔

میں نے اپنے خنجر پر انگلی پھیر دی!

"نہیں!" وہ ابتر حالت میں ہونے کے باوجود لڑکھڑا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ "تم مجھ سے جان بخشی کا وعدہ کر چکے ہو!" اپنی زندگی کا سوال سامنے آنے پر سردی کے باوجود اس کی پیشانی اور سارا چہرہ یک بیک پسینے میں ڈوب گیا۔ خون کے درمیان پسینے کے قطرات نمایاں تھے!

"میں وعدے پر قائم ہوں!" میرا لہجہ بدستور سرد اور بے رحمانہ تھا۔ "میں تمہیں ذبح نہیں کروں گا بلکہ گولی ماروں گا!"

"تم ایسا نہیں کر سکو گے۔" وہ چیختا ہُوا میری طرف دوڑا، مگر دو قدم بڑھانے کے بعد ہی لڑکھڑا کر ریت پر ڈھیر ہو گیا!

"میں یقیناً ایسا ہی کروں گا!" میں نے اپنا پستول نکال کر فضا میں اچھالا اور پھر اسے نیچے گرنے سے پہلے لپک لیا!

"نہیں!" اس کی آنکھوں میں وحشت سمٹ آئی۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دُنیا کے آخری سرے تک البرونو کی تلاش میں تمہاری مدد کروں گا!"

"اب میں تمہارے پورے بدن کو چھلنی کر کے تمہیں دو تین گھنٹے تک سسکاؤں گا۔ اور جب مجھ پر اکتاہٹ سوار ہونے لگے گی تو آخری گولی تمہارے دل میں اتار دوں گا! اگر تم پہلی گولی سے فوراً مرنا پسند کرتے ہو تو اب رضاکارانہ طور پر ہر وہ بات بتا ڈالو جو مجھے البرونو کی تلاش میں مدد دے سکتی ہے!"

دُنیا کے ہر بُرے آدمی کی طرح اسے بھی اپنی زندگی سے بے حد پیار تھا، وہ میرے سامنے گڑگڑاتا رہا، پھر گریہ زاری پر اتر آیا، مگر مجھے اپنے ارادے پر اٹل پا کر اس کی آنکھوں میں موت کی زردی اور ویرانی ابھر آئی۔

وہ چند ثانیوں تک سکتے کے عالم میں پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا، پھر بہت نحیف اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اب مرنا ہی ہے تو میں موت کی اذیت محسوس کئے بغیر اس مرحلے سے گزرنا چاہتا ہوں۔ میرے دل کا نشانہ نہ لینا ۔۔۔ اور اس خواہش کے عوض میں تمہاری شرط پوری کر رہا ہوں۔ البرونو کے بارے میں ائیر انڈیا کے مقامی دفتر کا منیجر رمیش پانڈے تمہیں کچھ نہ کچھ بتا سکے گا!" وہ سانس لینے کے لئے رُکا، پھر بات جاری رکھتا ہُوا بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کے معاملے میں وہی البرونو کو سرمایہ فراہم کر رہا تھا!"

اسی لمحے حامد العزیز میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے قدرے دُور لے گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں البرونو کے معاملے میں حمزہ کو زندہ رکھ کر اس سے کام لے سکتا تھا مگر میں اس کی فطرت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ ایک بار ۔۔ گرفت کمزور ہوتے ہی وہ نہ صرف نکل بھاگتا، بلکہ پوری قوت اور وسائل صرف کر کے مجھے اور حامد العزیز کو پیوندِ زمین کر دیتا!

اس کا کام ختم ہو چکا تھا اور وہ ہر اعتبار سے موت کا مستحق تھا۔ عام لوگوں کے لئے وہ موذی تھا، پھر میرے لئے تو ذاتی سلامتی ہر چیز پر مقدم تھی!

ہم دونوں مشورہ کر کے واپس لوٹے تو وہ شاید خوف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا، حامد العزیز نے قریب بیٹھ کر اسے ہلایا جلایا، مگر اس کے بدن میں کوئی جنبش نہ ہوئی!

اس کے اعضاء کی غیر فطری بے حسی نے مجھے چونکا دیا۔ میرے اشارے پر حامد العزیز نے اس کے دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی مگر وہاں موت کا بھیانک اور لامتناہی سکوت طاری ہو چکا تھا، نبضیں بھی یکسر مفقود تھیں۔ حامد العزیز اس کی لاش سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا!

"قدرت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا!" وہ سر جھکا کر ششدر لہجے میں بولا۔ "شاید یقینی موت کی دہشت سے اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی ہے؟"

غرور کے اندرونی احساس سے مجھے اپنا وجود معمول سے بڑا معلوم ہونے لگا! قدرت اس قدر فیصلہ کن انداز میں بہت کم انسانی عزائم کی تائید کرتی ہے!

صحرا کے زرد سینے پر اس وقت دُور تک دودھیا چاندنی کا راج تھا اور صحرا کی فضا کا سکوت بہت فسوں خیز معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا رومال گیلا کر کے حامد العزیز کا چہرہ بہت احتیاط سے صاف کیا اور بظاہر کوئی دھبّہ نظر نہ آنے کے باوجود میرا سفید رومال سرخ ہو گیا۔ چہرہ صاف ہونے کے بعد حامد کی پیشانی پر چند معمولی خراشیں رہ گئیں!

اگلا مرحلہ حمزہ کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ حامد العزیز کی رائے تھی کہ لاش کو ڈکی میں بند کر کے گاڑی کہیں چھوڑ دی جائے تاکہ پولیس کو سواری اور مسافر کو الگ الگ تلاش نہ کرنا پڑے، مگر میں یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا!

میرے ساتھ حامد بھی پولیس کی نگاہوں میں مفرور تھا۔ آخر رات گئے شہر کی طرف لوٹتے ہوئے راستے میں کوئی سپاہی روک لیتا تو لازماً کار کی تلاشی بھی لی جاتی اور لاش کی موجودگی میں جوابدہی ناممکن ہو جاتی!

حامد العزیز اس نکتے پر فوراً مجھ سے متفق ہو گیا اور ہم دونوں نے نرم ریت میں ایک گڑھا کھود کر حمزہ کی لاش ریت کی چند انچ موٹی

تھرکے نیچے دبا دی۔ پھر جلنے واردات سے لنچ پیکٹ اور خالی کاغذی گلاس بھی سمیٹ کر نذر آتش کر دیئے تاکہ پولیس کو وہاں سے کوئی سراغ نہ مل سکے!

روانگی سے قبل حامد نے اپنا یہ آٹھ دس منٹ تک جیپ کو اسی مقام پر بے ترتیب دائروں کی صورت میں گھما تا رہا تاکہ ریت پر نظر آنے والے قدموں کے ہر نشان کو مٹایا جا سکے!

اس اہم کارروائی سے نمٹ کر حامد نے کار ریت کے تودے سے ٹھیک شمال کی سمت میں ڈال دی۔

صحرا میں چاندنی اس وقت تک اتنی نکھر چکی تھی کہ روشنیاں جلانے کی قطعی ضرورت پیش نہ آئی۔

"رمیش پانڈے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے پُرخیال لہجے میں سوال کیا!

"اس نے موت کے دہانے پر پہنچ کر زبان کھولی تھی!" حامد العزیز نے کہا۔ "اس حالت میں آدمی سچ ہی بولتا ہے!"

"یہ کلیہ اس وقت صادق آتا ہے جب مرنے والا اپنے دوستوں کے درمیان ہو۔ حمزہ تو اپنی دانست میں اپنے قاتلوں سے مخاطب تھا!"

"تمہارے تجزیے بہت دُوررس اور حقیقی ہوتے ہیں!"

"اس نے سمجھ لیا تھا کہ اسے ہمارے ہاتھوں مرنا ہے، لہٰذا آخری سانسوں پر اس نے ہمیں ایک ایسے آدمی کا نام دے دیا جس سے ٹکرا کر ہم کسی مصیبت سے دوچار ہو سکتے ہیں!" میں نے کہا۔

"یعنی رمیش پانڈے کا البرونو والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو گا؟" حامد العزیز نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی!" میں نے جواب دیا۔ "دونوں ہی امکانات ہیں، مگر یہ بات طے ہے کہ رمیش پانڈے کا معاملہ سیدھا سادا نہیں ہو گا! اور پھر حمزہ کی موت کے بعد ہم البرونو کے معاملے میں بالکل تاریکی میں ہیں، ہم اس کو یکسر نظرانداز بھی نہیں کر سکتے!"

"ہم رمیش پانڈے پر براہِ راست دھاوا بولنے سے پہلے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں!" پھر وہ چونک کر بولا۔ "مگر اب تم البرونو کا سٹیلانو کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو؟"

"کیا تم سمجھ رہے ہو کہ البرونو ساٹھ ہزار دینار کی خطیر رقم بھول کر محض پولیس کے خوف سے روپوش ہوا ہو گا، جب کہ اس کا ماضی ہمیشہ سے بہت مشکوک رہا ہے؟"

"حمزہ نے یہ بات اپنی موت کا یقین ہونے سے پہلے شراب کے سرور میں بتائی تھی اور پھر تم ابھی تک یہاں کی پولیس سے ناواقف ہو، یہ لوگ مُردوں تک کی زبان کھولنے کی اہلیت رکھتے ہیں!"

"میں پورے معاملے پر کسی اور ہی انداز میں سوچ رہا ہوں!"

"اونچی آواز میں سوچو گے تو میں بھی کوئی مشورہ دے سکوں گا!"

"یہ کوئی لمبا چکر ہے!" میں نے پُرخیال لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "البرونو کبھی اور کی شہ پر سیتا کی راہ پر لگا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اکسانے والا رمیش پانڈے ہی رہا ہو۔ اسی نے البرونو کو خطیر رقم فراہم کی، پھر جب سیتا کے قبل از وقت فرار پر البرونو نے جیل کے وارڈن پر دھاوا بولا تو بحث کے دوران یا اس کے خاتمے پر البرونو کو کوئی اہم نکتہ سوجھ گیا، سیتا کا حصول اس کے لئے اس قدر اہم اور قیمتی تھا کہ نہ ساٹھ ہزار دینار، اپنی کار، اور لیبیا میں اپنے قدیم روابط کو فراموش کر کے اپنی دانست میں سیتا کے تعاقب میں ہو لیا۔ اب اگر رمیش پانڈے ہی اس منصوبے کا روحِ رواں تھا تو ہم اس کے نرخرے پر پستول کی نالی رکھے بغیر کچھ معلوم نہ کر سکیں گے!"

"تمہارے اندیشے بہت ٹھوس وزن رکھتے ہیں، ہمیں آگے بڑھنے سے قبل ہر پہلو پر غور کرنا ہو گا!"

مزید گفتگو کرتے ہم سڑک پر آ گئے۔

"یہ کار کہاں چھوڑ گے؟" میں نے سوال کیا۔

"شہر کے قریب!" اس نے کہا۔ "یہاں چھوڑ دی تو شہر پہنچنے تک سردی اور تکان ہمارا کام تمام کر دے گی!"

ویران صحرائی شاہراہ پر سبک رفتاری کے ساتھ سفر جاری رہا۔ راستے میں ایک گشتی کار بھی نظر آئی جس کی چھت پر سرخ روشنی گردش کر رہی تھی، مگر خوف کے باوجود حامد العزیز نے رفتار اور اسٹیئرنگ پر قابو رکھا اور وہ پولیس کار ہم سے کوئی تعرض کئے بغیر مخالف سمت پر چلی گئی۔

"اگر رات کو صحرا میں تیز ہوائیں نہ چلیں تو صبح یہ جیپ دریافت ہونے کے نصف گھنٹے کے اندر پولیس حمزہ کی لاش تک پہنچ جائے گی!" کافی دیر بعد خاموشی کے بعد حامد العزیز نے کہا۔

"اس قدر ذہین محکمہ ہے؟"

"ذہانت کی بات نہیں، یہ مشینی اصولوں پر کام کرتے ہیں!" اس نے بتایا۔ "ہر گشتی کار کا عملہ گشت کے دوران آنے اور جانے والی گاڑیوں کے نمبر اور سمتیں درج کرتا رہتا ہے اور یہ ریکارڈ تین روز بعد تلف کر دیا جاتا ہے۔ صبح یہ جیپ ملے گی تو پولیس کے مرکزی دفتر میں ریکارڈ سے معلوم ہو گا کہ یہ کار رات کے سوا کس بجے صلالہ سے بن غازی آتے ہوئے دیکھی گئی تھی اور فوراً ہی ایک جماعت جیپ کے ٹائروں کے فوٹو لے کر بن غازی سے روانہ ہو جائے گی، اگر رات پُرسکون رہی تو ریت پر ٹائروں کے نشانات دیکھتے ہی وہ جماعت صحرا میں گھس جائے گی، ہاں اگر رات کو جھکڑ چل گئے تو کچھ بھی معلوم نہ ہو سکے گا!"

"ان کے طریقۂ کار سے گہری واقفیت رکھتے ہو!"

"دو سال اسی محکمے میں کلرکی کی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اجنبیوں کے لئے مقامی نظام کے لئے یہ رموز جاننا واقعی ناممکنات میں سے ہے!" میں نے خلوصِ دل سے کہا۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد حامد نے وہ کار ایک سنسان مقام پر سڑک کے کنارے چھوڑ دی اور ہم دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہاں سے پیدل ہی ایک سمت میں بڑھ گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے اور ہر سو پھیلی ہوئی ویرانی کو دیکھ کر میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا!

"یہاں سے فلیٹ کی کتنی مسافت ہے؟"

"کم از کم آٹھ میل!" اس کا جواب سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ "اس وقت ہم بن غازی کے مضافات میں ہیں!"

"گاڑی شہر میں چند میل اور لے جاتے!"

"رات کے وقت شہری حدود میں ہر سواری کو روک کر جا بجا تلاشی لی جاتی ہے۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا!"

"پھر کسی بردو میں رات بسر کرنے کا ارادہ ہے؟"

وہ ہنس پڑا۔ "قریب ہی میرا ایک قابلِ اعتماد دوست رہتا ہے رات اسی کے پاس بسر کریں گے اور صبح سویرے وہ ہمیں فلیٹ پر چھوڑ دے گا!"

"تو وہ ابھی کیوں نہ چھوڑ دے گا؟"

"کہا نا کہ اس وقت خطرہ ہے!" وہ بے دلی سے بولا۔ "راستے میں جانچ پڑتال ضرور ہو گی اور ہم انہیں مطمئن نہیں کر سکیں گے!"

تھوڑی دیر بعد ہم پتھر اور گارے کے بنے ہوئے بڑے بڑے کچے مکانات پر مشتمل ایسی آبادی میں جا نکلے جہاں ہر طرف بکثرت کھجور کے درخت پھیلے ہوئے تھے!

حامد العزیز نے عقبی گلی کے ایک مکان کے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ فوراً ہی اندر سے ایک غنودہ آواز ابھری، اور چند ثانیوں بعد ایک جوان العمر شخص باہر آ گیا۔ اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

وہ حامد کو دیکھتے ہی اس سے بغل گیر ہو گیا اور ہم دونوں کو اندر کھینچ کر دروازہ پھرتی سے بولٹ کر دیا۔

"کیسے آئے ہو؟" کمرے میں آ کر اس نے تجسس آمیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "تمہاری پیشانی پر بھی خراشیں ہیں؟"

"رات گزارنے آئے ہیں، صبح سویرے تم ہمیں شارع بحرین چھوڑ دو گے؟" حامد العزیز گفتگو کو مختصر رکھنا چاہ رہا تھا!

اس کچے مکان میں چار کمرے تھے جو جدید طرزِ زندگی کی جملہ آسائشوں سے مزین تھے۔ منہ ہاتھ دھونے کے لئے ہم دونوں غسل خانے میں جانے کے لئے باہر صحن میں آئے تو پچھلے صحن میں سیاہ رنگ کی بیوک موجود تھی!

ہم دونوں منہ ہاتھ دھو کر واپس لوٹے تو گوشت کے پارچے، مقامی طور پر تیار کیا ہوا پنیر، سبز زیتون اور دہی ہماری منتظر تھی۔ تکان اور شراب نوشی کے بعد وہ چیزیں دیکھ کر ہماری اشتہا بھڑک اٹھی اور ہم نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ حامد العزیز نے میرا اور اپنے دوست کا تعارف نہیں کرایا تھا اور نہ ہی اس شخص کو اس بات کی فکر تھی کہ اپنی چھت کے نیچے رات بسر کرنے والے اجنبی کے بارے میں کچھ معلوم کرے!

جب ہم دونوں سونے کے لئے ایک کمرے میں پہنچے تو موقع میسر آتے ہی میں اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا!

"یہ کون ہے؟"

"کیا اتنا کافی نہیں کہ میرا ایک قابلِ اعتماد دوست ہے؟" حامد العزیز نے مسکرا کر کہا اور میں ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔ اسے پہلی بار مجھ پر نہایت لطیف پیرائے میں چوٹ کرنے کی جرأت ہوئی تھی۔

بستر پر دراز ہونے کے بعد بھی حامد العزیز کے وہ الفاظ میرے ذہن میں چونے کی بھٹی کی طرح کھولتے اور سنسناتے رہے کئی بار جی چاہا کہ خاموشی سے بستر چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں الغائب ہو جاؤں کہ حامد کو میرا سایہ تک نہ مل سکے مگر رفتہ رفتہ میرا ذہن اعتدال پر آ گیا!

اگر ان لوگوں کا اپنا کوئی طریقۂ کار اور بہت ہی نجی حصہ تھا تو مجھے غیر ضروری طور پر اس میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ دراصل اسرائیل میں محمود اور فرانس میں عبداللہ اور عبدالعزیز کے ساتھ رہ کر میری عادت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ میں ان لوگوں کی ہر سرگرمی اور متعلق کی جزئیات کو جاننا اپنا حق سمجھنے لگا تھا!

اس ذہنی ابال سے نجات پانے کے بعد میں گہری نیند سو گیا۔ اگلی صبح ساڑھے پانچ بجے حامد العزیز نے مجھے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ اس کا دوست نہ جانے کب سے جاگا ہوا تھا کیونکہ میں تیار ہو کر لوٹا تو گرم گرم اشتہا انگیز ناشتہ تیار تھا!

چھ بجے ہم وہاں سے بیوک میں روانہ ہو گئے۔ سڑکوں پر معمولی سی آمدورفت شروع ہو چکی تھی، مگر بیشتر رہائشی مکانات کی روشن کھڑکیاں یہ بتا رہی تھیں کہ بن غازی کے لوگ صبح دم اٹھنے کے عادی تھے!

شارع بحرین پر اپنے ٹھکانے سے تھوڑی دور بیوک سے

اترتے ہوئے میں نے تشکر کے رسمی فقرے کہہ کر اس شخص کو پہلی بار مخاطب کیا۔ [...]ن کا جواب اس نے تپاک سے دیا۔ پھر وہ رخصت ہو گیا اور ہم خراماں خراماں اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیئے!

لفٹ سے ملحق ہاشم کا کمرہ دور ہی سے تاریک نظر آ رہا تھا لیکن جب ہم لفٹ میں سوار ہوتے تو اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سایہ لپک کر دروازہ بند ہونے سے قبل لفٹ میں آ گیا۔

وہ ہاشم تھا! اس کی جلتی ہوئی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روشنیاں گل کر کے رات بھر تاریک کھڑکی کے عقب میں بیٹھا ہماری واپسی کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل کے کسی خانے میں ورد کی ایک خفیف سی لہر ابھری جو نہ جانے کس جذبے کی پیداوار تھی!

ہمارے فلیٹ میں پہنچ کر اس نے نہ اپنی بے خوابی کا شکوہ کیا اور نہ ہم دونوں کی طویل غیر حاضری کا گلہ ... بس اتنا پوچھا کہ ہم دونوں کس دشواری میں پھنسے تھے کہ رات بھر واپسی کی نوبت ہی نہ آ سکی!

حامد نے اختصار کے ساتھ اسے سارے واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان سب معاملات میں تو میں بھی شریک تھا، مگر صفیہ کے ساتھ خلوت میں جو کچھ ہوا، وہ تم اسی کی زبانی سن سکو گے!"

"ایسی خلوتوں میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ بن کہے ہر ایک جانتا ہے!" ہاشم بزرگانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے حیرت تو یہ ہے کہ تم دونوں نے حمزہ جیسے عفریت کو اس قدر آسانی سے مار لیا۔ میں رات بھر اسی خیال سے لرزتا رہا کہ کہیں بازی الٹی ہی نہ ہو گئی ہو!"

"مجھے الزام نہ دو، منصوبہ کچھ اور بنا تھا مگر صفدر نے اچانک ہی پیش قدمی کر کے دوسری چال چل دی اور وہ ضرورت سے زیادہ ایماب ثابت ہوئی!" حامد بولا۔

"وہ قصہ تو خیر نمٹ گیا!" میں نے کہا۔ "میری نیند پوری نہیں ہوئی ہے، تم رمیش پانڈے کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ آج شام تک اس کا رخ ہو جائے تو خاصا وقت بچ سکے گا!"

"تم دونوں کے یہاں آ جانے سے مجھے بڑی ڈھارس ہوئی ہے، میرا کھویا ہوا اعتماد بھی بحال ہو رہا ہے، میں کچھ چکر چلاتا ہوں!" ہاشم نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلا گیا تو میں نے گرم پانی سے طویل غسل کیا اور پھر بستر میں گھس کر سو گیا!

شام کو ہاشم رمیش پانڈے کے بارے میں اطلاعات لایا جو ہمارے لئے خاصی مایوس کن تھیں کہ ان میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی!

رمیش پانڈے ایک غیر شادی شدہ ادھیڑ عمر شخص تھا جو اپنی دفتری مصروفیات کے بعد بیشتر وقت اپنے مکان پر گزارتا تھا یا اس کے چند ہندوستانی گھرانوں سے مراسم تھے۔ اپنے دفتر میں وہ عام طور پر خاموش طبع سمجھا جاتا تھا لیکن پچھلے آٹھ دس روز سے وہ کسی پریشانی کا شکار تھا جس کا اظہار اس کے رویئے سے ہوتا تھا لیکن اس پریشانی کی نوعیت سے کوئی بھی واقف نہیں تھا!

"ہو سکتا ہے کہ اس پریشانی کا تعلق البرونو کا سیٹلانو کے ہی معاملے سے ہو!" حامد نے ہاشم کی پوری کہانی سننے کے بعد کہا۔

"اس سے ملنا ہی پڑے گا!" میں نے کہا۔ "اس سے ملے بغیر ہم کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے؟"

"ایک اور بھی اہم خبر ہے!" ہاشم نے چونک کر کہا۔ "حمزہ کی کار پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی ہے اور اس کار کو رات گئے دو مسافروں کے ساتھ صلالہ سے بن غازی کی طرف آتے ہوئے دیکھا گیا تھا!"

"یہ کہاں سے معلوم ہوا؟"

"شام کے اخبارات میں خاصی نمایاں خبر ہے!" ہاشم بولا۔ "پولیس کو حمزہ کی گمشدگی کے بارے میں تشویش ہے!"

"یعنی وہ لاش تک نہیں پہنچ سکے!" میں نے سوال کیا۔

"اخبارات میں ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا!"

"پھر رات کو صحرا میں یقیناً تیز ہوائیں چلی ہوں گی!" حامد العزیز نے کہا۔ "ہاشم کے معاملے میں قدرت نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا ہے!"

"مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں اپنے اقدامات کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہو!" ہاشم نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "ویسے تمہیں محتاط بھی رہنا چاہئے کیونکہ پولیس ابھی تک تم دونوں کی تلاش میں ہے!"

"تمہیں اپنے ذرائع سے سیتا کے بارے میں کوئی اطلاع ملی!" میں نے پوچھا۔

"نہیں!" وہ بولا۔ "مجھے تو یقین سا ہو چلا ہے کہ وہ لیبیا سے چلی گئی ہے۔ پولیس نے سیتا اور البرونو کی تلاش میں کچھ جماعتیں پڑوسی ممالک میں بھی بھیجی ہیں۔ ویسے البرونو کا نام ابھی تک صیغۂ راز میں رکھا جا رہا ہے!"

ہاشم کے سامنے ہی ہم دونوں نے رمیش پانڈے کے مکان پر چھاپہ مارنے کا پروگرام طے کیا اور اس کے جانے کے بعد اپنی وضع قطع میں نمایاں تبدیلی کر کے ہم دونوں منزل کی طرف روانہ ہو گئے!

رمیش کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں، ان کی روشنی میں کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ میں تنہا اس کے پاس جاؤں گا اور حامد العزیز باہر رہ کر کسی ممکنہ خطرے کی نگرانی کرے گا!

رمیش پانڈے اوسط درجے کی جس تین منزلہ عمارت میں مقیم تھا وہاں شاید سب ہی ہندوستانی گھرانے رہتے تھے کیونکہ عمارت کے احاطے میں کھیلنے والوں میں کوئی لیبی بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے آخری منزل پر رمیش پانڈے کے دروازے پر دو مرتبہ دستک دی تو دروازہ کھول دیا گیا!

دروازہ کھولنے والا کرتے اور دھوتی میں ملبوس ادھیڑ عمر

کا شخص تھا جس کی آنکھوں پہ بینائی کا چشمہ نظر آ رہا تھا!
مجھ پہ نگاہ پڑتے ہی وہ قدرے بوکھلا گیا!
"رمیش پانڈے!" میں نے اسے نرمی سے واپس فلیٹ میں دھکیلتے ہوئے اُردو میں سوال کیا!
مقامی وضع قطع کے ایک فرد سے اُردو سن کر اسے خاصی خوشگوار حیرت ہوئی اور وہ مصلحانہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا!
"مجھے حمزہ العلاوی نے تمہارے پاس بھیجا ہے!" اندر بیٹھنے کے بعد میں نے عقابی نظروں سے فلیٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
"اس سے کہو کہ میں اسے کچھ نہ دے سکوں گا!" وہ کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک کر تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں نے اپنی ساری جمع پونجی صرف کر کے وہ تینوں ویزے خریدے تھے، مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ان میں جعلسازی کس نے کی۔"
"تلاشی اس کا جواب سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔
"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور حمزہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"
"برسوں سے حمزہ کا ملازم ہوں!"
"وہ ملعون مجھے برباد کر چکا ہے، اب تو میں اسے ایک پیسہ بھی نہ دے سکوں گا! شاید تم پورے معاملے سے بے خبر ہو!"
میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔
اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔ "کئی مہینے پہلے میں نے آٹھ سو دینار میں ایک مقامی سے تین ویزے خرید کر ہندوستان میں اپنے بیٹے اور بھتیجوں کو بھیجے تھے، مگر کچھ روز پہلے وہ تینوں بن غازی پہنچے تو ائیرپورٹ پہ امیگریشن والوں نے انہیں قید کر دیا کیوں کہ ان کے پاس جعلی ویزے تھے۔ ان لڑکوں سے میرا نام معلوم ہوا تو حمزہ میرے سر پہ سوار ہو گیا، وہ مجھے اس چکر سے بچانے کے لئے ایک ہزار دینار طلب کر رہا تھا جب کہ میرے پاس سو دینار بھی نہیں تھے۔ مجھ سے مایوس ہو کر وہ اول فول دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ اس روز کے بعد سے امیگریشن پولیس اور مقامی سراغرسانی والے مسلسل میری اور میرے ملاقاتیوں کی نگرانی کر رہے ہیں، دو مرتبہ مجھ سے کڑی بازپرس بھی کی جا چکی ہے۔ حمزہ نے انہیں یقین دلایا ہے کہ میں یہاں سے جعلی ویزے فروخت کرنے کا منظم کاروبار چلا رہا ہوں!"
میرے حلق سے بے اختیار ایک طویل سانس آزاد ہو گئی! اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد میری بھی نگرانی ہو گی!
وہ تلخ انداز میں ہنس دیا۔ "شاید تم بھی ہندوستانی ہو! حمزہ نے تمہیں سزا کے طور پہ یہاں بھیجا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نیچے اترتے ہی وہ تمہیں پکڑ کر لے جائیں!"
"مگر انہیں کیسے معلوم ہو گا کہ میں تمہارے پاس ہی آیا ہوں! اس بلڈنگ میں کتنی فلیٹ ہیں؟"
"انہوں نے سب کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔" وہ اٹھ کر محتاط انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہاں کل نو فلیٹ ہیں، تمہارے اندر گھستے ہی ان کے ایک آدمی نے باری باری آٹھ فلیٹوں پر کسی ملاقاتی کی آمد کے بارے میں دریافت کیا ہو گا۔ اور انکار کے بعد انہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ تم میرے پاس موجود ہو، دن میں بھی دس بار ان کو جوابدہی کرنی پڑتی ہے!"
یہ سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حمزہ العلاوی نے مرتے مرتے بھی مجھ پہ کاری وار کر ہی دیا تھا!
"وہ دیکھو!" وہ مجھے اپنے قریب بلاتے ہوئے بولا۔ "عموماً سبز رنگ کی کاروں میں ہوتے ہیں، اس وقت ان کی سیاہ کار میرے سامنے موجود ہے!"
کھڑکی سے باہر وہ سیاہ کار مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے حامد العزیز کو بھی تلاش کرنا چاہا، مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آ سکا!
"اگر میں انہیں جُل دے کر نکل گیا تو وہ تمہیں تنگ کریں گے؟"
"میں تو تنگ ہوتا ہی رہتا ہوں!" وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "بازپرس کے دوران مجھ پر دو بار تشدد بھی ہوا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ کسی بھی وقت مجھ پہ مقدمہ چلا کر مجھے سزا دے سکتے ہیں جس کے بعد میں ملک بدر کر دیا جاؤں گا۔ حمزہ نے میری پوری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے!"
رمیش پانڈے واقعی سادہ لوح انسان تھا۔ اس کی کہانی سننے کے بعد میں سمجھ چکا تھا کہ حمزہ نے اس کا نام کیوں لیا تھا۔ اس گفتگو کے بعد رمیش کے سامنے ابروز کا نام لینا کتنا خطرناک تھا!
"تم عربی سمجھ لیتے ہو؟" میں نے اس سے عربی میں سوال کیا۔
"دس برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔" وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ عربی میں ہی بولا۔ "شاید اب دیس نکالا مل جائے!"
"میری تم سے ایک التجا ہے!" میں نے اس بدنصیب شخص سے کہا۔ "اگر تم سے پوچھ گچھ کی نوبت آ ہی جائے تو میرے بارے میں یہی بتانا کہ آنے والا ایک عرب تھا، اُردو کا حوالہ نہ دینا!"
"تم بے فکر رہو۔" وہ پُرخلوص لہجے میں بولا۔ "اگر میں اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبا تو مجھے خود افسوس رہے گا!"
میں کچھ دیر وہاں بیٹھا تازہ صورتِ حال کے بارے میں غور کرتا رہا، پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ زینے طے کرتے ہوئے میرا داہنا ہاتھ جیب میں تھا اور بھرے ہوئے پستول کے دستے پہ میری گرفت مضبوط تھی۔ میں سیڑھیاں ختم کر کے باہر نکلا تو حامد العزیز بچوں کے قریب کھڑا ان کا کھیل دیکھنے میں مصروف تھا!
مجھے دیکھتے ہی وہ میرے قریب آ گیا اور ہیجان آمیز سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "عمارت کی نگرانی ہو رہی ہے۔ تمہارے جاتے ہی ایک آدمی اندر گیا تھا جو چند منٹ بعد واپس آ کر پھر اپنے مورچے پہ جم گیا۔"
"سیاہ کار کی بات کر رہے ہو؟"
"ہاں ہاں!" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "دیکھو وہ دونوں حرامزادے اتر رہے ہیں!" اس کے اشارے پہ بے اختیار میری نگاہیں سیاہ کار کی طرف اٹھ گئیں۔ اس سے دو سادہ سفید پوش مقامی اتر کر ہماری سمت سے سڑک عبور کرتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے!
"بس یہی دو ہیں!" میں نے سوال کیا۔
"[illegible] نہیں!" وہ میرا ارادہ بھانپ کر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے ان ہی کو دیکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ کوئی اور بھی آس پاس ہو۔ گولی چلانے کے بعد ہم پیدل ہونے کے سبب یہاں سے بچ نکل سکیں گے!"
میں نے ایک طویل سانس لے کر اپنا داہنا ہاتھ جیب سے باہر نکال لیا۔
ہم دونوں فٹ پاتھ پہ معمول کے انداز میں واپسی کی طرف پلٹے۔
"رکو!" ان میں سے کسی ایک کی کڑکدار آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ [illegible] تو ان دونوں نے ہی ہاتھ ہلا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور [illegible] جھجکنے کے انداز میں وہیں تھم کر رہ گئے۔
مجھے پورا یقین تھا کہ رمیش پانڈے اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہا ہو گا۔
"کہاں سے آ رہے ہو؟" قریب آتے ہی ان میں سے لمبے قد والے [illegible] ہوئی نگاہیں میرے چہرے پہ مرکوز کر کے رعونت آمیز [illegible] سوال کیا۔
"اس عمارت سے!" میں نے معصومیت سے رمیش پانڈے والی [illegible] کی طرف اپنا داہنا ہاتھ بلند کر دیا۔
"[illegible] ملنے گئے تھے؟" اس کا لہجہ جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔
"[illegible]" اچانک حامد العزیز نے خونخوار لہجے میں [illegible] اور تمہیں کس نے یہ حق دیا کہ سرکاری اہلکاروں سے [illegible]!"
حامد العزیز کے لب و لہجے پہ دونوں ہی چکرا کر رہ گئے، پھر [illegible] ہوئے بولا۔ "ہم تو امیگریشن پولیس کے محکمے سے [illegible]!"
"[illegible]" حامد العزیز [illegible] لہجے میں بولا۔ "[illegible] کہ اس عمارت میں جعلسازی کا ایک مشکوک [illegible]!"
"[illegible] ہم اسی کی نگرانی کر رہے ہیں!" حامد العزیز کی سینہ زوری نے ان پہ اپنا زبردست رنگ جمایا تھا!
"تمہارے شناختی کارڈ کہاں ہیں؟" حامد العزیز نے کسی بددماغ افسر کی طرح ان کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔
انہوں نے جھجکتے ہوئے اپنے کارڈ حامد العزیز کے حوالے کر دیئے، اور اس نے کارڈوں پہ سرسری نظر ڈال کر انہیں جیب میں ڈال لیا۔ "میں نیشنل سیکیورٹی بیورو کے افسر کے طور پہ تم دونوں کے کارڈ ضبط کرتا ہوں!"
نیشنل سیکیورٹی بیورو لیبیا میں داخلی سلامتی سے متعلقہ امور کا اہم ترین ادارہ تھا۔ اس کا نام سنتے ہی دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے، مگر پھر بھی انہوں نے ہتھیار نہ ڈالے بلکہ دراز قامت نے حامد العزیز سے ایک چبھتا ہوا سوال کر ہی ڈالا۔ "تم دونوں کے شناختی کارڈ کہاں ہیں؟"
"شناختی کارڈ!" حامد العزیز بپھر گیا اور انجان بنتے ہوئے بولا۔ "کار کہاں ہے تمہاری! میرے ساتھ ہیڈکوارٹر چلو، وہاں میں تمہارے چیف کو سارے شناختی کاغذات دکھاؤں گا!"
"تم ہمارے ساتھ چلو گے؟" دراز قامت کا منہ لٹک گیا۔
"ہاں! اپنی کار لاؤ!" وہ غرایا۔
پستہ قامت شاید ان دونوں میں جونیئر تھا، کیونکہ وہ کار لانے کے لئے چلا گیا۔
"تم مجھے اپنی شناخت کرا دو، تو میں اور میرا ساتھی تم سے دست بستہ معافی مانگنے کو تیار ہیں!" اکیلے رہ جانے والے دراز قامت نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"خاموش رہو!" حامد العزیز نے اسے جھڑک دیا۔ "اب فیصلہ تمہارے چیف کے ہی سامنے ہو گا!"
کار آئی تو میں نے جھکا کر ڈرائیور کے پہلو میں بیٹھ گیا! حامد العزیز نے دراز قامت کے ساتھ عقبی نشست سنبھال لی۔
"دونوں جا رہے ہو تو اب ملزم کی نگرانی کون کرے گا!" حامد العزیز نے کار کے حرکت میں آتے ہی تلخ لہجے میں سوال کیا۔
"وہاں ہمارے دو آدمی اور ہیں!" دراز قامت کی مُردہ سی آواز ابھری۔
"تم دونوں سے زیادہ ذہین معلوم ہوتے ہیں، جو انہوں نے دخل اندازی کی کوشش نہیں کی!" اس وقت حامد العزیز عملاً ان دونوں کا افسر معلوم ہو رہا تھا!
"وہ بھی ہمارے پیچھے آ رہے ہیں!" پستہ قامت نے شاید عقبی نما آئینے میں دیکھ کر کہا اور میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔
"انہیں وہیں روک دو!" دراز قامت الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "پیچھے کوئی گڑبڑ ہو گئی تو چیف سب کو پھاڑ کھائے گا!"
"ہو سکتا ہے کہ انہوں نے وائرلیس پہ ہیڈکوارٹر سے ہدایات لی

لی ہوں! پستہ قامت کا ہر فقرہ صورتِ حال کو گھمبیر تر کرتا جا رہا تھا۔

"آنے دو، انہیں بھی آنے دو" حامد العزیز کی اضطراری آواز سنائی دی۔ پھر یک بیک اس کا لہجہ بدل گیا۔ "اپنی کار پوری تیز رفتاری سے ساحلی شاہراہ پر نکالنے کی کوشش کرو!"

اسی کے ساتھ دراز قامت کی عجیب سی آواز آئی۔ میرے لئے یہ اشارہ کافی تھا، میں نے اپنی جیبوں سے پستول کے ساتھ ہی زہریلے تیروں والی شیشی بھی نکال لی۔

میں پشت گاہ پر بازو ٹکا کر پیچھے گھوما تو حامد العزیز اس کی پسلیوں میں اپنی نال اڑا چکا تھا!

اس وقت صورتِ حال بہت زیادہ خطرناک ہو چکی تھی۔ میں نے دراز قامت کو خاموشی سے ختم کرنے کے لئے زہریلے تیر والی شیشی سے اس کے بدن کا نشانہ لیا اور اسی لمحے پستہ قامت نے مجھے اپنی طرف سے غافل پا کر اسٹیئرنگ چھوڑ کر پوری قوت سے میرے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کی۔

اس جدوجہد میں میرا ہاتھ بہک گیا اور بے اختیار میرے حلق سے ایک وحشیانہ غراہٹ آزاد ہو گئی۔ کیوں کہ تیر پھینکتے ہوئے میرا نشانہ حامد العزیز کے چہرے کی طرف ہو گیا تھا، مگر اس کے ستارے اچھے تھے کہ وہ فوراً ہی صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ گیا اور نیچے جھک کر خود کو اس مہلک وار سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر اس کوشش میں دراز قامت کو حامد العزیز پر جھپٹنے کا موقع مل گیا۔

ادھر پستہ قامت نے کار کی رفتار سست کر دی تھی اور پوری قوت پستول چھیننے پر صرف کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں سڑک پر کوئی خفیف سی لہر آ جانے کے باعث کار تھوڑی سی لہرائی اور کھڑی ہوئی جیپ سے شدید رگڑ کھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اس ٹکر کا جھٹکا اس قدر شدید تھا کہ پستہ قامت نے غیر ارادی طور پر پستول چھوڑ کر جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

مگر پچھلی نشست پر ہیبت ناک جدوجہد جاری تھی۔ دوسری طرف پیچھے آنے والی کار نے شاید سیاہ کار کی رفتار اور ٹکر سے صورتِ حال بھانپ لی تھی، کیوں کہ انہوں نے مسلسل سائرن بجانا شروع کر دیا تھا!

اس وقت دراز قامت نے حامد العزیز کی گردن سختی سے اپنے سینے کے ساتھ دبوچی ہوئی تھی۔ اور حامد العزیز کو اس کے جسم کے کسی حصے میں گولی اتارنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ مگر اتنا ہی کافی تھا کہ پستول بدستور حامد کے قبضے میں تھا!

میں اپنے معاملات پر قابو پا چکا تھا لہٰذا میں نے کم چشم زدن میں دراز قامت کے بدن میں [illegible] دیا اور وہ... لڑتے لڑتے یک بیک اس طرح بے جان ہو گیا جیسے کوئی برقی کھلونا [illegible]

کے بعد اچانک رُک جاتا ہے!

مرنے والے کو حلق سے کوئی آواز نکالنے کی مہلت تک نہ مل سکی تھی، مگر پستہ قامت عقبی نشست پر کھیل کو دکے خاتمے سے پریشان ہو گیا۔

"اسے کیا ہوا؟" اس نے گھبرائی ہوئی شکست خوردہ آواز میں سوال کیا۔

"مر گیا اور اگر تم نے ہر ہدایت پر عمل نہ کیا تو تمہاری لاش بھی باہر سڑک پر لڑھکا دی جائے گی!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اس پر میری دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے کار کی رفتار یک بیک بہت تیز کر دی اور پیچھے والی کار کے ہیڈ لیمپس سے ہمارا فاصلہ بڑھنے لگا!

"کیا اس کار میں سائرن نہیں ہے؟" میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"سائرن تو ہے، وائرلیس سیٹ نہیں ہے!"

"تو پھر آن کر دو اسے!" میرے الفاظ کے ساتھ ہی فضا دہشت ناک سائرن کی دل اڑا دینے والی وحشتناک آواز سے گونج اٹھی۔

مگر مجھے اس آواز سے خاصی ڈھارس ہوئی۔

پیچھے والی سیاہ کار کا سائرن سن کر ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اس میں سیاہ کار کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اور یہ اندازہ لگنے کے بعد کوئی بھی پر جوش شخص سیاہ کار کا راستہ مسدود کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن دونوں کاروں کے سائرن ہر ایک پر یہی تاثر قائم کرتے کہ وہ دونوں کاریں کسی اہم مشن پر جا رہی ہیں!

پیچھے والوں نے بھی اپنی رفتار میں خاصا اضافہ کر لیا تھا اور ان کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں ایک مستقل فاصلے سے پیچھے چلی آ رہی تھیں!

رمیش پانڈے کی قیام گاہ پر وائرلیس سیٹ سمیت دوسری پارٹی کی موجودگی نے ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس روح فرسا صورتِ حال سے کیسے نجات حاصل کر سکیں گے!

حمزہ العلاوی نے اپنی زندگی کے آخری سانس لیتے ہوئے ہم دونوں سے بھیانک انتقام لینے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ بادی النظر میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا نظر آ رہا تھا!

پھر شہر کا وہ حصہ ایک اور سائرن کی گھٹتی بڑھتی آواز سے گونجنے لگا۔ چند ثانیوں بعد سامنے سے آتی ہوئی وہ کار بھی نظر آ گئی جس کی چھت پر سرخ روشنی تیزی سے گردش کر رہی تھی!

تعاقب کرنے والوں کا وائرلیس سیٹ اپنا رنگ دکھا چکا تھا اور مجھے موت سامنے نظر آ رہی تھی!

آگے اور پیچھے سے گھیر لئے جانے کے بعد مجھے اور حامد العزیز کو کوئی معجزہ ہی ذلت کی گرفتاری یا موت سے بچا سکتا تھا!

اُس وقت

ہماری سیاہ سائرن کار دو طرفہ عمارات کے درمیان ایک اوسط درجے کی سڑک سے گزر رہی تھی اور اگر سامنے سے آنے والی کار ہم سے تھوڑے فاصلے پر ترچھی کر کے روک دی جاتی تو ہمارے لئے آگے بڑھنے کا راستہ مسدود ہو جاتا اور پھر پیچھے سے آنے والے ہم پر مسلط ہو جاتے۔

"جو بھی گلی نظر آئے کار اس میں گھما لو!" میں نے شدید اعصابی تناؤ کے عالم میں پستہ قامت کو حکم دیا۔

خوش قسمتی سے تقریباً فوراً ہی داہنی جانب ایک بغلی سڑک نظر آئی اور پستہ قامت نے بریک لگا کر نہایت مہارت سے کار اس گلی میں گھما لی۔

رہائشی عمارات کی وجہ سے وہ سڑک خاصی مصروف تھی دونوں اطراف میں دکانوں وغیرہ پر بھی کافی لوگ موجود تھے جو سائرن کا شور اتنے قریب سن کر چونک پڑے اور وہاں دور تک ہیجان پھیلتا چلا گیا۔

"کار سڑک کے وسط میں چلاؤ!" پستہ قامت کو حکم دے کر میں حامد العزیز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "بائیں طرف کا دروازہ کھول کر لاش ذرا سڑک کے وسط میں پھینک دو تاکہ وہ آگے نہ بڑھ سکیں۔"

حامد العزیز نے نہایت پھرتی سے میری ہدایت کو عملی جامہ پہنایا، بائیں گھوم کر اپنے پیچھے متوقع نتائج کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا کہ لوگوں پر اس واقعہ کا فطری ردِعمل ہوا تھا۔

بہت سے لوگ ہاتھ لہرا لہرا کر چلاتے ہوئے آگے لپکے تاکہ ہمیں روک سکیں لیکن ایک بڑی تعداد سڑک کے وسط میں پڑی ہوئی لاش کی طرف لپکی تھی۔

اسے گاڑی سے گرتے دیکھ کر کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا ہو گا، کہ سائرن والی ایک سرکاری یا نیم سرکاری کار سے کوئی لاش بھی سڑک پر پھینکی جا سکتی ہے اکثریت کو یہی شبہ ہوا ہو گا کہ کسی ملزم نے موقع پا کر چلتی کار سے چھلانگ لگا دی ہے مگر مجھے لوگوں کے تاثرات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خوشی کی اصل بات یہ تھی کہ آناً فاناً... وہاں تماشائیوں کا جمِ غفیر لگ گیا اور ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ ہمارا تعاقب کرنے والے اس سڑک پر گھس بھی آتے تو چند منٹ ضائع کئے بغیر وہاں آگے بڑھانے کا راستہ حاصل نہ کر پاتے۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حامد العزیز سے مشورہ کیا اور ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد پستہ قامت سے کہا۔ "ذرا کار کی رفتار سست کر لو، میں پیچھے آنے والوں کی بے بسی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میرا بتایا ہوا جواز اتنا معقول تھا کہ اس نے فوراً ہی بریک لگا کر رفتار بالکل سست کر دی۔

اسی لمحے حامد العزیز نے پیچھے سے ہاتھ ڈال کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اور میں نے ایک زہریلی سوئی پستہ قامت کی گردن میں اتار دی۔

اس کے جسم نے ایک شدید جھٹکا لیا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس وقت اس کا داہنا پاؤں ایکسیلریٹر کے بجائے بریک پیڈل پر تھا لہٰذا کار ایک جھٹکا کھا کر رک گئی مگر اس کا انجن بدستور چلتا رہا۔

اس وقت کئی راہگیر چلتے چلتے رک کر کسی ہنگامے کی توقع میں کار کی طرف دیکھ رہے تھے اس مقام پر سائرن کار کا رکنا اس بات کی علامت تھی کہ وہاں آس پاس ہی کوئی بڑی کارروائی ہونے والی ہے۔

حامد العزیز نے مرنے والے کی گردن تھامی اور میں نے اسٹیئرنگ سے اس کی انگلیاں ہٹا کر اسے بھی کھلے ہوئے دروازے سے باہر... لڑھکا دیا۔

تماشائی کچھ نہ سمجھ سکے کہ وہاں کیا ہو رہا تھا اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر سیاہ کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔

کار کے روانہ ہوتے ہی وہاں ادھم مچ گیا اور عقب نما آئینے میں دوسری لاش کے گرد بھی ہجوم... ہوتا نظر آنے لگا۔

"سائرن بند کر دو"، حامد العزیز اچھل کر میرے برابر والی نشست پر آتے ہوئے بولا۔ "اب وہ ہمارے سایوں کو بھی نہ پہنچ سکیں گے!"

میں نے داہنی طرف کار موڑتے ہوئے سائرن بند کر دیا۔

حامد العزیز کی ہدایت پر چند موڑ کاٹنے کے بعد ہم اتنی دور نکل آئے کہ بقیہ دو کاروں کے سائرنوں کا شور معدوم ہو گیا اس وقت سیاہ کار ایک عام سی کار کی طرح تھی لہٰذا کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔

"اب کسی بھی پارکنگ لاٹ میں گھس جانا" ایک بارونق بازار سے گزرتے ہوئے حامد العزیز نے کہا۔

ایک جگہ پارکنگ کا نشان دیکھ کر میں نے کار کچی گلی میں موڑ دی اور تجارتی عمارات کے عقب میں ایک وسیع پارکنگ لاٹ میں داخل ہو گیا جہاں اندھیرے میں سینکڑوں کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔

ہم نے سیاہ کار ایک دور افتادہ حصے میں پارک کی اور محتاط انداز میں کار کے اندرونی حصوں کو اس طرح صاف کرنے لگے کہ ہمارے نشاناتِ انگشت کسی کے ہاتھ نہ لگ سکیں لاشوں کے معاملے میں بہرحال مجبوری تھی اگر رمیش پانڈے کے سلسلے میں پہلے سے ایسے بھیانک تصادم کا اندازہ ہوتا تو ہم گھر سے نکلتے ہی جھلی نما باریک دستانے خرید لیتے مگر میں نے سیاہ کار کی کھڑکی اور اسٹیئرنگ وغیرہ کی صفائی کرتے ہوئے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب میں کبھی باریک دستانوں کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلوں گا۔

باہر نکل کر ہم نے سیاہ کار کی چابی ایک طرف ریتلی زمین پر پھینک دی اور عقبی سمت سے باہر نکلنے لگے۔

"اب ہمیں جلد از جلد فلیٹ واپس پہنچنا چاہیئے۔" میں نے اندھیرے میں رک کر اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"جلدی کی بات نہ کرنا" وہ فوراً ہی بولا "ہمیں فلیٹ تک پہنچنے میں کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوگا"۔

"کیا پیدل چلنے کا ارادہ ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" وہ میری پشت پر ہاتھ مار کر ہنسا "روزانہ تھوڑی سی ورزش ہوتی رہے تو آدمی چاق و چوبند رہتا ہے"۔

"میں باز آیا ایسی ورزش سے، تم فوراً ٹیکسی روکو۔"

"بن غازی میں بیک وقت دو سرکاری اہلکاروں کا قتل ایسی ہولناک واردات ہے جو شاید پچھلے دس بارہ برسوں میں پہلی بار ہوئی ہے" وہ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا "اس وقت عملاً پورے شہر کی ناکہ بندی ہو رہی ہوگی اور شہر کی سڑکوں سے کوئی کار تلاشی کے بغیر نہ گزر سکے گی۔"

"وہ اتنے مستعد ہیں؟"

"وائرلیس پر سیکنڈوں میں ہر طرف خبر پھیل گئی ہوگی، اس وقت پیدل سفر کر کے ہی ہم لوگوں کی توجہ سے بچے رہ سکیں گے، ورنہ ٹیکسی میں ایک جگہ نہیں بلکہ جگہ جگہ اپنی شناخت اور بازپرس کے مراحل سے گزرنا ہوگا۔"

اس نے اپنا مدعا نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں ادا کیا تھا۔ مگر میں دل ہی دل میں حامد العزیز کی قوتِ فیصلہ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

[دنیا میں عام طور پر ننانوے فیصد مجرم محض اس وجہ سے قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں کہ جرم کے ارتکاب کے بعد جلد از جلد جائے واردات سے زیادہ دور نکل جانا چاہتے ہیں تاکہ برا وقت آنے پر وقوعہ کے وقت جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت فراہم کر سکیں اور ان کی یہی عجلت قانون کا آہنی شکنجہ بن کر ان کے حلقوم کے گرد موت کا چنگل بن جاتی ہے]

قانون کی گرفت سے بالکل صاف بچ نکلنے والوں میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو جرم کی منصوبہ بندی نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے کرتے ہیں اور ارتکابِ جرم کے بعد ایک عامیانہ مجرم کی طرح موقع سے فرار کے بجائے تماشائیوں میں مل کر قانون کے تنخواہ یافتہ محافظوں کی موشگافیوں سے محظوظ ہونے کی جرأت رکھتے ہیں۔

قانون کا ہر ذہین محافظ عام طور پر یہی حساب لگاتا ہے کہ جرم کو وقوع پذیر ہوئے اتنا وقت گزر چکا ہے اور مجرم اس مدت میں سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جائے واردات سے اتنا دور نکل چکا ہوگا پھر وہ پورے شہر کے بڑے نقشے پر جائے واردات پر پرکار کی نوک رکھ کر اس فاصلے کے تین چوتھائی قطر پر ایک دائرہ لگاتا ہے اور جو مقامات اس دائرے کی زد میں آتے ہیں ان سے باہر بھرپور پیمانے پر تفتیش کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔

حامد العزیز نے اپنے مختصر سے مشورے میں ان تمام بنیادی خطرات کا مکمل توڑ تجویز کر دیا تھا عام شہریوں کی طرح خراماں خراماں اپنی پناہ گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے نہ ہم کسی کی توجہ کا نشانہ بنتے اور نہ ہمیں اپنی شناخت کرانے کے ناقابلِ عمل مرحلے سے دوچار ہونا پڑتا۔

ہم دونوں چکر کاٹ کر سڑک پر آئے تو حالات معمول پر تھے ہم معتدل رفتار کے ساتھ شارع سجرین کی طرف بڑھنے لگے۔

راستے میں ہم کو پولیس کی تین چار گاڑیاں برق رفتاری سے آتی جاتی ہوئی نظر آئیں اور پھر ہمیں وہ منظر بھی نظر آ گیا جس کے بارے میں حامد العزیز پیشگی اظہارِ خیال کر چکا تھا اس مقام پر ہر قسم کی کاروں کی ایک لمبی قطار سڑک کے دونوں اطراف میں رکی ہوئی تھی اور پولیس کے چند سپاہی نہایت پھرتی کے ساتھ ہر سواری کا مختصر مگر بھرپور جائزہ لینے کے بعد اسے آگے بڑھنے کی اجازت دے رہے تھے پیدل چلنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد رک کر حیرت سے وہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

اس جانچ پڑتال کا طریقہ مجھے بے حد پسند آیا پولیس والوں نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے متعدد گاڑیوں اور ٹیکسیوں کو سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی مگر دو تین کاروں پر شبہ کرتے ہوئے انہوں نے قطار سے باہر نکال کر قدرے آگے کھڑی ہوئی ایک پولیس کار کی طرف بھیج دیا جہاں ایک لمبا تڑنگا افسر اپنے ماتحت کے ساتھ مشکوک مسافروں کی تفصیلی تلاشی لینے کے ساتھ ہی ان کے کاغذات وغیرہ بھی دیکھ رہا تھا اس طرح چند مشکوک افراد کی وجہ سے دوسروں کو غیر ضروری طور پر انتظار کی زحمت میں نہیں ڈالا جا رہا تھا۔

ہم دونوں کسی دشواری سے دوچار ہوئے بغیر نہایت سکون سے آگے بڑھتے رہے ہمیں اپنی طویل مسافت میں مزید دو مقامات پر تلاشی کے ایسے ہی مناظر نظر آئے حامد العزیز نے پولیس والوں کی اس کارروائی کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ انہوں نے نہایت قرینے سے ہر سڑک پر ایک ہی مورچہ بنایا ہوا تھا اور یوں مختصر عملے کے ساتھ پورے شہر کی کڑی ناکہ بندی کی جا چکی تھی۔

خدا خدا کر کے ہم بخیر و عافیت اپنے ٹھکانے پر پہنچ ہی گئے۔

وہاں ہاشم اوورکوٹ پہنے اپنے کمرے سے باہر ایک منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے سر کی خفیف سی جنبش سے اسے سلام کرنے پر ہی اکتفا کیا لیکن میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔

فلیٹ میں پہنچتے ہی حامد العزیز نے بھی یہی بات چھیڑ دی: "ہاشم کچھ فکرمند نظر آ رہا تھا"

"کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے!"

"فون پر بات کروں؟"

"نہیں، موقع پا کر وہ خود ہی اوپر آئے گا"

ہم دونوں نے فلیٹ میں نہایت سکون کے ساتھ کھانا کھایا جس کے بعد ہاشم کے انتظار میں حامد العزیز نے ٹیلی ویژن کھول دیا۔

اس وقت اسکرین پر حیرتناک جسمانی تناسب رکھنے والی ایک رقاصہ سُروں کے آہنگ پر فتنے بکھیر رہی تھی۔

اس رقاصہ کے تیکھے خدوخال بے حد حسین اور دعوت انگیز تھے اس کا پیکر کسی نازک ہرنی کی طرح اتنا مختصر تھا کہ ہتھیلیوں کے حصار میں اس چاند کو مکمل طور پر گھمایا جا سکتا تھا اس سے نیچے صراحی دار گردن تھی جو نازک شانوں میں تحلیل ہو رہی تھی مگر اس سے ذرا نیچے اچانک ابھار پیدا ہو گیا تھا ان زہر شکن ہولناک بلندیوں سے نیچے کسی بیلے ڈانسر کی تیکھی کمر تھی جس نے فوراً ہی پھیلاؤ اختیار کر کے اسی قدر تیزی کے ساتھ نزاکت کا ہر معیار سر کر لیا تھا۔

دھن پر پڑنے والی ہر چوٹ کے ساتھ اس کا اوپری بدن ساکن رہتا مگر نچلا دھڑ لرزیدہ و شبانہ جھٹکے کھاتا جیسے کسی تندرست مچھلی کو پانی سے نکال کر تپتی ہوئی خشک ریت پر پھینک دیا گیا ہو اور دف کا آہنگ بدلتے ہی یہ حرکت کچھ اس انداز میں محسوس ہوتی کہ نچلے بدن پر تماشائی کی صورت کچھ بے الاسکتہ طاری ہو جاتا اور اوپری دھڑ عجب والہانہ انداز میں تڑپ کر اور مچل مچل کر خفتہ جذبوں کو جنون پر مائل کرنے لگتا۔

"زبردست فتنہ ساز رقص ہے۔" میں نے گہری محویت سے چونک کر ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ رقاصہ بھی ہے" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا "آسمانی بجلی کی طرح جو رستے کے ہر شے کو راکھ کر دیتی ہے اپنی روشنی کی زد میں آنے والے ہر شخص کو نقصان نہیں پہنچاتی مگر صاعقہ اپنے ہر تماشائی کو پاگل کر رہی ہے۔"

"یہ کہاں ملتی ہے؟" میں نے سرخ شراب کے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر بہکا ہوا سا سوال کیا۔

"بھول جاؤ۔" وہ چٹکی بجا کر زور سے ہنسا "یہ لاکھوں میں کھیلتی ہے اور خود کھلونا بننے کے بجائے اپنی پسند کے مرد خریدتی ہے۔"

"بڑی حرافہ ہے۔"

"بڑی تو شاید تمہاری طرف پائی جاتی ہے یہ اس کے بعد بھی جانتی ہے" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے تبصرے پر میں اندر سے بری طرح تڑپا مگر دل کا چور ابھی پکڑا نہ جا سکا وہ جس انداز میں اور جس کسی کے بارے میں کہہ رہا تھا وہ خوب جانتا تھا مگر اس سے بات آگے بڑھانے کی ہمت نہ پڑ سکی۔

تھوڑی دیر کے لئے ماحول پر قدرے بوجھل پن طاری ہو گیا اس کے بعد ہم دونوں خاموشی کے ساتھ شراب سے شغل کرتے رہے اور جب خاصی مقدار معدے میں اتر گئی تو سرور کے عالم میں پھر بے تکلفانہ گفتگو چھڑ گئی۔

گیارہ بجنے کے اعلان کے ساتھ ٹیلی ویژن کی نشریات ختم ہوئیں تو حامد العزیز چونک پڑا "ہمیں آئے دو گھنٹے سے زیادہ وقت ہو چکا ہے لیکن ہاشم ابھی تک ہم سے ملنے اوپر نہیں آیا۔"

"نیچے جا کر دیکھنا پڑے گا۔"

"اس وقت فلیٹ سے باہر نکلنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے" وہ بوجھل لہجے میں بولا "وہاں نہ جانے کیا حالات ہوں؟"

"پھر فون ہی کر لیا جائے۔" میں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اپنا نام نہ بتانا" وہ جلدی سے بولا "پہلے یقین کر لینا کہ دوسری طرف ہاشم ہی نے ریسیور اٹھایا ہے۔"

میں نے یکے بعد دیگرے تین بار ہاشم کا نمبر ڈائل کیا مگر ہر مرتبہ انگیجڈ ٹون ہی سنائی دی جس کے دو مفہوم تھے کہ اس کا فون خراب تھا یا وہ خود کسی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھا۔

اس مرحلے پر حامد العزیز کی تشویش بڑھ گئی چند منٹ بعد اس نے بھی کئی بار ہاشم کا نمبر ملانے کی ناکام کوششیں کیں اور پھر عین اس وقت جب ہم دونوں ہر خطرہ مول لے کر نیچے اترنے کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے، دروازے پر مدھم سی دستک ہوئی اور میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

ہاشم خوفزدہ انداز میں فوراً ہی اندر گھس آیا اور میں نے دروازہ مقفل کر دیا۔

"کیا ہوا؟" حامد العزیز نے اپنی بوجھل پلکیں اوپر اٹھاتے ہوئے مخمور لہجے میں سوال کیا "اتنی دیر سے تم کہاں تھے اور تمہارے فون کو کیا ہوا؟"

"مقامی لباس میں ملبوس دو مشکوک افراد نے شہر میں چند گھنٹے قبل دو پولیس افسران کو بے رحمی سے قتل کر دیا اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔" ہاشم اپنے لئے وائن کا گلاس بناتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"تو تم کیوں پریشان ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہارے اوپر چڑھنے کے بعد ہی ایک پولیس پارٹی اس سڑک پر بھی پہنچی تھی وہ کافی دیر تک یہاں چوکیداروں سے پوچھ گچھ کرتی رہی کچھ کاروں کی تلاشی لی اور پھر ابھی واپس گئی ہے" اس نے بتایا۔

"تمہارے پاس بھی آئے تھے؟"

"ہاں" وہ وائن کا ایک لمبا گھونٹ لے کر بولا "مگر میں ان کے آنے سے پہلے ریڈیو پر نشر ہونے والا اعلان سن چکا تھا جس میں شہریوں سے قاتلوں کی گرفتاری میں مدد دینے کی اپیل کی گئی تھی۔"

"اوہ۔ تو معاملہ اس حد تک بڑھ گیا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس وقت پورے شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہوگی" ہاشم نے کہا۔

"یہاں مدتوں کے بعد ایسی ہولناک واردات ہوئی ہے۔"

"مگر تمہارے فون کو کیا ہو گیا؟" حامد العزیز نے سوال کیا۔

"میں نے ریسیور کریڈل سے ہٹا دیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم فون نہ کر بیٹھو اور ہماری گفتگو آس پاس منڈلاتے ہوئے کسی سپاہی کے کان میں نہ پڑ جائے۔"

"تم نے اچھا ہی کیا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ہم کڑی ناکہ بندی سے گزر کر یہاں پہنچے ہیں، اگر سواری کا لالچ کرتے تو شاید دھر ہی لئے جاتے۔"

"تو کیا پیدل ہی آئے ہو؟" اس نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"پیدل آنا ہی سلامتی کا بہانہ بن گیا ورنہ اس وقت کسی قید خانے میں باز پرس کے کڑے مرحلوں سے گزر رہے ہوتے۔"

"ان دو پولیس افسران کے قتل کا کیا معاملہ ہے؟" ہاشم نے تجسس آمیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"حمزہ العلاوی نے رمیش پانڈے کے حوالے سے ہم سے خوفناک انتقام لینے کی کوشش کی تھی۔" اس بار میں نے جواب دیا۔ کیونکہ حامد العزیز گلاس خالی کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ "یہ صرف مقدر کی یاوری ہی تھی کہ ہم دو سرکاری اہلکاروں کو مار کر خیریت سے واپس آ گئے۔"

"میں سمجھا نہیں!" وہ تحیر آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے تفصیل کے ساتھ اسے گزرے ہوئے واقعات سے آگاہ کر دیا۔

"بڑے ہی لرزہ خیز تجربے سے گزرے ہو تم دونوں۔" وہ میرے خاموش ہونے پر آہستہ سے بولا۔ "شاید حمزہ العلاوی کو یقین ہو گیا تھا کہ تم ہر صورت میں اسے ہلاک ہی کر دو گے۔"

"موت کی دہلیز پر پہنچ کر بڑے بڑوں کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "مگر حمزہ العلاوی نے جس انداز میں ہمیں گمراہ کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔"

"اس کے اعصاب تو اسی کے ساتھ صحرا کی ریت میں دفن ہو گئے۔" وہ صوفے کی پشتگاہ سے ٹکتے ہوئے بولا۔ "اصل چیز یہ ہے کہ تمہارے ستارے اس وقت عروج پر ہیں ورنہ لیبیا جیسے ملک میں بر سرِ عام کسی جرم کا ارتکاب کر کے جائے واردات سے بچ نکلنا ناممکنات میں شمار ہوتا ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ "اس معاملے میں حامد العزیز کی حاضر دماغی کام آئی، اگر یہ نیشنل سیکیورٹی بیورو کے حوالے سے ان دونوں کو خائف نہ کرتا تو حالات نہ صرف بگڑ جاتے بلکہ میری اور اس کی گلو خلاصی بھی ناممکن ہو جاتی۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم دونوں فراخ دلی سے ایک دوسرے کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے رہتے ہو!" ہاشم نے بزرگانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ورنہ ہر شخص کسی بھی مہم میں اپنا ہی نام اونچا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔"

"ہم تو مہمات سے زیادہ ناگہانی مصائب جھیل رہے ہیں۔" حامد العزیز میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"سیتا کے بارے میں ہماری ساری تگ و دو ابھی تک بے سود ہی رہی ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد گہرا سانس لے کر کہا۔

"اس وقت سیتا سے زیادہ تم دونوں کی سلامتی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔" ہاشم کی یہ بات مجھے خاصی ناگوار گزری۔

"یہ مت کہو۔" میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ "مرد وہی ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کا ہر لمحہ موت سے ٹکرا کر حاصل کرتے ہیں، اگر لیبیا کی ساری پولیس بھی میری ٹوہ پر لگی ہوئی ہو تو میں سیتا کے معاملے کو التوا میں نہیں ڈالوں گا۔"

"میں اس کی اہمیت کم نہیں کر رہا۔" ہاشم جلدی سے بولا۔ "تمہارے بارے میں پولیس پہلے ہی سے کام کر رہی ہے پھر حامد العزیز کے فلیٹ پر تم دونوں پولیس کے حصار میں جاتے جاتے بمشکل فرار ہو سکے اور اب رمیش پانڈے والے معاملے نے تو سارے متعلقہ محکموں کو چوکنا کر دیا ہو گا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ رمیش پانڈے والوں کے قتل کے بعد ہم پہچان لئے گئے ہوں گے؟" میں نے ... ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"تم غیر ضروری طور پر اکھڑ رہے ہو۔" اس مرتبہ ہاشم میرا لہجہ نظر انداز نہ کر سکا۔ "ہم اس فلیٹ کی چند چار دیواری میں بیٹھ کر محض محتاط قیاس آرائیاں ہی کر سکتے ہیں۔ یہ قدرت کا بہت بڑا احسان ہے کہ رمیش پانڈے والے قصے میں کوئی بھی قاتلوں کو شناخت نہیں کر سکا۔ ریڈیو پر بھی جو اعلانات کئے گئے ہیں ان میں قاتلوں کی قامت کے علاوہ کوئی بات نہیں بتائی گئی لیکن خطرات اس کے باوجود مسلط ہیں۔ سب سے بڑی احتیاط تو یہ ہو سکتی ہے کہ تم دونوں ایک ساتھ باہر نہ نکلو لیکن تنہا نکلنے پر بھی اگر کسی نے تمہیں یا حامد کو روک کر شناختی کاغذات طلب کر لئے تو تمہارے لئے ایک اور قتل ناگزیر ہو جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"مگر میں ان مبہم خطرات کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "بے عملی سے بہتر یہ ہے کہ میں بن غازی کی سڑکوں پر بے جگری کے ساتھ اپنی مدافعت کرتے ہوئے مار ڈالا جاؤں۔"

"ایسے کلمات منہ سے نہ نکالو۔" ہاشم ... سے کہا۔ "میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ دو ایک روز میں تم دونوں کے جعلی شناختی کاغذات آ جائیں گے، اس وقت تک تم موجودہ صورتحال کو قبول کر لو۔"

"کمال ہے کہ اتنی معقول اور مناسب بات کہنے کے لئے تم نے گفتگو کو غیر ضروری طول دیا۔" اس کا مدعا واضح ہو جانے کے بعد ... ہنس پڑا۔

"دراصل تم سے براہ راست بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" ہاشم میرا شانہ دباتے ہوئے بولا۔ "اپنی بیوی کے فراق میں تم اس قدر حساس اور جذباتی ہو گئے ہو کہ بال کی کھال نکالتے رہتے ہو...۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم اندازہ نہیں کر سکتے ہاشم!" ... تپائی سے وائن کا گلاس اٹھا کر سارا آتشیں سیال اپنے معدے میں انڈیل لیا اور پھر صوفے کی پشتگاہ سے ٹیک کر تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لیں۔ "سیتا محض ایک بیوی نہیں بلکہ مثالی بیوی ہے اس کے بغیر میں اپنی زندگی میں ایسا بھیانک خلا محسوس کرتا ہوں جسے دنیا کی کوئی طاقت پُر نہیں کر سکتی۔ کاش تم اس سے ملے ہوتے تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ وہ کس قدر سیدھی، سچی اور دل میں اتر جانے والی حسین شخصیت کی مالک ہے۔"

"میں تمہارے ان خیالات کی قدر کرتا ہوں برادر!" ہاشم احترام آمیز لہجے میں بولا۔ "یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں سیتا سے نہ مل سکا لیکن جن دنوں وہ مقامی حکمرانوں کے عتاب میں نہیں آئی تھی ان دنوں اس کی ایسی صلاحیتوں کے تذکرے سننے میں آتے تھے کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔"

"سیتا کے بارے میں تمہارے ذرائع کیا کہتے ہیں؟"

"ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔" وہ بولا۔ "اور اب میں نے سیتا کے ساتھ ہی البردلو کا سٹیلا نو کی تلاش کی ہدایات بھی جاری کر دی ہیں۔"

"اب ہمیں کب تک گوشہ نشین رہنا ہو گا؟" حامد العزیز نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ کاغذات کل ہی آ جائیں۔" ہاشم اٹھتے ہوئے بولا۔ "اس دوران میں تم مجھ سے فون پر بات کرنے سے گریز ہی کرنا۔"

"کیوں نہ گوشہ نشینی کی یہ مدت صفیہ کے فلیٹ پر ہی گزاری جائے؟" حامد العزیز مجھے آنکھ مارتے ہوئے بولا۔

"تجویز معقول ہے۔" میں ہنستے ہوئے بولا۔ "مگر میری موجودگی میں تمہاری دال ہرگز نہ گل سکے گی۔"

"ادھر نہ جانا۔" ہاشم جلدی سے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ حمزہ العلاوی کی تفتیش کے سلسلے میں وہ بھی پولیس کی نگاہوں میں آ چکی ہو۔"

"اچھا جناب!" حامد العزیز نے بیچارگی کے ساتھ گہرا سانس لے کر کہا۔

"سامنے والی عمارت میں بھی ایک مصری عورت رہتی ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "شاید کسی اسکول میں پڑھاتی ہے، اس عمارت کے چوکیدار کی معرفت اس عورت تک رسائی ممکن ہے مگر میں فی الحال احتیاط کا ہی مشورہ ...

دوں گا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" حامد العزیز نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نام نہیں معلوم مگر ہے بہت طرح دار ـــــ مگر فی الحال تم اسے بھولے ہی رہو تو تمہارے لئے اچھا ہے۔" ہاشم یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

دن بھر کی تھکان اور شراب نوشی کے بعد ہم دونوں گہری نیند سوئے اور اگلی صبح کافی دیر سے اس وقت بیدار ہوئے جب فون کی گھنٹی کافی دیر تک مسلسل بجتی ہی چلی گئی۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو ہاشم کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔

"تم ابھی تک سو رہے ہو، اس وقت صبح کے دس بج رہے ہیں۔"

"کیا ضروری کام ہے؟" میرا ذہن اس وقت تک نیند کے گہرے خمار سے بوجھل ہو رہا تھا۔

"میں تین دفعہ تمہارے دروازے پر دستک دے کر واپس آ چکا ہوں۔" وہ بہت زیادہ مسرور تھا۔ "بس میں ابھی اوپر آ رہا ہوں۔"

اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا اور چند ہی منٹ بعد اوپر آ موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اخبارات کا ایک بنڈل موجود تھا۔

وہ آتے ہی والہانہ انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور فرطِ مسرت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا "ہم بڑی مشکل سے بچ گئے ہیں۔"

اسی اثنا میں حامد العزیز اخبارات کا بنڈل کھول چکا تھا وہ تین عربی اخبارات تھے اور متن کی حد تک تینوں کی سرخیاں یکساں تھیں طرابلس میں یاسر عرفات کے ساتھ صدر قذافی کے نمائندے کے دو روزہ مذاکرات کے بعد دوستی کے ایک نئے دور کے آغاز کی نوید دی گئی تھی۔ اخبارات کے مطابق ان مذاکرات کے نتیجے میں فلسطینیوں کی طرف سے ساری غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں اور فلسطین کے لئے کام کرنے والے اداروں کو لیبیا میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت مل گئی تھی اسی کے ساتھ ممتاز فلسطینیوں کی گرفتاری کے سارے خصوصی وارنٹ فوری طور پر منسوخ کر دیئے گئے تھے اور جو فلسطینی حراست میں تھے انہیں رات ہی کو رہا کیا جا چکا تھا۔

"مبارک ہو، بڑی نیک خبریں ہیں۔" میں نے گرمجوشی کے ساتھ اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ "شاید اب تمہیں بھی زیرِ زمین نہیں رہنا پڑے گا۔"

"اس عمارت کے مالک سے فون پر میری بات ہو گئی ہے۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "بس پرانا حارس آ جائے تو میں چلا جاؤں گا۔"

"حامد العزیز کے لئے بھی کوئی مشکل نہ ہو گی؟"

"نہیں نہیں۔" ہاشم بولا۔ "میں نے کہا نا کہ ایک طرح سے لیبیا میں مقیم فلسطینیوں کو عام معافی مل گئی ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔ اب تم دونوں کے تقریباً سارے مسائل حل ہو گئے، میرا خیال ہے کہ مجھے اپنے لئے کوئی بندوبست کر لینا چاہئے۔"

وہ دونوں ہی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے پھر حامد العزیز نے میرے شانے تھام کر مجھے تقریباً جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ جب تک تم لیبیا میں ہو تمہاری ضروریات کو پورا کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے اور اسی کے ساتھ ہم اپنی جانوں پر کھیل کر بھی تمہیں پورا پورا تحفظ فراہم کریں گے۔"

"یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے۔" میں نے [illegible] لہجے میں کہا "مگر میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مفرور قاتل کو پناہ فراہم کر کے تم ناقابلِ یقین [illegible] دشواریوں سے دوچار ہو جاؤ۔"

"معلوم ہے کہ مایوسی کفر ہے؟" اچانک ہاشم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر درشت لہجے میں کہا۔ "تمہارے لب و لہجے سے مایوسی کی بو آ رہی ہے، ہماری تنظیم [illegible] تمہاری خدمات اتنی بے مثال ہیں کہ ہم اپنی جانیں قربان کر کے بھی [illegible] عظیم احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔"

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ جیسے اشتہاری مجرم [illegible] کو پناہ دے کر تم خود کو کس طرح محفوظ رکھ سکو گے۔"

"اشتہاری مجرم ـــ" ہاشم نے استہزائیہ لہجے میں کہا "برادرم میرے مہمان بن کر میرے ساتھ قیام کرو گے اب تک تو میں خود کسی خارش زدہ چوہے کی طرح سہمی ہوئی زندگی گزار رہا تھا۔"

"یاسر عرفات کو میرے بارے میں معلوم ہے؟"

"ہمارا گروپ افواجِ آزادیٔ فلسطین کے نام سے کام کرتا ہے مگر یاسر عرفات فلسطین کے مفاد کے لئے کام کرنے والوں سے پوری طرح واقف رہتا ہے اور دیکھا جائے تو وہ ساری فلسطینی تنظیموں کا واحد کمانڈر ہے جسے ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے وہ تمہارے اور سیتا کے کارناموں سے پوری طرح باخبر ہے مگر اسے شاید یہ علم نہیں کہ صفدر علی اس وقت لیبیا میں موجود ہے۔"

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ وہ خود تم سے ملاقات کا متمنی ہے مگر کل [illegible] مذاکرات ختم ہوتے ہی وہ طرابلس سے بیروت روانہ ہو گیا جہاں شدید نوعیت کے کچھ مقامی اختلافات نے خونریز تصادم کی صورت اختیار کر لی ہے۔"

"کیا یاسر عرفات بھی صدر قذافی کو سیتا کی بے گناہی کا یقین نہ دلا سکا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے حالات کا صحیح علم نہیں لیکن یہ اندازہ ضرور لگا سکتا ہوں کہ کوششیں کی گئی ہوں گی جو ناکام ثابت ہوئیں۔" ہاشم نے مصالحانہ لہجے میں کہا "گزری ہوئی تلخ باتوں کو نہ چھیڑو تو مناسب ہو گا۔ وہ کمان سے نکلا ہوا تیر تھا جو اب کسی طرح واپس نہیں آ سکتا، مگر آئندہ کے لئے میں عہد کرتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہونے پائے گی۔"

"ایک خیال مجھے رہ رہ کر کچوکے لگاتا ہے۔" میں نے مضمحل لہجے میں کہا۔

"اسے دل میں نہ رکھو، مجھ سے کہہ ڈالو، اس طرح تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" اس نے مربیانہ انداز میں کہا۔

"یاسر عرفات تمہاری تنظیم کا سربراہ نہیں تو سرپرست ضرور ہے اس کے الفاظ میں اتنا وزن ہے کہ لیبیا کی حکومت اس کی سفارش پر تمام فلسطینیوں کی گرفتاری کے وارنٹ واپس لے سکتی ہے تو سیتا کے معاملے میں ایسی کوشش کیوں نہیں کی گئی؟ میری دانست میں اس معاملے کو دانستہ نظر انداز کیا گیا ورنہ سیتا آج بھی لیبیا میں حکومت کی خصوصی مہمان کے طور پر مقیم ہوتی۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے دل کی بات کہہ ڈالی۔" ہاشم اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "لیبیا کے حکمراں اپنے ملک کو ایک مثالی ریاست قرار دیتے ہیں اور یہاں جتنے حکومتی فیصلے ہوتے ہیں ان کی بنیاد افراد کے بجائے اصول ہوتے ہیں سیتا کا معاملہ محض اسی لئے پس پشت رہ گیا کہ وہاں اصول کے بجائے فرد کی خدمات کے حوالے سے گفتگو کرنا پڑتی جسے صدر قذافی کسی صورت میں قبول نہیں کرتے وہ تو اپنے اہلِ خانہ کے لئے بھی کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یہاں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ صدر قذافی نے عدالتی اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے اپنے رشتے داروں کو ایسی انتہائی سزائیں دیں جو شاید عام شہریوں کے جرم کے ارتکاب کی صورت میں ہرگز نہ دی جاتیں۔ ان حالات میں تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ اگر سیتا کے معاملے میں یاسر عرفات اعلیٰ سطح پر کوئی کوشش کی ہوتی تو اس کا کیا حشر ہوا ہوتا؟"

"میں ان باریکیوں میں نہیں پڑتا لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اب تم میرے یا سیتا کے لئے کیا کر سکو گے؟"

"مجھے پورا یقین ہے کہ سیتا لیبیا کی سرحدوں کو خیرباد کہہ چکی ہو گی۔" ہاشم نے پراعتماد لہجے میں کہا "مصر اور سوڈان میں میرے آدمی اس کی تلاش میں مصروف ہیں اس کے علاوہ چھوٹ مل جانے کے بعد میں ایک ایسے آدمی تک بھی پہنچ سکوں گا جو البرونو اور اس کی مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"البرونو کا سٹیلانز کی فرانسیسی محبوبہ کا باپ جو کسی زمانے میں اس کے لئے کام کرتا تھا مگر ٹانگوں سے معذور ہونے کے بعد گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔"

"تم نے مجھے اور حامد کو اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟" میں نے شکایتی لہجے میں سوال کیا۔

"وہ کسی ملاقاتی سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اگر تم زبردستی اس تک پہنچ جاتے تو وہ زبان نہ کھولتا مگر ایک معاملے میں وہ میرا احسان مند ہے شاید میرے سامنے کچھ اگل دے، میں تمہیں ساتھ لے کر اس سے ملنے جاؤں گا۔"

"اور اگر راستے میں کسی نے مجھے روک کر شناختی کاغذات طلب کر لئے تو میں کیا کروں گا؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہارے کاغذات آج کسی بھی وقت آ جائیں گے۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "اس کے علاوہ مجھے اپنی سرکاری حیثیت میں یہاں بہت سی مراعات حاصل تھیں جو آج سے بحال ہو گئی ہیں، ان کی رو سے پولیس میری قیام گاہ اور کار کی تلاشی نہیں لے سکتی اس طرح میں اپنے مہمانوں کو بھرپور تحفظ فراہم کر سکتا ہوں۔"

"پھر تو مجھے بھی تمہارا ہی مہمان رہنا ہو گا۔" حامد العزیز نے دخل در معقولات کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ کیوں؟" ہاشم چونک پڑا۔

"اس لئے کہ مجھے یہ بانکا سجیلا نوجوان پسند آ گیا ہے اور اس کے بغیر میں اپنا وقت نہ گزار سکوں گا۔"

"ڈپارٹمنٹل اسٹور میں اپنی ڈیوٹی گزارنے کے بعد تمہارے پاس وقت ہی کہاں بچتا ہے جو تم میرے بارے میں سوچ سکو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ اب تم شریف بچوں کی طرح اپنے کام پر توجہ دو۔"

"صفیہ سے تمہارے بارے میں کیا کہوں؟" حامد العزیز نے روکھا سامنہ بنا کر سوال کیا۔

"تو وہاں جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"جانا ہی پڑے گا۔" وہ بے چارگی کے ساتھ بولا۔ "آج رات بھی خواب میں بری طرح تنگ کر رہی تھی۔"

"کہہ دینا کہ میں باہر سے آیا تھا اور چند روز رہنے کے بعد واپس چلا گیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو تمہارا سکریٹری تھا۔"

"مقامی طور پر رکھا ہوا عارضی سکریٹری۔" میں نے اس کی تصحیح کی "یہ یاد رکھنا کہ میں دوبارہ وہاں نہیں جاؤں گا لہٰذا تم میرے بارے میں جو چاہو کہہ سکتے ہو۔"

"جھوٹے کے حافظے کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے درست ہی کہا گیا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے اس سے کہا تھا کہ میں پچھلے سات برسوں سے تمہاری رفاقت میں ہوں۔"

"ادھر کا بھول کر بھی رخ نہ کرنا۔" ہاشم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پولیس حمزہ کے قتل کی تفتیش کرتے ہوئے اس تک بھی پہنچی ہو گی۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی لمبے چکر میں پھنس جاؤ اور کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے۔"

"تو پھر سامنے والی مصری استانی سے ملنا پڑے گا۔" حامد العزیز اس کا خاصا منہ چڑھا معلوم ہو رہا تھا۔

"وہ تمہیں گود لے لے گی۔" میں نے قہقہہ مار کر کہا۔

"چلو اسی بہانے تمہارا بھائی بننے کی سعادت حاصل ہو جائے

گی" اس نے برجستہ کہا۔ اور میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔

"بدلتے ہوئے حالات کی نوید نے اس کے دماغ پر شاید گہرا اثر ڈالا ہے۔" ہاشم خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم اس کی کسی بات کا برا نہ ماننا، ویسے میں خود اس کی بسیار گوئی پر۔۔۔ حیران ہوں۔"

"اب میرے لئے اگلا حکم کیا ہے؟" حامد العزیز یک بیک سنجیدہ ہو گیا۔

"تم فوری طور پر اپنے مکان پر واپس چلے جاؤ۔" ہاشم نے کہا۔ "۔۔۔ کے بعد تمہارے معمولات میں فرق نہیں آنا چاہئے، چند روز کی غیر حاضری کے بارے میں تم اپنے آجر سے بیماری وغیرہ کا کوئی بہانہ کر سکتے ہو۔"

"اور یہ تمہارے ساتھ رہے گا؟"

"آج کے بعد اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔" ہاشم خشک لہجے میں بولا۔ "یہ ایک مہمان بن کر تم سے ٹکرایا تھا اور اسی طرح تم سے اچانک بچھڑ جائے گا۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم اس کے بارے میں زیادہ نہ سوچو۔"

"تمہارا حکم سر آنکھوں پر مگر سوچ پر پابندی لگانا تو درکنار خود میرے لئے بھی ناممکن ہے۔ بعض لوگ ہماری زندگی میں دبے قدموں خاموشی سے در آتے ہیں اور پھر اسی طرح واپس بھی چلے جاتے ہیں۔ مگر ان کو برسوں نہیں بھلایا جا سکتا۔ صفدر علی کا تعلق انسانوں کے اسی مقناطیسی قبیلے سے ہے۔" حامد العزیز کے لہجے پر جذباتیت حاوی ہو گئی۔

"اس سے دور رہ کر تم اس کی ناقابلِ فراموش خدمت کرو گے۔" ہاشم بھی اس کے لب و لہجے سے متاثر ہو گیا۔ "ہو سکتا ہے کہ موجودہ مراحل سے بخیر و خوبی نمٹنے کے بعد یہ زندگی کے کسی ناخوشگوار موڑ پر تم سے ٹکرا جائے تو اس وقت تم جذبوں کا سارا حساب بآسانی بے باق کر سکو گے۔"

"اجازت ہو تو اس کا پتہ لے لوں۔" حامد العزیز اس گفتگو کے بعد یک بیک بے حد اداس نظر آنے لگا تھا۔

"وہ تمہارا آپس کا معاملہ ہے۔" ہاشم ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کے لیے ہنس پڑا۔ "چاہو تو میں خلوت میں چھوڑ کر باہر جا سکتا ہوں۔"

"میرا کوئی پتہ یا ٹھکانا نہیں ہے میرے دوست۔" میں نے حامد العزیز کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کرب آلود لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنا گھر چھوڑے مدت بیت چکی ہے اور میں ایک ایسی منزل کا راہی ہوں جو کسی سراب کی مانند قریب آ کر بھی دھندلکوں میں معدوم ہوتی رہتی ہے۔"

"تم پاکستانی ہو نا؟" حامد العزیز اس وقت بدلی ہوئی گمبھیر شخصیت کا مالک نظر آ رہا تھا۔

میرے دل پر چوٹ سی لگی، ایک مدت کے بعد کسی نے مجھے میری قومیت کے حوالے سے پہچاننے کی پرخلوص کوشش کی تھی۔ میں نے زبان سے کچھ کہے بغیر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے دی۔

"مجھے بھی چھٹی مل گئی۔ میں پاکستان ضرور جاؤں گا اور وہاں جا کر تم سے نہ ملنا بڑا ظلم ہو گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں اداسی کے ساتھ مسکرا دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ میں چند ہفتوں میں پاکستان چلا جاؤں اور یہ امکان بھی ہے کہ شاید مدت تک ادھر کا رخ کرنے کی نوبت ہی نہ آ سکے۔ سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ سیتا کب ملتی ہے۔"

"اگر تم پاکستان میں نہ ملے تو میں اسے اپنی بدنصیبی سمجھوں گا۔"

"تو کیا وہاں کوئی اور بھی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کراتشی میں آٹو پارٹس کا ایک تاجر ہے جو یہاں بہت سا خوردنی سامان بھیجتا ہے۔ وہ جب بھی لیبیا آتا ہے، مجھے ساتھ لے جانے پر تلا رہتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "اس کا نام انتظار احمد ہے۔ پرخلوص آدمی ہے مگر کام کے سلسلے میں بے حد چالاک۔ اس نے میرے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے مالکان کو اپنی میٹھی باتوں سے ایسا رام کیا ہوا ہے کہ وہ بھارت سے نسبتاً سستا مال منگوانے کے بجائے انتظار کی سرپرستی کرتے ہیں۔"

حامد العزیز کے الفاظ سن کر مجھے ایک انجانی سی مسرت ہوئی کہ دیارِ غیر میں میرے ایک ہم وطن نے نیک نام پیدا کیا تھا۔

"مگر اس کا نام غلط ہے۔" ہاشم نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "انتظار فعل ہے اور قواعد کی رو سے فعل کسی کا نام نہیں بن سکتا۔ اسے مشورہ دو کہ وہ اپنا نام منتظر الاحمد رکھ لے تاکہ معنی پیدا ہو سکیں۔"

"ہماری طرف لوگ قواعد کی پرواہ نہیں کرتے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ عربی زبان کے ہر لفظ کو مقدس سمجھتے ہیں اور جو لفظ پسند آ جائے اسی کو نام میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔"

"عربی میں خاصے شرمناک الفاظ بھی ہیں۔" حامد العزیز نے داہنی آنکھ دبا کر کہا۔ "کیا انہیں بھی نام بنا لیا جاتا ہے؟"

"ہماری طرف عربی زبان کے گندے الفاظ کو صیہونی سازش قرار دے کر فوراً ہی مسترد کر دیا جاتا ہے۔"

میرے جواب پر وہ دونوں ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ "بڑی عجیب بات کہی ہے تم نے۔" ہاشم نے اسی دوران میں کہا۔ "ہم دونوں کی ابتر حالت پر اس سے زیادہ لطیف طنز میں نے آج تک نہیں سنا۔"

"میں طنز نہیں کر رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ حقیقت ہے کہ ہماری طرف کے لوگ عربوں کو دنیا کی معصوم ترین مخلوق تصور کرتے ہیں جو اپنا بیشتر وقت یادِ خدا میں صرف کرتی ہے۔"

"کاش۔۔۔ کاش کوئی ہمارے شیوخ کو یہ بتا سکے۔" ہاشم کی ہنسی رک گئی اور اس کے لہجے میں درد سمٹ آیا۔ "پچھلے دنوں لاس ویگاس کے ایک جوئے گھر میں ایک عرب شہزادہ ایک رات میں ڈیڑھ ملین ڈالر کا خطیر رقم ہار کر نکلا تھا اور مغربی پریس نے اسے ایک افسانوی کردار بنا کر اخبا۔۔۔

۔۔۔ سرخیوں میں اتنے خوبصورت اور پراسرار انداز میں اچھالا تھا کہ اب ۔۔۔ ہر ذی حیثیت عرب اس سے زیادہ رقم ہار کر وہ شہرت اور تعریف ۔۔۔ حاصل کرنے کے چکر میں ہو گا۔"

"یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔" حامد العزیز نے ہاشم کے خاموش ۔۔۔ نے ہی بات اچک لی۔ "تم سے میری یہ الوداعی ملاقات ہے مجھے اپنا ۔۔۔ بتا دو تاکہ کبھی پاکستان کا رخ کروں ــــ تو تم تک پہنچ سکوں۔"

"پاکستان میرا وطن ضرور ہے دوست مگر وہاں میرا کوئی ٹھکانہ ۔۔۔ ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "تم مجھے اپنے دوست ۔۔۔ کا پتہ بتا دو۔ اگر میں پاکستان پہنچ گیا تو اپنے تازہ ترین پتے سے ۔۔۔ باخبر رکھوں گا۔"

"مجھے اس کا پتہ تو پوری طرح یاد نہیں۔ ویسے شاید وہ چڑیا گھر ۔۔۔ قرب و جوار میں کام کرتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اس بار میری ہنسنے کی باری تھی۔ "چڑیا گھر کے اندر کی بات تو نہیں ۔۔۔ رہے ہو؟"

"اس نے ایک بار سرسری سا ذکر کیا تھا۔" وہ ذہن پر زور دیتے ۔۔۔ بولا۔ "چڑیا گھر کے باہر شاید کچھ دکانیں وغیرہ ہیں یا شاید دفاتر ہیں۔ ۔۔۔ ہی میں سے کسی میں اس کا کاروبار ہے۔"

"اتنا کافی ہے، میں اسے تلاش کر لوں گا۔"

کچھ دیر تک بات چیت کرنے کے بعد ہاشم واپس چلا گیا اور ۔۔۔ العزیز منہ ہاتھ دھو کر روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

جیسے جیسے حامد العزیز اپنی تیاری کے مراحل طے کرتا جا رہا تھا ۔۔۔ کے بارے میں اس کی گفتگو جذباتی رخ اختیار کرتی جا رہی تھی اور ۔۔۔ وہ ناشتے کی میز پر میرے مقابل بیٹھا تو اس کی بڑی بڑی سیاہ ۔۔۔ نکھوں میں اداسی کا بیکراں سمندر انگڑائیاں لے رہا تھا اور وہ مجھ ۔۔۔ نگاہیں چار کیے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

"ہماری رفاقت بڑی مختصر رہی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "مگر ہم نے ایک ۔۔۔ ہنگاموں کے جلو میں بسر کیا ہے۔ چار خون بہت وزن رکھتے ۔۔۔ اور اس کام میں ہم ایک دوسرے کے شریک تھے۔ میرا خیال ہے کہ ۔۔۔ اب ساری زندگی ایسے ہنگامہ پرور شب و روز گزارنے کی حسرت ۔۔۔ رہے گی۔ تمہارے جیسا فوری اور درست فیصلے کرنا والا ساتھی مجھے ۔۔۔ ہی میسر آ سکے۔"

"ہم نے واقعی یادگار دن گزارے ہیں مگر ہماری راہیں جدا ۔۔۔" میں نے اس کی پیالی میں تلخ قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا۔ "ہمیں جلد ۔۔۔ جدا ہونا ہی تھا۔"

"قدرت کا نظام بھی نرالا ہی ہے۔" اس نے سر اٹھایا تو اس ۔۔۔ آنکھوں میں نمی کی ایک موہوم سی چادر لرزاں تھی۔ "اچھے ساتھی ۔۔۔ تو محض بچھڑنے کے لیے اور جن کا وجود ناقابلِ برداشت ہو وہ ہمیشہ کے لیے گلے کا ہار بن جاتے ہیں۔"

"ہم پھر ملیں گے۔" میں نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ "اچھا سپاہی وہی ہوتا ہے جو تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے بھی فوری سمجھوتہ کرے۔"

وہ ایک نازک جذباتی بحران تھا جس۔۔۔ سے میں بمشکل نمٹ سکا اور انجام یہ ہوا کہ حامد العزیز سر جھکا کر ایک جھٹکے کے ساتھ فلیٹ سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے دروازے پر رک کر الوداعی مسکراہٹوں کے تبادلے کی بھی ہمت نہیں کی تھی۔

میں فلیٹ کا دروازہ بند کر کے تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر گیا۔ اس وقت میں اندر سے اپنا وجود خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے جسم میں یک بیک کسی اہم عضو کی کمی واقع ہو گئی ہو۔

میں بستر پر پڑے پڑے کئی سگریٹیں پی گیا۔ تنہا رہ جانے کے بعد میرے ذہن کی اسکرین پر گزرے ہوئے واقعات آسیبی سایوں کی طرح ابھر ابھر کر معدوم ہو رہے تھے۔

میری سیتا مجھ سے بچھڑنے کے بعد نہ جانے کن کن کمالات پر قادر ہو چکی تھی۔ اس کی کہانیاں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سیتا کسی غیر مرئی چھلاوے کا نام ہو جسے زمان اور مکان کی قید میں رکھنا انسانی بس سے باہر ہو۔

ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کے سائے میں، جانوروں کے غول پر حکمرانی کرتے ہوئے اپنی بن بیاہی ماں سندری کے ساتھ رہ کر تن بدن ۔۔۔ چڑھنے والی اس سیدھی سادی مگر دلیر لڑکی نے مہذب دنیا کی چکا چوند ۔۔۔ آنے کے بعد بھی سپر نہیں ڈالی تھی۔ بلکہ اس کی سیماب صفت طبیعت نے شاید فوری طور پر جدید طرزِ زندگی کے سارے لوازم اس طرح جذب کر لیے تھے کہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا اس کے لیے کہیں بھی اور کبھی بھی دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔

مگر اس کی وہ دیدہ دلیری، بے خوفی اور پھرتی میرے امتحان کی صعوبتوں کو طویل سے طویل تر کرتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں اس کے نئے روپ کی سینکڑوں تصویریں ابھرتی اور دھندلاتی رہیں مگر پھر بھی میں یہ اندازہ نہ کر سکا کہ میری سیتا مجھ سے کس روپ میں اور کہاں ملے گی۔

سیتا سے بچھڑنے کے بعد کئی دلنواز اور خوبرو لڑکیاں میری زندگی میں آئیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی میرے دل سے سیتا کی جدائی کا داغ دور نہ کر سکی۔ بلکہ ہر نئی ملاقاتی سے ملنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں سیتا کی طلب اور شدید ہو گئی۔

البتہ مرد دوستوں میں ایسے ہمدرد اور ہم نوا ضرور ملے جن کی موجودگی میں تنہائی کا ہولناک اور آسیبی احساس وقتی طور پر دب گیا اور ایسے لوگوں کی فہرست بڑی مختصر سی تھی۔

اسرائیل میں محمود نے دوستی کا حق ادا کیا تھا اور اسی کے طفیل میں فلسطینی تحریک سے متعارف ہوا اور اسی شخص نے مجھے اس یہودی سلطنت سے فرار میں مدد دی ورنہ میں تل ابیب کے کسی تنگ و تاریک قید خانے میں اذیتوں کا عذاب سہہ کر نہایت دردناک انداز میں موت کی بھیانک آغوش میں جا گرتا۔ پھر فرانس میں عبداللہ ملا جس کی ذات میں نرم اور لطیف جذبوں کی ایک ولولہ انگیز کائنات بسی ہوئی تھی اور آج ایک مدت کے بعد اپنی یہ کہانی رقم کرتے ہوئے مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ مذہبی رجحانات اور احکامات کے سلسلے میں اس کا ذہن قابلِ رشک حد تک کسی آئینے کی طرح صاف تھا۔ وہ شب و روز میرے ساتھ رہا لیکن شراب یا عورت تو درکنار اس نے بھول کر بھی کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہ لگایا اور اسے الوداع کہنے کے بعد اس وقت تک حامد العزیز میری زندگی کی محرومیت سے لبریز لمحوں کا وہ ساتھی تھا جس سے میری رفاقت نہایت مختصر تھی۔ مگر اس کا اثر بہت گہرا تھا۔

حامد العزیز نہ کسی فلسطینی تنظیم کا باقاعدہ رکن تھا نہ کٹر مذہبی رجحانات کا مالک تھا۔ اسے مذہب کی ہر ممنوعہ شے سے والہانہ لگاؤ تھا۔ مگر خلوص اور وفاداری کی حد تک اس کے اپنے اصول بہت سخت اور متاثر کن تھے۔

اس نے مجھے بدترین لمحات میں ایسا بھرپور سہارا دیا تھا کہ اپنی ملازمت کو بھول کر ایک مفرور مجرم کے روپ میں مجھے تحفظ فراہم کرتا رہا اور اس وقت حامد العزیز بھی مجھ سے بچھڑ کر انسانوں کے ہجوم میں گم ہو چکا تھا۔

ہاشم میرے ساتھ تھا۔ وہ پختہ سوچ اور وسیع تجربے کا مالک تھا مگر میرے لیے اس کی ذات بے کیف تھی کیونکہ اس میں دوستوں کے لیے آنکھ بند کر کے مر مٹنے کا والہانہ جذبہ عنقا تھا۔ وہ مجھے مفید مشورے ضرور دے سکتا تھا۔ مگر مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میری صوابدید پر بھروسا کرتے ہوئے میرے ساتھ آنکھ بند کر کے کسی زہرہ گداز خطر میں کود پڑنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

اور یہی وہ مقام تھا جہاں حامد العزیز کے چلے جانے کے بعد مجھے اپنی سیتا بہت زیادہ یاد آنے لگی۔

اسی اداسی کے عالم میں میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ بیدار ہوا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے جیسے تیسے اپنا وقت گزارنے کا اہتمام کیا۔ اور جب شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تو ہاشم میرے فلیٹ پر آ پہنچا۔ اس کے لباس سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے آتے ہی اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا بریف کیس میرے سامنے ڈال دیا۔

"ساری رقم اس میں بھر لو، یہ خالی ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

الماری سے رقم نکالتے ہوئے میں چونک پڑا۔ اس میں حامد العزیز کا بھی حصہ تھا۔ وہ خالی ہاتھ ہی چلا گیا۔

"وہ کچھ نہیں لے گا، یہ ساری رقم تمہاری ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں رقم کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ بلکہ ہم البرنو کی محبوبہ کے باپ کو بھی رشوت کی پیش کش کر کے زبان کھولنے پر آمادہ کر سکیں گے۔"

"یہاں شراب کی ایک دو بوتلیں بھی پڑی ہیں۔" میں نے اس کے ہمراہ فلیٹ سے نکلتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"رہنے دو۔" وہ بولا۔ "حارس کے کام آ جائیں گی۔"

نیچے سفید رنگ کی فوکس ویگن موجود تھی جس کی نمبر پلیٹ کے ساتھ ہی سرخ رنگ کی ایک اور خصوصی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

"یہ تمہارے نئے شناختی کاغذات ہیں۔" اس نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ ڈیش بورڈ سے نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اسی میں تمہارا اردنی پاسپورٹ بھی ہے۔ اب تم بڑی حد تک محفوظ ہو۔"

"اس مرتبہ خاصا مشکل نام پلے پڑا ہے۔" میں نے لفافہ کھول کر پاسپورٹ کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا نام ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"مصطفیٰ المرزوق۔" میں نے کہا۔ "مرزوق بڑا نامانوس سا نام ہے۔"

راستے بھر ہاشم سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ براہِ راست البرنو کا سٹیلانو کی محبوبہ کے باپ کے پاس جا رہا تھا۔

میرے پاس رقم کے علاوہ زہریلے تیروں والی دو شیشیاں اور ایک بھرا ہوا پستول بھی تھا۔ مگر ہاشم کے خیال میں اس مہم کے لیے ہتھیار غیر ضروری تھے۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک گندی سی آبادی میں ہوا جہاں کچی گلیوں میں سے گزرنے کے بعد ہاشم نے ایک درخت کے قریب کار روک دی۔

ایک خستہ حال یک منزلہ مکان کے دروازے پر دستک دی تو خاصی دیر بعد دروازہ کھولا گیا اور فوراً ہی اس تاخیر کا سبب بھی سامنے آ گیا۔

دروازہ کھولنے والا ادھیڑ عمر کا ایک معذور شخص تھا جو المونیم کی بیساکھیوں پر کھڑا ہوا تھا۔

شاید اس کی بینائی بھی کمزور تھی کیوں کہ اس نے ہاشم کو دیر سے پہچانا پھر اس کے چہرے پر چمک عود کر آئی۔

"ارے ہاشم!" اس کا لہجہ تحیر آمیز تھا۔ اور وہ عربی ہی میں بولا تھا۔ "تم ادھر کیسے آ نکلے آؤ، اندر آ جاؤ۔"

"یہ میرا دوست مرزوق ہے۔" ہاشم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس معذور شخص سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ ...شلر ہے، میرا فرخ نژاد دوست۔"

رسمی نعروں کے تبادلے کے دوران ہم اندرونی کمرے میں پہنچے ...اں ہر چیز سے بے ترتیبی اور مفلوک الحالی برس رہی تھی۔ تینوں خاموشی سے گرد آلود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"مجھے حیرت ہے کہ تمہارے حالات اب بھی جوں کے توں ہیں۔" ...م نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ...رنے میں معذور ہونے کے بعد تمہیں بیمے کی خاصی بڑی رقم ملی تھی۔"

"ضرور ملی تھی۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "اگر یہاں علاج کی سہولتیں میسر نہ ہوتیں تو میں شاید زندہ ہی نہ بچتا۔ بیمے کی ساری رقم ...نے ہتھیا لی تھی۔"

"بڑی افسوسناک بات ہے۔" ہاشم نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ...نے رقم کا کیا کیا ہوگا؟ وہ تو شاید تمہارے ساتھ بھی نہیں رہتی ...ا۔"

"جوئے کی لت بہت بری ہوتی ہے۔" وہ کہتے کہتے کسی ...ال کے تحت اچانک خاموش ہو کر مشکوک نظروں سے ہاشم کی طرف ...یکھنے لگا۔ جو بظاہر خالی الذہن نظر آ رہا تھا۔ "چھوڑو اس قصے کو کوئی ...بات کرو۔" قدرے توقف کے بعد الشلر نے مضمحل لہجے میں کہا۔ ...یں ان باتوں کو بھول جانا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارے نجی معاملات میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔" ہاشم ...معذرت آمیز محتاط لہجے میں کہا۔ "جہاں تک مجھے علم ہے ایلی کسی ...ی حال لڑکے کے ساتھ رہ رہی تھی یا شاید شادی بھی کر لی تھی۔"

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑا۔ "آج کل کے لڑکے بیوی سے ...یادہ مجبور رکھنی پسند کرتے ہیں۔ کسی روز وہ اچانک اسے بھی چھوڑ دے ...ا۔ وہ پکا جواری ہے۔ اکثر کوڑی کوڑی کو ترستا رہتا ہے۔ پھر اچانک ...کھوں میں کھیلنے لگتا ہے اور چند روز بعد پھر وہی مفلسی طاری ہو ...الب ہے۔ جواری کے لیے تو سونے کی کان بھی کم پڑ جاتی ہے۔"

"شاید تمہاری رقم اس نے ایلی کے ذریعے ہتھیائی ہوگی۔" ہاشم ...ہمدردانہ/ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "تم چاہو تو مرزوق تمہاری مالی اعانت کر ...سکتا ہے۔"

الشلر کی آنکھوں میں حریصانہ چمک عود کر آئی اور اس نے پہلی ...بار بھرپور توجہ کے ساتھ میرا جائزہ لیا۔

"میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" میں نے بے نیازی سے ...کہا۔ "لیکن اس نابکار شخص کو رقم کی بھنک مل گئی تو وہ پھر ایلی کو سکھا ...کر تمہارے سر پر مسلط کر دے گا۔"

"وہ کہاں ملے گا۔" ہاشم نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تم ...مجھے اس کا نام اور پتا بتاؤ۔ میں سختی کے ساتھ اسے سمجھاؤں گا کہ ایک ...معذور آدمی کی زندگی میں زہر گھولنا کس قدر گھناؤنی حرکت ہے۔"

"پتھر سے سر ٹکرانا بے سود ہے۔" اس نے بظاہر ہاشم کی بات کا جواب دیا مگر اس کی نظریں مجھ پر ہی جمی رہیں۔ "اس محلے کے لوگ اکثر میری اعانت کرتے رہتے ہیں۔ اگر مجھے ڈیڑھ دو ہزار دینار مل جائیں تو میں اسی کمرے میں روزمرہ کی ضروریات کی چیزوں کی مختصر سی دکان کھول لوں گا جس سے میرا گزارا بھی ہوتا رہے گا اور وقت بھی اچھا گزرے گا۔"

"اس نیک مقصد کے لیے تو مرزوق تین ہزار بھی دے دے گا۔" ہاشم اس وقت نہایت مخیر اور نرم دل انسان نظر آ رہا تھا۔ "مگر پہلے تم مجھے اس مردود کے بارے میں بتاؤ، ہو سکتا ہے کہ میں اسے ایلی سے بھی دور رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

میری جیب میں نوٹوں کی ایک گڈی موجود تھی۔ میں نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے جیب سے گڈی نکال کر دس دس دینار کے وہ نوٹ الشلر کی طرف بڑھا دیے جو اس نے نہایت بے تابی سے لے لیے۔

"بقیہ رقم اگر گاڑی میں ہوئی تو جاتے ہوئے دے دوں گا۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ ایک ہزار دینار ہاتھ میں آ جانے کے بعد الشلر کے رویے میں ممنونیت طاری ہو گئی تھی۔

"تم بڑے اچھے لوگ ہو۔" وہ گڈی اپنی جیب میں اڑستے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم البرنو سے نہ

ملو، وہ بہت اکھڑ اور بدزبان شخص ہے، کہیں تم پر کوئی گندی تہمت نہ لگا بیٹھے۔"

"اگر تم کسی ذاتی وجہ سے اس کا پتہ چھپا رہے ہو تو اور بات ہے میں تو تمہاری ہی بھلائی سوچ رہا تھا۔" ہاشم نے ایسا لہجہ اختیار کیا کہ ایشلر اندازہ کر سکے کہ اس موضوع سے اس کی مسلسل پہلو تہی ہاشم کو ناگوار گزری ہے۔

وہ حربہ نہایت مؤثر رہا اور ایشلر فوراً ہی بول پڑا۔ "مجھے غلط نہ سمجھو، دراصل اس کی حرکتیں ہمیشہ سے مشکوک ہیں اور وہ یہ بات پسند نہیں کرتا کہ میں اس کے بارے میں کسی کو کوئی بھی اطلاع فراہم کروں۔ اب بھی وہ کئی روز سے غائب تھا اور کل ہی ایلی بھی سوڈان گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آجکل وہیں ہوگا۔ اب بتاؤ کہ میں تمہیں اس کے پتے کے بارے میں کیا بتاؤں؟"

"تمہیں صحیح علم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"ایلی کل مجھے بتانے آئی تھی کہ وہ چند ہفتوں کے لئے سوڈان جا رہی ہے۔ البرونو کے بارے میں میرے استفسار پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ لیکن اس کے رویّے سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ البرونو کے طلب کرنے پر وہاں جا رہی تھی۔" ایشلر کا داہنا ہاتھ کوٹ کی اس جیب میں مسلسل حرکت کر رہا تھا جس میں رقم موجود تھی۔ شاید اتنے نوٹوں کا لمس محسوس کر کے اس کے کسی تشنہ جذبے کی تسکین ہو رہی تھی۔

"تمہارا مقدر!" ہاشم گہرا سانس لے کر بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ میں نے بریف کیس میں سے نوٹوں کی مزید دو گڈیاں نکال کر ایشلر کو تھما دیں۔

"مجھے ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے۔" اس نے وہ نوٹ بھی جلدی سے جیبوں میں اڑستے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کیا؟" ہاشم کار میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔

"اگر تم میرے لئے بھلائی کرنا ہی چاہتے ہو تو اس وقت موقع غنیمت ہے۔" وہ ہاشم کی طرف جھک کر کہنے لگا۔ "ایلی اور البرونو دونوں ملک سے باہر ہیں، اگر کسی طرح ان کے فلیٹ کی تلاشی لے کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ البرونو کا ذریعۂ معاش کیا ہے تو پھر شاید وہ اپنے راز فاش ہونے کے خوف سے مجھے تنگ کرنا چھوڑ دے۔"

ہاشم چند ثانیوں کے لئے خاموش رہا پھر بولا۔ "کسی کی چار دیواری کی حرمت کو پامال کرنا بھی قانون کی نظروں میں ایک سنگین جرم ہے، ویسے میں کوشش کروں گا، تم مجھے اس کا پتہ دے دو۔"

ایشلر نے ہاشم کو البرونو کے مکان کا پتہ دیا اور پھر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔

"اس لالچی بڈھے پر تین ہزار دینار نے زبردست اثر کیا ورنہ ہم ناکام ہی واپس لوٹتے۔" ہاشم نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ ضرور علم ہو گیا کہ البرونو کی سوڈان میں موجودگی کے قوی امکانات ہیں مگر سوڈان بہت بڑا ملک ہے۔"

"وہ تو آسانی سے معلوم ہو جائیگا کسی آدمی کو ایئرپورٹ پر فضائی کمپنیوں کے کاؤنٹرز پر بھیجنا ہوگا اور کل سوڈان جانے والی پروازوں کے فلائٹ کوپن دیکھ کر ایلی کی منزل کا علم ہو جائیگا۔" اس نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "مگر میں البرونو کے مکان کے پتے کی بات کر رہا تھا۔"

"تو کیا پہلے تمہیں اس کا پتہ معلوم نہیں تھا؟"

"مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ گرانڈ ہوٹل سے ملحق ایک اوسط درجے کی عمارت میں مقیم ہے۔ مگر ایشلر نے جو پتہ دیا ہے وہ شہر کے بہترین رہائشی علاقے کا ہے۔ شاید وہ البرونو کی خفیہ قیام گاہ ہوگی۔"

"اگر وہ واقعی خفیہ قیام گاہ ہے تو اس کی تلاشی میں بہت کارآمد مواد مل سکتا ہے۔" میں نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"مگر تالا توڑنے کے لئے کوئی ماہر تلاش کرنا ہوگا۔" وہ بولا۔ "اگر فلیٹ کا تالا توڑتے ہوئے کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔"

"فکر نہ کرو، میرے سامنے مضبوط سے مضبوط تالا بھی خود بخود پگھل جاتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے دلاسا دیا اور اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس کام میں بھی ماہر ہو۔"

"شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ اپنے بُرے وقت میں میں نے قفل شکنی کر کے معمولی چوریاں تک کی ہیں۔"

"ہمارا دوست!" اس نے اچانک سخت لہجے میں کہا اور میں بُری طرح چونک پڑا۔ "ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ یہ ناممکن ہے کہ تم کوئی بات کہو اور ہاشم اس پر پوری طرح یقین نہ کرے۔"

میں ایک گہرا سانس خارج کر کے ہنس پڑا۔ "تم نے تو اپنے لب و لہجے سے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

ایشلر سے ہونے والی اہم ملاقات پر بحث کرتے ہوئے ہم اس صاف ستھرے اور مہنگے رہائشی علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاں البرونو کا سٹیلا نو کی خفیہ قیام گاہ کا سراغ ملا تھا۔

وہ کثادہ رہائشی فلیٹوں پر مشتمل ایک چار منزلہ عمارت تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے لفٹ میں سوار ہوئے اور چوتھی منزل پر اتر گئے۔ اس عمارت کا چوکیدار اگر دُور سے ہمیں دیکھ بھی رہا تھا تو اس نے شاید ہماری مقامی وضع قطع کے باعث دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ویران راہداری میں لفٹ سے اتر کر ہم زینوں کے راستے تیسری منزل پر آ گئے جہاں چار نمبر فلیٹ کا دروازہ سامنے ہی تھا۔

اس عمارت میں ہر منزل پر دو فلیٹ تھے۔ اس وقت تین نمبر کا دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے احتیاط سے چار نمبر کے دروازے کا ہینڈل گھمانے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے مقفل تھا۔ پھر میں نے جھک کر تالے کی ساخت کا جائزہ لیا۔ پھر جیب میں سے وہ تار نکال لیا جو مجھے کار کے ڈیش بورڈ

...ہی مل گیا تھا۔

اس دوران میں ہاشم میرے پیچھے کھڑا اضطراب کے عالم میں میری ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

پھر میں نے تار کے سرے کو مخصوص انداز میں موڑ کر جونہی چابی کے سوراخ میں داخل کیا، وہ دروازہ اچانک کسی آواز کے بغیر کھل گیا۔ میں ہڑبڑاتے ہوئے انداز میں سیدھا ہوا تو کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے برآمد ہونے والے شخص کا درشت چہرہ نظر آیا۔ اسے جس چیز نے زیادہ چونکا دیا تھا وہ سفید دستے والا ایک ریوالور تھا۔ جو اس کے بائیں ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

"ہم... مسٹر البرونو۔" اس پر نظر پڑتے ہی بے اختیار میرے منہ سے نکلا اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خاموشی سے اندر چلے آؤ، ورنہ تمہارے بھیجوں میں سوراخ کر دوں گا۔" ریوالور کی نال کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ اس کی عربی بہت شکستہ تھی۔

مجھ سے پہلے ہاشم نے اس کی ہدایت کی تعمیل کی اور میرے قریب سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔ میرے پہلو سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے کہنی مار کر کچھ بتانے کی کوشش کی تھی جو میری سمجھ میں نہ آ سکی۔

ہمیں کور کرنے والا شخص بہت چالاک تھا۔ اس نے پورا دروازہ کھول کر ایسی جگہ سنبھال لی تھی کہ میں اور ہاشم دونوں ہی بیک وقت اس کے کھڑے ہوئے ریوالور کی زد میں تھے۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے دوبارہ مقفل کر دیا۔ اس دوران میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔

ہم دونوں کو اپنے ہاتھ اٹھا کر کھڑا رہنے کا حکم دے کر وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تم دونوں میں ہاشم الاحمد المصباح کون ہے؟" اس شخص کا پہلا سوال بہت چبھتا ہوا اور براہ راست تھا جس نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ہاشم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "کوئی بھی نہیں، لیکن تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کیا البرونو کا سٹیلا نو کو اپنے فلیٹ کے بجائے کہیں اور ہونا چاہیئے؟" اس درشت چہرے والے سفید فام نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" ہاشم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں البرونو سے بارہا مل چکا ہوں۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"کہا نہ کہ تمہیں نہیں بنا سکتا!" وہ ڈھٹائی کے ساتھ ہنسا، پھر یک بیک سنجیدہ ہو گیا۔ "سنو! تم جو کوئی بھی ہو، اس معاملے سے خاصے باخبر ہو ورنہ اس وقت نقب زنی کرتے ہوئے نہ پکڑے جاتے۔ اب تمہاری گلو خلاصی کی چند ہی صورتیں ہیں۔"

"تمہاری خود ساختہ شرائط سننے سے پہلے یہ بتا دوں کہ البرونو جس کے سلسلے میں ہمارا مقروض ہے۔" ہاشم اس سے قطعی خائف نہیں تھا۔ "اس نے تین دن میں رقم کی واپسی کا وعدہ کیا تھا مگر دس روز سے وہ شہر سے ہی لاپتہ ہے۔"

"تمہارا خیال تھا کہ وہ شرم سے اپنے فلیٹ میں مقفل ہو کر بیٹھ گیا ہے۔" اس نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں علم ہے کہ وہ کہیں فرار ہو گیا ہے۔" ہاشم نے جھڑکے بغیر کہا۔ "ہم نقب زنی کر کے یہاں سے اپنی رقم کی مالیت کا سامان اٹھا لے جانے کی نیت سے آئے تھے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ خشمناک نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے غرایا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جیل سے فرار ہونے والی لڑکی اور البرونو کی پُراسرار روپوشی میں کیا تعلق ہے؟ اگر میں تمہاری بات درست مان لوں تب بھی البرونو سے تمہارے قریبی مراسم تھے اور تم اس بارے میں ضرور واقفیت رکھتے ہوگے۔"

"تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟" میں نے انتہائی پُرسکون انداز میں پہلی مرتبہ دخل اندازی کی۔

"صورت سے تم اتنے جاہل تو نظر نہیں آتے۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "اخبارات میں کئی دن تک اس لڑکی کے نام کی سُرخیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔"

"اوہ!" میں ایک گہرا سانس لے کر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بولا۔

"اب یاد آیا ہے کہ البرونو اسی روز سے غائب ہے جس دن سیتا نامی لڑکی جیل سے فرار ہوئی تھی، اگر تم اسی کے بارے میں بات کر رہے ہو تو دونوں کی بیک وقت روپوشی سراسر اتفاق ہی ہو سکتی ہے۔"

"یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ نا سمجھ پڑ رہے ہو۔" وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔ "البرونو کا منصوبہ یہی تھا اور سیتا کو اغوا کر کے دوسرے روز وہ طرابلس میں لڑکی میرے حوالے کرنے والا تھا۔ مگر وہ حرامی نہ جانے کہاں مر گیا ہے۔"

"اب میں پورے وثوق سے سب کچھ بتا سکتا ہوں۔" میں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "شاید میں تمہاری پوری بات سمجھ گیا ہوں۔"

"اگر تم میری مدد کرو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ دوں گا۔" وہ بے تابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں دل ہی دل میں اس کی حماقت پر ہنسا۔ پھر حمزہ کے رشتے دار وارڈن کے بارے میں حمزہ کی سنائی ہوئی کہانی ذہن میں تازہ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ سیتا کے بارے میں البرونو سے تمہارا جو بھی سودا ہوا، اس کے لئے تم نے اسے پیشگی کے طور پر کم از کم ستر ہزار دینار دیئے تھے۔ جو وہ سیتا کے جیل سے فرار سے کئی روز پہلے۔ جوئے میں ہار بیٹھا، پھر لڑکی خود ہی جیل سے فرار ہوئی تو وہ خوفزدہ ہو گیا، تم یقیناً اس سے لڑکی کے بارے میں مطالبہ کرتے اور ہو سکتا تھا کہ طیش میں آ کر اسے ہلاک کر دیتے لہٰذا وہ خود ہی لیبیا سے بھاگ گیا۔"

اس کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی۔ "اسے ایک لاکھ دینار پیشگی دیئے گئے تھے، لیکن میں یقین نہیں کر سکتا کہ وہ اس قدر غیر ذمہ دار ثابت ہوا ہو گا اور پھر قصر خیال کے قید خانے سے کسی قیدی لڑکی کا فرار ہونا بھی بعید از فہم ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ البرونو کے علاوہ کوئی اور بھی لڑکی میں دلچسپی لیتا رہا ہو!" پھر میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں پہلے سے البرونو کے منصوبے کا علم تھا۔"

میری گفتگو کے نتیجے میں اس کا معاندانہ رویہ بڑی حد تک تبدیل ہو چکا تھا اور میں اسے باتوں میں الجھانے کے ساتھ ہی اس کی اصلیت اگلوانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"تم غلط سمجھے" وہ نرمی سے بولا۔ "منصوبہ یہی تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اسے کب ہم تک لائے گا۔ مجھے اخبارات سے لڑکی کے فرار کی خبر ملی تو میں نے اگلے روز سے البرونو کا انتظار شروع کر دیا۔"

"تم نے قاسم الاحمد کا بھی تو نام لیا تھا۔" ہاشم نے اسے یاد دہانی کرائی۔

"قاسم نہیں، ہاشم!" اس نے تصحیح کی۔ "میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ وہ لیبیا میں سیتا کا سب سے مضبوط اور بارسوخ ہمدرد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی نے سیتا کو جیل سے نکالا ہو۔"

"تو تم اسے کیوں نہیں گھیرتے؟" ہاشم نے صورت حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر سوال کیا۔

"آج صبح تک لیبیا میں سارے سرگرم فلسطینی زیر زمین تھے میں اس سے واقف بھی نہیں ہوں۔ البتہ البرونو نے مجھے بتایا تھا کہ شاید ہاشم کی وجہ سے اس کا کام دشوار ہو جائے۔ تمہاری کہانی سننے کے بعد تو مجھے ہاشم ہی کو پکڑنا ہو گا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اسرائیل کے لئے کام کر رہے ہو؟" ہاشم نے فوراً ہی ایک نازک سوال کر ڈالا۔

اس نے ایک بار نظر بھر کر ہاشم کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"نہیں، یہ ذاتی رقابتوں کا معاملہ ہے۔"

وہ تند خو اور بد صورت سفید فام جو کوئی بھی تھا، بہت چالاک تھا۔ اور یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر عرب فلسطینیوں کو پسند کرتا ہو یا ناپسند لیکن اسرائیلیوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔ محض اس وجہ سے اس نے حقیقت کے اعتراف پر کھلے جھوٹ کو ترجیح دی تھی۔ حالانکہ اس کا لہجہ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا اور میرے لئے یہ ایک نیک شگون تھا کیونکہ میری دانست میں اس طرح وہ ہماری خوشنودی حاصل کرنے کی لاشعوری کوشش کر رہا تھا۔

"تم اپنی رقم پر تو صبر کر لو۔" میں نے کہا۔ "لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ تم لوگ اس معاملے میں ملوث نہیں ہو اور اگر میں البرونو پر واجب تمہارے قرضے کی رقم ادا کرنے کی بجائے یاد دہانی کرا دوں تو تم میری خاصی مدد کر سکو گے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"وہ تین ہزار کا مقروض تھا!" ہاشم نے برجستہ کہا، اس وقت وہ حاسد حریص شخص نظر آ رہا تھا اس پر اس روز شاید تین ہزار کا سنسنی بری طرح مسلط تھا کیونکہ اس سفید فام سے قبل ہی وہ ایڈلر کو بھی تین ہزار دینار دلوا چکا تھا۔

"میں کل ہی یہ رقم ادا کر دوں گا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ——— اپنے ریوالور کی نال نیچے کر لی اور ہم دونوں اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئے۔ "تم دونوں نے اس وقت بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر تم برخلاف میں مقابلے کی کوشش کرتے تو ہم تینوں ہی ننگے ہاتھوں دھر لئے جاتے کیونکہ یہاں ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

"رقم ادا کرنے کے بجائے تم ہمیں یہاں سے اپنی پسند کی چیزیں لے جانے دو!" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "ہم نے تمہیں اپنی آمد کا مقصد صاف صاف بتا دیا۔ لیکن تمہاری یہاں موجودگی کا سبب ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا ہے۔"

اس نے بے فکری سے اپنے لئے سگریٹ سلگائی اور بولا۔ "میں پہلی بار یہاں آیا ہوں اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا ہوں۔ البرونو کے طویل انتظار کے بعد میں پرسوں طرابلس سے یہاں پہنچا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں البرونو اپنے مکان میں مردہ نہ پڑا ہو۔ یہاں آ کر مجھے اس کے گراؤنڈ فلور والے مکان کا علم ہوا، مگر وہاں کچھ نہ مل سکا۔ ایک دو آدمیوں سے معلوم ہوا کہ بن غازی میں اس کا کوئی خفیہ ٹھکانہ بھی ہے، مگر کوئی اس کی نشاندہی نہ کر سکا۔ آج صبح مجھے اس فلیٹ کا علم ہوا اور میں ابھی وقت سے یہاں موجود ہوں۔ فلیٹ کی صفائی اور فضا میں رچی ہوئی خوشبوئیں بتا رہی تھیں کہ یہ فلیٹ دس پندرہ گھنٹے پہلے تک آباد تھا۔ لہٰذا میں یہیں مقیم رہ کر مکین کی واپسی کا منتظر تھا کہ تم لوگ آ گئے۔"

"تم نے فلیٹ کی تلاشی تو لی ہو گی؟" میں نے سوال کیا۔

"کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو البرونو کی یہاں موجودگی یا روپوشی پر روشنی ڈال سکے۔ البتہ کچن میں جلے ہوئے کاغذوں کی تازہ راکھ سے بھرا ہوا ڈسٹ بن مشکوک حالات کی نشاندہی کر رہا تھا۔"

"پھر تو ساری بات صاف ہے۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "رقم ہڑپ کرنے کے بعد وہ تم سے منہ چھپا کر اس خفیہ فلیٹ میں اپنی کسی داشتہ کے ساتھ دادِ عیش دیتا رہا اور کل یا پرسوں جب اسے پتہ چلا کہ تم بن غازی پہنچ چکے ہو تو اسے خوف لاحق ہو گیا ہو گا کہ تم کسی بھی وقت اس تک پہنچ کر لڑکی یا رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتے ہو۔ لہٰذا وہ سارے اہم کاغذات تلف کر کے یہاں سے بھاگ گیا۔"

"یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ "کمال ہے کہ میرا ذہن یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکا۔"

"تمہیں یہ علم نہیں تھا نا کہ وہ تمہاری دی ہوئی خطیر رقم اصل کام میں صرف کرنے کے بجائے جوئے میں ہار چکا ہے۔" میں نے سہارا دیا۔

"میرا تو خیال ہے کہ تمہارے روپ میں قدرت نے فرشتوں کو میری مدد کے لئے بھیجا ہے۔" اس کا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔ "چاہو تو شراب کا ایک دور ہو جائے۔ یہاں دنیا کی بہترین شرابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔"

"تم نے فرشتوں پر ریوالور کی نال اٹھائی تھی۔" میں نے اسے ملامت آمیز لہجے میں گزرا ہوا رویہ یاد دلایا۔

"میں شرمندہ ہوں۔" وہ قریب آ کر میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"پھر دوستی کے ایک دو جام پی لینے میں کوئی حرج نہیں" میں نے مسکرا کر کہا۔ اور وہ اندر چلا گیا۔

"اب معاملے کو طول نہ دو۔" ہاشم نے اس کے جاتے ہی میرے کان کے نیچے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"ماحول سازگار ہو گیا ہے تو یہ معلوم کریں گے کہ البرونو کس کی شہ پر سیتا کے خلاف کام کر رہا تھا۔"

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ یہ صیہونی ایجنٹ ہے۔"

"تھوڑی دیر میں اگل دے گا" میں دائیں آنکھ دبا کر بولا۔

"ویسے تمہاری مربوط کہانی سن کر وہ البرونو کا سٹیلا نوٹ ایسا بدظن ہوا ہے کہ شاید اسے سامنے دیکھ کر کچھ پوچھے بغیر گولی مار دے۔"

اندرونی کمرے میں سفید فام کے قدموں کی آہٹ سن کر ہم دونوں خاموش ہو کر تھکے ہوئے انداز میں صوفوں پر ڈھلک گئے۔

شراب کے دور کا آغاز بے تکلفانہ انداز میں ہوا اور میں نے پہلا گھونٹ لیتے ہی اس کا نام دریافت کر ڈالا۔

"یہ میرے اصول کے خلاف ہے، ویسے تم مجھے اینڈریو کہہ سکتے ہو!" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اور تم دونوں؟"

"اسی اصول کا اطلاق کرتے ہوئے مجھے ہاشم اور اسے مرزوق کہہ لو۔" ہاشم نے اپنے ترلبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ نام تم نے ہی دیا تھا۔"

"تم کسی طرح مجھے اسرائیل لے جا سکتے ہو؟" دوسرا گلاس تیار کرتے ہوئے میں نے اپنا لہجہ بوجھل بنا کر اس سے سوال کیا۔

"کیوں؟" اسرائیل کا نام سنتے ہی وہ چونک پڑا۔

"سنا ہے وہاں کے مخلوط معاشرے میں بڑی آزادیاں ہیں اور بھرے گداز جسموں والی یہودی لڑکیاں بھی بڑی حسین ہوتی ہیں۔" میں نے ندیدے پن کے ساتھ کہا۔

"یہودی لڑکیاں تو اسرائیل سے باہر بھی آسانی مل جاتی ہیں!"

"میرے لئے اسرائیل کی سرزمین بڑی پُراسرار ہے۔" میں نے سنبھالا لینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مختصر سرحدوں اور محدود آبادی والی ایک چھوٹی سی قوم جدید آسائشوں میں پلنے کے باوجود اس قدر جفاکش کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ان کی عورتیں بچے جننے کے ساتھ ہی رائفلیں بھی چلاتی ہیں۔" ہاشم نے بھرائی ہوئی آواز میں لقمہ دیا۔ "ہمارے مرد اگر بوجھ اٹھائیں تو ان کی کمر میں موچ آ جاتی ہے۔"

"تم دونوں کو چڑھ رہی ہے۔" وہ بوتل اپنی طرف سرکاتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ پینے کے معاملے میں بالکل ہی اناڑی ہو"

"اسرائیلی دلیری کے بنیادی فلسفے پر عمل کرتے ہیں۔" میں اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بظاہر ہاشم سے مخاطب ہو گیا۔ "ذرا تصور تو کرو کہ اگر میری محبوبہ قریب کے مورچے میں رائفل چلا رہی ہو تو میں گرینیڈ لے کر ٹینک میں گھس جاؤں گا۔"

ہم دونوں چند منٹ تک اسی انداز میں اول فول بکتے رہے۔ اینڈریو نے ہمارے درمیان دخل نہیں دیا۔ مگر وہ ہماری گفتگو نہایت دلچسپی سے سن رہا تھا۔

"اسرائیل اور اسرائیلیوں کو قریب سے دیکھنے کی ایک صورت ہے۔" موقع پا کر اینڈریو نے نرمی سے وہ بات کہہ ڈالی جس کا میں منتظر تھا۔

"کیا؟" میں فضا میں ہاتھ لہرا کر اس کی جانب جھک گیا۔

"ہو سکتا ہے کہ تم اسے بُرا سمجھو۔" اس نے ایک گھونٹ لے کر

جھجکتے ہوئے کہا۔

"کم ظرف لوگ" میں نے تقریباً اسے ڈانٹ دیا۔ "بُرا سمجھیں گے تو ناکارہ کر دیں گے۔"

اس نے گلاس سے پھر ایک گھونٹ لیا اور باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ "اسرائیل کے لئے کام کرنا چاہو تو تمہاری مفادات حاصل ہو سکتے ہیں۔"

میں سرک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور تجسس آمیز سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "کیا واقعی ایسا ہونا ممکن ہے۔"

"میں ممکن بنا سکتا ہوں۔" اس کے چہرے پر پُراعتماد مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بکواس!" میں ہنس پڑا۔ "شاید تمہیں چڑھ گئی ہے۔"

اس مرتبہ اس کے باغیانہ رویے پر پُورا یقین آ گیا۔ "دوسری قومیت کے لوگوں کے مقابلے میں عربوں کو بھاری معاوضے ملتے ہیں۔ تم چاہو تو میں آج ہی بلکہ ابھی تم سے شرائط پر بات چیت کر سکتا ہوں۔"

"بات چیت کر سکتا ہوں۔" میں پھر ہنس پڑا۔ "تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اسرائیل نے تمہیں اس کام کا ٹھیکہ دیا ہو۔" اسی کے ساتھ میرا داہنا ہاتھ اپنی جیب میں رینگ گیا۔

"اس وقت مجھے بہت اختیارات حاصل ہیں۔ سیتا کی تلاش اور ہاشم کی سرکوبی کے لئے مجھے چند مقامیوں کی شدید ضرورت ہے، میں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے سکتا ہوں۔"

"مگر سیتا کا اسرائیل سے کیا واسطہ؟" ہاشم نے سوال کیا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ وہ ذاتی رقابتوں کا چکر ہے۔"

"وہ جھوٹ تھا۔ اُس وقت تم میرے لئے اجنبی تھے۔" غیر ارادی طور پر اس کا لہجہ سرگوشیانہ ہو گیا۔ "اس وقت البرونو بھی اسرائیل ہی کے لئے کام کر رہا ہے۔"

میرا ہاتھ یکلخت جیب سے باہر آ گیا جس میں زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی موجود تھی میرا خیال تھا کہ وہ ہتھیار اس کے لئے اجنبی ہو گا، مگر اس کا رویہ دیکھتے ہوئے یہ خوش فہمی فوراً ہی رفع ہو گئی۔

اس کا چہرہ یکلخت دھواں ہو گیا۔ آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اور وہ اپنا گلاس قالین پر پھینک کر صوفے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

پھر اس نے کچھ کہنے یا شاید چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن اسرائیل سے وابستگی کا اعتراف کر کے وہ اپنی موت کے پروانے پر آخری مہر ثبت کر چکا تھا۔ میں نے شیشی کا سیدھا سادا میکنزم چھیڑا اور باریک سی زہر میں بجھی ہوئی سوئی اس کے بدن کے اوپری حصے میں جلد میں اتر گئی اور ہاشم نے لپک کر وہ شیشی میرے ہاتھ سے لے لی۔

سوئی کے مسامات میں سمجھا ہوا وہ زہر بھی عجیب زہر تھا کہ اس کا شکار ہونے والے کے چہرے پر موت سے پہلے کے آخری تاثرات یوں چپک کر رہ جاتے تھے جیسے وہ کسی ٹھوس لاش کے بجائے تصویر ہو۔ موت کی ہولناک اذیت کو بھی اتنی مہلت نہیں ملتی تھی کہ وہ چہرے پر اثر انداز ہو کر آخری نقوش کو مسخ کر سکے۔

وہ واقعہ اس طرح ظہور پذیر ہوا کہ نہ ہاشم نے اس پر کوئی تبصرہ کیا، نہ میں نے کوئی لفظ کہا، بلکہ ہم دونوں گلاس اور بوتل وغیرہ سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے لگے۔

اس کام سے نمٹ کر مقتول کی جامہ تلاشی لی تو کوئی کارآمد چیز نہ مل سکی۔ مگر جب اس کی گھڑی اتاری گئی تو اس کے پینڈنٹ پر نہایت نازک اور نفیس ڈھلائی میں اسرائیل کا سرکاری نشان ابھرا ہوا تھا جس کے گرد عبرانی زبان میں کوئی عبارت موجود تھی۔ عبارت کے آغاز اور اختتام کے درمیان آر تھری کندہ تھا۔ میں نے وہ رسٹ واچ احتیاط سے اپنی جیب میں ڈال لی۔

ہمیں عمارت میں داخل ہوئے خاصا وقت ہو چکا تھا۔ پھر رات بھی تیزی سے گزر رہی تھی، لہٰذا ہم پر واپسی کا بھوت سوار ہو چکا تھا مگر پھر بھی ہم نے پورے فلیٹ کا سرسری جائزہ لے ڈالا۔ پھر کچن میں ٹوسٹر بن دیکھ کر مایوس ہونا پڑا۔ کاغذات اسی میں ڈال کر بہت احتیاط سے جلائے گئے تھے کیوں کہ آہنی جادر کا سارا روغن جل کر پپڑیوں کی صورت میں گر چکا تھا۔

سوختہ کاغذات کی راکھ کریدنے پر کوئی محفوظ پرزہ تک نظر نہیں آیا اور ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ فلیٹ سے باہر آ گئے۔

لفٹ کے ڈسپلے پر روشن ہندسے سے معلوم ہو رہا تھا کہ لفٹ نیچے رکی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نہایت پھرتی کے ساتھ سیڑھیاں عبور کر کے چوتھی منزل پر پہنچے تاکہ چوکیدار یا کسی اور نگراں کو ہماری آمد و رفت میں کسی عدم تسلسل کا شبہ نہ ہو اور پھر لفٹ کو طلب کرنے کے لئے بٹن دبا دیا۔

کسی نے لفٹ کو شاید دانستہ نیچے روکا ہوا تھا کیونکہ بٹن دبانے پر لفٹ کی پوزیشن ظاہر کرنے والا ہندسہ فوراً ہی معدوم نہیں ہوا۔ ہاشم نے اضطراب کے عالم میں دوبارہ بٹن کو دبانا چاہا لیکن میں نے ہوشیاری سے اسے روک دیا۔ اس طرح نیچے والوں میں سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ چوتھی منزل پر کسی کو روانگی کی غیر معمولی عجلت ہے۔

چند ثانیوں کے سنسنی خیز توقف کے بعد لفٹ حرکت میں آئی اور سرعت کے ساتھ چوتھی منزل پر آ کر رک گئی۔

دروازہ کھلا، ہمارے قدم آگے بڑھے اور ٹھٹک گئے۔

لفٹ کے فرش سے کم و بیش چھ فٹ کی بلندی پر سیاہ سوڈانی چہرے میں جڑی ہوئی دو اشتباہ آمیز نگاہیں ہماری طرف نگران تھیں۔

اگر وہ نیچے سے اوپر آیا تھا تو اسے لفٹ سے نکلنا چاہئے تھا۔ لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لفٹ کے فرش پر یوں جما کھڑا تھا جیسے ہمارے ساتھ ہی نیچے واپس جانے کا عزم رکھتا ہو۔

"فضل۔" لفٹ کے اندر سے ایک بھاری مگر دھیمی سی گنگناہٹ ابھری۔ اس شخص نے ہمیں باہر ٹھٹکتے دیکھ کر لبے دلی کے ساتھ لفٹ میں داخل ہونے کی دعوت دی تھی۔ ہم دونوں مشینی انداز میں لفٹ میں داخل ہو گئے۔

مگر گہرے سرمئی اونی جبے میں ملبوس اس سوڈانی نے ... بٹن پر رکھ دی جس سے دروازہ کھولا جاتا ہے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ لفٹ اس وقت تک روانہ نہ ہو سکے گی جب تک وہ سوڈانی اپنی بھدی انگلی اس بٹن سے نہ ہٹائے۔

"کس کا انتظار ہے؟" ہاشم نے پلٹ کر اس سے تند لہجے میں سوال کیا۔

سوڈانی مسکرا دیا۔ سیاہ لبوں کی اوٹ میں موتی جیسے سفید دانتوں کی چمکتی قطاریں اس وقت مجھے کسی چیتے کے دانتوں کی یاد دلا رہی تھیں۔

"میں اس عمارت کا نگراں ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم اس منزل پر کس سے ملاقات کرنے آتے تھے؟"

"کیا تمہیں مہمانوں سے اس طرح باز پرس کی ہدایت دی گئی ہے؟" ہاشم اس پر غصہ دکھاتے ہوئے بھی لہجہ دھیما ہی رکھا کیونکہ بصورت دیگر چوتھی منزل کے مکین اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔" اس نے کہا لیکن اس کے لہجے میں ندامت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ "یہ سوال میں نے اس لئے کیا ہے کہ اس منزل کے ایک فلیٹ کے مکین صبح سے باہر ہیں اور دوسرے فلیٹ والا جوڑا بھی نصف گھنٹے پہلے تفریح کے لئے نکل چکا ہے۔ پھر تم دونوں یہاں کیا کر رہے تھے...؟" آخری سوال کرتے ہوئے اس کا لہجہ قدرے تحکم آمیز ہو گیا تھا۔

سوڈانی کے الفاظ سن کر میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس کا شبہ اپنی جگہ بالکل جائز بلکہ لائق تحسین تھا۔ کیونکہ اس عمارت کے مکینوں کے مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری بڑی حد تک اسی پر عائد ہوتی تھی۔

وہ لمحات ہمارے لئے بہت نازک اور فیصلہ کن تھے۔

"ہمارے ہاتھ خالی ہیں۔ آخر تم ہم پر کس قسم کا شبہ کر رہے ہو؟" ہاشم نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے لجاجت سے سوال کیا۔

وہ خاموش ہو گیا اور اس کے لبوں پر فاتحانہ تبسم مچلنے لگا۔ "ہو سکتا ہے کہ تم نے نچلی تین منزلوں میں سے کسی پر قیمتی زیورات کی چوری کی ہو، کسی کی آبرو ریزی کی ہو، یا کوئی قتل کیا ہو اور پھر نیچے اترنے کے بجائے چوتھی منزل پر آ گئے ہو۔ تمہارے دہانوں سے شراب کی بُو بھی آ رہی ہے۔"

ہاشم نے بلا تکلف مجھ سے لی ہوئی شیشی جیب سے نکالی اور ایک زہریلا تیر سوڈانی کے بدن میں اتر گیا۔ اس نے حد سے زیادہ سچا و رکھ کے خود ہی موت کو للکارا تھا اور ہاشم اس پر وار کرنے میں قطعی حق بجانب تھا۔

اس وقت ہاشم نے بڑی قوموں کے اس سرکاری فلسفے پر عمل کیا تھا کہ بڑے مقاصد کے حصول کے لئے چھوٹے مہروں کو مسلسل پٹواتے چلے جانا کامیابی کی دلیل ہوتا ہے۔

مگر میں اس فلسفے پر زیادہ غور نہ کر سکا۔ جوں ہی سوڈانی کسی کٹے ہوئے وزنی شہتیر کی طرح لفٹ کے فرش پر گرا، اس کی انگلی بٹن سے ہٹ گئی۔ دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ بند ہوا اور لفٹ فوراً نیچے روانہ ہو گئی۔

میں نے جھپٹ کر تیسری منزل کا بٹن دبایا اور لفٹ مختصر سے وقفے کے بعد رُک گئی۔ اس بار میں نے دروازہ نہیں کھلنے دیا اور دوبارہ لفٹ کو چوتھی منزل پر لے گیا۔

وہاں میں نے بٹن دبا کر دروازہ کھولا اور پھر سوڈانی کی لاش اس خلا میں اس طرح ڈال دی گئی کہ خودکار طریقے پر دروازہ بند نہ ہو سکے۔ اس کارروائی سے نمٹ کر ہم دونوں لاش پر سے کود کر واپس باہر آ گئے۔

خودکار نظام کے تحت مقررہ وقفے کے بعد لفٹ کا دروازہ بند ہونے کے لئے سرکا مگر سوڈانی کے جسم سے ٹکرا کر دوبارہ کھل گیا۔

ہمیں کم از کم یہ اطمینان ہو گیا کہ سوڈانی کی لاش اس وقت تک دریافت نہ ہو سکے گی جب تک کوئی شخص سیڑھیوں کے ذریعے چوتھی منزل پر آ کر لفٹ کی خرابی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اس ہیجان خیز معرکے سے نمٹ کر ہم ان سیڑھیوں کے راستے نیچے اترے اور کسی سے ٹکرائے بغیر ہاشم کی کار میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

چند لمحوں کے وقفے میں ہم دونوں ایک ایک خون کر چکے تھے اور میرے ذہن میں بیچارے رمیش پانڈے کی مظلوم سی تصویر گردش کر رہی تھی۔

قتل و جدال کی ابتدا رمیش پانڈے سے ملاقات کے بعد ہی ہوئی تھی اور میں نے حامد العزیز کے تعاون سے رمیش پانڈے کے فلیٹ کی نگرانی کرنے والے دو پولیس افسروں کو زہریلی سوئیوں کا نشانہ بنایا تھا جب اس عمارت سے ہی دو ایسی لاشیں ملتیں جن میں زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں پیوست تھیں تو چاروں خون بلا مبالغہ ایک ہی کڑی میں پرو لئے جاتے جس کا واحد سرا پولیس کو رمیش پانڈے کی صورت میں میسر تھا جن کیلئے اگلی صبح کا سورج ہولناک مصائب کا بوجھ لے کر طلوع ہونے والا تھا۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟" کافی دیر کی خاموشی کے بعد ہاشم سے میں نے سوال کیا۔

"اپنے گھر۔" وہ بولا تو اس کی آواز گلوگیر تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"کچھ دیر کے لئے مجھے نہ چھیڑو۔ پُرانی یادوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔" اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

میں خاموش رہا۔

اس کا درد میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور خود فوکس ویگن کے انجن کے کرخت شور میں سوڈان روانگی کا منصوبہ مرتب کرنے لگا۔

بن غازی کی سڑکوں پر اتنی رات گئے بہت معمولی سا ٹریفک تھا اور سرد رات کے سناٹے میں ہماری کار کے انجن کا شور ایک آہنگ پر ایک ہی سُر پیدا کئے جا رہا تھا اور میں خاموشی سے اپنے خیالات کی رو میں ڈوبا ہُوا تھا۔

سیتا لیبیا میں کسی وجہ سے زیرِ عتاب آکر زنداں میں جا پہنچی۔ اور اسرائیلیوں نے خطیر رقم صرف کر کے البرونو کا سٹیلانو کو جیل سے سیتا کے اغوا پر مامور کر دیا۔ مگر سیتا قبل از وقت اپنی ہی کوششوں کے ذریعے جیل سے بحفاظت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

سیتا کہاں تھی؟

یہ سوال ہمارے لئے ایک پُراسرار معمہ بنا ہُوا تھا مگر الیشلر اور اینڈریو سے ملنے کے بعد ایک واضح صورتِ حال سامنے آ چکی تھی۔

البرونو کو سیتا کے اغوا کے لئے ایک لاکھ دینار کی رقم پیشگی ادا کی گئی تھی جو بلاشبہ توقع سے زیادہ خطیر رقم تھی۔ اور البرونو جانتا تھا کہ ایک لاکھ دینار صرف کرنے والے اس سے ہر قیمت پر سیتا کا مطالبہ کریں گے اور اگر اس نے ان کے سامنے جا کر اپنی بدترین ناکامی کی داستان سنائی تو اس کا مارا جانا یقینی تھا۔

ان ایک لاکھ دینار میں سے ساٹھ ہزار حمزہ نے البرونو سے اینٹھ لئے اور اس میں سے دس ہزار جیل کے وارڈن کو پہنچا دیئے جو سیتا کے فرار کے منصوبے کا اہم ستون تھا۔ مگر ان اخراجات کے باوجود البرونو کو پیشگی ملنے والی رقم میں سے چالیس ہزار دینار بچے تھے اور کامیابی کی صورت میں شاید اسے مزید ادائیگی کا بھی امکان تھا۔ لہٰذا یہ یقینی بات تھی کہ البرونو نہ اپنے یہودی سرمایہ کاروں کے خوف سے روپوش ہُوا تھا اور نہ ہی سیتا کے معاملے سے دستبردار ہُوا تھا [illegible] سا بھی تھا، اپنے وجود کو خفیہ رکھتے ہوئے سیتا کی تلاش میں مصروف تھا۔

الیشلر کے بیان کے مطابق اس کی بیٹی پچھلی رات سوڈان روانہ ہوئی تھی، وہ البرونو کی ایسی معتمد تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی خفیہ کمین گاہ کی حفاظت کرتی رہی تھی۔ البرونو کے مکان کے کچن میں کاغذات کی جلی ہوئی راکھ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی تھی کہ البرونو کی بہت سی اہم دستاویزات بھی ایلی کی تحویل میں تھیں جو اس نے اپنی روانگی سے قبل ڈسٹ بن میں ڈال کر نذرِ آتش کر دیں۔

اگر وہ کاغذات البرونو نے ہی جلائے ہوتے تو اسے غائب ہوئے کم و بیش ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور اس مدت میں ایلی اس فلیٹ میں مقیم تھی لہٰذا کاغذات کی وہ راکھ ہر اعتبار سے منتقل کر دی جانا چاہئے تھی۔

ایلی اور البرونو کے اس باہمی اعتماد نے میرے لئے یک بیک ایلی کا کردار بھی اہم بنا دیا تھا۔ اگر ایلی سوڈان ہی گئی تھی تو میرا بھی ادھر جانا ناگزیر تھا۔

اگر سوڈان میں البرونو مل جاتا تو میں براہِ راست اسے گھیر کر سیتا کے بارے میں باز پرس کر سکتا تھا۔ اس کے نہ ملنے کی صورت میں مجھے ایلی کا کھوج نکالنا پڑتا اور مجھے پُورا یقین تھا کہ ایلی سے البرونو کی نقل و حرکت کے بارے میں اہم باتیں اگلوائی جا سکتی تھیں۔

اہمیت کے اعتبار سے سیتا، البرونو اور ایلی ایک مثلث کے تین نقطے تھے جو کسی نہ کسی طرح آپس میں منسلک تھے اور میں ان تک رسائی حاصل کئے بغیر اپنے مقصد میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

سوڈان کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں بار بار اس مقتول نگراں کا سفید دانتوں سے سجا ہُوا سیاہ چہرہ سر ابھارتا رہا۔ جو البرونو کا سٹیلانو کی رہائشی عمارت کی لفٹ میں محض اپنی فرض شناسی کے باعث ہاشم کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اور پھر میں نے ہاشم کو چھیڑ دیا۔ "کن پُرانی یادوں میں کھوئے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ سوچتے سوچتے اپنی کار کہیں لڑا بیٹھو۔"

"میں نے اسے مار کر اچھا نہیں کیا۔" اس کی آواز معمول پہ آ چکی تھی۔ مگر لہجے پہ نہایت گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔

"یہ بعد کی پشیمانی ہے، اس وقت تمہارا وہ فیصلہ ہی بہترین تھا اگر اسے ہلاک نہ کیا جاتا تو اینڈریو کی لاش دریافت ہونے کے بعد وہی ہم دونوں کا حلیہ پولیس کو بتا دیتا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وقت گزرنے کے بعد موقع پر کئے گئے سو میں سے ننانوے فیصلے اکثر و بیشتر غلط محسوس ہوتے ہیں۔"

"ہم اسے اپنے تفصیلی جائزے کا موقع دیئے بغیر ہی بے ہوش کر سکتے تھے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

میں اسے پشیمانی سے نجات دلانے کے لئے مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنس دیا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ہم پہ نگاہ پڑتے ہی وہ شرم سے خود بے ہوش ہو جاتا۔" پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ محض شبہ کی وجہ سے لفٹ میں سوار ہو کر چوتھی منزل پہ آیا تھا۔ اسے بے ہوش کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی۔ اور خود کو خطرے میں پا کر وہ چیخ بھی سکتا تھا۔ اس کا واحد توڑ تو بس زہریلی سوئی میں ہی پوشیدہ تھا جو اپنے شکار کو کسی بھی قسم کی مزاحمت وغیرہ کا موقع نہیں دیتی۔"

"مگر وہ بہت معصوم آدمی تھا۔"

"شاید اس لئے کہ نہایت خاموشی سے مر گیا۔"

"اس کی آنکھوں میں سادگی اور چہرے پر معصومیت رچی ہوئی تھی۔" اس کے اندر کا آدمی ضرورت سے زیادہ حساس تھا۔ "اور سوڈانی تو ویسے بھی بہت سادہ لوح اور وفادار ہوتے ہیں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو کہ میں تمہارے گلے سے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دوں۔" میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "جو ہونا تھا سو ہو گیا، دُنیا کی کوئی طاقت اس سوڈانی کو زندہ نہیں کر سکتی مگر مجھے اس کے قتل کا مدتوں قلق رہے گا۔"

"اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" میں نے موضوع بدلنے کی نیت سے سوال کیا حالانکہ میں اس کے جواب سے واقف تھا۔

"کافی دن بعد اپنی چھت کے نیچے رات گزاروں گا۔"

"تمہاری یہ کار اچانک کہاں سے نمودار ہو گئی؟"

"روپوشی اختیار کرنے سے پہلے مرمت کے لئے ایک گیراج میں کھڑی کر دی تھی۔ آج تاخیر پر معذرت کر کے واپس لے آیا۔"

"نمبر پلیٹ کے ساتھ سرخ رنگ کی خصوصی پلیٹ کیا ہے؟"

"ایک طرح کا نیم سرکاری سفارتی نشان سمجھ لو۔" اس نے جواب دیا۔ "لیبیا کی حکومت جن فلسطینی نمائندوں کو تسلیم کرتی ہے، انہیں اپنی کار پہ یہ اعزازی تختی لگانے کا حق بھی دے دیتی ہے۔ اس کی موجودگی میں نہ اس کار کی تلاشی لی جا سکتی ہے اور نہ اس کے مسافروں پہ مقامی قانون کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔"

"خیال اس میں مصطفیٰ المرزوق ہی کیوں نہ سوار ہو؟"

وہ ہنس کر رہ گیا۔

سفر کا اختتام اوسط درجے کی آبادی میں واقع ایک یک منزلہ مکان پر ہُوا جہاں گہری تاریکی اور ویرانی کا راج تھا۔

پورچ میں کار کا انجن بند کر کے ہم دونوں اترے اور ہاشم نے باہر ہی لگا ہُوا سوئچ دبا کر برآمدے میں روشنی کر دی۔

گرد آلود فرش پر چند قدم آگے بڑھ کر ہاشم نے داخلی دروازے کا ہینڈل گھما کر خفیف سا دباؤ ڈالا اور غیر متوقع طور پر دروازہ کھل گیا۔

ہاشم بآوازِ ایک گہرا سانس لے کر اندر داخل ہو گیا اور کھٹکے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی وہ راہداری بھی روشن ہو گئی۔

"تو کیا تم اتنی عجلت میں روپوش ہوئے تھے کہ مکان کو مقفل کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"مکان مقفل تھا۔" اس نے نشست گاہ میں داخل ہوتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر تم نے تو چابی لگائے بغیر دروازے کا ہینڈل ایسے اعتماد سے گھمایا تھا جیسے تمہیں یقین تھا کہ دروازہ غیر مقفل ہو گا۔"

"میں جانتا تھا کہ میرا سراغ حاصل کرنے کے لئے میری عدم موجودگی میں بارہا اس مکان کی تلاشی لی گئی ہو گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

[illegible] پورے مکان کا جائزہ لینے کے بعد اس کے خیال کی مکمل تصدیق ہو گئی۔ سارے کمروں میں سامان بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ صوفوں کو پلٹ کر ان کے نیچے اسپرنگوں وغیرہ کو چھپانے کے لئے لگا ہُوا استر تک ادھیڑ دیا گیا تھا۔ اور ان تمام کارروائیوں کے بعد کسی بھی چیز کو دوبارہ اصلی حالت میں رکھنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

"اس بے رحمانہ تلاشی کے بارے میں کوئی شکایت یا احتجاج کرو گے؟"

"حسابِ دوستاں در دل۔" وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔ "انہوں نے تو صرف تلاشی ہی لی ہے مگر ہم نے شہر میں کئی خون کئے ہیں۔ ایسے میں کوئی شکایت زیب دے گی؟"

میں اپنے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دے کر رہ گیا۔

اس وقت ہم دونوں اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ صرف اپنے بستر درست کر کے ان پہ دراز ہو گئے۔

ہاشم سونے سے قبل ایک آدھ پیگ لینا چاہتا تھا مگر شیلف کا جائزہ لینے پر انکشاف ہُوا کہ تلاشی لینے والوں نے وہاں موجود تینوں بوتلوں کے پیندے تک نچوڑ لئے تھے۔

اگلی صبح میں خاصی دیر سے بیدار ہُوا اور مکان کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن ہاشم نے یہ بتا کر میری حیرت دُور کر دی کہ اس نے صبح سویرے ہی اپنے پُرانے باورچی اور خدمتگار کو بُلا لیا تھا۔ اور ان دونوں نے آناً فاناً میں مکان کی اندرونی حیثیت بحال کر دی۔

ناشتے کی میز پر میں نے ان دونوں کو بھی دیکھ لیا۔ ہاشم پہلے ہی نمٹ چکا تھا لہٰذا وہ تلخ قہوے کی ایک پیالی لے کر ٹیلی فون کی طرف چلا گیا۔

میرے ناشتے کے دوران وہ مسکراتا ہُوا واپس آ گیا۔ "ایلی کی منزل کا سراغ لگا لیا گیا ہے، وہ پرسوں رات ہی روانہ ہوئی تھی۔"

"یعنی الیشلر نے درست ہی کہا تھا۔" میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "مگر وہ یہاں سے نکل کر گئی کہاں ہے؟"

"وہ یوگوسلاوین ایئر لائنز کی بلغراد سے آنے والی پرواز سے

پرسوں رات گیارہ بجے روانہ ہوئی تھی۔ اس کا ٹکٹ بن غازی سے خرطوم تک کا تھا۔"

"پرواز براہِ راست تھی؟"

"نہیں۔" وہ چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔"بن غازی سے قاہرہ ہوتے ہوئے خرطوم پہنچی ہوگی۔"

"اور اگر وہ قاہرہ ہی میں اتر گئی ہو؟"

ہاشم کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی۔"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خرطوم تک کا ٹکٹ اور اپنے باپ سے سوڈان رہنا کا ذکر ایلی نے کسی ممکنہ تعاقب کو ناکام بنانے کے لئے کیا تھا۔ پھر تو اس کی منزل کا تعین ہی ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ قاہرہ اترنے کے بعد کسی دوسری پرواز سے کہیں اور نکل گئی ہوگی۔"

"میں محض امکانات پر غور کر رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔"بن غازی سے نکلنے کے بعد تو میں شاید کسی سے مشورہ نہ کر سکوں گا۔"

"تمہاری بات قرینِ قیاس لگتی ہے۔" وہ بولا۔"البرونو کا سٹیلا نو بہت گھاگ ایجنٹ ہے۔ اس سے ہر احتیاطی اقدام کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

"بن غازی سے خرطوم کا فاصلہ بہت زیادہ ہے جب کہ مصری سرحدیں یہاں سے قریب ہیں۔ سیتا کے لئے لیبیا سے فرار ہو کر مصر پہنچنا تو قرینِ قیاس نظر آتا ہے لیکن لیبیا کے شمالی ساحل سے چل کر پورا ملک گھومتے ہوئے جنوب مشرق کی انتہا میں سوڈانی سرحد میں داخل ہونے سے قبل ہی شاید وہ پکڑی جاتی۔ کیونکہ اس کی تلاش کی مہم ملک گیر پیمانے پر شروع کی گئی ہوگی۔"

"میں تمہاری بات بخوبی سمجھ رہا ہوں۔" وہ سگریٹ کا کش لے کر دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا۔"البرونو کے معاملے میں اس وقت ایلی ہمارے سامنے واحد سراغ ہے۔ قاہرہ میں میرے کئی اچھے دوست ہیں، ان سے تمہیں ہر قسم کی مدد ملے گی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایلی قاہرہ میں ہی اتر گئی تھی تو تم وہیں رک کر اسے تلاش کر سکو گے بصورتِ دیگر تم خرطوم جاسکو گے۔"

"خرطوم میں تمہارے کیسے مراسم ہیں؟"

اس نے مایوسانہ انداز میں اپنا سر ہلایا۔"خرطوم میں ہمارے صرف دو آدمی ہیں جو محض رسمی طور پر تنظیم کا دفتر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان سے تمہیں کوئی مؤثر مدد نہ مل سکے گی۔ وہ دونوں وہاں رہتے رہتے ناکارہ ہوگئے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔"سوڈان تو تمہارے حامیوں میں شامل ہے۔"

"بنیادی طور پر وہ ایک غریب ملک ہے۔" ہاشم نے کہا۔"اخلاقی طور پر وہ ہم سے بھرپور تعاون کرتے ہیں مگر عملی آویزش سے اپنا دامن بچائے رکھنا چاہتے ہیں۔ وہاں ہمیں سختی کے ساتھ مقامی قانون کی حدود میں رہنا پڑتا ہے۔"

"مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ تمہاری تنظیم میں کچھ ناکارہ لوگ بھی ہیں۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔"جہاں رسمی خط و کتابت سے زیادہ کچھ کام نہ ہو وہاں فعال ترین آدمی کی صلاحیتوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ بیروت میں وہ دونوں بہت زیرک سمجھے جاتے تھے مگر برسوں سے خرطوم میں پڑے رہنے کے باعث سپاٹ اور پرسکون زندگی کے عادی ہوگئے ہیں۔"

"اگر سیتا بدقسمتی سے خرطوم یا سوڈان ہی کے کسی اور علاقے میں جا نکلی تو وہاں وہ بالکل ہی بے یار و مددگار ہوگی۔"

ہاشم کے پاس میرے اس ہولناک اندیشے کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے نظریں جھکالیں۔

ہاشم نے اسی روز جدوجہد کرکے ۔۔۔ دو گھنٹے میں میرے پاسپورٹ پر تین ممالک کا ویزا لگوا دیا۔ جس کے بعد میں اُردنی باشندے مصطفیٰ المزروق کی ۔۔۔ حیثیت سے اردن کے علاوہ مصر، سوڈان اور لبنان کا سفر کر سکتا تھا جب کہ لیبیا کا ویزا پہلے سے موجود تھا۔

مگر پاسپورٹ پر اندراجات کرانے کے ساتھ ہی وہ چند بُری خبریں بھی لایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خصوصی اخباری ضمیموں کا ایک بنڈل موجود تھا جو پاسپورٹ دکھانے کے بعد اس نے میرے سامنے ڈال دیا۔

موٹی موٹی سرخیوں پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں چھ مقتول چہرے گردش کرنے لگے۔

ان کا سرخیل مفتی الیوسف کا کاؤنٹر والا شخص جارلی تھا جو میرے ہاتھوں لیبیا میں زہریلی سوئی کا نشانہ بننے والا پہلا شخص تھا۔ اس کے بعد حمزہ العلاوی ویران صحرا میں میرے اور حامد العزیز کے ہاتھوں بُری طرح لہولہان ہو کر حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث مر گیا تھا۔ پھر حمزہ کے انتقامی منصوبے کے جال میں پھنس کر ہم دونوں رمیش پانڈے سے ملنے پہنچے تو خطرہ بھانپ کر وہاں سے الٹے پاؤں بھاگنا پڑا۔ مگر جلد کے جالے بھی قانون کے محافظوں سے خونریز تصادم ہو ہی گیا اور دو باہمت پولیس افسر میرے ہاتھوں زہریلی سوئیوں کا نشانہ بن گئے۔ اور وہ اخباری ضمیمے ایک عمارت کے مقفل فلیٹ سے ایک نامعلوم غیر ملکی کی لاش کی دریافت کے ساتھ اسی عمارت کی لفٹ سے سوڈانی نگہبان کی لاش ملنے کی خبر دے رہے تھے۔

وہ دونوں لاشیں بھی زہریلی سوئیوں کا شاہکار تھیں۔ شہر میں پانچ لاشیں قلیل سے عرصے میں پائی جاچکی تھیں اور ہر مقتول یکساں حربے کا شکار ہوا تھا۔ جب کہ پولیس صحرا میں مدفون حمزہ کی لاش تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ مگر اخباری ضمیمے میں حمزہ العلاوی کی گمشدگی کے حوالے سے کھل کر لکھا گیا تھا کہ زہریلی سوئی سے شکار کی چھٹی لاش بھی

شہر کے کسی علاقے میں کسی بھی وقت مل سکتی تھی۔

اخبارات کی رائے میں پانچوں یکساں قتل ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ اور ان سنسنی خیز وارداتوں کی واحد زندہ کڑی، رمیش پانڈے کی صورت میں پولیس کی تحویل میں تھی۔ رمیش پانڈے کے قید میں ہوتے ہوئے نامعلوم غیر ملکی اور سوڈانی چوکیدار کی ہلاکت سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ رمیش پانڈے قاتل نہیں تھا مگر اس کا غیر قانونی کاروبار کرنے والوں کے کسی ایسے مضبوط گروہ سے تعلق تھا جو اپنی راہ میں مزاحم ہونے والے ہر انسان کو کسی حقیر اور بے جان سنگریزے کی طرح ٹھوکر مار کر ہٹا ڈالنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ان ہی خبروں کے مطابق پولیس کی تحویل میں رمیش پانڈے شدید بیمار ہو کر ہسپتال پہنچا ہوا تھا جہاں اپنے گروہ کے امکانی قاتلانہ حملے سے بچانے کے لئے اس کے کمرے پر مسلح فوجی پہرہ لگا ہوا تھا۔

اعلیٰ حکام کا خیال تھا کہ قاتلوں کا سفاک ٹولہ قانون کی تحویل میں موجود اپنے خلاف واحد گواہ کو ہر قیمت پر ختم کرنے کے لئے کوشاں ہوگا۔

"غنیمت ہے کہ وہ لوگ بالکل ہی غلط راہ پر لگے ہوئے ہیں۔" میں نے تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت گاہ سے ٹکتے ہوئے کہا۔

"بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پولیس ویزا کا ناجائز کاروبار کرنے والے کسی منظم گروہ کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر شہر میں کچھ اور خبریں گرم ہیں۔"

"وہ کیا؟" میں نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا۔

"سوڈانی چوکیدار اور اینڈریو کی لاش ملنے کے بعد پولیس نے یہ سراغ لگا لیا ہے کہ فلیٹ البرونو کا سٹیلا نو کا تھا اور فلیٹ میں موجود نسوانی ضروریات کا سامان دیکھنے کے بعد پولیس البرونو کی اسی داشتہ کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے جو اس کے ساتھ فلیٹ میں بھی رہتی رہی ہے۔"

"واقعی؟" میں نے بے اختیار سوال کیا۔"پھر تو ایلی کا نام زیادہ دیر تک پولیس سے پوشیدہ نہ رہ سکے گا اور پولیس ایلی سے ہر بات اگلوا لے گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگے۔" ہاشم پُرخیال انداز میں بولا۔"فوری خطرہ یہ ہے کہ ان وارداتوں سے البرونو کا تعلق ظاہر ہونے کے بعد سیتا کے پُراسرار فرار کا واقعہ یک بیک اہمیت اختیار کرلے گا اور نئے زاویوں سے تفتیش شروع کر دی جائے گی۔"

"اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ مجھے فوری طور پر لیبیا کی سرزمین کو خیرباد کہہ دینا چاہئے۔" میں ان خبروں سے تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

"شاید اب یہ بھی اتنا آسان ثابت نہ ہوگا۔" وہ بڑبڑایا۔

"تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟" میں بے تابانہ انداز میں اپنی نشست چھوڑ کر اس کے پہلو میں جا پہنچا۔

"فرانس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ سے آئے ہوئے سراغرسانی کے ماہرین شاید معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔" وہ نظریں جھکا کر پژمردہ لہجے میں بولا۔"زہریلی سوئیوں کے حوالے سے انہوں نے بہت سی پرانی کڑیاں یکجا کرلی ہیں۔"

"کن کڑیوں کی بات کر رہے ہو؟" لمحہ بہ لمحہ میرا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا اور میرے وجود میں سیکڑوں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

"پوٹاشیم سائنائیڈ میں بجھی ہوئی سوئیاں ریڈ بریگیڈ کا ایک اہم ترین اور خفیہ ہتھیار ہے جسے طویل عرصے کے بعد پہلی بار ال ایل کے طیارے کو تل ابیب سے پیرس کے بعد اغوا کے دوران استعمال کیا گیا اور اسرائیلی یہ معلوم کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے کہ تم اسی طیارے کے ذریعے استنبول سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگا۔"پھر فرانس میں اسرائیلیوں سے تمہارا کھلا تصادم ہوا اور تم نے وہاں بھی زہریلی سوئیاں استعمال کیں، لہٰذا ان معلومات کی روشنی میں انہوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس وقت صفدر علی لیبیا کی سرحدوں میں موجود ہے۔"

"مگر میں تو اب مصطفیٰ المزروق ہوں۔"

"تربیت یافتہ کتے نام بدلنے سے دھوکا نہیں کھا سکتے۔" وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔"اس نظریے پر پہنچنے کے بعد اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماہرین نے اپنے طور پر تل ابیب سے کچھ ایسی اشیا منگوائی ہیں جو وہاں تمہارے استعمال میں رہی ہیں اور اس بُو پر سدھائے ہوئے خونخوار کتوں کے ذریعے بن غازی کی مکمل ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔"

میرے جسم کے تمام مساموں سے یک بیک پسینے کی دھاریں بہہ نکلیں۔"یہ سب اتنی جلدی کیسے ہوگیا؟"

وہ جارلی کی لاش ملنے کے بعد سے ہی ان خطوط پر کام کر رہے تھے۔ مگر میں اپنی گرفتاری کے خوف سے چھپا ہوا تھا اس لئے ہمیں یہ معلومات نہ مل سکیں۔ آج میں نے ہوائی اڈے پر اپنی آنکھوں سے تین کتوں کو اپنے انگریز رکھوالوں سمیت اہم مقامات پر مامور دیکھا ہے اور یہی حال شہر سے نکلنے والی تین شاہراہوں کا ہے۔"

"وہ ہر گاڑی کو روکتے ہیں۔"

"سفارتی گاڑیاں بھی رُکے بغیر نہیں گزر سکتیں۔"

"مگر یہ تو صریحاً زیادتی ہے۔"

"حکام نے ہنگامی اختیارات کو بروئے کار لاکر یہ فیصلے کئے ہیں اور ہر سفارتی دفتر کو کل ہی گشتی مراسلوں کے ذریعے پیشگی اطلاعات دے دی گئی ہیں۔"

"ان تین شاہراہوں کے علاوہ بھی شہر سے نکلنے کے دوسرے راستے ہوں گے۔" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"دو راستے ہیں۔" وہ تفکر آمیز لہجے میں بولا۔"لیکن ان کچے اور ریتیلے راستوں پر اگر کسی غیر متعلقہ شخص کو بھی دیکھ لیا گیا تو شاید اسے پکڑ لیا جائے بلکہ زیادہ امکان تو یہ ہے کہ ان راستوں کو بھی کھلا نہ چھوڑا گیا ہوگا۔"

"تم نے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیا۔" میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ "مسائل ہی مسائل بتا رہے ہو۔ اس صورت حال سے نکلنے کی بھی کوئی تدبیر ہے یا میں خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں؟"

"حکام تمہیں بے خبری میں گھیرنا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اگر میں اپنے مخبروں سے رابطہ قائم نہ کرتا تو شاید یہ اطلاعات اب بھی نہ ملتیں۔ ہمارے سامنے اب ـــ ایک ہی موہوم سی امید باقی رہ گئی ہے۔"

"ساحل کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہارا درست اندازہ ہے تمہارا۔" وہ پھیکے انداز میں ہنس دیا۔ "ساحل پر تفریحی مشاغل حسب معمول جاری ہیں۔ مگر کل سے غیر معینہ مدت کے لئے سمندر میں نجی کشتیاں اتارنا جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ ورنہ ہم بآسانی کسی دوست کی موٹر بوٹ میں سوار ہو کر سو ڈیڑھ سو کلو میٹر دور نکل سکتے تھے۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ غوطہ خوری کا لباس پہن کر ساحل سے قریب رہتے ہوئے طرابلس کی سمت میں خلیج الصدرۃ کی کسی کھاڑی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔"

"اس سرد موسم میں؟" میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ "اور اگر سمندر میں گشت کرنے والی کسی مسلح بوٹ سے ہمیں دیکھ لیا گیا تو کیا ہوگا؟"

"موجودہ حالات میں تمہارا بن غازی میں رُک کے رہنا خطرناک ہے۔ مگر دوسری طرف یہاں سے نکلنا خطرناک ترین نظر آ رہا ہے۔"

کچھ دیر کے لئے فضا پر روح فرسا سکوت چھا گیا۔ ہم دونوں ہی سگریٹیں پھونکتے ہوئے سوچنے میں مصروف تھے۔

میری دانست میں میرے لئے اسرائیل بدترین قید خانہ تھا مگر میں وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ مگر لیبیا جسے میں دوستوں کی سرزمین سمجھ کر آیا تھا، میرے لئے ہولناک مقتل بنتی نظر آ رہی تھی۔ میرے فرار کی بحری، بری اور فضائی راہیں مسدود کی جا چکی تھیں اور بن غازی کے چوہے دان میں میرا ہانکا شروع ہو چکا تھا جسے جلد یا بدیر میری شکست پر منتج ہونا تھا۔

اس گمبھیر خاموشی کے دوران ہاشم نے کنکھیوں سے کئی بار میری طرف دیکھا لیکن ایک مرتبہ بھی مجھے مخاطب کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

"صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔" طویل سکوت کے بعد میں نے بھرائی ہوئی آواز میں سکوت توڑا۔ "اور دونوں صورتوں میں ہمیں ایک خون اور کرنا ہوگا۔"

میری طرف دیکھتے ہی ہاشم جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو؟ مجھے بتاؤ، شاید کوئی راہ نکالی جا سکے۔"

"فوری طور پر تم یا تمہارا کوئی آدمی بن غازی سے سینکڑوں میل دور طرابلس یا کسی اور شہر میں زہریلی سوئیوں سے کم از کم ایک یا زائد افراد کو قتل کرے۔" میں نے جذبات سے عاری، سرد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اس طرح حکام پوری توجہ نئے شہر پر مرکوز کر دیں گے اور میں خاموشی سے فرار ہو سکوں گا۔"

"ہم... مگر کسی بے گناہ کا قتل...؟"

اس نے ہکلاتے ہوئے احتجاج کرنا چاہا مگر میں نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "حمزہ العلاوی بے گناہ نہیں تھا۔ ہر شہر میں ایسے لوگ ملیں گے جو قتل کے سزاوار ہیں، مگر قانون کی گرفت سے بچے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو کی تلاش کرنا قاتل کا کام ہوگا۔ اپنا کام پورا کرنے کے بعد وہ زہریلی سوئیوں کی شیشی تلف کر دے گا۔"

"تت... تم کسی دوسری صورت کا بھی تو ذکر کر رہے تھے۔" میرے خطرناک اور جارحانہ تیور دیکھ کر ہاشم بوکھلا کر رہ گیا تھا۔

"دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو میرا استعمال شدہ لباس پہنا کر ایئرپورٹ بھیجو۔ جب خونخوار کتے سونگھ کر اس پر لپکیں گے تو فوری طور پر اسے صفدر علی سمجھ کر پکڑ لیا جائے گا اور ناکہ بندیاں ختم کر دی جائیں گی۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ جب تک وہ شخص اپنی شناخت کرائے گا، میں بہت دور نکل چکا ہوں گا۔"

"اس میں ایک ہی خطرہ ہے کہ بے خبری میں وہ شخص کسی کتے سے اتنا قریب نہ ہو جائے کہ وہ خونخوار درندہ اشتعال میں اچھل کر اس کا نرخرا دبوچ لے۔"

"اگر بچ جائے تو اس کی خوش نصیبی ہوگی۔ ورنہ میں تو اسے خون ہی شمار کروں گا۔" میں نے کہا۔

"یہ طریقہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔" چند ثانیوں کے بعد ہاشم کے حلق سے خفیف سی آواز نکلی۔ "وہ زندہ بچ گیا تو لباس کے بارے میں حکام کو یہ باور کرانا مشکل نہ ہوگا کہ وہ اسے تحفے میں دیا گیا تھا۔"

"بہتر نہیں، یہ طریقہ خطرناک ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ظاہر ہے کہ اس شخص کو بے خبری میں آلۂ کار بنایا جائے گا، اگر اس کے اعصاب مضبوط ہوئے تو وہ صورت حال واضح ہوتے ہی طیش کے عالم میں یہ انکشاف کر دے گا کہ فلاں شخص نے معاوضہ دے کر اسے مخصوص لباس میں فضائی سفر پر آمادہ کیا تھا اور ہم اپنا مقصد حاصل نہ کر سکیں گے۔ اس بندوبست کو یقینی بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جوں ہی اس پر کوئی کتا لپکے اس شخص کو کوئی نادیدہ گولی چاٹ جائے۔"

"ابھی تم ہی نے کہا تھا کہ جب تک وہ شخص اپنی شناخت کرائے گا، تم لیبیا سے بہت دور نکل چکے ہو گے۔" ہاشم میرے خون آشام مشوروں سے خائف نظر آ رہا تھا۔

"کہا تھا۔" میں نے سخت لہجے میں اعتراف کیا۔ "مگر ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمیں پہلے سے یقینی اور بے داغ منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔"

"اگر تم چند روز کے لئے یہیں گوشہ نشین ہو جاؤ تو رفتہ رفتہ سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں۔" میں نے ادھ جلی سگریٹ کو جوتے کے تلے سے مسلتے ہوئے کہا۔ "مگر سیتا لاپتہ ہے اور رابرٹو کسی بھوکے درندے کی طرح اس کے تعاقب میں لگا ہوا ہے۔ میں اس صورت حال کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کر سکتا۔"

وہ خفت آمیز انداز میں خاموش ہو گیا۔

میں خاصی دیر تک اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ لیکن جب سکوت طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا تو مجھے اس کو ٹوکنا پڑا۔

"میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔"

اس نے آہستہ آہستہ مگر پُریقین انداز میں اپنا سر اوپر اٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "میرے لئے دونوں ہی صورتیں ناقابل عمل ہیں۔" اس کا لہجہ اس بار نپا تلا اور پُراعتماد تھا۔ "میں فوری طور پر یہاں یا کہیں اور ایک یا دو واجب القتل آدمیوں کو نہیں تلاش کر سکتا۔ بے گناہوں کے خون کا بوجھ لے کر میں ایک پل بھی سکون سے زندہ نہ رہ سکوں گا، یہ اور بات ہے کہ خود میرا اگلا سانس آخری ثابت ہو۔ تم یقین کرو کہ سوڈانی حاجی کے قتل کے بعد سے اب تک میرا ضمیر مجھ پر شدید ملامت کر رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ بوجھ اٹھانے کا اہل نہیں ہوں۔"

میرے لئے اس کا جواب دو ٹوک تھا۔ میں نے جھلاہٹ کے عالم میں ایک جھٹکے سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"کیا ہوا؟" اس نے لپک کر میرا بازو تھام لیا۔ "میری زبان سے سچ سن کر ناراض ہو گئے؟"

"جس کا مقدر اس سے ناراض ہو، وہ کسی اور سے کیا ناراض ہوگا۔" میں نے تلخ مگر آزردہ لہجے میں کہا۔ "شکوہ یہ ہے کہ تم نے مجھ سے بہت دیر میں اور بڑے خطرناک مرحلے پر سچ بولنے کا فیصلہ کیا، میں نے تو بہت پہلے تم سے اجازت چاہی تھی کہ میں لیبیا کی سرزمین پر اپنی بقا کی جنگ تنہا لڑوں گا مگر اس وقت تم نے میرے قدموں میں امیدوں کی وزنی زنجیریں ڈال کر مجھے روک لیا۔ مجھے افسوس ہے برادر ہاشم کہ میری وجہ سے تمہیں ایک ایسا قتل کرنا پڑا جس پر تم نادم ہو۔" میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا پھر بولا۔ "ایک میں ہی ایسا بے ضمیر شخص ہوں جو تل ابیب سے یہاں تک فلسطین اور فلسطینیوں کے نام پر ان کے دشمنوں کے لہو کی ہولی کھیلتا چلا آ رہا ہوں۔"

"طنز اور ملامت کے تیر نہ برساؤ۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "اس وقت تم جذباتی ہو رہے ہو، ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو گے تو مجھے اتنا برا نہ پاؤ گے۔ میں اب بھی تمہاری ہر ممکنہ خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

میں چند ثانیوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تھکے ہوئے مغموم انداز میں ہنس دیا۔ "مجھے ایک تیز رفتار کار کی ضرورت ہے جو میں کہیں سے اٹھا لوں گا۔ زہریلے تیروں کی دوسری شیشی جو تمہارے پاس ہے وہ مجھے لوٹا دو۔ اس کے علاوہ کچھ دستی ہتھیار دے دو جو ایک بریف کیس میں سما سکیں۔"

"تو تم نے واقعی اپنی جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"کسی تاریک کمرے میں دبک کر موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آگے بڑھ کر موت کے دہانے سے اپنی زندگی چھین لی جائے۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر تم یہ مدد بھی نہیں کر سکتے تو کوئی حرج نہیں، میں دوست کی طرح تم سے گلے مل کر رخصت ہوں گا۔"

"تمہاری زبان کی دھار بہت تیز ہے۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "میرے لئے تم جیسے ضدی شخص کو قائل کرنا بہت دشوار ہے۔"

"میں نے اب جو فیصلہ کیا ہے وہ موجودہ حالات میں ناگزیر ہے۔"

"تو کیا تم سڑک کے راستے قاہرہ جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس کی الجھن آمیز نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"اس بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"آخر تم کیا کرنے جا رہے ہو؟ مجھے کچھ تو بتاؤ۔"

"میرے منصوبے کے بارے میں زیادہ تجسس کا اظہار نہ کرو۔" میں نے سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوگا، کل کے اخبارات کے ذریعے تمہارے علم میں آ جائے گا، اگر میں نے ابھی تمہیں سب کچھ بتا دیا تو میری مہم کی ناکامی کی صورت میں تمہارا ضمیر میرے بُرے انجام کے لئے تمہیں بھی ذمے دار ٹھہرائے گا اور میں تمہارے مزاج کو سمجھنے کے بعد تمہیں ایسے کسی کڑے امتحان سے دوچار کرنا نہیں چاہتا۔"

"مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم کوئی اندھی چال چلو گے۔" وہ بھرائی ہوئی اضطراری آواز میں بولا۔ "ابھی تمہیں خود علم نہیں کہ تم کیا کرو گے اور اس کا امکانی انجام کیا ہوگا۔ یہ خودکشی ہوگی، صریحاً خودکشی۔"

"میرے ذہن میں منصوبے کی تمام جزئیات بالکل واضح ہیں۔" میں نے نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تیز رفتار کار، دستی بم اور زہریلی سوئیاں میں بلاوجہ طلب نہیں کر رہا، اگر کامیاب رہا تو واپس تمہارے ہی پاس آؤں گا۔"

"واپس آؤ گے؟" اس نے حیرت اور بے یقینی سے سوال کیا۔ "کامیابی کی صورت میں میرے پاس واپس آؤ گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ناکام رہا تو ہسپتال یا کسی قید خانے میں پہنچا دیا جاؤں گا، یہ امکان بھی ہے کہ براہ راست تدفین کی ہی نوبت آ جائے۔"

"تمہیں اپنی ذات کے بارے میں ایسے بے رحمانہ فیصلے کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔" وہ یک بیک برہم ہو گیا۔ "تم سمجھتے ہو کہ اپنی جان پر کھیل کر تم سیتا کی کوئی لازوال خدمت انجام دو گے۔ جس کی بنا پر وہ بیوگی کے عالم میں بھی فخر سے اپنا سر بلند کر کے چل سکے گی؟"

"میرے ذہن میں ایسی کوئی احمقانہ بات نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی

سے کہا: "میرے دل میں زندہ رہنے کی امنگ اب بھی باقی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ میں جس معرکے کو جرأت کا امتحان سمجھ رہا ہوں، اسے تم خودکشی قرار دے رہے ہو اور بات صرف اتنی ہے کہ تم محض تماشائی ہو جبکہ میں خود اپنی نگاہوں میں ایک عبرت انگیز تماشا بن کر رہ گیا ہوں اور اب اس تہمت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ چند ثانیوں تک ہونٹ بھینچے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتا رہا اور میں مسلسل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا رہا۔

آخر کار وہ ضبط نہ کر سکا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نشست چھوڑ کر اندرونی کمرے میں چلا گیا۔

وہ اگر کٹر اصول پرست تھا تو میں بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ میں اسے یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ دوستی میں بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں اصولوں کو فراموش کر کے محض دوستی کے جذبے کی لاج رکھنی پڑتی ہے اور اگر انسان ایسے مواقع پر بھی اپنے مقام سے جنبش نہ کرے تو اسے انسان کے بجائے پتھر کا ایک متحرک مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔

چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فینسی بریف کیس جھول رہا تھا جو اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی نکال کر مجھے تھما دی اور قدرے درشت لہجے میں بولا: "اس بریف کیس میں تین دستی بم ہیں، ایک آتش گیر، دوسرا بارودی اور تیسرا دھوئیں کا گرینیڈ ہے۔"

"تمہارے مکان کی تلاشی میں یہ اسلحہ کیسے بچ گیا؟"

"مجھ پر شبہ نہ کرو، بریف کیس کھول کر دیکھ لو۔" وہ تلخ لہجے میں بولا: "چاہو تو ایک گرینیڈ اسی مکان پر آزما سکتے ہو، وہ تینوں اصلی اور کارآمد ہیں میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا ہے۔"

میں نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹ ڈالا، اور جھلائے ہوئے لہجے میں کہا: "تمہارا دماغ چل گیا ہے، لعنت ہو شبہ کرنے والے پر، میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا اس مکان میں کوئی خفیہ ٹھکانا بھی ہے؟"

"تم اب چلے ہی جاؤ تو بہتر ہوگا۔" وہ میری وضاحت پر ندامت آمیز لہجے میں بولا: "ایسا نہ ہو کہ ہم آپس میں ہی دست و گریباں ہو جائیں۔"

"کار چرانا ہی پڑے گی؟" میں نے بریف کیس احتیاط سے اپنی گود میں رکھتے ہوئے مصالحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"ظاہر ہے۔" اس نے شانے اچکا کر کہا: "چاہو تو پچھلے والی گلی سے ایک بیوک لے جا سکتے ہو، ادھر دو تین گاڑیوں میں ہمیشہ چابیاں موجود رہتی ہیں، ان ہی میں ایک طاقت ور بیوک بھی ہے۔"

میرے استفسار پر اس نے گاڑیوں میں چابی کی موجودگی کا سبب بھی بتا دیا۔ وہ تینوں گاڑیاں ایسے مقام پر کھڑی کی جاتی تھیں کہ گلی میں بہت کم جگہ رہ جاتی تھی اور اگر رات گئے اس طرف پانی کا کوئی ٹرک یا ایمبولینس وغیرہ آ جاتی تھی تو اسے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ملتا تھا لہٰذا اگنیشن میں موجود چابی کے ذریعے ہنگامی ضرورت کے تحت کوئی بھی ان گاڑیوں کو آگے بڑھا کر راستہ بنا سکتا تھا۔

میرے لئے ہاشم کی یہ وضاحت خاصی حیرت ناک تھی ایک نودولتئے معاشرے میں شہری اور اجتماعی ذمے داریوں کا اتنا گہرا شعور عجوبے سے کم نہیں تھا۔

"یہاں چوری کو رشوت کے بعد دوسرا بدترین جرم سمجھا جاتا ہے۔" اس نے میری حیرت بھانپتے ہوئے کہا۔ اس کا مزاج آہستہ آہستہ اعتدال پر آ گیا تھا: "سال بھر میں چوری کے اکا دکا واقعات ہوتے ہیں جن میں ہمیشہ غیر ملکی ہی ملوث ہوتے ہیں ورنہ لیبیا میں چوری — نہیں ہوتی۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے۔" میں ہنس پڑا: "اس بار بھی کار چرانے والا ایک غیر ملکی ہی ہوگا۔"

"غیر ملکی!" وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا: "کیا تمہارے سارے ہم وطن تمہارے ہی جیسے ہوتے ہیں؟"

میں اس کے معصومانہ سوال پر ہنس پڑا: "اگر سارے فلسطینی ہاشم الاحمد الصلح جیسے ہوتے ہیں تو میرا جواب اثبات میں ہے۔"

"موہوم سی خواہش تو پہلے بھی تھی مگر تم سے ملنے کے بعد پاکستان دیکھنے کی آرزو شدت اختیار کر گئی ہے۔"

"میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ میرا ملک میرے حوالے سے بھی پہچانا جا رہا ہے لیکن تم برا نہ ماننے کا وعدہ کرو تو ایک بات کہوں؟"

"کہہ ڈالو۔"

"فلسطین کے مسئلے میں ہر پاکستانی جذبات کی پوری شدت کے ساتھ ملوث ہے لیکن میرے ملک میں تعلیم کے حصول کے لئے وظائف پر آنے والے بعض فلسطینی طلباء کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر انہیں مایوسی ہوتی ہے۔"

"وہ کیوں؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں گراں قدر وظائف ملتے ہوں اور وہ اپنی ضروریات سے بچ رہنے والی رقوم عیاشی پر صرف کرتے ہوں مگر یہ بات مصدقہ ہے کہ کچھ لڑکے بے تحاشا عیاشیوں میں ملوث رہتے ہیں۔"

"یہ تو بڑی افسوسناک بات سنائی تم نے۔" وہ شرمندہ سا ہو گیا: "انہیں بڑی چھان بین کے بعد عظیم توقعات کے ساتھ برادر ممالک میں بھیجا جاتا ہے۔"

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو وہ نو بجا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں مزید کچھ دیر ہاشم کے پاس رک سکتا تھا تاکہ رات کے سناٹے میں مجھے اپنا منصوبہ پوری طرح روبہ عمل لانے کی سہولت حاصل رہے۔

"مگر میں نے تمہیں ایک حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔"

"تم نے اس کا جواز بھی درست ہی بتایا ہے۔" وہ بولا: "فاضل پیسہ نوجوان خون کو پوری قوت سے گمراہی کی طرف دھکیلتا ہے پھر دوسری بات یہ ہے کہ وہاں انہیں کوئی دیکھنے اور ٹوکنے والا بھی نہیں ہوتا۔"

"یہ تمہارے سمجھنے کی باتیں ہیں، میں نے تو ذاتی تجربے کی روشنی میں تمہیں یہ بات بتائی ہے، ایسی سرگرمیوں سے تمہارے کاز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔" میں نے اس موضوع کو بدلنے کی نیت سے کہا۔

وہ خود بھی شاید مزید شرمندگی سے بچنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے خود ہی قاہرہ کا ذکر چھیڑ دیا۔

اس نے مجھے قاہرہ میں اپنے چند دوستوں کے نام اور پتے بھی دیئے جو وہاں میری ہر طرح مدد کر سکتے تھے۔

سینا کے بارے میں حالات اور واقعات کی مدد سے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس کے لئے لیبیا سے محفوظ طریقے پر فرار ہو کر سوڈان کے مقابلے میں مصر پہنچنا زیادہ آسان تھا جبکہ اس کے تعاقب میں لگے ہوئے خونخوار ایجنٹ البرولو کا سٹیلانو کی فرانسیسی محبوبہ ایلی کی خرطوم روانگی ان قیاس آرائیوں کی نفی کر رہی تھی۔

بہرکیف میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر میں لیبیا میں کسی بڑے خطرے سے دوچار ہوئے بغیر سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تو قاہرہ پہنچ کر پہلے وہیں سینا کو تلاش کروں گا اور بالفرض وہاں اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا تو خرطوم پہنچ کر البرولو یا ایلی کو تلاش کروں گا۔

دس بجے رات میں ہاشم کو الوداع کہہ کر اس کے مکان سے نکل آیا۔ میرے ہاتھ میں ہتھیاروں سے بھرا ہوا بریف کیس جھول رہا تھا اور جیبوں میں خطیر رقم کے ساتھ ہی زہریلے تیر برسانے والی دو شیشیاں بھی موجود تھیں۔

سرد رات کے گمبھیر سناٹے میں فٹ پاتھ پر میرے قدموں کی مدھم سی چاپ کسی نقارے پر پڑنے والی ضربوں کی طرح گونج رہی تھی۔ میں کچھ دور آنے کے بعد داہنے ہاتھ پر پہلی گلی میں گھوم گیا، چند ثانیوں بعد مجھے دوبارہ داہنی طرف گھومنا پڑا اور میں ہاشم کے مکان کی عقبی گلی میں داخل ہو گیا۔

وہ پختہ گلی بمشکل دس فٹ چوڑی تھی اور اس طرف روشنی کا انتظام بھی خاصا معقول تھا مگر جو بات میرے لئے مسرت کا باعث بنی وہ وہاں چار عدد چمکتی ہوئی نئی کاروں کی موجودگی تھی۔

ان میں سے تیسری کار جدید ساخت کی بیوک تھی۔ دور ہی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد میں محتاط مگر نپے تلے انداز میں بیوک کی طرف بڑھنے لگا۔

یخ بستہ ہوائیں چلنے کی وجہ سے علاقے کے سارے مکین کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اندر دبکے ہوئے مصنوعی حرارت سے لطف اندوز ہو رہے تھے پھر رات بھی خاصی بیت چکی تھی لہٰذا وہ عقبی گلی بالکل ویران پڑی ہوئی تھی۔

میں نے آخری بار گردن گھما کر قرب و جوار کا جائزہ لیا اور بیوک کی ڈرائیونگ سیٹ کی سمت کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو پوری طرح کامیاب رہی۔

دروازہ کھلتے ہی میری عقابی نظروں نے ڈیش بورڈ کے قریب اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی چابی کی جھلک بھی دیکھ لی۔

میں نے آہستگی سے دروازہ بند کر کے چابی گھمائی اور سارا وہ ہولناک مشینی درندہ ایک جھرجھری لے کر بیدار ہو گیا۔

اس کار کے گیئر کا نظام خودکار تھا۔ میں نے گیئر لیور کو پارکنگ کی پوزیشن سے پیچھے دھکیل کر ریورس میں ڈالا اور آہستہ رفتار سے چند گز پیچھے ہٹانے کے بعد کار کو آگے بڑھا لیا۔

اگلی کار کے پہلو سے گزرتے ہوئے مجھے خاصی دشواری ہوئی مگر غنیمت یہ ہوا کہ میں کہیں ٹکرائے بغیر بیوک کو باہر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

ہیڈ لیمپس کا سوئچ مجھے تیسری کوشش میں ملا اور میں تیز روشنی کی اس چادر کے تعاقب میں بڑی سڑک پر آ گیا۔

ڈرائیونگ پر پوری توجہ مرکوز کرنے سے قبل میں نے احتیاط سے کار کے مختلف کنٹرولز اور سوئچوں کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر یک بیوک کی رفتار بڑھا دی۔

ہاشم نے بن غازی سے مصر کی سرحد کی طرف جانے والی شاہراہ کے بارے میں زبانی طور پر میری اتنی عمدہ رہنمائی کی تھی کہ میں نہایت اعتماد کے ساتھ اس کی بتائی ہوئی نشانیوں سے دائیں اور بائیں گھومتے ہوئے آخر کار اس چمکتی ہوئی ساحلی شاہراہ پر آ نکلا جو تھوڑی دور چلنے کے بعد مصری سرحد کا رخ اختیار کر لیتی تھی۔

کار کے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں میری نگاہیں اس سپاٹ اور ویران سڑک سے زیادہ حدِ نظر پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس راستے کی ناکہ بندی کس مقام پر کی گئی ہو گی۔

اس وقت میرا دل آنے والے نامعلوم مگر فیصلہ کن لمحات کے تصور سے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا، میں نے بریف کیس اپنے پہلو میں سیٹ پر رکھ کر کھول دیا تھا تاکہ وقتِ ضرورت کوئی بھی گرینیڈ فوری طور پر استعمال کر سکوں زہریلے تیر پھینکنے والی پرانی شیشی پر انحصار کرنے کے بجائے میں نے نئی شیشی بائیں ہاتھ میں دبائی ہوئی تھی جس کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ کم از کم آنے والے معرکے میں آخر تک اپنی مہلک صلاحیت کے ذریعے میرا ساتھ دے گی۔

رفتہ رفتہ سڑک کے خم کے ساتھ میرے بائیں جانب پھیلا ہوا ساحل ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں اتنی دور چلا گیا کہ لہروں کے بپھرنے کا شور بھی معدوم ہو گیا۔ اس سڑک پر اب روشنی کا سرکاری سلسلہ بھی باقی نہیں رہا تھا بس تیز روشنی کی دور تک پھیلی ہوئی ایک چادر بیوک سے آگے سیاہ سڑک اور ریتیلے ٹیلوں پر سبک رفتاری سے تیر رہی تھی جبکہ

عقب نما آئینوں میں بیوک کے پیچھے پھیلا ہوا مہیب اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

اس سڑک کے پُرہول سناٹے میں کار دوڑاتے ہوئے مجھے دس منٹ گزر گئے اور پھر اچانک ہی مجھے سڑک کے کنارے ریت میں نصب خیمے کا دھندلا سا ہیولا نظر آیا جو اگلے ہی لمحے واضح ہو گیا۔

میں نے اچانک کار کی رفتار کم کر دی اور میرا ذہن نہایت تیزی کے ساتھ آنے والے لمحات کے بارے میں فیصلے کرنے لگا۔

پھر ان خیموں کے قریب ایک دوسرے میں گڈمڈ چند ہیولے نظر آئے ان میں سے کوئی سرخ شیشے والی ٹارچ روشن کر کے مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

ایک ڈیڑھ منٹ میں ساری صورتحال عیاں ہو گئی۔

اس خیمے کے قریب اوورکوٹ وغیرہ میں لپٹے ہوئے تین افراد موجود تھے ان کے ساتھ ہی زنجیر میں بندھا ہوا ایک خاصا قدآور کتا بھی تھا جو فضا میں منہ اٹھائے نہایت بے چینی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اس کے علاوہ سڑک کے دونوں جانب ریت میں آہنی یا چوبی کھونٹے نصب کر کے ان سے اس طرح زنجیر باندھ دی گئی تھی کہ کسی بھی سواری کے لئے وہاں رکنا ناگزیر تھا۔

آگے بڑھ جانے کی دو ہی صورتیں تھیں۔ پہلی صورت یہ تھی کہ کار کو ریت میں اتار کر آگے جایا جانا ممکن تھا لیکن اس طرح کار کے ریت میں دھنس جانے کا شدید خطرہ تھا جس کے بعد وہ لوگ فرار کی کوشش کرنے والے کو بآسانی پکڑ سکتے تھے اور پکڑ لیتے تو شاید انہیں خود زحمت بھی نہ کرنا پڑتی بلکہ میری بُو پر سدھایا ہوا خونخوار کتا زنجیر تڑا کر خود ہی مجھ پر آن پڑتا۔ شاید ان لوگوں نے شاہراہ کی ناکہ بندی کے لئے اس دور دراز مقام کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ انہیں پورا یقین تھا کہ سڑک سے اترنے کی کوشش کرنے والا کوئی بھی شخص ان کی گرفت سے زیادہ دور نہیں نکل سکے گا۔

دوسری صورت اس سے زیادہ خطرناک تھی اگر میں ان کے اشارے کی پروا کئے بغیر تیز رفتاری سے آہنی زنجیر توڑتا ہوا آگے نکلتا چلا جاتا تو نہ صرف کار کے انجن اور ریڈی ایٹر کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا، بلکہ میں خود بھی زخمی ہو سکتا تھا۔

ان دونوں خطرات سے قطع نظر اگر میں کسی طرح وہاں رکے بغیر آگے بڑھنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو میری ذات یک بیک ان کی تمام تر توجہ کا مرکز بن جاتی اور اس شاہراہ پر میرا تعاقب شروع ہو جاتا جس کا اختتام میرے لئے کسی طرح خوشگوار ثابت نہ ہوتا اور محض اسی وجہ سے میں نے ابتدا ہی سے فرار کی کسی کوشش کو اپنے منصوبے کا جزو بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے دور ہی سے رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ پھر مجھے ریت پر ایستادہ خیمے میں روشنی بھی نظر آئی، خیمے سے ذرا دور سڑک کے کنارے لمبے لمبے ایریل والی دو عدد کاریں بھی موجود تھیں۔

آخر کار ان کے خدوخال بھی واضح ہو گئے۔ ان میں دو سفید فام تھے اور ان ہی میں سے ایک نے کتے کی زنجیر تھامی ہوئی تھی، تیسرا کوئی مقامی معلوم ہو رہا تھا، روشن ٹارچ اسی کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔

ان سے چند سو فٹ کے فاصلے پر میں نے کار کو سڑک کے کنارے پر لا کر رفتار اتنی سست کر دی تھی کہ وہ دوسرے گیئر میں رینگ رہی تھی ٹارچ والے نے مجھے اپنی ہدایت پر عمل پیرا دیکھتے ہوئے آسودہ انداز میں اپنا ٹارچ والا ہاتھ گرا لیا اور وہ تینوں کتے سمیت ریت سے چند قدم آگے بڑھ آئے۔

میرے لئے وہ زاویہ بہت مناسب تھا۔ رینگتی ہوئی بیوک کا خودکار گیئر اس وقت میرے لئے سب سے بڑا ہتھیار تھا، میں نے اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اچانک کار کی رفتار بڑھا دی، دیوہیکل بیوک کسی منہ زور گھوڑے کی طرح اچھل کر تیزی سے آگے بڑھی، میں نے تھوڑا سا اسٹیئرنگ کاٹا اور ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ اپنی سیٹ پر اچھل کر رہ گیا۔

بیوک ان چاروں کو ایک ساتھ روندتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی

اگر میں تصادم کا جھٹکا سہنے کے بعد فوری طور پر اپنے اعصاب پر قابو نہ پاتا تو کار گہری ریت میں جا کر پھنس جاتی۔

آہنی زنجیر کے قریب میں نے کار روک دی مگر انجن بند کئے بغیر ہینڈ بریک لگا کر پھرتی سے نیچے آ گیا۔

ان تینوں میں سے ایک کربناک انداز میں زور زور سے کراہ رہا تھا۔ کتے کا دھڑ بری طرح کار کے نیچے کچلا گیا تھا، بقیہ دو افراد بے حس و حرکت خون میں نہائے ہوئے پڑے ہوئے تھے، ایک کا چہرہ کچلا گیا تھا، دوسرے کی حالت بھی ابتر تھی مگر میرے پاس ان کے تفصیلی معائنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں نے یکے بعد دیگرے چار زہریلی سوئیاں ان تینوں کے علاوہ کتے کے بدن میں بھی اتار دیں اور واپس ہو گیا۔

آہنی زنجیر کا ایک سرا کھونٹے میں نصب تھا جبکہ دوسری طرف ایک کڑی کھانچے میں پھنسی ہوئی تھی، میں نے اوورکوٹ کے دامن سے پکڑ کر وہ کڑی نکال دی اور زنجیر سڑک پر آ گئی۔

کار کو سڑک پر لا کر میں تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ میری نگاہیں عقب نما آئینے پر جمی ہوئی تھیں اور اگر وہاں ان تینوں کے سوا کوئی اور موجود تھا تو اسے فوری طور پر سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کسی ایک میں میرے تعاقب میں روانہ ہونا چاہئے تھا مگر شاید وہاں ان تینوں کے سوا کوئی اور متنفس موجود ہی نہیں تھا۔

دو ڈھائی میل آگے نکل آنے کے بعد میں نے اس ویران اور اندھیری شاہراہ پر یو ٹرن لیا اور واپس اسی چوکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں کسی دوسری گاڑی کے نمودار ہونے سے قبل جلد از جلد اپنا ادھورا کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔

میرا کام مکمل ہو چکا تھا، اس حادثے کا کوئی گواہ زندہ نہیں بچا تھا، زہریلی سوئیوں کے ذریعے میں نے ان کی ہلاکت کو یقینی بنا دیا تھا۔

میں بیوک میں تیزی کے ساتھ شہر واپس روانہ ہو گیا۔ سارا معاملہ میری توقع سے زیادہ آسانی کے ساتھ نمٹ گیا تھا اور میں ہاشم سے لئے ہوئے دستی بم شکریئے کے ساتھ اسے واپس کر سکتا تھا۔

بن غازی کی طرف لوٹتے ہوئے سب سے پہلے میں نے اس شاہراہ سے اپنا راستہ تبدیل کیا جو مصر کی طرف جاتی تھی۔ اس کے بعد ناہموار گلیوں میں پھنس گیا جب کافی بھٹکنے کے بعد بھی راستہ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے ایک سنسان مگر آباد علاقے میں گاڑیوں کے درمیان بیوک پارک کر دی۔

اس جگہ روشنی ناکافی تھی اور کسی بھولے بھٹکے آدمی کیلئے بیوک کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

انجن بند کر کے میں عقبی سیٹ کے پائیدان میں دبک گیا۔

میں نے اسی حالت میں کئی گھنٹے دھڑکتے دل کے ساتھ گزارے اتنی رات گئے میری مشکوک ڈرائیونگ کہیں بھی میری موت کا باعث بن سکتی تھی۔

صبح کے پہلے آثار نمودار ہوتے ہی میں پوری احتیاط کے ساتھ پناہ گاہ سے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور پھر بیوک وہاں سے روانہ ہو گئی۔

بن غازی کے لوگ سحرخیز تھے اور ان کی یہ عادت اس وقت میرے لئے مددگار ثابت ہو رہی تھی سڑکوں پر چھایا ہوا رات کا بیکراں سناٹا بکھر چکا تھا اور اکا دکا گاڑیاں سڑک پر رواں دواں تھیں جن کے درمیان میں خود کو چوری کی اس کار میں بھی محفوظ سمجھ رہا تھا۔

بن غازی کے ایک مانوس علاقے میں پہنچ کر میں نے بیوک ایک جگہ چھوڑ دی۔ وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے میں نے سرسری نظر سے کار کے اگلے حصے کا جائزہ لیا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فولادی چادر سے بنی ہوئی اس کار پر اس زبردست تصادم کا کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں ہوا تھا۔

حامد العزیز کے سکھائے ہوئے اصول پر عمل کرتے ہوئے میں تین ٹیکسیاں بدل کر جب ہاشم کے گھر پہنچا تو صبح کے سوا نو بج رہے تھے۔

وہ مجھے اپنے دروازے پر زندہ وسلامت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”سنا تھا کہ تم تو بن غازی سے نکل گئے؟“ اس نے مجھے اندر لے جاتے ہوئے میرا شانہ دباتے ہوئے سوال کیا۔

”تم نے کہاں سے سن لیا؟“

”صبح سے تین بار ریڈیو سے اعلان نشر ہو چکا ہے، ایک مرتبہ خبروں میں تفصیلی ذکر آیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میرا منصوبہ کامیاب رہا۔“ میں نے صورتحال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”کامیاب؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”اب تو وہ صاف طور پر تمہارا نام لے رہے ہیں، کیا بات ہے کہ تم نے تین افراد کو اپنی کار سے کچلا تھا؟“

”چار“ میں نے اس کی تصحیح کی۔ ”چوتھا ایک تربیت یافتہ کتا تھا......“

”نشریئے کے مطابق صفدر علی نے انہیں کچلنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بن غازی کی حدود سے نکلنے سے قبل ان کے جسموں میں اپنا مخصوص ہتھیار بھی پیوست کر دیا حالانکہ ان میں سے دو آدمی تو پہلے ہی مر چکے تھے۔“ اس نے کہا۔ ”انہیں تمہارا سراغ مل گیا ہے اور تم اسے اپنی کامیابی قرار دے رہے ہو۔“

”جائے حادثہ کے معائنے سے یہی پتہ چلے گا کہ قاتل بن غازی سے فرار ہوا ہے مگر میں ڈیڑھ دو میل آگے نکلنے کے بعد واپس لوٹ آیا، یہ یاد رکھو کہ میرے موجودہ حلیئے میں مجھے تمہارے اور حامد العزیز کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ میں نے تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں واقعی آگے نکل جاتا تو زیادہ دور نکلنے سے پہلے ہی وہ مجھے دھر لیتے، اب میری تلاش کے سلسلے میں وہ بن غازی کو بھول جائیں گے اور اپنی ساری توجہ مشرقی شہروں پر مرکوز کر دیں گے، میں نے انہیں یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ میں ساحلی شاہراہ کے ذریعے برکہ، بیدہ اور درنہ سے ہوتا ہوا طبروق پہنچنا چاہتا ہوں جہاں سے سڑک یا ریل کے ذریعے مصر میں داخلہ ممکن ہے اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔“

”تمہارے منصوبوں کی تہہ تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ وہ ستائش آمیز لہجے میں بولا۔ ”جو کام تم مجھ سے لینا چاہتے تھے میرے انکار کے بعد تم نے خود کیا ہے اور اب تم مصطفےٰ المرزوق کی حیثیت سے کسی بھی وقت یہاں سے قاہرہ کے لئے بلا خوف و خطر پرواز کر سکتے ہو۔“

”اس کے علاوہ میرے پاس کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔“ میں نے مدافعانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے حساب سے میں نے تین ناگہانی قتل کئے ہیں، جو سزا چاہو دے سکتے ہو۔“

”ان میں دو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماہرین تھے اور کتا بھی وہیں سے لایا گیا تھا انہوں نے اسی راستے کو سب سے اہم قرار دیا تھا۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”ان کی روحوں کو مسرت ہو گی کہ میں نے ان کے اندازوں سے سرمُو بھی انحراف نہیں کیا۔“

”تم بن غازی سے فوراً نکل جاؤ گے؟“

"جب تک تمہاری زبان سے ایئرپورٹ سے نگرانی کے خاتمے کی خبر نہ سن لوں ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔"

"وہ کار کہاں چھوڑی؟"

"سوق کے نزدیک۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا تمہیں علم ہو گیا تھا کہ میں نے پچھلی گلی سے ہی کار اٹھائی تھی؟"

"رات کے دس بجے ہی سب کو علم ہو گیا تھا۔" وہ بولا۔ "کار والے کو اپنی حاملہ بیوی کو ہسپتال لے جانے کے لئے کار کی ضرورت پیش آئی تو اس کی بیوک غائب تھی۔"

"حاملہ بیوی!" میں بے اختیار زور سے ہنس پڑا۔ "قدرت بھی مہربان معلوم ہوتی ہے جب تک اسے اپنی بیوی کی طرف سے بے فکری نہ ہوگی، شاید وہ پولیس کو رپورٹ بھی نہیں دے گا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔"

وہ میرے تبصرے سے بہت محظوظ ہوا اور پھر میرے لئے خورد و نوش کا بندوبست کرنے میں مصروف ہو گیا۔

رات بھر کی بھاگ دوڑ اور بے آرامی نے رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا پھر رانۂ گندم کے خمار نے تو مجھے براہِ راست بستر پر ہی پہنچا دیا۔

شام کے چھ بجے میں بیدار ہوا تو ہاشم ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں تازہ دم ہو کر نشست گاہ میں پہنچا، تو وہ ہنس پڑا۔

"کئی مرتبہ چاہا کہ تمہیں جگا دوں لیکن چھیڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔"

"اکیلے دل گھبرا رہا تھا؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے بارے میں ٹیلی ویژن پر نصف گھنٹے کا خصوصی پروگرام تھا۔"

"واقعی؟" میں چونک پڑا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "تمہاری کئی تصاویر بھی مختلف زاویوں سے پیش کی گئیں۔ بن غازی سے طبرق جانے والی ساحلی شاہراہ کے شہروں اور مضافاتی قصبات کے رہنے والوں کو صفدر علی نامی خوفناک اور پیشہ ور قاتل سے خبردار کرتے ہوئے اس کی گرفتاری میں تعاون کی اپیل بھی کی گئی تھی۔"

"میری تصاویر تو انہیں اسرائیل ہی سے ملی ہوں گی۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"ہاں، پرانی ہی معلوم ہو رہی تھیں، اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے اپنے طور پر تمہارے خلاف اسرائیل سے خاصا مواد حاصل کیا ہے ویسے ایک بات ہے کہ ٹیلی ویژن پر تمہاری تصاویر دیکھنے والا کوئی بھی شخص اس وقت تمہیں صفدر علی تسلیم نہیں کر سکتا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"مشکل حالات میں تمہاری حاضر دماغی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ تم نے بچپن ہی سے بہت سخت زندگی گزاری ہے۔" چند ثانیوں تک خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"کاش کہ میرا تابناک بچپن پھر لوٹ آئے۔" اس کے الفاظ نے ایک ہی ٹھوکر میں مجھے برسوں پیچھے دھکیل دیا۔ "بائیس برس کی عمر تک میں اپنے والدین کا ایسا لاڈلا بیٹا تھا جس نے زندگی کو ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھا تھا، میری شخصیت کی عبرتناک تباہی اس کے بعد کے برسوں کی کہانی ہے۔"

"شخصیت کی تباہی!" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "میں تو دیکھتا ہوں کہ تم مختصر سی مدت میں ہی تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو گئے ہو۔"

"تم جو چاہو کہہ لو مگر میں اپنی ذات سے شرمندہ رہتا ہوں۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔

"آخر کیوں؟" وہ مصر ہو گیا۔

"قتل و خونریزی خواہ کیسے ہی بدترین حالات میں کی جائے کبھی سرخروئی کا باعث نہیں بنتی، انسانی لہو کی حرمت کو پامال کرنا ایک گھناؤنا جرم ہے اور میں پے در پے اس کا ارتکاب کئے جا رہا ہوں شاید تم یقین نہ کرو کہ بعض اوقات مجھے اپنے بدترین حریفوں کو قتل کر کے بھی ملال ہوتا ہے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "گوشت پوست سے بنے ہوئے عام سے انسان جیسی باتیں؟ میں تو سمجھتا تھا کہ تمہارے احساسات عام آدمیوں سے ماورا ہیں جن میں نہ نرمی کی انتہا ہے اور نہ قہر کی کوئی تھاہ۔"

"میری ذات کو موضوع نہ بناؤ برادر۔" میں نے دردناک لہجے میں کہا۔ "ایک ایک لفظ پر میرا دل دکھتا ہے، اگر کبھی میں نے اپنے تجربات کو قلم بند کیا تو اس میں میری ندامت کا اعتراف سب جزئیات پر حاوی ہوگا۔"

"اور اس کہانی میں میرا ذکر ہوگا؟" یک بیک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اس کے بغیر شاید کہانی مکمل ہی نہ ہو سکے گی۔" میں تھکے ہوئے انداز میں مسکرا دیا۔

"اس کی ایک نقل مجھے ضرور بھیجنا، میں اسے عربی میں ترجمہ کرا کے بیروت سے شائع کراؤں گا تاکہ ہمارے بعد والوں کو بھی پتہ چل سکے کہ دنیا کے دوسرے خطوں کے مسلمان بھی فلسطین کے لئے کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔"

"تم یہ بتاؤ کہ باہر نکلے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"پہلے وعدہ کرو، پھر بتاتا ہوں۔"

اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

مگر اپنی کہانی کا آغاز کرتے ہوئے مجھے اپنا وعدہ یاد نہیں رہ سکا چند روز قبل مجھے اپنا وعدہ یاد آیا تو میں نے اسے بیروت کے پتے پر ایک خط لکھا جہاں سے آج ہی ہاشم کی بیوہ کا جذبات سے لبریز ایک دردناک خط آیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاشم الاحمد الصباح کئی برس پہلے لبنان

[اس]رائیلی جنگی کشتیوں کے ایک بھرپور حملے میں مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا [خد]ا اس کی مغفرت کرے۔

میں ہاشم سے کیا ہوا اپنا وعدہ نہیں نبھا سکا مگر اس نے اپنا وعدہ پورا [کیا] تھا میرے اقرار کے بعد اس نے بتایا کہ وہ دوپہر میں شہر کا جائزہ لینے [گیا] تھا اور میرے لئے ایئرپورٹ محفوظ پایا تھا کیونکہ وہاں سے تربیت یافتہ [کتّ]وں کا پہرہ ہٹا لیا گیا تھا۔

اس نے اپنے وسائل کے ذریعے کھوج نکالا تو اسے علم ہوا کہ بن غازی [س]ے طبرق تک بہت بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع کی جا چکی تھی۔ [امریکہ] اور برطانیہ کے ماہر سراغرسانوں کے علاوہ لیبی فوج کے بری دستے صحرا [میں] بھیج دیئے گئے تھے جبکہ بحریہ کی کشتیوں نے مصری حدود تک پوری ساحلی [پٹ]ی کی کڑی ناکہ بندی کر دی تھی اس پر مستزاد بری فوج کے دس ہیلی کاپٹر بھی [طب]رق کو جانے والی شاہراہ سے جنوب میں پھیلے ہوئے بنجر ریگستان [میں] دور تک نیچی پروازیں کر کے صفدر علی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہاشم نے اگلی صبح روانہ ہونے والی [ا]یک ــــــ پرواز پر میرے لئے قاہرہ کی نشست مخصوص کرا لی تھی۔ حالات یکے بعد دیگرے کئی موڑ لینے کے بعد میرے حق میں اعتدال پر [آ چ]کے تھے اور اگلی صبح تک کسی نئی تبدیلی کا امکان نہیں تھا۔ لہٰذا وہ یقینی طور [پر ہ]مارے اشتراک کی آخری رات تھی۔

اس رات ہم دونوں نے مکان کے تمام دروازے اندر سے مقفل کر [کے خ]وب شراب نوشی کی۔ اس دوران میں حواس کو بے لگام ہونے کی اجازت [نہ]یں دی گئی مگر اس کے باوجود ہم دونوں نے ایک دوسرے کے سامنے ایسے [ایس]ے ناگفتہ اعترافات کئے جنہیں شاید نوکِ قلم بھی دہرانا پسند نہ کرے۔ [ا]یسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دو قریب المرگ راہب اپنے گناہ بخشوانے کیلئے ایک دوسرے کے سامنے اپنے گناہوں کا کھلے دل سے اعتراف کر رہے ہوں۔

جب ہاشم کی زبان کے لئے الفاظ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تو میں [نے] بوتل سنبھال لی اور اسے خالی کر کے مسہری کے نیچے لڑھکا دیا۔

ہاشم تھوڑی دیر بعد سو گیا مگر میں نیم مدہوشی کے عالم میں جاگتا [رہا] میری چشمِ تصور کے سامنے عجیب عجیب انسانی اور حیوانی ہیولے رقص [کر]تے رہے ہر انسانی ہیولا اپنے تمام کرتب دکھانے کے بعد سیتا کے روپ میں [نمای]اں ہو کر مخصوص انداز میں مسکرا دیتا تھا اور حیوانی ہیولے مال کار میری [طرف] بڑھتے ہوئے خونخوار کتوں کے روپ میں اپنی گز بھر لمبی زبانیں باہر [نکا]لے میری طرف لپکتے تھے۔

آٹھ بجے گھنٹے کا گجر سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میں نے ہاشم کو [جگا]نے کی بہت کوششیں کیں مگر وہ خمار کے عالم میں اتنی گہری نیند سو رہا تھا [کہ ا]یک بار بھی جواب نہیں دیا۔

خمار میرے ذہن پر بھی طاری تھا جس کے باعث سر بوجھل ہو رہا [تھ]ا مگر مجھے ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

روانگی سے قبل میں نے ایک بار پھر اسے بیدار کرنے کی ناکام کوشش کی اور آخرکار اپنے سوئے ہوئے دوست کی پیشانی پر بوسہ دے کر باہر نکل آیا۔

میں مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی ایئرپورٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں ٹیکسی سے اترتے ہی میں نے قرب و جوار کا جائزہ لے ڈالا۔ یہ موقع میں نے جیب میں کرائے کی رقم ٹٹولنے کے بہانے حاصل کیا تھا۔

غنیمت ہوا کہ وہاں کے بارے میں ہاشم کی فراہم کی ہوئی اطلاعات درست تھیں ورنہ میں طے کر چکا تھا کہ کہیں بھی کوئی پالتو کتا نظر آگیا تو کوئی خطرہ مول لئے بغیر اسی ٹیکسی سے واپس روانہ ہو جاؤں گا۔

ہاشم نے میرے لئے کھلا ٹکٹ لیا تھا۔ میں نے پاسپورٹ دکھا کر کاؤنٹر پر ٹکٹ کے اندراجات درست کرائے اور تھوڑی دیر بعد مجھے بورڈنگ کارڈ مل گیا۔

روانگی کا وہ مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ تلاشی کے بارے میں مجھے کوئی فکر نہیں تھی میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بس جیبوں میں زہریلے تیر پھینکنے والی دو شیشیاں تھیں جو بظاہر کپڑوں پر سے دھبے صاف کرنے والے بے ضرر محلول پر مشتمل تھیں۔

اگلا مرحلہ تلاشی کا تھا جس کے بعد مجھے اس ممنوعہ حصے میں جانے کی اجازت مل جاتی۔ جہاں روانہ ہونے والے مسافر بٹھائے جاتے ہیں۔

مسافروں کا دستی سامان کلوزڈ سرکٹ ٹیلی ویژن کیمرے پر مشتمل صندوق میں سے گزارا جا رہا تھا اور ایک ماہر اسکرین پر بغور ہر فریم کا معائنہ کر رہا تھا اس مرحلے سے فراغت کے بعد مسافر اسلحہ کا سراغ لگانے والی الیکٹرونک مشین سے گزرتے تھے اور آخر میں ایک گارڈ جسم کے مختلف حصوں پر پھرتی سے ہاتھ پھیر کر مسافر کے بارے میں پوری طرح اطمینان کرتا تھا۔

میں دستی سامان جانچنے والے کاؤنٹر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک تیز آواز سن کر میرے قدموں کی جان نکل گئی۔

"کھولو، اس میں رقم معلوم ہوتی ہے۔" کاؤنٹر والا اپنے سامنے کھڑے ہوئے عرب مسافر کو ڈانٹ رہا تھا۔

"اس میں تین ہزار دینار ہیں۔" مسافر نے اپنا بیگ لیتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"انہیں لے جانے کا اجازت نامہ ہے؟"

"نہیں، مگر ......"

"اگر مگر مت کرو۔" وہ غرّایا۔ "خصوصی اجازت کے بغیر تم یہاں سے دو سو دینار سے زائد رقم باہر نہیں لے جا سکتے، تم نے زرِ مبادلہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کرنسی باہر اسمگل کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"یہ جائز کرنسی ہے، اگر تم مصر ہو تو رقم روک کر رسید دے دو، میں واپسی پر لے لوں گا۔"

کاؤنٹر والا تضحیک آمیز انداز میں ہنس دیا: "بورڈنگ کارڈ واپس کرو، تم فیصلہ ہونے تک ملک سے باہر نہیں جا سکتے۔"

"مگر میرا قاہرہ جانا ضروری ہے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"میں رقم لے جانے پر تو اصرار نہیں کر رہا۔"

"وقت ضائع مت کرو....."

بے رحمانہ لہجے میں کاؤنٹر والے کے کہے ہوئے پورے الفاظ سننے کے لئے میں وہاں نہیں رکا۔

میرے بریف کیس میں مفتی الیوسف سے حاصل کی ہوئی ہزاروں دینار کی رقم موجود تھی جو میرے لئے مصیبت کا باعث بن سکتی تھی، للہذا تلاشی دینے سے قبل اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ناگزیر تھا ورنہ تلاشی کے ہر مرحلے پر جواب دہی مشکل ہو جاتی۔

میں چہل قدمی کے انداز میں ٹوائلٹ روم کی طرف چل دیا اور اندر داخل ہو کر تیزی سے بریف کیس کا جائزہ لے ڈالا۔

اس میں کرنسی کے علاوہ جو اشیاء موجود تھیں وہ میں نے چند سونیا کے ساتھ اپنی جیبوں میں منتقل کیں اور بریف کیس سے ایرلائن کا ٹیگ نکال کر باہر آگیا اس طرح محض اس بریف کیس کی مدد سے اس کے مالک کا سراغ لگانا ناممکن تھا۔

طیارے کی پرواز میں ابھی خاصا وقت باقی تھا اور میں بریف کیس سے ایسی خوش اسلوبی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا کہ طیارے کی پرواز تک وہ لاوارث بریف کیس کسی کی نگاہوں میں نہ آ سکے۔

میں اس وسیع ہال میں ایک آرام دہ کرسی پر جا بیٹھا اور تپائی سے اخبار اٹھا کر اس کا مطالعہ کرنے لگا میرے قریب ہی ایک خوش پوش مقامی بوڑھا بھی پورے انہماک سے کوئی رسالہ پڑھنے میں مصروف تھا۔

میں نے بوڑھے کو اپنی طرف سے غافل پا کر اپنا بریف کیس آہستہ سے کرسی کے نیچے سرکا دیا اور خود اخبار کی سرخیاں دیکھنے لگا۔

چند منٹ تک انتظار اور اکتاہٹ کی اداکاری کے درمیان اخبار پڑھنے کے بعد میں خالی ہاتھ وہاں سے اٹھا اور ایک طرف چل دیا۔

مگر میں چند قدم بھی نہیں گیا تھا کہ عقب سے ایک ہاتھ میرے شانے پر جم گیا۔

میں سرعت سے پلٹا تو وہی بوڑھا میرے پیچھے موجود تھا، میرا بریف کیس اس کے داہنے ہاتھ میں لٹکا ہوا تھا۔

"یہ تم وہیں بھول آئے تھے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا: "مجھ جیسے بوڑھے کے لئے یہ بہت وزنی ہے۔"

میرا جی تو یہ چاہا کہ ایک مکہ مار کر اس ایسا مذار بڈھے کی کھوپڑی چٹخا دوں لیکن صورتِ حال کی نزاکت کے تحت شکریہ ادا کر کے بریف کیس اس سے لے لیا۔

"سونا تو نہیں ہے اس میں؟" بریف کیس دیتے ہوئے بوڑھے نے رازدارانہ لہجے میں مذاق کرنے کی بھونڈی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں بیش قیمت کتابیں ہیں جو بآسانی دستیاب نہیں ہوتیں۔" میں نے اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں رکھتے ہوئے زبردستی مسکرا کر کہا اور وہاں سے آگے چل دیا۔

ایک کوشش ناکام ہو چکی تھی اور اب مجھے اس ناگوار بوجھ کے لئے کوئی دوسرا ٹھکانا تلاش کرنا تھا۔

کچھ دیر تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد معاً مجھے وہ ڈرم نما ڈسٹ بن یاد آیا جو ٹوائلٹ روم کے قریب راہداری میں رکھا ہوا تھا۔

میں دوبارہ اسی طرف ہو لیا۔ ٹوائلٹ سے ایک آدمی کو نکلتے دیکھ کر میں نے اپنی رفتار سست کر دی اور جب میں اس مختصر سی راہداری میں داخل ہوا تو وہ ویران پڑی ہوئی تھی۔

میں نے پھرتی سے بریف کیس ڈسٹ بن پر پھینک دیا۔ بریف کیس کے بوجھ سے ڈسٹ بن کا ڈھکن اندر دبا اور میرا بیش قیمت بریف کیس ہلکی سی آواز کے ساتھ اندر موجود کچرے میں جا گرا اور ڈھکن اسپرنگ کے زور سے اچھل کر دوبارہ اپنی جگہ واپس آگیا۔

ہال میں گھستے ہی دوبارہ اسی نابکار بڈھے سے سامنا ہو گیا وہ ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا اپنے دانتوں کا جائزہ لے رہا تھا جن میں سے بیشتر شاید مصنوعی تھے۔

میں اسے نظر انداز کر کے آگے نکلنا چاہتا تھا مگر وہ میرے سامنے آگیا: "تمہارے ہاتھ خالی ہیں برادر! معلوم ہوتا ہے پھر کہیں بھول آئے۔"
اس کا دھیما لہجہ بزرگانہ ملامت کا رنگ لئے ہوئے تھا۔

"تمہارے کہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بھاری تھا۔" میں نے خود پر زبردستی خوش اخلاقی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "اسی لئے میں نے اسے اپنے سامان کے ساتھ ڈال دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" وہ خوش ہو گیا "آج کل کے نوجوان حد سے زیادہ بھول بھلکڑ ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو کہیں نہ کہیں ان قیمتی کتابوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ـــ ویسے تم جا کہاں رہے ہو؟"

"جہاں مقدر لے جائے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر بے بسی سے کہا اور تیزی سے آگے کی طرف چل دیا۔

"عجیب لڑکے ہیں آج کل کے۔" مجھے اپنے پیچھے بوڑھے کی بڑبڑاہٹ سنائی دی "ہمدردی کرو تو اکتا جاتے ہیں، ان کے حال پر چھوڑ دو تو رونے لگتے ہیں۔"

میں واپس پہنچا تو کرنسی اسمگل کرنے کے الزام میں پھنسا ہوا شخص کئی باوردی افراد میں گھرا ہوا تھا اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا شاید کسی نے اسے ممکنہ سزاؤں سے باخبر کر دیا تھا۔

میں اپنی ذاتی تلاشی کے دونوں مرحلوں سے گزر کر بخیر و عافیت لاؤنج میں پہنچ گیا۔ جہاں کم از کم چالیس ملے جلے مسافر موجود تھے۔

پندرہ منٹ بعد مسافروں کو طیارے میں سوار کیا جانے لگا۔ اس وقت طیارے کے نچلے حصے میں سامان لادا جا رہا تھا۔

طیارے میں مجھے کھڑکی کے قریب ہی نشست ملی اور چند منٹ بعد میرے برابر والی نشست پر خوشبوؤں میں بسی ہوئی ایک خوبرو اور سبک اندام لڑکی بڑے سلیقے اور محتاط انداز میں آ بیٹھی۔

پرواز شروع ہونے تک خاموشی برقرار رہی۔ اس کی طرف سے پیش قدمی کی توقع تو خیر بے سود ہی تھی مگر مجھے بھی کوئی موقع نہ مل سکا البتہ جب پرواز معمول پر آنے کے بعد تمباکو نوشی کی ممانعت کی ہدایات معدوم ہوئیں تو مجھے موقع مل گیا۔

"خاتون اگر آپ برا نہ مانیں تو میں تمباکو نوشی کر لوں؟" میں نے مہذب لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"مجھے سگریٹ کے دھوئیں سے سخت نفرت ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ اپنی دانست میں اس نے مجھے منع ہی کیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے، پھر آپ کسی اور خالی نشست پر چلی جائیں۔" اس کا گھمنڈ دیکھ کر میں نے نرم لہجے میں ایک سخت مشورہ دے ڈالا۔ "میں سگریٹ سلگانا چاہ رہا ہوں۔"

اس نے مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی اور نہ ہی وہ نشست بدلنے پہ آمادہ نظر آئی۔

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے سگریٹ سلگا لی اس نے ایک بار اضطرار کے عالم میں پہلو بدل کر فرش پہ پاؤں پٹخے مگر میں نے اس پر توجہ دینے کی کوئی زحمت نہیں کی۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" کچھ دیر بعد اسی نے سوال کیا۔

"قاہرہ سے پہلے تو کہیں نہیں اتر سکتا۔" میں نے بے بسی کے لہجے میں جواب دیا۔ اور اس کے پتھر سے تراشے ہوئے پتلے پتلے لبوں پر بے اختیار زندگی مچل گئی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ کم مسکرانے والے حسین چہروں کی مسکراہٹ کس قدر حسین اور خطرناک ہوتی ہے۔

"میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہاں ہی اتر جاؤ گے یا آگے تک جاؤ گے؟"

"اگر تم چاہو تو آگے بھی جا سکتا ہوں۔" اس کی ذات پر چڑھا ہوا ملمع اتر جانے کے بعد میری ہمت بندھ گئی۔

"تو کیا بے مقصد سفر کر رہے ہو؟" اس نے انجان بن کر مضحکانہ لہجے میں سوال کیا۔ وقت گزاری کے لئے شاید اس نے مصالحت اختیار کر لی تھی۔

"ہم سفر اچھا ہو تو آدمی منزل اور مقصد دونوں کو ہی بھول جاتا ہے۔" اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ہوسٹس کو روک کر شراب طلب کی اور میں نے بھی اپنے لئے فرمائش کر ڈالی۔

"کمال ہے کہ تم شراب پیتی ہو!" ہوسٹس کے چلے جانے کے بعد میں نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

"اور تم نے جو منگوائی ہے؟"

"تمہاری پیروی کی ہے ورنہ تمہاری رفاقت میں کسی اور نشے کا تصور نامناسب سا ہے۔"

"آہستہ بولو۔" وہ چیختے ہوئے لہجے میں بولی۔ "جہاز کے کپتان کو تمہارے خیالات کی بھنک بھی مل گئی تو کوئی ہنگامی دروازہ کھلوا کر دورانِ پرواز ہی ہزاروں فٹ کی بلندی سے یخ بستہ سمندر میں پھینک دے گا تمہیں۔"

"وہ تمہارا کون ہے؟"

"ابھی پتہ چل جائیگا۔" وہ دلفریب انداز میں مسکرائی۔ "یہ اس کی ریٹائرمنٹ سے قبل آخری پرواز ہے اور اسے وہ یادگار طریقے پر اختتام تک پہنچانا چاہتا ہے۔"

"کہیں تمہارا یہ مطلب تو نہیں کہ تم کیبن میں جا کر اس کے ساتھ کسی جشن میں شرکت کروگی؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"خاصے سمجھدار ہو۔" وہ پُرغرور انداز میں مسکرادی۔ "میں اسی کی فرمائش پر بن غازی سے سوار ہوئی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس وقت کوئی دوسری بھی اس کے ساتھ ہو۔" کپتان کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی میری وحشت بڑھنے لگی۔

"وہ شراب پیئے بغیر عیاشی کا قائل نہیں ہے۔" لڑکی غالباً اس طرح مجھ کو اپنے حسن کی حشر سامانیوں سے باخبر کر کے اپنی انا کی تسکین حاصل کر رہی تھی۔

"مسافروں کا کیا ہوگا؟"

"اس کا نائب اپنے کام پر پوری دسترس رکھتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی نشے میں دھت ہو۔"

وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔ "لیبیا کے شہری پرواز کے حکام بہت سخت گیر ہیں۔ نشہ تو درکنار، اگر اس کے منہ سے شراب کی بو بھی آ رہی ہوتی تو بن غازی پر ہی پرواز معطل کر کے اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ عیاشی کی ابتدا تو لیبیا کی سرزمین چھوڑنے کے بعد کھلے آسمان میں ہوگی۔"

"تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟" میں نے ایک گہرا سانس لے کر دریافت کیا۔

"فلسطین سے۔" اس نے اپنا پیمانہ خالی کرتے ہوئے کہا اور اس کے ان دو الفاظ سے مجھے شدید ذہنی صدمہ ہوا۔

مگر چند منٹ بعد جب اس کے نام کا انکشاف ہوا تو میری حیرت جاتی رہی۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ پروٹسٹنٹ عیسائی تھی اور اس کے نزدیک آزاد روی کوئی سنگین اخلاقی جرم نہیں تھا۔ یہ سن کر میری ذہنی کوفت میں خاصی کمی واقع ہوئی ورنہ اس سے قبل تو میں

فلسطینی کا ذکر آتے ہی یہ فرض کر لیتا تھا کہ وہ یقیناً مسلمان ہوگا۔

"اپنے وطن کے بارے میں تمہارے کیا احساسات ہیں؟" موقع میسر آجانے پر میں نے اس پہلو کو بھی چھیڑ دیا۔

"تم شاید فلسطین کی بات کر رہے ہو" وہ محتاط انداز میں بولی۔ "وہ شروع سے قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کسی جگہ کا نام یا حکمران بدل جانے سے اس جگہ کی تاریخ اور ماہیت نہیں بدل سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ آج وہاں اسرائیلی —— حکمراں ہیں تو کچھ عرصے بعد مسلمانوں یا عیسائیوں کو یہ موقع مل جائے۔"

فلسطین کے حوالے سے مقہی الیوسف کا مالک جوزف مجھ سے ملنے والا پہلا عیسائی تھا۔ مگر اس سے کسی گفتگو کی نوبت ہی نہ آسکی اور دوسری وہ لڑکی تھی جو فلسطینی تحریک کے بارے میں شاید اپنے طبقے کے خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

"تمہاری دانست میں یہودی تسلط قابلِ اعتراض نہیں ہے؟"

"فلسطین مسلمانوں کو مل جائے تو ہمارے لئے کیا فرق پڑے گا۔" وہ سرور میں خاصی دوٹوک باتیں کر رہی تھی۔ "یاسر عرفات کو اقتدار مل جانے سے بھی ہمارے لئے حالات یوں ہی رہیں گے، میں تو اس تحریک کو اقتدار کی جنگ سمجھتی ہوں جسے بدقسمتی سے مذہب کی آڑ میں ہر محاذ پر لڑا جا رہا ہے۔"

میرے منہ سے حلق تک تلخی سرایت کر گئی۔ اس لڑکی کی گفتگو نہایت زہریلی اور تعصب آمیز تھی۔ اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں لبنان میں ہونے والی وہ چھوٹی بڑی خانہ جنگیاں بھی تازہ ہو گئیں جن کے نتیجے میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد سیکڑوں مسلمان اور عیسائی مارے جاتے تھے اور ایسے ہر موقع پر اسرائیل کے بحری دستے جنگی کشتیوں سے لبنانی ساحلوں پر اتر کر ہمیشہ عیسائی گروہوں کی دستگیری کیا کرتے تھے۔

مگر اس لڑکی سے گفتگو زیادہ تلخ نہ ہو سکی کیونکہ ایک ائیر ہوسٹس نے جو شاید اسے پہچانتی تھی، قریب آکر اسے سرگوشی میں کوئی پیغام دیا اور وہ عجلت میں اٹھ کر پہلے اور درمیانے درجے کو علیحدہ کرنے والے حریری پردوں کے عقب میں غائب ہو گئی۔ شاید اس کے آشنا نے اسے طلب کر لیا تھا۔

میں نے اپنی نشست کی پشت گاہ پیچھے ڈھلکائی اور ذہن میں چلنے والی آندھیوں سے نجات پانے کے لئے ایک اخبار کا جائزہ لینے لگا۔

تقریباً دس پندرہ منٹ بعد میں نے اکانومی کلاس میں مسافروں کو ناشتہ وغیرہ فراہم کرنے والے عملے میں ایک موہوم سی سراسیمگی محسوس کی جو شاید دوسرے مسافروں کی نگاہ میں نہ آسکی تھی۔

دونوں راہداریوں میں سروس مکمل کئے بغیر عملے کی اراکین ٹرالیاں لے کر تیزی سے فلائٹ کچن کی طرف غائب ہو گئیں۔

اس وقت وہ دیو ہیکر فضائی عفریت کم از کم ڈیڑھ سو انسانی جانوں کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ جہاز کا کپتان اپنی آخری پرواز کو یادگار بنانے کے لئے کہیں مصروف تھا۔

میرے پورے وجود میں یک بیک کروڑوں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور میں نے غیر ارادی طور پر ائیر ہوسٹس کو طلب کرنے والی گھنٹی بجادی۔

سنسنی خیز لمحے سرکتے رہے مگر گھنٹی کا بٹن دوبارہ دبانے کے باوجود کوئی نہ آیا، میرے بدن کے سارے مساموں سے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے کی دھاریں بہ نکلیں۔

پھر اچانک ایک ہوسٹس نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا اور طیارے کے فرش پر چلتے ہوئے اس کے قدم یوں لڑکھڑا رہے تھے جیسے وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو کر نیچے ڈھیر ہونے والی ہو۔

میرے قریب آکر وہ کسی بے جان مشینی پتلے کی طرح ساکت کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟ تم گھبرائی ہوئی ہو، کیا کوئی گڑبڑ ہے؟" میں نے اس کی طرف جھک کر کانپتی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں سوال کیا۔

"نہیں ... نہیں، سب ٹھیک ہے۔" اس کی دھیمی آواز پر تو یہی کیفیت طاری تھی جیسے وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہو۔ "تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"مجھے ناشتہ درکار ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر یرقان زدہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "چند لمحے صبر کرو، ناشتہ ابھی لے آتی ہوں۔"

اور چند منٹ بعد واقعی ناشتے کی ٹرالیاں دوبارہ نمودار ہوئیں مگر ان کے ساتھ آنے والا عملہ ہراساں اور بوکھلایا ہوا تھا۔

انہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ طیارے کے اندر کوئی ناگہانی آفت نازل ہوئی تھی جس پر حالات بگڑنے سے پہلے ہی قابو پالیا گیا۔

میں ناشتے میں مصروف تھا تو میری ہم سفر لڑکی بھی آگئی۔ آنے سے قبل شاید اس نے اپنی نوک پلک سنوارنے کی پوری کوشش کی تھی مگر میں اس کے چہرے اور بالوں کی ترتیب میں کچھ ایسی نشانیاں دیکھے بغیر نہ رہ سکا جو کسی اندر والے کی سرمستیوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی تھیں۔

وہ مجھ سے نگاہیں چرائے بغیر خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

"بہت جلد واپس آگئیں؟" میں نے گفتگو کا آغاز نرم لہجے میں کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ورنہ جارحانہ تیوروں کے ساتھ اس سے کچھ اگلوانا ناممکن ہو جاتا۔

"مجھے کچھ دیر سکون سے بیٹھا رہنے دو۔" وہ مرتعش آواز میں

بولی۔ اس کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا اور آنکھوں میں خوف رچا ہوا تھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری حالت غیر ہے، میں تمہارا ہمدرد ہوں اچھی لڑکی!" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور میرا وار کام کر گیا۔

اس نے بے اختیار اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا اور میں ہولے ہولے اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے رخساروں کو سہلانے لگا۔

جب تک اس کی حالت قدرے بحال نہ ہوئی، میں اسے تسلی دلاسہ ہی دیتا رہا۔ اور وہ میرے سینے سے سر ٹکائے بے آواز سسکیاں لیتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی نمناک پلکیں اوپر اٹھائیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تھوڑی دیر قبل ہم موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے ہیں۔"

میرے لئے وہ خبر غیر متوقع نہیں تھی، پھر بھی مجھے بے اختیار جھرجھری آگئی۔ "کیا واقعی؟"

"فرسٹ کلاس کیبن میں ایک مسافر کے ہاتھ سے وہسکی کا گلاس گر گیا تھا۔ پھر اس کی جلائی ہوئی ماچس کی تیلی سے وہسکی میں بھیگی ہوئی بلیو والی نشست نے اور فرش نے آگ پکڑلی، اگر اس پر فوری قابو نہ پایا جاتا تو یہ طیارہ اب تک شعلوں کی گیند میں تبدیل ہو کر —— سمندر میں گر گیا ہوتا۔"

"وہ کپتان تو نہیں تھا؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سرگوشی کی۔

"شش۔ وہ بے چین ہو گئی۔ "ایسے غیر ذمہ دارانہ کلمات منہ سے نہ نکالو، کپتان کا اس قصے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔"

"مگر تمہاری کلائی کا تھوڑا سا روواں جھلسا ہوا ہے۔" میں نے اس کی داہنی برہنہ کلائی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"خاموش رہو، خدا کے لئے خاموش رہو۔" وہ شکست خوردہ انداز میں بڑبڑائی۔ "وہ بھیانک منظر بار بار میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔"

میں اسے ترحم آمیز نگاہوں سے گھورنے لگا۔

جہاز کے دیگر تمام مسافر اس ہولناک قصے سے بے خبر اپنی اپنی مصروفیات میں الجھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار بلند آہنگ قہقہے اور مترنم آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں جن میں زندگی اپنے پورے جوش اور ولولے کے ساتھ نمایاں ہو رہی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ فرسٹ کلاس کے بارے میں لڑکی کی سنائی ہوئی کہانی میں مسافر کا نام محض ایک بہانا تھا۔ اوّل تو کسی بھی پرواز پر مسافروں کو اتنی شراب فراہم نہیں کی جاتی کہ وہ اپنی ذات کو بھول کر دوسروں کے لئے پریشانیاں پیدا کرنے لگیں اور اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو صورتِ حال اعتدال پر آنے کے بعد اس مسافر کے بارے میں کسی فوری کارروائی کے ساتھ ہی مسافروں کو گزرے ہوئے خطرے سے باخبر کرنا ضروری تھا تاکہ وہ شراب نوشی کے دوران خصوصی احتیاط برت سکیں مگر کپتان کی طرف سے مکمل خاموشی اور عملے کا سہما سہما راز دارانہ رویہ کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

طیارے میں انجنوں کا دھیما دھیما آسیبی آہنگ ایک تواتر کے ساتھ گونجتا رہا اور پرواز کسی خطرے کے بغیر جاری رہی۔

"تم کپتان کی فرمائش پر اس جہاز میں سوار ہوئی تھیں؟" طویل سکوت کے بعد میں نے اسے یاد دلایا۔

"کیا میں کسی دوسری نشست پر چلی جاؤں؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

"اگر جا سکو تو ضرور چلی جاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں یوں ہنس پڑی جیسے ہنستے ہوئے بھی کسی سے خوفزدہ ہو۔ "لاؤ مجھے ایک سگریٹ دو۔"

"مگر تمہیں تو سگریٹ سے سخت نفرت ہے۔"

"موت کو اتنے قریب سے دیکھ لینے کے بعد محبت اور نفرت کے سارے معیار چکنا چور ہو جاتے ہیں، اس وقت میں صرف ایک لڑکی ہوں جو ہر صورت میں اور ہر قیمت پر سکون کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہے۔"

"بڑا پیار ہے زندگی سے؟" میں نے سگریٹ سلگا کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"کیسے نہیں ہوتا؟"

"اگر اپنی زندگی سے اتنا ہی پیار ہے تو آئندہ دوران پرواز کسی سے عشق جتانے کی کوشش نہ کرنا۔ بچھڑی ہوئی محبوبہ کو سامنے پا کر بہکا ہوا آدمی الکحل اور پانی کا فرق بھول کر بہک بے احتیاطی کر گزرتا ہے۔"

"خدا کے لئے کچھ اور باتیں کرو۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔

"اچھا بس ایک بات اور بتا دو۔"

"پوچھو۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"اس مسافر کا اب کیا حال ہے؟"

"وہ تھوڑی سی زیادہ پی گیا تھا، اسے خواب آور دوا کا انجکشن لگا دیا گیا ہے۔" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی زبانی حادثے کی جزئیات سن کر میں نے اپنی کہانی مکمل کر لی تھی لہٰذا اس کے بعد میں نے اسے نہیں چھیڑا۔

بن غازی سے قاہرہ کی پرواز میری توقع سے زیادہ مختصر ثابت ہوئی۔ ناشتے اور مشروبات کے برتن سمیٹے جانے کے دوران ہی کیبن میں جہاز کے نائب کپتان کی آواز گونجنے لگی۔

طیارے کی بلندی کم کی جا چکی تھی اور ہوائی اڈے پر لینڈنگ سے قبل طیارہ قاہرہ کے جنوب مغرب میں صحرا کے سینے پر پھیلے ہوئے عظیم الشان اہرام پر پرواز کر رہا تھا۔

مسافر کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر ان رفیع الشان

سنگی علامتوں کو دیکھنے لگے۔ جو سورج کی تیز روشنی میں نیل کی قدیم تہذیب کی کہانی سُنا رہی تھیں۔

نیل کے مغربی کنارے پر میمفس کے کھنڈرات۔ ابوالہول کے مجسمے اور اہراموں پر پرواز کرتے ہوئے طیارے نے دریائے نیل کو عبور کیا۔ پھر المعادی کے باغات پر سے اڑتا ہوا انیم وانزے کی صورت میں قاہرہ کے جنوب سے چکر کاٹتا ہوا ہوائی اڈے پر پرواز کرنے لگا۔

اس طیارے کے نائب کپتان نے حفاظتی پیٹی باندھنے کی ہدایت کی اور میں نیل کی سرزمین پر اپنے مستقبل کی تلاش میں اترنے کی تیاری کرنے لگا۔

نیل کی وادی جو افسانوں، پُراسرار کہانیوں، عظمت و جبروت اور فسوں خیز واقعات کی سرزمین تھی میرے لیے اپنے دامن میں کچھ نئی پہیلیاں چھپائے میری منتظر تھی۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔" اپنا حفاظتی بند باندھتے ہوئے اس لڑکی نے سوال کیا اور جواب کی توقع میں میری طرف دیکھنے لگی۔

"مصطفےٰ المزروق!" میں نے بلا تکلف اپنا نیا سرکاری نام بتا ڈالا۔

"قاہرہ میں کہاں ٹھہرو گے؟"

"تو کیا تم بھی قاہرہ میں ہی اترو گی؟"

وہ ہنس پڑی۔ "یہ پرواز برلن سے شروع ہو کر قاہرہ میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ کپتان سے ملاقات کے بعد والیس پر وہ صرف اسی وقت اپنے اوپر غالب آتے ہوئے خوف سے نجات حاصل کر سکی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ چند منٹ بعد طیارہ اترنے والا تھا۔

"پہلے بھی قاہرہ آتی رہی ہو؟"

"اکثر آتی رہتی ہوں۔" مریم نے مسکرا کر کہا۔

"پھر تو اس مرتبہ تم اپنے کپتان دوست کے ساتھ بہترین وقت گزارو گی۔"

"اس کا ذکر چھوڑو۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ "میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم قاہرہ میں کہاں قیام کرو گے۔"

"میں پہلی بار قاہرہ آیا ہوں، نہ جانے کہاں ٹھکانا ملے۔ ایسا کرو کہ تم مجھے اپنا پتہ دے دو میں خود تم سے مل لوں گا۔"

"پتہ نہیں بتاتے تو نہ بتاؤ۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "یہ نہ سمجھنا کہ میں پہلی ہی نظر میں تم پر مرمٹی ہوں۔"

"میں حقیقت بتا رہا ہوں۔" میں نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ "میں قاہرہ میں اس حد تک اجنبی ہوں کہ تم چاہو تو تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔"

"اور تمہاری قومیت کیا ہے؟" اس نے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بے یقینی کے لہجے میں سوال کیا۔

"اردنی ہوں۔"

"عجیب عرب ہو۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "عرب اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے تو قاہرہ اس کی پہلی منزل ہوتی ہے اور ایک تم ہو کہ آدھی عمر پہ تعلیم کے باوجود اس عظیم شہر سے ناواقف ہو۔"

میں جواب میں بس مسکرا کر رہ گیا۔

اس نے اپنے دستی بیگ میں سے قلم نکال کر کاغذ کے ایک پُرزے پر کوئی فون نمبر لکھ دیا۔ "فرصت ملے تو اس نمبر پہ فون کر لینا۔ اس وقت تک میں قاہرہ میں رُکی رہی تو کہیں مل بیٹھیں گے۔"

"اس نمبر پر براہ راست تم سے ہی بات ہو گی؟"

"نسوانی آواز سنائی دے تو بات کرنا اور اگر مردانہ آواز مخاطب ہو تو بات کیے بغیر فون کا سلسلہ منقطع کر دینا۔"

"تو میرا خیال درست ہی تھا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "قاہرہ میں بھی کپتان ہی تمہارا میزبان ہو گا۔"

"ذاتیات میں دخل نہ دو۔" اس کا لہجہ یک بیک سخت ہو گیا۔ "اگر یہی ارادے ہیں تو بہتر ہو گا کہ ہم دوبارہ نہ ملیں۔"

"میں تو بس اپنے اندازے کی درستگی پر خوش ہو رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ورنہ اس جہاز سے اترنے کے بعد تمہارے ذاتی معاملات سے میرا کوئی تعلق نہ ہو گا۔"

"تم قاہرہ کیوں آئے ہو؟" یک بیک اس نے سوال کر ڈالا۔

"تاکہ قاہرہ دیکھنے کے بعد مکمل عرب کہلاتے جانے کا حقدار بن سکوں۔" میں نے مسکرا کر برجستہ جواب دیا۔

اسی اثنا میں طیارے نے اپنا بوجھ کنکریٹ کے رن وے سے ٹکرانے والے پہیوں پر ڈال دیا تھا۔ ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ طیارہ رن وے پر دوڑنے لگا۔

قاہرہ کے ہوائی اڈے پر خاصی چہل پہل تھی مگر ماحول پر عجیب سی گھٹن طاری تھی۔ اس کی بڑی وجہ ہر جگہ موجود وہ بے فکرے مقامی تھے جن کے پاس غالباً وقت کی کوئی کمی نہیں تھی اور ایسی ہر ٹولی میں یک بیک کئی کئی افراد بلند آہنگ کے ساتھ اپنی اپنی بولیاں بولے جا رہے تھے۔

مجموعی طور پر وہاں بے انتہا سُست روی کا اظہار ہو رہا تھا جیسے کسی کو وقت گزرنے کی فکر ہی نہ ہو۔ ہر شخص اپنی مرضی اور مزاج کے اعتبار سے کام کرنے کا عادی معلوم ہو رہا تھا اور یہ کسی زوال پذیر معاشرے کی سب سے بڑی نشانی تھی۔

ایک کاؤنٹر پر میں قطار میں چوتھے نمبر پر کھڑا ہوا تھا مگر کاؤنٹر والا اگلے شخص کا پاسپورٹ ہاتھ میں تھامے قہقہے لگا لگا کر اپنے کسی ساتھی سے مذاق کر رہا تھا اسی اثنا میں کسی جانب سے قہوے کی تیاری کا نعرہ گونجا اور وہ شخص حیران و پریشان مسافروں کو ان کے حال پر چھوڑ کر پاسپورٹ ہاتھ میں دبائے قہوہ نوش کرنے چلا گیا۔

تکان، نقاہت اور کاہلی سے بیزار لوگوں سے فراغت پا کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مریم غائب تھی۔

ایئرپورٹ سے باہر آیا تو ٹیکسی ڈرائیوروں کی ایک ٹولی تیزی سے میری طرف جھپٹی اور اگر مجھ سے ذرا بھی چُوک ہوتی تو میرا مختصر سا سوٹ کیس اسی لمحے غائب ہو گیا ہوتا۔

ہاشم نے مجھے جو اہم ترین نام اور پتہ دیا تھا اس وقت میرے لیے وہی اہم ترین تھا۔ ہاشم کی دی ہوئی فوقیت کو نظر انداز کرنا اس وقت میرے بس سے باہر تھا۔

شہر پہنچ کر میں نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں کمرہ کرائے پہ لیا اور سوٹ کیس وہاں مقفل کر کے چند منٹ بعد ہی باہر نکل گیا۔

نصف گھنٹے بعد میں کیبنوں پر مشتمل قدیم طرز کے اس بے ترتیب بازار میں پہنچ گیا جہاں مجھے عبدالکمال سے ملنا تھا۔

ہاشم کے بیان کے مطابق عبدالکمال اس بازار میں گیارہویں کیبن پہ کپڑا بیچنے کا کام کرتا تھا۔

جب اس بھیڑ بھاڑ میں کافی وقت برباد کرنے کے باوجود میں گیارہویں کیبن کا سراغ نہ پا سکا تو ناچار پندرہ نمبر کیبن پہ جا پہنچا۔

اتفاق سے وہ شخص بھی کپڑا فروش تھا۔ اس نے خوشامدانہ انداز میں دانت نکال کر میرا استقبال کیا۔

"عبدالکمال کا کیبن کدھر ہے؟" میں نے براہ راست سوال کر ڈالا۔

"یہی ہے۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرے قدموں میں بچھ کر مجھے رام کر لے۔

میں نے تیوریوں پر بل ڈال کر اس سیاہ آہنی تختی کو دیکھا جس پر واضح طور پر پندرہ نمبر درج تھا۔

"عبدالکمال تو گیارہویں کیبن میں بیٹھتا ہے۔"

"عبدالکمال میرا چھوٹا بھائی ہے۔ مال لینے گیا ہوا ہے۔" اس کی خوش خلقی بدستور برقرار تھی۔ "تم بتاؤ تو سہی کہ کیا لینا ہے میں اس کی غیر موجودگی میں بھی تمہیں پوری رعایت دوں گا۔ تم میرے بھائی ہو۔"

اس کی بکواس پر میرا خون کھول گیا۔ لالچ اس کی آنکھوں اور بشرے سے ہویدا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے موٹا گاہک سمجھتے ہوئے جھوٹ بول کر عبدالکمال سے اپنی قریبی رشتے داری کا اظہار کر رہا تھا۔

میں نے غصے کا اظہار کیے بغیر سنجیدگی برقرار رکھی اور آہستہ سے کہا۔ "اگر وہ واقعی تمہارا چھوٹا بھائی ہے تو میری صورت دیکھ کر ہرگز ادھر نہیں آئے گا۔"

"وہ کیوں؟" میرے جواب پر وہ حیران رہ گیا۔

"وہ تین برس سے میرا گیارہ ہزار پونڈ کا مقروض ہے۔" میرے الفاظ سن کر اس کے چہرے سے مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی۔

"پھر تو تم گیارہ نمبر پر ہی جاؤ۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "تم نے بلاوجہ میرا وقت برباد کیا ہے۔"

"مگر عبدالکمال تو تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔" اسے سبق دینے کی نیت سے میں کٹ حجتی پر اتر آیا۔

"یہ دکان میری ہے۔" وہ تیز لہجے میں غرّایا۔ "آگے تیسری گلی میں بائیں طرف مُڑ جاؤ وہیں دائیں ہاتھ پہ پانچویں دکان پہ تمہارا قرضدار موجود ہو گا۔"

"مگر تمہارا بھائی....؟"

اس نے جھنجھلا کر میری بات کاٹ دی۔ "جہنم میں گیا میرا بھائی، میرا کوئی بھائی وائی نہیں ہے تم گیارہ نمبر پہ جاؤ اور میری جان چھوڑ دو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے جھوٹ بول کر مجھے یہاں روکا تھا۔" میرا لہجہ بھی بلند ہو گیا۔ "آخر اس حرکت کا مطلب کیا تھا؟"

میرا لہجہ تیز ہو جانے پر اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے گھور کر دیکھا پھر اچانک ہنس پڑا۔ "وہ دکانداری کی بات تھی۔ ہم گاہک کو کسی بھی قیمت پر دوسری جگہ نہیں جانے دیتے تمہارا تو معاملہ ہی دوسرا نکلا۔"

اس نے ڈھٹائی کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی لہٰذا میں آگے بڑھ گیا البتہ اس کے ساتھ اتنا وقت ضائع کر کے میں نے عبدالکمال کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔

پندرھویں کیبن والے کی بتائی ہوئی گلی میں دائیں ہاتھ کا پانچواں کیبن واقعی گیارہ نمبر تھا مگر اس شان سے کہ اس کے ایک طرف ایک سو تین نمبر تھا اور دوسری طرف اناسی نمبر کی تختی میرا منہ چڑا رہی تھی۔

اگر میں محض نمبروں کے سہارے بھٹکتا رہتا تو شاید دو دن تک بھی اپنے مطلوبہ مقام پر نہ پہنچ پاتا۔

"عبدالکمال؟" میں نے کیبن پر پہنچ کر نرم دوستانہ لہجے میں سوال کیا اور تکیے کے سہارے نیم دراز شخص نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھ کر سر کو اثبات میں جنبش دی اور سیدھا بیٹھ گیا۔

"کیا ہم کہیں اور چل سکتے ہیں؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا کیونکہ وہ کیبن اتنے مختصر تھے کہ دھیمے سے دھیمے لہجے میں کہی ہوئی بات بھی دوسرے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ پُرتپاک انداز میں کیبن سے نیچے اتر آیا۔ اپنی جوتیاں اس نے کیبن میں بچھی ہوئی دری کے نیچے سے نکالی تھیں۔

"کہاں سے آئے ہو؟ کس نے بھیجا ہے؟" اس نے میرے ہمراہ ایک طرف چلتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

"بن غازی سے ہاشم نے بھیجا ہے۔"

"ارے تو پہلے کیوں نہ بتایا۔" وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "تم تو میرے

مربّی کے بھیجے ہوئے مہمان ہو۔ میں ابھی دکان کو تالا لگا کر آتا ہوں۔"
"سنو! میری آمد کو غیر معمولی اہمیت نہ دو۔"
"اوہ!" اس کے ہونٹوں سے بے اختیار ایک طویل سانس آزاد ہو گیا۔" تم بہت سمجھدار معلوم ہوتے ہو، لیکن بازار بند ہونے تک تم کہاں بھٹکتے پھرو گے۔"
"میری فکر نہ کرو، میں مطعم الدولی کے کمرہ نمبر چار میں مقیم ہوں۔" میں نے اس کے ہمراہ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
"شاید کسی اہم کام سے آئے ہو؟"
"وہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تم دکان خالی چھوڑ آئے ہو، ایسا نہ ہو کہ لوگ میدان صاف پا کر اسے خالی ہی کر دیں۔"
میری بات پر اس نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا اور بولا۔" واللہ تم نے پہچانا ہے قاہرہ کو۔ لیکن اس بازار میں لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ خالی دکان میں چوری نہیں ہو سکتی لیکن سڑک پر کھوٹا سکہ بھی پڑا ہو تو لوگ اسے اٹھا لے جائیں گے۔"
ایک قہوہ خانے کے دور افتادہ گوشے میں لے جا کر میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ میرا اصل نام صفدر علی تھا جس پر وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔
"چند روز پہلے تک میرے لیے تمہارا نام اجنبی تھا۔" وہ کہنیوں کے بل میز پر میری طرف جھک کر بولا۔" لیکن مقامی اخباروں میں تمہارا نام خوب اچھالا جا رہا ہے۔ آج ہی خبر چھپی ہے کہ تم تین پولیس افسروں اور ایک تربیت یافتہ کتّے کو ہلاک کر کے بن غازی سے مصری سرحدوں کی طرف بھاگے ہو۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اتنی تشہیر اور ناکہ بندی کے باوجود تم اتنی جلدی کیسے آ گئے؟"
"سب کچھ بتا دوں گا، تم مطعم الدولی کب آ رہے ہو؟" میں نے اس کی گفتگو کو اختصار دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"رات نو بجے تک۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔" چاہو تو دکان جلدی بند کر دوں؟"
"اپنے معمولات میں فرق نہ آنے دو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔" میری سلامتی کے لیے یہ نکتہ بہت اہم ہے۔"
"تم فکر نہ کرو میں خیال رکھوں گا۔"
قہوے کی پیالیاں خالی کر کے ہم دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ عبدالکمال اپنی دکان کی طرف چل دیا اور میں مخالف سمت میں ہو لیا۔
میں اپنی دھن میں مگن لاپرواہانہ انداز میں سیدھا چلا جا رہا تھا۔ کہ کچھ دیر بعد ایک نسوانی سرگوشی نے مجھے چونکا دیا۔
میں نے "یا حبیبی!" کہنے والی کی طرف سر گھمایا تو کاجل کے ڈوروں میں لپٹی ہوئی دو مدھ بھری آنکھوں نے مجھے ایک والہانہ سا اشارہ کیا اور چلتے چلتے میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔
بھرے بھرے بدن والی وہ خوبصورت عورت لپک کر میرے قریب آ گئی اور میں نے اس کے بدن سے اٹھنے والی وحشیانہ مہکار اپنے نتھنوں کے راستے دماغ پر اثر انداز ہوتی محسوس کی۔ وہ جو بھی تھی، بہر حال قابلِ دید تھی۔
مگر وہ دید سے زیادہ فیاضی پر آمادہ تھی۔" تم میرے ساتھ چلو گے یا میں تمہارے ساتھ چلوں؟" اس نے اپنی بات اتنے وثوق سے کہی گویا اس کی دانست میں میرے لیے تیسری صورت اختیار کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔
میں نے اس کے نیچے گلے والے بلاؤز میں سے جھانکتے ہوئے گداز گندمی بدن کا جائزہ لیا اور اسکرٹ سے نیچے برہنہ پنڈلیوں تک کا محتاط سفر طے کرنے کے بعد دوبارہ سر اٹھایا تو وہ گرد و پیش سے بے خبر اپنے بھرے بھرے خوبصورت ہونٹوں پر حسین مسکان سجائے میرے جواب کے لیے سراپا انتظار بنی ہوئی تھی۔
"تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔۔۔" میں نے اپنے وجود میں ابھرنے والی شورش پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔
"میرا نام خالدہ ہے۔" میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔" میری سرپرستی غلط آدمی ہی کرتے ہیں اور مجھے ان کی بڑی پہچان ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلو، مایوس نہیں کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے جسمانی خد و خال کچھ اور واضح کر دیئے۔
"میری جیب خالی ہے۔" اس کے پے در پے حملوں کے سامنے میرا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔" بدفال منہ سے نہ نکالو۔ میں ان میں سے نہیں ہوں جو مردوں کی جیبیں الٹی کرا لیتی ہیں جو خالی ہو جانے دے دینا۔"
پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
صفدر علی زندگی میں کبھی دن دہاڑے بھرے بازار سے اغوا نہیں ہوا تھا مگر اس روز یہ واقعہ بھی پیش آ ہی گیا۔
پہلے میرا خیال تھا کہ اسے ہوٹل لے جاؤں لیکن قاہرہ میں آمد کے ابتدائی مرحلے پر میں ایسی بے اعتدالی سے گریز ہی کرنا چاہتا تھا، لہٰذا خالدہ کے استفسار پر میں نے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔
اس کا دو کمروں پر مشتمل عسرت زدہ سا فلیٹ شہر کے گندے اور تنگ و تاریک مقام پر واقع تھا جہاں فلیٹ کے بند دروازوں کے پیچھے بھی ان بچوں کا شور سنائی دے رہا تھا جو نیچے گلی میں دھول اڑاتے کھیلتے پھر رہے تھے۔
"بڑی گنجان آبادی میں رہتی ہو تم۔" اس کے فلیٹ پر پہنچ کر میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
"یہاں فلیٹ کا کرایہ کم ہے۔" وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔" سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتے۔"

"یہ تو عجیب بات کہہ رہی ہو تم۔" میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا۔" گنجان بستیوں میں تو ہر عورت پڑوس کے گھر میں جھانکنے کے لیے بے تاب رہتی ہے، خاص طور پر اس وقت جب پڑوس میں کوئی خوبرو لڑکی تنہا رہتی ہو۔"
"یہاں تاک جھانک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔" وہ بولی۔" دو سال سے رہ رہی ہوں جس روز آتے جاتے کسی نے ٹوک دیا دوسری جگہ چلی جاؤں گی۔"
"بُرا نہ مانو تو ایک بات کہہ ڈالوں۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔
"بُرا مان کر کیا کروں گی۔" وہ خاصی حقیقت پسند واقع ہوئی تھی۔
"یہاں آنے سے تو بہتر تھا کہ تم میرے ساتھ چلتیں۔"
"تم ہی خاموشی اختیار کر گئے تھے، ویسے عام طور پر میں کہیں جانے کے بجائے اپنے دوستوں کو یہیں لانا پسند کرتی ہوں۔"
"دوستوں کو؟"
"ہاں ہاں!" وہ ہنس کر بولی۔" عارضی سہی مگر تم بھی تو اس وقت میرے دوست ہی ہو۔"
"وہ بات رہ گئی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔
"کون سی؟"
"دوستوں کو یہاں لانے والی۔"
"اوہ۔" وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔" لاکھ بُری سہی مگر میں بھی عورت ہوں۔ اپنے ٹھکانے پر میں ہمیشہ خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔"
"تمہارے پاس تو محبتوں کے سوداگر آتے ہیں۔" میں نے اس کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔" ان سے تمہیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"
"یہ نہ کہو، ان میں بھی بڑے بڑے جنونی ہوتے ہیں۔"
"تمہارا تجربہ تو ہر جنون کا توڑ سکھا دیتا ہے۔"
"شاید تم نے شام کے اخبار نہیں دیکھے۔" وہ چھبتے ہوئے لہجے میں بولی۔" سب سے بڑی خبر ہی پڑھ لی ہوتی تو مجھ سے بحث نہ کرتے۔"
"کیا ہے اس خبر میں؟"
"ایک غیر ملکی اپنے ہوٹل کے کمرے میں مُردہ پایا گیا ہے۔" میرے ہاتھوں نے اس کے بدن کا لمحاتی ارتعاش نمایاں طور پر محسوس کیا۔
"روز نہ جانے کتنے لوگ مُردہ پائے جاتے ہیں۔ اس کا تمہاری بات سے کیا تعلق ہے؟" میں نے سرسری لہجے میں سوال کیا۔
"اس کی قاتل ایک عورت تھی۔"
"یہ نکتہ تمہارے فلسفے کے خلاف جاتا ہے۔"
"مرنے والے کی مٹھی میں کسی عورت کے لمبے لمبے سرخ بال پائے گئے ہیں۔ اس کے ناخنوں میں جلد کا گوشت اور خون پھنسا ہوا تھا، جس کا مطلب ہے کہ مرنے والے نے عورت پر زیادتی کی ہو گی اور عورت نے بلبلا کر اس کا نرخرا ہی دبا ڈالا۔" اس واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے خالدہ پر خوف طاری ہونے لگا۔
"عورت پکڑی گئی؟"
"نہیں، وہ تو چھلاوہ نکلی۔" خالدہ نے کہا۔" ہوٹل کے عملہ تک نے اس کی جھلک نہیں دیکھی۔ اسے نہ آتے ہوئے دیکھا گیا نہ جاتے ہوئے۔"
"اور اگر اب میں تمہارے ہی فلیٹ میں تمہارے ساتھ زیادتی شروع کر دوں تو کیسا رہے گا؟"
وہ پھریری لے کر اچانک مجھ سے دور ہٹ گئی اور خوفزدہ لہجے میں بولی۔" خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ میں خوفزدہ ہو کر بے اختیار چلّانے لگوں۔"
"ڈرو نہیں۔" میں ہنسنے لگا۔" میں اتنا خونخوار عاشق نہیں ہوں۔"
"میں جانتی ہوں۔" وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔" لیکن میں ایسا خوفناک مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"
"چلو اب خیال رکھوں گا۔" میں دوبارہ اس کے قریب پہنچ گیا۔
"ٹھہرو، پہلے لباس بدل لوں۔" وہ میری گرفت سے بچ کر پھرتی سے اٹھ گئی۔" ابتدا پہلو تہی سے کی تھی اور اب ندیدے ہوتے جا رہے ہو۔"
وہ لپک کر غسل خانے میں جا گھسی اور میں اٹھ کر کمرے کے وسط میں ٹہلنے لگا۔ اسی اثنا میں میری نظر اخبار پر پڑی اور میں نے اسے اٹھا لیا۔
وہ قاہرہ کے روزنامے القبس کا شام کا ضمیمہ تھا اور اس کی سرخی قتل کے اسی واقعہ کے بارے میں تھی جس کا ذکر خالدہ کر چکی تھی۔
سرخیوں کے نیچے میں نے متوفی کی لاش کا مسخ شدہ چہرہ دیکھا تو یک بیک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اذیت ناک موت کے آخری اثرات نے لاش کا چہرہ ۔۔۔۔۔ بہت بگاڑ دیا تھا لیکن البرونو کا سٹیلانو کی تصویر میں پہلی نظر میں پہچان چکا تھا۔
میں نے نہایت بے چینی کے ساتھ پوری خبر کا مطالعہ شروع کر دیا۔
اگر مرنے والا البرونو کاسٹیلانو تھا اور اس کی قاتلہ کوئی بیوقوف عورت تھی تو وہ صرف سیتا ہی ہو سکتی تھی۔ میری پیاری، میری دلبر سیتا۔
سیتا کے سرخ بال البرونو کی مٹھی میں ملے تھے اور اس خبیث نے مرنے سے قبل سیتا کا چہرہ یا بدن بُری طرح نوچا تھا۔
مجھے پورا یقین تھا کہ وہ معرکہ جو کچھ بھی رہا ہو سیتا کے سامنے البرونو کے شیطانی عزائم بُری طرح ناکام ہوتے ہوں گے مگر تشویش کی

بات یہ تھی کہ زخمی ہونے کے بعد سیتا خطرات سے دوچار تھی۔ پولیس کو ہر زخمی عورت پر البرونو کی قاتلہ کا شبہ کرنے کا پورا قانونی اور اخلاقی حق حاصل تھا۔

میں وہ پوری سنسنی خیز خبر پڑھ گیا مگر اس میں کہیں بھی سیتا یا البرونو کا نام نہیں تھا۔ البرونو کاسٹیلانو اس ہوٹل میں اسمتھ براؤن نام کے برطانوی باشندے کے طور پر مقیم تھا اور خبر میں اس کا وہی نام شائع ہوا تھا البتہ سیتا کے بارے میں صرف تحیر ہی تحیر تھا۔

اگر البرونو کی مٹھی سے نسوانی بال برآمد نہ ہوتے تو شاید یہ پتہ چلانا بھی دشوار ہو جاتا کہ قاتل کی جنس کیا تھی۔

بے اختیار میری مٹھیاں بھنچ گئیں اور میرے بدن کا رواں رواں انتقام کی بھٹی میں تپنے لگا۔ میں بن غازی سے جس مشن پر نکلا تھا اس میں غیر متوقع طور پر پہلے ہی مرحلے میں نمایاں کامیابی ہو گئی تھی نہ صرف سیتا بلکہ اس کے دشمن کا بھی ایک حد تک سراغ مل گیا تھا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ البرونو نے سیتا کے ساتھ ظلم کیا تھا اور میں اس کے احساس ہی سے پاگل ہوا جا رہا تھا مگر سیتا نے میرے انتقام کے لیے کچھ نہیں چھوڑا تھا اس نے اپنا بھرپور بدلہ خود ہی لے لیا تھا، اور میرے لیے اپنا ایک موہوم سا سراغ چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر کہیں گم ہو گئی تھی۔

بن غازی سے روانہ ہوتے ہوئے میں نے منصوبہ بنایا تھا کہ قاہرہ سے ہوتا ہوا خرطوم جاؤں گا اور پھر البرونو کاسٹیلانو کی محبوبہ ایلی کا کھوج نکال کر اس کے ذریعے البرونو تک پہنچوں گا اور اس سے سیتا کا پتہ چلاؤں گا۔

مگر قدرت شاید اسی وقت سے میرے منصوبوں پر خندہ زن تھی۔

قاہرہ کے بھرے بازار میں طوائف کے روپ میں مجھے ایک بہترین رہنما میسر آیا تھا جسے میں احتیاط کے باعث ٹھکراتا رہا لیکن خالدہ میرے گلے کا ہار بن گئی اور پھر اس کے فلیٹ پر ایسی گفتگو کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں مجھے اہم ترین اطلاعات مل گئیں۔

اگر میں خالدہ کے ساتھ نہ آتا تو شاید البرونو کے قتل اور شام کے اخباری ضمیموں کی سرخیوں سے بھی لاعلم رہتا کیونکہ ان میں اسمتھ براؤن کا نام تھا جب کہ میں عبدالکمال سے البرونو اور سیتا کے حوالے سے بات کرتا اور وہ مجھے کچھ بھی نہ بتا پاتا۔ دوسرا اہم ترین اتفاق خالدہ کا رویہ تھا۔ اس کی زبانی قتل کا پورا قصہ سن کر بھی میں معاملے کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکا تھا بلکہ خود کو اس کے حسن کی رعنائیوں میں کھو دینا چاہتا تھا لیکن خلافِ توقع وہ اس مرحلے پر خود سپردگی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے لباس تبدیل کرنے کے لیے پھرتی سے غسل خانے میں جا گھسی اور یوں خالی لمحات میں میری نگاہیں اخبار تک جا پہنچیں جہاں پہلے ہی صفحے پر میرے لیے انکشافات موجود تھے۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اچانک خالدہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے تیزی سے سر گھمایا تو وہ بال شانوں پر بکھرائے باریک لبادہ زیب تن کیے میری لاعلمی میں نہ جانے کب میرے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔

”میں مقدر کی کرشمہ سازیوں پر غور کر رہا تھا۔“ میں نے اخبار پھینک کر صوفے سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”ان نجومیوں کی باتوں میں نہ آنا، یہ نپے تلے الفاظ میں برسوں سے دبی گھسی پٹی الٹی سیدھی پیش گوئیاں کرتے آرہے ہیں۔“

”کن نجومیوں کی بات کر رہی ہو؟“

”شام کے اخبارات میں نجومیوں کے کالم لازمی صورت اختیار کر گئے ہیں اور ہر قاری ان پر یقین کرنے کے باوجود انہیں بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔“ وہ میرے پھینکے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”تمہاری بتائی ہوئی خبر پڑھنے کے بعد تو کسی کالم پر نظر ڈالنے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے نرمی سے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔

”پڑھ لی نا خبر تم نے۔ اب بتاؤ کہ میں غلط کہہ رہی تھی کیا؟“

”اگر چہرے پر خراشوں کے تازہ نشانات والی کوئی عورت تمہیں نظر آجائے تو اس کے ساتھ تمہارا کیا سلوک ہوگا؟“

”اس کے ہاتھوں کو چوم لوں گی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”اتنی عقیدت ہو گئی ہے اس سے؟“ میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے پوچھا۔

”یہی سمجھ لو۔“ وہ لاپروائی سے بولی۔

”چاہو تو اسے تلاش بھی کر سکتی ہو۔“ میں نے اندھیرے میں دوسرا تیر پھینکا۔

”یہ قاہرہ ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایک عورت تو بڑی معمولی ہستی ہوتی ہے، اگر ابوالہول کا مجسمہ بھی بدمعاشی پر تل جائے تو قاہرہ میں اس کا سراغ بھی نہ مل سکے گا۔“

”تمہارے بدن پر یہ لبادہ گھٹیا معلوم ہو رہا ہے۔“ میں نے موضوع بدلنے کی نیت سے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو کیا اسے بھی مجھے خود ہی اتارنا ہوگا؟“ اس نے بے حجابانہ لہجے میں سوال کیا۔

”لاحول ولاقوۃ۔“ میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”لباس وہ اچھا لگتا ہے جو جسم کو پوری طرح چھپا لے۔“

”اور میرے غسل خانے میں جانے سے پہلے تم اسی لباس کے دشمن ہو رہے تھے۔“ اس نے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس وقت تجسس سوار تھا، اب ندامت ہو رہی ہے۔“ میں نے صاف لفظوں میں اپنے احساسات کا اعتراف کر لیا۔

”پیسے نہیں دینا چاہتے تو نہ دینا مگر راہبانہ انداز میں گفتگو کر کے میری طبیعت مکدر کرنے کی کوشش نہ کرو۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

”نذرانہ حاضر ہے۔“ میں نے جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے اور صوفے سے اٹھ گیا۔

اس نے بے تکلفانہ خوشی کے ساتھ وہ نوٹ لے لیے جو بلا مبالغہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھے۔

میں دروازے کی طرف بڑھا تو خالدہ نے لپک کر میرا بازو تھام لیا۔ ”پیسے دے کر کہاں جا رہے ہو؟“

”یہ تمہارے اس وقت کا معاوضہ ہے جو میں نے برباد کیا۔“ میں نے مڑ کر بہت نرم لہجے میں کہا۔

ایک ثانیے کے لیے اس کی نگاہوں میں حقارت اور غصے کی لہر دوڑ گئی اور اس نے ایک جھٹکے سے وہ نوٹ میری جیب میں اڑس دیے۔

”میں بھکارن نہیں ہوں۔“ وہ غصے سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اپنا جسم ضرور بیچتی ہوں مگر مفت کے ٹکڑوں پر نہیں پلتی...... تم نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے میری توہین کی ہے اور میرا دل دکھایا ہے!“

وہ واقعی بہت آزردہ تھی۔ شاید اسے اپنی نسائیت پر ناز تھا اور میرے رویے سے اس کی انا کو شدید ٹھیس لگی تھی۔

”مجھے معاف کر دو خالدہ!“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔ ان پیسوں کو تم ایک دوست کا حقیر سا تحفہ بھی سمجھ سکتی ہو۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ اس وقت ہم دونوں ایک اعتبار سے عارضی دوست ہیں۔“

”کوئی کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔“ وہ بھرائی ہوئی غصیلی آواز میں بولی۔ ”نکل جاؤ یہاں سے ورنہ ابھی شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔“

میں نے تاسف آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا، اس وقت اس کے تیور خطرناک تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے مزید سمجھانے پر وہ واقعی شور مچانا بھی شروع کر سکتی تھی۔

میں اس کے فلیٹ کا دروازہ کھول کر بوجھل دل کے ساتھ باہر آگیا۔

خالدہ سرزمین نیل کی بھولی بیٹی تھی جو ایک طوائف کے روپ میں مجھ سے ٹکرائی تھی مگر اس میں خودداری کا جذبہ پوری قوت سے زندہ تھا۔

مطعم الدولی پہنچنے کے بعد بھی میں اس واقعہ کو فراموش نہ کر سکا۔ ایک ایسی عورت جس نے نادانستگی میں میری بے انتہا مدد کی تھی میں اسے اپنے الفاظ کی حد تک بھی خوش نہ رکھ سکا تھا۔

راستے میں میں نے شام کے کسی عربی اور انگریزی اخبارات کے ساتھ ہی شراب کی ایک بوتل بھی خرید لی تھی۔ لہٰذا خود کو ہوٹل کے کمرے میں مقفل کرنے کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے ان اخبارات کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ہر اخبار نے قتل کی اس ہولناک واردات پر اپنے اپنے انداز میں قیاس آرائی کی تھی مگر متن کے اعتبار سے میری معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

ہر اخبار نے ایک ہوٹل کے کمرے میں سرخ بالوں والی کسی بے خوف لڑکی کے ہاتھوں اسمتھ براؤن نامی ایک انگریز کے قتل کی کہانی شائع کی تھی جو پچھلے کئی روز سے اسی ہوٹل میں قیام کیے ہوئے تھا۔

البتہ المستقبل نامی اخبار کے نامہ نگار نے ذاتی جدوجہد کے بعد یہ معلوم کیا تھا کہ مقتول بہت زیادہ تنہائی پسند تھا اور اسے کھانا وغیرہ بھی کمرے ہی میں پہنچایا جاتا تھا وہ ہر روز تین چار گھنٹوں کے لیے ہوٹل سے غائب رہتا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے تاریخی مقامات وغیرہ کی سیاحت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس ضمن میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ہوٹل کے کمروں میں مقیم مسافروں کی خدمت پر مامور عملے نے کبھی بھی اس کے کمرے میں کسی لڑکی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ وہ عیاشی کا دلدادہ بھی نہیں تھا۔

المستقبل کے نامہ نگار کے لیے وہ نکات اہم تھے مگر میں البرونو کاسٹیلانو کے اس رویے کے اسباب سے واقف تھا۔

وہ اسرائیلی ایجنٹوں سے خطیر پیشگی رقوم وصول کرنے کے باوجود سیتا کو ان کے حوالے کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اور سیتا قصر خیار کی جیل سے فرار ہو کر لیبیا کی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور البرونو اس کے تعاقب میں قاہرہ پہنچ گیا۔

اسے ایک طرف سیتا کی تلاش تھی جسے وہ مزید منہ مانگی رقم کے عوض اسرائیلیوں کے حوالے کر سکتا تھا تو دوسری طرف وہ اسرائیلی خفیہ ایجنٹوں سے بھی چھپتا پھر رہا تھا۔ ان حالات میں اس کے لیے تنہائی پسندی ہی بہتر صورت تھی۔

اس موڑ پر مجھے ایلی کا خیال آیا جو بن غازی سے خرطوم کے لیے روانہ ہوئی تھی مگر میرا ذہن قاہرہ میں البرونو کے قتل کے بعد ایلی کے معاملے کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

البرونو نے شاید حفظ ماتقدم کے طور پر ایلی کو قاہرہ کے بجائے خرطوم پہنچنے کی ہدایت کی تھی اور حالات سازگار پاتے ہی وہ اسے ضرور قاہرہ طلب کر لیتا۔

رات کے نو بجے دروازے پر دستک سننے کے بعد ہی میں خیالات کی ہولناک یلغار سے نجات پا سکا۔

اس وقت تک نصف سے زیادہ بوتل میرے معدے میں منتقل ہو چکی تھی اور ایش ٹرے سگریٹ کے مسلے ہوئے ٹکڑوں... سے بھری ہوئی تھی۔

میں نے نہایت سرور کے عالم میں دروازہ کھولا تو عبدالکمال کا

مسکراتا ہوا بارونق چہرہ میرے سامنے موجود تھا۔

"اب بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟" سلام دعا کے بعد اس نے اندر آتے ہی مجھ سے پہلا سوال کر ڈالا۔

"بس کسی نہ کسی طرح آ ہی گیا۔"

"الکحل اور تمبا کو، دونوں ہی صحت کے لیے زہر ہیں۔" اس نے بھری ہوئی ایش ٹرے اور نصف بوتل پر ناپسندیدگی سے نگاہ ڈال کر کہا۔

"تم میرے دکھوں سے ناواقف ہو ورنہ ہر زہر کو امرت کہنے پر مجبور ہو جاتے۔" میں نے دردآمیز لہجے میں کہا۔

"تمہارا لہجہ لکنت سے عاری ہے ورنہ میں یہی سمجھتا کہ تم نشے میں مکالمے بولنے کی مشق کر رہے ہو۔"

"شاید تم نے سیتا کا نام نہیں سنا؟"

وہ پُراعتماد انداز میں ہنس دیا۔ "بن غازی سے تمہارے خون آشام فرار کی خبروں کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا گیا تھا کہ کچھ عرصے قبل تمہاری سیتا نامی بیوی بھی لیبیا کی ایک جیل سے فرار ہو کر لاپتہ ہو چکی ہے۔"

"میں اسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔"

"سیتا کا کوئی سراغ مل سکے گا؟"

"میرے لیے تو ابھی تک وہ محض ایک نام ہے، اب تم نے کہا ہے تو کچھ کوشش کروں گا ویسے تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر تو ہو گی؟"

میں نے مایوسانہ انداز میں اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ "اسے مجھ سے بچھڑے ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا ہے کہ اب تو شاید میں خود بھی اسے فوراً نہ پہچان سکوں۔"

"تصویر کے بغیر بڑی مشکل ہو گی۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا نام بدل لیا ہو۔"

"اگر تم لیبیا کے ایک ڈیڑھ ماہ پرانے اخبار حاصل کر سکو تو شاید ان ہی میں سیتا کی کوئی تصویر مل جائے۔ ان دنوں وہ لیبی حکام کے لیے بہت محترمہ ہوا کرتی تھی۔" میں نے فوری خیال کے تحت تجویز پیش کی۔

"یہ تو بہت آسان ہے۔" وہ خوش ہو گیا۔ "لیبیا کے سفارت خانے کے ریڈنگ روم میں پرانے اخبارات کی ساری فائلیں مل جائیں گی۔ ..... اس کے بعد اگر وہ واقعی قاہرہ میں موجود ہے تو میں اسے تلاش کر لوں گا۔"

"وہ قاہرہ میں ہے۔" میں نے باوثوق لہجے میں کہا۔ "کم از کم آج صبح تک ضرور موجود تھی۔"

"یہ کیسے کہہ رہے ہو جب کہ تم دوپہر کو قاہرہ ایئرپورٹ پر اترے ہو؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"شاید تم نے شام کے اخبارات نہیں پڑھے!"

"اوہ!" اس کا منہ فرطِ حیرت سے وا ہوتا چلا گیا۔ "کہیں تمہارا اشارہ اسمتھ براؤن کی قاتلہ کی طرف تو نہیں ہے؟"

میں نے گلاس میں بچی ہوئی شراب اپنے دہانے میں انڈیل کر محض اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"یہ کیسے ہو گیا؟"

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے اپنے لیے نیا گلاس تیار کرتے ہوئے کہا۔ "بس یہ سمجھو کہ وہ بدمعاش سیتا کا اور میں اس بدمعاش کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسمتھ براؤن اس کا فرضی نام تھا۔ اصل نام البرونو کاسٹیلانو تھا اور وہ یہودیوں کے لیے کام کر رہا تھا۔"

"کمال ہے کہ یہ حادثہ بھی آج ہی ہونا تھا۔" وہ بے یقینی سے بڑبڑایا۔ "تمہیں شام کے اخبارات کا خیال کیسے آ گیا تھا؟"

"ایک عورت مجھ سے ہاتھ چھڑا کر لباس بدلنے نہ جاتی تو مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو پاتا۔" میں نے خالدہ کے بارے میں ایک مرتبہ اپنے دل میں کسک محسوس کی۔

عبدالکمال کے استفسار پر میں نے اسے خالدہ کے آٹکرانے کا واقعہ سنا دیا۔ "جب وہ مجھ پر برسی تو میں اپنے کانوں پر یقین نہ کر سکا۔ جس طرح کوئی چور ایماندار نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی پیشہ ور عورت غیرت مند نہیں ہو سکتی۔ مگر خالدہ نے اپنے دو ٹوک رویّے سے میرے برسوں پرانے تجربے کو چند لمحوں میں جھٹلا دیا۔"

"تم خوش نصیب ہو ورنہ قاہرہ میں تو حسین چہرے والیاں سیّاحوں کی جیب میں واپسی کا کرایہ تک نہیں چھوڑتیں۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ سیتا کے ملنے کا کیا امکان ہے؟"

"وہ زخمی ہے اور اس حالت میں سفر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی تلاش کے لیے اگلے چوبیس گھنٹے اہم ثابت ہوں گے۔"

"خدا تمہارے الفاظ مبارک کرے۔"

"میں اب چلوں گا، میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلتے چلتے ایک بات بتاتے جاؤ!"

"پوچھو!"

"تم تنظیم کے رکن ہو؟"

"کیسی تنظیم؟"

"آزادیٔ فلسطین!" میں نے کہا۔

"اس کی رکنیت کی فرصت کسے ہے۔" وہ لاابالی انداز میں بولا۔ "ہاشم جیسے دولت سے ادر جذباتی لوگ ہی ایسی تنظیموں کا ایندھن بنتے ہیں۔ میں تو بس اس کا بچپن کا دوست ہوں اور اس کے بھیجے ہوئے مہمان کی خدمت کا فرض نباہنے کی کوشش کروں گا۔"

"اچھا ہی ہوا کہ میں نے پوچھ لیا ورنہ تم سے کچھ اور بھی توقعات کر بیٹھتا۔"

"فکر نہ کرو، اگر رقم وغیرہ بھی درکار ہے تو بے دریغ بتا ڈالو میرے دوستوں کے لیے ہاشم ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیتا رہا ہے۔"

"میرے پاس خاصی رقم موجود ہے، میرا مقصد محاذ آرائی سے تھا۔"

"کس سے لڑو گے تم؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"اپنے اس دشمن سے جو میرے اور سیتا کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے گا۔" میں نے نیا گلاس بھی خالی کر دیا۔

"سنو!" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "اس وقت تمہارے اور سیتا کے درمیان صرف اور صرف قانون حائل ہے کیونکہ اپنے دشمن کو تمہاری بیوی خود کیفرِ کردار تک پہنچا چکی ہے۔ اگر تم نے قانون سے ٹکرانے کی حماقت کی تو مجھے اپنے ساتھ نہیں پاؤ گے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں عجیب سے انداز میں ہنس دیا۔ "ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے قبل میں خود ہی تم سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔"

عبدالکمال نے میرے عزائم بھانپ کر مجھ سے بالکل وہی بات کہی تھی جو مجھے قانون شکنی پر آمادہ پا کر ہاشم نے کہی تھی۔ اور اس معاملے میں ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی میرے لیے تعجب خیز بھی نہیں تھی کیونکہ گہری دوستی کے لیے خیالات کی بنیادی ہم آہنگی ضروری ہوتی ہے۔

عبدالکمال عجلت میں مجھ سے رخصت ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سیتا کو قاہرہ سے نکلنے کا موقع میسر آنے سے قبل اس کے گرد اپنے آدمیوں کا ایسا جال پھیلا دے کہ اس کی نقل و حرکت کی خبریں مجھ تک پہنچنے لگیں۔

اس رات میں نے مطعم الدلی کے کمرے میں بے تحاشا شراب نوشی کی اور بلانوش ہونے کے باوجود اس رات میرے حواس بہکنے شروع ہو گئے۔

اسی مدہوشی کے عالم میں میں نے وہ رات بسر کی صبح بیدار ہوا تو میرا سر بہت زیادہ بھاری ہو رہا تھا۔ کسلمندی کا یہ حال تھا کہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ اپنی مصروفیات سے ہٹ کر میں نے ناشتہ کمرے میں ہی طلب کر لیا مگر ناشتے کے بعد بھی پچھلی رات کی بے اعتدالی کے اثرات سے نجات نہ مل سکی۔

مگر میرے لیے باہر نکلنا ناگزیر تھا۔ خدمت گار سے مقامی اخبارات منگوانے میں خفیف سا امکان تھا کہ وہ اخبارات میں میری اس غیر معمولی دلچسپی کو مشتبہ سمجھ بیٹھتا جب کہ میں مختلف اخبارات کے ذریعے البرونو کاسٹیلانو کے قتل کے بارے میں پولیس کی کارگزاری سے واقفیت حاصل کرنی چاہتا تھا۔

میں خود پر جبر کر کے باہر نکل ہی گیا اور پھر ایک قریبی اسٹال پر سجے ہوئے اخبارات کی شہ سرخیوں میں سیتا کا نام دیکھ کر یک بیک میری نبضیں ڈوبنے لگیں۔ ان ہی سرخیوں میں البرونو کاسٹیلانو کا نام بھی موجود تھا۔

میں نے بظاہر لاپروائی اختیار کرتے ہوئے ایک سرخی پڑھ ڈالی۔

"ہوٹل کے کمرے میں مرنے والا مشہور ایجنٹ البرونو کاسٹیلانو ثابت ہوا — اس کی قاتلہ سیتا ہے جو لیبیا کی جیل سے مفرور ہے۔"

سرخیاں اس قدر سنسنی خیز اور ایسے یقینی الفاظ سے سجائی گئی تھیں کہ مجھے یقین ہونے لگا کہ پولیس نے پوری گتھی سلجھا لی تھی۔

میں نے دو عربی اور ایک انگریزی اخبار خریدے اور بازار کا ایک مختصر سا چکر لگا کر واپس اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

اس وقت مجھ پر شدید مایوسی اور نقاہت طاری ہونے لگی تھی اور میری نگاہوں میں اپنی طویل جدوجہد کا بھیانک انجام ناچ رہا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے پہلا اخبار کھولا تو ابتدائی سطروں سے گزرتے ہی پوری صورتحال واضح ہونے لگی۔ اخبار کی فیصلہ کن سرخیاں البرونو کاسٹیلانو کی محبوبہ، ایلی ایشلر کے بیان پر تیار کی گئی تھیں جو پچھلے روز ہی اپنے محبوب کی پہلے سے ملی ہوئی ہدایت کے تحت بن غازی سے خرطوم جا کر واپس قاہرہ لوٹی تھی۔

البرونو نے اسے اپنے پاس طلب کیا تھا مگر مخصوص الفاظ کے سہارے یہ واضح کر دیا تھا کہ ایلی کو البرونو کی زندگی کی خاطر براہِ راست قاہرہ پہنچنے کے بجائے خرطوم ہو کر واپس آنا تھا۔

وہ اپنے زندہ محبوب سے ملاقات کی تمنا لیے قاہرہ پہنچی تو اس نے اخبارات میں اپنے مقتول محبوب کی تصاویر دیکھیں اور غم و غصے سے مغلوب ہو کر وہ ماتم گسار دوشیزہ اعلیٰ پولیس حکام کے سامنے پہنچ گئی۔

اس نے بتایا کہ اسمتھ براؤن دراصل البرونو کاسٹیلانو کا فرضی نام تھا اور وہ بن غازی سے سیتا نامی سفاک مجرمہ کا تعاقب کرتا ہوا قاہرہ پہنچا تھا۔ ایلی کے بیان کے مطابق سیتا اس قدر مکار، خطرناک اور بے خوف عورت تھی کہ جیل سے فرار ہونے کے بعد لیبیا سے متعدد سرحدی اہلکاروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قاہرہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس مرحلہ پر ایلی نے صحرائے اعظم میں کھوئی ہوئی سوئی کی مثال دے کر اپنے عاشق کی بے پناہ تعریف کی تھی کہ وہ کوئی سراغ نہ ہونے کے باوجود قاہرہ میں سیتا کا کھوج نکالنے میں کامیاب ہو گیا مگر مقدر نے اس کی یاوری نہیں کی اور وہ فتحیاب ہونے کے بجائے نیل کی سرزمین پر حریف کے ہاتھوں اپنی زندگی کی بازی ہار گیا۔

سیتا کو البرونو کاسٹیلانو کے قتل کا واحد اور مکمل ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اس نے حکام کی توجہ لیبیا کے پرانے اخبارات کی طرف بھی مبذول کرائی تھی جس کے نتیجے میں ہر اخبار نے اپنے بیرونی اور اندرونی صفحات پر سیتا کی اس دور کی ہنستی مسکراتی تصویریں شائع کی تھیں جب

وہ لیبیا کے حکام کے عتاب میں نہیں تھی۔

میرے لیے اس مرحلے پر ایلی کا یوں اچانک نمودار ہونا حد سے زیادہ تشویشناک تھا اس طرح سیتا کی سلامتی ایک مرتبہ پھر خطرے میں پڑ گئی تھی۔

اخبارات نے سیتا کا نام سامنے آنے کے بعد اس کی ذات اور ماضی کے بارے میں اپنی معلومات کی حد تک ایسے مبالغہ آمیز فیچر شائع کیے تھے جن کی روشنی میں سیتا کا کردار مافوق الفطرت عادات اور قوتوں کا مظہر معلوم ہوتا تھا اور اسی کے حوالے سے میرا نام بھی اچھالا گیا تھا۔

اخبارات نے سیتا کے شوہر صفدر علی کے بارے میں اپنے قارئین کو یاد دلایا تھا کہ وہ شخص جیل سے اپنی بیوی کے فرار کے چند روز بعد ہی بن غازی کے نواح میں خفیہ سروس کے ارکین کے لہو سے بھیانک ہولی کھیل چکا تھا اور اس واردات کے بعد لیبی حکام فوج کی مدد کے باوجود صفدر علی کا سراغ نہیں لگا سکے تھے اور اس امر کے قوی امکانات تھے کہ صفدر علی سرحد عبور کر کے مصر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

مجھے اپنے نام کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ اس وقت میں مصطفیٰ المرزوق بنا ہوا تھا پھر میری مطبوعہ تصاویر اتنی پرانی تھیں کہ میرے موجودہ حلیے سے ان کی کوئی مطابقت نہیں تھی۔

البتہ سیتا کے لیے آزادی کی جدوجہد بھیانک رخ اختیار کر گئی تھی۔

اس ضمن میں ایک اخبار نے نہایت حقیقی انداز میں قتل کی واردات کا منطقی تجزیہ کر کے کچھ سوال اٹھائے تھے۔

ایلی کے بیان اور سابقہ اطلاعات کی روشنی میں یہ بات مسلّمہ تھی کہ سیتا انتہائی بے خوف عورت تھی جسے جسمانی طاقت کے علاوہ جدید اسلحہ کے استعمال پر بھی کافی عبور حاصل تھا اور ایلی اس خوفناک عورت کے تعاقب میں تھی۔

اگر وہ دونوں واقعی ایک دوسرے کے دشمن تھے تو سیتا رضا کارانہ طور پر البرونو کے ہوٹل کے کمرے میں ہرگز نہ آئی ہوگی۔ دوسری طرف اگر یہ مان لیا جاتا کہ البرونو اسے اغوا کر کے زبردستی ہوٹل لایا تھا تو اس جیسے زیرک اور تجربہ کار شخص سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ اپنی بدترین دشمن کے سامنے اس نے مہلک لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو غیر مسلح رکھا ہو۔

جب کہ نہ جائے واردات پر کوئی اسلحہ ملا تھا نہ ہوٹل میں ہی کسی فائر وغیرہ کا دھماکہ سنا گیا تھا۔

البرونو کے کمرے میں جو کچھ ہوا وہ سراسر جسمانی طاقت کی برتری کا ایک خون آشام مقابلہ تھا۔

البرونو کے ناخنوں میں پھنسے ہوئے جلد اور گوشت کے ریشوں اور خشک انسانی خون سے یہ ظاہر تھا کہ مرنے سے قبل البرونو نے محض ہاتھ پیروں سے اپنا دفاع کیا تھا اور آخر کار سیتا نے اس کا گلا دبوچ کر اسے ہلاک کر دیا۔

ان حالات میں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا کہ دو انتہائی خطرناک چالاک اور تجربہ کار دشمن ایک ہوٹل کے رہائشی کمرے میں ایک دوسرے کے دو بدو غیر مسلح حالت میں کیوں کر جمع ہو گئے جب کہ ان میں ایک کی رہائش اسی کمرے میں تھی۔

میرے لیے یہ نکتہ بہت خیال افروز تھا۔

اگر البرونو کی لاش اس کے رہائشی کمرے کے بجائے کسی اور جگہ ملی ہوتی تو میں ان حالات میں یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ اپنی بدقسمتی سے وہ دونوں ہی کسی سفاک اسرائیلی ایجنٹ کے ہاتھ لگ گئے۔ جس کے نزدیک سیتا اس کے قومی مجرم کی بیوی تھی اور البرونو کا سٹیلا نوخطیر رقم کے فراڈ کا مجرم تھا لہٰذا اس نے ان دونوں کو نہتا کر کے ایک دوسرے سے لڑا دیا جس کے نتیجے میں البرونو مارا گیا اور سیتا کو اس ایجنٹ نے اپنا قیدی بنا لیا۔

مگر ہوٹل کے کمرے کے باعث یہ نظریہ بالکل بے جان معلوم ہوتا تھا۔

میں اپنے خیالات میں غلطاں اپنے کمرے میں محصور تھا کہ دوپہر کے وقت عبدالکمال آ پہنچا۔ وہ بہت زیادہ جوش میں معلوم ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں اسے دیکھ کر مضطرب ہو گیا۔

”میں...... میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“ اس نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”حالات کچھ نازک ہو گئے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”الحمرا کے رہائشی علاقے میں پولیس بہت بڑے پیمانے پر پُراسرار سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ میرے ساتھیوں کا خیال ہے کہ انہوں نے کسی خاص عمارت کا محاصرہ کیا ہے اور تیزی کے ساتھ اردگرد کی عمارات خالی کرا رہے ہیں۔“

”یعنی...... یعنی تمہارا مطلب ہے کہ انہوں نے سیتا کو گھیر لیا ہے۔“ میں نے اس کے شانے پکڑ کر اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

”ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“ اس نے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ”مگر پولیس کی سرگرمی دیکھ کر شبہ سا ہوا ہے۔“

”چلو...... پھر کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔“ میں نے فرطِ جذبات میں اسے ڈانٹ دیا۔ زخمی سیتا کے محاصرے کا تصور اس وقت میرے لیے سوہانِ روح بن گیا تھا۔

ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکلے تو فٹ پاتھ کے کنارے عبدالکمال کی بوسیدہ سی سیاہ فورڈ کار کھڑی ہوئی نظر آئی اور اس میں ہم دونوں ایک طرف روانہ ہو گئے۔

”الحمرا میں خوش قسمتی سے میرا ایک دوست رہتا ہے۔“ عبدالکمال نے کار آگے بڑھاتے ہی کہا۔ ”آج جس وقت گھیراؤ شروع ہوا تو اس سے چند ثانیوں قبل کسی عمارت سے اسٹین گن کے ذریعے گولیاں چلائی گئی تھیں بعد میں معلوم ہوا کہ گولیوں کا نشانہ بننے والے پولیس کے اہلکار تھے جنہوں نے ایک مشتبہ عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ ان کی دانست میں عمارت میں داخلہ محفوظ تھا۔“

”تو کیا اس عمارت میں ایک ہی خاندان مقیم تھا؟“ میں مختصر سے مختصر عرصے میں اس واقعے کی تمام تفصیلات جاننے کے لیے بے تاب تھا۔

”نہیں...... وہ کثیر المنزلہ عمارت ہے اور اس میں بہت سے خاندان مقیم ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ پولیس کے بروقت محاصرے کے ساتھ ہی عمارت میں موجود مشتبہ افراد نے سارے مکینوں کو یرغمالی بنا لیا ہے۔“

”یہ کام اکیلی عورت تو کیا دو تین مردوں کے بس سے بھی باہر ہے۔“ میں نے اپنی نشست پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”وہ تعداد میں کئی ہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”پولیس نے کئی مرتبہ آنسو گیس بھی استعمال کی ہے مگر وہ عمارت میں گھسنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ویسے اس علاقے میں زبردست افواہ اڑی ہوئی ہے کہ لوگوں نے اسٹین گن سے مسلح ایک عورت کو اس عمارت کی چھت پر ٹہلتے دیکھا ہے۔“

”پولیس کے ذرائع کیا کہتے ہیں؟“

”انہوں نے سختی سے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔“

”فائرنگ سے کوئی مرا تو نہیں؟“

”ایک سپاہی مرا ہے۔ تین بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔“ اس کے لہجے میں جوش کی جگہ تفکر امڈ آیا۔ ”پچھلے ایک گھنٹے میں وہاں تین بار گولیوں کا زبردست تبادلہ ہوا ہے۔ پہلے پولیس والوں کے پاس صرف رائفلیں تھیں مگر اب آخری راؤنڈ میں انہوں نے بھی بھاری اسلحہ استعمال کیا ہے۔“

”اگر وہ سیتا ہی ہے تو بری طرح گھر چکی ہے۔“

”خدا کرے کہ وہ سیتا نہ ہو، اسے قاہرہ میں ساتھی کہاں سے ملے ہوں گے۔ مخصوص افراد نے اس طرح قانون کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے۔“

میں اسے گھور کر رہ گیا۔

اس کی نگاہ جرم پر تھی مگر وہ محرکات سے گریز کرنا چاہتا تھا یہ درست تھا کہ سیتا نے البرونو کا سٹیلانو کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا لیکن وہ ذرا بھی ہچکچاتی تو البرونو اسے ختم کر دیتا۔ وہ سب لمحوں کے فیصلے تھے! سارے حالات وہی رہتے لیکن نتائج بدل جاتے تو مرنے والے البرونو کے بجائے پریس سے عوام تک ہر ایک کی ہمدردیاں سیتا کے ساتھ ہوتیں۔

”یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ وہاں کون محصور ہے؟“ چند ثانیوں کے تکلیف دہ سکوت کے بعد میں نے سوال کیا۔

”میرے چند دوست اسی علاقے میں موجود ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک کچھ معلوم کر چکے ہوں۔“

”اس عمارت میں کسی کو فون کرنے کی کوشش کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے نرمی سے کہا۔

”بے سود ہے، وہ فون کی ساری لائنیں کاٹ چکے ہیں۔“ اس نے مایوسانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد ہی ہمارے کانوں میں فائرنگ کا دھیما دھیما شور آنے لگا جس میں خاصا تسلسل تھا۔

”اس وقت بھی مقابلہ جاری ہے۔“ عبدالکمال بولا۔ ”ابھی ہم الحمرا سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔“

”فائرنگ بند ہونی چاہیے، ہر قیمت پر بند ہونی چاہیے۔“ میں نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ”جتنا زیادہ خون خرابہ ہوگا اسی قدر ان لوگوں کے جرم کی نوعیت سنگین ہوتی چلی جائے گی۔“

اور اسی لمحہ فائرنگ کی واضح ہوتی ہوئی آوازیں یکلخت موقوف ہو گئیں۔

متاثرہ علاقے سے کافی دور ہمیں کار چھوڑ دینی پڑی محصور عمارت کی طرف جانے والی گلیوں پر پولیس کی اسلحہ بردار بھاری نفری متعین تھی اور ان پولیس والوں کے پیچھے خوف، دہشت، اشتعال اور غصے میں بھرا ہوا تماشائیوں کا ہجوم تھا۔

ہم دو گلیاں جھانکنے کے بعد تیسری گلی میں گم گئے۔

وہاں سے نہ صرف چار منزلہ محصور عمارت صاف نظر آ رہی تھی بلکہ عبدالکمال کو اپنا ایک ملاقاتی بھی نظر آ گیا تھا۔

کافی جدوجہد کے بعد میں ایک ایسی جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے عمارت کے سامنے والی سڑک کا حال بہتر طور پر نظر آ رہا تھا۔

عمارت کے عین سامنے پولیس والوں کے ساتھ ہی باوردی فوجی بھی نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے سڑک کے وسط میں آہنی باڈی والے ٹرک کھڑے کر کے دفاعی مورچے بنائے ہوئے تھے۔ اور خود اسی کے پیچھے موجود تھے۔

چند فوجی رائفلیں سیدھی کیے سینے کے بل سڑک پر اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ ان کی نالوں کے دہانے ٹرکوں کے نیچے سے براہِ راست اس عمارت کے داخلی راستے کو زد میں لیتے ہوئے نظر آ

رہے تھے۔

اس عمارت کے اردگرد کا علاقہ شاید خالی کرایا جا چکا تھا کیونکہ ادھر موت کی سی ہولناک ویرانی ناچ رہی تھی۔

اچانک عبدالکمال مجھے مجمع سے نکال لے گیا۔

"بہت سے تماشائی تو پولیس کو بھی اس کی پُرتشدد اور بھونڈی کارروائی پر گالیاں دے رہے ہیں۔" میں نے کافی دور نکل آنے کے بعد کہا۔ "ان کا خیال ہے کہ اس طرح یرغمالیوں کو ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔"

"ایک خوف زدہ شخص تیسری منزل کی عقبی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا کر اپنے ہاتھ پیروں کی ہڈیاں توڑ چکا ہے۔"

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یرغمالیوں کی سربراہی سرخ بالوں والی ایک خوبصورت عورت کر رہی ہے جس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپایا ہوا ہے۔"

"کیسے؟"

"انہوں نے ایک سترہ سالہ لڑکی اور ایک حاملہ عورت کو رہا کیا ہے اور ان دونوں کے ذریعے اپنے مطالبات بھیجے ہیں۔ وہ لوگ اپنی سلامتی کی ضمانت کے طور پر کم از کم بارہ یرغمالیوں کو لے کر یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں۔"

"وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"لڑکی فوجی حکام کی تحویل میں ہے۔ حاملہ عورت کو زچگی نمٹانے کے لیے ایک ہسپتال روانہ کر دیا گیا ہے۔ اسی عورت نے ہذیان کے عالم میں یہ باتیں بتائی تھیں۔ وہ کہتی ہے کہ عمارت پر قبضہ کرنے والی عورت بے حد حسین ہے لیکن اس کے ہاتھ میں اسٹین گن دیکھ کر پتہ پانی ہونے لگتا ہے۔"

"ہمیں کچھ کرنا پڑے گا میرے دوست، کچھ کرنا پڑے گا۔" میں نے اضطراب کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "سیتا خطرناک چکر میں آ پھنسی ہے۔"

"ہم بے بس ہیں۔" اس نے مجھ سے نگاہیں چرا کر کہا۔

"پھر تم چلے جاؤ۔" میں نے اسے پیچھے دھکا دے دیا۔ "یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں اپنا نوشتہ تقدیر خود جھیلوں گا۔"

یہ کہہ کر میں واپس مجمع کی طرف ہو لیا مگر چند قدم بھی نہ بڑھنے پایا تھا کہ ہجوم میں زبردست بھگدڑ مچ گئی اور تقریباً اسی کے ساتھ فضا میں اسٹین گن کا ہیبت ناک شور گونجنے لگا۔

بھاگنے والوں کے شور و غل میں ایک درد میں ڈوبی ہوئی طویل چیخ گونجی جو شور میں معدوم ہو گئی۔ شاید محاذ پر کوئی مارا گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں بمشکل تمام ایک شخص کو روکنے میں کامیاب ہو سکا۔

"ایک فوجی نے عمارت کے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی اور چھلنی کر دیا گیا۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بدقتِ تمام کہا۔ شاید وہ اس واردات کو بہت قریب سے دیکھنے والوں میں سے تھا۔

لوگوں کا وہ بھگدڑ کا ہوا ریلا ختم ہوا تو عبدالکمال مجھ سے بچھڑ چکا تھا۔ بھاگنے والوں نے مجھے بھی اپنی جگہ سے دھکیل کر ایک مکان کے دروازے پر پہنچا دیا تھا۔

میں وہیں کھڑا ہوا اس لرزہ خیز صورتحال کے بارے میں غور کرتا رہا۔ گلی میں بکھرے ہوئے جوتے اور مکانوں کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے خوفزدہ چہرے مجھے آنے والے لمحات کی کہانی سنا رہے تھے جن کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

بہرحال ایک بات یقینی تھی کہ پولیس اور فوج کے حکام نے خونریزی کی طرف قدم بڑھا کر اپنے عزائم کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر سر نہیں ٹالیں گے اور ان کا یہ موقف خاصا درست بھی معلوم ہوتا تھا۔

قانون کی پشت پناہی کرنے والوں کو باہر سے حسبِ منشا افرادی قوت اور اسلحہ مل سکتا تھا مگر گھری ہوئی ٹولی کا کل اثاثہ وہی تھا جو ان کے پاس موجود تھا۔ چند گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ روز گزرنے کے بعد انہیں یا تو خودکشی کرنی پڑ جاتی یا خود کو قانون کے حوالے کرنا پڑ جاتا۔

میرے خیالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب لاؤڈ اسپیکر پر اس علاقے میں کرفیو کے نفاذ کا اعلان کیا جانے لگا۔

اعلان کرنے والی فوجیوں کی جیپ میرے قریب سے گزری تو ایک سپاہی نے فضا میں رائفل لہرا کر مجھے گھر بھاگ جانے کا حکم دیا مگر میں اس کی بات پر کان دھرے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر غرایا اور مجھے اپنی جگہ سے ہلتے نہ دیکھ کر رینگتی ہوئی جیپ سے کود کر گالیاں دیتا ہوا میری طرف لپکا۔

اس نے پیش قدمی کرتے ہوئے رائفل کی نال اپنے ہاتھ میں تھام لی تھی اور شاید بٹ کے ذریعے میری پنڈلیوں پر ضرب لگانی چاہتا تھا۔

جوں ہی اس کا ہاتھ گردش میں آیا میرے پتھر کی طرح ساکت بدن نے بجلی کی سی سرعت سے حرکت کی اور اگلے ہی لمحے رائفل میرے ہاتھ میں تھی جسے میں نے حقارت سے سڑک پر پھینک دیا۔

میری اس جسارت پر دیگر فوجیوں کو اشتعال آ گیا۔

جیپ روک دی گئی، کرفیو کا اعلان بھی موقوف ہو گیا اور پانچ فوجی بھوکے بھیڑیوں کی طرح میری طرف لپک پڑے۔

"مجھے ہاتھ نہ لگانا۔" میں دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر مدافعانہ لہجے میں بولا "میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔"

ان میں سے آگے والا جو شاید ان کا کمانڈر تھا میرے رویے سے متاثر ہو گیا اور اس کے حکم پر جو جہاں تھا وہیں رک گیا۔

میں نے اپنے ہاتھ گرا دیئے۔

"کیا تم نے کرفیو کا اعلان نہیں سنا؟" کمانڈر نے میرے قریب آ کر سخت اور ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری جدوجہد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میرے کہے ہوئے الفاظ کا مفہوم اس کے ذہن میں نہ آیا ہو۔

"یہ گلی لاشوں سے پٹ جائے گی، شاید رائے عامہ کا دباؤ استعمال کرنے کے لیے وہ جنونی یکے بعد دیگرے یرغمالیوں کی لاشیں نیچے پھینکنے لگیں۔ اس وقت پورا شہر مشتعل ہو کر تمہارے مقابل آ جائے گا۔ تم رائفل کی نال کے زور پر کس کس کو گھر واپس بھیجو گے؟"

"ہم اپنا کام جانتے ہیں تم چلے جاؤ یہاں سے۔"

"میں تمہاری مدد کرنی چاہتا ہوں۔"

"مدد!" اس بار کمانڈر کے بجائے کوئی اور استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "یہ ایسے نہیں جائے گا جناب، اس کی تواضع کرنی ہی پڑے گی۔"

"کیسی مدد؟" کمانڈر خاصا سلجھا ہوا شخص معلوم ہوتا تھا۔

"اگر اس عمارت میں سیتا ہی محصور ہے تو میں اسے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کر سکتا ہوں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"تم کون ہو؟" کمانڈر کی آواز گونجی

"صفدر علی۔ سیتا کا شوہر!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد اور پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ان کی گردنیں یوں بے اختیار ایک دوسرے کی طرف گھومیں جیسے ان کے منکے اپنی جگہ سے سرک گئے ہوں۔

"تم جھوٹے ہو۔" کمانڈر کے لہجے سے بے اعتباری مترشح تھی۔ "میں شہرت کے بھوکے نوجوانوں کی فطرت سے خوب واقف ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور گھر پر آرام کرو، مقدر میں ہوئی تو شہرت بھی کبھی نہ کبھی مل جائے گی۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "جب تک میں انکار کرتا رہا تو مجھ سے اقرار کرانے کی کوششیں کی جاتی رہیں اور آج میں اعتراف کر رہا ہوں تو تم صفدر علی کو گھر جانے کا مشورہ دے رہے ہو، جس کا کوئی گھر نہیں ہے۔"

"تم مخبوط الحواس ہو!" کمانڈر کے لبوں پر تحقیر آمیز تبسم پھیل گیا۔

"میں نے صرف اس لیے خود کو تمہارے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ محض اسی طرح میں سیتا کو زندہ بچا سکتا ہوں ورنہ وہ مآل کار اس معرکے سے زندہ نہ بچ سکے گی۔" میں نے کہا

"اسے بٹھا لو جیپ میں۔" کمانڈر نے مڑ کر سپاہیوں کو حکم دیا اور میں خود بخود جیپ کی طرف چل پڑا۔

اس مرتبہ جیپ تیزی کے ساتھ روانہ ہوئی اور کئی گلیوں کا چکر کاٹ کر محصور عمارت کے سامنے گزرنے والی چوڑی سڑک کے اس محفوظ کنارے پر رک گئی جہاں فوجی گاڑیوں کے قریب اعلیٰ فوجی اور شہری حکام جمع تھے۔

ان سے آگے پوری سڑک پر ویرانی کا راج تھا البتہ ایک قطار کی صورت میں سڑک کے وسط میں کھڑے ہوئے دیوہیکل فوجی ٹرک اور ان کے پیچھے گشت کرتے ہوئے فوجی ماحول کی ہیبت میں اضافہ کر رہے تھے۔

مجھے سپاہیوں کی تحویل میں چھوڑ کر کمانڈر افسران کے جمگھٹ کی طرف بڑھ گیا، جہاں کسی نے اس کی آمد پر توجہ نہیں دی۔

پھر شاید اس نے دھیمے لہجے میں ان سے کچھ کہا اور وہ سب ہی یوں بھڑک کر جیپ کی طرف متوجہ ہو گئے جیسے وہ جیپ کے بجائے کوئی اڑن طشتری ہو۔

پھر ان کے درمیان مشوروں کا آغاز ہو گیا۔

یہ مشاورت چند منٹ تک جاری رہی غالباً ان میں سے کوئی بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ صفدر علی جیسے شخص نے اتنی آسانی اور شرافت سے گشت پر نکلی ہوئی ایک جماعت کے سامنے سپر ڈال دی۔

وہاں کسی نے مجھے منہ لگانا ہی مناسب خیال نہیں کیا اور دو سپاہی مجھے لے کر ایک فوجی گاڑی کے عقبی بند حصے میں سوار ہو گئے۔ فوراً ہی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور میرا نامعلوم سفر شروع ہو گیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" سفر کے آغاز کے بعد میں نے دوستانہ لہجے میں ایک سپاہی سے دریافت کیا۔

"تمہاری خوش نصیبی ہے کہ پاگل خانے نہیں جا رہے۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا اور اس کا ساتھی دل کھول کر ہنس پڑا۔

"باشندہ تو وہیں کا معلوم ہوتا ہے۔" دوسرے نے ہنسی کے دوران کہا اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

سفر کے اختتام تک میں خاموش ہی رہا۔ ان دونوں نے دو ایک بار مجھے چھیڑنے کی کوشش کی مگر میں چپ سادھے رہا۔

نصف گھنٹے بعد ہمارے سفر کا اختتام خاردار تاروں سے گھرے ہوئے ایک فوجی علاقے میں ہوا۔ وہاں دونوں سپاہی مجھے ایک پختہ کمرے میں بند کر کے کہیں غائب ہو گئے اور میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

کافی دیر بعد دوبارہ اس کمرے کا دروازہ کھولا گیا اور اس بار مجھے مسلح فوجیوں نے ایک آراستہ کمرے میں پہنچایا جہاں ایک جنرل کی سربراہی میں تین اعلیٰ فوجی افسر مرصع کرسیوں پر باوقار انداز میں براجمان تھے۔

"ہاں۔ تو یہ ہے وُہ شخص۔" جنرل نے بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے اس طرح زیرِلب کہا جیسے وُہ بھی میرے اعتراف سے شاکی ہو۔

"شاید تمہیں بھی میرے صفدر علی ہونے میں شبہ ہے؟" میں نے اس کے سوال کا انتظار کئے بغیر اسے براہ راست مخاطب کیا۔

"سیتا کے مددگار ہمیں اصل محاذ سے غافل کرنے کے لیے ایسا شوشہ چھوڑ سکتے ہیں" وُہ خلافِ توقع نرم لہجے میں بولا "تمہارے پاس اپنے دعوے کا کیا ثبوت ہے؟"

"بڑا عجیب سوال ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کئی برس سے میں ایسی زندگی گزار رہا ہوں کہ ہر قدم پر اپنی شناخت کے نشانات مٹاتا چلا آرہا ہوں۔"

"ایسی صورت میں تمہیں فوجی تحویل میں رہ کر اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا جب تمہارے الفاظ کی صداقت ثابت ہو جائے۔" جنرل کے برابر والے نے کہا۔

"میں نے انتہائی مجبوری کے عالم میں یہ اعتراف کیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ میری اصلیت ثابت ہو جانے کے بعد کئی ملک میرے سر کے طلبگار ہو جائیں گے۔ اس وقت میں نے اپنی بیوی کو زندہ بچانے کے لیے اپنی سلامتی داؤ پر لگائی ہے ورنہ مجھے اپنی زندگی سے بے پناہ پیار ہے۔" میں نے کرب آلود لہجے میں کہا۔

"مجھے بتایا گیا ہے۔" جنرل نے سگار کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اُسے ہتھیار ڈالنے پر کیسے آمادہ کر لو گے۔ تم نے اس عمارت کی طرف قدم بھی بڑھایا تو بھون ڈالے جاؤ گے!"

"وُہ مجھے، میری آواز کو، میری بُو کو پہچان لے گی۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مجھے بس یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ میری پشت پر کوئی فوجی یا سپاہی گولی نہیں چلائے گا۔ اگر میرے مقدر میں اپنے سینے پر سیتا کی گولیاں کھانا لکھا ہُوا ہے تو میں خوشی سے اپنے نوشتۂ قسمت کو تسلیم کر لوں گا۔"

"اس کے ساتھ کئی افراد ہیں۔" جنرل کا لہجہ ہمدردانہ ہو گیا۔ "ہو سکتا ہے کہ سیتا سے پہلے اس کا کوئی ساتھی تمہیں دیکھ کر گولی چلا دے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اس کا اعتراض بہت وزنی تھا۔ سیتا کی محبت میں مَیں اُس کے ساتھیوں کو بھُول گیا تھا۔

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔" جنرل کے ایک ساتھی نے کہا۔ "اصل بات تمہاری شناخت کی ہے جس کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

"میرے فنگر پرنٹ اسرائیلی سیکرٹ سروس......"

اسی افسر نے ناگواری سے میری بات کاٹ دی۔ "اسرائیل کا نام نہ لو ہم دشمنوں سے کہیں بھی مصالحت نہیں کرتے۔"

"لیبیا کے حکام نے اسکاٹ لینڈ کی معرفت میرے فنگر پرنٹ حاصل کئے تھے۔" میں نے اس کے خاموش ہو جانے پر کہا۔ "وہاں سے تصدیق کی جاسکتی ہے!"

تینوں افسروں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا پھر جنرل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "فنگر پرنٹس والی بات معقول ہے مگر فوری طور پر صرف یہ ممکن ہے کہ تمہیں ہتھکڑیاں لگا کر الحمرا کے علاقے میں لے جایا جائے اور تم کو سیتا سے جو کچھ کہنا ہے وہ میگافون پر کہو۔"

"میں اس فیصلے کے لیے ممنون ہوں۔" میں نے صدقِ دل سے کہا "لیکن قانون کے محافظوں کے حصار میں ہتھکڑیوں کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ میں جانتا ہوں۔" جنرل پہلی بار مسکرایا۔ "تم اس وقت اپنی ذات کی شکست کے جذباتی بحران میں مبتلا ہو ممکن ہے کہ دیوانہ وار سامنے آؤ اور بے موت مار دیئے جاؤ۔ دُوسری طرف یہ امکان بھی تو ہے کہ تمہاری اور سیتا کی ملی بھگت ہو اور اگر تم ایک بار اندر اس تک پہنچ گئے تو نہ صرف یہ کہ باہر کے حالات کی روشنی میں اسے خوفناک رہنمائی فراہم کر سکو گے بلکہ اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ زندہ رہنے یا مرنے کا ایک رُومانی وعدہ بھی نباہ سکو گے۔"

میں لاجواب ہو گیا۔

"اب یہ بتاؤ کہ قاہرہ میں سیتا سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟" ایک افسر نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں نے مدت سے اس کی صورت نہیں دیکھی ہے!" میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میں بعد میں تمہارے ہر سوال کا جواب دُوں گا مگر برائے خدا فی الحال وقت ضائع نہ کرو۔ انسانی لہو کی ہر وہ بوند جو اس وقت سیتا یا اس کے ساتھیوں کی چلائی ہُوئی گولی سے گر رہی ہے مجھے اپنی ذات کی تباہی سے قریب تر لے جا رہی ہے۔"

"اگر تم واقعی صفدر علی ہو تو تمہاری زبان سے یہ الفاظ عجیب سے معلوم ہو رہے ہیں۔ تمہاری نگاہوں میں انسانی لہو کا واقعی کوئی احترام ہے؟" تیسرے فوجی نے طنزیہ لہجے میں پہلی بار زبان کھولی۔

"اچھا ہوا کہ مجھ سے یہ سوال ایک فوجی افسر نے کیا۔" میں نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "محاذ پر یا ہنگامی حالت میں تمہارے سپاہی قتل و غارتگری کر کے قومی ہیرو کا درجہ حاصل کرتے ہیں مگر وہی فوجی حالتِ امن میں کسی کو محض زخمی بھی کر دے تو قانون اسے سزا دیتا ہے۔ آج تک میں اپنے دشمنوں کے خلاف صف آراء تھا لیکن سیتا کو سامنے پاکر اب میں امان چاہتا ہوں۔ یوں سمجھو کہ محاذ پر لڑتا ہُوا سپاہی ابھی ابھی اپنے گھر واپس پہنچا ہے۔"

آخری الفاظ پر بے اختیار میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

جنرل نے خاموشی سے اپنی نشست چھوڑ دی۔

میری وہاں آمد قیدیوں والی بند گاڑی میں ہوئی تھی مگر واپسی جنرل کے ساتھ اسکی آرام دہ کار میں ہوئی تھی۔

وُہ سیتا کے معاملے میں میری کارگزاری کا بنفسِ نفیس جائزہ لینا چاہتا تھا۔ الحمرا کے کرفیو زدہ علاقے میں پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی۔ خالی کرائی جانے والی عمارتیں تاریک پڑی ہُوئی تھیں اور محصور عمارت میں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ دفاعی نقطۂ نظر سے فوجیوں اور پولیس والوں نے بھی اندھیرے کو ہی ترجیح دی تھی۔

ویران سڑک پر پُرہول تاریکی میں فوجی ہیولوں کو نقل و حرکت میں مصروف دیکھ کر میں پھریری لیکر رہ گیا۔

جنرل کی کار دُور ہی سے پہچان لی گئی اور وہاں ہر طرف دبا دبا سا جوش پھیل گیا۔ جنرل کار سے اُترا تو پختہ سڑک ایڑیوں کی کھٹاکھٹ سے گونجتی چلی گئی۔

جنرل کے ساتھ آنیوالے ایک افسر کے اشارے پر میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی گئی اور پھر ہم سڑک کے وسط میں کھڑی ہُوئی گاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے اُس عمارت کی سمت میں بڑھنے لگے جہاں سیتا زندگی کی آخری جدوجہد کر رہی تھی۔

عمارت کے ٹھیک سامنے ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ میں جنرل کی ہدایت پر وہیں رُک گیا۔ پھر میرے پیروں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔ اور میں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

اِسی اثناء میں جنرل کے حکم پر کوئی شخص ایک طاقتور میگافون بھی لے آیا جو جنرل نے مجھے تھما دیا۔

میرا دل حلق اور کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

"تم جو چاہو کہہ سکتے ہو۔" اس وقت جنرل کا لہجہ نرم اور ترحم آمیز تھا۔

میں نے میگافون کا سوئچ آن کیا اور اُسے مُنہ کے قریب لے آیا۔

"سیتا!" میری آواز سناٹے میں دور تک گونجی مگر فضا اچانک اسٹین گن کی تڑتڑاہٹ سے لرز اٹھی۔

عمارت سے ایک برسٹ مارا گیا تھا۔ گولیاں ٹرکوں کی آہنی چادروں سے ٹکرا کر ہولناک شور پیدا کر رہی تھیں۔

جب پسینے چھُوٹ رہے تھے۔ سیتا نے میری پہلی آواز کا جواب اسٹین گن کی گولیاں چلا کر دیا تھا۔ میں جنرل کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

چند ثانیوں تک میں خود کو فائرنگ کے صدمے سے سنبھالتا رہا۔ اس دوران میں فضا میں پھیلی ہُوئی گونج بھی دُور ہو گئی۔

شاید سب فوجیوں وغیرہ کو نئی صورتحال کا علم ہو چکا تھا۔ اور ہر شخص کسی نہ کسی مورچے کی آڑ لئے سانس روکے نئی تبدیلیوں کا منتظر تھا۔

"دوبارہ ہمت کرو۔" جنرل کی ہمت افزا آواز سُن کر میں یُوں اُچھل پڑا، جیسے کسی نے میرے سر پر بے خبری میں ٹھنڈے پانی کی بالٹی اُلٹ دی ہو۔ "جب تک تم مایوس نہیں ہو جاتے میری طرف سے کوئی گولی نہیں چلائی جائے گی۔"

"سیتا، میں تمہارا شوہر صفدر علی تم سے مخاطب ہُوں۔" میں غیر ضروری طور پر پوری قوت سے چیخا۔ حالانکہ طاقتور میگافون تو سانس کی آواز بھی میلوں دُور پہنچا رہا تھا۔

اس مرتبہ خلافِ توقع فوراً ہی گولیاں چلا کر جواب نہیں دیا گیا، اور میرا دل خوشی سے اچھل پڑا، مگر یہ خوشی فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

"تم جھوٹے ہو، مکار ہو!" تاریک عمارت کی چھت سے کسی عورت نے چیخ کر عربی میں کہا اور اسی کے ساتھ ایک اور برسٹ مارا گیا۔

اس بار ساری گولیاں میرے سامنے کھڑے ہوئے ٹرک پر پڑی تھیں شاید وہ بہت چالاک تھی اور اس بار اس نے میری کمین گاہ کا پتہ چلا لیا تھا۔

معاً مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ پہلی بار تو میں نے صرف اس کا نام لیا تھا مگر دُوسری بار اضطرار کے عالم میں عربی بولا تھا اور شاید سیتا عربی سے واقف تھی لہٰذا اُس نے اسی زبان میں جواب دیا تھا۔ زبان اور لہجے کے باعث میں اس کی آواز نہ پہچان سکا تھا تو وہ بھلا میری آواز کیسے پہچانتی۔

"میں تمہارا صفدر ہوں سیتا۔" میں فرطِ جذبات سے لرزتی ہُوئی آواز میں اُردو میں بولا۔ "میں تمہیں تمہاری ماں سُندری کا واسطہ دیتا ہُوں کہ ہتھیار پھینک کر خود کو قانون کے حوالے کر دو۔"

"نہیں!" تاریک چھت سے کرب میں ڈوبی ہُوئی ایک نسوانی چیخ ابھری۔ "میرا صفدر مجھے ایسا بزدلی کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ وُہ یقیناً تمہارا قیدی ہے اور تم کوئی بہروپیئے ہو۔" اور اسی کے ساتھ کئی اسٹین گنیں مختلف سمتوں میں دیوانہ وار گولیاں برسانے لگیں۔

میری ٹانگیں بید مجنوں کی طرح لرزنے لگیں اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی دُھند ناچنے لگی۔

اس بار میں نے سیتا کی آواز صاف پہچان لی تھی۔ مگر وہ مجھے گولیوں سے جواب دینے پر تلی ہوئی تھی۔

میرے لئے وقت کی رفتار اچانک تھم کر رہ گئی تھی۔

میری ٹانگیں بدن کے بوجھ سے لرزنے لگی تھیں۔ بصارت یک بیک دُھندلا گئی، ساری جسمانی توانائی نقاہت میں بدل گئی، زبان گویا تالو سے چپک کر رہ گئی مگر ان تمام خامیوں کا ازالہ میری قوتِ سماعت نے کر دیا تھا۔ الحمرا کے علاقے میں تاریک، ویران اور خوف آمیز فضا میں گونجتی ہوئی اسٹین گنوں کے فائر کی آوازیں میں بخوبی سُن رہا تھا۔ گولیوں کا ہدف وہی ٹرک تھا جس کی اوٹ میں مَیں نے جنرل اور دوسرے اعلیٰ فوجی حکام کے ساتھ پناہ لی ہوئی تھی۔ آہنی چادروں پر برستی ہوئی گولیوں سے ماحول میں اعصاب شکن اور بھیانک گونج پیدا ہو رہی تھی اور پھر وہ سلسلہ یک لخت موقوف ہو گیا۔

مقدر کی گردش نے اس وقت مجھے ایک اذیت ناک موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

میرے لئے دنیا میں اگر کوئی ہستی قابلِ محبت تھی تو وہ صرف میری

بچھڑی ہوئی سیتا ہی تھی جس کے ساتھ میں نے ہمالیہ کی برفپوش وادیوں میں پرسکون گھریلو زندگی کے سنہرے خواب دیکھے تھے۔

سیتا نے انسانوں سے دور ہمالیہ ہی کی وادیوں میں اپنی ماں کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور وہیں پروان چڑھی تھی۔ اس کی دوستی ان علاقوں میں بکثرت پائے جانے والے بندروں اور لنگوروں سے تھی جو اس کی زبان سے نکلنے والے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے مگر ذہنی اعتبار سے وہ باہر کی دنیا کے لوگوں سے بھی کہیں برتر تھی۔ اس میں بس ایک ہی خرابی تھی کہ وہ بہت زیادہ انانیت پرست تھی۔

اور اس کی یہی انا ایک روز اسے ایسے راستے پر لے گئی جو مجھ سے دور جاتا تھا۔

وہ خود بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ ہمارے شوق۔ ہماری پسند اور ہمارے راستے سب ہی مشترک تھے مگر جب وہ مجھ سے بچھڑی تو پھر اس کا سایہ تک کہیں نظر نہ آسکا۔

سیتا سے جدائی کی اس طویل مدت میں میں نے اپنی تنہائی کا روگ بھلانے کے لئے ان گنت لڑکیوں سے دوستی پیدا کی لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے دل سے سیتا کی فسوں خیز یادوں کا نقش نہ مٹا سکی۔ ان میں سے ہر لڑکی راستے میں پڑے ہوئے اس پتھر کی طرح نظر آئی جو بلا امتیاز ہر مسافر کی ٹھوکریں کھاتا ادھر سے اُدھر لڑھکتا پھرتا ہے۔ اور اسے کہیں اماں نہیں ملتی۔

اب قاہرہ میں سیتا کا سراغ مل گیا تھا۔ وہ قانون کے محافظوں کے خوفناک حصار میں گھر کر بھی موت برسا رہی تھی اور میں اس کے مقابل آگیا تھا۔

اردو زبان اور سندری کا نام استعمال کر کے میں نے اپنی دانست میں سیتا کو یہ یقین دلانے کی آخری کوشش کر ڈالی تھی کہ اس کا مخاطب اس کا شوہر صفدر علی ہی تھا مگر اس نے میری آواز، میرے لب ولہجے اور میرے دیئے ہوئے حوالے کو تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا تھا۔

سیتا جب مجھ سے بچھڑی تھی تو اس وقت میں اپنی طاقت اور صلاحیت کے زعم میں ڈوبا ہوا ایک سرکش نوجوان تھا جو دشمنوں سے ٹکرا کر فنا ہو جانے کو شان سمجھتا تھا مگر ہتھیار ڈال کر زندہ رہنے کو کسی طرح تیار نہیں تھا۔

اسی وجہ سے سیتا نے میری شناخت سے انکار کیا تھا۔ اس کی دانست میں اس کا نڈر شوہر صفدر علی اسے کسی بھی قیمت پر ہتھیار ڈالنے کا بزدلانہ مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔

اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ گھر بار اور سکون کو ترسا ہوا ایک شخص اپنی بقا کی ہولناک جنگ کے آخری مرحلوں پر محض چند بے خوف لمحوں کے عوض اپنے ہر اٹل اصول کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔

ہولناک آتشیں اسلحے کے حصار میں گھری ہوئی سیتا نے مردانہ وار... فائرنگ کر کے اپنے اس عزم کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ آخری سانس یا آخری گولی تک اپنا دفاع کرتی رہے گی اور یہ تصور ہی میرے لئے کربناک تھا۔

قانون کے محافظ ہر اعتبار سے برتر تھے۔ وہ سیتا تو کیا اس کے سیکڑوں حمایتیوں کو بھی پیوند خاک کر ڈالنے کی قوت رکھتے تھے مگر اس وقت وہ عارضی طور پر پس منظر میں چلے گئے تھے اور میں براہ راست سیتا کے سامنے آگیا تھا۔

ایک طرف اسلحہ سے لیس بیوی تھی تو دوسری طرف پابند سلاسل شوہر، جس کے پاس ایک ٹرک کی آڑ کے سوا محض میگا فون ہی تھا۔

اچانک پشت سے ایک ہاتھ نرمی سے میرے شانے پر جم گیا۔

میں چونک کر مڑا تو اندھیرے میں جنرل کی چمکتی ہوئی آنکھیں اپنے چہرے پر مرکوز نظر آئیں۔

"مجھے افسوس ہے جوان!" جنرل کی دھیمی آواز میں واقعی تاسف کا عنصر نمایاں تھا۔ "وہ تمہیں نہیں پہچانتی ــــ اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے، میں نے تمہیں پورا موقع فراہم کیا تھا۔"

"میرے مقدر کی خرابی۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھ میں مزید کسی کوشش کی ہمت نہیں رہی اب میرا مستقبل تمہارے احکام کا پابند ہے۔"

وہ مربیانہ انداز میں ہنس دیا۔ اندھیرے میں اس کے سرخی چہرے پر سفید دانتوں کی قطاریں خفیف سی نمایاں ہوئیں پھر وہ بولا۔ "کیا اس تجربے کے بعد بھی تم اپنے دعوے پر اصرار کرتے رہو گے؟"

میں نے چند ثانیوں تک سوچا پھر سر اٹھا کر کہا۔ "اصولاً تو مجھے اس مرحلے پر اپنا دعویٰ ترک کر دینا چاہئے کیونکہ اس طرح مجھے آزادی مل سکے گی مگر میں تمہارے اعتماد کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے اب بھی اقرار ہے کہ میں صفدر علی ہوں۔"

"میرا سوال محض رسمی تھا۔" جنرل بولا۔ "تم اقرار کرتے یا انکار، ہم تمہیں اس وقت تک رہا نہ کرتے جب تک لیبیا سے تمہارے فنگر پرنٹس کی رپورٹ موصول نہ ہو جاتی، مگر تمہارے جواب سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔"

"اب میرا کیا ہوگا؟"

"تم ہمارے قیدی ہو، فی الحال تمہیں ایک فوجی قید خانے میں ڈال دیا جائے گا جہاں تمہیں آزادی کے علاوہ ہر سہولت میسر ہوگی۔"

"تم نے میری پہلی بات مان کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اپنی آخری آرزو بھی ظاہر کر دوں؟"

"آخری آرزو؟" اس نے تعجب آمیز لہجے میں دہرایا۔

"ہاں۔" میرا لہجہ پُراعتماد تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ صفدر علی کے طور پر میری شناخت ہو جانے کے بعد میرے لئے موت ہی واحد سزا ہوگی۔"

جنرل نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبے ہوئے سگار کے دو تین گہرے کش لے کر میری طرف دیکھا پھر دھیمے ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "ایسی باتیں نہ کرو، میں پھر دہراؤں گا کہ مجھے تمہارے اعتراف پر شبہ ہے اور اگر تم صفدر علی ہی ہو تو مصری قانون شاید تمہیں کوئی سزا نہ دے سکے۔"

حیرت اور مسرت سے یک بیک میرا دل اچھل پڑا۔ "شاید تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟"

"مذاق نہیں ــــ یہ حقیقت ہے۔" وہ بولا۔ "میری اطلاعات کے مطابق صفدر علی نے لیبیا سے مصر کا رخ ضرور کیا ہے مگر مصری سرحدوں میں ابھی تک اس کے کسی ارتکاب جرم کی خبر نہیں ملی ہے۔"

"یہ درست ہے کہ مصری قانون کی نظروں میں میں ابھی تک بے گناہ ہوں مگر لیبیا کی حکومت نے مجھ پر سنگین الزامات عائد کئے ہوئے ہیں، وہ مصری حکومت سے اپنا مجرم طلب کریں گے اور اسے پھانسی لگا دینگے۔"

"ان الزامات کا انکار یا اعتراف تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔" جنرل بلاوی سے بولا جیسے وہ میری زبان سے کسی جرم کا اقرار سننا نہ چاہتا ہو۔ "کم از کم مصر میں تم محفوظ ہو، اگر کوئی سزا ملی تو وہ ہماری سرحدوں سے باہر کا معاملہ ہوگا۔"

اسی وقت اچانک تاریک عمارت کی چھت سے گولیوں کی ایک اور باڑھ ماری گئی جو بظاہر بے مقصد ہی تھی۔

ان گولیوں سے کوئی نقصان تو نہ ہوا لیکن چند ثانیوں کے لئے وہاں موجود ہر شخص پر اعصابی تناؤ طاری ہو گیا۔

"چلو۔" سکتے کی اس کیفیت کے خاتمے پر جنرل کے برابر میں کھڑے ہوئے ایک باوردی افسر نے مجھ سے کہا۔

"میری آخری آرزو۔" میں نے جنرل کی طرف مڑ کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے اس محاصرے کا دردناک انجام معلوم ہے مگر پھر بھی میں یہ اختتام بچشم خود دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔ اور اگر مجھ پر ذرا بھی شبہ ہو تو مجھے بے دریغ گولی مار دی جائے۔"

"مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے نوجوان!" جنرل دھیمی آواز میں بولا۔ "مگر مجھ سے ناسمجھ بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔"

جنرل کے کسی گوشے میں شاید میرے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے جو وہ چند منٹ تک مجھ سے بحث میں الجھا رہا اور آخر کار مجھے فوجی قیدیوں کو لے جانے والی ایک لاری میں بند ہو کر موقع پر موجود رہنے کی اجازت دے دی۔

مجھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے بوجھ میں آہنی چادروں سے بنی ہوئی ایک گاڑی کے عقبی حصے میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے ساتھ ایک مسلح گارڈ بھی موجود تھا۔

اس گاڑی کے دروازے میں باریک آہنی جالی لگی ہوئی تھی اور وہ عمارت کے سامنے اس طرح کھڑی ہوئی تھی کہ محصور عمارت اس کے داہنی طرف تھی۔

محاذ پر کئی منٹ تک پُرہول سی خاموشی چھائی رہی پھر عمارت کی طرف سے یکے بعد دیگرے چار شدید دھماکے سنائی دیئے۔

شاید فوجیوں نے سیتا اور اس کے اعصاب کو مفلوج کرنے کے لئے دھویں وغیرہ کے بم پھینکے تھے۔

ان دھماکوں کی گونج میں مردوں، عورتوں اور بچوں کا ملا جلا شور بھی سنائی دیا۔ چند ثانیوں بعد ایسا محسوس ہوا جیسے چیخنے والوں کا دم گھٹنے لگا ہو اور پھر فضا گولیوں کی ہولناک آوازوں سے لرزنے لگی۔

گولیاں تڑاتڑ آہنی چادروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں اپنے وجود میں بے چینی کی لہر محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

سیتا اس طرح بے مقصد فائرنگ کر کے اپنا دفاع کمزور کر رہی تھی۔

پھر اچانک ایک لرزہ خیز دھماکا ہوا اور میری نگاہوں کے سامنے شعلوں کی ایک چادر سی تن گئی۔ اس کے ساتھ ہی فضا مرنے والوں اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے لرزنے لگی۔

عمارت سے پھینکے جانے والے آتشگیر بم نے کم از کم دو یا تین گاڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

گولیوں کی برسات رک گئی مگر فوجیوں اور پولیس والوں کی صفوں میں پھیلی ہوئی ابتری کم نہ ہو سکی۔ وہ لوگ زخمیوں کو سنبھالنے کے ساتھ ہی چھپا کر آگ پر قابو پانے کی کوششیں بھی کر رہے تھے۔

"سنو!" اچانک فضا میں سیتا کی چیختی ہوئی آواز گونجی۔ اس نے عربی زبان ہی استعمال کی تھی۔ "ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ تم نے بے گناہوں پر دھویں کے بم پھینک کر یرغمالیوں کو زخمی کر دیا ہے، دو گاڑیاں عمارت کے دروازے پر لگا دو، میں گیارہ یرغمالیوں کو رہا کر رہی ہوں، میرے ساتھ بدمعاشی کی کوشش تمہیں مہنگی پڑے گی، عمارت کی چھت اور چاروں طرف سے میرے جانباز ساتھی پوری صورت حال کا جائزہ لیتے رہیں گے۔"

"ہتھیار ڈال دو۔" اس کے خاموش ہوتے ہی میگا فون پر ایک بھاری مردانہ آواز گونجی۔ "تمہارے ہتھیار نہیں تو کم از کم اعصاب ضرور جلد ہی تمہارا ساتھ چھوڑ دیں گے اور تمہارے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں گے۔"

جواب میں ایک ہذیانی قہقہہ گونجا پھر سیتا کی آواز سنائی دی۔ "بکواس نہ کرو، اب کچھ یرغمالی بھی ہمارے ساتھ مل گئے ہیں اور اگر چند گھنٹوں تک تم نے ہماری شرائط نہ مانیں تو ہم سارے علاقے کو بھیانک کھنڈرات میں بدل دیں گے۔"

اس کی آواز معدوم ہوتے ہی اسٹین گن کا ہلکا سا برسٹ گونجا مگر اس بار شاید ہوائی فائر کئے گئے تھے کیونکہ گولیاں کسی ٹرک کی چادر سے نہیں ٹکرائی تھیں اور ان کا شور بھی قدرے مدھم تھا۔

دروازے میں لگی ہوئی آہنی جالی میں سے میں نے دیکھا کہ کافی دور فوجی ایمبولنس کے طرز کی دو بھاری گاڑیاں حرکت میں آچکی تھیں۔

"کسی گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ کوئی اور موجود ہوا تو مار دیا جائے گا۔" سیتا کی آواز گونجی۔ شاید گاڑیوں کی نقل و حرکت اس نے

بھی دیکھ لی تھی۔

جلتے ہوئے ٹرکوں کی خون آشام روشنی میں میں نے ان دونوں گاڑیوں پر بنے ہوئے ملتی پونٹوں کے نشانات کے ساتھ ہی وہ سفید پرچم بھی دیکھے جو کیبن پر نمایاں طور پر لہرا رہے تھے۔

رینگتی اور غراتی ہوئی وہ دونوں گاڑیاں آسیبی ہیولوں کی طرح میرے سامنے سے گزر کر دائیں پہلو پر معدوم ہو گئیں۔ چند ثانیوں بعد آواز سے اندازہ ہوا کہ گاڑیاں تو رک چکی تھیں مگر ان کے انجن بیدار رہے۔

ان گاڑیوں کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ بمشکل چند منٹ بعد ہی وہ سائرن بجاتی ہوئی تیزی سے اسی سمت میں چلی گئیں جدھر سے آئی تھیں۔

دو تین منٹ کے لئے پھر سکوت چھا گیا، اس کے بعد ایک مرتبہ پھر عمارت سے فائر کیا گیا، اس بار کئی سمتوں سے فوجیوں نے بھی رائفلیں چلائیں مگر دونوں فریق ایک دوسرے کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

فضا پر ہولناک سناٹا بمشکل پانچ منٹ تک قائم رہا اور پھر اسٹین گن کی گولیاں برسنے لگیں۔

اسٹین گن خاموش ہوئی تو میگا فون پر ایک سرد اور تحکم آمیز آواز ابھری: "خود کو قانون کے حوالے کر دو، ورنہ ہم پوری عمارت اڑا دیں گے۔"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

"ہم تمہارے جواب کے منتظر ہیں۔" قدرے انتظار کے بعد میگا فون والے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

اس بار بھی جواب دینے کی زحمت نہیں کی گئی۔ میرے لئے سیتا کی خاموشی نہایت حیرت انگیز تھی۔

پچھلی فائرنگ کے کم و بیش پانچ منٹ بعد جب اسٹین گن کا شور دوبارہ سنائی دیا تو یک بیک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور نگاہیں ہتھکڑی کے ساتھ بندھی رسٹ واچ پر جم گئیں جس کے ڈائل کے چمکدار سوئیاں اندھیرے میں نمایاں طور پر چمک کر وقت بتا رہے تھے۔

فائرنگ ختم ہو گئی مگر میری نظریں رسٹ واچ پر ہی جمی رہیں جیسے مجھے وہاں سے کسی جن کے نمودار ہونے کی امید ہو۔

لمحہ لمحہ کر کے وقت رینگتا رہا۔ شاید اس وقت گھڑی کی رفتار ہی سست ہو گئی تھی مجھے ایک ایک سیکنڈ گننا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔

پھر جوں ہی پانچ منٹ کا وقفہ مکمل ہوا، اسٹین گن ایک مرتبہ پھر مشینی انداز میں چل پڑی۔ اس بار نیچے سے بھی فائرنگ کا بھرپور جواب دیا گیا۔ جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

میرے ذہن میں ایک موہوم سی امید جنم لے چکی تھی اور میرا دل خوشی سے قدرے تیز دھڑکنے لگا تھا مگر اپنے خیال کی تائید کے لئے مجھے مزید کچھ وقت درکار تھا۔

اسٹین گن کا اگلا برسٹ پھر پانچ منٹ کے وقفے سے آیا اور چند سیکنڈ بعد یک لخت موقوف ہو گیا اس بار نیچے سے فائر نہیں کیا گیا تھا۔

میری امید کو اس صورتحال سے خاصی تقویت حاصل ہوئی۔

اور جب اسی پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اسٹین گن پھر گنگنائی تو میں نے پُر اعتماد انداز میں اپنا رسٹ واچ والا ہاتھ گرا لیا اور بے اختیار اپنے ساتھ موجود مسلح فوجی کو مخاطب کر بیٹھا۔

میری آواز سنتے ہی وہ آگے بڑھا مگر میں اپنی اضطراری حماقت پر بھنا کر رہ گیا، اس وقت مجھے زبان بند رکھنی تھی مگر اسے کچھ کہنے کا موقع نہ دینے کے سبب مجھے اس سے کچھ نہ کچھ کہنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

"ایک سگریٹ ہو گی تمہارے پاس؟" میں نے سوال کیا۔

اسی لمحے مختلف سمتوں سے متعدد رائفلیں چلیں اور کوئی کارتوس کام دکھا گیا۔ عمارت کی سمت سے ایک کربناک چیخ ابھری اور ساتھ ہی اسٹین گن کے فائر کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔

"وہ مارا۔" میرا نگراں فرطِ مسرت سے چلا یا۔

جانتا میں بھی تھا کہ نیچے والوں کی فائرنگ سے عمارت میں موجود ایک ایسا شخص ہلاک یا زخمی ہوا تھا جو اسٹین گن چلا رہا تھا۔ لیکن اس وقت میرے لئے عمارت یک بیک اپنی اہمیت کھو بیٹھی تھی۔

واقعات اور ان کے تواتر سے میں نے اپنے ذہن میں امیدوں کا تانا بانا تیار کر لیا تھا جس میں وہ عمارت کوئی افادیت نہیں رکھتی تھی۔

ایک شکار مار لینے کے بعد نیچے والوں کا جوش و خروش بڑھ گیا اور ہر سمت سے گولیوں کا کان پھاڑ دینے والا شور سنائی دینے لگا مگر دوسری طرف سے ان وحشیانہ حملوں کا کوئی جواب سنائی نہ دیا۔

"فائر بند۔" اچانک میگا فون پر ایک چیختی ہوئی تحکمانہ آواز گونجی اور لرزتی ہوئی فضا کو یک بیک قرار آ گیا۔

مسلسل شور کے بعد وہ سناٹا غیر فطری محسوس ہو رہا تھا۔

میرے محافظ نے ایک سگریٹ سلگا کر میری طرف بڑھا دی جو میں نے اطمینان سے اپنے لبوں میں دبا لی۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہمارا اگلا قدم بہت سخت ثابت ہو گا۔"

میگا فون پر وہی تحکمانہ آواز ابھری اور اپنی ہی بازگشت میں ڈوب گئی۔ دوسری جانب سے اس تنبیہ کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

میں پُر سکون تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ فریقِ مخالف کی خاموشی قانون کے محافظوں کے اعصاب پر گراں گزر رہی ہو گی۔

کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ شاید محاذ کے کمانڈر میلی ہیلی کوپٹر پر آپس میں صلاح مشورے کر رہے تھے۔

پھر غالباً وہ کسی نتیجے پر پہنچ ہی گئے۔

"اگر پانچ تک گنتی مکمل ہونے تک تم نے جواب نہیں دیا تو نتائج کی ساری ذمہ داری تم پر ہو گی۔" میگا فون پر طویل سکوت کے بعد ہی آواز ابھری اور اس نے گنتی شروع کر دی۔ "ایک۔"

چند ثانیوں کے لئے سناٹا چھا گیا پھر وہ آواز گونجی۔ "ایک۔"

وہ دیدہ دانستہ گنتی مکمل کرنے میں تاخیر کر رہا تھا تاکہ فریقِ مخالف کو سوچنے کے لئے زیادہ وقت مل سکے مگر بظاہر اس کی یہ کوشش رائیگاں جاتی نظر آ رہی تھی۔ محصور ٹولی نے مسلسل چپ سادھی ہوئی تھی۔

"دو...... تین" اور اسی کے ساتھ کئی فوجی گاڑیوں کے انجن بیدار ہو گئے ان کی بھاری گڑگڑاہٹ نے ماحول کو اور گمبھیر بنا دیا جلتی ہوئی گاڑیوں کے شعلے گو ماند پڑ چکے تھے مگر وہاں سے اٹھنے والا کثیف دھواں اور لہو رنگ انعکاس اس وقت کسی پامال محاذ کا سماں باندھ رہا تھا جیسے دشمن کی سپاہ بے دردی سے روندتی ہوئی آگے نکل گئی ہوں۔

پھر فضا ایک جگر خراش دھماکے سے لرز اٹھی جس کے جلو میں بھاری آہنی جھنکار بھی نمایاں تھی۔

شاید کسی ٹرک کا سلگتا ہوا ٹائر پھٹا تھا۔

"چار...... پانچ۔" اور گنتی مکمل ہوتے ہی سڑک کے وسط میں کھڑے ہوئے آہنی ٹرکوں کی فصیل بکھر گئی۔

بیک وقت سات آٹھ ٹرک غراتے ہوئے اپنی جگہ سے نکل کر محصور عمارت کے داخلی پھاٹک کی طرف بڑھے، جگہ کی تنگی کے باعث دو تین ٹرک تیز رفتاری میں ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوئے مگر ان کی پیش قدمی میں فرق نہ آیا۔ وہ ایک دوسرے کی آہنی چادریں پھاڑتے ہوئے میری گاڑی کی داہنی جانب روپوش ہو گئے اور پھر شاید انہوں نے عمارت کے داخلی راستے پر ناقابلِ شکست مورچے قائم کر لئے جنہیں توڑنا آسان نہیں تھا۔

پھر یخ بستہ سڑک پر وزنی جوتوں کا شور سنائی دیا۔ شاید ان ٹرکوں میں چھپے ہوئے مسلح فوجی نیچے کود کر عمارت میں گھس پڑے تھے۔

اتنا کچھ ہو گیا مگر عمارت سے کوئی گولی نہ چلی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک محصور ملزم کو گولی لگتے ہی اس کے بقیہ ساتھی بھی معذور ہو چکے تھے۔

مختصر سے وقت میں بولا جانے والا وہ دھاوا اس اعتبار سے نہایت منظم تھا کہ کارروائی کے آغاز کے چھ سات منٹ بعد ہی اندر سے میگا فون پر وہ خبر آگئی جس کا میں خاصی دیر سے منتظر تھا۔

عمارت میں ایک شخص اسٹین گن کے ساتھ مردہ حالت میں ملا تھا اس کے علاوہ وہاں صرف بیر خالی تھے، سیتا اور اس کے بقیہ ساتھیوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

اس خبر نے نیچے ہلچل مچا دی۔ گلیوں میں چھپا ہوا تماشائیوں کا ہجوم بے قابو ریلے کی صورت میں چاروں طرف سے امڈ آیا، ہر طرف سے فلیش گنوں کی چکا چوند ہونے لگی۔ حکام چیخ چیخ کر لوگوں کو دور رہنے کا حکم دے رہے تھے مگر وہاں کوئی اس کی سننے کے لئے تیار نہیں تھا، ہر شخص اس عمارت تک پہنچنے میں دوسروں سے سبقت لے جانا چاہ رہا تھا۔

اندر گھسنے والے کمانڈو دستوں کے سربراہ نے ہیجان اور اضطرار کے عالم میں سیتا وغیرہ کے لاپتہ ہونے کی خبر جلد از جلد اپنے نیچے والے ساتھیوں تک پہنچانے کے لئے وائرلیس ٹرانسمٹر وغیرہ کے بجائے میگا فون استعمال کر ڈالا تھا۔ جس کی آواز دور تک سنی گئی تھی اور خلط ملط جانے کے اس اعلانِ عام نے آناً فاناً میں وہاں کا نظم و نسق تہہ و بالا کر دیا تھا۔

فوجی افسران سڑک کے وسط میں کھڑی ہوئی گاڑیاں ہٹانا یا کہیں اور لے جانا چاہ رہے تھے بہت سے انجن بھی اسٹارٹ کر دیئے گئے تھے مگر اس سیلِ بے پناہ میں دو چار افراد کو زخمی کئے بغیر کسی گاڑی کو اپنی جگہ سے ہلانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

ہجوم کو بار بار وارننگ دی گئی۔ مگر افراتفری میں کوئی کمی نظر نہ آئی۔ میرے ساتھ موجود مسلح نگراں دانت پیس پیس کر نہایت ہی فراخ دلی سے ان سرکش تماشائیوں کی خواتین سے زبانی حد تک ناگفتنی رشتے استوار کئے جا رہا تھا۔

"کیوں اپنی زبان خراب کر رہے ہو؟" میں نے نرم لہجے میں اسے ٹوکا۔

"بکواس مت کرو۔" وہ غرا کر مجھ پر ہی چڑھ دوڑا۔ "زیادہ نفاست بھگاری تو ایک ہی گولی میں خانہ خراب کر دوں گا۔"

"میں مجرم نہیں ہوں۔" میں نے دھیمے سے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بھنا کر بولا۔ "مجھے حکم ملا ہے کہ تم ذرا بھی چالاک بننے کی کوشش کرو تو تم سے اپنی مرضی کے مطابق نمٹ سکتا ہوں۔"

اس دوران میں باہر کیا ہوا؟ میں اس سے لاعلم رہا، البتہ اچانک ہوائی فائرنگ کا شور سن کر مجھے نئے تماشے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

اندھیرے میں بے شمار لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اور ٹھوکریں کھاتے پناہ کی تلاش میں واپس بھاگے جا رہے تھے۔

پھر شاید کسی کو بھاگنے والوں کی حالتِ زار پر ترس آیا اور وہاں موجود تمام فوجی ٹرکوں کے ہیڈ لیمپس روشن کر دیئے گئے۔

وہ ہجوم جتنی تیزی سے جمع ہوا تھا، ہوائی فائرنگ کی دہشت سے اس سے زیادہ سرعت سے صاف ہو گیا۔

البتہ ہیڈلائٹس کی روشنی میں دور تک جوتے، رومال اور مختلف اشیاء بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں جو ایسی خوفناک بھگدڑ کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔

فوجی گاڑیاں میدان صاف ہوتے ہی سڑک کے وسط سے ہٹا کر مناسب مقامات پر کھڑی کی جانے لگیں۔ اس وقت وہاں اعلیٰ حکام سے ادنیٰ سپاہیوں تک، ہر ایک پر بدحواسی طاری نظر آ رہی تھی۔

پھر میری گاڑی کا انجن بھی بیدار ہو گیا اور کسی کی ہدایت پر گاڑی آگے بڑھ گئی، اس وقت میں نے دیکھا کہ محصور عمارت کے سامنے مسلح

جوانوں کی بھاری تعداد شانے سے شانہ ملاتے اس طرح کھڑی تھی کہ چڑیا کا بچہ بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر اس عمارت سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

میری بند گاڑی کہیں رکنے کے بجائے سیدھی ہی چلی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں لمحہ بہ لمحہ زنداں سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

سیتا قانون کے محافظوں کے خطرناک نرغے میں پھنسنے کے باوجود صاف بچ نکلی تھی اور میں نے از خود اپنی گردن قانون کے شکنجے میں پھنسا دی تھی۔

واقعات کی ترتیب کے پیشِ نظر مجھے سیتا کے فرار کی کڑیاں یکجا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ حالات بگڑتے دیکھ کر سیتا اپنے ساتھیوں سمیت یرغمالیوں کی زرہ کی جانے والی آخری کھیپ میں شامل ہو کر فرار ہو گئی۔ پولیس کو الجھائے رکھنے کے لئے اس نے کسی یرغمالی ہی کو آلۂ کار بنایا ہو گا جو اس کے حکم کے مطابق ہر پانچ منٹ بعد مختصر وقت کے لئے اسٹین گن کے راؤنڈ چلاتا رہا۔ غالباً اسے دھمکی دی گئی ہو گی کہ اگر اس نے ہدایت سے انحراف کیا تو اس کا بدن چھلنی کر دیا جائے گا اور وہ بے چارہ آخری سانس تک اسی نفسیاتی خوف میں مبتلا رہا۔

اس طرح سیتا نے حصار سے نکلنے کے بعد کافی وقت حاصل کر لیا تھا اور اس مدت میں اس نے یرغمالیوں کو لے جانے والی فوجی گاڑیوں سے گلو خلاصی کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکال لی ہو گی۔

اگر بد قسمتی سے اسٹین گن چلانے والا باہر کے فائر کا نشانہ نہ بنتا تو شاید کافی دیر تک فوجیوں کو یہ علم ہی نہ ہو پاتا کہ وہ جس کی خاطر وہاں گھیرا ڈالے ہوئے تھے وہ انہیں چوٹ دے کر نکل گئی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں برادر؟" طویل سکوت کے بعد میں نے نہایت محتاط لہجے میں اپنے نگراں سے سوال کیا۔

"جہنم میں۔" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں غرایا۔

"میرے بارے میں ایسی بدفالی تو منہ سے نہ نکالو۔" میں نے دھیمے لہجے میں جھنجھلایا ہوا احتجاج کیا۔

"بدفال بھی گئی جہنم میں۔" وہ سخت بیزار نظر آ رہا تھا اور اسی بیزاری میں وہ میرے الفاظ کا مفہوم بھی نہ پا سکا تھا۔ "خاموش بیٹھو، میرا بھیجا نہ چاٹو۔"

"مجھے تمہارے ایک افسر نے پکڑ کر زبردستی بند کر دیا۔ مجھے اپنا قصور تو معلوم ہونا ہی چاہئے۔"

"زبردستی۔" اس نے زہریلے لہجے میں دہرایا۔ "وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر ایک کو معلوم تھا کہ تم زبردستی اس حرافہ کے رشتے دار بن رہے تھے، وہ تو اسی نے خود تمہارے منہ پر تھوک دیا۔"

"مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔" میں سٹپٹائی ہوئی آواز میں بولا۔ "زیادہ چرس پی لینے کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟"

"تم چرسی ہو؟" اس کا غصہ قدرے کم ہو گیا۔

"ہاں۔" میں نے غمناک لہجے میں کہا۔

"مگر تمہاری حالت تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ تم نشے میں ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ "جب مجھے خود پتہ نہیں چلتا تو دوسروں کو کیا معلوم ہو گا۔" پھر قدرے توقف کے بعد بڑبڑایا۔ "پتہ نہیں اب گلو خلاصی کیسے ہو گی؟"

"سیتا کے نکل جانے کی وجہ سے تمہارا معاملہ بگڑ گیا ہے ورنہ میں تمہاری کافی مدد کر سکتا تھا۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں اپنی گفتگو سے اس کے دل میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ اب مجھے پھانسی پر ہی چڑھا دیا جائے۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اس بند گاڑی میں اندھیرا ہونے کے باعث مجھے اس کے ساتھ اداکاری کرنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آ رہی تھی۔

"تم نرے احمق ہو۔" میری قنوطیت پر وہ چڑ گیا۔ "وہ زیادہ سے زیادہ دو چار دن قید میں رکھ کر تمہارے بارے میں تفتیش کریں گے اور تمہاری اصلیت معلوم ہونے کے بعد تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔"

"کاش ایسا ہو سکتا۔" میرے لہجے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ "وہ تفتیش کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں اپنی لڑاکا بیوی کا مفرور قاتل ہوں۔"

اچانک وہ میرے قریب آ گیا اور پُر جوش انداز میں میرا شانہ دباتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "تو تم اپنی بیوی کے قاتل ہو؟"

"میں اس کی بد زبانی سے عاجز آیا ہوا تھا، ایک روز نشے کے عالم میں اس کے پیٹ میں چھری اتار کر مزے کی نیند سو گیا، بیدار ہوا تو نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس کی خون میں لت پت لاش وہیں چھوڑ کر گھر سے ایسا نکلا کہ ابھی تک پھر ادھر کا رخ نہیں کیا ہے۔"

میں اسے محض باتوں میں الجھا کر کوئی موقع پیدا کرنے کی نیت سے داستان طرازی کر رہا تھا مگر نئے موضوع میں اس کی غیر متوقع دلچسپی محسوس کر کے میں ہر موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔

"نشہ واقعی بری چیز ہے۔" وہ حسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "آدمی ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جن کے بارے میں سوچ کر ہی ہوش کے عالم میں پتا پانی ہونے لگتا ہے۔ کاش میں بھی کبھی کوئی کارنامہ انجام دے سکوں۔"

"بتاؤ ـــــ دل کی بات بتاؤ، شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔" میں نے اس کی غیر اخلاقی خواہش کو اخلاقی سہلا دیا۔

"تم بہادر آدمی ہو۔" اس کا لہجہ بالکل ہی تبدیل ہو گیا۔ "اور میں بیوی کا ستایا ہوا ایک بزدل انسان ہوں۔"

"مجھے تم کو بزدلی نہیں کہا جا سکتا میرے دوست۔" مجھے مربیانہ اندازِ گفتگو اختیار کرنے کا موقع ملتا جا رہا تھا۔ "سمجھوتہ زندگی اور مسرتوں کے لئے کیا جاتا ہے، ان کے عوض نہیں۔"

اس بار اس کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ "میرا تو یقین ہے کہ سانپ کا کاٹا زندہ بچ سکتا ہے مگر بیوی کا ڈسا ہوا کبھی نہیں پنپ سکتا۔"

"بہت دکھی ہو؟"

"ایسا ویسا۔" اس وقت وہ اپنی اور میری حیثیت کا فرق بالکل بھول چکا تھا۔ "وہ میری کمائی کے بل پر اپنے پورے گھرانے کو پالنا چاہتی ہے، پہلے میں سرحدی پولیس میں تھا تو اپنی مرضی کے خلاف اسمگلروں سے تعاون کے عوض بھاری رقمیں بٹورتا رہا تھا مگر جس دن سے میری بدلی ہوئی ہے میری بیوی نے بھی کینچلی بدل لی ہے۔ جب اس کے ہزار طعنوں کے باوجود میں اپنی آمدنی بڑھانے کے ذرائع پیدا نہ کر سکا تو اس نے گھناؤنے کام شروع کر دیئے۔ میرے دوست بتاتے ہیں کہ ہر شام وہ نئے مردوں کے ساتھ گھومتی ہے اب اسے نہ میری پروا ہے نہ میری مختصر سی کمائی کی۔"

"تو کیا اس کا گھرانہ بے سہارا ہے؟"

"وہ نہیں جو کہیں ملازمت کر سکتی ہیں مسلسل پڑھے جا رہی ہیں، نہ جانے وہ کیا کر کے دکھانا چاہتی ہیں؟ تیسرا مسٹنڈا بھائی دن رات جوئے کے چکر میں رہتا ہے بس ایک معذور باپ ہے جو واقعی ہر ہمدردی کا مستحق ہے مگر ..... مگر شاید میری بیوی کو عیاشی کا مزا راس آ گیا ہے۔"

"ایسی عورت کو واقعی ایک پل بھی زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔"

"مجھے سامنے کی باتیں سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے آہنی زنجیروں کو آپس میں ٹکرایا۔ "اس زیور نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں چھوڑا ورنہ بتانے کے بجائے میں بہت کچھ کر دکھاتا۔"

"تو کیا ......؟"

"ہاں ہاں ..... تم درست سمجھ رہے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر لاپروایانہ لہجے میں کہا۔

"وہ بے حد حسین ہے اور شاید میری بد قسمتی کا سبب بھی یہی ہے۔" وہ دردناک لہجے میں بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنے حسن کے سحر میں گرفتار کر لے۔"

"ایک مجبور آدمی پر تم جو الزام چاہو عائد کر سکتے ہو۔" میں نے ایک مرتبہ پھر ہتھکڑیاں بجا کر کہا۔

"نہیں ـــــ میرا مطلب غلط نہ سمجھو۔" وہ ہڑبڑا کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "غلط راہوں پر چل پڑنے کے بعد وہ مکار اور فسوں کار ہو گئی ہے۔ اشاروں ہی اشاروں میں کسی بھی مرد کو زیر کر لیتی ہے۔"

"وہ قلو پطرہ بھی ہوئی تو میرے ہاتھوں ......"

"شش شش۔" اس نے مضطرب کے عالم میں مجھے خاموش کر دیا پھر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولا۔ "میں چاہوں تو اسی وقت تمہیں آزاد کر سکتا ہوں مگر اس طرح سارا الزام مجھ پر آئے گا، میں جلد از جلد تمہیں رہا کرا دوں گا مگر تمہیں میرا کام اس خوبصورتی سے کرنا ہو گا کہ مجھ پر حرف نہ آنے پائے۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔

ایک بدکار اور شوہر کی بے وفا بیوی کا قتل میری نگاہ میں کوئی ایسا قابلِ نفرین فعل نہیں تھا جس سے میں پس و پیش کرتا جبکہ اس طرح مجھے مصر کی سرحدوں میں ایک اور نہایت مضبوط سہارا مل رہا ہے۔

"یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ میں آج کل قاہرہ کے مضافات میں ہی متعین ہوں مگر ہفتہ وار تعطیل کے سوا میں کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ اگلی چھٹی میں صرف ایک دن رہ گیا ہے میں دور سے تمہیں اسے دکھا دوں گا اور تم اگلے روز آسانی سے اپنا کام سر انجام دے سکو گے۔"

"تو وہ قاہرہ میں ہی رہتی ہے؟"

"ہاں، ایسی عورتوں کے لئے بیروت کے بعد قاہرہ ہی سب سے زرخیز شہر ہے۔" اس نے دھیمی مگر تلخ آواز میں کہا۔

"نام کیا ہے اس کا؟"

اسی وقت اچانک گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور وہ یوں اچھل کر مجھ سے دور ہٹ گیا۔ جیسے ہمیں فوراً ہی دیکھ لئے جانے کا امکان ہے۔

چند ثانیوں بعد اس کی بوکھلاہٹ کا سبب بھی واضح ہو گیا کیونکہ ہماری قیدیلیں والی گاڑی خاردار تاروں کی باڑھ میں بنا ہوا چوبی پھاٹک عبور کر کے سرچ لائٹوں سے منور فوجی کیمپ میں داخل ہو چکی تھی۔

"میں آج رات یا کل رات آؤں گا، تم تیار رہنا۔" وہ میرے قریب آئے بغیر آہستگی سے منمنایا۔

شاید ہمارے مقدرات نے اس محاصرے کے بہانے ہمیں یکجا کیا تھا۔ دونوں کا مقصد آزادی کا حصول تھا۔ ایک بیوی سے رہائی چاہتا تھا اور دوسرا قید سے اور میرے لئے آزادی کے بدلے آزادی کا سودا زیادہ مہنگا نہیں تھا۔

اس کیمپ کے ایک دور افتادہ حصے میں کھپریل کی چھت والے ایک بلاک کے سامنے گاڑی رک گئی، انجن بند ہوا اور فوراً ہی جالی دار دروازے کے سامنے دو مستعد فوجی آ موجود ہوئے۔

میں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی کرخت جھنکار میں اپنے نگراں کے ساتھ گاڑی سے نیچے اترا اور کشاں کشاں ایک وسیع کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

مجھے اندر چھوڑ کر میرا نگراں الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ پھر ایک اندرونی دروازے سے وہی جنرل دو نئے چہروں کے ساتھ نمودار ہوا جس کے ایما پر مجھے سیتا سے براہِ راست مخاطب ہونے کا موقع دیا گیا تھا۔

جنرل کے ہاتھ میں ادھ جلا سگار دبا ہوا تھا، اس کے پپوٹے قدرے متورم تھے، آنکھیں غیر معمولی حد تک چمک رہی تھیں اور پیشانی کی تمام وریدیں ابھری ہوئی تھیں۔ غالباً وہ کسی اندرونی حصے میں کافی دیر سے شراب نوشی میں مبتلا تھا۔

"جلدی لوٹ آئے۔" جنرل نے آتے ہی بھاری آواز مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ کیسے نکلنے میں کامیاب ہو گئی؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی بہت خونخوار عورت ہے۔" جنرل کے ان ملامت آمیز الفاظ کو سنتے ہوئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت مجھے لانے والا نگران وہاں موجود نہیں تھا ورنہ میری ساری محنت رائیگاں جاتی۔

"وہ یرغمالیوں میں مل کر فرار ہوئی، اس کے ساتھ دو افراد تھے۔" جنرل نے کہا۔ "باقی واقعی یرغمالی تھے۔ راستے میں ان تینوں نے اچانک گارڈز پر فائرنگ شروع کر دی، ہمارے پانچ جوان مارے گئے، سات زخمی ہوئے اور وہ تینوں ہماری ہی ایک جیپ میں نکل گئے۔"

"مجھے افسوس ہے جنرل۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔ "میں اسی بُری گھڑی کو ٹالنے کے لئے مضطرب تھا۔ اب وہ زیادہ دیر تک تمہاری دسترس سے آزاد نہ رہ سکے گی اور میں بھی اس کے لئے کچھ نہ کر سکوں گا۔"

"یہ الفاظ تمہارے شانوں پر آیا ہوا بوجھ ہلکا نہیں کر سکیں گے۔" جنرل کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "تمہاری اور سیتا کی گفتگو ریکارڈ کی گئی تھی تم نے ہندی بھی......"

"ہندی نہیں جنرل! اردو کہو۔" اب جبکہ میں صفدر علی ہونے کا اعتراف کر چکا تھا۔ ایسی باتوں پر خاموش رہنا بے سود تھا۔

"ایک ہی بات ہے۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں جناب فرق ہے۔" میں نے ادب سے کہا۔ "جس طرح عربی اور عبرانی مختلف ہیں اس سے زیادہ اردو اور ہندی میں فرق ہے۔"

جنرل نے مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے گھورا پھر سگار کا ایک گہرا کش لے کر بولا۔ "خیر وہ جو بھی زبان تھی، اسے دوبارہ سنا گیا یہ غنیمت ہے کہ ماہرین کے مطابق تم نے اسے فرار کی کوئی راہ سجھانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سندری کون ہے جس کا تم نے واسطہ دیا تھا؟"

یک بیک میرا ذہن ہزاروں میل دور ہمالیہ کی برفانی وادیوں میں پہنچ گیا اور میں نے خفیف سے جذباتی تلاطم کے ساتھ کہا۔ "وہ کوئی کوڈ نہیں تھا جنرل! سندری مشرق کے پہاڑوں کی ایک غیور بیٹی تھی جس کی کوکھ سے سیتا نے جنم لیا تھا۔"

"سیتا کی ماں؟" جنرل نے سگار قالین پر پھینک کر جوتے کی ایڑی سے مسل دیا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"نہ جانے کہاں ہوگی، میں نے آخری بار اسے فلک بوس چوٹیوں سے گھری ہوئی برفپوش وادیوں میں تنہا کھڑے دیکھا تھا جب وہ اپنی بیٹی کو میرے ساتھ رخصت کر رہی تھی۔" ماضی کی یادیں یکے بعد دیگرے میری نگاہوں میں مجسم ہونے لگیں۔

"شاعری مت کرو۔" جنرل کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے قہر بار لہجے میں کہا۔ "جنرل صاحب جو پوچھ رہے ہیں صرف اتنا جواب دو۔"

"یہ یاد رکھو کہ تم یہاں مہمان نہیں ایک خطرناک قیدی بنا کر لائے گئے ہو۔" جنرل نے دوسرے سگار کا کونہ چباتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے اپنا رویہ مناسب نہ رکھا تو آدمی کے انٹروگیشن سیل میں بڑی اذیتیں سہو گے۔"

"مگر میرا جرم جنرل؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ میں مصری قانون کی نگاہوں میں بے قصور ہوں کیونکہ میں نے مصر کی سرحدوں میں کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔"

"اگر سیتا زندہ یا مُردہ پکڑی جاتی تو شاید ایسا ہی ہوتا۔ اس وقت مجھے اپنی حکمتِ عملی پر اعتماد تھا مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور تم ایک مفرور قاتلہ کے شوہر ہو جسے استعمال کر کے ہم اصل ملزمہ تک پہنچ سکتے ہیں۔" جنرل نے الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا لئے بغیر سیتا کے مقابلے میں اپنی کوتاہی تسلیم کر لی۔

"ہمیں اپنے مقدر پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔" میں نے مکمل مایوسی کی گمبھیر اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "کاش میں نے سامنے آنے کی حماقت نہ کی ہوتی۔"

"وہ تم سے بہت زیادہ چالاک ہے۔" جنرل نے نیا سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "اس نے ہماری گاڑیوں پر دانستہ آتش گیر بم پھینکے تاکہ ہم مشتعل ہو کر انتقامی کارروائی کریں اور یوں وہ زخمی یرغمالیوں کو رہا کرنے کی آڑ میں خود بھی نکل جائے اور وہ کامیاب ہو گئی۔"

بات ختم کر کے جنرل نے اپنے ساتھ والوں کو اشارہ کیا اور وہ مجھے ایک گوشے میں پڑی ہوئی میز کی طرف لے گئے۔

اس میز پر نشاناتِ انگشت کے بڑے بڑے مطبوعہ فارم پڑے ہوئے تھے جن کے قریب ہی دوسرے لوازمات بھی موجود تھے۔

انگلیوں کے نشانات لینے سے قبل انہوں نے تولیہ کر اور عدسے کی مدد سے میرے ہاتھوں کا محتاط جائزہ لیا کہ کہیں باریک جھلی وغیرہ نہ چڑھی ہوئی ہو اور پھر مختلف فارموں پر نشانات لینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں اس کام سے فارغ ہو کر پلٹا تو جنرل واپس جا چکا تھا اور ایک فوجی مجھے لے جانے کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔

ان دونوں سے سامنا ہوتے ہی اس فوجی نے انہیں سیلوٹ پیش کیا اور ان کا اشارہ پاتے ہی مجھے لے کر باہر چل دیا۔

باہر مجھے لانے والے کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اپنی ذات کو شبہات سے بالاتر رکھنے کے لئے وہ غیر ضروری طور پر میرے قریب نہیں آنا چاہتا تھا اور یہ اس کی عقل مندی کی ایک واضح نشانی تھی۔

مجھے اس بلاک کے ایک ایسے کمرے میں بند کیا گیا جہاں سونے کے لئے فرش پر صرف ایک بستر اور کمبل موجود تھا۔

نئے محافظ کے پاس چابیاں موجود تھیں اور اس نے یہ مہربانی کی کہ میری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول کر مجھے اس وزن سے نجات دلا دی اور پھر وہ زنجیریں کھینچتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

وہ دروازہ بند کر رہا تھا تو معاً میں نے اسے آواز دے ڈالی۔

وہ منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن اس کے تیور بگڑ گئے۔

"کھانے کے لئے کچھ مل سکے گا؟"

اس نے سختی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "ناشتہ چھ بجے، دوپہر کا کھانا ایک بجے اور رات کا کھانا سات بجے۔ نہ اس سے پہلے اور نہ بعد۔"

مشینی انداز میں اپنی بات مکمل کر کے اس نے سلاخوں والا دروازہ مقفل کر دیا اور کسی طرف چلا گیا۔

اس کمرے میں تیز روشنی والے دو بلب جل رہے تھے میں نے روشنی کم کرنے کے لئے سوئچ تلاش کئے جو نہ مل سکے لہٰذا مجھے مجبوراً اسی حالت میں بستر پر دراز ہونا پڑا جو خاصا آرام دہ ثابت ہوا۔

میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس آرام دہ بستر سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن ذہن مسلسل سیتا اور پہلے نگراں میں الجھا رہا۔

سیتا حصار سے نکل کر بدترین خطرے سے محفوظ ہو گئی تھی مگر اسے خطرے کی زد سے نکلنے کے لئے خاصا وقت درکار تھا۔

سیتا نے جدید آتشیں اسلحے کے استعمال میں جس مہارت کا ثبوت دیا تھا وہ میرے لئے حیران کن تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نے وہ ساری تربیت کہاں اور کیسے حاصل کی ہوگی؟ پھر عربی زبان سے اس کی بھرپور واقفیت بھی تعجب خیز تھی اس کے لب و لہجہ میں بھی بلا کی پختگی پیدا ہو گئی تھی۔

کانوں سے سنی ہوئی سیتا، آنکھوں سے دیکھی ہوئی سیتا سے انتہائی مختلف محسوس ہوئی تھی اور اس نے اس معرکے میں جس ہمت و جرات کا ثبوت دیا تھا اس کے پیشِ نظر مجھے یقین تھا کہ وہ خود کو خطرات سے نکال لے جائے گی۔

لیکن طویل مدت کے بعد ایک دوسرے کے مقابل آ جانے کے بعد سیتا کا مجھ سے یوں بچھڑ جانا مجھے بہت گراں گزر رہا تھا۔ میں اسے کسی بھی طرح اپنی صداقت کا یقین نہ دلا سکا تھا۔

اس سے پیشتر صرف میں مفرور تھا اور قاہرہ کے اس خونریز معرکے کے بعد سیتا بھی مفرور کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

لیبیا سے وہ جیل سے فرار ہوئی اور وہاں قانون کو مطلوب تھی۔

البرٹو کاسٹیلانو جو اسرائیلیوں کے ایما پر سیتا کے پیچھے لگا ہوا تھا، قاہرہ میں ہی اس کے ہاتھوں اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا تھا مگر مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میں سیتا سے کب اور کس طرح مل سکوں گا؟

پھر امید کا دھارا بیوی کے ہاتھوں ستائے ہوئے اس فوجی کی طرف منتقل ہو گیا جو میری آزادی کا واحد سہارا تھا۔

اس سے گفتگو کی تمام تر نوعیت ایسی رہی کہ میں اس کا نام تک نہ دریافت کر سکا اگر مجھ سے جدا ہونے کے بعد اس کا جذبۂ انتقام کمزور نہ ہوتا تو اسے اگلے چوبیس گھنٹوں میں میرے پاس آنا چاہئے تھا۔

خیالات کی اس دھند میں کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

وہ رات کسی خاص واقعے کے بغیر گزر گئی اور صبح سویرے ہی مجھے بے دردی سے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا گیا۔

اسی کمرے کے ایک گوشے میں دوسری ضروریات کا بندوبست تھا ان سے نمٹ کر لوٹا تو ناشتے کی ٹرے فرش پر موجود تھی۔

ابلے ہوئے دو انڈوں، مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ اور گرم گرم عربی قہوے پر مشتمل اس ناشتے نے خاصی تقویت پہنچائی اور میں نے ٹرے صاف کرنے کے بعد اپنے لئے سگریٹ سلگا لی۔

مجھے حیرت تھی کہ ان لوگوں نے میرے پاس ماچس چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ اس کی مدد سے اور کچھ نہ سہی تو میں بستر کو آگ دکھا سکتا تھا لیکن ان لوگوں کا اعتماد بھی بلاسبب نہیں تھا۔ وہ بلاک اور خصوصاً وہ کمرہ ایسے سامان سے تیار کیا گیا تھا کہ آگ اس پر کوئی برا اثر نہیں ڈال سکتی تھی۔

دوپہر کا کھانا لانے والا چہرہ میرا شناسا تھا مگر میں نے اسے دیکھ کر کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔

وہ دروازہ کھول کر کھانے کی ٹرے اندر لایا تو ٹرے رکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے ایک چابی فرش پر گرا دی۔

"یہ دروازے کی چابی ہے۔" اس کی زیرِلب آواز بہت دھیمی مگر واضح تھی۔ "آج رات دو بجے دروازہ کھول کر راہداری میں داہنی جانب جاؤ گے تو آخری کوڑے دان میں فوجی وردی کا تھیلا ملے گا، وردی پہن کر جنوبی باڑ تک پہنچ جانا، میں وہیں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"اور محافظ؟"

"دو بجے میدان صاف ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ برتن واپس لینے آیا تو ہم نے آپس میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا البتہ تفہیمی نگاہوں کا تبادلہ ضرور ہوا۔

دروازے کی چابی کو میں نے اسی کمرے میں ہو کمٹ کی ایک دراڑ میں اس طرح پھنسا دیا کہ وہ بآسانی نظر نہیں آ سکتی تھی اور پھر آنے والی رات کے بارے میں اپنی حکمتِ عملی پر غور کرنے لگا۔

اس بے نام دوست نے مجھے جو ترکیب بتائی وہ الفاظ کی حد تک بہت آسان اور قابلِ عمل تھی لیکن اس میں بے شمار عملی خطرات

پوشیدہ تھے۔

میں ایک رات اس قید خانے میں گزار کر اس بات سے تو واقف ہو گیا تھا کہ میرا کمرہ رات بھر روشن رہتا تھا لیکن بیرونی برآمدہ یا راہداری تاریک رہتی تھی مگر آدھی رات گئے دروازے کا قفل کھول کر میرا باہر نکلنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

باہر اندھیرے میں گزرتا ہوا کوئی بھی فوجی لاعلمی میں مجھے دیکھ سکتا تھا پھر سادہ لباس میں باہر نکلنا بھی کسی خونخوار فوجی سے مڈبھیڑ کا سبب بن سکتا تھا۔

کپڑے دان سے فوجی وردی حاصل کرنے کے بعد اپنا لباس تبدیل کرنا اور ساتھ لے جانا بھی ضروری تھا تاکہ بعد میں کسی کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ میں اپنا لباس تبدیل کر کے وہاں سے فرار ہوا تھا۔

مجھے امید تھی کہ اگر میں ان مراحل سے بخیر و خوبی گزر کر فوجی وردی پہننے میں کامیاب ہو جاتا تو میرے لئے باڑ تک پہنچنا مشکل ثابت نہ ہوتا۔ میں راستے میں ٹکرانے والے کسی بھی فوجی کو باآسانی جل دے سکتا تھا۔

جنوبی باڑ کا خیال آتے ہی میں سلاخوں دار دروازے کے قریب جا بیٹھا مجھے ستاروں کے بارے میں اتنا علم نہیں تھا کہ رات کے بیچ ان کی مدد سے جنوب کا تعین کر سکتا اور نہ ہی میرے پاس قطب نما کے قسم کی کوئی چیز موجود تھی لہٰذا میں نے باہر کھلے میدان میں بننے والے سایوں کا گہرا مشاہدہ شروع کر دیا۔

وہ زوال کا وقت تھا لہٰذا میں سایوں کے بڑھنے کی سمت سے اپنا مسئلہ حل کرنے میں باآسانی کامیاب ہو گیا۔ اس اعتبار سے باڑ کی جنوبی سمت میرے بلاک کے عقب میں واقع تھی۔

جیسے تیسے شام آئی پھر رات بھی آ گئی۔

اعصابی تناؤ کے باعث میں اس رات کھانا بھی نہ کھا سکا میری خواہش رہی تھی کہ مجھے مقررہ وقت تک بالکل تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو مجتمع رکھ سکوں۔

رات کے نو بجے میں کمبل اوڑھ کر بستر پر دراز ہو گیا میں نے دانستہ کمبل سر تک اوڑھ کر اپنی پشت دروازے کی طرف کر لی۔

اس طرح میں رات کی کارروائی کے لئے میدان ہموار کر رہا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ کمرے سے نکلنے سے قبل بستر خالی چھوڑنے کے بجائے میں کمبل کے نیچے مختلف چیزیں اس طرح چھپا دوں گا کہ..... بادی النظر میں وہاں کوئی آدمی پیر سے سر تک کمبل اوڑھے سوتا نظر آئے۔

ساڑھے دس بجے کے قریب میں نے کروٹ بدل کر کمبل میں خفیف سی جھری پیدا کی تو مجھے اپنے کمرے کے باہر راہداری مکمل تاریک نظر آئی۔

گیارہ بجے تک مجھے قریب و جوار میں کچی زمین پر فوجی جوتوں کی دھمک کی آوازیں سنائی دیتی رہیں جو رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگیں۔ اور بارہ بجے تک فضا پر ایک ایسا مکمل سکوت طاری ہو چکا تھا کہ میں اپنے دل کی تیز دھڑکنیں واضح طور پر سن سکتا تھا۔ آس پاس کہیں بھی کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔

ٹھیک پونے دو بجے میں نے آہستگی سے کمبل اتار دیا۔

آہنی سلاخوں سے گزر کر باہر پڑنے والی روشنی کے سوا سامنے گہری تاریکی کا راج نظر آ رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے ملحقہ پیشاب خانے کی چوکھٹ سے دروازے کی چابی حاصل کی پھر بستر کو الٹ کر کمبل کی سطح میں حسب منشا ابھار پیدا کر دیا۔ اس سے نمٹ کر میں جمائی لیتا ہوا چہل قدمی کے انداز میں دروازے تک پہنچ گیا۔

قرب و جوار سے کوئی بھی خفیف سی آواز نہ سنائی دی۔ ہر سُو بھیانک سناٹا طاری تھا۔

میرا ہاتھ بے اختیار جیب میں رینگ گیا۔

چشم زدن میں میں تالا کھول کر اس کمرے سے باہر آ چکا تھا باہر آنے کے بعد میں نے کنڈے میں دوبارہ تالا ڈال دیا۔ اور تیزی سے داہنی طرف اندھیرے میں رینگ گیا تاکہ باہر کا ردِعمل دیکھ سکوں۔

میں نے اپنے چرمی جوتے دیدہ دانستہ اندر چھوڑ دیئے تھے کیونکہ ان سے اندھیرے میں کہیں بھی آہٹ پیدا ہو سکتی تھی البتہ پیروں پر موزے موجود تھے۔

میں محض چند ثانیوں کے لئے وہاں دیوار کے سہارے رکا اور پھر پنجوں کے بل راہداری میں داہنی طرف چل دیا۔

راہداری میں توقع کے برعکس تاریکی نہیں تھی۔ وہاں کافی فاصلے سے مدھم روشنی والے بلب جل رہے تھے۔

میری کوشش تھی کہ راہداری جلد از جلد طے کر کے کسی تاریک گوشے میں پہنچ جاؤں جہاں کوئی مجھے نہ دیکھ سکے۔

میرے بائیں طرف دیوار کے ساتھ چند ڈسٹ بن رکھے ہوئے تھے اور آخری ڈسٹ بن کم از کم پچاس فٹ دور نظر آ رہا تھا۔

میں بلا کسی رکاوٹ کے وہاں تک پہنچ گیا۔ اس وقت تک میرے ہمدرد کی کہی ہوئی بات لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوئی تھی۔

مگر مجھے حیرت تھی کہ مجھے خطرناک مجرم قرار دینے کے باوجود فوجی افسران نے رات کے وقت میری کوٹھری پر کسی پہرے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

یہ درست تھا کہ میری انگلیوں کے نشانات کی تصدیق ہونے تک وہ مجھے مفرور علی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے مگر جنرل کے قول کے مطابق سیتا کے دلیرانہ فرار کے بعد میری ذات یک بیک اہمیت اختیار کر گئی تھی اور ایک اہم قیدی کو یوں اس کے حال پر چھوڑ دینا غیر فطری نظر آ رہا تھا۔

ڈسٹ بن کا آہنی ڈھکنا میں نے بہت احتیاط سے ہٹایا تو مجھے

اندر پولی تھین کا ایک تھیلا نظر آیا جسے میں نے بلا تامل باہر نکال لیا۔

تھیلا خاصا بھاری تھا اور اس کے علاوہ ڈسٹ بن میں کوئی ایسی شے موجود نہیں تھی جو کسی مغالطے کا باعث بنتی لہٰذا میں نے فوراً ہی آہنی ڈھکنا واپس رکھا اور تھیلا بغل میں دبا کر چند قدم پیچھے ایک تاریک کاریڈور میں گھس گیا۔

اس دوران میں میرا ذہن سمتوں کے بارے میں بہت محتاط تھا کیونکہ نجات کے آخری مرحلے کی کامیابی کا انحصار اسی ایک پہلو پر تھا۔

تاریک راہداری میں چند قدم بڑھنے کے بعد مجھے اچانک رکنا پڑا کیونکہ میرے کانوں میں کسی جاندار کے سانس لینے کی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔

پہلے میں نے آگے بڑھ کر احتیاط سے صورتحال کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا مگر احتیاط کے پیش نظر اسے فوراً ہی ترک کر دیا۔

تاریک کاریڈور سے نیم روشن راہداری میں آتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا اور واپس اپنے کمرے کی طرف چل دیا کیونکہ اس بلاک سے نکاسی کا راستہ اسی طرف واقع تھا اور میں ہر قیمت پر فوراً اس بلاک سے نکل جانا چاہتا تھا

راستے میں تھیلے کو ٹٹول کر میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ اس میں اگر وردی نہیں تو وردی نما کوئی لباس ہی موجود تھا مگر مضحکہ خیز بات یہ تھی کردہ وردی پہن لینے کے باوجود میرے جوتوں سے محروم پیر ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن سکتے تھے۔

میں نے راستے میں ہی فیصلہ کر لیا کہ تحفظ کی خاطر مجھے ایک بار پھر اپنے کمرے میں داخل ہونے کا خطرہ مول لینا پڑے گا اور چند ثانیوں بعد میں خود کو ایک مرتبہ پھر اسی جگہ مقفل کر چکا تھا۔

میں نے تنگ پیشاب خانے میں داخل ہو کر پولی تھین کی تھیلی پھاڑ دی اور مصری فوج کی ایک وردی میرے ہاتھ میں آ گئی۔

وہ وردی میرے جسم پر قدرے تنگ تھی مگر بے تکی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے جوتے پہننے کے بعد اپنی تمام اشیا فوجی وردی کی جیبوں میں منتقل کیں اور اپنا لباس تھیلی میں ٹھونس دیا۔

میں نے غسل خانے یا پیشاب خانے سے جھانک کر باہر کا جائزہ لینا چاہا مگر یہ ممکن نہ ہو سکا اور میں تن بہ تقدیر باہر روشنی میں آ گیا۔

اس مرتبہ سلاخوں دار دروازہ میں نے دوبارہ مقفل نہیں کیا، بلکہ پلٹ کر تیزی سے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس بلاک کے عقب میں کافی دور تک تاریک میدان پھیلا ہوا تھا وہ چونکہ زمانہ امن کا فوجی کیمپ تھا لہٰذا وہاں زمین سے بلند نگراں برجیاں اور سرچ لائٹس بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔

میں رکے بغیر اپنے اندازے کی بنا پر جنوبی باڑ کی طرف بڑھتا چلا گیا میری آنکھیں اس اثنا میں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں لہٰذا مجھے اپنا راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

چند منٹ بعد تاروں کی چھاؤں میں مجھے خاردار تاروں کی وہ باڑ بھی نظر آ گئی جو مشرق اور مغرب کی سمتوں میں اندھیرے میں مدغم ہو رہی تھی۔

"باڑ پھلانگ آؤ۔" چند گز دُور سے مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی اور میں لحظہ بھر کے لئے چونک پڑا۔

پھر خیال آیا کہ وہ جو بھی تھا میرے مفاد کی بات کہہ رہا تھا لہٰذا میرے دوستوں میں سے ہی ہو سکتا تھا لہٰذا ابتدائی کشمکش و پیچ کے بعد میں نے آنکھیں بند کر کے وہ باڑ عبور کر ڈالی۔

چند ہی ثانیوں میں تاریکی سے ایک انسانی ہیولا میرے سامنے آ گیا "میرے پیچھے چلے آؤ، نیچے گاڑی موجود ہے۔"

اس مرتبہ میں نے اس کی آواز پہچان لی اپنی بیوی کے ہاتھوں ستایا ہوا وہی مظلوم شخص تھا جو اس فرار میں میرا معاون تھا۔

اس نے اپنے چہرے پر ایک نقاب منڈھی ہوئی تھی جس کے باعث اس کی آواز میں تبدیلی آ گئی تھی۔

"مجھے اب تک تمہارا نام معلوم نہیں ہو سکا۔" میں نے اس کی رہنمائی میں ریتلی ڈھلوان عبور کرتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم کر چکا ہوں۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا جس میں مجھے طنز کی بو بھی محسوس ہوئی۔

"کیا؟" میں نے مختصر سا سوال کر ڈالا۔

"تم سیتا کے شوہر ہونے کے دعوے دار تھے جبکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم اپنی بیوی کے مفرور قاتل ہو۔"

"اور شاید میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے جو کچھ دعوے کئے ہیں وہ چرس کے نشے میں کئے تھے جبکہ حقیقت میں میرا سیتا اور اس کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو خیر میں نے بھی اندازہ کر لیا تھا مگر اخبارات اسی قسم کے سنسنی خیز پہلوؤں کو ابھارتے ہیں۔"

"کیا اندازہ تھا تمہارا؟"

"تم نڈر بھی ہو اور دلیر بھی مگر اتنی بڑی ہستی نہیں ہو کہ سیتا جیسی عورت تمہیں اپنا شوہر بنا سکے۔"

میں دل ہی دل میں اس کی خوش فہمی پر مسکرا کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد یہ بات واضح ہوئی کہ اس نے فرار کے لئے باڑ کی جنوبی سمت کا انتخاب کیوں کیا تھا؟

اس طرف باڑ کے اختتام پر تقریباً فوراً ہی ریتلی ڈھلان شروع ہو گئی تھی جس کے بعد چند ٹیلے عبور کرنے پڑے اور ہم کھلے میدان میں نکل آئے جہاں ایک پرانی وضع کی موٹر کار موجود تھی۔

"فکر نہ کرو، یہ میری ہی ہے۔" وہ مجھے چونکتے ہوئے دیکھ کر

جلدی سے بولا "اس معاملے میں تم سے زیادہ مجھے رازداری کی فکر ستی ۔"

"تم اس کار کے اخراجات کہاں سے پورے کرتے ہو؟" میں نے اس کے ہمراہ کار میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"دراصل یہ میرے بڑے بھائی کی ہے" اس نے جواب دیا "جب وہ کاروباری دوروں پر قاہرہ سے باہر جاتا ہے تو کار میرے گھر چھوڑ جاتا ہے ۔"

گو کہ وہ کار پرانی ستی مگر اس کے کل پرزے اچھی حالت میں تھے۔ سیلف لگاتے ہی انجن فوراً بیدار ہو گیا۔ اور اس نے ہیڈ لائٹس آن کئے بغیر کار آگے بڑھا دی۔

"اپنا نام نہیں بتایا تم نے ابھی تک ۔"

"میرا نام توفیق ہے" وہ ہنس کر بولا "تھوڑی دیر پہلے تک تو میں تمہیں صفدر علی ہی سمجھتا رہا تھا اب اپنا اصلی نام بھی بتا دو ۔"

"مصطفےٰ المرزدق ۔" میں نے کہا۔

"تو کیا تم واقعی عرب ہو؟"

"شبہ ہے تمہیں ؟"

"نن ۔۔ نہیں ۔" وہ بوکھلا گیا "دراصل صفدر علی ہونے کی وجہ سے تمہیں ہندی ہونا چاہئے تھا۔"

"جو میں نہیں ہوں ۔" میں قہقہہ مار کر موضوع کو بدلنے کی نیت سے جلدی سے بولا "اب مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"اپنی بیوی کو دکھا کر تمہیں کہیں چھوڑ دوں گا ۔"

"کل تمہاری چھٹی ہے ؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اوہ ۔۔ ہاں ۔" وہ پُر خیال لہجے میں بولا "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کل ہی اپنا کام نمٹا لو گے ۔"

"پھر تو کل ہی سہی ۔"

"نہیں ۔" وہ جلدی سے بولا "میں چاہتا ہوں کہ جس وقت تم اپنا کام کرو میں کیمپ میں اپنی ڈیوٹی پر ہوں ۔"

"پھر مجھے پناہ گاہ بتاؤ ۔"

"تمہیں خود ہی کچھ کرنا ہوگا ۔" وہ بڑبڑایا "میری بیوی تو آج رات شاید ہی گھر آئے مگر اس کا باپ اور ماں ہر وقت وہیں رہتی ہیں رات گئے اس کا بھائی بھی واپس لوٹ آتا ہے ۔"

"میں بندوبست کر لوں گا ۔" میں نے کہا "تمہاری بیوی کا نام کیا ہے؟"

"خالدہ ۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "وہ سمجھتی ہے کہ اس کی عیاشی کا اڈا میرے علم میں نہیں ہے مگر میں دو بار اس مقام تک اس کا پیچھا کر چکا ہوں ، وہ عباسیہ کے علاقے میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں میرے اعتماد کا مقتل سجاتی ہے ۔"

اس کی زبان سے خالدہ کا نام سنتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور مجھے بے اختیار وہ عورت یاد آ گئی جو مجھے بہلا پھسلا کر جسم فروشی کی نیت سے اپنے فلیٹ میں لے گئی ستی اور وہیں مجھے اس کی زبانی نوجوان کے قتل کی خبر ملی ستی ۔

اس عورت نے اپنا نام خالدہ ہی بتایا تھا اور وہ پیسے کے ساتھ ہی عیاشی کی شوقین بھی معلوم ہوتی ستی کیونکہ جب میں نے اسے چھوئے بغیر چلتے وقت کچھ رقم وقت کی قیمت کے طور پر دینی چاہی تو اس نے حقارت اور غصے سے میری پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اسے یہ جان کر دلی اذیت ہوئی ستی کہ روئے زمین پر ایک شخص ایسا بھی تھا جو نہ صرف حسن کی دعوت کو بھی ٹھکرا سکتا تھا۔

میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش ابھری کہ کاش وہ خالدہ توفیق کی بیوی نہ ہو کیونکہ ایک طرح سے میں اس کا احسان مند تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان
کے بقیہ واقعات
پانچویں حصے میں
ملاحظہ فرمائیں




جاسوسی ڈائجسٹ کا مشہور سلسلہ
مفرور
پانچواں حصہ

مفرور

اقلیم علیم

مجھے قاہرہ میں قتل کی ایک لرزہ خیز واردات کی خبر اسی کی زبانی ملی تھی اور پھر میں نے اخبارات میں چھپی ہوئی تصاویر وغیرہ دیکھیں تو مجھے قاہرہ میں سیتا کی موجودگی کا پہلا سراغ ملا کیونکہ مرنے والا اس کا دشمن البرولز کاسٹیلانو تھا اور اخباری اطلاعات کے مطابق اس کی قاتلہ ایک عورت تھی۔

مگر میں توفیق سے بھی وعدہ کر چکا تھا کہ فرار میں مدد کے عوض میں اس کی بے وفا بیوی کو ہلاک کر دوں گا اور اگر وہی خالدہ توفیق کی بیوی تھی تو اس کی اپنے شوہر سے بے وفائی مسلّم تھی اور وہ قتل کی سزاوار تھی ——

"تو کیا تم مجھے اسی فلیٹ پہ لے جا رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا "فلیٹ کے بند دروازوں کے پیچھے تم کچھ نہ دیکھ سکو گے۔"

"مگر ابھی تو تم نے کہا تھا کہ مجھے اپنی بیوی دکھاؤ گے۔"

"میں اس کی تین تصویریں لے آیا ہوں۔" وہ یک بیک پھر جذباتی ہو گیا "پہلے میں ہر وقت اس کی ایک تصویر اپنے پرس میں رکھا کرتا تھا مجھے شبہ تک نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر سکتی ہے مگر پہلا ناقابلِ تردید ثبوت میسّر آنے کے بعد میں نے اس کی تصویر کے پُرزے گندے نالے میں بہا دیئے۔"

اب کار کچے میدان کو عبور کر کے ایک تاریک سڑک پر آ چکی تھی ——

"تمہارے ہاتھ میں بنڈل کیسا تھا؟" کچھ دیر کے سکوت کے بعد توفیق نے پژمردہ لہجے میں سوال کیا۔

"اتارے ہوئے کپڑے ہیں۔" میں نے کہا "وہیں چھوڑ آتا تو لوگ سمجھ لیتے کہ میں کسی اور حلیے میں فرار ہوا ہوں —— اب وہ خاصا وقت لباس کے سہارے مفرور کی تلاش میں برباد کریں گے۔"

"بہت چالاک ہو۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"مجھے شہر کے وسط میں کہیں اتار دینا۔" میں نے چند ثانیوں بعد کہا ——

"ہوں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا جیسے ذہنی طور پر کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا ہو۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"زندگی کے اہم فیصلے بغیر سوچے ہوئے نہیں کیئے جاتے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہو گی اگر تم اپنا فیصلہ بدل سکو۔" میں نے اسے بلا معاوضہ اپنے دلی جذبات سے آگاہ کر دیا۔

"فیصلہ تو اٹل ہے۔" اس کا لہجہ الفاظ سے مطابقت رکھتا تھا۔ "اگر اس میں ذرا بھی گنجائش ہوتی تو میں تمہارے ساتھ یہ منصوبہ نہ بناتا۔"

"تو اب کیا سوچ رہے ہو؟"

"میرا اپنا تحفظ بھی اہم ہے۔" وہ بولا۔

"اس سے زیادہ کیا تحفظ چاہتے ہو کہ جس وقت وہ ماری جائے گی تم فوجی کیمپ میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہو گے۔"

"میری ذات پھر بھی شبہات کی زد میں آئے گی۔" اس نے کہا۔ "پرانے کپڑوں کا بنڈل پچھلے پائیدان میں ڈال دو، میں انہیں جلا کر تلف کر دوں گا۔"

"میرے کپڑے تمہارے ذہن پر کیوں سوار ہو گئے؟" میں نے وہ بنڈل عقبی پائیدان کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

"اگر تم یہ بنڈل جائے واردات پر بھول گئے تو تھوڑی سی تحقیق کے بعد یہ معلوم ہو جائے گا کہ قاتل فوجی کیمپ کا مفرور قیدی ہے اور مقتولہ کا شوہر اسی کیمپ میں متعین ہے۔ تم فوج میں بازپرس کے طریقوں سے لاعلم ہو، اگر تفتیش کا رخ ایک بار بھی میری ذات کی طرف ہو گیا تو میں نہ بچ سکوں گا۔"

میں ہنس پڑا۔ "اصل مہم کے آغاز سے قبل میں یہ بنڈل ہی ٹھکانے لگا دوں گا۔ ویسے یہ اچھی بات ہے کہ اب میرا اور تمہارا تحفظ ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔"

ہم شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ شہر کے مکین دن بھر کے ہنگاموں سے تھک کر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

کار چلاتے ہوئے توفیق نے اپنی جیب سے اپنی بیوی کی تینوں تصاویر نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ "وہ عباسیہ کے علاقے میں تیرہویں عمارت کے فلیٹ نمبر سات میں اکیلی ہی رہتی ہے۔" تنہائی کے باوجود اس کا لہجہ رازدارانہ تھا۔ "اور اس کی بیشتر راتیں وہیں بسر ہوتی ہیں۔"

میں نے پہلی تصویر پر نگاہ ڈالی اور اسٹریٹ لائٹس کے دھیمے انعکاس میں اس نسوانی چہرے کے نقوش دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

میرے اندیشوں کے عین مطابق وہ وہی خالدہ تھی۔

اس وقت مجھے دنیا بہت مختصر اور حقیر سی معلوم ہونے لگی جہاں ہر فرد ایک دوسرے کا شناسا تھا۔

قاہرہ جیسے انسانوں کے شہر میں خالدہ، میں اور توفیق اس طرح یکجا ہو گئے تھے جیسے ایک مثلث کے تین ناگزیر نکتے ہوں۔

میں نے وہ تصاویر فوراً ہی اپنی فوجی وردی کی جیب میں رکھ لیں۔

"پہچاننے میں غلطی تو نہیں کرو گے؟" توفیق نے پوچھا۔

"ابھی کافی وقت ہے، فرصت میں تصویروں کو غور سے دیکھوں گا۔"

"میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ صورتحال کو الجھانے کے لئے جو راستہ چاہو، اختیار کرو، مجھے اب عزت کی کوئی پروا نہیں۔ خالدہ نے مجھے اپنے دوستوں میں سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے مجھے خوشی ہو گی اگر اس کے قتل کی خبر کسی گمنام جنسی جنونی کے حوالے سے منظرِ عام پر آئے۔"

"یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "طریقۂ کار مجھ پر چھوڑ دو، تم پر آنچ بھی نہ آنے پائے گی۔"

"میں لوگوں کو یہ جتانا چاہتا ہوں کہ خالدہ اسی سانپ سے ڈسی گئی جسے اس نے میری محبت کا لہو پلا کر پروان چڑھایا تھا۔ اس طرح اس کی موت اپنی جیسی دوسری عورتوں کے لیے عبرت آموز بن سکے گی۔" اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"میرے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں میرے دوست!" میں نے نرمی سے کہا۔

"کاش..... کاش تم واقعی صفدر علی ہوتے۔" وہ حسرت اور اشتعال کے عالم میں آہستہ آہستہ بڑبڑایا۔

میں خاموش رہا، البتہ اس کے الفاظ سن کر مجھے تھوڑا سا دکھ ہوا کہ غائبانہ طور پر بعض لوگ مجھے درندہ بھی سمجھتے تھے۔

مگر یہ ان کا قصور نہیں تھا جو شخص ایک مرتبہ قانون کا باغی قرار دے دیا جائے، اس کے نام پر لوگ ہر اخلاقی تہمت بآسانی سجا دیتے ہیں اور میرا نام اپنے ماضی کی بنا پر اس کام کے لیے نہایت موزوں تھا۔

پھر میرا ذہن اپنے سامان کی طرف منتقل ہو گیا جو مطعم الدولی میں میرے کمرے میں مقفل پڑا تھا۔

زہریلے تیر برسانے والی ایک زیرِ استعمال شیشی تو بے شک میرے پاس موجود تھی مگر چند ذاتی کپڑوں کے ساتھ ہی دوسری شیشی ہوٹل میں تھی جو میں واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"تم میرا ایک کام کر سکو گے؟" کچھ دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد میں نے توفیق ہی کو ٹٹولنا مناسب سمجھا۔

"اگر بس میں ہوا۔"

"فوجیوں کا قیدی بننے سے قبل میں مطعم الدولی نامی ہوٹل میں مقیم تھا۔ میرے چند جوڑے اور ایک آدھ اہم چیز وہیں پڑی ہے۔"

"تم نے بازپرس کے دوران اس ہوٹل کی نشان دہی تو نہیں کی تھی؟" اس نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "سچ پوچھو تو مجھ سے کسی بازپرس کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

"اور شاید تمہاری کوئی تازہ تصویر بھی نہیں لی گئی ہو گی۔"

"مجھے کوئی اہمیت دیتے تو یہ خیال بھی ضرور آتا۔"

"یوں تو میں بھی تمہارا دوست بن کر حساب بے باق کرنے کے بعد سامان لا سکتا ہوں مگر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ ان چیزوں کو بھول ہی جانا تمہارے حق میں بہتر ثابت ہو گا۔"

"اس وردی سے بھی تو جان چھڑانا ہے۔" اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر میں نے بات بدلنا ہی مناسب سمجھا۔

"اسے رہنے دو۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "اس وردی میں تم زیادہ محفوظ رہو گے، یہاں فوجیوں کی کافی عزت کی جاتی ہے۔"

"صرف وردی کیا کر سکے گی، میرے پاس اپنی کوئی شناخت بھی تو نہیں ہے۔ پاسپورٹ وغیرہ بھی ہوٹل ہی میں ہے۔"

"شناخت کی ضرورت تو اس وقت پیش آئے گی جب تم وردی سے کوئی رعایت حاصل کرنے کی کوشش کرو گے ورنہ کوئی تمہاری طرف بری نگاہ ڈالنے کی ہمت بھی نہ کر سکے گا۔" اس نے کہا۔

"چلو پھر یہ نقصان بھی سہی۔"

"میرے ذہن میں تمہاری طرف سے ایک بات چبھ رہی ہے۔"

"کہہ ڈالو۔"

"تم عادی چرسی ہو مگر تم نے ابھی تک اس خواہش کا اظہار نہیں کیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکو گے۔" میں نے کہا۔ "اسی لیے تو میں اپنے سامان کی طرف سے فکرمند تھا۔"

"تو کیا اس سامان میں چرس بھی شامل ہے؟" میری نئی قلابازی اس کے لیے شدید حیرت کا باعث ثابت ہوئی۔

"دو جوڑے تو میں کہیں سے بھی حاصل کر سکتا ہوں۔" میں نے قہقہہ مار کر کہا۔

"میں تمہارے لیے چرس لایا تھا۔" اس نے بایاں ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ نشے کا عادی شخص نشے کے بغیر ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ تم ابھی اس منزل سے دور ہو۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے تھیلی لینے میں مصنوعی بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"ابھی نہیں۔" اس نے سختی سے کہا۔ "میری گاڑی میں بو رچ جائے گی۔ اترنے کے بعد تم کسی جگہ اپنا شوق پورا کر لینا۔"

"اس سے تو بہتر تھا کہ یہ تھیلی اترتے وقت ہی میرے ہاتھ میں دیتے۔"

"بس اب تمہیں اترنا ہی ہے۔ ہم اس وقت شہر کے وسطی علاقے میں سے گزر رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کار کی رفتار کم کر دی۔

چند ثانیوں بعد کار ویران فٹ پاتھ کے کنارے روک دی گئی۔ میں توفیق سے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر نیچے اتر گیا۔

"رہائشی علاقہ قریب ہی ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "تم صبح ہونے سے قبل اپنے چند گھنٹے کسی بھی پارک میں سستا کر گزار سکتے ہو۔"

"میں اپنا انتظام خود کر لوں گا۔" میں نے خوش دلی سے کہا اور وہ تیز رفتاری سے اپنی کار آگے بڑھا لے گیا۔

میرے لیے صبح تک کے چند گھنٹے واقعی اہم تھے۔ اگر میں یہ مدت بخوبی گزار لیتا تو صبح میرا ارادہ عبدالکمال سے ملنے کا تھا جو مجھے کوئی بہتر پناہ گاہ مہیا کر سکتا تھا مگر خرابی یہ تھی کہ طلوع ہونے والا دن ہفتہ وار تعطیل کا دن تھا۔

مگر مجھے پھر بھی عبدالکمال کے بارے میں تھوڑی سی امید تھی۔ اس کا چوبی کیبن جس قسم کے بازار میں واقع تھا وہاں تعطیل وغیرہ کے بارے میں لگے بندھے اصولوں کا ہونا عام طور پر محال ثابت ہوتا پھر بعض مقامات پر تعطیل والے دن بازار محض اس لیے کھولے جاتے ہیں کہ خریدار فرصت میں اپنی جیبیں ہلکی کر سکیں اور اسی امید کے سہارے میں صبح کے وقت ادھر جانے کے لیے تیار تھا۔

وہ علاقہ گو میرے لیے اجنبی تھا مگر میں اجنبی علاقوں اور لوگوں میں اپنی راہ تلاش کرنے میں خاصی مہارت حاصل کر چکا تھا لہٰذا میرے لیے کھیل کے اس میدان تک پہنچنا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا جہاں گراؤنڈ کے چاروں طرف درختوں کے سائے میں تماشائیوں کے لیے چوبی بنچیں نصب تھیں۔

کسی مناسب مقام کی تلاش میں چکر لگاتے ہوئے مجھے ان بنچوں پر دو افراد سوتے ہوئے بھی ملے، جن میں سے ایک کی ہیئت ہی اسے پیشہ ور گداگر ظاہر کر رہی تھی اور دوسرا بھی کوئی مفلوک الحال نظر آ رہا تھا۔

میں نے بھی ایک نسبتاً تاریک گوشہ سنبھال لیا اور بنچ پر دراز ہو گیا۔

سر پر تاروں بھرا آسمان، چاروں طرف کھلا میدان اور گلابی موسم کی بھیگی بھیگی ہلکی ہوائیں اس وقت میرے لیے نعمت سے کم نہیں تھیں۔ چند گھنٹے قبل اس ماحول کا تصور بھی مجھے محال نظر آ رہا تھا۔ بلکہ گزرتا ہوا ہر لمحہ مجھے پھانسی سے قریب تر لے جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر اب میں آزاد تھا۔

میرے پے در پے مصائب اور پھر سرخرو رہنے اس بات کی غماز تھی کہ قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ میں بارہا موت کے دہانے سے یوں بچ نکلا تھا کہ نجات کے بعد وہ سارے مراحل ایک ناقابلِ یقین خواب کی طرح نظر آتے تھے۔

جس وقت توفیق کی نگرانی میں مجھے بند آہنی الماری میں قید کیا گیا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چڑچڑا، کم گو اور مردم بیزار نظر آنے والا وہ فوجی میرے ساتھ اس قدر تعاون کر سکتا ہے مگر میں محض اسے چھیڑنے کے لیے اسے کریدتا رہا اور جوں ہی میرا ہاتھ اس کے

زخم پر پڑا نہ صرف اس کی بیزاری کی وجہ سامنے آگئی بلکہ میرے اور اس کے درمیان حائل سارے فاصلے ختم ہوگئے۔

میں نے اپنے ذہن میں بار بار یہ تجزیہ کرنا چاہا کہ میں کس کا زیادہ احسان مند تھا؟ خالدہ کا یا توفیق کا؟

ایک نے نادانستگی میں میری مدد کی اور دوسرے نے دیدہ دانستہ ایک بھیانک خطرہ مول لے کر مجھے قید سے نجات دلائی تھی۔

میرا فیصلہ ہر بار توفیق ہی کے حق میں رہا۔ خالدہ کی مدد نہ صرف غیر ارادی تھی بلکہ وہ شوہر سے بے وفائی کے ہولناک جرم کا ارتکاب کر رہی تھی جس کا میں چشم دید گواہ تھا۔

صفدر علی بذات خود کوئی پارسا نہیں تھا، اس کی زندگی کا ہر لمحہ ان کہی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ بیوی اور شوہر کے رشتے کے تقدس پر ایمان رکھتا تھا۔

یہ اس رشتے پر یقین اور بیوی کی محبت ہی تھی جو مجھے کہیں بھی ایک پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اگر میرے دل میں یہ جذبہ جنون نہ ہوتا تو سیتا کے بچھڑنے کے بعد میں کہیں بھی اپنی ایک چھوٹی سی نئی دنیا بسا کر پُرسکون زندگی گزار سکتا تھا مگر ایک بار محبت کے بندھن میں بندھ جانے کے بعد ہم دونوں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے لیے جی رہے تھے بلکہ ایک دوسرے کو پالینے کے لیے دیوانہ وار اس قوت سے برسر پیکار تھے جو ہمارے درمیان حائل تھی۔

اور میرا آخری فیصلہ یہ تھا کہ توفیق سے کئے ہوئے وعدے کی پاسداری ہر اعتبار سے میرے لئے ناگزیر تھی۔

مجھے رہائی مل چکی تھی، میں چاہتا تو خالدہ کی صورت دیکھے بغیر کہیں بھی روپوش ہوجاتا اور توفیق میرا کچھ بھی نہ بگاڑ پاتا۔ مگر میرا ضمیر مجھے ہر وقت ملامت کرتا رہتا کہ میں نے ایک دکھی انسان کی کمزوریوں کو لفظی بہلاووں میں الجھا کر اپنا راستہ سیدھا کیا۔ جو میرے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا۔

خیالات کی رو توفیق کی طرف بہکنے کے ساتھ ہی مجھے افسوس ہوا کہ میں نے سارے راستے اس سے یہ دریافت نہیں کیا کہ میرے کیمپ سے فرار کے وقت وہاں جو ویرانی چھائی ہوئی تھی وہ کیمپ کے معمولات میں شامل تھی یا اس میں توفیق کی در پردہ کوششوں کا کوئی دخل تھا۔

اس چوبی بینچ پر ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے میں نے مریم کے بارے میں سوچا جو فلسطینی لڑکی تھی مگر عیسائی ہونے کے ناطے اس کے خیالات بالکل ہی باغیانہ تھے۔ وہ بن غازی سے قاہرہ تک میری ہم سفر تھی اور دوستوں کے لئے خاصی فراخدل معلوم ہوتی تھی اس نے مجھے بھی اپنا فون نمبر دیا تھا جس پر میں اس سے کم از کم ایک رنگین شام کا پروگرام طے کرسکتا تھا۔ مگر اس کا نمبر دوسری چیزوں کے ساتھ میرے ہوٹل کے کمرے میں ہی رہ گیا تھا جس کی بازیابی کی اب کوئی امید نہیں تھی۔

ان ہی خیالات میں صبح کا اجالا مشرقی افق پر نمودار ہونے لگا۔ جتنی دیر میں اندھیرے میں بینچ پر پڑا رہا، میں نے شدید خواہش کے باوجود سگریٹ سلگانے کی حماقت نہیں کی کیونکہ اس طرح دور سے کوئی بھی نادیدہ شخص میری طرف متوجہ ہوسکتا تھا مگر اجالا بڑھنے کے ساتھ ہی میں اپنی اس خواہش کو مزید ضبط نہ کرسکا۔

بینچ چھوڑ کر میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور چہل قدمی کے انداز میں نکاسی کے راستے کی طرف چل دیا۔

سست روی کے ساتھ میں نے اس علاقے میں اتنا وقت ضائع کیا کہ راہوار مشرق کی ابتدائی کرنیں زمین پر پڑنے لگیں پھر میری چال میں تیزی آگئی۔

میری جیب میں رقم موجود تھی، مگر ناشتے کے لئے کوئی معقول ٹھکانا تلاش کرنے میں خاصی دقت کا سامنا ہوا۔

میں نے ناشتے میں کافی وقت صرف کیا پھر اس سے قبل کہ میری طویل نشست لوگوں کو میری طرف متوجہ کرتی۔ میں وہاں سے اٹھ گیا اور ایک حجام کے یہاں پہنچا۔ جسے اپنے پہلے گاہک کو فوجی وردی میں ملبوس دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

اِدھر اُدھر وقت گذارنے کے بعد میں دس بجے اس بازار کی طرف چل دیا جہاں عبدالکمال کا کیبن واقع تھا۔

بازار میں داخل ہوتے ہی مجھے دکانیں کھلنے کے آثار دیکھ کر خاصی ڈھارس ہوئی چند دکانیں کھل چکی تھیں، بعض کھولی جارہی تھیں میں گیارھویں کیبن والی گلی میں پہنچا تو عبدالکمال دور ہی سے نظر آگیا۔

میرے سامنے پہنچنے سے قبل وہ بے خیالی کے عالم میں خلا میں کسی نقطے کو گھور رہا تھا مگر پھر فوجی وردی کو سامنے پاکر بوکھلا گیا اور جب اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑیں تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پیشانی پر جا چڑھیں۔

"تت ...... تم!" حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں تمہارے گھر چلنا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اسی قہوہ خانے کے باہر انتظار کرو، میں دس منٹ میں آتا ہوں۔" اس کے روئیں روئیں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

میں قہوہ خانے کی مخالف سمت میں چل دیا۔ اور دوسری گلی سے ایک طویل چکر کاٹ کر مقررہ مقام تک جا پہنچا۔

چند منٹ بعد عبدالکمال بھی آگیا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں اور میں خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا۔

پُر پیچ گلیوں میں چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد عبدالکمال نے ایک ٹیکسی روک لی، وہ عقبی نشست پر بیٹھا ہی تھا کہ میں بھی سوار ہوگیا اور ٹیکسی عبدالکمال کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہوگئی۔

سارے راستے ہم دونوں ہی خاموش رہے پندرہ منٹ کی مسافت اور عبدالکمال کی ہدایات کے بعد ٹیکسی ایک پُرسکون اور صاف ستھرے علاقے میں ایک مکان کے سامنے رک گئی۔

کرایہ ادا کرکے عبدالکمال اندر گیا۔ اور پھر دوسرا دروازہ کھول کر مجھے وسیع نشستگاہ میں بلالیا۔ جہاں فرشی قالین پر گاؤ تکیے سجے ہوئے تھے۔

"اب سناؤ۔" اندر گھستے ہی اس نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہاشم بھی یہاں پہنچا ہوا ہے۔"

"ہاشم؟ وہ کب آیا؟"

"کل صبح۔" عبدالکمال بولا۔ "اخباری اطلاعات نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سب ہی تمہیں شہرت کا بھوکا کوئی بہروپیہ قرار دے رہے تھے مگر القبس کی رائے تھی کہ صفدر علی نے مایوسی کی انتہا پر پہنچنے کے بعد خود کو مصری فوج کے حوالے کردیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اتنے کھلے اعتراف کے بعد تم کیسے بچ نکلے اور یہ وردی کہاں سے ہاتھ لگی؟"

"انہیں میرے فنگر پرنٹس کی رپورٹ ملے گی تو سر پیٹتے رہ جائیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وہ میرے اعتراف کو تسلیم کرنے پر ہی تیار نہیں تھے۔ سیتا کے محاصرے سے نکل جانے کے بعد انہوں نے مجھے محض مشکوک شخص سمجھ کر روکا ہوا تھا۔"

"تو کیا انہوں نے تمہیں خود رہا کردیا؟"

"اپنی وردی پہنا کر ہرگز رہا نہ کرتے۔" میں نے کہا۔ "مجھے قید میں رکھ کر میرے فنگر پرنٹس کی رپورٹ کے منتظر تھے کہ مجھے فرار کا موقع مل گیا۔"

"فرار ......" وہ اچھل پڑا۔ "واللہ تم میاں بیوی دونوں ہی عمرو عیار سے کم نہیں ہو۔ سیتا ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایسی صاف نکلی کہ وہ ہر طرف کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں اور رہی سہی کسر تم نے پوری کردی۔"

"سیتا کا کچھ علم ہے!"

"اُڑتی اُڑتی سی خبر سنی ہے کہ لیبیا کے دو سر پھرے حریت پسند اس کے ساتھ ہیں اور ان تینوں کا کہیں پتہ نہیں، ہاشم کل سے اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ ان دونوں کے نام معلوم ہوں تو سلسلہ آگے بڑھے۔"

مزید گفتگو کرنے سے پہلے وہ میری کہانی سننے پر مصر ہوگیا اور میں نے اسے ساری تفصیلات سنا ڈالیں۔

"تو اب تم خالدہ کو ملنے جاؤ گے؟" میری بات پوری ہوجانے پر اس نے آنکھیں نکال کر سوال کیا۔

"جانا ہی پڑے گا، توفیق سے وعدہ کرلینے کے بعد یہ میری اخلاقی ذمہ داری ہے۔" میں نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ذمہ داری نبھانی ہے تو پہلے پولیس اسٹیشن جاؤ۔" وہ بگڑ کر بولا۔ "تم پر سب سے زیادہ قانون کی ذمہ داری ہے۔"

"مطلب یہ طعنہ نہ دو۔" میں ہنس پڑا۔ "وہ جانتے ہی نہیں کہ میں صفدر علی ہوں۔"

"میں بھی بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔" وہ بدستور تیز لہجے میں بولا۔ "اگر وہ عورت بگڑی ہے تو قصور شوہر کا بھی ہوگا۔ تم خدائی فوجدار تو نہیں ہو۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے عبدالکمال۔" اسے پھیلتے دیکھ کر میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے یہ خطرہ مول لے کر رہائی کا سودا کیا ہے اور میں یہ قیمت ادا کروں گا۔"

وہ مسلسل مجھ سے بحث کرتا رہا۔ اس کی سب سے مضبوط دلیل یہ تھی کہ ایک بار سارے خطرات سے نکل آنے کے بعد محض وعدے کا بھرم رکھنے کے لیے کسی چکر میں پھنسنا جذباتی حماقت تھی۔ مگر میں اسے

خاموش کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

ہاشم قاہرہ میں تھا مگر آزادانہ آمد و رفت کے خیال سے عبدالکمال کے گھر کے بجائے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے ایما پر اس نے ہوٹل کا نمبر ملایا مگر ہاشم اس وقت تک باہر نکل چکا تھا۔

"آج میں نے محض تمہاری وجہ سے دکان کھولی تھی۔" ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے عبدالکمال نے کہا۔

"میری وجہ سے کیوں؟"

"حالانکہ تم فوجی قید میں تھے جہاں سے میری دانست میں رہائی کا کوئی امکان نہیں تھا مگر پھر بھی مجھے یہ خیال تھا کہ تمہارے پاس قاہرہ میں میری دکان کے علاوہ کوئی اور قابلِ اعتماد ٹھکانہ نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے کل بھی دکان جلدی کھول کر رات گئے بند کی تھی۔ آج چھٹی کرتا ہوں مگر پھر جا بیٹھا اور دیکھو کہ یہ احتیاط کام آ ہی گئی۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔"

"اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"قاہرہ میرے لیے مخدوش ہوگیا ہے۔ کل کے بعد ہر قیمت پر یہاں سے نکلنا ہے۔" میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"سیتا کو تلاش نہیں کرو گے؟"

"اس کا ایک معرکہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوگیا ہے، اگر وہ لبنی بھی اس کے ہمراہ ہیں تو وہ تینوں پہلا موقع پاتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"کہیں نہیں۔ بس مصر سے نکلنا ہے اور اس کا بندوبست تم ہی کو کرنا ہوگا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہاری جیب گرم ہو تو یہاں سارے کام ہو جاتے ہیں۔ میں کاغذات بنوانے کے ساتھ ساتھ کچھ رقم بھی دے دوں گا۔"

وہ دن میں نے اسی کے گھر میں گزارا۔ اس کی مدارات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں اس کی بیوی سے بھی ملا۔ بچوں کو وہ دانستہ سامنے نہیں لایا کہ کہیں کوئی غیر ذمے دارانہ بات باہر نہ پہنچ جائے۔

اس کی بیوی مجھ سے نہایت احترام اور حیرت سے ملی۔ شاید عبدالکمال بیوی سے ہر بات کہہ دینے کا عادی تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی مسلسل مجھ سے سیتا کے بارے میں سوالات کرتی رہی۔

اس کے جانے کے بعد میں وہیں سو گیا۔

شام کو بیدار ہوا تو پھر ہاشم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہوٹل سے مسلسل لاپتہ تھا۔ اسی وقت عبدالکمال نے بتایا کہ میرے فرار کی خبر پھیل چکی تھی اور ہر طرف سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ کیونکہ میرے فرار کے چند گھنٹے بعد ہی مصری فوجی حکام کو ننگر پرنٹس کی رپورٹ مل گئی تھی جس میں مجھے صفدر علی تسلیم کیا گیا تھا مگر اس وقت تک کیمپ کمانڈنٹ اپنے اوپر والوں کو میرے فرار سے مطلع کر چکا تھا۔

عبدالکمال شطرنج کا شوقین تھا اور میرے لیے باہر نکلنا نامناسب تھا۔ لہٰذا کھانے کے بعد بساط جم گئی جو رات گئے تک جمی رہی۔

بستر پر دراز ہونے سے قبل پانچویں بار بھی ہاشم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ نجانے وہ کہاں غائب تھا اور کیا کرتا پھر رہا تھا۔

دن کے مقابلے میں رات کا خوابناک ماحول میری تکان کے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوا اور میں ایسے گھوڑے بیچ کر سویا کہ اگلے روز دن چڑھے کی خبر لایا۔

عبدالکمال دکان جانے کے بجائے میری بیداری کا منتظر تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاشم ساری رات لاپتہ رہا اور اس وقت تک ہوٹل نہیں پہنچا تھا۔

وہ میرے لیے دوسرے لباس کا بندوبست بھی کر چکا تھا۔ لہٰذا غسل کے بعد میں نے فوجی وردی کے بجائے نیا لباس پہن لیا۔

عبدالکمال اس روز دکان بند رکھنے کے موڈ میں تھا مگر میں نے ناشتے کے دوران جبراً اسے دکان بھیجنے پر آمادہ کیا۔ کیونکہ اس کے معمولات میں تبدیلی میری ذات کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس کی روانگی کے چند منٹ بعد میں بھی نکل کھڑا ہوا۔

میرا خیال تھا کہ دن میں خالدہ اپنے فلیٹ پر ہی مل سکتی تھی جب کہ اس کی شامیں حسن پرستوں کی تلاش میں باہر گزرتی تھیں۔

عباسیہ کے علاقے میں پہنچ کر میرے لیے تیرھویں عمارت تک پہنچنا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا اور پھر میں نے عمارت بھی پہچان لی۔ خالدہ کا عارضی خریدار بن کر پچھلی بار میں اسی عمارت میں آیا تھا۔

اس عمارت میں داخل ہوتے ہوئے مجھے پھریری سی آگئی۔

میں زندگی میں پہلی بار ایک پیشہ ور قاتل کا کردار ادا کرنے جا رہا تھا۔ اس سے قبل میں نے انسانی لہو اپنی ذاتی سلامتی اور ذاتی فیصلوں کے تحت بہایا تھا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ میں ایک فرمائشی قتل کا ارتکاب کرنے جا رہا تھا۔

باہر دھول مٹی میں اٹے ہوئے بچوں کا شور اپنے عروج پر تھا۔ گنجان آبادی میں ہر ایک اپنی اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔ کسی نے میری طرف توجہ دینے کی زحمت بھی نہیں کی مگر اس کے باوجود میرے تحت الشعور میں ایک اجنبی سی گونج ابھر رہی تھی۔

اس سے پہلے میرے ہاتھوں جتنے قتل سرزد ہوئے فیصلہ کن لمحہ سامنے آنے سے قبل مجھے خود انجام کا علم نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس بار صرف مجھے ہی نہیں بلکہ ایک اور ہستی کو بھی ہونے والے خون کا پیشگی علم تھا۔

تیسری منزل پر ساتواں فلیٹ میری منزل تھا۔

میں نے دروازے کے سامنے راہداری میں رک کر ہلکی سی دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے وہی شناسا سا نسوانی آواز ابھری۔

میں نے دوبارہ دستک دی۔ اس بار اندر کچھ عجلت آمیز آہٹیں سنائی دیں اور پھر دروازہ کھول دیا گیا۔

میرے سامنے خالدہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس کھڑی تھی۔ شاید پچھلی رات اس نے جاگ کر گزاری تھی جو اس وقت تک بستر ہی میں تھی۔

مجھے پہچانتے ہی خالدہ کے تیور چڑھ گئے۔ "کیوں آئے ہو یہاں؟ میرا مذاق اڑانے؟ مجھے ذلیل کرنے؟"

"تم سے چند باتیں کرنے۔" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اور اگر میں انکار کر دوں؟" وہ غرائی۔ غصے میں اس کا حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔

"میں لوٹ جاؤں گا اور کل دوبارہ آؤں گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ایسی کیا ضروری بات ہے؟" میرے اندازِ گفتگو نے اسے الجھا دیا۔

"اندر آجاؤں؟"

اس نے میرے لیے راستہ چھوڑ دیا اور میں اس کے بکھرے ہوئے مختصر سے فلیٹ میں داخل ہوگیا۔

اندر پہنچ کر میں نے کرسی سنبھالی اور پُرسکون انداز میں سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ وہ لاپروایانہ انداز میں میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بے حد رعونت آمیز اور جارحانہ تھا۔

"میں تمہارے بولنے کی منتظر ہوں۔" طویل سکوت کو اسی نے توڑا۔ اس کی آواز سے دبی دبی بے چینی مترشح تھی۔

میں نے مسکرا کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کے عقب میں پہنچ کر دونوں ہاتھ اس کی مخملی گردن پر رکھ دیے۔

اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ میں نے دو تین بار ہولے ہولے اس کی گردن سہلائی اور واپس اپنی کرسی پر آگیا۔

"بولتے جاؤ، رک کیوں گئے؟" اس بار اس کی آواز نرم تھی۔

"ابھی تک تو خاموش ہی ہوں۔"

"بعض لوگ زبان سے شکست کا اقرار نہیں کرتے، اشاروں کی زبان میں بات کرتے ہیں۔" اس کے لہجے میں یک بیک اعتماد سمٹ آیا۔ "بولنا شروع کیا ہے تو بولتے جاؤ، اجازت ہے۔"

میں گردن جھٹک کر مسکرا دیا۔

کتنی نادان تھی وہ کہ اپنے قاتل کو مسیحا سمجھ رہی تھی۔ وہ اپنی ذات کے ایسے طلسم میں گرفتار تھی کہ اپنے جسم و شباب سے آگے دیکھنے کو ہی تیار نہ تھی مگر اس کے باوجود مجھے اس پر رحم آرہا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے دو ٹوک بات کرنے کے بعد ہی میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناؤں گا، اس سے پہلے نہیں۔

"تم شادی شدہ ہو؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میں نے خالدہ سے سوال کیا۔

"اندھیروں کی سہاگن اور اجالوں کی بیوہ ہوں۔" اس نے بال جھٹک کر شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔

اس حسین ساحرہ کو میرے سنگین عزائم کے بارے میں ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ مسلسل اسی خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ ایک بار اسے ٹھکرا کر چلے جانے کے بعد میں اسے نہ بھول سکا اور آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک مرتبہ پھر اس کی دہلیز پر آ پہنچا۔

میرے سوال کا جواب اس نے ایسے دو ٹوک انداز میں دیا تھا کہ میں فوری طور پر اپنا سوال دہرانے کے لیے الفاظ کا انتخاب نہ کر سکا۔

"شاعری بھی کر لیتی ہو؟" میں نے قدرے توقف کے بعد خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اجالوں کی بیوہ کیسے ہو سکتی ہو؟"

"رات کے اندھیرے میں مجھ پر اپنی جان نثار کرنے کا دعویٰ کرنے والے معززین دن کے اجالے میں مجھے پہچاننا بھی گوارا نہیں کرتے۔" وہ شہادت کی مخروطی انگلی سے اپنا داہنا رخسار سہلاتے ہوئے بولی۔

"میں عیاشیوں کا ذکر نہیں کر رہا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں فی الحقیقت یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی ہوئی یا نہیں؟"

وہ ایک ادا کے ساتھ ہنس پڑی۔ اس ہنسی میں طنز کا زہر ملا ہوا تھا۔ "بزدل مرد میرے بدن کے حصول کی مہم کی ابتدا ایسے ہی سوالات سے کرتے ہیں۔ تمہیں تو میں اجازت دے چکی ہوں۔"

"میری ہر بات کو اسی ایک معیار پر نہ جانچو" میں نے اس کے تضحیک آمیز اندازِ گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "جب میرے سوالات کا مقصد واضح ہو گا تو تم اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکو گی۔"

"مجھ سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جارحانہ لہجے میں بولی۔

"میں خود شادی شدہ ہوں۔ وقت برباد نہ کرو اور جو کچھ میں جاننا چاہتا ہوں اس میں لیت و لعل نہ کرو۔"

پہلی بار اس کے بشرے پر الجھن کے آثار عود کر آئے اور اس نے فکر آمیز لہجے میں سوال کیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

"تمہارا ایک ہمدرد۔" میں نے سگریٹ کا ٹوٹا فرش پر پھینک کر جوتے کے تلے سے بے رحمی سے کچل دیا۔

وہ چند ثانیوں تک خالی الذہنی کے عالم میں میری طرف دیکھتی رہی پھر دھیمی آواز میں بولی۔ "میں شادی شدہ ہوں۔"

"پھر ان بری عادتوں میں کیوں مبتلا ہو؟"

"آخر تمہیں میری نجی زندگی سے اتنی دل چسپی کیوں ہے؟" وہ ایک مرتبہ پھر بھڑک گئی۔ اس کا رویہ غیر یقینی سا تھا۔

"محض ہمدردی۔"

"قاہرہ میں میرے علاوہ اور لڑکیاں بھی ہیں، تم ان سے ہمدردی جتانے کیوں نہیں جاتے؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اپنی عادتوں کی وجہ سے ان میں سے کسی کی جان کو فوری خطرہ لاحق ہے تو ضرور اس کے پاس جاؤں گا۔"

یک بیک اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ "پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے بلا وجہ خوفزدہ مت کرو۔"

"میں درست کہہ رہا ہوں مسز خالدہ توفیق!"

وہ کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی نگاہیں مسلسل میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تو تم بہت کچھ جانتے ہو۔" اس کی آواز شکست خوردہ تھی۔ "شاید میری زبان سے اپنی معلومات کی تصدیق کرانا چاہ رہے تھے؟"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے موجودہ روش کیوں اختیار کی ہوئی ہے۔" میں نے اپنے لیے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

"تم نے مجھے سہما دیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میری جان کو کیا خطرہ درپیش ہے اور میرا کون سا دشمن پیدا ہو گیا ہے؟"

"فکر نہ کرو میری موجودگی میں کوئی دوسرا تمہاری طرف نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا۔ تم میری بات کا جواب دو۔"

"تم توفیق کے دوست ہو؟" اس کی نگاہوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میری ذات سے خوفزدہ تھی۔

"دوست نہیں ہوں، مگر اسے جانتا ہوں۔"

"اگر جانتے ہو تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ کیسا کمینہ آدمی ہے۔" اس نے مضمحل اور غصیلی آواز میں کہا۔

"اس کی کمینگی کا یہ علاج تو نہیں کہ تم سرِ بازار اپنی آبرو کی دکان سجا ڈالو۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ اس وقت میں حقیقی طور پر خود کو خالدہ کے مقابلے میں عمر رسیدہ اور سرپرست نما شخص محسوس کر رہا تھا اور میرے ذہن کے کسی بھی گوشے میں آوارگی کے جراثیم نہیں ابھر رہے تھے۔

"یہ راستہ مجھے اسی نے دکھایا تھا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ خالدہ کا وہ انکشاف میرے لیے شدید حیرت اور ذہنی جھٹکے کا باعث ثابت ہوا تھا۔

"وہ میری موجودہ سرگرمیوں کے بارے میں خاصا واقف ہے مگر اس نے ایک بار بھی براہِ راست مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ وہ حیلے بہانوں سے آئے دن میری مرمّت کرتا رہتا ہے مگر مجھ پر کھلا الزام عائد کرنے کی اس میں جرأت نہیں ہے کیونکہ اس کے دل میں کئی برسوں سے چور موجود ہے۔"

"میرے لیے تمہاری بات ناقابلِ فہم ہے۔"

"ہونی ہی چاہیے کیونکہ تم خود ایک مرد ہو۔" وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولی۔

"تفصیل جانے بغیر میں یقینی رائے کیسے قائم کر سکتا ہوں۔"

"شادی کے دو سال بعد تک میں ایک وفا شعار بیوی تھی۔ جو اپنے شوہر کو رشوت خوری سے باز رکھنے کی ناکام کوشش کرتے کرتے آخر کار آسانی سے ملنے والی رقموں کی عادی ہوتی گئی۔ پھر ایک روز توفیق کو اسمگلروں سے لین دین کرتے ہوئے اُس کے افسروں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ دو روز حوالات میں رہا، کورٹ مارشل، قید، جرمانہ اور ملازمت سے برطرفی سامنے کی بات تھی۔" خالدہ کی نگاہیں خلا میں کسی نکتے پر مرکوز تھیں اور اس کی آواز کرب آلود ہو گئی تھی۔ "پہلی رات اس نے حوالات کی سلاخیں تھام کر بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنی آزادی اور مستقبل کے نام پر مجھ سے ایک شرمناک فرمائش کی جس پر میں برہم ہو گئی مگر جب وہ رو رو کر التجائیں کرتا رہا تو میرا رویّہ بدل گیا۔ اگلی رات میں نے تحقیقاتی جماعت کے سربراہ کی خلوت میں بسر کی اور اگلی صبح توفیق کو حوالات سے رہائی مل گئی مگر وہ ملازمت سے معطل رہا۔ دو ماہ بعد اس پر عائد کئے گئے سارے الزامات واپس لے لیے گئے۔ اس دوران میں توفیق کے ایماء پر میں بار بار اس افسر سے ملتی رہی۔ وہ قصہ ختم ہونے پر توفیق کا تبادلہ کر دیا گیا۔ اور میں اس گھناؤنی ذمّے داری سے بچ گئی۔ مگر ہماری ضروریات بڑھ چکی تھیں۔ توفیق کے لیے رشوت کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس نے تبادلے کے لیے ایک مرتبہ پھر مجھے گناہ پر مجبور کیا۔ اس کے نئے افسر نے تین بار مجھ سے درندے جیسا سلوک کیا۔ پھر خود افسر کا اسکندریہ تبادلہ ہو گیا اور میری عزتِ نفس کی بھینٹ دینے کے باوجود توفیق جہاں تھا وہیں رہا..... اپنی اس بے ثمر پامالی پر میری ذات بکھر کر رہ گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں توفیق کی ترقی کا زینہ بننے کے بجائے اپنی قیمت خود وصول کروں گی۔ اور آج تک میں اپنے اسی فیصلے پر کاربند ہوں۔ توفیق کا ایک افسر وعدہ خلاف اور دھوکے باز نکلا تھا مگر میرے سارے گاہک ---- ایماندار ہوتے ہیں۔ جاتے ہوئے طے شدہ معاوضے سے کچھ زیادہ ہی دے جاتے ہیں۔"

اس کی کہانی سن کر میں ششدر رہ گیا۔ توفیق سے گفتگو کے بعد میں خالدہ کو قابلِ گردن زدنی سمجھ رہا تھا مگر خالدہ کی کتھا سننے کے بعد توفیق جیسے بے شرم آدمی کے لیے موت بھی معمولی سزا نظر آ رہی تھی۔

غنیمت یہ ہوا کہ میں نے براہِ راست اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے بجائے خالدہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ورنہ نادانستگی میں توفیق کے بوئے ہوئے پاپ کی سزا خالدہ کو دے بیٹھتا۔

"تم نے اس سے کنارہ کشی کیوں نہیں کر لی؟" میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والا ایک منطقی سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔

"اگر معاملہ صرف میری ذات کا ہوتا تو ضرور کر لیتی مگر میری دو بہنوں کا مستقبل میرے سامنے تھا جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔"

"وہ تمہاری ذمّے داری کیسے بن گئیں؟"

"یہی پہلو تو دردناک ہے۔" وہ دُکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "شادی سے پہلے میرا بھائی مزدوری کر کے گھر چلاتا تھا۔ شادی کے بعد توفیق نے میرے باپ، بھائی اور دونوں بہنوں کو اپنے پاس بُلا لیا کیونکہ اسکے پاس پیسے کی ریل پیل تھی۔ پیسے کی فراوانی نے میرے محنتی بھائی کو بگاڑ دیا۔ حرام کا پیسہ اسے راس نہ آ سکا اور وہ کام کاج چھوڑ کر بُری عادتوں میں غرق ہوتا چلا گیا۔ دو برس میں وہ اس قدر بگڑ گیا کہ جب توفیق پر رشوت کے دروازے بند ہوتے تو میرا بھائی گھر سے بھاگ گیا۔ میرا باپ معذور ہے اور بہنیں پڑھ رہی ہیں۔ ان حالات میں اگر میں توفیق کو ٹھکرا دیتی تو تحفظ کا وہ نام نہاد سائبان بھی باقی نہ رہتا۔ جو شوہر کے طور پر مجھے حاصل تھا جب کہ گزارے کے لیے اس وقت بھی مجھے یہی راستہ اپنانا پڑتا جو توفیق نے مجھے سکھایا تھا۔"

"تم پہلی بار ہی توفیق کی التجا ٹھکرا کر روزی کا کوئی باعزت طریقہ تلاش کر سکتی تھیں۔" میں نے کہا۔

وہ مغموم انداز میں مسکرا دی۔ "یہ مصر ہے عربِ دنیا کا غریب ترین ملک، یہاں عورت کے لیے عزت سے روزی کمانا تقریباً ناممکن ہے جب کہ بے شمار مرد روزگار کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ پھر میری تعلیم صرف تیسری جماعت تک ہے۔"

"میں نہیں مانتا، بہت سی عورتیں عزت سے روزی کما رہی ہوں گی۔"

"یہ مفروضہ ہے۔" وہ بولی۔ "بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے مگر خرابی معاشرے کی رگوں میں پیوست ہے اور کچھ نہیں تو ملازم لڑکیوں کو اپنے آجروں یا افسروں کو خوش رکھنا پڑتا ہے ورنہ ان کے کام میں نقائص نکال کر انہیں بے روزگاری کے جہنم میں پھینک دیا جاتا ہے۔" وہ کہیں بھی شکست ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔

وہ قاہرہ کے گندے ماحول میں رچی ہوئی عورت تھی اور جو کچھ کہہ رہی تھی ذاتی تجربات کی بنا پر کہہ رہی تھی۔ مگر مجھے خود بھی اس کے تجزیے سے قدرے اتفاق ہو چلا تھا۔ میرے ذہن میں توفیق کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ آوارہ عورتوں کے لیے

بیروت کے بعد قاہرہ سب سے زرخیز شہر تھا۔

اور ایسی زرخیزی کا سبب سیاح وغیرہ نہیں ہوتے بلکہ اس کے عوامل اسی مقام کے معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کی بنیادوں میں نمو پاتے ہیں۔ اور ان اسباب پر مجھ جیسا سطحی انسان بھی ایک ضخیم کتاب لکھ سکتا تھا۔

خالدہ معصوم اور بے گناہ نہیں تھی لیکن میرے نزدیک اس کی سزا موت نہیں ہو سکتی تھی۔ توفیق اس کا برابر کا ساتھی تھا۔ اگر وہ بیوی کو گناہوں سے متعارف کرانے کے بعد خود زندہ رہنے کا آرزو مند تھا تو خالدہ کو بھی گناہوں کی دلدل میں اُتر جانے کے بعد طبعی زندگی گزارنے کا پورا حق حاصل تھا۔

"اب بتاؤ کہ میرا کیا جرم ہے؟" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد وہ بولی۔ "اور وہ کون ہے جو میری جان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے؟"

"تمہاری کہانی سننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صرف میرا وہم تھا، تمھیں کوئی حقیقی خطرہ لاحق نہیں ہے۔"

"مگر وہ ہے کون؟"

"بزدل اور بے ضمیر شوہر بیویوں کے پیچھے ہی شور مچاتے ہیں، ان میں حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔"

"تو توفیق میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"بلکہ ایسا ظاہر کر رہا ہے۔" میں نے تصحیح کی۔

"اسے بس ایک ہی بات ناپسند ہو گی۔" وہ بولی۔ "میرے مشاغل سے وہ باخبر ہے مگر بظاہر ہم دونوں انجان بنے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے طلب کیے بغیر اپنی تمام کمائی اس کے حوالے کر دوں تاکہ وہ رشوت والے دور کی طرح عیاشانہ زندگی گزار سکے۔"

"شاید بنیادی بات یہی ہے۔"

"مگر تم اس سے کہاں ٹکرا گئے؟"

"محض اتفاق۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پچھلی مرتبہ تم سے مل تو چکا تھا، پھر ایک بار میں نے نشے میں بہکے ہوئے ایک شخص کو کسی عورت کی تصویر پر تھوکتے ہوئے دیکھا تو تجسس پر قابو نہ رکھ سکا۔ تصویر دیکھی تو وہ تمھاری ہی تھی۔ میں اس شرابی سے مل بیٹھا جو بعد میں تمھارا شوہر توفیق ثابت ہوا اور میں تمھیں ہوشیار کرنے یہاں دوڑا چلا آیا۔"

"میں تمھاری احسان مند ہوں۔" وہ اچانک اٹھ کر میرے سینے سے آ لگی۔ "اس دور میں تو لوگ ایسے معاملات سے دور ہی بھاگتے ہیں۔"

اسے تھوڑی سی مہلت دے کر میں نے نرمی سے اپنے سینے سے ہٹا دیا۔

وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے باہر نکلتے ہی تم مجھے بھول جاؤ گی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"تم اس مشینی دور کے انسان نہیں لگتے، عجیب اور بے لوث۔" اس نے ممنونیت سے کہا۔ "تمھیں تو میں عمر بھر نہیں بھلا سکوں گی۔"

"وہ دل کی باتیں ہیں۔" میں دھیمے لہجے میں بولا۔ "میرے اور تمھارے درمیان۔ مگر کسی تیسرے کے لیے ہم ملے ہی نہیں تھے۔"

"میں سمجھ گئی۔" وہ جلدی سے بولی۔

میں مزید کچھ دیر وہاں رکا اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس دوران میں عبدالکمال کی باتیں مجھے بار بار یاد آتی رہیں۔

اس نے مجھے خالدہ کی طرف آنے سے کافی روکا تھا، خدائی فوجدار ہونے کے طعنے بھی دیے تھے۔ اور یہاں تک کہا تھا کہ اگر آخری لمحات پر توفیق کے دل میں بیوی کی محبت نے زور مارا تو کہیں وہ خالدہ کے فلیٹ پر پہنچ کر میرا ہی کام تمام نہ کر دے لہٰذا مجھے میاں بیوی کے اس جھگڑے سے دُور ہی رہنا چاہیے مگر میں کسی نہ کسی طرح اسے خاموش کرانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

دستک کا انداز دوستانہ اور دھیما تھا مگر خالدہ سراسیمہ سی ہو گئی۔

میری نگاہیں تیزی سے فلیٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ مختصر سا فلیٹ اس قدر بے تکا تھا کہ وہاں چھپنے کے لیے کوئی موزوں جگہ نہیں تھی۔ باتھ روم میں داخل ہونے کا مطلب خود کو چوہے دان میں قید کر لینا تھا۔

میں پھرتی سے دروازے کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تاکہ آنے والے کی نگاہ فوری طور پر مجھ پر نہ پڑ سکے۔

خالدہ میری اس پناہ گاہ سے مطمئن نہیں تھی۔ اسی اثناء میں دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی اور خالدہ نے اضطراری کیفیت میں کنڈی کھول دی۔

"توفیق! تم!" دروازہ کھلتے ہی میرے کانوں میں خالدہ کی سرسراتی ہوئی خوفزدہ آواز آئی اور میرے اعصاب تن گئے۔

میں نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر زہریلے تیر پھینکنے والی وہ شیشی جو پہلے سے میرے استعمال میں تھی، اس وقت میری جیب میں موجود نہیں تھی۔

اِدھر آنے والے پر نگاہ پڑتے ہی خالدہ نے دروازہ دوبارہ بند کرنے کی کوشش کی تھی جسے شاید ناکام بنا دیا گیا۔

"اندر چلو۔" باہر سے آنے والی دھیمی مگر تحکم آمیز مردانہ آواز توفیق ہی کی تھی۔ "اگر تم دونوں میں سے کسی نے بھی بدمعاشی کرنے کی کوشش کی تو بلا تامل گولی مار دوں گا۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے عزائم نیک نہیں تھے۔

خالدہ مشینی انداز میں اُلٹے قدموں اندر آ گئی۔ چند قدم پیچھے ہٹتے ہی اس نے بے بسی کی نگاہوں سے دروازے کے پیچھے میری طرف دیکھا اور توفیق کو فوراً ہی میری کمین گاہ کا علم ہو گیا۔

وہ اس قدر پھرتی اور مکاری کے ساتھ اندر داخل ہوا کہ میں فوری طور پر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے آٹومیٹک ریوالور سے براہِ راست مجھے اپنی زد میں لیتے ہوئے دروازے کا بولٹ چڑھا دیا۔

"دونوں ایک ہی طرف آ جاؤ۔" اس نے ریوالور کی نال ہلا کر خالدہ کو میرے برابر میں آ جانے کا اشارہ کیا اور خود دیوار کے ساتھ ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کی بغل میں اخباری کاغذ میں لپٹا ہوا ایک بنڈل تھا جو اس نے فرش پر گرا دیا۔

"ایک تیر سے دو شکار۔" توفیق کے بشرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "میں نے تمھیں فرار کرانے کے لیے بڑی محنت کی تھی مصطفیٰ المرزوق!" اس مرتبہ وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ "رات کے دو گارڈز کی شراب کی بوتلوں میں بے ہوشی کی دوا ملائی تھی۔ پھر خود بہروپ بدل کر خطرہ مول لیتے ہوئے وردی ڈسٹ بن میں ڈالی تھی اور میری دلی خواہش تھی کہ خالدہ تمھارے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے مگر شاید تم پر اس کا جادو کام کر گیا جو یہ ابھی تک زندہ ہے۔"

"تم کیمپ کے بجائے یہاں کیسے ہو؟" میں نے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"میرے لیے آج بڑا دن ہے نا، چھٹی لی ہے آج کی۔"

"تمھاری نیت میں بھی کچھ فتور معلوم ہو رہا ہے۔"

"تمھارے فنگر پرنٹس کی رپورٹ آتے ہی ہر ایک کو تمھاری اصلیت کا۔۔۔"

"تت۔۔۔ تت۔۔۔ تم صفدر علی!" توفیق کی بات کاٹ کر خالدہ دہشت، حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولی۔

میں انکسار سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا مگر وہ مجھے یوں مسلسل گھورے جا رہی تھی جیسے میں کوئی عجوبہ رہا ہوں۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے۔" میں نے توفیق کو یاد دلایا۔

"ہاں۔" وہ بولنے لگا۔ "تمھاری زندہ یا مُردہ گرفتاری کے لیے دو لاکھ مصری پونڈ کا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ اور میں آج کل مالی مشکلات سے دوچار ہوں۔ حالانکہ تمھیں آج یہاں آنا تھا مگر میں کل سے ہی اس فلیٹ کی نگرانی کر رہا ہوں۔۔۔"

"تم ذلیل، کمینے، تمھیں شرم نہیں آتی۔۔۔؟" خالدہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکی۔

"تم خاموش رہو بے بی!" میں نے سختی سے کہا۔ "ہمیں بات کرنے دو۔"

"بیوی کے گاہکوں کی گنتی واقعی شرم کی بات ہے۔" توفیق نے بے حیائی سے کہا۔ "لیکن دو لاکھ پونڈ میری زندگی بدل سکتے ہیں۔ میں صفدر علی کے پیچھے ہی آیا تھا۔ اور اس انتظار میں دروازے پر کھڑا تھا کہ جب یہ تمھیں ہلاک کر کے باہر نکلے گا تو میں اسے دھر لوں گا مگر برا ہو تمھاری ایک پڑوسن کا کہ وہ باہر آ گئی اور مجھے مجبوراً دستک دینی پڑ گئی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ وہ دروازہ کھلنے سے پہلے ہی زینہ اُتر گئی ورنہ میں اسے بھی تمھارے فلیٹ میں لانے سے نہ چُوکتا۔"

"تو تم مجھے گرفتار کرنے آئے ہو؟"

"ہاں۔ یہ بھی یاد رہے کہ زندہ یا مُردہ سے انعام کی رقم میں فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ قتل کی صورت میں مجھے زیادہ بڑا قومی ہیرو قرار دیا جائے گا۔" وہ اپنی کامیابی کے بارے میں بجا طور پر بہت زیادہ پُریقین تھا۔

وہ مسلح اور صورتحال پر پوری طرح حاوی تھا اور میں غیر مسلح اور مغلوب تھا۔ اس وقت رہ رہ کر مجھے زہریلے تیروں والی شیشی یاد آ رہی تھی جسے میں اس مہم پر روانہ ہوتے وقت دانستہ عبدالکمال کے گھر چھوڑ آیا تھا۔

میری دانست میں موجودہ مہم بہت آسان سیدھی اور بے خطر تھی۔ مجھے ایک حسین عورت کو قتل کر کے یا بغیر قتل کیے واپس لوٹنا تھا اور اس معاملے میں کسی بھی مرحلے پر کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑنا تھا کہ اس فلیٹ میں صفدر علی کا شبہ کیا جا سکے۔ اور محض اسی احتیاط کے پیشِ نظر میں نے وہ شیشی ساتھ نہیں لی تھی کہ کہیں خطرے کے وقت اضطراری طور پر اسے استعمال نہ کر بیٹھوں کیونکہ زہریلے تیروں کے شکار صفدر علی کے مقابل ہی ہوا کرتے تھے۔

مگر توفیق کے نئے عزائم نے صورتحال بالکل ہی بدل دی تھی۔ میرے لیے رہائی اہم تھی خواہ وہ زہریلے تیروں کی برسات میں ہی ہوتی۔

"میری زندہ یا مُردہ گرفتاری کے بعد بھی تم جوابدہی سے نہیں بچ سکو گے۔ اعلیٰ مصری حکام اتنے احمق نہیں ہیں کہ واقعات کی کڑیاں نہ ملا سکیں۔"

"میں نے وہ سب سوچ لیا ہے۔" اس نے اپنے قدموں میں پڑے ہوئے بنڈل کو ٹھوکر مار کر کہا۔ "اس میں تمھارے وہ کپڑے ہیں جو میں نے تلف کرنے کے لیے کار میں ڈالے ہوئے تھے مگر خوش قسمتی سے بھول گیا۔ اب یہ لباس بھی اسی فلیٹ سے برآمد ہو گا۔"

"احمق آدمی تم اس طرح بھی نہیں بچ سکو گے۔" میں خوفناک صورتحال کے باوجود پوری طرح پُرسکون تھا۔

"لوگوں کو میرے اور خالدہ کے اختلافات کا علم ہے۔" وہ شاید اپنی برتری جتا کر صورتحال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "کل نیا منصوبہ بنانے کے بعد میں اپنے ایک دو قریبی دوستوں سے ذکر کر چکا ہوں کہ مزید رسوائی میری برداشت سے باہر ہے اور میں خالدہ کو چھوڑ دوں گا۔ فرض کر دیں کل سے اس فلیٹ کی نگرانی کر رہا ہوں تاکہ اس کے ملاقاتیوں کی آمد و رفت پر نظر رکھ سکوں، اسی اثناء میں ایک شناسا چہرہ مجھے خالدہ کے ساتھ عمارت میں داخل ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور میں ان کے تعاقب میں اوپر آ گیا۔ اس شناسا چہرے نے بھاری معاوضہ دے کر یا دھمکی سے خالدہ کو اپنا میزبان بننے پر مجبور کیا تھا جب کہ خالدہ اس سے ایک پیشہ ور عورت کے ہی روپ میں ٹکرائی ہو گی۔" اتنا کہہ کر وہ لحظہ بھر کے لیے رُکا پھر خالدہ کو آنکھ مار کر کہنے لگا۔ "میں کچھ دیر باہر منتظر رہا پھر میں نے اپنی آوارہ بیوی کے فلیٹ پر دستک دی تو صفدر علی نے پستول کے سہارے زیر کرنا چاہا، گولیوں کا تبادلہ ہوا خالدہ صفدر کی گولی سے اور وہ خود میری گولی سے مارا گیا۔"

"اس کہانی میں ایک جھول ہے۔" میں مسکرایا۔

"بتا دو تو اسے بھی دور کر دوں گا۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "حکومت سے دو لاکھ پونڈ انعام وصول کرنے کے لیے میں نے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔"

"میں غیر مسلح ہوں، تم ایک ریوالور سے دو قسم کی گولیاں کیسے چلا لو گے؟"

"اچھا سوال ہے۔" وہ تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ پھر اس نے بغلی ہولسٹر سے اعشاریہ دو چھ کا ایک بھرا ہوا پستول نکال کر میرے سامنے کر دیا۔ "یہ میں ساتھ لایا ہوں مرنے کے بعد تمہارے ہاتھ میں اچھا معلوم ہو گا۔"

میرے بدن کے مسامات بھیگنے لگے۔ اگر سب کچھ اس کے مفروضہ طریقوں پر وقوع پذیر ہوتا چلا جاتا تو اس کا منصوبہ بے داغ تھا۔ وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے باوجود نہ صرف بے گناہ رہتا بلکہ صفدر علی کو قتل کر کے ہیرو کا درجہ بھی حاصل کر لیتا۔ اور سرکاری خزانے سے دو لاکھ پونڈ کی خطیر رقم اس کی جیب میں منتقل ہو جاتی۔

مجھے اس بزدل، مکار اور بے ضمیر شخص سے نفرت محسوس ہونے لگی۔

"یہ سوانگ ختم کرو ورنہ میں شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔" خالدہ تیز لہجے میں بولی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"آواز نیچی رکھو گی تو تھوڑی دیر زندہ رہ لو گی۔ ورنہ مجھے صرف دو گولیاں چلانی ہیں اور یہیں رہ کر پولیس کا انتظار کرنا ہے۔" وہ غرّایا اور دوسرا پستول اپنی گود میں رکھ لیا۔

خالدہ بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ پھر توفیق سے مخاطب ہو گیا۔ "تمھیں دو لاکھ پونڈ سے ہی سروکار ہے نا؟"

"ہاں۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "مگر اس عورت کا خاتمہ بھی ضروری ہے۔"

"اس عورت کو میں لے جاؤں گا۔ اس کے عوض نصف گھنٹے میں ڈھائی لاکھ پونڈ تمھیں دیے جا سکتے ہیں۔"

وہ مکّارانہ انداز میں ہنس دیا۔ "میں تو نقد کا قائل ہوں تیرہ ادھار پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اس وقت تو تم میرے نشانے کی زد پر ہو ورنہ تم سے تو حکومتیں بھی ہارتی چلی آئی ہیں۔ ریوالور کی نال ہٹتے ہی تم بدل گئے تو میں بیچارہ کیا کر سکوں گا۔ اور پھر تم سے ملی ہوئی رقم میں کھلے عام خرچ بھی نہ کر سکوں گا۔ نہیں بھائی، میرے لیے تو عزت آبرو والے دو لاکھ ہی کافی ہیں۔ تمہارے چار لاکھ بھی مہنگے پڑیں گے۔"

"تو پھر یہ بھی سن لو کہ مجھے اس طرح ہلاک کرنے کے بعد، روئے زمین پر تمھیں کہیں اماں نہ مل سکے گی۔" میں نے اچانک پینترا بدل دیا۔ "تم انعام لو گے تو اخبارات میرے قاتل کے طور پر تمہارا نام شہہ سرخیوں میں اچھالیں گے۔ تمہارا شجرہ مع تصاویر شائع ہو گا اور انعام وصول کرنے کے چند گھنٹوں کے اندر ہی تم کسی لاوارث چوپائے کی طرح مار دیے جاؤ گے۔ سیتا سمیت میرے بے جگر ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد تمہارے خون کی بُو پر لگ جائے گی۔"

یہ حربہ کارگر رہا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے دو تین بار خالی منہ چلایا جیسے حلق میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"پیشہ ور اور نئے مجرم میں بس یہی فرق ہوتا ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا، دو لاکھ نے میری عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔"

"میں اب بھی ڈھائی لاکھ کے وعدے پر قائم ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں۔" وہ نروس نظر آنے لگا۔ "تمہارا بھروسہ نہیں۔ تم سامنے سے نال ہٹتے ہی بدل سکتے ہو۔ میں تم دونوں کو ضرور ختم کر دوں گا اور خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ مجھے انعام سے زیادہ اپنی زندگی پیاری ہے۔"

"تم نہیں جا سکتے۔" میرا لہجہ سرد ہو گیا۔ "ہم دونوں خاموشی سے نہیں مریں گے۔ ہماری چیخیں اور پھر فائروں کے دھماکے اس فلیٹ کے دروازے پر ہجوم جمع کرا دیں گے۔ تم انعام لو یا نہ لو، مجھے مار کر تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ "تم مجھے خوفزدہ کر رہے ہو۔"

"تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا۔ "ایسی حالت میں تمہارا نشانہ ضرور خطا ہو گا۔ جتنی زیادہ گولیاں چلیں گی اتنی ہی زیادہ بھیڑ تمھیں گھیرنے کے لیے جمع ہو گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں محض زخمی ہو کر یا زخمی ہوئے بغیر تم سے پستول چھین لوں، وہ تمہارا آخری لمحہ ہو گا۔"

اس کے لبوں کے گوشے پھڑکنے لگے اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی سے اُٹھ گیا۔ اس کی گود میں رکھا ہوا پستول پرشور آواز سے فرش پر گر پڑا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس کا سیفٹی کیچ چڑھا ہوا تھا ورنہ گولی چل گئی ہوتی۔

پستول گرنے کے دھماکے پر توفیق اچھلا، چند ساعتوں کے لیے اس کی توجہ فرش کی طرف مبذول ہوئی اور میں نے ایک ہی جست میں اُسے جھاپ لیا۔

میرا داہنا ہاتھ مضبوطی سے اس کے دہانے پر جم گیا اور بائیں ہاتھ سے میں نے بآسانی خودکار ریوالور چھین لیا اور اُسے ساتھ لیے فرش پر گر گیا۔

خالدہ نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرش پر گرا ہوا پستول اُٹھا لیا۔

خوف اور دہشت سے توفیق کے بدن پر تشنج کی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں اور وہ میری داہنی ہتھیلی پر کاٹ کر اپنا دہانہ آزاد کرانے کی ناکام کوششوں میں مبتلا تھا۔

وہ جس شخص کے قتل کا منصوبہ بنا کر خالدہ کے فلیٹ میں آیا تھا۔ اس وقت وہی اس کے سینے پر سوار تھا۔

میں نئے وار کے لیے سنبھلا بھی نہ تھا کہ خالدہ نے پستول کا وزنی دستہ توفیق کی کھوپڑی کے وسط میں رسید کر دیا۔

کھٹ کی آواز کے ساتھ ہی توفیق کا بدن خاصی شدت سے اچھلا۔ وہ چیخ تو نہ سکا مگر میری ہتھیلی میں اپنے دانت پیوست کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

خالدہ کی لگائی ہوئی ضرب شدید تھی مگر نشانہ غلط تھا لہٰذا مجھے توفیق کی کنپٹی پر ایک جچا تلا ہاتھ رسید کرنا پڑا اور وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔

"اُف۔ کیا بھیانک خواب تھا۔" مجھے توفیق کے بدن پر سے اُترتے ہوئے خالدہ کی آواز سنائی دی۔

"ہم موت کے دہانے سے نکلے ہیں۔" میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر ہنستے ہوئے کہا۔ "اس نے میری عقل بھی ماؤف کر دی تھی۔ مگر پھر اس نے خود ہی میرے مقابلے میں حکومتوں کی ہار کا ذکر کر کے مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔"

میرے بدن سے لگا ہوا اُس کا پورا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ "تت۔۔۔ تمھاری باتیں بہت دہشتناک تھیں۔۔۔ تم واقعی صفدر علی ہو، تم نہ ہوتے تو میں شاید ریوالور کی دہشت ہی سے مر جاتی۔"

"تم لیٹ جاؤ۔" میں نے آہستگی سے اسے بستر پر ڈال دیا۔

"اس کا کیا ہو گا؟" اس نے بے ہوش توفیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"اسے میں لے جاؤں گا۔ آئندہ تم اس کی صورت بھی نہ دیکھو گی۔"

"تو کیا تم اسے مار دو گے؟" وہ ایک مرتبہ پھر سہم گئی۔

"اسے چھوڑ دیا گیا تو یہ تمھیں ضرور مار دے گا۔" میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "ایک بار تم دونوں کا آمنا سامنا ہونے کے بعد کسی ایک کو مرنا ہی ہو گا۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "میں ابھی تک اپنی طبیعت نہیں سنبھال سکی ہوں۔"

"میں خود بھی خاموش رہ کر یہ سوچنا چاہتا ہوں کہ اسے باہر کیسے لے جاؤں۔" میں یہ کہہ کر لاپرواہانہ انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم مجھے مارنے آئے تھے؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد خالدہ نے سحر زدہ آواز میں سوال کیا۔

"ہاں۔ وہ توفیق کی فرمائش تھی۔" میں نے اس سے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ "مگر تمہاری کہانی سننے کے بعد میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔"

"میں تمہاری احسانمند ہوں۔" اس کی آواز بھر آگئی۔ "تم واقعی افسانوی دنیا کے کوئی پُراسرار شہزادے معلوم ہوتے ہو۔"

"توفیق نے ہی تمہیں فوجی کیمپ سے فرار ہونے میں مدد دی تھی؟"

"ہاں، اس کا سارا انتظام اس قدر مکمل تھا کہ عملاً میں ٹہلتا ہوا کیمپ سے باہر آگیا اور کسی نے میری راہ نہیں روکی۔"

"یہ سب اس نے اس لیے کیا کہ تمہاری رہائی کی صورت میں وہ مجھے مقتول دیکھ رہا تھا۔" اس کی آواز اس وقت بھی سوگوار تھی۔

"ہاں، اسے شبہ بھی نہ رہا ہو گا کہ وہ صفدر علی کو فرار کرا رہا ہے، اس وقت تو میں معمولی درجہ کا ایک مشتبہ قیدی تھا۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے بستر پر لیٹی میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر حسرت آمیز لہجے میں بولی۔ "یہاں میرے قریب آجاؤ۔"

"یہ نہ ہو سکے گا۔" میں نے اٹھ کر اس کی طرف اپنی پشت گھما لی۔

"بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جنہیں بے نقاب دیکھ لینے کے بعد بھی معصوم سمجھنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہارے قریب آ کر میں اپنی اس آرزو کو پامال کرنا نہیں چاہتا۔"

"پتہ نہیں تم میری تکریم کر رہے ہو یا تحقیر؟ بہر حال میں زندگی بھر تمہیں نہ بھول سکوں گی تم میرے محسن ہو۔"

"تحقیر کرتا تو یوں پیٹھ نہ دکھاتا۔" اس وقت میری نگاہوں میں سیتا گھوم رہی تھی۔

"مجھے تم زندہ کیوں چھوڑ رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔" میں دوبارہ اس کی طرف گھوم گیا۔

"میں تمہیں جان چکی ہوں، تمہارے لیے خطرات بھی پیدا کر سکتی ہوں۔" اس نے گویا مجھے اکسانے کی کوشش کی۔

"خطرات" میں ہنس دیا۔ "اس عمارت سے نکلنے کے بعد میں انسانوں کے ہجوم میں گم ہو جاؤں گا۔ اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔ حالانکہ مجھے تم سے ایسا کوئی حقیقی اندیشہ نہیں ہے اور یہ بھی بتا دوں کہ میری سیکڑوں تصاویر اسرائیلی حکام کے ذریعے اب تک مصری حکام تک پہنچ چکی ہوں گی۔"

"پھر تو توفیق بھی تمہارے لیے بے ضرر ہے۔ اسے کیوں ہلاک کر رہے ہو؟"

"تم بھول رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن یہ زندہ رہا تو تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"واقعی میں بھول گئی تھی۔"

توفیق کو خالدہ کے فلیٹ سے لے جانا مجھے خاصا دشوار نظر آ رہا تھا کیونکہ میرے پاس اپنی سواری بھی نہیں تھی۔

معاً مجھے وہ کار یاد آئی جس میں توفیق مجھے کیمپ سے شہر تک لایا تھا اور میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

اس کی جیبوں سے چند سو پونڈ پر مشتمل رقم کچھ کاغذات اور وزیٹنگ کارڈز کے علاوہ کار کی چابیاں بھی برآمد ہوئیں۔ میں نے رقم خالدہ کے حوالے کی، کاغذات وغیرہ جلا کر تلف کر دیے اور خود نیچے چلا گیا۔

توفیق کے بھائی کی کار اس عمارت سے کافی دور ایک گلی میں کھڑی ہوئی تھی میں اطمینان سے اسے اسٹارٹ کر کے خالدہ والی عمارت کے قریب لے آیا۔

میں دوبارہ اوپر پہنچا تو خالدہ خاصی وحشت زدہ نظر آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی میں توفیق دو مرتبہ کراہ کر پہلو بدل چکا تھا۔ اور وہ خوفزدہ تھی کہ اگر توفیق میری واپسی سے پہلے ہوش میں آ گیا تو وہ مشکلات میں گھر جائے گی۔

میں نے توفیق کے بدن کو کئی مرتبہ ہلایا جلایا مگر اس نے کسی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا پھر بھی میں نے احتیاطاً اس کی کنپٹی پر ایک اور ضرب رسید کر ہی دی۔

پھر میں نے خالدہ کی مدد سے توفیق کو ایک اونی چادر میں اس طرح لپیٹا کہ اس کا چہرہ چھپ کر رہ گیا۔ اور پھر اس کی داہنی بغل میں سہارا دے کر اسے اپنے قدموں پر اس طرح کھڑا کر دیا کہ اس کا سارا بوجھ مجھ پر آ گیا۔

اب وہ بادی النظر میں کوئی علیل شخص معلوم ہو رہا تھا جو اپنے تیماردار کے سہارے باہر جانے کے لیے تیار ہو۔

"پھر کبھی آؤ گے؟" مجھے روانگی کے لیے تیار پا کر خالدہ نے دل گرفتہ لہجے میں سوال کیا۔

"اگر موقع ملا۔"

دونوں آتشیں ہتھیار میں پہلے ہی توفیق کی جیبوں میں ڈال چکا تھا۔ بس میرے پرانے کپڑوں کا بنڈل فرش پر پڑا رہ گیا تھا جو میرا اشارہ پا کر خالدہ نے مجھے تھما دیا۔

خالدہ نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور میں اس کی طرف دیکھے بغیر آہستہ آہستہ باہر راہداری میں نکل گیا۔

توفیق کا وزن اتنا زیادہ نہیں تھا اور اگر ہموار راستے کا معاملہ ہوتا تو شاید مجھے ذرا بھی دقت نہ ہوتی مگر سیڑھیوں پر ایک بے ہوش شخص کو اس کے قدموں پر سنبھالنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔

وہ تو غنیمت تھا کہ خالدہ کا فلیٹ صرف تیسری منزل پر واقع تھا۔ اور سیڑھیاں بھی بالکل ویران پڑی ہوئی تھیں۔

نیچے پہنچنے تک میرا سانس بُری طرح پھول گیا۔ آخری سیڑھی طے کرنے کے بعد میں نے چند ثانیوں تک رک کر اپنا سانس درست کیا پھر ایک ہی سانس میں توفیق کو لیے ہوئے مورس کار تک پہنچ گیا۔

مجھے دیکھ کر گلی میں کھیلتے ہوئے بچے چونکے مگر ان کے آنے سے پہلے ہی میں نے توفیق کو عقبی نشست پر لٹا دیا۔ اپنے پرانے کپڑوں کا بنڈل بھی میں نے عقبی پائیدان میں ڈال دیا تھا۔

قدرے توقف کے بعد مورس کار تیزی کے ساتھ آگے روانہ ہو گئی۔ مجھے قاہرہ کے راستوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا بس میری پوری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح کسی ویران شاہراہ پر پہنچ جاؤں۔

ڈیش بورڈ میں لگا ہوا فیول گیج ٹنکی کی قابل اطمینان حالت ظاہر کر رہا تھا اور میں پورے اعتماد سے کار ڈرائیو کیے جا رہا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے کی جدوجہد کے بعد میں جنوب مشرق میں حلوان اور الصف کی طرف جانے والی ویران شاہراہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا یہ شاہراہ ویران ضرور تھی مگر اس کے اطراف میں سبزہ اور باغات کا سلسلہ بھی موجود تھا اور آخر کار میں نے ایک جگہ مورس جھاڑیوں میں اتار دی۔

چند سو گز دور تک ناہموار زمین پر کار ڈرائیو کرنے کے بعد میں نے انجن بند کر دیا۔ اور پھرتی سے عقبی نشست پر پہنچ گیا۔

توفیق کے بدن سے اونی چادر اتارنے کے بعد میں نے پہلے اسے ریوالور سے ہلاک کرنے کی ٹھانی مگر فائر کا شور کسی کو اس طرف متوجہ کر سکتا تھا لہٰذا میں نے اس کی کنپٹیوں پر دو تین زوردار ضربیں لگائیں پھر اس کے گلے پر ایک کپڑا ڈال کر دونوں ہاتھوں سے اس کا نرخرا دبوچ لیا۔ سانس گھٹتے ہی توفیق کا ساکت بدن بُری طرح تڑپا مگر میں اس کے سینے پر سوار تھا۔ وہ میری گرفت سے کسی طرح نجات نہ پا سکا۔ زندگی کے لیے اس کی جدوجہد بہت قلیل مدت میں دم توڑ گئی اور دو لاکھ پونڈ کے سرکاری انعام کے لالچ میں صفدر علی پر ہتھیار اٹھانے والا مورس کار کی عقبی نشست پر عبرت اور شکست کا مرقع بنا پڑا رہ گیا۔

اس وقت میں غیر مسلح تھا لہٰذا میں نے توفیق کی جیب سے پستول نکال لیا۔ البتہ اس کا سروس آٹومیٹک اسی کی جیب میں چھوڑ دیا پھر میں نے اخباری کاغذ کا بنڈل کھول کر خالدہ کی اونی چادر اپنے پرانے لباس کے ساتھ لپیٹی اور جھاڑیوں میں چھپتا ہوا واپس چل دیا۔

واپسی میں میری کوشش یہ رہی کہ حتی الامکان سڑک کے متوازی چلتا رہوں اور جب راستہ دشوار گزار ہو جائے تو عموداً مڑ کر چند منٹ میں سڑک پر پہنچ سکوں۔ جھاڑیوں کے درمیان زمین خاصی نرم اور ریتلی تھی پھر مجھے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے بنڈل کا بوجھ بھی گراں گزر رہا تھا۔ لہٰذا ایک جگہ میں نے وہ بنڈل گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال دی تھوڑی ہی دیر میں وہ بنڈل ہمیشہ کے لیے زمین کی آغوش میں گم ہو چکا تھا۔

خاصی دیر بعد میں نے سڑک کا رخ کیا مگر جب چلتے چلتے کافی وقت گزر گیا تو مجھے تشویش ہونے لگی، غالباً میں سڑک سے کافی دور ہٹ چکا تھا۔

اس ویران خودرو جنگل میں بھٹکتے ہوتے مجھے تقریباً شام ہو چلی تھی کہ میرے کانوں میں ایک ٹرک کے انجن کا مدھم سا شور آیا اور میں نے رک کر اپنی پوری توجہ اس شور کی سمت کے تعین پر مرکوز کر دی۔

اس اندازے کی بنا پر مجھے بائیں طرف گھومنا پڑا۔ اور تقریباً بیس منٹ بعد میں سڑک پر آ چکا تھا۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ اگر میں بائیں طرف گھومے بغیر سیدھا چلتا رہتا تو ساری رات اسی جنگل میں بھٹکتا رہتا۔

سڑک ضرور مل گئی تھی مگر اب قاہرہ پہنچنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ اس سمت میں چلنے لگا جو میرے اندازے کے مطابق مجھے بحفاظت قریب تر لے جانے والی تھی۔

شام کا دھندلکا پھیلنے سے قبل مجھے عقب میں کسی انجن کی دھیمی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ کوئی نجی کار تھی جس میں اگلی نشست پر کم از کم دو افراد موجود تھے۔ میں نے اسے روکنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مگر کار والے اس ویران شاہراہ پر میری موجودگی کو نظر انداز نہ کر سکے۔ اور وہ کار میرے قریب آ کر رک گئی۔

میں پھرتی سے مڑا تو کار کی کھڑکی میں سے جھانکتا ہوا ایک ادھیڑ عمر مردانہ چہرہ میری طرف متوجہ تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس کی آواز نرم اور ہمدردانہ تھی۔

"قاہرہ۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"قاہرہ؟" اس شخص کی آواز تحیر آمیز تھی "جانتے ہو تم اس وقت قاہرہ سے کتنے فاصلے پر موجود ہو؟"

میں نے بے بسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اتنا اندازہ ضرور ہے کہ پیدل چل کر صبح سے پہلے وہاں نہ پہنچ سکوں گا میرے دوست شرارت میں مجھے یہاں اتار کر بھاگ لیے تھے۔ ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد واپس آ جائیں۔"

"لعنت ہے ایسے مذاق پر۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "آؤ میں تمہیں پہنچا دوں گا۔"

میں اس نیک دل انسان کا شکریہ ادا کر کے عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر کے برابر میں بیٹھا ہوا نوجوان لڑکا گہری، پر اشتیاق نظروں سے میرا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔

"تم مصری ہو؟" کار روانہ ہونے کے بعد لڑکے نے سوال کیا۔

"اردنی۔" میں نے مختصر سا جواب دے کر جلدی سے موضوع تبدیل کر دیا۔ "شاید تم دونوں باپ بیٹے ہو؟"

"یہ بھتیجا ہے میرا۔" لڑکے کے بجائے ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا۔ "مگر اپنی سگی اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔"

"تم قاہرہ میں ہی رہتے ہو؟" میری پوری کوشش یہ تھی کہ ان کے ذہنوں کو کسی نہ کسی طرح الجھائے رکھوں تا کہ ان دونوں کو میرے بارے میں زیادہ سوچنے اور کریدنے کی مہلت نہ مل سکے۔

"قاہرہ میں بھی مکان ہے مگر ہم زیادہ تر زرعی زمینوں پر رہتے ہیں۔ پرسوں ہماری واپسی ہو گی، چاہو تو ہمارے ساتھ آ جانا۔" ادھیڑ عمر شخص ہمدرد کے ساتھ خاصا فراخدل بھی معلوم ہو رہا تھا۔

سارے راستے میں ان دونوں کو باتوں میں الجھائے رہا یا آخر تقریباً چالیس منٹ کے بعد کار قاہرہ میں داخل ہو گئی۔

"کہاں رہتے ہو؟ گھر پر اتار دوں گا۔" ادھیڑ عمر نے ازراہ اخلاق پیش کش کی جسے میں نے نرمی سے ٹال دیا۔

"مجھے بازار میں کچھ کام ہے، اس کے بعد گھر جاؤں گا۔"

اور اس نے میری درخواست پر ایک جگہ کار روک دی میرے اترنے سے قبل مجھے اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا جس پر اس کا قاہرہ کا پتہ اور فون نمبر بھی درج تھا اور میں گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

وہ کار آگے بڑھ جانے کے بعد میں ایک بار میں جا پہنچا۔ وہاں تلخ سیال کے دو پیگ معدے میں انڈیلنے کے بعد سینڈوچ وغیرہ سے شکم پری کی اور باہر آگیا۔

جس وقت میں عبدالکمال کے گھر پر دستک دے رہا تھا تو میری رسٹ واچ رات کے نو بجا رہی تھی۔

عبدالکمال کے چہرے پر پھیلے ہوئے تردد کے آثار مجھے دیکھتے ہی دور ہوگئے اور اس نے مجھے فوراً نشستگاہ میں بلالیا۔

اس کمرے میں گھستے ہی میں چونک پڑا اور کچھ یہی کیفیت ہاشم کی بھی ہوئی جو ایک گوشے میں بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔

ہم دونوں نہایت تپاک سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہاشم کی آنکھیں سرخ اور ورم آلود نظر آرہی تھیں۔

"یہ کیا حال بنا یا ہوا ہے تم نے اپنا؟" میں نے ہاشم کے ساتھ فرشِ قالین پر بیٹھتے ہوتے سوال کیا۔

"تمہاری وجہ سے میری نیندیں حرام ہو چکی ہیں"۔ وہ مسکراتے ہوتے بولا۔" یہ بتاؤ کہ اس نئی مشکل کا کیا رہا جو تم مول لینے گئے تھے"۔

"بار بار عبدالکمال کے الفاظ یاد آتے رہے"۔

"وہ کیا؟" اس بار عبدالکمال ہی بولا تھا۔

"کسی کو خدائی فوجدار نہ بننا چاہیے"۔ میں نے کہا۔" اس لڑکی کے فلیٹ میں اس کا شوہر بھی آدھمکا۔ میری زندہ یا مردہ گرفتاری پر دو لاکھ کا انعام مقرر ہوتے ہی اس کی نیت خراب ہوگئی اور وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کے چکر میں پڑ گیا"۔

"پھر نتیجہ کیا رہا؟" ہاشم انجام کے بارے میں مضطرب تھا۔

"اس شخص کی لاش الصف سے آگے ویران جھاڑیوں میں پڑی ہوگی، میں بمشکل اس سے اپنی گلوخلاصی کرا سکا"۔

مگر میری اختصار گوئی کام نہ آسکی۔ ان دونوں نے پوری تفصیل سنے بغیر کوئی اور بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"جو کچھ ہوا بہتر ہی ہوا" ہاشم ایک گہرا سانس لے کر بولا۔" عبدالکمال کو تمہاری گرفتاری پر انعام مقرر ہونے کی خبر نہیں ملی تھی ورنہ یہ تمہیں باہر قدم بھی نہ نکالنے دیتا"۔

"ہاشم تمہاری اور سیتا کی فکر میں دو راتوں سے جاگ رہا ہے" عبدالکمال نے میری پشت پر ہاتھ مارتے ہوتے کہا" تم جس طرح اقبالی مجرم بنے تھے۔ اسے تمہاری گلوخلاصی کی خفیف سی امید بھی نہیں رہی تھی"۔

"میرا تذکرہ چھوڑو۔ میں تو اب تمہارے ساتھ موجود ہوں"۔ میں نے کہا۔" یہ بتاؤ کہ سیتا کے بارے میں کیا خبر ملی ہے؟"

"اس کے لیے بھی انعام مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے فرار کے سلسلے میں غفلت برتنے پر ایک میجر جنرل اور اس کے تین نائبین کو معطل کیا جا چکا ہے"۔ ہاشم نے کہا۔

"مگر وہ خود کہاں ہے؟"

"اس کے ساتھ دو لیبی لڑکے بھی تھے۔ جاسم اور حسین"۔ ہاشم پُرخیال لہجے میں بولا۔" جاسم آج رات لیبیا واپس چلا گیا ہوگا۔ حسین شاید ابھی تک سیتا کے ساتھ ہے"۔

"تمہاری جاسم سے ملاقات ہوئی ہے؟"

"نہیں، اس کے ماموں نے اسے کسی سے نہیں ملنے دیا۔ وہ یہیں رہتا ہے"۔ ہاشم بتانے لگا۔" اس کی زبانی یہ ضرور معلوم ہوا کہ سیتا نے قاہرہ پہنچنے کے بعد ان دونوں کو واپسی کے لیے مجبور کیا تھا مگر وہ نہ مانے۔ محاصرے سے نکلنے کے بعد جاسم تو سیتا کے مشورے کا قائل ہوگیا اور سیدھا اپنے ماموں کے گھر پہنچ گیا مگر حسین اب بھی آخری سانس تک سیتا کا ساتھ دینے پر مصر ہے"۔

"اس پر عاشق تو نہیں ہوگیا؟" میں نے بظاہر ہنستے ہوتے سوال کیا مگر میں نے اپنے وجود میں حسد کی تپش سی ابھرتی محسوس کی تھی۔

"ایسے نہیں"۔ ہاشم بے ساختہ بولا۔" گو ان کی عمروں میں بڑا معمولی سا فرق ہے مگر جاسم کے ماموں کے بیان کے مطابق حسین کسی بزرگ کی طرح سیتا کا احترام کرتا ہے۔ پھر تمہاری بیوی بھی اس معاملے میں بہت سخت ہے"۔

"سیتا کا تازہ پروگرام کیا ہے؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا"۔ جاسم بولا۔" محاصرے کی حالت میں تمہاری آواز سن کر وہ یہی سمجھی تھی کہ تم پکڑے جا چکے ہو اور تمہارے بیانات کی روشنی میں حکام کسی اور شخص سے اسے ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دلوا رہے ہیں۔ اس وقت وہ قاہرہ میں رک کر تمہیں سرکاری قید سے رہائی دلانے کا عزم رکھتی تھی"۔

"جاسم سے میری ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"نہیں، لیبیا تمہارے لیے چوہے دان ثابت ہوگا"۔

"ان لوگوں کے محصور ہونے کی نوبت کیسے آگئی؟"

"ان تینوں کو خود حیرت تھی"۔ ہاشم بولا۔" محاصرے سے پہلے انہیں شبہ بھی نہ ہو سکا تھا۔ دراصل ان تینوں نے اسی روز اس عمارت میں ایک خالی فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔ شاید مالک مکان یا کسی اور کو ان پر شبہ ہوگیا ہوگا"۔

"جاسم اور حسین کے بارے میں مقامی حکام کو بھی علم ہوگا؟"

"نہیں"۔ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔" یہ ساری معلومات تو میں نے بمشکل جمع کی ہیں۔ البتہ پولیس وغیرہ کو یہ یقین ہے کہ سیتا تنہا نہیں ہے"۔

"البرنو کا ستیلا نواد وسیتا کے تصادم کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"

ہاشم ایک دم اچھل پڑا۔" اس معاملے کو تو میں بھلا ہی بیٹھا تھا۔ جاسم نے بتایا تھا کہ سیتا کے چہرے پر کہیں سے خراشیں آگئی تھیں شاید کسی نے ان خراشوں کو دیکھ کر ہی اس پر شبہ کیا ہوگا کیونکہ البرنو کے قتل کے سلسلے میں کسی زخمی قاتلہ کا امکان بہت اُچھالا گیا تھا۔ پولیس اس عمارت میں زخمی چہرے والی ایک عورت کی موجودگی کی خبر پاتے ہی فوج کی مدد سے وہاں چڑھ دوڑی ہوگی"۔

"صفدر نے البرنو کے بارے میں کچھ پوچھا تھا"۔ عبدالکمال نے اسے ٹوکا۔

"سیتا نے جاسم اور حسین کو صرف اتنا بتایا تھا کہ اس نے اپنے ایک بڑے دشمن کا صفایا کر دیا، زخموں کے سبب یا دشمن کے بارے میں کوئی بات نہیں کی"۔

"اس کے ماموں سے ایک بار اور مل لو"۔ میں نے کہا۔" ہو سکتا ہے کہ جاسم کسی وجہ سے آج رات لیبیا نہ جا سکا ہو"۔

"وہ قاہرہ میں لیبیا کی فضائی کمپنی کا اسٹیشن منیجر ہے اور اپنے مہم جو بھانجے کی سلامتی کی طرف سے بہت فکرمند تھا، اس نے ہر قیمت پر جاسم کو روانہ کر دیا ہوگا"۔

"پھر اب میں سیتا کو کہاں تلاش کروں؟"

ہاشم نے سر جھکا لیا۔" میں کیا کہہ سکتا ہوں، یہ مقدر کی ہی بات ہے کہ تم دونوں میاں بیوی ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دُور ہو"۔

"میں تو جلد از جلد مصر سے نکلنا چاہ رہا تھا مگر تم بتا رہے ہو کہ سیتا مصر میں رہ کر مجھے تلاش کرے گی، ایسی صورت میں مجھے بھی یہاں رکنا پڑے گا"۔

"اس چار دیواری میں تم بالکل محفوظ ہو"۔ عبدالکمال نے کہا۔" خطرہ باہر نکلنے میں ہے، گھر میں رہ کر بھی تم حالات کا انتظار کر سکتے ہو"۔

"قاہرہ میں حسین کے بھی کچھ رشتے دار ہیں"۔ ہاشم نے کہا۔" میں ان کے سراغ میں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ حسین نے ان میں سے کسی سے رجوع کیا ہو۔ اس کی بہن کا مصری شوہر یہاں ہماری تنظیم کا بہت فعال رکن ہے مگر دو روز سے وہ بھی لاپتہ ہے۔ حسین کسی سے ملا ہو یا نہ ملا ہو، اس کے پاس ضرور پہنچا ہوگا"۔

"کوئی سراغ ملنا بہت ضروری ہے"۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔" ابھی سیتا کے چہرے پر خراشیں باقی ہیں۔ ان کے مندمل ہونے سے قبل وہ باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ کیونکہ ایک معرکہ وہ بھگت چکی ہے"۔

"یہ میں بھی جانتا ہوں برادر!" ہاشم ناصحانہ لہجے میں بولا۔" میں تمہاری احمقانہ گرفتاری کی خبر سن کر ہی یہاں آیا تھا۔ مگر زیادہ فکر مجھے سیتا کی تھی"۔

"میرے اقدام کو احمقانہ مت کہو"۔ میں نے کھلے الفاظ میں احتجاج کیا۔" تم برسوں سے گھر کے سکون کو ترسے ہوئے انسان کی دلی کیفیت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے"۔

"میں بھی گھر بار چھوڑ کر مدت سے بن غازی میں پڑا ہوا ہوں"۔

"وہ درست ہے مگر تمہارا ایک گھر ہے اور تم جانتے ہو کہ جب چاہو وہاں جا کر سکون و راحت کی چند گھڑیاں بسر کر سکتے ہو۔ سکون اور طمانیت کا یہ احساس بجائے خود بہت عظیم ہوتا ہے جب کہ مجھے تو آج تک اپنا گھر بسانے کا موقع ہی نہیں مل سکا"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو"۔ عبدالکمال نے لقمہ دیا۔" میں تو اس جذبے کو آفرین کہتا ہوں جس کے تحت تم دونوں میاں بیوی مدت سے ایک دوسرے کی تلاش میں دربدر مارے مارے پھر رہے ہو۔ ورنہ اتنی طویل جدائی تو خون کے رشتے تک بھلا دیتی ہے"۔

"مجھے دکھ ہے ہاشم! مجھے بڑا دکھ ہے ان لمحوں کا جب ایک طرف مسلح سیتا تھی اور دوسری طرف اس کا پابجولاں شوہر مگر وہ اپنے شوہر کی آواز نہ پہچان سکی"۔ میں نے کرب آلود لہجے میں کہا۔" اس وقت میں یک بیک ایک ایسا ننھا سا بچہ بن گیا تھا جو مدت سے کسی کھلونے کو ترسا ہوا ہو۔ میں نے جب فوجیوں کے سامنے اپنے صفدر علی ہونے کا اعتراف کیا تو میرے دل میں جیل خانے کے در و دیوار کے لیے بھی محبت پیدا ہوگئی تھی کیونکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ سیتا کے ساتھ میں سب سے پہلے وہی چار دیواری آباد کروں گا"۔

"گزرے ہوئے لمحوں کو بھول جاؤ برادر"۔ ہاشم بولا۔" ماضی کی یادیں انسان کے حوصلے کو دیمک بن کر چاٹ جاتی ہیں"۔

"جاسم چلا گیا۔ سیتا لاپتہ ہے، حسین کا بہنوئی ملتا نہیں تو بتاؤ پھر میں کیا کروں؟" میرے لہجے میں اپنی ذات کے سارے دکھ سمٹ آتے۔ "اس کا نام پتہ مجھے بتاؤ۔ میں کہیں نہ کہیں اسے تلاش کر لوں گا"۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ تم اس مکان سے باہر قدم نہیں نکالو گے"۔ ہاشم کا لہجہ سخت ہوگیا۔" نہ جانے تمہارے اعصاب کو کیا ہوگیا ہے۔ میں تو تم کو بہت مضبوط اور ناقابلِ شکست انسان سمجھتا رہا ہوں"۔

"برا نہ ماننا لیکن یہ بتا دوں کہ اگر تمہارے ہی مشوروں پر چلتا رہتا تو ابھی تک بن غازی میں ہی کسی گیدڑ کی طرح دبکا رہتا"۔

"میں مانتا ہوں" اس نے فوراً ہی اعتراف کر لیا۔" لیکن اس وقت تمہارے لب و لہجے سے مایوسی کی بو آرہی ہے۔ اس وقت تم بڑا امید تھے"۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے"۔ عبدالکمال نرم لہجے میں بولا۔" ایک آدھ دن انتظار کر لو۔ اگر اس دوران میں خطرات کچھ کم ہوگئے تو تم بھی باہر جا سکو گے"۔

"میں بھی بندوبست کروں گا"۔ ہاشم نے نرمی سے کہا۔" میں اپنے ایک آدھ صحافی دوست کے ذریعے اخبارات میں ایسی اطلاعات بھی شائع کرا دوں گا جن کی بنا پر یہ شبہ ہو سکے کہ صفدر علی مصر سے بوکھلا کر کسی اور ملک میں چلا گیا ہے۔ بن غازی کے مقابلے میں قاہرہ میں

ہمارے پاس زیادہ وسائل موجود ہیں۔"

"میں صرف دو دن انتظار کروں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس کے بعد یا تو تم میرے ارادوں کی تکمیل میں میری مدد کرو گے یا ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جائیں گے۔"

"ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔" عبدالکمال بولا۔ "دوستی اس لیے نہیں کی کہ مشکل وقت آ پڑے تو ہم آنکھیں بدل لیں۔"

"تم دونوں کی اپنی بھی ذمہ داریاں ہیں، بیوی، بچے، تنظیم اور پھر قانون!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ان سب سے واقف ہوں، میں تمہیں اپنے مسائل سے اتنا زیر بار کرنا نہیں چاہتا کہ تم ان سب کو بھولنے پر مجبور ہو جاؤ۔"

"تلخی اختیار نہ کرو!" یہ آواز ہاشم کی تھی۔ "میں قانون شکن بھی ہوں مگر انتہائی ضرورت کے بغیر قانون سے ٹکرانا حماقت سمجھتا ہوں۔"

میرے الفاظ پر اس کے ذہن میں چھپا ہوا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ کیونکہ اس نے لیبیا سے نکلنے کے سلسلے میں قانون کی آڑ لے کر مجھے اپنے اقدامات سے روکنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"میں طنز نہیں کر رہا۔" میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ دبا کر نرم لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں صرف اپنی سوچ سے آگاہ کر رہا تھا۔"

"تمہاری سوچ جو کچھ بھی ہو لیکن یہ یاد رکھنا کہ ہم آخری وقت تک تمہارا ساتھ دیں گے، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو!" ہاشم نے کہا۔

"یہ تمہاری شرافت ہے۔" میں نے کہا۔ "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔"

"کہہ ڈالو۔"

"انتظار کے دو دن اس مکان کے بجائے میں کہیں اور بسر کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہاں؟" ان دونوں نے بیک زبان سوال کیا۔

"مریم ــــ" میں نے کہا۔ "وہ ایک فلسطینی دوشیزہ ہے، میرا خیال ہے کہ اس کی رفاقت میں میرا وقت بہتر گزر سکے گا۔"

"وہ قاہرہ میں ہی ہے؟" یہ سوال عبدالکمال نے کیا تھا۔

"میرے پاس اس کا فون نمبر موجود ہے۔" میں نے کہا۔

میرا ذہنی انتشار ان دونوں پر صاف ظاہر تھا، انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنی عافیت کے لیے میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

ان دونوں کے ایما پر میں نے وہیں سے مریم کے دیئے ہوئے نمبر ملائے اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز ہی سنائی دی۔ اگر وہ آواز مردانہ ہوتی تو مریم کی ہدایت کے مطابق مجھے کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کرنا ہوتا۔

"مصطفےٰ المرزوق۔" میں نے نسوانی آواز سنتے ہی ماؤتھ پیس میں کہا۔ "میں مس مریم سے بات کرنی چاہتا ہوں۔"

"میں بول رہی ہوں۔" اسی آواز نے کہا۔ "تم دو تین روز سے کہاں غائب تھے؟"

"مچھلی کے شکار پر چلا گیا تھا۔" میں نے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی پھنسی؟" ترنم قہقہے کے ساتھ سوال کیا گیا۔

"نہیں پھنسی جب ہی تو تمہیں فون کیا ہے۔" میں نے برجستہ کہا۔ "میں فوراً تمہارے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

"چلے آؤ، میں منتظر ہوں۔"

"پتے کے بغیر تو شاید میں عالم بالا میں بھی صحیح مقام پر نہ پہنچ سکوں۔" میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"میں القاہرہ کے اٹھارہویں کمرے میں مقیم ہوں، تم کتنی دیر میں آ رہے ہو؟" اس کے لہجے سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

"نصف گھنٹے میں۔" میں نے کہا۔

جواب میں ریسیور پر خوشی کی چہکار سنائی دی اور پھر فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ہاشم اور عبدالکمال ہونقوں کی طرح میرا چہرہ تک رہے تھے۔

"نصف گھنٹے میں کہاں پہنچنا ہے؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"القاہرہ!" میرا جواب نہایت مختصر تھا۔

"وہاں کون ہے؟" یہ سوال عبدالکمال نے کیا تھا۔

"مریم نامی فلسطینی لڑکی جو حسین بھی ہے نمکین بھی۔"

"عیسائی ہے؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"چکھے بغیر کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" ہاشم برا سا منہ بنا کر بڑبڑایا۔ "تمہارے دماغ میں واقعی خلل پیدا ہو چکا ہے۔ تمہیں ضرور القاہرہ جانا چاہیئے۔"

"ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے تم کسی دشواری سے دوچار ہو جاؤ۔" عبدالکمال نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے نام وغیرہ کی تشہیر ضرور کی گئی ہے لیکن ان تمام اشتہاروں میں میری پرانی تصاویر ہی لگائی گئی ہوں گی۔ نئی تصویر تو لینے کی زحمت ہی نہیں کی گئی تھی۔ وہ مجھ پر ذرا بھی شبہ نہ کر سکے گی۔" میں نے لاپرائی سے کہا۔

"عبدالکمال درست کہہ رہا ہے۔" ہاشم نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "مجھے مریم مشکوک نظر آتی ہے۔"

"وہ کیسے۔" میرا سوال فطری تھا۔

"اس کا دیا ہوا نمبر ملانے پر تمہاری براہ راست اسی سے بات ہوئی تھی؟" ہاشم نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں ـــــ تم خود سن رہے تھے۔" میں نے کچھ نہ سمجھنے والے ا

میں کہا۔

"اسی لیے تو شبہ ہو رہا ہے۔" وہ بولا۔ "میں خود القاہرہ میں مقیم ہوں اور دوسرے ہوٹلوں کی طرح وہاں بھی کمروں میں براہِ راست فون نہیں ہیں۔ بلکہ آپریٹر کے ذریعے بات ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس وقت القاہرہ کے بجائے کہیں اور موجود ہے اور تمہیں نمبر بھی اسی جگہ کا دیا ہوا ہے۔ مگر اب وہ تم سے پہلے القاہرہ پہنچ جائے گی۔"

"اس بات کی تو تصدیق بھی کی جاسکتی ہے۔" عبدالکمال نے کہا۔ "چند منٹ بعد وہ القاہرہ کے لیے روانہ ہو چکی ہوگی، تمہیں اس نمبر سے کوئی جواب نہیں ملے گا۔"

ان کی گفتگو نے مجھے الجھا دیا۔ "فرض کرو کہ تمہاری بات درست ہی ہو تو پھر تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کر رہے ہو۔"

"اگر وہ کہیں اور مقیم ہے تو تمہیں القاہرہ کیوں بلا رہی ہے؟" یہ نکتہ ہاشم نے پیدا کیا تھا۔ "اگر وہ کسی اور کے ساتھ تھی تو تمہیں باآسانی ٹال سکتی تھی لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ تم سے ملاقات کا موقع ضائع کرنا نہیں چاہتی —— آخر کیوں؟ اسے تمہاری ذات سے ایسی کیا دلچسپی ہے کہ وہ اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے القاہرہ پہنچنے پر آمادہ ہو گئی۔"

"تمہاری بات منطقی ہے مگر میں اتنا ضرور بتا دوں کہ اس سے میری سرسری سی ملاقات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تنہائی کا شکار ہو۔"

"بقول تمہارے وہ حسین بھی ہے اور نمکین بھی۔" ہاشم بحث پر آمادہ تھا۔ "قاہرہ میں ایسی لڑکی کبھی تنہائی کا شکار نہیں ہو سکتی۔"

"میں اس قضیے کو ابھی نمٹائے دیتا ہوں۔" میں نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ذرا القاہرہ کا نمبر تو بتاؤ کہ کیا ہے۔"

شاید وہ دونوں ہی میرا ارادہ بھانپ گئے اور عبدالکمال نے پھرتی سے القاہرہ کا نمبر تلاش کر کے مجھے بتا دیا۔

"مس مریم۔" میں نے القاہرہ کا نمبر مل جانے پر آپریٹر سے کہا۔

دوسری طرف چند ثانیوں خاموشی رہی، شاید وہ ہوٹل میں مقیم مسافروں کی فہرست پر نظر دوڑا رہی تھی۔

"کس کمرے میں ہیں وہ؟" توقف کے بعد آپریٹر کی نرم آواز سنائی دی۔

"کمرہ نمبر اٹھارہ۔" میں نے مریم کا بتایا ہوا نمبر دہرا دیا۔

"اس کمرے میں تو مسٹر اور مسز بیرنگٹن مقیم ہیں۔"

میں نے معذرت کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہاشم کے پیدا کیے ہوئے شبہ کی پہلی کڑی درست ثابت ہو چکی تھی۔

"کیا ہوا؟" مجھے کریڈل دباتے دیکھ کر ہاشم اور عبدالکمال نے تقریباً بیک آواز مجھ سے سوال کیا۔

"وہ القاہرہ میں نہیں ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے وہ نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا جس پر کچھ دیر قبل مریم سے بات ہوئی تھی۔

دوسری طرف تیسری گھنٹی کے بعد ریسیور اٹھایا گیا اور میرے کانوں میں ایک تھکی ہوئی سی مردانہ آواز گونج اٹھی۔

"مس مریم!" میں نے اپنے لہجے کو اعتدال پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کون بول رہا ہے؟" مردانہ آواز سے بیزاری مترشح تھی۔

"تم کون ہو؟" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر تلخ ہو گیا۔

"وہ میری داشتہ ہے —— سمجھے؟" دوسری طرف سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا گیا۔ "تمہیں کیا کام ہے؟"

"کام پوچھ کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے [illegible] میں کہا۔ "کہیں تم وہی ریٹائرڈ پائلٹ تو نہیں ہو جس نے بدحواسی [illegible] دوران پرواز طیارے میں آگ لگا دی تھی۔"

"تم الو کے پٹھے ہو۔" وہ اتنی زور سے چیخا تھا کہ مجھے ریسیور کان سے دور ہٹانا پڑ گیا۔ "میں دیکھوں گا کہ وہ تم سے کیسے ملتی [illegible]"

"ایسا ہی دعویٰ ہے تو یہ بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں گئی [illegible]" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں اس کی ذاتی مصروفیات کی نگرانی نہیں کرتا لیکن اتنا بتا [illegible] کہ وہ تم جیسے گھٹیا شخص سے ہرگز نہیں ملے گی۔" وہ آپے سے باہر جا رہا تھا۔

"تو کان کھول کر سن لو گول الو! کہ میں اس کی سب سے بڑی [illegible] مصروفیت ہوں اور تم طلائی پروں والے ایک بوڑھے گدھ!"

یہ کہہ کر میں نے اس کے غضبناک جوابات سنے بغیر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہاشم اور عبدالکمال کی مستفسرانہ نگاہیں میری طرف نگران [illegible]

"ہاشم کا خیال درست تھا۔" میں نے کہا۔ "شاید وہ میری خا[illegible] اب القاہرہ پہنچ کر کوئی کمرہ حاصل کرے گی ورنہ وہ اپنے کسی آشنا [illegible] ساتھ رہ رہی ہے۔"

"اس غیر معمولی دلچسپی کو تم کیا نام دو گے؟" ہاشم کا فاتحانہ لہجہ پسند نہیں آیا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جارحانہ انداز میں ماچس کی تیلی جلا کر سگ[illegible] سلگاتے ہوئے کہا۔ "عورت ایک ایسی گتھی ہے جسے آج تک کوئی [illegible] سلجھا سکا۔"

"مگر اس وقت بات صرف مریم کی ہے۔" عبدالکمال اس وقت [illegible] ہاشم کا ہمنوا نظر آ رہا تھا۔

"مریم بھی ایک عورت ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "اور میں [illegible] سے ملنے القاہرہ ضرور جاؤں گا۔ میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔"

"مسئلہ خوف کا نہیں، احتیاط کا ہے برادر۔" ہاشم نے غیر معمولی [illegible] سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "وہاں نہ جاؤ گے تو کیا بگڑ جائے گا؟"

"اور کچھ نہیں تو یہی معلوم ہو جائے گا کہ مجھ میں اس کی غیر معمولی [illegible] کا سبب کیا ہے۔" میں نے لاپروایانہ انداز میں کہا۔ "پھر میرے لیے [illegible]

دن خالی بیٹھ کر محض حالات کی بہتری کا انتظار کرنا کسی عذاب سے کم نہیں ہوگا۔"

"تم سے بحث بے سود ہے۔" ہاشم نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے قریب موجود رہوں گا۔ القاہرہ میں میرا کمرہ نمبر ایک سو چالیس ہے۔ خطرے کی صورت میں ہم ایک دوسرے سے فوری رابطہ قائم کرسکیں گے۔"

اس سمجھوتے کے بعد وہ نشست جلد ہی ختم ہوگئی اور میں عبدالکمال کو الوداع کہہ کر ہاشم کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

راستے میں ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ القاہرہ کی پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی کا انجن بند کرنے کے بعد اس سکوت کو ہاشم ہی نے توڑا۔ "خداحافظ ـــــ یہاں سے ہم اجنبیوں کی طرح ہوٹل میں داخل ہوں گے۔"

اس کی تجویز معقول تھی۔ میں ... آگے بڑھ گیا۔

القاہرہ اپنے نام کی طرح ایک پُرشکوہ ہوٹل تھا۔ میں اس کی داخلی راہداری میں سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔ میرا ارادہ براہِ راست اٹھارہویں کمرے کے دروازے پر دستک دینے کا تھا تاکہ میں بالکل انجان بن کر مریم کے ردِعمل کا جائزہ لے سکوں۔

لیکن مجھے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ مل سکا۔ مریم لفٹ کے قریب ہی میری منتظر تھی اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف آئی۔

"خیریت ہے تم یہاں نیچے کیا کررہی ہو؟" اس سے غیر متوقع طور پر سامنا ہونے کے باعث میں اپنے فطری ردِعمل پر قابو نہ پاسکا۔

"میرے ساتھ آؤ، اوپر چل کر سب بتادوں گی۔" وہ والہانہ انداز میں میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "میرا کمرہ نمبر غلط تھا۔"

وہاں پہلو بہ پہلو دو لفٹیں نصب تھیں۔ جونہی پہلی لفٹ نیچے آئی میں مریم کے ساتھ اس میں سوار ہوگیا۔ ہمارے ساتھ چند افراد اور بھی تھے۔ ان ہی میں ہاشم بھی شامل تھا۔

میں نے اس مردود پر بہت سرسری سی نگاہ ڈالی۔ وہ بالکل لاتعلقانہ انداز میں اس متحرک کمرے میں موجود تھا مگر میری دانست میں وہ میرے لیے ضرورت سے زیادہ ہمدردی کے اظہار پر تلا ہوا تھا۔

"کس کمرے میں جانا ہے؟" میں نے محض ہاشم کو سنانے کے لیے مریم سے سوال کیا۔

"چار سو چار!" اس نے لفٹ کا چوتھی منزل کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ لفٹ پہلی منزل پر رکی تو ہاشم اتر گیا۔ میرا کمرہ نمبر معلوم ہوجانے کے بعد وہ مزید زحمت سے بچ گیا تھا اور مجھے اس کی عدم موجودگی سے آزادی کا احساس ملا تھا۔

چوتھی منزل پر لفٹ سے اترنے والے صرف ہم دونوں تھے۔

"تم نے تو کمرہ نمبر اٹھارہ بتایا تھا۔" میں نے راہداری میں بچھے ہوئے دبیز قالین پر چلتے ہوئے مریم سے سوال کیا۔

"میں نے یہ کمرہ تمہارے آنے سے چند لمحے پہلے بُک کرایا ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میرے پاس کوئی اور بھی موجود تھا مگر میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔"

"سرخاب کے پر لگے ہیں مجھ میں؟"

"تمہاری ذات سے یک بیک میرا مستقبل وابستہ ہوگیا ہے۔" وہ کمرہ نمبر چار سو چار کے دروازے کا قفل کھولتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

اس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا مگر میرے قدم زمین پر جم کر رہ گئے کیونکہ اس کی بات بہت معنی خیز تھی۔ مصری حکومت نے میری زندہ یا مُردہ گرفتاری کے لیے ایک خطیر انعام کا اعلان کیا تھا اور وہ رقم مریم کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوسکتی تھی۔

"میری ذات سے تمہارا مستقبل کیسے وابستہ ہوگیا؟"

"جہاز میں دورانِ پرواز ہونے والا حادثہ اور تمہارے قیاسات۔" اس نے بلا جھجک مجھے جواب دیا اور میرے رکے ہوئے قدم بڑھ گئے مگر وہ بدستور کہتی رہی۔ "شاید تمہیں بھی علم ہوگا کہ مصر کے شہری ہوابازی کے حکام نے اس واقعے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا ہے اگر تم نے وہاں آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کردیا تو نہ صرف یہ کہ جہاز کے کپتان کو سزا ہوسکتی ہے بلکہ انضباطی کارروائی کے طور پر اسے ریٹائرمنٹ پر ملنے والی وہ خطیر رقم بھی روکی جاسکتی ہے جس کی واحد حقدار میں ہوں۔"

"تم اس رقم کی حقدار کیسے ہوگئیں؟"

"کپتان سے میرے بہت پرانے تعلقات ہیں۔" وہ خوبصورت اور آراستہ کمرے میں ایک صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔ "اور میاں بیوی نہ ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں پہلے مجھے کچھ علم نہیں تھا لیکن تحقیقاتی کمیشن کے قیام کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی وصیت میں مجھے اپنا تنہا وارث نامزد کرچکا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں مسہری پر دراز ہوچکا تھا۔

"میرے مقابلے میں وہ بوڑھا ہے اور پھر اسے دل کا مرض لاحق ہونے پر ایئرلائن سے قبل از وقت ریٹائر کیا گیا ہے۔" اس کا لہجہ سرگوشیانہ اور الفاظ نپے تُلے تھے۔ "وہ کسی بھی وقت مرسکتا ہے۔ اس کے لیے ایک ذہنی جھٹکا ہی کافی ہوگا اور پھر اسے ملنے والی ساری دولت میری ملکیت ہوگی۔"

"اس معاملے سے میرا کیا تعلق ہے؟"

وہ ہنسی۔ "کمیشن تین روز سے کام کررہا ہے اور میں ہر روز دفتری اوقات میں اس عمارت کے داخلی راستے کے سامنے موجود رہی ہوں جہاں کمیشن کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ مجھے صرف تمہاری فکر تھی کیونکہ تمام مسافروں میں صرف تم ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ سکے تھے، تمہارا بیان میرا مستقبل برباد کرنے کے لیے کافی ہوتا۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میری ذات میں اس کی دلچسپی کا

سبب بہت زیادہ نجی اور محدود تھا۔

"تم اسی کپتان کے ساتھ رہ رہی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"اور کہاں رہوں گی؟" اس نے برجستہ کہا۔ "اب تو میری ساری امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ ہیں۔"

"اس کی مرضی سے یہاں آئی ہو؟"

"وہ تو مجھے عاق ہی کردنیا۔" وہ ہنس کر بولی۔ "آج کل وہ ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا ہے، رات میں کسی بھی وقت واپس پہنچ گئی تو اسے یاد بھی نہ آسکے گا کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں گئی تھی۔"

"باعزت ریٹائرمنٹ کی صورت میں اسے کیا ملے گا؟"

"مصری کرنسی میں کم و بیش ایک لاکھ پونڈ سمجھ لو!" اس نے ذہن پر قدرے زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

"اس سے دوگنے کے لیے مقدر کیوں نہیں آزمائیں؟" میں نے دانستہ اسے کریدتے ہوئے کہا۔

"کیا میری بولی لگا رہے ہو؟" اس کی تیوری میں بل پڑ گئے۔

"ارے نہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "میں یہ گستاخی نہیں کرسکتا اور پھر اتنی رقم تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی۔"

"پھر دوگنے سے کیا مطلب تھا تمہارا؟" وہ سنجیدہ ہوگئی۔

"شاید تم اخبار نہیں پڑھتیں۔"

"اوہ۔" وہ خفت آمیز انداز میں ہنس پڑی۔ "صفدر علی کی بات کررہے ہو، اس جیسے خونخوار آدمی کو میں کہاں تلاش کروں گی؟"

"انعام خاصا خطیر ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم فلسطینی ہو اور اس کے فلسطینیوں سے قریبی روابط رہے ہیں۔ تم تھوڑی سی جدوجہد کرو تو اس کا سُراغ مل سکتا ہے۔"

"پولیس نے بھی ان خطوط پر کام کیا ہوگا۔ صفدر علی تمہاری سوچ سے بہت بلند ہے ورنہ وہ ابھی تک دوبارہ پکڑا گیا ہوتا۔"

میرے لیے اس کا جواب بہت اطمینان بخش تھا اور اسے میرے بارے میں خفیف سا شبہ تک نہیں تھا۔

"تمہاری مرضی۔" میں نے شانے اچکا کر کہا۔ "میرے لیے تو پندرہ بیس ہزار ہی کافی ہوتے۔ باقی رقم پر تمہارا تصرف ہوتا۔"

"آج کل کی جذباتی لہر کی روشنی میں تو کوئی مجھے فلسطینی تسلیم ہی نہیں کرے گا حالانکہ میں تعلیم یافتہ فلسطینی طبقے کی سوچ رکھتی ہوں۔ میرا کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو تمہارے مشورے پر عمل نہ کرسکوں گی۔"

"فلسطین کے بارے میں تمہارا رویہ شاید اس لیے مختلف ہے کہ تم عیسائی ہو۔" میں نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کردیا۔

وہ ہنس پڑی۔ "یہ تمہارے متعصب ذہن کا تجزیہ ہے۔ فلسطینی تنظیموں میں بے شمار عیسائی بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کررہے ہیں۔" موضوع خوش اسلوبی سے بدل گیا۔

"تم خود اپنی بات کی تردید کررہی ہو۔" میں نے اس کی بات پکڑ لی۔ "اگر کسی جدوجہد کا وجود ہے تو پھر تم کس طبقے کی نمائندگی کی دعویدار ہو؟"

"گفتگو تلخ ہوجائے گی، اس موضوع کو چھوڑ ہی دو۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میرا دماغ بہت ٹھنڈا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہارے خیالات سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔"

"ہماری موجودہ نسل بڑے کرب اور عسرت کے عالم میں جوان ہوئی ہے۔" اس کا لہجہ قدرے جذباتی ہوگیا۔ "لبنان اور اردن کے مہاجر کیمپوں میں ہم نے بھوک اور موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تپتی ہوئی ریت اور سنگلاخ ٹیلوں پر لازمی فوجی تربیت کی یادگاریں میری کہنیوں اور گھٹنوں پر گہرے سیاہ نشانات کی صورت میں اب تک باقی ہیں۔ اس پُرصعوبت اور غیر یقینی زندگی کے بعد ہمیں دوست ملکوں کے وظائف پر اعلیٰ تعلیم کا موقع نصیب ہوا۔ اور بہت سے ملکوں نے ہم پر اپنی شہریت کے دروازے کھول دیے۔ اور آج ہم تلخ ماضی کو بھول کر اس قابل ہیں کہ آسائشوں کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں۔ ہم ماضی کو بھول جانا چاہتے ہیں لیکن ہمیں اپنی پُرسکون جنت سے زبردستی جنگ و پیکار کے ہولناک جہنم میں گھسیٹنے کی کوششیں جاری ہیں۔"

"یہ کوششیں تمہاری اگلی نسلوں کی بہتری کے لیے ہیں۔" میں کوشش کے باوجود خود کو قطع کلامی سے باز نہ رکھ سکا۔ "تاکہ وہ مہاجر کیمپوں کے بجائے اپنے ملک اور اپنی سرزمین پر آزاد شہری کی حیثیت میں جوان ہوں۔"

"یہی تو ہماری قیادت کا سب سے زیادہ پُرفریب نعرہ ہے۔" اس کے پاس میرے اعتراض کا بھرپور جواب موجود تھا۔ "اسرائیل ہماری مجوزہ سرحدوں کو نہیں مانتا اور اسے عالمی طاقتوں کی سرپرستی حاصل ہے اور ہماری مطلوبہ سرحدیں کسی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ تم جانتے ہو کہ اس وقت دنیا میں فلسطینی مہاجرین کی تعداد کیا ہے اور مجوزہ فلسطین کا رقبہ کتنے ہزار مربع میل ہے؟ اگر کسی روز یہ لولا لنگڑا فلسطین قبول کرلیا گیا تو ہم بالکل ہی بے خانماں ہوکر رہ جائیں گے۔ ہر ملک ہم سے شہریت کے حقوق واپس لے لے گا اور ہمیں اپنی لبی لبائی جنت ترک کرکے بنجر اور پسماندہ فلسطین کی تعمیر میں مصروف ہونا پڑے گا یعنی یہ نسل تو پیوند زمین ہی ہوجائے گی مگر فلسطین پھر بھی ایک مفلوک الحال ریاست سے زیادہ کوئی درجہ نہ پاسکے گا۔"

"تمہاری قیادت کو اگر محض حکومت درکار ہوتی تو وہ اب سے پہلے ادھورا فلسطین قبول کرچکے ہوتے، سارا جھگڑا اسی بات پر چل رہا ہے۔"

"حکومت ریت کے ٹیلوں پر نہیں کی جاتی۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "کسی مُلک کے لیے اس کی افرادی قوت اور قدرتی وسائل بھی لازمی ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر کوئی قوم زیادہ دن اپنی خودمختاری کا تحفظ نہیں کرسکتی۔"

اس کے اندازِ گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں خودغرضی کے سوا کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ ملکی اور قومی مفاد پر وہ ذاتی آسائشوں کو ترجیح دے رہی تھی۔ اور ایسی عورت سے مزید بحث

کرنا تلخیوں کو بڑھانے ہی کے مترادف ہوتا لہٰذا میں نے اس کے جواب میں چپ سادھ لی اور اپنے لیے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

"تم نے ابھی تک میری بات کا جواب نہیں دیا۔" قدرے توقف کے بعد اس نے مجھے ٹوکا۔

"کون سی بات؟"

"تم کمیشن کے سامنے جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے نا؟" اس کے لبوں پر ترغیب آمیز مسکراہٹ مچلنے لگی۔

"اگر میری زبان بند رہنے سے تمہارا کچھ فائدہ ہوتا ہے تو میرا کیا ہرج ہے!" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "میری طرف سے تم بے فکر رہو۔"

"مجھے یقین تھا۔" وہ مسرت آمیز انداز میں میرے سینے سے آ لگی "تم خاصے سمجھدار آدمی ہو ورنہ صورتحال بھانپ کر جہاز میں ہی ہنگامہ کر سکتے تھے۔"

وہ میرے ساتھ ڈیڑھ بجے تک رکی رہی پھر بے حد معذرت کر کے واپس چلی گئی۔ وہ رات بھر غائب رہ کر اپنے کپتان دوست سے لڑائی مول نہیں لینا چاہتی تھی البتہ اس نے اگلی صبح میرے پاس آنے کا وعدہ کر لیا۔

میں اس کی واپسی کا اطمینان کرنے کے لیے اسے نیچے تک چھوڑنے آیا اور جب وہ چلی گئی تو میں اپنے کمرے کے بجائے ہاشم کے کمرے میں جا پہنچا۔

وہ شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھا مگر اس کے بشرے پر نیند کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی۔

مجھ سے اس کا پہلا سوال مریم کے بارے میں تھا اور جب میں نے اپنی ذات میں اس کی دلچسپی کا سبب بتایا تو وہ خاصا محظوظ ہوا۔

"بعض لوگ تو اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں مگر تم تو مسائل کی انجمن بنے ہوئے ہو۔ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانا آسان نہیں ہے۔"

"اب یہ بتاؤ کہ ہوٹل میں آنے کے بعد تمہارا کسی سے رابطہ قائم ہوا؟" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک نتیجہ صفر ہی ہے، کہیں سے کوئی کڑی ہاتھ نہیں آ سکی۔"

میں کچھ دیر بعد اس کے کمرے سے رخصت ہو گیا۔

اس رات میرا ذہنی اضمحلال کسی حد تک دور ہو گیا تھا لہٰذا مجھے گہری نیند آئی۔ دن چڑھے بیدار ہو کر میں نے ناشتہ کمرے میں ہی طلب کر لیا۔

جب ساڑھے دس بج گئے مگر مریم نہ آئی تو میں نے القاہرہ کے آپریٹر سے وہی نمبر ملوایا جو مجھے مریم نے دیا ہوا تھا۔

"تم اب تک کہاں ہو؟" میں فون پر مریم کی آواز پہچان گیا۔

"کون؟ مرزوق؟" میرے کانوں میں اس کی تحیر آمیز آواز آئی۔

"ہاں، میری بیزاری بڑھ رہی ہے۔"

"وہ ابھی ابھی کیبن گیا ہے، میں بس چند منٹ میں پہنچتی ہوں۔" اس کا لب و لہجہ بہت زیادہ خوشامدانہ تھا۔

"میں انتظار کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند ہی منٹ گزرے تھے کہ مجھے کمرے کے دروازے پر دستک سنائی دی اور میں چونک پڑا کیونکہ مریم اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اسی اثناء میں دوبارہ دستک ہوئی۔ آنیوالا نہایت عجلت میں معلوم ہوتا تھا۔

میں نے بہت احتیاط سے دروازہ کھولنا چاہا مگر ہاشم مجھے دھکیل کر اندر گھس آیا۔

اس کا چہرہ دفورِ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ اندر آتے ہی وہ مسہری پر گر گیا اور تقریباً ہانپتے ہوئے بولا۔ "فوراً روانگی کی تیاری کرو۔"

"کہاں؟" میں اس کی حالت دیکھ کر حیران ہوا جا رہا تھا۔

"وہ... وہ شاید پھر نرغے میں آ گئی ہے۔" ہاشم نے اسی لہجے میں کہا۔

"کون؟ سینا؟" میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اگر وہ دوسری مرتبہ گھیر لی گئی تھی تو شاید اس کے ستارے گردش میں آ چکے تھے۔

"ہاں، جلدی چلو۔" وہ مضطرب کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ "اس بار وہ بہت محتاط ہیں۔ انہوں نے بھاری مسلح نفری کے ساتھ اس باغ کا محاصرہ کیا ہوا ہے مگر یہ ساری کارروائی صیغۂ راز میں ہے۔ اس بار شاید للکارنے کے بجائے وہ اس وقت کے منتظر ہیں جب سینا بے خبری میں خود ہی باہر نکلنے کی کوشش کرے گی۔"

"تو کیا وہ کسی باغ میں پھنس گئی ہے؟" میں عجلت میں اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے صبح چار بجے اطلاع ملی تھی کہ کل کسی وقت پولیس نے حسین کے بہنوئی پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔" وہ بتانے لگا۔ "وہ بہت نیک آدمی ہے، اس کی گرفتاری کا مطلب تھا کہ سینا کے معاملے میں پولیس صحیح راہ پر لگ چکی تھی اور اگر سینا نے پناہ کے سلسلے میں حسین کی معرفت اس کے بہنوئی پر بھروسہ کیا تھا تو وہ خطرے میں تھی لہٰذا میں یہ خبر پاتے ہی ہوٹل سے نکل گیا۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے صرف ایک جگہ ایسی نظر آئی جو اس کی ملکیت تھی۔ اور جسے ایک محفوظ پناہ گاہ بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ قاہرہ کے نواح میں حسین کے بہنوئی رجب کا ایک وسیع باغ ہے جس کے وسط میں ایک رہائشی کاٹیج بھی ہے، یہ سراغ مجھے آٹھ بجے ملا اور میں نے خود جانے کے بجائے اپنے ایک آدمی کو ادھر روانہ کر دیا۔ اسے وہاں پہنچ کر رجب کے بارے میں معلوم کر کے لوٹ آنا تھا مگر اسے باغ سے دور ہی سڑک پر روک لیا گیا۔ وہاں نہ صرف سڑک پر رکاوٹیں کھڑی تھیں بلکہ بھاری نفری کی نقل و حرکت کے آثار بھی تھے۔ جو جھاڑیوں وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے واپس آنے پر میں نے مزید ہاتھ پیر ملے تو پتہ چلا کہ اس کاٹیج میں فون ہی نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع کیے کاٹیج میں بے خبر بیٹھی ہے اور باہر موت اس کی منتظر ہے۔" میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"یہ صرف میرے قیاسات ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میرے آدمیوں کو روکنے والوں نے ناکہ بندی کا کوئی سبب نہیں بتلایا تھا۔"

"بعض باتیں بتائے بغیر خود ہی واضح ہو جاتی ہیں۔" میرا لہجہ سرد تھا۔

جوتے پہن کر میں ہاشم کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

"اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو رکھو۔" راہداری میں ہاشم میرے قریب ہو کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے بشرے سے اس وقت درندگی ٹپک رہی ہے۔"

میں محض غرا کر رہ گیا۔ اس وقت میرے لیے خود پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔

ہم لفٹ سے نیچے اترے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ راستے میں مریم ٹکرا گئی۔ وہ سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس سے کترا کر نکل جانا چاہا مگر وہ مجھے دیکھ چکی تھی۔

"مجھے بلا کر کہاں بھاگ رہے ہو؟" میرے قریب آ کر وہ ناز آفریں لہجے میں بولی۔ غنیمت یہ تھا کہ ہاشم ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیدھا نکلا چلا گیا تھا۔

"مجھے اچانک ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے۔" میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "شاید دو تین گھنٹے تک نہ لوٹ سکوں۔ تم چاہو تو واپس جا سکتی ہو۔ میں واپس آ کر خود ہی فون کر لوں گا۔"

"خیریت تو ہے؟ تم کچھ مشتعل سے نظر آ رہے ہو؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر درشت ہو گیا اور وہ سہم کر مجھ سے دور ہٹ گئی۔

"جاؤ!" میں نے دوبارہ کہا اور وہ خوفزدہ نظروں سے آخری بار میرا جائزہ لینے کے بعد مڑے بغیر ہوٹل سے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

مریم کی رفتار غیر معمولی حد تک تیز تھی۔ میں باہر نکلا تو وہ کہیں غائب ہو چکی تھی مگر ہاشم دروازے کے قریب ہی میرا منتظر تھا۔

"کیا کہہ دیا تھا اسے، بہت خوفزدہ ہو کر بھاگی ہے؟" ہاشم نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ کدھر گئی ہے وہ؟" میری نظریں مریم کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔

"اسے باہر آتے ہی خالی ٹیکسی مل گئی تھی۔" اس نے کہا۔ "وہ تو اس طرح واپس لوٹی تھی جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس اثناء میں وہ اپنی کار تک پہنچ گیا۔

"تم فوری طور پر کتنے آدمی جمع کر سکتے ہو؟" کار روانہ ہونے کے بعد میں نے سپاٹ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"عبدالکمال سمیت پانچ۔" اس نے جواب دیا۔ "اور وہ پانچوں راستے میں کسی جگہ ہمارے منتظر ہوں گے۔"

"تم کدھر جا رہے ہو؟"

"رجب کے مضافاتی باغ کی طرف۔"

"وہاں ہم سات آدمی کیا کر سکیں گے؟"

"میری تو عقل ماؤف ہو چکی ہے۔ ہر شخص تمہارے احکام پر عمل کرے گا۔ میں نے اپنے تمام تر وسائل تمہارے لیے مجتمع کر لیے ہیں۔"

"سات آدمی۔ یہ تمہارے جملہ وسائل ہیں؟" میرا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"ان کے ساتھ کافی اسلحہ اور بم وغیرہ بھی ہوں گے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اسلحہ ہمارے کسی کام آ سکے گا۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" میں نے اپنے سنسناتے ہوئے اعصاب میں سکون کی ایک موہوم سی لہر سرایت ہوتی محسوس کی اور میرا ذہن حالات کے تجزیے میں الجھ گیا۔

ہاشم کی کار قاہرہ کی بھری پُری سڑکوں پر تیزی کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ اور ہم لحظہ بہ لحظہ ایک ایسے محاذ سے قریب ہوتے جا رہے تھے جہاں تمام تر حالات ہمارے خلاف تھے۔

"مجھے بس ایک ہی ڈر ہے۔" ہاشم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"وہ کیا؟"

"ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی سب کچھ ختم نہ ہو جائے۔"

"نہیں۔" میں دہشت زدہ لہجے میں غرایا پھر مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں اسے قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ وہ اب بہت چالاک ہو گئی ہے اگر اس نے واقعی اس باغ میں پناہ لی ہے تو چہرے کے زخم پوری طرح مندمل ہونے سے قبل وہ کھلے آسمان کے نیچے بھی نہ آئے گی۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔" وہ دھیمی آواز میں منمنا کر رہ گیا۔

"تم کس حد تک میرا ساتھ دو گے؟" چند ثانیوں کے بعد میں نے سوال کیا۔

"تمہارے سارے اگلے پچھلے شکوے دور کر دوں گا۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پرعزم لہجے میں بولا۔

"کچھ کر کے مرنے کے لیے تیار ہو نا؟" میں نے پھر اسے جھنجوڑا۔

"زندگی ایک بلجانی ہے۔" وہ بولا۔ "پھر اسے کسی بڑے مقصد کے لیے کیوں نہ داؤ پر لگایا جائے تاکہ مرنے کے بعد افسوس نہ ہو۔"

"یہ نہ کہو ہاشم۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "مسلمان کی موت کا ایک وقت مقرر ہے اور میں تمہیں خود سے بہتر مسلمان سمجھتا ہوں۔"

"تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"اگر اسلحہ کافی ہے تو ہم خود کو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ کر ان کے مورچوں کا جائزہ لیں گے اور رات کا اندھیرا پھیلنے پر سات مختلف مقامات سے بیک وقت ان پر موت کی یلغار کر دیں گے پھر وہ ہمارے حصار میں ہوں گے۔"

"اور اگر سینا رات سے پہلے باہر نکلی......؟"

"نہیں۔" میں نے بُری طرح اسے جھڑک دیا۔ "بار بار مایوسی کے کلمات زبان پر نہ لاؤ۔ باہر مقابلہ شروع ہوتے ہی وہ چونک کر فرار کی راہ تلاش کرے گی۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

شہر سے نکلنے کے بعد ہاشم کی کار تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ ہمیں سڑک کے کنارے ایک بڑی سیاہ وین کھڑی نظر آئی۔ اس سے ذرا پہلے ایک شخص کھڑا ہوا تھا جس نے شاید ہاشم کی کار پہچان کر ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔

قریب آنے پر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ عبدالکمال تھا۔ کار رُکتے ہی وہ دوڑتا ہوا میری طرف والی کھڑکی پر آ گیا۔

"سب کچھ تیار ہے۔" اس نے آتے ہی پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہم سب صفدر کے احکام پر عمل کریں گے۔" ہاشم کے لہجے پر گمبھیر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی جو ان حالات کا قدرتی نتیجہ تھی۔

"میں ایک نظر اسلحہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہمارے ساتھ وین پر ہی آ جاؤ۔ سب کچھ پچھلے حصے میں موجود ہے۔" عبدالکمال کا مشورہ نہایت مناسب تھا۔ میں کار سے اتر گیا۔

ہم دونوں وین کے عقبی حصے پر پردے کی صورت میں جھولتی ہوئی ترپال ہٹا کر اندر گھس گئے۔ وہ شاید کسی گوالے کی وین تھی کیونکہ اس میں دودھ وغیرہ کی مانوس بُو رچی ہوئی تھی۔

اندر ایک جواں سال شخص پہلے سے موجود تھا۔ عبدالکمال نے ڈرائیور کے کیبن میں کھلنے والی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے شخص کو اشارہ کیا اور بند وین حرکت میں آ گئی۔

وین میں چار اسٹین گنز فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے فاضل راؤنڈز کے متعدد چوبی کریٹ بھی موجود تھے۔ تین بڑے بڑے صندوق مختلف قسم کے دستی بموں سے بھرے ہوئے تھے ان کے علاوہ تین دو بمار الفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

"اسلحہ بہت کافی ہے۔" میرے اضطراب میں قدرے کمی آ گئی۔ "اگلے حصے میں کتنے آدمی سفر کر رہے ہیں؟"

"تین۔" عبدالکمال نے جواب دیا۔ "تین اسٹین گنز ان کے پاس ہیں۔"

"ایسا نہ ہو کہ ہم براہِ راست ان میں جا گھسیں۔"

"اوّل تو ابھی خاصی مسافت باقی ہے پھر ٹرک کے اسٹیرنگ وھیل پر جو شخص موجود ہے وہ صبح اِدھر جا چکا ہے۔ مخدوش علاقہ آنے سے پہلے ہی وہ ذیلی سڑک پر اُتر جائے گا۔"

"سب لوگ اسلحے کے استعمال میں ماہر ہیں؟" میں نے اپنی تسلّی کے لیے بادلِ ناخواستہ یہ سوال بھی کر ہی ڈالا۔

"پیشہ ور جنگجو سمجھ سکتے ہو۔"

"یہ ٹرک کس کا ہے؟"

"ایک ڈیری فارم سے چُرایا گیا ہے۔ بے فکر رہو۔ اس کے مالک کو رات گئے سے پہلے اس کی چوری کا علم نہ ہو سکے گا۔"

"پھر ہاشم کی کار کا کیا ہو گا؟"

"وہ کسی محفوظ جگہ چھوڑی جائے گی تاکہ بھاگتے وقت رہبی جائے تو کسی مشکل کا سبب نہ بنے۔" عبدالکمال کا جواب مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے الفاظ پُرامید تھے جن میں معرکے کے بعد واپسی کا تذکرہ بھی تھا۔

"کیا تمہیں ہاشم نے کسی منصوبے کے تحت بلایا ہے؟" میں نے سوال کیا۔ جس کا جواب نفی میں ملا۔

"پھر تم مقابلے اور واپسی کی بات کیسے کر رہے ہو؟" میں نے اگلا سوال کر ڈالا۔

"ظاہر سی بات ہے کہ اسلحہ بلاوجہ نہیں منگوایا گیا اور پھر ہاشم نے یہ تو بتا ہی دیا تھا کہ سیتا کس خطرے سے دوچار ہے۔"

"ہاشم الجھا ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے ساری ذمّے داری مجھ پر ڈال دی ہے لیکن مناسب مشورہ تم ہر وقت دے سکتے ہو۔"

"پروگرام کا علم ہو تو مشورے کی نوبت آئے گی نا۔"

میں آہستہ آہستہ عبدالکمال کو اپنے مجوزہ منصوبے کی جزئیات سے آگاہ کرنے لگا۔ تیسرا شخص بھی نہایت انہماک سے میری باتیں سُن رہا تھا۔

"اُس عورت کو اپنے مقدّر پر ناز ہونا چاہیے جسے تم جیسا شوہر ملا ہو۔" میرے خاموش ہونے پر وہ ستائش بھرے لہجے میں بولا۔ "خدا کی پناہ! تم اپنی بیوی کے حصول کے لیے خون، آگ اور تصادم کے کسی سمندر کو بھی خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

"یہی زندگی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "دُوسری صُورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں گوشہ نشین ہو کر ساری عمر اپنی گمشدہ بیوی کی یاد میں آنسو بہاتے گزار دیتا۔"

"تمہارا منصوبہ زبردست ہے مگر اس کی کامیابی کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ سیتا تصادم کے آغاز سے قبل اپنی کمین گاہ سے باہر نہ نکلے۔" عبدالکمال نے قدرے توقّف کے بعد تفکّر آمیز لہجے میں کہا۔

"ایک بات پوچھ لوں؟" وین کے عقبی حصے میں موجود تیسرے شخص نے مودّب لہجے میں دخل اندازی کرتے ہوئے سوال کیا۔

میری استفسار طلب نگاہیں اس کے چہرے کی طرف اُٹھ گئیں۔

"تم سمیت ہماری کُل تعداد سات ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اور تم پولیس والوں پر مختلف سمتوں سے حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہو۔ ہم سات آدمی بیک وقت کتنے مورچے سنبھال سکیں گے؟"

"کسی مورچے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہ سیتا کی کمین گاہ کے گرد پھیلے ہوئے ہیں اور ہم ساتوں ان کے گرد پھیل جائیں گے اسٹین گن کی مار بہت لمبی ہوتی ہے جب ایک ہی وقت پر سات مختلف سمتوں سے ہماری اسٹین گنز چلیں گی تو انھیں سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملے گی اور وہ خوف کے عالم میں منتشر ہو جائیں گے میری طرف سے تم سب کو اجازت ہے کہ ابتدائی برسٹ مارنے کے بعد ذرا بھی خطرہ محسوس کرو

تو فوراً اپنی جان بچا کر بھاگ نکلنا۔"

"نہیں تنہا چھوڑ کر؟" اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"میں خود بھی اسی ترکیب پر عمل کروں گا۔" میں نے کہا

"یعنی ہم محض دہشت گردی کر کے بے نیلِ مرام لوٹ جائیں گے؟"

اس کا لہجہ مایوسانہ تھا۔

میں تلخ انداز میں ہنس دیا۔ "ہمارا مقصد ان کے محاصرے کو درہم برہم کرنا اور سیتا کو باہر کے مخدوش حالات سے باخبر کرنا ہے۔ فائرنگ اور شور سے وہ سمجھ جائے گی کہ اسے خطرات لاحق ہیں اور پھر وہ محاصرے کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر نکاسی کی راہ خود ہی تلاش کرے گی۔ ابھی تک وہ آدم خور شیر کی کچھار میں بے خبری کے عالم میں بسیرا کیے بیٹھی ہو گی۔"

"بظاہر بڑا آسان نظر آ رہا ہے۔" عبدالکمال نے کہا

"عملاً بھی شاید ہی کوئی دِقّت پیش آئے۔" تیسرے شخص نے کہا۔ "سات سمتوں سے برسنے والے فائر اور پھر بموں کے دو چار ہولناک دھماکے شاید انہیں یہ تک بھلا دیں گے کہ وہ ان اطراف میں کس مقصد پر مامور کیے گئے تھے۔"

"اگر سیتا رجب کے باغ میں موجود ہے تو شاید حُسین بھی سیتا کے ساتھ ہی ہو گا۔" عبدالکمال نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہا۔

"لازمی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے اگر سیتا تنہا بھی ہوتی تو صورتحال کو مناسب طور پر سنبھال لیتی۔"

"میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ پولیس رجب تک کیسے پہنچ گئی؟" عبدالکمال نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاشم نے بتایا تھا کہ رجب قاہرہ میں فلسطینی تنظیم کا سرگرم رکن ہے۔"

"سرگرم رکن ضرور ہے لیکن اس کی بیشتر مصروفیات سیاسی ہوتی ہیں۔" عبدالکمال کا لہجہ مدافعانہ تھا۔ "وہ قانون کی حدود کا بہت احترام کرتا ہے۔"

"پھر تو بس دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اوّل یہ کہ کسی نے مخبری کی ہو، مگر یہ نکتہ اس لیے بے وزن نظر آتا ہے کہ مخبری کے بعد پولیس رجب پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے براہ راست باغ پر دھاوا بول دیتی تاکہ کسی کو بھی پولیس کی نقل و حرکت کا اندازہ ہونے سے قبل سیتا کو پکڑ لیا جائے اور دوسرا امکان یہ ہے کہ پولیس کو کسی طرح یہ علم ہو گیا ہو کہ سیتا کے ساتھ حُسین نامی ایک لبنی لڑکا بھی ہے اور یوں پولیس نے کڑیاں یکجا کرنے کے بعد رجب پر ہاتھ ڈال دیا ہو۔"

"یہی صُورت قرینِ قیاس لگتی ہے۔ پہلے رجب گرفتار ہوا اور اس کے بعد پولیس نے اس کے مضافاتی باغ کا محاصرہ کیا۔"

"تو کیا تمہارا خیال ہے کہ رجب نے گرفتاری کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی پولیس کے حربوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہوں گے؟"

"وہ بہت مضبوط اور بے خوف آدمی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اس سے ایسی امید تو نہیں کی جا سکتی مگر جو کچھ ہوا اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"یہ پتہ چلا کہ رجب گرفتاری سے پہلے کہاں غائب تھا؟"

اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "وہ براہِ راست پولیس کی تحویل میں پہنچا ہے۔ ہمیں علم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کب اور کہاں سے نمودار ہوا۔"

اس کے بعد ٹرک کے عقبی حصے میں خاموشی چھا گئی۔ تینوں افراد اپنی اپنی جگہ کسی سوچ میں غرق تھے۔

کچھ دیر تک وین کا سفر ہموار سڑک پر جاری رہا پھر وہ بائیں طرف ایک ناہموار راستے پر موڑ دی گئی۔

شدید ہچکولوں کے درمیان تقریباً دس منٹ تک وین آگے بڑھتی رہی پھر اسے روک کر انجن بند کر دیا گیا۔

ہم تینوں وین کے عقبی حصے میں جھولتی ہوئی ترپال ہٹا کر نیچے کُودے تو خود کو گھنے درختوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ پر موجود پایا۔ وہاں تک رسائی کے لیے بادی النظر میں کوئی راستہ نہیں تھا مگر وین کا ڈرائیور ٹائروں سے جھاڑیاں کچلتا ہوا ادھر گھس آیا تھا۔

لحظہ بھر میں وین کی اگلی نشست سے تینوں افراد بھی ہمارے پاس آ گئے۔ "ہاشم یہاں تک کیسے آئے گا؟" میں نے تجسّس آمیز نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"چند منٹ میں ہی آ جائے گا۔" عبدالکمال نے جواب دیا۔

پھر عبدالکمال کی ہدایت پر بقیہ چاروں افراد ٹرک میں موجود اسلحہ کو اس طرح چھپانے میں مصروف ہو گئے کہ کوئی نووارد پہلی ہی نظر میں ان ہتھیاروں کی شناخت نہ کر سکے۔

اس دوران میں ہاشم بھی وہاں آ پہنچا۔

"تمہاری کار کہاں ہے؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ پھیکے انداز میں مسکرا دیا۔ "یہاں سے ذرا آگے کھڑی کی ہے۔ تم لوگ شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے؟"

دو آدمی وہیں اسلحہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیے گئے اور بقیہ آدمی دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔

میرے ساتھ ہاشم کے علاوہ وہ شخص بھی تھا جو صبح سویرے ایک بار رجب کے باغ میں جانے کی ناکام کوشش کر چکا تھا اور عبدالکمال کے ساتھ محض ایک آدمی تھا۔ ہم لوگوں کا منصوبہ دور سے محاصرے کا جائزہ لینا تھا۔

دونوں ٹولیاں قطعی غیر مسلح حالت میں اس کمین گاہ سے مختلف سمتوں میں روانہ ہوئیں تاکہ کسی غیر متوقع مڈبھیڑ میں اسلحہ کی موجودگی ہمیں مشکوک ثابت نہ کر سکے۔

"تمہیں یقین ہے کہ ہمیں باغ میں گھسنے کا موقع نہیں مل سکے گا؟" کچھ دُور تک خاموشی سے چلنے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"تھوڑی دیر بعد تم خود ہی بہتر رائے قائم کر سکو گے۔" ہاشم نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے عزائم کیا ہیں؟"

میں نے اختصار کے ساتھ اسے اپنی حکمتِ عملی سے آگاہ کر دیا۔

"موجودہ حالات میں اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔" اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "پھر تم اندر گھسنے کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟"

"سیتا میری بیوی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مدتوں کے فراق کے بعد بھی اگر میں اس کو قریب سے دیکھنے کی آرزو نہ کروں تو یہ رشتہ ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"آرزو کی حد تک تو بات دُرست ہے لیکن عملاً تمہارا باغ میں داخلہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو لیکن اس وقت میرے لیے بڑے سے بڑا خطرہ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ میں صرف ایک بار سیتا کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری خواہش قطعی فطری ہے اور تمہارا جذبہ بھی قابلِ داد ہے مگر میں صرف یہ جتانا چاہتا ہوں کہ اس مرحلے پر تمہاری کوئی جذباتی حرکت تمہاری اور سیتا کی سلامتی پر بُری طرح اثر انداز ہو سکتی ہے۔"

"سلامتی!" میں استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "میرے لیے تو اب یہ لفظ مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ اگر سلامتی یہ ہوتی ہے تو خطرات نہ جانے کیا ہوتے ہیں۔"

وہ خاموش ہی رہا۔

وہ علاقہ گھنے درختوں اور سرسبز باغات سے بھرا ہوا تھا۔ ہم تینوں چوکنے انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ ہماری رہنمائی کا فرض تیسرا شخص انجام دے رہا تھا جو میری اور ہاشم کی گفتگو سے بظاہر لاتعلق بنا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں پولیس کے جوانوں کی پہلی ٹولی نظر آگئی جو رائفلوں سے لیس بظاہر لاپروایانہ انداز میں ایک کھلے مقام پر براجمان تھی۔ پھر اُن کی لاپروائی کا سبب بھی واضح ہو گیا کیونکہ ان کا ہدف ان کے سامنے ایک کھلے میدان کے پار واقع تھا اور اگر ادھر کوئی گڑبڑ ہوتی، تو پولیس والوں کے پاس جوابی کارروائی کے لیے خاصا وقت موجود ہوتا۔

ہم تینوں درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں مسلسل آگے بڑھتے رہے اور اس دوران ہمیں جابجا مسلح سپاہی نظر آتے رہے۔

پھر ہم نے وہ سڑک بھی عبور کر لی جو رجب کے باغ کو جاتی تھی۔ اس سڑک پر قدرے آگے ناکہ بندی کے آثار نمایاں تھے۔

تقریباً تین گھنٹے بعد ہم اپنا چکر مکمل کر کے اپنی کمین گاہ میں واپس پہنچے تو تکان سے ہمارا حال ابتر تھا۔

عبدالکمال اور اس کا ساتھی پورا چکر لگائے بغیر ادھورے جائزے کے بعد کافی دیر قبل واپس پہنچ چکے تھے۔

اپنے جائزے کی روشنی میں ہم لوگوں نے آپس میں مشورے شروع کر دیئے جن کا خلاصہ یہی تھا کہ ہماری اچانک فائرنگ پولیس والوں کو حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

سارے پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد جب یہ طے کر لیا گیا کہ ہر شخص اپنا اسلحہ سنبھال کر پانچ بجے اس پناہ گاہ سے نکل جائے گا اور ساتوں آدمی دائرے کی صورت میں اپنی جگہیں سنبھال کر ٹھیک سوا سات بجے کسی کا نشانہ لیے بغیر اندھا دھند اندرونی سمت میں فائر شروع کر دیں گے اور اگر موقع ملا تو ایک آدھ دستی بم بھی اس سمت میں اچھال دیں گے تو میں ایک اسٹین گن اپنے شانے سے لٹکا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

"تم کدھر چلے؟" ہاشم نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"سوا سات بجے میری اسٹین گن کا نغمہ تمہارے اسلحے کے شور میں شامل ہو گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر تم چلے کہاں؟"

"ہو سکتا ہے کہ مجھے اندر گھسنے کا کوئی موقع مل جائے اور میں زیادہ بہتر طور پر اپنا کام سرانجام دے سکوں۔"

"تم پر حماقت کا دورہ پڑ رہا ہے۔" ہاشم غرایا۔ "یہ یاد رکھو کہ اس وقت تم ہی ہمارے کمانڈر ہو۔ اگر تم یہاں سے چلے گئے تو بعد کے حالات کی ذمہ داری کسی پر نہ ہو گی۔ یہ مہم پوری طرح تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"سارا کام تقسیم کیا جا چکا ہے۔" میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔ "اب یہاں میری موجودگی کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم مسئلے کو دوگنا خطرناک بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔" عبدالکمال نے ہاشم کے موقف کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ بس ہر قیمت پر مجھے اپنے ساتھ روکنا چاہتے ہو۔"

"روکنا ضرور چاہتے ہیں مگر صرف تمہاری بہتری کی خاطر۔" ہاشم نے کہا۔ "اگر تم ہمارے ساتھ رہے تو سوا سات بجے ہم صرف سیتا کے فرار یا رہائی کے لیے اپنی مہم کا آغاز کریں گے لیکن تمہارے اندر چلے جانے کے بعد معاملہ دو افراد کی رہائی کا ہو گا جو خاصی حد تک خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں مگر اس کے باوجود میں تم سے روانگی کی اجازت چاہوں گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

ہاشم اور عبدالکمال کی نگاہیں چار ہوئیں جن میں محض تشویش ہی لہرا رہی تھی۔ پھر ہاشم مجھ سے نگاہیں چرا کر بولا۔ "تو ٹھیک ہے، تم اپنی راہ جاؤ، ہم اپنی راہ چلتے ہیں۔ تمہیں غیر یقینی حالات میں جھونک کر تو شاید مجھ سے ایک گولی بھی نہ چلائی جا سکے گی۔"

باقی لوگ تو محض حکم کے بندے تھے مگر ہاشم اور عبدالکمال کے ساتھ میری بحث طول پکڑ گئی اور وہ کسی طرح مجھے ڈھیل دینے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ میرے لہجے کی تلخی بھی ان پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکی۔

اور اس جبری سمجھوتے کے بعد ساتوں افراد کی ذمہ داریاں متعین کی جانے لگیں۔ میرا مورچہ اس کمین گاہ سے قریب ترین تھا۔ مجھ سے دو سو گز دُور داہنی سمت میں ہاشم کو فائرنگ کرنی تھی جبکہ بائیں طرف عبدالکمال مامور کیا گیا تھا۔ بقیہ افراد آگے پھیلائے گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو ذاتی تحفظ کے بارے میں ہاشم نے غیر معمولی نوعیت کا لیکچر دیا تھا، جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ خطرے کی صورت میں وہ ہتھیاروں تک سے

چھٹکارا حاصل کر لیں۔

اسلحہ کی تقسیم بڑی حد تک مساویانہ رہی۔ اسٹین گن کی گولیوں کے علاوہ ہر ایک کے پاس دو چار دستی بم بھی تھے جو دہشت گردی کے علاوہ ذاتی تحفظ کے نازک مرحلے پر بھی کام آ سکتے تھے!

چاروں نئے افراد کیے بعد دیگرے وہاں سے رخصت ہوئے۔ انہیں واپسی کے بارے میں کھلی چھوٹ تھی کہ بحفاظت کسی طرف نکل سکیں تو غیر ضروری طور پر پیچیدہ راستہ نہ اپنائیں اور اگر مشکل محسوس ہو تو آٹھ بجے تک اسی مقام پر پہنچنے کی کوشش کریں جہاں درختوں کے کنج میں ہماری وین پوشیدہ تھی۔

وین کو وہاں سے واپس لے جانا قطعی ضروری نہیں تھا لیکن ہنگامی صورتحال میں وہ اسلحہ کام آ سکتا تھا جو وین کے عقبی حصے میں فاضل پڑا رہ گیا تھا اور یہ ذمہ داری ہاشم نے اپنے سر لی تھی کہ کام پورا کرنے کے بعد وہ آٹھ بجے تک وین کے قرب و جوار میں موجود رہ کر اپنے کسی لوٹنے والے ساتھی کا انتظار کرتا اور اگر سارا کام حسبِ منشا پورا ہو جاتا تو وہاں سے کھسک کر اپنی کار میں شہر واپس لوٹ جاتا۔

"مجھے امید ہے کہ تم اندر گھسنے کی کوشش نہیں کرو گے!" ہاشم نے وہاں سے روانہ ہونے سے قبل بے اعتباری سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اب بھی مجھے اجازت دے دو تو میں تمہارا احسان مند رہوں گا۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"اندر گھس کر نہ صرف تم خود مصیبت میں پڑ جاؤ گے بلکہ سیتا کو بھی غیر ضروری مشکلات سے دوچار کر دو گے۔" وہ ناپسندیدہ لہجے میں بولا۔

"اگر تم مُصر ہو تو میں تمہاری مرضی کے سامنے لاچار ہوں۔" میں نے اس کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

"تمہارے سامنے میری مرضی بے معنی ہے۔" وہ قدرے چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "تم چاہو تو مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود اندر گھس سکتے ہو۔"

"یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔" میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔ "تم سے کیا ہوا وعدہ میرے لئے اٹل ہو گا اور میں اس سے کسی قیمت پر انحراف نہیں کر سکوں گا۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں دیکھا پھر بولا۔ "اگر تمہارا وعدہ اسی قدر اٹل ہے تو میں ہرگز تمہیں اس احمقانہ اقدام کی اجازت نہیں دوں گا۔ تمہیں باہر رہ کر اپنا کام کرنا ہو گا۔"

"اگر یہ تمہارا حکم ہے تو میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں اپنے محسنوں کی بات کبھی نہیں ٹالتا۔"

"فی امان اللہ۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا اور وہ روایتی انداز میں میرے داہنے رخسار پر بوسہ دے کر وہاں سے چلا گیا۔

چند ثانیوں بعد ہی عبدالکمال نے بھی اس کی تقلید کی اور میں گوالوں کی اس وین کے قریب تنہا کھڑا رہ گیا۔

وہ لمحات نہ جانے کیسے جذباتی شدت کے حامل تھے کہ بے اختیار میری آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے۔

چند سیکنڈ بعد مجھے اس عارضی سکتے سے نجات ملی تو میں نے بھی سر جھٹک کر اپنی اسٹین گن شانے سے لٹکائی اور دستی بم جیبوں میں اڑس کر اس کنجِ عافیت سے باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں خالی الذہنی کے عالم میں چند منٹ تک آگے بڑھتا رہا، پھر ایک دم چونک پڑا کیونکہ میرے کانوں میں کچھ فاصلے سے دو تین مقامیوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے!

"واللہ لطف آ جائے گا۔" کوئی قہقہہ لگا کر کہہ رہا تھا۔ میرے کانوں سے ٹکرانے والا وہ پہلا مکمل فقرہ تھا۔

"تم احمق ہو۔" یہ دوسری آواز تھی۔ "اگر وہ میرے قبضے میں آ گئی تو پہلے اسے کالے کتے کی پوری بوتل پلاؤں گا پھر اسے سنچا سنچا کر ہلاک کروں گا۔"

"سنچا سنچا کر۔" یہ دو ملی جلی مضحکانہ آوازیں تھیں۔ ابتدائی فقرے کے بعد وہ صرف ایک ہی مردانہ آواز رہ گئی۔

"مجھ سے ٹکرا گئی تو اس کا منہ دبوچ کر اسے اتنی دُور لے جاؤں گا کہ میرے کمانڈنگ آفیسر کی آواز بھی مجھ تک نہ پہنچ سکے گی۔"

میری نبض کی رفتار یک بیک تیز تر ہو گئی اور دوران کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میرے لئے ان حبشیوں کی گفتگو بہت زیادہ واضح تھی اور وہ ہولناک تبصرے میرے لئے قطعی ناقابلِ برداشت تھے۔

میں احتیاط اور اشتعال کی ملی جلی کیفیت میں کئی قدم آگے سرک گیا۔

"وہ جو بھی ہے محض ایک عورت ہی ہے!" یہ الفاظ ادا کرنے والا سپاہی میری تیز نگاہوں کی زد میں آ چکا تھا۔ "اور اس سے وہی سلوک مناسب رہے گا جو ایک فاتح مرد مفتوحہ عورت کے ساتھ کر سکتا ہے۔"

اس کے یہ الفاظ میری قوتِ برداشت کے لئے تازیانہ ثابت ہوئے۔ اس وقت تین باوردی مسلح پولیس والے میری نگاہوں کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اسٹین گن کی نالی سیدھی کی میگزین کی پیٹی چڑھائی اور کسی اور کے تبصرے سے پیشتر ہی میری اسٹین گن چل پڑی۔ میرا وار اس قدر کاری اور سچا ثابت ہوا کہ وہ تینوں ہی فضا میں اچھل کر ایک دوسرے سے گز دو گز دُور خاک پر گر کر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

اپنا کام کر کے میرا داہنا ہاتھ ساکت ہو گیا مگر اسٹین گن کا شور بدستور جاری رہا۔ چند ثانیوں کے لئے میں بوکھلا کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ میرے فائر کی بازگشت تھی یا کسی اور فریق کا جوابی فائر۔

مگر پھر صورتِ حال واضح ہوگئی۔ مختلف سمتوں سے اسٹین گنیں چل رہی تھیں میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو سات بج کر سولہ منٹ ہو رہے تھے۔

ہاشم اور اس کے آدمی پروگرام کے مطابق مقررہ وقت پر فائرنگ کا آغاز کر چکے تھے اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ اشتعال کے عالم میں میری خونریز فائرنگ مقررہ وقت پر ہی شروع ہوئی تھی!

اسٹین گنوں کی فائرنگ بدستور جاری تھی اور اس کے نتیجے میں اندرونی حلقے میں ابتری کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے جابجا ہذیانی چیخیں اور بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے قدرے توقف کے بعد اپنی اسٹین گن کا دہانہ دوبارہ کھول دیا۔ اسی اثنا میں اندر سے بھی رائفلوں کے فائر ہونے لگے مگر مجھے پورا یقین تھا کہ وہ لوگ اس ناگہانی افتاد کے بارے میں کوئی بھی اندازہ نہ لگا سکے ہوں گے۔

جوابی فائرنگ کا آغاز ہوتے ہی اسٹین گنوں کا شور تھمنے لگا پھر میں نے بھی ہاتھ روک لیا اور اندھیرے میں اندازے کی بنا پر تیزی سے اس طرف ہو لیا جہاں درختوں کے کنج میں وین موجود تھی۔ کیونکہ ہاشم کو بہرحال وہیں واپس پہنچنا تھا۔

اسٹین گنوں کے خاموش ہو جانے کے باوجود فضا رائفلوں کی وحشیانہ فائرنگ سے لرز رہی تھی اور میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ سیتا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر باغ سے فرار ہو گئی ہو۔

لوٹتے لوٹتے مجھے خیال آیا کہ میرے ساتھیوں کی فائرنگ بمشکل چھ سات منٹ تک جاری رہی تھی، ایسا نہ ہوا ہو کہ مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے وہ عرصہ کم رہا ہو لہٰذا میں نے رک کر ایک بار پھر گولیاں برسانے کا ارادہ کیا جسے دوسرے خدشے کے پیشِ نظر فوراً ہی ترک کر دینا پڑا۔ خوف زدہ اور بوکھلائے ہوئے سپاہی باہر کی طرف گولیاں چلا رہے تھے جبکہ میری گولیاں ان سے گزر کر براہِ راست رجب کے اس باغ تک جاتیں جہاں سے سیتا کے فرار کی امید تھی اور یہ امکان بھی تھا کہ... اندھیرے میں آزادی کی راہ پر بڑھتی ہوئی سیتا میری کسی بھٹکی ہوئی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔

اس خوف کے باعث میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

واپسی پر مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ ہماری مسروقہ وین اصل محاذ سے کافی فاصلے پر روکی گئی تھی۔

میں اندھیرے میں انتہائی احتیاط سے پیش قدمی کرتے ہوئے اس کنج سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

کئی لمحوں تک سانس روک کر سن گن لینے کے باوجود جب مجھے کوئی آہٹ یا آواز نہ سنائی دی تو میں نے نہایت دھیمے سُر میں اپنے ہونٹوں سے ایک بار سیٹی بجائی جس کے جواب میں اندر سے اسی انداز میں دو مرتبہ سیٹی کی آواز سنائی دی جس کا مطلب تھا کہ میں بلا خوف آگے بڑھ سکتا تھا۔

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ اگر باہمی شناخت کا وہ اشارہ پہلے سے طے نہ کر لیا جاتا تو بعد میں غلط فہمی کی بنا پر آپس میں ہی کسی خونریز جھڑپ کا امکان پیدا ہو جاتا۔

اندر پانچ آدمی واپس آ چکے تھے ان میں ہاشم اور عبدالکمال بھی شامل تھا صرف ایک آدمی باہر رہ گیا تھا۔

ان سب کو وہاں موجود پا کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ میرے مقابلے میں وہ سب ہی اس کمین گاہ سے زیادہ فاصلے پر بھیجے گئے تھے مگر اس کے باوجود مجھ سے پہلے وہاں واپس لوٹ آئے تھے۔

وہ سب ہی وین میں سوار تھے۔ ہاشم اور عبدالکمال ایک شخص کے ہمراہ عقبی حصے میں موجود تھے جبکہ دو افراد اگلی نشست پر چھپے ہوئے تھے۔ آگے والوں نے بھی باہر کی دیکھ بھال کے لئے کوئی بندوبست کیا ہوا تھا کیونکہ پیچھے والے تینوں افراد نے وین کے عقبی حصے پر منڈھی ہوئی ترپال میں مختلف سمتوں میں سوراخ کئے ہوئے تھے تاکہ خود روپوش رہ کر باہر کی نگرانی کر سکیں۔

وین کے عقبی حصے میں پہنچتے ہی مجھے بھی اسٹین گن سمیت ایک مورچہ سنبھالنا پڑا کیونکہ سوا آٹھ بجے تک آخری آدمی کا انتظار ضروری تھا۔

"سب آدمی یہیں کیوں لوٹ آئے؟" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں ہاشم سے سوال کیا۔

"ہر شخص کو معلوم تھا کہ میں ہرحال میں سوا آٹھ بجے تک یہاں رکوں گا اور کوئی بھی مجھے تنہا چھوڑنا نہیں چاہ رہا تھا پھر یہاں سے واپسی کے لئے سواری کا حصول خاصا دشوار ہوتا جب کہ وین سے شہر پہنچنا بہت آسان ہوگا۔" اس کے بعد تاریک وین میں گہرا سکوت چھا گیا۔ سکوت کے اس تسلسل کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے حشرات الارض کی آوازیں توڑ رہی تھیں ورنہ ہم لوگ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں تک صاف سن رہے تھے۔ وقت جوؤں کی چال رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ ہمارے لیے اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور ہم کو پولیس کی تلاش کی مہم شروع ہونے سے قبل خطرناک علاقہ عبور کر جانے کا موقع حاصل تھا جو ساتویں آدمی کے انتظار کے سبب ضائع ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک نگاہ اپنی ریڈیم ڈائل ریسٹ واچ پر ڈالی جو آٹھ بج کر دس منٹ کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہماری روانگی میں ابھی پانچ منٹ کا طویل عرصہ باقی تھا۔

یہ تو ہماری کمین گاہ کا اعصاب شکن اور سنسنی خیز ماحول تھا، دوسری طرف رجب کے باغ کے گرد پھیلے ہوئے مسلح سپاہیوں کی بوکھلاہٹ تھی جس کے صوتی اثرات اب تک ہمارے

کانوں میں گونج رہے تھے۔

ان پر اس قدر منظم اور بھرپور انداز میں فائرنگ کی گئی تھی کہ کافی دیر قبل وہ سلسلہ موقوف ہونے کے باوجود وہ یہ یقین نہیں کر سکے تھے ان کے سروں پر منڈلاتا ہوا موت کا ان دیکھا خطرہ ٹل چکا تھا—

ان کی طرف سے رائفلوں کی فائرنگ کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا مگر اس کے باوجود ہر چند سیکنڈ بعد ان اطراف سے رائفل کے اِکا دُکا فائر کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ لوگ گھبراہٹ کے عالم میں خیالی ہیولوں پر بھی فائر کرنے سے نہیں چوک رہے تھے۔

معاً وین کی محدود فضا ایک مدھم سی شٹکار سے گونج اٹھی۔

میں اور میرے ساتھ ہی شاید دوسرے بھی چونک کر پلٹے اور پھر میری اندھیرے کی عادی نگاہوں نے وین کے عقبی ترپال کے سوراخ میں سے آنکھیں لگائے ہوئے شخص کو دیکھا جو اپنی نشست پر بے تابی سے بایاں ہاتھ لہرا لہرا کر دوسروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں وین کے فرش پر بکھرے ہوئے چوبی بکسوں سے بچتا ہوا سب سے پہلے اس کے قریب پہنچا اور عقبی پردے کا سرا خفیف سا سرکا کر باہر جھانکنے لگا۔

باہر کا منظر خاصا سنسنی خیز تھا!

وہ ایک طویل القامت اور دبلا پتلا شخص تھا جو دونوں ہاتھوں میں رائفل یا بندوق سنبھالے چوکنے انداز میں ان کچلی ہوئی جھاڑیوں کو عبور کرتا آگے بڑھ رہا تھا جو وین کے پہیوں تلے روندی گئی تھیں۔

وہ رات ویسے ہی اندھیری تھی پھر وین گھنے درختوں کے ایسے کنج میں چھپی ہوئی تھی کہ اسے چند فٹ کے فاصلے سے بھی دیکھا جانا ناممکن تھا ورنہ وہ محتاط شخص یوں سیدھا اس کچھار میں نہ گھسا چلا آتا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال ہوا کہ وہ ہمارا ساتواں آدمی نہ ہو لیکن اول تو ہم میں سے کسی کا قد اتنا طویل نہیں تھا اور پھر سیٹی کے مخصوص اشاروں کے تبادلے کے بغیر ہمارا آدمی اس طرح کنج میں گھسنے کی حماقت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ مبادا وین پر کسی حریف کا قبضہ ہو گیا ہو جو اسے دیکھتے ہی گولی مار دے۔

میں نے حیرت سے نگاہیں ہٹائیں تو ہاشم اور عبدالکمال کو بھی وہیں موجود پایا۔ چوتھا آدمی ایک بغلی ترپال پر جا کھڑا ہوا تھا کیونکہ اس موقع پر ساری سمتوں کی بیک وقت نگرانی ضروری تھی۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" سانسوں کے آہنگ میں عبدالکمال کی مدھم سی ہیجان آمیز سرگوشیانہ آواز ابھری۔

اس وقت تک آنے والا اتنی دور تھا کہ ایسی کوئی آواز کسی بھی طرح اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"تھوڑا سا لنگڑا رہا ہے، شاید زخمی ہے!" ہاشم نے ترپال کے سوراخ سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا پھر کسی فوری خیال کے تحت وہ تیزی سے سیدھا ہو گیا اور پُرجوش لہجے میں بولا "واللہ! یہ تو پیٹر سالومن ہے، لنگڑا سالومن!"

"کون؟" میرا لہجہ سرگوشیانہ اور سرد تھا کیونکہ ہاشم کی زبان سے نکلنے والا نام بجائے خود خاصا معنی خیز تھا۔

"اسرائیلی سیکرٹ سروس کا ایک خطرناک کارندہ! مم.... مگر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟" ہاشم نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اسے زندہ پکڑا جائے گا۔" میں نے دوبارہ سوراخ سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "میری ہدایت کے بغیر کوئی اس پر گولی نہ چلائے۔"

"تم احمق ہو" ہاشم غرایا "یہ پیدائشی لنگڑا ضرور ہے مگر چھلاوے سے کم نہیں۔ اسے ذرا بھی موقع مل گیا تو ہم سب ان جنگلوں میں سر ٹکراتے رہ جائیں گے۔"

"کمانڈر میں ہوں ہاشم، تم نہیں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا اور وین میں صرف سانسوں کی آواز باقی رہ گئی۔

ہاشم عقبی رخ پر نگرانی کرتا رہا۔ عبدالکمال نے تیسرا رخ سنبھال لیا اور میں ڈرائیونگ کیبن میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

آگے والے شاید ہماری بھنبھناہٹ تو سنتے رہے تھے مگر صورتحال کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔

اس وقت وہ دونوں شاید نیچے دبکے ہوئے تھے۔ میں نے خفیف سی آواز میں انہیں مخاطب کیا تو ان میں سے ایک سیدھا ہو گیا۔

"ایک آدمی ادھر آ رہا ہے۔" اس نے اٹھتے ہی گویا مجھے اطلاع دی۔

"اس پر گولی نہ چلانا، میں اسے زندہ پکڑنے باہر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اس کا جواب سنے بغیر پیچھے لوٹ گیا۔

باہر نگاہ ڈالتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں یکبارگی تیز ہو گئیں۔

باہر کافی اندھیرا تھا اور اتنے فاصلے کی کسی چیز کا تفصیلی طور پر دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دراز قامت اور دبلا پتلا ہیولا خاصا نمایاں تھا۔

شاید وہ وین دیکھ چکا تھا کیونکہ وہ پتھر کے کسی بُت کی طرح ایک ہی جگہ جما ہوا کھڑا تھا اور اپنی رائفل کا کندا اس نے زمین پر ٹکایا ہوا تھا۔

اس کی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ بیک وقت وین کے دو حصے دیکھ رہا تھا۔ عقبی اور داہنا رخ مخدوش تھا۔

میں نے ڈرائیونگ کیبن کے قریب بائیں رخ پر تیزی سے ترپال الگ کی اور بجلی کی سی سرعت سے آہنی ڈھانچے پر لٹک کے نرم زمین پر پہنچ گیا۔

گھور اندھیرے میں میں فوراً ہی پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا۔ اور رینگتا ہوا اسی سمت کے اگلے ٹائر کے آگے اس طرح لیٹ گیا کہ لنگڑے سالومن کا موہوم سا ہیولا میری نگاہوں کی زد میں تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں

دیکھ سکتا تھا۔

چند سیکنڈ اسی طرح گذر گئے وہ بچہ کسی بے جان مجسمے کی طرح ساکت تھا۔ نہ جانے اس طرح وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر جنبش کی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی مگر چشم زدن میں سب کچھ واضح ہو گیا۔

اس نے نہ جانے کیا حرکت کی تھی کہ اس کے قدموں میں یکایک سفید رنگ کی اس قدر تیز روشنی نمودار ہوئی جس نے میری نگاہیں خیرہ کردیں۔ اس روشنی کا رخ وین کی طرف تھا اور اس کے پیچھے وہی گھور اندھیرا یا روشنی کا دھیما سا انعکاس تھا۔ یوں معلوم ہوا جیسے سالومن نے ہزاروں واٹ کے طاقتور قمقمے والی سرچ لائٹ ہماری طرف پھیر کر روشن کردی ہو!

وہ تیز ترین اور عجیب وغریب روشنی بمشکل ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقفے کے لئے برقرار رہی اور پھر ہر سو وہی گھور اندھیرا پھیل گیا۔

میں نے کئی بار پلکیں جھپکائیں، ہتھیلیوں سے آنکھوں کو رگڑا مگر فوری طور پر میری بینائی بحال نہ ہو سکی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ سالومن اپنی پیدا کی ہوئی اس انوکھی چکا چوند کی آڑ میں واقعی کسی چھلاوے کی طرح کہیں غائب ہو گیا ہوگا۔

" بھاگو۔۔۔! چکا چوند کے معدوم ہوتے ہی یا شاید اس سے لحظہ بھر بعد میرے کانوں میں ہاشم کی آواز آئی۔

یکلخت وین کا انجن جاگ اٹھا اور میں اچھل کر اگلے ٹائر کے سامنے سے ہٹ گیا مگر وہ وین آگے بڑھنے کے بجائے تیزی کے ساتھ الٹی دوڑنے لگی، میں دیوانہ وار اچھل کر داہنی طرف کیبن کے پائیدان پر جھول گیا۔

وین اپنی جگہ سے چند فٹ ہی کھسکی تھی کہ عین اسی جگہ کوئی ہلکی سی چیز گر کر تیز دھماکے سے پھٹی اور جا بجا آگ بھڑک اٹھی۔

شاید وہ کوئی چھوٹا مگر مہلک آتش گیر بم تھا جو پوری وین کو خاکستر کرنے کے لئے کافی تھا اور پھر شعلوں کی روشنی میں جو بھی وین سے کود کر جان بچانے کی کوشش کرتا، سالومن کی پیاسی رائفل کا نشانہ بن جاتا۔

ان سب حرکات میں اس قدر مشینی تسلسل اور تواتر تھا کہ یہ تعین کرنا دشوار تھا کہ پہلے کیا ہوا اور بعد میں کیا ظہور پذیر ہوا، مگر ایک بات یقینی تھی کہ جب ہاشم نے بھاگنے کا نعرہ لگایا تو آتش گیر بم سالومن کی ہتھیلی سے نکل کر فضا میں پہنچ چکا تھا اور اگر وین کا ڈرائیور وہاں سے سرکنے میں حیرتناک مستعدی کا مظاہرہ نہ کرتا تو وین کے انجن پر پڑنے والا بم وین کے ساتھ ہی مجھے بھی لے ڈوبتا۔

ایک وار خالی جانے کے بعد سالومن نے دوسرا بم پھینکا مگر موت کے دہانے سے نکلنے والا وین ڈرائیور اس وقت تک کنج کا دہانہ عبور کر کے درختوں وغیرہ سے ٹکراتا ہوا وین کو ریورس گیئر میں ہی ایک اوٹ میں لے گیا تھا۔

پھر اس نے پوری قوت سے بریک لگا کر پہلا گیئر ڈالا اور وین کسی زخمی درندے کی طرح غراتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔

وہ کچا راستہ اس قدر ناہموار تھا کہ مجھے اچھلتی ہوئی وین کے مختصر سے پائیدان پر اپنے قدم جمائے رکھنے کے لئے جانگسل جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔

میں جس طرف لٹکا ہوا تھا۔ اسی رخ پر وین کی ڈرائیونگ سیٹ بھی تھی اور یہ امکان بھی نہیں تھا کہ میں وین کی رفتار پر اثر ڈالے بغیر کیبن میں داخل ہو سکتا۔

ایک جگہ نہایت تنگ موڑ کاٹتے ہوئے چند شاخیں پورے زور سے میرے بدن کے مختلف حصوں سے ٹکرائیں اور میں اف بھی نہ کر سکا۔

" صفدر ..... صفدر کہاں ہے ؟" اچانک ڈرائیونگ کیبن میں مجھے عبدالکمال کی تردد آمیز آواز سنائی دی۔

شاید وہ عقبی حصے میں کھلنے والی کھڑکی سے میرے بارے میں استفسار کر رہا تھا۔

" وہ ادھر ہی پائیدان سے لٹکا ہوا ہے۔" ڈرائیو کرنے والے کی آواز سنائی دی۔" ذرا آگے گاڑی روک کر اسے اندر لے لیں گے۔"

" ہم کافی آگے نکل آئے، اسے اندر لے لو، کہیں جھٹکوں سے گر کر وہ زخمی نہ ہو جائے۔" وہ آواز عبدالکمال کی ہی تھی۔

فوری طور پر وین روک دی گئی اور میں غراتے ہوئے انجن کے سامنے سے لپک کر ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھ گیا۔ وین دوبارہ آگے روانہ ہو گئی۔

اوسان بحال ہونے کے بعد جب میں نے کچے راستے کی غیر معمولی طوالت پر غور کیا تو انکشاف ہوا کہ واپسی کے لئے مختلف راستہ استعمال کیا گیا تھا۔

" ہم کدھر جا رہے ہیں ؟" میں نے یخ بستہ انگلیوں سے اپنے لئے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے وین ڈرائیور سے سوال کیا۔

" شہر کی طرف !" اس کا مؤدبانہ جواب تھا۔" یہ راستہ کم وبیش دگنا طویل ہے۔ پرانے راستے پر پولیس سے مڈبھیڑ کا خطرہ تھا۔"

" تم ادھر کیوں بیٹھ گئے ؟" اچانک مجھے عقبی خلا میں ہاشم کی آواز سنائی دی۔ ظاہر تھا کہ وہ سوال مجھ ہی سے کیا گیا تھا۔

" بس مہلت یا کچھ آرام کی طلب کہہ لو، سگریٹ دوں ؟" میں نے زبردستی ہنستے ہوئے خفت آمیز لہجے میں کہا۔

" میرے پاس موجود ہے !" وہ شاید جواب دے کر وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

" ہمارا ساتواں آدمی نہیں لوٹا ؟" قدرے توقف کے بعد میں نے اپنے برابر والے سے نرم لہجے میں سوال کیا۔

" ہم وہاں سے مقررہ وقت کے بعد ہی چلے ہیں۔" اس نے کہا۔" دو ہی صورتیں ممکن ہیں کہ وہ کسی اور طرف نکل گیا ہو یا پھر زخمی ہو گیا ہو !"

" اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی !"

" اس کے لئے ضرور مشکل ہو جائے گی مگر وہ زبان کھولنے والوں میں سے نہیں ہے۔" اس کا لہجہ پر یقین تھا۔

" شادی شدہ ہے ؟"

وہ میرے سامنے پہلی بار ہنسا اور بولا۔" شادی کے ساتھ ہی آدمی کی نصف مردانگی رخصت ہو جاتی ہے ؟"

" میرے بارے میں کیا خیال ہے ؟" میں نے اپنے ذہن کو ہلکی پھلکی گفتگو میں الجھائے رکھنے کی نیت سے سوال کیا۔

" مم ..... میں ... سم .... سمجھا نہیں ؟" وہ بے چارہ بری طرح بوکھلا گیا۔

" میری مردانگی کو پورا شمار کرتے ہو یا ادھورا ؟" میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

" معاف کرنا مجھے معلوم نہیں تھا۔" وہ بے اختیار ندامت آمیز لہجے میں بولا۔" وہ بات تو میں نے یوں ہی مذاق میں کہہ دی تھی۔"

" کیا معلوم نہیں تھا تمہیں ؟"

" یہی کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے !" اس کے لہجے میں ایسی بیچارگی سمٹ آئی جو قصاب کی چھری تلے دبی بکری کی ممیاہٹ میں ہوتی ہے۔

اسے ذہنی بوجھ سے نجات دلانے کے لئے میں ہنس پڑا۔" پھر تو شاید تمہیں میرا نام بھی معلوم نہ ہوگا ؟"

اس نے خاموشی سے گردن میری طرف گھمائی پھر لحظہ بھر سکوت کے بعد تحیر آمیز لہجے میں بولا۔" اوہ ۔۔۔ تو تم وہی مشہور ومعروف صفدر علی ہو۔ جس کی پولیس اور فوج سے ٹھنی ہوئی ہے۔ میں تو تمہیں اس کا کوئی اتفاقی ہم نام سمجھ رہا تھا۔ میرے خدا ! تمہاری دلیری اور مردانگی کی تو قسم کھائی جا سکتی ہے۔"

" تو کیا عبدالکمال نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا ؟"

" جن باتوں سے ہمارا براہ راست تعلق نہ ہو وہ ہمیں نہیں بتائی جاتیں اور نہ ہی ہم انہیں جاننا چاہتے ہیں مگر تمہاری رفاقت تو میرے لئے ایک اعزاز ہے۔" وہ یک بیک مجھ سے بہت زیادہ مرعوب ہو گیا تھا۔

" ایکس تھری پر وین اسلحہ سے خالی کر کے ہم آگے بڑھیں گے !" اس بار عقبی کھڑکی سے عبدالکمال کی آواز آئی۔

" پھر کچا راستہ ہی مناسب رہے گا !" وین ڈرائیور نے تائید طلب لہجے میں کہا۔

" ہاں، موجودہ حالت میں شاہراہوں پر نکلنا خطرناک ہوگا۔"

میرے ذہن میں ایکس تھری کے بارے میں تجسس نے سر ابھارا مگر میں نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔

وین کے ہیڈلیمپس کی روشنی دو رویہ گھنے باغات اور کھیتوں کے درمیان سے گذرنے والے اس ناہموار راستے پر پڑ رہی تھی جہاں شاید مدتوں بعد ہی کوئی مشینی گاڑی پہنچتی ہو۔ اس راستے کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ مویشیوں کے سہارے چلنے والی بھونڈی گاڑیوں کی برسوں کی آمد ورفت سے وجود میں آیا ہوگا۔

کچھ دیر بعد کھیتوں وغیرہ کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وین ریگستانی علاقے میں بڑھنے لگی۔ چند منٹ بعد اس سفر کا اختتام دیہاتی طرز کے ایک بڑے سے کچے مکان پر ہوا جہاں وین کے انجن کا شور سن کر ایک ادھیڑ عمر آدمی دروازے پر نکل آیا تھا۔

وین رکتے ہی میں نیچے کود گیا۔

ادھیڑ عمر آدمی ہیڈلیمپس کی روشنی میں مکان کے دروازے پر کھڑا معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہا تھا۔

" کیا حال ہے ابوجمال ؟" عبدالکمال نے وین کے عقبی حصے سے اترتے ہوئے بآواز بلند اس شخص کی مزاج پرسی کی۔

ان دونوں میں پرتپاک فقروں کا تبادلہ ہوا پھر عبدالکمال کے چاروں آدمی اسلحہ کی پیٹیاں اس مکان میں لے جانے لگے جہاں شاید پیٹرومیکس لیمپ روشن تھا۔

میں نے اس مکان کو اندر سے دیکھنے کی نیت سے اسلحہ کی منتقلی میں شریک ہونے کی کوشش کی مگر ہاشم نے مجھے روک دیا۔

" تم رہنے دو، لڑکے یہ کام پھرتی سے نمٹا لیں گے۔" اس نے کہا۔

" مجھے افسوس ہے ہاشم !" میں نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ فراخدلانہ انداز میں ہنس پڑا۔" تمہارا قصور نہیں تھا۔ دراصل تم اس سے ناواقف تھے۔ وہ ہر وقت بے شمار شعبدے جیب میں لئے پھرتا ہے۔ تم نے دیکھا کہ وہ روشنی کیسی عجیب وغریب اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والی تھی !"

" اگر ہم فائرنگ کر کے اس کا نچلا دھڑ ناکارہ کر دیتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی اور وہ بآسانی پکڑ لیا جاتا۔"

" اب اسے بھول جاؤ، بس یہی غنیمت ہوا کہ ہم اس کے ہاتھوں بھاری زک اٹھانے سے بال بال بچ گئے۔"

" اسے میں بھول تو نہیں سکتا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔" آخر وہ ان حالات میں وہاں کیا کرتا پھر رہا تھا ؟"

" اس کی وہاں موجودگی واقعی حیرت ناک تھی، اس کا مطلب یہی ہے کہ اسرائیلی ابھی تک تمہارے اور سیتا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ البردنو کا سٹیلانو کو سالومن ہی نے سیتا پر ہاتھ ڈالنے کے لئے تیار کیا ہو اور اس کی موت کے بعد وہ خود میدان میں آ گیا ہو۔"

" وہ بہت گھاگ اور تجربے کار معلوم ہوتا ہے، وہ ہماری تمام احتیاط کے باوجود بھانپ گیا تھا کہ وین اس کے لئے چوہے دان ثابت ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔" پھر وہ اتنا مشہور ہے کہ اسے تمہارے علاوہ بھی بے شمار لوگ جانتے ہوں گے۔ ایسا آدمی ایک دشمن ملک میں بذات خود کوئی مہم سر لے کر محض خودکشی ہی کر سکتا ہے اور سالومن اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"ایسا تو نہیں کہ اس معاملے میں مصری حکام نے اسرائیلی سیکرٹ سروس کا تعاون بھی حاصل کر لیا ہو؟"

"اگر تمہاری بات درست مان لی جائے تو سالومن وہاں چوروں کی طرح اکیلا کیوں گھوم رہا تھا؟ اسے تو اعلیٰ حکام کے ساتھ ہونا چاہیے تھا!" اس نے کہا۔

"اس وقت تو یہ معلوم ہونا مشکل ہی ہے کہ ہمارے اقدام کے بعد رجب کے باغ میں کیا واقعات پیش آئے ہیں؟"

"مشکل ہی نہیں ناممکن سمجھو۔" اس کا جواب تھا: "صبح کے اخبارات ہی سے صحیح حالات کا علم ہو سکے گا۔"

اس اثنا میں اسلحہ کی منتقلی کا کام مکمل ہو چکا تھا لہٰذا سب لوگ وین میں سوار ہو گئے۔ اس مرتبہ میں ہاشم اور عبدالکمال کے ساتھ عقبی حصے میں تھا۔ بقیہ تینوں ڈرائیونگ کیبن میں جا بیٹھے تھے۔

"ہمارا ساتواں آدمی نہیں لوٹا۔" وین روانہ ہونے کے بعد ہاشم نے تشویش آمیز لہجے میں کہا: "مجھے خدشہ ہے کہ وہ مارا نہ گیا ہو!"

"خدا کرے کہ وہ زندہ ہو۔" میں نے کہا: "مگر اتنا بتا دوں کہ میں نے ان کے کم از کم تین آدمی اپنے ہاتھوں سے مارے ہیں۔"

"دانستہ؟" ہاشم نے تحیّر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں، میں نے تو اپنی دانست میں قبل از وقت ہی فائرنگ کا آغاز کر دیا تھا مگر غنیمت یہ ہے کہ وہ اتفاقاً مقررہ وقت ہی تھا!"

پھر ان کے استفسار پر میں نے انہیں اس واردات کی تفصیل سنا ڈالی اور ان دونوں نے ہی میرے اس اقدام کی تعریف کی۔

نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک جگہ وین روک کر اس کا انجن بند کر دیا گیا اور سب لوگ نیچے اتر پڑے۔

مجھے بتایا گیا کہ وہ مقام قاہرہ کی ایک مضافاتی آبادی سے قریب تھا، اور چوری کی وین سے وہیں چھٹکارا پانا مناسب تھا۔

وین سے اترنے کے بعد تینوں لڑکے پُرجوش انداز میں رخصت ہو کر تیزی سے مختلف سمتوں میں معدوم ہو گئے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد ہم تینوں بھی ایک طرف روانہ ہو گئے۔

اس آبادی میں عبدالکمال کا کوئی دوست رہتا تھا۔ وہ ہمیں ایک جگہ چھوڑ کر چلا گیا اور دس منٹ بعد ایک اور شخص کے ساتھ کار میں واپس آیا جو اس کا ایک قریبی معتمد تھا۔

واپسی میں میرے ساتھ ہی ہاشم بھی ہوٹل القاہرہ پر اتر گیا اور عبدالکمال اسی کار میں واپس گھر چلا گیا۔

ہوٹل میں ہم دونوں لاتعلقانہ انداز میں آگے پیچھے داخل ہوئے۔ ہاشم کاؤنٹر سے اپنے کمرے کی چابی لے کر اوپر چلا گیا۔

میں نے روانگی کے وقت کمرہ نمبر چار سو چار کی چابی عجلت کے باعث کاؤنٹر پر واپس نہیں کی تھی۔ لہٰذا میں براہِ راست اوپر جا سکتا تھا مگر ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ میں نے جس رکھائی سے مریم سے پیچھا چھڑایا تھا، اس کے پیشِ نظر کہیں اس نے کمرے کی بکنگ ہی منسوخ نہ کرا دی ہو اور میں اس کمرے کا قفل کھولتے ہوئے نقب زنی کے الزام میں دھر لیا جاؤں۔

پھر میں نے براہ راست کاؤنٹر پر جانے کے بجائے القاہرہ کی وسیع راہداری میں لگے ہوئے انٹرکام پر کاؤنٹر کا نمبر ڈائل کیا اور استقبالیہ کلرک سے مسٹر جوزف اور مسز مریم جوزف کے بارے میں دریافت کیا کیونکہ مریم نے کمرہ نمبر چار سو چار انہی ناموں پر بک کرایا تھا۔

جواب میں مجھے بتایا گیا کہ اس کمرے کی چابی کی بورڈ پر موجود نہیں تھی۔

"وہ دونوں ابھی تک یہاں مقیم ہیں؟" میں نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

"جی ہاں۔" مختصر سا جواب ملا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اوپر جاتے ہوئے پہلے میں کمرہ نمبر ایک سو چالیس پر رکا اور ہاشم کو بتلایا کہ القاہرہ میں میری کمین گاہ بدستور قائم تھی پھر چوتھی منزل پر اپنے کمرے میں جا پہنچا۔

پہلے میں نے منہ ہاتھ دھویا، اس کے بعد آپریٹر سے مریم کے ہالٹ دوست کے گھر کا نمبر ملوایا جہاں سے سلسلہ ملنے پر مریم ہی کی آواز سنائی دی۔

"تم کہاں ہو؟ میں دو گھنٹے سے تمہارا منتظر ہوں۔" میں نے اس کی آواز پہچانتے ہی خوشگوار لہجے میں کہا۔

"اس وقت رات کے دس بج چکے ہیں۔" اس کا لہجہ دھیما تھا: "میں نے آٹھ بجے تک دو مرتبہ فون کیا مگر کمرے سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔"

"اب آ سکتی ہو؟"

"مشکل ہی ہے، وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گا، یہ معاملہ صبح پر ہی رکھو۔" اس نے کہا: "لیکن یہ تو بتاؤ کہ صبح نہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"صبح آؤ گی تو بتاؤں گا، ویسے میں اپنے رویّے پر معذرت خواہ ہوں۔" میں نے اسے ٹالنے کی نیت سے کہا۔

"بس تمہاری معذرت ہی کافی ہے۔ میں صبح دس بجے تک پہنچوں گی۔" اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

مریم سے اس گفتگو کے ذریعے میں نے ایسے کسی خطرے کو ٹال دیا تھا جو اس کی ناراضگی کے سبب پیدا ہو سکتا تھا ورنہ درحقیقت مجھے مریم کے قرب کی ذرا بھی خواہش نہ تھی۔ میں بس چند گھنٹوں کی گہری نیند سے کر اپنی تکان دور کرنی چاہتا تھا۔

مگر میں اپنی خواہش کے برعکس اس رات ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکا۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے اور سگریٹیں پھونکتے گزر گئی۔

صبح سات بجے مجھے اپنے دروازے پر دستک سنائی دی اور میں نے اٹھ کر پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔

میرے سامنے ہاشم کھڑا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ لحظہ بھر کو ہماری نگاہیں چار ہوئیں اور میرے وجود کی گہرائیوں میں کرب کی ایک اذیت ناک لہر تڑپ اٹھی۔

ہاشم نے فوراً ہی نگاہیں جھکا لیں اور پژمردہ لہجے میں بولا: "میرے کمرے میں آ جاؤ، کچھ اہم باتیں کرنا ہیں۔"

"اخبارات آ گئے؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"روم سروس والے ساڑھے سات بجے لاتے ہیں۔ میں باہر سے لے آیا ہوں۔"

اس کا لہجہ بدستور پژمردہ اور مدافعانہ تھا۔

"کیا خبریں ہیں؟" میں نے اپنے کمرے میں مڑتے ہوئے سوال کیا۔

"اختصار سے کام نہیں چلے گا۔ نیچے آ جاؤ، تمہارا ناشتہ بھی وہیں منگوا دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ واپس چلا گیا۔

اس نے اپنے تیوروں سے میرا سکون برباد کر دیا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے عجلت کے عالم میں اپنا حلیہ درست کیا اور جوتے پہن کر نیچے روانہ ہو گیا۔

وہ اپنے کمرے میں میرا ہی منتظر تھا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی ہر طرف نگاہیں دوڑائیں مگر کوئی اخبار نظر نہ آ سکا۔

"اخبارات کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔ اس کے رازدارانہ انداز کے باعث میری بے چینی حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"جب کوئی اچھی خبر نہ ہو تو پہلے باہمی تبادلۂ خیال بہتر ہوتا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں ذہنی طور پر ہر بُری خبر کے لیے تیار ہوں۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا: "میرے ساتھ یوں بچوں کا سا رویہ اختیار نہ کرو۔"

"تمہارے لیے بدترین خبر کیا ہو سکتی ہے؟" اس نے بستر کا گدا الٹتے ہوئے سوال کیا۔

"سیتا فرار نہ ہو سکی ہو گی، فرار ہوتے ہوئے زخمی ہو گئی ہو گی۔ یا۔ یا۔"

اس سے آگے میری زبان ہکلا گئی۔

اس نے کئی اخبارات میرے سامنے ڈال دیے۔

عربی اخبار المستقبل کی شہ سرخی پر نظر پڑتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ناچنے لگا۔ اور مجھے اپنا وجود یک بیک کھوکھلا سا محسوس ہونے لگا۔

المستقبل کی شہ سرخی زندگی کے لیے مدتوں سے لڑنے والی بے خوف اور دلیر سیتا کی موت کی کہانی سنا رہی تھی۔

میرے جبڑے بھنچ گئے اور آنکھوں کے گوشے غیر ارادی طور پر نمناک ہو گئے۔

"دل چھوٹا نہ کرو برادر۔" وہ میرے قریب آ کر میری پشت سہلاتے ہوئے بولا: "موت ہر انسان کا یقینی مقدر ہے اور اس کا ایک وقت معین ہے۔ وہ اس سے نہ ایک لمحے پہلے مر سکتا ہے نہ ایک سانس زیادہ لے سکتا ہے۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "میں دیکھوں گا کہ میں اب کس کس کو اس کے معینہ وقت کی نوید دیتا ہوں۔"

میرے وجود میں بھڑک اٹھنے والی انتقام کی آگ نے میرا دل یک بیک سخت کر دیا۔

وہ کچھ نہ بولا۔ اور میں تفصیلی خبر پڑھنے لگا۔

المستقبل کے نامہ نگار نے واقعات کی کڑیاں بہت محنت سے یکجا کی تھیں۔

پولیس کو سب سے پہلے یہ اطلاع ملی کہ سیتا کے ساتھ حسین نامی ایک لبنانی لڑکا بھی موجود تھا۔ اور پھر پولیس حسین کے بہنوئی رجب تک پہنچ گئی جب پولیس کو یہ علم ہوا کہ قاہرہ کے مضافات میں رجب کے باغ میں ایک رہائشی کاٹیج بھی ہے تو فوری طور پر اس کاٹیج کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں اور یہ سراغ ملا کہ وہاں ایک ایسی حسین عورت مقیم تھی جس کے چہرے پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔

اس اطلاع کے بعد فوری طور پر اس باغ کا خفیہ محاصرہ کر لیا گیا مگر شام کے ساڑھے سات بجے نامعلوم لوگوں نے بھاری جمعیت کے ساتھ باہر سے پولیس پر دھاوا بول دیا۔ وہ سب اسٹین گنوں سے لیس تھے ان کی فائرنگ سے چار پولیس والے ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔ پولیس کا اندازہ تھا کہ حملہ آوروں کے بھی کم از کم گیارہ افراد ہلاک اور زخمی ہوئے جنہیں حملہ آور بھاگتے ہوئے اٹھا کر لے گئے۔

پولیس کے خلاف اس تشدد آمیز کارروائی کے بعد باغ اور کاٹیج پر دھاوا بولنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور جب پولیس کسی مزاحمت کے بغیر رات کے ایک بجے کاٹیج میں داخل ہوئی تو وہاں سیتا کی مسخ شدہ لاش ملی!

اس کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے، منہ پر مضبوطی سے ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ اور اس کے جسم کے متعدد حصوں پر تشدد کے بے شمار نشانات واضح تھے۔

سرکاری حکام کا خیال تھا کہ سیتا جرائم پیشہ لوگوں کے کسی حریف گروہ کے ہاتھوں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچی تھی۔

اس کی لاش پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی پولیس نے اس کے قاتلوں اور حملہ آوروں کی تلاش کی مہم تیز کر دی تھی۔ ساتھ ہی صفدر علی کی گرفتاری کے لیے خصوصی دستے تشکیل دے دیے گئے تھے۔

وہ اخبار جا بجا اسی واقعہ سے متعلق خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں سیتا کی پرانی تصاویر اور ماضی قریب کے واقعات بھی شائع کیے گئے تھے مگر اس کی لاش کی تصویر شاید اشاعت کے لیے جاری نہیں کی گئی تھی۔

تفصیلی مطالعہ کے بعد میں نے اخبار فرش پر پھینک دیا۔

"اس تمام بربادی کا ذمہ دار رجب ہے۔" میں نے سرد اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر وہ تشدد کے خلاف مزاحمت کی صلاحیت سے عاری تھا تو اسے سیتا کو بنا مُرے کر جھمیلوں میں پھنسانے کا کوئی حق نہیں تھا۔"

"اسے کسی نامعلوم مقام پر سخت رازداری میں رکھا گیا ہے۔ اس کی ضمانت کی سرتوڑ کوششیں جاری ہیں۔ یہ تو اسی سے معلوم ہو سکے گا کہ اس المناک سانحے کا وہ کس حد تک ذمہ دار ہے۔"

"اب کسی صفائی، وضاحت یا تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" میرا لہجہ تلخ اور سرد تھا: "میرے لیے یہی خبریں کافی ہیں۔ میرے اندر کا آدمی اس وقت شکست و ریخت کے عذاب سے دوچار ہے۔ میں اب سکون چاہتا

ہوں چند روز کا مکمل سکون تاکہ اس کے بعد لوگوں کو صفدر علی کے بھیانک روپ سے بھی متعارف کرا سکوں۔"

"اگر ان خبروں کو درست مان لیا جائے تو پھر اس مقام پر سالومن کی موجودگی کا جواز بھی مل جاتا ہے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

اس نکتے پر میں چونک پڑا۔

اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ سالومن کو میں واقعی بھول رہا تھا۔ اگر یہ درست تھا کہ سیتا پولیس کے ستم کا نشانہ نہیں بنی تھی تو سالومن پولیس سے پہلے ہی رجب کے باغ تک پہنچ گیا تھا۔ اور وہی سیتا کے قتل کا ذمے دار تھا۔

لیکن یہ بات بعید از فہم تھی کہ سالومن نے سیتا کو زیر کرنے کے بعد اس پر تشدد کیا ہو۔ اسرائیلی اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ سالومن کے قبضے میں آ ہی گئی تھی تو اسے پہلی فرصت میں سیتا کو لے کر اپنے ملک کی طرف فرار ہونا چاہئے تھا۔

"اسرائیلیوں کے لیے سیتا کی حیثیت ثانوی تھی۔" میرا سوال سن کر ہاشم نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "وہ تم تک پہنچنے کے لیے سیتا کو آلۂ کار بنانا چاہتے تھے مگر اس وقت سالومن کے لیے سیتا سمیت مصر سے نکلنا ناممکن تھا لہٰذا وہ سیتا سے تمہارے ٹھکانے کے بارے میں باز پرس کرتا رہا۔ شاید وہ سیتا کو ہلاک نہ کرتا لیکن اسی دوران میں باہر سے ہم نے حملہ بول دیا اور وہ سیتا کو ہلاک کر کے باہر نکل گیا۔"

"ٹھگڑا سالومن تو بہرحال مجھ سے نہ بچ سکے گا مگر یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔" میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے اس قضیے کو دانستہ سیدھا سادا بنا کر پیش کیا گیا ہے۔"

"ان خبروں میں جھوٹ تو ضرور ہے۔" وہ بولا۔ "حملہ آوروں کی بھاری جمعیت اور پھر ان کے کم از کم گیارہ آدمی ہلاک و زخمی کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس طرح پولیس نے اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کے چار آدمی مر جانے پر انہیں تنقید کا نشانہ نہ بنایا جا سکے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارا ساتواں آدمی بھی بخیر و عافیت نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

سیتا کی موت کی خبر نے ابتدا میں میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا مگر اب وہ بلکہ مجھے وہ خبر ایک موہوم مفروضے میں بدلتی محسوس ہو رہی تھی مگر پھر بھی میں اس بارے میں یقین اور بے یقینی کے ملے جلے ردِعمل کا شکار تھا۔

"پیٹر سالومن کی حد تک تو میں پوری طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ اس سے اگلے لائحہ عمل کے لیے ہمیں رجب کی رہائی کا انتظار کرنا ہو گا۔" ہاشم نے کہا۔

"لیکن رجب کب رہا ہو گا۔ سالومن کے لیے تم کیا کر سکتے ہو؟" میں نے دل برداشتہ لہجے میں سوال کیا۔

"رجب کسی بھی وقت رہا ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ سیاسی آدمی ہے اور شہر کے اعلیٰ حلقوں میں خاصا اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ اس کی ضمانت کی کئی درخواستیں داخل کی جا چکی ہیں۔ اور سالومن کے بارے میں رات ہی میں نے ہدایات جاری کر دی ہیں۔"

"کون جانے کہ ہدایات کے اجرا اور نتائج کے حصول میں کتنا وقت لگتا ہے۔ بہرحال رجب کی رہائی سے کچھ امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔"

میں نے ہاشم کے ہمراہ اسی کے کمرے میں ناشتہ کیا۔ اس دوران میری ذہنی کیفیت عجیب و غریب تھی۔ کبھی طبیعت چاہتی کہ جیبوں میں [...] رکھ کر معروف بازاروں میں نکل جاؤں اور آنکھیں بند کر کے اس علاقے کو جہنم زار میں بدل دوں جہاں زندگی کی کوئی بھی رعنائی مجھے اپنی محرومی کا منہ چڑاتی نظر آئے اور کبھی ہنگاموں میں گزرتی ہوئی زندگی کو تیاگ کر کسی گوشۂ عافیت میں [...] بیٹھنے کا موڈ طاری ہو جاتا۔

ہاشم اس وقت ہر طرح میری دل جوئی کی کوششوں میں مصروف تھا مگر اس کی طفلانہ تسلیاں میرے لیے بے وقعت تھیں۔

اپنے گھر بار سے بچھڑنے کے بعد میں نے کچھ وقت اپنے تحفظ کی [...] کوششوں میں گزارا۔ پھر سیتا کو اپنانے کے بعد میں یک بیک دو محاذوں پر مصروف ہو گیا۔ اپنی ذات کی بقا اور سیتا کا تحفظ۔

میرے دونوں مقاصد اعلیٰ تھے۔ ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی فوقیت [...] تھی پچھلی رات تک میری یہ جنگ جاری تھی۔

لیکن سیتا کی موت کے ساتھ میری زندگی کا ایک تابناک باب [...] انداز میں اچانک ختم ہو گیا تھا۔ میں ادھورا رہ گیا تھا اور میری ذات بکھرنے لگی [...]

میری سوچ میں انگاروں کی تپش بھر گئی تھی۔ ذہن میں ابھرنے [...] ہر خیال کی بنیاد عظیم تر تخریب پر تھی اور اس وقت میں یہ سمجھنے سے قاصر [...] انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا صفدر علی اپنی باقی زندگی ایک عام آدمی کی طرح کیوں [...] اور کیسے گزار سکے گا۔

ہاشم مجھ سے نہ جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میرا ذہن تاریک خلاؤں [...] غیر مرئی سہارے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ میں محض ہوں ہاں کرتا [...] رہا اور پھر اس کے کمرے سے اٹھ کر واپس اوپر آ گیا۔

اس وقت میں تھکا ہوا تھا اور مضمحل تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا [...] جیسے میری عمر یک بیک دس برس بڑھ گئی ہو۔

وہ دن میری زندگی کا ایک عجیب اور سوگوار دن تھا۔ مجھے پہلی [...] اندازہ ہوا کہ زندگی اور زندہ رہنے کے لیے لطیف جذباتی سہارے کتنے [...] ہیں۔ ان کے بغیر انسان کسی کٹی ہوئی آوارہ پتنگ کی طرح وقت کی فضاؤں [...] بے مقصد بھٹکتا رہتا ہے جس کی نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ ٹھکانا۔ [...] کے تھپیڑے جدھر دھکیل دیں ادھر ہی چلا جاتا ہے تاوقتیکہ کوئی [...] اسے دوسرے راستے پر ڈال دیتا ہے۔

میرے دل میں اس روز بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی [...] میں اپنی مرضی سے آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والا ننھا سا بے پروا پرندہ [...] جس کے نہ جذبات ہوتے ہیں اور نہ جذباتی رشتے۔ جس شاخ پر کوئی [...] دبیز سرتوں میں ڈوب کر رات بھر بسیرا کر لیا اور اگلی صبح طلوع ہونے [...] نئے آشیانے اور نئے ہمنوا کی تلاش میں فضا میں پر پھیلائے سینہ نکالے آگے بڑھ جاتا ہے۔

اچانک دستک کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نیم زندہ انداز میں اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ مجھے دھکیل کر اندر آ گئی۔

القاہرہ کی ایک شاخ پر بسیرا کرتے ہوئے زخم خوردہ، ننھے سے پرندے کو اچانک ہی ایک ہمنوا نظر آ گئی تھی۔

میں دروازہ مقفل کر کے اس کے پیچھے ہو لیا۔

"یہ کمرے میں اندھیرا کیوں کیا ہوا ہے۔ کیا ابھی تک سو رہے تھے؟" اس نے حیرت آمیز لہجے میں سوال کر دیا۔

"پھر تم روشنی بھی گل کر دو۔" میں نے سنبھالا لے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس وقت اندھیرے میں بڑا سکون مل رہا ہے۔"

"کیا ہو گیا تم کو؟" یہ کہتے ہوئے اس نے کمرہ روشن کر دیا اور میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ اور متورم ہو رہی ہیں؟"

"راتوں کی بے کلی کی کہانی ایسی ہی آنکھیں سناتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے تقریباً بستر پر گر گیا۔ اور وہ میرے قریب ہی آ بیٹھی۔

"کیا بات ہے؟ تم بہت اداس ہو؟" اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار کے ساتھ پوچھا۔

میں نے آنکھیں موند لیں۔ اس کا نرم اور سلگتا ہوا لمس بہت لذت انگیز تھا۔

"روشنی گل کر دو۔"

"پہلے اپنی پریشانی کا سبب بتاؤ پھر مکمل اندھیرا کر دوں گی۔" اس نے سرکش اور ناز آفریں لہجے میں اصرار کیا۔

"کل میں بلاوجہ پریشان نہیں تھا۔" میں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "دشمنوں نے میرے گھر کو آگ لگا دی۔"

"کہاں؟ اردن میں؟"

"سب کچھ جل گیا۔ کچھ نہ بچ سکا۔" غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں اندر کا درد واضح طور پر ابھر آیا۔ میں نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟" وہ میرے اوپر جھک گئی۔ میرے انکشاف سے اسے واقعی صدمہ ہوا تھا۔

"بھرا گھر جل گیا۔ کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ میری ساری عمر کی پونجی برباد ہو گئی۔ میں اکیلا رہ گیا مریم! میں اکیلا رہ گیا۔" آخری فقرے پر میری آواز بھر گئی۔

اور وہ محبت آمیز انداز میں میرا سر سہلانے لگی۔

"روشنی گل کر دو۔" قدرے توقف کے بعد میں اسی بھرائی ہوئی آواز میں غرایا۔

وہ فوراً اٹھی اور چٹ چٹ کی دو آوازوں کے ساتھ کمرہ گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ سورج کی شعاعیں بھی کھڑکی پر جھولتے ہوئے دبیز پردوں کو عبور کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں۔

مریم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرا دکھ اپنی ذات میں سمیٹ لے۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں میری دشمنی اور میرے گھر کے بارے میں دریافت کرتی رہی اور میں استعاروں میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا رہا۔

میری کوئی بات جھوٹ نہیں تھی۔

سیتا واقعی میری زندگی کی سب سے بڑی پونجی تھی۔ میرے گھر کا تصور اسی کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہی میرے گھر کی ابتدا تھی اور وہی انتہا۔ اس کی موت کے بعد میں اعتبار سے یکہ و تنہا رہ گیا تھا۔

کمرے میں ڈمپل کی دو بوتلیں موجود تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے ان کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مریم نے ایک بوتل کھولی اور بستر کے سرہانے لگا ہوا دھیمی روشنی والا بلب آن کر دیا جو اس وقت خاصا تیز محسوس ہو رہا تھا۔

مریم نے دو گلاس تیار کیے۔ فضا میں شیشے کے باہم ٹکرانے کی ہلکی سی کھنک پیدا ہوئی۔ مریم نے گلاس سے اپنے لب تر کر کے بڑی ادا سے ان دہکتے ہوئے یاقوتوں پر زبان پھیری اور میں نے پورا گلاس معدے میں انڈیل لیا۔ مریم کا پہلا گلاس ہی چلتا رہا اور میں چوتھا گلاس خالی کر گیا۔ اس وقت مجھے تھوڑا بہت ہوش تھا۔ مگر سننے میں آیا تھا کہ اعصابی تناؤ کی کیفیت میں نشہ بہت سرعت کے ساتھ اور زیادہ اثر کرتا ہے۔ لہٰذا تھوڑی دیر بعد ہی میں من و تو کے فرق کو یکسر فراموش کر کے اپنے ہی تصور کی تراشی ہوئی لہلہاتی جنت میں گم ہو گیا۔

اس روز مریم نجانے کب واپس گئی۔ شاید اس نے واپس جاتے ہوئے میری نیند بھی خراب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میری آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ مگر اندر سے میں خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو فرش پر ڈمپل کی ایک خالی بوتل پر نظر پڑی دوسری بوتل جو نصف سے قدرے زائد تھی۔ ٹیبل پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے غسل خانے میں گھس کر گرم پانی سے طویل غسل کیا پھر تر و تازہ ہو کر آپریٹر کے ذریعے ہاشم سے بات کرنے کا ارادہ کیا جسے فوراً ہی ترک کرنا پڑا۔ کیوں کہ میں القاہرہ میں اپنے اور ہاشم کے تعلق کے زیادہ گواہ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نیچے پہنچا تو ہاشم کے کمرے سے کوئی جواب نہیں ملا اور میں لاؤنج میں پہنچ کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

اس وقت قاہرہ کی رات اپنے شباب پر تھی۔ منچلے مقامی اور غیر ملکی سیاحوں کے ٹولے ہر سمت تفریح کے ساتھ ہی زندہ اور بے جان اشیاء کے سودوں میں مصروف تھے مگر مجھے ان تمام سرگرمیوں پر سوگواری کی گہری لپٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جو شاید میری اندرونی حالت کی عکاس تھی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اپنے خیالات کی رو میں ڈوبا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک مرتبہ پھر میری طبیعت ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگی تھی۔

دن میں نیند پوری کر لینے کے باعث دور دور تک نیند کا پتہ نہیں تھا۔

میں بستر پر پڑا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ ذہن میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ سیتا سے ہاتھ دھو لینے کے بعد بہتر یہی ہوگا کہ میں اپنے وطن کی راہ لوں اور اپنے خاندان کی ان گمشدہ کڑیوں کو تلاش کر کے ان کے سائے میں باقی ماندہ زندگی گزاروں جن سے اپنی حرکات کے باعث میں نے ہر ناطہ توڑ لیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

رات گئے ہاشم میرے پاس آ پہنچا۔ وہ اس روز کے اخبارات بھی ساتھ ہی لیتا آیا تھا جو اس نے میرے آگے ڈال دیے۔

"کہاں غائب تھے؟" میں نے اس سے چھوٹتے ہی پہلا سوال کیا۔

"لمبی مہم پر گیا تھا، غنیمت ہے کہ سرخرو ہو کر واپس لوٹا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"رجب کی ضمانت ہو گئی ہے؟"

اس کا چہرہ لٹک گیا اور وہ اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "ضمانت مسترد ہو گئی، اس پر ناقابلِ ضمانت جرائم عائد کیے گئے ہیں۔"

"یعنی معاملہ طول پکڑے گا؟"

"وہ اہم سماجی مرتبے کا مالک ہے، اس کا دو روز کا ریمانڈ دیا گیا ہے، اس کے بعد ابتدائی چالان پیش ہوگا، شاید اس وقت کامیابی حاصل ہو جائے۔"

وہ ہر معاملے کے روشن پہلو پر نگاہ رکھنے کا عادی تھا۔

"پھر کس سرخروئی کی بات کر رہے تھے؟"

"صبح تم نے سارے اخبار تفصیل سے پڑھے تھے؟" اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔

"ہاں دیکھے تھے۔"

"اس میں کہیں اس واردات کا ذکر تھا جو میجر سالومن نے ہمارے ساتھ کی تھی؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"اس معاملے کے دو ہی فریق تھے جو فرار ہو گئے، پھر اخبارات تک خبر کیسے پہنچتی؟" میں نے کہا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ تھوڑی دور موجود فوجیوں نے گھور اندھیرے میں نہ وہ تیز روشنی دیکھی ہوگی اور نہ ہی بموں کے دھماکے سنے ہوں گے؟"

"دھماکے تو ہر طرف ہی ہو رہے تھے، ہو سکتا ہے کہ روشنی کو کوئی اہمیت نہ دی گئی ہو۔" میں اس سے بحث پر آمادہ تھا۔

"وہ لوگ بعد میں ضرور اس کنج تک پہنچے ہوں گے۔ پھر بموں کے ٹکڑے، جھلسی ہوئی جھاڑیاں اور دین کے ٹائروں کے نشانات سے بہت نتائج... اخذ کیے گئے ہوں گے مگر اخبارات میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔"

"اس طرح تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"سالومن کو دیدہ و دانستہ ان الجھنوں سے دور رکھا جا رہا ہے۔" اس نے پُرزور لہجے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

"اس میں کس کا مفاد ہے؟"

"مقامی حکام کا۔" وہ بولا۔ "کیونکہ میجر سالومن ان کے لیے کام کر رہا ہے اور یہ معاہدہ خفیہ رکھا جا رہا ہے۔"

"میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا۔ مجھے اور سیتا کو خوفزدہ کرنے کے لیے تو قاہرہ میں ایک اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ کی موجودگی کی تشہیر بہت ضروری تھی۔"

"مسئلہ صرف تمہارا یا سیتا کا ہی نہیں تھا، رائے عامہ بھی وزن رکھتی ہے۔" اس نے کہا۔ "تم عربوں کو نہیں جانتے، وہ اسرائیلیوں سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ یہ تک برداشت نہیں کریں گے کہ اسرائیلی حکومت کے تنخواہ دار ہماری سڑکوں کو جھاڑو لگائیں۔ کوئی بھی مصری اہلکار اس قومی انا کو مجروح کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"اگر میں یہ بات مان بھی لوں کہ ایسا ہوا ہے تو سالومن اس علاقے میں چوروں کی طرح کیوں چھپتا پھر رہا تھا جبکہ اسے وہاں مامور سپاہیوں کی بھرپور اعانت حاصل ہونا چاہیے تھی۔" میں ہر کمزوری کو سامنے لا رہا تھا۔

"سالومن ان سب سے الگ رہ کر چند اعلیٰ مصری حکام کے اشارے پر کام کر رہا تھا۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "محاصرہ کرنے والوں کو بھی اس کے بارے میں علم نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اسے اعلیٰ اختیارات کے ساتھ ایسی شناخت تفویض کی گئی ہوگی کہ نچلے درجے کا کوئی اہلکار اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔"

"کیا یہ سب تم محض اس لیے کہہ رہے ہو کہ اخبارات میں ہماری اور سالومن کی جھڑپ کے بارے میں کچھ شائع نہیں ہوا؟"

"وہ تو محض شبہے کی ابتدا تھی جس کی بعد میں تائید ہوتی چلی گئی۔ آج شام سالومن کو قاہرہ کے پولیس کمشنر کی قیام گاہ سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور وہ شہر کے اعلیٰ رہائشی علاقے کے ایک ایسے بنگلے میں مقیم ہے جو محکمۂ پولیس کی ملکیت ہے۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں بتایا۔

"وہ ابھی تک یہیں ہے؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔

"ہاں۔ اس کی مسلسل نگرانی کی جا رہی ہے۔" وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب سے نصف گھنٹے قبل میں اسے اس کی قیام گاہ تک پہنچا کر آیا ہوں۔"

"وہاں کچھ حفاظتی اقدامات بھی ہیں؟"

"بظاہر نظر نہیں آتے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "وہ ساری شام شہر میں بے مقصد گھومتا رہا۔ ٹھکانے کس جگہ تک ہے۔"

"تو کیوں نہ اسے ابھی دھر لیا جائے۔"

"اپنے ٹھکانے پر وہ آسانی سے شاید ہی قابو میں آ سکے۔"

"پھر تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"اگر وہ کل بھی اسی طرح بے مقصد شہر میں گھومتا رہا تو اسے کہیں سے اغوا کیا جا سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس کی قیام گاہ میں خفیہ برقی الارم وغیرہ نصب ہوں۔ اگر وہ ایک مرتبہ بھڑک گیا تو دوبارہ اس کا سراغ تک پانا محال ہو جائے گا۔"

"وہاں اس وقت بھی تمہارا کوئی آدمی موجود ہے؟"

"ہاں۔ صبح چار بجے دوسرا آدمی اس کی جگہ سنبھال لے گا۔"

"ان سے تمہارے رابطے کی کیا صورت ہوگی؟"

"ہر شخص ڈیوٹی ختم کر کے اپنی تحریری رپورٹ ایک مقام پر چھوڑے گا جو میں حاصل کر لوں گا۔ ہدایات کا بھی یہی طریقہ ہوگا۔ ہنگامی صورت میں اسی جگہ پہنچ کر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ سالومن گھر میں ہی موجود ہو۔"

"تمہاری کار واپس آ گئی؟"

"ہاں۔ میں اسی میں گھومتا رہا ہوں۔"

"پھر تم فوراً ایک اور کار کا بندوبست کرو۔ صبح چار بجے سے ہم دونوں الگ الگ کاروں میں اس بنگلے کی نگرانی کریں گے۔"

یہ پروگرام طے کر کے ہاشم واپس چلا گیا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے اور اسے میرے لیے ایک اور گاڑی کا بندوبست کرنا تھا تاکہ صبح چار بجے والا منصوبہ کسی تبدیلی کے بغیر روبہ کار لایا جا سکے۔

صبح چار بجے ہاشم خبر لایا کہ مہم کے لیے چوری کی ایک کار کا بندوبست کر لیا گیا تھا جو ایک دو روز کے لیے محفوظ تھی۔

"تم چاہو تو میری کار لے لینا۔" اس نے پیشکش کی۔ "ہم میں سے جو بھی چوری کی کار میں ہوگا وہ زیادہ آزادانہ طور پر کارروائی کر سکے گا۔"

"تم اپنی کار میں جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

پھر ہم وہاں بیٹھے تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ ہاشم کا ارادہ اسے اغوا کر کے ایک ایسی کٹھری پہنچانے کا تھا جہاں میلوں دور کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ اس کی دانست میں سیتا کی موت کا انتقام سالومن کی موت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس کی سسکتی ہوئی زندگی ہی انتقام قرار پاتی۔

ہم دونوں ہوٹل سے لاپروایانہ انداز میں رخصت ہوئے۔ ہاشم کی کار بھی پارکنگ لاٹ کے بجائے باہر موجود تھی اور مسروقہ ڈاج اسی قطار میں کھڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور اپنی اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھے۔

ہوٹل سے سالومن کی قیام گاہ تک کا فاصلہ دس منٹ میں طے ہو گیا۔ وہ رہائشی علاقہ صاف ستھرا اور فیشن ایبل ضرور تھا مگر مکانات کا رقبہ کم ہی تھا۔ بیشتر مکانات کے سامنے کاریں فٹ پاتھ کے سہارے کھڑی ہوئی تھیں۔ ہاشم نے اپنی کار ایک تاریک مقام پر روک دی۔ میں نے بھی کچھ دور نکل کر ایسی ہی جگہ تلاش کر لی۔ ہاشم کی بتائی ہوئی علامات کے مطابق سڑک کے اس پار مجھ سے تقریباً تین سو گز دور میرے شکار کا مسکن واقع تھا۔

اتنے سویرے میرا کار سے نکل کر باہر ٹہلنا خطرناک تھا لہٰذا میں خود کو چھپانے کی نیت سے کار کے شیشے چڑھا کر نشست پر دراز ہو گیا۔

پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ ہاشم سالومن کو مکان سے نکلتے دیکھ کر اپنی گاڑی کا ہارن بجاتا اور میں ہاشم کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ہاشم کی کار کا ہارن بہت ہی مخصوص آواز والا تھا جس کی بنا پر دھوکا کھانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا۔ آخرکار صبح طلوع ہو گئی اور سڑک پر تھوڑا بہت ٹریفک بھی رواں ہو گیا۔ میں خاموشی سے اپنی کار سے اترا اور ہاشم کی طرف چل دیا۔ میں نے دور سے دیکھا کہ وہ کسی پیشہ ور ڈرائیور کی طرح اپنا سر اسٹیئرنگ پر ٹکائے اونگھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ داہنی طرف تھا اور مجھے... یقین تھا کہ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سالومن کے مکان کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ شاید اس نے کسی کھڑکی کا شیشہ قدرے کھولا ہوا تھا کیونکہ میری آہٹ پاتے ہی وہ چونک پڑا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" نیچے اتر کر اس نے مزید تاریکی میں لے جاتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گئے ہو؟"

"یہ کام بڑا ذلیل ہے۔ تمہارا آدمی موجود ہے یا چلا گیا ہے؟"

"اُسے میں نے چلتا کر دیا۔ زیادہ بھیڑ سے گڑبڑ کا امکان تھا۔"

"اب دن نکل آیا ہے۔ میں پوری طرح ہوشیار ہوں۔ سالومن کو دیکھ کر تم ہارن نہ بجانا، میں خود خیال رکھوں گا۔ ہارن کی آواز پر کہیں وہ چوکنا نہ ہو جائے۔"

"پھر اپنی کار کا رخ گھما لو۔" اس نے دانشمندانہ مشورہ دیا۔ "اسی طرح ہم دونوں سمتوں میں فوری طور پر اس کا پیچھا کر سکیں گے۔"

واپس جا کر میں نے اپنی کار سڑک کے دوسرے کنارے پر لگا دی۔ اس طرح میں عقب نما آئینے کے بجائے براہِ راست سالومن کے مکان پر نظر رکھ سکتا تھا۔

طویل اور اکتا دینے والا انتظار ساڑھے آٹھ بجے تک جاری رہا پھر آخرکار سالومن کی سفید آسٹن مکان سے باہر رینگتی ہوئی نظر آئی اور میں نے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر لیا۔ سفید آسٹن باہر نکل کر آگے جانے کے بجائے سبک رفتاری سے میری طرف بڑھتی چلی آئی۔ تھوڑے فاصلے سے ہاشم کی کار بھی بڑھ آئی۔ اس کے گزر جانے کے بعد میں یوٹرن لے کر اسی راہ پر ہو لیا۔ نہ صرف وہ سفید آسٹن میری نظروں میں پوری طرح آ چکی تھی بلکہ میں اس کا نمبر بھی یاد کر چکا تھا۔ کچھ دور نکلنے کے بعد میں نے ہاشم کو پیچھے چھوڑ دیا اور خود سالومن کے پیچھے لگ گیا۔ یہ آنکھ مچولی ایک ایسے دفتری علاقے میں ختم ہوئی جہاں شاید سارے ہی سرکاری ملازمین دفاتر میں پہنچ چکے تھے کیونکہ باہر بس اِکا دُکا ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔ سالومن کار روک کر نیچے اترا مگر میں نے ایک فوری خیال کے تحت اپنی کار کا انجن بند نہیں کیا۔ اور یہ دیکھ کر میری خوشی

کی انتہا نہ رہی کہ ٹریفک صاف پاکر سالومن سکون سے سڑک عبور کر رہا تھا۔

میں نے پھرتی سے گیئر ڈالا اور مسروقہ کار کسی چیتے کی طرح غراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس وقت تک سالومن نصف سڑک عبور کرکے آنے والے ٹریفک کی لائن میں داخل ہو چکا تھا اور ٹریفک نہ ہونے کے باوجود اس کی نگاہیں مخالف سمت میں نگراں تھیں تاکہ وہ ناگہانی نمودار ہونے والی کسی گاڑی کا شکار نہ ہو سکے۔

مگر اس کے لیے ناگہانی مصیبت دوسری طرف سے نازل ہو رہی تھی۔ میں نے ٹریفک کے قاعدے کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی کے بمپر سے اس کی پنڈلیوں پر شدید ضرب لگائی اور وہ چیخ مار کر دور جا گرا۔ میں ہینڈ بریک لگا کر پھرتی سے نیچے اترا۔ سالومن کراہتے ہوئے سڑک سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باہر موجود اکا دکا افراد بھی دھماکے اور پھر چیخ کی آواز سن کر ادھر لپکے آ رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے سالومن کے بال پکڑ کر کنپٹی کے رخ سے اس کا سر سڑک پر دے مارا اور اس کا بدن کانپ کر ساکت ہو گیا۔

اس کی ٹوٹی ہوئی پنڈلیوں سے بہنے والا خون اس کی پتلون سے بہہ کر پختہ سڑک کو رنگین کر رہا تھا۔ میں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالا اور اسے اپنی کار کی طرف کھینچنے لگا۔

"ٹھہرو ــ پہلے پولیس بلائی جائے گی۔" وہاں آ جانے والوں میں سے کسی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"چاہے یہ خون بہنے کے سبب یہیں مر جائے۔" میں غصیلے لہجے میں غرایا۔ "اسے میری گاڑی میں ڈالو اور کار کا نمبر نوٹ کر لو۔ مجھے معلوم ہے کہ غلطی میری ہے۔ میں خود پولیس کے سامنے اس کا اعتراف کروں گا۔"

مسروقہ کار کی شان و شوکت اور میرے لب و لہجے نے ان کو مرعوب کر دیا اور دو آدمیوں نے اپنے کپڑوں کی پروا کیے بغیر پیٹر سالومن کو میری کار کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔

وہاں تماشائیوں کی بھیڑ بڑھنے لگی تھی۔ دفاتر سے بھی لوگ باہر آنے لگے تھے مگر میں وہاں سے اپنے شکار کو لے کر روانہ ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ عقب نما آئینے میں ہاشم کی کار میرے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

میں کافی دور تک تیز رفتاری سے کار دوڑاتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں جائے واردات سے محفوظ فاصلے پر پہنچ چکا ہوں تو میں نے رفتار سست کر دی اور ہاتھ لہرا کر ہاشم کو آگے نکلنے کا اشارہ کیا۔

ہاشم کی گاڑی میری کار سے آگے نکلی اور پھر میں اس کی تقلید کرنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی دونوں گاڑیاں ایک ویرانے میں پہنچ گئیں جہاں ہاشم نے اپنی کار روک دی۔ میں نے بھی اپنی کار اس کے پہلو میں روک دی اور میدان صاف پاکر ہم دونوں نے آناً فاناً میں سالومن کو ہاشم کی کار میں منتقل کر دیا۔

پھر میں نے مسروقہ کار کا رخ گھما کر اسے سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا اور خود ہاشم کی کار میں آ بیٹھا۔

اگلے ہی لمحے ہاشم کی کار نئی منزل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

"یہ تو بہت آسانی سے ہاتھ آ گیا۔ تم نے بھی حد ہی کر دی۔" پھولتے ہوئے سانسوں پر قابو پانے کے بعد ہاشم نے کہا۔

"وہ بس ایک فوری خیال تھا اور غنیمت یہ ہوا کہ وہاں جمع ہونے والے بھی میری ہمدردی کے رعب میں آ گئے۔ اگر میں تمہاری کار چلا رہا ہوتا تو یہ قدم ہرگز نہ اٹھا پاتا۔"

"تو کیا انھوں نے تمھیں روکنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں۔ احمق پولیس کو بلانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں پھٹکارا کہ وہ کار کا نمبر نوٹ کر لیں، زخمی کو طبی امداد نہ دی گئی تو پولیس کے آنے تک مر ہی جائے گا۔"

"یہ فوری قلابازیاں تمھارے ہی بس کا روگ ہیں۔"

"دیکھنا یہ ہوگا کہ اب سالومن کیا قلابازیاں کھاتا ہے؟"

کچھ دور سفر خاموشی کے ساتھ جاری رہا۔ ہاشم ــــ میرا دوست، میرا ہمدرد خاموشی کے ساتھ کار ڈرائیو کر رہا تھا اور میرا دشمن اپنے ہی لہو میں نہایا ہوا بے ہوشی کے عالم میں عقبی نشستوں کے پائیدان میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا ہوا تھا۔

"تمہاری ایک خوبی مجھے ہمیشہ متاثر کرتی ہے!" کچھ دیر کے سکوت کے بعد ہاشم نے عقیدت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"محض بدذوقی ہے تمہاری!" میں نے بوجھل ہنسی کے ساتھ کہا۔

"میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "مشکل کے لمحات میں تمہاری حاضر دماغی میرے لیے ہمیشہ قابلِ رشک رہی ہے!"

"جس پر افتاد پڑے، اس کا دماغ کسی کوشش کے بغیر خود بخود حاضر رہتا ہے اس میں میرا کوئی انفرادی کمال نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم پہلے سے اسے کار سے ٹکر مار کر زخمی کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے؟" ہاشم نے مجھ سے سوال کیا۔

"نہیں!" میں نے فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کر لیا۔ "بس میری چھٹی حس نے مجھے کار کا انجن بند کرنے سے باز رکھا تھا۔ اس کے بعد جب میں نے اسے سڑک عبور کرتے دیکھا تو فوری طور پر غلط سمت میں جا کر اسے کار کی ٹکر سے زخمی کرنے کا فیصلہ کر ڈالا اور اس کے لیے حالات بھی سازگار ہو گئے۔"

"ٹکر مارتے ہوئے کیا تم نے یہ سوچ لیا تھا کہ اسے اپنی کار میں ہی اٹھا کر لے آؤ گے؟" وہ بال کی کھال نکالے جا رہا تھا۔

"میرے ذہن میں فوری خیال صرف اسے زخمی یا معذور کرنے کا تھا اور جب وہ مرحلہ نمٹ گیا تو میں نے طبی امداد کے بہانے اسے اغوا کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ چوری کی کار میں سوار ہونے کے باعث میں نے دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا ڈالا۔ اگر میرے پاس تمہاری کار ہوتی تو شاید میں یہ خطرہ مول نہ لے پاتا۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں۔" وہ پُرزور لہجے میں بولا۔ "ایسے فیصلے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔"

"یہ قدرت کے فیصلے ہوتے ہیں جن پر مقدر یا ہاشم کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "جب ہم رحیب کے باغ کے نواح میں موجود تھے تو محض میری ہی ضد کی وجہ سے پیٹر سالومن نہ صرف بچ نکلنے میں کامیاب ہوا بلکہ ہم اس کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بال بال بچے تھے اور اب وہ کسی سہمے ہوئے چوہے کی طرح نہایت آسانی کے ساتھ ہمارے قبضے میں آ گیا۔"

"کسی حد تک تمہاری بات درست ہے۔" وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔ "مگر بات مقدر کی بھی ہے۔"

"کس کے؟" میں نے ہنس کر سوال کیا۔ "میرے یا پیٹر سالومن کے؟"

"دونوں کے ہی کہہ لو۔" وہ بھی ہنس پڑا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ حرامزادہ میرے قابو میں نہ آتا، اب دیکھنا ہے کہ یہ ایکس بتری میں اپنی زبان کب تک بند رکھ سکے گا؟"

"یہ ایکس بتری ہے کیا بلا؟" میں نے اپنے ذہن میں دبا ہوا سوال الفاظ کی صورت میں اس کے سامنے اگل دیا۔

"باہر سے تو تم دیکھ چکے ہو، اب اندر سے بھی دیکھ لینا۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "وہ ہمارا ایک بااعتماد ٹھکانہ ہے۔"

"اگر ایکس بتری وہی کچھ ہے جو باہر سے نظر آتا ہے تو سراسر غیر اطمینان بخش ہے۔ وہاں بس ایک ہی خوبی ہے کہ بیک وقت خاصی دور تک نگاہ رکھی جا سکتی ہے اور کسی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لئے پیشگی تیاری کی جا سکتی ہے۔"

"وہاں ایک عظیم الشان تہہ خانہ بھی ہے۔" ہاشم نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے انکشاف کیا۔ "ایک زیرِ زمین راہداری کے ذریعے اس تہہ خانے سے نکاسی کا دوسرا خفیہ راستہ کم و بیش نصف میل جنوب میں نکلتا ہے۔"

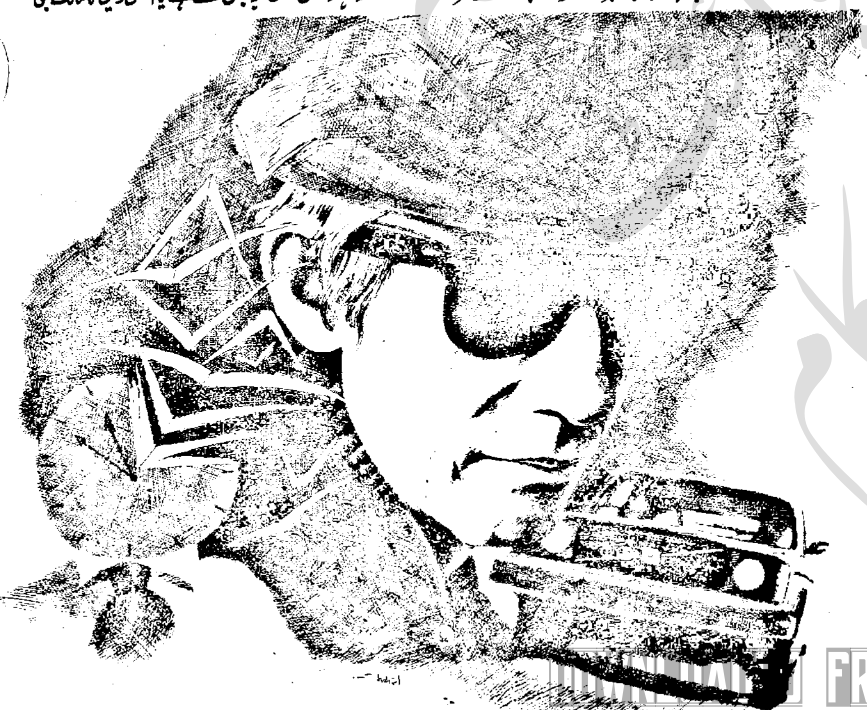
"تو تہہ خانہ بھی ہے وہاں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اس کے بغیر تو وہ مٹی اور گارے سے بنا ہوا ایک غیر محفوظ سا جھونپڑا ہی رہ جاتا جہاں تحفظ کا احساس ہی باقی نہ رہتا۔"

"مگر اس لق و دق ویرانے میں اس جھونپڑے کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟" میں نے ایک اور پہلو چھیڑ دیا۔

"وہ طویل و عریض آراضی ایک شخص کی ملکیت ہے جس نے اپنی ملکیت اور قبضے کی علامت کے طور پر وہاں الوجمال کو نگہبان رکھا ہوا ہے جس روز بھی ان زمینوں پر پانی پہنچانے کا اہم منصوبہ روبہ عمل آ گیا وہ سارا ریگستان لہلہاتے ہوئے سبزہ زار میں تبدیل ہو جائے گا۔ مصر میں قیمتی آراضی پر مالکان کی جانب سے کل وقتی چوکیداری کا انتظام ایک پرانی روایت ہے۔ اگر ایسا بندوبست نہ کیا جائے تو کسی بھی وقت کوئی دوسرا شخص بظاہر وارث نظر آنے والی آراضی پر قابض ہو جاتا ہے۔"

"تو تمہارا تعلق محض الوجمال سے ہے یا اس زمین کا مالک بھی



تمہارے ساتھ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہاں ایک وسیع تہہ خانے اور پھر پختہ سرنگ کی تیاری کوئی چھوٹا کام نہیں تھا۔" ہاشم نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ سارے کام زمین کے مالک نے اپنے خاص آدمیوں سے ذاتی نگرانی میں مکمل کرائے تھے اور وہ بذاتِ خود مصر میں ہماری تنظیم کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔"

قاہرہ سے ایکس نفری تک کا فاصلہ خاصا طویل تھا۔ اگر ہم دونوں باتوں میں مصروف نہ رہتے تو وہ سفر خاصا بوجھل ہو جاتا۔

میں اس وقت چونکا جب ہاشم نے اپنی کار ایک مضافاتی شاہراہ سے ایسی کچی راہداری پر موڑلی جس کے دونوں طرف تاحدِ نظر ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی اس کا مطلب تھا کہ ہم ایکس نفری کے قریب پہنچ چکے تھے!

اچانک عقبی پائیدان سے پیٹر سالومن کی کراہ اُبھری۔

اس کی آواز بہکی ہوئی سی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ بدستور بے ہوش تھا مگر میں اس کے معاملے میں مزید کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

میں اگلی نشست سے عقبی نشست پر جا پہنچا اور تیزی کے ساتھ اس کی تمام جیبوں کی تلاشی لے ڈالی۔

کاغذات اور تھوڑی سی رقم کے علاوہ اس کی جیب سے اعشاریہ دو پانچ کا ایک مختصر سا ریوالور برآمد ہوا۔ اس کے علاوہ چند چیزیں ایسی بھی دستیاب ہوئیں جو میرے ساتھ ہی ہاشم کے لئے بھی ناقابلِ فہم تھیں مگر مجھے پورا یقین تھا کہ وہ سب سالومن کے مؤثر ترین دفاعی حربوں میں شمار ہونے والے شعبدے تھے۔

سالومن کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ قطعی ناگہانی تھا لہٰذا اسے پہلے سے کچھ سوچنے یا سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا لہٰذا میری دانست میں اس وقت وہ تمام شعبدے غیر مؤثر تھے اور لاعلمی کے باعث ان سے اس وقت تک کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں تھا جب تک انہیں چھیڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔

میں نے وہ تمام اشیاء احتیاط سے ڈیش بورڈ میں بنے ہوئے خانے میں محفوظ کر دیں تاکہ سالومن ان تک کسی طرح رسائی حاصل نہ کر سکے۔

تھوڑی دیر بعد ٹیلوں کی اوٹ میں پھوس، مٹی اور گارے سے بنے ہوئے اس مکان کا ہیولا نظر آنے لگا جو میری نگاہوں میں رفتہ رفتہ ایک عجیب اور پُراسرار سی اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

اس مکان کا مکین نظاہر ادھیڑ عمر تھا مگر اپنے فرض کے معاملے میں بے حد حساس ثابت ہوا تھا۔

شاید اس نے ویرانے میں ہاشم کی کار کے انجن کی گونج دُور ہی سے سُن لی تھی اور سمت کا بھی تعین کر لیا تھا کیونکہ جب ہم آخری بلند ٹیلے کا طواف کر کے اس مکان کے سامنے پہنچے تو ابوجمال کو سینہ تانے اپنی طرف نگراں پایا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر تھے۔

"اس کے چھپے ہوئے ہاتھوں میں یقیناً کوئی مہلک ہتھیار موجود ہوگا۔" ہاشم کار کی رفتار کم کرتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "ابوجمال تین برس تک ہمارے گوریلا دستوں میں اہم نوعیت کا کام سرانجام دے چکا ہے۔"

شاید ابوجمال نے دُور ہی سے اسٹیئرنگ کے عقب میں بیٹھے ہوئے ہاشم کو پہچان لیا تھا کیونکہ یک لخت اس کے سخت گیر بشرے پر مسکراہٹ پھوٹ پڑی تھی۔

مکان کے دروازے کے قریب ہاشم نے کار روکی تو ابوجمال استقبالیہ انداز میں کار کا دروازہ کھولنے کے لئے آگے لپکا مگر شاید دروازہ کھولنے سے پہلے ہی اس کی نگاہ عقبی پائیدان میں پڑے ہوئے زخمی تک پہنچ گئی۔

کیونکہ اس کی آنکھوں سے تحیّر کی جھلکیاں تیرتی نظر آئی تھیں۔

اس سے پیشتر کہ ابوجمال ذہنی جھٹکے سے سنبھلتا، ہم دونوں کار سے اتر گئے۔

"کیفک یا معلم؟" ابوجمال نے عربوں کے روایتی انداز میں مگر احترام کے ساتھ ہاشم کی مزاج پرسی کی۔

"خدا کا شکر ہے۔" ہاشم شاید یک بیک موج میں آ گیا تھا۔ "ذرا اپنا بایاں ہاتھ تو سامنے لاؤ تاکہ پتہ چل سکے کہ تم ہمارے استقبال کے لئے اپنے اسلحہ خانے سے کون سا ہتھیار لائے تھے؟"

وہ کھسیانے ہوئے انداز میں ہنس دیا اور خفت کے ساتھ اپنی پشت سے بایاں ہاتھ سامنے لے آیا جس میں ٹینس کی گیند کے برابر کا ایک آہنی گولا دبا ہوا تھا پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "ملٹی فائر ہے، جدید ترین روسی ہینڈ گرینیڈ! آگ بھی لگاتا ہے اور چیتھڑے بھی اُڑاتا ہے، مجھے کیا پتہ تھا کہ تم آ رہے ہو، ورنہ ملٹی فائر کے بجائے گلاب کے پھول دامن میں سمیٹ کر تمہارا استقبال کرتا۔"

"اس ریگستان میں گلاب کے پھول؟" میں مضحکانہ انداز میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ "اس بنجر زمین پر تو ریت کا تذکرہ ہی زیب دیتا ہے۔"

"اسے بنجر نہ کہو دوست!" وہ دُکھ بھرے انداز میں مجھ سے بولا۔ "اس زمین کی زرخیزی سطح کے اوپر نہیں دیکھی جا سکتی۔"

اس کا لہجہ مجھے پسند نہیں آیا اور میں نے اس پر اپنے عرفان کا اظہار لازمی سمجھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نیچے کا حال بھی جانتا ہوں اور آج معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا تہہ خانہ کس قدر زرخیز کر سکتا ہے؟"

"شاید یہ زخمی وہیں لے جایا جائے گا؟" ابوجمال نے ہاشم کی طرف گھوم کر تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔ اس کے ردِ عمل سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اس پہلی تفصیلی ملاقات پر وہ میرے بارے میں کوئی بہتر رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔

"شاید نہیں بلکہ یقیناً!" ہاشم نے فوری طور پر جواب دیا۔

"اس کی ذات ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔"

"اور اس کی قبر بھی آخر کار یہیں کہیں بنے گی۔" میں نے اپنی دانست میں اس پر صورتِ حال کی سنگینی واضح کرتے ہوئے کہا۔

"بڑا مناسب ہوگا۔" وہ خوش ہو گیا۔ "گوشت پوست اور ہڈیوں سے بہترین کھاد وجود میں آتی ہے، شاید تم اسے فوری طور پر تو دفن کرنا نہیں چاہو گے!"

"اسے نیچے لے جاؤ۔" ہاشم نے کہا۔

اس نے نہایت سعادت مندی سے ہاشم کی کار کا عقبی دروازہ کھولا اور اندر جھک کر نہایت مہارت اور پھرتی کے ساتھ سالومن کے بے ہوش جسم کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔

اندر سے وہ مکان ایک بڑے اور ایک چھوٹے کمرے پر مشتمل تھا۔ ہم بڑے کمرے سے گزر کر چھوٹے کمرے میں پہنچے تو کھلے ہوئے دروازے کے باہر نہایت مختصر سا صحن اور اس میں بنی ہوئی بند کوٹھری بھی دکھائی دی۔

ابوجمال نے اسی چھوٹے کمرے کے وسط میں سالومن کے بے ہوش بدن کو فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر ڈال دیا۔

اس کمرے کی کُل کائنات اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے چند کپڑوں کے علاوہ ایک اونچے سے چوبی تخت پر مشتمل تھی جو ایک طرف دیوار کے سہارے بچھا ہوا تھا اور اس پر قرینے کا بستر بھی لگا ہوا تھا شاید ابوجمال اسی پر سویا کرتا تھا۔

تخت سے نیچے لٹکی ہوئی چادر اُلٹ کر ابوجمال نے چٹائی کا وہ حصہ لپیٹا جو تخت کے نیچے سے ہوتا ہوا دیوار سے چند انچ تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ چٹائی بچھانے میں خاصی احتیاط سے کام لیا گیا تھا۔ اگلی طرف تو وہ تخت کے وزنی پایوں کے نیچے دبی ہوئی تھی مگر اس کا آخری سرا آزاد تھا۔

میں نے چٹائی لپیٹنے میں ابوجمال کی مدد کا ارادہ کیا مگر اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ دوسری طرف اس نے تخت کے نیچے والا حصہ لپیٹ کر اس میں لگے ہوئے دو تار تخت کے اگلے پایوں میں اس طرح پھنسا دیئے کہ چٹائی کے دوبارہ کھلنے کا امکان باقی نہیں رہا اور وہ دوبارہ سالومن کی طرف آ گیا۔

اس کے ہٹنے کے بعد میری نگاہ اس چوکور خلا تک پہنچ سکی جو تخت کے عین وسط میں فرش پر نظر آ رہا تھا۔

"تم دونوں یہیں ٹھہرو، میں اسے نیچے ڈال کر واپس آتا ہوں۔" ابوجمال نے اکڑوں بیٹھ کر تخت کے نیچے گھستے ہوئے کہا۔

پھر وہ سالومن کے بے حس و حرکت بدن کو اپنے کندھوں پر ڈال کر بتدریج اس تاریک خلا میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔

فرش میں بنے ہوئے اس خلا کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ دو فٹ رہی ہوگی جبکہ اس کی لمبائی کسی طرح پانچ فٹ سے کم نہیں تھی۔ ابوجمال اس میں جس طرح غائب ہوا اس کے پیشِ نظر میرا خیال تھا کہ اس خلا میں پیر ٹکانے کی نزدیک ترین جگہ سطح سے کم از کم تین فٹ نیچے تھی اور پھر براہِ راست نیچے اترنے کے لئے سیڑھیاں شروع ہو گئی تھیں۔

میرے لئے ایک کچے صحرائی مکان میں اس قدر خفیہ انتظام ایک عجوبے سے کم نہیں تھا اس جگہ تہہ خانہ بنانے اور پھر اسے ایک راز رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ سارا کام تنظیم کے معتبر ارکان نے خود اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیا ہو اور اگر وہ لوگ اپنے انفرادی وسائل سے ایسے پیچیدہ اور دشوار کام سرانجام دینے کے اہل تھے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ وہ سب والہانہ لگن کے ساتھ ایک مقدس مشن پر عمل کر رہے تھے۔

یہ میرا ذاتی مشاہدہ تھا مگر ریٹائرڈ پائلٹ کی فلسطینی داشتہ مریم کی تلخ و شیریں باتیں ان سارے مشاہدات کی نفی کرتی تھیں۔

یہ دُرست ہے کہ وہ مسلمان نہیں، عیسائی تھی اور یوں بھی فلسطین کی آزاد مسلم ریاست کے بارے میں اس کے جذبات میں فطری گہرائی نہیں تھی مگر اس نے تنظیم اور اس کے مقاصد کے بارے میں... اعداد و شمار کے حوالے سے جو زہریلی گفتگو کی تھی، اس کی چبھن کسی کسی وقت مجھے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں محسوس ہوتی تھی۔

"میں نیچے جا رہا ہوں۔" اچانک ہاشم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "تم ابوجمال کے آنے کے بعد اُتر آنا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تم یک بیک کہاں چل دیئے؟"

"ایسا نہ ہو کہ ابوجمال کی واپسی اور ہمارے پہنچنے کے درمیانی عرصے میں وہ ہوش میں آ جائے اور کوئی مشکل کھڑی کر دے!" وہ یہ کہہ کر نیچے اُتر گیا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ابوجمال مطمئن انداز میں واپس آیا تھا۔ "جاؤ! ہاشم تمہارا منتظر ہے۔"

تنگ اور تاریک سیڑھیوں کو عبور کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی گہرے کنویں میں اتر رہا ہوں مگر فرش تک پہنچتے ہی اچانک کشادگی کے احساس نے آ لیا۔ وہ تہہ خانہ خاصا طویل و عریض تھا اور وہاں ماحول میں سرد خنکی کا رچاؤ خاصا گہرا تھا۔ رہی سہی کسر تاریکی نے پوری کر دی تھی اوپری خلا سے آنے والی روشنی بس اسی قدر تھی کہ اس ماحول کا عادی ہونے کے بعد نگاہیں ساکن اور متحرک ہیولوں میں بآسانی تمیز کر سکتی تھیں۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس تہہ خانے میں جا بجا بڑی بڑی چوبی پیٹیوں کے کریٹ رکھے ہوئے تھے جن کی ساخت سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ ان میں مختلف اقسام کا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔

فرش سے چھت تک چنی ہوئی بیشتر پیٹیوں کی جسامت اتنی زیادہ تھی کہ انہیں دو فٹ چوڑے خلا میں سے گزار کر نیچے لانا کسی طرح

ممکن نہیں تھا۔

"کہاں رُک گئے؟ آگے چلے آؤ!" ہاشم کی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا۔

اسلحہ کے زبردست ذخائر کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ان پیٹیوں پر بنے ہوئے نشانات بھی دیکھے جن سے پتہ چل رہا تھا کہ وہاں مختلف ممالک کا بنا ہوا بھانت بھانت کا اسلحہ موجود تھا۔

ہاشم ایک جگہ پڑی ہوئی چند پرانی وضع کی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان تھا اور اس کے قدموں میں پیٹر سالومن بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

"یہ تو اسلحے کا زبردست گودام ہے۔" میں نے دوسری کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مگر اس کی آمد کا راستہ کون سا ہے؟"

"سرنگ کے ذریعے چھوٹے ٹرک بآسانی اندر آ جاتے ہیں!" اس نے سگریٹ سلگا کر دیا سلائی احتیاط سے بجھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ہم اسی راستے سے کیوں نہیں آئے۔ کار سمیت یہاں موجودگی خاصا دشوار تجربہ ہوتی!"

"پیشگی منصوبے کے بغیر باہر سے آنے کے لئے وہ راستہ استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "سرنگ کے دہانے کو کھولنے کا..... میکانزم اندر ہی پوشیدہ ہے۔ البتہ وہ خودکار طریقے سے بند ہوتا ہے ہاں اگر اب ہم چاہیں تو ادھر سے باہر نکل سکتے ہیں۔"

"پیشگی پروگرام کا مطلب تو یہ ہوا کہ الوجمال ہی مقررہ وقت پر ادھر جا کر سرنگ کا دہانہ کھولتا ہوگا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "ایکس تھری ہمارے لئے ایک قابلِ فخر ٹھکانہ ہے۔"

میں نے دیا سلائی جلائے بغیر ہاشم کی سلگتی ہوئی سگریٹ سے اپنی سگریٹ سلگائی پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے کہ سالومن کے ہاتھ پیر جکڑ کر اسے تنہا ہی چھوڑ دیا جائے۔"

"کیوں؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ وہ ہوش میں آئے تو تنہائی میں بخوبی یہ اندازہ لگائے کہ وہ کس قدر سنگین خطرے سے دوچار ہے۔ اسے ذہنی طور پر قدرے خوفزدہ کرنے کے بعد ہم سامنے آئیں گے تو شاید وہ آسانی سے زبان کھول دے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو!" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور پھر کسی گوشے سے نائیلون کی مضبوط ڈوری کا لچھا لے آیا۔

سالومن کی پنڈلیاں بُری طرح زخمی تھیں مگر میرے نزدیک وہ انتہائی سفاک درندہ تھا جس پر رحم کھانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ہم دونوں نے اس کے ٹخنے مضبوطی سے جکڑنے کے بعد اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت پہ باندھ دیئے اور بندشوں کی آزمائش کے بعد ہم دونوں ٹہلتے ہوئے وہاں سے آگے کی طرف چل دیئے۔

وہ تہہ خانہ کسی بھی طرح پینتیس چالیس فٹ سے کم طویل و عریض نہیں تھا۔ اس کی تعمیر میں لوہے کا استعمال خاصی فراخدلی کے ساتھ کیا گیا تھا۔

وہاں گھومتے ہوئے میرے ذہن میں رہ رہ کر سیتا کا خیال سر ابھار رہا تھا جو اخباری اطلاعات کے مطابق ماری جا چکی تھی مگر میرا ذہن واقعات کو قبول کرنے کے لئے قطعی آمادہ نہیں تھا۔

مایوسی کے ابتدائی غلبے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر سیتا کی... زندگی کے بارے میں موہوم سی امید محسوس کر رہا تھا۔

ہاشم ٹہلتے ٹہلتے ایک ایسے گوشے میں جا نکلا جہاں ایک کھلی ہوئی چوبی الماری میں بہت سی ایسی چیزیں موجود تھیں جو عموماً کالو... میں کام کرنے والے عملے کے استعمال میں آتی رہتی ہیں!

اسی سامان میں متعدد طاقتور ٹارچیں بھی تھیں جن میں سے دو ہم نے اٹھا لیں ورنہ روشنی کے بغیر اس تہہ خانے کے بعض حصوں میں جانا دشوار نظر آ رہا تھا۔

ہاشم نے ٹارچ روشن کر لی اور پھر ہم دونوں اس سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے جو بھاری اسباب کی آمد و رفت میں کام آتی تھی وہ سرنگ خاصی کشادہ اور تقریباً نیم دائرے کی صورت میں کھودی گئی تھی۔ اس میں چھت اور دیواریں ایک قوس کی صورت میں یوں کھودی گئی تھیں کہ دیواروں کے اختتام اور چھت کے نقطۂ آغاز کا تعین ناممکن ہو کر رہ گیا تھا!

سرنگ کا فرش بہت ہی غیر محسوس اور تدریجی انداز میں بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ ہم دونوں اس سرنگ میں بمشکل تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ تہہ خانے سے ایک آواز ابھری اور ہمارے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔

ہاشم کی ٹارچ کی روشنی نے سرنگ کو دُور تک منور کیا ہوا تھا مگر ہم دونوں ایسی مکمل تاریکی میں تھے کہ ہمارے لئے ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

اچانک ہاشم نے میرا ہاتھ تھاما اور واپس مڑ گیا۔

"شاید ہوش میں آ رہا ہے۔" میں نے اپنی آواز کم کئے تبصرہ کیا۔

"اگر اس نے بدمعاشی کا مظاہرہ کیا تو ہم اس پر زیادہ وقت ضائع نہیں کریں گے!" ہاشم نے جواب میں کہا۔ اس معاملے میں وہ بلا کا ذہین تھا اور میرا مدعا فوراً سمجھ گیا تھا۔ ہمارے تبصرے قیدی کے اعصاب کے لئے مؤثر ثابت ہو سکتے تھے۔

"اسے زندہ رکھنا ہمارے حق میں مفید ثابت ہوگا۔" میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ تاکہ قیدی کے ذہن میں زندگی کی امید باقی رہے۔

"اگر زبان کھولے گا تو تم کو اختیار رہے گا کہ اسے زندہ رکھو یا کام لے سکو دوسری صورت میں میں اسے زندہ رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ مجھے دوغلے لوگوں سے سخت نفرت ہے!" ہاشم اب اپنے لہجے کی حد تک خاصی اچھی اداکاری کر رہا تھا۔

ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے دوبارہ اسی طرف جا نکلے جہاں سالومن بدستور فرش پر پڑا ہوا تھا۔

جب روشنی کا دائرہ اس کے جسم پر پڑا تو وہ قدرے کسمسا کر رہ گیا مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

ہم دونوں اس کے سر پر پہنچ گئے لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے اپنی ٹارچ کی روشنی براہِ راست اس کے چہرے پر ڈالی تو اس کے پپوٹوں کی اضطراری جنبش سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہوش میں آ جانے کے باوجود حالات کا جائزہ لینے کے لئے بے ہوشی کی اداکاری کر رہا تھا۔

"یہ ہوش میں آ چکا ہے مگر بن رہا ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"یہ سیتا طرح راہِ راست پر آنے والوں میں سے نہیں معلوم ہوتا۔" ہاشم بولا۔ "اگر اس کی یہی حرکتیں جاری رہیں تو میں اسے ٹکڑے کر کے اُڑا کر رکھ دوں گا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے گریبان کو زور سے جھنجھوڑا اور اس نے فوراً ہی کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔

"روشنی ہٹاؤ۔" وہ فوراً ہی آنکھیں بند کر کے بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ کیونکہ اس کا چہرہ براہِ راست میری ٹارچ کی روشنی کی زد میں تھا۔

میں نے ٹارچ کا رُخ قدرے گھما دیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"تو کیا جانے بوجھے بغیر ہی مجھے اٹھا لائے تھے؟" اس کی آواز بھرّائی ہوئی ضرور تھی مگر یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ غیر معمولی قوتِ برداشت کا مالک تھا کیونکہ شدید زخمی ہونے کے باوجود اسے اپنے حواس پر پوری طرح قابو تھا۔

"تمہاری زبان سے اعتراف سننا چاہتے ہیں!"

"اگر میں کین مائیکل کہوں؟" اس کا لہجہ بہت پُرسکون اور سُلجھا ہوا تھا۔ اس کی آواز سے اس کی حالت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

"ہم تم پر زیادہ وقت برباد نہیں کر سکتے!" اس بار ہاشم بھڑک کر بولا۔ "یہ یاد رکھو کہ تمہارا کوئی ہمدرد یہاں تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی تم اپنا کوئی شعبدہ دکھا سکتے ہو۔ اس بار تم بُری طرح پھنس چکے ہو۔"

"تم نے مجھے بے رحمی سے زخمی کیا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "درد سے میری ٹوٹی ہوئی پنڈلیاں اور داہنی کنپٹی پھٹی جا رہی ہے۔ اگر تم مجھے کسی قسم کی طبّی امداد دے سکو تو میں شاید تمہاری باتوں پر زیادہ توجہ دے سکوں گا۔"

"میں نے کہا نا ہم تم پر زیادہ وقت برباد نہیں کر سکتے۔" ہاشم کسی زخمی درندے کی طرح غصیلے لہجے میں غرّایا۔

"کم از کم میرے ہاتھ پیر ہی آزاد کر دو تاکہ ہل جل کر کسی بہتر حالت میں آ سکوں ورنہ شاید تکلیف کی شدت مجھے دوبارہ بے ہوش کر دے گی۔" اس بار اس کے لہجے میں واضح طور پر بے چارگی اُمڈ آئی تھی۔

میں نے بڑھ کر اس کے پیروں کی بندش کھول دی۔

"نام؟" میرے پیچھے ہٹتے ہی ہاشم غرّایا۔

"سالومن!" وہ بولا۔ "یہ یاد رکھنا کہ میں زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں، شاید تم لوگ سیتا کے حمایتی ہو، تمہارا لب و لہجہ بتا رہا ہے کہ فلسطینی بھی ہو۔ مجھ سے ایسے سوالات نہ کرنا جن کے جواب میں نہ دے سکوں اور تم غصے میں بے قابو ہو جاؤ۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟"

"میں اپنی قوم سے غدّاری نہیں کر سکوں گا۔" وہ سر گھما کر کراہتے ہوئے بولا۔ "جس روز سے میں نے کام شروع کیا، اسی روز سے اس وقت..... کے لئے تیار تھا مگر یہ شاید میرا مقدر ہے کہ وہ برا وقت آج تیس برس بعد آیا ہے!" وہ صورتحال کی سنگینی کا پوری طرح اندازہ لگا چکا تھا اور اس کے ذہن پر مایوسی کی لہر طاری ہونے لگی تھی۔ "جو بتا سکتا ہوں بلا حیل و حجت بتاتا چلا جاؤں گا اور جو نہیں بتا سکتا اس کے لئے تمہارا تشدد بھی کام نہ آ سکے گا کیونکہ میں زندگی کی بھیک مانگنے کا قائل نہیں ہوں۔"

میں اس کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جو شخص خود ہی موت کو گلے لگانے کے لئے تیار ہو اسے کسی بھی طرح دھمکایا نہیں جا سکتا تھا۔

وہ میرا بدترین حریف تھا کیونکہ وہ سیتا کا قاتل تھا، یا اس مذموم فعل میں شریک تھا یا اگر سیتا زندہ تھی تو وہ اس کی راہ پر لگا ہوا تھا مگر پھر بھی میں اس شخص کے لئے اپنے دل میں خفیف سی ہمدردی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کی پنڈلیاں قطعی ناکارہ ہو چکی تھیں اور وہ کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس کی ساری جیبیں خالی کی جا چکی تھیں لہٰذا میں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ بھی کھول دیئے۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے بدن کو آہستہ آہستہ جنبش دی اور فرش پر چت لیٹ گیا۔

"تم اعلیٰ ظرف کے مالک ہو۔" اس نے بھرّائے ہوئے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "شکست خوردہ حریف کے ساتھ نرمی سے پیش آنا شاید میرے خمیر میں بھی شامل نہیں ہے مگر تم بہت عظیم ہو کاش میں تم سے کچھ بہتر حالات میں ملا ہوتا۔"

"رجب کے باغ میں کیا واقعات پیش آئے تھے؟" میں نے قدرے توقف کے بعد گمبھیر لہجے میں دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"تم صفدر علی کے ٹھکانے سے واقف ہو؟" اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"کیوں؟" میں نے بے اختیار سوال کیا۔

"میری حالت ابتر ہے، میں جانتا ہوں کہ میں اسے زیر نہ کر سکوں گا مگر میرے دل میں اسے قریب سے دیکھنے کی حسرت ہے۔" اس کے لب و لہجے پر مایوسی کی چھاپ لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"باتوں میں اُلجھانے کی کوشش نہ کرو.... " ہاشم کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔

"سنو دوست!" لنگڑے سالومن کا لہجہ یک بیک تلخ ہو گیا۔ "میں پیشہ ور سیکرٹ ایجنٹ ہوں اور ہر سیکرٹ ایجنٹ ان حالات کے لیے تیار رہتا ہے۔ تم اگر مجھے نہ بھی مارو تو میں جانتا ہوں کہ میرے بدن سے اتنا خون زائل ہو چکا ہے کہ میں بمشکل ایک آدھ دن گزار سکوں گا۔ تم نے اخبارات میں پڑھ لیا ہو گا کہ سیتا وہاں ماردی گئی مگر.... مگر اصل حالات صرف میں ہی جانتا ہوں۔ وہاں پیش آنے والے واقعات میں صرف اور صرف صفدر علی کے سامنے ہی دُہراؤں گا جسے دیکھنا اس وقت میری باقی ماندہ مختصر زندگی کی سب سے بڑی حسرت ہے۔ اسے سامنے لائے بغیر تم میری زبان نہ کھلوا سکو گے۔"

"کیا یہ تمہارا عہد ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں یہ میرا آخری عہد ہے اور میثاقِ مقدس کی قسم میں اس پر اٹل ہوں گا۔" اس نے پہلی بار جذباتی لہجے میں کہا۔

"تو دیکھو!" یہ کہہ کر ہاشم نے اچانک اپنی ٹارچ روشن کر دی مگر اس کا رُخ براہِ راست میری طرف نہیں تھا لیکن میرا چہرہ روشنی کی زد میں آ گیا تھا۔

"شاید قدرت تم پر مہربان ہے کہ صفدر علی خود تمہارے سامنے موجود ہے۔"

سالومن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ سرگوشیانہ انداز میں بڑبڑایا۔

"صفدر علی، سب کچھ بدل گیا مگر آنکھیں وہی ہیں، ہر تصویر میں مشترک نظر آتی رہیں۔ اب کم از کم مجھے ایک بات کی خوشی ہے کہ میری زندگی کی آخری اور فیصلہ کن شکست میرے اس حریف کے ہاتھوں ہوئی جسے میں نے کبھی خود سے کم تر نہیں سمجھا تھا۔"

"اپنا وعدہ پورا کرو سالومن!" میں نے آہستگی سے اسے یاد دلایا۔

میں زندگی کے کسی بھی مرحلے پر خود پسندی یا انا پرستی کا شکار نہیں رہا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ قریب المرگ سالومن کی باتوں نے وقتی طور پر میرے ذہن میں بڑائی کا فتور برپا کر دیا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں اپنے دشمنوں کے لیے بھی ایک غیر معمولی مرتبے کا مالک تھا۔

"رجب علی مصر کی سرزمین پر شاید سیتا کا سب سے بڑا ہمدرد تھا۔" پیٹر سالومن نے کراہتے ہوئے کہا۔ رفتہ رفتہ اس کا وجود بکھرتا جا رہا تھا۔ "میں کافی عرصے سے تمہاری اور سیتا کی گرفتاری کے مشن پر مامور تھا۔ اپنی چال میں ایک نمایاں خامی کے باعث عرب ملکوں میں میرا تحفظ ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا ہے۔ اسی لیے میں نے لیبیا میں البرزو کا سٹیلانو کو سیتا کے پیچھے لگایا مگر وہ البرزو کو جل دے گئی۔ اور آخر کار قاہرہ میں وہ البرزو کاسٹیلانو کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ البرزو کی موت اور پھر ایک محاصرے سے سیتا کے سنسنی خیز فرار کے بعد مصری وزارتِ دفاع نے تمہاری اور سیتا کی گرفتاری کو اپنے وقار کا معاملہ بنا لیا۔ سب جانتے ہیں کہ تمہارے بارے میں دنیا میں سب سے زیادہ معلومات اسرائیلی حکام کے قبضے میں ہیں لہٰذا مصری وزارتِ دفاع نے ایک مشترکہ دوست ملک کے ذریعے اسرائیل سے مدد کی درخواست کی اور نتیجے کے طور پر مجھے قاہرہ بھیج دیا گیا۔ یہاں مجھے تقریباً لامحدود اختیارات دے دیے گئے اور میں براہِ راست ایک مصری جنرل کو جوابدہ تھا۔ ماتحت عملے کو میری مصر میں موجودگی کا علم ہی نہیں تھا۔" اس مرحلے پر وہ خاموش ہوا اور کراہتے ہوئے اپنی پوزیشن قدرے تبدیل کر کے دوبارہ کہنے لگا۔ "میری یہاں آمد کے ساتھ ہی رجب پکڑا گیا اور پھر اس کے مضافاتی باغ کا علم ہوتے ہی حکام نے باغ کا خفیہ محاصرہ کرا لیا۔ میرے لیے انتظار محال تھا۔ لہٰذا میں کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر محاصرے سے گزر کر باغ میں بنے ہوئے رہائشی کاٹیج میں جا پہنچا اور وہاں واقعی ایک ایسی خوبصورت لڑکی نظر آئی جس کے رخساروں پر خراشوں کے نشانات پڑے ہوئے تھے۔ ان خراشوں سے میں دھوکا نہ کھا سکا کیونکہ لڑکی کے خدوخال سیتا کی پرانی تصاویر سے قطعی مختلف تھے۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے لڑکی کو زیر کر لیا پھر پتہ چلا کہ اس کے رخساروں پر خراشوں کے نشانات گھٹیا قسم کے میک اپ کا نتیجہ تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس لڑکی کو لوگوں کی توجہ کا نشانہ بنا کر سیتا کو فرار ہونے کا موقع فراہم کیا گیا تھا۔

میرے نزدیک وہ لڑکی بھی سازش میں شریک تھی۔ میں نے باز پرس کے سلسلے میں اس پر تشدد کیا مگر کوئی کارآمد بات معلوم نہ کر سکا۔ تشدد کے نتیجے میں لڑکی کی حالت اتنی ابتر ہو گئی تھی کہ وہ زندہ بھی رہتی تو معذور ہی رہتی پھر میری شناخت کا معاملہ بھی نازک تھا لہٰذا میں نے اسے ہلاک کر دیا۔ واپسی میں شاید تمہارے ساتھیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ جب میں نے جنرل کو یہ ساری کتھا سنائی تو اس نے سیتا کی ہلاکت کا اسکینڈل گھڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح صفدر علی انتقام میں اندھا ہو کر دیوانہ وار سامنے آ سکے گا اور کسی مخبوط الحواس عاشق کی طرح آسانی کے ساتھ پکڑ لیا جائے گا۔"

وہ اس کے بعد بھی دھیمی اور بھرائی ہوئی آواز میں کچھ کہتا رہا مگر میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کی زبان سے سیتا کی زندگی کی نوید سننے کے بعد مجھے اپنا وجود پرندوں سے زیادہ ہلکا ہو کر فضا کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

میری سیتا زندہ تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ صفدر علی کے لیے زندہ رہنے اور اپنی زندگی کے لیے پورے عزم کے ساتھ لڑتے رہنے کا جواز باقی تھا۔

"تو تم کہتے ہو کہ رجب کے مضافاتی باغ میں تمہارے ہاتھوں سیتا نہیں بلکہ کوئی اور لڑکی ماری گئی تھی؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔" زیادہ دیر تک مسلسل بولتے رہنے کے باعث اس کی آواز پر نقاہت غالب آ گئی تھی۔ "اور اس وقت تم سامنے نہ ہوتے تو شاید میں اس موضوع پر اپنی زبان بند ہی رکھتا۔ یہ سمجھ لو کہ سیتا کی زندگی کا انکشاف تمہارے لیے اس جرأت اور مردانگی کا انعام ہے جو تم نے اپنے مرتے ہوئے دشمن کے ساتھ اختیار کی ہے۔"

"میں تمہیں مارنا ہی چاہتا تھا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مگر اس قدر مایوسی کے عالم میں نہیں۔ کاش تم بچ سکتے اور میں دوبدو مقابلہ کر کے تمہیں اپنے ہتھیاروں کا نشانہ بناتا۔ میرے لیے تمہارا یہ انجام خاصا عبرت ناک ہے۔"

"تکلیف کی شدت آہستہ آہستہ میرے حواس پر اثر انداز ہو رہی ہے، نقاہت بھی بڑھ گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے زندہ رکھنے کی کوشش نہیں کرو گے مگر میں یہ بزدلانہ التجا بھی نہیں کرنی چاہتا کہ مجھے سسکتی ہوئی موت سے بچانے کے لیے گولی مار دو۔"

اور میرے ذہن پر یک بیک کئی فلسفوں کا نزول شروع ہو گیا۔

اقتدار، اختیار اور طاقت کے نشے میں سرشار ہر انسان اپنی قوتوں کو لازوال سمجھ کر مادی مسرتوں کے لیے اپنے ہم نفسوں سے ہر لمحہ اس قدر خون آشام انداز میں برسرِپیکار رہتا ہے کہ اسے خونخوار درندوں پر بھی برتری دینے کو جی چاہتا ہے۔

اس وقت وہ شاید بھول جاتا ہے کہ وہ اپنے ہر سانس کے لیے کائنات کی کسی برتر قوت کا احسان مند ہے اور اس پر بھی مآلِ کار ایسا وقت آنے والا ہے جب اسے زندہ رہنے کے لیے اپنی قوت کے بجائے دوسرں کے رحم کی ضرورت ہو گی اور اگر دوسرے اس پر رحم کرنے کے بجائے اسے حالات کی سولی پر چڑھانے کا اٹل فیصلہ صادر کر دیں تو اس کی کوئی ذاتی خوبی اور ذاتی صلاحیت اسے موت کے دردناک عذاب سے نہ بچا سکے گی۔

اس وقت پیٹر سالومن کی کیفیت بالکل وہی تھی۔

وہ میرا خوددار، انا پسند اور عظیم دشمن تھا مگر اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اس کی تمام خوبیوں کا معترف ہونے کے باوجود تہہ دل سے اس کی موت کا خواہاں ہوں اور اگر مجھ سے زندگی کی کوئی التجا کرے گا تو وہ ٹھکرا دی جائے گی۔ وہ مرنے والا تھا مگر مرتے دم بھی اسے اپنی انا کی یہ تحقیر گوارا نہیں تھی کہ اس کا دشمن اپنی ظالمانہ اور برتر قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی التجا کو ٹھکرا دے۔

وہ مرنے کے لیے تیار تھا اور مرنے سے پہلے درد و اذیت کے ایک کربناک جہنم سے گزر رہا تھا جس کا خاتمہ آخر کار موت کی سنسناتی ہوئی پُرہول اور گمنام وادیوں میں ہی ہونا تھا مگر وہ اپنے اس دردناک عارضی دور کے اختصار کے لیے بھی کوئی التجا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا یہ عزم اور یہ جذبہ پسِ زنداں دہرائی جانے والی نہ جانے کتنی کہانیوں کا امین تھا۔

میرے اور ہاشم کے لیے وہ پتھر کی ایک ایسی طلسماتی دیوار بن کر رہ گیا تھا۔ جس سے سر ٹکرا کر خود ہی لہولہان ہو جاؤ اور اگر اس پر سنگ باری کرو تو ہر ضرب اس کی بنیاد سے چپک کر اسے اور زیادہ مضبوطی عطا کر جائے۔

میں خاموشی کے ساتھ ہاشم کو ایک طرف لے گیا۔

"اسے گولی مار دو۔" کچھ دور آ جانے کے بعد میں نے سرگوشیانہ لہجے میں ہاشم سے کہا۔

"اس سے یہ تو پوچھو کہ اس کے ہاتھوں مرنے والی کون تھی؟" ہاشم کا لہجہ بھی بہت دھیما تھا۔

"کیا اتنا کافی نہیں کہ وہ سیتا نہیں تھی۔"

"وہ جو بھی تھی بہت عظیم تھی۔" ہاشم نے کہا۔ "اس نے سیتا کی سلامتی کی خاطر دیدہ و دانستہ اپنی جان قربان کر دی۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنی اس گمنام محسنہ کا نام معلوم کریں۔ وہ ایک جیتی جاگتی عورت تھی، پتھر کا بے جان مجسمہ تو نہیں تھی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "یہ معلوم کرنے کے بعد ہم سالومن کو ختم کر دیں گے۔ اس کی حالت بہت زیادہ ابتر ہے۔"

"اس پر بہت زیادہ مہربان ہو گئے ہو۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ سیتا کا نہ سہی مگر ہماری ایک ہمدرد لڑکی کا قاتل ہے۔"

"وہ کس کا قاتل ہے اور قاتل ہے بھی یا نہیں۔ اس وقت میرے لیے یہ مفروضات بے معنی ہیں۔" میں نے سخت مگر دھیمے لہجے میں کہا۔ "اس کی حالت ابتر ہے اور وہ شاید مزید زبان نہیں کھولے گا۔"

"تو اب تم اسے میرے حوالے کر دو۔"

"وہ تمہارے ہی حوالے ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

ہم دونوں واپس آئے تو سالومن نقاہت زدہ انداز میں آنکھیں موندے زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ہمارے قدموں کی آوازیں سن کر اس نے بدقت تمام اپنے پپوٹوں میں جھری پیدا کی پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

"سالومن!" ہاشم نے اسے سخت لہجے میں پکارا۔

اس نے اپنی گردن کو ہولے سے جنبش دی مگر اس کی زبان سے کوئی آواز نہ نکل سکی وہ بہت زیادہ نڈھال ہو رہا تھا کیونکہ اس کی پنڈلیوں کے زخموں سے اس وقت تک تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔

"رجب کے باغ میں تمہارے ہاتھوں مرنے والی لڑکی کون تھی؟" ہاشم نے سرد لہجے میں اس سے سوال کیا۔

سالومن نے اپنی ہتھیلی کو لاعلمی کے انداز میں فضا میں لہرایا۔

"اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔" وہ ہماری طرف دیکھے بغیر مدھم آواز میں بڑبڑایا۔ مگر تہہ خانے کے پُرسکوت ماحول میں اس کی آواز ہم تک پہنچ رہی گئی۔

"وہ پانچوں اسیر کہاں ہیں جنہیں دو برس پہلے حیفہ میں یوم القدس کی تیاری کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا؟" ہاشم کا لہجہ خطرناک اور گمبھیر تھا۔

"وہ جیلوں میں دم توڑ گئے۔" سالومن نے جواب دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس مرحلے پر سر وہ بات بتلانے پر آمادہ ہو گیا ہو جو اس کے علم میں رہی ہو۔ "ان پر.... ان پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا تھا۔"

اچانک وہ بُری طرح تڑپا اور اس کے حلق سے کرب میں ڈوبی ہوئی نحیف سی غراہٹ ابھری پھر اس کا بدن ہولے ہولے لرزنے لگا۔

میں نے اسے آواز دی مگر وہ کچھ نہ بولا۔

اس کے تنفس کی رفتار یک بیک تیز ہو گئی تھی۔

ہم دونوں خاموش کھڑے ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھتے رہے شاید قدرت کی طرف سے اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں اس کے چہرے پر سنسنی خیز کر دینے والی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ چہرے کی تمام وریدیں نیلے کیچوؤں کی طرح جلد پر ابھر آئی تھیں۔

پھر بمشکل تمام اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ "یہ شاید ایکس تھری ....ہے۔ مجھے اسے بھی...دو...دیکھنے کی تمنا تھی۔" اس کی زبان سے ایکس تھری کا نام سن کر میرے ساتھ ہی ہاشم بھی بوکھلا کر رہ گیا۔

"میری لاش کم از کم چار گھنٹے اسی تہہ خانے میں پڑی رہنے دینا۔" وہ اٹک اٹک کر کہہ رہا تھا۔ "نہ جانے میری حالت اچانک کیوں بگڑ گئی ہے۔ میں کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہتا تھا بس کچھ دیر تین چار گھنٹے ... یا رب لایزال بس چند گھنٹے۔"

کرب اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے اس کے آخری الفاظ پر میرے ذہن کے کسی گوشے میں گویا بچھو نے ڈنک مار دیا۔

"اسے باہر پھینکو۔" میں لپک کر پیٹر سالومن کے نیم جان بدن کو کندھے پر لادتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولا۔ "مجھے راستہ دکھاؤ۔"

"کیا، کیا ہوا؟" ہاشم بوکھلا کر رہ گیا۔

"یہ شاید کوئی کام دکھا گیا ہے۔" میں سیڑھیوں کی طرف تقریباً دوڑتے ہوئے بولا۔ "اس کے الفاظ خوف آور تھے۔"

سالومن کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے میری کارروائی کے خلاف مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بالکل قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا مگر اس وقت میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

سیڑھیوں تک پہنچتے ہی ہاشم نے ابو جمال کو آواز دی اور جب میرا سر اس خلا سے باہر طلوع ہوا تو ابو جمال سراسیمہ انداز میں وہاں آ پہنچا تھا۔

"کیا ہوا حلیم؟" اس نے آتے ہی بلند آواز میں سوال کیا۔

"ذرا قیدی کو سنبھالو۔" میرے پیچھے سیڑھیوں سے ہاشم نے اسے ہدایت دی اور ابو جمال فوراً ہی میرے کندھوں سے سالومن کو باہر گھسیٹنے لگا۔

"اسے اٹھا کر یہاں سے سرپٹ دوڑتے چلے جاؤ اور اسے دو تین فرلانگ دور کھلے ریگستان میں پھینک آؤ۔" میں نے سنبھل کر باہر آتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ تو زندہ ہے اور شاید ہوش میں ہے۔" ابو جمال نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"جاؤ۔" میں اضطراری انداز میں غرایا اور وہ بھڑک کر دوڑ پڑا۔

میں ہاشم کے ہمراہ بڑے کمرے سے گزر کر باہر آیا تو ابو جمال سورج کی روشنی میں چمکیلی ریت پر کافی دور نکل چکا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا؟ آخر اس مرتے ہوئے دشمن سے تمہیں اچانک کیا خطرہ محسوس ہونے لگا؟" ہاشم نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہو سکتا ہے میرا یہ اقدام سراسر حماقت ثابت ہو مگر سالومن کے آخری فقروں نے میرے ذہن میں خطرے کے ایک ہولناک امکان کو جنم دیا تھا۔"

"میں تو بس جاننا چاہتا ہوں۔"

اس کی زبان سے یہ انکشاف سنتے ہی میں چونکا تھا کہ وہ تھری کے بارے میں درست اندازہ لگا چکا تھا۔ اسے ہوش میں آ یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ وہ کسی زیر زمین تہہ خانے میں قید پڑا ہوا ہماری ٹارچوں کی روشنی میں اس نے اسلحے سے بھری ہوئی پیٹیوں انبار بھی دیکھ لیے...."

"آہا... ذرا ٹھہرو۔" ہاشم نے میری بات کاٹی۔ "کیا تم یہ ہو کہ اسرائیلی قاہرہ کے نواح میں ہمارے ایکس تھری نامی اسلحے کے گودا سے باخبر ہیں؟"

"شاید صرف نام اور استعمال کی حد تک۔" میں نے کہا۔ "البتہ کے محل وقوع سے لاعلم ہیں۔ ورنہ آج سے بہت پہلے ایکس تھری چھاپہ مار دستہ حملہ کر کے اسے نیست و نابود کر چکا ہوتا۔"

"تم اپنی بات جاری رکھو۔" اس نے متجسس لہجے میں کہا۔ "اس تم نے میرے ذہن کے تار جھنجھنا ڈالے۔"

ایکس تھری کی شناخت کے بعد اسے یقین ہو گیا ہوگا کہ نہ حالت میں اپنی مدافعت کر سکے گا اور نہ ہم اسے چھوڑیں گے لہٰذا ا نے ہمیں نفسیاتی طور پر متاثر کرنے کے لیے ابتدا سے ہی قابل رحم شریفانہ رویہ اختیار کیا اور اس طرح اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ وہ محکم تھری میں ہی نہیں بلکہ صفدر علی کے ہمراہ بھی ہے۔ اب تم سوچو کہ اگر مرتے ایکس تھری کو برباد کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو کیا اس کا کا ہوتا۔؟"

"مگر کیسے؟" ہاشم نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔ "جب وہ معذور اور کمزور ہو چکا تھا۔ اور اس کی جیبیں ہم پہلے ہی خالی کر چکے"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے "بس مجھے یک بیک خطرے کا احساس ہوا تھا۔"

"تو تم اسے وہیں ہلاک کر سکتے تھے۔" ہاشم کی ذہنی خلش بڑھی ہوئی تھی۔ "اسے یہاں سے دور پھنکوانے میں کیا مصلحت تھی"

"میرے ذہن میں صرف ایک بات تھی۔" میں نے شرح آگے سے کہا۔ "وہ مر جانے کے بعد بھی کم از کم چار گھنٹے اپنی لاش تہہ خانے میں رکھوانے کا وعدہ لینا چاہتا تھا یعنی اس مدت میں اسے کسی معجزے ہونے کی امید تھی۔ لہٰذا میرا فوری فیصلہ یہی تھا کہ اسے بلا تاخیر باہر پھینکا جائے۔ اب چار گھنٹے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ میرا اندیشہ حقیقی تھا یا بے بنیاد۔"

"شاید یہ جواز تم نے اب پیدا کیا ہے۔ اس وقت تم سالو خواہش کا الٹ کرنے پر تل گئے تھے۔"

"ہم نے اس کے جسم کی تلاشی نہیں لی تھی۔" میں نے کافی دو پر جاتے ہوئے ابو جمال پر نگاہیں جما کر کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز

کے قبضے میں رہ گئی ہو میں نے کافی دن پہلے ایک یورپی ملک میں ہونے والے عجیب جنگی تجربات کے بارے میں سنا تھا۔ ان تجربات کی بنیاد یہ تھی کہ کسی طرح مائیکرو بم تیار کیے جائیں جو دوران جنگ ففتھ کالم اپنے منافع کے لیے استعمال کر سکے۔"

"ابوجمال بھانپ گیا ہوگا۔" ہاشم نے کہا۔ "اگر ہم اسے کار میں رکھ کر کہیں دور ڈال آتے تو بہتر رہتا۔"

کچھ دیر بعد ابوجمال واپس آگیا اور آتے ہی بولا۔ "میں ایک بلاوجہ قتل سے بال بال بچا ہوں۔ ورنہ میں نے تو مصمم ارادہ کر لیا تھا۔"

"کس بات کا؟" ہاشم نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"میں اسے زندہ تو وہاں چھوڑ کر نہ آتا۔" اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "غنیمت یہ ہوا کہ وہ راستے میں خود ہی چل بسا!"

"کچھ کہہ رہا تھا؟"

"اسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا!"

اندر پہنچ کر ہم دونوں نے چھوٹے کمرے میں فرش کا خلا چٹائی کے نیچے چھپانے میں ابوجمال کی مدد کرنی شروع کی تھی کہ ہاشم نے ایک مناسب مشورہ دیا اور ہم دونوں ایک مرتبہ پھر تہہ خانے میں اُتر گئے۔

ہم نے ٹارچوں کی روشنی میں اس سمت کا چپہ چپہ چھان مارا جہاں ہم نے لنگڑے سالومن کو ڈالا تھا مگر وہاں خون کے دھبّوں کے علاوہ کوئی ایسی مشتبہ چیز نظر نہ آسکی جسے سالومن سے موسوم کیا جاسکتا۔

اس کے بعد تہہ خانہ گویا بند کر دیا گیا۔ ابوجمال ہمارے لئے قہوہ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا اور ہم دونوں باہر ریت پہ آ بیٹھے جہاں سورج کی خوشگوار حدت ٹھنڈی صحرائی ہوائیں عجیب لطف دے رہی تھی۔

یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ اپنے شبہات کی تصدیق کے لئے ہمیں وہاں چار گھنٹے برباد نہیں کرنے پڑے۔

پہلا گھنٹہ گزرنے سے قبل ہی وہ ویرانہ ایک ہولناک دھماکے سے لرز اٹھا۔ جس سمت سے ابوجمال کی واپسی ہوئی تھی ادھر ریت کا ایک زبردست بگولا کافی بلندی تک اٹھتا چلا گیا تھا۔ ہم دونوں حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ دھماکے کی آواز سن کر ابوجمال بھی گھبرا کر باہر آگیا۔

اس دھماکے نے میرے شبہے کی تصدیق کر دی تھی مگر اس بارے میں مجھے خوشی کے بجائے گہری تشویش لاحق ہو گئی تھی۔

پتہ نہیں وہ سالومن کے بدن کے کسی حصے سے بندھے ہوئے بم کا دھماکہ تھا یا کسی حرکت کے نتیجے میں سالومن کی لاش ہی بم کی طرح پھٹی تھی۔

اس دھماکے کا سبب جو بھی رہا ہو مگر یہ بات یقینی تھی کہ اگر سالومن کی لاش تہہ خانے میں پڑی رہتی تو اس ہولناک دھماکے کے نتیجے میں تہہ خانے میں رکھا ہوا بارودی اسلحہ بھی پھٹ پڑتا اور پھر ہم سب ایکس تھری کے جھلسے ہوئے ملبے میں چیتھڑوں کی صورت میں دفن ہو کر رہ جاتے۔

"ہم موت سے بال بال بچے ہیں۔" ہاشم پھریری لے کر بولا۔ "بے خبری میں آدبوچنے والی ایسی موت بہت مہیب ہوتی ہے۔"

"غنیمت ہے کہ بچ گئے۔" میں نے ریت کے دھندلاتے ہوئے گرداب کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اس دھماکے نے کسی کو ادھر متوجہ تو نہیں کیا ہوگا!"

"بہت کم امکان ہے۔" ابوجمال کی آواز سہمی ہوئی تھی۔ "یہ علاقہ عام گزرگاہ سے بہت دور اور اندر کی طرف واقع ہے!"

"وہاں چل کر دیکھا جائے؟" ہاشم نے رائے پیش کی۔

"اب دیکھنے کو کیا رہ گیا ہوگا؟" میری آواز میں بھی بشاشت مفقود تھی۔ "ویسے ایک چکر لگا ہی لیتے ہیں۔"

ہم دونوں سگریٹیں سلگا کر اس طرف چل پڑے۔ ریت میں پھنس جانے کے اندیشے کے پیش نظر کار نہیں لی گئی تھی۔

وہ جگہ بغیر کسی دقت کے نظر آگئی۔ دھماکے کے باعث وہاں زمین میں کئی فٹ گہرا اور کم و بیش دس فٹ قطر کا ایک گڑھا پیدا ہو گیا تھا جس میں سالومن کے جسم کے کسی حصے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کے رہے سہے باقیات شاید صحرا کی ریت نے اپنے سینے میں چھپا لئے تھے!

مجھے سیتا کی زندگی کی نوید مل چکی تھی، پیٹر سالومن جیسے خطرناک حریف سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل ہو چکا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایکس تھری کو اس ساری مہم میں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا تھا مگر اس کے باوجود میرا دل بوجھل تھا اور ہاشم کے چہرے سے بھی کسی خاص مسرت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا!

"تم کچھ خاموش ہو!" قاہرہ کی طرف واپسی کے سفر میں میں نے ہاشم کو کریدنے کی نیت سے کہا۔

"نہیں!" اس نے چونک کر کہا۔ "بس کچھ سوچ رہا تھا۔"

"وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں!"

"آج میں پریشان ہوں دوست۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "سالومن سے جو کچھ معلوم ہوا وہ میرے لئے دلی تکلیف کا باعث بنا ہے۔"

"سیتا کی وجہ سے ماری جانے والی لڑکی کے لئے اداس ہو؟"

"سیتا کے لئے تو ایسی کتنی ہی جانیں نثار کی جاسکتی ہیں مگر میری پریشانی کا سبب کچھ اور ہے۔ مجھے اس خطے میں بڑی ڈرامائی تبدیلیوں کا امکان نظر آرہا ہے جو شاید ہمارے حق میں بدترین ثابت ہوں گی۔"

"کھل کر بات کرو۔"

"مصر آج تک ہر مرحلے پر ہمارا بہت بڑا ہمنوا رہا ہے اور اسرائیل کے ازلی دشمنوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اسرائیلی جارحیت کا بھی شکار ہوا ہے اور اس کی سرزمین کا وسیع رقبہ صیہونی توسیع پسندی کی زد میں آیا ہوا ہے مگر اس کے باوجود اعلیٰ سرکاری سطح پہ تنہا سے اور سیتا کے معاملے میں مصر نے اسرائیل سے مدد حاصل کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصری حکومت کے مؤقف میں جھکاؤ پیدا ہو رہا ہے۔ ہماری اعلیٰ کمان اور بیشتر عرب ملکوں کے لئے یہ خبر نہایت اندوہناک اور پریشان کن ثابت ہوگی!"

"ہوسکتا ہے کہ سالومن کو مصری حکومت کے کسی بڑے نے ذاتی مراسم کی بنا پر یہاں بلوا لیا ہو۔" میں نے کہا۔

"حساس ریاستی معاملات میں ذاتی مراسم بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "آج مصری عوام سے پوشیدہ رکھ کر ایک اسرائیلی اہلکار کو اس سرزمین پہ کام کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ میں تو کئی برس آگے کی سوچ رہا ہوں۔ شاید مصری فیصلہ کر چکے ہیں کہ اسرائیل سے دوستی کئے بغیر وہ اس خطے میں کبھی نہیں پنپ سکیں گے۔"

"یہ باتیں اپنی اعلیٰ کمان کے لئے چھوڑ دو......!"

"ایسے عرب باشندوں اور حکام کی تادیب کرنا میرے فرائضِ منصبی میں شامل ہے جو مشترکہ عرب مفاد کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کی راہ پر چلنے لگیں۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

"تو کیا تم قاہرہ کے پولیس کمشنر سے بھی ملوگے؟"

"اس خبیث کو تو اغوا کرنا ہوگا تاکہ اس جنرل کا نام سامنے آئے جس کے سامنے سالومن جواب دِہ تھا۔"

"اور پھر اس جنرل کو گھیرو گے؟"

"اگر ہدایت ملی تو یہ بھی کرنا ہوگا۔"

ہم دونوں ہوٹل القاہرہ پہنچے تو شام کے چار بج رہے تھے ہم دونوں خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

مجھ پر پچھلی رات کی بے خوابی کے باعث تکان طاری تھی لہٰذا میں منہ ہاتھ دھو کر بستر پہ دراز ہو گیا۔

اور بستر پہ دراز ہوتے ہی مجھ پہ اپنی اداسی کا سبب منکشف ہو گیا۔

ابھی تک میرے پاس سیتا کا سراغ موجود تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ قاہرہ میں موجود تھی، پھر اس کی موت کی خبر آئی اور میں تنہائی کے ہولناک احساس میں گھر گیا۔ سیتا کی حیاتِ نو کی خبر پا کر میں تنہائی کے احساس سے تو نجات پا گیا تھا مگر میرے لئے سیتا ایک بار پھر صحرا کا سراب بن گئی تھی۔ مجھے اس کی نقل و حرکت اور ٹھکانے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

لیبیا میں وہ مدتوں بعد مجھ سے ملتے ملتے یکایک بچھڑ گئی تھی اور جب مقدر نے ہمیں قاہرہ میں یکجا کیا تو حالات نے سیتا کو میرے سامنے سپر انداز کر دیا۔

قاہرہ میں ملے بغیر سیتا کا مجھ سے یوں بچھڑ جانا مجھے اپنی ذات کے لئے ایک المیہ محسوس ہو رہا تھا!

ایک طویل مدت ہو گئی تھی کہ قانون میرے تعاقب میں تھا اور میں سیتا کے پیچھے لگا ہوا تھا لیکن نہ قانون میرے قدموں میں زنجیر ڈال سکا تھا اور نہ میں سیتا کی مخروطی گردن میں اپنی باہیں ڈال سکا تھا۔

تین گھنٹے کی گہری نیند کے بعد میں بیدار ہوا تو تازہ دم ہو چکا تھا۔

ہاشم کے ذہن پر سالومن والے قضیئے کے بعد سے سیاست سوار ہو چکی تھی لہٰذا میں نے ادھر جانے کے بجائے تنہا باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

گھومتے گھامتے میں قاہرہ کے اس بارونق حصے میں جا نکلا جہاں کئی تھیٹر اور کلب موجود تھے۔

میں آہستہ خرامی سے باہر لگے ہوئے قدِ آدم پوسٹروں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔

ٹکرانے کا احساس تو خیر بعد میں ہوا، چونکا دینے والا احساس حرارت اور گداز لمس کا تھا۔

سر اٹھایا تو کم و بیش اپنی ہم قامت ایک مقامی عورت کو

اپنے سامنے موجود پایا جس نے گلابی اسکرٹ اور بلاؤز پر سیاہ مخمل کا لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ کوٹ کے کالر میں لگی ہوئی پھولی ہوئی فر میں اس کا سرخ و سفید اور حسین چہرہ روئی کے درمیان سجے ہوئے گلاب کے تر و تازہ پھول کی طرح دمک رہا تھا۔

"ہیلو"! نگاہیں چار ہوتے ہی وہ دعوت انگیز مسکان کے ساتھ ترنم ریز آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

اس سبک اندام، پری چہرہ دوشیزہ کو یوں اچانک سامنے پانے کے بعد میرا ابتدائی ردِعمل لوکھلاہٹ کا تھا۔ جس پر میں نے فی الفور قابو پالیا اور دلپذیر مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہیلو! کہو میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟"

"اگر کسی بہتر تفریح کی تلاش میں ہو تو میرے پاس سامنے والے کلب کے دو ٹکٹ ہیں وہاں ہر رات بیلے ہوتا ہے مصری بیلے!"

"تم ہی ناچتی ہو گی؟" میں نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

"نہیں تو"! اس نے سٹپٹا کر کہا۔ "یہ کیسے کہہ دیا تم نے؟"

"تمہاری کمر خاصی پتلی ہے!" میں نے اگلا شوشا چھوڑ دیا۔ حالانکہ میں اچھی طرح واقف تھا کہ مغربی بیلے کے برعکس مصری بیلے میں پتلی کمر کے بجائے اگر فوری طور پر جسم مجرب نہ ہو تو رقاصہ کو اسٹیج کے بجائے محض آئینے کے سامنے ہی ناچنے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

"تم ٹکٹ لوگے؟" اس کے چہرے پر مسکراہٹ برقرار رہی لیکن اس نے اپنی کمر کی تعریف پر کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔

"دوسرے کا کیا کروگی؟"

"دوسرا کسی اور کو دے دوں گی۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "دراصل میرا ساتھی کسی ضروری کام کی وجہ سے نہ آسکے گا ورنہ میں خود ہی یہ پروگرام دیکھتی!"

"تو میرے ساتھ دیکھ لو!" میں نے اسے پیشکش کی۔

"اگر مجبور کرتے ہو تو چلو یہی سہی!" اس نے میرے مجبور کئے بغیر فوری طور پر کہا اور میں نے نہایت نرمی سے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا مجھے اس کی یہ بھائی ادا خاصی پسند آئی!

"لاؤ پیسے دو تو ٹکٹ لے آؤں!" اس نے دھیمی آواز میں کہا تو اس کے گرم گرم سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ دو ٹکٹ تمہارے پاس ہیں؟"

"بکنگ کلرک میرا دوست ہے دو ٹکٹ اس نے روک لئے ہوں گے، دس پاؤنڈ دو تو ابھی لے آتی ہوں"

اس کا انداز اس قدر دلربایانہ اور جارحانہ تھا کہ میں نے جیب سے دس پاؤنڈ نکال کر اس کے حوالے کر دئیے۔

"تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آئی!" نوٹ لے کر اس نے کہا اور پھرتی سے ایک طرف چل دی۔ میں لاپرواہانہ انداز میں سگریٹ سلگا کر ایک پوسٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس نسوانی پوسٹر کی ساری جزئیات میرے ذہن نشین ہو گئیں پھر میری سگریٹ بھی ختم ہو گئی تو مجھے تشویش لاحق ہوئی کہ وہ پتلی کمر کہاں غائب ہو گئی؟

میں نے گردوپیش میں نظریں دوڑائیں لیکن پتلی کمر والی کا دُور دُور بھی پتہ نہیں تھا۔ دوسری طرف زیادہ دیر تک اسی جگہ کھڑے رہنے کے باعث میں وہاں ہاکروں کی توجہ کا نشانہ بنتا جا رہا تھا۔

ان میں سے بیشتر کم سن یا نوجوان لڑکے تھے اور وہ وقفے وقفے سے میری طرف متوجہ ہوئے بغیر تند آوازے کستے جا رہے تھے۔

میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ جگہ چھوڑ دوں، دس پاؤنڈ کے نوٹ کو بھول جاؤں اور آئندہ حسن کے اچانک دیدار پر جذبات قابو میں رکھنے کی مشق شروع کر دوں تاکہ کوئی اور پتلی کمر مجھے یوں احمق نہ بنا سکے۔

میں اپنے حلق میں تلخی محسوس کرتا تھوڑی ہی دُور بڑھا تھا کہ اچانک پشت سے ایک نرم ہاتھ میرے شانے پر جم گیا۔

میں چونک کر مڑا تو وہی پتلی کمر خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھی۔

"میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی، وہ تو اتفاقاً ہی نظر پڑ گئی ورنہ نکل جاتے" اس نے نہایت معصومیت سے کہا۔

میں نے دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیجی کہ ایسی حسین اور سادہ لوح دوشیزہ کے بارے میں اپنے دل میں شبہات پال رہا تھا حالانکہ وہ ایک ایماندار لڑکی تھی۔ چاہتی تو مجھے جاتا ہوا دیکھ کر خود بھی کھسک جاتی لیکن اس نے بڑھ کر مجھے روکنے کا فیصلہ کیا تھا جو نہایت شائستہ تھا۔

"اتنی دیر کہاں لگا دی؟" میں نے پلٹ کر اس کی پتلی کمر میں دوبارہ اپنا ہاتھ حمائل کر دیا۔ اس بار میں نے یہ کارروائی کھلے ہوئے کوٹ کے اندر سے کی تھی کیونکہ پچھلی بار کوٹ کی درمیان میں موجودگی کے باعث کمر خاصی بڑی محسوس ہوئی تھی!

وہ خاصی وضعدار لڑکی تھی، حسب سابق اس بار بھی اس نے میری جسارت پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خفت آمیز انداز میں بولی۔ "میں شرمندگی سے بچنا چاہتی تھی، میں نے چپہ چپہ چھان مارا مگر وہ نوٹ کہیں نہیں ملے۔ میرا خیال ہے کہ وہ گرے نہیں بلکہ کوئی اچکا نہایت صفائی سے انہیں اڑا لے گیا۔"

وہ شاید مجھے صرف اتنا ہی بتانے آئی تھی مگر میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ایک بار اسے رقص دکھانے کی دعوت دینے کے بعد بے نیل و مرام واپس جانے دوں۔ میرا ہاتھ مشینی انداز میں جیب میں گیا اور مزید دس پاؤنڈ باہر آگئے۔

"نہ، نہ!" وہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی "ایسا نہ ہو کہ میں دوبارہ پھینک دوں تم خود ہی ساتھ چل کر اس سے ٹکٹ لے لو"

"کوئی بات نہیں، تیسری بار کوشش کر لیں گے" میں نے خوشدلی سے کہا پھر قدرے رکھائی سے نوٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "جو کہہ رہا ہوں وہ کرو، جاؤ اور جلدی سے دونوں ٹکٹ لے آؤ" مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے فوری طور پر میری بات مان لی اور نوٹ لے کر تیز تیز قدموں سے واپس چل دی۔

اس بار میرے آس پاس کوئی دلکش پوسٹر نہیں تھا لہٰذا میں پلٹ کر اسی کو دیکھنے لگا۔

وہ مجھ سے الگ ہو کر تھوڑی ہی دُور گئی تھی کہ کسی جانب سے ایک نوجوان اس کی طرف لپکا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ..... چلنے لگے۔

چلتے چلتے لڑکی نے اپنا سر پیچھے گھمایا اور پھر جُوں ہی اسے یہ احساس ہوا کہ میں اسی طرف دیکھ رہا تھا تو یک بیک اس کی رفتار تیز ہو گئی!

برقی اشتہاروں کی روشنی میں میں نے لڑکی کے چہرے پر واضح طور پر سراسیمگی کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تھے۔

میں تیزی سے واپس پلٹا مگر جب تک میں وہاں پہنچا پتلی کمر اپنے نوجوان ساتھی سمیت کہیں غائب ہو چکی تھی۔

اس وقت مجھے اپنی حماقت پر خاصا تاؤ آیا۔ میں ایک ہی سوراخ سے دوبار ڈسا گیا تھا اور سارا فتور اس نسوانی لمس کا تھا جو پہلی بار میں نے مخمل کے کوٹ پر سے اور دوسری بار اُونی اسکرٹ پر سے اپنے بائیں ہاتھ پر محسوس کیا تھا۔

میرے ذہن میں جھلاہٹ طاری ہونے لگی۔

میں اپنی دانست میں ایک پختہ کار اور گھاگ مرد تھا میرے لئے کسی عورت کے وجود اور بالواسطہ لمس سے اس قدر متاثر ہو جانے کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ اس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی محرومی سر ابھار رہی تھی۔

آگے بڑھتے ہوئے میری نگاہ ایک فون بوتھ پر پڑی اور میں اندر جا گھسا۔

مریم کے ریٹائرڈ پائلٹ دوست کا نمبر مجھے یاد تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ اس وقت وہ نشے میں دُھت ہو گا لہٰذا میں نے سکہ ڈال کر اس کا نمبر ڈائل کر ڈالا۔

سلسلہ ملنے پر میرے کانوں میں ایک نامانوس سی کرخت آواز آئی جو مریم کے دوست کی ہرگز نہیں تھی کیونکہ اس کی آواز میں



ایک بار فون پر سن چکا تھا۔

"مس مریم؟" میں نے استفسار کیا۔

"تم کون ہو؟" آواز سرد اور گمبھیر تھی۔

"اس کا ایک دوست!"

"پھر تم فوراً یہاں آ جاؤ۔"

"ہماری ملاقاتیں باہر ہی ہوتی رہی ہیں۔" میں روانی میں کہہ گیا۔

"تو شاید وہ تمہاری ہی وجہ سے ماری گئی ہے!"

"ماری گئی ہے؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"میں تفتیشی پولیس افسر بول رہا ہوں، پڑوسیوں نے فائر کی آواز سن کر تھانے فون کیا تھا۔ اگر تم مریم سے ذرا بھی لگاؤ رکھتے تھے تو تمہارا فرض ہے کہ یہاں آ کر قانون کی مدد کرنے کی کوشش کرو۔"

میں نے مزید کچھ سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے لئے وہ دن کچھ ناساز گار ہی تھا۔

بس سیتا کی زندگی کی خبر ایسی تھی جو ساری نحوستوں پر بھاری تھی ورنہ دیگر معاملات میں مقدر بالکل بھی یاوری نہیں کر رہا تھا۔

مریم کے قتل کی خبر ملنے کے بعد میرا القاہرہ جانا خطرناک تھا۔ پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں وہ ٹھکانا میرے لئے مخدوش ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بوتھ میں رکھی ہوئی ڈائرکٹری کی ورق گردانی کر کے القاہرہ کا نمبر ملایا اور آپریٹر سے ہاشم کے کمرے کا نمبر مانگا مگر چند ثانیوں بعد اس نے بتایا کہ کمرے سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔

تسلسل کے ساتھ ہونے والی ان کئی ناکامیوں نے میری طبیعت خاصی مکدر کر دی!

پتلی کمر کے تلخ تجربے کے بعد میں نے قاہرہ کے بارے میں خاصی تلخ رائے قائم کر لی تھی۔ وہ ٹھگوں کا شہر تھا اور مجھ جیسے شخص کے لئے بھاری مالی نقصان سے دوچار ہوئے بغیر مقامی تفریحات کی خریداری ناممکن تھی!

میرے لئے بے مقصد شہر میں بھٹکتے پھرنا بھی ناممکن تھا۔ ہاشم ہوٹل کے کمرے سے غائب تھا، عبدالکمال کی قیامگاہ کے پیچیدہ راستے میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہے تھے اور مریم قتل کی جا چکی تھی۔

یہ غنیمت ہی ہوا کہ میں نے ہوٹل کا رخ کرنے سے پیشتر مریم کے دوسرے ٹھکانے پر فون کر لیا ورنہ میں کسی بھی وقت ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو سکتا تھا۔

فون پر تفتیشی افسر نے جو کچھ کہا اس سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس کے نام نہاد عاشق کو اس پر بے وفائی کا شبہ ہو گیا تھا اور پھر نشے کی جھونک میں یا اپنے شبہے کی تصدیق میں کچھ مواد جمع کرنے کے بعد اس نے اشتعال کے عالم میں مریم جیسی حسین اور دلربا لڑکی کو ہلاک کر ڈالا۔

میرے لئے ذاتی طور پر اب قاہرہ میں رُک کے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا میں فٹ پاتھ پر بے مقصد بڑھتے ہوئے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔

ہاشم کے لئے قاہرہ میں یک بیک کام بڑھ گیا تھا۔ اسے مصری حکومت میں پیدا ہونے والے اسرائیل پرستانہ رجحان کی بنیادیں تلاش کرنی تھیں اور اس بارے میں قاہرہ کے پولیس کمشنر کا نام اس کے سامنے موجود تھا جس پر تشدد کر کے شاید اس جنرل کا سراغ حاصل کیا جا سکتا تھا جو مصر میں سالومن کی سرگرمیوں کا ذمّے دار تھا اور شاید اس کے بعد بھی اسے مصر ہی میں رہنا پڑ جاتا۔

اپنی ان نئی مصروفیات کے باعث وہ مجھے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا البتہ یہ امکان ضرور تھا کہ وہ اپنے ساتھ مجھے بھی الجھا لے اور میں ایک مرتبہ اس نئے چکّر میں ملوّث ہونے کے بعد اخلاقی طور پر اس وقت تک ہاشم کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک اس کے معاملات میں بہتری کے آثار پیدا نہ ہو جاتے!

اور پھر سیتا بھی اتنی احمق نہیں تھی کہ مختصر سے عرصے میں دوبار مقامی حکام کے ناکام گھیرے میں آنے کے بعد بھی مصری سرحدوں میں ہی منڈلاتی پھر رہی ہو۔

میری دانست میں رجب کے باغ والے معاملے کے بعد اسے ایک لمحے کے لئے بھی مصر میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے تھا۔

قاہرہ میں میری دلچسپی کا مرکز اب صرف رجب کی ذات تھی۔ وہی رہا ہونے کے بعد یہ بتا سکتا تھا کہ سیتا قاہرہ سے کدھر گئی تھی باغ میں سالومن کے ہاتھوں مرنے والی لڑکی کا سیتا سے کیا تعلق تھا اور وہ شروع سے ہی سیتا کا روپ دھار کر باغ میں رہ رہی تھی یا خطرہ بھانپنے کے بعد اس نے سیتا کی جگہ لی تھی۔

کافی دیر بعد ایک دوسرے بوتھ سے میں نے القاہرہ فون کیا تو اس بار ہاشم سے بات کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔

"تم کہاں غائب ہو؟" اس نے میری آواز پہچانتے ہی سوال داغ دیا۔

"میں ہوٹل الف لیلیٰ کے نکڑ والے بوتھ سے بول رہا ہوں۔ کیا تم فوری طور پر یہاں پہنچ سکتے ہو؟" میں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"میں فوراً آ رہا ہوں۔" وہ موقع کی نزاکت بھانپ گیا اور گفتگو کو طول دیئے بغیر اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

شاید میں اس وقت القاہرہ سے زیادہ دُور نہیں تھا کیونکہ ہاشم بمشکل دس ہی منٹ میں وہاں آ پہنچا۔

"خیریت تو ہے؟ کہاں بھاگے پھر رہے ہو؟"، میرے بیٹھنے کے بعد اس نے کار آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"مریم قتل کر دی گئی!" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "پولیس جلد یا بدیر القاہرہ تک پہنچ ہی جائے گی، میں ایک مرتبہ پھر بے گھر ہو گیا ہوں۔"

"اس کی فکر نہ کرو.....!"

"فکر کیسے نہ کروں۔" میں نے کہا۔ "میرے شناختی کاغذات مصطفیٰ المرزوق کے نام سے ہیں اور مریم میرے اسی نام سے واقف تھی ہو سکتا ہے کہ اس کی کسی تحریری یادداشت سے پولیس کو یہ نام معلوم ہو جائے۔"

"تمہارے نئے کاغذات تیار ہو جائیں گے۔" اس نے ہنس کر کہا "نئی قیام گاہ کا بھی بندوبست ہو جائے گا چاہو تو فوری طور پر تھیٹر کے ایک اداکار کے ساتھ رہ سکتے ہو۔ وہ تنظیم سے باہر کا آدمی ہے مگر بہت زیادہ قابلِ اعتماد ہے!"

"جب اسے میری اصل شخصیت کا علم ہی نہ ہو گا تو اعتماد کی زیادہ اہمیت نہیں رہتی، بس مجھے اپنے مکالمے سنا سنا کر بور نہ کرے۔"

"بہت خوش باش اور مجلسی آدمی ہے!"

"پتلی کمر بھی ایسی ہی لگتی تھی!"، میں نے ٹھنڈا سانس لے کر بے اختیار کہا۔

"پتلی کمر؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "کیا یہ بھی مریم کا کوئی نام تھا؟ اور ہاں تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ کیسے.... ماری گئی؟"

میں پتلی کمر کا تذکرہ گول کر گیا۔ ہاشم کو وہ قصّہ سنا کر میں خود کو مذاق بنانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اسے مریم کے قتل کی تفصیلات میں الجھا لیا۔

میرے خاموش ہونے کے چند ثانیوں بعد اس نے سکوت توڑا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس کمشنر پر کیسے ہاتھ ڈالوں۔ میرے لئے یہ کام بہت ضروری ہو گیا ہے!"

"ایک اہم سرکاری افسر کا معاملہ ہے، سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا ہو گا۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"میری تو عقل کام نہیں کرتی!" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔ "ہر وقت دو مسلح اردلی اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ جب تک بیک وقت تینوں پر ہاتھ نہ ڈالا جائے ہمارا راز فاش ہونے کا خطرہ سروں پر منڈلاتا رہے گا۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے اگر کوئی قابلِ اعتماد عورت مل سکے تو پہلی کوشش اسی وقت کی جا سکتی ہے۔"

"کیا ترکیب ہے؟"، وہ متجسس لہجے میں بولا۔

"عورت برادر عورت!" میں نے زور دے کر کہا۔ "عورت کے بغیر میرا منصوبہ کامیاب ہونے کا امکان بہت کم ہو گا۔"

"وہ بندوبست ہو جائیگا۔" وہ میری تجویز سننے کے لیے بے چین ہو اجا رہا تھا۔ "رفیق کی محبوبہ سے بھی کام لیا جا سکتا ہے!"

"رفیق کون؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہی تھیٹر کا اداکار، وہ لڑکی مدتوں سے اسی کے ساتھ رہتی چلی آئی ہے۔" پھر قدرے جھنجلا کر بولا۔ "مگر تم اپنی تجویز کیوں نہیں بتاتے؟"

"وہ لڑکی مظلوم اور سہمی ہوئی آواز میں پولیس کمشنر کو فون کر کے فوراً شہر کے کسی کم آباد علاقے میں بلاتے.....!"

"اور تمہارا خیال ہے کہ ایک مظلوم نسوانی آواز سن کر وہ اُلّو کا پٹھا سر کے بل وہاں دوڑا چلا آئیگا۔" وہ میری پوری بات سنے بغیر پھٹ پڑا۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ "پہلے پوری بات تو سُن لو۔ سالومن براہِ راست جنرل کو جوابدہ تھا۔ کل شام تم نے اُسے پولیس کمشنر کے دفتر سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ پولیس کمشنر بھی سالومن سے متعارف ہے۔ یہ بات ناممکن ہے کہ دشمن ملک کا ایک ممتاز سیکرٹ ایجنٹ جو میک اپ کے بغیر پھر رہا ہو اور اسکی چال میں بھی ایک مخصوص جھکاؤ موجود ہو۔ وہ قاہرہ کے پولیس کمشنر کے لیے اجنبی رہا ہو گا۔ وہ لڑکی پولیس کمشنر سے یہی کہے گی کہ سالومن کسی مقام پہ شدید زخمی حالت میں پڑا ہے اور اسے طبّی امداد پہنچانے کے لیے سواری، بہتر معالج اور مکمل رازداری کی ضرورت ہے، لہٰذا وہ تنہا کار لے کر اس جگہ پہنچے۔ اسے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس کے عہدے سے واقف ہے، وہ اتنا کہے گی کہ وہ نام اور فون نمبر اسے قریب المرگ سالومن نے دیا ہے۔"

"اور اگر اس نے حادثے کے اسباب کریدنے شروع کر دیئے؟"

"ایسے موقع پر گمنام اور مسلح حملہ آوروں کا تذکرہ برسوں سے کامیاب چلا آ رہا ہے۔ وہ لڑکی خود کو سالومن کی دوست بتلائے گی اور یہ حادثہ اسی کی قیام گاہ پہ پیش آیا ہو گا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"اور اگر نسوانی آواز سن کر وہ ڈر گیا؟"

"رفیق کی محبوبہ کی آواز اتنی بھیانک تو نہ ہو گی۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ سنجیدگی سے غور کرو۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "ہم کام اخباروں کی حد تک تو سیتا کو ہلاک کر چکے ہیں، مگر پولیس کمشنر ضرور حقیقت سے آگاہ ہو گا۔ وہ یہ بھی تو سمجھ سکتا ہے کہ سیتا کو کسی طرح سالومن کی بھنک مل گئی ہے اور وہ سالومن کے نام کی آڑ میں اسے رگیدنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"تم نے بہت دُور کی سوچی ہے۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "لیکن کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟ ہم مقررہ مقام پر چھپے رہنے کے بجائے ادھر آنے والے راستے پر کئی میل دُور سے نظر رکھیں گے، اگر وہ تنہا آیا تو اسے راستے میں ہی چھاپ لیں گے، ورنہ وہ سر پیٹ کر واپس لوٹ جائیگا۔ بس ہمیں ایسے محفوظ مقام کا انتخاب کرنا ہو گا جہاں تک پہنچنے کے لیے پولیس کمشنر کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہو۔"

"سارا انحصار اس بات پر ہے کہ پولیس کمشنر کے کاندھوں پر سالومن کے تحفظ کے سلسلے میں کتنی ذمّہ داریاں عائد ہیں؟" ہاشم نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ سالومن کے زخمی ہونے کی خبر اسے بوکھلا کر رکھ دے اور وہ اپنی چمڑی بچانے کے لیے بتائی ہوئی جگہ کی طرف دوڑ پڑے۔ ایسی صورت میں اسے زیادہ پوچھ گچھ کا بھی ہوش نہیں رہے گا۔"

یہ سب محض اس لیے ضروری ہے کہ تم اسے زندہ پکڑ کر جیل تک پہنچانا چاہتے ہو، ورنہ ہلاک کر دینا کا راستہ تو بہت آسان تھا!"

"پھر میں رفیق کے گھر ہی چل رہا ہوں۔" اس نے تائید طلب لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارے سمجھنے کی بات ہے!"

وہ چھوٹے چھوٹے مکانات پر مشتمل متوسط طبقے کی بستی تھی جہاں ہمارے سفر کا اختتام ہُوا۔ کار سڑک کے کنارے روک کر ہم دونوں ایک دروازے پر جا رکے۔

ہاشم نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور چند ثانیوں بعد دروازہ کھول دیا گیا۔

"اوہ ہاشم بھائی!" قدرے کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے عربی میں ایک مسرت آمیز نسوانی آواز ابھری اور پھر دونوں پٹ کھل گئے۔

اس عورت یا لڑکی پر نظر پڑتے ہی میری کھوپڑی بھق سے اڑ گئی!

پھر اس کی نگاہیں بھی ہاشم سے گزرتی ہوئی میرے چہرے پر پڑیں اور وہ مبہوت سی رہ گئی۔ اس کا دہانہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور پھٹی ہوئی آنکھیں پیشانی پر جا چڑھی تھیں!

"کیا تم دونوں ایک دوسرے کے شناسا ہو؟" ہاشم نے وہاں پھیلی ہوئی مدھم روشنی میں باری باری ہم دونوں کے چہروں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

اس وقت ہاشم گردن گھما کر میری طرف دیکھ رہا تھا اور میری نگاہیں "پتلی کمر" کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں زلزلے کے آثار نمایاں تھے!

اس دلربا ٹھگ کے لیے وہ صورتحال بڑی صبر آزما تھی۔ خاموش رہتی تو میری زبان سے اپنے کرتوت کا انکشاف سُننے کا خطرہ تھا اور اگر بولتی تو بولنے کے لیے اس کے پاس نہ ہی الفاظ تھے اور نہ موضوع! اس نے ہاشم کی توجہ میری طرف مبذول ہونے سے یہ فائدہ اٹھایا کہ نہایت بے بسی سے اپنے دونوں کانوں کو چھو کر ہاتھ جوڑ لیے اور گردن بہت تیزی کے ساتھ نفی کے انداز میں ہلنے لگی۔ گویا بزبانِ خاموشی کہہ رہی ہو کہ خُدا کے لیے اپنی زبان نہ کھولنا، میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کروں گی۔

"ہم شام کو ایک قہوہ خانے میں ایک دوسرے سے ملے تھے۔" میں نے مسکرا کر ہاشم سے کہا اور پتلی کمر کے چہرے پر گہرے سکون کی لہر دوڑ گئی۔ "صورت آشنائی ضرور ہے لیکن تفصیلی تعارف کی نوبت نہیں آسکی۔"

"اندر نہیں بلاؤ گی؟" ہاشم نے پلٹ کر کہا۔ "رفیق کہاں ہے؟"

"آجاؤ، آجاؤ، وہ اندر ہی ہے؟"

"یہ عابدہ ہے۔" ہاشم مختصر سے صحن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "رفیق کی بیوی ہے، میں نے اسے کافی مدت کے بعد دیکھا ہے مگر اب بھی پہلے ہی جیسی ہے۔"

ہماری آوازیں سُن کر ایک مرد کمرے سے باہر آگیا۔ خاصا توبرو اور صحتمند تھا۔ مجھے شبہ سا ہُوا کہ وہ وہی شخص تھا جو اس لڑکی کے ساتھ مجھے تماشائیوں کی بھیڑ میں آخری بار نظر آیا تھا!

اس کے چہرے پر مجھے اپنے لیے شناسائی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

وہ واقعی ہنس مکھ اور ملنسار آدمی تھا۔ ہاشم سے تو وہ یوں بغلگیر ہُوا جیسے برسوں بعد ملا ہو۔ پھر وہ ہمیں اندر لے گیا۔

عابدہ اس وقت تک ہمارے سروں پر مسلط رہی جب تک اسے میری جانب سے پوری طرح اطمینان نہیں ہوگیا۔

میرے لیے یہ بات حیرت ناک تھی کہ رفیق جیسا خوددار اور باوقار نظر آنیوالا شخص اپنی محبوبہ کے ذریعے سیاحوں کو ٹھگنے کی گھناؤنی سرگرمیوں میں ملوث تھا! شاید ہاشم کو اس کی ان حرکات کا علم نہیں تھا ورنہ اس کے لہجے میں رفیق کے لیے خلوص اور احترام نہ ہوتا کیونکہ ہاشم بنیادی طور پر ایک اصول پرست انسان تھا۔

کچھ دیر بعد یہ معمہ بھی حل ہوگیا۔

قاہرہ کے تھیٹروں میں نیم عریاں نسوانی ناچوں کی لہر نے پچھلے چند برس میں مرد اداکاروں کے لیے روزی کمانے کے مواقع تقریباً ختم ہی کر دیے تھے، جس کے نتیجے میں رفیق اکثر و بیشتر کئی کئی ماہ تک بیروزگار رہتا تھا اور جو کام ملتا، وہ بھی عارضی ہی ہوتا اور عابدہ کو وہ ملازمت کرانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا تنگی ترشی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس مختصر سے گھر میں تنگی ترشی کی ایسی ایک علامت بھی موجود نہیں تھی جو ان دونوں کی لوٹ مار کا جواز پیدا کرتی!

یہ انسانی معاشرے کا ایک افسوس ناک پہلو تھا۔ آسائشوں میں مبتلا لوگ اپنے جسموں پر دوہرے چہرے سجانے کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ پہلا چہرہ ایک امن پسند اور صلح کل بھیڑ کا تھا جو اذیت پہنچنے پر بھی صرف ممیا کر رہ جاتی ہے اور دوسرا چہرہ کسی خونخوار بھیڑیے کا تھا جو کسی بھیڑ کو زندہ رہنے کا حق دینے کو تیار نہیں ہوتا!

ہاشم کے لیے وہ دونوں معزز اور آبرومند تھے، مگر میری نگاہوں میں وہ دونوں ہی آبرو باختہ تھے!

میرا جی چاہا کہ ہاشم کو عابدہ سے بات کرنے سے روک دُوں لیکن ان لوگوں کے باہمی مراسم کو دیکھتے ہوئے لب کشائی کی جُرأت نہ کر سکا۔

"مجھے عابدہ سے ایک کام ہے۔" ہاشم نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ورنہ اس کی نگاہیں مسلسل میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں سُننے بغیر تیار ہوں!" وہ ہنس کر بولی۔

"تمہیں میرے دوست کے ساتھ جا کر کہیں سے ایک فون کرنا ہے اور اس کام کا معقول معاوضہ دیا جائیگا!" ہاشم نے کہا پھر کاغذ کے ایک پرزے پر نام اور فون نمبر لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اسے راس البحر پہنچنے کے لیے کہنا ہے۔"

"معاوضے کی بات کر کے تم نے میرا دل دُکھایا ہے ہاشم!" رفیق افسردہ لہجے میں بولا۔ "ہم دونوں کو تم اپنی خدمت کے لیے تیار پاؤ گے۔"

"عابدہ کو فون پر اداکاری کرنی ہے جس سے مجھے کچھ فائدہ حاصل ہونے کی توقع ہے۔" ہاشم نے اسے دوٹوک بتا دیا۔ "اگر میں اسے معاوضہ دیئے بغیر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش کروں تو یہ میری کم ظرفی ہوگی!"

"پھر ٹھیک ہے۔" رفیق نے مسکرا کر رضامندی کا اظہار کیا۔

"اور یہی نہیں۔" ہاشم نے مزید کہا۔ "آج سے میرا یہ دوست چند روز کے لیے تمہارے پاس رہے گا لیکن یہ تمہیں خورد و نوش کے تمام اخراجات ادا کرے گا کیونکہ میں تمہارے مالی حالات سے واقف ہوں، بصورتِ دیگر شاید بیا بناجیب خرچ بھی تم ہی سے وصول کرتا۔"

تھوڑے سے احتجاج کے بعد وہ ہاشم کا دوسرا مشورہ بھی مان گئے۔ ہاشم نے اپنی کار کی چابی مجھے تھما دی اور میں عابدہ کے پیچھے چل دیا۔ چلتے ہوئے اس نے فر کے کالر والا سیاہ مخملی کوٹ بھی پہن لیا تھا اور اب وہ میرے لیے مکمل طور پر وہی ٹھگ لڑکی بن چکی تھی۔

"کہاں لے جاؤ گے مجھے؟" کار میں بیٹھ کر عابدہ نے دل آویز لہجے میں پہلی بار زبان کھولی۔

"فون بوتھ۔" یہ کہہ کر میں اسے فون پر کی جانے والی گفتگو کے بارے میں تفصیلات سمجھانے لگا۔ اس دوران میں نے کار آگے بڑھا لی تھی۔

ہاشم کے دوست سے عابدہ کا تعلق ثابت ہو جانے کے بعد میں نے اپنا رویّہ محتاط کر لیا تھا تاکہ میری وجہ سے ہاشم کو کسی قسم کی خفّت یا ندامت نہ ہو۔

"سیدھے چلتے رہو۔" عابدہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر اس کا ہاتھ وہیں جم کر رہ گیا۔

گفتگو سے متعلق تفصیلات سمجھا کر میں خاموش ہوگیا پھر جونہی کار قدرے تاریک سڑک پر بڑھی عابدہ اچانک مجھ پر جھک آئی۔

"سیدھی بیٹھو، حادثہ ہو جائے گا۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"تم بہت اچھے انسان ہو۔" وہ احسان مندانہ لہجے میں بولی۔ "تم نے ہاشم کے سامنے اپنی زبان بند رکھ کر مجھے اور توفیق کو بہت بڑی ندامت سے بچا لیا ہے۔"

"اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟"

"گزر اوقات کے لیے یہی کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔ تم جان ہی گئے ہو تو یہ بھی بتا دوں کہ تم اپنے بیس پاؤنڈ وصول کرنا چاہو تو میں اپنا جسم پیش کر کے خوشی محسوس کروں گی۔"

"تم خوبصورت عورت ہو۔" میں نے بائیں ہاتھ سے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ "پہلی ملاقات میں میں نے تمہارا نام پتلی کمر تجویز کیا تھا۔"

"کیا واقعی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"دوسری بار تمہیں دس پاؤنڈ بلاوجہ تو نہیں دیے تھے۔"

"دیکھو، دنیا کتنی مختصر سی ہے۔" وہ کھنکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا آج کا شکار کچھ دیر بعد میرے اور رفیق کے ایک پرانے دوست کے ساتھ ہماری دہلیز پر موجود ہوگا۔"

"مگر تم پر میرا کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ہے۔" میں نے قدرے بھاری آواز میں کہا۔ "میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ تم رفیق کے اعتماد کو دھوکا دو۔"

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑی۔ "دھوکا۔" پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

"ہم دونوں طویل عرصے سے محض اسی لیے ساتھ رہتے چلے آرہے ہیں کہ ہم نے ہر قیمت پر ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی کسی آزادی میں دخل انداز نہیں ہوتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بُرے وقت میں ہم آخرکار ایک دوسرے سے ہی رجوع کریں گے اور تم جانتے ہی ہوگے کہ بڑھاپے سے زیادہ بُرا وقت انسان کی زندگی میں کبھی نہیں آتا۔"

"تمہارا تعلق بڑا عجیب اور ناقابلِ فہم سا ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تمہیں شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ ہم میں رشک اور حسد کا مادّہ بالکل نہیں ہے، اگر وہ میرے ساتھ گھر میں کسی اجنبی مرد کو دیکھ لیتا ہے تو ضروری کام کا عذر کر کے ساری رات کے لیے غائب ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنی کوئی من پسند لڑکی لے آتا ہے تو میں ساری رات کسی سرکاری پارک کے بنچ پر سو کر گزار دیتی ہوں۔"

"بڑی بے مقصد زندگی گزار رہے ہو تم لوگ۔"

"اس میں آسودگی ہے۔" وہ بولی۔ "اگر تم چند روز ہمارے ساتھ رہے تو دیکھنا کہ وہ شاذ و نادر ہی اِدھر کا رُخ کرے گا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔" اندھیرے میں اس کی خوابناک آواز ابھری۔ "اور رفیق میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ میری نگاہوں کو پہچانتا ہے۔"

"یہ اخلاق باختہ مغربی معاشرے میں خوبی قرار پا سکتی ہے، تمہاری زبان سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"جو آج مغرب میں ہو رہا ہے وہ صدیوں پہلے ہماری سرزمین پر ہوتا رہا ہے۔" اس کے وجود میں اونگھتی ہوئی فرعون کی رُوح بھڑک اٹھی اور اس نے میرے زانو سے سر اٹھا لیا۔ "قلوپطرہ اسی سرزمین کی بیٹی تھی۔"

"یہ تم کس ویران راستے پر لیے جا رہی ہو؟" میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا کیونکہ اس کی گفتگو جذباتی اور اخلاقی اشتعال کی طرف مائل تھی جس سے گریز کرنا ضروری تھا۔ "ہم ایک اہم فون کرنے نکلے تھے۔"

"آگے سے داہنی طرف گھما لینا۔"

فون بوتھ تک پہنچنے میں خاصا وقت صرف ہوا پھر میں بھی عابدہ کے ساتھ ہی بوتھ میں داخل ہوگیا۔ نمبر ڈائل کرنے پر دوسری طرف سے غالباً فوراً ہی فون اٹھایا گیا تھا۔

عابدہ نے اپنا کردار اس خوبی سے نبھایا تھا کہ دوسری جانب سے زیادہ سوالات کی نوبت ہی نہ آسکی اور اس نے راس البحر کا نام سنتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

آس پاس سناٹا تھا اور بوتھ میں شیشہ صرف دروازے کے رُخ پر تھا۔ عابدہ ریسیور ہک سے لٹکا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ اس کے جسم کے طواف کو بہکے مگر میں فوراً ہی سنبھل گیا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

"وہ آرہا ہے۔" عابدہ نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ "اب تم کیا کرو گے؟"

"جلدی چلو! انھیں چھوڑ کر ہاشم کو ساتھ لینا ہے۔"

"میرا معاوضہ کہاں ادا کر رہے ہو؟" اس کے تیور خطرناک تھے۔

"وہ معاملہ ہاشم نے نمٹا لیا ہوگا۔" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا اور کار میں گھس گیا۔

ٹیلی فون بوتھ تک پہنچنے میں جتنا وقت صرف ہوا تھا اس کے چھٹے حصے میں ہم گھر واپس پہنچ گئے۔

"کیا رہا؟ کہاں دیر کردی؟" ہمیں دیکھتے ہی ہاشم نے اضطراری طور پر سوال کیا۔

"وہ آرہا ہے۔ بوتھ میں کوئی گھسا ہوا تھا۔" میرے بجائے عابدہ نے پورے اعتماد کے ساتھ ہاشم کے دونوں سوالوں کے جواب دیے۔

"دیکھا، میں نہ کہتا تھا۔" رفیق نے تحسین طلب لہجے میں ہاشم سے کہا۔ "یہاں پبلک بوتھ میں گھسنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ باہر بھی کوئی منتظر ہوگا۔"

وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ اگر میں عابدہ کو زبردستی بوتھ سے باہر نہ لاتا تو وہ خاصا وقت وہیں گزارنے پر آمادہ نظر آرہی تھی۔

"چلو۔" ہاشم ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

ہم دونوں وہاں سے عجلت میں روانہ ہوئے اور چند منٹ کی مسافت کے بعد ہاشم نے اپنی کار شاہراہ سے ملنے والی ایک بغلی گلی کے دہانے پر روک دی۔

"شہر سے راس البحر جانے والی یہ واحد شاہراہ ہے۔" اس نے مجھے باخبر کیا۔ "اور راس البحر یہاں سے کم از کم چھ میل دور ہے۔"

"مگر یہاں روشنی ناکافی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اسے کیسے پہچانو گے؟"

"وہ اکیلا آیا تو سیاہ مرسڈیز میں ہوگا اور محافظوں کو ساتھ لیا تو سیاہ بیوک میں آئے گا، جس پر سرکاری نمبر پلیٹ ہوگی۔" اس نے اپنا وقت برباد نہیں کیا تھا بلکہ پولیس کمشنر کے معمولات کے بارے میں خاصی تفصیلات جمع کرلی تھیں۔

وہاں سنسنی اور اعصابی تناؤ کے عالم میں ہم خاصی دیر انتظار کرتے رہے۔ اس دوران میں ہم نے پہلی سگریٹ ختم کر کے دوسری سگریٹ بھی سلگالی۔ انتظار کے معاملے میں دونوں کا اعصابی ردعمل کم و بیش یکساں ہی تھا۔

دوسری سگریٹ کے خاتمے سے قبل شہر کی سمت سے آنے والی اکادکا گاڑیوں میں تقریباً چوکور ہیڈ لیمپس روشن نظر آئے جن کا درمیانی فاصلہ اور لیمپ کی سڑک سے بلندی کسی بڑی کار کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

ہاشم نے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کرلیا۔ وہ روشن ہیڈ لیمپس سامنے سے گزرے تو معلوم ہوا کہ وہ سیاہ مرسڈیز ہی تھی اور اس میں صرف ایک انسانی ہیولا نظر آرہا تھا جو اسٹیرنگ وھیل کے پیچھے براجمان تھا۔

اس کے آگے بڑھتے ہی ہاشم نے اپنی کار بھی شاہراہ پر ڈال دی۔

"کوئی اسلحہ ہے تمہارے پاس؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"صرف زہریلے تیروں والی زیر استعمال شیشی ہے!"

"اپنی نشست کے نیچے ہاتھ ڈال کر اعشاریہ تین آٹھ کا پستول نکال لو، وہ اکیلا ہے، ہم کہیں بھی اسے روک لیں گے۔"

"راس البحر کیسی جگہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ویران جگہ ہے مگر وہاں اِکا دُکا رہائشی مکانات بنے ہوئے ہیں۔"

"تو کیا راستے میں اس سے بہتر جگہ ملنے کا امکان ہے؟"

"ہاں، بس تم دیکھتے جاؤ۔" وہ صورتحال کے بارے میں بہت زیادہ پُراعتماد نظر آرہا تھا۔

کچھ دُور تک وہ دونوں کاریں اسی ترتیب میں دوڑتی رہیں۔ ہاشم نے اپنی کار کے ہیڈ لیمپس روشن نہیں کیے تھے اور اس ہموار شاہراہ پر سیاہ مرسڈیز کا تعاقب کرتے ہوئے وہ احتیاط کسی دشواری کا سبب بھی نہیں بن رہی تھی۔

پھر جوں ہی آبادی کے آثار ختم ہوئے اور ایک ویرانے کا آغاز ہوا، ہاشم نے یک بیک اپنی کار کی رفتار تیز کردی۔

بغیر روشنیوں والی وہ برق رفتار کار جب ہارن بجاتی ہوئی سیاہ مرسڈیز کے برابر سے گزرنے لگی تو اس کا ڈرائیور بوکھلا گیا۔

ہاشم نے ایکسلریٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ کم کردیا اور سیاہ مرسڈیز کے تقریباً پہلو بہ پہلو دوڑتے ہوئے تیزی سے اسے سڑک سے نیچے اترنے پر مجبور کرنے لگا۔

پھر اچانک ہاشم کی کار کا عقبی حصہ مرسڈیز کے اگلے حصے سے پُرشور آواز کے ساتھ ٹکرایا اسی کے ساتھ مرسڈیز سے ایک فائر ہوا اور گولی عقبی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی گزر گئی۔

دوسرا فائر میں نے کیا، اس بار مرسڈیز کا اگلا ٹائر ہولناک دھماکے سے پھٹ گیا اور وہ لہراتی ہوئی نشیب میں کافی دور تک چلی گئی۔

میں نے مرسڈیز کا ٹائر پھٹتے ہی ہاشم کی کار سے نیچے چھلانگ لگادی۔ چلتی کار سے کودنے کے باعث میرے جسم پر کچھ خراشیں آئیں مگر میں ان کی پروا کیے بغیر کچی ڈھلان پر ڈگمگاتی ہوئی مرسڈیز کے پیچھے دوڑ پڑا۔

اور جب خاصی دُور تک گھسٹنے کے بعد سیاہ مرسڈیز رُکی تو میں اس کے برابر میں موجود تھا۔ اس کا ڈرائیور اگنیشن آف کر کے باہر کودنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کے کھولے ہوئے دروازے میں سے گریبان پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لیا اور وہ گھگھیاتا ہوا منہ کے بل کچی زمین پر آرہا۔ اپنے گرتے ہوئے جسم کو ہتھیلیوں کا سہارا دینے کی کوشش میں اس کے ہاتھ سے ریوالور بھی نکل گیا تھا اور اب وہ میرے مقابلے میں بالکل نہتا تھا۔

شاید منہ کے بل گرنے کے باعث اسے شدید ضربات آئی تھیں کیوں کہ کچھ دُور تک گھسٹنے کے بعد اس کا بدن ساکت ہوگیا تھا۔ میں اس خیال سے آگے بڑھا کہ کہیں وہ نازک مزاج بے ہوش نہ ہوگیا ہو مگر وہ نابکار اپنے سر پر میری آہٹیں سن کر فوراً سنبھل گیا۔

تاروں کی چھاؤں میں میرے لیے اس کی حالت کا صحیح اندازہ لگانا دشوار تھا مگر اپنی دانست میں میں یہ ضرور دیکھ رہا تھا کہ اس کی پیشانی سے خون بہہ کر اس کے پورے چہرے کو داغدار کر رہا تھا اور اس کے قدموں میں بھی قدرے لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔

اسی اثنا میں ہاشم بھی اپنی کار سے اتر کر دوڑتا ہوا وہاں آ پہنچا۔

"اٹھو!" ہاشم اس کے سر پر پہنچ کر غرایا۔

اس وقت وہ چاروں ہاتھ پیروں پر لڑکھڑاتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاشم کی آواز سن کر وہ لپک تیزی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا جیسے تاخیر ہوتے ہی اسے اپنے سینے میں گولی اتر جانے کا خدشہ ہو!

"تم کون ہو؟" اس نے آستین سے اپنی خون آلود پیشانی صاف کرتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا۔

ہاشم نے جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر اس کی جامہ تلاشی لے ڈالی مگر اس کی جیبوں سے کوئی ہتھیار برآمد نہ ہوا۔

"ادھر چلو!" ہاشم نے اسے اپنی کار کی طرف دھکیلتے ہوئے درشت لہجے میں حکم دیا مگر وہ سنبھل کر دو قدم آگے پھر رُک گیا۔

"شاید تمہیں یہ علم نہیں کہ اس وقت تم نے کس پر ہاتھ ڈالا ہے۔" اس نے پُراعتماد اور قدرے غرور آمیز لہجے میں کہا۔

وہ بہرحال ایک اعلیٰ پولیس افسر تھا اور اس نے ابتدائی صدمے سے سنبھلنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔

"معلوم ہے۔ معلوم ہے کہ تم فرعون کے داماد ہو۔" ہاشم نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "اگر اب تم نے رعب جھاڑنے کی کوشش کی تو جوتے مار مار کر تمہارا سر فرش کردوں گا۔"

"تمہیں چند گھنٹوں سے زیادہ مہلت نہیں ملے گی۔" وہ ہاشم کی کار کی طرف بڑھتے ہوئے غصے اور بے بسی کے عالم میں بولا۔ "صبح تم ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنے کسی بدترین حوالات میں نظر آؤ گے۔ سرکاری کام میں رخنہ اندازی کی جسارت تمہیں مہنگی پڑے گی۔"

"سرکاری کام!" ہاشم کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "تمہارے دونوں مسلح محافظ اور سرکاری بیوک کہاں ہے؟ ان تینوں کے بغیر تو باہر نکلتے تمہیں شرم آتی ہے پولیس کمشنر صاحب! یہ بتاؤ کہ اس وقت چوروں کی طرح کدھر جا رہے تھے؟"

"میرا کام بہت اہم ہے، مجھے جانے دو۔" وہ تاریک اور ناہموار راستے پر چلتے چلتے رک گیا۔ "میرے لئے ...."

"میں تم سے اور تمہارے کام سے خوب واقف ہوں۔" ہاشم نے اسے چٹکلا۔ پولیس کمشنر کے ساتھ اس کا رویہ نہایت تحقیر آمیز تھا۔

لحظہ بھر کے لیے اس کے لہجے میں تحیر اُمڈ آیا۔ "کہیں وہ تمہارا ہی ساتھی تو نہیں تھا؟"

"درست سمجھے!" میں قہقہہ مار کر بولا۔ "بہتر یہی ہے کہ جو کہا جا رہا ہے، سعادت مندی سے اس پر عمل کرو۔"

"سالومن کہاں ہے؟" اپنے سر پر منڈلاتا ہوا سنگین خطرہ محسوس کر کے اس پر خوف طاری ہونے لگا۔

"عالم بالا میں۔" ہاشم نے کہا۔ "اور اگر تمہاری جرح یونہی جاری رہی تو تمہیں بھی اسی کے پاس بھیج دیا جائیگا۔"

"او میرے خدا!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کراہا۔ "آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اب میرے لیے ناقابل تصور دشواریاں پیدا ہوجائیں گی۔"

"آگے بڑھو!" میں نے اس کا بازو سختی سے تھام کر کہا اور وہ مضمحل انداز میں میرے ساتھ ہاشم کی کار کی طرف بڑھنے لگا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" کار کا انجن اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے فکر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہمیں اپنے مطلوبہ جوابات مل گئے تو راستے میں ہی اتار دیں گے ورنہ تمہاری سالومن سے ہی ملاقات ہوگی۔"

"مجھے صرف ایک بات بتا دو۔" اس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا، پھر ہم دونوں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر دوبارہ بولا۔ "تم فلسطینی تو نہیں ہو؟"

اس بار ہاشم سے پہلے میں بول پڑا۔ "فکر نہ کرو، دو چار روز میں وہ بھی تم سے ٹکرائیں گے اور شاید ان کا رویہ ہم سے بہت مختلف ہوگا۔"

"پھر تم کون ہو؟"

"اس لڑکی کے قریبی رشتے دار جو رجب کے فارم پر سالومن کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تو تم سیتا سے بھی واقف ہوگے؟"

"اسے تو تم مار ہی چکے ہو۔" ہاشم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ مجھ سے اوپر والوں کی حرکت تھی۔"

"کان کھول کر سنو کہ ہم اس لڑکی کے قاتل کو جہنم رسید کر چکے ہیں مگر ہر اس شخص کو بھی اس المناک واقعہ میں برابر کا شریک سمجھتے ہیں جس نے سالومن کو مصر کی سرزمین پر اپنی من مانی کرنے کی اجازت دی تھی...."

"بیئر سالومن کو جاننے والے عام آدمی نہیں ہوسکتے۔" وہ ہاشم کی بات کاٹ کر تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ "تم لوگ مجھ سے یقیناً کوئی بات چھپا رہے ہو، کوئی ایسی بات جو بنیادی اہمیت کی حامل ہے؟"

"تمہارا محکمہ بہت بڑا ہے، ہمارے بارے میں تحقیقات بعد میں کرالینا" ہاشم کا لہجہ تلخ تھا۔ "فی الحال یہ بتاؤ کہ سالومن تمہارے محکمے کے لیے کیسے کام کر رہا تھا؟"

"میرے محکمے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"بکواس مت کرو!" ہاشم غرایا۔ "اسے کئی بار تمہارے دفتر میں آتے جاتے دیکھا گیا تھا اور وہ تمہارے ہی محکمے کی ایک اقامت گاہ میں رہ رہا تھا!"

"وہ براہِ راست کسی اور کو جواب دہ تھا۔ اسی کی ہدایت پر مجھے سالومن کو رہائش گاہ فراہم کرنی پڑی اور سالومن کی میرے پاس آمد کا سبب صرف یہ تھا کہ رجب کے باغ کا محاصرہ میرے آدمیوں نے کیا ہوا تھا لہٰذا سالومن کو ان کی دخل اندازی سے محفوظ رکھنے کے لیے مجھے اس کو اعلیٰ ترین اختیارات کے ساتھ ایک شناخت نامہ جاری کرنا پڑا۔ پورے محکمے میں میرے علاوہ کوئی اس سے واقف نہیں تھا!"

"وہ شناخت نامہ تم نے کس کے ایما پر جاری کیا؟"

"ملٹری سیکرٹ سروس کا چیف!"

"جنرل احمد فواد؟"

"ہاں، اس نے ذاتی طور پر مجھے حکم دیا تھا۔"

"مگر تم اس کا حکم ماننے پر مجبور تو نہیں تھے!"

"قانون کے حوالے سے تمہاری بات درست ہے مگر عملاً جنرل کے حکم سے سرتابی کرنا میرے لیے ملازمت بلکہ شاید جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہوتا!"

"اگر تم صرف اسی حد تک ملوث تھے تو سالومن کی موت کی خبر سن کر تم نے کن ناقابلِ تصور دشواریوں کا ذکر کیا تھا؟"

"سالومن کا ذاتی تحفظ بھی میری ذمہ داری میں شامل تھا!"

"اپنے ماتحتوں میں سے چند کو اعتماد میں لیے بغیر تم اس کا تحفظ کیسے کر سکتے تھے؟" ہاشم نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"کسی کو اعتماد میں نہیں لیا اسی لیے تو سالومن تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔"

"سیتا کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟" قدرے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "اس بارے میں تو جب ہی کچھ بتا سکتا ہے مگر اس نے سختی سے زبان بند کر رکھی ہے۔"

"سالومن کی مصر میں موجودگی کے بارے میں تمہاری نجی رائے کیا ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ سیتا قاہرہ میں ہمارے لیے ایک شرمناک چیلنج بن گئی تھی اور ہم اپنے بہترین وسائل بروئے کار لا کر بھی اسے زیر نہیں کر سکے تھے، مگر اس معاملے میں اسرائیل جیسے دشمن ملک کا تعاون حاصل کرنا مزید شرمناک تھا۔"

"تو کیا جنرل احمد کو اتنے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ اس معاملے میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کا مجاز ہوتا؟"

"ہرگز نہیں!" وہ بولا۔ "اگر کوئی دوست ملک ہوتا تو شاید میں مان لیتا لیکن اسرائیل سے رجوع کرنے میں ہمارا قومی وقار داؤ پر لگ گیا... یہ قدم تو صدر کی منشا کے بغیر ہرگز نہ اٹھایا گیا ہوگا۔ میں نے سالومن کے معاملے پر اتنی مغز زنی نہیں کی تھی لیکن تمہارے کریدنے سے مجھے احساس ہوا ہے کہ اس کی یہاں موجودگی ایک بہت بڑا واقعہ تھی!"

"شاید تم ہماری ہمدردیاں جیتنے کے لیے یہ سب کہہ رہے ہو ورنہ مصری حمیت کے نیلام میں تم بھی برابر کے شریک تھے۔" ہاشم نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے برابر کا شریک نہ کہو۔" اس نے احتجاج کیا۔ "سالومن کو یہاں طلب کرنے میں میری مرضی یا کوششوں کا کوئی دخل نہیں تھا، اگر میں اسے شناخت نامہ جاری کرنے سے انکار کر بھی دیتا تو مجھے معطل کر کے کسی قید خانے میں سڑا دیا جاتا اور وہ میری جگہ اپنی پسند کا آدمی لے آتے جو سب کچھ کر گزرتا۔"

اس کا پیش کیا ہوا جواز معقول تھا اور اب تک کی اپنی گفتگو سے وہ خود کو معقول ثابت کرتا چلا آیا تھا۔

"اب اگر تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے تو تمہارا رویّہ کیا ہوگا؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد ہاشم نے سوال کیا۔

"لڑکی کے فون سے اب تک کے واقعات کو بالکل بھول جاؤں گا۔"

"اور سالومن کی گمشدگی؟"

"اس کی لاش برآمد ہونے تک میں بھی اس کی روپوشی پر زور و شور سے اپنی تشویش کا اظہار کرتا رہوں گا۔ دیکھا جائے تو اس کی موت سے مجھے سرخروئی حاصل ہوگی!"

"سرخروئی کا خیال کیسے آ گیا؟"

"دیکھا جائے تو سیتا کے مقابلے میں سالومن کو سورما سمجھ کر بلایا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں میرے محکمے کو نااہل سمجھا گیا تھا۔ سالومن کی لاش ان لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہوگی کہ سیتا کوئی آسان شکار نہیں تھی۔ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ سالومن سیتا کے جوابی وار کا شکار بنا ہوگا۔"

"اور تم اسی نظریے کو ہوا دو گے!"

"میں عہد کرتا ہوں۔"

ہاشم نے ایک ویران اور تاریک مقام پر کار روک دی۔

"تم مجھے بہت دور لے آئے ہو۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے اپنی کار کے پاس ہی اتار دو تو بہتر ہوگا۔ میرے گھریلو عملے اور دربان نے مجھے اسی مرسڈیز میں گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ اگر صبح وہ کار ویرانے میں سے ملی تو میری حیثیت مشکوک ہو جائے گی اور میں اس بارے میں

کوئی تاویل پیش نہ کر سکوں گا۔"

ہاشم نے اس سے بحث کیے بغیر اپنی کار واپس گھما لی۔

واپسی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ شاید پولیس کمشنر بھی گلو خلاصی کے بعد زبان پر قابو رکھنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اسے یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ کہیں اس کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی غلط بات اسے دوبارہ دشواریوں میں نہ ڈال دے۔

ہم وہاں پہنچے تو سیاہ مرسڈیز بدستور سڑک سے نیچے نشیب میں کھڑی ہوئی تھی!

کار رکتے ہی پولیس کمشنر شکریہ ادا کر کے نیچے اتر گیا اور ہاشم نے کار کی تمام روشنیاں گل کر کے اسے تیزی سے آگے بڑھا دیا!

"ہیڈ لیمپس روشن کر دو!" میں نے چند ثانیوں کے انتظار کے بعد اسے یاد دلایا۔

"میں نے دانستہ روشنیاں گل کی تھیں۔" وہ سیلف آن کرتے ہوئے بولا۔ "تاکہ وہ کار کا نمبر نہ دیکھ سکے۔"

"وہ کار کا میک، ماڈل اور رنگ تو دیکھ ہی چکا ہے، پھر سب سے بڑھ کر ہمیں اچھی طرح پہچان چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہم سے بدعہدی نہیں کرے گا۔"

"تم نے فلسطینی ہونے سے کیوں انکار کیا؟"

"تو کیا میں فلسطینی ہوں؟" میرے اس سوال پر وہ ہنس پڑا۔ اور میں نے بات جاری رکھی۔ "میں نے دخل دے کر تمہیں جھوٹ بولنے سے بچایا، وہ فلسطینیوں سے بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا، شاید بوکھلاہٹ میں ایسی حماقتیں کر گزرتا کہ اسے ختم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ زندہ رہ کر شاید وہ تمہارے کام آ سکے گا!"

"ہر بزدل اور ضمیر فروش عرب فلسطینی تنظیموں سے خائف رہتا ہے۔" اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"تمہیں رفیق کے مکان پر چھوڑ دوں گا۔"

"جنرل احمد فواد کو معاف کر دیا؟"

"اس تک رسائی اتنی آسان نہیں ہے، بہت چالاک اور مکار جنرل ہے۔ صرف اس کا نام سامنے آ جانا کافی ہے۔ البتہ کارروائی اوپر سے ہدایات ملنے کے بعد کی جائے گی۔"

"ہاں، ایک بات تو بتاؤ۔" قدرے توقف کے بعد میں نے اچانک سوال کیا۔ "تم نے مجھ سے عابدہ کو رفیق کی بیوی کے طور پر کیوں متعارف کرایا تھا؟"

"مروّت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" وہ دھیمے سے ہنس کر بولا۔ "اگر میں اس کے منہ پر اسے رفیق کی محبوبہ یا داشتہ کہتا تو اسے یقیناً صدمہ ہوتا۔"

"بڑے با مروّت ہو!" میں نے ہنس کر کہا۔ "رفیق سے کب سے دوستی ہے؟"

"ہم اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے، آخر تم اس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟" اس نے یک بیک ایک چبھتا ہوا سوال کر ڈالا۔

"یہ میری سلامتی کا معاملہ ہے۔" میں نے اپنے دل کا چور چھپاتے ہوئے دیدہ دلیری سے کہا۔ "رفیق مالی مشکلات کا شکار ہے، اگر وہ میری طرف سے مشکوک ہو گیا تو خطیر سرکاری انعام کے لالچ میں مجھے مروا بھی سکتا ہے۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس کو کس حد تک جانتے ہو اور وہ کہاں تک قابلِ اعتماد ثابت ہوگا۔"

"اس کی طرف سے تم بے فکر رہو، تمہاری سلامتی کی زیادہ فکر مجھے لاحق ہے۔" اس نے بُرا مانے بغیر خوش دلی سے بات ختم کر دی۔

ہم واپس رفیق کے مکان پر پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے مگر پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ شاید وہ دونوں ہماری واپسی کے منتظر تھے۔ دروازہ کھولنے والا رفیق تھا۔

"میرا دوست اب تمہارا مہمان ہے، میں جا رہا ہوں۔" ہاشم نے اپنی کار سے اترے بغیر رفیق سے کہا۔

"تھوڑی دیر بیٹھو گے نہیں؟" رفیق کا لہجہ رسمی سا تھا۔

"نہیں میں عجلت میں ہوں۔"

"پھر ذرا مجھے اسٹور پر اتار دینا، کچھ سامان لینا ہے۔" رفیق یہ کہہ کر بلا تکلف ہاشم کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے سر نکال کر مجھ سے بولا۔ "تم اندر چلے جاؤ، شاید وہ کچن میں ہوگی۔"

کار آگے بڑھ گئی اور میں رفیق کے مکان میں داخل ہو گیا۔

میری دانست میں نئے کھیل کا آغاز ہو چکا تھا!

عابدہ نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ رفیق کے ساتھ ایک ان کہے سمجھوتے کے تحت رہ رہی تھی جس کی رو سے دونوں کو ہر قسم کی انفرادی آزادی حاصل تھی۔ عابدہ کی نگاہوں میں میرے لیے پسندیدگی جھلکتی دیکھ کر رفیق از خود راہ سے ہٹ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے سامان کی خریداری کا بہانہ کیا تھا ورنہ وہ عابدہ کے مطالبے کے بغیر اسے چھوٹ دینے کی نیت سے ہاشم کے ساتھ گیا تھا!

میں اندر پہنچا تو عابدہ نہایت آرام سے ایک کرسی میں دراز کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی!

اس وقت اس کے بدن پر شب خوابی کا لباس موجود تھا جس نے اس کے بے مہار حسن کو اور فتنہ انگیز بنا دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے شانوں پر بکھری ہوئی سیاہ ریشمی زلفوں نے پوری کر دی تھی!

مجھے یکایک اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی محسوس ہوئی۔

"بہت جلدی لوٹ آئے۔" وہ رسالہ تپائی پر ڈال کر مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ "تمہارا دوست ہاشم کہاں رہ گیا؟"

"وہ چلا گیا!" میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا کام توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔"

"بیٹھ جاؤ۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "ٹھنڈا پانی لاؤں؟ شاید تمہارے گلے

میں خراش آگئی ہے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "رفیق اتنی رات گئے کس چیز کی خریداری کرنے گیا ہے؟"

"ہم دونوں کی غیر موجودگی میں ہاشم نے اسے تمہارے مشاغل سے آگاہ کر دیا تھا۔" وہ میری الجھن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ "سنا ہے کہ تمہیں شراب پی کر گہری نیند آتی ہے، ورنہ رات بھر پہلو بدلتے رہتے ہو۔"

"مہمانوں کا بڑا خیال رکھتا ہے!"

"چاہو تو اس الماری سے رفیق کے کپڑے لے لو۔" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

اس کا مشورہ مناسب تھا۔ میں نے الماری میں سے شب خوابی کا ایک دھلا ہوا مردانہ لباس نکالا اور باہر غسل خانے میں جانے کے بجائے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہیں لباس تبدیل کر لیا۔

چند ثانیوں بعد عابدہ خشک میوے لے آئی پھر رفیق بھی واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا موجود تھا جس میں سے بلیک ڈاگ کی دو بوتلیں برآمد ہوئیں۔

"ہاشم بہت ضدی ہے۔" رفیق ہنستے ہوئے بولا۔ "میرے اصرار کے باوجود وہ مجھے واپس چھوڑے بغیر نہ مانا۔"

"یہ دو بوتلیں کس کے لیے لائے ہو؟"

"ایک آدھ راؤنڈ میں تو ہم دونوں بھی تمہارا ساتھ دیں گے، کیوں عابدہ؟"

اس نے ہنس کر کہا۔ "اس کے بعد تم جانو اور تمہارا کام!"

"میری عادتیں اتنی خراب نہ کرو کہ میں تمہارے گھر سے نکلنے سے انکار کر دوں۔"

"فکر نہ کرو، دوستوں کے لیے ہمارا دل بہت بڑا ہے!"

رفیق کی گفتگو بہت سلجھی ہوئی تھی۔ اگر عابدہ نے اس کے بارے میں زبان نہ کھولی ہوتی تو میں یقیناً اس کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو جاتا مگر میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال کچوکے لگا رہا تھا کہ مے نوشی کے کسی نازک مرحلے پر وہ اپنی محبوبہ کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود کہیں غائب ہو جائیگا۔

مگر ایسا نہ ہو سکا!

ہم تینوں نے دو پیگ وہیں بیٹھے بیٹھے خالی کیے پھر رفیق کھلی ہوئی بوتل لے کر دوسرے کمرے کی طرف چل دیا، مجھے بھی اس نے ساتھ ہی لے لیا تھا۔ دوسرا کمرہ میرے سونے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ وہاں عابدہ ہمارے ساتھ نہیں آئی اور میں اس کے انتظار میں یکے بعد دیگرے پیمانے خالی کرتا رہا۔

تین بجے تک ہم دونوں بیٹھے شراب نوشی کرتے رہے۔

شاید وہ میرے سونے کا منتظر تھا اور میں اس لمحے کی آس لگائے بیٹھا تھا جب وہ پُرامن بقائے باہمی کے نام پر اس چھت کے نیچے سے رخصت ہوتا۔

"تم سو کیوں نہیں جاتے میرے دوست؟" آخر کار رفیق نے بُری طرح جھومتے ہوئے مجھ سے وہ نازک سوال کر ہی ڈالا۔

"تم کہو تو ابھی سو جاتا ہوں!" میں نے اس کے گھٹتے بڑھتے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے اس کے تاثرات پڑھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سو جاؤ۔ بہتر یہی ہے کہ سو جاؤ۔" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "تاکہ میں بھی سکون سے سو سکوں!"

اچانک میرے ذہن میں اشتعال کے انگارے چٹخنے لگے!

عابدہ نے دو بار مجھے اپنی پتلی کمر کے ادھورے لمس کی آڑ میں بے وقوف بنایا تھا اور اب مہمان بنانے کے بعد بھی عجیب سی امید دلا کر رفیق کے کہنے پر میرے صبر کا پیمانہ آزما رہی تھی۔ وہ اوّل درجے کی مکار عورت معلوم ہوتی تھی۔

"کیا تمہاری بیوی سو گئی؟" میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے سوال کر ہی ڈالا۔

"اس سے تمہارا کیا مطلب؟" وہ میرے سوال پر غیر متوقع طور پر اکھڑ گیا۔ "تم بہت گھٹیا آدمی معلوم ہوتے ہو!"

میں بھی تھوڑی سی جھونک میں تھا۔ اپنے ردِعمل پر قابو نہ رکھ سکا اور تلخ لہجے میں بولا۔ "ان سے پھر بھی بہتر ہوں جو محبوبہ کو چارہ بنا کر اجنبیوں کو ٹھگتے ہیں!"

اس نے بے اختیار ہاتھ گھما دیا۔

بسیار نوشی کے باعث اس کی بصارت ڈگمگائی ہوئی تھی لہٰذا اس کا ہاتھ پوری قوت سے ہوا میں لہرا کر چھوٹی تپائی سے ٹکرایا اور وہ خود تپائی سمیت فرش پر ڈھلک گیا تھا۔

بلیک ڈاگ کی خالی بوتل فرش پر گر کر ٹوٹ گئی، دوسری بوتل اگر میں پھرتی سے نہ اٹھالیتا تو اس کا حشر بھی مختلف نہ ہوتا!

"اسے کیا ہوا؟" اچانک دروازے پر عابدہ کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی، میں نے سر گھمایا تو وہ بال بے ترتیبی سے اپنے شانوں پر بکھرائے، شب خوابی کے لبادے میں ملبوس میرے سامنے موجود تھی۔

اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں رچی ہوئی نیند کی سرخی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سوتے سوتے اٹھ کر وہاں آئی تھی۔

غالباً شراب کی خالی بوتل کے ٹوٹنے کی آواز نے اس کی نیند خراب کر دی تھی۔

"شراب پی کر اس کی غیرت جاگ اٹھی تھی۔" میں نے ایک نظر عابدہ کا جائزہ لینے کے بعد لاپروایانہ لہجے میں کہا۔

"کیا تم نے مارا ہے اسے؟" اس کا لہجہ غصیلا تھا اور وہ چوکھٹ سے اندر بڑھ آئی تھی۔ رفیق جس حالت میں فرش پر گرا تھا، بدستور اسی حالت میں پڑا ہوا تھا!

"قسم لے لو جو ہاتھ بھی لگایا ہو!"

"ارے! یہ تو بے ہوش ہے!" وہ اس کے قریب بیٹھ کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ہوگا!" میرا لہجہ لاتعلقانہ ہی رہا۔ "اپنی مرضی کا مالک ہے، جب جاگے گا

ہوش میں بھی آجائیگا۔"

"بیٹھے منہ کیا دیکھ رہے ہو، مدد کرو نا میری!" وہ دانت پیس کر جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکراتے ہوئے اٹھا اور رفیق کے بدن کو مسہری پر ڈال دیا۔

"یہ کتنی دیر میں ہوش میں آئیگا؟" عابدہ نے غصے اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ سوال اسی سے کرتیں تو بہتر تھا۔" میں نے کہا۔ اسے سامنے پا کر میرا ذہن سرور کے عالم میں ہلکورے لینے لگا تھا!

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے بھیجے میں بھی بہکی ہوئی ہے۔" وہ تنک کر بولی۔ "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اسے کیا ہوا ہے؟"

"تمہارے بارے میں باتیں کرتے کرتے جذباتی ہو گیا تھا۔ تپائی پر مکا مارا اور کسی فلمی ہیرو کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔"

"ضرور تم نے کچھ بکواس کی ہوگی۔"

"میں نے صرف اتنا کہہ دیا تھا کہ تمہاری بیوی بھلی عورت ہے!"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟" مجھے خاموشی سے سگریٹ سلگانے میں مصروف پا کر وہ ایک مرتبہ پھر تاؤ کھا گئی۔

"وہ صاف مکر گیا۔ کہنے لگا کہ عابدہ میری بیوی نہیں بلکہ محبوبہ ہے اور اسکی وجہ صرف اتنی ہے کہ میرا پیدائشی برج حوت ہے اور عابدہ کا سنبلہ۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"اس نے کہیں پڑھ لیا تھا کہ برج حوت والے مردوں کی شادیاں سنبلہ برج والی عورتوں سے بُری طرح ناکام ہوتی ہیں۔" اسے مسلسل بولتے رکھنے کے لیے میں بات بڑھائے جا رہا تھا کیونکہ غصے میں بات کرتے ہوئے اس کا حسن اور بڑھ جاتا تھا۔

"تم جھوٹے ہو۔"

"اور شاید رفیق کی بے ہوشی خواب ہے۔" میں نے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ "کاش عابدہ کا برج سرطان یا عقرب ہوتا! حسرت زدہ انداز میں یہ کہتے ہوئے اس نے زور سے میز پر مکا مارا اور میز سمیت فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"مجھے زچ نہ کرو، سچ سچ بتاؤ۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

اضمحلال نے اس کے چہرے کا تمام حسن نگل لیا اور میں بوکھلا گیا۔ "یقین مانو یہی بات تھی۔ شراب میں نے بھی پی ہے مگر مجھے حواس پر مکمل اختیار ہے۔"

"میں ابھی سارے رسالوں کو آگ لگاؤں گی۔" قدرے توقف کے بعد وہ پھر غصے میں آگئی۔ "وہ نجوم اور دست شناسی وغیرہ جیسے مضامین بڑے انہماک سے پڑھتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کا یہ خبط اتنا بڑھ گیا ہے!"

میں سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ سب عملی زندگی سے فرار کی باتیں ہیں۔ ان باتوں میں وزن ہوتا تو آج ساری شادیاں ان ہی ڈھکوسلوں کے ذریعے ہوتیں اور مثالی حد تک کامیاب رہتیں!"

"مجھے آج تک علم نہیں تھا۔" اسے میری باتوں پر یقین آچلا تھا۔ "وہ شراب کا عادی نہیں ہے۔ اسی لیے نشے کی جھونک میں تمہارے سامنے یہ باتیں اگل بیٹھا۔ صبح میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گی۔"

"اگر وہ نشے کا اتنا ہی کچا ہے تو میری بتائی ہوئی باتیں اس کے سامنے نہ دہرانا، بلاوجہ اسے خفت ہوگی۔"

"مگر میں اس کے ذہن سے توہم پرستی کا بھوت اتارنا چاہتی ہوں۔" اس کا انداز سو فیصد مصالحانہ ہو گیا اور وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔

"تم فکر نہ کرو، شاید میں اسے تمہارے ساتھ شادی پر آمادہ کر لوں!" میں نے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔

"میں اپنی موجودہ زندگی سے خوش ہوں۔" وہ چڑ کر بولی۔ "میرے اور اس کے درمیان جو تعلق برقرار ہے، وہ بھی بالکل درست ہے۔ میں شادی ابھی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر یہ کیا خرافات ہے کہ وہ محض نجوم اور جوتش جیسے بے بنیاد گورکھ دھندوں کی وجہ سے شادی سے گریز کر رہا ہے؟"

"اسے سمجھانے کے لیے میں کافی ہوں، تم اس سے بات نہ کرنا۔" میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "نشے میں سرزد ہونے والی حماقتوں کا تذکرہ آدمی کو بعد میں ضرورت سے زیادہ شرمندہ کرتا ہے۔"

"وہ حساس بھی ہے۔" عابدہ قدرے اداس ہو گئی۔ "ایسا نہ ہو کہ میری لعن طعن کا بُرا مان کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جائے۔"

"تم نے تو اس کے بارے میں کچھ اور ہی کہا تھا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں ایک نکتہ فراموش کر گئی تھی۔" وہ دھیمے سے مسکرا دی۔

"وہ کیا؟"

"ہاشم اس کا بچپن کا دوست ہے اور اسے عزت دار آدمی سمجھتا ہے اور تم اسی کے ساتھ یہاں آئے ہو لہٰذا رفیق تمہارے سامنے ہر قیمت پر اپنی آبرو کا بھرم رکھنے کی کوشش کرے گا۔" وہ میری طرف جھک کر بولی۔ "چاہو تو ....!"

"بالکل نہیں۔" میں نے جلدی سے اسکی بات کاٹ دی۔ "تم مجھے بہت پسند آئی ہو، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس شخص کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں جس کی چھت کے نیچے میں نے پناہ لی ہوئی ہے۔"

"محسن پرست ہو!" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خفت آمیز انداز میں مسکرا کر بولی۔

"اسی کے ساتھ حسن پرست بھی ہوں مگر اپنی حدود میں!"

وہ کافی دیر وہاں بیٹھی گیلے تولیے سے اس کے چہرے اور پیشانی پر ہلکا سا مساج کرتی رہی اور آخر کار رفیق نے کسلمندانہ انداز میں آنکھیں کھول دیں۔

وہ عابدہ کی طرف دیکھ کر نہایت والہانہ انداز میں مسکرایا تھا اور پھر

جب اس کی نگاہیں میرے چہرے پر پڑیں تو اس کے بشرے پر معصومیت پھیل گئی!

"شاید میں نے تمہارا سارا لطف غارت کر دیا۔" وہ کہنیوں کے بل بستر سے اٹھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"تھوڑی دیر لیٹے رہو۔" عابدہ نے سختی سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اب لٹ ہرن ہو گیا۔" وہ ہنستے ہوئے سیدھا ہو گیا پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "میں نے تمہیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا تھا؟" اس کا لب و لہجہ اس وقت بھی لڑکھڑاہٹ آمیز تھا کیونکہ وہ بنتِ عنب کے سحر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا تھا۔

"یہ بہت ہی پتا مسئلہ ہے، کچھ اور بات کرو۔"

"بہرحال!" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "میں شرمندہ ہوں، شراب کے معاملے میں میری قوتِ برداشت بالکل ناکارہ ہے۔"

"میرا خیال ہے تم اب جاکر آرام کرو۔ عابدہ نیند سے اٹھ کر آئی ہے!" میں نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا۔

وہ مزید کچھ دیر رک کر وہاں اپنی خفت کا ازالہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن عابدہ اسے وہاں سے اٹھا لے گئی اور میں نے اپنا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اگلی صبح میں بیدار ہوا تو میرا ذہن بالکل صاف تھا!

رفیق کہیں جا چکا تھا اور عابدہ میرے بیدار ہونے کی منتظر تھی۔

خستہ خمیری نان، نمکین پنیر اور قہوے پر مشتمل ناشتہ بہت اشتہا انگیز تھا اور عابدہ رفیق کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے مقابل ایک چیلنج ہی بیٹھی تھی۔

"رفیق صبح سویرے کہاں چلا گیا؟" میں نے سکوت کو توڑنے کی نیت سے سوال کیا۔

"یہ سویرا ہے؟" وہ کھنکتی ہوئی آواز میں ہنسی۔ "اس وقت ساڑھے دس بجے ہیں!"

بے اختیار میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی جو عابدہ کے بیان کی تائید کر رہی تھی!

"اسے کوئی بلانے آیا تھا!"

"ہاشم کا کوئی ساتھی تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں، میرے ساتھ ہی وہ رفیق کے لیے بھی اجنبی تھا!" وہ بولی۔ "اس کی آمد میرے لیے بھی غیر متوقع تھی!"

"ناشتے کے بعد کیا پروگرام ہے؟"

"جو مزاجِ دوست میں آئے!" وہ دلربایانہ انداز میں مسکرا اٹھی۔

"تمہارے معاملے میں میرا مزاج جاڑے کا شکار ہو چکا ہے، بہتر ہوگا کہ تم باہر جاکر میرے لیے اخبار لے آؤ۔"

"مجھے اخبارات سے چڑ ہے، تم خود کیوں نہیں لے آتے؟"

"جب تم میرے لیے تھیٹر کے ٹکٹ خرید سکتی ہو تو اخبارات لے آنے میں کیا مضائقہ ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے بیس پاؤنڈ واپس کرنے کو تیار ہوں۔" وہ تنک کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے مگر میں اس بار بڑھ سے دستبردار ہو چکا ہوں۔"

اس نے پھرتی سے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر پرس نکال لیا۔ "ہونہہ! ادا کروں گی میں ـــ یہ لو اپنے بیس پاؤنڈ!"

"اسے رکھ لو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مذاق میں بُرا نہیں مانا جاتا!"

"یہ اب پتہ چلا کہ تم مذاق بھی کر لیتے ہو۔" اس کا موڈ بدستور بگڑا ہوا تھا۔ "پیسے واپس لے لو ورنہ تمہاری زبان پر ان ہی کا ورد رہے گا۔"

"یہ نوٹ واپس رکھ لو، تمہارے پاس ان کا مقام بلند ہے، یہ وہاں خوش رہیں گے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر بے بسی سے مجھے گھورا اور نوٹ پرس میں ڈال کر اسے دوبارہ بلاؤز میں اڑس لیا۔

ناشتے کے بعد عابدہ باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی میں بمشکل نصف گھنٹہ صرف ہوا سو وہ لوٹی تو اس کے ہاتھوں میں کئی اخبارات کے علاوہ میرے لیے سگریٹ وغیرہ بھی موجود تھیں۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اخبارات کے مطالعے میں مصروف ہو گیا اور وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ان تینوں اخبارات میں کہیں بھی قاہرہ کے پولیس کمشنر کے بارے میں کوئی ایسی خبر نہیں تھی جس میں پچھلی رات کے واقعے کا شائبہ بھی ہوتا۔ البتہ مضافاتی فارم پر پیش آنے والے خونریز واقعات کی بازگشت خبروں میں نمایاں تھی!

اخبارات کو سرکاری ذرائع سے اس واقعے کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کی گئی تھیں ان کا محور یہی تھا کہ سیتا اس مقابلے میں ہلاک کر دی گئی تھی اور اس مفروضے کی بنیاد پر اخبارات میں سیتا کے ماضی کے بارے میں افسانوی واقعات شائع کیے گئے تھے۔

اگر ایک روز قبل میں نے سیتا کے بارے میں وہ اخباری حاشیہ آرائیاں پڑھی ہوتیں تو نہایت دل گرفتہ ہو جاتا مگر میں سالومن کی زبانی وہ اعتراف سن چکا تھا جس کی رو سے مضافاتی فارم میں سیتا تو کجا اس کا سایہ بھی اس صیہونی درندے کی زد میں نہ آسکا تھا!

ایک روز کے فرق سے میرے لیے سیتا زندہ ہو چکی تھی اور اس کا شکار پر نکلا ہوا پیٹر سالومن اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہو چکا تھا۔ پیٹر سالومن کو مصر میں خفیہ طور پر درآمد کیا گیا تھا لہٰذا اخبارات میں اس کے نام کی اشاعت کی توقع ہی بے سود تھی۔ مگر کسی بھی سطر سے یہ نہ ہو سکا کہ موت کی سنسناتی ہوئی وادیوں میں اس کی راز دارانہ روانگی کی اطلاع اس کے مصری خیر خواہوں کو ملی تھی یا نہیں؟

میں اخبارات کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ اندرونی صفحات پر مریم کے قتل کے بارے میں خبر نظر آئی۔ خبر کے ساتھ ہی اس کی کئی تصاویر بھی چھپی ہوئی تھیں۔

وہ آزاد خیال، لالچی لڑکی اپنے ہی ادھیڑ عمر پارلیمنٹ دوست کے ہاتھوں ماری گئی تھی جس کو ملنے والی خطیر رقم کی امید میں اس نے اپنے جوان شب و روز بڑھاپے کی دہلیز پر گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس قتل کا سبب وہی تھا جو مرد اور عورت کی ازلی مثلث میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔

بوڑھے عاشق کو شبہ ہو گیا تھا کہ اس کا کوئی جوان رقیب اس کی لت اور مریم کے خوبرو پیکر کے حصول کی بازی میں اسے مات دینے پر تلا ہوا ہے اور جب مریم اپنی بے وقت غیر حاضری کے بارے میں کوئی معقول جواز نہ پیش کر سکی تو بوڑھے کے ریوالور سے نکلی ہوئی دو گولیوں نے مریم کے سانسوں کی لڑی کو توڑ دیا۔

اس معاملے میں قاہرہ کی پولیس خاصی مستعد ثابت ہوئی تھی۔ مریم کے پرس سے برآمد ہونے والی ایک پرچی کے سہارے اسے ہوٹل القاہرہ کے اس کمرے کا سراغ مل گیا جہاں مریم کسی پُراسرار نوجوان کے ساتھ اندھیروں کا جشن مناتی رہی تھی۔ وہ کمرہ بدستور مرنے والی کے نام پر محفوظ تھا مگر اس کا جواں سال محبوب خطرہ بھانپ کر پہلے ہی غائب ہو چکا تھا اور پولیس اپنے پورے وسائل کے ساتھ اس کا سراغ لگانے کے لیے کوشاں تھی۔

وہ تفصیل پڑھ کر میں خوف سے جھرجھری لے کر رہ گیا!

مریم کے معاملے میں مقدر نے میری زبردست یاوری کی تھی۔ اگر میں پچھلی شام اکتا کر ہوٹل سے تنہا باہر نہ نکلا ہوتا تو شاید ساری کہانی کا رخ ہی کچھ اور ہوتا!

پچھلی شام تنہائی کا احساس مٹانے کی کوششوں میں عابدہ سے روشناس ہوا اور یہ اسی کی دھوکہ بازی کا نتیجہ تھا کہ آخر کار میں نے مریم کو فون کر کے ہوٹل بلانے کا ارادہ کیا اور یوں مجھے بروقت اس کے قتل کی اطلاع مل گئی ورنہ میں القاہرہ کے اسی چوہے دان میں نہایت بے بسی کے ساتھ گرفتار کر لیا جاتا!

میں اخبارات میں ہی الجھا ہوا تھا کہ ہاشم آ پہنچا۔

عابدہ اسے میرے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ اس روز ہاشم کے چہرے سے خاصے اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا جو میرے لیے بھی تسلی کا باعث تھا۔

"آج تیسرے پہر حبیب رہا ہو جائے گا۔" اس نے مجھے خوشخبری سنائی۔ "اس کی ضمانت کے کاغذات پر احکام ہو گئے ہیں جو تیسرے پہر جیل کے حکام کو مل جائیں گے۔"

"اسے عدالت میں لایا گیا تھا؟" میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "تم فکر نہ کرو، میں وقت ضائع کیے بغیر اس سے مل لوں گا۔"

"میں جلد از جلد مصر سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے احساس ہے۔ یہاں میرا کام بڑھ گیا ہے ورنہ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا۔"

"جنرل کے بارے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟" میں نے محض اخلاقاً سوال کیا ورنہ اس وقت میں ذہنی طور پر کسی اور موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"میں نے صبح ہی اپنی رپورٹ بیروت روانہ کی ہے، کل تک وہاں سے احکام آجائیں گے، اس کے بعد ہی کچھ ہو سکے گا۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "تمہیں یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"شاید میرے لیے اس مکان سے بہتر پناہ گاہ ملنی مشکل تھی۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا، رفیق دو تین پیگ پی کر ہی بے قابو ہو جاتا ہے!"

"تم نے بتانے میں دیر کر دی۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اس بارے میں کل رات میں اچھا خاصا تجربہ حاصل کر چکا ہوں۔"

"زیادہ گڑبڑ تو نہیں ہوئی تھی؟" وہ بوکھلا کر بولا۔

"عابدہ نے میری خاصی مدد کی تھی۔"

"بڑی اچھی لڑکی ہے۔ پتہ نہیں یہ دونوں آپس میں شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"ستارے نہیں ملتے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "بڑھاپے میں شاید ستارے سمجھوتہ کر لیں۔"

"تم یہاں ٹھاٹ سے رہو۔" اس نے کہا۔ "میں نے کل رات رفیق کو دو سو پونڈ دے دیے تھے۔"

"جب ہی وہ اسکاچ کی دو بوتلیں لایا تھا۔"

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی اور ہم دونوں چونک پڑے!

عابدہ نے لپک کر دروازہ کھولا پھر سخت فرش پر کئی قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اپنی جگہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں کل صبح واپس آؤں گا۔" صحن سے رفیق کی آواز آئی۔ شاید وہ عابدہ سے مخاطب تھا۔

"کیوں؟ کہاں جا رہے ہو؟" عابدہ اس کی بیوی نہیں تھی، مگر اس کے لہجے میں اس وقت کسی سخت گیر بیوی جیسا تحکم تھا!

"ضروری کام ہے، معقول معاوضہ ملے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ دونوں ہمارے سامنے آ پہنچے اور میں چونک پڑا۔

ہاشم کا ردِعمل بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا کیونکہ ان دونوں کے پیچھے ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام چلا آ رہا تھا جس کے بدن پر خاکی پتلون اور بش شرٹ موجود تھی۔

"اوہو... تم بھی یہیں موجود ہو!" ہاشم پر نگاہ پڑتے ہی رفیق نے مسرت کا اظہار کیا مگر اس کے چہرے پر چھائی ہوئی بوکھلاہٹ اس مسرت میں بھی نہ دب سکی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" ہاشم نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ایک کام مل گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے داہنی آنکھ دبائی۔ اس کی یہ حرکت نہ سیاہ فام دیکھ سکا اور نہ ہی عابدہ۔

رفیق کی حرکت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کچھ گڑبڑ تھی اور اس گڑبڑ کے بارے میں سیاہ فام کی ذات سب سے زیادہ مشتبہ تھی۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ رفیق ناپسندیدہ لوگوں کے جنگل میں پھنس چکا تھا اور ان ہی کے ایما پر اسے کسی ناگزیر ضرورت کے تحت اپنے گھر آنا پڑا تھا اور اس سلسلے میں ایک خطرناک نگراں اس پر مسلط کر دیا گیا تھا تاکہ وہ کسی کو بھی اصل صورت حال سے آگاہ نہ کر سکے۔

"یہ کون ہے؟" ہاشم نے سیاہ فام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اسی کے مالک نے مجھے کام فراہم کیا ہے۔" رفیق جلدی سے بولا جیسے لحظہ بھر کی تاخیر کی صورت میں سیاہ فام اس کی گردن دبوچ لے گا۔

"تو کیا صرف یہی بتانے آئے ہو؟" عابدہ نے تیز لہجے میں سوال کیا۔ وہ بھی گڑبڑ کا اندازہ تو کر چکی تھی مگر اسے صحیح صورتِ حال کا ادراک نہیں ہو سکا تھا۔

"یہ بتانے بھی اور کچھ ضروری سامان لینے بھی!"

"وقت ضائع مت کرو!" سیاہ فام نے عقب سے رفیق کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا مگر لہجے کے برعکس رفیق کے شانے پر اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

رفیق تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ ہم تینوں وہیں رکے رہے مگر سیاہ فام نہایت اعتماد سے اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتا چلا گیا۔

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ اس گرانڈیل سیاہ فام کا داہنا ہاتھ پتلون کی جیب میں موجود تھا۔ یقینی طور پر اس پھولی ہوئی جیب میں کوئی ہتھیار ہی تھا جو اجنبی لوگوں کے درمیان بھی سیاہ فام کو بلا کا اعتماد بخش رہا تھا۔

ہماری طرف اس کی پشت ہوتے ہی میری اور ہاشم کی نگاہیں چار ہوئیں اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سیاہ فام پر حملہ آور ہونے کا اشارہ دیا مگر ہاشم کے چہرے پر وحشت عود کر آئی اور اس نے تیزی کے ساتھ اپنی گردن کو نفی میں جنبش دینی شروع کر دی۔

میرے لئے وہ وقت غنیمت تھا۔ ایک بار سیاہ فام پلٹ پڑتا تو وہ سنہرا موقع ضائع ہو جاتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ سیاہ فام بے خبری میں عقب سے کئے جانے والے حملے سے کسی بھی طرح سنبھل نہیں سکے گا۔

میں ننگے پیر اپنے کمرے سے نکلا اور حیران و پریشان عابدہ کے قریب سے گزر کر رفیق کے کمرے میں داخل ہوا۔

اس وقت تک رفیق اور سیاہ فام کی پیش قدمی جاری تھی ہا... میرے اس کمرے میں گھستے ہی نہ جانے سیاہ فام کی کون سی حس ر... آئی کہ وہ کسی چیتے کی سی پھرتی سے واپس پلٹ پڑا اور اس کا داہنا ہ... جیب سے باہر آ گیا جس میں اعشاریہ دو یا پنچ کا ریوالور دبا ہوا تھا جس کا دہانہ میرے سینے کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے اور سیاہ فام کے موٹے موٹے ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

اگر پھولے ہوئے سیاہ ہونٹوں کے عقب میں اچانک موتیوں جیسے سفید دانتوں کی قطار نہ چمکنے لگتی تو شاید میرے لئے اس کی مسکراہٹ کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہو جاتا۔

"مجھے گھیرنے کا ارادہ ہے؟" سیاہ فام پہلی بار مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوا تو اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"میں رفیق سے کچھ معلوم کرنے آیا تھا!"

"ننگے پاؤں؟ چوروں کی طرح؟" اس بار سیاہ فام کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"صرف اتنا بتا دو کہ رفیق صبح تک واپس نہ آئے یا کہیں سے اس کی لاش دستیاب ہو تو ہم لوگ تمہیں کہاں تلاش کریں؟"

"ایسی صورتِ حال صرف اسی وقت پیش آئے گی جب رفیق ہماری ہدایات پر عمل کرنے سے انکار کر دے!"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے ساتھ اور لوگ بھی ہیں؟"

"وہ تو اسی مکان کے بیرونی دروازے پر موجود ہوں گے۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "کچھ اور بھی ہیں!"

"تو تم اعتراف کرتے ہو کہ رفیق کو معاوضے پر کوئی کام نہیں ... بلکہ تم نے اپنے کسی مقصد کے لئے اسے اغوا کیا ہے؟"

"یوں دل خوش ہوتا ہے تو یہی سمجھ لو۔" وہ سرسری انداز میں بات کہنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ "مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر تمہارا ساتھی آخر تک ہماری ہدایات پر عمل کرتا رہا تو آخر میں اسے گراں قدر انعام ملے گا۔"

"چند تولے پگھلا ہوا سیسہ؟"

"وعدہ خلافی بے ضمیر لوگ کرتے ہیں!" اس نے شانے اچکا کر کہا پھر رفیق سے مخاطب ہو گیا۔ "تم فارغ ہوئے یا نہیں؟"

رفیق ہڑبڑا گیا کیونکہ وہ سب کچھ بھول بھال کر نہایت توجہ زدہ انداز میں میری اور سیاہ فام کی گفتگو سن رہا تھا۔

"بس..... بس دو منٹ میں چلتا ہوں!" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پہلو میں رکھی ہوئی چوبی الماری کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اپنے کام کے لئے تم نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے!" میں نے اسے دوبارہ اپنی طرف متوجہ کرنے کی نیت سے کہا۔

"مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش نہ کرو۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہمارے تعاقب کی کوشش نہ صرف تمہارے بلکہ رفیق کے حق میں بھی مضر ثابت ہو سکتی ہے!"

"تم کون ہو؟"

"میں تمہاری کسی بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"تم ایک بیوی کے سامنے اس کے شوہر کو ریوالور کی زد پر لئے جا رہے ہو، کیا اس حرکت پر تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرتا؟"

"میرے ضمیر کا ٹھیکہ لینے کی کوشش نہ کرو اور اس کمرے سے باہر نکل جاؤ۔" اس نے ریوالور کی نال لہرا کر دوٹوک لہجے میں کہا۔

"بحث مت کرو۔" رفیق پلٹ کر مجھ سے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا ارادہ نیک ہی ہو۔"

اچانک دروازے پر ایک دبی دبی تحیر زدہ آواز سنائی دی اور پھر مجھے عابدہ بھی نظر آ گئی جو دروازے پر ہاشم کے ساتھ کھڑی خوفزدہ نگاہوں سے ریوالور بردار سیاہ فام کو تکے جا رہی تھی۔ وہ آواز اسی کی تھی!

ان دونوں کا یکایک وہاں نمودار ہونا فطری امر تھا کیونکہ مجھے اس کمرے میں آئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور حالات پُرسکون تھے۔

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں لڑکی!" سیاہ فام کی آواز گونجی۔ "یہ ریوالور تمہارے اس نادان دوست کی وجہ سے جیب سے باہر آیا ہے جو مجھے زیر کرنے کی نیت سے میرے پیچھے آیا تھا ورنہ مجھے کسی سے کوئی پُرخاش نہیں ہے۔"

"تم ابوسلطان کے آدمی تو نہیں ہو؟" ہاشم نے بغور سیاہ فام کا جائزہ لیتے ہوئے ایک سوال کر ڈالا۔

"کون ابوسلطان؟" سیاہ فام کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"اخوان الصفا کا مقامی امیر!"

سیاہ فام ہنس پڑا۔ "دور کی کوڑی لائے ہو۔ مصر میں رہنے والا سوڈانی اخوان الصفا کا رکن نہیں ہوتا۔"

"مگر میرے لئے تمہاری صورت شناسا ہے۔" ہاشم نے اصرار کیا۔

"ہو گی۔" وہ ٹھوڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ "میرے بارے میں اپنے ذہنوں پر زور نہ دو، صبح جب رفیق جیبیں بھر کر واپس آئے گا تو تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔"

اس اثنا میں رفیق ایک چوکور چرمی صندوق سنبھال چکا تھا۔

"تم تیار ہو؟" سوڈانی نے اس سے دریافت کیا اور جب رفیق نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تو بولا۔ "باہر جا کر سیدھے گاڑی میں بیٹھ جاؤ!"

رفیق نہایت سعادت مندانہ انداز میں واپس چل دیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" جب وہ عابدہ کے قریب سے گزرا تو وہ رفیق کا بازو تھام کر بلک پڑی۔ "میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"ضرور چلو۔" سوڈانی بولا۔ "مگر میرے بعض ساتھی عورتوں کے خطرناک شکاری ہیں، ایسا نہ ہو کہ رفیق کو تنہا واپس ہونا پڑے۔"

ہاشم نے ملامت آمیز نظروں سے سوڈانی کو گھورا اور عابدہ کو کھینچ کر رفیق سے دور کر دیا اور وہ عابدہ کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی مشینی انداز میں آگے بڑھ گیا۔

"غالباً یہاں تم تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے!" سوڈانی نے تجسس آمیز نگاہیں چاروں طرف دوڑاتے ہوئے کہا۔

"تلاش کر لو۔" میں نے کہا۔

"اتنا احمق نہیں ہوں۔" وہ ہنس پڑا، خاصے ٹھنڈے دماغ کا مالک تھا۔ "اب تم تینوں ادھر آؤ اور عقبی دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

اس کی بات سن کر عابدہ سہم گئی اور کچھ کہنا ہی چاہتی تھی، کہ سیاہ فام بول پڑا۔ "ڈرو نہیں۔ تم پر گولیاں نہیں برساؤں گا۔"

وہ ہم سے الگ چوکنا کھڑا رہا اور جب ہم تینوں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو اس نے پھرتی سے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔

خود کو یوں بے دست و پا ہوتے دیکھ کر میں یک بیک مشتعل ہو گیا اور میں نے دوڑ کر پوری قوت سے اپنا بایاں شانہ چوبی دروازے پر دے مارا۔

چوکھٹ مضبوط تھی مگر دروازے میں لگے ہوئے تختے میرے شانے کی شدید ضرب نہ سہار سکے اور چرچرا کر ٹوٹ گئے۔

میں نے ٹوٹے ہوئے تختوں..... میں سے ہاتھ باہر نکال کر کنڈی کھول دی اور پھر ہم تینوں ہی دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔

مکان سے نکاسی کے دروازے پر بھی مایوسی ہماری منتظر تھی وہ خبیث جاتے جاتے وہ دروازہ بھی باہر سے بند کر گیا تھا۔

میں وقت ضائع کئے بغیر کسی بندر کی سی پھرتی کے ساتھ احاطے کی دیوار پر چڑھ کر باہر کود گیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اکا دکا لوگوں نے حیرت سے مجھے دیکھا مگر میں نے ان کی کوئی پروا کئے بغیر باہر سے دروازہ کھول دیا۔

ہاشم کے ہمراہ عابدہ کو کھلے ہوئے دروازے سے باہر آتے دیکھ کر وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ وہ شاید اسی علاقے کے مکین تھے اور باہر سے لگی ہوئی کنڈی کو بچوں کی شرارت سمجھے تھے۔

میں نے احاطے کی دیوار پر چڑھتے ہوئے گلی کی نکڑ سے سرمئی رنگ کی ایک کار کو تیزی کے ساتھ بائیں طرف گھومتے دیکھا تھا لہٰذا ہاشم کی کار میں سوار ہوتے ہی میں نے اسے اس سمت میں روانہ ہونے کی ہدایت کی جس پر بڑی عجلت میں عمل کیا گیا۔

روانگی کے وقت ہاشم نے عابدہ کے مکان کے بیرونی دروازے کے پٹ ملا کر مزدور بند کر دیئے تھے مگر کنڈی نہیں لگائی تھی۔ تھوڑی دور نکلنے کے بعد ہاشم نے عابدہ کو یاد دلایا تو وہ کچھ نہ بولی۔ شاید اسے خدشہ تھا کہ ذرا سی بھی تاخیر اس وقت رفیق کے حق میں مضر ثابت ہو سکتی تھی۔

"تم یہیں اتر جاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔ "اور گھر میں ٹھہرو، ایسا نہ ہو کہ تمہاری وجہ سے ہم کسی دشواری میں پڑ جائیں۔"

"میری فکر نہ کرو۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "رفیق کے لئے میں اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا سکتی ہوں، تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔"

"رفیق اس چرمی صندوق میں کیا لے گیا ہے؟" ہاشم نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ بولی۔ "ویسے وہ ڈراموں وغیرہ کے سلسلے میں اپنا میک اپ خود ہی کرتا رہا ہے اور اس صندوق میں وہی شعبدے بھرے رہتے ہیں۔"

"میک اپ کا سامان۔" ہاشم کار تیزی سے موڑتے ہوئے بڑبڑایا۔ "ضروری تو نہیں کہ وہ وہی سامان لے گیا ہو۔"

"اس کی الماری دیکھے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" عابدہ بولی۔ "اس کے پاس کوئی بریف کیس بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی چیز لے جانے کے لئے اس چرمی صندوق کو بریف کیس کے طور پر استعمال کیا ہو!"

"وہ رہی!" میں اچانک اچھل پڑا۔ مجھے کئی فرلانگ دور ایک سرمئی کار نظر آ گئی جو میری چھٹی حس کے مطابق مطلوبہ کار تھی۔

ہاشم نے اپنی کار کی رفتار اور تیز کر دی جس کے نتیجے میں کار کا پورا ڈھانچہ پُر شور آواز سے لرزنے لگا۔

سرمئی کار سے ہمارا فاصلہ لحظہ بہ لحظہ کم ہونے لگا۔

"سیٹوں کے نیچے دیکھو، شاید کوئی ہتھیار پڑا ہو!" ہاشم کی آواز میں اس وقت ٹھہراؤ کے بجائے ہیجان نمایاں تھا۔

ہاشم کے برابر والی نشست کے نیچے پائیدان میں غیر معمولی ابھار تھا لہٰذا میں نے پائیدان کے نیچے ہاتھ ڈال دیا اور اعشاریہ تین آٹھ کا سات گولیوں والا خود کار پستول میری گرفت میں آ گیا جس کا چیمبر بھرا ہوا تھا۔

میں نے پستول کی نال کو بوسہ دیا اور سیفٹی کیچ ہٹا کر اپنی سمت والی کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔

"کیا تم ان پر گولیاں چلاؤ گے؟" کار کے ڈھانچے کے شور میں عابدہ کی کانپتی ہوئی، خوف زدہ آواز ابھری۔

"لاؤ، تو گلاب کے پھول برسائیں گے!" میں ہاشم کی موجودگی کو فراموش کر کے روانی میں کہہ گیا۔

"نہیں، خدا کے لئے اس کار پر گولی نہ چلانا۔" وہ مجھے پہلو بدل کر اپنی نشست درست کرتے ہوئے دیکھ کر بولی۔ "کہیں تمہا رفیق کو نشانہ نہ بنا لے!"

"ڈرو نہیں، میں اس کے عقبی ٹائروں کا نشانہ لو... نے سر گھما کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"اس اچھلتی کودتی کار میں تمہارا نشانہ خطا ہو گا۔" ... بہت زیادہ خائف نظر آنے لگی تھی۔ "ان سے آگے نکل کر ... کیوں نہیں رکتے؟"

"وہ ہمیں بھون دیں گے۔" ہاشم نے دخل دیا۔ "شا... وہ ہماری کار سے غافل ہی ہیں۔ یہ ہمارے لئے اچھا موقع ...

وہ طویل سڑک نیم آباد تھی اور وہ بھی محض اس ... کے اطراف میں وسیع و عریض مکانات بنے ہوئے تھے ... دور تک کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا اور ہماری کار ان ... تر ہوتی جا رہی تھی۔

جوں ہی میں نے محسوس کیا کہ فاصلہ مناسب ہے ... والے ہاتھ سمیت اپنا دھڑ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نکال ... میں تیز ہوا لگتے ہی آنسو امڈ آئے، میں نے دھڑ اند... سے اپنی ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں خشک کیں اور اس بار ... ہی سرمئی کار پر یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے۔

"وہ مارا۔" ہاشم کی مسرت آمیز آواز ابھری۔ فائر ہوتے ہی سرمئی کار سڑک کے ایک سمت تک اس بری طرح لہرائی تھی کہ پہلے مجھے بھی اپنا نشانہ کار... ہو گیا مگر اگلی کار کے وہ لہریئے فائر سے بچنے کے لئے ... کامیابی کے بعد ہی اس کی رفتار بڑھا دی گئی۔

میری نظر ہاشم کے داہنے پاؤں پر پڑی جس ... پیڈل کو پائیدان میں پیوست کرنے میں کوئی کسر نہیں ... فاصلہ بدستور قائم تھا۔ شاید سرمئی کار کا انج... کی آخری حدوں پر چل رہا تھا ورنہ ہم سر پیٹتے رہ جاتے۔

"وہ رفیق کو نہ مار دیں!" عابدہ کی رقت آمیز آ...

"خاموش بیٹھی رہو۔" ہاشم غرایا۔ میں نے ... لہجے میں درندگی کے آثار محسوس کئے تھے ورنہ وہ ہر قسم ... نرم گفتار ہی ثابت ہوا تھا۔

پھر ہم تینوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

سرمئی کار کی بریک لائٹس یک بیک جل اٹھی ... پر ٹائر چیخ اٹھے تھے جن سے اٹھتا ہوا دھواں صا... سکتا تھا۔

اس قدر تیز رفتاری پر اچانک پورے بریک ... خطرناک تھا۔ سرمئی کار بے قابو ہو کر گھسٹتی ہوئی کا... اور پھر سڑک کے وسط میں رک گئی۔

ہاشم نے بھی سرمئی کار کی بریک لائٹس دیکھتے ہی اپنا داہنا پاؤں بریک پیڈل پر رکھ دیا تھا اس کی کار نے جھٹکا لیا مگر رفتار میں سرعت سے کمی واقع نہیں ہوئی۔

ہماری کار آناً فاناً میں سرمئی کار سے ٹکراتی نظر آ رہی تھی کیونکہ اگلی کار کے مقابلے میں ہاشم کی کار کے بریک ناقص تھے۔

اس نے دو تین مرتبہ پیڈل کو پمپ کر کے بریک لگائے مگر اس وقت تک وقت اپنا فیصلہ صادر کر چکا تھا۔

اگلی کار سے تین فائر ہوئے۔ رائفل کے دھماکوں سے فضا لرز اٹھی پھر ان دھماکوں میں ہماری کار کے اگلے ٹائروں کے پھٹنے کا شور بھی شامل ہو گیا اور کار تھوڑی دور تک اچھل کر ساکت ہو گئی۔

پہلے فائر نے داہنا ٹائر ناکارہ کیا، دوسرا بونٹ کو چھلنی کر گیا اور شاید ریڈی ایٹر بھی اس کی زد میں آیا تھا اور تیسرا فائر بائیں ٹائر کو برباد کر گیا۔

تیسرے فائر کی بازگشت معدوم ہونے سے پہلے ہی سرمئی کار برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی اور ہاشم کا منہ لٹک گیا۔

چند ثانیوں تک ہم دونوں سکتے کے عالم میں کار ہی میں بیٹھے رہے۔ عابدہ عقبی نشست پر دبی دبی سسکیاں لے کر رہی تھی۔

"جواب دہی کی فکر کرو" آخر مجھے ہی آنے والے لمحات کی سنگینی نے چوکنا کیا" فائرنگ اور دھماکے دور تک سنے گئے ہوں گے اس علاقے کے مکین کسی بھی لمحے جمع ہونے لگیں گے۔"

ہاشم دروازہ کھول کر باہر کود گیا میں نے بھی اس کی تقلید کی، عابدہ بدقت نیچے آ سکی۔ رونے کے واضح اثرات اس کی آنکھوں چہرے اور سرخ ناک سے نمایاں تھے۔

اس وقت تک میدان صاف تھا۔ ہاشم نے پستول مجھ سے لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اور سامنے ہی جھاڑیوں سے اٹے ہوئے ویران قطعات بھی تھے جن میں ہم تینوں بآسانی روپوش ہو سکتے تھے مگر ایسی صورت میں ادھڑی ہوئی کار زیادہ مسائل کا سبب بن جاتی کیونکہ اس کے نمبروں کے ذریعے پولیس ہاشم تک پہنچ سکتی تھی!

"تم دونوں نکل جاؤ، میں یہیں رکوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے پہلا فائر سنتے ہی پولیس کو خبر دے دی ہو۔" یہ کہہ کر اس نے پستول دوبارہ مجھے تھما دیا۔

اس کے الفاظ سن کر میرے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

ان دنوں میں ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا مگر میرے لئے بدترین خطرہ قاہرہ کی پولیس بنی ہوئی تھی جس سے میں ہر قیمت پر دور رہنا چاہتا تھا۔

میں نے عابدہ کا ہاتھ تھاما اور سڑک عبور کر کے مکانوں کے درمیان خالی قطعات پر اُگی ہوئی خودرو جھاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔ شاید میں دبک چھپ کر ہاشم کو پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیتا مگر میرے ذہن میں ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں کسی نے اپنے مکان کی اوپری منزل کے کسی حصے سے ہم تینوں کو تباہ شدہ کار کے قریب یکجا نہ دیکھ لیا ہو، اگر یہ اطلاع پولیس کو مل جاتی تو ہاشم سے ملاقات کے بعد وہ بقیہ دو افراد کی تلاش میں علاقے کا چپہ چپہ چھان مارتی۔

"اپنی حالت درست کرو!" جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں نے عابدہ کو تنبیہہ کی "تم تو یوں رو رہی ہو جیسے وہ تمہارا شوہر تھا۔"

"بکواس مت کرو" وہ منہ پھلا کر بولی "میرے لئے وہ شوہر سے زیادہ تھا۔"

"ابھی اس کی زندگی کی امید ہے" میں نے اسے سمجھانا چاہا "ابھی سے اس کے لئے اتنا نہ رو کہ اس کے لئے مرنا نا گزیر ہو جائے۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میری وجہ سے؟" اس کا یہ انکشاف میرے لئے حیرت انگیز تھا۔

"ہاں ہاں، تمہاری وجہ سے!" وہ غصیلے لہجے میں بولی "نہ تم پچھلی رات اسے شراب پلاتے اور نہ وہ اپنی ندامت چھپانے کے لئے صبح سویرے باہر نکلتا۔"

"بڑی اچھی منطق ہے" میں آخری جھاڑی عبور کر کے گلی میں داخل ہوتے ہوئے بولا "پھر تو سب سے بڑا قصور اس کی ماں کا ہے، نہ وہ پیدا ہوتا اور نہ آج اسے یوں اغوا ہونا پڑتا۔"

وہ کھسیائے ہوئے انداز میں بے اختیار ہنس پڑی۔

"خدا کا شکر ہے" میں نے آہستہ سے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ تم ہنسنا ہی بھول گئی ہو۔"

"پتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں اور اسے کیوں اٹھا لے گئے" وہ تشویشناک لہجے میں بڑبڑائی "وہ تو کسی سے بھی نہیں الجھتا۔"

"دشمنی کا معاملہ ہوتا تو وہ سوڈالی اسے گھر نہ لاتا" میں نے کہا "یہ عقدہ اسی وقت حل ہو گا جب یہ پتہ چلے گا کہ وہ چیزوں میں کیا لے گیا تھا؟"

ہمیں بارونق علاقے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دو میل پیدل چلنا پڑا۔ پھر ایک ٹیکسی کے ذریعے ہم گھر پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بیرونی دروازے کے پٹ بند تھے اور ان میں بھی کسی کی دخل اندازی کے آثار نہیں تھے۔

"میں نے تو سنا تھا کہ قاہرہ چوری چکاری کے سلسلے میں بدنام ہے!" میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"درست سنا تھا" وہ بولی "باہر سے کنڈی کھلی ہونے کی وجہ سے یہ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس وقت گھر ویران پڑا ہے ورنہ کوئی نہ کوئی ضرور گھس آتا۔"

"یہاں بھی ایک کوتاہی بچت کا بہانہ بن گئی۔"

"اگر گھر کا صفایا بھی ہو جاتا اور ہم رفیق کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتے تو میں پروا نہ کرتی مگر اب طبیعت فکر مند ہے۔"

"پینے پلانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اس وقت تو تمہیں بھی نہ پینے دوں گی۔ مجھے تمہاری توجہ اور ہمدردی کی ضرورت ہے" اس نے سختی سے کہا۔

"مجھ پر تمہارا ایسا کوئی حق نہیں ہے۔"

"مجھے تنگ نہ کرو" وہ سنجیدگی سے بولی "رفیق سے تو مجھے کافی عرصے سے والہانہ محبت ہے مگر اس کے بعد اگر کسی نے مجھے واقعی متاثر کیا ہے تو وہ تمہاری ذات ہے۔"

"اے باپ رے!" میں ہولے ہولے کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولا "اس کا مطلب ہے کہ اب میرے اغوا کی باری ہے!"

"تم بہت اجڈ ہو، تمہیں دوسروں کے دلی جذبات کا ذرا بھی پاس نہیں" وہ بھڑک گئی۔

"دوسروں کے جذبات کا پاس نہ ہوتا تو اس وقت تمہارے ساتھ رفیق کے اغوا کا جشن منا رہا ہوتا" میں نے کہا اور وہ خاموش ہو گئی۔

مجھے صبح سے پہلے رفیق کی واپسی کی امید نہیں تھی اور سچ تو یہ تھا کہ اغوا کرنے والوں سے ناکام ٹکراؤ کے بعد مجھے رفیق کی صحیح سلامت واپسی کی بھی امید نہیں رہی تھی مگر پھر بھی میں اس کے اغوا کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں عابدہ کے ہمراہ اس گوشے کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا جہاں سے رفیق چرمی صندوق لے گیا تھا۔

"وہ میک اپ کا سامان ہی لے گیا ہے!" کافی دیر کی دیکھ بھال کے بعد عابدہ نے اعلان کیا "وہ میک اپ سے متعلق ہر چیز اٹھا لے گیا ہے!"

"کیا اسے روپ بدلنے میں خاص مہارت حاصل ہے؟"

"اس فن کا ماہر ہی سمجھو، لوگوں کو ٹھگنے کی وارداتوں میں وہ اکثر میرے خدوخال میں تبدیلی کرتا رہتا تھا تاکہ پکڑے جانے کا احتمال نہ رہے!"

"اور اس کے باوجود بے روزگار رہتا ہے۔"

"فلم میں اور ٹیلی ویژن پر ایسے لوگوں کی اجارہ داریاں ہیں جو غازہ، پاؤڈر اور رنگوں سے سوانگ بھرتے ہیں، رفیق کا فن تھیٹر کا فن ہے جس کا رجحان پچھلے چند سالوں میں بالکل بدل کر رہ گیا ہے!"

میرے وجود میں ایک نئے خیال کے تحت پھریری کی لہر سی دوڑ گئی "تو فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے کسی کی شناخت بدلوانے کے لئے رفیق کو اغوا کیا ہے اور شاید وہ شخصیت کسی خطرے سے دوچار ہے!"

"ہوا کرے مگر کسی کو یہ حق کیسے مل گیا کہ اپنی جان بچانے کے لئے دوسروں کو بے دریغ خطرات میں جھونک دے؟"

"اس پر بعد میں بحث ہوتی رہے گی، فی الحال مجھے بے چینی سے ہاشم کا انتظار ہے" میں نے جان چھڑانے کی نیت سے کہا کیونکہ اب میرا ذہن ایک واضح لائن پر سوچنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

میرے لئے اس وقت ایک ایک پل گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میں ہاشم کے بغیر ذرا بھی پیش قدمی نہیں کر سکتا تھا۔

شام ڈھلنے والی تھی مگر ہاشم کا کہیں پتہ نہیں تھا اس کے بیان کے مطابق رجب کو رہائی ملے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور قاہرہ میں وہ واحد شخص تھا جسے سیتا کے بارے میں سب سے بہتر معلومات حاصل ہونی چاہئے تھیں۔

رجب سیتا کا ہمدرد تھا اور سیتا کا معاملہ اس قدر نازک تھا کہ اس کا کوئی بھی خیرخواہ اس موضوع پر ایک اجنبی سے بات کرنا پسند نہ کرتا جبکہ میں رجب کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ ہاشم کے بغیر میں رجب کو کسی طرح اپنی اصلیت کا یقین نہیں دلا سکتا تھا۔

آخر کار مغرب کے وقت وہ آ ہی پہنچا۔ اس کے بشرے سے شدید تکان اور اضمحلال کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" میں نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"وہاں سے بڑی مشکل سے گلو خلاصی ہوئی، پولیس کو بمشکل میری کہانی پر یقین آ سکا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رجب کا کیا رہا؟"

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے، میں اسی کے پاس سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ عابدہ آ گئی۔

"رفیق کا کچھ پتہ چلا؟" وہ اپنے ہی فراق میں تھی۔

"آج پہلی بار مجھے پرانی کار کی وجہ سے خفت اٹھانی پڑی ہے!" ہاشم نے کہا "وہ لوگ ایسے صاف نکلے کہ اب ان کا سراغ لگانا مشکل ہے!"

اس موضوع پر عابدہ کی تھوڑی سی تشفی کرنے کے بعد ہاشم نے قہوے کی خواہش کا اظہار کیا جس کا مطلب محض عابدہ کو رخصت کرنا تھا۔

"سیتا اسی کے باغ میں روپوش تھی" عابدہ کے جاتے ہی وہ سرگوشیانہ لہجے میں بتانے لگا "مگر رجب نے اسے وہاں غیر محفوظ خیال...

کرتے ہوئے دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دیا اور لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے رفیعہ نامی ایک لڑکی کو سارے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے سیتا کے بھونڈے میک اپ میں فارم پر رہنے پر آمادہ کر لیا یوں پولیس کی ساری توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ وہاں سالومن کے ہاتھوں رفیعہ ہی ماری گئی تھی۔"

"مگر سیتا کہاں ہے؟"

"پروگرام کے مطابق اسے ایک صحرائی قافلے میں شریک ہو کر سوڈان جانا تھا......"

"سوڈان!" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "تو کیا وہ وہاں پہنچ گئی؟"

"رجب تو فوراً ہی پکڑا گیا تھا۔ اسے تو یہ تصدیق کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا کہ سیتا اس کے باغ سے مقررہ مقام پر بحفاظت پہنچی یا نہیں۔" اس نے کہا۔ "تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس نے سیتا کو کس کی تحویل میں دیا تھا؟"

"ابوسلطان کا نام تمہاری زبان سے بلاوجہ نہیں نکلا تھا۔" اس کی گفتگو سن کر میرا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔

"اخوان الصفا کا ہیڈ کوارٹر خرطوم میں ہے اور اس خالص مذہبی تنظیم کا مقامی امیر ابوسلطان رجب کے گہرے دوستوں میں سے ہے لیکن آج رجب فون پر اس سے رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔"

"سیتا سے اس مذہبی تنظیم کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے؟"

"اخوان الصفا زیرِ زمین تنظیم ہے جو حقیقی اسلامی انقلاب کے لئے کوشاں ہے اور اس کے اراکین فلسطین کے مسئلے پر جہاد کو فرض تصور کرتے ہیں لہٰذا فلسطینیوں کی ہمدرد ہونے کی بنا پر سیتا ان میں بھی مقبول ہے۔"

"تم نے رفیق کو اغوا کرنے والے کو اخوان الصفا کا حوالہ کیوں دیا تھا؟"

"وہ سوڈانی تھا اور ایک زمانے میں مجھے اخوان الصفا سے قریب رہ کر کام کرنے کا موقع مل چکا ہے میرا خیال تھا کہ میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں!"

"بتا سکتے ہو کہ رفیق کو کیوں اغوا کیا گیا ہے؟"

"میں تو ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا! تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

"سیتا ابھی تک قاہرہ میں ہے......!"

"اس کا رفیق کے اغوا سے کیا تعلق ہو گیا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"سنتے جاؤ۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ اس کی زبان سے تازہ ترین معلومات حاصل ہونے کے بعد میں اپنے وجود میں ایک نیا ولولہ بیدار ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

"سیتا ابوسلطان کی تحویل میں دے دی گئی!" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے کہ مجوزہ صحرائی قافلہ اپنے سفر کا آغاز نہ کر سکا اور پھر رجب کے مضافاتی فارم پر پولیس کے دھاوے کے بعد ابوسلطان نے قافلے والا منصوبہ ترک کر دیا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ ابوسلطان نے سیتا کو بھیس بدل کر مصر سے نکالنے کا فیصلہ کیا اور پھر سیتا کے حلیے میں تبدیلی کے لئے اخوان الصفا والوں کی نظرِ انتخاب رفیق پر پڑی اور وہ اسے لے گئے......!"

"واللہ یہی ہوا ہے بالکل یہی ہوا ہے۔" وہ اچھل پڑا۔

"مقدر نے ہم سب کو سمیٹ کر ایک ہی جگہ جمع کر دیا مگر ہم ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے رہے، دیکھا جائے تو رفیق کو بچانے کی کوشش کر کے ہم نے سیتا کی راہ میں روڑے اٹکانے والی حرکت کی تھی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ وہ لوگ خون خرابے کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے!"

"ابوسلطان محض اسی لئے روپوش ہے وہ اپنی نگرانی میں رفیق سے سیتا کے خدوخال میں نمایاں تبدیلیاں کرائے گا اور پھر اسے کسی طرح مصر سے نکال دے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ سیتا آج رات کسی بھی وقت مصر چھوڑ دے گی۔"

"یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو؟"

"دو اور دو چار والی بات ہے۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ "کسی کے حلیے میں تبدیلی کے لئے سولہ اٹھارہ گھنٹے درکار نہیں ہوتے رفیق ایک دو گھنٹوں میں نمٹ گیا ہو گا مگر اخوان الصفا والے اس وقت تک اسے روکیں گے جب تک سیتا بحفاظت اپنی نئی منزل تک نہ پہنچ جائے۔ اگر وہ رفیق کو اس سے پہلے چھوڑ دیں تو یہ خطرہ برقرار رہے گا کہ رفیق سیتا کے نئے حلیے کا راز حکام کے سامنے فاش نہ کر دے۔"

"رفیق محفوظ ہاتھوں میں ہے۔" اس نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "اور یقیناً صبح بخیر و عافیت واپس آئے گا۔"

"کاش! کسی طرح علم ہو سکتا کہ ابوسلطان نے سیتا کو کہاں رکھا ہے اور وہ اسے کس وقت مصر سے نکالنے کا ارادہ رکھتا ہے!"

"اخوان الصفا والے اصولوں پر جان دیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "رجب نے اپنے جاننے والے دو اراکین سے رابطہ قائم کیا مگر ابوسلطان کے بارے میں انہوں نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ رفیق کی رہائی کے بعد ہی وہ بھی نمودار ہو جائے گا۔"

"تم اس سے واقف ہو؟"

"بہت اچھی طرح!"

"پھر صبح ہم اس سے براہِ راست ملنے کی کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ رجب کی خفیہ نگرانی کی جا رہی ہو!"

ہاشم کا ارادہ القاہرہ واپس جانے کا تھا مگر میں ابوسلطان سے ملنے تک اسے ساتھ رکھنے پر مُصر تھا۔ عابدہ کو میرے اصرار کا سبب تو معلوم نہیں تھا مگر وہ تھوڑے کر آئی تو اس نے بھی میری ہم نوائی شروع کر دی۔ وہ رفیق کا سراغ ملنے تک ہاشم کو اور مجھے اپنے پاس روک کے رکھنا چاہتی تھی۔

"اگر وقت ضائع کرنے کے بجائے رفیق کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی جائے تو کیسا رہے گا؟" عابدہ نے قہوہ پیتے ہوئے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی جس کی میرے اور ہاشم کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

"انہوں نے صبح تک اسے رہا کرنے کا وعدہ کیا ہے، ہمیں کسی بھی اقدام سے پہلے اس وقت تک انتظار کرنا ہو گا۔ بصورتِ دیگر وہ رفیق کو نقصان پہنچا سکتے ہیں!"

"میرے لئے وقت کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے!"

"صبح تک کے لئے اپنے دل پر جبر کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا بال بھی بیکا نہ ہونے پائے گا۔" ہاشم نے کہا۔

"تمہاری کار کہاں ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کی نیت سے سوال کیا۔

"پولیس کرین اٹھا لے گئی۔" وہ ہنس کر بولا۔ "واپس ملے گی تو شاید ڈھانچہ ہی ڈھانچہ رہ جائے گا باقی حصے تفتیش کی نذر ہو جائیں گے۔"

"یہ خوبی یہاں بھی موجود ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم تو یوں پوچھ رہے ہو جیسے مریخ سے آئے ہو!" عابدہ نے دخل اندازی کی۔ "ہر عرب جانتا ہے کہ مصر کے سرکاری اہلکار تمام عرب ملکوں میں سب سے زیادہ اصولوں سے عاری ہیں اور ہر بے ایمانی کو اپنا حق سمجھتے ہیں!"

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کیونکہ عابدہ کے لئے میں ایک عرب ہی تھا پھر بھی بات سنبھالنے کے لئے میں نے ہنس کر کہا۔ "مصری حکام سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔"

رات کا کھانا عابدہ بازار سے لے آئی جو ہم نے گھر میں بیٹھ کر ہی کھایا پھر رات گئے تک تینوں آپس میں نوک جھونک کرتے رہے۔ رفیق کے اغوا والے قصے کے بعد ہاشم کے سامنے بھی عابدہ سے بے تکلفانہ انداز میں بات کرنے کا جواز فراہم ہو گیا تھا اور مجھے ایسے ماحول میں خاصا لطف آ رہا تھا۔

میں دس بجے کے قریب بستر پر دراز ہوا اور تقریباً فوراً ہی نیند آ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔

بستر چھوڑنے پر معلوم ہوا کہ رفیق کو اغوا کرنے والے اسے صبح چھ بجے خود ہی گھر کے دروازے پر چھوڑ گئے تھے۔

رفیق مجھ سے یوں گلے ملا جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا کوئی قریبی عزیز ہو پھر سب سے پہلے اس نے پُرجوش لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ مجھے کیوں لے گئے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے اپنے قیاسات کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔

"ایک عورت کا حلیہ بدلنا تھا۔ میں ان کے سامنے تو احمق بنا رہا مگر میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ سیتا تھی سیتا!"

"سیتا؟" میں اور بھی انجان بن گیا۔ "یہ تو کسی غیر زبان کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔"

"کمال ہے۔" وہ سینہ پھلا کر بولا۔ "شاید تم اخبار نہیں پڑھتے ورنہ قاہرہ کا بچہ بچہ اس دلیر عورت کے نام سے واقف ہے۔ بہت حسین اور دلیر عورت ہے۔"

"اچھا۔" میں نے سمجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی قانون شکن عورت تو نہیں جو شاید صفدر علی کی بیوی ہے۔"

"ہاں۔ وہی... وہی...؟" رفیق مسرت آمیز لہجے میں بولا۔

"اس کا شوہر بھی ساتھ ہو گا۔ کیسا آدمی ہے؟"

"ساتھ تو نہیں تھا مگر سنا ہے وہ بھی بے جگر آدمی ہے اور تم سیتا کو قانون شکن کہہ رہے ہو... وہ قانون شکن ضرور ہے مگر انصاف پسند بھی ہے۔ اپنے ذاتی کام کے لئے مجھے اغوا کرا کے اس نے جرم کیا تھا۔ مگر جانتے ہو مجھے دس ہزار پونڈ کا انعام بھی تو ملا ہے۔"

"دن پھر گئے تمہارے تو۔" اتنی خطیر رقم کا ذکر میرے لئے حیرت انگیز تھا۔

"انعام کب دیا گیا؟" قدرے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

"صبح آتے ہوئے۔" اس نے جواب دیا۔

اگر اسے روانگی کے وقت ابوسلطان کی جانب سے وہ خطیر انعام دیا گیا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ رفیق کا کیا ہوا میک اپ کامیاب رہا تھا اور سیتا اپنی منزل پر بخیر و خوبی پہنچ گئی تھی۔

"میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی اتنی بڑی رقم نہیں دیکھی تھی۔" رفیق اپنی دھن میں مگن کہے جا رہا تھا۔ "اگر کل تم لوگ مجھے چھڑا لیتے تو میں اس موقع سے محروم رہ جاتا۔ قدرت جب فیاضی کرتی ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتی ہے۔"

جب تک رفیق ہم دونوں کے پاس رہا۔ عابدہ اس سے تنہائی

میں ملنے کے لئے بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی رہی۔ آخر کار ہم دونوں اسی بہانے سے اٹھ گئے۔

"ٹھہرو۔ کہاں جا رہے ہو؟" رفیق نے ہم دونوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر میں آتے ہیں، باہر کچھ ضروری کام ہے۔" ہاشم نے کہا اور ہم دونوں گھر سے باہر آ گئے۔

رفیق کے گھر سے پبلک فون بوتھ خاصی دُور تھا۔ سارے راستے ہم ان اتفاقات پر گفتگو کرتے رہے جن کے تحت ہم رفیق تک پہنچے تھے اور بعد میں تصیٹر کا وہ ناکام اداکار ہماری کہانی میں یک بیک ایک اہم مقام حاصل کر گیا تھا۔

"اگر وہ راضی ہوا تو اس سے ابھی ملاقات کرنے چلو گے نا؟" بازار میں پہنچ کر ہاشم نے تائید طلب لہجے میں دریافت کیا۔

"سر کے بل چلوں گا" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو بے چینی سے اس وقت کا منتظر تھا کہ رفیق واپس آئے تو ہم ابوسلطان کی جستجو کریں۔"

"اور اگر اس نے اب بھی سیتا کے بارے میں بات کرنے سے گریز کیا تو...؟" ہاشم نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے اندیشے کا اظہار کیا۔

"اس کا امکان نہیں ہے۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "تم سن ہی چکے ہو کہ ان کے نہ بتانے کے باوجود رفیق سیتا کو پہچان گیا تھا۔ اگر ابوسلطان نے اسے رہا کیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ سیتا اب احتیاطی تدابیر کے مراحل سے آگے بڑھ چکی ہے۔"

"رفیق سے ایک بات پوچھنی رہ گئی۔" ہاشم نے اچانک کہا۔

"وہ کیا؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"اس نے سیتا کے حلیے میں اپنی مرضی سے تبدیلیاں کی تھیں یا اسے کسی مخصوص روپ میں لانے کی کوشش کی گئی تھی؟"

"یہ واقعی چُوک ہوئی، واپسی میں پوچھیں گے۔"

پبلک بوتھ سے ہاشم کی پہلی ہی کوشش بار آور ثابت ہوئی کیونکہ وہ ایک کال کرنے کے بعد ہی باہر آ گیا۔

"چلو، وہ اپنے گھر پر ہی ہے۔" ہاشم کے لہجے سے مسرت پھوٹ پڑ رہی تھی۔

"آج دن کا آغاز بہت اچھا ہوا ہے۔" مجھے اس کی کامیابی سے واقعی مسرت ہوئی۔ "ہو سکتا ہے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی سیتا سے میری ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے۔"

"اتنی خوش فہمی بھی مناسب نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ابھی تو تمہارے نئے سفری کاغذات بھی حاصل کرنے ہیں۔ اس کام میں ایک آدھ دن ضائع ہو سکتا ہے۔"

"اس بار کوئی آسان نام منتخب کرنا۔ مصطفٰی المرزوق بڑا ثقیل ہو گیا تھا۔"

"اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھ لوں؟" ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے ہاشم نے دبے لہجے میں کہا۔

"تمہاری بات کا بُرا مان کر کہاں جاؤں گا؟"

"نہیں۔ وہ ایسی ہی بات ہے مگر رہ رہ کر میرے دل میں چبھ رہی ہے۔" اس کے لہجے پر میں چونک پڑا۔ وہ یقیناً کوئی خاص بات پوچھنے والا تھا۔

"تم نے مجھے بے چین کر دیا ہے۔"

"میں اب بھی زبان بند ہی رکھتا۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں آغاز کیا۔ "مگر اب ہم کسی بھی لمحے ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور میں اس سے پہلے تم سے عابدہ کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تم اس سے پہلے سے واقف تھے اور وہ تمہیں میرے ہمراہ اپنی چوکھٹ پر دیکھ کر کچھ سراسیمہ سی ہو گئی تھی۔ اس وقت تو میں انجان بن گیا تھا۔ مگر اس کا وہ رویہ مسلسل میرے ذہن میں ٹھونگیں مارتا رہا ہے۔"

"میں نے اس وقت بھی تمہیں سچ بات ہی بتائی تھی۔ وہ مجھ سے شہر کے ایک تفریحی مقام پر ٹکرائی تھی اور تعارف کی نوبت آنے سے پہلے ہی ہم اپنی اپنی راہ ہو لئے تھے۔" میں نے بلاجھجک اپنی بات دہرا ڈالی۔

"وہ تم سے ٹکرائی تھی؟" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

مجھے احساس ہوا کہ نادانستگی میں میرے منہ سے غلط الفاظ نکل گئے تھے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"میرے الفاظ نہ پکڑو۔ وہ لڑکی کسی غلط راہ پر نہیں ہے۔"

"میں نے محسوس کیا کہ وہ آج تم سے بہت زیادہ بے تکلف تھی۔"

"میں دوستی کا آخری حدوں تک احترام کرتا ہوں ہاشم۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارا ذہن غلط راہ پر بھٹک رہا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ میری باتوں کا غلط مقصد نہ لو۔" وہ بوکھلا کر بولا۔ "میرا مقصد تمہاری ذات کو الزام دینا نہیں ہے، مجھے اپنے دوست رفیق کی فکر ہے۔"

"تم اس کی فکر چھوڑ دو۔ عابدہ اسے دیوانہ وار چاہتی ہے۔"

"مجھے یہ اندازہ ہے۔ مگر اس کا تمہاری طرف جھکاؤ بہت زیادہ تھا۔ مجھے اس کی یہ بات پسند نہیں آئی۔" اس نے ٹیکسی اسٹینڈ پر رک کر کہا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اسے کیا خلش تھی اور وہ اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ مگر میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ اس کا دوست اپنی جھوٹی کارکردگی کے بل بوتے پر اس وقت تک ہی لوگوں کو ٹھگنے میں مصروف تھا۔ ورنہ رفیق ہمیشہ کے لئے اس کی نگاہوں سے گر جاتا۔

"کم از کم میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ رفیق کے اغوا نے ہمارے درمیان تکلف ختم کرنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا۔"

"میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اس وقت تمہاری ذات میرا ہدف نہیں تھی۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھے لڑکی کی طرف سے تشویش تھی جو تم نے دور کر دی ہے۔"

"اب اس موضوع کو ختم کرو۔"

ہم دونوں ایک ٹیکسی کی طرف بڑھے اور ہاشم ڈرائیور سے کرائے میں مول تول کر کے عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

"یہ میٹر سے نہیں چلتے؟" میں نے دبے لہجے میں ہاشم سے سوال کیا۔

"شاید ہی کوئی میٹر سے چلتا ہو۔ یہ قاہرہ ہے۔"

"مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کے وہ بھڑکے گا تو نہیں؟" ٹیکسی روانہ ہونے کے بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔

"تعارف کرانے کے بعد تو شاید اسے خوشی ہو گی۔" ہاشم نے کہا۔ "بہت خوش اخلاق اور واضح ذہن کا مالک ہے۔" پھر ہم دونوں خاموشی کے ساتھ سگریٹ پھونکنے میں مصروف ہو گئے۔

ٹیکسی کا سفر بیس پچیس منٹ تک جاری رہا۔ پھر ہاشم نے اسے ایک جگہ رکوا لیا۔ وہ علاقہ خاصا گنجان آباد تھا اور اس وقت وہاں خاصی بھاگ دوڑ کا سماں تھا جو اتنے سویرے میرے لئے غیر معمولی تھا۔

ایک گلی عبور کر کے ہم دوسری سڑک پر نکلے تو اس بھاگ دوڑ اور ہیجان کا سبب بھی نظر آ گیا۔ وہاں فوجیوں کا ایک ٹرک موجود تھا اور ایک عمارت کے قریب ان کا جماؤ نظر آ رہا تھا۔

پھر میرے نتھنوں نے بارود کی بُو بھی محسوس کر لی اور میں چوکنا ہو گیا۔

"خدا خیر کرے۔" ہاشم میرے کان کے قریب بڑبڑایا۔ "فوجی اسی عمارت پر پہرے دے رہے ہیں جہاں ہمیں جانا ہے۔"

"کسی سے معلومات تو حاصل کرو۔" میں نے کہا۔

مگر کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ چند افراد کی ٹولی قریب ہی تبادلۂ خیال میں مصروف تھی اور اس ٹکڑی کے مکالمے سن کر میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ آٹھ دس فوجی اس عمارت کی دوسری منزل پر مقیم کسی شخص کی گرفتاری کے لئے آئے تھے مگر اس نے فوجیوں کو دیکھتے ہی اخوان الصفا کا نعرہ لگا کر ان پر گولیاں چلا دیں۔ اور اگلے ہی لمحے فوجیوں نے اس کا بدن چھلنی کر دیا۔

اخوان الصفا کا نام آ جانے کے بعد کوئی اُمید عبث تھی۔ میرے ذہن پر یک بیک بیزاری چھا گئی۔ مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہاشم کے فون کرنے سے وہاں پہنچنے تک نصف گھنٹے میں ایسا کیا واقعہ رونما ہوا کہ فوجیوں نے ابوسلطان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں اسے ہلاک ہی کر دیا۔

ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور پھر ہم تیزی کے ساتھ بھیڑ سے نکلتے چلے گئے۔

صبح سویرے پیش آنے والے اس واقعے کے اثرات دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہر طرف ہیجان اور افراتفری نظر آ رہی تھی۔ اس ماحول سے نکلنے کے لئے ہمیں خاصی دُور ایک چھوٹے سے باغ میں پناہ لینی پڑی۔

"پھر گڑبڑ ہو گئی۔" ہاشم تشویش آمیز لہجے میں بڑبڑایا۔

"مگر اتنی جلدی یہ بساط کیسے الٹ گئی؟"

"بیشتر افریقی ملکوں میں اخوان الصفا پر انتہا پسندانہ رجحانات کی وجہ سے پابندی ہے۔ یہ جماعت مصر میں بھی خلافِ قانون قرار دی جا چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہاں منظم اور فعال ہے۔ آئے دن اس کے ارکان گرفتار ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"مگر اس وقت تو حد ہو گئی۔"

"شاید وہ پہلے سے ابوسلطان کی گھات میں تھے۔" وہ بولا۔ "ہو سکتا ہے اس کے فلیٹ کی نگرانی ہو رہی ہو اور انہیں جیسے ہی مخبر سے ابوسلطان کے بارے میں واپسی کی خبر ملی انہوں نے اس کے فلیٹ پر دھاوا بول دیا۔"

"ایسے اتفاقات میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم کو چند منٹ ہی اس سے بات کرنے کا موقع مل جاتا تو کام بن گیا تھا۔"

"اب یہاں وقت برباد کرنا بے سود ہے۔"

"پھر کہاں سر ٹکرانے کا ارادہ ہے؟"

"ایک مرتبہ پھر رجب سے رجوع کرنا پڑے گا۔"

"اور اگر ہم وہاں دھر لئے گئے؟"

"وہاں میں اکیلا جاؤں گا۔" ہاشم نے کہا۔ "اسی نے سیتا کو ابوسلطان کی تحویل میں دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مرنے سے قبل ابوسلطان کو اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا ہو اور سیتا کے بارے میں رجب کو بھی علم ہو گیا ہو۔"

"گردش کا آغاز ہو چکا ہے۔ میری مانو تو وہاں جانے سے پہلے اسے فون کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں بھی بازی الٹ چکی ہو۔"

ہم ایک مرتبہ پھر پبلک بوتھ کی تلاش میں چل دیئے۔

ہاشم نے دو تین دفعہ نمبر ملائے مگر تینوں بار گھنٹی بجتی رہی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر تنگ آ کر اس نے رجب کے سیکرٹری کے گھر فون کیا اور وہاں سے یہ اطلاع ملی کہ پچھلی شام رہائی

کے بعد صبح سویرے رجب کو فوجی حکام نے دوبارہ حراست میں لے لیا تھا۔

ابوسلطان مارا جا چکا تھا اور رجب دوبارہ پکڑا گیا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ فوجی حکام کو سیتا کے بارے میں کوئی اہم سراغ مل چکا تھا ورنہ یوں بیک وقت دو اہم مہروں پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں تھا۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ پشیر سالومن لاپتہ تھا جسے جنرل... نے اسرائیل سے طلب کیا تھا لہٰذا سالومن کی تلاش میں جنرل... پیمانے پر ایک آپریشن کا آغاز کر دیا تھا۔

اصل صورتِ حال کیا تھی۔ اس کا جواب آنے والا وقت ہی...



سیتا کی حد تک حالات بہت امید افزا تھے۔ وہ قاہرہ میں مسلسل فوج اور پولیس کا نشانہ بنی رہی تھی پھر رجب کے مضافاتی فارم والے قصّے کے بعد سے اسی شہر میں روپوش تھی!

میں اس کے بارے میں یکسر لاعلم تھا مگر پچھلے روز رفیق کے اغوا اور پھر انعام کی خطیر رقم سمیت اس کی خوش و خرّم واپسی کے بعد کچھ دیر پہلے ہی یہ معلوم ہوا کہ اسٹیج کے اس ناکام اداکار کو سیتا کے حُلیے میں تبدیلی کے لئے اغوا کیا گیا تھا۔

ان واقعات کی بنا پر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ سیتا روپ بدل کر قاہرہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکی تھی اور قاہرہ ہی نہیں بلکہ اس نے مصر بھی چھوڑ دیا ہو گا!

مگر رفیق کو کچھ علم نہیں تھا کہ سیتا دمیں موجود تھی یا کہیں روانہ

ہوئی تھی اور اگر وہ کہیں روانہ ہوئی تھی تو اس نے سفر کے لئے... اور کون سی منزل کا انتخاب کیا تھا۔

ابوسلطان کے مکان پر پیش آنے والا واقعہ رہ رہ کر... میں چبھ رہا تھا۔ ہاشم نے فون پر اس کی گھر میں موجودگی کی تصدیق نہ... اور اس کے بعد ہمیں وہاں پہنچنے میں بمشکل نصف گھنٹہ لگا تھا اور... تیس منٹوں میں ابوسلطان کے فلیٹ پر فوج نے دھاوا بول... بظاہر تو یہ سامنے کی بات تھی کہ قانون کا نفاذ کرنے... کی گھات میں بیٹھے ہو روپوش تھا اور پھر جوں ہی وہ اپنے فلیٹ... آیا، ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر حکّام نے اس کی قیام گاہ پر... چشم دید گواہوں سے پتہ چلا تھا کہ حملے کے وقت فلیٹ... ایک آدمی تھا جس نے اخوان الصفا کا مخصوص نعرہ لگا کر... گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور پھر شکست خوردہ دشمنوں نے...

چھلنی کر دیا۔

سارے آثار یہی بتاتے تھے کہ مرنے والا خود ابوسلطان تھا مگر میرا دل اس خیال کی نفی کر رہا تھا۔ وہ کئی عرب ملکوں میں پھیلی ہوئی ایک زیرِ زمین تنظیم کا مقامی سربراہ تھا اور اس رُتبے کا کوئی شخص یوں جذباتی انداز میں موت کو گلے لگانا پسند نہیں کرتا۔ جس سے اس کے مقصد یا گروہ کو کوئی فائدہ نہ ہو۔

مگر میں نے ہاشم پر اپنے ان خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

دوسری طرف رجب کا معاملہ بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا اسے چند گھنٹوں سے زیادہ آزادی کی فضا راس نہ آ سکی تھی اور وہ ہمارے پہنچنے سے قبل دوبارہ فوجی حکام کی قید میں جا پہنچا تھا۔

اس سے ہاشم کو صرف اسی قدر معلوم ہو سکا کہ اس کے فارم سے ہٹائے جانے تک سیتا کا ایک صحرائی قافلے میں شامل ہو کر خرطوم کی طرف روانہ ہونے کا پروگرام تھا جو اخوان الصفا کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

یکے بعد دیگرے دو بُری خبروں کے بعد ہاشم کو چپ سی لگ گئی تھی اور وہ فلسفیانہ انداز میں میرے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟" میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ یوں بھڑکا جیسے راہگیروں کے ہجوم میں سے گزرنے کے باوجود وہ خود کو تنہا سمجھتا رہا ہو!

"کہاں سر پھوڑا جائے؟" اس کے بشرے پر اداسی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

"تمہارے لب و لہجے سے مایوسی کی بُو آ رہی ہے!"

"ان حالات میں تو مسکرانا بھی گناہ معلوم ہو رہا ہے۔" وہ بولا۔ "ہم ایک مرتبہ پھر ایسے بند کمرے میں آ پہنچے ہیں جہاں چاروں طرف پتھر کی دیواریں ہیں۔"

"نکاسی کی راہ ضرور ملے گی۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "مگر حوصلہ رکھنا ضروری ہے، ہو سکتا ہے کہ ابوسلطان زندہ ہو۔"

وہ میرا ہاتھ تھام کر اضطراری انداز میں ایک طرف لے گیا اور تیز مگر سرگوشیانہ لہجے میں غرّایا: "تم مجھے بہلا رہے ہو؟"

"اگر مرنے والا وہی تھا تو میری رائے میں اسے امیر بننے کا کوئی حق نہ تھا۔"

"تو کیا وہ ہتھیار ڈال کر خود کو ان بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا؟"

"ان حالات میں ہر سمجھ دار آدمی یہی کرتا۔"

"وہ اسے چند روز میں ہی سُولی پر ٹانگ دیتے.....!"

"چند روز تو مل جاتے نا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اس مدت میں فرار کا امکان تو ضرور باقی رہتا۔"

"یہ مقدّر کی بات ہوتی ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "اگر تم بدترین اور جان لیوا ماحول سے بھی فرار میں کامیاب ہوتے رہے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص خود کو اتنا ہی خوش نصیب سمجھتے ہوئے زندگی بھر کا قیدی بن جائے۔"

"اب گھر واپس چلو!" قدرے سکوت کے بعد میں نے نرمی سے کہا۔

"کس کے گھر؟" اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"رفیق کے گھر!" میں نے کہا۔ "مجھے گھور کیوں رہے ہو؟ شاید عابدہ کے بارے میں تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔"

"جو تم نے کہا وہ میں نے مان لیا، ہم..... مگر نہ جانے کیوں میں عابدہ کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ تمہارا دل صاف ہے مگر میں نے ایک غیر جانبدار تماشائی کی طرح اس کی نگاہوں میں تمہارے لئے بے انتہا پسندیدگی دیکھی ہے! میں تمہیں بھی مشورہ دوں گا کہ اب ادھر کا رُخ نہ کرو!" اس نے جھجکتے ہوئے کہہ ہی ڈالا۔

"وہ تمہارے دوست کا گھر ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم وہاں نہ گئے تو اس راستے پر میرا کیا کام۔ مگر تمہاری باتوں نے میرا دل دُکھایا ہے، تم عابدہ کو غیر ضروری اہمیت دے رہے ہو حالانکہ وہ رفیق کی محض داشتہ ہے جو کبھی بھی بدلی جا سکتی ہے۔"

"مگر وہ برسوں سے ساتھ رہ رہے ہیں۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "ان میں میاں بیوی جیسی چاہت اور ہم آہنگی ہے۔"

اس کے الفاظ نے مجھے پھٹ پڑنے کا موقع فراہم کر دیا۔ "میاں بیوی کے مقدس رشتے کو گالی نہ دو ہاشم، اگر ان میں اسی قدر خلوص ہوتا تو وہ اب تک شادی کر چکے ہوتے، چند ٹکوں یا چند لمحوں کے لئے آشنائی کرنے والی کبھی اس مقدس رشتے کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ جو میاں بیوی کے درمیان پروان چڑھتا ہے اور وہ تو اسٹیج پر ناچنے والی ہے، دن میں نہ جانے کتنے لوگوں کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتی ہو گی، تم کہاں تک رفیق کی آبرو کو محفوظ کرتے پھرو گے؟"

میں نے براہِ راست کچھ کہے بغیر اپنے دل کا غبار نکال دیا۔ جب سے ہاشم نے عابدہ کے بارے میں بات چھیڑی تھی، میں اندر ہی اندر خود کو لٹا سا محسوس کر رہا تھا مگر دل ہلکا ہو جانے کے بعد وہ بے بنیاد سی شرمساری جاتی رہی تھی۔

"شاید تم درست کہتے ہو۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔ "میں اس ماحول کا عادی نہیں ہوں۔ غلطی میری ہے، مجھے تم سے براہِ راست اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ مگر تم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے!"

"شاید اس کے بغیر تم قائل بھی نہ ہوتے!" میں اس پر بُری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ "وہ کس لئے ساتھ رہتے ہیں؟ رفیق بے روزگار ہے اور تم غور کرو تو وہ عابدہ کی کمائی پر ہی پل رہا ہے، اس نے یقیناً عابدہ

کو بہت سی ناگفتنی رعایتیں دی ہوئی ہوں گی اور تم ..... تم نے اس عورت کی خاطر میرے دامن پر داغ لگانے کی کوشش کی ہے!"

"تم مجھے غلط سمجھے ہو۔" اس نے مضبوطی سے میرا بازو دبوچ لیا۔ "میں بات اتنی زیادہ بڑھانی نہیں چاہتا تھا، مجھے معاف کر دو، ہم ابھی کے گھر چلیں گے۔"

"میں رفیق سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے سیتا کا..... میک اپ اپنی مرضی سے کیا تھا یا کسی تصویر کے مطابق مگر اب میں ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔" میں نے ملامت آمیز اور اداس لہجے میں کہا۔

"اس بات کو اتنا طول نہ دو!" وہ چلتے چلتے رک گیا، اس وقت ہمارے اردگرد اکا دکا ہی راہگیر دکھائی دے رہے تھے۔

"اپنی باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "تم نے بہت بڑی بات کہی ہے اور مجھے اس پر برا ماننے کا پورا حق ہے!"

"میں کہہ رہا ہوں معاف کر دو مجھے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "ورنہ سچ مچ تمہارے سر میں گولی مار کر خودکشی کر لوں گا۔"

"میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس کی آواز بدستور گلوگیر تھی۔ "اور یہ بھی سمجھ گیا ہوں کہ میں نے چاند پر کیچڑ اچھالنے کی نادانستہ حماقت کی تھی مگر اب مجھے زیادہ شرمسار نہ کرو، ختم کرو اس ناگوار قصے کو۔"

"میری طرف سے ختم ہی سمجھو۔"

"تو پھر رفیق کے گھر چلو!"

"یہ ہرگز نہیں ہو گا۔" میں نے سختی سے انکار کر دیا۔

"میں اسی وقت تمہارا دل صاف سمجھوں گا جب تم میرے ساتھ وہاں چلو گے!" اس کا لہجہ خوشامدانہ ہو گیا۔

میرا انکار جاری رہا اور وہ اصرار کرتا رہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کافی رد و قدح کے بعد مجھے اس کے ہمراہ رفیق کے گھر کی طرف روانہ ہونا ہی پڑا۔

گھر پہنچے تو رفیق غائب تھا اور عابدہ موجود تھی۔

میں نے ہاشم کی گفتگو کے انتقامی ردعمل کے طور پر عابدہ کی دلآویز مسکراہٹ کا جواب نہایت فراخ دلی سے دیا۔

اس سے پہلے کئی مرتبہ میں نے عابدہ کی کھلی دعوت کو ٹھکرایا تھا کیونکہ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اس کا ایک ایسے شخص سے تعلق تھا جس نے مجھے مہمان سمجھ کر برے وقت میں مجھے اپنی چھت کے نیچے پناہ دی تھی۔

مگر اب میں عابدہ کے لئے اپنے وجود میں درندگی ابھرتی محسوس کر رہا تھا۔

میں کوئی پاکباز شخص نہیں تھا مگر میں نے ہمیشہ اپنی حدود کا پورا لحاظ رکھا تھا لیکن ہاشم نے مجھ پر اپنی حدود سے تجاوز کا الزام لگا کر میرے گرم لہو میں ایک منفی اور وحشیانہ ردعمل پیدا کر دیا تھا، اس کی شرمندگی اور معذرت بھی فرو نہ کر سکتی تھی۔

"رفیق کہاں ہے؟" میں نے مسکرا کر سوال کیا تو میری نگاہ اس کے حسین رخساروں پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے کوئی بھیڑیا سب سے پہلے اپنے شکار کو گھورتا ہے!

"آتا ہی ہو گا۔" وہ داہنی آنکھ دبا کر بولی اور میرا خون یک بارگی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

ہاشم شروع ہی سے سر نیچے جھکائے بیٹھا تھا لہٰذا اسے میری مسکراہٹ کی خبر تھی نہ عابدہ کی چشمک زنی کی جبکہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ ان تفصیلات کو بغور دیکھے اور مسلسل ندامت میں مبتلا رہے۔

"شاید انعام کی رقم ٹھکانے لگانے کا عمل شروع ہو گیا ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو، اسے کیوبا کے قیمتی سگار ہمیشہ سے پسند ہیں، وہی لینے کے لئے گیا ہے۔"

"اسے مہنگے شوق کرنے کا حق حاصل ہے۔" میں نے ہلکی سی انگڑائی لے کر کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر سوال کیا اور ہاشم بھی گھبرا کر میری طرف متوجہ ہو گیا شاید اسے ڈر ہو گا کہ میں عابدہ سے کوئی بدکلامی نہ کر گزروں حالانکہ اس وقت تو میں اس سراپا نازک کے سامنے سرتاپا نیاز بنا ہوا تھا!

"تم جیسی ..... یعنی سمجھ دار بیوی کے ہوتے ہوئے آدمی کو کوئی فکر نہیں ہونی چاہئے۔" میں نے ذومعنی بات کہتے کہتے ارادتاً وضاحت کر ڈالی۔ "اس معاملے میں رفیق بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔"

"قہوہ نہیں پلاؤ گی؟" ہاشم نے موقع پاتے ہی ہماری گفتگو کا تسلسل توڑ دیا۔

"ابھی لائی۔" عابدہ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

"تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟" تنہائی میسر آتے ہی ہاشم نے مجھ سے بے بسی کے ساتھ سوال کیا۔

"کس سلسلے میں؟" میں دانستہ انجان بن گیا۔

"عابدہ سے بات کرتے ہوئے تمہارے تیور جارحانہ تھے!" اس کے لہجے میں بے بسی کے ساتھ ہی شکایت کا عنصر بھی ابھر آیا۔

"وہ پہلے روز سے ہی میرے لئے چیلنج بنی ہوئی ہے۔" میں نے کہہ ڈالا۔ "میرے انداز گفتگو کا تمہارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"وہ تمہارا اور عابدہ کا معاملہ ہے، مجھے درمیان میں نہ لاؤ۔"

"ٹھیک ہے احتیاط کروں گا!" میں نے سرسری طور پر کہا۔

اس وقت مجھے ہاشم سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی۔

ہم دونوں خاموش اور اپنے اپنے خیالات میں گم سگریٹیں پھونکتے رہے۔ ہم دونوں کے درمیان عابدہ کی وجہ سے ایک غیرمحسوس سی دیوار حائل ہو چکی تھی جسے گرانا ہاشم کے بس کی بات نہیں تھی اور مجھے اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی بھی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک ہی دھن سوار تھی کہ عابدہ کی ہر دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا جائے۔

"میری طرف سے تمہارا دل ابھی تک صاف نہیں ہوا ہے!" کچھ دیر کے بوجھل سکوت کے بعد ہاشم نے سکوت توڑا۔

"تلوار کے زخم جلدی بھر جاتے ہیں مگر الفاظ کے گھاؤ بڑا وقت لیتے ہیں۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "رفتہ رفتہ تمہاری شکایت جاتی رہے گی، ویسے میں دانستہ تمہارے ساتھ مخاصمانہ رویہ اختیار نہیں کر رہا۔"

"اس بار مجھے اپنی زندگی کا ایک اہم ترین تجربہ حاصل ہوا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"نجی موضوعات پر کسی قریبی دوست سے بھی کھل کر بات نہ کرنی چاہئے۔" اس نے کہا۔ "ورنہ کسی غلطی کا مداوا ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اس موضوع کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"میرے لئے تمہاری خوشنودی سب سے زیادہ عزیز ہے!"

"تم نے جنرل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" میں نے اس کا دھیان بانٹنے کی نیت سے ایک نیا موضوع نکال لیا۔

"کون جنرل؟"

"جنرل احمد فواد!" میں نے اسے یاد دلایا۔

"آج کسی وقت بیروت سے احکام آ جائیں گے، ان ہی کی روشنی میں نئے اقدام کئے جائیں گے یا میں طرابلس واپس چلا جاؤں گا۔"

"میرا معاملہ تو خیر اس وجہ سے بگڑ گیا تھا کہ سیتا آخری ایام میں لیبی حکام کے عتاب کا نشانہ بن گئی تھی ورنہ میرا خیال ہے کہ تم لیبیا میں آزادی کے ساتھ کام کرتے ہو۔"

"لیبیا میں آزادی کا تصور قدرے مختلف ہے!"

"وہ کیسے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"وہاں مکمل آزادی کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں حائل ہوتی رہتی ہیں۔" گفتگو کا موضوع تبدیل ہو جانے پر وہ بھی خوش نظر آ رہا تھا۔

"مگر افواجِ آزادیٔ فلسطین کے ایک عہدہ دار کے لئے میزبان ملک کی سرکاری پالیسی کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی ہے!"

"بظاہر نہیں ہوتی لیکن عملاً ساری اہمیت اسی کی ہے!" ہاشم نے زور دے کر کہا۔ "یوں سمجھو کہ لیبیا کی حکومت استعمار، نو آبادیت اور استحصال کے خلاف چلنے والی ہر تحریک کی اصولی طور پر حمایت کرتی ہے خواہ وہ قطب شمالی میں ہو یا سوڈان میں اور اس ضمن میں وہ تخریب اور تشدد کو بھی جائز سمجھتی ہے مگر یہ غیرمشروط حمایت عملاً مشروط ہے کیونکہ صدر قذافی کے فیصلوں سے اتفاق نہ کرنے والے افراد کے ساتھ ہی ان کی تنظیمیں بھی لیبی حکومت کی حمایت سے محروم ہو جاتی ہیں لہٰذا لیبیا میں آزادی سے کام کرنے کے لئے مجھے وہاں کی حکومت کے ہر فیصلے اور موقف کی تائید میں داد و تحسین سے لبریز بیانات جاری کرنے پڑتے ہیں۔"

"یوں ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "اگر تم سر سہلا کر بھیجا کھانے کی استطاعت رکھتے ہو تو یہی کیا کم ہے۔"

"چند ماہ پہلے یہ بھی ہوا تھا کہ میری جدوجہد کے بعد صدر قذافی کے اہلکاروں نے ہمارے گروپ کی فوجی اعانت کے لئے چالیس لاکھ پاؤنڈ کی امداد منظور کی تھی اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی جاری ہو گیا تھا مگر تیسرے ہی روز کویت میں ایک فلسطینی رہنما کے "احمقانہ تنقیدی بیان" کی وجہ سے وہ امداد منسوخ کر دی گئی!"

"کس کی امداد منسوخ ہو گئی؟" عابدہ نے قہوے کی ٹرے سمیت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر سوال کیا۔

شاید اس نے ہاشم کے آخری الفاظ سن لئے تھے۔

"معذوروں کی ایک انجمن کا تذکرہ تھا۔" ہاشم نے جلدی سے بات بنائی۔ "پچھلے دنوں ان کا سرکاری چندہ روک دیا گیا۔"

"یہ تو بری بات ہے۔" وہ پیالیوں میں گرم گرم قہوہ انڈیلتے ہوئے بولی۔ "اب تو شاید رفیق ہی ان کی کچھ مدد کر سکے گا، کون لوگ چلاتے ہیں اس انجمن کو؟"

"میرے دوست ہیں۔" ہاشم کو کہنا پڑا۔ "ان کا دس بیس ہزار پاؤنڈ سے بھی کچھ بھلا نہ ہو سکے گا۔"

"لکھ پتی معلوم ہوتے ہیں وہ لوگ!" عابدہ نے قہوے کی ایک پیالی ہاشم کی طرف بڑھاتے ہوئے قہقہہ مار کر کہا۔

"معذوروں اور مسکینوں کی دیکھ بھال ہمارے جیسے متوسط لوگوں کا کام بھی نہیں ہے۔" میں اس کی تائید کرنے میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔

"معذوروں تک تمہاری بات درست ہے، مسکینوں کو اس میں شامل نہ کرو، میں ان کی خاصی مدد کر چکی ہوں۔"

"کن مسکینوں کا ذکر ہے؟" ہاشم نے اسے وہیں الجھا لیا۔

"ہندی مسکین!" وہ استہزائیہ انداز میں زور سے ہنس پڑی اور اس وقت پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عرب نژاد افراد ہندوستانی باشندوں کو بلا کسی تخصیص کے مسکین کہہ کر پکارتے تھے!

"کیا قصہ تھا؟" میں نے اپنے فطری تجسس کے تحت سوال کیا۔

"پچھلے دنوں دمشق میں ہند کے یوم آزادی کے موقع پر ایک ہندی مسکین نے ورائٹی شو منعقد کیا تھا جس میں شرکت کے لئے مجھے

دو طرفہ ٹکٹ اور مفت قیام و طعام کے علاوہ اس نے چھ ہزار پاؤنڈ نقد دیئے تھے، سنا ہے کہ ساری ادائیگیوں کے بعد اسے ڈیڑھ ہزار مصری پاؤنڈ کے مساوی رقم بچی تھی جس پر وہ بے حد مسرور تھا۔"

عابدہ کو ملنے والی مراعات و معاوضے سے صاف ظاہر تھا کہ اسٹیج پر اسے اپنے جسم کی بے حجاب نمائش پر آمادہ کیا گیا ہوگا مگر اس وقت میں نے وہ پہلو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس گم نام ہندی مسکین کی مدافعت میں ایک فقرہ کہہ گیا "ہو سکتا ہے کہ اسے ڈیڑھ ہزار پاؤنڈ سے زیادہ کامیاب پروگرام کی خوشی ہو!"

"یہ تم اسی لئے کہہ رہے ہو کہ ان سے ناواقف ہو۔" وہ سنجیدہ ہوگئی "ٹیلوگ کوڑیوں کے عوض اپنی ہر چیز داؤ پر لگا دیتے ہیں۔"

عابدہ کا تعلق ایک مختلف جغرافیائی خطے سے تھا جبکہ ہندی کسی حد تک میرے اپنے علاقے کے لوگ تھے لہٰذا میں تلملا گیا اور ہاشم کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے ایک بالواسطہ حملہ کر ڈالا۔

"کسی قوم کو بُرا نہ کہو عابدہ! میں ایسے مصریوں سے واقف ہوں جو اپنے حلوے مانڈے کے لئے اپنی محبوباؤں کو لمحوں کی سوداگری پر اکساتے رہتے ہیں۔"

وہ بہت چالاک تھی لہٰذا میرے تبصرے پر کھلکھلا کر ہنس پڑی "ہندیوں سے بہت ہمدردی ہے تمہیں؟"

"میری محبوبہ ایک ہندی لڑکی ہے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اور میں اس کی پاک دامنی کی قسم بھی کھا سکتا ہوں!"

ہاشم جو اس وقت تک ہکّا بکّا بیٹھا ہم دونوں کی بحث سن رہا تھا۔ اس نازک موڑ پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

شاید اس نے اندازہ لگا لیا کہ عابدہ سے بات کرتے کرتے میرے جذباتی دھارے کا رُخ سیتا کی طرف ہو گیا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر عجلت آمیز لہجے میں کہا "ایک آدھ فرد کے کردار کو کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔"

"تمہارا دوست بہت زیادہ آتش مزاج ہے۔" عابدہ ہنس کر بولی۔ اس پر میرے گہرے طنز کا بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔

"کوئی بھی شخص اپنی محبوبہ کے وطن کی بُرائی برداشت نہیں کر سکتا۔" ہاشم نے مصالحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟" عابدہ نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اچھے لوگ بُری باتوں کا بھی بُرا نہیں مانتے!" میں اپنے ذہن میں ابھرنے والی تلخی کو کوشش کے باوجود نہ چھپا سکا۔

"حسین و جمیل ہندی عورتیں عرب ملکوں کو سونے کی کان سمجھ کر گھریلو خادماؤں کے طور پر یہاں آتی ہیں اور پھر اپنی بے حجاب اداؤں کے سہارے کسی عرب کی محبوبہ یا تیسری چوتھی بیوی بن جانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں!"

"تمہارے حق پر ڈاکا ڈالتی ہیں؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"اگر تم دونوں کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے تو مجھے اجازت دو تاکہ میں رفیق کو ڈھونڈ لاؤں۔" ہاشم فیصلہ کن انداز میں اٹھا۔

"عابدہ کو ان باتوں میں مزہ آرہا ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم رفیق کی غیر موجودگی میں اس کے دوستوں سے ایسے موضوعات پر بات کرو!" ہاشم نے ملامت آمیز لہجے میں عابدہ سے کہا۔

"یہ میرے اور رفیق کے باہمی اعتماد کا معاملہ ہے۔" عابدہ نے ... سے کہا۔ "مجھے اخلاق کی تربیت کی ضرورت نہیں ہے!"

"پھر میرا جانا ہی بہتر ہے!" ہاشم نے خشک لہجے میں کہا اور ... سے مڑ کر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

نہ میں نے اسے روکا اور نہ ہی عابدہ نے اسے ٹوکنے کی ضرورت سمجھی۔ وہ چند ثانیوں تک نکاسی کے راستے کی طرف دیکھتی رہی ... والہانہ انداز میں ہنس پڑی۔

"پاگلوں کی طرح کیوں ہنس رہی ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

"جل گیا۔" وہ بدستور ہنستے ہوئے بولی "یہ برداشت ... کہ اس کے دوست کی بیوی کسی اور سے ہنس کر بات کرے!"

"اور اگر اس نے رفیق سے شکایت کر دی؟"

"وہ ہاشم کے سامنے جو چاہے اداکاری کر لے مگر میرے ... مارنے کی جرأت بھی نہ کر سکے گا۔"

"میں نے یہاں رُک کر غلطی کی۔ مجھے بھی اسی کے ساتھ جانا تھا۔" میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نشست چھوڑتے ہوئے کہا۔

"جانے تو نہیں دوں گی۔" وہ لپک کر میری راہ میں حائل ہو گئی۔ "عورت کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ نکلنا مردانگی نہیں بزدلی ہے۔"

"مجھے احمق نہ بنا سکو گی۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "... لئے رفیق ہی مناسب ہے یا پھر تمہارے اپنے تلاش کئے ہوئے ...۔"

"تمہیں بھی میں نے ہی تلاش کیا تھا۔" وہ میرے قریب ...

"ہاشم تو نہ جانے کہاں سے ہمارے درمیان آ ٹپکا؟"

"تمہاری دہلیز اسی نے دکھائی ہے!"

"تو پھر اس دہلیز کے نمک سے کیوں پرہیز کر رہے ہو؟"

اس نے اپنے جارحانہ رویّے سے میرے ... میں اشتعال کا ایک ایسا جوالا مکھی بیدار کر دیا تھا جسے کوئی ... بھینٹ ہی سرد کر سکتی تھی۔

میرے ذہن سے رفیق اور ہاشم کا تصوّر بالکل ہی فرد ...

میری آنکھوں کے سامنے اس وقت صرف ایک للکارتا ہوا وجود باقی رہ گیا تھا جس کا گھمنڈ پاش پاش کرنا اس وقت میرے لئے اہم ترین معرکہ تھا۔ میں نے خود کو ان سنگین لمحات سے بچا لینے کی سر توڑ کوشش کی تھی مگر عابدہ نے میری ایسی ہر خواہش کو یوں پامال کیا کہ میں اسے بُری طرح پامال کرنے کے باوجود بھی حیوانی انتقام کی آگ سے نجات نہ پا سکا۔

کچھ دیر بعد رفیق آگیا۔

اس کے پیچھے ایک حمال بھی تھا جس کے سر پر لدی ہوئی ٹوکری نباتات کے سامان سے بھری ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

میں نے عابدہ پر نگاہ ڈالی اور اسے قدرے شرمسار دیکھ کر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

"ہاشم نہیں ملا تمہیں؟" عابدہ نے اس سے سوال کیا۔

"ہاشم؟ کہاں ہے وہ؟" رفیق نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہیں ڈھونڈنے نکلا تھا کچھ دیر پہلے۔" میں نے کہا۔ "میری اور عابدہ کی بحث سے بوکھلا کر بھاگ نکلا تھا۔"

"تم تو صرف سگار لینے گئے تھے؟" عابدہ نے باربرداری کی ٹوکری کا جائزہ لیتے ہوئے چالاکی کے ساتھ میری بات کاٹ دی۔

"کچھ چیزیں تمہارے لئے بھی لے آیا۔" رفیق کا انداز والہانہ تھا۔

اس نے مزدور کو اجرت دے کر رخصت کیا تو عابدہ سامان سمیٹنے میں مصروف ہوگئی اور میں رفیق کو تخلیئے میں لے گیا۔

"صبح ہم تم سے ایک بات پوچھنی بھول گئے تھے!" میں نے سنجیدہ اور دھیمے لہجے میں کہا۔ "تم نے جس لڑکی کا میک اپ کیا، وہ واقعی سیتا تھی؟"

وہ ہنس پڑا۔ "یہ تو میں نے صبح ہی بتایا تھا، وہ سو فیصدی سیتا ہی تھی مگر تم اور ہاشم اس کے معاملے میں زیادہ پُرجوش نظر آرہے ہو!"

"اس کی صورت تم نے اپنی مرضی سے تبدیل کی تھی؟" میں نے اس کا تبصرہ نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے ایک تصویر دی گئی تھی۔" میرے سوال پر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے اسے کافی حد تک تصویر والی کا ہم شکل بنا دیا تھا۔"

"تم اس کا بدلا ہوا حلیہ بتا سکو گے؟" میں نے پوچھا۔ ویسے اس کا جواب سن کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف تصویر کے بجائے کسی پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر کا حوالہ دے گا۔

"خدوخال میں کوئی بڑی تبدیلی تو ناممکن تھی۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ "قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ مجھے اس سرخ و سفید عورت کی جلد کو سیاہی مائل کرنا پڑا۔"

"مصری تو زیادہ تر گندمی......!"

اس نے میرا مفہوم سمجھ کر میری بات درمیان ہی سے اچک لی۔

"مصری نہیں، اس رنگ و روپ میں وہ کسی سوڈانی قبیلے سے متعلق نظر آرہی تھی، میں نے اس کے بالوں کی ترتیب بدلنے پر بڑی محنت کی تھی۔"

"کوئی اور بات؟" میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

"میں سوڈانیوں کے درمیان رہا ہوں اور وہ ان سے کافی مانوس نظر آرہی تھی...... لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں اس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

"میں ہاشم کے ایما پر اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہوں۔" میں نے فوری طور پر دفاعی انداز اختیار کر لیا۔ "اگر ہاشم تمہاری تلاش میں نہ نکل جاتا تو میں یہ سوالات بھی نہ کرتا مگر اس وقت عابدہ مصروف ہے، اس لئے میں نے تخلیئے کا فائدہ اٹھا لیا۔"

"تم بھی تو کچھ نہ کچھ جانتے ہوگے؟" اس نے زور دے کر کہا۔ "میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ کوئی لمبا معاملہ ہے ایسا نہ ہو کہ ہاشم بے چارہ بے موت مارا جائے!"

"وہ ذاتی تحفظ کو داؤ پر لگانے والوں میں سے نہیں ہے!" میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ دیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ آج کل فلسطینی گروپوں کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ ملوّث ہو گیا ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "مجھ میں اس سے براہِ راست اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہیں ہے لیکن تم اس کے دوست ہو تو اسے روکو۔ آج کل کے حالات بہت نامساعد ہیں۔ وہ کسی چکّر میں پھنس گیا تو مجھے بڑا قلق ہوگا۔"

"میں کوشش کروں گا۔"

پھر عابدہ بھی ہم دونوں کے ساتھ شامل ہو گئی اور خوش گپیوں کے دور کا آغاز ہو گیا۔ اس دوران میں میں نے عابدہ کے رویّے میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی کہ وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

پھر کھانے کا وقت ہو گیا مگر ہاشم کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

عابدہ کی رائے ہم دونوں سے مختلف تھی اور ہمارا خیال تھا کہ کھانے کے لئے ہاشم کی واپسی کا انتظار کیا جائے مگر عابدہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، مجھے ہاشم کے بارے میں تشویش ہوتی جا رہی تھی اور میں سنجیدگی سے ان امکانات پر غور کرنے لگا تھا کہ اگر ہاشم کسی دشواری میں گھر گیا یا اس نے دانستہ عابدہ کے مکان پر واپس نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تو میں اپنے قیام کے لئے کدھر کا رُخ کروں گا اور میری حکمتِ عملی کیا ہوگی!

لیکن ہاشم کی روپوشی کے بارے میں میرے تمام خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے اور کھانے کے اختتام پر وہ آ پہنچا۔

اس کی حالت خاصی ابتر تھی، بشرے سے تکان کا اظہار ہو رہا

تھا اور چال میں خفیف سی لنگڑاہٹ آگئی تھی۔
"کہاں رہ گئے تھے؟" اسے دیکھتے ہی عابدہ نے سوال کیا۔
"رفیق قریبی بازار میں نہیں ملا تو میں اپنے ضروری کام سے آگے چلا گیا۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کرسی میں ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔
عابدہ اس کے لئے کھانا لینے گئی تو ہاشم نے آگے جھک کر آہستہ سے کہا: "باہر جانا میرے لئے دشوار ہے، کیا ہم دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے تنہائی میسر آسکے گی!"
"ہاں، ہاں،" رفیق نے فراخ دلی کے ساتھ کہا: "تم کھانا کھالو، میں ابھی اسے باہر لے جاؤں گا، مگر بات کیا ہے؟"
"کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" ہاشم نے معذرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ گول مول جواب دیا: "میں تمہیں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔"
"تمہاری مرضی، مگر میں بھی تمہارا خیرخواہ ہوں۔" رفیق نے شانے اُچکا کر نرم اور دوستانہ لہجے میں کہا۔
"میں جانتا ہوں اور تمہارے جذبات کی قدر بھی کرتا ہوں۔" ہاشم نے کہا: "مگر میں تمہارے تفکرات میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔"
کھانا آیا اور ہاشم خاموشی سے فارغ ہو گیا۔ عابدہ نے دو تین بار اسے اکسانا چاہا لیکن وہ ہر بار گفتگو کو اختصار کے دائرے میں رکھنے میں کامیاب رہا۔
کھانے کے بعد رفیق واقعی عابدہ کو لے کر کہیں روانہ ہو گیا۔
"تم مجھ سے کیا سننے کی توقع کر رہے ہو؟" تخلیہ میسر آجانے کے بعد ہاشم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔
"کوئی کہانی ـــ دشواریوں اور مشکلات سے پُر!" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
"کیسے اندازہ لگا لیا تم نے؟" وہ متحیر رہ گیا۔
"تمہاری چال کی خفیف سی لنگڑاہٹ نے بہت کچھ بتا دیا ہے!"
"تو کیا میں لنگڑا رہا تھا؟" اس نے بوکھلا کر سوال کیا۔
"سامنے کی بات ہے!"
"مگر رفیق یا عابدہ نے اسے محسوس نہیں کیا ورنہ عابدہ ضرور طعنہ دیتی، میرے بارے میں اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔"
"میں تمہاری کہانی سننے کے لئے بے چین ہوں!"
"شاید تمہیں یقین نہ آئے۔" اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لے کر کہا: "تمہاری باتوں نے مجھے الجھن میں ڈالا تھا اور مجھے ابوسلطان کے انجام کی جستجو تھی۔ اسی بھاگ دوڑ میں ایک گنجان علاقے میں دو غنڈوں نے مجھے بلاوجہ گھیر لیا۔ اور خاصی مرمت کے بعد چھوڑ کر رفوچکر ہو گئے میں ان کی اس حرکت کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکا۔"
"بلا سبب مرمت؟" میں نے حیرت سے سوال کیا
"ہاں وہ ناگہانی پیچھے سے مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے اور پھر مغلظات بکتے ہوئے مجھ پر مکوں اور لاتوں کی یلغار کر دی!"
"مقامی ہی تھے؟"
"یہ دیکھنے کی مہلت ہی نہ مل سکی، البتہ ہٹے کٹے عرب تھے۔ انہوں نے تو آناً فاناً میں شدید ضربیں لگائیں اور جتنی دیر میں میرے اوسان بحال ہوتے وہ ہاتھ پاؤں جھاڑ کر بھیڑ میں غائب ہو چکے تھے!"
"قرب و جوار کے لوگوں سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا؟"
"وہ سب اتنی سرعت سے ہوا کہ لوگ مجھے کچھ بتانے کے بجائے الٹا جرح کرنے لگے تھے لہٰذا میں نے وہاں تماشا بننے کے بجائے واپس چلے آنے میں ہی عافیت سمجھی!"
"ایک بات تو طے ہے کہ وہ سرکاری آدمی نہیں تھے۔"
"یہ کیسے کہہ دیا تم نے؟ مجھے تو سب سے زیادہ ڈر اسی بات کا ہے۔" اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔
"سرکاری اہلکار ہوتے تو یوں مار دھاڑ کر کے فرار نہ ہوتے، پورے اختیارات کے ساتھ تمہارے سینے پر سوار ہو جاتے!"
"میری پسلیاں ابھی تک دُکھ رہی ہیں۔" وہ آہستہ سے بڑبڑا کر بولا: "ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کی ہو۔"
"ایسا ہوتا تو پہلی بات یہ ماننی پڑے گی کہ وہ لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ہراساں کیا گیا تھا تو اس کا ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ تم بوکھلا کر اپنے کسی اہم ترین ٹھکانے کا رُخ اختیار کرو اور وہ ان پر ہاتھ ڈال سکیں۔"
وہ چونک کر کرسی میں سیدھا ہو گیا: "یہ تو میں نے خیال ہی نہیں کیا، ہو سکتا ہے کہ یہاں تک میرا تعاقب کیا گیا ہو۔"
"اگر تعاقب کیا گیا ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہوتا۔" میں نے اس کے خیال کی نفی کی۔
"وہ ایک پُرہجوم گزرگاہ پر مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے۔" وہ بولا: "میں مان ہی نہیں سکتا کہ وہ کوئی اتفاق تھا یا وہ کوئی بے مقصد حرکت تھی۔"
"ایک امکان اور بھی ہے۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔
"وہ کیا؟"
"ابوسلطان کی تلاش میں تم کہاں کہاں گئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔
"اخوان الصفا کے کم از کم تین مصدقہ ارکین سے مل چکا ہوں۔"
"اور ان سے کیا اطلاعات ملیں؟"
"ابوسلطان کے بارے میں ہر ایک نے لاعلمی ظاہر کی۔" وہ آہستہ سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔
"اب یوں سوچو کہ ابوسلطان زندہ ہے.....!" میں نے شروع کیا مگر ہاشم نے میری بات کاٹ دی۔

"مگر وہ تو مر چکا ہے؟"
"فرض کرو کہ وہ زندہ ہے۔" میں نے زور دے کر کہا: "حکام سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے اسے مار لیا۔ ان حالات میں اگر کوئی اس کی تلاش شروع کر دیتا ہے تو اس کے جاں نثار یہی سمجھیں گے کہ اس طرح مقامی حکام بھی دوبارہ اس کی بُو پر لگ جائیں گے۔ دوسری طرف ابوسلطان کے حامی یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کی تلاش میں مصروف آدمی دشمن نہیں بلکہ ممکنہ دوست ہے لہٰذا انہوں نے براہِ راست سامنے آکر مشورہ دینے کے بجائے اس شخص کی مرمت پر اکتفا کیا تاکہ وہ تلاش کا عمل فی الحال معطل کر دے۔"
"اتنی گہری سوچ اخوانیوں کے بس کی بات نہیں۔" اس نے کہا: "ان کی پوری تحریک دو تین دماغوں پر چل رہی ہے جنہیں بے شمار اندھے پیروکار ملے ہوئے ہیں۔"
"یہ تو طے ہے کہ وہ سرکاری آدمی نہیں تھے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا: "اور اگر تم انہیں اخوانی بھی نہیں مانتے تو وہ تمہارے کسی نجی دشمن کے بھیجے ہوئے کرائے کے بدمعاش تھے۔"
"قاہرہ میں میرا کوئی دشمن نہیں ہے!" اس نے کہا: "میں ذاتی مراسم میں ہمیشہ سے محتاط روی کا عادی ہوں!"
"اس وقت ہمارے سامنے صرف دو نام ہیں۔" میں نے کہا: "ابوسلطان اور جنرل فواد! ان کے علاوہ تیسرا کوئی حریف نہیں ہے۔"
"تم اس نکتے پر اس قدر زور کیوں دے رہے ہو کہ ابوسلطان زندہ ہے؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔
"مرنے والے نے جو ستارہ جذباتی انداز اختیار کیا وہ کسی پختہ کار آدمی کے رویّے سے میل نہیں کھاتا۔"
"تم یوں بھی تو سوچ سکتے ہو کہ ابوسلطان بوکھلاہٹ کے عالم میں شایانِ شان طور پر نہ مر سکا۔"
"میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ بس تمہاری باتیں سن کر اپنے ذہن میں اس کی ایک تصویر بنائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر توجہ دینی چاہئے۔ یہاں شاید موت کے اسباب کے ساتھ ہی متوفی کی شناخت کا مرحلہ بھی مُردہ خانے میں طے ہوتا ہو!"
"یہ تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔" وہ پُرجوش انداز میں پہلو بدل کر بولا: "ابوسلطان فوجیوں کی گولیاں کھا کر فرش پر گرا اور پھر اس کا بدن ایک دھماکے سے چیتھڑوں میں تبدیل ہو گیا۔"
"اب تو میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔" میں نے پُرزور لہجے میں کہا: "فلیٹ پر اس وقت ابوسلطان کے علاوہ اس کا کوئی جاں نثار بھی موجود تھا جب تم نے اسے فون کیا تھا۔ بعد میں خطرہ بھانپتے ہی ابوسلطان فرار ہو گیا۔"
"یہ تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔" اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا: "تمہارا اندازہ بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مرنے والے نے مرتے مرتے اسی لئے اپنی ذات پر کوئی گرینیڈ وغیرہ آزما لیا کہ اس کی شناخت نہ ہو سکے اور یہی سمجھا جائے کہ وہاں مرنے والا شخص ابوسلطان ہی تھا۔"
"سوڈان میں تو تم نے بتایا کہ اخوان الصفا خلافِ قانون ہے مگر مصر میں اس کی کیا حیثیت ہے؟" میں نے سوال کیا۔
"مصر میں بھی وہ لوگ زیرِ عتاب ہیں!" اس نے کہا: "یہ فرق ضرور ہے کہ یہاں سرکاری اہلکار شکاری کتوں کی طرح ان کا پیچھا نہیں کرتے۔"
"اتنی پابندیوں کے باوجود وہ تحریک کیسے زندہ ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا: "انہیں سرمایہ کہاں سے ملتا ہے؟"
"میں نے تمہیں لیبیا کے رجحانات کے بارے میں بتایا تھا۔" اس نے کہا: "وہی اخوان الصفا کا سب سے بڑا سرپرست ہے۔ وہ لوگ دائیں بازو کے انتہا پسندوں کی بھی کھل کر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"
"اگر یہ سب درست ہے تو شاید جلد ہی ابوسلطان سے تمہاری ملاقات ہو سکے گی۔" میں نے اسے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔
"مگر کیسے؟"
"تمہاری مرمت کرنے والے اسے اپنے کارنامے سے ضرور آگاہ کریں گے اور وہ تم سے ملنے کی کوئی راہ نکال لے گا۔"
"اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، اس کے اپنے مسائل ہی بہت زیادہ ہیں۔" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔
"تمہارے فون اور پہنچنے کے درمیان اس کے فلیٹ پر چھاپہ مارا گیا تھا اور وہ شاید تمہاری وفاداریوں سے بھی باخبر ہے لہٰذا وہ جاننا چاہے گا کہ تم اس سے کس لئے ملنا چاہ رہے تھے اور اس معاملے کی کیا اہمیت تھی؟"
وہ اس معاملے پر مجھ سے خاصی دیر تک بحث کرتا رہا اور آخرکار میری رائے سے متفق ہو ہی گیا۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ اسے جنرل فواد کے بارے میں بیروت سے احکامات مل گئے تھے۔
افواجِ آزادیٔ فلسطین کے اعلیٰ اہلکاروں کی دانست میں جنرل کا وہ جرم ناقابلِ معافی تھا جو اس نے سیتا کی گرفتاری کے لئے پیٹر سالومن کو مصر مدعو کر کے کیا تھا۔
پیٹر سالومن کی ذاتی صلاحیتیں جو بھی رہی ہوں مگر بنیادی نکتہ یہ تھا کہ وہ اسرائیل کا تنخواہ دار سرکاری ملازم تھا اور اسے بلا کر عربوں کی اصولی خودداری پر ناقابلِ تلافی کاری ضرب لگائی گئی تھی۔
تنظیم کے قائدین اس معاملے کو مصری قیادت کے سامنے سفارتی سطح پر بھی اٹھانے کا ارادہ رکھتے تھے کیونکہ سرکاری پالیسی میں کسی بڑی تبدیلی کے بغیر جنرل کے لئے کوئی ایسا قدم اٹھانا ممکن نہیں تھا۔

مگر ہاشم کے لئے خفیہ حکم بہت واضح تھا اسے ہر قیمت پر جلد از جلد جنرل احمد فواد کا کام تمام کرنے پر مامور کر دیا گیا تھا۔

"الوسلطان سے رابطہ قائم ہونے تک میں جنرل احمد فواد کے شکار میں تمہارا ساتھ دوں گا لیکن اب ہمارا قیام کہاں ہوگا؟"

وہ الجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا پھر قدرے توقف کے بعد بولا: "یہاں رہنے میں کیا ہرج ہے؟"

"میں نہیں چاہتا کہ عابدہ کی وجہ سے تمہارے ساتھ دوبارہ کوئی تلخی پیدا ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہاں رہنے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ رفیق اخوان الصفا والوں کی نظروں میں آ چکا ہے۔" اس نے کہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اسے بھول جاؤ، عارضی طور پر وہ ان کے لئے کارآمد تھا، انہوں نے اس سے اپنا کام نکال لیا اب وہ اسے بھول چکے ہوں گے۔"

"پھر کوئی ہوٹل ہی تلاش کرنا ہوگا۔" وہ بہت فراخدل انسان تھا عابدہ کے سلسلے میں ہونے والی تلخ کلامی کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

ہمارے تبادلۂ خیال کے دوران ہی رفیق، عابدہ کے ساتھ واپس آگیا عابدہ لباس تبدیل کرنے چلی گئی، رفیق ہمارے پاس آگیا۔

"تم نے ہماری جو دیکھ بھال کی اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" ہاشم نے اس سے کہا: "اب ہم رخصت چاہیں گے۔"

"اس حالت میں؟"

"کیوں؟ کیا ہوا میری حالت کو؟"

"اس وقت میں نے عابدہ کے سامنے بات نہیں کی ورنہ تم آتے وقت لنگڑا رہے تھے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیلے کے چھلکے پر سے پاؤں پھسل گیا تھا۔" ہاشم نے کھسیائے ہوئے انداز میں ہنس کر بات بنا دی۔

"سب کچھ تمہاری سہولت پر منحصر ہے!" رفیق نے اس کا عذر قبول کرتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میرا تو اپنا ٹھکانا ہے، میں اپنے دوست کو تمہارے پاس لایا تھا، یہ کسی بھی وقت روانہ ہو جائے گا۔"

"مجھے امید ہے کہ تمہارے دوست کو کوئی تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "عابدہ ذرا منہ پھٹ ہے مگر دل کی بُری نہیں۔"

"وہ بہت اچھی میزبان ہے۔" میں نے اپنے دل کی گہرائی سے کہا۔ "میں اسے طویل عرصے تک نہ بھلا سکوں گا۔"

اور تھوڑی دیر بعد جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو عابدہ کو خاصی حیرت ہوئی۔ وہ بار بار عجیب انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی!

اور پھر اس نے مجھ سے چند ثانیے کے لئے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نکال ہی لیا۔

"اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو؟" اس نے شکایت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"قاہرہ میں رہا تو پھر آؤں گا۔"

"آج رات نو بجے میں میمفس میں تمہارا انتظار کروں گی!" اس نے عجلت آمیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"مم..... مگر۔" میں نے احتجاج کرنا چاہا۔

"بکواس مت کرو، تمہیں آنا ہوگا۔" وہ تیزی سے بولی۔ "میں تمہاری بہتری کے لئے کہہ رہی ہوں نہ آئے تو پچھتاؤ گے۔"

اس کے الفاظ پر میرے وجود میں سنسنی کی ایک سرد سی لہر سرایت کر گئی کیونکہ اس کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت پچھتاوے کا حوالہ دے کر وہ اپنے وجود کی سرور آگیں صفات نہیں بلکہ کچھ اور یاد دلانا چاہ رہی تھی!

ہم دونوں گھر سے نکلے تو کچھ دور تک رفیق ہمارے ساتھ آیا پھر ہم پیدل ہی ٹیکسی کی تلاش میں بڑھتے چلے گئے۔

عابدہ کی آخری گفتگو کے بارے میں کئی بار میں نے زبان کھولنی چاہی لیکن ہمت نہ کر سکا کیونکہ اس دل رُبا کی جانب سے میرے دل میں چور پیدا ہو چکا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ ہاشم اس گفتگو کو کوئی اہمیت دینے کے بجائے رنگ رلیوں کے پروگرام کا آغاز ہی تصور کرے گا۔

باہمی مشورے کے بعد ہم دونوں نے شہر کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں دو علیحدہ کمرے بک کرا لئے۔ ہوٹل کے رجسٹر میں میں نے اپنا نام فاروق لکھایا اور مستقل رہائش گاہ اسکندریہ میں ظاہر کی اس طرح میں ان شناختی جھمیلوں سے بچ گیا جو ایک غیر ملکی کی صورت میں پیش آسکتے تھے۔

میرے لئے وقت گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں عابدہ کی گفتگو پر جتنا غور کر رہا تھا اسی قدر میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی میں جلد از جلد اس سے مل کر وہ باتیں سننا چاہتا تھا جن سے محرومی کو اس نے پچھتاوا قرار دیا تھا۔

میں غیر یقینی کیفیت کا شکار تھا اور ساتھ ہی لاشعور میں عدم تحفظ کا احساس بھی کسی سیاہ بچھو کے زہریلے ڈنک کی طرح چبھنے لگا تھا۔

میرے پاس حفظِ ماتقدم کے طور پر زہریلے تیروں والی زیرِ استعمال شیشی ہی رہ گئی تھی جو کسی بھی لمحے جواب دے سکتی تھی۔

میں اضطرار کے عالم میں ہاشم کے پاس جا پہنچا۔

"کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟" اس نے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"طبیعت کچھ مضطرب سی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید چھٹی حس کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے جو ابھی تک میرے پلّے نہیں پڑ سکا۔"

"اکتاہٹ کا شدید حملہ معلوم ہوتا ہے!"

"کوئی ہتھیار ہے تمہارے پاس؟"

"کولٹ کا اعشاریہ دو پانچ کا خودکار ریوالور ہے۔ سائیلنسر سمیت؟"

وہ اچانک بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا: "آخر یک بیک تمہیں کیا سوجھی ہے؟"

"سوجھے گی تو ضرور بتاؤں گا۔" میں نے کہا: "سائیلنسر کے ساتھ تو ریوالور خاصا بڑا اور وزنی ہوگا؟"

"دیکھ لو!" وہ بریف کیس اپنے سامنے کھینچتے ہوئے بولا۔ "بالکل نئی چیز ہے، سائیلنسر الگ سے نہیں ہے، نالی میں ہی کوئی کرتب کیا گیا ہے، بند کمرے میں کئے جانے والے فائر کی آواز باہر نہیں سنی جا سکتی!"

اور وہ واقعی بہت سبک اور عمدہ ریوالور تھا۔ میں نے فاضل راؤنڈ جیب میں ڈال کر چری تسمہ ہاشم کو واپس دے دیا۔ ہولسٹر بھی غیر ضروری تھا۔

"اب تم کہاں جاؤ گے؟" ہاشم نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"اپنے کمرے میں!" میں نے کہا: "ریوالور محض احتیاطاً لیا ہے کیونکہ زہریلے تیروں والی شیشی کا چیمبر دیکھ کر پہلے سے اندازہ لگانا مشکل ہے پھر اس بے ضرر سی شیشی سے کسی کو دھمکایا بھی نہیں جا سکتا۔"

میں نے کچھ وقت اس کے پاس گزارا پھر کمرے میں لوٹ آیا۔ میں نے اس سے میمفس کے بارے میں پوچھنے کا ارادہ کیا تھا مگر باز رہا کیونکہ اس سوال پر وہ چونکنا ہو جاتا اور پھر شاید میرے تعاقب میں بھی ہو لیتا۔

آٹھ بجے میں خاموشی سے ہوٹل سے نکل گیا۔

اس روز قاہرہ بھیگی ہوئی سرد ہواؤں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ سڑکوں پر رونق میں خاصی کمی تھی!

میں تھوڑی دور تک چلنے کے بعد ایک ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

"کہاں جانا ہے؟" ڈرائیور نے خلافِ معمول میٹر نیچے کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میمفس!" میں نے یہ سمجھ کر کہہ دیا کہ وہ یقیناً کوئی مشہور جگہ ہوگی اور وہ نام سنتے ہی چل پڑے گا۔

"کلب یا ہوٹل؟"

اس کا سوال میرے دماغ پر وزنی ہتھوڑے کی طرح پڑا۔

عابدہ اسٹیج کی رقاصہ تھی لہٰذا کلب کی طرف ذہن جانا لازمی تھا مگر اس نے جس رازدارانہ لب و لہجے میں مجھے مدعو کیا تھا اس کی بنا پر میرا قیاس تھا کہ اس نے اپنے کسی ٹھکانے کا انتخاب نہیں کیا ہوگا۔

یہ سب چند سیکنڈ میں سوچ لینے کے بعد میں نے ڈرائیور کو کسی شبہ کا موقع دیئے بغیر اعتماد سے ہوٹل کہہ دیا۔

ہوٹل میمفس قدیم طرز کی ایک پُرشکوہ عمارت میں واقع تھا۔ میں پورچ میں ٹیکسی سے اترا تو میری رسٹ واچ پونے نو بجا رہی تھی۔

میں کرایہ ادا کر کے دو تین سیڑھیاں ہی طے کر پایا تھا کہ پورچ کے کسی نیم تاریک گوشے سے عابدہ اچانک سامنے آگئی اور میرا ہاتھ تھام کر داخلی دروازے کے بجائے ایک بغلی راہداری میں گھستی چلی گئی۔

"بہت اچھا ہوا کہ تم آگئے۔" اس کی سرگوشیانہ آواز سے گھبراہٹ مترشح تھی۔ "رفیق بہت عیار ہے، وہ تمہارے گرد شکنجہ کس رہا ہے!"

سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سے گزرتی چلی گئی۔

"رفیق؟ تو کیا اسے میرے اور تمہارے مراسم کا....."

"اسے ان باتوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔" وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولی: "اس کا اصل روپ تو میں نے برسوں بعد آج دوپہر کو دیکھا ہے فاروق صاحب!"

میرے بدن کے مساموں نے خنکی کے باوجود پسینے کا اخراج شروع کر دیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے ہوتا تھا کہ اس نے مجھے اس نئے نام سے پکارا تھا جو رفیق کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد میں نے چند گھنٹوں قبل اختیار کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عابدہ میرے بارے میں بہت زیادہ باخبر تھی۔

میرا دایاں ہاتھ آہستگی سے جیب میں رینگ گیا اور میں نے کولٹ کا سرد آہنی دستہ اپنی ہتھیلی کی گرفت میں لے لیا۔

راہداری کی دیواروں میں چھپے ہوئے اسپیکروں سے پھوٹنے والی دھیمی عربی موسیقی، نیم اندھیرا، نیم اجالا اور عابدہ کا مانوس وحشی بدن میرے احساسات کے لئے اپنی ساری لطافت کھو چکا تھا۔

وہ مجھے لے کر نیچی چھت والے ایک ایسے ہال میں پہنچی جہاں.. میزوں پر مومی شمعیں روشن تھیں۔ میزوں کا درمیانی فاصلہ بھی کافی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر بیشتر میزیں ویران پڑی ہوئی تھیں۔

اس ہال میں عود و عنبر کی بھینی بھینی مگر گوارا مہکار رچی ہوئی تھی اور نیم تاریک ماحول میں سرو کرنے والی دو چار لڑکیاں اس قدر خاموش اور پُراسرار انداز میں حرکت کر رہی تھیں جیسے ذرا سی بھی آہٹ پر انہیں ہال میں سوئے ہوئے فرعونوں کے جاگ پڑنے کا خطرہ ہو۔

ہم دونوں اس ہال کے ایک دور افتادہ گوشے میں جا بیٹھے۔

"تمہیں..... تمہیں شاید میری بات کا یقین نہیں آیا!" بیٹھنے کے بعد اس نے قدرے اداس لہجے میں کہا۔

"مگر تم کوئی بات بتاؤ تو سہی۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں؟" وہ بہت زیادہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ "بس یہ سمجھ لو کہ بہت سے درندوں نے تمہیں ایک کمرے میں گھیر لیا ہے وہ تین سمت سے بڑھ رہے ہیں اور تمہارے پیچھے ایک سنگین دیوار ہے۔"

"تم تو بڑی کامیاب تمثیل نگار بن سکتی ہو۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ اس کا مدعا سامنے آنے سے قبل میں اس پر اپنا اضطراب ظاہر کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"واللہ! میں سچ کہہ رہی ہوں، تم ہاشم کے دوست نہ ہوتے تو

شاید اب تک رفیق تمہیں بند کر کے تمہارے پُرزے اڑا ڈالتا۔"

"وہ تمہاری زبردستی تھی۔" میں خود پر جبر کر کے لاپروائی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ "میں تو بچنا ہی چاہ رہا تھا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔" وہ جھلا گئی۔ "رفیق کسی خفیہ سرکاری ادارے کا تنخواہ دار ہے اور کسی جنرل کو جواب دہ ہے، جانتے ہو رفیق تم پر کیا شبہ کر رہا ہے؟"

"میں تو اب تک اسے نکھٹو ہی سمجھتا رہا ہوں۔"

ویٹرس کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے فوری طور پر اپنے لئے وسکی کا بڑا پیگ منگوا لیا، عابدہ نے شیری کا انتخاب کیا۔

"تھیٹر کے ٹکٹوں کے بہانے میں اسی کی ہدایت پر تمہارے پیچھے لگی تھی۔" ویٹرس کے چلے جانے پر وہ بولی۔ "وہ تو ہاشم تمہیں خود ہی ہمارے گھر لے آیا ورنہ رفیق شاید اسی روز سے مسلسل تمہاری نگرانی کر رہا ہو گا۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ صبح تک تم خاموش تھیں مگر اب اچانک تمہارا ٹیپ کیوں چل پڑا ہے؟" میں نے مطلب پر آتے ہوئے سوال کیا۔

"اگر دوپہر میں ہم تمہیں چھوڑ کر باہر نہ جاتے تو یہ نوبت نہ آتی۔"

وہ خاموش ہو گئی کیونکہ ویٹرس مشروبات کی ٹرے لے آئی تھی۔

"وہ بہت خود غرض اور کمینہ ہے۔" ویٹرس کے چلے جانے پر وہ بولی۔ "ہم گھر سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے اچانک ایک سیاہ فورڈ کار ہمارے قریب آ کر رُکی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ترش رُو شخص نے بلا کسی تمہید کے رفیق کو گاڑی میں سوار ہونے کو کہا۔ رفیق اسے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا اس نے اس شخص کو میری موجودگی کی طرف توجہ دلائی تو اس نے غضب ناک انداز میں ننگی ننگی گالیاں دیں اور کہا کہ اگر میں نے کسی سے زبان بھی کھولی تو وہ میرا نرخرہ چیر ڈالے گا۔ رفیق نے اس کی ہرزہ سرائی بڑی لاتعلقی سے سنی اور مجھے لے کر کار میں سوار ہو گیا۔ اس وقت میں غصّے میں ہونے کے باوجود بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ وہ شخص رفیق کو کسی جنرل کی تشویش سے آگاہ کرنے آیا تھا کیونکہ رفیق نے کئی روز سے اسے رپورٹ نہیں دی تھی بلکہ کسی کی اجازت کے بغیر دو افراد کو اپنے مصنوعی اغوا میں ملوّث کیا تھا جس کے نتیجے میں بے مقصد فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔"

وہ سانس لینے کے لئے رُکی اور میں نے اضطرار کے عالم میں ادھ جلی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر وسکی کا گلاس نصف کر دیا۔

وہ ایک بالکل ہی نئی کہانی لے کر آئی تھی جس نے میرے تمام سابقہ اندازوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔

میرے ذہن میں بیک وقت بے شمار سوالات ابھر رہے تھے جن کا جواب عابدہ ہی کے پاس تھا مگر میں اس کے خیالات کے خود رَو تسلسل کو نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

رفیق جنرل کا آدمی ہے — اور اس وقت ہمارے سامنے صرف ایک جنرل کا نام تھا جو شاید سیتا کے ساتھ ہی صفدر علی کی سرکوبی پر بھی مامور تھا۔

گویا میں ہاشم کے ساتھ کئی روز تک آدم خور سے پناہ کے لئے خود اسی کی کچھار میں چھپا رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ زندہ و سلامت لوٹ آیا تھا۔

"اس سے بات کرتے ہوئے رفیق بالکل مختلف اور با اعتماد نظر آ رہا تھا۔" عابدہ شیری سے اپنا حلق تر کر کے بولی۔ "رفیق نے اسے بتایا کہ وہ اپنی ذمّے داری سے بخوبی واقف ہے اور کوئی یقینی نتیجہ اخذ کئے بغیر رپورٹیں بھیجنے کا عادی نہیں ہے۔ جب بھی کوئی مثبت پیش رفت ہو گی، جنرل کو اطلاع مل جائے گی پھر اس شخص نے تم دونوں کے بارے میں دریافت کیا اور رفیق نے دونوں کو اپنا دوست بتایا۔ گھر میں تمہارے قیام پر وہ ناراض تھا کیونکہ اسے رفیق سے رابطے کے لئے باہر بھٹکنا پڑ رہا ہے..... اس کمینے شخص کی زبان سے گالی کھا کر اور پھر رفیق کا رویّہ دیکھ کر میں نے خود کو بہت حقیر اور بے آبرو محسوس کیا۔

جب اس نے ہمیں ایک جگہ اتار دیا تو میں رفیق پر بُری طرح برسی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس نے مجھے ہموار کرنے کے لئے بہت کچھ بتایا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ سرکاری آدمی ہے اور اس کا کام عام لوگوں میں گھل مل کر قوم کے دشمنوں پر نگاہ رکھنا ہے اور اس کام میں اسے میری ذات سے بڑی مدد ملتی رہی ہے۔ خود ساختہ اغوا کے بارے میں میری ضد پر وہ بمشکل کھلا کہ ہاشم دراصل ایک فلسطینی تنظیم کا اہم رکن ہے جو اس وقت صفدر علی اور سیتا نامی خطرناک مجرموں کی اعانت کے جرم میں مصری حکومت کو مطلوب ہے مگر محض دوستی کی وجہ سے وہ کوئی ناقابلِ تردید ثبوت ملے بغیر ہاشم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں پہنچائے گا۔

ٹکٹوں کے بہانے تمہارے پاس بھیجتے وقت اس نے تمہیں تگڑی آسامی بتایا تھا مگر آج دوپہر کو اس نے اُگلا کہ پہلی نظر میں ہی اسے تم پر صفدر علی ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ اس وقت اس نے تمہارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی اور بعد میں میرے ذریعے تم پر جال ڈالنے کا ارادہ تھا، اور وہ یہ کارنامہ تنہا سر انجام دینے کے خبط میں تھا مگر وہاں تم بھیڑ میں گم ہو گئے پھر رات کو اس کی خوش قسمتی تمہیں ہاشم کے ساتھ ہمارے گھر لے آئی اور اس نے میزبانی کی آڑ میں اطمینان سے تمہاری اصلیت پرکھنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اگر تم صفدر علی ثابت ہو جاتے تو وہ تمہارے ساتھ ہی ہاشم کو بھی جیل بھجوا دیتا۔ وہ اب بھی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے اسی نے مجھے بتایا کہ تم فاروق کے نام سے ایک سستے ہوٹل میں ٹھہرے ہو۔"

اس نے خاموشی سے سگریٹ سلگائی اور شیری کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"میں تمہارا مشکور ہوں عابدہ!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مگر سچ سچ بتاؤ کہ تم واقعی صفدر علی ہو؟" اس کے لہجے میں بلا کا تجسس امڈ آیا۔

میں یوں ہنس پڑا جیسے اس نے کوئی احمقانہ سوال پوچھ لیا ہو۔ "اگر میں صفدر علی ہی ہوتا تو رفیق اب تک مجھے سولی لگوا چکا ہوتا۔"

"کاش! تم صفدر علی ہی ہوتے۔" وہ آنکھیں موند کر ہولے سے بولی۔ اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"وہ اغوا کا قصہ رہ گیا۔" اسے خیالات کی لذت میں کھوئے رہنے کی تھوڑی سی مہلت دینے کے بعد میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں!" وہ چونک کر بولی۔ "سیتا کے معاملے میں کوئی سوڈانی بھی پوری طرح ملوّث ہے۔ سرحد پر آباد بہت سے مصری بھی رنگت اور جثّے کے اعتبار سے سوڈانی لگتے ہیں لہٰذا اس نے تمہارا امتحان لینے کے لئے اپنے اغوا کا ناٹک رچایا اور واپسی پر سوڈانیوں اور سیتا کے میک اپ کا من گھڑت قصّہ سنایا جس پر تمہارا ردِ عمل بہت سرد اور مایوس کن تھا بلکہ تم نے تو صفدر علی کے بارے میں بھی سوالات کئے تھے اس مرحلے پر اس نے تمہارا پیچھا ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر آج صبح تم دونوں گھر سے نکلے تو اس نے تمہارا پیچھا کیا کیونکہ اس نے اسی وقت اپنی واپسی کی کہانی سنائی تھی اور پھر تم عجلت میں روانہ ہوئے تھے۔ اس مرتبہ اس نے تمہیں الوسلطان کی قیام گاہ کے اطراف میں دیکھا جو سیتا کے معاملے میں آج کل بدنام ہے اور وہ ایک بار پھر شبہات کا شکار ہو گیا یہی وجہ تھی کہ تم واپس آئے تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ آخر میں تمہیں اپنے گھر کی طرف آتے دیکھ کر اس نے راہ بدل لی تھی اور وہ کوئی نئی گھات لگانے والا ہے!"

"یہ سب بتانے کے بعد اس نے تمہیں کیسے چھوٹ دے دی؟"

"وہ ہرگز مجھے کچھ نہ بتاتا۔" وہ بولی۔ "سیاہ کار والے نے اچانک نمودار ہو کر میری آنکھیں کھول دیں۔ ورنہ میں شاید بے خبری میں ساری عمر اس کی آلۂ کار بنی رہتی۔ وہ گھناؤنا شخص اپنے پیشہ ورانہ مفادات کے لئے مجھے مہرہ بنا کر مسلسل بیچتا رہا ہے مگر اب میں نے اسے ایک حقیر کیڑے کی طرح مسل ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں اس پر اسی کی چال چلوں گی۔ اس نے مجھ سے قسمیں لی تھیں کہ میں یہ سارے راز اپنے سینے میں دفن رکھوں گی مگر میں سیدھی تمہارے پاس چلی آئی۔"

"تم اس سے اکیلی کیسے ٹکراؤ گی؟" میں نے نرمی سے سوال کیا۔

"تو تمہارے پاس کیوں آئی ہوں؟"

"میں اس کا کیا بگاڑ سکوں گا؟ اس کی پشت پر قانون کی بھرپور قوت موجود ہے اور میں ایک تنہا انسان!"

"کاش کہ تم صفدر علی ہی ہوتے تاکہ قاہرہ کے کسی چوک پر اس کی ٹانگیں چیر سکتے۔" وہ حسرت زدہ لہجے میں بولی۔ "مگر اب تم ہاشم کو یہ ساری باتیں بتا دینا۔ وہ یقیناً رفیق کو معاف نہیں کرے گا۔"

"اور اگر میں ہی اس کی ٹانگیں چیر دوں؟"

"تو تم میرے صفدر علی ہو گے!" وہ بے اختیار بولی۔

"صفدر علی کیوں؟" میں نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میرا اپنا نام تمہارے لئے فخر کا باعث نہیں ہو گا؟"

"ضرور ہو گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "دراصل صفدر علی کا نام میرے لئے ہی نہیں، نہ جانے کتنوں کے لئے جرأت و مردانگی کی علامت بن گیا ہے!"

"کبھی سامنا ہوا تو دیکھوں گا کہ کتنی جرأت ہے اس مردود میں؟"

"بڑے ناموں کی یوں توہین نہیں کی جاتی۔"

"بڑا نام..... ہونہہ!" میں نے اپنا باقی ماندہ گلاس یک لخت خالی کر دیا۔ "بیوی کے لئے سسکتا اور قانون سے چھپتا ہوا ایک دو ٹکے کا مجرم آج بڑے نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔"

"اپنا اس سے مقابلہ نہ کرو۔" وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولی۔ "ایک مفرور مجرم کے لئے واقعی اس طرح نہ سوچنا چاہیئے۔"

"وہ میرے پیچھے ہے!" میں نے فوری خیال کے تحت کہا۔ "ایسا تو نہیں کہ وہ میرے تعاقب میں یہاں بھی آ پہنچا ہو؟"

"تمہارا ٹھکانہ نظر میں آ جانے کے بعد وہ مطمئن ہے۔" وہ زبردستی ہنس کر بولی۔ "تمہارے ہوٹل سے آنے کے بعد مسلسل میرے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا، بمشکل اس سے پیچھا چھڑا کر آئی ہوں۔"

"اور اگر اس نے تمہارا....."

اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اور وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"خود کو سنبھالو عابدہ!" میں نے سختی سے کہا۔ "ہم اپنے رویّے سے کسی نگرانی کرنے والے کو یہ تاثر بھی دے سکتے ہیں کہ ہماری ملاقات کسی نازک جذباتی رویّے کا نتیجہ ہے!"

"پہلے میں اسے اسی قدر کند ذہن سمجھتی تھی مگر آج دوپہر کو میں نے اسے پہچانا ہے، وہ بھیڑ کی کھال میں چھپا ہوا بھیڑیا ہے۔"

"تو پھر اٹھو یہاں سے!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور ویٹرس کو بِل لانے کا اشارہ دیا۔

وہ بے چاری بوکھلائی ہوئی آئی۔ "کھانا تیار ہے جناب! آپ نے آرڈر دیا تھا۔" شاید وہ حیران تھی۔ ایک ڈبل وسکی نے مجھے کس طرح اتنا ماؤف کر دیا۔

"مجھے یاد ہے مادام!" میں نے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کھانے کا بِل بھی لے آؤ اور برتن کسی بلّی کے سامنے الٹ دینا۔"

وہ تیزی سے گئی اور جلد ہی لوٹ آئی۔ میں نے بِل کی رقم ٹرے میں ڈالی اور عابدہ کی پتلی کمر کو سہارا دے کر وہاں سے اٹھ گیا۔

عود و عنبر سے مہکتے ہوئے اس ہال سے نکل کر ہم دونوں۔ جوں ہی نیم روشن راہداری میں گھومے مجھے سامنے ایک ہیولا سا لہراتا دکھائی دیا جو فائر کی ہولناک گونج کے ساتھ ہی داہنی طرف روپوش ہو گیا اور عابدہ تیز چیخ مار کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر بچھے ہوئے قالین پر ڈھیر ہو گئی۔

گرتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے بائیں پہلو پر تھے اور میں نے اس کی انگلیوں کے درمیان سے سرخ سرخ لہو کی لکیریں باہر پھیلتی دیکھیں اور میں فائر کرنے والے کے تعاقب میں راہداری میں دوڑتا چلا گیا۔

عابدہ کے بارے میں میرا پہلا اور آخری اندازہ یہی تھا کہ قاتل کا نشانہ بے خطا تھا اور وہ صفدر علی کی زبان سے اس کی اصلیت کا اعتراف سننے کی حسرت دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

چند گز کے فاصلے پر راہداری میں داہنی طرف ایک مختصر سا راستہ تھا جس کے اختتام پر بند دروازہ تھا جس پر ٹوائلٹ روم کی علامات بنی ہوئی تھیں۔

میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا! اگر قاتل ٹوائلٹ روم میں ہی موجود تھا تو میں دروازہ کھلتے ہی براہ راست اس کی زد میں آ جاتا پیچھے پلٹنا بھی دشوار تھا کیونکہ فائر کی گونج پورے ہوٹل میں پھیلی تھی اور یقینی طور پر عابدہ کا لہو لہان بدن دیکھنے والوں کو اس کے قاتل یا کسی مشکوک فرد کی جستجو ہو گئی ہو گی۔

میں نے اعشاریہ دو پانچ کا خود کار اور بے آواز کولٹ نکالا اور بجلی کی سی سرعت سے ٹوائلٹ روم میں گھس گیا جہاں دوسرا دروازہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں غول سے بھٹکے ہوئے کسی درندے کی طرح اس دروازے سے بھی گزر گیا اور غیر متوقع طور پر سرد ہوائیں چہرے سے ٹکرائیں۔

اس طرف ہوٹل کا تقریباً تاریک لان تھا اور عمارت کی نکڑ پر لگے ہوئے واحد بلب کی روشنی میں ایک انسانی سایہ تیزی سے دوڑتا ہوا بائیں طرف مڑ رہا تھا۔

میرے لئے مزید کوشش بے سود تھی۔

میں بھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اسی طرف پہنچا اور پورچ میں پھیلی ہوئی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

فائر کا دھماکہ سنتے ہی ہوٹل میں موجود بیشتر مرد اور خواتین ہذیانی انداز میں چیخ و پکار کرتی باہر آ چکی تھیں اور ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ سب سے پہلے اپنی کار میں سوار ہو کر وہاں سے نکل بھاگے۔

دیوار گیر ایمپلی فائر پر موسیقی کی مدھر تانوں کے بجائے میمفس کے عملے کے کسی ذمے دار رکن کی بوکھلائی ہوئی آواز گونج رہی تھی وہ فائر کے حوالے سے لوگوں سے پولیس کی آمد تک وہاں رکے رہنے کی درخواست

کر رہا تھا مگر انسانوں کا اس بھرے ہوئے ریوڑ میں کوئی بھی اس کی

التجاؤں پر کان دھرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

مجھے عابدہ کے ساتھ پیش آنے والے دردناک سانحے کا

قلق تھا مگر میں وہاں رک کر اپنے لئے مزید دشواریاں نہیں

کرنی چاہتا تھا لہٰذا پیدل ہی پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت تک پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ قطار میں کھڑی

کاروں کے ڈرائیور مسلسل تیز ہارن بجائے جا رہے تھے اور کچھ تنو

کاروں سے باہر نکل کر ہولناک انداز میں اکلوتے دربان پر برس

رہے تھے۔

اسی لمحے فضا ایک خوفناک دھماکے سے لرز اٹھی اور سڑک کی

جانب کثیف دھوئیں کے جلو میں سرخ شعلے لپکتے نظر آئے۔

وہ کسی طاقت ور بم یا ڈائنا مائیٹ کا دھماکہ تھا جس

رہی سہی کسر پوری کر دی!

دربان شاید سابقہ فوجی تھا کیونکہ وہ فوراً دونوں کان

کو ہتھیلیوں میں دبا کر اپنی کہنیوں کے بل فرش پر گر گیا۔ جتنی

وہ دوسرے دھماکے کے انتظار سے مایوس ہو کر سیدھا ہوا مشتعل

ہراساں افراد پھاٹک کھول چکے تھے اور کاروں کی قطار کے ساتھ ہی

افراد بھی باہر بھاگ رہے تھے پیدل بھاگنے والوں میں اب

عملے کے افراد بھی نظر آ رہے تھے۔

میں باہر آیا تو ہوٹل سے تھوڑی دور سڑک کے وسط میں

سیاہ رنگ کی ایک فورڈ مستانگ شعلوں میں گھری پھوس کی طرح

رہی تھی۔

عابدہ کی زندگی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ جلتی ہوئی

کار دیکھنے تک میں عابدہ کے قتل کا ذمے دار رفیق کو سمجھتا رہا تھا

جلتی ہوئی سیاہ فورڈ نے کرداروں کی ترتیب قدرے بدل دی تھی۔

میری دلی خواہش تھی کہ جلنے والی کار میں ہوٹل کا وہی

ہرکارہ سوار رہا ہو جس نے دوپہر میں رفیق کے سامنے عابدہ کو

بے آبرو کیا تھا۔

جائے واردات سے دور نکلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر

عابدہ کو رفیق نے مارا ہوتا تو وہ اسی پر اکتفا نہ کرتا بلکہ مجھ پر بھی

وار کرتا لہٰذا گمان یہی ہوتا تھا کہ دوپہر والے قصے کے بعد فواد

نے سوچا ہو گا کہ عابدہ غیر ضروری طور پر اس کے اور رفیق کے راز

سے واقف ہو گئی تھی اور وہ اس کا ذمے دار تھا جبکہ اسے عابدہ کے

کردار کا بھی علم رہا ہو گا لہٰذا اس نے اپنی ایک حماقت کے ازالے کے

دوسری بڑی حماقت کا فیصلہ کیا اور کھوج لگاتے لگاتے میمفس میں

عابدہ تک پہنچ گیا جہاں رفیق پہلے سے عابدہ کی اور میری نگرانی

میں مصروف تھا۔

اس طرح ترش رو شخص رفیق کی نگاہوں میں آ گیا مگر رفیق کے کچھ سمجھنے سے قبل ہی وہ عابدہ کو مار کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور رفیق نے اس کے تعاقب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مختصر راستے سے اس کی کار تک پہنچنے کو ترجیح دی اور جب اس کی نام نہاد معبودیہ کا قاتل کار لے کر فرار ہونے لگا تو رفیق نے اس کی کار پر دستی بم پھینک کر قصہ تمام کر دیا۔

کچھ آگے چل کر میں نے ٹیکسی لے لی۔ ٹیکسی چلتی رہی اور میرے دماغ میں دستی بم کھٹکتا رہا۔ سوال یہ تھا کہ رفیق میمفس میں دستی بم لئے کیوں گھوم رہا تھا اور اگر اسے پہلے سے ترش رو کی حرکت کا علم تھا تو اس نے جوابی حملے کے بجائے اسے ناکام بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔

ان ہی خیالات میں غلطاں میں ہوٹل جا پہنچا۔

ہاشم اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا جس سے تبادلہ خیال کر کے ذہن ہلکا ہوتا لہٰذا مجھے مجبوراً اپنے کمرے میں جانا پڑ گیا۔

دنیا کی ہر بری عورت کی طرح عابدہ میں بھی ایک خوبی تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا کہ وہ آبرومندانہ مستقبل کی امید پر اپنا حال قربان کئے جا رہی تھی مگر جب اسے پتہ چلا کہ اس کا دوست اس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا آیا ہے تو وہ اس کی بیخ کنی پر تل گئی اور اسی کوشش میں اپنی جان سے گزر گئی۔

پھر میں نے اپنے رویئے پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ زندہ انسان کسی کو خود سے بڑا اور بہتر نہیں سمجھتا، ہاں مرنے والوں کے لئے پتھر سے پتھر دل میں بھی نرم گوشے دریافت ہو جاتے ہیں کیونکہ اس وقت مرنے والا کسی زندہ انسان کے لئے چیلنج نہیں ہوتا۔

میں کئی سگریٹ پھونک چکا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو ہاشم بپھرے ہوئے تیوروں کے ساتھ اندر گھس آیا۔

"تم باز نہیں آئے؟" دروازہ بند کر کے اس نے بلا کسی تمہید کے ملامت آمیز اور غصیلے لہجے میں کہا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میمفس کیوں گئے تھے؟"

"اوہ — تو تم میرا تعاقب کر رہے تھے؟" میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ "پھر تو عابدہ کی لاش بھی دیکھ آئے ہو گے۔"

"تم نے میرا خون خشک کرا دیا، گولی چلی تو میں نے تمہاری فاتحہ پڑھ لی تھی۔" وہ بہت زیادہ برہم تھا مگر غصے کے اظہار میں کفایت سے کام لے رہا تھا۔ "تم نے مجھ سے ریوالور لیا تو میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ عابدہ تمہارے دماغ پر اس حد تک سوار ہو چکی تھی۔"

"ابھی بھڑاس نکال لو۔" میں نے کہا۔ "میری کہتا سنو گے تو......

انگشت بدنداں رہ جاؤ گے، وہ محض ہمارے لئے ماری گئی ہے۔"

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم کسی سے لڑنے مرنے جا رہے ہو، اسی لئے میں خاموشی سے تمہارے پیچھے ہو لیا۔ کوئی ہتھیار نہیں تھا تو دو چھوٹے بم ہی جیب میں....."

"تو کہیں وہ سیاہ کار تمہارا ہی نشانہ تو نہیں بنی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"میمفس کے پورچ میں تمہیں عابدہ کے ساتھ ملتے دیکھ کر میری ہڈیاں تک سلگ اٹھی تھیں مگر اسی وقت میں نے تم دونوں کے پیچھے ایک آدمی کو راہداری میں لپکتے دیکھا اور واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔" وہ بتانے لگا۔ "وہ شروع سے تم دونوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اسے نگاہوں سے اوجھل کئے بغیر تمہیں ہوشیار کر دوں مگر یہ ممکن نہ ہو سکا اور پھر میرے گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ بھرے ہوٹل میں قتل کی جسارت کر سکے گا۔ گولی چلی تو میں یہی سمجھا کہ تم مارے گئے وہ چھلاوے کی طرح باہر نکلا مگر میں نے اسے پھاٹک سے باہر نکل کر فٹ پاتھ کے کنارے لگی ہوئی کار میں سوار ہوتے دیکھ لیا اور پھر میرا ہاتھ چل گیا۔"

"تم نے بہت بڑے موذی کو مارا ہے، اگر میرا قیاس غلط نہیں تو وہ جنرل احمد فواد کے محکمے کا کوئی اہم آدمی تھا۔"

"یہ تم کیا جانو؟" وہ حیرت سے بولا۔

"یہی نہیں بلکہ تمہارا بچپن کا دوست بھی مجھ پر شبہ کر رہا ہے اور وہ بھی طویل مدت سے جنرل احمد فواد کے لئے کام کر رہا ہے۔"

"نہیں — میں نہیں مان سکتا۔" وہ بے اعتباری سے بولا۔

"تمہارے نہ ماننے سے حقائق نہیں بدل سکتے۔" میں نے کہا۔ "عابدہ نے مجھے یہی سب بتانے کے لئے بلایا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں فاروق کے فرضی نام سے اس ہوٹل میں مقیم ہوں۔"

مجھے اور عابدہ کو یکجا دیکھ کر اس کا ذہن کسی اور راہ پر کام کرنے لگا تھا مگر میری زبان سے تفصیلات سن کر وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"میں یقین نہیں کر سکتا، میں اب بھی یقین نہیں کر سکتا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "رفیق میں شروع سے ایسی کوئی صلاحیت ہی نہیں تھی۔"

"شاید اس وقت یقین آ جائے جب وہ میرے ساتھ تمہیں بھی اندر کرائے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر عابدہ مجھے میرے نام سے نہ پکارتی تو شاید میں بھی اس کی باتوں کو اتنا وزن نہ دیتا۔ ہمیں اب یہ ٹھکانا فوراً چھوڑنا پڑے گا۔"

"کیوں نہ اسی وقت براہ راست رفیق سے ملا جائے؟"

"کس سلسلے میں؟"

"عابدہ کی تعزیت سے بہتر بہانا کون سا ہوگا، میں ایک بار غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

"یہ اپنی گردن پھندے میں دینے کے برابر ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہمیں کیا معلوم کہ عابدہ ماری گئی، یہ خبر تو صبح کے اخبارات ہی سے پھیلے گی۔"

"اگر عابدہ نے سب کچھ درست کہا ہے تو ہماری یہ خوش فہمی بھی رفع ہو جانی چاہیے کہ سیتا ابوسلطان کی تحویل میں ہے یا مصر سے نکل چکی ہے!"

"سامنے کی بات ہے اس کے معاملے میں ہم پھر تاریکی میں ہیں۔ بلکہ اب تو تمہارے اوپر حملہ کرنے والوں پر بھی شبہ ہو رہا ہے۔"

"وہ رفیق کے آدمی تھے؟"

"حملہ آور ہونا اور پھر محض مار پیٹ کر بھاگ جانے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں شدید جسمانی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔"

"اس حرکت سے اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟"

"شاید ہم بوکھلاہٹ میں کوئی ایسی حرکت کر گزریں جس سے اس کا کام پہلے سے زیادہ آسان ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "یا کوئی دوسرا مقصد بھی ہو سکتا تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔"

"اگر یہ سب درست ہے تو تم یقین کرو کہ وہ میرے ہاتھوں پناہ مانگے گا۔" رفتہ رفتہ ہاشم بھی راہ پہ آنے لگا۔

"دنیا گول بھی ہے اور نہایت مختصر بھی!" میں نے کہا۔ "ابتدا میں سارے حالات دھاگوں کی طرح الجھے ہوئے تھے مگر اب جنرل احمد فواد ابوسلطان، رفیق اور سیتا کا ایک دوسرے سے تعلق پیدا ہو چکا ہے۔ ہاں میں تمہیں ایک بات تو بتانی بھول ہی گیا تھا کہ جب تم مجھ سے ناراض ہو کر آج عابدہ کے گھر سے چلے گئے تھے تو رفیق نے علیحدگی میں مجھے خاصا کریدا تھا مگر میں انجان بنا رہا۔ اس نے تمہارے بارے میں تو یہاں تک مشورہ دیا تھا کہ میں تمہیں مسلطین کے معاملات سے کنارہ کشی پہ آمادہ کروں۔"

"میں اس سے ایک ایک بات کا جواب طلب کروں گا۔"

"یہ شاید اتنا آسان نہ ہو، وہ صفدر علی کو تنہا پکڑنے کے چکر میں اب تک بھٹک رہا ہے۔ ورنہ شاید فوجی ٹرک ہمیں نیند کے عالم میں ہی اس کے گھر سے اٹھا کر فوجی قید خانے میں منتقل کر دیتے۔"

"میرے ذہن میں بھی اس کے لیے ایک لاجواب ٹھکانہ ہے۔"

"ایکس نخری سے بہتر تو کیا ہوگا؟"

"میں اسے مُرتّے لگاؤں گا۔" وہ طیش کے عالم میں بولا۔ "وہاں میلوں دور تک اس کی فریاد سننے والا نہ ہوگا۔"

"اس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو گے۔" میں نے سختی سے کہا۔

اس روز کے واقعات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ ہم دونوں رات گئے تک سر جوڑے اپنے مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ اس دوران میں ایک نکتہ یہ بھی ابھرا تھا کہ اگر ہوٹل والوں کے بیان کی روشنی میں عابدہ کے ساتھی کی تلاش ہوئی تو محض حلیے سے پولیس مجھ تک پہنچے یا نہ پہنچے، رفیق کا ذہن ضرور میری طرف جائے گا۔ میں نے اس شام والا اپنا لباس اسی وقت جلا کر ٹکڑے اور راکھ نالی میں بہا دی۔ مجھے یہ بھی تسلی تھی کہ میمفس میں مجھے لوگوں نے نہیں دیکھا تھا اور پھر عابدہ نے داخلے کے لیے مرکزی کے بجائے سروس کاریڈور استعمال کیا تھا۔ پھر بیٹھنے کے لیے موجی مشعلوں کی ناکافی روشنی میں دور افتادہ گوشہ تلاش کیا گیا۔ اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ عملے کا کوئی فرد عابدہ کے ساتھی میری شناخت کر سکے۔

اگلی صبح کے اخبارات توقع کے عین مطابق سنسنی خیز عابدہ طبی امداد ملنے سے قبل ہی میمفس کے سروس کاریڈور توڑ گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق اعشاریہ تین دو کے پستول سے ہوئی گولی اس کی چوتھی اور پانچویں پسلی توڑ کر دل میں پیوست ہو گئی

دوسری اہم خبر میمفس کے قریب ہی ملٹری سیکرٹ کے ایک عہدے دار کے کار سمیت جل مرنے سے متعلق تھی۔ حادثوں کی جائے وقوع بہت قریب تھی مگر مرنے والوں کے اور ان کی مصروفیات کے باعث کسی بھی اخبار نے دونوں حادثوں کوئی تعلق پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ مصری سیکرٹ کی ہلاکت کے بارے میں قارئین کو مصر میں قانون شکن صفدر علی کی یاد دلائی گئی تھی کیونکہ سرکاری اور اخباری ریکارڈ کے مطابق تو رحیب کے مضافاتی فارم پر ہلاک کر دی گئی تھی۔

تیسری اطلاع میں ابوسلطان کی موت کا تذکرہ تھا۔ اس خاصی حاشیہ آرائیاں کی گئی تھیں اور ابوسلطان کی موت کو مصر جیسی دہشت گرد تنظیم کے خاتمے کے سلسلے میں بڑی کامیابی قرار دیا گیا

"مجھے حیرت ہے کہ اخبارات پر سنسر نہ ہونے کے باوجود تمام ہی صحافی سرکاری سروں میں گانے کے عادی ہیں۔" میں نے کے مطالعے کے بعد کہا۔

"اسرائیل کے ساتھ پے در پے جنگوں نے صحافت کو اقدامات کی حمایت کا عادی بنا دیا ہے اور شاید مصری عوام بھی روش کو قبول نہیں کرتے۔ بس یوں سمجھو کہ قومی وقار حکومت ہو کر رہ گیا ہے۔" ہاشم نے کہا۔

"یہ رویہ مایوسی بلکہ اجتماعی مایوسی کا اظہار کرتا ہے۔"

"ضرور کرتا ہے۔ جو قوم برسوں سے اپنے علاقے دشمن میں دیکھ رہی ہو اس پہ مایوسی نہیں تو کیا مسرت راج کرے

"شاید اسی رجحان نے جنرل احمد فواد جیسے لوگوں کو

ورنہ پیٹر سالومن مصر میں قدم نہ رکھ پاتا۔"

"ختم کرو ان مقامی قصوں کو۔" ہاشم اکتاتے ہوئے انداز میں بولا۔ "دن رات ہر ایک سے اسی موضوع پر سر کھپانا پڑتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اب کیا ارادہ ہے؟"

"رفیق کے پاس جانا تو ضروری ہے لیکن ڈر ہے کہ وہاں تفتیشی حکام کا ہجوم نہ ہو۔" میں نے رائے ظاہر کی۔

"اگر وہ واقعی سیکرٹ سروس کا کارندہ ہے تو شاید وہ لوگ اسے تنگ نہ کریں۔" ہاشم کی بات معقول تھی۔

ہم دونوں رفیق کے مکان پر پہنچے تو دروازے پر وزنی قفل لٹک رہا تھا، پھر ہاشم نے اس تالے پر سرکاری سیل بھی دیکھی جس کا مقصد تھا کہ عابدہ کے قتل کی تحقیقات مکمل ہونے تک وہ مکان سیل کر دیا گیا تھا۔ علاقے کے ایک شخص سے معلوم ہوا کہ رفیق نے پچھلی رات عابدہ کے قتل کی خبر ملنے کے بعد ہی اپنی رہائش گاہ بدل لی تھی۔ اس مکان پر سرکاری سیل رفیق کی عدم موجودگی میں لگائی گئی تھی۔

ہم دونوں تھوڑی دور ہی آگے چلے تھے کہ سامنے سے رفیق آتا ہوا نظر آیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ خفیف سا مسکرایا مگر اس کے چہرے پر اضمحلال طاری تھا۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ ہوٹل ہی سے ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ مگر اپنے پرانے گھر سے ہمیں واپس جاتے دیکھ کر سامنے آگیا۔

ہم دونوں نے وہیں رک کر اس سے رسمی انداز میں اظہارِ تعزیت کیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے چند سیکنڈ باتیں کیں پھر بولا۔ "آؤ گھر میں بیٹھتے ہیں۔"

"یہاں تو سیل لگی ہوئی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ تم اپنی بیوی کے قتل کی خبر سننے کے بعد کہیں اور منتقل ہو گئے ہو۔" میں نے کہا۔

"سیل؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "میں تو اس خیال سے دوسری جگہ چلا گیا تھا کہ عابدہ کے بے شمار ملاقاتی تھے، میں تعزیت کے لیے آنے والوں سے پریشان ہو جاتا اور وہ میری بیوی نہیں دوست تھی۔"

"دوست؟" اس بار میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ پھر میں ہاشم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم نے تو عابدہ کو رفیق کی بیوی بتایا تھا؟"

"منہ سے نکل گیا ہوگا۔" ہاشم کے بجائے رفیق بولا۔ "ہم رہتے بھی تو اسی طرح تھے۔"

"پھر اب کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"آؤ میرے ساتھ چلو، میرا اپنا فلیٹ تم پسند کرو گے۔" رفیق نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

پھر وہ قریب ہی کھڑی ہوئی نیلی فاکس ویگن کی طرف بڑھا تو ہمارے قدم ٹھٹکے۔ جس پر اس نے بتایا کہ وہ کار اس نے پچھلی شام ہی خریدی تھی۔

چند منٹ میں ہم اس کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ وہ ایک تین منزلہ عمارت میں گراؤنڈ فلور پر اس طرح واقع تھا کہ رازدارانہ آمد و رفت بھی ممکن تھی۔ اندر نشست گاہ میں بیٹھنے کے بعد چند ثانیوں تک ماحول پر بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ وہ تو ہمارے بارے میں پہلے ہی مشکوک تھا مگر اب اس کی اصلیت بھی ہم سے پوشیدہ نہیں تھی!

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دو بھوکے شیر نہایت تحمل سے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے فریقِ مخالف کی کسی غلطی کے منتظر ہوں اور آخر اس نے خود ہی ہماری مشکل آسان کر دی۔

"کیا بات ہے؟ آج تم دونوں کا رویہ کچھ بدلا ہوا ہے؟" اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ پُرسکون لہجے میں کہا۔

"عابدہ کی موت کے بعد دکھ نے زبان بندی کی ہوئی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو بھی اس سے ملا ہے اُسے ضرور دکھ ہوگا۔" وہ بولا۔ "مگر یہ قدرت کا منشا ہے، ہر ایک کا انجام یہی ہے تو پھر جلنے والوں کو کڑھنے سے فائدہ؟"

"حالانکہ زندگی میں انسان ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسم کھاتا ہے۔" میں محتاط انداز میں گفتگو کو آگے بڑھاتا رہا۔

"موت کا نام لینا سہل ہے مگر اس کا سامنا کرنا بہت مشکل کام ہے۔"

"بعض لوگ تو اپنی موت کی جستجو میں رہتے ہیں۔" میں اس سے مخاطب تھا — اور ہاشم بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ قدرے بے چین نظر آنے لگا۔

"سیکرٹ ایجنٹوں کو ہی لے لو۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کی بے چینی بھی معدوم ہو گئی تھی۔ "موت کسی پیشے میں نہیں چھپی ہوتی، مارے وہ لوگ جاتے ہیں جو عورتوں کی عقل سے سوچتے ہیں۔"

اس کا طنز بہت گہرا تھا۔ شاید اس نے کوئی چوٹ کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے عابدہ سے سُن گُن ملنے پر سیکرٹ ایجنٹ کا ذکر چھیڑا تھا۔

"اور جو عورتیں ماری جاتی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ بھی اپنی عقل کے سبب۔" وہ چوکنا اور پُراعتماد نظر آ رہا تھا۔

"عابدہ کی موت کو کہاں فٹ کرو گے؟"

"میری مان لیتی تو میرا ساتھ چھوڑ کر میمفس نہ جاتی اور شاید یہ حادثہ ٹل جاتا۔" اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم خطرے سے آگاہ تھے۔"

"میری چھٹی حس بہت تیز ہے۔" یک بیک اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔

"تم اس انداز میں بھی مسکرا لیتے ہو؟" ہاشم نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہ شخص کون ہے؟" اچانک اس نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف اٹھایا جس میں دبے ہوئے ریوالور کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"فاروقی... احمد فاروقی۔" ہاشم کے بجائے میں نے جواب دیا۔

"عابدہ نے تم سے مرنے سے پہلے کیا بکواس کی تھی؟" اس نے صوفے سے اٹھ کر سرد لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"مرنے سے پہلے؟" میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "اس سے میری آخری ملاقات تمہارے سامنے ہی ہوئی تھی۔"

"مجھے ہوٹل سے عابدہ کے ساتھی کا جو سرسری حلیہ معلوم ہوا ہے، وہ پورے قاہرہ میں تمہارے سوا کسی پر صادق نہیں آسکتا۔"

"یہ کیا حرکت ہے رفیق؟ ریوالور نیچے کرو۔" ہاشم بازی اچانک ہاتھ سے نکل جانے پر بوکھلاتے ہوئے انداز میں بولا۔ شاید اسے علم نہیں تھا کہ رفیق نے مجھے اپنی جیب میں ہاتھ لے جاتے دیکھ کر مجھ سے زیادہ پھرتی سے ریوالور نکالا تھا۔

"تم میرے دوست ہو ہاشم!" وہ اس سے نرم لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے ساتھ فی الحال کوئی بدتمیزی نہیں کرنی چاہتا۔ مجھے....."

"مگر یہ میرا دوست ہے۔" ہاشم نے احتجاج کیا۔

"ہوا کرے، اگر آج میں نے اس پر ہتھیار اٹھا ہی لیا ہے تو میں اس سے کچھ باتیں بھی کروں گا....."

اس نے بوکھلا کر اس تیاقی سے اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کی جو میں نے بائیں جوتے میں اٹکا کر اس پر اچھالی تھی اور وہ ہاشم کی طرف متوجہ ہونے کے باعث آخری لمحے تک میری اس حرکت کو نہ دیکھ سکا تھا۔ میں چشم زدن میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ ریوالور بدستور اس کے ہاتھ میں تھا جس کے لیے وہاں ایک دھما چوکڑی کا آغاز ہو گیا۔

نہ وہ آسانی سے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ تھا اور نہ میں اس معرکے میں اس معصوم صورت درندے کو کوئی رعایت دینے پر تیار تھا۔

ریوالور بدستور اس کے داہنے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور شہادت کی انگلی ٹریگر پر موجود تھی مگر اس کی دونوں کلائیاں میری مضبوط گرفت میں اس طرح فرش پر جمی ہوئی تھیں کہ میں اس کے سینے پر سوار تھا۔

اسی اثنا میں میری نگاہ غیر ارادی طور پر ہاشم پر پڑی جو حیرت اور غصے کے شدید دباؤ کے باعث سکتے کی کیفیت میں ایک طرف کھڑا ہم دونوں کو گھورے جا رہا تھا۔

رفیق نے پوری قوت سے اپنی ٹانگیں چلا کر میری پشت پر اپنے گھٹنوں سے چند شدید ضربات لگائیں اور میں بے اختیار اس پر جھک گیا۔ میرا چہرہ اس کے چہرے سے اس قدر قریب ہو گیا کہ اس کے پھنکارتے ہوئے گرم گرم سانسوں کا لمس مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہونے لگا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے سینے پر سے ورنہ.....؟" وہ کسی زخم خوردہ درندے کی طرح غضب ناک لہجے میں غرایا۔ مگر میں نے تلخ لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"یوں ہی پڑا رہوں گا۔" میں نے کہا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "ریوالور فرش پر گرا دو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

اس کے حلق سے عربی میں ایک ثقیل سی گالی برآمد ہوئی اور اس نے ایک مرتبہ پھر میری گرفت سے نکلنے کے لئے جان توڑ کوشش شروع کر دی۔

میں چاہتا تو پھرتی کے ساتھ اس کی بائیں کلائی چھوڑ کر اپنے داہنے ہاتھ کی مدد سے ریوالور چھیننے کی کوشش کر سکتا تھا جس میں کامیابی اور ناکامی کے مساوی امکانات تھے مگر میں ایک بار اس کے ریوالور کی زد پر آکر اس کی پھرتی کا تجربہ بھی کر چکا تھا لہٰذا کوئی غیر محتاط قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

رفیق کی اچھل کود میں ایک بار جونہی مجھے موقع ملا میں نے اس کی ناک پر پوری قوت سے اپنے سر کی ضرب لگائی اور وہ بلبلا اٹھا۔

ناک پر شدید ضرب لگنے کے ساتھ ہی غیر ارادی طور پر ریوالور پر اس کی گرفت کمزور ہوئی اور اگلے ہی لحظہ میں اس کا ریوالور میرے قبضے میں آگیا تھا۔

میں پھرتی سے اسے چھوڑ کر الگ جا کھڑا ہوا۔

اس کی زخمی ناک سے خاصی مقدار میں خون بہہ رہا تھا جس کے باعث اس کے چہرے کا نچلا حصہ رنگین ہو کر بہت زیادہ بھیانک نظر آرہا تھا۔

پھر اٹھنے کے کئی سیکنڈ بعد بھی جب وہ فرش سے اٹھنے پر آمادہ نظر نہ آیا تو میں نے اس پر ریوالور تان لیا۔

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے خشک سا حکم دیا۔

"تم آج اس چھت کے نیچے سے زندہ نہ جا سکو گے۔" وہ آستین سے اپنے لہو میں تر ہونٹ صاف کرتے ہوئے حقارت سے بولا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں ورنہ مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاؤ گے۔"

"تمہارا یہ روپ دیکھ کر مجھے شدید ذہنی صدمہ ہوا ہے رفیق۔" ہاشم نے دھیمے اور پرملال لہجے میں کہا۔

"صرف تمہاری دوستی کی وجہ سے آج یہ نوبت آئی ہے۔" رفیق نے کہا۔ "ورنہ آج سے بہت پہلے میں اسے قید کرا چکا ہوتا۔ میں محض شبہات کی بنا پر کوئی ایسا قدم اٹھانے سے گریز کرتا رہا جس میں تمہارے سامنے ندامت کا موہوم سا امکان بھی ہو۔"

"مگر آج تم نے ان تمام باتوں کو پس پشت ڈال دیا۔"

"تم تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہو ہاشم۔" وہ فرش سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم واقعی حقائق سے بے خبر ہو تو میری زبان سے سن لو کہ تمہارا دوست وہی بدمعاش صفدر علی ہے جس کی مصری پولیس کو تلاش ہے۔"

"مصری پولیس بلاوجہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔" ہاشم نے کسی غیر معمولی ردعمل کا مظاہرہ کئے بغیر کہا۔

"نجی قید سے فرار اور دہشت گردی کے علاوہ اس پر کئی قتل کرنے کے الزام بھی ہیں اور یہ معمولی جرائم نہیں ہیں۔"

اس وقت تک ہاشم ذہنی جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اور اپنے جرائم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرے جرائم؟" اس نے حیرت اور حقارت سے کہا۔

"تم فلسطینی تحریک کے دشمن ہو۔" اس بار میں نے کہا۔ "اور تم نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ہاشم کو ان معاملات میں ملوث ہونے سے روکو۔"

"مجھے اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی مکمل آزادی ہے۔"

"یہی آزادی مجھے بھی ہے۔" ہاشم بولا۔ "اس کے علاوہ تم نے مجھے دوستی کا صلہ یہ دیا کہ قاہرہ کے ایک بھرے پرے بازار میں کرائے کے بدمعاشوں سے مجھ پر حملہ کرایا۔ وہ تمہاری دشمنی کا کھلا اظہار تھا۔"

شاید اس کے خون آلود ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ "وہ تمہیں زد و کوب کر کے بھاگ گئے تھے۔ میری ہدایت ہوتی تو وہ آسانی کے ساتھ تمہیں ہلاک بھی کر سکتے تھے۔"

"یہ اچھا ہوا کہ تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کی۔" ہاشم پر رفتہ رفتہ غصہ غالب آتا جا رہا تھا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم کس کے لئے کام کر رہے ہو اور کس کے ایما پر صفدر علی کے پیچھے لگے تھے؟"

"شاید عابدہ نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔" وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ اسی سے معلوم کرو تو بہتر ہوگا۔"

"تو تمہیں اعتراف ہے کہ تم جنرل کے لئے کام کرتے ہو؟"

"میں جنرل کا غلام نہیں ہوں۔"

"جنرل احمد فواد سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"کان کھول کر سن لو کہ میں مصر کے سرکاری خزانے سے تنخواہ پاتا ہوں اور جنرل اس محکمے کا سربراہ ہے جو میری خدمات سے استفادہ کرتا ہے۔ تم میرے ساتھ جو سلوک چاہو، روا رکھو لیکن اتنا یاد رکھنا کہ تمہارا انجام عبرتناک ہوگا۔"

"وہ نظر ہی آرہا ہے۔" میں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

"تمہیں علم ہے کہ جنرل نے سیتا اور صفدر علی کی گرفتاری میں مدد کے لئے اسرائیل سے پیٹر سالومن کو یہاں بلایا تھا؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"اس کا اقدام بڑا دانشمندانہ تھا۔" رفیق نے برجستہ کہا۔

"یہ عربوں کے اجتماعی مؤقف سے کھلی غداری نہیں تھی؟" ہاشم نے غصیلے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"اجتماعی مؤقف؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "اسی کی خاطر ہم اسرائیل سے تباہ کن جنگیں لڑ چکے ہیں۔ ہماری ہزاروں میل پر محیط سرزمین اسرائیلی قبضے میں ہے۔ ہمارے شہر مسمار ہوئے۔ ہزاروں شہری اور فوجی مارے گئے۔ اس اجتماعی مؤقف نے مصر کو مکمل تباہی اور بربادی کے سوا کیا دیا؟"

"میرے نزدیک تم جیسے لوگ منحرف اور غدار ہیں۔" ہاشم غرایا۔

"ضرور ہوں گے۔ ہم لوگ پہلے مصر کی سلامتی اور بہبود کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس کے بعد عرب اور فلسطین کی باری آتی ہے۔ ہم قربانی کا دنبہ نہیں ہیں۔ ہماری موجودہ نسل آگ، دھوئیں اور جنگ کی دوسری تباہ کاریوں سے نفرت کرتی ہے۔ دوسری عرب قومیں اب ہمیں امداد کے نام پر پیسہ دے کر خون بہانے پر مجبور نہ کر سکیں گی۔" ہاشم کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ جذباتی ہو گیا۔

"جنرل احمد فواد سے تمہارے رابطے کا کیا ذریعہ ہے؟" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد میں نے سوال کیا۔

"اس وقت میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ خود ہی پتہ چلا لو۔" اس نے ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔

"ٹرانسمیٹر؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"تلاشی لو گے تو صرف اٹھنا برآمد ہوگا۔" وہ زہریلا قہقہہ مار کر بولا۔

ہاشم نے پوری قوت سے بڑھ کر اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا اور وہ کراہ کر پیچھے الٹ گیا۔

"مجھے اپنے سوال کا جواب چاہئے۔" اس کے کھڑے ہو جانے پر ہاشم نے سرد لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"تم میری زبان نہ کھلوا سکو گے۔" وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ "میں اپنے فرائض سے آخری سانس تک بھی انحراف نہیں کروں گا۔"

"تم دونوں ہاتھ بلند کر کے دیوار کی طرف منہ کر لو۔" میں نے ریوالور کی نال کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "ہاشم تمہاری جامہ تلاشی لے گا۔"

"اسے میرے پاس سے کچھ نہ ملے گا۔" وہ دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"منہ دیوار سے لگا لو۔" میں نے حکم دیا اور اس نے کسلمندانہ انداز میں میرے حکم کی تعمیل کر ہی ڈالی۔

ہاشم نے اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میری طرف دیکھا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

ہاشم مجھے ریوالور کی مختصر سی نال تھامتے دیکھ کر میرا ارادہ

بھانپ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر رفیق کی تلاشی لینے کے بجائے اس کی داہنی کنپٹی پر ریوالور کے فولادی دستے کی نپی تلی ضرب لگائی اور وہ حلق سے غراہٹیں بلند کرتا ہوا کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح کمرے کے پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

"اسے بے ہوش کیوں کر دیا؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"یہ جگہ ہمارے لئے مخدوش ہے۔" میں نے کہا۔ "ایکس تھری میں اس سے مناسب طور پر باز پرس ہو سکے گی۔"

"بات تو درست ہے مگر ہم اسے کس طرح لے جائیں گے؟"

"بیہوشی کی حالت میں یہ کوئی گڑبڑ نہیں کر سکے گا۔"

"مگر ہمارے پاس سواری کہاں ہے؟"

"تم رفیق کی نیلی فاکس ویگن کو بھول رہے ہو جو اس نے کل تمام ہی خریدی ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

ہاشم یک بیک خوش ہو گیا۔ "اس نے شاید وہ کار ہماری سہولت کے لئے خریدی ہے۔"

وہاں سے روانگی میں رفیق کے فلیٹ کا محل وقوع بہت کام آیا۔ گراؤنڈ فلور پر واقع وہ فلیٹ اس طرح بنا ہوا تھا کہ وہاں سے کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر نکلنا خاصا سہل ثابت ہوا۔

روانگی سے قبل ہم دونوں نے رفیق کی ناک کا زخم اور چہرہ اچھی طرح صاف کر دیا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میری ٹکر کے باعث رفیق کی نکسیر بہہ نکلی تھی مگر خون صاف کرتے ہوئے پتا چلا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

رفیق کو عقبی نشست پر ڈال کر میں ہاشم کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اور اس نے کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔

میں سگریٹ سلگا کر اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔

قاہرہ پہنچنے کے بعد میں حالات کی بھول بھلیوں میں کچھ اس طرح پھنسا تھا کہ عین آخری مرحلے پر ہر راہ مسدود نظر آتی تھی۔

سیتا رجب کے مضافاتی فارم سے زندہ سلامت نکل گئی تھی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ اخوان الصفا کے مقامی امیر ابو سلطان تک پہنچی تھی یا نہیں۔ اس بندوبست کا ذمہ دار رجب ایک مختصر سے وقفے کے بعد دوبارہ قیدی بن چکا تھا۔ ابو سلطان کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ مقامی ذرائع اسے مردہ قرار دے رہے تھے مگر میرا قیاس کہتا تھا کہ وہ زندہ ہے لیکن وہ کہاں چھپا ہوا تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" ہاشم کی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

"شاید ابو سلطان کے بارے میں رفیق سے کچھ معلوم ہو سکے۔"

"مشکل ہی ہے۔"

"مجھے تو قوی امید ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ سیتا اور سوڈانیوں کے مراسم سے اس حد تک آگاہ تھا کہ اس نے میری اصلیت معلوم کرنے کے لئے سوڈانیوں کے ہاتھوں اپنے اغوا اور پھر سیتا کے سوڈانیوں پر اپ کا ڈرامہ رچایا تھا۔"

"اور اگر اس نے زبان نہ کھولی؟"

"ہم اس پر زیادہ وقت برباد نہیں کریں گے۔" میں نے فوری طور پر یہ محسوس کر کے کہا کہ رفیق ہوش میں آ رہا تھا۔ "اگر اس نے تعاون کیا تو نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ شاید اسے مالی فائدہ بھی ہو جائے ورنہ میں اسے ختم کر دوں گا۔"

ہاشم نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میں اسے آنکھ مار کر مسکرانے لگا۔

چند ثانیوں بعد میں نے عقبی نشست کا جائزہ لیا تو رفیق بے حس و حرکت پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اسے براہ راست ہلاک کرنا مناسب نہیں۔" ہاشم نے کہا۔ "اسے شایان شان طریقے پر مرنا چاہئے۔"

"وہ کیسے؟"

"اسے برہنہ کر کے بے ہوشی کی حالت میں قاہرہ کے کسی گنجان علاقے کے کوڑا گھر پر ڈال دیا جائے اور جب لوگ اچھی طرح اس بدحواس محبوبے کا دیدار کر لیں تو اس پر ایک عدد گولی ضائع کر دی جائے۔"

"تجویز خاصی معقول ہے۔"

جب فاکس ویگن ایکس تھری کو جانے والے صحرائی راستے پر گھومی تو سورج کی چمکیلی روشنی میں تاحد نظر ریت ہی ریت چمک رہی تھی۔

ایکس تھری کے آثار نمودار ہونے سے ذرا دیر پہلے رفیق ہوش میں آگیا۔

"تم لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟" انجن کی پرشور غراہٹ میں اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ایک صحرائی پکنک پوائنٹ پر جا رہے ہیں۔ تم بھی اس ماحول سے لطف اندوز ہو سکو گے۔"

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے سیٹ پر سیدھا بیٹھ گیا پھر اس کے حلق سے تحیر آمیز سی آواز نکلی۔

"اوہ۔ تم تو صحرا میں داخل ہو چکے ہو۔ یہ یاد رکھنا کہ بھٹک گئے تو نہ منزل پر پہنچ سکو گے اور نہ نکاسی کا راستہ آسانی سے ملے گا۔"

"ہماری فکر نہ کرو اپنی خیر مناؤ۔" ہاشم نے کہا۔ "تم نے دوست بن کر جو دغا دی ہے وہ کسی بڑی سزا کی متقاضی ہے۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"جنرل سے تمہارے رابطے کا کیا ذریعہ ہے؟" ہاشم کے ذہن پر بس جنرل احمد فوادی کی دھن طاری تھی۔

"ان سب باتوں کے بجائے اگر تم اپنا مقصد بیان کرو تو شاید ہم بہتر فضا میں بات کر سکیں۔"

"ہمارا مقصد تمہاری سوچ سے بہت بلند ہے۔" ہاشم نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "بس اتنا یاد رکھو کہ اب تم ہمارے رحم و کرم پر ہو۔"

"میں تمہارے لئے تر لقمہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کے لہجے میں بھی تلخی عود کر آئی۔ "تمہاری برتری کسی بھی لمحے ختم ہو سکتی ہے۔"

"سیتا کی تلاش میں تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟" میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے سوال کیا۔ "تم اس معاملے میں خاصے باخبر معلوم ہوتے ہو۔"

"میری معلومات تم سے زیادہ نہیں ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مقامی حکام نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ تاثر پھیلایا ہے کہ سیتا ایک مضافاتی فارم پر مقابلہ کرتے ہوئے ماری گئی تھی مگر درحقیقت وہ کوئی اور لڑکی تھی۔"

"مگر سیتا کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کچھ معلوم نہیں۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "میں نے تو محض تمہاری اصلیت معلوم کرنے کے لیے سیتا کا نام استعمال کیا تھا۔"

"پھر تمہیں جنرل کے بارے میں ہاشم کے سوالات کے جواب دینا ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"شاید تم اس جھونپڑے میں جا رہے ہو۔" اس نے ایک ریتیلے ٹیلے کی اوٹ میں اچانک نمودار ہونے والے ایکس تھری کے آثار دیکھ کر کہا۔

فاکس ویگن ایکس تھری کے سامنے رکی تو مقامی نگہبان باہر موجود تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ جیب میں پڑا ہوا تھا۔

"میں ہاشم ہوں۔" ہاشم نے انجن بند کر کے زور سے کہا کہ وہ عجلت اور غلط فہمی میں کہیں فائر نہ کر بیٹھے۔

نگہبان کا داہنا ہاتھ جیب سے باہر آگیا۔ اس کی لٹکی ہوئی جیب اندر کسی وزنی ہتھیار کی موجودگی کی چغلی کھا رہی تھی۔

ہم تینوں یکے بعد دیگرے کار سے اتر آئے۔

ہاشم نے قریب جا کر نگہبان سے کچھ بات کی اور وہ جھونپڑے میں چلا گیا اور ہم تینوں باہر ہی ریت پر بیٹھ گئے۔

خنک ہوا میں قدرے گرم ریت بہت خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

اس وقت میرے پاس ہاشم کے دیئے ہوئے اعشاریہ دو پانچ کے بے آواز کولٹ کے علاوہ رفیق سے چھینا ہوا ریوالور بھی موجود تھا جو میں نے جیب سے نکال لیا پھر میرے ایما پر ہاشم نے رفیق کی جامہ تلاشی بھی لے ڈالی لیکن کوئی کار آمد چیز برآمد نہ ہو سکی۔

کافی دیر کی کوشش اور تھوڑے سے تشدد کے بعد ہاشم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ رفیق اپنے گھر میں موجود ایک ٹرانسمٹر پر جنرل سے ہدایات لیا کرتا تھا اور اس کا کوڈ فالکن ہوا کرتا تھا۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد ہاشم نے نگہبان کو آواز دی اور اسے رفیق کی نگرانی پر مامور کر کے میرے ساتھ ایک طرف ہو لیا۔

ہمارے چلنے سے قبل نگہبان نے خود کار پستول نکال لیا۔

"الحدید کے علاقے میں ویران پہاڑیوں سے میں ایک اہم کام لینا چاہتا ہوں۔" رفیق سے کچھ دور نکل آنے کے بعد ہاشم نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"میں نے سنا ہے کہ جنرل احمد فواد قاہرہ کے مضافات وغیرہ میں آمد و رفت کے لئے ہیلی کاپٹر کے استعمال کا شوقین ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ رفیق ہماری نگرانی میں ٹرانسمٹر پر جنرل سے بات کرے اور آج رات اسے الحدید آنے کا مشورہ دے۔"

"تو کیا تم جنرل کو اتنا احمق سمجھتے ہو کہ وہ رفیق کے مشورے پر اندھا دھند عمل کر ڈالے گا؟"

"اس کا انحصار تو بہانے پر ہو گا۔"

"رفیق کیا بہانہ کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کہہ سکتا ہے کہ آج رات الحدید کی پہاڑیوں میں صفدر علی اور سیتا کی ملاقات کا امکان ہے۔ اور اسے یہ خبر باوثوق ذرائع سے ملی ہے۔"

"ایسی صورت میں وہ ہیلی کاپٹر کے بجائے کسی دوسرے رازدارانہ طریقے کو ترجیح دے گا۔" میں نے کہا۔ "تم نے ہیلی کاپٹر کا حوالہ کیوں دیا تھا؟"

"یہ ضروری ہے۔" وہ بولا۔ "اس کا ہیلی کاپٹر تیز رفتار ہے اور ہمیں جنرل کے ساتھ ساتھ اس پر بھی قبضہ کرنا ہے تاکہ جلد از جلد قاہرہ سے دور نکل سکیں۔"

"تو کیا تم ہیلی کاپٹر اڑا لو گے؟"

"جنرل یا اگر اس کا کوئی معاون ہوا تو وہی ہمارے بتائے ہوئے راستے پر پرواز کرے گا۔"

"ہیلی کاپٹر میں تم مصر کی سرحد تو عبور نہ کر سکو گے۔"

"ہیلی کاپٹر تو ہم ایندھن ختم ہونے سے قبل کسی محفوظ مقام پر چھوڑ دیں گے اور وہاں سے آگے بڑھنے کے بجائے واپس ہو لیں گے تاکہ حکام ہم تک نہ پہنچ سکیں۔"

"میری دانست میں یہ بے سود مہم جوئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اگر رفیق کی آڑ لے کر جنرل کو ہلاک ہی کرنا ہے تو قاہرہ شہر سے بہتر جگہ ملنی مشکل ہے۔"

"شہر میں وہ محافظوں کے جمگھٹے میں نکلتا ہے۔ شاید صدر سے

زیادہ اس کی حفاظت کی جاتی ہے؟"

"پھر تو وہ الحدید پہنچنے سے قبل ان پہاڑیوں کا خفیہ محاصرہ بھی کرا سکتا ہے؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ ان پہاڑیوں سے ناواقف ہو؟" اس نے کہا۔ "ان کا محل وقوع ایسا ہے کہ جنرل سے رفیق کی گفتگو کے بعد ہم نے وہاں مورچے سنبھال لئے تو ہماری نظروں میں آئے بغیر چڑیا کا بچہ بھی وہاں پر نہ مار سکے گا۔"

"لیکن تم نے ابھی تک اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا کہ اگر جنرل ہیلی کاپٹر کے بجائے کسی آرمرڈ کار وغیرہ میں الحدید پہنچا تو کیا ہوگا؟"

"تمہارا ایک ہی اعتراض معقول ہے۔ ایسی صورت میں ہم دوبارہ رفیق کا نام بھی استعمال نہ کر سکیں گے۔"

"کیوں نہ رفیق کو ختم کر کے تم اس کی جگہ سنبھال لو؟" چند ثانیوں تک سوچتے رہنے کے بعد میں نے تجویز پیش کی۔

"کیسے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"جنرل سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ بس تم رفیق کا ٹرانسمٹر اور کوڈ استعمال کرتے رہنا۔ اس طرح شاید کوئی موقع مل جائے۔"

اسی لمحے صحرا کی فضا ایک دھماکے اور پھر انسانی چیخ سے لرز اٹھی ہم دونوں بوکھلا کر پلٹے تو ایکس تھری کا نگہبان ریت پر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور رفیق فاکس ویگن میں جھانک رہا تھا۔

مجھے صورت حال کی سنگین نوعیت کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور میں ریوالور نکال کر جائے واردات کی طرف دوڑ پڑا۔

اسی اثنا میں رفیق اگنیشن میں چابی موجود نہ پا کر برق رفتاری سے ایکس تھری میں گھس پڑا۔

میں نے دوڑتے ہوئے اضطراری طور پر دو فائر کیے مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث وہ ضائع گئے اور جب میں ایکس تھری کے قریب پہنچا تو احتیاط کے پیش نظر مجھے باہر رکنا پڑا۔

"رفیق! خود کو ہمارے حوالے کر دو۔" میں نے باہر ہی سے اسے للکارا۔ اس دوران میں ہاشم قریب المرگ نگہبان کے قریب پہنچ چکا تھا۔

میرے جواب میں اندر خاموشی ہی رہی۔ میں نے اسے دوبارہ للکارا پھر کوئی جواب نہ پا کر دوڑتا ہوا اندر گھسا۔ پہلا کمرہ ویران تھا اور دوسرے کمرے میں تہہ خانے میں داخلے کا کھلا ہوا راستہ میرا منہ چڑھا رہا تھا۔

میں آہستہ آہستہ فرشی راستے کے قریب پہنچ گیا۔ اندر سے واضح طور پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"رفیق! باہر آ جاؤ۔" میں نے تہہ خانے کے دہانے پر جا کر آواز دی۔

"دفع ہو جاؤ۔" تہہ خانے میں سے رفیق کی تیز آواز کی گونج ابھری۔ "اگر دو گھنٹے میں مصری سیکرٹ سروس کے حکام کی آواز میرے کانوں میں نہ پہنچی تو میں اسلحہ کے اس زیر زمین گودام کو اڑا دوں گا۔"

اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس کر کے میں بری طرح اچھل پڑا۔

وہ ہاشم تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی رچی ہوئی تھی۔

"وہ مر گیا۔ گولی اس کے دل میں لگی ہے۔" اس نے پژمردہ لہجے میں مجھے ایکس تھری کے نگہبان کی خبر دی۔

میں اس کا بازو تھام کر باہر آ گیا۔

صورتحال یک بیک گمبھیر ہو چکی تھی عملاً رفیق اسلحہ کے اس ہولناک ذخیرے پر قابض ہو چکا تھا اور زندگی سے مایوس ہو کر کسی وقت بھی اسے تباہ کر سکتا تھا۔

میں نے ہاشم کو رفیق کی شرط سے آگاہ کیا تو اس کا منہ اتر گیا۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا، اگر میں تمہیں مشورے کے لیے دور نہ لے جاتا تو یہ خوفناک صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ اب ایکس تھری کا بچانا..."

"جو ہونا تھا سو ہو گیا، اب اس کے ازالے کی تدبیر سوچو۔" میں نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ اسلحہ خانہ مصری سیکرٹ سروس کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ رفیق مایوس ہو کر خود کو اسلحے سمیت ہلاکت کے آتش فشاں میں جھونک دے۔" اس نے کہا۔ "کم از کم اس کا مطالبہ تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"

"الحدید کی پہاڑیوں والا منصوبہ؟"

لحظہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی جو فوراً ہی مفقود ہو گئی۔ "میں جنرل کو ادھر آنے پر آمادہ کر سکتا ہوں مگر یقین رکھو کہ وہ ایسی بھرپور تیاریوں سے آئے گا کہ ہم دونوں کو بھی اس کھلے صحرا میں کہیں امان نہ مل سکے گی۔"

"کیوں نہ اسے شہر کے کسی مقام پر بلا کر اغوا کیا جائے؟"

"بہت مشکل ہوگا، تم میرے ساتھ شہر کیوں نہیں چلتے" اس نے کہا۔ "شاید ہم دونوں مل کر کوئی راہ نکال سکیں۔"

"اور اگر رفیق نکل بھاگا؟"

"وہ سوچ بھی نہ سکتا ہوگا کہ ہم اس قدر اہم اور بڑے اسلحہ خانے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔" اس نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ "وہ اندر ہی جل مرے گا لیکن باہر آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

"دشمن کو حقیر نہ سمجھو ہاشم!" میں نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "وہ اب تک تمہاری توقعات سے زیادہ ذہین اور مکار ثابت ہوا ہے۔"

"میں قاہرہ سے ایکس تھری تک کمک بھی لا سکتا ہوں۔" اس نے ذہنی خلفشار کے عالم میں پیشکش کی۔

"کتنے آدمی لے آؤ گے؟"

"بارہ سے پندرہ تک مسلح اور جانباز گوریلے۔" اس نے کہا۔ "وہ تمہارے ایک اشارے پر تہہ خانے میں کود پڑیں گے۔"

"میں کسی کو موت کی باہوں میں دھکیلنا پسند نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "وہ ذرا سا بھی خطرہ دیکھتے ہی اسلحے کے پورے ذخیرے کو اڑا دے گا۔"

"پھر... پھر کیا کیا جائے؟" اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ وہ بہت زیادہ متوحش اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

"بظاہر تو بربادی ایکس تھری کا مقدر معلوم ہوتی ہے۔" میں نے حقیقت پسندانہ لہجے میں کہا۔ "ہماری کوشش بس یہی ہو سکتی ہے کہ رفیق اس کے ملبے سے زندہ فرار نہ ہو سکے اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں۔ آخر ہم اس قدر بے بس کیوں ہیں؟" اس پر وحشت سی طاری ہونے لگی۔ اس کا ذہن ایکس تھری کی بربادی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"جذباتی نہ بنو ہاشم!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا۔ "تلخ حقائق کا سامنا ہی مردانگی کی شان کہلاتا ہے... میرا مشورہ مانو تو فوراً شہر لوٹ جاؤ اور جنرل کو ایکس تھری کی راہ پر لگا دو...."

"مگر کیسے؟" اس نے اضطراب کے عالم میں میری بات کاٹ دی۔

"تم رفیق کے ٹرانسمٹر سے فالکن کا کوڈ استعمال کرتے ہوئے مضافات کے صحرا میں اسلحے کے بھاری ذخیرے بمعیت صفدر کی موجودگی کی خبر دے ڈالو۔ یہ مہم اتنی بڑی نظر آئے گی کہ جنرل نے فوجی دستے بھی ساتھ لیے تو ان کی کمان خود ہی کرنا چاہے گا۔ اسی کے ساتھ تم اپنے مسلح ساتھی یہاں لے آؤ۔ جنرل کو رفیق کی موجودگی کا علم نہ ہوگا اور اس کے آدمی ایکس تھری پر دھاوا بول کر اس کے ساتھ ہی رفیق کے بھی پرخچے اڑا دیں گے اور عقب سے تمہارے آدمی جنرل کے عملے پر آگ برسانی شروع کر دیں گے اس طرح ایکس تھری تو تباہ ہو ہی جائے گا مگر یہ امکان بھی ہے کہ جنرل احمد فواد ہمارے ہاتھوں مارا جائے۔"

"تو پھر تم بھی میرے ساتھ شہر چلو۔" میری تجویز اس کے ذہن میں آ گئی۔

"ہم میں سے ایک آدمی کا یہاں ٹھہر کر نگرانی کرنا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "رفیق مرنے کا ارادہ ـــــــ کرنے کے باوجود زندگی کے لیے آخری کوشش ضرور کریگا جسے ناکام بنانا ہم میں سے کسی ایک کی ذمہ داری ہوگا۔"

"تو میں یہاں رک جاتا ہوں، تم شہر چلے جاؤ۔" وہ اس وقت زود حس ہو رہا تھا۔ "جنرل سے بات کرنے کے بعد میرے حوالے سے تمہیں صرف ایک آدمی سے ملنا ہوگا اور وہ بارہ سے پندرہ گوریلے مختصر سی مدت میں تمہارے ساتھ روانہ کر دے گا۔"

"میرا لب و لہجہ جنرل کو شبہ میں ڈال دے گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "تم نستعلیق قسم کی عربی بولتے ہو، ٹرانسمٹر پر تمہاری آواز رفیق سے مشابہ ہوگی اور پھر میرے لیے تمام راستے اجنبی ہیں۔ شاید میں وہیں بھی نہ پہنچ سکوں۔"

"تم بھٹک جاؤ گے۔" وہ مایوسانہ انداز میں بولا۔ "صحرائی ہوائیں آناً فاناً میں ریت پر ٹائروں کے نشان صاف کر دیتی ہیں۔"

تھوڑی سی رد و قدح کے بعد وہ ایکس تھری سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور میں محتاط انداز میں اس اندرونی کمرے میں جا پہنچا جہاں تہہ خانے میں اترنے کا راستہ موجود تھا۔

میں نے دونوں ریوالور گود میں رکھ لیے اور ایک دیوار کے سہارے اس طرح بیٹھ گیا کہ تہہ خانے کا راستہ براہ راست میری نگاہوں کی زد میں تھا۔

میرے لیے بھی وہ صورتحال روح فرسا تھی میرے قدموں کے عین نیچے ہزاروں ٹن بارودی قوت کے آتش گیر ذخائر موجود تھے جن پر ایک مایوس شخص قابض تھا اور وہ کسی بھی لمحے اس ذخیرے کو اڑا سکتا تھا۔

وقت جوں کی چال رینگتا رہا۔ باہر سے آنے والی ہوا میں خنکی کے بجائے حدت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی اور میں اس روح فرسا معرکے کے ممکنہ نتائج پر غور کر رہا تھا۔

یک بیک میں چونک پڑا۔

تہہ خانے سے کوئی تیز آواز ابھری تھی۔ میں دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھام کر بے آواز سیدھا کھڑا ہو گیا۔

چند سیکنڈ گزر گئے مگر دوسری آواز نہیں ابھری۔

میرے اعصاب پر تناؤ طاری ہونے لگا۔ شاید رفیق کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ننگے پاؤں زینہ طے کر کے اوپر آ رہا تھا۔

"ہاشم!" اس بار تہہ خانے میں سے آنے والی رفیق کی آواز میں نے واضح طور پر سنی جو اپنی ہی گونج میں معدوم ہو گئی۔

میں اپنی جگہ خاموش لیکن چوکنا کھڑا رہا۔

"ہاشم!... حرامزادے! مجھے معلوم ہے کہ تو میری گھات میں کسی مردے کی طرح دبکا بیٹھا ہوگا مگر یہ سن لے کہ آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے، اگر دو گھنٹے گزر گئے تو میں بلا تردد اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دوں گا۔"

اس بار بھی میں خاموش رہا اور احتیاط سے ایک ایسی جگہ سرک گیا جہاں سے میں تہہ خانے کے راستے پر نظر رکھ سکتا تھا لیکن تہہ خانے سے برآمد ہونے والا فوری طور پر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میری مسلسل خاموشی پر تہہ خانے میں بڑبڑاہٹ سی گونجی

محسوس ہوئی اور ایکس تھری میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔

اِنتظار کے لمحات کتنے طویل اور صبر آزما ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اس صعوبت سے گزر چکے ہوں۔ رفیق کے بیان اور میری رسٹ واچ کے مطابق واقعی صرف نصف گھنٹہ گزرا تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کئی گھنٹوں سے انتظار کی اس کیفیت کو بھگت رہا ہوں۔

باہر صحرا میں بھی ہر طرف سکوت کا راج تھا۔ بس کبھی کبھار ٹھوس کی چٹانوں میں سے گزرنے والے جھکڑ تیز شور پیدا کرنے لگتے تھے۔

"ہاشم اور صفدر!" طویل سکوت کے بعد تہہ خانے میں سے رفیق کی آواز پھر ابھری۔ "تم دونوں کتنے میری بات کا جواب دو یا نہ دو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم میری آواز ضرور سن رہے ہو۔"

چند ثانیوں کے لیے بوجھل اور سنسنی خیز سکوت طاری ہوا، جس کے بعد اس کی آواز دوبارہ سُنائی دی۔ "تہہ خانے میں طاقتور ڈائنامائیٹ کے سیٹ بیٹریوں اور ریموٹ کنٹرول سمیت موجود ہیں۔ میں نے چار سیٹ پورے تہہ خانے میں پھیلا کر بیٹری سے جوڑ دیئے ہیں اور میں ریموٹ کنٹرول ساتھ لے کر باہر آرہا ہوں، اگر تم دونوں سے مجھے ذرا بھی خطرہ لاحق ہوا تو یہ عظیم الشان تہہ خانہ پورے اسلحہ سمیت میرے خفیف سے اشارے پر ایک جلتے ہوئے الاؤ میں تبدیل ہوجائے گا۔"

میں ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

اس مکار شخص نے تہہ خانے میں اپنی گلوخلاصی کا ایک مؤثر ذریعہ تلاش کر ہی لیا تھا اور کم از کم میں رفیق کی موت کے عوض ایکس تھری کی بربادی کو گھاٹے کا سودا شمار کرتا تھا۔

"مختصر سا ریموٹ کنٹرول یونٹ میرے ہاتھ میں ہے۔" تہہ خانے کے دہانے کے قریب سے رفیق کی آواز آئی۔ شاید وہ سیڑھیاں عبور کرکے اوپر آرہا تھا۔ "اور میری انگلی اس بٹن پر ہے جو اس تہہ خانے کو کھنڈر بنا سکتا ہے۔ تم دونوں کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہ ہونا چاہیے اور نہ تم مجھ سے قریب آنے کی کوشش کروگے۔"

"تو ایک بار باہر تو نکل۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "پھر دیکھا جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔"

میں دونوں ریوالور جیب میں ڈال کر ایک دیوار کی اوٹ میں ہوگیا۔ چند سیکنڈ تک کچھ نہ ہوا پھر اچانک رفیق کی کھوپڑی فرشی خلا میں سے نمودار ہوئی اور نہایت سرعت سے فوراً ہی غائب ہوگئی۔ شاید اس طرح وہ باہر کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

قدرے توقف کے بعد وہ چوکنا نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیتا ہوا اس خلا سے باہر آگیا۔

اس کے داہنے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا اور بائیں ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبیہ کے برابر ایک سیاہ بکس تھا جو یقینی طور پر تار و دیگر رابطے کے بغیر خاصے فاصلے سے ڈائنامائیٹس کو اڑا سکتا تھا۔

باہر آکر وہ کمرے کے وسط میں خاصی دیر کھڑا سُن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے خود کو وہاں تنہا دیکھ کر خاصی حیرت ہو رہی تھی۔ آخر کار وہ سر جھٹک کر نکاسی کے راستے کی طرف چل دیا جو بیرونی کمرے سے ہوکر گزرتا تھا۔ میرے کان پوری توجہ سے اس کے قدموں کی مدھم سی چاپ پر مرکوز تھے جو بتدریج اور تیزی سے تلے تسلسل کے ساتھ دور ہوتی جارہی تھی۔

میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور پنجوں کے بل اس دروازے کی اوٹ میں پہنچ گیا جو دونوں کمروں کو ملاتا تھا۔

رفیق کی پشت میری جانب تھی اور وہ اس دروازے کی طرف جارہا تھا جو صحرا میں کھلتا تھا۔ غالباً اسے اطمینان ہوچکا تھا کہ اس کے پیچھے جھونپڑے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس وقت میں چاہتا تو عقب سے فائر کرکے بآسانی رفیق کو ختم کرسکتا تھا مگر وہ مرتے مرتے بھی ریموٹ کنٹرول سے ایکس تھری کو تباہ کرسکتا تھا۔ جب کہ بدلے ہوئے حالات میں میرا ذہن ایک اور ہی منصوبہ ترتیب دے رہا تھا۔

وہ باہر چلا گیا مگر میں آگے نہ بڑھا۔ اگر میں بیرونی کمرے میں چلا جاتا تو رفیق کی اچانک واپسی کی صورت میں میرے لیے خود کو چھپانا ناممکن ہوکر رہ جاتا۔ اور میں مناسب موقع آنے سے قبل اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

باہر جاکر شاید اسے یقین ہوگیا کہ اس کے دونوں حریف بوکھلا کر بھاگ نکلے تھے کیونکہ اسی کی کار میں ہاشم شہر جاچکا تھا۔ پھر اپنے عقب پر ایک آواز سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

وہ آواز بہت واضح اور تیز تھی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے پھوس کی چٹائی کو توڑنے کی کوشش کی ہو۔

وہ آواز یقینی طور پر اندرونی کمرے کے پیچھے والے احاطے سے آئی تھی۔ شاید رفیق اس وقت تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔

وہ بے خبری میں عقب سے اندر داخل ہوکر یقین کرنا چاہتا تھا کہ اندر واقعی سناٹا تھا۔

میرے لیے وہ لمحات بڑے خطرناک تھے۔ میرا صرف ایک دشمن تھا لیکن اس نے اپنی حکمتِ عملی سے وہم میں ڈال دیا تھا۔

میں وہیں رُکا رہتا اور رفیق صحن سے اندر گھس آتا تو میں اس سے بچ نہ سکتا تھا اور اگر میں بیرونی کمرہ عبور کرکے باہر جانکلتا اور چٹائی ٹوٹنے کے بارے میں میرا اندیشہ بے بنیاد ہوتا تو وہ وہیں مجھے گھیر لیتا۔ تیسری راہ اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے مترادف تھی، یعنی میں پھرتی کے ساتھ تہہ خانے میں اُتر جاتا مگر میرے لیے وہ ہلاکت کا یقینی راستہ تھا۔

نیچے اُترنے کے بعد میں بیٹری سے منسلک تاروں کو علیحدہ کرکے رفیق کے ریموٹ کنٹرول کو بآسانی ناکارہ بنا سکتا تھا۔ مگر دوسری طرف عجلت میں جنرل احمد فواد کو ایکس تھری کی طرف متوجہ کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے وہاں حملہ آور ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں منصوبے کے برعکس رفیق کے بجائے میں اسلحے کے اس ہولناک انبار میں ہلاک ہوجاتا۔ تیسرا راستہ میں نے فوری طور پر ترک کردیا۔

پھر جوں ہی صحن میں دوسری آہٹ سُنائی دی میں نے تن بہ تقدیر ہوکر اپنی جگہ چھوڑ دی اور ایک ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔ بیرونی کمرہ عبور کرکے میں پھرتی سے نکاسی کے راستے کی اوٹ میں پہنچا اور تھوڑا سا سر باہر نکال کر جائزہ لیا تو دروازے کے سامنے پڑی ایکس تھری کے نگہبان کی لاش کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ جھونپڑے کو خیرباد کہہ کر کھلے صحرا کے سینے پر نکل آیا۔ باہر آنے کے بعد یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں غیر متوقع طور پر دائیں بائیں سے وہ سامنے نہ آجائے۔ ایک مسلح اور وحشی دشمن کے بارے میں وہ میرا عجیب و غریب تجربہ تھا جس میں ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے تھے اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آخر کار دونوں میں چوہا کون ثابت ہوگا۔

میں سامنے سے ہٹ کر اس جھونپڑے کی داہنی طرف دبک گیا۔

اس بار رفیق کے انداز میں بے یقینی اور سراسیمگی نہیں تھی۔ وہ خاصے اعتماد سے باہر آیا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ بدستور بلند تھا مگر بایاں ہاتھ پہلو میں جھول رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ریموٹ کنٹرول یونٹ کے بٹن پر سے اپنی انگلی بھی ہٹا چکا تھا۔

وہ اپنی دانست میں ایکس تھری کی مکمل تلاشی لے چکا تھا اور اپنے کسی حریف کو وہاں موجود نہ پاکر خاصا مطمئن تھا۔ اس کی تقویت میں نیلی فاکس ویگن کی عدم موجودگی کا نمایاں دخل تھا۔

اس نے ریموٹ کنٹرول کا مختصر سا سیاہ یونٹ ریت پر رکھ دیا اور خود پھوس کی دیوار کے سائے میں ٹانگیں دراز کرکے بیٹھ گیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک اس نے اپنا سر بائیں طرف گھمایا۔ اس وقت میرا سر اوٹ سے ذرا آگے نکلا ہوا تھا۔ میں خود کو اس کی نگاہوں سے نہ بچا سکا۔

پھر ہم دونوں نے قیامت کی پھرتی دکھائی، اس نے اٹھتے ہوئے ریت پر سے ریموٹ کنٹرول بھی لینا چاہا اور میں نے ہاتھ سیدھا کرکے گولی چلادی۔

اس سے نگاہیں چار ہوتے ہی میرا پہلا فیصلہ گولی چلانے کا تھا جس پر میں بے دھڑک عمل کر گزرا مگر مجھے دیکھ کر ایک لحظے کے ہزارویں حصے کے لیے وہ متحیر نظر آیا تھا پھر اسے وار کرنے کے ساتھ ہی ریموٹ کنٹرول کی بھی فکر تھی لہٰذا وہ مار کھا گیا۔

بائیں پسلیوں میں گولی پیوست ہوتے ہی وہ چیخ مار کر داہنی طرف لڑھک گیا، اس کے اور میرے درمیان وہ مختصر سی سیاہ ڈبیہ بدستور ریت پر پڑی ہوئی تھی جس پر ایکس تھری کی سلامتی کا دارومدار تھا۔

میری گولی نے اسے زخمی تو کیا تھا مگر زخم کاری نہیں ثابت ہوا تھا۔ ریت پر قلابازی کھا کر وہ فوراً ہی سیاہ ڈبیہ کی طرف جھپٹا مگر میں اس سے زیادہ سُرعت کے ساتھ وہ ڈبیہ لے کر پیچھے ہٹ چکا تھا۔

اس نے گھٹنوں کے بل ریت پر کھڑے ہوکر میری طرف ایک فائر جھونک مارا میرے لیے اس بہکے ہوئے فائر سے بچنا دشوار ثابت نہیں ہوا۔

میں نے اس کے پستول والے ہاتھ کی شست لے کر دوسرا فائر کیا اور گولی اس کے پیٹ میں اُتر گئی۔ اس کا نچلا دھڑ اس کے لہو میں رنگین ہونے لگا اور اسی وقت صحرا کی فضا میں کسی کار کے انجن کی کرخت سی گونج سُنائی دینے لگی۔

رفیق کے پیٹ اور پسلیوں سے بھاری مقدار میں خون بہہ رہا تھا مگر وہ ریت میں لوٹ کر ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔

اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور غیظ و غضب نے اس کے چہرے کے نقوش مسخ کرکے رکھ دیئے تھے۔

اس بار میں نے توقف کئے بغیر تیسری گولی چلادی اور اس کے داہنے کندھے سے سرخ سُرخ لہو کی دھاریں بہہ نکلیں۔

اس کے جسم نے ایک شدید جھٹکا کھایا مگر وہ بدستور اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا اور نقاہت سے لرزتی ہوئی قہر آلود آواز میں بولا "صفدر ... علی ... کاش میں تجھے مار سکوں۔"

اس کے پستول سے یکے بعد دیگرے تین گولیاں برآمد ہوئیں چوتھی بار محض کھٹکا ہوکر رہ گیا کیونکہ چیمبر خالی ہوچکا تھا۔ اس کی پہلی اور تیسری گولی تو نہ جانے کدھر نکل گئی، مگر دوسری گولی نے میرا بایاں بازو ادھیڑ ڈالا۔

میری فائرنگ سے اسے تین گہرے زخم آچکے تھے جن سے تیزی سے خون رواں تھا مگر وہ سخت جان نہ صرف اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا بلکہ اس نے مجھے بھی زخمی کردیا تھا۔ میں نے اشتعال کے عالم میں اس کی پنڈلی کا نشانہ لیا اور اس بار وہ چیخ مار کر ریت پر ڈھیر ہوگیا۔

انجن کا کرخت شور اب فاکس ویگن کی آواز اختیار کرچکا تھا، شاید ہاشم اپنے مشن سے واپس آرہا تھا اور میں اپنے ہولناک

منصوبے کی بنیادیں حسبِ مرضی ڈھالنے میں غیر متوقع کامیابی حاصل کر چکا تھا۔

رفیق سخت اذیت کے عالم میں مجھے بے تحاشہ گالیاں دے رہا تھا، زندگی اور موت کے اس بھیانک موڑ پر بھی وہ چند سانسوں کی التجا کرنے پر تیار نہیں تھا۔

"یہ قصاص ہے رفیق!" میں نے اس کے قریب پہنچ کر پرسکون لہجے میں کہا۔ "مرنے والے نگہبان کے لہو کا قصاص۔"

"روئے زمین پر تجھ سے زیادہ مکار انسان نہ ہوگا۔" اس نے غصے اور حقارت سے لبریز لہجے میں رک رک کر کہا۔ "کاش ۔۔۔ میں نے حد زیادہ خود اعتمادی نہ دکھائی ہوتی۔"

"تم بہت بودے نکلے۔" قریب المرگ دشمن کے ساتھ میں نے ترشی مناسب نہ سمجھی۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ میں اس گودام کو اپنے ہاتھوں سے اڑا سکوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں حیرت تیر گئی۔ "تو کیا ۔۔۔ تم بھی ہاشم کے پیچھے لگے ہوئے ہو؟ دوست بن کر اسے دغا دے رہے ہو؟"

"جو چاہو سمجھ لو۔" میں اپنے بازو کا زخم دباتے ہوئے مسکرایا۔

"کیا تمہیں پہلے سے اس گودام کا علم تھا؟"

"علم ہوتا تو یہ بہت پہلے مٹا دیا گیا ہوتا۔" وہ ریت پر کرب سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ "کاش میں ہاشم کو تمہارا قابلِ نفرت چہرہ دکھا سکتا۔"

"وہ آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنی کار کے انجن کی آواز پہچانو۔"

"واللہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گا ۔۔۔ میں تو خیر دشمن ہی سہی مگر تم دوست ہونے کے باوجود اس اسلحہ خانے کے سراغ میں لگے ہوئے تھے۔"

"مجھے صرف اتنا بتا دو کہ نگہبان کو قتل کرنے کے بعد تم اتنی آسانی کے ساتھ تہہ خانے میں کیسے گھس گئے؟"

"لوگوں کو مشتعل کر کے ان کی زبان کھلوانا ایک فن ہے۔ نگہبان کی ہرزہ سرائی میری معلومات کا ذریعہ بنی تھی۔"

اسی اثنا میں نیلی فاکس ویگن وہاں آ پہنچی۔ اس میں ہاشم کے علاوہ بھی کئی آدمی ٹھنسے ہوئے تھے۔

ہاشم گاڑی سے اتر کر تیر کی طرح میری طرف آیا۔

"تت ۔۔۔ تم نے اسے زیر کر لیا؟" وہ ریت پر کراہتے ہوئے رفیق کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "یہ کیسے ہو گیا؟"

"یہ تہہ خانے میں ریموٹ کنٹرول پر چار ڈائنامائیٹ سیٹ کر کے باہر نکلا تھا۔" میں نے اسے سیاہ ڈبیہ دکھا کر کہا۔ "بس پھر ۔۔۔"

"یہ حرامی تمہارا دشمن ہے۔" رفیق درمیان میں چیخ پڑا۔ "دوست بن کر اپنا کام نکال رہا ہے اور یہ تمہارا اسلحہ خانہ برباد کرنا چاہتا ہے۔"

ہاشم نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں میری طرف دیکھا اور اسے آنکھ مار کر مسکرا دیا۔

"اوہ!" ہاشم وارفتگی سے بولا۔ "تم غم نہ کرو، یہ باز پر آیا تو اسے بھی سنبھال لوں گا۔"

میری نگاہیں ہاشم کے ساتھ آنے والے ان پانچوں افراد پر مرکوز تھیں جو فاکس ویگن سے اترنے کے بعد نشستوں کے پیچھے سے اسٹین گنیں نکال رہے تھے۔

"یہاں سے بھاگنے کی فکر کرو۔" ہاشم نے مجھے تڑپتے اور کراہتے ہوئے دشمن سے دور لے جا کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"جنرل سے کیا بات ہوئی؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس وقت دو بجے ہیں، میرا آدمی اب سے دس منٹ بعد جنرل سے بات کرے گا۔"

"تم اسے روک نہیں سکتے؟" میں نے اضطرار کے عالم میں اس کا بازو پکڑ لیا۔

"ناممکن ہے۔" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "یہاں سے شہر کی مسافت نصف گھنٹے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔" پھر چونک کر بولا۔ "ارے تمہارا تو بازو زخمی ہے!"

"فکر نہ کرو معمولی زخم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ اپنا پروگرام کیوں بدل دیا؟"

"چھاپہ ماروں کا ایک گروپ سینائی کے مقبوضہ علاقے میں گیا ہے صرف پانچ آدمی بروقت ہاتھ آ سکے۔" اس نے بتایا۔ "شہر پہنچ کر میرے ذہن میں آیا کہ اگر ہمارے واپس ایکس بھٹری پہنچنے سے پہلے جنرل نے دھاوا بول دیا تو تمہارا منصوبہ چوپٹ ہو جائے گا۔ اسی لیے آدمی کو دو بج کر دس منٹ پر جنرل سے بات کرنے پر مامور کر آیا۔ اب تم فوری طور پر یہاں سے بھاگنے کی فکر کرو۔"

"کیوں؟"

"میں نے کہا نا کہ آج میری عقل ذرا تاخیر سے کام کر رہی ہے، اس کھلے صحرا میں کہیں ایک انچ کا بھی سایہ میسر نہیں ہے اگر جنرل نے ہیلی کاپٹر استعمال کئے تو ہم سب بھی ہوائی بھیڑوں کی طرح فضائی فائرنگ سے بھون دیئے جائیں گے!"

"اس کا بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے دھیمے سے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ یہ ریموٹ کنٹرول زیادہ سے زیادہ کس فاصلے سے کارآمد ہے؟"

"ڈیڑھ میل!" ہاشم نے پلاسٹک کی سیاہ ڈبیہ احتیاط سے الٹ کر اس کا لیبل دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر تم کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"بس دیکھتے جاؤ!" میں نے کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔

اس وقت تک رفیق نقاہت کے باعث بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس کا جسم رہ رہ کر یوں جھرجھری لے رہا تھا جیسے اس پر نزع کا عالم طاری ہو۔

میری ہدایت پر وہ پانچوں ایکس بھٹری میں گھس گئے اور ہاشم میرا شانہ برہنہ کر کے زخم پر رومال کی پٹی کسنے لگا۔

"اگر وہ ریموٹ کنٹرول سمیت باہر آیا تھا تو آخر تم نے کس طرح اسے زیر کر لیا؟" ہاشم نے مجھ سے دوبارہ سوال کر ڈالا۔ "اور وہ بھی ایکس بھٹری کو نقصان پہنچائے بغیر!"

"بس مقدر اور احتیاط کہہ لو ورنہ مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری تھا کہیں بھی ذرا سی لغزش ہو جاتی تو شاید تمہارے سامنے زندہ نہ ہوتا۔"

"ہم نے جنرل کو ادھر متوجہ کرنے کا فیصلہ کر کے بڑی غلطی کی۔" اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "ورنہ ایکس بھٹری کو بچایا جا سکتا تھا!"

"پہلے میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن درحقیقت اسی فیصلے کی وجہ سے اس وقت صورتِ حال پر ہماری گرفت مضبوط ہے!" میں نے کہا۔

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

"میں خون ریز تصادم سے پہلے تک رفیق کی نگاہوں سے روپوش رہا۔ اس نے جھونپڑے کی بھی مکمل تلاشی لی تھی مگر اسے ہم دونوں کے بھاگ نکلنے کا یقین اسی وقت آیا جب اس نے اپنی کار غائب پائی۔ اس کے بعد وہ بے فکر ہو گیا اور اس کی یہی بے فکری میری کامیابی کا سبب بن گئی۔" میں نے اسے بتایا۔

"یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ہم اس کی کار چند فرلانگ دور کسی ٹیلے کی اوٹ میں چھپا دیتے۔" اس کے لہجے میں تاسف نمایاں تھا!

"اسی وقت ہو سکتا تھا جب ہمیں رفیق کے اقدامات کا پیشگی علم ہوتا۔" میرا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ "جس وقت تم روانہ ہوئے تمہارے ذہن پر صرف دو گھنٹے کی مہلت مسلط تھی اور اس وقت تمہیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ تہہ خانے میں اس قدر خطرناک قسم کے ڈائنامائیٹ بھی موجود ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔ "بعض اوقات میں بلا سوچے سمجھے اپنے قیاسات کا اظہار کرتا چلا جاتا ہوں۔"

وہ پانچوں ایکس بھٹری میں سے مٹیالے رنگ کی تین ترپالیں لے کر آئے تو میرے ساتھ ہی ہاشم بھی خوش ہو گیا۔

"اس طرف دو ڈھائی فرلانگ دور چلے جاؤ۔" میں نے جنوب کی سمت میں اشارہ کر کے ان پانچوں سے کہا۔

"ادھر ہی کیوں؟" ان کے بڑھ جانے کے بعد ہاشم نے سوال کیا۔

"اگر میرا اندازہ درست ہے تو حملہ آور شمال سے آئیں گے!"

"تمہارا اندازہ قابلِ رشک ہے۔ ہم اس وقت قاہرہ کے ٹھیک جنوب میں ہیں!" اس نے کہا۔ "ادھر ہم نسبتاً محفوظ رہیں گے۔"

"اس کا کیا کیا جائے؟" میں نے رفیق کے سانسوں کی بے ترتیب آمد و رفت محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

"پڑا رہنے دو، تہہ خانے میں اتنا بارود ہے کہ وہ کافی وسیع علاقہ کو برباد کر دے گا۔" اس نے میرا کام سہل کر دیا۔

"اس کی لاش بھی یہیں پڑی رہنے دو۔" قدرے توقف کے بعد وہ نگہبان کی خون آلود لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "دو لاشیں آنے والوں کے لئے ٹکراؤ کی خاصی اثر انگیز کہانی سنائیں گی۔"

"دوسری لاش کہاں سے لاؤ گے؟"

وہ پھیکے انداز میں ہنس پڑا۔ "رفیق لاش سے کم نہیں ہے اس کے جسم سے اتنا خون بہہ چکا ہے کہ کوئی علاج اسے نہ بچا سکے گا۔"

پھر ہم دونوں بھی ان پانچوں کے پیچھے چل دیئے۔

"اگر رفیق کی کار کچھ دور ہٹا دی جاتی تو وہ تباہی سے بچ جاتی۔" کچھ دور چلنے کے بعد ہاشم نے دبے لہجے میں کہا۔

"اسے بچا کر کیا کرنا ہے؟"

"واپسی میں سہولت ہو جاتی۔"

"صحرا میں گھسنے والی پارٹی جس طرح بھی آئے لیکن یہ یقین رکھو کہ سڑک کی ناکہ بندی بھی کر لی جائے گی، ادھر سے واپسی کی کوشش موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو گی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو تمہارے ذہن میں واپسی کی کیا راہ ہے؟"

میں مسکرا دیا۔ "شام کے دھندلکے میں تم اس راستے کی طرف رہنمائی کرو گے جو رجب کے فارم تک لے جاتا ہے۔"

"وہ ابھی تک مجھے یاد ہے، خاصا وقت صرف ہوگا اور دشواری کا ذکر تو خیر بے سود ہے۔" اس نے کہا۔ "مگر اپنی جانوں کے تحفظ کے لئے یہ بھی کرنا ہی ہوگا۔"

ایکس بھٹری سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ہم ساتوں ایک ایسے ریتیلے ٹیلے کی تلاش میں کامیاب ہو گئے جس کی اوٹ میں ایکس بھٹری سے ہمیں دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔

اس وقت میری رسٹ واچ دو بج کر دس منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ان پانچوں کو ہدایات دینی شروع کر دیں اور وہ پانچوں دو ترپالیں اوڑھ کر سینوں کے بل نیم گرم ریت پر لیٹ گئے۔ ترپالوں کے نیچے ان کے ہاتھ اپنے ہتھیاروں پر تیار تھے اور انہوں نے سرتاپا خود کو اس طرح ترپالوں میں چھپا یا تھا کہ میری دانست میں اوپر سے پرواز کرتے ہوئے بادی النظر میں ان پر شبہ کرنا مشکل تھا۔

تیسری ترپال میں نے ہاشم کے ساتھ سر پر اوڑھ لی ہم دونوں ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ایکس بھٹری کی نگرانی کر رہے تھے اور ہماری پوزیشن ایسی تھی کہ ضرورت پیش آنے پر ہم دونوں پل بھر میں ترپالیں

اوندھے سینے کے بل ریت پر گر سکتے تھے!

"ریموٹ کنٹرولر کہاں ہے؟" ہاشم نے سوال کیا۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ہیجان پیدا ہو چکا تھا!

میں نے داہنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا جس میں پلاسٹک کی سیاہ ڈبیا موجود تھی!

"سوا دو!" ہاشم رسٹ واچ دیکھ کر بڑبڑایا۔ "سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹرز میں اب تک ہنگامہ شروع ہو چکا ہوگا۔"

"اس موضوع پر اتنی شدت سے نہ سوچو، آنے والے وقت کے لئے اپنی صلاحیتوں کو محفوظ رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ سوچتے سوچتے اعصاب جواب دے جائیں اور عین وقت پر ہم سے بوکھلاہٹیں سرزد ہونے لگیں۔"

"مگر اس وقت ذہن کو کسی اور طرف لگانا محال ہے!"

"شہر گئے تھے تو رجب یا ابو سلطان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی؟" میں نے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"میری تو جر بٹا رہے ہو؟" وہ ہنس دیا مگر اس کی بوجھل ہنسی سے بھی فکرمندی ٹپک رہی تھی۔

"اس واقعے کے بعد شاید قاہرہ میں ہماری نقل و حرکت مخدوش ہو جائے۔ اسی خیال سے پوچھ رہا تھا۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے ایک لمحے کی مہلت نہیں ملی، ایکس تھری، رفیق اور جنرل میرے ذہن پر سوار تھے۔"

"جنرل کے بذاتِ خود آنے کے کیا امکانات ہیں؟"

"فالکن نے اسے یہاں صفدر علی کی موجودگی کی خبر دی ہوگی......"

"اوہ...... ایک غلطی ہو گئی!" میں نے اضطراری انداز میں اپنے سر پر سے ترپال پھینک دی۔ "سامنے کی بات رہ گئی!"

"کہاں چلے؟ بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟" میری بدحواسی دیکھ کر ہاشم بھی بوکھلا گیا۔

"فالکن کے گھر پر ٹرانسمٹر ہے۔ وہ دو بج کر دس منٹ پر جنرل سے بات کرتا ہے پھر تھوڑی ہی دیر بعد جنرل ایکس تھری کے باہر فالکن کی لاش دیکھے گا تو فوراً خطرہ بھانپ لے گا۔ تمہارے کہنے کے مطابق شہر سے یہاں تک کا راستہ نصف گھنٹے کا ہے پھر رفیق کے زخموں پر خون کی جمی ہوئی تہہ چغلی کھائے گی کہ وہ دو سوا دو کے لگ بھگ زخمی ہوا ہے...... نہیں ہاشم، اسے وہاں سامنے نہیں ہونا چاہئے۔"

"اب وقت نہیں ہے۔" ہاشم خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ تم وہاں سے لوٹنے بھی نہ پاؤ کہ وہ آ جائیں۔"

شاید قدرت کو حالات میں تبدیلی منظور نہیں تھی کیونکہ اسی وقت ہمارے کانوں میں ہیلی کاپٹر کا شور گونجنے لگا جو تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا۔

میں نے پھرتی سے ترپال اٹھا کر اپنے اور ہاشم کے سر پر ڈال دی

اور ہماری نگاہیں شمال کی سمت اٹھ گئیں جہاں ایکس تھری سے کافی آگے ریت کا ایک ہولناک بادل تیزی کے ساتھ ایکس تھری کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔

وہ ہیلی کاپٹر اس قدر نیچی پرواز کر رہا تھا کہ سورج کی چمک کے باوجود ریت کے گہرے بادل میں ایک سرمئی ہیولے سے زیادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"وہ دو ہیں!" اچانک ہاشم ہذیانی انداز میں بولا۔

"ہو سکتا ہے کہ پیچھے اور بھی ہوں!" میں نے اسے بدترین حال کے لئے تیار کرنے کی نیت سے کہا۔

"اور اگر وہ کئی سمتوں سے آئے؟" ہیلی کاپٹروں کی آمد بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہاشم کے خلجان میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میرے لئے اس کا رویہ بہت مایوس کن تھا اور ایک لمحے کے لئے میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سات آدمی، پانچ گنیں اور دو ریوالور ایکس تھری پر ہونے والی بھاری یلغار سے کیونکر نمٹ سکیں گے!

ریت کے بگولوں نے ایکس تھری تک پہنچنے سے قبل ہی ماہیئت بدل لی اور ہمیں دو ہیلی کاپٹر دائیں بائیں سے ایکس تھری کی طرف بڑھتے نظر آئے!

پہلے ان میں سے ایک ہیلی کاپٹر دائرے کی صورت میں کاٹتا ہوا ایکس تھری پر سے گزرا اور صحرا کا سینہ مشین گنوں کی فائرنگ سے لرز اٹھا۔

پھر دوسرا ہیلی کاپٹر زمین سے بمشکل بیس فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا اور گولیاں برساتا ایکس تھری پر سے گزرا۔ اسی طرح انہوں نے کئی بار چکر لگا کر اور بے تحاشا گولیاں برسا کر نشانے کا جائزہ لیا اور مزاحمت کے آثار نہ دیکھ کر دونوں یکے بعد دیگرے ریت پر اتر گئے۔

ان کے پنکھوں سے اڑنے والا ریت کا طوفان شاید اتنا شدید تھا کہ مسافروں کے لئے اترنا محال تھا لہٰذا ان فضائی جہازوں کے انجن بند کر دیئے گئے۔

ایکس تھری کا ویران ڈھانچہ ہیلی کاپٹروں کے عقب میں چھپ کر رہ گیا تھا۔

پھر ہیلی کاپٹروں نے مسلح باوردی فوجی اگلنے شروع کر دیئے جو زمین پر ٹکتے ہی پیٹ کے بل لیٹتے جا رہے تھے۔

ایک ہیلی کاپٹر سے تین نفوس نیچے آئے جبکہ دوسرے سے اترنے والوں کی تعداد کسی طرح پندرہ بیس سے کم نہیں تھی۔

ریت کا طوفان ختم ہو جانے کے بعد دوسرے ہیلی کاپٹر پر بنے ہوئے فوجی نشانات بھی نظر آنے لگے تھے۔

اچانک فضا ایک بار پھر مشین گنوں کے شور سے لرز اٹھی شاید وہ پیش قدمی سے قبل ایک مرتبہ پھر اپنی تسلی کرنا چاہتے تھے۔ میں ٹیلے کے عقب میں دبک گیا۔

"یوسف!" اچانک ہاشم نے کسی کو پکارا۔

"الواہ! یا معلّم!" عقب سے آواز آئی۔

"دُوربین دو!"

اور پیچھے سے ایک شخص نے ترپال سے نکلے بغیر جیبی دُوربین ہاشم کو تھما دی۔

"ترپالوں سے باہر آ جاؤ۔" میں نے ہدایت کی۔ "یکدم فضا میں کسی بھی جہاز یا ہیلی کاپٹر کی آواز سنتے ہی دوبارہ ترپالیں اوڑھ لینا!"

وہ پانچوں اپنی اسٹین گنیں سنبھال کر ہمارے پیچھے آ گئے۔

"ان میں کوئی بھی جنرل کی وردی میں نہیں ہے!" ہاشم دُوربین آنکھوں سے ہٹائے بغیر تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔ "دو تین کے کندھوں پر وائرلیس سیٹ بھی ہیں!"

"غور سے دیکھو۔" میں نے کہا۔ "وہ ضرور ہوگا۔"

"تین افسر لاشوں کا معائنہ کر رہے ہیں باقی فوجی جھونپڑے کے گرد پھیل گئے ہیں۔" وہ بتانے لگا۔ "شاید رفیق بھی مر چکا ہے، زندہ ہوتا تو اسے ہوش میں لانے یا طبی امداد پہنچانے کے لئے کچھ بھاگ دوڑ ہوتی جو مفقود ہے!"

تھوڑے سے وقفے کے بعد ایک بار پھر متعدد سب مشین گنیں چلنے لگیں۔ محض پھوس کے بنے ہوئے ایک جھونپڑے میں داخل ہونے کے لئے ان کی احتیاطی تدابیر میرے لئے حیرت ناک تھیں جبکہ آثار کے مطابق وہ سب ہی فوجی نظر آ رہے تھے۔

"لو، وہ تو جھونپڑا گرا رہے ہیں!" بے اختیار ہاشم کے منہ سے نکلا اور میں نے اس کے ہاتھ سے دُوربین جھپٹ لی۔

ان کی حرکتیں مضحکہ خیز تھیں۔ ان کے تین افسر الگ پہچانے جا سکتے تھے جو شاید دُور کھڑے ہدایات دے رہے تھے اور بقیہ فوجی اس طرح ڈر ڈر کر پھوس کی چٹائیاں توڑ رہے تھے جیسے کسی بھی تنکے میں سے اچانک کسی کے نکل پڑنے کی امید ہو!

"ان سب کے دماغوں پر تمہارے نام کا آسیب سوار ہے۔ شاید انہیں بتا دیا گیا ہے کہ یہ مہم کس کی گرفتاری کے لئے ترتیب دی گئی ہے!" ہاشم نے ٹیلے کی اوٹ سے تبصرہ کیا۔ "شاید یہ لوگ وائرلیس پر ملنے والی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں۔"

میں نے غور سے جائزہ لیا۔ اس وقت وہ سب ایکس تھری کے ہولناک آتش فشاں کی زد میں تھے۔ البتہ دونوں ہیلی کاپٹروں کے بارے میں کچھ کہنا دشوار تھا۔

اچانک فضا میں ایک مانوس سی گونج سنائی دی۔ وہ پانچوں فوراً ترپالیں اوڑھ کر ریت پر لیٹ گئے۔ ہاشم نے بھی ترپال سر پر گھسیٹ لی۔

شمال کی جانب سے ایک تیسرا ہیلی کاپٹر ریت کے بگولے اڑاتا ایکس تھری کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

تیسرے ہیلی کاپٹر نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس وقت نیم مسمار ایکس تھری کے گرد کم از کم اٹھارہ فوجی موجود تھے اور اگر ان میں مزید بارہ پندرہ افراد شامل ہو جاتے تو شاید وہ لوگ اپنا دائرۂ کار دُور تک پھیلا دیتے۔

اتنا اندازہ تو کوئی عام آدمی بھی کر سکتا تھا کہ ایکس تھری کے باہر دو تازہ لاشیں موجود تھیں اور قاتلوں کا صحرا میں زیادہ دُور جانا ممکن نہیں تھا لہٰذا ان کے پھیلنے کی صورت میں اوّل تو ہماری کمین گاہ خطرے میں پڑ جاتی پھر وہ لوگ ہمیں گھیرنے کی کوشش بھی کر سکتے تھے۔

تیسرا ہیلی کاپٹر دائیں بائیں پہلو سے آنے کے بجائے سیدھا ایکس تھری کی طرف آیا۔ اس کی زمین سے بلندی خطرناک حد تک کم تھی۔

پھر جوں ہی ہیلی کاپٹر سے پیدا ہونے والے ہوا کے جھکڑوں نے ایکس تھری کے رہے سہے ڈھانچے کو اپنی زد میں لیا۔ میں نے ریموٹ کنٹرولر کا بٹن دبا دیا۔

کان پھاڑ دینے والا پہلا دھماکہ میری توقعات سے کہیں زیادہ شدید تھا، آگ، سیاہ دھویں اور ملبے کا ایک مینار ایکس تھری سے آسمان کی طرف اٹھتا چلا گیا۔

تیسرے ہیلی کاپٹر والا سیدھا اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ اسے اپنا رُخ تبدیل کرنے کی مہلت بھی نہ مل سکی اور بارودی ملبے کی زد میں آ کر اس ہیلی کاپٹر کے فضا میں ہی پرخچے اڑ گئے۔

اس کے بعد دھماکوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ صحرا کا سینہ آندھی کی زد میں آئے ہوئے کسی خزاں رسیدہ پتّے کی طرح لرز رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے صحرا کے اس حصّے میں کوئی آتش فشاں یک بیک پوری قوت سے جاگ اٹھا ہو۔

میں نے اپنی ترپال ایک طرف اچھال دی۔

ہاشم کا چہرہ تاریک پڑا ہوا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے جلتے ہوئے اس سیاہ ستون کو دیکھ رہا تھا جس کی بنیاد ایکس تھری کی راکھ سے اٹھی تھی۔

"سب ختم ہو گیا۔" میں نے ہاشم کے کان کے نیچے چیخ کر کہا۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات جوں کے توں رہے!

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی سماعت کھو چکا ہو۔

میں نے اسے جھنجھوڑا تو وہ بڑبڑا گیا اور ہذیانی انداز میں بڑبڑایا۔ "تم نے سب کو مار دیا، سب کو مار دیا۔ ان میں سے ایک

بھی زندہ نہیں بچا ہوگا۔"

اس کی آنکھوں میں غیر معمولی ویرانی جمی ہوئی تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ ذہنی صدمے سے وہ وقتی طور پر ماؤف ہو چکا تھا۔

"ایک آدمی ہاشم کو دیکھو، چار میرے ساتھ آؤ۔" میں نے چیخ کر کہا: "جو سامنے آئے اسے بے دریغ گولی مار دینا۔"

"ٹھہرو!" اچانک ہاشم چیخا۔ "کسی زخمی پر تم میں سے کوئی ہتھیار نہیں اٹھائے گا۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے!" میں غرایا۔

"جو مر گئے سو مر گئے، جنہیں قدرت نے اس حادثے کے بعد بھی زندہ رکھا ہے انہیں زندہ رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔"

"یہ اخلاقیات جھاڑنے کا وقت نہیں ہے ہاشم!" میں درشت لہجے میں غرایا۔ "ان سے ہماری جنگ ہے اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے!"

"جو میں کہہ رہا ہوں، وہی ہوگا۔" اس پر اپنی بات منوانے کا غیر معمولی جنون سوار تھا۔ "تمہارے سر پر اس وقت خون سوار ہے۔"

ہاشم کے اندر کا آدمی ایک مرتبہ پھر میری راہ میں روڑے اٹکا رہا تھا۔ اس سے پہلے لیبیا میں بھی ہاشم نے ایک نازک موقع پر قانون شکنی میں میرا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اب نیل کی سرزمین پر اس ویران صحرا میں وہ پھر مجھ سے سرکشی پر آمادہ تھا۔

"اور اگر بچنے والا جنرل احمد فواد ہوا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"اسے میں خود گولی ماروں گا۔" وہ مشتعل ہو گیا۔ "وہ کتے کی موت مارے جانے کے قابل ہے۔"

"اگر وہ زندہ ہے تو اسے بھی قدرت ہی نے بچایا ہے ورنہ ہمارا سارا انتظام اسی کے لئے تھا۔" میں نے پر زور لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہ بولا۔ بس خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔

"جنگ میں چہرے دیکھ کر گولی نہیں چلائی جاتی۔" میں نے نرمی سے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "وقت ضائع نہ کرو، دھوئیں کے یہ کثیف بادل اور ہولناک دھماکے اب تک دُور دُور کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کر چکے ہوں گے۔"

"چلو!" اس نے سر جھکا لیا۔ پھر ان پانچوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میرا ذہن اعتدال پر نہیں رہا ہے۔ تم وہی کرو گے جو میرا بھائی کہے گا۔"

دھماکوں کی شدت میں کمی ضرور آ گئی تھی مگر ان کا سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا۔

اسٹین گنیں سینوں سے آ لگیں اور ہم ساتوں ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر ایکس تھری کے آتش بداماں ملبے کی طرف دوڑنے لگے۔

کثیف دھوئیں نے اوپر فضا میں پھیل کر ابر کی سی کیفیت طاری کر دی تھی مگر پیش قدمی کے بعد یہ دیکھنا مشکل ثابت نہیں ہوا کہ دونوں ہیلی کاپٹر بدستور صحیح سالم کھڑے تھے۔

"اب خالد کام آئے گا۔" ہاشم کا لہجہ مسرت سے یکسر عاری بلکہ گمبھیر تھا!

"کیا خالد ہوا باز ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"آرمی ایوی ایشن کا ریٹائرڈ میجر ہوں جناب۔" میرے ساتھ بھاگنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "مگر صرف ہیلی کاپٹر اڑا سکتا ہوں۔"

کچھ اور آگے پہنچے تو رفیق کی فاکس ویگن کا... پتہ بھی نہ تھا۔ نہ جانے وہ دھماکوں سے اڑ کر کہاں جا گری تھی؟

ایکس تھری کی جگہ ایک ہولناک کھڈ کسی جہنمی بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا۔ وہاں کہیں بھی زندگی کے آثار باقی نہیں رہے تھے اور نہ ہی کوئی لاش نظر آ رہی تھی۔ شاید دھماکوں نے اپنی زد میں آنے والی ہر چیز کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے!

"ایک ہیلی کاپٹر ناکارہ ہے۔" خالد نے تقریباً چیخ کر کہا۔

مجھے ہوا بازی کی ابجد کا بھی علم نہیں ہے مگر خالد کے اشارے پر میں نے ایکس تھری سے نسبتاً قریب کھڑے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا تو اس کی ایک ہیلو میکل پنکھڑی غائب تھی اور ڈھانچے میں بھی کئی جلے ہوئے سوراخ نظر آ رہے تھے جو ملبے سے اڑنے والے گرم ٹکڑوں نے بنائے ہوں گے۔

اس سے آگے کھڑا ہوا ہیلی کاپٹر صحیح سلامت تھا۔ اس میں سب سے پہلے خالد چڑھا اس کے پیچھے میں کیبن میں گھسا تو وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

ہیلی کاپٹر میں پائلٹ اور اس کے معاون کے علاوہ آٹھ نشستیں تھیں۔ جن میں ہم بآسانی سما گئے۔

"ریڈیو ___ پرواز سے پہلے ریڈیو چیک کرو!" ہاشم نے کہا۔

خالد نے ریڈیو آن کر دیا۔

"کنٹرول..... کنٹرول کالنگ ٹو آپریشن شارک اوور!"

فوراً ہی آواز ابھری۔

خالد نے انجن آن کر دیا۔ اس دوران میں وقفے وقفے سے وائرلیس ریسیور پر وہی پیغام سنائی دیتا رہا مگر اس کا جواب نہیں دیا گیا۔

ہمارے سروں پر ہیلی کاپٹر کی ہیلو میکل پنکھڑیوں کا شور بڑھتا رہا پھر خالد نے اپنے ہاتھوں کو مختلف آلات پر آزمایا اور ہیلی کاپٹر کسی مست خرام پرندے کی طرح سرعت سے فضا میں اٹھتا چلا گیا۔

"کنٹرول کو گمراہ کرو!" میں نے خالد کو ہیڈ فون پر ہدایت دی۔

"آپریشن شارک ٹو کنٹرول اوور۔" خالد نے ایک بٹن دبا کر فوراً کہا۔ میں اس کے آواز ہیڈ فون پر سن رہا تھا۔

"ہمیں کافی دیر سے جواب نہیں ملا۔ فیلڈ سٹ والے کہاں مر گئے، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ جنرل کہاں ہے اوور؟" دوسری طرف سے غصیلی آواز میں بیک وقت کئی سوالات کر ڈالے گئے۔

"ان لوگوں نے اپنا اسلحہ کا ذخیرہ خود تباہ کر دیا۔" خالد کی آواز آ رہی تھی۔ "ہمارا تیسرا ہیلی کاپٹر ملبے کی برسات میں گھر کر تباہ ہو گیا۔ کچھ لوگ گرفتار ہوئے ہیں، باقی مارے گئے۔ مقابلہ اب بھی جاری ہے ___ اوور!"

"تیسرا ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ___ اوور؟" دوسری طرف سے حیرت سے تقریباً چیخ کر کہا گیا۔

"یس سر!" خالد کی آواز ابھری۔ "فیلڈ وائرلیس والے بھی ہلاک یا زخمی ہو گئے، ہمارا انجن اسٹارٹ ہے جیسے ہی سگنل ملا ہم قاہرہ کے لئے پرواز کریں گے ___ اوور۔"

"تم کون ہو؟ اوور۔" اس بار وائرلیس ریسیور پر اشتباہ آمیز ایک نئی آواز ابھری۔

"میں رمضان ہوں جناب..... اور کچھ لوگ فائر کرتے ادھر بھی آ رہے ہیں، اوور اینڈ آل۔" خالد نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس نے اپنا کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا اور کنٹرول میں موجود افراد کو ایسی الجھن میں ڈال دیا تھا کہ ان کی اگلی کارروائی میں نہ صرف تاخیر کا امکان تھا بلکہ ان کی تمام تر توجہ ایکس تھری پر ہی مرکوز رہتی ___

تیسرے ہیلی کاپٹر کی تباہی پر کنٹرول نے جس حیرت اور بے یقینی کا اظہار کیا تھا وہ میرے لئے باعث مسرت تھی اور میرے اس موہوم سے شبہ کو تقویت پہنچا رہی تھی کہ ایڈوانس پارٹی سے رپورٹ موصول ہونے کے بعد جنرل احمد فواد تیسرے ہیلی کاپٹر میں بنفس نفیس ایکس تھری آیا تھا لیکن لینڈ کرنے سے قبل ہی اجل کے بے رحم ہاتھوں نے اسے فضا میں اچک لیا اور یوں ایکس تھری کی تباہی کی قیمت وصول ہو گئی۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ ہیلی کاپٹر کتنی دیر محوِ پرواز رہا۔ جب وہ اترا تو چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔ پنکھا رکتے ہی ہم ساتوں تیزی سے نیچے اتر آئے۔

یہاں سے ہماری رہنمائی خالد نے سنبھال لی اور ہم تیز رفتاری کے ساتھ ایک طرف چل دیئے۔

یہ سفر خاموش اور اکتا دینے والا ثابت ہوا۔

میرے لئے وہ پانچوں اجنبی تھے اور ہاشم کھویا کھویا سا تھا۔ شاید اس کے لئے اتنے آدمیوں کی اجتماعی موت کا منظر بہت ہی بھیانک ثابت ہوا تھا۔ حالانکہ وہ یہ بھول رہا تھا کہ اگر جنرل فواد اور اس کے حواری ہم پر غالب آ جاتے تو ہماری موت شاید کہیں زیادہ دردناک ہوتی۔

شام سات بجے کے قریب پہلی بار ایک آبادی کے خواب ناک سے آثار نظر آئے تو یہ مختصر سا کارواں رک گیا اور میری خون آلود قمیص ایک شخص سے بدل دی گئی۔

"اب ہم اپنی راہ جائیں گے!" خالد نے ہاشم سے کہا۔ "ہم ساتوں کا ایک ساتھ کسی بستی میں داخل ہونا خطرناک ہو سکتا ہے۔" ایکس تھری کی تباہی کے بعد میں نے پہلی بار ہاشم کو اپنے اوسان میں دیکھا۔

"یہ بستی عمارہ کہلاتی ہے، یہاں چند ایسی سرائیں ہیں جہاں ہر روز بہت سے اجنبی بلا خوف آتے جاتے رہتے ہیں۔" خالد نے بتایا۔

"جبل کیوں نہ لے گئے؟" ہاشم نے کہا۔

"ہیلی کاپٹر دریافت ہونے کے بعد قریب ترین آبادیاں ان کا پہلا نشانہ ہوں گی۔" خالد نے کہا۔ "عمارہ وہاں سے طویل... مسافت پر ہے۔"

پھر وہ پانچوں ہم دونوں سے پر تپاک انداز میں گلے مل کر اندھیرے میں واپس روانہ ہو گئے۔

کس قدر عجیب تھے وہ انسان، کہ محض ایک مقصد اور اعتماد کے باعث دوسروں کے اشاروں پر اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیتے تھے اور کٹھن لمحات گزرنے کے بعد بالکل اجنبی بن کر انسانوں کی بھیڑ میں یوں گم ہو جاتے تھے جیسے ان کی زندگی کا مقصد ہی دوسری جانوں کی حفاظت کے لئے خطرات مول لینا ہو!

خلوص، وفاداری اور محبت کے تمام جذبوں کا محور یہی ایک اعتماد تو ہے کہ فریق ثانی کو سچا تصور کر لیا جاتا ہے پھر وہ جو کہے وہ نہ صرف مانا جاتا ہے بلکہ اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے، اور جہاں یہ اعتماد مفقود ہو وہاں پر ایک دوسرے کو جھوٹا اور بے ایمان تصور کرتا ہے۔ لمحوں کا اور مصروفیت کا حساب طلب کیا جاتا ہے دلوں کے آبگینے توڑے جاتے ہیں اور پھر بھی اس نازک حساب میں ذرا سی لغزش ہو جائے تو مغلوب الغضب اور بے کردار درندے ایک دوسرے کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔

میرے دل کی گہرائیوں میں ان پانچوں کے لئے عظمت کا ایک ناقابل بیان احساس انگڑائیاں لے رہا تھا انہوں نے جو کچھ کیا وہ بڑے بڑے بے خوف لوگ کرنے سے گھبراتے مگر ان کا انداز اس قدر عاجزانہ تھا جیسے انہوں نے کچی پگڈنڈی سے محض ایک ٹوٹا ہوا شیشہ

اٹھا کر کنارے ڈالا ہوتا کہ کسی دہقان کا پیر زخمی نہ ہو جائے۔

وہ اندھیرے میں اپنے وجود کا نور بکھیرنے کسی طرف چلے گئے اور میں ہاشم کے ساتھ عمارہ کی بستی کی طرف بڑھنے لگا۔

ہاشم نے مجھے بتایا کہ عمارہ کوئی بڑا قصبہ نہیں تھا۔ اس کی آبادی خاصی مختصر تھی مگر وہ قاہرہ سے آنے والی ایک مصروف شاہراہ کے قریب واقع تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے شہر میں داخل ہوئے تو میرے احساسات عجیب سے تھے۔

وہ الف لیلوی انداز کا ایک سست رو قصبہ تھا جہاں اِکا دُکا پختہ حویلیوں سے قطع نظر قدیم طرز کے کچے یا نیم پختہ مکانات تھے۔ وہاں کے باشندے بھی سست یا قناعت پسند نظر آتے تھے۔ ایک اہم مواصلاتی شاہراہ سے قریب ہونے کے باوجود ان کی بود و باش جدید تہذیب کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا!

قہوہ خانوں میں سراسر فرصت کا سماں تھا۔ جو بیٹھا تھا وہ اس بے فکری سے بیٹھا ہوا تھا۔ کہ جب تک اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر نہ اٹھایا جائے جگہ خالی نہیں کرے گا۔ قہوہ خانوں میں کڑوے تمباکو کے حقّوں کی فراوانی تھی۔ اس فراوانی کے باوجود ایک ایک حقّے پر چھ چھ آدمی طبع آزمائی میں مصروف تھے۔

مجھے زندگی کا یہ ہلکا پھلکا انداز پسند آیا اور میں ہاشم کے ساتھ ایک ہوٹل میں جا گھسا جہاں حقّے اور قہوے کے علاوہ کھانے کا انتظام بھی تھا۔

مصری طرز کا کھانا لذیذ تھا مگر پیش کرنے کا انداز بہت بھونڈا تھا۔ کھانے کے بعد قہوے کے دَور کا آغاز ہوا تو پچھلی میز پر ہونے والی گفتگو نے میری توجّہ اپنی طرف مبذول کرالی اور ہاشم کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

دو اُدھیڑ عمر آدمی زمانے کی خرابیوں کے ضمن میں ان مجرموں کا تذکرہ کر رہے تھے جن کے بارے میں ریڈیو سے اعلان کیا گیا تھا۔

ان تخریب کاروں کی تعداد نامعلوم تھی وہ بیس فوجیوں کے ایک دستے کو ہلاک کر کے فرار ہوئے تھے جن میں ایک جنرل بھی شامل تھا۔

ہم دونوں پیسے ادا کر کے وہاں سے اٹھ گئے۔

"مجھے خوشی ہے کہ جنرل بھی ان میں شامل تھا مگر وہ وہاں کیسے آگیا؟" راستے میں ایک جگہ سنّاٹا دیکھ کر ہاشم نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"پتہ نہیں تھیں کیا ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یاد نہیں کہ کنٹرول سے بات کرنے والے نے تیسرے ہیلی کاپٹر کی تباہی پر کس قدرت حیرت کا اظہار کیا تھا؟"

"تو کیا وہ اسی میں تھا؟"

"اگر مجھے بٹن دبانے میں ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ اکیس مغزی پر سے گزر جاتا اور اس کا بال بھی بیکا نہ ہوتا!"

"تو کیا تمھیں اس ہیلی کاپٹر پر شبہ تھا؟"

"وہم و گمان تک نہ تھا۔ بس یہ خیال تھا کہ اگر ان کی نفری میں دو یا بارہ کا اضافہ ہو گیا تو وہ دور تک پھیل جائیں گے۔"

"یہ بھیانک منظر میں ساری عمر نہ بھول سکوں گا۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے انسانی اعضا گروں اور پھٹتے دیکھے تھے۔"

"اس قدر کمزور دل ہو کر کام کیسے کر رہے ہو؟"

"میرا واسطہ غیر فوجی شعبے سے ہے، یہ سارے تجربات محض تمھاری دوستی میں ہو رہے ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"مگر جنرل کے بارے میں تو تمھیں براہِ راست واضح حکم ملا تھا۔"

"اس کی نوعیت بھی غیر فوجی تھی۔ میں جنرل کو تنہا گھیرنے کی کوشش کرتا۔" اس نے کہا۔ "مگر تم، خدا کی پناہ! تم تو پوری بٹالین سے بھی ٹکرانے پر تُل سکتے ہو۔"

"حالات کے تحت سب کچھ کرنا پڑتا ہے میرے دوست!"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"مصر سے اکتا گیا ہوں، نکلنا چاہتا ہوں۔" میں نے اسے اپنی دلی کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ "مزید یہاں رکا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

"اور تمھاری بیوی؟" اس نے سیتا کا نام لینے سے دانستہ گریز کرتے ہوئے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"تم جیسے دوستوں کے طفیل اس کی بھی کوئی خبر مل ہی جائے گی!"

"کدھر کا رُخ کرو گے؟"

"جدھر موقع مل گیا، اب میں کچھ روز گمنام رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہماری امداد کرتے کرتے بیزار ہو گئے ہو؟"

"ارے نہیں!" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم لوگوں کی وجہ سے تو میری زندگی میں رونق رہی ہے ورنہ یک رنگی سے میں کبھی کا اکتا گیا ہوتا۔"

اس پُر سکون قصبے میں چہل قدمی کرتے ہوئے ہم دونوں مشورے کرتے رہے پھر یہ طے پایا کہ ہم بظاہر الگ ہو جائیں مگر ایک دوسرے کی خیر خبر رکھیں۔

یہ عارضی انتظام تھا جو محض عمارہ میں قیام کے لیے کیا گیا تھا کیونکہ مفرور ملزموں کی تشہیر کے بعد خطرات کافی بڑھ گئے تھے۔

وہ سرائے سے قدرے بہتر اور ہوٹل سے کمتر ایک اقامت گاہ تھی جہاں رہائش کے لیے ہسپتالوں کے جنرل وارڈ کی طرح کئی بستروں والے کمرے موجود تھے۔

اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس ہوٹل میں تین بستروں کا صرف ایک ہی کمرہ خالی تھا۔ پہلا بستر میرے حصّے میں آیا۔ نصف گھنٹے بعد ہاشم بھی منہ

اٹھائے وہیں چلا آیا۔

تیسرا بستر انتظار کے باوجود خالی ہی رہا۔ دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد بستر میسّر آیا تو نیند نے فوراً ہی آ لیا۔ صبح مجھے ہاشم نے بیدار کیا تو طبیعت خاصی شگفتہ تھی۔

ریڈیو کی نشریات ہاشم نے سنی تھیں جن سے یہ تصدیق ہو گئی کہ ایکس مغزی کے حادثے میں ملٹری سیکرٹ سروس کا سربراہ جنرل احمد فواد بھی کام آیا تھا۔ سرکاری ذرائع نے مجرموں کی تعداد واضح نہیں کی تھی لیکن قیاس یہ تھا کہ اسلحے کے ان زیرِ زمین ذخائر پر صفدر علی کم از کم بیس تا دیڑھ سو کے ساتھ قابض تھا ورنہ اتنی آسانی کے ساتھ بیس مسلح فوجیوں کو ہلاک کر کے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونا ناممکنات میں تھا۔

مسروقہ ہیلی کاپٹر ایک مسافر بردار طیارے کے ہوا بازکی اطلاع پر جبل کے قریبی ریگستان سے برآمد ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ماہرین کا کہنا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں کسی بھی طرح بارہ سے زیادہ آدمی پرواز نہیں کر سکتے تھے لہٰذا کم از کم آٹھ یا نو مجرم صحرا میں بھٹک رہے تھے یا قاہرہ کی طرف نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جرائم کے معاملے میں مصر کے فوجی اور سول حکّام کا رویّہ تقریباً یکساں تھا۔ وہ لوگ اپنی کوتاہی کی پردہ پوشی کے لیے ملزمان کی تعداد میں مبالغہ آرائی کرتے تھے جس کے نتیجے میں انھیں شہریوں سے مدد ملنی محال ہو جاتی تھی۔

اخبارات میں بارہ کے ٹولے کے فرار کی خبر پڑھنے کے بعد اکّا دُکّا مشکوک افراد بھی عام آدمی کے لیے قابلِ توجہ نہیں رہتے تھے لیکن اس بار فوجی حکام نے اپنی حماقت کا ازالہ میری ان پرانی تصاویر کی اشاعت سے کیا تھا جو اسرائیل میں میری قید کے دوران میں لی گئی تھی اور رپیپر سالومن کے ذریعے مصر پہنچی تھیں۔

وہ سردیوں کا خوشگوار موسم تھا لہٰذا دن کا بیشتر وقت ہم نے شہر میں الگ الگ گھوم کر گزارا اور ایک بجے واپس ہوٹل آ گئے۔ ہاشم مجھ سے پہلے پہنچا تھا اور اپنے چہرے پر چمک سجائے میری واپسی کا منتظر تھا۔

"کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے؟" میں نے اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

جواب میں اس نے اپنی جیب سے ایک رقعہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ آج بازار میں کسی نے میری بے خبری میں میری جیب میں ڈالا ہے۔"

اس رقعہ پر پختہ خط میں صرف ایک سطر لکھی تھی۔ "آج شام سوڈانی سرکس میں ضرور آنا۔"

خط میں نہ خطاب تھا نہ بھیجنے والے کا نام اور نہ ہی تاریخ میرے لیے وہ دعوت نامہ خاصا پریشان کن تھا۔ آخر اس اجنبی قصبے میں ہاشم کا کون سا شناسا پیدا ہو گیا تھا؟ ہاشم نے مجھ سے رقعہ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

"پھاڑ دو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"فکر مت کرو، ٹہلنے جاؤں گا تو اسے جلا دوں گا۔" اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم کیا سمجھے؟"

"تمھارا کوئی بے تکلف دوست جو....." میں کہتے کہتے رک گیا۔

اور حیرت سے بولا۔ "اوہ۔ سوڈانی سرکس [illegible] معاملہ نظر آتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"سرکس اسی شہر میں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کمال ہے کہ تم نے اس کا شہرہ نہیں سُنا۔" وہ حیرت سے بولا۔ "سوڈانی سرکسوں میں جانوروں سے زیادہ انسانی کمالات دکھائے جاتے ہیں اور ان میں بھی عورتوں پہ زیادہ زور دیا جاتا ہے۔"

"رقاصائیں ہیں؟"

"ہاں۔ اس سرکس میں بھی تین غضب کی رقاصائیں ہیں جو ہر روز نئے جوہر دکھاتی ہیں۔ قصبے میں سوڈانی سرکس کے ٹکٹ بلیک ہو رہے ہیں۔"

"تو تم ضرور جاؤ، میں بھی وہیں پہنچوں گا۔ شو کس وقت شروع ہوتا ہے؟" اس نئے واقعے نے مجھ میں ازسرِ نو حرارت سی دوڑا دی۔

"میرے ساتھ ہی چلو۔"

"وہ مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے مجھے ساتھ دیکھنے کے بعد تمھارا نامعلوم دوست سامنے ہی نہ آئے۔"

پھر یہی طے ہوا کہ شام والے شو میں ہم دونوں اپنے طور پر جائیں، مجھے دور رہ کر ہاشم کی نگرانی بھی کرنی تھی۔

کھانے کے بعد میرے لیے وہاں تک رہنا دشوار ہو گیا اور میں ہاشم سے رخصت ہو کر بازار کی طرف چل دیا۔

تو جیسے ہی مجھے عمارہ کے کئی اہم مقامات پر سوڈانی سرکس کے بورڈ نظر آئے جن میں تین عرب رقاصاؤں کے نام جلی حروف میں درج تھے۔ ایک جگہ ان تینوں کی برش سے بنی ہوئی تصاویر بھی آویزاں تھیں مگر میں کوشش کے باوجود کسی میں بھی سیتا کی مماثلت تلاش نہ کر سکا۔

شام تک آوارہ گردی کے بعد میں اتنا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ سوڈانی سرکس عمارہ میں تین روز پہلے آیا تھا اور پہلے شو کے بعد ہی اس کا پروگرام پورے قصبے میں مشہور ہو گیا تھا۔

وہ سرکس قاہرہ سے واپس اُمِ درمان جا رہا تھا۔ سوڈان جاتے ہوئے ان کا راستے کے ہر قریے میں۔۔۔ مختصر پڑاؤ کا پروگرام تھا اور وہ اگلے روز عمارہ سے بھی روانہ ہونے والے تھے۔

اُمِ درمان خرطوم کے مغرب میں ایک شہر تھا اور ان تمام کڑیوں کو یکجا کرنے کے بعد میرے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سیتا یا ابو سلطان کا اس سرکس سے گہرا تعلق تھا۔

سرکس چھ بجے شروع ہوتا تھا مگر میں پانچ بجے ہی پنڈال پر پہنچ گیا۔ وہاں ہر درجے کے ٹکٹ گھر کے سامنے اچھی خاصی دھینگا مشتی ہو رہی تھی۔ تماشائیوں میں ہر عمر کے مرد شامل تھے لیکن عورت کا سایہ تک نظر نہ آتا تھا۔ بھیڑ میں گھسنے کی کوشش میں ایک دو بار میرے شانے کے زخم پر ٹیسیں بھی لگیں مگر مجھے کھڑکی سے ٹکٹ نہ مل سکا۔ کھڑکی بند ہونے کے بعد ایک لڑکے سے میں نے دو گنے داموں پر تیسرے درجے کا ٹکٹ لیا اور اندر داخل ہو کر آخری قطار میں ایک نشست سنبھال لی۔۔۔

پنڈال میں گراموفون پر تیز صحرائی موسیقی کے ریکارڈ بج رہے تھے اور بیشتر پرجوش تماشائی تالیوں اور ایڑیوں کی تال پر موسیقی کا ساتھ دینے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔

ٹھیک چھ بجے پنڈال کے پردے گرا دیے گئے۔ چاروں طرف دھند لکا سا چھا گیا۔ بس وسط میں بنتے ہوئے رنگ میں رنگ برنگی روشنیوں کے ہالے رقص کر رہے تھے۔ شو کی ابتدا مسخروں کے کام سے ہوئی۔ ان میں ایک پستہ قامت لڑکا ہکلا بنا ہوا تھا اور دوسرا باریش شخص تھا۔ ان دونوں کے بازاری فقروں پر تماشائیوں میں خاصا جوش و خروش پیدا ہوا۔ اس کے بعد بندروں کے کرتب دکھائے گئے، اسی دوران میں ایک رقاصہ قدِ آدم رنگین دھجیاں اپنے شانوں کے سہارے بدن کے دونوں طرف لٹکائے اسٹیج پر آئی اور موسیقی کی پہلی تال کے ساتھ ہی اس سرکس کی کامیابی کا راز سامنے آ گیا۔

اس کے بعد رنگ میں کیا ہوتا رہا مجھے کچھ علم نہیں میری نظریں ہاشم کی تلاش میں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ لچر اور بے ہودہ سرکس بلا کسی وقفے کے ساڑھے آٹھ بجے تک جاری رہا۔ دو تین بار منتظمین۔۔۔ مردار قسم کے جانور رنگ میں لائے لیکن تماشائی صرف رقص دیکھنے پر مصر رہے جس کے نتیجے میں جانوروں کے کرتب اور رقص ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

نو بجے میں سخت کوفت اور بے زاری کے عالم میں ہوٹل پہنچا تو ہاشم وہاں بھی موجود نہیں تھا۔ سرکس کے بعد ہوٹل سے بھی ہاشم کی غیر موجودگی میرے لیے تشویشناک تھی مگر یہ تشویش زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ وہ واپس لوٹ آیا۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" میں نے اُسے دیکھتے ہی سوال داغ دیا۔

"ہم بہت بروقت عمارہ پہنچے ہیں، کہیں اور نکل جاتے تو زندگی بھر قلق رہتا۔" اس نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں بجھواتے رہو گے؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"اس سرکس میں ابو سلطان شامل ہے۔" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "اس نے آج دن میں مجھے بازار میں دیکھا تو خود ہی میری جیب میں رقعہ ڈال دیا۔"

"اور تم اُسے نہ پہچان سکے؟"

"اس نے سر اور داڑھی منڈوا دی ہے، میں اُسے صرف آواز سے پہچان سکا ورنہ وہ بالکل بدلا ہوا آدمی ہے۔"

"کیوں بلایا تھا اس نے؟"

"اب پوچھا ہے تم نے صحیح سوال۔" وہ ہنسا۔ "وہ تمہاری شناخت چاہتا ہے۔"

"کیا تمہاری گواہی کافی نہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس سرکس میں ایک بندر ہے جسے سیتا نے تمہاری بو پر سدھایا ہوا ہے، اگر وہ تمہیں پہچان لے گا تو ابو سلطان تمہیں بھی قافلے میں شامل کر لے گا۔ سیتا بندر کے علاوہ کوئی گواہی نہیں مانے گی۔"

"مگر سیتا کہاں ہے؟" میں بے چین ہو گیا۔

"وہ ایک اور سرکس کے ساتھ کئی دن پہلے یہاں سے گزری تھی۔ وہ لوگ تو شاید اب سرحد بھی پار کر چکے ہوں گے۔"

"تو چلو میں ابھی ابو سلطان کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔"

"اس کے اپنے بھی بہت سے بکھیڑے ہیں، ذرا صبر سے کام لو۔" ہاشم نے نرمی سے کہا۔ "اس نے کل صبح دس بجے بلایا ہے۔ ان کا قافلہ شام کو روانہ ہو جائے گا۔"

میں نے بڑھ کر بے اختیار ہاشم کی پیشانی چوم لی۔ اس نے خبر سنائی تھی جس کا میں ایک مدت سے منتظر تھا۔

ہاشم غائب تھا تو میرے سر پر عجیب سا بوجھ مسلط تھا اور اب وہ واپس آیا تھا تو میرے لیے ہیجان خیز خبر لایا تھا!

عمارہ میں مقیم سوڈانی سرکس میں زیرِ زمین تنظیم کا مقامی سربراہ ابو سلطان بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ موجود تھا اور میری شناخت کے بعد مجھے سرکس کے ساتھ سوڈان کے شہر ام درمان لے جانے کے لیے تیار تھا!

سیتا اس سے آگے جانے والے سرکس کے عملے میں شامل ہو کر شاید اس وقت تک سوڈان کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی!

اگر عمارہ میں مقیم سوڈانی سرکس میں میری بو پر سدھایا ہوا کوئی ایسا بندر موجود تھا جو مجھے پہچان سکتا تھا تو میرے لیے یہ اطلاع بڑی خیال انگیز تھی!

ایک دوسرے سے جدائی کے اتنے طویل عرصے کے بعد بھی میرے ذاتی استعمال کی کچھ ایسی چیزیں اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں جن کے سہارے میری شناخت ممکن تھی!

وہ مجھ سے بچھڑی ہوئی ضرور تھی مگر اُس کے دل میں میری یاد پوری شدت سے باقی تھی اور اگر میں اُسے اپنی زندگی کا مقصد سمجھ کر اُس کی تلاش میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھٹک رہا تھا تو سیتا کی ذات اس جستجو کی مستحق تھی!

اور پھر میرے ذہن میں ایک دوسری رو اُبھرنے لگی جس کی چبھن میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی!

عمارہ میں سوڈانی سرکس کا ایک شو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور سرکس میں شریک تین رقاصاؤں کو سیکڑوں تماشائیوں کے سامنے اپنے بدن کی نمائش کے جنون میں بھی مبتلا دیکھا تھا۔ ان تینوں میں سے ہر ایک موسیقی کی ایک ایک تال پر اپنے بدن کے اَن گنت زاویوں کی بجلی تماشائیوں پر گرانے کی کوشش کرتی تھی اور یہی سبب تھا کہ عمارہ کی پوری آبادی سرکس دیکھنے کے لیے سرِ شام ہی۔۔۔ پنڈال پر لوٹ پڑتی تھی!

اور سیتا بھی ایک سرکس میں شامل ہو کر عمارہ سے گزر کر سوڈان کی طرف گئی تھی! وہ سرکس میں کس حیثیت میں شامل تھی؟ کیا وہ بھی تماشائیوں کو بہلانے پر مامور تھی؟ کیا وہ اس قدر گر سکتی ہے کہ محض عارضی سہارے کے لیے سرکس کے منتظمین کی ہدایات پر تماشائیوں کو اپنے حسن کے جلووں سے مسحور کرنے پر آمادہ ہو گئی ہو؟

میرے ذہن میں خیالات کے ہولناک بگولے اُٹھنے لگے!

سیتا کے حوالے سے میرے ذہن میں عصمت و عفت کا ایک ایسا نازک سا پیمانہ قائم ہو چکا تھا جو ذرا سی بھی لغزش کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اگر



میں نے اپنی آنکھوں سے سرکس میں انسانوں کے حیوانی ناچ نہ دیکھے ہوتے تو شاید ذہن میں ایسے خیالات ہی نہ اُبھرتے مگر اس تجربے سے گزرنے کے بعد میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گیا تھا کہ سینا کو عمارہ اور دوسری بستیوں کے تماشائیوں نے کس انداز میں سرکس میں شریک دیکھا ہوگا!

"کیا سوچے جا رہے ہو؟" میری طویل خاموشی پر ہاشم ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔ "اب عمل کا وقت قریب آ رہا ہے!"

"میں شروع سے آخر تک وہاں موجود رہا تھا۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ تمھیں کہاں ملا تھا؟"

"ٹکٹ گھر پر بھیڑ بھاڑ دیکھ کر میں دُور ہی رکا رہا تھا، اسی اثنا میں وہ کہیں سے میرے پاس آ گیا۔" اُس نے ہنس کر کہا۔

"پھر گفت گو کہاں ہوئی؟"

"جانوروں کے پنجروں کے قریب عملے کے افراد کے لیے چھولداریاں لگی ہوئی ہیں، ان ہی میں سے ایک میں ہم جا بیٹھے تھے!"

"کتنی دیر باتیں ہوتی رہیں؟"

"بمشکل چند منٹ!"

"میں پورا شو دیکھنے کے باوجود تم سے پہلے واپس آ گیا، تم کہاں رہ گئے تھے؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

"ابوسلطان نے اپنا ایک کام میرے ذمے لگا دیا تھا۔" وہ پہلو بدل کر بولا۔ "مصر میں اخوان الصفا کے کسی رکن کو ابوسلطان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے، کچھ لوگ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ واقعی فوجی حملے میں مارا گیا۔ میں نے عمارہ میں ایک شخص کو یہ اطلاع دی ہے کہ ابوسلطان نہ صرف زندہ ہے بلکہ مصر سے نکل چکا ہے!"

"اگر وہ خاموش ہی رہتا تو کیا بُرا تھا؟"

"جب تک امیر کی موت کی تصدیق نہ ہو جائے، اس کا نائب کام نہیں سنبھالتا اور ان لوگوں کی تمام سرگرمیاں معطل رہتی ہیں، عام حالات میں بھی امیر کی روپوشی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ حالات خراب ہیں اور اراکین ہر سرگرمی سے احتراز کریں۔ جو زیادہ سرگرم ہوتے ہیں وہ زیرِ زمین چلے جاتے ہیں۔ اب مصر سے ابوسلطان کی روانگی کی خبر ملتے ہی وہ لوگ اپنے نائب امیر کی ہدایات کے مطابق سرگرم ہو جائیں گے!"

"مگر ابوسلطان تو ابھی تک مصر میں ہی ہے!"

"وہ سامنے نہیں آنا چاہتا۔ اخوان الصفا کے سرگرم ہونے کی وجہ سے حکام بھی اُلجھ جائیں گے اور وہ خاموشی سے سوڈان چلا جائے گا۔"

"بڑا عجیب طریقۂ کار ہے!"

"ہر زیرِ زمین تحریک میں یہ طریقے رائج ہیں۔" وہ بولا۔ "بعض گروپوں میں تو ہر وقت دس دس لیڈر نامزد کیے جاتے ہیں اور ایک کے بعد دوسرا طے شدہ علامات کے ظہور پذیر ہوتے ہی خود بخود کام سنبھال لیتا ہے!"

"تاکہ کسی ایک شخص کو نقصان پہنچنے کی صورت میں تحریک وہیں ٹھپ ہو کر نہ رہ جائے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں! پھر مخدوش مواصلاتی رابطے بھی اس امر کے متقاضی ہوتے ہیں کہ اچھے دِنوں میں سکون سے بُرے دِنوں کی منصوبہ بندی کر لی جائے!"

"مگر یہ طریقہ خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر نامزد افراد میں سے کوئی بھی بغاوت یا سرکشی پر آمادہ ہو جائے تو اُس کا انجام گروپ کی تباہی سے کم نہ ہوگا۔"

"زیرِ زمین دُنیا میں اعتماد بنیادی عنصر ہوتا ہے۔" اُس نے میری طرف جھک کر کہا۔ "یہ لوگ آخری دم تک اپنے بنائے ہوئے ضوابط کا پورا پورا احترام کرتے ہیں، تمھارا خیال فطری ہے مگر ابھی تک کوئی ایسا قصہ سامنے نہیں آیا۔"

میں ہنس دیا۔ "تمھارا اپنا تعلق بھی تو زیرِ زمین دنیا سے ہے!"

"اسی لیے میں ان باتوں سے واقف ہوں۔" وہ بولا۔ "مجھے یہاں سے آئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے مگر نمبر دو میرے نائب نے سارا کام سنبھال لیا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارا اصول ہے کہ اگر نائب اور سربراہ میں تین روز تک رابطہ نہ ہو تو نائب آگے بڑھ کر کام سنبھال لے اور اگر نائب دس روز تک کسی طرح سربراہ سے رابطہ قائم نہ کر سکے تو سربراہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا نیا نائب نامزد کر دے!"

"پُرانے نائب پر خواہ کیسی ہی اُفتاد کیوں نہ ہو؟"

"اس کی نشاندہی اور اعانت کی ساری کوششیں کی جاتی ہیں، اُسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر نہیں کیا جاتا!"

"کبھی موقع ملا تو زندگی کے اس سنسنی خیز روپ کو بھی قریب سے دیکھنے کی کوشش کروں گا جس میں ہر انسان کے کئی چہرے ہوتے ہیں۔"

"مگر اندر کا آدمی اپنے مقصد سے بہت مخلص ہوتا ہے۔" اُس نے فوراً کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اُس کے مقصد کو بُرا تصور کرتے ہوں جن کے مفادات پر وہ ضرب لگاتا ہو مگر وہ سب کچھ اپنے مقصد کے لیے کرتا ہے!"

"میں اس فلسفے سے بخوبی واقف ہوں۔" میں ہنس دیا۔ "جنگ میں بھی تو یہی ہوتا ہے کہ محاذ پر ہزاروں کو مارنے والا وطن لوٹ آئے تو اُس کی چھاتی تمغوں سے جھلملانے لگتی ہے اور اگر وہی شخص دشمن کی قید میں چلا جائے تو اُسے سفاک قرار دے کر بدترین سزاؤں کا مستحق سمجھا جاتا ہے!"

"نیورمبرگ کی عدالت کیا تھی؟" وہ دھیمے مگر پُرجوش لہجے میں بولا۔ "محض ایک ڈھکوسلا! فاتح قوموں نے مفتوحین پر الزام تراشیاں کیں اور انھیں ایسے جرائم پر سزائیں دی گئیں جو نازیوں کی فتح کی صورت میں قومی کارنامے قرار پاتے!"

"اور ہٹلر، چرچل سے جنرل منٹگمری تک سب کو عدالتی کٹہروں میں لے آتا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تاریخ بالکل ہی اُلٹ ہوتی!"

"یہ ہمارے قیاسات ہیں۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک عالمی ذرائع ابلاغ پر ہٹلر کے بدترین دشمنوں کا غلبہ رہا ہے۔ انھوں نے اُس کی ایک بھیانک اور کراہت آمیز شبیہ بنائی ہے، میرا ذاتی خیال ہے کہ گوئبلز کو تاریخ کا سب سے بڑا دروغ گو قرار دینے والے ہٹلر کے معاملے میں گوئبلز پر سبقت لے جا چکے ہیں... شاید... شاید وہ اتنا بُرا آدمی نہیں تھا!"

"شاید اس موضوع پر تمھارا مطالعہ محدود ہے!" میں نے حیرت سے کہا۔ "تاریخ کا جزو بن جانے والے واقعات کو اتنی آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔"

"تاریخ؟" وہ تلخ انداز میں بولا۔ "کس تاریخ کی بات کر رہے ہو؟ ہٹلر کے کردار کو مسخ کرنے کا سارا کام یہودی قلم کاروں نے سرانجام دیا ہے اور دُوسرے مؤرخین بھی اُن کے منظم جھوٹ سے متاثر نظر آتے ہیں اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ہٹلر یہودیوں کو زمین کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتا تھا اور انھیں مٹانا چاہتا تھا۔"

"اوہ....!" میں طویل سانس لے کر بولا۔ "تم اسرائیل کے ستائے ہوئے ہو اس لیے ہٹلر کے حامی نظر آتے ہو!"

"تمھیں بتا دوں کہ میرے خیالات سے اتفاق رکھنے والے شاید دو چار فلسطینی بھی تمھیں میسر نہ آ سکیں گے۔ یہ میرا ذاتی تجزیہ ہے جس کی بنیاد ٹھوس مطالعہ ہے۔ دراصل میں نے طویل المیعاد صیہونی منصوبوں کو ذہن میں رکھ کر اُن کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے۔" وہ میری طرف جھک کر بولا۔ "ہٹلر کی کردار کشی کا آغاز صیہونی منصوبہ سازوں.... نے کیا اور مغربی قومیں اپنی پیشانی سے ایٹمی تباہ کاری کا داغ ہلکا کرنے کے چکر میں اُن کی آلۂ کار بن گئیں۔ اگر جاپان پر امریکی بم نہ گرائے جاتے تو بھی شاید تاریخ اتنی مسخ نہ ہوتی!"

"مگر تم نے یہ سارے نتائج کہاں سے اخذ کر لیے؟" میرے لیے اُس کی باتیں نہایت نامانوس اور سطحی سی تھیں!

"میں حوالوں میں نہیں جاتا، بس اتنا کہوں گا کہ اگر ہٹلر اسی قدر بُرا ہوتا تو اُس کی موت کے برسوں بعد آج جرمنی میں دوبارہ نازی تحریک زندہ نہ ہوتی!"

"وہ مُٹھی بھر نوجوانوں کی حرکت ہے، اس طرح وہ سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کہہ کر ان اُبھرتے ہوئے رجحانات پر پردہ ڈالا جا رہا ہے اور پسِ پشت ایسے عناصر کو پوری بے رحمی سے کچلنے کی کوششیں جاری ہیں!"

"عمارہ کی اس دقیانوسی سرائے میں بیٹھ کر ہم اب تک لکھی گئی تاریخ کو رَد نہیں کر سکتے۔" میں نے گفتگو کو اختصار دینے کی نیت سے کہا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ اس موضوع پر اس قدر سنجیدہ بحث لے بیٹھے گا!

"میرے پاس سیکڑوں کتابیں ہیں، کبھی فرصت ملے تو لیبیا آنا، میں تمھیں ہر سطر کا ماخذ اور محرک بتاؤں گا اور تم میری تائید کے سوا کچھ نہ کر سکو گے!"

"اگر یہ درست ہے تو تم نے ایک زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے، تم ان چیزوں کو سینے میں کیوں لیے بیٹھے ہو؟"

"میں ایک فلسطینی گروپ کا ذمہ دار رکن ہوں، میرے لیے ان نکات کی اشاعت ناممکن ہے اس سے فوری طور پر ہماری تحریک پر منفی اثر پڑے گا اور ہمارے بہت سے دوست ہماری حمایت سے دست کش ہو جائیں گے!"

"تمھاری ترجیحات بڑی اٹل ہیں!"

"تم سے تو میں نے اتنی بات بھی کر لی ورنہ دوسروں کے سامنے میں محتاط رہتا ہوں، سچ پوچھو تو میری ہمدردیاں ہٹلر کے لیے ہیں!"

میں نے چند ثانیوں کے لیے خاموش رہ کر دوسری سگریٹ سلگائی پھر آہستہ سے اپنا موضوع چھیڑ دیا۔

"سینا اس سرکس میں کس حیثیت سے گئی ہے؟"

"پتہ نہیں۔" اُس نے سرسری لہجے میں کہا۔ "میرے لیے تو بس اتنا جاننا ہی کافی تھا کہ وہ کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر سرحد کی طرف بڑھتی جا رہی ہے!"

"شاید اپنے سدھائے ہوئے جانوروں کے تماشے دکھاتی ہوگی؟" میں نے تائید طلب اور دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر وہ اُسے قیدی بھی بنا کر لے گئے ہیں تو عزت و احترام سے لے جائیں گے، تم اُس کی اتنی فکر کیوں کر رہے ہو؟" وہ قدرے تند لہجے میں بولا۔ "ابوسلطان بہت معتبر آدمی ہے، اُس کے انتظامات کافی مضبوط ہوتے ہیں!"

میرے پاس خاموش ہو جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ ہاشم کے لیے میری خلش کو سمجھنا ناممکنات میں سے تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں ایک تیسرا مسافر بھی آ گیا اور اُس کے آ جانے کے بعد ہم دونوں کے تعلقات میں سرد مہری سی آ گئی!

نووارد نہایت غلیظ اور اُجڈ آدمی تھا اُس نے وہاں آتے

ہی ہم دونوں سے بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر ہاشم نے سر میں درد کا بہانا کر کے خشک لہجے میں اُسے خاموشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور وہ نہایت بے تکلفی سے میرے بستر پر آ بیٹھا۔

"یہاں کب سے رہ رہے ہو؟" اس نے سوال کر کے دانتوں کے عقب میں زبان جما کر چیرر کی آواز کے ساتھ فرش پر تھوک کی پچکاری ماری!

"تمھیں کمرے کے فرش پر نہ تھوکنا چاہیے!" میں نے اُس کا سوال نظر انداز کر کے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"تو کیا بستر پر تھوکوں؟" یہ کہہ کر اُس نے یوں بلند آہنگ قہقہہ لگایا جیسے اُس نے مجھ پر کوئی بہت ہی لطیف طنز کیا ہو!

"ضرور۔ مگر تمھاری چارپائی وہ ہے!" میں نے خالی بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

اس مرتبہ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "میں نے بھی تمھارے برابر کرایہ دیا ہے اور مجھے اس کمرے کی ہر چیز پر تم دونوں کے برابر حق ہے!"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو!" میں نے اُس سے پیچھا چھڑانے کی نیت سے کہا۔ "مگر ہر چیز میں میرا وجود شامل نہیں ہے!"

وہ پھر بے ہودہ انداز میں ہنسا۔ "بے فکر رہو، میں تم پر اپنا کوئی حق جتانے کا ارادہ نہیں رکھتا اس معاملے میں میرا مذاق بہت اعلیٰ ہے۔"

اُس کے گھٹیا مذاق پر میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا مگر میرے کچھ بولنے سے قبل ہاشم اپنے بستر سے اُٹھ گیا۔

"تم دونوں اپنی بکواس بند نہیں کرو گے تو باہر پھینک دوں گا۔" وہ باری باری مجھے اور اس دہقانی کو گھورتے ہوئے خونخوار لہجے میں غرایا۔

"کیوں پھینک دو گے؟" وہ اکڑ کر بولا۔ وہ ہاشم کے لب و لہجے سے مرعوب تو ہو گیا تھا مگر اُس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا!

"اس وقت سوا دس بجے ہیں۔" ہاشم اُسی لہجے میں بولا۔ "یہ باتیں کرنے کا نہیں، سونے کا وقت ہے!"

"مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم دونوں منیجر کو تیسرے بستر کا کرایہ دے دیتے ہیں، وہ اسے باہر ہانک دے گا۔"

"اپنی زبان سنبھالو لنگڑے اونٹ!" وہ مشتعل ہو کر بولا۔ "میں ایک نہیں، ایک سو بستروں کا کرایہ دے کر پورا ہوٹل خالی کرانے کی استطاعت رکھتا ہوں!"

"وہ تو تمھاری صورت سے ہی ظاہر ہے!" میں نے اس کے بدبودار لباس پر نگاہ ڈال کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"صورت!" اُس نے غرا کر میرا بستر چھوڑ دیا اور فرش پر رکھا ہوا کپڑے کا بڑا سا تھیلا جوش کے عالم میں فرش پر الٹ دیا۔

میرے ساتھ ہی ہاشم بھی متحیر رہ گیا کیونکہ فرش پر کثیر تعداد میں بڑے مصری نوٹوں کی گڈیاں پھیل گئی تھیں۔

"میں دو نخلستانوں کا مالک ہوں۔" وہ فخر آمیز غصیلے لہجے میں بولا اور ایک بار پھر فرش پر تھوک کی پچکاری مار دی!

بگڑی ہوئی عادتوں کو اگر مالی پشت پناہی حاصل ہو تو وہ بہت خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے اُسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ اس دہقانی سے مزید اُلجھنا کسی بڑی اُلجھن کو دعوت دینے کے مترادف ہو سکتا تھا لہٰذا اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

چند ثانیوں بعد ہاشم اس کمرے سے نکل گیا۔ اس مصری نے کئی بار مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش کی مگر میں مسلسل اُسے نظر انداز کرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ہاشم واپس آیا تو تنہا نہیں تھا، اس سرائے کا مالک یا منیجر اس کے ہمراہ موجود تھا۔

"سُنا ہے کہ تمھارے پاس خطیر رقم موجود ہے۔" سرائے کے مالک نے آتے ہی تیسرے مسافر سے بات شروع کر دی۔ "اور تم غیر ذمہ دارانہ طور پر اُس کی نمائش کرتے پھر رہے ہو۔ اگر کسی اُچکے نے رقم تاڑ لیا اور رات میں تمھارا پتہ صاف کر کے رقم لے اُڑا تو ان دونوں مسافروں کے ساتھ ہی میں بھی مارا جاؤں گا۔"

"اس نے شکایت کی ہے میری؟" دہقانی نے ہاشم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرائے کے مالک سے سوال کیا۔

"اسے تم شکایت نہیں کہہ سکتے۔ اگر تم یہاں رات گزارنے کا ارادہ رکھتے ہو تو برائے مہربانی اپنی رقم کا کوئی مناسب انتظام [illegible]"

سرائے کا مالک بہت ہوشیار آدمی تھا، چند منٹ کی گفتگو کے بعد وہ دہقان کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا!

ہاشم تو جلد ہی سو گیا لیکن میں بیشتر وقت آنے والے لمحات کے بارے میں سوچتا رہا!

اگلی صبح ہم دونوں ہی جلدی بیدار ہو گئے۔ تیسرا بستر خالی تھا جس کا مطلب تھا کہ سرائے کے مالک نے اس دہقان کو کہیں اور بستر فراہم کر دیا تھا!

عمارہ کی اس سرائے سے اپنا حساب بیباق کر کے میں روانہ ہوا، دس منٹ بعد ہاشم بھی ایک مقررہ جگہ پر مجھ سے آ ملا۔

ہم دونوں خراماں خراماں قصبے کے شمالی سرے کی طرف بڑھنے لگے جہاں آبادی سے باہر ابوسلطان کا سوڈانی سرکس خیمہ زن تھا!

"عمارہ سے روانگی کے بعد سرحد عبور کرنے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟" میں نے راستے میں ہاشم سے سوال کیا۔

"مجھے ان صحرائی راستوں کا کوئی اندازہ نہیں اور ابوسلطان کے منصوبے سے بھی میں لاعلم ہوں۔ اگر سرکس راستے میں پڑنے والی بستیوں میں رکتا رہا تو یہ مدت خاصی طویل ہو سکتی ہے۔" وہ تفکر آمیز لہجے میں بولا۔

"میرے ساتھ ہی ابوسلطان کا مفاد بھی اسی حکمت عملی میں ہے کہ ہم جلد از جلد سوڈان میں داخل ہو جائیں۔" میں نے کہا۔ "اُس سے بات کر کے ہی اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟"

اُس نے کہا۔ "اب ہمارا تمام تر دار و مدار اُسی پر ہو گا۔ تم بھی ساتھ ہی چلو گے؟"

"ہاں، وہیں سے طرابلس چلا جاؤں گا۔" اُس نے کہا۔ "اس وقت مصر میں منظرِ عام پر آنا میرے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

ہم دونوں آبادی سے باہر والے میدان میں پہنچے تو وہاں خلافِ معمول خاصی سرگرمی کے آثار نمایاں تھے۔ چند مضبوط قسم کے افراد وہ بڑا سا خیمہ اکھاڑنے میں مصروف تھے جس میں ہر رات تماشائی بیٹھ کر سرکس دیکھا کرتے تھے!

ہاشم اس پنڈال کے پہلو میں سے گزر کر ایک طرف بڑھا تو ایک تنومند سوڈانی محافظ نے اُس کا راستہ روک لیا۔

"ادھر جانا منع ہے!"

"مجھے خلیل نے بلایا ہے۔" ہاشم نے نرمی سے کہا۔

"نام کیا ہے تمھارا؟" محافظ کے لہجے میں فوراً ہی تبدیلی آ گئی۔

"ہاشم!" اُس نے کہا۔ "اور یہ میرا ساتھی ہے!"

"میرے ساتھ آؤ!" محافظ یہ کہہ کر واپس مڑ گیا۔

میرے لیے اُن کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ابوسلطان اس سرکس میں خلیل کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

بڑے پنڈال کے عقب میں جانوروں کے پنجرے تھے جو ایک سرکس کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ ان پنجروں میں کوئی بھی بڑا جانور نہیں تھا سوائے لے دے کر سارا انحصار پہاڑی بکروں، بندروں، کتوں اور ایک سیاہ ریچھ پر نظر آ رہا تھا۔

پنجروں کے قریب ہی کافی تعداد میں اونٹ بندھے ہوئے تھے اور اس سے ذرا فاصلے پر آٹھ دس چھولداریاں نصب تھیں جن کے پاس خاصی چہل پہل تھی!

روانگی کی تیاریوں کے سلسلے میں چھولداریاں بھی سمیٹی جا رہی تھیں اور اسی طرف بچے اور بڑے سرکس کی روانگی کا تماشا دیکھنے کے لیے جمع تھے!

محافظ ہم دونوں کو لے کر جس چھولداری میں داخل ہوا وہاں کسرتی بدن والا ایک سیاہ فام شخص موجود تھا جس کے قدموں میں ایک چھوٹا سا بندر بیٹھا زمین کھرچ رہا تھا۔

ہماری آہٹ سن کر بندر چونکا پھر حلق سے ایک تیز چیخ خارج کرتا وہ اچھل کر سیدھا میرے شانے پر آ رہا۔ ہاشم بوکھلا کر مجھ سے دُور ہٹ گیا۔

کسرتی بدن والے کا اشارہ پا کر محافظ واپس چلا گیا اور اُس شخص نے ہم دونوں کو اپنے قریب بُلا لیا۔

بندر بدستور میرے شانے پر سوار تھا اور عجیب انداز میں میرا سر کھوجے جا رہا تھا!

میں نے تپائی پر بیٹھ کر پہلی بار اس سیاہ فام کو غور سے دیکھا۔ اگر وہ واقعی ابوسلطان تھا تو حالات کی ستم ظریفیوں کا بُری طرح شکار تھا۔ اُس کی داڑھی غائب تھی، سر کے بال بھی مُنڈے ہوئے تھے بدن پر سُرخ اور سفید دھاریوں والی چست ٹی شرٹ اور سیاہ تنگ پتلون تھی مگر اس حلیے کے باوجود اُس کی تنگ پیشانی اور بڑی بڑی آنکھوں سے ذہانت نمایاں تھی!

"آؤ... ادھر آؤ!" اُس نے نرم آواز میں میرے شانے پر براجمان بندر کو مخاطب کیا مگر وہ خوخو کر کے بدستور وہیں جما رہا۔

"رہنے دو، یہ مجھے تنگ نہیں کر رہا۔" میں نے کہا۔

"تم دونوں کو واپس تو نہیں جانا؟" اُس نے باری باری میرے اور ہاشم کے چہرے پر نگاہیں دوڑا کر کہا اور ہم دونوں نے ہی نفی میں اپنے سر ہلا دیے!

وہ ہمیں لے کر چھولداری سے باہر آ گیا۔ باہر نکلتے ہوئے بندر میرے شانے پر سے اُتر گیا تھا۔ ایک کھلی ہوئی مسطح جگہ پر وہ رک گیا۔

"چھولداری میں باہر سے ہماری باتیں سنی جا سکتی تھیں" وہ قدرے مسکرایا اور موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں کے پیچھے اُس کے موتی جیسے دانت چمکنے لگے!

"احتیاط اچھی چیز ہے!" میں نے اُس کی تائید کی۔

"تم دونوں لباس تبدیل کر لو۔" اُس نے کہا۔ "اور سامان سمیٹنے والوں میں شامل ہو جاؤ، عمارہ میں ہم نے کچھ مصری کارکنوں کا حساب بیباق کر دیا ہے جو سوڈان جانے کے لیے آمادہ نہیں تھے اور ہماری نفری کم رہ گئی تھی، اجرت میں تمھیں کھانے پینے کے علاوہ یومیہ پانچ مصری پاؤنڈ ملیں گے اور اگر ضرورت پیش آئی تو اداکاری یا مسخرے پن سے مشقت تک ہر کام کے لیے تیار رہنا ہو گا۔"

"ہمیں تمھارا ہر فیصلہ منظور ہے!" میں نے کہا۔

"سرکس میں میری حیثیت ثانوی ہے مگر سرکس کا مالک میرے مشورے پر تمھیں اپنی ٹیم میں شامل کر لے گا... اور ہاں تم

اپنے نام بھی بدل لو تو بہتر ہوگا۔"

مجھے یہ جان کر خوشی نہیں ہوئی کہ سرکس میں اُس کی حیثیت ثانوی تھی لیکن ناموں کی تبدیلی کے بارے میں اُس کا مشورہ مناسب تھا۔

"میرا نام جمال اور اس کا توفیق ہوگا۔" ہاشم نے کہا۔ "لیکن سرحد عبور کرنے وقت ہمارے کاغذات کا کیا ہوگا؟"

"سرحد سے آنے جانے والے قافلوں کے پاس اجتماعی اجازت نامے ہوتے ہیں جن میں صرف شرکاء کی تعداد ہوتی ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "سرحد عبور کرتے وقت ہر شخص کو ایک فارم پُر کرنا ہوتا ہے، کوئی خاص جانچ پڑتال نہیں ہوتی۔"

"ہمیں لباس خریدنا ہوگا؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"نہیں، سب کچھ یہیں سے مل جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ!" ابوسلطان نے کہا اور ایک طرف چل دیا، ہم دونوں اس کے پیچھے ہو لیے۔

سرکس کا مالک ایک دراز قامت اور سخت گیر نظر آنے والا مصری تھا۔ وہ اپنے خیمے میں ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔ لڑکی کے بدن پر موجود مختصر لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سرکس کے عملے میں شامل تھی!

ابوسلطان پر نگاہ پڑتے ہی وہ لڑکی فوراً وہاں سے چل دی اور سرکس کا مالک بھی قدرے سنبھل کر بیٹھ گیا جس سے ظاہر ہوا کہ وہ ابوسلطان کا کافی لحاظ کرتا تھا!

"جمال اور توفیق!" ابوسلطان نے باری باری ہم دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں سوڈان تک ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔"

"انھیں پورا اختیار ہے۔" سرکس کے مالک نے کہا۔ "انھیں کام سے لگا دو!"

"آؤ!" ابوسلطان یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"سرکس کا مالک لڑکیوں کے معاملے میں بڑا حسّاس ہے۔" راستے میں وہ کہنے لگا۔ "بس ان سے دُور رہنا۔"

ایک خیمے میں ہم نے ٹی شرٹس اور پتلونیں پہنیں اور پھر خیمے وغیرہ اکھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔

سرکس کے عملے کے پرانے اراکین نے بڑے سرسری انداز میں ہماری موجودگی کو قبول کیا جیسے نئے لوگوں کی آمدورفت اُن کے لیے انہونی بات نہ ہو!

ان لوگوں سے باتوں باتوں میں بہت سے نکتے معلوم ہوئے جن میں اہم ترین یہ تھا کہ صحرائی راستوں پر سفر کرنے والے سرکسوں میں سفری صعوبتوں کے باعث جانوروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ صرف وہی جانور رکھے جاتے ہیں جو سفر کی دشواریاں سہہ سکیں اور جب وہ لوگ کسی جگہ شو کرتے ہیں تو اُن کی آمدنی کا تناسب زیادہ ہوتا ہے جس کا سبب سڈول بدن والی حسین و جمیل رقاصائیں ہوتی ہیں!

دوپہر تک مجھے سرکس کے عملے کی تعداد کا علم ہو چکا تھا۔ سرکس کے مالک اور ابوسلطان کے علاوہ تین سوڈانی لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک پر سرکس کا مالک دل و جان سے فدا تھا۔ باقی عملے میں سات سوڈانی اور تین مصری شامل تھے۔ اس طرح پوری جماعت سترہ نفوس پر مشتمل تھی۔

باربرداری اور سواری کے لیے اس قافلے میں بارہ اونٹ تھے جن کی نگہداشت کے لیے ایک کل وقتی ملازم موجود تھا۔

دوپہر کا کھانا سب لوگوں نے ایک جگہ جمع ہو کر کھایا۔ اس کے بعد کام میں تیزی آتی چلی گئی۔ دوپہر کے بعد سرکس کی روانگی کا تماشا دیکھنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی لیکن اُن کو ایک مخصوص مقام سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں تھی!

ٹھیک چار بجے پورا قافلہ اپنے صحرائی سفر پر روانگی کے لیے تیار تھا۔ چھولداریوں اور لمبے لمبے صندوقوں کے علاوہ پانی سے بھرے ہوئے مشکیزوں کی بھی خاصی تعداد اونٹوں پر لدی ہوئی نظر آ رہی تھی!

مجھے لوگوں سے معلوم ہوا تھا کہ عمارہ سے روانگی کے بعد اگلی منزل ایک صحرائی نخلستان تھا جہاں بمشکل سو سوا سو نفوس کی آبادی تھی۔ اگلے روز گیارہ بجے صبح تک وہاں پہنچنے کے امکانات تھے اور چند گھنٹوں کے قیام کے بعد شاید اگلی منزل کی طرف روانگی عمل میں آتی!

سرکس کے مالک نے اپنی اونٹنی پر آخری بار چکر لگا کر پورے کارواں کا جائزہ لیا۔ سارا مال و اسباب بار ہو چکا تھا، چھوٹے جانور اونٹوں پر سوار تھے۔ ریچھ غالباً عمارہ ہی میں کسی سے پکڑ لیا گیا تھا کیونکہ وہ واپس لے جایا جا چکا تھا!

سوا چار بجے ابوسلطان نے اپنی بھاری آواز میں کوچ کا حکم دیا اور سارے اونٹ حرکت میں آ گئے۔ عمارہ کے تماشائیوں کا چیختا چلّاتا ہجوم اونٹوں کے پیچھے ہو لیا، بعض منچلے ان اونٹوں پر کنکر وغیرہ مار رہے تھے جن پر سرکس کی رقاصائیں سوار تھیں۔ سرکس کے مالک کو ان سب حرکات کا علم تھا لیکن وہ ہر طرف سے انجان بنا ابوسلطان کے ہمراہ سب سے آگے چلا جا رہا تھا جیسے اُسے کسی سے کوئی واسطہ نہ ہو!

قافلے کی رفتار میں تیزی آنے کے ساتھ ہی الوداع کہنے والے تماشائیوں کی بھیڑ چھٹنے لگی اور چند سو گز دُور نکلنے کے بعد میدان بالکل صاف ہو گیا!

وہ منظر میرے لیے بہت عجیب اور دلآویز تھا!

عمارہ کا مختصر سا قصبہ پیچھے رہ گیا تھا اور ہمارے سامنے دُور دُور تک ریت کا یکساں میدان پھیلا ہوا تھا۔ زرد ریت سورج کی روشنی میں پگھلے ہوئے سونے کی لہروں کی طرح چمک رہی تھی۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج آہستہ آہستہ مغرب کی سمت جھکتا جا رہا تھا اور اس ماحول میں سترہ انسانوں کا وہ ہنستا بولتا کارواں اپنی منزل کی طرف رواں تھا!

سارے اونٹ ایک قطار میں چلے جا رہے تھے۔ میرے آگے ایک لڑکی کا اونٹ تھا، پیچھے ہاشم چلا آ رہا تھا۔ آگے والی لڑکی نے ایک دوبار سر گھما کر میری طرف دیکھا تھا مگر میں اُس کی حوصلہ افزائی کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ اُسے میں سرکس کے مالک کے ہمراہ اُس کی چھولداری میں قہوہ نوشی میں مصروف دیکھ چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ابوسلطان کا اونٹ قطار سے الگ ہو گیا اور اُس کی رفتار بھی کم رہ گئی۔ سب لوگ یکے بعد دیگرے اس سے آگے نکلتے رہے اور وہ قطار کے آخر میں ہو لیا۔

میرے لیے یوں خاموشی سے چلتے رہنا دشوار تھا لہٰذا کچھ دیر بعد میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور ابوسلطان کے ساتھ جا پہنچا۔

مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار نظر آئے۔ اُس کی گود میں بیٹھا ہوا بندر رسی سے بندھا ہونے کے سبب محض غرّا کر رہ گیا۔

"اگر کوئی مصلحت ہے تو میں واپس اپنی جگہ چلا جاتا ہوں۔" میں نے اپنا اونٹ اُس کے پہلو میں لا کر دھیمی آواز میں کہا۔

"صحرائی سفر میں نظم و ضبط بہت اہم ہوتا ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "اگر ہر ایک یوں ہی بے لگام ہو کر اپنی جگہ بدلتا رہا تو قافلے کی رفتار پر اثر پڑے گا۔"

"آئندہ احتیاط رکھوں گا۔" میں نے غصّہ ضبط کر کے کہا۔ "اس وقت تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں جو بہت ضروری ہیں۔"

اُس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر ہم دونوں نے ہی اپنے اونٹوں کی رفتار سُست کر دی۔

"سُنا ہے کہ ہم لوگ راستے کی بستیوں میں کھیل تماشے دکھاتے ہوئے جائیں گے۔" میں نے قافلے سے پیچھے رہ جانے پر کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو مگر یہ ضروری ہے۔ اگر دوسرے لوگوں کے برعکس ہمارا سرکس بستیوں سے کترا کر گزرا تو بلاوجہ ہم پر شبہ کیا جائے گا۔ صحرائی بستیوں والوں سے ہمیں خاصی معقول آمدنی ہوتی ہے!"

"یہ سارا سامان کھولنا اور لپیٹنا ہی دشوار ہوگا۔ ہم ہفتے عشرے سے پہلے تو سرحد عبور نہ کر سکیں گے!"

"اب تم میرے ساتھ ہو، یہ سارے مسائل مجھ پر چھوڑ دو!" اُسے اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ "چھوٹی آبادیوں میں ہم کھلے آسمان کے نیچے تماشا دکھائیں گے، راستے میں صرف ایک بڑی آبادی آتی ہے جہاں ہمیں پنڈال وغیرہ لگانا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں ہم کوئی بہانا تراش کر جان چھڑا سکیں!"

"میرے پاس ایک پستول ہے!" میں نے قدرے توقف کے بعد جھجکتے ہوئے کہا۔ "اُسے راستے میں پھینک دینے سے قبل تمھارا مشورہ چاہتا ہوں!"

"رہنے دو!" وہ ہنس کر بولا۔ "صحرائی سفر میں اسلحہ پانی سے زیادہ ضروری ہوتا ہے لیکن ہدایت کے بغیر اسے استعمال نہ کرنا!"

پھر ہم دونوں اپنی اپنی جگہ آ گئے!

"کیا اُٹھانے گئے تھے؟" مجھ سے آگے والے اونٹ پر بیٹھی ہوئی رقاصہ کو اس بار مجھے مخاطب کرنے کا بہانا مل گیا۔ اُس کا لہجہ بے حد شوخ تھا!

"اگر سرکس کے مالک نے تمھیں اس لہجے میں مجھ سے بات کرتے سن لیا تو تمھاری چمڑی گرا دے گا۔" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔ "بالکل ہی گاؤدی ہو، ہم ہوا کی مخالف سمت میں بڑھ رہے ہیں اور وہ سب سے آگے جا رہا ہے، ہماری آوازیں کیسے سن لے گا؟"

"اُس کا دستِ راست پیچھے ہے!"

"خلیل چغل خور نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے!" اسی اثنا میں وہ بتدریج اپنا اونٹ میرے برابر میں لے آئی۔

"جب سرکس کا مالک تم پر فدا ہے تو تم دوسروں کو کیوں ستاتی ہو؟" میں نے دھیمی آواز میں اُس سے سوال کیا۔

"عورت آقا نہیں ایک چاہنے والا ساتھی تلاش کرتی ہے!"

"آخر تمھاری نظر مجھ غریب پر ہی کیوں پڑی؟ سرکس میں اور بھی تو بہت سے مرد ہیں!" میں نے اس کی حوصلہ شکنی کرنے کی نیت سے کہا۔

"اسے تم..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ عقب میں یک بیک ایک تیز آواز سنائی دی تھی۔ میں نے بوکھلا کر سر گھمایا تو قافلے سے خاصی دُور فضا میں ایک ہیلی کاپٹر پرواز کرتا نظر آیا۔ جو تیزی سے آگے بڑھتا آ رہا تھا۔

یک بیک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ ہیلی کاپٹر زمین سے خاصا بلند تھا مگر اُس کے پنکھوں

سے پیدا ہونے والی ہوا صحرا کے سینے پر ریت کا گرداب بنا رہی تھی۔ اور میری آنکھوں میں ہکسس بھرتی کے واقعات پھرنے لگے تھے۔

ناگہانی طور پر نمودار ہونے والا وہ ہیلی کاپٹر میرے لیے کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ فضائی عفریت قافلے ہی کے تعاقب میں ہو۔

"آنے والے شاید فوجی ہیں۔" صحرا میں ابوسلطان کی کرخت آواز گونجی "سب لوگ معمول کے مطابق بڑھتے رہو، ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں آگے جا رہے ہوں۔"

یہ اعلان کرنے کے لیے وہ اپنے اونٹ کو آگے بڑھا لایا تھا۔

قافلہ بڑھتا رہا لیکن سواروں کی نگاہیں عقبی آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔ دوسروں سے قطعِ نظر میری اندرونی کیفیت بڑی خراب تھی اور میں خود کو بدترین امکانات کے مقابلے کے لیے تیار کرنے میں مصروف تھا۔

ہیلی کاپٹر ہمارے قافلے پر سے گزرا تو اوپر سے پڑنے والے ہوا کے دباؤ اور انجن کے شور کے باعث چند اونٹ بری طرح بھڑکے مگر دوسروں نے فوراً ہی انھیں گھیر لیا اور قافلے کو انتشار سے بچا لیا۔

وہ فوجی ہیلی کاپٹر کچھ دُور جا کر ریت کے زبردست غبار میں صحرا کے سینے پر اُتر گیا اور اسی کے ساتھ خلیل کی ہدایت پر اونٹوں کو ٹھہرا لیا گیا۔

اعصاب شکن سنسنی کے لمحات شروع ہو گئے۔ ہر نگاہ ریت پر ٹھہرے ہوئے عفریت کی طرف نگراں تھی۔

پنکھے رک جانے کے بعد جب ریت کا طوفان ماند پڑا تو اُدھر سے چار باوردی فوجی قافلے کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ان میں سے تین کے ہاتھوں میں اسٹین گن کی قسم کا کوئی اسلحہ نظر آ رہا تھا۔

خلیل چلّایا اور اونٹوں کی مہاریں کھینچ لیں۔ سارے اونٹ یکے بعد دیگرے بلبلاتے ہوئے ریت پر بیٹھ گئے۔

وہ چاروں تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے پھر قریب آ کر غیر مسلح شخص بقیہ تینوں سے آگے آ گیا۔ وہ کوئی اعلیٰ افسر معلوم ہوتا تھا۔

"میر کارواں کون ہے؟" اس نے تحکم آمیز بھاری آواز میں سوال کیا اور سرکس کا مالک اپنے اونٹ سے اُتر کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" فوجی افسر نے سوال کیا۔

"جوزف امین!" سرکس کے مالک کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

"قافلے والوں سے تمھارا کیا واسطہ ہے؟"

"یہ سرکس ہے میرا۔" وہ بولا "ہم چند گھنٹے پیشتر عمارہ روانہ ہوتے ہیں اور اُم درمان ہماری منزل ہے۔"

"ٹھیک۔" فوجی افسر تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "یہ ہم کارہ میں معلوم کراتے ہیں اور تمھیں بتانا چاہتے ہیں کہ کچھ خطرناک قاتل قاہرہ کے نواح میں اہم سرکاری اہلکاروں کو ہلاک کرنے کے بعد شاید صحرا کی طرف فرار ہوتے ہیں اور ہمیں ان کی تلاش ہے ..... تمھیں کچھ معلوم ہے ان کے بارے میں؟"

جوزف نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا مگر ابوسلطان آگے بڑھ گیا۔ "یہ ان بیس قاتلوں کا قصہ تو نہیں جن کی گرفتاری میں مدد دینے والے کے لیے ریڈیو سے پچیس ہزار پاؤنڈ کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے؟"

"ہاں!" فوجی افسر خوش ہو گیا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ ان ہی اطراف میں بھٹک رہے ہوں۔ اگر تمھیں صحرا میں کوئی بھٹکا ہوا اجنبی ملے تو اسے قریب ترین آبادی میں پولیس کے حوالے کر دینا اور سفر کے دوران محتاط رہنا۔"

"بہت بہتر۔" جوزف امین نے سر ہلا کر کہا۔

"ہم نہیں چاہتے کہ کوئی بے گناہ مسافر صحرا میں ان سفاک قاتلوں کا نشانہ بنے۔ خبر مل جانے کے بعد اپنی حفاظت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔"

ڈوبتے سورج کی روشنی میں ان چاروں فوجیوں کی واپسی کا منظر میرے لیے بے حد حسین تھا اور جوں ہی ان کو لے کر ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوا، قافلے میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔

جوزف نے ابوسلطان سے مشورے کے بعد ایک بڑا سا چوبی صندوق کھلوا دیا جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

اس چوبی صندوق میں بڑے بور کی دُور مار رائفلیں موجود تھیں جن کی تعداد آٹھ تھی اور بھاری تعداد میں فاضل راؤنڈز بھی موجود تھے۔

جوزف نے اسلحہ تقسیم کرنے سے پہلے نئی صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے سختی سے حکم دیا کہ جب تک وہ یا خلیل حکم نہ دے اسلحہ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اور پھر وہ آٹھوں رائفلیں تقسیم کر دی گئیں۔

مجھے اور ہاشم کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا اور قافلہ ایک مرتبہ پھر اپنی راہ پر چل پڑا۔

اس بار قطار والی ترتیب توڑ دی گئی تھی۔ جوزف اور ابوسلطان آگے چل رہے تھے۔ باقی تمام اونٹ ایک جھنڈ کی صورت میں ان کے پیچھے تھے، البتہ بغیر مسافر والے باربردار اونٹ تھا

میں چلنے پر مجبور تھے کیونکہ ان کی مہاریں لمبی ڈوریوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔

سفر کا دوبارہ آغاز خوف کی فضا میں ہوا مگر سورج غروب ہونے کے بعد ماحول پر خوشگوار سی کیفیت طاری ہونے لگی اور ایک شخص نے اونٹوں کے گلوں سے جھولتی ہوئی گھنٹیوں کے ترنم سے متاثر ہو کر ایک صحرائی نغمہ چھیڑ دیا جس میں فوراً ہی دو تین آوازیں شامل ہو گئیں۔

"تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟" اپنے قریب ایک مدھم نسوانی آواز سن کر میں چونک پڑا۔

جوزف امین کی پسندیدہ رقاصہ ایک مرتبہ پھر اپنا اونٹ میرے قریب لے آئی تھی۔

"تم سے؟" میں نے برجستہ سوال کیا۔

"صحرا میں قاتل گھوم رہے ہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "اور اسلحہ تقسیم کیا جا چکا ہے۔"

"ایک سرکس میں اتنے اسلحے کا کیا کام؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔"

"وادی العلاقی میں ضرب العربین نامی صحرائی راستے پر قزاق حملے کرتے ہیں۔ اس وادی سے گزرنے سے قبل ہر قافلہ اسلحہ سنبھال لیتا ہے مگر اس بار تو ہمیں ابتدا ہی سے اسلحہ تھما دیا گیا ہے۔" اس نے کہا

"ہماری اگلی منزل کتنی دُور ہے؟"

"الفجیرہ۔" اس نے کہا۔ "اگر حالات یوں ہی سازگار رہے تو صبح سویرے ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"تم اس سرکس میں کب سے ہو؟"

"سات برس پہلے جوزف نے مجھے خریدا تھا۔ بس اُسی وقت سے اس کے لیے کما رہی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

اس کا جواب سن کر میری کھوپڑی دھمک اٹھی۔ بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی بعض خطے ایسے تھے جہاں انسانوں کی خرید و فروخت جاری تھی۔

"مصر میں تو انسانوں کی خرید و فروخت ممنوع ہے!"

"جوزف نے مجھے سوڈان میں خریدا تھا۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "یہ شرمناک دھندا وہاں بھی غیرقانونی ہے لیکن میں اس سے فرار ہو کر کہیں پناہ حاصل نہیں کر سکتی۔ بردہ فروشوں کے ہاتھ قانون سے زیادہ مضبوط ہیں۔"

جوزف امین خود بردہ فروش نہیں تھا مگر لڑکیوں کی خریداری کر کے وہ اس شرمناک جرم کی سرپرستی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ میرا محسن ضرور تھا مگر میرے دل میں اس کے لیے نفرت کی ایک چنگاری سلگ اٹھی تھی۔

اندھیری رات میں آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے اور نیچے تاحدِ نظر ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھیرے کا وہ لامتناہی سمندر وقت اور سمت کے ادراک سے یکسر عاری تھا مگر جوزف امین شاید ان صحرائی رستوں کا کیڑا تھا کیونکہ وہ نہایت اعتماد سے ناپے تلے زاویوں پر راستے تبدیل کر رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" لڑکی نے مجھے ٹوکا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "تم مجھ پر اتنا کرم کرو کہ دورانِ سفر مجھ سے دُور رہو۔ پڑاؤ پر ہم ساری کسر نکال لیں گے۔"

اس کے بعد اس نے مجھے مخاطب نہیں کیا۔ شاید وہ میرے لب و لہجے سے ڈر گئی تھی کہ کہیں میں چڑ کر جوزف سے اُس کی شکایت نہ کر دوں۔

میرے لیے وہ سفر ایک انوکھا تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس پوری بھیڑ میں صرف ہاشم ہی ایسا شخص تھا جس پر مجھے پورا اعتماد تھا ورنہ ابوسلطان جیسے سخت گیر اور تحکم پرست شخص کے ساتھ سمجھوتہ کرنا میرے لیے خاصا مشکل تھا اور جوزف امین کے کردار سے قدرے متعارف ہونے کے بعد تو میں اس سے تقریباً بھڑک ہی گیا تھا مگر اس کے باوجود میں ان لوگوں کے ساتھ اپنی سلامتی کا اہم ترین سفر جاری رکھنے پر مجبور تھا۔

وقت کی رفتار صحرا میں تھم سی گئی تھی۔ اونٹ ہچکولے لیتے تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے لیکن اندھیرے کا وہ سمندر ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ پھر گانے بجانے والوں کی آوازوں پر بھی تکان غالب آنے لگی۔

صبح کا اوّلین دھندلکا نمودار ہوا تو ہمارے چاروں طرف ریت ہی ریت تھی مگر پھر تھوڑی دیر بعد سامنے ایک آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے ہمارا قافلہ اس آبادی میں داخل ہو گیا۔

الفجیرہ کی اس مختصر سی بستی کے خاصے مکین سحر خیز تھے کیونکہ کارواں کی گھنٹیوں کی آواز سن کر دس پندرہ افراد مکانوں سے باہر نکل آئے تھے۔

جوزف ان لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ شاید وہ پہلے بھی اپنا سرکس لے کر اس راہ سے گزرتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمارا پورا قافلہ پھوس کی دیواروں پر مشتمل ایک احاطے میں داخل ہو گیا جہاں اونٹوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔

اونٹ وہاں چھوڑ دیے گئے۔ ساز و سامان اتار کر ایک طرف ڈھیر کر دیا گیا۔ جوزف نے آٹھوں رائفلیں بھی واپس لے کر خالی کر دیں۔

"اس بار تمھارے ہاتھوں میں اسلحہ کیوں ہے؟" ایک بوڑھے

نے حیرت کے ساتھ جوزف سے سوال کیا۔

"کچھ خطرناک مجرم صحرا میں بھٹک رہے ہیں، تم لوگوں کو بھی چوکنا رہنا چاہیے۔" جوزف نے جواب دیا۔

"وہی، جن کے بارے میں بار بار ریڈیو سے اعلان ہو رہا ہے؟" کسی اور شخص نے تحیر آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

"ہاں۔ ابھی تک ان کا سراغ نہیں ملا ہے۔ فوجی افسر صحرا میں دُور تک انہیں تلاش کر رہے ہیں۔" جوزف نے کہا اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اسے میری اور ہاشم کی اصلیت کے بارے میں ذرا بھی علم نہیں تھا۔

اسی احاطے میں ایک چھپّر کے نیچے پیال کا فرش بچھا ہوا تھا۔ خورد و نوش کی مختصر سی محفل کے بعد سب نے وہیں جگہ سنبھال لی۔

اُونٹ کی پشت پر چودہ پندرہ گھنٹے گزارنے کے بعد میرا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی میں ایسا بے خبر ہو کر سویا کہ دُنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہی۔ اگر ہاشم تیسرے پہر مجھے بیدار نہ کرتا تو شاید میں رات گئے بھی خود سے بیدار نہ ہوتا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ باقی لوگ شاید پہلے ہی نمٹ چکے تھے۔

کھانے کے بعد میں چہل قدمی کے لیے باہر نکل گیا۔

الفجیرہ بنجر صحرا کے سینے پر مختصر سی سرسبز و شاداب بستی تھی جس کے مکینوں کی زندگی اور روزی کا تمام تر انحصار میٹھے پانی کے ان دو کنوؤں پر تھا جو درختوں کے جھنڈ میں گھرے ہوئے تھے۔ وہ بستی بمشکل ساٹھ یا ستّر مکانات پر مشتمل تھی اور میرے لیے یقین کرنا دشوار تھا کہ کچے مکانوں میں رہنے والے وہ صحرانشین اتنے خود کفیل تھے کہ بیرونی دُنیا سے کوئی رابطہ نہ ہونے کے باوجود بے فکری سے اپنی زندگی بسر کر لیتے تھے اور انھیں محرومی کا کوئی احساس نہیں ستاتا تھا۔

لیکن بعد میں ہاشم سے پتہ چلا کہ کپڑے، چائے، تمباکو اور نمک کے لیے ان کا انحصار الفجیرہ سے گزرنے والے قافلوں پر تھا۔ پانی، اناج، جانوروں کے چارے اور دوسری خدمات کے عوض وہ صرف اپنی ضرورت کی چیزیں لیا کرتے تھے۔

بستی میں چند لوگ رقاصاؤں کی محفل دیکھنے کے لیے مضطرب تھے۔ مگر جوزف نے پہلے ہی سے پیش بندی کر لی تھی۔ اس نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ ناچنے والیاں اس بار دورانِ سفر ہی بیمار ہو گئی تھیں اور اگر انہیں ناچنے پر مجبور کیا گیا تو ان کا قافلہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے گا۔

"تو دو ایک روز یہاں رُک جاؤ۔" ایک نوجوان نے نڈر لہجے میں جوزف سے کہا" جب وہ صحت یاب ہو جائیں تو آگے چلے جانا۔"

"ہمارے پاس نپا تلا راشن ہے برخوردار!" جوزف نے سختی سے جواب دیا۔ "تمہارا شوق پورا کرنے کے لیے ایک روز یہاں رُک گئے تو سفر کا آخری روز فاقے میں گزرے گا۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ ممکن ہوا تو ایک آدھ گھنٹے کی محفل ضرور جمے گی۔"

ایک آدھ گھنٹے کی خبر آگ کی طرح اس نخلستان میں پھیل گئی اور لوگ پھونس کے اس احاطے کے پاس منڈلانے لگے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے قافلے والے اونٹوں کو سفر کے لیے تیار کرنے میں مصروف تھے۔ اور جوزف ابوسلطان سے مشورے کر رہا تھا اور پھر اسی دوران میں جوزف دو لڑکیوں اور ایک مرد کو ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔

احاطے کے قرب و جوار میں منڈلانے والے اس تیزی سے غائب ہونے شروع ہوئے کہ تھوڑی ہی دیر میں سنّاٹا چھا گیا۔ میں ایک طرف اکیلا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ تیسری لڑکی نہ جانے کہاں سے میرے پاس آ موجود ہوئی۔ وہ وہی لڑکی تھی جس نے راستے میں مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میرے بارے میں سوچ رہے تھے؟" وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے دلآویز لہجے میں بولی۔

"مجھ پر اپنا وقت برباد نہ کرو لڑکی۔" میں نے دھیمے لیکن تادیبی لہجے میں کہا۔ "اگر تم جوزف سے بدظن ہو تو میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔"

وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔ "بہت بزدل ہو۔ میں نے کب کہا کہ مجھ سے شادی کر لو یا مجھے جوزف کے چنگل سے نجات دلاؤ۔ میں جانتی ہوں کہ اب ساری عمر مجھے اس کے اشاروں پر ناچنا پڑے گا۔ میں تو بس تھوڑا سا وقت ہنس بول کر اچھے انداز میں گزارنا چاہتی ہوں۔"

"جوزف اس وقت یہاں نہیں ہے لیکن یہ نہ بھولو کہ اس کا ہر تنخواہ دار اس کا مخبر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ میرے اور تمہارے میل جول کو برداشت نہیں کرے گا۔"

وہ چند ثانیوں تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر بولی۔ "کون کہتا ہے کہ تم اس سرکس میں نئے ہو؟ تم تو جوزف کی رگ رگ سے واقف ہو۔"

"جوزف جیسے نہ جانے کتنے لوگوں سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے۔ یہ محض تجربہ ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "تم تو اُس کی زرخرید ہو اور آمدنی کا ذریعہ بھی، وہ تمہارا چہرہ نہیں بگاڑے گا مگر میری زندگی دشوار بنا دے گا۔"

"تم بہت ہوشیار ہو۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ ایسا ہی درندہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے لیے مرد یا عورت ہونے کے بجائے محض پتھر کے مجسمے ہیں جو جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔"

"شاید اسی لیے تم سرکس کے اسٹیج پر تماشائیوں کو اشتعال دلاتی ہو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ہاں۔" اس نے پُر سوز لہجے میں کہا۔ "میرا بس چلے تو میں اسٹیج پر برہنہ رقص پیش کروں۔ وہیں تو میری پگھلی ہوئی انا کو تسکین ملتی ہے کہ سرکس میں ملازم مردوں کے لیے اگر میں محض پتھر ہوں تو سیکڑوں تماشائی میرے بدن کی ایک ایک جنبش سے نہ جانے لذّت کی کن کن منزلوں سے گزرتے ہوں گے۔"

"تو تم مجھے قربانی کا بکرا بنا رہی تھیں؟" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"شاید۔" وہ میرا بازو دبا کر بولی۔ "میرا خیال تھا کہ تم نئے ہو بہک جاؤ گے، میرا کچھ نہ بگڑے گا۔ ہاں جوزف تمہیں ذلیل کر کے ملازمت سے برطرف کر دے گا اور تم کوئی نئی ملازمت تلاش کر لو گے۔"

اسی لمحے فضا میں دف کا شور اُبھرا اور پھر ایک صحرائی گانے کی لَے سنائی دی جو مردانہ آواز میں تھی۔

"وہ ریت پر کٹھ پتلیاں نچا رہا ہے۔" وہ لڑکی بولی۔ "تم دیکھ لینا کہ ناچ دکھا کر ان سے اتنا کچھ سمیٹ لے گا کہ اس بستی کے لوگ ہفتوں اپنی حماقت پر روئیں گے۔"

"یہاں سے روانگی کب ہو گی؟"

"قافلہ تیار ہے۔" وہ بولی۔ "بس جس وقت بستی کے تماش بینوں کی فیاضی ماند پڑنے لگے گی وہ واپس آ کر روانگی کا اعلان کر دے گا۔"

"نام نہیں بتایا تم نے اپنا۔"

"جمیلہ۔" اس نے کہا۔ "اور تمہارا نام شاید توفیق ہے؟"

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ "اس سفر میں تم مجھ سے دُور ہی رہو، اگر ممکن ہوا تو سوڈان پہنچ کر تم کو جوزف سے نجات دلانے کی کوشش کروں گا۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" اس کا لہجہ یک بیک سرگوشیانہ ہو گیا۔ "میں نے تو نجات کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اس کی بس دو صورتیں ہیں۔ تم بھاری قیمت لگا کر مجھے اس سے خرید لو یا اسے ہلاک کر دو۔"

"کیا یہ سوڈان کا کوئی بڑا شورہ پشت ہے؟"

"بہت بڑا۔" اس نے کہا۔ "اس کے چار سرکس مصر آتے جاتے ہیں اور گیارہ سرکس سوڈان کے شہروں میں چلتے ہیں جن میں چھٹے ہوئے بدمعاش ملازم ہیں۔ وہ سب اس کی خریدی ہوئی لڑکیوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔"

"ایسی لڑکیوں کی تعداد کتنی ہو گی؟"

"گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔" اس کا جواب سن کر میں جھرجھری لے کر رہ گیا کہ میں اس وقت حقیقی معنوں میں ایک بردہ فروش کی امان میں تھا۔

"اچھے دام ملیں تو وہ لڑکیوں کو بیچ بھی دیتا ہے۔" جمیلہ کہہ رہی تھی اور میرا ذہن جوزف سے بھٹک کر ابوسلطان میں اُلجھ کر رہ گیا۔

ابوسلطان قاہرہ میں اخوان الصّفا کا مقامی امیر تھا اور وہ تنظیم قدامت پسند اور کٹر مذہبی نوعیت کی سمجھی جاتی تھی لیکن ایک ایسی انتہاپسند مذہبی تنظیم کا ذمہ دار رکن ایک بردہ فروش غنڈے کا اس قدر گہرا دوست تھا کہ اُس نے مصر کی حدود سے محفوظ فرار کے لیے اس بردہ فروش کے قافلے کا سہارا لیا تھا۔

میں نے اپنے ذہن میں ابوسلطان کی جو تصویر بنائی تھی وہ تقدس کے نور میں ڈوبی ہوئی اصولوں پر جان قربان کر دینے والے آدمی کی تصویر تھی۔ مگر وہ شخص اپنی جان پر سارے اصول قربان کرنے والا نظر آ رہا تھا۔

میرے دل میں جوزف کے ساتھ ابوسلطان سے بھی کراہت پیدا ہونے لگی۔

جمیلہ میرے پاس سے نہ جانے کب اُٹھ گئی مگر میں اپنے خیالات میں ڈوبا رہا۔ میرے خیالات کا سلسل اس وقت ٹوٹا جب کھلی فضا سے آنے والی نغمہ و دف کی آوازیں شور و غل میں دم توڑ گئیں۔

چند منٹ بعد جوزف فاتحانہ شان سے واپس لوٹ آیا۔ دونوں رقاصہ لڑکیاں اور تیسرا شخص اُس کے ساتھ تھا۔

اس محفل سے سمیٹے ہوئے تحائف جوزف نے ایک مقفل صندوق میں ڈال دیئے اور قافلہ روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

دو بے حجاب لڑکیوں کے ناچ پر اپنی پونجی لٹانے والوں نے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ ہمارے کارواں کو رخصت کیا اور کچھ دیر بعد ہم نے الفجیرہ کے آثار کو پیچھے پھیلے ہوئے اندھیرے میں چھوڑ دیا۔

یہ مصر سے ہمارے سفر کا آغاز تھا۔ ریت کے سمندر میں سترہ انسانوں کا کارواں محض جوزف امین کی صوابدید کے سہارے بڑھتا رہا۔ راستے میں کئی جگہ پڑاؤ ہوئے۔ ناچ گانے سے مقامیوں کے دل بہلائے گئے اور اگر حقیقت کا اظہار کیا جائے تو شاید قاہرہ سے نکلنے کے بعد وہ سرکس رقص و سرود کا بے حجاب مظاہرہ کرنے والوں کی جمعیت میں شامل

ہو چکا تھا۔

مجھے اس خطرناک خطے کا شروع سے انتظار تھا جو وادی العلاقی میں واقع تھا۔ ہم ایک چھوٹی سی بستی میں پڑاؤ کر کے آگے بڑھے تو بلند ریتلے ٹیلوں کے درمیان گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے مجھے ہر لمحے کسی حملے کا خوف رہا لیکن جوزف ابین ان راستوں پر بارہا سفر کر چکا تھا اور اس کا خیال تھا کہ صحرائی قزاق غیر مسلح قافلوں کو ہی اپنا نشانہ بناتے تھے جو پوری طرح لیس ہوں وہ بحفاظت ضرب العربین نامی صحرائی راستے سے گزر جاتے ہیں۔

ضرب العربین سے گزرتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں آٹھ بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور جوزف نے ہر اسلحہ بردار کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ خطرہ بھانپتے ہی بلا تردد فائر کر دیا جائے لہٰذا اس خطرناک گھاٹی میں ہم پر کوئی وار نہ ہوا اور ہم بحفاظت اس پرخطر مقام سے گزر گئے۔

اس طویل صحرائی سفر کے چوتھے روز ہمارا قافلہ مصری سرحدی چوکی پر کھڑا ہوا تھا۔ اہلکاروں کے پاس اعتراضات داغنے کے لیے وسیع اختیارات تھے مگر جوزف ابین کھلے ہوئے دہانوں میں لقمہ ڈالنے میں خاصا ماہر تھا۔

خارم بھرے گئے اور قافلہ آگے بڑھ گیا۔

سوڈان کی سرحدی چوکی پر مامور عملہ نسبتاً زیادہ شریف تھا، ان کے لیے کسی خاص تدبیر کی ضرورت پیش نہ آئی اور ہمارا کارواں وادی حلفہ میں داخل ہو گیا۔

میرے لیے مصری سرحد سے گزرنا ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔ اس سے نکلتے ہی میرا دل چاہا کہ اپنے بردہ فروش محسن سے یکسر قطع تعلق کر لوں لیکن احتیاط کے تقاضوں کے پیش نظر میں ایسا نہ کر سکا۔

وادی حلفہ مصری سرحد سے ملحق تھی اور وہیں اسی نام کا اوسط درجے کا ایک شہر بھی تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد مجھے صحیح معنوں میں جوزف ابین کی حقیقت کا علم ہوا۔

وہ شاید کسی پیشگی اطلاع کے بغیر سوڈان پہنچا تھا مگر کارواں کے شہری حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی جوزف کی آمد کی خبر شہر میں پہنچ گئی اور راستے میں ہی کئی گاڑیاں آ پہنچیں۔

آنے والوں نے نہایت تپاک سے جوزف کا استقبال کیا اور پھر قافلے کے چند گنے چنے شرکاء ان گاڑیوں میں چلے گئے جوزف کے ساتھ جانے والوں میں ابوسلطان بھی شامل تھا۔ کچھ پیشہ ور ساربان قافلے کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے جن کی رہنمائی میں تھکا ہارا قافلہ پختہ سڑک کے کنارے شہر کی طرف بڑھنے لگا۔

"مبارک ہو۔" موقع پا کر ہاشم اپنا اونٹ میرے قریب لے آیا۔ "سوڈان میں تم ہر پریشانی سے محفوظ ہو چکے ہو۔"

"مگر جوزف اور ابوسلطان کہاں غائب ہو گیا ہے؟"

"خاموشی اور صبر سے انتظار کرتے رہو۔ شاید سوڈان میں جوزف ابین کسی بڑے درجے کا مالک ہے۔"

"وہ بہت بڑا بردہ فروش ہے۔" میں نے موقع پا کر پہلی بار اسے اپنی معلومات سے آگاہ کیا۔ "وہ متعدد سرکسوں کا..."

"مگر مصر میں تو وہ بڑا مسکین نظر آتا تھا۔" ہاشم نے حیرت سے کہا۔ "تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟"

"جمیلہ!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس سرکس کی ایک رقاصہ سے یہ باتیں معلوم ہوئی تھیں ورنہ میں بھی جوزف بے زبان سمجھ رہا تھا۔"

"اگر تمھاری معلومات درست ہیں تو جوزف یقیناً ہمیں بڑا چکر چلا رہا ہے۔" وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "ہمیں فوراً کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔"

"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "سیتا کا ٹھکانہ معلوم کر کے ہم اس سے رخصت ہو جائیں گے۔"

نصف گھنٹے کے سفر کے بعد قافلہ شہر میں داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد سوڈانی ساربانوں کی رہنمائی میں پورا قافلہ کچی بنی ہوئی ایک قلعہ نما چار دیواری میں داخل ہو گیا۔ جس کے وسیع احاطے کے علاوہ کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔

احاطے کی بلند دیواروں کے ساتھ بنے ہوئے سائبانوں کے نیچے اونٹ بٹھا دیے گئے اور ایک شخص تمام مسافروں کو لے کر وسیع عمارت کی طرف چل دیا۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع کمرے میں ابوسلطان اضطراب کے عالم میں ٹہلتا نظر آیا۔ ہمیں دیکھتے ہی لپک کر آگے بڑھا اور اس نے میرا بازو تھام لیا۔ ہاشم بھی میرے قریب ہی رک گیا۔

ابوسلطان اس وقت تک خاموش رہا جب تک قافلے کے دیگر شرکاء وہاں سے غائب نہ ہو گئے پھر وہ ہذیانی انداز میں پھٹ پڑا۔

"تم نے میرا منہ کالا کرا دیا۔ جوزف اس کا خون نچوڑ ڈالے گا۔"

"کیا ہوا؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" میں نے اپنے بازو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"وہ لڑکی بھاگ گئی، جوزف بہت برہم ہے۔" ابوسلطان نے مضطرانہ لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ خاصا نروس نظر آ رہا تھا۔

"پہیلیوں میں بات نہیں بنے گی۔" میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے تجسس کو دباتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں؟"

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔" وہ گھومتے ہوئے بولا۔ "غضب یہ ہوا ہے کہ وہ تنہا نہیں گئی ہے تین لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ بھگا لے گئی ہے۔"

میں اس کی بہکی ہوئی گفتگو سے بہت کچھ اخذ کر چکا تھا مگر میں نے انجان بن کر سوال کیا۔ "تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"جب نے اس لڑکی کو میرے حوالے کیا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ میری ساکھ کو بٹہ لگا دے گی۔"

اس وقت تک ہم تینوں ایک کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

"شاید تم سیتا کی بات کر رہے ہو؟" کمرے میں پہنچنے کے بعد ہاشم نے دھیمے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"وہ یہاں پہنچتے ہی نہ جانے کس طرف نکل بھاگی۔ اپنے ہمراہ جوزف کی تین زر خرید کنیزوں کو بھی لے گئی جو سرکس میں ناچتی تھیں۔" ابوسلطان نے بھونڈی وضع کی ایک چارپائی میں ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت برا ہوا ابوسلطان!" ہاشم نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ ایک لڑکی کی بھی حفاظت نہ کر سکے؟"

"وہ یہاں سے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہوئی ہے۔" ابوسلطان جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جوزف سے لے کر اس کے ملازمین تک کسی کو بھی تم دونوں یا اس لڑکی کی اصلیت کا علم نہیں تھا ورنہ شاید جوزف اپنا سفر ترک کر کے سرکاری انعام کی رقم حاصل کرنے کو ترجیح دیتا۔"

"وہ ہمارے بارے میں بھی لاعلم تھا؟" ہاشم نے حیرت سے سوال کیا۔

"نہ ہوتا تو تم بخیر و عافیت سوڈان میں داخل نہ ہو پاتے۔" وہ چڑچڑاتے لہجے میں بولا۔

"مگر راستے بھر تو اس کا رویہ بہت معقول رہا۔" میں نے کہا۔

"اس کے ذہن میں رہ رہ کر شبہات سر ابھار رہے تھے۔ دوران سفر اس نے کم از کم چار مرتبہ مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کہیں تم دونوں اشتہاری مجرموں سے کوئی تعلق تو نہیں رکھتے۔ وہ پیسے کے معاملے میں بہت حریص ہے۔"

"سیتا وادی حلفہ ہی سے غائب ہوئی تھی؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"رات کو وہ پورے کارواں کے ساتھ اسی عمارت میں مقیم تھی۔ صبح ہوئی تو تین کنیزوں اور چار اونٹوں کے ساتھ وہ لاپتہ ہو چکی تھی۔"

"ہو سکتا ہے کہ اسے اغوا کیا گیا ہو؟" میں نے کہا۔

"بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "وہ دیدہ دانستہ یہاں سے فرار ہوئی ہے، جوزف کے آدمی اس کی تلاش میں ہیں اور وہ جلد یا بدیر پکڑی جائے گی مگر اس کی وجہ سے میرے اور جوزف کے برسوں پرانے مراسم میں فرق آ گیا ہے۔"

"میری ایک بات کا جواب دو گے؟" میں نے قدرے توقف کے بعد جذبات سے عاری لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"کیا؟" اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔

"اخوان الصفا دائیں بازو کی ایک کٹر اصول پرست تنظیم ہے اور تم اس کے ایک ذمہ دار رکن ہو؟" میں نے کہا۔

"آگے کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ ناگواری کے ساتھ غرایا۔

"تم جانتے ہو کہ جوزف ابین کون ہے؟"

"صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جوزف ابین سوڈان کا ایک بارسوخ بردہ فروش ہے..."

"بس، خاموش ہو جاؤ۔" وہ میری بات کاٹ کر دھاڑا پھر ہاشم سے مخاطب ہو گیا۔ "اگر مجھے علم ہو جاتا کہ تم آستین میں ایک سانپ لیے پھر رہے ہو تو ہرگز تمھارے ساتھ تعاون پر آمادہ نہ ہوتا۔"

"لہجہ نیچا رکھو ابوسلطان۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اگر جوزف نے سن لیا کہ تم نے اسے دھوکہ دے کر مصر کے اشتہاری مجرموں کو سرحد عبور کرائی ہے تو شاید وہ تمھاری پشت پر درے لگوانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔"

ابوسلطان کے پرغرور چہرے پر پہلی بار تردد کے آثار نظر آئے۔ "آخر تم مجھ سے کیا توقعات باندھ رہے ہو؟"

"میرا پہلا کام تمھیں شرمندہ کرنا ہے۔" میں اس کی دکھتی رگ قابو میں آ جانے پر اعتماد سے بولا۔ "تمھارے مرتبے کے شخص کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایک بدنام بردہ فروش سے اتنے قریبی مراسم رکھے۔"

"تم یہاں اجنبی ہو۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "سوڈان میں ہر ذی حیثیت شخص دو چار کنیزوں کا مالک ہوتا ہے۔"

"کیا یہ خرید و فروخت قانونی ہوتی ہے؟"

"نہ ہو، مقامی رسوم و رواج قانون سے بالاتر ہوتے ہیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "سوڈان میں پچھلے کئی برسوں سے کسی پر بردہ فروشی کا الزام عائد نہیں کیا گیا۔"

"اس لیے کہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے بقول تمھارے ذی حیثیت لوگ ہوتے ہیں۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو۔" وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے

بولا: "اپنا مدعا بیان کرو کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"تم بھی غیر قانونی رجحانات کے مالک ہو" میں نے کہا: "اور تمہارے سوڈان کے زیرِ زمین عناصر سے قریبی روابط ہوں گے۔ میں مفرور لڑکی کا سراغ چاہتا ہوں۔ اگر اس کا بال بھی بیکا ہوا تو جوزف کے ساتھ تم بھی نتائج بھگتو گے!"

"مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش نہ کرو" وہ غصیلے لہجے میں بولا: "جوزف کو یہ علم نہیں ہے کہ وہ لڑکی تمہاری ساتھی تھی۔ اس بارے میں اگر میں نے زبان بھی کھولی تو میری اور جوزف کی ٹھن جائے گی، کاش میں تمہارے معاملے میں نہ پڑا ہوتا!"

"قدرت بعض اوقات بُرے لوگوں سے بھی اچھے کام لے لیتی ہے!" میں نے اسے سلگانے کے لئے ہنس کر کہا: "تم اپنی فکر چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"تم مجرم کی طرح خاموش کیوں ہو؟" ابوسلطان ہاشم پر برس پڑا: "یہ مصیبت تم ہی نے مجھ پر مسلط کی ہے!"

"تم تو شروع ہی سے سیتا کے ہمدرد تھے" ہاشم نے مدافعانہ لہجے میں کہا: "شاید سرکس میں ناچنے والی لڑکیوں نے اپنی دردناک کہانی سے اسے متاثر کر لیا ورنہ وہ کبھی ایسی حرکت کا ارتکاب نہ کرتی۔"

"جوزف کون ہے اور کیا کرتا ہے؟ ہمیں اس سے سروکار نہ ہونا چاہئے" وہ تلملائے ہوئے لہجے میں بولا: "ہمارے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہمارا محسن ہے!"

"ہم احسان فراموش نہیں ہیں" ہاشم نرم لہجے میں بولا: "لیکن ہمارے لئے سیتا کی بازیابی بہت اہم ہے، تم یہ بات بخوبی جانتے ہو۔"

"جانتا ہوں!" وہ دانت پیس کر بولا: "کاش! میں نے شروع ہی میں رجب سے انکار کر دیا ہوتا۔ وہ میرے لئے زیادہ بہتر ہوتا۔"

"اب پھر کیا کرنا ہوگا؟" چند ثانیوں کی کشیدگی آمیز خاموشی کے بعد میں نے دوستانہ لہجے میں بات کی۔

"پہلا مرحلہ جوزف کے اطمینان کا ہے" ابوسلطان متفکرانہ لہجے میں بولا: "وہ بُری طرح بپھرا ہوا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس مشکل مرحلے سے تم بخوبی نمٹ لوگے۔" ہاشم نے کہا: "اس میں ہمارا سامنے آنا مناسب نہ ہوگا۔"

"اب سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا" وہ بولا: "پہلے پروگرام تھا کہ یہاں وہ دو دن کے لئے سارے عملے کو چھٹی دے دے گا اور دو روز بعد سب لوگ ایک دن میں ام درمان روانہ ہو جائیں گے میری خواہش تھی کہ میں یہیں تمہارا حساب بیباق کرا دیتا اور تم دونوں اپنے طور پر خرطوم پہنچ کر میرا انتظار کرتے!"

"سیتا کے بارے میں وہ ابھی بھیڑ کا ہوا ہے۔ [illegible] گھنٹوں بعد قدرے اعتدال پر آ جائے اس وقت تم زبان [illegible] بہتر ہوگا۔"

"تم دونوں بہت محتاط رہو گے" اس نے گمبھیر لہجے میں [illegible] "میری ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا ورنہ سب [illegible] کو سنبھالنا دشوار ہو جائے گا۔"

"تم بے فکر رہو!" ہاشم نے اسے اطمینان دلایا۔ [illegible]

وہ ہمیں وہیں کھڑا چھوڑ کر ایک طرف غائب ہو [illegible]

ہم ایک دو کمروں میں بھٹکنے کے بعد اس طرف [illegible] کامیاب ہو گئے جہاں سرکس کے تمام اراکین کو ٹھہرا [illegible]

"تم دونوں کہاں رہ گئے تھے؟" ہمیں دیکھتے ہی ایک [illegible] غراتا ہوا لپکا جو شاید عملے کی دیکھ بھال پر مامور کوئی [illegible]

"حویلی بہت بڑی ہے، راستہ بھٹک گئے تھے" [illegible] نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ شخص بھی چلا گیا اور ترکان سے [illegible] افراد ایک قطار میں بنے ہوئے الٹے پانچ کمروں میں اپنی اپنی [illegible] بنانے لگے جہاں سب کو ٹھہرایا گیا تھا۔

"میں جمیلہ سے مل بیٹھنے کی کوشش کرتا ہوں" میں نے [illegible] دھونے کے بعد موقع پا کر ہاشم سے کہا: "شاید اس سے کچھ [illegible] باتیں معلوم ہو سکیں۔"

ہاشم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میرے ارادے کی تائید [illegible] اور میں آہستگی کے ساتھ وہاں سے کھسک لیا۔

تینوں لڑکیاں ایک ہی کمرے میں مقیم تھیں اور راہداری [illegible] ان کے بولنے کی آوازیں سن کر مجھے ان کے کمرے کے تعین میں [illegible] پیش نہیں آئی۔

مجھے اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھ کر وہ تینوں ہی [illegible]

"یہ بدّو کسے ڈھونڈ رہا ہے؟" ان میں سب سے [illegible] شوخ نظر آنے والی لڑکی نے مضحکانہ لہجے میں کہا اور دوسری [illegible] کے ساتھ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

جمیلہ نہ صرف خاموش رہی بلکہ اٹھ کر میری طرف چلی آئی [illegible] اسے آتے دیکھ کر میں دروازے سے ہٹ کر راہداری [illegible] آ گیا اور وہ میرے مقابل آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس [illegible] نگاہوں میں سنجیدگی تیر رہی تھی!

"کیوں آئے ہو؟" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس بھیڑ میں صرف تم ہی کچھ مانوس نظر آتی ہو [illegible] باقی سب تو اپنی اپنی ذات میں مگن نظر آتے ہیں، [illegible] بہلانے آ گیا تھا۔"

"وقت بہلانا ہی چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ" وہ میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف چل دی اور چند موڑ گھومنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے وہ سائبان صاف نظر آ رہے تھے جہاں قافلے کے اونٹ باندھے گئے تھے۔

جمیلہ اس نیم تاریک گلیارے میں ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اور میں نے بھی اس کے پہلو میں جگہ سنبھال لی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے بیٹھتے ہی تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا: "اونٹوں پر سے سامان اتارنے کے لئے اس قدر پہرے کی کیا ضرورت ہے؟"

میری نگاہیں ان لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں جو رائفلوں کے ساتھ اس احاطے میں جا بجا مستعد کھڑے ہوئے تھے۔

"پہرے میں اسمگلنگ کا سامان اتارا جا رہا ہے!" جمیلہ کی دھیمی آواز سنائی دی "اس وقت کوئی بھی مشکوک آدمی سامنے آیا تو بے دریغ مار دیا جائے گا۔"

"اسمگلنگ کا مال؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔

"ہاں" وہ تلخ لہجے میں بولی: "جوزف امین احمق نہیں ہے جو ہر دوسرے مہینے اپنا سرکس لے کر مصر جاتا ہے حالانکہ اس دورے سے بظاہر اتنی مالی منفعت وابستہ نہیں ہے کہ اس جیسا آدمی ان دوروں پر اپنا وقت برباد کرے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"مصر میں بعض افراد نے غیر قانونی طور پر آثارِ قدیمہ کا سراغ لگایا ہے" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی: "اور انہوں نے اپنی دریافت کو حکومت سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ وہ چوری چھپے ان مقامات سے تمام قیمتی اشیاء مصر سے باہر لے جاتے ہیں اور زیرِ زمین عالمی منڈی میں شائقین کو بھاری داموں بیچتے ہیں۔ جوزف امین بھی فرعون کے دور میں ایک عظیم خفیہ مقبرے کا سامان غیر قانونی طور پر مصر سے سوڈان منتقل کرنے کے منصوبے پر کام کر رہا ہے اور اس وقت اس کے جاں نثار ان اونٹوں پر سے وہ صندوق اتار رہے ہیں جن میں نوادرات کی قیمتی کھیپ پوشیدہ ہوگی۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"میں جوزف کی لاعلمی میں بہت کچھ جانتی ہوں" اس کا لہجہ دھیما لیکن پُر اعتماد تھا: "مجھے اس سرکس میں کافی [illegible] ہو گیا ہے مگر میں نے ابھی تک یہ ذہنی غلامی من و عن قبول نہیں کی ہے۔ میں آج بھی مستقبل کے بارے میں پُرامید ہوں۔"

"کاش کہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا!"

"یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا" وہ تلخ سی ہنسی کے ساتھ بولی: "آج جوزف غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔ ہم سے پہلے مصر سے آنے والے اس کے سرکس میں شامل ایک نئی لڑکی تین ایرانی لڑکیوں سمیت بھاگ گئی ہے اور اس کے آدمی چار روز گزرنے کے باوجود ان میں سے کسی کا سراغ نہیں لگا سکے ہیں۔"

"یعنی وہ چاروں فرار ہو گئیں؟"

"ہاں — چار لڑکیاں بھاگ گئیں مگر چالیس مرد ابھی تک ان کا سراغ نہیں لگا سکے حالانکہ وادیٔ حلفہ سے صرف ایک ہی شاہراہ صحرائے نوبی کی طرف جاتی ہے۔ اس شاہراہ کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔"

"نئی لڑکی کون تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"ہوگی کوئی" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی: "ہم سب سے بہرحال بہتر تھی کہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے کچھ کر گزری۔"

"تم چاہو تو اپنے ساتھ ہی متعدد دوسری لڑکیوں کو بھی اس کے چنگل سے نجات دلا سکتی ہو" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تم اکسا رہے ہو مجھے؟"

"اکسا نہیں رہا، حقیقت بتا رہا ہوں" میں نے کہا: "آثارِ قدیمہ اور نوادرات ہر علاقے کا قومی ورثہ ہوتے ہیں اور ان کے تحفظ کے لئے بین الاقوامی قانون ہوتے ہیں!"

"قانون!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی: "جوزف جیسے لوگ قانون سے نہیں ڈسے جا سکتے، ان کے لئے صرف طاقت درکار ہوتی ہے!"

"قانون کی پشت پر طاقت بھی ہوتی ہے، تم مخبری کر کے بآسانی اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کرا سکتی ہو!"

"صبح کا اُجالا پھیلنے سے قبل سوڈانی پولیس میری خودکشی کے اسباب کی تفتیش کر رہی ہوگی" وہ بولی: "اپنے مشورے تم اپنے پاس ہی رکھو!"

"دراصل تم بزدل ہو" میں نے کہا: "آخر وہ لڑکی تین کو لے کر فرار ہو گئی نا؟"

"میں نے سب کچھ تمہیں بھی بتا دیا ہے۔ اگر تم بہادر ہو تو مجھے بھڑکانے کے بجائے خود پولیس سے رجوع کیوں نہیں کر لیتے؟"

میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔ میں اسے اپنی مجبوریوں سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔

ہم دونوں کو وہاں بیٹھے تھوڑی دیر گزری تھی کہ اچانک باہر چند گاڑیاں رکنے کی آواز آئی اور فوراً ہی باوردی پولیس والوں کی ایک بھاری جمعیت اسلحہ اٹھائے دھڑ دھڑاتی ہوئی اندر

گھس آئی۔

پہرے پر مامور جوزف کے مسلح نگہبان آہٹیں سُن کر بھڑکے اور شینی انداز میں ان کی رائفلوں کی نالیں بلند ہوئیں مگر پولیس کی وردی پر نگاہ پڑتے ہی ان سب کے شانے ڈھلک گئے۔

اونٹوں پر سے سامان اتارنے والے بھی رک کر حیرت سے وہ نظارہ دیکھنے لگے۔ چار افراد جو ایک لمبا سا چوبی صندوق اٹھا کر مویشی خانے سے عمارت کی طرف آ رہے تھے للکار کر روک لئے گئے اور پھر آناً فاناً میں پولیس والوں نے ان سب کو غیر مسلح کر کے احاطے کے وسط میں جمع کر لیا اور ان کے گرد حصار باندھ لیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جمیلہ نے تحیر آمیز سہمی ہوئی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے خود حیرت ہے۔" میں نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبولیت کے لمحات تھے اور قدرت نے میری بات سن لی۔"

"میں اسے اتفاق نہیں مان سکتی۔" وہ اشتباہ آمیز لہجے میں بولی۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا؟"

"یہ تمہاری یا تمہارے کسی ساتھی کی شرارت ہے۔" اس نے کہا "شاید پولیس کو کسی اہم ذریعے سے اطلاع دی گئی ہے ورنہ وہ لوگ جوزف امین کی طرف نگاہ اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"تھوڑی دیر بعد سب کچھ سامنے آ جائے گا۔"

اسی وقت چند افسران کا ایک گروپ عمارت کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا اور میں نے جمیلہ کے ساتھ وہ جگہ چھوڑ دی۔

"کہاں چلے؟" اس نے سوال کیا۔

"اس وقت یہاں بیٹھنا مناسب نہیں، ہر شخص کو اپنی جگہ پر موجود ہونا چاہیئے ورنہ خواہ مخواہ شبہات پیدا ہوں گے۔"

جمیلہ کو اس کے کمرے کے قریب چھوڑ کر میں آگے بڑھا تو وہاں سب ہی پُرسکون نظر آئے معلوم ہوتا تھا کہ باہر ہونے والی کارروائی سے وہ سب لاعلم تھے!

میں اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا کہ ایک بدحواس سوڈانی بری طرح بھاگتا ہوا اس راہداری میں آیا۔ ٹینٹوں کے فرش پر اس کے قدموں کی بے ہنگم دھمک سن کر کئی کمروں میں سے سرکس کے عملے کے متعدد افراد باہر نکل آئے۔

"گڑبڑ ہو گئی ہے!" وہ سوڈانی پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان بمشکل کہہ سکا "پولیس نے چھاپہ مارا ہے!"

"پولیس نے؟" بیک وقت کئی تحیر آمیز آوازیں سنائی دیں "مگر کس لئے۔ ایک سرکس سے پولیس والوں کو کیا مخاصمت ہو سکتی ہے؟"

"کمروں میں جاؤ!" اچانک ایک طرف سے جوزف امین کی گمبھیر آواز سنائی دی "اگلی ہدایات تک کوئی اپنی جگہ نہیں چھوڑے گا!"

اس کی آواز میں ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ راہداری فوراً ہی خالی ہو گئی!

میں بھی ہاشم کے پاس جا بیٹھا!

پولیس کی اس غیر متوقع کارروائی سے ماحول پر عجیب سا ہراس اور کھلبلی طاری ہو گیا تھا اور لوگ سر جوڑے دبی دبی سرگوشیوں میں قیاس آرائیوں میں مصروف تھے!

"تمہیں کچھ خبر ہے اس بارے میں؟" ہاشم نے بہت دھیمی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔

"پولیس اچانک آئی ہے۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن میں نے جو کچھ سنا ہے اس کی رو سے سوڈانی پولیس جوزف سے کتراتی ہے، اس بار نہ جانے انہوں نے یہاں کس کے ایما پر دھاوا بولا ہے؟"

وہاں ہر شخص ایک دوسرے کی گفتگو پر کان لگائے بیٹھا تھا لہٰذا احتیاط کے پیش نظر ہمیں خاموش ہو جانا پڑا۔

اس روح فرسا سنسنی کے لمحات طویل ہوتے ہوئے ناقابلِ برداشت ہونے لگے تھے اور باہر سے کوئی خبر نہیں آئی تھی!

اور جب باہر راہداری میں کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی تو تمام نگاہیں امید اور خوف کے عالم میں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔

چند منٹ بعد آنے والے ہمارے ہی کمرے میں گھس آئے۔ وہ تعداد میں چھ تھے!

سب سے آگے وہ شخص تھا جو اس قیام گاہ میں سرکس کے عملے کی دیکھ بھال میں مصروف تھا اس کے ساتھ جوزف امین اپنے قہر بار چہرے سمیت موجود تھا۔ اس کے پیچھے ابو سلطان تین پولیس افسروں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔

"اِدھر آؤ تم دونوں!" جوزف نے سخت لہجے میں انگلی سے میری اور ہاشم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس وقت میری جیب میں ایک بھرا ہوا پستول موجود تھا اور غالباً ہاشم نے بھی اپنا ریوالور نہیں چھپایا تھا لیکن ہم ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکے تھے کہ اسلحہ استعمال کرنے کے باوجود وہاں سے نکلنا ناممکنات میں سے تھا۔

"یہ ہیں وہ دونوں خبیث!" ہمیں آگے بڑھتے دیکھ کر جوزف نے پولیس افسروں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ کہاں سے تمہارے ساتھ شامل ہوئے تھے؟" ایک پولیس افسر نے کڑی نظروں سے باری باری ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"قاہرہ سے۔" جوزف امین نے نہایت اعتماد سے سفید جھوٹ بولا "مجھے یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہمیں چکر میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

میں نے کوئی اشارہ ملنے کی امید میں ابو سلطان کی طرف دیکھا مگر وہ دانستہ مجھ سے اور ہاشم سے نگاہیں چار کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

وہ لوگ ہم دونوں کو لے کر ایک وسیع کمرے میں جا پہنچے جہاں دبیز فرشی قالین پر شراب سے لبریز صراحیاں اور جام رکھے تھے اور ایک خوبرو لڑکی پہلے سے وہاں موجود دو پولیس افسروں کی ساقی گری کر رہی تھی۔

سب نے گاؤ تکیوں کے سہارے قالین پر جگہ سنبھال لی۔ میں بھی ایک طرف جا بیٹھا اور ہاشم نے میری تقلید کر ڈالی۔

"قاہرہ میں کس مقبرے سے سامان چرایا جا رہا ہے؟" ایک پولیس افسر نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

اس وقت میری نگاہ اس کھلے ہوئے لمبے چوبی صندوق پر پڑی جو شاید باہر سے لایا گیا تھا۔ اس کے قریب فرش پر نقرئی اور طلائی مجسموں کے علاوہ منقش ظروف بھی موجود تھے جن کی ساخت ان کی قدیم تاریخ کی کہانی سنا رہی تھی۔

"شاید اس بارے میں ہم کچھ نہ بتا سکیں۔" میں نے نرم بلکہ کسی حد تک معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا اور میرا غیر متوقع جواب سن کر جوزف کے ساتھ ہی ابو سلطان بھی حیران رہ گیا۔

"تو تمہیں اعتراف ہے کہ قدیم نوادرات سے بھرے ہوئے یہ تینوں چوبی صندوق تمہارے قبضے میں تھے؟" پولیس افسر معاملہ اتنی آسانی سے نمٹتے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"ہمیں قطعی علم نہیں تھا کہ ان صندوقوں میں کیا ہے۔" میں نے کہا "ہمیں بے خبری میں آلۂ کار بنایا گیا ہے اور یہاں جس اہتمام کے ساتھ اونٹوں سے سامان اتارا جا رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید سرکس کے کسی فرد کے ذمہ داروں کو ان صندوقوں کی مالیت کا اندازہ ہے۔"

"باہر سے آنے والے قافلوں سے ہمیشہ اسی طرح پہرے میں سامان اتارا جاتا ہے۔" اس بار جوزف کا لہجہ بے حد نرم تھا "عام خیال یہ ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے قافلوں میں قیمتی مال و متاع ہوتی ہے لہٰذا چور ڈاکو عموماً تھکے ہوئے قافلوں کو لوٹنے کے چکر میں رہتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان نوادرات کو مصر سے باہر اسمگل کر کے تم نے بہت سنگین جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔" دوسرے پولیس افسر نے کہا۔

"ہمیں نوادرات کا علم نہیں تھا۔" ہاشم کو بھی بولنے کی راہ مل گئی "ہمیں یہ صندوق سوڈان پہنچانے کا پیشگی معاوضہ مل گیا تھا اگر کسی طرح ہماری خلاصی ہو سکے تو ہم احسان مند رہیں گے۔ ہم تو سیدھے سادے جفاکش لوگ ہیں۔"

"مال برآمد ہونے کے بعد ملزموں کی گرفتاری ضروری تو نہیں۔" ابو سلطان پہلی بار ہماری حمایت میں پولیس افسران سے مخاطب ہوا۔

"چھاپہ اس عمارت پر مارا گیا ہے اور اعلیٰ حکام کو اطلاع دی گئی تھی، ان کے حکم پر ہم نے اِدھر کا رُخ کیا تھا۔ اب اگر ملزم نہیں پکڑے جاتے تو ہماری کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی کی جاتی۔ ان کے اعتراف سے معاملہ سلجھ گیا ہے، اب بعد کے معاملات تم ہماری صوابدید پر چھوڑ دو۔" ایک پولیس افسر نے کہا۔

"میں ان سے بات کر لوں؟" ابو سلطان نے جوزف امین سے اجازت طلب کی۔

"ہاں ہاں۔ ایک طرف لے جاؤ۔" جوزف نے ایسی فراخ دلی سے کہا جیسے وہاں موجود تمام لوگ اس کے تنخواہ دار ہوں۔

"میرے لیے تم لوگوں کا رویہ حیرتناک رہا ہے۔" ابو سلطان مجھے اور ہاشم کو ایک کونے میں لے جا کر بولا "تم نے ناکردہ گناہ اپنے سر لے کر جوزف کے علاوہ پولیس افسران کی بھی ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں اور دو چار روز میں ہی تمہیں رہائی کا موقع فراہم کر دیا جائے گا۔"

"تو کیا پولیس افسران کو علم تھا کہ ہم بے گناہ ہیں؟" ہاشم نے حیرت سے سوال کیا۔

"جو کچھ ہوا پولیس کے مشورے سے ہوا ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا "اگر تم انکار کرتے تو تشدد کے ذریعے تم سے اقبالِ جرم کرایا جاتا۔ تم دونوں سرکس کے عملے میں نئے تھے اس لیے جوزف نے تمہارا نام تجویز کیا۔"

"اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ ہمیں لانے والے تم تھے؟"

"لڑکی کے معاملے میں وہ مجھ سے بدظن ہے۔" وہ بولا "میں نے تو یہ بھی چاہا تھا کہ پولیس کے سامنے لائے جانے سے پہلے تمہیں سمجھا دوں لیکن وہ راضی نہیں ہوا۔"

"اس کی مخبری کون کر سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ان ماتحت افسروں کو کچھ معلوم نہیں لیکن جوزف کو سیتا کے ہمراہ فرار ہونے والی ایک لڑکی پر شبہ ہے، وہ جوزف کے ان غیر قانونی کاموں سے خاصی واقف تھی۔"

"واقف تو جمیلہ بھی......"

"اب ان باتوں کو چھوڑو۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا "فی الحال تم حراست میں لے لیے جاؤ گے، موقع پا کر تمہیں حوالات سے فرار کرا دیا جائے گا۔ اس کے بعد اپنی حفاظت کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔"

"تم سے کہاں رابطہ قائم ہو سکے گا؟"

"سوڈان میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ میری تلاش میں اپنا وقت برباد نہ کرنا۔" اس نے صاف لہجے میں کہا "یہاں میری اور پولیس کی آنکھ مچولی

ہوتی رہتی ہے۔"

"سیتا کا کیا بنے گا؟" میں نے مدھم لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ اب مصر کی سرحد سے باہر ہے۔ اس کو صرف جوزف کی طرف سے خطرہ ہے جو اس نے خود مول لیا ہے۔ میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔"

"کہانیاں ختم کرو خلیل!" جوزف امین کی اونچی آواز سنائی دی اور ہم تینوں واپس اسی طرف ہو لیے جہاں لوگ بیٹھے تھے۔

اونٹوں پر سے نوادرات کے تین بھرے ہوئے صندوق برآمد ہوئے تھے جو کسی خفیہ معاہدے کے تحت تقسیم ہو گئے۔

پولیس افسران نے صرف ایک صندوق سیل کر کے اپنی تحویل میں لیا اور جن کاغذات پر ہم دونوں سے دستخط لیے گئے ان میں بھی ایک ہی صندوق کا تذکرہ تھا۔ باقی دو چوبی صندوقوں کو جوزف کے حوالے کر کے بھلا دیا گیا۔

میرے لیے یہ چشم دید تجربہ جہاں افسوسناک تھا وہاں اس اعتبار سے خوش آئند بھی تھا کہ سوڈان میں آزاد رہنے کا نسخہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اگر جیبیں بھاری ہوں تو وہاں ہر شکنجے سے بآسانی نکلا جا سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اور ہاشم کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں اور وہ لشکر ہم ناکردہ گناہ اسیروں کو لے کر واپس روانہ ہو گیا۔

اس شہر کے پولیس اسٹیشن کی عمارت خاصی صاف ستھری تھی احاطے میں بھی جا بجا پھول اور پودے لگے ہوئے تھے۔ اس قافلے کے پہنچتے ہی عمارت میں خاصی چہل پہل نظر آئی اور ہم دونوں کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

وہاں موجود شخص شاید کوتوالِ شہر تھا۔ اپنے سامنے دو اجنبی قیدیوں کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"جوزف امین کہاں ہے؟" اس نے کرخت لہجے میں ہم دونوں کے ساتھ اندر داخل ہونے والے دو افسروں سے سوال کیا۔

"نوادرات کی اسمگلنگ سے وہ لاتعلق ہے۔" ایک افسر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سرکس کے عملے میں شامل یہ دونوں افراد اس جرم کے ذمے دار ہیں۔"

"مگر خبر اس کے بارے میں ملی تھی۔" کوتوال شہر غرایا۔

"ہم اسے بھی ضرور گھیرتے مگر ان دونوں نے اقبال جرم کر لیا اور مال بھی برآمد ہو گیا۔ قانونی تقاضوں کے پورا ہونے کے بعد ہم مجبور ہو گئے۔"

"نوادرات کہاں ہیں؟"

"فہرست کے ساتھ مال خانے میں بھجوا دیے گئے۔"

"تم دونوں باہر جاؤ۔" کوتوال نے چند ثانیوں تک مجھے اور ہاشم کو خونخوار نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد اپنے ماتحت افسروں کو حکم دیا۔

"سچ سچ بتاؤ کہ تم دونوں کون ہو؟" ان کے چلے جانے کے بعد کوتوال نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"ہم جوزف کے سرکس میں قاہرہ سے شامل ہوئے تھے۔"

"اور نوادرات وہیں سے تمہارے ساتھ تھے؟"

"جی ہاں۔" ہاشم نے مسکین لہجے میں کہا۔

"بکواس۔" اس نے غصے میں اپنی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ فرش پر پھینک کر ایڑی سے مسل دی۔ "میرا خیال ہے کہ جوزف نے تمہیں بھاری معاوضہ دے کر اقبال جرم پر آمادہ کیا ہے۔ اگر میرا یہ شبہ درست ثابت ہوا تو میں تم دونوں کی کھالیں کھچوا دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے اردلی کو آواز دی جو ہماری ہتھکڑیاں تھام کر ہمیں باہر لے گیا۔

باہر دونوں ماتحت افسر پژمردہ چہروں کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے کاغذی خانہ پری کے بعد ہم دونوں کو حوالات میں بھجوا دیا۔

تین طرف سے سلاخوں سے گھری ہوئی حوالات کی کوٹھڑی اس وقت غیر آباد تھی۔ ہمیں اندر ڈال کر دروازہ مقفل کر دیا گیا اور پھر ہمیں لانے والے واپس چلے گئے۔

اس عقبی حصے میں اتنا مکمل سناٹا تھا کہ ہم دونوں کئی منٹ تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کے سانسوں کی آوازیں سنتے رہے!

"ہم بہت برے پھنسے ہیں!" آخر ہاشم نے ہی سرگوشیانہ آواز میں سکوت توڑا۔

"کوتوال کا رویہ بہت خطرناک ہے۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو شاید زندگی بھر سوڈان کی کسی جیل میں سڑتے رہ جائیں گے!"

"دو چار روز تک تو انتظار کرنا ہی ہو گا۔"

میں دھیمے سے ہنس دیا۔ "کوئی اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال کر ہمیں فرار کا موقع نہیں دے گا۔ کوتوال کے تیور دیکھنے کے بعد میں نے وہ امید ترک کر دی ہے!"

"پھر کیا کیا جائے۔؟"

میں نے آہستگی سے سگریٹ جلائی پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"حوالات میں ڈالنے سے پہلے ہماری جامہ تلاشی نہیں لی گئی ہے۔ ہمیں اسی وقت کوشش کا آغاز کر دینا چاہیے!"

حوالات میں پھیلی ہوئی یرقان زدہ روشنی میں ہاشم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "واقعی۔ ہتھیار تو ہمارے پاس موجود ہیں۔ اللہ نے تمہارے پاس تو زہریلے تیروں والی۔۔۔!"

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا کیونکہ باہر راہداری میں کسی کے وزنی جوتوں کی چاپ قریب آتی سنائی دے رہی تھی!

"مجھ سے دور ہٹ جاؤ۔" میں نے دھیمے لہجے میں سرگوشی کی اور وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر اس کوٹھری کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ میں نے وہیں اکڑوں بیٹھ کر اپنا سر دونوں گھٹنوں کے درمیان اس طرح دبالیا جیسے میرے سر میں شدید درد رہا ہو۔

آہٹیں بتدریج قریب آتی رہیں پھر یوں محسوس ہوا جیسے آنیوالا حوالات کے دروازے پر رک گیا ہو مگر میں نے اپنی ظاہری حالت میں کوئی تبدیلی نہ آنے دی ہیں... آنیوالے کو دنیا و ما فیہا سے اپنی بے خبری کا تاثر دینا چاہتا تھا۔

"سنو!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میرے کانوں میں ایک سرگوشی سی آواز گونجی۔

آنے والے کے رازدارانہ رویے کے پیش نظر میرے لیے تجاہلِ عارفانہ کو طول دینا مناسب نہیں تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا اور لمحے بھر کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ شاید حوالات کی وہ قید میری توقع سے زیادہ مختصر ثابت ہونے والی تھی اور جوزف سے رشوت وصول کرنے والے کسی افسر نے حالات کے مزید خراب ہونے سے پیشتر ہم دونوں کو فرار کا موقع دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اور جب میں نے سر اٹھایا تو ویران راہداری میں حوالات کے سلاخوں دار دروازے کے عقب میں مجھے ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ وہ ان تین راشی پولیس افسروں میں سے ایک تھا جنہوں نے سوڈانی سرکس کے مالک جوزف امین سے ساز باز کر کے مجھے اور ہاشم کو قربانی کا بکرا بنایا تھا۔

اسے پہچانتے ہی میرے دل میں امید کا دیا جل اٹھا شاید وہ ہم دونوں کی مدد کی نیت سے ہی اس وقت وہاں آیا تھا۔ میں لپک کر سلاخوں کے قریب جا پہنچا۔

"اور قریب آجاؤ۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا اور میں نے دو مضبوط سلاخیں تھام کر اپنا چہرہ پُرتجسس انداز میں ان سے ٹکا دیا۔

"کوتوال نے تمہیں تنہائی میں کیوں روکا تھا؟" اس کے اشتباہ آمیز لہجے نے میری خوش فہمی فوری طور پر رفع کر دی۔

اسے ہم سے یا ہماری آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اعلیٰ افسر ہماری گرفتاریوں پر کس انداز میں سوچ رہا تھا۔

"اسے جوزف امین کی بے گناہی پر شبہ ہے!" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"وہ گدھے کی اولاد کچھ نہ پا سکے گا۔" اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ "تم نے کیا جواب دیا؟"

"تمہارے خیال میں کیا کہنا چاہیے تھا؟" جواب دینے کے بجائے میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس سے صاف دلی سے گفتگو کر کے میں کسی بدترین خسارے سے دوچار ہو سکتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو۔" وہ تند لہجے میں غرایا۔ "میں یہاں تم سے ہنسی مذاق کرنے نہیں آیا ہوں۔"

"اوہ معاف کرنا۔" میں نے سنبھل کر سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے کچھ غلط فہمی ہوئی تھی۔ ہاں! تو تم مجھ سے کیا پوچھنے آئے تھے؟"

وہ اس قدر بودم بھی نہ تھا کہ میرے طنز کو نہ سمجھتا، اس نے غصے میں اس قدر شدت سے اپنے دانت بھینچے کہ اس کے جبڑوں کی وریدیں تک جلد پر ابھر آئیں۔

"سنو اُلو کے پٹھے۔" وہ دھیمے لیکن غصیلے لہجے میں غرایا۔ "اپنی اوقات نہ بھولو میرے منہ لگنے والوں کا انجام عبرتناک ہوتا ہے۔"

"ضرور ہوتا ہوگا۔" میں نے پُرخلوص لہجے میں اس کی تائید کی۔ "لیکن کوتوال نے تمہاری عدم موجودگی میں ہم دونوں سے گفتگو کرنے کو ترجیح دی تھی۔ ہم اس کی اجازت کے بغیر تمہیں اس سے ہونیوالی بات چیت کا ایک لفظ بھی نہ بتا سکیں گے۔"

"میں تمہیں گولی مار دوں گا۔" وہ غصے میں آپے سے باہر ہونے لگا تھا۔

"بشرطیکہ تم قتلِ عمد کے جرم میں اپنی گردن کٹوانے کے لیے تیار ہو۔" میرا لہجہ بدستور نرم اور مدافعانہ رہا۔ "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ ایک عدد ریوالور میرے قبضے میں بھی موجود ہے!"

اس نے نہایت تلخ اور تضحیک آمیز انداز میں قہقہہ لگایا۔ "حوالات میں بھیجتے وقت تمہاری جامہ تلاشی سے دانستہ گریز کیا گیا تھا اور یہ سقم روزنامچے میں بھی موجود ہے۔ تم نے زیادہ اُڑنے کی کوشش کی تو تمہارے پستول کی گولی ہی تمہاری کھوپڑی میں پائی جائے گی اور تمہاری موت کو مایوسی کے عالم میں سرزد ہونے والی خودکشی قرار دے دیا جائے گا۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ میں مسلح ہوں؟" اس مرتبہ میری حیرت مصنوعی نہیں بلکہ قطعی غیر ارادی تھی۔

"تمہاری ایک جھولتی ہوئی وزنی جیب دیکھ کر کوئی بھی تجربہ کار شخص اندازہ لگا سکتا تھا کہ تم دونوں کے پاس آتشیں اسلحہ موجود ہے" اس کے لیے میری حیرت خاصی تسکین کا سبب ثابت ہوئی۔

"تم نے حوالاتیوں کی جامہ تلاشی نہ لے کر شدید غفلت کا ارتکاب کیا ہے۔ تمہیں پھنسانے کے لیے یہی ایک بے اعتدالی کافی ہوگی۔"

"فرائض سے تھوڑی سی غفلت قتل کے مقابلے میں بے وقعت سمجھی جاتی ہے تمہاری لاش ملنے پر فائل بنے گی۔ کچھ روز تک محکمانہ تحقیقات ہوتی رہے گی اور پھر معمولی سی سرزنش کے بعد مجھے دوبارہ بحال کر دیا جائے گا۔" اس نے مجھ پر اپنی مضبوط پوزیشن واضح کرنے کے لیے دورانِ گفتگو... اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔

"اور اگر اس سے قبل ہی میں تمہارا پتہ صاف...!"

"خبردار!" وہ اپنا ریوالور والا ہاتھ سیدھا کر کے غرایا۔ "اپنے ہاتھ سلاخوں پر رکھو۔ ہاتھ گرانے کی کوشش کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

"اپنے ریوالور سے؟" میں نے مسکرا کر سوال کیا حالانکہ اس مردود کے خوفناک عزائم سے واقف ہونے کے بعد میں تشویش کا شکار ہو گیا تھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "چند سیکنڈ کے وقفے سے چلائی جانے والی دو گولیوں کے بارے میں بڑے سے بڑا سرجن بھی نہیں بتا سکتا کہ موت کا سبب کون سی گولی تھی جب کہ ایک دل میں لگی اور دوسری دماغ میں۔"

"اپنی ایسی لاش مجھے ہرگز پسند نہ آسکے گی۔ یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے سلاخوں کے پیچھے مایوسانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"اپنے پہلے سوال کا جواب!" اس کا لہجہ مزید سنگین ہو گیا۔

"اگر تم اس حد تک جانے کے لیے تیار ہو تو میں تمہیں مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ اس معاملے سے دُور ہی رہو۔" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد گمبھیر لہجے میں کہا۔ "یہ چوہے دان جوزف امین کے لیے تیار کیا گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ تم اس کا شکار ہو جاؤ۔"

پہلی بار اس کے چہرے پر تردد کے آثار نظر آئے اور وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "آخر تم مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"ہم لوگ جوزف امین کے چکر میں ہیں۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "مگر تم سرکاری طور پر اس حقیقت سے لاعلم ہو لہٰذا وہی کرتے رہو جو یہ اطلاع ملنے سے قبل کرتے۔"

"ہم لوگ؟" وہ میری گفتگو کے ابہام سے اور زیادہ الجھ گیا۔ "تو تم دونوں کے ساتھ کوئی اور بھی کام کر رہا ہے؟"

"شاید مجھے کوئی اور واضح بات کرنی ہوگی۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہم دونوں کا تعلق مصر کی پولیس سے ہے اور آثارِ قدیمہ کی اسمگلنگ کے سلسلے میں جوزف امین بہت دنوں سے قاہرہ کے پولیس کمشنر کی نگاہوں میں تھا لیکن وہ جوزف کی گرفتاری کے ساتھ ہی اس کا طریقۂ کار اور سوڈان میں اس کے روابط کا سراغ لگانا چاہتا ہے



محض اسی مقصد کے تحت ہم دونوں نے جوزف کے سرکس میں شمولیت اختیار کی تھی۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" اس کے لب و لہجے سے حیرت اور لہجے سے قدرے خوف مترشح تھا۔

"تمھارا ماتھا اسی وقت ٹھنکنا چاہیے تھا جب ہم دونوں نے بے چون و چرا جوزف کے ٹھکانے پر ایک ناکردہ جرم کا اعتراف کیا تھا۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "ہم لوگ بھی تجربہ کار ہیں اور وہاں کا ماحول دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے کہ مقامی پولیس جوزف سے دبتی ہے اور اگر ہم نے کٹھ پتلی بننے سے انکار کیا تو ہم پر تشدد کا آغاز ہو جائے گا۔ بلا حیل و حجت اعتراف کر کے ہم معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔"

"مجھے حیرت ہوئی تھی۔" اس کا لہجہ غیر ارادی طور پر مصالحانہ ہو گیا۔ "مگر میں نے اسے تم دونوں کی دُور اندیشی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔۔۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ کوتوال نے تمھیں تنہائی میں کیوں روکا تھا؟"

"ہر چھوٹے قصبے کے پولیس افسر دن رات کسی بڑے مجرم کی گرفتاری کے نتیجے میں شہرت اور ترقی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ تمھارا کوتوال بھی ان ہی بے صبروں میں سے ہے۔" میں نے پورے اعتماد سے ایک فی البدیہہ کہانی کا آغاز کر دیا۔ "شاید اسے بھی کہیں سے جوزف کے خلاف تیاریوں کی بھنک مل گئی تھی کیونکہ اس منصوبے پر قاہرہ اور خرطوم کے حکام میں قریبی رابطہ تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ خرطوم پہنچنے سے قبل راستے میں ہی جوزف کو مسروقہ نوادرات سمیت گرفتار کرے گا۔ وہ اس بات پر برہم تھا کہ ہم دونوں نے جھوٹا اعترافِ جرم کر کے اسے جوزف کی گرفتاری کے اعزاز سے محروم کر دیا تھا۔"

"تو کیا وہ تمھاری اصلیت سے واقف تھا؟" وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری باتیں سن رہا تھا جو اس کی ننھی سی کھوپڑی کے لیے بہت پُراسرار تھیں۔

"تنہا ہوتے ہی اس نے مصری پولیس سے ہمارا تعلق دریافت کیا تھا جس کا مطلب ہے کہ اسے پورے معاملے کی سُن گُن تھی۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "ہمارے اقرار پر وہ جھلائے ہوئے انداز میں برس پڑا لیکن اس نے تو ہمیں زندگی بھر جیل میں سڑانے کی دھمکی بھی دینے سے گریز نہیں کیا۔"

"تمھارے پاس شناختی کاغذات تو ہوں گے؟"

"چھوٹی آبادی اور بڑے شہروں کی پولیس میں یہی فرق ہوتا ہے برلور۔" میں اس پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ "جوزف خطرناک آدمی ہے ہم اپنی جان ہتھیلیوں پر لیکر نکلے تھے۔ اگر صحرا میں جوزف کو ہم پر شبہ ہو جاتا اور تلاشی پر ہمارے پاس سے شناخت نامے برآمد ہوتے تو وہ وہیں ہماری کھالوں میں تپتی ہوئی ریت بھروا دیتا۔"

"پھر تو یہاں کا کوتوال تمھیں واقعی جیل میں سڑا دے گا۔" وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "وہ اپنی دھن کا بہت پکا ہے تم اقبالی مجرم ہو اور تم عدالت میں اپنی سرکاری حیثیت بھی ثابت نہ کر سکو گے۔ تم واقعی بڑی مشکل میں پھنس گئے۔"

"خیال ہے تمھارا۔" میں آہستگی سے ہنسا۔ "اطلاع ملتے ہی قاہرہ کے پولیس حکام ہمارے لیے حرکت میں آ جائیں گے۔"

"یہاں ماتحت عدالتوں میں انصاف اس قدر بے لاگ نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "کوتوال قاہرہ سے تمھارا رابطہ ہی قائم نہیں ہونے دے گا۔"

"کب تک؟" میں نے کہا۔ "چند روز یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتے اور اس دوران میں اگر قاہرہ کے پولیس حکام کو ہمارے بارے میں کوئی خبر نہ ملی تو وہ اپنے طور پر ہمارا سراغ نکال لیں گے مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

"بہت پُراعتماد ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری ہر بات پر پوری طرح یقین کرتا جا رہا ہو۔

"اپنے وعدے کے مطابق تم ہمیں حوالات سے فرار کرانے کے پابند ہو۔" میں نے معنی خیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"کون سا وعدہ؟" وہ بوکھلا گیا۔ "میں نے تم سے تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی میں اس سنگین معاملے میں اپنی نوکری اور آزادی داؤ پر لگانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"ہم سے براہِ راست تو بے شک کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا لیکن جوزف امین کو تم نے یہی پٹی پڑھائی تھی اور جو کچھ ہوا تھا تمھارے ایما پر ہوا تھا۔"

"اسے بھول جاؤ۔" وہ تیز سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "تم ایک دوست ملک کے سرکاری اہلکار ہو جب تمھیں براہِ راست آزادی مل سکتی ہے تو میری گردن کیوں پھنسوانا چاہتے ہو؟"

"اس کے بغیر ہمارا مشن ناکام رہ جائے گا۔"

"یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"ہم فطری طور پر ان تمام حالات سے گزرنا چاہتے ہیں جو تم پر اپنی حیثیت کا اظہار کیے بغیر ہمیں پیش آتے۔ ہمیں تم سے یا دیگر درمیانی افراد سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم صرف جوزف امین کی جڑوں تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی پشت پناہی کرنے والے با اثر افراد باضابطہ طور پر بے نقاب کیے جا سکیں۔"

"نہیں، میں قربانی کا بکرا بننے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ بے ضمیر شخص ایک بزدل اور ڈرپوک معلوم ہونے لگا تھا۔

"تمھاری رپورٹ میں حلفہ کی حوالات سے فرار کے سلسلے میں میرا نام آئے بغیر تمھاری رپورٹ نامکمل ہو گی۔"

"یہاں سے فرار کا سہرا میں اپنے سر باندھ لوں گا۔" میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جال میں آتے ہوئے شکار کے سامنے آخری چارہ ڈالا۔ "اور تمھارا نام تو مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔"

"نہیں۔ اس معاملے میں میں پس کر رہ جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "تم مجھے اس کام پر کسی طرح مجبور نہیں کر سکتے۔"

"یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟" اچانک مجھے اپنے عقب سے ہاشم کی دھیمی آواز سنائی دی۔ وہ نہ جانے کب سے کھڑا پیچھے سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

"بالکل آخری سمجھو۔" وہ اس قدر شدید ذہنی کرب کا شکار تھا کہ گفتگو میں کسی تیسرے فریق کی شمولیت تک کو محسوس نہ کر سکا۔ میرے لیے ہاشم کے لب و لہجے سے اس کے عزائم کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ مقفل حوالات کے باہر وہ راشی افسر زخمی ہو کر گرے لہٰذا میں نے اس کا جواب پورا ہونے سے پہلے ہی کہنی سے ٹہوکا دے کر ہاشم کو روک دیا جو میرے قیاس کے مطابق اپنا بھرا ہوا ریوالور نکال چکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں گہرا سانس لے کر بولا۔ "اگر تم خود ہی اپنی شامت بلانے کا ارادہ کر چکے ہو تو ہم تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"میرے خلاف تم کچھ بھی نہ کر سکو گے۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولا جس سے بے اعتمادی نمایاں تھی۔

"ہمیں حلفہ کے کوتوال کو اعتماد میں لے کر جوزف کے ٹھکانے پر پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنا ہو گا۔ وہاں ہونے والے لین دین سے واقف ہونے کے بعد وہ تمھیں حکم دے گا اور تم اپنے ہاتھوں سے حوالات کا دروازہ کھول کر ہمیں فرار کراؤ گے۔"

"ایسی صورت میں تمھارے فرار کی ذمے داری کوتوال پر ہو گی۔"

"صرف زبانی۔" میں فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ "قانون شکنی کے احکام زبانی دیے جاتے ہیں، تم کوتوال کو ملوث نہیں کر سکو گے۔"

"او خدا۔" وہ داہنا ہاتھ پیشانی پر مار کر بڑبڑایا۔ "میں کس چکر میں پھنس گیا۔ اگر مجھے ان خطرات کا شائبہ بھی ہوتا، تو جوزف کا رخ نہ کرتا۔"

"یہی نہیں بلکہ ہمارے فرار کے بعد کوتوال تمھیں فرائض سے غفلت اور جوزف سے رشوت کے جرائم میں گرفتار کر لے گا اور پھر تمھارا مستقبل ہمیشہ کے لیے تاریک ہو جائے گا کیونکہ کوتوال جوزف کی گرفتاری میں ناکامی کا ذمے دار تمھیں قرار دے گا۔"

وہ چند ثانیوں تک خاموش کھڑا خوفزدہ نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ "تم بہت خبیث پولیس افسر ہو، میں تم سے فوراً وعدہ نہیں کر سکتا۔ مجھے سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔"

"ایک گھنٹے بعد ہم تمھارا انتظار کریں گے۔"

"یہ مہلت کم ہے۔" وہ اپنا سروس ریوالور ہولسٹر میں اُڑستے ہوئے بولا۔ "جوزف سے ہونے والے معاملے میں دو افراد اور بھی شامل تھے، ان سے مشورے کے بعد ہی میں تمھیں کوئی جواب دے سکوں گا۔"

"دو گھنٹے سہی۔"

"نہیں کل رات سے پہلے مشکل ہے۔" وہ بولا۔ "صبح میری ڈیوٹی ختم ہو گی تو میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں گا۔"

"چاہو تو تم انھیں فون بھی کر سکتے ہو۔" میں نے لاتعلقانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے، ہمیں آج رات آزادی چاہیے ورنہ صبح ہم کوتوال سے ملاقات کریں گے۔"

"آج رات؟ یعنی میری ہی ڈیوٹی میں؟" خوف اور حیرت سے اس کی دونوں آنکھیں اس کی پیشانی پر جا چڑھیں۔

"یہ تمھارے مقدر کی خرابی ہے تم خود ہی ہمارے پاس آئے تھے۔" میں نے سرد لہجے اور قدرے بے رحمانہ انداز میں کہا۔

"کل رات تک انتظار کر لو۔" وہ خوشامدانہ انداز میں گڑگڑایا۔

"ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "جوزف لحظہ بہ لحظہ ہماری دسترس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں اس کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرنی ہے۔ کل رات تک شاید سارا قصہ ہی تمام ہو جائے۔"

"مجھے کوئی بہت بڑا قدم اٹھانا ہو گا۔" وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "بہرحال میں دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آتا ہوں۔"

"واپس نہ لوٹے تو ہم صبح کوتوال سے ملنے میں تاخیر نہیں کریں گے۔" میں نے اس پر ذہنی دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا اور وہ پژمردہ انداز میں واپس چل دیا۔

اس کے جاتے ہی میری اور ہاشم کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس کا چہرہ کسی بے پناہ اندرونی جذبے کے تحت دمک رہا تھا۔

"تم اوّل درجے کے جھوٹے اور بہترین اداکار ہو۔" پولیس افسر کی آہٹیں دور ہو جانے پر وہ میرا بازو دبا کر مسرت سے سرشار لہجے میں بولا۔ "تم دونوں کی گفتگو کے دوران میں خود کو قاہرہ پولیس کا ذمے دار افسر سمجھ رہا تھا۔"

"شاید ہمیں آزادی مل جائے مگر یہاں کا حال دیکھ کر مجھے دکھ ہوا ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "جہاں لوگوں کی جان و مال کے محافظ اس قدر اخلاق باختہ ہوں وہاں شرافت ایک گالی بن جاتی ہے جسے کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"کسی ایک شخص کی وجہ سے تم اتنا بڑا اگلیہ اخذ نہیں کر سکتے۔"
ہاشم نے کہا۔ "برے اور بھلے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ سوڈان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔"

"بددیانت آدمی کو بیداری میں بھی سائے آسیب بنکر ڈراتے ہیں۔ یہ اس کے دل کا چور تھا جو اسے گھیر کر ہمارے قدموں میں لے آیا۔ اس میں اتنی جرأت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ کوتوال سے میرے بیان کی تائید کا ارادہ ظاہر کرتا۔"

"اس کو بے قدر ملامت نہ کرو۔" ہاشم دھیمے سے ہنس کر بولا۔

"تم اس سے اس قدر تسلسل کے ساتھ بھرپور جھوٹ بولتے رہے ہو کہ وہ بے بس ہو گیا اور ناامیدی میں ہماری نجات کی ایک راہ نکل آئی۔ ورنہ میں نے تو مایوس ہو کر اسے گولی مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوسرا فائر میں حوالات کے تالے پر نال رکھ کر کرتا پھر کھلی فضا میں جو ہوتا، سو دیکھا جاتا۔ تم نے بروقت مجھے کنی ماری تھی ورنہ میں اسے زد میں لے چکا تھا۔"

"تمھارا اقدام خودکشی سے کم نہ ہوتا۔"

"مجھے اعتراف ہے۔" وہ بولا۔ "مگر اس وقت کوئی دوسری راہ بھی نہیں سجھائی دے رہی تھی۔"

"یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنے اصول کے برعکس اس پولیس افسر کو گولی مارنے کا ارادہ کیسے کر لیا تھا؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"میرا فیصلہ اصول کے مطابق تھا۔" وہ میرا طنز سمجھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ اسمگلنگ کی سرپرستی کر رہا تھا جس کی سزا موت سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہو سکتی۔"

"میرے ذہن میں ایک خلش باقی ہے۔" اپنے سوال کا معقول جواب مل جانے پر میں نے نئی بات چھیڑ دی۔

"کس کے بارے میں؟" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"جوزف کے بارے میں مخبری کس نے کی؟" میں نے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے وادیٔ حلفہ کے قرب و جوار میں ہی ہے ورنہ خرطوم یا ام درمان میں اطلاع دی جاتی تو تجربہ کار افسروں کی معیت میں بھاری نفری دھاوا بولتی۔"

"تم صحیح سمت میں سوچ رہے ہو۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "سوڈان ایک پسماندہ ملک ہے۔ یہاں دوسرے شہروں سے حلفہ فون کرنا خاصا صبر آزما کام ہے۔"

"جوزف کے خلاف مخبری کون کر سکتا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"سیتا۔" ہاشم کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "اس کے ساتھ فرار ہونے والی تین لڑکیوں میں سے ایک جوزف کے غیر قانونی دھندوں سے خاصی واقف تھی۔"

"مگر اسے جوزف کی نقل و حرکت کا علم کیونکر ہوا؟ پولیس نے بروقت چھاپہ مارا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پولیس نے جوزف جیسے بدنام اور خونخوار شخص کے خلاف اس اطلاع پر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا لیا؟"

"نقل و حرکت والی بات تو آسان سی ہے۔ وادیٔ حلفہ میں کسی بھی قافلے کی آمد سے پوری بستی آگاہ ہو جاتی ہے۔ شاید جوزف کے پہلے خبر دی گئی ہو کہ جوزف اس بار نوادرات لا رہا ہے اور جیسے ہی وہ حلفہ پہنچا چھاپہ مار دیا گیا۔" وہ کہنے لگا۔ "لیکن دوسرا سوال اہم ہے۔ تم نے کوتوال کے رویے میں کوئی خاص بات محسوس کی؟"

اس سوال پر میں چونک پڑا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کے دل میں جوزف کی طرف سے کوئی عناد معلوم ہوتا تھا بلکہ اس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ جوزف نے ہمیں بھاری معاوضہ دے کر اس جرم پر آمادہ کیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے جوزف نے کوتوال سے لین دین میں کوئی بے ایمانی کی ہو اور اس نے مخبری کی آڑ میں بدلہ لینے کی کوشش کی ہو۔" ہاشم بولا۔

"کوتوال سے ٹھن جانے کی صورت میں اس کے ماتحت جوزف کی اس قدر کھلی حمایت نہ کرتے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہاں نیا ہے اور اس کارروائی کے نتیجے میں جوزف سے اپنا بھاری مشاہرہ بندھوانا چاہتا ہے۔"

"تمھارا نظریہ قرینِ قیاس ہے۔" ہاشم نے تائید کی۔ "کوتوال موقع کی تلاش میں تھا جو کسی مخبر نے اسے فراہم کر دیا مگر مجھے حیرت ہے کہ تم اس قدر حقیقی نتائج کیسے اخذ کر لیتے ہو۔ میرا تو ذہن کام نہیں کرتا۔"

"رشوت کا بھاؤ بڑھانے کے یہ نسخے ہر ملک میں رائج ہیں۔" میں نے ذہن میں ابھرنے والے اپنے وطن کا نام لیے بغیر کہا۔ "اگر قانون کے اندھے پن سے پوری مہارت سے کام لیا جائے تو غنڈے اور اسمگلر تو درکنار، شرفا بھی اپنی عزت کو حوالات کے سائے سے بچانے کے لیے بھاری خراج دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسے ملکوں میں تو پولیس کے سپاہی سے لے کر افسر تک کے سارے عہدے سالانہ ٹھیکے کی بنیاد پر فروخت کیے جانے چاہئیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس طرح نہ صرف سرکاری خزانے کو تنخواہوں کی مد میں بچت ہو گی بلکہ ٹھیکوں سے کئی گنا مزید آمدنی ہو گی۔"

"کہیں کہیں تو یہ دور آیا ہی چاہتا ہے۔"

اس وقت ہمارے ذہنوں پر سے قید کا بوجھ قدرے ہلکا ہو چکا تھا لہٰذا ہماری گفتگو بہکنے لگی اور سوڈان کے اس مختصر سے قصبے کی حوالات میں ہم عالمی نوعیت کے سیاسی، سماجی، فوجی اور معاشرتی مسائل پر اپنے اٹل فیصلے صادر کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اسی اثنا میں باہر قدموں کی دھمک دوبارہ سنائی دی اور میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو وہ رات کے دو بجا رہی تھی۔

اگر آنے والا وہی پولیس افسر تھا تو وہ حسبِ وعدہ ڈھائی گھنٹے بعد واپس آ رہا تھا اور اگر کوئی سنتری تھا تو اسے بڑی دیر سے حوالات کا خیال آیا تھا۔

ویسے وہاں سنتری کے نہ ہونے پر مجھے کوئی حیرت بھی نہیں تھی کیونکہ حوالات کی کوٹھری ایک راہداری کے آخری سرے پر بنی ہوئی تھی اور حوالات سے نکاسی کا وہ واحد راستہ تھا جس کے اختتام پر کوتوالی کے محرر کا کمرہ تھا جہاں ایک مسلح سنتری شاید ہر وقت پہرے پر مامور رہتا تھا۔

آنے والا وہی پولیس افسر ثابت ہوا۔ اس وقت اس کے لہجے سے اعتماد ٹپک رہا تھا۔ تھوڑی دیر قبل کی تمام پریشانی رفع ہو چکی تھی۔

"سارا بندوبست ہو گیا ہے۔" اس نے قریب آتے ہی ٹھوس سرگوشیانہ لہجے میں ہمیں نوید سنائی۔ "تین بجے تک بھاگنے کا سارا عملہ سو جائے گا۔ چار بجے تم دونوں تیار رہنا، جیسے ہی قرب و جوار میں کسی دھماکے کی آواز سنائی دے تو تم حوالات سے نکل پڑو گے۔ راہداری کے اختتام پر محرر کا کمرہ ہے اس کی داہنی طرف دروازے سے گزر کر تم برآمدے میں پہنچو گے۔ برآمدے سے آگے صحن میں اندھیرا ہو گا وہاں سے تم جو راہ چاہو اختیار کر سکو گے۔"

"اور یہ تالا کیسے کھلے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"اسے میں ابھی کھول دوں گا مگر تم دھماکے سے پہلے باہر نہیں نکلو گے۔ بادی النظر میں یہ تالا مقفل ہی نظر آئے گا۔" اس کے لب و لہجے کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد میرے دل میں کھٹک رہا تھا مگر میرے لیے اس پر شبہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔

"وہ دھماکا کہاں ہو گا؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"اس سے تمھیں غرض نہیں ہونی چاہیے۔" اس نے روکھے لہجے میں کہا۔ "وہ عملے کی توجہ منتقل کرانے کے لیے میرا اپنا بندوبست ہو گا۔"

"مگر ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔" میں نے کہا۔ "حلفہ چھوٹا سا شہر ہے چند گھنٹوں میں شہر کے بچے بچے کو دو مفرور حوالاتیوں کے بارے میں معلوم ہو جائے گا اور تمھارا کوتوال بھی پورے شہر کو گھیرے میں لے لے گا، ایسی صورت میں ہم کہاں پناہ لیں گے؟"

"پناہ؟" اس نے غور سے میری طرف دیکھ کر دہرایا۔ پھر بولا "ہمارا معاہدہ فرار تک تھا۔ پناہ حاصل کرنا تمھارا ذاتی فعل ہے۔"

"مجبوری ہے برادر!" میں نے کہا۔ "خود کو ہماری جگہ رکھ کر سوچو۔ اگر فرار کے چند گھنٹے بعد ہم دوبارہ پکڑ لیے گئے تو قاہرہ سے پیغام آنے تک تمھارا کوتوال ہمیں مار مار کر لہولہان کر دے گا اور اس تشدد سے بچنے کے لیے ہمیں اس کے سامنے سچ بولنا ہو گا جو تمھارے حق میں بھی شاید بہتر ثابت نہ ہو۔"

"تم بدمعاش ہو اور اب بلیک میل پر اُتر آئے ہو۔" وہ دھیمے لہجے میں غرایا۔

"جو چاہو کہہ لو تمھارے ہی ہم پیشہ ہیں۔" میں نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر کہا۔ "لیکن ہماری مجبوریاں اپنی جگہ ہیں۔"

وہ خاموش ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگا جیسے کچھ سوچ رہا ہو مگر وہ جب سے آیا تھا میں مسلسل اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ اس مرحلے پر اس کی آنکھوں میں پُرخیال کیفیت مفقود تھی اور وہ سپاٹ انداز میں چھت کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"یہ بندوبست بھی ہو جائے گا۔" خاصے طویل سکوت کے بعد وہ بولا۔ "برآمدے کے زینے عبور کر کے تم تاریک صحن میں سیدھے بڑھتے جاؤ گے تو کوتوالی کے احاطے سے باہر سڑک پر پہنچ جاؤ گے وہاں سیاہ رنگ کی ایک سیڈان بائیں طرف تمھاری منتظر ہو گی اور تمھیں ایک محفوظ مقام پر لے جائے گی۔"

"تمھیں یقین ہے کہ وہ سیاہ سیڈان ہی ہو گی؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔

"ہاں میں ابھی جا کر اس کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے اس وقت وہ کار میسر نہ ہو۔۔۔۔"

"وہ میرا دردِ سر ہے۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "وہ میرے دوست کی کار ہے، وہ مقررہ وقت پر ہر قیمت پر آئے گا۔"

"میں صرف یہ یاد دلانا چاہ رہا تھا کہ وہ کار کہیں بیرون شہر نہ گئی ہو۔" میں نے شانے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"یہ تمھاری ہی نہیں میری بھی سلامتی کا معاملہ ہے۔" وہ یک بیک نرم پڑ گیا۔ "میں جانتا ہوں کہ خود کو خطرے میں پا کر تم مجھے بھی دلدل میں گھسیٹ لو گے۔"

"شاید یہ ملاقات آخری ہو۔" میں نے کہا۔ "اس کا اختتام خوشگوار انداز میں ہی ہونا چاہیے۔"

اس نے جیب سے چابی نکال کر حوالات کے سلاخ دار دروازے کا آہنی قفل کھول دیا۔

"ایک بار دروازہ کھول کر دیکھ لوں؟ کہیں زنگ آلود قبضے شور نہ کرتے ہوں؟" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"جلدی دیکھو۔" شاید اسے میرا لہجہ پسند آ گیا تھا۔

کنڈی کھولنے کے بعد حوالات کا دیوہیکل دروازہ میں نے

آواز کھل گیا۔

"شکریہ!" اس پر خوشامد کا اثر دیکھنے کے بعد میں نے کہا۔

"تم اچھے آدمی ہو، جاتے جاتے ایک بار گلے تو ملتے جاؤ۔"

وہ زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا کوٹھری میں داخل ہوا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دیئے اور جوں ہی وہ میری زد میں آیا میں نے پوری قوت سے اس کا گلا دبا کر اسے آہستگی سے فرش پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔

ہاشم کے لیے میرا یہ وار بالکل غیر متوقع تھا مگر اس نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے پیچھے گرتے ہوئے افسر کی دونوں ٹانگیں اچھل کر جکڑ لیں تاکہ وہ فرش پر پاؤں مار مار کر کسی کو ادھر متوجہ نہ کر سکے۔

"سیاہ کار میں کون ہوگا؟" میں نے اس کے نرخرے پر دباؤ بڑھاتے ہوئے سفاکانہ لہجے میں سوال کیا۔

اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا، موت کی دہشت سے آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں اور شاید اس کا دل بھی اس کے ضمیر کی طرح کمزور تھا کیونکہ میرا سوال سنتے ہی اس نے مزاحمت ترک کر کے کچھ بولنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

میں نے بتدریج اس کی گردن پر اپنی گرفت اتنی کم کی کہ اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد ہو سکے۔

"میرا دوست۔" پھنسی پھنسی دہشت زدہ آواز سن کر میں نے یکلخت اس کی گردن پر دباؤ پھر بڑھا دیا اور میرے نیچے اس کا بدن شدت سے کسمسانے لگا۔

شاید دم گھٹنے کے سبب وہ بوکھلا گیا کیونکہ اس کا سر تیزی سے نفی کے انداز میں ہلنے لگا تھا اور میں نے ایک بار پھر گرفت قدرے ہلکی کر دی۔

"مجھے چھوڑ دو۔" بہ دقت تمام اس کے حلق سے سرسراہٹ اُبھری۔ "میں بتا دوں گا۔"

میرے لیے وہ لمحہ فیصلہ کن تھا۔ اس شخص کے بارے میں اتنا تو مجھے یقین تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا، کیونکہ وہ تنہا تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ مشینی انداز میں سچ اگلنا شروع کر دیتا لیکن ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں گلا آزاد ہوتے ہی بری طرح شور مچانا شروع نہ کر دے۔

اس وقت بہتر بات یہ تھی کہ حوالات کا دروازہ غیر مقفل تھا اور ہم دونوں کے پاس اپنے ہتھیار ہونے کے علاوہ اس افسر کا ریوالور اور فاضل گولیاں بھی موجود تھیں لہٰذا میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔" میں نے اسے حکم دیا جس کی پھرتی سے تعمیل کی گئی۔ "دونوں ٹانگیں فرش پر پھیلا دو اور اس وقت تک یوں ہی پڑے رہنا جب تک میں اٹھنے کی اجازت نہ دے دوں۔"

اس نے نہ صرف ٹانگیں سیدھی کر لیں بلکہ اس کی آنکھوں سے بھی ممنونیت سی جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے گردن آزاد کی اور اس کے بدن پر سے اچھل کر دور ہٹ گیا۔ ہاشم نے بھی میری تقلید کی مگر وہ اس اعتبار سے ہوشیار تھا، اسی اثنا میں وہ کسی وقت اس کے ہولسٹر کو بھی خالی کر چکا تھا۔

"شروع ہو جاؤ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"م... مجھے معاف کر دو۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے ہکلایا۔ "مجھے معلوم تھا تم فرار کے بعد کسی محفوظ پناہ گاہ کا مطالبہ کرو گے لہٰذا میں نے تمہیں حوالات سے آزاد کرا کے اپنی ذاتی قید میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو ذلیل آدمی۔" میں غصیلے لہجے میں غرایا۔ اس وقت کی خطرناک صورتِ حال کے پیشِ نظر میرا بدن پسینے میں بھیگتا چلا جا رہا تھا اور میں خود پر شدید اعصابی دباؤ محسوس کر رہا تھا۔

کوتوالی کی کھلی حوالات میں وہ خطرناک کارروائی جنون سے کم نہیں تھی اور کسی بھی لمحے وہاں کوتوالی کے عملے کی مداخلت کا خطرہ تلوار بن کر سر پر لٹک رہا تھا لہٰذا میں مختصر ترین وقت میں اس کی زبان سے سچ سننا چاہتا تھا تاکہ پھر اگلے اقدام کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔

"میں... میں نے اس سے مشورہ کیا تھا۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "خدا کے لیے مجھے ہلاک نہ کرنا میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بے اختیار رو پڑا۔

میں نے اپنی جیب سے پستول کے ساتھ ہی زہریلے تیروں والی شلیشی بھی نکال لی، جو کافی عرصے سے استعمال نہیں ہوئی تھی۔

"کس سے؟" میں نے اس کے قریب ہو کر سوال کیا۔ "پوری بات کہہ ڈالو۔" پھر میں نے ہاشم کو حوالات کا دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا جس پر فوری عمل کیا گیا۔

"جوزف سے۔" وہ ہانپتے اور لرزتے ہوئے بولا۔ "میں نے پہلے اسے سب کچھ بتا دیا جس پر وہ بہت زیادہ مشتعل ہو گیا۔ پھر اس نے حوالات سے تمہارے فرار کا منصوبہ سمجھایا۔ صبح چار بجے اس کا آدمی کوتوالی کے اسلحہ خانے پر آتشگیر بم پھینکے گا۔ اسلحہ خانہ عمارت کے عقب میں ہے مسلسل دھماکوں اور آگ کے باعث سب ادھر بھاگیں گے، تم باہر نکل کر سیاہ کار میں جا بیٹھتے جس کا آدمی چلا رہا ہوتا اور تمہیں جوزف کے کسی ٹھکانے پر لے جاتا۔"

میرے لیے وہ صرف اسی حد تک کارآمد تھا۔ میں نے لپک کر جیب میں ڈال کر زہریلے تیروں والی شلیشی کا رخ اس کی طرف کیا تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا اور جب پوٹاشیم سائنائیڈ میں بجھی ہوئی سوئی اس کی گردن میں پیوست ہوئی تو اس نے سسکاری لینے کے لیے ہونٹ پھیلانے چاہے جو کوئی آواز پیدا کیے بغیر اسی صورت میں پتھرا گئے۔

ہم دونوں نے پھرتی سے اس کی لاش کو ایک کونے میں دھکیلا اور اس سے قبل کہ جسم کی حرارت مفقود ہونے کے بعد لاش اکڑنی شروع ہوتی، ہم نے اسے ایک گٹھڑی کی صورت میں سمیٹ کر اس پر کمبل وغیرہ اس طرح ڈال دیئے کہ اس کا دیکھا جانا ناممکن ہو کر رہ گیا۔

میرے لیے اس سنسنی خیز مرحلے کا اختتام بہت تحسین بخش تھا۔ میں نے فرش پر بیٹھ کر اپنے لیے سگریٹ سلگائی۔

حوالات میں ایک تازہ لاش کے سرہانے بیٹھ کر کوئی سنجیدہ بات سوچنی خاصی دشوار ہوتی ہے مگر میں اس وقت کی صورتحال کے پیشِ نظر تیزی سے سوچنے پر مجبور تھا۔

سیتا مصر کی سرحد عبور کر کے بخیر و عافیت سوڈان پہنچ چکی تھی جہاں ابوسلطان کے سوا اسے پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جوزف امین کے ایک سرکس کے ساتھ وادی حلفہ پہنچی تھی اور پھر سرکس میں کام کرنے والی تین لڑکیوں سمیت پہلی ہی رات یوں غائب ہوئی کہ کئی روز گزرنے کے بعد بھی جوزف کے متعدد ہرکارے اس کا سراغ نہیں پا سکے تھے۔

وہ سوڈان میں تھی لیکن کہاں تھی؟ یہ معلوم کرنا میرا کام تھا۔ اگر میں جوزف امین کے طفیل پولیس کے چکر میں ملوث نہ ہوتا تو مجھے پورا یقین تھا کہ میں اپنی مہم بآسانی سرانجام دے سکتا تھا۔

اب حوالات میں کوتوال ادریس کا عملہ ہمارا دشمن تھا۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے وہاں بیٹھے رہتے تو چند گھنٹوں بعد کسی بھی لمحے متوفی پولیس افسر کی لاش دریافت ہو سکتی تھی اور قتل بہرحال اسمگلنگ سے زیادہ سنگین جرم قرار دیا جاتا ہے خواہ وہ کیسے ہی حالات میں سرزد کیا گیا ہو اور اس مصیبت سے نجات کے لیے فرار کی فوری راہیں غیر یقینی سی تھیں۔ اگر صبح کے چار بجے کوتوالی کے اسلحہ خانے میں دھماکوں کے بعد ہم فرار کی راہ اختیار کرتے تو باہر جوزف امین کے آدمیوں سے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا۔

فرار کے بعد اپنے اغوا سے محفوظ رہنے کی بہتر صورت یہ تھی کہ ہم متوفی پولیس افسر کے بتائے ہوئے راستے کے بجائے کوئی اور راہ اختیار کرتے مگر یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں جوزف نے احتیاطاً پوری کوتوالی کا مخبر محاصرہ نہ کرا لیا ہو۔

مقامی پولیس اور جوزف کی دشمنی مول لینے کے بعد حلفہ جیسے مختصر سے شہر میں کوئی محفوظ ٹھکانا تلاش کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہ تھا اور فوری طور پر شہر سے نکلنے والی شاہراہ کا رخ کرنا تو گویا ایک طرح سے دانستہ موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہوتا۔ مگر یہ ایک ایسا کام تھا جو بظاہر ناممکن نظر آنے کے باوجود سیتا نے پوری کامیابی سے کر دکھایا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ہاشم کی سرگوشی نے مجھے چونکایا۔

"ایک رکاوٹ دُور ہو چکی ہے۔" میں نے کمبلوں کے نیچے دبی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "باقی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"تم نے اس پر زہریلی سوئی استعمال کر کے بڑی غلطی کی!"

"پستول چلاتا تو شاید چند لمحوں میں ہی شدید مصائب کا آغاز ہو جاتا۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"اس کا گلا دوبارہ دبوچا جا سکتا تھا۔" وہ بولا۔ "لیبیا اور مصر میں زہریلی سوئیاں صفدر علی سے منسوب ہیں۔ یہ لاش سامنے آتے ہی سوڈان والوں پر صفدر علی کا ہوّا سوار ہو جائے گا اور تمہاری یہاں آمد کا راز فاش ہو جائے گا۔"

"تم نے بہت دُور کی بات سوچی ہے۔" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "میں صفدر علی کی طرف تو ان کا خیال بھی نہیں ہونے دینا چاہتا۔"

"اب تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ چار بجے دھماکا ہوتے ہی ہم لاش کندھے پر لاد کر بھاگ نکلیں۔"

"مذاق نہ سمجھو! میں یہی سوچ رہا ہوں۔"

"تو کیا تم سیاہ سیڈان کار استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔" میں نے کہا۔ "دوسری کوئی راہ اختیار کی تو شاید شہر سے نکلنے سے قبل ہی ہم دوبارہ دھر لیے جائیں۔"

"اور وہ کار بھی چوہے دان ثابت ہو گی۔"

"صرف ایک ہی امید کی جا سکتی ہے، اگر اس کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک یا دو آدمی ہوئے تو ہم بآسانی انہیں زیر کر سکیں گے!"

"کیا وہ اتنے ہی بودے ہوں گے۔"

"بودے پن کی بات نہیں، وہ ہماری طرف سے مطمئن ہوں گے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم ان کے پروگرام سے بے خبر ہیں اور فرار میں انہیں اپنا معاون سمجھ رہے ہیں۔ ہم ان کے اسی اعتماد سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"تمہارا یہ نکتہ دل کو لگتا ہے۔"

"جوزف ہمارے فرار میں غیر قانونی طور پر ملوث ہو رہا ہے لہٰذا وہ بعد میں کسی بھی مرحلے پر اس واردات سے اپنے تعلق کا برملا اظہار نہیں کر سکے گا لہٰذا ہم اس کے ایک آدمی کو ہلاک کر کے اس کی لاش متوفی پولیس افسر سمیت سیاہ کار میں چھوڑ کر ویران صحرا میں لے

آگ لگا دیں گے۔ دو جلی ہوئی لاشوں کی شناخت ناممکن ہوگی اور انہیں ہماری لاشیں قرار دے کر پولیس اپنی فائل بند کر دے گی۔"

"ابھی وقت ہے۔" وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ "اچھی طرح سوچ لو، پولیس افسر کو بلیک میل کرتے ہوئے ہم یہ بھلا بیٹھے تھے کہ وہ اپنی گلوخلاصی کے لئے براہ راست جوزف سے بھی رجوع کر سکتا ہے!"

"وہ تو ہمارے اندازوں کی بدترین غلطی تھی اور اب شاید ہم اسی کی سزا بھگت رہے ہیں لیکن تمہارے منصوبے کا صرف ایک منفی پہلو ہے جس کا تدارک لازمی ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے پُرتجسس لہجے میں دریافت کیا۔

"ہمارا قیاس ہے کہ جوزف زور و شور سے ہماری تلاش کا آغاز کر دے گا اور پولیس سیاہ سیڈان میں دو خاکستر لاشیں دیکھ کر ہمارا کیس داخل دفتر کر دے گی۔ مگر بعد میں گمشدہ پولیس افسر کے بارے میں کیا سوچا جائے گا؟"

"تو پھر جلی ہوئی کار میں تین لاشیں کیوں نہ ہوں۔" ہاشم نے فوری طور پر کہا۔ "اس طرح حلقہ کا کوتوال اپنی پوری توجہ جوزف پر مرکوز کر دے گا۔ وہ پہلے ہی شبہ کر رہا ہے کہ جوزف نے اپنا جرم محکمے کے افسروں کی ملی بھگت سے ہمارے سر ڈالا ہے۔ لہٰذا کار کے رجسٹریشن سے اس کی ملکیت کا تعین ہوتے ہی اس کی کہانی مکمل ہو جائے گی۔ وہ سمجھے گا کہ اس کے شبہات کی سُن گن پانے کے بعد جوزف نے متوفی کو حوالات سے ہماری رہائی پر آمادہ کیا اور جب اسلحہ خانے میں تخریبی کارروائی ہوئی تو متوفی ہم دونوں کو جوزف کی فراہم کی ہوئی کار میں صحرائی شاہراہ پر لے بھاگا جہاں راستے میں جوزف کے منصوبے کے مطابق کار کو کسی طرح اس کے مسافروں سمیت نذرِ آتش کر دیا گیا تاکہ جوزف کے خلاف کوئی مضبوط گواہ ہی باقی نہ رہے اور وہ چین کی بنسی بجاتا رہے!"

"تم زندہ مسافروں کو جلانے کی بات کر رہے ہو لیکن مُردہ پولیس افسر کی جلی ہوئی لاش سے برآمد ہونے والی اشیاء کے تجزیے سے اس کے جسمانی نظام میں پوٹاشیم سائنائڈ کی گردش کا ثبوت مل جائے گا جو تمہارے مفروضوں کی نفی کے لئے کافی ہوگا۔"

"ٹنکی میں اگر ایندھن پورا ہو تو لاشیں اندر تک سے کوئلہ بن جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کس چیز کا تجزیہ کریں گے؟" اس نے کہا اور مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اس بار وہ اپنی تجویز کے ہر پہلو پر غور کر چکا تھا!

"پھر تو معاملہ خاصا سہل نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر زہریلی سوئیوں نے ساتھ دیا تو اس کار پر قبضہ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔"

ایک مرتبہ یہ طے کر لینے کے بعد کہ جوزف امین کو خود اسی کے جال میں پھانس کر زک دی جائے۔ ہم دونوں نے سرگوشیوں میں اپنے فرار کی جزئیات پر تبادلۂ خیال شروع کر دیا تاکہ کوئی خامی اگر باقی رہ گئی ہو تو اسے دُور کیا جا سکے!

گھڑی کی سوئیاں سست رفتاری سے آگے بڑھتی رہیں۔ کوتوالی کے اندرونی حصّوں سے آنے والی اکّا دُکّا آوازیں بھی رات تین بجے یکسر معدوم ہوگئیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے عملے کے تمام افراد سو چکے ہوں۔ ان لوگوں کے اطمینان کا یہ عالم تھا کہ جب سے ہم حوالات میں آئے تھے، متوفی پولیس افسر کے علاوہ کسی سنتری یا سپاہی نے اُدھر کا رُخ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی کو یہ ہوش تھا کہ مقتول آخری بار حوالات کی طرف آنے کے بعد واپس نہیں لوٹا تھا۔

مگر مقتول کی طرف سے عملے کے دوسرے اراکین کی بےخبری کا جواز بھی میرے ذہن میں آگیا۔ وہ ڈھائی بجے کے بعد ہمارے پاس آیا تھا اور اس نے خود ہمیں بتایا تھا کہ کوتوالی کا عملہ تین بجے تک سو جاتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ جس وقت وہ حوالات کی طرف آیا، وہاں کا عملہ اپنے سونے کی تیاریوں کا آغاز کر چکا تھا لہٰذا اس کی آمد اور واپسی کے بارے میں کسی کو کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی۔

جیسے جیسے وقت قریب آتا جا رہا تھا میں اپنے اعصاب میں خطرناک سی سنسنی پھیلتی ہوئی محسوس کر رہا تھا جو شاید کسی بڑے معرکے کا پیش خیمہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آفات کے سلسلے میں جانور بڑے حساس ہوتے ہیں۔ طوفان کی آمد ہو تو پرندے غول کی صورت میں اپنے آشیانوں سے کھلی فضا میں نکل پڑتے ہیں اور تیز آوازیں نکالنے لگتے ہیں، بندر بلند درختوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر چیخنے لگتے ہیں اور دیگر چوپائے بھی زور زور سے بولنے لگتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ زلزلے کی آمد سے پیشتر چوہے اپنے بلوں سے نکل کر دہشت کے عالم میں ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ اسی طرح شاید قدرت نے ناگہانی آفات اور مصائب کے سلسلے میں انسان میں ایک خفیہ حس رکھی ہے جو پیشگی اطلاعات فراہم کرتی ہے یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ اپنی چھٹی حس کی کمزور سی للکار پر توجّہ نہیں دیتے اور جو شش و پنج کے عالم میں مارے جاتے ہیں اور جو لوگ اپنے اعصابی ردعمل پر پوری طرح قادر ہوتے ہیں وہ عام طور پر خطرات سے بچ نکلتے ہیں یا کسی نہ کسی طرح ان کی سنگینی میں کمی لانے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ بدترین خطرات سے اپنی زندہ سلامت نکاسی کے بعد میں واقعات کے بعد میں خود کو دوسری قسم کے لوگوں میں شمار کرنے لگا

تھا مگر مجھے یہ احساس بھی رہتا تھا کہ میرا خاتمہ جب بھی ہوا اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوگا!

"پونے چار!" ہاشم کی فکرمندانہ بڑبڑاہٹ میرے کانوں میں پہنچی اور میں نے مضطربانہ انداز میں اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"تمہارے انداز سے بےچینی مترشح ہے!" ہاشم نے مجھے پشت پر ہاتھ باندھ کر حوالات میں گھومتے ہوئے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"مجھے اپنی کیفیت کا احساس ہے۔" میں نے رک کر کہا۔ "وہ پہلے کے مقابلے میں خاصا پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ "مقدر نے یاوری کی تو ہمارا منصوبہ ضرور کامیاب رہے گا لیکن میں اپنی بےچینی کا مفہوم نہیں سمجھ پا رہا۔ شاید میرے لاشعور میں کچھ اندیشے کلبلا رہے ہیں۔"

"کیا؟" اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کاش اپنے لاشعور میں جھانکنا میرے بس میں ہوتا۔"

"اس وقت جوزف کے آدمی تیزی سے کوتوالی کے گرد پھیل رہے ہوں گے۔" اس نے میرے ذہن کو مصروف کرنے کے لئے باہر کی کہانی چھیڑ دی!

"گیارہ منٹ رہ گئے!" میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈال کر کہا اور حلقہ کے حوالات میں اپنی دانست میں آخری سگریٹ سلگائی۔

"ایک بات پوچھوں؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔ "مگر تم مجھے مایوسی کا طعنہ نہیں دو گے۔ ایسے ہی خیال آ رہا ہے!"

"کوئی ڈھنگ کی بات پوچھنا۔" میری مسکراہٹ کے جواب میں وہ بھی مسکرا دیا۔

"اگر میں مر گیا تو کیا ہوگا؟"

لحظہ بھر کے لئے وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "کچھ بھی نہیں — دنیا کے سارے کاروبار اسی طرح چلتے رہیں گے۔ ہاں جن کو تمہاری ذات پیاری ہے وہ چند روز۔ یا شاید چند سال تمہارے لئے دل گرفتہ رہیں گے پھر آلامِ روزگار میں گھر کر بتدریج تمہیں بھول جائیں گے۔ جب ایک نہ ایک دن ہر ایک کو ہی مرنا ہے تو پھر کسی کی موت کو اپنی زندگی کا روگ بنا لینا قدرت سے بغاوت ہے!"

اس کا جواب میرے لئے غیر متوقع تھا۔ "بڑا بےرحمانہ تبصرہ کیا ہے تم نے۔" میں نے ہنس کر کہہ ہی ڈالا۔ "بیزار ہو مجھ سے؟"

"تمہارا سوال مایوسانہ تھا برادر!" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں نے تمہیں حقیقت بتائی ہے، میری پوچھو تو تمہاری ذات میرے لئے ایک تربیت گاہ بن گئی ہے۔ تم میرے ساتھ رہو یا نہ رہو لیکن میں آسودہ رہوں گا۔ ہاں جس روز تمہارے بارے میں کوئی بُری خبر آئی، میں خود کو یتیم سمجھنے لگوں گا۔"

میں نے بےاختیار اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور عین اسی وقت حوالات کے در و دیوار ایک ہولناک دھماکے سے لرز اٹھے!

شاید تخریب کار کی گھڑی کچھ تیز تھی کیونکہ میری رسٹ واچ میں چار بجنے میں ڈیڑھ منٹ باقی تھا!

ہم منصوبے کی جزئیات پہلے سے طے کر چکے تھے۔ اب ان پر برق رفتاری سے عمل پیرا ہونے کا مرحلہ آگیا تھا۔

میں نے حوالات کا دروازہ کھول دیا اور پستول ہاتھ میں لے کر باہر نکل گیا۔ دیوار میں ایک بورڈ پر دو سوئچ لگے ہوئے تھے جو میں نے آف کر دیئے! حوالات کے ساتھ ہی راہداری میں بھی اندھیرا ہو گیا۔ اب راہداری کے اختتام پر نکاسی کی راہ ایک چوکور اور روشن خلا کی صورت میں نظر آ رہی تھی!

میں اندازے سے چند سیکنڈ وہاں رکا۔ پھر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور ساتھ ہی بہت سے لوگوں کا ملا جُلا شور بھی سنائی دیا۔ روشن خلا کے سامنے سے میرے دیکھتے ہی کئی افراد سُرعت سے بائیں جانب گئے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اندھیرے میں بیٹھا روشن اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔

تاریک راہداری سے بلامزاحمت گزر کر محرر کے روشن کمرے میں پہنچنے میں مجھے بمشکل نصف منٹ لگا، اس دوران میں مجھے اپنے عقب میں قدموں کی بےآواز دھمک بخوبی محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے سر گھمانے کی حماقت نہیں کی کیونکہ میرے لئے سامنے کا محاذ فیصلہ کن تھا جس پر ہماری آزادی اور بقا کا دارومدار تھا!

محرر کے کمرے میں میں نے چند سیکنڈ میں ہی سوئچ بورڈ دیکھ کر سارے سوئچ بند کر دیئے اور نہ صرف کمرہ بلکہ اس کے قرب و جوار کا خاصا حصہ مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا اور عقب میں آنے والی دھمک تاریکی کی چادر میں سمٹی راہداری سے محرر کے کمرے میں بڑھ آئی جہاں داہنی طرف کا دروازہ ہمیں الوداع کہنے کے لئے وا تھا۔

کمرے میں پہنچنے اور سوئچ بند کرنے کے درمیانی چند سیکنڈ میں میں نے اس کمرے کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔

وہاں تین بستر فرش پر لگے ہوئے تھے جو خالی تھے۔ چوتھا بستر راہداری سے ملی ہوئی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی چوبی بینچ پر تھا جہاں شاید مسلح سنتری سویا ہوا تھا۔ دھماکوں کے نتیجے میں وہ اس قدر بدحواسی

کے عالم میں بستر چھوڑ کر بھاگا تھا کہ اپنی رائفل بھی بینچ کے نیچے فرش پر رکھی چھوڑ گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں ایک خالی کرسی اور میز تھی جس پر فون اور رجسٹر پڑے تھے۔

محرر کے کمرے میں بائیں جانب سے اب مسلسل دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ اسلحہ خانہ پوری طرح تباہی کی زد میں آ چکا تھا!

تاریکی میں قدرے کم تاریک دروازہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں پھرتی سے داہنی طرف مڑا اور دروازے سے گزر کر برآمدے میں جا نکلا جہاں سامنے تاریک صحن پھیلا ہوا تھا۔

اسی وقت کسی طرف سے ایک شخص تیزی سے دوڑتا ہوا آیا۔ میں نے ایک طرف سرک کر خود کو تصادم سے بچا لیا لیکن شاید ہاشم اس وقت دروازے سے گزر رہا تھا اور اس کے شانے پر ایک لاش بھی لدی ہوئی تھی لہٰذا بھاگنے والا پورے زور میں اس سے جا ٹکرایا۔

پختہ فرش پر کئی جسموں کے گرنے کے دھماکے ہوئے۔ ہاشم کی کراہ مدھم تھی مگر ٹکرانے والا پوری آواز سے گالیاں بک رہا تھا۔

میں تیزی سے واپس پلٹا اور تاریکی میں فرش سے اٹھتے ہوئے دو انسانی ہیولوں میں ڈکراتے ہوئے اجنبی کو بآسانی پہچان لیا۔

اس وقت کوتوالی میں غیر معمولی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ سارا عملہ جلتے ہوئے اسلحہ خانے کی طرف متوجہ تھا ایسے میں اگر اندھیری عمارت میں پستول کا دھماکا ہوتا تو یقیناً کچھ لوگ اُدھر بھی آ جاتے اور ہماری راہ مسدود ہو جاتی اور اس مرحلے پر میں زہریلے تیر ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں جوزف کی کار میں عین موقع پر وہ شیشی جواب نہ دے جائے لہٰذا میں نے فوری طور پر اپنے پستول کی نال داہنے ہاتھ میں تھامی اور بدکلام اجنبی پر ٹوٹ پڑا۔

مجھے نہ اس کی زندگی عزیز تھی اور نہ میں اس کے لہو کا پیاسا تھا میری کوشش صرف اتنی تھی کہ اس کا اونچا لہجہ کسی کو ادھر گڑبڑ کے وہم میں نہ ڈال دے!

میرا ہاتھ فضا میں بلند ہو کر نیچے آیا اور آہنی دستہ اس کے سر سے ٹکرایا تو ضرب میں غیر ارادی طور پر اتنی شدت تھی..... کہ لوہا کاسۂ سر میں اتر گیا اور اندھیرے میں ہڈی ٹوٹنے کی آواز واضح طور پر سنائی دی۔

اجنبی کا لہجہ بہک گیا اور وہ کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں واپس لوٹا تو ہاشم لاش کو دوبارہ کندھے پر لاد کر برآمدے کے زینے طے کر رہا تھا۔

"میرے پیچھے چلے آؤ۔" میں نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ہیجان آمیز لہجے میں سرگوشی کی اور آگے بڑھ گیا۔

تاریک صحن خاصا طویل تھا مگر موت کے آگے بھاگتے ہوئے شخص کے لئے صرف یہی اطمینان کافی تھا کہ اس آخری زندان کے بعد آزادی کے چند سانس میسر آ سکیں گے۔

پھاٹک سے نکلنے سے پہلے میں نے بائیں طرف کھڑی ہوئی سیاہ کار دیکھ لی اور تیزی سے اس کی طرف لپکا مگر اس میں موجود افراد مجھ سے زیادہ مستعد تھے۔

میرے قریب پہنچتے ہی کار کی عقبی نشست کا دروازہ کھل گیا مگر میں باہر ہی رک گیا۔

"اندر آؤ!" کار میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں کسی کی اشتعال آمیز غراہٹ ابھری۔ "وہ بھی آ جائے گا۔"

اسی وقت ہاشم بھی پھاٹک سے نکل آیا۔

"یہ کیا لئے آ رہا ہے؟" کار میں سے وہی درشت آواز ابھری۔ اس بار لہجہ تحیر آمیز تھا۔

"ایک پولیس افسر نے یہ بے ہوش قیدی بھی ہمارے حوالے کیا ہے۔ اسے وہ بعد میں ہم سے اپنی ذاتی تحویل میں لے لے گا۔" میں نے قریب جا کر کہا۔

"قیدی کو پائیدان میں ڈال دینا۔"

اس کی یہ ہدایت غیر ضروری تھی کیونکہ اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن بھی نہیں تھی کیونکہ کار میں ڈرائیور سمیت تین افراد پہلے سے موجود تھے۔

میں نے آہستگی سے پستول جیب میں ڈال کر زہریلے تیروں والی شیشی نکال لی جس نے مجھے کئی خطرناک مواقع پر نئی زندگی حاصل کرنے میں مدد دی تھی۔

ڈرائیور کے ساتھ ایک آدمی اگلی نشست پر براجمان تھا۔ دوسرا عقبی نشست پر جا بیٹھا تھا۔ میں نے لاش عقبی پائیدان میں گھسیٹنے میں ہاشم کی مدد کی اور خود درمیان میں بیٹھ گیا۔ ہاشم میرے بائیں پہلو میں بیٹھ گیا۔

دروازہ بند ہونے سے قبل ہی کالی سیڈان کا انجن بیدار ہوا اور وہ کسی غضبناک درندے کی طرح اچھل کر آگے بڑھتی چلی گئی۔

میں نے سر گھما کر کوتوالی کا جائزہ لیا تو شدید دھماکوں کے ساتھ عمارت کا ایک حصہ گہرے سرخ شعلوں اور کثیف دھوئیں میں گھرا ہوا تھا۔ بھاگ دوڑ کا اختتام ہونے پر نتھنوں نے فضا میں رچی ہوئی بارود کی تیز بو پہلے ہی محسوس کر لی تھی۔

پہلا موڑ آتے ہی میرے داہنے ہاتھ نے خفیف سی جنبش کی اور میرے ساتھ بیٹھا ہوا نامعلوم شخص ایک خفیف سا جھٹکا لے کر ساکت ہو گیا۔

دشمن کو اذیت پہنچائے بغیر ہلاک کرنے کا وہ طریقہ اس قدر سہل اور خوشگوار تھا کہ جب تک مرنے والے کو جھنجوڑا نہ جائے اس کی موت کا ظاہری حالت سے یقین کرنا دشوار تھا تاآنکہ زہر کے اثر سے اس کی جلد سیاہی مائل نیلی پڑنی شروع ہو جائے!

"ذرا تیز چلاؤ بھائی!" یہ کہہ کر میں نے بڑے زاویے سے اپنے جسم کو حرکت دیتے ہوئے ڈرائیور کے ساتھ والے کی گردن کے قریب شیشی کا دہانہ دبایا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس بار بھی شیشی نے میرا ساتھ دیا تھا۔

خرابی یہ ہوئی کہ میں نے جس وقت اس پر وار کیا اس نے ڈرائیور سے کچھ کہنا شروع کیا تھا مگر اس خوفناک زہر کے اثر سے وہ پہلا لفظ بھی مکمل نہ کر سکا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی یک لخت خاموشی اس قدر غیر فطری تھی کہ ڈرائیور چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

حلفہ چھوٹا سا شہر تھا اور کوتوالی سے چند منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد بھی جوزف امین کے مجوزہ مقام پر سفر کے اختتام کا امکان تھا لہٰذا میں عجلت میں تھا اور یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کار پر قابض ہوتے ہی سب سے پہلے اس کا رخ واپس گھماؤں گا تاکہ جوزف یا اس کے مجوزہ قید خانے کے قریب سے بھی گزرنے کا امکان باقی نہ رہے!

"ابوموسیٰ..... ابوموسیٰ۔" ڈرائیور نے دو بار اسے پکارا پھر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا ہو گیا اس کو؟ ابھی تو اچھا خاصا تھا۔"

"کار روکو تو دیکھتے ہیں!" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تم چپ رہو۔" اس نے غصیلے لہجے میں مجھے جھڑک دیا۔ پھر بولا۔ "تم کیوں خاموش ہو عبدالکامل؟ ذرا ابوموسیٰ کو تو دیکھو!" اسی کے ساتھ اس نے کار کی رفتار بھی بتدریج کم کرنی شروع کر دی تھی۔

ظاہر تھا کہ اس بار اس کا مخاطب پیچھے والا تھا۔ جو سننے اور بولنے کی مشقت سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر چکا تھا۔

"یہ بھی اونگھ رہا ہے۔" میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ "شاید تم لوگ ساری رات کے جاگے ہوئے ہو۔ عبدالکامل تو گرا جا رہا ہے مجھ پر!"

"ولدالحرام!" ڈرائیور کسی کا نام لئے بغیر دانت پیس کر غرایا۔ مگر اس کی آواز پر خوف غالب آ چکا تھا۔

یہ بات واضح تھی کہ اس نے دخل در معقولات پر مجھ ہی کو گالی دی تھی مگر میں یوں خاموش رہا کہ اس نے پوری قوت سے بریک لگا دیئے تھے۔

کار کے ٹائروں نے دبی دبی آواز میں احتجاج کیا اور کالی سیڈان کچھ دور تک گھسٹنے کے بعد رک گئی۔

میرا داہنا ہاتھ اس وقت ڈرائیور کی پشت گاہ پر رکھا ہوا تھا اور اس میں دبی ہوئی شیشی گالی کا ہولناک انتقام لینے کے لئے تیار تھی۔

شاید وہ اگنیشن بند کر کے میری طرف پلٹتا لیکن اس بدنصیب کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکی۔ سیڈان کے انجن کی عارضی خاموشی کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا انجن ہمیشہ کے لئے اپنی پٹڑی سے اتر گیا اور چار لاشوں کے درمیان دو مفرور بیٹھے رہ گئے۔ جن کے حصے میں برابری کے اصول سے فی کس دو لاشیں آتی تھیں مگر یہ خوش نصیبی تھی یا بدنصیبی کہ میں دو گھنٹے سے بھی کم عرصے میں یکے بعد دیگرے چار خون کر چکا تھا اور اگر بدکلام اجنبی مر جاتا تو یہ تعداد پانچ ہو جاتی۔

کھیل کے میدان میں مسلسل تین گول کئے جائیں تو ہیٹ ٹرک کا اعزاز ملتا ہے مگر چار انسانوں کی زندگی گول کرنے والے کے لئے بے نام اندیشوں کی گہری دھند میں ڈوبا ہوا غیر یقینی مستقبل تھا جس کے بارے میں کوئی قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہمارے فرار کی راہ کی آخری رکاوٹ جوزف امین کے ڈرائیور کو ٹھکانے لگا کر کالی سیڈان پر قبضہ کرنا تھا اور یہ مرحلہ بھی غیر متوقع کامیابی کے ساتھ نمٹ گیا تھا مگر میری دھڑکن ابھی تک برقرار تھی جو آخری لمحات میں حوالات میں ستا رہی تھی۔

میں نے خیالات کی رَو ابھرنے کے باوجود کام میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور عبدالکامل کی لاش عقبی پائیدان پر لڑھکا دی۔ اسی اثنا میں ہاشم نیچے اتر کر ڈرائیور کی لاش ابوموسیٰ کے قدموں میں گھسیٹ چکا تھا۔ میں نے پیچھے سے ابوموسیٰ کو بھی وہیں گرا دیا اور ہاشم نے پھرتی سے اپنی نشست سنبھال کر انجن اسٹارٹ کر لیا۔

"کار واپس گھما لو!" میں نے پیچھے سے ہدایت دی۔

"ہاں واپس ہی لے رہا ہوں۔" وہ مہارت سے یوٹرن لیتے ہوئے بولا۔

"تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پیچھے ایک جگہ صحرائی شاہراہ کی نشاندہی کرنے والا بورڈ دیکھا تھا۔ اس کے مطابق ہمیں واپس ہی جانا ہوگا۔"

اس کا جواب سن کر مجھے خوشی ہوئی ورنہ شاہراہ کی تلاش بھی بجائے خود ایک مہم تھی۔ کیونکہ سوڈان کی سرحدی مواصلاتی رابطے ہاشم کے لئے بھی اجنبی تھے!

ویران اور خوابیدہ شہر سے نکل کر ہم صحرائی شاہراہ پر گھومے تو میری رسٹ واچ چار بجے کر بارہ منٹ بتا رہی تھی یعنی دھماکے سے اس وقت تک کل ساڑھے تیرہ منٹ میں ہم نے اپنے فرار کے مجوزہ منصوبے کو پوری کامیابی سے عملی جامہ پہنا دیا تھا!

"تم بہت سفاک آدمی ہو!" کچھ دیر بعد ہاشم نے سکوت توڑا تو اس کے لہجے میں کرب تھا۔ ڈیش بورڈ کی مدھم روشنیوں کے انعکاس میں اس کے بشرے پر بھی اداسی اور رقت چھائی ہوئی

محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو ہاشم؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ "جس نے میری مجبوریوں کو اتنے قریب سے دیکھا ہے!"

"دشمن کا خون کرتے ہوئے تم انسان نہیں رہتے، پتھر بن جاتے ہو جس کے سر سے کوئی احساسات نہیں ہوتے۔ میں جتنی دیر میں پہلے وار کا فیصلہ کرتا، تم نے تین انسانوں کو مشینی انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور تمہارے لہجے یا چہرے پر ذرا بھی ملال نہیں ہے!"

"وہ جوزف کے پروردہ تھے، چھٹے ہوئے مجرم!"

"وہ جو بھی رہے ہوں مگر انسان ہی تھے۔" اس نے کہہ ڈالا۔ "اور انسان کے لہو کی بڑی حرمت ہے، اسے پامال کرتے ہوئے دل کے کسی گوشے میں ذرا سی کسک تو ہونی چاہیئے۔ جرم ایک چیز ہے اور احساسِ جرم اس سے ماورا ایک دوسرا لطیف جذبہ ہے۔ جس سے تم یکسر عاری ہو ــــ بُرا نہ ماننا، یہ بات میں پہلے بھی کہنی چاہتا تھا مگر آج خود بخود زبان پر آگئی، میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں مگر پھر بھی یہ کہنے پر مجبور رہوں۔"

"تم اپنی جگہ ٹھیک کہتے ہو۔" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد میں نے اس کے خیالات کی قدر کرتے ہوئے کہا۔ "پہلی بار انسانی خون بہاتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ میرا دل بھی لرز رہا تھا۔ تمہارے اپنے آلام و مصائب بھی کچھ کم نہیں ہیں لیکن تم نے شاید ان حالات کا عشرِ عشیر بھی نہ دیکھا ہوگا جن سے میں دوچار ہوتا آیا ہوں۔ میں نے اپنی سرکشی کو بہت دبایا ہوا ہے ورنہ شاید میری ذات یکسر اپنی پہچان کھو بیٹھتی!"

"مجھے معاف کر دینا۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں تمہارا دکھ کریدنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی یہ وقت اس گفتگو کے لئے موزوں تھا مگر تم سے اتنی اپنائیت ہو گئی ہے کہ زبان کھل ہی گئی۔ میری باتوں کا ملال نہ کرنا!"

"تم مجھے جوتے بھی لگا لو گے تو شاید تمہارے سامنے میں ہتھیار تو کیا ہاتھ بھی نہ اٹھا سکوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ عقیدت مندانہ لہجے میں بولا۔ "مجھے یہی تو حیرت ہے، تمہاری شخصیت کے دو متضاد روپ ہیں۔ ایک گداز، مہربان اور شفیق دوست کا اور دوسرا سراپا انتقام، بھیانک دشمن کا۔"

"ان میں ایک روپ ہے دوسرا بہروپ!" میں نے اس کی بات مذاق میں ٹال دی۔ "شاید تم رفیق کو بھول گئے۔ معصوم اور بے ضرر نظر آنے والا شخص آخر میں کس قدر عیار اور مکار ثابت ہوا۔"

"اس کی دوست عابدہ ایک بدکار لڑکی تھی مگر مجھے اس کی موت کا ملال ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "رفیق اسے طویل عرصے تک دھوکا دیتا رہا۔"

"یہ میرے وطن کی تلخ یادوں میں سے ایک ہے۔" میرے تصور میں کراچی ابھر آیا!

روشنیوں کا شہر جس کی کچھ بستیوں کو ہر رات اژدہے نگلتے ہیں جہاں پیسہ محنت کے بجائے پیسے سے کمایا جاتا ہے۔ کراچی میں میں نے محنت کی تو نانِ شبینہ سے بھی محتاجی کی نوبت آگئی اور جب میں نے سمندری کاموں کا رُخ کیا تو زرداروں کی فہرست میں میرا نام بھی ایک چھوٹی سی جگہ پانے کا اہل ہو گیا۔ کراچی ایک شہرِ خرابات تھا جہاں محبت، رفاقت، عداوت اور رقابت کے سارے جذبے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ شہر کو بڑا رنگین چھوڑ کر آیا تھا، نہ جانے اس میں کیا کیا تبدیلیاں آئی تھیں۔ میری سوچ کا دائرہ پھیلتا رہا لیکن کراچی کی سرحدیں پوری نہ آئیں۔

میں روانی میں نہ جانے کس کس کی کہانیاں سنائے جا رہا تھا۔ ہاشم عقیدت مندانہ انہماک سے میرا ایک ایک لفظ کو سن رہا تھا۔ صحرائے نوبی ریت کا ایک عظیم الشان سمندر تھا جو تاروں کی مدھم روشنی میں تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا اور حدِ نگاہ پر بس اور اندھیرا تھا۔ ریت کی سطح پر ٹیلے ہوئے وحشی ہواؤں کے لہر اس وقت پُراسرار سے لگ رہے تھے جیسے کوئی دیو ہیکل عفریت سناٹے میں اپنی ہتھیلی پھیلائے پڑا ہو کہ کوئی آنے والا اس کی ریکھائیں دیکھ کر اسے آنے والے دنوں کا حال سنا سکے۔

صحرا میں حلفہ کے بعد شاہراہ سے دُور کہیں کہیں دیئے لو دیتے نظر آئے جو شاید چھوٹی چھوٹی صحرائی بستیوں کی نشاندہی کر رہے تھے مگر کالی سیڈان کہیں رُکے بغیر تیز رفتاری سے سیدھی بڑھتی ہی رہی۔

پانچ بجے سڑک سے ذرا دُور تین اونٹوں پر مشتمل ایک کارواں مخالف سمت سے آتا نظر آیا جو محض ایک نفری تھا۔ آگے والے اونٹ پر ایک سوڈانی بڑی تمکنت اور لاپروائی سے بیٹھا تھا۔ پچھلے دو اونٹوں پر سامان لدا ہوا تھا اور وہ سر جھکائے میرِ کارواں کے پیچھے چلے آرہے تھے۔

"پَو پھٹنے والی ہے!" ہاشم نے کہا۔ "صحرا میں کاروبارِ زندگی کا آغاز ہو چکا ہے، اب راستے میں شاہراہ کے متوازی سفر کرتے متعدد قافلے نظر آئیں گے۔"

"صحرا نشینوں کی صبح کچھ جلدی ہو جاتی ہے؟"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "گرمی ہو یا جاڑا، صحرا میں دن کا وقت بہت کٹھن ہوتا ہے لہٰذا یہ لوگ اپنا زیادہ سے زیادہ کام منہ اندھیرے ہی نمٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دن خیموں میں آرام کر کے گزار سکیں۔"

"ہم حلفے سے کتنی دُور آچکے ہیں؟"

"بہتر میل!" اس نے میٹر دیکھ کر جواب دیا۔

"اب ہمیں کار سے پیچھا چھڑا لینا چاہیئے۔" میں نے کہا۔ "جتنے کم لوگ ہم دونوں کو صحرا میں سفر کرتے دیکھیں اسی قدر اچھا ہے!"

"تمہارا خیال درست ہے!" اس نے فوری طور پر کار بائیں طرف تارتے ہوئے کہا۔ "جوزف کے آدمی ہماری تلاش میں صحرائے نوبی کا ہی رُخ کریں گے، انہیں ہمارے بارے میں کم سے کم معلومات ملنی چاہئیں۔"

سڑک کے کناروں سے چند سو گز دور تک ریت خاصی سخت تھی مگر ہاشم پھر بھی کار کو لہرا کر چلاتا رہا تاکہ ٹائروں کے نشانات سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکے کہ کار قابو سے باہر ہو کر ریت میں گھستی چلی گئی۔ اور پھر اس میں آگ لگ گئی۔

جہاں تک کار کے انجن نے ساتھ دیا، ہاشم بے دردی سے اسے آگے بڑھاتا رہا پھر نرم ریت میں سب سے پہلے کار کا ریڈی ایٹر لیک ہوا۔ انجن سے آوازیں ابھریں لیکن سفر جاری رہا۔ اندر آجانے کے بعد ہاشم نے کار کا رُخ سڑک کے متوازی کر لیا تھا مگر اسٹیئرنگ سے وہ مسلسل پوری طرح کام لے رہا تھا۔

آخر کار ایک ٹیلے کے قریب کار رُک دی گئی۔

لاشوں کی حالت میں معمولی ردّ و بدل کے بعد کار کی تلاشی لی گئی جس میں خاصی رقم اور کچھ اسلحہ ہاتھ لگا۔ خورد و نوش کی چند چیزیں بھی تھیں جو جیبوں میں اُڑس لی گئیں پھر ہم نے جوزف کے دو آدمیوں کی لاشوں سے ہر ایسی چیز نکال لی جو آگ سے متاثر ہونے کے باوجود شناخت میں کام آ سکتی تھی۔ اس سلسلے میں دھات کی اشیاء ہماری توجہ کا خاص مرکز بنیں پھر ہاشم نے ٹنکی سے فیول پمپ کو ملانے والا پائپ کھینچ لیا اور پٹرول کی پتلی سی دھار ریت پر گرنے لگی۔

ہم نے کار میں موجود کپڑے کے ٹکڑے پٹرول میں تر کر کے اندر پھینک دیئے اور اپنے ہاتھ ریت میں خشک کرنے کے بعد ایک کپڑا جلا کر کار میں اچھال دیا، دوسرا پٹرول والے پائپ کے قریب پھینک دیا اور تیز آواز کے ساتھ کار جلنے کا عمل شروع ہو گیا۔

جب تک آگ کے شعلے خطرناک صورت اختیار نہ کر گئے، ہم محفوظ فاصلے پر رُکے رہے پھر ایک طرف چل دیئے۔

ہم تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ ایک زبردست دھماکا ہوا اور دھوئیں کے کثیف بادل میں لپٹے ہوئے نارنجی رنگ کے شعلے خاصی بلندی تک لپکنے لگے۔

ہم نے پلٹ کر دیکھا تو پوری کار بُری طرح جل رہی تھی شاید پٹرول کی ٹنکی پھٹ چکی تھی جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔

کار اور لاشوں کے بارے میں ہم دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور ہم ایک طویل چکر کاٹ کر جلد از جلد شاہراہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" ریت کے سمندر میں سمتوں کی احتیاط کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہاشم نے سوال کیا۔

"کسی بستی کا رُخ کرنا تو حماقت ہوگا، میرے ذہن میں ایک اور تدبیر آ رہی ہے۔" میں نے کہا اور وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "کسی سے ایک یا دو اونٹ خرید لئے جائیں.....!"

میری بات پوری ہونے سے قبل وہ مسرت سے اچھل پڑا۔ "اس سے بہتر اور محفوظ صورت ممکن ہی نہیں ہے، اونٹوں کی آڑ میں ہم صحرائی مسافروں کے روپ میں بستیوں میں بھی ایک آدھ رات قیام کر سکتے ہیں!"

"پھر شاہراہ تک پہنچنے میں عجلت کرو۔" میں نے کہا۔ "ہمارے لئے ابتدائی چند گھنٹے بہت قیمتی ہیں۔ ہمیں اس علاقے سے اتنی دُور نکل جانا چاہئے کہ تعاقب کرنے والے ہم تک نہ پہنچ سکیں اب تک تو شاہراہ سے کار کے شعلے بھی دیکھے جا چکے ہوں گے۔"

"ہاں!" اس نے رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ لوگ ابھی تک ہمیں حلفہ میں ہی ڈھونڈ رہے ہوں گے تو ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد حلفہ پہنچنے والا کوئی موٹر سوار صحرا میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کی خبر پہنچا دے گا۔" اس نے ایک لحظہ کے لئے توقف کیا پھر آہستہ سے بولا۔ "کام بگڑنے کا بس ایک ہی خطرہ ہے!"

"اب ہم بیشتر خطرات سے باہر ہیں!"

"کوئی کار والا تو شعلوں تک پہنچنے کی ہمت ہی نہیں کر سکے گا۔" اس نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ مدد کے نتیجے میں انعام یا لوٹ مار کے لالچ میں شتر سوار وہاں پہنچ کر آگ پر قابو پالیں اور لاشیں پوری طرح خاکستر نہ ہو سکیں۔"

"آگ بُری طرح بھڑکی ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "پٹرول کی آگ پر تجربہ کار لوگ بھی مشکل ہی سے قابو پاتے ہیں۔ بھلا یہ بے سر و سامان صحرائی تماشا دیکھنے کے علاوہ وہاں کیا کر سکیں گے؟"

"انہیں بے سر و سامان نہ کہو۔" وہ بولا۔ "ریت ہر قسم کی آگ کا بہترین توڑ ہے اور دس پندرہ صحرائی مٹھیوں سے ریت اچھال اچھال کر دیکھتے ہی دیکھتے کار کو ریت میں دفن کر دینے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"امید نہیں ہے۔" میں نے پلٹ کر شعلوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "جب آگ سے ٹائر پھٹ کر دُور دُور تک اُڑیں گے تو کوئی قریب جانے کی ہمت بھی نہ کر سکے گا۔ بس تم اب دوڑ لگانی شروع کر دو!"

نرم ریت پر چلنا ہی کیا کم دشوار تھا کہ دوڑنے کا آغاز ہو گیا۔ ہر قدم زمین پر ٹکتے ہی کئی کئی انچ اندر دھنس رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم چند ہی منٹ میں اس بُری طرح ہانپ گئے کہ سانس درست کرنے کے لئے رکنا لازمی ہو گیا۔

ہمارے چاروں طرف ریت ہی ریت تھی اور مجھے وہاں سمتوں کا کوئی احساس باقی نہیں تھا۔ ہم جلتی ہوئی سیڈان سے بہت دور نکل آئے تھے مگر پھر بھی صحرا کے ایک حصّے میں دھوئیں اور شعلوں سے آلودہ فضا دور سے نظر آ رہی تھی۔

" تمہیں یاد ہے نا کہ ہمیں سستانے کے بعد کس سمت میں بڑھنا ہے؟" میں نے نرم اور ٹھنڈی ریت پر دراز ہو کر سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

" ہمیں شمال مشرق کی سمت بڑھنا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

" میرا خیال ہے کہ صحیح سمت میں کوئی نشانی رکھ دو تاکہ سوائے گی کی سمت بالکل درست رہے۔" میں اس کے منہ سے شمال مشرق سُن کر پریشان ہو گیا کیونکہ ریت کے اس بیکراں سمندر میں اس قدر صحت کے ساتھ سمت کا تعین دشوار تھا۔

" مشرقی گوشوں میں پھیلتی ہوئی سفیدی ہماری مدد کرے گی۔ تم بے فکر رہو، بھٹکائے بغیر شاہراہ تک لے جاؤں گا۔" وہ میری پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

" اب ہمیں شاہراہ تک پہنچنے کے لئے مختصر ترین راستہ اختیار کر لینا چاہئے۔ ورنہ بہت تاخیر ہو جائے گی۔" اس کا اطمینان میری تشویش میں کمی نہ لا سکا۔

" تو پھر چلو۔" وہ زمین سے اٹھ گیا۔

میں نے کالی سیڈان کے ڈیش بورڈ سے برآمد ہونے والے اسکاچ کے سربند ادھّے کو کھول کر تلخ لاوے کے دو گھونٹوں سے اپنا حلق تر کیا اور ہاشم کے ساتھ ہو لیا۔

صبح صادق کے ملگجے اجالے میں خنک صحرائی ہوائیں عجیب سرور دے رہی تھیں۔ اگر تعاقب میں آنے والوں کا خوف نہ ہوتا تو شاید میں سورج طلوع ہونے تک ایک ہی جگہ رک کر صحرا کے اس رومان انگیز طلسم سے لطف اندوز ہونے کو ترجیح دیتا مگر اس وقت متوقع خطرات کا خوف ساری جمالیاتی حسوں کو نگل گیا تھا اور میں جلد از جلد صحرا کے سینے پر سیاہ ناگن کی طرح لہراتی ہوئی شاہراہ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔

آسمان پر تیزی سے اجالا بڑھتا جا رہا تھا اور نسبتاً دور تک دیکھنا بھی ممکن ہوتا جا رہا تھا اور پھر ایک تودے کی انتہائی بلندی پر پہنچتے ہی خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چند فرلانگ کے فاصلے پر صحرائی شاہراہ چمک رہی تھی۔

فاصلے کے بارے میں میری رائے سن کر ہاشم بے اختیار ... پڑا۔ "کھلے صحرا میں فاصلوں کا اندازہ اتنا صحیح نہیں ہوتا ... اب بھی کئی میل دور ہے۔"

" تو مجھے یہ سراب نظر آ رہا ہے۔"

" سراب تو محض نظر کا فریب ہی ہوتا ہے اور ... میں یا سورج کی حرارت میں نظر آتا ہے جب سطح زمین کے ... ہوا زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ تم کو شاہراہ ضرور نظر آ رہی ہے ... نزدیک نہیں ہے۔"

اور بعد میں اس کی بات درست ثابت ہوئی ... منٹ کی زبردست جدوجہد کے بعد ہم شاہراہ کے کنارے ... کی اس پٹی میں داخل ہو گئے جو کارروانوں کی گذرگاہ تھی اور ... بھی نسبتاً آسان تھا۔

میرے لئے صحرا میں سورج طلوع ہونے کا منظر بھی ... دلکش ثابت ہوا۔ سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہونے سے کئی ... ہی ہر طرف اس قدر شفاف اجالا پھیل گیا تھا کہ ہر چیز بالکل ... دیکھی جا سکتی تھی اور جب تھوڑی دیر بعد سورج پوری طرح طلوع ... تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے دوپہر ہونے والی ہو کیونکہ صحرا ... دور تک کہیں بھی سائے کا نشان نہیں تھا۔ ہر طرف سنہری ریت ... نظر آ رہی تھی۔

وہ سورج کی کرنوں کی نرم اور لطیف حرارت ہی تھی جس ... دوپہر کے تصوّر کو پائیدار ہونے کی مہلت نہ دی۔

ایک بار شاہراہ کے قریب آنے کے بعد ہم دوبارہ تدریجاً ... چلے گئے اور ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں حلفہ کی مخالف سمت ... بڑھنے لگے۔ یہ احتیاط محض اس لئے کی گئی تھی کہ سڑک سے گزرنے ... دو پیدل مسافروں کو دیکھ کر کسی شبہ کا شکار نہ ہو جائیں۔

چند منٹ کے بعد ہمارے کانوں میں کسی انجن کی مدھم ... گونج ابھری جو ہوا کی لہروں کے ساتھ چند ثانیوں تک ابھرتی ... معدوم ہوتی رہی پھر اس میں تسلسل پیدا ہو گیا۔

" شاید کسی کار کے انجن کی آواز ہے مگر اس کی سمت کا اندازہ ... نہیں ہو رہا۔" میں نے کہا۔ "آواز چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی ہے۔"

" یہ صحرائی گونج ہے، چند ثانیوں بعد اندازہ ہو سکے گا۔" ... نے کہا اور تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے بتایا کہ وہ کار ... وادیٔ حلفہ کی طرف سے آ رہی تھی۔

اس کار کو خاصی دیر بعد ہم نے ایک ٹیلے کی اوٹ میں ... شاہراہ سے گزرتے دیکھا اور پھر آگے چل دیئے۔

سات بجے میں نے کچھ دور شاہراہ کے کنارے ایک شخص ...

اونٹ کے ہمراہ بیٹھے دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ نہایت اطمینان سے اس لق و دق صحرا میں ریت پر بیٹھا تھا قریب ہی اس کا اونٹ بھی آسودہ انداز میں بیٹھا جگالی میں مصروف تھا مجھے اس کا وہاں بیٹھنا نہایت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ کسی ہنگامی ضرورت کے تحت وہاں رکا ہوا تھا تو اس کے انداز میں اس قدر اطمینان نہ پایا جاتا اور اگر وہ سوچ سمجھ کر وہاں رکا تھا تو اس کا مقصد کیا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ کھانے پینے کے لئے رکا ہو — میں نے سوچا مگر چند ثانیوں کے جائزے کے بعد اس خیال کی بھی تردید ہو گئی اس کے کسی طریقے سے خورد و نوش کی حرکات و سکنات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

" اس بادیہ نشین کے پاس چلیں؟" ہاشم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ شاید اس نے اسی وقت اس شخص کو دیکھا تھا۔

" مجھے تو یہ پُراسرار بلکہ مشکوک سا نظر آتا ہے۔"

" ارے نہیں۔" اس نے لاپروائی سے ہنس کر کہا۔ "کچھ بیچ رہا ہو گا یہ شخص۔"

" بیچ رہا ہو گا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ "اس ویرانے میں جہاں دور دور تک اس کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آ رہا۔"

" ہاں — شاہراہ سے گزرنے والوں کی دلچسپی کی ایک آدھ چیز بھی بیچ کر یہ لوگ خاصی رقم کما لیتے ہیں۔ آؤ دیکھیں تو سہی یہ کیا بیچ رہا ہے؟"

" ہمیں دیکھ کر بھڑک نہ جائے۔"

" نہیں۔ یہ لوگ عموماً بہت حریص اور دروغ گو ہوتے ہیں اس سے بات کرتے ہوئے ذرا ہوشیار رہنا۔"

" حرص کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، جہاں غربت ہو وہاں لالچ پیدا ہو ہی جاتا ہے مگر دروغ گوئی والی بات میری سمجھ سے تو بالا ہے۔"

" دروغ گوئی کی حد تک مبالغہ کہہ لو۔" اس نے وضاحت کی۔ "صحرا میں پیدائش سے وفات تک ان کی زندگی اس قدر یکساں اور بندھے انداز میں گذرتی ہے کہ یہ اجنبیوں کی نگاہوں میں اہمیت حاصل کرنے اور انہیں بے وقوف بنانے کے لئے فی البدیہہ محیّر العقول بلکہ سنسنی خیز کہانیاں تراش لیتے ہیں اور اپنی بستی کے لوگوں کو شام کے وقت چوپال میں اس جھوٹ کو اپنے کارنامے بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس بہانے یہ اپنی یکساں زندگی میں تھوڑا سا تنوع اور ہیجان پیدا کر لیتے ہیں۔"

" بڑی گہری نظر ہے تمہاری ان خانہ بدوشوں پر!"

" خانہ بدوش ان سے بہتر ہوتے ہیں۔" اس نے میری تصحیح کی۔ "وہ ایک جگہ سے اکتا جاتے ہیں تو ٹھکانا بدل لیتے ہیں، جہاں زندگی کی نئی کہانیاں ان کی زندگی میں ہلچل پیدا کئے رہتی ہیں، یہ تو نسلوں سے صحرا کی ایک ہی بستی میں رہنے والے کنوئیں کے مینڈک ہوتے ہیں جو سنسنی خیزی کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔"

" پھر تو تم ہی اس سے بات کرنا۔" میں نے اس کے ہمراہ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

" یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" اس نے کہا۔ "تمہیں یوں ہوشیار کر دیا کہ اس کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین نہ کر لینا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے رہے اور اسے اس وقت تک ہماری آمد کا علم نہیں ہوا جب تک ہم اس کے سر پر پہنچ نہ گئے کیونکہ ہوا کی سمت بھی مخالف تھی اور وہ ہماری طرف پشت کئے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ریت پر ایک بڑا سا رومال بچھا ہوا تھا جس پر کھجور کے تنکوں سے بنی ہوئی متعدد آرائشی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں مردانہ اور زنانہ گڑیاں میری توجہ کا مرکز بنے بغیر نہ رہ سکیں۔

" سلام یا اخ!" پیچھے سے ہاشم نے بلند آواز سے کہا اور وہ خوفزدہ ہو کر بُری طرح اچھل پڑا۔

" سلام!" اس نے اٹھ کر مشکوک اور خوفزدہ نگاہوں سے باری باری ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

" کیا بیچ رہے ہو؟" ہاشم نے آگے بڑھ کر ریت پر بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے سوال کیا۔

وہ ایک دراز قد اور ادھیڑ عمر شخص تھا جس کے چہرے پر سیاہ رنگ کی خاصی بڑی داڑھی موجود تھی۔ اس نے شمالی سوڈان والوں کے مخصوص انداز میں اپنے سر پر سفید عمامہ باندھا ہوا تھا جو اس کی شخصیت میں ایک خوبصورت اضافہ تھا۔

" یہی سب ہے۔" اس نے اپنی چمکدار آنکھیں مجھ پر جما کر کہا۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور اچانک کہاں سے نمودار ہو گئے؟" اس کے لب و لہجے میں اب بھی خوف باقی تھا۔

اس کی حیرت دیکھ کر مجھے مذاق سوجھا اور میں نے کہہ ڈالا — "کہو تو ابھی غائب ہوئے جاتے ہیں، صحرائی روحوں کو آنے جانے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔"

میری بات پوری ہونے سے پہلے اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ برآمد ہوئی اور وہ بلند آواز سے لاحول پڑھتا اچھل کر ایک طرف بھاگ لیا مگر ہاشم نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔

وہ جو کچھ بھی رہا ہو مگر تھا بہت سادہ لوح اور ہمیں اس کی خاصی مدد کی ضرورت تھی۔ اس کے بھاگ نکلنے کے بعد ہم مفت میں اُونٹ پر قابض ہو سکتے تھے مگر ایسی صورت میں وہ نہ جانے کس کس کو ہماری کہانی اور اپنے اونٹ کی نشانیاں بتا کر ہماری راہ میں روڑے

اٹکا دیا۔

ہم دونوں خاصی دیر میں اسے یہ اطمینان دلا سکے کہ ہم اسی جیسے انسان تھے اور ہمارے اونٹ راستے میں قیام کے دوران کسی وجہ سے بھڑک کر سازوسامان سمیت فرار ہو گئے اور ہم آدھی رات سے مدد کی تلاش میں صحرا میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

"پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" خوف دور ہو جانے کے بعد وہ اپنی پرانی جگہ سنبھالتے ہوئے محتاط لہجے میں بولا۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہ علاقہ کون سا ہے؟" ہاشم نے کہا۔

"الاخضار۔" اس نے کہا۔ "سڑک سے چار میل اندر اس نام کا نخلستان ہے جہاں سبزیاں کاشت ہوتی ہیں۔" اس نے سڑک کے پار اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم وہیں رہتے ہو؟"

"میں جبل الصوف میں رہتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "یہ اس طرف ڈیڑھ دو میل اندر ہے۔"

"اپنا اونٹ فروخت کرو گے؟" ہاشم نے اس کی طرف دیکھے بغیر نرم لہجے میں پہلا براہ راست سوال کر ڈالا۔ "مسافر ہیں، دعائیں دیں گے۔"

"جہاں جانا ہو، میں پہنچا دوں گا۔ مجھے کرایہ دے دینا۔" اس کے لہجے میں قدرے گرمجوشی عود کر آئی جو بہتر مفاہمت کی علامت تھی۔

"منزل کا تو ہمیں خود بھی علم نہیں، ناکام رہے تو واپس وادی حلفہ لوٹ جائیں گے۔" ہاشم کی گفتگو کا نیا زاویہ میری سمجھ میں نہ آسکا۔

"کسی خزانے کی تلاش ہے؟" وہ آگے جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ اس کی طبیعت میں چھپے ہوئے تجسس کو یک بیک لمبی زقند لگانے کا موقع مل گیا۔

"صحرا میں خزانہ کہاں!" ہاشم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کاش کوئی خزانہ مل ہی جاتا تو دربدر بھٹکنے سے بچ جاتے۔"

"صاف صاف بتاؤ نا۔" وہ ہمدردی پر مائل ہونے لگا۔ "شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔" وہ بھانپ چکا تھا کہ جو لوگ اس سے اونٹ کی خریداری کا سودا طے کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کی جیبیں خالی نہیں ہو سکتیں۔

"ہمیں ایک عورت کی تلاش ہے۔"

"اوہ!" بے اختیار اس کے منہ سے ایک تحیر آمیز آواز نکلی۔ "تو تم بھی ان ہی کے ساتھی ہو، مگر وہ تو چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔"

"تو کیا کوئی اور بھی اس سلسلے میں تم سے ٹکرایا ہے؟"

"انجان نہ بنو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "جب غنڈہ گردی سے کام نہیں نکلا تو اب تم دونوں کو بھیجا گیا ہے۔ کیا وہ اب تک نہیں ملی؟"

"ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔" ہاشم نے اس کا رجحان بھانپ کر جلدی سے کہا۔ "ہم اس عورت کے ہمدردوں میں سے ہیں، وہ ان ہی غنڈوں کے خوف سے بھاگی پھر رہی ہے۔"

"پھر شاید تم کسی اور کی تلاش میں ہو۔" اس نے مایوسانہ [illegible] کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ شاید تم ان چاروں کی بات کر رہے ہو [illegible] میں نے غنڈوں سے چار روز پہلے خاصی مار بھی کھائی تھی۔"

"ہاں ہاں۔ ہم ان ہی کے لیے بھٹک رہے ہیں۔ [illegible] کی باندیاں ہیں۔" میں اضطراری طور پر پہلی مرتبہ دخل دے بیٹھا۔

"شتر سوار مسلح غنڈوں نے پچھلے چار پانچ روز سے [illegible] علاقے کی ساری صحرائی بستیوں کو ہراساں کیا ہوا ہے۔" اس نے [illegible] کیا۔ "چار روز پہلے خوفناک صورتوں والے چار شتر سوار جبل الصوف پہنچے تھے۔ پہلے انھوں نے گولیاں چلا کر سب کو خوفزدہ کیا، پھر [illegible] مکینوں کو انھوں نے باہر نکال کر ایک ایک گھر کی تلاشی لی اور جب [illegible] نہ ملا تو بستی کے مردوں سے چار لڑکیوں کے بارے میں سوالات [illegible] ہر ایک چپ سادھے رہا، میری شامت نے دھکا دیا تو میں ان پر [illegible] طنز کر بیٹھا جس پر ان میں سے ایک نے میرے منہ پر کئی طمانچے مارے پھر [illegible] کر ٹھوکریں بھی لگائیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دامن اٹھا کر دائیں [illegible] کی پسلیاں ہمارے سامنے کر دیں جن پر زخموں کے کھرنڈ موجود تھے۔

اس نمائش کے ذریعے شاید اس نے اپنا بھاؤ بڑھانے کا [illegible] حربہ استعمال کیا تھا جس کی مطلق ضرورت نہیں تھی کیونکہ سوڈان [illegible] پہلا شخص تھا جو سیتا کے فرار کے بعد کے حالات کے بارے میں [illegible] تھا۔ اور میں اسے بھرپور انعام دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ دوسری بستیوں میں بھی گئے تھے؟" ہاشم اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں ہر روز یہیں بیٹھتا ہوں، ادھر سے گزرنے والوں کی [illegible] مجھے پورے صحرا کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔" اس نے فخر آمیز لہجے میں [illegible] "چار لڑکیوں اور ان کے خون کے پیاسوں کی کہانی شاید قرب و جوار کے ہر رہنے والے کے علم میں آچکی ہے۔"

اب تک اس نے جو کہا وہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔ [illegible] جوزف امین کے آدمیوں کی ناکام مہم کے بارے میں ہمیں وادی حلفہ [illegible] ہی ابوسلطان کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ اس صحرائی کی باتوں سے معلوم [illegible] میں بس اتنا اضافہ ہوا کہ جوزف امین کے آدمیوں نے سیتا کا سراغ [illegible] کرنے کے لیے تحکم اور سخت گیری کا رویہ اپنایا تھا۔

"تم کہہ رہے تھے کہ جبل الصوف کے مردوں نے لڑکیوں کے بارے میں چپ سادھ لی تو کیا وہ کچھ جانتے تھے؟" ہاشم نے سوال [illegible]

وہ پرغرور انداز میں ہنسا۔ "جبل الصوف کے لوگ تحکم کو پسند نہیں کرتے اور پھر وہ لڑکیاں بھی مظلوم نظر آتی تھیں۔ وہ ان غنڈوں کی یلغار سے ایک رات پہلے ہی پریشان حال جبل الصوف پہنچی تھیں۔ صحرا سے بالکل ناواقف تھیں۔ ہماری عورتوں نے خوشخبرانہ نظروں [illegible]

[illegible] استقبال کیا تھا مگر جب انھوں نے بتایا کہ وہ ایک بردہ فروش [illegible] سے بھاگی ہیں جو انھیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا تو انھیں [illegible] دلیتی میں رو کنے کے بعد دو اونٹ دے کر آگے روانہ کر دیا۔۔۔ [illegible] شریف تھیں وہ چاروں لڑکیاں۔"

"جبل الصوف والوں نے دو اونٹ مفت دے دیے؟" ہاشم نے [illegible] گھورتے ہوئے اس بار قدرے تیز آواز میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ اونٹ تو مفت ہی دیتے تھے۔" وہ ہڑبڑا کر بولا۔ [illegible] جاتے ہوئے انھوں نے اپنی خطیر رقم اور کچھ زیورات ہمیں انعام میں دیے۔"

معاً مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اس صحرائی کے اندر چھپا ہوا سنسنی پسند داستان گو بیدار نہ ہو گیا ہو جو فی البدیہہ داستانیں سنانے میں ماہر تھا۔ اور یہ امکان خاصا قوی تھا۔ وہ خود بتا چکا تھا کہ اس علاقے میں بسنے والا ہر شخص چار لڑکیوں کے قصے سے بدمعاشوں کے طفیل واقف ہو چکا تھا لہٰذا اس کے لیے ہمیں لڑکیوں کا ہمدرد سمجھتے ہوئے ان کے جبل الصوف پہنچنے کی کہانی تخلیق کرنے کا بہترین موقع تھا۔

"مگر بستی میں ناکامی کے بعد۔" اس کی بات بدستور جاری تھی اور اب اس کا لہجہ تحقیر آمیز ہو گیا تھا۔ "وہ غنڈے اپنے ساتھ کئی زیورات اور خاصی رقم بھی لے گئے۔" اس نے خاموش ہو کر حقارت سے ریت پر تھوکا۔

"فکر نہ کرو، ہم تمہارا نقصان پورا کر دیں گے۔" ہاشم نے کہا اور وہ اپنی حکمت عملی کی کامیابی پر کھل اٹھا۔

"میرا دل گواہی دیتا تھا کہ ہمارا نقصان رائیگاں نہیں جائے گا۔ دیکھو مقدر نے تمہیں مجھ سے کس طرح لا ملایا ہے۔ تم چاہو تو میرا اونٹ لے جاؤ۔ میں دو ڈھائی سو پونڈ میں کوئی دوسرا اونٹ خرید لوں گا۔" اس نے مکاری سے کام لیتے ہوئے اپنے اونٹ کی قیمت بھی از خود لگا دی تھی۔

"دو ڈھائی سو پونڈ؟" ہاشم نے جگالی کرتے ہوئے اونٹ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "پچاس پونڈ میں تو حلفہ میں اس سے کہیں جاندار اور خوبصورت اونٹ مل جاتا ہے۔" ہاشم نے اس کی بتائی ہوئی رقم میں ضرور کمی کی تھی لیکن اس کی اپنی پیشکش بھی بہت فیاضانہ تھی کیونکہ میری دانست میں وہ اونٹ کسی طرح پندرہ بیس پونڈ سے زیادہ مالیت کا نہیں تھا۔

"ارے تو میں اپنا یہ دوست بیچ کب رہا ہوں۔" پچاس پونڈ سن کر وہ گردن میں آگیا۔ "یہ اونٹ تمہارے پاس میری یادگار رہے گا۔ تم پچاس تو دے دینا۔ بہترین سدھایا ہوا جانور ہے اور کھانے کو بھی کچھ نہ ملے تو بھی ریت سونگھ کر زندہ رہ لیتا ہے۔"

اس کی ہرزہ سرائی سن کر میرے ذہن میں یک بیک اس کا بیچ پرکھنے کی ایک تدبیر آگئی۔

"وہ لڑکیاں پہنچیں تو تم جبل الصوف میں ہی تھے؟" میں نے ممتانت سے [illegible]

اور سرسری لہجے میں سوال کیا کیونکہ میں اس نادر الوجود شخص کو غیر ضروری طور پر مشتعل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں نے خود انہیں اونٹوں پر سوار کرایا تھا۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

اس دوران میں شاہراہ سے دونوں سمتوں میں کئی موٹریں وغیرہ گزری تھیں مگر وہ شخص متوقع گاہک مل جانے کے باعث انہیں بھولا ہوا تھا۔

"تو پھر تم نے یہ بھی اندازہ لگایا ہوگا کہ ان کا تعلق کس علاقے سے تھا؟" میں نے سوچ سمجھ کر سوال کیا۔

"شمالی اور جنوبی سوڈان تو بڑی چیز ہے، میں تو لب و لہجے اور چہرے سے قبیلہ تک بتا سکتا ہوں۔" وہ اپنے بارے میں اذیتناک حد تک خوش فہمیوں میں مبتلا تھا۔ "مگر ان چاروں میں سے کوئی بھی لڑکی سوڈانی نہیں تھی۔"

وہ آزمائش میں پورا اترا تھا لہٰذا میں نے اس کی اب تک کہی ہوئی ہر ضروری اور غیر ضروری بات پر پورا یقین کر لیا۔

مگر ہاشم شاید ابھی تک غیر مطمئن تھا۔ "پھر کہاں کی لگتی تھیں وہ؟" وہ مسکراتے ہوئے اسے کرید رہا تھا۔

"جہاں کی بھی ہوں مگر سوڈانی ہرگز نہیں تھیں۔" اس نے پورے وثوق سے کہا۔ "سرخ و سفید رنگت اور تیکھے خدوخال یہاں کہاں ملتے ہیں اور ان میں تو ایک کی آنکھیں بھی کسی جھیل جیسی گہری نیلی تھیں۔"

میرا جی چاہا کہ اس صحرائی کی آنکھوں کو چوم لوں جس نے صحرائے نوبی کے ایک دور افتادہ حصے میں میری سیتا کو اتنے قریب سے دیکھا تھا مگر ہاشم کی گھورتی ہوئی نگاہوں نے ہر بے اعتدالی سے باز رکھا۔ وہ بھانپ گیا تھا کہ گفتگو کے اس غیر متوقع مرحلے پر میرے لیے جذبات سے مغلوب ہونا کس قدر سہل ہوگا۔

"وہ کس طرف گئی تھیں؟" ہاشم نے پوچھا۔

"وہ تعاقب سے خوفزدہ تھیں۔" اس نے کہا۔ "میں نے انھیں قطب نما بھی دیے تھے اور وہ میری بستی سے مغرب کی طرف گئی تھیں، ادھر صحرا بہت خوفناک سمجھا جاتا ہے اس لیے کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ اس غیر آباد ریگستان میں دس بارہ میل اندر گھسنے کے بعد میں نے انہیں جنوب کی طرف جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر انہوں نے سمتوں کا خیال رکھا ہوگا۔ تو پچیس تیس گھنٹوں بعد ہی کسی بڑے شہر کی طرف جا نکلی ہوں گی۔"

"کبھی تم خود ادھر گئے ہو؟"

"صحرا کا چپہ چپہ چھانا ہوا ہے مگر شہر جس سے بے خبر ہوں۔ لڑکیوں کو جو راستہ بتایا وہ بزرگوں سے سنا ہوا تھا۔ لڑائیوں میں ہار کے بعد وہ اسی طرف بھاگتے تھے۔ اور خود دیار نکل جاتے تھے مگر پیچھا کرنے والے صحرا میں بھٹک کر بھوک کے پیاسے مر جاتے تھے اور اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ نہ ویسی

لڑائیاں ہیں اور نہ ویسی دشمنیاں۔" اس مرتبہ پہلی بار اس نے اپنی ذات کے بارے میں مبالغہ آرائی سے گریز کیا تھا۔

"ہمارے ساتھ چلو گے؟" ہاشم نے سوال کیا۔

"کہاں؟"

"لڑکیوں کی تلاش میں، اسی راستے پر۔" ہاشم نے کہا۔

"مگر میری روزی....."

ہاشم نے اس کی بات کاٹ دی: "اس شاہراہ پر اوسطاً کیا کما لیتے ہو؟"

"کبھی کبھی تو سو پونڈ بھی کما لیتا ہوں۔" موقع پاتے ہی وہ پھر مبالغہ آرائی پر اتر آیا۔ "بس یہ سمجھ لو کہ ساری کمائی محنت کی ہے۔ ہماری عورتیں یہ چیزیں بناتی ہیں اور جبل الصوف کے چار آدمی اسی شاہراہ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے یہ اشیا بیچتے ہیں اور تیئیس افراد کے کنبے کی کفالت کرتے ہیں۔"

"سو پونڈ؟" ہاشم نے حیرت سے دہرایا۔

"ہماری دکانداری کے بھی گر ہیں۔" وہ ہاشم کی حیرت کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "آنے والی کاروں کے مسافروں کو ہمارا پہلا آدمی بہت دام بتاتا ہے اگر وہ نہ پھنسیں تو پھر آگے والے دام کم بتاتے ہیں۔ حتیٰ کہ آخری آدمی کے پاس گاہک رک جائے تو اپنی مرضی کے داموں پر چیز لے لیتا ہے مگر یہ نوبت کم ہی آتی ہے۔"

"میں نے تم چاروں کی مشترکہ آمدنی نہیں پوچھی تھی۔" ہاشم نے کہا۔

"تیس چالیس تو کما ہی لیتا ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ گفتگو کی حد تک وہ ہر معاملے میں فیاض ثابت ہو رہا تھا۔

"سنو! میں آسمان سے نہیں اترا ہوں۔" ہاشم نے اس بار ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "ہم تمہیں پچاس پونڈ انعام دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے دس دس پونڈ کے پانچ نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔ "اب چاہو تو پچاس میں اپنا اونٹ ہمارے حوالے کر دو یا پندرہ پونڈ یومیہ پر صحرا کے راستے کسی شہر تک ہماری رہنمائی کرو، واپسی میں اپنے جانور لیتے آنا۔"

"چلو بیس پونڈ یومیہ۔" میں نے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کر کہا۔ اور اس نے رومال کا ایک کونہ پکڑ کر سب چیزیں ریت پر اچھال دیں۔

اس کے چہرے پر تذبذب نہیں بلکہ بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ پندرہ پونڈ یومیہ کمانے والا ہے کہ میں نے مزید پانچ بڑھا دیے اور وہ خوشی میں آپے سے باہر ہو گیا۔

"یہ تمہاری روزی ہے اسے یوں نہ پھینکو۔" میں نے کھجور کے تنکوں سے بنی ہوئی نازک آرائشی اشیا ریت سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ نہ بھولو کہ مسلسل سفر کی صورت میں صحرا دو دن سے بھی کم عرصے میں عبور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی چالیس پونڈ کمانے کے بعد اگلے ہفتے تم کو پھر یہیں بیٹھنا ہو گا۔"

اچانک اس کا منہ لٹک گیا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں تو کئی چار چھ سو پونڈ گھوم رہے تھے۔"

"بہرحال میں تمہیں کم از کم دو سو پونڈ ضرور دوں گا۔" میں نے ... "خواہ ہم چند گھنٹوں میں ہی صحرا کے اس پار نکل جائیں۔"

اس نے عجلت کے ساتھ تنکوں کا سامان رومال میں باندھا ... کی مہار تھام کر ہمارے ساتھ پیدل ہی صحرا میں چل دیا۔ دو سو پونڈ کی یقین ... نے اس کا دماغ معلق کر دیا تھا۔

"کام نکل جانے کے بعد تمہارا ارادہ بدل تو نہیں جائے گا؟" ... راستے میں جھجکتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"مرد کی ایک زبان ہوتی ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"واپسی میں، میں تنہا ہوں گا۔" تھوڑے سے توقف کے دوران ... نے ایک بہترین عذر تراش لیا۔ "اور تمہیں مجھے دو سو پونڈ دینے ہی ہیں ... کیوں نہ دے دو۔ یہ رقم واپسی میں لوٹ مار کے خطرے سے محفوظ ہو جائے ... اسے میں گھر چھوڑ دوں گا۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "تم بہت حریص آدمی ہو۔ رقم لینے ... اگر تم ہمیں صحرا میں ہانک کر واپس لوٹ آئے تو کیا ہو گا؟"

"میں بھی مرد ہوں۔" وہ طرارے میں آ گیا۔ "چاہو تو میں تمہیں ... خنجر گھر سے دے دوں گا۔ جب بھی تم سے منہ پھیروں، بے دریغ میری انتڑیاں ادھیڑ ڈالنا۔"

"چیزیں بیچنے میں تمہاری زبان ایک نہیں رہتی ہو گی۔" میں نے ... سے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"دکانداری کا بھلا مردانگی سے کیا تعلق۔" وہ بے حیائی سے ... "آنے جانے والوں سے سنتا ہوں کہ خرطوم میں تو لڑکیاں بھی مال بیچنے لگی ہیں ..."

وہ مسافت سست رفتاری سے طے کی گئی پھر اس نے بتایا کہ ... والے آخری ٹیلے کو عبور کرنے کے بعد جبل الصوف کی بستی آ جائے گی۔

اور جب ہم گہری ریت میں اپنا بوجھ گھسیٹتے اس ٹیلے پر چڑھ رہے تھے تو اچانک فضا پستول کے فائر کے ہولناک دھماکے سے گونج اٹھی ... اسی کے ساتھ ایک کرب ناک مردانہ چیخ صحرا کے سناٹے میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔

"تم یہیں رکو۔" میں نے ہاشم سے نگاہیں چار ہونے کے بعد ... دل کے ساتھ اس شخص سے کہا۔ "اونٹ کو بھی بٹھا لو۔"

"مگر کیوں؟ یہ دھماکہ کیسا تھا؟ وہ چیخ جبل الصوف سے ابھری ..." وہ بہت زیادہ خائف ہو گیا تھا اور اس کی زندہ دلی تشویش میں بدل گئی ...

"تم ٹھہرو۔ ہم اوپر جا کر دیکھتے ہیں۔" ہاشم نے نرم لہجے میں اسے دلاسہ دیا۔ اور ہم دونوں تیزی سے اوپر جانے لگے۔

چوٹی کے قریب پہنچ کر ہم سینے اور پیٹ کے بل اوپر سرکنے لگے ... دوسری طرف سے ہمیں نہ دیکھا جا سکے اور پھر وہ چار شتر سوار ہمیں بیچ ... چند خیموں کی اس مفلوک الحال بستی کے وسط میں نظر آ گئے جن کے ہاتھوں ... آتشیں اسلحہ موجود تھا۔

ان کے سامنے خوف زدہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی افلاس زدہ بھیڑ موجود تھی۔ اور ان میں ہی کوئی ایک بدنصیب اپنے لہو میں لتھڑا صحرائے نوبی کی زرد ریت پر پڑا ہوا تھا۔

جبل الصوف میں چار لڑکیوں والی کہانی خونریز انداز میں دہرائی جا رہی تھی۔ اس بار ان بھیڑیوں پر جھلاہٹ میں خون سوار ہو چکا تھا۔ لڑکیاں فرار ہوئیں اور وہ منہ پیٹ کر رہ گئے۔ اس بار شاید ان کے آقا نے ان اطراف میں جلی ہوئی میڈان دریافت ہونے کے بعد ان درندوں کو جاری تلاش کا حکم دیا تھا۔ اور جبل الصوف کی قریب ترین بستی کے مکین ان کے ستم کا پہلا نشانہ بنے تھے۔

ہم دونوں نے اپنے پستول نکال لیے لیکن فاصلہ اتنا زیادہ تھا پستول بستی میں پہنچے بغیر بالکل بے سود تھے۔

میں

نے سر اٹھا کر ایک بار پھر اس مفلوک الحال صحرائی بستی کا جائزہ لیا۔ اس بار ان چاروں میں سے ایک شتر سوار تحکم آمیز انداز میں اپنا اسلحہ والا ہاتھ زور زور سے لہرا کر کچھ کہہ رہا تھا۔

"میں اوپر آ جاؤں؟" ہمیں ڈھلان پر اپنے عقب سے جبل الصوف کے باسی کی خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔

"ٹھہرو، ہم واپس آ رہے ہیں۔" ہاشم نے الٹے قدموں واپس سرکتے ہوئے کہا۔

ہم واپس لوٹے تو اس کے چہرے سے دہشت عیاں تھی اور وہ امید و بیم کی کیفیت میں ہم دونوں کی طرف نگراں تھا۔

"کیا دیکھا تم نے؟" اس نے سرسراتی ہوئی خوفزدہ آواز میں سوال کیا۔

"شاید وہی بدمعاش دوبارہ جبل الصوف آ پہنچے ہیں۔" میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈھلان سے نیچے لے جاتے ہوئے کہا۔ "اس بار شاید ان کی شامت ہی انہیں ادھر لائی ہے وہ یہاں سے زندہ نہیں جا سکیں گے۔"

"تت... تم ان سے ٹکراؤ گے؟" وہ اپنے اونٹ کی مہار کو خفیف سا جھٹکا دے کر بے اعتباری سے ہکلایا۔

"بس تم دیکھتے جاؤ۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"یوسف!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری مانو تو ان سے الجھنے کا ارادہ ترک کر دو۔ میری بستی میں رکھا ہی کیا ہے، ایک گھنٹے سر مار کر خود ہی واپس چلے جائیں گے۔ اگر تم مارے گئے تو قصہ ہی ختم ہو جائے گا، اور انہیں زک اٹھانی پڑی تو بعد میں وہ زیادہ نفری کے ساتھ جبل الصوف پر حملہ آور ہوں گے اور ہمیں بے خانماں کر کے ہماری عورتوں کی بے آبروئی کریں گے تم صحرا کے مسافر ہو، بھلا کب تک ہمارا ساتھ دے سکو گے؟"

"تم یہ بھول چکے ہو کہ وہ پہلی گولی چلا کر اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔" ہم نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ جبل الصوف کے بوسیدہ خیموں کے درمیان تمہارا کوئی قریبی عزیز زخمی یا مردہ حالت میں صحرائے نوبی کے سینے پر بیٹا ہو۔"

اس کے چہرے پر کرب اُمڈ آیا۔ "ہم ایسے حادثوں کے عادی ہیں۔ ہر ایک آدھ برس بعد ہم پر کوئی قدرتی یا انسانی آفت نازل ہوتی ہے اور ہمارے چند نفوس لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ جب تک انسان اپنے سانس پورے نہ کرے، دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں مار سکتی، اور جن کا وقت پورا ہو جاتا ہے وہ ریشمی بستروں میں ہمیشہ کے لیے سوتے رہ جاتے ہیں۔ تم تصادم کی سوچو ورنہ میرا قبیلہ یہاں سے کوچ کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"اگر انہیں مار کر ہم ان کی لاشیں ریت میں دبا دیں تو قیامت تک کسی کو پتہ نہ چل سکے گا کہ وہ کبھی جبل الصوف آئے بھی تھے۔" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "تمہارے ساتھ اسلحہ بھی ہے مگر ان کی تعداد کتنی ہے؟"

"چار شتر سوار ہیں۔"

میرا جواب سن کر وہ پھیکے انداز میں ہنس دیا۔ "پھر انہیں بھول جاؤ، تم صحرائی مقابلوں کے طریقوں سے واقف نہیں ہو۔ وہ تم پر غالب آ گئے تو پاتال تک بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور اگر کمزور پڑنے لگے تو ان میں سے ہر ایک فرار کی کوشش کرے گا تاکہ جلد از جلد بھاری کمک لا کر تمہاری سرکوبی کر سکے۔ کھلے صحرا میں چار شتر سواروں کو گھیرنا یا روکنا تم دونوں کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔"

ڈھلان سے نیچے آ کر ہم تینوں رک گئے۔ میرے اور ہاشم کے ہاتھوں میں اس وقت بھی بھرے ہوئے پستول موجود تھے مگر اس بسیار گو صحرائی نے اپنی منطق سے میرے لیے کسی پیش قدمی کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔

"تمہاری بستی کے پیچھے کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے ہیں۔ ہم حملہ آوروں کی نگاہ میں آئے بغیر کسی طرح وہاں پہنچ سکتے ہیں؟" قدرے توقف کے بعد ہاشم نے شاید میری مدد کے لیے بات آگے بڑھائی۔

"مشکل ہے۔" یوسف نے بے بسی سے کہا۔ "دوسری طرف ٹیلوں کی آڑ میں پہنچنے کے لیے ہمیں کم از کم تین چار سو گز ہموار رتیلے میدان سے گزرنا ہو گا جو جبل الصوف سے بالکل صاف نظر آتا ہے، ہم فوراً دیکھ لیے جائیں گے۔"

"تم اپنا لباس اور اونٹ مجھے دے دو۔" میں نے ڈھلان کی آڑ میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "اور تم میرے ساتھی کے ہمراہ یہیں رکے رہو، میں تنہا بستی میں جاؤں گا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" یوسف سے پہلے ہی ہاشم بول پڑا۔ "تمہاری ظاہری حالت بدلنے سے بستی والے دھوکا نہیں کھائیں گے اور شتر سوار تمہیں پکڑ لیں گے یا مار ڈالیں گے، ایسے احمقانہ اقدام سے بہتر تو یہی ہے کہ یہاں رک کر ان کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔ بلکہ اب ہمیں یہی کرنا ہو گا۔"

"میں اپنا چہرہ یوسف کے رومال سے چھپا لوں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ دُور سے مجھے بالکل بھی نہ پہچان سکیں گے، ہر شخص مجھے یوسف ہی سمجھے گا اور میں اونٹ کو دوڑاتے ہوئے ان چاروں پر یکایک گولیاں برسا دُوں گا۔۔۔ منصوبہ خطرناک ضرور ہے لیکن مجھے اس کی کامیابی کا پورا یقین ہے۔ ہمیں ان کو گھیرنا چاہیے۔"

"اس کی ایک ہی صُورت ہے۔" یوسف نے زبان کھولی۔ "اگر یہ ان ہی میں سے ہیں جو پچھلی بار لڑکیوں کی تلاش میں آئے تھے تو ان کی واپسی شمال کی طرف ہوگی اور یہ ریتیلے ٹیلوں کے درمیان واقع ہموار ریتیلے میدان سے گزریں گے، وہاں تم ٹیلوں کی اوٹ سے بے خبری میں ان پر کاری وار کر سکتے ہو۔"

"مگر تم نے تو بتایا تھا کہ وہ سپاٹ گزرگاہ تین چار سو گز چوڑی ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "اگر انھوں نے انتہائی سرا اختیار کیا تو وہ ہمارے ہتھیاروں کی زد سے باہر ہوں گے۔"

"دعا کرو کہ یہ وہی ہوں، پھر تم خود کو اُن کے سروں پر پاؤ گے۔" یوسف بولا۔ "وہ میدان وسیع ضرور ہے مگر نرم ریت میں قدرے سخت صحرائی پگڈنڈی ہماری سمت والے ٹیلوں کے قریب سے گزرتی ہے، وہ اس لگے بندھے راستے سے انحراف نہیں کریں گے کیونکہ نرم ریت میں اونٹوں کی رفتار نہ صرف سُست ہو جاتی ہے بلکہ وہ جلدی تھک جاتے ہیں۔"

"تو پھر اسی طرف چلو، یہاں کیوں کھڑے ہو؟" میں نے اُسے آگے دھکیل کر کہا، اس کی تجویز مجھے بہت مناسب معلوم ہوتی تھی۔

ہم تیز رفتاری سے ٹیلوں کی اوٹ میں آگے بڑھتے رہے۔ اسی دوران میں یوسف پورے انہماک سے صحرائی ہواؤں کے دوش پر ابھرنے والی کسی غیر معمولی آواز کی گھات میں لگا رہا تھا جو ہمیں ان چاروں کی نقل و حرکت کی خبر دے سکے۔

آخر ایک جگہ ہمیں تھوڑی سی چڑھائی چڑھنی پڑی۔

یوسف کے بیان کے مطابق وہ صحرائی پگڈنڈی کے قریب واقع آخری ریتیلا ٹیلا تھا اور تھوڑی سی بلندی پر پہنچنے کے بعد ہمیں نیچے پگڈنڈی نظر آنے لگی۔

ریت کا وہ بے ہنگم تودہ بمشکل سو فٹ اونچا تھا مگر اس صحرائی خطے میں اس کا وجود بھی کسی زبردست مورچے سے کم نہیں تھا۔

یوسف نے اپنا اونٹ اسی ڈھلان پر ایک جگہ بٹھا دیا تھا اور وہ سعادت مند جانور وہاں بیٹھ کر اس قدر خلوص سے جگالی میں مصروف ہو گیا تھا جیسے یوسف نے اگلا حکم صادر نہ کیا تو اپنی ساری عمر اسی مقام پر، اسی مشغلے میں گزارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

اس ٹیلے سے بھی جبل الصّوف کی بستی صاف نظر آ رہی تھی مگر اس بار فاصلہ قدرے زیادہ ہو گیا تھا۔

سُورج کی چمکتی ہوئی روشنی میں بستی کے مکین بدستور ایک جگہ جمع نظر آ رہے تھے۔ ان کے قریب دو شتر سوار موجود تھے جب کہ بقیہ دو اُونٹ خالی کھڑے تھے۔

یہ صورتحال دیکھ کر ہم تینوں نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا کہ شتر سواروں نے حسبِ سابق جبل الصوف والوں کی باتوں کا یقین نہ کرتے ہوئے خیموں کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا تھا اور ان کے دو ساتھی اس کام میں مصروف تھے۔

"یہ دُوسری بار ان عورتوں کی تلاش میں جبل الصوف آئے ہیں۔" یوسف تشویش زدہ انداز میں بڑبڑایا۔ "ایسا نہ ہو کہ انہیں کہیں سے یہ سُن گُن مل گئی ہو کہ وہ چاروں عورتیں ہماری مدد سے مغرب کی طرف فرار ہوئی تھیں۔"

"ان وسوسوں کو بھول کر آنے والے وقت کی تیاری کرو۔" میں نے اس کی پشت پر ہاتھ مار کر کہا۔ "پستول چلا لیتے ہو؟"

اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ہم گھر سے نکلتے ہیں تو اپنے لمبے رومال کے ایک سرے میں چند مٹھی ریت باندھ لیتے ہیں۔ کسی بھی مقابلے میں وہ رومال ہمارا بہترین ہتھیار ہوتا ہے۔ ریت کی ننھی سی گٹھڑی کی ضرب ادھر بھٹک آنے والے درندے کا بھیجا توڑ ڈالتی ہے۔"

"پھر تم یہیں رُک کے رہنا۔" میں نے کہا۔ "میرا اشارہ ملے بغیر اپنی جگہ سے باہر آئے تو بے موت مارے جاؤ گے۔"

"مجھے خوفزدہ نہ کرو۔" وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بھونڈے انداز میں ہنسا۔ "ویسے میں تمھارے ہی مشورے پر عمل کروں گا۔"

میں نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلگا لیا اور پھر ہاشم کے ساتھ ایسی جگہ تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا جہاں سے پگڈنڈی کا خاصا حصّہ ہماری زد میں ہوتا۔

"ان لڑکیوں سے تمھارا کیا تعلق ہے؟" مورچے بن جانے کے بعد یوسف نے وہ سوال کر ہی ڈالا جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا۔

"نیلی آنکھوں والی ہمارے سردار کی بیٹی ہے اور باقی تین اُس کی رازدار باندیاں ہیں۔" ہاشم نے فوراً جواب دے کر میری مشکل آسان کر دی۔

"تمھارا سردار؟" یوسف نے بے اعتباری سے کہا۔ "تو کیا بڑے شہروں میں بھی قبیلے اور سردار ہوتے ہیں؟"

"زندگی رہی تو تمھیں اپنے سردار سے ملوائیں گے۔" ہاشم نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"مگر سردار کی بیٹی یوں صحرا میں کیوں بھاگی پھر رہی ہے؟" یوسف کے ذہن میں تجسّس پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

"لمبی کہانی ہے۔" ہاشم گہرا سانس لے کر بولا۔ "اسے غنڈوں نے اُٹھا لیا تھا۔ ہم کھوج نکالتے غنڈوں تک پہنچے تو وہ ان کی قید سے بھاگ چکی تھی۔"

"مگر اس نے لوٹنے کے بجائے آگے فرار ہونا کیوں پسند کیا؟"

"تم مرد ہو کر ان غنڈوں سے خوفزدہ ہو، وہ تو پھر لڑکیاں ہی تھیں۔ واپس لوٹنے کی کوشش کرتیں تو ان سے دوبارہ ٹکراؤ ہو جاتا۔"

"ہوں۔" اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی پھر یوں گویا ہوا جیسے اسے اچانک کوئی اہم نکتہ سُوجھ گیا ہو۔ "ان لڑکیوں کے دشمن تمام سوڈانی ہیں اور وہ خود باہر کی معلوم ہوتی تھیں۔ تم دونوں بھی باہر والے معلوم ہوتے ہو پھر یہ دشمنی کیسے شروع ہو گئی؟"

"اپنے دماغ پر اتنا زور نہ دو۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "صحرا میں بیٹھ کر تمھیں دُنیا بہت وسیع معلوم ہوتی ہے۔ باہر نکلو تو یہ بڑی مختصر نظر آئے گی۔ اب تم خاموش رہو اور ہمیں کچھ اور بھی سوچنے دو۔"

"سوچو سوچو۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "جس دن میں نے باہر کی دُنیا دیکھ لی، تو میں بھی تمھاری طرح سوچنے لگوں گا۔"

وہ ہم سے ذرا دُور ریت پر چت لیٹ گیا اور اپنی آنکھوں پر اُس نے رُومال ڈال لیا تاکہ سورج کی چمک سے اس کی نگاہیں محفوظ رہیں۔

ہمارے لیے وہ صورتحال جو بھی رہی ہو مگر یوسف کے لیے پریشان کُن اور خوفناک ضرور تھی اس کے کنبے کا کوئی فرد ایک گولی کا شکار ہو چکا تھا اور چار خون آشام درندے ابھی تک جبل الصّوف میں دندناتے پھر رہے تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ واپسی سے قبل وہ بستی میں اور کیا گل کھلانے کے عزائم رکھتے تھے لیکن ابتدائی دہشت کے بعد یوسف اب اس طرح پُرسکون نظر آ رہا تھا جیسے اُسے صورتحال کی کوئی فکر نہ رہ گئی ہو۔

اس نے ان حملہ آوروں کو مقدر سمجھ کر قبول کر لیا تھا جس پر اس کا یقین اٹل تھا لہٰذا اُن کی لائی ہوئی ہر مصیبت بھی اس کے نزدیک مقدر ہی کا ایک حصہ ہوتی جس سے فرار نہ پاتال میں ممکن تھا اور نہ فضاؤں میں۔

پھر جب انسان کسی بات کو اپنے اختیار سے اس قدر ماورا تصوّر کرے تو اس مد میں ذہنی یا جسمانی صعوبتیں جھیلنا خودساختہ عذاب سے کم نہیں ہوتا اور یوسف ایسی کسی حماقت کے ارتکاب پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تم نے یوسف کو دیکھے رہنے کی ہدایت کیوں کی ہے؟" کئی منٹ کے بوجھل سکوت کے بعد ہاشم نے مجھ سے سوال کیا۔

"وہ ہمارے لیے قطعی بے مصرف ہے۔"

"لیکن ان پر چار کے مقابلے میں تین کی نفری کا خاصا نفسیاتی دباؤ ہوگا۔" ہاشم نے کہا۔ "اسلحے کے ساتھ نفری کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔"

"پھر تو میں چاہوں گا کہ انتہائی ضرورت کے بغیر تم بھی سامنے نہ آنا۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

"وہ کیوں؟" ہاشم نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہم دونوں نے بھی گولیاں چلائیں تو یہ مشکل ہوگا کہ پہلے ہی راؤنڈ

میں چاروں کا کام تمام ہو جائے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "پہلے وار سے بچنے والوں کو اگر برابر کے ٹکراؤ کا اندیشہ ہوا تو وہ مقابلے کے بجائے فرار اور بھاری کمک کے ساتھ فوری واپسی کی کوشش کریں گے اور اگر انھیں ٹیلے پر ایک ہی حریف نظر آیا تو وہ فرار کے بجائے اسے گھیرنے کی کوشش کریں گے اور یوں بآسانی ہم انہیں مار لیں گے۔"

"پھر تم یوسف سے لباس بدل ہی ڈالو۔" اس نے میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تمھیں دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ جبل الصوف کا کوئی سرپھرا باشندہ ان سے انتقام کے چکر میں ہے جو ذرا سی کوشش سے زیر کیا جا سکتا ہے۔"

"پھر میں آتشیں اسلحہ استعمال نہ کر سکوں گا۔" میں نے دھیمے سے کہا۔ "جبل الصوف والوں کے لیے آتشیں اسلحہ نامانوس معلوم ہوتا ہے۔"

اسی مقام پر ہماری گفتگو ختم ہو گئی کیونکہ بستی سے وہ چاروں شتر سوار واپس ہماری سمت میں آتے نظر آ رہے تھے۔

میں نے پرسکون انداز میں سینے کے بل ریت پر لیٹ کر اپنی پوزیشن درست کر لی۔ ہاشم بھی میرے برابر میں تھا۔

"پہلے فائر میں کم از کم دو کا کام تمام ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"دو کا؟" ہاشم نے حیرت سے دہرایا۔ "مگر تم نے مجھے منع کیا تھا۔"

"ایک دو سیکنڈ کے وقفے سے تم بھی ایک فائر صحیح نشانہ لے کر کر دو گے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں تمھارا پستول میں بائیں ہاتھ میں لے لوں گا اور کسی مناسب مرحلے پر بچ رہنے والے مقابل کو یہ دکھا دوں گا کہ میں بیک وقت دو پستول چلا رہا ہوں۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تم صحیح نشانے کا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو، فکر نہ کرو میں تمھاری توقعات پر پورا اتروں گا۔"

شتر سوار اس دوران میں خیموں سے آگے آ چکے تھے اور ان کی رفتار بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی اور وہ ایک ڈیڑھ منٹ میں اس ٹیلے کے قریب سے گزرنے والے تھے۔

"یوسف وہیں پڑے رہنا۔" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "وہ کسی بھی لمحے ادھر پہنچ سکتے ہیں۔"

"تم مدد کے لیے بھی پکارو گے تو سامنے نہیں آؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے تو ان خطرناک آدمیوں کے تصور ہی سے ہول آتا ہے۔"

گمبھیر صورت حال سے دوچار ہونے کے باوجود میں یوسف کی بزدلی پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اُن چاروں کے جسموں پر سوڈانی لباس تھے۔ اُن کے گندمی چہرے سامنے سے پڑنے والی سورج کی روشنی میں واضح طور پر خباثت سے بھرپور نظر آ رہے تھے مگر میں دیکھ لیے جانے کے خوف کے باعث تفصیل سے ان کا جائزہ نہ لے سکا۔

آخر کار وہ اتنے قریب آ گئے کہ ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں ہمارے کانوں میں آنے لگیں پھر چند ثانیوں کے لیے وہ ٹیلے کی اوٹ میں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس وقت وہ چاروں عین نیچے گزر رہے تھے۔

ہم دونوں اپنی کارروائی کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

جوں ہی وہ ٹیلے کی آڑ سے نمودار ہوئے میں نے ایک لمحے کے لیے ہاشم کی طرف دیکھا اور شست لے کر فائر کر دیا۔

اس وقت ہم ان کے عقب میں خاصی بلندی پر تھے، لہٰذا میرا فائر کارگر رہا اور ان میں سے ایک اپنی پشت پر گولی کھاتا ہوا ایک چیخ کے ساتھ ریت پر گر گیا۔ اس سے قبل کہ اس کے بقیہ تینوں ساتھی کچھ سمجھتے چند سیکنڈ کے بعد ہی ہاشم نے گولی چلا دی۔ اس بار میں نے دوسرے شتر سوار کو گردن تھامے ریت پر ڈھیر ہوتے دیکھا۔

اس ناگہانی آفت سے بوکھلا کر بقیہ دو نے اپنے اونٹوں کو بھگانا چاہا مگر میں نے پے در پے تین فائر کر کے ان میں سے ایک کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا اونٹ اپنے سوار کو ریت پر پھینک کر بلبلاتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔

میں نے ہاشم کے ہاتھ سے پستول لے کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور دونوں ہاتھوں میں پستول لے کر دوڑتا ہوا ڈھلان سے قدرے نیچے آ گیا۔

کچھ دور پہنچ کر چوتھا شتر سوار رک چکا تھا اور مڑ کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ دھماکوں سے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کا گمنام دشمن پستول سے مسلح تھا اور اس وقت وہ کسی بڑے سے بڑے بور کے پستول کی بھی زد سے باہر تھا۔

اس نے اپنے شانے سے جھولتی ہوئی رائفل اتار کر اونٹ کی پشت سے میرا نشانہ لیا تو مجھے فوری طور پر ریت پر گر جانا پڑا۔

اسی لمحے ایک ہولناک دھماکا ہوا اور میرے قریب بارود کی تیز بو بکھر گئی۔ اس شخص کا نشانہ بہت عمدہ تھا اور مجھے احتیاط کی ضرورت تھی۔

رائفل کی مار سے بچنے کے لیے ریت پر گرتے ہوئے میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میری اور ہاشم کی گولیوں کا نشانہ بننے والوں میں سے دو ریت پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے مگر تیسرا اٹھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اپنا سر قدرے اوپر اٹھایا اور فضا رائفل کے نغمے سے گونج اٹھی۔ اگر میں نے سر فوراً ہی نیچے نہ کر لیا ہوتا تو چند انچ اوپر سے گزرنے والی رائفل کی گولی نے میرا بھیجا اڑا دیا ہوتا۔ رائفل کی گونج سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ چوتھا شتر سوار مجھے اپنی کمین گاہ میں دبکے رہنے پر مجبور کر کے تیزی سے واپس لوٹ رہا تھا۔ تاکہ اپنے تین ساتھیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ہی مجھ پر کاری وار کر کے مفلوج کر سکے۔

میں نے دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور اپنے اس عیار دشمن کو محض خوفزدہ کرنے کے لیے نشانے کی پروا کیے بغیر بیک وقت دونوں پستول چلا دیے اور فوراً ہی اگلا دھڑ دونوں کہنیوں پر زمین سے اوپر اٹھا لیا۔

چوتھا شتر سوار ٹیلے سے نسبتاً قریب آ کر اونٹ کی پشت سے نیچے اتر چکا تھا۔ اس کا زخمی ساتھی اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا اور رائفل کو کسی لاٹھی کی طرح سہارا لے کر لنگڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت چوتھے کی توجہ اپنے زخمی ساتھی پر مرکوز تھی کیونکہ اس نے برابر بھر لینے پر رائفل نہیں چلائی تھی۔

وہ قریب آنے کے باوجود پستول کی زد سے باہر تھا لہٰذا میں نے فرار ہوتے ہوئے زخمی دشمن کی پشت کا نشانہ لے کر خود کار پستول کی لبلبی دبا دی۔ اور وہ ایک ہولناک چیخ کے ساتھ فضا میں اچھل کر ریت پر ڈھیر ہو گیا۔

پستول کا دھماکا اور اپنے ساتھی کی چیخ سن کر چوتھے کو اپنی حماقت اور غفلت کا احساس ہوا مگر اس کے فائر سے پہلے میں دوبارہ زمین سے چپک چکا تھا۔

تین کے بارے میں مجھے پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ مرے ہوں یا زندہ رہے ہوں مگر میرے لیے بے ضرر ہو چکے تھے البتہ چوتھے کا صحیح سلامت زندہ رہنا میرے لیے خطرناک تھا جبکہ میرے پاس موجود ایک پستول کے چیمبر میں صرف ایک اور دوسرے میں پانچ گولیاں باقی رہ گئی تھیں لہٰذا میں نے سیفٹی کیچ چڑھا کر پھرتی سے جیب میں موجود گولیاں یکے بعد دیگرے دونوں پستولوں میں بھریں اور سیفٹی کیچ ہٹا کر اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گیا۔

"وہ ابھی تک تمھیں اکیلا ہی سمجھ رہا ہے۔" اپنے قریب ایک سرگوشیانہ آواز سن کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔

سر گھمایا تو ہاشم میرے قریب ہی ریت پر پڑا ہوا تھا۔ وہ گوریلا کارروائیوں کے ضمن میں باقاعدہ تربیت یافتہ تھا اور شاید اپنی اسی مہارت کے سہارے میری لاعلمی میں کہنیوں اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا میرے قریب آ پہنچا تھا۔

"گدھے کی اولاد، ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ ورنہ فنا کر دوں گا۔" صحرا کی طرف سے قہر اور غصے میں ڈوبی ہوئی للکار سنائی دی جو یقیناً چوتھے آدمی کی تھی۔

جواب دیے بغیر میں نے اس کی طرف ایک اندھا دھند فائر کر دیا جو بجائے خود اس کے مطالبے کا مسکت جواب تھا۔

اس بار فائر کا اثر حسب توقع رہا اور جھلاہٹ کے عالم میں اس نے فحش گالیوں سے نوازنے کے ساتھ ہی بزدلی اور کمینگی کے طعنے بھی دے ڈالے۔

اس کے فائر کے ساتھ ہی میں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اس کی پوزیشن کا جائزہ لیا اور فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے بارود کی دھوئیں کے مدھم سے سرمئی غبار سے اندازہ لگایا کہ اس نے بڑی چالاکی کے ساتھ مزید آگے بڑھ کر چٹیل صحرا میں اپنے لیے ایک جیتا جاگتا مورچہ قائم کر لیا تھا جو زمین پر بیٹھے اور جگالی کرتے ہوئے ایک اونٹ کی صورت میں میرے اور اس کے درمیان پوری طرح حائل تھا۔

شاید اس نے مجھے اٹھتے دیکھا ہو گا مگر وہ فوری طور پر گولی نہ چلا سکا کیونکہ ہر ایک یا دو فائروں کے بعد اسے رائفل لوڈ کرنی پڑ رہی ہو گی اور میں نے اسی متوقع وقفے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

"وہ مسلسل آگے آ رہا ہے۔" میں نے ہاشم کو اس کا پستول واپس کرتے ہوئے کہا۔ "اسے زندہ پکڑنا ضروری ہے کیونکہ اس کے تینوں ساتھی شاید مر چکے ہیں۔ تم عقبی ڈھلان سے نیچے اتر جاؤ اور ٹیلے کی اوٹ سے ایک دو فائر کرو۔ وہ ٹیلے کو خالی سمجھ کر اپنی رائفل کے زعم میں بے خوف اوپر چلا آئے گا اور میں اسے جا لوں گا۔"

اسی وقت یوسف کا اونٹ پے در پے دھماکوں سے گھبرا کر بلبلاتا ہوا ٹیلے سے اتر بھاگا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت ہمارے پاس صرف ایک ہی اونٹ تھا جس کی وجہ سے نامعلوم دشمن کو میرے

تنہا ہونے کا یقین ہو سکتا تھا۔

"وہ میرے اور تمہارے جسمانی فرق سے چوکنا نہ ہو جائے۔" ہاشم نے پستول لیتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"وہ ابھی تک مجھے پوری طرح دیکھ ہی نہیں سکا ہے۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ "جو تمہیں اس کے سامنے تو نہیں جانا ہے وہ مغالطے میں پڑ جائے گا۔"

ہاشم نے لیٹے ہی لیٹے سرعت سے اپنی سمت تبدیل کی اور ناہموار تودوں کی آڑ میں پیٹ کے بل ڈھلان پر رینگتا ہوا اوپر جانے لگا۔ اس وقت مجھے بس ایک ہی خدشہ تھا کہ کہیں ہمارا دشمن نشیب سے اسے نہ دیکھ لے لیکن ہاشم میرے دیکھتے ہی دیکھتے ریت کے اس انبار میں کہیں غائب ہو گیا۔ میرے لیے وہ لمحات سنسنی خیز اور صبر آزما تھے۔ محاذ پر دونوں طرف پُر ہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اسلحے کے اعتبار سے میرے حریف کو مجھ پر برتری حاصل تھی اور مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ مجھ پر اگلا وار کس سمت سے کرے گا۔

بظاہر آسان نظر آنے والا وہ معرکہ عملی طور پر نہایت جانگسل ثابت ہو رہا تھا۔ وقت دھیمے دھیمے رینگتا رہا مگر میں سر اٹھا کر سامنے کا جائزہ لینے کی ہمت نہ کر سکا۔

چند منٹ کے بعد ٹیلے کے دہن سے پستول کا دھماکا ہوا تو میں نے اپنے وجود میں آسودگی کی ایک لہر ابھرتی محسوس کی۔ ہاشم ٹیلے کے عقبی دامن میں پہنچ چکا تھا۔ اور اس نے یقینی طور پر دشمن کو دیکھنے کے بعد فائر کیا تھا۔

پھر رائفل چلی اور اس کی آواز اس قدر قریب سے ابھری تھی کہ میں سناٹے میں آ گیا۔ شاید چوتھا آدمی دھیمے دھیمے پیش قدمی کرتا ٹیلے کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔

دونوں طرف سے وقفے وقفے سے گولیوں کا تبادلہ ہوا اور ہر بار رائفل کی آواز کی سمت میں تبدیلی آتی رہی۔ چوتھا شخص میری توقع کے مطابق ٹیلے پر چڑھتا آ رہا تھا۔ شاید وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک بار بلندی پر پہنچنے کے بعد وہ نیچے بھٹکتے ہوئے دشمن کے پستول کی زد سے محفوظ ہو جائے گا۔ اور پھر بے خوفی سے اسے تاک کر رائفل کی لمبی مار سے گرا لے گا۔

ایک مرتبہ پھر سناٹا چھا گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر فضا ایک تیز چیخ اور پھر مسلسل چیخوں سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی ایسے ہلکے دھماکے بھی سنائی دیے جیسے کوئی وزنی بوجھ ڈھلان پر نیچے کی طرف لڑھکتا جا رہا ہو۔

"آؤ جلدی آؤ۔" اسی کے ساتھ فضا میں یوسف کی ہذیانی آواز سنائی دی۔ "میں نے گولیاں چلانے والے کو نیچے پھینک دیا ہے۔"

میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سیدھا ہونے پر مجھے چوتھا آدمی ڈھلان پر نیچے جاتا نظر آ گیا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سپاٹ ڈھلان اسے بدستور نیچے لیے جا رہی تھی۔ اس کی چیخیں بھی غضبناک غراہٹوں اور گالیوں میں ڈھل چکی تھیں۔

اس کی طرف دوڑنے سے پہلے میں نے ایک نگاہ میدان کار زار پر ڈالی۔ وہاں تین انسان بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔

ریتلی ڈھلان پر نیچے کی طرف دوڑنے میں منہ کے بل گر کر لہولہان ہونے کا خطرہ بھی موجود تھا مگر میں اس کی پروا کیے بغیر دوڑ پڑا۔

"ہاشم --- باہر آ جاؤ۔" لمبی لمبی زقندوں میں کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں چلایا اور پھر رک کر ایک گولی چلا دی کیونکہ چوتھا آدمی نشیب میں رکتے ہی اٹھ کر اس طرف بھاگا تھا جہاں اس کے مردہ یا بے ہوش ساتھیوں کی بھری ہوئی رائفلیں پڑی تھیں۔

گولی اس کے نچلے دھڑ میں لگی اور وہ چیخ کر دہیں گر گیا۔ لیکن تھا وہ بہت سخت جان کہ زخم کھانے کے فوراً بعد ہی اٹھ کر دوبارہ آگے لپکا مگر اس دوران میں میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے گولی چلانے کے بجائے اس پر چھلانگ لگا دی اور ریت پر اسے دور تک رگیدتا چلا گیا۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے زیادہ قوی تھا مگر ناگہانی زخم اور پھر رائفل سے محرومی نے اس کے حواس باختہ کر دیے تھے۔ لہٰذا دو چار مکوں اور ناک پر پڑنے والی ایک بھرپور ٹکر نے اس کے سارے کس بل نکال دیے اور وہ آستین سے اپنی خون آلود ناک صاف کرتے ہوئے ریت پر ہی پڑا رہا۔

میں نے دو بٹ کر اس پر پستول تان لیا۔ اسی اثنا میں ہاشم بھی دوڑتا ہوا وہاں آن پہنچا۔

"یوسف کو بھی بلا لو۔" میں نے ہاشم سے کہا۔ "یہ مکار شخص اس کی بزدلی کا شکار ہوا ہے ورنہ یہ آنکھ مچولی شاید اتنی جلد ختم نہ ہوتی۔"

"تم کون ہو؟" زخمی نحیف آواز میں غرایا۔

"یہ تو تم بتاؤ گے میری جان،" میں نے خوشدلی سے کہا۔ "تم چاروں شروع سے ہماری توقعات کے مطابق عمل کرتے رہے ہو۔ امید ہے کہ اسی طرح زبان بھی کھول دو گے۔"

"اوہ!" اچانک اس کے منہ سے ایک متحیر آمیز آواز نکلی اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تم تو وہی ہو......"

"جس کی بو پر تمہارے آقا نے تمہیں صحرائے نوبی میں ہانکا تھا۔" میں نے ہنس کر اس کی بات مکمل کی۔ "مگر تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"میرے ہی سامنے علاقے کی پولیس تمہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔" اس نے کہا۔ ذہنی طور پر اس کی مدافعت یک بیک ختم ہو گئی تھی۔

"یعنی تم اسی سرکس کے مسخرے کے نمک خوار ہو؟"

"تم میرا جو حشر چاہے کر لو لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اب یہی صحرا تمہارا مدفن بنے گا۔ کار میں جلی ہوئی لاشیں پا کر پولیس تو شاید دھوکا کھا گئی مگر جوزف ابن تمہاری راہ پر لگ گیا ہے اور ہمارے آدمی ہر طرف بکھر گئے ہیں۔"

"ہم کو تمہارا کیا حشر کرنا چاہیے؟" میں نے اسی سے سوال کیا۔

"میں بتاتا ہوں۔" اچانک یوسف بول پڑا جسے شاید ہاشم اسی وقت وہاں لایا تھا۔ اس نے داہنے ہاتھ میں رائفل کو نال سے ایک لاٹھی کی طرح تھاما ہوا تھا۔

اس کے لہجے سے مجھے اس کے ارادے کا مطلق احساس نہ ہو سکا۔ مغلوبی انداز میں ارے ارے ہی کرتا رہ گیا اور اس نے رائفل کا کندہ پوری قوت سے قیدی کی ٹانگوں پر رسید کر دیا اور وہ بلبلا کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

مگر اس شدید جھٹکے کے نتیجے میں رائفل چل گئی اور اس کی گولی یوسف کی کلائی ادھیڑتی ہوئی گزر گئی جس پر وہ خود بھی ناچ اٹھا۔

مجھے یوسف کی اس حماقت پر شدید تاؤ آ گیا مگر اسے اپنے کیے کی سزا از خود مل گئی تھی لہٰذا میرا کچھ کہنا بے سود تھا۔

ہاشم اس کے زخم کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا اور میں ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے زخمی قیدی کو خاموش کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ شدید کرب کی حالت میں تھا اور غالباً اپنی زندگی سے بھی مایوس ہو چکا تھا کیونکہ اس کے تیور جارحانہ ہو گئے تھے۔

گفتگو کے دوران ایک مرتبہ جب میں نے اسے طعنہ دیا کہ جوزف ابن کچھ روز پہلے بھاگی ہوئی لڑکیوں کا سراغ نہ پا سکا تو بھلا ہمارا راستہ کیسے روک سکے گا۔ تو اس نے طیش میں آ کر صرف اتنا کہا کہ لڑکیاں وقتی طور پر ضرور کامیاب ہوئیں مگر جوزف نے ان کا کھوج نکال لیا تھا۔ اس سے آگے وہ شخص کوئی کارآمد بات نہ بتا سکا۔ اور میں نے اس کی کنپٹی میں گولی مار کر اسے ٹوٹی ہوئی پنڈلیوں کی اذیت سے نجات دلا دی۔

اس کے تین ساتھی پہلے ہی مردہ تھے۔ دو گولیوں کا شکار ہوئے تھے اور تیسرا شاید اونٹ کی پشت سے بے طرح گر کر اپنی گردن کی ہڈی تڑوا بیٹھا تھا۔

میں ہاشم کے ساتھ ان چاروں کی تدفین کے لیے گڑھا کھودنے لگا اور یوسف کو پانچوں اونٹوں کو پکڑنے پر لگا دیا گیا کیونکہ صحرا میں گھومتے ہوئے آوارہ اونٹوں کو پہچان کر ان چاروں کا کوئی بھی ہمدرد یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ لونٹ جبل الصّوف کے قرب و جوار میں ہی اپنے سواروں سے محروم ہوئے ہوں گے۔

اوپر سے نرم ریت ہٹنے کے بعد زمین قدرے سخت ثابت ہوئی لیکن سوا گھنٹے کی مشقت کے بعد ایک وسیع گڑھا تیار ہو گیا۔ اسی اثنا میں یوسف بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ پانچوں اونٹ پے در پے دھماکوں سے بھڑک کر بھاگے ضرور تھے مگر سدھے ہوئے ہونے کی وجہ سے کسی سمت میں نہیں نکلے تھے بلکہ آس پاس ہی موجود تھے لہٰذا یوسف باآسانی انہیں یکجا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

چار لاشوں کی اجتماعی تدفین خاصا ناخوشگوار فریضہ تھا جسے بادلِ ناخواستہ انجام دینا ہی پڑا پھر وہاں سے خون ریزی کے تمام نشان مٹانے کے بعد ہم دو رائفلوں اور ان کے فاضل کارتوسوں سمیت اونٹوں پر واپس ہو لیے۔ دو رائفلیں لاشوں سمیت ریت میں دبا دی گئیں کیونکہ یوسف یا جبل الصّوف کے کسی باسی کے قبضے سے ان کی برآمدگی پوری بستی کو ناقابلِ بیان مصائب میں مبتلا کر سکتی تھی۔

"سب کچھ ہو گیا۔" واپسی میں یوسف بولا۔ "لاشیں صحرا نے نگل لیں، رائفلیں تم لے جاؤ گے مگر ان چار اونٹوں کا کیا ہو گا۔ ان کے ساتھی پھر ادھر آئے تو اپنے اونٹوں کا ایک ایک بال پہچان لیں گے اور ہم مارے جائیں گے۔"

"دو اونٹ صحرا عبور کرنے میں ہمارے کام آئیں گے، دو کو تم بستی میں ذبح کر لینا۔" ہاشم نے اسے مشورہ دیا۔

وہ مغموم انداز میں ہنس دیا۔ "بستی کے سارے لوگ آٹھ دس دن میں بھی دونوں کا گوشت ختم نہ کر سکیں گے اور اس سے پہلے ہی وہ سڑنا شروع ہو جائے گا۔"

"فکر نہ کرو، ان کی مہاریں باندھ کر ہم انہیں بھی ساتھ لے جائیں گے اور صحرا سے نکلنے سے پہلے انہیں آزاد کر دیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم واقعی بہت عقلمند ہو۔" وہ خوش ہو گیا۔ "مگر اب میری ایک بات سن لو کہ بستی میں پورا قصہ چند گنے چنے لوگوں ہی کو بتایا جائے گا، باقی لوگوں کو وہ خود سمجھا لیں گے ورنہ آپس کی تضاد بیانی پوری بستی کو لے ڈوبے گی۔"

پانچوں میں سے کسی اونٹ کے گلے میں گھنٹی نہیں تھی۔ لہٰذا ہمارا سہ نفری قافلہ بہت خاموشی سے بستی میں داخل ہوا جہاں کی فضا میں ندرہی سے اداسی محسوس کی جا سکتی تھی۔

اونٹوں کو دیکھ کر عورتوں، بچوں اور مردوں کی بھیڑ لگ گئی اور نیچے اترنے سے پیشتر یہ معلوم ہو گیا کہ حملہ آوروں کے ہاتھوں ایک لڑکا مارا گیا تھا جس کو دفنایا جا چکا تھا۔

لوگوں نے تجسس اور خوف کے ملے جلے جذبات و احساسات کے تحت یوسف سے ہمارے بارے میں بہت سے سوالات کیے مگر اس نے سختی سے اپنی زبان بند رکھی اور ہمارے ساتھ متوفی کے پھٹے ہوئے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

جبل الصّوف میں ہم نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت گزارا مگر وہ وقت خاصا جذبات انگیز ثابت ہوا۔ وہاں کے رہنے والے انتہائی عسرت کا شکار تھے۔ ان کی روزی کا سارا انحصار کھجور کے قریبی باغ اور میٹھے پانی کے کنوئیں پر تھا مگر پھر بھی ان میں قناعت پائی جاتی تھی۔ یوسف جیسا حریص ان میں کوئی نہیں تھا بلکہ وہ تین سرآوردہ افراد جنہیں یوسف نے ہماری موجودگی میں سارے واقعات سے آگاہ کیا، بے حد متین اور سمجھدار تھے۔

وہ کہانی سنتے ہوئے ان کے بُشروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حملہ آوروں سے خونریز تصادم انہیں پسند نہیں آیا تھا۔ محض صحرا کی پُرسکون اجتماعی زندگی کی خاطر وہ اپنے ایک لختِ جگر کے قاتلوں کو بھی کھلی چھوٹ دینے پر تیار تھے مگر انھوں نے زبانی طور پر اپنے اس ردِ عمل کا قطعی اظہار نہیں کیا بلکہ اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ان کی آمد کے وقت ہم دونوں بستی میں نہیں پہنچے تھے کیونکہ ان چاروں کی ساری باز پرس دو یا زائد اجنبیوں کے بارے میں تھی جن کا تذکرہ وہ انتہائی نفرت اور حقارت سے کر رہے تھے۔

جبل الصّوف کے ان تین بڑوں نے ہمیں فوری طور مغرب کی طرف روانہ ہونے کا مشورہ بھی دیا تاکہ ان چاروں کی پُراسرار گمشدگی کے بعد شروع ہونے والی تلاش کی مہم سے قبل ہم وہاں سے زیادہ سے زیادہ دُور نکل سکیں۔

ان کا مشورہ مناسب تھا لہٰذا ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔

یوسف نے اس سارے معاملے میں توقع سے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیا تھا لہٰذا ہم نے سوانگی سے قبل اسے چار سو پونڈ دے دیئے جو اس نے مسرّت آمیز حیرت سے قبول کر کے اپنے کسی عزیز کے حوالے کر دیئے۔

پانچ اونٹوں اور تین سواروں کا وہ قافلہ بہت تیز رفتاری سے روانہ ہوا۔ نرم ریت پر اونٹ یوں سبک رفتاری سے دوڑ رہے تھے جیسے فضا میں تیر رہے ہوں۔

"راستے میں پانی یا کسی چیز کی کمی تو نہ ہو گی؟" جبل الصّوف سے کافی دور نکل آنے کے بعد میں نے یوسف سے سوال کیا۔

"ہر چیز ضرورت سے زیادہ ہی ہو گی۔" اس نے کہا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ زادِ راہ کی کثرت کا تمھاری دی ہوئی رقم سے کوئی تعلق ہے۔ اگر تم ہماری بستی سے گزرنے والے مسافر بھی ہوتے تو ہم لوگ تمھاری حسبِ توفیق اعانت کرتے۔"

"یعنی بچ رہنے والی اشیا تو تم ساتھ لے آؤ گے؟" میں نے جمود توڑنے کی خاطر اسے چھیڑا۔

"میری بیوی نے تو یہی کہا تھا۔" وہ گہرا سانس لیکر بولا۔ "مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہر چیز تمھاری ملکیت ہے۔"

"بیوی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "تو کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"جبل الصّوف کی سب سے خوبصورت عورت میری بیوی ہے۔" وہ فخر کے ساتھ سینہ پھُلا کر بولا۔ "تم نے بھی اسے دیکھا ہو گا۔۔۔"

"ٹھہرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے قیاس کرنے دو کہیں وہ سیاہ لباس والی تو تمھاری بیوی نہیں تھی جس کی پیشانی پر ہلکا سا نشان ہے۔"

"واللہ بہت خوب ہے تمھارا اندازہ۔" وہ خوش ہو گیا۔ "ہم ساتھ ہی پلے بڑھے ہیں اور اس کی پیشانی پر بچپن میں میں نے ہی ضرب لگائی تھی۔"

"مقدر جگا رہے تھے اس کا؟" میں نے ہنس کر سوال کیا۔

"سر پھوڑنے سے مقدر جاگنے لگے تو سب سے پہلے میں اپنے سر میں تیشہ ماروں۔" وہ حسرت زدہ لہجے میں بولا۔ "مقدر تو یہ ہے کہ بے ملال مجھے چار سو پونڈ بخش دینے کی استطاعت رکھتے ہو۔"

"مقدر صرف پونڈ سے ہی وابستہ نہیں ہوتا۔ زندگی میں کچھ ایسی بھی راحتیں ہوتی ہیں جنھیں رقم سے نہیں تولا جاسکتا۔" میں نے ... لہجے میں کہا۔

"پتہ نہیں وہ دوسری راحتیں کون سی ہوتی ہیں۔" وہ حسرت و بے زاری کے ساتھ بولا۔ "میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ پیسے سے انسان مسرت خرید سکتا ہے۔ محض پیسے کے بل پر سیاہ دلوں اور گندی ذہنیت والے نیک انسانوں کے غول ہانکتے نظر آتے ہیں۔"

"ایسا ظاہر ضرور ہوتا ہے۔" میں اس صحرا نشین کے فلسفے سے متاثر ہو کر بولا۔ "مگر ہانکے جانے والے نیک انسانوں کو لازوال سکون نصیب ہوتا ہے جب کہ ان کے نام نہاد آقا ساری زندگی اپنی ذات کے دوزخ میں جلتے رہتے ہیں۔ اندر کا یہی کرب ان کی زبانوں کو گندا اور تیوروں کو سنگلاخ بنا دیتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تم سچ کہہ رہے ہو۔" وہ بولا۔ "مگر میں تو اپنے پیسے کی خاطر اپنی زندگی کی تمام ان دیکھی مسرتوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔"

"اوّل تو تمھاری یہ معصوم سی لیکن حریصانہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا تو آخر کار تمھیں ملال کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔"

"تم لوگ کس بحث میں اُلجھ گئے۔" ہاشم نے دخل اندازی کی۔ "یہ تو بتاؤ کہ قطب نما بھی ہے کسی کے پاس؟ یا ہم یوں ہی منہ اٹھائے چلے جا رہے ہیں؟"

میری نگاہیں بے اختیار یوسف کی طرف اُٹھ گئیں کیونکہ سارا انتظام اسی کی ذمہ داری تھا۔

"قطب نما نہیں ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "لیکن فکر نہ کرو میں تمھیں بھٹکائے بغیر مقررہ راستے سے نکال لے جاؤں گا۔"

"مگر کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"جب تک سورج غروب نہیں ہو جاتا، ہمارا سفر اپنے سایوں کی مخالف سمت میں جاری رہنا چاہیئے۔ اور رات میں تاروں کے ذریعے مغربی سمت کی نشاندہی ہو سکے گی۔" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔

"اور اگر رات میں بادل چھا گئے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے یوں قہقہہ لگایا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "اس صحرا میں بادل کبھی کبھار ہی نظر آتے ہیں جس کا فی الحال دُور دُور تک کوئی امکان نہیں اور اگر ایسا ہو ہی گیا تو ہمیں رُکنا پڑے گا۔"

"مغربی سمت میں ہمیں کتنی دُور تک سیدھا جانا ہو گا؟"

"ریت کے سخت اور دشوار گزار ٹیلے شروع ہونے کے بعد ہم کسی بھی جگہ اپنی سمت بدل سکیں گے۔" اس نے آگاہ کیا۔ "ان اطراف میں خوفناک آندھیاں بکثرت اُٹھتی رہتی ہیں جو اپنی زد میں آنے والی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جاتی ہیں، اس خطے میں ہمیں یکجا ہو کر احتیاط سے بڑھنا ہو گا۔"

"ورنہ ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔" میں نے اس کی بات مکمل کی۔

لمحہ بہ لمحہ ہمارے سائے دراز تر ہوتے جا رہے تھے اور عین ہماری پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ سمت کے تعین کا وہ طریقہ بے حد سہل تھا۔ لیکن یوسف کے بتائے بغیر میرا ذہن اس تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے ہمیں سفر کا سلسلہ موقوف کرنا پڑا کیونکہ آسمان صاف ہونے کے باوجود اس وقت تک ستارے نمودار نہیں ہوئے تھے۔

اس مہلت کا فائدہ اُٹھا کر ہم نے اونٹوں کو کچھ دیر کے لیے آزاد چھوڑ دیا اور خود ریت پر بیٹھ کر کھانے سے فارغ ہو گئے۔

اس وقت ہوا میں ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی جو نہایت خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ مگر شکم پُری کے بعد ہم تینوں کو سردی کا ہلکا سا احساس ہونے لگا جسے فرو کرنے کے لیے میں نے سگریٹ سلگا لی۔

"وہ لڑکیاں بھی صحرا میں اسی راہ سے گزری ہوں گی۔" میں نے ٹھنڈی ریت پر ٹہلتے ہوئے یوسف سے سوال کیا۔

"قدم بہ قدم تو نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے چار چھ سو گز ادھر اُدھر رہی ہوں۔" وہ بڑھتے ہوئے دھندلکے میں بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بشرطیکہ اس مقام تک زندہ سلامت پہنچنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔"

آخری فقرہ اس نے دھیمے لہجے میں ادا کیا مگر اس کے الفاظ سن کر میرے وجود کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔

"کیا بک رہے ہو تم؟" میں نے شانہ تھام کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"بُرا نہ مانو تو ایک بات کہہ ڈالوں؟" اس نے اپنا دھیما لہجہ برقرار رکھتے ہوئے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

"اول فول نہ بکنا۔" میں نے جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم جو چاہو سمجھو مگر میرا اندازہ ہے کہ تم ان میں سے کسی لڑکی سے دل ہارے ہوئے ہو ورنہ میرے اندیشے پر یوں بےچین نہ ہوتے۔"

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ میں سیتا کے بارے میں اپنے رویئے کو کبھی بھی بے لگام ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا مگر اس حریص صحرائی نے بڑی سادگی کے ساتھ مجھے اپنے خول سے باہر گھسیٹ کر ایک صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔

"تو تمھاری دانست میں ان میں کوئی چاہے جانے کے قابل بھی تھی؟" میں نے اس کی بات کا وزن کم کرنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔

"یوں تو چاروں ہی خوبصورت اور طرحدار تھیں۔" یوسف بولا۔ "اسی لیے ان کی آمد پر بستی کی عورتوں میں اشتعال پھیلا تھا مگر نیلی آنکھوں والی تو واقعی ساحرہ تھی۔ عجیب جلال تھا اس کے بُشرے پر۔ پھر وہ بات بھی ایسی تمکنت سے کرتی تھی جیسے پُورا یقین رکھتی ہو کہ مخاطب اس کی بات تسلیم کرے گا۔"

"بہت غور سے دیکھا تھا اسے؟" ہاشم نے ٹکڑا لگایا۔ "اگر اسے اندازہ بھی ہو جاتا کہ تم اس کی ذات میں دلچسپی لے رہے ہو تو فرار کو بھُول کر تمھاری دو چار پسلیاں تو توڑ ہی ڈالتی، خواہ باقی عمر اسے جبل الصّوف ہی میں قیدی بن کر گزارنی پڑتی۔"

"وہ تو بہت حلیم الطبع اور نرم خُو تھی۔" یوسف نے بے اعتباری سے کہا۔ "شاید تم کسی اور کی بات کر رہے ہو۔"

سیتا کی تعریف و توصیف میں یوسف نے بہت محتاط لب و لہجہ استعمال کیا تھا جس میں ناشائستگی کا شائبہ بھی نہیں تھا لہٰذا اس کی گفتگو مجھے گراں نہیں گزری بلکہ میں اس سے عجیب سا سرور حاصل کرتا رہا۔

لق و دق صحرا کے وسط میں وہ پڑاؤ خاصا مختصر رہا اور ستاروں کے نمودار ہوتے ہی یوسف ہم دونوں کو لے کر آگے چل دیا۔

صحرا میں وقت کی رفتار تھمی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور فاصلے کا اس کے سوا کوئی تصور موجود نہیں تھا کہ دھیمے ہی سہی لیکن گھڑی کی سوئیاں سرک رہی تھیں اور ہمارے اونٹ بھی متحرک تھے لہٰذا ہم کسی نہ کسی ... میں کوئی نہ کوئی فاصلہ ضرور طے کر رہے تھے۔

رات کے سواد و بجے کے قریب جب ہواؤں میں قدرے شور پیدا ہوا تو یوسف پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔

"رفتار تیز کر دو۔" وہ بے چین لہجے میں بولا۔ "ہمیں کھلے صحرا کے بجائے جلد از جلد کسی ٹیلے کے قریب پہنچنا چاہیئے۔"

میں نے اپنے اونٹ کی مہار کو خفیف سا جھٹکا دے کر ڈھیلا چھوڑ دیا اور وہ بلبلا کر یک بیک تیزی سے دوڑنے لگا۔

"کیا کوئی خطرہ درپیش ہے؟" میں نے یوسف کے برابر میں پہنچ کر سوال کیا۔

"خدا کرے کہ یہ ناگہانی افتاد ٹل جائے۔" یوسف کا لہجہ تشویش انگیز تھا۔ "یہ تیز ہوا آندھی کا پیش خیمہ ہے۔"

ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ اس وقت وہ خاموشی بھی سراسر تشویش انگیز ثابت ہو رہی تھی جسے اونٹوں کے رویّے سے اور زیادہ تقویت مل رہی تھی۔

تینوں اونٹ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بار بار ہڑبڑا کر عجیب خوفزدہ آواز میں بلبلا رہے تھے میرے اونٹ نے تو دو مرتبہ سرکشی بھی کرنی

چاہی مگر میں نے نکیل کھینچ کر اسے سختی سے قابو میں کر لیا۔ اس وقت کسی جانور کے بھڑکنے کی صورت میں ہم کھلے صحرا میں سمت کا احساس قطعی بھلا بیٹھتے جس کے بعد بھٹکنا ہمارا مقدر بن جاتا۔

ہوائیں آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھیں اور ان میں باریک ریت کے ذرات بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ ہمارے سامنے کافی دور آسمان پر دھند لاہٹ کا بادل گہرا ہوتا جا رہا تھا جو اس امر کا ثبوت تھا کہ مغرب کی طرف سے کوئی ہولناک آندھی آ رہی ہے جس کے ہراول بگولے ہمارے مختصر سے کارواں کا طواف کر رہے تھے۔

پھر ریت کے ذرات ہمارے چہرے اور جسم کے کھلے ہوئے حصوں سے ٹکرانے لگے۔ بتدریج ہوا میں اڑ کر آنے والے ان حقیر ذرات میں اتنی قوت پیدا ہو گئی کہ آنکھوں کو کھلا رکھنا محال ہونے لگا۔ میں نے بدقت تمام ایک ہاتھ سے اپنے لباس کا پھڑپھڑاتا ہوا ایک حصہ اپنے چہرے پر لپیٹ لیا مگر اگلے ہی لمحے تیز ہوا کے ایک جھکڑ نے میرا چہرہ دوبارہ برہنہ کر دیا اور سیروں وزنی ریت میرے لباس اور بدن پر یوں آ گری جیسے کسی نے وہ بیلچوں میں بھر کر اچھالی ہو۔

پانچوں اونٹوں پر وحشت طاری ہو چکی تھی، ان کی سبک خرامی بے ہنگم اور بہکی ہوئی چال میں بدل گئی اور وہ مسلسل کربناک آوازوں میں بلبلانے لگے۔

اس جھکڑ کے بعد ہم ہواؤں کے زبردست تھپیڑوں کی زد میں آ گئے۔

"یوسف!" میں پوری قوت سے چلایا اور دہانہ کھلتے ہی مٹھیوں بھر ریت میرے دہانے کے راستے حلق میں اتر گئی۔

سانس کی نالی میں سوزش ہوتے ہی میں بری طرح کھانسنے لگا۔

"اپنے اونٹ کی گردن سے لپٹ جاؤ۔" مجھے اپنے قریب ہی یوسف کی موہوم سی آواز سنائی دی۔ "ورنہ گر کر ریت میں دفن ہو جاؤ گے۔"

شاید اس نے میرے اور ہاشم کے لیے عمومی ہدایت جاری کی تھی جس پر میں نے فوری طور پر عمل کر ڈالا۔

وہ چوپائی آندھی اس قدر دہشتناک تھی کہ میرے ذہن میں اپنی سلامتی کے سوا کوئی اور خیال باقی نہ رہا۔

باریک ریت سے آلودہ طوفانی جھکڑوں کی کوئی ایک سمت نہیں تھی جس سے رخ بدل کر بچنا ممکن ہوتا۔ صحرا میں ہواؤں کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں تھی مگر اس کے باوجود ہوائیں مہیب بلاؤں کی طرح چنگھاڑ رہی تھیں۔ فضا میں غبار کی کثافت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ رات کی سیاہی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ آسمان اور ستارے سب ہی اس زمینی بادل میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ طوفانی بگولے اس رات صحرا کی ساری ریت اڑا کر آسمان کی وسعتوں میں پہنچا دیں گے۔

میرا اونٹ بار بار بھڑک رہا تھا۔ بغیر سوار کا ایک اونٹ میرے اونٹ کی نکیل سے بندھا ہوا تھا جس کی وجہ سے مزید دقت پیش آ رہی تھی۔ کیونکہ دونوں اونٹوں کی آزادانہ نقل و حرکت ممکن نہیں تھی اور وہ بار بار ایک دوسرے کی مہاروں پر اذیتناک جھٹکے پیدا کر رہے تھے۔

میں نے ٹٹول کر ہاتھ سے مہار توڑنی چاہی تاکہ پیچھے والے اونٹ کو آزادی میسر آ سکے اور میری سواری بھی قدرے محفوظ ہو سکے لیکن وہ ڈوری اس قدر مضبوط تھی کہ چاقو یا کسی تیز دھار آلے کے بغیر اسے کاٹنا یا توڑنا ناممکن تھا۔

کئی مرتبہ میرا اونٹ دردناک آوازوں میں بلبلاتا ہوا اپنے پچھلے دونوں پیروں پر فضا میں کئی کئی فٹ بلند ہوا، نجانے اس طرح وہ میرے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا مہار کے جھٹکوں کی شدت میں کمی لانا چاہتا تھا۔

ہواؤں میں مسلسل تیزی آتی رہی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اماوس کی کسی کالی رات میں ہمیں بیچ صحرا میں طاغوتی قوتوں نے گھیر لیا ہو اور چیختی چلاتی ہمارے چاروں طرف شیطانی رقص میں مصروف ہوں۔

اچانک میرا اونٹ دوڑتے دوڑتے لرزہ خیز اور غیر فطری آوازیں بلبلایا اور بری طرح بائیں پہلو کے بل پوری قوت سے ریت پر گر پڑا — اگر اس وقت میں کسی جونک کی طرح اس کی گردن سے نہ لپٹا ہوتا تو اس کے نیچے کچل کر میری ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہوتا۔

نیچے گر کر اونٹ سیدھا ہو کر تیزی سے اٹھا اور ایک مرتبہ پھر دیوانہ وار طوفان میں دوڑ پڑا۔

میرے اعصاب پر غنودگی اور نقاہت کا حملہ ہونے لگا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اونٹ کی گردن پر ہی سو جاؤں اور اس وقت بیدار ہوں جب آوارہ ہوائیں بربادی کا جشن مکمل کر کے تھک چکی ہوں، مگر موت کے خوف نے اس خواہش کو مغلوب کیا ہوا تھا۔

"ہاشم... یوسف!" اونٹ کی گردن کے لمبے لمبے بالوں میں منہ چھپا کر میں نے چند سیکنڈ کے وقفے سے ان دونوں کو آوازیں دیں۔ اس کوشش میں ایک بار پھر مجھے اونٹ کے بالوں میں پھنسی ہوئی ریت پھانکنی پڑی مگر میری وہ آوازیں واقعی صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔

ہواؤں کے غضبناک شور اور اونٹ کی فریادوں کے سوا مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی، اور یہ سوچ کر میرا دل بیٹھ گیا کہ دونوں مجھ سے بچھڑ چکے تھے۔

نہ جانے وہ کوئی خوفناک جھکڑ تھا یا ٹھوس ریتیلا ٹیلا، کم از کم مجھے یہی محسوس ہوا جیسے اونٹ دوڑتے دوڑتے کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا ہو اور اس شدید جھٹکے کے نتیجے میں میرا ذہن تاریک دلدلوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو آنکھیں کھولنے سے پہلے یہ احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پیر بری طرح اکڑے ہوئے تھے اور میرا جسم ہولے ہولے ہل رہا تھا — آنکھیں کھولیں تو چند فٹ نیچے صحرا کی چمکتی ہوئی زرد ریت دن کے اجالے میں سمندر کی لہروں کی طرح ہلکورے لیتی نظر آئی۔

میرے تھکے ہوئے اعصاب کے لیے وہ مشاہدہ بہت حیرتناک تھا، مگر چند ثانیوں بعد ہی ساری صورتحال مجھ پر پوری طرح منکشف ہو گئی۔ میں اس وقت بھی پوری قوت سے اونٹ کی گردن سے لپٹا ہوا تھا اور وہ میرے وجود کو قدرت کا نازل کیا ہوا عذاب سمجھ کر قبول کر چکا تھا کیونکہ میرے بوجھ یا وحشیانہ گرفت کی پروا کیے بغیر مست خرامی کے ساتھ جگالی میں مصروف تھا۔

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ یقینی موت کا اندیشہ انسان کے اعصاب پر کس حد تک اثرانداز ہو سکتا ہے۔ شعور اور لاشعور تو بڑی چیزیں ہیں خوف بے ہوشی کے عالم میں بھی انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ میں نے بے ہوش ہوتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنی ساری قوت اور صلاحیت اونٹ کی گردن سے چپکے رہنے پر مرکوز کر دی تھی۔ اور کئی گھنٹوں تک اسی حالت میں رہنے کے باعث میرے جسم کے تمام پٹھے اکڑ چکے تھے۔

میں نے جس طرف بھی سر گھمایا مجھے ہر سمت تا حد نظر بے داغ زرد ریت ہی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ ہاشم، یوسف اور بقیہ چار اونٹوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

اپنی گردن سے لپٹے ہوئے عذاب میں حرکت محسوس کر کے اونٹ کئی مرتبہ بھڑکا مگر گلوخلاصی کی کوئی صورت نہ پا کر اس نے ایک مرتبہ پھر حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔

صحرا میں دن طلوع ہوتے دیر ہو چکی تھی۔ ہر طرف سورج کی حیات آفریں حرارت کا راج تھا اور صحرا یوں پرسکون تھا جیسے وہاں صدیوں سے کوئی تلاطم پیدا نہ ہوا ہو۔

میں کئی بار کی کوشش کے بعد اس قابل ہو سکا کہ اپنے پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے ہاتھوں اور ٹانگوں کو حرکت دے سکوں۔

اونٹ نے شاید مجھے اچھال پھینکنے کے لیے اپنی گردن جھکانے اور جھٹکنے کے بھی تمام حربے آزمائے تھے کیونکہ میں اس کی گردن کی انتہائی بلندی پر ٹھوڑی اور سر سے ذرا پہلے موجود تھا۔ میں نے آہستگی سے گرفت ڈھیلی کی اور نرم گردن پر پھسلتا ہوا اونٹ کی پشت پر واپس آ گیا۔ اس دوران میں اونٹ نے اتنی شدید جھرجھری لی کہ اس کی جلد سے ریت کا بھاری غبار اڑا جو اس بار میرے لیے بے ضرر ثابت ہوا۔

اونٹ کی پشت پر آنے کے بعد میں نے مہار کی تلاش شروع کی تو وہ غائب تھی اور میرے اونٹ کی ناک بری طرح لہولہان تھی جس کے ساتھ خون آلود ڈوری کا دس بارہ انچ لمبا ٹکڑا جھول رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ طوفانِ باد کے دوران میں دوسرا خالی اونٹ نکیل تڑا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور اپنے ساتھ میرے اونٹ کی مہار بھی لیتا چلا گیا تھا۔

میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لے کر رومال برآمد کیا اور اس سے پتلی پتلی دھجیاں پھاڑ کر ان میں گرہیں باندھ لیں۔ اس طرح میں ایک ایسی ڈوری تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا جسے اونٹ کی ناک سے جھولتے ہوئے ٹکڑے سے باندھ کر میں اونٹ کو اپنی مرضی کا تابع رکھنے کا انتظام کر سکتا تھا۔

اونٹ کو پچکار کر میں نے بدقت تمام ریت پر بٹھایا اور اس کی ادھوری مہار کو لمبا کر کے اسے کچھ دیر کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

میرا بدن کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اس لق و دق صحرا میں ہاشم اور یوسف کو کہاں تلاش کیا جائے۔

مجھے صحرائی سفر کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی میرے لیے سمتوں کا تعین آسان تھا، ان حالات میں صحرا میں بھوک پیاس سے مرنا ہی مقدر معلوم ہوتا تھا جس کا تصور ہی میرے لیے اذیت ناک تھا۔

مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ آندھی کے دوران اور اس کے بعد میں مجوزہ راستے سے کتنا بھٹکا تھا بس یہ یاد تھا کہ یوسف سخت اور دشوار گزار ٹیلوں تک مغرب کی سمت پر چلتا رہتا اور وہاں سے جنوب کی راہ اختیار کرتا جو ہمیں کسی آبادی میں نکال لے جاتی۔

صحرا میں ہاشم اور یوسف کی تلاش میں بھٹکنا بے سود تھا مگر اپنے تجربات کی روشنی میں میری دعا بس یہی تھی کہ وہ آندھی کی صعوبتیں جھیل کر زندہ بچ گئے ہوں۔

اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے، میں نے احتیاط سے اپنے سائے کی سمت متعین کی اور اونٹ پر سوار ہو کر اسی طرف روانہ ہو گیا۔

میرا پورا جسم، لباس اور حلق ریت سے کرکرا ہو رہا تھا جس کی وجہ سے حلق میں پانی کے چند قطرے ٹپکانے کی شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی مگر میرے پاس کھانے پینے کے نام پر سگریٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

خالی الذہنی کے عالم میں کچھ دور چلنے کے بعد یک بیک میں نے اونٹ کو داہنی طرف موڑ لیا کیونکہ یوسف کے کہنے کے مطابق صحرا سے نکاسی کی راہ جنوب کی طرف ہی تھی۔ اب یہ اور بات تھی کہ میں مقررہ مقام سے پہلے یا بعد میں صحرا کو خیرباد کہتا۔

خورونوش کے اسباب سے محرومی کے بعد جوزف ابن کے آدمیوں کا خوف بے وقعت ہو کر رہ گیا تھا اور میں ہر قیمت پر جلد از جلد صحرا سے نکلنا چاہتا تھا۔

جنوب کی طرف کئی گھنٹوں کے تشویش آمیز سفر کے بعد میری تھکی ہوئی نگاہوں نے کافی دور ایک ناقہ سوار کا ہیولا دیکھا جو فوراً ہی معدوم ہو گیا۔ میں نے دو تین بار پلکیں جھپکائیں اور چاق و چوبند ہو کر پھر جنوبی افق پر نگاہیں جما دیں۔ کئی سیکنڈ تک مسلسل گھورتے رہنے کے بعد ایک بار پھر وہی جھلک نظر آ کر معدوم ہو گئی۔

نگاہ کے اس آسیبی فریب نے مجھے پریشان کر دیا مگر آٹھ دس منٹ بعد تیسری بار وہ پراسرار ہیولا نظر آیا تو خاصے انتظار کے بعد بھی روپوش

نہ ہُوا اور اسی وقت اس آنکھ مچولی کا سبب مجھ پر عیاں ہو گیا۔

اس کا بار بار نظر آ کر روپوش ہونا صحرائی فریب نظر تھا جو دوپہر کی دھوپ میں ہوا کی گرم اور نسبتاً ٹھنڈی تہوں میں انعطاف کے باعث عموماً ہوتا رہتا ہے۔

"المدد... المدد۔" میں نے دونوں ہاتھ اپنے دہانے پر رکھ کر پوری قوت سے کئی بار پکارا تاکہ نظر آنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر سکوں لیکن میری یہ کوشش ہوا کے مخالف رُخ کے باعث رائیگاں گئی۔

جوزف این کے لڑاکوں کے شاید سارے ہی اُونٹ بہترین تربیت یافتہ ہوتے تھے کیونکہ میرے ایک ہی اشارے پر اونٹ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

وہ ہیولا رفتہ رفتہ واضح ہونے لگا اور پھر میں نے یہ تعین بھی کر لیا کہ وہ مشرق کی طرف سفر کر رہا تھا۔

مزید چند منٹ سفر کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر مدد کا نعرہ لگایا اور اس بار یہ محسوس کر کے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا کہ چلتے چلتے وہ رُک گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ میری آواز سُن لی گئی تھی۔

دُوسرے سوار نے فضا میں رومال لہرا کر اشارہ کیا۔ پھر اپنے اونٹ کا رُخ میری طرف پھیر دیا اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ ایک دُوسرے سے قریب ہونے لگے۔ ایک مددگار کو سامنے پا کر میری پیاس اچانک بڑھ گئی تھی۔

اس کی رفتار جو بھی رہی ہو لیکن میرا اُونٹ پُوری سُرعت سے دوڑ رہا تھا۔ پھر بھی آنے والے کے خدوخال واضح نہیں ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ ہم دونوں کا فاصلہ .... اس سے کہیں زیادہ تھا جو بادی النظر میں محسوس ہو رہا تھا۔

دس منٹ کی دوطرفہ مسافت کے بعد اس کی شناخت ممکن ہوئی تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ وہ میرا گمشدہ رہنما یوسف تھا۔

"یوسف!" میں نے اسے پہچان کر مسرت آمیز آواز میں پکارا مگر وہ صرف فضا میں ہاتھ ہلا کر رہ گیا۔

اس کے رویے میں گرمجوشی مفقود تھی اور پھر میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کا چہرہ بالکل سُتا ہوا تھا جیسے وہ ابھی تک پچھلی رات کے روح فرسا تجربات کو فراموش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ہو۔

"تم... تم خیریت سے تو ہو نا؟" قریب پہنچنے پر میں نے گرمجوشی سے سوال کیا۔

"ہاں۔" اس کا مشینی لہجہ بالکل سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا۔ "زندگی تھی جو بچ گیا، وہ میری زندگی کا بدترین تجربہ تھا۔"

"اس کے باوجود کہ تم خود صحرائی ہو؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ان آندھیوں کے بارے میں میں سُنتا ہی آیا ہوں۔ یہ صحرا کے مخصوص حصّوں میں اٹھتی رہتی ہیں جن میں جبل القنوف کے اطراف کا وسیع علاقہ شامل نہیں ہے۔" وہ اونٹ کی پشت سے نیچے اتر آیا۔ "مغرور صحرا موت ہے۔"

"لاؤ ذرا پانی تو دو۔" میں نے اس کی پشت سے جھولتی ہوئی چرمی چھاگل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ تم کیسے بچ گئے۔" وہ مجھے پانی پلا کر بولا۔ "اونٹ کی گردن سے لپٹنے کا تمھارا مشورہ نہ سُنتا تو ہڈیاں تڑوا بیٹھتا۔ جھکڑوں میں اُونٹ کسی تنکے کی طرح جھول رہا تھا۔"

"مگر وہ نہ بچ سکا۔" اس کی آنکھوں کی ویرانی گمبھیر ہو گئی۔

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا تھا۔

"تمھارا ساتھی بڑی دردناک موت مرا ہے۔" اس کے لہجے سے دکھ نمایاں تھا۔ "اس کی ایک ٹانگ اور کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اور وہ ٹنوں وزنی ریت میں زندہ دفن تھا۔ میرے سامنے اس نے ایک ایک سانس کی آرزو میں دم توڑا ہے۔"

"نہیں، تم جھوٹے ہو یوسف۔" میں بے اختیار چیخ اٹھا۔

"کاش میں جھوٹا ہی ہوتا۔" اس کی ویران آنکھیں خلا میں کسی نکتے پر مرکوز ہو گئیں۔ "شاید اس کا اونٹ گر گیا تھا۔ اس کی گردن اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، تمھارا دوست اسی کے نیچے کچلا گیا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ میں طوفان کے بعد اونٹ کی لاش دیکھ کر اس تک پہنچا تو اس کا صرف چہرہ اور داہنا ہاتھ ریت سے باہر تھا۔ وہ بمشکل سانس لے رہا تھا۔ اس کی ناک، آنکھوں اور دہانے سے خون جاری تھا۔ میں نے ریت ہٹا کر اُسے نکالنے کی کوشش کی مگر میرے کامیاب ہونے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔"

میرے وجود کی گہرائیوں میں کرب و اندوہ کی لہریں ابھرنے لگیں۔

"کہاں ہے وہ..... وہ کہاں ہے؟ اس کے مقدر میں ایسی دردناک موت تو شاید کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا!"

"میں اُسے میلوں پیچھے دفن کر آیا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ خونی صحرا ہے، تم بھی واپس نہ جاؤ۔ میرے ساتھ جبل القنوف لوٹ چلو۔"

"جبل القنوف؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "تو کیا تم واپس جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں تمھاری رقم بھی لوٹا دوں گا۔ دولت سے انسان مقدر نہیں خرید سکتا جس میں زندگی کے دُکھ سُکھ کے ساتھ اس کا انجام بھی شامل ہوتا ہے۔"

"مگر میں اب نہیں لوٹ سکتا یوسف!" میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "جس راستے پر میرے دوست نے اپنی جان قربان کی میں اس پر آگے بڑھوں گا، مگر تمھارے بغیر یہ صحرا عبور کرنا میرے لیے

بہت مشکل ہوگا۔"

"مغرب میں ہمیں اور آگے جانا تھا۔ وہاں آندھیوں کا کچھ علم نہیں ہوتا اسی لیے وہ ریگستان غیر آباد ہے، مرنا چاہتے ہو تو کوئی آسان سا راستہ اختیار کرو۔"

"اور اگر ہم یہیں سے جنوب کی طرف چل دیں؟"

"صرف اپنی بات کرو برادر۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "میں جبل العتوف جاؤں گا، وہاں میری بیوی ہے، میرے اپنے لوگ ہیں، میں ان کے درمیان ہی رہنا اور مرنا پسند کروں گا۔"

"میں تمہیں مزید منہ مانگی رقم دوں گا۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

وہ پھیکے انداز میں مسکرا دیا۔ "تم نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ پیسہ سب کچھ نہیں خرید سکتا۔ اس وقت تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر اب میں اس پر ایمان لے آیا ہوں۔ مجھے مجبور نہ کرو، تمہاری بھی حالت غیر ہے۔ شاید سیروں ریت تمہارے معدے تک پہنچ گئی ہوگی، تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

میں نے اس کے ساتھ کافی مغز زنی کی مگر صحرائی خونی آندھی سے زیادہ ہاشم کی موت اس پر اثر انداز ہوئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، البتہ اس نے پانی اور ضرورت کی ہر چیز جو اس کے پاس موجود تھی، میرے حوالے کر دی۔

"اور تم بھوکے پیاسے کیا کرو گے؟" میں نے چرمی مشکیزہ اپنے کندھے سے لٹکاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"میں زیادہ سے زیادہ شام تک جبل العتوف پہنچ جاؤں گا۔ تم میری فکر نہ کرو۔" وہ بولا۔ "ہم لوگ بھوک پیاس کے معاملے میں تھوڑے سخت جان ہوتے ہیں۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تمہارا واپسی کا راستہ ٹھیک ہے؟"

"ہم جبل العتوف سے مغرب کی طرف چلے تھے، اب مشرقی سمت میں جا رہا ہوں۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "آندھی میں بھٹکنے کی وجہ سے اگر بستی سے دو چار میل شمال یا جنوب میں نکلا تو راستہ پہچان لوں گا۔"

میرے مقابلے میں اس کے دلائل مضبوط تھے اور میرے ذہن پر بھی صحرا کی دہشت سوار ہو گئی تھی مگر میں اس راستے پر مُڑنا نہیں چاہتا تھا جس سے گزر کر اس فیصلہ کن مقام پر پہنچا تھا۔

ہم دونوں ہی ہاشم کے لیے سوگوار تھے۔ وہ میرا ایک وفا شعار اور قریبی دوست تھا جب کہ یوسف اس کا آخری سانسوں کا ساتھی تھا۔ ہم نے دل گرفتہ انداز میں ایک دوسرے کو الوداع کہا، پھر میں جنوب کی طرف چل دیا۔

میں بہت دُور تک مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ یوسف بدستور اسی مقام پر کھڑا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا لیکن اسی لمحے اسے مشرق کی طرف روانہ ہوتے دیکھ کر میں نے اپنے اونٹ کی رفتار بڑھا دی۔

بے یقینی کے پُرہول اندیشوں میں کھویا میں پوری رفتار سے جنوب کی طرف بڑھتا رہا، حتیٰ کہ سورج کی آخری کرنیں بھی مغربی وادیوں میں کہیں معدوم ہو گئیں۔

میں نے سفر ترک کر دیا اور وہیں ریت پر پڑاؤ کر لیا۔ گو میرا اونٹ اس وقت تک بہت وفادار ثابت ہوا تھا مگر میں کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے مختلف رسیاں جوڑ کر مہار کو مزید لمبا کیا اور اس کا آخری سرا اپنی کلائی میں باندھ لیا تاکہ مجھ پر غفلت اور غنودگی بھی طاری ہو جائے تو اونٹ میری بے خبری میں زیادہ دور نہ نکل سکے۔ اس بندوبست کے بعد میں تیزی سے ٹھنڈی ہوتی ہوئی ریت پر دراز ہو گیا۔

ہاشم کی موت میرے لیے ناقابلِ یقین حادثہ ثابت ہوئی تھی۔ اس جیسے عظیم اور با اصول انسان کا یوں بے موت مارے جانا سخت اندوہناک تھا لیکن انسانی نگاہیں اس مقام تک نہیں پہنچ سکتیں جہاں کاتبِ تقدیر اپنے اٹل فیصلے صادر کرتا ہے۔

ہاشم کی موت کے ساتھ میری جدوجہد کا ایک تابناک باب ختم ہو گیا تھا جس میں ہاشم کا تعاون ہر جگہ نمایاں رہا تھا لیکن میری جدوجہد باقی تھی جس کا اختتام سیتا کی بازیابی کی صورت میں ہی ہو سکتا تھا۔

جبل العتوف سے سیتا گزری تھی، اس سے آگے میں نے نصف سفر طے کر لیا تھا لیکن مجھے رہ رہ کر یہ خوف ستا رہا تھا کہ کہیں دورانِ سفر سیتا بھی صحرائی بگولوں کی زد میں نہ آ گئی ہو۔ اس اندیشے کی تردید یا تائید فوری طور پر مشکل تھی۔ صحرا عبور کرنے کے بعد ہاشم کے بغیر میں بالکل بے یار و مددگار ہوتا جب کہ ہاشم اپنی تنظیم کے رابطے بروئے کار لا کر میری خاصی مدد کر سکتا تھا۔

وہ ساری رات میں نے سگریٹیں پی پی کر سوچتے ہوئے گزار دی۔ جو لوگ اس مرحلے سے گزرے ہوں وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ سنسناتی ہوئی رات کی پُرہول تنہائی میں پُرخطر مستقبل کے بارے میں سوچنا کس قدر روح فرسا ثابت ہوتا ہے۔

صبح ہوتے ہی میں نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

جبل العتوف سے نکلے ہوئے مجھے تیسرا دن تھا لیکن ریت کا ایک یکساں سمندر دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں درد رہنے لگا تھا۔ دراصل صحرا اس اعتبار سے عجیب و غریب تھا کہ وہاں فضا میں پرندے تک پرواز کرتے نظر نہیں آتے تھے۔

چوتھے روز شام کے وقت مجھے پہلی بار صحرا کے افق پر کسی آبادی کے ہیولے نظر آئے۔ وہ میرا ابتدائی تاثر تھا مگر بعد میں مجھے یہ گمان بھی ہوا کہ وہ کسی ویران بستی کے کھنڈرات نہ ہوں۔ اس اندیشے

نے سورج غروب ہونے کے بعد بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ ایک ٹھکانہ سامنے آ جانے کے بعد ٹھہرنا بے سود تھا۔

اندھیرا ہونے کے بعد مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ان آثار میں روشنیاں ٹمٹمانے لگی تھیں۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ میں نے تنِ تنہا صحرائے نوبی کا ایک خطرناک حصہ بخیر و عافیت عبور کر لیا تھا۔

کچھ دیر بعد ذہن میں خیالات کی منفی رَو نے سر اُبھارا تو میں نے اونٹ کو روک لیا۔

آبادی کے آثار اس بات کی نوید ضرور تھے کہ میں نے صحرا میں انجم شماری کا مرحلہ طے کر لیا تھا لیکن صحرا سے آنے والے ایک مسافر کی حیثیت سے کسی بھی آبادی کا رُخ کرنا میرے لیے پُرخطر ثابت ہو سکتا تھا۔

صحرا عبور کر کے تنہا کہیں پہنچنا خود کو دوسروں کی توجہ کا نشانہ بنانے کے مترادف ہوتا اور ہر شخص یہ جاننے کے تجسس میں مبتلا ہو جاتا کہ آنے والا کس افتاد کے تحت لق و دق صحرا کو تنہا پار کرنے پر مجبور ہوا ہے؟ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟

جب کہ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ہوتا اور میری خاموشی یا مبہم جوابات سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاتا۔ لوگ مجھے قانون سے بھاگا ہوا کوئی مجرم سمجھ کر تفتیش کے لیے مقامی حکام کے حوالے کر دیتے۔

میرے لیے ہر دو صورتیں ناقابلِ قبول تھیں لہٰذا میں نے بستی کے پہلو سے گزر کر آگے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔

سمت کی تھوڑی سی تبدیلی اور رفتار میں اضافے کے بعد آدھی رات کے قریب میں ان روشنیوں سے محفوظ فاصلے سے گزر گیا۔

وہ کوئی چھوٹا سا دیہی قصبہ تھا جس کا طول و عرض خاصا محدود تھا۔ رات کے دو بجے مجھے سامنے سے ایک ٹرک کا شور سنائی دیا اور میں اونٹ پر سے اُتر کر اس کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

ٹرک کی روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ میں ایک سڑک سے چند فرلانگ دُور رہ گیا تھا لہٰذا میں نے اپنے اونٹ کی نکیل میں بندھے ہوئے سارے چیتھڑے الگ کر کے اُسے پیار سے ایک طرف ہانکا اور خود آگے بڑھ گیا۔

میری جیب میں معقول رقم، زہریلی سوئیوں والی شیشی، خودکار پستول اور فاضل گولیوں کی صورت میں فوری ضرورت کی تمام اشیا موجود تھیں۔

تھوڑی دیر میں میں تارکول کی بنی ہوئی ایک پتلی سی سڑک کے کنارے پہنچ کر ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔

میرا ارادہ تھا کہ وہاں پوشیدہ رہ کر میں ٹریفک کی نوعیت کا اندازہ کر کے کسی سے لفٹ لینے کی کوشش کروں گا اور پھر آگے نکل جاؤں گا مگر وہ سڑک میری توقع سے زیادہ ویران ثابت ہوئی۔ مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی لیکن ٹرک کے بعد نہ کوئی سواری آئی تھی نہ آئی۔

اجالا پھیلنے سے قبل میں پیچھے رہ جانے والی آبادی سے مخالف سمت میں سڑک سے قدرے دُور رہ کر پیدل چل دیا۔

وہ کسی کار کے انجن کی دھیمی سی آواز تھی جس نے مجھے سڑک کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا اور میں کنارے پر آ کر جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک گیا۔

ہیڈ لیمپس کی متحرک روشنیوں سے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وہ کار آبادی کی طرف سے آ رہی تھی لیکن دشواری یہ آ پڑی کہ روشن ہیڈ لیمپس کے باعث پہلے سے یہ دیکھنا دشوار تھا کہ کار میں کُل کتنے افراد تھے۔

میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف ہو گیا اور پھر میں پھرتی سے سڑک کے کنارے پر آ گیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول کی نال پر سے سیفٹی کیچ ہٹا دیا تھا تاکہ امکانی خطرے کی صورت میں اس سے کام لے سکوں۔

پھر جونہی وہ کار سڑک پر نمودار ہوئی میں نے خوشامدانہ انداز میں بے تابی سے فضا میں ہاتھ لہرانا شروع کر دیا۔

سڑک پر کار کی عقبی سُرخ روشنیوں کا انعکاس یک بیک تیز ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ آنے والا بریک پیڈل پر اپنا پاؤں رکھ چکا تھا۔ اس قدر فوری ردِّعمل کے دو ہی نتائج ہو سکتے تھے کہ کار میں صرف ایک ہی آدمی آ رہا تھا جسے فیصلے سے قبل کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں تھی اور اگر کار میں زائد افراد تھے تو ان میں وہی سب سے برتر اور تحکم پسند تھا جو اسٹیئرنگ وھیل پر موجود تھا۔

میرے قریب آ کر کار رک گئی اور میرا داہنا ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔

"کیا بات ہے؟" کار کی کھڑکی میں سے ایک عمر رسیدہ سوڈانی نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ میں نے دیکھا کہ کار میں اس کے ہمراہ دو خواتین بھی موجود تھیں جن میں سے ایک اگلی نشست پر اس کے برابر میں براجمان تھی۔

"معاف کرنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں دیکھ نہیں سکا کہ تمہارے ساتھ کار میں عورتیں بھی سفر کر رہی ہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ وہ بغور میرے بشرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ "لفٹ چاہیے یا خیرات؟"

"جو مل جائے۔" میں نے دانت نکال دیے۔

"کہاں جانا ہے؟" وہ نہ جانے کیوں میرے ساتھ اپنا وقت برباد کرنے پر آمادہ تھا۔

میں اس سوال پر بوکھلا گیا کیونکہ مجھے سوڈان کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، سگریٹ بناتے ہوئے بولا۔ "اگلے قصبے میں اتار دینا۔"

"آجاؤ۔" اس نے مجھ سے کہا۔ پھر عربی میں اپنے ساتھ والی عورت کو پچھلی نشست پر جانے کی ہدایت کی۔ وہ تابعدارانہ انداز میں نیچے اتری اور عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ میں نے اگلی نشست سنبھال لی اور کار چل پڑی۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" کچھ دیر کے توقف کے بعد اس خرانٹ بوڑھے نے باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا جو میرے حق میں مضر ثابت ہو سکتا تھا۔

"یمن۔" میں نے اسے سوچنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ "جنوبی یمن۔"

"عرب ہو کر بھیک مانگتے ہو۔" اس نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ کام تو ہندیوں کو ہی زیب دیتا ہے، صورت سے بھی مسکین لگتے ہیں۔"

"ہندی یہاں بھیک مانگتے ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"کثرت سے ملیں گے۔" اس نے ڈیش بورڈ سے سگار نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ذرا اُسے سلگا دو۔"

"مگران کا یہاں کیا کام ہے؟" میں نے اس کے ہاتھ سے سگار لیتے ہوئے سوال کیا۔ موقع مل جانے پر میں اُسے ہندیوں ہی کے بارے میں مصروف رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے سوالات کا رخ میری ذات اور مصروفیات کی طرف مبذول نہ ہو سکے۔

"بڑے ولدالحرام ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ "غیر قانونی کاغذات پر پیسہ بٹورنے لیبیا چلے آتے ہیں اور جب وہاں والے دُرّے مار کر باہر ہانک دیتے ہیں تو سوڈان میں گھس آتے ہیں۔ ان کے تو یہاں آنے اور بھیک مانگنے کا جواز ہے مگر تم کیوں بھیک مانگ کر عربوں کے نام پر بٹہ لگا رہے ہو؟"

میری کوشش بارآور ثابت نہ ہو سکی اور وہ دوبارہ میرے بارے میں سوال کر بیٹھا۔ اس کی سوچ بھی خاصی متعصبانہ تھی۔

"یمن بھی خاصا مفلوک الحال ملک ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"مگر تم جیسے مٹے کٹے کو ہر ایک ملازمت پر رکھ لے گا۔"

"میری کہانی خاصی طویل ہے، کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم خواتین کی موجودگی میں اس موضوع پر بات نہ کریں؟"

وہ سگار کا دھواں اگل کر زور سے ہنس پڑا۔ "ان کی پروا نہ کرو، یہ ہر قسم کی گفتگو سننے کی عادی ہیں۔"

"میں تو انھیں تمھاری محرمات سمجھ رہا تھا۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"تم مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو۔" وہ یک بیک سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے اپنی باتوں کا جواب چاہیے۔"

"تم غلط سمجھے ہو......"

"میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔" وہ میری بات کاٹ کر غرّایا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو اور اتنی صبح اس سڑک پر کیا کر رہے تھے؟"

میری ریڑھ کی ہڈی میں ہزاروں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس کا لب و لہجہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھا۔

"تمھارا رویہ توہین آمیز ہوتا جا رہا ہے۔" میں نے نرم لہجے میں احتجاج کیا۔ "میں جو بھی سہی مگر تمھیں مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"میں نے لفٹ دی ہے تمھیں۔" وہ چڑانے والے لہجے میں بولا۔

"پھر اتار دو مجھے۔"

"سنو دوست! تم بھکاری نہیں ہو۔" وہ بولا۔ "میں نے بھی ایک عمر گزاری ہے اور آج تک کسی بھکاری کو تم جیسا خوددار نہیں دیکھا۔"

"اچھا ہوا کہ اب دیکھ لیا۔" یہ کہہ کر میں نے پھرتی سے پستول نکال لیا۔ "نہ دیکھتے تو حسرت دل میں لیے مر جاتے۔"

وہ عورتیں جو بھی رہی ہوں مگر آتشیں اسلحہ بخوبی پہچانتی تھیں۔ پستول کی جھلک دیکھتے ہی دونوں کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔

"خاموش رہو۔" ادھیڑ عمر پستول کو نظرانداز کرتے ہوئے دونوں عورتوں پر برس پڑا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تو میرے شبہات درست ہی نکلے۔"

"گاڑی کی رفتار کم کر لو اور آگے جو پہلا موڑ آئے گاڑی اسی پر گھما لینا۔" میں نے پستول کی سرد نال اس کی برہنہ گردن سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اُسے دور ہٹاؤ۔" اس نے بے خوفی سے میرا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا۔ "ایسا نہ ہو کہ بدحواسی میں تمھاری کوئی کانپتی ہوئی انگلی ٹریگر کو دبا دے۔"

مجھے اس کی بکواس پر خاصا طیش آیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ قطعی خائف نہیں تھا، دوسرے یہ کہ وہ الٹا میرا ہی مضحکہ اڑا رہا تھا البتہ اس نے میری ہدایت ملتے ہی کار کی رفتار فوری طور پر کم کر دی تھی۔

"یہ نہ سمجھنا کہ میں ضرورت پڑنے پر محض سوچتا رہ جاؤں گا۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "بعد میں تمھیں پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے گا۔"

"یہ بتاؤ کہ تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو یا کسی کا خون کر کے بھاگ رہے ہو؟" اس نے پہلو بدل کر ایک کہنی کھڑکی پر ٹکاتے ہوئے سوال کیا۔

"پہلے تمھیں لوٹوں گا پھر تمھاری کھال میں بھوسہ بھر دوں گا۔" اس کی گفتگو خواہ مخواہ مجھے اشتعال دلا رہی تھی حالانکہ میں پُرسکون رہنا چاہتا تھا۔

وہ پھر زور سے ہنسا۔ "لوٹنے کے لیے میرے پاس ان دو عورتوں کی آبرو کے سوا کچھ نہیں ہے، چاہو گے تو میں خود انھیں تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ کیا بکواس ہے اسد!" پیچھے سے ایک عورت خوفزدہ اور غصیلے لہجے میں بولی۔ "تم خواہ مخواہ اُسے اکسا رہے ہو۔"

"تمھاری پیشکش قابل غور ہے۔" میں نے دونوں عورتوں کو بدظن کرنے کے لیے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ "چند گھنٹے خاصے پرکیف گزریں گے۔"

"نہیں اتار دو۔" پیچھے والی بوکھلا کر بولی۔ "ہم بھیڑ بکریاں نہیں ہیں جنھیں ان کی مرضی کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔"

اسد غصیلے لہجے میں بولا۔ "اگر اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو تمھیں بھی نہیں بخشے گا لہٰذا خاموشی سے بیٹھی رہو۔ ہم اس کے دشمن نہیں ہیں۔"

"میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانا کمینگی سمجھتا ہوں۔" میں نے آنکھ مار کر کہا کیونکہ اسد اس وقت سڑک کے بجائے مجھے گھور رہا تھا۔

اسد نے غصے میں اسٹیئرنگ وہیل پر مکا مارا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کو میرے خلاف ورغلانے کی کوشش کر رہے ہو اور وہ بھی تمھاری باتوں میں آ رہی ہیں لیکن تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔"

"موم لگا کر تمھارا مجسمہ محفوظ کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تک تمھاری خیریت رہے گی جب تک بے چون و چرا میری بات مانتے رہو گے۔"

اس کے بعد کار میں خاموشی چھا گئی۔ کافی دیر تک سفر کے بعد بھی کوئی موڑ نہ آیا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ تیز رفتاری کی صورت میں اچانک بریک لگا کر اسد کوئی چال چل سکتا تھا جب کہ میں اس کار سے جلد از جلد اترنا چاہتا تھا۔ اس سیدھی سڑک پر اترنے کی صورت میں میرا دوبارہ تلاش کیا جانا آسان ہوتا محض اس لیے میں کسی موڑ کا منتظر تھا تاکہ کسی ذیلی راستے پر چند میل آگے جا کر ان سے الگ ہو سکوں۔ ان تینوں سے مجھے کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں تھا اگر وہ شخص بسیارگوئی کا شکار نہ ہوتا تو شاید اس سے الجھنے کی نوبت نہ آتی۔ میں طے کر چکا تھا کہ ان تینوں کو بے ہوش کر کے کسی ویرانے میں چھوڑنے کے بعد میں کار لے کر روانہ ہو جاؤں گا جسے کسی ایسے مقام پر چھوڑ دوں گا جہاں سے ٹرک کے ذریعے ام درمان یا خرطوم کا رُخ اختیار کر سکوں۔ اسد ہوش میں آنے کے بعد اپنی کار کی چوری کی رپورٹ درج کراتا تو میرا نام بتانے سے قاصر رہتا البتہ حلیے کے طور پر پولیس کو میرے حلیے سے ضرور آگاہ کر دیتا جسے میں باآسانی تبدیل کر سکتا تھا۔ پھر کار کی چوری کوئی سنگین جرم بھی نہیں تھا جب کار دستیاب ہو جاتی تو سارا معاملہ از خود داخل دفتر ہو جاتا۔

میرے جی میں آئی کہ اسد سے راستے کے بارے میں سوال کروں لیکن اس طرح وہ سمجھ لیتا کہ میں ان اطراف میں اجنبی تھا جب کہ میں اُسے اپنے بارے میں کم سے کم معلومات فراہم کرنا چاہتا تھا۔ عقبی نشست پر دونوں عورتیں سکوت سے کتا گئی تھیں اور انھوں نے سرگوشیوں میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ میں نے بظاہر بے خبر بنتے ہوئے ان کی مدھم آوازوں پر کان لگائے تو یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ میرے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہی تھیں بلکہ میرا اور اسد کا موازنہ کرنے میں مصروف تھیں اور ان کی رائے میرے حق میں تھی۔

پھر دو پہاڑیوں کے درمیان ایک طویل موڑ گھومتے ہوئے اچانک ہی کسی آبادی کے آثار نظر آنے لگے اور میں چوکنا ہو گیا۔

"یہ کون سی آبادی آنے والی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ابو حمار۔" اس نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔

"میں نے تمھاری ولدیت نہیں بستی کا نام پوچھا ہے۔" میں نے غرّا کر کہا اور دونوں عورتیں خوفزدہ ہونے کے باوجود بے ساختہ ہنس پڑیں کیونکہ اسد نے جو کچھ کہا اس کا مطلب گدھے کا باپ ہوتا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" وہ خفت آمیز غصیلے لہجے میں بولا۔

"اپنی ولدیت؟" مجھے اسے سلگانے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا جو میں نے ضائع نہیں کیا اور عقبی نشست سے اس مرتبہ پھر بلند آہنگ قہقہے پھوٹ پڑے۔ وہ دونوں عورتیں واضح طور پر مجھے دوستی کی دعوت دے رہی تھیں مگر میں انجان بنا ہوا تھا۔

اسد نے بریک لگا کر جھٹکے کے ساتھ کار روک دی۔

"تم اترو اور دفع ہو جاؤ۔" وہ میرے پستول کو خاطر میں لاتے بغیر کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرّایا۔ "اتنا ہی ساتھ کافی ہے۔"

"کار چلاؤ۔" میں نے پستول کی نال اس کی گردن کے بجائے پہلو سے لگا دی تاکہ آنے جانے والی کسی گاڑی میں سے ہتھیار نہ دیکھا جا سکے۔

"چلا دو گولی۔" وہ بے خوفی سے غرّایا۔ "یہ کار تمھارے ناپاک بوجھ سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر یہاں سے ایک انچ آگے نہیں بڑھے گی۔" اسی کے ساتھ اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کار کا انجن بھی بند کر دیا۔

میرے لیے ایک گولی چلانا بڑا آسان تھا لیکن نہ جانے کیوں میں اس سنکی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ اس بیچارے کی شامت ہی اسے اس راستے پر لے آئی تھی جہاں میں کسی کا منتظر تھا۔ عورتوں کا ساتھ ہونے کے باوجود اُس نے مجھے لفٹ دے کر اعلیٰ ظرف اور حوصلے کا ثبوت دیا تھا، اب یہ اور بات تھی کہ طویل صحرائی سفر سے بگڑی ہوئی میری حالت بھی اسے میرے گداگر ہونے کا یقین نہ دلا سکی اور وہ میرے کوائف سے واقفیت حاصل کرنے پر مُصر ہو گیا اور بس کا یہی اصرار اس وقت میرے لیے ایک فیصلہ کن عنصر بن گیا تھا۔

"سُن رہی ہو تم دونوں؟" میں نے سر گھمائے بغیر دونوں عورتوں کو پہلی بار براہِ راست مخاطب کیا۔ "یہ خود گولی کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

"تو کیا تم واقعی اسے مار دو گے؟" اس بار اُبھرنے والی نسوانی آواز مترنم اور دلکش تھی مگر اس میں خوف کی لرزش نمایاں تھی۔

"تمھاری نظروں سے نہ مر سکا تو اب مجھے ہی مارنا ہو گا۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "اسے سمجھاؤ کہ میری ہدایات پر عمل کرتا رہے۔"

"تم کیوں اس شریف آدمی کو مشتعل کر رہے ہو اسد؟" اس بار دُوسری عورت کی آواز ابھری تھی۔ "جو کہہ رہا ہے وہ کرتے رہو۔"

"میں اس کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔" اسد کے دماغ کی کوئی رگ شاید بُری طرح بھڑک گئی تھی۔ "مجھے گولی مارنا ہے تو مار دے، تم دونوں میرے قتل کی چشم دید گواہ ہو گی کیونکہ میرے دوستوں نے ساری

رات مجھے تمھارے ساتھ جشن منانے کے بعد کار میں لوٹتے دیکھا ہے۔ یہ فرار ہو جائے گا اور تم بندھی پھرتی رہو گی۔ پولیس کا ہر ہر اہلکار تمھارے ساتھ قیدِ تنہائی میں ایسی باز پرس کرے گا کہ تم زندگی بھر کے لیے گواہ بننے کے جبری یا رضاکارانہ گناہ سے توبہ کر لو گی۔"

"تم اس سے جس طرح چاہو نمٹ لینا لیکن اس سے پہلے ہمیں جانے دو۔" اس بار خوفزدہ مگر دلکش نسوانی آواز ابھری تھی۔

"تم کیسے اور کہاں جاؤ گی؟" میں نے سوال کیا۔

"آبادی قریب آ گئی ہے، ہم پیدل چلے جائیں گے۔" اسی دل نواز آواز نے سہمے ہوئے لہجے نے تجویز پیش کی۔

"یہ شخص واپس چھوڑنے جا رہا تھا؟" میں نے اسد کی طرف سے غافل ہوئے بغیر سوال کیا۔

"یہ طوائفیں ہیں۔ مخصوص لوگوں پر گزارہ کرتی ہیں۔" اسد نے جلے بھنے لہجے میں خود بخود بولنا شروع کر دیا۔ "پچھلی رات میں ان کا خریدار تھا۔ دام دے کر سودا وصول کر لیا اور اب انھیں ان کے ٹھکانے پر پھینکنے جا رہا تھا جہاں اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی شاید کوئی نیا گاہک دام لگانے آ جائے گا۔"

"تم پر خدا کا عذاب ہو اسد!" دلکش آواز نے اسے بد دعا دی۔ "تم نے ہمیں پیشہ ور بنا دیا حالانکہ تمھارا دل جانتا ہے ہم کاروباری سے زیادہ دوستیاں نبھاتے ہیں۔"

"میرا شمار کس میں ہے؟" وہ طنزیہ انداز میں غرایا۔ "سکوں کی جھنکار کے بغیر تو میں تمھیں بے حجاب بھی نہ دیکھ سکا۔"

میرے لیے اس تنازعے میں ملوث ہونا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا میں نے آہستگی سے پستول کی نال ہاتھ میں تھامی اور اسد کو کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر وزنی دستہ اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ ضرب کی آواز کے ساتھ ہی اسد کے حلق سے غضبناک غراہٹ بلند ہوئی اور اس کے ہاتھ میری طرف لپکے مگر کوئی مدافعت کرنے سے پیشتر ہی وہ بیہوش ہو کر ڈرائیونگ سیٹ پر لڑھک گیا۔

"ارے! یہ تو شاید مر گیا۔" وہ دونوں ہی بیک وقت حیرت اور خوف سے بول اٹھیں۔

"صرف بے ہوش ہوا ہے۔" میں نے انھیں ڈھارس دی۔ "تمھاری نیک نیتی پر بھروسہ کرتے ہوئے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔" میں نے پہلی بار ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟" سوال کرنے والی حسین ضرور تھی، لیکن خاصی پختہ کار معلوم ہوتی تھی جب کہ دلکش آواز والی حسین و گداز ہونے کے ساتھ ہی معصوم بھی نظر آ رہی تھی۔

"ایک مرد تم سے کیا چاہ سکتا ہے؟" میں روانی میں کہہ گیا۔

"یہ کتنی دیر بعد ہوش میں آئے گا؟" اس بار دلکش آواز والی نے شپٹا کر سوال کیا تھا مگر اس کی نشیلی آنکھیں میرے ہی چہرے پر

مرکوز رہیں۔

"ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ناممکن ہے۔" میں نے لپٹ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

وہ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر جھجکتے ہوئے بولی۔ "تم اسے ڈکی میں ڈال دو۔ ایسا نہ ہو راستے میں کسی کو ہم پر شبہ ہو جائے پھر ہمارے ساتھ چلو۔"

"تم کہاں رہتی ہو؟"

"راس الفلاح۔ یہاں سے شاید دس میل ہو گی ہماری بستی۔" آواز والی ہی مجھ سے مسلسل... مخاطب تھی۔ شاید وہ بھانپ چکی تھی دوسری کے مقابلے میں مجھے اس کی ذات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

"تمھاری صورت کی طرح تمھاری بستی کا نام بھی پیارا ہے۔" بے تکلفی سے کہہ ڈالا۔ اس کی نگاہوں کے تیور خمار انگیز تھے کہ چند لمحوں میں ساری صورتحال کو فراموش کر کے اس کی ذات میں محسور ہو گیا۔

"اسے ڈکی میں ڈال دو، پھر گھر چلیں گے۔" اس نے اپنی نرم و گداز ہتھیلی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

اس سڑک پر ایک بے ہوش قیدی کے ساتھ زیادہ دیر رکنا خود میرے لیے مخدوش تھا لہٰذا میں دروازہ کھول کر نیچے اترا اور نصف طواف کر کے ڈرائیونگ سیٹ کی سمت میں پہنچ گیا۔

اسد کے بھونڈے جسم کو اپنے کندھے پر لاد کر میں ڈکی کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر سخت الجھن ہوئی کہ اس میں چابی لگانے کے لیے سوراخ تھا اور نہ ڈکی کھولنے کے لیے کوئی بٹن لگا ہوا تھا۔ پہلے خیال آیا کہ کہیں لڑکی کی ہتھیلی کا لمس میری بینائی پر اثر انداز نہ ہوا ہو لیکن جب کوئی چیز نظر نہ آئی تو میں واپس ہو لیا۔

اس وقت دوسری لڑکی نشست پھلانگ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ چکی تھی۔

"کیا ہوا؟" مجھے دیکھ کر اس نے بوکھلائے لہجے میں سوال کیا۔

"ڈکی شاید خودکار ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈیش بورڈ پر کوئی بٹن تلاش کرو جو اسے کھول سکے۔"

"لاؤ چابی مجھے دے دو۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "سوئچ آن کیے بغیر شاید بٹن کام نہ کرے۔"

میں نے چابی اسے دے دی جو اس نے سوئچ میں لگا کر گھمائی تو ڈیش بورڈ کے خانے میں تیل اور بیٹری چارجنگ کی روشنیاں جل اٹھیں۔

ڈکی کا سوئچ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ مخصوص بٹن دبتے ہی ڈکی کا ڈھکن بے آواز اوپر اٹھ گیا۔

میں نے کار کے عقب میں جا کر بے رحمی سے اسد کو ڈکی میں ڈالا۔ اس کے ہاتھ پیر یوں سمیٹ دیے کہ وہ ڈھکن بند کرنے سے زخمی نہ ہو اور ڈکی بند کر دی۔

عین اسی لمحے یک بیک کار کا انجن بیدار ہوا اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ سوچ سکتا، وہ کار برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ میں کسی احمق کی طرح سڑک پر کھڑا اس کار کو تکتا رہ گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ ڈالوں۔

اس وقت میں حقیقی معنوں میں عورت کے طلسم کا شکار ہوا تھا۔ دلکش آواز والی جتنی حسین تھی اس سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوئی تھی۔ میرا اعتماد جیتنے کے لیے وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شروع سے میرے ساتھ لگاوٹ کا اظہار کرتی رہی اور میں اس خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ وہ واقعی میری ذات اور باتوں سے متاثر ہوئی تھی جب کہ وہ ابتدا ہی سے کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہی ہو گی کہ مجھے جل دے کر اسد سمیت فرار ہو سکے۔

اسد کی ذات سے ان دونوں عورتوں کی وابستگی اتنی گہری تھی کہ خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ اسد کو چھوڑ کر نہیں بھاگیں ورنہ مجھ سے چابی حاصل کرنے کے بعد وہ میرے شانے سے اسد کی ڈکی میں منتقلی کا انتظار کیے بغیر بآسانی رفوچکر ہو سکتی تھیں اور میں اسد کے بے ہوش جسم کو کندھے پر لادے کفِ افسوس ملتا رہ جاتا۔

ان کی یہ حرکت میرے لیے اس قدر غیر متوقع تھی کہ میں جوابی کارروائی تو درکنار، اس کا جواز بھی نہ سوچ سکا ورنہ پھرتی سے کام لے کر پستول سے کام لیا جاتا تو ایک یا دونوں عقبی ٹائروں کا ناکارہ کیا جانا بھی آسان ثابت ہوتا۔

آبادی قریب تھی اور میرے ہاتھوں ادھوری رہ جانے والا لطف ان کے ساتھ جا چکا تھا۔ مجھے ڈر محسوس ہونے لگا کہ وہ عورتیں کہیں اسد کے ساتھ فوراً ہی واپسی کا ارادہ نہ کر لیں لہٰذا میں نے سڑک سے اتر کر تیز رفتاری سے ایک طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

اس وقت میری حالت بہت ابتر تھی۔ صحرا میں سفر اور آندھی کے سبب میرا حلیہ بہت خراب ہو چکا تھا۔ اس طرح کسی بھی آبادی میں میری طرف بآسانی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی۔ میرا سب سے پہلا مسئلہ شیو کا تھا۔ کئی روز کی بڑھی ہوئی داڑھی کے بارے میں جبل القوف میں کوئی خیال آیا ہوتا تو وہیں سے شیو بنانے کا کوئی اوزار لے لیا ہوتا۔ میرے پاس آئینہ نہیں تھا مگر اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے سے مجھے اپنی ہیئت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

میں سڑک سے بمشکل ایک ڈیڑھ فرلانگ دور گیا ہوں گا کہ اچانک فضاؤں میں کرخت سی گونج پیدا ہو گئی۔ میں نے سر گھمایا تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

دو باوردی افراد جو یقینی طور پر پولیس افسر ہی معلوم ہو رہے تھے، بڑے انجنوں والی موٹر سائیکلوں پر سوار سڑک سے اتر کر ناہموار میدان میں میری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

"ٹھہرو!" مجھے گردن گھماتے دیکھ کر ان میں سے ایک للکارا۔

اس وقت میں ایک ایسے کچے میدان میں تھا جہاں گھاس پھونس اور چھوٹی خودرو جھاڑیوں کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ ان دو کے مقابلے میں میں خراب پوزیشن میں تھا اور یہ امکان بھی تھا کہ ان کے پیچھے بھاری نفری آ رہی ہو لہٰذا ان کا مقابلہ کرنا ہر اعتبار سے بے سود، بلکہ نقصان دہ تھا۔

اس وقت تک مجھ پر اپنی شناخت کے علاوہ کوئی سنگین جرم عائد نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن پولیس سے مقابلے کے بعد اگر میں زخمی حالت میں گرفتار کیا جاتا تو مجھے بدترین فردِ جرم کا سامنا کرنا پڑتا۔

زہریلے تیروں والی نلکی کی کارکردگی گو مشکوک ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ میرا بہترین ہتھیار تھی جو دوسروں کے لیے ہر شبہ سے بالاتر ہوتی لیکن پستول پولیس افسران سب سے پہلے اپنی تحویل میں لے لیتے اور مجھ پر بلا لائسنس ہتھیار رکھنے کا جرم بھی عائد ہو جاتا۔

میں نے ایک فیصلے پر پہنچ کر پستول ایک طرف اچھال دیا۔ گولیاں بھی جھاڑیوں میں پھینک دیں پھر محض جگہ بدلنے کے لیے ایک طرف دوڑ پڑا۔

"ٹھہرو!" پولیس افسر کی للکار دوبارہ گونجی اور اسی کے ساتھ ریوالور کے فائر کی آواز سنائی دی۔

ریوالور کی گولی مجھ تک نہیں پہنچی لیکن میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا رک کر مڑا اور دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا دیے۔

دونوں موٹر سائیکلیں ناہموار کچی زمین پر اچھلتی اور غراتی تیزی سے میرے قریب آتی جا رہی تھیں اور ان کا قرب لحظہ بہ لحظہ مجھے سیتا سے دور کرتا جا رہا تھا۔



میری طرف سے بے چون و چرا سپردگی کا اظہار خیرسگالی کی اچھی علامت ثابت ہوا کیونکہ جب پولیس افسران نے قریب آکر اپنی موٹر سائیکلیں روکیں تو ان کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمایاں تھی اور وہ اس معرکے کے انجام پر خوش تھے جو انہوں نے لڑے بغیر جیت لیا تھا اور میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں نے اس خوبرو عورت کی رسیلی آواز سن کر اس کے فریب کا شکار ہونے کا رضاکارانہ فیصلہ کیا تھا۔

عورت کی ذات میرے لیے کھلونا ضرور بنتی رہی لیکن میں کبھی اس کو سمجھنے کا دعویٰ کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ ایک طرف سیتا تھی جس کی خاطر میں دنیا سے ٹکرا جانے پر آمادہ تھا اور دوسری طرف وہ رسیلی آواز والی تھی جو سراپا صیاد تھی۔

ان میں سے ایک نے موٹر سائیکل سے اتر کر رسمی انداز میں مجھ پر ریوالور نکال لیا اور دوسرے نے میرے پورے جسم پر ہاتھ پھیر کر یہ اطمینان کر لیا کہ میرے پاس کوئی خطرناک ہتھیار موجود نہیں تھا جو ان کی سلامتی پر اثرانداز ہو سکے۔

"عورتوں نے بھیجا ہے؟" میں نے مسکرا کر نرم لہجے میں سوال کیا۔

"اگر تم نے کچھ پیسے ہی خرچ کر لیے ہوتے تو ہم بھی اس ہنگامی بھاگ دوڑ سے بچ گئے ہوتے۔" غیر مسلح افسر نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "عورتوں کے معاملے میں مفت خوری کی عادت حوالات ہی کا راستہ دکھاتی ہے۔"

"تو کیا شکایت کی گئی میری؟" میں نے اس کے ہمراہ بڑھتے ہوئے کہا۔

"تم نے لفٹ لی تھی ان سے؟"

"ہاں!" میں نے حیرت سے کہا۔

"غلطی ان ہی کی تھی۔" اس نے کہا۔ "انہیں ایک مرد کو بٹھانے کی ضرورت کیا تھی اور تم بھی ان کا قرب نہ جھیل سکے۔ دست درازی پر اتر آئے۔" اس کا لہجہ ملامت آمیز تھا۔

"اوہ!" میں اس صاف جھوٹ پر حیران رہ گیا۔ "یہ کھلی بکواس ہے۔ وہ عورتیں کہاں ہیں؟"

"ان کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ خوفزدہ تھیں۔ شاید چلی گئی ہوں۔" میرا ردعمل اس کے لیے غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔

"ان کے ساتھ ایک مرد بھی تھا.....!"

"نہیں۔" اس نے پورے وثوق سے میری بات کاٹ دی۔ "کار میں ان دونوں کے علاوہ چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا۔"

"وہ ڈکی میں بیہوش پڑا ہے۔" میں نے کہا اور وہ دونوں ہی حیرت سے اچھل پڑے۔

"وہ کون ہے اور اسے کس نے بے ہوش کیا؟" تقریباً یکساں الفاظ میں دونوں نے ہی بیک وقت ایک ہی سوال کیا۔

"دونوں عورتیں طوائفیں تھیں.....!"

"یہ معلوم ہے، آگے کہو۔" ان میں سے ایک نے اضطراری انداز میں میری بات کاٹ کر قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"وہ مردان کا کوئی پرستار تھا اور شب بسری کے بعد انہیں چھوڑنے واپس جا رہا تھا۔ اسی نے کار روک کر مجھے لفٹ دی تھی اور بعد میں اپنا احسان جتا کر وہ مجھے دھمکیاں دینے لگا اور میں نے طیش میں آ کر اس کے سر پر ایک مکا رسید کر دیا جو اس کی بے ہوشی کا سبب بن گیا۔" میں نے پستول کا تذکرہ دانستہ اپنی کہانی سے گول کر دیا۔ "ان دونوں عورتوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اسے ڈکی میں ٹھونس کر ان کے ہمراہ چلوں اور جوں ہی میں نے نیچے اتر کر اسے ڈکی میں ڈالا وہ مجھے سڑک پر کھڑا چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔"

"انہیں تمہارے خلاف جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ تو وہی بتا سکیں گی۔" میں نے شانے اچکا کر لاپروائی سے کہا۔ "نہ جانے کیا سوچ کر اس معاملے میں انہوں نے تم لوگوں کو ملوث کیا۔"

"اے!" ان میں ایک نے تیز لہجے میں کہا۔ "ہم لوگ نہیں... ہم قانون کے محافظ ہیں اور ہمیں طاقت کے زور پر قانون نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔"

"اوہ! میرا مطلب تمہاری تضحیک نہیں تھا۔" میں نے جلدی سے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب میں نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تو انہیں پولیس سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"فی الحال تو تم تھانے چلو۔" وہی شخص بولا۔ "بعد میں انہیں بھی بلا لیا جائے گا پھر پتہ چل جائے گا کہ دونوں میں کون جھوٹا ہے!"

وہ میری تلاشی لے کر اپنا اطمینان کر چکے تھے اور پھر میرے مصالحانہ رویے نے بھی انہیں یقین دلا دیا تھا کہ میں راستے میں ان کے ساتھ شرارت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لہٰذا ان میں سے ایک نے مجھے اپنے عقب میں موٹر سائیکل پر بٹھا لیا اور دوسرا [illegible] سے ہمارے پیچھے آنے لگا۔

روانگی کے وقت پیچھے والے نے احتیاطاً مجھے تنبیہ کر دی [illegible] میں نے ذرا بھی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو وہ بے دریغ مجھے [illegible] دے گا۔

ہموار سڑک پر وہ سفر چند منٹ بعد ہی ختم ہوتا نظر آنے لگا [illegible] درختوں کے درمیان سے گھومتا ہوا موڑ طے کرتے ہی آبادی کے [illegible] آنے لگے۔

وہ کوئی خاصی بڑی اور بارونق آبادی تھی۔ کم از کم سڑک [illegible] کنارے سے میں نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کیونکہ مجھے آبادی [illegible] کا موقع نہیں مل سکا۔ تھانہ لب سڑک ایک کشادہ عمارت

تھا اور دونوں موٹر سائیکلیں یکے بعد دیگرے اس کے احاطے میں داخل ہو کر ایک سایہ دار مقام پر روک دی گئیں کیونکہ سورج کی کرنوں میں اس وقت بھی خاصی حرارت تھی۔

تھانے کے احاطے میں بھی خاصی بارونق تھی۔ باوردی سپاہیوں اور افسروں کے علاوہ عام شہری بھی چلتے پھرتے یا سایہ دار مقامات پر بیٹھے نظر آ رہے تھے جس طرح وہاں نظر آنے والے انسانوں میں تنوع تھا اسی طرح سواریوں کے معاملے میں بھی رنگینی نظر آ رہی تھی۔

چھوٹی بڑی موٹروں، موٹر سائیکلوں اور ایک لاری کے علاوہ احاطے میں جا بجا اونٹ اور خچر بھی بندھے ہوئے تھے جن کی موجودگی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس قصبے کے لوگوں نے بیرونی سہولتوں سے روشناس ہونے کے بعد ماضی سے اپنا ناتہ بالکل ہی نہیں توڑ لیا تھا۔ ان کی زندگی میں جدت اور قدامت کے اس امتزاج نے ایک حسن سمو دیا تھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے موٹر سائیکل سے اترنے کے بعد ایک پولیس افسر سے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"مرقاب۔" اس نے مختصراً جواب دیا اور میرے شانے پر ہاتھ مار کر برآمدے کے زینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

برآمدے میں پڑی ہوئی خستہ حال چوبی بنچ پر بٹھا کر انہوں نے مجھے ایک مسلح سنتری کی تحویل میں دیا اور خود کہیں غائب ہو گئے۔

"سگریٹ سلگاؤں؟" کچھ دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد میں نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر پر مسلط سنتری سے سوال کیا۔

"ایک مجھے بھی دو۔" وہ میرے برابر ہی میں بنچ پر بیٹھ گیا۔

"راس الفلاح یہاں سے کتنی دور ہے؟" سگریٹ کے ایک دو کش لینے کے بعد میں نے سنتری کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

"کیا؟" اس نے یوں چونک کر پوچھا کہ میں بوکھلا گیا۔

"راس الفلاح۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا کسی عمارت کا نام ہے؟" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"اسی راستے پر کوئی بستی ہے۔"

وہ عارفانہ انداز میں ہنس پڑا۔ "کسی نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ یہاں دور دور اس نام کی کوئی آبادی نہیں ہے۔ شاید تم یہاں اجنبی ہو۔"

"شاید مجھے سننے میں مغالطہ ہوا ہو گا۔" میں نے اس کا آخری سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"عبداللہ!" اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟"

"پتہ نہیں وہ واپس آئیں تو معلوم ہو گا۔" میں نے اسے ٹالنے کی نیت سے کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔ "صبح سویرے تمہاری گرفتاری بے مقصد نہیں ہے۔ ان دونوں کو شاید آج کچھ خریداری کرنی ہے۔"

"خدا خیر ہی کرے، میرے لیے تو آج دن کا آغاز بہت ہی خراب انداز میں ہوا ہے۔" میں تشویش زدہ انداز میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

"کہاں چھپے ہوئے تھے تم؟ غالباً کئی روز بعد پولیس تم تک پہنچی ہے۔" اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شکل و صورت سے تو اتنے بے قصور نہیں معلوم ہوتے جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔"

میرے لبوں سے بے بسی کی ایک گہری آواز آزاد ہو گئی اور میں اپنی کئی روز کی بڑھی ہوئی داڑھی سہلانے لگا۔ اس نے اپنے تبصرے سے پہلی بار مجھے یاد دلایا تھا کہ میری شکستہ حالی بھی بازپرس کے مراحل میں بہتیرے سوالات کو جنم دے سکتی تھی۔

میری ذات میں اس سنتری کی دلچسپی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی جبکہ وہ میرے لیے قطعی بے مصرف تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ خود ہی اس سے گفتگو کا آغاز کرنے کے بعد میں اسے کس طرح خاموش رکھ سکوں گا۔

مگر میری یہ مشکل چند ہی ثانیوں میں آسان ہو گئی کیونکہ ایک اردلی دور سے ہاتھ ہلا کر میرے نگہبان سے میرے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"چلو جاؤ۔" سنتری نے میری پشت پر ہاتھ مار کر کہا۔ "سسرال سے بلاوا آ گیا ہے تمہارا۔"

میں فوری طور پر بنچ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

بھونڈے جسم والا اردلی غیر ضروری حد تک فرض شناسی کے مظاہرے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی سختی سے میرا داہنا بازو دبوچ لیا اور اپنی دانست میں مجھے آگے کی طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے قدم سختی سے فرش پر جم گئے۔ "میرا بازو چھوڑ دو، میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔"

میری غراہٹ سن کر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور توقع کے برعکس بایاں ہاتھ گھما دیا۔

اس کی کلائی اور پنجے کی ضرب خاصی قوت سے میرے چہرے پر لگی اور میں اشتعال کے عالم میں اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

وہ بھی شاید ایسے سلوک کی امید نہیں رکھتا تھا کیونکہ اس کے حلق سے بوکھلائی ہوئی بے معنی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس سے پیشتر کہ کوئی صورت حال کا صحیح ادراک کر کے اس کی مدد کو آتا میں اسے دیوار سے ٹکرا کر تین چار بھرپور گھونسے رسید کر چکا تھا۔

کسی نے عقب سے کالر پکڑ کر مجھے گھسیٹا تو وہ اردلی میرے ہاتھوں سے پھسل کر کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اسی کے ساتھ کئی افراد میرے بدن کے مختلف حصوں پر مکے برسانے لگے اور میں نے اپنا سر اور چہرہ کہنیوں میں چھپا لیا۔

یہ تمام کارروائی بمشکل چند ثانیوں میں رونما ہوئی مگر اس کے

جلو میں اس قدر شور و غوغا پیدا ہوا کہ شاید کئی اعلیٰ افسران کو بوکھلا کر اپنے کمروں سے باہر آنا پڑا اور ان کی مداخلت کے باعث میں خاک چاٹنے سے بچ گیا۔

مجھے زدوکوب کرنے کا سلسلہ تو موقوف ہو گیا لیکن کئی افراد نے مجھے بری طرح جکڑا ہوا تھا۔

"چھوڑ دو اسے" ایک کرخت مردانہ آواز گونجی اور مجھے اس وحشیانہ گرفت سے فوری طور پر نجات مل گئی۔

میرے سامنے سانولی رنگت اور گھونگھریالے بالوں والا ایک لحیم شحیم سوڈانی پولیس افسر اپنے ماتحتوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

اس نے کچھ کہے بغیر اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی بید سے میرے بدن پر ضرب لگانے کی کوشش کی مگر میں اچھل کر بچ گیا۔

میں اس کے ظالمانہ ردِ عمل کے لیے تیار ہو چکا تھا لیکن وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنس پڑا۔ "اس بندر کی اولاد کو میرے کمرے میں لے آؤ۔"

اس کے ہمراہ وہ دونوں افسر بھی تھے جنہوں نے مرقاب کے نواح سے مجھے گرفتار کیا تھا۔ وہ مجھے پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

اپنے غصیلے ردِ عمل پر مجھے خود بھی ندامت ہو رہی تھی کیوں کہ گرفتاری کے وقت میں نے اپنے مصالحانہ رویے سے خیر سگالی کی جو فضا ہموار کی تھی وہ اشتعال کے سبب معدوم ہو چکی تھی اور میرے لیے مصائب کی ابتدا ہونے والی تھی۔

بید والا قدآور سوڈانی پولیس افسر شاید اس تھانے میں سب سے زیادہ با اختیار تھا کیونکہ اپنے آراستہ دفتر میں اس نے نہایت باوقار انداز میں کرسی سنبھالی تھی۔

میرے لیے صورتِ حال خاصی سنگین ہو چکی تھی جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میں نے وہی راہ اپنانے کا فیصلہ کیا جو میرے ہاتھوں ہونے والے طوائفوں کے ساتھی نے ابتدا میں سجھائی تھی۔

افسرِ اعلیٰ کا پہلا سوال میرے نام اور پتے سے متعلق تھا اور میں نے بلا تردد اپنا نام احمد صلاح بتا ڈالا۔

"ٹھکانہ کہاں ہے؟" اس نے تحمل سے اپنا سوال دہرایا۔

"جنوبی یمن سے پیسہ کمانے لیبیا آیا تھا۔ انہوں نے پکڑ کر نکال دیا تو ادھر کا رُخ کیا تھا۔" میں نے منہ لٹکا کر کہا۔

"سوڈان میں کب داخل ہوئے تھے؟" وہ پولیس افسر ہونے کے باوجود غیر ضروری طور پر اپنا لہجہ بلند کرنے کا عادی نہیں تھا۔

"اٹھارہ بیس روز ہو گئے۔ ویرانوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ آبادی میں داخل ہوتے ہوتے خوف آتا تھا اور آج شہر کا رُخ کرتے ہی پکڑا گیا۔" میں نے اپنے لب و لہجے پر مظلومیت طاری کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یمن کا پتہ؟" اس نے سوال کیا اور دفتر کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا منشی پنسل سنبھال کر میرے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"عدن میں جھونپڑیوں کی ایک بستی میں رہتا تھا۔" میں اسے اپنی بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کمرے میں مجھ پر کم و بیش ایک گھنٹے تک جرح ہوتی رہی جس کے جواب میں میں نے روزگار کے ستائے ہوئے ایک غریب الدیار یمنی کی تصویر مکمل کر دی جو لیبیا میں زیرِ عتاب آنے کے بعد ایک طرف بھاگ نکلا۔ ہر سمت اور ملک کا احساس کیے بغیر ریگستان میں سفر کرتا ہوا مرقاب آ پہنچا۔ دورانِ سفر صحرا نشینوں سے مدد ملتی رہی۔ ایک آوارہ اونٹ بھی ہاتھ لگا تھا جو دو روز پہلے صحرا میں مر گیا۔

اس کے بعد باز پرس کا رُخ ان دو طوائفوں کی طرف ہو گیا، جن کی شکایت پر مجھے گرفتار کیا گیا تھا۔

اس کے سوالات سے میں نے اندازہ لگایا کہ سوڈانی قانون کے مطابق کسی شخص کو شدید ضرب پہنچا کر بے ہوش کرنے کے مقابلے میں کسی عورت پر مجرمانہ دست درازی کی کوشش زیادہ سنگین جرم تھی۔

اس معاملے میں میں اپنے ابتدائی بیان پر اڑا رہا اور آخر کار مجھے حوالات میں ڈالنے کے حکم کے ساتھ واپسی کی اجازت مل گئی۔

دروازے سے باہر اسی اردلی نے خونخوار نگاہوں سے میرا استقبال کیا جو اپنی بدتمیزی کی بنا پر میرے ہاتھوں پٹ چکا تھا۔

مجھے لے جانے کے لیے وہ لپک کر میرے پہلو میں آ گیا۔

"اسے حوالات میں ڈال دو۔" عقب سے کسی نے اسے حکم دیا اور سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

"تیرا خانہ خراب نہ کر دوں تو میرا بھی نام نہیں۔" اس نے میرے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"تجھ جیسے بہت سے دیکھے ہیں۔" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

"ابھی چند منٹ میں پتہ چل جائے گا۔" اس نے دھیمی مگر زہر آلود آواز میں کہا۔

اس وقت اس کا مفہوم میرے پلے نہ پڑ سکا لیکن جب وہ مجھے لے کر عقبی حصے میں جانے والی ایک تنگ اور قدرے تاریک راہداری میں سے گزر رہا تھا تو اس نے اپنے لباس کے کسی حصے میں پوشیدہ خنجر نکال کر پھرتی سے میرے بائیں پہلو میں اتار دیا۔

میرے حلق سے نکلنے والی اضطراری چیخ بہت تیز تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے پہلو دبائے وہیں گر گیا۔

وہ بزدل اپنا خنجر میری پسلیوں سے نیچے بدن میں پیوست چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ میں نے دستہ تھام کر وہ خنجر زخم سے باہر کھینچ لیا اور اسی کے ساتھ خون کے اخراج میں بھی خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

پھر کئی سمتوں سے قدموں کی آوازیں اور تحیر آمیز انسانی تبصرے ابھرنے لگے اور کئی چہرے میرے اوپر جھک گئے۔

"خودکشی کی کوشش کی تھی اس نے۔" مجھے مجمع میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔ "میں نے خود اسے اپنے پہلو میں خنجر بھونکتے دیکھا تھا۔"

"جھوٹ ہے یہ!" میں کسی سے مخاطب ہوئے بغیر بولا تو مجھے اپنی آواز کمزور محسوس ہوئی۔ "مجھ پر اردلی نے وار کیا تھا۔"

فوری طور پر اسٹریچر لایا گیا اور مجھے اٹھا کر اس پر ڈال دیا گیا۔ میرے زخم کے شگاف سے شاید خون کی زیادہ مقدار بہہ گئی تھی کیونکہ ایمبولینس میں پہنچنے سے پہلے ہی میرا ذہن اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں کسی ہسپتال کے صاف ستھرے کمرے میں بستر پر دراز تھا۔ میرے زخم میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سرہانے رکھے ہوئے آہنی اسٹینڈ سے جھولتی ہوئی خون کی بوتل ٹیوب کے ذریعہ میری بائیں کلائی کی کسی نس سے منسلک تھی۔

میں نے بدقت تمام داہنے ہاتھ سے جائزہ لیا تو زخم پر پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں۔

میں نے آنکھیں موندلیں اور بستر پر پڑا اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں حالات کی دلدل میں پھنس چکا ہوں، میں ہنگاموں اور کشت و خون سے جس قدر گریز کرنا چاہتا تھا اسی قدر ان سرگرمیوں میں ملوث ہوتا جا رہا تھا اور یکسوئی کے ساتھ سیتا تک پہنچنے کی کوئی صورت بار آور ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

ہاشم جو ایک مدت سے بُرے وقت میں میرا ساتھ دیتا چلا آیا تھا دردناک انداز میں صحرائے نوبی میں اٹھنے والی موت کی آندھی کا لقمہ بن چکا تھا اور سیتا کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ اس ہولناک صحرا کو عبور کر کے کسی آبادی تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکی تھی یا ہاشم کی طرح اسے بھی ریتیلی موت نے آ لیا تھا۔

ہسپتال کے بستر پر میں نے محسوس کیا کہ میں قانون سے چھپ کر سیتا کی تلاش میں بھاگتے بھاگتے تھک چکا تھا۔ لاہور میں اپنے گھر سے نکلنے کے بعد میری جد و جہد کی کہانی بڑی روح فرسا تھی۔ جنگلوں پہاڑوں شہروں اور ریگزاروں میں مجھے اپنے ایک ایک سانس کے لیے خوفناک تگ و دو کرنی پڑی تھی جبکہ میری منزل یا مقصد بہت زیادہ پُرفریب نہیں تھا۔

پیٹ بھر کر روٹی اور اپنی بیوی کی چاہت کا حصول ..... یہ دونوں آرزوئیں بہت ننھی منی اور معصوم سی تھیں مگر اندھا قانون زمین کے کسی بھی خطے پر میرے اس حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

صحرائے نوبی میں ہاشم کی دردناک موت اور پھر یوسف کی بے مہری کے بعد مجھے یہ امید بہت کم تھی کہ میں دوبارہ انسانوں کی شکل دیکھنے کے لیے زندہ رہ سکوں گا مگر میری سخت جان لق و دق صحرا کے تو سارے عذاب جھیل گئی لیکن رسیلی آواز والی سوڈانی طوائف کی میٹھی مسکان کا فریب برداشت نہ کر سکی۔

پھر مجھے یاد آیا کہ مرقاب کے تھانے میں بے ہوشی سے قبل مجھ پر کیے جانے والے قاتلانہ حملے کو خودکشی کہا جا رہا تھا اور وہ ایسا جرم تھا جس کی کامیاب تکمیل مجرم کو ہر سزا سے ماورا کر دیتی ہے مگر جرم میں ناکامی قابلِ تعزیر ٹھہرتی ہے۔

قدموں کی آہٹ نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

دروازہ وا ہوا تو آنے والا ایک باوردی سپاہی ثابت ہوا۔

"مرنا بھی کس قدر مشکل ہو گیا ہے۔" میرے بستر کے قریب رک کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اب کیا حال ہے تمہارا؟"

"مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہنا چاہا لیکن اس نے حیرت سے میری بات کاٹ دی۔

"یہ جھوٹ عدالت میں بولنا۔ تمہاری خودکشی کے تین چشم دید گواہ ہیں۔"

"چشم دید گواہ؟" اب حیران ہونے کی میری باری تھی۔

"دو آدمیوں نے تمہیں بچشم خود حارث سے خنجر چھین کر اپنے پہلو میں اتارتے دیکھا تھا۔" اس نے پورے اعتماد سے مجھے آگاہ کیا۔ "اور خنجر کے دستے پر تمہاری انگلیوں کے نشان بھی پائے گئے ہیں۔ تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔"

"تم یقین کرو کہ حارث نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے مجھ پر خنجر سے وار کیا تھا اور اس وقت دور دور تک کوئی متنفس اس راہداری میں نہیں تھا۔"

"حارث بھی بہت بدمعاش ہے مگر وہ گھبرا گیا تھا وہ سمجھا کہ تم خنجر سے اسی پر وار کرو گے۔" وہ میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ "اس وقت میں تو ڈیوٹی پر نہیں تھا لیکن لوگوں سے سنا کہ دو آدمیوں نے سارا منظر دیکھا تھا۔"

میں نے اپنا سر چکراتا محسوس کیا۔ حارث میری توقع سے زیادہ بدطینت شخص ثابت ہوا تھا اور اس نے اپنے جرم کا بوجھ میرے کندھوں پر لادنے کے لئے اپنے حواریوں میں سے میرے خلاف دو پکے گواہ بھی فراہم کر لیے تھے۔

"میری اشیاء کہاں ہیں؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"سب محفوظ ہیں، فکر نہ کرو۔" وہ بولا۔ "سزایابی کے بعد رہا ہو گے تو ہر چیز واپس مل جائے گی۔"

"مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا ہے؟"

"دو روز بعد!" اس نے میرے سرہانے پڑی ہوئی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ "تم پرسوں صبح بے ہوش ہوئے

تھے، اور شام ڈھلے یہاں پہنچا دیئے گئے تھے!"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ خرطوم کا مرکزی ہسپتال ہے، مرقاب میں تو معمولی زخموں کی دیکھ بھال بھی مشکل ہوتی ہے۔ آپریشن کے لئے تمہیں یہاں لانا پڑا!"

"تو آپریشن بھی ہوا ہے میرا؟" وہ ہر لمحہ میرے لئے حیرتناک انکشافات کئے جا رہا تھا۔ اس کی زبان سے خرطوم کا نام سن کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا تھا کیونکہ سوڈان میں اپنی مہم کے لئے میں نے اسی شہر کو ٹھکانا بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اب یہ اور بات تھی کہ میں کچھ عرصے کے لئے بستر سے لگ کر رہ گیا تھا۔

"سنا ہے خنجر کی نوک تمہارے ایک گردے میں اتر گئی تھی سفر میں زیادہ وقت لگنے کے باعث گردے کا زخم خراب ہو گیا اور یہاں تمہارا ایک گردہ نکال دیا گیا۔" اس نے کرسی کی پشت گاہ سے اپنا سر ٹکا کر سگریٹ سلگا لی۔

"ایک سگریٹ مجھے بھی دو گے؟"

"ضرور!" اس نے جلی ہوئی سگریٹ میری طرف بڑھا دی۔

"تمہاری وجہ سے تو مجھے خرطوم دیکھنا نصیب ہوا ہے ورنہ ساری عمر مرقاب ہی میں گزر جاتی، میں نے کل سارا دن شہر کی سیر میں گزارا کیونکہ فی الحال تم فرار کے قابل نہیں ہو!"

"یعنی میں زیر حراست ہوں؟"

"ہاں!" وہ بولا "غنیمت یہ ہے کہ تم پر صرف خودکشی کا الزام ہے جس رپورٹ پر تم پکڑے گئے تھے وہ تھانیدار کی وجہ سے واپس لے لی گئی یا شاید خودکشی کی خبر سن کر شکایت درج کرانے والیوں کو تم پر ترس آ گیا۔"

"اگر وہ رپورٹ واپس لے لی گئی ہے تو عدالت میں پولیس اس امر کا کیا جواز پیش کر سکے گی کہ میں قاتلانہ حملے کے وقت تھانے کی عمارت میں ایک اردلی کی نگرانی میں تھا۔"

وہ ہنس پڑا "تمہاری گرفتاری مشتبہ فرد کے طور پر دکھائی گئی ہے جو بازپرس سے گھبرا کر سوڈان میں غیر قانونی داخلے کا اعتراف کر چکا ہے!"

"تو یوں کہو کہ تھانیدار ان طوائفوں کو اس چکر سے بچا گیا" میں نے کہا "اس کی کہانی خاصی مؤثر ہو گی کہ ایک بے روزگار اور پریشان حال شخص جب پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا تو اپنے غیر قانونی داخلے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی زندگی سے بھی مایوس ہو گیا اور موقع پا کر اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کر ڈالی۔"

"شاید تم درست ہی کہہ رہے ہو" وہ بولا "مرقاب کا تھانیدار اپنی حسن پرستی کے سلسلے میں خاصا بدنام ہے!"

"تم میرے ساتھ چوبیس گھنٹے رہو گے؟" کچھ دیر کے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

"فی الحال ایسا ارادہ نہیں ہے" وہ مسکرا کر بولا "جب تک تم چلنے پھرنے سے معذور ہو اس وقت تک خرطوم کی دل کھول کر سیر کروں گا بہت ہی عمدہ شہر ہے، بس جس روز تم نے چہل قدمی شروع کی میری چھٹی بند ہو جائے گی، اصولاً تو مجھے ہر حال میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگے رہنا ہے اور اسی وجہ سے مجھے محکمے سے ایک ریوالور بھی دیا گیا ہے!"

"میری جیبوں سے برآمد ہونے والا سامان کہاں ہے؟"

"تم نے یہ سوال دوسری مرتبہ کیا ہے!" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "وہ ہسپتال والوں نے میرے حوالے کیا ہوا ہے، فکر نہ کرو... واپسی پر تھانے میں جمع کرا دوں گا۔"

"اس میں پلاسٹک کی ایک چھوٹی شیشی ہے اس کی مجھے کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا مدعا بیان کیا۔

"ہے تو" اس نے کہا "عجیب سی لُبے اس میں سے نکلنے والے اسپرے میں!" اس کا مطلب تھا کہ وہ زہریلے تیروں والی شیشی کا بیرونی ڈھکن کھول کر اسے آزما چکا تھا جبکہ اس کی اندرونی دوسری ساخت میں زہریلی سوئیوں کی صورت میں موت خوابیدہ تھی جس سے وہ بے چارہ قطعی بے خبر تھا۔

"اس میں ایک خاص قسم کی دوا ہے" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "لخلخے کا نعم البدل سمجھو مجھ پر مرگی کا دورہ پڑنے والا ہو تو بس وہی دوا مجھے نجات دلاتی ہے!"

"مرگی کے مریض ہو تم؟" اس نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"بس مقدر کی بات ہے!" میں نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"مگر ہسپتال والوں کی فہرست میں وہ شیشی بھی شامل ہے" اس نے کہا "ان سے فہرست میں تصحیح کرانی ہو گی۔"

"نہ نہ!" میں نے جلدی سے کہا "وہ جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی دوا ہے، ڈاکٹر اسے تلف کر کے اپنا علاج ٹھونک دیں گے، اگر وہ خالی ہو گئی تو لوٹا دوں گا اور پھر اس بے وقعت سی چیز کے لئے کون پوچھے گا؟"

"اگر اس میں تمہارے موذی مرض کی دوا نہ ہوتی تو شاید ہرگز نہ لوٹاتا" اس نے رضامندانہ لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

اسی کمرے کی ایک دیوارگیر الماری میں اس کا مختصر سا مقفل سوٹ کیس رکھا ہوا تھا، اس نے سوٹ کیس کھول کر شیشی میرے حوالے کر دی!

وہ ہتھیار اپنی ساخت کے اعتبار سے غیر یقینی تھا۔ پیشگی اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں تھا کہ اس ترکش میں کتنے تیر باقی رہ گئے ہوں گے مگر ان ناسازگار حالات میں زہریلے تیروں والی شیشی کی بازیابی نے یک بیک میرا حوصلہ بہت بلند کر دیا۔

ہسپتال کا عملہ مجموعی طور پر اچھے اخلاق کا مالک تھا... ہوش میں آنے کے بعد میں نے جس پہلی نرس کو دیکھا وہ خاصی خوش شکل تھی اور اس کے چہرے کی رنگت بھی صاف تھی۔ وہ خاصی توجہ سے خون کا دباؤ، نبض کی رفتار اور درجۂ حرارت دیکھ کر فائل میں نوٹ کرتی رہی پھر جب اس نے مجھے دوائیں دیں تو میں اس سے اس کے وطن کے بارے میں دریافت کر بیٹھا۔

"سوڈانی ہوں!" اس نے میرے سوال پر حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہ خیال کیسے آ گیا تمہارے ذہن میں؟"

"تمہارا رنگ روپ مقامیوں سے خاصا مختلف ہے!" میں نے وضاحت کی۔

"اوہ!" وہ معصومیت کے ساتھ ہنس پڑی "میری ماں فلسطینی اور باپ سوڈانی ہے مگر میں خود کو خالص سوڈانی سمجھتی ہوں!"

"فلسطین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"ہر ماہ پی ایل او کے فنڈ میں چندہ دیتی ہوں مگر عملاً اس طرف زیادہ رجحان نہیں ہے!" وہ سپاہی کی خالی کرسی پہ پیر رکھ کر بولی۔

"تو یہاں بھی دفتر ہے ان کا؟" میں نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا ورنہ میرا اصل مقصد اس دفتر کا پتہ دریافت کرنا تھا!

"شارع استقلال پہ خاصا بڑا دفتر ہے" اس نے کہا "مگر تم تو شاید یمنی ہو، تمہیں ان سے کیا دلچسپی ہے؟"

"بس تم سے بات کرنے کا بہانہ چاہیئے تھا" میں نے نرم لہجے میں کہا "تیماردار اچھے ہوں تو مریض اپنا مرض بھول جاتا ہے۔"

"سارے ہی مریض ایک جیسے ہوتے ہیں" یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی میرے کمرے سے چلی گئی مگر میں سوچ چکا تھا کہ ہسپتال سے نکلتے ہوئے باہر کی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں وہ سادہ لوح لڑکی خاصی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔

دوپہر میں ڈیوٹی تبدیل ہونے سے قبل وہی نرس ایک ڈاکٹر کے ہمراہ میرے کمرے میں آئی اور ڈاکٹر نے مجھے مژدہ سنایا کہ دو روز بعد مجھے چہل قدمی کی اجازت مل جائے گی۔

اگلے دو روز میں نے بستر پہ ہی گزارے، اس دوران میں ایک بار نرس نے دو مرتبہ مجھے بستر سے اٹھانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے شدید تکلیف میں مبتلا ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اس سے تعاون سے صاف انکار کر دیا۔ اس دوران میں خون چڑھانے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

"اس کے ساتھ زبردستی نہ کرو" ایسے ہی ایک موقع پر میری نگرانی پر مامور سپاہی دخل اندازی کرتے ہوئے بول پڑا کیونکہ اس وقت وہ بھی موجود تھا "تکلیف میں کمی ہو گی تو یہ خود ہی بستر چھوڑنے کی کوشش کرے گا۔"

"میں تو بستر پہ پڑے پڑے اکتا گیا ہوں" میں نے بیزاری کے عالم میں کہا "نہ جانے اس عذاب سے کب نجات ملے گی؟"

"یہ تمہارا اپنا مسلط کیا ہوا عذاب ہے" سپاہی نے مشفقانہ لہجے میں کہا "تمہارا اندرونی زخم بھرنے میں شاید دیر لگ رہی ہے ورنہ ڈاکٹر کے مطابق اب تک تمہیں اپنے قدموں پہ چلنے کے قابل ہو جانا چاہیئے تھا۔"

میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرے لئے آہستہ آہستہ چلنا ناممکن نہیں تھا مگر میں اس سپاہی کو اپنی جانب سے بےفکر رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ میرے سر پہ سوار رہنے کے بجائے خرطوم کی رنگینیوں میں ڈوبا رہے!

وہ جب بھی دو چار گھنٹے باہر گزار کر واپس آتا مجھے مبالغہ آمیز انداز میں اپنے نت نئے تجربات کے قصے ضرور سناتا تھا!

اسی روز شام کو میرا آپریشن کرنے والا سرجن شاید خاص طور پہ مجھے دیکھنے آیا۔ اس نے آتے ہی تیز لہجے میں مجھے ڈانٹ کر بستر سے اترنے کا حکم دیا لیکن میں بےبسی سے بستر پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ درد کی ٹیسوں کے باعث میرے لئے اس کی ہدایت کی تعمیل ناممکن تھی!

اس نے بغور میری فائل کا جائزہ لیا پھر میرے زخم کو ہاتھ لگا کر اندازہ کرنا چاہا مگر میری بھرپور اداکاری نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ جوں ہی زخم کو ہولے سے دباتا تھا میں بری طرح تڑپ اٹھتا تھا۔

آخرکار میرا بستر دھکیل کر کچھ دور واقع آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں سرجن نے اپنے ہاتھوں سے پٹیاں اتاریں، اس دوران میں مناسب وقفوں سے میرا احتجاج اور شکایات بھی جاری رہیں۔

زخم کی حالت دیکھ کر وہ الجھن میں پڑ گیا۔ ٹانکے خشک ہو رہے تھے اور ورم کا دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ آخرکار وہ یہ رائے قائم کرنے پہ مجبور ہو گیا کہ کسی بےاحتیاطی کے سبب میرے اندرونی زخم یا ٹانکوں کو نقصان پہنچا تھا۔

اس نے مزید تین روز مجھے زیرِ مشاہدہ رکھنے کی ہدایات جاری کرنے کے ساتھ ہی مجھ سے کہا کہ پیدل نہ سہی تو وھیل چیئر پر بیٹھ کر میں روز صبح و شام کچھ وقت باہر گزارا کروں کیونکہ میری شکایات کا اس طرح افاقہ نہ ہوا تو دوسرا آپریشن ناگزیر ہو گا۔

مجھے وھیل چیئر پر پہلی بار باہر لے جایا گیا تو سپاہی بغور میری ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور جب میں ایک ہنگامے کے بعد معذوروں والی اس کرسی میں منتقل ہو گیا تو اس کے بشرے پر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

ہسپتال کے احاطے میں حسین سبزہ زار دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ رنگ برنگے پھولوں کے تختے کے درمیان سرخ بجری کی کشادہ روشیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ معذور مریضوں کو گھاس پر لے جائے بغیر پورے سبزہ زار میں گھمایا جا سکتا تھا!

وھیل چیئر باہر آنے کے بعد سپاہی خرطوم کی حسین شام کا حسن لوٹنے کہیں غائب ہو گیا اور سوڈانی نرس آہستہ آہستہ میری کرسی کو آگے دھکیلتی رہی!

"آج کے لئے اتنا کافی ہے اب واپس چلیں!" تھوڑی دیر بعد موٹے موٹے ہونٹوں والی سیاہ فام نرس نے کرسی کو گھماتے ہوئے کہا۔

"مجھے سکون مل رہا ہے سسٹر!" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا، "کئی روز بعد میں نے کھلے آسمان کے نیچے تازہ ہوا کا لمس اپنے چہرے پر محسوس کیا ہے، کچھ وقت اور گزار لینے دو!"

"مگر مجھے دو مریضوں کو باہر لانا ہے، وہ میرے منتظر ہوں گے۔" میرے مہذب رویّے کے باعث وہ سختی کا اظہار نہ کر سکی "میری کرسی کسی پُرسکون گوشے میں کھڑی کر دو اور ان دونوں سے فارغ ہو لو، آخر میں مجھے واپس لے جانا۔"

لہجہ اگر نرم ہو تو پتھر کو بھی موم کر دیتا ہے جبکہ وہ تو ایک جیتی جاگتی عورت تھی۔ اس نے کرسی روش کے اس آخری حصے کی طرف گھمالی جہاں قدرے اونچے پودوں کا ایک کنج واقع تھا۔ "اکیلے میں تمہیں کوئی الجھن اور پریشانی تو نہیں ہو گی؟" کرسی روک کر اس نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم میری طرف سے بے فکر رہو سسٹر!" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "آزاد فضا میں یہ چند سانس تمہاری مہربانی کے طفیل میسر ہوں گے اس کے بعد تو شاید زنداں کی سلاخیں ہی میرا مقدر بننے والی ہیں۔"

ڈوبتے سورج کے دھندلکے میں وہ بے چاری سر گھما کر تیزی سے واپس لوٹ گئی۔

میری نگاہیں اُس وقت تک اُس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک وہ عمارت میں روپوش نہ ہو گئی اور میں نے سہارا ہاتھ مانگا ہوا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا لی۔

نرس کی واپسی میں کم و بیش دس منٹ صرف ہوئے اس دوران میں سورج کی روشنی بہت ماند پڑ چکی تھی۔

نرس نئی ادھیڑ عمر مریضہ کو سیر کراتے ہوئے چند ثانیوں کے لئے میرے پاس بھی رُکی۔ نئی مریضہ ہر لحاظ سے تندرست نظر آ رہی تھی، اپنی گود میں رکھے ہوئے پھلوں کو باری باری دانتوں سے اُدھیڑنے میں مصروف تھی۔

"میں آرام سے ہوں، تم اپنا کام پورا کر لو۔" میں نے نرس کو تسلّی دی اور وہ وھیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اِس عورت کو سیر کرانے کے بعد وہ عمارت کی طرف واپس لوٹی تو ہر طرف سورج کی حکمرانی کے آخری آثار بھی معدوم ہو چکے تھے۔ دُور دُور لگے ہوئے کھمبوں پر روشن برقی قمقموں نے ہر طرف ایک مدّھم سی روشن دُھند بکھیر دی تھی۔

جوں ہی وہ نرس اپنی مریضہ سمیت عمارت میں داخل ہوئی میں نے وھیل چیئر چھوڑ دی۔ میرے پاس اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لئے کم از کم دس منٹ کی مدّت تھی۔

ادھیڑ عمر مریضہ کو کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹانے اور پھر مریض کو وھیل چیئر پر ڈال کر باہر لانے میں نرس کو زیادہ وقت لگنے کا امکان بھی تھا مگر میں اِس بارے میں کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اِس وقت پارکنگ لاٹ میں خاصی گاڑیاں موجود تھیں اور اُن کی قریب ترین قطار مجھ سے کم و بیش سو فٹ دور تھی۔

میں نے عجلت کا اظہار کئے بغیر دھڑکتے دل کے ساتھ کاروں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور چند ثانیوں بعد ہی میں نیم تاریکی میں کاروں کے درمیان موجود تھا۔

دوسری اور تیسری کار غیر مقفّل ضرور تھی مگر اگنیشن میں چابیاں نہیں تھیں۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ اُس وقت میرا دل کینٹین کی طرح دھڑک رہا تھا اور ہر آن مجھے یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں کسی کار میں اُونگھتا ہوا کوئی ڈرائیور میری مشکوک حرکات و سکنات دیکھ کر کے لئے میرے سامنے نہ آ جائے۔

مگر ان پُرہول اندیشوں کے حقیقت میں بدلنے سے قبل مجھے ساتویں کار کے اگنیشن میں چابی لگی ہوئی نظر آ گئی اور میں نے دروازہ کھول کر پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

پہلے ہی اشارے میں کار کا انجن جاگ اٹھا اور میں نے گیئر ڈال کر آہستگی سے کار کو پارکنگ لاٹ سے نکال دیا۔

پودوں کے کنج کے قریب پہیوں والی کرسی میں بیٹھے ہوئے میں نے اپنا تمام وقت مشاہدے میں گزارا تھا لہٰذا مجھے نکاسی کا راستہ تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور میں کار ہسپتال کے احاطے سے باہر وسیع اور پُرسکون شاہراہ پر لے آیا۔

میرے لئے پہلا مسئلہ ہسپتال سے دور نکلنے کا تھا۔ ہسپتال کا دربان یہ دیکھ چکا تھا کہ پھاٹک سے نکلنے کے بعد سُرخ کار داہنی طرف روانہ ہوئی تھی لہٰذا تھوڑی دیر بعد جب میرے ساتھ ہی سُرخ کار کے غائب ہونے کا علم ہوتا تو دربان کے ذریعے ہر ایک کی توجہ داہنی سمت والے راستے پر مرکوز ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے چند فرلانگ آگے جانے کے بعد موڑ لیا اور پلک جھپکتے میں، ہسپتال کے سامنے سے گزر کر بائیں طرف بڑھتا چلا گیا۔

ہنگاموں سے محفوظ اِس شاہراہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے ڈرائیونگ کے دوران میں ڈیش بورڈ کی بھی تلاشی لے ڈالی اور اس میں سے تھوڑی سی رقم کے علاوہ تین انچ لمبے پھل والا ایک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک سہ راہے پر سڑکوں کے ناموں کی نشاندہی کرنے والی تختیوں کے سہارے میں ایک طرف مُڑ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد میری مسروقہ کار خرطوم شہر کے ہنگاموں میں شامل ہو گئی۔

میں نے راہگیروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ کر لیا کہ کار سے نجات حاصل کرنے کے بعد میں محض اپنے میلے لبادے کی وجہ سے کسی کی توجہ کا مرکز نہیں بنوں گا، ہاں اگر کوئی مجھے اِس کار سے اُترتے دیکھ لیتا تو اُس کا ماتھا ٹھنکنا لازمی تھا۔

میں نے کار مصروف شاہراہ کی ایک ذیلی گلی میں گھمائی اور کچھ آگے بڑھ کر تاریکی میں روک دی اور پھرتی سے نیچے اُتر گیا۔

نیچے اُترتے ہی مجھے اپنے گُردے میں ایک ٹیس سی اُٹھتی محسوس ہوئی۔ کئی روز کے مسلسل آرام کے بعد کار چلانے کی مشقت زخم پر اثر انداز ہوئی تھی۔

میں نے ایک کھمبے کے سہارے ٹک کر درد کی اِس لہر پر قابو پایا اور پھر ہموار فُٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

میرے لئے زیادہ دیر تک پیدل چلنا محال محسوس ہو رہا تھا لہٰذا میں نے بڑی سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روک لی۔ میرا خیال تھا کہ کار سے ملنے والی رقم ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لئے کافی ہو گی اور یہی ہوا بھی کیونکہ ٹیکسی ڈرائیور نے شارع استقلال پہنچانے کے لئے دو پاؤنڈ کرایہ طلب کیا تھا جب کہ میری جیب میں سات پاؤنڈ موجود تھے۔

"شارع استقلال تو دو میل لمبی ہے، تمہیں اِس پر کہاں اُترنا ہے؟" ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"نام بھول گیا ہوں مگر جگہ پہچانتا ہوں۔ تم ایک سرے سے داخل ہو کر دوسری طرف نکلتے جانا، میں خود تمہیں رُکوا لوں گا۔"

ڈرائیور نے عجیب انداز میں سر کو جنبش دی مگر خاموش ہی رہا۔ اُس نے یقینی طور پر مجھ سے زیادہ کرایہ طلب کیا تھا کیونکہ دو یا تین منٹ بعد ہی ٹیکسی شارع استقلال پر دوڑ رہی تھی اور میری بے چین نگاہیں دونوں طرف پی۔ ایل۔ او کے بورڈ کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔

آخر کار مجھے تنظیم آزادیٔ فلسطین کا بڑا سا بورڈ نظر آ ہی گیا اور میں نے قدرے آگے جا کر ٹیکسی رُکوالی۔ کرایہ لیتے ہوئے ڈرائیور نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا مگر اس وقت میں اِن معمولی جزئیات میں اُلجھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اُسے بھی فوری طور پر ایک سواری مل گئی اور میرے ذہن سے یہ اندیشہ بھی ٹل گیا کہ وہ وہیں رُک کر میری نگرانی کی کوشش نہ کرے۔

میں سڑک عبور کر کے آہستہ آہستہ فُٹ پاتھ پر واپس چل دیا۔ اِس وقت میرے ذہن پر ایک ہی خیال مسلّط تھا کہ میں پی۔ ایل۔ او کے دفتر میں خود کو کس طرح متعارف کرا سکوں گا۔

بڑی بڑی آراستہ دکانوں کے سامنے بھیڑ بھاڑ سے گزرتا ہوا میں بخیر و عافیت دفتر کے سامنے پہنچ ہی گیا۔ دفتر کا سامنے کا حصہ شفاف شیشوں پر مشتمل تھا مگر اِن پر اندر کے رُخ سے جہاد، حریّت اور فلسطینی کیمپوں سے متعلق بڑے بڑے مطبوعہ پوسٹر چسپاں تھے جس کی وجہ سے اندر کا حال دیکھنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے سیڑھی چڑھ کر دروازہ کھولا اور ہیجان کی اندرونی کیفیت کے تحت دفتر میں داخل ہو گیا۔

باہر سے پُرشکوہ نظر آنے والا دفتر اندر سے نہ صرف سادہ بلکہ خاصا مختصر تھا۔ کاؤنٹر نما میز کے عقب میں نیلی چُست پتلون اور اُسی رنگ کی جیکٹ میں سنہرے بالوں والی ایک خوبرو لڑکی موجود تھی۔ جس کے چہرے پر حُسن کے باوجود واضح سختی برس رہی تھی۔

"آجاؤ، چلے آؤ!" اُس نے مسکرا کر مجھے مخاطب کیا تو اُس کی آواز میں بلا کا اعتماد نمایاں تھا جو اُسے کھاگ ثابت کر رہا تھا۔

میں اُس کی میز کے قریب ہی دیوار سے لگے ہوئے صوفے پر گر گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ مسلسل میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"پانی، ایک گلاس پانی!" میں نے آہستہ سے کہا۔ منزل پر پہنچ جانے کے بعد درد اور نقاہت کا بھولا ہوا احساس پوری شدّت سے جاگ اٹھا تھا۔

وہ کرسی چھوڑ کر دیوار گیر کولر سے پانی کا گلاس لے آئی اور اپنی جگہ کے بجائے میرے برابر میں صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔

"شاید تم زخمی ہو" اُس نے آہستگی سے کہا "مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو اور کیا مشکل درپیش ہے، شاید میں تمہارے کام آسکوں۔"

میں نے پانی کا گلاس خالی کر کے اُس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھا، پھر رُک رُک کر بولا۔

"میں کچھ دیر خاموش رہنا چاہتا ہوں، اُس کے بعد کسی ذمہ دار آدمی سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"تم بلاخوف و خطر مجھ سے ہر بات کر سکتے ہو۔" اُس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "مگر پہلے تمہاری حالت اعتدال پر آجائے۔"

میں نے آنکھیں موند کر اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔

وہ خاموشی سے میرے پاس سے اُٹھ گئی پھر مجھے فون پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے کی آواز آئی اور چند ثانیوں بعد وہ لڑکی بولنے لگی۔

"میں کیتھی مائر بول رہی ہوں۔ اِس وقت میرے پاس ایک خستہ حال اجنبی موجود ہے جو بظاہر دشمن سے زک اُٹھایا ہوا کوئی ایجنٹ معلوم ہوتا ہے ــــــ خاموشی سے سُنتے رہو۔"

شاید اُس نے سُننے والے کی دخل اندازی کو ترشی کے ساتھ روک دیا۔

"میں دفتر بند کر کے اُسے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ اُس کا یہاں رُکا رہنا شاید بعد میں خطرناک ثابت ہو۔ ہو سکتا ہے کہ صبح مجھے دیر ہو جائے۔ اِس لئے تم بروقت دفتر کھول لینا۔"

اِسی کے ساتھ ریسیور کریڈل پر رکھنے کی آواز آئی اور میں نے تھکے ہوئے انداز میں اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟"

وہ مسکرا کر پھر میرے قریب آگئی۔ "ایک محفوظ مقام پر ـــ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ تم ہمارے دوستوں میں سے ہو۔"

"اور تمہارا نام کیتھی مائر ہے؟"

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "ہاں ابھی نہیں بلکہ میں یہودی بھی ہوں۔ تمہیں اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے اپنے مذہب پر فخر ہے مگر میں بھی اسرائیل سے نفرت کرتی ہوں جو طاقت کے خمار میں ہر کمزور کو کچلنے پر تلا ہوا ہے۔"

"میں تم سے بہت سی باتیں کروں گا مگر پہلے میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا لبادہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں زخمی ہوں اور تازہ آپریشن کا شکار بھی۔"

زخم دیکھنے کے بعد وہ بے چین ہو گئی اور اُس نے فوری طور پر دفتر کا دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔ پھر مجھے ہمراہ لے کر عقبی راستے سے باہر نکل گئی جو خود کار طریقے پر بند ہوتے ہی مقفل ہو گیا۔

عقبی راستہ ہمیں پارکنگ والے حصے میں لے گیا اور کیتھی مجھے اپنی گاڑی میں لے کر تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔

میری تکلیف کی وجہ سے سارے راستے اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور میں اپنے مسائل بھول کر اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اُس نے اپنے بارے میں جو چند باتیں بتائیں وہ میرا ذہن قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا مگر دوسری طرف [illegible] کے دفتر میں اُس کی موجودگی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تنظیم کے [illegible] جاں نثاروں میں سے تھی۔ ایک جوان سال یہودی لڑکی کی فلسطینی تحریک سے اتنی وابستگی میرے لئے عجوبے سے کم نہیں تھی۔ جب [illegible] اسرائیل کے سیاسی غنڈوں نے فلسطین کو خالص مذہبی [illegible] بنانے میں اپنی تمام تر منفی صلاحیتیں صرف کی ہوئی تھیں۔

وہ جو بھی تھی اور جیسی بھی تھی۔ میرا اُس کی ذات پر اعتماد کرنے کو جی چاہ رہا تھا کیونکہ میرے مقدر نے مجھے سوڈان کی سرزمین پر [illegible] قانون کا مفرور بنا دیا تھا اور اگر فوری طور پر مجھے کوئی جائے پناہ نہ ملتی تو میں دوبارہ قانون کے آہنی چنگل میں پھنس جاتا۔

اُس نے جدید عمارتوں پر مشتمل ایک پُرسکون رہائشی علاقے میں گاڑی روکی تو میں چونک کر نشست پر سیدھا ہو گیا۔

کار کے دروازے مقفل کر کے اُس نے مجھے سہارا دیا اور قریبی عمارت کے گراؤنڈ فلور کے فلیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

"تم یہاں تنہا رہتی ہو؟" میں نے اُسے فلیٹ کا ہضمی قفل کھولتے دیکھ کر سوال کیا۔

"تنہا میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتی ہوں۔" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے مُسکرا کر بولی۔ پھر قدرے توقف کے بعد کسی فوری خیال کے تحت بولی۔

"ضرورت ہوئی تو تم بھی کچھ عرصے کے لئے بے خوف و خطر [illegible] ساتھ رہ سکو گے۔"

فلیٹ نہ صرف کشادہ بلکہ صاف سُتھرا اور قرینے سے آراستہ تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر چلی گئی۔ میں نے وقت [illegible] کے لئے اُٹھ کر وہاں موجود ٹیلی وژن کا سوئچ آن کر دیا۔ جس پر [illegible] سے موسیقی کا کوئی پروگرام آرہا تھا۔

کیتھی چند منٹ بعد منہ ہاتھ دھو کر لوٹی تو اُس کا حسن [illegible] نکھر آیا تھا۔ بغیر آستینوں والے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اُس کا [illegible] خاصا فتنہ پرور نظر آرہا تھا۔

"اب بتاؤ کہ تم کون ہو؟" وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ کر اپنے لئے سگریٹ سُلگاتے ہوئے بولی۔

"میرا نام صفدر علی ......" میں نے کہنا شروع کیا مگر میرا نام [illegible] ہی اس نے تحیر کے عالم میں میری بات کاٹ دی۔

"تت ... تم وہی صفدر علی ہو جس نے تل ابیب میں سرکاری [illegible]

کے مرکزی لوازمے کے علاوہ اور بھی کئی عمارات میں کامیاب دھماکے کرائے تھے پھر شاید پیرس میں بن حیان کو قتل کیا تھا۔ تم وہی ہو جس سے اسرائیلی بھاری زک اٹھا چکے ہیں؟" فرطِ حیرت کے باعث وہ صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اور مسلسل میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"وہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ تم میرے بارے میں بہت زیادہ باخبر معلوم ہوتی ہو۔" میں نے فخر کے احساس کے ساتھ کہا۔ "اسرائیلی ایجنٹ بیئر سالومن سے قاہرہ میں میرا آخری ٹکراؤ ہوا تھا۔ اسے ختم کرنے کے بعد میں بمشکل ایک سرکس کے ساتھ مصر سے سرحد عبور کر کے سوڈان میں داخل ہوا مگر مرقاب نامی قصبے میں دو طوالُفوں پر دست درازی کے جرم میں پکڑا گیا۔"

میں نے اسے مرقاب میں اپنی گرفتاری سے اس تک پہنچنے کی ساری کہانی بلا کم و کاست سنا دی جو وہ خاموشی اور انہماک سے سنتی رہی۔

"یہ سب درست ہے مگر تمہاری شناخت؟" میری بات ختم ہونے پر اس نے بالکل دو ٹوک انداز میں سوال کر ڈالا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تم یہ ضرور پوچھو گی۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "لیبیا میں افواجِ آزادیٔ فلسطین کا اعلیٰ نمائندہ ہاشم قاہرہ میری مدد کے لیے آیا تھا اور فرار میں بھی میرے ساتھ رہا مگر صحرائے نوبی میں ریت کا ایک خوفناک طوفان اسے نگل گیا۔ ورنہ اس وقت مجھے اپنی شناخت ثابت نہ کرنی پڑتی۔" میرا لہجہ تاسف انگیز ہو گیا۔ "پورے سوڈان میں مجھے صفدر علی کی حیثیت سے جاننے والا شاید کوئی نہ ہو مگر ہاشم کے ساتھی کے طور پر اخوان الصفا کا ایک سربرآوردہ شخص ابوسلطان ضرور پہچان لے گا مگر وہ میرے لہو کا پیاسا ہو گا۔"

"اس سے ہمارے بھی مراسم ہیں۔ وہ تمہارا دشمن کیوں ہے؟" کیتھی نے پُرتفکر لہجے میں سوال کیا۔ "برا نہ ماننا میرے لیے صفدر علی کا نام بہت عظیم ہے مگر میں تمہاری اصلیت کے بارے میں پورا یقین کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔"

مجھے بتانا پڑا کہ مصر میں میرے لیے کیا مشکلات تھیں اور پھر سیتا ایک سرکس میں شامل ہو کر سوڈان کی طرف آئی تھی۔ لہٰذا مجھے بھی ابوسلطان کی معرفت وہی راہ اختیار کرنی پڑی پھر حلفہ میں قافلے کے کیمپ سے اپنی اور ہاشم کی گرفتاری اور فرار کے بارے میں بھی بتانا پڑا۔ جوزف امین اور ابوسلطان کے قریبی مراسم کے بارے میں میری زبان سے تذکرہ اس کے لیے اثر انگیز ثابت ہوا اور وہ بولی۔ "فی الحال میں تمہاری بات مانے لیتی ہوں مگر اس بارے میں قاہرہ سے تصدیق کروں گی۔ اس کے بعد ہم اپنے پورے وسائل کے ساتھ تمہاری مدد کریں گے۔"

"فی الحال تو مجھے بھی سر چھپانے کو ایک ٹھکانا چاہیے۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ مجھے کیتھی کی زبان سے تصدیق کا تذکرہ توہین آمیز محسوس ہوا تھا مگر وہ لوگ اپنے طریقہ کار اور اصولوں کے پابند تھے۔ یہی کافی تھا کہ وہ مجھے فوری طور پر پناہ دینے پر آمادہ تھی۔

"تم یہیں رہو گے۔ میں تمہاری دیکھ بھال کروں گی۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ "میرا دل تمہاری ہر بات کو تسلیم کر رہا ہے لیکن باضابطہ اقدام کے لیے ٹھوس مادی اور منطقی جواز کی ضرورت ہے اور میں اس اصولی کارروائی کے لیے مجبور رہوں۔"

"میں تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں کیتھی۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔ "یہی کیا کم ہے کہ تصدیق ہو جانے تک تم نے مجھے کوئی دوسرا در آزمانے کی ہدایت نہیں کی۔"

"مجھے غلط نہ سمجھو صفدر۔" وہ بوکھلا کر میرے قریب آگئی۔ "تمہیں میری مجبوری کا اندازہ ہوتا تو یوں طنز نہ کرتے۔"

"طنز نہیں کر رہا۔ میں واقعی تمہارا احسان مند ہوں۔" میں نے اس حساس لڑکی کو اعتدال پر رکھنے کے لیے جلدی سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہیں سیتا کی کچھ خبر ہے؟"

اس نے مایوسی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اڑتی سی خبریں ضرور سنی ہیں کہ وہ مصر سے سوڈان کی طرف آئی ہے مگر تصدیق نہیں ہو سکی۔"

"ابوسلطان بخوبی واقف ہے کہ وہ سوڈان کے سرحدی شہر میں پہنچنے کے بعد سرکس میں ناچنے والی تین لڑکیوں سمیت لاپتہ ہو گئی۔ اس سے رابطہ قائم کرو۔"

"اب یہی کرنا ہو گا۔" وہ بولی۔ "یہ سب تو تمہاری زبانی معلوم ہوا ہے۔ یہ بتاؤ کہ سیتا تمہاری کون ہے؟" آخری سوال پر اس کے لہجے میں اشتیاق سمٹ آیا۔

"بیوی۔" میں نے کہا۔

"یہ تو میں بھی سنتی آئی ہوں مگر میں یقین نہیں کر سکتی کہ کوئی شخص اپنی منکوحہ کے لیے اتنے پاپڑ بیل سکتا ہے، شاید وہ تمہاری منگیتر ہے۔"

اس کی خود فریبی میں ڈوبی ہوئی قیاس آرائی پر میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا مگر سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے اپنے مذہب کے مطابق اس سے نکاح کیا ہے اور میں پرستش کی حد تک اسے چاہتا ہوں۔"

"اسی کے ساتھ تم لڑکیوں کے رسیا بھی ہو؟" وہ گفتگو کو قطعی بجی رخ پر لے آئی۔

"اسے تم ہر انسان میں چھپی ہوئی حیوانی جبلتوں کا تقاضہ کہہ سکتی ہو۔" میں نے صوفے پر آرام سے دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"مگر سیتا کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں سنی گئی۔" اس نے برجستہ کہا۔ "وہ بھی تم سے بچھڑی ہوئی ہے مگر اسے اپنی جبلت پر پورا اختیار ہے۔"

"عورت کے نفس کی ساخت ہی ایسی ہے کیتھی۔" میں نے شرمندگی کے احساس کے ساتھ کہا۔

"مگر عورتیں بھی مردوں جیسی انسان ہی ہوتی ہیں۔"

"ضرور ہوتی ہیں مگر قدرت نے انہیں نسلوں کا امین بنایا ہے حشر میں سارے انسان اپنی ماؤں کے نام سے پہچانے جائیں گے۔" میں نے اپنی ندامت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے پرزور لہجے میں کہا۔ "اگر ہر عورت اپنے اس منصب کو پہچان لے تو ساری گمراہیوں سے نجات مل سکتی ہے۔"

"میں تمہارے مذہب سے زیادہ واقف نہیں لیکن مرد اور عورت میں اس قدر امتیاز برتنا بدترین ناانصافی ہے۔"

"یہ امتیاز مذہب نے نہیں سکھایا۔" میں نے جلدی سے اس کی غلط فہمی کی تصحیح کی۔ "یہ میرا اپنا قیاس ہے ورنہ برائی ہر صورت اور ہر جنس میں برائی ہے۔"

"مگر لذت گناہ میں ہی ہے۔" وہ دھیمے سے ہنس پڑی۔

میں مسکرا کر خاموش ہی رہا۔

کیتھی نپی تلی مقدار میں شراب کی بھی عادی تھی۔ اس کی دعوت پر میں نے بھی شریک ہونے کا ارادہ کیا مگر گردے کی تکلیف کے باعث فوراً ہی ارادہ ترک کر دیا۔

نو بجے جب کیتھی کھانے میں مصروف تھی تو خرطوم ٹیلی وژن اسٹیشن سے پروگرام روک کر ایک خصوصی اعلان نشر کیا گیا۔ جسے سن کر ہم دونوں ہی چونک پڑے کیونکہ خبر خرطوم کے ہسپتال سے احمد صلاح نامی ایک زیرِ علاج ملزم کے فرار کے بارے میں تھی۔ اعلان میں میری مکمل لفظی تصویر بیان کر کے شہریوں سے مفرور کو پناہ نہ دینے اور اس کی گرفتاری میں تعاون کی اپیل کی گئی تھی۔

"تم بے فکر رہو، کسی کو علم ہی نہ ہو سکے گا کہ یہاں کوئی اور بھی مقیم ہے۔ ہاں تم اپنی بے ترتیب داڑھی فوراً صاف کر دو کیونکہ اعلان میں اس پر خاصا زور دیا گیا ہے۔" اعلان کے ختم ہونے پر کیتھی نے ہدایت کی اور میں فوراً اٹھ گیا۔

"مگر ریزر؟" میں نے سوال کیا۔

"غسل خانے میں سب کچھ ملے گا۔" اس نے خفت آمیز تیز لہجے میں کہا۔ اور میں آگے بڑھ گیا۔

شیو اور منہ دھونے کے بعد تازگی ضرور محسوس ہوئی مگر نیند بھی غالب آنے لگی۔ اس فلیٹ میں صرف ایک ہی خواب گاہ تھی۔ میں نے ڈرائنگ روم میں صوفے یا قالین پر سونے پر اصرار کیا۔ مگر کیتھی زخموں کی وجہ سے اس کی اجازت دینے پر آمادہ نہ ہوئی اور ناچار مجھے اس کے وسیع بستر کا ایک سرا سنبھالنا پڑا۔ وہ خود مسہری کے دوسرے کنارے پر لیٹ گئی۔

ہسپتال کے ماحول اور ذہنی دباؤ سے نجات کے بعد مجھے جلد ہی نیند آ گئی۔ مگر رات گئے میں اپنے سینے پر کسی کا لمس محسوس کر کے بیدار ہو گیا۔ تاریکی میں میرے اوپر ایک انسانی ہیولا جھکا ہوا تھا۔ میں اس کے مخصوص خد و خال کو پہچان کر سونے کی اداکاری کرتا رہا۔

کیتھی نے اندھیرے میں نرمی سے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا اور جب میں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تو وہ ہولے ہولے سہلاتے ہوئے اتنا نیچے جھک آئی کہ اس کے نرم بال میرے چہرے سے ٹکرانے لگے۔

پھر اس کا دوسرا ہاتھ میری پیشانی پر جم گیا۔ میں نے کسمسا کر کروٹ لی اور اس نے بوکھلا کر اپنے دونوں ہاتھ ہٹا لیے۔

کئی سیکنڈ گزرنے کے باوجود کیتھی دوبارہ میرے بدن کو چھونے کی ہمت نہ کر سکی۔ اور آخر کار مسہری کی جنبش سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واپس اپنی جگہ پر لوٹ چکی تھی۔ میں بے اختیار اس گفتگو کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا جو وہ سیتا کی ذات کے حوالے سے پچھلی رات کر رہی تھی۔ اور اسی دوران میں دوبارہ میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح کا آغاز میرے لیے قدرے تاخیر سے مگر سنسنی خیز انداز میں ہوا تھا۔

میری آنکھ ٹیلی فون کی تیز گھنٹی سے کھلی تھی۔ جب کیتھی فون سے فارغ ہو کر آئی تو اس کے چہرے پر پچھلی شب کی بے خوابی کی علامات نمایاں تھیں اور وہ منہ ہاتھ دھو کر نہ جانے کس وقت لباس بھی تبدیل کر چکی تھی۔

"ابو سلطان بارہ بجے یہاں آ رہا ہے۔" اس نے آتے ہی انکشاف کیا۔ "میں نے پچھلی رات اپنے ساتھیوں کو اس کی تلاش پر مامور کر دیا تھا۔ وہ ان دنوں واقعی قاہرہ سے خرطوم آیا ہوا ہے۔"

"اسے کس لیے بلایا ہے تم نے؟"

"بلایا نہیں، میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔" اس نے وضاحت کی۔ "وہ میرا پیغام ملتے ہی یہاں آنے پر تیار ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے ہیں۔"

"اور اگر اسے یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا؟"

"تم اندر چھپے رہو گے اور اگر کسی طرح اس نے تمہیں یہاں دیکھ بھی لیا تو یہ راز اپنی ذات تک محدود رکھے گا۔ ایک دوسرے کی پناہ میں آیا ہوا ہمارا جانی دشمن بھی ہمارا دوست ہوتا ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"پھر میں تمہارے اس دعوے کو ضرور آزماؤں گا۔" میری کوئی رگ بھڑک اٹھی۔

"وہ کیسے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں اس کے سامنے موجود رہوں گا خواہ اس کے نتیجے میں مجھے دوبارہ قید خانے کا منہ دیکھنا پڑے۔" میں نے کہا۔ "بلکہ میں خود اس سے بات کروں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔" اس نے فراخ دلی سے کہا۔

اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ مجھے تیاری میں مصروف چھوڑ کر فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے کہیں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے پاس مردانہ ملبوسات کے کئی پیکٹ اور آپریشن کے بعد استعمال ہونے والی چند عمومی دواؤں کی ایک تھیلی موجود تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے نیا لباس تبدیل کیا ہی تھا کہ کیتھی کے فلیٹ میں ڈور بیل کی آواز گونجی اور میں خواب گاہ میں دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔

سرگرم استقبالیہ فقروں کے تبادلے کے بعد مردانہ آواز ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی اور شاید کیتھی نے دروازہ بند کر دیا۔

"تم خود کیوں چلے آئے مجھے بلا لیا ہوتا!" وہ آواز کیتھی کی تھی!

"ایک ہی بات ہے مادام۔" مردانہ آواز واضح طور پر ابو سلطان کی تھی۔ "میرے پاس وقت تھا تو چلا آیا ورنہ شاید کئی دنوں تک مل بیٹھنے کی نوبت بھی نہ آتی!"

"میں نے تمہیں اپنے ایک مہمان سے ملنے کے لئے بلایا ہے!"

"مجھے بڑی خوشی ہو گی ـــــ کہاں ہے وہ؟"

میں کیتھی کے اشارے کا انتظار کئے بغیر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ ابو سلطان مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے شرارے کوندے اور لب کچھ کہنے کے لئے وا ہوئے مگر کوئی آواز پیدا کئے بغیر دوبارہ سختی سے جڑ گئے۔

چند ثانیوں تک ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے خونخوار درندوں کی طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر ابو سلطان ہنس پڑا۔

"تمہارا مہمان میرا پرانا شناسا ہے مادام!" اس نے کہا۔ "شاید اسی نے تمہیں قاہرہ سے میری واپسی کی خبر دی ہو گی کیونکہ اس بار میں بہت رازداری کے ساتھ واپس لوٹا ہوں۔"

"مگر تم دونوں کا ابتدائی ردِ عمل بہت مخاصمانہ تھا!" کیتھی کا لہجہ حیرتناک طور پر ناخوشگوار تھا۔ میرے لئے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ وہ لڑکی ابو سلطان جیسے گھاگ سے ایسے لہجے میں بھی بات کر سکتی تھی۔

"ہم برے حالات میں ایک دوسرے سے ملے تھے۔" ابو سلطان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسے پہچان کر ماضی کا زخم تازہ ہو گیا تھا مگر اب شاید وہ تلخی فراموش کر چکا ہوں!"

"مجھے خوشی ہوئی ابو سلطان!" میں نے اپنا داہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں جمال!" وہ میرا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں میرے مفروضہ نام سے مخاطب ہوا۔ "ان دنوں میں عبدالسلام کہلاتا ہوں!" اسے نہ صرف میری صورت بلکہ وہ نام بھی یاد تھا جو ہاشم نے اسے بتایا تھا۔

ہم دونوں بیٹھ گئے۔ چند منٹ تک کیتھی اور ابو سلطان زیرزمین گوریلوں کی بڑھتی ہوئی عملی مشکلات پر باتیں کرتے رہے پھر میں بھی شریک ہو گیا۔

میرے لئے ابو سلطان سے براہِ راست سیتا کے بارے میں دریافت کرنا نامناسب تھا کیونکہ وہ سیتا کی اصلیت سے واقف تھا مگر مجھے جمال ہی سمجھتا تھا لہٰذا میں نے جوزف امین سے گفتگو کا آغاز کیا جس سے میرا اور ابو سلطان کا مشترکہ تعلق رہا تھا۔

"تمہارے اور ہاشم کے تھانے سے فرار کے بعد وہ مجھ سے بدظن ہو گیا۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہاشم نے لڑکی کے اور اپنے معاملے میں مجھے بہت نیچا دکھایا اور میں جوزف امین جیسے مخلص دوست سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا!"

"وہی لڑکی جو سرکس سے تین رقاصاؤں کو لے بھاگی تھی؟" میں نے سرسری لہجے میں انجان بنتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوئی۔" ابو سلطان نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مگر جوزف امین کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، میرا تو تمہیں بھی یہی مشورہ ہے کہ اس کی طرف سے ہوشیار رہنا۔ اس کے دل میں اپنے حریف کو زیر کرنے کی امید کبھی دم نہیں توڑتی!"

"تو کیا وہ لڑکی پکڑی گئی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"بچ کر کہاں جاتی؟" اس نے سرد مہری سے کہا۔ "وہ ہر جگہ اپنے نام کے جھنڈے گاڑتی رہی لیکن جوزف امین کو زک نہ دے سکی۔"

"یہ کس لڑکی کا ذکر ہے؟" کیتھی نے پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔

"سیتا!" ابو سلطان نے کہا۔ "افواجِ آزادیٔ فلسطین کے ایما پر میں نے اسے سوڈان پہنچانے کا ذمہ لیا تھا لیکن وہ سوڈان میں داخل ہوتے ہی کسی طرف بھاگ نکلی!"

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ بچ کر نہ جا سکی!" کیتھی نے کہا۔ "اس کی سلامتی سے تو شاید ہمیں بھی گہری دلچسپی ہو گی۔"

"وہ تو بعد کی کہانی ہے مادام!" ابو سلطان گہرا سانس لے کر بولا۔ "اس کے بھاگنے کے بعد متعدد تجربہ کار آدمیوں نے پورا علاقہ چھان مارا لیکن اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ پھر صحرائے لوبی کے دشوار گزار حصے سے شتر سوار سوڈانی بری فوج کے ایک قافلے نے کسی مہم سے واپسی پر ان چاروں کو دیکھا اور گھیر لیا۔ وہ فوجیوں کے سوالات کا کوئی معقول جواب نہ دے سکیں لہٰذا فوجی انہیں

"عبدالکریم کے فرضی پتے سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ ان تینوں میں سے ہی کسی ایک نے دو مختلف ناموں سے دو مختلف ضمانت نامے داخل نہ کیے ہوں۔
"ہاتھ پیر ہلائے بغیر ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارے آدمیوں کی طرف سے اطلاعات ملنے کے بعد ہی کچھ کیا جاسکے گا۔"

"نہیں، اس کے بعد بھی کچھ انتظار کرنا ہوگا۔" وہ قالین کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

"وہ کس لیے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"قاہرہ نے تمہارے بارے میں تصدیق کر دی ہے مگر سوڈان میں فی الحال پی ایل او تمہیں قبول نہیں کرسکتی۔" اس کا لہجہ پژمردہ اور خفت آمیز تھا۔ "بیروت سے نئی ہدایات آنے تک حالات جوں کے توں رہیں گے ہیڈ کوارٹرز میں تمہارے مسئلے کی پیچیدگی کا حل تلاش کیا جارہا ہے۔"

"کیسی پیچیدگی؟ کیا لڑکی ہو تم؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "مجھ سے کھل کر بات کرو۔"

"پی ایل او دوست ممالک میں مقامی قوانین کا پورا احترام کرتی ہے اور یہاں تمہاری حیثیت ایک مفرور مجرم کی ہے، ہم مقامی حکام سے کوئی تنازعہ مول نہیں لے سکتے۔"

"پھر تم نے مجھے یہاں کیوں روکا تھا؟" میں بپھر گیا۔ "جن لوگوں کے لیے میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگاتا رہا، آج مجھ پر برا وقت آنے پر وہ مجھے اصولوں کا سبق پڑھا رہے ہیں۔"

"فرد اور تنظیم میں بہت فرق ہوتا ہے صفدر!" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی مگر اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ "تم نے فلسطینی جدوجہد کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں مگر پی ایل او سے پہلی بار تمہارا رابطہ قائم ہوا ہے۔ تمہاری مدد میں تاخیر ضرور ہوگی مگر ہیڈ کوارٹرز والے اس الجھن کا کوئی قابلِ عمل حل تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

"خواہ اس دوران میں سیتا پر قیامت گزر جائے۔" میں نے ملخ لہجے میں کہا۔ "میں انتظار نہیں کرسکتا۔ میں اسی وقت تمہاری فراہم کی ہوئی سہولتوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"سیتا کے بارے میں ہمارے آدمی اپنا کام جاری رکھیں گے، مگر تم فی الحال روپوش رہو گے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"روپوشی کے لیے میں کسی اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گا مگر یہاں نہیں رکوں گا۔" میں زہریلے لہجے میں یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"تم نہیں جاؤ گے۔" وہ میرے سامنے آکر بولی۔ "حالات جوں کے توں رہنے کا مطلب یہ ہے کہ نئی ہدایات آنے تک تم جہاں ہو وہیں رہو گے۔"

"خوب۔" میں استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "یعنی سوڈانی پولیس کے بجائے اب پی ایل او مجھے اپنا قیدی بنائے گی۔"

"یہ فیصلہ تمہاری بہتری کے لیے کیا گیا ہے۔"

"اپنی بہتری کو میں خوب سمجھتا ہوں۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "اب تو طاقت استعمال کر کے بھی مجھے نہ روکا جاسکے گا۔"

"میرے فرض کا تقاضا یہی ہے کہ نرمی سے یا طاقت سے تمہیں ہر قیمت پر یہیں روکا جائے مگر میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔ اگر باہر نکل کر تم نہ صرف اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈالو گے بلکہ مجھے بھی معطلی کی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں نمی کے ننھے ننھے قطرے جھلملانے لگے تھے۔ "جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ کیتھی کی دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ لوٹ کر آؤ گے تو اس گھر کے در و دیوار تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔"

"اخلاقی جواز نہ پانے کے بعد اب مجھ پر جذباتی دباؤ آزمانا چاہتی ہو۔" میں نے غصیلی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم پر ... [illegible]"

کہا۔ "دریا کے ریلے میں بہنے والے پانی کے قطروں کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ تنظیم کے دھارے میں کیتھی بھی اپنی انفرادیت کھو چکی ہے۔ مجھے تمہارے کرب کا پورا احساس ہے مگر میں مجبور ہوں۔"

"مگر تمہاری مجبوری میرے قدموں کی زنجیر کیوں بن رہی ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں نے کہا نا کہ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"اور تم حالات کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں ناکامی پر معطل کر دی جاؤ گی۔" میں نے زچ ہو کر اس سے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ مجھے کوئی رعایت مل جائے۔ تم میری فکر کیوں کر رہے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

"مگر یہاں رک کر میں کیا کرسکوں گا؟" میں نے توقف کے بعد سوال کیا۔ "اگر ہیڈ کوارٹرز والے میرے معاملے پر غور کرتے کرتے سو گئے تو کیا ہوگا؟"

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" وہ پُریقین لہجے میں بولی۔ "زیادہ سے زیادہ اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی نہ کوئی فیصلہ صادر ہو جائے گا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے خرطوم میں افواجِ آزادیٔ فلسطین کے مرکز تک پہنچا دو؟" میں نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد تجویز پیش کی۔ "وہ لوگ اصولوں کے معاملے میں اس قدر سخت نہیں ہیں اور پھر میرا ان کا شروع سے ساتھ رہا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "میں بیروت کو اطلاع دے چکی ہوں کہ تم میرے فلیٹ میں پناہ گزین ہو۔"

ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے پر مجھے کیتھی کا مشورہ قبول کرتے ہی بنی۔ جہاں میں نے سیتا کی تلاش کی مہم میں طویل ... تھی وہاں اڑتالیس گھنٹے کی مدت ... زیادہ اہم نہیں تھی ...

... خرطوم میں ایک مصنوعی سہارا چھوڑ کر سڑکوں پر نکل پڑتا۔ دس بجے تک کیتھی کو ان دونوں ضامنوں کے بارے میں بھی معلومات مل گئیں جنھوں نے جوزف کے ایما پر عدالتی تحویل سے ایرانی شہزادوں کو رہا کرایا تھا۔

ان میں سے ایک خرطوم میں کپڑے کا تاجر تھا اور دوسرا بندرگاہ کا ایک مقامی دلال۔ ان دونوں کے بارے میں ملنے والی اطلاعات کا جائزہ لینے سے ہم دونوں نے متفقہ طور پر ایک ہی نتیجہ اخذ کیا کہ کپڑے کا تاجر ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا تھا۔

پہلی شب کے برخلاف کیتھی کے فلیٹ میں میری دوسری رات اعصاب شکن ثابت ہوئی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور ذہن عجیب الجھنوں میں گرفتار تھا۔

فلیٹ کی خاموش فضا میں صبح سوا تین بجے ٹیلی فون کی بلند گھنٹی ... کیتھی شاید سونے کی اداکاری کرنے کے باوجود جاگ رہی تھی کیونکہ وہ پہلی ہی گھنٹی پر بستر چھوڑ کر ٹیلی فون پر جا پہنچی۔

ٹیلی فون پر بات کر کے وہ اتنی سرعت سے واپس آئی جیسے ان پر بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اس اثنا میں میں خواب گاہ میں روشنی کر چکا تھا۔

"تمہارے سارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے۔" وہ آتے ہی مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ "بیروت سے تمہیں استثنیٰ دینے کے احکام آگئے ہیں۔ تنظیم تمہیں سوڈان میں پورا تحفظ فراہم کرے گی۔"

"مگر ایک بات اب بھی جواب طلب ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے معاملے میں اتنی چھان پھٹک کی گئی مگر سوڈان کی غیر قانونی تنظیم اخوان الصفا کے ابو سلطان سے تمہارے گہرے مراسم ہیں۔ کیا یہ مقامی قانون کی کھلی خلاف ورزی نہیں ہے؟"

"صرف اس حد تک کہ ہم پولیس کو ان کے خفیہ ٹھکانوں کی نشاندہی نہیں کرتے۔" اس کے پاس میری بات کا جواب تیار تھا۔ "عملی طور پر ہمارے درمیان کوئی تعاون نہیں ہے بس یوں سمجھو کہ ہم قانون کے حلیفوں اور حریفوں کے درمیان قطعی غیر جانبدار رہتے ہیں جب کہ تمہارے لیے میدان میں کودنا پڑے گا۔" وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"پھر کیوں نہ ابھی سے اپنے کام کا آغاز کیا جائے۔"

وہ تیار ہو گئی اور دس منٹ بعد اس کی کار خرطوم کی ویران شاہراہوں پر برق رفتاری سے ایک طرف دوڑی جا رہی تھی۔

ہمارے سفر کا اختتام قدیم سوڈانی طرز کی ایک آبادی میں ہوا، جہاں پتھر اور گارے کے بڑے بڑے مکان واقع تھے۔

خرطوم میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ رہائشی علاقوں میں چوکیداری کا کوئی انتظام نہیں تھا اور اگر سپاہی گشت بھی کرتے تھے تو وہ ... ہونے سے بہت پہلے اپنے مسکنوں میں گھس کر شاید گہری نیند سو چکے ہوتے تھے۔ البتہ آوارہ کتوں کی جانب سے تھوڑی سی مزاحمت ہوئی اور کیتھی نے اپنی کار ایک تاریک مکان کے سامنے روک دی۔

ہمارا مطلوبہ مکان وہاں سے کچھ دور ایک تاریک گلی میں واقع تھا۔ کیتھی میرا ہاتھ تھام کر اتنی مہارت سے وہاں تک پہنچی کہ میں حیران رہ گیا۔

مکان پر دستک دینے کا خیال احمقانہ تھا لہٰذا کیتھی پھرتی سے پہر ہنہ جما کر احاطے کی دیوار سے اندر کود گئی اور کنڈی کھول کر مجھے دروازے سے اندر بلا لیا۔

مکان کا صحن خاصا وسیع تھا جس میں دو طرف دالان کے پیچھے کمرے بنے ہوئے تھے مگر مجھے یہ اطمینان تھا کہ ہمارا مطلوبہ آدمی اس مکان میں تنہا رہتا تھا۔

ہم دونوں حیرتناک سہولت کے ساتھ اس شخص کی خوابگاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے مگر کیتھی اسے چھیڑنے سے قبل دوسرے کمروں کی طرف سے بھی اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ ان میں اس کا کوئی دوست وغیرہ نہ سو رہا ہو۔

کیتھی چند منٹ بعد میدان صاف ہونے کی خوشخبری لے کر آئی تو ہم دونوں ایک ساتھ خوابگاہ میں داخل ہو گئے اور کیتھی نے کمرے کی بتی روشن کر دی۔ اس سے قبل ہم دونوں نے اپنے چہروں پر نقاب چڑھا لیے تھے۔

روشنی کی چمک سے سوتا ہوا ادھیڑ عمر شخص ہڑبڑا کر اٹھا تو کیتھی کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی نشست ... کی طرف گھومتا پایا۔

ہماری توقع کے مطابق وہ کمزور اعصاب کا مالک ثابت ہوا کیونکہ ناگہانی مصیبت کو اپنے سر پر موجود پا کر اس کی گھگھی بندھ گئی۔

اسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کے لیے تھوڑی سی مہلت دینے کے بعد کیتھی براہِ راست اپنے مقصد پر آگئی۔ "تم نے جن لڑکیوں کی ضمانت لی تھی وہ کہاں ہیں؟"

"ل... لڑکیاں!" اس نے بوکھلا کر حیرت سے کہا۔ "میں نے تو صرف ایک کی ضمانت لی تھی اور اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"تم نے اس کی ضمانت کس کے ایما پر لی تھی؟"

"م... میں سب بتا دوں گا مگر خدا کے لیے یہ خطرناک ہتھیار ہٹا لو، ایسا نہ ہو کہ غصے میں گولی چل جائے۔" وہ رو دینے والی آواز میں بولا اور کیتھی نے اسے تعاون پر آمادہ پا کر اپنا پستول والا ہاتھ نیچے گرا لیا۔

اس نے جو کچھ بتایا وہ زیادہ کارآمد نہیں تھا۔ اسے اور دیگر دو افراد کو عبدالکریم صالح نے نقد رقم دے کر ضمانت پر آمادہ کر لیا تھا۔ ان تینوں کو نقد رقم دینے کے علاوہ عبدالکریم نے عدالت میں زرِ ضمانت بھی خود ہی جمع کرایا تھا اور لڑکیوں کی رہائی کے پروانے لے کر ان سے رخصت ہو گیا تھا جس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلا تھا۔

تاریخ سماعت پر لڑکی کے عدالت میں حاضر نہ ہونے پر اسے نوٹس ملا تھا جس میں ملزمہ کی ضمانت فسخ ہونے کے ساتھ ہی اس کے خلاف کارروائی کی دھمکی دی گئی تھی وہ عبدالکریم سے ملا تو اس نے تسلی دی کہ قانونی کارروائی زر ضمانت کی ضبطی پر ختم ہو جائے گی لہٰذا وہ گھر بیٹھ گیا۔

عبدالکریم صالح سے اس کی ملاقات ایک ہوٹل کی آڑ میں چلنے والے قمار خانے میں ہوئی تھی اور اس نے قمار خانے کا جو پتہ بتایا وہ غالباً اسی شخص کا ٹھکانہ تھا جسے خطرناک سمجھتے ہوئے ہم دونوں نے باز پرس کے مقام کے ... ... تھا۔

"اب تم دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر دیوار سے ناک ٹکا کر کھڑے ہو جاؤ۔" کیتھی نے پستول کی نال ہلا کر اسے حکم دیا۔

وہ ایک غلط کام میں ضرور ملوث ہو گیا تھا مگر سیدھا آدمی تھا۔ اس نے بے چوں و چرا اس کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں اسے یوں ہی کھڑا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ جائیں گے مگر کیتھی کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے دبے قدموں آگے بڑھ کر اس کی کھوپڑی پر پستول کا وزنی دستہ رسید کیا اور وہ ہلکی کراہ کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ہم دونوں اپنے چہروں سے نقابیں اتار کر دروازے سے باہر نکلے اور کسی تعرض کے بغیر ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

"ہمیں اس ہوٹل والے سے ٹکرانا ہی پڑے گا۔" میں نے راستے میں کہا۔ "تم نے کیا نام معلوم کیا تھا اس کا؟"

"ہشام نام ہے اس کا اور ہوٹل بھی فندق الہشام کہلاتا ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر عبدالکریم بھی وہیں پایا جاتا ہے تو وہ ہوٹل ان کا مضبوط ... ... ہوگا۔"

"ہوا کرے، اب تو یہ قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "البتہ ایک چوک ہو گئی کہ ہم نے نئے شکار کو اپنی زبان بند رکھنے کی دھمکی نہیں دی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عبدالکریم کو اپنی افتاد سے باخبر کر دے۔"

"زیادہ سے زیادہ وہ چوکنا ہو جائے گا۔" کیتھی نے کہا۔ "میں تو کوئی ایسی تدبیر سوچ رہی ہوں کہ اسے اس کی پناہ گاہ سے باہر نکال کر گھیروں۔"

مگر فلیٹ پر پہنچنے تک وہ کوئی تدبیر نہ سوچ سکی۔ سوڈان میں جوا غیر قانونی تھا لہٰذا کسی خفیہ جوئے خانے تک رسائی بھی آسان نہیں تھی۔ ورنہ کیتھی محض جائزہ لینے کے لئے وہاں جا کر کچھ رقم بھی ہارنے کے لئے تیار تھی۔

اسی سوچ بچار میں ہم دونوں نے سر جوڑے صبح کر دی لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

"میں ادھر جاؤں گی ..." ناشتے کے بعد کیتھی نے ...

میں کہا۔ "یہاں سستے ہوٹلوں میں عورتوں اور خصوصاً اکیلی عورت کا جانا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن میرا وہاں جانا اگزیر ہے کیونکہ قدم اٹھانے سے پہلے اگر ہم نے وہاں کے حالات کا جائزہ نہیں لیا تو ہم چوہے دان میں از خود اپنی گردن پھنسانے کی ... کریں گے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"تم پہچان لئے جاؤ گے۔" اس نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔ "اور پھر تم زخمی بھی ہو۔ تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔"

اس کے ساتھ مجھے خاصا سر کھپانا پڑا مگر میں نے اس معاملے پر اس کی رائے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ ذہنی سکون سے بے فکری میسر آ جانے کی وجہ سے یا شاید انجکشن کی وجہ سے میری حالت تیزی سے سنبھل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کیتھی نے اپنے نرسنگ کے کمالات دکھاتے ہوئے انجکشن لگائے پھر میرے بالوں وغیرہ کے اسٹائل میں تبدیلی کرنے لگی تاکہ پہلی نظر میں میری شناخت نہ ہو سکے۔

میں اس کے ہمراہ فلیٹ سے روانہ ہوا تو میرے بدن پر نیا تھائی کا سوٹ اور آنکھوں پر تاریک اور بڑے شیشوں والی عینک موجود تھی۔

تجارتی علاقے میں ایک ویران جگہ پر کیتھی نے اپنی کار چھوڑ دی اور ہم دونوں لاپروایانہ انداز میں ایک طرف بڑھنے لگے۔ برے وقت سے نمٹنے کے لئے ہم دونوں کے پاس ریوالور موجود تھے اور میرے پاس زہریلے تیروں والی شیشی بھی تھی جس سے کیتھی لاعلم تھی۔

تھوک فروشوں کی منڈی کے اختتام پر قدرے علیحدہ مقام پر فندق الہشام کی دو منزلہ عمارت دور سے دیکھی جا سکتی تھی جہاں اس وقت خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔

ہم دونوں سیدھے بڑھتے ہوئے ہوٹل کے ہال میں جا گھسے وہاں میزوں پر موجود مزدوروں اور متوسط طبقے کے دیگر لوگوں نے کیتھی کا حیرت بھری خوشگوار نظروں سے استقبال کیا۔ چست پتلون اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوبصورت لڑکی کو اپنے درمیان دیکھ کر وہ سب ہی مسرور نظر آ رہے تھے۔ میں اس کے ہمراہ چار نشستوں والی ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔

کیتھی کی موجودگی نے ہوٹل میں ابھرنے والے شور میں نمایاں کمی پیدا کر دی تھی اور بیشتر لوگ شاید میری عقل کا ماتم کر رہے ہوں گے کہ ایسی خوبصورت لڑکی کو خلوت کے کسی مقام پر لے جانے کے بجائے میں وحشی مردوں کی بھیڑ میں آ پھنسا تھا۔

ہوٹل کا بیرہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میرے قریب آیا تو میں نے اسے بسکٹوں کے ساتھ ٹھنڈے مشروب کا آرڈر دیا اور لاتعلقانہ انداز میں سگریٹ سلگانے لگا۔

میں نے ہوٹل میں قدم رکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ کاؤنٹر والا مسلسل میری طرف متوجہ تھا اور جب آرڈر لینے کے بعد بیرا مطبخ کے بجائے کاؤنٹر کی طرف گیا تو اس سے کچھ بات کرنے کے بعد دو گرانڈیل شخص کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر آ گیا۔

"ہم عورتوں کو یہاں سرو نہیں کرتے۔" میرے قریب آ کر اس گرانڈیل نے جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"مگر مجھے تو یہاں کوئی کیبن نظر نہیں آیا۔" میں نے احمقانہ سادگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ کیتھی شاید گرانڈیل سے نگاہیں چار کر کے مسکرا رہی تھی۔

"یہ مردانہ ہوٹل ہے۔" وہ اسی رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "یہاں تم دونوں سارے گاہکوں کا نشانہ بن رہے ہو۔ مشروبات پینا ہی چاہتے ہو تو باہر سے سیڑھیاں طے کر کے اوپری منزل پر میرے کیبن میں آ جاؤ۔"

"اوہ۔ تمہارا بہت بہت شکریہ!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً کرسی چھوڑ دی۔ "بیرے سے کہو کہ وہ سامان ادھر ہی لے آئے۔"

"باہر داہنی طرف سیڑھیاں ہیں۔" وہ میرے کان میں سرگوشی کر کے واپس کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ ہمیں لوٹتے دیکھ کر ہوٹل میں موجود بہت سے گاہکوں کے چہرے لٹک گئے کیونکہ ان کی نگاہیں سینکنے کا موقع گرانڈیل نے برباد کر دیا تھا۔

تنگ زینے عبور کرتے ہوئے کیتھی نے پُرجوش انداز میں میرا ہاتھ دبایا۔ "شاید اسی وقت کچھ ہو جائے۔" اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

میں خاموشی سے زینے عبور کرتا رہا۔ زینوں کے اختتام پر گرانڈیل آنکھوں میں عجیب سی چمک لئے ہمارا منتظر تھا۔ شاید وہ ہوٹل میں موجود کسی دوسرے زینے سے اوپر پہنچا تھا۔

چھوٹی سی راہداری میں داہنی طرف گھوم کر ایک صاف ستھرا کمرہ تھا۔ میں دانستہ کیتھی سے پیچھے رہ گیا۔ گرانڈیل میرے ساتھ تھا۔

"تمہیں کچھ فروخت تو نہیں کرنا ہے؟" گرانڈیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رازدارانہ لہجے میں سوال کیا اور میں کسی ہونق کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اندر چلی جائیں خاتون!" گرانڈیل نے کیتھی کو کمرے کے دروازے پر جھجکتے دیکھ کر بلند آواز میں کہا پھر میرے کان میں بولا۔ "یہاں غیر ملکی کسی خاص ضرورت کے تحت ہی آتے ہیں۔ تمہاری ساتھی شاید یورپ سے آئی ہے مگر عربی بھی سمجھتی ہے۔"

"یہ چرس بیچنے کے چکر میں مجھ سے ٹکرائی ہے۔ میرا بس چلے تو میں اسی کی بولی لگوا دوں۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "سالی بہت مغرور ہے۔"

"تو پھر کراؤ اس کا سودا؟"

"ارے نہیں۔" میں بوکھلا کر بولا۔ "اسے بھنک بھی مل گئی تو میری چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔"

"چیز اچھی ہے، تم رقم لے کر کھسک جانا، اس سے ہم نمٹ لیں گے۔" وہ میرا کندھا دبا کر مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"تو نکالو رقم۔" میں نے حریصانہ بزدلی کے ساتھ کہا۔

"ابھی سے غائب ہوئے تو وہ بھڑک جائے گی۔ اندر جا کر اس کے ساتھ کچھ کھاؤ پیو۔ اس دوران میں میں اپنے ساتھی کو بھیجتا ہوں مجھے نیچے کا کیش سنبھالنا ہے۔"

میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر کو جھٹک کر کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ تیزی سے نیچے بڑھتا چلا گیا۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" مجھے دیکھتے ہی کیتھی نے سوال کیا۔

"تمہارا سودا کر رہا تھا۔ یہاں کی کوئی چیز نہ چکھنا۔" میں نے دفتر نما کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ اتنی جلدی کھل گیا تم سے؟" کیتھی نے حیرت سے سوال کیا۔ "بڑے دیدہ دلیر ہیں یہ لوگ۔"

اس سے باتیں کرتے ہوئے میں نے زہریلے تیروں والی شیشی جیب سے نکال لی تاکہ کسی ناگہانی صورتحال میں مدافعت کی فوری راہ باقی رہے۔

"یہ کیا نکال لیا تم نے ..." کیتھی ...

"دوا ہے میری۔" میں نے اسے ٹال دیا اور اسی وقت بیرا ٹرے اٹھائے اندر گھس آیا۔ کسی ٹھنڈے مشروب سے بھرے ہوئے دو گلاس کے علاوہ وہ خاصی مقدار میں بسکٹ وغیرہ بھی لے آیا تھا۔

بیرے کے واپس لوٹتے ہی میں نے کیتھی کے سامنے رکھے ہوئے گلاس کا سارا مشروب کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باہر اچھال دیا۔ اور اپنے گلاس کی ... ...

"... پورے خرطوم میں تمہیں اپنی چرس کے بہترین دام نہیں مل سکیں گے۔" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "اور پھر پکڑ دھکڑ کا بھی خوف نہیں ہوگا۔"

"ابھی پتہ چل جائے گا۔" کیتھی نے مسکرا کر کہا۔

میں ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ میری نگاہ میں آئے بغیر کوئی راہداری میں نہیں آ سکتا تھا جو اس وقت ویران پڑی ہوئی تھی۔

"تم انگریزی میں سر بھاری ہونے اور پھر بیہوش ہونے کی اداکاری شروع کر دو۔" میں نے راہداری کے دور افتادہ حصے میں قدموں کی دھمک سن کر جلدی سے کہا اور آنے والے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ جو بھی تھا بہت نخوت سے ایک ایک قدم بڑھاتا آ رہا تھا۔

وہ دبلا پتلا دراز قامت سوڈانی جونہی کمرے میں داخل ہوا ... سے اٹھ کر اپنا داہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "مجھے

احمد کہتے ہیں؟

"میں عبدالکریم ہوں۔" ہاتھ ملاتے ہوئے اسے اخلاقاً اپنا نام بھی بتانا پڑا اور اس کا نام سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔

"میرا سر بھاری ہو رہا ہے احمد!" کیتھی نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنا سر دباتے ہوئے انگریزی میں شکایت کی۔ عبدالکریم بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر وہ گھوم کر اپنی میز کے عقب میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم دونوں اپنے گلاس خالی کرلو تو آگے بات ہوگی۔" عبدالکریم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"میں تو لیمن اسکواش پسند ہی نہیں کرتا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ خاتون زیادہ پیاسی تھی تو میں نے اس کا گلاس خالی ہونے پر آدھا مشروب اسے دے دیا۔"

عبدالکریم ہونٹ بھینچ کر تیز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

"میں بے ہوش ہوجاؤں گی احمد۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جارہا ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔" کیتھی اس وقت واقعی کرب میں مبتلا نظر آرہی تھی۔

"اور اسکواش پی لو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"تمہارا ساتھی درست کہہ رہا ہے۔" عبدالکریم مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "جلدی کرو، ہمیں معاملے کی بات بھی کرنی ہے اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

اسی وقت کیتھی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر میز پر ٹکا دیا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے جھنجوڑا مگر عبدالکریم نے مجھے ٹوک دیا۔ "اسے آرام کرنے دو اور تم معاملے کی بات کرو۔ مال کہاں ہے؟"

"پہلے اس کا تو سودا طے کرلو۔" میں نے کیتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لو۔" اس نے جیب سے چند بڑے نوٹ کھینچ کر میری طرف بڑھا دیئے۔

"صرف پانچسو پونڈ؟" میں نے نوٹ گن کر حیرت سے کہا۔

"اوقات میں رہو۔" وہ غرایا۔ "یہ تمہیں مفت میں ملے ہیں۔ سارا رسک میرا ہے۔ اگر بھاگ گئی یا پولیس کو بھنک مل گئی تو میری رقم مع منافع ڈوب جائے گی۔ یہ بتاؤ کہ چرس کہاں ہے؟"

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ بہترین قسم کی تین کلو چرس کار میں پڑی ہے۔" میں نے نوٹ اپنی جیب میں اڑستے ہوئے کہا۔

"بغیر دیکھے دو سو فی کلو بھی تمہارے۔" یہ کہہ کر اس نے مزید چھ سو پونڈ مجھے تھما دیئے اور میرے ساتھ چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس کا کیا ہوگا؟" میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کیتھی کے بارے میں سوال کیا۔

"یہ کئی گھنٹے اسی حالت میں پڑی رہے گی۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "یہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہ مار سکے گا۔"

اس وقت میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا کیونکہ ذرا سی لغزش سے کیتھی کی زندگی برباد ہوسکتی تھی۔ مگر میں دل کڑا کرکے باہر نکل گیا۔ میرے پیچھے وہ بھی سیڑھیاں طے کرکے باہر آگیا میں دانستہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ کچھ دور آنے کے بعد میں نے کنکھیوں سے پیچھے دیکھا تو کیتھی کا ہیولا ایک ٹیکسی میں داخل ہوتا نظر آیا اور میرے اوسان بحال ہوگئے۔

"تم مجھے کہاں لئے جارہے ہو؟" کچھ دیر کے بعد عبدالکریم نے غرا کر پوچھا۔

"بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے گاڑی ذرا دور پارک کی ہے۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

عبدالکریم غصے میں پھنکارتا اور پیر پٹختا میرے ساتھ چل رہا تھا اور میں اس کے کسی بھی وحشیانہ ردِعمل سے نمٹنے کے لئے زہریلی سوئیاں برسانے کے لئے تیار تھا۔

آخرکار ہم کیتھی کی کار کے قریب پہنچ گئے اور میں دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہی بوکھلا گیا۔ "اوہ۔ چابی تو اسی کے پاس رہ گئی ہے۔"

"سؤر کا بچہ!" عبدالکریم دانت پیس کر غرایا۔ وہ خاصا مغلوب الغضب آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے چند منٹ کی کوششوں میں اگلی نشست کی چھوٹی کھڑکی اکھاڑ دی اور ہاتھ اندر ڈال کر دروازے کا قفل کھول دیا۔

میں نے کار میں داخل ہوکر ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے ہاتھ ڈالا اور ایسی اداکاری کرنے لگا جیسے کوئی پھنسی ہوئی چیز نکال رہا ہوں پھر سر اٹھا کر بے بسی سے بولا۔ "ذرا تم پیچھے سے پوٹلی باہر گھسیٹ لو۔"

وہ طیش کے عالم میں کار کے عقبی حصے میں گھسا اور میں نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا اور جونہی وہ خیالی پوٹلی کھینچنے کے لئے نیچے جھکا میں نے اس کے سر پر ریوالور کے آہنی دستے کی پے درپے تین شدید ضربات لگادیں اور وہ غراتا ہوا وہیں پائیدان میں ڈھیر ہوگیا۔

میں ریوالور جیب میں ڈال کر باہر آگیا۔ ویران جگہ کار پارک کرنے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میری تمام کارروائی کسی کی نظروں میں آئے بغیر مکمل ہوگئی تھی۔

میں نے عبدالکریم کی باہر لٹکی ہوئی ٹانگیں اندر موڑ کر عقبی دروازہ بند کردیا تو میری نگاہ کیتھی پر پڑی جو مجھے پُرسکون دیکھ کر ایک گلی کی اوٹ سے برآمد ہو رہی تھی۔

"یہ تو بڑی آسانی سے قابو میں آگیا!" تیز تیز قدموں سے میرے قریب پہنچ کر کیتھی نے تحیر آمیز آواز میں کہا۔

"حد سے زیادہ خوداعتمادی آدمی کو لے ڈوبتی ہے۔" میں نے کار میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اسے پورا یقین ہوگیا تھا کہ تم نے اسکواش کا پورا گلاس پی لیا ہے!"

"اور اگر میں نے واقعی پی لیا ہوتا؟" وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"فندق الہشام کے ہال میں اگر میز پر ہمیں ٹھنڈے مشروب کی آڑ میں زہر بھی دے دیا جاتا تو شاید میں شبہ کئے بغیر پی جاتا مگر میرا ماتھا اسی وقت ٹھنک گیا تھا جب کاؤنٹر والے نے بدخو نظر آنے کے باوجود ہم دونوں کو اپنے اوپر والے کمرے میں مدعو کیا تھا!"

"تم بہت تیزی سے فیصلے کرتے ہو!" وہ ایک گہرا سانس لے کر کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو حیران ہونے کی مہلت بھی نہ مل سکی!"

"وہاں شاید ابھی تک کسی کو علم ہی نہ ہوسکا ہوگا کہ عبدالکریم ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ تم نے باہر نکلنے میں حیرت ناک احتیاط اور پھرتی کا مظاہرہ کیا ورنہ یہ سارا معاملہ اتنے سکون کے ساتھ انجام کو نہ پہنچتا۔"

"سیڑھیاں اترتے ہوتے میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔" وہ ہنستے ہوتے بولی۔ "اور اسی خوف کی وجہ سے میں نے ٹیکسی کا سہارا لیا۔ میں مختصر ترین مدت میں اس گھٹیا ہوٹل سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتی تھی!"

"اب اسے کہاں لے جانا ہے؟"

"کوئی ٹھکانا سوجھ ہی جائے گا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "لیکن یہ جلد ہی ہوش میں تو نہیں آجائے گا؟"

"اس طرف سے بے فکر رہو، ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے شاید یہ ہلنے کے قابل بھی نہ ہوسکے گا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے اسے کار میں گھسنے پر آمادہ کیسے کرلیا؟ مجھے تو مار دھاڑ کا خطرہ تھا اور پھر تمہارے زخم کی بھی فکر تھی!"

"یوں سمجھو کہ سب کچھ خودبخود ہوتا چلا گیا۔" میں نے یہ کہہ کر اسے عبدالکریم کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے باخبر کردیا۔

"سیتا کو تم واقعی اسی قدر چاہتے ہو یا اس کی بازیابی کو محض پندار کا معاملہ سمجھ کر تم اس کے پیچھے لگے ہوئے ہو؟" چند ثانیوں کی گہری خاموشی کے بعد اس نے براہِ راست الفاظ میں وہ سوال دہرایا!

ڈالا جس کا جواب شاید پہلی بار اسے تسلی بخش محسوس نہیں ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ میری ذات کے ساتھ ہی سیتا کے تعلق کے سلسلے میں بہت زیادہ متجسس تھی۔

کسی حد تک اس کا یہ تجسس جائز بھی تھا کیونکہ وہ یہودی معاشرے کے جس آزاد خیال طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس میں ازدواجی رشتوں کو محض ایک سماجی مجبوری اور رسمی سمجھوتے کے طور پر قبول کیا جاتا ہے جس سے کوئی بھی فریق کسی بھی وقت منحرف ہوسکتا ہے!

"یہ تم نہیں سمجھ سکو گی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "عورت کسی مرد کے لئے بھی صرف اسی وقت وقار کا مسئلہ بنتی ہے جب کوئی رقیب اس عورت کو ورغلانے میں کامیاب ہوجائے اور سیتا کی پاکدامنی کا کل تم خود ہی اعتراف کرچکی ہو!"

"یہ ضروری نہیں۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "یہی ہوتا ہے کہ محض کسی عورت کا حصول انسان کے لئے انا کا مسئلہ بن جاتا ہے!"

"ضرور ہوتا ہے!" میں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "مگر تم یہ بھول رہی ہو کہ میں سیتا کو حاصل کرچکا ہوں۔ وہ میری بیوی ہے بات صرف اتنی ہے کہ میں اسے بے پناہ چاہتا ہوں اور اس کے بغیر اپنی ذات کو ادھورا محسوس کرتا ہوں!"

"مگر تمہیں اس کی کس بات سے اتنا والہانہ پیار ہے؟" وہ نہ جانے کیوں اس بارے میں میرے ذہن میں اترنے پر مُصر تھی۔

"کوئی ادا یا کوئی انگ وقتی تفریح کے لئے پسند کیا جاتا ہے لیکن چاہت ایک ذات سے کی جاتی ہے جو اپنی عادات اور خدوخال کے ساتھ مجسم ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک عنصر الگ کردیا جائے تو ذات بدل جاتی ہے۔" میں نے وضاحت کے ساتھ کہا۔ "سیتا کسی خاص عادت کا نام ہے اور نہ رخسار کے کسی حسین تل کا ـــ وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے اور میں اسے اس کی تمام اچھائیوں، برائیوں سمیت چاہتا ہوں!"

"تو تمہارا خیال ہے کہ دنیا کی کوئی لڑکی تمہیں سیتا کو بھولنے پر مجبور نہیں کرسکتی؟" میرے جواب پر اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"اسے اپنے لئے چیلنج نہ سمجھنا مگر یہ حقیقت ہے!" میں نے قہقہہ مار کر ماحول خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے لئے کیوں چیلنج سمجھوں!" وہ جھنجھلا کر بولی۔ "میں نے اپنے لئے ایک علیحدہ دنیا بسائی ہوئی ہے اور مجھے اس سے باہر جھانکنے کی کوئی ضرورت نہیں!"

میں خاموش رہا۔ اس کے آخری الفاظ زخم خوردہ لہجے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ مجھے بے اختیار اس کے فلیٹ میں گزاری ہوئی پہلی رات یاد آگئی جب ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سوتے سوتے ... ... گئے میری آنکھ کھلی تو کیتھی میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔

میرے پہلو بدلتے ہی وہ سہم کر کسی چور کی طرح خاموشی سے اپنی جگہ جا لیٹی تھی۔

اس رات کا خیال آنے کے بعد میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ اس نے اپنی علیحدہ دنیا کا تذکرہ محض کمزور دفاع کے طور پر کیا تھا ورنہ وہ میری ذات میں دلچسپی لینے لگی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اسے سیتا کے ساتھ میرے تعلق کی جڑوں کی تلاش تھی۔ جنہیں اکھاڑ کر ہی وہ کوئی راہ بنا سکتی تھی۔

اگر میرا اندازہ درست تھا تو [illegible] لئے بہت سنگین اور تشویشناک تھی۔

کیتھی مائر خرطوم میں میرے لئے واحد سہارا تھی اور سیتا کی بازیابی کا تمام تر دارومدار اس کی نیک نیتی اور ہمت پر تھا۔ اگر وہ خود میری ذات میں دلچسپی لے رہی تھی تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکل سکتا تھا کہ وہ میری راہ میں غیر محسوس طور پر روڑے اٹکانے لگتی اور میری مہم طول پکڑ جاتی!

میں نے غور سے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھا جہاں گہری سنجیدگی کا راج تھا۔ پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے اور آنکھیں پُر خیال انداز میں سیاہ سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ لڑکی ضرور تھی مگر جنگجو فطرت کی مالک تھی۔ اگر وہ جدال پسند نہ ہوتی تو گوریلا تربیتی کیمپوں سے گزر کر خرطوم کے تنظیم آزادی فلسطین کے مرکزی دفتر تک نہ پہنچتی۔

میں نے ازراہ مذاق چیلنج کا ذکر کیا تھا لیکن وہ سیتا کی ذات کو اپنے لئے اگر واقعی چیلنج سمجھ بیٹھتی تو اسے مجھ سے دُور رکھنے کا ہر حربہ آزما سکتی تھی بلکہ ایک بدترین اندیشہ یہ بھی میرے ذہن میں سر اُبھارنے لگا کہ کہیں وہ بالا ہی بالا سیتا تک پہنچ کر اس کا پتہ نہ صاف کر دے!

اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بھی ہر جتن کر کے اس کو دل کی بات زبان پر لانے پر مجبور کر دوں گا اور اگر میرے اندیشے درست ثابت ہوئے تو خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے اسے پامال کر کے سیتا کی طرف بڑھتا چلا جاؤں گا!

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

"ہوں!" وہ چونک پڑی جیسے اس وقت گہرے خیالات میں ڈوبی رہی تھی: "کچھ بھی نہیں۔ بس آئندہ اقدام کے بارے میں سوچ رہی تھی"

"آئندہ اقدام؟ کس کے بارے میں؟"

"اس وقت عبدالکریم کے علاوہ سوچنے کے لئے اور کیا رہا ہے"۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"تو سوچتی رہو" میں نے ہنس کر کہا "سوچتے ہوئے تم بہت حسین لگتی ہو!"

اس نے بے ساختہ سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ہزار جذبے تڑپ رہے تھے جن میں حیرت، بے یقینی، مسرت اور آزردگی نمایاں تھی۔

"سامنے دیکھو" میں پھر ہنس پڑا۔ "ورنہ کار لڑا دو گی!"

"تمہاری زبان سے کسی کے حُسن کی تعریف اچھی نہیں لگتی!" اس نے دوبارہ سڑک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھ پر یہ پابندی کب سے لگا دی تم نے؟"

"سیتا سے چاہت کا راگ الاپنے کے بعد تم نے خود ہی اپنے اوپر پابندی لگائی ہے" اس نے بظاہر لاپروایانہ لہجے میں کہا۔

"چاہت اور پسند میں بڑا فرق ہوتا ہے!"

"ہوتا ہوگا" اس کے لہجے میں خود سری عود کر آئی: "پسند چاہت کا پہلا زینہ ہوتی ہے میرے لئے باریک فلسفے کو جھیلنا مشکل ہے! معلوم ہوتا ہے تم نے اپنی زندگی میں کبھی پیار نہیں کیا" میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع فراہم کرنا چاہ رہا تھا۔

"الزام تراشی بڑی دیدہ دلیری سے کرتے ہو" وہ ہنستے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی: "محبت تو انسان کی زندگی کا خمیر ہے جن کی زندگی بنجر رہتی ہے وہ کبھی مکمل انسان ثابت نہیں ہوتے درندے بن جاتے ہیں یا گٹھو کردں میں پرورش پانے والے حقیر کیڑے!"

"بڑے انتہا پسندانہ رجحانات ہیں تمہارے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"انتہا پسند نہ ہوتی تو یہودی ہونے کے باوجود پی ایل او میں آبرومندانہ مقام کی مالک نہ ہوتی" اس نے برجستہ کہا۔

"تو کسی سے محبت کی تم نے؟"

"دوسروں کی نجی زندگی میں جھانکنے کی عادت بُری ہوتی ہے" اُس نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

اس کے جارحانہ جوابات نے طبیعت کو خاصا بے مزہ کیا لیکن میں نے اس پر اپنی دلی کیفیت ظاہر نہ ہونے دی!

"اتنا تو بتا سکتی ہو کہ محبت کامیاب رہی یا ناکام؟"

"ناکام محبت صرف دل کے نہاں خانے میں جنم لیتی ہے اور وہیں مدفون رہتی ہے اور جب اس کا ذکر زبان پر آ جائے تو اسے ناکام نہیں کہا جا سکتا!"

"بڑا مبہم جواب ہے" میں نے تبصرہ کیا "ہزاروں تماش بین صوفیہ لورین اور جیکولین کینیڈی سے محبت کا دم بھرتے پھرتے ہیں مگر میرے نزدیک وہ سب ناکام و نامراد عاشق ہیں کیونکہ وہ عورتیں اُن کے وجود تک سے بے خبر ہیں!"

"جنس زدہ جذبوں کو محبت کا نام نہ دو" [illegible] زبانی [illegible] مجھ پر خفیف [illegible] کے احساس نے اس کا موڈ [illegible]

کردیا: "عشق کے لئے مرد اور عورت کا وجود لازمی نہیں، محبت تو پتھر اور پھولوں سے بھی کی جا سکتی ہے!"

میرا جی چاہا کہ اعلیٰ جذبوں کی بات کرنے والی اس حسین اور خوش اندام دوشیزہ سے یہ تو پوچھ ہی لوں کہ اپنے فلیٹ پر رات کے اندھیرے میں وہ میرے بدن پر کیا ٹٹول رہی تھی اور اس کا محرک کون سا جذبہ تھا مگر مجھے اس کی خوشنودی بھی مقصود تھی۔ لہٰذا اس کے تمام بلند پایہ افکار کو شوخی محبوب سمجھ کر سگریٹ کے ایک گہرے کش میں ہضم کر لیا!

اس کے بعد چند منٹ تک خاموشی سے سفر جاری رہا مگر کیتھی نے خود ہی اس خاموشی کو توڑ دیا۔

"اب کیسی لگ رہی ہوں؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہونے کے بجائے اکسانے والا تھا۔

"خوبصورت ہو اور ویسی ہی لگ رہی ہو!"

"کچھ دیر پہلے تمہارا خیال تھا کہ میں سوچتے ہوئے حسین لگتی ہوں لیکن کمال ہے کہ اب خالی الذہن ہونے کے باوجود خوبصورت لگ رہی ہوں"

"جھوٹ بول رہی ہو!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا: "محبت کرنے والا کبھی خالی الذہن نہیں رہ سکتا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ہی محبوب پیکر چکراتا رہتا ہے!"

"تم ... میں کسی سے محبت نہیں کرتی" میرے کاری وار پر وہ یوں بوکھلا گئی جیسے میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو: "مجھے کیا ضرورت ہے کسی کے بارے میں سوچنے کی؟"

"کچھ دیر پہلے تم نے مجھے الزام تراش کہہ کر محبت کو زندگی کا خمیر قرار دیا تھا" میں نے اسے یاد دلایا مگر وہ بلا کی عیار تھی!

"میں تو ایک عام بات کہہ رہی تھی" اس نے ہٹ دھرمی اختیار کرتے ہوئے کہا: "اسے تم میرا اعتراف نہیں کہہ سکتے!"

"تو ابھی تک ہم خلا میں باتیں کرتے رہے" میرا لہجہ قدرے ترش ہو گیا: "میرا تو خیال تھا کہ تم ذاتی تجربات کے حوالے سے بات کر رہی ہو!"

"دوسروں کے تجربات سے سیکھنے والے کامیاب انسان ہوتے ہیں، میرے نزدیک ہر معاملے میں بذاتِ خود تجربہ کرنے والے احمق یا سنکی ہوتے ہیں"

"ہمارے اس سفر کا اختتام کہاں ہوگا؟" میں نے قدرے توقف کے بعد گفتگو بلکہ اس کی سوچ کا رُخ موڑنے کی نیت سے سوال کیا۔

"قصر السودان پر!" اس نے جواب دیا۔

"کوئی سرکاری عمارت ہے؟"

وہ ہنس پڑی "یہ کیسے سمجھ لیا تم نے؟"

"نام ہی کچھ ایسا ہے!"

"سودان دراصل اس علاقے میں بولا جانے والا مقبول لفظ ہے پہلے یہ خطہ بلد السودان یعنی کالوں کا شہر کہلاتا تھا۔ اسی سے سودان کا نام اخذ کیا گیا یہاں تمہیں بہتیری نجی عمارات اور جاگیریں سودان کے نام پر ملیں گی"

"عبدالکریم کو وہاں لے جانا مخدوش تو ثابت نہ ہوگا؟"

"قصر السودان خرطوم میں پی ایل او کا ایک اہم ٹھکانا ہے جہاں غیر متعلق آدمی کے لئے پھٹکنا بھی دشوار ہے۔ اس کے علاوہ کہیں اور گئے تو تم خطرات سے دوچار ہو سکتے ہو!" اس نے سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کی۔

"قصر السودان کے ذمہ داروں کو میری موجودگی پر اعتراض نہ ہوگا؟"

"تم میرے ساتھ ہو" اس نے اعتماد سے کہا "چلتے رہو ہم سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا" اس کے بعد ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔

اس عمارت کے لئے قصر کا نام خاصا مناسب تھا۔ جہاں ہمارے سفر کا اختتام ہوا کیونکہ وہ ایک کم آباد علاقے میں واقع تھی اور اس کے احاطے کی دیواریں کسی قلعے کی فصیل کی طرح کم از کم پندرہ فٹ بلند تھیں جس کے بعد دیوار پر خاردار تاروں کی تین قطاریں تنی ہوئی تھیں جن کو چھیڑے بغیر کمند کے ذریعے اندر کودنا ناممکنات میں سے تھا۔

کیتھی نے اپنی کار اس فصیل میں لگے ہوئے دیو ہیکل آہنی پھاٹک کے سامنے روک دی جو اس وقت بند نظر آ رہا تھا۔

کار کے رکتے ہی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی میں سے خاکی وردی میں ملبوس ایک چاق و چوبند مسلح محافظ نمودار ہوا اور تیر کی طرح کار کی طرف بڑھتا آیا۔

"سلام مادام!" قریب پہنچ کر اس نے داہنا ہاتھ اٹھا کر کیتھی کو سلام کیا پھر لحظہ بھر توقف کے بعد بولا "شناخت؟"

"کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟" کیتھی نے اپنا پرس ٹٹولتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں سوال کیا "جو مجھ سے شناخت طلب کر رہے ہو؟"

"اچھی طرح جانتا ہوں" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا "مگر تم جانتی ہو کہ ہم اصولوں کے قیدی ہیں!"

کیتھی نے اپنے پرس سے گلابی رنگ کا ایک کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا اور وہ اس کارڈ کو دیکھتے ہی مشینی انداز میں واپس چل دیا۔

کیتھی نے وہ کارڈ پرس میں رکھا تو میں نے اس کے مندرجات پڑھنے کی کوشش کی جس پر وہ مسکرانے لگی۔ "اس چکر میں نہ پڑو، ہمارے [illegible] میان باہمی اعتماد کی یہی تو ایک خفیہ شناخت ہے!"

اپنی حراست میں خرطوم لے آئے!"

"تو وہ اب فوجی تحویل میں ہیں؟" میں نے اس کی لحظہ بھر کی خاموشی میں سوال کر ڈالا۔

وہ معنی خیز انداز میں ہنسا "انہیں غیر قانونی طور پر سوڈان میں داخل ہونے کے جرم میں عدالت میں پیش کیا گیا اور مقدمے کی سماعت مکمل ہونے تک جیل بھیج دیا گیا۔ جوزف امین کو شاید چار لڑکیوں کی گرفتاری کی اخباری اطلاعات سے چونکایا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے عدالت میں اپنے اصلی نام ظاہر نہیں کیے تھے ۔۔۔ اور جوزف امین جب ایک راہ پر لگ جاتا ہے تو اس کا کھوج نکال کر رہتا ہے میں نے سنا ہے کہ اس نے لڑکیوں کی اصلیت کا پتہ چلا لیا اور پھر فرضی ناموں سے ان چاروں کی ضمانت کرا لی۔"

"پھر کیا ہوا؟" اسے خاموش پا کر کیتھی نے سوال کیا۔

"جوزف سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے صحیح علم نہ ہو سکا لیکن پرسوں مقدمہ کی تاریخ پر ان چاروں میں سے کوئی لڑکی عدالت میں پیش نہیں ہوئی اور ان کے ضامنوں نے معذرت کے ساتھ عدالت میں زرِ ضمانت جرمانے کے طور پر ادا کر دیا۔"

"اس کا تو ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں کو رہائی ملتے ہی جوزف کے آدمیوں نے چھاپ لیا ہوگا۔" کیتھی نے کہا۔

"قیاس یہی کہتا ہے۔" ابوسلطان نے کہا۔ "مگر وہ لڑکیاں اشتہاری مجرم بن چکی ہیں۔ جوزف انہیں کسی سرکس میں کھلے بندوں نہیں نچا سکتا۔ اس نے یقیناً انہیں شوقین امراء کے ہاتھوں بھاری داموں پر فروخت کر دیا ہوگا۔"

"تو کیا وہ بردہ فروش ہے؟" کیتھی اس انکشاف پر حیران رہ گئی۔

"ہاں، جوزف سے میرے نجی مراسم تھے مگر اس کا کام بہت گندہ ہے۔ تم جانتی ہو کہ سوڈان میں یہ کام بہت منفعت بخش ہے۔" ابوسلطان کیتھی سے نظریں چرا کر بولا۔ "بس ایک ہی بات اطمینان بخش ہے کہ جوزف امین سیتا کی اصلیت سے بے خبر ہے۔ میری سفارش پر اس نے سیتا کو ایک عام مگر خوبرو لڑکی سمجھ کر سرکس میں شامل کیا تھا۔"

"تم کسی طرح معلوم کر سکتے ہو کہ ان لڑکیوں کا کیا حشر ہوا؟" میرے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کیتھی دریافت کر رہی تھی۔

"کوشش ضرور کروں گا مگر میرے لیے یہ کام مشکل ہی ہوگا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "اس کام کے لیے میں اخوان الصفا کے اراکین سے بھی مدد نہیں لے سکتا ورنہ وہ میرے اور ایک بردہ فروش کے مراسم پر سوچنے لگیں گے۔"

"پھر میں یہ کام خود سرانجام دوں گی۔" کیتھی نے کہا۔ "پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ عدالت میں سیتا نے اپنا کیا نام بتایا تھا، پھر اس کا ضامن بہت کچھ بتا سکے گا۔"

ابوسلطان سے جو کچھ معلوم ہو سکتا تھا وہ معلوم ہو چکا تھا اور میری خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد واپس چلا جائے تاکہ میں کیتھی سے تبادلۂ خیالات کر سکوں۔

"کیا مجھ سے مادام اسی سلسلے میں ملنا چاہتی تھیں؟" کمرے میں چھائے ہوئے گہرے سکوت میں ابوسلطان کی آواز گونجی۔

"یہ تو ضمنی موضوع تھا۔" کیتھی نے کہا۔ "میرا مہمان تمہارا سامنا کرنے سے خائف تھا۔ اگر سرِراہ تم اسے دیکھ لیتے تو شاید تصادم ہو جاتا۔ میں صرف کہنا چاہتی ہوں کہ جمال کے بارے میں تمہارے ذہن میں اگر کچھ تلخیاں باقی ہیں تو از راہِ کرم انہیں بھول جاؤ۔"

"میں بھول گیا تھا مادام!" اس نے جلدی سے کہا۔ "تمہیں تمہارے مہمان کو۔۔۔ اس بارے میں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

پھر وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

دروازہ بند کر کے کیتھی پُرجوش انداز میں مجھ سے مخاطب ہو گئی۔ "یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ صفدر علی میرے ساتھ موجود ہے اور سیتا بھی قرب و جوار میں ہی کہیں ہو سکتی ہے۔"

"اس وقت ابوسلطان رہنمائی کا فرشتہ بن کر آیا تھا ورنہ ہم شاید ساری عمر بھی سیتا کا سراغ پانے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔" میرے لیے بھی اپنی مسرت پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔

"خوابوں میں دیکھے ہوئے پیکر اگر غیر متوقع طور پر عملی زندگی میں سامنے آجائیں تو انسان جذباتی طور پر بیکار ہو جاتا ہے۔" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولی۔ "میں مدتوں تمہارے بارے میں سوچتی رہی ہوں، تمہیں انوکھے روپ میں سوچا ہے مگر اب تم سامنے ہو تو مجھ میں نہیں آتا کہ تم پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیسے کروں۔"

"میں تمہارا ممنون ہوں کیتھی!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مگر تصدیق ہونے تک میرا صفدر علی ہونا مشکوک ہے۔"

اس نے بھڑک کر غصیلی نگاہوں سے مجھے گھورا۔ "اگر میں تمہیں مشکوک سمجھتی تو اس وقت ابوسلطان یہاں موجود نہ ہوتا۔"

میں قہقہہ مار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "آج تم دفتر نہیں گئیں؟"

"کام کی ترجیحات ہوتی ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہاری خبرگیری دفتری معاملات سے زیادہ اہم ہے۔ وہاں دوسرے آدمی نے میری جگہ سنبھالی ہوئی ہے۔"

"تو کیوں نہ سیتا کے معاملے پر فوری طور پر کام کا آغاز کر دیا جائے؟"

"تمہاری یاد دہانی سے پہلے میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں۔" وہ چہک کر بولی۔ "تم نے دیکھا کہ ابوسلطان جیسا خرانٹ شخص میرا کتنا لحاظ کرتا ہے مگر تم مجھے شاید دودھ پیتی بچی سمجھ رہے ہو۔"

"میں تمہیں جو کچھ سمجھ رہا ہوں اس کا اظہار میرے بس میں نہیں ہے۔" میں نے شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں تم نے ۔۔۔ مقام کس طرح بنایا ہوگا کہ ابوسلطان اور اس جیسے دوسرے لوگ تمہارے سامنے مودب لہجہ اپنانے پر مجبور ہو گئے۔"

"ان کے سامنے میں جذبات سے عاری ایک کٹر اصول پرست شخصیت ہوں، تمہارے سامنے شاید محض ایک لڑکی۔ اسی لیے تم یہ سوچ رہے ہو۔"

"یہ تو تم پر منحصر ہے۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "تم خود کو جس روپ میں میرے سامنے پیش کرو گی، میں تم کو وہی سمجھوں گا۔"

"میں جا رہی ہوں۔" وہ ایک دم بات ٹال کر اٹھ گئی۔ "واپسی میں ڈاکٹر کو لیتی آؤں گی جو تمہارے زخم کی دیکھ بھال کرے گا۔"

"اس سے پہلے مجھے سگریٹ دیتی جانا۔ بس ایک ہی رہ گئی ہے۔"

وہ دس منٹ بعد سگریٹوں کا پیکٹ میرے حوالے کر کے دوبارہ چلی گئی اور میں خوابگاہ میں بستر پر دراز ہو کر سیتا تک رسائی کی ممکنہ صورتوں پر غور کرنے لگا۔

اس بارے میں جتنا سوچتا رہا اسی قدر میرے وجود میں غصہ سرایت کرتا چلا گیا۔ جوزف امین ایک سکہ بند بردہ فروش تھا اور اگر اس نے بھاری معاوضہ لے کر سیتا کو کسی رنگین مزاج امیر کے ہاتھ فروخت کیا تھا تو سیتا کے لیے اس غلامی کا ایک ایک لمحہ آبروسوز تھا۔ بھاری رقم خرچ کرنے والا اپنی تمام تر قوت صرف کر کے سیتا کو پامال کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ دوسری طرف مجھے سیتا کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ اپنی طرف اٹھنے والے ہاتھوں کو توڑ ڈالنے کی قدرتی صلاحیت سے مالامال تھی اور اگر حالات کے بھنور میں پھنس کر وہ اپنے تحفظ میں ناکام ہو جاتی تو مجھے پورا یقین تھا کہ بے آبروئی کی زندگی پر آبرومندانہ موت کو ترجیح دیتے ہوئے وہ بخوشی اپنے ہاتھوں موت کو گلے لگا لے گی۔ میرا دل کہتا تھا کہ سیتا مجھے زندہ ملے یا مُردہ لیکن اس کی پیشانی پر عفت و عصمت کا لازوال نور جگمگا رہا ہوگا جس کی سوداگری نے جوزف امین کو بردہ فروش بنایا ہوا تھا۔

کیتھی کے فلیٹ کی خاموش تنہائی میں میرے خیالات کا سلسلہ بڑھتا ہی رہا۔ اور مجھے وہ دن کائنات کا آخری دن محسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر سیتا کے لیے کوئی فوری قدم اٹھانا تھا خواہ میری کوشش اپنی موت پر ہی کیوں نہ منتج ہو۔

تین بجے دروازے کے قفل میں چابی کا کھٹکا ہوا اور کیتھی ایک ادھیڑ سالہ فلسطینی کے ساتھ فلیٹ میں داخل ہوئی جو سوٹ میں ملبوس تھا۔ میں بستر سے اتر کر خوابگاہ کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ کیتھی نے شرارتی لہجے میں کہا۔ "تم یہیں بیٹھے رہو میں ڈاکٹر عبدالرب کو لے آئی ہوں۔ یہ تمہارا معائنہ کریں گے۔"

نوجوان ڈاکٹر نے اپنا بریف کیس بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور مجھے آہستگی سے بستر پر لٹا دیا۔ کیتھی کی مدد سے اس نے میرے زخم سے پٹیاں اتاریں۔ زخم کی حالت دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا "ٹانکے سوکھ چکے ہیں اور زخم کی حالت بہت بہتر ہے۔" وہ زخم کا آس پاس کا حصہ ہولے ہولے دباتا ہوا بولا۔ "بس دو چار روز کے مکمل آرام کے بعد تکلیف سے نجات مل جائے گی۔"

"مگر میرے لیے بستر پر پڑے رہنا محال ہو گیا ہے ڈاکٹر۔"

"مجبوری ہے۔" اس نے میری نبض دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ایک ٹانکا بھی کھل گیا تو از سرِ نو علاج شروع کرنا پڑ جائے گا۔"

میری کیفیت کے پیش نظر اس نے زیرِ استعمال دواؤں پر ہی اکتفا کیا البتہ طاقت اور زخم کو سکھانے کے لیے دو انجکشن لگا دیے۔

"یہ چھ روز تک جاری رہیں گے۔" اس نے اپنے بریف کیس سے انجکشن نکال کر کیتھی کو تھماتے ہوئے کہا۔ "چاہو تو میں آ کر لگا دیا کروں گا۔"

"۔۔۔ چکی ہوں۔" کیتھی نے مسکرا کر کہا۔ "مگر ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر زخم کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔"

وہ چند منٹ بعد واپس چلا گیا۔

"عدالت میں سیتا نے اپنا نام ٹریسی لکھوایا تھا۔" واپس آکر کیتھی نے بتایا۔

"کمال ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "حالانکہ وہ بالکل غیر تعلیم یافتہ ہے، ایسا نام اسے کس طرح سوجھ گیا؟"

"ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ نام سنا ہو اور اس کے ذہن میں اٹکا رہ گیا ہو۔" کیتھی نے وضاحت کی۔ "اس کا ضامن عبدالکریم صالح تھا جو اپنے پتے پر نہیں مل سکا۔ اس کے پتے کی تصدیق پر عدالت نے بھی توجہ نہیں دی تھی کیونکہ ضمانت کی رقم نقد جمع کرائی گئی تھی۔"

"پھر تو جوزف امین کا ہی رُخ کرنا پڑے گا۔"

"وہ واپس قاہرہ جا چکا ہے۔" کیتھی نے پرس سے چاکلیٹ کا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ معلوم ہونے پر میں نے عدالت سے بقیہ تین لڑکیوں کے ضامنوں کے بھی نام اور پتے حاصل کر لیے۔ ان میں سے ایک کا ٹھکانا مل گیا ہے۔ وہ شہر میں سستے قسم کے ایک ہوٹل کا مالک ہے اور اسی کی اوپری منزل پر مقیم ہے۔"

"اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تم نے؟"

"وہ خاصا بدنام آدمی ہے، منشیات کی غیر قانونی تجارت میں بری طرح ملوث ہے۔ آسانی سے ایک لفظ بھی نہیں اگلے گا۔"

"بقیہ دو کے بارے میں کیا ہوا؟"

"میرے لیے آج کی بھاگ دوڑ تھکا دینے والی ثابت ہوئی۔ ان کا سراغ نکالنے پر دو آدمی مامور کر دیے ہیں، وہ شام تک اطلاع دیں گے۔"

"ہمیں سب سے آسان شکار پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔" میں نے چاکلیٹ نگلتے ہوئے کہا۔ "ان تینوں سے شاید سیتا کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ البتہ عبدالکریم صالح کا ٹھکانا ضرور معلوم ہو سکتا ہے۔"

اس اثنا میں وزنی پھاٹک کھل چکا تھا، کیتھی نے کار آگے بڑھا دی!

"تمہیں پہچان لینے کے بعد بھی... کارڈ طلب کرنا غیر ضروری بلکہ غیر فطری محسوس ہو رہا تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ کیتھی مائرہ قصر السوڈان کے پھاٹک پر آئی ہے مگر اسے یہ یقین نہیں تھا کہ کیتھی اب بھی تنظیم کی رکن ہے۔"

"تو کیا تمہارے یہاں رکنیت اس قدر غیر یقینی ہوتی ہے؟" میں نے سامنے نظر آنے والی دو منزلہ وسیع عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت سے سوال کیا۔

"ذرا سی غلطی پر رکنیت معطل یا ساقط کر دی جاتی ہے۔" اس نے کہا "اور اس سزا کی پہلی کڑی یہ ہوتی ہے کہ کوئی مجاز شخص معتوب رکن کا کارڈ ضبط کر لیتا ہے۔"

"اور اس طریقہ کار پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیوں ہو گا؟" اس نے الٹا مجھ ہی سے سوال کر دیا۔ "ہر رکن کا جذبہ سچائی پر مبنی ہے اور تادیبی کارروائی ہزار احتیاط کے ساتھ کی جائے تو کون اعتراض کرے گا؟ انقلابی تنظیمیں کڑے نظم و ضبط میں ہی پنپ پاتی ہیں!"

اس اثنا میں کیتھی سرسبز لان کے درمیان بنی ہوئی پختہ سڑک طے کر کے اپنی کار پورچ میں روک چکی تھی۔

کار روک کر کیتھی نیچے اتری تو میں نے بھی اپنی سمت کا دروازہ کھولا مگر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں مجھے نیچے اترنے سے روک دیا۔

پھر میری نگاہ ان خونخوار کتوں پر بھی پڑ گئی۔ جو پودوں وغیرہ کے کنج سے نکل کر کیتھی کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے اور اس کی کار کی طرف دیکھ کر دبے دبے غضبناک انداز میں غرا رہے تھے۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کتے عمارت کے نگراں تھے اور صرف ان ہی لوگوں سے نرمی سے پیش آتے ہوں گے جن کی بو سے مانوس رہے ہوں... ورنہ ان کے خونخوار جبڑے سیکنڈوں کی قلیل مدت میں کسی بھی اجنبی کے چیتھڑے اڑا دینے کی قوت رکھتے تھے!

کیتھی کو کار کے قریب کھڑے ہوئے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ وسیع برآمدے کے کسی گوشے میں سے ایک شخص تقریباً دوڑتا ہوا اس تک آ پہنچا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے آتے ہی میری طرف دیکھ کر کیتھی سے لٹھ مار انداز میں سوال کیا۔

"میرا مہمان!" کیتھی نے نرمی سے جواب دیا۔ "پچھلے پائیدان میں ایک شکار بے ہوش پڑا ہے ذرا اپنے کتوں کو سنبھال لو!"

"ادھر آؤ، میرے ساتھ!" وہ سوڈانی ڈپٹ کر عربی میں بولا۔ اور وہ چاروں کتے غراہٹیں بھول کر دُمیں ہلاتے اس کے پیچھے ہو لئے۔

"اب نیچے آ جاؤ!" کیتھی نے ہنس کر کہا۔

"انہیں معدوم ہی ہو جانے دو!" میں نے جواب دیا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ آہٹ پاتے ہی بھوکے بھیڑیوں کی طرح پلٹ پڑیں۔"

"اعلیٰ نسل کے کتے ہیں، اپنے ٹرینر کے حکم سے ذرا بھی سرتابی نہیں کرتے۔" وہ کھڑکی پر جھک کر بولی۔

میں جھجکتے ہوئے کار سے نیچے آ گیا۔

کیتھی مجھے ہمراہ لے کر وسیع و عریض برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں ایک مختصر سے چوبی کاؤنٹر کے عقب میں کتوں کا رکھوالا بیٹھا ہوا تھا۔ کتے فرش پر پُرسکون انداز میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہماری آہٹوں پر تقریباً ان سب ہی نے کسلمندانہ انداز میں نیم وا آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند کر کسی سوچ میں غرق ہو گئے۔

"میری کار میں جو شخص بے ہوش پڑا ہے اسے بارہ نمبر......!" کیتھی کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ اونگھتے ہوئے کتوں کے ڈھلکے ہوئے کان یک لخت کھڑے ہو گئے اور ان چاروں نے بیک وقت ہولناک آوازوں میں غرانا شروع کر دیا۔

میرے دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل گئے۔ مگر میری وہ کیفیت پل بھر سے زیادہ برقرار نہ رہ سکی۔

وہ چاروں کتے لمبی لمبی چھلانگیں مارتے برآمدے کی طرف دوڑ پڑے تھے اور پھر ان کی وحشیانہ غراہٹوں میں کسی انسان کی خوف زدہ چیخیں بھی شامل ہو گئی تھیں!

مدد کے لئے کربناک انداز میں چلانے والے کی آوازوں کے نشیب و فراز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قصر السوڈان کے خون آشام رکھوالے اس کے بدن کو بری طرح نوچ رہے تھے۔

یہ سب اس قدر تیزی سے ہوا کہ میں دہشت کے ابتدائی جھٹکے سے ہی نہ سنبھل سکا۔ پھر جو کاؤنٹر کی طرف سر گھمایا تو وہ خالی پڑا ہوا تھا اور کیتھی نے میرا داہنا بازو اتنی سختی سے دبوچ رکھا تھا کہ اس کے انگلیوں کے بڑھے ہوئے ناخن مجھے اپنی جلد میں پیوست ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

باہر کتوں کے رکھوالے کی تیز آوازیں ابھریں اور کتوں کا وہ غضبناک شور یک بیک ختم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ انسانی چیخیں آہوں اور کراہوں میں تبدیل ہو گئیں۔

"غالباً عبدالکریم مارا گیا؟" میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ میری آواز سن کر وہ چونک پڑی اور میرے بازو پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ "میں نے ان کتوں کو پہلی بار اشتعال کے عالم میں دیکھا ہے!"

"عبدالکریم شاید ہوش میں آ کر گاڑی سے اُتر پڑا۔ اور کتوں کا نشانہ بن گیا۔" میں نے بلند آواز میں قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔

پھر تقریباً فوراً ہی میرے اندیشے کی توثیق ہو گئی کیونکہ دو افراد عبدالکریم کو اس حالت میں اٹھا کر لا رہے تھے کہ اس کا تار تار لباس خون میں بُری طرح آلودہ تھا۔ ادھڑے ہوئے چہرے سے بہنے والے خون نے اس کا حلیہ بہت بھیانک بنا دیا تھا اور وہ کرب کے عالم میں بُری طرح کراہ رہا تھا۔

"نمبر بارہ!" کیتھی نے عبدالکریم کو لانے والوں کو یاد دلایا اور مجھے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئی۔ وہ اپنے ابتدائی ردِعمل پر قابو پانے کے بعد اعتدال پر آ چکی تھی جبکہ میں عبدالکریم کے کتوں کے بھنبھوڑے ہوئے جسم کا تصور کر کے ہی جھرجھریاں لے رہا تھا!

قصر السوڈان کی عمارت باہر سے جتنی پُرشکوہ تھی، اندر سے اسی قدر پُراسرار تھی۔ اس وقت حالانکہ باہر دوپہر کی چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی لیکن عمارت میں تین راہداریاں اور ایک مختصر سا زینہ استعمال کرنے کے بعد ہم ایسے ماحول میں پہنچ گئے جہاں سقف گیر روشنیاں نہ ہوتیں تو شاید ہاتھ کو ہاتھ بھی نہ سجھائی دیتا!

"یہ عمارت تو اچھی خاصی بھول بھلیاں ہے!" میں نے اس کے ہمراہ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"افریقہ میں یہ عمارت ہمارا سب سے بڑا اور محفوظ مرکز ہے۔" وہ فخریہ انداز میں بولی۔ "باہر تم نے احاطے کی دیوار پر خاردار تاروں کی جو باڑ دیکھی تھی اس میں ہر وقت طاقت ور اور مہلک برقی رو دوڑتی رہتی ہے، برقی رو اور مسلح محافظوں کے بعد خونخوار کتے ہیں جن کی کارکردگی ابھی تم خود دیکھ چکے ہو!"

"مگر میرا تو خیال تھا کہ افریقہ میں مصر تمہارا سب سے بڑا سرپرست ہے۔" میں نے اس پر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"وہ گزرے دنوں کی کہانیاں ہیں۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی! "جب مصر ہماری حکمتِ عملی کا سرچشمہ ہوا کرتا تھا مگر اب وہاں علاقائی سلامتی کی فکر طلوع ہو رہی ہے۔ وہ لوگ فلسطین کی خاطر اپنی آزادی اور بقا کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار نہیں ہیں!"

"فی الحال تو ایسی کوئی علامت نظر نہیں آتی!" میں نے اپنے روزمرہ کے اخباری مطالعے کی روشنی میں کہا۔

"یہ اندر کی کہانیاں ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "تم لکھ کر رکھ لو کہ یہی رجحانات برقرار رہے تو آنے والے دو چار برسوں میں فراعین کی سرزمین سے اسرائیل دوستی کا نعرہ بلند ہو گا اور وہ شاید ہماری تحریک کے لئے بدترین دور ثابت ہو گا!"

پُرپیچ راستوں سے گزرنے کے بعد آخرکار وہ ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہو گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ عمارت کے اندر خاصی طویل مسافت طے کرنے کے باوجود راستے میں ہمیں کوئی ذی روح نہیں ملا تھا!

اس کمرے میں نشست گاہ اور خوابگاہ کے مشترکہ لوازم موجود تھے، میں اندر داخل ہوتے ہی تھکے ہوئے انداز میں ایک نرم بستر پر گر گیا۔

"ایک بات بتاؤ گی؟" میں نے چند گہرے سانس لینے کے بعد اس سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں بتلاؤں گی؟" وہ مسکرا دی!

"اگر قصر السوڈان میں صرف وہی لوگ آ سکتے ہیں جن کی بو سے کتے مانوس ہیں، تو ان کی تعداد کیا ہے؟"

"بہت قلیل!" وہ بولی۔ "شاید کل بیالیس نفوس!"

"اور شاید وہ سب اس وقت عمارت میں موجود نہیں ہیں؟"

"یہ اندازہ کیسے لگا لیا تم نے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"برآمدے سے یہاں پہنچنے تک راستے میں ہماری کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہی ہے کہ مکینوں کی تعداد کے اعتبار سے عمارت بہت وسیع ہے!"

"مجھے تمہارے منطقی قیاسات پر حیرت ہوتی ہے۔" اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "کتے صرف بیالیس نفوس کی بو پر تربیت یافتہ ہیں۔ جن میں سے گیارہ بیروت میں یا کم از کم سوڈان سے باہر مقیم رہتے ہیں۔"

"کیا یہ اعداد و شمار پی ایل او کے رازوں میں شمار نہیں ہوتے؟"

"یہ تو کلیدی راز ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میری کوئی ہم شکل نگہبانوں کو دھوکا دے کر اندر داخل ہو بھی جائے تو کتوں سے نہیں بچ سکے گی۔ یہ سب ہمارے راز ہیں۔ جن پر قصر السوڈان کی سلامتی اور کارکردگی کا دارومدار ہے!"

"پھر ان رازوں میں مجھے کیوں شریک کیا جا رہا ہے؟"

"بیروت سے احکام آ جانے کے بعد تم ہمارے لئے اراکین سے زیادہ اہم ہو۔ ورنہ قصر السوڈان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ جان سکتے!"

"عبدالکریم سے ملاقات کب ہو گی؟" میں نے چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد اس سے دبے لہجے میں سوال کیا۔

"اسے کتوں نے بڑی بے رحمی سے ادھیڑا ہے۔" وہ بولی۔ "اسے مرہم پٹی کے بعد یہیں لایا جائے گا۔ یہی کمرہ نمبر بارہ ہے!"

"اور اگر وہ اس سے پہلے ہی چل بسا؟"

"پھر کوئی اور راہ تلاش کریں گے!" وہ عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔ "اس دوران میں ذرا اپنی ڈاک دیکھ لوں۔"

"کیا یہاں کوئی مواصلاتی رابطہ بھی ہے؟"

"یہاں شارٹ ویو کا ایک طاقتور ٹرانسمٹر ریسیور بھی ہے۔

جس پر دور دراز سے خفیہ اطلاعات آتی جاتی رہتی ہیں۔" اس نے میری حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں آرام کرو، میں چند منٹ میں واپس آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی اور میں سگریٹ سلگا کر اپنے خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ میرے لئے کیتھی مائر کی ذات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ تر ہوتی جا رہی تھی۔

اُس نے عبدالکریم کی موت کے اندیشے پر جس لاتعلقانہ انداز میں تبصرہ کیا تھا۔ اس کی بنا پر مجھے شبہ ہو رہا تھا کہیں وہ دیدہ و دانستہ اسے ختم نہ کرا دے اس طرح سیتا کے بارے میں فوری طور پر کوئی سراغ ملنا ناممکن ہو کر رہ جاتا اور میں کوئی نیا سرا ملنے تک کیتھی مائر کے رحم و کرم پر پڑا رہ جاتا۔ میری ذات میں اس کی دلچسپی کے پیشِ نظر ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں تھا اور میں کیتھی کے تاخیری ہتھکنڈوں کو ناکام بنانا چاہتا تھا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ باہر سخت ترین حفاظتی انتظامات ہونے کے باوجود عمارت میں غیر معمولی ویرانی کا راج تھا اور اتنے بڑے تعمیر شدہ رقبے کی دو منزلوں میں بیرونی محافظوں سمیت کل اٹھائیس نفوس کا ہونا بہت ناکافی تھا لہٰذا میں باہر نکل کر یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر سکتا تھا کہ اس وقت کیتھی کہاں تھی اور کیا کرتی پھر رہی تھی!

وہ خیال آتے ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔

بارہ نمبر کا دروازہ میرے موہوم سے اندیشے کے برعکس غیر مقفل تھا میں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور باہر ویران راہداری میں پہنچ گیا۔ جہاں اگر بلب روشن نہ ہوتے تو رات کے گھور اندھیرے کا سا ہولناک سماں ہوتا۔

میں بارہ نمبر سے باہر ضرور نکل آیا تھا مگر میرے پاس اس بے اعتدالی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کیا اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے چھت میں نصب روشنیوں کے علاوہ ایک ایسا دیوار گیر بلب بھی نظر آ گیا جو میری دسترس میں تھا اس قسم کے بلب راہداری میں خاصے فاصلے پر نصب تھے۔

میں نے جیب سے ایک سکہ نکالا اور پھرتی سے اس بلب کے قریب پہنچ گیا، اس وقت راہداری میں دُور تک پُر ہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کی مدد سے روشن بلب ہولڈر سے باہر نکالا جو خاصا گرم تھا پھر بلب کے دھاتی حصے پر سکہ رکھ کر اسے دوبارہ ہولڈر میں پھنسا دیا۔

بلب پر خفیف سا دباؤ پڑتے ہی یک لخت ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ میں نے بلب ہٹا کر احتیاط سے وہ سکہ دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لیا اور اندازہ کر کے بلب دوبارہ ہولڈر میں لگا دیا، اس حصے کا فیوز اڑا دینے کے بعد میرا مقصد پورا ہو گیا تھا لہٰذا میں بلب لگا کر وہاں سے کھسک لیا۔

بارہ نمبر کا دروازہ کھول کر میرا دل باغ باغ ہو گیا کیونکہ وہ کمرہ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں دروازہ بند کر کے راہداری میں تیزی سے ایک طرف چل دیا۔

میں نے بارہ نمبر کا دروازہ بند کرنے کے بعد غیر ارادی طور پر داہنی سمت اختیار کی تھی اور اس طرف کسی موڑ سے آنے والی روشنی نظر آ رہی تھی۔

میں اندھیرے میں تیزی سے پیش قدمی کرتا ہوا روشنی تک پہنچا تو مڑتے ہی سامنے سے سفید کوٹ میں ملبوس ایک شخص اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ یوں چونکا تھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو یا پھر مجھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی ہو!

"کون ہو تم؟" میرے قریب آ کر اس نے تیز نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"یہی سوال میں بھی تم سے کر سکتا ہوں!" میں نے رُک کر پُر اعتماد لہجے سے کہا۔

"تمہاری شناخت؟" اس نے اپنی جیب سے گلابی رنگ کا کارڈ نکال کر میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ اس کارڈ پر سیاہ ہندسوں میں ایک نمبر کے علاوہ اس شخص کی رنگین تصویر چسپاں تھی اور تصویر کو کاٹتی ہوئی ابھرے ہوئے الفاظ میں پی ایل او کی مہر ثبت تھی۔ مجھے دکھا کر اس نے وہ کارڈ فوراً ہی اپنی جیب میں واپس رکھ لیا تھا۔

"کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود صحیح سلامت اس عمارت میں موجود ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

اس کی آنکھوں میں الجھن عود کر آئی اور اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی مضبوط استدلال نہیں ہے، تم کس کے ساتھ آئے ہو؟"

"کیتھی مائر کے ساتھ!" میں نے اس کے سنجیدہ تیور دیکھتے ہوئے جواب دیا بصورتِ دیگر مجھے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر مجھ پر کوئی وار نہ کر گزرے جبکہ میں اپنے مندمل ہوتے ہوئے زخم کے بارے میں خاصا محتاط تھا!

"تو یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس کے لہجے میں نمایاں نرمی پیدا ہو گئی۔ "تمہیں تو اس وقت بارہ نمبر میں ہونا چاہیئے تھا!"

اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میرے لئے حیران کن تھے اتنی مختصر سی مدت میں قصر السودان کے مکینوں کو نہ صرف نئے آدمی کی موجودگی بلکہ اس کے مخصوص کمرے کا بھی علم ہو چکا تھا!

"وہاں اچانک اندھیرا ہو گیا ہے!"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "میں وہی دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"کیتھی مائزہ اس وقت کہاں ہوگی؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ جہاں بھی ہوگی تمہارے پاس لوٹ آئے گی۔"

"تمہیں زخمی ہونے والے کے بارے میں کچھ علم ہے؟"

"سنا ہے کہ کتوں نے اس کا چہرہ اور سینہ بُری طرح ادھیڑا ہے، شاید وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔"

"تم مجھے اس کے پاس لے چلو!" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "میں مرنے سے پہلے اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں بارہ نمبر میں ہی محدود رہنا چاہئے۔" اس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں وہاں سے انٹرکام پر کیتھی سے تمہاری بات کرا دوں گا!"

ناچار مجھے اس کے ساتھ لوٹنا پڑا۔

اسے اڑا ہوا فیوز تبدیل کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی مگر وہ فیوز اڑنے کا سبب جاننے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

راہداری میں روشنی بحال ہونے کے بعد میں اس کے ہمراہ بارہ نمبر میں داخل ہوا تو اس نے وہاں موجود داخلی فون پر ایک نمبر ڈائل کیا اور کیتھی کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا اور دوسری بار نمبر ملا کر اس نے ریسیور مجھے دے دیا۔

"کیتھی!" گھنٹی کی آواز موقوف ہوتے ہی میرے کانوں میں کیتھی کی تحکم آمیز آواز آئی۔

"تم کہاں غائب ہو؟" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ عبدالکریم قریب المرگ ہے۔ اس سے باز پرس کی نوبت کب آئے گی؟"

"میں آرہی ہوں!" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے پاس سے اس شخص کے جانے کے چند منٹ بعد ہی کیتھی واپس آگئی۔

"تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے!" اس نے آتے ہی مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاشم تمہارے بارے میں فکر مند تھا!"

"ہاشم؟" میں حیرت اور بے یقینی کے عالم میں تقریباً چیخ اٹھا "تو وہ زندہ ہے؟"

"وہ بیروت میں ہے!" کیتھی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کے گردے نے پی ایل او سے باضابطہ طور پر صحرائے نوبی میں تمہاری لاش کی تلاش کی درخواست کی تھی جبکہ تم اسے مردہ سمجھ رہے تھے!"

"کمال ہے۔" میں نے مسرت آمیز حیرت سے کہا۔ "وہ بیروت کیسے پہنچ گیا؟ میں نے تو اپنی طرف سے اس پر صبر کر لیا تھا۔"

"بیروت سے کل رات یہاں پیغام موصول ہوا تھا اور میں ابھی ہاشم سے وائرلیس پر بات کر کے آئی ہوں۔ وہ تمہارے بارے میں کسی خبر کے انتظار میں پچھلے تیس گھنٹوں سے مسلسل پی ایل او کے ہنگامی مواصلاتی مرکز میں جما بیٹھا تھا!"

"تو کیا تم اس سے واقف تھیں؟"

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "افواج آزادئ فلسطین کے سرکردہ رہنما کے طور پر بس اس کے نام سے واقف تھی۔ دراصل تم دونوں اپنے گائیڈ کی فریب دہی کا نشانہ بنے۔ اس نے ہاشم کو تمہارے بارے میں بھی بالکل وہی دردناک کہانی سنا کر آگے جانے سے انکار کیا تھا جو اس نے تمہیں ہاشم کے بارے میں... سنائی تھی۔ اور ہاشم صحرا سے نکلنے کے بعد دل برداشتہ ہو کر فوراً سوڈان سے چلا گیا کیونکہ یہاں اسے قانون کے ہاتھوں پریشانی کا خطرہ تھا!"

"یہ تو بہت بڑی نوید سنائی تم نے!" میں نے حقیقی مسرت کے احساس کے ساتھ کہا۔ اس وقت میرے ذہن میں ہاشم کے وہ الفاظ گھوم رہے تھے جو اس نے صحرا میں رہنے والوں کے بارے میں کہے تھے۔ اس کی دانست میں یکساں صحرائی زندگی سے اکتائے ہوئے لوگ تفریح اور سنسنی پیدا کرنے کے چکر میں، نہایت روانی کے ساتھ جھوٹی کہانیاں گھڑنے کے ماہر تھے اور شاید یوسف نے بھی سرخ آندھی کا تجربہ ہونے کے بعد اپنی گلوخلاصی کے لئے ہم دونوں پر علیحدہ علیحدہ وہی حربہ آزمایا تھا۔

اس نے ہاشم کی دردناک موت کی منظر کشی کر کے مجھ پر شدید جذباتی رقت طاری کرنے کے بعد محض اپنے گھر بار کی خاطر معاوضے یا انعام کو بھی ٹھکرانے کا ذکر کیا تھا جبکہ وہ سفر کے آغاز سے پہلے ہی ایک خطیر رقم ہم سے لے کر اپنی بستی میں چھوڑ آیا تھا۔

ہاشم کی زندگی کی خوش خبری پا کر کچھ دیر کے لئے میں عبدالکریم کو بھول گیا۔ اس کے ساتھ میری رفاقت اتنی طویل اور محبت آمیز تھی کہ اس کی موت میرے لئے ایک ناقابلِ یقین حقیقت بنی ہوئی تھی مگر کیتھی نے مجھے اس صدمے سے نجات دلا دی تھی۔

"عبدالکریم کو دیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ!" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

دو سفید بستروں والا وہ کمرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے کسی ہسپتال کا پُرتکلف وارڈ معلوم ہو رہا تھا! جہاں ایک بستر پر عبدالکریم پٹیوں میں لپٹا ہوا بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

اس کے چہرے، سینے اور ہاتھوں کے زخموں کی حالت اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ ساری ڈریسنگ خون میں تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی نس میں لگی ہوئی سوئی پلاسٹک کی پتلی سی نلکی کے ذریعے خون کی لٹکی ہوئی بوتل سے ملحق تھی۔

اسے گو بوند بوند خون مسلسل مل رہا تھا لیکن اخراج کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میں پھریری لے کر رہ گیا اور میری آنکھوں میں سرخ دیدوں والے وہ مہیب شیم اور خون آشام کتے گھوم گئے جنہوں نے آناً فاناً میں اسے اس حال میں پہنچایا تھا!

"کیا توقع ہے؟" میں نے وہاں موجود دو نرسوں میں سے ایک سے سوال کیا۔

اس نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "بچنا محال ہے۔ سینے کے بائیں حصے پر اتنا گہرا زخم آیا ہے کہ پسلیوں تک پر خراشیں آئی ہیں، نبض کی رفتار بھی خطرناک ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب لڑھک جائے!"

"اسے کچھ دیر کے لئے ہوش آسکتا ہے؟"

"یہ دہشت اور نقاہت سے نڈھال ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولتا ہے اور بے معنی سی گالیاں بکنے لگتا ہے۔"

"پھر میں یہیں بیٹھوں گا۔" میں نے کیتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے کب یہ آخری ہچکی لے کر دم توڑ دے!"

"تم دونوں جاؤ، میں اسے دیکھ لوں گی!" کیتھی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اور وہ نرسیں ہمیں چھوڑ کر وہاں سے چلی گئیں!

میں نے قریب کھڑے ہو کر دو تین بار عبدالکریم کو پکارا تو اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ کراہوں کے درمیان قہر اور نفرت بھرے لہجے میں برس پڑا۔

"تم جھوٹے...... مکار...... میں تمہارے چیتھڑے اڑا دوں گا۔"

"زندہ بچ جاؤ تو ضرور اڑا دینا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فی الحال میں تم سے صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ عدالت سے تم نے جن چار لڑکیوں کی ضمانت کرائی تھی وہ کہاں ہیں؟"

ایک لحظہ کے لئے پٹیوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی اس کی قہربار آنکھوں میں حیرت کی جھلک نمودار ہوئی پھر اس نے سوال کیا۔ "تم کون ہو؟"

"سوال کرنے کے بجائے جواب دینے کی کوشش کرو!" میں نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "تعاون کرو گے تو طبی امداد کے ساتھ ہی رہائی بھی مل سکتی ہے ورنہ سسک سسک کر اسی بستر پر اپنے آخری سانس پورے کرو گے!"

"میں...... میں نے صرف ایک لڑکی کی ضمانت لی تھی!" وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولا۔

دنیا کے ہر برے آدمی کی طرح اپنی موت کا امکان سامنے آتے ہی اس کا سارا غصہ یک بیک خوف میں ڈھل گیا تھا۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے غرا کر کہا۔ "ان چاروں کی ضمانت کا سارا بندوبست تم ہی نے کیا تھا اور عدالت سے ان کی رہائی کے پروانے جاری ہوتے ہی تم نے حاصل کر لئے تھے!"

"شاید تمہیں نہیں معلوم کہ وہ سارا چکر کیا تھا۔" وہ اپنی تکلیف بھول کر بہت زیادہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ "تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ اس معاملے سے دُور رہو!"

اس دوران میں کیتھی خاموش کھڑی بغور میرا جائزہ لے رہی تھی اس پر عجیب سی اعصابی کیفیت طاری تھی جو میرے لئے ایک نئی چیز تھی۔

"یہ باز نہیں آئے گا۔" وہ اچانک بولی۔ "ہم اس پر اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ اس کا تو قصہ ہی پاک کر دو!"

یہ کہتے ہوئے کیتھی نے اتنے پُرسکون انداز میں اپنے وینٹی بیگ میں سے ریوالور نکالا کہ میں بوکھلا گیا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسی وقت عبدالکریم کو گولی مار دے گی۔

"ارے ارے!" میں نے لپک کر اس سے ریوالور چھین لیا۔ "یہ کیا نیکی کر رہی ہو اس کے ساتھ؟ اسے ہم دوبارہ کتوں کے حوالے کئے دیتے ہیں۔"

"نہیں!" وہ حلق کے بل ہذیانی انداز میں چیخ پڑا۔ "تم یہ زندگی نہیں کر سکتے۔ میں تم سب کو فنا کر دوں گا، تمہاری ہڈیاں چورا کر دوں گا۔"

"بکواس بند کر گدھے کی اولاد!" کیتھی نے بڑھ کر اس کے ٹخنے پر ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "ورنہ سارے جوڑ بھی ہلا دیئے جائیں گے!"

وہ خاموش ہو گیا۔ مگر اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ہی قہر اور نفرت کے شرارے بھی کوند رہے تھے۔

"لڑکیاں کہاں ہیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"جوزف امین میری کھال میں بھوسہ بھروا دے گا۔" وہ قدرے توقف کے بعد کراہتے ہوئے بولا۔ "میں تو بڑی مشکل میں گھر گیا ہوں۔"

"ہم لوگوں سے تعاون کر کے تم فائدے میں رہو گے!" میں نے سخت لہجے میں اس پر اپنی نرم دلی کا اظہار کیا۔

"اگر تمہارے سوال کا جواب دے دوں تو مجھے رہائی مل جائے گی؟" اس نے یاس آمیز لہجے میں سوال کیا جیسے اسے آزادی کی کوئی امید نہ رہی ہو!

"اتنے احمق نہیں ہیں ہم۔" میں تلخ انداز میں ہنسا۔ "لڑکیوں کی بازیابی تک تم ہمارے یرغمالی بنے رہو گے۔ فی الحال ویسے بھی تمہیں دیکھ بھال کی ضرورت ہے!"

"اپنی دیکھ بھال کا بندوبست میں خود کر سکتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تمہارے لئے لڑکیوں کی بازیابی اتنی آسان نہ ہوگی۔ بس تم ان کی موجودگی کے بارے میں میرے بیان کی تصدیق کر کے مجھے آزادی دینے کا وعدہ کر لو!"

"کہاں ہیں لڑکیاں؟" میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

"میرا خیال ہے کہ جوزف امین انہیں رہائی سے پہلے فروخت کر چکا تھا۔"

"کس کے ہاتھ؟"

"ایک لڑکی کو تو میں نے شیخ مالود الفوزی کی جاگیر پر پہنچایا

تھا۔ باقی تین کو ایک شخص لے گیا تھا۔" اس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"شیخ جالود الفوز؟" کیتھی مائرہ نے حیرت سے دہرایا۔ "وہ تو خاصا قابلِ احترام سیاستداں سمجھا جاتا ہے!"

اس کے ہونٹوں پر تکلیف میں ڈوبی ہوئی تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "بلا کا شوقین بڈھا ہے۔ اس کی جاگیر میں غیر مرد تو دور کنار اس کی بیویاں تک نہیں پھٹک سکتیں۔ وہاں اس نے دنیا بھر سے حسن کے نادر نمونے جمع کئے ہوئے ہیں!"

"شیخ جالود والی لڑکی کا نام کیا تھا؟"

"عدالت میں لڑکیوں نے اپنے اصل نام ظاہر نہیں کئے تھے، جوزف نے مجھے ان کے فرضی نام بتلائے تھے۔ اس کا نام شہیر تھا۔"

میرے ذہن سے جالود کا نام فوراً محو ہو گیا کیونکہ سبیتا اس تک نہیں لے جائی گئی تھی!

"باقی تین لڑکیوں کے نام کیا تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"ٹریسی مارٹن، دُردانہ خانم اور ایلس براؤن!" اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"انہیں کون لے گیا تھا؟"

"وہ میرے لئے اجنبی تھا، جوزف امین کی ہدایت کے مطابق میں نے کوڈ کے تبادلے کے ذریعے اسے پہچانا اور لڑکیاں اس کے حوالے کر دیں۔"

"تم جھوٹے ہو!" میں غرّایا۔

"سنو!" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "میں نے تمہیں صاف دلی سے ہر بات بتا دی ہے۔ ان لڑکیوں سے میرا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، معاوضے کی رقم مجھے پیشگی مل چکی تھی اور میرا خیال ہے کہ جوزف کو یہ بتانے تو نہ جاؤ گے کہ لڑکیوں کا سراغ تمہیں کیسے ملا؟"

"مگر وہ اجنبی؟" میرا لہجہ درشت تھا۔

"شاید تم اسے ڈھونڈ ہی لو۔" وہ بولا۔ "وہ کوئی مقامی ہی تھا اور صورت سے پیشہ ور نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی فرمائش پر لڑکیوں کو بے ہوش کر کے اس کی وین کے عقبی حصّے میں بند کیا گیا تھا۔ وہ بہت نروس قسم کا آدمی تھا!"

"زیرِ زمین دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟" کیتھی نے سوال کیا۔

"کم از کم میرے لئے وہ اجنبی تھا!" وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔

"اس کی کوئی واضح شناخت؟" میں نے کہا۔

"دراز قامت، سیاہ فام، گھونگھریالے بال۔" وہ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "کسرتی بدن اور ہاں شاید اس کے ایک کان کا نچلا حصّہ خم کھا کر اوپر کی طرف مڑا ہوا تھا۔"

"کون سا کان؟" کیتھی نے چونک کر سوال کیا۔

"جہاں تک یاد پڑتا ہے، داہنا کان تھا!" وہ بے یقینی کے عالم میں بولا۔

"اور اس کا سامنے کا ایک اوپری دانت سونے کے خول سے منڈھا ہوا تھا۔" کیتھی نے پُرجوش لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں ہاں! وہی۔" وہ بے اختیار بول پڑا۔ "سب سے نمایاں نشانی تو میں بھول ہی رہا تھا۔"

"کون ہے وہ؟" میں فوری طور پر کیتھی سے وہ سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں اسے نہیں جانتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مڑے ہوئے کان کے حوالے سے مجھے اوپری سنہرا دانت یاد آ گیا، اس شخص کو میں کئی بار دیکھ چکی ہوں۔"

"مگر کہاں؟"

"سوچنا پڑے گا۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولی۔ "اس کا ایک کان ہالہ پُو کی شکل میں اوپر گھوما ہوا ہے۔ غالباً آخری بار میں نے اسے تین ماہ قبل دیکھا تھا۔"

میں نے اسے وہاں سے کھسکنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں باہر آ گئے۔ دونوں نرسیں اس کمرے سے ذرا دور راہداری میں موجود تھیں وہ ہمیں دیکھتے ہی واپس آ گئیں۔

"اسے اب کوئی تیز خواب آور دوا دے دو!" کیتھی نے کہا۔ "اگر حالت بگڑنے لگے تو راحیل کو اطلاع دے دینا۔"

ان دونوں کی آنکھیں تحیّر آمیز انداز میں پھیل گئیں اور وہ مزید کچھ کہے بغیر عبدالکریم کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"یہ راحیل کون ہے؟" اس کے ہمراہ آگے بڑھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

"قصر السوڈان کے عملے کا ایک رکن ہے!" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اس کا نام سن کر دونوں نرسیں بھی حیران ہو گئی تھیں!" میں نے کہا۔ "غالباً راحیل یہاں کا کوئی ناپسندیدہ شخص ہے!"

"تنہائی پسند اور خونخوار آدمی ہے!"

"تو وہ عبدالکریم کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ "اس کا زندہ بچنا ناممکنات میں سے ہے، اسے فوری طور پر رہا کیا گیا تو باہر وہ مرنے سے پہلے اپنے بارے میں اتنی بکواس کر ڈالے گا کہ اس کی موت پر خطرناک قیاس آرائیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔"

"تو تم اسے ختم کرا دو گی؟"

"قتل و خون ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "جب وہ اپنے سانس پورے کر لے گا تو راحیل اسے کہیں ڈال آئے گا۔"

"قیاس آرائیاں تو پھر بھی ہوں گی۔"

"مگر وہ خطرناک نہیں ہوں گی۔" وہ بولی۔ "فندق الہشام سے کسی نے اسے تمہارے ساتھ نکلتے نہیں دیکھا تھا، ہم پر شبہ ضرور کیا جائے گا مگر اس کی نوعیت موہوم سی ہو گی مگر عبدالکریم باہر جاتے ہی ہم دونوں پر اپنے اغوا اور تشدد کا براہِ راست الزام عائد کرے گا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ اور میں قصر السوڈان کے پُراسرار طریقۂ کار کے بارے میں سوچنے لگا۔

"فی الحال تم یہیں ٹھہرو گے!" کمرہ نمبر بارہ میں پہنچنے کے بعد کیتھی نے کہا۔

"اور تم کہاں جا رہی ہو؟"

"مڑے ہوئے کان والے کی تلاش میں!"

"کیا کچھ یاد آیا اس کے بارے میں؟" میں نے پُرامید لہجے میں سوال کیا۔

"یاد آ جاتا تو شاید اتنی دشواری نہ ہوتی!" اس نے کہا۔ "مجھے اتنا تو یقین ہے کہ وہ جو بھی ہے، خاصا معزز آدمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالکریم کے پاس سے لڑکیوں کو غیر قانونی طریقے پر لے جاتے ہوئے وہ نروس نظر آ رہا تھا۔"

"میرے لئے تنہا یہاں رہنا بہت مشکل ہے، گھٹن سی محسوس ہوتی ہے!" میں نے کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے اپنے فلیٹ پر چھوڑ دینا۔"

"یہاں والے بہت ملنسار ہیں۔"

"ان سے دوستی کرنے میں وقت لگے گا جو میرے پاس نہیں ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "پھر میں یہاں کے قواعد سے بھی ناآشنا ہوں۔"

"اچھا! تو چلو میرے ساتھ۔" وہ اٹھ گئی۔

"گُتّے کہاں غائب ہو گئے؟" بلا کسی تعرض کے کیتھی کی کار میں سوار ہو جانے کے بعد میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"کہیں سستا رہے ہوں گے مگر یہ نہ سمجھنا کہ وہ غافل ہوں گے۔ محض میری بُو کی وجہ سے وہ ادھر نہیں لپکے!" اس نے اگنیشن آن کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"تمہاری بُو!" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "اب تو میں بھی اس سے مانوس ہوتا جا رہا ہوں ورنہ ابھی تک کتنوں کو پچھاڑ چکا ہوتا۔"

"مردوں میں درندگی مجھے پسند ہے۔" اس نے دلفریب لہجے میں کہا۔

"راحیل سے شادی کر لو!"

"لطافت کے ساتھ درندگی اچھی لگتی ہے۔ اس کے بغیر انسان محض جانور بن کر رہ جاتا ہے۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"تو قصر السوڈان میں راحیل کی صورت میں ایک جانور پلا ہوا ہے" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اگر قتل و خون تمہاری پالیسی کا حصہ نہیں ہیں تو پھر راحیل جیسے آدمی کا کیا کام ہے؟"

میرا خیال تھا کہ وہ لاجواب ہو جائے گی مگر وہ اپنی کار قصر السوڈان کے دیو ہیکل پھاٹک سے نکالتے ہوئے بولی۔ "خطرات کا اندازہ لگانے کے معاملے میں اس کی چھٹی حس بہت تیز ہے۔ اس کا اصل کام قصر السوڈان میں آئے ہوئے اہم مہمانوں کی کُل وقتی حفاظت ہے۔ کئی بار وہ عقاب کی سی تیزی دکھا کر قاتلانہ حملوں کو ناکام بنا چکا ہے۔"

"تشدّد اور خونریزی تو یہ بھی کہلائے گی۔"

"اپنے دفاع میں کی جانے والی خونریزی کو ہر ملک کا قانون جائز سمجھتا ہے اور یہی ہمارا بھی رہنما اصول ہے۔ جارحیت کے خلاف آواز بلند کرنے والے اگر خود دہشت گردی پر اتر آئیں تو ان کے ہمنوا قلیل تعداد میں رہ جاتے ہیں۔"

"لگے ہاتھوں ایک بات اور بتا چلو۔" میں نے کہا۔ "عبدالکریم کو اغوا کرنے کے بعد تم نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس سے بازپرس کے لئے تم کوئی جگہ سوچ رہی ہو، کہیں اس طرح تم قصر السوڈان کو میری نگاہوں سے بچانا تو نہیں چاہتی تھیں؟"

"تم سے تو نہیں البتہ عبدالکریم سے ضرور بچانا چاہتی تھی۔" اس نے صاف دلی سے جواب دیا۔ "آخری لمحات پر بھی کوئی جگہ سوجھ جاتی تو میں ادھر کا رخ نہ کرتی۔"

"حالانکہ وہ وہاں سے زندہ نہ نکل سکے گا۔"

"یہ بدقسمتی ہے اس کی، میرا ارادہ تو یہی تھا کہ اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد اسے چھوڑ دوں گی۔ اسے قصر السوڈان میں لے جاتے ہوئے بھی میرا یہی خیال تھا کہ اس کی واپسی بھی بے ہوشی کی حالت میں ہو گی تاکہ وہ بلاوہ نمبر کے علاوہ کوئی اور کمرہ نہ دیکھ سکے!"

مجھے اپنے فلیٹ پر اتار کر وہ کہیں چلی گئی۔ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے اس نے دو تین گھنٹے بعد اپنی واپسی کا امکان ظاہر کیا تھا۔

کیتھی مائرہ کے فلیٹ پر فریج میں خورد و نوش کی خاصی اشیاء موجود تھیں لہٰذا مجھے شکم پُری میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سارڈینا فش گرم کرتے ہوئے اندر سے میرا دل بہت مسرور تھا۔ اس روز مجھے دو بڑی کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں جو کیتھی کے تعاون کے بغیر ممکن نہ ہوتیں!

پہلی پیش رفت مڑے ہوئے کان والے کی نشاندہی کی صورت میں ہوئی تھی جس سے سبیتا کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں اور دوسری خوشخبری ہاشم کی زندگی کے بارے میں تھی!

اپنے صحرائی رہنما سے خونی آندھی کے دوران ہاشم کی موت کی

فرضی اطلاع پاکر میں دل ہی دل میں خود کو اس کی ہلاکت کا مجرم سمجھ رہا تھا مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ نہ ہم سیتا وغیرہ کے تعاقب میں صحرائے نوبی کے خطرناک حصے کی طرف سفر کرنے کا قصد کرتے اور نہ ہاشم ناگہانی مارا جاتا۔ اس کے زندہ ہونے کی خبر پاکر میرے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے باہر نکلنے کا قصد کیا مگر فوراً ہی یاد آگیا کہ کیتھی حسبِ معمول فلیٹ کو مقفل کر کے گئی ہوگی!

دروازے پر زور آزمائی سے میرا خیال درست ثابت ہوا اور میں پرانے اخبارات سمیٹ کر کیتھی کے کشادہ بستر پر دراز ہو گیا۔

بھرے ہوئے پیٹ کا خمار تھوڑی دیر بعد رنگ دکھانے لگا اور میں چند سگریٹیں پھونکنے کے بعد گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو فلیٹ میں گہری تاریکی اور سناٹے کا راج تھا جس کا مطلب تھا کہ دن ڈھلے کافی دیر گزر چکی تھی۔

میں نے ہڑبڑا کر بستر چھوڑ دیا۔

فلیٹ میں سناٹے کا مطلب یہ تھا کہ کیتھی اس وقت تک واپس نہیں لوٹی تھی۔

اس بوکھلاہٹ میں بھی۔۔۔ احتیاط دامن گیر رہی اور میں نے ساری کھڑکیوں کے دبیز پردے کھینچ کر خواب گاہ میں دھیمی روشنی والا بلب جلا دیا۔

اس وقت میری رسٹ واچ سوا آٹھ بجا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ کیتھی کو گئے سوا چھ گھنٹے گزر چکے تھے جو اس کے اندازے سے دوگنا وقت تھا۔

میں سگریٹیں پھونکتا ہوا خواب گاہ کے دبیز قالین پر بے چینی سے چہل قدمی کرنے لگا۔

خرطوم میرے لئے اجنبی شہر تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیتھی مڑے ہوئے کانوں والے کو تلاش میں کس طرف گئی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں فلیٹ میں مقفل تھا۔ اگر میں دروازہ یا کھڑکی توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو یقیناً دیوار کے مکین کیتھی کے فلیٹ کی طرف متوجہ ہو جاتے اور ایک تنہا لڑکی کے فلیٹ سے برآمد ہونے والے اجنبی کو کیتھی کی آمد اور تصدیق تک قانون کی تحویل میں دینے سے باز نہ آتے!

اچانک ٹیلی فون کی تیز گھنٹی نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا اور میں چونک کر اس بولتے ہوئے مواصلاتی آلے کو گھورنے لگا۔

اس سے پیشتر میں نے کیتھی کی عدم موجودگی میں کبھی فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ ہر بار نمبر ملانے والے خود ہی تھک ہار کر سلسلہ منقطع کر دیتے تھے اور یہ احتیاط محض اس لئے کی گئی تھی کہ کسی کو کیتھی کے فلیٹ میں ایک مرد کی موجودگی کا علم نہ ہو سکے۔

مگر اس وقت صورتحال بہت سنگین تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید کیتھی نے مصیبت میں گھرنے کے بعد کوئی راہ نہ پاتے ہوئے ناچار فون پر خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی ہو!

یہ خیال آتے ہی میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

"مادام کیتھی؟" ریسیور اٹھاتے ہی میرے کان میں ایک نرم سی مردانہ سوالیہ آواز آئی۔

"کون ہو تم؟ کیا کام ہے اُس سے؟" میں نے عربی میں بگڑ کر دو سوال کر ڈالے۔

"میں نجیب بول رہا ہوں، فون مادام کو دے دو!" نرم مردانہ آواز میں میرے استفسارات کے جواب میں یک بیک تحکم پیدا ہو گیا۔

"یہاں کوئی مادام نہیں رہتی برخوردار! شاید تم نے غلط نمبر ملا یا ہے۔"

"گدھے کی اولاد!" وہ غرایا۔ "پھر پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے اپنی گالی پر میرا تبصرہ سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سوڈان میں گدھا لوگوں میں اس قدر محبوب جانور ہے کہ گالیوں کا بیشتر وزن بھی اسی پہ لاد دیا گیا ہے!

مجھے اندازہ تھا کہ وہ دوبارہ نمبر ملانے کی کوشش کرے گا لہٰذا میں نے ریسیور تپائی پر رکھ دیا اور خود ٹیلی فون ڈائرکٹری کی ورق گردانی کرنے لگا۔

پی ایل او کے نام کے ساتھ محض دو فون نمبر تھے۔ جن میں ایک دفتر کا اور دوسرا دفتری اوقات کے بعد کوئی اقامتی نمبر تھا مگر نمبر کے آگے خلافِ توقع کسی کا نام درج نہیں تھا۔ میں نے وہ دونوں نمبر ایک کاغذ پر لکھ لئے پھر قصر السودان کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

اس وقت فوری طور پر میرا کہیں فون کا ارادہ نہیں تھا میں رات گئے تک کیتھی کا انتظار کرنا چاہتا تھا اگر وہ اس وقت تک بھی واپس نہ آتی تو میں فون پر اس کے رفقائے کار سے رابطہ پیدا کرتا اور یہ تیاری اسی سلسلے کی پیشگی کر لی تھی۔

قصر السودان جیسی شان و شوکت کی عمارت تھی اس کے اعتبار سے وہاں کئی نمبر ہونے لازمی تھے۔ مگر فہرست میں قصر السودان کا نام میں تلاش نہ کر سکا جس کا مطلب تھا کہ سارے فون عمارت کے بجائے کسی فرد کے نام پر مخصوص تھے جس سے میں لاعلم تھا!

دس بج گئے اور میں دھندلائی ہوئی روشنی میں مضطرب بیٹھا کیتھی کا ناکام انتظار کرتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی سلامتی کے بارے میں میری تشویش میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ وہ خونریز لڑکی تنہا کسی معرکے پر نکلی تھی اور اگر اس کو مغلوب کرنے والے مجرمانہ رجحانات کے مالک تھے تو فوری طور پر جنسی تشدد ان کا پہلا حربہ ہوتا!

میں نے بے اختیار سر جھٹک کر ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا۔ امید صرف یہی تھی کہ کہیں کیتھی کا فون نہ آجائے۔

کیتھی نہ صرف گوریلا تربیت لئے ہوئے تھی بلکہ ذاتی طور پر بھی وہ بہت پُرعزم اور باہمت لڑکی تھی اور اس مرحلے پر اس کا لڑکی ہونا ہی مجھے کاٹ رہا تھا۔

ساڑھے بارہ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی کسی آسیبی چیخ کی طرح یکبارگی گونج اٹھی اور میں نے اضطراری طور پر ریسیور اٹھا لیا۔

"مادام کیتھی؟" سوال کیا گیا۔

"نجیب؟" میں نے آواز پہچان کر سوال کیا۔

"ہاں!" شاید وہ غیر ارادی طور پر کہہ گیا۔

"گدھے کی اولاد!" میں نے اس کی دی ہوئی گالی اسے لوٹا کر فوری طور پر فون بند کر دیا۔ اس حرکت میں میرے ارادے سے زیادہ لاشعور کا دخل تھا جس میں وہ گالی شاید چپک کر رہ گئی تھی۔

گالی عام طور پر محض گالی سمجھ کر دی جاتی ہے اور اس کی ترکیب پر غور کئے بغیر اسی طرح قبول بھی کر لی جاتی ہے لیکن گالی کھانے والا اگر اس کی ماہیت اور اس طریقۂ کار پر غور کرنا شروع کر دے جس سے گزرنے کے بعد وہ بدکلامی اس پر صادق آسکے تو عموماً اشتعال کی آخری حدود فوری طور پر پیدا ہو جاتی ہیں جس کا انجام خونریزی سے کم کسی طرح نہیں ہوتا۔

ذہنی طور پر میں کیتھی کی سلامتی کے گمبھیر مسئلے میں الجھا ہوا تھا مگر میرا لاشعور شاید مسلسل اس بیہودہ اور غیر منطقی طریقۂ کار پر کام کئے جا رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں کسی انسان کی ولدیت ایک حیوان کو منتقل کرنی ممکن ہو اور اسی کے نتیجے میں میں نے نجیب کا قرض چکا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔

رفتہ رفتہ باہر سے آنے والی آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں اور میں کیتھی کی خوابگاہ میں اندھیرے حصار کا قیدی بنا بیٹھا رہ گیا۔

جب ذہنی خلفشار کے ساتھ ہی زخم میں بھی تکلیف بڑھنے لگی تو میں بستر پر دراز ہو گیا۔ میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی مگر آنے والے بُرے وقت کے لئے جسمانی طور پر قدرے سنبھال رکھنا اہم تھا تاکہ کسی امکانی معرکے میں نیچا نہ دیکھنا پڑے۔

رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ سناٹا اس قدر مکمل تھا کہ باہر سڑک پر سوئی گرنے کی آواز بھی فلیٹ میں بخوبی سنی جا سکتی تھی اور میں سگریٹ نوشی میں مصروف تھا کہ فلیٹ کے دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا اور میں نے بھڑک کر بستر چھوڑ دیا۔

سب سے پہلے میں نے سوئچ دبا کر مدھم روشنی والا سینر بلب بند کیا تاکہ آنے والا خود اندھیرے میں رہتے ہوئے مجھے نشانہ نہ بنا لے۔ اور اگر وہ کیتھی ہی ہوتی تو اندر داخل ہوتے ہی خود روشنی کر کے اپنی آمد کا کھلا اعلان کرتی اور میں اس کے سامنے پہنچ جاتا مگر اس وقت میں جن اندیشوں سے دوچار تھا ان کے پیشِ نظر میری چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

دروازے پر دوبارہ خفیف سا کھٹکا ہوا جس میں کلک کی دھیمی سی آواز بھی شامل تھی، وہ جو کوئی بھی تھا بہت رازداری اور احتیاط کے ساتھ قفل پر طبع آزمائی کر رہا تھا اور کلک کی آواز اس کی کامیابی کی چغلی کھا رہی تھی۔

دروازہ آواز پیدا کئے بغیر تھوڑا سا کھلا اور مدھم روشنی کی ایک لکیر اس جھری سے اندھیرے ڈرائنگ روم کے وسط تک رینگ آئی۔ میں خواب گاہ کے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ مگر میری نگاہ بدستور داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھی اور میں نے سرہانے رکھا ہوا پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا اس نے دروازہ کھولنے سے قبل باہر لگا ہوا بلب بجھا دیا تھا ورنہ ڈرائنگ روم میں خاصی روشنی در آتی۔ خفیف سی روشنی شاید اوپری منزل اور زینوں پہ جلنے والے بلب سے وہاں تک آرہی تھی۔

دروازہ مزید کھلا۔ پھر اس جھری میں سے ایک اوسط درجے کی سیاہ کھوپڑی اندر داخل ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ایک متوسط قامت و جسامت والا شخص اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر چکا تھا۔

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا اور پستول کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔

اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایک لحظے کے لئے روشنی کی مدھم لکیر کے سامنے سے گزرا تھا، اس کا چہرہ تاریکی میں تھا جو مجھے نظر نہ آسکا۔ مگر اس کے گھونگھریالے بالوں اور سیاہ رنگ کے بارے میں میں پورا پُر یقین تھا۔

اس شخص کے دونوں شانے خفیف سے آگے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے اور وہ یقینی طور پر مسلح تھا کیونکہ اس کا آگے بڑھا ہوا داہنا ہاتھ جسم کے سائے میں ہونے کے باعث مجھے پوری کوشش کے باوجود نظر نہ آسکا۔

اس قفل شکن سیاہ فام اجنبی کے بارے میں میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ پہلا خیال تو یہی تھا کہ کہیں وہ مڑے ہوئے کان والا نہ ہو جس کی تلاش میں کیتھی پچھلے بارہ گھنٹوں سے لاپتہ تھی۔

اندھیرے میں ہر طرح سے قدم جمانے کے بعد سیاہ فام نے پنسل ٹارچ روشن کی اور ایک طاقتور لیکن محدود روشن لکیر تیزی سے کمرے میں ناچنے لگی۔ ایسے گوشے روشنی کا خاص نشانہ تھے جہاں کسی کے چھپنے کی گنجائش تھی۔

ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بے آواز قدموں سے

خواب گاہ کی طرف آرہا تھا۔ اس کمرے میں مسہری ایسی جگہ پر تھی کہ وہ دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہی شکن آلود بستر دیکھ سکتا تھا پھر خواب گاہ میں بھرا ہوا سگریٹ کا دھواں اور ایش ٹرے میں سگریٹ کے مسلے ہوئے ٹکڑوں کا انبار اسے اندر کسی کی موجودگی کا یقین دلا دیتا اور وہ ہوشیار ہو جاتا۔

اس کا ہوشیار ہونا میرے لئے ہر اعتبار سے خطرناک تھا مگر میں خوابگاہ میں رہتے ہوئے محض پستول کی دھمکی سے اسے قابو میں نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خواب گاہ سے ڈرائنگ روم میں روشنی کرنی ناممکن تھی۔ اپنی ٹارچ بجھانے کے بعد وہ خود بھی اندھیرے میں ضم ہو جاتا اور اندھے مقابلے کا آغاز ہو جاتا جس میں اس کے زیر ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بالفرض محال میں اس پر حاوی ہونے بھی لگتا تو وہ اپنی کمزوری بھانپتے ہی کسی بھی لمحے دروازہ کھول کر باہر نکل سکتا تھا اور فائرنگ کا شور سن کر باہر جمع ہونے والوں کو اندر موجود ایک مسلح اور جنونی مجرم کی موجودگی کا ہوّا دکھا کر افراتفری میں باآسانی فرار ہو سکتا تھا جبکہ میرے لئے ناقابلِ بیان دشواریاں پیدا ہونے کے سارے امکانات موجود تھے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ روشن ٹارچ کے باعث مجھے اس کی لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی پوزیشن کا پورا اندازہ تھا لہٰذا میں زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی کے ایک ہی کاری وار سے سارا معاملہ خاموشی سے نمٹا سکتا تھا مگر اس طرح میں اس سے معلومات حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا۔

وہ مڑے ہوئے کان والا تھا یا کوئی اور لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ کم از کم کیتھی کے بارے میں ضرور جانتا تھا ورنہ اس وقت چوروں کی طرح اس کے فلیٹ میں داخل نہ ہوا ہوتا۔

میرا ذہن تیزی سے ساری صورتحال کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا اور آخر کار میں نے اپنی جیب سے زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی نکال لی۔

بعد کی بدترین صورتحال کا سامنا کرنے سے بہتر یہ تھا کہ خاموشی سے اسے ہلاک کر کے اس کی لاش کی شناخت کے ذریعے کیتھی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

شیشی کا بٹن دبتے ہی وہ لڑکھڑا کر قالین پر ڈھیر ہو گیا اور جلتی ہوئی ٹارچ لڑھک کر ایک تپائی کے نیچے چلی گئی۔

میں شیشی جیب میں رکھ کر پھرتی سے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا اور پنسل ٹارچ اٹھا کر مرنے والے کا جائزہ لینے لگا۔

وہ سیاہ فام ضرور تھا مگر اس کے دونوں کان سیدھے تھے اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں نے اس کی تلاشی لے ڈالی۔

اس کے ہاتھ میں موجود اعشاریہ دو پانچ کا خودکار ریوالور لاش کے قریب پڑا ہوا تھا۔ جیب سے لمبے اور دوہرے پھل والے خطرناک چاقو کے علاوہ کرنسی اور ایک مڑا تڑا کاغذ برآمد ہوا جس پر دو نمبر درج تھے۔ اس کے قبضے سے برآمد ہونے والی اہم ترین چیز وہ کی چین تھی جو کیتھی مائرہ کی ملکیت تھی۔ اس گچھے میں فلیٹ اور الماری کے علاوہ اس کی کار کی چابی بھی موجود تھی۔ لاش سے ایسی کوئی چیز برآمد نہ ہو سکی جس سے مرنے والے کی شناخت ممکن ہوتی۔

گمشدہ کیتھی کے فلیٹ میں ایک لاش کے ساتھ میری موجودگی خطرناک تھی۔ فلیٹ کا تالا کھل چکا تھا اور میں چاہتا تو باآسانی وہاں سے کھسک سکتا تھا لیکن باہر میرے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا نہیں تھا میں نے ایک مرتبہ پھر لاش کی اچھی طرح تلاشی لی اور پھر خوابگاہ میں پہنچ گیا۔

دھیمی سبز روشنی کا بلب جلا کر میں نے فون پر وہ نمبر ڈائل کیا جو ڈائرکٹری میں پی ایل او کے حوالے سے اقامتی نمبر کے طور پر درج تھا۔

"ہیلو!" تیسری گھنٹی کے بعد میرے کانوں میں نیند کے گہرے خمار میں ڈوبی ہوئی ایک مردانہ آواز آئی۔

میں نے نمبر دہرا کر تصدیق چاہی تاکہ کسی غیر متعلق آدمی کو اپنے نازک رازوں میں نادانستہ طور پر شریک نہ بنا بیٹھوں۔

"ہاں ہاں — کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ شاید گہری نیند سے ناوقت بیدار کیے جانے پر جھلایا ہوا تھا مگر اس بار میں نے اس کی آواز پہچان لی!

"تم شاید نجیب بول رہے ہو۔" میں نے رکے بغیر کہنا شروع کیا۔ "پہلے بھی دو بار تم سے میری بات ہو چکی ہے، کیا تم فوری طور پر کیتھی کی قیام گاہ پر پہنچ سکتے ہو؟"

"مادام کہاں ہیں اور تم کون ہو؟" اس کی آواز سے نیند کا اثر فوراً کافور ہو گیا۔

"میں اس کا مہمان ہوں۔ باقی باتیں یہاں آکر سن لینا۔" میں نے فون پر گفتگو کو حتی الامکان مختصر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور میں نے بھی سلسلہ منقطع کر دیا۔

پی ایل او کے نمبر پر نجیب کی آواز سن کر مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ رات گئے فون پر اسے گدھے کی اولاد قرار دیتے ہوئے یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ کیتھی کے معاملے میں آخر کار مجھے اسی سے رجوع کرنا پڑے گا۔

وہ دس منٹ میرے لیے ناقابلِ بیان طوالت اختیار کر گئے۔ میرے لیے اس فلیٹ میں مقتول کی آمد کا کوئی مضبوط جواز ڈھونڈنا مشکل ہو رہا تھا کیتھی ان لوگوں کی تحویل میں تھی یا ماری جا چکی تھی

لیکن ہر دو صورتوں میں کیتھی کی قیام گاہ کی تلاشی بظاہر بے مصرف تھی مگر ڈرائنگ روم کے قالین پر پڑی ہوئی اکڑی ہوئی لاش اس ناقابلِ جواز اقدام کا کھلا ثبوت تھی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اگر خوابگاہ میں اپنی موجودگی کے آثار موجود نہ ہوتے تو پورے فلیٹ کے سرسری جائزے کے بعد متوفی بھرپور انداز میں فلیٹ کی تلاشی لیتا۔

مگر اسے وہاں کس چیز کی تلاش تھی؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

نجیب کے دیے ہوئے دس منٹ گزر چکے تھے میری نگاہ رسٹ واچ پر تھی اور کان دروازے پر لگے ہوئے تھے کہ گیارہواں منٹ پورا ہونے سے قبل دروازے پر خفیف سی دستک کی آواز سنائی دی اور میں پستول لے کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بولٹ گرانے کے بعد میں نے پٹ کھول دیا اور خود اس کی اوٹ میں رہا لیکن کوئی اندر نہ آیا۔

"اندر چلے آؤ۔" میں نے باہر والے کو محض اپنی آواز سنانے کے لیے کہا۔

"پہلے تم سامنے آؤ۔" باہر سے دھیمی آواز آئی۔

نجیب کی آواز پہچان کر میں نے پستول والا ہاتھ گرا لیا، اور دروازے کے سامنے چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی

وہ اسی طرح مجھے کور کیے اندر آگیا۔

"خوابگاہ میں روشنی میں چلو۔" وہ مدھم روشنی میں فرش پر پڑی ہوئی لاش پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا حرکت ہے، ریوالور ہٹاؤ۔" میں پیچھے ہٹے بغیر غرایا۔

"احتیاط۔ صرف احتیاط میرے دوست!" وہ نرمی سے بولا "میں صرف تمھاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اطمینان کر سکوں۔"

اس کی بات درست ہی تھی۔ میں نے ایک قابل اعتماد فون پر اس کی آواز سن کر ایک شناخت مقرر کر لی تھی۔ مگر میں اس کے لیے اجنبی تھا تو اجالے میں وہ کیسے پہچان لے گا۔

"کیا تم پہلے مجھے دیکھ چکے ہو؟" میں نے خوابگاہ کی طرف سرکتے ہوئے سوال کیا۔

"آج ہی قصر السودان میں دیکھا تھا۔" اس کی نرم آواز سنائی دی اور میرے چہرے پر روشنی کی پہلی کرن پڑتے ہی اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

"مادام کہاں ہیں؟" سنگین صورتحال میں رسمی گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں تھی لہٰذا وہ براہِ راست مقصد کی طرف آگیا۔

"قصر السوداں سے آنے کے بعد سے وہ لاپتہ ہے۔" اس کے احترام آمیز رویے کے باوجود میں کیتھی کے لیے اپنا معمول کا لب و لہجہ نہ بدل سکا۔ "اسے زیادہ سے زیادہ پانچ بجے شام تک آجانا چاہیے تھا اور اب رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔"

"کچھ علم ہے کہ کہاں گئی تھیں؟"

"کسی مڑے ہوئے کان والے سیاہ فام کی تلاش میں۔"

"کیا؟" اس کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی۔ "مڑے ہوئے کان والا سیاہ فام؟ اس سے مادام کو کیا کام پڑ گیا؟"

"تم جانتے ہو اسے؟" میں نے مضطرب لہجے میں سوال کیا۔

"اچھی طرح۔" وہ وثوق سے بولا۔ اس کا داہنا کان یو کی شکل میں اوپر کی طرف مڑا ہوا ہے، وہ ایک چھوٹی سی افریقی ریاست کے مقامی سفارتخانے کا کمرشل اتاشی ہے۔"

"تو پھر فوراً ادھر کا رخ کرو۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "باہر جس شخص کی لاش پڑی ہے وہ بھی اسی کا آدمی ہوگا۔ کیتھی کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"آؤ۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مربیانہ لہجے میں کہا پھر پنسل ٹارچ کی روشنی میں لاش کا چہرہ دیکھتے ہی جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ... یہ تو کسی سریع الاثر زہر کا شکار ہوا ہے۔" اس کی آواز سے حیرت نمایاں تھی۔

"ہاں، پوٹاشیم سائنائیڈ!" میں نے جواب دیا۔ "میرے پاس زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں پھینکنے والا ہتھیار موجود ہے۔"

دھندلی روشنی میں اس کی تحیر زدہ نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ "تت... تم صفدر علی تو نہیں ہو؟"

"تمہارا قیاس درست ہے۔" میں نے آہستگی سے اعتراف کیا۔

"میں اپنی بدکلامی پر شرمندہ ہوں محترم دوست!" میرے نام سے واقف ہوتے ہی گندمی چہرے والا وہ سوڈانی سراپا انکسار بن گیا۔

"بعد میں میں نے بھی اس کا جواب دے دیا تھا۔" کئی گھنٹوں کے بعد میرے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "کاش میں نے اسی وقت تم سے بات کر لی ہوتی۔"

"میں اسی وقت سے پریشان ہوں، خرطوم میں فون پر غلط نمبر ملنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں تم اتنے محتاط کیوں تھے؟"

کیتھی کی عدم موجودگی میں میں فون ہی نہیں اٹھاتا۔ اس وقت محض اس امید پر اٹھایا تھا کہ شاید کیتھی نے کسی مشکل میں گھرنے کے بعد خود فون کا سہارا لیا ہو۔"

"میری آواز سن کر مایوسی ہوئی ہو گی۔"

"ہاں۔ میں نے تم سے پیچھا چھڑایا تھا۔" اس نے اقرار کیا۔ "دراصل میں نہیں چاہتا کہ کیتھی کے دوست اس سے یہ سوال کریں کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے فلیٹ میں فون اٹھانے والا مرد کون ہوتا ہے؟"

"تم نے جامہ تلاشی لی تھی اس کی؟"

"ہاں، ایک کاغذ کے علاوہ کوئی کارآمد چیز نہیں ملی۔" میں نے جیب سے مڑا تڑا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "دوسری چیزیں کیتھی کی گمشدگی میں ملوث کرتی ہیں یہ اس کی چابی سے قفل کھول کر اندر آیا تھا۔"

"یہ تو فون نمبر ہیں۔" اس نے ٹارچ کی روشنی میں کاغذ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ابھی معلوم کرتا ہوں کہ یہ نمبر کہاں کے ہیں۔"

اس نے کیتھی کے فون پر اپنے کسی دوست کے نمبر ملاتے جس نے بمشکل ڈیڑھ منٹ میں بتا دیا کہ وہ دونوں نمبر پیٹر کارلائل نامی ایک غیر ملکی کی مضافاتی جاگیر کے تھے۔

وہ اطلاع پاتے ہی نجیب پرجوش ہو گیا کیونکہ اس کی یادداشت کے مطابق مڑے ہوئے کان والے کمرشل اتاشی کا نام پیٹر کارلائل ہی تھا ٹیلی فون ڈائرکٹری اس بار نجیب کے کام آئی سفارت خانوں کی فہرست میں مطلوبہ ملک کے سفارتی عملے میں پیٹر کارلائل کا نام کمرشل اتاشی کے طور پر موجود تھا۔

"وہ کیتھی کو اپنی سرکاری قیام گاہ سے شاید مضافاتی مکان پر ہی لے گیا ہو گا۔" میں نے پرزور لہجے میں کہا۔ "اور شاید یہ نمبر بھی اسی لیے متوفی کی جیب سے مل گئے کہ ہنگامی رابطے کے لیے اسے فوری طور پر فراہم کیے گئے ہوں گے۔"

"اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیٹر کی مضافاتی قیام گاہ سے مرنے والا مانوس تھا اور پیٹر کو بادلِ ناخواستہ اس سے کام لینا پڑ گیا تھا۔ اگر مرنے والا سفارتی عملے کا رکن تھا تو اس کی لاش سرے سے غائب کرنی ہو گی۔"

"وہ تو ہر صورت میں ضروری ہے۔"

"ہاں... آں!" وہ چونک کر بولا۔ "تمہاری رازداری بھی ضروری ہے۔ بلو پائپ قدیم افریقی ہتھیار ہے مگر عرصے سے یہاں متروک ہے اور پھر پوٹاشیم سائنائڈ میں بجھی ہوئی سوئیوں کے شکار تو محض تمہارے نام سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"روانگی کے ساتھ ہی یہ بندوبست بھی کیوں نہ کر لیا جائے؟" میں نے تجویز پیش کی۔ "کل نہ جانے کیا حالات ہوں، اس وقت تو رات کا اندھیرا معاون رہے گا۔"

"تم لاش کو میرے ساتھ کار تک سہارا دے سکو گے؟"

"سہارا ہی دوں گا بوجھ نہیں سنبھال سکوں گا۔" میں نے بلاتکلف کہہ ڈالا۔ "میرے بدن پر گہرا زخم آیا ہوا ہے، ٹانکے نہ کھل جائیں۔"

"میرا خیال ہے کہ پیٹر کارلائل کی قیام گاہ کے بجائے اس کی مضافاتی جاگیر کی طرف چلا جائے یوں ہم قصر السودان کے قریب سے گزریں گے اور وہاں ایک آدمی ہم سے کار بدل کر لاش کو ٹھکانے لگانے لے جائے گا۔"

"یہ بہترین صورت ہو گی۔"

نجیب نے فون پر ہی کسی کو مختصر الفاظ میں کچھ ہدایات دیں۔ اس دوران میں میں دانستہ اس سے دور رہا تاکہ وہ کھل کر بات کر سکے۔

فون سے فارغ ہو کر نجیب ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ سیاہ فام کو مرے ہوئے بہت دیر نہیں ہوئی تھی۔ مگر سریع الاثر زہر کے باعث اس کے جسم میں اکڑاؤ طاری ہونے لگا نجیب نے اس کا بایاں بازو اپنے شانے پر سے گزار کر گردن کے سہارے بوجھ اٹھایا اور پھر اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے چلا۔ میں نے آگے بڑھ کر موقع کا جائزہ لیا اور میرا اشارہ پاتے ہی نجیب عمارت سے نکل کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ پختہ زمین پر متوفی کے جوتوں کی رگڑ عجیب آواز پیدا کر رہی تھی اور اگر چند ثانیوں کی تاخیر کی جاتی تو لاش کے جوتے بھی اتارے جا سکتے تھے مگر اس وقت ہم پر ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ میں نے نجیب کی کار کا عقبی دروازہ کھولا اور اس نے اکڑی ہوئی لاش کو دروازے میں سے اندر گرا دیا۔

مرنے والا نشست سے لڑھک کر اس بری طرح نشستوں کے درمیان پھنسا کہ اس کا آدھا بدن سڑک پر لٹکا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے پھرتی سے اسے اندر گھسیٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

مجھے کیتھی کا فلیٹ مقفل کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر عمارت میں جانا پڑا۔ واپس آیا تو میدان بدستور صاف تھا۔ نجیب نے مجھے دیکھتے ہی کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا اور میرے بیٹھتے ہی اس کی کار تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ میری طرف کا دروازہ میرا ہاتھ لگے بغیر رفتار کے جھٹکے سے خود ہی مضبوطی سے بند ہو گیا اور میں سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

پہاڑ کی طرح نظر آنے والا مسئلہ اتنی سہولت سے حل ہو گیا تھا کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

"تمہیں مادام اور پیٹر کارلائل کے تنازعہ کے بارے میں کچھ علم ہے؟" کچھ دور تک خاموشی سے کار چلانے کے بعد نجیب نے سوال کیا۔

"کسی حد تک!" میں نے یہ سوچ کر جواب دیا کہ کیتھی پیٹر کارلائل یا اس کے کسی گرگے کے ہتھے چڑھ چکی تھی اور اس کی بازیابی کی مہم نجیب کے کندھوں پر آ پڑی تھی لہٰذا اسے معاملے کی صحیح نوعیت کا علم ہونا چاہیے تاکہ وہ پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ اپنی کارروائی کا آغاز کر سکے۔

مناسب سمجھو تو بتا بھی ڈالو۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "پیٹر کارلائل خرطوم میں بہت پرانا سفارتی نمائندہ ہے اور مقامی حکام سے اس کے اچھے روابط ہیں۔ ہم سے کہیں بھی چوک ہو گئی تو نہ صرف وہ صاف نکل جائے گا بلکہ الٹی ہماری گردنیں پھنسوا دے گا۔"

"پیٹر کارلائل سفارتی مراعات کی آڑ میں یہاں بردہ فروشی میں ملوث ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا مگر وہ بے یقینی سے اچھل پڑا۔

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس کے نام اور درجے کا علم تو تم سے ہوا ہے ورنہ کیتھی تو اپنی دانست میں مڑے ہوئے کان والے ایک بردہ فروش کی راہ پر تھی جس کے جوزف امین سے قریبی مراسم ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیتھی کا خیال تھا کہ اس نے مڑے ہوئے کان والے شخص کو کئی بار دیکھا تھا لیکن وہ یہ یاد نہ کر سکی کہ اس سے کب اور کہاں سامنا ہوا تھا۔"

"یہ قصہ کب سے چل رہا تھا؟"

"کئی روز سے مگر پیٹر کارلائل کی شناخت آج ہی اس شخص کے ذریعے سے سامنے آئی جسے کیتھی قصر السودان لے گئی تھی۔"

وہ ایک مرتبہ پھر چونک پڑا۔ "تو قصر السودان کا قیدی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا؟"

"صحیح راہ تو اسی سے ملی تھی۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں مادام کو بار بار کیوں فون کر رہا تھا؟" اس نے سوال کیا۔

"تم ہی بتا سکو گے۔"

"وہ شخص آج شام زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔"

"کیتھی کے لیے اس کا یہ انجام متوقع تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ نہ مرتا تو شاید کیتھی کو اپنے اندازے کی غلطی پر افسوس ہوتا۔"

"مجھے حیرت ہے کہ پیٹر بردہ فروشی جیسے گھناؤنے جرم میں ملوث ہے مگر وہ یہ گندا کام کس لیے کر رہا ہے؟ اسے تو عام طور پر ایک ہوشیار لیکن شریف سفارت کار سمجھا جاتا ہے۔"

"مجرم کا بہروپ اس کے روپ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ پیٹر کو زیر کرنا آسان ثابت نہ ہو گا۔"

"ہماری کامیابی کا دارومدار ہماری حکمتِ عملی پر ہو گا۔"

"اس کی مضافاتی جاگیر کی طرف جانے سے پہلے اگر ہم اسکی شہری قیام گاہ سے اس کی عدم موجودگی کی تصدیق کر لیں تو کیسا رہے گا؟" میں نے چند ثانیوں تک غور کرنے کے بعد کہا۔

"مگر کس طرح؟" اس نے سوال کیا۔ "کسی بہانے کے بغیر فون کیا تو وہ چوکنا ہو جائے گا۔"

"فون وہ اپنے سرہانے تو نہ رکھتا ہو گا۔" میں نے پاکستان میں اپنے تجربے کو بیان کرنے کی تمہید باندھی۔ "تم قصر السودان سے اس کے گھر ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے فون کر کے اس کی موجودگی کے بارے میں معلوم کر سکتے ہو۔"

"مگر بہانہ کیا ہو گا؟"

"سوازی لینڈ سے پیٹر کارلائل کے نام پر ٹرنک کال آنے والی ہے، اگر وہ موجود نہ ہوا تو قصہ ختم اور اگر موجود ہو تو فون اٹھانے والے کو تمام رات اپنے آقا کی ٹرنک کال کے انتظار میں جاگ کر گزارنی ہو گی۔" میں نے اسے اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔

"اور اگر اس نے خود فون اٹھایا؟"

"تو خود کال کے انتظار میں جاگے گا اور اسی دوران میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"تمہاری تجویز قابلِ عمل ہے۔" وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "لیکن ہم لاش سمیت قصر السودان نہیں جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہماری کار قصر السودان کی عظیم الشان عمارت کے سامنے سے گزر گئی جو خوابناک روشنیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ویران سڑک پر ڈیڑھ دو فرلانگ آگے سڑک کے کنارے اندھیرے

میں سیاہ رنگ کی ایک بڑی کار کھڑی ہوئی تھی، جس کی تمام روشنیاں گل تھیں۔ اس کے قریب ہی سڑک پر ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پُرسکون انداز میں کھڑا ہوا تھا۔

نجیب نے سڑک پر کار روک کر انجن بند کیا اور نیچے اُتر گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ لمبا تڑنگا شخص بہت بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔ اس نے زبان ہلائے بغیر سر کی خفیف جنبش سے نجیب کو سلام کیا اور اس کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مُڑ کر یہ دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ لاش کیسی اور کس کی تھی۔

"یہ گونگا تھا۔" نجیب نے سیاہ کار میں بیٹھتے ہوئے میری حیرت بھانپ کر کہا۔

"مگر اس نے تو لاش کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔"

"وہ حکم کا بندہ ہے۔" نجیب نے کار کو واپس قصر السودان کی طرف گھماتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ ایک لاش ٹھکانے لگانی ہے جو کار میں موجود ہے۔"

"اس کا نام راحیل تو نہیں تھا؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"کلیتھی سے ذکر سنا تھا۔"

"بہت بے جگر آدمی ہے جب نیا نیا آیا تھا تو قصر السودان کے پانچ میں سے دو کتوں کی ٹانگیں چیر دی تھیں، باقی تین خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔"

"تو کیا اسے کتوں کا چارہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی؟"

"نہیں معمول کے مطابق اس کا لباس طلب کیا گیا تھا تاکہ کتوں کا رکھوالا کتوں کو اس کی بُو سے مانوس کر سکے مگر راحیل نے اس سے صاف انکار کر دیا۔"

"حیرت ناک آدمی ہے۔" میں نے کہا

"کبھی وقت آیا تو اس کی شہ زوری دیکھ کر ششدر رہ جاؤ گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ اور کار گھما کر قصر السودان کے پھاٹک کے سامنے روک دی۔

نجیب کو بھی داخلے کے لیے اپنا کارڈ دکھانا پڑا۔ کار کے انجن کا شور سن کر کتے آگے بڑھے تھے مگر پورچ سے کافی پہلے اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔

نجیب نے مجھے بھی کار سے اُترنے کے لیے کہا مگر میں وہیں جما رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کتے کسی آڑ سے اچانک مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔ وہاں آنے جانے والوں کو اُن کی وفاداری پر اعتماد تھا، مگر میں عبدالکریم کا دردناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور اپنی سلامتی کے لیے خواہ مخواہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

نجیب کے اندر جانے کے بعد ہی چاروں کتے نہ جانے کہاں سے آموجود ہوئے اور سیاہ کار کے گرد جمع ہو کر دھیمی آوازوں سے غرّانے لگے۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کار کے شیشے چڑھا لیے مگر اسی وقت برآمدے سے کتوں کے رکھوالے نے انھیں پھٹکار کر خاموش کرا دیا اور وہ دُمیں دبا کر وہاں سے چلے گئے۔

نجیب میری دوسری سگریٹ ختم ہونے سے پہلے واپس آگیا۔ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ خاصا مسرور نظر آ رہا تھا۔

"وہ گھر پر نہیں ہے اور نہ ہی اُس کا کوئی اور نمبر مل سکا۔" اس نے بتایا۔ "میں نے پوچھا تھا کہ وہ اگر کسی دوسرے نمبر پر ہو تو کال وہاں ملا دی جائے مگر دوسری طرف سے اس کی سیکرٹری نے معذرت ظاہر کی۔"

"تب تو وہ خبیث جاگیر پر ہی ہوگا۔"

"مگر ہم اندر تک رسائی کیسے حاصل کریں گے؟" نجیب نے کار قصر السودان سے نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کار میں اسلحہ تو کافی ہے لیکن تصادم مادام کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔"

"محلِ وقوع کا جائزہ لینے کے بعد ہی کچھ کیا جا سکے گا۔"

جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی ہم دونوں پر اعصابی تناؤ طاری ہوتا جا رہا تھا جیسے ایک دوسرے سے چھپانے کے لیے ہم اپنی ذات کے خول میں سمٹتے جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سیاہ کار ایک ویران سڑک پر دوڑنے لگی جہاں دُور دُور تک نہ روشنی تھی نہ آبادی۔

خرطوم سے کافی دُور نکل آنے کے بعد دورویہ باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں کھلے باغات بھی تھے اور تاروں کی باڑھ یا احاطے میں گھرے ہوئے قطعاتِ آراضی بھی جن کے درمیان کہیں کہیں اکا دکا مکانات نظر آ رہے تھے جو شاید باغوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کی رہائش کے مصرف میں آتے تھے۔ ان ہی میں سے کسی مکان میں لرزتی ہوئی روشنی بھی نظر آ جاتی تھی۔

"اب وہ کتنی دُور رہ گیا ہے؟"

"داہنی طرف تاروں کی باڑھ میں لگا ہوا سرخ چوبی پھاٹک دیکھتے رہو، وہی ہماری منزل ہے۔" طویل سکوت کے بعد اس نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔

"ہمیں ایک اور آدمی کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔" تھوڑی دیر بعد وہ بڑبڑانے لگا۔ "یہاں ایسی جگہ ملنی مشکل ہے جہاں کار کو بآسانی چھپایا جا سکے۔ اگر کار پر ان کا قبضہ ہو گیا تو ہم نہتے رہ جائیں گے تیسرا آدمی ہوتا اسلحے کے بل پر اپنے ساتھ ہی کار کی حفاظت بھی کر سکتا تھا۔"

"یہ علاقہ دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک تجویز آ رہی ہے۔"

میں نے اس کی تشویش کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اتار کر آگے بڑھ جانا اور پھاٹک سے دُور کسی انتہائی سرے پر فائر کر کے اندر والوں کی توجہ اِدھر مبذول کرا لینا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اندر گھس جاؤں گا اور شاید عمارت تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔"

"اور واپسی کا کیا ہوگا؟"

"اگر بھرپور ہاتھ پڑ گیا تو پیٹر کارلائل خود ہی مجھے کیتھی سمیت شہر پہنچانے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"اور اگر ایسا نہ ہو سکا؟"

میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا میں خاموش ہو گیا۔

اسی لمحے کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں خاردار تاروں میں لگے ہوئے سُرخ چوبی پھاٹک پر پڑیں اور نجیب نے کار کی رفتار قدرے سست کر دی۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس احاطے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جہاں ہر طرف گہری تاریکی کا راج تھا۔ اندر بھی کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ باغ بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔

مگر میرے لیے وہ ویرانی اتنی اہم نہیں تھی صبح کے ساڑھے تین بجے اس دُور افتادہ عمارت کے مکین اگر گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے تو اس سے غلط نتیجہ اخذ کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

مگر اس باغ پر چھائی ہوئی ویرانی اسی لمحے دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوئی کیونکہ پھاٹک کی آڑ سے اچانک ہی ایک رائفل بردار سامنے آ گیا تھا جس نے رائفل کی نال ہماری کار کی طرف بلند کی ہوئی تھی۔ ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں اس کے ہونٹوں کی جنبش سے اندازہ ہوا تھا کہ اس نے ہمیں کوئی حکم بھی دیا جو چھ سلنڈروں والے انجن کے شور میں نہ سنا جا سکا۔

"کار روک دو۔" میں نے اپنا پستول نشست سے نیچے جھکتے ہوئے سرگوشیانہ آواز میں نجیب کو حکم دیا اور اس نے فوراً بریک لگا دیے۔ سیاہ کار رائفل بردار سیاہ فام سے چند گز دُور رُک گئی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اپنی طرف کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر بلند آواز میں سوال کیا۔

"انجن اور روشنیاں بند کر کے نیچے اُتر آؤ۔" پھاٹک کی طرف سے کسی اور کی تحکم آمیز آواز آئی اور اسی سمت سے کسی طاقت ور سرچ لائٹ کی روشنی ہم پر پھینکی گئی جس سے میری آنکھیں چندھیا گئیں کیونکہ اس وقت میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رائفل بردار کے ساتھی کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" میں چہرہ گھما کر جھلائی ہوئی آواز میں چیخا۔ "روشنی بند کرو، ہم نیچے آ رہے ہیں۔"

"چالاکی دکھائی تو بھون دیے جاؤ گے۔" سرچ لائٹ بجھنے کے ساتھ ہی دوسرے کی غراہٹ سنائی دی۔ اس اثناء میں نجیب رائفل بردار کے حکم کی تعمیل میں کار کا انجن اور روشنیاں بند کر چکا تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر ہر سُو گہرا اندھیرا پھیل گیا تھا۔

"فکر نہ کرو، ہم شریف آدمی ہیں۔" میں نے اپنے اندرونی ہیجان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تم بلاوجہ اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔"

"شریف آدمی صبح کے چار بجے ویرانوں میں نہیں گھوما کرتے۔" بولنے والے کا لہجہ طنزیہ تھا۔ "اِدھر روشنی میں آؤ۔"

اسی کے ساتھ سرچ لائٹ دوبارہ روشن ہو گئی۔ اس کی روشنی کا ہالہ چند قدم دُور کچی زمین پر پڑ رہا تھا۔

میرے ساتھ نجیب بھی سعادت مندانہ انداز میں روشنی کے ہالے میں پہنچ گیا۔ "تم لوگ کون ہو؟ خود بھی تو سامنے آؤ۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"اس وقت تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟" دوسری آواز نسبتاً قریب سے اُبھری۔

"ہم العبید سے آ رہے ہیں اور عتبارہ ہماری منزل ہے۔" نجیب نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس کے بُشرے سے بھی اطمینان ٹپک رہا تھا۔

"خرطوم میں رات کیوں نہیں گزاری؟"

"عجیب لوگ ہو تم!" نجیب غصیلے لہجے میں بولا۔ "عتبارہ میں میری خالہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے اور میں آرام سے خرطوم میں پڑا سوتا رہتا۔"

"اِدھر لٹیرے بھی آتے رہتے ہیں۔" اس شخص کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "ہمارے پاس اسلحہ ہے اس لیے ہم اجنبیوں کو ضرور روکتے ہیں اگر تمھاری خالہ بیمار ہے تو تم جا سکتے ہو۔"

"ہم العبید سے مسلسل چلے آ رہے ہیں، اب تم نے روک ہی لیا ہے تو پہلے قہوہ پلا دو پھر دھکا لگا کر کار اسٹارٹ کرانی ہوگی۔"

"قہوہ تو خیر مل جائے گا مگر اس پہاڑ کو دھکا کون لگائے گا؟" اس بار رائفل بردار بولا تھا۔ "اگر یہ چابی سے اسٹارٹ نہیں ہوتی تھی، تو اس میں اتنے لمبے سفر پر نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"خالہ کی بیماری برادر!" نجیب کے لہجے سے خالہ کی بیماری کا سوگ نمایاں تھا۔ "کئی ہفتوں کے بعد آج اس کا انجن اسٹارٹ کرنے کی نوبت آئی تھی اپنے دو تین ساتھیوں کو بلا لو گے تو ذرا سی کوشش میں اسٹارٹ ہو جائے گی۔"

"دو چار ساتھی، رائفل بردار شاید ہنسا۔" اندر ان کی پوری نفری ہے مگر کسی کو بھی جگایا گیا تو وہ ہتھیں گولی مار کر کار کو آگ لگا دے گا۔"

"ایسا نہ ہو کہ ہماری قہوہ نوشی اُن کی نیند میں مخل ہو۔" نجیب نے بوکھلا کر کہا۔ "تم ہمیں اجازت ہی دے دو تو بہتر ہے۔"

نجیب کی بزدلی پر وہ دل کھول کر ہنسا۔ "ہم اتنے برے بھی نہیں ہیں کہ قہوے کی پیالی سے منہ موڑ یں، فکر نہ کرو، باہر کیبن میں ہم دو ہی ہیں وہ سب اندر عمارت میں ہیں۔ تمھارا اُن سے سامنا بھی نہیں ہوگا۔"

اس خوشخبری پر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا جن معلومات کے حصول کے بارے میں ہم دونوں فکر مند تھے، وہ خود سامنے آ گئی تھیں، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ پوری رات کی بھاگ دوڑ کے بعد شاید قدرت کو ہم رحم آ گیا تھا اور ہماری محنت رنگ لانے والی تھی۔

وہ دونوں ہمارے قریب آ گئے اور سرچ لائٹ کی روشنی میں ہم چاروں مخروخ چوبی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔

پھاٹک بند تھا مگر ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی کے باعث اتنی جگہ بنی ہوئی تھی کہ نچلی لکڑیاں عبور کر کے بآسانی اندر جایا جا سکتا تھا۔

پیٹر کارلائل کی جاگیر پر قدم رکھتے ہی مجھے فتحمندی کا ایسا احساس ہوا جیسے میں نے پیٹر کے سینے پر پاؤں رکھ دیا ہو۔

پھاٹک کے قریب ہی درختوں کے کنج میں ان دونوں کا چوبی کیبن تھا جس میں روشنی کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ روشنی کی کمی انھوں نے بیٹری سے جلنے والے بلبوں سے پوری کر لی۔

روشنی ہوتے ہی میری اور نجیب کی آنکھیں چار ہوئیں جن میں ایک دوسرے کے لیے ایک ہی نمایاں پیغام تھا۔

تیز اور بھرپور وار ہی ہماری کامیابی کا ضامن تھا۔ میں نے اپنی جیب سے زہریلے تیروں والی شیشی نکالی اور رائفل بردار کوئی آواز پیدا کیے بغیر چوبی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

گرنے کے دھماکے سے دوسرا بھڑک کر پلٹا۔ "ارے اسے کیا ہوا؟" اس کا لہجہ اشتباہ آمیز تھا۔

"پتہ نہیں کھڑے کھڑے گر گیا۔" نجیب تشویشناک لہجے میں یہ کہتا ہوا نیچے بیٹھ کر رائفل بردار کا جسم سیدھا کرنے لگا، میں نے بھی اس کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ مرنے والے کا ساتھی زور زور سے اس کے رخسار تھپتھپا رہا تھا۔

ہم دونوں مرنے والے کی مدد تو کیا کرتے، اسے فرش پر سیدھا کرنے کے بہانے نجیب نے اس کی رائفل حاصل کر لی اور پھر اچانک ہی اس کی نال دوسرے کی کھوپڑی سے لگا دی۔

"یہ... یہ کک... کیا حرکت؟" وہ آہنی نال کا ٹھوس لمس اپنے بھیجے سے چند انچ کے فاصلے پر محسوس کر کے گھبرا گیا۔

"پیٹر کارلائل کہاں ہے؟" نجیب سرگوشیانہ آواز میں غرایا۔

"مم... میں کسی پیٹر سے واقف نہیں۔" رائفل کی زد میں آنے کے بعد وہ کسی خوفزدہ چوہے سے بھی بدتر ہو کر رہ گیا تھا۔

"مڑے ہوئے کان والا۔" میں نے پیٹر کی شناخت کرائی۔

"وہ اندر ہی ہے۔" وہ جلدی سے بولا

"اس کے ساتھ کتنی نفری ہے؟"

"پتہ نہیں۔" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مگر چھ سات آدمی اندر ہی رہتے ہیں۔"

"اندر کوئی لڑکی بھی ہے؟" میں اس سے جلد از جلد فارغ ہو جانا چاہتا تھا۔

"لڑکیاں تو وہ لاتا ہی رہتا ہے۔ مجھے علم نہیں کیونکہ میں رات کے آٹھ بجے ڈیوٹی پر آیا تو وہ اندر موجود تھا۔"

اس پر وقت ضائع کرنا بے سود تھا۔ میں نے تو محض آزمائش کے لیے مرے ہوئے شخص کے بازو میں سے زہریلی سوئی دوسرے کی نظر سے بچا کر چٹکی کی مدد سے نکالی اور عقب سے جا کر اس کی گردن میں گھونپ دی۔ استعمال شدہ زہریلی سوئی کا میرا پہلا تجربہ تھا جو سو فیصد کامیاب رہا اور دوسرا شخص ایک ہچکی لے کر چوبی فرش پر گر گیا۔ اگر زہر فوری طور پر اثر انداز نہ ہوتا تو شاید وہ ہچکی ایک تیز چیخ کی صورت اختیار کر چکی ہوتی۔

"ان دونوں کی لاشیں کار کی ڈکی میں ٹھونس دیتا ہوں تم پچھلی نشستوں کے نیچے سے دو اسٹین گنیں، فاضل راؤنڈ اور دستی بم لے لو۔" یہ کہتے ہوئے نجیب نے کسی ماہر حمال کی طرح تازہ لاش اپنے کندھے پر لاد لی۔

صبح قریب آتی جا رہی تھی اور پیٹر کارلائل کی جاگیر پر چھلتے ہوئے اندھیرے پر خون کے بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ تعداد اور مورچوں کے اعتبار سے ہم پر برتر ضرور تھے مگر مجھے پورا یقین تھا کہ ہم بے خبری میں انھیں چھاپ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یک بیک میرے ذہن میں کیتھی کا پیکر ابھرا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں ویران تھیں اور میں نے دو مری تہیں گن اٹھاتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لیں اور عہد کیا کہ اگر پیٹر کے ہاتھوں کیتھی کا دامن ذرا بھی داغدار ہوا تو میں اسے ایسی عبرتناک موت ماروں گا کہ اس کے انجام پر ہر تماشائی لرز اٹھے گا۔

سیلیتا اس وقت میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ اس جاگیر پر پیٹر کارلائل میرا واحد شکار تھا اور کیتھی میری جد و جہد کا حاصل جس نے میری خاطر ایک سنگین خطرے کو گلے لگا لیا تھا۔

کیتھی کے لیے وہ میرے اخلاقی جذبات تھے سیلیتا کے بارے میں شروع ہی سے اس کی نیت پر شبہ کرتا رہا مگر اس نے یہاں پیٹر کارلائل تک پہنچ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ مجھ کو پسند ضرور کرنے لگی تھی مگر سیلیتا کو میرے پیار سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اور اس کی جد و جہد کا قرض چکانا میرا فرض تھا۔

اندر کسی چار دیواری میں کیتھی محبوس تھی اور پیٹر کارلائل اپنے سات غنڈوں کی پشت پناہی میں اس پر پوری دسترس رکھتا تھا۔

"چلو نجیب!" میں اسے ڈکی میں الجھا دیکھ کر تیز لہجے میں بولا "کچھ سوچتے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی ہیں۔"

اور نجیب فوراً ہی اپنی جیبوں میں اسلحہ بھرنے لگا۔ دستی بموں کی خاصی تعداد جیبوں میں رکھنے کے بعد اس نے اسٹین گنیں کے راؤنڈز شانوں پر لٹکائے اور ہم دونوں سرخ پھاٹک عبور کر کے اندھیرے جنگل میں گھس پڑے!



وہ رات شاید کچھ زیادہ ہی تاریک اور گمبھیر تھی کہ پھاٹک عبور کرنے کے بعد چند فٹ آگے تک دیکھنا بھی ممکن نہ رہتا اگر چوکیداروں کے چوبی کیبن میں بیٹری سے جلنے والے بلب روشن نہ ہوتے!

ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر چوبی کیبن کی طرف دوڑے۔ وہاں میں نے فرش پر پڑی ہوئی دستی سرچ لائٹ پر قبضہ کیا اور پھر نجیب نے دونوں قمقمے بجھا دیے!

"کار کو بھی اندر عمارت تک ہی نہ پہنچا دیں؟" نجیب نے اندھیرے کیبن سے احتیاط سے باہر نکلتے ہوئے سوال کیا!

"انجن کا شور انہیں چوکنا کر دے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "بے خبری میں ہی انہیں چھاپ لیا گیا تو کامیابی حاصل ہو سکے گی ورنہ ہم دونوں بھی پکڑے جائیں گے اور کسی کو ہمارے حشر کا علم نہ ہو سکے گا!"

اس نے خاموش رہ کر میری بات تسلیم کر لی اور ہم بلند و بالا درختوں

سے گھرے اندھیرے راستے پر تیزی سے عمارت کی طرف بڑھنے لگے جو تاریکی میں ایک تاریک تنہیولے کی طرح ایستادہ نظر آ رہی تھی!

"یہ عمارت خاصی وسیع معلوم ہوتی ہے!" نجیب نے پنجوں کے بل عمارت کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "اندر ان سب کو تلاش کرنا آسان ثابت نہ ہوگا۔"

"پہلے ہمیں ان ساتوں کو ہی ٹھکانے لگانا ہے۔ تاکہ اطمینان سے پیٹر کارلائل سے نمٹ سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سب ہمیں کسی جگہ یکجا مل جائیں!"

"خدا کی پناہ!" وہ شاید پھریری لے کر بولا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سوازی لینڈ کا وہ پرانا سفارت کار کسی مذموم سرگرمی میں ملوث ہوگا مگر اس خفیہ جاگیر پر اس کی رازدارانہ سرگرمیاں تمہاری اطلاعات کی توثیق کرتی ہیں!"

"پیٹر کو ہلاک نہیں کرنا ہے!" میں نے سخت لہجے میں اسے بتایا۔ "ہمیں اس کو زندہ رکھ کر قابو کرنا ہے!"

"کیوں؟" اس کی آواز تحیر آمیز تھی۔ "مصیبت کیوں مول لیتے ہو... اسے دیکھتے ہی مار ڈالیں گے اگر وہ ولد الحرام بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارے لیے متعدد مشکلات کھڑی کر دے گا۔ خرطوم کے سرکاری حلقوں میں وہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے!"

"یہ میرا حکم ہے نجیب!" میں نے گفتگو کو طول دیے بغیر سرد اور تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ "اس سے انحراف نہیں ہوگا!"

"اگر یہ صفدر علی کا حکم ہے تو اس کی تعمیل سے سرِ مو انحراف نہ ہوگا!"

اندھیرے میں اس کی مدھم آواز ابھری!

"اور تم میرا نام بھی زبان پر نہیں لاؤ گے!" میں نے فوری طور پر اسے یاد دلایا۔ "بدترین صورت حال کے لئے ہم کو تیار رہنا ہوگا!"

"اچھا ہوا کہ تم نے بتا دیا!"

نجیب کے ان الفاظ کے بعد اندھیرے کے اس خودرو جنگل میں ہولناک سکوت پھیل گیا۔ جیسے قدموں کے نیچے کچلے جانے والے خشک پتوں کی موہوم سی آوازیں مجروح کر رہی تھیں کیونکہ پنجوں کے بل دوڑنے کے باعث ہمارے قدموں کی چاپ بھی مفقود تھی!

سرخ چوبی پھاٹک سے تاریک عمارت کا فاصلہ ہمارے لئے بہت روح فرسا اور اعصاب شکن ثابت ہوا۔ ہر لحظہ مجھے یہ دھڑکا لگا رہا کہ کہیں کسی گوشے سے نادیدہ نگہبان مداخلت کرنے والوں پر گولیاں نہ برسا بیٹھیں!

مگر سارے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے عمارت میں خوابیدہ مکینوں کو پھاٹک پر موجود محافظوں اور ان کے مؤثر اسلحے پر اتنا اعتماد تھا کہ جاگیر کے تحفظ کے لئے کسی قسم کے دوہرے انتظام کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی!

ہم دونوں کسی بھی مداخلت سے دوچار ہوئے بغیر یک منزلہ عمارت کے تاریک داخلی برآمدے تک پہنچ گئے۔ جہاں دیوہیکل چوبی دروازے کے بند پٹ ہمارا منہ چڑا رہے تھے!

نجیب نے اس دروازے پر قدرے زور آزمائی کرنے کے بعد سرگوشی میں مجھے مطلع کیا کہ اندر داخل ہونے کے لئے ہمیں کوئی دوسری راہ تلاش کرنی ہوگی!

ہم برآمدے سے اتر آئے اور عمارت کا محتاط طواف شروع ہو گیا!

قدیم طرز کی اس عمارت میں ہمارے نقطۂ نظر سے ناقص تعمیری انداز اختیار کیا گیا تھا۔ جس میں باہر سے مداخلت کے امکانات کا پورا تدارک کیا گیا تھا!

عمارت بہت طویل و عریض تھی۔ ہم نے اس کا چکر مکمل کر لیا۔ لیکن رسائی یا نکاسی کا کوئی دوسرا راستہ دریافت نہ کر سکے جبکہ کھڑکیوں پر زور آزمائی سوتے ہوئے دشمنوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے مترادف ہوتی!

"اب کیا کیا جائے؟" نجیب نے ہیجان آمیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔ ہدف کے قریب تر آجانے پر وہ خاصے اشتعال کا شکار ہو گیا تھا!

"انتظار!" میں نے دیوار کے سہارے اپنی کمر ٹکاتے ہوئے جواب دیا۔ "اندر اگر پوری فوج بھی موجود ہے تو صرف دروازے سے ہی باہر نکلے گی!"

"اور اگر اس دوران میں مادام کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ گیا ہوگا؟" اس کا لہجہ دھیما اور معنی خیز تھا!

"ہم نے پوری عمارت کا طواف کیا ہے اور اندر سے کوئی آہٹ تک نہیں سنائی دی!" میں نے سپاٹ اور تلے لہجے میں کہا۔ "اور نہ ہی کہیں روشنی نظر آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ اندر والے سب لوگ گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہیں، کیتھی کے ساتھ جو کچھ برا یا بھلا پیش آنا تھا۔ وہ پیش آچکا ہے اور تھوڑی سی تاخیر سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی!"

"عمارت بہت وسیع ہے!" وہ مسلسل اضطرابی کیفیت کا شکار تھا۔ "ہو سکتا ہے کہ وحشت اور بربریت کا کھیل کسی اندرونی کمرے میں جاری ہو اور آوازوں کے ساتھ ہی روشنی کی کرنیں بھی سنگین دیواروں میں محصور ہوں!"

"امکانات کے بجائے حقائق پر بات کرو۔ مجھے بتاؤ کہ اندر گھسنے کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہ داخلی دروازے کا قفل کھولنے کی کوشش کی جائے؟"

میں آہستہ سے ہنس دیا۔ "یہ حویلی قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہے اس کے دروازے میں کوئی بھی قفل نہیں ہے۔ بلکہ اندر سے مضبوط کنڈے

پڑھے ہوئے ہوں گے۔ جنہیں گرانا ناممکنات میں سے ہے!"

"پھر تم ہی کوئی تدبیر سوچو، میں سنتا آیا ہوں کہ بدترین حالات میں تم بہترین فیصلے کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو!"

"بس ایک ہی صورت ہے!" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہا۔ "ہم میں سے ایک دروازے پر مضبوط مورچہ سنبھالے اور دوسرا کسی طرح چھت پر پہنچ کر اندر اترنے کی کوشش کرے، دوسری کوئی فوری راہ نہیں ہے!"

"میں نے سچ ہی سنا تھا!" وہ مسرت سے اچھل پڑا۔ "تمہاری ترکیب ضرور کامیاب ہوگی۔ تمام باورچی خانوں سے دود کش چھت پر نکلے ہوئے ہوں گے ان سے بآسانی اندر اترا جا سکے گا۔ پرانی عمارات میں دھوئیں کی نکاسی کی چمنیاں ان اطراف میں ایک لازمہ ہیں!"

"پھر تم دروازہ سنبھالو، میں اوپر جانے کی ترکیب سوچتا ہوں!" میں نے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر کہا!

"اندر گھسنا زیادہ خطرناک ہے۔ یہ کام میرے سپرد کر دو!" وہ سادہ لوحی اور روانی میں کہہ گیا۔ "تمہاری جان زیادہ قیمتی ہے!"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو!" میں نے کہا۔ "دونوں ہی محاذ... خطرناک ہیں۔ اگر باہر کا محاذ کمزور ثابت ہوا تو وہ لوگ اندر خطرہ بھانپتے ہی بآسانی نکل بھاگیں گے۔ بس یہ خیال رکھنا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ جا سکے!"

"اندھیرے میں ایک دروازے سے نکلنے والے انسانی سایوں پر محفوظ کمین گاہ سے گولیاں برسانا کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوگا!" اس نے پھیکے لہجے میں کہا۔ "لیکن تم اگر اندر ان درندوں کے نرغے میں پھنس گئے تو کوئی مدد بھی نہ مل سکے گی!"

"میری فکر نہ کرو!" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "مر گیا تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا۔ سیتا کے بغیر میں بے مقصد زندگی گزار رہا ہوں!"

"سیتا!" میری زبان سے وہ نام سن کر نجیب چونک پڑا۔ "تو کیا وہ ابھی تک تم سے نہیں مل سکی ہے؟"

"تمہیں میرے بارے میں خاصی معلومات ہیں!" میں نے دل میں ایک کسک سی محسوس کرتے ہوئے کہا! "فی الحال میری ذات اور اس کے مسائل کو بھول جاؤ۔ ہمارے سامنے ایک بڑی مہم درپیش ہے!"

پھر وہ بھی میرے ساتھ ہو لیا۔

چھت تک پہنچنے کے لئے برساتی پانی کی نکاسی کے موٹے پائپوں کے سوا کوئی دوسری صورت قابلِ عمل نہیں تھی لہٰذا میں نے بھری کے جوتے اتار کر اپنی جیبوں میں ٹھونسے اور اسٹین گن شانے سے لٹکا کر پائپ کے سہارے اوپر چڑھنے لگا!

پائپ پر گرفت مضبوط کر کے زمین سے قدم اٹھاتے ہی میرے مندمل ہوتے ہوئے زخم میں ایک شدید ٹیس اٹھی اور میں نے تڑپ کر پائپ چھوڑ دیا!

جوش کے عالم میں میں اپنی حالت کو فراموش کر بیٹھا تھا مگر اس ٹیس نے فوراً ہی احساس دلا دیا کہ بندر کی طرح پائپ سے چپک کر اوپر پہنچنا میرے لئے ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا اور یہ امکان بھی تھا کہ اس کوشش میں ایک آدھ کچا ٹانکا کھل جاتا!

"کیا ہوا؟" مجھے بے چینی کے عالم میں پائپ سے الگ ہوتے دیکھ کر نجیب نے پوچھا!

"میں زخمی ہوں۔ میرے لئے اوپر چڑھنا ممکن نہ ہوگا!"

"میں نے تو پہلے ہی خود جانے کی پیش کش کی تھی!"

اس نے جوتے اتارے اور کسی بندر کی سی پھرتی سے اسی پائپ کے سہارے اوپر سرکتا ہوا آناً فاناً میں چھت پر غائب ہو گیا! جلتے ہوئے وہ تیز روشنی والی سرچ لائٹ مجھے تھما گیا تھا!

اس کے جانے کے بعد میں نے عمارت کے داخلی دروازے کے مقابل ایک درخت کی اوٹ میں مورچہ سنبھال لیا۔

چند منٹ بعد اچانک دروازے پر اندر سے کوئی کھٹکا ہوا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی کمین گاہ سے حرکت کی اور بے آواز قدموں سے دوڑتے ہوئے تاریک برآمدے میں...... دروازے کی داہنی جانب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا!

اندر سے کھٹ پٹ کی چند آوازیں اور ابھریں جس کے بعد شاید دروازہ کھول دیا گیا۔ میں نے سانس روک کر زہریلے تیروں والی شیشی سنبھال لی!

پھر دروازے کے کھلے ہوئے خلا میں سے ٹارچ کی روشنی تاریک برآمدے میں رینگ آئی وہ جو بھی تھا۔ نہایت بے فکری سے باہر آ رہا تھا!

روشنی کی حرکت کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ ابھری پھر ایک متوسط قامت شخص باہر آ گیا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور وہ سگریٹ کا کش لیتا ہوا باہر آیا تھا۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ عقب سے حملہ کر کے اسے دبوچ لوں، مگر اس کے گٹھے ہوئے کسرتی بدن کو دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور اس سے قبل کہ وہ اگلا قدم اٹھا کر مجھ سے نسبتاً زیادہ فاصلے پر ہو جاتا۔ میں نے شیشی کا رخ درست کر کے اوپری حصہ دبایا اور وہ اچانک ہی کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح برآمدے کے پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا!

بالکل یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی چلتے ہوئے مشینی روبوٹ کو برقی رو کی فراہمی یکلخت منقطع کر دی گئی ہو!

گرتے ہوئے جسم کا دھماکا میرے لیے خاصا تیز تھا۔ ٹارچ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لڑھکتی ہوئی قدرے دور چلی گئی تھی۔ اور بدستور روشن تھی!

میں دم سادھے کسی ردِعمل کا منتظر رہا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ مرنے

والا شاید کسی کام سے اکیلا باہر نکلا تھا!

میں نے جھپٹ کر سب سے پہلے اس کی ٹارچ بجھا کر اپنے تحویل میں لی پھر اسے گھسیٹ کر برآمدے سے نیچے کچی زمین پر گرا دیا تاکہ اندر سے آنے والا اسے نہ دیکھ سکے!

برآمدے سے ذرا دور اندھیرے میں ایک سیاہ وین اور ایک کار موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ لاش کو ان میں سے کسی میں ڈال دیا جائے مگر بے سود مشقت سمجھ کر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا!

فی الحال ہمیں باہر سے کسی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا اور ایک مرتبہ اندر گھس جانے کے بعد باہر پڑی ہوئی لاشوں کی تعداد اور حالت سے صورتِ حال کا کوئی سروکار نہ رہتا!

اس بڑی کامیابی کے بعد مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے نجیب کو چھت پر کیوں بھیجا، اس کی طرف سے میں لاعلمی میں تھا اور اگر وہ چھت سے اندر گھسنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسی خیال میں رہتا کہ میں نے دروازے سے باہر مورچہ سنبھال رکھا ہوگا، ایسی صورت میں عمارت کے اندر اندھیرے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے بآسانی متصادم ہو سکتے تھے!

مگر اچانک ہی فضا میں کسی اُلو کی تیز آواز تین مرتبہ تسلسل کے ساتھ ابھری اور میرے ذہن میں فوراً ہی ایک احساس بیدار ہو گیا!

اُلو کی آواز اس تواتر کے ساتھ میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اور چند ثانیوں بعد ہی مجھے یاد آ گیا کہ اس قسم کی آوازیں ایک موقع پر فلسطینی ساتھیوں کے ہمراہ شناخت کے استعمال کے لئے بروئے کار لائی گئی تھیں۔

وہ یاد آتے ہی غیر ارادی طور پر میرے حلق سے بھی اُلو کی آوازیں بلند ہونے لگیں!

ایک ڈیڑھ منٹ کی مدت میں نجیب میرے پاس آ پہنچا اس وقت میں عمارت کے داخلی دروازے کے مقابل درختوں کی اوٹ میں تھا!

"عمارت کے اندر گھسنے کے سارے راستے مسدود ہیں!" میرے پاس پہنچنے پر اس نے دبی ہوئی مایوسانہ آواز میں کہا!

"دھوئیں کی چمنیاں.....؟"

"چھت پر تین چمنیاں اور ایک ہوادان موجود ہے مگر ان سب کے دہانوں پر اینٹوں کی چنائی کر کے انہیں بند کر دیا گیا ہے!"

"اب اس کی ضرورت نہیں دروازہ کھل چکا ہے!" میں نے اسے مطلع کیا!

"کیسے؟" میرے انکشاف پر وہ متحیر رہ گیا۔

"اندر سے ایک شخص ٹارچ جلائے باہر آیا تھا.....!"

"کدھر گیا وہ؟" اس نے میری بات کاٹ کر بے تابی سے سوال کیا۔

"اللہ کو پیارا ہو گیا!"

"نہیں!" وہ بے اعتباری سے بولا "میرے کانوں تک تو کوئی خفیف سی آواز بھی نہیں پہنچی۔ کیسے مار لیا تم نے اسے؟"

"ایک زہریلا تیر ضائع کرنا پڑا!"

"اوہ!" وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا "تمہارے اس مہلک ہتھیار کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ لاش کہاں ہے اس کی؟"

"سامنے چبوترے کے نیچے، میں اندر گھستے ہوئے فکر مند تھا کہ کہیں بے خبری میں اندر ہم دونوں کا پہلا سامنا ایک دوسرے سے نہ ہو جائے!"

"تو اب چلو اندر!"

"میں جا رہا ہوں!" میں نے کہا "تم باہر ٹھہرو گے اور اسلحے کے استعمال میں ذرا بھی دریغ نہیں کرو گے!"

"جیسے تمہارا حکم!" میری ہدایت پر اس کے لہجے میں مایوسی عود کر آئی!

متوفی سے حاصل کی ہوئی ٹارچ میں نے نجیب کو تھما دی اور اندھیرے میں احتیاط سے چبوترے کی طرف بڑھ گیا!

عمارت کا دیو ہیکل چوبی دروازہ بدستور قدرے کھلا ہوا تھا جس کے پیچھے باہر سے بھی زیادہ گھمبیر اندھیرے کا راج تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا اور دروازے کے پٹ ملا کر بند کر دیے!

اس کارروائی کے بعد چند ثانیوں کے لئے مجھے وہیں رکنا پڑا تاکہ میری آنکھیں اس ہولناک اندھیرے میں سمتوں کا ادراک کرنے کی عادی ہو سکیں!

پھر میں اس کشادہ راہداری میں آگے ہو لیا۔

راہداری کے دونوں طرف سپاٹ دیواریں تھیں اور اس کا اختتام ایک وسیع ہال پر ہوا تھا، میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ابتدا کس سمت سے کی جائے مگر اس وقت میرا مقدر یاور تھا کہ ہال کے داہنی جانب والی ایک راہداری میں مجھے کہیں سے روشنی کا لرزتا ہوا انعکاس نظر آیا جو چند ثانیوں بعد اندھیرے کی چادر میں تحلیل ہو گیا!

وہ تیز روشنی واضح طور پر کسی دیا سلائی کی رہی تھی۔ اس طرف کسی کمرے میں یقیناً کوئی جاگ رہا تھا۔ اور اس نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلگا کر میری رہنمائی کا ایک بہانہ پیدا کیا تھا!

میں نے اسٹین گن پر اپنی گرفت درست کی اور دبے قدموں اسی سمت میں چل دیا۔

وہاں ایک طرف کمروں کے دروازے تھے اور میرے اندازے کے مطابق روشنی تیسرے دروازے کے شیشے سے نمودار ہوئی تھی!

مشتبہ دروازہ بند تھا۔ میں سانس روک کر دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا!

اس وقت وہاں اس قدر مکمل تاریکی تھی کہ چند ثانیوں بعد مجھے راہداری میں کھڑے کھڑے روشنی کا ایک موہوم سا احساس ہوا جو چند سیکنڈ بعد ختم ہو گیا، میری دانست میں اندر والے نے تازہ جلی ہوئی سگریٹ کا گہرا کش لیا تھا اور سگریٹ کا راکھ سے محروم سلگتا ہوا سرا کش کے ساتھ دمک اٹھا تھا!

میں پیٹر کارسلائل کی اندھیری کمین گاہ میں گھسنے میں کامیاب ضرور ہو گیا تھا مگر اس وقت تک مجھے صورتِ حال پر قطعی اختیار نہیں تھا!

باہر ہمارے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کے بعد عمارت میں کم از کم سات نفوس ضرور موجود تھے اور پیٹر سمیت ان میں شاید کوئی بھی اتنا نرم خو نہ رہا ہوگا کہ اپنی پناہ گاہ میں گھسنے والے کو سامنا ہونے پر پہل کرنے کا موقع دیتا!

میں نے چند ثانیوں کی قلیل مدت میں کئی بار اس کمرے کا دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا مگر اس کارروائی میں مضمر سنگین جوابی خطرات ہر بار آڑے آ گئے!

اندر والے کو اگر باہر خطرے کا ذرا بھی احساس ہو جاتا تو میری مہم ابتدائی مرحلے پر ہی بدترین ناکامی سے دوچار ہو جاتی!

میں نے اپنی جیب سے المونیم کا ایک چھوٹا سا سکہ نکال کر ایک ڈیڑھ فٹ کی بلندی سے فرش پر گرایا اور پھرتی سے سیدھا کھڑا ہو گیا!

عمارت میں چھائے ہوئے آسیبی سکوت میں سکے کی آواز غیر معمولی حد تک نمایاں تھی اور اس کا اثر بھی حسبِ توقع رہا!

"کون ہے؟" کمرے میں سے کسی کی دھیمی اور بوجھل غراہٹ ابھری۔ وہ اس کمرے میں تنہا تھا یا اس کے ساتھی گہری نیند سو رہے تھے!

سکے کی آواز اس شخص کے لیے بہت واضح رہی ہوگی لہٰذا اپنے سوال کا جواب نہ پا کر اس نے باہر آنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا اظہار دروازے اور فرش کی درمیانی خفیف سی خلا میں سے آنے والی متحرک روشنی سے ہوا۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور پنسل ٹارچ کی روشن لکیر کے عقب میں ایک انسانی ہیولا باہر راہداری میں آ گیا۔

باہر آتے ہی فطری طور پر اس نے پہلے دائیں بائیں کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی مگر میں نے عقب سے اسٹین گن کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ اس نے نال کا لمس محسوس کرتے ہی اپنی ٹارچ بجھا دی مگر میں نے اسے کسی چالبازی کی مہلت نہیں دی!

"ہاتھ اٹھا کر ٹارچ روشن کرو۔ ورنہ چھیتڑے اڑا دوں گا!" میں نے سرد سرگوشیانہ غراہٹ میں اسے حکم دیا۔

اپنی پسلیوں پر نال کا بے رحمانہ دباؤ اسے میرے عزائم کا یقین دلانے کے لئے کافی ثابت ہوا اور اس نے ہاتھ سر سے بلند کر کے پنسل ٹارچ روشن کر لی۔ اس اثنا میں میرے کان گرد و پیش پر جمے ہوئے تھے اور مجھے یہ جان کر خاصا حوصلہ ہوا کہ میری کارروائی کے جواب میں کہیں سے بھی کوئی آواز نہیں ابھری تھی!

"کمرے میں چلو!" میں نے اسے اگلا حکم دیا۔ اس وقت میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر درندگی اور سفاکی عود کر آئی تھی۔

وہ گرانڈیل شخص خاصا گھاگ معلوم ہوتا تھا کیونکہ اسے اپنی خراب پوزیشن کا بخوبی احساس ہو چکا تھا لہٰذا اس نے بلا چون و چرا میری نئی ہدایت پر عمل کر ڈالا!

اندر داخل ہوتے ہوتے میں نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا کیونکہ اس کشادہ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا متنفس نہیں تھا اس کمرے میں مختصر فرنیچر کے علاوہ ایک شکن آلود بستر بھی تھا جس پر میرا تازہ شکار اسیر ہونے سے قبل شاید کروٹیں بدلتا رہا تھا!

"ٹارچ بستر پر گرا کر آگے بڑھ جاؤ!" میں نے اس پر گہری نظر رکھتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ بھی اس نے نہایت سعادت مندی کا مظاہرہ کیا اور میں نے اس کی پشت سے اسٹین گن کی نال ہٹا کر روشن ٹارچ اٹھا لی۔

وہ دونوں ہاتھ سر سے بلند کئے تیزی سے میری طرف پلٹا تھا!

اس سوڈانی کا چوڑا چکلا چہرہ کسی بلڈاگ سے مشابہ تھا۔ زرد آنکھوں کے نچلے پپوٹے کسی عادی شرابی کی طرح ورم آلود تھے اور آگے کی طرف جھکے ہوئے شانے اس کی مصالحانہ فطرت کی غمازی کر رہے تھے مگر میں جانتا تھا کہ اس قماش کے لوگ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر اپنی چھوٹی ناکامیوں کو بڑی کامیابی کا زینہ بنانے کا گر خوب جانتے ہیں!

میرے ساتھ تعاون کر کے اس نے سوچنے سمجھنے کا وقت حاصل کر لیا تھا اور اس وقت شاید وہ مجھ پر حاوی ہو کر میرے خاتمے کی کسی بھیانک تجویز پر غور کر رہا تھا!

"اس عمارت میں کل کتنے نفوس ہیں؟" میں نے پنسل ٹارچ کی محدود روشنی میں براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا!

"مجھے پوری عمارت کے بارے میں علم نہیں، میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں!" اس نے بوجھل بلغمی آواز میں جواب دیا!

"مجھے بہانہ نہیں جواب چاہیے!" میں نے سختی سے کہا۔

"اگر تم اس عمارت میں ڈاکے کی نیت سے آئے ہو تو یقین کر لو کہ اس عمارت سے تمہیں کچھ نہ مل سکے گا۔ تم خاموشی سے لوٹ جاؤ، میں

تمہاری آمد کا کسی سے تذکرہ نہیں کروں گا۔" اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔" اس کے طرزِ گفتگو نے مجھے مشتعل کر دیا۔ "میں تین لاشوں پر سے گزر کر تم تک پہنچا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ چوتھا نمبر تمہارا ہو!"

اس اطلاع پر اس کے چہرے پر خوف کے بجائے حیرت کے تاثرات عود کر آئے۔ "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"صرف اپنے سوالات کے جواب۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔"

"باز پرس کے بعد تم مجھے گولی مار دو گے؟"

"فائر کر کے میں اس عمارت کے دوسرے مکینوں کو خطرے... کا احساس دلانا نہیں چاہتا۔ تم تعاون کرو گے تو تمہارے سر پر ضرب لگا کر تمہیں بے ہوش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ورنہ میرے علاوہ باہر بھی میرے مسلح ساتھی پھیلے ہوئے ہیں!"

"اس عمارت میں بھی کم از کم دس بارہ بے جگر لڑاکے موجود ہیں۔" اس نے بالواسطہ طور پر میرے سوال کا جواب دیا۔ "تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس وقت وہ سب بے خبر سوئے ہوئے ہوں گے!"

"مڑے ہوئے کان والا کہاں ہوگا؟"

اس سوال پر بے اختیار اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز آزاد ہوگئی۔ "تو تم باس کی تلاش میں یہاں پہنچے ہو!"

"مجھے سوال نہیں، جواب چاہیے!" میں نے غرا کر یاد دلایا!

"وہ اسی راہداری کے اختتام پر اپنی خواب گاہ میں ہوگا۔" اس نے نسبتاً نیچی آواز میں جواب دیا۔ جیسے اسے اپنی بات سن لیے جانے کا اندیشہ رہا ہو! "مگر تمہیں اس سے کیا پرخاش ہے؟"

"لڑکی کہاں ہے؟" میں نے اگلا سوال براہِ راست کیا۔

"کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟ یہاں تو روز ہی لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں!"

"وہ لڑکی جسے تمہارا باس خود لایا تھا!"

"وہ خود تو پچھلی رات تنہا ہی آیا تھا۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "اس سے پہلے اس کا محافظ ایک بے ہوش لڑکی کو ضرور لایا تھا!"

"اس کا محافظ کون ہے؟"

"وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" بلڈاگ نے جواب دیا۔ "بہت کم گو اور علیحدگی پسند ہے، باس کے ساتھ ہی آتا ہے اور اس کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے!"

"اس وقت یہیں ہے؟"

"پتہ نہیں، پچھلی رات باس کے آنے کے گھنٹے بھر بعد واپس چلا گیا تھا اور بارہ بجے تک واپس نہیں لوٹا تھا۔"

"لڑکی پر تشدد ہوا تھا؟"

"غیر ضروری سوال نہ کرو تو بہتر ہے!" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "اس کی چیخیں سنی گئی تھیں۔ بہت سی لڑکیوں کو اداکاری کا شوق ہوتا ہے۔"

"اسے کہاں رکھا گیا ہے؟" میں نے اشتعال پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"شاید باس کے برابر والے کمرے میں بند ہے!"

"تم وہاں تک میری رہنمائی کرو گے!" میں نے اسٹین گن کو خفیف سی جنبش دے کر کہا۔

"یہ ہرگز نہیں ہوسکے گا!" اس نے دو ٹوک لہجے میں انکار کر دیا۔ "تم اپنی زبان سے پھر رہے ہو۔ میں عملی طور پر کوئی تعاون نہیں کروں گا۔ اگر تمہارے سوالات ختم ہوگئے ہیں تو بلا تکلف میرے سر پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دو!"

"وہیں کھڑے رہو!" میں نے غرا کر کہا کیونکہ وہ اپنی بات پوری کرتے ہی سر جھکا کر میری طرف بڑھا تھا!

"تم نے مجھے زندہ چھوڑ بھی دیا تو باس میری کھال میں بھوسہ بھروا دے گا، اسے غداری کرنے والوں سے نفرت ہے!" بلڈاگ کا لہجہ سرگوشیانہ ہوگیا۔ "وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گا کہ اس کا کوئی آدمی اپنی جان بچانے کے لئے اس کے کسی دشمن کو اس کے درپے لے آئے، میں اتنا آگے نہیں بڑھ سکتا!"

میں نے اسے بہیترا دھمکایا مگر وہ اس معاملے میں ٹس سے مس نہ ہونے پر بھی رضامند نہ ہوا۔ البتہ زبانی طور پر اس نے مجھے پیٹر کارلائل کی خواب گاہ تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ میرا زندہ سلامت اس کمرے تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔ کیونکہ مڑے ہوئے کان والے کا محافظ پلک جھپکائے بغیر رات دن اپنے آقا کی حفاظت کرتا تھا!

مگر میں بلڈاگ کے بیان کی روشنی میں کچھ مفروضات قائم کر چکا تھا۔ جن کا نچوڑ یہ تھا کہ پچھلی رات کیتھی کے فلیٹ میں داخل ہونے والا سیاہ فام ہی پیٹر کارلائل کا معتمد اور محافظ تھا۔ جو میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ جب کہ وہ لوگ اس کے قتل سے لاعلم تھا۔ اور اگر وہ محافظ موجود نہیں تھا تو میرے لئے پیٹر کی خواب گاہ تک پہنچنا بہت زیادہ دشوار نہ ہوتا!

"اپنے بیان پر ایک دفعہ پھر غور کر لو!" میں نے بلڈاگ کو وارننگ دی۔ "اگر تمہاری کوئی بھی بات غلط ثابت ہوئی تو واپسی پر میں تمہارے بے ہوش بدن کو چھلنی کئے بغیر عمارت سے باہر قدم نہیں نکالوں گا!"

"میں جھوٹا نہیں ہوں!" اس نے کہا۔ "اپنی زندگی سے پیار نہ ہوتا تو تمہارے سوالات کے جواب دینے سے انکار کر دیتا!"

"بہت پیار ہے اپنی زندگی سے؟" میرے اس سوال پر اس کی سوچ کا شعول بکھر گیا۔

"یہاں میں سسک رہا ہوں!" وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دردناک لہجے میں بولا۔ "میں باہر نکل کر بھرپور زندگی گزارنا چاہتا ہوں!"

"تم یہاں قیدی تو نہیں ہو!"

"قیدی سے بھی بدتر!" اس نے نفرت آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔ "دس برس سے اسی عمارت میں رہتا چلا آرہا ہوں۔ ہفتے عشرے میں بس چند گھنٹوں کے لئے بیوی بچوں میں جانا نصیب ہوتا ہے۔ جس دن بھی میں نے ان کا ساتھ چھوڑنے کا ارادہ کیا اسی روز میری لاش خرطوم کے کسی گندے نالے سے برآمد ہوگی!"

میرا دل چاہا کہ اسے بھی اسلحہ دے کر اپنے ساتھ شریک کر لوں مگر میں اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہ کر سکا!

بلڈاگ بہت شریف نظر آرہا تھا اور ایک امکان یہ بھی تھا کہ کہیں وہ میری ہمدردیاں حاصل کر کے اعتماد کے سہارے مجھ پر کاری وار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہو!

"سوچتے سوچتے میری نیندیں اڑ گئی ہیں!" وہ کہے جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں درد سا سمٹ آیا تھا۔ "میں بیشتر راتیں سگریٹیں پھونک کر گزارتا ہوں، نہ جانے اس عمر قید سے کب رہائی نصیب ہوگی مجھے!"

پہلے میرا ارادہ تھا کہ وہ کمرہ چھوڑنے سے قبل اسے بھی زہریلی سوئی کا نشانہ بنا دوں گا مگر وہ اپنی گفتگو سے میرے دل میں اپنے لئے اتنی جگہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ میں نے اسے محض بے ہوش کرنے پر اکتفا کیا اور پھر احتیاط سے اس کمرے سے باہر نکل گیا!

بے ہوشی کے لیے وہ خود منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑا ہوگیا تھا۔ اور میں نے عقب سے اس کی کنپٹی پر ضرب لگانے کا مؤثر حربہ آزمایا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر فرش پر ڈھیر ہوگیا تھا۔

اس شخص سے نمٹنے کے بعد میں ایک بار پھر اندھیرے میں پہنچ گیا۔ میرا قیاس تھا کہ اس طرف بنے ہوئے بیشتر کمرے آباد تھے اب یہ اور بات تھی کہ ان کے مکین گہری نیند سوئے ہوئے ہوں۔

پیٹر کارلائل کے کمرے کی نشاندہی ہو جانے کے بعد عمارت کے دوسرے مکین میرے لیے اپنی افادیت کھو بیٹھے تھے اور میں ان سے الجھے بغیر جلد از جلد اس مڑے ہوئے کان والے سفارت کار کے درشن کرنا چاہتا تھا جو نہ صرف سیتا کے معاملے میں ملوث تھا بلکہ کیتھی مائر بھی اس کی تحویل میں تھی۔

بلڈاگ نما چہرے والے کی ہدایات کے مطابق میں اندھیرے میں پنجوں کے بل تین موڑ طے کر کے اس وسیع لابی میں جا نکلا جہاں میرے داہنے ہاتھ پر دوسرا دروازہ پیٹر کارلائل کی خوابگاہ کا تھا۔ جب کہ پہلا دروازہ کیتھی مائر کے قفس کا ہونا چاہیے تھا۔

آگے بڑھنے سے قبل میں نے اندھیرے میں رک کر بھرپور جائزہ لیا۔ اس وقت تک میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ مگر میں اس تاریک لابی میں پیٹر کارلائل کا محافظ تو درکنار، اس کا سایہ بھی محسوس نہ کر سکا۔

میدان صاف تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پیٹر کارلائل کے بارے میں میرا قائم کیا ہوا نظریہ درست ہی تھا۔

دبے قدموں پیٹر کی خوابگاہ کی طرف بڑھتے ہوئے پہلی بار مجھے خیال آیا کہ وہ پوری عمارت گھور اندھیرے میں کیوں ڈوبی ہوئی تھی؟

اگر وہاں رہنے والے اتنے نازک مزاج تھے کہ روشنی کی خفیف سی کرن بھی ان کے آرام میں حارج ہوتی تھی تو بھی راہداریوں وغیرہ میں ایک آدھ بلب روشن ہونا ضروری تھا۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ اس دور افتادہ زرعی علاقے میں برقی توانائی ہی نایاب ہو۔ مگر عمارت میں ہر جگہ بھرپور برقی تنصیبات اس خیال کی نفی کر رہی تھیں۔

تیسرا قیاس بھی کمزور تھا۔ اگر کسی وجہ سے برقی رو کی فراہمی میں تعطل واقع ہوا تھا تو برقی آسائشوں کے عادی مکینوں کی نیند خراب ہونا لازمی تھا جب کہ وہ سب ایسی گہری نیند سوتے ہوئے تھے جیسے ہمیشہ سے اسی انداز میں سونے کے عادی رہے ہوں۔

یہی سب سوچتا ہوا میں داہنی جانب سے پہلے دروازے پر پہنچ گیا۔ جس کے عقب میں کیتھی مائر مقید تھی۔

میں کئی منٹ تک بند دروازے سے کان لگائے اندر کی سن گن

لینے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہاں لاتنا ہی سناٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اور بلڈاگ نما چہرے والے کے کہے ہوئے الفاظ رہ رہ کر میرے ذہن میں بچھو کے ڈنک لگا رہے تھے۔

اس نے جس پیرائے میں اداکاری کی شوقین لڑکیوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس عمارت میں لائی جانے والی لڑکیوں پر۔۔ تشدد معمولات میں شامل تھا۔ اگر کیتھی ماتر بھی سیتا کی تلاش کے سلسلے میں اسی بدسلوکی کا شکار ہوتی تھی تو۔۔۔۔

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا اور میرے قدم برابر والے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ میں نے جذباتی ہیجان کے باعث کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کیے بغیر پیٹر کارلائل کی خوابگاہ کے چوبی دروازے پر دباؤ ڈالا مگر وہ اندر سے مقفل ثابت ہوا۔

اس وقت میرے دل میں رہ رہ کر ایک ہی احساس گونج رہا تھا۔ میں کیتھی کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہو گیا تھا مگر اس نے تنہا پیٹر کارلائل تک پہنچ کر میری اس بدگمانی کو بے بنیاد ثابت کر دیا تھا۔ اور اس وقت میں آبرو باختہ مگر زندہ کیتھی کے بجائے آبرومند مگر مردہ کیتھی کا سامنا کرنے کی دعا مانگ رہا تھا کیونکہ دشمن۔۔۔۔ کے ہاتھوں اجڑی ہوئی کیتھی کا سامنا کرنے کی مجھ میں جرأت نہیں تھی۔

پیٹر کارلائل کے کمرے میں بھی وہی سناٹا حکمراں تھا جو بقیہ عمارت پر راج کر رہا تھا چند ثانیوں کے انتظار کے بعد میں نے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

"کون ہے؟" دوسری دستک کے جواب میں ایک خوابناک اور بھاری مردانہ آواز ابھری۔

اسی کے ساتھ عمارت کے کسی دور افتادہ گوشے میں کسی بڑے انجن کے اسٹارٹ ہونے کا شور سنائی دیا۔ اور لابی میں لگے ہوئے قمقموں میں سرخی مائل دھیمی روشنی عود کر آئی جو انجن کا شور تیز ہونے کے ساتھ ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

غالباً عمارت میں برقی توانائی کا تمام تر دارومدار کسی جنریٹر پر تھا جسے اسی وقت چلایا گیا تھا اور جنریٹر کی رفتار کے ساتھ ہی قمقموں کی روشنی بھی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

جنریٹر کی رفتار اعتدال پر آتے ہی عمارت کے کئی حصوں میں بیک وقت فائرنگ کا بھیانک شور ابھرنے لگا جو یقینی طور پر رائفلوں کے دہانوں سے ابھر رہا تھا۔

میرے تنفس کی رفتار یک بیک تیز ہو گئی اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خودکار دفاعی نظام پیٹر کارلائل کی خوابگاہ کے دروازے سے منسلک تھا جو دروازہ چھوتے ہی حرکت میں آ چکا تھا۔

اندھیرے کی گہری چادر میں گھرے رہنے کے بعد اجالا بہت عجیب اور خوف آور محسوس ہو رہا تھا۔ رائفل کی اکا دکا آوازیں بہت قریب سے ابھری تھیں اور مجھے اندیشہ تھا کہ اگر مزید چند ثانیوں تک میں اس روشن لابی میں کوئی پناہ گاہ تلاش نہ کر سکا تو کوئی رائفل بردار درندہ دندناتا ہوا وہاں آ پہنچے گا اور مجھے مار گرائے گا۔

مگر اسی وقت پیٹر کارلائل کی خوابگاہ کا دروازہ کھل گیا اور مجھے اپنے سامنے چوڑی دھاریوں والے شب خوابی کے لبادے میں ملبوس ایک دراز قامت سیاہ فام کھڑا نظر آیا جس کے داہنے ہاتھ میں بڑے بور کا وزنی پستول موجود تھا۔

دراز قامت، سیاہ رنگت، کسرتی بدن، کٹی شکل میں مڑا ہوا داہنے کان کا نچلا حصہ اور اوپر کے ایک سامنے والے دانت پر سونے کا خول منڈھا ہوا۔ اس میں وہ ساری ہی نشانیاں موجود تھیں جو اسے میرا مطلوبہ شخص ثابت کر رہی تھیں۔

دروازہ کھولتے وقت اس نے یہ چالاکی کی تھی کہ خوابگاہ میں کوئی بلب روشن نہیں کیا تھا تاکہ خود نسبتاً اندھیرے میں رہتے ہوئے نامعلوم مداخلت کار کو بہتر طور پر دیکھ سکے لیکن میرے لیے لابی کی روشنیوں کا انعکاس ہی بہت کافی ثابت ہوا تھا۔

دروازہ کھلے ہوئے چند لمحے ہی گزرے تھے اور مجھے اس کے چہرے پر تحیر کے ساتھ ہی بے یقینی کی پرچھائیاں لرزتی نظر آ رہی تھیں مگر یہ غنیمت تھا کہ اس نے فوراً ہی مجھ پر فائر کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مہلک اسلحے کی زد پر تھے۔ اور کسی ایک کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خود زخمی ہوئے بغیر دوسرے کو ہلاک کر سکے۔

"اسٹین گن پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا لو۔" رائفلوں کی اکا دکا آوازوں میں اس کی سرد اور تحکم آمیز آواز ابھری۔

"تمہاری گولی مجھے صرف زخمی کرے گی جب کہ میرا ایک ہلکا سا برسٹ تمہارے جسم کے چیتھڑے اڑا دے گا۔" میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اندر آنے دو پھر ہم غیر مسلح ہو کر بات کریں گے۔"

"چلے آؤ۔" اس نے فوری طور پر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اور میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کی پرتعیش خوابگاہ میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میں نے دروازے کے قریب دیوارگیر سوئچوں پر ہاتھ مار کر کمرہ روشن کیا پھر ٹانگ سے دروازہ بند کر دیا جو اندر سے بند کیے جانے پر خودبخود مقفل ہو جانے والے مضمی قفل سے مرتبع تھا۔

"دروازہ کیوں بند کیا تم نے؟" وہ غصیلی آواز میں بولا۔

"تمہارے آدمی شاید باؤلے ہو گئے ہیں جو ہوا میں گولیاں

چلا رہے ہیں۔ میں ان کی مداخلت کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔"

"تم کون ہو؟" اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"غیر مسلح ہو کر ہم برابری سے بات کر سکیں گے۔" میں نے پرسکون انداز میں ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میری اسٹین گن کی نال بدستور اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اور ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی کسی بھی لمحے جنبش کرنے کے لیے تیار تھی۔

"میں تمہیں شناخت کیے بغیر غیر مسلح ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" اس نے مکارانہ لہجے میں کہا۔

"تم مجھے شناخت نہیں کر سکتے کیونکہ میں تمہارے لیے اجنبی ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "بس یہ سمجھ لو کہ دشمن نہیں ہوں۔"

"دوست بھی نہیں ہو سکتے۔" وہ فوراً بولا۔ "ورنہ چوروں کی طرح یہاں تک پہنچنے کی کوشش نہ کرتے۔"

"جسمانی طور پر تم برتر ہو، غیر مسلح ہو کر فائدے میں رہو گے۔"

وہ ایک گہرا سانس لے کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "تم جو بھی ہو مجھے فوری طور پر مارنے کا ارادہ نہیں رکھتے ورنہ دروازہ کھلتے ہی اسٹین گن چلا دیتے مگر میں تمہاری نیت کا کوئی اندازہ کرنے سے قاصر ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے اس نے اپنا پستول والا ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے اس کے جسم کو بچاتے ہوئے اسٹین گن کا ہلکا سا راؤنڈ چلا دیا۔

پستول اس کے لہولہان ہاتھ سے اڑ گیا اور وہ چیختا ہوا بدحواسی کے عالم میں فرش پر بچھے قالین پر گر گیا۔

مگر میں غافل نہیں تھا بظاہر بدحواسی معلوم ہونے والی اسکی حرکت مکاری پر مبنی تھی کیونکہ وہ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر گرے ہوئے پستول کی طرف جھپٹا تھا مگر میں نے اسٹین گن چھوڑ کر اس پر چھلانگ لگا دی اور وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہونے سے پہلے میری بے رحمانہ گرفت میں پھنس گیا۔

اس کے چہرے پر چند ضربات لگانے کی کوشش میں میری ناک اسکی وحشیانہ ٹکر سے بال بال بچی اور اس کے سر کا عقبی حصہ میری پیشانی پر ایک ابھار طلوع کر گیا۔

اس کی پیش قدمی مسدود کرتے ہی میں نے اس کے پستول پر قبضہ کر لیا اور واپس لوٹ کر اسٹین گن اپنے شانے سے لٹکا لی۔

اسی وقت دروازے پر دو تین افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ کر رکیں اور پوری قوت سے دروازہ پیٹا جانے لگا۔

"چلے جاؤ جہنمی کتو۔" پیٹر کارلائل غضبناک آواز میں دہاڑا "یہاں اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہاری غفلت کا خمیازہ میں بھگتوں گا۔"

اور باہر سناٹا چھا گیا۔

رائفلوں کا شور اس سے پہلے ہی معدوم ہو چکا تھا میرا خیال تھا کہ باہر نجیب نے اسٹین گن کی فائرنگ کی آواز سن کر مقابلے کے آغاز کا اندازہ کر لیا ہو گا اور اپنے مورچے میں بیٹھا بیتابی سے شکار کا منتظر ہو گا۔

اس کی اسٹین گن کی خاموشی اس بات کی غماز تھی کہ پیٹر کارلائل کے کسی بھی آدمی کو عمارت سے باہر نکلنے کی نہیں سوجھی تھی ورنہ فضا آتشیں نغموں کے جلو سے ابھرتی ہوئی انسانی چیخوں سے ضرور گونج اٹھتی۔

پیٹر کارلائل کا خون کی چھینٹوں سے تر چہرا غصے کے عالم میں بہت بھیانک نظر آ رہا تھا مگر وقتی طور پر اس نے کوئی جنونی کارروائی نہیں کی۔

"دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" میں نے اپنی پرانی نشست سنبھالتے ہوئے اسی کے پستول کی زد پر اسے حکم دیا۔

"میں زخمی اور غیر مسلح ہوں۔" وہ کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرایا۔

"مجھے افسوس ہے پیٹر کہ تم نے مصالحانہ فضا برباد کی۔ اب مجھے اپنی تمام شرائط منوانے کا حق ہے۔"

"میں ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔" وہ جھلاتے ہوئے لہجے میں غرایا۔

"تمہارے لباس میں کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟"

جواب میں اس نے گالیاں بکتے ہوئے جس ہتھیار کی موجودگی کی اطلاع دی وہ کسی مصرف کا نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے سلگانے کے لیے ایک قہقہہ مار کر اسی حالت میں کھڑا رہنے کی اجازت دے دی۔

"مجھے معلوم ہے تم سفارتی مراعات کی آڑ میں بردہ فروشی میں ملوث ہو۔" میں نے شروع ہی سے مضبوط اور جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ورنہ اس سے سیتا کے بارے میں کچھ اگلوانا محال ہو جاتا۔ "مگر میری دلچسپی صرف ان تین لڑکیوں تک ہے جنہیں چند روز پہلے کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد تم ایک نام آدمی سے بے ہوشی کی حالت میں اپنی وین میں لائے تھے۔"

"تمہاری بکواس میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "یہ نہ بھولنا کہ میری اس قیام گاہ میں گھس کر تم نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے جسے مقامی قانون کسی صورت میں معاف نہیں کرے گا۔"

"تین لڑکیاں مسٹر پیٹر کارلائل!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "یہ نہ سوچو کہ تم وہاں تنہا تھے۔ لڑکیوں کو وین میں لادتے ہوئے حساس کیمروں سے تمہاری بہت واضح تصاویر لی گئی تھیں اور پھر وہ شخص بھی تمہارے خلاف گواہی دے گا جس سے تم نے لڑکیاں حاصل کی تھیں۔" میں نے اسے خوفزدہ کرنے کے لیے فوراً ہی پینترا بدلا تھا۔

"یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب تم یہاں سے زندہ بچ کر جا سکو۔" وہ تنفر آمیز لہجے میں بولا۔ "تمہاری یہ بے سروپا باتیں مجھے متاثر نہیں کر سکتیں۔"

"میں تنہا نہیں ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میری پشت پر ایک مضبوط شخصیت اور اس کی تنظیم ہے۔"

"تم مجھے کیا جتانا چاہ رہے ہو؟" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"جوزف امین کے لیے کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ وہ جب چاہے قانون کے نگہبانوں کو تمھاری دہلیز پر پہنچا سکتا ہے۔"

"ج۔۔۔جوزف؟ تم اس کے آدمی ہو؟" وہ فرطِ حیرت سے بوکھلا کر بولا۔ "میں مان ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑے دھندے ضرور کرتا ہے، مگر بہت کھرا آدمی ہے۔ وہ بلیک میلنگ جیسی ذلیل حرکت کر ہی نہیں سکتا۔"

"مجبوری مسٹر پلیٹر!" میں نے نرمی سے کہا۔ "ان تینوں میں سے ایک لڑکی غلطی سے تمھارے حوالے کر دی گئی جس کی وجہ سے جوزف امین عتاب میں آیا ہوا ہے، اسے ہر قیمت پر وہ لڑکی واپس چاہیے ورنہ۔۔۔"

میں نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ تو معمولی سی بات تھی۔" وہ بے اعتبارانہ لہجے میں بولا۔ "اگر وہ مجھ سے براہِ راست بات کر لیتا تو ایک کیا میں تینوں لڑکیوں کو واپس لانے کا بندوبست کر سکتا تھا۔ اسے تم جیسے دو کوڑی کے دہشت گرد اور غیر مہذب آدمی کو مجھ پر مسلط کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس کے جواب سے مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے اپنی زبان سے جوزف امین سے اپنے مراسم کا اعتراف کر لیا تھا مگر واپس لانے کے بندوبست کے تذکرے نے مجھے چونکا دیا تھا جس کا مطلب تھا کہ لڑکیاں اب اس کی تحویل میں نہیں تھیں۔

"اس سے ذاتی شکوے اس وقت کر لینا جب وہ سوڈان سے واپس آئے۔ فی الحال میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ اسی کے حکم پر کر رہا ہوں، وہ ہر قیمت پر لڑکی کو واپس چاہتا ہے اور اس معاملے میں میں پوری طرح با اختیار ہوں۔"

"مگر تمھارا بھونڈا طریقۂ کار۔۔۔" اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

"طریقۂ کار ضرور میرا اپنا ہے جس کے لیے تم اس سے شکایت کر دینا۔" میں نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نے میرے بارے میں گھٹیا زبان استعمال کر کے خود کو اس سلوک کا مستحق ثابت کر دیا ہے۔"

"تم تنہا ہو؟"

"اپنے کسی آدمی کو باہر بھیجو، پتہ چل جائے گا۔"

"اوہ!" پہلی بار وہ متفکرانہ انداز میں بولا۔ "باقاعدہ دھاوا بولا گیا ہے، معاملہ واقعی سنگین معلوم ہوتا ہے۔"

"غنیمت ہے کہ تمھیں اس کا احساس ہو گیا۔"

"میں آزمائے بغیر تمھاری بات کا یقین نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔ "مگر یہ بتاؤ کہ تمھارے علاوہ اور کوئی بھی اس لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے؟"

میں اس سے کسی بھی لمحے اس سوال کی توقع کر رہا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ کیتھی مائر کو بھی وہ اسی سلسلے کی کڑی سمجھ رہا تھا جو میری معلومات کے مطابق برابر والے کمرے میں مقید تھی۔ مگر میں سینتا کی بات مکمل کیے بغیر کیتھی مائر کی طرف نہیں آنا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح دونوں ہی معاملے الجھ کر رہ جاتے۔

"اس بارے میں لاعلم ہوں۔" میں نے اپنا دامن بچاتے ہوئے کہا۔

وہ پُرخیال انداز میں ٹہلتا ہوا بستر پر دوبارہ جا بیٹھا۔ اس وقت وہ اپنے زخمی ہاتھ کو تقریباً بھولا ہوا تھا۔ میں نے بھی زیادہ سختی مناسب سمجھی لیکن پستول کی نال کو بدستور اس کے سینے پر ہی مرکوز رکھا۔

پھر اچانک ہی اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا فون اٹھا لیا اور کوئی نمبر گھمائے بغیر ماؤتھ پیس میں کسی کو حکم دیا کہ ایڈی باہر کا جائزہ لے کر اسے رپورٹ دے۔

شاید ہی چند منٹ گزرے ہوں گے، ہم دونوں بالکل خاموش بیٹھے ایک دوسرے کا چہرہ تکے جا رہے تھے کہ اچانک فضا اسٹین گن کے ہولناک شور سے لرز اٹھی اور پھر فائرنگ دم توڑتی انسانی چیخوں میں معدوم ہو گئی۔

فائرنگ کی پہلی آواز سنتے ہی پلیٹر مضطربانہ انداز میں بستر سے اٹھ گیا اور کسی زخم خوردہ بھیڑیے کی طرح قالین پر ٹہلنے لگا۔

"تم نے بلاوجہ اپنے دو آدمی ضائع کرائے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"چھوٹے مہروں سے بازی نہیں جیتی جاتی۔" وہ میری طرف مڑ کر تلخ لہجے میں بولا۔ "وہ ہوتے ہی پٹوانے کے لیے ہیں۔"

انٹر کام کی گھنٹی بجی اور پلیٹر نے ریسیور اٹھا کر شٹ اپ کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اب کام کی بات کرو۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اگر باہر تمھارے آدمی نہ پھیلے ہوتے تو میں سرہانے لگے ہوئے ایک بٹن کو دبا کر اس کمرے سمیت پوری عمارت کو اندھیرے میں غرق کر دیتا اور یہی کمرہ تمھارا مدفن بنتا۔"

"تو کیا جنریٹر اسی کمرے سے چلایا جاتا ہے؟"

"دونوں بٹن میرے سرہانے ہیں، وہاں سارا نظام خودکار ہے، پھر بھی انجن چلتے ہی دیکھ بھال کے لیے ایک آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے۔"

"اس کے ہوتے ہوئے اندھیرے میں کیوں رہتے ہو؟" میں نے مصالحانہ فضا ہموار کرنے کے لیے پستول گود میں رکھ کر سگریٹ سلگا لی۔

"میں یہاں ہوتا ہوں تو رات کو انجن بند رہتا ہے۔ اس کا شور میری

نیند خراب کر دیتا ہے۔" اس نے اندھیرے اور پھر اجالے کا معمّہ بھی حل کر دیا۔

"تم ان تینوں میں سے کس لڑکی کی واپسی چاہتے ہو؟" قدرے سکوت کے بعد اس نے ہی گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

"نہ جانے وہ تمھیں کن ناموں سے بیچی گئی ہوں؟" میں نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ہم میں وہ ٹریسی مارٹن کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔"

"سب سے سرکش اور بدتمیز لڑکی تھی۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "اگر جوزف نے مجھے جلد از جلد ان تینوں کو آگے بڑھانے کا اشارہ نہ دے دیا ہوتا تو میں دیکھتا کہ اس حرّافہ میں کتنے کس بل ہیں۔"

"وہ سوڈان میں ہی ہے؟"

اس نے اپنے سر کو آہستہ آہستہ نفی میں جنبش دی۔ "وہ جوہانسبرگ یا ڈربن میں ہوگی میں اسے دو تین روز میں یہاں منگوا سکوں گا۔"

"جنوبی افریقہ میں ہے وہ؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں" وہ تلخ انداز میں ہنسا۔ "یہ نہ پوچھنا کہ وہاں کیوں ہے بس زیادہ سے زیادہ تین دن لگیں گے اور وہ یہاں ہوگی۔"

"اگر وہ سوڈان سے نکل ہی چکی ہے تو ہمارا کام آسان ہو گیا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "یہاں وہ قانون سے بھاگی ہوئی ہے۔ ایک بار آئے گی اور دوبارہ ہمیں پھر اسے لے جانا پڑے گا۔ کوئی ایسا بندوبست کیوں نہیں کر لیتے کہ ہم اسے جوہانسبرگ یا ڈربن ہی سے حاصل کر لیں۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "میری ایک مختصر سی تحریر ہی کافی ہوگی۔ مگر وہاں کون جائے گا؟"

"میں خود۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ٹریسی کو تم سے حاصل کر کے منا کو تک پہنچانے کی ذمّے داری میرے سر ہے۔"

میرا خیال تھا وہ زخمی انگلیوں کا عذر تراش کر دو چار دن کی مہلت چاہے گا مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ایک تپائی پر سے قلم اور پیڈ اٹھا کر بائیں ہاتھ سے چند الفاظ لکھے اور کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

اس کاغذ پر انگریزی کے مہمل سے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ نیچے دستخط کے بجائے ایک مضحکہ خیز خاکہ سا بنا ہوا تھا۔

"یہ خفیہ پیغام ہے۔" وہ میری پیشانی پر ناگواری کی لکیریں ابھرتی دیکھ کر بولا۔ "تم جوہانسبرگ میں وزیرِ داخلہ کے تھرڈ سیکرٹری پولس۔ٹی۔اسمتھ سے ملو گے تو باقی سارا کام وہ پورا کرا دے گا۔"

"تمھاری تحریر وہ پہچان لے گا؟" میں نے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

وہ ہنسا۔ "فکر نہ کرو۔ میں داہنے اور بائیں ہاتھ سے یکساں کام لے سکتا ہوں۔ جوزف امین کا نام درمیان میں آنے کے بعد بدمعاملگی کا خوف دل سے نکال دو۔"

میں نے وہ رقعہ احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

"تم نے مجھ سے ٹریسی کے معاملے میں کسی اور کی دلچسپی کے بارے میں سوال کیا تھا؟" میں نے پہلو بدلتے ہوئے نیا موضوع چھیڑ دیا۔ سینتا کا معاملہ نمٹ جانے کے بعد کیتھی کے بارے میں میری ذمہ داری باقی رہ جاتی تھی۔

"بس یوں ہی خیال آ گیا تھا۔"

"کوئی نہ کوئی وجہ ضرور رہی ہوگی۔"

"دراصل پچھلی شام ایک خوبرو لڑکی میرے مکان میں میری اسٹڈی میں گھستے ہوئے پکڑی گئی تھی، میرا خیال اسی طرف گیا تھا۔"

"اسے تو پولیس کے حوالے کر دیا ہوگا؟"

"جو لوگ اپنے معاملات خود نمٹانے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں وہی قانون کی بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔" اس کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔ "مگر وہ لڑکی بہت ڈھیٹ ہے، اس نے اپنی قیام گاہ کے پتے کے علاوہ کوئی بات نہیں اگلی۔"

"شاید برابر والے کمرے میں ہے۔" میں نے دونوں کمروں کو ملانے والے درمیانی بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ یوں اچھل پڑا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ "تمھیں کیا معلوم؟"

"تمھارے دروازے پر دستک دینے سے پہلے اس کمرے سے مدھم سی نسوانی کراہیں سنی تھیں۔" میں نے جلدی سے بات بنائی ورنہ اس عمارت سے زندہ نکاسی محال ہو جاتی۔

"اوہ!" وہ مطمئن ہو گیا۔ "بڑی پیاری لڑکی ہے۔ ایک بار تو تشدد سہہ گئی مگر مزید تشدد کے سامنے شاید زیادہ دیر نہ رک سکے۔"

"وہ تمھارا اپنا معاملہ ہے، یہ بتاؤ کہ واپسی میں تمھارے آدمیوں نے مزاحمت کی تو کیا ہوگا؟" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

"میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

"ہو سکتا ہے کہ کوئی سرپھرا حماقت کر گزرے، ان کے دو ساتھی چند منٹ پہلے ہی مارے گئے ہیں۔ چھوٹے آدمی انتقام کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔"

"یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"خواہش ضرور میری ہے مگر اس پر تم اپنے طور پر عمل کرو گے انہیں غفلت برتنے کے الزام میں سزا دینے کے لیے تم غیر مسلح کر کے برابر والے کمرے میں بند کر دو۔"

"مگر وہاں تو لڑکی ہے؟"

"اسے تمھارے کمرے میں لے آتے ہیں۔"

وہ والہانہ انداز میں ہنس پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کیتھی مارٹن جیسے قیدی سے استفادے کے لیے ہی وہ اس دُور افتادہ عمارت میں پڑا ہوا تھا۔

میں نے کچھ دیر کے لیے ہر قسم کے خطرات مول لینے کا فیصلہ کر لیا اور اسٹین گن کے ساتھ ہی پیٹر کارلائل کا پستول بھی ایک صوفے کے نیچے ڈال دیا۔

پیٹر نے درمیانی دروازہ کھولا تو فرش پر کیتھی مارٹن بیہوشی کے عالم میں چت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ چہرے پر طمانچوں کے گہرے نشانات نیل کی صورت میں اُبھرے ہوئے تھے۔ لباس نہ صرف جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا بلکہ اس پر سگریٹ یا اور کسی گرم شے سے داغنے کے نشانات بھی تھے۔ بازوؤں پر بھی زخم تھے جن پر رِسنے والا خون سوکھ کر جم چکا تھا۔

"نہلائے دھوئے بغیر بستر پر لائے جانے کے قابل نہیں ہے۔" پیٹر نے اسے دیکھ کر تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تشدد نے اس کے حسین خدوخال تک مسخ کر کے رکھ دیے ہیں مگر ابھی تک اس کے کس بل نہیں نکل سکے ہیں۔"

"اس کی بندشیں کھولو۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے نرمی سے کہا اور وہ کیتھی کے ایک ایک عضو کے بارے میں گھٹیا لفاظی کرتے ہوئے رسیوں کے بند کھولنے لگا۔

میری پسلیاں مندمل ہوتے ہوئے زخم کا شکار تھیں اور اس کا داہنا ہاتھ لہو میں لتھڑا ہوا تھا مگر اسے اپنے زخم کی پروا نہیں تھی۔

ہم دونوں نے تھوڑی سی محنت کے بعد کیتھی مارٹن کے بیہوش بدن کو خوابگاہ میں آرام دہ مسہری پر منتقل کر دیا۔ اس اثنا میں کیتھی کو قدرے ہوش آ گیا اور وہ ہولے ہولے کراہتے ہوئے اپنے بدن کو جنبش دینے لگی۔

"اب تم ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ میں اُن سب کو بُلاتا ہوں۔" پیٹر کارلائل نے چند ثانیوں بعد مجھ سے کہا۔

اس وقت میری چھٹی حس پھڑکی اور میں اسی صوفے پر جا بیٹھا جس کے نیچے پستول اور اسٹین گن پوشیدہ تھی۔

پیٹر کارلائل انٹرکام پر اپنے آدمیوں کو ہدایت دے رہا تھا تو میں نے آہستگی سے دونوں ہتھیار صوفے کے نیچے سے نکال لیے اور پھرتی سے پستول کا چیمبر خالی کر کے گولیاں اپنی جیب میں ڈال لیں۔

"تم نے پھر ہتھیار سنبھال لیے۔" فون سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوتے ہی پیٹر کارلائل چڑچڑے لہجے میں بولا۔

"روانگی کی تیاری۔" میں نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تو میرا پستول واپس کرو۔"

میں نے اس کا پستول لوٹا دیا۔ یہ لین دین ایسی سازگار فضا میں ہوا کہ اسے کسی فریب کا شبہ تک نہ ہو سکا۔ اس نے چیمبر دیکھے بغیر پستول مسہری پر اپنے قریب رکھ لیا۔

چند ثانیوں بعد چار تنومند اور لڑاکا قسم کے مسلح سوڈانی پیٹر کی خوابگاہ میں آ موجود ہوئے۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" پیٹر غضبناک لہجے میں غرّایا۔

"معظم اپنے کمرے میں بیہوش پڑا ہوا ہے۔ جعفر اور رابطی جائزہ لیتے ہوئے مارے گئے اور امیر لاپتہ ہے۔" آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

امیر شاید میرے ہاتھوں مرنے والا وہ سوڈانی تھا جو نجیب کی غیر موجودگی میں عمارت کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

چوکیداروں نے مرنے سے پہلے پیٹر کے علاوہ اندر سات نفوس کے قیام کی اطلاع دی تھی جب کہ وہ تعداد آٹھ بن رہی تھی۔ مگر تعداد سے زیادہ مجھے یہ تسلی تھی کہ وہ جتنے بھی تھے اس وقت میرے سامنے یکجا ہو چکے تھے۔

"تم سب اندھے اور غافل ہو۔" پیٹر کارلائل ان چاروں پر برس رہا تھا۔ "مُردوں کی طرح بے خبر سوتے رہے اور یہ اسٹین گن تانے میرے سینے پر چڑھ آیا۔ اگر میں چوکنا نہ رہوں تو تم لوگ کسی بھی وقت مجھے بے موت مروا دو۔ اُلّو کے پٹھو! اب کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اس کی ہڈیاں سُرمہ کر دو۔"

پیٹر کارلائل کی اس قلابازی نے میرا ذہن بھک سے اُڑا دیا۔ وہ چاروں اپنی شہ زوری کے زعم میں ہتھیار سیدھے کیے بغیر میری طرف لپکے اور میں نے اسٹین گن سیدھی کر کے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دو کا بدن چھلنی ہو گیا۔ تیسرا ان کی آڑ میں ہونے کے باعث بچ گیا جب کہ چوتھا محض زخمی ہوا۔

بچ جانے والوں نے ریوالور نکالے ہی تھے کہ اسٹین گن کا دُوسرا برسٹ انہیں لے ڈوبا اور اسی وقت ہر سو گھور اندھیرا چھا گیا۔

شاید پیٹر کارلائل نے حالات نازک دیکھتے ہوئے اندھیرے کی آغوش میں پناہ لینے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ اور جنریٹر چلانے والے انجن کو بند کرنے والا بٹن دبا دیا تھا۔

ان چار حملہ آوروں پر فائر کرتے ہوئے بھی مجھے کراہتی ہوئی نیم بے ہوش کیتھی کا خیال تھا جو اندھیرا پھیلنے کے بعد اور بھی بڑھ گیا تھا۔ کوئی بھی بھٹکی ہوئی گولی بآسانی اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی تھی۔ فائرنگ کے بے پناہ شور... اور مرنے والوں کی چیخوں کے بعد اندھیرے کمرے کا سناٹا بہت بھیانک اور غیر فطری محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت کیتھی کی بھی بھولی بھٹکی کوئی کراہ نہیں سنائی دے رہی تھی۔

میں صوفے کی اوٹ میں قالین پر دبکا ہوا تھا اور میری نگاہیں دونوں دروازوں پر مرکوز تھیں۔ اس وقت اگر میں چاہتا تو کیتھی کو پیٹر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر باہر نکل سکتا تھا مگر پیٹر کے لیے بری نگاہوں سے بچ کر باہر جانا محال تھا۔

پھر اچانک ہی مجھے اپنی جیب میں پڑے ہوئے دستی بموں کا خیال آیا۔ اور میں نے ٹٹول کر بارودی قوت والا ایک بم نکال لیا۔ دانتوں سے سیفٹی پن کھینچ کر میں نے وہ دستی بم اندازے سے اس طرف اُچھال دیا جدھر پیٹر کی موجودگی کا امکان تھا۔

گھور اندھیرے میں دھماکے کے ساتھ روشنی کا ایک ہلکا سا جھماکا ہوا اور پیٹر کی غضبناک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید دستی بم یا فرنیچر وغیرہ کے ٹکڑے اسے زخمی کر گئے تھے۔

مگر اس دھماکے سے پیدا ہونے والی روشنی میں مجھے پیٹر کا خالی بستر دیکھ کر تشویش ہوئی کیونکہ میں نے آخری بار کیتھی کو وہیں بے ہوش پڑے دیکھا تھا۔

اس وقت میرے پاس طاقتور سرچ لائٹ کے علاوہ پنسل ٹارچ بھی تھی لیکن میں نے روشنی کے ذریعے اپنی کمین گاہ کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ دوسری طرف شاید پیٹر بھی اپنے پستول کے خالی چیمبر کا اندازہ کر کے اسے بھر چکا تھا۔

پھر اچانک ہی پیٹر کی ایک کربیہ چیخ سن کر میں اچھل پڑا اس کے ساتھ کیتھی کی تھکی ہوئی مگر پُرجوش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی وہ بے چینی سے مجھے بُلا رہی تھی۔

پیٹر بدستور کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخے جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کیتھی نے اس کے جسم کے کسی نازک اور کمزور حصے پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

سرچ لائٹ کی روشنی میں کیتھی مجھے مسہری کے عقب میں پیٹر سے زور آزمائی کرتی نظر آئی جب کہ پیٹر کی حالت غیر تھی۔

میں نے جھپٹ کر قالین پر پڑا ہوا وہ پستول اُٹھا لیا جو شاید اس جدوجہد کے دوران میں نیچے گر گیا تھا۔

"چھوڑ دو اسے۔" میں نے کیتھی کو حکم دیا اور وہ پیٹر کو تڑپتا چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

میں نے پیٹر کو بھی کھڑا ہونے کا حکم دیا لیکن وہ کیتھی کے وحشیانہ حربے کے باعث اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ فوری طور پر اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔" پیٹر قالین پر پڑے پڑے ہانپتے ہوئے بولا۔ "مجھے شبہ تھا کہ تم میرے ساتھ کوئی لمبا کھیل کھیلنے کے چکر میں ہو۔"

"تمہارے سارے آدمی ٹھکانے لگ چکے ہیں۔" میں نے اسے خوفزدہ کرنے کے لیے حقیقت کا اظہار کرنا چاہا مگر وہ چیخ پڑا۔

"تم جھوٹے ہو، چار کو مار کر یہ نہ سمجھو کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔"

"بقیہ پہلے ہی مارے جا چکے ہیں۔" میں نے اس کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ "دو چوکیدار اور امیر ہمارے ابتدائی شکار تھے۔"

"تم کون ہو؟" اس کی آواز میں پہلی بار سراسیمگی عود کر آئی۔

"جوزف امین کا ایک معمولی خادم۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم جھوٹے ہو۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "مجھ سے بس یہ چوک ہو گئی کہ تمہیں اس حرّافہ سے الگ سمجھ بیٹھا ورنہ یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔"

"ٹریسی مارٹن کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا اس میں کہاں تک صداقت تھی؟" میں نے اس کو اٹھنے پر مجبور کیے بغیر... سوال کیا۔

"اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"ہتھیار کی زد پر آئے ہوئے کسی دشمن کی زبان سے سوال اچھے نہیں لگتے۔" میں نے تلخ لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"میں یہ جانے بغیر کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا کہ تم کون ہو اور میری راہ پر کیسے لگے۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

"پھر میں تمہارا چہرہ ادھیڑ ڈالوں گا۔"

"جو چاہے کر لو۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "میں اپنی ساری زندگی کی ساکھ ختم کر کے زندہ بھی نہیں رہنا چاہتا۔" سرچ لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔

میں تلخ انداز میں ہنسا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ میں آسانی سے تمہیں مار دوں گا۔ تشدد کے طریقوں پر مجھے خاصا عبور حاصل ہے اور مردوں پر اذیت ناک تشدد میں مجھے خصوصی مہارت حاصل ہے۔ تم زیادہ دیر تک اپنی زبان بند نہ رکھ سکو گے۔"

وہ ہراساں نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"تم بیٹھو۔ اس سے میں خود ہی نمٹوں گی۔" اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر کیتھی آگے بڑھ آئی۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔

میں نے خاموشی سے اس کا مشورہ مان لیا اور سگریٹ سلگا کر ایسی پوزیشن اختیار کر لی کہ پیٹر میری نظر بچا کر کیتھی پر کوئی داؤ نہ چلا سکے۔

کیتھی نے پستول سنبھالتے ہی بڑھ کر غیر متوقع طور پر پیٹر کارلائل کے چہرے پر پُرزور ٹھوکر رسید کی اور وہ دونوں ہتھیلیوں میں خون کا فوارہ دبا کر ماہی بے آب کی طرح قالین پر تڑپنے لگا۔ ساتھ ہی وہ چیختا بھی جا رہا تھا۔

میں اسے نظرانداز کر کے مسہری کے سرہانے دیوار میں نصب

اس سوئچ بورڈ کی طرف متوجہ ہو گیا جس پر چار خاص سوئچ نظر آرہے تھے ہر سوئچ کا رنگ مختلف تھا لیکن یہ پتہ چلانا دشوار تھا کہ ان میں سے کون سا سوئچ برقی فراہمی بحال کرنے کے کام آسکتا تھا۔

میں نے یکے بعد دیگرے چاروں سوئچ آزمانے کا ارادہ کر لیا اور آخری سوئچ دبتے ہی تاریک عمارت کے کسی دور افتادہ حصے میں جنریٹر چل پڑا۔

"تمھاری خاموشی برقرار رہی تو ٹھوکروں سے بھیجہ بہادوں گی۔" کیبھتی نے اس کی چیخوں کی پروا کیے بغیر سرد اور سفاکانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تم پر تشدد کرتے ہوئے ذرا بھی ملال نہیں ہو گا کیونکہ میں تمھارے درندہ صفت آدمیوں کا تشدد جھیل چکی ہوں۔"

"ٹھہرو۔" وہ ایک ہاتھ کسی اندھے کی طرح فضا میں لہراتے ہوئے چیخا۔ "میری آنکھوں میں خون بھر گیا ہے میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔"

"اندھے بھی ہو جاؤ تو تم پر ترس نہیں کھایا جا سکتا۔" کیبھتی پر واقعی اس وقت درندگی طاری ہو چکی تھی۔ "تمھارا دیکھنا نہیں بلکہ بولنا اہم ہے۔"

"تم جو پوچھو گی بتا دوں گا مگر پہلے مجھے پانی لا دو، اندھیری آنکھوں سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔" وہ کرب آلود فضا میں گڑگڑا یا۔

"میرے لیے تمھاری کرب ناک حالت خوشی کا باعث ہے۔" اس نے میرے اور کیبھتی کے ساتھ ہی اپنے مقدر پر بھی چند ثقیل گالیوں کا بوجھ لاد دیا پھر کراہتے ہوئے بولا۔ "ٹریسی کے بارے میں میں نے سب کچھ درست بتایا تھا۔"

"وہ کہاں موجود ہے؟" کیبھتی نے سوال کیا اور میں نے دخل اندازی مناسب نہ سمجھی حالانکہ وہ مجھے اس سوال کا جواب پہلے ہی دے چکا تھا۔

"جوہانسبرگ یا ڈربن میں۔" وہ اوندھے منہ قالین پر پڑے پڑے کراہتے ہوئے بولا۔

"وہاں سے اس کی بازیابی کیونکر ممکن ہے؟" اس بار میں نے سوال کیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں موجود ہو ورنہ یہ لڑکی تو بڑی سنگدل ہے۔" اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ "جنوبی افریقہ سے ٹریسی کی بازیابی کے لیے میری تحریر اب بھی کارآمد ہو گی۔ میں نے اس بارے میں ہر بات درست بتائی تھی۔"

"مجھ پر پہلے سے شبہ ہونے کے باوجود؟" میں نے زہریلے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔" وہ جلدی سے بول پڑا۔ "مجھے پورا یقین تھا کہ تم میرے پاس سے زندہ واپس نہ جا سکو گے۔"

"جنوبی افریقہ سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"میرا سفارت خانہ سوڈان میں ان کے مفادات کی دیکھ بھال کرتا ہے۔" اس نے کرب کے عالم میں قالین پر تقریباً مچلتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں ہر بات بتا دوں گا مگر تم وعدہ کرو کہ میری سرگرمیاں اپنی ذات تک محدود رکھو گے ورنہ میں کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔

"مگر میری زندگی اور عزت کا سوال ہے۔" وہ کرب آلود لہجے میں بولا۔ "میں آج تک بہت کامیابی سے دوہری شخصیت اختیار کیے رہا۔ اگر میری ذات کے خفیہ گوشے بے نقاب ہوئے تو میں معاشرے میں اپنا مقام کھو بیٹھوں گا۔"

"مجھے تمھاری آبرو سے کوئی غرض نہیں۔" کیبھتی بے رحمانہ لہجے میں بولی۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ اپنی ذات سے شرمسار ہو کر تم خود ہی اپنی زندگی کا چراغ گل کر دو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ مجھے ہلاک نہیں کرو گے؟" اس نے فوراً ہی سوال کیا۔ اس کے لہجے میں نئی امنگ سمٹ آئی تھی جس سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ جیرڈ کارلائل کے لیے اس وقت اپنی زندگی ہر بات پر مقدم تھی۔

"اس کا سارا انحصار تمھارے رویے پر ہو گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم لڑکی کو اپنے تشدد کا نشانہ بنا چکے ہو لہٰذا تمھیں اس کے انتقامی رویے کا بخوبی اندازہ ہونا چاہیے۔ تمھارے بارے میں آخری فیصلے کا انحصار اسی پر ہے۔"

"جنوبی افریقہ!" کیبھتی نے چبھتے ہوئے لہجے میں اسے یاد دلایا۔ "وہاں سے تمھارے مراسم کی نوعیت کیا ہے؟"

"میں نے بتایا نا!" وہ قالین پر سیدھا ہوتے ہوئے ہکلایا۔ "میرا سفارت خانہ سوڈان میں اُن کے مفادات کا نگراں ہے۔"

"اُن سے تمھارے نجی روابط کیا ہیں؟" کیبھتی نے غرّا کر سوال کیا۔ "اگر اس بار تم نے حرامزدگی کی تو میں ٹھوکریں برسانی شروع کر دوں گی۔"

"ٹھیرو!" وہ بوکھلا کر جلدی سے بولا۔ "میں بتا رہا ہوں۔"

کیبھتی کی ٹھوکر شاید اس کی پیشانی کے وسط میں پڑی تھی کیونکہ زخم سے بہنے والے خون نے واقعی آنکھوں سمیت اس کا پورا چہرہ تر کیا ہوا تھا۔ چند منٹ گزر جانے کے باعث زخم سے خون کے اخراج میں کمی ضرور واقع ہوئی تھی مگر مرتے ہوئے کان والے اس پُراسرار سفارتی اہلکار کی حالت قابلِ رحم تھی۔

ہم دونوں سے مدد کی کوئی امید نہ پا کر وہ اپنی قمیص ہی

کے دامن سے اپنی آنکھوں پر آیا ہوا تازہ خون صاف کرنے لگا جب کہ خشک خون کی جمی ہوئی پپڑیوں نے اس کا چہرہ انتہائی بھیانک بنا دیا تھا۔

جب وہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنے شب خوابی کے لباس سے ہی چند پٹیاں پھاڑ کر اپنی پیشانی پر باندھ لیں تاکہ خون کا ضیاع بند ہو سکے۔

"جنوبی افریقہ سے میرے مراسم کی نوعیت بہت ہی رازدارانہ ہے۔" وہ اپنی دیکھ بھال سے فارغ ہو کر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میں اُن سے تعاون کی خاطر ہی یہاں بردہ فروشی کے کھیل میں ملوث ہوا ہوں۔"

"تفصیل سے بتلائے جاؤ۔" کیبھتی کی آواز سے نسوانیت کا لوچ اس وقت بالکل غائب ہو چکا تھا اور وہ نہایت خونخوار نظر آرہی تھی۔

"وہ سفید چمڑی والی عورتوں کے بہترین خریدار ہیں۔" چند ثانیوں کے خفت آمیز توقف کے بعد اس نے کھنکار کر کہنا شروع کیا۔ "اور یہ سلسلہ انتہائی رازداری کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ پورے علاقے میں سوڈان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کے روایتی نظام میں غیر قانونی طور پر انسانوں کی خرید و فروخت ایک رواج کے طور پر چل رہی ہے لہٰذا اس منڈی سے میں اُن کے لیے سودے کر کے مال وہاں روانہ کرتا ہوں۔"

"مال!" کیبھتی کے لہجے میں حیرت اور ملامت کے انتہائی تاثرات پوشیدہ تھے۔

"تم عورتیں کہہ لو۔" وہ اپنی خون آلود پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "ہم انھیں مال ہی کہتے ہیں۔ جوزف این سے میرے مراسم اسی سلسلے میں ہیں۔"

"تم اس سے صرف سفید فام عورتیں خریدتے ہو؟" کیبھتی نے سوال کیا۔

"ہاں! صرف سفید فام۔" وہ مسلسل خوفزدہ نظروں سے کیبھتی کی طرف ہی دیکھے جا رہا تھا جیسے وہ اس کے لیے ملک الموت رہی ہو۔

"مگر صرف سفید فام کیوں؟"

"ان لوگوں سے اس مسئلے پر آج تک براہِ راست بات نہیں ہوئی لیکن میں نے تجربے کی بنا پر کچھ اندازے قائم کیے ہیں۔" وہ بولا۔

"وہ کیا؟"

"جنوبی افریقہ میں سفید فام اقلیت کا تناسب پندرہ سترہ فیصد ہے مگر وہ حکومت پر قابض ہے۔ اس دور میں اکثریت پر اقلیت کا استبدادی غلبہ ایک غیر منطقی عمل ہے جو کسی بھی انقلابی مرحلے پر جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا ہے لہٰذا مقامی حکمراں اس وقت کے آنے سے قبل مقامی لوگوں میں گوروں کی اکثریت پیدا کرنے کی کوشش

کر رہے ہیں۔"

"ہمیں ان خشک سیاسی فلسفوں سے غرض نہیں۔" میں نے درمیان میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ "ہم تم سے مختصر مگر جامع جوابات چاہتے ہیں۔"

"اسے بولنے دو۔" کیتھی مارٹن نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں آنکھ مار کر کہا۔ "شاید یہ اپنی مدافعت میں سنسنی خیز کہانی گھڑنے کے چکر میں ہے۔"

"یہ کہانی نہیں، حقیقت ہے۔" پیٹر کارلائل کو طرارہ آ گیا۔ "اگر تم میں کسی سفارتکار کی سی سوجھ بوجھ ہو تو تم باآسانی دیکھ سکو گے کہ جنوبی افریقہ کے حکمراں اپنے ملک میں ہر قسم کی سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ملازمتوں میں سفید فام عورتوں کو بے پناہ ترغیبات کی پیشکش کر رہے ہیں تاکہ ان کے ملک میں نسلی افزائش کا تناسب بدل سکے۔"

"اوہ!" کیتھی کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی۔ "تو تمہارا مقصد ہے کہ سفید فام عورتوں کو خرید کر وہ افزائش نسل کا کام لیتے ہیں؟"

"میرا اندازہ ہے کہ بالکل مویشیوں کی طرح۔" اس نے جواب دیا۔ "چند برس تک وہ اس ملک پر بزور حکومت کریں گے پھر ایک روز مردم شماری میں اچانک انکشاف کیا جائے گا کہ سفید فام وہاں اگر اکثریت نہیں تو مؤثر ترین اقلیت ضرور ہیں۔"

"اور تم اس مذموم مہم میں ان سے تعاون کر رہے ہو؟"

"یہ پیسے کا دور ہے خاتون!" وہ براہ راست پہلی بار کیتھی سے مخاطب ہوا۔ "مجھے ہر سودے میں خطیر منافع ہوتا ہے۔ محض رازداری کے لیے وہ بہت بھاری رقوم ادا کرتے ہیں جو بازار کی شرح سے بہت اونچی ہوتی ہیں۔"

"مگر تم درمیان میں کیوں ہو؟" کیتھی نے سوال کیا۔ "وہ براہ راست جوزف امین یا اس جیسے کسی بڑے بردہ فروش سے براہ راست معاہدہ کر سکتے تھے۔"

"ضرور کر سکتے تھے۔" اس نے اقرار کیا۔ "اور ہو سکتا ہے کہ افریقہ سے باہر انہیں ملازمت دلانے والے اداروں کی آڑ میں یا کسی اور طرح بردہ فروشوں کا تعاون حاصل ہو مگر یہاں معاملہ رسائی کا تھا۔ سوڈان پورے افریقہ میں انسانوں کی خرید و فروخت کا آج بھی سب سے بڑا مرکز ہے اور جوزف امین کو اس تجارت میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ زیر زمین دنیا کے مشہور افراد سے اگر رابطہ ہو بھی جائے تو ہر آن کسی بڑے خطرے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہوا کہ تم خرطوم میں سفارتی مراعات کی آڑ میں جنوبی افریقہ کے لیے سفید عورتوں کی خریداری کا کام سرانجام دے رہے تھے۔"

"شاید اب اسے ترک کر دوں۔" وہ بولا۔ "میں بہت کچھ پس انداز کر چکا ہوں۔ آج تک سارا کام بے خوف و خطر کرتا رہا لیکن آج پہلی بار تم لوگوں سے میرا تصادم ہوا ہے۔ میرے آدمی میرے خونخوار مزاج سے تھراتے ہیں مگر میں نجی زندگی میں زیادہ خطرات مول لینے کا عادی نہیں ہوں۔ زندگی وہی ہے جو سکھ چین سے گزاری جائے۔"

"کمال ہے کہ پہلے تمھیں یہ خیال نہ آیا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیسے آتا؟" وہ آہستہ سے بولا۔ "میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ للٰہذا میرا دل شیر ہوتا گیا اور اب تمہاری مداخلت کے باعث میرا سارا حوصلہ پانی کے بلبلوں کی مانند غرق ہو چکا ہے۔ میرے نزدیک زندگی زیادہ اہم ہے۔ انسان کو کھانے کے لیے زندہ رہنا ہو تو وہ ہوس کہلاتی ہے لیکن محض اپنے رنگ میں زندہ رہنے کے لیے کمایا جائے تو وہ صحیح معنوں میں زندگی ہوتی ہے اور میری تمامتر دلچسپی اپنی زندگی سے وابستہ ہے للٰہذا میں آئندہ ایسا کوئی خطرہ مول لینے کا ارادہ نہیں رکھتا جو میری موت پر منتج ہو۔"

"جنوبی افریقہ کو سفید فام عورتوں کی ترسیل کے لیے تمہارا طریقہ کار کیا تھا؟" میں نے اپنی نجی الجھن کے ضمن میں سوال کیا۔

"لاریاں۔" وہ بولا۔ "ایئر کنڈیشنڈ لاریاں ہی اس علاقے میں زندہ جانوروں کی نقل و حمل کا واحد ذریعہ ہیں۔"

"راستے میں اُن کی چیکنگ نہیں ہوتی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہر پوسٹ پر ہوتی ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن تیس پینتیس فٹ طویل گاڑی میں مویشیوں کے بول و براز میں سے گزر کر آگے تک چیکنگ کی کسی کو توفیق نہیں ہوتی اور آخری حصے میں بے ہوش پڑی ہوئی لڑکیاں چوپایوں کی آڑ میں بلا کسی خوف و خطر سرحد پر پہنچا دی جاتی ہیں۔"

"لیکن کہاں؟" میں نے سوال کیا۔ "سوڈان سے جنوبی افریقہ تک تو بہت طویل فاصلہ ہے اور متعدد ممالک درمیان میں ہیں۔"

"ہمارا راستہ ایتھوپیا کی بندرگاہ اسمرہ کے بجائے اس کے نواحی گھاٹ ہوتے ہیں اور سمندر کے ذریعے ہر لانچ باآسانی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے۔"

"ٹریلر سے لانچ پر منتقلی کے دوران عورتوں یا لڑکیوں کی موجودگی کا راز فاش نہیں ہوتا؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ سب کر لیا جاتا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "آج تک مجھے کہیں سے بھی کوئی بری خبر نہیں ملی۔ میرے سارے کام کا انحصار سوڈان اور ایتھوپیا کے درمیان اپنا نجی ٹریلر چلانے والے ایک شخص پر ہوتا ہے۔"

"اس کا نام پتہ؟" کیتھی نے دریافت کیا۔

پیٹر نے بلا چوں و چرا اس شخص کے بارے میں تفصیلات بتا دیں۔

"تمھیں اور کچھ پوچھنا ہے؟" کیتھی نے میری طرف معنی خیز لہجے میں سوال کیا اور میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

میرے انکار پر کیتھی نے پیٹر مائیکل کے پیٹ پر گولی چلا دی اور وہ ایک چیخ مار کر اچھل پڑا۔ اس وقت پہلی بار اسے اپنے مقدر کا اندازہ ہوا تھا اور اس کی چیخ میں موت کی لرزہ خیز دہشت سمٹ آئی تھی۔

کیتھی پر اس وقت دیوانگی سی طاری ہو رہی تھی۔ وہ واضح طور پر پیٹر کو سسکا سسکا کر مارنا چاہتی تھی ورنہ اس کے پیٹ پر گولی نہ چلاتی۔

چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد کیتھی نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار پیٹر کی داہنی ران ادھڑ گئی پھر تو کیتھی نے اس پستول کا پورا چیمبر ہی خالی کر دیا۔ پیٹر کا سارا جسم لہولہان تھا لیکن ان میں کوئی بھی زخم اتنا کاری نہیں تھا کہ وہ فوری طور پر مر جاتا۔

اس سے قبل کہ کیتھی میری طرف متوجہ ہوتی میں نے اسٹین گن سیدھی کر کے اس کا سینہ چھلنی کر دیا۔

کیتھی میری طرف پلٹی اور محض مجھے گھور کر رہ گئی۔

اس بار پیٹر مائیکل نے تڑپ کر چند ہی ثانیوں میں دم توڑ دیا۔

مختصر سی مدت میں اس عمارت میں یا اس کے باہر مرنے والا وہ آٹھواں فرد تھا۔ وہاں موجود پوری بھیڑ میں سے صرف وہی بلڈاگ نما شخص زندہ بچا تھا جسے میں ابتدا میں بے ہوش کر کے چلا آیا تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ واپسی سے قبل اس عمارت کو آگ لگا دی جائے لیکن کیتھی نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

واپسی میں میں نے بلڈاگ نما چہرے والے شخص کی خبر لینی چاہی جس کا نام معظم دریافت ہوا تھا مگر وہ بدستور اسی کمرے میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

"تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" کیتھی نے میرے بازو کا سہارا لیتے ہوئے پہلی بار نقاہت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"شاید پیٹر کا ذاتی محافظ تمہاری چابیاں لے کر فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔"

"اوہ!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "شاید اس طرح وہ میری اصلیت کا پتہ چلانا چاہتا ہوگا کیونکہ میں نے سختی سے اپنی زبان بند رکھی تھی۔"

"پھر اسے فلیٹ کا علم کیوں کر ہوا؟"

"میں نے دانستہ فلیٹ کا پتہ بتا دیا تھا۔" اس نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم وہاں مقفل ہو للٰہذا اسے اندر گھستے ہی چھاپ لو گے۔"

میں مسکرا کر رہ گیا کیونکہ اس بارے میں اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ "وہ فلیٹ میں میرے ہاتھوں مارا گیا۔"

"مگر تم یہاں کیسے پہنچے؟" میری رسائی کے بارے میں اس کا تجسس برقرار تھا۔

"نجیب!" میں نے کہا۔

"نجیب؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"اسٹین گن لیے عمارت سے باہر موجود ہے۔" میری زبان سے یہ سن کر وہ اچھل پڑی اور میں اسے آہستہ آہستہ اپنے وہاں تک پہنچنے کی کہانی سنانے لگا۔

عمارت سے باہر نکلنے سے قبل میں نے تین بار الو کی آوازیں نکالی تھیں تاکہ نجیب کو اپنی واپسی کی اطلاع دے سکوں اور جلد ہی اس کی جوابی آوازیں سنائی دیں ہم دونوں اس منحوس عمارت سے باہر نکل گئے۔

نجیب کو کیتھی کی خستہ حالی دیکھ کر شدید صدمہ ہوا لیکن یہ بات اس کے لیے بھی باعث مسرت ثابت ہوئی کہ ہماری بروقت مداخلت کے باعث وہ زندہ نظر آ رہی تھی۔

"تم اندر جا کر ایک بار اچھی طرح عمارت کی تلاشی لے ڈالو۔" میں نے نجیب سے کہا۔ "ہم دونوں یہیں تمہارے منتظر ہیں۔"

نجیب باہر موجود کار کی چابی میرے حوالے کر کے بلا چوں و چرا اندر چل دیا۔

میں نے کیتھی کو وہیں برآمدے میں چھوڑا اور خود باہر جا کر کار اندر لے آیا جس کی ڈکی میں زہر آلود تیروں کے دو شکار پڑے تھے۔ واپس آیا تو کیتھی اس لاش کے قریب کھڑی ہوئی تھی جو میرے زہریلے تیر کا تیسرا شکار تھی۔

"نجیب لوٹ آئے تو اسے بھی کار میں ڈالنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تیروں سے مرنے والے کسی بھی فرد کو یہاں چھوڑنا مناسب نہ ہوگا۔" میں نے انجن بند کر کے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"یہ کار کیا نجیب کے پاس تھی؟" کیتھی نے سوال کیا۔

"نہیں، راستے میں راحیل سے تبدیل کی تھی۔" میں نے بتایا۔ "نجیب کی کار میں پیٹر کے محافظ کی لاش تھی جسے ٹھکانے لگانے کے لیے راحیل کے حوالے کر دیا تھا۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ پیٹر کارلائل اس قدر گھناؤنے کردار کا مالک تھا۔" کیتھی نے پختہ برآمدے کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ تم اُس کے چنگل میں کیسے پھنس گئی تھیں؟" میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے بہت تاخیر سے یاد آیا کہ مُڑے ہوئے کان والا کہاں دیکھا گیا تھا۔" اس نے بتانا شروع کیا۔ "پھر خرطوم میں کام کرنے والے ایک دوست صحافی سے رابطہ قائم کرنے پر پیٹر کی سفارتی حیثیت سامنے آگئی۔ میں اس کی رہائش گاہ میں گھس کر تلاشی کے ذریعے اپنے شبہات کی تصدیق کرنا چاہتی تھی۔ میں اندر گھسنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی لیکن میری بدقسمتی کہ میں جس کمرے میں داخل ہوئی وہاں پیٹر کا خونخوار محافظ پہلے سے آرام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیئے بغیر بجلی کی سی سرعت سے بے ہوش کر دیا۔"

"تمہارے پاس کوئی ایسی چیز تو نہیں تھی جس سے تمہاری شخصیت پر روشنی پڑتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔" وہ پھیکے انداز میں ہنس دی۔ "کرنسی اور چابیوں کے علاوہ میں نے دانستہ ایسی کوئی چیز ساتھ نہیں لی تھی۔"

"تشدد کے دوران میں کوئی۔۔۔" میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے ایک نازک سا سوال کرنا چاہا جسے وہ فوراً ہی سمجھ گئی۔

"نہیں۔" مجھے اپنا سوال پورا کرنے کا موقع دیئے بغیر اس نے جواب دیا۔ "غنیمت ہے کہ انہیں کسی کمینگی کے مظاہرے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔"

"تم نے تنہا اس سے ٹکرانے کا فیصلہ کر کے حماقت کا ثبوت دیا تھا۔" میں نے نرم لیکن ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے خود بھی اندازہ تھا مگر تمہارے رویئے نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میرا رویہ؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! میرے ساتھ تمہارا استہزا آمیز رویہ۔ شاید تم سوچ رہے تھے کہ میں تمہارے اور سیتا کے درمیان حائل ہونا چاہتی ہوں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب سیتا کا سراغ میں تنہا ہی حاصل کروں گی۔"

"میں نے کبھی بھی ایسا نہیں سوچا۔" میں نے دانستہ جھوٹ بولا مگر دل ہی دل میں مجھے اس کے مشاہدے کی داد دینی پڑی کیونکہ اس نے میرے بارے میں بالکل صحیح اندازہ قائم کیا تھا۔ "یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔"

"خیر۔ جو کچھ بھی ہو۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔ "میں نے جو سوچا تھا وہ کر دکھایا۔ اب یہ میرے مقدر کی خرابی تھی کہ پیٹر کے ہاتھوں میں خود اسیر ہو گئی۔"

اسی وقت عمارت کی جانب سے کئی قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ عمارت کے نکاسی کے راستے سے حبیب دو سفید فام عورتوں کے ساتھ باہر آ رہا تھا۔

"یہ کہاں تھیں؟" کیتھی نے متحیرانہ لہجے میں سوال کیا۔

"عمارت میں ایک تہہ خانہ بھی ہے۔" حبیب نے بتایا۔ "انہیں وہاں بستروں سمیت ہر قسم کا آرام میسر تھا مگر یہ اوپر کی دھماچوکڑی سے خوف زدہ تھیں۔"

"تم لوگ کون ہو؟" میں نے متوحش نظر آنے والی ان دونوں عورتوں سے نرمی سے سوال کیا جس کا کوئی جواب نہ ملا۔

ان دونوں کے چہرے سپاٹ ہی رہے۔ جیسے وہ میری بات نہ سمجھی ہوں۔ پھر ان میں سے ایک بولنے لگی۔ مگر اس کی زبان میرے لیے اجنبی ثابت ہوئی۔

"انگریزی!" میں نے اسے ٹوکا۔ "کیا تم انگریزی بول سکتی ہو؟" اور دوسری نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنی شروع کر دی۔

ان دونوں کا تعلق یوگوسلاویہ سے تھا۔ وہ اپنے ملک سے سیاحت کے لیے نکلی تھیں۔ اور خرطوم پہنچ کر قلاشی کا شکار ہو گئیں۔ اس اثنا میں ان کا رابطہ ایک مقامی سے ہوا جس نے بھاری معاوضے پر باعزت ملازمت دلانے کا جھانسہ دے کر انہیں اس عمارت میں پہنچا دیا اور وہ دو روز سے تہہ خانے میں بند کسی پیش رفت کی منتظر تھیں۔

ان سے پتہ چلا کہ تہہ خانے میں انہیں ہر قسم کی آسائشیں میسر تھیں، لوگوں کا رویہ بھی اچھا ہی تھا لیکن مڑے ہوئے کان والا، پچھلے دو روز سے ان سے تمام آسائشوں کا معاوضہ اپنے اوباش انداز میں وصول کر رہا تھا جس پر ان دونوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ اس طرح وہ ہر قسم کی صعوبتوں سے محفوظ تھیں۔

ان سے پتہ چلا کہ پیٹر کو مشرقی یورپ میں بولی جانے والی کئی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا اور شراب کے سرور میں وہ انہیں بہترین رفاقت فراہم کرتا تھا۔

ہمارے لیے وہ دونوں عورتیں بیکار تھیں۔ انہیں ساتھ لے جانا بھی مشکل تھا اور ایک بار اندر ہونے والے خون خرابے کے آثار دیکھ لینے کے بعد وہ دوبارہ وہاں داخل ہونے پر ہرگز آمادہ نہ ہوتیں۔ کیتھی کے مشورے پر یہی طے پایا کہ ان دونوں کو ساتھ لے جا کر راستے میں کہیں بھی اتار دیا جائے۔ وہ خود اس قدر خوفزدہ تھیں کہ ان سے کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور شاید وہ پولیس سے رجوع کرنا پسند نہ کرتیں۔

"اگر تم پولیس کا رخ کیے بغیر خرطوم سے بھاگ جانے کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں شہر چھوڑ دیں گے۔" کیتھی نے انہیں پیشکش کی۔

"ہم تیار ہیں مگر ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

نیلی آنکھوں اور گداز بدن والی عورت نے بے بسی سے کہا۔

اس وقت اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ وہ دو روز سے وہاں مقیم تھیں لہٰذا میں نے ایک سوال کر ڈالا "تم آئیں تو تہہ خانے میں اور کون تھا؟"

"ہم سے پہلے تین لڑکیاں تھیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ان میں نیلی آنکھوں والی لڑکی بہت طرار اور خونخوار تھی، کھانا وغیرہ لانے والے بھی اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔"

"وہ کہاں گئیں؟" میں نے اضطراری انداز میں سوال کیا۔

"ہمارے آنے کے چند گھنٹے بعد ہی وہ لوگ انہیں نکال لے گئے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر فوراً چلو۔" کیتھی نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اگر انھیں گئے ہوئے ڈیڑھ دو دن ہی ہوئے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم راستے ہی میں انہیں جا لیں۔"

اس اثنا میں بجیب مٹی پر پڑی ہوئی تیسری لاش کار کی ڈکی میں ٹھونس چکا تھا۔ عورتوں نے ادھر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کار ایسے رخ سے کھڑی ہوئی تھی کہ انہیں اپنی کوشش میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ورنہ پہلے سے موجود دو لاشیں انہیں ضرور خوفزدہ کر دیتیں۔

واپسی کا سفر بہت عجلت میں شروع ہوا۔ بجیب نہایت مہارت سے تاریک سڑک پر تیزی سے کار دوڑا رہا تھا۔

"اگر ان تینوں کو بھی اسمارہ ہی لے جایا گیا ہے تو امید ہے کہ وہ ابھی راستے ہی میں ہوں گی۔" کیتھی کہہ رہی تھی۔ "وہاں سے آگے کا سفر شاید بحری راستے سے طے کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنوبی افریقہ پہنچنے سے قبل انہیں رہا کرایا جا سکتا ہے۔"

"کاش ایسا ہو سکے۔" میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

جب ان دونوں عورتوں کو خاصی رقم دے کر قدرے آباد علاقے میں کار سے اتارا گیا تو وہ خاصی خوفزدہ ہو گئیں۔ صبح طلوع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی اور اتنی رات گئے ویران سڑکوں پر دو غیر ملکی عورتوں کا تنہا گھومنا ہر اعتبار سے مخدوش تھا مگر ہمارے لیے اس سے زیادہ تعاون نادیدہ مشکلات کا سبب بن سکتا تھا لہٰذا انسانی ہمدردی کے جذبات کو زبردستی نظرانداز کر کے ہم آگے بڑھ گئے۔

کار کے سرکتے ہی کیتھی نے بجیب کو ایک رہائشی علاقے کا رخ کرنے کا حکم دیا۔

"پہلے لاشوں سے تو چھٹکارا حاصل کر لو۔" میں نے چونک کر کہا۔ "اس طرف اچانک کیا کام یاد آ گیا تمہیں؟"

"بجیب ہم دونوں کو چھوڑنے کے بعد ان کا بندوبست کرے گا۔" کیتھی نے کہا۔ "وہاں پیٹر کارلائل کی قیامگاہ سے تھوڑی دور میری کار کھڑی ہے۔ ہم اس پر شعبان کی طرف جائیں گے، اب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔"

"شعبان کا ملنا مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ٹریلر لے کر نکل گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ راستے میں پکڑا جا سکے۔"

"ملے یا نہ ملے کم از کم اس کی روانگی کے بارے میں صحیح اطلاعات تو مل سکیں گی۔" کیتھی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر کار میں خاموشی چھا گئی۔ رات کے سناٹے میں کار کے انجن کا شور بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا اور ہم تینوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔

حالات نے یکایک پلٹا کھایا تھا اور آنے والے لمحات کے تصور سے میں اپنے رگ و پے میں سنسنی سی پھیلتی محسوس کر رہا تھا۔

"مادام" کافی دیر کے مسلسل سکوت کے بعد کار کے انجن کے شور میں بجیب کی فکرمند آواز ابھری۔

کیتھی کا ردِعمل مجھ سے مختلف نہیں تھا، وہ یوں چونکی تھی جیسے بے خیالی میں اس کا ہاتھ ننگے برقی تار سے چھو گیا ہو!

"کیا بات ہے؟"

"برا نہ مانو تو کچھ کہوں؟" بجیب کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"کہہ ڈالو۔" کیتھی کی آواز ابھری۔ "اس وقت مجھے اپنا ہم رتبہ ہی سمجھو!"

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت عالی ہمت ہو!" بجیب نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "لیکن اس وقت تم بہت خستہ حالت میں ہو، تمہارا چہرہ نیلا ہو رہا ہے۔ بازو زخمی ہیں اور لباس جگہ جگہ سے جلا یا پھٹا ہوا ہے، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم پہلے ان چیزوں پر توجہ دو!"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔" کیتھی نے تیز لہجے میں کہا۔ "اس وقت ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے!"

"بجیب درست کہہ رہا ہے کیتھی!" میں نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "تم راستے میں قصر السودان پر رک جانا، ہم کسی اور کار میں آگے نکل جائیں گے!"

کار میں پھیلے ہوئے خنک اندھیرے میں کیتھی کی ہنسی کی آواز ابھری۔ "قصر السودان ہم میلوں پیچھے چھوڑ آئے، واپسی میں شاید بجیب نے مختصر راہ اختیار کی ہے!"

"وہ درست ہے مادام!" میری شہہ پا کر بجیب نے جلدی سے کہا۔ "تمہاری کار میں ہم دونوں شعبان کی طرف چلے جائیں گے تم یہ کار لے کر قصر السودان واپس چلی جانا۔"

"تمہاری ہمدردی کا شکریہ بجیب!" کیتھی کا لہجہ خشک تھا۔ "مگر میں اپنی ترجیحات سے بخوبی واقف ہوں، تم وہی کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔"

"بہتر مادام!" اس کے سعادت مندانہ جواب پر مجھے حیرت ہوئی!

"ضد نہ کرو کیتھی، دن کی روشنی میں اس حلیے میں تم اچھا خاصا تماشا بن جاؤ گی۔ اجالا پھیلنے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"کمال ہے کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولی "اگر شعبان کے بارے میں کوئی خبر مل گئی تو ہم فوراً اس کے تعاقب میں روانہ ہو جائیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ جب بجیب اور تم کوئی اطلاع لے کر قصر السودان میں مجھ تک پہنچو تو شعبان ہماری زد





سے مزید دُور جا چکا ہو۔"

اس کی بات معقول تھی لہٰذا میں خاموش ہو گیا۔

اس وقت اس کا لب و لہجہ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لوگوں سے اپنے احکام منوانے کی فن پر عبور رکھتی ہے۔

خرطوم کی ویران اور سنسان سڑکوں کے پیچ و خم طے کرتے ہوئے ایک جگہ اچانک ہی کیتھی کی گاڑی سامنے آ گئی اور نجیب نے سیاہ کار کی روشنیاں گل کر کے اسے پیچھے ہی روک دیا۔

"ہتھیار؟" نجیب نے سوال کیا۔

"میری کار میں سب کچھ موجود ہے!" کیتھی نے کہا اور تیزی سے نیچے اتر کر دروازہ بند کر دیا۔ میں اس سے پہلے نیچے آ چکا تھا۔

ہمیں اتارتے ہی نجیب روشنیاں جلائے بغیر اس کار کو تیزی سے آگے بڑھا لے گیا۔ جو اس وقت مُردے ڈھونے والی گاڑی بنی ہوئی تھی۔

اپنی کار کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہی کیتھی کے منہ سے بے اختیار ایک تاسف آمیز آواز آزاد ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"چابی!" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "میرا چابیوں کا گچھا تو پیٹر کارلائل کے محافظ نے چھین لیا تھا..... خیر ایک شیشہ توڑ کر تار ملا لیں گے!"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی!" میں نے جیبیں ٹٹول کر چابیاں اس کی طرف بڑھا دیں "اسے مارنے کے بعد میں نے چابیاں محض احتیاطاً جیب میں ڈال لی تھیں تاکہ تمہاری واپسی تک فلیٹ میں مقید ہونے کا احساس نہ رہے!"

"تمہارے بعض کام بہت برجستہ ہوتے ہیں!" میرے ہاتھ سے چابی لیتے ہوئے وہ بے ساختہ بول اٹھی اور پھر چند ہی ثانیوں میں اس کی کار وہاں سے روانہ ہو گئی۔

"تم نے ابھی تک پیٹر کارلائل کے محافظ والا قصہ نہیں سنایا۔" تیز رفتاری سے ویران سڑکوں پر کار دوڑاتے ہوئے کیتھی نے کہا۔ شاید اس طرح وہ ذہنی طور پر خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔

"کوئی قصہ ہی نہیں ہوا، بس وہ اندر داخل ہوا اور میں نے اندھیری خوابگاہ میں اس کی ٹارچ کی روشنی پہنچنے سے پہلے اسے زہریلے تیر کا نشانہ بنا دیا۔" میں نے کہا۔

"اس کی لاش کہاں ہے؟"

"وہ پیٹر کارلائل کی مضافاتی قیامگاہ کی طرف جاتے ہوئے قصر السودان سے ذرا آگے راحیل کے حوالے کر دی گئی تھی۔"

"پھر تو اب تک اس کا آخری سراغ بھی معدوم ہو چکا ہوگا۔"

وہ قہقہہ مار کر بولی۔ "مگر نجیب تم سے کیسے ٹکرا گیا؟"

"گمالیوں سے ابتدا ہوئی تھی۔" میں نے اسے شروع سے تفصیل بتانی شروع کی تو وہ اس سے خاصی محظوظ ہوئی۔

"تم نے صحیح وقت پر صحیح آدمی سے رابطہ قائم کیا ورنہ اب تک محافظ کی لاش کے سرہانے بیٹھے میرے بارے میں سوچ رہے ہوتے!"

"اس حویلی میں معظم کو زندہ چھوڑ کر میں نے بُرا کیا۔" قدرے توقف کے بعد میں نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ "کہیں وہ ہوش میں آنے کے بعد بھانڈا نہ پھوڑ دے، شاید اس نے تمہیں بھی دیکھا ہوگا اور میں تو کافی دیر اس کے ساتھ رہا تھا۔"

"اپنے سارے ساتھیوں کے علاوہ پیٹر کی لاش دیکھ کر وہ... بدحواس ہو جائے گا۔" وہ بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ اس قضیے سے اپنی ذات کو بالکل ہی الگ کر لے، مجھے اس کی طرف سے بے فکری ہے اور بقول تمہارے وہ اپنی ملازمت سے بدظن بھی تھا۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو!" میں نے کہا پھر چند ثانیوں کے سکوت کے بعد سوال کیا۔ "کیا تم کسی تیاری کے بغیر اسمارہ جانے کا ارادہ کر رہی ہو؟"

"تیاری کا وقت کہاں ہے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "پھر بھی شاید نجیب جلد از جلد شعبان کے ٹھکانے پر پہنچنے کی کوشش کرے گا، کچھ مدد اس سے مل جائے گی۔"

"مگر تم نے اسے شعبان کا پتہ نہیں بتایا تھا!"

"شعبان اس کے لئے نیا آدمی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کے پاس بس ایک ہی ٹریلر ہے جسے وہ خود ایتھوپیا اور سوڈان کے درمیان چلاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے بارہا وہاں سے چوری چھپے اسلحہ لایا ہے مگر اب پتہ چلا کہ وہ دوسری غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہے۔ ان کاموں میں اسے اتنا بھاری معاوضہ مل جاتا ہوگا کہ وہ توسیع کی فکر نہیں کرتا!"

"توسیع کے ساتھ عملے میں بھی اضافہ ہوگا اور راز داری خطرے میں پڑ جائے گی۔ شاید لوگ محض اس لئے اس پر اعتماد کرتے ہیں کہ تنہا ہے!"

"تنہا تو خیر نہیں ہے، اس کا اکلوتا لڑکا اس کے ساتھ ہوتا ہے مگر تمہاری بات درست ہے۔ اس سے ہم راز داری کی ہی وجہ سے متعارف ہوئے تھے۔"

"وہ ہر چکر میں کچھ نہ کچھ گھپلا کرتا ہوگا۔" میں نے باوثوق لہجے میں کہا۔ "مویشیوں کی باربرداری تو محض آڑ ہوگی۔"

جس وقت ہم خرطوم کی اس متوسط آبادی میں داخل ہوئے تو آسمان کے مشرقی گوشوں پر صبح کی ابتدائی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔

ایک جگہ کار روک کر کیتھی نے ڈیش بورڈ سے ریوالور نکالا اور نیچے اتر کر کار کے دروازے مقفل کر دیے۔

"کتنی دور ہے یہاں سے؟" میں نے سوال کیا۔

"بس چلے آؤ، تھوڑی ہی دور ہے!" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اور میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

کیتھی عجیب دل گردے کی لڑکی تھی! اس وقت وہ ایسی ابتر اور مشتبہ حالت میں تھی کہ اسے دیکھنے والا یقیناً ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتا۔ مجھے سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ کہیں گشت پر نکلا ہوا کوئی سپاہی ٹکرا گیا تو سیتا کے بارے میں نہ صرف ساری عجلت دھری رہ جاتی بلکہ اپنی گلوخلاصی مشکل ہو جاتی۔

چند قدم آگے چل کر کیتھی ایک تنگ گلی میں گھس گئی۔ پھر تنگ گلیوں میں پیچ در پیچ سفر کا آغاز ہوا جس کا اختتام ایک کشادہ علاقے میں ہوا جہاں سفید رنگ کے بڑے سے پھاٹک پر عربی میں شرکہ شعبان المزینی لکھا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ پھاٹک کے عقب میں کھلا احاطہ تھا جو شاید ٹریلر کے گیراج کا کام دیتا تھا مگر کیتھی اسے نظرانداز کر کے گیراج سے متصل مکان کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

دروازے پر پہلی دو دستکیں بے سود ثابت ہوئیں تیسری دستک کے جواب میں اندر سے ایک جھلائی ہوئی اور خوابناک نسوانی آواز ابھری جو خاصی مدھم تھی۔ "کون ہے؟"

"جلدی دروازہ کھولو!" کیتھی نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "ہم شعبان کے لئے ایک بُری خبر لائے ہیں۔"

اندر سے آنے والی نسوانی آواز سن کر میں بوکھلا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کیتھی شعبان کے بارے میں اس کے کسی دوست وغیرہ سے معلومات حاصل کرے گی۔ مگر بادی النظر میں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ جوش میں شعبان کی بیوی پر چڑھ دوڑی ہو جو شوہر کے چلے جانے کے بعد شاید اس مکان میں اکیلی تھی۔

کیتھی کے الفاظ مؤثر ثابت ہوئے اور دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔ بستر سے اٹھ کر دروازے پر آنے والی گہرے گندمی رنگ کی ایک جواں سال عورت تھی۔ جس کا خوابناک چہرہ بکھرے ہوئے سیاہ بالوں کے ہالے میں بہت پُرکشش نظر آ رہا تھا۔ اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں کیتھی پر اشتباہ آمیز انداز میں جم گئیں۔

"اندر آنے کا راستہ دو!" کیتھی نے اسے پس و پیش میں مبتلا دیکھ کر تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

اس عورت نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر اس کی آنکھیں دہشت زدہ انداز میں پھیل گئیں۔ میں کیتھی کے عقب میں ضرور تھا مگر مجھے یہ قیاس کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ کیتھی نے اس پر ریوالور تان لیا تھا۔

وہ لڑکھڑانے والے انداز میں راستے سے ہٹی اور کیتھی پھرتی سے اندر داخل ہو گئی۔ میں نے بھی اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

سیاہ فام دوشیزہ اس ڈیوڑھی نما کمرے کے وسط میں کھڑی خوف زدہ نظروں سے مسلسل کیتھی کو گھورے جا رہی تھی۔

"شعبان کہاں ہے؟" کیتھی کا لہجہ سرد تھا۔

اس بار اس نے ہمت کر ہی ڈالی "تم کون ہو اور مجھ پر یہ ہتھیار کیوں اٹھایا ہوا ہے؟"

"اوہ!" کیتھی نے چونک کر ریوالور والا ہاتھ نیچے گرا لیا "شور وغیرہ مچانے کی حماقت نہ کرنا۔ ہم شعبان کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔"

"اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" سیاہ فام دوشیزہ کے الفاظ میں نسوانی حسد اور رقابت کی مخصوص کاٹ میں بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"مطمئن رہو، اس کی داشتہ نہیں ہوں۔" کیتھی کا لہجہ بھی زہریلا تھا "تمہارا مستقبل خطرے میں نہیں ہے۔"

سیاہ فام عورت کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے مگر ان سے کوئی آواز برآمد نہ ہو سکی۔

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے، اگر تمہاری حماقت کی وجہ سے شعبان مارا گیا تو اس کے ورثاء گردن پکڑ کر تمہیں باہر پھینک دیں گے" کیتھی نے اسے خوف زدہ کرنے کے لئے کہا۔

"وہ کل علی الصبح اسمارہ گیا ہے، ٹریلر میں سامان لے کر۔" وہ غیر ارادی طور پر بول پڑی "مگر اسے کن لوگوں سے خطرہ ہے، وہ اسے کیوں مارنا چاہتے ہیں؟"

"اس بار کیا لے گیا ہے؟" کیتھی نے اس کے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ وہ اپنے کام کے بارے میں مجھ سے کبھی بات نہیں کرتا۔"

"یہاں سے ٹریلر خالی گیا تھا؟"

"میں گھر میں رہتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ گیراج میں کیا ہوتا رہتا ہے مگر اس بار جانوروں کے ریوڑوں کی آوازیں نہیں سنائی دی تھیں"

"شعبان کی واپسی تک ہمارے بارے میں تم اپنی زبان بند رکھو گی" کیتھی نے کہا "ذرا بھی زبان کھولی تو صحرائی شاہراہ پر شعبان کے لئے جہنم جاگ اٹھے گا۔"

اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی۔ اور وہ رونے لہجے میں بولی "کچھ بتاؤ تو سہی ۔۔۔ خدا کے لئے کچھ تو بتاؤ!"

"فی الحال اسی قدر کافی ہے!" کیتھی نے کہا اور اس کو ہکا بکا چھوڑ کر ہم دونوں پھرتی سے باہر نکل آئے!

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" تنگ و تاریک گلیوں میں گھسنے کے بعد میں نے کہا۔

"پیٹر کے زیر زمین قید خانے سے برآمد ہونے والی لڑکیوں کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔" اس نے جواب دیا "یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تینوں لڑکیوں کو تہہ خانے سے ضرور پرسوں نکالا گیا تھا۔ مگر انہیں خرطوم چھوڑے بمشکل چوبیس گھنٹے ہوئے ہیں!"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ عورت شعبان کی داشتہ ہے؟" میں نے اپنے ذہن میں چبھنے والا سوال کیتھی سے کر ڈالا۔

"تنظیم کے معاملات میں جن لوگوں سے مستقل بنیادوں پر رابطہ قائم کیا جاتا ہے ان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کی جاتی ہیں!"

"شعبان کے لڑکے کی کیا عمر ہے؟"

"اٹھارہ بیس برس ہو گی ۔۔۔ وہ کیوں یاد آ گیا؟"

"اسے بھی اس داشتہ کا علم ہو گا؟"

"اوہ ۔۔۔" وہ لا پروائی سے بولی "یہاں سب چلتا ہے معاشرے میں بھی ایسے لوگوں کے مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا، با حیثیت طبقے کا ہر فرد فخریہ طور پر بیویوں کے علاوہ ایک دو عورتوں کی باقاعدہ کفالت کرتا ہے۔"

"جدید مواصلاتی رابطوں کے باوجود یہ لوگ ذہنی طور پر قبائلی دور میں زندگی گزار رہے ہیں!" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے میری رائے کی تائید کی "سوڈان میں لوگوں کی تقسیم علاقائی بنیادوں کے بجائے آج بھی قبائل پر ہے قبائلی رسوم و رواج کے خاتمے کی رفتار یہاں بہت زیادہ سست ہے ذہنی طور پر ہر شخص اسی فرسودہ نظام سے چپکا رہنا چاہتا ہے۔ اسی لئے ساری جہالت اعزاز میں ملی ہوئی ہے!"

کیتھی کی کار تک ہم عافیت سے پہنچ گئے اور اس نے انجن اسٹارٹ کر کے کار کو واپس گھما لیا۔ اس کی کار بمشکل چند فٹ ہی بڑھی ہو گی کہ اچانک سامنے کے ایک موڑ سے کسی تیز رفتار کار کے ہیڈ لیمپس روشن ہوئیں اور کیتھی نے اپنی کار سڑک کے کنارے کر لی تاکہ آنے والے جنونی کو آگے بڑھنے کے لئے کافی راستہ مل سکے۔

مگر وہ کار تیزی سے ہمارے برابر میں آ کر رک گئی۔

اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر نجیب موجود تھا۔ اس کے برابر میں گونگا راحیل کسی قدِ آدم سنگین بت کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس بار وہ دونوں سیاہ کار کے بجائے نجیب کی کار میں تھے۔ سیاہ کار شاید لاشوں سمیت کسی کے حوالے کر دی گئی تھی۔

"اسے کیوں لے آئے؟" کیتھی نے کھڑکی میں سے سر نکال کر قدرے ناخوشگوار لہجے میں نجیب سے سوال کیا۔

"میرا خیال تھا کہ شاید مادام اسے ساتھ لے جانا چاہیں" نجیب کی مدافعانہ آواز آئی "یہ خالی تھا تو میں لے آیا!"

"بہر رقم ہے!" قدرے توقف کے بعد نجیب کی سرگوشی سنائی دی اور کیتھی نے اس سے ایک پیکٹ لے کر میری گود میں ڈال دیا۔

پھر کیتھی نے تیزی سے کار آگے بڑھا لی۔ چند منٹ کی خاموشی سانت کے بعد جب ہم ایک ویران سڑک پر پہنچے تو کیتھی نے کار روک دی اور نیچے اتر گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تھوڑی دور تم چلاؤ۔ دن پوری طرح طلوع ہونے سے پہلے میرا حلیہ درست ہو جانا چاہئے۔" اس نے دروازہ کھول کر عقبی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے سرک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار آگے بڑھا دی "حلیہ کیسے درست ہو گا؟ سب سے پہلے تو تمہیں قرینے کے لباس کی ضرورت ہے۔"

"لباس ہی بدلنے پیچھے آئی ہوں، ذرا عقب نما آئینے کا رخ چھت کی طرف کر دو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور میرے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سرایت کر گئی۔

میں نے ونڈ شیلڈ پر لگا ہوا عقب نما آئینہ ہاتھ مار کر چھت کے رخ پر کر دیا "مگر ۔۔۔ مگر لباس کہاں سے آیا؟"

اپنی آواز مجھے خود بھاری محسوس ہوئی تھی۔

"ایک بریف کیس ہر وقت عقبی پائیدان پر پڑا رہتا ہے، اس میں ہنگامی ضرورت کے لئے دو جوڑے اور دوسری اشیاء موجود رہتی ہیں۔"

عقبی نشست پر اس کی مصروفیات جاری رہیں اور چند منٹ بعد اس نے اطمینان کا ایک طویل سانس لے کر مجھے عقب نما آئینہ درست کرنے کی اجازت دے دی۔

آئینہ درست کرنے پر مجھے وہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس نظر آئی۔ باہر تیزی سے پھیلتا ہوا کہر آلود اجالا پوری طرح اس کی مدد کر رہا تھا اور وہ وینٹی بیگ سے سامان نکال کر آئینے کی مدد سے میک اپ میں مصروف تھی۔

فارغ ہونے کے بعد وہ اچک کر میرے برابر والی سیٹ پر آ گئی۔

"خوب!" میں نے اس کے شگفتہ سراپا پر تحسین آمیز نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا "کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم وہی تھوڑی دیر پہلے والی لڑکی ہو!"

"لکوئڈ میک اپ نیل اور داغ چھپانے کے لئے بڑا کارآمد ہوتا ہے!" وہ پُرسکون انداز میں سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔

"شوہر کے ہاتھوں پٹنے والی عورتوں میں بہت مقبول ہو گا۔"

"کیوں؟" اس نے بیساختہ حیرت سے سوال کیا۔

"زود حس مرد حسین چہرے پر رحم کر کے سالم لڑکی کو بیوی بنا بیٹھے ہیں یا غصے کے عالم میں عموماً اسی پر طمانچے برساتے ہیں۔ سیال میک اپ سارے نیل چھپا کر بھرم قائم رکھنے میں بیویوں کی بڑی مدد کرتا ہو گا۔"

پوری بات سمجھ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

شہر کی ایک کشادہ شاہراہ پر واقع پٹرول پمپ سے ٹنکی بھرواتے ہوئے کیتھی دوبارہ اسٹیئرنگ پر آ گئی۔ اس کا چہرہ معمولی ورم اور خراش کے علاوہ پوری طرح شگفتہ نظر آ رہا تھا۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ کسی کے تشدد کا شکار رہی ہو گی۔ بازو اور جسم کے نچلے حصوں کی خراشیں لباس نے چھپا لی تھیں۔

سورج کی روپہلی کرنیں نمودار ہونے تک ہم خرطوم سے مشرق میں نکلنے والی شاہراہ پر پہنچ چکے تھے۔

"پیٹر کارلائل کی کہانی پر مجھے اب تک یقین نہیں آ سکا" کافی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے ہی سکوت توڑنے میں پہل کی۔

"کون سی کہانی؟" کیتھی محویت سے چونک پڑی۔

"کیا تم یقین کر سکتی ہو کہ آج کے مہذب دور میں سرکاری سرپرستی میں کسی ملک میں عورتوں سے حیوانی انداز میں افزائش نسل کا کام لیا جا سکتا ہے؟"

"آج کا مہذب دور!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی ۔۔۔ "بردہ فروشی میں ملوث ایک سفارت کار کے اعترافات تم سن ہی چکے ہو ۔۔۔ اس کے بعد تبصرے کے لئے کیا رہ جاتا ہے! انسان آج بھی وہی ہے جو پتھر کے دور میں تھا بلکہ شاید زیادہ وحشی، فرق بس اتنا ہے کہ اس پر چڑھا ہوا خول دو، بدن موٹا ہوتا جا رہا ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ پیٹر نے ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کی ہو۔"

"اسلحے کی زد پر آیا ہوا زندگی سے پیار کرنے والا کوئی مجرم اتنا پکا نہیں ہوتا۔" اس نے کہا "ہمیں کافی عرصے سے اطلاعات مل رہی تھیں کہ یورپ میں روزگار دلانے والے ادارے جنوبی افریقہ کے لئے بھاری تعداد میں سفید فام عورتیں بھرتی کر رہے ہیں جس کے لئے انہیں گرانقدر کمیشن مل رہا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ اس طرح وہ لوگ نو آبادکاری کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پیٹر نے جو کچھ بتایا ہے وہ درست ہی ہو گا۔"

"پھر اس معاملے میں جنوبی افریقہ کے حکمراں ہٹلر کی تقلید کر رہے ہیں؟" میں نے کہا "ان کا بھی انجام برا ہی ہو گا!"

"تو کیا ہٹلر بھی بردہ فروشی میں ملوث تھا؟"

"اس اعتبار سے وہ بہتر تھا، اس نے جرمنوں کی اگلی نسل کو دنیا کی بہترین قوم بنانے کے لئے ایک منصوبے کا آغاز کیا تھا جس کے تحت بھرپور ذہنی اور جسمانی ساخت رکھنے والے جرمن مردوں اور عورتوں کو یکجا کر کے ایک ناقابل شکست نسل پیدا کی جا رہی تھی۔ ایسے تمام بچوں کی ولدیت ہٹلر کے نام سے معنون ہوا کرتی تھی۔"

"اس کا مجھے علم نہیں تھا!" اس نے حیرت سے کہا۔

باتوں کے درمیان سفر جاری رہا۔ خرطوم سے جانے والی اس شاہراہ پر دونوں طرف ریت کا میدان پھیلا ہوا تھا جس میں جا بجا درختوں کی قطاریں موجود تھیں۔ خرطوم سے تقریباً چالیس میل دُور نکلنے کے بعد ایک قصبے کے آثار نظر آئے تو کیتھی نے کار کی رفتار سست کر لی۔

اس وقت دن پوری طرح طلوع ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی۔ اور سورج مشرقی افق پر خاصا اونچا ہو چکا تھا۔ کھلے میدانی علاقے اور روشن دھوپ کے باعث اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دن نکلے کئی گھنٹے گزر چکے ہوں!

اس صحرائی قصبے کی آبادی تو شاہراہ سے کئی سو گز اندر واقع تھی۔ جہاں سوڈان کی دیہی زندگی کے بیشتر عناصر جیتے جاگتے نظر آ رہے تھے لیکن سڑک کے کنارے گارے سے بنا ہوا ایک سرائے نما ہوٹل اور دو دکانیں شاید شاہراہ سے گزرنے والے مسافروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔

ہوٹل کے سامنے کار رکتے ہی لمبی ٹوپی اور ڈھیلے لبادے میں ملبوس ایک مقامی تیر کی طرح ہماری طرف آیا۔

"اندر بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ ہے؟" کیتھی نے کار سے اترتے ہوئے اس مقامی سے عربی میں سوال کیا!

"جگہ بہت ہے مگر تم جیسی مِسی کے لئے مناسب نہ ہوگی۔" وہ خوشامدانہ انداز میں اپنے دودھ جیسے سفید دانت چمکاتے ہوئے بولا۔ "حکم دو، جو کہوگی وہ یہیں لے آؤں گا۔"

کیتھی نے قہوہ اور دو چار بسکٹوں کی فرمائش کی اور وہ بے ہنگم انداز میں دوڑتا ہوا ہوٹل کی طرف ہو لیا۔

"باہر سردی ہے!" کیتھی اندر بیٹھ کر زور زور سے اپنی دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑتے ہوئے بولی۔

اسی وقت قرب و جوار میں آوارہ پھرتے ہوئے گدھوں کی ٹولی میں سے ایک میری طرف کی بند کھڑکی کے قریب نہایت مسکین انداز میں آ کھڑا ہوا!

"کچھ کہنا چاہتا ہے تم سے!" کیتھی نے اس کی طرف دیکھ کر قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"اسے معلوم ہے کہ میں ترجمان کے ساتھ سفر کر رہا ہوں!" میں نے لاپروائی سے کہا۔

کیتھی کا منہ بن گیا۔ "میں گدھوں کی طرح بولتی ہوں؟"

"سمجھتی ضرور ہوگی!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے تیور خراب ہو گئے، شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن لمبی ٹوپی والے کی آمد کے باعث اسے خاموش ہو جانا پڑا۔

وہ احمقانہ انداز میں اپنے سر پہ ایک چھوٹی سی میز اٹھا لایا تھا جو اس نے کیتھی کی سمت والے دروازے کے پاس رکھ دی۔

"ہم کتنی دُور آ گئے ہیں؟" اس کے جاتے ہی میں نے سوال داغ دیا تاکہ کیتھی اپنی زبان دانی کا متنازعہ مسئلہ دوبارہ نہ اٹھانے پائے اور وہ بے چاری پوری سنجیدگی سے میری اس چال کا شکار ہو گئی۔

لمبی ٹوپی والا دوبارہ آیا تو لدا پھندا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں قہوے کے برتنوں کی بدوضع سی ٹرے تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک کیک اسٹینڈ لٹک رہا تھا۔ جس کی تینوں تھالیوں میں بھانت بھانت کے بسکٹ وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔

"یہ سب نہیں چاہیے۔" کیتھی نے دروازہ کھول کر احتجاج کیا۔ "دو نمکین بسکٹ چھوڑ کر باقی سامان واپس لے جاؤ۔"

"فکر نہ کریں۔" وہ دانت نکال کر بولا۔ "جو کھانا ہو، کھا لیں بچنے والا سامان بخوشی واپس لے جاؤں گا۔"

قہوہ گرم اور لذیذ تھا لیکن بسکٹ وغیرہ باسی اور انتہائی ناقص تھے۔ ہم دونوں پیالیاں لے کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

چند ثانیوں بعد کسی چیز کے گرنے کی آواز نے چونکا دیا اور نگاہیں اٹھاتے ہی پوری صورتحال واضح ہو گئی۔

ایک جغادری گدھے نے منہ مار کر پورا کیک اسٹینڈ ریت پر گرا دیا تھا اور اطمینان سے گرے ہوئے لوازمات پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔

مجھے گدھے کی اس حرکت پر بہت تاؤ آیا لیکن کچھ کرنا بے سود تھا۔ اسی وقت لمبی ٹوپی والا کہیں سے نمودار ہو گیا اور گدھے کو بُرا بھلا کہتے ہوئے ریت سے کیک اسٹینڈ اٹھا لے گیا۔

تھوڑی دیر بعد پیسوں کی ادائیگی کا معاملہ آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ گدھے کی وہ ضیافت خاصی مہنگی پڑی تھی۔ کیتھی نے لمبی ٹوپی والے سے تکرار کرنی چاہی لیکن میں نے اسے خاموش کر دیا۔

ہماری مرضی کے خلاف اس نے وہ تمام اشیاء وہاں رکھ کر اگر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا تھا تو ہم دونوں بھی لاپروائی کے مرتکب ہوئے تھے۔

اس مرحلے سے نمٹ کر سڑک کی طرف بڑھے تو ایک معذور بھکاری سامنے آ گیا۔ کیتھی نے کار روک لی۔

"خیرات تو نہیں، تمہیں انعام ضرور ملے گا۔ اگر تم ایک سوال کا درست جواب دے سکو!" کیتھی نے شیشہ اتار کر اس بوڑھے سے کہا۔

"جو خوشی سے دے دو بابا!" اس نے دستِ سوال دراز کر دیا۔

"یہ آوارہ گدھے کس کی ملکیت ہیں؟" کیتھی نے سوال کیا۔

"میں سب دیکھ رہا تھا۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "روز دو چار مرتبہ یہی تماشا ہوتا ہے مگر خدا کے لئے اس سے لڑنا نہیں ورنہ وہ مجھے مارے گا۔"

"کون؟"

"وہی ہوٹل والا۔۔۔ سارے گدھے اسی کے ہیں اور گاہکوں کے پیسے پر پل کر روز بروز خچروں سے زیادہ طاقتور ہوتے جا رہے ہیں!"

کیتھی نے اس کی ہتھیلی پر ایک نوٹ رکھ کر کار آگے بڑھا دی۔

"بڑا ذہین آدمی ہے ہوٹل والا۔" میں نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا۔ "گدھوں سے سیلز پروموشن کا کام لے رہا ہے!"

"مسافروں کو بے وقوف بنا کر پیسے بٹورنا ان لوگوں کا دل پسند مشغلہ ہے!" وہ منہ بنا کر بولی۔ "شاہراہوں پر آباد لفِصف سے زیادہ قبائل اسی رجحان میں مبتلا ہیں!"

"اسے تم قومی مزاج نہیں کہو گی؟"

"نہ نہ!" اس نے جلدی سے کہا۔ "سوڈانی قوم بڑے سیدھے مزاج کی مالک ہے۔ یہاں اب بھی تحمل اور رواداری کے ساتھ انکسار پایا جاتا ہے۔ دُوسرے۔۔۔!"

"شاید تم دوسرے عرب ملکوں کی بات کرو گی۔" میں نے اس کا فقرہ درمیان سے ہی اچک لیا۔ "ان سے موازنہ مت کرو، وہ مالا مال ہیں اور سوڈانی غریب ہیں۔ اُن کے دماغوں میں تو پیسے کا خمار چڑھا ہوا ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہارا مشاہدہ بھی یہی ہے!" وہ بولی۔ "جس دن عربوں کے دماغ سے دولت کا بھوت اتر گیا، یہ اسرائیل کو اپنے ایک ہی ریلے میں بہا لے جائیں گے۔"

"یہودی ہوتے ہوئے تمہارے یہ خیالات ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں یہودی ضرور ہوں مگر مزاج منصفانہ پایا ہے۔" وہ بولی۔ "میرا ایمان ہے کہ اسرائیل کو اس کے سرپرست کسی کڑے وقت کے لئے پال رہے ہیں۔ جس روز مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے ذخائر سے مغرب کی طرف تیل کا بہاؤ بند ہوا اُسی روز اسرائیل کی سرزمین ایک فیصلہ کُن اور بڑی جنگ کے لئے ان کا ہیڈ کوارٹر بن جائے گی!"

"مگر اسرائیلی حکمراں اتنے احمق نہیں ہیں۔"

"دنیا کو وہ یہی تاثر دے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ آخری لمحہ آنے سے پہلے اسرائیلی اپنی قوت میں اتنا اضافہ کر لیں گے کہ ان کی مرضی کے بغیر ان کی سرزمین کسی بھی مقصد کے لئے استعمال نہیں کی جا سکے گی۔"

"اسرائیلی ابھی تک اپنی حکمتِ عملی میں کامیاب ہیں۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے اپنی سرحدوں سے ہزاروں میل دُور نکل کر ایسے حیرتناک جنگی کارنامے انجام دیے ہیں کہ ان کی صلاحیتیں ہر شبہے سے بالاتر ہو چکی ہیں۔"

"یہ سب درست ہے لیکن ان کا سارا دفاعی نظام امریکی ماہرین چلا رہے ہیں جن میں یہودی کم اور عیسائی زیادہ ہیں۔"

"یہ میں نہیں مان سکتا۔"

"نہ مانو۔۔۔ لیکن میں تنظیم میں شریک ہونے سے پہلے سوا دو برس اسرائیلی سیکرٹ سروس میں کام کر چکی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا ہے۔ میرے مشاہدے غیر جانبدارانہ تھے اسی لئے میری باتیں تمہیں عجیب لگ رہی ہیں۔"

"کیا دیکھ لیا تم نے؟" اس کی گفتگو میں میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"سرکاری طور پر اسرائیل میں امریکی ماہرین کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے مگر وہ جس کی ضرورت سمجھتے ہیں اسے امریکی محکموں سے فوری طور پر سبکدوش کر کے تارکِ وطن کے طور پر اسرائیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اسرائیل کا فوجی مرکز پوری طرح ایسے لوگوں کی مٹھی میں ہے اور وہ اسرائیل سے زیادہ اپنے ملکوں کے وفادار ہیں۔"

"اگر تمہارے قیاسات درست ہیں تو اسرائیل کا وجود اس خطے میں ایک ناسور سے کم نہیں۔" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"اسے لکھ کر رکھ لو کہ تیسری جنگ شروع ہوئی تو اسرائیل یا اس کے قرب و جوار سے ہوگی اور اس میں سب سے بُری موت وطن کو ترسے ہوئے وہ یہودی مارے جائیں گے جو امن و سلامتی کی تلاش میں بارودی اسلحے کے ایک ملک گیر ذخیرے میں جا پھنسے ہیں!" اس کے لہجے پر جذبات کی تندی غالب آ گئی۔

"دوسروں کو یہ باتیں کیوں نہیں سُوجھتیں؟"

"انہیں ہیکلِ سلیمانی کا جذباتی نعرہ دیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ہر چار چھ ہفتے بعد حکومت کے اشارے پر کوئی نہ کوئی ربّی ہیکلِ سلیمانی کی بنیادوں کے بارے میں اپنے وعظ میں ایک بشارت کی اطلاع دیتا ہے۔۔۔۔ اور مذہب؟" وہ ایک لحظے کے لئے رُکی۔ پھر تلخ لہجے میں بولی۔ "یہ افیم بھی ہے جسے کھا کر قومیں سو جاتی ہیں اور ایسا نشہ بھی جو غالب آ جائے تو انسان چٹانوں کا بھوسہ اڑا کر رکھ دے!"

"آج پہلی بار مجھے تمہارے صحیح رجحانات کا اندازہ ہوا۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "تمہارا تجربہ جو بھی ہو لیکن تمہارے سوچنے کا انداز منطقی ہے!"

"مشکل یہ ہے کہ ہر فرد اور قوم دوسروں کے بارے میں منطقی انداز میں سوچتی ہے لیکن اپنے بارے میں ہر ایک خوش فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔"

"اس وقت شاید ہم بھی کسی خوش فہمی کا شکار ہیں!" میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ہمیں سوڈان کی سرحد عبور کر کے ایتھوپیا میں داخل ہونا ہے اور ہم اس مرحلے کو بھول کر دُنیا جہان کی سیاست پر مغز زنی کر رہے ہیں۔"

"میرے پاس پی۔ایل۔او کا شناخت نامہ ہے۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ "مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ تمہارے لئے بھی کوئی راہ نکال لوں گی۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ پیٹر کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے تمہارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے تمہاری شناخت ہو سکے۔"

"ایسی تمام چیزیں میں کار ہی میں چھوڑ گئی تھی!"

سفر کسی غیر معمولی واقعہ کے بغیر جاری رہا۔ راستے میں راس العنب نامی ایک قصبے میں کھانا کھانے کے بعد ہم بلا رکے آگے بڑھتے رہے اور سہ پہر کے تین بجے سوڈان اور ایتھوپیا کی سرحد پر واقع قصالہ نامی آخری سوڈانی شہر میں داخل ہو گئے۔

سرحد پر واقع ہونے کے باوجود اس شہر کا طرز زندگی سادہ ہی نظر آتا تھا۔ تھوڑی دیر کی جستجو کے بعد کیتھی اس ہوٹل تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئی جہاں سے اس کی دانست میں سرحد عبور کرنے میں مدد مل سکتی تھی

ہوٹل شیلہ ایک اوسط درجے کا اقامتی ہوٹل تھا جو قصالہ کے معیار زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اوّل درجے میں شمار کیا جا سکتا تھا!

استقبالیہ کاؤنٹر پر بھرے بھرے بدن والی ایک سوڈانی لڑکی نے دلکش مسکراہٹ سے استقبال کیا تو میری سفر کی آدھی تکان دور ہو گئی

"ابوحسّان موجود ہے؟" کیتھی کہنیوں کے سہارے چوبی کاؤنٹر پر جھک کر لڑکی سے پوچھ رہی تھی۔

"موجود ہیں! تم کون ہو؟" لڑکی کی آنکھیں کیتھی کے چہرے پر جم گئیں۔

"میرا نام کیتھی ہے!"

اس نے کیتھی کے چہرے سے نگاہیں ہٹائے بغیر انٹرکام پر کوئی نمبر ملایا اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔

انٹرکام پر کیتھی کا نام بتانے کے بعد اس لڑکی کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا گیا اور شاید سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"بیٹھو ــــ وہ آ رہے ہیں!" لڑکی نے کہا لیکن اس کے بشرے پر تجسس آمیز آثار مزید گہرے ہو گئے تھے۔ اور وہ مسلسل کیتھی کو گھورے جا رہی تھی۔

ہمیں کاؤنٹر کے قریب پڑے ہوئے صوفوں پر بیٹھے چند ثانیے بھی نہیں گزرے تھے کہ استقبالیہ کاؤنٹر کے ساتھ والی راہداری سے ایک عظیم الجثہ شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا برآمد ہوا۔ اس کی متلاشی نگاہیں جوں ہی کیتھی پر پڑیں اس کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا اور وہ مجھے نظرانداز کر کے سیدھا اسی کی طرف بڑھ گیا۔

"مادام تم؟ بغیر کسی اطلاع کے؟" اس نے حیرت اور مسرت کے ساتھ سوال کیا۔ اپنے لب و لہجے سے وہ بھی کیتھی کے نیازمندوں میں معلوم ہوتا تھا۔

رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد کیتھی نے مجھے بھی اس سے متعارف کرایا اور وہ ہم دونوں کو اپنے وسیع اور آراستہ دفتر میں لے گیا۔

خلوت میسّر آتے ہی کیتھی براہ راست مطلب پر آ گئی "مجھے راشد کے ساتھ فوری طور پر ایتھوپیا روانہ ہونا ہے۔"

اس نے ابوحسّان سے میرا تعارف راشد ہی کے نام سے کرایا تھا

"فوری طور پر؟" وہ سوچ میں پڑ گیا "کاغذات کی تیاری میں تھوڑا سا وقت درکار ہوگا اور آج تو دفتری اوقات بھی ختم ہو گئے"

"میں کل تک انتظار نہیں کر سکتی۔ ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے!" اس گرانڈیل نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "لیکن سرحدوں پر آج کل خاصی سختی ہے۔ فوجی افسر سرحدی عملے کی کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کوئی خطرہ مول نہ لے گا!"

"میں سرحد پار کر لوں گی، مسئلہ صرف راشد کا ہے" کیتھی نے کہا۔

"پھر شاید کچھ ہو سکے!" اس کے لہجے میں امید کی لہر عود کر آئی۔

"ہم چند گھنٹے بعد روانہ ہوں گے، مجھے بھی ساتھ چلنا ہوگا۔"

"مگر کس بندوبست کے تحت؟"

"تم براہ راست نکلو گی اور راشد میری کار کی ڈکی میں ہوگا!"

"اگر تلاشی لی گئی؟"

"قصالہ میں ابوحسّان کی اتنی حیثیت ہے مادام!" وہ انکسار سے اپنے سر کو خم دے کر بولا "وہ مجھ پر شبہ نہ کر سکیں گے۔"

ابوحسّان کی ہدایت پر ہوٹل کی ایک خادمہ مشروبات اور دیگر لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی لے آئی اور ابوحسّان روانگی کی تیاری کے لئے چلا گیا۔

طویل بھاگ دوڑ کے بعد اسکاچ کا پہلا گھونٹ نہایت سکون بخش ثابت ہوا اور ہم دونوں آہستہ آہستہ گلاس خالی کرنے لگے۔

"کیا یہ بھی تنظیم سے وابستہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

کیتھی نے اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "میں ذاتی طور پر اس سے کام لیتی رہتی ہوں!"

تقریباً ایک گھنٹے بعد ابوحسّان واپس لوٹا تو بوتل نصف ہو چکی تھی اور میں ذہنی طور پر خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

ابوحسّان ان بےفکرے لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات کو کسی کا پابند کئے بغیر ساری عمر لااُبالی انداز میں گزار دیتے ہیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی رہائش ہوٹل ہی کے ایک حصے میں تھی۔ وہ انگریزی تراش کے سوٹ میں خاصا وجیہہ نظر آ رہا تھا۔

"کیا ارادہ ہے؟" اس نے آتے ہی شگفتہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"روانگی!" کیتھی گلاس سے آخری گھونٹ لے کر اٹھ گئی۔

"میں نے اپنی کار گیراج میں پہنچا دی ہے تاکہ راشد کو ڈکی میں چھپنے میں آسانی ہو!" اس نے کہا۔

"یہ تماشا تو میں بھی دیکھوں گی!" کیتھی قہقہہ مار کر بولی۔

پھر ہم تینوں ہوٹل کے دیران ہال اور راہداری سے گزر کر تین

کمروں پر مشتمل اس حصے میں پہنچ گئے جہاں شاید ابوحسّان رہتا تھا۔ اس مکان کے ایک دروازے سے نکلنے کے بعد ہم تینوں گیراج میں پہنچ گئے جہاں سفید رنگ کی شاندار بیوک کھڑی ہوئی تھی۔

بیوک دیکھ کر مجھے خاصی مسرت ہوئی کیونکہ اس کی کشادہ ڈکی میں سفر اتنا زیادہ تکلیف دہ ثابت نہ ہوتا!

"اسٹیریو کے اسپیکرز کی وجہ سے اس کی ڈکی خاصی ہوادار ہے" ابوحسّان نے کہا۔

مگر کیتھی کو میرا آرام زیادہ عزیز تھا۔ اس نے ڈکی کھولنے کے بعد اس کی اچھی طرح صفائی کی اور ڈکی میں پڑے ہوئے ریکسین پر چار کشن بچھا دیے۔ سر رکھنے کے لئے وہ حسّان کے بستر سے تکیہ بھی اٹھا لائی تھی

کیتھی کی فرمائش پر ابوحسّان میرے لئے سگریٹ کے دو پیکٹ اور اسکاچ کی نصف بوتل میں برابر کا سوڈا ملا کر لے آیا۔

"ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے تم دونوں مجھے مستقل طور پر اسی ڈکی میں بند رکھنے کا ارادہ کر چکے ہو!" میں نے ان تیاریوں پر تبصرہ کیا۔

"ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے گلو خلاصی ممکن نہ ہوگی!" کیتھی نے کہا۔

"تمہیں ڈکی میں ہر طرح کی آزادی ہوگی" ابوحسّان نے اپنے لئے سگار کا گوشہ توڑتے ہوئے کہا "چلتی کار میں خطرہ ہوا تو میں کیسٹ پلیئر کی آواز اچانک تیز کر کے اسے بند کر دوں گا اور کھڑی کار میں احتیاط لازماً کرنی ہوگی۔ تاکہ تمہاری کوئی آہٹ کسی کو ڈکی کی طرف متوجہ کرنے کا سبب نہ بن سکے۔"

"اب ایتھوپیا ہی میں ملاقات ہوگی!" میں مسکراتے ہوئے ڈکی میں گھس گیا۔

"اس طرف بلب بھی ہے!" ابوحسّان نے ڈکی کے داہنے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگنیشن آن ہونے کے بعد تم اسے سوئچ سے بھی روشن کر سکو گے!"

میرے لیٹتے ہی ابوحسان نے ڈکی بند کر دی!

چند ثانیوں بعد انجن اسٹارٹ ہوا اور بیوک ہچکولے لیتی ہوئی باہر نکلتی چلی گئی!

میرے لیے پوری طرح ٹانگیں پھیلانا ممکن نہیں تھا لیکن وہ صورت حال ناقابل برداشت بھی نہیں تھی میں نے سکون سے سگریٹ سلگائی اور اسی وقت ابوحسان نے دھیمی آواز میں کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

موسیقی کے مدھم سروں اور بیوک کے لطیف ہچکولوں میں وہ سفر جاری رہا۔ ڈکی ہر طرف سے اتنی سیل تھی کہ باہر کی آوازیں مجھے بہت موہوم سی سنائی دے رہی تھیں!

تقریباً دس منٹ کی سست رفتاری کے بعد کار کی رفتار تیز ہو گئی، شاید ابوحسان کی بیوک آبادی سے باہر نکل چکی تھی!

ڈکی میں میرا سفر پورے سوا گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران میں بیوک تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے دو جگہ رکی تھی۔ ان میں سے ایک سوڈان کی آخری سرحدی چوکی اور دوسری ایتھوپیا کی پہلی چوکی رہی ہوگی!

تیسری بار سوا گھنٹے بعد کار رکی تو اس کا انجن بند کر دیا گیا اور چند ثانیوں بعد ڈکی میں چابی گھومنے کی آواز کے ساتھ ہی ڈھکنا کھل گیا!

"جلدی باہر آؤ" ابوحسان نے کہا۔ اور میں اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈکی سے اچھل کر سڑک پر آ گیا اور ڈکی بند کر دی گئی!

"شاید ہم ایتھوپیا کی سرزمین پر ہیں؟"

"ہاں!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کی نگاہیں پیچھے پھیلی ہوئی سڑک پر جمی ہوئی تھیں جو شام کے گہرے ہوتے ہوئے دھندلکے میں معدوم ہوتی جا رہی تھی!

"کیتھی پیچھے ہے تمہارے؟"

"ہاں ــــ آں!" وہ نہ جانے کس خیال میں ڈوبا ہوا تھا!

تھوڑی دیر بعد کافی دور کسی کار کا ہیولا سا دکھائی دیا۔ جو تیزی سے واضح ہوتا جا رہا تھا اور پھر کیتھی کی کار بیوک کے پیچھے آ کر رکی!

"خدا کا شکر ہے کہ مجھے سرخروئی ہوئی!" ابوحسان نے کہا "اب اجازت ہے مجھے؟"

"تم کہاں جاؤ گے؟" کیتھی نے سوال کیا۔

"واپس!" وہ بولا۔

"واپس؟" کیتھی نے حیرت سے دہرایا "وہ مشکوک ہو جائیں گے!"

"انہیں مطمئن کرنے کے لیے میں کوئی عذر تراش لوں گا" وہ مسکرا کر بولا "دراصل آج رات میں ایک بڑی ضیافت کا میزبان ہوں۔ میری فوری واپسی بہت ضروری ہے فکر نہ کریں۔ میری وجہ سے کوئی آنچ نہ آئے گی!"

اس کی مزید ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ لہٰذا اسے اجازت مل گئی اور وہ اسی مقام سے واپس قصالہ کی طرف روانہ ہو گیا!

"جب یہ کنوارا ہے تو ابوحسان کیسے کہلاتا ہے؟" کیتھی کی کار میں آگے روانہ ہوتے ہی میں نے پہلا سوال کر دیا۔

"یہ مجھے بھی کبھی خیال نہیں آیا۔ اس کا اصل نام کچھ اور ہے لیکن ابوحسان کہلانے کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ہوگا!" اس نے کہا۔

سرحد عبور کرنے کے بعد میرا خیال تھا کہ کیتھی کہیں شب گزاری کی سوچے گی۔ لیکن اس کا حوصلہ مجھ سے زیادہ تازہ تھا!

"ہم نے پھرتی دکھا کر گیارہ گھنٹے کا فرق دور کیا ہے" اس نے کہا "شعبان کا ٹریلر ہم سے صرف تیرہ گھنٹے پہلے قصالہ سے گزرا تھا اگر ہم راستے پر رک گئے تو پھر ہماری مہم دشوارتر ہوتی چلی جائے گی!"

لہٰذا راستے میں صرف کھانے کے لیے تھوڑی دیر ایک قصبے میں رکنے کے بعد ہم دوبارہ آگے روانہ ہو گئے کیتھی کا اندازہ تھا کہ رات

کے نو بجے سے پہلے ہم اسمارہ پہنچ جاتے۔ جہاں سے شعبان کا سراغ حاصل کرنا زیادہ دشوار نہ ہوتا۔

رات کے اندھیرے میں سیاہ سڑک ہیڈ لیمپس کی روشنی میں کسی اژدہے کا سماں باندھ رہی تھی اور ہم دونوں اپنی سوچوں میں گم تھے!

کیتھی کی مختصر سی کار کا انجن خاصا جاندار تھا جس نے اس طویل راستے پر ہم سے کہیں دغا نہ کی۔ اور رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہماری کار اسمارہ میں داخل ہو چکی تھی!

میں اس مرحلے پر کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن کیتھی نے پہلے جنگی ناکے پر اپنی کار روک دی!

وہاں کا عملہ یک نفری تھا کیتھی کو اپنے کمرے میں موجود پا کر اس اُدھیڑ عمر کلرک کے بشرے پر تازگی کی لہر دوڑ گئی!

"یہاں سے شعبان ۔ ۔ ۔ کی گاڑی کب گزری ہے؟" کیتھی نے اس کے سلام کا جواب دے کر نہایت اعتماد سے سوال کیا۔

"مجھ سے پہلے گئی ہوگی۔" وہ میز پر کھلے ہوئے رجسٹر پر جھکتے ہوئے بولا "میری ڈیوٹی سات بجے شام سے شروع ہوتی ہے!"

"دیکھو ـــ ذرا دیکھ کر بتاؤ!" کیتھی نے ایک نوٹ اس کے سامنے ڈال دیا۔

"اس کا ٹریلر پانچ بجے گزرا ہے!" اس نے نوٹ اپنی جیب میں اڑستے ہوئے جواب دیا "اس میں باجرے اور مکئی کی بوریاں لدی ہوئی تھیں!"

ہم نے مزید ساڑھے نو گھنٹے بچا لیے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شعبان کا ٹریلر یا تو اسے تنگ کر رہا تھا۔ یا وہ نہایت بے فکری سے آرام کرتے ہوئے سفر طے کرنے کا عادی تھا!

اسمارہ قدیم اور جدید طرز کے مکانات پر مشتمل ایک خاصا مناسب شہر تھا جو کیتھی کے لیے بھی اجنبی ہی تھا!

وہ کافی دیر تک اپنی کار شہر کی سڑکوں پر محض اس اُمید پر دوڑاتی رہی کہ شاید کسی گودام پر شعبان کا ٹریلر کھڑا نظر آ جائے جسے وہ دور سے پہچان سکتی تھی۔ لیکن اس کوشش میں بُری طرح ناکامی ہوئی!

بالآخر ہمیں ایک ہوٹل کا رخ کرنا پڑا۔ وہاں چائے وغیرہ کا آرڈر دے کر کیتھی پبلک بوتھ کی طرف چلی گئی!

وہ فون کر کے واپس آئی تو اس کے بشرے سے اطمینان جھلک رہا تھا!

"شکر ہے کہ وہ مل گیا۔" اس نے بیٹھتے ہی ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"کون؟" میں نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

"پی۔ ایل۔ او کا مقامی ہرکارہ۔" اس نے جواب دیا "ہمیں یہاں کچھ وقت گزارنا ہوگا، وہ یہیں ہم سے رابطہ قائم کرے گا!"

وقت کی رفتار سست پڑ گئی اور میں ۔۔ اپنے وجود میں بے چینی کی ایک نئی لہر ابھرتی محسوس کرنے لگا۔

سیتا کی تلاش کی مہم بتدریج سنسنی خیز ہوتی جا رہی تھی۔ خرطوم سے بہار جیسے ٹریلر کا تعاقب کرتے ہم اسمارہ آ پہنچے تھے۔ مگر وہاں ٹریلر یک بیک اس طرح غائب ہو گیا تھا۔ جیسے صحرا میں کوئی ننھی سی سوئی!

ہر وہ لمحہ جو ہم ہوٹل کی اس میز پر گزار رہے تھے۔ ہمیں سیتا سے دور کرتا جا رہا تھا۔ اور اگر ایک بار اس کے سفر کا آغاز ہو جاتا تو جنوبی افریقہ کی سرزمین پر اترنے سے پہلے اس کی بازیابی ممکن نہیں تھی!

برتن سمیٹے گئے اور جب وقت زیادہ ہونے لگا تو مجبوراً ہمیں دوبارہ چائے منگوانی پڑ گئی لیکن اس بار چائے ختم ہونے سے پہلے ایک ایسا شخص ہوٹل میں داخل ہوا جس کے لیے کیتھی کی بے چین نگاہوں میں شناسائی جھلک رہی تھی!

اس نے شاید گھستے ہی کیتھی کو دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ پُرسکون انداز میں ہماری میز کے گرد پڑی ہوئی خالی کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کا رویہ بھی بہت سرسری اور رسمی تھا۔ جو ان حالات میں نہایت مناسب تھا۔

"بندوبست ہو گیا ہے، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا!" بیٹھنے کے بعد اس نے پُرسکون لیکن سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" کیتھی چائے ختم کرنے سے پہلے سب کچھ جان لینے کے لیے بے چین تھی! "کیا اس ٹریلر کا پتہ نہیں چلا؟"

"نہیں۔" اس نے دھیمے سے کہا "یوں ہم ساری رات سر مارتے رہیں گے۔ اور ٹریلر کا سراغ نہیں ملے گا۔ میں نے ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کر لیا ہے!"

ان لوگوں کے وسائل پر میں دل ہی دل میں عش عش کر اٹھا۔ اس نے اتنے سرسری انداز میں ہیلی کاپٹر کے حصول کی اطلاع دی تھی، جیسے جنرل اسٹور سے سگریٹ خرید لینے کے بارے میں بتا رہا ہو۔

"سرکاری ہے؟" کیتھی نے سوال کیا۔

"کوسٹل گارڈز میں میرا ایک دوست ہے۔ آج رات ہیلی کاپٹر پر اسی کی ڈیوٹی ہے!" اس نے بتایا۔

"مگر اس کے ساتھ عملے کا ایک آدھ فرد بھی ضرور ہوگا۔" کیتھی نے کہا۔

"ہم پرواز نہیں کریں گے۔" اس نے بتایا اور پھر تینوں ہی خاموش ہو گئے!

بل کی رقم ادا کرنے کے بعد ہم تینوں باہر آئے تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہا تھا! کیتھی کی کار میں سوار ہونے کے بعد نووارد نے اپنی جیب سے ایک ٹرانسمیٹر نکال کر ہم دونوں کے سامنے رکھ دیا۔

"وہ اس وقت شہر پر نیچی پرواز کر رہا ہوگا۔" اس نے کہنا شروع کیا! "صحرا میں سفر کرنے والے ہر ٹریلر اور لاری کی چھت پر بہت بڑے حروف میں رجسٹریشن نمبر اور کمپنی کا نام لکھنا لازمی ہے تاکہ کسی ناگہانی حادثے کی صورت میں فضا سے شناخت میں آسانی ہو۔ کسی بھی ٹریلر کی چھت پر شعبان ٹریلرز کا نام دیکھتے ہی وہ اپنے اڈے پر لوٹ جائے گا۔ اور طاقت ور حیطۂ عمل کے ایک جیبی ٹرانسمیٹر پر اس کے بارے میں مجھے اطلاع دے گا۔ جو میں سن سکوں گا!"

"اس کے پاس یہ ٹرانسمیٹر کیوں ہے؟" کیتھی کا لہجہ سخت اور تحکم آمیز تھا!

"وہ ۔۔۔۔ وہ میرا نمبر دو ہے!" وہ ہڑبڑا کر بولا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جن میں ناپسندیدگی واضح تھی!

"اسے مت گھورو! باہر سے آنے والی روشنیوں کے انعکاس میں کیتھی نے بھی اس کے تاثرات دیکھ لیے "یہ بھی ہم میں سے ہے!"

"میں معافی چاہتا ہوں مادام" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں اسے باہر کا آدمی سمجھ رہا تھا۔ وہ ہوا باز دراصل ہمارے شمالی یونٹ کا سربراہ ہے!"

"مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے ہو کہ ایک اجنبی کے سامنے تم سے نازک معاملات پر بات کرتی؟" کیتھی اسے آسانی سے معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

"غلطی ہو گئی مادام!" اس کا لہجہ خفت آمیز تھا "میں نے اپنی دانست میں احتیاط کرنی چاہی تھی۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔"

"اور دوسری بات!" کیتھی کا لہجہ بدستور سخت ہی رہا "میری شناخت دیکھے بغیر تم نے مجھ پر اعتماد کیسے کر لیا؟"

اس بار وہ واقعی لوکھلا گیا "مجھے معاف کر دیں۔ آپ کی صورت دیکھ کر میں سارے ضابطے بھلا بیٹھا۔ یہ واقعی سنگین غلطی تھی!"

"لیکن تمہاری مستعدی قابلِ داد ہے!" کیتھی کا لہجہ نرم پڑ گیا اور اس نے اپنے پرس میں سے شناختی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا!

پھر کیتھی نے کار اس کے بتائے ہوئے راستے پر ڈال دی!

وہ شاید اسمارہ کا کوئی وسیع و عریض پارک تھا۔ جہاں درختوں کے سائے میں ایک نیم پختہ روش پر نووارد نے کار رکوا دی!

کار رکتے ہی کیتھی نے طاقت ور جیبی ٹرانسمیٹر کا بٹن آن کر دیا اور اس کے ڈائل پر ایک ننھا سا سرخ نقطہ روشن ہو گیا!

"اسمارہ میں کوسٹل گارڈز کیا کرتے ہیں؟" کیتھی نے کھڑکی کا

شیشہ اتار کر سگریٹ سلگاتے ہوئے نووارد سے سوال کیا۔

"اسمارہ کے شمال سے شمال مشرق تک پھیلے ہوئے ساحل کی فضائی دیکھ بھال کرنے والوں کا مرکز اسمارہ میں ہی ہے!" نووارد نے کہا۔ "بحیرۂ احمر سے ملنے والی یہ ساحلی پٹی ایتھوپیا کا چور دروازہ سمجھی جاتی ہے!"

"ہو سکتا ہے کہ وہ ٹریلر اسمارہ میں رکنے کے بجائے اسی پٹی پر واقع کسی گھاٹ کی طرف گیا ہو؟" کیتھی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"تم سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں سارا بندوبست کیا گیا ہے۔ اگر ٹریلر اسمارہ میں نہ دکھائی دیا تو وہ سارے نواحی گھاٹ بھی دیکھے گا!"

میں ابوحسان کی دی ہوئی بوتل لے کر کار سے اتر گیا۔ اور اندھیرے میں چند قدم دور جا کر چند تلخ گھونٹ معدے میں اتار لیے۔

میں واپس لوٹ رہا تھا تو فضا میں ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کا تیز شور سنائی دیا اور پھر وہ مشینی پرندہ تیزی سے آگے نکل گیا میری نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد چند ثانیوں کے لیے اس کے نیچے لگی ہوئی طاقتور سرچ لائٹ روشن ہوئی جو فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

اس کا ہوا باز شاید مشکوک مقامات پر روشنی پھینک کر اپنے شبہات دور کرتا جا رہا تھا۔

اس ویران پارک میں انتظار کے لمحات اعصاب شکن ہونے لگے تھے ہر ایک پر اضطرابی کیفیت طاری تھی اور میں رہ رہ کر یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ ٹریلر کھلی فضا کے بجائے اسمارہ کے کسی بند گودام میں نہ جا گھسا ہو۔ جہاں تک رسائی آسان نہ تھی!

ٹھیک پونے گیارہ بجے اچانک ٹرانسمٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ "ٹی تھری کالنگ ...... ہیلو ٹی تھری کالنگ فار ایکس ٹی اوور!" وہ مدھم سی مردانہ آواز جوں ہی معدوم ہوئی کیتھی نے ٹرانسمٹر نووارد کو تھما دیا۔

"ایکس ٹی رسیونگ ...... رپورٹ اوور!" نووارد نے بٹن دبا کر پیغام کا جواب دیا اور فقرہ مکمل کر کے بٹن چھوڑ دیا۔

"ٹریلر مصاوا کے شمال میں الجزیرہ نامی گھاٹ پر مال اتار رہا ہے اور وہاں کافی نفری کام کر رہی ہے اوور!"

میں نے اندھیرے میں کیتھی کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اور میرے بدن میں برقی لہر سی سرایت کر گئی!

"تمہارا کام پورا ہو گیا، آرام کرو، اوور اینڈ آل!" نووارد نے یہ کہہ کر ٹرانسمٹر کا سلسلہ بند کر دیا!

"بہت اچھا ہوا کہ تم نے ہیلی کاپٹر کا بندوبست کر لیا۔ ورنہ ہم ساری رات اسمارہ ہی میں سر کھپاتے رہ جاتے اور ٹریلر کا سراغ نہ ملتا!" کیتھی نے کہا۔

"مصاوا یہاں سے پچیس تیس میل دور ہے، ذرا راستہ خراب ہے!" نووارد نے آہستہ سے کہا۔

"ہمیں ابھی چلنا ہو گا!" کیتھی بولی۔ "جو اطلاع ملی ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مال لادتے ہی ان کی بوٹ چل پڑے گی!"

"مگر اطلاع میں بوٹ کا ذکر نہیں تھا!" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ ٹی تھری بتانا بھول گیا ہو!" نووارد نے کہا۔

"اس سے دوبارہ رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے؟" کیتھی نے سوال کیا۔

"وہ ڈیوٹی پر ہے ایسا نہ ہو کہ کسی مشکل میں پڑ جائے۔ اس نے خود بھی موقع نکال کر خبر دی ہو گی!"

"بوٹ کا ہونا نہ ہونا غیر اہم ہے!" کیتھی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ٹریلر کا سراغ مل گیا ہے اور ہمیں فوراً ان سے ٹکرا جانا چاہیے!"

"ان کی نفری!" میں نے اسے یاد دلایا۔

"وہ سب مزدور ہوں گے، ان میں دو چار مسلح ہوئے تو ان کی بے خبری ہمارے لیے سود مند ثابت ہو گی!" کیتھی نے لاپروائی سے کہا اور کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

"واپس گھمالیں!" کار کے حرکت میں آتے ہی نووارد نے کہا۔

"کدھر لے جاؤ گے؟"

"اسمارہ!" اس نے کہا "کچھ اسلحہ ساتھ لے لیں!"

"فکر نہ کرو، اس کار میں اسلحہ کا خاصا ذخیرہ موجود ہے!" وہ ہنس کر بولی۔ "دو اسٹین گنیں ایک پستول اور ایک رائفل کے علاوہ کچھ دستی بم بھی موجود ہیں!"

"پھر مصاوا ہی چلنا چاہیے!" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "سیدھی ہی چلتی رہو!"

چند منٹ بعد ہی کار ہموار سڑکوں کو پیچھے چھوڑ کر نیم پختہ اور غیر مسطح راستے پر آ گئی۔ جہاں ہر طرف بکھرے ہوئے ٹیلوں کے درمیان سے تیز رفتاری سے گزرنا ناممکن تھا!

"کیا براہ راست وہاں دھاوا بولنا ہے؟" تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد نووارد نے دبے لہجے میں سوال کیا۔

"خودکشی کرنی ہو تو ضرور ایسا کر لینا!" میں نے پہلی بار اسے براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ کوئی حکمت عملی سوچنی ہو گی!"

"اس معاملے میں تمہارا ہی دماغ چلتا ہے!" کیتھی نے مجھ سے کہا۔

"میرے ذہن پر تو بس ایک ہی دھن سوار ہے کہ انہیں گھیر لیا جائے!" اور کچھ دیر کے غور و خوض کے بعد میرے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ جس پر ابتدا میں ان دونوں نے کئی اعتراضات کیے، مگر بعد میں وہ بھی مجھ سے متفق ہو گئے!

تیسرے شخص کا نام احمد تھا اور وہ ان علاقوں سے بخوبی واقف تھا لہٰذا جب اس نے ہمیں رکنے کے لیے کہا تو کیتھی نے فوراً ہی انجن بند کر دیا! احمد ایک اسٹین گن اور خاصے فاضل راؤنڈز لے کر تاریکی میں اتر گیا۔ "یہی راستہ الجزیرہ تک لے جائے گا تم آہستہ آہستہ آگے بڑھو۔ میں ٹیلے عبور کر کے کوئی مورچہ سنبھالتا ہوں!" یہ کہہ کر وہ تاریک ٹیلوں ہی اوٹ میں غائب ہو گیا۔

کیتھی نے انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے سگریٹ سلگا کر اس کے دو تین گہرے گہرے کش لیے پھر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی!

"کچھ فکرمند نظر آ رہی ہو؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"ہم بہت بڑا خطرہ مول لینے جا رہے ہیں!" اس نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔ "اگر انہیں شبہ بھی ہو گیا تو ہم دونوں بھی جنوبی افریقہ پہنچا دیے جائیں گے!"

"ہماری پشت پر احمد موجود رہے گا!" میں نے کہا۔ "حالات خراب ہوتے ہی اگر وہ بھرپور انداز میں دخل اندازی کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارے لیے زیادہ مشکلات پیدا نہیں ہو سکیں گی۔ اس بھیڑ میں سازشی افراد دو چار ہی ہوں گے!"

چند منٹ بعد ہیڈ لیمپس کی ابھرتی ڈوبتی روشنیاں جوں ہی ایک ڈھلان کے رخ پر نیچی ہوئیں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

المونیم کی سفید باڈی والا ایک لمبا سا ٹریلر کچھ فاصلے پر نظر آیا تھا اس سے ذرا دور سمندری لہروں کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا!

اس سے زیادہ اہم مزدوروں کا وہ ملا جلا شور تھا جو مال لادنے کے دوران میں پیدا کر رہے تھے۔

"یہاں تو لانچ بھی موجود ہے!" کیتھی بڑبڑائی!

"اچھا ہے!" میں نے اپنے وجود کی گہرائیوں میں مسرت کا لہر ابھرتی محسوس کی۔ "میرا خیال ہے کہ ہم بر وقت یہاں پہنچ گئے!"

"شاید احمد بھی اپنی جگہ لے چکا ہو گا!" اس نے قیاس آرائی کی۔

"اب آگے بڑھتی رہو!" میں نے کار کی رفتار میں سستی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری کار دیکھ لی گئی ہے، انہیں مشکوک ہونے کا موقع نہ دو!"

کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ٹریلر کے قریب ایک تنومند شخص نظر آ رہا تھا جو اپنی آنکھوں کو تیز روشنی سے بچاتے ہوئے ہماری کار کو دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"کون ہے؟" قدرے آگے بڑھنے کے بعد میرے کانوں میں اس کی چنگھاڑتی ہوئی درشت آواز آئی۔ جس کے ساتھ ہی مزید کئی افراد اس سے آ ملے۔

ان میں سے بیشتر اپنی خستہ حالی کے باعث مزدور نظر آ رہے تھے، مگر ایک جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ جن میں یقینی طور پر کوئی آتش گیر اسلحہ موجود تھا!

میرے اشارے پر کیتھی نے اپنی کار ان سے دور ہی روک دی اور اسی وقت ٹریلر کو کھینچنے والے ٹریکٹر کے کیبن پر لگی ہوئی طاقتور سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔

ٹریلر کو گھما کر اس طرح کھڑا کیا گیا تھا کہ اس کا عقبی حصہ سمندر کی طرف تھا۔ لہٰذا ہم دونوں کار سے اترتے ہی روشنی میں نہا گئے!

"جاؤ، تم لوگ اپنا کام کرو!" ہم دونوں کو ٹھٹھا دیکھ کر اندھیرے میں کسی نے کہا اور بھنبھناہٹ کی آوازوں کے ساتھ ہی متعدد قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی!

ٹریلر سے پڑنے والی تیز روشنی کی زد سے نکلنے پر ہمیں وہ دونوں نظر آ گئے جو نیم تاریکی میں کھڑے ہمیں گھور رہے تھے!

"کون ہو تم؟" جیکٹ والے نے دور ہی سے درشت لہجے میں سوال کیا۔

"ہم خرطوم سے آئے ہیں!" میں نے دانستہ ادھورا جواب دیا تاکہ بے خبری میں ان سے قریب تر پہنچنے کا موقع مل سکے!

"مگر کیوں؟ یہاں کیا کام ہے؟"

"ہم شعبان کے لیے ایک بڑی خبر لائے ہیں۔ ذرا اسے بلا دو!" میں نے گمبھیر لہجے میں انکشاف کیا۔

وہ دونوں دبی آواز میں آپس میں بات کرنے لگے!

اس دوران میں ہمیں اس گھاٹ کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا!

شعبان کا ٹریلر پتھروں اور ریت سے بنے ہوئے ایک بھونڈے پلیٹ فارم سے ملا ہوا کھڑا تھا۔ اور اس سے کم از کم پچاس فٹ دور سمندر کی لہروں میں ایک بڑی لانچ لنگر انداز تھی۔ جسے تختوں کے پل کے ذریعے ٹریلر کے پلیٹ فارم سے ملا دیا گیا تھا!

ایک سرچ لائٹ ٹریلر کے عقب میں روشن تھی اور دوسری لانچ پر جل رہی تھی۔ اس روشنی میں دس پندرہ مزدور مشینی انداز میں ٹریلر سے بوریاں لانچ پر منتقل کر رہے تھے!

ہم ان دونوں کے قریب جا کر ٹھہر گئے!

"تم دونوں کون ہو؟" جیکٹ والے نے ایک مرتبہ پھر ہم دونوں کو اشتباہ آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"تمہارے لیے اجنبی ہیں۔ شاید شعبان پہچان سکے!" اس بار کیتھی نے نپے تلے لہجے میں جواب دیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

ساری منصوبہ بندی کرتے ہوئے ایک اہم پہلو مجھ سے نظرانداز ہو گیا تھا میرا خیال تھا کہ شعبان سے ہماری ملاقات اجنبیوں کی طرح ہو گی۔ لیکن وہ پی ایل۔ او کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ اور کیتھی اس سے بخوبی واقف تھی جس کا لازمی مقصد یہ تھا کہ شعبان بھی کیتھی سے واقف تھا۔ اگر وہ آتے ہی کیتھی کو پہچان لیتا تو سارا معاملہ خراب ہو سکتا تھا!

"تمہیں یہاں کا پتہ کیسے معلوم ہوا؟" جیکٹ والا اس وقت

تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"ڈھونڈتے ہوئے پہنچے ہیں!" میں نے اس پر اپنی صداقت کا اظہار کرنے کے لیے قدرے ترشی سے جواب دیا۔" وہ باجرہ اور مکئی لے کر اسمارہ آیا تھا جب شہر میں ٹریلر نہیں ملا تو ہم ادھر نکل آئے اسے بلاؤ۔ ہم اس کے بہی خواہوں میں سے ہیں!"

کیا خبر لائے ہو؟" اس کے لہجے میں شبہ کے بجائے تجسس عود کر آیا۔

"کچھ لوگوں نے اس کے مکان کو آگ لگا کر اس کی داشتہ کو اغوا کر لیا ہے!" میں نے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ!" اس کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ "واقعی بہت بری خبر ہے، ٹھہرو، میں اسے بلاتا ہوں کیبن میں پڑا سو رہا ہوگا!"

وہ چلا گیا اور اس کا تنومند ساتھی ہمارے ساتھ کھڑا رہ گیا۔

میں نے سگریٹ کے پیکٹ کے ساتھ ہی زہریلے تیروں والی شیشی بھی نکال لی۔ اس وقت میرے لیے خود پر قابو پانا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ سیتا مجھ سے تھوڑی دور ٹریلر یا لانچ میں ایک بے بس قیدی کی صورت میں موجود تھی اور میں اس کی رہائی کے لیے کوئی فوری اور بھرپور قدم اٹھانے سے معذور تھا۔

تھوڑی دیر بعد جیکٹ والا پلپلے بدن والے ایک موٹے سوڈانی کے ساتھ آتا نظر آیا۔ سوڈانی کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ جیکٹ والے نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا!

"اب بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہے تھے!" قریب آ کر جیکٹ والے نے کہا۔

"میں تو ان دونوں سے ناواقف ہوں!" میرے یا کیتھی کے بولنے سے قبل پلپلے بدن والے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر ہم تمہارے لیے آئے ہیں شعبان!" کیتھی نے کہا۔" کل رات کسی نے تمہارے گھر کو آگ لگا کر صائقہ کو اغوا کر لیا ہے!"

"نہیں!" وہ اضطراری طور پر مضحکہ خیز آواز میں چیخ پڑا۔"خرطوم میں میرا کون سا دشمن پیدا ہو گیا؟" اس کے لہجے سے بے اعتباری مترشح تھی!

"ہمارے لیے تم پہلے بھی کام کر چکے ہو!" کیتھی نے کہا۔" اگلے ہفتے ہمیں پھر تمہاری ضرورت ہے۔ اسی لیے یہاں دوڑے چلے آئے!"

میرے لیے یہ بات تسلی بخش تھی کہ شعبان کیتھی کو نہیں پہچانتا تھا۔ شاید کیتھی سامنے آئے بغیر اس سے کام لیتی رہی تھی۔

"میں جا رہا ہوں!" شعبان مڑ کر روہانسے لہجے میں جیکٹ والے سے بولا۔" اگر صائقہ کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گا۔"

"مگر ٹریلر ابھی خالی نہیں ہوا!" تنومند شخص نے کہا۔

"تم اسے خالی کرا لو، اطمینان سے خالی کرا لو!" شعبان کے لہجے پر بوکھلاہٹ طاری تھی" ! میرا بیٹا اسے واپس اسمارہ لے جائے گا!"

"دو ڈرائیوروں کے بغیر ٹریلر کو سفر کی اجازت نہ مل سکے گی!" جیکٹ والے نے تیز لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"واپسی میں سامان بھی لادنا ہے!" شعبان نے کہا!" وہ اسمارہ میں رک کر میری واپسی کا انتظار کر لے گا!"

"اور جاؤ گے کیسے؟"

"ہم واپس خرطوم جا رہے ہیں!" کیتھی جلدی سے بول پڑی۔" شعبان چاہے تو ہمارے ساتھ چل سکتا ہے!"

"میں تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گا!" شعبان ممنون لہجے میں بولا۔

"تو پھر چلو!" میں نے کہا۔

"ذرا لڑکے کو ہدایات دے آؤں!" یہ کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"یہیں انتظار کرو، وہ لوٹ آئے گا!" جیکٹ والے نے کہا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس اس طرف چل دیا جہاں کام ہو رہا تھا۔

شعبان ان سے کافی آگے نکل چکا تھا۔ وہ دونوں ہم سے مطمئن ہو چکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں ان کے زیادہ ساتھی نہیں تھے۔ لہٰذا میں نے پلک جھپکتے میں ایک فیصلہ کیا اور ریت پہ چند قدم دوڑ کر یکے بعد دیگرے ان دونوں پر دو زہریلے تیر چلا دیے! چلتے چلتے وہ منہ کے بل زمین پر گرے اور ٹھنڈے ہو گئے!

"یہ کیا کیا تم نے؟" کیتھی قریب آ کر میرا شانہ جھنجوڑتے ہوئے نیم ہذیانی انداز میں بولی۔

"بس اب تم تماشا دیکھتی جاؤ!"

"اور اگر ادھر سے کسی نے انہیں گرتے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟"

"گاڑی آگے لے آؤ اور اسلحہ سنبھال لو!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اسی لمحے کہیں سے رائفل چلی اور بھیانک گونج کے ساتھ گولی میرے سر سے چند انچ اوپر سے گزر گئی۔ میں بے اختیار سینے کے بل ریت پر گر گیا!

پھر لانچ پر سرچ لائٹ بجھا دی گئی، رائفل کا دوسرا فائر ہوا اور اس بار شیشہ ٹوٹنے کے چھناکے کے ساتھ ٹریلر کے عقب میں روشن دوسری سرچ لائٹ تاریک ہو گئی!

ہر سو گھور اندھیرا پھیل گیا اور اس اندھیرے میں خوف زدہ نہتے مزدوروں کی چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ نے قیامت کا سماں پیدا کر دیا۔

اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر میں پلٹا اور تیزی سے کیتھی کے پیچھے ہو لیا۔

دوسری اسٹین گن کیتھی نے سنبھال لی اور میں نے رائفل کے ساتھ ہی پستول اٹھا لیا۔ میں نے اس کام سے نمٹتے ہوئے اپنے حلق سے تو کی جیسی آوازیں نکالیں، جس کے جواب میں مخالف سمت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور احمد بھی منصوبے کے مطابق ہم سے آملا۔ شاید وہ شروع ہی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا!

"ٹریلر پر!" میں نے پرجوش سرگوشیانہ آواز میں کہا اور کیبن کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہو لیے!

رات کے گھور اندھیرے میں وہ ماحول بہت ہی لرزہ خیز تھا۔ خوف زدہ مزدوروں کی بھاگ دوڑ ختم ہو چکی تھی۔ شاید انہوں نے کوئی پناہ گاہ تلاش کر ہی لی تھی!

اچانک اندھیرے میں دو رائفلیں چلیں۔ لانچ کے عرشے پر دو شعلے چمکتے نظر آئے اور گولیاں نامعلوم سمت میں فضا میں تیر گئیں! اس وقت تک ہماری طرف سے کوئی گولی نہیں چلائی گئی تھی۔ لیکن مخالفین چار اندھادھند فائر کر چکے تھے جس سے ان کی بوکھلاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

ٹریلر کو کھینچنے والے اونچے ٹرک کے قریب پہنچ کر میں پائیدان پر چڑھ گیا۔ آہٹیں پیدا ہوتے ہی بند دروازے کے پیچھے میں نے دو خوف زدہ آوازیں واضح طور پر سنیں!

میں ایک ہی جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر گھس گیا!

دیوہیکل آہنی کیبن میں دو انسانی ہیولے ایک دوسرے سے لپٹے پائیدان میں گھسے ہوئے تھے اور خوف سے کانپ رہے تھے! اندر میری موجودگی محسوس کرتے ہی اضطراری طور پر ان میں سے ایک کے حلق سے چیخ آزاد ہو گئی!

"چابی!" میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہو کر سفاکانہ لہجے میں مطالبہ کیا۔

"تت.... تم کون لوگ ہو؟" وہ رو دینے والی خوف زدہ آواز شعبان کی تھی!

اس وقت مجھ پر درندگی سوار تھی لہٰذا اس کا سوال مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے غیر ارادی طور پر رائفل کا کندہ ان کی طرف دھکیل دیا!

وہ دونوں ہی چیخے، دوسرے کو شدید ضرب آئی تھی کیونکہ اس کی جوان آواز شعبان کی چیخ پر حاوی تھی!

میں نے رائفل واپس کھینچنی چاہی لیکن کندہ مضبوطی سے پکڑ لیا گیا تھا!

"چھوڑ دو!" میں نے غرا کر رائفل کی نال پر وحشیانہ انداز میں زور لگایا اور کندہ چھوڑ دیا گیا!

"چابی! ورنہ گولی مار دوں گا تم دونوں کو!" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا اور شعبان نے فوراً ہی چابی میری طرف بڑھا دی۔

وہ دونوں اس ناگہانی افتاد سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ سہمے ہوئے چوہوں کی طرح اسی پائیدان میں دبکے رہے اور میں نے چابی حاصل کر کے ان کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

ان پر میرا مقصد دیر سے ظاہر ہوا۔ پہلی ٹھوکر کھاتے ہی وہ رحم کے لئے بلبلائے تھے لیکن میرے سر پر خون سوار ہو چکا تھا میں نے ٹھوکریں مار مار کر ان دونوں کو سات فٹ اونچے کیبن سے ناہموار ساحلی زمین پر پھینک دیا اور ان کی بوکھلائی ہوئی چیخیں دور تک گونجتی چلی گئیں۔ شاید انہیں گرنے سے زیادہ ٹھوکروں سے چوٹیں آئی تھیں۔

اگنیشن میں چابی گھما کر میں نے پھرتی سے انجن اسٹارٹ کیا اور پلیٹ فارم سے ہٹانے کے لئے فوراً ہی ٹرک کو آگے لیتا چلا گیا۔

اس دیوہیکل ٹریلر کے ساتھ میرا وہ اضطراری سلوک ناروا تھا لہٰذا آگے بڑھتے ہوئے اس نے کئی شدید جھٹکے لئے اور اسی کے ساتھ ٹریلر میں سے چیخوں اور دھماچوکڑی کی آوازیں بھی آئیں۔

ان آوازوں سے عقدہ کھلا کہ اندھا دھند گولیوں سے بچنے کے لئے خوف زدہ مزدوروں کو کھلے آسمان کے نیچے بند ٹریلر ہی سب سے محفوظ نظر آیا تھا۔

کچھ آگے بڑھنے کے بعد میں نے اچانک بریک لگا دیے۔ شدید جھٹکے کے ساتھ ٹریلر رک گیا اور میں اسٹیئرنگ کو پوری طرح کاٹنے لگا۔ ریورس گیئر ڈالنے کی پہلی کوشش میں انجن گھری ہچکی لے کر بند ہو گیا۔

"ایک راؤنڈ فائر کرو!" میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر کہا۔ احمد جو پائیدان پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوراً رک گیا اور فضا اسٹین گن کے ہولناک شور سے لرز اٹھی۔

اسٹین گن کا شور معدوم ہونے سے قبل میں نے دوبارہ انجن اسٹارٹ کر لیا اور اس بار ریورس گیئر میں لے جانے میں کامیابی ہوئی۔

ٹریلر کا انجن کسی زخمی درندے کی طرح غرا رہا تھا۔ میرے لئے اندھیرے میں پیچھے کا خیال رکھنا ناممکن تھا۔ میں بس یادداشت کے سہارے ٹریلر کو ٹیلوں سے بچاتا ہوا تیزی سے لانچ کی طرف لے جا رہا تھا۔

"لانچ کا انجن اسٹارٹ ہے!" پائیدان سے جھولتی ہوئی کیتھی کی اعصاب زدہ آواز ابھری۔" تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ایکسلریٹر پوری قوت سے دبا دیا۔ اچھلتے ہوئے ٹریلر کا عقبی حصہ ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ لانچ سے جا ٹکرایا۔ وہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میرے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ وھیل نکل گیا اور سر ونڈ شیلڈ سے جا ٹکرایا۔

جھٹکے سے ٹرک کا انجن بھی بند ہو گیا۔ میں نے کلچ دبا کر انجن

اسٹارٹ کیا اور ٹریلر کو آگے لے جانا چاہا، اس بار انجن پر خاصا زور پڑا۔ غالباً عقبی حصّے کی ٹوٹ پھوٹ سے ٹریلر کے پہیے قدرے جام ہو گئے تھے۔

تقریباً سو گز آگے بڑھنے کے بعد میں دوسرے تصادم کے لئے واپس پلٹا اور اسی وقت فضا میں بارود کی بُو پھیلنے لگی۔

ایک طرف دُور مار رائفلیں تھیں اور دوسری طرف اسٹین گنیں۔

فائرنگ میں ایک کربناک انسانی چیخ بھی ابھری۔ جس میں موت کی ویرانی رچی ہوئی تھی مگر میرے لئے باہر کی وہ تمام کارروائیاں بے معنی تھیں۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ لانچ کا حلیہ اتنا بگاڑ دیا جائے کہ وہ سفر کے قابل نہ رہے۔

دُوسرا تصادم بھی بہت شدید تھا۔ میں اگنیشن کی چابیاں جیب میں ڈال کر کیبن سے نیچے کُود گیا۔ کیتھی کے علاوہ احمد بھی ٹرک کی آڑ میں جھکا ہوا... لانچ کی طرف نگراں تھا۔ وہ دونوں شاید ٹریلر کے ساتھ ہی بڑھتے اور ہٹتے رہے تھے۔

"لانچ پر دستی بم پھینکو!" احمد نے اعصاب زدہ لہجے میں مشورہ دیا۔

"نہیں!" میں نے غرّا کر اسے منع کر دیا۔ "لانچ پر چڑھنے کی کوشش کرو۔"

اس وقت ٹریلر میں قیامتِ صغریٰ کا سا سماں برپا تھا۔ گولیوں سے پناہ لینے کے لئے ٹریلر میں گھسنے والے پہلی ٹکّر کے بعد ہی اندر محبوس ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ اس تصادم نے انہیں نہ صرف زخمی کیا ہوگا بلکہ عقبی راستہ بھی مسدُود ہو گیا ہوگا۔ رہی سہی کسر دوسری ٹکّر نے پوری کر دی اور اس وقت وہ سارے بدنصیب قیدی اندر سے چیخ چیخ کر ٹریلر کی دیواریں پیٹ رہے تھے۔

ٹکراؤ تو ہو ہی گیا تھا لیکن صورتحال اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ اس وقت ٹریلر کا عقبی حصّہ لانچ کے وسطی حصّے میں پیوست تھا اور اسے علیحدہ کئے بغیر لانچ کو آگے لے جانا ناممکن تھا لیکن اسی کے ساتھ ہمارے لئے لانچ پر پہنچنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

پھر ایک حیرتناک واقعہ ہوا۔ وہ طویل و عریض لانچ حرکت میں آ گئی اسی کے ساتھ دھاتوں کی آپس میں رگڑ کی تیز آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔

لانچ کے حرکت کرنے کی وجہ سے ٹریلر بھی بُری طرح لرز رہا تھا۔ ہم لوگوں نے لانچ پر دیوانہ وار فائرنگ کی لیکن بحیرۂ احمر کے گہرے پانی کی طرف اس کی پیشقدمی نہ روک سکے۔

ٹریلر کے مقابلے میں لانچ کے آہنی ڈھانچے کو معمولی نقصان پہنچا تھا۔ اور شاید وہ سفر جاری رکھنے کے قابل تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے لانچ کی رفتار تیز ہوئی اور وہ الجزیرہ کے ساحل سے دُور ہونے لگی۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا کیتھی!" میں نے انتہائی مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "لانچ پر ہر صورت میں ہمارا قبضہ ہونا چاہئے تھا۔"

"اس کا تعاقب کیوں نہ کیا جائے؟" احمد نے تجویز پیش کی۔

"مگر کیسے؟" میں نے اور کیتھی نے بیک وقت سوال کیا۔

"اسمارہ پہنچ کر میں ایک تیز رفتار بوٹ کا بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر چلو۔" کیتھی اس کا بازو تھام کر بولی اور ہم تیزی سے دُور کھڑی ہوئی کیتھی کی کار کی طرف دوڑ پڑے۔

کیتھی کی کار کے ہیڈ لیمپس روشن ہوتے ہی مجھے پھریری آ گئی۔ زہریلی سوئیوں سے مرنے والے دونوں افراد کی لاشیں شاید وزنی ٹرک کے نیچے آ کر رات کے گھور اندھیرے میں اس بُری طرح کچلی گئی تھیں کہ شاید ان کی شناخت بھی دشوار تھی۔

"وہ کار!" اچانک احمد نے اشارہ کیا اور میری نگاہ اسی طرف اٹھ گئی۔

وہ خاصی دُور کھڑی ہوئی تھی اور پہلے ٹریلر کی اوٹ میں ہونے کے باعث ہماری نظروں میں نہ آ سکی تھی۔

کیتھی نے اپنی کار اسی طرف بڑھا دی۔

میں نے اُتر کر اندر نگاہ ماری تو شعبان اور اس کا بیٹا عقبی نشست کے پائیدان میں دبکے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس قدر بدحواس اور خوفزدہ تھے کہ انہیں میری آمد کا بھی علم نہیں ہوا۔

جب میں نے جیب سے ٹریلر کی چابی نکال کر شعبان کو آواز دی تو وہ یوں اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

میری آواز پہچاننے کے بعد اس نے باہر آنا چاہا لیکن میں نے اسے دھمکا کر وہیں پڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔

"یہ چابی رکھ لو، تم دس منٹ گزرنے سے پہلے کار سے باہر نکلے تو انجام کے خود ذمہ دار ہوگے۔" یہ کہہ کر میں کار میں واپس لوٹ آیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس مرحلے پر کیتھی کی کار کا نمبر وغیرہ نوٹ کر سکے۔

اسمارہ کی طرف واپسی کا سفر بہت تیز تھا۔ راستے میں احمد نے ایک بار وائرلیس پر بی ٹھری سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا پھر جوں ہی ہماری کار اسمارہ کی حدود میں داخل ہوئی، ٹرانسمٹر پر اشارہ موصول ہوا اور احمد نے اسے آن کر دیا۔

"بی ٹھری کالنگ..... اوور!" ریسیور پر مانوس آواز ابھری۔

"ایکس ٹی.... اوور!" احمد نے بٹن دبا کر کہا اور انگلی ہٹالی۔

"مجھے گیارہ منٹ پہلے سگنل ملا تھا مگر اس وقت میں پرواز پر تھا۔ لانچ الجزیرہ سے کھلے سمندر میں جا چکی تھی اور وہاں ہر طرف بربادی کے آثار تھے، اوور!"

"ہیں چوٹ ہو گئی۔" احمد نے کہا۔ "ہو سکے تو لانچ پر نگاہ رکھو

ہم اس کے تعاقب میں نکلنے والے ہیں.... اوور!"

"کیا معاملہ بہت اہم ہے؟ اوور!"

"بہت زیادہ اہم! اوور!"

"میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے معاون کی نظر بچا کر لانچ پر ایک دستی بم گرا دوں تاکہ وہ آگے سفر کے قابل نہ رہے، اوور!"

"نہیں!" اس بار ٹرانسمٹر کیتھی نے لے لیا تھا۔ "لانچ پر کچھ ایسے افراد ہیں جن کی سلامتی کے لئے ہم بہت زیادہ فکرمند ہیں، اوور!"

"لانچ زیادہ تیز رفتار نہیں ہے!" ٹرانسمٹر پر آواز اُبھری۔ "میں اس پر سے گزر رہا تھا۔ شاید وہ تیس چالیس ناٹ سے زیادہ نہ جا سکیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ایک گھنٹے سے پہلے ہماری بحری حدود عبور نہیں کر سکیں گے۔ اس دوران میں میں ان کے سفر کی سمت کا بآسانی تعین کرلوں گا۔" اوور!"

"تم یہی کرو!" احمد بولا۔ "اس وقت ساڑھے بارہ بجے ہیں کوشش کرو کہ ایک بجے سے ڈیڑھ بجے تک اپنا وقت ان ہی اطراف میں پرواز کرنے گزارو، شاید ہم بھی اس دوران میں ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں، اوور!"

"جس وقت میں نے انہیں دیکھا، ان کا رُخ خلیج کے دہانے کی طرف تھا، اوور!"

"اطلاعات کا شکریہ! ان پر حتی الامکان نگاہ رکھو، اوور اینڈ آل۔" احمد نے اختتامی فقرہ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

واپسی میں ہم سیدھے احمد کے مکان پہنچے جو باہر سے خاصا مناسب اور صاف ستھرا نظر آتا تھا لیکن اندر ہر طرف بے ترتیبی کا راج تھا۔

مکان کی ایک ایک شے زبانِ حال سے پکار رہی تھی کہ اسے اپنی تزئین و ترتیب کے لئے نسوانی ہاتھوں کے سہارے کی ضرورت تھی لیکن احمد اس معاملے میں لاپروا نظر آ رہا تھا۔

صوفوں پر سے کپڑے ہٹا کر اس نے ہم دونوں کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی اور خود فون پر مصروف ہو گیا۔

دو جگہ فون کرنے کے بعد وہ چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

اسمارہ کے مضافات میں ساحل پر ایک پرائیویٹ بوٹ کلب واقع تھا جہاں سے بوٹنگ کے شائقین کو نہ صرف کرائے پر انجن بوٹ ملتی تھیں بلکہ وہ ذاتی بوٹس بھی وہاں رکھ سکتے تھے۔ احمد نے اپنے کسی شناسا سے اس کی نجی کشتی کا بندوبست کیا تھا۔

مسلسل بھاگ دوڑ کی وہ دوسری رات تھی جو تیزی سے گزرتی جا رہی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ اس جدّ و جہد کا خاتمہ کہاں ہوگا؟

میرے لئے تو وہ معاملہ زندگی اور موت کی جنگ کے مترادف تھا۔ سیتا کے حصول کی مہم کا وہ آخری مرحلہ نظر آ رہا تھا۔ اس لئے میں ذہنی اور جسمانی طور پر بدترین حالات کے مقابلے کے لئے تیار تھا لیکن کیتھی کا

معاملہ میرے لئے حیرتناک تھا۔

اس سے ملاقات اور تعارف کے بعد ابتدا میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کیتھی میری چاہت میں سیتا سے رقابت اور حسد محسوس کرنے لگی تھی پھر شبہات نے اس قدر سر اٹھایا کہ مجھے کیتھی کے ہاتھوں سیتا کی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی لیکن اس نے بے مثال کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے تنہا ہیٹر کارلائل جیسے خونخوار درندے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ جو سیتا کو خرید کر سوڈان سے باہر بھیجنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اور اب وہ اپنا سُکھ چین بھُول کر بدترین حالات میں میرے ساتھ محض اس لئے ماری ماری پھر رہی تھی کہ سیتا کے حصول کے بعد میں اپنی ذات کو مکمل محسوس کر سکوں۔

میں گزشتہ اڑتالیس گھنٹوں کے بارے میں اتنے انہماک سے سوچتا رہا کہ اسمارہ بوٹنگ کلب کی خوبصورت عمارت آنے تک مجھے ہوش ہی نہیں آیا!

اتنی رات گئے بوٹنگ کلب میں دربان کے علاوہ ایک کلرک بھی موجود تھا جس کا بظاہر اس کے علاوہ کوئی مصرف نہیں تھا کہ کلب کا کوئی سرپھرا رکن اگر رات گئے سمندر کی سیر پر تل جائے تو اس کی روانگی اور واپسی کا ریکارڈ رکھا جا سکے۔

اُدھیڑ عمر کلرک کو شاید فون پر پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کیونکہ وہ برآمدے میں ہی ہمارا منتظر تھا۔

کلرک نے برآمدے میں ہی الحدید نامی انجن بوٹ کی روانگی کے بارے میں رجسٹر پر اندراج کر کے احمد کے دستخط لئے اور رجسٹر میز پر چھوڑ کر ہمارے ساتھ باہر آ گیا۔

عمارت کے عقب میں ساحل کے متوازی ایک نیم پختہ سڑک پھیلی ہوئی تھی جس کے ساتھ متعدد بوٹس پانی میں لنگر انداز تھیں۔

گاڑی میں ہمیں خاصی دُور جانا پڑا۔ کیونکہ الحدید تقریباً آخری سرے پر لنگر انداز تھی۔ کلرک نے چابی ہمارے حوالے کر کے پیدل واپس جانا چاہا لیکن کیتھی کو اس پر ترس آ گیا۔

وہ کلرک کو چھوڑ کر واپس آئی تو احمد اس کشادہ اور مضبوط فیملی بوٹ کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔

کیتھی کے کہنے پر میں نے اس کی کار کے پائیدان سے ایک مضبوط تھیلا اٹھایا تو وزن محسوس کر کے چونک پڑا۔

"یہ کہاں سے آ گیا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تھیلا احمد کے گھر سے لیا گیا تھا، اس نے راستے میں ضرورت کے مطابق اسلحہ اس میں منتقل کیا تھا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کمال ہے کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا!"

"تم تو خیالات میں گُم تھے۔" اس نے کہا۔ "یہ احتیاط اس لئے کی

گئی کہ کسی کی معیت میں اگر پیدل چل کر لوٹ تک جانا ہو تو اسلحہ کا بھرم باقی رہ سکے۔"

"لوٹ کافی بڑی اور مضبوط ہے۔" میں نے اسلحہ کا تھیلا اندر پہنچانے کے بعد کہا۔ "لیکن ان کی لانچ ہمارے لئے ناقابلِ تسخیر قلعہ ثابت ہوگی۔"

"میں نے اپنے بہترین وسائل داؤ پر لگا دیئے ہیں۔" احمد قدرے بُرا مان کر بولا۔ "اس سے زیادہ انتظام میری بساط سے باہر ہے۔"

"تمہاری مدد کے بغیر تو ہم شاید ان کا سراغ بھی حاصل نہ کر پاتے۔" کیتھی نے جلدی سے کہا۔ "لیکن کھلے سمندر میں ان سے ٹکرانا آسان نہ ہوگا۔"

میں نے لوٹ کے عرشے سے بندھا ہوا رسّا کھولا اور لوٹ قدرے گھوم کر سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔

"ذرا دیکھو کہ اس لوٹ پر کتنے لائف جیکٹ ہیں؟" احمد نے پینل پر لگے ہوئے مختلف آلات کا جائزہ لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

کیبن سے باہر سات لائف جیکٹ موجود تھے۔ احمد نے مشورہ دیا کہ بدترین صورتحال کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ بہتر ہوگا کہ ہم تینوں سفر کے آغاز سے ہی لائف جیکٹس پہن لیں تاکہ عین وقت پر کوئی بدحواسی آڑے نہ آئے۔

تجویز معقول تھی۔ تینوں نے فوراً ہی اس مشورے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

الحدید کا کیبن بہت آرام دہ اور ہر طرف سے بند تھا لیکن باہر کی راہداری میں یخ بستہ سمندری ہوا کپکپی بندھوا رہی تھی۔

میں نے ابوحسّان کی دی ہوئی بوتل منہ سے لگا کر خالی کر دی!

احمد میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "لوٹ کے ہولڈ میں تین چار بوتلیں پڑی ہیں، چاہو تو نکال لینا لیکن سوڈے کی جگہ پانی ملانا ہوگا۔"

"شاید اب ضرورت نہ پڑے۔" میں نے کھڑکی کھول کر خالی بوتل دھیمے دھیمے سنسناتی ہوئی لہروں پر اچھال دی۔

"میرے پاس آجاؤ تاکہ ہنگامی صورتحال میں ہم جگہیں بدل سکیں۔" احمد نے کہا اور میں نرم کوچ سے اٹھ کر احمد کے برابر میں بیٹھ گیا۔

احمد نے چابی گھما کر انجن بند کر دیا اور الحدید تاریکی میں ڈوب گئی۔ انجن بند ہونے کے بعد لہروں کا آسیبی شور کانوں کو چبھنے لگا تھا۔

مجھے دکھا کر اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ اس سے پہلے اس نے روشنیوں کا سوئچ آف کر دیا تھا تاکہ بیٹری زیرِ بار نہ ہو۔ انجن چل پڑنے پر بتیاں جلادی گئیں۔

قطب سما کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ بتدریج رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے الحدید کے ڈیش پر چالیس ناٹ کی رفتار نظر آنے لگی۔

لوٹ کے دونوں طرف جھاگ کا سمندر پیدا ہو رہا تھا جو اندر سے پڑنے والی روشنی میں ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت نظر آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم سمندر کے بجائے برف کی کسی سرنگ میں سفر کر رہے ہوں۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی جو رات کا ایک بجا رہی تھی۔ احمد نے لیور کو مزید جنبش دی۔ طاقتور انجن کی غرّاہٹ تیز ہوگئی۔ اور رفتار بتانے والا میٹر پچاس ناٹ کی خبر لانے لگا۔

"ہم ان سے مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟" بوجھل سکوت میں کیتھی کی فکرمند آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ "تمہارے اندیشے اتنی درست تھے۔"

"عملی لحاظ سے ہم بالکل ناکارہ ہیں۔" احمد نے اعتراف کیا۔ "وہ دُور مار رائفلوں سے لیس ہیں اور خطرہ بھانپتے ہی ہمیں دور سے باڑھ پر رکھ سکتے ہیں۔"

"پھر تو یہ تعاقب ہی بے سُود ہے!" کیتھی بولی۔

"مجھے صرف اتنا علم ہے کہ مادام کو ایک ٹریلر کی تلاش تھی جو مل گیا۔" احمد نے کہا۔ "اس سے آگے میں بے خبر ہوں۔ تفصیل سامنے آئے تو شاید کوئی راہ بھی سُوجھ ہی جائے۔"

"تفصیل بھی سن لو۔" میں نے فوری خیال کے تحت کہا۔ "مگر میرے ذہن میں ایک تدبیر آگئی ہے!"

"کیا؟" کیتھی نے بے تابی سے سوال کیا۔

"پہلے احمد کو پوری صورتحال سمجھا دوں۔" میں نے کہا اور احمد کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "اس ٹریلر میں خرطوم سے ایک لڑکی اغوا کر کے لائی گئی تھی جسے دوسرے سامان کے ساتھ لانچ پر منتقل کر دیا گیا ہوگا۔ ہم اس لڑکی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لڑکی کی منتقلی کی نوبت ہی نہ آئی ہو۔" احمد کی آواز مجھے بہت دُور کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"تمہارا مفروضہ حقائق سے میل نہیں کھاتا۔" کیتھی کے جواب نے مجھے سہارا دیا۔ "یہ نہ بھولو کہ لڑکی مغویہ تھی۔ اسے وہ کھلے بندوں لانچ پر نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس کی منتقلی کے بعد ہی انہوں نے قلیوں کو ٹریلر میں گھسنے کی اجازت دی ہوگی۔"

"اور اگر لڑکی لانچ پر ہے تو ہمارا مقصد صرف اس کا حصول ہے۔" میں نے گلا صاف کر کے اپنی بات جاری رکھی۔ "ان سے مقابلہ کرنے کے بجائے ہم مدعا حاصل کر سکتے ہیں۔ تفریح کے شوقین گہرے سمندر میں آ کر اکثر سمتوں کا شعور کھو بیٹھتے ہیں!"

"ایک مرتبہ لانچ پر پہنچنے کے بعد تو ہم کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیں گے۔" کیتھی نے پُرجوش انداز میں میری تائید کی۔

"اور اگر انہوں نے ہمیں نظرانداز کر دیا۔" احمد معاملے کے ہر پہلو پر پیشگی غور و فکر کا قائل معلوم ہوتا تھا۔ "وہ واپس ایتھوپیا کے کسی ساحل پر نہیں جا رہے پھر وہ ہمیں اپنے سروں پر کیوں مسلط کریں گے؟"

"اس کا سارا انحصار ہم پر ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم انہیں اپنی مظلومیت کا یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے تو وہ کسی بھی اگلی بندرگاہ تک ضرور ہمیں مدد فراہم کر دیں گے؟"

"خرابی بس ایک ہی ہے۔" کیتھی نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ "ان کی طرف سے فائرنگ میں پہل کا مقصد تھا کہ ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی ہم دونوں کو شناخت کر لے اور ہم کوئی قدم اٹھانے سے پہلے دھر لیے جائیں!"

"کاش کہ ہمارے پہنچنے تک ٹی ٹھری ان کے سروں پر منڈلاتا رہے۔" احمد نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت بے خوف آدمی ہے، اس سے ہمیں خاصی مدد مل سکے گی۔"

بے یقینی کی اس فضا میں تینوں ہی خاموش ہوگئے مگر ہر ایک اپنی جگہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

معاً فضا میں ایک عجیب سا شور سُنائی دیا اور میں اضطراری طور پر کیبن کا دروازہ کھول کر عرشے پر نکل آیا۔

پیچھے کافی دُور سے فضا میں ایک سفید ہیلی کاپٹر ہماری طرف بڑھتا آرہا تھا۔ اس کی نچلی سرچ لائٹ نے دُور تک سمندر کا سینہ روشن کیا تھا۔

پنکھوں کی تیز گردش کے شور کے ساتھ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری لوٹ ہیلی کاپٹر کی تیز روشنی کی زد میں آگئی۔ اور میں پھُرتی سے اندر گھس گیا۔ مگر اندر گھُستے ہی میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ کیتھی اسٹین گن اٹھائے کیبن کے وسط میں کھڑی ہوئی تھی۔ اور گن کی نال کیبن کے واحد داخلی دروازے کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔





میں موٹر بوٹ کے کیبن کے داخلی دروازے پر ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

کیتھی مائر کے ہاتھوں میں دبی ہوئی اسٹین گن کا دہانہ میرے سینے کی جانب اٹھا ہوا تھا اور فضا میں گرجتے ہوئے سفید ہیلی کاپٹر کے انجن کا بے ہنگم شور لحظہ بہ لحظہ قریب تر آتا جا رہا تھا۔ اس مرحلے پر میری عقل یکسر ماؤف ہو کر رہ گئی تھی۔

کیتھی نے قہقہہ لگایا لیکن اس کی آواز میں زندگی کی کھنک مفقود تھی مگر میرے لئے اہم بات یہ تھی کہ اس نے اپنی اسٹین گن کی نال جھکالی تھی۔

"کیا ہو گیا تمہیں؟" میں نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ کیتھی کے نرم شانوں پر جما دیے۔

میرا وہ اقدام اضطراری نہیں بلکہ سوچا سمجھا تھا۔ اس کے شانوں کو اپنی گرفت میں لے کر میں نے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ کیتھی اگر دوبارہ میرے سینے پر نال اٹھانی چاہے تو اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی کراہتی ہوئی کسی کینچوے کی طرح بوٹ کے فرش پر ڈھیر ہو جائے۔

"آج کی رات میرے لئے یادگار ہوگی۔" وہ آنکھیں موند کر قدرے خود فراموشی کے عالم میں ہنہنائی۔ "میں اس کی منتظر تھی!"

"مگر کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ "تم نے مجھ پر ہتھیار کیوں اٹھایا تھا؟"

وہ عجیب انداز میں ہنسی۔ "بس اضطراری حرکت کہہ لو مگر کچھ لوگ میری ذات سے یہ امید وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ میں پہلی مہلت ملتے ہی تمہیں اپنے ہتھیار کی زد پر بے بس کر کے قید کر لوں گی۔"

"سارے ہتھیاروں سے کام لینے پر تل جاؤ تو شاید اسیر کر ہی لو۔" میں نے اس کے سراپا پر بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "مگر وہ کون لوگ ہیں جو تم سے ایسی توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہیں؟"

"دیکھتے جاؤ، سب کچھ خود بخود سامنے آ جائے گا۔" اس نے سنبھل کر کہا۔ پھر چونک کر سوال کیا۔ "یہ کس کا ہیلی کاپٹر تھا؟"

اس وقت تک سفید ہیلی کاپٹر ہماری بوٹ پر سے گزر کر کافی آگے نکل چکا تھا مگر اس کے انجن کی ڈوبتی ہوئی آوازیں اس وقت بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"معلوم نہیں، لیکن سفید تھا!" میں نے کہا۔

"پھر وہ ڈی تھری ہی رہا ہوگا۔" احمد نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ "ایتھوپیا کے کوسٹل گارڈز سفید ہیلی کاپٹر ہی استعمال کرتے ہیں!"

"اگر وہ ڈی تھری ہے تو اسے یہاں تک پہنچنے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔" کیتھی نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اپنے کسی ماتحت کی نااہلی پر ناخوش ہو۔

"درست ہے!" احمد نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "لیکن ڈی تھری سرکاری ملازم ہے۔ فرائض منصبی کے دوران وقت نکالنا بجائے خود دشوار کام ہے!"

"کاش اس سے رابطہ قائم کیا جا سکتا!" کیتھی نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ "فضا میں رہتے ہوئے وہ ہماری کافی مدد کر سکتا ہے!"

"موقع ملا تو وہ خود ہی.....!"

احمد نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے اپنے ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا اور اس نے فوراً ہی بٹن آن کر دیا۔

"ڈی تھری کالنگ فار ایکس ٹی۔ اوور..." اس مختصر سے آلے پر تسلسل کے ساتھ ہی ایک فقرہ ابھرنے لگا۔

انسانی آواز کے پس منظر میں تیز اور گونجیلا شور بھی نمایاں تھا جو میری دانست میں سفید ہیلی کاپٹر کے انجن کی پیداوار تھا۔

تیسری بار جب ہی ڈی تھری نے فقرہ مکمل کرنے کے بعد چند ثانیوں کا سکوت اختیار کیا۔ احمد نے اپنے سیٹ کا بٹن دبا دیا۔

"ایکس ٹی رسپونڈنگ اوور!" احمد کی آواز پُرسکون تھی۔ وہ نشریاتی رابطہ اتنا سنسنی خیز تھا کہ میرے ساتھ ہی کیتھی بھی احمد کے قریب آ گئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے وہ لانچ دیکھ لی ہے۔" سیٹ پر ڈی تھری کی آواز سنائی دی۔ "وہ مسلسل خلیج کے دہانے کی طرف رواں ہے۔ اس کے پیچھے نیلے رنگ کا ایک موٹر بوٹ ہے جس پر سے میں تھوڑی دیر قبل گزرا ہوں۔ تم کہاں ہو؟ اوور!"

"نیلی بوٹ ہماری ہے۔" احمد کی آواز میں جوش کا عنصر نمایاں ہو گیا۔ "تم کافی دیر سے پہنچے ہو؟ تمہارا ساتھی ہوا باز کہاں ہے؟ اوور!"

اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ "مجھے اپنے ساتھی کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ وہ اسکاچ کا رسیا ہے۔ اسے کوئین این کی آغوش میں پہنچانے کے بعد میں نکلا ہوں ورنہ اس وقت تم سے بات بھی نہ کر پاتا، اوور!"

"میری ناقص رائے میں تم نے تنہا پرواز کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔" احمد کا لہجہ قدرے تلخ اور تادیبی تھا۔ "ایسا نہ ہو کہ محض اسی بنا پر تم کو طویل مدت کے لئے جبری رخصت پر بھیج دیا جائے یا معطلی کا پروانہ جاری ہو جائے، اوور!"

"ڈیوٹی کے دوران شراب نوشی سب سے زیادہ سنگین جرم ہے۔" ٹرانسمیٹر پر ڈی تھری کی پُرسکون آواز سنائی دی۔ "میرا نائب ڈیوٹی پر اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لئے میری لاگ بک پر اپنے دستخط ضرور ثبت کرے گا اور مجھ سے کسی باز پرس کی نوعیت نہ آئے گی۔ ان معاملوں میں میں بہت محتاط ہوں ــــ اوور!"

"ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ تم لانچ پر ایک چکر کاٹ کر دور ہی

سے اس کا جائزہ لینے کے بعد رپورٹ دیتا کہ ہم اسی کے مطابق اپنی حکمت عملی طے کر سکیں..... اوور!" احمد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"بس چند منٹ بعد رابطہ قائم کرتا ہوں ــــ اوور اینڈ آل!" دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا لیکن احمد نے اپنا ٹرانسمٹر بدستور آن رہنے دیا۔

"یہ بہت اچھا ہوا!" کیتھی نے اضطراری لہجے میں کہا "ڈی تھری بروقت پہنچا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ وہ اکیلا ہے ورنہ لیول کھل کر اس سے بات نہ ہو پاتی!"

"اس کی موجودگی میں ہم بہتر پوزیشن میں ہوں گے!" میں نے احمد سے قدرے ہٹتے ہوئے کہا اور کیتھی بھی میرے ساتھ ہی سرک آئی۔

"تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے!" میں نے اس کا بازو تھام کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا "تم نے کن لوگوں کی طرف اشارہ کیا تھا؟"

"تمہارے خون کے پیاسے!"

"مگر کون؟" میں نے بے صبری سے سوال کیا "میرے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس وقت تو تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے علاوہ مجھے کوئی بھی اپنا دوست یا ہمدرد نظر نہیں آتا۔ مجھ سے کھل کر بات کرو!"

"اسرائیلی!" وہ میری آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولی۔

اس کی زبان سے وہ لفظ سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا "اسرائیلی؟" میں نے تحیر زدہ لہجے میں اس سے سوال کیا "ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

میرے ذہن نے ان چند ثانیوں میں صورتحال کے بارے میں ایک گمبھیر کہانی تراش لی تھی۔ شاید کیتھی مائر اسرائیلیوں کی ہی پروردہ تھی۔ اس نے مجھ سے خود اعتراف کیا تھا کہ وہ کافی عرصے تک اسرائیلی سیکرٹ سروس میں ایک اہم عہدے پر فائز رہی تھی۔ پھر شاید اس نے کسی لمبے کھیل کے لئے اپنا ماضی چھپائے بغیر اسرائیل سے بیزاری بلکہ بے وفائی کا ڈھونگ رچایا اور فلسطینی تنظیم کے ذمہ داروں سے آملی۔

پی ایل او کے سرکردہ لوگوں کے لئے سیاسی اعتبار سے یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی کہ یہودی نسل کی ایک لڑکی اسرائیل سے منحرف ہو کر ان کے کاز کے لئے کام کرے۔ لہٰذا وہ کیتھی مائر کے فریب کا شکار ہو گئے اور اس لڑکی نے ان کے اعتماد کے سہارے مختصر عرصے میں ترقی کی اتنی منازل طے کر لیں کہ خرطوم میں پی ایل او کے دفاتر پر حکمراں ہو گئی۔

مگر اسرائیلیوں کے ساتھ اس کے خفیہ روابط برقرار تھے۔ وہ ہر قیمت پر صفدر علی کو اپنا قیدی بنانا چاہتے تھے اور کیتھی بھی اس بات سے باخبر تھی۔ اس کے آقاؤں کو اس سے امید رہی ہوگی کہ موقع میسر آیا تو کیتھی پہلی فرصت میں صفدر علی کو بے بس کر کے اپنا حقِ نمک ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرے گی اور شاید کیتھی بھی ان کی توقعات پر پوری اترنے کے لئے آمادہ رہی ہوگی لیکن مجھ سے ملاقات کے بعد حالات بدل گئے۔

اس لڑکی کو میری ذات سے قدرے لگاؤ ہو گیا تھا اور محض اسی وابستگی کی بنا پر اس نے مجھ پر کوئی داؤ چلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"یہ نہ بھولو کہ اسرائیل میرا وطن ہے!" وہ کہہ رہی تھی "میں حیفہ میں پیدا ہوئی اور تل ابیب میں پروان چڑھی۔ اسرائیل میں آج بھی بہتیرے لوگ ایسے ہیں جن کے لئے میرے دل میں نیک جذبات موجود ہیں!"

"اور ان سے تمہارے روابط بھی ہیں؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ان معنوں میں نہیں جو تم سمجھ رہے ہو؟"

"مجھ پر مزید احسان نہ کرو!" میں نے اس کی بات کاٹ کر تلخ لہجے میں کہا "مجھ پر ہتھیار اٹھاؤ، مقدر نے ساتھ دیا تو تمہیں زیر کر کے آزاد رہوں گا ورنہ تمہیں میرے بارے میں آزادانہ فیصلے کا پورا پورا اختیار ہوگا!"

"ذہنی چھلانگیں نہ لگاؤ!" وہ سنجیدہ ہو گئی "تین روز قبل میرا باپ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اسرائیلیوں کو کسی طرح بھنک مل گئی تھی کہ تم سوڈان میں داخل ہو چکے ہو۔ میرا باپ اسرائیل کی سیکیورٹی اینڈ ڈیفنس کونسل کے سربراہ جنرل شمعون کا پیغام لایا تھا۔ جنرل کی خواہش تھی کہ میں اسرائیل کی سرزمین سے اپنے رشتے کی خاطر زندگی میں آخری بار اس کے لئے ایک کام سرانجام دوں اور کسی بھی طرح سوڈان میں تمہیں تلاش کر کے اسے مطلع کر دوں یا تمہیں پکڑ لوں۔ اس کام کے لئے مجھے منہ مانگے انعام کی نوید دی گئی تھی۔ میرے باپ نے پورا زور لگایا لیکن میں نے اسے گرفتاری سے خوف زدہ کر کے اسی روز سوڈان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا!"

میں حیرت سے گنگ اس کا چہرہ تکتا رہ گیا۔

اس کی کہانی میرے اندازوں کے برعکس بہت مؤثر اور حیران کن تھی۔ اگر وہ سچ بول رہی تھی تو اس کی ذات لائق احترام تھی۔ اس دور میں ایسے لوگوں کا ہر طرف کال ہے جو محض اپنے گنے چنے اصولوں کی خاطر ہر مادی منفعت اور آسائش کو حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں اور کیتھی مائر بظاہر ان ہی کے گروہ کی سرخیل معلوم ہوتی تھی۔

"اور تمہارے باپ کے مشن کی ناکامی کے بعد اگر تمہاری نگرانی شروع کرا دی گئی ہو؟" میں نے قدرے توقف کے دوران جذباتی جھٹکے سے سنبھالا لینے کے بعد سوال کیا۔

"سوازی لینڈ کے سفارت کار سے ٹکراؤ کے بعد سارا نظام درہم برہم ہو گیا ہوگا!" اس نے جواب دیا "اگر میری نگرانی ہو رہی ہوتی تو تم سے پہلے اسرائیلی ایجنٹ مجھے پیٹر کارلائل کی قید سے نجات دلاتے اور مجھے احسان مند بنا کر میرا تعاون خریدنے کی دوسری کوشش ضرور کرتے میں ان کے طریقۂ کار سے بخوبی واقف ہوں!"

"مجھے خوشی ہے کہ اسرائیلی ابھی تک مجھے بھول نہیں سکے ہیں!"

"تمہارے دیے ہوئے چرکے بہت گہرے تھے!" وہ ہنسی۔ "اسرائیل کے مفرور قومی مجرموں کی فہرست میں ہٹلر کے ایک دستِ راست کے بعد دوسرا نام تمہارا ہے!"

"ایک بار سیتا کو پا لینے کے بعد میں اپنے ماضی کے سراغ اس طرح مٹا ڈالوں گا کہ یہ سارے حوالے میری ذات سے ٹوٹ کر رہ جائیں گے!"

"اور وہ مرحلہ.....!"

کیتھی کا فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اسی لمحے ٹرانسمٹر پر ڈی تھری کی آواز ابھرنے لگی!

"ایکس ٹی رسیونگ، اوور!" احمد نے سیٹ کا بٹن دبا کر سگنل نشر کیا اور بٹن پر سے انگلی ہٹائی۔

"حالات مخدوش ہیں!" ہیلی کاپٹر کے انجن کے شور میں ڈی تھری کی آواز ابھری "پہلے لانچ کے عرشے پر سناٹا تھا لیکن میری نیچی پرواز کے بعد عرشے کی بیشتر روشنیاں بجھا دی گئیں۔ میں نے دور سے تیز روشنی پھینک کر جائزہ لیا تو عرشے پر کم از کم تین نفوس نظر آئے جن میں سے کم از کم دو کے ہاتھوں میں دور مار رائفلیں تھیں..... اوور!"

"تم دوبارہ لانچ پر سے نہیں گزرے؟ اوور!" احمد نے سوال کیا۔

"ان کے تیور خراب ہیں!" وہ بولا "ان کے چوکنا ہونے کے بعد میری ایسی کوشش خودکشی کے مترادف ہوتی، وہ رائفل سے باآسانی ہیلی کاپٹر گرا سکتے ہیں۔ انہوں نے لانچ کی رفتار بھی کچھ تیز کر دی ہے..... اوور!"

"میں بات کرتا ہوں!" میں نے احمد کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا اور اسے خاموش پاتے ہی میں نے ٹرانسمٹر سنبھال لیا جو اس وقت بالکل خاموش تھا۔ ڈی تھری اوور کہنے کے بعد تحمل کے ساتھ جواب کا منتظر تھا۔

"تم ہیلی کاپٹر میں اکیلے ہو؟ اوور!" میں نے سرخ بٹن دبا کر سوال کیا۔

"تم کون ہو؟ اوور!" ڈی تھری کا لہجہ قدرے سخت اور توہین آمیز تھا۔

"تم بات کر سکتے ہو!" احمد نے جلدی سے وضاحت کی "بوٹ پر میرے دو ساتھی بھی موجود ہیں جن پر مجھے پورا اعتماد ہے..... اوور!"

"میں اکیلا ہوں، اوور!" ڈی تھری نے جواب دیا۔

"اگر تمہارے پاس رسّے کی سیڑھی ہو تو میں تمہارے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں..... اوور!" میں نے کہا۔

"سیڑھی بھی ہے اور میرے جہاز میں خودکار گن بھی نصب ہے جو ایک وسیع رینج میں حرکت کر سکتی ہے لیکن تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اوور!"

"تمہارے ساتھ مل کر شاید کوئی راہ سوجھ جائے..... اوور!" میں نے کہا۔

"میں آ رہا ہوں..... تیار رہو! اوور اینڈ آل!"

ڈی تھری کے اختتامی فقرے کے ساتھ ہی ٹرانسمٹر بے جان ہو گیا۔

"تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" کیتھی نے آگے بڑھ کر اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"فی الحال خالی الذہن ہوں!" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ موٹر بوٹ پر رہ کر ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ فضا سے شاید کوئی مؤثر کارروائی ممکن ہو!"

کیتھی نے احمد کی موجودگی کی پروا کئے بغیر میری پیشانی چوم لی۔

"تم پر دیوانگی طاری ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ عجلت میں خود کو خطرے میں ڈال دو!"

"خطرات مرد کی زندگی کی شان بڑھاتے ہیں کیتھی!" میں نے اپنی لائف جیکٹ کے بند درست کرتے ہوئے کہا "اگر سیتا اس وقت ہاتھ نہ آسکی تو شاید میں طویل مدت تک اس کے لئے بھٹکتا رہ جاؤں گا!"

"میں پھر یاد دلا رہا ہوں کہ کہیں وہ ٹریلر میں ہی نہ چھنسی ہوئی ہو!" احمد کی تادیبی آواز ابھری جو اس مرحلے پر مجھے خاصی ناگوار گزری!

"ٹریلر واپسی پر بھی وہیں ملے گا!" میں نے ترش لہجے میں کہا "لیکن یہ لانچ دوبارہ ہاتھ نہ آسکے گی!"

لائف جیکٹ درست کرنے کے بعد میں نے تیزی سے بارودی اسلحے کا بار اپنے شانوں اور جیبوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اسٹین گن، اس کے فاضل راؤنڈز، تین اقسام کے پانچ دستی بم اور ایک پستول لے کر میں موٹر بوٹ کے کیبن سے باہر نکلا تو سفید ہیلی کاپٹر سطح سمندر سے بمشکل بیس فٹ اوپر پرواز کرتا تیزی سے ہماری طرف آ رہا تھا۔

اس کے نچلے حصے میں روشن سرچ لائٹ نے سمندر کا وسیع حصہ دُور تک منور کیا ہوا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے ہماری موٹر بوٹ کو دُور سے دیکھتے ہی رسّی کی سیڑھی نیچے لٹکانی شروع کر دی تھی۔

اور جب ہیلی کاپٹر ہماری موٹر بوٹ پر آیا تو اس کی پنکھڑیوں سے پیدا ہونے والے شدید دباؤ کے باعث نہ صرف رسّی کی سیڑھی بے تحاشا فضا میں جھول رہی تھی بلکہ میرے لئے بھی ڈیک پر قدم جمائے رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

"کوئی حماقت نہ کر گزرنا!" لوٹ اور ہیلی کاپٹر کے انجنوں کے شور میں مجھے اپنے کان کے قریب ایک بھرّائی ہوئی نسوانی منمناہٹ سنائی دی تو میں چونک پڑا۔

ہیلی کاپٹر سے پڑنے والی روشنی میں کیتھی کے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے شفاف موتی ہیروں کی طرح چمک رہے تھے اور وہ نچلا ہونٹ اپنے موتیوں جیسے دانتوں میں دبائے حسرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم فکر نہ کرو!" میں نے نرمی سے اس کا بازو تھپتھپا کر اس کے کان میں زور سے کہا تاکہ وہ میری بات سن سکے۔

"خدا کرے کہ سیتا لانچ پر ہو اور زندہ سلامت تمہیں مل جائے ...مم... مگر یہ یاد رکھنا کہ میں بھی تم کو ٹوٹ کر چاہنے لگی ہوں۔"

اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا اور آخری الفاظ سسکیوں میں ڈوبنے کے باوجود اپنے تاثر کی مہر ثبت کر گئے۔

میں اس کی طرف لپکا مگر وہ روتی ہوئی بوٹ کے کیبن میں جا گھسی۔

میں نے سوچا کہ اسے دلاسا دوں مگر مجھے ہمت نہ ہو سکی میں اس کے دلی جذبات سے واقف تھا۔ وہ خود بھی اعتراف کر گئی تھی اور میں سیتا کے حصول کی راہ پہ گامزن تھا جو کیتھی کے شوریدہ جذبوں کی سراسر نفی تھی لہٰذا اس آخری موڑ پر اس سے سامنا کر کے مجھے خفت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔

پھر جوں ہی ہوا کے جھکڑوں میں جھولتی ہوئی رسّی کی سیڑھی قریب آئی، میں نے لپک کر اسے تھام لیا اور ہوا کے طوفانی تھپیڑوں میں تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔

چند سیڑھیاں عبور کرتے ہی ہیلی کاپٹر سست روی کے ساتھ موٹر بوٹ سے دُور ہونے لگا اور میں سرکش سمندری موجوں پر معلق رسّوں کے ذریعے ہیلی کاپٹر کے کیبن میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس ہیلی کاپٹر کا کیبن مختصر لیکن آرام دہ تھا۔ میں نے اندر گھسنے کے بعد ٹی تھری کے اشارے پر اس کے برابر والی نشست سنبھال لی۔

اس سے قبل میری دانست میں وہ روزمرہ کی گشتی پروازوں میں کام آنے والا ایک معمولی ہیلی کاپٹر تھا لیکن اس کے کیبن میں نصب آلات کو دیکھتے ہی میرا تاثر ایک دم بدل گیا۔ وہ کسی بھی طرح ایک جنگی ہیلی کاپٹر سے کم نہیں تھا۔

ٹی تھری سے نگاہوں کے تبادلے کے بعد میں نے اپنے کان پر ہیڈ فون چڑھائے تو شور کی شدت میں فوری کمی واقع ہو گئی۔

"تمہارا کوڈ ایگل ہے!" ہیڈ فون چڑھاتے ہی مجھے ٹی تھری کی آواز سنائی دی۔ "میں نے ایکس ٹی کو بھی بتا دیا ہے!"

"اب لانچ کی طرف چلو!"

"ضرور چلوں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ لائف جیکٹ کس خوشی میں پہنی ہوئی ہے؟" اس کا لہجہ شوخ اور اکسانے والا تھا۔ "لوگ سمندر میں غوطہ مارتے وقت جیکٹ استعمال کرتے ہیں اور تم نے جہاز میں آتے ہوئے جیکٹ پہنی ہے!"

"میں لانچ پہ اتروں گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اندازے کی ذراسی غلطی مجھے سمندر میں بھی پہنچا سکتی ہے۔"

"تو کیا تم یہ طے کر کے آئے ہو؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں!" میرا لہجہ اٹل اور سنگین تھا۔

"لیکن ایکس ٹی تو کہہ رہا تھا کہ تم میرے ساتھ مل کر کوئی راہ تلاش کرو گے!" اس نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔" میں بولا۔ "اگر اسے پوری بات بتا دیتا تو شاید اس وقت میں تمہارے ساتھ کیبن میں موجود نہ ہوتا۔"

"شاید ایکس ٹی یہ سب تمہارے ہی لئے کر رہا ہے؟" اس نے قدرے تجسس کے ساتھ سوال کیا۔

"جو چاہو سمجھ لو۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

"تم ایکس ٹی کو تو فریب دے آئے لیکن میں تمہیں خودکشی کی اجازت نہیں دوں گا۔" اس نے اچانک بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیسی خودکشی؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"لانچ پر اترنے کی کوشش خودکشی سے ہی مماثل ہو گی۔" اس کا لہجہ بڑی حد تک پُراعتماد تھا۔

"میں عقل سے بالکل ہی پیدل نہیں ہوں میرے دوست!" میرا لہجہ غیرارادی طور پر قدرے تلخ ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں!" وہ ہیلی کاپٹر کو تیزی سے بلندی کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ "لیکن جہاں عورت کا معاملہ ہو، مرد بڑی سے بڑی حماقت کر گزرتا ہے۔"

"بشرطیکہ وہ عورت محبوبہ ہو!" میں نے کہا اور وہ مجھ سے نگاہیں چار کر کے ہنس پڑا۔ "اور میں جس عورت کے فراق میں ہوں وہ میری محبوبہ اور معشوقہ ہونے کے ساتھ ہی میری بیوی بھی ہے۔"

"بیوی؟" ہیڈ فون میں مجھے اس کی تحیر زدہ آواز سنائی دی۔ "تم اپنی بیوی کے لیے اس قدر حیران اور پریشان ہو؟"

"وہ میری اکلوتی بیوی ہے۔ اور میں اسے والہانہ انداز میں چاہتا ہوں!"

"تم اپنی مدافعت میں جو چاہے کہہ لو۔ لیکن اجازت ہو تو میں بھی اپنے مسلک کا ایک رمز بیان کر ڈالوں؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میری دانست میں بیویوں کی تعداد کسی بھی شخص کی مالی حیثیت کے مطابق ہی ہوا کرتی ہے۔ اگر تم ایک ہی عورت کے پیچھے اپنی جان پر ہولناک ستم ڈھانے پر تلے ہوئے ہو تو میں تم سے محض ہمدردی کر سکتا ہوں۔"

"شاید تم مجھے مفلس کہنا چاہتے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "لیکن یہ تمہارے اپنے ذہن کا تصور ہے۔ میری دانست میں مرد صرف اور صرف وہی ہے جو کسی کو چاہے اور جسے ٹوٹ کر چاہا جائے!"

"تم جذباتی ہو گئے ایگل!" اس نے جلدی سے کہا۔ "اب اس موضوع کو ختم کرو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"ایک مرتبہ میں دور سے اس لانچ کا جائزہ لینا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔ "پھر تم اپنی گن سے لانچ پر فائر برساتے تیزی سے گزر دو گے۔ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر پناہ تلاش کریں گے۔ اور اسی دوران میں واپس پلٹ کر تم مجھے لانچ کے عرشے پہ اتار دو گے۔ انہیں علم ہی نہ ہو سکے گا کہ کیا ہوا ہے!"

"ایکس ٹی نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس کے لیے بہت اہم ہو۔ اور تمہارے ہر حکم کی تعمیل میرے لیے لازمی ہے۔ لیکن میں بصد معذرت یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا تمہیں اپنے اقدام کے منفی اثرات کا پوری طرح علم ہے؟"

"اس کا بدترین منفی نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ میں مار دیا جاؤں۔ اس سے زیادہ وہ میرا کیا بگاڑ سکیں گے؟"

"ٹھیک ہے!" شاید وہ ہنسا۔ "تم تو مارے جاؤ گے۔ مگر اس عورت کا کیا بنے گا۔ جسے انہوں نے قیدی بنایا ہوا ہے؟"

"وہ قیدی ہی رہے گی۔" میں نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"قیدی اور شکست خوردہ قیدی میں فرق ہوتا ہے میرے عزیز!" اس نے گویا میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اگر انہوں نے تمہیں قفس کا اسیر کر لیا تو وہ اس کا جشن خاتون کے ساتھ منائیں گے...!"

"کیا بک رہے ہو؟" میں اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ "وہ مرجانا گوارا کرے گی لیکن ان بھیڑیوں کا کھلونا بننا پسند نہیں کرے گی۔"

"عملاً ایسا نہیں ہوتا۔" وہ آہستگی سے بولا۔ "جب زندگی اپنے آخری سانسوں پر نظر آنے لگے تو انسان زیادہ فراخدلی سے سمجھوتوں پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہی سمجھوتے اس کی ذات کی آخری پہچان ہوتے ہیں!"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھ سے بحث کرنے کے بجائے تم اپنے کام سے کام رکھو!" میں نے بدمزگی کے ساتھ کہا اور وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔

اچانک اس کی گود میں پڑے ہوئے ٹرانسمٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ اور اس نے فوراً ہی وہ آلہ میری طرف بڑھا دیا۔

دوسری طرف سے کیتھی مجھ سے بات کرنا چاہ رہی تھی!

"تم نے کیا حکمت عملی طے کی ہے؟ اوور۔" اس نے میرا جواب سن کر سوال کیا۔ اس کا لہجہ بجھا ہوا اور بے جان سا تھا!

"ہیلی کاپٹر سے لانچ پر فائرنگ کی آڑ میں اس کے عرشے پر اترنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں بنے گی۔ اوور!"

"یہ قدم خطرناک ہو گا!" کیتھی کی اضطراری آواز سنائی دی۔ "لانچ پر ان کی تعداد کسی بھی طرح چھ آٹھ سے کم نہ ہو گی۔ وہ ذرا ہی دیر میں تمہیں بے قابو کر لیں گے۔ اوور!"

"میری کامیابی کا دار و مدار تم لوگوں پر بھی ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں انہیں عرشے سے دور رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اس دوران میں تم لوگوں کو عقب سے پیش قدمی کر کے تیزی سے لانچ پہ پہنچنا ہو گا... اوور!"

"ٹی تھری تم سے متفق ہے؟ اوور!"

"ہونا ہی پڑے گا کیونکہ اس کے پاس کوئی متبادل تجویز نہیں ہے!" میں نے کہا۔ "لانچ نظر آنے لگی ہے۔ مگر ہم اس سے دور رہ کر تمہارے نمودار ہونے کا انتظار کریں گے۔ اوور!"

"اوور اینڈ آل!" ٹرانسمٹر خاموش ہو گیا۔

ٹی تھری اپنے کام میں خاصا مشاق تھا۔ اس نے میرے پہنچنے کے بعد ہیلی کاپٹر کی بیرونی روشنیاں گل کر دی تھیں۔ تاکہ رات کے اندھیرے میں دور سے اس کی نشاندہی کا امکان باقی نہ رہے۔ رسّے کی سیڑھی بھی مشینی چرخے پر لپیٹ لی گئی تھی!

ٹرانسمٹر پر کیتھی سے گفتگو کے دوران میں ٹی تھری نے اشارے سے مجھے وہ تین روشن نقطے دکھائے تھے جو غیر محسوس طریقے سے سمندر کے تاریک سینے پر متحرک تھے!

"فی الحال لانچ سے دور ہی رہو!" میں نے کہا اور ٹی تھری نے ایک لیور دبا کر ہیلی کاپٹر کو تیزی کے ساتھ داہنی طرف موڑ لیا۔

اس لانچ سے کئی فرلانگ دور رہتے ہوئے ہیلی کاپٹر نے فضا میں اس کے گرد اپنا پہلا چکر پورا کیا تھا کہ ٹرانسمٹر پہ دوبارہ کیتھی

کی آواز ابھری !

ان لوگوں نے اپنی موٹر بوٹ کی تمام روشنیاں گل کر کے اندھیرے میں سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور سمندر میں اتنے بڑھ آئے تھے کہ لانچ کی تین روشنیاں انہیں نظر آنے لگی تھیں مگر وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھے !

احمد کے استفسار پر ڈٹھری نے انہیں بتایا کہ وہی روشنیاں لانچ کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ پھر وہ انہیں لانچ کے عقب میں پہنچنے کے لیے سمتوں کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔ جو میری فہم سے بالاتر تھیں۔

اس وقت میں نے اپنے وجود پر طاری اعصابی دباؤ میں یک بیک نمایاں کمی محسوس کی۔ اور معرکے کے آغاز سے قبل آخری سگریٹ سلگائی۔

اس وقت صورتِ حال نہایت سنسنی خیز تھی اور مقابلے کی تیاریاں بھی بھرپور تھیں۔ اعصابی سکون میسر آنے سے قبل مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں کسی معروف جنگی محاذ پر ایک بحری معرکے کی تیاریوں میں مصروف ہوں !

فضا میں بے مقصد وقت گزاری کرتے ہوئے ایک بار ہیلی کاپٹر موٹر بوٹ پر سے گزرا۔ جو سمندر کے سیاہ سینے پر ایک سیاہ دھبے کی طرح ایک ہی جگہ لرزتی محسوس ہوئی !

"اب ہمیں ابتدا کر دینی چاہیے !" میں نے فاصلوں کا اندازہ لگاتے ہوئے ڈٹھری سے کہا۔ "تاخیر نقصان دہ ہو سکتی ہے !"

"مجھے ایندھن کی بھی فکر ہے !" ہیڈ فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ "ساری کارروائی پچیس منٹ میں مکمل نہ ہوئی تو مجھے اپنے مستقر کی طرف لوٹنا ہوگا !"

"مجھے اتار کر تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔ لیکن انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے تمہارا فضا میں منڈلاتے رہنا ضروری ہے !"

"میں پچیس منٹ سے زیادہ رکنے کا خطرہ مول نہیں لوں گا" اس نے کہا۔ "اگر واپسی میں ایندھن کی کمی کی وجہ سے کوئی دشواری پیش آئی۔ تو میری اس تنہا پرواز کا راز برقرار رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ اور میں پریشانی کا شکار ہو جاؤں گا !"

"لیکن عرشے پر پہنچنے کے بعد میرا نہ تم سے کوئی رابطہ رہے گا۔ اور نہ لوٹ سے !" میں نے چونک کر اپنی تشویش کا اظہار کیا !

"تم میرا جیبی ٹرانسمٹر لے لو" اس نے پیش کش کی۔ "تمہارا ایکس ٹی سے رابطہ قائم رہنا ضروری ہے۔ اپنا کام میں خود سنبھال لوں گا"

"یہ بہتر ہے !" میں نے کہا۔ "کامیابی کی صورت میں میں عرشے پر اپنا رومال جلا کر سمندر کی طرف اچھال دوں گا !"

"میں اس سگنل کا منتظر رہوں گا !"

اس نے عجلت میں احمد کو اس نئے انتظام سے باخبر کیا۔ اور پھر ہیلی کاپٹر کسی خونخوار پرندے کی طرح تیزی سے لانچ کی طرف بڑھنے لگا۔

ڈٹھری آگے بڑھنے کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر کو بتدریج نیچے بھی لاتا جا رہا تھا۔ اس نے ساری روشنیاں ضرور گل کی ہوئی تھیں لیکن اسے یہ خدشہ تھا کہ کہیں انجن اور پنکھڑیوں کا تیز شور لانچ والوں کو کسی پیش قدمی کا موقع فراہم نہ کر دے !

اس نے دور ہی سے ایک لیور کو دبایا اور اندھیری رات کا سکوت گن کے ہولناک فائر سے بکھر کر رہ گیا۔

ہر فائر کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں جھٹکے محسوس ہو رہے تھے۔ جو گن کی طاقت کے مظہر تھے !

ہیلی کاپٹر گولیوں کی بوچھار برساتا ہوا لانچ پر سے گزرتا چلا گیا۔ میں نے دوربین سے لانچ کے عرشے کا جائزہ لینے کی بہتر کوشش کی۔ لیکن کچھ بھی نہ دیکھ سکا !

فائرنگ کے ساتھ لانچ پر بھی گھور اندھیرا چھا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اس پر سے گزرتے ہوئے ایک رائفل کی گونج بھی سنی تھی۔ لیکن یقینی طور پر کچھ کہنا دشوار تھا۔ کیونکہ رائفل اگر چلائی بھی گئی تھی۔ تو اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا !

ڈٹھری اس قدر مشاق ہوا باز تھا کہ میں اس کی مہارت پر دنگ رہ گیا۔ لانچ پر سے گولیاں برساتے ہوئے گزرنے کے بعد وہ ناقابلِ یقین زاویے سے اتنی پھرتی کے ساتھ واپس لوٹا تھا کہ تقریباً اگلے ہی لمحے میں لانچ دوبارہ فائرنگ کی زد میں تھی۔ اور اس بار نیچے سے ایک دردناک انسانی چیخ بھی سنائی دی !

تاریک کیبن کے کنٹرول پینل پر جلنے والے ننھے ننھے سرخ اور سبز نقطوں کے آسیبی انعکاس میں میں نے ڈٹھری کی نگاہوں کا اشارہ دیکھا اور ہیڈ فون اتار کر نشست چھوڑ دی !

"فی امان اللہ !" ہیڈ فون میں ڈٹھری کا آخری فقرہ سن کر میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اس وقت میں نجانے دل گرفتہ تھا یا کیا بات تھی کہ میں ذہنی طور پر خود کو قطعی شل محسوس کر رہا تھا۔

نشستوں سے ذرا پیچھے کیبن کی نچلی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس وقت ڈٹھری نے لانچ پر سے گزر جانے کے بعد فائر بند کیا تھا !

میں نے مشینی چرخے سے لپٹے ہوئے رسّے کا آخری سرا تھام کر تاریک خلا میں چھلانگ لگا دی اور متحرک ہیلی کاپٹر کے نیچے فضا میں جھولنے لگا۔

حسبِ سابق ہیلی کاپٹر تیزی سے واپس ہوا گن دوبارہ چلنے لگی۔ اور اس بار ہیلی کاپٹر لانچ کے عرشے پر معلق ہو کر رہ گیا۔

مشینی چرخہ حرکت میں آیا اور رسے کی سیڑھی کھلنے لگی۔ لیکن عرشے سے میری بلندی اس قدر کم تھی کہ میں صبر نہ کر سکا۔ اور رسّہ چھوڑ دیا۔

میرے قدم عرشے سے لگنے سے پہلے کسی جانب سے ایک رائفل چلی لیکن مجھے یا ہیلی کاپٹر کو نقصان پہنچائے بغیر گولی فضا میں کہیں بھٹک گئی۔

ڈٹھری کو میری جلدبازی کا علم نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے سیڑھی عرشے تک لٹکائی، پل بھر توقف کیا پھر ہیلی کاپٹر اچانک ہی اوپر اٹھتا چلا گیا۔

اس وقت لانچ کے تاریک عرشے پر میں بہت مخدوش حالت میں تھا لہٰذا میں نے سب سے پہلے دوڑ کر اس پلیٹ فارم کی آڑ لی جس پر لائف بوٹ موجود تھی۔ اور اسی کے ساتھ اسٹین گن شانے سے اتار لی۔

اس اثنا میں میری نگاہیں اندھیرے کی قدرے عادی ہو چکی تھیں اور میں کسی سفاک شکاری کی طرح چاروں طرف نگاہیں دوڑا رہا تھا۔

میدان صاف پا کر میں نے بائیں ہاتھ میں ٹرانسمٹر تھام لیا۔

"ایگل کالنگ فار ایکس ٹی ... اوور !" میں نے ٹرانسمٹر منہ کے قریب لا کر آہستگی سے اپنا پیغام نشر کیا۔

"ایکس ٹی رسیونگ !" احمد کی آواز میں دہشت اور تشویش نمایاں تھی۔ "تم اس وقت کہاں موجود ہو ؟ اوور !"

"لانچ کے عرشے پر !" میں غیر ارادی طور پر دھیمے لہجے میں غرایا۔ "فوراً اوپر آنے کی کوشش کرو۔ وہ لوگ ابھی تک تذبذب میں ہیں اوور !"

اچانک مجھے اندھیرے میں اپنے سامنے ایک انسانی ہیولا تیرتا نظر آیا اور میں نے ٹرانسمٹر پھینک کر بے اختیار اسٹین گن چلا دی ! سیڑھی سے عرشے پر ابھرنے والا نہ صرف پہلا بلکہ دوسرا شخص بھی زد میں آگیا اور دو دلدوز انسانی چیخیں فضا میں گونج اٹھیں۔

میرے لیے ان دونوں کے ہلاک یا زخمی ہونے سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان کے طفیل وہ راستہ میری نگاہ میں آگیا تھا جس سے گزرے بغیر نیچے والے عرشے پر نمودار نہیں ہو سکتے تھے اور وہ میرے لیے ایک بڑی کامیابی تھی !

اسی اثنا میں ہیلی کاپٹر تیسری بار لانچ پر معلق ہو چکا تھا۔ اس بار ڈٹھری نے میری وجہ سے فائرنگ نہیں کی تھی۔ لیکن گھمبیر اندھیرے میں ہیلی کاپٹر کے انجن اور پنکھڑیوں کا شور بے حد مہیب معلوم ہو رہا تھا !

اس بے پناہ شور میں نہ معلوم کیسے مجھے وہ خفیف سی آہٹ سنائی دے گئی۔ یا شاید وہ محض چھٹی حس کا کرشمہ تھا۔ کیونکہ میں نے

جوں ہی پیچھے سر گھمایا۔ مجھے ایک دیو ہیکل انسانی سایہ اپنے اوپر جھپٹتا نظر آیا۔ اور میں نے مشینی انداز میں اسٹین گن چلادی۔

وہ فضا میں دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے منہ کے بل عرشے پر ڈھیر ہو گیا۔ میری اسٹین گن نے اسے اس بری طرح چھلنی کیا تھا کہ اس کے حلق سے کوئی درد ناک احتجاجی چیخ بھی آزاد نہیں ہو پائی تھی!

میری دانست میں لانچ پر وہ میرا تیسرا شکار تھا!

میرے عقب سے اس کا نمودار ہونا اس امر کا غماز تھا کہ کیبنوں سے عرشے پر آنے کے لیے کم از کم دو راستے تھے۔ جن میں سے ایک میرے سامنے اور دوسرا عقب میں تھا۔

عقبی راستہ میری نگاہ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن سامنے والا راستہ میں دیکھ چکا تھا۔

اسٹین گن شانے سے لٹکا کر میں نے خود کار پستول ہاتھ میں تھاما اور اس راستے کی طرف ہو لیا۔

نیچے جانے والی ان سیڑھیوں کے قریب ایک شخص عرشے پر لڑھکا ہوا تھا اور دوسرا تین چار قدم نیچے سیڑھیوں پر بے طرح پڑا ہوا تھا میرے پاس ان کے تفصیلی معائنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے صرف ان کے نتھنوں پر انگلیاں رکھ کر یہ اطمینان کرنے پر اکتفا کیا کہ ان کے سانسوں کی آمد و رفت مفقود تھی۔ اور پھر محتاط انداز میں نیچے اترنے لگا!

زینوں کے اختتام پر سناٹا اور اندھیرا تھا۔

لانچ سے کسی منفی ردِ عمل کا اظہار نہ ہونے پر ٹی تھری نے اپنا ہیلی کاپٹر شاید مستقل طور پر لانچ پر ہی معلق کیا ہوا تھا۔ کیوں کہ اس کے شور میں تسلسل اور یکسانیت پیدا ہو گئی تھی!

اسی لمحے مجھے اندھیرے میں کچھ فاصلے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں زینے سے ملحق چوبی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

اس نچلے فلور پر شاید اس لیے اندھیرا رکھا گیا تھا کہ روشنی کا انعکاس عرشے پر سیڑھیوں کی موجودگی کا راز فاش نہ کر سکے۔

آہٹیں قریب آتی گئیں۔ حتیٰ کہ مجھے یہ یقین کرنا پڑا کہ آنے والا سیڑھیاں عبور کر کے عرشے پر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لہٰذا میں اپنی جگہ مستعد ہو گیا اور جیسے ہی اس نے اندھیرے میں پہلا قدم سیڑھی پر رکھا میں نے اپنے پستول کی نال بے رحمی سے اس کی پسلیوں میں اتار دی۔

"آواز پیدا کیے بغیر دونوں ہاتھ اٹھا لو!" میں نے سرد اور سفاکانہ لہجے میں اسے حکم دیا۔

میری آواز سن کر وہ بری طرح بھڑکا تھا۔ لیکن اس نے میری ہدایت کی تعمیل میں کوئی تامل نہیں کیا۔

اندھیرا بہت گمبھیر تھا۔ لیکن اسے ٹٹول کر میں نے اس کے داہنے ہاتھ میں موجود رائفل بآسانی دریافت کر لی۔

میں نے ایک جھٹکے سے وہ رائفل اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

"اب شرافت سے اوپر چلو۔ ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی۔ تو گولی پسلیوں کے پار نکلے گی!"

"تم کون ہو؟" اس کی آواز میں خوف سے زیادہ تشویش نمایاں تھی۔

"اپنی شامت سمجھ لو!" میں نے تلخ لہجے میں سرگوشی کی!

"شاید تم درست کہہ رہے ہو!" اس کے لہجے میں عجیب سا اعتماد تھا۔ "لیکن بعد میں تمہیں اپنے رویے اور جسارت پر رونا پڑے گا!"

"وقت بتائے گا!" میں نے اس کے تعاقب میں احتیاط سے سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارا تعلق کوسٹل گارڈز سے ہے!" وہ آدمی سیڑھیوں پر پڑی ہوئی لاش پر سے گزرتے ہوئے بولا۔ "تم لوگوں کا گشتی ہیلی کاپٹر کچھ دیر پہلے بھی ہماری لانچ کا طواف کر کے گیا تھا!"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" میں نے عرشے پر اس کے مقابل کھڑے ہو کر تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"جنرل ہیلی فاس تمہارے محکمے کا سربراہ ہے!" وہ اس طرح بولا جیسے کسی بچے کو کوئی بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہو۔ "اور اسے ہم سے ایک مقررہ ماہانہ مشاہرہ ملتا ہے۔ تم شاید نئے ہو۔ صبح جب ہمارا کیس اس کی میز پر پہنچے گا تو تمہیں نالائقی کے الزام کے ساتھ ہمیں برطرفی کا پروانہ مل جائے گا۔"

"لانچ پر تمہارے سمیت کل کتنے نفوس ہیں؟" میں نے اس کی ہرزہ سرائی کو اہمیت دیے بغیر سخت لہجے میں سوال کیا!

"اکیس!" اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ "ان میں سے دو کو مردہ یا نیم مردہ حالت میں میں دیکھ ہی چکا ہوں!" اس کا اشارہ ان دونوں کی طرف تھا۔ جو میری اسٹین گن کا شکار ہوئے تھے جبکہ تیسری لاش سے وہ شاید بے خبر تھا!

"مقصداً اسے لانچ پر کتنی لڑکیاں سوار کی تھیں؟" میں نے براہ راست سوال کر ڈالا۔ جس نے مجھے اس مہم پر اکسایا تھا!

"تلاشی لو گے تو خود ہی علم ہو جائے گا!" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "ہمارے معاملات میں یہ داخل اندازی تمہیں مہنگی پڑے گی!"

"مجھے تبصرہ نہیں، جواب چاہیے!" میں نے سخت لہجے میں کہا

"ایسا نہ ہو کہ لاشوں کی فہرست میں تمہارا نام بھی شامل ہو!"

"جنرل .....!"

اس نے کہنا چاہا۔ لیکن میں نے ایک ثقیل سی گالی استعمال کر کے اسے خاموش کر دیا۔ "اس سے اپنے ناجائز مراسم کا حوالہ نہ دو ورنہ میں باز پرس کے بغیر تمہیں گولی مار کر سمندر میں پھینک دوں گا!"

میرا لہجہ اتنا سرسری تھا کہ وہ واقعی بوکھلا گیا۔

"تمہیں لڑکیوں سے کیا دلچسپی ہے؟" اس نے بوکھلاتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"سوالات کرنے کے بجائے جواب دو۔ الو کے پٹھے!" میں نے طیش میں آکر پستول کی آہنی نال سے اس کے دہانے پر ضرب لگا کر کہا اور وہ کراہ کر پیچھے الٹ گیا!

اس کے ستارے ہی اچھے تھے کہ جھٹکے سے پستول کا ٹریگر نہیں دبا تھا۔ ورنہ اس کے چہرے کے چیتھڑے اڑ گئے ہوتے!

"سس ..... سات لڑکیاں ہیں!" وہ نیچے سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"سب شعبان کے ٹرالر پر لائی گئی تھیں؟"

"نہیں!" میرے جارحانہ رویے نے اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔ "چار اس سے پہلے لائی گئی تھیں!"

اسی وقت ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔

"ایگل ریسیونگ اوور!" میں نے اپنا شکار کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں احمد کے پیغام کا جواب دیا۔

"ہم دونوں عرشے پر آچکے ہیں۔ تم کدھر ہو؟ اوور!" احمد کی آواز سرگوشیانہ تھی!

"عرشے کے تقریباً وسط میں نیچے جانے والے زینوں کے پاس ایک قیدی سمیت موجود ہوں۔۔۔ اوور!" میں نے ان کی رہنمائی کے لیے کوئی واضح نشانی نہ پاکر کہا۔

"ہم آرہے ہیں! اوور اینڈ آل!"

اسی لمحے عقب سے مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

وہ کوئی دیو پیکر شخص تھا۔ جس نے چیتے کی سی عیاری کے ساتھ پیچھے سے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن اندھیرے میں اندازے کی غلطی کے باعث مجھ کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا۔ اور میں اس کی جھونک میں منہ کے بل آگے گرتا چلا گیا!

مگر سامنے میرا قیدی موجود تھا۔ اسے مجھ سے بدلا لینے کا سنہری موقع ملا تھا۔ لہٰذا اس نے پیچھے ہٹ کر میرے چہرے پر بھرپور ٹھوکر مارنی چاہی جس نے بہک کر میرا بایاں شانہ ادھیڑ ڈالا۔

میرے لیے صورتحال یک بیک خطرناک رخ اختیار کر گئی تھی۔ اسٹین گن گرنے کے باوجود میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اور پستول پر بھی میں نے اپنی گرفت مضبوط رکھی تھی۔ نیچے سے اٹھتے ہوئے جوں ہی مجھے ایک تاریک ہیولا اپنے اوپر آتا نظر آیا۔ میں نے بے دریغ فائر کر دیا۔ اور بڑھنے والا ایک کریہہ چیخ کے ساتھ نیچے ڈھیر ہو گیا۔

سامنے والا میرے وار کا شکار ہو گیا۔ لیکن عقب سے حملہ آور ہونے والے نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنے مضبوط بازوؤں میں دبوچ لیا۔

وہ شاید غیر مسلح تھا۔ ورنہ اس خطرناک صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زورِ بازو کے بجائے اسلحے کے استعمال کو ہی ترجیح دیتا!

وہ اندھیرے کے باوجود میرے داہنے ہاتھ میں دبا ہوا پستول دیکھ چکا تھا اور اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ مجھے غیر مسلح کر دے۔ جبکہ میرے لیے بدن پر چڑھی ہوئی لائف جیکٹ ایک بوجھ بن کر رہ گئی تھی!

پھر اچانک ہی لہروں کے شور میں یک بیک کئی رائفلوں کا شور شامل ہو گیا۔ جس کے جواب میں اسٹین گن بھی گرجنے لگی!

فائرنگ کے اس تبادلے نے میرے حریف کو پریشانی میں ڈال دیا۔ اسی وقت ٹی تھری نے ایک اہم اقدام کیا اور بلندی سے نیچے آکر لانچ کے قریب سمندر پر گولیاں برساتا ہوا تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

میرے لیے وہ قلیل سی مہلت بہت کافی تھی۔ اس دوران نہ صرف مجھے اپنے مقابل کی گرفت سے آزاد ہونے کا موقع مل گیا بلکہ میں نے اس کے سینے میں دو گولیاں بھی اتار دیں۔

اس کا فتنہ ختم کرتے ہی میں نے پستول جیب میں ڈال کر اسٹین گن سنبھال لی اور ہاتھ سے گرا ہوا ٹرانسمیٹر تلاش کرنے لگا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد ٹرانسمیٹر مل تو گیا لیکن گرنے کے باعث اس کے حساس آلات ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔

رائفلوں اور اسٹین گنوں کے شور میں خاصا تسلسل پیدا ہو چکا تھا لیکن دونوں فریق ایک دوسرے کو کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام رہے تھے۔ بھٹکی ہوئی اکا دکا گولیاں میرے اطراف سے بھی گزر رہی تھیں جن سے مجھے زک پہنچنے کا احتمال تھا۔

میں نے سینے کے بل فرش پر لیٹ کر فائرنگ کی آوازوں پر کان جما دیے تاکہ فریقین کی پوزیشن کا تعین کر سکوں۔

چند ثانیوں کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ رائفل بردار مجھ سے آگے تھے اور اسٹین گن چلانے والے عرشے کے آخری سرے پر تھے۔ ان سے جا ملنے کے لیے مجھے رائفل والوں کے قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا۔

صورتحال تیزی سے بگڑ رہی تھی اور میرے لیے احمد اور کیتھی سے ملنا بے حد ضروری تھا۔

میں چند لمحوں تک اندھیرے میں نگاہیں جمائے رائفل والوں کی پوزیشن کا تعین کرتا رہا۔ پھر فائر کی روشنی نے مجھ پر ان کی جائے پناہ بالکل واضح کر دی۔

میرا اگلا قدم بہت عجلت میں اٹھا تھا۔ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنی پوزیشن بدل لیتے، لہٰذا میں نے اپنی جیب سے دھویں کا ایک چھوٹا سا بم نکال کر ان لوگوں کی طرف اچھال دیا۔ وہ بم قدرے توقف کے بعد پھٹا اور اپنے قرب و جوار کی فضا کو کثیف کالے دھوئیں میں لپیٹ لیا۔

میں سینے اور کہنیوں کے بل بہت تیزی سے آگے سرکنے لگا۔ دھوئیں کی چادر میں سے کئی افراد کے بری طرح کھانسنے اور بے تحاشا گالیاں بکنے کی آواز آرہی تھی۔

گو میرے سینے کو لائف جیکٹ کا تحفظ حاصل تھا لیکن آگے

گھسٹتے ہیں کیبنوں پر خاصا زور پڑ رہا تھا جو میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔

دھوئیں کے بادل کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس طرف اندھا دھند اسٹین گن کا ایک ہلکا سا راؤنڈ چلا دیا جس کے جواب میں دو بے ساختہ انسانی چیخیں بلند ہوئیں جن میں سے ایک میں تو یقیناً موت کا کرب نمایاں تھا۔

"کون ہے؟" اچانک کچھ دور سے ایک کڑکدار آواز گونجی جس کی شناخت میرے لیے دشوار نہیں تھی۔

"اینگل۔" میں نے احمد کی آواز پہچان کر اونچے لہجے میں کہا۔

"سیدھے چلے آؤ۔" شاید سیاہ دھوئیں کے پس منظر میں وہ میرے متحرک ہیولے کو واضح طور پر دیکھ رہا تھا جب کہ میں آواز سننے کے باوجود اسے دیکھنے سے قاصر تھا۔

وہ دونوں تیل کے پیپوں کے عقب میں موجود تھے۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم ہم سے آملے۔" احمد نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "گولیاں چلاتے ہوئے ہم تمہاری طرف سے متفکر تھے۔"

"ٹی بھری سے بھی کوئی رابطہ نہیں۔" کیتھی کی آواز سنائی دی۔ "تمہارا ٹرانسمٹر کیا ہوا؟ میں مسلسل کوشش کر رہی تھی۔"

"گر کر ناکارہ ہو گیا۔" میں نے پوزیشن لیتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ اس وقت حواس باختہ ہیں، پیش قدمی کی فکر کرو، اگر ان کے اوسان بحال ہو گئے تو محض اسلحہ کے بل پر ہم انہیں زیر نہ کر سکیں گے ان کے پاس لانچ پر اسلحہ کا وافر ذخیرہ ہو گا۔"

"جب تک ٹی بھری فضا میں ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے، دہشت سے ان کی عقلیں ماؤف رہیں گی۔" کیتھی نے کہا۔

"انہیں اتنا بودا نہ سمجھو۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "انہوں نے خطرہ بھانپتے ہی پوری لانچ پر اندھیرا کر دیا تھا اور ٹی بھری بھی زیادہ دیر نہ رک سکے گا۔ اس کے پاس صرف پچیس منٹ کا ایندھن باقی رہ گیا تھا جس میں سے اب تک تین چار منٹ گزر چکے ہیں۔ اپنا وقت پورا ہوتے ہی وہ لوٹ جائے گا۔"

یک بیک ڈیک کا پورا عرشہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ ٹی بھری نے کافی بلندی سے لانچ پر سرچ لائٹ کی تیز روشنی ڈالی تھی اور محض چند ثانیوں بعد ہی وہ روشنی معدوم ہو گئی۔

اس معرکے میں ٹی بھری کی وہ حرکت سخت نقصان دہ ہو سکتی تھی، لیکن غنیمت یہ تھا کہ اس وقت ہم تینوں محفوظ مورچے میں تھے اور چند لمحوں کی اس روشنی نے ہمیں پورے عرشے کا منظر دکھا دیا تھا۔

اس وقت پورے عرشے پر کل تین نفوس متحرک نظر آتے تھے، جنھوں نے روشنی ہوتے ہی خود کو آڑ میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔

اس مشاہدے پر میرا اور احمد کا ردعمل یکساں تھا۔ ہم دونوں نے ہی بیک وقت اپنی اپنی اسٹین گن چلا دی اور سمندر کا بے ہول اندھیرا ایک بار اور چیخ سے لرز اٹھا۔

اس حملے نے شاید ان کے پیر اکھاڑ دیے کیونکہ تاریک عرشہ دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سے گونج اٹھا اور پھر اس سے پیشتر کہ ہم لوگ کچھ سمجھ پاتے، یکے بعد دیگرے بائیں پہلو سے پرشور چھپاکوں کی تین آوازیں آئیں جن سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ لوگ سمندر میں کود چکے تھے۔

میں نے محض اندازہ لگانے کے لیے مزید ایک برسٹ مارا اور اس کی بازگشت لہروں کے شور میں دور تک گونجتی چلی گئی۔

اس طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ہم نے اپنی جگہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

کیتھی اٹھ کر آگے بڑھی تو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"کیا ہوا تم کو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ "پنڈلی پر گولی سے معمولی سا زخم آیا ہے۔"

جواب دیتے ہوئے اس کی آواز کانپ سی گئی اور مجھے یہ سمجھنا دشوار نہ رہا کہ وہ شدید زخمی تھی اور اپنی تکلیف مجھ سے چھپا رہی تھی۔

"اپنی ذات پر زیادتی نہ کرو۔" میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "پہلے پیپوں کی اوٹ میں اپنے زخم پر پٹی باندھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ خون ضائع ہونے سے تمہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے اور ہم کچھ نہ کر سکیں۔"

"تھوڑا سا خون بہنے سے میں مر نہیں جاؤں گی۔" وہ چڑچڑے لہجے میں غرائی۔ "وقت برباد کرنے کے بجائے آگے بڑھو۔"

احمد کے پاس جیبی ٹارچ موجود تھی لیکن اس وقت اسے جلانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا لہٰذا میں اندھیرے میں بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے انہیں اس طرف لے جانے لگا جدھر نیچے جانے والے زینے واقع تھے۔

تاروں کی چھاؤں میں وہ ماحول بے حد سنسنی خیز تھا ہم تینوں پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہے تھے مگر ہر لمحے کسی بھی جانب سے گولی آنے کا خطرہ بدستور برقرار تھا۔

طاقتور بصارت رکھنے والا کوئی بھی حریف پچیس تیس فٹ کی دوری سے متحرک انسانی ہیولوں کو دیکھ سکتا تھا۔

ایک جگہ بے خیالی میں احمد نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی جس کے نتیجے میں تیز آواز پیدا ہوئی اور ہم تینوں ہی بیک وقت سینوں کے بل نیچے گر گئے۔

کئی سیکنڈ تک جب کہیں سے بھی کوئی ردعمل نہ ہوا تو میں نے اپنی اسٹین گن کے دستے پر سے ہاتھ ہٹا کر احمد کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹ کو ٹٹولنے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ ایک وزنی رائفل کے دستے پر جا پڑا۔ جو شاید تازہ انسانی خون سے چپچپا رہا تھا۔

کسی زخمی بھگوڑے کے اس ہتھیار کو میں نے وہیں چھوڑ دیا اور ہم تینوں ایک بار پھر آگے کی طرف بڑھنے لگے۔

سیڑھیوں کے قریب عرشے پر تین لاشیں ان دونوں کے لیے حیرت

کا باعث ثابت ہوئیں لیکن وہ وقت تبادلۂ خیال کا نہیں تھا۔

"تم دونوں یہیں نگرانی کرو، میں عرشے کا ایک چکر لگاتا ہوں۔"

احمد نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ ہمارے لیے چوہے دان تیار کیا گیا ہو اور جیسے ہی ہم نیچے اتریں وہ لوگ عقب سے ہماری ناکہ بندی کر دیں۔"

"وقت برباد مت کرو احمد۔" کیتھی کے لہجے میں تکلیف کی شدت نمایاں ہو گئی تھی۔ "ایسا ہی ہے تو تم یہیں پہرہ دو، میں اس کے ساتھ نیچے جاؤں گی۔"

"مم۔۔۔ مگر تم زخمی ہو۔" احمد نے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ "کھلے عرشے کے مقابلے میں نیچے کی لڑائی خطرناک ہو گی۔ ذرا سی بھی سستی ہم میں سے ہر ایک کے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتی ہے۔"

"مجھے اتنا ہی بیکار سمجھ رہے ہو تو گولی مار کر پھینک دو۔" وہ سرد لہجے میں غرائی۔ "میری فکر چھوڑ کر کام کی بات کرو۔"

میں نے شانے دبا کر ان دونوں کو خاموش کر دیا۔ نہ جانے میں نے نیچے واقعی کوئی آواز سنی تھی یا وہ میری چھٹی حس کا کرشمہ تھا کہ میں تیزی سے پیچھے سرک گیا۔

اسی لمحے لانچ کی نچلی منزل میں ایک ہولناک دھماکہ ہوا اور رائفل کا شعلہ سیڑھیوں کے خلا میں سے نمودار ہو کر آسمان کی طرف تیر گیا۔

فائر بیکار جانے پر نیچے سے ایک کرخت ہذیانی قہقہہ ابھرا اور میں نے محفوظ سمت سے اسٹین گن کا دہانہ تاریک خلا کی طرف جھکا کر فائر کھول دیا۔

بارودی دھماکوں کے تسلسل میں وہ قہقہہ مسلسل گونجتا رہا۔ وہ ڈراؤنا قہقہہ کسی صحیح الدماغ آدمی کا نہیں محسوس ہوتا تھا۔

"زندگی چاہتے ہو تو باہر آ کر ہتھیار ڈال دو۔" میں نے راؤنڈ کا ضیاع روک کر تحکمانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"تم حقیر کتو! میرے جیتے جی تمہارے ناپاک ہاتھ میرے گریبان تک نہ پہنچ سکیں گے۔" اس کی گونجیلی آواز میں زہر کی سی کاٹ تھی۔

"عرشے پر تمہارے سارے آدمی مارے گئے ہیں یا سمندر میں چھلانگیں لگا کر فرار ہو گئے ہیں۔" میں نے اس کا اعتماد ختم کرنے کی نیت سے کہا۔ "شاید تم پوری بھیڑ میں تنہا احمق تھے جو نچلے پنجرے میں پھنسے رہ گئے ہو۔"

"تم جھوٹے ہو۔" اس کی غراہٹ اس بار زخم خوردہ تھی۔ "میں تم سب کو ننگا کر کے سر بازار دُرّے لگواؤں گا۔ جنرل ہیلی خاص ہم سے باقاعدہ تنخواہ پاتا ہے۔ اس کے کتوں کی یہ مجال کہ اپنے آقاؤں پر جھپٹنے لگے ہیں۔"

وہ جو بھی تھا اپنی انا کے غرور میں مبتلا تھا اور اس کی انا کو مجروح کیے بغیر اسے زیر کرنا ناممکنات میں سے نظر آ رہا تھا۔

کیتھی کو سرگوشی میں زینے کی نگرانی کی ہدایت کر کے میں، احمد کو بے آواز قدموں سے کچھ دور لے گیا۔

"وہ اکیلا نہیں ہو سکتا۔" دور ہٹتے ہی احمد نے دبی ہوئی پُرجوش آواز میں کہا۔ "لانچ چل رہی ہے اور اس کا انجن بھی بیدار ہے۔"

"اس کے پاس نفری کم رہ گئی ہے۔" میں نے عجلت میں کہا۔ "وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنے نمک خواروں سے آخری سانس تک بھرپور انداز میں کام لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ تم فوری طور پر نیچے اترنے کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرو۔"

"دوسرا راستہ!" وہ بڑبڑایا۔ "ہاں ظاہر ہے کہ اناج کی بوریاں وغیرہ اس مختصر سے زینے سے تو نیچے نہیں لے جائی جا سکتیں۔"

"بڑے راستے کو بھول جاؤ۔" میں نے قدرے جھلا کر کہا۔ "بوریاں نیچے لے جانے والا راستہ تختے جما کر بند کر دیا گیا ہو گا لیکن ہنگامی زینہ بھی ضرور ہونا چاہیے۔"

"میں چکر لگاتا ہوں۔" اس نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "راستہ مل گیا تو اندر اترنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ اندھیرے میں ایک طرف چل دیا۔ میں واپس کیتھی کے پاس آ گیا۔

"تمہاری۔۔۔"

اس نے میری موجودگی کو محسوس کر کے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے سختی کے ساتھ اسے خاموش کر دیا۔

کئی ثانیوں تک نیچے اعصاب شکن سکوت چھایا رہا پھر اکتا کر اسی کو جمود توڑنا پڑا۔

"تمہارا تعلق کوسٹل گارڈز سے ہے؟" اس کے ایک ایک لفظ میں بدستور حاکمیت رچی ہوئی تھی۔

"جو چاہو سمجھ لو۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔

"کوسٹل گارڈز کا گشتی ہیلی کاپٹر تمہاری پشت پناہی کر رہا ہے۔"

اس کی جھلاتی ہوئی غراہٹ سنائی دی۔

"جانتے ہو تو انجان بن کر سوال نہ کرو۔"

"ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

"لانچ کی غیر مشروط اور آزادانہ تلاشی۔"

"مجھ سے سن لو کہ لانچ پر کیا ہے۔" اس کی آواز ابھری۔ "مقامی سے غیر قانونی طور پر لادی گئی اناج کی ادھوری کھیپ سے تمہیں کیا ملے گا؟"

"ہماری اطلاعات مختلف ہیں۔"

"اطلاعات گمراہ کن بھی ہوتی ہیں، پھر بھی میں جاننا چاہوں گا کہ تمہیں کس خبر نے اتنی بڑی مہم پر مجبور کیا؟"

"مذاکرات میں الجھا کر وقت ضائع کرنے کے بجائے اثبات یا نفی میں جواب دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم تلاشی ہی لینا چاہتے ہو نا؟"

"مگر کوئی چال چلی گئی تو وہ خود تمہارے حق میں نقصان دہ ہو گی۔"

اندھیرے میں اس کی آسودہ سی ہنسی ابھری۔ "میں نے ہمیشہ نقصان کے سودے کر کے بھاری منافع کمایا ہے۔ تم شاید کسی بڑی ہڈی کی تلاش میں ہو اور وہ خوش قسمتی سے تمہیں فراہم کر دی جائے گی، بولو کیا چاہتے ہو؟"

"پردے میں رہنے کے بجائے روبرو بات کرو۔"

"تو پھر تم نیچے چلے آؤ۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "یہ یاد رکھنا کہ سیڑھیوں پر دو آدمیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو بے دریغ گولی چلا دوں گا۔"

میں ہنس پڑا۔ "گولی تو شاید تم اکیلے پر بھی چلا دو گے۔۔۔ یہ ملاقات ہم پر نہیں چل سکے گی، تمہیں اوپر آنا ہو گا۔"

"تم میرے ساتھ دغا کر سکتے ہو۔"

"یہ شبہ تمہارے بارے میں بھی ہے۔" میں نے بلا تامل کہہ ڈالا۔ "اس بے اعتمادی کا حل تمہیں ہی تلاش کرنا ہے۔"

"تمہارے ساتھ کتنی نفری ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"صرف سات نفوس۔" میں نے نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کے لیے کہا۔

"یہ سات آدمی کہاں باندھے گئے تھے؟" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "کوسٹل گارڈز کے سفید ہیلی کاپٹرز میں تو محض دو نشستیں ہوتی ہیں۔"

"میں ہیلی کاپٹر سے کودا تھا۔" میں نے تمام بحث کے لیے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "چھ افراد موٹر بوٹ سے پہنچے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ٹڈی نما ہیلی کاپٹر سرعت سے نیچے آ گیا۔ اس نے اپنی سرچ لائٹ آن کی اور لانچ پر سے گزرتا ہوا سیدھا ایک طرف چلا گیا۔

بے اختیار میری نگاہیں اپنی رسٹ واچ پر چلی گئیں۔ ٹڈی نما فضا میں اپنے پچیس منٹ پورے کر چکا تھا اور جاتے جاتے گمبھیر خطرہ مول لے کر لانچ کا آخری فضائی جائزہ لیتا ہوا گیا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے تھے؟" ہیلی کاپٹر کا شور معدوم ہو جانے کے بعد قدرے توقف سے میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں اپنا ایک آدمی بطور ضمانت اوپر بھیجتا ہوں اور تم خود نیچے آؤ، پھر ہم دوبدو طے کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"احتیاطاً یہ بھی بتا دوں کہ فی الحال ہمارا ہیلی کاپٹر واپس چلا گیا ہے۔" میں نے سینہ زوری کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" اس کی آواز میں حیرت نمایاں تھی۔

"کمک لینے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "اس کا لاسلکی مواصلاتی نظام کچھ خراب ہو گیا تھا۔ ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی واپسی سے پہلے یہ معاملہ طے نہ ہوا تو الجھنیں بڑھ جائیں گی۔" اس کا لہجہ فکرمندانہ تھا۔

"یہ سوچنا میرا نہیں تمہارا کام ہے۔"

"چند ثانیوں کے لیے انتظار کرو۔" نیچے سے اس کی آواز ابھری۔

اس کا رویہ اضطراری تھا جب کہ میں نے ہر قدم منصوبہ بندی کے تحت اٹھایا تھا۔ اس کے مہلت طلب کرنے کا مطلب تھا کہ وہ کسی کو اوپر بھیجنے کے لیے آمادہ کرنے اپنی جگہ سے چلا گیا تھا۔

میں نے کیتھی کو اشارہ کیا، پھر جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکال کر سیڑھیوں پر اچھال دی۔

ماچس کی ڈبیہ کے گرنے کی آواز میرے لیے بہت زیادہ پُرشور تھی مگر نیچے اس کا کوئی ردعمل نہ ہوا۔ نہ ہی اس انا پسند خبیث کی کوئی چنگھاڑ سنائی دی اور نہ اس کھٹکے پر کوئی گولی چلی۔

میں نے کیتھی کو اشارہ کیا اور اسٹین گن کی نال سیدھی کر کے بے آواز قدموں سے نیچے اترنے لگا۔

سیڑھیوں کی طوالت مجھے غیر معمولی محسوس ہوئی لیکن یہ بات باعث اطمینان تھی کہ نیچے پہنچنے تک ہمارے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا گیا تھا۔

سیڑھیوں کا اختتام ایک بلائنڈ کارنر سے ہوا تھا جہاں سے براہِ راست آگے بڑھنا ناممکن تھا لیکن داہنے اور بائیں دو راستے موجود تھے۔ ادھر سے ابھرنے والی آوازوں کے سہارے میں نے داہنی سمت والے راستے کو ترجیح دی کیونکہ اس راہداری سے انجن وغیرہ کی آوازیں اس سمت کی نشاندہی کر رہی تھیں اور ادھر کچھ روشنی بھی نظر آتی تھی۔

ہم دونوں ہی تیزی سے دبے قدموں آگے بڑھے اور اس کشادہ کمرے کے قریب پہنچ گئے جو اس لانچ کا انجن روم تھا۔ راہداری میں روشنی اسی کمرے سے آ رہی تھی۔

کیتھی میرے اشارے پر راہداری میں رکی رہی اور میں انجن روم میں داخل ہو گیا۔

وہاں کل تین نفوس تھے جو ایک دیوہیکل انجن کے قریب اکھٹے کھڑے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہاں کوئی چوتھا فرد موجود نہیں تھا۔

"ہینڈز اپ۔" میں نے اسٹین گن کی نال سیدھی کر کے تقریباً چیختے ہوئے ان تینوں کو حکم دیا۔

وہ تینوں ہی بوکھلا کر تیزی سے میری طرف پلٹے تھے لیکن تیسرا میری صورت دیکھتے ہی نتائج کی پروا کیے بغیر واپس بھاگ نکلا۔

وہ قوی الجثہ اور ادھیڑ عمر سیاہ فام اتنی سرعت سے تنصیبات کی آڑ لیتا ہوا فرار ہوا تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکا۔

پھر انجن کے شور میں شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا اور میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شخص شاید کسی پورٹ ہول کا شیشہ توڑ کر سمندر میں کود گیا تھا۔

"ہم دونوں اس لانچ کے ڈرائیور ہیں۔" پھنس جانے والوں میں سے ایک نے جلدی سے کہا۔ "تمہارے جھگڑے سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔"

"بھاگنے والا کون تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ لانچ اسی کی ملکیت ہے، باقی سارا عملہ اس کا تنخواہ دار ہے۔" اسی شخص نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنے کے باوجود وہ اپنے انجام سے خائف نظر آ رہا تھا کیونکہ شدید فائرنگ کے تبادلے کے بعد ان کا یوں بے بس کر لیا جانا معنی خیز تھا۔

"باہر لانچ کی تمام روشنیاں جلا دو۔" میں نے حکم دیا۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔

"ذرا بھی بدمعاشی کرنے کی کوشش کی تو چیتھڑے اڑا دوں گا۔" میں نے اسٹین گن کا رُخ اسی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک سوئچ آن کیا اور شرافت سے واپس آگیا۔

"اندر چلی آؤ۔" میں نے سر گھمائے بغیر کیتھی کو حکم دیا۔

وہ لنگڑاتی ہوئی میرے قریب آ کھڑی ہوئی اور میں روشنی میں اُس کی حالت دیکھ کر لرز کر رہ گیا۔

اس کی پتلون کا داہنا پائنچا بُری طرح خون میں لتھڑا ہوا تھا اور اور وہ بائیں پیر پر اپنے جسم کا وزن سنبھالے کھڑی تھی۔

"میری فکر نہ کرو۔" وہ مجھ سے نگاہیں چار ہوتے ہی مُسکرائی۔

"اس قصے کو ختم کرنے کی کوشش کرو تاکہ سکون سے مرہم پٹی ہوسکے۔"

اس کی حالت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی مگر اس وقت میں اس سے کام لینے پر مجبور ہو کر رہ گیا تھا۔

ان دونوں کو کیتھی کے نشانے پر چھوڑ کر میں نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کی تلاشی لی اور انہیں ہاتھ گرانے کی اجازت دے دی۔

"لانچ پر کل کتنا عملہ تھا؟" میں نے ان سے سوال کیا۔

"آٹھ افراد۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "لانچ کا مالک اور اس کے دو ساتھی ہمارے علاوہ موجود تھے۔"

میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا اور رائے قائم کی کہ مرنے والوں اور فرار ہونے والوں کے علاوہ غالباً صرف یہی دو افراد لانچ پر تھے۔

"کیا اس لانچ کے لیے اتنا اسٹاف ضروری تھا؟"

"دراصل لانچ چلانے والے تو صرف چار ہی تھے۔ باقی چار مسلح محافظ تھے جو دورانِ سفر ہمارا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتے تھے۔"

"لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"لڑکیاں؟" ان دونوں ہی نے بےساختہ حیرت کا مظاہرہ کیا تھا اور ان کے اس ابتدائی ردِعمل پر مجھے یقین کرلینا پڑا کہ لڑکیوں والے معاملے سے وہ لاعلم تھے۔

"مصاوا کے گھاٹ سے لانچ پر کیا لادا گیا تھا؟" میں نے اُسے کریدنے کے لیے سوال کیا۔

"ہماری دانست میں صرف اناج تھا۔" ایک شخص نے صلح جوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اناج کی منتقلی شروع ہونے سے دو گھنٹے پہلے لانچ چلانے والے چاروں افراد ایک محافظ کی نگرانی میں نیچے تھے۔ اس دوران میں اگر کچھ ہوا ہو تو اس سے ہم لاعلم ہیں۔"

"تمہارے لیے وہ دو گھنٹے مشکوک نہیں تھے؟"

"مشکوک!" میرا ہمدردانہ لب و لہجہ اُسے اعتدال پر لے آیا تھا۔ "میں تین برس سے اس لانچ پر ہوں اور ہمارا ہر سفر غیرقانونی ہوتا ہے کالے دھندوں میں ایسے دو چار گھنٹوں کی ہمیں کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس لانچ پر اغوا کی ہوئی کم از کم سات لڑکیاں موجود ہیں۔ اُن کی تلاش میں تم دونوں کو ہماری مدد کرنی ہے۔"

"وہ آخری کیبن میں ہی بند ہوں گی۔" دوسرے نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن اُن کی بازیابی کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا؟"

کوئی تعاون کرنے سے پہلے وہ اپنے مستقبل کی یقین دہانی چاہتے تھے۔

"ہمیں تم سے کوئی پرخاش نہیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ اس معاملے میں تمہارے ہاتھ صاف ہیں۔ ہمیں کسی محفوظ ساحل پر اتارنے کے بعد تم جہاں چاہو لانچ سمیت جانے کے لیے آزاد ہوگے۔"

"اور لڑکیاں؟" اسی نے سوال کیا۔

"وہ ہمارے ساتھ جائیں گی۔"

"تو تمہارا تعلق ایتھوپیا کے کوسٹل گارڈز سے نہیں ہے؟" دراز قد نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"یہ اندازہ کیسے لگایا تم نے؟"

"سفید ہیلی کاپٹر نے حملے سے پہلے کئی بار لانچ پر نیچا چکر لگایا تھا اور اوکیف نے بھی یہی بتایا تھا کہ کوسٹل گارڈز نے چھاپہ مارا ہے۔"

"اوکیف ایتھوپیا ہی کا باشندہ ہے؟" میں نے اس کے ادھیڑ عمر رفیق کے بارے میں سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔" جواب مختصر تھا۔

ان میں سے ایک کو کیتھی کی نگرانی میں انجن کی دیکھ بھال کے لیے وہیں چھوڑ دیا گیا۔ میں نے جاتے جاتے اس شخص کو تاکید کی کہ وہ زخمی کیتھی کے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش نہ کرے۔ جس پر اس نے حوصلہ افزا ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔

پھر میں جیسے ہی باہر راہداری میں نکلا، لانچ کا نچلا حصہ ایک رائفل کے ہولناک دھماکے سے لرز اٹھا اور اسی کے ساتھ ایک کربناک چیخ بھی سنائی دی۔

چیخ کے معدوم ہونے سے پہلے ہی دوبارہ رائفل چلی اور میں بےچین ہوگیا کیونکہ وہ چیخ سو فیصد احمد کی معلوم ہوئی تھی۔

"احمد۔" میں اضطراری طور پر پوری قوت سے چیخ پڑا۔

چیخ اس بند ہال میں گونجی تھی لہٰذا مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا لیکن اس ملاح نے میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ہم دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں احمد شدید زخمی حالت میں پڑا ہوا اپنی اسٹین گن کی طرف سرکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس کا داہنا شانہ بُری طرح زخمی ہوا تھا جس سے بہنے والا تازہ خون لباس کے ساتھ ہی فرش کو بھی رنگین کرتا جا رہا تھا۔

"شانے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" احمد کراہتے ہوئے بولا۔ "تم اس

اس وقت وحشت سے میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ اگر میرا اندیشہ درست تھا تو رائفل ہاتھ لگ جانے کے بعد سیتا یک بہ یک خونخوار ہوگئی تھی اور اس قید سے نجات پانے کے لیے سامنے آنے والے ہر ذی روح کو فنا کرنے پر تل گئی تھی۔

سیڑھیوں تک پہنچنے کے لیے میں نے انجن روم والی راہداری اختیار کی۔ وہاں کی صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"احمد زندہ ہے۔" میں نے انجن روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے کیتھی سے کہا۔ "شاید سیتا نے رہائی حاصل کر کے ایک رائفل پر قبضہ کر لیا ہے۔"

میں سیتا کے امکانی فائر کو نظر انداز کر کے بے تحاشا عرشے پر جا نکلا۔ وہ عرشے کے دوسرے کنارے پر تیزی کے ساتھ رسوں سے بندھی ہوئی لائف بوٹ کھولنے میں مصروف تھی۔

"رک جاؤ سیتا!" میں اشتعال، بے بسی، غصے اور جذباتی ہیجان کے ملے جلے اثرات کے تحت چیخ اٹھا۔

اس نے ایک لحظے کے لیے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ بے اختیار میری نگاہوں میں نمی رینگ آئی اور دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے کسی بھی لمحے پسلیاں توڑ کر باہر اچھل آئے گا۔

برسوں کے فراق کے بعد وہ سیتا کی پہلی جھلک تھی اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ ایک نگاہ ہی اس قدر بھرپور تھی کہ میرے لیے اپنے جذبات کا بھرپور اندازہ ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ بالکل وہی سیتا تھی جو انبالہ کے ہوٹل سے مجھ سے روٹھ کر خاموشی سے کسی طرف نکل گئی تھی اور میں انسانوں کے سمندر میں اسے تلاش کرتا مدت سے جہاں جہاں کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔

وہی سرخ و سفید چہرہ، وہی طویل قامت، وہی گداز سراپا اور وہی سنہرے بال میری نگاہوں کے سامنے موجود تھے۔

فرق صرف اتنا تھا کہ وقت نے اس الھڑ پہاڑی دوشیزہ کو زندگی گزارنے کے وہ باغیانہ انداز سکھا دیے تھے جو انسان کو بدترین حالات میں بھی ہتھیار ڈالنے کی راہ نہیں سجھاتے۔

اس کے بدن پر چست پتلون اور چرمی جیکٹ چڑھی ہوئی تھی اور رائفل کندھے سے جھول رہی تھی۔

اس نے مڑ کر ایک نگاہ غلط انداز ڈالنے کے سوا میری آواز کا کوئی جواب دیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے لائف بوٹ سمندر میں پھینک کر اس نے پھنکارتے ہوئے سمندر کی سرکش موجوں پر چھلانگ لگا دی۔

یک بیک میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ سامنے ہونے کے باوجود مجھے نہیں پہچان سکی تھی۔

میں نے بھی جذبات سے بے قابو ہو کر اس کے پیچھے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اپنی اسٹین گن میں نے عرشے پر ہی پھینک دی تھی۔ دستی بموں سے بھی نجات حاصل کر لی تھی کیونکہ وہ پانی کے دباؤ سے پھٹ کر میرے چیتھڑے اڑا سکتے تھے۔

میں چند ثانیوں بعد پانی کی سطح پر ابھرا تو سیتا مجھ سے چند فٹ دور لائف بوٹ پر چڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف بڑھنے کے لیے جونہی ہاتھوں کو جنبش دی تو میری پسلیوں میں درد کی ایک ناقابل برداشت ٹیس ابھری اور میں کانپ کر رہ گیا۔

یخ بستہ پانی کے ساتھ ہی مندمل ہوتے ہوئے پرانے زخم کی وہ تکلیف میرے لیے ایک عذاب سے کم نہیں تھی۔

پسلیوں کا اندرونی زخم اس حد تک تو مندمل ہو چکا تھا کہ روزمرہ کے معمولات سرانجام دینے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی لیکن دس بارہ فٹ کی بلندی سے سمندر میں چھلانگ لگانے کا دھچکا پوری بھاگ دوڑ کا بدترین تجربہ تھا۔

"رکو سیتا!" اسے لائف بوٹ کا پتوار سنبھالتے دیکھ کر میں کربناک آواز میں چیخا۔ "میں صفدر ہوں۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔"

اس بار میں اردو میں مخاطب ہوا تھا۔

اس وقت میری آواز میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ وہ بجلی کی سی سرعت سے بوٹ سے دوبارہ سمندر میں کود گئی۔ اس نے محض پہلے دو الفاظ پر اس ردعمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں اپنے بدن پر موجود لائف جیکٹ کی وجہ سے کوئی جدوجہد کیے بغیر پانی کی سطح پر موجود تھا۔ اس کا والہانہ ردعمل دیکھ کر میرے وجود میں لازوال آسودگی کی ایک لہر سرایت کر گئی۔ آخرکار اس نے مجھے پہچان ہی لیا تھا۔

وہ دیوانہ وار ہاتھ چلاتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے ذہن سے اپنی تکلیف اور سمندر کے یخ بستہ پانی کا احساس مٹ چکا تھا۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے سیتا کی تڑپ دیکھ کر مجھے اپنا ذہن سکون اور لذت کی ایک بے نام سی دلدل میں دھنستا ہی چلا جا رہا تھا۔

فاصلہ طے کرتے ہوئے آخری اسٹروک میں سیتا دیوانگی اور جنون کے عالم میں میرے سینے سے لپٹ گئی اور میں نے پوری قوت سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

وقت گویا ایک جگہ ٹھہر گیا، لمحات اٹل ہو گئے پھر میں نے اس کے سینے کے زیر و بم سے محسوس کیا کہ وہ کسی معصوم بچی کی طرح بلک بلک کر رو پڑی تھی جیسے برسوں سے بچھڑی ہوئی شفقت اچانک ہی میسر آ گئی ہو۔

"عقل سے کام لو۔" میں نے اسے دلاسہ دینا چاہا تو میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "میں زخمی ہوں۔ مجھے سہارا دے کر بوٹ کی طرف پہنچنے کی کوشش کرو۔"

"تم۔ ۔ ۔ تم کہاں تھے؟" وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بلک کر بولی۔ "میری آنکھیں ترس گئیں۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک گئی صفدر! تمہاری بانہوں میں گزارے ہوئے سکون اور عافیت کے لمحات میرے لیے ایک بھولا ہوا خواب بن کر رہ گئے تھے۔"

لانچ کے عرشے سے آنے والی روشنیوں کے انعکاس میں اس کی جھیل جیسی نیلی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"تمہارے بدن پر لائف جیکٹ موجود ہے۔" وہ پانی میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور میں سینے کے بل سمندر کی پرسکون موجوں پر پڑا اس کو تکے جا رہا تھا۔ میرے لیے اس کا دوبارہ حصول ایک ناقابل یقین سہانے خواب سے کم نہیں تھا۔

"تم یہیں رکو، میں بوٹ ادھر لے آتی ہوں۔" اس کے لہجے میں محبت کی تڑپ تھی اور چہرہ انجانے دلی جذبوں سے تمتمائے جا رہا تھا۔

وہ بوٹ کی طرف چلی گئی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرے لیے اس رات سب کچھ ناقابل یقین ثابت ہو رہا تھا۔

سیتا نے قاہرہ کی ایک عمارت میں محصور ہو جانے کے موقع پر بیگانوں پر میری آواز پہچاننے سے انکار کر دیا تھا اور دوسری بار ذرا دیر پہلے جب اس نے میری آواز کا جواب نہیں دیا تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔

مجھے گمان ہوا تھا کہ حوادث زمانہ نے میری ذات اور اس کا نقش اس حد تک بدل کر رکھ دیا تھا کہ سیتا کے لیے بآسانی مجھے پہچاننا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے سامنے مجھے خود کو صفدر علی ثابت کرنے کے دانتوں پسینہ آ جاتا۔

لیکن جہاں رشتوں کا تعلق دل کی گہرائیوں سے ہو وہاں مادی تشخص اور ظاہری ہیئت کام نہیں آتی بلکہ منہ زور حیوانی جبلت انتہائی غیر منطقی انداز میں سر چڑھ کر بولتی ہے۔

سیتا میری آواز سن کر مجھے نہ پہچانی تھی لیکن جب اس کی کوئی زائد حس بیدار ہوئی تو اسے مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ زمانے سے ٹکرانے والی سیتا محض ایک عورت کی طرح میرے سینے سے آ لگی۔

مجھے پہچاننے تک وہ وحشی بھیڑیوں کے غول میں گھری ہوئی اس ہرنی کی طرح تھی جسے اپنی بقا کی جنگ میں اس غول میں کسی ہم نفس کے ملنے کی امید نہیں ہوتی اور وہ سامنے حائل ہونے والی ہر شے کو بلا تامل اپنے سینگوں سے الٹ کر نکل بھاگنے کی فکر میں ہوتی ہے۔

ہمالیہ کے پہاڑوں میں سندری کی آغوش اور بندروں کی معیت میں برہنہ تن پروان چڑھنے والی معصوم سیتا کا نیا روپ میرے لیے حیران کن تھا۔

ایک وقت وہ تھا کہ جب سیتا میرے ہمراہ پہاڑوں سے اتر کر ہندوستان کے شہروں میں داخل ہوئی تو عمارات سے لے کر بسوں اور موٹروں تک ہر چیز کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑا کرتی تھی اور اس وقت وہ نہ صرف ہر قسم کے جدید اسلحے کے استعمال پر قادر تھی بلکہ میرے بدن پر چڑھی ہوئی لائف جیکٹ کو بھی پہچان سکتی تھی۔

سیتا لائف بوٹ میرے قریب لے آئی اور مجھے سہارا دے کر بوٹ میں سوار کرا لیا۔

"مجھے اپنی آنکھوں پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔" وہ خوشی سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہم اس وقت کہاں ہیں؟"

"انبالہ میں بچھڑ کر بحیرۂ احمر کے پانیوں پر ملے ہیں۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"اوہ! تم زخمی بھی تو ہو۔" وہ چونک کر بولی۔

"فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ "کچھ عرصہ قبل پسلیوں پر اندرونی ضربات آئی تھیں۔ سمندر میں کودنے سے ان ہی میں درد شروع ہو گیا۔"

وہ والہانہ انداز میں میرے وجود کا مانوس لمس محسوس کرنے میں مصروف تھی اور میری نگاہیں لانچ کے ویران عرشے پر جمی ہوئی تھیں۔

ہم دونوں کے لیے لانچ کی بلند آہنی دیواریں طے کر کے اوپر پہنچنا دشوار تھا پھر مجھے اس موٹر بوٹ کا خیال آیا جو احمد اور کیتھی نے لانچ پر آتے ہوئے اس کے عقب میں چھوڑی تھی۔ میرے ایماء پر سیتا لائف بوٹ اس رخ پر لے گئی تو میدان صاف تھا۔ شاید لانچ سے فرار ہونے والوں نے موٹر بوٹ پر ہاتھ صاف کیا تھا۔

لانچ کی رفتار گو سست ہو چکی تھی مگر وہ بتدریج تاریک اور پرسکون سمندر میں آگے بڑھے جا رہی تھی اور اس کے گرد پیدا ہونے والی لہروں کے اچھال کے باعث لائف بوٹ کو اس کے قریب لے جانا دشوار ہو رہا تھا۔

لائف بوٹ پانی میں ڈانواں ڈول تھی۔ رفتہ رفتہ لانچ کا وہ رخ ہمارے سامنے آ گیا جہاں انجن روم کی روشنی میں پورٹ ہول کا ٹوٹا ہوا شیشہ نظر آ رہا تھا جس سے اوکیف فرار ہوا تھا۔

"کیتھی کا نام لے کر زور زور سے چلاؤ۔" سیتا کو ہدایت دے کر میں نے بھی پوری قوت سے چلانا شروع کر دیا۔

ہم دونوں گلے پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے لیکن لانچ والوں پر ہماری آوازوں کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ رفتہ رفتہ لانچ ہم سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

سیتا مدد کے لیے چلانے کے ساتھ ہی پوری رفتار سے چپو بھی چلا رہی تھی لیکن لائف بوٹ کی رفتار لانچ کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔

آخر ناامید ہو کر ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ ان حالات میں تن بہ تقدیر ہو کر انتظار کرنے کے علاوہ کوئی راہ نہیں تھی۔

"میری حماقت سے یہ مشکل پیش آئی۔" وہ جھلاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ اپنی غلطی کے اعتراف کا اس کا وہ پرانا انداز تھا۔

"غنیمت یہ ہوا کہ تم نے پلٹ کر مجھ پر گولی نہیں چلائی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ورنہ۔ ۔ ۔"

اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ میرے دہانے پر جما دیا۔ "آگے نہ بولو۔ اگر میرے ہاتھوں تمہیں ذرا بھی زک پہنچتی تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کرتی۔"

"تمہیں علم ہی نہ ہوتا کہ تمہارا شکار کون ہوا ہے۔" میں کھلے سمندر میں پھنس جانے کے باوجود خود کو بشاش محسوس کر رہا تھا۔ "تم تو سمندر میں چھلانگ لگا کر خاموشی سے کسی طرف فرار ہو جاتیں۔"

"یہ لانچ کس کی ہے؟" اس نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

"بردہ فروشوں کی۔" میں نے قدرے توقف کے بعد "انھوں نے سومگان سے تمہیں جنوبی افریقہ کے لیے خریدا تھا۔"

"اوہو۔ پھر تو غضب ہو گیا۔" وہ یک بیک مضطرب ہو گئی۔ "اس کا مطلب ہوا کہ باقی لڑکیاں ابھی تک ان کے قبضے میں ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟" معًا مجھے یاد آیا کہ سیتا کے علاوہ بھی لانچ پر کئی لڑکیاں قیدی تھیں۔

"نیچے تہ خانے میں ایک کیبن میں ہیں۔"

"اب تک تو نکل آئی ہوں گی۔"

"نہیں۔" اس نے مایوسی سے اپنے سر کو جنبش دی اور اپنا سر میرے شانے سے ٹکا لیا۔ "ان سب کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ وہ صرف کھانے کے وقت ہمارے ہاتھ کھولتے تھے اور دو آدمی ہماری نگرانی کرتے تھے۔ فائرنگ کا ہنگامہ شروع ہونے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے خود کو ڈوریوں سے آزاد کرایا تھا۔"

"رائفل کہاں سے ملی تھی؟"

"رائفل اور یہ جیکٹ میں نے سیڑھیوں کے قریب پڑی ہوئی ایک لاش سے حاصل کی تھی۔" اس نے اپنی جیکٹ کے بارے میں بھی بتا ڈالا۔

"وہ سب مارے گئے یا بھاگ نکلے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "اب لانچ پر ان کے فقط دو آدمی رہ گئے ہیں جو بظاہر شریف لگتے ہیں اور ان کے ساتھ میرے دو زخمی مددگار بھی موجود ہیں۔ مجھے ان کی فکر لاحق ہے۔"

"کیمیتی کون ہے جسے تم پکار رہے تھے؟" اس نے اچانک سوال کر ڈالا۔

"وہ ایک یہودی لڑکی ہے۔" میں کہتے کہتے رک گیا پھر ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ جب تم مجھ سے بچھڑیں تو بہت سادہ اور معصوم تھیں۔ مسلمان اور ہندو کا فرق بھی بمشکل سمجھ میں آیا تھا۔"

"اس وقت تک میں نے ساری عمر بندروں کے ساتھ گزاری تھی یا اپنی ماں سے رام، کرشن اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کے قصے سنا کرتی تھی اور اب میں نے ایک طویل عرصہ چالاک اور مکار ترین انسانوں میں گزارا ہے۔" وہ قدرے سوگوار لہجے میں بولی۔ "تم بتلاتے جاؤ جہاں سمجھ کام نہیں کرے گی پوچھ لوں گی۔"

"کیمیتی یہودی فرد ہے مگر فلسطینیوں سے ہمدردی رکھتی ہے اور تمہارے معاملے میں تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ یہ اسی کا دم ہے کہ اس بار میں تم تک پہنچ گیا۔"

"خوبصورت لڑکی ہے؟"

"ضرور ہے۔ لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟" میں نے کہا۔

"تم ہی نے میری زبان کھلوائی ہے!" اس نے میری سنجیدگی کے جواب میں شوخ قہقہہ مار کر جواب دیا۔ "اسے میری ذات سے بھلا کیا دلچسپی ہو گی!"

"پھر وہ خرطوم سے یہاں تک سیکڑوں میل میرے ساتھ کیوں ماری پھرتی رہی؟"

"میری تلاش میں مدد دینے کے بہانے تمہارے ساتھ لگی رہنا چاہتی ہو گی!" وہ بدستور ہنستے ہوئے بولی۔

"وہ بہت مخلص لڑکی ہے۔ یوں بے دردی سے اس کا مذاق نہ اڑاؤ!" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

"تو چڑ کیوں رہے ہو؟" اس نے میرے بال ہولے سے مٹھی میں تھام کر کہا۔ "تمہیں ہزار لڑکیاں بھی چاہ سکتی ہیں اس میں تمہارا کیا قصور ہو گا؟"

"فلسطینی تحریک سے قریبی تعلق رکھنے والا شاید ہر فرد میری اور تمہاری کہانی سے واقف ہے۔ کیمیتی بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔" میں نے پرزور لہجے میں کہا۔ "محض تمہاری خاطر خرطوم میں وہ تنہا ایک ایسے بھٹ میں جا گھسی تھی کہ بچنا محال تھا۔ اور اب بھی اس کی داہنی پنڈلی بری طرح چھلنی ہے۔ لیکن وہ تمہاری تلاش میں پوری لانچ پر گھسٹتی پھر رہی تھی!"

"لانچ پر تمہارا دوسرا ساتھی کون ہے؟" اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

"احمد!" میں نے کہا۔ "وہ تمہارا شکار ہوا ہے۔ رائفل کی گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی ہے!"

"تمہارے باقی آدمی کہاں ہیں؟"

"باقی آدمی!" میں ہنس دیا۔ "ہم صرف تین ہی تھے!"

"میں نے لانچ پر کئی لاشیں بھی دیکھی تھیں!" اس نے حیرت سے کہا۔ "تو کیا وہ سب بردہ فروشوں کے ہی ساتھی تھے!"

"وہ تو شاید کل سات تھے۔ مقابلہ شروع ہوا تو غالباً انہوں نے اپنے اناڑی ملاحوں کو بھی اسلحہ تھما کر مقابلے میں جھونک دیا!"

"وہ دیکھو!" اس نے اچانک دور جاتی ہوئی لانچ کی طرف ہاتھ اٹھا کر اضطراری لہجے میں کہا۔ "کوئی عرشے پر موجود ہے!"

اتنے گہرے اندھیرے میں اس فاصلے پر دیکھنا ناممکن تھا۔ لیکن بار بار جلتی بجھتی ہوئی سرخ روشنی سے کسی کی موجودگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

اس روشنی کا رخ مستقل طور پر عقب میں یعنی ہماری طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ لانچ پر کسی نے لڑکی کے ساتھ ہی میری اور لائف بوٹ کی غیر موجودگی محسوس کر لی تھی اور اب سگنل کے ذریعہ ہماری

تلاش میں تھا!

میں مضطرب ہو گیا۔ اس سگنل کا فوری جواب ضروری تھا۔ ورنہ ساری رات موجوں کے رحم و کرم پر سرد ہوائیں پھانکنی پڑتیں۔

گیلے لباس کا خیال آتے ہی میں مایوس ہو گیا۔ جیب میں دو ڈبے ماچس کی تیلیوں کی لو بھی اس گھور اندھیرے میں لانچ سے دیکھی جا سکتی تھی۔ لیکن گیلی دیاسلائی جلانے کی کوئی ترکیب میرے پاس نہیں تھی!

طویل جدائی کے بعد سیتا کے ساتھ رفاقت کے چند ہی لمحات گزرے تھے۔ لیکن مجھے اچانک اس پر غصہ آنے لگا۔ اس نے آخری لمحات پر سمندر میں چھلانگ لگا کر مسائل ہی مسائل کھڑے کر دیے تھے!

پھر جوں ہی غیر ارادی طور پر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، میرا دل خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ ٹارچ بدستور میری جیب میں موجود تھی۔

ٹارچ نکال کر میں نے بٹن دبایا تو بلب روشن ہو گیا اور میں نے اپنا داہنا ہاتھ سر سے بلند کر کے لانچ کے رخ پر بار بار ٹارچ جلانی بجھانی شروع کر دی۔

سرخ روشنی کے اشاروں میں بھی تواتر پیدا ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد وہ روشنی معدوم ہو گئی۔ لیکن میں ٹارچ جلائے اسی طرح کھڑا رہا تاکہ لانچ کا رخ موڑنے والوں کو سمت کی نشاندہی میں آسانی ہو!

تقریباً ایک ڈیڑھ منٹ کے سکون کے بعد سمندر کا تاریک سینہ ایک کرخت آسیبی چیخ سے لرز اٹھا۔ جو لانچ کے ہوٹر سے پیدا ہوئی تھی۔

"شاید ہمیں دیکھ لیا گیا ہے!" سیتا نے پرامید لہجے میں کہا۔ "گیلے کپڑوں میں سردی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے!"

تاحد نظر پھیلے ہوئے سمندر کی یکسانیت میں ہمیں غور کرنے کے باوجود نہ لانچ کی سمت تبدیل ہونے کا احساس ہوا۔ اور نہ ہی اس کی واپسی کا۔ البتہ اس کی روشنیاں نمایاں ہونے لگیں تو ہمارے دل کو ڈھارس ہوئی!

"تمہارا ایک ساتھی میری رائفل کا نشانہ بنا تھا۔ میں اس کا سامنا نہ کر سکوں گی!" سیتا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"وہ جنگجو آدمی ہے.... مقابلوں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے!" میں نے اسے دلاسہ دینے کی نیت سے کہا۔ "پھر وہ تو غلط فہمی میں مارا گیا تھا!"

"خدا کرے کہ اسے کاری زخم نہ آیا ہو!" وہ بڑبڑائی۔

"زخم تو کاری ہی ہے!" میں نے اسے لاعلم رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ "اسے فوری طور پر مناسب طبی امداد کی ضرورت ہے!"

وہ خاموش ہو گئی اور ہم دونوں اپنے اپنے وجود میں ٹھٹھرتے ہوئے لانچ کی طرف دیکھنے لگے۔ جو واپسی کا خاصا سفر طے کر چکی تھی!

ہماری لائف بوٹ سے کافی دور لانچ کا انجن بند کر دیا گیا۔ اور وہ بتدریج سست ہوتی ہوئی ہم سے چالیس پچاس فٹ دور متلاطم موجوں پر ٹھہر گئی۔

"چلے آؤ۔ ہم رسہ پھینکتے ہیں!" عرشے پر لانچ چلانے والوں میں سے ایک موجود تھا۔ کیمیتی اور احمد کو وہاں نہ دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔

رسہ پھینکتے ہوئے اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی آملی۔ جسے دیکھ کر سیتا چونک پڑی!

"ارے، یہ تو لوسی ہے۔ یہ کیسے آزاد ہو گئی!" سیتا نے لائف بوٹ کو لانچ کے قریب لے جاتے ہوئے کہا۔

"اوپر چل کر معلوم ہو گا!" میں دل ہی دل میں لانچ کے عملے کے ان دونوں افراد کے لیے عقیدت کے جذبات محسوس کر رہا تھا جنھوں نے خون اور آگ کی برسات دیکھنے کے باوجود فرار کے بجائے ہمدردی کی راہ اپنائی تھی۔ اگر وہ چاہتے تو کیمیتی اور احمد کو سمندر میں پھینک کر بآسانی اپنا من مانا راستہ اختیار کر سکتے تھے!

رسے کے ذریعے پہلے میں لانچ کے عرشے پر پہنچا پھر سیتا بھی اوپر آگئی۔ اس اثنا میں لوسی ہم دونوں کے لیے گرم کمبل لے آئی تھی۔

اس وقت لانچ کا مین انجن بند تھا۔ لیکن جنریٹر وغیرہ چلانے والا کوئی چھوٹا انجن بدستور چل رہا تھا۔ جس کی موہوم سی آواز عرشے پر بھی سنائی دے رہی تھی!

"تم کدھر نکل بھاگی تھیں؟" لوسی نے گرمجوشی سے سیتا کو کمبل میں لپیٹتے ہوئے اس کی سرد پیشانی چوم کر سوال کیا۔

"دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہ کر سکی تھی!" سیتا نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے شکستہ انگریزی میں جواب دیا۔ اور میں اس جاہل مطلق کی زبان سے وہ فقرہ سن کر ششدر رہ گیا!

میں سیڑھیوں کی طرف پلٹا ہی تھا کہ اچانک میرے قدم زمین میں جم کر رہ گئے!

کیمیتی مائرہ قابل رحم انداز میں سیڑھیوں کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ناقابل بیان اذیت ٹپک رہی تھی۔ لیکن اس بے خوف لڑکی کے خشک ہونٹوں پر میرے لیے مسکراہٹ موجود تھی!

درد میں ڈوبی ہوئی غمناک سی مسکراہٹ!

میں سیتا کو ایک طرف دھکیل کر بے اختیار کیمیتی کی طرف دوڑ پڑا۔ اور پھر سیتا نے میرے ساتھ مل کر اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

اس کی خون میں لتھڑی ہوئی داہنی ٹانگ دیکھنے کے بعد شاید سیتا نے بھی اسے پہچان لیا تھا



"اسے نیچے لے چلو۔" لانچ چلانے والے نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ "وہاں تمہارے ساتھی کی حالت بھی خراب ہے۔"

"وہ ہوش میں ہے؟" سیتا نے سر گھما کر اس سے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔ اس کی قسمت اچھی ہے، شاید شانے کی ہڈی بچ گئی ہے لیکن خون بہت ضائع ہو چکا ہے۔"

"احمد کی زندگی مجھ سے زیادہ اہم ہے۔" کیتھی کرب آلود لہجے میں بولی۔ اس نے اپنا سر میرے سینے سے ٹکا لیا تھا جب کہ سیتا نے اس کے پاؤں تھامے ہوئے تھے۔

میں اس وقت سیتا سے نگاہیں چار کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ کیتھی کی قربانی نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ وہ میری محبت میں گرفتار تھی لیکن میری زندگی میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے جس انداز میں میرے سینے سے اپنا سر ٹکایا ہوا تھا اس میں سکون اور اپنائیت کا بھرپور تاثر تھا اور سیتا کے لیے میرے اور اس کے تعلق کے بارے میں کوئی معنی خیز نتیجہ اخذ کرنا بہت آسان تھا۔

"تم بھی زندہ رہو گی۔" میں نے احتیاط سے پہلی سیڑھی اترتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہاری ٹانگ بھی بحال ہو جائے۔"

"میری ٹانگ!" وہ تلخ انداز میں دھیمے سے ہنسی۔ "پنڈلی کی ہڈی کئی ٹکڑوں میں بدل چکی ہے اور جہاں رائفل کی گولی لگی تھی، اس مقام پر تو شاید چورا ہی ہو گئی ہو۔۔۔۔"

"فکر نہ کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ "مائیکرو سرجری کے ذریعے تمہاری ہڈی کا ایک ایک ریزہ اپنی جگہ پر پرو لیا جائے گا۔ بس دعا کرو کہ ہم جلد از جلد کسی ایسے ساحل پر پہنچ جائیں جہاں طبی امداد کی اعلیٰ سہولتیں میسر ہوں۔"

"لیکن مجھے اب اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔" اس کے لہجے سے دل ہلا دینے والی مایوسی ٹپک رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" اس بار سیتا سوال کر بیٹھی۔ اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

"میں تمہیں سمجھا ہی نہ سکوں گی۔" کیتھی ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

اس بار سیتا خاموش ہو گئی اور میں نے وہ بحث ٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ میرے لیے وہ موضوع بہت نازک تھا۔

سیڑھیوں پر چار نفوس کے قدموں کی آواز ماحول کو اور بوجھل بنا رہی تھی جب کہ میرا ذہن مسلسل اسی گتھی میں الجھا ہوا تھا۔

سیتا کی ذات میرے لیے روئے زمین پر سب سے عزیز تھی۔ اس ہوشربا حسن والی الھڑ لڑکی کو میں نے اپنے دل کے شدید ترین جذبوں کے ساتھ چاہا تھا اور اس نے بھی ہر اعتبار سے خود کو اس چاہت کا اہل ثابت کیا تھا۔

مگر وہ تنک مزاج بھی اور ذرا ذرا سی بات پر بڑے بڑے فیصلے کرنے پر تل سکتی تھی۔ جب وہ انبالہ میں مجھ سے بچھڑی تھی تو کم از کم ایسی ہی تھی۔ مذاق میں کہی گئی میری ایک بات اس کے دل میں ایسی چبھی کہ رات کی خاموشی میں وہ مجھے راجہ ہوٹل کے کمرے میں سوتا چھوڑ کر چپکے سے کہیں چلدی اور پھر ہم دونوں کے درمیان تلاش کی ایک روح فرسا مہم شروع ہو گئی اور طویل عرصے کے بعد وہ مجھے ملی تھی تو کیتھی مار ہمارے درمیان موجود تھی۔

میں کیتھی کا دل کی گہرائیوں سے احسان مند تھا اور اس مرحلے پر اس کے ساتھ بے رخی برت کر میں اس کی دلآزاری بھی نہیں کرنی چاہتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کہیں اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو سیتا کے ذہن کو غلط راہ پر ڈال دے اور وہ مجھے اعتماد میں لیے بغیر کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے۔

اسی سوچ میں غلطاں میں انجن روم میں پہنچ گیا۔ وہاں احمد ایک بینچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا لیکن اس کے بشرے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھا۔

ہم نے کیتھی کو اسی کے قریب دوسری بینچ پر لٹا دیا۔

اس وقت انجن روم میں دوسرے ڈرائیور کے علاوہ پانچ سہمی ہوئی سفید فام لڑکیاں بھی موجود تھیں جو کیبن کی قید سے آزادی پا لینے کے باوجود اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ پُریقین نظر نہیں آ رہی تھیں۔ جب کہ چھوٹی لڑکی لوسی کا رویہ خاصا مختلف تھا۔

"تم دونوں لانچ کو جلد از جلد کسی قریبی ساحل پر لے جانے کی کوشش کرو۔" میں نے لانچ چلانے والوں کو ہدایت دینے کے بعد لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ "تم سب میرا ہاتھ بٹاؤ۔ زخمی لڑکی کو بینچ سمیت اٹھا کر رہائشی کیبن میں لے آؤ۔ فرسٹ ایڈ کا سامان بھی لے لو۔۔۔ اب تم سب آزاد ہو اور ساحل پر پہنچنے کے بعد سب کو اپنی مرضی کی راہ اختیار کرنے کی آزادی ہو گی۔"

"میں نرسنگ سے واقف ہوں۔" ایک دبلی پتلی خوبصورت سی لڑکی نے شکستہ انگریزی میں پیش کش کی۔ اس کا لہجہ اس کے فرانسیسی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

انجن روم والی راہداری کے آخری سرے پر ایک دوسرے کے برابر میں چار آرام دہ کیبن بنے ہوئے تھے جہاں خورد و نوش کی اشیا سے لے کر مختلف شرابوں اور سگریٹوں کی ہر آسائش میسر تھی۔

احمد اپنے قدموں پر چل کر اس کیبن تک آیا جہاں کیتھی کو نرم کوچ پر ڈال دیا گیا تھا۔ پانچ لڑکیوں کو برابر والے کیبنوں میں محدود رہ کر آرام کرنے کی اجازت دے کر میں کیتھی کی ادھڑی پنڈلی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نرسنگ میں مہارت رکھنے والی فرنچ لڑکی نے پھرتی سے کیبرٹا

وغیرہ کاٹ کر زخم کا جائزہ لینا چاہا تو کیتھی تڑپ کر چیخ اٹھی اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

اس کی پنڈلی کی ہڈی قطعی طور پر دو حصوں میں منقسم ہو چکی تھی اور گھٹنے کی طرف سے سہارا دے کر پنڈلی اٹھانے کی کوشش میں اس کا پنجے والا رُخ بدستور نیچے جُھکا رہا۔ جب کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کے نکیلے کنارے کھلے ہوئے زخم کے علاوہ کھنچنے والی کھال میں بھی اُبھر آئے تھے۔

"ہم زخم صاف کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔" فرنچ لڑکی نے مایوسانہ لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"ہڈی بہت بُری طرح ٹوٹی ہے۔" احمد نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاتھوں تم بھی زخمی ہو گئے۔" سیتا نے پہلی بار معذرت آمیز لہجے میں احمد سے کہا۔

"یہ ہوتا رہتا ہے۔" احمد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اندھے مقابلوں میں دوست اور دشمن کی تمیز نہیں رہتی۔ ہو سکتا ہے کہ تم گولی چلانے میں تامل کرتیں تو اضطراری طور پر میں فائر کر بیٹھتا۔"

"تم عظیم ہو۔" سیتا نے دھیمے سے کہا۔

"زخم جلد ہی بھر جائے گا۔" وہ بولا۔ "خوشی اس بات کی ہے کہ میرے اندازے کے برعکس شانے کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔"

میں فرنچ لڑکی کے ہمراہ کیتھی کا زخم صاف کرنے میں مصروف تھا کہ معاً اس نے بھیگے ہوئے لباس کا خیال دلایا اور مجھے فوراً ہی سردی کا احساس ہونے لگا۔

عرشے پر پہنچنے کے بعد ہم دونوں ہی اپنے گیلے کپڑوں کو بھول گئے تھے۔ احمد کے اصرار پر مجھے فوری طور پر کیبن میں موجود لباسوں میں سے انتخاب کرنا پڑا۔ مجبوری کے تحت سیتا کے لیے بھی ایک مردانہ پتلون اور جیکٹ ہی پہنی پڑی اور ہم دونوں نے باری باری کیبن سے ملحقہ باتھ رُوم میں بدن خشک کر کے لباس تبدیل کر لیے۔

اس دوران میں فرنچ لڑکی نے کیتھی کا زخم صاف کر کے کھلا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وقت گزر جانے کے باعث خون بہنا بند ہو چکا تھا۔ وہ کیتھی کو بے ہوش ہونے کے باوجود خواب آور انجکشن دینا چاہتی تھی لیکن سیتا نے اسے روک دیا تھا۔ احمد نے بھی اس کی تائید کی۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ کیتھی کو زبردستی سُلائے رکھنا مناسب نہیں تھا لہٰذا لڑکی نے درد دُور کرنے والی دوا کا انجکشن دینے پر ہی اکتفا کیا۔

اسی وقت لانچ حرکت میں آگئی، اس کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ کیا جا چکا تھا۔

"ہمیں قریب ترین ساحل کے بجائے کسی معروف بندرگاہ کا رُخ کرنا چاہیے تاکہ کیتھی کو فوری طور پر طبی امداد مل سکے۔" احمد نے کہا۔

"تمھارا خیال درست ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن کسی بھی بندرگاہ کے حکام لانچ پر موجود لاشوں اور تصادم کے دوسرے آثار کو آسانی سے نظر انداز نہیں کریں گے اور ہم سب حراست میں لے لیے جائیں گے۔"

"لاشیں تو خیر ابھی سمندر میں پھینکی جا سکتی ہیں۔" احمد نے کہا۔ "لیکن لانچ پر بکھرے ہوئے ناکارہ خولوں اور فائرنگ کے سوراخوں کو چھپانا ناممکن ہے۔"

"ہمارے لیے سب سے مقدم کیتھی کی زندگی ہے لیکن اس کے لیے یہ خطرہ بھی مول نہیں لیا جا سکتا کہ کیتھی سمیت ہم سب کسی زنداں میں دھکیل دیے جائیں۔"

"کیوں نہ واپس مصادا ہی چلا جائے؟" احمد نے کہا۔

"شاید اب تک وہاں ہر طرف تلاش کی مہم کا آغاز ہو گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ٹربلہ میں پھنسے ہوئے لوگوں نے کسی نہ کسی طرح نجات پا لی ہو گی وہ سب محض قلی تھے، انھوں نے اب تک پولیس وغیرہ سے رجوع کر لیا ہو گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ متفکرانہ لہجے میں بولا۔ "بلکہ یہ امکان بھی ہے کہ می بقری نے خود اپنے محکمے کو اُدھر متوجہ کر دیا ہو۔ ہم لوگوں کے نکل جانے کے بعد وہ علاقہ می بقری کے لیے اپنی اہمیت کھو بیٹھا ہے۔"

"اور ادکیف کو بھی نہ بھولو۔" میں نے اُسے یاد دلایا۔

"اس سے کیا خطرہ ہے؟"

"وہ موٹر بوٹ میں فرار ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کمک لے کر واپس لوٹ پڑے وہ اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔"

"اپنی دانست میں وہ کوسٹل گارڈز سے شکست کھا کر بھاگا ہے۔" اس نے کہا۔ "قانون سے ہارنے والوں میں دیدہ دلیری کی اتنی جرأت نہیں ہوتی ہے۔"

"تم یہ بھول رہے ہو کہ اُس نے کوسٹل گارڈز کے سربراہ جنرل ہیلی فاس کا تذکرہ تحقیر آمیز لہجے میں کیا تھا۔" میں نے اُسے یاد دلایا۔ "واپس پہنچتے ہی اُس نے اپنے تنخواہ دار جنرل کو نیند سے بیدار کر کے ساری کہانی سُنائی ہو گی۔"

"اوہ! یہ پہلو تو میں بھول ہی گیا تھا۔" وہ مضطربانہ انداز میں اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ "اگر اپنے اور جنرل ہیلی فاس کے مراسم کے بارے میں وہ جھوٹ نہیں بولا تھا تو کچھ عجب نہیں کہ جنرل کسی ہیلی کاپٹر میں خود ہمارے سروں پر آ پہنچے۔"

"تم دونوں بلاوجہ دماغ کھپا رہے ہو۔" سیتا نے پہلی مرتبہ پُراعتماد لہجے میں دخل اندازی کی۔ "ایک مورچے پر کامیاب ہونے کے بعد بھی وہیں جمے رہنا حماقت ہے۔ ہمیں جلد از جلد اس لانچ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔"

سیتا نے ایک فقرے میں پوری جنگی حکمت عملی بیان کر دی تھی۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ "تم تینوں یہیں رُکو، میں انجن رُوم میں جا رہا ہوں۔"

برابر والے کیبنوں میں لڑکیوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بدترین حالات سے گزرنے کے بعد رفتہ رفتہ ان کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

میں انجن رُوم میں پہنچا تو وہ دونوں پُورے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ میری آواز سُن کر وہ چونک پڑے۔

"اس وقت ہماری پوزیشن کیا ہے؟" میں نے اُن کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

چند سیکنڈ کے لیے وہ دونوں لاگ شیٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر اُن میں سے ایک بولا۔ "ہم لوگ مصادا سے تقریباً سو میل دور، بین الاقوامی سمندر میں جنوب مشرق کی طرف سفر کر رہے ہیں۔"

"قریب ترین ساحل کتنی دُور ہے؟"

"شمالی یمن۔" وہ نقشے پر جُھکتے ہوئے بولا۔ "صنعا کے جنوب کا ویران ریگستانی ساحل شاید ڈیڑھ دو گھنٹے میں آ جائے۔"

"اپنا رُخ فوراً اُدھر پھیر لو۔" میں نے ہدایت کی۔

"ہم عدن کی طرف جانا چاہتے تھے۔" دوسرے نے محتاط لہجے میں کہا۔

"ادکیف کی واپسی کا خطرہ ہے۔" میں نے اُن دونوں کے بستروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے ہمارا ساتھ دے کر اپنی بے مثال شرافت کا ثبوت دیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ہماری بربادی کے ساتھ ہی تم دوبارہ ادکیف کی غلامی میں پہنچ جاؤ۔"

"پھر ہم کھلے سمندر کے بجائے یمن کی بحری حدود میں داخل ہو جاتے ہیں تاکہ ادکیف کے لیے کوئی کارروائی آسان نہ رہے۔"

"مجھے شبہ ہے کہ ادکیف ایتھوپیا کے کوسٹل گارڈز ہی سے مدد لے گا۔ وہ لوگ سب کچھ کر گزریں گے لیکن کسی دوسرے ملک کی بحری حدود کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ میں نے پوری صورتحال واضح کر دی ہے اور اب فیصلہ تمھارے اختیار میں ہے۔"

"قریب ترین ساحل ہی ہمیں مصائب سے بچا سکتا ہے۔"

وہ دونوں لانچ کے کنٹرول پینل پر مصروف ہو گئے۔

میں واپس لوٹا تو کیتھی ہوش میں آ چکی تھی اور کوچ پر لیٹے لیٹے اسکاچ سے شغل کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اُس اذیت کا اظہار ہو رہا تھا جسے وہ محض اپنی اٹل قوتِ ارادی کے بل پر برداشت کر رہی تھی۔ فرنچ لڑکی شاید برابر والے کیبن میں چلی گئی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر رونق کی ایک لہر سی آ کر گزر گئی۔

"اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔" کیتھی نے اسکاچ کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مادام پر مایوسی طاری ہے۔" کیتھی کے سرہانے بیٹھے ہوئے احمد نے کرب آلود لہجے میں کہا۔ "شاید تم انھیں سمجھا سکو۔"

"تم باہر جاؤ احمد۔ کچھ دیر کے لیے۔" کیتھی نے اس کی طرف نگاہیں گھما کر دھیمے سے کہا اور وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

"یہ عورت میرے لیے بڑی عجیب ثابت ہو رہی ہے۔" احمد کے چلے جانے کے بعد کیتھی کے سامنے اسٹول پر بیٹھی ہوئی سیتا نے کہا۔

"عجیب!" کیتھی نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ "شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ میں صفدر کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔"

میرا سانس سینے میں پھنسنے لگا۔ کیتھی براہِ راست سیتا سے مخاطب ہو گئی تھی۔

"میں بھی ایک عورت ہوں کیتھی!" سیتا کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "اور عورت کی نگاہوں کے مفہوم سے پُوری طرح آشنا ہوں۔"

"یہ کیا بحث چھیڑ دی تم دونوں نے۔۔۔"

میں نے وہ موضوع ختم کرنا چاہا لیکن کیتھی نے میری بات کاٹ دی۔ "مجھے بولنے دو صفدر، میں یہ بوجھ سینے پر لے کر نہیں مرنا چاہتی۔"

"تم زندہ رہو گی۔" سیتا نے جذبات سے عاری مگر مضبوط لہجے میں کہا۔ "صفدر نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر مجھ تک اس کی رہنمائی کی ہے۔"

"معذور زندگی۔" کیتھی نے حقارت سے کہا۔ "مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اگر تمھاری ٹانگ ضائع ہو گئی تو اس کا بہتر متبادل ہر قیمت پر



فراہم کیا جائے گا۔" سیتا کے لہجے میں ہمدردی عود کر آئی۔

"ٹانگیں تو دونوں بھی کاٹ دی جائیں تو مجھے ملال نہ ہوگا۔" کیتھی نے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ "زندگی تو بس جذبوں کا نام ہے اور اگر انسان زندگی کے سب سے بڑے جذبے سے محروم ہو جائے تو اس کی زندگی محض ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔"

"کھل کر بات کرو۔" سیتا کا لہجہ ایک مرتبہ پھر سپاٹ ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ صفدر مجھے کبھی نہ اپنا سکے گا۔" کیتھی کے لہجے میں بدترین شکست کی کسک نمایاں تھی۔

"تو۔ مجھے گولی مار دو۔" سیتا نے اسٹول سے اتر کر ایک طرف رکھا ہوا ریوالور کیتھی کی طرف بڑھا دیا۔

کیتھی نے ریوالور لے کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ "خود مارنا ہوتا تو شاید صفدر یہاں نہ ہوتا۔ میں مقدر کی جنگ ہاری ہوں۔ میں نے نیک نیتی سے تمہاری تلاش میں صفدر کا ساتھ دیا لیکن ہر وقت میری یہ تمنا رہی کہ تم مر جاؤ یا مار دی جاؤ اور صفدر تمہاری موت کے بعد اپنے آنسو میرے دامن میں ڈال دے لیکن۔۔۔ لیکن تم جیت گئیں۔"

"یہ باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔" میں نے دخل اندازی کی۔

"اپنی گفتگو سے تم ان احسانات کو دھندلا رہی ہو جو زندگی بھر میرا، اور سیتا کا سر تمہارے سامنے خم رکھیں گے۔"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔" وہ گلاس خالی کر کے کراہتے ہوئے بولی۔ "میں تو اپنی دانست میں تمہیں سیتا کی لاش کی طرف لا رہی تھی مگر یہ مقدر کی دھنی ہے۔ موت کے سایوں کو فریب دیتی ہوئی تمہاری پناہ میں پہنچ ہی گئی۔"

"تو اب اپنا خواب پورا کرو، مار دو گولی مجھے۔" سیتا کا لہجہ سرد اور بے رحمانہ تھا وہ پلکیں جھپکائے بغیر کیتھی کو گھورے جا رہی تھی۔

"تم نے اچھا کیا کہ یہ مجھے دے دیا۔" وہ ریوالور کو اپنی انگلیوں میں سنبھالتے ہوئے بولی اور میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

"ٹرائیگر سے انگلی ہٹا لو کیتھی!" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ بے احتیاطی سے یہ چل ہی جائے۔"

اس نے اچانک نال سیتا کی طرف تان لی اور میں اچھل کر درمیان میں آ گیا۔

وہ ہذیانی انداز میں ہنس پڑی۔ "فکر نہ کرو، میں اسے نہیں ماروں گی۔ میں سمجھ چکی ہوں کہ اس کے بغیر تم ادھورے رہ جاؤ گے۔"

اس نے ریوالور دوبارہ سینے پر رکھ لیا اور احمد کو آواز دی۔

وہ شاید دروازے ہی سے لگا کھڑا تھا۔ کیتھی کی آواز بلند ہوتے ہی اندر گھس آیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے مادام، یہ سراسر دیوانگی ہے۔"

"تو تم نے سب کچھ سن لیا۔" کیتھی کا لہجہ پھیکا تھا۔ "حالانکہ میں نے تمہیں رازداری کے خیال سے باہر بھیجا تھا۔"

احمد نے سر جھکا لیا۔

"سر اٹھاؤ۔" کیتھی کی آواز میں نہ جانے کہاں سے تحکم سمٹ آیا۔

احمد نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا اور کیتھی نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی میرے اور احمد کے ساتھ ہی سیتا بھی اس کی طرف لپکی لیکن اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔

دھماکے کے ساتھ ہی کیتھی مائر کا بدن تڑپنے لگا۔ فائر کے بعد اس کے منہ سے کوئی چیخ نہیں نکلی تھی۔

ہم تینوں دم بخود سر جھکائے کیتھی مائر کا دردناک انجام دیکھتے رہے اور جوں ہی اس کا جسم ساکت ہوا، احمد سر جھکا کر تیز رفتاری کے ساتھ باہر نکل گیا۔

میری آنکھوں کے گوشوں میں تیزی سے نمی پھیلتی جا رہی تھی۔ سیتا نے شاید دانستہ میری طرف سے نگاہیں پھیر لی تھیں۔

کوچ چند ہی ثانیوں میں کیتھی کے خون سے تر ہو گیا۔ اس۔۔۔ کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں جنھیں سیتا ہی نے پپوٹوں میں چھپا دیا اور اس کی لاش پر چادر ڈال دی۔

فائر کی آواز نے برابر میں موجود لڑکیوں کو بھی بوکھلا دیا، مگر ان میں سے فرنچ لڑکی کے سوا کوئی ہمارے کیبن میں آنے کی ہمت نہ کر سکی۔

"او، میرے خدا!" کیتھی کے چادر میں چھپے ہوئے جسم کو دیکھتے ہی اس کے منہ سے آواز نکلی اور وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

"تم یہیں ٹھہرو، میں احمد کو دیکھتا ہوں کہیں وہ بھی کوئی حماقت نہ کر گزرے۔" میں یہ کہہ کر کیبن سے باہر نکل گیا۔

احمد کا کیتھی سے کوئی خصوصی تعلق نہیں تھا لیکن ایک بار جذباتی بھنور کا شکار ہو جانے کے بعد معقول ترین آدمی سے بھی بدترین حماقتیں سرزد ہو جاتی ہیں لہٰذا میں احمد کو اس وقت ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

انجن روم والے اس حادثے سے بے خبر تھے۔ وہاں اس قدر شور تھا کہ فائر کی موہوم سی آواز کو انہوں نے توجہ کے قابل بھی نہ سمجھا ہوگا۔ لیکن میں نے انہیں بتا دیا کہ پنڈلی کی تکلیف سے پریشان ہو کر ہماری ساتھی لڑکی نے خودکشی کر لی تھی۔

وہ دونوں محض رسمی انداز میں اظہارِ افسوس کر کے رہ گئے۔

نچلے حصے میں ناکامی کے بعد میں عرشے پر پہنچا تو احمد سر ہواؤں سے بے نیاز ایک چوبی پیٹی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے اس کے برابر میں بیٹھ کر سوال کیا۔

"تم جاؤ، میں پرسکون ہو کر لوٹ آؤں گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"پریشان ہو؟"

"میں دو مرتبہ محاذ پر لڑ چکا ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں [illegible] "مگر آج کی وارت جیسی بے تکی خونریزی ہوئی ہے، اس نے مجھے [illegible] کر رکھ دیا ہے۔"

"کیتھی کی خودکشی تک تو تم اعتدال پر تھے۔"

"کوشش کر رہا تھا، کیتھی کی خودکشی برداشت کے تابوت [میں] آخری کیل ثابت ہوئی۔" اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "مجرموں کے [سا]تھ ہی ہمارے ہاتھوں وہ بے قصور بھی مارے گئے جو محض اپنی [رو]زی کمانے کے لیے لانچ پر ملازم تھے۔"

میں نے اس سے بحث کرنی مناسب نہ سمجھی ورنہ یہ بات وہ خود [ب]جانتا تھا کہ ہمارے ہاتھوں صرف وہی لوگ مارے گئے تھے، جنہوں نے [ہم]ارے پر آنے کی جسارت کی تھی ورنہ وہ دو آدمی بھی نہ بچتے، جن کی [وج]ہ سے ہمارا سفر جاری تھا۔

"ہمیں لانچ پر موجود لاشیں سمندر میں ڈالنی ہیں۔" میں نے [پھ]ینکنے کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کرتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ "ساحل [وی]ران ہو یا آباد، ہر صورت میں ہمیں احتیاطی اقدام کر لینے چاہئیں۔"

"آؤ۔" اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"تمہارا شانہ زخمی ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "تم ہر طرف چکر لگا کر بس یہ دیکھ لو کہ کہیں کوئی پڑا نہ رہ جائے۔"

عرشے پر چار لاشیں موجود تھیں جو میں نے یکے بعد دیگرے [سم]ندر میں ڈال دیں۔ کیتھی کے بارے میں تذبذب میں مبتلا تھا کہ احمد خود ہی [ب]ول پڑا۔

"مادام کی لاش کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تمہیں علم ہے کہ وہ یہودی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"یہودی؟" حیرت سے اس کی آنکھیں پیشانی پر جا چڑھیں۔ "[ن]ائیل اور میں یہودی؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں درست کہہ رہا ہوں۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ [یہ]ودی ضرور تھی مگر اس کی تمام تر ہمدردیاں تمہارے مقاصد کے لیے [و]قف تھیں۔"

"مجھے آج تک علم نہ ہو سکا۔" اس نے کہا۔ "البتہ مجھے مادام کے [ظ]اہر پر ضرور حیرت تھی، اب تو اس کی لاش بھی سمندر ہی میں ڈالنی ہوگی۔"

مجھے اس کی زبان سے ان ہی الفاظ کا انتظار تھا۔ میں اس کے ساتھ کیبن میں پہنچا پھر سیتا اور لوسی کی مدد سے کیتھی کے بے جان [ب]دن کو عرشے پر لا کر احمد کے سامنے ایک کنارے سے سمندر کی پرسکون [ل]ہروں کے حوالے کر دیا گیا۔

ہم سب کے لیے کیتھی کی موت اس قدر تاثر انگیز تھی کہ اس کی [ل]اش سمندر برد کرنے کے بعد بھی ہم لوگ کئی منٹ تک ریلنگ [ک]ے کنارے خاموش کھڑے رہے۔

میرا قیاس تھا کہ میری طرح ہر ایک کے ذہن میں کسی قیمتی شے کے بچھڑ جانے کا ایک چبھتا ہوا احساس موجود تھا۔

نیچے پہنچنے پر سیتا کی زبانی معلوم ہوا کہ لڑکیاں بہتر حالت میں تھیں۔ ریوالور کے فائر کے بارے میں بھی انہیں بتا دیا گیا تھا۔

میں نے پہلی بار ان چھ لڑکیوں کو ایک کیبن میں یکجا کر کے بغور دیکھا ان میں ایک تو وہی فرانسیسی لڑکی تھی جسے نرسنگ پر عبور تھا۔ دو لڑکیاں برطانوی تھیں اور بقیہ تین اطالوی، ہسپانی اور جرمن تھیں۔

میرے نزدیک وہ سب ہی حسین چہروں کی مالک تھیں اور انہیں مختلف مقامات سے مختلف طریقوں سے اغوا کیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر لڑکی اغوا کے بعد متعدد ہاتھوں سے گزرتی ہوئی اس لانچ تک پہنچی تھی۔

اغوا اور سفر کے آغاز کے درمیان انہیں بار بار حیوانی سلوک کا نشانہ بنایا گیا تھا اور دورانِ سفر بھی انہیں کسی بہتر رویے کی امید نہیں تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی اس سفر کے مقاصد اور منزل کا علم نہیں تھا۔

جب انہیں میری زبانی علم ہوا کہ ان سب کو سفید فاموں کی حیوانی انداز میں افزائش نسل کے لیے جنوبی افریقہ لے جایا جا رہا تھا۔ تو وہ سب ہی ششدر رہ گئیں اور ان کی۔۔۔ آنکھوں میں ہمارے لیے ممنونیت کے جذبات ابھر آئے۔

لانچ پر حالات بہت ناخوشگوار انداز میں سکون پذیر ہو چکے تھے۔ احمد کے زخم کی ڈریسنگ ہو چکی تھی اور کیتھی نے غیر متوقع انداز میں خودکشی کر کے ہر ایک کو اپنے زخم کی تشویش سے آزاد کر دیا تھا۔ لہٰذا آہستہ آہستہ سب منتشر ہو گئے۔

"مجھے طویل مدت تک اس لڑکی کی موت کا قلق رہے گا۔" میرے اور سیتا کے سوا کیبن میں کوئی نہ رہا تو چند ثانیوں کے سکوت کے بعد سیتا نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"وہ اپنی حماقت کا شکار ہوئی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "شاید آخری لمحوں پر اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔"

"رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ خودکشی سے پہلے میرا بھی خاتمہ کر سکتی تھی لیکن محض تمہاری وجہ سے وہ مجھے نقصان پہنچانے سے باز رہی۔"

"ہمارے تبصرے اسے واپس نہیں لا سکتے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس بہتیرے موضوعات ہیں۔"

"مجھے اپنے اوپر رشک آ رہا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیا حسین اتفاق ہے کہ میں تم سے ملی تو میں نے تمہارے ہاتھوں ایک حسین اور جوان لڑکی کی ناقدری بھی دیکھ لی، کیا تم مجھے واقعی اسی قدر چاہتے ہو؟"

"تم احمق ہو۔" میں ہنس پڑا۔

"مگر خوش نصیب بھی۔" وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔

"تمھاری تلاش کا ایک ایک لمحہ میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔ اِس بہانے میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اتنا کچھ سیکھا ہے جو شاید عام حالات میں عمر بھر نہ سیکھ پاتی۔"

"مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم انبالہ سے خاموشی سے کیوں فرار ہو گئی تھیں؟" میں نے مُنی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں اس کی زبان سے اُس کے ایک ایک لمحے کی کہانی سننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

وہ سر جھکا کر ہنس دی۔ "قانون کے ہر کارے تمھارے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور ہر جگہ میری وجہ سے تم پہچانے جا رہے تھے۔ اس رات تمھاری زبان سے یہی بات نکلی تھی تو دل کو جا لگی اور میں نے تنہا سرحد عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"مگر وہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔"

"یہ بعد میں میری سمجھ میں آیا۔" اس کے لہجے میں ندامت سمٹ آئی۔ "میں تین روز تک بھوکی پیاسی اور خوفزدہ حالت میں اسی شہر میں بھٹکتی رہی۔ پھر بدقت تمام واپس ہوٹل پہنچنے میں کامیاب ہوئی تو تم وہاں سے جا چکے تھے۔"

"میں سُننا چاہتا ہوں مجھے اپنی پوری کہانی سناؤ۔" میں نے سگریٹ سُلگا کر بے چینی کے ساتھ کہا۔

وہ تھرماس اٹھا کر اس سے پانی پینے لگی۔

"میری کہانی بہت عجیب بلکہ ناقابلِ یقین سی ہے۔" حلق تر کرنے کے بعد وہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں یک بیک سنجیدگی نمایاں ہو گئی تھی۔ "وہ تین دن میرے لیے بدترین دن تھے۔ تم نے مختصر سے عرصے میں مجھے بہت کچھ بتا اور سکھا دیا تھا لیکن میں اس قابل نہیں تھی کہ شہروں میں اپنی اجنبیت ظاہر کیے بغیر کسی سے کوئی بات کر سکوں۔ اس دوران میں دو مرتبہ بدمعاش قسم کے آدمی بھی میرے پیچھے لگے۔ ایک مرتبہ تو میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی مگر دوسری بار ایک شخص میرے ہاتھوں بُری طرح لہولہان ہوا۔۔۔"

"کوئی مرد۔۔۔۔"

میں نے سوال کرنا چاہا مگر اس نے پورے اعتماد سے میری بات کاٹ دی۔ "میں بدترین قسم کے حالات میں قید و بند کا بھی شکار رہی لیکن کوئی مرد مجھے اپنے عزائم کا نشانہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔" اس کے جواب پر میرے حلق میں پھنستا ہوا غیر مرئی سا گولہ معدے میں اُتر گیا۔

وہ لاکھ بے خوف اور دلیر سہی مگر ایک عورت ہی تھی، اور اس پر مکمل بھروسا ہونے کے باوجود میں اس کی زبان سے وہ الفاظ سننے کا منتظر تھا۔

"تم سے بچھڑنے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک تنہا عورت کے لیے حسن کس قدر خطرناک ہوتا ہے لہٰذا میں نے وحشیانہ تیور اختیار کر لیے۔ نرم خو عورت کی حیثیت سے میرا زندہ رہنا دشوار ہو جاتا لہٰذا میں خونخوار ہو گئی۔"

"وہی ہمالیہ والی سیتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے ٹوکا۔ "مُنڈی کی بیٹی اور بندروں کی ملکہ۔"

"شاید اس سے بھی زیادہ خون آشام۔" اُس کی آنکھیں بدستور سوچوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ "حالات نے آناً فاناً میری کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ تمھیں دوبارہ پا لینے کی ناقابلِ بیان تڑپ نے میری سوچ تک بدل کر رکھ دی تھی اور سات دن کی جدّوجہد کے بعد میں سرحد عبور کر کے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔"

"مگر کیسے؟"

"میں انبالہ سے بھٹکتی ہوئی کسی قصبے میں جا نکلی تھی۔۔۔ وہاں سرحد پار جانے والے مال بردار ٹرک رُکا کرتے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹرک پاکستان کے راستے افغانستان کے لیے مال لے جاتے تھے۔ میں کوشش کر کے ایک رات بوریوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک میں ترپال کے نیچے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔"

اس سے بچھڑنے کے بعد میں اپنے مصائب کا شکار ہو کر رہ گیا تھا اور سرحد عبور کرنے کے بجائے اسیر ہو کر سیکڑوں میل دُور پہنچا دیا گیا تھا جب کہ وہ آٹھویں دن پاکستانی سرزمین پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس کے نزدیک پاکستان صفدر علی کا وطن تھا۔ میں نے ہمالیہ سے انبالہ تک کے سفر میں اپنے چھوٹے سے گھر اور پُرسکون زندگی کے حوالے سے سیتا کو پاکستان کے بارے میں بہت سی کہانیاں سُنائی تھیں، اور سیتا کے دل میں اس سرزمین کے لیے عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔

لیکن پاکستان میں سیتا کا پہلا تجربہ بہت دل شکن تھا۔ اسے جو پہلا شخص ملا وہ شرافت کے لبادے میں اس منڈی کا کارندہ تھا جہاں رات کے گناہ پرور اندھیرے میں جسموں کے مول چکائے جاتے تھے۔

سیتا کو فوری پناہ درکار تھی لہٰذا وہ اس کے ساتھ ہولی، مگر جب اس نے بجتے سازوں اور ناچتے جسموں کو دیکھا تو اس ماحول سے بے خبر ہونے کے باوجود حقیقت سمجھ گئی اور وہاں سے بھاگ نکلی۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھوں کئی افراد زخمی بھی ہوئے۔

وہ کئی روز تک ہر طرف سر ٹکراتی پھری لیکن اسے کہیں جائے پناہ نہ مل سکی ۔۔۔ شکم پُری کے لیے اُسے چھوٹی موٹی چوریوں کا ارتکاب کرنا پڑا اور پھر وہ بنجاروں کی ایک ٹولی سے جا ٹکرائی کیونکہ اسے ان میں اپنی دلچسپی کا سامان نظر آیا تھا۔

پانچ مردوں، تین عورتوں اور آٹھ بچوں پر مشتمل خانہ بدوش شہر شہر گھوم کر جانوروں کے کرتب دکھا کر اپنی روزی کماتے تھے۔ بھالو کتے اور بکری سے سیتا کو کوئی شغف نہیں تھا لیکن وہ دو بندروں سے بہتیرے کام لے سکتی تھی۔

بنجاروں کی ٹولی نے سیتا کو فوری طور پر قبول نہیں کیا عورتیں خصوصاً اُس سے بدظن نظر آ رہی تھیں۔

مگر جب سیتا کے اشاروں اور آوازوں پر بندروں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اُس سے مذاکرات شروع کیے تو بنجارے حیران رہ گئے اور سیتا نے رہائش و روزگار کا بندوبست کر لیا۔

نگر نگر میں تماشے دکھاتے وہ لوگ کافی عرصے بعد کراچی بھی پہنچے جہاں عام دنوں میں وہ لوگ آبادیوں میں گھوم پھر کر تماشے دکھاتے اور چھٹی والے دنوں میں شہر کے تفریحی مقامات پر اپنے ڈیرے جما کر لوگوں کو محظوظ کرتے۔

پھر بندروں کے ساتھ سیتا کی مفاہمت کا مظاہرہ کسی اخباری نمائندے نے بھی دیکھ لیا اور اس نے اپنے اخبار میں سیتا کا تصویری انٹرویو شائع کر دیا۔ سیتا نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔

انٹرویو کی تشہیر کے بعد ایک نجی کلب کے منتظمین نے سیتا سے رابطہ قائم کیا اور ان کی دعوت پر سیتا نے ایک محدود اجتماع کے سامنے بندروں کے محیرالعقول کمالات دکھائے۔ اس مظاہرے کے اختتام پر ایک بڑے ہوٹل کے مالک نے سیتا کو بھاری مشاہرے پر ملازمت کی پیش کش کی جسے سیتا نے ٹھکرا دیا۔ کیونکہ وہ شخص سیتا کو ایک رقاصہ کے طور پر متعارف کرانا چاہتا تھا۔

اِس کے علاوہ سیتا کو بنجاروں کے ساتھ ملک بھر میں گھومنے کی آزادی تھی اور اُسے یہ امید تھی کہ اس طرح کسی روز وہ مجھے پا لے گی۔ اس نے ان جاہل بنجاروں میں خود کو ہمیشہ محفوظ محسوس کیا۔ کرخت خدّوخال والے وہ میلے کچیلے اور قدآور مرد اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب کہ اس ٹولی سے باہر تقریباً ہر مرد کی نگاہ میں سیتا کو گھناؤنی سی چبھن محسوس ہوتی تھی۔

اور پھر ایک روز کلفٹن کی آبادی میں خوبصورت مکانات کے عقب میں پھیلے ہوئے ویران اور ناہموار ریتیلے میدان میں دو سُرخ و سفید غیر ملکی لڑکے ان خانہ بدوشوں کے جھونپڑوں پر آ پہنچے۔ ڈوبتے سورج کے دُھندلکے میں ہر ایک نے اِن لڑکوں کو اشتباہ آمیز نظروں سے دیکھا میلے کچیلے بچوں نے انھیں گھیر لیا۔

انھوں نے آتے ہی سیتا کے بارے میں سوال کیا اور اُن پر جمی ہوئی مردانہ نگاہوں میں قہر کے شعلے بھڑک اُٹھے۔

ایک بنجارے کا تلخ جواب کانوں میں پڑتے ہی سیتا جھونپڑے سے نکل آئی۔

"ہم آوارہ نہیں ہیں۔" اُن میں سے ایک نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں

مشتعل بنجاروں کے سامنے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں سیتا سے بس چند باتیں کرنی ہیں۔"

"چلے جاؤ۔" آمو نامی نوجوان ہاتھ فضا میں اٹھا کر دہاڑا۔ "ہماری عزت سے نہ کھیلو۔ سفید پوشوں کو ان پھٹے ہوئے جھونپڑوں پر دیکھ کر لوگ نہ جانے کیا کیا سوچنے لگتے ہیں۔"

"ٹھہر جاؤ آمو۔" سیتا نے اسے روک دیا اور آگے بڑھ گئی۔

وہ دونوں غیر ملکی سیتا کی تیز نگاہوں کا سامنا کرتے ہی پٹپٹا گئے۔

"کہو، کیا بات کرنی ہے؟" وہ اُن کے مقابل کھڑی ہو کر غرائی۔

"ہم فلسطینی ہیں۔" ان میں سے ایک نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا "ہم تمہارے ملک میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہوتے ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں؟" سیتا کو ان لڑکوں سے اپنی ملاقات کی تمام تر جزئیات پوری طرح یاد تھیں کیونکہ اس ملاقات نے اس کی زندگی کا دھارا موڑنے میں سنگِ میل کا کام کیا تھا۔

"بندروں کو سدھانے کے بارے میں تمہاری مہارت ہمیں یہاں تک لائی ہے۔" دوسرے لڑکے نے آہستہ سے کہا۔ "ہم بمشکل اس ٹھکانے کا سراغ لگا سکے ہیں۔"

"مگر کیوں؟" سیتا اُن کے سروں پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔

"تم صفدر علی کو جانتی ہو؟"

اُس کا سوال سنتے ہی سیتا تڑپ اٹھی اور اس نے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے سوال کرنے والے کا گریبان تھام لیا۔ "ہاں جانتی ہوں! کہاں ہے وہ؟ تم اُسے کیسے جانتے ہو؟"

"وہ یہاں سے ہزاروں میل دور کسی اور ملک میں ہے۔ تم چاہو تو تمہیں وہاں بھیجنے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔"

سیتا نے گریبان چھوڑ دیا اور اشتباہ آمیز نظروں سے انہیں گھورنے لگی۔

"اِس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم سچ بول رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اُن میں سے ایک نے سادگی سے اعتراف کیا۔ "پی ایل او کی ہدایت پر ہر طرف تمہاری تلاش کی مہم جاری ہے۔"

اُس وقت سیتا کے لیے ان باتوں کو سمجھنا ناممکن تھا۔ وہ دونوں اسے بمشکل تمام فلسطینی تنظیم کے بارے میں سمجھا سکے اور اسی دوران میں سیتا کو اُن کے لب و لہجے سے اُن کی صداقت کا یقین آ گیا۔

سیتا اُن کے ہمراہ اسی وقت روانہ ہو گئی۔

خانہ بدوشوں کے لیے وہ سب ناقابلِ فہم تھا۔ سیتا اپنے رویے سے اُن کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ اس کی روانگی پر وہ سب ہی دل گرفتہ سے ہو گئے۔

ریتیلے ٹیلوں کے پار پختہ گلی کے کنارے ان لڑکوں کی کار موجود تھی جس میں وہ سیتا کو شہر کی طرف لے چلے۔

اس سفر کا اختتام حبیب بطریقی نامی ایک فلسطینی نوجوان کے مکان پر ہوا جو ٹیپو سلطان روڈ پر ایک بنگلے میں مقیم تھا۔

سیتا کے ساتھ ان تینوں کا رویہ احترام آمیز تھا۔ تھوڑی دیر بعد سیتا کو لانے والے واپس چلے گئے اور حبیب بطریقی سیتا کو روداد کے مختلف مراحل سے آگاہ کرنے لگا۔

تین روز سیتا کے سفری کاغذات کی تیاری میں صرف ہوئے اور چوتھے روز حبیب نے اس کے ہمراہ شہر چھوڑ دیا۔

آغازِ سفر سے پہلے حبیب کے ایما پر سیتا نے زندگی میں پہلی بار جینز اور جیکٹ زیبِ تن کی اور وہ لباس اُسے ایسا پسند آیا کہ بعد میں اس نے ہمیشہ اسی کے استعمال کو ترجیح دی۔

"جہاز کا سفر میرے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ تھا۔" سیتا مجھے بتا رہی تھی۔ "حبیب نے میرے لیے خاص طور پر کھڑکی سے ملحق نشست لی تھی لہٰذا جب رات گئے جہاز زمین سے بلند ہوا تو زمین پر جھومتی ہوئی روشنیوں کا منظر میرے لیے حیرت ناک تھا۔۔۔"

"مگر تمہارا سفر کہاں کے لیے تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"ایتھنز سے طیارہ بدل کر ہمیں طرابلس پہنچنا تھا۔ مجھے بتلایا گیا تھا کہ طرابلس ہی میں میری اور تمہاری ملاقات کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔"

اُسی وقت باہر راہداری میں کسی کے قدموں کا شور سنائی دیا اور ہم دونوں خاموش ہو کر داخلی دروازے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آنے والا احمد تھا۔

اُس کے پھولے ہوئے سانس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کافی دور سے دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ہیلی کاپٹر آ رہا ہے۔"

اس کے منہ سے اسی قدر سن لینا کافی تھا۔ ہم تینوں اسٹین گنیں اٹھا کر باہر دوڑ لیے۔

"کیا ہوا؟" ایک لڑکی نے کیبن کے دروازے سے سر نکال کر سہمے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"کیبنوں میں محدود رہو۔" میں نے رُکے بغیر بلند آواز میں کہا۔ "وہ لوگ شکست کھانے کے بعد دوبارہ واپس لوٹے ہیں۔"

ہم تینوں سیڑھیاں عبور کر کے عرشے پر پہنچے تو سفید ہیلی کاپٹر سمندر پر نیچی پرواز کر کے بہت قریب آ چکا تھا۔

جونہی ہیلی کاپٹر لانچ پر آ کر لحظہ بھر کے لیے معلق ہوا، ایک رسے کے سہارے ہوا باز کے لباس میں ملبوس ایک شخص عرشے پر کود آیا اور ہیلی کاپٹر آگے بڑھ گیا۔

میں نے اترنے والے کو فوراً ہی اسٹین گن کی زد پر لے لیا تھا مگر اس کا چہرہ دیکھتے ہی اسٹین گن کی نال خود بخود جھک گئی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" وہ سر پر سے خود اتارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"تم؟" احمد نے حیرت سے کہا۔ "تمہارے ساتھ ہیلی کاپٹر میں دوسرا کون ہے؟"

"میرا ساتھی۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ شراب کے نشے میں کہیں دھت پڑا ہوگا۔"

"جنرل ہیلی کاس کے احکام سُن کر اس کے سارے ہی ماتحتوں کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ ہم اس وقت خصوصی گشت پر ہیں۔"

"کھل کر بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "تمہارے معمے ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔"

"تھوڑی دیر قبل اسٹیشن کمانڈر کو جنرل ہیلی کاس کا فون ملا تھا۔ جنرل کو شکایت تھی کہ ہم سے ملتے جلتے کسی ہیلی کاپٹر سے اس کے ایک دوست کی لانچ پر زبردست حملہ کیا گیا اور لانچ کو چھین لیا گیا۔"

"تم سے ملتا جلتا ہیلی کاپٹر؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! جنرل بے چارہ یہ یقین ہی نہ کر سکا کہ حملے میں اُس کا ہیلی کاپٹر ملوث تھا۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔

"تمہارا خیال درست ثابت ہوا۔" احمد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ادکیف یہاں سے فرار ہو کر سیدھا جنرل کے پاس پہنچا ہوگا۔"

"ادکیف؟" ٹی تھری نے تحیّر زدہ لہجے میں سوال کیا۔ "تو کیا یہ لانچ اُسی کی ہے؟"

میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "وہ ایک پورٹ ہول سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ورنہ اس وقت ہمارا قیدی ہوتا۔"

"پھر یہ معاملہ طول کھینچے گا۔" اُس کے چہرے پر تشویش عود کر آئی۔ "اس خاتون کا کیا رہا جس کے لیے یہ سارے پاپڑ بیلے گئے تھے؟"

میں نے سیتا کی طرف اشارہ کیا پھر اس کے قریب جا کر بولا۔

"تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جنرل نے خود ہی تمہیں راہ سُجھا دی ہے۔ تم واپس جا کر اُسے کوئی بھی من گھڑت کہانی سنا سکتے ہو۔"

"سب سے بہتر تو یہ ہوتا کہ میں اُسے لانچ کے ویران ہونے کی خبر دیتا۔ اس دوران میں تم قریب ترین ساحل پر لانچ سے چھٹکارا حاصل کر لیتے۔ مگر اب عرشے پر میرا ساتھی تم تینوں کو دیکھ چکا ہے۔"

"تمہارے ساتھی کو خریدا نہیں جا سکتا؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا تجربہ ہے کہ شرابی کبھی اعتماد کے قابل نہیں ہوتا۔ وہ فی الحال رضامند ہو جائے گا مگر کسی بھی لمحے راز فاش کر دے گا۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟"

"میں واپسی میں سوچوں گا مگر تم جلد از جلد لانچ سے اپنا پیچھا چھڑاؤ۔" اس نے دور منڈلاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ جنرل، ادکیف کے ہمراہ خود لانچ کا جائزہ لینے کا فیصلہ کر لے، وہ خود بھی ہوا باز ہے۔"

"وہ آتا ہے تو اُسے آنے دو۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ "ہم کسی بھی لمحے شمالی یمن کی بحری حدود میں داخل ہو سکتے ہیں اور اگر وہ مملکت کا مارا آ ہی گیا تو زندہ واپس نہ لوٹ سکے گا، تم بے فکر ہو کر واپس جاؤ۔"

"تمہارے ہیلی کاپٹر میں کسی تیسرے کی گنجائش ہے؟" اچانک سیتا سوال کر بیٹھی۔

"نہیں۔" ٹی تھری کا لہجہ دوٹوک تھا۔ "مگر کس کے لیے؟"

"احمد کا داہنا شانہ بُری طرح زخمی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اسے فوری طور پر لے جایا جائے تو بہتر ہوگا۔"

"چلو۔" ٹی تھری نے احمد سے کہا۔ "نشست نہیں مل سکے گی، لیکن میں تمھیں ایتھوپیا کے ساحل پر کہیں ویران کھاڑیوں میں اتار دوں گا۔"

"اور تمہارا ساتھی؟" احمد نے سوال کیا۔

"اُسے دیکھ لیا جائے گا۔ میرے نزدیک تمہارے زخموں کی دیکھ بھال زیادہ ضروری ہے، تمہارے داہنے شانے پر بہت ورم ہے۔"

"ورم نہیں ہے۔" احمد پھیکے انداز میں ہنسا۔ "لباس کے نیچے میرے شانے پر پٹیاں بندھی ہیں۔"

"تم سوچ لو، میں تمہیں لے جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"میرا زخم اتنا خطرناک نہیں ہے۔ تم کوئی خطرہ مول نہ لو۔" احمد نے قدرے توقف سے کہا۔ "میں اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔"

ٹی تھری کا سفید ہیلی کاپٹر خطرناک انداز میں غوطہ مار کر لانچ پر آیا۔ اس سے ایک رسا نیچے جھول رہا تھا۔ ٹی تھری ماہرانہ انداز میں رسہ تھام کر اوپر چڑھتا چلا گیا اور ہیلی کاپٹر واپس اسی طرف پرواز کر گیا، جدھر سے نمودار ہوا تھا۔

نیچے اُتر کر ہم تینوں لانچ کے انجن روم میں جا پہنچے۔

"آگے گھور اندھیرا ہے۔ ہم کسی بھی لمحے رُک سکتے ہیں۔" اُن میں سے ایک نے ہمیں پُرسکون لہجے میں اطلاع دی۔

"اِس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"یمن کی سمندری حدود میں! الحدیدہ کے جنوب میں ہماری منزل ہے۔"

"پہلے تو تم نے صنعا کا حوالہ دیا تھا؟" میں نے سوال کیا

"صنعا ساحلی شہر نہیں ہے، شاید شہرت کی وجہ سے اُس کا نام منہ پر آ گیا ہوگا۔" اس نے صاف دلی سے کہا۔

مجھے حیرت تھی کہ ٹی تھری نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم لوگ ایتھوپیا کی سمندری حدود کو خیرباد کہہ کر دوسرے ملک کی بحری حدود میں داخل ہو چکے تھے۔

میں احمد کے ساتھ دوبارہ عرشے پر چلا گیا۔ میں نے انجن روم سے

دُور بین ساتھ لے لی تھی جب کہ سیتا خوفزدہ لڑکیوں کو تسلی دینے کے لیے کیبن کی طرف چلی گئی تھی۔

دُور بین کے ذریعے مجھے سمندر کے سینے پر طویل فاصلوں پر روشنی کے متعدد نکتے نظر آئے جن کا اس آبی گزرگاہ میں پُورا جواز تھا۔ مغرب سے آنے والے جہاز نہر سویز سے گزرنے کے بعد بحیرۂ احمر کی آبی گزرگاہ سے ہوتے ہوئے باب المندب عبور کر کے بحیرۂ ہند میں داخل ہوتے تھے لہٰذا اس علاقے میں جہازوں کی کثیر تعداد کی موجودگی حیران کن نہیں تھی۔

ہم دونوں عرشے پر بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے اور اپنے اپنے تفکرات میں گم تھے کہ یکایک لانچ کی رفتار میں نمایاں کمی کا احساس ہوا اور چند منٹ کے اندر ہی لانچ جھٹکے کھاتی ہوئی رک گئی۔

ہم نیچے اُترنے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھے ہی تھے کہ لانچ چلانے والے دونوں افراد میں سے ایک اوپر آ پہنچا۔

"لانچ دلدل میں پھنس گئی ہے۔" اس نے دُور ہی سے کہا۔ "اس کا آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ناممکن ہے۔"

"ہم ساحل سے کتنی دُور ہوں گے؟" میں نے سوال کیا

"زیادہ سے زیادہ چار پانچ میل۔" اس نے جواب دیا۔ "سمندری بہاؤ کی وجہ سے یمن کی بیشتر ساحلی پٹی چار پانچ میل تک جہازرانی کے لیے ناکارہ ہے کیونکہ یہاں ریت بہت تیزی سے جمع ہوتی ہے۔"

"تمھیں یقین ہے کہ ہم سمندر کے وسط میں کسی ریتیلے جزیرے پر نہیں جا چڑھے ہیں؟"

"اس علاقے سے ہم پوری طرح واقف ہیں۔" اس نے انکسار آمیز لہجے میں کہا۔

طویل مشورے کے بعد لانچ کا انجن بند کر دیا گیا اور سب لوگ عرشے پر سمٹ آئے۔ اس وقت لانچ پر کُل گیارہ نفوس موجود تھے۔ جب کہ عرشے پر صرف ایک لائف بوٹ موجود تھی جس میں بیک وقت صرف چار افراد کی گنجائش تھی۔ پانچویں فرد کو سوار کرنے کی صورت میں بوٹ کسی بھی تیز لہر کے سامنے اُلٹ سکتی تھی۔

بوٹ کو سمندر میں ڈالنے کے بعد سب سے پہلے سیتا کو رسّے کی سیڑھی کی مدد سے نیچے اُتارا گیا پھر بدقت تمام دو لڑکیاں کانپتی لرزتی نیچے پہنچیں اور وہ لانچ کا ایک ملاح لائف بوٹ کو تاریکی میں ساحل کی طرف لے گیا۔

انہیں مقدر کے حوالے کر کے بقیہ لوگ عرشے پر ہی بیٹھ گئے میں نے اس مہلت کا فائدہ اٹھا کر ملاح کے ساتھ نیچے کا چکر لگایا اور دو تھیلوں میں خورد و نوش کا سامان بھر کر اوپر لے آیا تاکہ صحرا میں بھٹکنے کی صورت میں بھوک اور پیاس کا مداوا ہو سکے۔

لائف بوٹ کم و بیش چالیس منٹ میں لوٹ آئی۔ ساحل خلاف توقع بہت قریب تھا۔ اس بار بھی تین لڑکیاں روانہ کر دی گئیں۔

تیسرے چکر میں میرے اور احمد کے ساتھ لوسی تھی۔ اب صرف دُوسرا ملاح عرشے پر اکیلا رہ گیا تھا۔

"ہم اپنا راستہ کسی اور طرف تلاش کریں گے۔" ہمیں ساحل پر اتارنے کے بعد لائف بوٹ میں سوار ملاح نے کہا۔ "میں اپنے ساتھی کو لے کر کسی بھی طرف نکل جاؤں گا۔"

"ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟" احمد نے سوال کیا

"اتنی بھیڑ کا نگاہوں سے بچنا محال ہو گا۔ سمندر تک ہم نے تمھارا ساتھ دیا، اب ہمارے راستے جُدا ہوں گے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"لانچ پر رقم وغیرہ بھی ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ہاں!" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "میرا ساتھی اس پر قابض ہو چکا ہو گا۔ اسی کے سہارے ہم از سرِ نو اپنی زندگی کا آغاز کر سکیں گے۔"

"جاؤ، ہم تمھاری کامیابی کے لیے دعاگو رہیں گے۔" میں نے کہا اور وہ اندھیرے ساحل پر ہمیں ریت پر کھڑا چھوڑ کر پتوار چلاتا غائب ہو گیا۔

سمندر سے آنے والی یخ بستہ ہوائیں ہر ایک کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں مگر سب تن بہ تقدیر خاموش کھڑے تھے۔

ریتیلے ساحل پر دم توڑتی ہوئی سمندر کی موجوں کے آسیبی شور میں ہر ایک اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھا۔

تعداد کے اعتبار سے ہماری نفری خاصی بھاری تھی لیکن اس پوری بھیڑ کی سلامتی میرے اور احمد کے سر تھی۔

ہم دونوں کے علاوہ سیتا بھی پوری طرح مسلح تھی اور ہم لوگوں میں بدترین حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت بھی موجود تھی مگر یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ سفر کا آغاز کس سمت میں کیا جائے۔

مگر اس سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے رائے پیش کی کہ ساحل سے ہٹ کر ریگستان میں بھٹکنے کے بجائے اگر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ شمال میں سفر جاری رکھتے تو کسی گھاٹ کا ملنا یقینی تھا۔ اور اگر وہ پورا ساحل ہی ویران تھا تو کم از کم ہم الحدیدہ کی بندرگاہ تک ضرور پہنچ جاتے۔

میرا مشورہ ہر ایک کے لیے قابلِ قبول تھا لہٰذا ہم شمال کی طرف چل دیے۔

احمد زخمی تھا مگر اس کا حوصلہ بلند تھا، اسی کے ساتھ سیتا بھی ہر صورتِ حال کے لیے پوری طرح تیار تھی مگر مغرب کے پُرآسائش ماحول کی پروردہ ان چھ لڑکیوں کے لیے نرم ریت میں پیدل چلنا ایک عذاب سے

کم نہیں تھا۔

رات کا پُرہول اندھیرا، سرد ہواؤں کے تھپیڑے اور سمندر کی موجوں کی آسیبی سسکیاں اُن کے اعصاب کو منتشر کیے ڈال رہی تھیں۔

چلتے چلتے احمد نے میرا ہاتھ دبایا اور قدرے تیز رفتاری سے اُن لڑکیوں سے کافی آگے نکل گیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی سیتا کو پیچھے چھوڑ کر احمد کے ساتھ پہنچ گیا۔

"میں اس وقت شدید اُلجھن میں مبتلا ہوں۔" احمد نے قدرے توقف کے بعد دھیمے لہجے میں کہا۔

"ان حالات میں تو ہر ایک اُلجھن کا شکار ہے۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "تمھارے ساتھ کوئی خاص معاملہ درپیش ہے؟"

"یہ چھ لڑکیاں مجھے اب بوجھ محسوس ہو رہی ہیں۔" اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر رازدارانہ لہجے میں کہہ ڈالا۔

"مگر کیوں؟"

"ان کی وجہ سے ہماری نفری غیر معمولی لگتی ہے، انھیں ساتھ لگائے رکھا تو ہم ہر جگہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔"

"لیکن اس کے سوا اور کیا راستہ ہے؟"

"انھیں ساحل کے ساتھ اپنے مجوزہ راستے پر بڑھنے دو۔" اس نے قدرے سکوت کے بعد جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہ جلد یا بدیر کہیں نہ کہیں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گی۔ ہم لوگ اپنا راستہ تبدیل کر سکتے ہیں۔"

"وہ سب بہت زیادہ خوفزدہ ہیں، اتنی آسانی سے ہمیں اپنی من مانی راہ اختیار نہیں کرنے دیں گی۔"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ بخوشی ہمارا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔"

"کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے اپنے لیے سگریٹ سُلگاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

چند ثانیوں کے بعد احمد نے پورے قافلے کو روک لیا۔

"تم لوگوں کو بردہ فروشوں کے شکنجے سے پوری طرح آزادی مل چکی ہے اور اس وقت تم یمن کی سرزمین پر ہو۔" احمد نے انگریزی میں رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔ "پہلی آبادی میں پہنچتے ہی تم مقامی پولیس کی ہمدردی کے ساتھ ہر قسم کی مدد حاصل کر سکو گی۔ تمہیں اس راہ پر ڈال دینے کے بعد ہماری ذمے داریاں ختم ہو جاتی ہیں۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" جرمن لہجے میں ایک ہراساں نسوانی آواز اُبھری۔

"ہمارا راستہ مختلف ہے، ہمارے ساتھ رہ کر تم سب گھاٹے میں



رہو گی۔ ہم نے تمھاری مدد ضرور کی ہے لیکن ہم قانونی الجھنوں میں پڑ کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتے، ہمارے لیے اپنی کارروائیوں کا جواز پیش کرنا دشوار ہو جائے گا۔"

"تم ہمیں موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتے ہو۔" ایک لڑکی کی خوفزدہ آواز ابھری۔ "اس سنسان ماحول میں ہم عورتیں کیا کر سکیں گی۔"

"اس ساحل پر تنہائی کے سوا کوئی خطرہ نہیں ہے۔" احمد بولا۔ "اور تم تعداد میں چھ ہو، تمھارے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔"

"اگر تمھارا یہی ارادہ تھا تو ہمیں ساحل پر کیوں اتارا تھا؟" یہ کوئی نئی آواز تھی۔

"اب تک ہم نے ہر قدم تمھاری بہتری کے لیے اٹھایا ہے۔" احمد کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "اور آخری فیصلہ بھی اسی سمت میں ایک قدم ہے، تم سب غیر ملکی ہو۔ تمھارے ساتھ مقامی قانون کا رویہ ہمدردانہ ہو گا، لیکن ہماری موجودگی صورتِ حال بدل دے گی۔"

میرے اندازے کے عین مطابق احمد کا فیصلہ ان میں سے کسی کو بھی آسانی سے قابلِ قبول نہیں تھا لیکن طویل بحث کے بعد احمد اُن کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

لُوسی نے چلتے چلتے کسی ہتھیار کا مطالبہ کیا تھا۔ جسے احمد نے ٹھکرا دیا۔ البتہ خورد و نوش کے سامان سے بھرا ہوا ایک تھیلا اُن کے حوالے کر دیا۔

سیتا کے بارے میں اُن سب کا رویہ حیرتناک حد تک دوستانہ تھا۔ سب لڑکیوں نے پُرجوش انداز میں اسے الوداع کہا اور چھ مختلف النسل لڑکیوں کا وہ پامال قافلہ اپنے مقدر کی تلاش میں اندھیرے راستے پر ساحل کے کنارے بڑھتا چلا گیا۔

جب رات کے آخری پہر کی تاریکی نے ان کے موہوم ہیولے اپنے جبڑوں میں نگل لیے تو پہلی بار سیتا نے زبان کھولی۔

"اب ہماری راہ کون سی ہو گی؟"

"اس طرف۔" احمد نے داہنی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اُدھر تو شاید ریت کا صحرا ہی صحرا ہے۔" میں نے کہا۔

"یمن غریب ملک ہے۔" وہ بولا۔ "یہاں کا صحرا ویران نہیں ہے۔ ہر دس یا پانچ میل کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی قصبہ آباد ہے۔"

"مگر یہ قصبے ہمارے کس کام آئیں گے؟" سیتا نے سوال کیا۔

"فوری طور پر ہمیں کسی پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔" احمد نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ پناہ سے زیادہ تیز تر پیش قدمی ہمارے حق میں مفید رہے گی۔" سیتا نے برجستہ کہا۔ "ہمیں فوری طور پر یمن سے نکلنا چاہیے۔"

"یمن سے تم کدھر جاؤ گے؟"

"ہندوستان یا پاکستان۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر مجھے ایتھوپیا واپس پہنچنا ہے۔" احمد کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ "وہاں میری بیوی اور دو بچے ہر آہٹ پر کان لگائے میرے منتظر ہوں گے۔"

"پہلے تمھاری روانگی ضروری ہے۔" میں نے داہنی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس بار میں نے سیتا کو حاصل کر لیا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور ہم تینوں اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔

اندھیرے میں ہمارا سفر جاری رہا۔ پھر رات کا طلسم غیر محسوس انداز میں بکھرنے لگا۔ پہلے آسمان کے مشرقی گوشوں پر سفیدی نمودار ہوئی پھر سُورج کی بنفشی کرنوں کی روشنی میں صحرا کی ریت سونے کی طرح جگمگانے لگی۔

چلتے چلتے ہم نے تھیلے میں سے اپنی شکم پُری کا کچھ اسباب فراہم کیا اور پھر احمد یکبارگی پُرجوش انداز میں چیخ پڑا۔

وہ آنکھوں پر دُوربین جمائے مشرق کی طرف نگراں تھا۔

"ہم کسی بستی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔" اس کی آواز مسرت سے لرز رہی تھی۔ "بس ایک آدھ گھنٹے کی مسافت معلوم ہوتی ہے۔"

ہم دونوں نے اُس سے دوربین لے کر باری باری اس سمت کا جائزہ لیا۔ اُدھر واقعی کوئی بستی موجود تھی جہاں مختصر مکانوں کے درمیان کسی مسجد کا بلند مینار نمایاں تھا۔

ہم تینوں کی رفتار میں تیزی آگئی۔

صحرا کی وسعت میں فاصلوں کا قیاس عموماً غلط ثابت ہوتا ہے لیکن ہم لوگ ٹھیک ایک گھنٹے میں اس آبادی کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ مکانوں سے باہر کھیلتے ہوئے بچے شور مچاتے ہوئے ہماری طرف بڑھ آئے۔

"یہ کون سی بستی ہے؟" احمد نے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے نسبتاً بڑی عمر کے ایک بچے سے سوال کیا۔

"برکہ۔" بیک وقت دو تین آوازیں ابھریں۔

اسی وقت بچوں کا شور سُن کر ایک موٹا اور پستہ قامت شخص اپنا خاکی لبادہ پنڈلیوں سے اوپر اٹھائے سامنے آگیا۔ اُس کے سر پر کپڑے کی گول ٹوپی جمی ہوئی تھی اور وہ دُور ہی سے بچوں پر برس رہا تھا۔

اُس کی ڈانٹ پھٹکار بچوں کے لیے خاصی مؤثر ثابت ہوئی اور وہ ہمارے قریب پہنچ گیا۔

"اہلین... اہلین۔" اُس نے دونوں ہاتھ اپنے سر کے قریب لہراتے ہوئے پُرتپاک لہجے میں کہا، پھر اچانک ہی خاموش ہو گیا۔

اس کا سارا جوش کافور ہو گیا تھا اور نگاہوں میں خوف امڈ آیا تھا۔ اُس کی حالت میں تغیر کا سبب مجھ پر فوراً ہی عیاں ہو گیا کیونکہ

وہ باری باری ہمارے اسلحے کو تکے جا رہا تھا۔

"لڑنے کی فرصت نہیں، ہم شریف لوگ ہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"کہاں سے آتے ہو؟" اس کا لہجہ محتاط اور اشتباہ آمیز تھا۔

"ہماری لانچ سمندر میں حادثے کا شکار ہو گئی، ہم بمشکل اپنی جانیں بچا کر ساحل تک پہنچ سکے۔" میں نے اپنے لہجے میں ذورہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"اس اسلحہ سمیت؟" وہ سادہ لوح ہونے کے باوجود احمق نہیں تھا۔

"اجنبی سرزمین پر خوراک سے زیادہ اسلحہ اہم ہوتا ہے۔ ہم سمندر میں بھی اس بوجھ کو اپنے سینوں سے لگائے رہے۔"

"اجنبی؟" وہ سست روی سے آبادی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تم تو لب و لہجے سے عرب ہی معلوم ہوتے ہو۔"

"ہمیں تمہاری تھوڑی سی مدد درکار ہے۔" احمد نے اس کے سوالات کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تقریباً چوبیس گھنٹے کے تھکے ہوئے ہیں میرا شانہ بھی زخمی ہے۔"

"تھوڑے آرام کے بعد ہم تمہارے ہر سوال کا جواب دے دیں گے۔" میں نے اُسے راہ راست پر رکھنے کی نیت سے پچکارتے ہوئے کہا۔

بچے بدستور ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے جلوس کی صورت میں ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے اور میں تیزی سے آئندہ حکمتِ عملی کے بارے میں سوچنے میں مصروف تھا۔

وہ بستی پچیس تیس کچے مکانات پر مشتمل تھی۔ ہمیں جس کمرے میں پہنچایا گیا وہ اپنے لوازم کے اعتبار سے بستی کی چوپال معلوم ہو رہی تھی۔

کنویں کے تازہ پانی سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد ہمارے لیے گیہوں کی روٹیاں، پنیر اور گرم گرم قہوہ تیار تھا۔ اس اثنا میں بستی کے مزید دو افراد وہاں آ گئے تھے اور حریصانہ انداز میں ہمارے اسلحے کا جائزہ لے رہے تھے۔

اسٹین گن کے ساتھ اُن کا محتاط سلوک اس امر کا غماز تھا کہ وہ اُن کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔

ناشتے سے فراغت پاتے ہی پستہ قامت مطلب پر آ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے ہماری اسٹین گنیں اپنے قریب رکھی ہوئی تھیں۔

"ہم صنعا پہنچنا چاہتے ہیں۔" اس کے سوال کے جواب میں احمد نے کہا۔ "ہم وہاں اپنے تمام مسائل حل کر لیں گے۔"

"اور اگر ہم تمہیں پولیس کی تحویل میں دے دیں؟" اس شخص نے مکارانہ لہجے میں سوال کیا اور میں نے فوراً بھانپ لیا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ پولیس کے نام سے دھمکا کر کہاں تک فائدہ اُٹھا سکے گا۔

"یہ سب سے بہتر ہو گا۔" میں احمد سے پہلے بول پڑا اور وہ میرا منہ دیکھتا رہ گیا۔ "کیا اس بستی میں پولیس چوکی بھی ہے؟"

"قریب ترین چوکی سات میل دُور ہے۔" وہ سپٹپا کر بولا۔ "وہاں بھی کسی کو بھیجنا ہی ہو گا۔ اور وہ لوگ تمہارے ساتھ شاید بہتر سلوک بھی نہ کریں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اسلحہ۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "جنوبی یمن سے اکثر مسلح تخریب کار اس طرف آتے رہتے ہیں، تم پر پہلا شبہ یہی ہو گا۔"

"ہم پولیس کے شبہات دُور کر دیں گے۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "لیکن تمہارے ذہن میں کوئی آسان تجویز ہو تو وہ بھی بتا ڈالو۔"

حقیقت یہ تھی کہ اس کی زبان سے مسلح تخریب کاروں کا ذکر سنتے ہی میرا دل ہَول اٹھا تھا۔ شمالی اور جنوبی یمن کی محاذ آرائی اس خطے کی بدترین حقیقت تھی۔ اور دونوں حکومتیں آئے دن ایک دوسرے کے خلاف کوئی نہ کوئی شوشہ کھڑا کرتی رہتی تھیں۔ ان حالات میں اگر ہم پولیس کے ہاتھ لگ جاتے تو اُن کے تشدد کے سامنے ہمیں نہ جانے کتنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرنا پڑتا لہٰذا بہتر یہی تھا کہ ان لوگوں کی کسی بھی متبادل تجویز کو قبول کر کے نکاسی کی راہ بنائی جاتی۔

"یہاں سے بیس بائیس میل دُور تعیز اور صنعا کو ملانے والی شاہراہ گزرتی ہے جس پر لاریاں چلتی ہیں۔ ہم تمہیں وہاں سے کسی لاری میں سوار کرا سکتے ہیں۔" اُس نے ٹوپی اُتار کر اپنے سر میں کھجاتے ہوئے کہا۔

"یہ بندوبست بھی قابلِ قبول ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

"لیکن تمہیں اپنا تمام اسلحہ ہمارے حوالے کرنا ہو گا۔" اُس نے ٹوپی دوبارہ سر پر جما کر فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"یہ سراسر زیادتی ہے۔۔۔۔۔"

"شش!" اس نے ڈھٹائی سے میری بات کاٹ دی۔ "پولیس کے پاس گئے تو نہ صرف اسلحہ ضبط ہو گا بلکہ کسی سفارش کا بندوبست ہونے تک مار بھی پڑے گی۔۔۔ اگر اسلحہ ہمیں دے دو گے۔۔۔ تو مار سے بچنے کے علاوہ لاری تک بھی بحفاظت پہنچائے جاؤ گے۔" وہ ہر قسم کی مروّت کو بالائے طاق رکھ کر کھلم کھلا دھونس پر اُتر آیا تھا۔

"مگر اس صحرا میں یہ اسلحہ تمہارے کس کام آئے گا؟" میں نے اُسکی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے تحمل سے سوال کیا۔ "یہ بہت بیش قیمت اور جدید ہتھیار ہیں۔"

"اسٹین گنوں سے ہم بخوبی واقف ہیں۔" اس مرتبہ پستہ قامت کے بجائے دوسرا بولا تھا۔ "ہمیں حسرت تھی کہ کاش بر کہ والوں کے پاس بھی ایسے ہتھیار ہوتے اور آج مقدر نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے تو ہم اسے ضائع نہیں کریں گے۔"

"تم لوگوں کو اس قدر شوق ہے تو ضرور یہ رکھ لو۔" میں نے محسوس کیا کہ ہمارے انکار کی صورت میں بھی وہ لوگ ہمیں پولیس کے حوالے نہیں کریں گے بلکہ ہلاک کر کے خاموشی سے ہتھیاروں پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں گے۔

"لیکن تمہیں اس کی ضرورت کیا ہے؟" احمد نے سوال کیا۔ "تمہیں تمہاری ملکیت میں دینے کے بعد ہمیں یہ تو جاننے کا حق ہے!"

"ان اطراف میں آئے دن خونریز قبائلی تصادم ہوتے رہتے ہیں برکہ والے ہر بار گھاٹے میں ہی رہتے ہیں کیونکہ ہم مفلوک الحال ہیں ہتھیار نہیں خرید سکتے۔ پوری بستی میں کُل چار بندوقیں ہیں جو دو تین معرکے جھا چکی ہیں۔" پستہ قامت نے کہا۔

"مگر یہ تصادم ہوتے کیوں ہیں؟" مجھے وہ موضوع دلچسپ معلوم ہوا۔

"ذرا سی بات بہانہ بن جاتی ہے۔" وہ لا پروائی سے بولا۔ "پچھلے دنوں ابجبل کے کنویں پر پانی کی باری پر دو قبیلے لڑ پڑے تھے۔ دونوں طرف کے تین آدمی مارے گئے اور سات زخمی ہوئے۔"

"ان معاملوں میں پولیس دخل نہیں دیتی؟" احمد نے سوال کیا۔

"قبائلی جھگڑوں میں پولیس کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ وہ اسی وقت حرکت میں آتی ہے جب کوئی فریق اُن سے رجوع کرے اور یہاں باہمی جھگڑوں میں پولیس سے مدد طلب کرنا ذلت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔"

اسٹین گنوں کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد اُن کا رویّہ دوستانہ ہو گیا۔ ہم لوگوں نے اپنی تحویل میں موجود تمام فاضل راؤنڈز بھی اُن کے حوالے کر دیے اور وہ والہانہ مسرت کے عالم میں اسلحہ سمیٹ کر وہاں سے چلے گئے۔

"اُف!" اُن کے جاتے ہی سیتا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "یہ لوگ تو آج بھی قدیم دور میں جی رہے ہیں۔"

"یہی نہیں اپنی بھی بات کرو۔" میں نے اردو میں کہا۔ "تمہیں ہمالیہ سے ساتھ نہ لایا ہوتا تو تم بھی اسی دور میں رہ رہی ہوتیں۔"

"میں باہر چلا جاؤں؟" احمد نے مسکرا کر سوال کیا۔

"ارے نہیں!" میں شرمسار سا ہو گیا۔ وہ میاں بیوی کی ایک نجی بات تھی جو میں غیرارادی طور پر اپنی مادری زبان میں بول گیا۔

"چاہو تو کچھ دیر نجی گفتگو کر لو مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں نے طویل مدّت کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔"

سیتا مجھے ملامت آمیز نظروں سے گھورنے لگی کیوں کہ میری ذرا سی لغزش نے احمد کو زبان کھولنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

احمد واقعی اُٹھ کر چوپال سے باہر جانے لگا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا۔

"اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے



دباؤ میں ہیں اس کے باوجود تم نے صنعا کی راہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس میں کیا مصلحت ہے؟" میں نے سگریٹ کے چند گہرے کش لینے کے بعد سوال کیا۔

"ساحلی بستی ہوتی تو کچھ اور بھی سوچا جا سکتا تھا۔ بحری راستے سے یہ کوئی مدد نہ دے سکیں گے؛ اور یہ بھی نہ بھولو کہ ہم یمن میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئے ہیں۔" اس کے ذہن میں پوری حکمتِ عملی واضح تھی۔

"صنعا میں کیا ہوگا؟"

"وہاں پی ایل او کا باقاعدہ دفتر ہے، اُن تک پہنچنے کی دیر ہے پھر وہی لوگ ہماری نکاسی کی راہ تلاش کریں گے۔"

"تم وہاں کسی سے واقف ہو؟"

"نہیں!" وہ بولا۔ "لیکن کوئی نہ کوئی راہ مل ہی جائے گی۔"

تھوڑی دیر بعد پستہ قامت دو تنومند اونٹوں کے ہمراہ وہاں آ پہنچا۔ اُس کے ساتھ اسلحہ لے جانے والوں میں سے ایک نوجوان بھی تھا۔

"نبیل تمھیں صنعا جانے والی لاری میں سوار کرا دے گا۔" پستہ قامت نے اونٹوں کو چوپال کے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔

احمد نبیل کے پیچھے ایک اونٹ پر سوار ہو گیا۔ سیتا کو میں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ پستہ قامت نے مجھے نبیل کے اشاروں کے بارے میں چند نکات ذہن نشین کرائے اور ہمارا چار نفری قافلہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

بستی سے باہر نکلتے ہی اونٹوں کی رفتار بڑھا دی گئی۔

کھلے صحرا میں آتے ہی نبیل نے مست ہو کر ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ اونٹوں کے گلے میں جھولتی ہوئی گھنٹیوں کا ترنم اس کی آواز کا ساتھ دیتا محسوس ہو رہا تھا۔

"کس قدر عجیب ہے یہ زندگی۔" سیتا میرے کان کے قریب بولی۔

"بے حد کٹھن اور پُر خطر۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اس میں بھی ایک اچھوتا رومان ہے۔"

"اُس وقت سے ڈرو جب برکہ والوں کے مخالف شتربان ہمارا راستہ روک لیں اور اندھا دھند گولیاں برسانے لگیں۔"

"جب تک میں اکیلی تھی، دنیا کے کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتی تھی لیکن تمھیں پا لینے کے بعد میری ہمت جواب دے گئی ہے۔"

"ہمت جواب نہیں دے گئی ہے بلکہ تمھاری سلامتی کی ذمّے داری میرے سر آ گئی ہے۔" میں نے اُس کے پہلو میں آہستہ سے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "یہ صرف تمھارا نہیں ہر مشرقی عورت کا مزاج ہوتا ہے۔"

"عورت مشرق میں بھی وہی ہوتی ہے جو مغرب میں۔" اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔ "فرق صرف اتنا ہے کہ مشرق کا مرد عورت کو اپنی ذمّے داری تصوّر کرتا ہے لیکن مغرب میں ہر مرد اس ذمّے داری سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے اور عورت کو مجبوراً نیم مردانگی اختیار کرنا پڑتی ہے، ورنہ عورت تو وہی ہے جو اپنی ہر سانس کے لیے مرد کی پناہ کی طالب ہوتی ہے۔"

"تم نے تو بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "تمھیں مغرب کی ہوا کہاں سے لگ گئی؟ میرا تو خیال ہے کہ تم لیبیا، قاہرہ اور سوڈان تک ہی محدود رہیں؟"

"چند ہفتوں کے لیے بیروت بھی گئی تھی۔ وہاں میں نے مرد اور عورت کے کمزور رشتوں کی بڑی بھیانک کہانیاں دیکھیں اور میرا رُواں رُواں لرز اٹھا۔"

"بیروت میں کیا کام تھا تمھارا؟"

"بندروں کی تربیت۔" اس نے جواب دیا۔ "دس بندروں کی ایک ٹولی کو تخریبی کارروائیوں کی تربیت دے کر اسرائیلی علاقے میں بھیجا گیا تھا۔"

"اور اس کا نتیجہ؟"

"فلسطینی حلقے حیران رہ گئے۔" سیتا نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ "اُن دس بندروں نے اسرائیل میں ناقابلِ بیان تباہی پھیلائی لیکن اُن میں سے کوئی زندہ نہ لوٹ سکا۔"

"شاید ایک بندر تم نے میری بُو پر بھی تو سدھایا تھا؟" میں نے مادام بواری کے خفیہ ٹھکانے پر پیش آنے والا سنسنی خیز واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "اُن دنوں تم شاید فرانس میں تھے لیکن تمھارا سُراغ نہیں مل رہا تھا میرے پاس تمھارے استعمال کے دو رومال تھے، میں نے اُن کی مدد سے لیبیا میں ہی ایک بندر کو سدھایا تھا لیکن اسے لے جانے والا پیرس میں اس کا سراغ ہی کھو بیٹھا، کیا وہ تم تک پہنچا تھا؟"

"ضرور پہنچا تھا اور میرے سینے میں اِک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔" میں نے ماضی کے اس قصے کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟" قدرے توقف کے بعد سیتا نے پہلی بار مستقبل کے بارے میں لب کشائی کی۔

"ہم پہلی فرصت میں پاکستان چلیں گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں اب۔"

"اور پھر؟" اس کا لہجہ شوخ تھا۔

"میں ایک چھوٹا سا گھر چاہتا ہوں سیتا جو میری کُل کائنات ہو اور جس کے آنگن میں دو تین ننھے بچوں کی آوازیں بھی گونجتی ہوں۔"

"سچ بتاؤ کہ مجھے کھونے اور پانے کے درمیان تم نے اپنا وقت کیسے گزارا؟" اس نے عقب میں میرے شانے پر سر ٹکا دیا۔

"میری زندگی ہنگاموں کا محور بن کر رہ گئی تھی۔ شاید تم تصوّر بھی نہیں کر سکتیں کہ میں نے کیسا ناقابلِ یقین وقت گزارا ہے۔ میں اپنی دانست میں تمھاری تلاش کی راہ پر گامزن تھا مگر تقدیر کے بے رحم ہاتھ بار بار مجھے خطرات کی بھٹی میں جھونک دیتے تھے جہاں سے میں ہر بار کُندن بن کر نکلتا رہا۔ میرا

ایک ایک لمحہ تمھارے لیے وقف تھا۔"

"میں تمھاری کہانی سُننا چاہتی ہوں۔" اُس نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔ "میں نے ہر طرف تمھاری جرأت اور بے خوفی کی کہانیاں سُنی ہیں۔"

"فرصت میسّر آنے دو، پھر ہم ایک دوسرے کو اپنی کہانیاں سُناتے رہیں گے۔"

"وہ انگوٹھی ہے تمھارے پاس؟" اچانک وہ سوال کر بیٹھی۔

"کون سی انگوٹھی؟"

"وہی جو میری ماں نے تمھیں نشانی کے طور پر دی تھی، جس میں پارس پتھر کا نگ جڑا ہوا تھا۔" اُس نے یاد دلایا۔

"تمھیں یاد نہیں کہ اس کی وجہ سے لوگ ہمارے لہو کے پیاسے ہو گئے تھے اور میں نے نگ نکال کر انگوٹھی ضائع کر دی تھی۔"

"تو وہ نگ تو تمھارے پاس ہے نا؟"

"وہ میں نے بڑے وقت سے بچاؤ کے لیے راجہ ہوٹل کے کمرے میں جہاں چھپایا تھا، وہیں چھوڑنا پڑا کیونکہ تمھاری روپوشی نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا اور مجھے ایک بار ہوٹل سے نکلنے کے بعد دوبارہ اندر گھسنا نصیب نہیں ہو سکا۔"

"تم نے بعد میں اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"ہوٹل سے نکلنے کے بعد قسمت مجھے انبالہ سے دُور لے گئی، پھر میں ایسا ہندوستان بدر ہوا کہ آج تک اُدھر کا رُخ کرنے کی نوبت ہی نہیں آ سکی۔ وہ پتھر خود میرے لیے بھی بہت عزیز ہے اور یہ میرا عزم ہے کہ میں اسے ضرور حاصل کروں گا۔"

"تو ہم سیدھے ہندوستان کیوں نہ چلیں؟"

"میں نے کہا نا کہ میں تھک گیا ہوں۔۔۔ پاکستان میں کچھ روز آرام کر کے میں تنہا انبالہ جاؤں گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ تمھاری ماں کی نشانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"کاش میں ایک بار پھر اپنی ماں کو دیکھ سکتی۔" سیتا کی آواز میں درد سمٹ آیا۔ "پتہ نہیں اب وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

"زندگی رہی تو ایک کوشش یہ بھی کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اور شنودری زندہ ہوئی تو اسے اپنے ساتھ لے آئیں گے۔"

وہ خوش ہو گئی۔

ہم دونوں آشیانے سے بچھڑے ہوئے معصوم پنچھیوں کی طرح سُہانے مستقبل کے بارے میں سپنوں کے محل بناتے صحرا میں سفر کرتے رہے اور پھر وہ سڑک آ گئی جہاں سے صنعا کے لیے بس ملتی تھی۔

نبیل نے ہمیں سڑک کے کنارے چھوڑ کر واپس جانا چاہا۔ لیکن احمد نے اسے روک لیا۔ "اس ویرانے میں ہمیں الوداع کہنے والا کوئی نہ ہوا تو بس کے سارے مسافر ہماری طرف سے مشکوک ہو جائیں گے۔"

"لاری کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے ہو سکتا ہے ہمیں شام تک انتظار کرنا پڑے۔" نبیل نے ریت پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

وہ راہ پر آ گیا تھا لہٰذا ہم میں سے کسی نے اس کی قیاس آرائی پر تبصرہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔

طویل انتظار کے دوران میں نے احمد کے ساتھ مل کر سگریٹوں کے کئی پیکٹ ختم کر ڈالے۔ نبیل تمباکو نوشی کا عادی نہیں تھا لیکن وقت گزاری کے لیے وہ بھی اس شغل میں ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔

"انتظار۔۔۔ انتظار۔" نبیل سگریٹ کا ٹکڑا ریت پر اچھال کر غصیلے لہجے میں بڑبڑایا۔ "نہ جانے لاری آج آئے گی بھی یا نہیں۔"

"تو کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ یمن ہے، یہاں پر ہر وہ چیز ہوتی ہے جو تم سوچ سکتے ہو۔" اس نے چڑچڑے لہجے میں جواب دے کر زیرِ لب کئی گالیاں دہرائیں۔

یہ غنیمت تھا کہ وہ سیتا کی موجودگی کا لحاظ کر رہا تھا، ورنہ میرے یا احمد کے لیے اس کی زبان کو بند رکھنا ناممکن ہی ثابت ہوتا۔

اور جب وہ بیزاری کے عالم میں واپسی کے لیے تقریباً تُل ہی گیا تھا تو اچانک صحرائی سڑک پر دور کہیں انجن کا شور سُنائی دیا اور چند منٹ کے بعد بس کا ہیولا بھی سامنے آ گیا۔

میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم نے اس سڑک پر کئی گھنٹے گزارے تھے مگر اس دوران میں وہاں سے کوئی بھی سواری نہیں گزری تھی۔

نبیل نے جلدی سے دونوں اونٹوں کو ہانک کر سڑک کے وسط میں کھڑا کر دیا اور خود بے تابی سے ہاتھ ہلانے لگا حالانکہ اس وقت بس ایک میل سے بھی زیادہ دور تھی۔

"اونٹوں کو سڑک پر کیوں لے آئے، ایسا نہ ہو کہ انجن کے شور سے بھڑک جائیں۔" سیتا نے نرمی سے کہا۔

"اسے راستہ کھلا مل گیا تو یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر رُکے سیدھا چلا جائے اور تم کل تک یہیں کھڑے سُوکھتے رہو۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "یہ سرکاری لاریاں ہیں، مسافر کم ہوں یا زیادہ انہیں پوری تنخواہیں ملتی رہتی ہیں۔"

"بس نہ روکنے کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہوگی؟"

"سب سے بڑی وجہ اُن کی مرضی ہوتی ہے۔ لاری کو روکنے اور دوبارہ اصل رفتار پر لانے میں اُن کے کئی منٹ خراب ہوتے ہیں جو وہ کبھی کبھار بچا بھی لیتے ہیں۔"

لاری والے نے دُور ہی سے دو تین مرتبہ ہیڈ لیمپس روشن کر کے بجھائے لیکن نبیل نے سڑک پر ذرا بھی جگہ نہیں چھوڑی اور آخرکار بس اونٹوں سے چند فٹ دُور رُک گئی۔

"کمینے۔۔۔ ذلیل۔۔۔ گدھے! یہ سڑک تیرے باپ کی خریدی ہوئی ہے؟" بس رُکتے ہی ڈرائیور کھڑکی سے سر نکال کر نبیل پر برس پڑا۔

جواب میں نبیل بھی دہاڑتا ہوا اُس کی طرف لپکا تھا۔ ہم تینوں کے لیے اس جھگڑے میں اُلجھنا بے سود تھا۔ لہٰذا ہم پھرتی سے بس

میں سوار ہو گئے۔

اندر پہنچنے پر انکشاف ہوا کہ بس پوری طرح بھری ہوئی تھی اور اگر نبیل سڑک بند نہ کرتا تو شاید ہمیں اگلے دن کا ہی انتظار کرنا پڑتا۔

ہم تینوں نشستوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور اپنی نشست پر جما ہوا بُری طرح برس رہا تھا۔ اُدھر باہر نبیل بھی جھاگ اُڑا رہا تھا لیکن سارا فساد گرمیٔ گفتار تک محدود رہا کیونکہ ثقیل زبان استعمال کرنے کے باوجود اُن میں سے کوئی بھی فریق دُوسرے پر ہاتھ اُٹھانے پر آمادہ نہیں تھا۔

مگر آخری کامیابی ڈرائیور کے ہاتھ رہی۔ اُس نے گیئر ڈال کر بس کو چلاتے ہی ایک مخش گالی بک کر پھرتی سے باہر کھڑے ہوئے نبیل کے منہ پر تھوکا اور فاتحانہ انداز میں بس کی رفتار تیز کر دی۔

ڈرائیور فاتحانہ شان سے کافی دیر تک بڑبڑاتا رہا لیکن مسافروں میں سے کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی اُسے زبان بند رکھنے کو کہتا۔ ہر ایک معصوم آسمانی مخلوق کی طرح یوں زبان بند کیے اپنی جگہ پر بیٹھا تھا جیسے ڈرائیور کی زبان اس کے لیے ناقابلِ فہم ہو۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا ورنہ میں بآسانی اس کا مزاج درست کر سکتا تھا۔ فساد کے نتیجے میں پولیس کا سامنا ہمارے حق میں زہر ثابت ہو سکتا تھا۔

چند میل کے بعد ایک نشست خالی ہوئی اور میں نے احمد کو بٹھا دیا۔ اُس کے زخمی شانے کو اس وقت تھوڑے آرام کی شدید ضرورت تھی۔

راستے میں مسافروں کو اتارتی چڑھاتی وہ بس سات بجے صنعا کی حدود میں داخل ہو گئی جہاں ویران صحرا کے مقابلے میں زندگی بھرپور انداز میں رقصاں تھی۔

بس کا آخری اسٹاپ صنعا کے وسط میں تھا۔ ہم تینوں دھڑکتے دلوں کے ساتھ بس سے نیچے آ گئے۔

"تم پہلے کبھی یہاں آئے ہو؟" وہ اہم سوال مجھے بہت تاخیر سے یاد آیا اور احمد نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

"پھر اب کدھر جانا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کسی اچھے ہوٹل میں چلو، میں ٹیلی فون ڈائرکٹری دیکھ لوں گا" اس نے آہستہ سے جواب دیا اور میری نگاہیں اچھے ہوٹل کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

اس علاقے میں چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی کثرت تھی اور اُن ہی کے درمیان الحمرا نامی ہوٹل کا نام روشن حروف میں چمک رہا تھا۔ ہم تینوں بلا تامل اس کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

اندر داخل ہونے پر اندازہ ہوا کہ وہ خاصا قرینے کا ہوٹل تھا...

اور اس میں سیاحوں جیسا لاابالی انداز لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کا سبب بن سکتا تھا لہٰذا سیتا کے ہاتھ میں موجود تھیلا میں نے کاؤنٹر پر جمع کرا کر ٹوکن حاصل کر لیا۔

"اس میں شراب... کی دو بوتلیں بھی تھیں۔" احمد نے سرگوشیانہ لہجے میں مجھے یاد دلایا۔ "اور یمن میں شراب نوشی قانوناً ممنوع ہے۔"

"ہمیں اُمید کرنی چاہیے کہ کاؤنٹر والی لڑکی تھیلے کی تلاشی نہیں لے گی۔"

پھر ہم الحمرا کے وسیع ہال میں جا بیٹھے جو ابھی زیادہ آباد نہیں ہوا تھا لیکن آراستہ ہال میں آرکسٹرا پر دھیمے سُروں میں موسیقی گونج رہی تھی۔

ایک میز کا انتخاب کر کے احمد واپس چلا گیا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر فلسطینی تنظیم کے کسی ذمے دار فرد سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بے چین تھا۔

اُس کی واپسی خاصی دیر میں ہوئی۔

"مایوس نظر آ رہے ہو!" میں نے اس کے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

"دفاتر بند ہو چکے ہیں۔" اُس نے تھکے ہوئے انداز میں سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ایک اقامتی نمبر پر رابطہ قائم کیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اُسے ملاقات پر آمادہ کر سکا۔"

"کوئی حوالہ کام نہیں آیا؟"

"تمھارا نام سُن کر وہ یہاں آنے پر تیار ہوا ورنہ کچھ سُننے کو تیار نہیں تھا۔ شاید یہاں کے حساس سیاسی ماحول کے باعث وہ لوگ زیادہ ہی محتاط رہتے ہیں۔"

"وہ ہمیں کیسے پہچان سکے گا؟"

"ہماری میز کا نمبر پندرہ ہے۔" احمد نے مجھے آگاہ کیا۔ "وہ سیدھا اِدھر ہی آئے گا۔"

سفر کی کوفت کے بعد ہال میں پھیلی ہوئی خوشبو ہمارے لیے اشتہا انگیز ثابت ہو رہی تھی لہٰذا ہم نے کھانے کے کچھ لوازم منگا لیے۔

کھانے کے بعد قہوہ کا دور بھی چلا اور ختم ہو گیا لیکن وہ شخص نہ آیا جس کا ہمیں انتظار تھا۔ اور احمد کو تشویش لاحق ہو گئی۔

اس نے دوبارہ باہر جا کر ٹیلی فون کیا تو اُدھر سے کوئی جواب نہیں مل سکا۔

ناامیدی اور جھلاہٹ میں ساڑھے آٹھ بجے ہم نے بل ادا کر کے اپنی نشستیں چھوڑ دیں۔ بل کی ادائیگی میں ایتھوپیا کی کرنسی بلا تامل قبول کر لی گئی تھی۔

ہال سے نکل کر ہم تینوں استقبالیہ برآمدے میں پہنچے تو سیتا ٹوکن دے کر تھیلا وصول کرنے کاؤنٹر کی طرف چلی گئی اور اسی لمحے ایک ستون کے سہارے کھڑا ہوا ایک نوجوان شخص تیزی سے ہماری طرف بڑھ آیا۔

"تم لوگ ایتھوپیا سے آئے ہو؟" اس نے قریب آ کر سرگوشیانہ

لہجے میں سوال کیا اور احمد نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"یوسف کسی محفوظ مقام پر تمھارا منتظر ہے۔"

"وہاں تک تم ہماری رہنمائی کرو گے؟" احمد نے سوال کیا

"باہر میری کار موجود ہے۔" یہ کہہ کر وہ نکاسی کے راستے کی طرف مڑ گیا۔ اس اثنا میں سیتا بھی آ گئی تھی۔ ہم تینوں اُس کے پیچھے ہو لیے۔

اس کی سُرخ کشادہ کار میں بیٹھ کر میں نے یمن کی سرزمین پر پہلی بار تحفظ محسوس کیا۔ احمد اگلی نشست پر تھا جب کہ میں سیتا کے ہمراہ عقبی نشست پر تھا۔

"تم میں صفدر علی کون ہے؟" نووارد نے کار آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ پیچھے۔" احمد نے کہا۔ "میں ایتھوپیا سے ان کے ساتھ ہوں۔"

"اور یہ خاتون؟"

"سیتا۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے بے اختیار ایک تحیر آمیز آواز نکلی اور غیر ارادی طور پر اس کی گردن پیچھے گھوم گئی۔ اگر وہ اگلے ہی لمحے سامنے متوجہ نہ ہوتا تو اُس کی کار یقیناً کہیں جا ٹکرائی ہوتی۔

"میں یوسف کا ماتحت ہوں۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں کوئی اُسے پھانسنے کے چکر میں نہ ہو۔" اُس نے کہا۔

"تمہیں الحمرا پہنچنے میں خاصی تاخیر ہو گئی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ آہستہ سے ہنسا۔ "میں کافی دیر سے وہاں موجود تھا اور شیشے کے دروازے سے... تمھاری نگرانی کر رہا تھا لیکن معاملہ ابھی طے نہیں ہوا ہے۔ یوسف کسی بھی گفتگو سے پہلے تم لوگوں کی شناخت چاہے گا۔"

"ہم بڑی بے سروسامانی کے عالم میں ایتھوپیا سے نکلے ہیں، یوسف کو اپنے ذرائع سے ہمارے بیان کی تصدیق کرنی ہو گی۔"

"صفدر اور سیتا سے نام کی حد تک تو میں بھی واقف ہوں، مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج تک ہم نے تم لوگوں کی کوئی تصویر تک نہیں دیکھی، تصدیق کے باعث معاملہ کچھ دیر کے لیے التوا میں چلا جائے گا۔"

"محفوظ ٹھکانا مل جائے تو تاخیر کی فکر نہ ہو گی۔" احمد نے کہا۔ "یہ طریقۂ کار میرے لیے نیا نہیں ہے اور نہ میں تحقیق قصور وار گردانتا ہوں۔"

تقریباً بیس منٹ کی مسافت کے بعد ہم لوگ صنعا کے ایک پُرسکون رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے جہاں کشادہ مکان قرینے سے تعمیر کیے گئے تھے۔

وہ اپنی کار ایک کھلے ہوئے پھاٹک میں لیتا چلا گیا اور پورچ میں انجن بند کر کے خود ہی پھاٹک بند کرنے چلا گیا اور ہم تینوں اُتر کر اُس کا انتظار کرنے لگے۔

پورچ کے ساتھ برآمدے پر داخلی دروازہ مقفل تھا جو نووارد نے اپنی جیب سے چابی نکال کر کھولا۔ میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ وہ

عمارت بظاہر ویران معلوم ہو رہی تھی جب کہ یوسف کو وہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔

ہم چاروں اندر داخل ہوئے تو حسین چہرے والا ایک فلسطینی صوفے پر سکون سے بیٹھا سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔ اُس کی آنکھوں کی ساخت کچھ ایسی تھی جیسے وہ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں کھوئی رہنے کی عادی ہوں۔

اس نے ہمارے استقبال میں کسی تپاک کا مظاہرہ نہیں کیا البتہ میرا اور سیتا کا گہرا جائزہ ضرور لیا تھا۔

"تمھارا اسٹیشن کہاں ہے؟" یوسف نے انگلی سے اپنے ماتحت کو کوئی اشارہ کرتے ہوئے احمد سے سوال کیا۔

"اسمارہ۔" احمد اس وقت خاصا جھنجلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یوسف کا ماتحت اُس کا اشارہ پا کر کمرے سے کہیں چلا گیا تھا۔

"میرے پاس تم لوگوں کی صداقت پر شبہ کرنے کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔" یوسف کے لبوں پر پہلی بار معذرت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "لیکن ہم ہمیشہ اپنے حالات کے قیدی ہوتے ہیں۔ میں نے خرطوم سے رابطہ قائم کر لیا ہے کیونکہ اسمارہ کا یونٹ وہیں سے کنٹرول ہوتا ہے۔ جواب آتے ہی میں تمہیں ہر قسم کا تعاون فراہم کروں گا۔"

"خرطوم میں کیتھی مارٹر یونٹ چیف تھی؟" میں نے سوال کیا۔

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "تھی سے کیا مراد ہے تمھاری؟"

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "خرطوم سے وہ مجھے ساتھ لے کر چلی تھی پھر اسمارہ سے احمد کو بھی شامل کر لیا لیکن بحیرہ احمر میں ہمیں اس کی لاش سمندر کے حوالے کرنی پڑی۔"

"لاش...! تو کیا وہ مر گئی؟" اس نے حیرت اور بے یقینی سے سوال کیا۔

"ہاں، اُس نے خودکشی کر لی۔" سیتا نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"مگر کیوں؟ وہ تو بڑی دلیر لڑکی تھی۔" یوسف کی حیرت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

"ذاتی معاملہ تھا۔" احمد اداس لہجے میں بولا۔ "وہ یک طرفہ طور پر کسی کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور جب اُسے کامیابی کی کوئی امید نہ رہی تو اُس نے اپنی کنپٹی پر گولی مار لی۔"

"ناقابلِ یقین!" یوسف بڑبڑایا۔ "میرا تو اندازہ تھا کہ وہ صنفِ مخالف سے کوئی اثر قبول ہی نہیں کر سکتی تھی۔"

"لیکن ایسا ہوا ہے۔"

"یہ کب کا قصہ ہے؟"

"کل رات۔" احمد نے کہا۔ "ہم ایک مشن پر تھے اور دشمن کو زیر کر کے اُس کی لانچ پر قبضہ کر چکے تھے کہ یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا۔"

"تمھارا شانہ بھی زخمی ہے؟"

"ڈریسنگ کا انتظام ہو تو میں اپنے شانے کا حشر بھی دیکھنا چاہوں گا۔" احمد نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا

"میرے ساتھ آؤ۔" یوسف نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ احمد کے اشارے پر ہم سب اس کے پیچھے ہو لیے۔

وہ شاید اس عمارت کا اسٹڈی روم تھا لیکن وہاں فرسٹ ایڈ کا بہت بہتر انتظام تھا۔ مرہم پٹی سے لے کر زود اثر انجکشن تک ہر چیز موجود تھی۔

یوسف نے جیکٹ اتارنے میں احمد کو مدد دی، پھر اسے آرام کرسی پر بٹھا کر احتیاط سے اس کی پٹیاں کھولنے لگا۔

اسی وقت یوسف کا ماتحت بوکھلایا ہوا وہاں آ پہنچا۔ اور یوسف احمد کو چھوڑ کر اس کے ہمراہ ایک گوشے میں چلا گیا۔

چند ثانیوں تک وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ یوسف کے ماتحت کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اور یوسف کے بشرے پر بھی تردد کے آثار واضح تر ہوتے جا رہے تھے۔

"ہمیں یہ جگہ فوراً چھوڑنی ہوگی۔" یوسف نے واپس لوٹ کر اعلان کیا اور ہم سب ایک مرتبہ پھر اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئے۔ "کچھ لوگوں نے ہمارے دفتر پر چھاپہ مارا ہے اور ان کی ٹولی کسی بھی لمحے یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔"

"مگر کیوں؟" احمد نے غیر ارادی طور پر سوال کیا۔

"وقت برباد مت کرو۔" یوسف کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "یہ باتیں یہاں سے دور نکلنے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔"

پھر وہ احمد کو جیکٹ پہننے میں مدد دینے لگا۔

اسی لمحے کسی قریبی کمرے سے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور یوسف کا ماتحت باہر دوڑ گیا۔

"خرطوم سے نجیب کا پیغام آ گیا ہے۔" واپس آ کر اس نے یوسف کو اطلاع دی۔ "مادام کیتھی، صفدر علی کے ساتھ کسی طویل مہم پر ہیں۔"

"یہاں سے نکلو۔" یوسف یہ کہتا ہوا راہداری کی طرف لپکا پھر اچانک ہی اس کے قدم زمین پر جم گئے۔

اس مکان کے باہر کئی بھاری گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ یہ شاید وہ لوگ ہی تھے جن سے یوسف خوفزدہ تھا۔



اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

چھٹے حصے میں

ملاحظہ فرمائیں جو کہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے۔


جاسوسی ڈائجسٹ کا مشہور سلسلہ
مفرور
چھٹا حصہ





اقلیم علیم

فرار کا سامنے والا راستہ بظاہر مسدود ہوچکا تھا اور یوسف شدید ذہنی الجھن کے عالم میں راہداری میں کھڑا ہوا تھا پھر اچانک ہی وہ واپس مڑ گیا۔

"ادھر آؤ۔ عقبی راستے کی طرف۔" ہم چاروں اس کے پیچھے ہو لیے۔

"اور اگر انھوں نے مکان کے گرد گھیرا ڈال دیا ہو؟" یوسف کے پیچھے بڑھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔ اور اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" یوسف کے لہجے میں اعتماد مفقود تھا۔ اور وہ سیتا کو گھورے جارہا تھا۔

"اس کی طرف نہ دیکھو۔" میں نے کہا "سوال میں نے کیا تھا۔ اگر وہ لوگ مکان کے عقب میں بھی موجود ہوئے تو کیا ہوگا؟"

"پھر تصادم کے سوا اور کیا صورت باقی رہ جائے گی؟" اس کے لہجے میں یکبارگی بے چارگی امڈ آئی۔

"اگر تصادم ہی ہونا ہے تو کیوں نہ ہم باہر بھاگنے کے بجائے اندر ہی ٹھیریں؟ اس طرح کم از کم ہمیں اپنے مورچوں کی مضبوطی کا اندازہ رہے گا اور ہم بے خبری میں مار دیے جانے سے بچ سکیں گے۔" احمد نے اپنے انداز میں میری تائید کی۔

"نکل کر لڑنے میں فائدہ یہ ہوگا کہ جس کو جدھر موقع ملا وہ ادھر فرار ہو سکے گا۔ اندر ہم محصور ہو کر رہ جائیں۔" یوسف کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

"جو کچھ کرنا ہے جلدی فیصلہ کرو، ہمارا باتوں میں وقت برباد مت کرو، ہم لوگ اس وقت محض تماشائی ہیں۔" میں نے اپنے وجود میں ہیجانی کیفیت محسوس کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"میرے پیچھے آؤ۔" وہ ہم سے بولا اور پھر اپنے ماتحت سے

مخاطب ہوگیا۔ "تم یہیں رکو گے اور خود کو سارے معاملے سے لاتعلق رکھ کر محض ایک تنخواہ دار ثابت کرو گے جسے یہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔"

"میں سمجھ گیا۔" اس نے اپنے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی۔

اور میں اس کے پیچھے عقبی راستے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس نے احمد کی نیت پر کسی شک و شبے کا اظہار کیے بغیر نہایت اطمینان سے قربانی کا بکرا بننے پر اپنی آمادگی ظاہر کر ڈالی تھی۔

وہ عمارت خاصی وسیع تھی۔ کم از کم باہر سے مجھے اس کی صحیح وسعت کا اندازہ نہ ہوسکا تھا۔ ہم دو راہداریوں اور تین کمروں سے گزرنے کے بعد عقبی برآمدے میں جا نکلے جہاں گہری تاریکی کا راج تھا۔

اس عمارت کے تمام کمرے بھی مکلّف اور ضروریات زندگی سے آراستہ نظر آئے لیکن وہاں ہمیں اپنی نفری کے سوا کوئی متنفس نظر نہیں آیا تھا۔

برآمدے کے بعد ویران لان تھا جس کے اختتام پر احاطے کی عقبی دیوار پھیلتی چلی گئی تھی۔

یوسف اسی عقبی دیوار میں نصب آہنی پھاٹک تک پہنچا جو مقفل تھا اور جتنی دیر میں اس نے قفل کا جائزہ لیا سیتا ماہرانہ انداز میں پھاٹک عبور کرکے باہر پہنچ گئی۔

"جلدی باہر آؤ میدان صاف ہے۔" باہر سے سیتا کی پرجوش مگر سرگوشیانہ آواز سن کر وہ دونوں ہی چونک پڑے کیونکہ انہیں احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ سیتا ان کی بے خبری میں پھاٹک پر چڑھ کر باہر کود چکی تھی۔

سیتا کی آواز نے تینوں کے لیے تازیانے کا کام کیا اور ہم قفل پر کوئی توجہ دیے بغیر پھرتی سے پھاٹک پر چڑھ کر باہر کود گئے۔

پختہ فٹ پاتھ پر قدم ٹکتے ہی احمد کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی دردناک آواز ابھری جو یقینی طور پر غیر ارادی تھی۔

"کیا ہوا؟" سیتا نے بڑھ کر پھرتی سے اسے اپنے ہاتھوں پر سنبھال لیا اور میرے وجود کے کسی گمنام گوشے میں تلخی کی ایک موہوم سی لہر دوڑ گئی۔

میں نے احمد کا بایاں شانہ مضبوطی سے تھام کر قدرے سختی سے اسے اس کے قدموں پر کھڑا کر دیا تھا۔

"کیا ہوگیا تھا؟" میں نے احمد سے جھنجھلاتے ہوئے بلکہ قدرے طنزیہ لہجے میں سوال کیا جو اسے ناگوار گزرا مگر اس سے پہلے سیتا بول پڑی۔

"اس کا داہنا شانہ زخمی ہے' اس کے لیے پھاٹک پر چڑھ کر باہر کودنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا میرے یا تمہارے لیے۔"

"تو تم اندر ہی رکے رہتے۔" میں نے اپنی جذباتی حماقت محسوس کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"تمہیں کیا ہو رہا ہے صفدر!" سیتا کی آواز تحیر آمیز تھی۔

"اندر ترک کردہ چیز بے دان کا شکار نہ ہوجانا!"

اپنی غائب دماغی پر میں جھلا کر رہ گیا مگر فوراً ہی بات بنا ڈالی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ باہر آنے کے بعد ہم جالیوں سے ہاتھ ڈال کر تالے پر غائر بھی کرسکتے تھے اور شاید یوسف کی جیب سے چابی بھی مل جاتی۔"

"وقت برباد نہ کرو۔" احمد بحث کو طول پکڑتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "معمولی سی ٹھیس لگی تھی، اب میں پرسکون ہوں۔"

یوسف کے ایما پر تیزی سے ویران سڑک عبور کرکے ہم لوگ دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر ہولیے۔

دوڑنے کی حد تک تیز قدموں سے چلنے میں ہمیں کوئی جھجک نہ ہوئی کیونکہ اس وقت وہ علاقہ نہ صرف ویران پڑا تھا بلکہ سڑک پر روشنی نہ ہونے کے باعث قرب و جوار سے ہمارا دیکھ لیا جانا بھی ناممکنات میں سے تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد داہنی طرف ایک گلی نظر آئی اور یوسف بے دریغ اسی میں گھستا چلا گیا۔

گلیوں وغیرہ میں وہ بھاگ دوڑ بمشکل چھ سات منٹ جاری رہی اور آخر کار ہمارا قافلہ ایک متعفن گلی میں ایک بوسیدہ مکان کے دروازے پر جارکا۔

میری رسٹ واچ کے مطابق اس وقت رات کے سوا گیارہ کا عمل تھا اور گرد و پیش پر چھائی ہوئی ویرانی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مقامی باشندوں کے طرز معاشرت کے لیے وہ وقت خاصا نامناسب تھا۔

یوسف کی دستک کے چند ثانیوں بعد مکان میں سے ایک عمر رسیدہ نسوانی آواز ابھری جو اتنی رات گئے آنے والے کا نام جاننا چاہتی تھی۔

"رفاعی کا پیغام لایا ہوں۔" یوسف نے دانستہ دبی آواز میں جواب دیا۔ دروازہ بعجلت کھول دیا گیا۔

بڑھیا نے اندر گھسنے والوں کو شدید حیرت کے ساتھ دیکھا۔ صحن میں جلنے والے بلب میں اس کا جھریوں بھرا چہرہ اس وقت متجسس نظر آرہا تھا لیکن اس نے دوبارہ دروازہ بند کرنے تک اپنی زبان بند رکھی۔

"اِدھر چلے آؤ۔" بڑھیا نے کنڈی چڑھانے کے بعد صحن کے اختتام پر پہلو بہ پہلو بنے ہوئے دو کمروں میں سے داہنی سمت والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس کمرے میں دھندلائی ہوئی روشنی والا ایک بلب روشن تھا جو صحن میں اندھیرا ہو جانے کے بعد خاصا غنیمت نظر آرہا تھا۔

اس کمرے بلکہ پورے مکان ہی سے مفلوک الحالی نمایاں تھی۔ یوسف بلا تامل فرش پر بچھی ہوئی گرد آلود دری پر بیٹھ گیا اور ہم لوگ بھی جوتے اتارے بغیر دیوار کے سہارے وہیں ٹک گئے۔

بڑھیا کے سرخ و سفید چہرے پر چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں استفسار طلب انداز میں یوسف کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"ہمیں چند گھنٹوں کے لیے پناہ درکار ہے۔" یوسف نے نرم اور دھیمے لہجے میں کہا۔ "صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے واپس لوٹ جائیں گے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" بڑھیا اس کے قریب ہی ٹک گئی۔

یوسف کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ غالباً بڑھیا کا وہ سوال طے شدہ طریقوں سے متجاوز تھا لیکن یوسف بڑھیا کو اس کی غلطی پر ٹوک کر آزردہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

"صابر اصلاحی۔" یوسف نے بڑھیا کے تجسس کے پیش نظر قدرے تفصیلی جواب دے ڈالا۔ "اس وقت غلط فہمی کی وجہ سے پولیس ہمارے تعاقب میں ہے۔"

"اوہ!" بڑھیا کے بشرے پر اطمینان کی علامات ابھر آئیں۔ "بھلا اپنا گھر ہے' بے فکری سے رہو لیکن اپنی آوازیں اونچی نہ ہونے دینا۔ برابر والے کمرے میں میری بیٹی بدقت تمام تھوڑی دیر قبل سوئی ہے۔"

"ہماری ذات سے لبنیٰ کو تکلیف نہ ہوگی۔" یوسف جوتے اتارتے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو اسے؟" بڑھیا نے یوسف کی زبان سے اپنی بیٹی کا نام سن کر مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہم لوگ ایک دوسرے سے ملیں یا نہ ملیں لیکن سب کے بارے میں واقفیت ضرور رکھتے ہیں۔" یوسف نے کہا۔ "بڑی مصروف ہے اس کی زندگی بھی۔"

"صبح اسکول میں پڑھانے جاتی ہے پھر تین سے رات کے گیارہ بجے تک ایک اسٹور میں کام کرتی ہے۔" بڑھیا کے لہجے میں درد سمٹ آیا۔ "اسے دوہری ملازمت سے لاکھ منع کرتی ہوں لیکن باز نہیں آتی۔ اس کی صحت تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔"

"کتنے لوگوں کی کفالت کرتی ہے وہ؟" سیتا نے غیر متوقع طور پر دخل اندازی کی۔

"بھرے گھر میں بس ہم دو ہی تو رہ گئے ہیں۔" بڑھیا حسرت زدہ لہجے میں بولی۔ "باقی سب تو صبرا و شتیلا میں یہودی حملوں کا ایندھن بن گئے۔"

"تمہارے اور اپنے لیے وہ دوہری ملازمت کرتی ہے؟" میں نے سیتا کا بازو دبایا تھا مگر اس کے باوجود وہ بات آگے بڑھانے سے باز نہ آئی۔

"محلے دار مجھے لکھپتی کنجوس سمجھتے ہیں۔" بڑھیا دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "لبنیٰ سعادت مند بچی ہے جو محلے میں بھی نیک نام ہے۔ اس کے ذاتی اخراجات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی ساری کمائی میرے حوالے کر دیتی ہے اور میں کنجوسی سے اخراجات نکالنے کے بعد سارا پیسہ جوڑ رہی ہوں۔"

"درست ہی سمجھتے ہیں۔" سیتا نے اس کمرے کی بے سروسامانی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں کوئی بھی چیز تو ایسی نہیں جو دوہری آمدنی کی چغلی کھا رہی ہو۔۔۔"

"اس موضوع پر ماں سے نہ الجھو۔" یوسف نے سیتا کی بات کاٹتے ہوئے دخل دیا۔ "اگر میرے مذہب میں غیر اللہ کی پرستش حرام نہ ہوتی تو میں لبنیٰ کو ضرور قابل پرستش قرار دیتا۔"

"اس کی وہ خوبی تو میں بھی جاننا چاہوں گی۔" سیتا بڑھیا کے بجائے یوسف سے ہی مخاطب ہوگئی۔

"وہ نازک اندام گھریلو لڑکی ہے لیکن فلسطین کی آزادی کے لیے اس کا عزم ناقابل تسخیر ہے۔" یوسف کہنے لگا۔ "وہ جو کچھ کماتی ہے اس میں سے ایک قلیل سی رقم اپنے گھریلو اخراجات کے لیے بچانے کے بعد سب کچھ پی ایل او کے جہاد فنڈ میں دے دیتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ محض اسی طرح وہ اپنے باپ' پانچ بھائیوں اور ایک بہن کے خون کا انتقام لے سکے گی۔ ہمارے لیے اس کا جذبہ لائق صد احترام ہے۔"

سیتا اور یوسف کے درمیان چند فقروں کا وہ تبادلہ بڑھیا کے لیے اس قدر جذبات انگیز ثابت ہوا کہ رقت کے گریز کے سبب اس کے جسم پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ منہ سے ایک بھی لفظ کہے بغیر ہمارے کمرے سے نکل چلی گئی۔

"تمہیں اس سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے دھیمی آواز میں غراتے ہوئے سیتا سے سوال کیا۔

وہ سہم گئی۔ "دوہری ملازمت کے ساتھ یہ مفلوک الحالی مجھے عجوبہ معلوم ہو رہی تھی، اب خاموش رہوں گی۔"

"اپنا کارنامہ تو دکھا ہی دیا، اب بولتی بھی رہو تو کوئی حرج نہیں۔" میں نے بیزاری کے ساتھ سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تجسس کو دور کرنا کوئی بری بات نہیں۔" یوسف نے مجھ سے کہا پھر سیتا سے مخاطب ہوگیا۔ "کوئی اور بات رہ گئی ہو تو پوچھ لو مجھ سے۔ لبنیٰ اور اس کی ماں ہم سب کے لیے واجب الاحترام ہیں خاص بات یہ ہے کہ ماں بیٹی میں سے کوئی بھی اپنے جذبۂ حریت کی تشہیر پسند نہیں کرتی۔"

"جذبۂ حریت؟" سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا اور میں اس سے لاتعلق سگریٹ پیتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ یوسف نے سیتا کو گفتگو کی کھلی چھوٹ دے کر اپنی شامت کو دعوت دی تھی اور اب میں اس گفتگو کے منطقی انجام کو دیکھنے کا متمنی تھا جو یوسف کے لیے شاید خوشگوار نہ ہوتا۔

"ہاں — اسے تم جذبۂ حریت ہی کہو گی۔" وہ جلدی سے بولا۔

"حریت اور انتقام میں فرق ہے۔" سیتا کا لہجہ سپاٹ اور دو ٹوک تھا۔ "لبنیٰ کی روح اپنے گھر والوں کے انتقام میں سلگ رہی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" یوسف تحیر آمیز لہجے میں بولا اور اضطراری انداز میں سگریٹ اس نے بھی اپنے لیے سلگا لی۔

"وہی جو تم نے سنا ہے۔" سیتا قطعی پرسکون رہی۔

یوسف نے شاید سگریٹ سُلگانے کے بہانے سوچنے کا وقت حاصل کرنا چاہا تھا جو اُسے مِل گیا تھا لہٰذا وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "حریت بجائے خود انتقام ہی کے پردے سے جنم لیتی ہے۔ پہلے حکمرانوں کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے پھر عمل اور ردِعمل کے طور پر حاکم کی طرف سے ظلم اور محکوم کی طرف سے انتقام کا اظہار ہوتا ہے اور یہی عمل بالآخر حریت کے راستے پر لے جاتا ہے۔"

"آزادی کی راہ پر لے جانے والے انتقام کا جذبہ اجتماعی ہوتا ہے۔" سیتا کی زبان سے نپے تُلے الفاظ میں وہ فقرہ سُن کر میں ششدر رہ گیا۔ "جب انتقام کا جذبہ بکھرے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں سرایت کر جاتے تو وہ آزادی کی تحریک کا رُخ اختیار کر لیتا ہے لیکن دو چار لوگوں کا انتقامی جذبہ حریت کی تعریف میں نہیں آتا۔"

"یعنی تم لبنیٰ اور اُس کی ماں کو حریت پسندوں کی فہرست سے خارج کر رہی ہو؟" اس نے شپٹائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"دانستہ نہیں بلکہ محض اصُولی طور پر۔" سیتا کے وہ الفاظ میرے لیے تحیّر آمیز تھے۔ "لبنیٰ اور اس کی ماں کو محض ایک مجبوری نے تمہارے ساتھ لا کھڑا کیا ہے۔ اگر لبنان کے حسن الباشہ کیمپ میں اُن کے اہالیانِ خانہ بربادی اور موت کا شکار نہ ہوئے ہوتے تو آج اُن کے جذبات قطعی مختلف ہوتے۔ وہ ذاتی سطح پر اسرائیل سے اپنے پیاروں کا انتقام نہیں لے سکتیں لیکن اُن کے نزدیک پی ایل او رُوئے زمین پر ایسی واحد تنظیم ہے جو اسرائیل کے خلاف صف آرا ہے لہٰذا وہ لڑکی تمہیں پیسہ فراہم کر کے اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کی کوشش کر رہی ہے۔ لبنیٰ کی دوہری ملازمت اور کٹھن زندگی کا جذبۂ آزادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" یوسف نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیکر اُلجھن آمیز لہجے میں سیتا سے سوال کیا۔

"صاف اور سیدھی سی بات۔" سیتا نے کہا۔ "اگر آج لبنیٰ کو علم ہو جائے کہ قطب شمالی پر رہنے والے چار ڈاکو اسرائیل کو بدترین جانی اور مالی نقصان پہنچانے کی استطاعت رکھتے ہیں تو شاید وہ پی ایل او کو دینے والے سارے فنڈز اُن کو منتقل کر دے گی اس میں تمہیں بھی کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔"

"تم مفروضات پر بات کر رہی ہو۔" یک بیک یوسف کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اور مفروضات کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ اب تک میں تمہاری باتوں سے جو کچھ سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ تم پی ایل او کا موازنہ قطب شمالی کے ڈاکوؤں سے کرنا۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔" سیتا نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرا نشانہ پی ایل او ہرگز نہیں تھا۔ میری ساری گفتگو کا مقصد لبنیٰ اور اس کی ماں کی نیت بلکہ مقاصد کا حقیقی تجزیہ تھا۔"

اُسی وقت لبنیٰ کی ماں کمرے میں واپس آ گئی۔ اُس کی ورم آلودہ آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پچھلے چند منٹ اس نے روتے ہوئے گزارے تھے۔

"تم لوگ کھانا کھاؤ گے؟" اس نے دروازے پر رُک کر کسی کو خاص طور پر مخاطب کیے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"نہیں۔" یوسف نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تم آرام کرو، ہم صبح پانچ بجے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔"

وہ خاموشی سے واپس مڑی اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

سیتا نے چاروں کے لیے دری خاصی محنت سے صاف کی پھر ہم بے فکری کے ساتھ اسی پر دراز ہو گئے۔

"اس بوڑھی عورت سے تمہارے مراسم کی نوعیت کیا ہے؟" چند منٹ تک بے آرامی سے کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد میں نے اپنے برابر میں لیٹے ہوئے یوسف سے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"رفاعی اس بڑھیا سے رابطے کا کوڈ ہے۔" وہ بولا۔ "بدترین حالات میں بھی یہ ہمیں بہترین تعاون فراہم کرتی رہی ہے۔"

"اس کی بیٹی کو دیکھنے کا شوق ہو رہا ہے۔" میں نے کنکھیوں سے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مدقوق سی لڑکی ہے۔" یوسف کا لہجہ سرسری تھا۔ "جوان ہے مگر خدوخال اور صحت کے اعتبار سے ڈھلی ہوئی عمر کی عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"مگر دھن کی پکی ہے۔"

"وہ تو ہے۔" یوسف مسکرا کر بولا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" قدرے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

"یہ ٹھکانا میرے مکان سے قریب ترین تھا یہاں فون وغیرہ کی کوئی سہولت میسّر نہیں ہے۔ صبح دوسرے ٹھکانے پر منتقلی کے بعد ہی اصل صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے گا۔ نہ جانے ان لوگوں نے میرے مکان پر کیوں چھاپہ مارا تھا۔ صحیح خبر میرا ماتحت ہی دے سکے گا۔"

"تمہارے ردِّعمل سے تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے تم اُن سے واقف ہو۔" میں نے یرقان زدہ روشنی میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس علاقے میں پی ایل او پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"شمالی یمن اعتدال پسند سیاسی خطوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں ہمیں انتہا پسند بائیں بازو میں شمار کیا جاتا ہے جو رُوس کے زیرِ اثر ہے۔"

"تو کیا یہ درست ہے؟"

"قطعی نہیں۔" اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "بات صرف اتنی ہے کہ رُوس ہماری تنظیم کی اصولی حمایت کرتا ہے لیکن اپنی پالیسیوں کے معاملے میں ہم برادر عرب مُلکوں کے مشورے پر انحصار کرتے ہیں۔"

"تو پھر رُوسی بلاک سے وابستگی کا تصوّر کیا ہے؟"

"یمن خصوصی حالات کا علاقہ ہے۔" یوسف کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ "مقامی معاملات میں ذرا بھی توازن خراب ہو تو افراد اور جماعتوں پر الحاد پرستی اور ملکی مفادات سے انحراف کا الزام بآسانی عاید کر دیا جاتا ہے۔"

"تمہاری بات بآسانی قابلِ قبول نظر آتی۔"

"مگر ایسا ہی ہے۔" وہ بولا۔ "آج کل ہم محض اسی لیے عتاب میں ہیں کہ پچھلے ہفتے شمال اور جنوب کے درمیان چند تلخ بیانات کا تبادلہ ہوا ہے۔"

یوسف سے مزید کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر میری آنکھ لگ گئی۔

صبح سویرے مجھے اُٹھانے والی سیتا تھی اور اپنے ساتھیوں میں شاید مجھے سب سے آخر میں جگایا گیا تھا۔

سُرخ و سفید بُڑھیا قہوے، پنیر اور ڈبل روٹی سمیت ہمارے کمرے میں موجود مہمانداری میں مصروف تھی۔

"تمہاری بیٹی کہاں ہے؟" صحن میں واقع غسل خانے میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے بڑھیا سے سوال کیا۔

"سو رہی ہے۔" اس نے میرے لیے پیالی میں گرم گرم قہوہ اُنڈیلتے ہوئے کہا۔ "میں اُسے سوا چھ سے پہلے نہیں اُٹھاتی۔"

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی جو صبح کے ساڑھے پانچ بجا رہی تھی اور پروگرام کے مطابق ہمیں لبنیٰ کے بیدار ہونے سے پہلے وہاں سے رخصت ہو جانا تھا تا کہ باہر اجالا پھیلنے سے پہلے ہم لوگ کسی نئے ٹھکانے پر پہنچ سکیں۔

ناشتے کے بعد ہم چاروں وہاں سے نکل آئے۔

اُس وقت سارا ماحول صبح کے دھندلکے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بعض بعض مکانوں میں روشنی کے ساتھ ہی لوگوں کی بول چال کی آوازیں بھی آ رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ صنعا کے رہنے والوں میں سحر خیزی کی اچھی عادت بھی موجود تھی۔

پُرپیچ گلیوں سے گزرنے کے بعد تھوڑی ہی دیر میں ہم چاروں ایک کشادہ سڑک پر جا نِکلے جو قمقموں کی روشنی میں تاحدِّ نظر ویران پڑی ہوئی تھی۔

یوسف کے لیے یہ شہر اجنبی نہیں تھا۔ اس سڑک پر پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی وہ عجلت میں ایک فون بوتھ سے کسی کو فون کر رہا تھا۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمیں بوتھ کے قریب ہی ایک درخت کے سائے میں لے گیا جہاں دُور سے ہمیں بآسانی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں سیاہ رنگ کی ایک بڑی سی کار بوتھ کے قریب فٹ پاتھ کے کنارے آ رُکی اور یوسف ہم تینوں کو لے کر اُسی طرف بڑھ گیا۔

یوسف ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اکہرے بدن اور گندمی رنگت والے مقامی کے ساتھ بیٹھ گیا اور میں سیتا اور احمد سمیت عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

"مجھے فکر تھی تمہاری۔" مقامی نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بس ستارے ہی اچھے تھے جو بچ نکلا۔" یوسف نے خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"عامری کو وہ ساتھ لے گئے، مکان میں بھی خاصی توڑ پھوڑ مچائی گئی۔" اس شخص نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "عامری نے شاید تمہارے نکلنے کے بعد اور اُن کے گھسنے سے پہلے مجھے فون کر دیا تھا۔ میں نصف گھنٹے بعد وہاں پہنچا تو میدان صاف ہو چکا تھا۔"

"تھے کون لوگ؟"

"صحیح علم تو نہیں ہو سکا لیکن تقریباً اُسی وقت تمہارے مکان کے سامنے والی سڑک پر بھاری اسلحہ سے لدے ایک فوجی ٹرک گزرتے دیکھا تھا۔"

"ہوں۔" یوسف ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "تو وہی ہوا جس کا دو روز سے مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔"

"کیسا خطرہ؟"

"کچھ لوگ ہمیں حکومت کے خلاف تازہ ترین ناکام بغاوت میں ملوث کرنے کے درپے ہیں اور کل رات کا چھاپہ بھی شاید اسی مہم کی ایک کڑی تھی۔"

"بغاوت کی ناکامی کے بعد کیپٹن خلیل کی خودکشی نے صورتحال کو اُلجھا دیا ہے۔" وہ تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ "حکام اب اندھیرے میں ہاتھ پیر چلا رہے ہیں مگر اس معاملے میں تمہاری ذات کیوں ملوث کی جا رہی ہے؟"

"چند روز پہلے ایک بڑی دعوت میں میں اُسی کی میز پر بیٹھا تھا۔" یوسف پُرخیال لہجے میں بولا۔ "شاید ہماری وہ یکجائی کسی نے نوٹ کر لی۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ قاہرہ کی ملٹری اکیڈمی سے میری اور اس کی دوستی ہے۔ ہمارے درمیان رسمی باتیں ہی ہوتی رہیں۔ اگر مجھے وہم بھی ہو جاتا کہ اس کے ذہن میں کوئی سازش پک رہی ہے اور تین روز بعد وہ پکڑا جانے والا ہے تو شاید میں اس کے سائے سے بھی دُور رہنے کی کوشش کرتا۔"

"تمہارے یہ مہمان۔۔۔؟" مقامی نے دانستہ اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"حادثاتی طور پر یمن میں آ نکلے ہیں۔" پہلی بار ہم لوگوں کے بارے میں بات کرنے کی نوبت آئی۔ "احمد کو ایتھوپیا واپس جانا ہے باقی دونوں پاکستان جائیں گے۔"

"ایتھوپیا کے لیے تو میں آج رات ہی بندوبست کرا دوں گا۔" اس نے برجستہ کہا۔ "بشرطیکہ تمہارے مہمان کو خلاصی بننے میں اعتراض نہ ہو۔"

"اعتراض؟ مجھے تو دلی مسرّت ہو گی، نکلنے کی راہ چاہیے۔" احمد اضطراری طور پر یوسف سے پہلے ہی بول پڑا۔

"بس یہ خیال رہے کہ اس کا داہنا شانہ بُری طرح زخمی ہے۔"

یوسف نے اپنے دوست کو مطلع کیا۔

"اسے کچھ بھی نہیں کرنا ہوگا۔" اس نے وضاحت کی۔ "میری لانچ جبوتی کے لیے اناج لے کر جا رہی ہے راستے میں اسے ایتھوپیا کے کسی بھی ساحلی گھاٹ پر اتار دیا جائے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" احمد بولا۔ "میرے لیے جبوتی سے ایتھوپیا میں داخل ہونا زیادہ آسان ہوگا۔ ویران ساحل سے راستہ تلاش کرنا دشوار ہوگا۔"

تھوڑی دیر کی مسافت کے بعد وہ سیاہ کار ایک وسیع حویلی نما مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی جہاں پھاٹک پر ایک باوردی پہریدار موجود تھا۔

وہ عمارت قدیم اور جدید طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج تھی۔ کار سے اُتر کر اندر داخل ہونے پر اندازہ ہوا کہ تعمیر میں عمارت کے مردانہ اور زنانہ رہائشی حصوں کو ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدہ رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اور یہ بات ہم لوگوں کے لیے خاصی سہولت کا باعث تھی۔ مردانہ حصے میں شاید مہمانداری کے ہی خیال سے متعدد آراستہ کمرے موجود تھے۔ دیوان خانے میں مجہول وضع قطع والے دو ملازم اتنے سویرے بھی مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔

"جسے جو کمرہ پسند آئے، اپنا لے۔" میزبان نے کمرے دکھاتے ہوئے کہا۔ پھر معذرت کر کے تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے چلا گیا۔

لبنیٰ کی ماں کے پاس ہماری رات خاصے سکون سے گزری تھی۔ مگر ہم تینوں کی حالت اتنی ابتر تھی کہ گرم پانی اور نرم گدے دار مسہریاں دیکھ کر ہر ایک پر ہی کاہلی سوار ہونے لگی تھی۔

میں گرم پانی سے دل کھول کر نہایا۔ کئی روز کے بعد پہلی بار مجھے تازگی اور فرحت کا صحیح احساس ہوا تھا ورنہ سمندر کے کھاری پانی کے جلد پر رہ جانے والے نمکیات نے مستقل پریشان کیا ہوا تھا۔

سیتا کے کمرے میں پہنچا تو وہ بھی تازہ دم ہو کر بستر پر دراز تھی۔ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کے باعث اگر وہاں خلوت میسّر نہیں تھی تو اس قدر جلوت بھی نہیں تھی کہ چند ثانیوں کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے اپنی چاہت کا بھرپور اعادہ کرنے میں جھجک ہوتی۔ سیتا نے پوری قوت سے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا تھا۔ میں نے آہستگی سے اُسے بستر پر بٹھا دیا۔

"ہمیں تنہائی کب میسّر ہوگی؟" وہ مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

"احمد کی روانگی کے بعد ہمارے بارے میں سوچنے کی نوبت آئے گی۔" میں نے اس کے پہلو میں بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "چھت کا سایہ مل جانے کے بعد تو اب ہم چند روز بے فکری سے یہاں بھی گزار سکتے ہیں۔"

"یہاں تحفظ ضرور ہے مگر اپنے گھر کی سی بے فکری نہ میسّر آسکے گی۔" وہ حسرت زدہ لہجے میں بولی۔ "وہ بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

"اپنا گھر۔" میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ "ابھی تک تو ایک سنہرا خواب ہی ہے شاید اس کی تعبیر بھی مل ہی جائے۔"

"یہ بُرا ہوا کہ اس وقت یوسف مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کا دوست بہت بارسوخ ہے، وہ یوسف کے بغیر بھی کوئی راہ نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا اگر ہم ایل او کے کسی چکر میں اُلجھ گئے تو ایک مرتبہ پھر گردش کا آغاز ہو جائے گا۔"

"میں بھی اب بھاگ دوڑ سے اُکتا گئی ہوں، لیکن تم اپنا وعدہ نہ بھول جانا۔" اس نے اپنا سر میرے شانے سے ٹکا کر کہا۔

"کون سا وعدہ؟"

"ابھی سے بھول گئے؟" اس نے بڑی بڑی آنکھیں شوخ انداز میں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"جب سے تم ملی ہو سارے معاملات وعدوں ہی پر ٹلتے آ رہے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم کس وعدے کی بات کر رہی ہو؟"

"تم احمق ہو۔" وہ مجھے دھکیل کر جھینپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں اپنی ماں سے ملنے کی کوشش کا ذکر کر رہی تھی۔"

"وہ یاد ہے مجھے۔"

اسی وقت دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کھنکھار کر یوسف اندر آ گیا۔

"تم لوگ تو نہا دھو کر پہچانے نہیں جا رہے۔" اس نے آتے ہی کہا۔

"اگر تم نے بھی پہچاننے سے انکار کیا تو ہمارے لیے کیپٹن خلیل کے پاس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اُسے بھول جاؤ۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "دوبارہ اس کا نام زبان پر بھی نہ آئے۔ غیر ملکیوں کے لیے یہاں تعاون و اقعات شجرِ ممنوعہ ہیں۔"

"تمہارے دوست کا نام کیا ہے؟"

"باقر۔۔ عبدالباقر۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ سیتا بھی ہمارے پیچھے ہو لی تھی۔ "بہت نفیس اور فراخ دل آدمی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اس سے میری محض چند برس پرانی دوستی ہے مگر مجھے اس پر اندھا اعتماد ہے۔ تنظیم سے باہر کے آدمیوں کو رازوں میں شریک کرنا ہمارے اصولوں کے خلاف ہے مگر باقر کے معاملے میں میں نے اوپر والوں سے استثناء حاصل کیا ہوا ہے، وہ ہمارا گہرا ہمدرد اور معاون ہے لیکن باضابطہ طور پر ہم سے منسلک نہیں ہے۔"

دیوان خانے میں ایرانی ساخت کے فرشی قالین پر دسترخوان سجا ہوا تھا جس پر ناشتے کے لیے اشتہا انگیز لوازمات موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی عبدالباقر پُرتپاک انداز میں آگے بڑھا اور مجھ سے یوں بغل گیر ہو گیا جیسے برسوں کے بعد میری اور اس کی پہلی ملاقات ہو۔

"تمہارا نام سُنا تھا میں نے۔" وہ مجھے زور زور سے بھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مگر یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی وقت تم میرے مہمان بھی ہو سکتے ہو۔"

اس وقت وہاں کوئی خادم موجود نہیں تھا۔ انہیں شاید آزادانہ گفتگو میں حارج سمجھ کر باہر بھیج دیا گیا تھا۔ یوسف نے اسے میرے اور سیتا کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لہٰذا عبدالباقر ہم دونوں کے لیے بچھا جا رہا تھا۔ ہر دو چار فقروں کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح اپنی مسرت کا اظہار کیے جا رہا تھا اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا ہے۔

"تم دونوں میاں بیوی کی طرح ہی اس گھر میں رہو گے۔" ناشتے کے اختتام پر اس نے کہا۔ "یہاں تمہیں پوری آزادی ہوگی۔ مگر تمہاری بیوی کو میں اپنی بیگمات سے متعارف نہیں کراؤں گا۔ وہ اس طرف نہیں آتیں۔ اور اگر ایک بار تمہاری بیوی اُدھر چلی گئی تو پوری حویلی میں اسی کا ذکرِ گردش کرنے لگے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔" میں نے قہوے کی پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔

"ناشتے کے بعد ہم تینوں باہر جا رہے ہیں۔" وہ احمد کے ساتھ یوسف کو بھی لے جا رہا تھا۔ "کسی مہمان کی آمد تک پورا حصّہ تمہارے تصرّف میں رہے گا۔ دونوں خادم باہر ڈیوڑھی میں موجود رہیں گے۔ کوئی بھی ضرورت ہو تو بلا لینا، ویسے دوسرے بستر والی خوابگاہ میں ریفریجریٹر میں خورد و نوش کا سارا سامان بھرا ہوا ہے۔"

"تم مسلسل مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔"

"عبدالباقر بہت اچھا میزبان ہے۔" یوسف ہنستے ہوئے بولا۔ "اور اب تو مقدر نے اُسے تم جیسے مہمانوں سے نوازا ہے، بخدا کسی بھی خدمت گار سے ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو عبدالباقر اپنے چرمی چابک سے اس کی چمڑی ہی اُدھیڑ دے گا۔"

"تاکہ وہ بعد تک مہمانوں کو کوستے ہی رہیں۔" احمد نے عبدالباقر کی تعریف کے اس انداز پر اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کر ڈالا۔

"یہ اپنے ملازموں کو اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہے۔" یوسف یک بیک سنجیدہ ہو گیا۔ "اور ان سے بھی ایسی ہی وفاداری کی اُمید رکھتا ہے اور اگر ان سے لغزش ہو جائے تو اس کا عتاب بھی ایسا ہی لرزہ خیز ہوتا۔۔۔؟"

"ختم کرو۔" عبدالباقر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آج صرف صفدر اور سیتا کی بات کرو۔ واللہ ان دونوں نے ازدواجی رشتے کی صحیح عظمت پہچانی ہے۔ اگر ان دونوں کو قانون کا خوف نہ ہوتا تو میں ان کے اعزاز میں اتنی بڑی دعوت دیتا کہ پورا یمن ان کے گرد جمع ہو جاتا۔ کاش حالات بدلنے پر یہ دوبارہ اِدھر آسکیں۔"

کچھ دیر تک یہی گفتگو جاری رہی پھر موقع پا کر عبدالباقر میرے قریب سرک آیا اور سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔ "پیتے بھی ہو؟"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اقرار کیا۔

"کوئی خاص ذوق؟" اس نے اسی لہجے میں دوسرا سوال کیا مگر اس بار اس کے لہجے میں اضطرار اور شوق سمٹ آیا تھا۔

"وسکی ہو اور عمدہ ہو۔"

"ڈریسنگ ٹیبل کے نچلے خانے میں شیواز ریگل کے اچھے اور رائل ایجنز کی ایک بوتل پڑی ہے۔ کچھ بیچارا تو رات کو ساتھ بیٹھیں گے یوسف اس معاملے میں کورا ہے۔" بات پوری کر کے اس نے محبت آمیز انداز میں میرے شانے پر ہاتھ مارا اور اُٹھ گیا۔

باہر بند آہنی باڈی والی ایک جیپ تیار تھی۔ ناشتے کے بعد وہ تینوں ہی روانہ ہو گئے۔ میں سیتا کے ہمراہ انہیں الوداع کہنے باہر تک آیا تھا۔

عبدالباقر نے ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھالی تھی رائفلوں سے مسلح دو یمنی محافظ جیپ کے پچھلے حصے میں جا گھسے جب کہ احمد اور یوسف اگلی ہی نشست پر بیٹھ گئے تھے۔

"میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گا۔" میں نے احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ واپسی میں تم تنہا ہو۔"

"مادام کے لیے میں اب بھی دل گرفتہ ہوں۔" احمد کی آواز بھرا گئی۔ "کاش میں نے وہ سب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا۔"

عبدالباقر کھلنڈرا آدمی تھا اس لیے فوراً ہی اگنیشن میں چابی گھما دی اور جیپ کا انجن کسی زخمی درندے کی طرح غرا کر بیدار ہو گیا۔

"فی امان اللہ۔" میرے عقب سے سیتا کی آواز اُبھری اور جیپ خفیف سا جھٹکا لے کر پھاٹک کی طرف بڑھ گئی جدھر آسمان کے گوشوں سے سورج کی پہلی کرنیں اپنا نور بکھیر رہی تھیں۔

میں چند ثانیوں تک خالی الذہنی کے عالم میں وہیں کھڑا رہا پھر سیتا کا ہاتھ تھام کر اندر داخل ہو گیا۔

صنعا ساحل سے دور تھا اور عبدالباقر احمد کو اسی رات ایک لانچ سے جبوتی بھیجنے والا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ ان کا سفر خاصا طویل تھا۔

"تم کیبیتی کو نہیں بھلا سکو گے۔" نئی خوابگاہ میں پہنچنے کے بعد سیتا نے سکوت توڑنے میں پہل کی۔ "اسی کے بارے میں سوچ رہے ہو نا؟"

"زندہ رہتی تو شاید تھوڑے ہی عرصے میں ذہن سے محو ہو جاتی

لیکن اس نے مرنے کے لیے جس حوصلے سے کام لیا اور جو چونکا دینے والا انداز اختیار کیا وہ اُس کی ذات کو کبھی نہیں بھلانے دے گا۔ اور میں ہی کیا شاید تم بھی اُسے نہ بھول سکو۔" میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تو اُسے بھول ہی نہیں سکتی۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اس نے دیدہ دلیری سے میرے سامنے تم پر اپنا حق جتایا تھا۔"

"دیدہ دلیری نہیں، وہ بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لو تھی۔"

وہ اُٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے نچلے خانے سے رائل ایجبز کی بوتل نکال لائی۔ سفید بوتل میں سیّال کندن خود بھی نشے میں مچل رہا تھا۔

"اسے واپس رکھ دو۔"

"تھوڑی سی لے لو۔" وہ بولی۔ "کیتی یاد نہیں آئے گی۔" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ طنز کا دُور تک شائبہ بھی نہیں تھا۔

"میں نے گلے تک ڈٹ کر ناشتہ کیا ہے۔" میں نے نیم دلی سے کہا۔ "لاؤ تھوڑی سی دے دو۔"

بلور کے گلاس کے ساتھ ہی وہ ریفریجریٹر سے پانی کی ایک تخ بوتل بھی لے آئی۔

"تمھیں کیسے پتہ کہ میں پانی کے ساتھ لیتا ہوں؟" میں نے شفاف شیشے کی دُھندلائی ہوئی سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"سوڈا نہیں تھا تو پانی لے آئی۔" اُس نے بوتل کا دہانہ کھول دیا۔

"تم پیتی ہو؟" میں نے پُوچھا اور میرا دل اندیشے سے کانپ اٹھا، اگر سیتا کا جواب اثبات میں ہوا؟

"نہیں۔" اس نے مُسکرا کر بڑے وثوق سے گردن ہلائی، اور میرے وجود میں سکون کی لہر سرایت کر گئی۔

"پھر پینے کے آداب سے کیسے واقف ہو؟" پہلا انکار سن کر میں نے بلا تامل دُوسرا سوال کر ڈالا۔

"سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو پی کر میں نے اکثر بہکتے دیکھا ہے، اس میں بڑا لطف آتا ہے۔" وہ پانی سے گلاس لبریز کرتے ہوئے بولی۔

"اس وقت میں پیے بغیر بھی بہک سکتا ہوں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آواز میٹھے جذبوں سے بوجھل ہو چلی تھی۔

اصُولاً ہمیں جلد سو جانا چاہیے تھا کیونکہ ایتھوپیا سے یمن تک ہمارے شب و روز بے آرامی اور جان توڑ تکان میں بسر ہوئے تھے لیکن داغِ فراقِ صحبتِ شب جو مدّت سے پروان چڑھتا آ رہا تھا، اس وقت اعصاب پر بُری طرح سوار ہو گیا تھا۔

نہ جانے کب میری آنکھ لگی اور وہ کیا وقت تھا۔ ہاں بس اتنا یاد تھا کہ سونے کی نیت کرنے سے قبل سیتا نے ساری کھڑکیوں کے دبیز پردے کھینچ کر کمرے میں اندھیرا کر دیا تھا۔

وہ کوئی آہٹ تھی اور اتنی واضح کہ میں ہڑبڑا گیا۔

گہری نیند کے خمار سے بوجھل پلکیں پوری طرح کھلنے بھی نہ پائی تھیں کہ اعصابی ردِ عمل کے تحت میں کہنی کے بل بستر سے اُٹھا اور نیم وا آنکھوں سے تاریکی میں اپنے قریب کھڑے ہوئے اس تاریک تر سائے کی محض ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا وزنی ڈنڈا پوری قوت سے میرے سر پر دے مارا۔

میں نے چیخنا چاہا لیکن ذہن سے پہلے زبان بے جان ہو چکی تھی اور میں وہیں بے ہوش ہو کر گر گیا۔

ڈنڈا کھانے اور بے ہوش ہونے کے مختصر ترین درمیانی عرصے میں میرے ذہن میں پوری شدت سے بس ایک ہی خواہش ابھری تھی کہ کاش میں کسی طرح سیتا کو کمرے میں موجود خطرے سے ہوشیار کر سکتا لیکن میں اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

دوبارہ ہوش آیا تو چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور میرا سر کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔

"سیتا!" میں نے آہستہ سے پُکارا اور آواز کی گونج نے فوراً ہی واضح کر دیا کہ وہ بے سروسامان بند کمرہ تھا۔

اپنی آواز کا جواب پا کر میں پریشان ہو گیا اور سر کی شدید تکلیف کے باوجود صورتِ حال کے بارے میں سوچنے لگا۔

عبدالباقر کی حویلی اور پھر اس کے مردانہ حصے میں وہ واقعہ پیش آنا میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ احاطے کی اونچی دیواروں میں بنے ہوئے داخلی پھاٹک پر مسلح محافظ مامور تھا جسے دھوکا دے کر اندر داخل ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ احاطے سے اندر داخل ہونے کے بعد دو خدمت گاروں کے ہوتے ہوئے مردانہ حصے میں گھسنا اور پھر ہماری خوابگاہ میں داخل ہونا کسی اجنبی کے لیے کسی بھی طرح ممکن نہ تھا۔

اس سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ حملہ آور جو بھی تھا اندر ہی کا آدمی تھا مگر اندر کے آدمی کو مجھ سے کیا پرخاش ہو سکتی تھی۔

اس کمرے میں گھور اندھیرا تھا اور میں فوری طور پر چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا ورنہ سیتا کے بارے میں بھی کچھ اندازہ ہو جاتا۔

پتہ نہیں اسے بھی بے ہوش کیا گیا تھا یا ساری افتاد صرف میرے ہی لیے تھی اور اگر وہ میرے ساتھ ہی لائی گئی تھی تو یقیناً اس وقت تک بے ہوش تھی۔

میں نے کسلمندانہ انداز میں جیب ٹٹول کر ماچس نکالی تو تیلی کی روشنی میں سیتا مجھے چند گز دور ننگے فرش پر بے ہوش پڑی نظر آئی۔

میں نے بے چین ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ شاید اسے بھی بے ہوش کرنے کے لیے وہی بے رحمانہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا جس کا میں شکار ہوا تھا مگر سیتا کے لیے وہ چوٹ شدید تر ثابت ہوئی تھی۔

غالباً اس کے سر پر زخم آیا تھا کیونکہ بڑا سا سفید رُومال پٹی کے طور پر بھونڈے انداز میں اس کے سر کے گرد بندھا تھا اور اس پر ایک جگہ رسنے والے خون کا بڑا سا دائرہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔

بے ہوش سیتا کو دیکھ کر بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ نامعلوم حملہ آور کو طبی امداد کے بجائے خون کے دھبّوں کی فکر تھی جو بعد میں عبدالباقر یا کسی اور کی رہنمائی کر سکتے تھے لہٰذا اس نے سیتا کے زخم پر کپڑا باندھ کر اس خطرے کا فوری سدِّباب کر لیا تھا۔

میں نے نرمی سے سیتا کو کئی بار ہلایا جُلایا لیکن وہ ہوش میں نہ آسکی اور میں اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

وہ کمرہ خاصا بڑا تھا مگر وہاں سامان کے نام پر ایک تنکا تک موجود نہیں تھا۔ کمرے میں حیرتناک طور پر کوئی کھڑکی یا روشندان بھی نہیں تھا۔ لے دے کے بس ایک سیاہ دروازہ تھا جو یقینی طور پر باہر سے مقفل رہا ہو گا۔

نیچے سے اوپر تک سپاٹ دیواروں اور وہاں فضا میں بسی ہوئی بُو اور سیلن کے باعث مجھے قوی شبہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی تہ خانہ تھا۔ تہ خانے میں مقید ہونے کا وہ احساس میرے لیے سخت اذیتناک تھا۔ عبدالباقر کے مہمان خانے کی آرام دہ خوابگاہ میں سوتے ہوئے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس محفوظ جگہ پر میرے اور سیتا کے لیے کوئی خطرہ درپیش ہو گا لیکن نوشتۂ تقدیر اس بار بھی میرے تصورات کے برعکس ثابت ہوا تھا۔

رسٹ واچ کے ریڈیم ڈائل پر نگاہ ڈالی تو وہاں تین بج رہے تھے۔ باہر سُورج کی چمکیلی دھوپ کا راج تھا مگر تہ خانے میں اندھیری رات کا وحشتناک سماں تھا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ سو جانے کے کتنی دیر بعد ہم دونوں پر وہ ناگہانی افتاد نازل ہوئی تھی مگر یہ بات یقینی تھی کہ میں کم از کم کئی گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔

اب اتفاقات کے علاوہ نجات کی بس ایک ہی صُورت تھی کہ عبدالباقر احمد کی روانگی کا انتظام کر کے واپس آ جاتا اور ہم دونوں کو غائب پا کر اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ ہماری تلاش میں مصروف ہو جاتا۔ سیتا کے خون آلود زخم کی وجہ سے مجھے پورا یقین تھا کہ خوابگاہ سے ہٹائے جانے سے قبل بستر کی چادر پر خون کا ایک آدھ دھبّہ ضرور پڑا ہو گا جو عبدالباقر اور یوسف کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلا سکے گا۔

میں انتظار کے وہ لمحات بے عملی میں گزارنے کے بجائے سیتا کے زخم کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن اندھیرے کے باعث ہمت نہ کر سکا۔

اس اجاڑ تہ خانے میں بلب تو در کنار، روشنی پیدا کرنے کے لیے ردّی کاغذ کا کوئی ٹکڑا تک نہیں تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ تہ خانہ محض قید خانے کا تصوّر ذہن میں رکھ کر بنوایا گیا تھا۔

میرے ماچس میں تیلیوں کی تعداد محدود رہ گئی تھی اور مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اس صعوبت سے کتنی مدت کے بعد نجات ملے گی لہٰذا میں اپنے جملہ وسائل نہایت کفایت سے استعمال کرنے چاہتا تھا اور پھر میرے لیے یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ ایک ہاتھ سے تیلی جلا کر دُوسرے سے سیتا کے زخم کو چھیڑوں جس کی شدت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

میرے لیے اس غیر یقینی اور رُوح فرسا ماحول میں ایک ایک لمحہ بھاری ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں تہ خانے کی محدُود فضا میں سیتا کی کراہ گونجی اور میں اس پر جھک پڑا۔

اس بار سیتا کو پکارنا اور ہلانا جُلانا سُودمند ثابت ہوا اور وہ جلد ہی ہوش میں آ گئی۔

"میرا سر — میں کہاں ہوں؟" اس نے غنودہ لہجے میں سوال کیا۔

"میں صفدر ہوں سیتا۔ ۔ ۔ تمھارا سر زخمی ہے۔" میں نے اُس کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں اضطراری لہجے میں کہا۔

"یہ ۔ ۔ ۔ یہ اندھیرا کیسا ہے؟" اس کی آواز میں ہراس سمٹ آیا۔ شاید اُس نے اپنی آنکھیں کھول لی تھیں۔

"ہم اغوا کیے جا چکے ہیں اور کسی تہ خانے میں قید ہیں۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "ذرا ہمت سے کام لو۔"

اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دُھند صاف ہو گئی اور وہ تیزی سے فرش سے اُٹھ گئی۔

"یہ کیا بندھا ہُوا ہے میرے سر پر؟"

میں نے ایک دیاسلائی روشن کر لی۔ "انہی لوگوں نے خون جذب کرنے کے لیے تمھارے زخم پر کپڑا باندھا ہوا ہے۔"

"اوہ خدا!" وہ کچھ یاد کر کے بڑبڑائی۔ اُس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "انہوں نے میرے سر پر نہایت بے دردی سے ضرب لگائی تھی۔ اور اُن کی تعداد صرف دو تھی ۔ ۔ ۔ اگر ایک ثانیے پہلے بھی میری آنکھ کھل گئی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔"

"غنیمت ہے کہ ہم دونوں کو اکٹھا ہی رکھا گیا ہے۔" میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اگر الگ الگ ہوتے تو اپنی تکلیف سے زیادہ دوسرے کی فکر میں ہی گھلتے رہتے۔"

"حماقت ہی ہوگی۔ لیکن پھر بھی نکاسی کے دروازے کا جائزہ

پینے میں ہرج نہیں" میں نے کہا اور سگریٹ کے سلگتے ہوئے سرے کے انعکاس میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

توقع کے مطابق دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ اس کی ساخت اتنی مضبوط تھی کہ اُسے توڑنے کا خیال ہی بے سود تھا۔

میں سگریٹ کے کش لگاتا واپس لوٹ گیا۔

"ہم صنعا ہی میں ہیں یا۔۔۔؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے فکرمندانہ لہجے میں اُس کی بات کاٹ دی۔ "ہماری بے ہوشی کا وقفہ خاصا طویل رہا ہے۔"

"مگر ہمیں اس مکان سے کیسے نکالا گیا ہوگا؟"

"بس نکال ہی لیا گیا ورنہ اس وقت قیدی نہ ہوتے۔"

"میں نہیں مان سکتی۔ مسلح محافظ اور پھر ملازموں کی فوج کو دن دہاڑے کس طرح دھوکا دیا گیا ہوگا۔ رات کی تاریکی کے بارے میں تو پھر بھی بہت سے مفروضات قائم کیے جا سکتے ہیں میرا ذہن اس واقعہ کو اتنا سیدھا تسلیم نہیں کر رہا۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"مجھے یہ عبدالباقر کی ہی شرارت معلوم ہوتی ہے۔"

"اس کا نام بھی نہ لو۔" میں نے فوری طور پر کہا۔ "اس کے بارے میں میں نے جو پختہ رائے قائم کی ہے اُس کے مطابق وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر دغاباز نہیں۔"

"واقعات کی کڑیاں ٹیک جلہونے کے بعد بھی نہیں؟"

"کیسے واقعات؟"

"ہم سے متعارف ہونے کے بعد ہی اُس کے عزائم خطرناک تھے۔ لیکن یوسف اور احمد کی موجودگی میں وہ ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔"

"رکو نہیں، بات پوری کر ڈالو۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"اس نے احمد کی زبان سے یعقوب پیار روانگی کی خواہش کا اظہار سنتے ہی فوراً ذمہ داری قبول کر لی۔" وہ کہنے لگی۔ "اور اس طرح ہم دونوں کو یہاں چھوڑ کر دیتر تک اپنی غیر حاضری کا جواز مہیا کر لیا۔ اپنی ذات کو شبہ سے بالاتر رکھنے کے لیے جاتے جاتے یوسف کو بھی ساتھ لے گیا اور موقع میسر آتے ہی اُس کے وفادار ملازموں نے ہم پر دھاوا بول دیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس حویلی کے کسی تہہ خانے میں قید کیے گئے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ضروری نہیں۔۔۔ اس کے خاص ملازموں کی باہر آمد و رفت معمولات میں شامل ہوگی۔ ہم دونوں کو بے ہوشی کی حالت میں ڈال کر بآسانی باہر لایا جا سکتا تھا۔" اس نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لیکن عبدالباقر کو ہم سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے؟"

"یہ تو وہی بتا سکے گا۔۔۔ اُس کی مرضی کے بغیر شاید اس کی حویلی میں پرندہ بھی پر نہ مار سکتا ہوگا۔ تم نے سن ہی لیا تھا کہ وہ اس قدر سخت گیر ہے کہ ذرا سی لغزش پر وہ اپنے ملازموں کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔"

"تمہارے دلائل معقول ہیں۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "لیکن اس شخص کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔ وہ ایسی اوچھی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"بعض لوگ صورت حرام بھی ہوتے ہیں۔"

"وہ بھی کسی نہ کسی حرکت سے پہچان لیے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وقت بہت سست رفتاری سے رینگتا رہا۔ اس اندھیرے تہہ خانے میں گھڑی کے سوا ہمارے پاس وقت کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ہمیں اغوا کرنے والوں نے پلٹ کر ہماری خبر تک نہ لی تھی حالانکہ میں اُن کا سامنا کرنے کے بعد کوئی واضح اندازہ قائم کرنے کی امید لیے بیٹھا تھا۔

صبح کے ناشتے کے بعد رات کا ایک بج گیا۔ ہم دونوں کی آنتوں نے بھی اس طویل فاقے کے خلاف دبا دبا احتجاج شروع کر دیا تھا لیکن ہم ہر معاملے میں بُری طرح بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

فرش ٹھنڈا تھا مگر بیٹھے بیٹھے کمر جواب دینے لگی تھی لہٰذا ہم دونوں ہی اطمینان سے فرش پر پہلو بہ پہلو لیٹ گئے۔

تنہائی اور بے کاری کے ان لمحات کا ازالہ ایک دوسرے میں دلچسپی لے کر ہی کیا جا سکتا تھا مگر کوشش کے باوجود ذہن کسی ایسی سرگرمی کی طرف مائل ہو سکا جو صورتحال کا گمبھیر احساس دھندلا سکے۔

رات سوا دو بجے کے قریب اچانک ہی ہم دونوں اچھل پڑے ہمارے کانوں میں کسی ٹامی گن کے فائر کی گھٹی گھٹی سی آواز آئی تھی۔ لحظہ بھر توقف رہا پھر ٹامی گن دوبارہ چلی اور اسی کے ساتھ رائفلوں کے ہولناک دھماکے ہونے لگے جو مختصر وقفوں کے بعد ابھر رہے تھے۔

ہم چاروں طرف سے بند دیواروں والے تہہ خانے میں محبوس تھے لہٰذا فائروں کی آواز سے سمت یا فاصلے کا تعین کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

مگر ان آوازوں سے مجھے عجیب سی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ اتفاق تو خارج از قیاس تھا کہ ہمارے زنداں کے قریب دو غیر متعلقہ فریق آپس میں لڑ پڑے ہوں لہٰذا یہ بات یقینی تھی کہ ہم دونوں کی تلاش کا آغاز ہو چکا تھا اور ہمارے نامعلوم ہمدرد مختصر سے عرصے میں تلاش کرتے ہوئے اس زیرِ زمین قید خانے کے نواح میں آ پہنچے تھے اور ہمارے دشمنوں نے اُن کی پیش قدمی کے خلاف مزاحمت شروع کر دی تھی۔

تھوڑی دیر قبل محسوس ہونے والی بے سروسامانی کی کیفیت ختم ہو چکی تھی اور اب مجھے یہ اطمینان تھا کہ کم از کم اس سرزمین پر ہمارے ہمدرد بھی موجود ہیں۔

"یہ خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے۔" سیتل نے میری خوش فہمی پر مبنی رائے پر تبصرہ کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ اغوا کرنے والے مجرم ہوں اور اس وقت مقامی پولیس اُن کے ٹھکانے پر چڑھ آئی ہو۔ ایسی صورت میں ہمارے ساتھ دونوں کا رویّہ ایک ہی ہوگا۔"

پھر اچانک فائرنگ میں شدت پیدا ہو گئی ان دھماکوں میں ہمیں واضح طور پر انسانی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دونوں فریقوں کے سروں پر انسانی لہو کی ہولی کھیلنے کا جنون سوار ہو گیا ہو۔

اسی وقت تہہ خانے کے دروازے کے باہر دھمک سنائی دینے لگی۔ آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی ننگے پیروں سیڑھیاں اُترتا تیزی سے تہہ خانے کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے سیتا کا بازو تھاما اور دروازے کے ساتھ والی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی بے تابانہ آواز کے بعد کھٹکا کھولا گیا اور پٹ وا ہوتے ہی ہانپتا ہوا ایک مریل سا اندر گھس آیا۔

"کہاں ہو؟ تم کہاں ہو میرے دوست؟" اس نے اندر گھسنے سے پہلے ہی کرب میں ڈوبی ہوئی خوفزدہ آواز میں پکارا تھا۔

میں نے منہ سے ایک لفظ بھی کہے بغیر دیاسلائی روشن کر دی اور وحشت زدہ شخص تیزی سے روشنی کی طرف مڑ گیا۔

وہ بالکل نہتا ہم سے چند قدم دور موجود تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔

اس کے نچلے دھڑ پر پیجامے نما لباس کے چیتھڑے اڑے ہوئے تھے اور وہ تازہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اوپری دھڑ برہنہ تھا۔ جس پر نیلی اور سرخ دھاریاں ایک دوسرے میں الجھی ہوئی تھیں۔ داہنی آنکھ ورم آلود تھی۔ رخسار بھی سوجے ہوئے تھے۔ اور پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون رواں تھا۔

"مجھے معاف کر دو میری خطا بخش دو۔" وہ گڑگڑا کر روتے ہوئے میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ "میں نادانستگی میں سازش کا شکار ہوا ہوں۔" تیلی بجھ گئی اور وہاں اندھیرا پھیل گیا۔

میں اس وقت تہہ خانے سے نکل کر باہر کی خبر لینے کے لیے بے چین تھا مگر اُس ادھڑے ہوئے خستہ حال حبشی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟ کیا چاہتے ہو؟ جلدی بتا ڈالو۔" میں نے اپنے قدموں میں پڑے ہوئے اس کے سر سے پیچھے ہٹتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

وہ آگے سرک کر دوبارہ کسی جونک کی طرح میرے قدموں سے لپٹ گیا اور زار و قطار روتے ہوئے بولا۔ "معاف کر دو یا ٹھوکریں مار مار کر میرا بھیجا اڑا دو۔ میں نے اپنے آقا سے نمک حرامی کی ہے میری یہی سزا ہے۔"

"میرے سوال کا جواب دو۔" اُسے ذہنی جمود سے نکالنے کے لیے میں بے رحمانہ لہجے میں غرایا۔ ورنہ درحقیقت مجھے اُس پر ترس آ رہا تھا۔

"عدنان۔" اُس نے شاید اپنا نام بتایا۔ "عبدالباقر میرا مالک ہے مجھے زینی نے بہکایا تھا۔ اسی کے ساتھ میں نے تمہیں اس حال کو پہنچایا مگر تم آقا سے یہی کہنا کہ اندھیرے میں تم نے بس ایک عورت ہی کو اپنے کمرے میں دیکھا تھا۔ تمہیں غائب پا کر وہ غصے سے پاگل ہو رہا ہے۔ اس نے درندے کی طرح ہر ایک کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔"

"یہ فائرنگ کیسی ہے؟" سیتل نے سوال کیا۔

"میں اپنی کوٹھری میں پڑا تھا۔ سنا ہے کہ زینی کئی آدمیوں کے ساتھ گھسی ہے، وہ معصوم بیوقون بڑی مکار نکلی، مالک نے میرا ایک ایک ریشہ بڑی بے رحمی سے اُدھیڑا ہے۔"

"چلو! میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔"

"معاف کر دیا نا تم نے؟" وہ کسی پاگل کی طرح بے اعتباری سے میرے پیر چومنے لگا۔

"اٹھو۔" میں نے اُسے جھڑکا۔ اور وہ یوں بھڑک کر اُٹھا جیسے ایک لمحے کی بھی تاخیر میں اُسے اپنی معافی سلب ہونے کا اندیشہ ہو۔

دروازے سے نکل کر وہ یوں تاریک سیڑھیوں پر غائب ہوا جیسے قفس سے رہائی پانے والا پرندہ رُکے بغیر آسمان کی وسعتوں کی طرف اُٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔

ہم دونوں بھی تہہ خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اوپر بڑھ گئے۔ باہر آتے ہی فائرنگ کا شور کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ ہم عمارت کے جس حصے میں نکلے وہ ہمارے لیے اجنبی تھا اور وہاں کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا جو کسی طرف ہماری رہنمائی کر سکتا۔ ہم مختلف حصوں سے اُبھرنے والے شور سے سمتوں کا اندازہ لگانے لگے۔

فائرنگ کے جوش و خروش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس رات جب تک دو میں سے ایک حریف فنا نہ ہو جائے گا وہ بارودی طوفان نہیں تھمے گا۔

فائروں کے درمیان ایک ہولناک چیخ گونجی جو یقیناً کسی مرنے والے کی آخری صدائے درد تھی۔

اس موت گرفتہ چیخ کے ساتھ ہی عمارت سے ایک مسرت آمیز وحشیانہ غلغلہ بلند ہوا جس میں عبدالباقر کی آواز سب پر حاوی تھی۔

"جہنم کی آگ میں ایک اور کندہ گیا۔۔۔ تو کب تک جمے گی

بنت الحرام!" عبدالباقر کی آواز قہر بربریت اور انتقام کے شعلوں سے دہک رہی تھی۔

میں سیتا کا ہاتھ تھام کر راہداریوں سے ہوتا ہوا اس سمت میں بڑھنے لگا جدھر سے باقر کی آواز آئی تھی۔

لیکن عبدالباقر اور اس کے ساتھیوں تک پہنچنا اتنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ کئی منٹ تک کمروں اور راہداریوں میں بھٹکنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ لوگ چھت پر مورچہ زن تھے۔

ہم دو تین ہی سیڑھیاں عبور کر سکے تھے کہ باہر سے ایک دردناک چیخ ابھری اور ایک ٹامی گن کی آواز دم توڑ گئی۔

ہم چھت پر پہنچے تو فضا میں رچی ہوئی بارود کی بو نے حلق اور نتھنے تک جلا دیے۔ عبدالباقر اور اس کے ساتھی ایک شکار مار لینے پر مسرت کے اظہار میں مصروف تھے۔

چھت پر عجیب جنگی سماں تھا۔ وسیع چھت پر چاروں طرف تین فٹ اونچی دیوار بنی ہوئی تھی جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی انچ کے مربع سوراخ بنے ہوئے تھے۔ اگر وہاں مسلح افراد موجود نہ ہوتے تو یہی سمجھا جاتا کہ وہ سوراخ بارش کے پانی کو بہاؤ کی راہ ہموار کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں لیکن اس وقت انہی سوراخوں میں سے رائفلوں کی نالیں باہر نکال کر وہ لوگ دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے۔

تین اطراف میں گنتی کے آدمی مورچہ زن تھے اور ان کے ہتھیار بھی خاموش تھے لیکن سامنے والے محاذ پر معرکہ جاری تھا۔

"کون ہے؟" تاروں کی چھاؤں میں دو اجنبی ہیولے دیکھ کر عبدالباقر کے آدمیوں میں سے کوئی دہشت زدہ آواز میں غرّایا۔

"عبدالباقر۔۔۔ یہ میں ہوں۔" میں جلدی سے چیخ پڑا ورنہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں للکارنے والا گولی ہی نہ مار دے۔

عبدالباقر اور یوسف اپنی رائفلیں پھینک کر والہانہ انداز میں ہماری طرف لپکے اور دونوں ہی بیک وقت مجھ سے لپٹ گئے۔

"شکر ہے۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ تم دونوں زندہ سلامت ہو۔" عبدالباقر وفورِ مسرت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے محافظوں کی بوٹیاں گدھوں کو کھلا دیتا۔"

"تم تھے کہاں؟" یوسف کی آواز تحیر آمیز تھی۔

"اسی عمارت کے ایک تہہ خانے میں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"واللہ؟" عبدالباقر وفورِ حیرت سے بے اختیار چیخ پڑا۔

میں نے اپنے سر کو آہستہ سے اثبات میں جنبش دی۔

"عمارت کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن ادھر خیال بھی نہیں گیا۔" وہ متاسفانہ لہجے میں بولا۔ "تمہیں میرے زنداں میں کس نے ڈالا ہے؟"

"تم ادھر کی خبر لو، یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" میں نے اسے یاد دلایا کیونکہ اس کے ہٹتے ہی رائفلوں کا شور غیر منظم ہو کر رہ گیا تھا۔

"ادھر آجاؤ۔" یوسف مجھے عقبی دیوار کی طرف لے گیا جہاں دو آدمی سینوں کے بل چھت پر لیٹے سوراخوں سے باہر نگراں تھے لیکن ان کی رائفلیں خاموش تھیں۔

یوسف نے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے ہماری دھیمی آوازیں کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

"اب بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟"

"ہم سوئے ہوئے تھے کہ اندھیرے میں ڈنڈا سنبھالے کوئی خوابگاہ میں گھس آیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب سر پر ڈنڈا پڑ چکا تھا اور زبان اپنی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔" میں نے بے تکان کہہ ڈالا۔

"مگر وہ تھا کون؟" اس نے سوال کیا۔ "سیتا کے تو سر پر خون بھی نظر آ رہا ہے۔"

"تھا یا تھی۔۔۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔" میں نے عدنان کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ "سیتا کے زخم پر پٹی اس نے خود ہی باندھی تھی۔"

"ہوش آیا تو تم زنداں میں تھے؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اپنا تجسس لفظوں میں ڈھال دیا۔

"واپسی پر تم دونوں غائب تھے۔ خوابگاہ میں کوئی سراغ نہ مل سکا تو عبدالباقر نے ملازموں سے باز پرس کی اور جب ہر طرف سے لاعلمی کا اظہار ہوا تو وہ بپھر گیا۔ پہلے ملازموں سے پہرے داروں کے ساتھ باز پرس کی گئی۔ اسی دوران میں پتہ چلا کہ زینی نامی ایک خادمہ غائب تھی۔ پھاٹک والے محافظوں سے پتہ چلا کہ وہ دوپہر ساڑھے بارہ بجے تنہا کسی کام سے باہر گئی تھی۔" وہ دھیمے لہجے میں بتا رہا تھا۔ "عبدالباقر نے اسے نظر انداز کر دیا۔ پھر ملازموں پر چابک گھومنے لگا۔ گیارہ بجے رات تک کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو عبدالباقر بے بس ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ مردانے حصے میں میرے پاس بیٹھا اسی مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ ایک بکتر بند کار نے پھاٹک سے اندر گھسنے کی کوشش کی اور گولیاں چلنے لگیں۔"

"تو کیا وہ اندر گھس آئے؟"

"ایک محافظ کو کچل کر وہ اندر آ گئے مگر یہاں پوری حویلی بیدار تھی۔ ادھر متعدد رائفلیں ہیں اور پھاٹک پر دو مسلح محافظ۔ ان کی زندگی کی ہر راہ مسدود ہو چکی ہے، چار مر چکے ہیں شاید 'باقی رہ گئے ہیں۔"

"اور زینی؟" وہ نام بار بار میرے ذہن میں بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔

"عبدالباقر کے کئی آدمیوں نے قسمیں کھائی ہیں کہ انہوں نے زینی کو حملہ آوروں کی کار میں سے اتر کر جھاڑیوں میں مورچہ سنبھالتے دیکھا تھا۔" اس نے ایک گہرا سانس لے کر بے یقینی کے لہجے میں کہا۔ "بڑی خطرناک عورت ہے۔"

"عبدالباقر کو ابھی تک یقین نہیں آیا۔" اس نے سرگوشیانہ لہجے

..س تھا۔ زینی بڑی خوبصورت اور سیدھی لڑکی ہے۔ عبدالباقر نے یہودی ہونے کے باوجود محض دل بہلانے کے لیے اُسے ملازم رکھ لیا تھا۔"

پھر شور بلند ہوا اور اس بار احاطے میں چیخوں کے بعد سناٹا چھا گیا۔ تامی گنوں کے بند ہوتے ہی رائفلیں بھی خاموش ہو گئیں اور چنگھاڑتی ہوئی بارودی فضا پر چھایا ہوا وہ سناٹا غیر فطری محسوس ہونے لگا۔

"تم زنداں سے نکلے کیسے؟" اچانک یوسف کو خیال آ گیا۔

"جب سے اندر بند ہوئے تھے، دروازے کو دیکھ کر یہی سمجھتے رہے کہ باہر سے مقفل ہوگا۔" میں نے اس طرح کہا جیسے اپنی حماقت کا اعتراف کر رہا ہوں۔ "فائرنگ کا شور سننے کے بعد اضطراری طور پر دروازے پر زور آزمائی کا ارادہ کیا تو وہ بآسانی کھل گیا اور ہم بلا توقف باہر نکل آئے۔"

"حیرت ہے کہ نہیں اغوا کرنے والے کو تم دونوں کو تہ خانے میں منتقل کرنے کی مہلت تو مل گئی لیکن دروازہ مقفل کرنے کی فرصت نہیں ملی۔"

"ہو سکتا ہے کہ حملہ آور کا مقصد محض کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنی جگہ سے ہٹانا ہی رہا ہو۔" سیتا نے کہا۔

"مگر کیوں؟" یوسف نے سوال کیا۔

جواب کی نوبت آنے سے پہلے عبدالباقر واپس آ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو لاشیں اپنی جگہ چھوڑ دینے کی ہدایت کی تھی۔

"زینی کے لیے..."

عبدالباقر نے یوسف کی بات کاٹ دی۔ "ہاں ایک آدمی لاشیں گننے گیا ہے وہی زینی کی خبر بھی لے آئے گا۔"

پھر ہم سب نیچے آ گئے۔ عبدالباقر کے بیشتر مسلح ملازمین زخمی نظر آ رہے تھے۔ اور اُن کے زخم واضح طور پر مقابلے کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ وہ سب عبدالباقر کے تشدد کے شاہکار تھے۔ میرے لیے اِن ملازموں کی وفاداری قابلِ رشک تھی جو اپنے مالک سے بری طرح پٹنے کے بعد وقت پڑتے ہی اسلحہ سنبھال کر اُس کے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔

دیوان خانے میں پہنچ کر یوسف نے عبدالباقر کو میری کہانی سنانی چاہی لیکن میں نے اُسے روک دیا۔

"بات اُلجھ جائے گی اور ہم کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میری بات یوسف کی فہم سے بالاتر تھی۔

"ابھی واضح ہوا جاتا ہے۔" اسے جواب دے کر میں عبدالباقر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "عدنان کیسا آدمی ہے؟"

"عدنان؟" عبدالباقر کے چہرے پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ "تم اُسے کیا جانو؟"

"زبان بند رکھو۔" اچانک سیتا دخل دے بیٹھی۔ "تم نے جو فیصلہ کیا تھا شاید وہ مناسب ہی تھا اب اس پر قائم رہو۔"

"یہ کیا پہیلیاں شروع کر دیں تم نے؟" عبدالباقر بہت زیادہ اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا اور یوسف تو شاید کچھ سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔

"میرے سوال کا جواب برادر۔" میں نے عبدالقادر کو نرمی سے یاد دلایا۔

"اس کا باپ اور دادا بھی میرے بزرگوں کے نمک خوار تھے۔" وہ بولا۔ "اس پر میں آنکھ بند کر کے اعتماد کرتا ہوں۔"

"اس کے باوجود آج تم نے اس کی مرمت کی ہے۔"

"اوہ۔ تو کیا وہ ولد الحرام..." عبدالباقر مٹھیاں بھینچ کر غصے سے چیخ پڑا۔

"نتائج پر چھلانگ مت لگاؤ۔" میں نے اسے پچکارا۔ "یوں ہی تاؤ کھاتے رہے تو کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ رہ سکو گے۔"

"جلدی بتاؤ، تم کیا بتانا چاہ رہے ہو؟" عبدالباقر بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔

"پہلے وعدہ کرو کہ عدنان کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔"

"مگر کیوں؟" وہ غصے میں پیر پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ "اگر اس نے کسی حرامزدگی کا ارتکاب کیا ہے تو میں اس کی ہڈیاں سُرمہ کر دوں گا۔"

"اسے زینی نے بہکایا تھا۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "اصل قصہ تو اُسی سے معلوم ہو سکے گا، میں اسے معافی دینے کا وعدہ کر چکا ہوں میرے الفاظ کا پاس رکھنا اب تمہارے اختیار کا معاملہ ہے۔"

عبدالباقر نے دھاڑ کر کسی ملازم کو پکارا اور عدنان کی طلبی کا حکم دے کر زخم خوردہ شیر کی طرح قالین پر ٹہلنے لگا۔

"لیکن یہ بات تم نے مجھ سے کیوں چھپائی؟" یوسف نے شکایتی لہجے میں سوال کیا۔

"تہ خانے سے رہائی کا معاملہ نہ اُلجھتا تو میں اس کا نام اب بھی زبان پر نہ لاتا، اسی نے ہمیں قید سے نجات دلائی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو کیا وہ تمہارے اغوا میں بھی ملوث تھا؟"

"اسے زینی نے کسی عمدہ طریقے سے بے وقوف بنایا ہوگا، ورنہ وہ میرے پیروں پر گر کر معافی نہ مانگتا۔ وہ یہ سن کر آیا تھا کہ حملہ آوروں میں زینی بھی شامل ہے۔" یہ کہہ کر میں نے مختصر الفاظ میں اسے عدنان کا قصہ سنا دیا۔

"میں مان ہی نہیں سکتا کہ وہ زینی کے بہکاوے میں آ گیا ہوگا۔" عبدالباقر کے بشرے پر جھلاہٹ اور شکست کی علامتیں نمایاں تھیں۔

"یہ تو وہی بتا سکے گا۔" سیتا نے کہا۔

اسی وقت باہر سے ایک ملازم اندر آیا اور عبدالباقر کے قریب ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا خبر ہے؟" عبدالباقر نے پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارا ایک محافظ ان کی کار سے کچل کر مارا گیا، چھ آدمی زخمی ہوتے ہیں۔" وہ مشینی انداز میں بتلانے لگا۔" اُن کی پانچ لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ زینی شاید بے ہوش ہے کیونکہ اُس کے جسم میں کچھ جنبش باقی ہے، اس کے پیٹ پہ کاری زخم آیا ہے۔"

"پھاٹک بند کرا کے چاروں طرف آدمی پھیلا دو۔" عبدالباقر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔" میری اجازت کے بغیر نہ کوئی اندر داخل ہو گا نہ باہر جا سکے گا۔ زینی کو اندر لا کر اس کو بہترین طبی امداد دو اور جب وہ ہوش میں آ جائے تو مجھے خبر دینا۔"

"اور لاشیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا

"جہاں پڑی ہیں پڑی رہنے دو۔ کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگائے۔" اُس نے غصیلے لہجے میں اپنے پرانے احکام دہراتے اور آنے والا تیزی سے لوٹ گیا۔

چند ثانیوں بعد عدنان رحم انگیز حالت میں وہاں لے آیا گیا اس کا اوپری دھڑ بدستور برہنہ تھا۔ چہرہ دہشت سے تاریک ہو رہا تھا، پیشانی عرق آلود تھی اور اس کے مضبوط بدن پر تشنج ایسی کیفیت طاری تھی۔

زخموں میں تکلیف کے باعث اس کے لیے سیدھا کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں عبدالباقر کے قدموں پہ جمی ہوئی تھیں۔

"تو سچ بولے گا عدنان!" عبدالباقر نے قہر آلود تحکمانہ لہجے میں کہا۔" ورنہ میں اپنے مہمانوں کی دی ہوئی امان سے بری ہو جاؤں گا۔"

وہ کچھ نہ بول سکا۔ تشنج کی کیفیت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

"ابو نعمان جیسے اس خاندان کے نمکخوار کا پوتا میرے مہمانوں پر ظلم میں کیوں شریک ہوا؟ میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"بتا دوں مالک؟" وہ رو دینے والی آواز میں گڑگڑایا۔" تم نے سچ بولنے کا حکم دیا ہے اس رُوسیاہ کو۔"

"بول۔" عبدالباقر دہاڑا اور عدنان خوف سے لرز کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

بدقت تمام وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور ڈرتے ڈرتے بولا۔" تخلیے میں پوچھ لینا میرے مالک!" اس کی آواز میں بلا کا کرب اُمڈ آیا تھا۔

"نہیں!" عبدالباقر مُکّہ تان کر غرایا۔" یہیں بتا، اِن سب کے سامنے، جن کی نگاہوں میں تو نے مجھے رسوا کیا ہے۔"

"عدنان کی رگوں میں وفا کا لہو دوڑ رہا ہے مالک!" وہ سر جھکا کر روتے ہوئے بولا۔" میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ اپنے مالکوں میں سے کسی کا حکم مانا ہے۔"

عبدالباقر کسی خون آشام درندے کی طرح جھپٹا اور عدنان کا نرخرہ دبوچ کر اسے رگیدتا ہوا پچھلی دیوار تک لے گیا۔

"نام بتا۔ مجھے نام بتا اُس کا۔" عبدالباقر کا چہرہ بھیانک ہو گیا اور اس کے دہانے سے کف اُڑنے لگا۔

میں نے جھپٹ کر بدقت تمام عدنان کے حلقوم کو عبدالباقر کی آہنی انگلیوں کے شکنجے سے نجات دلائی اور وہ اسی دیوار سے ٹک کر ہانپنے لگا۔

"بول۔" میرے ساتھ لوٹتے لوٹتے عبدالباقر پھر بھڑک اُٹھا۔

"چھوٹی مالکن میرے مالک!" وہ اپنا گلا سہلاتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بولا اور اس بار اُس نے حلق میں خراش آ جانے کے باوجود توقف کا خطرہ مول نہیں لیا۔" انہیں زینی نے بہکایا تھا کہ تمہارا مہمان اپنے ساتھ جو عورت لایا ہے وہ تمہارے حرم کے لیے ہے اور اُسے مالکنوں میں شامل کرنے کے لیے تم چھوٹی مالکن کو چھوڑ دو گے تاکہ تم پر چار سے تجاوز کا الزام نہ آئے۔ مالکن پھوٹ پھوٹ کر رو ئی تھی۔ پھر زینی نے کہا کہ مالکن اگر اسے ایک اعتماد کا آدمی دے دیں تو کانوں کان کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ مہمان اور اس کی لائی ہوئی عورت کہاں گئی۔ یہ میری بدنصیبی ہے مالک! کہ مالکن نے میرا انتخاب کیا۔ اُن کا حکم تھا کہ میں زینی کا ساتھ دوں اور یوں تمہارے سامنے عمر بھر کی رُوسیاہی میرا مقدر بن گئی۔"

"چھوٹی مالکن۔" عبدالباقر نے ہونٹ بھینچ کر طیش کے عالم میں دہرایا۔ اُس کی حلقوں سے اُبلتی ہوئی آنکھیں خلا میں کسی نکتے پر مرکوز تھیں۔

پھر اس کا بھاری جسم ایک جھٹکے سے حرکت میں آیا اور وہ دروازے سے گزر کر زنان خانے کی طرف جانے والی راہداری میں غائب ہو گیا۔

کسی نے اپنی جگہ سے جُنبش تک کی۔

"اِسے روکو یوسف!" میں نے بازو پکڑ کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔" وہ اس وقت طیش میں ہے اور اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا ہے۔"

"اس وقت اس کا دماغ پھر گیا ہے، وہ راہ میں حائل ہونے والوں کو پیس کر رکھ دے گا۔" یوسف کی آنکھوں میں اس کی مجبوری عیاں تھی۔

حکم کا غلام عدنان دیوار سے ٹکا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اُس کی پشت پر زخموں سے رِسنے والے خون کے داغ سفید دیوار پہ اُس ظالمانہ تسلط کی کہانی رقم کر رہے تھے جس کے بل پہ وہ کڑیل جوان تشتیلینی غلام بن کر رہ گیا تھا۔

چند منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ عمارت کے در و دیوار کسی

عورت کی دردناک چیخوں سے گونجنے لگے۔

سیتا پہلو بدلنے لگی میرے بدن میں کروڑوں چیونٹیاں رینگنے لگیں کیونکہ عبدالباقر کی کرخت آواز میں گونجنے والی مغلظات ان چیخوں پر حاوی تھیں۔

چیخیں اور گالیاں لحظہ بہ لحظہ قریب آنے لگیں اور پھر فرطِ غضب سے کانپتے ہوئے عبدالباقر نے ایک دوشیزہ کو بالوں سے پکڑ کر کمرے کے وسط میں پھینک دیا۔

عبدالباقر کے وحشیانہ طمانچوں نے اس عورت کے نازک رخساروں کی جلد کو جگہ جگہ سے پھاڑ دیا تھا اور وہ کسی عقاب کے پنجے میں دبی ہوئی چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی۔

"اِس پر تھوکو۔ اسے ٹھوکریں مارو۔" عبدالباقر اس وقت واقعی پاگل نظر آ رہا تھا۔" یہ چھوٹی مالکن ہے۔ میری چوتھی بیوی جو ایک حرّافہ کے بہکاوے میں آ کر میرے دو مہمانوں کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔"

سیتا نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور عبدالباقر کے مقابل جا کھڑی ہوئی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"یہ کھیل ختم کرو۔" سیتا کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔

"تت۔۔۔ تم؟" سیتا کی وہ دخل اندازی اس قدر غیر متوقع تھی کہ عبدالباقر کے غصے پر حیرت غالب آ گئی۔

"ہاں۔ میں۔" سیتا کا لہجہ گمبھیر تھا۔" تم اپنے پالتو ناگ سے ڈسے گئے ہو میرے محترم دوست! یہ دونوں بے قصور ہیں۔"

"تم راستے سے ہٹ جاؤ۔" عبدالباقر نے اپنے بھڑک اُٹھنے والے غصے پر بمشکل تمام قابو پایا۔" یہ میری بیوی ہے میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ اس کی یہ مجال!"

"ایسی ہی نفرت ہو گئی ہے تو چھوڑ دو اِسے۔" سیتا کی معلومات کے ہر شعبے میں حیرتناک حد تک اضافہ ہوا تھا۔

وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنسا۔" چھوڑا تو یہ آزاد ہو جائے گی۔ میں اس پر اپنا حق برقرار رکھوں گا اور اسے سسکا سسکا کر زندگی کی قیمت بتاؤں گا۔ اس نے دو زندگیوں کا فیصلہ کیسے کر لیا؟"

ایک بڑا مقابلہ اچانک ہی ذاتی قسم کے گھریلو جھگڑے میں بدل گیا تھا۔

"زینی کو کس نے ملازم رکھا تھا؟" سیتا نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔" تم نے۔۔۔ اور اسی نے تمہاری بیوی کو بہکایا۔ اگر تم اسے قصوروار ہی کہتے ہو تو تم بھی برابر کے سزاوار ہو۔ ایک مشکوک عورت کو تمہارے حرم میں رسائی کیوں حاصل ہوئی اس کے ذمے دار تم ہو۔"

اس بار عبدالباقر کچھ نہ بولا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سیتا کا چہرہ تکتا رہا جس نے کوئی راہ نہ پا کر اس پر بھی فردِ جرم عائد کر دی تھی۔

بوجھل لمحات طویل سے طویل تر ہوتے گئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں گھورے جا رہے تھے۔ اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب عبدالباقر نے سر جھکایا اور دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر ایک گاؤ تکیے کے سہارے قالین پر بیٹھ گیا۔

"جاؤ حدلقہ!" اُس نے سر اٹھائے بغیر کمزور اور شکست خوردہ لہجے میں کہا اور قالین کے وسط میں پڑی اپنے وجود میں سمٹی ہوئی دھیمے دھیمے سسکتی ہوئی چھوٹی مالکن کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح تقریباً دوڑتی ہوئی راہداری میں غائب ہو گئی۔ یوسف نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں عبدالباقر کے پاس جا بیٹھے۔

"کوئی گستاخی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دینا میرے محسن!" سیتا نے نرمی سے عبدالباقر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم عظیم ہو۔۔۔ واقعی عظیم ہو، تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور سر بدستور دونوں ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا۔

پھر اُس نے عدنان کو پکارا جسے سب ہی فراموش کر چکے تھے۔

"جی مالک۔" وہ اپنی ذات کے سارے دُکھ بھول کر عبدالباقر کے سامنے جھک گیا تھا۔

"تو بھی عظیم ہے میرے لال!" اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

"جا شراب لے آ۔ تھوڑی سی نہ پی تو میں بکھر کر رہ جاؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ مالک کے وہ پیار بھرے بول سن کر وہ اپنی ساری تکلیف بھول گیا تھا۔ اُسے خوشی تھی کہ مالک نے اسے کوئی کام بتایا تھا۔

عبدالباقر نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں خشک انگاروں کی طرح لال ہو رہی تھیں۔" آج مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سبق ملا ہے۔" وہ بھاری آواز میں کہہ رہا تھا۔" نفس کو اگر کھلا چھوڑ دیا جائے تو یہ سر پر چڑھ کر ناچتا ہے۔ میں نے زینی کے حسن اور آوارہ مزاجی سے متاثر ہو کر اسے نوکر رکھا تھا اور آج اس نے میری بیوی کو میرے ہاتھوں رسوا کر دیا۔ بیوی تو ہر ایک کے لیے عزتِ نفس ہوتی ہے۔۔۔ زینی! میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔"

تینوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

اوپری دھڑ سے برہنہ اور اپنے خون میں ڈوبا ہوا عدنان ہاتھ دھو کر شراب کی ٹرے سجا کر لایا تو میں اپنے وجود کی گہرائیوں سے لرز اٹھا۔ اس کی ذات اس وقت اپنے نوکر کی زندگی کے بدترین تضاد کا بہترین شاہکار تھی۔

"تو جا۔ اور آرام کر۔" عبدالباقر نے کہا۔

"جو حکم مالک۔" وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

آتش صفت سیال کے پیمانے بھرے گئے جو تین تھے۔۔۔ سیتا

الگ بیٹھی رہی۔ عبدالباقر نے اس سے معذرت کی اور پورا پیمانہ پانی کی طرح اپنے معدے میں انڈیل لیا۔

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ زینی کا مقصد کیا تھا۔" اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"میرے ذہن میں کچھ خاکہ مرتب ہو رہا ہے۔" میں نے اپنے جام سے آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا کیونکہ وہ دونوں میرا پیمانہ خالی ہونے کے منتظر تھے۔

"وہ کیا؟" یوسف نے بیتابی سے لقمہ دیا۔

"زینی یہودی تھی۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اور یقینی طور پر اس کا تعلق صنعا میں کام کرنے والے زیرِ زمین اسرائیلی ہرکاروں سے ہے۔ اُسے صنعا میں اپنی خفیہ سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے کسی ظاہری آڑ کی ضرورت تھی لہٰذا اس نے عبدالباقر کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔"

"تمہارا قیاس درست ہے۔" عبدالباقر نے دُوسرے پیالے سے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ اکثر سے باہر جاتی رہتی تھی لیکن میں نے اس کی طویل غیر حاضریوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔"

"آج تم غیر معمولی طور پر حویلی سے باہر گئے ہو گے تو اسے پیشہ ورانہ طور پر تجسس ہوا ہو گا جو دلچسپی میں مزید تین نفوس کو ساتھ دیکھ کر اور بڑھ گیا ہو گا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ محض اتفاق تھا اور اس نے ہماری باتوں کی سُن گُن لیتے ہوئے یہ راز معلوم کر لیا کہ صفدر، سیتا سمیت اس چھت کے نیچے مقیم ہے۔ ایک عام اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں ایک مدت سے اسرائیل کے مفرور قومی مجرم ہیں بلکہ میرے لیے تو ایک زمانے میں خطیر انعام کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی زینی کا سازشی ذہن منصوبہ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا ہو گا جسے احمد اور یوسف کے ساتھ ہماری رہائی کی خبر پر تقویت ملی کیونکہ زینی اور اس کے شکاروں کے درمیان کوئی بڑی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ شاید اس نے بیگمات سے بھی رازدارانہ مراسم رکھے ہوئے تھے۔ اسے چھوٹی مالکن سب سے سہل چارہ نظر آئی اور اُسے طلاق کا ذہنی خطرہ سمجھا کر زینی نے حویلی میں من مانی کارروائی کر گزرنے کی کھلی اجازت حاصل کر لی۔۔۔۔"

"یہاں بھی۔۔۔ زینی نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا۔" عبدالباقر دلا۔ "حد لیقہ سے ابھی تک میری کوئی اولاد نہیں ہے لہٰذا نئی شادی کی صورت میں طلاق کا سب سے زیادہ خطرہ اسی کو درپیش تھا۔ زینی شاید ہی مقامی رواج سے واقف ہے۔"

"مگر آگے کا منصوبہ کیا تھا اس کا؟" یوسف نے بے تابی سے سوال کیا۔

"اپنی دانست میں مجھے اور سیتا کو قید کر کے وہ مطمئن ہو گئی۔ اسے پورا یقین تھا کہ عبدالباقر کا تشدد بھی ہم دونوں کا سُراغ نہ لگا سکے گا۔ وہ خاموشی سے یہاں سے رخصت ہو گئی اور شہر میں بکھرے ہوئے اپنے ساتھیوں اور وسائل کو یکجا کر کے رات گئے یہاں حملہ آور ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ اندر داخلے کے سلسلے میں اس سے اندازے کی کوئی غلطی ہوئی یا کوئی خلافِ توقع بات ہو گئی جس کے نتیجے میں گولیاں چل پڑیں ورنہ وہ سکون سے اندر گھستی اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے ہم دونوں کو تہ خانے سے نکال لے جاتی۔ چھوٹی موٹی مزاحمت کے لیے اس کے ساتھی ضرورت سے زیادہ مسلح تھے لیکن ان کی بدقسمتی کہ تمہاری حویلی میں گھسنے کے بعد وہ دونوں طرف سے گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیے گئے۔"

"تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے۔" عبدالباقر تیسرا پیگ تیار کرتے ہوئے بولا۔ "میرا دعویٰ ہے کہ زینی بھی اس سے آگے کچھ نہ بتا سکے گی۔"

"یہ نہ کہو۔ وہ بہت کچھ بتا سکتی ہے۔" اس کی کھدبُد کی اعتدال پر آ گئی تھی لہٰذا میں دوبارہ اس سے بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔

"اپنی تدفین کے مقام کے علاوہ بھلا کیا بتا سکے گی۔" وہ تنفر بلند کر بولا۔

"اس سے ان تمام لوگوں کے نام پتے اگلوائے جا سکتے ہیں۔ جو صنعا میں اسرائیلی مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی تھا۔" یوسف نے تائید کی۔

"ارے، اس کے زخم کا تو کسی کو خیال ہی نہیں رہا۔" عبدالباقر اچانک سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں بولا۔

"معمولی چوٹ ہے، خود ٹھیک ہو جائے گی۔" سیتا مسکرا کر بولی۔ اس نے اپنے زخم پر بندھا ہوا رومال نہ جانے کس وقت کھول دیا تھا۔

"آؤ آؤ۔" عبدالباقر بولا۔ "اسی طرف چلتے ہیں، دیکھیں زینی کس حال میں ہے اب تک تو اسے ہوش آ جانا چاہیے۔"

"اور یہ لاشیں یوں ہی پڑی سڑتی رہیں گی۔" یوسف نے اسے یاد دلایا۔

"ایک دفعہ ہم لوگ خود ان کا جائزہ لے لیں پھر پولیس کو مطلع کر دیں گے۔"

"پولیس کو؟" یوسف نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔ یہاں اتنی گولیاں چلی ہیں کہ گزرنے والوں نے آوازیں ضرور سنی ہوں گی مجھے تو حیرت ہے کہ اب تک پولیس کیوں نہیں پہنچی۔" میں نے عبدالباقر کی تائید کی۔

"اتنی رات گئے یہ سڑک عموماً ویران ہی رہتی ہے۔" اس نے مجھے بتایا۔ "لیکن پولیس کو مطلع کرنا پھر بھی مناسب ہو گا۔ زینی کو ہم غائب کر دیں گے۔"

"تو مجھے اور سیتا کو بھی یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔"

"کیوں؟"

"پولیس تفتیش شروع کرے گی تو ہم کو بھی سامنے آنا ہی پڑے گا۔"

"ہرگز نہیں۔" عبدالباقر پُر وثوق لہجے میں بولا۔ "تمہارا تو نام بھی نہ آ سکے گا۔ پولیس کو یہی بتایا جائے گا کہ پانچ نامعلوم افراد نے

ہمارے محافظ کو پھلانگ کر اندر گھسنا چاہا۔ انہیں للکارا گیا تو وہ مقابلے پر تل گئے اور آخر کار مارے گئے۔"

"تو پھر انتظام کرو۔"

"پہلے طبی امداد۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا اور ہم چاروں ایک طرف چل دیے۔

عبدالباقر کی حویلی میں طبی امداد کا معقول انتظام تھا۔ وہ اس وسیع عمارت ہی کا ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں سفید بستر اور دیگر لوازمات دیکھ کر ہسپتال کے کسی وارڈ کا گمان ہوتا تھا۔ وہاں زینی اس بستر پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی اور اس کے بائیں بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

عبدالباقر کے اشارے پر وہ دونوں سیتا کو ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے زخم کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ میں بھی اسی کے ساتھ رُکا رہا۔ وہ دونوں زینی کا جائزہ لینے لگے۔ ہمارا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ہمیں کچھ نظر نہ آتا۔

زینی پُورے تن و توش کی ایک صحت مند اور حسین عورت تھی جس پر اگر عبدالباقر پھسل گیا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کا پورا پیٹ موٹی پٹیوں میں بندھا ہوا تھا مگر اس کے باوجود تھوڑا بہت خون ان پٹیوں سے رس رہا تھا۔

سیتا کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر ہم لوگ لوٹ آئے ۔۔۔ عبدالباقر اپنے ملازمین کو ضروری ہدایات جاری کرنے کے بعد کوتوالی فون کرنے لگا۔

"اب تم تینوں ہی خود کو کسی ایک خوابگاہ میں مقفل کر لو۔" اس نے کہا۔ "میدان صاف ہونے پر میں دروازے پر تین بار مسلسل دستک دُوں گا۔"

"پکارو گے نہیں؟" میں نے مسکرا کر سوال کیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ اپنے سر پر دو ہتڑ رسید کر کے بولا۔ "میری بھی عقل پھر گئی ہے بھلا دستک کی کیا ضرورت ہو گی۔"

ہم تینوں نے اپنے لیے دوہرے بستر والی اسی خوابگاہ کا انتخاب کیا جہاں سے ہم دونوں کو اغوا کیا گیا تھا۔ عبدالباقر نے عارضی طور پر زبردستی اس کمرے میں تیسری مسہری بھی ڈلوا دی تاکہ ہم میں سے ہر ایک کو بستر مہیا رہے۔

"خون کے دھبوں والی چادر اسی کمرے میں ہونی چاہیے۔" کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد سیتا متجسس لہجے میں بولی اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے ایک الماری کے نچلے خانے میں ٹھونسی ہوئی وہ چادر برآمد ہی کر لی۔

صنعا کی پولیس میں شاید شان و شوکت کا جذبہ نمایاں تھا کیونکہ سائرن کی آواز سے ہمیں بھی ان کی آمد کا علم ہو گیا۔

"مجھے عبدالباقر کے اعتماد پر حیرت ہے۔" میں نے سگریٹ سُلگا کر کہا۔ "اتنی خونریزی کے باوجود اسے پولیس کی باز پرس کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

"وہ اس علاقے کا ایک مضبوط اور معزز آدمی ہے۔ اس کی بات کو عموماً چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔"

"پولیس کو اطلاع دینے سے قبل ہم لوگ لاشوں کا جائزہ لینا بھول گئے۔" میں نے کہا۔

"عبدالباقر نے دانستہ ارادہ ترک کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالنا چاہیے پولیس خود ہی اُن کا شجرہ دریافت کر لے گی۔"

"بہتر یہ ہو گا کہ روشنیاں گُل کر کے ہم لوگ خاموشی سے بستروں پر دراز رہیں۔" سیتا نے آہستہ سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ ہماری یہ خود اعتمادی ہمارے لیے کوئی دشواری پیدا کر دے۔ یہ کمرہ اس وقت ویران ہی محسوس ہونا چاہیے۔"

اس کا مشورہ معقول تھا لہٰذا روشنیاں گُل کر کے ہم تینوں اپنے بستروں پر آ گئے۔

بمشکل نصف گھنٹے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے سائرن بجاتی ہوئی دو گاڑیاں وہاں سے روانہ ہوئیں جس کا مطلب یہ تھا کہ عبدالباقر کی حویلی پر پولیس کی گاڑیوں کا پورا کارواں آیا تھا مگر آتے ہوئے شاید جلوس کی صرف اگلی کار کا سائرن استعمال کیا گیا تھا۔

ان دو گاڑیوں کے جانے کے بعد ہمیں انتظار کرتے کرتے صبح ہو گئی۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب خوابگاہ کے دروازے پر عبدالباقر کی تھکی ہوئی آواز سُنائی دی۔ وہ یوسف کو پکار رہا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آیا اور میری مسہری کے پاس پڑی ہوئی آرام کرسی میں دھنس گیا۔

"اب تک صفدر کے سارے قیاسات درست ثابت ہوتے آ رہے ہیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مرنے والوں میں سے ایک کو پولیس انسپکٹر نے شناخت کر لیا۔ وہ چند ماہ پہلے ایک غیر ملکی سفارتخانے کے ذریعے اسرائیل کو اہم معلومات بھیجنے کے شبہ میں پکڑا گیا تھا مگر ثبوت نہ ملنے کی بنا پر رہا ہو گیا تھا۔"

"اور کار کس کی ملکیت ہے؟" یوسف نے سوال کیا۔

"اس پر نمبر وغیرہ نہیں ہے۔ اب کوئی اور بات کرو، میں تو پولیس والوں کے سوالات دیتے دیتے اکتا گیا ہوں۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے یوسف سے سوال کیا کیونکہ اس کی آنکھوں سے تکان مترشح ہو رہی تھی۔

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک شخص نے راہداری میں دروازے سے دُور رُک کر اندر آنے کی اجازت طلب کی، اور عبدالباقر کی اجازت پا کر اندر آ گیا۔

"زینی ہوش میں آ گئی ہے۔" اس نے کہا اور ہم چاروں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔



"اُس سے محتاط رہ کر گفتگو کرنی ہوگی!" میں نے یوسف عبدالباقر اور سیتا کے ہمراہ زینی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"محتاط!" عبدالباقر تلخ لہجے میں ہنسا۔ "اس سے تو دو ٹوک بات کروں گا، زبان نہ کھولی تو اس کی ہڈیاں سرمہ کر دی جائیں گی۔"

"اگر وہ واقعی اسرائیلی سیکرٹ سروس کی رکن ہے تو محض تشدد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تو تمھاری کیا تجویز ہے؟" یوسف نے سوال کیا۔

"اُسے حالات سے بے خبر رکھنا ہوگا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے تمام ساتھی مقابلے میں ہی مارے گئے ہیں اور ہم اُن سے کچھ معلوم نہ کر سکے تو رازداری کی خاطر وہ ہمارے کسی حربے کو خاطر میں نہیں لائے گی۔"

"پھر تم ہی اس سے بات کرو گے۔" عبدالباقر نے کہا۔ "میں تو اس کی صورت دیکھتے ہی اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکوں گا۔"

"یہی بہتر ہوگا۔" یوسف نے اس کی تائید کی۔

ہم لوگ اس وسیع کمرے میں پہنچے جہاں سفید بستر کے ساتھ طبی امداد کے دیگر لوازمات بھی موجود تھے تو زینی نے مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔

اس کے پیٹ پر بندھی ہوئی پٹیوں پر خون کے دھبے... کافی پھیل چکے تھے اور وہ اس وقت مسہری کا سرہانا اونچا کیے بستر پر نیم دراز تھی۔

"تو تمہیں آزادی مل ہی گئی؟" اُس نے طنزیہ لہجے میں سب سے پہلے مجھے ہی مخاطب کیا تھا۔ اس کی آواز سے ہلکی سی نقاہت کے سوا ایسی کسی بات کا اظہار نہیں ہوا تھا جس سے گزرے ہوئے واقعات پر اس کی ندامت کا اظہار ہوتا۔

"تمھاری دانست میں کیا ہونا چاہیے تھا؟" میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر لاپروایانہ لہجے میں سوال کیا۔

اس وقت تک کمرے میں موجود میل نرس عبدالباقر کا اشارہ پاکر ایک دروازے کے عقب میں روپوش ہو چکا تھا۔

"مجھے خوشی ہوتی، اگر تم دونوں اسی تہ خانے میں بھوک اور پیاس سے سسک سسک کر مر جاتے۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "اور پھر وہاں سے پھوٹنے والا تعفن ہی عبدالباقر کے ملازموں کو اُدھر متوجہ کرتا۔"

میں نے بڑھ کر اس کے بھرے بھرے سرخ و سفید رخسار پر ایک بھرپور طمانچہ رسید کیا اور وہ کمرہ چٹاخ کی آواز سے گونج اٹھا۔

طمانچے کی شدت سے زینی کا چہرہ دوسری طرف گھوم گیا لیکن حیرتناک طور پر اس کے منہ سے اُف کی آواز تک برآمد نہ ہوئی۔

اس نے دوبارہ میری طرف دیکھا تو اس کا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا تھا اور تکلیف کی شدت سے آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے مگر اس کے باوجود اُس کی نگاہوں میں تنفّر کا ایک اتھاہ سمندر انگڑائیاں لے رہا تھا۔

"اب تمھارے تین ساتھی وہاں بند ہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ان میں سے ایک بہت بودا نکلا اور اُس نے سب کچھ اُگل دیا۔ اب شاید اس کے دونوں ساتھی اس کی بوٹیاں نوچ رہے ہوں گے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔"

"تمھاری حالت قدرے بہتر ہونے کا انتظار ہے پھر تمہیں بھی اُسی زیرِ زمین کمرے میں ہانک دیا جائے گا۔ اور پھر عبدالباقر کے پالتو عقابوں کی ایک بھوکی ٹکڑی تم لوگوں پر چھوڑ دی جائے گی۔" میرا لہجہ سرد اور بے رحمانہ تھا۔

"نن... نہیں ـــ ایسا نہیں ہو سکے گا۔" یکلخت اس کی آنکھوں



میں ہراس سمٹ آیا۔

"ایسا ہی ہوگا خوبصورت ناگن!" عبدالباقر کی پاٹ دار آواز گونجی۔ "تو نے اپنے جس ملائم اور دودھیا بدن سے مجھے زیر کیا تھا، اسے عقابوں کی خوراک بنا کر ہی مجھے چین آ سکے گا۔ تو نے میرے حرم کی حرمت کو پامال کیا ہے۔"

"یہ سب کس کے اشارے پر ہوا؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"میرے ساتھی نے یہ نہیں بتایا؟" اس کے لہجے میں ہراس، طنز اور تشویش کے ملے جلے اثرات نمایاں تھے۔

"وہ اسرائیلی ایجنٹ ہے..." میرے الفاظ سنتے ہی اُس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ "تم نے ان لوگوں کو صرف اتنا بتا کر جمع کیا تھا کہ اسرائیل کے دو اہم مجرموں کو ایک عمارت سے نکالنا ہے مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں یہ حکم کس نے دیا تھا؟"

"تم جیسے قابلِ نفرت مجرم کے لیے کسی کے حکم کی ضرورت نہیں تھی ہر ذمہ دار اسرائیلی یہ جانتا ہے کہ تمہاری گرفتاری میں مدد دینا اُس کا قومی فریضہ ہے۔" وہ فوری طور پر اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"تو تمہیں اعتراف ہے کہ تم ذمہ دار اسرائیلی شہری ہو؟" عبدالباقر نے غصے سے دانت پیستے ہوئے سوال کیا۔

"یہ کوئی جرم تو نہیں۔" وہ عبدالباقر سے مخاطب ہو گئی۔ "مقبوضہ علاقوں کے بہت سے مسلمان عربوں نے بھی اسرائیلی شہریت اختیار کی ہوئی ہے۔"

"بحث کے بجائے صرف اپنی بات کرو۔" وہ غرایا۔ "انہوں نے مجبوریوں کے تحت یہ ناپاک طوق اپنے گلے میں لٹکایا ہے۔"

"جب میری زندگی کے بارے میں تم ایک فیصلہ کر چکے ہو تو اب

مجھ سے یہ باز پرس کیوں کی جا رہی ہے؟"

"شاید تمھاری زندگی کو کچھ طول مل جائے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "عبدالباقر کو تمھارا بدن اب بھی پسند ہے۔"

میں نے دیکھا کہ میرے الفاظ پر غصے سے عبدالباقر کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ زبان کھولے بغیر اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"کیا یہ ... کہہ رہا ہے میرے آقا؟" اس نے پُرامید لہجے میں سوال کیا۔

"پہلے اس کے سوالات کے جواب دو، بعد میں مجھ سے بات کرنا۔" عبدالباقر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"میرے ساتھیوں میں سے کس نے تمھارے سامنے اعترافات کیے ہیں؟" اس نے چند ثانیوں کی الجھن آمیز خاموشی کے بعد سوال کیا۔

"مائیکل سمعون نے۔" میں نے بلا تامل اسی شخص کا نام لے ڈالا جس کی لاش پولیس انسپکٹر نے ماضی کے ایک مشکوک ملزم کے طور پر شناخت کی تھی۔

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"تمھیں صرف اسی سے نہیں بلکہ اپنے دیگر ساتھیوں سے بھی ملنے کا پورا موقع فراہم کیا جائے گا۔" میں نے خلوصِ نیت سے کہا۔ "اس سے پہلے تمھیں یہ بتانا ہوگا کہ صنعا میں تمھاری تنظیم کا سربراہ کون ہے اور اس کے کیا روابط ہیں۔"

"شاید تم کو یہ سوالات کرتے ہوئے خود بھی اندازہ رہا ہوگا کہ ایک اچھا سیکرٹ ایجنٹ محض اپنی زندگی کے لیے اپنے کسی یونٹ کی سلامتی کو داؤ پر نہیں لگاتا۔ شاید تم لوگ مجھے زندگی کی بھیک دے دو مگر یہ سب اگل کر میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں موت کو دعوت دوں گی۔ وہ پاتال میں بھی مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"تمھیں بھرپور تحفظ دیا جائے گا..."

"تم اُن سے واقف نہیں ہو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "وہ دشمنوں سے زیادہ غدار کو خطرہ سمجھتے ہیں۔ کسی بھی لمحے عقاب کی طرح تمھاری نگاہوں کے سامنے سے مجھے اُچک لے جائیں گے اور تم کچھ بھی نہ کر سکو گے۔"

"اس مبالغہ آرائی کی ضرورت نہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "تمھیں امان محض اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ تم ہمیں مطلوبہ معلومات فراہم کر دو تاکہ آئندہ تم ان سے رابطہ قائم کرنے کی ہمت ہی نہ کر سکو۔"

"تم اُن سے بھی تصادم مول لو گے؟"

"سامنے کی بات ہے، کوئی بھی اپنی سرزمین پر دشمنوں کا خفیہ وجود تک برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم اُن کی فوری بیخ کنی کریں گے۔" یوسف نے بڑھ کر کہا۔

"تم مائیکل کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟" اس نے لحظہ بھر کی خاموشی کے بعد سوال کیا۔ "وہ اُس سے خود ہی سب کچھ اُگلوا لیں گے۔"

"ہمیں سبق نہ پڑھا اُلو کی پٹھی!" عبدالباقر کے صبر کا پیمانہ آخرکار چھلک ہی گیا۔ "ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

زینی کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی جس میں پہلی بار اعتماد نمایاں تھا۔ "تم بہت جلدی جھلا جاتے ہو مالک! میں اتنی بھی بری نہیں ہوں۔"

"صنعا میں تمھارے سربراہ کا نام!" میں نے اسے للکارا۔ "اور دوسرے کوائف، ہم تم پر زیادہ وقت برباد نہیں کر سکتے۔"

"میں صرف سربراہ کا نام ہی بتاؤں گی۔"

"چلو وہی بتا دو۔"

"مالک کو تخلیے میں بتاؤں گی۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"نہیں!" عبدالباقر پیر پٹخ کر چیخا۔ "یہیں سب کے سامنے بتاؤ۔"

"پھر تمھارے کان میں بتاؤں گی۔"

زینی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ عبدالباقر کے ملازم عدنان نے بھی چھوٹی مالکن کا نام ظاہر کرنے سے پیشتر دردمندانہ لہجے میں اپنے آقا سے تخلیے میں بات کرنے کی درخواست کی تھی جسے عبدالباقر نے ٹھکرا دیا تھا۔ زینی کے الفاظ سن کر مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ خود بھی عبدالباقر کے اہلِ خانہ میں ہی سے کسی کے احکام کی تابع نہ رہی ہو اور اس کے ایسے انکشاف کا مطلب یہ ہوتا کہ یمن میں اسرائیلی سیکرٹ سروس کی مقامی تنظیم عبدالباقر کی بے خبری میں اسی کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہی تھی۔

"کان میں نہیں، باآوازِ بلند بتاؤ۔" عبدالباقر جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بس یہی تو میری ایک شرط ہے۔" وہ پُراعتماد انداز میں مسکرائی۔ "اس سے آگے تم میرا کیا حشر کرو گے، وہ میں بخوبی جانتی ہوں اور یہ بھی یقین ہے کہ میری پوری کوشش کے باوجود میرے انجام میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہو سکے گی۔"

"سن لو ابوکفایہ!" یوسف نے عبدالباقر کو اس کی کنیت سے پکارتے ہوئے نرم آواز میں مشورہ دیا۔

"تم لوگ نہ جانے مجھے کیوں مجبور کیے جاتے ہو۔" وہ تاؤ میں آ کر بڑبڑاتے ہوئے زینی کے بستر کے قریب جا رُکا۔ اور پھاڑ کھانے والے انداز میں غرّایا۔ "اب بکو۔"

"میں زخمی ہوں مالک! اُٹھ کر تم تک نہیں پہنچ سکتی۔ تمھیں ہی جھکنا ہوگا۔" وہ کہنیوں کے سہارے اپنے جسم کا زاویہ قدرے تبدیل کرتے ہوئے بولی۔

عبدالباقر نے اپنا چہرہ گھما کر بایاں کان زینی کے دہانے کے قریب کیا، زینی کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور اس نے اپنی ہتھیلیوں میں عبدالباقر کا سر تھام کر پوری قوت سے اپنے دانت اُس کے کان میں پیوست کر دیے۔

عبدالباقر کی بے ساختہ چیخوں نے ہم تینوں کو ہی بوکھلا دیا۔ وہ بری طرح مچل کر زینی کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن زینی کسی جونک کی طرح اس سے لپٹی ہوئی تھی اور شاید اس کا کان جڑ سے کاٹ لینے کے لیے کوشاں تھی۔

عبدالباقر نے اندھا دھند دونوں ہاتھ چلائے اور زینی کی پسلیوں پر ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی لمحے اُسے زینی کے پنجے سے نجات مل گئی۔

زینی کا سُرخ و سفید چہرہ اُس وقت کسی ایسے خون آشام درندے کی تصویر یاد دلا رہا تھا۔ جو اپنے تازہ شکار سے فراغت کے بعد ایک گوشے میں جا بیٹھا ہو۔ اس کے رخساروں، دہانے اور گردن پر عبدالباقر کے کان سے بہا ہوا تازہ خون موجود تھا اور پھر اس نے دونوں ہونٹ سکوڑ کر اپنے منہ میں دبا ہوا ایک بڑا سا خون آلود لوتھڑا فضا میں اچھال دیا جو واضح طور پر عبدالباقر کا بایاں کان تھا۔

میں زینی کی اس حیوانی بربریت پر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

زینی کے تیز دانتوں سے نجات ملتے ہی عبدالباقر کے دونوں ہاتھ تیزی سے بائیں کان کی طرف گئے تھے اور زخم چھوتے ہی اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی من پسند یہودی کنیز کے طفیل اپنے ایک کان سے محروم ہو چکا تھا۔

وہ تیزی سے لپکا اور اپنے خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے زینی کے بال جکڑ کر اس کے چہرے پر دیوانہ وار ٹکریں برساتا چلا گیا۔ عبدالباقر کی اس وحشیانہ یورش نے زینی کے اوسان خطا کر دیے اور در و دیوار اس کی چیخوں سے لرز اٹھے۔ اس نے عبدالباقر کو روکنے کی پوری کوشش کی لیکن اُسے کامیابی نہ ہو سکی بلکہ چند ہی ثانیوں میں اس کے چہرے کا حلیہ بگڑ گیا۔

میں یوسف کے ساتھ مل کر بمشکل عبدالباقر کو روک سکا اور وہ ہانپتا ہوا ایک کرسی پر گر گیا۔ زینی اس سے پہلے ہی بے ہوش ہو چکی تھی۔

اس کمرے میں اس قدر شور شرابا ہوا تھا لیکن عبدالباقر کے کسی بھی خادم نے وہاں رُونما ہونے والے واقعات میں مداخلت کی کوشش نہیں کی لیکن بیتا کو صورتحال کی نزاکت کا پورا احساس تھا۔ لہٰذا وہ اس دروازے سے نکل گئی جس کے عقب میں زینی کی دیکھ بھال کرنے والا میل نرس روپوش ہوا تھا۔

چند ثانیوں بعد ہی وہ دو آدمیوں کے ساتھ آ پہنچی۔ اسی دوران میں، میں یوسف کی مدد سے اس کا خون آلود چہرہ صاف کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

اپنے مالک کی ڈراؤنی حالت دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئے، اور اس کی طرف لپکے لیکن عبدالباقر نے انہیں روک دیا۔

"پہلے اسے دیکھو۔" اس نے فرش پر پڑے ہوئے اپنے کان کے خون آلود لوتھڑے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "اگر اس میں جان ہے تو میں اسے جڑوانا چاہوں گا۔" اس کا سانس ضرور پھولا ہوا تھا لیکن آواز سے کسی تکلیف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

ان دونوں نے پھرتی کے ساتھ وہ لوتھڑا اُٹھایا اور واش بیسن میں اُس پر اسپرٹ کی پوری بوتل خالی کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے چہرے اُتر گئے۔

زینی نے دانتوں سے عبدالباقر کا کان کاٹ لینے کی کوشش میں عملاً اُسے بری طرح چبا ڈالا تھا۔ اور اسے دوبارہ جوڑنے کی کوئی اُمید نہیں رہ گئی تھی۔

پھر عبدالباقر کے کان کی دیکھ بھال شروع ہو گئی۔

یوسف نے اس اثنا میں زینی کا جائزہ لے ڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ عبدالباقر نے اس سے اپنے زخم کا بھرپور انتقام لیا تھا۔ زینی کے اگلے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے۔ ہونٹ کچل کر لہولہان ہو گئے تھے۔ ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور آنکھوں کے اوپری حصے بھی ٹکروں سے محفوظ نہیں ہو سکے تھے۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" یوسف نے کچھ دیر کے سکوت کے بعد کسی کو خاص طور پر مخاطب کیے بغیر سوال کیا۔

"اس نے ابوکفایہ کے ساتھ بدسلوکی کر کے اپنے عزائم کا اظہار کر دیا ہے۔" میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "اس سے مزید کچھ معلوم ہونے کی اُمید نہیں لہٰذا اس کی پرورش بے سود ہی ثابت ہو گی یہ ہمارے لیے بے کار ہے۔"

"اسے مجھ پر چھوڑ دو۔" عبدالباقر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں چند روز اُسے اپنی تحویل میں زندہ رکھوں گا۔ اس کے بعد ہی کچھ ہو سکے گا۔" میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا تھا۔ اس کے لب و لہجے سے اُس کی نیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

عبدالباقر کے زخم کی مرہم پٹی میں خاصا وقت صرف ہوا۔ اس کے دونوں ملازمین کو طبی معاملات میں خاصی دسترس تھی۔ انہوں نے چند تجربے کر کے یہ یقین کر لیا تھا کہ بیرونی زخم کی وجہ سے عبدالباقر کے بائیں کان کی سماعت متاثر نہیں ہوئی تھی۔

اپنی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر عبدالباقر نے اپنے ملازمین کو زینی کے بارے میں علیحدگی میں کچھ ہدایات دیں اور وہ فوراً باہر چلے گئے۔

جس وقت ہم چاروں اس کمرے سے نکل رہے تھے تو وہ دونوں اس کمرے میں ایک اسٹریچر لے کر داخل ہو رہے تھے۔

عبدالباقر کے زخم میں تکلیف کے ساتھ ہی سر میں بھی شدید درد ہو رہا تھا۔ اور اسے فوری طور پر آرام کی ضرورت تھی لہٰذا ہم نے اصرار کر کے اُسے اندر بھیج دیا۔

"خون اور لاشیں دیکھ دیکھ کر میرا سر چکرا رہا ہے۔" اس کے جانے کے بعد یوسف نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"بس یہی غنیمت ہُوا کہ ان میں میری اور سینتا کی لاشیں شامل ہونے سے بال بال بچ گئیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ احمد روانہ ہو گیا؟"

"ہاں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ہم لانچ کی روانگی کے بعد ہی گھاٹ سے لوٹے تھے۔ اب مجھے اس کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہے۔"

"اِن گھمبیر حالات میں تو مجھے اپنی روانگی کے بارے میں سوچنا بھی جرم محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تمھارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہو گا۔" اس نے کہا۔ "یہاں کے حالات بہت غیر یقینی بلکہ مخدوش ہو گئے ہیں۔"

"اس تصادم کے نتیجے میں؟" سینتا نے سوال کیا۔

"ارے نہیں!" وہ ہنس پڑا۔ "ایسے واقعات عبدالباقر جیسے بارسوخ لوگوں کے لیے کوئی دشواری پیدا نہیں کرتے۔"

"پھر تم کن حالات کی بات کر رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"جنوبی سرحدوں پر کچھ قبائل نے بغاوت کر دی ہے وہاں دن رات فضاؤں میں بارود کی بُو رچی رہتی ہے۔ ایسے حالات میں مقامی سلامتی کے ذمہ دار حکام ہر غیر ملکی کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہیں اتفاقاً تم کسی دشواری میں پڑ گئے تو گلو خلاصی حاصل کرنی دشوار ہو جائے گی۔"

"میرے لیے تو یہ خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم دونوں اب جلد از جلد پاکستان پہنچنے کے لیے بے چین ہیں۔"

"میری پوری کوشش ہو گی کہ پہلی فرصت میں تمھیں یہاں سے روانہ کر دوں۔ اگر روانگی صحیح کاغذات پر ہوئی تو پاکستان پہنچنے میں تمھیں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔"

"مجھے خوشی ہے کہ ہمارے معاملے کے ہر پہلو پر تمھاری نگاہ ہے۔"

"روانگی سے پہلے میں یہ ضرور جاننا چاہوں گی کہ عبدالباقر نے زینی کے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔" سینتا نے یوسف سے کہا۔

"وہ میں ابھی بتا سکتا ہوں۔" یوسف کے بجائے میں نے کہا۔ "زینی نے اپنے آقا سے بہت بڑی نمک حرامی کی ہے اور عبدالباقر اسے شایانِ شان سزا سے نوازنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

مزید کچھ دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد یوسف اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہم دونوں بھی بستر پر دراز ہو گئے۔

پچھلی رات بھی بھاگ دوڑ اور بیداری کے عالم میں گزری تھی جس کے ازالے کے لیے ہم دونوں نے دن میں سو جانا چاہا لیکن زینی اور عدنان کی سازش نے اس نیند کو بے ہوشی میں بدل دیا جس کے نتیجے میں پچھلی شب بھی بیداری کے عالم میں بسر ہوئی لہٰذا اس وقت ہم دونوں کے ذہن نیند سے بوجھل ہوتے جا رہے تھے۔

نیند کا وہ وقفہ طویل ضرور تھا مگر اس کا اختتام رضاکارانہ طور پر نہیں ہُوا بلکہ فائروں کی آواز نے میری اور سینتا کی نیند پر کلپ اثر ڈالا تھا۔

آنکھ کھلنے پر پہلے تو میں نے ان آوازوں کو اپنے وہم کی پیداوار سمجھا لیکن جب دوبارہ باہر ایک رائفل کا دھماکا گونجا تو میں نے بستر چھوڑ دیا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو دیوان خانے میں یوسف ایک خدمت گار سے باز پرس میں مصروف تھا اور اس کے چہرے پر تشویش کے آثار ہویدا تھے۔

"باہر نکل کر دیکھنا پڑے گا۔" میرے قدموں کی آہٹ سنتے ہی یوسف میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "ابھی تک کچھ علم نہیں ہو سکا ہے۔"

"چلو۔" میں اس کے ساتھ نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

صبح صادق کی خونریز جھڑپ کے اثرات سے بوجھل ذہنوں پر اس وقت کی اِکا دُکا فائرنگ نے بہت ناخوشگوار اثر ڈالا تھا۔

اس وقت سورج اپنے سفر کی آخری منزل پر تھا اور حویلی کے سامنے اُگے ہوئے تناور درختوں کے نیچے خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ مجھے اِن درختوں میں کئی افراد رائفلیں سنبھالے ٹارچوں کی روشنی میں کسی کو تلاش کرتے نظر آئے۔

"ہم لوگ غیر مسلح ہیں۔" یوسف کو اچانک یاد آیا۔

اسی لمحہ حویلی کے محافظوں میں سے ایک شخص دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل موجود تھی۔

"تم لوگ اندر چلے جاؤ۔" ہمارے قریب رُک کر اس نے بلا کسی تمہید کے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ اپنے ہی کسی آدمی کا نشانہ بن جاؤ۔"

"مگر ہوا کیا ہے؟" یوسف نے سوال کیا۔

"احاطے کے آخری سرے والی دیوار پھاند کر دو آدمی ویران حصے میں کودتے دیکھے گئے ہیں۔ ان ہی کی تلاش جاری ہے۔" اس نے چوکنی نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تو اتنی جلدی وہ کہاں غائب ہو گئے؟"

"اس طرف گھنے درختوں کے ساتھ ہی لمبی لمبی خودرو گھاس بھی اُگی ہوئی ہے، اتنی آسانی سے ان کا سُراغ نہ مل سکے گا۔"

"اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے مشکوک حصے کا محاصرہ کر ڈالو۔" میں نے کہا۔ "اور دو رائفلیں ہمیں بھی دے دو ہم تمھارے ساتھ اُدھر چلیں گے۔"

اس نے خوبصورتی سے ہمیں ٹالنا چاہا۔ اسی اثنا میں ایک شخص یہ خبر بھی لے آیا کہ عبدالباقر کسی مسکن دوا کے زیر اثر اپنی خواب گاہ میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔

"اس کی غیر موجودگی میں خاصی ذمہ داری ہم پر بھی آ گئی ہے۔" یوسف نے محافظ سے کہا۔ "جو کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرنے میں تاخیر نہ کرو۔"

ناچار اُسے اسلحہ خانے سے دو رائفلیں ہمارے حوالے کرنی پڑیں۔ اسی کے ساتھ تیز روشنی والی ٹارچیں بھی تھما دی گئیں۔

پھر پانچ افراد کے ساتھ ہم اس دُور افتادہ حصے کی طرف دوڑ پڑے جدھر مشکوک افراد کودتے دیکھے گئے تھے۔

حویلی کے صحیح طول و عرض کا اندازہ مجھے اسی وقت ہو سکا کیونکہ احاطے کے آخری سرے تک پہنچنے میں سبھی کے سانس بے قابو ہو گئے تھے۔

چند افراد پہلے سے وہاں موجود تھے اور اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے لمبی گھاس میں دور تک چکراتے پھر رہے تھے۔

"تم لوگ یہیں رُک کر مورچے سنبھال لو۔" میں نے بقیہ پانچوں کو ہدایت دی۔ "تاکہ انھیں حویلی تک پہنچنے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔"

"اور اگر وہ اس طرف نکل ہی چکے ہوں؟" یوسف نے شبہ کا اظہار کیا۔

"نہیں۔" ہمیں ہتھیار فراہم کرنے والے نے سختی سے اس امکان کو رد کر دیا۔ "انھیں دیکھتے ہی میرے دو آدمی ادھر آ گئے تھے۔ وہ ابھی تک اسی خودرو جنگل میں کہیں روپوش ہوں گے اور زیادہ دیر تک محفوظ نہ رہ سکیں گے۔"

"پھر میرے ساتھ آؤ۔۔۔ انھیں اندر کودتے کس نے دیکھا تھا؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"عبداللہ کی نگاہ پڑی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اور اس نے فوراً ہی شور مچا دیا تھا۔ وہ اس وقت حویلی کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پھولوں کے تختوں سے خشک پتے چن رہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے اسے وہم ہوا۔" یوسف نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ بہت ہی متین طبیعت کا آدمی ہے۔" محافظ نے کہا۔ "جس بات کا اسے پورا یقین نہ ہو اُسے زبان سے نہیں نکالتا۔"

پھر ہم تینوں جھاڑیوں کو روندتے ہوئے احاطے کی دیوار کے قریب اس جگہ پہنچ گئے جہاں عبداللہ مالی کے بیان کے مطابق مداخلت کار کودے تھے۔

میں دیوار کے ساتھ نرم زمین پر غور سے کسی قسم کے نشانات تلاش کرنے لگا۔ میرا رویہ حویلی کے محافظ کی سمجھ سے بالاتر تھا لیکن پھر بھی وہ کوئی تعرض کیے بغیر میرا ساتھ دیتا رہا اور آخرکار اسی کی آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

وہ دیوار سے چند منٹ فٹ کی دُوری پر کچلی ہوئی گھاس پر جھکا ہوا تھا۔ ہم دونوں اُدھر پہنچے تو اس کی ٹارچ کی روشنی میں دھات کا ایک مختصر سا ڈبہ وہاں پڑا چمک رہا تھا۔

اِن اطراف میں ننگی زمین نہ ہونے کے برابر تھی لہٰذا اس گھاس میں وہ غیر معمولی چیز بھی ہمارے لیے اہم تھی۔

محافظ نے ہمیں متوجہ کرنے کے بعد وہ ڈبہ جھک کر اٹھانا چاہا اور وہ ڈبیہ ایک تیز دھماکے سے پھٹ گئی۔

میں یوسف کو لے کر اگر گھاس پر نہ گر جاتا تو شاید اس دستی سرنگ سے اُڑنے والے دھات اور بارود کے ذرات ہمیں بھی زخمی کر دیتے۔

دھماکا معدوم ہوتے ہی ہم محافظ کی طرف لپکے تو وہ شدید زخمی حالت میں گھاس پر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

اس بارودی سرنگ نے اس کا داہنا ہاتھ، سینہ اور چہرہ بری طرح جھلسا دیا تھا اور شاید اس کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

اس سے پیشتر کہ اس بدنصیب کو طبی امداد پہنچانے کا بندوبست کیا جاتا، اس نے اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں میں سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ بارودی سرنگ کا دھماکا اتنا شدید تھا کہ درختوں اور خودرو گھاس میں بھٹکتی ہوئی ساری نفری وہیں جمع ہو گئی تھی اور ٹارچوں کے متحرک انعکاس میں ان سب کے بشروں سے عجیب سی دہشت ہویدا تھی۔

"سب لوگوں کو درختوں میں سے باہر بلا لو۔" میں نے بلند آواز میں احتیاطی ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی بھی شخص کسی مشکوک چیز کو چھونے یا اس کی جگہ سے ہلانے کی کوشش نہ کرے۔ یہاں بارودی سرنگیں بکھری ہوئی ہیں۔"

اس انکشاف نے ان میں ہراس کی لہر دوڑا دی اور جو اکا دُکا فرض شناس محافظ اس وقت تک درختوں میں بھٹک رہے تھے، وہ واپس بُلا لیے گئے۔

اسی اثنا میں اسٹریچر فراہم کر لیا گیا تھا۔ تین افراد مرنے والے کو اس پر اٹھا کر حویلی کی پُرشکوہ عمارت کی طرف چل دیے۔

"عمارت سے احاطے پر روشنیاں پھینکنے والا انتظام آج کیوں ناکارہ ہے؟" میں نے درختوں میں پھیلی ہوئی خوف اور تاریکی کو دیکھ کر پچھلی رات کے تجربے کی روشنی میں سوال کیا۔

"کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا۔" اندھیرے میں کسی مقامی کی آواز اُبھری اور کچی زمین پر ایک آدمی کے قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔

"یہ بارودی سرنگ کہاں سے آ گئی؟" اضطراب اور تجسس کے ان لمحات میں یوسف کی تشویش زدہ آواز اُبھری۔

"کسی باہر کے آدمی کا کام ہے، پورے جنگل کی تلاشی لیے بغیر کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔" میں نے رائفل شانے سے لٹکا کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیسا نتیجہ؟" عبدالباقر کے آدمیوں میں سے کسی کی تحیّر آمیز آواز ابھری۔ "تو کیا اب بھی اندر کسی کالی بھیڑ کی موجودگی کا خطرہ ہے؟"

"نہیں!" میں نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "اتنی تگ و دو کے بعد بھی کوئی ہاتھ نہیں لگ سکا۔ ہو سکتا ہے کہ جس وقت عبداللہ نے۔۔۔"

اسی وقت حویلی پر لگی ہوئی طاقتور سرچ لائٹیں روشن ہو گئیں اور وہ علاقہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔

روشنی ہوتے ہی ان سب پر جوش کی سی کیفیت طاری ہو گئی مگر کالی بھیڑ کی موجودگی کے بارے میں سوال کرنے والا میرے ادھورے جواب کو نہ بھول سکا۔

"تم کیا کہہ رہے تھے معلّم؟" اس نے آگے بڑھ کر مودّبانہ لہجے میں سوال کیا اور میں بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر لیکن تنومند مقامی تھا جس کے چہرے پر پڑی ہوئی بے شمار شکنیں اس کے پُرمشقت ماضی کی کہانی سُنا رہی تھیں۔

"سب لوگ دوبارہ اندر گھس جاؤ۔" میں نے بآوازِ بلند کہا۔ "اور جہاں بھی کوئی غیر معمولی چیز پڑی دیکھو، اسے چھوئے بغیر مجھے اطلاع دو۔"

"عبدالباقر کی غیر موجودگی میں یہی ہم سب کا سربراہ ہے۔" یوسف نے اُن پر میری حیثیت جتانا ضروری سمجھی ورنہ وہ میری ہدایات سے انحراف بھی کر سکتے تھے۔

میرے سامنے کھڑا ہوا ادھیڑ عمر بھی میری عمومی ہدایت سنتے ہی سر جھکا کر واپسی کے لیے مُڑا تھا لیکن میں نے اُسے روک لیا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"عبداللہ۔" اس نے انکساری سے جواب دیا۔ "میں مالی ہوں یہاں۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تو تم ہی نے ان دونوں کو احاطے کی دیوار سے اندر کودتے دیکھا تھا؟"

"ہاں مالک!" اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"تم نے انہیں کہاں دیکھا تھا؟"

"احاطے کی دیوار پر مالک!" اس نے میرا سوال نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "تم یقین کرو کہ میں اس وقت پوری طرح اپنے حواس میں تھا بس اتفاقاً ہی اس طرف نظر پڑ گئی ورنہ بے خبری میں نہ جانے وہ حویلی میں کہاں تک۔۔۔"

"صحیح طرح یاد کر کے بتاؤ کہ وہ کہاں کہاں تھے؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"بتا تو رہا ہوں مالک!" اس نے حیرانی سے کہا۔

"وہ دونوں دیوار پر تھے یا ان میں سے کوئی نیچے بھی کود چکا تھا؟" میں نے سگریٹ کا کثیف دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک تو دیوار پر ہی تھا۔ دوسرا دیوار کی طرف منہ کیے دونوں ہاتھ اٹھا کر شاید اپنے ساتھی کو نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔" اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے انہیں اندر کودتے نہیں دیکھا؟"

"وہ اجنبی چہرے تھے مالک۔ ظاہر ہے کہ اندر ہی کود رہے تھے۔"

"تم نے جو دیکھا صرف وہی بتاؤ۔" یوسف نے سخت لہجے میں اس باتونی مالی کو ٹوکا۔ "نتائج ہم خود اخذ کر لیں گے۔"

"اُن کی جھلک دیکھتے ہی میں نے پلٹ کر چور چور کا شور مچایا تھا۔ چند ثانیوں بعد دوبارہ اس طرف دیکھا تو وہ دونوں غائب تھے، شاید انہوں نے نیچے گر کر خود کو لمبی گھاس میں چھپا لیا تھا۔" وہ قیاس آرائی کے معاملے میں اپنی عادت سے مجبور نظر آ رہا تھا۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے عبداللہ کہ جب تم نے انہیں دیکھا تو وہ اندر اپنا کوئی خطرناک کام پورا کر کے اس راستے سے فرار ہو رہے ہوں؟" میں نے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر سوال کیا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے۔" اس کے منہ سے بہ دقت تمام نکلا۔ "مگر وہ اندر کیا کرنے آئے تھے جو یوں واپس جا رہے تھے۔"

"ان درختوں میں انتقام کی آگ بکھیرنے۔" میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا کہ اتنی بھیڑ میں ایک آدمی مارا گیا اور کوئی کچھ نہ کر سکا۔"

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تو وہ موت بانٹنے آئے تھے۔۔۔ مم۔۔۔ مگر تم نے یہ سب کچھ کیسے سمجھ لیا؟"

"محض قیاس ۔۔۔ شاید اس کی تصدیق بھی ہو جائے۔"

چند ثانیوں بعد یوسف کے اشارے پر وہ وہاں سے چلا گیا۔

"یہ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟" اس کے چلے جانے کے بعد یوسف نے سوال کیا۔

"انہیں دیوار کے قریب دیکھتے ہی شور مچا دیا گیا تھا۔ درخت گھنے ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ بیس بائیس کی نفری اتنی دیر تک دو آدمیوں کا سراغ نہ لگا سکے اور اتنی قلیل مدّت میں وہ درخت عبور کر کے حویلی کی طرف پناہ نہیں لے سکتے تھے جس کا صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جس وقت انہیں دیکھا گیا وہ فرار ہو رہے تھے۔"

"ظاہر ہے کہ اندر بھی اسی راستے سے آئے ہوں گے۔" یوسف نے کہا۔

"زینی اور اس کے ساتھیوں کے انجام کی خبر اُن لوگوں تک پہنچ چکی ہے جو اس حملے کے پس پردہ کام کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ

[illegible] بڑی جوابی کارروائی نہیں کر سکتے لیکن عبدالباقر کو یہ بھی جتانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ہار نہیں مانی لہٰذا اُن کے دو آدمی اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر یہاں گھسے اور بارودی سرنگیں بکھیر کر واپس بھاگ نکلے۔"

یوسف میرے خیال کی تائید میں قدرے متردّد تھا لیکن نصف گھنٹے بعد جب اسے پھاٹک سے تھوڑے فاصلے پر درختوں میں دوسری بارودی سرنگ کی موجودگی کی اطلاع ملی تو اسے بھی میرا ہمنوا ہونا پڑا۔

احاطے کے اس حصّے سے پھاٹک تک کی مسافت اتنی طویل تھی کہ آناً فاناً میں کارروائی کرنے والوں کے لیے وہ فاصلہ طے کرنا محال تھا مزید تین گھنٹے کی شدید چھان بین کے بعد تیرہ بارودی سرنگیں اصلی حالت میں دریافت کر لی گئیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ حادثاتی طور پر عبدالباقر کا کوئی آدمی ان کا شکار نہیں ہوا تھا اور تلاش کی مہم بخیر و خوبی اختتام کو پہنچ گئی۔

ان بارودی سرنگوں کو وہاں سے ہٹانے کا سوال آیا تو پتہ چلا کہ عبدالباقر کی حویلی میں پلنے والے ملازمین کی فوجِ ظفر موج میں کسی کو بھی بارودی ہتھیاروں کو بحفاظت ناکارہ کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ اسی اثنا میں عبدالباقر بھی وہاں آ پہنچا۔

اس کے بائیں کان کے قریب جبڑے پر کافی ورم آیا ہوا تھا جب کہ کنپٹی زخم سمیت ڈریسنگ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا خون آلود لباس تو شاید سونے سے قبل ہی تبدیل کر لیا تھا کیوں کہ اس وقت وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔

غالباً اُسے بیدار ہوتے ہی باہر رونما ہونے والے واقعات کی اجمالی اطلاع دی گئی تھی اور وہ صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے لباس تبدیل کیے بغیر باہر آ گیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے چند قدم دور ہی سے ہم لوگوں کو دیکھ کر بآوازِ بلند سوال کیا۔

"درختوں میں بارودی سرنگیں بکھری پڑی ہیں۔" یوسف نے اپنی آواز میں بحالی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ شاید مجھے ہی سمیٹنی پڑیں گی۔"

اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ یوسف فلسطینی حریت پسند ہونے کے ناتے روایتی اور جدید طرز کے اسلحے سے بخوبی واقف تھا اور وہی بارودی سرنگوں کے خطرے سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"بارودی سرنگیں؟" عبدالباقر حیرت سے کہہ رہا تھا۔ "وہ یہاں کون پھیلا گیا؟"

میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے ایک طرف لے گیا اور اسے پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس دوران میں یوسف ایک آدمی کو ساتھ لے کر اپنا کام نمٹانے کے لیے گھنے درختوں میں گھس گیا۔

"واللہ! اگر مجھے ان میں سے کسی کی بھنک بھی مل گئی تو اُس کے چیتھڑے اڑا دوں گا۔" وہ غضب آلود لہجے میں بولا۔ "خدا کی پناہ! انہوں نے میرے گھر میں گھس کر میرے دو آدمی مار ڈالے اور میں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔"

"یہ نہ کھوا ابو کھایہ!" میں نے اُسے یاد دلایا۔ "تم نے بڑی بے رحمی سے اُن کے پانچ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور زینی تمھاری قید میں ہے۔"

"جب تک اپنے دو کے بدلے اُن کے بیس ٹھنڈے نہ کر دوں گا، چین نہیں آئے گا۔" کشت و خون کے معاملے میں اس کی ذہنیت بالکل قبائلی تھی۔

میرے لیے اس سے اُلجھنا بے سود تھا لہٰذا میں نے گفتگو کا رُخ اس کے زخمی کان کی طرف کر دیا۔

"اس نے کسی کُتیا کی طرح پورا کان جڑ ہی سے چبا ڈالا ہے۔ اب جب تک وہ میرے سامنے درد اور اذیت سے نہیں تڑپے گی، میں اپنی تکلیف نہ بھول سکوں گا۔"

"پھر تم میں اور اس میں کوئی فرق رہ جائے گا؟" میں نے جھرجھری لیتے ہوئے سوال کیا۔

"میں دشمن سے اسی کی سطح پر رہ کر مقابلہ کرنے کا قائل ہوں۔" وہ تنفر آمیز لہجے میں بولا۔ "میں اپنی شان کے چکر میں رہا تو وہ کوئی دوسرا چرکا لگانے میں کامیاب ہو جائے گی۔"

"تمھارے آدمی مجھے کس نام سے جانتے ہیں؟" میں نے قدرے توقف کے بعد دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"کسی بھی نام سے نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اُن کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ تم میرے ایک معزز مہمان ہو۔"

"مگر نام پھر بھی ضروری ہے۔" میں نے بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کسی وقت تم ہی کو پکارنا پڑ جائے۔"

"طیب مناسب رہے گا؟" پہلی بار اس کا لہجہ قدرے نرم ہوا۔

یوسف کی واپسی تک ہم وہیں رکے رہے پھر عبدالباقر نے اپنے ملازمین کو کسی نامعلوم دشمن کے حوالے سے ہمہ وقت مستعد اور مسلح رہنے کی ہدایات دیں اور ہم تینوں حویلی کی جانب واپس روانہ ہو گئے۔

اندر سیتا خاصی پریشان تھی۔ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اس کے بستر کی بحالی واپس لوٹ آئی۔

عبدالباقر دیوان خانے میں پہنچتے ہی فون پر مصروف ہو گیا اور یوسف سیتا کو باہر پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

فون پر عبدالباقر کا رابطہ قائم ہوا تو گفتگو سنتے ہی سب چونک پڑے۔ وہ کسی پولیس افسر سے بات کر رہا تھا۔

دورانِ گفتگو عبدالباقر کے لہجے سے مسلسل برتری کا اظہار ہوتا رہا۔ ایک دو بار اس کی زبان بے لگام ہو کر کچھ لوگوں کے لیے گالیوں کی طرف مائل ہو گئی۔ پھر اُس نے پُرجوش انداز میں سلسلہ منقطع کر دیا۔

"پولیس والے کام دکھانے پر تل جائیں تو مُردوں کا بھی شجرہ اگلوا لیتے ہیں۔ انہوں نے مرنے والوں میں سے ایک کو شناخت کر لیا ہے۔" اُس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"کون ہے وہ؟" یوسف نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

"مائیکل ٹرمپ کے گروپ کا آدمی ہے۔ یہ اپنی دہشت گرد کے ساتھی یہاں کرائے کے گوریوں کا کردار ادا کرتے آئے ہیں۔"

"مگر اُس کی شناخت کیسے ممکن ہوئی؟" یوسف کے لیے وہ موضوع بہت زیادہ دلچسپ ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"اُس کے سینے پہ گدے ہوئے نشان سے۔" عبدالباقر نے بتایا۔ "ہتھکڑی کی دو ٹوٹی ہوئی کڑیاں اُن کا شناختی نشان ہیں۔"

"انہوں نے ایک اور کو بھی تو پہچانا تھا جو ایک غیر ملکی سفارت خانے کے ذریعے اسرائیل کو اہم معلومات فراہم کرنے کے شبہے میں پکڑا گیا تھا مگر بعد میں ناکافی شواہد ہونے کی وجہ سے بری ہو گیا تھا۔" میں نے عبدالباقر کو یاد دلایا۔

"سب ہی ایک واقعہ کی کڑیاں ہیں۔" عبدالباقر گہرا سانس لیکر بولا۔ "قوی شبہ ہے کہ مائیکل کے گروپ کو بھی اسی سفارت خانے کے کسی اہم افسر کی پشت پناہی حاصل ہے۔"

"تو اب پولیس کیا کر رہی ہے؟"

"قانون ثبوت کے بغیر کسی جرم کو تسلیم نہیں کرتا۔" عبدالباقر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "پولیس کی بھاری نفری سادہ لباس میں سفارت خانے کے عملے کی نگرانی پر مامور کر دی گئی ہے مگر میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔ ان سے پہلے کچھ کر گزرنا چاہتا ہوں۔"

"ہم دونوں کی یہاں موجودگی کی وجہ سے تمھاری حویلی ان لوگوں کا نشانہ بن رہی ہے۔" میں نے قدرے توقف سے کہا۔ "آثار بتا رہے ہیں کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم خاموشی سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔"

"عبدالباقر اتنا بزدل نہیں ہے میرے دوست!" وہ تڑپ کے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "مہمانوں کی حفاظت میں میرے دو کیا دس آدمی بھی کام آ جائیں تو میں منہ نہیں موڑوں گا۔"

"جذباتی نہ ہو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں تو انہیں سامنے لانے کی ایک راہ تجویز کر رہا ہوں۔"

"تجویز کوئی بھی ہو، اگر اس میں تمہاری یہاں سے منتقلی شامل ہے تو میں سُنے بغیر رد کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی بات کرو۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"تمھاری حویلی میں صرف زینی اُن کی مخبر تھی۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "اس کے قید ہو جانے کے بعد اب وہ اندر کے حالات سے لاعلم ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہم کو تم خاموشی سے یہاں سے نکال دو تو انہیں کوئی علم نہ ہو سکے گا اور اُن کا منصوبہ بُری طرح ناکام ہو جائے گا۔"

"جلدی کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" عبدالباقر نے بے تابی سے ٹوکا۔

"وہ ہر قیمت پر ہمیں اسی حویلی میں محصور رکھنا چاہیں گے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے آدمی ہر وقت حویلی میں ہونے والی آمد و رفت کی نگرانی کریں۔ اب اگر حویلی میں سے ایک بند کار مشتبہ انداز میں نکل کر تیز رفتاری سے کسی طرف روانہ ہوتی ہے تو نگرانی کرنے والوں کو پہلا شبہ یہی ہوگا کہ اُن کے مطلوبہ افراد نکلے جا رہے ہیں اور وہ تعاقب کریں یا براہِ راست تصادم کی راہ اختیار کریں انہیں سامنے آنا ہوگا اور قدرے بعد میں روانہ ہونے والی مسلح آدمیوں کی ایک ٹولی پہلے سے طے شدہ کسی مقام پر بند کار کی مدد سے انہیں گھیرے گی اور وہ چوہے کی موت مار دیے جائیں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" عبدالباقر مضطرب ہو گیا۔ "باہر سے حویلی کی نگرانی ضرور کی جا رہی ہو گی لیکن ہم ان کا کھوج نہیں لگا سکتے۔ ہر طرف بے شمار ٹیلے، جھاڑیاں اور گڑھے پھیلے ہوئے ہیں۔ جو اُن کی بہترین کمین گاہ ثابت ہو رہے ہوں گے۔"

"انہیں بل سے باہر نکالنے کی بس یہی ایک صورت ہے۔ اگر اُن پر جوابی وار نہ ہوا تو وہ اپنی قوت مجتمع کر کے حملہ آور ہوں گے۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"لیکن تمھارے منصوبے میں ایک خرابی ہے۔" یوسف نے اعتراض کیا۔ "اگر پچھلی کار کے ذریعے گھیرے جانے سے قبل وہ بم پھینک کر اگلی کار کو تباہ کر کے بھاگ نکلے تو کیا ہو گا؟"

"اور اس کا قوی امکان ہے۔" عبدالباقر نے اس کی تائید کی۔ "مائیکل ٹرمپ کا گروپ انتہا پسند کارروائیوں کے سلسلے میں بدنام ہے انہیں ذرا بھی خطرہ محسوس ہوا تو ....."

میں اچانک ہی ہنس پڑا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" عبدالباقر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر مجھے گھورنے لگا۔

"میرے سارے مفروضے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ نگرانی کرنے والوں کے پاس کوئی کار بھی ہو گی جس پر سوار ہو کر وہ ہماری پہلی بند گاڑی کا تعاقب کریں گے۔" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "اور اگر اُن کے پاس کوئی کار بھی موجود ہے تو وہ یقیناً سڑک کے آس پاس کہیں موجود ہو گی تاکہ ضرورت کے وقت اسے فوری طور پر حرکت میں لایا جا سکے۔ آدمی گڑھوں میں یا ٹیلوں

یا جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ سکتے ہیں اپنی جگہ بھی بدل سکتے ہیں لیکن کار اس طرح نہیں چھپائی جا سکتی۔ ہم بآسانی اس کا سُراغ لگا کر اسے ناکارہ کر سکتے ہیں۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" عبدالباقر نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اپنے چند آدمی باہر بھیجتا ہوں پھر ساری صورتحال واضح ہو جائے گی۔"

عبدالباقر نے اپنے کسی مُلازم کو پکارا اور فوراً ہی عدنان اندر آ گیا۔ اس وقت وہ قرینے کے لباس میں تھا لیکن اس کا ورم آلود اور زخمی چہرہ اس وقت بھی رحم انگیز تھا۔

عدنان کے ذریعے محافظوں کے سربراہ کو طلب کر کے عبدالباقر نے حویلی کے اطراف میں نظر آنے والی کسی بھی مشکوک کار کو آگ لگا کر برباد کرنے کی سخت ہدایات دیں۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد اپنی پژمردہ طبیعت کی بحالی کے لیے مے نوشی میں مصروف ہو گیا۔ اس شغل میں اس کا ساتھ دینے کے لیے وہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

ایک گھنٹے بعد اطلاع ملی کہ حویلی تو درکنار اس سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے دائرے میں بھی کوئی کار موجود نہیں تھی۔

میرے لیے یہ اطلاع ناقابلِ فہم تھی لیکن عبدالباقر کے آدمیوں کے مشاہدے پر اعتراض کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟" عبدالباقر نے مجھ سے سوال کیا۔

"میری تجویز اب بھی برقرار ہے۔" میں نے کہا۔

"نگرانی نہ ہونے کا ثبوت مل جانے کے باوجود؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی نے تعاقب نہ کیا تو چند میل کا چکر کاٹ کر دونوں گاڑیاں واپس آ جائیں گی۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تعاقب کے بارے میں اب بھی مشکوک ہو؟"

عبدالباقر کے اس چبھتے ہوئے سوال نے اچانک میرے ذہن کے دریچے کھول دیے۔

ہمارا واسطہ اٹھائی گیروں سے نہیں بلکہ گروہ بند دشمنوں سے تھا۔ جو اسلحے کے ساتھ ہی جدید ترین ذرائع سے استفادہ کرنے کی بھرپور۔۔۔ صلاحیتوں کے مالک تھے۔

حویلی کی اگر نگرانی جاری تھی تو اس کا تسلسل برقرار رہنا ضروری تھا۔ اگر اس کام پر مامور لوگ ہی کسی مشکوک گاڑی کے پیچھے ہو لیتے تو حویلی سے اُن کا رابطہ ٹوٹ جاتا۔ پھر یہ امکان بھی اُن کے پیشِ نظر رہا ہو گا کہ اس ویران سڑک پر زیادہ دیر تک کھڑی ہوئی کوئی بھی لاوارث سواری ان مخصوص حالات میں حویلی کے مکینوں کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی لہٰذا اس کا بہترین متبادل یہ تھا کہ حویلی کے سامنے ان کے ایک دو آدمی محدود حیطۂ عمل کے جیبی ٹرانسمٹر لیے اپنے مورچے پر ڈٹے رہتے اور وہاں سے گزرنے والی واحد سڑک کے دونوں سروں پر ایک آدھ میل آگے اُن کے ساتھی گاڑیوں میں کسی اوٹ میں چھپے رہتے۔ اور جوں ہی حویلی سے کوئی مشکوک کار روانہ ہوتی۔ نگرانی کرنے والے اس سمت میں موجود اپنے ساتھیوں کو ٹرانسمٹر پر چوکنا کر دیتے اور یوں ایک دو میل کی ویران مسافت کے بعد اس کار کا تعاقب شروع ہو جاتا۔

میری گفتگو یوسف کے لیے قابلِ قبول تھی لیکن عبدالباقر کے لیے وہ تمام باتیں نہایت سنسنی خیز ثابت ہوئیں اور وہ بے اعتباری سے میرا منہ تکنے لگا۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ڈیڑھ دو میل کے دائرے میں کام کرنے والے وائرلیس ٹرانسمٹر صنعا کے بازاروں میں بچوں کے کھلونوں میں دستیاب ہیں جو بیس پچیس ریال میں بآسانی مل جاتے ہیں۔" یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ امکان بھی خاصا قرینِ قیاس ہے۔"

"پھر تو باہر نکلنا ہی چاہیے۔" عبدالباقر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "دیکھا جائے کہ ماضی کے کتابی طریقے آج کس حد تک عمل میں آ رہے ہیں۔"

"لیکن تم حویلی ہی میں ٹھیرو گے۔" یوسف نے سختی سے کہا۔ "تمھارا زخم خراب حالت میں ہے، ایسا نہ ہو کہ اس سے دوبارہ خون جاری ہو جائے۔"

"ان حالات میں ہم تینوں میں سے ایک کو تو یہاں رکنا ہی ہو گا۔" اُس نے خلافِ توقع لاپروائی سے کہا۔ "چلو میں ہی رُک جاؤں گا۔"

"مگر میں ساتھ چلوں گی۔" سینا نے طویل سکوت کے بعد زبان کھولی۔

عبدالباقر نے زبان کھولنی چاہی مگر اس سے پہلے میں نے سینا کی تائید کر ڈالی اور وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

پھر فوری طور پر تیاریاں شروع ہو گئیں۔

پہلی گاڑی کے طور پر بند آہنی باڈی والی سیاہ سینڈ رووَر جیپ کا انتخاب کیا گیا جس میں بھاری اسلحہ سمیت چار افراد کو روانہ ہونا تھا۔

دوسری گاڑی عبدالباقر کی سیاہ بیوک تھی جس میں ڈرائیور کے ساتھ میری یوسف اور سینا کی روانگی طے پائی۔ مہم پر روانہ ہونے والوں کے علاوہ بقیہ عملے کو پورے معاملے سے الگ رکھا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عبدالباقر سینڈ رووَر والوں کو صحیح منصوبہ نہیں بتائے گا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے اپنے مالک کی بات ختم ہوتے ہی سعادت مندی سے اپنے سر کو جھکا کر قربانی کا بکرا بننے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

راستہ طے کر لیا گیا تھا۔ اگلی جیپ کو صنعا کے مضافات سے گزرنے والی سڑک پر سفر کرتے ہوئے شہر کے شمال مشرق میں صحرا کی طرف جانے والی شاہراہ پر بڑھنا تھا۔ اسے اپنی رفتار کی حد چالیس میل فی گھنٹہ سے متجاوز نہیں کرنی تھی تاکہ اس کی روانگی کے سات منٹ بعد جب بیوک روانہ ہو تو جلد از جلد اس کے قریب پہنچ جائے۔

دونوں گاڑیوں کی روانگی میں سات منٹ کا وقفہ سوچ سمجھ کر رکھا گیا تھا تاکہ حویلی کے سامنے مامور افراد اپنے ساتھیوں کو وائرلیس ٹرانسمٹر پر دوسری گاڑی کی روانگی سے مطلع نہ کر سکیں۔ اس کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی تھی کہ ہمارے دشمن چار میل کے دائرے میں کام کرنے والے ٹرانسمٹر سے لیس ہوں گے۔ اُن کے پاس اگر زیادہ طاقتور ٹرانسمٹر ہوتے تو ہماری مہم خاصی خطرناک

بلکہ تباہ کاری کا شکار ہو سکتی تھی جس کا مداوا بھی شاید ممکن نہ ہوتا۔

ٹھیک ساڑھے سات بجے سیاہ سینڈ رووَر اپنے چار سواروں کو لے کر سبک رفتاری سے آگے بڑھی اور پھاٹک سے نکل کر بائیں طرف روانہ ہو گئی۔

بیوک کا ڈرائیور گاڑی میں اپنی نشست پر تیار بیٹھا تھا اور ہم چاروں برآمدے میں کھڑے بار بار اپنی گھڑیوں پر نگاہ ڈال رہے تھے۔

وقت کی رفتار اس وقت سُست ہو گئی تھی۔ سیکنڈ کی سوئی رُک رُک کر چلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سارا منصوبہ چونکہ میرا اپنا تھا لہٰذا میری حالت زیادہ متاثر تھی۔ اعصاب پر عجیب سی بے چینی طاری تھی۔ جو پے در پے سگریٹ نوشی سے بھی کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور خنکی کے باوجود میری بغلوں سے پہلوؤں پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

"تم پریشان ہو؟" عبدالباقر مجھے اضطراری طور پر بار بار اپنی خشک پیشانی پونچھتے دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"وقت تھما ہوا محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے اپنی آواز کھوکھلی محسوس کی۔ اس وقت میرے لیے اپنی اس غیر معمولی کیفیت کو کوئی نام دینا ممکن نہیں تھا۔

"گھڑیاں چل رہی ہیں ابھی صرف پینتالیس سیکنڈ گزرے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے شانے پر جھک آیا۔ "فکر نہ کرو، زیادہ گڑبڑ ہوئی، تو زیادہ سے زیادہ وہ چاروں مارے جائیں گے۔ تمھارا مشورہ قبول کرتے ہی میں نے ذہنی طور پر خود کو اس بدترین صورتحال کے لیے تیار کر لیا تھا۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ اس اثناء میں ایک منٹ پورا ہو چکا تھا۔

اچانک فضا میں بوجھل سی مشینی گونج سُنائی دینے لگی جو تیزی سے واضح ہوتی جا رہی تھی۔

میرے خلجان میں اضافہ ہو گیا کیونکہ وہ گونج میرے لیے مانوس تھی یوسف کی قیام گاہ پر فوجی چھاپے سے پہلے فضا میں وہی گڑگڑاہٹ سُنائی دی تھی اور اس بار ان آوازوں میں شدت تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ آس پاس سے کوئی فوجی قافلہ گزر رہا تھا۔

ڈیڑھ منٹ گزرا۔ بھاری گاڑیوں کے انجنوں اور ٹائروں کی آسیبی گونج میرے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی۔

"شاید فوجی گاڑیاں آ رہی ہیں۔" یوسف نے پہلو بدل کر کہا۔

"اِدھر؟۔۔۔ اِدھر فوجی گاڑیوں کا کیا کام؟" عبدالباقر بھی تذبذب میں پڑ گیا۔

"شاید کسی مہم سے لوٹ رہے ہوں۔" یوسف نے عبدالباقر کو جواب دینے کے بجائے گویا خود کو باآواز دلاسا دیا۔

اچانک حویلی کے احاطے کا پھاٹک روشنی میں نہا گیا۔

فوجی گاڑیوں کے انجنوں کا تسلسل بے ترتیبی میں بدل گیا۔ چند انجن تیزی سے غرّا کر بند ہو گئے، بعض کی رفتار سُست ہو گئی اور کھلی ہوئی باڈی والا ایک دیوقامت فوجی ٹرک کچے راستے پر اچھلتا ہوا حویلی کے کھلے ہوئے پھاٹک سے اندر گھس آیا۔ اُس کے پیچھے دوسری گاڑیوں کی روشنیاں تھیں جو یقینی طور پر اندر آنے والی تھیں۔

دو منٹ دس سیکنڈ ہوئے تھے، بیوک کے ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو ریورس گیئر میں تیز رفتاری سے ایک ذیلی راہداری پر لیتا چلا گیا۔

"جاؤ، تم تینوں اندر جاؤ۔" عبدالباقر کی آواز سے پہلی بار خوف کی لرزش نمایاں تھی لیکن ہم اس کے کہنے سے پیشتر کھلے ہوئے دروازے میں گھس چکے تھے۔

پھاٹک سے حویلی تک خاصا راستہ تھا اور پھر عمارت پر روشن سرچ لائٹس کی چکاچوند میں شاید آنے والوں کو برآمدے میں ہونے والی بھاگ دوڑ بالکل نہ سجھائی دی کیونکہ ٹرک بدستور یکساں رفتار سے بڑھتا آ رہا تھا

"میں ان کی آمد کا مدعا معلوم کر کے دوبارہ لوٹتا ہوں۔" عبدالباقر ہمارے قریب کھڑا خوفزدہ سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "تم یہیں چھپے رہو۔ اگر ان کے براہِ راست اندر گھسنے کا خطرہ ہو تو درمیانی راہداری سے سیدھے زنان خانے میں گھستے چلے جانا۔ وہاں لیلیٰ تمھاری رہنمائی کرے گی۔"

یہ کہہ کر وہ دوبارہ باہر نکل گیا۔

سب سے آگے آنے والا فوجی افسر شاید عبدالباقر کے لیے اجنبی تھا کیونکہ اُسے رسمی سے انداز میں خوش آمدید کہا گیا تھا۔

"شیخ عبدالباقر؟" وہ کرخت اور تحکمانہ آواز یقیناً آنے والے فوجی افسر کی تھی۔

"ہاں!" عبدالباقر کا لہجہ حیرت ناک طور پر جھلاہٹ آمیز تھا۔ "لیکن یہ بھاری نفری، اسلحے اور گاڑیوں کی بھرمار؟ میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میرے غریب خانے کو اس عزت افزائی کا مستحق کیوں سمجھا گیا؟"

عبدالباقر کے طنز پر شاید وہ تلملا اٹھا ہو۔ "میں بریگیڈیئر حماد ہوں شیخ۔۔۔ ہمیں معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ تمھاری حویلی میں ریاست کے تین سازشی پناہ گزین ہیں۔ دو مرد اور ایک عورت، ہم انہیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

عبدالباقر اس وقت نازک صورتحال سے دوچار تھا، لیکن اس کی کھوپڑی اس یلغار کو قبول کرنے پر کسی طرح تیار نہیں تھی۔ "قانون تمھارا مطیع ہے بریگیڈیئر! اس مکان میں مرد بھی بہت ہیں اور عورتیں بھی۔ جسے چاہو اپنا مجرم قرار دے کر لے جاؤ۔ میری دانست میں اس چھت کے نیچے اس وقت ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"ہم ضابطے کی کارروائی کریں گے۔" بریگیڈیئر کا لہجہ تلخ تھا۔ "اور امید کرتے ہیں کہ تم ہمیں عمارت کے چپے چپے تک رسائی کا موقع دو گے۔"

"عورتیں ساتھ لائے ہو؟" اس بار عبدالباقر کی آواز تضحیک آمیز تھی۔ "میرے حرم میں مرد تو درکنار خواجہ سرا بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔"

"حد سے نہ بڑھو شیخ!" وہ غصے سے لرزتی آواز میں غرّایا۔ "ہمیں

کچھ نہ مل سکا تو بھرپور معذرت کر کے لوٹ جائیں گے۔ ہمارے حرم کی طرف ہمارا کوئی آدمی نہ بھٹکے گا۔"

پٹ کی طرح قبضوں کے سہارے کھل گیا اور بیلی ہمیں لے کر اندر داخل ہو گئی اور اندر گھس کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب ہم چاروں اس قدر [illegible]

"سینڈ روڈ میں جانے والے تو بے چارے بے موت ہی مارے گئے۔" اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "انہیں گئے ہوئے انتیس منٹ ہو چکے ہیں۔"

"مگر اب ہم کہاں جائیں گے؟" سیتا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

جلا کر کار میں آگے پیچھے دیکھا تھا۔ میں نے اسلحے پر کپڑا ڈال دیا تھا مگر دونالیں پھر بھی ننگی تھیں۔ انہوں نے اسلحے پر ذرا بھی توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

کچھ نہ مل سکا تو بھرپور معذرت کر کے لَوٹ جائیں گے۔ تمہارے حرم کی طرف بھلا کوئی آدمی نہ پھٹکے گا۔"

"تم بہت شریف النفس ہو۔" عبدالباقر کا لہجہ یک بیک نرم پڑ گیا۔ "تمھاری زبان سے چپے چپے کا تذکرہ سُن کر میں تو سمجھا تھا کہ آج میرے حرم کی آبرو بھی پامال ہوئی۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ عبدالباقر نے ہمیں روک کر ہمیں پوری صورتحال سُنانے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا ہم تینوں نے اشاروں ہی اشاروں میں فیصلہ کیا اور تیزی سے زنان خانے کی طرف جانے والی درمیانی راہداری میں ہو لیے۔

طویل اور خمدار راہداری کے اختتام پر خاصا وسیع صحن تھا جس کے اختتام پر ایک فصیل نما دیوار بنی ہوئی تھی۔ یوسف ہم دونوں کو اسی فصیل نما دیوار میں نصب چوبی دروازے کی طرف لیتا چلا گیا۔

دروازہ کھولتے ہی وسیع ڈیوڑھی موجود تھی جہاں ایک تخت پر دُودھیا رنگت والی ایک خوش جمال دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی اور فصیل کے پیچھے سے عورتوں اور بچوں کے ہنسنے بولنے کی ملی جُلی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

پانچ منٹ پورے ہونے والے تھے اور ہم اسی حویلی میں ایک گمبھیر صُورتِ حال سے دوچار ہو چکے تھے۔

زینی نے ہم سے بدترین انتقام لیا تھا اور انتقام کی بنیاد یہ تھی کہ ہم اس کے وطن کے سفاک حکمرانوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔

وہ ہماری مخالف تھی اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ صفدر اور سیتا یوسف سمیت عبدالباقر کی حویلی میں موجود ہیں لہٰذا اُس نے یہ خبر اپنے ہمدردوں تک پہنچا دی اور جب وہ لوگ ہمیں زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو غالباً انہوں نے کسی گمنام لیکن مؤثر ذریعے سے یہ اطلاع ان کے فوجی حکام تک پہنچا دی جو پہلے ہی یوسف کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اور یوں مجرموں نے ہمارے خلاف قانون کی مقامی قوت کو بھرپور طریقے پر اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔

"لیلیٰ؟" یوسف کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ اس سہمی ہوئی دوشیزہ کے چیخنے سے پہلے ہی سوال کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اُس کے لب ہلے لیکن خوف سے سوکھی زبان سے کوئی آواز نہ برآمد ہو سکی۔ تو اُس نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہم شیخ کے مہمان ہیں اسی نے ہمیں تمھاری طرف بھیجا ہے۔" یوسف نے جلدی سے کہا۔

"آؤ۔" اس کی قوتِ گویائی بحال ہو گئی اور وہ اپنے تخت کے مقابل والی دیوار میں لگے ہوئے ایک چوبی فریم کے وسط میں لگا ہوا گول دستہ گھمانے لگی۔

چند مخصوص حرکات کے بعد وہ چوبی فریم کسی دروازے کے پٹ کی طرح قبضوں کے سہارے کھل گیا اور لیلیٰ ہمیں لے کر اندر داخل ہو گئی اور اندر گھس کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور ہم چاروں اس قدر گھور اندھیرے میں گھر گئے کہ ایک دوسرے کے ہیولے کو دیکھنا بھی ناممکن ہو کر رہ گیا۔

"آگے ڈھلان ہے، سنبھل کر میرے پیچھے چلے آؤ۔" لیلیٰ کی دھیمی آواز کی گونج سے اندازہ ہوا کہ اس راستے کی تعمیر کسی تہ خانے کے طرز پر ہوئی تھی۔

سانسوں اور قدموں کی گونج میں خاصی ڈھلان اُترنے کے بعد ہم اس تنگ سرنگ کے مسطح حصّے میں آ گئے جو ہمیں زنان خانے سے بچا کر نکاسی کے کسی محفوظ راستے پر لیے جا رہی تھی۔

"ہمیں کہاں لیے جا رہی ہو؟" کچھ دیر تک چلتے رہنے کے بعد سیتا سوال کر بیٹھی۔

"حویلی سے باہر عقبی ویرانے میں۔" اس کی آواز میں اس وقت پہلی بار مٹھاس محسوس ہوئی۔

"اُدھر تو ریت کے تودوں اور جھاڑیوں میں خطرناک حشرات الارض بھی ہیں۔" یوسف کی قدرے تشویش زدہ آواز اُبھری۔

"مجھے تم تک بھیجے جانے کا مطلب یہی ہے کہ میں اس راستے سے تمہیں بحفاظت باہر نکال دوں۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔ "اس سے آگے سوچنا اور عمل کرنا تمھارا کام ہوگا۔"

سفر خاموشی سے جاری رہا۔ تاریک سرنگ کے مسطح حصّے میں دو موڑ گھومنے کے بعد قدرے چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ بات حیرت ناک تھی کہ سرنگ تاریک ہونے کے باوجود ہوادار تھی۔ اس میں گھٹن یا کسی قسم کی بدبُو کا احساس نام کو نہیں تھا۔

پھر ہم سب ہی روانی میں ایک دوسرے سے جا ٹکرائے کیونکہ سُرنگ اچانک ہی ختم ہو گئی تھی اور لیلیٰ کو بھی آخری سرا قریب آنے کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

اندھیرے میں ہمیں پیچھے سرکا کر لیلیٰ نے کسی میکانزم کو جنبش دی اور اس سرنگ کا سامنے والا حصّہ بے آواز ایک طرف سرک گیا۔

"جاؤ۔" لیلیٰ کی آواز سپاٹ تھی۔

ہم تینوں یکے بعد دیگرے اس چوکور سوراخ سے جھک کر گزرے اور ہمارے باہر آتے ہی سوراخ دوبارہ بند ہو گیا۔

اس وقت ہم لق و دق ریگستان میں حویلی کی عقبی دیوار سے ملحق ایک جوہڑ نما خشک قدرتی گڑھے میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے کھڑے ہوئے تھے جس سوراخ سے ہم باہر برآمد ہوئے وہ فصیل نما دیوار کے اس نچلے حصّے میں نمودار ہوا تھا جو خشک جوہڑ میں بنا ہوا تھا۔

"یہ تو سب کچھ ہی چوپٹ ہو گیا۔" میں نے تازہ ہوا میں گہرے سانس لیتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں یوسف سے کہا۔

"سینڈ روور میں جانے والے تو بے چارے بے موت ہی مارے گئے۔" اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "انہیں گئے ہوئے انتیس منٹ ہو چکے ہیں۔"

"مگر اب ہم کہاں جائیں گے؟" سیتا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

"میں موجود ہوں مستی!" اچانک قریب ہی سے آواز آئی اور ہم تینوں حیرت سے اچھل پڑے۔

ہم تینوں فوراً ہی اس کھڈے کے کناروں پر چڑھ کر اوپر آ گئے اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عبدالباقر کی عالیشان سیاہ بیوک اس ناقابلِ سفر حصّے میں موجود تھی اور سیتا کو مخاطب کرنے والا وہی شخص تھا جسے بیوک کے ڈرائیور کے طور پر ہمارے ساتھ جانا تھا۔

"تم؟ یہاں کیسے پہنچے؟" میں نے اُسے پہچانتے ہی سوال کیا۔

"مالک کا حکم تھا، آنکھ بند کر کے گاڑی لیتا چلا آیا۔ بعض جگہ نچلا حصّہ بُری طرح گڑھوں اور اُبھاروں سے ٹکرایا ہے۔ خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہوگی۔" اس نے بتایا۔

"لیکن تمہیں آنے کی اجازت کیسے ملی؟"

"مالک نے کسی اہم کام کے حوالے سے ایک افسر سے اجازت لی اور علیحدگی میں مجھے سمجھا کر روانہ کر دیا۔ میں لمبا چکر کاٹ کر یہاں پہنچا ہوں۔"

"انہوں نے تلاشی لی تھی کار کی؟"

"انہیں کچھ آدمیوں کی تلاش ہے۔" وہ بولا۔ "ایک افسر نے ٹارچ جلا کر کار میں آگے پیچھے دیکھا تھا۔ میں نے اسلحے پر کپڑا ڈال دیا تھا مگر دو نالیں پھر بھی ننگی تھیں۔ انہوں نے اسلحے پر ذرا بھی توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

بیوک میں قدم رکھتے ہی اسلحہ کا انبار جوں کا توں دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔

"اب جلد از جلد کار کو مقررہ راستے پر ڈال دو۔" یوسف نے پائیدان سے ایک رائفل اٹھا کر اپنی گود میں رکھتے ہوئے کہا اور ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔

وہ راستہ، کار تو دور کی بات ہے، پیدل چلنے کے بھی قابل نہیں تھا لیکن ڈرائیور چابکدستی سے اسٹیرنگ کنٹرول کرتا کار کو آگے بڑھاتا رہا۔ اس دوران میں ہر ٹیلے پر پوری کار ایک نئے زاویے پر جھٹکے کھا رہی تھی۔

غنیمت یہ تھا کہ اس طرف جھاڑیاں تو بے تحاشا اگی ہوئی تھیں لیکن ان میں کانٹے مفقود تھے ورنہ چند گز کی مسافت طے کرتے ہی چاروں ٹائر چھلنی ہو جاتے۔

اس صبر آزما اور اذیت ناک سفر کے بعد جب حویلی سے کافی دُور بیوک دوبارہ سڑک پر آئی تو ڈرائیور سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

یوسف نے ڈرائیور کو مشورہ دیا کہ سڑک پر تیز رفتاری سے



سفر کا آغاز کرنے سے قبل وہ گاڑی کے نازک حصّوں کی امکانی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لے لے مگر اسے وقت بہت عزیز تھا اُس نے آناً فاناً میں بیوک کو کسی برق رفتار چیتے کی طرح ہوا کے دوش پہ اڑانا شروع کر دیا۔

بہت جلد ہم صنعا کے مضافاتی علاقے سے گزر گئے اور بیوک صنعا کے شمال مشرقی ریگستان کی طرف جانے والی شاہراہ پر گامزن ہو گئی لیکن پورے راستے نہ کہیں تصادم کے آثار نظر آئے اور نہ ہی کہیں سینڈر ووڈ کا کوئی سراغ مل سکا۔

اور آخر کار صنعا سے کافی دور ویران صحرا میں ہم اس مخصوص مقام پر بھی پہنچ گئے جہاں ریت کے دو عظیم الشان تودوں کے درمیان محض درّہ نما راستے پر سڑک تعمیر کی گئی تھی۔ ابتدائی منصوبے کے مطابق تعاقب کرنے والوں کو اسی مقام پر گھیرنا تھا۔ اس اعتبار سے وہی ریگستانی درّہ سینڈر ووڈ کی منزل تھی جس سے عام حالات میں آگے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس گاڑی کے نہ ملنے کے تین ہی اسباب ہو سکتے تھے جن میں پہلا یہ تھا کہ شاید اُس کا سرے سے تعاقب ہی نہ ہوا ہو اور وہ مقررہ مقام تک آنے کے بعد بحفاظت عبدالباقر کی حویلی کی طرف واپس چلی گئی ہو۔ دوسرا امکان راستے ہی سے سواروں سمیت گاڑی کے اغوا کا تھا، جو خاصا موہوم محسوس ہوتا تھا لے دے کر تیسری صورت یہ رہ جاتی تھی کہ حالات ناسازگار دیکھ کر وہ لوگ اس جگہ رُکنے کے بجائے تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے ہوں۔

یوسف نئے حالات کے تحت کوئی قدم اٹھانے سے قبل پچھلے واقعات پر مجھ سے تبادلۂ خیال کے لیے بے چین تھا مگر ڈرائیور کی وجہ سے سارے راستے ہم نے زبان بند ہی رکھی تھی لیکن سینڈر ووڈ کی پُراسرار گمشدگی پوری توجہ کی طالب تھی۔

ہمارے مشورے پر ڈرائیور نے بیوک اس تنگ گھاٹی سے آگے نکال کر سڑک کے کنارے روک دی اور خود ٹارچ کی روشنی میں گاڑی کے ستم رسیدہ پرزوں کی جانچ پڑتال میں مصروف ہو گیا۔

ہم تینوں ہوا کے رخ پر ٹہلتے ہوئے خنک ریت پر اتنی دُور نکل گئے کہ ہماری آوازیں اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔

چلتے ہوئے ہم تینوں اپنے اپنے کندھوں پر رائفلیں اور جیبوں میں فاضل کارتوس لینے نہیں بھولے تھے۔

”فون پر عبدالباقر سے بات کیے بغیر حویلی کا رخ کرنا تو دشواریوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔“ میں نے موقع پاتے ہی زبان کھولی۔ ”پھر اب کیا کیا جائے؟“

”ان فوجیوں کی یلغار کا سبب جانے بغیر ہم صحیح سمت میں کوئی قدم نہ اٹھا سکیں گے۔“ سیتا نے سنجیدگی سے کہا۔

”سیدھی سی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ لوگ ہمیں نکال لے جانے میں کامیاب ہو سکے اور انہوں نے یہ اندازہ بھی قائم کر لیا کہ عبدالباقر کی تحویل سے ہمیں نکال لے جانا اُن کے لیے آسان ثابت نہ ہو گا لہٰذا انہوں نے فوجی حکام سے ہماری مخبری کر دی۔“

”لیکن اس کا مقصد؟“ یوسف نے سوال کیا۔

”شاید انہوں نے عبدالباقر کی حویلی کے مقابلے میں ہمیں فوجی تحویل سے نکال لے جانے کو سہل خیال کیا ہو۔ دوسری بات یہ کہ قیدیوں کی صورت میں ہم صنعا یا زیادہ سے زیادہ یمن ہی کے کسی علاقے میں رکھے جاتے لیکن عبدالباقر کی پناہ سے ہم کسی گمنام منزل کی طرف بھی روانہ ہو سکتے تھے اور اس بار اسرائیلی کسی بھی قیمت پر ہمارا سراغ کھونے کو تیار نظر نہیں آتے۔“

”ان کا نشانہ محض ہم دونوں ہیں لیکن فوجی افسر تین افراد کی بات کر رہا تھا جس کا مطلب ہے کہ مخبر نے ہمارے ساتھ یوسف کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اسے وہ بلاوجہ کیوں ہمارے ساتھ ملوث کرنے پر تُل گئے؟“ سیتا نے سوال کیا۔

”یمن ابھی حال ہی میں ایک ناکام فوجی بغاوت کا شکار ہو چکا ہے جس کے سلسلے میں میری ذات پر بھی شبہے کیے جا رہے ہیں۔“ یوسف نے خود ہی جواب دینا شروع کیا۔ ”اس وقت فوجی حکام کے لیے صفدر باسیتا سے مقدم مقامی استحکام ہے اور وہ فوری طور پر ہر مشتبہ آدمی کو پکڑنا چاہتے ہیں لہٰذا انہیں فوری طور پر حرکت میں لانے کے لیے زیادہ زور میری نشاندہی پر دیا گیا ہو گا۔ تم دونوں کے نام میرے معاون کے طور پر لیے گئے ہوں گے۔ حالانکہ اُن کے لیے مجھ سے زیادہ تم دونوں اہم ہو۔ اُن کا اندازہ درست ثابت ہوا اور محض میری وجہ سے فوجی جماعت فوری طور پر عبدالباقر کی حویلی پر چڑھ دوڑی۔“

”ہم لوگوں کو وہاں نہ پا کر ان کا ردِعمل کیا رہا ہو گا؟“ سیتا نے سوال کیا۔

”ظاہری طور پر شاید معاملہ نمٹا دیا جائے لیکن چند روز تک عبدالباقر کی کڑی نگرانی ضرور کی جائے گی اس دوران میں ہمیں اس سے دور رہنا ہو گا۔“ یوسف نے کہا۔

”اور اگر زینی ناگفتہ حالت میں فوجیوں کے ہاتھ لگ گئی ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”امراء اپنے عملے سے عموماً اس سے بھی بُرا سلوک کرتے ہیں، اگر زینی بے ہوش رہی ہو گی تو اس کی ذات عبدالباقر کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنی ہو گی۔“ یوسف نے کہا۔ ”بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ فوجیوں کو تہہ خانے تک خود ہی لے گیا ہو تاکہ اس کی ذات شبہے سے بالا رہ سکے۔“

”ہم لوگ اچانک ہی بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے ہیں۔“ میں نے خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”ان حالات میں ہم تینوں کا یکجا رہنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”اپنی آزادیوں کی تھوڑی سی قربانی دے کر ہم یہ رات بھی محفوظ چھت تلے بسر کر سکتے ہیں۔“ یوسف بولا۔ ”بس ہمیں اپنی نقل و حرکت محدود رکھنی ہو گی۔“

”تو پھر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ سیتا کے لہجے میں شوخی عود کر آئی۔ ”ہمارا سب سے بڑا مسئلہ تو جائے پناہ کا ہی ہے۔ فوراً چلو۔“

اور ہم تینوں اپنے دلوں کا غبار ہلکا کر کے بیوک کی طرف واپس ہو لیے۔

بیوک کا ڈرائیور اپنے کام سے فارغ ہو کر پُرسکون انداز میں ٹھنڈی ریت پر چت لیٹا کچھ گنگنا رہا تھا۔ اُس کے نزدیک اس وقت کوئی اہم مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ اس کی مختصر سی کھوپڑی بدلے ہوئے گمبھیر حالات کا ادراک کرنے سے اگر قاصر نہ ہوتی تو وہ عبدالباقر کا ایک ادنیٰ ملازم نہ ہوتا۔

”واپس چلو۔“ یوسف نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”صباحیہ کے مشرقی علاقے میں جانا ہے۔“

اس نے کوئی سوال کیے بغیر انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”عبدالباقر کے سوا تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ ہمیں کہاں چھوڑا گیا تھا۔“ یوسف نے قدرے توقف کے بعد اسے ہدایت دی۔ ”موقع میسّر آتے ہی میں خود عبدالباقر سے بات کروں گا۔“

گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ریتیلے میدان کے درمیان تارکول کی سیاہ سڑک رات کے پس منظر میں عجیب سماں باندھ رہی تھی۔

اور پھر کچھ دیر بعد بیوک ریت کے دُور تک پھیلے ہوئے تودوں کے درمیان پُرپیچ راستے پر سفر کرنے لگی۔

پھر اچانک ہی ہم چاروں چونک پڑے اور کار کی رفتار کم کر دی گئی۔

ایک تنگ موڑ گھومتے ہی کار کے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں چند سو گز دُور سڑک کے عین وسط میں ایک جیپ یوں اڑی کھڑی ہوئی تھی کہ اس سے آگے نکلنے کا راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے تیزی سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر پیش قدمی جاری رکھنے کے لیے بیوک کو کسی بھی طرف نرم ریت میں اتارا گیا۔ تو وہ اس بُری طرح دھنسنے گی کہ شاید کرین کے بغیر اسے دوبارہ سڑک پر لانا ہی ممکن نہ ہو سکے۔

جیپ سے تقریباً دس گز دُور ڈرائیور نے بیوک روک دی۔ لیکن اُس کا انجن بیدار رہا۔

”گاڑی سے نہ اترنا۔“ رفتار معدوم ہونے کے ساتھ ہی ڈرائیور کی آواز سنائی دی ”بس دروازے مقفل کر لو۔ یہ کار بلٹ پروف ہے۔“

”کچھ دیر قبل ہم ادھر سے گزرے تو راستہ صاف تھا۔“ یوسف تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ راستہ مسدود کر کے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی گئی ہے۔“

میرے ساتھ ہی سیتا اور یوسف نے بھی بھری ہوئی رائفلیں اٹھا لیں۔

اس وقت ہمارے کان پوری توجہ سے باہر مرکوز تھے لیکن شیشے بند اور دروازے مقفل ہونے کے باعث کسی معمولی آواز کا سُن لیا جانا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا جب کہ بظاہر ہر طرف سکوت اور سنّاٹے کا راج نظر آ رہا تھا اور جیپ بھی بالکل خالی تھی۔

اس گھاٹی میں راستہ روکنے کا مقصد واضح طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ مخالفین نے ٹیلوں کی بلندی کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا لہٰذا میری نگاہیں اپنی سمت کی بلندیوں پر بھٹکنے لگیں، اور کافی کوشش کے بعد میں نے ٹیلے کی چوٹی پر ایک انسانی ہیولا دیکھ ہی لیا جو تاروں کی چھاؤں میں شاید بیوک کے مسافروں کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔ میں نے آہستگی سے شیشہ نیچے اتارا پھر اس سے قبل کہ عقبی نشست پر میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی سیتا کچھ سمجھ سکے، میں نے نشانہ لے کر گولی چلا دی۔

اس گھاٹی میں رائفل کی آسیبی گونج بہت ہولناک تھی مگر وہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔

اپنی پشت پر دھماکا سن کر یوسف اچھل پڑا۔ میں نے فوراً

ہی دھواں اگلتی نال اندر کھینچ کر دوبارہ کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔

"اُدھر بلندی پر ایک آدمی موجود ہے۔" میں نے اُسے آگاہ کیا۔

"شاید وہ ہمارے باہر نکلنے کا منتظر ہے ورنہ اب تک کچھ کر گزرا ہوتا۔"

اِسی لمحے دوسری طرف والے ٹیلے سے ایک فائر ہوا اور بیوک سے چند فٹ کے فاصلے پر ریت کا غبار اُڑ کر رہ گیا۔

سیتا نے اپنی سمت کے شیشے کو اتار کر قدرے جھری پیدا کی ہوئی تھی جس کے سبب وہ کرخت آواز واضح طور پر سُنی گئی جس نے ہمیں ہاتھ اٹھا کر نیچے اُترنے کا حکم دیا تھا۔

ڈرائیور نے بیوک کے ہیڈلیمپس بجھا دیے۔

"کار واپس لو۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

اس نے ریورس گیئر میں جیسے ہی گاڑی پیچھے سرکائی، داہنی سمت سے دوبارہ فائر ہوا اور رائفل کے کارتوس سے نکلنے والے چھرے بیوک کی باڈی پر ساز بجاتے اچٹ گئے۔

"انجن بند کر دو۔" بلندی سے وہی کرخت تحکمانہ آواز گونجی۔ "ورنہ گاڑی سمیت اسی مقام پر چھلنی کر دیے جاؤ گے۔"

"بیوک کو تیزی سے آگے لے جا کر جیپ کے عقبی حصے پر ٹکر مار دو۔ راستہ بن جائے گا۔" یوسف نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"گاڑی کے انجن کو نقصان پہنچا تو ہم اس گھاٹی میں پھنس کر رہ جائیں گے۔" میں نے جلدی سے اس کی بات اُچک لی۔ "پتہ نہیں اُن کی نفری کتنی ہے۔"

"باہر نکلو یا وہی کرو جو یوسف کہہ رہا ہے۔" سیتا نے تیزی سے کہا۔ "موجودہ حالت میں ہم بلاوجہ وقت برباد کر رہے ہیں۔"

"دو منٹ میں تم لوگ باہر نہیں آئے تو دونوں طرف سے بارھ پر رکھ لیے جاؤ گے۔" تاریکی میں سے اسی نامعلوم آدمی کی آواز سنائی دی۔

"کافی اسلحہ باہر گرا کر خود بھی کار کے نیچے رینگ جاؤ۔" میں نے عجلت میں کہا۔ "ایک آدمی کار میں چھپا رہے گا۔ تاکہ بدترین حالات میں کوئی کارروائی کر سکے۔"

سیتا نے باہر نکلنے کے لیے بہت اِصرار کیا لیکن ہم لوگوں نے اسے اندر پائیدان پر چھپے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس اثنا میں دروازوں کو قدرے کھول کر بقیہ تینوں افراد رائفلیں ریت پر گرانے کے ساتھ ہی فاضل کارتوسوں کی پیٹیاں بھی سنبھال چکے تھے۔

ڈرائیور نے انجن بند کیا اور تقریباً بیک وقت ہم تینوں دروازے کھول کر ریت پر لڑھک گئے۔ اس اقدام سے پہلے ہی یہ بندوبست کر لیا گیا تھا کہ دروازے کھلنے پر کار کی کیبن لائٹ روشن نہ ہو۔ سیتا بھی پچھلے پائیدان میں دبک گئی تھی تاکہ اس کی جھلک بھی نہ دیکھی جا سکے۔

لیکن ہم لوگوں کی کارروائی شاید دیکھ لی گئی تھی کیونکہ ہم تینوں کے گرتے ہی دونوں سمتوں سے رائفلیں چلی تھیں اور گولیاں کار سے ٹکراتی تھیں۔

یوسف میرے ہمراہ کار کی داہنی سمت پر تھا جب کہ ڈرائیور دوسری طرف تنہا تھا۔

پھرتی سے اپنے جسم کو کار کے نیچے اور ٹائر کی آڑ میں سمیٹتے ہوئے میں نے اس بات پر خوشی محسوس کی تھی کہ اضطراری طور پر ہونے والی آخری فائرنگ میں دونوں سمتوں سے ایک ایک ہی گولی چلائی گئی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ دو تھے۔ اگر ان کی تعداد زیادہ ہوتی تو ہمیں مار لینے کی اضطراری کوشش میں ہر ایک ہی فائر کرتا۔

اور پھر اپنی نفری کو کم ظاہر کرنا ان کے لیے ہر اعتبار سے نقصان دہ تھا۔ ہم پر اپنی تعداد کی دھونس جما کر وہ بآسانی ذہنی اُلجھن میں ڈال سکتے تھے۔

"دس بیس فائر اندازے سے ہی کر ڈالو۔" میں نے تیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا اور اپنی رائفل سیدھی کر لی۔

اس ویرانے میں ہماری فائرنگ سے بھونچال سا آ گیا۔ گولیوں کی آپس میں ٹکرانے والی گونج کمزور اعصاب والوں کے لیے خاصی دہشتناک تھی۔

اور پھر چند ثانیوں بعد اوپر سے بھی تواتر سے گولیاں برسائی جانے لگیں۔

اچانک میرے کانوں میں ہلکی سی اذیت ناک غراہٹ کی آواز آئی اور لحظہ بھر کے لیے میری توجہ آواز کی طرف مبذول ہو گئی۔

بیوک کے ڈرائیور کی کلائی اوپر سے آنے والی گولی سے زخمی ہو گئی تھی مگر اُس نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر بتایا کہ وہ فائرنگ سے معذور نہیں ہوا تھا۔

میں نے مزید دو تین ہی فائر کیے ہوں گے کہ میرے کانوں میں سیتا کی پُرجوش سرگوشیانہ آواز آئی۔ "میں فائر کر رہی ہوں۔"

وہ میری سمت والے دروازے کو قدرے کھول کر اسی کی اوٹ میں باہر جھکی کہہ رہی تھی۔

"نہیں، تم اندر ہی دبکی رہو۔" میں نے غرا کر کہا۔

"اوپر دیکھو، ایک شخص اپنی جگہ بدل رہا ہے۔" لحظہ بھر کے توقف کے بعد اُس نے اسی انداز میں کہا۔ میں نے اندھیرے میں اپنی آنکھوں پر خاصا زور دیا لیکن داہنے ٹیلے کی ڈھلان پر مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

"دروازہ بند کر لو، وہ وہم ہے تمہارا۔" میں نے جھلا کر کہا اور اس طرف گولی چلا دی جہاں سے ایک شعلہ مجھے پیچھے تیرتا نظر آیا تھا۔

"اندھیرے کے معاملے میں میری بینائی تم سب سے تیز ہے۔" سیتا غضیلی آواز میں بولی۔ "میں یہ موقع ضائع نہیں کروں گی۔"

اس بار میں کچھ نہ بولا۔ آپس میں اُلجھنے کے بجائے اس وقت ہر ایک کو اپنی توجہ مقابلے پر مرکوز کرنے کی ضرورت تھی۔

چند ثانیوں بعد کار میں سے ایک دھماکے کے ساتھ فائر ہوا اور

ریتلے ٹیلے کی تاریک ڈھلان سے اذیت میں ڈوبی ہوئی ایک انسانی چیخ سُن کر میں سیتا کے سچے نشانے پر عش عش کر اٹھا۔ اس نے ان دونوں میں سے ایک کو مار کر واقعی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

پھر میرے علاوہ یوسف نے بھی اُسے دیکھ لیا۔

سیتا کے فائر سے زخمی ہونے کے بعد اس کا توازن اس بُری طرح بگڑا تھا کہ وہ سپاٹ ریتیلی ڈھلان پر کسی گٹھڑی کی طرح قلابازیاں کھاتا اور دردناک چیخیں مارتا نیچے لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔

اس پورے مقابلے میں دونوں سمتوں سے ہم پر محض ایک ایک رائفل ہی گرجتی رہی تھی جس کی بنا پر یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ وہ محض دو ہی تھے لیکن اپنی بہتر پوزیشن کے باعث اس گھاٹی میں ایک پوری کمپنی کو برباد کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اندھیرے میں سیتا کا وار کارگر ہوتے ہی داہنی طرف کے ٹیلے سے فائرنگ معدوم ہو گئی تھی لہٰذا میں یوسف کے ہمراہ کار کے پیچھے سے نکل آیا تاکہ اپنے حریف کو سڑک کے کنارے پہنچتے ہی بے قابو کیا جا سکے۔

ہم دونوں فوری طور پر آگے نہیں بڑھے تھے کیونکہ کار کی اوٹ سے باہر آتے ہی ہم بائیں جانب والے کی رائفل کی زد میں آ جاتے۔

چند ہی ثانیوں بعد داہنی ڈھلان پر لڑھکنے والے کی چیخیں معدوم ہو گئیں۔ شاید گرتے ہوئے اسے شدید ضربات آئی تھیں۔

پھر جیسے وہ اندھیرے میں ایک بے جان گٹھڑی کی طرح لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے گرا تو یوسف نیچے بیٹھے بیٹھے پنجوں کے بل آگے جھپٹا اور بے ہوش دشمن کی ٹانگ پکڑ کر اسے بے رحمی سے گھسیٹتا ہوا کار کے قریب لے آیا۔

سڑک پر جیپ کی رکاوٹ پر نگاہ پڑنے کے بعد جو خوفناک صورتحال سامنے آئی تھی اس کے پیشِ نظر ہم لوگوں کا زندہ سلامت وہاں سے گزر جانا بھی دشوار نظر آ رہا تھا لیکن ایک بے ہوش قیدی کے ہاتھ لگنے کے بعد صورتِ حال یکسر بدل گئی تھی۔

اس وقت تک ہمارے علاوہ ڈرائیور بھی فائرنگ سے دستبردار ہو چکا تھا مگر بائیں ٹیلے والا قلیل وقفوں سے مسلسل گولیاں چلاتے جا رہا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس کا کوئی بھی فائر بلٹ پروف بیوک کے کسی ٹائر کو چاٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"کار کے نیچے سے رینگ کر ہماری طرف آ جاؤ۔" یوسف نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ "اب ہمیں فوراً آگے بڑھنا ہے۔"

"مگر میں کار نہ سنبھال سکوں گا۔" وہ ہماری طرف نمودار ہو کر بولا۔ اُس کی آواز سے شدید تکلیف کا عنصر مترشح تھا۔

"کیا زیادہ زخمی ہوئے ہو؟" یوسف نے عقبی دروازہ کھول کر میری مدد سے بے ہوش قیدی کو پائیدان میں ٹھونستے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "شاید بائیں کلائی کی ہڈی ٹوٹی ہے۔"

یوسف اگلا دروازہ کھول کر اندر گھسا اور ڈرائیونگ سیٹ پر سرک گیا۔ زخمی ڈرائیور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے سیتا کے ہمراہ عقبی نشست سنبھال لی۔

جوں ہی بیوک اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی، بائیں طرف سے ہونے والی فائرنگ میں شدت پیدا ہو گئی لیکن یوسف نے پروا کیے بغیر بیوک جیپ کے قریب لے جا کر اس طرح روک دی کہ اس کی آڑ لے کر فائروں سے محفوظ رہتے ہوئے جیپ کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

ہم تینوں نے محفوظ طریقے پر اترنے کے لیے اس بار بھی داہنی طرف کے دروازے استعمال کیے اور چند ہی لمحوں میں جیپ ریت میں دھکیل دی گئی۔

بائیں سمت والے کو اچھی طرح ہمارے عزائم کا اندازہ ہو چکا تھا لہٰذا اس نے ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے بھرپور فائرنگ جاری رکھی۔ جو دو گاڑیوں کی آڑ کی وجہ سے ہمیں نقصان نہ پہنچا سکی۔ سیتا نے بھی اندازہ قائم کر کے ادھر دو فائر کیے جو موثر ثابت نہ ہو سکے۔ شاید اس نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھتے ہوئے کسی اوٹ میں اپنا مورچہ بنایا ہوا تھا۔

جیپ کو نیچے اتارنے کے بعد میں اس کے نیچے گھسا تو یوسف حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"بس دیکھتے جاؤ۔" میرا جواب تھا۔

میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر فیول پمپ میں آنے والا پٹرول کا پائپ کھینچ کر الگ کیا تو اس بدبودار سیال کی خاصی مقدار نیچے بہ نکلی۔

بیوک میں روانگی کی تیاری مکمل کرتے ہی میں نے دیا سلائی جلا کر جیپ کے نیچے گرے ہوئے پٹرول پر اچھال دی اور وہاں ایک ہلکے سے دھماکے سے شعلہ بھڑک اٹھا۔

میں نے فوراً اپنی نشست سنبھالی اور بیوک تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

آگ لگانے کا وہ طریقہ اس قدر موثر ثابت ہوا کہ ہمارے اس گھاٹی سے نکلنے تک وہ جیپ بلند شعلوں میں گھر چکی تھی اور موڑ گھومنے کے بعد دھوئیں کے کثیف بادل شعلوں کے تیز انعکاس میں آسمان کی طرف اُمڈتے نظر آ رہے تھے۔

"یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟" یوسف نے کچھ دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد زبان کھولی۔

"انہی میں سے معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کی اس گھاٹی میں موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ان کا پہلی کار سے مقابلہ ہوا تھا اور شاید عبدالباقر کے آدمی پھانس لیے گئے۔"

"مگر ان کی کار کہاں گئی؟" سیتا نے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ تین بیسے ہوں اور ان کا تیسرا ساتھی لاشوں اور بے ہوش قیدیوں کو اسی گاڑی میں ٹھونس کر لے گیا ہو۔ اور دو ہمارے انتظار میں کہیں چھپے رہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ ایسے نازک موقع پر میں تم لوگوں کے لیے بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔" ڈرائیور نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

"افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم تمہیں طبی امداد بھی نہیں دے سکتے۔" سیتا نے یہ کہتے ہوئے اندر کی لائٹ روشن کر دی۔

پھر ہم دونوں نے ہی آگے جھک کر اس کی خون آلود کلائی کو دیکھا۔ وہ شاید اس دوران میں تکلیف کو ضبط کیے ایک رومال سے خون صاف کرتا رہا تھا کیونکہ کلائی پر زخم صاف نظر آ رہا تھا اور اس کے اطراف میں ورم پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

"میں گاڑی چلا تو اب بھی سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن وقت پڑنے پر تیز رفتاری میں اسٹیرنگ پر مہارت سے قابو رکھنا دشوار ہو جائے گا۔"

اس کا آخری فقرہ سن کر میری جان میں جان آئی ورنہ میں مسلسل یہی سوچے جا رہا تھا کہ ہمارے صباحیہ پہنچنے کے بعد وہ واپس کیسے جا سکے گا؟

اس کی واپسی کے ساتھ ہی صباحیہ کے علاقے سے سیاہ بیوک کا ہٹایا جانا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ وہ مجرموں کی نگاہ میں آ چکی تھی اور اس کی موجودگی سے کوئی بھی ذہین فرد صباحیہ کے علاقے میں ہماری امکانی موجودگی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں صباحیہ میں اُتار کر تم واپس جا سکو گے؟" یوسف نے سوال کیا۔ شاید اس کا ذہن بھی میری ہی نہج پر کام کرتا رہا تھا۔

"ہاتھ ٹوٹ بھی جاتا تو بھی ضرور واپس جاتا۔" اس نے پُرعزم لہجے میں جواب دے کر سب ہی کا دل خوش کر دیا۔ "موجودہ حالات میں تو تم تینوں میں سے جو بھی حویلی کی طرف گیا چوہے دان میں پھنس جائے گا۔"

"تم عظیم ہو میرے دوست!" میں نے محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اپنی تکلیف کے باوجود تمہیں ہماری دشواریوں کا پورا احساس ہے۔"

"اس قیدی کو ٹھکانے لگانا دشوار ہو گا۔" چند ثانیوں کے بعد یوسف نے کہا۔ "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ اس کی ابتر حالت دیکھ کر ہمیں پناہ دینے ہی سے انکار نہ کر دے۔"

"تو تم اسے لادے کیوں پھر رہے ہو؟" غیر محسوس طریقے پر عبدالباقر کا وہ آدمی ہمارے معاملے میں بڑی حد تک ملوث ہو گیا تھا۔

"اس سے کچھ بازپرس کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ان ہی لوگوں میں سے ہے جنہوں نے کل رات حویلی پر دھاوا بولا۔ پھر آج بارودی سرنگیں پھیلائی تھیں۔"

"اوہ۔ یعنی زینی کا ساتھی!" وہ حیرت اور تحقیر کے ساتھ بولا۔ "پھر میری مانو اور اسے رملہ کے ویران کھنڈرات میں۔۔۔"

"خوب تجویز ہے تمہاری۔" اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی یوسف مسرت سے اچھل پڑا۔ "اتنی رات گئے وہاں دور دور تک کوئی اس کی آواز سننے والا بھی نہیں ہو گا۔"

رملہ صنعاء سے بیس میل جنوب میں ریگستانی علاقے میں کسی قدیم معبد کے کھنڈرات کا نام تھا جو صدیوں سے غیر آباد پڑے آ رہے تھے۔ شکستہ ستونوں پر کہیں بھی چھت کے نام پر ایک شہتیر بھی باقی نہیں رہا تھا۔ چوبی ڈھانچے دیمک کا شکار ہو کر ہواؤں کی اڑائی ریت میں مل چکے تھے۔ وہ جگہ ہر اعتبار سے ہمارے فوری مقاصد کے لیے بہترین تھی۔

شہر میں داخل ہوتے ہی بیوک ایک طویل لیکن ویران راستے پر ڈال دی گئی جو شہر کا تقریباً نصف طواف کرتا ہوا رملہ سے چند میل دور سے گزرنے والے سڑک سے مل جاتا تھا۔

رات کے دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ بیوک رملہ کے پُرہیبت کھنڈرات کے قریب جا کر ٹھہر گئی۔ سڑک سے کھنڈرات تک کا راستہ گو کچا ہی تھا لیکن اس پر کار دوڑانے میں یوسف کو کوئی قابلِ ذکر دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

بے ہوش قیدی کو بے رحمی سے باہر نکال کر ہم لوگ کھنڈرات کے ایسے حصے میں لے گئے جہاں ہمرادِ زمانہ کے باعث گرنے والے ملبے کے درمیان بیٹھنے کے لیے سطح جگہ موجود تھی۔

قیدی کو فرش پر ڈال کر میں نے ڈرائیور سے ٹارچ لے لی۔

سیتا کے فائر نے اس شخص کی داہنی طرف کی نچلی پسلیوں کا خاصا کاری زخم لگایا تھا جس سے کم از کم نچلی چار پسلیاں متاثر ہوتی تھیں۔

رنگت کے اعتبار سے وہ مقامی ہی معلوم ہوتا تھا مگر خدوخال میں عجیب سی کشش پائی جاتی تھی۔ اس کے جسم پر لباس مغربی طرز کا تھا جو مقامیوں میں بھی مقبول ہوتا جا رہا تھا۔

اس کے جائزے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ سلگا لیا اور ہم تینوں ایک طرف بیٹھ گئے۔

"اب کس کا انتظار ہے؟" ڈرائیور نے ادب سے سوال کیا۔

"یہ ہوش میں آ جائے۔" میں نے کہا۔

"اسے تو ابھی لاتا ہوں ہوش میں۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی پشت پر گُردوں کے مقام پر پوری قوت سے ایک لات رسید کی اور قیدی کا پورا جسم حرکت میں آ گیا۔ اس کے حلق سے ایک خفیف سی کراہ بھی برآمد ہوئی تھی جسے سن کر میں حیران رہ گیا۔

چند ثانیوں تک اس کا جسم بے چینی سے دائیں بائیں ہلکورے لیتا رہا۔ ڈرائیور اس کے سر پر سوار غور سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے جھک کر قیدی کے منہ پر داہنے ہاتھ سے بھرپور تھپڑ رسید کیا اور قیدی نے چیخ مار کر آنکھیں کھول دیں۔

ہوش میں آتے ہی اس کے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر پڑ گئے۔ اس کے بُشرے پر بھی شدید اذیت کے آثار طاری تھے جو ٹارچ کی روشنی میں ڈراؤنے نظر آ رہے تھے۔

"تت۔۔۔ تم کون لوگ ہو؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں عربی میں سوال کیا تھا۔

ڈرائیور نے بے رحمی سے اسے دوسرا تھپڑ رسید کیا۔ "ولدالحرام! سوال سن! اگر مالکوں کے سوالات کے جواب فوری طور پر نہ دیے تو واللہ تیری کھال کھینچ کر اس میں مینگنیاں بھروا دوں گا۔"

وہ دھمکی کارگر رہی۔ قیدی خاموش ہو گیا لیکن اس کے گہرے سانسوں کی آوازیں بآسانی سنی جا سکتی تھیں۔

"تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟" یوسف نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"وعدہ کرو کہ تم مجھے ہلاک نہیں کرو گے۔" وہ خوفزدہ آواز میں منمنایا۔

"کوئی وعدہ نہیں۔" یوسف سے پہلے ڈرائیور بول پڑا۔ "تمہاری زندگی اور موت کا فیصلہ آخر میں تمہارے اس وقت کے رویے کے پیشِ نظر کیا جائے گا۔"

اس نے شاید اپنا حلق تر کرنے کے لیے تھوک نگلا جس کی آواز سنائی دی تھی۔ "تت۔۔۔ تم سنگدل معلوم ہوتے ہو۔" وہ ڈرائیور سے بولا تھا۔ "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ اور خدا کے لیے مجھے دوسروں سے بات کرنے دو، وہ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"تمہارے مقدر کے فیصلے کا انحصار اسی پر ہے۔" یوسف نے سفاکانہ لہجے میں اس سے کہا۔ "اس کی بائیں کلائی تمہارے ساتھی کی گولی سے ٹوٹی ہے۔"

"میں تمہیں اس کا بھی پتہ بتا دوں گا۔" وہ گڑگڑایا۔ "لیکن مجھے معاف کرنے کا وعدہ کر دو پہلے۔"

"بزدل!" ڈرائیور خوفناک زہریلے انداز میں ہنسا اور اس نے پھر اس کے چہرے پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ "تو بتاتا کیوں نہیں؟"

"م۔۔۔ میں مائیکل ٹرمپ کے لیے کام کرتا ہوں۔" وہ ہکلاتے ہوئے مشینی انداز میں بول پڑا۔ مجھے خوشی تھی کہ عبدالباقر کے اس نمک خوار نے نہایت پیشہ ورانہ انداز میں قیدی کو دہشت زدہ کرنے کا کام سرانجام دیا تھا ورنہ دوسرے طریقوں سے شاید وہ بآسانی قابو میں نہ آتا۔

"اس کا پتہ؟" یوسف نے سوال کیا۔

قیدی نے بلاتوقف ایک فون نمبر دہرا دیا۔ "ہم نے آج تک اسے نہیں دیکھا۔ اسی نمبر پر اسے اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔ ہدایات ہمیں ہر بار مختلف طریقوں سے ملتی ہیں۔"

"وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

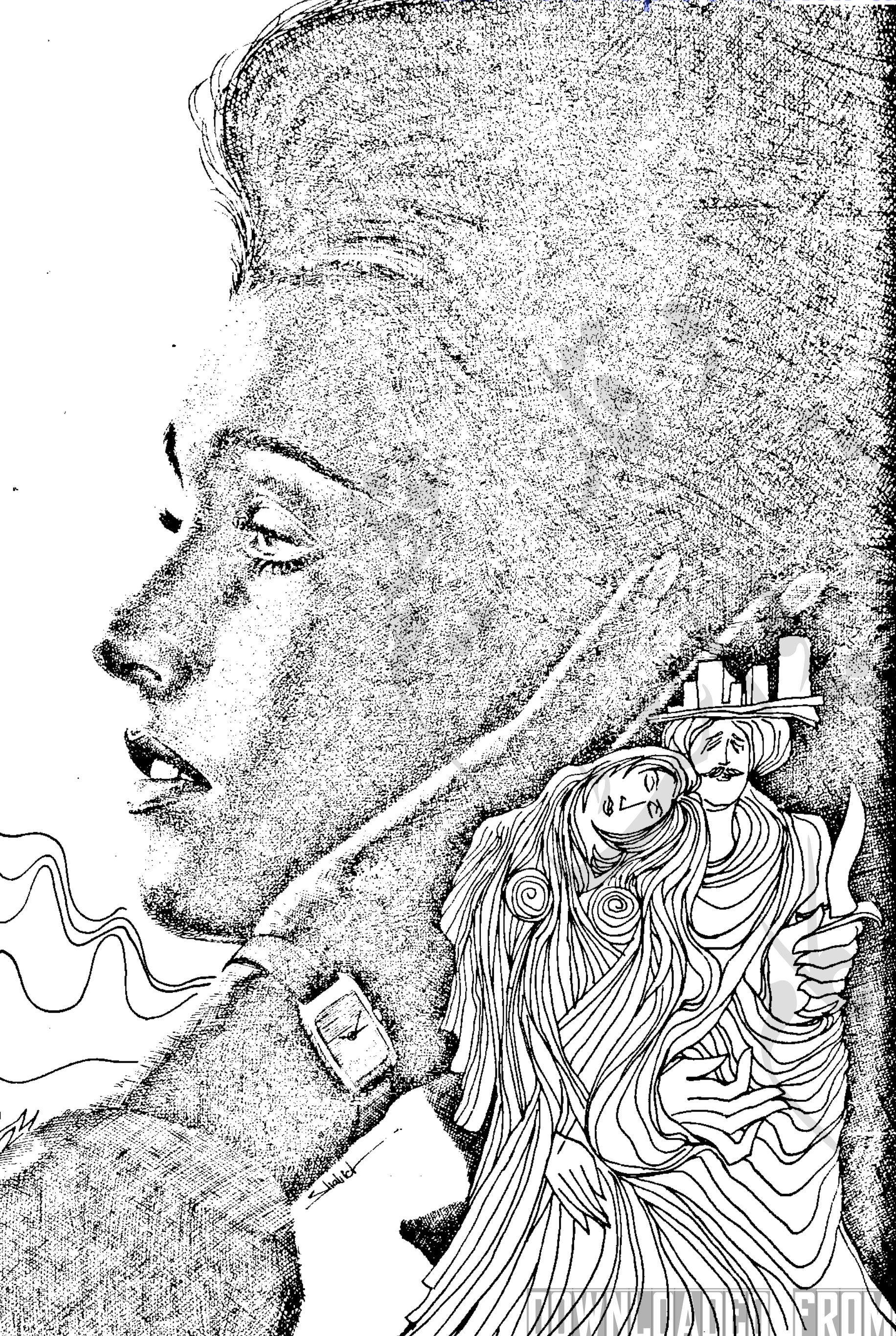
"ہمیں حویلی سے نکلنے والے ہر فرد کو اغوا یا قتل کرنے کی بھرپور کوششیں کرنی تھیں۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں انکشاف کیا۔

"سیاہ بینڈ روور کے مسافروں کا کیا حشر ہوا؟" یوسف پتھریلے لہجے میں اس سے سوالات کیے جا رہا تھا۔

"یہی معلوم کرنے کے لیے تو گھاٹی میں زندہ پکڑنے کی کوشش کی تھی ہم نے۔" اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ یوسف کا ردِعمل بھی مختلف نہیں تھا۔

"تفصیل سے بکتے چلے جاؤ۔"

"میں لفظ بہ لفظ سچ بول رہا ہوں۔" وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔ "تم میرا یقین کرو۔ وہاں ٹرانسمیٹروں سے لیس پانچ پارٹیاں مامور تھیں۔ دو آدمی حویلی کے سامنے ٹیلوں میں چھپے نکاسی کے راستے کی نگرانی کر رہے تھے۔ سات آدمی سڑک کے ایک سرے پر دو گاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ دوسرے سرے پر بھی دو گاڑیوں میں پانچ آدمی موجود تھے۔ اور ہم سب کا محدود حلقے میں کام کرنے والے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم تھا۔ سیاہ بینڈ روور حویلی سے نکل کر ہماری طرف روانہ ہوئی، تو پھاٹک کی نگرانی کرنے والوں نے ہمیں ہوشیار کر دیا۔ ہم حویلی سے دو میل آگے تعاقب کے لیے تیار ہو گئے لیکن مطلوبہ کار کے بجائے مخالف سمت سے ہمیں ایک بڑا فوجی قافلہ آتا نظر آیا، جو حویلی کی طرف جا رہا



تھا۔ ٹیلوں کی آڑ میں ہماری گاڑیاں محفوظ رہیں لیکن سیاہ گاڑی اس کے بعد بھی نظر نہ آئی۔ بعد میں ہمارے دو آدمیوں کو بھی حویلی کے سامنے سے بھاگ کر دوسری سمت میں جانا پڑ گیا کیونکہ فوجیوں نے عمارت میں گھسنے کے ساتھ ہی باہر بھی پھیلنا شروع کر دیا تھا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ شاید انہیں ٹرانسمٹر کے حلقے سے دور جا کر پناہ لینی پڑی تھی لیکن ہم بالکل محفوظ تھے۔"

وہ شاید اپنا سانس درست کرنے کے لیے خاموش ہوا تھا لیکن ڈرائیور اس کے حق میں جلاد ہی بنا ہوا تھا۔ اس نے جوں ہی قیدی کو للکارا، وہ پھر بولنے لگا۔

"ہم اس راستے کی کڑی نگرانی کر رہے تھے کہ حویلی والی سمت کے کچے راستے سے تمھاری کار سڑک پر آئی اور ہم چونک پڑے۔ ان اطراف میں حویلی کے علاوہ کوئی عمارت نہیں ہے پھر ہمارے لیے یہ سوچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ فوجی کارروائی کے نتیجے میں حویلی سے خفیہ طور پر کسی شخص یا سامان کو کہیں منتقل کیا جا رہا ہے لہٰذا ہم دو آدمی جیپ میں تمھارے پیچھے لگ گئے۔ صحرائی راستے پر ہم نے جیپ کی تمام روشنیاں گل رکھی تھیں پھر گھاٹی سے گزرنے کے بعد جب تمھاری کار سڑک کے کنارے رک گئی تو ہم نے سمجھ لیا کہ وہاں سے تمھاری واپسی ہوگی۔ تمھاری تعداد چار تھی اور رائفلیں بھی موجود تھیں اس لیے کھلے میدان میں تمھیں للکارنا خودکشی کے مترادف ہوتا لہٰذا ہم واپس ہوئے اور گھاٹی میں ایک مقام کا انتخاب کر کے وہیں رک گئے۔ میں ایک ٹیلے کی چوٹی پر چڑھ گیا اور جیسے ہی دور سے تمھاری بیوک آتی دیکھی، میں نے اپنے ساتھی کو اشارہ دیا اور وہ جیپ سے راستہ مسدود کر کے دوسری طرف کے ٹیلے پر چڑھتا چلا گیا۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ تم میں سے کم از کم ایک کو زندہ پکڑ کر سینڈ رودر کے بارے میں معلوم کر سکیں۔"

"یعنی ہمارے نمودار ہونے تک وہ گاڑی تمھارے سامنے سے نہیں گزری تھی؟" یوسف نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں۔" اس نے لوگرے وثوق سے جواب دیا۔

"اور نہ تم یہ بتا سکتے ہو کہ فوجیوں کی اس بھاری جمعیت نے وہاں دھاوا کیوں بولا تھا؟" یوسف کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

"ان کی آمد پر ہم خود حیران تھے۔"

"تمھاری قومیت کیا ہے؟" یوسف اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کا لہجہ یک لخت خوفناک ہو گیا تھا۔

"یمنی۔" قیدی کی آواز میں دہشت سمٹ آئی تھی۔ یوسف کے لہجے کی تبدیلی نے اسے بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا۔

"اور مائیکل ٹرمپ کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟" یوسف اس کے قریب جا پہنچا۔

"ساڑھے تین سال سے۔" وہ بولا۔ "وہ مجھے بھاری مشاہرہ دیتا ہے۔"

"ہر قاتل، غدار، وطن فروش اور بے ضمیر کو بھاری مشاہرہ ہی ملتا ہے۔" یوسف کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا۔ "تم جانتے ہو وہ کون ہے؟"

"نن... نہیں۔" قیدی کی آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔

"وہ بھی تم جیسا ہی ہے۔" یوسف کی آواز اور گمبھیر ہو گئی۔ "جو یہ دیتا ہے وہ اسی کے لیے کام کرتا ہے مگر وہ خود کو بے وطن کہتا ہے اور تم... تم ذلیل انسان! خود کو یمنی کہتے ہو۔"

"م... میں نے یمن کے خلاف آج تک کوئی کام نہیں کیا۔" وہ سراسیمہ آواز میں بولا۔

"مگر میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہاں تم اسرائیلی مفادات کے لیے کام کرتے رہے ہو۔" یوسف غرایا اور بجلی کی سی سرعت سے اپنے شانے سے رائفل اتار کر چند انچ کے فاصلے سے قیدی کی کھوپڑی پر گولی چلا دی۔

بارود کا دھواں صاف ہوا تو بغیر سر کی ایک لاش ریلے کے ان ویران کھنڈرات میں پڑی ہوئی لرز رہی تھی۔

یوسف سر جھکا کر تیزی کے ساتھ نکاسی کے راستے پر بڑھ گیا۔ ہم تینوں بھی خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیے۔

بیوک کے سفر کا آغاز نہایت خاموشی کے ساتھ بوجھل انداز میں ہوا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔

اور اسی گمبھیر خاموشی میں بیوک صنعا میں داخل ہوئی اور تھوڑی دیر بعد صباحیہ کی صاف ستھری آبادی میں ایک بنگلے کے چوبی پھاٹک کے سامنے ٹھہر گئی۔

"خالی ہاتھ اتر آؤ۔" یوسف کی آواز دل گرفتہ تھی۔

میں سیتا سمیت نیچے آ گیا۔ ڈرائیور نے بھی احتراماً نشست چھوڑ دی۔ کار کا انجن بدستور چل رہا تھا۔

خاموشی لیکن گرمجوشی کے ساتھ ہم تینوں نے عبدالباقر کے اس جانفروش سے ہاتھ ملائے اور وہ ہمیں وہیں کھڑا چھوڑ کر بیوک آگے لیتا چلا گیا۔

جب یوسف واپس مڑا تو میں چونک پڑا۔

"کیا یہ بنگلہ نہیں ہے؟" میں نے چوبی پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا

"نہیں، تھوڑی دور چلنا ہوگا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے لیکن کہنا پڑتا ہے کہ وہ ایک حریص پاکستانی کا مکان ہے جو لوگوں سے رازداری کی منہ مانگی قیمت وصول کر کے انہیں ہر قسم کی مدد فراہم کرتا ہے۔"

پاکستانی کا ذکر آتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ گو یوسف نے اس کا تذکرہ عزت آمیز الفاظ میں نہیں کیا تھا لیکن یہی کافی تھا۔ مصیبت کے ان کٹھن لمحات میں وہ یوسف کے اعتماد کے لائق تھا۔ دنیا بڑی مختصر سی ہے، کون جانے کہ وہ میرا ماضی کا کوئی شناسا ہی ہو۔ میں نے سوچا اور یوسف کی تقلید میں سیتا سمیت ایک گلی میں مڑ گیا۔

"برا مان گئے ؟" اگلی گلی میں گھومتے ہوئے یوسف نے مجھے خاموش پا کر چھیڑا۔

"کس بات کا ؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"تمہارے ایک ہم وطن کا تذکرہ میں نے نامناسب الفاظ میں کیا ہے !" اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"حریص ہونے کے باوجود تم نے اسے اپنے اعتماد کے قابل سمجھا ہے۔" میں نے اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر اپنے تجربے کی بنا پر اسے اس سے بھی برے الفاظ میں یاد کرتے تو میں برا نہ مانتا !"

"بڑے فراخ دل ہو !" وہ ہنسا۔

"ہر ملک اور ہر خطے میں برے اور بھلے لوگ پائے جاتے ہیں۔ پاکستان بھی ان ہی میں شامل ہے۔ حقائق کا برا ماننا حماقت ہے۔" میں نے کہا۔

"معاوضہ منہ مانگا لیتا ہے لیکن زبان کا پکا ہے۔ اگر بعد میں اس پر ہمارے دشمنوں کا ہاتھ پڑ بھی گیا تو مر جائے گا مگر ہمارے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔"

"تم برائی کے بجائے اس کی تعریف کر رہے ہو !" میں نے خوشدلی سے اسے ٹوکا۔

"برے لوگوں میں بھی بعض اچھی صفات پائی جاتی ہیں۔ ان کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور بعض اچھے لوگوں کی شخصیت محض کسی ایک بری عادت کی وجہ سے مسخ ہو کر رہ جاتی ہے !" میں نے وہ پیدل مسافت خاموشی سے طے کرنے کے بجائے بات جاری رکھنے کی نیت سے چٹکلا چھوڑا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے بھرپور لہجے میں میری تائید کی۔ "میری زندگی کا رخ بدلنے والا بھی ایک ایسا ہی شخص تھا جو نرم دل، فیاض اور ہمدرد ہونے کے ساتھ ہی بدزبان بھی تھا۔ غصے میں آ کر لوگوں کی دل آزاری کی حد تک بدزبانی کرتا تھا اور بعد میں خلوصِ دل سے ان سے معافی بھی مانگ لیتا تھا۔"

"لیکن زبان کا لگایا ہوا زخم معذرتوں سے کبھی نہیں بھرتا۔" سیتا نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے لقمہ دیا۔

"واللہ یہی ہوا !" یوسف فوراً بولا۔ "تین برس کی لازمی فوجی تربیت اور خدمت کے بعد میں نے بیروت میں ایک ملازمت کی تھی پھر ایک روز میرے آجر نے طیش میں آ کر میری کارکردگی کو گدھا گاڑی کے کام سے تشبیہ دے کر مجھے ہمیشہ کے لئے نجی ملازمت کے تصور سے متنفر کر دیا اور میں دوسرے ہی روز استعفیٰ دے کر تنظیم میں لوٹ آیا۔"

"کبھی کبھی معمولی واقعات بھی بڑے اہم ثابت ہوتے ہیں۔" میں نے کہا پھر قدرے توقف کے بعد دریافت کیا۔ "نام کیا ہے اس پاکستانی کا ؟"

"عبداللطیف !" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بھاڑ سے تنہا رہتا ہے لیکن پیسہ کمانے کی بے اندازہ ہوس ہے۔ نہ جانے ملک میں اس کا کون بیٹھا ہے ؟ کس کے لئے کمائے جا رہا ہے وہ ؟ نجی زندگی میں کسی کو دخیل نہیں ہونے دیتا !"

چند منٹ بعد ہم اس خوبصورت بنگلہ نما مکان کے پھاٹک پر پہنچ گئے جس کا احاطہ اندر جلنے والے بلب کی روشنی کے باوجود نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا !

یوسف نے ستون پر نصب بٹن دبایا جس کے جواب میں عمارت کے کسی دور افتادہ حصے میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور چند ثانیوں بعد ہی عمارت کا دروازہ کھل گیا۔

کھلے ہوئے دروازے کے روشن خلا میں نظر آنے والا دراز قامت انسانی ہیولا باہر نکل کر رکا۔ پھر اس کی پاٹ دار آواز گونجی۔ "کون ہے ؟"

"مشرق کے مہمان !" یوسف نے اپنی آواز اسی حد تک بلند کی تھی کہ وہ شخص اس کا پراسرار جواب سن سکے۔

یوسف کے الفاظ میں کوئی نہ کوئی تاثیر تھی کہ وہ شخص تیزی سے آگے بڑھتا چلا آیا۔ اور فوری طور پر پھاٹک کھول کر ہمیں اندر بلا لیا۔

"یوسف !" برآمدے سے آنے والی مدھم روشنی میں اس نے یوسف کو پہچانتے ہی تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔ "خیریت تو ہے ؟"

"تمہارے گھر کا راستہ خراب حالات میں ہی یاد آتا ہے !" یوسف نے اس کے ہمراہ عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ دونوں کون ہیں ؟"

"میرے ساتھی !" یوسف نے جواب دیا اور اس نے بھی یوسف کے رویے کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے بارے میں تفصیل جاننے پر کوئی اصرار نہیں کیا۔

مکان اندر سے بہت صاف ستھرا تھا لیکن وہاں عبداللطیف کے سوا کسی اور کی موجودگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

ایک آدھ رسمی فقرے کے بعد یوسف براہ راست مطلب کی طرف آ گیا۔ "ہمیں دو چار روز کے لئے پناہ درکار ہے۔ ممکن ہوا تو اس سے پہلے ہی چلے جائیں گے !"

"پہلے جانا تمہارا اپنا فعل ہو گا۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ میں دو روز کا معاوضہ لوں یا چار دن کا ؟" کام کی بات شروع ہوتے ہی عبداللطیف نے اپنی خصلت کا اظہار کر ڈالا۔

"فی الحال حالات کچھ نا سازگار ہیں۔ چار روز ہی رکھو !" یوسف نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"دس ہزار ہوں گے !" عبداللطیف نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر سنجیدگی سے کہا۔ "تم سے زیادہ تمہارے ساتھیوں کو پناہ دینا خطرناک محسوس ہوتا ہے !"

"وہ کیوں ؟" میں اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔

"اول تو یہاں ہندی اور پاکستانی جرم کرتے ہوئے بھی کانپتے ہیں۔ بالفرض چھوٹا موٹا جرم کر بھی لیں تو فوراً ہی پکڑے بھی جاتے ہیں مگر تم !" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ "تم یوسف کے ہمراہ پناہ لینے میرے پاس آئے ہو تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم کسی سنگین معاملے میں مطلوب ہو لیکن ہتھیار ڈالنے کے عادی نہیں ہو..."

"تمہیں منہ مانگی رقم ملے گی۔" یوسف نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن ہماری موجودگی میں یہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مارے گا۔"

"فکر نہ کرو۔" وہ پراعتماد انداز میں ہنسا۔ "اپنا کام خود کر سکو تو میں اپنی مصری نژاد خادمہ کو بھی چار دن کی چھٹی دے دوں !"

"اعتماد کی عورت ہے ؟" یوسف نے سوال کیا اور سیتا دانستہ ٹہلتی ہوئی ہم سے چند قدم دور نکل گئی۔

"ایسی ویسی !" عبداللطیف آزادانہ لہجے میں بولا۔ "میرے ہی دکالہ پر یمن میں موجود ہے ورنہ ابھی نکال دی جائے۔ بیس بائیس برس کی چھوکری ہے !"

"اسے چلتا ہی کر دو تو بہتر ہے !" یوسف نے کہا۔

"لیکن وہ مشکوک نہ ہو جائے کہ مہمانوں کے آتے ہی اسے کیوں چھٹی مل گئی ؟" میں نے اپنی دانست میں ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" عبداللطیف مکارانہ انداز میں ہنسا۔ "جب میں اسے بتاؤں گا کہ میرے قریبی عزیز میرے ساتھ ایک جوان عورت کی موجودگی کی خبر سن کر اطلاع دیے بغیر اچانک آ دھمکے ہیں تاکہ اس کی چوری تھام کر قاضی کی عدالت میں لے جائیں تو وہ خود ہی بھاگ نکلنے کیلئے بے چین ہو جائے گی !"

"تو جاؤ پہلے اسے نمٹا کر آؤ !" یوسف نے کہا اور وہ چلا گیا۔

"واقعی بہت مکار آدمی ہے !" اس کے چلے جانے کے بعد سیتا ہم دونوں کے قریب آ کر دھیمی آواز میں بولی۔

"وہ جس فن سے پیسہ کماتا ہے۔ اس میں ساری قیمت مکاری کی ہے۔" یوسف نے نرمی سے کہا۔ "یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ اس بدترین وقت میں پورے صنعا میں یہی چھت ہمیں چند روز کے لئے تحفظ فراہم کر سکتی ہے۔"

ہم تینوں وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور میں سگریٹ سلگا کر اس وقت تک پیش آنے والے واقعات کو ذہن میں یکجا کرنے لگا۔

یہ طے ہو گیا تھا کہ عبدالباقر کی خادمہ زینی یہودی سیکرٹ سروس کی آلۂ کار تھی اور صنعا میں اس کے روابط اسپینی دہشت گرد مائیکل ٹرمپ سے بھی تھے۔ اس کی نشان دہی پر مائیکل ٹرمپ کے سرکاروں نے عبدالباقر کی حویلی پر مسلح دھاوا بولا کہ مجھے اور سیتا کو لے جانے کی ناکام کوشش کی تھی !

اس ناکامی کے نتیجے میں جو لاشیں وجود میں آئیں۔ ان میں ماضی کا ایک مشکوک ملزم مائیکل شمعون تھا اور دوسرے کے سینے پر ہتھکڑی کی دو ٹوٹی ہوئی کڑیاں گدی ہوئی تھیں جو یقینی طور پر مائیکل ٹرمپ کے گروہ کا شناختی نشان تھا !

اس ناکامی کے بعد عبدالباقر کی حویلی کی جھاڑیوں میں دستی سرنگیں بکھیری گئیں اور ان سے گلوخلاصی ہوتے ہی حویلی فوجی کارروائی کی زد میں آ گئی جس کے بارے میں یوسف کا نظریہ مجھے قرینِ قیاس معلوم ہو رہا تھا۔

ماضی قریب کی ایک ناکام فوجی بغاوت کے سلسلے میں غلط فہمی کی بنا پر اس کا نام سامنے آیا ہوا تھا اور وہ فوج کو مطلوب تھا۔ لہٰذا دہشت گردوں نے میرا اور سیتا کا نام اس کے معاون کے طور پر فوج تک پہنچا دیا اور فوجی دستے مشینی یلغار کرتے عبدالباقر کی حویلی پر آ پہنچے تاکہ یوسف اور اس کے مددگاروں کو اپنی تحویل میں لے سکیں۔

لیکن وہ خطرہ بھی ہمارے کانوں پر سے گزر گیا اور ریتیلے ٹیلوں میں مائیکل ٹرمپ کے ایک حواری کو مار دینے کے بعد رملہ کے کھنڈرات میں دوسرے قیدی سے یہ معلوم ہو گیا کہ صنعا میں مائیکل ٹرمپ اپنے پورے وسائل کے ساتھ ہماری بو پر لگا ہوا تھا جبکہ ہمارے پاس محض ایک فون نمبر تھا یا ایک مشکوک سفارتی افسر کا نام !

یوسف کو مائیکل ٹرمپ اور اس کے پشت پناہوں کے خاتمے سے دلچسپی ہونی ناگزیر تھی جب کہ میرا اور سیتا کا مفاد کسی الجھن میں پڑے بغیر نکل بھاگنے میں تھا لیکن ان حالات میں جبکہ مائیکل اور اس کے حواری یوسف کے ساتھ ہی ہمارے لہو کے بھی پیاسے ہو رہے تھے، ہمارے لئے کسی تصادم سے دوچار ہوئے بغیر نکلنا محال نظر آ رہا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں ڈوبا ہوا تھا کہ عبداللطیف اپنے بشرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے واپس آ پہنچا۔

"کیا ہوا ؟" عورت ہونے کے رشتے سے سیتا کو اس معاملے کے انجام سے قدرتی طور پر گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

"قاضی اور میرے رشتے داروں کا ذکر سنتے ہی سراسیمہ ہو گئی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "پوری بات سنے بغیر عقبی دروازے سے بھاگ گئی۔"

"مگر گئی کہاں ہو گی ؟" یوسف نے سوال کیا۔

"یمن جیسے خشک ملک میں دو چار روز کے لئے اسے باآسانی پناہ مل جائے گی۔" اس نے لاپرائی سے جواب دیا۔

عبداللطیف کے اور ہمارے درمیان کوئی گہرا رشتہ نہیں تھا۔ وہ پیسے کا رسیا تھا اور ہم تحفظ کے خریدار !

ہم نے اسے منہ مانگا معاوضہ دے کر چار دن کے لئے اسے اپنا بندۂ بے دام بنا لیا تھا۔ اس سے آگے دونوں فریق ایک دوسرے سے لاتعلق تھے۔

اس نے ہمیں اپنے مکان کے دو کمرے دکھائے جن میں سے چھوٹا یوسف نے منتخب کر لیا اور میں نے سیتا کے ہمراہ بڑا کمرہ اپنا لیا۔

جتنی دیر میں ہم لوگ نہا دھو کر تازہ دم ہوئے۔ عبداللطیف نے ہمارے لئے کھانے کی میز تیار کر دی۔

"یہ سب کہاں سے لے آئے تم؟" میں نے میز پر کئی قسم کے گرم گرم کھانے دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

"صرف گرم کرنے کا قصوروار ہوں" وہ خوشدلی کے ساتھ بولا۔ "میرا ڈیپ فریزر منجمد کھانوں سے ہر وقت بھرا رہتا ہے"

"اکیلی ذات کے لئے اتنا اہتمام؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم جیسے مہمانوں کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں، اگر خورد و نوش کے سامان کی روزمرہ خریداری میں اچانک اضافہ ہو جائے تو دیکھنے والوں کو سوچنے کے لئے کافی سے زیادہ مواد مل جاتا ہے۔ اب چار روز تک تم اپنی خورد و نوش کی ساری ضروریات اسی چار دیواری میں محدود رہتے ہوئے پوری کر سکو گے۔"

کھانا دوستانہ فضا میں کھایا گیا۔ اس دوران میں نہ یوسف نے ہم دونوں کا عبداللطیف سے تعارف کرایا اور نہ ہی اس نے ہمارے بارے میں کسی تجسس کا اظہار کیا۔

کھانے کے بعد میرے ایما پر قہوہ کا ایک دور ہوا پھر سب اپنے کمروں میں لوٹ گئے۔

"مجھے یہ شخص بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا ہے!" خلوت میسر آتے ہی سیتا نے لطیف کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر ڈالا۔

"خطرناک؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں" اس نے بے دلی سے کہا "نہ خطرناک نہ شریف لیکن پھر بھی اس کی طرف سے اپنے دل میں بے چینی سی محسوس کر رہی ہوں!"

"شاید اس لئے کہ اس نے ہم دونوں کے بارے میں غیر فطری رویئے کا اظہار کیا ہے" میں نے اس کی خلش کو زبان عطا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"غیر فطری رویہ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟"

"روئے زمین پر شاید گنتی کے چند لوگ ہی ایسے ہوں جو کسی اجنبی کا نام تک جانے بغیر اسے راضی خوشی اپنی چھت کے نیچے پناہ دینے پر تیار ہو جائیں!"

"لیکن وہ اس بات کا معاوضہ لے رہا ہے!"

"فطری تجسس کا معاوضے سے کوئی تعلق نہیں" میں نے کہا "معاوضے سے اتنا فرق پڑتا کہ وہ ہماری زبانوں سے فرضی نام سننے کے بعد بھی بظاہر یقین کر لیتا"

"بہرحال آج کی رات ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"پہلی رات کی ذرا سی غفلت عمر بھر رُلاتی ہے" میں نے قدرے شوخی سے کہا۔

"تم بہک رہے ہو" وہ غصیلے لہجے میں بولی "چلو! اپنے بستر پر لیٹو!"

ہم دونوں ہلکی پھلکی فضاؤں میں ہوا سے بھی لطیف تر ہو کر سرمئی بادلوں کی طرف اڑتے ہوئے معصوم پرندوں کی طرح ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ان وعدوں کا ذکر ہوا جو ہمالیہ کے پہاڑوں میں کئے گئے تھے۔ سُندری کا نام آیا جس نے ان برف پوش ویرانوں میں ایک حسین بچی کو جنم دے کر پروان چڑھایا اور جب وہ سیتا کے خوابناک پیکر میں ڈھل گئی تو میں مقدر کے ہاتھوں بھٹکتا، ڈھلکتا اس نیم وحشی دوشیزہ کے حیوانی قبیلے میں جا پہنچا جہاں سندری نے تہذیب کے سائے کی آرزو میں اپنی سیتا مجھے سونپ دی پھر وہ سہانے خواب یاد آئے جو انبالہ میں ایک دوسرے سے بچھڑنے تک ہم نے ایک دوسرے کے گرم سانسوں میں پگھل کر ایک ساتھ دیکھے تھے۔

معاً مجھے بستر پہ پڑے پڑے تکان کا احساس ہونے لگا جیسے میرے بدن کے سارے جوڑ کھل چکے ہوں!

سیتا کو پا لینے تک میں اس کے سوا ماضی کی ہر یاد سے رشتہ توڑ کر ایک خون آشام وحشی کی طرح اپنی زندگی اور سیتا کے حصول کے لئے آگے ہی آگے بھاگتا چلا جا رہا تھا اور اب فرصت کے چند سانس میسر آ جانے پر اپنے ماضی پر نگاہ دوڑائی تو ایک طویل مسافت کا احساس یک بیک جاگ اٹھا میں نے اپنی عمر عزیز کے کتنے قیمتی دن اس بھاگ دوڑ میں گزار دیئے تھے!

اچانک خواب گاہ کے دروازے پر دھیمی سی دستک کی آواز سنائی دی، سیتا کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح بھڑکی۔ اس کا بایاں ہاتھ چلا اور اس نے سرہانے لٹکتا ہوا سوئچ دبا کر مدھم روشنی والا سبز بلب بھی بجھا دیا۔

وہ عبداللطیف کی چھت کے نیچے ہماری پہلی رات تھی۔

کسی وحشیانہ جذبے کے زیر اثر میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا سیتا کے سانسوں کی آواز اس اندھیری فضا میں مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شراروں کی طرح دہک رہی تھیں اور وہ کسی بھی لمحے بستر سے کودنے کے لئے تیار تھی!

دروازے پر دوبارہ ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کیا تم جاگ رہے ہو؟" آواز سرگوشیانہ تھی لیکن پھر بھی اجنبی نہیں تھی۔ دستک دینے والا ہمارا میزبان عبداللطیف تھا اور اندر بول رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کی آواز پہچان لینے کے بعد قدرے ناگواری کے ساتھ سوال کیا۔

"تم سے کچھ بات کرنی ہے!" اس کی آواز میں التجا پچی ہوئی تھی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی بستر چھوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ اس اثنا میں سیتا کمرہ روشن کر چکی تھی۔

"معاف کرنا میں تمہارے آرام میں مخل ہوا" وہ اندر آئے بغیر ہی معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "مگر وطن کی لو اس وقت مجھے تمہارے در پر لے آئی۔ تم پاکستانی ہو نا؟"

اس وقت وہ حریص اور مکار عبداللطیف نہیں رہا تھا، بلکہ حقیقی معنوں میں کسی ہم نفس کو ترسا ہوا ایک غریب الوطن شخص نظر آ رہا تھا۔

مجھے اس پر ترس آ گیا مگر پھر بھی میں نے کسی اعتراف سے گریز کرتے ہوئے کہا "پاکستانی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہاں خاتون کے آرام میں خلل پڑے گا" وہ لجاجت سے بولا "برا نہ مانو تو ذرا سی دیر کے لئے میرے کمرے یا ڈرائنگ روم میں آ جاؤ!"

مجھے تنفر کے باوجود اس پر ترس آ گیا "چاہو تو یہیں آ جاؤ، یہ میری بیوی ہے کسی بات کا برا نہیں منائے گی"

"بہت بہت شکریہ!" اس کے لہجے میں واقعی ممنونیت جھلک آئی "لیکن بہتر ہوگا کہ تم میرے ساتھ آ جاؤ، تم سے بے تکلفی سے باتیں کرنے کو طبیعت چاہ رہی ہے"

"جاؤ، میں انتظار کروں گی" سیتا نے میرا رجحان دیکھتے ہوئے مجھے سہارا دیا اور میں خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

"غریب الوطن ہونا بھی بڑا عذاب ہے" وہ مختصر سی راہداری طے کر کے مجھے اپنے شب خوابی کے کمرے میں لے جاتے ہوئے بولا "آدمی ہزاروں میں رہنے سہنے کے باوجود بھی بسا اوقات خود کو بالکل یکہ و تنہا محسوس کرتا ہے"

"مگر تم تو یہاں بڑی آسودہ زندگی گزار رہے ہو!" میں نے اس کے ہمراہ آراستہ خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہر غریب الوطن کی زندگی کے دو روپ ہوتے ہیں!" وہ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دکھی لہجے میں بولا "ایک خوشگوار، جو دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے اور دوسرا کربناک، جو خود اس کے لئے ہوتا ہے اور جس کی آگ میں وہ دھیمے دھیمے جلتا رہتا ہے!"

"میرے لئے تمہاری گفتگو حیرتناک ہے!"

وہ سادگی سے ہنسا "ضرور ہوگی کیونکہ دور سے دیکھنے والے مجھے ایک سکھی اور خوشحال انسان کے طور پر جانتے ہیں اور تم بھی ان ہی میں سے ایک ہو"

"لیکن ایسا کیا دکھ ہے تمہیں؟"

"تم میرے ہم وطن ہو!" اس نے میرے اعتراف کی ضرورت محسوس کئے بغیر یکطرفہ طور پر فرض کر لیا "اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو شاید تم میرے شناسا بھی ہو"

"شناسا؟" میں نے اپنے حافظے کو کریدتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔

"ضروری نہیں کہ تم بھی مجھے جانتے ہو" اس نے میری حیرت دور کرتے ہوئے کہا "لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے"

میرا دل یک بیک تیزی سے دھڑک اٹھا "پہچان لیا ہے؟"

"مہینوں پہلے کسی اخبار میں تصویر دیکھی تھی تمہاری۔ تم شاید، بلکہ یقیناً صفدر علی ہو" اس نے جھجکتے ہوئے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"کس صفدر علی کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہاری" وہ پُر وثوق اور جوشیلے لہجے میں بولا "اور کس صفدر علی کو جنم دیا ہے اس دھرتی نے، جس کے نام سے بہتیروں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے...... تت...... تم یقین کرو کہ میں تمہارا والہانہ پرستار ہوں۔ میری ذات سے تمہاری سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں پہنچے گا۔ بس تمہارا اعتراف سن کر میرے دل کو قرار آ جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میری نگاہیں مجھے دھوکا نہیں دیتیں"

"تو کیا یہی اقرار کرانے مجھے کمرے سے اٹھا کر لائے تھے؟" میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"تمہیں پہچانتے ہی میں تم سے بہت سی باتیں کرنے کے لئے بے چین تھا" وہ بولا "میں نے پہلی ہی نظر میں تمہیں پہچان لیا تھا لیکن محض اس خیال سے خاموش رہا کہ کہیں راز افشا ہو جانے کے خوف سے یوسف میرے یہاں پناہ لینے کا ارادہ ترک نہ کر دے، میں ہر قیمت پر تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میری یہ آرزو رائیگاں نہیں گئی!"

"تم اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہے تھے!" میں نے گفتگو کو اختصار دینے کی نیت سے نرم لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"تمہیں لاہور میں اپنے کالج کے ساتھی یاد ہیں؟" قدرے توقف کے بعد اس نے دھیمی اور پژمردہ آواز میں سوال کیا۔

"اچھی طرح!" میں نے پہلی بار بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کاکا یاد ہے؟" اس نے سوال کیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ گورا چٹا، گول مٹول لڑکا مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ دلاور کے اکسانے پر میں گلنار کو شریف زادی سمجھ کر مسلسل پیش قدمی کرتا جا رہا تھا اور وہ آوارہ مزاج لڑکی مجھے اپنے چنگل میں جکڑتی جا رہی تھی۔ ان دنوں میرے دوستوں میں کاکا واحد لڑکا تھا جس نے میری سنجیدگی کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ گلنار کے بارے میں اس کی رائے ابتدا سے ہی خراب



تھی مگر میں نے اس کی مخالفت کو حسد یا رقابت پر مبنی سمجھ کر کاکا سے اپنی برسوں پرانی دوستی ختم کرلی تھی۔

"کاکا!" میں نے حیرت سے دہرایا "مگر تم کون ہو؟ وہ تو خاصا موٹا تازہ اور خوبصورت لڑکا تھا۔"

"مزنگ میں تم کئی بار کاکا کے ساتھ اس کے گھر آئے تھے، مجھے تمہاری صورت اچھی طرح یاد ہے۔ میں کاکا کا بڑا بھائی ہوں۔"

معاً میری نگاہوں میں مزنگ کے اس دو منزلہ مکان کا پورا نقشہ گھوم گیا جس میں کاکا کے بڑے بھائی کا پیکر بھی مجسم تھا۔ عبداللطیف کے خدوخال گزرتے ہوئے برسوں کی رعایت سے اس خاکے پر پوری طرح موزوں ہوتے تھے۔

"مم... مگر تم یہاں کیسے؟ کاکا کہاں ہے؟" ماضی کا ایک رشتہ دریافت ہونے پر میری اعصابی کیفیت اضطرار کا شکار ہوگئی۔

"کاکا کو غنڈوں نے اتنے چاقو مارے کہ اس کا چہرہ ناقابل شناخت ہوکر رہ گیا تھا۔" عبداللطیف کی آواز میں کرب سمٹ آیا۔ "ماجھے کے آدمی اس کی بہن کو اٹھانے آدھی رات کو مکان میں آ کودے تھے اور کاکا نہتا ہونے کے باوجود ان کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ میرے گھرانے کے لئے وہ قیامت کی رات تھی۔" گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرکے اس کی آواز بھرا گئی۔ "تین مرد اور دو عورتیں غنڈوں کے ہاتھوں ماری گئیں لیکن وہ ناجی کو لے جانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ کاکا چھوٹا تھا لیکن میرے بڑے بھائی کے سات بچے تھے جو اس رات کی ہولناک سیاہی میں شفقت پدری سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے... وہ رات گزر گئی لیکن میرے سینے میں انتقام کی ہولناک آگ بھڑک اٹھی۔"

میں حیرت اور سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھا اس کی کتھا سن رہا تھا۔ سلگتی ہوئی سگریٹ نے جب انگلیاں جلائیں تو میں نے ہڑبڑا کر وہ ٹوٹا فرش پر مسل دیا۔

"ماجھا میرے ہاتھ نہیں آیا۔" وہ کہہ رہا تھا "لنگڑا، لولا اور مفلوج قانون بھی ان سب کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ نہ آلاتِ قتل برآمد ہوئے تھے اور نہ میرے سوا کوئی بالغ چشم دید گواہ تھا۔ ڈیڑھ سال تک خاک چھاننے کے بعد مجھے اس خبر نے چراغ پا کردیا کہ وہ سب عدم ثبوت کی بنا پر بری کردیے گئے تھے۔ قانون اندھا تھا مگر میں تو ان میں سے ایک ایک کو پہچانتا تھا۔ قانون کی بارگاہ سے ٹھوکر مارے جانے کے بعد میرے اندر جوالا مکھی پھوٹ پڑا۔ میں نے دو راتوں میں چار خون کئے۔ جنہوں نے کاکا اور میرے بڑے بھائی کے لہو سے ہولی کھیلی تھی۔ انہیں میں نے ان ہی کے لہو میں نہلا دیا۔ میں نے رازداری کا سارا اہتمام کیا تھا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ اس بار قانون کی سماعت اور بصارت کا سارا ضعف دور ہوگیا تھا اور قاتل کے طور پر ہر سو میری تلاش کی مہم شروع ہوچکی تھی۔ میرے اندر بھڑکی ہوئی انتقام کی آگ سرد ہوگئی اور تحفظ کا نرالا جذبہ پوری قوت سے عود کر آیا۔ میں نے سارے وسائل یکجا کرکے کراچی کا رخ کیا مگر یہ خبر بھی قانون کے محافظوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور جب انسانوں کے سمندر میں بے رحمی سے میرا ہانکا شروع ہوا تو میں نے اصلی سمندر کی راہ لی اور چار ہزار خرچ کرکے قطر پہنچ گیا۔ وہاں میں رحیم الدین سے عبداللطیف بن گیا اور بھٹکتے بھٹکتے آخر کار صنعا میں اپنا ٹھکانہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں میری جائز آمدنی محدود ہے جبکہ میرا دکھ بے کراں ہے۔ میں شادی کئے بغیر پہاڑ جیسی زندگی تنہا جھیل رہا ہوں۔ کیونکہ میرے کندھوں پر اپنے بڑے بھائی کے سات یتیم بچوں کی کفالت کا بوجھ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں حریص ہوں، لالچی ہوں، اپنے وطن کے نام کو بٹہ لگا رہا ہوں لیکن میری دانست میں یہ سب مجبوری کا سودا ہے، شاید تم نے بھی مجھے لالچی ہی سمجھا ہو مگر میری کہانی سننے کے بعد یقیناً تمہارے دل کے کسی گوشے میں میری ذات سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا ہوگا اور میں یہی چاہتا تھا کہ کاکا کا دوست مجھے بزدل، بے ایمان اور لالچی سمجھ کر میرے گھر سے رخصت نہ ہو۔ کم از کم اسے ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ عبداللطیف کے حریص چہرے کے پیچھے رحیم الدین کی دردناک زندگی پوشیدہ ہے!"

"بڑا دکھ ہوا مجھے تمہاری کہانی سن کر!" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "کاکا تو بڑا نیک نفس اور ملنسار لڑکا تھا۔ کاش اس کے مقدر میں ایسی دردناک موت نہ لکھی گئی ہوتی۔"

"مجھے کاکا کا نہیں، ان سات یتیموں کا دکھ ہے جن کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن وہ باپ کے سائے کے بغیر زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ میں نے ہر قیمت پر انہیں بہترین زندگی سے فیض یاب کرانے کا عہد کیا ہوا ہے لیکن میں انہیں باپ کی محبت خرید کر نہیں دے سکتا۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں موٹے موٹے شفاف موتی جھلملانے لگے۔

"لوگ واقعی تمہیں برا سمجھتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اور مجھے بھی بہت سے لوگ برا ہی سمجھتے ہوں گے لیکن لوگ کسی کے اندر نہیں جھانک سکتے۔ اپنی ذات کا دکھ وہی جانتا ہے جو اس چتا میں دھیمے دھیمے جل رہا ہو۔ دوسروں کو تو بس وہی کچھ نظر آتا ہے جو وہ انتقام یا مجبوری کے تحت کر رہا ہو۔ بے گناہوں کے قاتل عدم ثبوت کی بنا پر پھانسی کے پھندے سے بچ گئے لیکن تم خونیوں کے قاتل ہونے کے باوجود قانون کو مطلوب ہو۔"

"ماجھا ابھی تک زندہ ہے!" وہ کسی اندرونی جذبے کے تحت مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "جس روز بھی میں پاکستان پہنچا اسے خون میں نہ نہلا دوں تو..."

"بس، کوئی قسم نہ کھا بیٹھنا۔" میں نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ "میں نے ماجھے کو بھی دیکھا ہوا ہے۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو کاکا کے لہو کا آخری انتقام میں اپنے ہاتھوں سے لوں گا۔"

کچھ دیر بوجھل اور سوگوار سی خاموشی طاری رہی جسے خود اسی نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ چونک کر توڑا۔ "معاف کرنا وہ خوں ریزی برسوں گزرنے کے باوجود مجھے بھلائے نہیں بھولتی۔ کس قدر خود غرض ہوں میں کہ تم میرے مہمان بن کر آئے تو تمہارے ذہن پر بھی اپنے دکھوں کا بوجھ لاد دیا۔ کچھ اپنی سناؤ۔ تم یوسف کے ساتھ کیسے ہو؟"

"میں اس سرزمین پر اجنبی ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "یہاں یوسف ہی نے مجھے تحفظ فراہم کیا ہوا ہے۔"

"یہاں غیر قانونی طور پر آئے ہو؟" اس نے متجسس سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"بس مقدر کے ہاتھوں دھکے کھاتا پھر رہا ہوں۔" میں ہنس کر رہ گیا۔ "آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا والا معاملہ چل رہا ہے۔ بہرحال میرے لائق کوئی کام ہو تو بتاؤ۔"

"وہ کام تو تم پہلے ہی سرانجام دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "یوسف کے کہنے کے مطابق اس وقت صنعا میں صرف تمہاری ہی چھت ہمیں تحفظ فراہم کر سکتی ہے!"

"تمہارا یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟" وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"اگر غلط فہمی کی بنا پر مقامی قانون ہمارے خلاف حرکت میں نہ آیا ہوتا تو اب تک ہم پاکستان کی طرف واپسی کا راستہ سوچ رہے ہوتے!"

"پاکستان جانا چاہتے ہو؟" اس نے سوال کیا اور میں اس کے لہجے میں جھلکتا ہوا اعتماد محسوس کر کے چونک پڑا۔

"کیا تم اس بارے میں کوئی مدد کر سکتے ہو؟" میں نے چند ثانیوں کے تحیر آمیز سکوت کے بعد پُرامید لہجے میں سوال کیا۔

"تمہاری واپسی کا بندوبست کرا سکتا ہوں۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"مگر کیسے؟"

"بحری راستے سے!" وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ جو عورت ہے، اسے تم چھوڑ سکتے ہو؟"

"کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے حیرت سے اس کا منہ تکتے ہوئے کہا۔ "وہ میری بیوی ہے۔"

اس نے اضطراری طور پر اپنے رخساروں پر تھپڑ مارنے شروع کر دیے اور مجھے لپک کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑنے پڑے۔

"معاف کرنا، مجھے شدید غلط فہمی ہوئی تھی۔" وہ خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "ورنہ میں تم سے ایسا بیہودہ سوال ہرگز نہ کرتا۔"

"مگر اس سوال کی ضرورت کیا تھی؟"

"چھوڑو ۔۔۔ اب اسے بھول جاؤ!" وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولا۔ "میری حماقت سمجھ کر درگزر کر دو۔"

"درگزر تو کر ہی دیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی وجہ سے تمہیں کیا دشواری پیش آ سکتی ہے!"

"در ۔۔۔ دراصل میں تمہیں ایک مال بردار لانچ کے ذریعے بھجوانے کا بندوبست کرتا۔" اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "اس پر ملاحوں اور ۔۔۔ خلاصیوں میں ایک کیا، کئی مرد کھپائے جا سکتے ہیں۔ لیکن عورت کا معاملہ مشکل ہو جاتا ہے!"

"کیوں نہ اسے مردانہ روپ دے دیں؟" میں نے بلا سوچے سمجھے تجویز پیش کر ڈالی۔

"جسمانی ساخت اور خدوخال تو بڑی چیز ہیں، کھلے سمندر میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے والے ملاحوں کو مردوں کے جسم سے پھوٹنے والی بو کی شناخت میں ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ محض اسی سے جنس کا تعین کر لیتے ہیں۔ ان کی اس حیوانی حس کو دھوکا دینا بہت مشکل ہوتا ہے!"

"تو کیا اسے لانچ پر چھپایا بھی نہ جا سکے گا؟"

"چھپانے کے لئے اوّل تو عملے کے آدمیوں کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔" اس نے خفت آمیز لہجے میں کہا۔ "اور یہ لوگ اپنی جنس کے لئے تو نہایت جاں نثار اور وفادار ثابت ہوتے ہیں لیکن بیشتر ملاح عورت کے معاملے میں خونخوار وحشی ثابت ہوتے ہیں۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ عین ممکن ہے کہ سفر کا آغاز تو پُرسکون ہو لیکن کھلے سمندر میں پہنچتے ہی تم ناگہانی مصائب سے دوچار ہو جاؤ۔ مجھے تمہارے لئے کوئی دوسری راہ نکالنی ہو گی۔"

"تم بہتر جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اب جلد از جلد پاکستان پہنچنے کے لئے بے چین ہوں۔ اگر میں یوسف کے ہمراہ تمہارے پاس رکا بھی رہا تو دو چار روز میں تلاش کی مہم سرد پڑنے پر یوسف میرے لئے نکاسی کی کوئی راہ تلاش کرے گا!"

"تم فکر نہ کرو، میں اس سے پہلے ہی کوئی بندوبست کر لوں گا۔" اس نے سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے جواب دیا۔ "اور اب جا کر آرام کرو، میرا خیال ہے کہ تم کافی سے زیادہ تھکے ہوئے بھی ہو!"

وہ مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آیا، اندر سیتا اضطراب کے عالم میں میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

رحیم الدین نے دروازے سے اسے ادب آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا تو اسے خاصی خوشگوار حیرت ہوئی۔

"ہم دونوں پرانے شناسا نکلے بھابی!" مسٹر رحیم الدین یا عبداللطیف نے سیتا سے سلام کا جواب وصول کرتے ہوئے کہا۔ وفورِ مسرت سے اس وقت وہ بچھا جا رہا تھا۔

میرے رویّے میں حوصلہ افزائی کا عنصر پا کر سیتا نے اسے کمرے میں روکنا چاہا لیکن اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے زیادہ ہمارے آرام کی فکر تھی لہٰذا چند ثانیوں بعد وہ چلا گیا۔

رحیم الدین کے بارے میں یوسف کے تبصرے سننے کے بعد سیتا کی رائے بھی خاصی خراب تھی لیکن جب میں نے اسے اصلیت سے آگاہ کیا تو وہ بھی اس زخم خوردہ شخص کو داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ جو اپنے پیاروں کے لہو کے داغ اپنے سینے میں چھپائے ایک عظیم مقصد کے لئے زندگی کے تپتے ہوئے خارزار میں تن تنہا سفر کر رہا تھا۔

رحیم الدین کی کہانی تلخ ضرور تھی مگر اس میں بلا کا گداز بھی تھا اور اس گداز سے آشنا ہونے کے بعد طبیعت ایسی بوجھل ہوئی کہ ہم دونوں ہی سو گئے!

اگلی صبح ہم بیدار ہوئے تو یوسف تیار ہو کر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ عبداللطیف نے گو ابتدا میں دستِ خود، دہانِ خود کی نوید دے کر اپنی مصری ملازمہ کو رخصت کر دیا تھا لیکن اس وقت وہ کسی مشاق باورچی کی طرح ناشتے کی تیاری میں مصروف تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر میں سیتا کے ہمراہ باہر نکلا تو یوسف نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور اشارے سے مجھے اپنے قریب بلا لیا۔

میں نے سیتا کو کچن میں جا کر عبداللطیف کی مدد کرنے کے لئے کہا اور خود یوسف کے پاس بیٹھ گیا جو میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا!

"وہ رات تمہارے کمرے میں کیوں آیا تھا؟" یوسف نے میرے بیٹھتے ہی رازدارانہ لہجے میں سوال کر ڈالا۔

"کچھ باتیں کرنے!" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے رات نیند نہیں آ رہی تھی۔" اس نے کہا۔ "پہلی آہٹ ہوتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دروازے کی اوٹ میں چھپ کر تمہاری باتیں سنی تھیں اور جب اس نے تم سے اپنی ماضی کی شناسائی کا ذکر کیا تو میں مطمئن ہو کر خاموشی سے اپنے کمرے میں لوٹ گیا!"

"تو پوری گفتگو نہیں سنی تم نے؟" میں نے قدرے مایوسانہ لہجے میں سوال کیا۔

"میں نے محض شبہ کی بنا پر گفتگو سننے کی کوشش کی تھی۔" اس نے صاف دلی سے کہا۔ "لیکن جب میں نے تم دونوں کے مابین اعتماد کی فضا موجود پائی تو خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔"

"کاش کہ تم نے اس کی پوری کہانی سنی ہوتی۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت زخم خوردہ اور دکھی انسان ہے۔"

"میرے لئے تمہارے الفاظ ہی کافی ہیں۔"

اسی اثنا میں عبداللطیف سیتا کے ہمراہ ناشتہ لے آیا۔

"یہ انقلاب کیسے آ گیا؟" یوسف نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر طنز کیا۔ "آج تم مہمانوں کے لئے کام کر رہے ہو!"

"کبھی کبھی اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں سے بھی انحراف کرنا پڑتا ہے!" اس نے ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"وجہ؟" یوسف کے اس رویّے سے اسے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے چھپ کر رات والی گفتگو کا کچھ حصہ سنا ہو گا۔

وہ دونوں اپنی گفتگو میں الجھے رہے اور میں نے اخبار اٹھا لیا۔

پہلے صفحے کی دوسری شہ سرخی تین مشتبہ تخریب کاروں کی تلاش کے سلسلے میں فوجی مہم کے بارے میں تھی جس کے مطابق تین خطرناک ملک دشمن افراد کی ٹولی صنعا میں سرگرم تھی اور حکام اس کی تلاش میں تھے۔

کسی معتبر ذریعے سے اطلاع ملنے پر ایک بڑی فوجی جماعت نے مجرموں کی مبینہ پناہ گاہ پر چھاپہ مارا تھا۔ لیکن وہاں کوئی بھی ہاتھ نہ آ سکا۔

پوری خبر کا لب و لہجہ عجیب پُراسرار سا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی سرکاری ذریعے نے اخبارات کو وہ متن جاری کیا ہو، جسے من و عن اخبار میں چھاپ دیا گیا۔

سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس خبر میں نہ تینوں افراد کے نام دیے گئے تھے اور نہ ہی عبدالباقر کا نام آیا تھا جس کی حویلی فوجی کارروائی کا نشانہ بنی تھی۔

"الکفایہ کی بھی خیر خبر لینی چاہیے!" میں نے وہ خبر پڑھنے کے بعد کہا۔ اس وقت تک وہ تینوں خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہو چکے تھے۔

"ہاں ۔۔۔ ناشتے کے بعد اسے فون کروں گا۔" یوسف نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

ہمیں ناشتے سے فارغ کرانے کے بعد عبداللطیف یا رحیم الدین اپنے کام کاج کے سلسلے میں گھر سے چلا گیا۔

جاتے جاتے اس نے ہمیں کمروں سے باہر نہ نکلنے کی سخت ہدایت کی تھی۔ کمروں کی بیرونی کھڑکیوں پر بھی پردے کھنچے رکھنے تھے تاکہ اندر کی کوئی بھی نقل و حرکت باہر سے نہ دیکھی جا سکے اور نہ ہی کسی آنے والی فون کال یا ڈور بیل کا جواب دینا تھا۔

اس کے جانے کے بعد ہمیں گھر کی ہر چیز پر بلا شرکتِ غیرے تصرف حاصل ہو گیا تو یوسف فون پر جا بیٹھا۔

یوسف نے عبدالباقر سے فون کا سلسلہ ملایا تو ابتدا میں اس کا لہجہ حد درجے مدافعانہ تھا۔ شاید عبدالباقر اس کے یوں غائب ہو جانے پر برافروختہ تھا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھا جو محض اپنی آن کی خاطر اپنے دو چار

مہمانوں کے جنازے بھی بخوشی اٹھوا دیتے ہیں۔

کافی طویل گفتگو کے بعد سلسلہ منقطع کرنے کی نوبت آئی تو یوسف نے ریسیور رکھ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اسے سمجھانا دشوار ہو رہا تھا کہ اس سے ملے بغیر ہم کیوں غائب ہوئے:" وہ بولا "اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ اپنے مہمانوں کی حفاظت کرنا جانتا ہے اور اس کی تحویل میں رہتے ہوئے منظم فوجی تو در کنار، خون آشام بھیڑیے بھی اس کی لاش پر سے گزرے بغیر ہم تک رسائی حاصل نہ کر سکتے:"

"اس کے مزاج کو میں اس حد تک سمجھ گیا تھا!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ کہ نتیجہ کیا رہا؟"

"سیاہ کار کو راستے ہی میں فوجیوں نے روک لیا تھا اور اپنی تحویل میں واپس حویلی لے آئے:" اس نے بتایا "انہوں نے کہا کہ وہ حویلی کے سامنے سڑک پر گشت پر نکلے تھے۔ بعد میں ان کی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عبدالباقر کو باوردی سرنگوں کی کہانی بھی سنانی پڑی لیکن اپنے متوقع دشمنوں کے بارے میں اس نے زبان نہیں کھولی۔ فوجی جماعت وہاں سے ناکام و نامراد ہی واپس لوٹی:"

"وہ زینی تک تو نہیں پہنچے؟"

"نہیں ــــ اور نہ وہ خود ہی انہیں ادھر لے گیا۔ جلتے ہوئے انہیں کھسیائے ہوئے انداز میں معذرت ہی کرتے بنی:"

"پھر اب وہ کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، ان لوگوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا خون جلا رہا ہے۔ جنہوں نے اس کی حویلی کی آبرو خاک میں ملانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی!"

"تو اب ادھر کے بارے میں تو سوچنا ہی بے کار ہے:" میں نے کہا "اس غیر یقینی صورت حال سے ہماری گلو خلاصی کب تک ہوگی!؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا:" وہ پُرخیال لہجے میں بولا "اس وقت میرے سامنے دو راستے ہیں، بے کار بیٹھے رہنے کے بجائے مائیکل ٹرمپ کا سراغ لگاؤں اور اسے نیست و نابود کرنے کی کوشش کروں یا کچھ عرصے کے لئے خود بھی یمن سے نکل جاؤں:"

"ان مخدوش حالات میں دوسری ہی راہ بہتر رہے گی:" میں نے مشورہ دیا۔

"لیکن باہر نکلے بغیر تو بات بن ہی نہیں سکے گی:"

"عبداللطیف ہماری مدد نہیں کر سکتا؟" میں نے اسے ٹٹولا۔

"آج تک اس سے ایسا کوئی واسطہ نہیں پڑا:" اس نے جواب دیا "ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکے:"

میں ہنسا "یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ رات تم نے ہم دونوں کی پوری گفتگو نہیں سنی تھی۔ پچھلی رات اس نے مجھے نکاسی میں مدد دینے کی پیش کش کی ہے:"

"نہیں!" بے اعتباری سے اس کی آنکھیں پیشانی پر جا چڑھیں۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنی اور رحیم الدین کی گفتگو کا نچوڑ اسے سنا دیا۔

"پھر تو وہ ہم تینوں کو یہاں سے نکال سکے گا:" اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"لیکن اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ میں نے تمہیں اپنی اور اس کی ساری گفتگو سے باخبر کر دیا ہے، موقع ملنے پر میں خود ہی ازسرِ نو یہ موضوع چھیڑوں گا:"

اسی لمحے ڈور بیل کی تیز آواز نے ہمیں چونکا دیا اور ہم دونوں بوکھلائے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کے چہرے تکنے لگے۔

پہلی بار گھنٹی مختصر سے وقفے کے لئے بجی تھی۔ بند مکان میں اس کی بازگشت معدوم ہوتے ہی چند ثانیوں کے لئے سناٹا چھا گیا۔

"پنجوں کے بل دروازے کی طرف بڑھ چلو!" میں نے تیز سرگوشیانہ آواز میں کہا۔ اس اثنا میں سیتا بھی ہمارے قریب آ چکی تھی۔

ہم تینوں فرش اور قالین پر ننگے پاؤں چلتے مکان کے داخلی دروازے کے قریب جا پہنچے۔ وہاں سیتا نے نیچے بیٹھ کر اپنا کان فرش سے لگا دیا پھر پُرجوش انداز میں فضا میں داہنا ہاتھ لہرایا، جس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی آہٹ سننے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس کی تقلید میں میرے ساتھ یوسف نے بھی اپنا ایک کان فرش پر ٹکا دیا۔ مجھے کچھ محسوس نہ ہوا۔ یوسف کا سپاٹ چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی بھی قوتِ سماعت مجھ سے بہتر نہیں تھی لیکن سیتا کے لبِ بشرے سے دبے دبے جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔

عبداللطیف کے مکان میں داخل ہوتے ہوتے یوسف نے احاطے کے بیرونی پھاٹک پر لگا ہوا گھنٹی کا بٹن دبا دیا تھا لیکن مجھے یاد پڑ رہا تھا کہ میں نے اندر گھسنے سے پہلے عمارت کے داخلی دروازے کے قریب بھی گھنٹی کا ایک دیوار گیر بٹن دیکھا تھا اور سیتا کے جوش سے پتہ چل رہا تھا کہ نامعلوم آنے والے احاطے کے بجائے اندرونی دروازے کے قریب موجود تھے۔

ایک مرتبہ پھر گھنٹی چیخ اٹھی۔ اس بار بٹن پر سے انگلی کافی دیر سے ہٹائی گئی تھی۔

ہم تینوں دم سادھے وہیں کھڑے رہے۔

پھر اچانک عمارت کے اندرونی حصے میں ایک زوردار چھناکا ہوا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیونکہ وہ آواز واضح طور پر کوئی بڑا شیشہ ٹوٹنے کی تھی۔

آنے والے شاید ہر قیمت پر اندر گھسنے کا تہیہ کر چکے تھے اور ڈور بیل کا جواب نہ ملنے کی صورت میں کسی عقبی کھڑکی پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔

میں یقینی طور پر اندر کی طرف بھاگتا مگر وہ راہداری عبور کرنے سے پہلے اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بلندی سے پختہ فرش پر کودا ہو اور لحظہ بھر بعد ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ اندرونی کمرے میں آگ بھڑک اٹھی۔

آگ نظر آتے ہی میرے نتھنوں نے پٹرول کی بُو بھی محسوس کر لی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر یقینی طور پر پٹرول سے بھرا ہوا پلاسٹک وغیرہ کا کوئی بڑا برتن کمرے میں پھینک کر اسے آگ دکھائی گئی تھی۔

اندرونی کمرے میں پھینکے جانے والے پٹرول کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ بھڑکتا ہوا مائع شعلوں کی آنچ میں تیرتا ہوا اس کمرے سے نکل کر سیکنڈوں میں راہداری تک آ گیا اور پھر شعلے اس کمرے کے قالین کو بھی چاٹنے لگے جو پچھلی رات میرے اور سیتا کے لئے خواب گاہ کے طور پر کام آیا تھا!

اس افتاد نے میرے ساتھ ہی یوسف کو بھی بوکھلا دیا۔ مکان بہت تیزی کے ساتھ شعلوں کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔ ہر شے دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ شعلوں کی تپش اور زندہ جل مرنے کی دہشت سے پسینے چھوٹنے پڑ رہے تھے!

اندر آگ تھی اور باہر یقینی طور پر کئی افراد کی نفری جو باہر نکلنے والوں کو ان کے اجالے میں بآسانی بارٹھ پر رکھ لیتی۔

جو لوگ اتنے دیدہ دلیر ہو سکتے تھے کہ دن دہاڑے ایک مکان کو گھیر کر آگ لگا سکیں۔ ان سے یہ امید ہی بے سُود تھی کہ وہ غیر مسلح رہے ہوں گے۔

سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ ہم تینوں ہی غیر مسلح تھے اور آگ میں گھرے ہوئے کمروں تک پہنچ کر اہلِ خانہ کے ہتھیار تلاش کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

یوسف نے بیوک سے اترتے ہوئے ہر ایک کو خالی ہاتھ رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ تاکہ رات کی تاریکی میں کسی سے ٹکراؤ ہو جائے تو ایسا نہ ہو کہ عبداللطیف کے مکان تک پہنچنے سے پہلے تینوں دھر لئے جائیں اس وقت وہی احتیاط ہمارے حق میں زہر بن گئی تھی۔ ورنہ بیوک میں نت نئے ہتھیاروں کا ایسا مؤثر ذخیرہ تھا کہ اس میں سے ایک آدھ چیز بھی ہمارے پاس ہوتی تو اس وقت اتنی بے چارگی مسلط نہ ہوتی۔

اس وقت لے دے کر میرے لباس میں زہریلے تیر پھینکنے والی وہ شیشی موجود تھی جس کی کارکردگی غیر یقینی بلکہ مشتبہ تھی۔ کافی عرصے سے میں محض اس لئے اسے استعمال کرنے سے گریز کرتا رہا تھا کہ اس کی وجہ سے حکام کو میری موجودگی کا علم ہو سکتا تھا لیکن اس وقت اپنی بقا کے لئے میں سب کچھ کر گزرنے پر تیار تھا۔

شعلے تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ دھوئیں سے دم گھٹنے لگا تھا۔ آثار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مزید چند منٹ اسی طرح گزرے تو جل مرنے کی نوبت تو بعد میں آئے گی۔ دھوئیں سے دم گھٹ کر تینوں ہی بیہوش ضرور ہو جائیں گے۔

"ہاتھ اٹھا لو!" میں نے سپاٹ لہجے میں ان دونوں سے کہا۔ اور اضطراری طور پر دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے سامنے احاطے کی سرسبز گھاس پر چار خوفناک چہروں والے افراد نہایت بے فکری میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں برآمد ہوتے دیکھ کر ان کے لبوں پر تلخ استہزائیہ مسکراہٹیں کوندنے لگیں۔

"چلے آؤ!" ان میں سے چوڑے شانوں والے نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی گود میں رکھا ہوا پستول انگلیوں پر نچا کر کہا۔

ہمیں بے بس دیکھ کر ان چاروں کا سلوک نہایت ذلت آمیز ہو گیا تھا۔

ہم ان سے چند قدم دور رہ گئے تو وہ تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاتھ گرا لو اور پھاٹک پر کھڑی ہوئی وین کے پچھلے حصے میں سوار ہو جاؤ:" چوڑے شانوں والا غرایا "آگ نے لوگوں کو متوجہ کر لیا ہے۔ انہیں دیکھ کر کوئی حرامی پن کیا تو گولی سینہ پھاڑ کر رکھ دے گی:"

ہم ان سے آگے نکل گئے اور وہ پیچھے آنے لگے۔

مجھے پکڑے جانے کا اتنا ملال نہیں جتنا ان کے ذلت آمیز رویّے کا تھا۔ ہم تینوں ذرا بھی چوں چرا کئے بغیر چوہوں کی طرح ان کے سامنے آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

پھاٹک پر پہنچنے تک قرب و جوار کے مکانوں سے چھ سات نفوس وحشت زدہ انداز میں وہاں آ پہنچے تھے۔ پھاٹک سے نکلتے ہوتے ہم تینوں آگے تھے لہٰذا انہوں نے آگ کے بارے میں ہم ہی سے سوالات کئے۔

"بجلی کے تاروں سے آگ لگی ہے:" عقب سے ایک کرخت آواز ابھری "فائر انجن آتے ہی ہوں گے۔ برابر کے مکانوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے:"



وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔ اس علاقے میں مکانوں کے درمیان وسیع رقبہ احاطے کے طور پر حائل تھا۔ لہٰذا ایک گھر کی آگ سے دوسرے مکانات کا متاثر ہونا محال ہی تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان لوگوں میں خاصی تشویش پائی جاتی تھی۔

ہم تینوں وین میں داخل ہوئے تو اس کے فرش پر ایک خوبصورت دوشیزہ اس حال میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے اور منہ پر چوڑا ٹیپ مضبوطی سے چپکا ہوا تھا۔ اس کے پیر بھی آزاد نہیں چھوڑے گئے تھے۔

ہمارے ساتھ چوڑے شانوں والا اور اس کا ایک ساتھی عقبی حصے میں گھس آیا۔ بقیہ دو اگلے حصے میں گئے اور انجن اسٹارٹ ہوتے ہی وین تیزی سے آگے بڑھ گئی!

"اسے تو اب مار ہی دو!" ان میں سے ایک بولا۔

"ہاں!" چوڑے شانوں والا غرایا۔ "وین شہر سے باہر نکلے تو اسے مار کر کہیں پھینک دیں گے!" پھر اس نے بھونڈے انداز میں قہقہہ لگایا۔ "ویسے یہ سچ بولی تھی، تین ہی نکلے!"

اس کے الفاظ پر اس لڑکی کے چہرے پر خوف سمٹ آیا اور آنکھوں سے دہشت ٹپکنے لگی۔ وہ اپنے پورے جسم کو حرکت دے کر لب ہلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے سوکھے حلق سے مدھم سی غوں غاں کے سوا کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی!

وہ دونوں ویسے تو عربی ہی بول رہے تھے۔ لب و لہجہ بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن "ح" کے تلفظ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عرب نہیں تھے۔ ان کے مسخ شدہ خدوخال سے ان کی قومیت کا تعین قطعی ناممکن تھا!

اچانک چوڑے شانوں والے نے اپنا داہنا جوتا پوری قوت سے وین کے فرش پر پڑی ہوئی لڑکی کے سینے پر رکھ دیا اور وہ قصاب کی چھری کے نیچے آئے ہوئے کسی خوفزدہ چوپائے کی طرح فریاد بھری نظروں سے ایک ایک کا چہرہ تکنے لگی!

"تم لوگ کون ہو؟" یوسف نے نرم لہجے میں ان سے سوال کیا۔

"تمہارے باپ!" چوڑے شانوں والے نے کہہ کر قہقہہ لگایا اور اس کا ساتھی خوشامدانہ انداز میں ہنسنے لگا!

ہنستے ہوئے چوڑے شانوں والے نے اپنے داہنے جوتے کو پوری قوت سے بار بار رگڑا اور اس مظلوم لڑکی کی حالت غیر ہو گئی!

"پیر ہٹاؤ!" ستیا اس نازک صورت حال میں بھی اپنی زبان بند نہ رکھ سکی! غنیمت یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کے قریب نہ تھی ورنہ ان کا جواب اس کی یا میری برداشت سے باہر ہی ہوتا!

"اسے بھی ہاتھ پیر باندھ کر نیچے ڈالو!" اس جنگلی نے غرا کر اپنے ساتھی کو حکم دیا!

"شہر سے نکل جائیں ورنہ یہ شور مچائے گی!" اس کا ساتھی میرے برابر میں بیٹھی ہوئی ستیا کو گھورتے ہوئے بولا۔

ستیا کی زبان ہلتے ہی مجھے صورت حال بگڑنے کا ادراک ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے قدرے پہلو بدلتے ہوئے جیب سے زہریلے تیروں والی شیشی نکال لی تھی اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ اس میں سے دو نہیں تو کم از کم ایک تیر ضرور برآمد ہو جائے!

"تم نے سنا نہیں بوڑھے گدھ!" ستیا نے درشت لہجے میں چوڑے شانے والے کو دوبارہ للکارا۔

اسے طیش آگیا۔ بیک زبان کئی ثقیل گالیاں دیتے ہوئے اس نے جیب سے پستول نکالنا چاہا۔ اسی لمحے میرا بایاں ہاتھ اس کی داہنی ران سے مس ہوا! اور نہ صرف اس کی آخری گالی ادھوری رہ گئی بلکہ پستول والا ہاتھ بھی جیب سے باہر نہ آسکا اور وہ نیچے لڑھک گیا!

"پیٹر.... پیٹر!" اس کے ساتھی نے بوکھلا کر اپنی جگہ چھوڑی۔ اسی اثنا میں میں نے مرنے والے کو سہارا دینے کے بہانے احتیاطاً اس کی ران میں پیوست سوئی چٹکی میں پکڑ کر نکال لی اور پھر جوں ہی وہ نیچے جھکا میں نے سوئی کی نوک پوری قوت سے اس کی گردن میں گھونپ کر واپس کھینچ لی۔

اس کے جسم کو تشنج کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ سوئی کی نوک کا لمس محسوس کرتے ہی اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اپنی حسرت دل ہی میں لیے وہ جہنم واصل ہو گیا۔

اس وقت جو کچھ ہوا وہ ہم تینوں ہی کے لیے غیر متوقع تھا۔ ہم نے فوری طور پر ان دونوں کے پستول اور فاضل راؤنڈز قابو میں کیے اور ان کو ایک دوسرے سے ملا کر وین کی ایک نشست پر یوں جما دیا کہ بادی النظر میں وہ اونگھتے ہوئے نظر آئیں!

ستیا اس قیدی لڑکی کی مدد کرنے کے لیے اس کی طرف لپکی تھی لیکن میں نے تیز سرگوشیانہ آواز میں اسے روک دیا۔

"یہ دہشت زدہ ہے، ہونٹ آزاد ہوتے ہی ہسٹریا کی مریضہ کی طرح چیخنا شروع کر دے گی!"

بات ستیا کی سمجھ میں آگئی۔ لیکن پھر بھی اس نے سہارا دے کر لڑکی کو وین کی بنچ نما سیٹ پر بٹھا دیا۔

"اس وقت ہم کہاں سے گزر رہے ہیں؟" میں نے سرگوشی میں یوسف سے سوال کیا۔ کیونکہ وین کا عقبی حصہ چاروں طرف سے بند تھا اور اس حد تک بند تھا کہ ڈرائیونگ کیبن سے اندر کا جائزہ لینا بھی ممکن نہیں تھا۔

"پتہ نہیں!" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔ "ویسے سفر لمبا ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ صحرا سے گزرنے کا ذکر کر رہے تھے!"

میں دل ہی دل میں اپنی اور یوسف کی حماقت پر ہنس دیا اور عقبی دروازہ کھول دیا۔

یوسف نے جھک کر پیچھے دیکھا اور سیدھا ہو گیا۔ "دس یا پانچ منٹ بعد ہم آبادی سے بالکل باہر ہوں گے۔ اس وقت صنعا کے مضافات سے گزر رہے ہیں!"

میں دھیمی آواز میں اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

وین یکساں رفتار سے کسی نامعلوم منزل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ اور ہمارے لیے ایک ایک منٹ بھاری ہو رہا تھا۔ پانچ منٹ گزرنے تک یوسف چار مرتبہ عقبی دروازے سے باہر کا جائزہ لے چکا تھا۔ اور پانچویں بار اس نے میدان صاف ہونے کا سگنل دیدیا!

پہلے میں نے کھلے ہوئے عقبی دروازے سے باہر جھول کر پائیدان پر اپنے قدم جمائے۔ توازن درست کیا اور پھرتی سے وین کی آہنی چھت پر چڑھ گیا۔ چند ثانیوں بعد یوسف بھی میرے برابر میں موجود تھا۔ اور ستیا نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا تھا۔

اس وقت وین کی سپاٹ چھت سے ہم بآسانی نیچے لڑھک سکتے تھے لیکن غنیمت یہ تھا کہ وین اس وقت ہموار صحرائی شاہراہ پر دوڑ رہی تھی جس میں زیادہ پیچ و خم بھی نہیں تھے۔ ورنہ اسٹیرنگ کی ذرا سی تیز گردش ہماری ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالتی!

آگے سرکنے کے بعد ہمیں عقبی اور ڈرائیونگ کیبن کے جوڑ پر گرفت مل گئی۔ میں نے سینے کے بل چھت پر چپکے چپکے سر اٹھا کر دیکھا تو زرد ریت کے درمیان ایک سیاہ منحنی لکیر کی طرح بنی ہوئی سڑک دور دور تک نظر آرہی تھی۔

اس سے آگے ہمارا پروگرام طے تھا۔ چھت پر ذرا بھی آہٹ پیدا کیے بغیر ہم قدرے آگے کھسکے۔ اور ایک دوسرے کو سہارا دینے کے لیے اپنی پنڈلیاں آپس میں الجھا لیں۔ پھر یوسف پستول تھام کر ونڈ شیلڈ کی سمت سے داہنی طرف جھکا اور عین اسی لمحے میں بائیں طرف ڈرائیور کی کھڑکی پر جھکا!

ونڈ شیلڈ پر جھکا ہوا یوسف کا الٹا چہرہ ڈرائیور کے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص کے لیے پستول سے زیادہ دہشت ناک ثابت ہوا۔ اور اس کے چوکنا ہونے سے پہلے ایک دھماکے کے ساتھ ونڈ شیلڈ کے پرخچے اڑ گئے۔ اور وہ خون میں نہایا ہوا سیٹ پر لڑھک گیا!

"آہستگی سے وین روک لو!" میں نے تیز ہواؤں کے شور میں چیخ کر کہا اور کھڑکی سے ہاتھ اندر ڈال کر پستول کی نال ڈرائیور کی کھوپڑی سے لگا دی۔ یوسف کے پستول کی مہیب نال ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ سے اس کے سینے پر اٹھی ہوئی تھی!

ڈرائیور کی ساری توجہ شاید یوسف پر مرکوز تھی کیونکہ میری آواز سنتے ہی وہ بری طرح اچھلا تھا اور پھر پوری قوت سے بریک لگا دیے!

اس کا وہ ردعمل اضطراری تھا۔ لیکن ہم دونوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ یوسف پھسل کر سر کے بل شیشے کے ٹکڑوں سے رگڑ کھاتا ہوا ڈرائیور کے برابر والی لاش پر جا گرا۔ اور میں لہرا کر ریت پر دور گرا!

بریکوں کا شور معدوم ہونے تک میں اچھل کر کھڑا ہوا لیکن اس سے پہلے ستیا صورت حال میں کسی غیر متوقع خرابی کا اندازہ کر کے نہ صرف باہر آچکی تھی۔ بلکہ اس نے گریبان پکڑ کر ڈرائیور کو ریت پر گھسیٹ لیا۔ اور نیچے گرا کر اس کے چہرے پر ٹھوکریں برسا رہی تھی!

میں نے ریت پر سے اپنا پستول اٹھایا اور اس خبیث صورت ڈرائیور کو کور کر کے معاملہ ختم کر دیا۔ ستیا نے اس کی جیب سے پستول کے علاوہ ایک لمبے پھل والا کھٹکے دار چاقو بھی برآمد کیا اور میری ہدایت پر اس کے جوتوں کے تسمے کھول کر اس کے دونوں ہاتھ سختی سے پشت پر کس دیے!

اس اثنا میں یوسف بھی نیچے آچکا تھا۔ ونڈ شیلڈ کے ربڑ گسکیٹ میں رہ جانے والی شیشے کی کرچیوں نے گرتے ہوئے اس کے بدن پر کئی خراشیں لگائی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر سہولت سے گلوخلاصی ہو جانے پر بہت مسرور نظر آرہا تھا!

"اب اس وین کو سڑک سے ریت میں اتار لے چلو!" اس نے آتے ہی کہا۔ "کسی آتی جاتی سواری نے شاہراہ کے گشتی دستے کو اطلاع دے دی تو ہمیں دھر لیے جائیں گے!"

"ریت میں یہ وین کتنی دور جا سکے گی؟" ستیا نے سوال کیا۔

"میں دیکھ چکا ہوں!" وہ ہنس کر بولا۔ "اندر گرنے سے یہی فائدہ ہوا ہے۔ فور وہیل ڈرائیو ہے۔ اسے ہم میلوں دور بھی لے جا سکیں گے!"

"یہ ٹھیک ہے!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہیں اسے اندر ڈال کر گاڑی کو آگ لگا دیں گے!"

"آگ!" اس کی وہ خوف زدہ آواز بھی غراہٹ پر مبنی تھی۔

"ہاں!" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "تمہارے ساتھ بالکل وہی سلوک ہوگا جو تم نے ہمارے ساتھ کرنے کی کوشش کی تھی!"

"وہ.... وہ پیٹر کی حرکت تھی۔ میرے دوسرے ساتھی اس کی گواہی دیں گے!" غیر متوقع طور پر ہمارے چنگل میں آجانے کے باعث اس کے اوسان باختہ ہو گئے تھے!

"مگر مشکل یہ ہے کہ تمہارے تینوں گواہ جہنم واصل ہو چکے ہیں!" یوسف اسے وین کے عقبی حصے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ "اور ان کے ساتھ مل کر کیے ہوئے کی سزا تم کو اکیلے ہی بھگتنا ہوگی!"

یوسف ڈرائیونگ پر چلا گیا اور میں اپنے شکار سمیت پچھلے حصے میں گھس گیا۔

وین میں گھستے ہی وہ پھیکے اور خوفزدہ انداز میں ہنسا۔ "تم بلاوجہ مجھے دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تو بے ہوش معلوم ہوتے ہیں!" وہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ جو عضلات اکڑ جانے کے باعث تیز بریک لگنے سے بھی سیٹ سے نیچے نہیں گری تھیں۔ بلکہ بدستور اسی طرح جمی ہوئی تھیں!

"بدمعاش ہیں، مرچکے ہیں. لیکن بے ہوشی کی اداکاری کررہے ہیں" میں فوراً انتقاماً تحقیر آمیز رویہ اپناتے ہوئے کہا "جب گاڑی میں آگ لگے گی تو گرمی کھا کر ان کے بدن حرکت میں آئیں گے۔ اس وقت اپنی بے گناہی کی گواہی دلوا دینا!"

وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اور وین نرم ریت میں اچھلتی ہنراتی تیزی سے آگے بڑھتی رہی۔ اس نے کئی بار بولنا چاہا لیکن ہر بار اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی موت کو بہت زیادہ قریب پاکر اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔

"اسے اب آزاد کردوں؟" سیتا نے وین کے فرش پر پڑی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"کردو، لیکن خیال رکھنا" میں نے کہا "جنون میں کہیں خود کو زخمی نہ کر بیٹھے!"

سیتا نے پہلے نرمی سے اس کو ہاتھوں اور پیروں کی بندشوں سے نجات دلائی اور اس نے ہاتھ کھلتے ہی وحشیانہ انداز میں اپنے ہونٹوں سے ٹیپ نوچ لیا:-

"بچاؤ، یہ سب درندے ہیں .... بھیڑیے ہیں .... میرا بدن پھاڑ ڈالیں گے ..... مجھے بچاؤ!" وہ منہ کھلتے ہی بری طرح چیخنے لگی!

اس نے چلتی ہوئی وین میں اٹھ کر شاید کسی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کا سر چھت سے جا ٹکرایا۔ اور وہ دوبارہ نیچے آرہی!

کئی منٹ کی روح فرسا چیخ و پکار کے بعد اس کی آواز پر نکان کے آثار غالب آنے لگے۔ اس کی آنکھیں چڑھنے لگیں اور آخر کار وہ بے ہوش ہوگئی. سیتا اپنی جگہ بیٹھی ترحم آمیز نگاہوں سے مسلسل اسے دیکھے جارہی تھی!

تشدد اور موت کے خوف نے اس کے شعور کو اس بری طرح گرفت میں لیا ہوا تھا کہ ذہنی ابتری کے باوجود وہ بے ہوش نہیں ہوئی. لیکن تحفظ کی پہلی امید ہوتے ہی اس کا جسمانی نظام اپنے معمول پر آیا اور نہ جانے کب سے تھمی ہوئی بے ہوشی کی فطری کیفیت رونما ہوگئی. مجھے امید تھی کہ ہوش میں آنے پر اس کی حالت خاصی معتدل ہوگی. اور وہ اپنے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا سکے گی۔

"تت .... تم کون ہو؟" کافی دیر تک اپنی قوت مجتمع کرنے کے بعد آخر کار قیدی مجھ سے ایک سوال کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"کیا سمجھ کر ہمیں زندہ جلانے کے لیے دوڑے چلے آئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ تم کون ہو اور تمہیں کس لیے پکڑنا مقصود تھا" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا "پیٹر کو دو روز سے یہ کام ملا تھا کہ عبداللطیف کے یہاں جو بھی شب بسری کے لیے آئے۔ اسے پکڑ کر ایک مقررہ مقام پر پہنچا دیا جائے!"

"ہم سے پہلے کتنے لوگوں کو پکڑا تم نے؟"

"تم پہلے ہی تھے" جان کے خوف سے وہ خود بخود بولنے پر آمادہ ہوگیا تھا "پیٹر کو یہ بتایا گیا تھا کہ جن لوگوں کی تلاش ہے۔ وہ بہت خطرناک ہیں. کام ملنے کے بعد سے ہی ہم چاروں باری باری عبداللطیف کے مکان کی نگرانی کر رہے تھے. کل رات پیٹر اس لڑکی کو لے آیا" اس نے بے ہوش لڑکی کے بارے میں کہا "پیٹر نے بتایا کہ ایک عورت اور دو مردوں کے اندر جانے کے بعد یہ لڑکی چوروں کی طرح باہر نکلی تھی. ہم نے پہلے ہی معلوم کرلیا تھا کہ یہ عبداللطیف کی خادمہ ہے. پیٹر نے اسے پیسوں کا لالچ دے کر رات گزارنے کی دعوت دی اور یہ خوشی خوشی چلی آئی. اس وقت فلیٹ پر ہم تین تھے. کلاڈ نگرانی کر رہا تھا۔ اس لڑکی نے بتایا کہ عبداللطیف کے گھر آنے والے اس کے قریبی رشتہ دار ہیں. ہم سمجھ گئے کہ یہ خادمہ کو ہٹانے کا بہانا تھا. ورنہ حقیقت کچھ اور تھی. پھر ہمیں تو وہاں آنے والے ہر اس شخص کو پکڑنا تھا. جو رات گزارے لہٰذا آج عبداللطیف کے جانے کے بعد ہم وہاں جا پہنچے. ہمیں اس کام کا بھاری معاوضہ ملنے والا تھا!"

"پکڑنا ہی تھا تو مکان کو آگ کیوں لگائی تھی؟"

"پیٹر ہر کام اپنی عقل کے مطابق کرتا ہے!" وہ روانی میں شاید اس کی موت کو فراموش کر بیٹھا تھا! "اس کا خیال تھا کہ اندر گھسنا خطرناک ہوگا. گھنٹی کے جواب میں جو بھی دروازہ کھولتا پہلے ہم اسے پکڑتے پھر بعد میں آنے والے بھی باری باری پکڑے جاتے لیکن جب گھنٹیوں کا کوئی جواب نہ ملا تو پیٹر نے اندر آگ لگانے کا حکم دے ڈالا. وہ اندر گھس کر کوئی خطرہ مول لینے کے بجائے تمہیں خود باہر آنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا. اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوگیا!"

"پیٹر کو اس کام پر کس نے مامور کیا تھا؟"

"پیٹر ہمیں صرف حصہ دیتا ہے!" وہ جلدی سے بولا "کام کرانے والے سے اگر کوئی واقف ہو تو وہ خود ہی ہوسکتا ہے!"

"ہمیں کہاں پہنچانا تھا؟"

"ہاتھ پاؤں باندھ کر وادی سر کی سرخ ٹیکری کے نیچے چھوڑ آنا تھا!" اس بار اس نے درست جواب دیا تھا. اگر وہ اس مقام سے بھی لاعلمی کا اظہار کرتا تو میں اس سے یہ ضرور پوچھتا کہ جب پیٹر شروع ہی سے وین کے عقبی حصے میں موجود تھا تو وہ اس سے ہدایات لیے بغیر برق رفتاری سے کس طرف چلا جارہا تھا. لیکن غنیمت ہے کہ اس نے خود ہی اس سوال کی نوبت نہ آنے دی!

"پیٹر نے اپنے مالک کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ عبداللطیف کے مکان میں دو مرد اور ایک عورت نے رات بسر کی ہے؟"

"نہیں!" وہ جلدی سے بولا "کلاڈ نے عبداللطیف کی ملازمہ کے ہاتھ لگنے کے بعد مشورہ دیا تھا. جو اس نے نہیں مانا ـــ وہ ضرورت سے ذرا بھی زیادہ کام کرنے کا عادی نہیں تھا. اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اسے آدمی پہنچانے کا معاوضہ ملے گا، اطلاع دینے کا نہیں!"

"تم ہمیشہ پیٹر کے لئے کام کرتے ہو؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"ہمیشہ نہیں!" اس نے جواب دیا "البتہ اگر خالی ہوں تو پیٹر ہم تینوں کو ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔ ساتھ کام کرکے ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھ گئے تھے"

"لیکن ایسے ہر موقع پر بالادستی اسی کی قائم رہتی تھی"

"ہاں ـــ!" اس نے اعتراف کیا "ہم چاروں میں ذہنی طور پر وہ سب سے بہتر تھا۔ اس کی حکمت عملی ہمیشہ ہی کامیاب ہوا کرتی تھی. تم تینوں کو بھی اس نے بے بس کر ہی لیا تھا اور میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم نے اس کی بازی کیسے الٹ دی؟"

"وہ زیادہ تر کس کے لئے کام کرتا رہا ہے؟"

"اپنے معاملات میں وہ ہمیں زیادہ دخیل نہیں ہونے دیتا تھا ہمیں کام ہونے پر صرف اپنے معاوضے سے دلچسپی ہوتی تھی اور اس بارے میں اس نے کبھی ہمیں شکایت کا موقع نہیں دیا"

پھر وین میں خاموشی چھا گئی۔

"تم مجھے ہلاک تو نہیں کروگے نا؟" کچھ دیر بعد اس نے تشویش زدہ اور پرامید لہجے میں سوال کیا "میں نے تمہارے ہر سوال کا صحیح جواب دیا ہے"

"تمہاری ساری گفتگو ہمارے لئے بے کار تھی" میں نے کہا۔

"شاید وقت گزاری کے لئے تم بلا وجہ ہی بولے جارہے تھے اور میں بھی تمہارا ساتھ دے رہا تھا!"

"لیکن میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"جس کمرے سے آگ کی ابتدا ہوئی۔ اگر میں اسی میں پڑا سو رہا ہوتا تو شاید بگڑنے کے لئے کچھ باقی ہی نہ رہا ہوتا"

پھر خاصی مسافت طے کرنے کے بعد جیسے ہی وین رکی، وہ شخص اپنی جگہ سے اچھلا اور پوری قوت سے میرے اوپر آرہا۔

دوران سفر مجھ سے باتیں کرنے کے ساتھ ہی وہ اپنی کارروائی بھی کرتا رہا تھا اور اسی دوران میں اس نے اپنی کلائیوں پر بندھے ہوئے جوتے کے تسمے زور لگا کر توڑ دیے تھے۔

سارے راستے وہ جس مایوسی اور بزدلی کا اظہار کرتا رہا اس نے مجھے اس کی طرف سے بے فکر کردیا تھا۔ میری دانست میں ایسی گئی گزری حالت میں انسان کے سارے جارحانہ تیور خوشامد اور چاپلوسی میں بدل جانے چاہئے تھے مگر میں یہ بھول گیا تھا کہ زندگی کی آخری امید بھی ہار دینے کے بعد آدمی چند سانسوں کے لئے ایک بار پوری دنیا سے بھی ٹکرانے پر تل جاتا ہے۔

اس نے میرے اوپر آتے ہی میری گردن اپنے ہاتھوں میں دبوچنے کی کوشش کی تھی. مگر میں نے پوری قوت سے اس کی ناک پر ٹکر رسید کرکے اسے بری طرح لڑکھڑا دیا۔

وہ ایک دہشت زدہ چیخ کے ساتھ قدرے پیچھے کی طرف جھولا۔ اور میں نے اس مختصر سی جگہ میں پوزیشن بنا کر اس کے سینے پر دو لاتیں ماریں اور وین کا دروازہ کھول کر پھرتی سے نیچے اتر گیا۔

مگر وہ بلا کا مکار بھی تھا۔ اس نے میرے تعاقب میں نیچے آنے کے بجائے وین میں ہی سیتا پر حملہ کردیا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے تشویش لاحق ہوئی مگر سیتا کے قریب پہنچتے ہی وہ اتنی صفائی سے وین کے کھلے ہوئے دروازے میں سے اڑتا ہوا بری طرح ریت پر آیا۔ جیسے سیتا کے بدن میں دوڑتی ہوئی طاقتور برقی رو نے اسے دور اچھال دیا ہو۔

ریت پر گرنے کے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ بس نیچے پڑا کسی تھکے ہوئے سانڈ کی طرح گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

اسی اثنا میں یوسف انجن بند کرکے نیچے آگیا۔

"کیا بولتا ہے؟" اس نے میری طرف آتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمارے لئے بے مصرف ہے۔ پیٹر ہی سے کچھ معلوم ہو سکتا تھا"

"پیٹر کی رہائش گاہ کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟" یوسف نے ریت پر پڑے ہوئے شکست خوردہ حریف کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تم معلوم کرلو" میں نے کہا۔

"تم سب الو کے پٹھے ہو!" وہ بھرائی ہوئی غصیلی آواز میں بولا "اب میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔ مرنا ہی ٹھہرا تو زبان پر قابو کیوں نہ رکھا جائے"

میں نے سرد نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ اور اس کی نگاہوں میں یک بیک خوف سرایت کرگیا۔

"ٹھہرو" یوسف نے ہاتھ اٹھا کر کہا "ابھی اس کے زندہ رہنے کی ایک صورت باقی ہے!"

یوسف کا لہجہ ٹھوس تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی تجویز موجود تھی لیکن میں نے اس بارے میں کسی تجسس کا اظہار نہیں کیا تاکہ قیدی پر میرا خوف بدستور مسلط رہے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" قیدی نے الجھے ہوئے لہجے میں یوسف سے دریافت کیا۔

"ہماری بہترین پناہ گاہ کو تم خاکستر کرچکے ہو" یوسف نے

کہا۔ اگر تم فوری طور پر کوئی ٹھکانا فراہم کر سکو تو شاید تمہاری گلوخلاصی ہو سکے!"

اس طرف میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ عبداللطیف یا رحیم الدین کا گھر جل جانے کے بعد صنعا میں ہمارے لئے کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا جبکہ وہ ہماری بنیادی ضرورت تھی۔

یوسف کے حکام کے زیرِ عتاب ہونے کی وجہ سے ایسا ہر مقام مخدوش ہو چکا تھا جس سے ماضی میں اس کا کوئی بھی کھلا رابطہ رہا ہو۔ ایسی صورت میں وہ قیدی ہمارے لئے واقعی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔

"تمہیں کن لوگوں سے خطرہ ہے؟" قیدی نے سوال کیا۔

"اس سے تمہارا کیا واسطہ؟" یوسف نے کہا۔

"پناہ گاہ کے انتخاب کے لئے یہ ضروری ہے!" اس کا ذہن زندگی کی امید نظر آتے ہی صحیح راستے پر سوچنے لگا تھا۔

"ایک دشمن نے تو تم لوگوں کو ہماری راہ پر لگایا تھا۔" یوسف نے اس کی بات کی معقولیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اور قانون سے ہم خود دُور رہنا چاہتے ہیں۔"

"شاید میں کچھ کر سکوں!" وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس نکتے پر سودے بازی نہ کر سکو گے!" میں نے اس کی نیت بھانپ کر درشت لہجے میں تنبیہہ کی۔ "ہمیں کوئی نہ کوئی جگہ مل ہی جائے گی۔ میرا دوست اس بہانے محض تمہارے خون سے بچنا چاہتا ہے۔"

"میری گلوخلاصی فوراً ہو جائے گی؟"

"جب تک ہم تمہاری فراہم کی ہوئی جگہ پر رہیں گے، تم ہمارے یرغمالی رہو گے۔" یوسف نے کہا۔ "ہمارے جانے کے بعد تم آزاد ہو گے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ جاتے ہوئے تم میری کھوپڑی میں گولی نہیں اتارو گے۔" وہ آسانی سے اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"پھر تو ہمیں بھی یہ ضمانت طلب کرنا ہو گی کہ تحفظ کے دھوکے میں تم ہمیں کسی چوہے دان میں نہیں پھنساؤ گے۔" یوسف کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"تمہیں میری نیت میں جب بھی فتور محسوس ہو، مجھے گولی مار سکو گے۔"

"معاملے کو طول دینے کے بجائے کام کی بات کرو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "جو کام ایک فائر سے نمٹ سکتا ہے اس کے لئے ہم زیادہ وقت برباد نہیں کر سکتے۔"

"پیٹر کے مکان سے تمہیں کیا دلچسپی تھی۔ کہیں اس کے بارے میں تو کچھ نہیں سوچ رہے تھے؟" قیدی نے سوال کیا۔

"اسے بھول جاؤ۔" یوسف نے کہا۔ "وہاں سے صرف یہ سراغ مل سکتا ہے کہ پیٹر کن لوگوں کے لئے کام کر رہا تھا مگر اب ہمیں اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"صنعا کے بجائے درنہ میں تمہارے لئے چند روز کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" قیدی نے کہا۔ "وہاں میرا بھتیجا ایک فارم چلاتا ہے کسی کو تمہاری موجودگی کا کانوں کان بھی پتہ نہیں چل سکے گا۔"

"پیٹر سے اس بار کتنا معاوضہ ملنے کی امید تھی؟"

"دو ہزار۔"

"اگر وہاں ہمیں کوئی دشواری پیش نہ آئی تو آزادی کے ساتھ ہی تمہیں یہ رقم بھی مل جائے گی۔" یوسف نے اسے پیشکش کی اور وہ ریت پر سے اٹھ گیا۔

درنہ صنعا سے کوئی ستر کلو میٹر دُور ایک زرعی علاقہ تھا لیکن ہمارے لئے وہاں تک پہنچنا ایک دشوار مسئلہ تھا۔

عبداللطیف کا مکان جس طرح ان لوگوں کی کارروائی کا نشانہ بنا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ پیٹر سے کام لینے والا اگر مائیکل ٹرمپ بذاتِ خود نہیں تھا تو اس کا کوئی ساتھی ضرور تھا اور ان لوگوں کو کافی عرصے سے اس بات کا علم تھا کہ یوسف آڑے وقتوں میں اس سے رجوع کرتا رہتا تھا۔ لیکن یوسف سے کوئی بڑا تنازعہ نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں نے عبداللطیف کو ہمیشہ ہی نظر انداز کئے رکھا.

لیکن اس بار معاملہ قطعی مختلف تھا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ مجھے اور سیتا کو صنعا میں یوسف کا بھرپور تعاون حاصل تھا لہٰذا جب انہوں نے ہمیں گھیرنے کی کوششوں کا آغاز کیا تو یہ امکان بھی سامنے رکھا کہ قانون اور نامعلوم دشمنوں کی دو طرفہ یلغار سے بچنے کے لئے یوسف ہم لوگوں سمیت عبداللطیف کے گھر کا رُخ بھی کر سکتا تھا۔ لہٰذا اپنی مہم کے آغاز کے ساتھ ہی انہوں نے پیٹر کو اس مورچے پر مامور کر دیا۔

لیکن پیٹر کو شاید انہوں نے پورے معاملے کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی۔ یہ پہلو اس اعتبار سے ہمارے حق میں مفید تھا کہ پیٹر اور اس کے دو ساتھی ہماری اصلیت جانے بغیر موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور جو چوتھا زندہ رہ گیا تھا وہ بھی ہماری شخصیتوں سے پوری طرح ناواقف تھا اور ہم سے تعاون پر بھی رضامند ہو گیا تھا۔

لیکن ان مثبت نکات کے باوجود اس مقام سے درنہ تک کی مسافت خطرے سے خالی نہیں تھی۔ اکیلا شخص تو آسانی سے لوگوں میں گھل مل کر اپنی شناخت مٹا سکتا تھا لیکن وہاں معاملہ کم از کم چار کا تھا اور ہم کوئی ایسی بے احتیاطی مول لینے کے لئے تیار نہیں تھے جس کے نتیجے میں قیدی ہمیں جُل دے کر نکلنے میں کامیاب ہو جائے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔

جس وین میں ہم اس مقام تک پہنچے تھے وہ مخدوش ہو چکی تھی۔ اسے عبداللطیف کے جلتے ہوئے مکان کے پھاٹک پر دیکھا گیا تھا۔ مکان جلنے کا واقعہ اتنا سنگین تھا کہ رحیم الدین اسے پولیس تک لے جائے بغیر باز نہ آتا اور اگر اس کا کوئی ہمدرد پڑوسی وین کا نمبر نوٹ کر چکا تھا تو دوسری فردِ جرم سے پہلے ہم سب کا سنگین آتشزنی کے شبہ میں پکڑا جانا لازمی ہو جاتا۔

وین میں موجود تین لاشوں کے معاملے میں قدرے بحث کے بعد یہ طے کر لیا گیا کہ ہمارا قیدی نرم ریت میں اپنے ہاتھوں سے ان کی تدفین عمل میں لائے۔ ان لاشوں کا چھپانا یا جلانا محض اس لئے ضروری تھا کہ ان میں سے دو لاشیں زہریلی تیروں کا شکار ہوئی تھیں اور اگر وہ اسی حالت میں پولیس کو مل جاتیں تو دوسرے جرائم کے علاوہ صفدر علی پر دوہرے قتل کا ایک تازہ الزام اور عائد ہو جاتا۔ یہی نہیں بلکہ پیٹر وغیرہ کے حوالے سے رحیم الدین کے مکان کی آتشزنی میں بھی کم از کم پولیس کی سطح پر میرا نام ملوث ہو ہی جاتا۔

اس وقت ہمارے لئے رحیم الدین کی مظلوم خادمہ بھی ایک بوجھ بنی ہوئی تھی۔ اول تو اس کی ذہنی حالت ہی ابتر تھی پھر ہماری نفری بجائے خود اتنی تھی کہ اسے ساتھ لگائے رکھنے میں خطرات ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتے لہٰذا اس کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ اگر وہ ہوش میں بھی آ جائے تو اسے کسی ترکیب سے زیادہ بے ہوش کر دیا جائے اور لاشوں کی تدفین کے بعد اسے وین میں شاہراہ پر چھوڑ دیا جائے۔

ہوش میں آنے پر وین سے نکلنے کے بعد اس کے بھٹکنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ کسی بھی سواری سے لفٹ لے کر بآسانی صنعا پہنچ سکتی تھی!

یہ سارے نکات طے کرنے کے بعد قیدی کی نگرانی میرے ذمے آ گئی اور یوسف وہاں سے پیدل ہی سڑک کی طرف چل دیا تاکہ اس ویران صحرا سے درنہ تک ہمارے قافلے کے محفوظ سفر کی کوئی سبیل پیدا کر سکے۔

یوسف کے جانے کے کچھ دیر بعد اچانک ہی میرے ذہن میں ایک تجویز آئی اور میں نے قیدی کو تدفین کا کام جلد نمٹانے میں مدد دینے کے لئے گڑھوں میں مٹی ڈالنی شروع کر دی۔

"کیا پروگرام میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟" قیدی نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے تحیّر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔" میں نے اختصار سے جواب دیا۔ پھر فوری طور پر موضوع تبدیل کرنے کی نیت سے سوال کیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"حسین المزینی!" اس نے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

سیتا وین کے عقبی حصے کے پائیدان پر بیٹھی دلچسپی سے یہ دیکھ رہی تھی کہ باہمی دشمنی اور خون آشام مقابلوں کے بعد قیدی کے اور میرے درمیان آخرکار مفاہمت کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ جو ہماری بدلی ہوئی حکمتِ عملی کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔

جب تدفین سے نمٹنے کے بعد میں نے حسین کو وین میں سوار ہونے کا حکم دیا تو اس کے بشرے پر تذبذب کے آثار ابھر آئے۔

"اسی وین میں جاؤ گے؟"

"صرف شاہراہ تک!" میں نے کہا۔ "لیکن یہ سمجھ کر کہ اب ایک پر ایک کا مقابلہ ہے، کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے پاس ایک ایسا ہتھیار موجود ہے جس کے شکار کو یہ علم ہی نہیں ہو پاتا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی!"

"میں نے وہ دونوں لاشیں دیکھی ہیں!" وہ پھیکے لہجے میں بولا۔ "ان پر کسی سریع الاثر زہر کی ساری علامات نمایاں تھیں۔ ویسے تم میری طرف سے اب بے فکر رہو، معاہدہ ہونے کے بعد میں آخری سانس تک اسے نباہنے کی کوشش کروں گا۔"

سیتا عقبی حصے میں سوار ہو گئی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ حسین المزینی میرے برابر والی نشست پر موجود تھا۔

ریت پر ٹائروں کے نشانات کے سہارے واپسی کا سفر شروع ہوا اور بمشکل نصف گھنٹے سے بھی کم عرصے میں ہم نے یوسف کو جا لیا۔ فضا میں انجن کا شور سن کر اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ میں پناہ لی ہوئی تھی لیکن وین کو پہچان کر وہ سامنے آ گیا تھا۔

میں انجن بند کر کے نیچے اتر گیا۔

"تمہارے چلے آنے کے بعد میرے ذہن میں ایک نئی تجویز آئی تھی۔"

"وہ کیا؟" اس نے دلچسپی کے ساتھ سوال کیا۔

"اس وقت ہم جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس کے پیشِ نظر شاہراہ سے گزرنے والے کسی بے گناہ مسافر کو بے ہوش کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے!" میں نے کہا۔

"بہت اچھی اور بے ضرر ترکیب ہے!" حسین المزینی وہ تجویز سن کر یوسف سے پہلے بول اٹھا۔ "اس وقت تین بجے ہیں اور ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ اگر ہم چھ بجے تک صنعا پہنچ جائیں تو ساڑھے چھ پر صنعا سے درنہ روانہ ہونے والی بس پکڑ سکیں گے۔"

"ہاں — سرِ شام درنہ کے لئے بس جاتی ہے۔" یوسف نے اس کی تائید کی۔ "جس میں بیشتر تعداد صنعا میں کام کرنے والے درنہ کے مزدوروں کی ہوتی ہے۔"

"ہم وین کہیں آڑ میں کھڑی کر کے چھپے رہیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی سڑک پر کسی ایسی کار کا انتظار کرے گا جس میں کوئی تنہا مسافر ہو۔ کار کو لفٹ کے بہانے روک کر مسافر کو بے ہوش کر دیا جائے

تو ہم طوالت میں پڑے بغیر آسانی سے صنعا تک پہنچ جائیں گے!" میں نے انہیں تفصیل کے ساتھ اپنی تجویز سے باخبر کیا۔ "مجھے اور سیتا کو صنعا وغیرہ سے بالکل واقفیت نہیں ہے۔ لہٰذا سیتا تمہارے ساتھ رہے گی اور میں حسین کے ساتھ۔ ہم دو دو کی نفری میں ایک دوسرے سے لاتعلق رہ کر بس میں سوار ہوں گے۔ اور کسی کو ہم پر شبہ بھی نہ ہو سکے گا۔"

یوسف بحث کئے بغیر فوراً ہی مجھ سے متفق ہو گیا اور ہمارا قافلہ وین میں دوبارہ سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب ٹیلوں پر سے گزرتے ہوئے دُور نشیب میں بل کھاتی ہوئی سیاہ ویران سڑک نظر آنے لگی تو تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک اونچے ٹیلے کی اوٹ میں وین روک دی گئی۔

وین میں پڑا ہوا ایک بڑا سا رومال سر پر ڈال کر یوسف نے اس کے سرے اس طرح گردن پر لپیٹے کہ اس کا خاصا چہرہ چھپ گیا۔ ہوا بلکہ خاص طور پر غبار آلود ہوا سے چہرے کے بچاؤ کے لئے وہ مقامیوں کا ایک خاص انداز تھا جس پر کسی کو بھی بادی النظر میں شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس کی کارروائیوں کا جائزہ لیتے رہنے کی نیت سے میں حسین المزینی کو ساتھ لے کر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ جہاں سے سڑک کا کئی فرلانگ کا طویل ٹکڑا صاف نظر آ رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے کیوں ساتھ لئے پھر رہے ہو۔" اوپر پہنچ کر حسین نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں اب بھی مجھ پر بھروسا نہیں ہے اور تم ایک پل کے لئے بھی مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے۔"

"میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"تمہیں گولی مار کر خاموشی سے شہر لوٹ جاتا۔"

"اس لئے کہ تم یہاں اجنبی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "صنعا میں ہم دُور ہی سے پہچان لئے جائیں گے۔ ہمیں یمن میں ایک ٹھکانہ چاہئے کیا تمہارے لئے یہی غنیمت نہیں ہے کہ اس بہانے ہمارے ہاتھوں تمہاری موت کا خطرہ ٹل چکا ہے!"

وہ نہ خود خاموش ہوا نہ مجھے خاموش رہنے دیا۔ ذہن پر سے موت کا خوف ہٹ جانے کے بعد وہ خاصا خوش کلام ثابت ہو رہا تھا۔

اسی اثنا میں یوسف سڑک کے کنارے جا پہنچا اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔

نصف گھنٹے کے عرصے میں وہ تین بار اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھا لیکن ہر بار لفٹ کا اشارہ کئے بغیر دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھا اور کاریں تیزی کے ساتھ اس کے سامنے سے گزر کر صنعا کی طرف بڑھتی چلی گئیں جس کا مطلب تھا کہ ان گاڑیوں میں ایک سے زیادہ مسافر تھے۔ جنہیں روکنا ناگہانی خطرات مول لینے کے مترادف تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح گزارنے کے بعد یوسف سڑک کے کنارے کھڑا ہوا تھا کہ ہم نے اسے تیزی سے سڑک عبور کرتے دیکھا اور پھر بے تابی سے فضا میں ہاتھ لہرانے لگا۔

"کیا صنعا سے آنے والی کار کو روکنے کا ارادہ ہے اس کا؟" حسین نے یوسف کی حرکات دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کار صنعا سے آ رہی ہو یا اُدھر جا رہی ہو۔ ہمیں تو بلا شرکت غیرے محض ایک کار کی ضرورت ہے!"

"ہاں ۔۔۔ ٹھیک ہی تو ہے۔" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

اس اثنا میں صنعا سے آنے والی سرخ شیورلے بھی ہمیں نظر آ گئی۔ اس کے انجن کی غراہٹ تو ہوا کے دوش پر پہلے ہی سے گونج رہی تھی۔

اس بار یوسف کے ستاروں نے یاوری کی اور وہ بڑی سی سرخ کار بتدریج سست ہوتی ہوئی اس کے سامنے آ رکی۔

ہم دونوں نے ہی یوسف کو اس کار کی اگلی کھڑکی کے قریب جھکتے دیکھا اور بمشکل چند ثانیوں بعد ہی وہ لپک کر ڈرائیونگ سیٹ کی سمت پہنچا اور مزید چند ثانیوں بعد سرخ شیورلے کو یوٹرن دے کر سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔

تقریباً ایک منٹ بعد ڈرائیونگ سیٹ کی سمت سے یوسف برآمد ہوا۔ اور اس بار اس نے کار کا بانٹ اٹھا دیا۔

اسے یہ علم نہیں تھا کہ ہم اس کی تمام کارروائیوں کا جائزہ لے رہے تھے لہٰذا وہ اپنے کام سے نمٹ کر تقریباً دوڑتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔

"وہیں رکو ۔۔۔ ہم آ رہے ہیں!" میں نے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے کہا اور آواز شاید اس کے کانوں تک پہنچ گئی کیونکہ دوڑتے دوڑتے وہ یک لخت رُک گیا تھا۔

"آؤ!" یہ کہہ کر میں تیزی سے ڈھلان اترتا چلا گیا۔

ایک بڑی کامیابی ہو جانے کے بعد ہمارے لئے ضروری تھا کہ شاہراہ سے کوئی دوسری کار پہنچنے سے پہلے سرخ کار میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو جائیں۔

میری آواز سیتا نے بھی سُن لی تھی اور وہ بے چینی سے میری واپسی کی منتظر تھی۔

"لڑکی ابھی ہوش میں آئی تھی۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ہلکی

سی ضرب لگا کر اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا۔" نیچے پہنچتے ہی اس نے مجھے مطلع کیا۔

شاہراہ کی طرف ہم تیزی سے بڑھے اور چند ہی منٹ میں اس لق و دق صحرائی راستے پر پہنچ گئے جہاں یوسف بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔

میں نے وہ وین سڑک سے نیچے مگر اس کے متوازی یوں کھڑی کی کہ اس کا رُخ صنعا کی مخالف سمت میں تھا پھر ہم تینوں پھرتی سے سرخ شیورلے میں منتقل ہو گئے۔ حسین المزینی یوسف کے برابر میں اگلی نشست پر بیٹھا تھا جبکہ میں سیتا کے ہمراہ عقبی نشست پر تھا۔ ہمارے پائیدان میں ایک خوش پوش مقامی نوجوان بے سُدھ پڑا ہوا تھا اور بے ہوش مصری خادمہ وین میں ہی چھوڑ دی گئی تھی۔

"بڑی آسانی سے قابو میں آ گیا۔" کار روانہ ہوتے ہی میں نے مسرت آمیز لہجے میں تبصرہ کیا۔

"بہت شریف لڑکا تھا۔ کچھ پوچھے بغیر لفٹ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔" اس نے کہا۔ "مگر میں نے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کر اس کی کھوپڑی پر پتھر سے ضرب لگائی اور وہ اسٹیئرنگ پر سر جھکا کر بے ہوش ہو گیا۔"

"کیا کار کا انجن بند کر دیا تھا؟"

"نہیں، لیکن وہ اس قدر قرینے کا آدمی تھا کہ کار رکتے ہوئے گیئر نیوٹرل کر لیا تھا ورنہ کار رکتے وقت والا شدید جھٹکا مجھے کوئی ضرب ضرور لگاتا۔"

بدترین خطرات کے سائے ہمارے سروں سے بڑی حد تک چھٹ چکے تھے، آخری فکر بس یہی رہ گئی تھی کہ صنعا پہنچنے تک راستے میں اس کار کی وجہ سے کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔

خدا خدا کر کے وہ شیطان کی آنت جیسا طویل سفر اس حد تک اپنے اختتام کو پہنچا کہ کار صنعا کے مضافات میں داخل ہو گئی۔

"ورنہ میں تمہارے بھتیجے کا کیا نام ہے؟" یوسف نے حسین المزینی سے سوال کیا۔ "اگر بس میں کسی سے بات کرنا ہی پڑ گئی تو ورنہ میں کسی شناسا کا نام لینا ہی پڑے گا۔"

"فکر نہ کرو۔ میں جو تمہارے ساتھ ہوں!" اس نے کہا۔

"تم بھول رہے ہو کہ ہم دو دو کی دو ٹولیوں میں سفر کریں گے۔" یوسف نے اسے یاد دلایا۔

"اس کا نام صباح المزینی ہے۔ ویسے تم اس کا نام نہ ہی لو تو بہتر رہے گا کیونکہ تمہیں اسی کے پاس پناہ لینی ہے۔"

"میرا اندازہ مجھے بھی ہے لیکن نام جاننا پھر بھی بہتر رہے گا۔"

ساڑھے پانچ بجے یوسف نے مجھے اور حسین کو ایک ویران گلی میں اترنے کے لئے کہا۔ ہم دونوں کے نیچے آتے ہی سُرخ کار آگے بڑھ گئی۔

"تمہارا ساتھی صنعا کے چپے چپے سے واقف معلوم ہوتا ہے!" حسین نے اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "یہ ویران گلی ویسے تو بس اسٹاپ سے بہت دُور ہے لیکن ایک زیرِ تعمیر عمارت سے گزرنے کے بعد بمشکل چند منٹ کا راستہ ہے!"

"بس کی روانگی میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے!"

زیرِ تعمیر عمارت میں پھیلے ہوئے ساز و سامان کو عبور کرنے کے بعد ایک میدان تھا جس کے اختتام پر ایک وسیع دیوار بنی ہوئی تھی۔ ہم دیوار کے سہارے چلتے ہوئے اگلے حصے میں پہنچے تو بارونق بازار سے گھرا ہوا وہ وسیع بس اسٹاپ ہمارے سامنے تھا جہاں چند روز پہلے میں سیتا اور یوسف کے ہمراہ پہلی بار اترا تھا۔

اس وقت میری نگاہ گرد و پیش سے پوری طرح باخبر تھی میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور ہر آن یہ خوف لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی مجھے پہچان کر میرے گریبان پر ہاتھ نہ ڈال دے۔

یوسف اور سیتا کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔

بس اسٹاپ پر بنے ہوئے کیبن کی دیوار پر صنعا سے مختلف مقامات تک کے کرائے درج تھے اور اگر ان کی ترتیب درست تھی تو صنعا اور ورنہ کے درمیان کم از کم بیس دیہات یا بس اسٹاپ ضرور آتے تھے۔

ہم ٹکٹ خرید کر بس میں داخل ہوئے تو آدھی سے زیادہ نشستیں بھر چکی تھیں۔ تقریباً سارے ہی مسافر بیک وقت ایک دوسرے سے زور زور سے بولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں سستے مزاج کا عنصر غالب تھا جس کا سبب شاید وہ دو لڑکیاں تھیں جو سب سے اگلی نشست پر خاموش بیٹھی تھیں۔

بس کا پورا فرش چبائی ہوئی گنڈیریوں اور مونگ پھلیوں کے چھلکوں سے اٹا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہفتوں سے اس کی صفائی کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی ہو۔

ہم دونوں کے داخلے پر کئی نگاہیں ہماری طرف اٹھی تھیں جن میں طنز، استہزائیہ، تمسخر اور تضحیک نمایاں تھی، دوستی کی جھلک یکسر مفقود تھی جو زیادہ قرینے کے تھے ان کی نگاہیں سپاٹ رہی تھیں۔

ہم دونوں دو برابر برابر خالی نشستوں پر بیٹھ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے میرا بازو تھام کر مجھے روک دیا۔

"کسی دوسری جگہ بیٹھو، یہاں مسافر آئیں گے!" وہ ادھیڑ عمر میرا بازو تھامے تیز لہجے میں کہہ رہا تھا اسی کے ساتھ وہ کچھ چباتا بھی جا رہا تھا۔

میں نے سختی سے اس کا ہاتھ دُور جھٹک دیا۔ "کہاں ہیں مسافر؟"

"اگلے اسٹاپ سے سوار ہوں گے!" وہ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

"تو وہ کہیں اور بیٹھیں گے!" حسین الزینی نے غرّا کر ترش لہجے میں جواب دیا اور اسے گھورتا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔ میں اس سے پہلے ہی نشست سنبھال چکا تھا۔

حسبِ توقع وہ شخص پلٹ کر کچھ نہ بولا بلکہ لاتعلقانہ انداز میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

روانگی سے دو تین منٹ پہلے ڈرائیور نے اپنی جگہ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ "سب آ گئے؟" اس نے تقریباً چیختے ہوئے سوال کیا۔

بس میں موجود تقریباً آدھے مسافروں نے اس کے سوال کا جواب دینا فرض تصور کیا۔ بیشتر نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے چل پڑنے کی فرمائش کی تھی جبکہ اکا دُکا نے خریداری کے لئے پیچھے گئے ہوئے اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے کی التجا کی تھی۔

ڈرائیور نے یکے بعد دیگرے دو تین بار کرخت ہارن بجایا اور بس کو گیئر میں ڈال کر دھیمے دھیمے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔

باہر والوں کے لئے اس کا اشارہ مؤثر ثابت ہوا اور کئی افراد دوڑتے ہوئے گیٹ سے اندر گھس آئے مگر ان میں سیتا اور یوسف کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

پروگرام کے مطابق انہیں اس وقت تک بس میں موجود ہونا چاہئے تھا لیکن وہ دونوں نجانے کہاں رہ گئے تھے۔

میرے دل میں ان دونوں کی سلامتی کی طرف سے عجیب عجیب وسوسے جنم لینے لگے۔ اور میں اس وقت کو بُرا کہنے لگا جب میں نے اکٹھے کے بجائے الگ الگ رہ کر سفر کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

سیتا کے نہ آنے کی وجہ سے میری نگاہوں میں ماضی کے وہ ماہ و سال گھوم رہے تھے جو میں نے اس کی تلاش میں دَر بدر بھٹک کر گزارے تھے۔

سچی بات تو یہ تھی کہ اس وقت مجھے یوسف سے ذرا بھی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ میرے اندر چھپا ہوا خود غرض انسان پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اگر میری سیتا واپس آ جاتی تو میں یوسف کی پروا کئے بغیر سیتا کے ساتھ آگے بڑھ جاتا۔

بس میں شاید ایک آدھ ہی نشست خالی رہ گئی تھی میری نگاہیں کھڑکی سے باہر بسوں کا انتظار کرنے والوں اور ہاکروں کے ہجوم میں بھٹک رہی تھیں لیکن ان دونوں کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ ان کے ساتھ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ وہ مسروقہ کار میں اس کے بے ہوش مالک کو لئے ہوئے شہر میں گھوم رہے تھے اور اگر وہ ہوش میں آ گیا تھا تو سیتا کے ہاتھوں دوبارہ زیر ہونے سے پہلے اس نے یقینی طور پر اتنا اودھم ضرور برپا کیا ہو گا کہ متعدد لوگ سُرخ کار کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں گے۔

بس میں نشستیں ایک دوسری سے اس قدر قریب تھیں کہ میں اس صُورتِ حال کے بارے میں حسین سے بھی کوئی مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ میری بے چینی بھانپ رہا تھا اور اس کے بشرے سے بھی تشویش کے آثار ہویدا تھے لیکن ہم دونوں ہی بے بس تھے۔

بے اختیار میرے دل میں آئی کہ بس سے اتر جاؤں لیکن میری وہ حرکت دوسرے مسافروں کو میری طرف سے مشکوک کر سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے دل پر جبر کر کے فیصلہ کیا کہ دو تین اسٹاپ گزرنے کے بعد میں خاموشی سے کسی جگہ اتر جاؤں گا تاکہ کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر ان کی تلاش کے لئے واپس صنعا لوٹ سکوں۔

"کوئی احمقانہ بات نہ سوچنا!" حسین نے اپنی پنڈلی پر کھجانے کے بہانے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کسی وجہ سے انہیں تاخیر ہو گئی ہو۔"

میرے لئے جواب دینے کا موقع نہیں تھا۔ میں بس اسے گھور کر رہ گیا۔

مگر اس کے اس فقرے نے مجھے اس کی نیت کی طرف سے مطمئن کر دیا۔ اس وقت تک میں اسے اپنا قیدی تصور کر رہا تھا جو طاقت کے بل پر میرا اسیر تھا اور اپنی زندگی کے خوف سے مجھے ورنہ تک لے جانے پر مجبور تھا۔ لیکن اس نے ثابت کر دیا تھا کہ معاہدے کے سلسلے میں اس کی نیت صاف تھی۔

ڈرائیور نے آخری بار چند ثانیوں تک مسلسل ہارن بجایا جس کے بعد بس حرکت میں آ گئی۔

صنعا کے پُر ہجوم دو رویہ راستوں کے درمیان بھری ہوئی بس میں سفر کرتے ہوئے بھی میں اس وقت تنہائی کے ایک ہولناک عذاب سے دوچار تھا۔ جس کا علاج سیتا کی ذات کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

گنجان ٹریفک سے گزرتی ہوئی وہ بس چند میل بعد صنعا کے ایک شہری اسٹاپ پر رُکی تو ایک باوردی فوجی دروازے سے اندر داخل ہوا اور میرا دورانِ خون یک بیک کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ فوجی کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری تھی اور وہ بغور مسافروں کا جائزہ لیتا ہوا بس کے عقبی حصے میں ہماری طرف آ رہا تھا۔

میرا ارادہ ہوا کہ اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دوں لیکن اسی لمحے حسین نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور میں جلدی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا لیکن کن انکھیوں سے مجھے وہ فوجی بدستور بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا

اوہ! اس وقت میری جان میں جان آئی جب وہ وردی پوش فوجی جوان ہم تک پہنچنے سے پہلے داہنی طرف والی ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔

اس کی پشت ہماری جانب ہوئی تو میں نے کھڑکی کی طرف سے سر گھما کر اس باوردی فوجی کے بعد داخل ہونے والے مسافروں کا جائزہ لیا لیکن اُن میں نہ یوسف کا پتہ تھا اور نہ ہی سیتا نظر آ رہی تھی۔

بس میں مسافروں کی تعداد نشستوں کی تعداد سے متجاوز ہو گئی تھی۔ اور تین چار افراد نشستوں کے درمیان رک کر بے بسی سے بھری ہوئی نشستوں کا حریصانہ جائزہ لے رہے تھے۔

چند ثانیوں بعد بس چل پڑی۔

"خود پر قابو رکھو۔" حسین المزینی نے میرے کان کے نیچے سرگوشی کی۔ "تمہارے چہرے سے اس وقت شدید تشویش اور پریشانی ظاہر ہو رہی ہے، بلا وجہ تم کسی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا بیٹھو گے۔"

میں نے چونک کر نشست پر پہلو بدلا اور اضطراری انداز میں سگریٹ سلگالی۔

بس میں سامنے نمایاں طور پر "ممنوع التدخین" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے لیکن اس رسمی ممانعت کی پروا کیے بغیر مجھ سے پہلے کئی مسافر تمباکو نوشی میں مصروف تھے لہٰذا میں نے بھی اس ممانعت کو نظر انداز کر دیا۔

اس وقت میرے ذہن میں خیالات کی پریشان کن آندھیاں چل رہی تھیں حسین المزینی کی تنبیہہ کے بعد میں نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میرے بشرے سے خیالات کا اظہار ضرور ہو رہا تھا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ بس میں نشستوں کا انتظام ایسا تھا کہ ہم بیشتر مسافروں کی پشت پر تھے اور جو باقی تھے وہ ہماری پشت پر تھے۔ بمشکل ایک دو ہی افراد مجھے دیکھ سکتے تھے۔

کچھ دیر کے بعد مسافروں میں سے ایک آدھ آواز بس کو رکوانے کے لیے ابھری۔ چند افراد اگلے اسٹاپ پر اترنے کے لیے اپنی نشستیں چھوڑ رہے تھے۔

میرے بوجھل ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

سیتا یوسف کے ہمراہ صنعا میں رہ گئی تھی۔ بس کی روانگی تک ان دونوں کے نہ پہنچنے کا ایک ہی سبب ہو سکتا تھا کہ وہ چلتے چلتے ایک بار پھر کسی ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ادھر میری عزیز از جان سیتا صنعا میں کسی پیچیدہ الجھن کا شکار ہو چکی تھی اور میں اس کا انجام معلوم کیے یا اس کی مدد کیے بغیر حسین المزینی کے ہمراہ اس شہر سے ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

"کہاں؟" حسین المزینی نے میرے بدن کی جنبش محسوس کرتے ہی چونک کر قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"میں یہاں اُتر رہا ہوں۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "میں انہیں تلاش کیے بغیر صنعا سے باہر نہیں نکل سکتا۔"

"بیٹھے رہو۔" وہ اپنی کہنی میرے پہلو میں مار کر غرایا۔ "جگہ چھوڑی تو ابھی شور مچا کر گرفتار کروا دوں گا۔"

میں حیرت سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

نصف گھنٹے سے بھی کم مدت میں اس نے اپنی نیک نیتی اور خیر خواہی کے دو ناقابلِ تردید ثبوت پیش کر دیے تھے۔

صنعا کے نواحی صحرا میں سفر کرتے ہوئے حسین المزینی ہم سب کا بدترین دشمن تھا اور ہمیں وادیٔ سر کے ایک مخصوص مقام تک پہنچانے کے عوض ہیٹر کی معرفت ہمارے کسی نامعلوم دشمن سے معاوضہ وصول کرنے کی فکر میں مبتلا تھا لیکن صحرا کے ویرانے میں مقدر کی یاوری نے طاقت کے بل پر اسے ہمارا اسیر بلکہ یرغمالی بنا دیا تھا لیکن اس نے اپنے رویے سے دوسری بار یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ خود کو میرا یرغمالی نہیں سمجھ رہا تھا بلکہ عملاً میرا مربی اور محافظ بننے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ مجھے میری حماقتوں سے باز رکھ سکے۔

اگر وہ ذاتی مفاد کے بارے میں سوچ رہا ہوتا تو اس کا ردِعمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ میں اگر تنہا اتر بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے روکنے کے بجائے اکسانے کی کوشش کرتا تاکہ اسے میری بالادستی سے نجات ملتی لیکن اس وقت وہ اپنے بجائے میری سلامتی کے بارے میں زیادہ متفکر تھا۔

"مم۔۔ مگر وہ۔۔" میں نے کہنا چاہا مگر اس نے تیزی سے میری بات کاٹ دی۔

"آجائیں گے، وہ بھی آجائیں گے مگر تم کوئی حماقت نہیں کرو گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اگلی نشست کی پشت گاہ اس طرح تھام لی کہ اس کی کلائیوں نے میرے باہر نکلنے کی راہ مسدود کر دی۔

میں نے چند ثانیوں تک غور کرنے کے بعد عارضی طور پر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ایک بار دور پہنچنے کے بعد بھی میں بآسانی صنعا واپس آسکتا تھا۔

بس کی رفتار بتدریج سست ہوتی رہی۔ اور وہ چند سیکنڈ بعد دوسرے اسٹاپ پر رک گئی۔

تین اترنے والوں کے بعد جو پہلا چہرہ سیڑھیوں سے بس میں داخل ہوا اسے دیکھتے ہی میرا دل وفورِ مسرت سے اچھل پڑا۔

اندر آنے والی سیتا تھی، اس کے پیچھے یوسف بھی صحیح سلامت موجود تھا۔ سیتا کی نگاہیں نشستوں پر بھٹک رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے بیٹھنے کی جگہ کی نہیں بلکہ کسی شناسا چہرے کی تلاش تھی۔ جو میرے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

ان سے پہلے تین مسافر پہلے ہی نشستوں کے درمیان کھڑے ہوئے تھے لہٰذا سیتا اگلے مسافر سے ایک معقول فاصلے پر ٹھہر گئی۔



اس اثنا میں میری اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور وہ اپنے حسین چہرے پر آسودگی کا ایک ناقابلِ بیان احساس لیے گھوم کر کھڑی ہو گئی۔ حسین المزینی نے ان دونوں کو دیکھتے ہی مجھے پُرجوش انداز میں کندھا مارا تھا۔

یمنی باشندے اپنے جغرافیائی حالات کے تحت تندخو اور کرخت ضرور تھے مگر ان میں صنفِ نازک کا اتنا احترام ضرور پایا جاتا تھا کہ لحظہ بھر بعد ہی ایک جواں سال مقامی نے اپنی نشست سیتا کے لیے خالی کر دی۔

سیتا نے نشست سنبھالی اور یوسف اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ جگہ دینے والا فیاضانہ انداز سے پیچھے سرک آیا تھا۔

سیتا کے نظر آجانے کے بعد میرے ذہن پر سرور کی ہلکی سی دھند چھاتی چلی گئی میرے لیے اس وقت یہ بات قطعی غیر اہم ہو کر رہ گئی تھی کہ سیتا کہاں پھنسی تھی؟ کس دشواری سے دوچار ہوئی تھی؟ اور اس سے کیسے نجات حاصل کی؟

میرے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ ہر رکاوٹ کو عبور کر کے آخرکار ایک مرتبہ میرے ساتھ پھر اس بس میں موجود تھی۔

صنعا میں اگلا اسٹاپ شہری حدود میں بس کا آخری اسٹاپ ثابت ہوا۔ شہر میں تین جگہ رکنے کے چند منٹ بعد ہی بس یک بیک

ایک ایسے راستے پر آ گئی جہاں سڑک کے دونوں طرف تاحدِ نظر ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔

صنعا سے درنہ تک کی مسافت ستر کلومیٹر تھی لیکن بس کے رکنے اور چلنے کا معاملہ جا بجا اتنے تواتر سے پیش آتا رہا کہ سوا دو گھنٹے بعد درنہ پہنچنے کی نوبت آ سکی۔

جن مقامات سے گزرتی ہوئی وہ بس اپنی منزل پر رکی ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ درنہ واقعی ایک مختصر سا دیہی علاقہ تھا جہاں کے مکین زیادہ دیر تک جاگتے رہنے کے عادی نہیں تھے لیکن بس اسٹاپ پر صنعا سے آنے والی آخری بس کے انتظار میں کئی ہاکر وغیرہ موجود تھے۔

ڈرائیور نے بس روک کر انجن بند کیا اور کراہتے ہوئے انداز میں نیچے اتر گیا۔ گو وہ بس کا آخری اسٹاپ تھا لیکن مسافروں کو نیچے اترنے کی ایسی عجلت تھی کہ نشستوں کے درمیان سرکتی ہوئی قطار میں سے بار بار حرکت اور یا اللہ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بس سے نیچے اتر کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی گھٹے ہوئے قید خانے سے کھلی فضا میں آ گیا ہوں۔

دو تین کیبنوں میں پیٹرومکس لیمپ جل رہے تھے۔ ایک دکان پر برقی قمقمے جل رہے تھے جن کے لیے شاید چھوٹے جنریٹر کا سہارا لیا گیا تھا۔ کیونکہ اس کا شور وہاں ابھرنے والی ہر آواز پر حاوی تھا۔

حسین المزینی میرے ہمراہ نیچے اتر کر سست روی سے ایک طرف چل دیا۔ بقیہ مسافروں کو اپنے گھروں پر پہنچنے کی عجلت تھی لہٰذا وہ تیزی سے بڑھتے چلے گئے اور چند منٹ بعد پختہ سڑک سے نکلنے والے کچے راستے پر ہم دونوں رہ گئے۔

میں نے سر گھمایا تو سیتا یوسف کے ہمراہ ہمارے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میدان صاف پاتے ہی وہ دونوں لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہم سے آ ملے۔

"آج تو تم دونوں نے جان ہی نکال دی تھی۔" ان کے قریب آنے پر حسین المزینی نے یوں ہنس کر کہا جیسے وہ ہمارا قریبی ساتھی رہا ہو۔

"اسے اب قابلِ اعتماد ہی سمجھو۔" میں نے ان دونوں کی متوقع حیرت کو دور کرنے کی نیت سے کہا۔ "یہ اس وقت ہمارا ہی خواہ ہے۔"

"اگر تم مجھ سے معاوضے کی بات نہ کرتے تو شاید میں موقع ملتے ہی نکل بھاگنے کی فکر کرتا۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تو یوں سمجھو کہ تمہارے لیے ہی کام کر رہا ہوں اور ہمارا مفاد مشترک ہے۔"

اس کے الفاظ نے میری بہت بڑی الجھن دور کر دی ورنہ میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ یکایک اتنا مخلص کیوں ہو گیا تھا۔

"ہم بمشکل بس پکڑ سکے ہیں۔" یوسف نے سنجیدگی سے کہا۔ "سرخ کار سے اترتے ہوئے اچانک ہی عبداللطیف سے سامنا ہو گیا۔"

"عبداللطیف؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ کہاں مل گیا تمہیں؟"

"اپنی کار میں گزر رہا تھا کہ ہم پر نگاہ پڑ گئی۔" یوسف نے کہا۔ "بے چارہ بہت اداس اور پریشان نظر آ رہا تھا۔"

"تو اسے اپنے گھر کی بربادی کا علم ہو چکا تھا؟"

"مکان تو خیر کرائے کا تھا لیکن اس کا سارا قیمتی اسباب راکھ ہو گیا۔ اس بربادی کے باوجود وہ تمہارے بارے میں متفکر تھا۔"

"اسے آتش زنی کے سبب کا تو علم نہیں رہا ہو گا؟"

"اتنا اندازہ ضرور تھا کہ آگ کا تعلق ہم لوگوں کی موجودگی سے تھا۔ میں نے اسے ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔"

"اب وہ کہاں رہ رہا ہے؟"

"کسی دوست کے ہاں پناہ لینے کا ارادہ تھا۔" یوسف نے کہا۔ "وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود یہاں اتنا بے بس نہیں ہے کہ اپنے نقصان پر خاموش رہے بلکہ وہ تو اب بھی ہمیں دوسرا ٹھکانا فراہم کرنے پر تیار تھا۔"

"وہ نظروں میں آ چکا ہے اب اس سے دور رہنا ہی بہتر ہو گا۔" سیتا نے پہلی بار زبان کھولی۔ "لیکن وہ ہمارے نئے ٹھکانے کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا، ہو سکتا ہے کہ کسی بھی وقت درنہ آ پہنچے۔"

"تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟" حسین المزینی نے سوال کیا۔

"اتنا سن کر بھی اندازہ نہیں کر سکے!" یوسف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ تو سمجھ گیا کہ تم اسی کی بات کر رہے ہو جس کا گھر ہم نے جلایا تھا۔" حسین المزینی نے مغلہمانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن وہ ہے کون؟"

"تمہارا قیاس کیا کہتا ہے؟" اس کے ساتھ اس کا رویہ میری وضاحت کے باوجود دوستانہ نہیں ہو سکا تھا۔

"اگر اس کا نام عبداللطیف ہی ہے اور غیر ملکی بھی ہے تو کوئی غیر مقامی عرب یا ہندی ہو گا۔" اس نے یوں کہا جیسے اسے اپنے سوال کی نامعقولیت کا احساس ہو گیا ہو۔

"اس سے تمہیں کیا دلچسپی ہے؟" یوسف نے سوال کیا۔

"تم نے اسے درنہ کا پتہ بتا کر اچھا نہیں کیا۔" حسین المزینی نے دھیمی آواز میں کہا۔ "صباح میری وجہ سے تمہیں پناہ تو دے دے گا لیکن یہ پسند نہیں کرے گا کہ تمہارے حوالے سے کوئی اجنبی اس کے دروازے پر دستک دے۔"

"تمہیں اس کو رضامند کرنا ہو گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ پیٹر کے ہمراہ تم نے عبداللطیف کے مکان کی نگرانی بھی کی مگر اس کے بارے میں تمہاری معلومات انتہائی ناقص ہیں۔"

"مجھے تو شبہ تھا کہیں اس کا نام ہی فرضی نہ ہو اور نہ میں نے اسے دیکھا تھا، دراصل ہمیں اس کی ذات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔" اس نے کہا۔ "اور اگر وہ ہندی ہے تو صباح شاید اس کی صورت بھی دیکھنی گوارا نہ کرے۔"

"ہندیوں سے اسے کیا بغض ہے؟"

"صباح نے ایک ہندی کو ترس کھا کر اپنے پاس ملازم رکھا تھا۔ چار برس تک وہ محنت سے کام کر کے صباح کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر ایک روز تمام نقدی اور زیورات سمیٹ کر ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا پتہ نہ چل سکا۔ وہ خود کو بمبئی کا رہنے والا بتاتا تھا۔ صباح بمبئی میں بھی دو ہفتے خوار ہوتا پھرا تھا۔"

"شاید ہم اسے سمجھا سکیں۔" میں نے کہا اور پھر ہم خاموشی سے اس تاریک اور کچے راستے پر بڑھنے لگے۔

درنہ میں کچے اور نیم پختہ مکانات پر مشتمل آبادی بس اسٹاپ کے گرد بمشکل چند سو گز تک رہی ہو گی۔ اس سے آگے لق و دق ویرانہ تھا لیکن چاند کی دھیمی روشنی میں اس ویرانے میں پھیلتی ہوئی پگڈنڈیاں اس بات کی غماز تھیں کہ وہاں کثرت سے لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ فضا میں رچی ہوئی نمناک خوشبو کا منبع تھوڑی دیر میں سامنے آ گیا اور ہم لوگ دو رویہ کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی منڈیر پر قطار کی صورت میں بڑھنے لگے۔

صباح المزینی کا فارم کسی باقاعدہ باڑھ کے بجائے درختوں اور اونچے پودوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ اس میں بآسانی اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔

تاریکی کی وجہ سے فارم کا تفصیلی جائزہ لینا ناممکن تھا لیکن قرائن بتا رہے تھے کہ وہ اس صحرائی سرزمین کا خاصا سرسبز و شاداب خطہ تھا۔

فارم کے خاصے اندرونی حصے میں دیہی طرز کا ایک وسیع کاٹیج بنا ہوا تھا جس کی اکا دکا کھڑکیوں میں سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔

حسین نے دروازے پر پہنچ کر دستک کے ساتھ ہی صباح کا نام بھی بلند آواز میں پکارا جس کے جواب میں کاٹیج کے کسی دور افتادہ حصے سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی اور چند ثانیوں بعد ایک قد آور شخص دروازہ کھول کر ہمارے سامنے آ گیا۔

"چچا، تم اس وقت؟" اس شخص کی آواز میں ہلکی سی لکنت تھی لیکن اس سے پیشتر ہی اس کی سانسوں میں رچی ہوئی بو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ چند ثانیوں قبل تک وہ وسکی سے شغل کرتا رہا تھا۔

وہ دونوں چچا بھتیجے بہت تپاک سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ حسین نے اس کی مے نوشی کے بارے میں کوئی خفیف ترین اشارہ بھی نہیں کیا تھا۔

"یہ میرے مہمان ہیں۔۔۔" حسین المزینی نے ہم تینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس نازک مرحلے پر یوسف نے درمیان ہی سے اس کا فقرہ اچک لیا۔

"مختار، لیلیٰ مختار اور میں سعید۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"لیلیٰ!" صباح المزینی ہم دونوں سے باری باری ہاتھ ملاتے ہوئے زور سے ہنسا۔ "یہ تو بڑا ظلم ہے، اس خاتون کے حسین چہرے میں نہ رات کی سیاہی ہے اور نہ سراپا میں ویرانی۔ پھر اس کا نام لیلیٰ کیوں ہے؟"

فقرہ مکمل کرتے ہوئے وہ مجھ سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس کا پنجہ ضرورت سے زیادہ دبا دیا اور وہ بے ساختہ اچھل پڑا۔

میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ اگر اپنے حواس میں ہوتا تو شاید میں سیتا کے بارے میں اس کے تبصرے پر اپنے غصے کی لہر کو کسی طرح ضبط نہ کر سکتا۔ لیکن وہ نشے میں تھا ——— اور اس عالم میں انسان ہر چیز کو اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھ کر زبان ہلاتا ہے لہٰذا اس نے سیتا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ اس کی جمال پرستی کا مظہر تھا اور اس دور کا ہر مرد اس خوئے بد کا شکار ہے کہ اپنے تصرف میں آئی ہوئی حسینۂ عالم کے مقابلے میں اختیار سے باہر معمولی چہرے پر بھی جان دیتا ہے جب کہ سیتا کو تو قدرت نے حسن کے انوکھے ہی سانچے میں ڈھالا تھا۔

اس مرحلے پر صباح المزینی کا وہ دو ٹوک انداز مجھے چوکنا کرنے کے لیے کافی تھا۔ چند روز کے لیے ہم تینوں اس کے پاس پناہ لینے والے تھے، اس دوران میں ایسے موقعوں سے گریز کرنا ضروری تھا، کہ صباح کو سیتا کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کا موقع مل سکے جس کے نتیجے میں اس سے تلخ کلامی یا تصادم کی نوبت آ جائے۔

"تمہارے مہمان!" وہ اپنے عقب میں کھلے ہوئے دروازے سے آتی ہوئی روشنی میں ہم تینوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "چچا تمہارے مہمان میرے بھی مہمان ہیں، یہاں کیوں کھڑے ہو، اندر آؤ نا!"

اس نے ایک طرف سرک کر راستہ چھوڑ دیا اور ہم تینوں یکے بعد دیگرے اندر داخل ہو گئے۔ جہاں فضا میں پیٹرومکس جلنے کی مخصوص بو رچی ہوئی تھی۔

گو حسین المزینی ہمارے نئے میزبان کا چچا تھا لیکن اپنے بھتیجے کی حالت سے وہ بے خبر نہیں تھا اس نے فوری طور پر کھانے کا بندوبست کرایا اور اس سے فراغت پاتے ہی ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا۔ جہاں بیک وقت چھ بستر موجود تھے۔

اس دیہی علاقے میں انفرادی خوابگاہوں کا تصور نہیں پہنچا تھا۔ یا شاید صباح المزینی ہی اس انداز میں رہنے کا عادی تھا لیکن وہ صورت حال ہمارے لیے اس اعتبار سے بہتر تھی کہ برے وقت میں ہم ایک دوسرے کے کام آ سکتے تھے۔

حسین المزینی بھی ہماری توقع کے برعکس لوٹ آیا۔

"اس کی حالت ابتر ہے۔" وہ آتے ہی مایوسانہ لہجے میں بولا۔

”میرا خیال ہے کہ تھوڑی دیر میں وہ اپنے قدموں پر چل کر اپنے بستر تک بھی نہ جاسکے گا۔“

”کیا وہ یہاں تنہا رہتا ہے؟“ یوسف نے سوال کیا۔

”تین چار ملازم ہیں۔“ حسین نے منہ پھیر کر دھیمے لہجے میں کہا۔

”سارے وسائل میسر ہونے کے باوجود شادی نہیں کرتا اور تجرد کی زندگی عام طور پر آدمی کو بے اعتدالی کے راستوں پر لے جاتی ہے۔“

”بڑے ستھرے خیالات ہیں تمہارے اس بارے میں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”صباح کو ہر ایک دو مہینے بعد کہیں سے ایک خوبصورت ملازمہ مل جاتی ہے اور نئی کے آتے ہی پرانی غائب ہو جاتی ہے۔“ وہ بولا۔ ”کم از کم اس بارے میں وہ میرا لحاظ کرتا ہے میرے آتے ہی اس نے دروازہ مقفل کر کے اپنے آقا کی ساقی گری شروع کر دی ہوگی اور شاید وہی اسے بستر تک بھی لے جائے گی۔“

”کیا باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟“ سیتا نے دیوار کے ساتھ آخری بستر پر لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔ ہماری دھیمی آوازیں اس کی فہم سے بالا ثابت ہو رہی تھیں۔

”کچھ منصوبے۔“ یوسف نے ہنس کر جواب دیا۔

”مجھے اندازہ ہے۔“ اچانک حسین المزینی بستر پر میرے قریب سرک آیا۔ اور میرا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشیانہ آواز میں بولا۔ ”تمہیں صباح کا تبصرہ ناگوار گزرا ہوگا لیکن صحیح حالت میں وہ اتنا گھٹیا نہیں ہوتا، نشے کی حالت میں وہ بہت گر جاتا ہے۔“

”کمال ہے کہ یہ تم کہہ رہے ہو!“ یوسف نے حیرت سے کہا۔ ”تمہاری اپنی اخلاقی حالت بھی کچھ اتنی بہتر نہیں ہے۔“

”میں عیال دار آدمی ہوں میرے دوست!“ وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ”بچپن سے بری صحبت میں پڑ کر نہ تعلیم حاصل کی اور نہ کوئی ہنر! پہلے چھوٹی موٹی چوریوں سے اخراجات چل جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ضروریات بڑھتی گئیں اور نوبت بُرے کاموں تک پہنچ گئی اور اب میں کسی بھی جائز ذریعے سے اتنی آمدنی حاصل نہیں کر سکتا کہ اپنا موجودہ معیارِ زندگی برقرار رکھ سکوں میرا اکلوتا بیٹا لندن کے ایک بہترین بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ میں اپنی زندگی میں ہی اسے کسی قابل بنا دینا چاہتا ہوں... میں برائی کے راستے پر چلتے ہوئے بھی اسے برائی ہی سمجھتا ہوں جائز نہیں۔“

”تمہاری باتیں تو بڑی معصوم ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یقین نہیں آتا کہ تم ہی نے پیٹر کار لائل کے ساتھ مل کر ہمیں عبداللطیف کے گھر میں زندہ جلانے کی کوشش کی ہوگی۔“

”ہمیں اندازہ تھا کہ آگ تم لوگوں کو کوئی جسمانی گزند نہیں پہنچائے گی۔“ وہ بولا۔ ”پیٹر اس طرح تم لوگوں کو باہر نکال کر زندہ پکڑنا چاہتا تھا اور وہ تجویز اسی کی تھی۔ اس کے مزاج میں تشدد اور خونریزی شامل تھی جب کہ میرے ہاتھوں آج تک کوئی قتل نہیں ہوا۔“

”تمہاری بیوی تمہاری آمدنی کے وسائل سے آگاہ ہے؟“ یوسف نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”بیوی سے اس معاملے میں رازداری بھلا کیسے ممکن ہے۔“ وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ”وہ واقف نہ ہوتی تو میں یوں اسے مطلع کیے بغیر تمہارے ساتھ نہ دوڑا چلا آتا۔ بس یہ فکر ہے کہ لڑکا بڑا ہو کر میری اصلیت سے آگاہ نہ ہو جائے۔ اب اس کی طرف سے اطمینان ہے، جب تک وہ فارغ التحصیل ہوگا میں خاصی رقم پس انداز کر کے اپنی موجودہ زندگی سے تائب ہو چکا ہوں گا۔“

”بشرطیکہ کسی حریف کے ہاتھوں مارے نہ گئے۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھا جائے تو اس بار تم موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے ہو۔ میرا یا سعید کا دماغ خراب ہوتا تو تمہارے ساتھ یہاں آنے کے بجائے تمہیں بھی گولی مار کر صحرا میں گاڑ دیا ہوتا۔“

”تمہارے نام کیا ہیں؟“ اس نے سعید کا ذکر آتے ہی چونک کر سوال کیا۔

”سعید، مختار، اور میلی مختار۔“

”میں نہیں مان سکتا۔“ وہ بے یقینی کے ساتھ بولا۔ ”تم نے صباح کو تو ہرگز اپنے اصلی نام نہ بتائے ہوں گے لیکن مجھ سے نام چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ابھی تک میری نیت پر شبہ ہے۔“ اس کے لہجے سے تاسف کا اظہار ہو رہا تھا۔

”شبہ ہوتا تو بلا تردد تمہیں کوئی اور فرضی نام بتا دیتا۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے ناموں سے واقفیت تمہارے لیے سود مند نہیں ہوگی۔“

”تم یہاں کب تک رکو گے؟“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے سرسری لہجے میں یوسف سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔

”اگر تمہارے بھتیجے نے کوئی بدمعاشی نہیں کی تو شاید تین دن ورنہ کبھی بھی لمحے۔“ یوسف کا جواب خاصا تلخ تھا۔

پھر چاروں خاموشی سے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ ہر ایک ہی اپنی اپنی جگہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حسین المزینی کسی کام سے اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا اور یوسف فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”عبداللطیف تمہارے لیے بہت بے چین تھا تم نے اس پر نہ جانے کون سا جادو کیا ہے کہ وہ تم تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔“

”مگر کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ یمن سے ہماری نکاسی کے بارے میں بہت فکر مند ہے مکان میں جلنے والے اثاثوں سے زیادہ ہماری الجھن اس کے ذہن پر سوار تھی۔“

سیتا بھی بستر چھوڑ کر ہم دونوں کی گفتگو میں شریک ہو گئی۔

”وہ تمہاری نکاسی کے کسی بندوبست میں مصروف ہے۔ راہ ملتے ہی تمہارے پاس دوڑا آئے گا۔“ یوسف نے کہا۔

”خدا کرے کہ وہ اپنی کوششوں میں جلد کامیاب ہو۔“ میں نے کہا۔

”سچ پوچھو تو مجھے تمہاری رفاقت میں مزہ آ رہا ہے۔“ یوسف نے کہا۔ ”میری تو خواہش تھی کہ مائیکل ٹرمپ اور اس کے پشت پناہ کی بیخ کنی میں میرا اور تمہارا ساتھ رہے۔“

”مجھے کوئی عذر نہیں لیکن اب حالات بہت مخدوش ہو چکے ہیں۔“ بات ادھوری چھوڑ کر میں چونک پڑا اور اس کا شانہ پکڑ کر پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”حسین المزینی کے چوڑے شانوں والے ساتھی کا نام کبھی تو مائیکل ٹرمپ ہی کے تنخواہ داروں میں آتا ہے؟“

”بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیٹر کو اسی نے عبداللطیف کے مکان پر لگایا تھا۔“ یوسف نے میرے جوش پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”حسین المزینی تو ہر معاملے سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کر چکا ہے لیکن پیٹر کی قیام گاہ سے کوئی کارآمد چیز مل سکتی ہے جو ہمیں مائیکل ٹرمپ تک پہنچنے میں مدد دے سکے... تم نے حسین سے پیٹر کی قیام گاہ کا پتہ کیوں معلوم کیا تھا؟“

”بھاگ دوڑ میں توجہ کہیں بھی مرکوز نہیں رہتی۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”خیال میرا بھی یہی تھا۔ پیٹر کے مکان کی تلاشی کام آ سکتی ہے۔“

”حسین سے سرسری طور پر اس کا پتہ تو معلوم کر ہی لو۔“ میں نے کہا۔ ”باقی باتوں کا انحصار آنے والے واقعات پر ہوگا۔“

اسی اثنا میں باہر حسین المزینی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ہماری گفتگو کا سلسلہ وہیں منقطع ہو گیا۔

اس کے آجانے کے بعد میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اندر سے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ حسین المزینی نے میری اس حرکت کو غور سے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا کیونکہ اپنے بدطینت بھتیجے کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ واقف تھا۔

پٹرومیکس بجھائے جانے کے بعد اس مشترکہ خواب گاہ میں رات کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

میں نے حالات کے دباؤ میں آکر صباح المزینی کے یہاں پناہ تو قبول کر لی تھی لیکن مجھے بے چینی کا ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا جس کا تعلق سیتا کی سلامتی سے تھا۔

شدید تکان اور شعوری کوشش کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور یوسف بھی بظاہر لیٹے رہنے کے باوجود جاگ رہا تھا البتہ سیتا پر جلد ہی نیند غالب آ گئی۔

حسین المزینی اس اعتبار سے ہم چاروں میں منفرد تھا کہ گہری نیند سوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کا ثبوت خراٹوں کی صورت میں نشر کرنے کا عادی تھا اور اس نے چند منٹ تک کروٹیں بدلنے کے بعد اپنی اس عادت پر عمل شروع کر دیا تھا۔

کھڑکیوں سے چھن کر آنے والی مدھم روشنی میں میں کافی دیر تک یوسف کو بستر پر ایک ہی کروٹ پر بے چینی سے کسمساتے دیکھتا رہا۔ پھر یوسف نے آہستگی سے پہلو بدل کر کہنی کے بل اپنا سر تکیے سے قدرے اوپر اٹھایا تاکہ درمیان میں سوتے ہوئے حسین المزینی کی اوٹ میں سے مجھے دیکھ سکے۔ میں سوتا ہوا بن گیا۔

یوسف چند ثانیوں تک گردن اٹھائے میرا جائزہ لیتا رہا اور پھر مطمئن ہو کر دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ ساری رات ہم دونوں نے اسی طرح گزاری۔ اس اثنا میں ہم ایک دوسرے کی بے چینی نہ صرف بھانپ چکے تھے بلکہ کچھ دیر کے لیے ایک گوشے میں ساتھ کھڑے سرگوشیوں میں اپنے متوقع اندیشوں کے بارے میں تبادلۂ خیال بھی کرتے رہے جب کہ حسین المزینی کے ساتھ سیتا بھی نیند سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

اگلی صبح ہماری ورم آلود سرخ آنکھیں بزبانِ حال گزری ہوئی رات کی کہانی سنا رہی تھیں اور حسین کو ہم سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”تم لوگ صباح کے بارے میں ضرورت سے زیادہ سوچ رہے ہو۔“ اس نے میرے قریب آکر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”وہ بُرا ضرور ہے لیکن اتنا نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“

”ہماری بے چینی کا سبب ہمارے اپنے مسائل ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”یہاں سے نکلنے کے بعد ہمارے مسائل وہی ہوں گے جو یہاں آتے ہوئے تھے۔“

”شاید میں مزید کام آسکوں۔“

”تم ایک ایسے دشمن کی نگاہ میں ہو جو ہمیں اپنا قیدی دیکھنا چاہتا تھا۔ ہماری ضرورت سے زیادہ خیر خواہی تمہیں بھی مہنگی پڑ سکتی ہے۔“

”مگر میرا تو اس سے کوئی رابطہ ہی نہیں رہا۔“

”یہی سب سے خطرناک بات ہے۔“ میرے بجائے یوسف نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری لاعلمی میں بہت قریب سے تمہیں دیکھ چکا ہو۔“

”تمہاری دلیل وزنی ہے لیکن ضروری نہیں کہ درست بھی ہو۔“

”چھپ کر کام کرنے والے بہت خطرناک ہوتے ہیں۔“ یوسف بولا۔ ”اس نے یہ جانے بغیر پیٹر سے کام کا معاہدہ نہیں کیا ہوگا کہ اس کے معاون کون ہوں گے۔“

”تم مجھے خوفزدہ کر رہے ہو!“ وہ پھیکے انداز میں ہنسا۔

”تمہارے لیے کیا پریشانی ہے؟“

”عبداللطیف کے مکان میں آگ لگنے کی خبر پا کر وہ ضرور سمجھے گا

کہ پیٹر وہاں تک پہنچا تھا اور تشدد کی نوبت بھی آئی تھی۔" وہ کہنے لگا۔ "اس کے بعد اُسے نہ قیدی ملیں گے اور نہ پیٹر کا سُراغ ملے گا۔ کلاڈ۔ پیٹر اور ویلیری مر چکے ہیں لہٰذا وہ پوری صورتِ حال جاننے کے لیے مجھ پر ہی ہاتھ ڈالے گا۔ اگر اسے شبہ ہو گیا کہ تمہارے ساتھ میں نے تعاون کیا تھا تو وہ میرے ساتھ بدترین سلوک کرے گا۔"

"مگر وہ کون ہو سکتا ہے؟" یوسف نے اس کا فطری خوف محسوس کرتے ہوئے اسے مزید کچھ اگلنے پر اکسایا۔

"صنعا میں ایسے لوگ بھرے پڑے ہیں۔" وہ تشویش زدہ انداز میں بڑبڑایا۔ "میں تو کسی کا بھی نام نہیں لے سکتا۔"

"اس سے پہلے تم نے پیٹر کے ساتھ کون سا کام سرانجام دیا تھا؟" میں نے اس ذہنی یلغار میں یوسف کا ساتھ دیتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک فلسطینی کی کار پر دستی بم پھینکے تھے۔" اُس نے کہا۔

"تو سلاطین ہوٹل کے احاطے والی حرکت بھی تمہاری ہی تھی؟" یوسف نے چونک کر سوال کیا۔

"مگر اس دھماکے میں کوئی زخمی تک نہیں ہوا تھا۔ بس چند کاریں تباہ ہوتی تھیں۔ ہمیں ہدایات ملی تھیں کہ کسی کو گزند پہنچائے بغیر اس سفارتی اجتماع میں شرکت کرنے والے فلسطینی رہنما کی کار کو اُڑا دیں۔"

"مقصد کیا تھا اس کا؟" یوسف نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

"معلوم نہیں۔" اُس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"تم نے سوچنے کی کوشش بھی نہیں؟"

"پیٹر سے اس بے مقصد دھماکے کی وجہ دریافت کی تھی تو اُس نے حسبِ عادت جواب دیا کہ اسے سوچنے کا معاوضہ نہیں ملا لہٰذا جو کہا گیا تھا، کر گزرنا تھا۔" اس نے کہا۔ "پیٹر کے ساتھ کام کرتے ہوئے بس حکم کا غلام بننا پڑتا تھا۔"

"محض دہشت گردی۔" میں نے یوسف کو جذبات کی رَو میں آکر موضوع سے بھٹکتے دیکھ کر جلدی سے دخل اندازی کی۔ "اس کا مطلب ہے کہ پیٹر کسی ایسے شخص کے لیے کام کر رہا ہے جو فلسطینیوں کے خلاف دہشت گردی پر آمادہ ہے۔"

"اوہ!" حسین المزینی کے ہونٹ تحیر آمیز انداز میں سُکڑ گئے۔ "تم درست ہی کہہ رہے ہو، تم میں بھی تو ایک فلسطینی ہے۔" اس کے لیے خدوخال کی بنا پر یوسف کی قومیت کا تعین کرنا ذرا بھی دشوار نہیں تھا۔

"نام آتا ہے کوئی ذہن میں؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"صنعا کے زیرِ زمین حلقوں میں تو ایک ہی نام سنائی دیتا ہے۔ لیکن وہ بھلا پیٹر جیسے تیسرے درجے کے آدمی کو کیوں منہ لگانے لگا۔"

"ہو سکتا ہے کہ تمہارا قیاس غلط ہو، بعض کام معمولی مہروں سے لیے جائیں تو خطرات کا تناسب بہت کم رہ جاتا ہے۔"

"مائیکل ٹرمپ کی شہرت ایسی نہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "سُنا ہے کہ دس پندرہ آدمی مسلسل اسی کے بل پر پل رہے ہیں۔"

"مائیکل ٹرمپ!" یوسف نے یوں دُہرایا جیسے وہ نام زندگی میں پہلی بار سُنا ہو۔ "کہاں رہائش ہے اس کی؟"

حسین المزینی یوں ہنسا جیسے یوسف نے کوئی احمقانہ سوال پوچھ لیا ہو۔ "اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ بس ایک نام ہی ہے وہ جنہوں نے اسے دیکھا ہے وہ بھی اس کا ٹھکانا نہیں بتا سکیں گے۔"

"تم کسی ایسے آدمی سے واقف ہو جو اُسے پہچانتا ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر چند ثانیوں بعد بولا۔ "سنا ہے کہ وہ کبھی کبھی کبیر شہزاد سے ملتا رہتا ہے پتہ نہیں اس میں کتنی صداقت ہے۔"

"کبیر شہزاد کون ہے؟" یوسف نے سوال کیا اور یہ اسی کا حق بھی تھا کیونکہ صنعا اور اس کے باسیوں کے بارے میں اسی کی معلومات سب سے بہتر تھیں۔

"ایک ایرانی خیاط ہے۔" حسین نے جواب دیا۔ "درزی خانے کی آڑ میں شراب فروشی کا دھندا چلاتا ہے۔"

ناشتے سے پہلے ملنے والی اس اہم خبر نے یوسف کی طبیعت کا وہ سارا تکدّر دُور کر دیا جو شبِ بیداری کی پیداوار تھا۔

صباح اس وقت تک حسبِ توقع بے خبر سو رہا تھا لیکن ہم لوگوں کے لیے ناشتہ تیار تھا۔ صباح کے ملازم حسین سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اپنے آقا کے چچا اور اس کے ساتھیوں کے لیے نشست گاہ میں بچھے ہوئے فرشی قالین پر ہلکی پھلکی بیسکن کشادہ چوبی تپائی ڈال کر پُرتکلف ناشتہ لگا دیا تھا۔

صباح گیارہ بجے پہلی بار نظر آیا۔ اس وقت وہ خوش اخلاق اور نرم خو نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اپنی ابتدائی رائے پر نظرِ ثانی کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔

نشے کی حالت میں اچھے سے اچھا آدمی بھی عموماً خاصا پست نظر آتا ہے اور اس کیفیت میں کسی کو دیکھ کر اس کے بارے میں پختہ رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ شاید اسی موروثی کلیے کی بنا پر شراب نوش اپنے اجتماعات میں ان لوگوں کی موجودگی پسند نہیں کرتے جو مے نوشی سے رغبت نہ رکھتے ہوں اور مدہوشوں کی اخلاقیات کو اپنے خول میں سمٹے ہوئے معیار پر پرکھنے کے عادی ہوں۔

لیکن صرف چار گھنٹے ہی گزرے تھے کہ ایک ناخوشگوار منظر سامنے آگیا۔ صباح کم و بیش دو گھنٹے کی طویل غیر حاضری کے بعد نظر آیا تھا۔ اور اس کا داہنا بازو گلے سے جھولتی ہوئی پٹی پر ٹکا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" حسین المزینی نے اُسے دیکھتے ہی بے تابی سے سوال کیا۔

"گر گیا تھا، ہڈی پر ضرب آئی ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس وقت میری نگاہیں صباح المزینی کے بجائے سیتا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں قہر اور تنفر کا ایک سمندر جاگ اٹھا تھا۔

سیتا کے بارے میں میری چھٹی حس بہت زیادہ مستعد تھی۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ صباح المزینی نے مجھے اپنی رائے پر نظرِ ثانی کے لیے زیادہ مہلت نہیں دی تھی۔

میرا دورانِ خون یک بہ یک تیز ہو گیا۔

"تمہارے مہمان کب تک جا رہے ہیں؟" وہ تھوڑے سے توقف کے بعد حسین سے سوال کر رہا تھا۔ "آج رات میرے کچھ دوست آنے والے ہیں۔"

"اچانک و بغیر کسی پروگرام کے؟" حسین نے حیرت سے سوال کیا۔ "صبح تک تو تم نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا!"

"بھول گیا ہوں گا۔" اس کے لہجے میں یک بیک تلخی اور بیداری عود کر آئی۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہارے مہمانوں کی وجہ سے میرے دوست اس چھت کے نیچے گھٹن محسوس کریں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو صباح!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر سرد لہجے میں جواب دیا۔ "ہم اندھیرا ہونے تک لوٹ جائیں گے۔"

"مگر کیوں؟" حسین المزینی نے مجھ سے احتجاج کیا۔ "ہم تو کم از کم تین روز کے لیے یہاں آئے تھے۔"

سیتا غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جوں ہی میں نے اس کی طرف سر گھمایا وہ سٹپٹا کر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے بعد اشتعال کے پیشِ نظر میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ صباح سے اُلجھنے کا پہلا موقع ملتے ہی دل کھول کر اس بدمعاش کی مرمت کر دوں گا۔ پھر ہم فوری طور پر وہاں سے رخصت ہو جائیں لیکن جب وہ خود ڈھٹائی کے ساتھ ہمیں اپنے گھر سے نکالنے پر آمادہ نظر آیا تو میں نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر دی۔

اس خبیث کو ایسا سبق دینا ضروری ہو گیا تھا جسے وہ نشے کے عالم میں بھی زندگی بھر فراموش نہ کر سکے۔

"ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے تمہارے بھتیجے کو اپنے دوستوں کے سامنے ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔" میں نے حسین سے کہا۔

"عجیب لوگ ہو تم بھی!" وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اپنا سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ "اور تم تو دن بہ دن میرے لیے ناقابلِ فہم ہوتے جا رہے ہو۔" آخری فقرہ اس نے صباح سے مخاطب ہو کر جلے کٹے انداز میں ادا کیا تھا۔

"میرے دروازے تمہارے لیے ہر وقت کھلے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہر ایرے غیرے کو ساتھ لاکر میرے سر پر مسلط کر دو۔" صباح کو ہم لوگوں کی تضحیک کا موقع مل گیا جو اس نے ضائع نہیں کیا۔

اس وقت ہم چاروں کے علاوہ وہاں کوئی پانچواں فرد موجود

نہیں تھا لہٰذا میں نے پانی سر سے گزرنے سے قبل قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں تم سے تخلیے میں کچھ بات کرنی چاہتا ہوں۔" میں نے صباح کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا بات کرو گے؟" وہ ایک دم بھڑک گیا کیونکہ اس کے دل میں چور تھا۔ "مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے پچھلی رات اپنی چھت کا سایہ تمہیں فراہم کر دیا۔۔۔ تم لوگ تو اب میرے گلے ہی پڑتے جا رہے ہو، میں کوئی بات نہیں کر سکتا۔"

"تت۔۔۔ تم اس سے کیوں الجھ رہے ہو؟" سیتا میرا بازو تھام کر قدرے بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تمہارا اشتعال غیر ضروری ہے۔"

میں نے پوری قوت سے اسے دور جھٹک کر یوسف کو اشارہ کیا۔ جو کسی گونگے اور بہرے کی طرح حیرت سے ایک ایک کا چہرہ تک رہا تھا اور اس نے پھرتی سے اپنا پستول نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ اسی لمحے میں بھی اپنا پستول نکال چکا تھا۔

صباح اور حسین دونوں ہی بیک وقت سیاہ آہنی نالوں کی زد میں آ چکے تھے جو انگلی کی خفیف سی جنبش سے ان کے سینوں میں بارود اگل سکتی تھیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کک۔۔۔ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" حسین صورت حال کو یوں بگڑتے دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا۔

"دروازہ بند کر دو۔" میں نے اس کی سنی ان سنی کر کے سرد لہجے میں سیتا کو حکم دیا اور اس نے مشینی انداز میں کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ چڑھا دیا۔

"یہ حرکت تمہیں مہنگی پڑے گی۔" صباح غرایا لیکن اس کی آواز سے خوف کا عنصر بھی مترشح تھا۔

"آخر پتہ تو چلے کہ اچانک کیا قیامت آ گئی ہے؟" حسین المزینی دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کراہا۔ "سب پر ہی خون سوار ہوا جا رہا ہے۔"

"اس سے پوچھو کہ اس کے ہاتھ کی ہڈی پر ضرب کیسے آئی ہے۔" میں نے سرد لہجے میں حسین المزینی سے کہا اور یوسف کی آنکھیں یکبارگی چمک اٹھیں۔

اشارہ پاتے ہی وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

"کیا کیا تھا میں نے؟" صباح المزینی نے پیر پٹخ کر غصے سے قالین پر تھوک دیا۔ "صرف نام ہی تو بدلنے کو کہا تھا مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ کٹکھنی کتیا ہے۔"

میں نے پستول بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے پوری قوت سے اس کے منہ پر داہنے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا اور کمرہ چٹاخ کی تیز آواز سے گونج اٹھا۔

اسے شاید اپنے نوکروں کے سامنے اپنی توہین گوارا نہیں تھی کیونکہ اس نے اپنی بے ساختہ چیخ کو بڑی مہارت سے ضبط کیا تھا۔

"یہ کیا بک رہا ہے؟" میں نے سیتا سے سوال کیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" وہ سر جھکا کر ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ "اس نے۔۔۔"

"شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "تمہارا کوئی قصور نہیں تھا، سر اٹھا کر اونچی آواز سے بولو۔"

"اس نے تھوڑی دیر قبل برآمدے میں مجھے تنہا دیکھ کر نام پوچھ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گوری رنگت اور سنہرے بالوں پر لیلیٰ زیب نہیں دیتا۔"

"اور تم نے اس کا ہاتھ توڑ دیا۔" اسے خاموش پا کر میں نے لقمہ دیا۔

"ارادہ تو اسے صرف اٹھا کر دور پھینکنے کا تھا۔ لیکن شاید بازو کی ہڈی ٹوٹ ہی گئی ہو۔" سیتا نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔

یہ جان کر اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں میں اسے سراسر بے قصور تصور کر رہا تھا اور اس کے بتلائے بغیر پوری صورت حال کا اندازہ کر چکا تھا۔

"لیلیٰ نے تمہیں اس قصے سے کب آگاہ کیا تھا؟" حسین المزینی نے خفت آمیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"نوبت ہی نہیں آئی۔" میں نے اسے بتایا۔ "اس کی پھٹکار زدہ صورت اور انتقامی رویے سے مجھے شبہ ہوا تھا کہ زخمی بازو کا سبب اس کی کوئی مکروہ جسارت ہے۔"

"قابل نفرت ہے تو صباح!" حسین المزینی کو واقعی طیش آ گیا۔ "دشمنوں سے تو خیر ہر سلوک روا رکھا جا سکتا ہے لیکن مہمان بنا کر کسی کی حرمت کو آزار پہنچانا تو موذیوں کا کام ہے لیکن تو اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے بجائے انہیں انتقاماً یہاں سے بھگا رہا ہے، کاش لیلیٰ نے تیرے چاروں ہاتھ پیر توڑ دیے ہوتے۔"

"شاید تجھے انہوں نے تگڑا راتب دیا ہے جو ان کی تال میں تال ملا رہا ہے۔" وہ اپنے چچا پر آنکھیں نکال کر غرایا۔ "اپنی زبان بند رکھ ورنہ ان کے جانے کے بعد تیرا حشر خراب کر دوں گا۔"

"باندھ لو اسے۔" میں نے یوسف سے کہا اور اس نے اتنی مہارت سے اس کا بایاں ہاتھ دونوں ٹخنوں کے ساتھ ملا کر باندھا کہ زخمی بازو کو ذرا بھی زک نہیں پہنچی۔ اپنی مخدوش پوزیشن کے پیش نظر صباح نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

وہ اس وقت بری طرح تڑپا تھا جب یوسف نے بے خبری میں اپنا رومال اس کے منہ میں ٹھونس کر اسے قطعی بے ضرر بنا دیا۔

"شاید ہم یہاں سے چلے ہی جاتے۔" میں نے اپنے پستول کی نال جھکا کر حسین المزینی سے کہا۔ "یہ ہمیں نکال لینے کا ارادہ ظاہر نہ کرتا تو میرا ضمیر کبھی گوارا نہ کرتا کہ لیلیٰ کے ہمراہ کسی بدنیت میزبان کی چھت کے نیچے ایک لمحہ بھی گزاروں لیکن اب میں اس کی سینہ زوری دیکھوں گا۔ یہ

اسی کمرے میں ہمارا قیدی رہے گا اور ہم اپنی مرضی سے یہاں سے جائیں گے۔"

"دفن کرو اس قصے کو اور یہاں سے نکل چلو۔" سیتا نے کہا۔ "اس کی غیر موجودگی اس کے ملازموں کو ہوشیار کر دے گی۔ وہ تعداد میں کئی ہیں۔ انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا تو مزاحمت پڑنے پر آنا فاناً بہت سے حمایتی پیدا کر لیں گے۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "میں دن رات اس کی نگرانی کروں گا۔"

"یہاں رکنا ہی بہتر ہے۔" یوسف نے قریب آ کر اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ صباح نہ سن سکے۔ "ہمیں یہاں رک کر عبداللطیف کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ ضرور کسی اچھی خبر کے ساتھ آئے گا۔" پھر اونچی آواز میں بولا۔ "اس خبیث کے سینے پر مونگ دل کر ہی ہمیں سکون آ سکے گا۔"

"غصہ تھوکو اور میری خاطر معاف کر دو اسے۔" حسین نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تمہارا لحاظ پہلے ہی کر لیا حسین!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارا بھتیجا نہ ہوتا تو میں اب سے پہلے گولی مار چکا ہوتا۔"

وہ ہمارے ہاتھوں ہونے والی خونریزی کا عینی شاہد تھا لہٰذا جھرجھری لے کر خاموش رہ گیا ورنہ شاید مزید سفارش کرتا۔

"اسے گھسیٹ کر غسلخانے میں ڈال دو۔" میں نے غضیلی آواز میں یوسف سے کہا۔ اس نے فوراً ہی میری ہدایت پر عمل شروع کیا۔ اس مرحلے پر چچا پر بھتیجے کی محبت غالب آ گئی اور وہ بھی یوسف کی مدد کو پہنچ گیا۔

انہوں نے اسے غسل خانے میں گھسیٹا تو میں بھی وہیں پہنچ گیا۔

"یہاں سے جانے سے پہلے اس کا ایسا حشر کروں گا کہ یہ مرد ہونے کے باوجود اپنی مردانگی پر ناز نہ کر سکے گا۔" میرے خون میں ایک بار پھر ابال آنا شروع ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ اتنی بڑی سزا نہ دینا اسے، اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔" حسین المزینی اضطراری لہجے میں گڑگڑانے لگا۔

"یہ میرے اندازے سے زیادہ کمین اور بدخصلت ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "جان بخشی اس کے ساتھ آخری رعایت ہے مجھے خوب اندازہ ہے کہ جو شخص لیلیٰ جیسی لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ عام لڑکیوں کے حق میں تو وحشی درندہ ثابت ہوتا ہو گا۔ میں اس کی درندگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔"

غسلخانے کے فرش پر پڑے ہوئے صباح المزینی کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ بے دست و پا ہونے سے قبل اس کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ میں اس کی جسارت کا ایسا بھیانک انتقام لے سکوں گا۔

میں پستول کی نال تھام کر نیچے جھکا اور صباح المزینی کی کنپٹی پر دستے سے کاری ضرب لگائی جس کے نتیجے میں اس کا جسم دو تین جھٹکے لے کر ساکت ہو گیا۔ حسین المزینی تشویش زدہ نظروں سے دروازے پر کھڑا اس کے سینے کے زیر و بم دیکھتا رہا۔

حسین المزینی کے انہماک نے مجھے موقع فراہم کر دیا اور میں یوسف سمیت وہاں سے دور ہٹ آیا۔

"حالات بگڑ گئے ہیں تمہیں ہر وقت حسین المزینی پر نگاہ رکھنی ہو گی۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "وہ کسی بھی وقت ہماری نظر بچا کر اپنے بھتیجے کی مدد پر تل سکتا ہے۔"

"کیا اس طرح ہم حالات کو قابو میں رکھ سکیں گے؟" یوسف کچھ زیادہ پرامید نہیں تھا۔

"یہ مجھ پر چھوڑ دو لیکن یہ خیال رہے کہ ذرا بھی لغزش ہوئی تو ہم بھیڑوں کے چھتے میں گھر جائیں گے جس سے گلوخلاصی ممکن نہ ہو گی۔"

"وہ آ رہا ہے۔" سیتا نے سرگوشی کی اور ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

"برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔" چند ثانیوں کی بوجھل خاموشی کے بعد حسین المزینی نے جھجکتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "صباح کے علاوہ کوئی اور بات کرنا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ یقین رکھو کہ ہم اسے ہلاک نہیں کریں گے۔"

"تم نے اس کے بارے میں جو سزا سوچی ہے وہ بہت بھیانک ہے جو کچھ ہو چکا اگر اسی پر اکتفا کیا جائے تو بھی وہ عمر بھر بھٹکنے کا تصور نہ کر سکے گا۔" وہ مجھ سے نگاہیں چراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"اس کے بارے میں خود فریبی سے کام نہ لو۔" میں نے سختی سے کہا۔ "وہ میری نگرانی میں رہے گا۔ تم سعید کے ہمراہ رہو اور موقع پاتے ہی صباح کے ملازموں کو یہ جتا دو کہ وہ اچانک کسی کام سے باہر چلا گیا ہے۔"

"وہ مشکوک ہو جائیں گے۔"

"تم نے روتی صورت بنائے رکھی تو ضرور مشکوک ہو جائیں گے۔" میں اس پر برہم ہو گیا اس کے علاوہ اسے خاموش رکھنے کی کوئی اور صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

"اس کی دونوں گاڑیاں گیراج میں موجود ہوں گی۔ اس دور افتادہ دیہی علاقے سے سواری کے بغیر اس کا اچانک چلے جانا کس کی سمجھ میں آئے گا؟" اس بار حسین المزینی نے صحیح نکتہ اٹھایا تھا۔

میں نے ایک لحظہ سوچا اور اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔

"تم کہو گے کہ اس کا کوئی دوست آیا تھا اور وہ اسی کے ساتھ چلا گیا۔ اس طرح اس کی ایک دو روز تک غیر حاضری کا جواز بھی پیدا ہو جائے گا۔"

"اور ان دوستوں کا کیا ہو گا جو آج رات یہاں آنے والے ہیں؟" سیتا نے سوال کیا۔

میں تلخ انداز میں ہنس پڑا۔" وہ محض ہمیں یہاں سے ہٹانے کا بہانہ تھا اور اگر وہ آ ہی گئے تو اُن سے بھی وہی بہانہ کیا جائے گا۔"

بات پوری ہو چکی تھی لہٰذا وہ دونوں دروازہ کھول کر باہر چلے گئے اور میں تھکے ہوئے انداز میں سگریٹ سلگا کر مسہری پر دراز ہو گیا۔

"تم نے اس کی کس بات سے حقیقت کا اندازہ لگا لیا؟" سیتا نے میرے قریب بیٹھ کر محبت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"نازک رشتوں کا معاملہ ہو تو انسان کی چھٹی حس کام کرتی ہے۔" میں نے اپنے لہجے سے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" لیکن تم نے مجھ سے اس واقعہ کا ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"شاید بتا دیتی لیکن یوسف سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگا ہوا تھا۔" اس نے کہا۔" پھر صباح نے جو کچھ کیا اس کی ضرورت سے زیادہ سزا بھی میرے ہاتھوں بھگت لی تھی۔ میں تذبذب میں تھی کہ تمہیں تفصیل بتائی تو تم ازسرِ نو معاملہ اٹھا دو گے جس کا اختتام انتہاپسندانہ ہو گا اور تم نے اپنے رویّے سے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔"

"کیا کہا تھا اس حرامزادے نے؟" میرے وجود میں رہ رہ کر اشتعال کی ناقابلِ برداشت لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"صرف دو فقروں کے بدلے ہاتھ تڑوا بیٹھا۔" شاید وہ موضوع کی سنگینی ختم کرنے کی نیت سے دھیمے سے ہنسی۔" سامنے آتے ہی پہلے میری آواز کی تعریف کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میری آواز سریلی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے انسانی آوازوں سے زیادہ بارودی ہتھیاروں کے دھماکے سریلے معلوم ہوتے ہیں مگر اس کی شامت ہی آ گئی تھی۔ میرے تیوروں کا اندازہ کیے بغیر نام کے بہانے رنگت اور بالوں کی تعریف پر اتر آیا اور میں نے بلا توقف اسے اچھال کر دور پھینک دیا۔"

"اس نے مزاحمت تو کی ہو گی؟" میرا تجسس واقعے کی جزئیات جانے بغیر سرد ہونا مشکل تھا۔

"اسے موقع ہی نہیں ملا، شاید اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں حرکت میں آ گئی تھی۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"یقین نہیں آتا، وزن میں وہ تم سے دوگنا نہیں تو ڈیوڑھا ضرور ہو گا۔"

"تم سے بچھڑ کر بس یہی تو سیکھا تھا کہ بھانت بھانت کے لوگوں میں اکیلی عورت آبرو کے ساتھ کس طرح زندہ رہ سکتی ہے۔"

بے اختیار میرا دل بھاری ہو گیا۔

"آخر تم یہاں رُکے رہنے پر کیوں مصر ہو؟" چند ثانیوں کے سکون پرور سکوت کے بعد سیتا نے بھاری لہجے میں سوال کیا۔

"پہلا سبب تو یہ ہے کہ مجھے عبداللطیف سے خاصی امید وابستہ ہے، اسے علم ہے کہ ہم یہاں مقیم ہیں اور میرا قیاس کہتا ہے کہ آج نہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ کل تک ضرور یہاں آئے گا۔ اگر اس نے یمن سے ہماری نکاسی کی کوئی راہ تلاش کر لی تو ہم کسی الجھن میں پڑے بغیر یہاں سے نکل جائیں گے۔ اور اگر اس کا انتظار کیے بغیر یہاں سے نکلے تو مائیکل ٹرمپ کی سرکوبی میں یوسف کا ہاتھ بٹانے کے بعد ہی روانگی کے بارے میں کوئی تجویز سوچی جا سکتی ہے۔" میں نے اسے تفصیلی طور پر اپنے خیالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔" لیکن آخر میں اس فیصلے میں ضد کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ اس نے ہمیں نکال بھگانے کی شرمناک کوشش کی تھی۔ اسے ناکام بنانے کے بعد اب ہم اپنی مرضی سے یہاں سے واپس جائیں گے۔ اس مرحلے پر ہو سکتا ہے کہ کسی وقت حسین کی ہمدردیاں صباح کے ساتھ ہو جائیں۔"

"تم نے بہت بڑا فیصلہ کیا ہے۔"

"تمہارا لہجہ ستائشی ہے یا تنقیدی؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا؟"

تقریباً ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد میں نے غسل خانے میں جا کر صباح المزینی کا جائزہ لیا تو وہ بدستور فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔

"یوسف حسین المزینی کو۔۔۔"

"یوسف نہیں سعید" سیتا نے فوراً ہی میری بات کاٹ دی۔

"احتیاط بہتر ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی ہماری گفتگو سن ہی لے۔"

"سعید حسین المزینی کو تنہا چھوڑ کر ادھر نہیں آئے گا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔" ذرا تم جا کر حالات کا جائزہ تو لو۔"

وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے چہرے سے رونق عیاں تھی۔

"فی الحال صورتحال پُرسکون ہے۔" اس نے بتایا۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقتی طور پر یہاں رہنے والوں نے صباح کی غیر حاضری کا جواز قبول کر لیا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر کئی کئی راتیں گھر سے باہر گزارنے کا عادی رہا ہے۔"

"وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"نشست گاہ میں بیٹھے شراب نوشی کر رہے ہیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ایک آدھ بوتل میرے لیے نہیں اٹھا لائیں۔"

"یہ نہ بھولو کہ ہم اس مکان پر قابض ہونے کے باوجود مہمان بنے ہوئے ہیں۔" اس نے مجھے یاد دلایا۔" میری ایسی کوئی بھی حرکت ملازموں کے لیے مشکوک ہوتی۔"

"تو تھوڑی دیر تم صباح المزینی کی نگرانی کرو۔" میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔" بعض باتوں میں دنیا کے سارے مرد یکساں ہوتے ہیں۔ شراب کا ذکر آتے ہی رال ٹپک پڑی نا تمہاری! دس پانچ روز بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

رہ سکتا ہوں۔" میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔" تین تین ہفتوں تک میں نے ایک بوند بھی نہیں چکھی۔ لیکن اب ذکر آ ہی گیا ہے اور شراب میسر بھی ہے تو کیوں نہ سرور کے چند لمحے میں بھی گزار لوں۔"

"سرور کے لیے میری موجودگی کافی نہیں؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تم احمق ہو جو یہ موازنہ کر رہی ہو۔" میں نے چڑ کر کہا۔" شراب کا سرور خلوت میں بھی ہوتا ہے اور جلوت میں بھی، اس سے دونوں صورتوں میں استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن عورت کا سرور خلوت کے بغیر نہیں چڑھتا۔"

"یعنی اس وقت تم پیے بغیر باز نہیں آؤ گے۔"

"کئی روز کی تکان، بے خوابی اور پریشانیوں کے بعد میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے اپنے شوق کی وکالت کی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم بلانوش ہو لیکن زیادہ نہ پینا۔" وہ اس وقت ایک خالص مشرقی بیوی بنی ہوئی تھی۔" ہمیں رات کو بھی چوکنا رہ کر سونا ہو گا۔"

میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گیا۔

میں نشست گاہ میں داخل ہوا تو وہاں عجیب ہی فسوں خیز سماں طاری تھا۔

وہ دونوں کھڑکیوں اور دروازوں کے تمام دبیز پردے کھینچے ایک موم شمع کی کپکپاتی ہوئی لو کے سائے میں قالین پر نیم دراز تھے۔ اور اُن کے سامنے ایک ٹرے میں برف کی قاشوں سے بھرا نقرئی برتن اور قدیم وِسکی کی ایک بوتل موجود تھی۔

کمرے کی فضا امبا کو اور اسکاچ کی بو سے رچی ہوئی تھی۔ اندر گھسنے کے بعد یہ یاد رکھنا بھی مشکل تھا کہ باہر سورج کی دہکتی کرنوں کے سائے میں گھڑیاں محض شام کے چار بجا رہی تھیں۔

وہ دونوں ہی قدرے سرور میں آئے ہوئے تھے۔ مجھ پر پہلے یوسف کی نگاہ پڑی اور اس نے نمی کے موتی جیسے قطروں سے ڈھکا ہوا گلاس فضا میں لہرا کر مسرت کا اظہار کیا۔

"چلے آؤ، یہ گوشۂ عافیت بہت پیارا ہے۔" حسین المزینی نے سر گھما کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔" مقدر کی گردشیں تو چلتی ہی رہیں گی، نشاط کی ان چند گھڑیوں کو کیوں کھویا جائے۔"

"تم لوگ کسی کام سے آئے تھے۔" میں نے ان کے درمیان بیٹھتے ہوئے خوش دلی سے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"کام ہو گیا۔" یوسف بولا۔" حسین اس کا جشن منا رہا ہے۔ ہماری کہانی پر من و عن یقین کر لیا گیا۔ پھر باہر دھوپ بھی بہت تیز ہے یہاں ذرا عافیت ہے۔"

"صباح کی غیر موجودگی میں تمہارا میزبان میں ہوں۔" حسین المزینی نے یہ کہتے ہوئے ٹرے کے قریب رکھی ہوئی کانسی کی گھنٹی چوبی دستہ پکڑ کر ہلائی اور جلترنگ کی گونج میں واپس رکھ دی۔" اور میں بھی اسی کی طرح فراخدل ہوں۔"

اسی وقت دروازے کا پردہ ہٹا کر گٹھے ہوئے جسم والا ایک پستہ قامت ملازم اندر داخل ہوا جس کی پانچ فٹ کی جملہ اونچائی میں گردن کا کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ شانوں کا اختتام ہوتے ہی اچانک چہرے کا آغاز ہو گیا تھا۔

"ایک گلاس اور کچھ تلے ہوئے نمکین گوشت کے پارچے۔" حسین المزینی کی آواز میں خفیف سی لکنت پیدا ہو چلی تھی۔

"زیادہ نہیں پینا۔" میں نے ان میں سے کسی ایک سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔" ایسا نہ ہو کہ ہم پی کر بے سدھ ہو جائیں اور ہوش آئے تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہو۔"

"فکر نہ کرو، ایسا ہی ہو گا۔" وہ گلاس میں بچا ہوا سیّال اپنے معدے میں انڈیلتے ہوئے روانی میں کہہ گیا۔

"کیا بک رہے ہو حسین؟" میں غصیلے لہجے میں غرایا۔

اسے ہیلی ہچکی آئی۔" مطلب ہے کہ جو تم چاہ رہے ہو، وہی ہو گا۔ بلکہ میں تو ساری رات جاگ کر پہرہ دیتا رہوں گا۔"

"وہ تو تمہاری حالت سے ظاہر ہے۔" میں دانت پیس کر بولا۔" بہتر یہی ہے کہ تم ہاتھ روک لو اور برف چوس کر دماغ کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرو۔"

"دانت نہ پیسو۔" وہ حواس میں ضرور تھا لیکن سرور کی لہر نے اس پر گرفت مضبوط کرنی شروع کر دی تھی۔" کوئی کونا جھڑ جائے گا۔"

اسی اثنا میں پستہ قامت ملازم تیسرا گلاس اور تلے ہوئے نمکین پارچے لے آیا۔

اس وقت یوسف کے رویّے میں شائستگی برقرار تھی لہٰذا میں نے اسے اپنے ساتھ شریک کر لینے میں حرج نہیں سمجھا اور حسین نے اپنے گلاس میں محض برف کے ٹکڑے ڈال کر اُن کے پگھلنے کا انتظار شروع کر دیا۔

حسین المزینی کے قدرے بہک جانے کے بعد ہم دونوں محتاط رہے۔ اور شام ڈھلے جب ہم نشست گاہ سے نکلے تو معمولی سرور کے علاوہ ہم پر شراب نوشی کا کوئی اثر نہیں تھا۔

اس بار ہم تینوں نے ہی اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔

سیتا اپنے بستر پر دراز بڑے انہماک سے ایک موٹی سی مجلد کتاب دیکھ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے پڑھنا کب سیکھ لیا تھا۔

ہماری آمد پر اس نے وہ کھلی ہوئی کتاب اپنے سینے پر رکھ لی تھی جلد پر موٹے حروف میں لکھا کتاب کا نام دور ہی سے نمایاں تھا۔ اس انگریزی کتاب کا نام دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ سیتا وہ کتاب سیدھی پڑھ رہی تھی۔

"چونکو نہیں!" وہ میری حیرت کا سبب بھانپ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ اور کتاب کے کھلے ہوئے اوراق میرے سامنے کر دیے جن پر تصاویر طبع تھیں اور تصویر کے ہوتے ہوئے کسی کتاب کا اُلٹا سیدھا پہچان لینا کوئی بڑا کام نہیں تھا۔

حسین المزینی بستر کو دیکھتے ہی بے سُدھ ہو کر چیت لیٹ گیا۔ تھا اور آنکھیں موند کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اشارے سے یوسف کو قریب بُلا لیا۔

"وہ ابھی تک بے ہوش ہے، تم اسے کب تک اسی حالت میں رکھو گے؟" سیتا نے مجھ سے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"جب تک ضرورت رہی۔" میں نے جواب دیا۔

"بھوکا پیاسا رہ کر وہ لبِ گور پہنچ سکتا ہے۔"

"اسے ہوش میں آنے دو۔" یوسف نے سر ہلا کر کہا۔ "اگر اس کی عقل ٹھکانے پر رہے تو اس کے مُنہ سے کپڑا نکال کر اسے کھانا پانی فراہم کر دیا جائے گا ورنہ اسے ہماری مقصد برآری تک بھوکا پیاسا ہی رہنا ہو گا۔"

حسین المزینی بمشکل نصف گھنٹے میں گہری نیند سو گیا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو آرام کے لیے سُولی پر بھی وقت نکال لیتے ہیں، اور اس وقت تو وہ شراب کے رنگین خمار میں پُوری طرح ڈُوبا ہُوا تھا لہٰذا اس کے جلد بیدار ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

میں ایک طرف بیٹھ کر یوسف سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

رات کا کھانا ہم نے وہیں منگوانے کا فیصلہ کیا اور کھانا لانے والے کو ہدایت دے دی کہ سوئے ہوئے حسین المزینی کی وجہ سے وہ برتن ہمارے کمرے میں ہی رہنے دے اور صبح لے جائے۔ تاکہ وہ جب بھی بیدار ہو، اپنی شکم پُری کر سکے۔

ملازم نے انکسار کے ساتھ پیش کش کی کہ حسین المزینی آدھی رات کو بھی بیدار ہُوا تو وہ اسے چند منٹ میں گرم گرم کھانا فراہم کر دے گا، لیکن میں نے انسانی مساوات اور اعلیٰ اخلاقی روایات کے حوالے سے اس کی پیش کش رد کر دی۔

خورد و نوش کی باقی ماندہ اشیا رکھنے میں حسین المزینی سے زیادہ بے ہوش صباح کا خیال کارفرما تھا تاکہ پہلی اور دوسری بے ہوشی کے درمیانی وقفے میں اس کے رویے کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر کچھ غذا فراہم کی جا سکے۔

رات کے سوا نو بجے جب ہم اپنے اپنے بستروں پر دراز تھے تو غسل خانے سے کچھ آہٹیں سُنائی دیں اور میں لپک کر اندر پہنچ گیا۔

صباح المزینی ہوش میں آ چکا تھا اور اپنے بدن کو فرش پر حرکت دینے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ ساکت ہو گیا۔

کمرے سے آنے والی روشنی اتنی کافی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ اس روشنی کا منبع کھلا ہوا دروازہ نہیں بلکہ غسل خانے کی وہ دیواریں تھیں جنہیں چھت سے کئی فٹ نیچے چھوڑ دیا گیا تھا۔

صباح کی آنکھوں میں میرے خلاف نفرت کا کارفرما ہونا قدرتی امر تھا لیکن میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ اسی کے ساتھ وہ خوفزدہ بھی نظر آ رہا تھا۔

شاید بےبسی کے مکمل احساس نے اُس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔

"میں چاہوں تو گلا گھونٹ کر بہت آسانی سے تمھارا قصہ تمام کر سکتا ہوں۔" میں نے اسے مزید خوفزدہ کرنے کی نیت سے کہا اور اسی وقت یوسف مجھے ایک طرف ہٹا کر اس کے مقابل آ گیا۔

میں سمجھ گیا کہ اُس کے ذہن میں کوئی موثر حکمتِ عملی جنم لے چکی ہے جس کے تحت وہ خود صباح سے بات کرنی چاہتا تھا لہٰذا میں بالکل خاموش رہا۔

"کیونکہ اس مکان سے تمھارے ملازموں کو دو روز کے لیے رخصت کیا جا چکا ہے۔" یوسف نے میری بات کے حوالے سے گفتگو آگے بڑھائی اور ہم من مانی کرنے کے لیے آزاد ہیں لیکن ہم تمھارے چچا سے وعدہ کر چکے ہیں کہ جب تک تم کوئی بدمعاشی نہیں کرو گے ہم تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے اور تمھاری کوئی بھی عیاری ہمیں اس وعدے سے آزاد کر دے گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا مہیب پستول نکال لیا۔

صباح کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ اس کے لیے یوسف کے بیان پر شُبہ کرنے کی کوئی بھی معقول وجہ نہیں تھی۔

"اگر تم نے چوں چرا کیے بغیر دو دن ہماری ہدایات کے مطابق گزار دیے تو جاتے ہوئے ہم تمہیں زندہ اور آزاد چھوڑ جائیں گے ورنہ تمھارے ملازم پولیس کو تمھاری لاش کی دریافت سے آگاہ کریں گے۔" یوسف کہہ رہا تھا۔ "تمھاری چیخیں اس علاقے میں زیادہ دور تک نہیں جا سکتیں، تمھارے فلام پر کام کرنے والوں کے لیے تمھارے چچا کے الفاظ کافی ہوں گے مگر پھر بھی ہم نہیں چاہتے کہ مُنہ سے کپڑا نکالے جانے کے بعد اونچی آواز میں بات کرو۔"

منہ میں ٹھنسے ہوئے کپڑے کی وجہ سے صباح اتنے شدید عذاب میں مُبتلا تھا کہ فوراً ہی اُس کا سر تیزی سے اثبات میں ہلنے لگا۔

یوسف نے بڑھ کر اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا رومال ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لیا۔

سُوتی کپڑے کی رگڑ سے صباح کو تکلیف ہونی لازمی تھی مگر وہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ اس کے حلق سے محض ایک گھٹی ہوئی کراہ برآمد ہو کر رہ گئی۔ چند ثانیوں تک اس کے حلق سے عجیب مضحکہ خیز سی آوازیں برآمد ہوتی رہیں۔ شاید وہ اپنے عضلات کو جنبش دے کر حلق تر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ت... تم جو چاہو گے، میں وہی کروں گا۔" ہر بزدل اور اخلاق باختہ شخص کی طرح وہ بھی بہت جلدی راہ پر آ گیا تھا۔ "مگر خدا کے لیے میرا بندھا ہوا ہاتھ بھی آزاد کر دو تاکہ میں اپنے زخمی بازو کو سنبھال سکوں، زخمی بازو درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

"یہ یاد رکھنا کہ حرامی پن کا پہلا اور آخری جواب گولی سے دیا جائے گا۔" یوسف نے درشت لہجے میں کہا اور صباح نے اس کی شرط منظور کر لی۔

یوسف نے اس کے منہ سے رُومال نکال کر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا لیکن اس اقدام سے قبل اُس نے صباح پر جو نفسیاتی دباؤ ڈالا تھا اس کی وجہ سے وہ کامیاب رہا تھا لہٰذا صباح کو دُوسری رعایت دینے میں بھی مضائقہ نہیں تھا۔

یوسف نے اُس کے ٹخنوں کو جوڑ کر باندھنے کے بعد بایاں ہاتھ اس طرح بندش میں لیا تھا کہ اسے آزاد کرتے ہوئے پیروں کی گرفت ایک لمحے کے لیے بھی ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔

اپنے زخمی بازو کو جنبش دیتے ہوئے صباح کے چہرے پر اُبھرنے والے اذیت کے آثار قابلِ رحم تھے اسے سیتا نے قرار واقعی سزا سے نوازا تھا۔

یوسف بہت خوبصورتی سے چند منٹ تک اس سے باتیں کرتا رہا پھر جب اسے کھانے کی پیش کش کی گئی تو وہ بہت خوش ہوا۔

"مگر مجھے یہاں سے تو باہر نکالو۔" اس نے مسرت سے مغلوب ہو کر کہا۔

"تحقیر کی سزا تحقیر ہے۔" یوسف نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمہیں یاد ہے گا کہ کسی وقت تم اتنے بے بس بھی کر دیے گئے تھے کہ اپنے غسل خانے میں کھانا کھانے پر مجبور تھے۔"

اس کے لیے وہی رعایتیں کافی تھیں جو اسے مل چکی تھیں جب کہ میرے رویے سے وہ بالکل ہی مایوس ہو چکا تھا۔

مگر وہ احمق ان رعایتوں کو مستقل سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ شکم پُری کے بعد دوبارہ اسے بے ہوش کیا جانا تھا۔

کھانا دیتے ہوئے یوسف نے سخاوت کی انتہا کر دی کہ پہلے اُسے اسکاچ کے دو پیگ اپنے سامنے پلائے جن پر وہ بہت ممنون ہوا۔ یہ سیال اسے اس بوتل سے فراہم کیا گیا تھا جو کھانے سے ذرا پہلے ملازم ہمارے لیے لایا تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد یوسف نے اچانک ہی ہاتھ چلایا، اور ہنستا کھیلتا صباح المزینی ایک بار پھر بے ہوشی کی دلدل میں ڈوب گیا۔

ہمارے لیے وہ کام بھی خاصا اہم تھا۔ ساری کارروائی کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کرنے کے بعد انجام دی گئی تھی تاکہ اچانک اِدھر آ نکلنے والا کوئی شخص اس کمرے کی دیواروں کے درمیان ہونے والے کھیل سے آگاہ نہ ہو سکے۔

حسین المزینی شراب کے نشے میں دُھت ہو کر شام سے ایسی گہری نیند سو رہا تھا کہ ہمارے بستر سنبھالنے تک اس نے کروٹ تک نہیں بدلی تھی لہٰذا ہم تینوں بھی بے فکری سے سونے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

وہ رات کسی قابلِ ذکر واقعہ کے بغیر گزر گئی۔ صبح بیدار ہونے والوں میں سیتا سب سے پہلی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ غسل خانے میں آوازیں سن کر بیدار ہوئی تھی۔ اس وقت صباح ہوش میں آیا ہوا تھا۔ لہٰذا سیتا نے بلا تامل اسے پھر انشا غفیل کر دیا۔

اس روز صبح ہی سے ہم تینوں نے یوں عبداللطیف کا انتظار شروع کر دیا جیسے اس نے آنے کا پکا وعدہ کیا ہوا ہو۔

اور شاید یہ ہماری سچی طلب ہی تھی کہ گیارہ بجے ایک ملازم نے حسین المزینی کو کسی انتہائی ڈھیٹ مہمان کی آمد کی اطلاع دی جو صباح سے ملنے آیا تھا لیکن جب اسے بتایا گیا کہ وہ باہر گیا ہوا ہے تو وہ کسی بھی ذمہ دار مکین سے ملنے پر اَڑ گیا۔

"ہے کون؟ کہاں سے آیا ہے؟" حسین المزینی نے چڑچڑے لہجے میں پوچھا۔

"بس نام بتایا ہے، عبداللطیف۔" ملازم نے بتایا۔ "صورت سے ہندی لگتا ہے۔ مالک ہوتا تو دروازے ہی سے اسے اٹھوا کر کسی کوڑا گھر میں پھکوا دیتا۔"

"اوہ۔" حسین المزینی وہ نام سنتے ہی چونک گیا۔ "اس سے تو ملنا ہی ہوگا۔ پتہ نہیں کس کام سے آیا ہو گا۔"

وہ چلا تو یوسف بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

گو ہمیں حسین سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا مگر اس کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ نازک موقع پر اسے غیر ضروری ڈھیل دے کر اُس کی وفاداری آزمانے کا خطرہ مول لیا جائے۔

چند منٹ بعد وہ دونوں عبداللطیف کو ساتھ لے کر نشست گاہ میں پہنچے۔ میں سیتا کو صباح کی نگرانی میں چھوڑ کر پہلے ہی وہاں جا پہنچا تھا۔

مجھے دیکھ کر عبداللطیف نے والہانہ مسرّت کا اظہار کیا اور پُرتپاک انداز میں مجھ سے گلے بھی ملا لیکن میں نے نچلی تہہ میں چھپی ہوئی تشویش صاف محسوس کر لی تھی۔

"مجھے تمھارے بھاری مالی نقصان پر دلی افسوس ہوا ہے۔" میں نے میٹھے ہوئے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "اس کا سبب صرف ہم لوگ تھے۔"

"زندگی میں یہ اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔" وہ شانے اچکا کر بولا۔

"تمھارے ساتھی نے مجھے بتایا تھا کہ تم لوگ اُن ہی میں سے ایک کے بھتیجے کے پاس پناہ لینے درنہ جا رہے ہو جنہوں نے میرے مکان کو خاکستر کیا تھا۔" اس نے یہ سمجھ کر یوسف کا نام لینے سے گریز کیا تھا کہ کہیں ہم نے حسین کو فرضی نام نہ بتا رکھے ہوں۔

"سعید!" میں نے محض عبداللطیف کو نام جتانے کے لیے یوسف کو پکارا۔ "ذرا کوئی مشروب تو منگواؤ میرے دوست کے لیے۔"

"لیلیٰ کہاں ہے مختار!" یوسف کا سوال سُن کر میں چونکا، لیکن پھر خیال آیا کہ دروازے پر باہمی شناسائی کے گہرے اظہار کے بعد یوسف کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ حسین المزینی کی موجودگی میں عبداللطیف کو اپنے نئے نام سے متعارف کراتا البتہ غائبانہ طور پر لیلیٰ اور مختار کا ذکر کر کے اس نے عبداللطیف کو ہمارے نئے ناموں کا اشارہ دے دیا ہوگا۔

"لیلیٰ آرام کر رہی ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"عجیب اتفاق ہے کہ تمہاری دجہ سے میں اس شخص کے سامنے دوستانہ ماحول میں بیٹھا ہوں جس نے کل میرے گھر کو آگ لگائی تھی۔" وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"حالات کے تحت ایسی تبدیلیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔" اسے جواب دے کر میں حسین المزینی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تخلیہ درکار ہے۔"

حسین المزینی میری درخواست کا بُرا مانے بغیر اٹھا اور مسکراتا ہوا اس کمرے سے واپس چلا گیا، اسی اثنا میں یوسف بھی واپس آگیا۔

"تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو۔" میں نے عبداللطیف کے چہرے پر نگاہیں جما کر دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"دو تین روز سے مسلسل میرا تعاقب ہو رہا ہے۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہر وقت کوئی نہ کوئی میرے پیچھے لگا رہتا ہے۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُن لوگوں کو اپنے پیچھے درنہ میں اس مکان تک لے آیا تھا۔

"دو تین روز کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے تمہارے پاس پہنچنے سے پہلے سے یہ صورتِ حال چل رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم نے ہم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"تمھارے پہنچنے سے ایک روز پہلے اس سلسلے کا آغاز ہوا تھا۔" اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں بمشکل دو تین مواقع پر ہی تعاقب کرنے والے کو خاص طور پر مارک کر سکا ہوں ورنہ وہ ہمیشہ چھلاوہ ثابت ہوتے ہیں۔"

"تو کیا کئی ہیں وہ؟"

"میرا خیال ہے۔" اس نے تصدیق کی۔ "اور گاڑیاں بھی کئی ہیں۔ ادھر کا رُخ کرنے سے پہلے میں ڈیڑھ گھنٹے تک محض اس لیے صنعا کی گلیوں اور سڑکوں پر بھٹکتا رہا کہ تعاقب کرنے والی سیاہ مزدا کو جھکائی دے سکوں مگر وہ جونک کی طرح پیچھے لگا رہا آخر ایک پُر ہجوم چوراہے پر میں بمشکل اسے پھنسا ہوا چھوڑ کر بھاگ سکا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ یہاں تک تمھارا تعاقب نہیں کیا گیا؟"

"سیاہ مزدا کا راستے میں میلوں دور تک پتہ نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "مگر میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تعاقب کرنے والے کون لوگ ہیں۔"

"سامنے کی بات ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ "ہمارے دشمنوں نے تمھارے خلاف دوہرا محاذ قائم کیا ہوا تھا۔ ایک طرف معاوضے پر ان لوگوں کو مامور کر دیا جن کے ہاتھوں تمہارا گھر خاکستر ہُوا اور اپنے طور پر دُور سے براہِ راست تمہاری نگرانی بھی شروع کرا دی۔ اپنی دانست میں انہوں نے تمہیں بہت اہم مُہرہ تصور کیا تھا اور تم نے آج یہاں پہنچ کر اُن کے قیاسی اندازوں کی تصدیق کر دی ہے۔"

"مگر گھر کی تباہی کے بعد انہوں نے مجھ پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا؟"

"وہ یہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ تم کس حد تک مطلوبہ معلومات رکھتے ہو۔ مکان والے حادثے کے بعد شاید انہوں نے دانستہ تم پر اپنی موجودگی زیادہ شدت سے ظاہر کی ہوگی تاکہ تم بوکھلا کر ہمارا رُخ اختیار کرو۔"

"ہوا تو کچھ یوں ہی ہے۔" وہ تحیّر آمیز لہجے میں بولا۔ "لیکن یہ تو سراسر اتفاق ہے، اگر پرسوں سعید اور لیلیٰ سے مڈبھیڑ نہ ہوئی ہوتی تو میرے فرشتوں کو بھی تمہاری ہوا نہ لگتی۔ اس بار بھی اس نے ڈاموں کی احتیاط رکھی تھی۔ مجھے کام مکمل ہونے کے بعد آنا چاہیے تھا لیکن بقول تمھارے مسلسل تعاقب سے بوکھلا کر ادھر کا رُخ کر بیٹھا۔" اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

"تو تم کیا کر رہے ہو؟"

"روانگی کے سارے انتظامات طے ہو چکے ہیں، بس کاغذات ملنے کی دیر ہے۔ زیادہ سے زیادہ کل شام تک تمھاری روانگی متوقع ہے۔"

"تصاویر کے۔۔۔"

میرے فقرے کا آغاز ہوتے ہی اس نے اپنے سر پر دو ہتڑ رسید کر لیا۔ "اصل سبب تو یہی تھا اس وقت میرے یہاں آنے کا۔ تصاویر کے بغیر سفری دستاویزات ادھوری رہیں گی۔"

"مگر ہمارے پاس تو کوئی بھی تصویر نہ ہوگی۔"

"مجھے یہ بھی اندازہ تھا۔" وہ بولا۔ "حسّاس جیبی کیمرہ میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تصاویر لے کر میں واپس چلا جاؤں گا تاکہ آج کا وقت ضائع نہ ہو۔ میری بھی عقل ماری گئی ہے۔" اپنے ذہنی انتشار سے وہ خود ہی شرمندہ سا نظر آرہا تھا۔

"ہم کس حیثیت میں سفر کریں گے؟"

"مسافر بردار لانچ پر جاؤ گے۔ مسافروں کے طور پر۔" اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "کسی بھی گڑبڑ کا امکان نہ ہوگا۔ بس دورانِ سفر تم دونوں کو اپنے نام بدلنے ہوں گے۔"

"پاسپورٹوں پر تصاویر بدلی جائیں گی؟"

"اس سے بہتر اور محفوظ راستہ کوئی اور نہیں ہے۔ سارا کام پیشہ ور افراد کے ذریعے نہایت مہارت سے سرانجام دیا جائے گا۔"

"میں تمھارا زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔۔۔ تم میرے لیے بساط سے بڑھ کر کوشش کر رہے ہو اور پھر تمہارا بھاری مالی نقصان۔۔۔"

"اس کا ذکر نہ کرو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "مکان کی ایک ایک کیل کا بیمہ تھا میرا سارا نقصان پُورا ہو جائے گا، بس ذرا سی ذہنی پریشانی ضرور ہوگئی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن یہاں اثاثوں کے ایسے بیموں کا تو کوئی رواج نہیں ہے۔" یوسف نے تحیّر زدہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"ہے۔۔۔ تمہیں نہیں معلوم۔" وہ چڑ کر تیز لہجے میں بولا۔ "آنکھیں کھول کر رہا کرو تو مالیاتی اداروں سے بھی بہتیرے مفادات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔"

یوسف خاموش ہوگیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے اُس نے بیمے کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا تھا اسی لیے یوسف کی تسبیح پر وہ چڑ گیا تھا۔

میں نے اس موضوع کو مزید کریدنے سے گریز ہی کیا کیونکہ مجھ میں اگر اس کے نقصانات کا ازالہ کرنے کی سکت نہیں تھی تو اس کا ذکر کر کے اسے آزردہ کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

اس نے دو میں ایک سپاٹ دیوار کے پس منظر میں میری دو تصاویر لیں پھر میں اُسے وہاں لے گیا جہاں سیتا بے ہوش قیدی کی نگرانی پر مامور تھی۔

سیتا کی تصاویر بناتے ہوئے اس نے مالکِ مکان کی غیر حاضری کے بارے میں استفسار کیا اور میں نے اسے غسلخانے کا دروازہ کھول کر دکھا دیا۔

"کون ہے یہ؟" اس کی آواز تحیّر آمیز تھی۔

"مالکِ مکان۔ ہمیں نکالنا چاہتا تھا اور ہم تمھاری آمد تک یہاں رُکے رہنا چاہتے تھے لہٰذا یہ کارروائی سرانجام دینا پڑی۔ اب شاید ہم یہ ٹھکانا چھوڑ دیں۔"

"ابھی نہیں۔" وہ جلدی سے بول پڑا۔ "زیادہ سے زیادہ کل دوپہر تک کی بات ہے۔ میں دوبارہ آؤں گا۔ اس وقت تک یہیں رُکے رہو۔"

اس کا مشورہ مناسب ہی تھا۔ ہم منظرِ عام سے دور رہ کر ہی اپنی سلامتی اور آزادی برقرار رکھ سکتے تھے۔ ورنہ قانون کی اور قانون شکن متضاد قوتیں، دونوں ہی ہمارے خلاف صف آرا تھیں اور ذرا سا سراغ ملتے ہی ہمیں بیس ڈالنے کی صلاحیتوں سے لیس تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ واپس چلا گیا۔

اس کی آمد سے کم از کم مجھے ذاتی طور پر بہت تسلی ہوئی تھی صنعا سے نکل کر درنہ میں پناہ لینے کے بعد بیرونی ذرائع سے ہمارا ہر قسم کا حقیقی رابطہ منقطع ہوگیا تھا جو اب بحال ہوگیا تھا اور اس عمارت سے باہر کم از کم ایک شخص ضرور ایسا تھا جو پورے وثوق کے ساتھ ہماری نئی قیام گاہ کے بارے میں ہمارے کسی بھی ہمدرد سے اظہارِ خیال کر سکتا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد حسین المزینی بھی واپس لوٹ آیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میرے بارے میں تمھارے دوست کے دل میں غبار باقی تھا۔" اُس نے آتے ہی مغموم لہجے میں کہا۔

"اس کی جگہ تم ہوتے تو شاید تمھارا رویّہ زیادہ سخت ہوتا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس نے تو محض زبانی اظہارِ خیال پر ہی اکتفا کیا۔"

"تم جانتے ہو کہ بربریت کا وہ منصوبہ پلیٹ کے ذہن کی پیداوار تھا اور وہ تمہارے ہاتھوں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"تم اس کے شریکِ کار رہے تھے اور اپنی ذمے داری سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"خیر، جو ہونا تھا سو ہوگیا مگر اب یہ کس لیے آیا تھا؟"

"ہمارے لیے زیادہ مدت تک یہاں رُکے رہنا مناسب نہیں تھا۔ اور اُسے بھی یہی فکر تھی۔ شاید کل تک ہم یہاں سے کوچ کر جائیں۔"

"تمھارے جانے کے بعد صباح کا سارا نزلہ مجھ پر ہی گرے گا۔"

"وہ تمھارا اور اس کا معاملہ ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "اگر اس میں شرم کی ذرا بھی رمق باقی ہے تو شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لائے گا۔"

"یعنی تم نے سزا کے اگلے مرحلے پر عمل کرنے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔" اس کے لہجے میں مسرت کی ایک ہلکی سی لہر عود کر آئی۔

"لیلیٰ سے بات کرنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔" وہ خوش ہوگیا۔ "اب میں صباح سے بخوبی نمٹ سکوں گا، ویسے بھی وہ اپنی آزاد روی کے باوجود میرا لحاظ کرتا ہے۔"

اسی رات صباح المزینی کے ملازموں نے کسی اور کی آمد کی اطلاع دی۔ اس بار آنے والے نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

میرے لیے یہ اطلاع اس اعتبار سے سنسنی خیز تھی کہ آنے والے نے میرا نام مختار بتایا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اندر کی صورتحال سے واقف تھا۔

اُسے فوری طور پر اندر بُلا لیا گیا۔

حسین المزینی اسے نشستگاہ میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

عبداللطیف کی آمد کے تجربے سے اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں اس کی

موجودگی پسند نہیں کرے گا۔

"مجھے عبداللطیف نے بھیجا ہے۔" آنے والے دراز قامت مقامی نے میری پیش کی ہوئی سگریٹ سلگاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

اپنے طور طریقوں سے وہ بہت متین اور سمجھ دار نظر آتا تھا۔

"کس سلسلے میں؟" میں گفتگو کی ابتدا میں محتاط رہنا چاہتا تھا۔

"وہ کچھ انتظامات میں مصروف ہے ورنہ خود ہی آتا۔" اس نے کہا۔ "مجھ سے صرف اتنا کہا گیا ہے کہ تمہیں اور تمہارے دو ساتھیوں کو بحفاظت صنعا کے ایک خفیہ مقام پر پہنچا دوں۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ تمہیں اسی نے بھیجا ہے؟"

"کیا میرا یہاں تک پہنچنا اور تمہارا نام جاننا کافی نہیں ہے؟" اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اور اگر ہم تمہارے ساتھ چلنے سے انکار کر دیں؟" میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارا چلنا تمہارے اپنے مفاد میں ہوگا۔" اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا۔ "انکار کر دو گے تو واپس جا کر اسے بتا دوں گا۔ مجھے اپنی طرف سے کسی اقدام کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں تو بس ایک قاصد ہوں۔"

"تمہارے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے؟"

اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "تنہا اور غیر مسلح ہوں۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا، شاید وہ میرے اشتباہ آمیز رویے پر طنز کرنا چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "چند منٹ ٹھہرو، ہم روانگی کی تیاری کرتے ہیں۔"

اسے نشست گاہ میں چھوڑ کر میں یوسف کے ہمراہ باہر آ گیا۔ حسین المزینی بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا، ہمیں نکلتا دیکھ کر وہ تیزی سے ہماری طرف آیا۔ "یہ کیوں آیا ہے؟"

"ہم اسی کے ساتھ روانہ ہو رہے ہیں۔" یوسف نے اسے بتایا۔

"اور میری رقم؟" روانگی کی اطلاع پاتے ہی اسے اپنے دو ہزار کی فکر ہو گئی۔

"تھوڑی دیر ہمارے مہمان کے ساتھ بیٹھو۔ اس سے غیر ضروری باتیں نہ کرنا۔" یوسف نے سنجیدگی سے کہا۔ "جانے سے پہلے تمہاری رقم بھی ادا کر دیں گے۔"

اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور نشست گاہ میں گھس گیا۔

"اس کے ساتھ تمہارا رویہ کچھ غیر یقینی سا ہے۔" یوسف نے میرے ہمراہ سیتا والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایسی بات ضرور ہے جو میرے ذہن میں چبھ رہی ہے لیکن میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "بس لاشعوری الارم کہہ لو۔"

"یہ آدمی فراڈ ہو سکتا ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ الجھن میں ہوں، فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"پھر ایک ترکیب آزمانی چاہیے۔" وہ کمرے میں پہنچ کر بولا۔ "ہم آنکھ بند کر کے چھلانگ لگا بیٹھے تو اس بار نکلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔"

"کیا پھر کوئی گڑبڑ ہے؟" سیتا نے اس کا آخری فقرہ سن کر سوال کیا جس کے جواب میں میں نے اسے تازہ صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

"عبداللطیف کی تازہ کوششوں کا تعلق صرف تم دونوں سے ہے۔" یوسف نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہارے چلے جانے کے بعد مجھے اپنا انتظام خود کرنا ہوگا۔ میری اکیلی ذات کے لیے صنعا میں اس وقت بھی بہتیرے ٹھکانے ہیں تو کیوں نہ میں اسی وقت تم سے الگ ہو جاؤں؟"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" سیتا نے سوال کیا۔

"تم دونوں آنے والے کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔ میں صباح المزینی کی کار میں تمہارا تعاقب کروں گا اور صنعا میں دور رہ کر اس ٹھکانے کی نگرانی کروں گا جہاں تمہیں لے جایا جا رہا ہے۔ کسی بھی وقت گڑبڑ کا شبہ ہوا تو میں باہر سے کچھ نہ کچھ مدد کر سکوں گا اور اگر تمہاری روانگی ٹھیک ٹھاک رہا تو میری دخل اندازی کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

"تمہاری تجویز بہت مناسب ہے لیکن حسین تمہیں اپنے بھتیجے کی کار بھلا کیوں لے جانے دے گا؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"وہ میں نمٹ لوں گا۔" وہ بولا۔ "ساری الجھن کل شام تک ہے۔ اس کے بعد وہ صباح کی کار صنعا کے کسی بھی طے شدہ مقام سے اٹھوا لے گا۔"

"پھر یہی راستہ مناسب رہے گا۔" میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح گڑبڑ کی صورت میں ہم تینوں ایک ساتھ کسی چوہے دان میں نہ پھنس سکیں گے۔"

پھر یوسف نے وہیں اپنی ایک خفیہ جیب سے بڑے نوٹوں پر مشتمل خاصی رقم نکالی اور دو ہزار الگ کر کے بقیہ نوٹ واپس چھپا لیے۔

"حسین کو اگر یہ دو ہزار مل گئے تو وہ صباح کی کار مستعار دینے پر راضی ہو جائے گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

چند منٹ تک ہم وہیں رک کے روانگی کے انتظامات پر تبادلہ خیال کرتے رہے کیونکہ غسل خانے میں پڑے ہوئے صباح المزینی کا معاملہ بھی اہم تھا۔ ساری جزئیات طے کرنے کے بعد یوسف اس کمرے سے چلا گیا۔ غسل خانے میں صباح المزینی بدستور بے ہوش پڑا تھا اور سیتا کا خیال تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہ آ سکے گا لہٰذا میں نے اس کی ورم آلود کنپٹیوں پر مزید کوئی ضرب لگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور اس کی بندشوں کو مزید سخت کر کے اس کے منہ میں

یوسف کے رومال کے علاوہ مزید ایک کپڑا ٹھونس دیا تاکہ وہ قبل از وقت ہوش میں آبھی جائے تو اپنی کسی آواز سے اپنے ملازموں کو کسی گڑبڑ کا احساس نہ دلا سکے۔

غسل خانے کا دروازہ بند کر کے میں نے کمرے کے ساز و سامان پر الوداعی نگاہیں ڈالیں اور سیتا کے ہمراہ باہر آ کر کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ سیتا نے مزید احتیاط کے طور پر باہر سے کمرے کا دروازہ بھی بولٹ کر دیا۔

ہم دونوں نشست گاہ میں پہنچے تو یوسف حسین المزینی کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔

"کیا طے پایا؟" نووارد نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"بس چند منٹ بعد چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس کون سی گاڑی ہے؟"

"کرسلر۔" وہ بولا۔ "چار مسافروں کے لیے بہت آرام دہ ہے۔"

"چوتھا کون ہے؟"

"تم تین ہو نا؟" اس نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔

"دو۔ ہم دونوں۔" میں نے اپنے جواب پر اس کے چہرے پر الجھن سی نمودار ہوتی دیکھی جو لحظہ بھر بعد ہی معدوم ہو گئی۔

وقت گزاری کے لیے میں نے ایک ملازم سے اسکاچ کے دو پیگ منگوا لیے۔ نووارد نے سختی کے ساتھ پینے سے انکار کر دیا جبکہ میں دھیرے دھیرے گلاس خالی کرنے لگا۔

روانگی سے پہلے یوسف کو اتنا وقت دینا ضروری تھا کہ وہ حسین المزینی کے ساتھ معاملات طے کر کے گاڑی سنبھال لے تاکہ ہمارے روانہ ہوتے ہی تعاقب کا آغاز کر سکے۔ حسین کو وہیں چھوڑنا تھا تاکہ وہ صباح کے ہوش میں آنے پر اس کی مناسب دیکھ بھال کر سکے۔

میں اسکاچ کا دوسرا گلاس خالی کر رہا تھا کہ حسین المزینی آ پہنچا، اس کے چہرے پر رقم مل جانے کی مسرت بہت واضح تھی۔

اسے دیکھتے ہی میں نے جگہ چھوڑ دی۔

نووارد کی نگاہیں قدرے بے چینی سے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں لیکن اس نے ہم میں سے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔

مکان کے باہر اندھیرے میں اس کی کرسلر موجود تھی۔ ہم تینوں حسین المزینی کو الوداع کہہ کر نووارد کی کار میں سوار ہو گئے۔

میں ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گیا۔ سیتا نے عقبی نشست سنبھال لی اور کرسلر سبک رفتاری سے کچے راستے پر گھوم کر آگے بڑھ گئی۔

دس بارہ منٹ کے بعد کار کچے راستے سے پختہ سڑک پر آ گئی۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی جیب ٹٹول کر اس بھرے ہوئے پستول کی موجودگی کا احساس کیا جو حسین المزینی کے ساتھیوں سے جھڑپ میں چھینا گیا تھا۔

وہ سڑک چند سو گز کے بعد درنہ کے اس ویران علاقے میں داخل ہو گئی جہاں بس اسٹاپ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید صنعا سے آنے والی آخری بس کے بعد وہاں روز ہی ایسا پرہول سناٹا چھا جاتا ہوگا۔

میں نے ایک دو بار سر پیچھے گھما کر سیتا سے بات کی۔ مقصد محض یہ تھا کہ پیچھے آنے والی یوسف کی کار کے ہیڈ لیمپس دیکھ سکوں لیکن عقب میں سڑک تا حدِ نظر تاریک پڑی ہوئی تھی۔

"تمہارا تیسرا ساتھی وہیں رہ گیا ہے؟" شہر سے ویران سڑک پر نکل آنے کے بعد نووارد نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہو سکتا ہے کہ صبح وہ بھی نکل جائے۔" میں نے کہا۔ "تم اس کے بارے میں اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہو؟"

"مجھے بتایا گیا تھا کہ درنہ سے مجھے مختار کے ساتھ مزید دو افراد لانے ہوں گے لیکن تم محض دو ہی رہ گئے ہو۔" اس نے کہا۔

کار میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔

کافی دور نکلنے کے بعد پیچھے ایک کار کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شاید یوسف نے سفر کا آغاز کافی دیر سے کیا تھا اور اس وقت تک کرسلر کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اگر ہمیں لے جانے والا ابتدا ہی سے کسی کار کو پیچھے لگا ہوا دیکھ لیتا تو ضرور چوکنا ہو جاتا۔

بس کے مقابلے میں کار کے ذریعے درنہ سے صنعا تک کی

مسافت بہت مختصر محسوس ہوئی۔ بمشکل پون گھنٹے بعد کار صنعا کی حدود میں داخل ہو گئی۔

درنہ کے مقابلے میں صنعا میں اس وقت بھی خاصی رونق تھی کرسلر مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک مرتبہ پھر ایک غیر آباد سڑک پر جا نکلی۔

اس بار سفر کا اختتام قدرے جلدی ہوا اور کرسلر ایک وسیع و عریض احاطے کے کھلے ہوئے پھاٹک میں گھستی چلی گئی۔

اندر ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں بھی تا حد نظر کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔

کرسلر کے رکتے ہی ڈرائیور نے اس کے ہیڈ لیمپس گل کر دیے۔

"یہ عمارت تو غیر آباد معلوم ہوتی ہے۔" میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن محفوظ ہے۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "نیچے اتر آؤ۔"

ہم دونوں نیچے اتر آئے اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ اس کے ہمراہ تاریک برآمدے کی طرف بڑھنے لگے۔

برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میں رک گیا۔ "عبداللطیف کہاں ہے؟"

"اندر ہی ہوگا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "تم رک کیوں گئے؟ چلتے رہو۔ یہ عمارت میری دیکھی بھالی ہے تاریکی میں بھی کوئی دشواری نہ ہوگی۔"

"ہم یہیں رکے ہوئے ہیں۔" میں نے ناقابل برداشت ذہنی دباؤ کے زیر اثر کہا۔ "تم عبداللطیف کو یہیں لے آؤ۔ اسی کے ساتھ ہم اندر داخل ہوں گے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا داہنا ہاتھ جیب میں ڈال کر پستول اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

"یہ ناممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ باہر گیا ہوا ہو۔" اس کا لہجہ قدرے درشت ہو گیا۔

"پھر ہم یہیں اس کی واپسی کا انتظار کریں گے۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارا فیصلہ ہے؟" اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

"ایسا ہی سمجھو۔" میں نے اپنی آواز سے پریشانی کا اظہار کیے بغیر کہا۔

اس نے قدرے اونچی آواز میں ایک گالی دی جو شاید اشارہ تھی کیونکہ چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے نے یک لخت آٹھ دس مسلح آدمی اگل دیے جن کے ہتھیاروں کی نالیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور پھر وہ نالیں ہمارے جسموں سے آ لگیں۔

"زبردستی لے چلو انہیں۔" ہمیں وہاں تک لانے والے کی غراہٹ ابھری اور وہ لوگ ہمیں نالوں کے زور سے عمارت کی طرف دھکیلنے لگے۔



"عبداللطیف تم لوگوں کی اس گستاخی کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔" میں نے پوری صورت حال کا اندازہ ہو جانے کے باوجود انجان بنتے ہوئے کہا۔

اندھیرے میں ایک غراتی ہوئی مردانہ آواز نے عبداللطیف کے بارے میں انتہائی نازیبا بلکہ فحش جملہ ادا کیا۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کو دیکھ کر اسے خوشی ہو گی۔ ابھی تو وہ تنہا ہی اپنے زخم چاٹ رہا ہوگا۔ شاید تم سے اسے کچھ دل سکے!"

"تو تم اس کے ساتھی نہیں ہو؟" میں نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

جواب میں اندھیرے میں ایک وحشیانہ قہقہہ گونج اٹھا۔ اسی لمحے کسی نے بٹن دبا کر تاریک برآمدے کو روشن کر دیا اور صورت حال کی ساری جزئیات یک بیک نمایاں ہو گئیں۔

یوں تو ان سب ہی کے خدوخال کرخت اور غیر شریفانہ تھے لیکن ہذیانی انداز میں قہقہہ لگانے والا دراز قامت سفید فام کچھ زیادہ ہی بھیانک چہرے کا مالک تھا۔ ہمیں درنہ سے لانے والا شخص ان ساتوں میں الگ ہی نظر آ رہا تھا۔ بادی النظر میں بھی یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں تھا کہ ہمیں جال میں پھانسنے کے لیے اس کا انتخاب محض اسی لیے کیا گیا تھا کہ چہرے مہرے سے وہ نہ صرف شریف نظر آتا تھا بلکہ رکھ رکھاؤ میں بھی ان جیسے عامیانہ انداز کا مالک نہیں تھا۔

"ہم بھلا آج تک ساتھی ہوئے ہیں کسی کے؟ جو اس کے ہوتے!" قہقہے کے اختتام پر دراز قامت سفید فام سفاکانہ لہجے میں غرایا۔

"تیسرا وہیں رہ گیا۔ اسے شاید شبہ ہو گیا تھا۔" قدرے سکوت کے بعد ہمیں لانے والے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"وہ بھی ہاتھ آ جاتا تو اچھا تھا۔" دراز قامت سفید فام نے شائستہ لہجے میں کہا۔ "اصل میں تو مجھے یہی نمونے درکار تھے۔ ان دونوں کی ممی بنا کر میں کسی عجائب گھر میں پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ تاکہ یہ دوسروں کے لیے عبرت کا سامان بنے رہیں!"

اس اثنا میں ہم اپنے مسلح استقبالی جلوس کی معیت میں برآمدہ طے کر کے ایک بڑے ہال میں داخل ہو چکے تھے۔ جسے فوری طور پر روشن کر دیا گیا تھا۔

"تم سب یہیں ٹھہرو ۔۔۔ اور الیس فورا! تم میرے ساتھ آؤ!" دراز قامت سفید فام نے ہمیں لانے والے سے مخاطب ہو کر کہا اور ہال کی بغلی دیوار میں نصب دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ہم دونوں پانچ نالوں کی زد میں اس روشن ہال کے وسط میں کھڑے رہے جس کی تمام بیرونی کھڑکیوں پر دبیز پردے تنے ہوئے تھے۔ اس احتیاط کے باعث باہر سے روشنی یا اندر متحرک سایوں کو دیکھا جانا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ درنہ پہنچنے والے اجنبی کے بارے میں ابتدا ہی سے میرا رویہ محتاط رہا تھا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے یوسف نے پیچھے رہ کر تعاقب کی تجویز پیش کی تھی ورنہ وہ بھی ہمارے ساتھ اس چوہے دان میں کھنچا چلا آتا۔

بدلے ہوئے خطرناک حالات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ صباح المزینی کی قیام گاہ پر اجنبی کے بارے میں میری چھٹی حس کی للکار حقیقی تھی اور اگر میرا قیاس غلط نہیں تھا تو اس وقت ہم رسوائے زمانہ مائیکل ٹرمپ کے آدمیوں کے نرغے میں آ چکے تھے۔

ان لوگوں کی گفتگو سے یہ تاثر ملا تھا کہ عبداللطیف ہم سے پہلے ان کی قید میں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عبداللطیف تو اپنی دانست میں تعاقب کرنے والے کو صنعا میں چکمہ دے کر درنہ کی طرف نکل بھاگا تھا لیکن درحقیقت اس کا تعاقب جاری تھا اور جب وہ ہم سے ملنے کے بعد لوٹ رہا تھا تو اس پر ہاتھ ڈال دیا گیا اور تشدد کے سامنے وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔

دوسری امکانی صورت یہ بھی تھی کہ عبداللطیف اپنا پیچھا کرنے والے کو جل دینے میں واقعی کامیاب ہو گیا ہو۔ اس کا سراغ کھوتے ہی اس کے دشمنوں نے شہر میں ہر طرف اس کی تلاش کی بھرپور مہم شروع کر دی اور درنہ میں ہم سے ملاقات کے بعد اسے جوں ہی صنعا میں دیکھا گیا۔ اس کے زخم خوردہ حریفوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور جھلاہٹ میں انہوں نے اسے گھیر کر پکڑ لیا۔ اس کے بعد بے رحمانہ تشدد کی کارروائی نے باقی مراحل تیزی سے نمٹا دیے ہوں گے۔

ان میں سے جو بھی صورت رہی ہو۔ اس وقت کی بدترین حقیقت یہ تھی کہ ہم خونخوار دشمنوں کے چنگل میں پھنس چکے تھے۔ ہمارا مددگار ۔۔۔ عبداللطیف ہم سے پہلے ان کا قیدی تھا اور یقینی طور پر ہم سے بہت زیادہ خراب حالت میں تھا۔

اس وقت لے دے کر ساری امیدیں یوسف کی ذات سے وابستہ تھیں۔ باہر موجود ہمارے ہمدردوں میں وہ واحد آدمی تھا۔ جسے درنہ سے ہماری واپسی کا علم تھا اور اگر وہ کامیابی کے ساتھ کرسلر کا تعاقب کرتا رہا تھا تو اس کی جانب سے کسی بھی لمحے مؤثر مداخلت کی امید کی جا سکتی تھی۔

باہر سے یوسف کی کامیابی کا دارومدار محض اس امکان پر تھا کہ ہمیں پکڑنے والے یہی سمجھتے رہیں کہ یوسف مشکوک ہو کر درنہ میں رک گیا تھا۔ اگر انہیں شبہ ہو جاتا کہ یوسف نے منصوبے کے تحت شاید تعاقب کی کوشش بھی کی ہو تو وہ لازمی طور پر باہر کی صورت حال پر کڑی نگاہ رکھتے اور یوسف کو اندر گھسنے کی کوشش میں بدترین خطرات کا سامنا کرنا پڑتا۔

"تلاشی لو..... اس کی جیب بہت پھولی ہوئی ہے!" باقی جانے والوں میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

میرے چونکنے سے پہلے ہی ایک شخص میری جیبیں خالی کرنے لگا تھا۔ دوسرا سیتا کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔

پھر وہ کمرہ اچانک ہی ایک کریہہ چیخ سے لرز اٹھا۔

سیتا کی تلاشی لینے والا دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ دبائے فرش پر تڑپ رہا تھا اور اس کی پیشانی سے تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا تھا۔

سیتا ایک ریوالور، ایک اسٹین گن اور دو رائفلوں کے دہانوں میں گھری ہونے کے باوجود ان سے بے خوف نظر آ رہی تھی۔ اس کی قہر بار آنکھیں فرش پر تڑپتے ہوئے شخص پر جمی ہوئی تھیں۔

یہ سب اس قدر اچانک ہوا کہ لحظہ بھر تک کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا پھر ان چاروں میں سے ایک رائفل کا کندہ اٹھا کر گالیاں بکتا ہوا سیتا کی طرف جھپٹا اور سیتا بھی اس سے بھڑ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ لیکن اسی وقت عقب سے ابھرنے والی ایک تیز آواز نے حملہ آور کو پتھر کے کسی بت کی طرح اس کی جگہ روک دیا۔

"ٹھہر جاؤ ـــ ابھی ان پر کوئی تشدد نہیں کیا جائے گا!" وہ تیز اور تحکم آمیز آواز بھاری چرمی جیکٹ میں ملبوس اس شخص کی تھی جو شاید چیخ سن کر اس دروازے سے نمودار ہوا تھا جس میں دراز قامت سفید فام ہمیں لانے والے کے ساتھ غائب ہوا تھا۔

چرمی جیکٹ والے کی شخصیت بہت مرعوب کن تھی۔ چوڑی پیشانی سے نیچے چمکتی ہوئی بے چین نیلی آنکھیں اور بھوری داڑھی میں چھپا ہوا کشادہ چہرہ اس اعتبار سے اسے باوقار بنا رہا تھا کہ دوسروں کے برعکس نہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا نہ بدن پر۔

مگر اس کی چال میں بلا کا اعتماد تھا۔ اس کے ہر اٹھتے ہوئے قدم میں ایک للکار سی محسوس ہو رہی تھی کہ کسی سے بن سکے تو میرا کچھ بگاڑ لے۔

میں نے دیکھا کہ اس کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی چاروں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ فرش پر تڑپنے والے کو اپنی تکلیف کے ضبط پر تو قدرت نہیں تھی لیکن اس کی بلند آہنگ چیخیں حلق ہی حلق میں گھٹ گئی تھیں۔

میرے لیے چرمی جیکٹ والے کا عارضی عدم تشدد پر مبنی حکم اس وقت بہت سکون بخش ثابت ہوا۔ اور مجھے کم از کم یہ یقین ہو گیا کہ کسی برے سلوک کے آغاز سے قبل ہم دونوں کو اپنی ذہنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع ضرور مل سکے گا۔

"اسے کیا ہوا؟" چرمی جیکٹ والے نے قریب آ کر غصیلے لہجے میں ان چاروں سے سوال کیا جو ہمیں گھیرے کھڑے تھے۔

دراز قامت سفید فام اور الیس فور چرمی جیکٹ والے کے پیچھے وہاں تک آئے تھے۔

"لڑکی نے اس کی پیشانی پر ٹھوکر ماری ہے" ان چاروں میں سے ایک نے مشینی انداز میں کہا جیسے جواب میں تاخیر ہونے پر اسے کسی بڑی سزا کا خوف لاحق ہو۔

"مگر کیوں؟" وہ فرش پر پیر مار کر طیش کے عالم میں دہاڑا اسے اپنے آدمی کا وہ نامکمل جواب پسند نہیں آیا تھا۔

"وہ..... وہ..... ل..... لڑکی کی تت..... تلاشی لے رہا تھا" جواب دینے والا خوفزدہ ہو کر بری طرح ہکلانے لگا۔

"بکواس..... " سیتا غصیلے لہجے میں بول پڑی "اس نے بے ہودگی کی تھی میرے ساتھ! یہ بتا دوں کہ تم لوگوں نے ہمیں قید ضرور کر لیا ہے مگر ہم پر ناجائز تصرف اختیار نہ کر سکو گے۔ اس کے مقابلے میں میں دو چار کے سر کھول کر مر جانا گوارا کر لوں گی!"

"مجھے تمھارا یقین ہے لڑکی!" چرمی جیکٹ والے کا لہجہ سپاٹ ہو گیا پھر وہ مڑ کر سفید فام سے مخاطب ہوا "اسے لے جاؤ اور تین نمبر ڈال دو۔ عورت کو قبضے میں دیکھ کر بے قابو ہو جانے والے دماغ کے کیڑے جھڑنے ضروری ہیں!"

کئی چہروں پر سیاہی کی لہر سی آ کر گزر گئی مگر کوئی کچھ نہ بولا حتیٰ کہ وہ زخمی بھی خاموشی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ جس کے بارے میں چرمی جیکٹ والے نے دراز قامت سفید فام کو حکم دیا تھا اور وہ حکم اپنے متن کے اعتبار سے تعزیری ہی تھا۔

دراز قامت سفید فام زخمی شخص کو سہارا دے کر ہال سے اسی روشن دروازے کے عقب میں روپوش ہو گیا۔ جہاں سے وہ چرمی جیکٹ والے کے ساتھ برآمد ہوا تھا۔

چرمی جیکٹ والا چند ثانیوں تک دلچسپی کے انداز میں باری باری میرا اور سیتا کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک سگار نکال کر اس کا کونہ توڑنے لگا۔

"ہمارے ساتھ کس جرم کی پاداش میں یہ سلوک کیا جا رہا ہے؟" میں نے موقع غنیمت جان کر براہ راست اسی سے سوال کر ڈالا۔

"تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے" وہ سگار سلگا کر کثیف دھواں فضا میں اگلتے ہوئے بولا۔ اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"ہم پر یمن میں غیر قانونی داخلے کے علاوہ کوئی جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا!" مجھے ان لوگوں کے بارے میں یقین کی حد تک شبہ تھا کہ ان کی وفاداریاں اسرائیل کے ساتھ تھیں لیکن پھر بھی میں نے انجان بنے رہنا مناسب سمجھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم یمن آئے!" چرمی جیکٹ والا خوش دلی سے بولا "قانونی اور غیر قانونی داخلے کا معاملہ مقامی حکام کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں!"

"تو تم کون ہو؟" میں نے بے ساختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اس وقت تم ہمارے قیدی ہو!" اس کا لہجہ شستہ مگر گمبھیر تھا۔

"اور باز پرس کا تمام تر حق ہمارا ہے لیکن اس وقت ہم خاموش ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم بھی اپنی زبان بند رکھو اور خود کو ذہنی طور پر بدترین حالات کے لیے تیار رکھو..... اگر تم نے ہم سے تعاون کیا تو ہمارے بارے میں بھی سب کچھ جان لو گے!"

اسی اثنا میں دراز قامت سفید فام لوٹ آیا۔

"ان دونوں کو آسٹن کے حوالے کر دو۔ وہ چاہے گا۔ تو انہیں عبداللطیف سے بھی ملا دے گا" اس نے دراز قامت کو ہدایت کی۔ "یہ یاد رکھنا تم نے ہدایت کی کوئی بھی خلاف ورزی کی تو ہمارا نرم رویہ ایک لمحے کے لیے بھی برقرار نہ رہ سکے گا" اس نے چلتے چلتے تادیبی لہجے میں ہمیں خبردار کیا مگر یہ بات اس کے بتائے بغیر میں بخوبی جانتا تھا۔

بقیہ لوگ وہیں رہ گئے اور دراز قامت ہم دونوں کو لے کر تیسری بار اسی دروازے میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے چرمی جیکٹ پوش برآمد ہوا تھا۔

دروازے سے گزرتے ہی ہم نے خود کو ایک روشن راہداری میں پایا جو بہت کشادہ تھی۔ اس میں مختلف فاصلوں سے دونوں طرف دروازے نظر آ رہے تھے۔ جو بلا استثنا سب ہی بند تھے اور باہر سے یہ قیاس کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا کمرہ اس وقت آباد رہا ہوگا کیونکہ راہداری میں پھیلی ہوئی تیز روشنی میں دروازوں کے نیچے سے آنے والی روشنی کو دیکھنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

اس عمارت میں پہنچنے کے بعد سے اس وقت تک ان لوگوں کی ساری گفتگو عربی میں ہی ہوتی رہی تھی لیکن اس دوران میں یہ واضح ہو چکا تھا کہ ان میں کئی غیر عرب بھی شامل تھے۔ دراز قامت سفید فام اور چرمی جیکٹ والے کے بارے میں تو واضح طور پر کسی یورپی ملک کا باشندہ ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے برادر؟" راہداری میں سفید فام کے ہمراہ چلتے ہوئے میں نے دوستانہ لہجے میں انگریزی میں سوال کیا۔

اس نے سر گھما کر مجھے گھورا پھر انگریزی ہی میں بولا "تمھیں یاد نہیں رہا کہ کیا ہدایت دی گئی تھی؟ خاموشی سے حالات کا رخ دیکھتے جاؤ!"

"مگر ہمیں یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کن لوگوں کی قید میں ہیں!"

"قید دشمنوں کی ہی ہوتی ہے!" وہ لاپروایانہ لہجے میں بولا "یہ اور بات ہے کہ مقدر نے اس بار تمھارا واسطہ شریف دشمنوں سے ڈالا ہے!"

پھر وہ داہنی سمت کے چوتھے دروازے پر رک گیا۔

دستک کے جواب میں ایک لاغر اور عمر رسیدہ شخص نے دروازہ کھولا اور موٹے عدسوں کے پیچھے اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں میں تجسس جاگ اٹھا۔

"ڈاکٹر آسٹن! یہ دونوں خصوصی مہمان ہیں!" ہمیں لانے والے نے وہیں کھڑے کھڑے احترام آمیز لہجے میں کہا۔

"اوہ!" ہمیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی "تو باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر لے آؤ انہیں!"

اپنے نگہبان کے اشارے پر ہمیں اندر داخل ہونا پڑا۔

"آؤ، آؤ" بوڑھا دروازہ بند کر کے ہمارے پیچھے آتے ہوئے کہہ رہا تھا "یہ کمرہ کئی روز سے تم دونوں کی آمد کا منتظر تھا!"

وہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ جہاں صاف ستھرے بستر کے علاوہ ایک گوشے میں مختصر سی میز مع ایک کرسی کے موجود تھی۔ میز پر ایک کھلی ہوئی ضخیم کتاب اوندھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک طرف دیوار گیر الماری تھی جس کے شیشے کے شفاف پٹوں کے پیچھے رنگ برنگ کے محلولوں اور نمکیات وغیرہ کی بوتلیں اور ڈبے نظر آ رہے تھے۔ اسی الماری کے ساتھ تجربہ گاہوں میں کام آنے والی مختصر سی میز تھی۔ جس پر روشن الیکٹرونک اسکرین پر ہندسوں کی صورت میں وزن بتانے والی ایک حساس ترازو موجود تھی۔

ان تمام اشیا کا تعلق تو بظاہر بوڑھے ہی سے تھا لیکن اس کے بیان کی روشنی میں کینوس کے وہ دو سفید کوچ میرے لیے پریشان کن تھے۔ جو قرینے سے ایک طرف پہلو بہ پہلو کھلے ہوئے رکھے تھے۔

بوڑھے کی ضروریات سے فاضل وہ دو کوچ بظاہر ہمارے ہی لیے تھے۔ لیکن میرا ذہن یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ وہ لوگ اس کمرے میں ہم دونوں کو اس نحیف و نزار بلکہ قریب المرگ بوڑھے کے ساتھ چھوڑنے کا خطرہ مول لیں گے۔

"بیٹھو" بوڑھے نے ہم تینوں سے مخاطب ہو کر اپنے بستر کی طرف اشارہ کیا "میرے پاس تمھیں بٹھانے کے لیے کرسیاں نہیں ہیں!"

"کوئی شراب مل سکے گی؟" میں نے بوڑھے کے بستر پر بیٹھتے ہوئے فوری حکمت عملی کے تحت لاپروایانہ انداز میں پوچھا۔

"اپنی اوقات میں رہو!" سفید فام غصیلے لہجے میں غرایا۔

"ڈاکٹر آسٹن کے سامنے تمھیں یہ لہجہ زیب نہیں دیتا" میں نے اسے سلگانے کے لیے ملامت آمیز لہجے میں کہا "یہاں پہنچنے کے بعد شاید ہمارے بارے میں تمھاری ذمہ داری ختم ہو گئی ہے!"

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کی قید میں جو گزرے گی سو گزرے گی۔ اس کے بارے میں پہلے سے سوچ سوچ کر ہلکان ہونے کے بجائے دبنگ انداز اختیار کیا جائے۔ ہماری طرف سے کمزوری یا پست ہمتی کا اظہار انہیں من مانی کرنے پر اکسا سکتا تھا۔ جبکہ مضبوط رویے کی بنا پر وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو سکتے تھے۔ اور تردد میں گزرنے والا ان کا ہر لمحہ ہمارے لیے بیش قیمت ہوتا۔

"میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں!" سفید فام میرے تبصرے پر حسب توقع جھلا گیا "میں گردن توڑ کر بھی تمھیں ڈاکٹر آسٹن کے حوالے کر

سکتا ہوں۔"

"اس عمر میں مُردوں کو ڈھونا ڈاکٹر کے لیے دشوار ہوگا!" میں نے براہِ راست سفید فام کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہ مکہ تان کر میری طرف بڑھا تھا، مگر ڈاکٹر آسٹن نے پھرتی سے درمیان میں آکر اسے روک دیا: "لڑنے کی ضرورت نہیں میرے بچے۔ وقت آنے پر تمہیں بھی ان پر بالادستی کا موقع دیا جائے گا۔ چند منٹ آرام سے بیٹھو۔"

"ہاں تم کیا مانگ رہے تھے؟" مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بوڑھے آسٹن کی آنکھیں پھر چمکنے لگیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ عجیب سی پُرجوش کیفیت کا شکار ہو جاتا تھا۔ میرے نزدیک اس کے اس ردِعمل کا ایک ہی سبب ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے صفدر علی کے طور پر پہچان چکا تھا۔

"شراب، کوئی بھی شراب۔" میں نے کہا۔

سیتا نے میرے پہلو میں کہنی ماری اور آنکھیں نکال کر بولی: "کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟"

"جن یا اسکاچ؟" ڈاکٹر آسٹن نے میرے اور سیتا کے تنازعہ کو بڑھنے کا موقع دیے بغیر نرم لہجے میں سوال کیا۔

"اسکاچ۔" میں نے کنکھیوں سے سفید فام کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ جو میری اور ڈاکٹر آسٹن کی گفتگو پر بُری طرح بل کھا رہا تھا۔

"اور خاتون کے لیے؟ شاید تھوڑی سی شیری بھی ہو میرے پاس۔"

"بد ذوق لڑکی ہے۔" میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا: "اسکواش کے علاوہ کسی مشروب سے رغبت نہیں رکھتی۔"

ڈاکٹر آسٹن نے اپنی مسہری کے سرہانے لگی ہوئی سائیڈ ٹیبل کا نچلا خانہ کھول کر بلیک ڈاگ کا کندن سا دمکتا ہوا اَدھا نکالا اور اپنی تجربہ گاہ والی میز پر پہنچ گیا۔

میں نے سفید فام کو قطعی نظرانداز کر کے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور یکبارگی خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ زہریلے تیروں والی شیشی کا لمس میری انگلیوں نے محسوس کیا تھا۔ جسے میں اس وقت قطعی بھولا ہوا تھا۔

تلاشی کے دوران ان لوگوں نے صرف آتشیں اسلحہ ہی نکلنے پر توجہ دی تھی۔ میری مملوکہ دیگر اشیا بدستور جیب میں موجود تھیں۔

چند ثانیوں بعد ڈاکٹر آسٹن ہم دونوں کے لیے مشروب لے آیا۔ سفید فام کو بھی اس بار توجہ دی گئی تھی۔ اور ڈاکٹر کا ہاتھ بھی خالی نہیں تھا۔

"تمہاری کامیابی کے نام پر۔" ڈاکٹر آسٹن نے گلاس والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے سفید فام سے کہا اور اس بار سفید فام کے ساتھ میں نے بھی اپنا گلاس فضا میں لہرایا اور اس آتش صفت سیّال کا پہلا گھونٹ اپنے معدے میں انڈیل لیا۔

سیتا نے احتیاط کے ساتھ پہلے اسکواش کا مختصر سا گھونٹ لے کر اسے چکھا پھر ہولے ہولے گلاس خالی کرنے میں مصروف ہوگئی۔

"صفدر علی۔" اپنا گلاس تقریباً خالی کرنے کے بعد ڈاکٹر آسٹن نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے الفاظ پر زور دے کر کہا: "تو آخر کار آج تمہیں دیکھنے کی سعادت حاصل ہو ہی گئی۔"

میں نے بے چینی سی محسوس کی اور پہلو بدلنا چاہا، لیکن اس وقت اچانک انکشاف ہوا کہ میں اپنے بدن کو حرکت دینے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر آسٹن نے شاید میرے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے تھے۔ کیونکہ اس کے لبوں پر غیر محسوس سی فاتحانہ مسکراہٹ رینگ آئی تھی۔

"مجھے کچھ دیا گیا ہے۔" اسی لمحے سیتا کی بوکھلائی ہوئی آواز ابھری "میں اپنے جسم کو کسی بھی سمت میں حرکت نہیں دے سکتی۔"

میں نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ جس میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ہاتھ منوں وزنی محسوس ہو رہا تھا۔

"جو کام ذہانت سے ہو سکتا ہے اس میں طاقت کا اسراف حماقت ہوتا ہے۔" میرے کانوں میں ڈاکٹر آسٹن کی آواز آئی۔ وہ سفید فام سے مخاطب تھا۔

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ میں بول سکتا تھا، سن سکتا تھا، اپنی آنکھ کی پتلیوں کو گردش دے سکتا تھا، لیکن گردن سمیت جسم کے کسی بیرونی.... حصے کو ہلانا تک ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی زود اثر دوا کے سبب سے میرا پورا جسم سن ہو کر رہ گیا تھا اور شاید سیتا بھی اسی صورتِ حال کا شکار ہوئی تھی۔

"یہ دونوں کم از کم آٹھ گھنٹے کے لیے قطعی بے ضرر ہو چکے ہیں۔" ڈاکٹر آسٹن میرے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ اس کا رخ بتا رہا تھا کہ وہ میرے بائیں طرف بیٹھے ہوئے سفید فام سے مخاطب تھا: "میرے ساتھ انہیں سہارا دے کر اسٹریچر تک پہنچا دو۔ اس کے بعد تم جا سکو گے۔"

"تم اگر بتا کر زہر بھی دیتے تو ہمیں پینے سے گریز نہ ہوتا۔" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا: "تم نے ہمارے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے ڈاکٹر آسٹن۔"

وہ ہنسا اور اس بار اس کی ہنسی میں خباثت کی جھلک نمایاں تھی۔

"تم ایسے ہی شریف النفس ہو۔ میں تمہاری فطرت سے خوب واقف ہوں صفدر علی.... تم جیسے لوگ اپنی جان بچانے کے لیے ایک بار پوری کائنات کو بھی الٹ دینے پر تلے رہتے ہیں۔" وہ بولتا ہوا میرے سامنے سے غائب ہوگیا۔ پھر سفید فام میرے سامنے سے گزرا مگر آسٹن کی بات جاری رہی: "تم انتہا پسند بلکہ جنونی ہو.... اور اسی جنون نے تمہاری عام سی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو خوف آور بنایا ہوا ہے۔ یہاں سے روانگی تک تم میرے معمول رہو گے۔ تمہاری ذات کا تجزیہ میرے لیے شاید ایک اثاثہ ثابت ہوگا۔"

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس بار سیتا کی آواز سنائی دی جو اپنی حالت پر وہ کسی حد تک خوفزدہ ہوگئی تھی۔

"اسی کمرے کے ایک کونے میں۔" ڈاکٹر آسٹن بولا: "تم بھی محیرالعقول کارنامے سرانجام دیتی رہی ہو۔ سنا ہے بندر تمہارے اشاروں کے غلام ہیں لیکن اس وقت تم بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئی ہو۔ اس وقت ذرا بھی مزاحمت کی تو زندگی بھر کے لیے خوفناک اعصابی درد میں مبتلا ہو جاؤ گی۔ گٹھیا سے فالج تک جوڑوں کا کوئی بھی مرض ہو سکتا ہے۔"

چند ثانیوں بعد میری بھی باری آگئی اور میں پتھر کے بت کی طرح انہیں دیکھتا رہا۔ انہوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اوپر اٹھایا۔ اور میرے ہاتھ بے جان لوتھڑوں کی طرح جھول کر نیچے گر گئے۔ پھر مڑتے ہوئے گھٹنے بھی خودبخود سیدھے ہوگئے۔

وہ دونوں مجھے سفید کوچ کی طرف لے کر چلے تو میری ٹانگیں پنجوں کے بل فرش پر گھسٹ رہی تھیں۔

مجھ پر جو کچھ گزر رہی تھی اس کی روشنی میں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر آسٹن کے دیے ہوئے زہر نے پٹھوں کو اکڑانے کے بجائے اس قدر نرم کر دیا تھا کہ وہ ذرا سا بھی بوجھ سہارنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مگر کمال یہ تھا کہ گردن بدستور اپنی جگہ قائم تھی۔ ورنہ اسے بھی ذرا سے جھٹکے سے کسی طرف ڈھلک جانا چاہیے تھا۔ ہونٹ نیم بے جان سے تھے۔ جن کی وجہ سے صحیح تلفظ کی ادائیگی دشوار تھی۔

سفید فام نے بے رحمی سے مجھے کوچ پر ڈالا لیکن مجھے جسم کے کسی بھی حصے میں درد یا تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہوا۔

اسٹریچر نما کوچ پر میرے ہاتھ پیر سیدھے کرانے کے بعد سفید فام وہاں سے چلا گیا، کیونکہ میں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنی تھیں۔

پھر ڈاکٹر آسٹن ایک کرسی گھسیٹ کر میرے قریب آبیٹھا۔

"سیتا کہاں ہے؟" میں نے ڈاکٹر آسٹن کا چہرہ نظر آتے ہی بے چین لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے پہلو میں، دوسرے کوچ پر۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم میرا چہرہ اس کے رخ پر گھما دو۔" میں نے درخواست کی۔

"اور اس کا چہرہ تمہاری طرف۔" وہ ہنسا: "تاکہ تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہو اور جو باتیں میری وجہ سے زبان سے نہ کر سکو آنکھوں کے اشاروں سے کر لو۔"

"یہ وہم ہے تمہارا — میں اسے دیکھ کر اپنی حالت کا اندازہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں — اسرائیل میں تمہاری کئی فلمیں بنائی گئی تھیں۔ میں نے ہر فلم کو بار بار دیکھا ہے۔ اور میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" وہ بار بار ایک ہی بات جتلائے جا رہا تھا۔ "لیکن اس وقت تم بالکل بے ضرر ہو۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے داہنی طرف کروٹ دلانے لگا۔

سیتا میری داہنی جانب چند فٹ کے فاصلے پر دوسرے کوچ پر بالکل بے حس و حرکت چت پڑی ہوئی تھی۔

جب ڈاکٹر آسٹن سیتا کو بائیں جانب کروٹ دلانے لگا، تو سیتا کی زبان چل پڑی: "تمہارا نام ڈاکٹر آسٹن کے بجائے ڈاکٹر شیطان ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ صورت سے لاغر اور مسکین نظر آتے ہو لیکن خواص بچھو کے پائے ہیں۔"

وہ یوں ہنسا جیسے سیتا نے کوئی بہت شستہ مذاق کیا ہو۔ "جھلاہٹ اور غصہ جوانی کے منہ زور جذبے ہوتے ہیں۔ جو آدمی کو ناکارہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں۔ جہاں آدمی گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوتا.... تم دونوں جس کوچ پر لیٹے ہوئے ہو اس کے کشنوں کے نیچے خودکار سرنجیں نصب ہیں۔ ابھی ان کے ٹائمر سیٹ کر دوں گا۔ پھر جیسے ہی تمہیں دیے ہوئے زہر کو آٹھ گھنٹے پورے ہوں گے۔ کوچ کے نیچے ایک ننھی سی موٹر چلے گی۔ سرنج کی سوئی خودبخود تمہارے جسم کے کسی حصے پر گوشت حصے میں داخل ہوگی اور وہی زہریلا سیّال سرنج سے آہستہ آہستہ تمہارے بدن میں سرایت کر جائے گا۔ میں یہاں رہوں یا نہ رہوں تم کم از کم سولہ گھنٹوں تک اپنے جسم کو ہلا بھی نہ سکو گے۔"

اس کی باتیں سن کر میرے وجود میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس بار میرا مقابلہ طاقت کے بجائے مکاری سے تھا۔

"تمہاری گفتگو سے یہ پتہ چل چکا ہے کہ تم اسرائیل کے تنخواہ دار ہو لیکن پھر بھی میں تمہارے بارے میں مزید جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"تمہاری معلومات میں اضافے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ میرے اور سیتا کے درمیان کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا: "یہ عمارت یمن کی سرزمین پر چھوٹا سا اسرائیل ہے۔ اور اس میں میری حکمرانی ہے۔ اس عمارت کا تحفظ کچھ تنخواہ دار لوگ کرتے ہیں...."

"مائیکل ٹرمپ اور اس کے آدمی؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

میری زبان سے مائیکل ٹرمپ کا نام سن کر وہ پہلی بار چونکا اور گہرا سانس لے کر بولا: "بظاہر اس کا اس عمارت سے کوئی واسطہ نہیں

ہے. لیکن اس کا نام لے کر تم نے مجھے جتا دیا ہے کہ تمھاری معلومات بالکل ہی ناقص نہیں ہیں" وہ لحظہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔" اسے خوش فہمی ہے کہ یہاں وہ مجھ سے برتر ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے" مجھے یاد آیا کہ چرمی جیکٹ والے نے آسٹن کا تذکرہ بہت سرسری بلکہ تحقیر آمیز انداز میں کیا تھا اور شاید دراز قامت سفید فام بھی اس سے مرعوب نہیں تھا میں نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو میں نے محض دراز قامت سفید فام کو چڑانے کے لیے ڈاکٹر آسٹن کی ذات کو بھی اپنی گفتگو میں لپیٹ لیا تھا۔

"میں جب چاہوں اسے شبہ کا موقع دیے بغیر موت کے گھاٹ اتار دوں" ڈاکٹر آسٹن کی انا اس وقت قدرے جوش میں آئی ہوئی تھی۔ "لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا کیونکہ ذاتی اختلافات خواہ کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، ہم ایک مشترکہ مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین اسرائیل کو اس حد تک طاقتور بنانا ہے کہ وہ اپنے خون آشام ہمسایوں کے لیے ناقابلِ شکست ڈراؤنا خواب بن جائے۔ مائیکل ٹرمپ کی کارکردگی اپنے شعبے میں لاجواب ہے۔ یہ اسی کا دم ہے کہ آج تم دونوں میرے اسیر ہو... کرنل رینا کے لیے تمھارے نام چیلنج بن گئے تھے۔ بن حیان جیسا عظیم ذہن فرانس میں تمھاری بربریت کا نشانہ بنا۔ جونا س کا خون ہوا۔ اور نہ جانے کتنے بڑے نام تمھارا نشانہ بنے لیکن اب تمھارا انجام کاتبِ تقدیر نے میرے حوالے کر دیا ہے ہم دیکھو گے کہ میری ایجادات کتنے سہل اور غیر محسوس طریقے سے تمھیں اسرائیل کا غلام بناتی ہیں۔ تم دونوں کے ذہن نادرالوجود ہیں۔ کچھ لوگ تمھیں ہر قیمت پر مردہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر میں تمھیں ڈیوڈ اسٹار کے سامنے سر جھکائے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور میری یہ آرزو پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

"لیکن بظاہر تو تم بھی یہاں اس کمرے کے قیدی نظر آتے ہو۔" میں نے اس سے مزید معلومات اگلوانے کے لیے اس کی انا پر چوٹ لگائی۔

"یہ میری خواب گاہ ہے۔" وہ پُرسکون رہا۔" اس عمارت میں ایک بھرپور تجربہ گاہ ہے۔ جہاں میرے ساتھ تین معاون بھی عرق ریزی کرتے ہیں پھر ہمارے نتائج اسرائیل میں اپنائے جاتے ہیں۔"

"مگر تمھیں تجربہ گاہ کے لیے چند گز زمین اسرائیل میں کیوں نہ مل سکی۔ ایسے ادارے تو محفوظ ترین مقامات پر قائم کیے جاتے ہیں۔"

وہ معنی خیز اور پُرغرور انداز میں ہنسا۔" کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم عربوں کی سرزمین پر ان ہی کے خلاف ہولناک تحقیقی تجربات کر رہے ہیں اگر کبھی یہ تجربہ گاہ برباد ہوئی تو اس کے گرد ہزاروں فٹ کے دائرے میں نہ کوئی ذی روح زندہ بچ سکے گا اور نہ درختوں پر سبزہ باقی رہے گا.... اسرائیل چھوٹا ضرور ہے مگر جمہوری ملک ہے۔ ہمارے عوامی نمائندوں نے اپنی آبادیوں کے درمیان ایسی ہلاکت خیز تجربہ گاہ کے قیام کی اجازت نہیں دی جس کا خام مال انسانی جانوں پر مشتمل ہو!"

"تو تم انسانوں پر مہلک تجربات کرتے ہو۔" میں حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔

"یہاں ہر طرف ہمارے دشمن بکھرے ہوئے ہیں۔ کسی عرب کا دل اسرائیل کی نفرت سے خالی نہیں۔ جب ایسے قابلِ گردن زدنی انسانوں کی بہتات ہو اور انھیں فراہم کرنے والا مائیکل ٹرمپ جیسا بااعتماد آدمی ہو۔ تو چوہوں، خرگوشوں اور بندروں پر تدریجی تجربات وقت کے ضیاع کے مترادف ہوں گے۔ زہریلی گیس اور دوسرے کیمیاوی ہتھیار میرا محبوب موضوع ہیں۔ ان ہتھیاروں کی چھوٹے پیمانے پر فوجی آزمائش کے لیے لبنان میں فلسطینیوں کے کیمپ بکثرت واقع ہیں۔" آخری فقروں پر اس کا لب و لہجہ تضحیک آمیز اور استہزائیہ ہو گیا۔

وہ مجھ سے محض اتنی دور تھا کہ اگر میں ہاتھ بڑھاتا تو اس کا ابھرا ابھرا نحیف سا نرخرا بڑے آرام سے میری گرفت میں آ جاتا۔

وہ جوں جوں کھل رہا تھا۔ اسی قدر میرا خون کھول رہا تھا لیکن میں اس منحنی سے شیطان صفت بوڑھے کے دیے ہوئے زہر کے زیرِ اثر اپنے غصے کے عملی اظہار کی قوت سے یکسر محروم ہو چکا تھا جس سے وہ پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

چند ثانیوں تک میں خاموش رہ کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس سے سوال کیا۔" وہ مائیکل ٹرمپ ہے کہاں؟"

"اسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے مگر آج تو اس نے بنفسِ نفیس تمھیں وصول کیا ہوگا۔" ڈاکٹر آسٹن بالکل پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

"وہ چرمی جیکٹ والا تو نہیں؟"

"وہی۔" ڈاکٹر آسٹن مسکرایا تو اس کے دانت مجھے کسی بھیڑیے کے دانتوں سے مشابہ نظر آئے۔" آج وہ چرمی جیکٹ ہی میں تھا۔"

"مگر تمھاری ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

"غنیمت ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔" تم دشمن ہو کر صرف ایک بات سمجھ میں نہ آنے کی شکایت کر رہے ہو جب کہ دوست اکثر میری کوئی بھی بات نہیں سمجھ پاتے۔"

"اگر تمھاری منطق کو درست مان لیا جائے تو اسرائیل امن و محبت کی سرزمین ہونی چاہیے۔" میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

"تم اونٹ کو گیدڑ کے پنجرے میں بند نہیں کر سکتے۔" وہ پُرزور لہجے میں بولا۔" اونٹ پنجرہ توڑ کر باہر نکل کر من مانی کرے گا۔ اسرائیل کو اتنی زمین دے دو جو اس کی دفاعی اور قومی ضروریات کے لیے درکار ہے۔ پھر دیکھو کہ ہر طرف امن اور محبت کا پرچار ہوگا۔"

"اور دوسروں کی ضروریات؟"

"سب بنجر اور غیر آباد ریگستان لیے بیٹھے ہیں۔ جس میں کہیں کہیں تیل بھی ہے۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔" ہمیں دیکھو کہ اسرائیل کی ریت کے ذرے ذرے سے ہری بالیاں اگائی ہیں۔ ضرورت پڑی تو صحرا کو چمن میں تبدیل ...

ورنہ... "تم بہک رہے ہو ڈاکٹر آسٹن۔" میں نے اسے ٹوکا اور وہ خاموش ہو گیا۔

"اگر اسرائیل کے عوامی نمائندے اس بنا پر تمھاری نسل کش تجربہ گاہ کی مخالفت کر سکتے ہیں کہ اس کی ناگہانی بربادی وسیع علاقے میں ہلاکت پھیلا دے گی۔ تو اسرائیلی سرزمین پر کوئی ایٹمی ری ایکٹر ہونا چاہیے اور نہ مہلک ترین باعدی اور جرثومی ہتھیار کیونکہ حادثے کی صورت میں وہ تمھاری تجربہ گاہ سے زیادہ خوف ناک ثابت ہوں گے۔"

"بہت ذہین ہو۔" اس نے بزرگانہ ستائشی لہجے میں کہا۔" تم نے میری دلیل دہرائی ہے۔ جانتے ہو مجھے کیا جواب ملا تھا؟"

میں خاموش رہا۔

چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ خود ہی بولا۔" ایٹمی ری ایکٹر معاشی بہبود اور صنعتی ترقی کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ اسی طرح ہر قسم کے روایتی اور غیر روایتی ہتھیار مؤثر دفاع کے لیے ضروری ہیں جبکہ میرے کام کا تعلق دفاع سے نہیں بلکہ پیش قدمی سے ہے۔ ذرا تصور تو کرو کہ اردن، عراق اور شام کے وسیع علاقوں پر میرے ایجاد کیے ہوئے ہلاکت خیز بموں کی برسات کر دی جائے اور دوسرے روز اسرائیلی دستے ایک بھی گولی چلائے بغیر ان علاقوں پر دور تک قبضہ کرتے چلے جائیں۔ تو کیسا روح پرور نظارہ ہوگا۔ دشمن اپنے مورچوں میں مرے ہوئے پڑے ہوں گے۔ اور ان کا سارا گولہ بارود قابلِ استعمال حالت میں ہیکلِ سلیمانی کے محافظوں کے ہاتھ لگے گا۔ وہ میری ایجادات کو دفاعی تسلیم نہیں کرتے لیکن ضروری سمجھتے ہیں اسی لیے قومی سرمائے سے ایک خطیر رقم میری تجربہ گاہ کی ضروریات پر صرف کی جاتی ہے۔"

اس بدمعاش کی ذات پورے طور پر بے نقاب ہو چکی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت میرے ہاتھوں جو اسرائیلی جہنم واصل ہوئے تھے وہ ڈاکٹر آسٹن کے مقابلے میں سراسر معصوم تھے۔ اس ایک نابکار کو ختم کر کے ہزاروں جانوں کا ثواب کمایا جا سکتا تھا۔

"اور تم نے کب سے یہ مستقر قائم کیا ہوا ہے؟"

"تین برس بھی پورے نہیں ہوئے اور دو اہم ایجادات اسرائیلی فوج کو دے چکا ہوں۔" اس نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"یہاں ہمیں کس تجربے کا نشانہ بنایا جائے گا؟"

"کسی بھی تجربے کا نہیں۔" وہ آسودہ انداز میں ہنسا۔" خوفزدہ ہو گئے نا۔ یہاں سے تمھیں پوری احتیاط کے ساتھ اسرائیل بھیج دیا جائے گا وہاں ذہنی معذوروں کی بحالی کے ادارے میں میرا قدیم ہم جماعت ڈاکٹر آسکر تمھاری برین واشنگ کر کے تمھاری وفاداریاں تبدیل کرے گا پھر تمھیں چھوڑ دیا جائے گا اور تم عمر بھر ہمارے لیے کام کرتے رہو گے۔"

"عبداللطیف کہاں ہے؟" کچھ دیر کے بوجھل سکوت کے بعد سیتا نے پہلی بار اس مکروہ صورت شخص سے سوال کیا۔

"اوہ — وہ زخمی لونڈا۔" وہ بے رحمانہ انداز میں ہنس دیا۔" برابر والے کمرے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوگا۔"

"اس سے ملنا ممکن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات کے دو بجے اس پر سے بے ہوشی کا اثر ختم ہونا شروع ہوگا۔ میں یہ کرتا ہوں کہ اسے نیا انجکشن دینے کے بجائے ویکسین ایکوا کا ایک ڈوز دے کر تمھارے پاس پہنچا دوں۔" اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ ویکسین ایکوا کیا بلا ہے؟" سیتا کے لہجے میں بیزاری عیاں تھی۔

"خوبصورت ضرور ہو مگر چڑچڑی ہو۔" وہ بولا۔" تم لوگوں کو یہی ویکسین دی گئی ہے۔ یہ ایک قسم کے وائرس کو پانی میں پروان چڑھا کر کشید کی جاتی ہے۔"

"اس کے ساتھ دوسرے لوگ کون ہیں؟" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس اذیت ناک سوال کو اپنی زبان تک آنے سے نہ روک سکا۔

"تجربوں کے منتظر قابلِ نفرت عرب!" اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔" میرا بس چلے تو ان بدروحوں کو اپنے تجربات میں شریک نہ کروں۔ اس طرح گمنام رہ کر بھی وہ ایک نام کما لیتے ہیں۔"

"کیا عبداللطیف زیادہ زخمی ہے؟"

"شاید مائیکل ٹرمپ کے آدمیوں نے اسے روئی کی طرح دھنکا ہے کسی طرح بھی دو روز سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اسی لیے میں نے کل شام اس پر ایک تجربہ کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"تو کیا تم اسے بھی قدرتی موت نہ مرنے دو گے؟" عبداللطیف کے بارے میں وہ خبر بد سن کر بے اختیار دل بھر آیا۔

"ہم یہودیوں کا ایمان ہے کہ موت جہاں اور جیسے بھی آئے قدرت ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔" اس نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔" کل میں یہ ثابت کر دوں گا کہ ناقص نظامِ تنفس کے حامل افراد کے کیمیاوی حملے میں بچنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔"

"تم اسے معاف نہیں کر سکتے ڈاکٹر؟" میں نے دکھ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"اس کا سانس اکھڑا ہوا ہے۔" وہ میری سنی ان سنی کر کے پُرخیال لہجے میں بولتا رہا۔" طاقتور ترین بم بھی استعمال کیا جائے تو کاربن مانو آکسائڈ کے اثرات سطحِ زمین سے دس فٹ کی بلندی تک محض نو منٹ تک برقرار رہتے ہیں پھر بتدریج تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک تندرست آدمی خطرہ بھانپ کر سانس روک بھی لے، تو زیادہ سے زیادہ پونے تین منٹ ایسا کرے گا اس کے بعد اگلا ایک منٹ اس کی ہلاکت کے لیے کافی ہوگا مگر میرا دعویٰ ہے کہ تمھارا دوست پانچ منٹ سے زیادہ زندہ رہے گا۔ میں اسے اس وقت تک کاربن مانو آکسائڈ کی شفاف نقاب میں رکھوں گا جب

تک اس کا آخری سانس بھی منقطع ہو جاتے۔"

میں نے آنکھیں بند کرنی چاہیں لیکن پپوٹوں کو جنبش نہ ہوئی، کان بند کر لینے چاہے مگر دونوں ہاتھ بے سدھ تھے۔

"تمہاری باتوں سے غرور کی بو آ رہی ہے ڈاکٹر آسٹن!" سیتا کی آواز سنائی دی۔ "شاید تم بھی مائیکل ٹرمپ کے کوئی فاترالعقل قیدی ہو اور ہمیں اس لیے تمہارے ساتھ بند کیا گیا ہے کہ تمہارا حشر دیکھ کر ہم اس سے مرعوب ہو جائیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ پہلی بار کسی بھیڑیے کی طرح غرایا اور مجھے خوشی ہوئی کہ اس طرح کم از کم اسے ایک ذہنی جھٹکا تو لگا ہی تھا۔

"میرا خیال ہے کہ بڑی تجربہ گاہ وغیرہ سب تمہارے اپنے ذہن کی پیداوار ہے اور تم ہر خیالی کام کا سہرا اپنے سر سجانے کے عادی ہو۔ تمہاری جملہ کائنات اسی کمرے پر مشتمل ہے۔"

"زبان بند کرو اپنی۔" وہ غصے میں تقریباً چیخ پڑا۔

"اسے تمہارا زہر بند نہ کر سکا تو خود کیا بند ہو گی۔" سیتا مضحکانہ لہجے میں بولی اور اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ ہم دونوں کو سرکشی کے لیے مائیکل ٹرمپ اور ڈاکٹر آسٹن نے یہ کہہ کر خود ہی کھلا پرمٹ دیا تھا کہ ان کا مشن ہمیں زندہ سلامت اسرائیل پہنچانے تک محدود تھا یعنی وہ ہمیں سزا دے سکتے تھے مگر مارنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔

"چیخنے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر آسٹن!" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "تمہاری باتوں میں تضاد ہے۔ پہلے تم نے کہا کہ اپنی ایجادات سے سہل اور غیر محسوس طریقے پر ہمیں اسرائیل کا غلام بناؤ گے پھر بولے کہ اسرائیل میں ڈاکٹر آسکر یہ کام سرانجام دے گا۔ ایک طرف تم انسانی عادات اور فطرت کے ماہر ہونے کے دعویدار ہو تو دوسری طرف مہلک کیمیاوی ہتھیاروں کی تیاری میں مہارت کا اظہار کر رہے ہو۔"

"یہ سب درست ہے۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "خوابگاہ میں یہ تھوڑا سا ساز و سامان اس لیے ہے کہ بعض اوقات نیند نہیں آتی اور میں کام میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ میں نے اسی کمرے میں ایسی منشیات دریافت کی ہیں جو انسان کی قوت ارادی کو عارضی طور پر بالکل برباد کر دیتی ہیں اور اسے جو ہدایات دی جائیں۔ وہ اس کے لاشعور میں جم جاتی ہیں جن پر وہ حواس بحال ہونے کے بعد رضاکارانہ مسرت کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ ایسی منشیات کے نپے تلے کورس کے بعد آدمی کی شخصیت نئے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ آسکر اپنے ادارے میں میری ان ہی منشیات سے کام لے رہا ہے۔ کام وہی کرے گا لیکن عمل میرا بتایا ہوا ہو گا۔ رہی فطرت شناسی کی بکواس، تو کان کھول کر سن لو کہ میرے تجربات ہر قسم کے انسانوں پر ہوتے ہیں۔ خوف، دہشت اور بے یقینی کے حالات میں انسان کے بدلتے ہوئے رویوں کا مطالعہ میری ہابی ہے جس کا میرے پیشے سے بھی خاصا تعلق ہے۔ اس کے ذریعے مجھے تجربات کی مناسبت سے معمول کے انتخاب میں آسانی ہوتی ہے۔"

"بکے جاؤ۔" سیتا اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے بولی۔ "جب تک بے حس و حرکت پڑے ہیں تمہاری ہرزہ سرائی سننی ہی پڑے گی۔"

ڈاکٹر آسٹن کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ ہی بے بسی بھی سمٹ آئی۔ شاید زندگی میں کسی نے اس طرح کھل کر اس کا مضحکہ اڑانے کی جسارت نہیں کی تھی۔

"آخر تم مجھے کیوں مشتعل کرنا چاہ رہی ہو؟" اس نے سیتا سے سوال کیا۔

"اشتعال اور غصے سے تمہارا کیا تعلق؟ یہ تو نوجوانوں کے روگ ہیں۔" سیتا کا رویہ بدستور جارحانہ ہی رہا۔

"پچھتاؤ گی لڑکی!"

"صرف ایک صورت میں۔" سیتا نے برجستہ کہا۔ "دو بندر لے آؤ، ایک کو میں زبان سے سکھاؤں گی۔ دوسرے کو تم بھنگ، چرس یا اپنی خود ساختہ منشیات پلا کر حکم دو جس کا پلہ ہلکا رہا وہ خود ہی شرمسار ہو جائے گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "اس ایک مطالبے کے لیے اتنا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارا اور کسی بندر کا تماشا تو میں خود دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس آڑ میں تم کوئی چالاکی نہ کر سکو گی۔ تم اس ویکسین کے زیر اثر رہو گی اور تماشا کسی کمرے کے مقفل دروازے کے پیچھے ہو گا تاکہ تم کسی بندر کو تخریب کاری پر اکسا کر بربادی پھیلانے میں کامیاب نہ ہو سکو۔"

سیتا کا عندیہ یقیناً وہی تھا جو ڈاکٹر آسٹن سمجھا تھا لیکن سیتا اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی۔

"میرے اس مطالبے کی بجائے خود کوئی حیثیت نہیں۔ مسلح آدمیوں کی فوج میں سے کوئی بھی بھڑکے ہوئے ایک بندر کو باسانی گولی مار سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ بحث غیر ضروری ہے ڈاکٹر!" میں نے موضوع کو اسی جگہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہو سکے تو عبداللطیف کو لے آؤ۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دیر کے لیے سونا بھی چاہتے ہیں۔"

وہ میرے کوچ کے قریب آ کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور جھک کر کوچ کے نیچے کچھ کارروائی سرانجام دینے لگا۔

"کیا کر رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ویکسین کے بوسٹر ڈوز کے لیے ٹائمر سیٹ کر رہا ہوں۔" اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔"

یہی کارروائی اس نے سیتا کے کوچ کے نیچے بھی کی پھر اس کمرے کی دیوار میں نصب ایک دروازہ کھول کر اس میں غائب ہو گیا۔

وہ دروازہ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا لیکن اسے ملحقہ باتھ روم میں جانے کا راستہ سمجھا تھا۔ جب کہ وہ کمرہ شاید اسی دروازے کے ذریعے دوسرے کمرے سے ملا ہوا تھا۔

چند منٹ بعد ڈاکٹر آسٹن پہیوں کا ایک اور کوچ دھکیلتا ہوا کمرے میں لوٹ آیا اور اس نئے کوچ کو میرے اور سیتا کے درمیان لگا دیا۔

عبداللطیف کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اس کا بدن جابجا خون آلود پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پیشانی پر بھی خاصی دبیز ڈریسنگ نظر آ رہی تھی جس سے رسنے والا خون اس کے چہرے سے بہہ کر گردن پر جما ہوا تھا۔

مجھے اس کی حالت دیکھ کر دلی صدمہ ہوا۔ وہ بے چارہ محض میری اور سیتا کی وجہ سے اس حال کو پہنچایا گیا تھا اور اگر کوئی معجزہ ہی رونما نہ ہوتا تو اگلی شام کو اسے ڈاکٹر آسٹن کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

ڈاکٹر آسٹن نے باری باری دو سرنجوں سے عبداللطیف کے جسم میں دو مختلف سیال اتارے پھر بولا۔ "یہ جلد ہی ہوش میں آ جائے گا لیکن تمہاری طرح بے سدھ رہے گا۔ اسے میں دوسری مہلت نہیں دوں گا بس بے ہوش کر دوں گا۔"

ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

"ہوش میں آنے پر اسے صرف نقاہت محسوس ہو گی۔ تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہو گا۔ یہ نہ بتانا کہ وہ بری طرح زخمی ہے۔" ڈاکٹر آسٹن نے کہا۔

"ہم محتاط رہیں گے۔" میں نے دونوں کی طرف سے کہا۔

"میں آج رات دوسرے کمرے میں سونے جا رہا ہوں تاکہ تمہاری آزادی میں خلل واقع نہ ہو۔ صبح سویرے واپس آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلتا ہوا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نکاسی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی مدھم سی آوازیں آئیں لیکن میرا دل یہ تسلیم نہ کر سکا کہ ڈاکٹر آسٹن واقعی وہاں سے چلا گیا تھا۔

مجھے قوی اندیشہ تھا کہ ۔۔۔۔ دروازہ کھول کر اس نے ہمیں یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ چلا گیا لیکن درحقیقت وہ اسی کمرے میں موجود تھا اور ہماری نگاہوں سے دور رہ کر ہماری گفتگو سننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"وہ گیا نہیں، یہیں موجود ہے۔" میں سوچتا ہی رہا اور سیتا نے باآواز بلند اسی اندیشے کا اظہار بھی کر ڈالا جو میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

"اسے یہاں رکنے کی کیا ضرورت تھی۔" اگر وہ کمرے ہی میں تھا تو میں نے محض اسے سنانے کی نیت سے کہا۔ "وہ ہمیں کیچوؤں سے بھی بدتر کر چکا ہے۔ اس حالت میں ہم ایسی کیا حرکت کر سکیں گے جس کے لیے وہ اپنی بقیہ رات خراب کرے۔"

"وہ بہت بدمعاش ہے، اور کچھ نہیں تو ہماری باتیں ہی سننی چاہے گا۔" سیتا اس کے بارے میں کسی رعایت سے کام لینے پر آمادہ نہیں تھی۔

"تو سنا کرے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "ان حالات میں ہماری گفتگو سے ایک از کار رفتہ بڈھا بھلا کیا لطف لے سکے گا۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ہم دونوں پیدائشی احمقوں کی طرح اپنے اپنے کوچ پر دراز ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے رہے۔

میں اس وقت اپنی زندگی کی بدترین صورت حال سے دوچار تھا۔ پوری طرح آزاد ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ پیر تو کیا، لبوں تک پر اختیار نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے بعض الفاظ کے صحیح تلفظ کی ادائیگی میں دشواری ہو رہی تھی۔

میرا دل چاہا کہ اپنی بے بسی پر دل کھول کر قہقہہ لگاؤں، لیکن جبڑے بھی ناکارہ ہو چکے تھے۔ قہقہے کی جگہ حلق سے محض ایک مضحکہ خیز آواز ہی پیدا کی جا سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عبداللطیف کو ہوش آ گیا۔ اس وقت میں سیتا سے اسرائیل میں بہتر مستقبل کے امکانات پر بحث کر رہا تھا، اور وہ مسلسل چڑے جا رہی تھی۔

"صف۔۔۔ در!" عبداللطیف کے ہونٹوں سے کانپتی ہوئی نحیف سی آواز برآمد ہوئی جسے سن کر ہم دونوں چونک پڑے۔

"میں تمہارے قریب موجود ہوں۔" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"میری مدد کرو۔" اس کی آواز سے بلا کی بے چارگی عیاں تھی۔ "میں نہ ہل جل سکتا ہوں اور نہ آنکھیں کھول سکتا ہوں لیکن تمہاری آواز سن رہا ہوں۔"

ہوش میں آنے سے پہلے چونکہ وہ ویکسین کے زیر اثر آ چکا تھا لہٰذا اس کے پپوٹوں کا نہ کھلنا میرے لیے قابل فہم تھا۔

"میری بھی یہی حالت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔" میں نے اسے اپنی بے چارگی سے آگاہ کیا۔

"مجھے دکھ ہے صفدر! کہ میں تمہیں نہ بچا سکا۔ ان درندوں نے ورنہ سے واپسی پر ہی مجھے اٹھا لیا تھا۔ پھر تمہارے بارے میں باز پرس شروع کر دی میرے انکار پر انہوں نے بے رحمی سے ادھیڑنا شروع کر

دیا۔۔۔" پھر کسی خیال کے تحت چونک کر اس نے سوال کیا۔ "بھابی کہاں ہے؟"

"میں بھی یہیں اسی حال میں ہوں۔" سیتا نے جواب دیا۔

"میں شرمندہ ہوں بھابی!" اس کے لہجے میں دکھ کے ساتھ ندامت بھی تھی۔ "میں نے ان کا بدترین تشدد برداشت کیا مگر وہ باز نہ آئے پھر نجانے کب میری قوت برداشت جواب دے گئی، مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے انہیں کیا بتایا۔۔۔ تم دونوں یہاں ہو اس کا مطلب ہے کہ سچ میری زبان سے بہہ نکلا اور تم دونوں عتاب میں آ گئے۔"

"تمھاری جگہ میں ہوتا تو شاید اتنا تشدد سہنے سے پہلے ہی زبان کھول بیٹھتا۔" میں نے نرم اور تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

"بہادر نہ دو میرے دوست!" اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ "سوچا تھا کہ مر جاؤں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا مگر زبان کھل ہی گئی اور اب مرنا بھی پڑے گا۔"

میرا دل دہل اٹھا۔

اس کی چھٹی حس نے موت کی بو سونگھ لی تھی۔

"مگر عجیب بات ہے کہ اس قدر تشدد کے باوجود میرے بدن میں کہیں تکلیف نہیں ہے۔" وہ کمزور آواز میں کہہ رہا تھا۔ "بس شدید نقاہت سی ہے۔"

"انہوں نے ہم سب کے بدن سن کیے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے تمہیں تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا۔" میں اس کے لیے اپنے رؤیں رؤیں میں رحم اور ہمدردی کے بے پناہ جذبات امڈتے محسوس کر رہا تھا۔

"کیا ان میں سے کوئی نہیں ہے یہاں؟" اس نے رک رک کر سوال کیا۔

"نہیں۔ بس ہم تینوں ہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"شاید ڈاکٹر آسٹن نامی ایک خبیث اسی کمرے میں چھپا ہماری باتیں سن رہا ہے۔" سیتا نے تیز لہجے میں میری تردید کی۔

"بلاؤ اسے!" عبداللطیف کراہا۔ "میرا گلا خشک ہو رہا ہے چند قطرے پانی۔"

"آسٹن!" میں نے اپنی تمام تر قوت مجتمع کر کے اسے پکارا۔

لیکن آواز کی گونج اسی کمرے کی چاردیواری میں دفن ہو کر رہ گئی۔

میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور بصارت دھندلا گئی۔

"مائی۔" عبداللطیف پھر کراہا۔ "مائیکل ٹرمپ بہت خطرناک ہے صفدر، جو۔۔۔ مان لینا ورنہ تمھارے بدن کے چیتھڑے چیتھڑے اڑوا دے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ ہم تینوں جلد ہی یہاں سے نکلیں گے۔" میری آواز بھرا گئی تھی۔

"تم دونوں۔" اس نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ "میرا شاید آخری وقت آ گیا ہے۔ مجھے معاف کرنا صفدر! میں تمہیں تحفظ نہ دے سکا۔"

میری آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے جس کی اوٹ میں ہر چیز دھندلا گئی۔ حتیٰ کہ میری آواز بھی ان آنسوؤں میں ایسی ڈوبی کہ حلق سے ابھر نہ سکی۔ مگر میرے کان عبداللطیف کی بڑبڑاہٹیں سن رہے تھے۔ وہ مسلمان تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا تھا لہٰذا وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ بے اختیار میری زبان پر آیات مقدسہ رواں ہو گئیں۔ اس کا دم توڑ دینا ہی بہتر تھا ورنہ اگلی شام اس سے کہیں زیادہ دردناک موت اس کا مقدر بن سکتی۔

اس پر وہ کیفیت محض چند سیکنڈ تک طاری رہی۔ میں صرف سن رہا تھا۔ آنسوؤں کی دھند سے آگے میرے لیے کچھ دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔

پھر ایک تیز ہچکی کے ساتھ اس نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ موت بہرصورت اس کا مقدر قرار پا چکی تھی لیکن اس نے مرتے مرتے ڈاکٹر آسٹن کو شکست دے دی تھی جو اسے کاربن مانو آکسائڈ کا ماسک پہنا کر سسکاتے ہوئے مارنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

کمرے میں موت کا بوجھل سکوت طاری ہو گیا جو لحظہ بہ لحظہ طویل تر ہی ہوتا چلا گیا۔

جب آنسوؤں کی دھند رفتہ رفتہ صاف ہوئی تو مجھے درمیان میں رکھا ہوا کوچ نظر آیا جہاں سکوت طاری تھا۔ اس سے دوسری طرف سیتا کی آنکھیں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں۔

کافی دیر گزر گئی مگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی سکوت توڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔

کم و بیش دس منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" ڈاکٹر آسکر کی آواز کے بعد اس کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس وقت وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔

"تمھارا تجربہ فی الحال ادھورا رہ گیا ڈاکٹر۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "تمہیں مائیکل ٹرمپ سے کہنا ہو گا کہ وہ مار مار کر کسی اور کو ادھ موا کرے تاکہ خراب تنفس پر زہریلی گیس کے اثرات کا تمھارا نایاب تجربہ پورا ہو سکے۔"

"کیوں؟" اس نے سوال کیا اور اسی لمحے اس نے عبداللطیف کے چہرے پر شاید موت کی ابدی تحریر پڑھ لی کیونکہ وہ جہاں تھا ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔

اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے اور چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔

"تمھارا خیال تھا کہ مرنے والے کی زندگی اور موت کا انحصار محض

تمھاری مرضی پر رہ گیا ہے لیکن ہم سب کے عزائم پر بھی کوئی قوت حاوی ہے ڈاکٹر آسٹن۔" چند ثانیوں بعد میں نے کہا۔ "تم بڑے وثوق سے اپنے تجربات کی بات کرتے ہو لیکن کسی وقت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی تم پر غالب آ کر تمھاری زہریلی گیسیں تم پر ہی آزما ڈالے اور تم عبرت کا شاہکار بن جاؤ۔"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری جو بتدریج گہری ہوتی چلی گئی۔ "طاقتور اور پرعزم لوگ کام کیے جاتے ہیں اور کمزور مشیت کی آڑ لے کر صرف سوچتے ہی رہ جاتے ہیں۔ انسانی سوچ کو شاید اسی لیے آزاد چھوڑا گیا ہے کہ پست ہمت تصور میں اپنے دشمنوں کی بوٹیاں نوچ کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیا کریں۔ انہیں عمل کی زحمت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔۔۔۔ اس وقت تمھاری کیفیت بھی یہی ہے لیکن یاد رکھو کتوں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔"

"اب اس لاش کو پامال نہ کرنا۔" سیتا نے اسے درمیانی کوچ کھینچتے دیکھ کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ مردوں کی حرمت سے ہم بھی واقف ہیں۔" وہ سر اٹھا کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

اس نے وہ کوچ ہمارے درمیان سے ہٹا کر کمرے کے وسط میں چھوڑ دیا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سفید کپڑوں میں ملبوس دو مرد وہاں آئے اور ہم دونوں پر ذرا بھی توجہ دیے بغیر کوچ کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

"عجیب جمود اور بے بسی کی کیفیت ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" سیتا بولی۔ "میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہمیں مشروب میں ایسی خطرناک چیز دے گا۔"

"مجھے شبہ تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "اس کے باوجود میں نے دیدہ دانستہ اسکاچ سے گریز نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ہمیں بے ہوشی کی دوا دے گا مگر اس نے تو ہمیں مفلوج اور لاچار کر کے بازی ہی الٹ دی۔"

"اگر تم اس سے شراب طلب کرتے تو اس وقت ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔" اس کا لہجہ ملامت آمیز ہو گیا۔ "نہ جانے شراب میں وہ کون سی تاثیر ہے کہ تم اس کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ ہم یہاں قیدی کے طور پر لائے گئے تھے کسی دعوت میں نہیں آئے تھے۔"

"میرا مقصد صرف سفید فام کو چھیڑ کر ڈاکٹر آسٹن سے الجھانا تھا۔ اور تم نے دیکھا کہ بعد میں آسٹن نے مائیکل ٹرمپ پر اپنی بالادستی جتانے کے لیے کیا کچھ کہہ ڈالا۔۔۔ یہ تمھارا وہم ہے کہ میں شراب طلب کرتا تو صورت حال مختلف ہوتی۔"

"وہ زبردستی ہمیں کچھ نہیں کھلا پلا سکتا تھا۔"

"مگر انجکشن تو لگا سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے گزرنے پر اسی دیکسین کا انجکشن اب بھی لگایا جائے گا۔ یہ تم کیوں بھول رہی ہو؟"

"جو بھی ہوتا، اس قدر اچانک اور غیر متوقع نہ ہوتا۔ اگر وہ طاقت استعمال کر کے ہمیں زیر کرنے کی کوشش کرتے تو مزاحمت کے دوران بھی کوئی راہ نکل سکتی تھی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی خاموشی سے اپنا بازو کھول کر پیش نہ کرتا کہ وہ جس قسم کا چاہیں انجکشن ٹھونک دیں۔" اس کا انداز بہت مدلل تھا۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اس پر دماغ کھپانا بے سود ہے۔ ہو سکے تو آئندہ کے لیے کوئی راستہ متعین کرنے کی کوشش کرو۔"

"بہت کچھ کیا جا سکتا ہے مگر اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ایک بار کچھ دیر کے لیے جسمانی طور پر ہم اعتدال پر آ جائیں۔"

"موجودہ صورت حال میں یہ مشکل نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے ڈوز کا اثر زائل ہونے سے پہلے خودکار طریقے پر نیا ڈوز لگتا رہا تو اسرائیل پہنچنے سے قبل ہماری حالت اعتدال پر ہرگز نہ آ سکے گی۔ اور وہاں دوسرا چکر چل پڑے گا۔"

"اس بار اسرائیلی بہت محتاط ہیں۔" وہ بولی۔ "ان سے میرا تو براہ راست پہلا واسطہ پڑا ہے لیکن ان میں تمھاری شہرت بہت خراب ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تمھارے کان مجھ سے زیادہ حساس ہیں۔" میں نے نیچی آواز میں کہا۔ "ذرا سن گن تو لو کہ یہاں کوئی اور تو موجود نہیں ہے؟"

چند ثانیوں کے لیے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"کوئی نہیں ہے۔" سیتا نے اعلان کیا۔ "عبداللطیف کو یہاں چھوڑنے کے بعد وہ باہر نہیں گیا تھا۔ دروازے کو کھول کر ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی مگر تم میری بات ماننے پر تیار نہ تھے۔"

"عبداللطیف کے مرنے کے بعد وہ آیا تو اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا۔"

"ہم ہلنے جلنے کے بھی قابل نہیں ہیں۔ اس نے اسی کمرے کے کسی گوشے میں لباس بدل لیا ہو گا۔ وہ ہماری اور لطیف کی گفتگو سننی چاہتا تھا۔"

"ہمالیہ میں بندروں کے ساتھ رہ کر تمھارے کان واقعی تیز ہو گئے ہیں۔"

"شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہو کہ اس زمانے میں میں زمین سے کان لگا کر کئی سو گز دور کی آہٹ صاف سن لیتی تھی۔"

"تمھارے بارے میں میں حیرت کی ساری منزلوں سے گزر چکا ہوں تم سے شادی نہ کی ہوتی تو شاید ابھی تک حیران ہو رہا ہوتا۔"

"تم کسی کی موجودگی کے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟"

"رشتے کے حوالے سے عادتاً پوچھ لیا تھا۔ دیکھ ہی رہی ہو کہ ہلنے

جھلنے سے بھی معذور ہوں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"بعض اوقات تم گرد و پیش کو بالکل فراموش کر بیٹھتے ہو۔۔"

اس کا لہجہ قدرے چڑچڑا تھا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہاری رفاقت کا کمال ہے دس پانچ برس بعد گرد و پیش کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دے گا اور تصوف کے مسائل پر توجہ دینے کے لیے وہی عمر مناسب ہوتی ہے۔"

"کمال ہے کہ تم اس وقت بھی ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

"دل بہت بوجھل ہو رہا ہے سیتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "عبداللطیف کی موت کا دکھ ہلکا کرنے کے لیے اول فول بک رہا تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں یوسف کے بارے میں پریشان ہوں اب تک اس کی جانب سے کوئی نہ کوئی کارروائی ہونی چاہیے تھی۔"

"ایسا تو نہیں ہے کہ وہ کسی وجہ سے تعاقب جاری نہ رکھ سکا ہو؟" سیتا نے ایک قوی امکان کے بارے میں سوال کر ڈالا۔

"خدا کرے کہ ایسا نہ ہوا ہو۔" میں نے خلوص دل سے کہا۔ "وہ ناکام ہوا تو سمجھ لو کہ عمر بھر کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے گا کہ ہم دونوں کہاں گئے۔"

"مگر اب تک وہ کہاں ہے؟" سیتا مضطرب ہو گئی۔ "ہمیں یہاں پہنچے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے، وہ کب آئے گا۔"

"شاید نفری جمع کر رہا ہو۔" میں یوسف کے بارے میں ہر اعتبار سے پُر امید رہنا چاہتا تھا۔ "اس جگہ کے لیے گھسنا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"اور اگر وہ گھسنے کے بعد پکڑا بھی گیا ہو؟"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے بے اعتباری سے کہا۔ "اگر وہ پکڑا جاتا تو ہمیں اپنی مکمل شکست کا احساس دلانے کے لیے اسے یہیں لایا جاتا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس کے ذہن نے ایک اور نکتہ تلاش کر لیا۔ "آسٹن کہہ رہا تھا کہ اس عمارت کی تباہی خطرناک ہو سکتی ہے۔"

"ظاہر ہے کہ ہمارے قید ہوتے ہوئے یوسف پوری عمارت کو بموں سے اڑانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اس کا نشانہ افراد ہوں گے ویسے میں موقع پا کر ڈاکٹر آسٹن سے اس عمارت کی تباہی سے پیدا ہونے والے امکانی خطرات پر بھی بات کروں گا۔"

دوبارہ ڈاکٹر آسٹن ہمارے کمرے میں آیا تو قرینے کے لباس میں بالکل تازہ دم نظر آ رہا تھا اور اس کے بشرے پر مسکراہٹ بھی نمایاں تھی۔

"رات کیسی گزری؟" اس نے رسمی لہجے میں ہم سے سوال کیا۔

"اس حالت میں نیند کا تصور بھی مشکل ہے۔" میں نے تلخی اختیار کیے بغیر کہا۔ "رہی سہی کسر ہمارے ساتھی کی دردناک موت نے پوری کر دی۔"

"اس ویکسین سے ہلکی سی غنودگی بھی طاری ہوتی ہے، لیکن تم پر تو اس کا اثر ہی الٹا ہو رہا ہے۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"کاش کہ اعصاب کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوتا۔"

وہ ہنس پڑا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تصور کی آزادی ہی انسان کی ذاتی شناخت ہوتی ہے۔ فی الحال عملی اعتبار سے تم میری مرضی کے پابند ہو لیکن میری مرضی کے خلاف سوچ کر اپنی شناخت کا اظہار کرنے پر قادر ہو۔ ڈاکٹر آسکر جدید منشیات کے ذریعے اس سوچ کو بھی سلب کر لیتا ہے۔ یوں سمجھو کہ کسی بھی پرانے جسم میں اپنی مرضی کی ایک نئی شخصیت ابھاری جا سکتی ہے۔"

"یہ طریقہ سو فیصد کامیاب تو نہیں ہو سکتا۔" میں نے اپنی مطلب براری کے لیے اس کی گفتگو میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

"سو فیصد!" اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "دوسرے طریقوں کے خلاف قوتِ ارادی کام کرتی ہے اور اسی پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے لیکن ہمارے طریقے کی بنیاد ہی یہ ہے کہ خاص طور پر تیار کی ہوئی منشیات بتدریج قوتِ ارادی کو برباد کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد ذہن موم کا سانچہ رہ جاتا ہے۔ انفرادی حالات میں وقت کی کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن ناکامی خارج از امکان ہے۔"

"اور اگر تمہارا کوئی شکار منشیات لینے پر آمادہ ہی نہ ہو؟"

"اول تو اسے علم ہی نہیں ہوتا کہ دیا کیا جا رہا ہے۔ جتنے عرصے میں اسے اندازہ ہوتا ہے صورتحال اس کے بس سے باہر ہو جاتی ہے اور پھر ابتدا میں تشدد بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہر نشہ مختلف صورتوں میں تیار کیا گیا ہے۔ سفوف اور سیال سے انجکشن تک ہر طریقہ دستیاب ہے۔"

"یہ سب تو اسرائیل میں ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارا کام مجھے زیادہ اہم اور بڑا نظر آتا ہے جس کے دُور رس اثرات ہوں گے۔"

"کام وہ بھی میرا ہی ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "ڈاکٹر آسکر کے ادارے کی بدولت اس وقت تل ابیب میں تین اہم ترین سفارت خانوں میں ان کے اپنے آدمیوں کی وفاداریاں پوری طرح ہمارے ساتھ ہیں۔ ان تینوں میں سے ہر آدمی کلیدی عہدے پر فائز ہے۔ ان سے ہمیں اندر کی خبریں ملتی ہیں اور ان ہی کی روشنی میں ہماری سیاسی اور جنگی حکمتِ عملی طے کی جاتی ہے۔"

"جاسوسی کا ناقابلِ یقین تصور ہے۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "شاید یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کا ہر قدم نپا تلا اٹھتا ہے اور عالمی ردِّعمل کبھی اس کی توقعات کے برعکس نہیں ہوتا۔"

"اقوامِ متحدہ ایک عالمی یتیم خانہ ہے۔" ڈاکٹر آسٹن نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "وہاں جمع ہونے والوں کی آوازیں کوئی

قوت نہیں ہے۔ بھیک پر پلنے والی قومیں کبھی بلند لہجے میں اپنی آواز نہیں اٹھا سکتیں۔ ہمارا عالمی توازن چھ ملکوں کے اجتماعی رویے سے وابستہ ہے۔ اور ان میں سے تین کے رازوں تک ہماری رسائی ہے۔"

"تمہاری گفتگو سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسرائیل کسی بہت بڑے فاتحانہ معرکے کی تیاری کر رہا ہے۔" میں نے اس بار اپنا حقیقی تاثر دہرایا تھا۔

"موجودہ سرحدوں میں اسرائیل نامکمل ہے۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "فی الحال اسے ہماری قربانیاں چلا رہی ہیں مگر کب تک؟ میثاقِ مقدس کی رو سے ہمارا سلطنت کا تصور آفاقی ہے۔ ہماری سرحدیں دور تک ہونی چاہئیں اور عنقریب یہ ہو کر رہے گا۔"

"ایٹمی ہتھیاروں کا حصول ان ہی تیاریوں کی ایک کڑی ہے؟"

وہ یوں ہنسا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔ "میری بات لکھ کر رکھ لو کہ تیسری جنگِ عظیم — ایٹمی ہتھیاروں سے شروع ہوگی اور کیمیاوی ہتھیاروں سے جیتی جائے گی۔ ایٹمی دھماکے اور تابکار ذرات کی برسات سے زیرِزمین ایٹمی پناہ گاہوں میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن ہوا سے بھاری زہریلی گیسیں ان پناہ گاہوں کو بھی اجتماعی قبروں میں تبدیل کر دیں گی کیونکہ یہ نیچے ہی بیٹھتی ہیں ان سے صرف اونچی عمارات میں پناہ مل سکتی ہے جو دھماکوں سے نیچے آ رہیں گی جنگ میں کامیابی کا مکمل ترین تصور انہی ہتھیاروں سے سامنے آئے گا۔ جب دشمن کی ساری افرادی قوت کو ہلاک کر کے فاتح قوم اس کے صحیح سلامت صنعتی، فوجی اور معاشی وسائل پر قابض ہوگی۔"

"اور اسرائیل کے لیے تم تنہا یہ کام کر رہے ہو؟"

"روس خلا سے جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ امریکہ بین البراعظمی ایٹمی میزائلوں میں جتا ہوا ہے جب کہ اسرائیل نے اپنی سرحدوں سے باہر تین بھرپور تجربہ گاہیں قائم ہوئی ہیں اور یہ ان میں سے ایک ہے۔"

"دوسری حکومتوں کو اپنی سرزمین پر ان سرگرمیوں کا علم ہے؟"

"جب انہوں نے برداشت نہیں کیا تو دوسرے کیسے اجازت دیں گے؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "یہ سب خفیہ کام ہیں۔"

"مگر یہاں تم کیا کر رہے ہو؟"

"یہ ایک بہت بڑا راز ہے۔" اس کے لہجے میں غرور سمٹ آیا۔ "لیکن اب تم اپنی برین واشنگ تک بے ضرر ہو اس لیے بتا ہی دیتا ہوں کہ میں ہوا سے دس گنا بھاری ایک گیس کی تیاری میں مصروف ہوں جس کے بادل اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں چھٹیں گے جب تک بارش نہ ہو یا مصنوعی طریقوں سے انہیں تحلیل نہ کیا جائے۔ یہ گیس پانی میں حل ہو کر ایک تیزاب بناتی ہے جو زمین میں کھار پیدا کر دیتا ہے۔"

"تو تم کامیاب ہو گئے؟"

"کسی بھی وقت کامیابی ہو سکتی ہے۔" اس نے کہا۔ "تجربہ کے لیے سیدون کے فلسطینی کیمپ منتخب کر لیے گئے ہیں۔"

"اور اگر اس سے پہلے ہی تمہاری یہ تجربہ گاہ تباہ ہو جائے؟"

وہ بے نیازی سے ہنسا۔ "یوں تو میں بھی مر سکتا ہوں اچانک میری حرکتِ قلب بند ہو جائے تو بھی کام نہیں رکے گا میرے نائب کام آگے بڑھائیں گے۔۔۔"

"تجربہ گاہ کی تباہی کی بات اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ ایک غیر۔۔۔ بلکہ دشمن ملک کی سرزمین پر واقع ہے۔"

"نیشنل ڈیفنس کونسل میں سارے فارمولوں کی مائیکرو فلمز موجود ہیں۔۔۔" وہ میرے سوال کو دوسرے رخ پر لے گیا۔ "ان کی روشنی میں کوئی اور کہیں اور کام کرے گا۔"

"اور اس علاقے کا کیا حشر ہوگا؟"

"دور تک موت راج کرے گی۔" اس نے کہا۔ "اس تجربہ گاہ میں گیسوں کے ذخائر ہی نہیں تجرباتی جراثیم بھی ہیں، وائرس بھی جو ناقابلِ فہم بیماریوں کو جنم دیں گے۔"

"اور اگر تمہاری ہی کسی غلطی سے یہ تجربہ گاہ تباہ ہو جائے؟"

میں اس سے تحفظ کا امکانی پہلو ہر صورت سے اگلوانا چاہتا تھا۔

"ظاہر ہے کہ ہم لوگ یہاں خودکشی کے لیے نہیں آئے ہیں۔" اس نے کہا۔ "حفاظت کے پہلو اپنی جگہ ہیں بموں کی برسات بھی ہمارے ہلاکت آفریں ذخیروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔۔۔ ہاں اگر دشمن کے قبضے کا خطرہ لاحق ہو تو چند سیکنڈ میں سارے ذخائر ایک تباہ کن نظام سے منسلک کیے جا سکتے ہیں اور جب دشمن ان ذخائر کو چھیڑنے کی کوشش کرے گا تو ہلاکت اور بیماریوں کا ایک ہولناک سیلاب امڈ پڑے گا جس پر قابو پانا کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔"

"تمہارا ضمیر ان تیاریوں پر کوئی ملامت نہیں کرتا؟"

"ہم حقائق کی دنیا میں رہ رہے ہیں، یہ سب رومانوی باتیں ہیں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اور ہم امکانی جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہمارے ہتھیار دشمن کے علاقوں میں اس کی قوت کے خلاف استعمال ہوں گے۔"

"اور اس وقت جو لوگ تمہارے تجربات کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں؟"

"بڑے مقاصد کے لیے چھوٹے اصول ہمیشہ سے قربان ہوتے آئے ہیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"ان فلسفوں میں ہماری بھوک بھی یاد ہے تمہیں؟" سیتا نے بیزاری کے عالم میں اسے ٹوکا۔

اس نے محظوظ ہوتے ہوئے رسٹ واچ دیکھی۔ "نصف گھنٹے بعد دوسرے ڈوز کا اثر ختم ہوگا تو تمہیں نصف گھنٹے کی آزادی ملے گی جس کے دوران دیگر ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ہی تمہیں اپنی آتشِ شکم سرد کرنے کا موقع ملے گا۔"

میرے لیے یہ اطلاع بہت دل خوش کن تھی مگر میں نے ڈاکٹر آسٹن پر اپنی خوشی کا اظہار نہیں کیا ورنہ وہ چوکنا ہو سکتا تھا۔

ہم دونوں اس عمارت میں جس خوفناک صورتِ حال سے دوچار تھے اس کے پیشِ نظر میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ایک بار اس مصنوعی فالج سے نجات مل گئی تو دوبارہ کسی حالت میں اس کے استعمال کی نوبت نہیں آنے دوں گا۔

اسرائیل پہنچ کر خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے بہتر تھا کہ اسی مرحلے پر ان سے مقابلہ کرتے ہوئے آزادی یا موت میں سے کسی کو اپنا لیا جائے۔

ڈاکٹر آسٹن ہمارے پاس سے اٹھ گیا مگر اس کی آہٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ اسی کمرے میں موجود کسی کام میں مصروف تھا۔

میری اور سیتا کی نگاہیں چار ہوئیں اور ہم بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ ہونٹوں کے بے حس ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے اشاروں کا تبادلہ بھی ناممکن تھا جب کہ ڈاکٹر آسٹن کی موجودگی میں تبادلہ خیال بے سود تھا۔

چند منٹ بعد آسٹن پھر ہمارے سامنے آ گیا۔ "کوئی ہتھیار ہے تمہارے پاس؟"

"قدرت کی نوازی ہوئی نعمتوں سے تو ہم انکار نہیں کر سکتے۔"

"میں آتشیں اسلحہ کی بات کر رہا تھا۔" اس نے پُرسکون لہجے میں وضاحت کی۔ وہ ہر اعتبار سے بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک تھا۔

"یہاں آنے سے پہلے ہم دونوں کی باقاعدہ جامہ تلاشی لی گئی تھی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ مائیکل ٹریپ کے آدمیوں نے ہمارے پاس کچھ چھوڑا ہوگا؟"

"تمہیں بات لمبی کرنے کی عادت ہے۔" اس بار وہ قدرے چڑ گیا۔ "اختصار سے کام لیتے ہوئے انکار بھی کر سکتے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم صرف میری زبان پر ہی اعتبار نہیں کرو گے۔ شبہ ہوا تو دوبارہ تلاشی ضرور لی جائے گی۔"

اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی کئی بھاری قدموں کی چاپ کمرے میں داخل ہو گئی۔

چند ثانیوں بعد مجھے دو شناسا چہرے نظر آئے۔ ان میں سے ایک سرمئی جیکٹ میں ملبوس مائیکل ٹریپ تھا۔ دوسرے کو پچھلی رات میں نے اسی کے آدمیوں میں دیکھا تھا لیکن اس کے نام سے واقف نہ تھا۔

مائیکل ٹریپ نہایت لاپروایانہ انداز میں ایک تنکا اپنے دانتوں سے کچل رہا تھا جو دہانے سے باہر نکلا ہوا تھا اور بار بار دائیں سے بائیں منتقل کر رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے آسٹن؟" اس نے ایک لحظہ کے بعد بے تکلفی سے سوال کیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یا تو وہ ڈاکٹر آسٹن سے بہت بے تکلف تھا یا اس سے اتنا متنفر کہ ڈاکٹر کہہ کر اس کی علمیت کا اعتراف بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

"اتنی بھیڑ ساتھ لانے کی ضرورت کیا تھی؟" ڈاکٹر آسٹن نے اسے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میں بہتر جانتا ہوں۔" مائیکل ٹریپ کا لہجہ واضح طور پر تحقیر آمیز تھا۔ "میں چاہتا تو اپنے آدمیوں کو بھی بھیج سکتا تھا لیکن میں بذاتِ خود آیا ہوں۔"

ڈاکٹر آسٹن ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا ہوا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

"ہیلو چارلی!" اس بار مائیکل ٹریپ مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ "رات کیسی گزری؟"

"بدترین!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ رات بھر دس بیس رائفلیں ہماری طرف اٹھی رہتیں کم از کم نیند تو آ جاتی۔"

اس کی آنکھوں میں یکایک شرارت جاگ اٹھی۔ اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر میرے اوپر جھک گیا۔

"میرے سامنے ڈاکٹر کو کمینہ کہہ دو تو ایک ڈبل پیگ پلاؤں گا۔" سرگوشیانہ لہجے میں یہ کہہ کر وہ جلدی سے سیدھا ہو گیا۔

میں کچھ نہ بولا لیکن ان دونوں میں کشیدگی بڑھانے کے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔

چند منٹ بعد مجھے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اسی کیفیت کے زیرِاثر جھرجھری کے انداز میں یکایک میرے پورے جسم نے جنبش کی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

ڈاکٹر آسٹن شاید دور سے میرا جائزہ لے رہا تھا کیونکہ وہ فوراً ہی لپک کر میری طرف آیا تھا۔ "جسم میں سنسناہٹ ہو رہی ہے؟"

"درد۔۔۔ میرا بدن درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" اس مرتبہ میں اپنی گردن کو جنبش دینے میں کامیاب ہو گیا۔

"درد؟" ڈاکٹر آسٹن کی پیشانی پر تفکر آمیز لکیریں نمودار ہو گئیں۔ "یہ تو سراسر ناممکن ہے۔ اس کے اثرات تو بہت خوشگوار طریقے پر ختم ہوتے ہیں۔"

"تم درست کہہ رہے ہو ڈاکٹر۔" سیتا کی آواز سنائی دی۔

"یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی بہت ہی لطیف شے کا اثر زائل ہو رہا ہے۔"

میں نے ذرا سی کوشش کی اور کینوس پر چت ہو گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنے حلق سے ایک بے ساختہ کراہ بھی پیدا کی۔ ڈاکٹر آسٹن نے میرا داہنا گھٹنا ٹٹولنا چاہا لیکن میں نے ہلکی سی چیخ مار کر اپنا پیر پھیلا لیا۔ "میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر آسٹن بے اعتباری سے بڑبڑایا۔ "یہ نہیں ہو سکتا... تم میرے برسوں کے نتائج کی نفی نہیں کر سکتے۔"

"تمھارے نتائج کی ایسی کی تیسی۔" میں جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا دم نکلا جا رہا ہے۔" اس وقت تک پپوٹوں اور لبوں کی حرکت بھی بحال ہو چکی تھی۔

میرے فقرے پر مائیکل ٹرمپ کا قہقہہ خاصا بلند تھا۔

"تم باہر نکلو۔" ڈاکٹر آسٹن پلٹ کر اس پر برس پڑا۔

"میرے بلائے بغیر اندر داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"اور اگر بلانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس نے تمھاری لاغر سی گردن دبا دی۔" مائیکل ٹرمپ کا انداز چڑانے والا تھا۔

"آپس کی چپقلش میں دشمن کے لیے رعایتیں پیدا نہ کرو۔ یہ اعتدال پر آتا جا رہا ہے اس وقت میں باہر جانے کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ میں کوچ سے اٹھ سکتا تھا مگر میں بدستور وہیں پڑا کراہتا رہا۔ ڈاکٹر آسٹن مجھے تشویش زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

اسی اثنا میں سیتا کوچ سے اتر کر نیچے آئی اور بے اختیار مجھ پر جھک پڑی میری حالت پر وہ بہت زیادہ تشویش کا شکار ہو چکی تھی۔

"ٹانگوں اور بازوؤں کو فضا میں تیزی سے حرکت دو تاکہ بدن کے متاثرہ حصوں میں دورانِ خون تیز ہو سکے۔" ڈاکٹر آسٹن نے ہدایت دی۔

"میرے ہاتھ اور پیر منوں وزنی ہو رہے ہیں۔" میں کراہا۔

"کیا ہو گیا؟ تمھیں کیا ہو گیا؟" سیتا بے اختیار میرا سینہ ٹٹولتے ہوئے بولی۔ "میں اب تو پہلے ہی کی طرح خود کو توانا محسوس کر رہی ہوں۔"

"درد اور نقاہت۔" میں نے آنکھیں موند کر کہا۔ "میرا سر چکرا رہا ہے۔"

میں سیتا سے اپنی اداکاری پوشیدہ ہی رکھنی چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے ردِ عمل میں بے ساختگی برقرار رہے ورنہ اس بھیڑیے کوئی بھی معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتا تھا۔

شاید ڈاکٹر آسٹن کا کوئی نائب بھی اس کمرے میں موجود تھا جو اس کے اشارے پر طبی لوازم سے لدی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹرالی دھکیلتا ہوا لے آیا۔

اس نے میری زبان کے نیچے تھرمامیٹر رکھا اور بازو پر پٹی باندھ کر بلڈ پریشر لینے میں مصروف ہو گیا۔ جب اس نے تھرمامیٹر میری نبض پر رکھا اور والو گھما کر ہوا کا دباؤ گرانا شروع کیا تو آسٹن کی نگاہیں بلڈ پریشر بتانے والے آلے کی متحرک سوئی پر جم گئیں۔

"نارمل۔" اس کے نائب نے میرے بازو سے بند کھولتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر آسٹن نے تھرمامیٹر نکال کر دیکھا اور اس کا منہ لٹک گیا۔

"ننانوے اس حالت میں نارمل ہی ہے۔" اس نے اپنے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "شاید یہ کسی پرانی بیماری کا ردِ عمل ہے۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "تمہیں کوئی پرانا مرض لاحق ہے؟"

"عرق النساء۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "شدید سردیوں میں کبھی کبھی بائیں ران سے کمر تک شدید درد کی ٹیسیں چلتی ہیں۔"

"پھر یہی ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر آسٹن کا نائب پُر زور لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر آسٹن نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "صرف ایک ہی صورت میں درد ہو سکتا ہے۔ اگر خون میں کولیسٹرول کی مقدار زیادہ ہو تو بحالی کے وقت شدید اینٹھن ہو سکتی ہے کیونکہ سکڑی ہوئی شریانیں بڑھتے ہوئے دورانِ خون میں مزاحم ہوتی ہیں۔"

"ان امکانات کو بعد کے لیے چھوڑ دو آسٹن۔" مائیکل ٹرمپ نے قریب آ کر نرم لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد مجھے بھی اس سے کچھ باز پرس کرنی ہے۔"

"معاملہ بگڑ گیا ہے۔" آسٹن کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔ "اس کے اعصابی نظام کا ردِ عمل خطرناک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بار اسے ویکسین دی جائے تو اس کا اثر ختم ہونے پر اس کی تمام شریانیں ہی پھٹ جائیں۔"

"کیا یہ امکان بھی ہے؟" مائیکل ٹرمپ چونک پڑا۔

مجھے ان کی الجھنوں پر دلی مسرت ہو رہی تھی۔ بعد کی تو بعد میں دیکھی جاتی مگر فوری فیصلے کے تحت کی گئی میری اداکاری نے ان کے سارے منصوبے تلپٹ کر دیے تھے۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں پہلی بار اس صورتحال سے دوچار ہوا ہوں۔" ڈاکٹر آسٹن اپنی پیشانی سے خیالی پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ویکسین کی تمام تر کارکردگی کا تعلق دورانِ خون کی مقدار میں کمی اور بعض خلیوں کی کارکردگی سے ہے۔"

"پھر تو اس کی روانگی کا طریقۂ کار بھی بدلنا پڑے گا۔" مائیکل ٹرمپ بھی پریشان ہو گیا۔

"خیر۔ فی الحال تو اسے سہارا دے کر اٹھاؤ۔ اس کے خون کے تجزیے کے بعد ہی میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں گا۔" ڈاکٹر آسٹن نے کہا

دو مضبوط آدمیوں نے میری بغلوں میں سہارا دے کر مجھے بستر سے اٹھایا۔ سیتا یہ ساری کارروائی ڈبڈبائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اپنے پیر فرش پر جمانے کے بجائے سارا بوجھ ان دونوں پر ڈال دیا اور پھر میرے پیچھے وہ جلوس سامنے والے کمرے میں منتقل ہو گیا جہاں قالین پر چاروں طرف آرام دہ صوفے پڑے ہوئے تھے۔

مجھے ایک صوفے پر بٹھا کر میز سامنے لائی گئی اور پھر خورد و نوش کے لوازم تیزی سے لگتے گئے جن میں پھلوں کی بہتات تھی۔

میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے کراہوں کا سلسلہ جاری رکھا اور اس حد تک افاقہ دکھایا کہ بہت ہی سست حرکات کے ذریعے بمشکل اپنی جیب سے سگریٹ نکالی اور چوتھی دیاسلائی سے اسے سلگا بھی لیا۔

اس وقت کمرے میں میرے اور سیتا کے علاوہ کل چھ نفوس تھے دو آدمی مائیکل ٹرمپ کے ساتھ آتے تھے اور شاید شروع ہی سے بڑے بور کے خودکار پستول ہاتھوں میں لیے ہر قسم کی صورتحال کے لیے تیار تھے۔ چوتھا ڈاکٹر آسٹن پانچواں اس کا نائب اور چھٹا شخص میز لگانے والا خدمت گار تھا۔

میری اداکاری نے وقتی طور پر ان لوگوں کے دلوں میں اتنی جگہ پیدا کر دی تھی کہ ناشتہ شروع کرنے کے لیے میری سگریٹ ختم ہونے کا انتظار کیا گیا اور ناشتے کے دوران مائیکل ٹرمپ میرے قریب آ بیٹھا۔

"تمھاری حالت قابلِ رحم ہے۔" مائیکل ٹرمپ نے چند ثانیوں بعد بات شروع کی۔ "اور میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی حماقت سے اپنے مصائب میں اضافہ کرو۔"

"میں تمھاری بات سمجھا نہیں۔"

"ورنہ سے تیسرا آدمی تمھارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟" اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے عادی لہجے میں سوال کیا۔

"وہ ہم سے الگ رہ کر اپنے کچھ مزید کام کرنا چاہتا تھا۔" میں نے بلاتوقف جواب دیا۔

"کیسے کام؟"

"شاید تم اسے جانتے نہیں۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں۔ یوسف صنعا میں پی ایل او کا نمائندہ ہے۔"

"تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ اپنے رازوں میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"تم بھی انہی میں سے ہو۔"

"ان میں سے نہیں بلکہ ان کا ہمدرد۔" میں نے تصحیح کی۔

"ورنہ سے تمھاری روانگی کے وقت وہ کہاں تھا؟"

"وہیں رہ گیا تھا۔"

"اور اس نے پیچھے رہ کر یہاں تک تمھارا تعاقب کیا تھا؟" اس کا لہجہ قدرے ترش ہو گیا۔

"نہیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ورنہ سے روانگی کے



وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمیں لے جانے والا عبداللطیف کے بجائے دشمن کا آدمی ہوگا۔"

"مگر اس کے باوجود تعاقب کیا گیا تھا۔"

"یہ تم کس بنا پر کہتے ہو؟"

"پچھلی رات کوئی عمارت میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "گارڈز کے للکارنے پر وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر غائب ہو گیا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ وہم ہی رہا ہو۔" میں نے اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں وہم نہیں حقائق کی بات کرتا ہوں۔" وہ بپھر گیا۔ "کل رات ہی تم دونوں لائے گئے ہو اور اس عمارت کی تاریخ میں پہلی بار کوئی اجنبی اندر آیا ہے۔"

"اس میں ہمارا کیا دخل ہو سکتا ہے؟"

"میرے آدمی بھی چین سے نہیں بیٹھے ہیں۔" وہ غرایا۔ "مجھے پتہ چل گیا ہے کہ ذرنہ میں جس شخص کے مکان میں تم نے پناہ لی تھی وہ حسین المزینی کا بھتیجا ہے۔ حسین نے اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے تم لوگوں کا ساتھ دیا تھا اور اب وہ کتے کی موت مارا جائے گا لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس کے ساتھی کہاں غائب ہو گئے۔"

"ان کی لاشیں صحرا میں مدفون ہیں۔"

"تو پھر مکان کو آگ کس نے لگائی؟"

"مکان میں آگ لگانے کے بعد ان چاروں نے ہمیں پکڑ لیا تھا اور ایک وین میں کسی نامعلوم مکان کی طرف لے جا رہے تھے کہ ہمیں موقع مل گیا۔ پیٹر، کلاڈ اور ویلری مارے گئے۔ حسین بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں جان بچانے کے لیے اسے تعاون کرنا پڑا۔"

"مگر تم تین ان پر کیسے غالب آ گئے؟" وہ جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"شاید مقدر۔" میں اس کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

دورانِ گفتگو میں نے درد اور کمزوری کے بارے میں اپنی اداکاری برقرار رکھی تھی۔ میری ہر کراہ پر سیتا کے حسین چہرے پر کرب کی پرچھائیاں آ کر گزر جاتی تھیں۔

اسی لمحہ اچانک اس کمرے میں کوئی الارم تیز آواز میں چیخ اٹھا۔ اور وہ سب تشویشی انداز میں بوکھلا کر اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ ہر ایک کے چہرے پر یکایک تشویش اور تناؤ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

الارم چند ثانیوں بعد بند ہو گیا۔

"تم دونوں یہیں رکو، میں دیکھتا ہوں۔" مائیکل ٹرمپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور تقریباً دوڑتا ہوا اس کمرے سے نکل گیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے ڈاکٹر آسٹن سے پوچھا جس نے اضطراری انداز میں ادھر سے اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

"باہر کوئی خطرہ ہے۔ عمارت کے محافظوں نے یہ الارم سگنل دیا تھا۔" ڈاکٹر آسٹن نے ہیجان آمیز لہجے میں کہا۔

"مائیکل کو تو شاید وقت نہ ملے۔" میں نے کہا۔ "کسی کو بھیج کر پتہ تو چلا لو۔"

وہ مائیکل ٹرمپ کے ایک آدمی سے مخاطب ہوا ہی تھا کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان بولا۔ "نیچے چلے جاؤ ڈاکٹر۔ فوجیوں کی بہت بڑی جماعت نے عمارت کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔"

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" خطرے کا ذکر سنتے ہی ڈاکٹر آسٹن کی حالت غیر ہونے لگی اور یہ تھا بھی درست ہی کیونکہ بنیادی طور پر وہ علمی آدمی تھا۔ لڑائی اور تصادم اس کے لیے دور کی باتیں تھیں۔

"مائیکل ٹرمپ نے۔" وہ بدستور ہانپتے ہوئے بولا۔ "میں نے خود بہت سے فوجی ٹرک دیکھے ہیں۔ وہ اندر داخل ہو کر تلاشی لینی چاہتے ہیں۔ انہیں بمشکل برآمدے میں روکا گیا ہے وہ کسی بھی لمحے اندر داخل ہو کر ہر طرف پھیل سکتے ہیں۔"

فوجیوں کی آمد میرے لیے ناقابلِ فہم تھی لیکن اس اعتبار سے وہ خبر کارآمد تھی کہ ان کی آمد کے نتیجے میں عمارت کے مکین افراتفری کا شکار ہو گئے تھے اور اس افراتفری سے ہم کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھا کر صورتحال کو اپنے حق میں بدل سکتے تھے۔

"اٹھو! اٹھ سکتے ہو تم؟" ڈاکٹر آسٹن نے تیز اضطراری لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

وقت آگیا تھا کہ میں اپنی حالت میں خفیف سی بہتری کا اظہار کرتا لہٰذا میں کراہتے ہوئے صوفے کا سہارا لے کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہیں رہو گے۔" ڈاکٹر آسٹن نے اپنے نائب سے کہا مگر اس نے میرے کھڑا ہو جانے کے باوجود آگے بڑھنے کی ہمت سے انکار کر دیا۔

اس مرحلے پر مائیکل ٹرمپ کے دونوں آدمی آگے بڑھے اور میں ان کے سہارے تیزی کے ساتھ اس کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

ڈاکٹر آسٹن اور سیتا ہمارے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

اس وسیع راہداری کو عبور کر کے ہم پانچوں ایک کمرے میں پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر آسٹن نے ایک دیوار گیر دستے کو اپنی طرف کھینچا اور دیوار کا ایک حصہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر فرش میں دفن ہو گیا۔

اس کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بکثرت زیرِ استعمال رہا ہے۔

دیوار کے دفن شدہ حصے کے پیچھے نمودار ہونے والی دھندلی خلا میں ایک کشادہ زینہ نظر آ رہا تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔

پہلی سیڑھی خاصی چوڑی تھی۔ اس پر پہنچ کر ڈاکٹر آسٹن نے اندرونی دیوار کے باقی ماندہ حصے پر نصب پہلے جیسے دستے کو باہر کھینچا اور دیوار فرش سے نکل کر آواز پیدا کیے بغیر لوٹ اپنی جگہ آ گئی جیسے پیچھے سے اسپرنگوں نے اسے اوپر دھکیل دیا ہو۔

دیوار کے اپنی جگہ آنے کے ساتھ ہی کسی خودکار سوئچ کے ذریعے نیچے تیز روشنی پھیل گئی اور ساتھ ہی میں ششدر رہ گیا۔

اس وقت ہم لوگ کم و بیش ساٹھ فٹ لمبے اور اسی قدر عریض ایک زیرِ زمین ہال سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر موجود تھے۔ اس ہال میں کسی جدید ترین تجربہ گاہ کا سارا مرعوب کن ساز و سامان موجود تھا۔ بعض بینچوں کے ساتھ کئی کئی فٹ بلند شیشے کی بوتلیں چمکتے ہوئے آہنی سہاروں پر کسی ہوئی تھیں اور چند افراد سیڑھیوں کے واقعات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو چکے تھے۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے سیتا بھی میری مدد کو آگئی لیکن اس مرحلے پر میں دوسروں کے سہارے کے بجائے اپنے قدموں سے زیادہ کام لے رہا تھا۔

اس وسیع اور مرعوب کن زیرِ زمین تجربہ گاہ میں موجود لوگوں نے سروں کی خفیف سی جنبش سے ڈاکٹر آسٹن کو تعظیم پیش کی اور وہ ہمارے ساتھ ہال کے آخری سرے پر چوبی دیواروں والے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

مائیکل ٹرمپ کے آدمیوں نے مجھے احتیاط سے دفتر کے ایک صوفے پر بٹھا دیا اور ڈاکٹر آسٹن اپنی بڑی سی میز کے عقب میں کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے سے اس وقت تکان اور تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تم دونوں باہر ٹھہرو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر مائیکل ٹرمپ کے آدمیوں سے کہا۔ "ضرورت ہوگی تو بلا لیا جائے گا۔"

"تو یہ ہے تمہاری تجربہ گاہ۔" میں نے ان کے چلے جانے کے بعد ستائشی لہجے میں کہا۔

"میری یہی کائنات ہے۔" وہ میز پر پڑے کاغذات کو سمیٹتے ہوئے بولا۔ "مگر مجھے حیرت ہے کہ مقامی فوج یہاں کیا لینے آئی ہے۔"

"صنعا میں مائیکل ٹرمپ کی شہرت بہت داغدار ہے۔ اس کی کسی مہم جوئی نے ان لوگوں کو ادھر متوجہ کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس عمارت سے اس کا رابطہ کسی کے بھی علم میں نہیں ہے۔" پریشانی کے عالم میں اس کا رویہ کچھ دوستانہ ہو چلا تھا۔

"اور تم کہتے ہو کہ تجربہ گاہ باہر کی دنیا کے لیے ایک سربستہ راز ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تم نے یہاں اتنا سامان جمع کیا اور مقامی حکام کو بھنک بھی نہ مل سکی۔"

"یہ میرا یقین ہے کہ وہ تجربہ گاہ سے بے خبر ہوں گے۔"

"اور اگر تلاشی کے دوران وہ یہاں تک پہنچ گئے؟" میں نے اُسے خوف دلایا۔

"اس سے پہلے میں اوپر والے کمرے میں پہنچ جاؤں گا۔" اس کے چہرے پر سفاکانہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ "وہ کبھی سوچ بھی لیں تو یہاں تک نہ پہنچ سکیں گے۔"

"سینہ چھلنی کر دیں گے تمہارا۔"

"ایسے ہی کسی برے وقت کے لیے میں نے ایک ہتھیار بنا لیا ہے۔ کیمیاوی ہتھیار!" وہ مٹھیاں بھینچ کر کرسی سے اٹھ گیا۔ "اس کے سہارے میں ان سب کو موت کی نیند سلا دوں گا۔"

"مگر کیسے؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"گیس ماسک پہن کر میں ایک چھوٹا سا آہنی سلنڈر کمرے پر لٹکا دوں گا جس کے پائپ سے موت برستی ہے۔ بس والو کے دستے پر میرے اشارے کی دیر ہوگی اور سانس کے ساتھ اندر جانے والی گیس کی پہلی رتی شکار کا خاتمہ کر دے گی۔"

یہ کہہ کر وہ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک فرنی تجوری کی طرف مڑ گیا۔

"آہ!" میں نے چھٹی حس کے زیرِ اثر اضطراری طور پر ایک کراہ بلند کی اور وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہو گیا اور یہی میرا مقصد بھی تھا کہ وہ فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔

"کیا ہوا؟" اس کی آواز میں تشویش تھی۔

"درد... شدید درد۔" میں نے دل کے مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔

اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی چابیاں اس نے میز پر ڈال دی تھیں۔ جتنی دیر میں وہ مجھ تک پہنچتا میں زہریلے تیر پھینکنے والی شیشی جیب سے نکال چکا تھا۔

وہ چند منٹ تک نیچے بیٹھ کر میرے سینے پر مالش کرتا رہا اور میں نے افاقے کا اظہار بھی شروع کر دیا۔ اسی درمیان میں اوپر سے یکے بعد دیگرے کئی فائروں کی مدھم سی آوازیں آئیں اور وہ بھڑک کر اٹھ گیا۔

"تصادم ہو گیا۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اس سے پہلے کہ وہ ادھر کا رخ کریں مجھے خودکار دھماکے کا بندوبست کر کے اوپر پہنچ جانا چاہیے۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خودکار دھماکے کی بات اس نے تجربہ گاہ کے حوالے سے ہی کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو جائے اور فوجی تجربہ گاہ میں گھس آئیں تو تجربہ گاہ دھماکے سے برباد ہو جائے۔ ایسی صورت میں نہ صرف ہر چیز ختم ہو جاتی

بلکہ فوجیوں سمیت گرد و نواح کی آبادی بھی موت کی لپیٹ میں آ جاتی۔

ادھر پھر چند فائر ہوئے۔

"دھماکے کا بندوبست کرو ڈاکٹر! وہ سوئچ کہاں ہے؟" میں نے اسے گم صم دیکھ کر کہا۔

"سب تجوری میں ہے۔" اس کی آنکھوں سے یکایک آنسو بہہ نکلے۔ "آج شاید اپنی محنت مجھے خود اپنے ہاتھوں برباد کرنی پڑے۔"

یہ کہہ کر وہ تجوری کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے عقب سے اُس پر وار کر دیا۔ ننھا سا اڑتا ہوا تیر اس کے جسم میں پیوست ہوا، اور وہ تیورا کر وہیں گر گیا۔ میرے لیے اس کی ضرورت ختم ہو چکی تھی۔

میں اچھل کر آگے لپکا اور اس کی لاش گھسیٹتا ہوا میز کے نیچے لے گیا تاکہ باہر موجود محافظوں میں سے کوئی اندر آتے ہی اسے نہ دیکھ سکے۔

"تت... تم، تمھارے تو اعصاب بے جان تھے۔" سیتا میرے سر پر کھڑی تحیر آمیز سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"وہ سب اداکاری تھی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم چابی تلاش کرکے تجوری کھولو۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا اور اسی لمحے مائیکل ٹریپ کا ایک آدمی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

میں ڈاکٹر آسٹن کی لاش میز کے نیچے گھسیٹ کر اس وقت تک سیدھا ہو چکا تھا۔

"ڈاکٹر آسٹن کہاں ہے؟" اس نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ "اور تم کب ٹھیک ہو گئے؟"

"ہو گیا۔ شاید گولیاں چل رہی ہیں۔" میں نے لہجے کو حتی الامکان پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر کرسی پر بیٹھے بیٹھے خوف اور صدمے سے بے ہوش ہو گیا۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟" وہ بے تابی سے غرایا۔

"کرسی سے پھسل کر میز کے نیچے گر گیا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

پھر وہ آگے بڑھ کر جیسے ہی میز کے نیچے ڈاکٹر کو دیکھنے کے لیے جھکا، اسے سیدھا ہونا نصیب نہ ہو سکا۔ دوسرے تیر نے اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کی لاش چھپانے کی پروا کیے بغیر میں تیزی سے سیتا کے پاس پہنچ گیا جو تجوری کھولنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔



"یہاں سے ہٹو اور دوسری لاش کو بھی میز کے نیچے ڈال دو۔" میں نے دھیمے مگر ہیجانی لہجے میں سیتا سے کہا اور اس نے پھرتی سے جگہ چھوڑ دی۔

"ہو سکے تو دونوں لاشوں سے زہریلی سوئیاں نکال لینا۔" میں نے اس کی جگہ لیتے ہوئے تاکید کی۔

"سب کچھ تجوری میں ہے۔" ڈاکٹر آسٹن کے وہ الفاظ رہ رہ کر میرے ذہن میں گونج رہے تھے اور پھر جیسے ہی میں نے تجوری کے نیم وا پٹ کو پوری طرح کھولا، خوشی سے میرا دماغ خلا میں معلق ہو گیا۔

تجوری میں سب سے آگے سیاہ رنگ کا ایک مختصر سا آہنی سلنڈر نائیلون کی مضبوط ڈوریوں میں کسا ہوا رکھا تھا۔

میں نے احتیاط سے اس ہتھیار کو چھیڑا اور اندازہ لگایا کہ وہ بہت زیادہ وزنی تھا۔ اس کی چادر کسی بھی طرح آدھے پونے انچ سے کم موٹی نہیں رہی ہوگی۔ اس سلنڈر کا قطر بمشکل آٹھ انچ رہا ہوگا اور مخروط نما اوپری حصے سمیت اس کی کل اونچائی چودہ پندرہ انچ سے زیادہ نہیں ہوگی۔

سلنڈر کو اس کی جگہ سے ہلانے سے قبل اس سے منسلکہ لوازم کا جائزہ لینا ضروری تھا ورنہ ربر کی نلکی کے سرے پر لگا ہوا حساس والو اپنے ہی بوجھ سے کھل کر میرے لیے موت کا پیغام بن سکتا تھا۔

اس تلاشی میں سلنڈر کے پیچھے رکھے ہوئے کئی گیس ماسک بھی نظر آئے جو میں نے نکال لیے مگر پہلے ماسک کا جائزہ لیتے ہی میرا دل دہل اٹھا۔

وہ ہوابند ماسک آکسیجن کی فراہمی کے بغیر بالکل ناکارہ تھا۔

میں نے ڈاکٹر آسٹن کا کام تمام کرنے سے قبل اس سے ساری ضروری باتیں معلوم کر لی تھیں لیکن یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ گیس ماسک میں آکسیجن فراہم کرنے والے سلنڈر کہاں دستیاب ہوں گے۔

مجھ پر اضطراری کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ وزنی سلنڈر باہر نکال لیا جس کا والو ایک آہنی حفاظتی جالی میں بند تھا۔ اس جالی کو الگ کیے بغیر والو کا دستہ استعمال کرنا ناممکن تھا۔

تجوری میں بس وہی ایک خانہ تھا جس میں سلنڈر باہر آنے کے بعد گہرائی میں خاصی جگہ نظر آ رہی تھی۔

تجوری کے پچھلے حصے میں سُرخ رنگ کا پلاسٹک کا ایک خاصا بڑا بکس لگا ہوا تھا جس پر انگریزی میں ایکسپلوژن سوئچ کے الفاظ لکھے تھے۔ سوئچ کے وسط میں سفید رنگ کا ایک چوکور بٹن ابھرا ہوا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ سوئچ سے نکلنے والے برقی تار اس بٹن کے دباتے ہی فعال ہو جائیں گے اور پھر تجربہ گاہ میں کسی غلط جگہ پڑنے والے قدم یا کسی مخصوص چیز کو چھیڑنے سے فوری طور پر وہ نظام حرکت میں آ جائے گا جو دھماکے کے ساتھ زہریلی گیسوں اور جراثیم کو آزاد کر دیتا۔

میں نے بہت احتیاط سے تجوری کا دروازہ بند کرکے مقفل کر دیا اور تجوری کی چابی والا گچھا اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سیاہ آہنی سلنڈر نائیلون کی ڈوریوں میں اس طرح کسا ہوا تھا کہ اسے بآسانی پشت پر لٹکایا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کی دوہری ڈوریوں میں سے اپنے بازو گزار کر اس بوجھ کو کمر پر لاد لیا۔ اسی وقت میری نگاہ والو میں لگے ہوئے اس مختصر سے گیج پر پڑی جس کی سرخ سوئی ڈھائی ہزار پونڈ فی مربع انچ بتا رہی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ سلنڈر کے مختصر سے حجم میں بہت زیادہ دباؤ بڑھا کر گیس کی بھاری مقدار بھری گئی تھی اور والو یا نوزل سے پہلے گیج فراہم کرکے یہ آسانی بھی پیدا کر لی گئی تھی کہ اس ہتھیار کو استعمال کرنے والے کو ہر لمحے سلنڈر میں موجود گیس کی مقدار کا اندازہ رہ سکے۔

"کوئی چیز رہ گئی ہے۔" اچانک سیتا کی آواز ابھری اور میں تقریباً اُچھل پڑا۔

وہ دوسرے شکار کو بخوبی میز کے نیچے چھپا چکی تھی اور نجانے کس چیز کے بارے میں متوحش ہو گئی تھی۔

"کس کے پاس؟" میں نے بے ساختہ سوال کیا۔

"تمھاری کمر پر جھولتے ہوئے سلنڈر کے ساتھ ڈوری کے تین فاضل حلقے لٹک رہے ہیں، ان میں بھی کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔" اس نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آکسیجن سلنڈر کے بغیر یہ سب بیکار ہے، ان حلقوں میں شاید وہی پھنسے گا۔" میں نے اعتراف کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نائیلون کی ڈوری کے فاضل حلقے مجھے نظر نہیں آ سکے تھے۔

"وہ کیا ہے؟" سیتا نے بے ساختہ ایک طرف اشارہ کیا اور میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اس کا اشارہ سفید رنگ کے اُن چار سلنڈروں کی طرف تھا جو ایک فائلنگ کیبنٹ کی اوٹ میں آہنی اسٹینڈ سے کسے ہوئے تھے۔

میں لپک کر وہاں پہنچ گیا۔ سیتا نے بھی میری تقلید کی اور ہم دونوں اس اسٹینڈ سے آکسیجن کے دو سلنڈر علیحدہ کرنے لگے۔

"تمھارا دھیان اس طرف کیسے ہوا؟" میں اس خطرناک اور سنسنی خیز صورتحال میں بھی سیتا سے وہ سوال پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"ہسپتالوں میں رہ چکی ہوں۔" وہ زنجیر ہٹا کر سلنڈر تسموں میں پھنساتے ہوئے بولی۔ "وہاں مجھے نرسوں سے معلوم ہوا تھا کہ سلنڈروں پر سفید رنگ آکسیجن کی شناخت ہوتی ہے۔ دو مرتبہ تو مجھے بھی آکسیجن دی جا چکی ہے۔"

سیتا کے لیے صرف حفاظتی ماسک تھا جسے سانس لیتے رہنے کے لیے آکسیجن سلنڈر سے منسلک کرنا ضروری تھا جب کہ میرے شانے پر دوہرا بوجھ تھا۔ اوّل تو زہریلی گیس کا سلنڈر جو سامنے مزاحم ہونے والے ہر حریف کے لیے کاری تھا اور دوسرا آکسیجن کی فراہمی کا نظام جو جان لیوا گیس کے استعمال کی صورت میں مجھے اس کے اثرات سے محفوظ رکھتا۔

سیتا نے سلنڈر کس کر اس کے تسمے اپنے شانوں پر پہن لیے اور پھر چہرے پر ماسک پہن لیا جس کی شفاف شیلڈ میں سے محض اس کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصّہ نظر آ رہا تھا پھر اس نے سلنڈر کا والو کھولا اور اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ سفید رنگ کے ان آہنی سلنڈروں میں حیات آفریں آکسیجن رہی محفوظ تھی جس کے طفیل ہم دشمنوں میں ایک اہم معرکہ سر کر سکتے تھے۔

”تم یہیں ٹھہرو۔“ میں نے ہیجان آمیز سرگوشیانہ لہجے میں سیتا سے کہا۔ ”باہر والوں سے نمٹنے سے پہلے تہ خانے میں موجود لوگوں کو ٹھکانے لگانا ضروری ہے۔“

سیتا نے آکسیجن سلنڈر کا والو بند کر کے ماسک اپنے چہرے سے اتار لیا۔ ”انہیں تم کس طرح زیر کرو گے؟“

”بس دیکھتی جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر آسٹن اور دوسرے شکار کی لاشوں سے سوئیاں نکال لی تھیں تم نے؟“

”ہاں، یہ ہیں۔“ سیتا نے داہنے ہاتھ کی چٹکی میں دبی ہوئی دو سوئیاں میری طرف بڑھا دیں جو شیشی سے اُڑ کر دو زندگیوں کا خاتمہ کر چکی تھیں۔

میں نے اُن میں سے ایک ہی سوئی لینے پر اکتفا کیا۔ اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اس کیبن کے دروازے پر پہنچ کر دوسرے محافظ کو اندر طلب کیا جو اس عمارت میں مائیکل ٹرمپ کا تنخواہ دار تھا۔

وہ بے چارہ اپنے پہلے ساتھی کے حشر سے لاعلم تھا لہٰذا میری پہلی آواز پر سپاہیانہ مستعدی سے کمرے میں داخل ہوا اور جوں ہی وہ کیبن کے کھلے ہوئے دروازے میں سے میرے سامنے سے گزرا، میں نے ایک استعمال شدہ زہریلی سوئی پوری قوت سے اس کے کولھے میں بھونک دی۔

ایک شکار کو ہلاکت کی بے کم وادیوں میں دھکیل دینے کے باوجود اس سوئی میں اتنی تاثیر باقی تھی کہ وہ محض دو قدم آگے بڑھ کر اچانک لڑکھڑایا اور کسی درخت کے کٹے ہوئے تنے کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو اس کے دہانے سے سفید کف جاری تھا اور جسم پر تشنج کی ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی۔

میں جذبات سے عاری انداز میں قریب کھڑا اس کی جانکنی کی کیفیت کا جائزہ لیتا رہا۔ اور جب اس کا جسم ساکت ہو گیا تو میں آگے بڑھا اور اس کے کولھوں سے وہ زہر آلود سوئی واپس کھینچ لی۔ جو اس سمیت دو افراد کو زندگی کی لطافتوں سے محروم کر چکی تھی۔

میں نے سیتا سے دوسری سوئی بھی لے لی۔ اس کے بعد اپنے جسم سے ہر وہ چیز الگ کر دی جو زہریلی گیس کے استعمال کے سلسلے میں بدن پر کسی تھی۔

ان دونوں سوئیوں سمیت میں ڈاکٹر آسٹن کے کمرے سے نکل گیا۔

اس وقت بھی اوپر سے اکّا دکّا فائروں کی آوازیں آ رہی تھیں جن کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا کہ مائیکل ٹرمپ اور اس کے ہمراہی شاید پسپا ہو چکے تھے اور نہیں یا تو پکڑ لیا گیا تھا یا وہ محاصرے میں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تہ خانے تک پہنچنے والی ان مدھم آوازوں سے بے نیاز تین افراد مختلف بینچوں پر انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان کے بدن پر موجود سفید کپڑوں اور اُن کے کام کی نوعیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تینوں ڈاکٹر آسٹن کے معاون تھے اور زہریلی گیسوں کی دریافت اور فوجی استعمال کے سلسلے میں جتنا قصوروار ڈاکٹر آسٹن تھا اسی قدر وہ تینوں بھی تھے۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مگر پُرسکون انداز میں یوں آگے بڑھتا رہا جیسے ستائشی انداز میں اس عظیم الشان تجربہ گاہ کا معائنہ کرنے میں مصروف ہوں۔

میرے کافی قریب پہنچنے پر وہ ادھیڑ عمر منحنی سا شخص چونک پڑا جو اونچے پایوں والی ایک کرسی کی پشتگاہ سے سر ٹکائے کسی سوچ میں غرق تھا اور اس کے سامنے کاؤنٹر پر دو تین کتابیں اور چند کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔

میں بہت زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں لیکن اتنا اندازہ لگانے میں ضرور کامیاب ہو گیا کہ وہ مختلف کیمیائی فارمولوں میں مغز کھپا کر کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے کوشاں تھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں تحیر امڈ آیا۔ اور اس نے نحیف سی کھوکھلی آواز میں سوال کیا۔ ”تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ڈاکٹر آسٹن کا مہمان ہوں اور اس کی اجازت سے یہاں گھوم رہا ہوں۔“ میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا کیونکہ اس نے انگریزی میں سوال کیا تھا۔

”ڈاکٹر کہاں ہے؟“ اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اپنے کیبن میں دوسرے مہمان سے کچھ اہم بات کر رہا ہے۔“

”خیر، گھومو پھرو، کسی چیز کو چھیڑنا نہیں۔“ اس نے کتاب اٹھاتے

ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہاں کا پورا نظام بہت حسّاس اور نازک ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ میں نے اس کے قریب پوزیشن سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ اتنی بڑی تجربہ گاہ کو تم صرف تین آدمی سنبھالتے ہو۔“

”اس کا تعلق مہارت اور اعتماد سے ہے۔“ وہ ایک کتاب اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ باریکیاں تمھارے بس کی نہیں، خاموشی سے جو کچھ دیکھ سکتے ہو، دیکھ لو۔ میرا یا کسی اور کا وقت برباد کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ڈاکٹر اس عادت کو سخت ناپسند کرتا ہے۔“

میں نے داہنا ہاتھ بڑھایا جس میں دو افراد کو ہلاک کرنے والی سوئی دبی ہوئی تھی۔ کام کے عذاب میں مبتلا اس بے چارے کو میری حرکت کا علم ہی نہ ہو سکا اور وہ باریک سی سوئی گردن اور شانے کے اتصال پر اس کی گردن میں پیوست ہو گئی۔

دو جسموں میں پیوست ہونے اور نکالے جانے کے بعد بھی اس چمکتی ہوئی سوئی کے مساموں میں زہر کی اتنی مقدار باقی تھی، کہ نوک کی چبھن محسوس کرتے ہی وہ اچھلا اور پھر یوں ہی رہ گیا۔ کرسی پر توازن بگڑ جانے کے باعث اس کا بدن آگے کی طرف جھکا تھا مگر میں نے پھرتی سے سہارا دے کر اسے پشتگاہ سے ٹکا دیا۔

اس کا سر کاؤنٹر سے ٹکرانے اور پھر جسم کے نیچے گرنے سے اتنا دھماکا ہوتا کہ بقیہ دو افراد قبل از وقت اجل کے پروں کا سایہ اپنے سروں پر محسوس کر لیتے اور میرے لیے اُن پر برتری حاصل کرنا دشوار ہو جاتا۔

میں نے اس کے شانے سے سوئی نکال کر مختلف ساز و سامان کی اوٹ سے بقیہ دونوں افراد کا جائزہ لیا مگر وہ بدستور اپنے کاموں میں مشغول تھے۔

تین افراد کو ٹھکانے لگانے والی سوئی میں مزید ایک آدمی پر آزمانی چاہتا تھا مگر اس کے لیے آخری شکار ہی مناسب تھا تاکہ سوئی کی ناکامی کی صورت میں مقابلے پر آمادہ ہونے والا تنہا ہی ہو اور زیادہ دشواری پیدا نہ کر سکے۔

میں سنبھلتا ہوا نئے شکار کی طرف چل دیا۔

اس وقت تک اُوپر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ ابتدا میں فائرنگ میں خطرناک شدت تھی۔ جو بعد میں یکایک کم ہو گئی تھی مگر اس وقت تو یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اوپر کے حالات اعتدال پر آ چکے ہوں۔

قریب پہنچ کر مجھے حیرت ہوئی کہ نیا شکار ایک عمر رسیدہ عورت تھی۔

بے اختیار میرا دل چاہا کہ اُسے کیفرِ کردار تک پہنچانے سے پہلے مختصر سی گفتگو کی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس جذبے کے تحت موت کے ہرکاروں کی قابلِ نفرت ٹولی میں شامل ہونے پر مجبور ہوئی مگر اس وقت میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

اس سے پیشتر کہ مائیکل ٹرمپ کے ساتھی یا فوجی تہ خانے تک پہنچنے میں کامیاب ہوں مجھے میدان صاف کر کے زہریلی گیس کے استعمال کے لیے تیار ہو جانا چاہیے تھا۔

اس عورت کے نامۂ اعمال کی سیاہی کے لیے اس کا تجربہ گاہ کے عملی کام میں مصروف نظر آنا ہی کافی تھا۔

اس وقت وہ آہنی اسٹینڈ سے کسی ہوئی شیشے کی صراحی میں موجود گلابی سیال میں بیورٹ کی ٹونٹی سے قطرہ قطرہ کر کے ایک کثیف سیال ٹپکا رہی تھی۔ اور اس کی نگاہیں صراحی پر مرکوز تھیں جس کے خالی حصّے میں کیمیائی عمل سے پیدا ہونے والا سرمئی دھواں جمع ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دھواں اس قدر بھاری تھا کہ صراحی کے کھلے ہوئے منہ میں سے باہر نکلنے کے بجائے گلابی سیال کی سطح پر ہی جمع ہو رہا تھا۔

سوئی اس تندرست مگر عمر رسیدہ عورت کے داہنے پہلو میں داخل ہوئی۔ اس کا ہاتھ بیورٹ کی ٹونٹی سے ہٹ گیا اور سر اچانک میز پر جا ٹکا۔

میں نے ایک چمٹی کی مدد سے بیورٹ کی ٹونٹی بند کر دی کیونکہ ہولناک کیمیائی مادوں کے اس انبار میں مجھے کسی بھی چیز کے چھونے کے تصوّر سے دہشت ہو رہی تھی۔ پھر اس عورت کی وزنی لاش کو سہارا دے کر فرش پر ڈال دیا۔

میں لاش کو فرش پر ڈال کر سیدھا ہو ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے سر پر ایک غراتی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی اور میرے بدن کے مساموں سے یک بیک سرد پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

میں پھرتی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا اور تجربہ گاہ کے سفید حفاظتی کوٹ میں ملبوس ایک جوان العمر سفید فام کو اپنے سر پر مسلط پایا۔

اس کے ہاتھ میں پستول کی وضع کا ایک عجیب سا ہتھیار تھا جس میں ٹریگر کے اوپر دو عدد افقی نالیاں تھیں۔ بظاہر اس پستول کی نال کا دہانہ بند تھا جس کا رُخ میری طرف اٹھا ہوا تھا۔

”یہ خاتون اچانک گر گئی۔“ میں نے بوکھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں ڈاکٹر آسٹن کا مہمان ہوں اور اسی کی اجازت سے ادھر آیا تھا۔“

”ڈاکٹر کہاں ہے؟“ اس کی آواز کی غراہٹ اور نگاہوں کی غضبناکی میں میرا جواب سن کر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

”اپنے کیبن میں۔“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ اس وقت میری تحویل میں صرف وہی سوئی تھی جو تین دشمنوں پر کامیابی سے

آزمائی جا چکی تھی۔ کم استعمال شدہ سوئی عورت کی لاش سے نکالنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔

"دُور ہٹو۔" وہ پستول نما ہتھیار کی نال ہلا کر چونکتے ہوئے بولا۔ "ربیکا کے دہانے سے توکف جاری ہے کیا ہُوا ہے اُسے؟"

"مم... مجھے نہیں معلوم۔" میں نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "میرے یہاں پہنچتے ہی یہ لڑکھڑائی تھی۔ اور میں نے لپک کر اُسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔"

"زہر... یہ تو کوئی زہر معلوم ہوتا ہے۔" وہ آگے بڑھ کر ربیکا کے بے جان بدن پر جھکتے ہوئے تشویشناک لہجے میں بڑبڑایا مگر اس وقت بھی وہ میری طرف سے غافل نہ تھا جب کہ اُسے زیر کرنے کے لیے مجھے محض لحظہ بھر کی مہلت درکار تھی۔

"یہ تو شاید مرگئی۔" میں نے اس کی توجہ منعطف کرانے کے لیے اچانک ہذیانی انداز میں چیخ کر کہا۔

اور یہ تدبیر کارگر رہی، وہ بے اختیار فرش پر پڑی ہوئی بے جان عورت کے سرھانے بیٹھ گیا اور اسی لمحے میں اس پر ٹوٹ پڑا۔

گو اُس وقت میرے ہاتھ میں زہریلی سوئی موجود تھی، لیکن تین کامیابیوں کے بعد اس کی افادیت کچھ مشکوک ہو چکی تھی جب کہ اُس کے ہاتھ میں ایک نیا ہتھیار موجود تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میری ناکامی کی صورت میں اُسے فوری طور پر اپنا وار کرنے کا موقع مل جاتا۔ لہٰذا میں نے اس پر جھپٹتے ہی سوئی پھینک کر اس کے پستول نما ہتھیار پر ہاتھ ڈالا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کو نہتا کر کے دُور نکل گیا۔

میں پستول نما اس ہتھیار کو اپنی گرفت میں لے کر واپس پلٹا، تو وہ اپنے قدموں پر اُٹھ رہا تھا اور اُس کی دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں میرے داہنے ہاتھ پر مرکوز تھیں جس میں اُس سے چھینا ہوا ہتھیار موجود تھا۔

"تت... تم نے تو کہا تھا کہ تم ڈاکٹر آسٹن کے مہمان ہو۔" اس نے دہشت اور بوکھلاہٹ کے عالم میں گھگھیا کر کہا۔

"اب بھی یہی کہتا ہوں۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا "بعض بن بُلائے مہمان بھی ہوتے ہیں جو جان کا عذاب بن جاتے ہیں۔"

"ٹریگر سے اُنگلی ہٹا لو۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا "یہ خفیف سے دباؤ سے چل پڑتا ہے... اس کی نال نیچے کر لو، میں تمھاری ہر بات مانوں گا۔"

"ٹریگر دینے سے کیا ہوتا ہے؟"

"زہریلے مرکب سیال کی تیز دھار نکلتی ہے جو تیس فٹ دُور تک کھڑے ہوئے آدمی کے جسم کو گلاتی ہوئی سوراخ کے پار نکل جاتی ہے۔" دہشت سے اس کے ہونٹ خشک ہوئے جا رہے تھے اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"پھر تو اس کا تجربہ ہونا چاہیے۔" میرے الفاظ سُن کر وہ ہذیانی انداز میں چلایا تھا۔ مگر میں نے پستول کا رُخ اُس کے بجائے فرش پر پڑی ہوئی ربیکا کی لاش کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ پستول میں ہلکی سی جھنجھناہٹ ہوئی اور کسی بے بُو، شفاف مائع کی باریک سی دھار دھوئیں کی لکیر کی طرح خارج ہو کر لاش کے پیٹ پر پڑی اور اس پر واقعی سوراخ ہو گیا۔ یہ عمل بھی ہر قسم کی بُو سے عاری تھا۔

ٹریگر سے دباؤ ختم ہوتے ہی مائع کی دھار رُک گئی۔

"اچھی چیز ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "اس سے ایسے کتنے فائر کیے جا سکتے ہیں؟"

وہ ایک طرف کھڑا دہشت سے لرز رہا تھا "ستّر سے سو تک اس کا انحصار ہر فائر کے دورانیے پر ہے۔"

"اور یہ ڈاکٹر آسٹن کی ایجاد ہے؟"

"نن... نہیں۔" وہ جلدی سے بولا "یہ میں نے اس کی لاعلمی میں خود بنایا ہے۔ اس میں کام آنے والے محلول بھی میری ایجاد ہیں۔"

"کبھی تجربہ کرنے کی نوبت آئی اس کی؟"

اس خطرناک مرحلے پر بھی اس کی پیشہ ورانہ انا بیدار ہوئے بغیر نہ رہ سکی "میں نے تجربات کے بعد ہی اُسے بنایا ہے۔"

"کس پر کیے تجربے؟" میں نے پوچھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"شاید جانوروں پر کرتا۔" اس کا جواب حسبِ توقع تھا "مگر یہاں جانوروں کے بجائے انسان ملتے ہیں۔ میں نے صرف دو بار آزمایا تھا اسے۔"

"اور ستّر فائروں کے بعد یہ پھینک دینے کے قابل رہ جاتا ہے!" میں اُسے جہنم واصل کرنے سے پہلے اس ہتھیار کے بارے میں جملہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں... یہی اس کا کمال ہے۔" وہ بولا "ٹریگر کے اُوپر لگی ہوئی دونوں آہنی نالیاں بدل کر یہ پھر نیا ہو جائے گا۔ ان ہی میں زہریلے سیال پیدا کرنے والے سفوف ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"تم جان بخشنے کا وعدہ کرو تو کارٹرج کے ساتوں سیٹ تمھارے حوالے کر دوں گا، ابھی تک میں اتنے ہی بنا پایا ہوں۔"

"اور اگر میں جھوٹ بولنے سے انکار کر دوں؟" میرا لہجہ سفاکانہ ہو گیا۔

"نہیں... تم مجھے نہیں مار سکتے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔

"ختم کرو۔" اچانک مجھے اپنے پیچھے سیتا کی اکتائی ہوئی آواز سنائی دی۔ شاید وہ اس کی پہلی چیخ سُن کر خاموشی سے کہیں آ دبکی تھی۔ "تہہ خانے کا دروازہ کھول کر لوگ کسی بھی وقت اندر آ سکتے ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دوست ہوں گے یا دشمن۔"

اُس کی بات ٹھیک ہی تھی جسے سُن کر آخری شکار نے میری طرف لپکنا چاہا مگر میں نے اس کے دل کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔

وہ تیورا کر فرش پر گرا، اُس کے حلق سے کربیہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور بدن پوری قوت سے کئی کئی انچ اُوپر تک اچھل کر تڑپ رہا تھا۔ چند لحظہ بعد سینے کے آرپار سوراخ سے خون کی بے تحاشا دھاریں بہہ نکلیں اور چھینٹیں دور تک جانے لگیں۔

وہ جوان آدمی تھا اور اس کے خون کے دوران نے سوراخ میں جانے والے سریع الاثر زہریلے سیال کو پہلے ہی دھارے میں صاف کر دیا تھا۔ وہ حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا فرش پر تڑپتا رہا۔ وہ منظر اس قدر کربیہ اور عبرتناک تھا کہ میں خود جھرجھری لے کر رہ گیا۔

میرے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ اس ہتھیار کے مُوجد نے صبر اور سکون کے ساتھ دو انسانوں کو اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیا ہو گا۔ اس سے زیادہ عبرتناک اور کرب آمیز موت کا تصور کم از کم میرے ذہن کے بعید ترین گوشے میں بھی نہیں تھا۔

سیتا نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے وہاں سے کیبن کی طرف لیتی چلی گئی۔

"عجیب اور بدترین ہتھیار ہے یہ۔" کیبن میں پہنچ کر میں نے وہ پستول سیتا کو تھماتے ہوئے کہا "اگر ذہین آدمی تخریب کی راہ پر چل پڑیں، تو اس سے زیادہ پُرہول شاہکار جنم لیتے ہیں... اب یہ تمھاری تحویل میں رہے گا۔"

سیتا کو آکسیجن سلنڈر اور ماسک سے لیس کرتے ہوئے میں نے اُسے تفصیل سے اس ہتھیار کی ساخت اور ترکیبِ استعمال سے آگاہ کر دیا۔

پھر میں بھی پھرتی کے ساتھ زہریلی گیس والا سلنڈر استعمال کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ زہریلی سوئیاں پھینکنے والی ٹیشی کے بعد ڈاکٹر آسٹن کے ہلاکت آفرین آہنی سلنڈر سے زیادہ مجھے پستول نما ہتھیار نے متاثر کیا تھا جس کے ذریعے سیتا دشمنوں کی بھیڑ سے بھی خود کو باآسانی بچا لے جا سکتی تھی۔

ہم دونوں زیرِزمین تجربہ گاہ کا وسیع ہال عبور کر کے سیڑھیوں پر جا پہنچے جن کے اختتام پر داخلی راستہ بدستور تھا۔

"کمال ہے کہ اب تک کوئی اِدھر نہیں آیا۔" سیتا نے اس محاذ پر سناٹا دیکھ کر مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ویسے اس وقت بیرونی عمارت میں بھی سناٹے ہی کا راج معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہاں سے فائرنگ یا دھماچوکڑی تو کجا کسی ذی رُوح کی نقل و حرکت کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

"اس راستے سے مائیکل ٹرمپ کے آدمی ہی واقف رہے ہوں گے۔" میں نے کوئی نتیجہ اخذ کیے بغیر سرسری لہجے میں کہا۔

"تو کیا تمھارا مطلب ہے کہ وہ نکل بھاگے ہیں؟" سیتا نے چونک کے سوال کیا۔

"نکل بھاگے ہیں، مارے اور پکڑے گئے ہیں یا فوجیوں سے مصالحت ہو گئی ہے۔" میں نے اپنے جواب میں جملہ امکانات سمو دیے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ اور اگر مصالحت ہی ہونی تھی تو فائرنگ کا کیا جواز تھا؟" اُس نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

"کوئی غیرمعمولی بات ضرور ہوئی ہے۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "فوجیوں کی بھاری تعداد کی آمد کی خبر ملی تھی اور مائیکل ٹرمپ کے آدمی بھی اتنے کم نہیں تھے جب کہ فائرنگ معمولی ہوئی ہے۔ اتنے بڑے تصادم میں دس بیس گولیاں کبھی فیصلہ کن نہیں ہوتیں۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" وہ شانے اچکا کر بُرا سا منہ بناتے ہوئے بڑبڑائی۔

"سیدھی سی بات ہے کہ باہر کے حالات غیریقینی ہیں اور اس وقت ہمیں از خود باہر نکل کر کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے کب کہا کہ ہمیں ابھی باہر نکلنا چاہیے؟"

"پُرسکون رہو۔" میں نے اُسے نرمی سے سمجھایا "اسی طرح ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہیں تو ضرورت پڑنے پر کچھ نہ کر سکو گی۔"

"تم نے فوجیوں سے ان کی مصالحت والی بات کیسے کہہ ڈالی؟" کچھ دیر کے بعد اس کی زبان پھر چل پڑی۔

"میں امکانات کی بات کر رہا تھا۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر آسٹن کی خواب گاہ میں اغوا کیے ہوئے متعدد مقامی قید تھے۔ اور شاید عبداللطیف کی لاش بھی عمارت سے باہر نہیں لے جائی گئی تھی۔ ان شواہد کی روشنی میں کسی بھی قسم کی مصالحت خارج از امکان ہے۔"

"تمھارے دماغ میں خشکی چڑھ گئی ہے۔" اس بار میں اس کی کٹھ حجتی سے چڑ گیا۔

وہ بے اختیار دھیمی مترنم آواز میں ہنس پڑی "تمھیں یہ بھیانک سکوت کاٹنے کو نہیں دوڑ رہا؟"

"اسے سکوت کے بجائے سکون کیوں نہ سمجھا جائے؟"

"باتیں کرتے رہو، اسی طرح ہم اپنا وقت آسانی سے گزار سکیں گے۔"

"آکسیجن سلنڈر کا والو بند کر کے ماسک تھوڑا سا اُوپر کر لو تاکہ تازہ ہوا میں سانس لیتی رہو۔" میں نے خود یہی عمل کرتے ہوئے اسے ہدایت کی "یہ ماسک سر کے خفیف سے جھٹکے سے کسی بھی وقت اپنی جگہ لایا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" اس نے ماسک اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا "ایسا نہ ہو کہ زہریلی گیس کے استعمال کی نوبت آئے تو آکسیجن جواب دے جائے۔"

"غنیمت ہے کہ اس بار تم نے اردو آسانی سے سمجھ لی۔"

وہ ہنسی پھر بولی۔ "حیرت ہے کہ اس زیرِ زمین تہ خانے میں گھٹن کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔"

"تہ خانہ زیرِ زمین عمارت ہی کو کہا جاتا ہے۔" میں نے اس کی تصحیح کی۔ "پھر یہاں تو کچھ اہم لوگ تیزابی بخارات سے آلودہ فضا میں کام کرتے ہیں لہٰذا باہر سے تازہ ہوا کا بندوبست خاص طور پر کیا گیا ہوگا۔"

ہمیں اوپری سیڑھی پر کھڑے کافی دیر گزر گئی مگر کہیں سے کوئی سُن گُن نہ سنائی دی۔ اس دوران میں میں نے چار سگریٹیں بھی پھونک ڈالیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ میری اعصابی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"تہ خانے کا دروازہ تو ایک غیر آباد کمرے میں کھلتا ہے نا؟" کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے سیتا سے تائیدی لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں، کیا ارادہ ہے؟"

"کیوں نہ دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا جائے؟" میں نے تجویز پیش کی۔

"تمہیں امید ہے کہ وہ کمرہ اس وقت بھی ویران ہی ہوگا؟"

"ہونا چاہیے۔" میں نے پُر زور لہجے میں کہا۔ "اول تو ہم پوری طرح مسلح ہیں اور اگر پھر بھی کوئی غیر متوقع صورتِ حال نظر آئی تو دروازہ بند کر دیں گے۔"

"ہاں۔ دروازہ تو بہت تیزی سے اوپر اٹھ کر بند ہوتا ہے۔" اس نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

میں اپنی جگہ چھوڑ کر اس طرف پہنچ گیا جدھر دیوار میں وہ دستہ نصب تھا جس سے دروازہ کھولنے اور بند کرنے والے میکانزم.. کو حرکت میں لایا جا سکتا تھا۔

میں نے اپنا ماسک نیچے گرا کر آکسیجن کا والو کھولا اور زہریلی گیس کے سلنڈر سے منسلک نوزل کا والو داہنے ہاتھ میں تھام کر بائیں ہاتھ سے دیوار گیر دستہ باہر کی طرف کھینچا اور یہ دیکھ کر میرے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی کہ سامنے حائل دیوار کو ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ میں نے فوری طور پر دستے کو اندر کی طرف دبانا چاہا لیکن وہ اسپرنگ کے ذریعہ اپنی جگہ جا کر رک گیا۔ اس سے پیچھے اسے دبانا ممکن نہ ہو سکا۔

"یہ کیا ہوا؟" سیتا بوکھلائی ہوئی آواز میں بولی۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے اس دستے پر بار بار زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔ "شاید نظام میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مائیکل ٹرمپ کے آدمیوں نے اس نظام کو ناکارہ بنا دیا ہو۔" سیتا نے رائے دی اور میں اچھل پڑا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرا دعویٰ ہے کہ عمارت میں اس وقت چڑیا کا بچہ بھی نہیں ہوگا۔ ہم دونوں تہ خانے میں قید کر دیے گئے ہیں۔"

"مگر کیسے؟"

"اس عمارت میں اسرائیلی سرگرمیوں کا ایک اہم ترین مرکز [تھا]۔ عام راستوں کے علاوہ ہنگامی صورتِ حال میں یہاں سے فرار کا کوئی خفیہ راستہ بھی رہا ہوگا اور مائیکل ٹرمپ کے آدمی مزاحمت کی آڑ میں چند گولیاں برسانے کے بعد ادھر سے صاف نکل گئے۔ انہوں نے ہی جاتے جاتے باہر سے اس تہ خانے کے دروازے کے نظام کو عارضی طور پر ناکارہ بنایا ہوگا تاکہ خالی عمارت میں گھسنے کے بعد کوئی فوجی بیرونی دستہ دیکھ بھی لے تو اس کی مدد سے تہ خانہ دریافت نہ کر سکے۔ بادی النظر میں وہ محض آرائشی نظر آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فوجی اس پر بے کار قوت آزمائی کر کے لوٹ گئے ہوں گے اور ویران عمارت سے مقتول قیدیوں کے علاوہ عبداللطیف کی لاش بھی لے گئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ نہیں ملا ہوگا۔"

"اندر سے فائرنگ کے بعد مکینوں کا سرے سے غائب ہونا ان کے لیے تشویش کا باعث نہ رہا ہوگا؟" سیتا نے سوال کیا۔

"لازمی بات ہے اور شاید انہیں غلط راہ پر ڈالنے کے لیے بھاگنے والوں نے کچھ مصنوعی آثار بھی چھوڑ دیے ہوں یا شاید خفیہ راستے سے ان کا تعاقب بھی کیا گیا ہو مگر یہ بات یقینی ہے کہ تجربہ گاہ کے تحفظ اور رازداری کے لیے ہمیں یہاں قید کر دیا ہے۔"

"مگر کیوں؟" وہ آسانی سے پوری بات نہ سمجھ سکی۔ "اس طرح تو ہمارے ساتھ انہوں نے اپنے چھ آدمی بھی یہاں قید کر دیے ہیں جبکہ تجربہ گاہ کا سارا انتظام تو یہاں خود ڈاکٹر آسٹن کے ہاتھوں میں تھا۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو، ان کی دانست میں اس بند تہ خانے میں ہم دونوں ان چھ افراد کے قیدی ہیں جنہیں مقدر کی خوبی سے لاشوں میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوم یہ کہ ڈاکٹر آسٹن کے پاس تجربہ گاہ کے تحفظ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ تو بس آخری چارۂ کار کے طور پر ایک اشارے سے تجربہ گاہ کو نیست و نابود کر سکتا تھا جب مائیکل ٹرمپ نے اسے بچانے کی مکارانہ کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر آسٹن اگر تجربہ گاہ کو تباہ کرنے کے بجائے زہریلی گیس کے استعمال کا فیصلہ کرتا تو شاید وہ سو پچاس فوجیوں کو ضرور مار لیتا مگر زندہ بھاگ نکلنے والا ایک فوجی بھی تجربہ گاہ کی تباہی کا پیغام بن جاتا۔ مقامی حکام پوری قوت سے اس اڈے کو روند ڈالتے۔ مائیکل نے اس بربادی کو ٹالنے کی کوشش کی ہے۔"

"پھر اب کیا کیا جائے؟" سیتا کی تشویش اپنی جگہ بجا تھی۔

"اس تہ خانے سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" میں نے پُر سکون لہجے میں کہا۔ "اب ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"یہاں سے نکلنا شاید اتنا آسان ثابت نہ ہو۔" وہ بولی۔ "یہ جگہ اس قدر محفوظ نہ ہوتی تو وہ یوں اطمینان سے قید کر کے نہ بھاگتے۔"

"اُن کے اطمینان کی وجہ ہمارے ساتھ اُن کے چھ آدمیوں کی موجودگی رہی ہوگی۔" میں نے تہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔ "وہ سوچ بھی نہ سکتے ہوں گے کہ ہم نہتے ہونے کے باوجود اُن کے دو مسلح اور چار ناکارہ ساتھیوں پر غالب آ جائیں گے۔"

"تو اب نیچے کہاں جا رہے ہو؟ نکاسی کی کوشش دروازے ہی سے کی جانی چاہیے۔"

"تہ خانے میں تازہ ہوا کی آمد اور کثافت کے اخراج کا راستہ زیادہ آسان رہے گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"مگر ہمیں یہاں بند کرنے سے ان کا مقصد کیا رہا ہوگا؟"

"سیدھی سی بات ہے۔" میں نے نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت وہ خطرے میں تھے لہٰذا نکل بھاگے مگر موقع ملتے ہی خفیہ راستے سے دوبارہ یہاں داخل ہوں گے اور تہ خانے میں داخلے کے نظام کو معمول پر لا کر اندر آئیں گے اور اپنی دانست میں ہمیں بآسانی بے ہوش کر کے نکال لے جانے کا منصوبہ روبہ عمل لے آئیں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ شائستہ لہجے میں بولی۔ "ہمیں ان کی آمد سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ورنہ بلاوجہ دشواریاں پیدا ہوں گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ چند گھنٹے بعد پلٹنے کی کوشش کریں لیکن فوجیوں نے عمارت کے گرد پہرہ برقرار رکھا تو ہو سکتا ہے کہ یہ نوبت کئی روز بعد آئے۔ اس تہ خانے میں خورد و نوش کی اشیاء کا خاصا ذخیرہ موجود ہوگا۔"

اس تہ خانے کی چھت بالکل مسطح اور چوکور تھی۔ ہم دونوں نے پوری توجہ کے ساتھ اس کے ایک ایک انچ کا جائزہ لیا لیکن کہیں بھی خلا تو درکنار باریک آہنی جالی بھی دریافت نہ کر سکے جو ہوا کے گزرنے کے لیے کافی ہوتی۔

اس کے بعد دیواروں کی باری آئی۔ اس میں بھی ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تمام دیواریں سپاٹ اور ہموار تھیں۔

پھر ہم دونوں تجربہ گاہ کی قیمتی اور خوبصورت ورک بینچوں کے درمیان گھسنے لگے۔ ہماری نگاہیں ہر لحظہ کسی سراغ کی تلاش میں تھیں۔

جس وقت میں پستول نما کیمیاوی ہتھیار کا شکار ہونے والے جوان العمر شخص کی لاش کے قریب پہنچا تو وہ فرش پر ساکت پڑا ہوا تھا۔ آخری لمحات کی جان کنی کے باعث لاش بہت برے زاویے سے مڑی تڑی ہوئی پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل کر پتھرائی ہوئی تھیں، چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا اور خون میں تھڑا ہونے کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ اس کے سینے کا سوراخ ابتدائی قطرے کے مقابلے میں کئی گنا چوڑا ہو چکا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مہلک سیال کی آخری بوندیں تک گوشت اور ہڈیوں کو گلاتی رہیں حتیٰ کہ خون کے بہاؤ کی کثرت نے انہیں بے ضرر بنا دیا۔

فرش پر دور تک پھیلے ہوئے تازہ خون پر لوتھڑے جمنے شروع ہو گئے تھے۔ میں ان سے بچنے کے لیے ایک الماری سے چپکتا ہوا آگے بڑھا تو چونک پڑا۔

میرے منہ سے لگی ہوئی سگریٹ سے ابھرتی ہوئی دھوئیں کی لکیریں مستقل طور پر لہراتی ہوئی اوپر کی طرف اٹھ رہی تھیں مگر الماری کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ دھواں اچانک دور بھاگا تھا۔ میں بڑھتے بڑھتے وہیں رک گیا۔

سیتا میرے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔

وہ چوبی الماری اپنے پٹوں کے اعتبار سے چھ فٹ اونچی تھی مگر اس پر تقریباً ایک فٹ بلند ایسا خانہ بنا ہوا تھا جو آگے سے کھلا ہوا تھا۔

میں نے ہاتھ بلند کیا تو اس کھلے چوبی خانے سے تیزی کے ساتھ تازہ ہوا آتی محسوس ہوئی اور ہم دونوں وہیں جم گئے۔

پہلی بار غور کرنے پر مجھے حیرت ہوئی کہ ہم وہ الماری کیوں نظر انداز کرتے رہے جو تہ خانے کے تقریباً وسط میں چار فٹ چوڑے اور اسی قدر لمبے ایک ستون کی طرح استادہ تھی اور اس کے اوپر چاروں طرف چوبی خلا میں مسلسل تازہ ہوا اگل رہی تھیں۔

الماریاں غیر مقفل تھیں اور ان میں ڈبوں، پیکٹوں اور بوتلوں میں بھانت بھانت کا سامان جمع تھا اور دونوں الماریاں ایک فٹ سے زیادہ گہری نہیں تھیں جس کا مطلب تھا کہ دونوں الماریوں کے عقبی حصوں کے درمیان ایک تقریباً دو فٹ چوڑی اور چار فٹ عمودی سرنگ پوشیدہ تھی اور یہ محض اس کا حجم ہی تھا کہ تہ خانے کے سناٹے میں ہوا کے بہاؤ میں کوئی آواز نہیں تھی۔

ہم دونوں نے احتیاط کے ساتھ وہ الماری خالی کر دی جو لاش سے دوسری طرف بنی ہوئی تھی۔ ہر چیز کو اٹھاتے ہوئے خوف سا محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں کوئی چیز نیچے گر کر یا کسی دوسری شے کے ساتھ مل کر اپنے کیمیاوی ردعمل سے فضا کو مسموم نہ کر دے۔

اس مرحلے سے نمٹ کر الماری توڑنے کا خیال آیا تو سیتا نے پستول نما ہتھیار میری طرف بڑھا دیا۔ اس کا خیال مناسب تھا کہ لکڑی کو گلانے کے لیے چند فائر کام میں لائے جائیں۔

نال کے باریک سوراخ سے خارج ہونے والی دھار کی شدت کے پیشِ نظر ہم دونوں خالی الماری سے خاصی دور ہٹ گئے پھر میں نے ٹریگر دبایا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سیال کی دھار چوبی تختوں میں سے گزرنے کے بجائے سطح سے ٹکرا کر نیچے بہہ نکلی۔

پھر فرش پر بھی اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ سیال ہتھیار کے جس حصے میں سے ہو کر گزر رہا تھا وہ بھی لوہے

یا کسی دھات کا بنا ہوا تھا اور سیال کے اثر سے محفوظ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی ساری تباہ کاری انسانوں جانوروں اور دوسرے ذی روح حشرات کے جسموں میں موجود حیاتیاتی خلیوں کے لیے وقف تھی۔ بظاہر زندگی سے عاری عناصر اس سے محفوظ تھے۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" سیتا بڑبڑائی۔

میں کوئی جواب دیے بغیر تہ خانے میں کارآمد اوزاروں کی تلاش میں چل دیا۔

بند منہ والی ایک خالی آہنی صراحی اور لمبی سی نوکیلی سلاخ لے کر میں واپس ہوا تو سیتا غائب تھی۔

میں نے تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر بے اختیار اسے پکار بیٹھا۔

"آتی ہوں۔" اس کی بھاری آواز میں گونج محسوس کر کے میں حیران رہ گیا اور چند ثانیوں بعد سیتا سرنگ کے ایک دہانے میں سے نیچے کود آئی۔

"میں اپنا تجسس نہ دبا سکی۔" ہاتھ جھاڑتے ہوئے وہ ہنس کر بولی "سوچا تمھاری غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر اندر کا جائزہ لے ہی ڈالوں۔"

میں محض اسے گھور کر رہ گیا۔

"چوبی سرنگ فرش میں اتری ہوئی ہے۔" وہ میری نگاہوں کا اثر قبول کیے بغیر ڈھٹائی کے ساتھ بولی۔ "اور اس کا رخ اس طرف ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے زینوں کی مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ "فرش سے کان لگا کر کسی مشین کے تیزی سے گھومنے کی خفیف سی آواز محسوس ہوئی جو شاید تم محسوس نہ کر سکو، اور خاص بات یہ ہے کہ سرنگ کے زیرِ زمین حصے کے آغاز پر ہی ٹھوس لوہے کی مضبوط جالی ہے جس کو کاٹنا یا اکھاڑنا مشکل ہو گا۔"

"کیا روشنی کا بندوبست بھی ہے وہاں؟" میں نے جلے کٹے لہجے میں سوال کیا۔

"میری آنکھیں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اندھیرے میں تم سے زیادہ دیکھ سکتی ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے چڑنے کے بجائے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ساری علامتیں بھی یہی بتاتی ہیں بس پروں کی کمی سے دھوکا کھا گیا۔"

اس نے زبان کھولنی چاہی لیکن میں نے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر نوکیلی سلاخ اسے تھما دی۔ "تختوں کے جوڑ تلاش کر کے انہیں اکھاڑنے کی کوشش کرو۔۔۔ بس بھری ہوئی الماری کو کوئی ضرب نہ پہنچے۔"

"اور تم مگدر ہلاؤ گے؟"

"دیکھتی جاؤ۔"

میں نے الماری کے پٹ کھول کر قبضوں کے قریب چند تیز مگر محتاط ضربیں لگائیں جن کے لیے آہنی صراحی بہت مناسب تھی۔

چند منٹ کی کوشش کے بعد الماری کا ایک پٹ اپنی جگہ چھوڑ بیٹھا اس اثنا میں سیتا بھی دو تختے اکھاڑ چکی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں لکڑی کے شکستہ تختوں کا ایک انبار جمع ہو گیا اور فرش میں بنی ہوئی سرنگ سامنے آگئی۔

سیتا نے اندھیرے میں جو کچھ دیکھا وہ بالکل درست ثابت ہوا۔ خالی ہونے والی جگہ پر فرش میں ایک تین فٹ گہرا اسٹیل کا گڑھا تھا جو ہر طرف سے بند تھا اور فرش کے متوازی زیرِ زمین جانے والی سرنگ کے دہانے پر آہنی سلاخوں کی موٹی جالی کنکریٹ میں دفن کر کے اتنی مضبوطی سے نصب کی گئی تھی کہ اسے توڑنے یا اکھاڑنے کا خیال ہی احمقانہ محسوس ہوتا تھا۔

"یہ تو تازہ ہوا کی آمد کا راستہ ہوا۔" میں نے سرنگ میں سے آنے والی تازہ ہوا کے خوشگوار تھپیڑوں میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب کہیں گندی ہوا کی نکاسی کی راہ بھی ملنی چاہیے۔ اس راستے کو تو چوبی سرنگ کے ذریعے فرش سے سات آٹھ فٹ اٹھا دیا گیا تھا لیکن نکلنے کی راہ فرش کی سطح پر ہی ہو گی۔"

"کیا یہ ضروری ہے؟" سیتا نے سوال کیا۔

"قطعی۔" میں نے کہا۔ "تازہ ہوا ہلکی ہوتی ہے اور گندی ہوا بھاری جو ہمیشہ فرش کے قریب ہی جمع ہوتی رہتی ہے۔"

"کوشش بے سود ہو گی۔" سیتا نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ انہوں نے ہوا کی آمد و رفت کے لیے سرنگیں استعمال کی ہیں۔ اس کی ساخت بھی ایسی ہو گی جب ہم اسے استعمال نہ کر سکے، تو اس سے کیا فائدہ اٹھا لیں گے۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اپنی توانائی بلاوجہ ضائع نہیں کرنی چاہیے۔"

ہم دونوں وہیں ایک تختے پر بیٹھ گئے۔

لکڑی کی عمودی سرنگ اور خاص زاویوں سے بنے ہوئے اس کے چار دہانوں کے خاتمے کے نتیجے میں ہوا کا بہاؤ قدرے تیز ہو گیا تھا مگر میں پوری کوشش کے بعد بھی دوسری طرف چلنے والے طاقتور پنکھے کی کوئی آواز نہ سن سکا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں یہیں رک کر ان لوگوں کی واپسی کا انتظار کرنا ہو گا۔" کچھ دیر بعد سیتا نے کہا۔ "خدا کرے کہ ان کے بارے میں تمھارے اندازے درست ہوں۔"

"اس قید میں قیاس آرائیوں کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم تو سگریٹ بھی پیے جا رہے ہو۔۔۔ مگر میں کیا کروں گی۔"

"سونے کی کوشش کرو۔" میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"نیند کا تو کوسوں دور بھی پتہ نہیں ہے۔"

"پھر تہ خانے میں کہیں خورد نوش کے سامان کا ذخیرہ تلاش کرو۔" یہ کہتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میری فرمائش پر ڈاکٹر آسٹن نے اپنی خوابگاہ سے اسکاچ کی نصف بوتل نکالی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ پینے کا کسی حد تک عادی تھا لہٰذا اس کے زیرِ زمین دفتر میں بھی شراب کی موجودگی ضروری تھی جہاں وہ دن کا بیشتر حصہ گزارا کرتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے سیتا کو لقمہ دیا۔ "ذرا بوتلوں کا بھی خیال رکھنا۔ یہاں ان کی بھی فراوانی ہونی چاہیے۔"

"ضرور رکھوں گی۔" وہ جاتے جاتے مڑ کر بولی۔ "مگر ایک بات بتا دوں کہ تمھاری ہر وقت کی یہ عادت مجھے پسند نہیں ہے۔"

میرے لیے اس پر تبصرہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ اس وقت میرا ذہن سرنگ کی آہنی سلاخوں سے نجات کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ اگر آہنی سلاخوں کو ہٹایا جانا ممکن ہوتا تو اس دو ڈھائی فٹ چوڑی سرنگ میں رینگ کر بآسانی اس کے دہانے پر پہنچا جا سکتا تھا جہاں کسی تدبیر سے پنکھے کو بند کر کے باہر نکلنا زیادہ دشوار نہ ہوتا۔

مختلف امکانات پر غور کرتے کرتے میرا دھیان لوہے پر تیزابی اثرات کی طرف گیا اور میں نے اٹھ کر وسیع تجربہ گاہ میں الماریوں میں سجی ہوئی بوتلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ابتدائی چند منٹ ہی میں مجھے اس اعتبار سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ وہاں ہر کیمیاوی مرکب کا نام الفاظ کے بجائے کیمیاوی اشاروں میں لکھا ہوا تھا۔

میں نے اپنے ذہن میں موجود تعلیمی دور کی ساری یادوں کو کھنگال ڈالا مگر دو چار عناصر سے زیادہ کوئی علامت یا اشارہ یاد نہ آسکا۔

پھر ٹہلتے ٹہلتے میری نگاہ زرد رنگ کے سیال سے بھرے ہوئے تنگ منہ کے ایک مرتبان پر پڑی اور اس پر لکھے ہوئے حرفی اشارے کا مفہوم اچانک یاد آگیا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا تھا تو وہ اٹھانوے فیصد قوت والا گندھک کا تیزاب تھا۔

میں نے احتیاط سے اس تیزاب کے چند قطرے فرش پر ٹپکائے اور سفید جھاگ اور بدبودار گیس کو محسوس کرتے ہی واپس سرنگ کے نودریافت دہانے کی طرف چل دیا۔

وہاں پہنچنے پر میرا سارا جوش بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

میرا ارادہ تھا کہ سلاخوں کے سروں کو بار بار تیزاب میں اچھی طرح تر کر کے میں چند گھنٹوں میں اتنا کمزور کر لوں گا کہ انہیں اکھاڑنا آسان ہو جائے مگر وہاں ہوا کے تیز بہاؤ نے میرا پورا منصوبہ چوپٹ کر دیا۔

عمودی چوبی راستہ ختم ہونے کے بعد ہوا بے ہنگم طریقے سے باہر آ رہی تھی اور سلاخوں پر تیزاب ڈالنے میں پورا خطرہ تھا کہ تیزاب کے ذرات ہوا کے ساتھ مل کر چہرے پر اور آنکھوں میں آ رہیں۔ اس کے علاوہ ہوا کے باعث تیزاب کا زیادہ دیر تک سلاخوں پر رک کر لوہے کو گلانا بھی ناممکن تھا مگر میں نے نیم دلی کے ساتھ ایک کوشش کا آغاز کر ہی دیا۔

ایک لمبی چھڑی کے سرے پر کافی مقدار میں روئی باندھ کر میں نے اسے اچھی طرح گندھک کے تیزاب میں تر کیا اور دور کھڑے ہو کر وہ روئی سلاخوں کے سروں پر پھیرنے لگا۔ تیزاب کے بخارات نے ہوا میں مل کر چند ہی ثانیوں میں پوری فضا کو آلودہ کر دیا۔

سیتا خوشی خوشی واپس لوٹی تو میں کئی بار روئی کو تیزاب میں تر کر کے اسے لوہے پر پھیر چکا تھا اور تیزابی بخارات کی جلن مجھے حلق سے آنکھوں تک میں محسوس ہو رہی تھی، ساتھ ہی آنکھوں سے پانی بھی بہہ رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟ حالت کیا ہو رہی ہے تمھاری؟" سیتا میری حالت دیکھ کر دور ہی سے چلا اٹھی۔ فضا میں رچی ہوئی بدبو اس نے وہاں بھی محسوس کی ہو گی۔

"تیزاب سے سلاخوں کو گلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ان مخدوش حالات میں بھی اپنے جواب کو خاصا احمقانہ محسوس کیا۔

"خدا کے لیے بند کرو یہ سلسلہ۔" وہ بے تحاشا کھانستی ہوئی میرے قریب آئی اور لکڑی میرے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دی۔ "بہت زہریلی بو ہے اس کی، ایسا نہ ہو کہ ہم خود ہی اپنے مرنے کا بندوبست کر لیں۔"

اس کا خوف قدرے حقیقی بھی تھا۔ میں نے کم از کم عارضی طور پر اپنی کوشش روک دینے کا فیصلہ کر لیا تاکہ فضا آلودگی سے پاک ہو سکے۔ اور میں سرنگ کے دہانے پر جا کر اپنے تجربے کا نتیجہ دیکھ سکوں۔

"کیبن میں صرف شراب ہے۔" اپنی کھانسی پر قابو پانے کے بعد وہ سینہ مسلتے ہوئے بولی۔ "البتہ باہر ایک ڈیپ فریزر میں کھانے کی اشیا کی بھاری مقدار موجود ہے۔"

"بڑی اچھی خبر ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے سینے میں جلن ہو رہی ہے شاید۔"

"میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں تم کیسے برداشت کر رہے تھے یہ سب۔"

"زہر پر زہر اثر نہیں کرتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے لے کر ڈاکٹر آسٹن کے کیبن کی طرف چل دیا۔

ڈاکٹر آسٹن کا کیبن ہر اعتبار سے بہت آرام دہ تھا لیکن وہاں اس سمیت تین لاشیں موجود تھیں جو ماحول کو ناخوشگوار بنا رہی تھیں لہٰذا ہم دونوں نے وہ لاشیں باہر نکال کر ایک طرف ڈال دیں تاکہ اس کمرے کو سکون کے ساتھ سستانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

کیبن میں رہتے ہوئے سیڑھیوں پر نگاہ رکھنی ضروری تھی تاکہ بے خبری میں صورتِ حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے لہٰذا میں نے سیڑھیوں کی سمت والی چوبی دیوار کا خاصا حصّہ توڑ دیا تاکہ سیڑھیوں پر براہِ راست نظر رکھی جا سکے۔

"کیبن سیڑھیوں سے خاصی دُور ہے۔" سیتا نے میری کارروائی کے اختتام پر کہا۔

اُس کی بات فوراً ہی میری سمجھ میں آگئی۔

اگر کوئی تہہ خانے میں اُترنے کی کوشش کرتا تو اسے بلا مزاحمت نیچے آنے اور صورتحال کا جائزہ لینے کی مہلت مل سکتی تھی کیونکہ ہمیں اس تک پہنچنے میں خاصی دیر لگ جاتی جب کہ حکمتِ عملی کا تقاضا یہ تھا کہ تہہ خانے کے دروازے میں جنبش ہوتے ہی ہم وہاں موجود ہوں تاکہ آنے والے کسی بھی شخص کو سنبھلنے کی مہلت دیے بغیر تیزی سے وار کیا جا سکے۔

میں نے بلیک ڈاگ کی ایک بوتل سنبھالی اور سیتا نے خورد و نوش کا کچھ سامان لیا اور ہم سیڑھیوں کی طرف چل دیے۔

تہہ خانے میں آنے والی پہلی سیڑھی کئی فٹ چوڑی تھی اور وہاں روشنی بھی معقول ہی تھی۔ لہٰذا ہم دونوں سیڑھیاں عبور کر کے وہیں پہنچ گئے۔

ماسک اور گیس کے سلنڈروں سمیت ضرورت کی ہر چیز ہمارے ساتھ موجود تھی۔

ہم دونوں کو وہاں بیٹھے بیٹھے خاصا وقت گزر گیا لیکن ہر طرف موت کا سکوت طاری رہا۔

تہہ خانے میں پھیلی ہوئی یکساں قدرتی روشنی میں وقت کا تصوّر مفقود تھا لیکن اکتاہٹ کے لمحات میں رسٹ واچ بتا رہی تھی کہ باہر دن ڈوب چلا تھا جس کا مطلب تھا کہ ہمیں اس زیرِ زمین قید خانے میں آتے ہوئے آٹھ گھنٹے سے زائد گزر چکے تھے۔

"اگر تمھارا اندازہ سرے سے غلط ثابت ہوا؟" سیتا نے میرے پہلو میں کروٹ بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے اندازے کچھ حقائق کی بنا پر قائم کیے ہیں اور میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ دو دن میں انہیں واپس لوٹنا چاہیے۔"

"دو دن؟" سیتا حیرت سے اچھل پڑی۔ "یعنی تم دو دن تک اس مقبرے میں رہنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو؟"

"مجبوری۔" میں ہنسا۔ "اس کے علاوہ تم کیا کر سکتی ہو؟"

"مجھے یوسف کی طرف سے پریشانی ہو گئی ہے۔" اسے پہلی بار خیال آیا۔ "شروع سے ہماری روانگی کے بعد سے وہ مسلسل لاپتہ ہے۔"

"بعض باتیں رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آتی جا رہی ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ اپنی کارگزاری دکھا چکا ہے۔"

"کیا؟" وہ حیرت سے اچھل پڑی۔ "کارگزاری دکھا چکا ہے۔"

"تمہیں یاد ہے کہ ناشتے کے دوران مائیکل ٹریپ کیا کچھ کہہ رہا تھا؟ وہ یوسف ہی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔" اس نے روا روی میں کہا پھر خود ہی چونک پڑی اور تحیر آمیز لہجے میں بولی۔ "خدا! تو تمھارا مطلب ہے کہ پچھلی رات اس عمارت میں ایک اجنبی کی گھس پیٹھ کی ناکام کوشش کے بارے میں وہ جھوٹا نہیں تھا۔"

"ہاں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "یوسف نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر قریب سے عمارت کا جائزہ لیا ہوگا مگر محافظوں کی وجہ سے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

"مگر اس میں کون سی کارگزاری نظر آ گئی تمہیں؟"

"اسے محافظوں نے بہت دیر سے دیکھا۔" میں نے کہا۔ "وہ پوری طرح جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوگا کہ وہ تنہا ان لوگوں کا کچھ بگاڑ نہیں کر سکتا لہٰذا یہاں سے واپسی کے بعد اس نے مائیکل کا حربہ اسی پر آزمانے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔"

"کون سا حربہ؟"

"جب ہم عبدالباقر کی حویلی میں پناہ گزین تھے تو مائیکل ٹریپ کو اس کی ذاتی فوج کی وجہ سے ہم پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں مل سکا تو اس نے فوجی حکام کو خبر دے دی کہ یمن میں ناکام فوجی بغاوت کا ایک مفرور سرخیل وہاں روپوش ہے اور فوجی وہاں چڑھ دوڑے۔ یوسف نے بھی اس عمارت کے بارے میں فوجی حکام تک ایسی ہی کوئی خبر پہنچائی ہوگی۔ تمہیں یاد نہیں کہ مائیکل ٹریپ کے آدمی نے ڈاکٹر آسٹن کو بتایا تھا کہ فوجی اندر داخل ہو کر عمارت کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔"

"تم ٹھیک ہی سوچ رہے ہو۔" وہ بڑبڑائی۔ "لیکن یہاں کی فوج تو کھلونا بنی ہوئی نظر آتی ہے، جو چاہے چابی گھما کر اسے حرکت میں لے آئے۔"

"یہ اتنا سہل بھی نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔"

"دیکھا جائے تو فوجی حکام مجرموں کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔"

"مائیکل ٹریپ کے بعد یوسف نے بھی دکھتی رگ کو چھیڑا ہوگا۔ سیاسی مجرم ہر غیر جمہوری حکومت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے چکر میں حکمرانوں سے ایسی احمقانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں جو عام حالات میں ایک بچہ بھی نہیں کر سکتا۔"

"بات درست ہی ہے تمھاری، یوسف پر تو حکومت کے خلاف ناکام بغاوت میں ملوث ہونے کا الزام ہے اس لیے مائیکل ٹریپ کامیاب ہو گیا تھا مگر یوسف نے انہیں کیسے اکسایا ہوگا؟"

"یہ نہ بھولو کہ وہ برسوں سے یہاں رہتا چلا آیا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کی نوعیت کی وجہ سے وہ درجنوں ایسے ناموں سے واقف ہوگا، جو حکومتِ وقت کے مفرور سیاسی ملزم ہیں، پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے انہیں اس عمارت میں خود اپنی ہی روپوشی کی خبر پہنچائی ہو۔"

آخری فقرے پر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "کاش کہ ایسا ہی ہو اور بعد میں انہیں بتایا جائے کہ وہ کس قدر مضحکہ خیز انداز میں آلۂ کار بنائے گئے تو وہ اپنا سر پیٹ کر رہ جائیں گے۔"

"فوج کسی بھی ملک کا سب سے قیمتی اور آخری اثاثہ ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہی وجہ ہے اسے گندی سیاست اور حکمرانوں کے من مانے تصرف سے دُور رکھا جاتا ہے کہ کوئی سربراہ اور وہ اہلکار اس کے وقار کو من مانے طریقے سے داؤ پر نہ لگا سکے۔"

"یہ سب تو اپنی جگہ درست ہی ہوگا لیکن اب ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟"

"دو دن۔ اڑتالیس گھنٹے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہم دروازہ توڑنے کی کوشش کا آغاز کر دیں گے۔"

اس غیر یقینی صورتِ حال اور مسلسل تھکان کے باعث ہم نے فیصلہ کیا کہ دونوں باری باری آرام کریں تاکہ دروازے کی مسلسل نگرانی کے ساتھ ہی کام اور آرام کے فطری توازن کو برقرار رکھا جا سکے۔

سیتا سونے کے لیے لیٹ گئی۔ آکسیجن ماسک اس نے پہن کر قدرے اوپر کیا ہوا تھا تاکہ ہنگامی صورتِ حال میں بیدار کیے جانے پر فوری طور پر بدترین صورتِ حال کے لیے تیار ہو سکے۔ احتیاطاً اس کو دیا ہوا پستول نما کیمیاوی ہتھیار میں نے واپس لے لیا تھا۔

تہہ خانہ مکمل سکوت میں ڈوبا ہوا تھا بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چھ افراد کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے والی موت کے مہیب سائے ہر طرف پھیل گئے تھے۔ وقت اپنی یکساں رفتار سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔

سیتا تہہ خانے کے دروازے کے قریب پہلی سیڑھی کے بجائے آخری سیڑھی کے پہلو میں فرش پر پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ یہ احتیاط اس لیے کی گئی تھی کہ تہہ خانے کا دروازہ خفیف سی آواز کے ساتھ محض چند سیکنڈ میں کھل سکتا تھا جب کہ یہ وقفہ گہری نیند سوئے ہوئے کسی انسان کے لیے بیدار ہو کر کسی خطرناک صورتِ حال کے مقابلے کے لیے تیار ہونے کے لیے ناکافی تھا۔ اگر باہر سے کوئی آ ہی جاتا تو سیتا کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا جب کہ داخلی راستے سے دُور ہونے کی بنا پر اسے اپنے حواس مجتمع کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔

کافی وقت گزارنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ خود میرے لیے بھی داخلی راستے کے عین سامنے رُکے رہنا اس اعتبار سے خطرناک تھا کہ دروازہ کھلتے ہی آنے والوں کے نشانے پر ہوتا اور قوی امکان تھا کہ ان کی نفری زیادہ ہوتی تو ایک دو کو زہریلی گیس کا نشانہ بناتے ہی بچنے والوں میں سے کسی کے ہاتھوں مجھے جسمانی طور پر تشدد یا ہتھیار کا نشانہ بننا پڑتا۔

میرا یہ خیال بہت بروقت ثابت ہوا۔

میں دیوار کے اس حصّے کی اوٹ میں چلا گیا جس میں دستہ نصب تھا کیونکہ وہ حصہ دروازہ پیچھے چلے جانے کے بعد بھی اپنی جگہ قائم رہتا تھا۔ جگہ تبدیل کرنے کے محض چند منٹ بعد خفیف سی آواز ہوئی، اور دیوار کا وسطی حصہ تیزی سے پیچھے چلا گیا۔

میرا دل یکبارگی دھڑکنے لگا۔

دیوار نے جوں ہی اپنی جگہ چھوڑی، کسی خودکار سوئچ کے ذریعے تہہ خانے کی بیشتر روشنیاں گل ہو گئیں۔ یہ احتیاطی تدبیر میں نے اسی وقت نوٹ کر لی تھی جب میں ڈاکٹر آسٹن کے ساتھ قیدی کے طور پر لایا گیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ دروازہ دوبارہ بند ہوتے ہی وہ روشنیاں خود بخود جل اٹھیں گی۔

دیوار میں پیدا ہونے والے راستے کی دوسری جانب چند سیکنڈ تک سنسنی خیز سکوت طاری رہا۔ میں نے ماسک چہرے پر گرا کر آکسیجن کا والو ضرور کھول لیا لیکن زہریلی گیس کے نوزل کے بجائے پستول نما ہتھیار سنبھالنے ہی پر اکتفا کیا کیونکہ اس وقت سیتا اوپر کے حالات سے بے خبر نیچے سوئی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ماسک نہ ہونے کی وجہ سے زہریلی گیس کے بخارات اسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔

"تجربہ گاہ میں گہرا سکوت ہے۔" خلا کے اس پار سے مدھم سی مردانہ آواز اُبھری جس میں تجسّس کے ساتھ بے یقینی بھی تھی۔

"ڈاکٹر آسٹن بہت خبیث ہے۔" اس بار میں نے مائیکل ٹریپ کی آواز پہچان لی۔ "قیدیوں کو بے ہوش کر کے خود بھی آرام کر رہا ہوگا۔"

پھر قدموں کی ہلکی سی دھمک میں تین افراد اس خلا میں سے گزر کر اندر آ گئے۔ ان کے قدموں کی پہلی جھلک دیکھتے ہی میں نے فوری طور پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اندر آنے کے بعد راستہ دوبارہ بند کرنے کے لیے اندر کے دیوارگیر دستے کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔

اور ہُوا بھی یہی۔

اندر پہنچتے ہی ایک کا رُخ اس سمت میں ہُوا تھا۔ وہاں مجھے ماسک میں موجود دیکھ کر اس کے حلق سے تیز تحیر آمیز آواز بلند ہوئی تھی مگر اسی لمحے میں نے بائیں ہاتھ سے دیوارگیر دستہ باہر کھینچا اور ان کی واپسی کی راہ مسدود کر دی اور اسی کے ساتھ پستول نما ہتھیار کا ٹریگر بھی دبا دیا۔ اس کی نال کے ننھے سے سوراخ سے ہلاکت آفریں سیال کی پتلی سی دھار نکلی اور اس کے پیٹ میں سے گزرتی چلی گئی۔

اس کے حلق سے کربناک چیخیں نکلیں جیسے کسی نے اسے الاؤ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا ہو اور وہ گر کر سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔

میں نے اس کارروائی کے فوراً بعد پستول کی نال کا رُخ ان دونوں کی طرف کر دیا تھا جو اپنے ساتھی کی تحیر زدہ چیخ سن کر تیزی سے میری طرف گھومے تھے۔

تہہ خانے کا دروازہ بند ہونے پر ساری روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

اور فضا میں دُھندلی سی آسیب زدہ روشنی کے بجائے تیز اجالا پھیل گیا تھا۔

"ہاتھ اُوپر اٹھاؤ۔" میں نے نال کو جنبش دے کر تیز تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم کو پچھتانا ہوگا۔" مائیکل ٹرمپ نے آہستہ آہستہ ہاتھ اُوپر کرتے ہوئے کہا۔

وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ اس مرحلے پر بساط الٹنے کا اندازہ نہ کر سکا ہو مگر پھر بھی اپنے لہجے میں رعب پیدا کر کے وہ خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"زبان بند رکھو۔" میں غصیلے انداز میں ایک قدم آگے لپک کے غرایا اور مائیکل کا ساتھی بُری طرح سہم گیا جب کہ مائیکل پر محض سرسری سا اثر ہوا۔

اس وقت میں نے اپنے مجنونانہ رویے سے ان دونوں کو بجا طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اگر انہوں نے میرے احکام سے ذرا بھی انحراف کیا تو فوری طور پر کوئی بھی انتہائی اقدام کر بیٹھوں گا ___ میرے اس رویّے کو اُن کے اس ساتھی کی حالت سے تقویت ملی تھی جو تہہ خانے کے فرش پر پہنچنے کے بعد بھی کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخے جا رہا تھا۔

"باقی کہاں رہ گئے؟" اچانک نیچے سے سیتا کی آواز اُبھری۔ اور میرے وجود میں سکون کی لہر سرایت کر گئی۔

بیدار ہونے کے بعد وہ نہ صرف صورتِ حال کا اندازہ کر چکی تھی بلکہ شاید گیس ماسک بھی پہن چکی تھی کیونکہ اس کی آواز کسی حد تک بھاری محسوس ہوئی تھی۔

"ایک نیچے بھیج رہے دو قبضے میں ہیں۔" میری آواز سن کر وہ اوٹ سے سامنے آ گئی۔ عملاً اس وقت وہ نہتی تھی اور سامنے آنے سے پہلے حالات کے رُخ کا اندازہ کر کے اُس نے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔

"نیچے اُترو۔" میں نے غرا کر اُن دونوں کو حکم دیا۔

مائیکل ٹرمپ کے ساتھی کے چہرے پر تو ہوائیاں اُڑنے لگیں اور اس نے مشینی انداز میں میرے حکم کی تعمیل کی تھی لیکن مائیکل کے تیور کچھ خطرناک نظر آ رہے تھے یا کم از کم وہ ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نیچے اُترتے ہوئے میں اُن دونوں کی پشت پر تھا لہٰذا . . . .

میں نے پستول نما ہتھیار کے بجائے انہیں گیس نوزل کی زد پر لے لیا۔

مائیکل ٹرمپ کی چال میں کچھ ایسی تمکنت تھی کہ وہ مجبور قیدی نظر نہیں آ رہا تھا بے اختیار مجھے طیش آ گیا اور میں نے پھرتی سے دو سیڑھیاں عبور کر کے اس کی پشت پر لات جمائی اور وہ بُری طرح نیچے لڑھک گیا۔

نیچے لڑھکتے ہوئے بھی اُس کے کس بل برقرار رہے کیونکہ چوٹوں سے بے پروا وہ بُری طرح بکتا رہا۔

فرش پر پہنچتے ہی وہ حیرت ناک سرعت سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی داہنی کنپٹی پھٹ چکی تھی جس سے بہنے والا خون اُس کے لباس کو داغدار کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر آسٹن کہاں ہے؟" وہ مجھے نفرت آمیز نگاہوں سے گھورتا ہوا غرایا۔

میں نے مائیکل کو اُس کے نجی حوالے سے ڈاکٹر آسٹن کا جو پتہ بتایا وہ ہر اعتبار سے اس کے لیے ناقابلِ رسائی تھا۔

"دیکھوں گا یہ ساری ہرزہ سرائی۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "اس وقت جو جی چاہے کر لو مگر آخر کار یہی تہہ خانہ تمہارا مقبرہ بنے گا۔ ڈاکٹر آسٹن کو بھی بڑا گھمنڈ تھا اپنی قوت اور تدبیر پر۔"

میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن اس وقت وہ عبرت کا شاہکار بنا ہوا ہے۔"

اسی لمحے سیتا میرے قریب آ گئی اور پستول نما ہتھیار میں نے اس کے حوالے کر دیا۔

"بلا وجہ شور کر رہا ہے۔ ختم کر دوں اسے؟" سیتا نے پستول لیتے ہی مجھ سے مائیکل ٹرمپ کے زخمی ساتھی کے بارے میں پوچھا۔

"ہاں ___ اور ذرا اس کی بھی ایک ٹانگ گلا دو تاکہ اس کی خوش فہمیاں رفع ہو سکیں۔" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

سیتا مائیکل کے عقب میں گئی مگر وہ تیزی سے اسی طرف گھوم گیا۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھنے کے بعد اسے پستول نما ہتھیار کی تباہ کاری کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

سیتا نے جوں ہی ٹریگر دبانے کے لیے اپنا ہاتھ سیدھا کیا۔ مائیکل ٹرمپ یکلخت پوری قوت سے اس کی طرف دوڑ پڑا لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے ہی فرش پر گر گیا۔ سیتا نے بہترین نشانہ بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی داہنی پنڈلی ناکارہ کر دی تھی۔

گرتے ہوئے اس کے حلق سے کسی بھیڑیے جیسی غراہٹ آزاد ہوئی تھی مگر اس نے کسی قسم کی چیخ پکار نہیں کی تھی۔

سیتا کے کیمیاوی فائر کے نتیجے میں مائیکل ٹرمپ کی پنڈلی کے وسط میں سوراخ ہوا تھا۔ جو بتدریج بڑھتا گیا اور پھر نچلا حصہ گل کر الگ ہی ہو گیا اس اثنا میں سیتا تڑپتے ہوئے پہلے شکار کے دل کو نشانہ بنا کر اسے جہنم واصل کر چکی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تم دونوں کے علاوہ کوئی زندہ نہیں بچا ہے۔" چند ثانیوں بعد مائیکل ٹرمپ پُرسکون لہجے میں بولا۔

اس کی آنکھوں سے اذیت کا اظہار ہو رہا تھا لیکن زبان سے اُس نے اُف تک نہیں کی تھی البتہ اس کے تند و تیز لہجے میں تبدیلی ایک اعتبار سے شکست کا اظہار تھی۔

"یہ تو تمہیں اندر قدم رکھتے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"پھر انتظار کس بات کا ہے؟" وہ گڑگڑا کر بھیک میں زندگی طلب کرنے والوں میں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

"زندگی سے اس قدر مایوس ہو؟"

"مجھے کس لیے زندہ رکھنا چاہو گے؟" اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "میں نے تمہیں پکڑوایا مگر مقدر نے تمہیں بازی الٹنے کا موقع دے دیا ... اتنا شاید تم بھی سمجھ چکے ہو گے کہ کسی بھی طرح میری زبان نہیں کھلوا سکو گے؟"

"اور اگر تمہیں زندہ حالت میں حکام کے حوالے کر دیا جائے؟"

"مقدمہ چلا کر بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بس بے مقصد تشدد ہوتا رہے گا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی داہنی ران دباتے ہوئے بولا۔ "حیرت ہے کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔"

"بس کہ زندہ رہو گے تو شاید دوسروں کو عبرت ہوگی۔"

"دشمن کو سسکا کر مارنا کم ظرفی کی نشانی ہوتا ہے، مارنا ہے تو بس مار دو۔"

"اسرائیل لے جا کر تم میرے ساتھ کون سا بہتر سلوک کروانے والے تھے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تمہارا ہاتھ پیروں سے محروم بدن صبح کوڑے کے کسی ڈھیر پر کراہتا ہوا ملے۔"

اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور پیشانی پر وریدیں اُبھر آئیں ___

"شاید پہلے تمہارے ہاتھوں کسی اسرائیلی کا یہ حشر ہو چکا ہے۔" تمہارے ذریعے تمہارے آقاؤں کی یاد تازہ ہو جائے گی کہ صفدر نہ صرف زندہ ہے بلکہ پہلے ہی جتنا بالا دست بھی ہے۔"

میں نے لحظہ بھر سوچا، اس کا زندہ رہنا خطرناک ہی ہوتا۔ اس کے ذریعے تجربہ گاہ کے خاتمے کی حقیقی کہانی اسرائیل تک پہنچ سکتی تھی جب کہ عینی شاہدوں کے خاتمے کے بعد اس عمارت کی بربادی کا راز اسرائیلیوں کے لیے ہمیشہ کی خلش بن جاتا۔

"باہر تمہارے کتنے آدمی ہیں؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"نکلو گے تو گن لینا۔" وہ کہیں بھی کمزوری دکھانے کو تیار نہ تھا۔

"اور عمارت میں کدھر سے داخل ہوئے؟"

"پھاٹک سے نکل کر طواف کرو گے تو سب سامنے آ جائے گا۔" اُس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "یہاں سے زندہ سلامت نکلنا تمہارے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

وہ وقت برباد کر رہا تھا اور میری تشویش بلکہ سوالوں کے جواب سے انکار کے ذریعے وہ مجھ پر اپنی برتری کا احساس کر رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے کچھ ساتھی اگر باہر موجود تھے تو زیادہ وقت گزرنے پر وہ ہوشیار ہو سکتے تھے، لہٰذا مناسب یہی تھا کہ ہم پہلی فرصت میں تہہ خانے کی بند فضا سے نجات حاصل کرتے۔

میں نے اپنے نوزل والے ہاتھ کو جنبش دے کر سیتا کو اشارہ کیا اور پھر زہریلی گیس کے سلنڈر سے منسلک نوزل کا لیور دبا دیا۔

اس خطرناک ہتھیار کو میں پہلی بار استعمال کر رہا تھا لہٰذا میرے دل میں عجیب سا خوف سمایا ہوا تھا۔ نوزل کا رُخ اس وقت مائیکل کے ساتھی کی طرف تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی گیس نوزل سے نکل کر کافی قوت سے سامنے چاروں طرف پھیلی تھی اور آناً فاناً میں اپنے شکار کو نرغے میں لے لیا تھا۔

یہ بہت اچھا تھا کہ وہ گیس تیز رنگ لیے ہوئے تھی کیونکہ اس طرح متاثرہ علاقے کا آسانی کے ساتھ تعین کیا جا سکتا تھا۔ اور نوزل سے خارج ہونے والی گیس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ چند ثانیوں کے بعد جب میں نے نوزل کے لیور پر سے دباؤ ہٹایا تو مجھ سے تین چار فٹ دور تک فضا صاف تھی البتہ اس سے آگے نیلی دھند کی پھیلتی ہوئی لکیر قائم تھی۔ جو بتدریج نیچے بیٹھتی جا رہی تھی اور اس میں گھرا ہوا شخص آسیبی ہیولا نظر آ رہا تھا۔

گیس کی پہلی بوچھار ہوتے ہی اس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ یوں نیچے آ رہے جیسے انہیں اٹھائے رکھنے والے عضلات کسی تیز دھار چھری سے اچانک کاٹ دیے گئے ہوں اگلے ہی لمحے اس کی پنڈلیاں کپکپانے لگیں اور جسم یوں آہستہ آہستہ ایک طرف جھکنے لگا جیسے وہ سلو موشن میں ایک پہلو پر گرنے کی اداکاری کر رہا ہو۔

"یہ کیا کیا تم نے ... میرا دم گھٹ رہا ہے، بدن سُن ہوا جا رہا ہے۔" اس کی آواز بے حد ڈراؤنی ہو گئی تھی کیونکہ وہ ناک کے بل الفاظ کو کھینچ کھینچ کر بول رہا تھا۔

یہ تصور کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ڈاکٹر آسٹن اس تجربہ گاہ میں مفلوج کرنے والی گیسوں کے علاوہ ایسی مہلک گیسیں بھی ایجاد کر رہا تھا جو بموں کے ذریعے شہروں میں بکھیری جائیں تو بھری پُری آبادیاں اسی شخص کی طرح دردناک موت سے دوچار ہو جائیں ___ جانوروں اور حشرات الارض سمیت انسانی آبادیوں کی اجتماعی موت کا وہ تصور قابلِ نفرت حد تک سفاکانہ اور غیر انسانی تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" مائیکل ٹرمپ کی آواز میں پہلی بار تشویش کے آثار اُمڈ آئے۔ وہ خوف اور حیرت سے نیلی دھند میں گرتے ہوئے اپنے ساتھی کو دیکھے جا رہا تھا۔

"تمہارے لیے تو یہ عجوبہ نہیں ہونا چاہیے۔" سیتا نے طنزیہ لہجے میں کہا مگر میں خاموش رہا کیونکہ موت کی اس دہشتناک فضا میں مائیکل ٹرمپ کی آواز میرے لیے خیال افروز ثابت ہوئی تھی اور مجھے ایک نئی راہ سوجھ گئی تھی۔

اس تہہ خانے میں ہوا کی غیر محسوس سی گردش باہر لگے ہوئے طاقتور

پنکھوں اور زیرِ زمین سرنگوں کے ذریعے برقرار تھی مگر ہوا کا وہ بہاؤ مجموعی طور پر اتنا ناکافی تھا کہ موت کی نیلی دھند کو منتشر نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ نیلی دھند جہاں تھی وہیں ٹھہری ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ نیچے بیٹھتی جا رہی تھی۔ اس میں گھرا ہوا شخص زہریلے بخارات کے زیرِ اثر ایک ایسے عمل سے دوچار ہو چکا تھا جو میرے لیے بھی بالکل نیا تھا لیکن مجھے یہ یقین تھا کہ اس کا انجام صرف اور صرف موت ہی تھا جب کہ مائیکل ٹرمپ کسی حفاظتی ماسک وغیرہ کے بغیر گیس کے حصار سے تھوڑی دُور معذوری کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا تھا لیکن گیس نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ ماسک وغیرہ کے بغیر بھی احتیاط کے ساتھ اس حربے کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔

دُھند میں گھرا ہوا شخص المناک صورتحال سے دوچار تھا۔ اُس کے فرش پر گرنے تک کا وقفہ جو شاید ایک سیکنڈ سے بھی کم رہا ہوگا مجھے بہت طویل محسوس ہوا۔ دم گھٹنے کے باعث اُس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ چہرے، گردن اور جسم کے کھلے ہوئے حصّوں کی وریدیں کسی ماس خور بیل کی نیلی شاخوں کے جال کی طرح اُس کی جلد پر ابھر آئی تھیں۔ خدوخال بھیانک انداز میں مسخ ہو کر رہ گئے تھے۔ پورا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اور آنکھیں یوں پھٹ پڑنے کے قریب ہو گئی تھیں جیسے وہ اپنی پوری قوت صرف کر کے بھی سانس لینے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا ہو۔

"اُف" سیتا نے بے اختیار اپنا منہ دُوسری طرف کر لیا۔ "کس قدر بھیانک منظر ہے انسانی بے بسی کا۔"

اس وقت تک میری پُوری توجہ مرنے والے کی طرف مرکوز تھی۔

سیتا نے جوں ہی اپنا منہ دُوسری طرف پھیرا، فرش پر پڑے ہوئے مائیکل ٹرمپ کو موقع مل گیا۔

ایک دھماکے سے گولی چلی اور میرے بائیں شانے کی جلد ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ اس وقت میرا ذہن اس حد تک حاضر تھا کہ مجھے تکلیف سے پہلے صورتِ حال بگڑنے کا احساس ہوا اور میں پھرتی سے سینے کے بل فرش پر گر گیا کیونکہ پشت پر دو عدد سلنڈر لدے ہوئے تھے۔

دُوسری گولی پل بھر کے بعد چلی تو میرے جسم کا کوئی حصہ اس بلندی پر نہیں تھا جہاں سے گولی گزری تھی۔

میں نے اس معذور مکار کو تیسرے فائر کی مہلت دیے بغیر نوزل سنبھال کر اس پر نیلی دُھند کی بوچھار کر دی۔

تیسرے فائر کے لیے وہ کہنیوں کے بل فرش سے اٹھ رہا تھا تاکہ مجھ پر کاری ضرب لگا سکے لیکن اس ہولناک گیس نے آناً فاناً میں اسے مفلوج کر دیا اور وہ دوبارہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میں سیدھا ہو گیا۔ اس وقت سیتا ششدر سی کھڑی ہوئی تھی۔ جو کچھ ہوا وہ اس قدر غیر متوقع طور پر اور اتنی تیزی سے ہوا کہ سیتا کو کچھ سمجھنے یا فیصلہ کرنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی۔

میں آگے بڑھا تو مائیکل فرش پر پڑا مجھے ہی گھور رہا تھا۔ اذیت اور جانکنی کے عالم میں اس کی آنکھوں سے قہر اور نفرت کے کوندے لپک رہے تھے۔

وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا آخری وقت آ گیا تھا لہٰذا وہ میرے بارے میں اپنے دلی جذبات چھپانا نہیں چاہتا تھا۔

پھنسے پھنسے سانسوں کے دوران ڈراؤنی آواز میں اس نے پے در پے کئی غلیظ گالیاں دیں اور پھر موت کے خلاف لڑنے میں مصروف ہو گیا۔

اس وقت تک پہلا ساکت ہو چکا تھا۔ اس پر پھیلی ہوئی دھند فرش سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر ہی رہ گئی تھی لیکن فرش کے قریب اس کا پھیلاؤ بڑھ گیا تھا۔

مائیکل ٹرمپ بہت عیار شخص تھا۔ اپنے ساتھی کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس نے یہ نوٹ کر لیا تھا کہ گیس کے حصار میں جان بچنا محال ہے لہٰذا اس نے پُوری قوت صرف کر کے کسی نہ کسی طرح اپنا سر گیس کی چادر سے باہر نکال لیا لیکن اس وقت تک زہریلی گیس کی جتنی مقدار اس کے نظام میں داخل ہو چکی تھی وہ اپنا کام دکھا رہی تھی۔

میں حالانکہ ماسک پہنے ہوئے تھا اور خالص آکسیجن میں سانس لے رہا تھا لیکن اس زہریلی گیس کے قریب جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں وہ غبارِ تنفس کے ساتھ جسم کے مساموں کے راستے بھی اثر نہ کرتا ہو۔

مائیکل ٹرمپ کا پستول اس وقت بھی فرش پر اس کی ہتھیلی کے نیچے دبا ہوا تھا مگر میں بڑھ کر اسے ٹھوکر مارنے کی ہمت نہ کر سکا۔

میں نے مائیکل پر گیس کی قدرے کم مقدار چھوڑی تھی لہٰذا میں نے محفوظ فاصلے سے دوبارہ نوزل سنبھالا اور اس کے چہرے کی سمت میں دوبارہ گیس چھوڑ دی۔

اُس وقت مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی صحت مند انسان کے بجائے ایک طاعون زدہ چوہے کی لاش پر جراثیم کش دوا چھڑک رہا ہوں۔

اور درحقیقت یمن میں ٹکرانے والی اسرائیلیوں کی وہ ٹولی طاعون زدہ چوہوں سے کم نہیں تھی۔ وہ لوگ بھی اس تہہ خانے میں بدترین قسم کی وبائی اموات پھیلانے کے منصوبے اور ذرائع ایجاد کر رہے تھے جو ہر اعتبار سے ناقابلِ معافی جرم تھا۔

اگر موت کے بعد زندگی دینا قدرت نے کسی کے اختیار میں دیا ہوتا تو اس گروہ کا ہر رُکن اس قابل تھا کہ اسے بار بار نت نئے بدترین طریقوں سے ہلاک کر کے موت کی حقیقی اذیت سے آگاہ کیا جاتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا، پھر بھی مجھے اتنی خوشی تھی کہ اس گروہ کے کم از کم چار آدمی ہمارے ہاتھوں روایتی ہتھیاروں کے بجائے اپنی شرمناک ایجادات کے شکار ہوئے تھے۔

ہم اس وقت تک وہاں رُکے رہے جب تک مائیکل ٹرمپ کے بھی دہانے، ناک اور کانوں سے خون کی پتلی پتلی لکیریں نہ بہہ نکلیں۔ دُوسروں کے لہو کی ہولی کھیلنے والوں کو اپنے لہو کو محسوس کرا کے ہم واپس ہو لیے۔

"تمہارا بازو زخمی ہے۔ ابھی تک خون بہہ رہا ہے" سیتا نے میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"جلد ادھڑی ہے، فی الحال اسے بھول جاؤ۔ اس وقت ہمارا باہر نکلنا ہر کام پر مقدم ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور بڑھ کر دیوار گیر دستہ اپنی طرف کھینچ لیا۔

ہلکی سی آواز کے ساتھ دیوار کا سامنے والا حصّہ فرش میں دھنستا چلا گیا۔ ہم دونوں چند ثانیوں تک اوٹ میں چھپے رہے لیکن باہر حسبِ توقع کوئی موجود نہیں تھا جو کوئی آہٹ وغیرہ سُنائی دیتی۔ لہٰذا ہم اطمینان سے کمرے میں داخل ہو گئے۔

اُدھر پہنچ کر ہم نے تہہ خانے کا دروازہ دوبارہ بند کر دیا جس کے عقب میں نو لاشیں موجود تھیں۔ اُن کا خیال آتے ہی میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پندرہ بیس گھنٹوں میں نو خون دو نفری جماعت کے لیے ناقابلِ یقین محسوس ہوتے تھے مگر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہم ناگزیر حالات میں اپنی زندگی اور بقا کے لیے اس ہولناک خونریزی کے مرتکب ہوئے تھے اور ہمارا نشانہ بننے والوں میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو سولی سے کم سزا کا مستحق ہو۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا معاشرتی اعتبار سے معیوب ضرور ہے لیکن مخصوص حالات میں مقدر کو انسان اس راستے پر دھکیل ہی دیتا ہے۔

تہہ خانے کا دروازہ بند ہونے کے بعد وہاں سے آنے والا روشنی کا مدھم سا اُجالا بھی معدوم ہو گیا اور ہم دونوں گھور اندھیرے میں کھڑے رہ گئے۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو چمکتی ہوئی سوئیاں ایک دوسرے کے قریب موجود صبح کے سوا چار بجا رہی تھیں۔

ہم دونوں کچھ دیر تک وہیں کھڑے خاموشی سے سُن گن لیتے رہے لیکن تاریک عمارت میں ہر طرف بھیانک ویرانی کا راج تھا۔ جیسے وہاں کے سارے مکینوں کو موت چاٹ گئی ہو۔ پھر سیتا نے اپنے کان فرش پر لگا دیے۔

"مدھم سی زناٹے کی آواز کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" چند سیکنڈ بعد اس نے مایوسانہ لہجے میں اعلان کیا۔

وہ بھی اندازہ کر چکی تھی کہ زناٹے کی آواز ان پنکھوں ہی کی ہو سکتی تھی جو عمارت کے کسی دور افتادہ حصّے میں تہہ خانے کو ہوا پہنچانے اور گندی ہوا کھینچنے کے لیے چل رہے تھے۔

سوال یہ تھا کہ اب کدھر کا رُخ کیا جائے؟

"ہو سکتا ہے کہ مائیکل ٹرمپ کسی خفیہ راستے سے آیا ہو" سیتا نے

دھیمی آواز میں کہا۔ "ہمیں اسی کو تلاش کرنا چاہیے۔"

"اس وسیع و عریض عمارت میں اندھیرے میں کہاں ٹکریں مارتے پھریں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "بہتر تو یہی ہے کہ نکاسی کے لیے صدر دروازہ استعمال کیا جائے۔"

"صدر دروازہ؟" سیتا نے حیرت سے دہرایا۔ "تو کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ فوجیوں نے اپنی کارروائی کے بعد یہاں پہرہ بھی برقرار نہ رکھا ہوگا؟"

"پہریدار ہوں بھی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ اس تجربہ گاہ کے خاتمے کے لیے ہمیں مقامی حکام سے رجوع کرنا ہی پڑے گا۔"

"ہم مشکلات میں نہ گھر جائیں؟"

"اسرائیلی تجربہ گاہ کی موجودگی کی خبر ملتے ہی شاید ہمارے سارے پچھلے گناہ تک معاف کر دیے جائیں۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "مقامی حکام کے رویّے کے بارے میں اب میں بے فکر ہو چکا ہوں — وہ ضرور ہم سے تعاون کریں گے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" وہ کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھی۔ "ویسے شاید کوئی پہرہ نہیں ہے۔ پہرے دار ہوتے تو پنکھوں کی طرف ضرور متوجہ ہوتے کیونکہ ان کا تعلق ایک زیرِ زمین سرنگ سے ہے۔"

"قیاس آرائیوں میں وقت برباد نہ کرو۔" میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا اور آکسیجن بند کر کے ماسک اپنے چہرے سے اٹھا دیا۔

سیتا نے بھی میری تقلید کی اور ہم اندھیرے میں احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔

کمرے سے نکل کر راہداری میں پہنچے تو وہاں بھی تاریکی اور ایسا بھرپور سکوت طاری تھا جیسے ہم سے پہلے برسوں وہاں سے کسی ذی روح کا گزر نہ ہوا ہو۔

اندھیرے میں مختلف کمروں اور راہداریوں میں بھٹکنے کے بعد یادداشت کے سہارے ہم آخر کار نکاسی کی سمت میں جا ہی نکلے جہاں کھلے ہوئے دروازے کی خلا میں سے تاریک برآمدہ اور ویران احاطہ نظر آ رہا تھا۔

ہم رکے بغیر آگے ہی بڑھتے رہے۔

"کون ہے؟" اچانک برآمدے میں سے ایک گھبرائی ہوئی تیز آواز ابھری اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ دیوار سے چپک گئے۔

وہ آواز تاریکی میں اپنے ساتھیوں کے انتظار میں مستعد بیٹھے ہوئے مائیکل ٹریپ کے کسی ماتحت کی ہرگز نہیں تھی کیونکہ اس للکار میں سنسنی، اختلاج اور چیلنج کے تاثرات مفقود تھے۔ بالکل یوں محسوس ہوا تھا جیسے گہری نیند سویا ہوا کوئی شخص آہٹیں سن کر بوکھلا کر بیدار ہو گیا ہو اور غیرارادی طور پر آواز دے بیٹھا ہو۔

"ہم فوجی ہیں۔" میں نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر جواب دیا۔ "ہتھیار پھینک کر ہمارے سامنے آ جاؤ ورنہ گولی مار دیں گے۔"

"گدھے کی اولاد!" جھلائی ہوئی آواز آئی۔ "تم کون سے گنر لنٹے ہو۔ یہاں ہم دو فوجی پہرے پر ہیں اور دونوں ساتھ موجود ہیں۔ عمر۔۔۔ یا عمر۔۔۔!" تنا کہ کر شاید وہ اپنے ساتھی کو جگانے لگا جس کی نیند اس وقت تک خراب نہیں ہوئی تھی۔

"بس ہم یہی جاننا چاہتے تھے۔" میں نے بلند لہجے میں کہا۔ "ہم فوجی نہیں لیکن تمھارے دوست ہیں اور باہر آ رہے ہیں۔"

"آؤ۔" اس کی آواز میں غراہٹ ابھر آئی۔

"سنو! ہم تمھارے چھاپے کے وقت یہاں قید تھے۔" میں نے اس کے رویّے میں خطرے کا عنصر بھانپتے ہوئے کہا۔ "بڑی مشکل سے اب رہائی ملی ہے۔ امید ہے کہ تم ہمارے ساتھ بُرا سلوک نہیں کرو گے۔"

"اب باہر آ بھی چکو۔" یہ دوسری آواز تھی۔ شاید اپنی نیند خراب ہونے پر وہ بہت زیادہ جھنجلایا ہوا تھا۔ "بُرا یا بھلا سلوک تو اسی وقت ہوگا جب دروازے سے تمھاری ولادت ہو۔ اب اندر کیوں مرے ہوئے ہو؟ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔"

اسی کے ساتھ برآمدے میں تیز روشنی پھیل گئی جس کا مخرج ضرور باہر تھا لیکن اس کا رخ کھلے ہوئے دروازے میں سے اندر کی طرف تھا تاکہ وہ دونوں باہر نکلنے سے پہلے ہمیں دیکھ لیں۔

سیتا نے اپنا پستول نما ہتھیار لباس میں کہیں چھپا لیا اور ہم دونوں اپنے ہاتھ سروں سے اوپر اٹھا کر باہر کی طرف بڑھنے لگے۔

جونہی ہم دونوں نے دروازے سے باہر قدم رکھا اچانک رائفلوں کی نالیں اتنی شدت سے ہمارے پہلوؤں میں اڑائی گئیں کہ ہم دونوں ہی بیک وقت کراہ اٹھے۔

ہمارا جائزہ لینے کے بعد وہ دونوں فرض شناس فوجی دروازے کے دائیں بائیں چھپ گئے تھے اور اسی مورچے سے انہوں نے وہ ماہرانہ جنگی کارروائی کی تھی۔

پھر روشنی میں ایک نے ہم دونوں کو اپنی زد میں لے لیا۔ دوسرا ناقدانہ نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لینے لگا۔

پھر اچانک اس نے اپنی رائفل کی نال ماسک میں اٹکا کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ "یہ کیا مصیبت ہے۔ کیا غوطہ خوری کر رہے تھے اندر؟"

"ہم تمھارے کمانڈر سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں نے اپنی تضحیک برداشت کرتے ہوئے پُرسکون لہجے میں اپنا مدعا بیان کیا۔

"کمانڈر!" وہ دونوں یوں ہنسے جیسے میں نے کسی ناقابلِ رسائی ہستی کا نام لے دیا ہو۔ پھر ایک بولا۔ "تمھارا فیصلہ تو سارجنٹ ہی کرے گا اور وہ بھی صبح نو بجے سے پہلے نہیں ملے گا۔۔۔ مگر تم سچ سچ بتاؤ کہ ہماری آنکھ بچا کر اندر کب گھسے تھے؟"

اس احمقانہ سوال پر میرا خون کھول کر رہ گیا۔ "ہم شروع ہی سے اندر تھے۔" "تم جھوٹے ہو۔" اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہ رہا تھا، اس کی محدود سی کھوپڑی کی رسائی وہیں تک تھی۔ "صبح اس عمارت کا چپہ چپہ چھانا گیا تھا۔ شاید تم دونوں نے یہ جادوئی ٹوپیاں اوڑھی ہوئی تھیں اسی لیے کسی کو نظر نہیں آ سکے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے آکسیجن کی نلی سے جھولتے ہوئے ماسک کی طرف اشارہ کیا تھا جس پر اس کا ساتھی بہت محظوظ ہوا تھا۔

"ہم ایک تہ خانے میں قید تھے جہاں۔۔۔" سیتا نے ماسک اتار کر کہنا شروع کیا مگر اس کی بات فوراً ہی کاٹ دی گئی۔

"بس بس۔۔۔ تم تو خاموش ہی رہو۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا تھا۔ "خوبصورت عورتیں جھوٹی کہانیاں گھڑنے کی ماہر ہوتی ہیں۔"

"تم معاملے کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر رہے ہو۔" میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "چاہو تو ہم تمہیں ابھی وہ تہ خانہ دکھا سکتے ہیں جہاں ہماری جدوجہد کی نشانیاں نو عدد لاشوں کی صورت میں پڑی ہوئی ہیں۔"

ہمارے قریب کھڑا ہوا فوجی حلق کے بل قہقہے لگانے لگا۔ "واللہ بڑے پُرمذاق ہو تم لوگ، نو آدمی مار دیے تم نے۔۔۔ یہ کون ہے تمھاری؟"

"بیوی؟" میں ان کی ساری ہرزہ سرائی برداشت کرنے پر مجبور تھا کیونکہ میں نے دانا دشمنوں سے مقابلہ کر کے آزادی حاصل کرنے کے بجائے نادان دوستوں کے تحفظ کا انتخاب کیا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ اگر ہم نے ان کی مرضی کے خلاف کوئی بھی حرکت کی تو وہ تشدد سے باز نہیں آئیں گے۔

"بہت خوبصورت ہے۔ غنیمت ہے کہ تم اسے کسی میلے میں نہیں لے گئے ورنہ اسے دیکھتے ہی نو تو کیا نو سو پٹ سے مر جاتے۔"

"تمھاری کمر پر یہ دو سلنڈر کیوں لٹک رہے ہیں؟" اسی لمحے اس فوجی نے سوال کیا جس نے ہم پر رائفل تانی ہوئی تھی۔

غنیمت یہ تھا کہ وہ آکسیجن ماسک کے لوازم سے واقف تھا ورنہ جواب ہی ذرا دشوار اور طویل ہو جاتا۔

"اس میں نیلے رنگ کی زہریلی گیس بھری ہوئی ہے۔" میں نے انہیں خائف کر کے زبان پر قابو رکھنے پر مجبور کرنے کی نیت سے کہا۔

"زہریلی گیس!" اس کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔

"اگر کوئی جانور میسر ہو تو ابھی اس کا تماشا دکھایا جا سکتا ہے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ انہیں پیش کش کی جسے قبول نہیں کیا گیا۔

• تو اسے فوراً ہی کمرے سے الگ کر دو۔"

میں نے انہیں اپنی نیک نیتی کا قائل کرنا چاہا لیکن اپنے تحفظ کے سلسلے میں دونوں کی عقل بہت تیز تھی۔ انہوں نے وہ سلنڈر اٹھوا ہی لیا۔ وہ اس سے اتنے خائف تھے کہ انہوں نے میرے ہی ہاتھوں سے اسے برآمدے کے ایک دور افتادہ حصے میں رکھوا دیا۔

"• اب صبح نو بجے تک ان کا کیا کیا جائے؟" رائفل بردار نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ اسے وہ ناوقت بیداری خاصی کھل رہی تھی۔

"• ہاتھ پیر باندھ کر کسی کمرے میں بند کر دیتے ہیں۔"

"• صبح تک ہم تمہارے قیدی ہیں لیکن ایک سوال ضرور کرنا چاہیں گے۔" میں نے انہیں من مانی پر آمادہ دیکھ کر کہا۔

"• کیا؟" اس بار بھی وہی ساتھا۔

"• صبح کے چھاپے میں یہاں کتنے لوگ پکڑے گئے؟"

"• ایک بھی نہیں۔" اس کا اضطراری جواب مجھے پسند آیا۔ "اندر سے اچانک گولیاں چلنے لگیں۔ ہم نے بھی فائر کھول دیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر والوں کی فائرنگ رک گئی اور ہمارا دستہ دروازہ توڑ کر اندر گھسا تو سات بے ہوش یرغمالیوں اور ایک لاش کے علاوہ چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا۔"

"• گولیاں برسانے والے کہاں گئے؟"

"• پتہ ہی نہیں چل سکا۔" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "سارجنٹ نے کوئی خفیہ راستہ بھی تلاش کرایا جو نہیں مل پایا جب کہ باہر ہمارے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔" پھر چونک کر بولا۔ "کہیں تم دونوں بھی اسی خفیہ راستے سے تو اندر نہیں گھسے تھے؟"

"• ایسا ہوتا تو واپسی میں تمہارے پاس نہ آتے۔"

"• ختم کرو یہ سلسلہ۔" رائفل بردار نے جماہی لیتے ہوئے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ معمہ تو کل سلجھ ہی جائے گا۔ صبح سارجنٹ خود سب معلوم کرلے گا۔"

ڈوریوں کی فراہمی میں انہوں نے خاصی پھرتی دکھائی اور ہم دونوں کو برآمدے کے قریب ہی ایک کمرے میں بے بس اور بے حرکت کر کے ڈال دیا گیا۔ جاتے ہوئے انہوں نے میرے زخمی شانے کے بارے میں استفسار کیا تھا اور میں نے معمولی سی خراش کا بہانہ کر کے انہیں ٹال دیا۔

کمرے کے دروازے میں باہر سے کنڈی لگنے کی آواز پر سیتا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ذہنی سکون تو ملا۔"

"• دیکھنا ہے کہ سارجنٹ کس قسم کا نمونہ ثابت ہوتا ہے۔"

"• اگر صبح تک ان دونوں کے ہی ساتھ رہنا پڑتا تو میں ضرور الجھ پڑتی۔ عقل سے بالکل ہی پیدل معلوم ہوتے تھے دونوں۔"

"• اس خطے کے بیشتر لوگ ذہنی اور جسمانی مشقت کے چور ہیں۔ براہ راست نتائج اخذ کرنے کی کوشش میں حماقتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"• اگر ان کا عام معیار یہی ہے تو اسرائیل کا تو بال بیکا نہ کر سکیں گے۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔ "تم نے دیکھا کہ تہ خانے کے ذکر کو انہوں نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی اور نہ لاشوں پر تو یقین ہی نہیں کریں گے۔"

"• ایک دو ملکوں کے علاوہ ہر جگہ لڑنے والے ہراول دستے غیر فوجیوں پر مشتمل ہیں جن کی خدمات بھاری مشاہرے پر حاصل کی جاتی ہیں۔ کبھی جنگ کی نوبت آ ہی گئی تو یہ محاذ سے پیچھے ہوں گے یا شہری دفاع میں مصروف۔"

"• یمن کے مالی وسائل تو خاصے محدود ہیں۔" سیتا کی زبان سے تبصرہ سن کر مجھے تحیر آمیز خوشی ہوئی کہ ذہنی اعتبار سے اس نے خود کو بہت آگے بڑھا لیا تھا۔

"• دوستوں کے وسائل سہارا دیتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "مجھے جو فلسطین کا ذکر بکثرت سنائی دیا ہے لیکن عملاً سب مجھے مظلوم بھیڑ نظر آتے ہیں۔ خدا کرے کہ وقت آنے پر میرے یہ خدشات بے بنیاد ثابت ہوں کیونکہ اس تجربہ گاہ میں اسرائیل کے بھیانک عزائم سامنے آگئے ہیں۔ وہ فلسطینی تحریک کی آڑ میں علاقے کے سارے ملکوں کے خلاف تیاریاں کر رہا ہے۔"

"• یہ ان لوگوں کا دردِ سر ہے جو علاقے کی سربراہی کے دعوے دار ہیں۔" اس نے دھیمی لیکن قدرے مضطرب آواز میں کہا۔ "کوئی نہیں مانا تو نہ سنے۔ تم تو اب اس مرحلے سے نمٹ کر پاکستان نکلنے کی فکر کرو ورنہ ہم اس چکی میں پستے ہی رہیں گے۔"

"• تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں پاکستان کا رخ کرنے سے پہلے یوسف کو تہ خانے کی بھیانک حقیقت سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

"• لیکن تجربہ گاہ کا بنے گا کیا؟"

"• ظاہر ہے کہ وہ تباہ کی جائے گی۔"

"• لیکن اس طرح قرب و جوار کی ساری آبادی کا کیا بنے گا۔ کیمیائی مادوں کی خوفناک ترکیب اور اس کے ہلاکت خیز اثرات زندہ چھوڑیں گے کسی کو؟"

میں دھیرے سے ہنسا۔ "یہی کرنا ہوتا تو میں ایک اشارے سے کر سکتا تھا۔ اسے جوں کا توں اس لیے چھوڑا ہے کہ مقامی حکام سائنسی ماہرین کے ذریعے خطرناک مادوں کو بے ضرر طریقے پر تلف کرا سکیں۔ اس کے بعد پوری عمارت تباہ کی جا سکتی ہے بلکہ وہاں لگے ہوئے بیش قیمت آلات سے مقامی طور پر بہتیرے تعمیری کام لیے جا سکتے ہیں۔"

ان دو فوجی پہرے داروں کے غیر ذمہ دارانہ بلکہ لاتعلقانہ رویے نے میرے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی تھی اور میں مسلسل اسی موضوع پر سوچ رہا تھا۔

اپنی ذات کے خول میں سمٹے ہوئے افراد پر مشتمل انبوہ کو ایک ہجوم تو کہا جا سکتا ہے لیکن مذہب، زبان اور اخلاقیات کے کسی حوالے سے قوم شمار نہیں کیا جا سکتا اور بدقسمتی سے عربوں کی سرزمین پر دیس بدیس کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے میں نے ایسے ہجوم ہی دیکھے تھے جن میں اتحاد کا

انفرادی حیثیت قابل معافی تھیں۔

اجالا نمودار ہونے تک ہم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکے۔ باہر موجود پہرے داروں نے دن نکل آنے پر ہمیں دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کہ ان کے قیدی کمرے میں موجود بھی ہیں یا نہیں۔

سوا نو بجے دروازے پر آہٹ ہوئی اور پوری فوجی وردیوں میں ملبوس دس بارہ نفوس کمرے میں گھس آئے۔

ان کی قیادت تیکھے نقوش اور اکہرے بدن والا ایک چالیس سالہ فوجی کر رہا تھا جس کی آنکھوں میں عقابی چمک موجود تھی۔

مجھے مقامی فوج کے امتیازی نشانات کی تمیز نہیں تھی لہٰذا میں اس کا عہدہ نہ پہچان سکا۔ وہ ہم دونوں کے قریب آکر رک گیا۔

"• کون ہو تم دونوں؟" اس نے باری باری ہمیں گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"• تخلیہ ممکن ہو تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔"

اس نے پلٹ کر سر کی جنبش سے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ سب دھڑا دھڑ کمرے سے نکل گئے۔

"• یہ عمارت یمن میں اسرائیلی ایجنٹوں کا سب سے مضبوط اور فعال مرکز تھی۔" میں نے اس کی تیز استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں کہا۔

اس نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا مگر میں کہتا رہا۔ "یہاں ایک زیر زمین تجربہ گاہ بھی ہے جہاں انسانوں پر زہریلے مادوں کے براہ راست تجربات کیے جاتے تھے۔ انہیں جو مفلوج قیدی یہاں سے ملے وہ اپنی باری پر تجربات کی بھینٹ چڑھائے جانے کے منتظر تھے۔ یہ بھاری۔۔۔"

"• اختصار سے کام لو۔" اس نے خشک لہجے میں مجھے ٹوکا۔ پھر گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "دس بجے مجھے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔"

بے اختیار میرا دل چاہا کہ میں اپنی اور اس کی جان ایک کردوں مگر اس وقت میں بے بس تھا۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پھر یہ باتیں اس وقت کے لیے چھوڑ دو جب تم زیادہ مصروف نہ ہو۔ میری کہانی ذرا طویل ہے۔"

"• یہ بہتر ہے۔" اس نے اپنی گلو خلاصی پر اطمینان کا سانس لیا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"• معظم علی، اور یہ میری بیوی سیتا۔"

میرا نام سنتے ہی اس کی چمکدار آنکھوں میں اور زیادہ چمک عود کر آئی۔ "تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"• قیدی تھے۔"

"• چلو اچھا ہی ہوا۔ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔" اتنا کہہ کر وہ مزید کسی بات کا انتظار کیے بغیر تیزی سے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

جیسے اپنے کسی بڑے کو کوئی اہم خبر پہنچانی چاہتا ہو۔

اس کے جانے کے چند ثانیوں بعد ہی کچھ فوجی ہلکی سب مشین گنیں تانے تقریباً دوڑتے ہوئے کمرے میں آئے۔ وہ ہم دونوں پر مشین گنیں تانے رہے اور بقیہ نہایت بے رحمی کے ساتھ ہماری جامہ تلاشی لینے لگے۔ ان دونوں کا کہیں پتہ نہیں تھا جنہوں نے رات ہمیں اپنا قیدی بنایا تھا۔

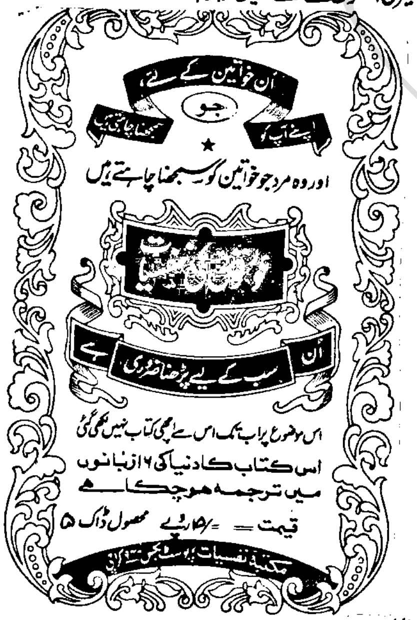
ہم دونوں نے ان کے بے محابہ سلوک پر بہتیرا احتجاج کیا مگر ہماری ایک نہ سنی گئی۔ وہ یوں ہماری تحقیر اور تذلیل پر تلے ہوئے تھے جیسے ہم تیسرے درجے کے اخلاقی مجرم ہوں۔

تلاشی کے دوران سیتا کے لباس سے پستول نما ہتھیار برآمد کیا گیا تو میں بے اختیار چیخ پڑا۔ "اس کے ٹریگر کو نہ چھونا یہ بہت مہلک ہتھیار ہے۔"

اس فوجی نے مجھے چڑانے کے لیے پستول کی نال سیتا کی طرف سیدھی کر دی۔ اس کے ہونٹوں پر ایسی فخر آمیز مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے مجھے جتا رہا ہو کہ وہ میری چال میں نہیں آئے گا۔

"• نہیں۔" میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔ "اسے نہ چلانا۔ اس کے زخم کا تم۔۔۔"

میں اپنی بات پوری نہ کر سکا کیونکہ ایک فوجی نے بے رحمی کے ساتھ اپنی سب مشین گن کا آہنی دستہ میرے سر پر رسید کیا، اور میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلتی چلی گئی۔



ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک تاریک کمرے میں مقید پایا۔ جس کی تین ٹھوس اور سپاٹ دیواروں میں کوئی روشن دان تک نہیں تھا۔ جب کہ چوتھی سمت میں فرش سے چھت تک موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

سیتا اسی چھت کے نیچے ایک دیوار کے سہارے سر ٹکائے اونگھ رہی تھی۔

اس کمرے میں روشنی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ البتہ آہنی سلاخوں کے سامنے پھیلی ہوئی راہداری کے کسی حصے میں جلنے والے بلب کا انعکاس اس حد تک کافی تھا کہ کمرے کی ساخت کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔

اس وقت میرا سر منوں وزنی ہو رہا تھا اور درد کی ٹیسیں ناقابلِ برداشت محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں موند کر اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا تو کھوپڑی کا عقبی حصہ جہاں سب مشین گن کے دستے کی ضرب لگائی گئی تھی۔ خاصا پھولا ہوا تھا۔

معاً مجھے یاد آیا کہ سر پر چوٹ کھانے کا معاملہ صبح سوا نو بجے کے لگ بھگ پیش آیا تھا جس کا مطلب تھا کہ میں تقریباً پورا دن ہی بےہوش رہا تھا۔

"کیا تم جاگ گئے ہو؟" اچانک سیتا کی سرگوشیانہ آواز ابھری۔ شاید میرے بدن کی جنبش اس کی نظر میں آ گئی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر اپنا سر اس کی طرف گھمایا تو وہ سوال کرنے کے ساتھ ہی بے آواز قدموں سے میرے قریب آ چکی تھی۔

کمرے میں آنے والی ناکافی روشنی میں بھی اس کے بشرے پر کرب اور بے چینی کے آثار دیکھ سکتا تھا۔

"تمہارے سر پہ بہت وحشیانہ ضرب لگائی گئی تھی۔" وہ اضطراری طور پہ ہولے ہولے میرے بالوں میں اپنی ملائم انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "تمہاری طویل بےہوشی سے گھبرا کر میں کئی بار چلاتی بھی رہی۔ مگر ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب ہی بہرے ہو چکے ہیں۔"

میں اس کا سہارا لے کر فرش سے اٹھ گیا۔ اٹھتے ہوئے مجھے اپنے بائیں شانے کے زخم میں بھی درد کی ٹیس محسوس ہوئی جو مائیکل ٹرمپ نے مرنے سے پہلے گولی چلا کر ادھیڑ ڈالا تھا۔

"اس وقت ہم کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا تو میری آواز سے نقاہت عیاں تھی۔ اس اثنا میں میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میرے شانے کے زخم پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جو سیتا نے میری قمیص کا دامن پھاڑ کر حاصل کی تھی۔

"شاید کوئی فوجی قید خانہ ہے۔" سیتا نے کہا۔ "مجھے یہاں لایا گیا تو میں ہوش میں ضرور تھی لیکن میری آنکھوں پہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔ تمہاری بےہوشی کے بعد میرے ساتھ ان کا رویہ بہت بے رحمانہ رہا تھا۔"

"مگر ہمیں یہاں لائے کافی وقت گزر چکا ہے۔"

"سارا دن ہی بیت گیا۔" سیتا نے کہا۔ "اب تو شام ڈھلنے کے بعد بھی خاصا وقت گزر چکا ہے لیکن ان میں سے کوئی واپس نہیں لوٹا۔"

"تمہارے لیے دوپہر کا کھانا؟"

وہ دھیمے سے ہنس پڑی۔ "کیسا کھانا اور کہاں کا پانی۔ سب آنے کے بعد سے بھوکی پیاسی ہوں اور کوئی خواہش بھی نہیں ہے۔"

"بہت نامعقول لوگ ہیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نامعقول ہی نہیں، عقل سے یتیم بھی ہیں۔" اس کے لہجے میں بھی تلخی عود کر آئی۔ "اسرائیلی سرگرمیوں اور تجربہ گاہ کے بارے میں تمہارے بیان کو انہوں نے قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھا ہے۔ ان کے سارجنٹ کا خیال ہے کہ تم نے ان کی توجہ اپنی جانب سے مبذول کرانے کے لیے زیرِ زمین تجربہ گاہ کا ہوا کھڑا کیا ہے۔"

"یعنی سارجنٹ سے بڑے عہدے کے کسی افسر نے ابھی تک ہمارے معاملے میں دخل نہیں دیا؟" میں نے فرطِ حیرت سے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" سیتا مسکرائی۔ "میرے اور تمہارے ناموں سے واقف ہونے کے بعد ان کا یہ حال ہے۔ وہ اپنی دانست میں معاملہ ختم سمجھ رہے ہیں۔ اب تو شاید ہمیں براہِ راست کسی متعصب فوجی عدالت کا ہی سامنا کرنا پڑے گا۔"

لیکن اس معاملے میں سیتا کی قیاس آرائی چند منٹ بعد ہی غلط ثابت ہو گئی۔

اس وقت میری رسٹ واچ کے مطابق رات کے پونے آٹھ بجے تھے کہ راہداری میں خاصے فاصلے پر کئی قدموں کی تیز گونج سنائی دی جو بتدریج قریب آتی جا رہی تھی اور چند ثانیوں بعد دو مسلح فوجی ہمارے قید خانے کے سامنے آ رکے۔

ان میں سے ایک نے اپنے شانے سے رائفل اتار کر ہاتھ میں تھام لی اور دوسرا آہنی دروازے کا قفل کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

"باہر نکلو!" دروازہ کھل جانے پر ہمیں حکم دیا گیا۔

ہم دونوں خاموشی سے اس کمرے سے باہر راہداری میں نکل آئے۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" دروازہ کھولنے والے نے اپنی رائفل سنبھالتے ہوئے ترش لہجے میں ہمیں حکم دیا جس پر ہم نے فوراً عمل کر ڈالا۔

پھر ان میں سے ایک ہمارے آگے ہو لیا، دوسرا ہمارے پیچھے تھا۔ اور ہمیں حکم یہ ملا تھا کہ ہم درمیان میں رہتے ہوئے آگے والے کی تقلید کریں۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت ہم کسی فوجی ٹھکانے پر موجود تھے کیونکہ راستے میں جو بھی ملا وہ یمن کی فوجی وردی میں ملبوس تھا اور وہاں مجموعی طور پر فوجی نظم و ضبط کا ہی اظہار ہو رہا تھا۔

چند موڑ گھومنے کے بعد ہمیں ایک بند دروازے کو عبور کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس مرحلے پر آگے چلنے والا فوجی دروازے کے ایک پہلو پر رک گیا تھا۔ ہم نے ہاتھ گرا کر دروازہ پر خفیف سا زور دیا اور وہ فوراً کھل گیا۔

"مارچ!" ہمارے پیچھے کھڑا ہوا فوجی اضطراری لہجے میں غرایا اور ہم دونوں مشینی انداز میں کھلے ہوئے دروازے سے گزرتے چلے گئے۔

دروازے سے گزرتے ہی ہمیں اس نیم روشن کمرے میں دو مستعد فوجی نظر آئے جن کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں موجود تھیں جن کی نالیں مشینی انداز میں ہمارے ساتھ گھومتی رہیں۔

ان مسلح محافظوں کے علاوہ اس کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی... آبنوسی میز کے عقب میں اونچی کرسیوں پر دو باوردی فوجی افسر براجمان تھے۔ جن میں سے ایک وہی تھا جو اپنی مصروفیت کا عذر کرکے گرفتاری کے وقت ہم سے پیچھا چھڑا چکا تھا۔

ان دونوں کے مقابل میز کی دوسری طرف دو کرسیاں موجود تھیں۔ جو بظاہر ہمارے لیے رکھی گئی تھیں لیکن میں نے اجازت ملے بغیر ان پر تصرف مناسب نہ سمجھا۔

"صفدر علی اور سیتا!" سارجنٹ کے برابر میں بیٹھے ہوئے فوجی افسر نے اپنے داہنے ہاتھ میں تھامی ہوئی چھڑی ہولے سے میز کی سطح پر مارتے ہوئے کہا۔ "تو آخر کار تم دونوں ہماری تحویل میں آہی گئے یہ بڑا اچھا ہوا۔"

"اس وقت ہم کس کی تحویل میں ہیں؟" میں نے اپنا دل کڑا کرکے وہ قدرے گستاخانہ سوال اس افسر سے کر ہی ڈالا۔

"یمن کی فوجی تحویل میں!" اس کا لہجہ فخر آمیز اور قدرے دوستانہ تھا۔ "میں بریگیڈیر محسن الغانم ہوں اور یہ سارجنٹ فضیل۔"

"یہ زخمی ہے!" سیتا نے اس کے رویے سے حوصلہ پاکر جلدی سے کہہ ڈالا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ کسی باز پرس سے پہلے اسے طبی امداد دی جاسکے؟"

"زخمی ہے؟" بریگیڈیر محسن نے سارجنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔ "مگر تم نے تو بتایا تھا کہ ان دونوں کو بلا مقابلہ گرفتار کیا گیا تھا!"

سارجنٹ فضیل اپنی کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"گرفتاری بلا مقابلہ ہی ہوئی تھی!" سیتا نے اس مرحلے پر بھی بولنا ضروری خیال کیا۔ "ہم نے بلا مزاحمت خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی صفدر کی کھوپڑی پر سب مشین گن کے دستے سے ضرب لگانی ضروری سمجھی گئی۔ یہ تو دس گھنٹے بعد ہوش میں آیا ہے!"

"ہم.... مجھے کمپنی کمانڈرز کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی!" سارجنٹ فضیل نے بمشکل اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "شاید میری روانگی کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہوگا!"

"اور اس کے بائیں شانے پر گولی کا زخم ہے!"

"وہ کیسے آیا؟" بریگیڈیر محسن سیتا سے بات کرتے ہوئے عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ جو مجھے سخت ناگوار گزر رہی تھی۔

"وہ گرفتاری سے پہلے یہودیوں سے مقابلے کا شاخسانہ تھا!" میں نے سیتا کے زبان کھولنے سے قبل جلدی سے کہا۔

"مرہم پٹی بعد میں ہوجائے گی!" بریگیڈیر نے اپنا فتویٰ صادر کیا "زخم یا چوٹ زیادہ کاری نہیں معلوم ہوتی، ورنہ اس وقت تم اتنے پرسکون نہ ہوتے۔"

"لیکن ہمیں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟"

"تمھارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟" بریگیڈیر نے اپنی چھڑی فضا میں لہراتے ہوئے سوال کیا۔

"تیسرا ساتھی؟" میں نے بے ساختہ حیرت سے کہا۔ "ہم دونوں نے کبھی کسی تیسرے کو اپنی جماعت میں شامل نہیں کیا!"

"بعض لوگ تمھارے خون کے پیاسے ہیں!" اس نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن ہمارے نزدیک تمھاری زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ تم محض اس لیے پکڑے گئے ہو کہ ہمیں نامعلوم ذرائع سے مسلسل یہ خبریں دی جارہی تھیں کہ ریاست کا ایک مفرور مجرم یوسف تمھارے ساتھ لگا پھر رہا ہے۔ اس پر یمن کی قانونی حکومت کے خلاف ایک ناکام مسلح بغاوت میں ملوث ہونے کا سنگین الزام ہے۔ اگر تم اسے گرفتار کرانے میں مدد دے سکو تو تمھیں باعزت رہائی مل سکتی ہے!"

"مگر وہ کسی بغاوت میں ملوث نہیں تھا... یہ اس کی....!"

"اس کی وکالت مت کرو۔" وہ میری بات کاٹ کر غصیلے لہجے میں غرایا۔ "یہ فیصلہ صنعا کا خصوصی فوجی ٹریبونل کرے گا کہ کون کس حد تک ملوث تھا تم ہمیں اس کی موجودہ کمین گاہ کا پتہ بتاؤ تاکہ اسے جلد از جلد پکڑا جاسکے۔"

"مگر ہم اس کے ٹھکانے سے واقف نہیں ہیں!"

"جھوٹ مت بولو!" اس کا لہجہ قدرے نرم ہوگیا۔ "اس کی پیشی میں جس قدر تاخیر ہوگی اسی قدر اس کا جرم بھی سنگین تر ہوتا جائے گا!"

"میں سچ بول رہا ہوں!"

"آخری بار تمھاری اور اس کی ملاقات کب ہوئی تھی؟" اس نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد سوال کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنی دیر گزر جانے کے باوجود مجھ سے یہودی سرگرمیوں یا ان کی زیر زمین تجربہ گاہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا گیا تھا۔

"دو تین روز پہلے درنہ میں وہ آخری بار ہمارے ساتھ تھا!"

"وہاں سے تم کہاں گئے؟"

"لمبی کہانی ہے!" میں گہرا سانس لے کر بولا۔ "کچھ اسرائیلی ایجنٹ ہماری ٹوہ میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں کسی طرح درنہ والے ٹھکانے کا علم ہوگیا اور ان کا ایک آدمی ہمارے ایک ہمدرد کا قاصد بن کر ہم تک آپہنچا۔ شاید اس وقت یوسف بھی ہمارے ساتھ ہی ہوتا۔ لیکن اس اجنبی قاصد سے اس کا ماتھا کچھ ٹھنک گیا اور وہ ہم سے الگ ہوگیا!"

"لیکن ہمیں اطلاع دی گئی تھی کہ اس عمارت میں تم تینوں پناہ گزیں ہو!" بریگیڈیر نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا پھر اضطراری طور پر ہاتھ ہلا کر بولا۔ "بیٹھو.... بیٹھ جاؤ۔ کھڑے ہوئے کیوں ہو؟"

ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"شاید میری اس بات پر بھی یقین نہ کیا جائے لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عمارت میں تینوں کی موجودگی کی اطلاع خود یوسف نے دی ہوگی!"

"وہ کیوں؟" بریگیڈیر نے حیرت سے سوال کیا۔

"درنہ میں منصوبہ یہی بنا تھا کہ وہ پیچھے رہ کر ہمارا تعاقب کرے گا!" میں نے کہنا شروع کیا۔ "اگر ہمیں لانے والا واقعی ہمارا ہمدرد ثابت ہوتا تو یوسف خاموشی سے اپنی راہ پر چلا جاتا اور اگر اسے ہماری سلامتی خطرے میں نظر آتی تو وہ باہر سے ہماری مدد کرنے کی کوشش کرتا.... مجھے پتہ چلا ہے کہ اس عمارت پر فوج کے چھاپے سے قبل کسی نے رات کے اندھیرے میں اندر گھسنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یوسف ہی رہا ہوگا۔ جب اس نے وسیع حفاظتی نظام کے سامنے خود کو بے بس پایا تو فوجی حکام سے مخبری کر بیٹھا.... یقیناً اس نے سامنے آئے بغیر فون یا کسی خط کے ذریعے وہ خبر فوجی حکام تک پہنچائی ہوگی!"

بریگیڈیر کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔ اور وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ "صنعا کے گیریژن کمانڈر کو ایک گمنام فون موصول ہوا تھا.... لیکن یوسف نے یہ کیوں کہا کہ وہ خود بھی تم دونوں کے ساتھ اس عمارت سے دستیاب ہوگا!"

"وہ جانتا تھا کہ مقامی حکام کی نظر میں ہم دونوں مجرم ضرور ہیں لیکن اتنے اہم نہیں کہ ہماری گرفتاری کے لیے کوئی فوری اور بڑا اقدام کیا جائے۔ اپنا نام شامل کرنے سے اس کا مقصد صرف اتنا رہا ہوگا کہ فوری کارروائی کی جائے کیونکہ ذرا بھی تاخیر ہوتی تو ہم دونوں کا انجام بہت عبرتناک ہوتا۔ اس بات سے وہ بخوبی واقف تھا۔"

"تم بار بار اسرائیلیوں کا نام لے رہے ہو!" بریگیڈیر رفتہ رفتہ پُرسکون ہوتا جارہا تھا۔ "یمن میں وہ ہماری ناک کے نیچے کس طرح سرگرم رہ سکتے ہیں؟"

"بدقسمتی سے ایسا ہوا ہے!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یمن میں ان کی طاقت کا منبع مائیکل ٹرمپ تھا جو ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا!"

"مائیکل ٹرمپ!" بریگیڈیر حیرت اور بے یقینی کے ساتھ تقریباً اچھل پڑا۔ "مارا گیا؟ تو کیا وہ بھی اس معاملے میں ملوث تھا؟"

"گردن تک!"

"لیکن فوجی کارروائی کے وقت تو وہ عمارت خالی ملی تھی!"

"وہ بہت بعد کی بات ہے.... ابتدا میں تو فوجیوں پر فائرنگ بھی کی گئی تھی!" میں اپنی بات بتدریج اس کے ذہن میں اتارتا چلا جارہا تھا۔

"لیکن وہ سب غائب کہاں ہوگئے تھے؟"

"ہم دونوں کو چند آدمی زیر زمین تجربہ گاہ میں لے گئے تھے۔ باقی لوگ فوجیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کسی خفیہ راستے سے فرار ہوگئے!"

"مائیکل تہہ خانے میں تمھارے ساتھ تھا؟"

"نہیں!" میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے فرار ہوتے ہوئے وہ نظام ناکارہ کر دیا تھا جس کی مدد سے زیر زمین تجربہ گاہ میں داخلے کا راستہ کھولا یا بند کیا جاسکتا تھا۔ تہہ خانے میں ہم دونوں کے علاوہ ان کے چھ آدمی بھی تھے جنھیں ہم نے جلد ہی ختم کر دیا۔ کل رات مائیکل ٹرمپ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ خفیہ راستے سے عمارت میں داخل ہوا تھا تاکہ ہمارا بندوبست کرسکے۔ وہ اس اعتماد کے ساتھ بے دھڑک تہہ خانے میں گھستا چلا آیا کہ اس کے چھ آدمیوں نے ہم دو کو بخوبی زیر کر رکھا ہوگا۔ لیکن اندر آنے کے بعد وہ تینوں ہمارے ہاتھوں مارے گئے اور ہم لاشیں چھوڑ کر باہر نکل آئے!"

"تو کیا وہ سب درست تھا جو تم نے تجربہ گاہ کے بارے میں کہا تھا!"

سارجنٹ نے پہلی بار تحیر زدہ لہجے میں زبان کھولی۔

"ہمیں تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا!" میں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ زیر زمین مختصر سی کائنات ہلاکت کا ایک طوفان بن سکتی ہے!"

"میرے جوانوں کا خیال تھا کہ تم دونوں نے ان کی توجہ لینے کے بجائے تجربہ گاہ کے مفروضے میں الجھانے کی کوشش کی تھی تاکہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلو!" بریگیڈیر کے لہجے سے خفیف سی خجالت ٹپک رہی تھی۔

"یوسف کا معاملہ تو درمیان میں ہی رہ گیا!" سارجنٹ فضیل نے طویل ہوتے ہوئے سکوت کو توڑتے ہوئے بریگیڈیر کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

"اگر اس کی کہانی پر یقین کرلیا جائے تو یوسف کا معاملہ ثانوی رہ جاتا ہے!" بریگیڈیر محسن الغانم نسبتاً معاملہ فہم نظر آرہا تھا۔

"یقین کے لیے اسی وقت وہاں چلا جاسکتا ہے!" میں نے کہا۔ "مجھے بس ایک ہی ڈر ہے کہ ہم نے کافی وقت ضائع کر دیا ہے مائیکل ٹرمپ کے لاپتہ ہونے کے بعد اس کے ساتھی اگر خفیہ راستے سے تجربہ گاہ تک پہنچ گئے تو اٹھارہ بیس گھنٹوں میں بہت کچھ کر گزرے ہوں گے!"

"مثلاً!" بریگیڈیر کی آنکھوں میں تجسس عود کر آیا۔

"لاشیں لے جائی جاسکتی ہیں۔ تجربہ گاہ سے اہم نوعیت کا ساز و سامان بھی غائب ہوسکتا ہے اور سب سے بڑا اندیشہ یہ ہے کہ کہیں تجربہ گاہ کے راستے کو اس نظام سے منسلک نہ کر دیا گیا ہو۔ جو دروازہ کھلتے ہی تجربہ گاہ کو تباہ کر دیتا ہے!"

"یہ کام نہ ہوسکا ہوگا!" سیتا نے کہا۔ "میں نے تجوری دوبارہ مقفل کر دی تھی۔ اور شاید اس کا علم ڈاکٹر آسٹن کے سوا کسی کو نہ ہوگا!"

"اس تجربہ گاہ میں ہوتا کیا رہا ہے؟" بریگیڈیر اس وقت تک معاملے کی سنگین نوعیت کو بخوبی سمجھ چکا تھا اور وہاں جانے سے قبل اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے تجربہ گاہ کی نوعیت کو چند فقروں میں بیان کرنا چاہا لیکن اس نے میری بات کاٹ دی: "تفصیلات بتاؤ۔ یہ چند فقرے تو میں سارجنٹ تفصیل سے بھی سن چکا ہوں۔"

میں نے تجربہ گاہ میں مامور عملے اور اس کے سربراہ ڈاکٹر آسٹن کی صلاحیتوں سے اپنے مشاہدے کا بیان شروع کر دیا۔

چند ہی منٹ میں بریگیڈیر محسن الغانم کی بے چینی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ وہ بار بار پیشانی اور چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"ذرا ٹھہرو۔" اس نے ادھ جلی سگریٹ ایش ٹرے میں رگڑ کر نئی سگریٹ جلاتے ہوئے مجھ سے کہا، پھر سارجنٹ سے مخاطب ہو گیا۔

"اس عمارت میں نفری کم ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میجر غالی سے فوراً دو دستے لے کر وہاں پہنچو اور عمارت کا محاصرہ کر لو لیکن تجربہ گاہ کے بارے میں نہ تم میجر کو کچھ بتاؤ گے۔ نہ اپنے ماتحتوں کو۔"

سارجنٹ نے فوراً کرسی چھوڑ دی۔

اس کے بعد بریگیڈیر محسن بلا مبالغہ نصف گھنٹے تک کہنیوں کے بل میز پر آگے جھکا ہوئے تجسس اور انہماک کے ساتھ میری کہانی سنتا رہا۔ درمیان میں اس نے اِکا دُکا سوالات بھی کیے جن سے اس کی اعلیٰ سمجھ بوجھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"سارجنٹ کند ذہن ہے۔" میری کہانی مکمل ہونے پر وہ اضطراری انداز میں میز کی سطح پر مکا مارتے ہوئے جھلائے ہوئے لہجے میں بولا: "وہ تمہاری کسی بات کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور اس نے تمہاری طرف سے میرا ذہن اس حد تک متنفر کر دیا تھا کہ بارہ برس کی ابتدا میں میں نے بھی تجربہ گاہ کا ذکر چھیڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

"مگر میں خوش ہوں کہ آخر کار کوئی ایسا شخص مل ہی گیا جو کھلے ذہن سے میری بات سننے کے لیے تیار ہے ورنہ میں تو خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "سارجنٹ کے رویّے کو دیکھتے ہوئے مجھے یہی نظر آ رہا تھا کہ تجربہ گاہ کا بال بھی بیکا نہ ہو سکے گا اور کچھ عرصے کے وقفے کے بعد ڈاکٹر آسٹن کی جگہ اسرائیل سے آیا ہوا کوئی دوسرا سائنسدان اس ہولناک مشن کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو جائے گا۔"

"ایسی صورت میں تم اس عمارت کو کھنڈر نہ بنا دیتے؟"

"کیسے؟" میں نے سوال کیا۔ "عمارت کی تباہی کے ساتھ ہی فضا میں دور تک زہریلے مادے پھیل جاتے۔ میں بے گناہ شہریوں کے خون کا بوجھ اپنے سر کیسے لے سکتا تھا؟"

"اوہ۔" بریگیڈیر محسن الغانم نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا: "تم بتا تو چکے ہو کہ تجربہ گاہ میں موجود زہریلی گیسوں اور دوسرے مادوں کے اتلاف کے بغیر اس عمارت کو چھیڑنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا۔"

میں نیلے رنگ کی دھند سے مشابہ زہریلی گیس کا سلنڈر دیکھا ہے

تم نے؟"

"صرف دیکھا ہی ہے۔" بریگیڈیر نے کھلے دل سے کہا۔ "سارجنٹ کی کہانی سننے کے بعد میں اس سلنڈر کو بھی ڈھکوسلا ہی سمجھا تھا۔"

"یہ معاملہ بہت نازک ہے۔" بریگیڈیر کرسی سے اٹھتے ہوئے "یہ بتا دوں کہ تم کو بھی ہمیشہ اپنی زبان بند رکھنا ہو گی اور کچھ عجب نہیں کہ انٹیلی جنس چیف کے ذریعے یہ معاملہ صدر تک جا پہنچے کیونکہ اس کا تعلق ہماری سلامتی سے ہے۔"

"تجربہ گاہ کی تباہی کے بعد تو یہ کارنامہ کہلائے گا۔"

"تجربہ گاہ بنانے کب سے یہاں قائم تھی۔" وہ ٹہلتے ہوئے کہنے لگا۔ "اور اس کے طفیل اسرائیلی طالع آزماؤں کو سنجانے کتنے ہتھیار مل چکے ہوں۔ آج اگر اس کا راز فاش ہوتا ہے۔ تو پوری عرب دنیا ہم پر ملامت کرے گی کہ ہماری سرزمین پر ایک اہم اسرائیلی مرکز ہماری لاعلمی میں اہم کام سرانجام دیتا رہا۔"

"ہاں — اس طرح اہلیت پر حرف آتا ہے۔"

"بات صرف اہلیت کی نہیں اس سے بڑی ہے۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے میرے مقابل رک گیا۔ "شام اور جنوبی یمن جیسے ممالک اس بات کو خوب ہوا دیں گے اور ہماری سرپرستی کرنے والوں کے پاس منہ چھپانے کے سوا کوئی راہ باقی نہ رہے گی۔"

"اگر اس کے مضمرات اتنے ہی دور رس ہیں تو میری زبان سے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ تمہاری نیت کی بات ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اوپر والے یہ بات کس حد تک گوارا کر لیں گے کہ اس تجربہ گاہ کی حیثیت سے واقف ایک غیر ملکی زندہ رہنے دیا جائے یا زندہ قیدی بنا کر رکھا جائے۔"

"اور آزادی؟" میں نے بے اختیار سوال کیا۔

"آزادی کا امکان بہت موہوم سا ہے۔" اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا: "تم اس وقت دنیا کے ایک ایسے خطے میں موجود ہو جہاں حکومت کے کٹر سیاسی مخالفین طویل روپوشیوں کے بعد اچانک ہی، کہیں اس حالت میں ملتے ہیں کہ زندگی کی آخری رمق بھی ان کے جسموں سے نچوڑی جا چکی ہوتی ہے اور کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ ان کے انجام پر زبان کھولے۔"

میں پھر بری لے کر رہ گیا: "تم مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"تم جو چاہو سمجھ لو مگر حقائق یہی ہیں۔" اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "اور میں تم دونوں سے خفیہ طور پر ہمدردی کا اظہار کرنے کے علاوہ کوئی عملی تعاون نہیں کر سکتا۔"

"پھر ہمارا مستقبل کیا ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" اس نے شانے ہلا کر کہا۔ "میں زیادہ

سے زیادہ تمہیں ایک ہمدردانہ مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے چند ثانیوں تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا "میں ابھی کمانڈر انچیف سے بات نہیں کروں گا۔ عمارت کی تلاشی کے بعد تجربہ گاہ کے بارے میں سرسری سی اطلاع دوں گا۔ باقی کام سائنسی شعبے کے ماہرین خود کرلیں گے۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"میں بتاؤں گا کہ تم نے کسی تہہ خانے کے بارے میں اطلاع دی تھی۔" وہ میرے قریب آکر دھیمے لہجے میں کہنے لگا "سارجنٹ فضیل بھی میرے ایما پر اتنا ہی کہے گا جس کے نتیجے میں اوپر والے سمجھیں گے کہ تم دونوں اس تجربہ گاہ کی اصلیت اور جنگی اہمیت سے بے خبر ہو۔ اس طرح تمہارے ساتھ کسی عام قیدی کا سا سلوک کیا جائے گا اور شاید مختصر سی سزا کے بعد تمہیں رہائی بھی مل جائے۔"

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس میں ہم دونوں کا مفاد تھا یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ اس خوف ناک تجربہ گاہ کی دریافت کا سہرا اس کے سر ضرور بندھ جاتا۔ جہاں ذرا سی بھی غیر محتاط کارکردگی ہلاکت و بربادی کا ایک طوفان برپا کردیتی۔

لیکن اپنی کمزور حیثیت کے پیش نظر اس کی تجویز قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اس پر عمل کرتے ہوئے فائدہ نہیں تو کسی نقصان کا بھی خطرہ نہیں تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔ "اس کے سوا گلو خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"تو پھر میرے ساتھ آؤ۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

اور میں نے فوری طور پر اپنی کرسی چھوڑ دی۔

اس وقت میں عملی طور پر خود کو بریگیڈیر محسن الغانم کے قیدی کے بجائے اس کا معتمد دوست تصور کر رہا تھا۔

اس پیش رفت کے نتیجے میں میں اپنے سر کے عقبی حصے کے ورم اور درد کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا۔ جو کچھ دیر پہلے میرے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

وہ عمارت خاصی وسیع و عریض تھی جس کا اندازہ وسیع احاطے میں پہنچ کر ہوا۔

احاطے میں ایک طرف دھندلی روشنی میں ہلکی اور بھاری فوجی گاڑیاں مشینی آسیبوں کی طرح قطاروں میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں بیشتر فوجی دستوں کی نقل و حرکت میں کام آنے والے دیوہیکل ٹرک تھے یا جیپیں۔ ان سے آگے نسبتاً گہرے اندھیرے میں چند ٹینک بھی موجود تھے اور پھر اس بھاری اجتماع کا سبب بھی سامنے آگیا جو ایک بڑے سیاہ بورڈ پر سفید عربی حروف میں جلی طور لکھا ہوا تھا۔

اس وقت ہم صنعا کے مرکزی گیریژن کمانڈ کوارٹر میں موجود تھے۔ بریگیڈیر جوں ہی برآمدے کی سیڑھیاں اترا، بائیں طرف کے سائبان سے ایک باوردی فوجی تیزی سے اس کی طرف آگیا۔

"جیپ نکالو۔" بریگیڈیر نے سخت تحکم آمیز لہجے میں کہا اور وہ ایڑیاں بجا کر تیزی سے گاڑیوں کی قطار کی طرف بڑھ گیا۔

چند ثانیوں بعد ہم جیپ میں تیزی کے ساتھ ایک طرف جا رہے تھے۔ میں سیتا کے ہمراہ جیپ کے عقبی حصے میں سخت آہنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ محسن الغانم چھ سلنڈروں والی اس جیپ کو خود چلا رہا تھا۔ ڈرائیور کو اس نے اپنے برابر میں بٹھا لیا تھا۔

وہ فوجی مرکز صنعا کے مضافات میں واقع تھا۔ کیونکہ وہاں سے نکلنے کے بعد بس چند ثانیوں تک ہی اکا دکا دور افتادہ روشنیاں نظر آئیں، پھر ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی کے سوا ہر طرف اندھیرے کی بھیانک چادر پھیل گئی۔

وہ سفر کم و بیش دس منٹ تک اعصاب شکن خاموشی میں جاری رہا۔ انجن کی تیز غراہٹ اور سڑک پر ٹائروں کی گھڑکھڑاہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دی اور آخرکار اندھیرے میں ڈوبی ہوئی اس عمارت کا ہیولا نظر آہی گیا جس میں ہم اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تحیر خیز تجربات سے گزرنے تھے۔

قدرے آگے بڑھنے کے بعد عمارت کے نچلے حصے میں اکا دکا روشنیاں بھی نظر آگئیں۔ یہ شاید ان ہی کا انعکاس تھا کہ تاریکی میں بھی عمارت کا ہیولا دور سے نظر آرہا تھا۔

عمارت کی طرف مڑتے ہی جیپ روک دی گئی — ایک فوجی... اچانک سب مشین گن سنبھالے جیپ کے سامنے آگیا تھا۔

بریگیڈیر نے چند وزنی گالیاں دیتے ہوئے بریک لگا دیے۔

شاید ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں نگاہیں خیرہ ہونے کے باعث وہ غریب فوجی جیپ کی نمبر پلیٹ نہیں دیکھ سکا تھا۔ ورنہ مخصوص نمبروں اور نشانات کے سہارے آنے والے کے رتبے سے یقیناً واقف ہو جاتا اور یوں راہ میں مزاحم نہ ہوتا۔

بریگیڈیر الغانم کو دیکھتے ہی اس بے چارے کے فرشتے کوچ کر گئے اور اس نے ایڑیاں بجا کر لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں یوں سیلوٹ مارا کہ اس کی سب مشین گن گرتے گرتے بچی۔

"جناب! ہیڈ لیمپس بجھا کر پارکنگ لائٹس جلالیں!" جیپ کے دوبارہ حرکت میں آتے ہی ڈرائیور نے ادب آمیز دھیمے لہجے میں کہا۔

بریگیڈیر محسن الغانم فوجی ضرور تھا لیکن اس کی کھوپڑی روایتی طرز کی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ اپنے ایک ادنیٰ خدمت گار کے مشورے پر تلملایا نہیں بھڑکا بلکہ فوری طور پر اس کے مشورے پر عمل بھی کر ڈالا جو میرے لیے زیادہ حیرت ناک ثابت نہیں ہوا۔

عمارت کے قریب چار بڑے فوجی ٹرک موجود تھے قریب ہی

برآمدے میں سارجنٹ فضیل چار ماتحتوں سمیت موجود تھا۔

چند ثانیوں بعد ہماری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو پتہ چلا کہ ہر بندہ بیس گز کے فاصلے پر پورے احاطے میں مسلح فوجی گھیرے کی شکل میں متعین کھڑے ہوئے تھے۔

ہم تینوں کے اترنے کے بعد بریگیڈیر کا ڈرائیور جیپ کو ٹرکوں کی طرف لے گیا اور بریگیڈیر سکون کے ساتھ سارجنٹ فضیل کی رپورٹ سننے لگا۔

اس دوران میں سارجنٹ کے ماتحت بدستور برآمدے میں موجود رہے تھے۔

سارجنٹ کی روداد میں کوئی بات قابل ذکر نہیں تھی مگر بریگیڈیر تحمل کے ساتھ اس کی بکواس سنتا رہا اور جب وہ خاموش ہوا تو اپنی چھڑی پنڈلی پر مارنے لگا۔

"کوئی خاص بات یا معلم؟" سارجنٹ شاید اپنے افسر اعلیٰ کا مزاج شناس تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ عام فوجی ضوابط کی رو سے ایک معمولی سارجنٹ کا براہ راست بریگیڈیر سے تعلق ہونا قابل اعتراض نہیں تو غیر معمولی ضرور تھا۔

"تجربہ گاہ کے بارے میں تم نے کسی سے ذکر تو نہیں کیا؟" قدرے توقف کے بعد بریگیڈیر نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔" اس نے بلا توقف جواب دیا "لیکن سپاہیوں میں اس کا تذکرہ ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"گرفتاری کے وقت شاید ان دونوں نے پہرے پر موجود سپاہیوں کو کسی تہہ خانے کے بارے میں بتانا چاہا تھا اور پھر نیلے رنگ کی زہریلی گیس والا سلنڈر بھی ان کے قبضے سے برآمد ہوا تھا۔ ان ہی حوالوں سے سپاہی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔"

"اس حد تک کوئی حرج نہیں۔" بریگیڈیر نے پرسکون مگر رازدارانہ لہجے میں کہا "ہم بھی یہی کہیں گے کہ قیدیوں نے عمارت میں کسی تہہ خانے کی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ اس کی اصلیت ہماری دریافت قرار دی جائے گی۔"

سارجنٹ کا چہرہ یکبارگی کھل اٹھا "کیا یہ دونوں بھی اس پر راضی ہوگئے ہیں؟"

بریگیڈیر نے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر سارجنٹ کا شانہ دبایا۔ اور اسی لہجے میں بولا "اس میں ان ہی کا مفاد ہے۔ تم ان کی طرف سے بے فکر ہو۔"

پھر بریگیڈیر ہم دونوں کی طرف متوجہ ہوگیا "اب یہاں جو کچھ ہوگا اسے تم خندہ پیشانی سے برداشت کروگے میں نہیں چاہتا کہ عام سپاہی بھی تمہیں میری طرف سے مراعات یافتہ قیدی سمجھنے لگیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی دشواریوں کا خیال رکھنا ہوگا۔"

"تمہیں ہم سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

اچانک سارجنٹ فضیل برآمدے کی طرف گھوم گیا اور کڑکدار آواز میں چیخا "وہاں کھڑے کیا منہ تک رہے ہو۔ یہ دو قیدی نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

وہ چاروں رائفل بردار دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے اور آناً فاناً میں ہم دونوں کو چار عدد رائفلوں کے ہولناک دہانوں کی زد پر لے لیا گیا۔

"ہوشیار جوان سے۔" بریگیڈیر نے ان میں سے ایک کو پھٹکارا جو جوش میں میرے جسم سے تقریباً آ لگا تھا "یہ خطرناک قیدی ہیں۔"

وہ فوری طور پر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"آگے چلو!" بریگیڈیر نے تحقیر آمیز لہجے میں ہمیں حکم دیا "دیکھیں کہ تمہارا وہ تہہ خانہ کہاں واقع ہے۔"

اس کا لہجہ واضح طور پر استہزائیہ تھا۔ اس نے سارجنٹ کے ماتحتوں کو یہ تاثر دینے کی کامیاب کوشش کی تھی کہ اسے ہماری فراہم کی ہوئی اطلاعات کی صداقت پر ذرہ برابر بھی یقین نہیں آسکا تھا۔

ہم دونوں کو رائفلوں کی نالوں کی زد پر آگے دھکیلا جانے لگا۔ برآمدہ عبور کرکے ہم پہلی راہداری میں داخل ہوئے تو ہر سو گھور اندھیرے کا راج تھا۔

"تاریکی میں ہم راستہ نہ پہچان سکیں گے۔" میں نے دو تین قدم بڑھنے کے بعد رکتے ہوئے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔

"باسم! آگے جاکر عمارت کی ساری روشنیاں جلادو۔"

ہمیں کور کرنے والوں میں سے ایک تیزی سے آگے بڑھ گیا اور اس راہداری کے بعد پوری عمارت میں روشنی پھیلتی چلی گئی۔

اپنی یادداشت کے سہارے میں انہیں اس کمرے میں لے ہی گیا جہاں ایک دیوار گیر آرائشی دستہ کھینچنے پر سامنے کی دیوار فرش میں ہضم ہو جاتی تھی۔

"یہاں تک تو ہم آئے تھے۔ یہاں تہہ خانہ کہاں سے آگیا؟"

"وہ دیوار گیر دستہ کھینچو۔" میں نے اس سے کہا۔

"بے سود ہوگا۔" وہ بے اعتباری سے بولا "وہ محض آرائشی ہے۔ میں نے خود اسے کھینچنے، دبانے اور گھمانے کی کوشش کی تھی۔"

اس اثنا میں سیتا نے آگے بڑھ کر وہ دستہ اپنی طرف کھینچا اور سامنے والی دیوار ایک خفیف سی آواز کے ساتھ فرش میں معدوم ہوگئی۔

بریگیڈیر کے ساتھ ہی سارجنٹ فضیل بھی اضطراری انداز میں آگے بڑھا اور دیوار میں پیدا ہونے والے خلا کے اس پار دھندلی روشنی میں تہہ خانے کا جائزہ لینے لگا۔

"تم چاروں یہیں ٹھہرو۔" بریگیڈیر نے ایک کے ہاتھ سے رائفل لیتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا "اگر ضرورت پڑی تو اندر بلوا لیا جائے گا۔"

"آگے چلو۔" بریگیڈیر نے رائفل کی نال سے اس خلا کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے ہمیں حکم دیا اور ہم اندر داخل ہو کر پہلی چوڑی سیڑھی پر رک گئے۔

سیتا نے گردن گھما کر دیکھا کہ وہ دونوں بھی اندر آچکے تھے۔ تو اس نے کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر اندرونی دستہ کھینچ لیا اور دیوار پلک جھپکتے میں اپنی جگہ واپس آگئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" بریگیڈیئر لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں غرایا "راستہ بحال کرو ورنہ بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

سیتا دھیمے سے ہنسی پھر اس نے دیوار کو دوبارہ نیچے کر دیا۔

"یہ راستہ اسی لیور سے کھلتا اور بند ہوتا ہے؟" بریگیڈیئر نے سیتا کی حرکات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں ——— اور بہت آسان ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بند کر دو اسے!" بریگیڈیئر نے دوبارہ حکم دیا جس کی سیتا نے فوری طور پر تعمیل کی اور تہہ خانے کی سمت میں ہم چاروں رہ گئے۔

"یہ بہتر ہے۔" بریگیڈیئر نے رائفل کی نال جھکا کر اسے آہستگی سے فرش پر ڈالتے ہوئے کہا "اب کس احتیاط کی ضرورت ہے؟"

"بس کسی چیز کو چھیڑا نہ جائے!" میں نے جواب دیا۔

"میں نے آنکھیں بند کر کے تم دونوں پر اعتماد کیا ہے۔" بریگیڈیئر محسن الغانم نے دھیمے لہجے میں کہا "تم ہمارے ساتھ کوئی چالبازی نہیں کرو گے۔"

"ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا، تہہ خانے کی بند اور پُراسرار فضا میں وہ دونوں ہی خائف نظر آرہے تھے "بس یہ ضرور چاہیں گے کہ اس تعاون کے بدلے میں ہمیں جلد از جلد آزادی ملنی چاہیے۔"

"تم فکر نہ کرو۔" بریگیڈیئر نے سیتا کے پیچھے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

سیڑھیوں کے تقریباً وسط میں پہنچتے ہی ان دونوں کے چہروں پر خوف اور حیرت کے آثار اُمڈ آئے کیونکہ ان کے سامنے ہی تین مسخ شدہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن کی حالت عبرت ناک ہو رہی تھی۔ ایک بار اس ماحول سے نکل جانے کے بعد دوبارہ میں بھی انہیں دیکھ کر اپنی جھرجھری پر قابو نہ پا سکا۔

"یہ ... یہ کس طرح مارے گئے؟" بریگیڈیئر نے سوال کیا اس کی آواز میں غیر محسوس سی کپکپاہٹ پوشیدہ تھی۔

"وہ اسی نیلے رنگ کی زہریلی دھند کا شکار ہوئے ہیں جس کا سلنڈر تمہارے محافظوں نے ہم سے لے لیا تھا۔ تیسرا ایک عجوبے کا شکار ہوا تھا۔"

"شاید اس کی بات کر رہے ہو؟" بریگیڈیئر نے اس لاش سے کئی فٹ دور رکتے ہوئے سوال کیا جس کا تقریباً پورا پیٹ زہریلے سیال کے زیر اثر پگھل چکا تھا۔

"ہاں ——" میں نے کہا "اس تجربہ گاہ میں موت کے تحفے اور اس سے بھی زیادہ مہلک ذرائع ایجاد کیے جاتے رہے ہیں۔"

"اوہ ——— یہ تو شاید مائیکل ٹرمپ ہے۔" اسی لمحے سارجنٹ فضیل کی تحیر زدہ آواز ابھری جس میں بے یقینی بھی شامل تھی۔

"مائیکل اپنے دو ساتھیوں سمیت ہمارا آخری نشانہ بنا تھا۔"

"یہی تینوں خفیہ راستے سے آئے تھے؟" بریگیڈیئر نے سوال کیا۔

"ہاں!" میں نے اسے بتایا "پہلے ان کا پروگرام تھا کہ ہم دونوں کو کسی دوا کے زیر اثر مفلوج کر کے آہنی صندوقوں میں بند کر کے بھیج دیا جائے۔ بعد میں یہاں فوجی کارروائی کے نتیجے میں پروگرام بدل گیا ہو گا۔"

باقی ماندہ دو لاشیں جو تجربہ گاہ میں کام کرنے والوں کی تھیں، زہریلے تیروں کا شکار ہوئی تھیں۔ اس وقت تک وہ بالکل سیاہ پڑ چکی تھیں لیکن تیسری لاش کی حالت بہت خراب تھی۔ ہلاکت خیز سیال پھینکنے والا ہتھیار میں نے اسی سے چھینا تھا۔ اور وہ بدنصیب خود اپنی دریافت کا شکار ہوا تھا۔ اس کا جسم نصف کے قریب گل چکا تھا۔ لاش کے قریب فرش پر سریش جیسا لیس دار اور کثیف رقیق مادہ پھیلا ہوا تھا۔

"یہ اس کا گلا ہوا جسم ہے۔" میں نے اس کثیف رقیق مادے کے بارے میں بریگیڈیئر کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"بس ... بس!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا "زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔"

وہاں سے ہٹ کر وہ حیرت اور دلچسپی کے ساتھ تجربہ گاہ میں موجود ساز و سامان کا جائزہ لیتا رہا لیکن کسی چیز کو چھونے کی ہمت نہ کر سکا۔

چوبی کیبن میں ڈاکٹر آسٹن اور دو محافظوں کی اکڑی ہوئی لاشیں اس جائزے کے اختتام پر سامنے آئیں مگر اس بار ان دونوں کا ردعمل عام ہی رہا کیونکہ فوجی افسر ہونے کے باعث انسانی زندگی کا المناک انجام ان کے لیے ایک پیشہ ورانہ حقیقت تھی۔ ابتدا میں بھی انہیں تعجب بھی اس لیے ہوا کہ مرنے والے روایتی ہتھیاروں کے بجائے انتہائی جدید بھیانک ہتھیاروں کا شکار ہوئے تھے جن کا ذکر بھی اس وقت تک عام نہیں ہوا تھا۔

وہاں سے ہم چاروں خاموشی کے ساتھ واپس ہو لیے۔

سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد بریگیڈیئر نے آخری سیڑھی پہ ہی رائفل اٹھا کر دوبارہ سیدھی کر لی اور اس کے اشارے پر سارجنٹ فضیل

نے تہ خانے سے نکاسی کا راستہ کھول دیا اور ہم چاروں یکے بعد دیگرے باہر نکل آئے۔

"اس کمرے پر چار آدمی مامور کر دو۔" وہ راستہ بند کیے جانے کے بعد بریگیڈیر نے سارجنٹ فضیل کو حکم دیا "اس اوپری کمرے میں چڑیا کا بچہ بھی پر نہ ملنے پائے۔"

"اگر اجازت ہو تو اس اوپر والے کمرے کو ہی باہر سے سیل کر دوں؟" سارجنٹ فضیل نے مؤدبانہ لہجے میں تجویز پیش کی۔

"یہی بہتر رہے گا۔" بریگیڈیر نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا اور پھر ہمارا جلوس اس کمرے سے واپس روانہ ہوگیا۔

سارجنٹ کی ہدایت پر دو سپاہی وہیں رک گئے تھے۔

ہم دونوں کو فوجیوں کی تحویل میں دے کر بریگیڈیر محسن العلم اپنے ماتحت کے ساتھ کچھ دیر صلاح مشورے کرتا رہا جس میں بعد میں کچھ اور فوجی بھی شریک ہوگئے۔

آخر کار رات گئے وہاں سے واپسی کی نوبت آئی اور بریگیڈیر کی جیپ میں ہم دونوں کو ایک بار پھر سخت عقبی نشستیں سنبھالنی پڑیں۔

گیریزن کے ہیڈ کوارٹر میں سناٹے بلکہ ویرانی کا بھرپور راج تھا۔ مگر بریگیڈیر کی جیپ اندر گھستے ہی کئی گوشوں سے مسلح سنتری نکلتے ہوئے نظر آئے۔ جو میدان صاف پا کر شاید عافیت کے گوشوں میں سستا رہے تھے۔

ان کی ایڑیاں بجتی رہیں اور بریگیڈیر ان پر توجہ دیے بغیر جیپ کو آگے لیتا چلا گیا۔

برآمدے سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں اس وقت روشنی ہو رہی تھی۔ بریگیڈیر کا ڈرائیور جیپ رکتے ہی تیزی سے نیچے کودا اور اس روشن کمرے کی کھڑکی پر جھک کر کسی سے کچھ کہنے لگا۔

جتنی دیر میں ہم دونوں نیچے اترتے اس کمرے سے دو فوجی باہر نکل آئے۔

"انہیں انٹروگیشن سیل میں ڈال دو۔" بریگیڈیر نے تحکم آمیز لہجے میں ان سے کہا اور ہماری طرف دیکھے بغیر برآمدے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

"کدھر چلیں؟" میں نے ان دونوں کو خاموش کھڑے دیکھ کر چند ثانیوں کے بعد سوال کیا۔

"ادھر چلو۔" وہ دونوں ہی چونک کر بیک وقت بولے اور ہم برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے داہنی طرف چل دیے۔

انٹروگیشن سیل میری دانست میں وہی سلاخوں والا کمرہ تھا جہاں ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو محبوس پایا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی میری یہ غلط فہمی رفع ہوگئی۔

ہمیں برآمدے اور متعدد راہداریوں سے گزرنے کے بعد جس بڑے چوبی دروازے کے سامنے رکنے کو کہا گیا۔ وہ یقینی طور پر سلاخوں والا زنداں نہیں تھا۔

آنے والوں میں سے ایک نے بڑھ کر دروازے کا قفل کھولا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا ہم دونوں نے اس کی تقلید کی وہ سپاہی باہر کھڑا رہا۔

اندر گھستے ہی بے اختیار میرے منہ سے ایک پُراطمینان آہ خارج ہوگئی۔

کھردرے فرش اور ننگی سپاٹ دیواروں کے برعکس وہ کمرہ قرینے کا تھا۔ عقبی دیوار میں آہنی جالی میں محفوظ ایک بڑی کھڑکی تھی جس پر وہ سمٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کھلے ہوئے دوسرے دروازے کے عقب میں ملحقہ باتھ روم بھی نظر آ رہا تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر جو چیز خوشی کا باعث بنی۔ وہ تین عدد آرام دہ مسہریوں کی موجودگی تھی۔

ان مسہریوں کے درمیان ہی دو کرسیاں بھی موجود تھیں۔

"میرے ساتھی کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔" سیتا نے دونوں فوجیوں کو واپسی پر آمادہ پا کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا؟" باہر والا بھی اندر ہی آگیا۔

"شانے پر گولی کا زخم اور سر پر ضرب ہے۔" سیتا نے کہا۔

ان میں سے ایک نے دونوں ضربات کا جائزہ لیا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا "تھوڑی دیر میں ڈسپنسر مرہم پٹی کر جائے گا۔"

"اور کھانا؟" میں یک بیک بھوک کی نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔

"صبح ناشتے سے پہلے کچھ ملنا مشکل ہے۔ میس بند ہو چکا ہوگا۔" میں نے اندازہ لگایا کہ ان دونوں میں شائستگی اور انسانی ہمدردی موجود تھی۔

"نہ ملا تو صبر کر لیں گے۔" میں نے کہا اور دونوں باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ بند کر کے باہر سے مقفل کرنا نہیں بھولے تھے۔

"آثار کچھ بہتر ہیں۔" تنہائی میسر آنے پر سیتا نے کہا۔

"جب تک رہائی نہ مل جائے حالات غیر یقینی ہی رہیں گے۔" میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"تہ خانے میں میری نیت خراب ہو رہی تھی۔" سیتا۔۔۔ مسکراتے ہوئے میرے قریب آ بیٹھی۔

"کیا انہیں مارنے کا ارادہ تھا؟"

"سب کچھ ہوا ہے۔ لیکن مہلک سیال پھینکنے والا پستول بدستور میرے پاس ہے۔" اس نے فتح مندانہ لہجے میں کہا۔

"اور زہریلے تیروں والی شیشی بھی ہے میرے پاس۔" میں نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"اگر حالات دگرگوں ہوتے نظر آئے تو ہم بے دریغ ان سے بھڑ جائیں گے۔" سیتا نے جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا اور میں نے اس کی گردن بازو میں دبوچ لی۔

اس وقت میں مسلح ہونے کی خبر پا کر یک بیک خود کو ذہنی طور پر بہت زیادہ آسودہ محسوس کر رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد ڈسپنسر ایک فوجی کے ہمراہ آیا تو ہم دونوں بستروں پر دراز تھے۔ مگر دروازے پر آہٹیں سن کر ان کے داخلے سے پہلے اٹھ گئے۔

ان دونوں کے پیچھے ایک خوبرو نرس بھی اندر داخل ہوئی تو سیتا کی تیوریوں پر بل پڑ گئے مگر وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔

نرس فرسٹ ایڈ کے سامان کی ٹرے سنبھالے ہوئے ان دونوں سے آگے بڑھ کر میرے قریب ہی بستر پر آ بیٹھی۔

میں سیتا کے تاثرات بھانپ چکا تھا۔ لہٰذا اسے چڑانے کے لیے دانستہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

"کیسے چوٹ آئی تمہارے؟" نرس نے میرے شانے کے زخم پر بندھے ہوئے چیتھڑے کھولتے ہوئے پُراشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

"ایک مجرم کی گولی نے جلد ادھیڑ ڈالی۔" میں نے کہا اس اثنا میں ڈسپنسر فرسٹ ایڈ کے سامان میں سے کچھ نکالنے لگا تھا۔

"ہڈی بچ گئی۔" وہ میرا شانہ ٹٹول کر ورم کی عدم موجودگی محسوس کرتے ہوئے بولی "ذرا بھی ہاتھ ہلتا تو ہنسلی کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔"

"تم خاموشی سے کام نہیں کر سکتیں؟" سیتا سے اس کا ہمدردانہ لہجہ برداشت نہ ہو سکا۔ اور وہ درمیان میں ٹانگ اڑا ہی بیٹھی۔

"اے لڑکی۔" سفید پوش ڈسپنسر نے خشک بلکہ اکھڑ لہجے میں سیتا کو مخاطب کیا۔ "یہاں سے ہٹو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔"

"میں تمہارا ہاتھ تو نہیں روک رہی۔" سیتا غرائی

"ادھر چلو۔" فوجی نے اپنی رائفل سیدھی کر کے اس کی نال سے کمرے کے ایک دور افتادہ گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میری بیوی ہے۔" معاملہ بڑھتے دیکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہوا کرے۔" نرس لاپروائی سے بولی "ہم تمہاری ہی مدد کے لیے آئے ہیں۔ اسے میرا تم سے بات کرنا ناگوار کیوں لگ رہا ہے؟"

"سوار کیوں ہوئی جا رہی ہو اس پر۔" سیتا نے غصّے اور بے بسی کے ساتھ کہا۔ "جو کام تم کر رہی ہو وہ میں تم سے بہتر کر سکتی ہوں۔"

"تو پھر کر لو۔" ڈسپنسر کچھ زیادہ ہی تنک مزاج تھا۔ "اب اس زخم میں زہر باد ہی ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ نرس سے مخاطب ہوگیا "چلو سامان اٹھاؤ یہاں سے۔"

اور وہ تینوں واقعی کمرے سے چلے گئے۔

سیتا چند ثانیوں تک سر جھکائے کھڑی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "شاید اب وہ ہرگز واپس نہیں آئیں گے۔"

"تم کچھ دیر خاموش رہتیں تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔" میں نے ہنستے ہوئے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔

"اور اسے نہیں دیکھا تم نے؟" اس کی آواز کی بھراہٹ میں غصّہ بھی اُمڈ آیا۔ "آتے ہی تم سے کیسی جڑ کر بیٹھی تھی۔"

"نرسوں کا کام ہی ایسا ہوتا ہے۔" میں نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔ "اگر وہ مریضوں میں جنس اور عمر کا امتیاز کریں تو کام ہی نہیں کر سکتیں۔ مجھ میں کوئی سرخاب کے پر نہیں ہیں۔ جو وہ آتے ہی مجھ پر مر مٹی تھی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں افسوس ہو رہا ہے اس کے یوں چلے جانے کا؟" وہ یک بیک اداس ہوگئی۔

"اس معاملے میں نری بیوقوف ہو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مجھے تو احساس بھی نہیں تھا کسی طبّی امداد کی ضرورت کا ـــ تم نے خود ہی انہیں بلایا تھا ـــ اور وہ کون سا مجھے ساتھ لیے جا رہی تھی۔ مرہم پٹی کے بعد چلی جاتی۔"

"یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ عورت کی فطرت سے ناواقف ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور میں اس کی کم فہمی پر دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ "عورت دوسری عورت کے حق پر ڈاکا ڈال کر بڑائی محسوس کرتی ہے۔ میں عورتوں میں رہی ہوں۔ میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں۔" وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی "ابھی وہ مرہم پٹی کرتی پھر دیکھ بھال کے بہانے سے دوبارہ آ جاتی۔۔۔۔ اس کا پیشہ کتنا ہی مقدس ہو لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی تھی۔"

"کیسی چمک تھی بھلا؟"

"دیکھتے تو شاید تم بھی پہچان لیتے۔" اس نے قدرے چڑ کر کہا۔ "میرے لیے بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسی باتیں محسوس ہی کی جا سکتی ہیں۔"

"خیر ـــ اب تو وہ چلی گئی، اس کے بارے میں سوچ کر اپنا خون نہ جلاؤ۔" میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"میرا بس چلے تو تم پر کسی غیر عورت کا سایہ تک نہ پڑنے دوں۔"

اس نے ہنستے ہوئے جو کچھ کہا وہ مختصر ضرور تھا مگر مفہوم کے اعتبار سے اس قدر جامع تھا کہ ان چند الفاظ میں مشرق کی عورت کا پورا مزاج سمویا ہوا تھا۔

تکان اور تکلیف کے باعث تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ہی سو گئے اور ایسی گہری نیند سوئے کہ دروازہ کھلنے پر بھی آنکھ نہ کھل سکی۔

جب خمار سے بوجھل ذہن میں گرد و پیش کا مبہم سا احساس بیدار ہوا تو اس بیداری کا سبب بھی فوراً ہی واضح ہوگیا۔

ایک شخص نہایت بے رحمی سے مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔

میں نے ہڑبڑا کر بستر چھوڑ دیا اور پلکیں جھپکتے ہوئے اس کمرے میں موجود اس بھیڑ کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ جو بستر کے گرد موجود تھی۔

یہ بات تو پہلی ہی نگاہ میں واضح ہوگئی کہ فوجی وردیوں کے ہجوم میں تین سادہ شہری لباس بھی نظر آ رہے تھے۔

ان تینوں کے لباس بے داغ اور اس قدر نفیس تھے کہ ان سے

اختیار اور دبدبے کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور یہ تاثر لباس سے ابھر کر خدوخال پر اور زیادہ واضح ہو گیا تھا ورنہ عموماً بیش قیمت اور ستھرے لباس پر موجود چہرے پیرہن کی بے توقیری کا بھی باعث بن جاتے ہیں۔

"جنرل صاحب تم سے ملنے آئے ہیں۔" بریگیڈیر کی آواز مجھے اپنے عقب سے سنائی دی جس میں تحکم ضرور تھا لیکن لہجہ حیرت ناک حد تک دھیما تھا۔

میں بستر سے اترنے کے لیے آگے کھسکا اور اس سمت میں موجود لوگوں نے میرے نیچے اترنے کے لیے جگہ چھوڑ دی۔

میرے نیچے پہنچتے ہی میرے لیے جگہ بنا دی گئی تاکہ میں سادہ لباس میں موجود اس شخص کے روبرو پہنچ سکوں جو سب سے زیادہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگار دبا ہوا تھا اور پیشانی پر تفکر آمیز لکیریں نظر آ رہی تھیں جو اس کے خدوخال کا مستقل حصہ نہیں تھیں۔

دو قدم آگے بڑھ کر میں نے گردوپیش میں نگاہیں دوڑائیں تو سیتا بستر کی دوسری جانب کھڑی نظر آئی۔ شاید اسے مجھ سے پہلے بیدار کر لیا گیا تھا۔

"ہوں ــــ تو تم ہو صفدر علی ؟" سویلین لباس والے سگار نوش نے سرتاپا میرا جائزہ لیتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

میں سر ہلا کر رہ گیا کیونکہ اس کا لہجہ محض تائید طلب تھا۔

"یوسف کہاں ہے ؟" قدرے توقف کے بعد اس نے ایک غیر متوقع سوال کر ڈالا۔

"وہ .... وہ درنہ تک ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے بعد کہاں گیا۔ یہ ہمیں معلوم نہیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کیونکہ اس موضوع پر بریگیڈیر محسن الغانم نے مجھے کوئی واضح ہدایت نہیں دی تھی اور میں اپنی جانب سے کوئی تضاد پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"عبدالباقر سے واقف ہو ؟" اس کا سوال سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر سرایت کر گئی۔ وہ تو گڑے مردے اکھاڑنے پر تلا ہوا تھا۔

"نہیں۔" ایک لحظہ کے بعد میں نے پُراعتماد لہجے میں صاف انکار کر دیا کیونکہ اقرار کی صورت میں سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

"تم یمن میں کیسے داخل ہوئے ؟" اس نے سگار کا ایک گہرا کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی نگاہیں مسلسل میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"بحری رستے پر ایک لانچ نے ہمیں ویران ساحل پر اتار دیا تھا۔" میں اس کے سوالات کے جواب بہت احتیاط سے دے رہا تھا۔ "یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ہم یمن پہنچ چکے ہیں۔"

"یمن میں تم کن لوگوں کے پاس پناہ گزین تھے ؟" سطحی گفتگو کے بجائے وہ ہمارے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرنی چاہ رہا تھا۔

"صنعا تک چھپتے چھپاتے پہنچے۔ پھر یہاں فلسطینی تنظیم کے دفتر سے رابطہ قائم کیا تھا۔" میں نے ضرورت سے زیادہ نہ بولنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

"ان کے لیے تمہارے پاس کیا شناخت تھی ؟"

"کوئی نہیں۔"

"پھر یوسف نے تمہیں کیسے قبول کر لیا ؟"

"اس نے اپنے کسی دفتر سے اس بارے میں ہدایات لی تھیں۔"

"یہ واقعہ کتنا پرانا ہے ؟"

"شاید آٹھ دس روز۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت یوسف حکومت کا مفرور اشتہاری مجرم تھا ؟" سگار نوش کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔

"نہیں ـــ ہمارے لیے یہ ایک خبر ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے ہم نے کسی کام میں اس کی معاونت نہیں کی۔ اس تمام عرصے وہ ہمیں ایک سے دوسری جگہ لیے چھپتا رہا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ساری بھاگ دوڑ ہمارے لیے کر رہا تھا۔"

اس کے لبوں پر تنفر آمیز کھچاؤ پیدا ہو گیا مگر وہ بولا تو لہجہ معتدل ہی تھا۔ "تم اس کے ساتھ اس کے کس کس ٹھکانے پر گئے ؟"

"صنعا ہمارے لیے اجنبی شہر ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "ہماری نقل و حرکت رات کے اندھیرے میں ہوتی تھی اور ہر دن نئے ٹھکانے پر بسر ہوتا تھا۔"

"ان ٹھکانوں کو شناخت کر سکو گے ؟"

"ہم جھونپڑیوں سے فلیٹوں تک میں رہے ہیں۔ ہم پر اپنی حفاظت کا ایسا خوف طاری تھا کہ کہیں بھی جزئیات پر توجہ نہ دے سکے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

اس نے پھر سگار کا ایک گہرا کش لے کر بے چینی سے پہلو بدلا۔ "درنہ میں کہاں گئے تھے ؟"

"وہ کسی سے ملنے گیا تھا۔" میں نے فوری طور پر ایک مربوط کہانی شروع کر دی۔ "مگر وہ شخص نہ مل سکا بلکہ اس کے حوالے سے ایک شخص نے خود کو متعارف کرایا۔ یوسف دھوکا کھا گیا اور اس نے ہم دونوں کو اس شخص کی پناہ میں دے دیا...."

"درنہ میں اس سے کہاں ملاقات ہوئی تھی ؟" اس نے میری بات کاٹ کر مضطربانہ لہجے میں سوال کیا جیسے اسے سرا ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہو۔

"صنعا سے وہاں پہنچنے والی بسوں کے اڈے پر۔" میں نے لہجے میں جواب دے کر اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

اس نے سگار کا خاصا بڑا باقی ماندہ حصہ فرش پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔ جو شاید غصے کا جذباتی اظہار تھا۔

"ابوالمکتوم، محسن الغانم اور ابو محمد کے علاوہ سب لوگ باہر نکل جائیں۔" اس شخص نے اونچی آواز میں ہدایت جاری کی اور سب لوگ تیزی سے

باہر جانے لگے۔

میں بغور جانے والوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ان میں کئی عام فوجی بھی تھے لیکن حیرت کی بات تھی کہ بریگیڈیر محسن الغانم کا چہیتا سارجنٹ فضیل کہیں نظر نہ آیا۔

باہر نکلنے والے آخری آدمی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

اب اس کمرے میں کُل چھ نفوس تھے۔

محسن الغانم اپنی مکمل فوجی وردی میں تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایک افسر اسی قسم کے اعزازات سمیت نظر آ رہا تھا۔ تیسرا سویلین لباس والا ترش رو شخص تھا جس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں قیمتی ہیروں کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں اور چوتھا سگار نوش سادہ پوش تھا جو ان میں اس وقت سب سے زیادہ بااختیار نظر آ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک گہرا سانس لے کر کرسی میں دھنس گیا۔

ترش رو نے دوسری کرسی سنبھال لی۔ محسن الغانم اور اس کے ساتھی نے وردیوں اور رتبے کی مناسبت سے کھڑے رہنا ہی مناسب سمجھا اور بیٹھنے والوں میں سے کسی نے ان کو دوبارہ بیٹھنے کے لیے نہیں کہا جس کا مطلب تھا کہ دوسرا سادہ پوش بھی وردی والوں سے زیادہ اختیارات کا مالک تھا۔

میرے اور سیتا کے لیے تو خیر مجرمانہ انداز میں کھڑے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھ کر نیا سگار نکالا اور اس کا گوشہ توڑ کر اسے سلگانے کے بعد پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

"وہ اجنبی کون تھا ؟"

"اس وقت یوسف کے رویے کے پیش نظر ہم اسے اپنا ہمدرد ہی سمجھے تھے لیکن وہ ہمیں درنہ سے براہِ راست اس عمارت میں لے گیا جہاں سے ہماری گرفتاری عمل میں آئی ہے۔" میں کہنے لگا۔ "وہاں ہمیں ہتھیاروں کی زد پر قیدی بنایا گیا تو اندازہ ہوا کہ یوسف اس کی شناخت تک بُری طرح دھوکے کا شکار ہوا تھا۔"

"پھر یوسف کا کیا ہوا ؟"

"کچھ پتہ نہیں ـ ہم تو مسلسل قید میں تھے۔"

"مسلسل قید میں تھے۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے دہرایا۔ "سُن رہے ہو ابوالمکتوم! کتنا تضاد ہے اس کہانی میں۔"

یکبارگی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور نگاہوں کے سامنے شرارے سے کوندنے لگے۔ نہ جانے اس نے میرے نپے تلے جوابات میں کہاں تضاد پکڑ لیا تھا۔

دوسرے سادہ پوش نے کرسی میں پہلو بدلا۔ پھر کھانس کر بولا۔ "اس نے تمہیں یوسف کے بارے میں کیا بتایا تھا محسن ؟"

"یوسف نے اس عمارت میں گھسنے کی ناکام کوشش کے بعد ہمیں اس عمارت پر ہلا بولنے پر اکسایا تھا۔" محسن الغانم بھی کچھ ہراساں نظر آنے لگا تھا۔

اس کا جواب سن کر میری جان میں جان آئی اور میں مشینی انداز میں بول پڑا۔ "وہ محض قیاس تھا میرا.... یوسف ہم دونوں کے بارے میں بہت فکرمند تھا۔ ہو سکتا ہے کہ الگ ہو جانے کے بعد اس نے درنہ سے صنعا تک اس آدمی کی کار کا تعاقب کیا ہو۔ یقینی طور پر تو ہم کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ میں نے ہر بات سچ بتائی ہے۔"

"اب اصل بات شروع نہ کر لی جائے ؟" ابوالمکتوم نے طویل ہوتے ہوئے سکوت کو توڑ کر سگار والے کو یاد دلایا۔

سگار والے نے لمحہ بھر کے لیے خوابناک انداز میں میری طرف دیکھا پھر بولا۔ "اب تک جو کچھ بات ہوتی رہی وہ اتنی اہم نہیں تھی۔ آخر میں خیال آیا تھا کہ شاید تمہارے ذریعے یوسف بھی ہاتھ آ سکے لیکن اب اس کی ذات ثانوی رہ گئی ہے۔"

میرے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں تھا کہ نسبتاً غیر اہم گفتگو سے بازپرس کا آغاز محض اس لیے کیا گیا تھا کہ باہر نکالے جانے والوں کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ اس وقت کا اہم ترین موضوع یوسف کی ذات تھی جب کہ اصل بات ان لوگوں سے بھی چھپائے جانے کے قابل تھی۔

"اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تم یمن میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتے ہوئے بھیڑ چھٹ جانے کے بعد ابوالمکتوم اتنا زیادہ مجبور و محکوم نظر نہیں آ رہا تھا۔ "تمھیں گولی مار کر کسی سڑک پر پھینک دیا جاتے تو تمھاری فریاد کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

"یہ میں جانتا ہوں۔" میں نے سر جھکا کر بے بسی سے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ وہ عمارت کن لوگوں کا مسکن تھی؟" سگار والے جنرل نے سوال کیا۔

"قانون تو یمن کا بھی ہمارے خلاف صف آرا ہے مگر ہمارے لہو کے پیاسے صرف اسرائیلی ہیں۔ وہ ہمیں اپنے قومی مجرم کے طور پر اسرائیل لے جانا چاہتے تھے۔"

"اس تہ خانے کے بارے میں تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟" جنرل پر اعصابی اضطراب کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

"وہ ایک خفیہ ٹھکانا ہے جہاں بعض عجیب ہتھیار موجود ہیں۔"

"تم نے ان لاشوں کو کن ہتھیاروں سے ٹھکانے لگایا ہے؟"

"چند زہریلی سوئیاں اور ایک گیس سلنڈر، وہ ڈاکٹر آسٹن نے ہمیں مجبور و مقہور سمجھتے ہوئے فخریہ خود دکھائی تھیں۔"

"مگر دو لاشوں کے جسم اور تیسری کی ایک پنڈلی گلی ہوئی تھی۔ وہ کس ہتھیار کا شکار ہوتے ہیں؟" اس نے فکر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ایک شیشی میں محلول تھا کوئی جو اتفاقاً ہاتھ آگیا۔" میں نے سفید جھوٹ بولا۔ "مگر جب ہم نے پہلے شکار پر اس کا اثر دیکھا تو دوسرے دو دشمنوں پہ اسے ہتھیار کے طور پر احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کی۔"

"وہ تہ خانہ ایک ہولناک زنداں ہے۔" غیر ارادی طور پر جنرل کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ "محسن نے اس کے بارے میں خوفناک اطلاع فراہم کیں، جن کی روشنی میں چند سائنسی ماہرین نے وہاں کا جائزہ لیا اور محض چند چیزوں کی اصلیت نے انھیں خوف زدہ کر دیا۔ اس تہ خانے کے چپے چپے پر موت کے ناقابلِ یقین روپ پوشیدہ ہیں اور ہر الماری برقی تاروں اور ڈائنامائیٹ کے ایک ایسے سلسلے سے منسلک ہے کہ کہیں بھی کسی بھی غلط چیز کو چھیڑا گیا تو وہ سب کچھ برباد ہو جائے گا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے کتنی ہلاکت جنم لے گی۔"

جنرل کے اس تبصرے پر میں جھرجھری لیے بغیر نہ رہ سکا۔ موت کے منہ میں بقا کی جنگ لڑنے والا نتائج سے بے پروا ہو کر سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے اور ہم نے بھی یہی کیا تھا۔ تجوری میں مرکزی برقی نظام کو ناکارہ بناتے ہوئے بھی سب کچھ برباد ہو سکتا تھا مگر اس وقت ہم نے کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اس انٹروگیشن سیل میں جنرل کی زبانی سائنسدانوں کے مشاہدات سنتے ہوئے میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

"ہمارے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ سائنسی عجائب گھر ہمارے لیے گلے کی ہڈی بن گیا ہے۔" جنرل کہہ رہا تھا۔ "نہ اسے جوں کا توں چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ اسے تباہ کرنا ہمارے ماہروں کے لیے آسان اور بے خطر ہے......"

"دوسری چیز۔" ابوالمکتوم نے دخل دیا۔ "وہ مختصر لیکن بھرپور جنگی تجربہ گاہ ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس کی یہاں موجودگی کا راز منظرِ عام پر نہیں لایا جا سکتا۔ ہمارے دوست ہم پر سنگین غفلت کا الزام عائد کریں گے۔ لبنان کے ہزاروں معذور اور یتیم بچوں کی کسمپرسی میں ہمارا نام لیا جائے گا۔ اس رسوائی سے بچنے کی صرف دو صورتیں ہیں۔"

"کاش میں کسی کام آسکوں۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے اداس لہجے میں کہا۔

"تمھاری عورت ضمانت کے طور پر ہماری تحویل میں رہے گی۔" بوجھل سکوت کے بعد جنرل نے پہلی بار مجھ سے نگاہیں چار کیے بغیر کہا۔ "اور تم رہا کر دیے جاؤ گے۔ یمن میں تمھیں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ تم بہت سے اسرائیلیوں کو جانتے ہو اور وہ سب تم سے واقف ہیں۔ اس عمارت سے نکل بھاگنے والوں میں سے بیشتر ابھی تک صنعا میں ہوں گے۔ وہ فوراً تمھارے پیچھے لگ جائیں گے۔ اب تم پکڑے جاؤ یا ان میں سے ایک کو پکڑ لو، تمھیں ان میں سے ایک سودا کرنا ہوگا۔"

"سودا؟" میں نے حیرت اور بے یقینی کے ساتھ دہرایا۔

"ہاں۔" جنرل نے سگار کا گل فرش پر جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس تہ خانے کی تنصیبات بیش قیمت اور بڑی نادر الوجود ہیں۔ تم انھیں پیشکش کرو کہ ان کے ماہرین تمھیں معاوضہ دے کر ایک مقررہ مدت میں اس تجربہ گاہ کی ایک ایک کیل اسرائیل منتقل کر سکتے ہیں۔ ورنہ تجبری کا معاوضہ طے کر کے تم مقامی حکومت کو تہ خانے کے راز سے آگاہ کر دو گے۔"

میں حیرت سے چند ثانیوں کے لیے گنگ رہ گیا پھر نقاہت آلود آواز میں بولا۔ "اگر میں نے اقرار کر لیا کہ تہ خانے کا راز میرے سینے میں دفن ہے تو وہ مجھے فوراً ہلاک کر دیں گے تاکہ تجربہ گاہ میں دوبارہ اپنے کام کا آغاز کر سکیں۔ یہ تو سراسر خودکشی ہوگی۔"

"نہیں۔" جنرل اٹھ کر مختصر سی جگہ میں بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ "منصوبہ بہت بہتر ہے۔ تمھیں جیبی ٹرانسمیٹروں سے لیس چار غیر سرکاری آدمی دیے جائیں گے۔ باری باری دو آدمی ہر وقت دور سے تمھاری حفاظت کرتے رہیں گے۔ مغلوب ہو جانے کی صورت میں تم ان کی موجودگی جتا سکو گے۔ پھر سیتا دنیا کی نظروں سے دور ہماری تحویل میں رہے گی۔ تم انھیں بتاؤ گے کہ سیتا بھی تہ خانے کے راز سے اسی قدر واقف ہے جتنے تم۔ اور اگر تم مسلسل بارہ

گھنٹے تک غائب رہے تو سیتا اپنی معلومات مقامی حکام تک پہنچا دے گی۔ دو دھمکیاں تمھاری زندگی کی مؤثر ترین ضمانت ہوں گی اور اگر تم اپنے مشن میں کامیاب رہے تو سودے میں حاصل ہونے والی رقم کے علاوہ تمھیں ہماری حکومت بھی خطیر انعامات سے نوازنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"یعنی اسرائیلیوں کو سارا ساز و سامان اور آلات اکھاڑ لے جانے کا موقع فراہم کیا جائے گا تاکہ وہ اپنا ہلاکت خیز منصوبہ جاری رکھیں۔" میں نے حیرت، صدمے اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات کے تحت مایوسانہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہی سمجھ لو۔ فی الوقت یہی سمجھ لو۔" جنرل اضطراری لہجے میں بولا۔

"یہ میرے ضمیر کے لیے ناقابلِ برداشت بوجھ ہوگا جنرل!" میں نے کرب آلود لہجے میں کہا۔ "تم دوسری صورت کیوں نہیں بتاتے؟"

"دوسری صورت ہمارے لیے بوجھ بنے گی۔" ابوالمکتوم نے اپنی ہیروں والی انگوٹھیوں کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

"کسی دوست ملک سے مدد لی جا سکتی ہے۔"

"مذاق بنوانے کے لیے۔" ابوالمکتوم غرایا۔ "یہ نہ بھولو کہ اس وقت تمھاری حیثیت کیا ہے۔ مشورہ دینے کے بجائے تعاون کرنے کی کوشش کرو۔"

میں نے کرب ناک نگاہوں سے باری باری ان دونوں سادہ پوشوں کو دیکھا جن کے چہرے لمحات کی سنگینی کے تحت کھُتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"اسرائیل کے ہاتھ مضبوط کرنے کے معاہدے میں، میں فریق نہیں بن سکتا۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر بالآخر کہہ ہی ڈالا۔

ابوالمکتوم مٹھیاں بھینچ کر کرسی سے اٹھ گیا اور جنرل تھکے ہوئے انداز میں دوبارہ کرسی پر دراز ہو گیا۔

"ہم... ہم اسرائیل کے ہاتھ مضبوط کرنے نہیں جا رہے۔" ابوالمکتوم دانت پیستے ہوئے نیچی آواز میں غرایا۔

"بتا دو... اسے پوری بات بتا دو۔" جنرل نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر ہولے ہولے آگے پیچھے جھولتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ اس بساط پر ہمارے پاس یہی ایک مہرہ ہے۔" ابوالمکتوم طیش کے عالم میں غرایا۔ "اس کے سامنے ہم سب بالکل بے بس ہیں۔"

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ اس جنگی تجربہ گاہ کی بھیانک ایجادات یمن کے گلی کوچوں میں بھی لبنان کی طرح معذور اور یتیم بچوں کی قطاریں پیدا نہیں کر....."

"خاموش۔" ابوالمکتوم پلٹ کر نیچی مگر قہر آلود آواز میں غرایا پھر سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ہم بھی اپنے بچوں کے لیے اپنی چھاتیاں چھلنی کرا لینے کا جذبہ رکھتے ہیں....."

"تو پھر....." میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے مجھے جھڑک دیا۔

"بکو مت۔ اب خاموشی سے سنتے رہو۔" وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کی اضطراری کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ اپنی بات کی ابتدا کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم اپنا کام، اپنا معاہدہ کرتے رہو گے۔" سکوت کے بعد وہ دوبارہ بولا تو اس کی آواز سے غیظ و غضب کے اثرات رفع ہو چکے تھے۔ "مگر ہم اس عمارت پر دور سے کڑی نگاہ رکھیں گے۔ تہ خانے سے ساز و سامان نکلتا رہے گا اور ہم صرفِ نظر کرتے رہیں گے۔ پھر جس بحری یا ہوائی جہاز سے وہ سامان یمن سے لے جانے کی کوشش کی جائے گی اسے ویران سمندر یا صحرا میں پوری قوت سے وار کر کے تباہ کر دیا جائے گا۔ آبادیوں سے دور وہ ساز و سامان اپنے رکھوالوں سمیت نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس کوشش میں اگر کچھ بے گناہ بھی بحالتِ مجبوری مارے گئے تو گریز نہیں کیا جائے گا۔"

"اب واقعی تمھاری تجویز قابلِ عمل نظر آتی ہے۔" میں نے اپنے سینے سے بوجھ ہٹتا ہوا محسوس کیا۔ "لیکن دوسری تجویز بھی بتا دینے میں کیا حرج ہے؟"

"کسی غیر ملک سے یہ معاملہ حکومتی سطح پر اٹھانے سے وقار پر حرف آتا ہے۔" ابوالمکتوم نے کہا۔ "اگر چند روز میں تمھاری کسی اسرائیلی ہرکارے سے مڈبھیڑ نہ ہوئی تو پھر ہم چاہیں گے کہ ان ہی شرائط پر تم کسی ترقی یافتہ ملک کے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کرو... لیکن اس کام میں ہم مخل نہیں ہو سکیں گے۔ ان کے مواصلاتی ذرائع بہت حساس ہیں۔ ہم ان سے مخاصمت مول نہیں لے سکتے۔ اور یہ سارا ساز و سامان ان کی تحویل میں چلا جائے گا۔"

"اس سے شاید کوئی فرق بھی نہ پڑے۔" جنرل نے کہا۔ "بڑی یا ترقی یافتہ طاقتیں پہلے ہی ایسی ایجادات پر کام کر رہی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تجربہ گاہ ان کے لیے دقیانوسی ثابت ہو مگر اس کے باوجود وہ اسے اکھاڑ لے جانا چاہیں گے تاکہ یمن جیسے ملک کو ایک اہم جنگی حکمتِ عملی تک رسائی حاصل نہ ہو سکے۔"

ابتدا میں ان دونوں کی باتیں مجھے احمقانہ محسوس ہو رہی تھیں لیکن ان کی تجاویز کے سارے پہلو سامنے آ جانے کے بعد مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ انھوں نے تجربہ گاہ کے معائنے کے بعد چند گھنٹوں کی مختصر سی مدت میں ایک اہم معاملے پر اتنے دور رس فیصلے کیسے کر لیے تھے۔

"میں تیار ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اس تجربہ گاہ کا یمن کی

سرزمین پر ہی تباہ کیا جانا سب سے بہتر ہو گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔" ابوالمکتوم بولا۔ "وہ تہہ خانہ ہلاکت کا انبار ہے۔ اسے وہی چھیڑنے کی جرأت کر سکتا ہے جس نے اسے بنایا ہے یا جو اس کے سارے رموز سے واقف ہے۔"

"میں بحث نہیں کر رہا۔" میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "مگر میں نے بھی ایک الماری جڑ سے اکھاڑ پھینکی تھی اور کچھ بھی نہ ہو سکا۔"

"خوش قسمتی تھی تمہاری۔" ابوالمکتوم بولا۔ "موت سمجھدار کے لیے ہی ہوتی ہے۔ تم سائنس کی ابجد سے بھی ناواقف ہو پھر تم ہر قیمت پر نجات کے متلاشی تھے خواہ اس کے نتیجے میں ہر سو موت کے ہیولے رقص شروع کر دیتے مگر جاننے والے اسے کبھی نہ چھیڑیں گے۔ ہاں ابھی جنگلی مزدوروں کو کدالیں پھاوڑے ہتھوڑے اور بارود دے کر بھیج دو، وہ دیکھے بھالے بغیر اس کے پتھر توڑنے اڑانے میں مصروف ہو جائیں گے خواہ اس کے نتیجے میں ان سمیت ہزاروں کھیت ہو جائیں۔"

"میں ایک بار اس تہہ خانے میں جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کس لیے ہے؟" ابوالمکتوم نے ترش لہجے میں سوال کیا۔

"سودے کے آغاز سے پہلے ذرا دیکھ تو لوں کہ وہاں کیا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں تو اسے ایک غیر معمولی تہہ خانہ ہی سمجھتا رہا تھا۔"

"مگر ایک شرط پر۔" جنرل کرسی سے اٹھ گیا۔

میں اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"تمہارے ساتھ چند ماہرین بھی ہوں گے اور تم کسی چیز کو بھی چھیڑنے کی کوشش نہیں کرو گے۔" جنرل نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"مجھے منظور ہے۔"

"اور اگر خلاف ورزی کی تو تمہیں موقع پر ہی گولی مار دی جائے گی۔" ابوالمکتوم میرے لیے کوئی راہ نہیں چھوڑنی چاہ رہا تھا۔

"میں خودکشی نہیں کروں گا۔" میں نے مغموم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور وہ چاروں بلحاظِ عہدہ آگے پیچھے اس کمرے سے چلے گئے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" ان کے جاتے ہی سیتا نے لرزتی ہوئی خوفزدہ آواز میں مجھ سے سوال کیا۔

"دیکھتی جاؤ، شاید مقدر کی آخری گردش ہے۔" میں نے اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اسی وقت باہر دروازے میں تالا ڈال دیا گیا۔

"میں کہتی ہوں کہ یہ چکر لمبا چلے گا۔" وہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس وہ پستول ہے اور تمہارے پاس زہریلی سوئیاں۔ دس پانچ کو مار کر ہم صاف نکل جائیں گے اور ان کے فرشتے بھی ہم تک نہ پہنچ سکیں گے۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو، ہم اجنبی ملک میں ہیں۔ ہم کسی صحرا میں بھوک اور پیاس سے سسک سسک کر مر جائیں گے لیکن یہاں سے نہ نکل سکیں گے۔"

"مگر اس بریگیڈیر نے تو ایسی امید دلائی تھی جیسے اس کی مرضی کا بیان دیتے ہی ہمیں آزادی کا پروانہ مل جائے گا۔"

"یہ سارا فتور اسی بیان کا ہے۔ اسی کے ازالے کے لیے میں دوبارہ تجربہ گاہ میں جانا چاہتا ہوں شاید میں ان کو قائل کر سکوں۔"

"مجھے پوری بات بتاؤ۔" وہ مصر ہو گئی مگر میں نے بدقت تمام اسے رات کا حصہ سو کر گزارنے پر آمادہ کر ہی لیا۔

اس مرتبہ میں نے روشنیاں گل کر دیں لیکن پھر بھی دور تک نیند کا پتہ نہیں تھا۔ ذہن میں خیالات کی عجیب سی آندھیاں چل رہی تھیں جن میں نہ کوئی ربط تھا نہ تسلسل۔ بس امید و بیم کی ایک عجب کشمکش چل رہی تھی۔

اگلی صبح دروازہ کھولا گیا تو ہم دونوں منہ ہاتھ دھوئے ناشتے کے منتظر تھے۔

فوجی بیرا اشتہا انگیز گرم ناشتے کی ٹرالی اندر لایا تو اس کے پیچھے بریگیڈیئر محسن الغانم بھی موجود تھا۔

بیرا ناشتہ چھوڑ کر چلا گیا لیکن محسن ہمارے بند کمرے میں آ بیٹھا۔

"رازداری کی وجہ سے تمہاری خدمت اور نگرانی کی ذمہ داری مجھ پر اور ابو محمد پر آ پڑی ہے ہم دونوں بارہ بارہ گھنٹے ڈیوٹی پر رہیں گے۔" بیرے کے چلے جانے پر اس نے...... سرگوشیانہ لہجے میں ہمیں آگاہ کیا۔

"ابوالمکتوم کون ہے؟" میں نے ہاتھ روکے بغیر سوال کیا۔

"انٹر سروسز انٹیلی جینس کا سربراہ ہے۔" محسن کا لہجہ سرگوشیانہ ہی رہا۔ "وہ بھی جنرل ہی ہے لیکن تین برس جونیئر ہے جنرل حسین العمادی سے۔"

"وہی سگار والا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔ وہی ہمارا فوجی سربراہ ہے۔" اس نے کہا۔ "بہت سلجھا ہوا اور نفیس آدمی ہے۔ اس نے تم سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے تمہارے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کے بعد تم سے ملنے آیا تھا۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تمہارے ملک میں کوئی ایسا نہیں جو اس تجربہ گاہ کو بے ضرر بنا کر برباد کر سکے۔" میں نے ایک بڑا سا لقمہ نگلتے ہوئے کہا۔ جنرل سے دو بدو مذاکرات کے بعد بریگیڈیئر محسن الغانم مجھے اپنے ہی درجے کا آدمی محسوس ہو رہا تھا۔

"حکومت اس وقت عدم استحکام کا شکار ہے۔" محسن کا لہجہ بھی دھیما ہو گیا۔ "چھوٹا سا بھی حادثہ ہو گیا تو ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑیں گے۔ شاید اسی لیے کوئی بھی یہ ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے تیار نہیں ہو رہا۔"

"کیا یہ لاتعلقی کی انتہا نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ناشتہ کرو۔" اس نے میرا بازو تھپک کر کہا۔ "تھوڑی دیر میں بلاوا بھی آ سکتا ہے۔"

"کہاں کے لیے؟"

"کیا تہہ خانے کا جائزہ نہیں لو گے؟"

"کیا وقت طے ہوا ہے؟"

"اب یہ معاملہ براہِ راست جنرل کے پاس ہے، اسی کی طرف سے پیغام آئے گا۔" محسن نے بے چارگی سے شانے اچکا کر کہا۔

"اگر ممکن ہو تو ہمارے ساتھ کوئی برقیاتی ماہر بھی ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "شاید اس کی موجودگی کسی کام آ سکے۔"

"کوشش کر لوں گا مگر وعدہ نہیں کر سکتا۔"

پندرہ منٹ بعد فوجی خانساماں برتن لینے آیا اور بریگیڈیئر اس کے ساتھ واپس چلا گیا البتہ جاتے ہوئے وہ اپنا سگریٹ کا پیکٹ میرے حوالے کر گیا تھا۔

"میری عدم موجودگی میں اپنے اوپر قابو رکھنا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سیتا کو سمجھایا۔ "ہو سکتا ہے اب ملاقات کچھ وقفے کے بعد ہو۔"

"کیوں؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

میں ہنس پڑا۔ "دونوں کا ہی سبب ہے... اگر تلاشی وغیرہ کی نوبت آ گئی تو پستول سے محروم کر دی جاؤ گی۔ دوسری طرف حالات تیزی سے رخ بدلتے جا رہے ہیں۔ جنرل چاہے گا کہ میں فوری طور پر باہر نکل کر اپنے کام کا آغاز کر دوں۔"

"تنہائی میں میرے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی کوشش کروں گی۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔ "اس زندگی سے تو بہتر تھا کہ مجھے ساتھ لانے کے بجائے تم بھی پہاڑوں میں میری ماں کے پاس ہی رہ جاتے۔"

میں ایک مجرمانہ احساس کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

سیتا کی ماں سندری کو ہمالیہ کی برف پوش وادیوں میں بالکل تنہا چھوڑ کر میں نے واقعی خود غرضی کا اظہار کیا تھا لیکن اس وقت ویران پہاڑوں کی آغوش میں مجھے وہ رشتے یاد آتے تھے جن سے میری شناخت ممکن تھی۔ اب یہ وقت کی ستم ظریفی تھی کہ برس ہا برس گزرنے کے بعد بھی میں ماں باپ اور بہن بھائیوں کی صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا۔

زندگی کے اس سفر میں ہر رکاوٹ مجھے آخری رکاوٹ محسوس ہوتی تھی جس کے بعد میں سیتا سمیت اپنے وطن میں اپنے پیاروں تک پہنچ سکتا تھا لیکن ہر بار آخری رکاوٹ کی اوٹ میں سے ایک نیا پتھر راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری ذات میں مصائب اور پریشانیوں کے لیے مقناطیسی کشش موجود تھی۔

ہم دونوں اپنی جگہ خاموش بیٹھے ماضی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کے بارے میں سوچتے رہے اور اسی اثنا میں محسن دوبارہ آ پہنچا۔ میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو وہ دن کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔

"چلے آؤ۔" محسن نے اندر داخل ہوئے بغیر کہا۔

میں نے سیتا پر محض الوداعی نظر ڈال کر کمرے سے نکل جانا چاہا لیکن وہ اپنی آنکھوں میں لرزتے موتی سجائے والہانہ انداز میں دوڑ کر میرے سینے سے لپٹ گئی۔ اور اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا۔

محسن الغانم اس اعتبار سے شریف النفس تھا کہ اس نے جذبوں کی شدت کا بے باک نظارہ کرنے کے بجائے دروازے کے پٹ بند کر دیے اور باہر میرا انتظار کرنے لگا۔

بدقت تمام میں سیتا کو سمجھا کر الگ کر سکا اور بوجھل قدموں کے ساتھ دل گرفتہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

محسن الغانم نے دروازہ بند کر کے خود تالا لگایا اور چابی دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے سنتری کے حوالے کر کے عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔

ایک مکلف اور آراستہ کمرے میں کرنل کے عہدے کا ایک افسر شاید ہمارا ہی منتظر تھا کیونکہ محسن الغانم مجھے اس کے حوالے کر کے وہیں سے لوٹ گیا۔

"فوجی ہو؟" کرنل نے میرے سراپا کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا اور میں نے سر کو نفی میں جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

"جنرل صاحب تمہارے منتظر ہیں ادب سے میرے پیچھے آؤ۔" اس نے اپنی دانست میں مجھے پروٹوکول سمجھانے کی کوشش کی۔

چند گز آگے اس نے اسی کمرے میں کھلنے والے ایک دروازے پر رک کر اپنی وردی پر ایک نگاہ ڈالی پھر انگلی سے دروازے پر خفیف سی دستک دے کر پٹ صرف اس قدر کھولا کہ اپنی کھوپڑی اندر داخل کر سکے۔

"جناب مہمان حاضر ہے۔" اس نے وہیں سے اطلاع دی۔

"اندر بھیج دو۔" ادھ کھلے دروازے میں سے جنرل حسین العمادی کی پاٹ دار آواز سنائی دی اور میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ دبیز قالین اور بیش قیمت صوفوں سے آراستہ اس وسیع

کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے خود کو کسی ماورائی دنیا میں محسوس کیا۔ دیوہیکل آبنوسی میز کے پیچھے جنرل ٹیبل لیمپ کی ناکافی روشنی میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا ہیولا تو بخوبی نظر آرہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنا محال تھا۔

"السلام علیک یا معلم!" میں نے ٹیبل کے گرد موجود اونچی پشت گاہ والی منقش کرسیوں پر کچھ لوگوں کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے جنرل کو سلام کرنا ضروری سمجھا۔

"وعلیک۔" جنرل نے خود سر عربوں کی طرح اختصار کے ساتھ جواب دیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

جنرل کی میز کے گرد بیک وقت بارہ ملاقاتیوں کے بیٹھنے کا انتظام موجود تھا لیکن اس وقت مجھ سمیت وہاں کُل پانچ نفوس موجود تھے۔

"یہ چاروں تمہارے دن رات کے ساتھی ہیں۔" جنرل نے بلا کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔ "انہیں اچھی طرح پہچان لو۔" یہ کہہ کر اس نے میز میں نصب کوئی بٹن دبایا اور کمرے میں پھیلا ہوا ملگجا دھندلکا تیز روشنی میں نہا گیا۔

چھت سے لٹکتے ہوئے بڑے فانوس کے علاوہ دیوار گیر روشنیاں بھی جل اٹھی تھیں لیکن ان میں چکاچوند نام کو بھی نہ تھی۔

"ان میں سے دو ہر وقت تمہارے آس پاس رہیں گے اور تم ان سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کرسکو گے ان کا کوڈ تم خود مقرر کرو گے یہ رقم تمہاری ضروریات کے لیے ہے۔" یہ کہتے ہوئے جنرل نے ایک وزنی لفافہ میری طرف کھسکا دیا۔ "جگہ دیکھنے کے بعد ہم سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں رہے گا۔ جو ضرورت ہوگی ان چاروں میں سے کسی کے ذریعے پوری کردی جائے گی۔ مناسب وقت آنے پر ہماری طرف سے خود تم سے رابطہ قائم کیا جائے گا۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے باری باری اِن چاروں کا جائزہ لیا جو چاق و چوبند اور توانا جوان تھے لیکن ان کے نقوش سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُن کا تعلق کسی باعزت طبقے سے نہیں تھا۔ ایک کے رخسار پر ٹانکوں کا کم از کم چار انچ لمبا نشان تھا۔ جو یقینی طور پر کسی چاقو کے زخم کے بعد وجود میں آیا تھا۔

"ٹرانسمیٹر کہاں ہے؟" میں نے جنرل سے سوال کیا۔

"پچھلے کمرے میں پانچوں سیٹ موجود ہیں۔" اُس نے اپنی پشت پر ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہیں تم اپنا طریقۂ کار طے کرلو۔ پندرہ منٹ بعد تمہیں جگہ دیکھنے کے لیے ہماری ٹیم کے ساتھ جانا ہے۔"

اسی کے ساتھ جنرل نے ساری روشنیاں گُل کردیں بس میز پر ایک لیمپ جلتا رہ گیا۔ جو تیز روشنی کے بعد ٹمٹماتا ہوا چراغ محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے نشست چھوڑ دی اور وہ چاروں بھی میرے ہمراہ جنرل کی پشت پر واقع کمرے میں داخل ہوگئے۔ جہاں میز پر بالکل نئے جیبی ٹرانسمیٹر کتابچوں سمیت موجود تھے۔

"یہ بعد میں پڑھ لینا۔" میں نے انہیں کتابچوں میں الجھتے دیکھ کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کے پاس کس قسم کا اسلحہ ہے؟"

"ہر قسم کا۔" رخسار پر زخم کے نشان والے نے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہم چاقو سے اسٹین گن تک سارے ہتھیار رکھیں گے۔ اور موقع محل کی مناسبت سے اسلحہ استعمال کریں گے یہ جنرل نے کافی سمجھا دیا ہے۔"

"دستی بم؟" میں نے سوال کیا۔

"آتش گیر اور دھوئیں کے بم رہیں گے ہمارے پاس۔" چاروں کی نمائندگی کا فرض اس نے از خود اپنے ذمے لیا ہوا تھا۔

"ہمارا مشترکہ شناختی کوڈ ڈیزرٹ واریئر ہوگا۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔ "میرا نمبر ایک، تمہارا بارہ، تمہارا اٹھائیس، تمہارا چونتیس اور تمہارا چالیس ہوگا۔" میں نے باری باری ان میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایک سے پانچ تک سیدھے نمبر کیوں نہ اختیار کیے جائیں؟" خشخشی ڈاڑھی والے نے تجویز پیش کی۔

"ہم دشمن کو اپنی نفری کے بارے میں دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو صحیح کوڈ کے ساتھ کسی اور نمبر سے مخاطب کرے تو مخاطب کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا ساتھی خطرے میں ہے۔"

"تمہاری طرف سے بھرپور وار کا سگنل کیا ہوگا؟" زخم خوردہ نے سوال کیا۔

"بازی ختم ہوگئی، ہتھیار ڈال دو۔" میں نے کہا۔ "بدترین حالات میں میں یہ پیغام دوں گا۔ اس وقت تمہیں اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانا ہوں گی۔"

اس کے بعد میں اُن چار اجنبیوں کے ساتھ اپنے مستقبل کے اہم ترین معرکے کی جزئیات طے کرنے لگا اور جب ہر ایک کو اس کے سوالوں کے جوابات مل گئے تو وہ محفل برخاست ہوگئی۔

اُن چاروں کے لیے جنرل کا دفتر اور اس کا عقبی کمرہ اجنبی نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے واپس جنرل کے کمرے میں جانے کے بجائے مخالف سمت کا دروازہ استعمال کیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے باہر نکل گئے تھے۔

میں چند ثانیوں تک خالی الذہنی کے عالم میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان چاروں کی تقلید میں باہر جاؤں یا واپس جنرل کے دفتر کا رُخ کروں کیونکہ بے لگام چھوڑے جانے سے قبل مجھے جنرل کے باہرنا کی جماعت کے ساتھ اس ہولناک زیرزمین تجربہ گاہ میں جانا تھا تاکہ میں وہاں کے مخصوص حالات کی روشنی میں اپنی گلوخلاصی کی کوئی سہل تر تجویز سوچ سکوں۔

میں اسی سوچ بچار میں مبتلا تھا کہ اچانک جنرل کے دفتر کی سمت کا دروازہ کھلا اور وہاں وہ خود موجود نظر آیا۔

"اِدھر آجاؤ۔" جنرل نے تحکم آمیز لہجے میں کہا اور میں کسی معمول کی طرح دوبارہ اس کے دفتر میں داخل ہوگیا۔

اُس وقت جنرل اپنے کمرے میں تنہا تھا اور وہاں کی خنک فضا میں سگار کے کثیف دھوئیں کی بُو رچی ہوئی تھی۔

"وہ لوگ تمہارے منتظر ہیں۔" جنرل نے کھڑے کھڑے مجھ سے کہا۔ "میں ایک بار پھر یاد دلاتا ہوں کہ اُن کی مرضی سے ذرا بھی انحراف کیا تو فوراً گولی ماردی جائے گی۔ اس جماعت میں ابو محمد اور محسن دونوں ہی سادہ لباس میں شامل ہیں۔"

"مجھے امید ہے کہ میری عدم موجودگی میں سیتا کی ضروریات اور آسائشوں کا خیال رکھا جائے گا۔" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"تم بے فکر رہو۔" جنرل نے داہنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے آج ہی ایک مکان میں منتقل کردیا جائے گا۔"

جنرل کے الوداعی مصافحے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے وہاں سے رخصت ہوجانا چاہیے تھا لہٰذا میں نے اس کی خواہش کا احترام کرنا ہی مناسب سمجھا۔

میرے باہر نکلنے سے پہلے جنرل نے شاید کسی بٹن یا انٹرکام کے ذریعے باہر موجود کرنل کو میری روانگی کے بارے میں بتادیا تھا کیونکہ وہ باہر میرا منتظر تھا۔

"اس طرف۔" کرنل نے میرا بازو تھامتے ہوئے ایک راہداری میں میری رہنمائی کی۔

راہداری کے اختتام پر گیارہ نشستوں والی ایک سفید ایئرکنڈیشنڈ اسٹیشن ویگن موجود تھی جس میں ڈرائیور سمیت پانچ افراد پہلے سے موجود تھے۔

کرنل نے ڈرائیور کے برابر والی نشست کا دروازہ کھول کر مجھے اندر بٹھایا اور اسٹیشن ویگن ذرا بھی توقف کیے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔

میں نے سر گھما کر پیچھے والوں کا جائزہ لیا تو ابو محمد اور محسن الغانم پر نگاہ پڑی۔ جنرل کے بیان کے مطابق وہ دونوں



سادہ لباس میں تھے اور اس وقت ان کی نگاہوں میں میرے لیے سرد مہری پائی جا رہی تھی۔
شاید وہ دونوں اپنے کسی بھی رویے سے کسی طرح میری حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔
میرا جی چاہا کہ دُوسرے دو اجنبیوں سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش کروں لیکن پہل کرنے کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ ان میں سے ایک تو اسٹیشن ویگن کے حرکت میں آتے ہی اونگھنے لگا تھا اور دُوسرا داہنی سمت کی کھڑکی سے کھلے صحرا میں کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھا۔
"اس وقت ہمارا میزبان کون ہے؟" کئی منٹ کی اکتا دینے والی خاموشی کے بعد میں نے سر پیچھے گھما کر سوال کر ہی ڈالا۔
اونگھتا ہوا ادھیڑ عمر یوں چونکا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ لحظہ بھر اس نے مجھے پھاڑ کھانے والے انداز میں گھورا اور پھر اسی لاتعلقانہ انداز میں اونگھنے لگا جیسے اُسے گاڑی میں دُوسروں کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو۔
دُوسرا اجنبی البتہ کارآمد ثابت ہُوا کیونکہ ابو محمد اور محسن کے برعکس وہ ہنسیلے لہجے میں بول پڑا تھا "کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟"
"میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ اس وقت کن معزز ہستیوں کا ہمسفر ہوں۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔
"میرا نام ناصر ہے۔ یونیورسٹی میں نامیاتی کیمیا کے تحقیقاتی شعبے کا سربراہ ہوں۔" اس نے چڑچڑے پن سے جواب دیا۔ "اب تو خاموش رہو گے نا!"
میں بے بسی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ اس بد دماغی کے جواب میں اس کے علاوہ اور کچھ کیا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔
اس عمارت تک کا سفر ان لوگوں کے خشک رویے کی وجہ سے خاصا طویل محسوس ہوا لیکن وہاں پہنچ کر مجھے حیرت ہوئی کہ احاطے میں دور دور تک نہ کوئی فوجی گاڑی تھی اور نہ ہی کوئی متنفس نظر آ رہا تھا۔ اس مرحلے پر میرے بشرے پر میری بے چینی کچھ زیادہ ہی عیاں ہو گئی تھی کیونکہ محسن الغانم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔
گاڑی سے اتر کر سب لوگ خاموشی سے ویران برآمدے میں داخل ہوئے جبکہ ڈرائیور وہیں گاڑی میں بیٹھا رہا۔
"ڈرائیور سویلین ہے۔" برآمدے میں پہنچتے ہی محسن الغانم دھیمے لہجے میں بول پڑا۔ "وہ ہماری مہم سے بالکل لاعلم ہے تم بلاوجہ بولنے کی کوشش کر رہے تھے۔"
"یہاں سناٹا کیسا ہے؟" میں نے دانستہ محسن کے ساتھ پیچھے رہتے ہوئے سوال کیا۔

"نئی حکمت عملی کے تحت یہ ضروری تھا، تجربہ گاہ پر بھی کوئی پہرہ نہیں ہے۔" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا۔
"ان دونوں میں کسی کو برقیاتی باریکیوں سے بھی واسطہ رہا ہے؟"
"ایک کیمیا داں ہے اور دوسرا نامور برقیاتی انجینئر۔" اس نے بتایا۔ "تمہاری فرمائش کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے لیکن تم زبانی تبادلہ خیال سے تجاوز نہیں کرو گے۔"
"میں جانتا ہوں۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
وہ عمارت اس وقت تک میرے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔ جانے بوجھے راستے طے کرتے ہوئے بلا کسی روک ٹوک کے ہم اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں ہمارے اور تہہ خانے کے درمیان صرف ایک خفیہ دیوار حائل تھی۔
ابھی ابو محمد نے دیوار گیر دستے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک باہر سے کسی ہلکی مشین گن کی فائرنگ کی گونج سنائی دی اور دونوں سادہ پوش فوجی بے اختیار نکاسی کے راستے پر دوڑ پڑے۔
ہمارے ساتھ آنے والے دونوں ماہرین خوف اور سراسیمگی کے عالم میں وہیں کھڑے رہ گئے جبکہ میں بھی ابو محمد اور محسن کے پیچھے ہو لیا۔
باہر بدستور مشین گن کا نغمہ گونجتا رہا پھر ایک بھیانک سی چیخ سنائی دی جس کے بعد فضا پر یکلخت غیر فطری سناٹا چھا گیا۔
برآمدے میں پہنچتے ہی وہ دونوں اچانک رک گئے۔ لحظہ کے بعد میں بھی ان سے جا ملا اور باہر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پیشانی پر جا چڑھیں۔
دشمن اس قدر بودا نہیں تھا جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ ان کی جانب سے عمارت کی مسلسل نگرانی کی جا رہی تھی اور انہوں نے پہلا موقع ہی اس اسٹیشن ویگن کو چھلنی کر دیا تھا جس کے ذریعے ہم وہاں تک پہنچے تھے۔ اسٹیشن ویگن کے ٹائر اور آہنی باڈی گولیوں سے ادھڑ کر رہ گئی تھی، سارے شیشے بھی چکنا چور ہو چکے تھے اور ویگن پر چھائے ہوئے مہیب سناٹے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈرائیور اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا۔
برآمدے سے نظر آنے والا وسیع احاطہ تاحدِ نظر ویران نظر آ رہا تھا مگر یہ بات ہم تینوں ہی جانتے تھے کہ حملہ آور ہماری نگاہوں سے اوجھل تھے مگر ہم پوری طرح ان کی نگاہ میں تھے۔
"یہ بہت بُرا ہوا۔" ابو محمد تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔ "ہم بہت خطرناک طریقے پر گھیرے گئے ہیں۔"
"واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو چکا ہے۔" محسن الغانم تباہ شدہ اسٹیشن ویگن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سامنے سے ہٹ جاؤ، ایسا نہ ہو کہ ان میں سے اچانک ہی کوئی سامنے کود کر گولیاں برسانے لگے۔"
مگر میں اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

ایک قوی امکان یہ بھی تھا کہ اسٹیشن ویگن پر وحشیانہ فائرنگ کی کارروائی کسی اسرائیلی جتھے کے بجائے یوسف نے کی ہو!
اگر اس کے بارے میں میرے قیاسات دُرست تھے تو اس نے دُور سے اس عمارت تک ہمارا تعاقب کیا پھر تن تنہا اندر گھس کر ہماری مدد کرنے کی ناکام کوشش کی اور اس ناکامی کے بعد گمنام فون کے ذریعے اعلیٰ فوجی حکام کو اس عمارت پر دھاوا بولنے پر مجبور کر دیا۔
اس نے یقینی طور پر دور رہتے ہوئے ہمارے بارے میں پوری صورتِ حال پر گہری نظر رکھی ہو گی اور ہمیں اسرائیلیوں سے آزادی پانے کے بعد فوجی حکام کی تحویل میں جاتے دیکھ کر وہ ہماری آزادی کے لیے مضطرب ہو گیا ہو۔
عمارت سے پہرہ ہٹائے جانے کے بعد وہ اس کے لیے سنہری موقع تھا۔ اسٹیشن ویگن ناکارہ کر دی گئی تھی اور میں چار آدمیوں کے ساتھ عمارت میں گھر گیا تھا اور اس کی مدد سے اس قید سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔
مگر میرے لیے یہ راستہ بھی مسدود تھا۔ اگر میں بریگیڈیئر محسن الغانم اور ابو محمد کو زیر کر لیتا تو مجھے ضرور رہائی مل جاتی لیکن سیتا کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی جو بریگیڈیئر کے اوپر والوں کے پاس یرغمال تھی۔
"کون ہو تم؟" اچانک محسن الغانم نے دیوار کی اوٹ سے باہر جھانکتے ہوئے بلند لہجے میں سوال کیا۔
جواب میں باہر سے سب مشین گن کا فائر ہوا اور گولیاں برآمدے میں سے گزرتی ہوئی داخلی راستے کی دیواروں میں پیوست ہو گئیں۔
"گدھے کی اولاد... سامنے آؤ۔" بریگیڈیئر محسن الغانم خوفزدہ ہوئے بغیر غصیلی آواز میں چلایا۔
اس نے اپنے لباس میں چھپا ہوا اعشاریہ تین دو کا خودکار براؤننگ نکال لیا تھا۔ ابو محمد بھی ایسے ہی پستول سے مسلح تھا مگر وہ دو پستول کسی بھی طرح ایک سب مشین گن کو زیر نہیں کر سکتے تھے۔
باہر کچھ دیر تک بھیانک سناٹا چھایا رہا۔
"کوئی اکیلا ہی ہے۔" ابو محمد نے دھیمی آواز میں کہا۔ محسن الغانم کے مقابلے میں وہ زیادہ تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔
"اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔" محسن الغانم نے کہا۔ برابر کا گھاؤ ہونے کے باوجود اس کے لہجے سے طنز کی بو آ رہی تھی۔ "دونوں مرتبہ ایک ہی مشین گن چلی ہے۔" ابو محمد نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر اپنی رائے کی وکالت کی۔
"وہ پہلے سے یہاں موجود تھے۔" محسن الغانم نے کہا۔ "ہماری تعداد سے بخوبی واقف ہیں ضرورت پیش آئی تو ایک سے زیادہ بھی گنگنا اٹھیں گے۔"
"یہ... یہ کیا ہو رہا ہے؟" اچانک پشت سے ایک کانپتی ہوئی خوفزدہ آواز سنائی دی۔
میں نے چونک کر سر گھمایا تو ادھیڑ عمر الیکٹریکل انجینئر کا خوف سے ستا ہوا چہرہ نظر آیا جس کی اونگھتی ہوئی آنکھیں اس وقت ماتھے پر چڑھی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔
"گولیاں چل رہی ہیں۔" اس قنوطی کو سُلگانے کا خیال اتنا شدید تھا کہ میری زبان بند نہ رہ سکی۔ "ڈرائیور مارا گیا، گاڑی چھلنی ہو گئی، اور باہر قاتلوں کا راج ہے۔"
وہ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی تیورا کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔
"یہ کیا کیا تم نے؟" محسن الغانم آنکھیں نکال کر غرّایا۔
"ایسے بزدل کا بے ہوش ہو جانا ہی بہتر ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "ورنہ ایسی صورتِ حال میں اسے کہاں سنبھالتے رہتے۔"
"کاش اس وقت ہمارے پاس بھی کوئی ہتھیار ہوتا۔" ابو محمد نے لحظہ بھر کے سکوت کے بعد تاسف آمیز لہجے میں کہا۔
اور اس وقت پہلی بار میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہُوا۔
اس عمارت میں فوجیوں کے ہاتھوں گرفتاری کے وقت میری اور سیتا کی جامہ تلاشی لی گئی تھی۔ زہریلے تیر پھینکنے والی مذہبی تو خیر فوجیوں نے بے ضرر سمجھتے ہوئے میرے پاس چھوڑ دی تھی۔ مگر پستول نما کیمیاوی ہتھیار سیتا کے قبضے سے لے لیا گیا تھا جبکہ بعد میں گیریژن کمانڈ کوارٹرز میں قید کے دوران میری یادداشت کے مطابق سیتا نے کم از کم دو بار مجھے یہ جتایا تھا کہ وہ ہتھیار اس کی تحویل میں تھا۔
اس وقت میں نے روا روی میں اس بات پر غور نہیں کیا تھا لیکن ابو محمد کے اضطراری تبصرے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ہتھیار دوبارہ سیتا کے قبضے میں کیسے اور کیونکر آیا؟
"وہ کہاں ہے؟" ابو محمد کے تبصرے کے بعد اچانک محسن الغانم نے میری طرف مڑ کر سوال کیا۔
"کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا
اس نے دانت پیس کر مجھے گھورا، پھر مضبوطی سے میرا بازو تھام کر مجھے ایک طرف لے گیا۔ "وہ پستول جو عجیب سا تھا" اس نے ابو محمد سے دور آ کر نیچی آواز میں سوال کیا۔
"میرے پاس تو نہیں ہے وہ۔" میں نے معصومیت سے کہا۔
"میں نے خود دیا تھا تمہاری بیوی کو... یہ سمجھوتے کے بعد کی بات ہے۔" وہ دھیمے مگر جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ تو اسی کے پاس ہے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ وہ دوبارہ دانت پیسنے لگا۔ "میں کسی بُرے وقت کے لیے تمھارے ہاتھ مضبوط کرنا چاہتا تھا اور تم اسے چھوڑ آئے۔ وہ اس کا کیا کرے گی؟"

"ایک قیدی لڑکی کا تحفظ زیادہ نازک ہوتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر اس پر بُرا وقت آ گیا تو ہتھیار ڈالنے کے بجائے دس پانچ کو مار کر خودکشی کرے گی۔"

"جہنم میں جاؤ۔" وہ بڑبڑایا۔ "اس وقت ہر ایک اپنی ہی حفاظت کرے تو کافی ہے۔" اس بار اس کا لہجہ قدرے بلند تھا لہٰذا یہ تبصرہ ناصر نامی کیمیادان نے بھی سُن لیا جو پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہاں آ گیا تھا۔

"کیا تم سنجیدہ ہو؟" اس نے محسن کو مڑنے کا موقع دیے بغیر سوال کیا۔

"ہمارے ساتھ رہو۔" محسن نے آگے لپکتے ہوئے کہا۔ "اگر مقدر نے یاوری کی تو شاید بچ ہی جائیں۔ اس عمارت کی بھول بھلیاں ہمارے لیے مددگار ثابت ہوں گی۔"

"مگر مجھے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اس مطالعاتی دورے میں کسی تصادم کا بھی خطرہ ہے۔" ناصر نے بلند لہجے میں احتجاج کیا۔

"ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ بلاوجہ بحث میں اُلجھنے کی کوشش نہ کرو۔"

"یہ بکواس ہے۔ تم مسلح ہو، اس کا مطلب ہے کہ تم تصادم کے امکان سے باخبر تھے۔" وہ خوف سے زیادہ جھلاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"فی الحال خاموش رہو۔" میں نے رَخل اندازی کی۔ "زندہ بچے تو یہ معاملات بعد میں طے کر لیں گے۔"

اسی لمحے اچانک ابو محمد نے سیدھا ہاتھ دراز کر کے اچانک باہر ایک فائر جھونک دیا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اسی وقت باہر سے مشین گن چلائی گئی جس کا شور بہت قریب سے آتا سُنائی دیا تھا۔ گولیاں تسلسل کے ساتھ دیواروں اور فرش میں پیوست ہوتی رہیں اور پھر اُن آوازوں میں یکایک گونج پیدا ہو گئی۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

محسوس ہو رہا تھا کہ حملہ آور فائرنگ کی آڑ میں اندر داخل ہو چکے تھے کیونکہ سب مشین گن کی اندھا دھند گونج کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔

"میں نے برآمدے میں تین پرچھائیاں دیکھی تھیں۔" ابو محمد نے ہیجان آمیز سرگوشیانہ لہجے میں محسن کو مطلع کیا۔

اور پھر یکایک محسن نے بغلی راہداری کا قریب ترین دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ ہم تینوں کے لیے بھی اس کی تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ حملہ آور جو بھی تھے، سر پر آ چکے تھے اور ان کی اندھا دھند فائرنگ سے بچاؤ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی۔

"ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔" سب مشین گن کے شور پر پہلی بار ایک کرخت اور تحکم آمیز آواز ابھری۔ "ورنہ بھون دیے جاؤ گے۔"

محسن الغانم نے پھرتی کے ساتھ اس کمرے کے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور لپک کر مخالف سمت کی کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی اور اگر اس نے فوراً ہی خود کو نیچے نہ گرا لیا ہوتا تو باہر سے چلی ہوئی رائفل کی گولی نے اس کا بھیجا اُڑا دیا ہوتا۔

اس صورتِ حال نے ہم چاروں کے اعصاب پر بُرا اثر ڈالا۔ ہم بدقسمتی سے ایک ایسے کمرے میں پھنس چکے تھے جس کے دروازے پر مشین گن چل رہی تھی اور احاطے میں کھلنے والی کھڑکی کسی رائفل کی زد میں تھی۔

"فائرنگ بند کرو۔" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد محسن الغانم شکست خوردہ لہجے میں چیخا۔ "ہم ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔"

سب مشین گن کا شور اس کی آواز بلند ہوتے ہی ختم ہو گیا۔

باہر کوئی زور سے ہنسا پھر وہی پہلے والی آواز سُنائی دی۔ "ہمیں معلوم ہے کہ اندر تم چار ہو۔ اپنے ہاتھ اٹھا کر باری باری نہتے باہر آ جاؤ۔"

چاروں تذبذب کے عالم میں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہم چاروں میں سے کون پہلے باہر نکل کر فریقِ مخالف کی نیت کا اندازہ لگانے کا فریضہ سرانجام دے۔

"پہلے تم باہر جاؤ۔" محسن الغانم نے دروازے کی کنڈی کھول کر دیوار سے چپکتے ہوئے ناصر سے کہا۔

"میں نہیں جاتا۔" وہ خوفزدہ انداز میں دیوار سے جا لگا۔ "مجھے بھی اپنی جان عزیز ہے۔"

"تاخیر کی تو کمرہ اڑا دیا جائے گا۔" باہر سے دھمکی دی گئی۔ شاید انھوں نے ناصر کی آواز سُن کر اندر کی صورتحال کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"بہت عزیز ہے اپنی جان؟" محسن الغانم نے زہریلے لہجے میں سوال کیا۔

ناصر نے اپنے خشک ہوتے ہوئے لبوں کو زبان سے تر کر کے اثبات میں سر ہلایا اور محسن نے میری توقع کے برعکس پھرتی سے گولی چلا دی۔

پگھلا ہوا آتشیں سیسہ ناصر کے دل کو چیرتا ہوا پار گزر گیا اور وہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ نیچے گر کر تڑپنے لگا۔

باہر والوں پر اضطراب طاری ہو گیا۔ کسی نے پوری قوت سے رائفل کا کندہ دروازے پر رسید کیا اور دروازہ دھماکے کے ساتھ کھل

محسن الغانم نے ان کے اندر گھسنے سے پہلے اپنا پستول پھینک کر دونوں ہاتھ بلند کر لیے۔ ابو محمد بھی پھرتیلا ثابت ہوا اور میں تو نہتا ہی تھا۔

اندر داخل ہونے والے تعداد میں تین تھے۔ وہ سب ہی دراز قد اور مضبوط جسموں کے مالک نظر آ رہے تھے مگر اپنے چہرے انھوں نے بڑے بڑے سفید رومالوں میں اس طرح چھپائے ہوئے تھے کہ ان کی آنکھوں اور پیشانی کے ذرا سے حصے کے علاوہ کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ بس ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکے اور پھر ان میں سے دو بجلی کی سی سُرعت سے آگے بڑھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی ہوئی تھیں۔ انھوں نے کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر محسن الغانم اور ابو محمد کی کھوپڑیوں پر رائفلوں کے کندوں سے ایسی ضرب لگائی کہ وہ چیختے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

اس ناگہانی حملے نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا اور میں فوری طور پر اپنی مدافعت کے لیے تیار ہو گیا مگر ان میں سے کسی نے میرا رُخ نہیں کیا۔ تیسرے نے اپنے شانے اور سینے کے سہارے ہلکی سب مشین گن اٹھائی ہوئی تھی اور ان دونوں کی بے ہوشی کے بعد اس کا رُخ میری ہی طرف تھا۔ "تم کون ہو؟" سب مشین گن والے نے جذبات سے عاری تیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"میں ان کا قیدی تھا۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"نام... نام کیا ہے تمھارا؟" میرے جواب پر وہ کسی قدر جھلا گیا۔

"صفدر علی۔" میں نے لحظہ بھر سوچنے کے بعد کہہ ڈالا، اور اُس نے اپنی سب مشین گن کی نال نیچے جھکا لی۔

"غنیمت ہے کہ تم زندہ ہو۔" ایک رائفل بردار نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "کمرے میں گولی چلی تو ہم یہی سمجھے کہ تم مارے گئے ہو۔"

"مگر تم کون ہو؟" میں نے مسرت آمیز حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"دوست۔" وہی شخص بولا۔

"کم از کم میرے لیے تم سب اجنبی ہو۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اور شاید میرے بارے میں تم نے بھی قیاس ہی سے کام لیا ہے۔"

"تھوڑی دیر میں سب کچھ سامنے آ جائے گا۔" مشین گن والا اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھتا ہوا بولا۔

"یہ تو مر ہی چکا ہے۔" ایک رائفل بردار ناصر کے خون آلود جسم کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "باہر والا بے ہوش ہے۔"

"انھیں بھی اندر ہی ڈال دو۔" سب مشین گن والا ان تینوں میں قدرے بااختیار نظر آ رہا تھا۔ "اور کمرے سے پستول اٹھا لو۔"

اُس کے مشورے پر بہت پھرتی سے عمل کیا گیا۔ باہر والے کو اٹھا کر کمرے کے فرش پر ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد محسن الغانم اور ابو محمد کی جامہ تلاشی بھی لے ڈالی گئی جس کے بعد وہ تینوں مجھے ساتھ لے کر اس کمرے سے باہر آ گئے۔

"چلے آؤ۔ میدان صاف ہے۔" کمرے کا دروازہ عبور کر کے داخلی راہداری میں گھومتے ہوئے مشین گن والے نے بلند آواز میں کسی نادیدہ شخص کو مخاطب کیا۔

آواز دینے کے باوجود اُس کے قدم نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتے رہے اور پھر برآمدے میں پہنچنے سے پہلے ہی باہر سے آنے والے دو افراد یکایک ہمارے سامنے آ گئے۔

اُن دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور چہرے سفید رومالوں میں لپٹے ہوئے تھے مگر قامت اور جسامت کی بنا پر میں اُن میں سے ایک کو پہچان گیا۔

بے اختیار میرا دل چاہا کہ دوڑ کر یوسف کو گلے لگا لوں مگر اسی وقت مجھے اُن دو افراد کا خیال آ گیا جنھیں ٹرانسمیٹروں سمیت ہر لمحے دُور رہ کر میری نگرانی کرنی تھی۔

میرا خیال تھا کہ جنرل حسین العمادی نے جن افراد سے مجھے متعارف کرایا تھا وہ اسی لمحے اپنی ڈیوٹی کا آغاز کر چکے تھے اور یہ امکان قوی تھا کہ اُن میں کوئی کسی محفوظ ٹھکانے میں چھپا عمارت کے داخلی دروازے کی نگرانی کر رہا ہو۔

"تپاک کا مظاہرہ نہ کرنا۔" وہ خیال آتے ہی میں نے جلدی سے اس شخص سے کہا جسے میں اپنی دانست میں یوسف سمجھ رہا تھا۔

"خُدا کا شکر ہے کہ تم بخیریت ہو..." یوسف کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ "مگر اس وقت یہ احتیاط غیر ضروری سی ہے۔"

"اندر چلے آؤ۔" میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کوئی نگرانی کر رہا ہو یہاں ہمیں دُور سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔"

"ورنہ میں مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔" اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "میں اس آدمی کے اعتماد سے دھوکا کھا گیا۔"

"دھوکا دینے کے لیے عبداللطیف کا نام ہی کافی تھا۔ کیونکہ یمن میں ہمارا اور اس کا تعلق بہت رازدارانہ تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کا مکان تباہ ہوا، نہ جانے اب کہاں ہوگا بیچارہ۔"

"وہ مجھ سے پہلے اس عمارت میں موجود تھا۔" میں نے اس کی آخری حالت کا تصور کر کے یک بیک مغموم لہجے میں کہا۔ "بازپرس کے سلسلے میں اس پر ہولناک تشدد کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ذہنی طور پر ماؤف ہو کر سب کچھ اگلتا چلا گیا اور ان لوگوں نے اس کے

فراہم کیے ہوئے حوالوں کے بل پر اپنے آدمی کے ذریعے ہمیں گھیر لیا۔۔۔"

"تو کیا وہ فوجی تحویل میں ہے؟" یوسف نے میری بات کاٹ کر سوال کیا۔ وہ بدنصیب عبداللطیف کی سلامتی کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند تھا۔

"اُسے میں نے قریب المرگ دیکھا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اور ڈاکٹر آسٹن نامی ایک یہودی سائنسداں اس پر کسی مہلک گیس کا تجربہ کرنا چاہتا تھا لیکن قدرت کو اس کی حالتِ زار پر رحم آگیا اور وہ تجربے کی نوبت آنے سے پہلے ہی خالقِ حقیقی سے جا ملا۔"

یوسف اور اس کے ساتھی زیرِ لب کچھ بڑبڑا کر رہ گئے۔

"اس وقت تم یہاں کیسے آئے تھے؟" کمرے میں ایک لاش اور تین بے ہوش قیدیوں کا جائزہ لینے کے بعد یوسف نے سوال کیا۔

"لمبی کہانی ہے۔ یوں سمجھو کہ قیدی سے ایک دم سرکاری مہمان بن گیا ہوں۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہر وقت دو محافظ ساتھ رہیں گے اور میں کسی بھی وقت انہیں ہدایات دے سکوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے جیبی ٹرانسمیٹر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"شاید تمہیں اُن ہی کی نگاہوں کا خوف تھا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہر بارہ گھنٹے بعد ڈیوٹیاں بدلنے کا اُن کا اپنا طریقۂ کار ہوگا لیکن مجھے کسی لمحے بے یار و مددگار نہ چھوڑا جائے گا۔"

"اوہ۔" وہ یک بیک مضطرب ہوگیا۔ "ہم سے چُوک ہوگئی، ہماری خونریز کارروائی کے بعد وہ تمہاری حمایت میں کوئی بھی خطرناک قدم اٹھا سکتے ہیں۔"

"ٹرانسمیٹر اسی لیے فراہم کیے گئے ہیں کہ میری ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھایا جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ ضرور ممکن ہے کہ وہ موقع پاکر قریب سے عمارت اور اندر کی صورتحال کا جائزہ لینے کی کوشش کریں۔"

"یعنی تمہاری رائے میں ہمارا کچھ دیر کے لیے یہاں ٹھہرنا کوئی خطرناک نہیں ہوگا۔" یوسف نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

"بلکہ ضروری ہے۔" میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہوکر اپنے ساتھیوں کی طرف گھوم گیا۔ "ایک شخص یہیں رُکے گا، باقی لوگ باہر رہ کر کڑی نگرانی کریں گے میں صفدر کے ساتھ رہ کر عمارت کا جائزہ لوں گا۔"

شاید فرائض کے تعین کے سلسلے میں اُن میں میکانکی ربط موجود تھا کیونکہ ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر ایک رائفل بردار وہیں رُکا رہا اور بقیہ تین باہر نکل گئے۔

"آؤ۔" میں نے نرمی سے یوسف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور اُسے ساتھ لیتا ہوا اس کمرے سے باہر راہداری میں آگیا۔

"یہ رُومال اب غیر ضروری ہے۔" باہر آکر میں نے کہا۔ "چہرے سے ہٹادو۔ اس وقت عمارت میں ہم لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔"

"یہ نہ بھولو کہ میں مفرور اشتہاری مجرم ہوں۔ احتیاط ہر حالت میں اچھی ہوتی ہے۔" پھر ایک دم سوال کر بیٹھا۔ "بھابی کہاں ہیں؟ اُن لوگوں کے سامنے میں نے سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔"

"فوجی حکام کے یرغمال میں ہے تاکہ آزادی پانے کے بعد میں اُن کی مرضی کے مطابق کام کرتا رہوں۔" میں نے اُسے آگاہ کیا۔

"کیسا کام؟"

"ابھی خود دیکھ لوگے۔" میں نے مختصراً کہا کیونکہ میں اُسے اس کمرے کی طرف لے جا رہا تھا جہاں سے ہولناک تہہ خانے میں اُترنا ممکن تھا۔

"تم نے کسی ڈاکٹر آسٹن اور اُس کے مہلک تجربے کا ذکر کیا تھا، وہ اس معاملے میں کہاں سے شامل ہوگیا؟" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اُس نے سوال کیا۔

"شامل نہیں ہوا۔ سارے معاملے کی بنیاد وہی ہے۔"

"تو بتاتے کیوں نہیں؟"

"اس عمارت کا تحفظ مائیکل ٹرمپ اور اُس کے ساتھیوں کی ذمہ داری تھی اور اسی لیے کبھی کبھی اُن کے تصرف میں بھی رہتی رہی ہوگی لیکن اس عمارت کا اصل حکمران ڈاکٹر آسٹن ہی تھا جو اس عمارت کے خفیہ تہہ خانے میں زہریلی گیسوں اور کیمیاوی ہتھیاروں کی ایجاد اور پیداوار میں مصروف تھا۔ اپنے شرمناک تجربات کے لیے وہ جانوروں کے بجائے نہایت سفّاکی کے ساتھ مقامی عرب باشندوں کو استعمال کرتا تھا۔۔۔!"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم دونوں کو ڈاکٹر آسٹن ہی کے حوالے کیا گیا تھا اور اُس کے کسی حربے کے زیرِ اثر طویل مدّت کے لیے ہلنے جلنے تک سے معذور ہوگئے تھے بس ایک ہی سمت میں دیکھ سکتے تھے یا سُن سکتے یا بول سکتے تھے۔ ایک اعتبار سے میری اور سیتا کی زندہ ممی تیار کرکے ہمیں اسرائیل روانہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ حالات ایک دم اُلٹ گئے یہ بتاؤ کہ اس عمارت پر فوجی حملہ کیسے ہوا تھا؟" بات کرتے کرتے اچانک میرے ذہن کی خلش الفاظ میں ڈھل گئی۔

وہ باآواز ہنسا۔ "میں نے مدینہ سے یہاں تک بہت احتیاط کے ساتھ اس کار کا تعاقب کیا تھا جس میں تم لائے گئے تھے۔ مجھے آخری لمحے پر اندازہ ہُوا کہ تمہیں جال میں پھانسا گیا تھا۔ فوری طور پر میں بے بس تھا مگر رات گئے میں نے عمارت میں داخل ہونے کی

ناکام کوشش کی اور اس عمارت کے محافظوں کی گولیوں سے بال بال بچ کر بمشکل اندھیرے میں فرار ہوسکا۔ تمھارے سلسلے میں یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ مائیکل ٹرمپ اپنے اسرائیلی آقاؤں کی خاطر تمھارے خون کا پیاسا ہورہا ہے لہٰذا میں نے کوئی خطرہ مول لیے بغیر ان کا وہی داؤ اُن پر لوٹا دیا جو عبدالباقر کی حویلی سے ہمیں پکڑوانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔"

"یعنی تم نے فوجی حکام کو خود خبر دی تھی کہ تم اس عمارت میں پناہ گزین ہو؟" میں نے اُس سے وضاحت چاہی۔

"ہاں۔ میں نے بتایا تھا کہ یوسف نامی مفرور مجرم اس عمارت میں چھپا ہوا ہے اور فوجی دستے فوری طور پر حرکت میں آگئے۔۔۔ اس تمام عرصے میں میں قُرب و جوار میں چھپ کر یہاں ہونے والی کارروائیاں دیکھتا رہا۔ مجھے تمہاری اور بھابی کی گرفتاری کی خبر بھی مل گئی اور میں نے وقت نکال کر اپنے چند ساتھیوں کو جمع کرلیا۔ فوج کی بھرپور کارروائی اور بھاری پہرے کے بعد اچانک یہاں سے اُن کی روانگی نے مجھے پریشان کردیا پھر میں نے اسٹیشن ویگن میں دُور سے تمہیں پہچان لیا اور اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ میرا خیال تھا کہ بھابی بھی تمھارے ساتھ ہوں گی اور اس بار تمہیں چند گھنٹوں میں یمن سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنا لیا گیا تھا۔"

اسی اثنا میں ہم اس کمرے میں پہنچ چکے تھے جہاں دیوارگیر دستے کی مدد سے تہہ خانے میں اُترنے کا راستہ پیدا کیا جاسکتا تھا۔

"اس دُورافتادہ کمرے میں کیوں آئے ہو؟" اُس نے خود کو وہاں پاکر سوال کیا۔

میں نے آہستگی سے دیوارگیر آہنی دستہ کھینچا اور دیوار کا بڑا حصّہ کوئی آواز کیے بغیر فرش میں دفن ہوگیا۔

"تو یہ ہے وہ موت کا جنگل؟" اس کے مُنہ سے بے ساختہ تحیّر آمیز آواز نکلی۔

"چلے آؤ۔" میں نے اس خلا میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "اب یہاں ہر طرف موت کا بھیانک سنّاٹا راج کر رہا ہے۔"

"دھاوا بولنے والے فوجی پہنچے تھے یہاں تک؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "مائیکل ٹرمپ کے ساتھیوں نے خفیہ راستے سے فرار ہونے سے قبل اس نظام کو ناکارہ کردیا تھا جو اس دیوارگیر دستے کو کھینچنے سے حرکت میں آتا ہے لہٰذا ہم دونوں تہہ خانے میں اُن کے چھ آدمیوں کے ساتھ محبوس رہے اور فوجی ہماری لاعلمی میں اس کمرے سے مایوس و نامراد لوٹ گئے۔"

"چھ آدمی تھے تم دونوں پر؟" یوسف کی آواز تحیّر آمیز تھی۔

"ان میں مسلح محافظ دو ہی تھے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم تہہ خانے میں قید کے دوران میں اُن سب کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوگئے۔" پہلی کشادہ سیڑھی پر پہنچ کر میں نے وہ راستہ دوبارہ بند کردیا۔ یوسف نیچے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ لاشیں؟"

"ہاں۔ ہم چھ لاشوں کے ساتھ کافی دیر تک تہہ خانے میں مقید رہے پھر مائیکل ٹرمپ شاید خفیہ راستے سے دو آدمیوں سمیت عمارت میں داخل ہُوا اور تہہ خانے کے راستے کو کنٹرول کرنے والا نظام بحال کرکے اس اعتماد کے ساتھ اندر آیا کہ ہم دونوں اس کے چھ آدمیوں کے سامنے بے بس پڑے ہوں گے اور وہ تینوں بھی مارے گئے۔"

"نو خون! خدا کی پناہ!" وہ میرے ساتھ نیچے اُترتے ہوئے بولا۔

"کم از کم یہاں اپنے چہرے سے رومال ہٹادو۔" میں نے اُسے ٹوکا۔ "تاکہ روبرو گفتگو کا صحیح لطف آسکے۔ باہر نکلتے ہوئے پھر لپیٹ لینا۔"

اُس نے رومال ہٹایا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی اور نگاہوں میں بڑائی کا ایک عجیب سا احساس موجزن تھا۔

"مجھے فخر ہے کہ میں تمھارے دوستوں میں ہوں۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بے سروسامانی کے باوجود دشمن کی نفری کو خاطر میں نہ لانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"ہمیں یہاں سے دو خوفناک ہتھیار بھی ملے تھے۔۔۔۔"

اچانک وہ تحیّر زدہ آواز میں چیخ پڑا۔ "یہ لاشیں تو گل رہی ہیں!"

"میں یہی بتا رہا تھا۔" میں نے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "ان سب کو موت کے گھاٹ اتار کر ہم باہر نکلے اور خود کو فوجیوں کے حوالے کردیا مگر تہہ خانے کے بارے میں کل شام تک کسی نے ہم سے ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہیں کیا۔ وہ مسلسل تمھارے بارے میں پوچھے جارہے تھے لیکن جب جنرل حسین العمادی کو حقائق کا علم ہُوا تو وہ اپنے طور پر چھان بین کے بعد اس تجربہ گاہ کے وجود سے دہشت زدہ ہے۔"

وہ میری گفتگو سننے کے ساتھ ہی تحیّر زدہ نگاہوں سے اس زیرِ زمین دُنیا کے عجائبات دیکھے جا رہا تھا۔

تہہ خانے میں اُترنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ شاید فوجی حکام نے وہ لاشیں وہاں سے اٹھوا دی ہوں لیکن وہاں کے تفصیلی جائزے کے بعد مجھے جنرل عمادی کی دُوربینی کا معترف ہونا پڑا۔

اگر اُس کے منصوبے کے مطابق میں اسرائیلیوں سے رابطہ قائم کرنے میں قائم ہو جاتا تو انہیں اپنی کہانی کا یقین دلانا محض اسی صورت میں ممکن ہوتا جب ساری لاشیں تہہ خانے

میں جوں کی توں ہوتیں۔

میں یوسف کو اس تجربہ گاہ کے مقاصد اور دائرہ کار کے بارے میں وہ سب بتاتا رہا جو مجھے ڈاکٹر ہسٹن سے اپنے طور پر معلوم ہوا تھا۔

"ہولناک اور ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے یہ سب۔" یوسف تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔ "یہ تو برسوں کی محنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہماری سرزمین ہمارے ہی خلاف اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہے اور ہمیں شبہ تک نہ ہو سکا۔"

"یہی بات جنرل عمادی کو پریشان کر رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس تجربہ گاہ کی کہانی عام ہوئی تو حکومت کی اہلیت پر انگشت نمائی ہوگی اور پھر پورے یمن میں کوئی ایسا ماہر نہیں ہے جو مقامی آبادی کو ہلاکت سے دوچار کیے بغیر اس تجربہ گاہ کو برباد کر سکے یا اسے اپنے ملکی مفاد کے لیے استعمال کر سکے۔"

"ہوں۔" وہ میرے ہمراہ ڈاکٹر ہسٹن کے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اب میں سمجھا کہ یہ معاملہ بالکل ہی نیا رُخ اختیار کر گیا ہے۔ حکومت اور فوجی حکام دونوں ہی اسے حلق میں پھنسی ہوئی چھچھوندر سمجھ رہے ہیں۔"

"یہ ہے وہ سفاک ڈاکٹر ہسٹن جو نہ جانے کتنے انسانوں کی بھینٹ لینے کے بعد مرا ہے۔" میں نے میز کے عقب میں پڑی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔" یوسف اس کی صورت دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ "یہ تو پروفیسر ویلنگٹن ہے جو یمن کے سماجی حلقوں میں بہت مقبول تھا مگر پچھلے دو تین برس سے گھر بار چھوڑ کر یک بیک کہیں غائب ہوگیا۔ کافی تلاش اور ناکام بھاگ دوڑ کے بعد لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سمندر وغیرہ میں کسی حادثے میں اس کی جان تلف ہوگئی ہوگی۔"

"بیٹھو۔" اسے پیش کش کرتے ہوئے میں بھی تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"فوجی حکام تم سے کیا کام لینا چاہ رہے ہیں؟" آخرکار وہ اصل موضوع کی طرف آ ہی گیا۔

"وہ اس تہہ خانے سے خوفزدہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں کسی طرح اسرائیلیوں کو اس بات پر آمادہ کروں کہ وہ تہہ خانے کی ساری تنصیبات خفیہ طور پر اکھاڑ کر یمن سے لے جائیں۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"بڑی احمقانہ تجویز ہے۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "اوّل تو اسرائیلیوں تک تمہاری رسائی ہی مشکل ہے اور پھر رسائی ہو بھی گئی تو تم اُن کے چنگل سے کیسے نکل سکو گے؟"

"بظاہر احمقانہ نظر آنے والا یہ منصوبہ اس قدر بودا نہیں ہے۔" میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

"تو تفصیل سے بتاؤ نا!"

"اُن کا خیال ہے کہ میں اہلوانہ صنعا میں گھوموں پھروں گا تو اسرائیلی خود مجھے پکڑ لیں گے اور اس وقت میں انہیں اس سودے کی پیش کش کروں گا۔ تجربہ گاہ کی تنصیبات کے عوض میں ان سے اپنی رہائی اور بھاری رقم کا مطالبہ اس بنیاد پر کروں گا کہ تہہ خانے کے بارے میں ساری معلومات میری اور سیتا کی ذات تک محدود ہیں۔ اگر انہوں نے مطالبہ تسلیم نہ کیا یا مجھے مسلسل قید رکھا تو بارہ گھنٹے گزرنے پر سیتا فوجی حکام کو ساری خبریں فراہم کر دے گی۔"

"تو سیتا کو اسی لیے انہوں نے اپنی تحویل میں رکھا ہے؟" وہ تحیّر زدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، اُن کا خیال ہے کہ وہ محفوظ بھی رہے گی اور اُس کی وجہ سے میں ان کی ہدایات سے سرِمُو انحراف کرنے کی جسارت نہ کر سکوں گا۔"

"اس تجویز کا سارا انحصار اس مفروضے پر ہے کہ اسرائیلی تجربہ گاہ کو تمھاری گرفتاری پر ترجیح دیں۔ جنرل عمادی کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ اسرائیلی تمھارے بارے میں کس قدر حساس ہیں۔"

"لیکن میں اُن کا آلۂ کار بننے پر مجبور ہوں۔"

"یہ مجبوری بجا لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمھارے ہاتھوں پے درپے زک اٹھانے کے بعد اب اسرائیلی تمہیں زندہ پکڑنے کے بجائے ہلاک کرنے پر ہی تُل جائیں اور اُن سے تمھاری سودے بازی کی نوبت بھی نہ آ سکے۔"

میں کچھ دیر تک خاموش رہا۔ یوسف کی آنکھیں بھی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"اگر بھائی کو یرغمال نہ بنایا گیا ہوتا تو سب کچھ ممکن تھا۔" چند ثانیوں کے بعد یوسف کرسی پر جھولتے ہوئے بولا۔

"میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔" میں نے کہا اور وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ "جو قابلِ عمل بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اس وقت دھاوا بولتے ہوئے تمھاری شناخت کس حیثیت میں ہوئی ہوگی؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سوال کیا۔

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔" وہ اُلجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "ہمیں دیکھا ہی کس نے ہے جو شناخت کی نوبت آئی ہوگی۔"

"ہو سکتا ہے کہ مجھ پر مامور دونوں آدمیوں نے تمہیں دیکھ لیا ہو۔ یہ محض ایک مفروضہ ہے کہ اگر کسی نے دیکھا ہو تو وہ کیا اندازہ قائم کرے گا؟"

"ویسے تو تمھارے ساتھ آنے والے بھی ہوش میں آنے سے پہلے اپنی انا کا اظہار کر سکیں گے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "بس یہی کہا جا سکے گا کہ کچھ نقاب پوشوں نے حملہ کیا تھا۔"

"تم لوگوں پر فلسطینی ہونے کا شبہ تو نہیں کیا جا سکے گا؟"

"دُور سے ہرگز نہیں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "مخدوش حالات کے پیشِ نظر ہم نے اپنے روایتی طریقۂ کار سے انحراف کیا ہے ... ہاں ہماری آوازیں سننے والوں میں سے کسی نے لہجے کی بنا پر اندازہ لگا لیا ہو تو دوسری بات ہے۔"

"تمھاری آوازیں سننے والوں کو تو ختم ہی کرنا ہوگا۔"

"اعلیٰ فوجی افسر ہیں وہ دونوں۔" یوسف نے کہا۔ "میں نے انہیں سادہ لباس کے باوجود پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔"

"دونوں بریگیڈیئر ہیں۔ محسن الغانم اور ابو محمد۔" میں نے کہا۔ "ان کی ہلاکت کے بعد میری کہانی یہ ہوگی کہ اس عمارت میں ہم پر اسرائیلیوں کے ایک برق رفتار جتھے نے حملہ کر کے سب کو ہلاک کر دیا اور مجھے قیدی بنا لیا۔۔۔۔"

"یعنی تم جنرل عمادی کو اپنے مشن کی کامیابی کی فرضی اطلاع دینا چاہتے ہو؟" اس نے مضطرابی لہجے میں میری بات کاٹ دی۔

"ہاں۔ اگر قدرت نے یہ موقع فراہم کیا ہے تو اسے ضائع کرنا حماقت سے کم نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ابو محمد اور محسن سادہ لباس میں ہیں۔ ضروری نہیں کہ اسرائیلی انہیں پہچانتے ہوں۔ میں بتاؤں گا کہ وہ لوگ میرے مددگار سمجھ کر مارے گئے۔"

"یہ تمھارا خیال ہے کہ وہ محض یہ خبر پا کر تمھاری اور سیتا کی جان چھوڑ دیں گے۔" یوسف نے اشتباہ آمیز لہجے میں کہا۔

"اس کا انحصار میرے رویّے پر ہوگا۔ مجھے ہر قدم نپا تُلا اٹھانا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔ "جنرل عمادی ذاتی طور پر اس تجربہ گاہ سے بہت خائف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ شرط عائد کرنے کی کوشش کرے کہ تجربہ گاہ کے سامان کی منتقلی سے قبل سیتا کو رہا نہیں کیا جائے گا۔"

"آخر یہ لوگ اس قدر بودے کیوں ہوگئے ہیں؟" وہ غصے اور بے بسی کے عالم میں بولا۔ "اس قدر مہلک سازوسامان اسرائیل کو لوٹانے پر تلے ہوئے ہیں جو عربوں کے لیے مصائب کے جہنم پیدا کرتا رہے گا۔ آخر اُنے تباہ....؟"

"سب کچھ ممکن ہے لیکن یہاں کے نازک سیاسی حالات مانع ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان فضولیات میں سر کھپانے کے بجائے کوئی راہ تلاش کرو۔ وہ لوگ وہی کرنا چاہیں گے جو اُن کے سر میں سما چکا ہے اُسے بدلنا میرے اور تمھارے بس سے باہر ہے۔"

"کیوں نہ ایسا بندوبست کیا جائے کہ تجربہ گاہ کا سامان اسرائیل کے بجائے کسی اور طاقت کے حوالے کر دیا جائے؟" کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"مثلاً کون؟"

"ایک بڑی طاقت جو ہماری ہمدرد بھی ہے۔"

"لیکن جنرل عمادی بہت چالاک ہے وہ دُور سے نگاہ رکھے گا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ راز فاش ہو جائے کہ سامان اسرائیل کے بجائے کوئی اور ملک لے جا رہا ہے۔"

"تم اس کی پروا نہ کرو۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "وہ ملک وسیع وسائل اور اختیار کا مالک ہے۔ یہاں وہی لوگ آئیں گے جو یہودی نما مغربی نظر آتے ہوں۔"

"اس طرح ایک پنتھ دو کاج ہوتے ہیں۔"

"ہاں تمھاری گلوخلاصی بھی ہو جائے گی اور اسرائیل کو تنکا بھی نہ مل سکے گا۔" وہ اپنی تجویز پر خاصا مسرور نظر آ رہا تھا۔

"تنکا تو شاید اس ملک میں بھی نہ پہنچ سکے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"جس بحری یا ہوائی جہاز سے سارا سامان منتقل کیا جائے گا اسے کھلے سمندر میں یا صحرائی ویرانے میں بھرپور حملہ کر کے یمن کے اہلکار تباہ کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ بس اتنا چاہتے ہیں کہ اس اقدام سے جو بھی تباہی اور بربادی پھیلے وہ یمن کی حد سے باہر ہو۔"

یوسف سوچ میں پڑ گیا۔ "کیا یہ کمینگی نہ ہوگی کہ اپنے مفاد کے لیے ہم اپنے دوستوں کو بے خبری میں موت کے منہ میں دھکیل دیں؟"

"اگر میں تمھارا اشارہ درست سمجھا ہوں تو شاید یہ اقدام اس قدر گھناؤنا نہ ہو۔" میں نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"کیوں؟" اس کا لہجہ تحیّر آمیز تھا۔

"زبانی ہمدردی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تمھارا دوست زبانی طور پر تمہیں اس قدر اکساتا رہا ہے کہ اس سے عملی امداد کی امید پر کئی بار تم اسرائیلیوں سے بھڑ گئے اور جب تم پر زندگی کے راستے بند ہو رہے تھے تو محض تماشا دیکھتا رہا... دوست ایسے مصلحت پسند تو نہیں ہوتے۔"

"شاید تم درست کہہ رہے ہو۔" وہ مضمحل لہجے میں بولا۔ "ہمدردی کے دو بول ہی دوستی کی پہلی نشانی ہوتے ہیں، اگر ان کا بھی اعتبار نہ کیا جائے تو ہم یکہ و تنہا ہی رہ جائیں۔"

"اور پھر۔" میں نے اسے اپنے موقف پر کمزور پڑتے دیکھ کر دوسرا وار کیا۔ "دو چار جانوں کی قربانی دے کر اگر ایک ایسے منصوبے کو نیست و نابود کیا جا سکے جو آئندہ ہزاروں انسانوں کی ہلاکت اور معذوری کا سبب بننے والا ہو تو ہر اخلاقی ضابطے کی رُو سے یہ اقدام درست ہوگا۔"

"ذرا ٹرانسمیٹر پر اپنے ساتھیوں کی تو خبر لو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کارروائی کو کسی نے دیکھا ہی نہ گیا ہو۔" کچھ دیر کی متذبذب خاموشی کے بعد یوسف نے کہا اور میں نے جیبی ٹرانسمیٹر نکال کر اُس کا سوئچ آن کر دیا۔

"ہیلو۔ ڈیزرٹ واریئر نمبر ون کالنگ نمبر تھرٹی فور۔۔۔ اوور۔"

میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ٹرانسمیٹر پر پیغام دہرایا اور دوسری کوشش پر ہی مدھم سی آواز میں جواب مل گیا۔

"تھرٹی فور ریسپونگ۔۔۔ اوور۔"

"تمہارا گروپ اس وقت کہاں ہے؟۔۔۔ اوور۔" میں نے یوسف کو آنکھ مارتے ہوئے ٹرانسمیٹر پر بولنے والے سے سوال کیا۔

"ہم دو مورچوں پر ہدایات کے منتظر ہیں۔ عمارت پر حملے کے بعد صورتِ حال ہماری نگاہ میں ہے۔ شاید ایک دو حملہ آور تو براہِ راست ہماری زد میں بھی ہیں۔۔۔ اوور۔"

"صورتحال میں بالکل دخل اندازی نہ کی جائے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "عمارت پر فائرنگ غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔۔۔ اوور۔"

"ہم خیال رکھیں گے جناب۔۔۔ اوور۔"

"اوور اینڈ آل۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تو تمہارا اندازہ درست ہی تھا۔" یوسف نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارا اگلا قدم کیا ہوگا اس سلسلے میں؟"

"جنرل مناسب موقع پر خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کرے گا اسی وقت میں اس سے تبادلہ خیال کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکوں گا۔"

"پھر تمہارا اور میرا رابطہ کیسے ہوگا؟"

"میرا ارادہ کسی اچھے ہوٹل میں قیام کا ہے۔"

"پھر تم فندق الذہبی میں ٹھہرو۔۔۔ وہاں ہمارا ایک آدمی بھی ہے۔ میں تم سے فون پر یا اس کے ذریعے رابطہ قائم کروں گا۔"

"اس کی کوئی شناخت بتا دو، ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی چوٹ ہو جائے۔" میں نے فراخ دلی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"منصور نام ہے اور داہنے کان کی لو کٹی ہوئی ہے۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "اس پر پوری طرح اعتماد کر سکتے ہو۔"

تہہ خانے سے نکلنے سے پہلے یوسف نے اپنے چہرے پر سفید رومال دوبارہ مضبوطی سے لپیٹ لیا اور باہر آنے کے بعد وہ راستہ دوبارہ بند کر دیا گیا۔

نئے منصوبے کے پیشِ نظر تینوں بے ہوش قیدیوں کا زندہ رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا یوسف کے ایما پر قیدیوں کی نگرانی پر مامور اس کے ساتھی نے محسن الغانم اور ابو محمد کو موت کے گھاٹ اتار دیا البتہ میرے ایما پر ادھیڑ عمر شخص کو زندہ چھوڑ دیا گیا کیونکہ وہ یوسف اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنے سے پہلے ہی دہشت زدہ ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کے سلسلے میں میری کہانی کی تردید نہیں کر سکتا تھا۔

"اسٹیشن ویگن تو ناکارہ ہو گئی، تمہاری واپسی کیسے ہوگی؟" یوسف نے برآمدے کی طرف جاتے ہوئے چونک کر سوال کیا۔

"تم جاؤ۔ ان دونوں ہی کو بلاؤں گا۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"فی امان اللہ۔" اس نے کہا اور اپنے ساتھی سمیت تیزی سے دوڑتا ہوا برآمدے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ چند ثانیوں بعد میں برآمدے میں پہنچا تو احاطے میں ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ یوسف اور اس کے ساتھی دن کی چمکیلی دھوپ میں نہ جانے کس طرف غائب ہو چکے تھے۔

میں کچھ دیر تک سیڑھیوں پر خالی الذہنی کے عالم میں کھڑا رہا پھر سفید اسٹیشن ویگن کے تباہ حال ڈھانچے کی طرف چل دیا۔

وہ گاڑی بری طرح تباہ ہوئی تھی اور اس کے ڈرائیور کی خون آلود لاش ڈرائیونگ سیٹ کے پائیدان میں پڑی ہوئی تھی۔

میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔

وہ عمارت، اسرائیلیوں کی شکست کے بعد لاوارث مردہ گھر کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ نو لاشیں تہہ خانے میں موجود تھیں۔ دسویں محسن الغانم کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ یہ تعداد یوسف کے ساتھی نے محسن اور ابو محمد کو قتلِ ناحق کی سزا دے کر بارہ تک پہنچا دی اور تیرھویں لاش اسٹیشن ویگن میں پڑی تھی۔

موت کی افزائش کے لیے ڈاکٹر آسٹن کا مرکز بننے والی وہ عمارت اس وقت حقیقی معنوں میں موت گھر بنی ہوئی تھی جبکہ مجھے وہاں رکنے کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگی۔

میں نے وہیں سے ٹرانسمیٹر پر اپنے نگہبانوں سے رابطہ قائم کیا وہ اپنی کار سمیت کہیں موجود تھے اور مجھے عمارت سے نکل کر اسٹیشن ویگن کی طرف آتے دیکھ چکے تھے۔

میری ہدایت پر وہ چند ہی منٹ میں کار میں سوار میرے پاس آ گئے۔

عمارت کے اوپری کمرے میں تین لاشیں دیکھ کر ان پر کوئی خاص ردِ عمل نہیں ہوا۔

"یہ تو شاید تمہارے ساتھ ہی آئے تھے؟" ان میں سے ایک نے لاشوں پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یہ بے ہوش ہے۔" میں نے ادھیڑ عمر الیکٹریکل انجینئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے کار میں ڈال لو اور کسی طرح جنرل تک خبر پہنچا دو۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"شہر کے کسی بھی مناسب ہوٹل میں۔"

وہ دونوں اپنے کام کے رموز سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے بڑی مہارت سے بے ہوش آدمی کو عقبی نشست پر بٹھا دیا۔ ان میں سے ایک نے اس کے برابر والی نشست سنبھال لی جبکہ دوسرا ڈرائیونگ سیٹ پر جم گیا۔

میرے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہی کار اچھل کر تیزی سے احاطے کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔

"وہ تینوں کیسے مارے گئے؟" طویل سکوت کے بعد کار چلانے والے نے سرسری لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"گولیوں سے۔" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ اندھادھند حملے میں مارے گئے یا قیدی بنائے جانے کے بعد؟" اس نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں ونڈ شیلڈ کے اس پار سیاہ سڑک پر جمی ہوئی تھیں اور چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

"حملے میں کسی کو خراش بھی نہ آئی تھی۔" اسے جنرل عمادی کا مخبر تصور کرتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ "بس فائرنگ سے دہشت زدہ ہو کر یہ بڈھا بے ہوش ہو گیا تھا پھر ایک کو محسن الغانم نے بزدلی دکھانے پر خود گولی مار دی۔ بعد میں اس کے ساتھ دوسرا بھی حملہ آوروں کے ہاتھوں مار ڈالا گیا۔"

"کمال ہے کہ تم چھوڑ دیے گئے۔"

"لہجہ درست رکھو۔" اس کے لہجے میں طنز کی ہلکی سی جھلک محسوس کر کے میں غصیلے لہجے میں غرایا۔ "میری صحیح سلامت رہائی جنرل کے منصوبے کی کامیابی ہے۔"

"مجھے کسی منصوبے کا علم نہیں لہٰذا حیرت ہونا لازمی تھی۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"شہر میں کون کون سے ہوٹل بہتر ہیں؟" کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے اس سے سوال کیا۔ میں اپنی زبان سے براہِ راست فندق الذہبی کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔

اس نے آٹھ دس نام گنوائے جن میں فندق الذہبی کا نام بھی شامل تھا۔

"اوسط درجے کا صاف ستھرا ہوٹل ہونا چاہیے۔"

اس بار اس نے صرف تین نام دہرائے جن میں پہلا نام میرا مطلوبہ تھا۔

"پھر سیدھے فندق الذہبی ہی چلو۔" میں نے اس سے کہا۔ "مگر میں پہلی فرصت میں جنرل سے بات کرنی چاہتا ہوں۔"

"تمہارا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔"

فندق الذہبی کی پانچ منزلہ عمارت کے پورٹیکو میں مجھے اتار کر وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچنے تک میری نگاہیں عملے کے ہر فرد کے داہنے کان سے ٹکراتی رہیں۔ غلطی یہ ہوئی کہ میں یوسف سے یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ اس کے معتمد منصور کا تعلق ہوٹل کے عملے کے کس درجے سے تھا۔

اپنے خدشات کے برعکس مجھے نہایت آسانی سے کمرہ دے دیا گیا مسافروں کے اندراجات کے رجسٹر پر میں نے خود کو یمنی ظاہر کرتے ہوئے عدن کے ایک فرضی پتے کا مکین ظاہر کیا تھا اور کلرک اندراجات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اطمینان سے رقم گننے میں مصروف ہو گیا۔

ہوٹل میں پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے گرم پانی کے شاور کے نیچے طویل غسل کیا اور لباس پہن کر بستر پر دراز ہو گیا۔

اس وقت بھوک کی ہلکی سی خواہش تھی لیکن میں نے کچھ دیر سو لینا ضروری خیال کیا اور کھڑکیوں کے دبیز پردے کھینچ کر کمرے میں رات کا سماں پیدا کر لیا۔

سکون، اندھیرا اور تنہائی میسر آتے ہی میرا ذہن سیتا کی ذات اور اس کی سلامتی میں الجھ گیا جو اس بار حکام کی یرغمالی بنی ہوئی تھی۔

جنرل حسین العمادی کے بارے میں میں نے جو رائے قائم کی، وہ بہت اچھی تھی۔ وہ ایک دلیر، بیباک اور زیرک فوجی افسر تھا جس کے الفاظ پر آنکھ بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا تھا مگر اس کا دوسرا ساتھی جنرل ابو المکتوم جو انٹر سروسز انٹیلی جنس کا سربراہ تھا، خاصا خبیث نظر آتا تھا مجھے ڈر تھا کہ کہیں بریگیڈیئر محسن الغانم اور ابو محمد کی موت کی خبر پانے کے بعد سیتا کے بارے میں وہ جنرل حسین العمادی کو بھڑکانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

خیالات کی اسی رو میں ذہن پر غنودگی سی طاری ہوئی تھی کہ اچانک کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔

"صفدر علی! تمہاری کال ہے۔" ریسیور اٹھاتے ہی میرے کانوں میں ٹیلی فون آپریٹر کی شوخ و شنگ آواز آئی اور کلک کی آواز کے ساتھ ہی کال ملا دی گئی۔

ہوٹل کے رجسٹر میں میں نے دانستہ اپنا اصل نام لکھایا تھا۔ کیونکہ مقامی حکام کی نگاہوں میں آ جانے کے بعد نام چھپانا بے سود تھا۔ جہاں تک اسرائیلیوں کا تعلق تھا تو وہ موشے دایان نام اختیار کر لینے کے باوجود ہزاروں کی بھیڑ میں شناخت کر سکتے تھے۔

"ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں زرد رنگ کی ایک بیوک موجود ہے جس کی داہنی ہیڈ لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے تم فوراً اس میں سوار ہو جاؤ۔" سرد اور خشک لہجے میں فون پر ہدایت دی گئی اور میں نے پہلا تجربہ ہونے کے باوجود جنرل کی آواز پہچان لی۔

"کار کا نمبر۔۔۔؟" میں نے سوال کرنا چاہا لیکن لائن بے جان ہو چکی تھی۔ میں چند ثانیوں تک ریسیور کو غصیلی نگاہوں سے گھورتا رہا۔ پھر اسے کریڈل پر پٹخ دیا۔

جنرل کی مختصر کلامی پر مجھے غصہ ضرور آیا تھا مگر اس بات سے خوشی بھی ہوئی کہ میرا معاملہ اس کے نزدیک اتنا اہم تھا کہ زیادہ وقت

برباد کیے بغیر اس نے دوسری مصروفیات ترک کرکے مجھ سے ملنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

کمرے سے نیچے پارکنگ لاٹ میں پہنچنے تک میری نگاہیں منصور نامی شخص کی تلاش میں بھٹکتی رہیں لیکن کوئی کامیابی نہ ہوسکی۔

اُس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے اور ہر طرف سورج کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پارکنگ لاٹ میں گنجائش سے کم کاریں پارک تھیں مگر پھر بھی اُن کی تعداد کافی تھی اور اس ہجوم میں زرد رنگ کی اکلوتی کار دُور ہی سے دیکھی جاسکتی تھی۔

میں نے زرد بیوک کے آگے سے گزرتے ہوئے اس کی داہنی ہیڈلائٹ کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھا اور ڈرائیور کے برابر والے دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ دروازہ مقفل تھا اور ڈرائیور شیشے چڑھائے دونوں پیر سیٹ پر رکھے بے فکری سے بیٹھا ہوا تھا۔

جب وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوا تو مجھے مجبوراً یخ بستہ شیشے پر ہلکی سی دستک دے کر کرخت خدوخال والے اس شخص کو متوجہ کرنا پڑا جو عربوں کے مخصوص سفید لبادے اور یمنی باشندوں کی مخصوص کپڑے والی گول ٹوپی میں ملبوس تھا۔

اُس نے ڈیش بورڈ پر لگا ہوا کوئی بٹن دبایا اور اس بار ہینڈل پر میرے ذرا سے دباؤ سے دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی خنک ہوا کا معطر جھونکا باہر آیا، ساتھ ہی مغربی موسیقی کا تیز شور بھی سنائی دیا اور میں جلدی سے ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

کار کے اندر کائنات ہی کچھ اور تھی۔

فضا میں لیونڈر کے اسپرے کی بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی اور کار کا بے آواز انجن اسٹارٹ تھا جو ائرکنڈیشنر کو چلانے میں مصروف تھا۔ ہولسٹری میں پوشیدہ طاقتور اسپیکرز سے مغربی موسیقی کی تیز لہریں اُٹھ رہی تھیں اور وہ سفیدپوش یمنی اس کائنات کا شہنشاہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ڈرائیور نہیں بلکہ اس کار کا مالک ہے۔

اس نے مجھ پر ناقدانہ نظر ڈالی پھر کھردرے لہجے میں میرا نام پوچھ بیٹھا۔

"صفدر علی۔" میں نے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے سوال کیا اور میری کھوپڑی چکرا کر رہ گئی۔

"یہ تو تمہیں ہی معلوم ہوگا۔"

"کیا مذاق ہے واللہ!" وہ دونوں ہاتھ زور سے اسٹیئرنگ پر مار کر بلند آواز میں ہنسا۔ "مسافر تم ہو اور منزل مجھے معلوم ہوگی۔"

ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا گیا کہ کہیں جنرل کی بتائی ہوئی کار کو پہچاننے میں مجھ سے غلطی نہ سرزد ہوگئی ہو۔

"معاف کرنا، شاید مجھ سے کار کی شناخت میں غلطی ہوئی ہے۔"

"معافی کیسی، اب آ ہی گئے ہو تو میری گاڑی میں سفر کرو۔"

اس کے کرخت چہرے پر نرمی عود کر آئی تھی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنی سمت کا دروازہ کھول لیا اور نیچے اترنا چاہا مگر اُس نے پھرتی سے میرا بازو تھام لیا۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو؟ چلو میں ہی تمہیں لیے چلتا ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر جھٹک کر دروازہ دوبارہ بند کرلیا۔

اس نے خود کار ٹرانسمیشن کا لیور آگے دھکیلا اور زرد بیوک سرکتی ہوئی پارکنگ لاٹ سے نکل کر پھاٹک کی طرف مڑ گئی۔

"میں عمادی کا دوست ہوں۔" سڑک پر رواں ٹریفک کی تیز رفتار قطار میں شامل ہونے کے بعد اس نے اپنے بارے میں میری الجھن دور کردی۔

"میں تو ڈر ہی گیا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہیں بلوانے کے لیے وہ کسی سرکاری آدمی کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا حالانکہ کام شاید سرکاری ہی ہے۔"

میں خاموش ہی رہا ورنہ اس باتونی سے پیچھا چھڑانا مشکل نظر آ رہا تھا۔

مصروف راستوں سے گزرنے کے بعد بیوک ایک خوبصورت مضافاتی شاہراہ پر نکل آئی۔ اور چند منٹ کے بعد ایک عالی شان ایک منزلہ مکانات پر مشتمل آبادی میں ایک احاطے میں داخل ہوگئی۔

وسیع پورچ میں انجن کو ریس دے کر اُس نے اگنیشن آف کر دیا اور نیچے اتر آیا۔

میں نیچے آیا تو جنرل حسین العمادی سفید لبادے میں اندر سے برآمدے میں آتا نظر آیا۔

میں برآمدے میں پڑی ہوئی بید کی کرسیوں کے قریب ٹھہر گیا۔

"آجاؤ۔" جنرل نے واپس اندر جاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری کہانی سننے کے لیے بے چین ہوں۔"

باہر کے مقابلے میں اس مکان کی اندرونی آرائش کہیں زیادہ پرشکوہ تھی۔ وہ مجھے مختلف راستوں سے لیتا ہوا ایک ایسے کمرے میں داخل ہوا جہاں تین دیواروں کے ساتھ بنی ہوئی اونچی اونچی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔

اس اسٹڈی میں تین نشستوں اور ایک بستر سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ ہم دونوں بڑی میز پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

"اگر گستاخی تصور نہ ہو تو ایک درخواست کردوں؟" کرسی سنبھالنے کے بعد میں نے جھجکتے ہوئے جنرل سے اجازت چاہی۔

"اس وقت تم میرے گھر میں میرے مہمان ہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" جنرل حسین العمادی کا لہجہ نرم اور خلوص آمیز تھا۔

"معیوب نہ ہو تو تھوڑی سی اسکاچ چاہوں گا۔"

"کوئی مخصوص برانڈ؟"

"جنرل جانے۔"

جنرل نے میز کے سرے پر رکھا ہوا انٹرکام اُٹھایا اور بٹن دبا کر کسی کو وسکی لانے کی ہدایت دے کر میری طرف متوجہ ہوگیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کے دو اعلیٰ افسر اس مہم میں مارے گئے۔" میں نے گفتگو کا آغاز محسن الغانم اور ابومحمد کے خون سے کرنا ہی مناسب سمجھا۔

"میرے نزدیک تو یہ اہم مہم تھی ہی نہیں۔" اس نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "بس تمہیں ان لوگوں کے ساتھ جائزہ لے کر لوٹ آنا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی حملہ ہوگا مگر خوشی ہے تم زندہ نظر آ رہے ہو۔"

"وہ پانچ تھے، ایک مشین گن اور چار رائفلوں سے مسلح۔" میں نے کہا۔ "وہ اُن کو میرا ساتھی سمجھ رہے تھے اور اُن کا ارادہ ہم چاروں کو قید کرکے لے جانے کا تھا مگر جب میں نے تجربہ گاہ کے بارے میں سودے کی پیشکش کی تو وہ انھیں مارنے پر تُل گئے۔ برقیاتی ماہر کو انھوں نے بمشکل اس وجہ سے زندہ چھوڑا کہ وہ گولیاں چلتے ہی بے ہوش ہوچکا تھا۔"

"وہ کون تھے؟"

"اُن میں سے ایک دو چہرے میں نے نائیکل ٹرمپ کے ساتھ دیکھے تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں کسی کے نام سے واقف نہیں ہوں۔"

"تمہیں زندہ چھوڑ کر انہیں مارنے میں کیا مصلحت تھی؟"

"اُن کے لیے میں معاملے کا دوسرا فریق تھا جب کہ وہ معمولی مقامی مہرے تھے جو کسی بھی وجہ سے ان کے لیے دشواریاں پیدا کرسکتے تھے۔"

"سنا ہے کہ ناصر کو محسن الغانم نے گولی ماری تھی؟"

میں نے ناصر کی موت کا واقعہ اسے من وعن سنا دیا۔

"یہ بُرا ہوا اور شاید قدرت نے اُسے فوراً ہی اس غلطی کی سزا بھی دے دی۔" وہ سگار کا ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس سودے کے لیے پچاس ہزار امریکی ڈالر کا مطالبہ کیا تھا، وہ اپنے ذمہ داروں سے بات کرکے کسی بھی وقت مجھے مطلع کر دیں گے۔"

"مگر وہ تمہیں شہر میں کیسے تلاش کریں گے؟" جنرل نے سوال کیا اور میری عقل چکرا کر رہ گئی۔ یہ مختصر لیکن اہم نکتہ میں نے نظرانداز کردیا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے خاموشی کا تشویشناک وقفہ طویل کیے بغیر جواب دیا۔ "ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ہمارا تعاقب کیا ہو۔"

"نہ تعاقب ہوا اور نہ تمہاری نگرانی ہو رہی ہے۔" وہ بغور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"میں نے رابطے کی صورت جاننی چاہی تھی مگر اُن کے سرغنہ کو شاید اپنے بارے میں بہت زیادہ خوش فہمی ہے، دعویٰ کر رہا تھا کہ صنعا تو کیا پاتال میں بھی مجھے ڈھونڈ لے گا۔"

"مگر کب تک؟" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ دو چار روز میں وہ عمارت بے ضرر ہوجائے۔ یہ معاملہ اعلیٰ سیاسی حلقوں کو تہہ و بالا کیے ہوئے ہے۔"

"آج کی رات تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

اسی اثنا میں جنرل کا خدمت گار ایک دمکتی ہوئی سنہری ٹرے میں عمدہ قسم کی اسکاچ کی ایک بوتل، بلور کے دو جام، سوڈا، سائفن اور برف کے ڈلوں سے بھرا ہوا آئس پاٹ لے آیا۔ اسی ٹرے میں ایک پلیٹ خشک پنیر کے نمکین پارچوں کی بھی تھی۔

مے نوشی کے وہ لوازمات دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا کیونکہ کافی عرصے کے بعد اس اہتمام کے ساتھ شراب نوشی کی نوبت آئی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ اُن کا پیغام ملتے ہی مجھے خبر دی جائے۔" اس نے دونوں کے لیے جام تیار کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"میں فون کرلوں گا۔"

"نہیں، فون پر کوئی اور بھی گفتگو سن سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا پھر مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "تمہارے پاس جیبی ٹرانسمیٹر تو ہے نا؟"

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"تمہاری نگرانی پر بیک وقت صرف دو آدمی رہتے ہیں، میں چار میں سے ایک ٹرانسمیٹر اُن سے لے لوں گا۔ اس پر تم ہوٹل کے کمرے ہی سے مجھ سے رابطہ قائم کرسکو گے۔" اس کے لہجے میں اس بار اطمینان کی جھلک تھی۔

"بیتا کہاں ہے؟" میں نے سکوت کے وقفے میں اسکاچ کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے دھیمی آواز میں جنرل سے سوال کیا۔

"اسی عمارت کے ایک حصے میں مقیم ہے۔" اُس نے بھی اپنے لب تر کرتے ہوئے کہا۔ "بہت مہذب اور شائستہ ثابت ہوئی ہے وہ۔"

"اگر اس کا احترام برقرار رکھا جائے تو وہ عموماً شائستہ ہی رہتی ہے۔" میں نے موقع پاکر وہ بات جتانی ضروری سمجھی۔ "ذرا بھی اہانت ہو تو اچانک خونخوار ہوجاتی ہے کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک وحشی لڑکی ہے۔"

"وحشی؟" جنرل نے اس بار ایک بڑا سا گھونٹ لے کر حیرت سے سوال کیا۔

"وہ تہذیب کی روشنی سے بہت دُور، ہمالیہ کی برفانی وادیوں

میں پیدا ہوئی اور وہیں جوان ہوئی اسی لیے دلیر اور بے باک ہے۔"

"کس قبیلے سے تعلق تھا اُس کا؟" جنرل نے دل چسپی کے ساتھ سوال کیا۔

"وہ اور اس کی ماں آبادی سے دُور پہاڑوں میں مقیم تھیں۔" میں نے اپنے ہمالیہ کے سفر کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دونوں بندروں پر حکمرانی کرتی تھیں اور وہی بے زبان ان دونوں کے محافظ ہوا کرتے تھے۔"

"حیرت ناک ماضی ہے اس کا!"

"کبھی کبھی میں خود بھی یہی سوچتا ہوں۔" میں نے جام خالی کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر جنرل نے کرسی چھوڑ دی۔ "تم یہیں رکو، میں سیتا کو بھیجتا ہوں، پندرہ منٹ بعد روانگی کے لیے تیار رہنا۔"

جنرل شراب اور اس کے لوازمات وہیں چھوڑ گیا تھا لہٰذا میں نے اس سہولت سے استفادہ کرنا ضروری سمجھا، اسی اثنا میں سیتا آگئی۔

گھریلو ماحول اور آسائش میسر ہونے کے باعث اس کے چہرے پر چند ہی گھنٹوں میں عجیب سی تازگی اور رعنائی عود کر آئی تھی۔

میں نے ملازم کے جاتے ہی بے اختیار اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

"تم پھر پی رہے ہو؟" میرے سینے سے الگ ہونے کے بعد اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"میزبان کی پیشکش کا احترام کر رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کر جھوٹ بولا۔

"اسے کچھ نہ کہو، بہت شریف النفس آدمی ہے میری دیکھ بھال اسکی بیوی بذاتِ خود کر رہی ہے بڑی مدت کے بعد یہ ماحول میسر آیا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم مطمئن ہو۔" میں نے کہا۔ "تمھارے بارے میں میں بہت زیادہ فکرمند تھا۔ اب امید ہو چلی ہے کہ شاید جلد ہی ہماری گلو خلاصی ہو جائے۔"

"کیا کام بن گیا؟"

"ہاں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے وہی کچھ بتا ڈالا جو جنرل کو بتا چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اسٹڈی میں کہیں ڈکٹا فون یا ٹیپ ریکارڈر موجود ہو۔

"بہت درندے تھے وہ۔" سیتا نے محسن الغانم کے قتل کی خبر سن کر تنفر آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ بھی بہت اچھا آدمی تھا۔"

"میں کوشش کے باوجود انھیں قتل سے باز نہ رکھ سکا۔"

"تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کیمیاوی پستول تلاشی میں چھن جانے کے بعد دوبارہ میرے قبضے میں کیسے آگیا؟"

"بس خیال ہی نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "مرنے سے ذرا دیر پہلے بریگیڈیئر محسن الغانم نے خود ہی بتایا کہ پستول نما کیمیاوی ہتھیار اس نے تمھیں لوٹا دیا تھا۔"

"اس کی موجودگی میرے لیے یہاں آنے تک بڑا سہارا رہی ہے۔"

"اب تو اس کی ضرورت نہیں تمھیں؟"

"نہیں۔ اس چھت کے نیچے میں خود کو بہت محفوظ تصور کر رہی ہوں۔" اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر وہ مجھے دے دو۔"

اُس نے اپنا وینٹی بیگ کھول کر موت کا وہ ہولناک پیغامبر میری طرف بڑھا دیا۔ اور میں نے پھرتی سے اسے اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ گزرنے کے بعد جنرل واپس آگیا۔ اس کے ہمراہ ایک دُبلا پتلا دراز قامت مقامی بھی موجود تھا۔

"یہ تمھیں شہر میں کسی ایسی جگہ چھوڑ دے گا جہاں سے تم سہولت کے ساتھ ٹیکسی وغیرہ میں اپنے ہوٹل میں پہنچ سکو گے۔" جنرل کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ شخص اس کا ڈرائیور تھا۔

میں روانگی کے لیے اٹھ گیا۔

سیتا برآمدے تک میرے ساتھ آئی پھر اس پر الوداعی نگاہیں ڈالنے کے بعد میں شہری نمبر پلیٹ والی جنرل کی کار میں سوار ہو گیا۔ شہر کے قلب میں ایک بارونق مقام پر مجھے اتار کر وہ کار آگے بڑھ گئی۔ میں کچھ دیر پُرہجوم راستوں پر مختصر سی خریداری کرتا رہا پھر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں ہوٹل میں اپنے فلور پر پہنچ کر کمرے کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ کچھ دُور واقع سروس رُوم میں سے ایک نوجوان شخص تیزی سے میری طرف آیا۔

میں نے محض اتنا دیکھا کہ وہ ہوٹل کے عملے کی مخصوص وردی میں تھا۔ اور میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے اُس نے بھی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

"معاف کرنا، میں بغیر اجازت اندر آگیا۔" میری تیز نگاہوں کا سامنا کر کے وہ بوکھلا گیا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس کے داہنے کان کی کٹی ہوئی لَو دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ "مجھے خود تمھاری تلاش تھی نام کیا ہے تمھارا؟"

"منصور۔" اُس نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی پیغام؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے کچھ کہے بغیر جیب سے ایک رقعہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

ہلکے نیلے رنگ کا تہہ کیا ہوا چھوٹا سا کاغذ تھا جس پر صرف ایک مختصر سی سطر درج تھی۔ "رات دس بجے آؤں گا۔"

"کس کا پیغام ہے؟" میں نے رقعے پر نام نہ دیکھ کر دانستہ سوال کیا۔

"معلم یوسف کا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔

"تمھاری ڈیوٹی کب تک رہے گی؟"

"گیارہ بجے تک۔" اس نے کہا۔ "ضرورت ہوئی تو رات والے کو چھٹی دے کر رُکا رہوں گا۔"

"تمھاری ڈیوٹی کہاں ہے؟"

"رُوم سروس سپروائزر ہوں جب ضرورت محسوس ہو آپ بیرے سے نمبر رِنگ کریں۔" اُس نے ادب کے ساتھ کہا۔

"اس وقت یہاں کیسے تھے؟"

وہ خفت آمیز انداز میں ہنسا۔ "ہر فلور کا اپنا سروس رُوم ہے، اس کے معائنے کے بہانے شام سے کئی بار اُوپر آ چکا ہوں کمرہ مقفل تھا۔"

میں کرسی پر بیٹھ کر جوتے اور موزے اُتارنے لگا۔ وہ سر کو قدرے خم دے کر واپس چلا گیا۔

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو آٹھ بج رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ مجھے یوسف کے انتظار میں دو گھنٹے گزارنے تھے۔

معاً مجھے احساس ہوا کہ میرا پیٹ خالی تھا۔ جنرل عمادی کے مکان پر معدے میں انڈیلی ہوئی اسکاچ بھی خوراک کی طلبگار تھی۔ لہٰذا میں نے نیچے جانے کے بجائے کمرے ہی میں کھانا طلب کرنے کو ترجیح دی۔ اور کھڑکیوں کے پردے سمیٹ دیے۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تک میں کھڑکی میں کھڑا نیچے سڑک پر زندگی کے ہنگاموں کا جائزہ لیتا رہا پھر خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے محافظوں سے کچھ بات کی جائے۔

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کر کے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کر دیا۔

"ہیلو ڈیزرٹ واریئر۔۔۔ نمبر وَن کالنگ۔۔۔ اوور۔" سلسلہ مل جانے کی سگنل ٹون سننے کے بعد میں نے کہا۔

"ڈیزرٹ واریئر۔۔۔ نمبر ٹو ریسیونگ سر۔۔۔ اوور۔" ٹریفک کی بھنبھناہٹ اس آواز کے پس منظر میں واضح تھی۔

"رپورٹ۔۔۔ اوور۔"

"کیا آپ کے پاس کوئی موجود ہے؟ اوور۔"

"نہیں۔ تم اطمینان سے بات کر سکتے ہو۔۔۔ اوور۔"

"تمھارا پیغام مطلوبہ آدمی کو پہنچا دیا گیا تھا اور زرد بیوک میں تم شاید اسی سے ملنے گئے تھے۔ ہم نے واپسی تک تمھارا تعاقب کیا تھا۔۔۔ اوور۔"

"لیکن کمرے میں اگر کوئی زبردستی گھس آئے تو تمھیں علم بھی نہ ہوگا۔ تم مزے سے ساری رات باہر بیٹھے رہو گے۔۔۔ اوور۔"

"موجودہ بندوبست میں یہ خرابی تو ہے۔۔۔ اوور۔"

"تم دونوں کس جگہ موجود ہو؟ اوور۔"

"احاطے میں ایک ایسی جگہ منتخب کی ہے جہاں سے ہم ہر آنے جانے والے پر نظر رکھ سکتے ہیں مگر ہمیں ساری رات بھی کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ اوور۔"

میں نے فوراً ہی یہ بات نوٹ کی کہ انہیں محل سے کر باہر نکلنا مقصود ہوا تو عقبی راستہ بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"آج کی رات خاصی اہم ہے۔۔۔ ذرا آنکھیں کھلی رکھنا۔ اوور۔"

"بے فکر رہو۔۔۔ اوور۔"

"شب بخیر۔۔۔ اوور اینڈ آل۔"

سلسلہ منقطع کر کے میں بستر پر آ گرا۔

دو چار سگریٹیں پھونکنے کے بعد دروازہ پر دھیمی سی دستک ہوئی اور میں نے لپک کر بولٹ گرا دیا۔

گھنی سیاہ مونچھوں اور خشخشی ڈاڑھی والے ایک شخص کو اپنے سامنے موجود پا کر میں ٹھٹک گیا اور میری بھنویں تن گئیں۔

"اندر نہیں آنے دو گے؟" اس نے مسکرا کر سوال کیا تو میں بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

وہ بدلے ہوئے حلیے میں یوسف تھا۔

"ہر طرف میری تلاش جاری ہے۔" اندر داخل ہو کر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور صنعا میں بے شمار لوگ میری صورت آشنا ہیں اس لیے میں نے حلیے میں تبدیلی ضروری سمجھی تاکہ میری شناخت تمہارے لیے دشواری کا سبب نہ بن جائے۔"

"یہ بتاؤ کہ اس وقت کس سلسلے میں آئے ہو؟" میں نے اُسے بیٹھنے کا موقع دینے کے بعد بے تابانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تجربہ گاہ۔۔۔" اُس نے بتانا شروع کیا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کھانا کھا کر آئے ہو؟"

"نہیں۔" وہ ہنستا ہوا بولا۔ "شاید صورت ہی سے بھوک ٹپک رہی ہے جو تم نے اندازہ لگا لیا۔ فون پر منصور سے کہہ دو۔ خود لے آئے گا۔"

میں نے انٹرکام اٹھا کر آپریٹر سے روم سروس سپروائزر کا نمبر مانگا اُدھر منصور ہی تھا۔ میں نے اُسے ہدایات دیں اور یوسف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہ لوگ بخوشی اس کیمیاوی اسلحہ خانے کو یہاں سے لے جانے پر تیار ہیں۔ اور اس کی صحیح نشاندہی کے لیے لاکھ ڈیڑھ لاکھ ڈالر تک دینے پر آمادہ ہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو تم نے انہیں عمارت کا پتہ نہیں بتایا؟"

"مجھے ڈر تھا کہ بازی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"ہو سکتا ہے کہ اُن کے ماہرین وہاں موجود سامان اور ذخائر کی اہمیت کا اندازہ لگا کر فوری طور پر وہاں قابض ہو جائیں۔ مقامی حکام اوّل تو اُن سے تعرض ہی نہیں کریں گے لیکن اپنے طور پر وہ ہر تعاون اور اس تہ خانے کے تحفظ کے لیے تیار ہوں گے ایسی صورت میں جنرل عمادی سیتا کو اس وقت تک قید رکھے گا جب تک تجربہ گاہ کا سارا سامان بخیر و عافیت یمن کی سرحدوں سے باہر نہیں نکل جاتا۔"

"لیکن پیشگی رہائی کی بھی تو کوئی صورت نہیں ہے۔"

"تم جنرل کو بتاؤ کہ وہ صرف اسی صورت میں رقم ادا کر کے معاہدہ کرنے پر آمادہ ہیں جب تم اور سیتا یمن سے باہر موجود ہوں۔"

"اس کا جواز کیا ہو گا؟"

"بڑا مضبوط جواز ہو گا۔" وہ بولا۔ "یہاں رہتے ہوئے تم مزید رقم اینٹھنے کے لیے انہیں بلیک میل کر سکتے ہو یا رقم لینے کے بعد بھی مخبری کر سکتے ہو جب کہ یمن سے باہر رہتے ہوئے تمہارے لیے ایسا کرنا دشوار ہو گا۔"

"بڑی کمزور دلیل ہے۔ جنرل اسے تسلیم نہیں کرے گا۔" میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "یہ خلائی رابطوں کا دور ہے۔ کسی دُور افتادہ ملک سے فون، خط، ٹیلکس یا یمن کے سفارت خانے کے ذریعے پل بھر میں مقامی حکومت کو ہر قسم کی اطلاع دی جا سکتی ہے۔"

"بہرحال یہ میرا مقصد تھا۔ اب طریقۂ کار تم خود سوچو۔" اُس نے قدرے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "جنرل سے پہلے تو تمہاری تسلی ضروری ہے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور منصور خود کھانے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُس نے پیر سے دروازہ بند کرنے کے بعد سر کو خم دے کر احترام آمیز انداز میں یوسف کو تعظیم دی اور کھانا سینٹر ٹیبل پر لگانے لگا۔

"تم نے پہچانا۔ یہ کون ہیں؟" میں نے حیرت کے ساتھ منصور سے سوال کیا۔

"معلّم کو ہزاروں میں شناخت کیا جا سکتا ہے۔" اُس نے انکسار آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا تم نے انہیں پہلے بھی اس حلیے میں دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے اعتراف کیا۔ "کئی بار ایسا ہو چکا ہے مگر حلیہ مختلف ہونے کے باوجود میں انہیں پہچان لیتا ہوں۔"

"کمال ہے۔" میں نے کہا۔ کیونکہ آواز سننے سے پہلے میں خود دھوکا کھا چکا تھا۔

کھانا لگا کر منصور چلا گیا اور یوسف اپنی آتشِ شکم سرد کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میں اس بارے میں کافی دیر تک سوچتا رہا لیکن کوئی راہ نہ سجھائی دے سکی۔ سیتا کی سرکاری تحویل سے رہائی کا معاملہ بہت الجھا ہوا تھا۔

"کچھ آیا ذہن میں؟" کھانے سے فارغ ہو کر یوسف نے گرم نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے شوخ لہجے میں سوال کیا۔

"ہمیں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنا ہو گا۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "میری اور سیتا کی یہاں سے روانگی میں اسرائیلی مفاد کا کوئی بھی پہلو پیدا کرنا ناممکن ہے۔"

"تم نے جنرل کو معاہدے کی کتنی رقم بتائی ہے؟" اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"پچاس ہزار امریکی ڈالر۔"

"جب کہ وہ ڈیڑھ لاکھ تک تیار ہیں اور رقم کی ادائیگی فوری طور پر نقد کی جائے گی۔" یوسف میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"اس وقت تم برابری کی سطح پر ہو۔" قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ "اپنی اور سیتا کی روانگی کی شرط اپنے طور پر عائد کر سکتے ہو۔"

"یہ ممکن ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "وہ ہر قیمت پر تجربہ گاہ سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ ہم سے انہیں کوئی پرخاش نہیں ہو سکتا ہے کہ میرا مطالبہ مان لیا جائے۔"

"یہ سارا معاملہ جنرل حسین العمادی خود طے کر رہا ہے؟"

"کم و بیش۔" میں نے کہا۔ "پہلی بار جنرل ابو المکتوم بھی خاصا سرگرم نظر آ رہا تھا۔" میں نے انٹروگیشن سیل کے تجربات یاد کرتے ہوئے کہا۔

"کوشش کرو کہ وہ دوبارہ سامنے آ ئے۔" یوسف نے کہا۔ "اس کی شہرت اچھی نہیں ہے اپنے مطالبے میں زور پیدا کرنے کے لیے تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ معاہدے سے ملنے والے پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ تمہیں اپنی فوری آزادی عزیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابو المکتوم پر لالچ غالب آ جائے اور وہ جنرل کو تمہاری شرط ماننے پر آمادہ کرے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کے بعد بھی میرے پاس ایک لاکھ کا خطیر سرمایہ ہو گا۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔" اُس نے پُر زور لہجے میں کہا۔ "اس بار آزادی ملنے کے بعد تم ایک نئی زندگی گزارنے کا منصوبہ بنا لیے ہو اس کے لیے سرمائے کی ضرورت ہو گی۔ اس رقم سے تم بآسانی اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل کر سکتے ہو۔"

میں دھیمے سے مسکرا دیا۔ "پیسے کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں برادر! میں یہ پچاس ہزار بھی نہیں ضائع کروں گا۔ اس معاہدے میں ملنے والی ساری رقم افواج آزادی فلسطین کی ملکیت ہو گی جسے وہ اپنی مرضی سے خرچ کر سکیں گے۔"

حیرت سے اس کی آنکھیں کشادہ ہو گئیں۔ "تم واقعی عظیم ہو منور علی! معاف کرنا، میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔"

"مجھے ایک بہتر اور منطقی راستہ سوجھ گیا ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد پُر خیال لہجے میں کہا۔ "جنرل جانتا ہے کہ اسرائیلی میرے اور سیتا کے ازلی دشمن ہیں اور اس کی دانست میں وہ محض تجربہ گاہ کو ہٹانے بلکہ لے جانے کے لیے پہلی بار مجھے نظر انداز کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور وہ اس وقت تک مجھے چھوٹ دیں گے جب تک تجربہ گاہ کی آخری کیل بھی اکھاڑ کر جہاز پر روانہ نہیں کر دی جاتی۔ اس کے بعد وہ پوری قوت سے میرے خلاف حرکت میں آئیں گے اور انہیں میرے ٹھکانے کا ذرا سا بھی علم ہوا تو وہ میری زندگی جہنم بنا دیں گے لہٰذا میری پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ تجربہ گاہ کا معاہدہ ہوتے ہی یمن سے نکل کر دنیا کے کسی ایسے دور افتادہ گوشے میں چلا جاؤں جہاں اسرائیلیوں کا وہم و گمان بھی نہ پہنچ سکے۔"

"یہ راستہ سب سے بہتر ہو گا۔" اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "ان خطوط پر تمہارے دلائل جنرل کو لاجواب کر دیں گے، آئندہ کی بے خوف اور پُر سکون زندگی کے لیے تمہارا اسرائیلیوں کی دسترس سے جلد از جلد دُور نکل جانا بہت ضروری ہے۔"

"جنرل کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ میرا معاہدہ اسرائیلیوں سے ہوا ہے، میں یمن سے مغرب کی جانب پرواز کروں گا اور یورپ اور لاطینی امریکہ کے گمنام ملکوں سے ہوتا ہوا اپنی منزل پر پہنچوں گا تاکہ اسرائیلی دوبارہ میرا سراغ ہی نہ پا سکیں۔"

"پھر جنرل سے تم کب بات کرو گے؟"

"ابھی اور اسی وقت۔" میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے

بولٹ کرتے ہوئے کہا اور ٹرانسمیٹر نکال لیا۔

"تو کیا اس پر جنرل سے بھی رابطہ ہو سکتا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ جنرل سے تازہ ترین ملاقات کے بارے میں میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا لہٰذا اختصار کے ساتھ سب کچھ بتا ڈالا۔

اسرائیلیوں کے ساتھ تجربہ گاہ کے معاملے میں ہونے والی بازی تو جنرل کے لیے بنایا ہوا ایک ڈھکوسلا تھا جس کی بنیاد خود اس نے فراہم کی تھی کہ میں یمن سے براہ راست پاکستان جانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔

ڈاکٹر آسٹن اور مائیکل ٹرمپ کی ہلاکت کے بعد یمن میں عارضی طور پر اسرائیلی ایجنسیوں کی قوت برباد ہو کر رہ گئی تھی لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ اس بھیڑ میں سے بچ رہنے والوں میں دو چار ضرور ایسے ہوں گے جو شاید اپنے برے وقت کے پیش نظر مجھ سے تصادم تو مول نہ لیں لیکن مجھے مستقل نگاہوں میں رکھنے کی کوشش ضرور کرتے۔

اور اگر انہیں یہ علم ہو جاتا کہ یمن سے میں نے جنوب مشرق میں پاکستان کی طرف سفر کیا ہے تو پاکستان سے سفارتی مراسم نہ ہونے کے باوجود اسرائیل کے تنخواہ داروں کے لیے یہ ممکن تھا کہ کسی دوسرے ملک کے پاسپورٹ پر ایک دو آدمی وہاں بھیج کر میری زندگی اجیرن بنا دیتے جب کہ پاکستان پہنچنے کے بعد میں سکون اور عافیت کی گمنام زندگی بسر کرنی چاہتا تھا اس لیے یہ ضروری تھا کہ اسرائیلیوں کو مکمل طور پر بے خبر رکھنے کے لیے میں مغرب کا سفر ضرور کرتا۔

"ایسا نہ ہو کہ جنرل سو چکا ہو۔" یوسف نے مجھے دوبارہ ٹرانسمیٹر کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"اس کا حکم ہے کہ کوئی نئی خبر ہو تو آدھی رات کو بھی وہ میری کال کا خیر مقدم کرے گا۔" میں نے یہ کہہ کر ٹرانسمیٹر کا بٹن آن کر دیا۔

"ہیلو ہیلس کالنگ فار جنرل۔۔۔ اوور۔" مجھے تھوڑے تھوڑے انتظار کے بعد کم از کم چار مرتبہ یہ پیغام نشر کرنا پڑا جس کے بعد جنرل کی نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ریسیونگ کیا پیغام ہے؟ اوور۔"

"وہ تیار ہیں۔۔۔ رقم لندن میں ادا کی جائے گی۔۔۔ اوور۔"

"رقم سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔" اس کی آواز سے نیند کا عنصر ایک دم غائب ہو گیا۔ "وہ کب سے اپنا کام شروع کریں گے؟ اوور۔"

"جب بھی میں انھیں میدان صاف ہونے کا اشارہ دوں گا۔ اوور۔"

"انھیں فوری طور پر آغاز کرنے دو۔۔۔ اوور۔"

"میں یہاں سے روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے انہیں سگنل دوں گا۔۔۔ اوور۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہہ ڈالا۔

"تمھاری روانگی؟" حیرت سے دوسری طرف دہرایا گیا۔ "کہاں جا رہے ہو تم؟ اوور۔"

"میں اپنی عورت سمیت یمن سے جانا چاہتا ہوں۔۔۔ اوور۔"

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" جنرل بھڑک اٹھا۔ "کام پورا ہونے سے پہلے تمھارے معاملات جوں کے توں رہیں گے۔۔۔ اوور۔"

"یہ میری سلامتی اور مستقبل کا سوال ہے جناب۔۔۔ اوور۔"

"میں بلا رہا ہوں۔۔۔ ابھی تمہیں بلا رہا ہوں۔۔۔ اوور اینڈ آل۔" ایریٹس کا ریسیور بے جان ہو گیا اور میں نے بھی بٹن آف کر دیا۔ یوسف جو سانس روک کے یہ تمام گفتگو سن رہا تھا پھریری لے کر رہ گیا۔ "جنرل سخت اشتعال کے عالم میں معلوم ہوتا ہے۔"

"ہوا کرے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "دو بدو بات ہوگی تو شاید میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"لیکن تم جاؤ گے کیسے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"شاید کوئی بندوبست کر کے اطلاع دے گا۔" میں نے شام والے تجربے کے پیش نظر کہا۔

"اور اگر خود ہی آ پہنچا؟"

"ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اسرائیلیوں نے اسے یہاں دیکھ لیا تو مجھ پر سے ان کا اعتماد اٹھ جائے گا۔" میں نے اسے ہلکا مار کر کہا اور وہ ہنسنے لگا۔

چند منٹ بعد ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ یوسف اس سے ذرا دور ہٹ گیا تاکہ اس کے سانس کی آواز بھی دوسری طرف نہ سنی جا سکے۔

"ایس ریسیونگ۔۔۔ اوور۔" میں نے ٹرانسمیٹر آن کرنے کے بعد جنرل کی غصیلی ہیلو ہیلو سن کر جلدی سے کہا۔

"وہی کار اسی جگہ منتظر ہے۔۔۔ اوور اینڈ آل۔" اس کے ایک ایک لفظ سے غصے کا کھولتا ہوا لاوا ٹپک رہا تھا۔

"آج خیر نہیں تمھاری۔" یوسف ہنسنے لگا پھر چونک کر بولا۔ "وہ تم نے لندن میں رقم کی ادائیگی کا کیا شوشہ چھوڑا تھا؟"

"فی البدیہہ خیال آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر جانے سے پہلے کسی خباثت کی بنا پر تلاشی کی نوبت آ گئی تو رقم کے نہ ہونے کے بارے میں کیا جواز پیش کرتا؟"

"اوہ۔ تو رقم کے بارے میں تم واقعی سنجیدہ ہو؟"

"ہاں ہاں۔ وہ تنظیم کی ملکیت ہوگی۔" میں نے اسے اپنا بٹوہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "میرے اخراجات کے لیے جنرل کی دی ہوئی رقم کافی ہوگی۔"

"تم جلدی نکل جاؤ، میں تمھاری واپسی کا انتظار کروں گا۔" اس نے مجھے ٹوکا۔ "انتظار میں اس کا غصہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔"

"یہ اس تجربہ گاہ سے ملنے والا ایک مہلک کیمیادی ہتھیار ہے، جو ٹریگر دبتے ہی ایک سیال کی پتلی سی دھار خارج کرتا ہے جس سے جاندار پگھل کر گل جاتے ہیں۔" میں نے کیمیادی پستول اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کروں اس کا؟"

"رکھ لو، واپس آ کر لے لوں گا۔"

میں اپنے کمرے سے نکل کر نچلی منزل پر پہنچا اور پھر باہر نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اور زندگی کی تھکی ہوئی رعنائیاں ہر سو دم توڑ رہی تھیں لیکن اونچے کھمبوں پر روشن طاقتور سرچ لائٹوں کی روشنی میں پارکنگ لاٹ پوری طرح روشن تھی جہاں زرد بیوک صاف نظر آ رہی تھی۔

اس کار کا بندوبست کرنے کے بعد جنرل نے مجھے اطلاع دینے میں اتنی تاخیر کی تھی کہ کار فندق الذہبی تک پہنچ سکے۔

شام کے برعکس اس وقت بیوک والے کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔

"تم ہو کیا بلا؟" میرے بیٹھتے ہی اس نے تیز چڑچڑے لہجے میں سوال کیا۔ اس وقت کار میں اسٹیریو کی گونج مفقود تھی۔

"لے جانا چاہتے ہو تو لہجہ درست رکھو۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "گھر بیٹھے حکم چلاتا ہے، اس نے میری بھی نیند خراب کی ہے۔"

"قصور تو تمہارا نہیں ہے مگر غور تو کرو کہ سوتے ہوئے آدمی کو فون کر کے اگر دس پندرہ میل دور دوڑا دیا جائے تو کیسی کوفت ہوتی ہے۔" اس نے نرم مصالحانہ لہجے میں کہا۔

"یہاں آ کر مجھے سنانے کے بجائے یہ جواب اسے فون پر دینا چاہیے تھا۔" میں نے اپنے بگڑے ہوئے لہجے کی تلخی میں کمی نہ آنے دی۔

وہ جسمانی طور پر مجھ سے کمتر تھا اور مزاجاً بزدل بھی، لہٰذا خاموش ہی رہا لیکن اپنی خاموشی کو اس نے کارٹریج پلیئر کی گونج میں چھپا لیا۔

وہ کوئی عربی نغمہ تھا جس کے بول مغنیہ کی سریلی آواز کی طرح اشتعال انگیز تھے۔ رہی سہی کسر دف کی آواز اور دوسرے سازوں کے زیر و بم نے پوری کر دی تھی۔ آنکھیں موند کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی جیتی جاگتی ہوشربا رقاصہ نچلے دھڑ کے مسلسل تصادم سے کوئی فصیل گرانے میں مصروف ہو۔

شام کے مقابلے میں رات گئے وہ مسافت بہت مختصر محسوس ہوئی۔

جنرل کی قیام گاہ کے پھاٹک پر روشنیاں جل رہی تھیں۔ لیکن برآمدہ تاریک پڑا ہوا تھا۔ باوردی سنتری نے پھاٹک کھولا تو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں جنرل شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہنے مضطربانہ انداز میں ٹہلتا نظر آیا۔

برآمدے کے قریب کار روکتے ہوئے مجھے لانے والے نے شیشہ اتار کر جنرل سے کہا۔ "یہ اتنا ہی اہم ہے تو اسے رات اپنے پاس سلا لو۔ اب نیند خراب کی تو واللہ قیامت تک نہ بخشوں گا۔"

جنرل کا جواب میں نہ سن سکا اور زرد بیوک وہاں سے واپس چلی گئی۔

"کیا بک رہے تھے تم؟" اندھیرے میں جنرل کی غراہٹ کسی بھیڑیے کی آواز سے مشابہہ محسوس ہو رہی تھی۔

"میں حکم کا بندہ ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مگر مسئلہ میری سلامتی کا ہے میرے دلائل آپ کو میرا ہم خیال بنا لیں گے۔"

"تمہاری سلامتی میرا مسئلہ ہے۔" وہ غرایا۔ "میں تو سنوں کہ وہ کون سا پہلو ہے جو میری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ تاریک برآمدے سے گزر کر کمرہ روشن تھا۔ وہ پرانے راستوں پر چلتا ہوا ایک مرتبہ پھر اسٹڈی روم میں پہنچ گیا۔

"بیٹھو اور بلا کے بولتے جاؤ۔" اس کا چہرہ غصے سے بگڑا ہوا تھا۔

"اس وقت محض تجربہ گاہ کی قیمتی تنصیبات اور ذخائر کے حصول کے لیے اسرائیلی مجھ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ آج بھی وہ میرے خطرناک دشمن ہیں اور پہلی فرصت میں مجھے قیدی بنا کر اسرائیل لے جانا چاہیں گے بلکہ تجربہ گاہ کے معاملے میں تو انہوں نے میرے ہاتھوں تازہ زخم کھایا ہے۔" میں نے نپے تلے الفاظ میں کہنا شروع کیا۔ "اگر میں ان کا کام مکمل ہونے تک یہاں رہا تو ان کی نگاہوں میں رہوں گا پھر تجربہ گاہ کا اسباب لے جانے والے جہاز کی تباہی انہیں میرے خلاف جنون میں مبتلا کر دے گی وہ سائے کی طرح میرے پیچھے لگ جائیں گے اور میری زندگی اجیرن کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسرائیلیوں سے عارضی صلح کا جو معاہدہ ہوا ہے۔۔۔ اس کی مدت دو ہفتہ ہو یا دس روز، میں اس سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہوئے اتنی تیزی سے اپنے ٹھکانے تبدیل کروں کہ اسرائیلی پوری کوشش کے باوجود بھی میرا سراغ نہ لگا سکیں اور کسی گمنام ملک میں سکون سے زندگی کے بقیہ دن پورے کر سکوں۔"

"تم یمن میں رہو۔" جنرل نے سگار کے گہرے گہرے کش لے کر دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں تمہیں بھرپور تحفظ فراہم کروا دوں گا۔"

اس کا لہجہ نرم تھا اور میں نے اس کے بشرے پر غصے کے بجائے تفکر کی علامات ابھرتی دیکھ لی تھیں لہٰذا میں دوسرے وار کے لیے تیار ہو گیا۔

"قانون سے تحفظ فراہم کرنا ممکن ہے کیوں کہ قانون کی ایک بندھی راہ ہوتی ہے۔ دہشت گرد کارروائیوں سے کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ میری حمایت میں اتنی پیش قدمی کہ کے آپ اپنے لیے خطرات مول لیں گے۔"

"سنو۔" وہ میز کی سطح پر زور سے ہتھیلی مار کر بولا۔ "جس روز میں نے پہلی بار فوجی وردی بدن پر سجائی تھی، اسی دن بلکہ اسی لمحے اپنی زندگی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ زندگی ایک ایسا بلبلہ ہے جو شیشے کی محفوظ بوتل میں بھی پھٹ جاتا ہے اور برقرار رہے تو سمندر کی سرکش موجوں کے سینے پر سوار میلوں تیرتا چلا جاتا ہے۔"

"میں بحث نہیں کروں گا۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "میں برسہا برس سے مصائب جھیل رہا ہوں۔ مگر اب میں ہر قیمت پر پرسکون گھریلو زندگی گزارنی چاہتا ہوں جہاں بارود، انسانی خون اور مسخ لاشوں کا گزر نہ ہو۔۔۔ میں۔۔۔ میں یہ سب دیکھتے دیکھتے اکتا گیا ہوں۔"

"یہاں سے نکل جاؤ گے؟" اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "مگر پچاس ہزار ڈالر کی اس رقم کا کیا ہو گا جو اسرائیلی تمہیں لندن میں ادا کریں گے؟"

میں فوراً ہی اس کی تہہ تک پہنچ گیا۔ "میں حریص نہیں ہوں جہاں چاہوں زورِ بازو سے اپنی روزی کما سکتا ہوں۔ میں اس رقم پر لعنت بھیج دوں گا کیونکہ اس طرح انہوں نے مجھے لندن میں گھیرنے کا منصوبہ بنایا ہو گا۔ شاید وہ رقم دے بھی دیں لیکن مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے اور جس روز صنعا سے تجربہ گاہ کی منتقلی مکمل ہونے کی خبر ملی وحشی بھیڑیوں کے غول کی طرح پوری قوت سے مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"تو یہاں تک سوچ لیا ہے تم نے؟" اس کے لہجے میں حیرت اور ستائش کا انداز نمایاں تھا۔

"جس کو چاروں طرف سے اپنی زندگی کی راہیں مسدود ہوتی نظر آ رہی ہوں اس کی نگاہیں بہت باریک بین ہو جاتی ہیں اور میں اسی کربناک دور سے گزر رہا ہوں۔"

"تم چلے جاؤ گے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ "مگر ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ تجربہ گاہ سے ہر مخدوش چیز ہٹائی جا چکی ہے؟"

"سائنسی معاملات میں میں بھی جاہل ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہاں رہا تب بھی اسرائیلیوں کی زبان پر بھروسا کرنا ہو گا۔ میں انہیں اپنی روانگی سے بے خبر رکھوں گا اور انہیں دس روز کی آخری مہلت دوں گا۔ اگر وہ اپنا کام پہلے ختم کر لیں گے تو عمارت پر سبز پرچم لہرا کر وہاں سے ہٹ جائیں گے۔ میں انہیں دھمکی دوں گا کہ کام مکمل ہو یا نہ ہو گیارھویں صبح وہ عمارت تباہ کر دی جائے گی۔"

"دھمکی والی بات تو صحیح ہے لیکن پرچم کی تجویز نامناسب ہے۔ تم ان سے کہو کہ جلد از جلد کام ختم کر کے عمارت کو خود ڈائنامیٹ سے اڑا دیں تاکہ اس عمارت کا ہر راز ہمیشہ کے لیے اسی کے ملبے میں دفن ہو جائے۔"

"یہ مناسب ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"اور دس دن کی مہلت پر بھی اصرار نہ کرنا۔" شاید ذہنی طور پر وہ مجھے اور سیتا کو آزادی کی نوید سنانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ "انہوں نے اپنے ماہرین سے رجوع کیا ہو گا۔۔۔ وہ خود ہی بتائیں گے کہ اس منتقلی کے لیے کتنا عرصہ درکار ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سعادت مندی کے ساتھ جواب دیا۔

"تم ابھی ہوٹل جا کر ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم نے آج رات سب کچھ طے کر لیا تو کل یمنی پاسپورٹ پر جدہ پہنچا دیے جاؤ گے۔ وہاں سے تمہیں اختیار ہو گا کہ جو راہ چاہو، اختیار کرو۔"

"سیتا میرے ساتھ ہو گی۔"

وہ پہلی بار ہنسا۔ "میں اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہوں۔ وہ ضرور تمہارے ساتھ ہو گی۔ کاش تم یمن کی شہریت قبول کر لیتے۔ میری بیٹی سیتا سے بہت مانوس ہو گئی ہے۔" جنرل نے آخری فقروں میں میرے ذہن پر اپنی شخصیت کی انمٹ یادیں نقش کر دی۔

میں وہاں آیا تو ہراساں اور پریشان تھا لیکن واپسی پر میرا دل خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ میں یوسف کی معرفت اس کے دوستوں سے تجربہ گاہ کے سارے معاملات طے کر کے جلد از جلد جنرل کو خبر دینی چاہتا تھا تاکہ پہلی بار کسی ملک کے قانونی شہری کے طور پر اپنے آزادی کے سفر کا آغاز کر سکوں۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے شہر کی تمام سڑکیں سنسان پڑی ہوئی تھیں اور ایسے وقت میں کہیں ٹیکسی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا لہٰذا جنرل حسین العمادی کا ڈرائیور مجھے ہوٹل تک لیتا چلا گیا اور پھاٹک سے ذرا پہلے فٹ پاتھ کے کنارے کار روک دی۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے ہلکے دل کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ ہولناک اور روح فرسا نظر آنے والے آسیبی واقعات خوشگوار انداز میں بہت جلد سمٹتے نظر آ رہے تھے۔

ان خیالات میں مگن میں جیسے ہی چند قدم چل کر پھاٹک میں گھسنے لگا میرے قدم زمین میں گڑ گئے اور اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔

احاطے میں یمنی پولیس کی تین گاڑیاں اور متعدد وردیاں پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

میں غیرارادی طور پر وہاں ٹھٹکا تھا لیکن لحظہ بھر بعد آگے بڑھنے لگا۔

جنرل حسین العمادی کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد مقامی حکام اور قانون کی دہشت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

میں پولیس افسران کے درمیان سے گزرتا ہوا ہوٹل کے برآمدے میں داخل ہو گیا لیکن کسی نے بھی مجھ سے تعرض نہیں کیا۔

وہاں پولیس کی موجودگی کے باعث سنسنی اور سراسیمگی کے آثار تو دیکھے جا سکتے تھے لیکن پولیس کے عملے کی کارروائی بہت محدود سی نظر آ رہی تھی ورنہ وہ مجھ سے ضرور کچھ نہ کچھ استفسار کرتے۔

ہوٹل کا عملہ البتہ بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا رخ کرنے کے بجائے استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خوش شکل لڑکی سے صورتِ حال کے بارے میں دریافت کرنا مناسب سمجھا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"انتظامیہ بے قصور ہے۔" اس نے دھیمی آواز اور مشینی سے لہجے میں کہا۔ "یہاں ٹھہرنے والوں کے بارے میں پوری تحقیق کرنا ہمارے بس سے باہر ہے البتہ ہم آنے والوں کے ظاہری کوائف سے مطمئن ہوئے بغیر اقامتی سہولتیں فراہم نہیں کرتے کیونکہ کروڑوں کے کرائے سے زیادہ ہمیں فندق الذہبی کی نیک نامی عزیز ہے۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سوال کیا۔

"پولیس نے ایک مسافر کے قبضے سے ایک مغویہ برآمد کی ہے یہاں وہ دونوں آج ہی میاں بیوی کی حیثیت سے آئے تھے۔"

میں نے لاپروائی سے اپنے سر کو جھٹکا اور لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

تیسری منزل پر میرے کمرے میں یوسف میرا منتظر تھا۔

"کیا رہا؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"نیچے کی بھی کچھ خبر ہے!" میں نے تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"اوہ — وہ کوئی گھپلا ہی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔ "پولیس کے آتے ہی منصور نے مجھے آگاہ کر دیا تھا اور میں نے روانگی کے لیے پر تول لیے تھے مگر چند ہی منٹ بعد اس نے پولیس کی آمد کا سبب بتا کر میری پریشانی دور کر دی۔"

"حیرت ہے کہ ایک مغویہ کو برآمد کرنے کے لیے پولیس کی اتنی بڑی پارٹی نے ہوٹل پر دھاوا بولا ہے۔"

"لڑکی کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے ہے منصور کو یقین ہے کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنی مرضی سے اس شخص کے ساتھ آئی ہے مگر وہ بے چارہ عاشقِ نامراد شاید اغوا کے الزام سے نہ بچ سکے۔" پھر وہ چڑ کر بولا۔ "تم نے یہ کیا موضوع چھیڑ دیا۔ یہ بتاؤ کہ [illegible] ملاقات کا نتیجہ کیا رہا؟"

"جنرل واقعی عظیم انسان ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اپنی برہمی کے باوجود اس نے مجھے اپنے دلائل سنانے کا موقع دیا اور پھر میری رائے سے متفق ہو گیا۔"

"یعنی تمہیں روانگی کی اجازت دے دی؟" یوسف نے [illegible] مسرت کے ساتھ سوال کیا۔

"سارے معاملات طے ہوتے ہی وہ مجھے اپنا [illegible] پر جدہ پہنچوا دے گا۔ وہاں سے مجھے اپنی منزل کے تعین کی آزادی ہو گی۔"

"معاملات میں سے کیا طے کیا گیا ہے؟" اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "ابھی اُن سے رقم وصول کر کے اس عمارت کی نشاندہی کر دوں تو وہ اسی وقت کام کا آغاز کر دیں گے۔"

"جنرل کام کی تکمیل کی مدت جاننی چاہتا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "اور اس کی یہ خواہش بھی ہے کہ اسرائیلی کام پورا ہوتے ہی اس عمارت کو اپنے ہاتھوں ڈائنامیٹ سے اڑا دیں تاکہ اس عمارت کا ہر راز انہی کے سینے میں دفن ہو جائے۔"

"اسرائیلی!" یوسف نے حیرت سے دہرایا۔

میں ہنسا۔ "جنرل تو یہی سمجھ رہا ہے نا کہ میں اسرائیلیوں سے سودے بازی کر رہا ہوں معاملات حیرت ناک طور پر سلجھتے جا رہے ہیں۔"

"میں صبح ہونے سے پہلے ہی سب کچھ طے کر کے تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔" اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ قصہ جتنی جلدی نمٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"ذرا پولیس والوں سے بچ کر نکلنا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر منصور تمہیں ہر میک اپ میں پہچان سکتا ہے تو پولیس والوں میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں ہو گی۔"

"فکر نہ کرو۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "فندق الذہبی میں ایک دو محفوظ راستے بھی ہیں میں نے بلاوجہ ہی تمہیں یہاں ٹھہرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔"

پھر وہ اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں دروازہ اندر سے بولٹ کر کے جوتوں سمیت بستر پر گر گیا۔

میں بستر پر خالی الذہنی کے عالم میں دراز سگریٹ پھونک رہا تھا کہ مجھے اپنے ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہونے کا احساس ہوا۔

میں نے پھرتی سے اس جیبی ٹرانسمیٹر کی آواز بڑھا دی۔ مدھم ریڈیائی شور میں نمبر بارہ بار بار اپنی شناخت نشر کر رہا تھا۔

"ڈیزرٹ واٹر، نمبر ٹو لیو کالنگ ٹو نمبر ون۔۔۔ اوور۔"

اس بار جوں ہی وہ خاموش ہوا میں نے اپنے ایپریٹس کا سوئچ دبا دیا۔ "اِٹ اِز نمبر ون ریسیونگ کیا بات ہے؟ ۔۔۔ اوور۔"

"صرف تمہاری خیریت معلوم کرنی تھی۔۔۔ اوور۔"

"میرے ساتھ بچوں کا سا سلوک نہ کرو۔" میں نے قدرے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "میں اپنی حفاظت خود بھی کرنی جانتا ہوں تمہاری موجودگی محض کسی ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ضروری سمجھی گئی ہے اس وقت میں ایک اہم کام میں مصروف تھا۔۔۔ اوور۔"

"اب خیال رکھا جائے گا۔" اس کا لہجہ خفت آمیز تھا۔ "ہمیں پولیس کے متوجہ ہو جانے کا خوف لاحق تھا۔۔۔ اوور۔"

"تشویش کا شکریہ۔۔۔ اوور اینڈ آل۔" میں نے خشک لہجے میں یہ کہہ کر ٹرانسمیٹر کا سلسلہ منقطع کر کے اضطراری طور پر نئی سگریٹ سلگائی۔ حالانکہ کال وصول کرنے سے قبل ہی میں نے ادھ جلی سگریٹ پھینکی تھی۔

یوسف تو میرے ایما پر تجربہ گاہ کی منتقلی کے انتظامات کرنے چلا گیا تھا اور اس وقت میں بھی مطمئن تھا کہ وہ لوٹے گا تو اس کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں میں جنرل کو اپنی کامیابی کی تفصیلی رپورٹ فراہم کر دوں گا لیکن میں ایک نکتہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ جنرل کے دو ہرکارے فندق الذہبی کے احاطے میں شب بیدار رکھوالوں کے روپ میں میرے نگران بھی تھے۔

اُن سے جب جنرل کو یہ معلوم ہوتا کہ اس سے ملنے کے بعد میں ساری رات ہوٹل ہی میں مقید رہا تھا اور کمرے میں بیٹھے بیٹھے اسے اپنی کامیابیوں کی اطلاع دی تھی تو اس کا ماتھا ٹھنک سکتا تھا۔ اور پھر ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر کے پیچھے ٹیلیفون آپریٹر کی لاگ بک سے بھی یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ساری رات میرے کمرے سے کوئی کال نہیں کی گئی تھی۔

یہ باتیں جنرل کو الجھن میں ڈالنے کے لیے کافی تھیں اور ان کا صرف ایک ہی توڑ تھا کہ میں اپنے اسرائیلیوں کی بہت زیادہ باخبری کا فسانہ سناتے ہوئے یہ اطلاع دیتا کہ اس کے گھر سے لوٹنے کے کچھ ہی دیر بعد ایک اسرائیلی ایجنٹ بنفسِ نفیس میرے کمرے پر پہنچا اور میں نے وہیں اس سے سارے معاملات طے کر لیے۔

جنرل حسین العمادی کا اعتماد میرے پورے کھیل کا محور تھا اسے ٹھیس پہنچا کر آزادی کا تصور بھی محال تھا۔

مجھے سوچ بچار میں کافی دیر گزر گئی۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں کی جاگ دوڑ اور تھکان کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا مجھے معاملہ اسی قدر گمبھیر نظر آ رہا تھا۔ آخر کار دو بجے شب دروازے پر ہونے والی مدھم سی دستک نے میرے خیالات کا طلسم بکھیر دیا اور میں دوسری دستک کے انتظار میں وحشت زدہ نگاہوں سے دروازے کو گھورنے لگا۔

چند ثانیوں کے بعد دوبارہ وہی دستک ہوئی تو میں پنجوں کے بل بے آواز قدموں سے چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

"کون ہے؟" میں نے کی ہول کے قریب منہ لے جا کر آہستگی سے سوال کیا۔

"دروازہ کھولو۔"

وہ واضح طور پر یوسف کی آواز تھی، میں نے بولٹ گرا کر دروازہ کھول دیا اور یوسف کے اندر آ جانے کے بعد دوبارہ بولٹ چڑھا دیا۔

یوسف کے چہرے پر تفکر آمیز لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ مگر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "بولٹ کیوں چڑھا دیا، بٹن دبا کر دروازہ ہی مقفل کر دیتے۔"

میں سر ہلاتے ہوئے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ "قفل تو صفائی والے عملے کے پاس موجود دوسری چابی سے بھی کھل سکتا ہے اور قفل شکن کے لیے تو شاید وہ بھی ضروری نہ ہو البتہ بولٹ گرانے کے لیے دروازہ ہی توڑنا پڑے گا۔"

"معمولی سی بات ہے۔" اس نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "مگر تحفظ کا یہ نکتہ تجربے کے بغیر ذہن میں نہیں آ سکتا۔"

"تم خاموش کیوں ہو؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد مجھے ہی اس تفکر آمیز فضا کا سحر توڑنا پڑا۔

"کچھ الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ وہ معاہدہ براہِ راست تم سے کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے بے اختیار سوال کیا۔

"میں خود نہیں سمجھ سکا۔" اس نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔ "پہلے تو صرف اتنی سی بات نظر آتی تھی کہ میں عمارت کی نشاندہی کروں گا اور وہ رقم میرے حوالے کر دیں گے۔"

"اور وہ تمہارے دوست ہیں۔" میرا لہجہ غیرارادی طور پر تلخ ہو گیا۔ "ایسے دوست جن پر تم اندھا اعتماد کرتے ہو اور کسی بڑے مقصد کے لیے بھی ان کی دو چار جانوں کے اتلاف کے تصور سے تمہارا ضمیر کچوکے لگانے لگتا ہے۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" الجھے الجھے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔

"سیدھی سی بات ہے۔" میں کرسی سے اٹھ گیا۔ "تم انہیں دوست گردانتے ہو لیکن اس سودے میں وہ تمہیں محض درمیان کا آدمی سمجھتے ہیں کیونکہ معاملہ ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر تم بدنیتی پر اتر آئے اور رقم لے کر روپوش ہو گئے تو میں اپنے مطالبے سمیت فوری طور پر ان کے سر پر سوار ہو جاؤں گا۔"

"یہ محض کیا ہے تمہارا۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا لیکن اس کے

بُشرے پر ابھرنے والی علامات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا بے لاگ اور بے رحمانہ تجزیہ اس کے لیے خاصی حد تک قابلِ قبول تھا اور وہ اپنے نام نہاد دوستوں کی طرف سے افسردہ ہوگیا۔

"تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے میں خود ان خطوط پر سوچ رہا تھا کہ اُن لوگوں سے میرا ملنا ضروری ہے تاکہ جنرل میرے بیان کی تصدیق دُوسرے ذرائع سے بھی سُن سکے لیکن میں اُن خود غرض لوگوں سے اب دُور ہی رہنا چاہوں گا۔"

"ہوسکتا ہے کہ تم درست ہی کہہ رہے ہو۔۔۔ لیکن اس وقت ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہیے۔ یہ ایک خداداد موقع ہے تم نے اسے گنوا دیا تو نہ جانے کن حالات میں اور کب تک یمن ہی میں پڑے رہو۔" وہ نرم مصالحانہ لہجے میں بولا۔

"آخر وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد بھاری لہجے میں سوال کیا۔

"جہاں باہمی اعتماد کی فضا ہو وہاں زیادہ سوال جواب ممکن نہیں ہوتے۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا پھر میرے لب ہلنے ہی جلدی سے دوبارہ بول پڑا۔ "تلخیاں نہ کریدو، مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ چلو باہمی نہ سہی وہ میرا یکطرفہ اعتماد تھا اُن پر۔ لیکن میں نہیں پوچھ سکا کہ وہ تم سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔"

"تمہارے مذاکرات اُن سے کہاں تک پہنچے؟" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دوبارہ اپنی نشست سنبھال لی۔

بات طے ہونے سے قبل ہی انھوں نے خاصی پیش قدمی کر ڈالی تھی۔ شام سے اُن کا ایک ماہرِ خصوصی پرواز کے ذریعے آج ہی رات یمن پہنچا ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر وہ تجربہ گاہ واقعی فینتی کیمیاوی ہتھیاروں کے سلسلے میں قائم کی گئی تھی تو وہ کتنی بھی پیچیدہ ہو سات روز اُسے بے ضرر بنا کر آخری کیل سمیت یمن سے نکال لے جانا ممکن ہوگا۔ سات روز اُس کی مقرر کی ہوئی آخری حد ہے۔ وہ دن رات کام کریں گے اور شاید اس سے پہلے ہی فارغ ہو جائیں۔ انہوں نے یہ تجویز بھی مان لی ہے کہ کام پورا ہو جانے پر اس آہنی عمارت کو ملبے کے ڈھیر میں بدل دیا جائے۔"

"سب ہی کچھ طے ہوگیا تو وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" میں نے دل ہی دل میں سوچا پھر یوسف سے سوال کیا۔ "وہ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں نے بس اتنا بتایا کہ غیر ملکی پیشہ ور لڑاکوں کے کسی گروہ کی یمن میں اسرائیلی ایجنٹوں سے ٹھن گئی اور اسرائیلی بُری طرح زیر کر لیے گئے۔ اب اُن کے مخالف گروہ کا سربراہ اپنی معلومات کا سودا کرنا چاہتا ہے جو تجربہ گاہ کے بارے میں ہیں۔" اس کا جواب میرے لیے تسلی آمیز تھا۔

"اس سلسلے میں مجھے کس سے ملنا ہوگا؟"

"یہ پہلو میری نگاہ میں تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آندرے سلوف اپنی قیام گاہ پر تم سے ملاقات کا خواہاں تھا مگر میرے مدِنظر احتیاط تھی۔ اگر ہم خندق الذہبی کے عقبی راستے سے بھی گئے تو مبہم سا امکان ہے کہ کہیں جنرل کا کوئی اہلکار تمھیں پہچان نہ لے۔"

"یہ آندرے سلوف کون ہے؟"

"سفارت خانے کا فوجی آتاشی۔"

"پھر طے کیا ہوا؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"شام سے آنے والا کیمیا دان مغرب نژاد یہودی ہے۔ کہتے ہیں کہ آج اپنے شعبے میں وہ سب سے برتر ہے مگر گمنام زندگی بسر کر رہا ہے۔ دفاعی حکمتِ عملی کے پیشِ نظر اس کے کارنامے دائرے چلتے ہیں۔ اس کے پاس شہریت بھی ہنگری کی ہے وہ ایک غیر معروف رہائشی علاقے میں مقیم ہے۔ ہم وہیں جائیں گے۔"

"اور آندرے سلوف؟"

"وہ پہلے سے وہاں روپوش ہوگا۔" اس نے وضاحت کی۔ "بظاہر یہی سمجھا جائے گا کہ ہم آئزک رودان سے ملنے گئے تھے۔"

"وہ یمن میں کس بہانے سے آیا ہوگا؟"

وہ دھیمے سے ہنسا۔ "مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں یمن میں داخلے کی شرائط بہت نرم اور آسان ہیں۔ دو تین ماہ کے لیے کوئی بھی سیاحت کے بہانے آکر رہ سکتا ہے کیونکہ یمن مفلس ہے یہاں حکام کو یہ خوف لاحق نہیں رہتا کہ روزگار اور بھاری مشاہروں کے لالچ میں آنے والے غیر ملکی ایک بار شہروں میں گھس گئے تو انھیں تلاش کر کے اپنی سرحدوں سے باہر پھینکنا دشوار ہو جائے گا۔"

"کب چلنے کا ارادہ ہے؟"

"اسی وقت چلو۔ یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اب تک آندرے سلوف آئزک کے گھر منتقل ہو چکا ہوگا اور دوپہر کے ایک بجے تک وہیں ہمارا انتظار کرے گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی تھی۔

"تم نے بہ احتیاط مدِنظر رکھی لہٰذا ہم خندق الذہبی کے عقبی دروازے کے بجائے عام راستے سے جائیں گے تاکہ جنرل کے آدمی آئزک کی رہائش گاہ تک ہمارا تعاقب کر سکیں۔" میں نے اُسے اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب میں جنرل کو اپنی کہانی سناؤں گا تو اُن دونوں کی رپورٹ اس کے ایک حصے کی تصدیق کرے گی۔"

"اُن کے بھی اپنے وسائل ہیں۔" وہ تردد آمیز لہجے میں بولا۔ "آندرے سلوف کی اس عمارت میں موجودگی کے باعث خفیہ نگرانی یا حفاظت کا بھی انتظام ہوگا۔ اگر انہیں تمہاری نگرانی کا علم ہوگیا تو حالات غیر متوقع طور پر بگڑ جائیں گے۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں پُراعتماد انداز میں مسکرایا۔ "بقول تمہارے میں ایک خطرناک غیر ملکی گروہ کا سربراہ ہوں بھلا میں کسی حفاظتی بندوبست کے بغیر ایک اجنبی ملاقاتی کی کچھار میں کیسے جا سکتا ہوں! جب کہ معاملہ دو لاکھ ڈالر کا ہے۔"

"دو نہیں، ڈیڑھ!" اس نے میری تصحیح کی۔

"دو!" میں نے جیب سے ٹرانسمیٹر نکالتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے مجھ سے ملاقات کی نئی شرط عائد کی جس کا تاوان انہیں دینا ہوگا۔ ان کی دلچسپی کے پیشِ نظر وہ دو لاکھ بھی دینے سے گریز نہیں کریں گے۔"

"تمہاری مرضی۔" یوسف نے شانے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "کچھ دیر ٹھہرو، میری گاڑی ہوٹل کے عقبی راستے کی سمت میں کھڑی ہے پہلے میں اسے آگے لے آؤں ورنہ سامنے سے گھوم کر پیچھے جانا شبہ کا سبب بن جائے گا۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہاں سے ہماری روانگی جتنے پُراسرار انداز میں ہو اتنا ہی بہتر ہے اس طرح میری دشواریاں خود بخود حل ہو رہی ہیں۔"

"کیسی دشواریاں؟" اس نے سوال کیا۔

"جنرل حسین العمادی اس بارے میں فکرمند تھا کہ میرے پاس اسرائیلیوں سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور میں نے اس کے سوال پر فی البدیہہ کہہ ڈالا تھا کہ اسرائیلی خود مجھے تلاش کریں گے۔ دیکھا جائے تو اُس کا الجھنا فطری تھا۔ اسرائیلیوں سے میرا مفروضہ ٹکراؤ اسی عمارت میں ہوا تھا جہاں تہ خانے میں تجربہ گاہ واقع ہے اور اس وقت تک میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ فندق الذہبی تو اس کے بعد کی بات تھی۔"

"پھر اب تم اُسے کیا بتاؤ گے؟"

"اسرائیلیوں کا ایک نمائندہ رات کے ڈھائی بجے ہوٹل کے عقبی راستے سے میرے کمرے تک پہنچا۔" میں نے اپنی رسٹ واچ پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اسی سمت سے مجھے ساتھ لے جانا چاہا مگر روانگی کے لیے میں نے سامنے سے جانے پر اصرار کیا تاکہ میرے محافظ میرے پیچھے آسکیں۔"

"واللہ۔" وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ "تم اتنی روانی سے مفروضے تراشتے ہو کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہر اسرائیلیوں کو تو محافظوں کی دانست میں اُن کی موجودگی تم عمارت والے تصادم کے دوران میں ہی جتا چکے تھے اب تم اُن سے دُہرا کام لو گے۔"

میں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ٹرانسمیٹر کا نشریاتی بٹن دبا کر دھیمے لہجے میں باہر والوں کے لیے پیغام نشر کرنے لگا۔

"ڈیزرٹ وائپر ٹو تھری رسیونگ۔۔۔۔۔ اوور۔" پہلی ہی کوشش میں مجھے غنودہ سی آواز میں۔۔۔ اپنی کال کا جواب مل گیا۔

"کیا تم سو رہے تھے؟۔۔۔ اوور۔" میں نے دھیمی آواز میں غراتے ہوئے کہا۔

"نن۔۔۔ نہیں! ہم مستعد ہیں۔۔۔ اوور۔" بولنے والے کی آواز سے غنودگی کا عنصر فوری طور پر رفع ہوگیا۔

"آنکھیں اور ہتھیار تیار رکھو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے مدھم مگر گمبھیر لہجے میں کہا اور یوسف جھرجھری لے کر رہ گیا۔ "شاید یہ رات فیصلہ کُن ثابت ہو مگر میرا اشارہ ملے بغیر تم کوئی کارروائی نہیں کرو گے۔۔۔ ابھی میرے کمرے سے گھنی سیاہ مونچھوں اور خشخشی ڈاڑھی والا ایک شخص باہر گیا ہے وہ مجھے کہاں اور کیسے لے جانا چاہتا ہے یہ مجھے معلوم نہیں۔ تم سایوں کی طرح ہمارا تعاقب کرو گے۔ اگر وہ مجھے کسی عمارت میں لے جائے تو تم باہر ہی رُک کر واپسی یا حملے کا انتظار کرو گے۔۔۔ سمجھ گئے؟۔۔۔ اوور۔" میں نے نشریاتی بٹن سے انگلی ہٹالی اور لحظہ بھر کے لیے کمرے میں ریڈیائی شور کی خفیف سی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

"اچھی طرح سمجھ گئے۔ تمھیں ہم سے مایوسی نہیں ہوگی۔۔۔ اوور۔" اس بار بولنے والے کی آواز سے دبا دبا سا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔

"اوور اینڈ آل۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

یوسف حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے آنکھ مار کر باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور چند ثانیوں بعد ہم ہوٹل کی ویران اور نیم روشن راہداری میں آگے بڑھ رہے تھے۔

کمروں کے مکین اس وقت اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے، نچلی منزل پر طعام خانے دیر ہوئی بند ہو چکے تھے۔ اور ہوٹل کی وسیع و عریض عمارت میں رات کا جوبن ڈھل چکا تھا۔

رات دھیمے دھیمے غیر محسوس طریقے پر پسپا ہو رہی تھی، مگر ہم دونوں ایک نئے فیصلہ کُن محاذ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔

ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر والی لڑکی رات کی اس غیر معروف ڈیوٹی کو غنیمت جان کر اپنے ناخنوں پر نیل پالش کی نئی تہہ جما رہی تھی۔ اس کے عقب میں ٹیلی فون آپریٹر کی بورڈ پر جھکی تیز سانسوں اور مترنم ہنسی کے درمیان کسی سے نجی گفتگو میں مصروف تھی۔

پختہ فرش پر ہم دونوں کے قدموں کی چاپ شاید انھوں نے اسی وقت سنی جب میں نے اپنے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر ڈالی۔ استقبالیہ کلرک نے بوکھلا کر نیل پالش کی کھلی ہوئی شیشی اٹھا کر کاؤنٹر کے نیچے چھپانی چاہی جس کے نتیجے میں اس کے خوبصورت ملبوس کے قابلِ ذکر حصے ناخنوں کے ہم رنگ ہوگئے اور میں ایک

ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ نکاسی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں دربان مستعد کھڑا ہوا تھا مگر اس کی سُرخ آنکھیں چیخ چیخ کر رہی تھیں کہ وہ چند ثانیوں قبل ہی نیند سے بیدار ہوا تھا۔

ہوٹل سے باہر ہوا قدرے خنک اور خوشگوار تھی۔ پختہ روش پر دن کے ہنگاموں کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"سیارہ یا معلّم؟" یکایک پام کے گملوں کے اوٹ میں تاریکی میں سے ایک بے ساختہ آواز ابھری اور اگلے ہی لمحے ستوان خدوخال والا ایک نوجوان یعنی ہمارے سامنے آگیا جو اپنی وردی کی بنا پر ٹیکسی ڈرائیور نظر آرہا تھا اور خمارِ نیم شب میں بہکے ہوئے کسی معزز مسافر کی امید میں نہ جانے کب سے پام کے گملوں کی اوٹ میں پڑا ہوا تھا۔

"شکراً۔" میں نے ایک چھوٹا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ نوٹ خاموشی سے لے لیا گیا مگر یوسف رک چکا تھا۔

"ٹیکسی کہاں ہے تمھاری؟" یوسف نے عربی میں سوال کیا۔

نوجوان کے چہرے پر رونق عود کر آئی۔ "یہیں پارکنگ میں ہے۔"

"ہمیں عقبی گلی میں جانا ہے کار اِدھر ہی کھڑی ہے۔" یوسف نے نرمی سے کہا اور ڈرائیور بخوشی ہمارے آگے آگے چل دیا۔

اندرونی اسٹینڈ پر اس وقت تین ٹیکسیاں موجود تھیں جن پر سیارۃ الاجرۃ کے الفاظ نمایاں تھے۔

ٹیکسی کے حرکت میں آتے ہی میرے کانوں میں کسی اور کار کا انجن بیدار ہونے کی خفیف سی آواز آئی تھی لیکن میں اس کار کو نہ دیکھ سکا۔

ٹیکسی نے بمشکل ڈیڑھ یا دو منٹ میں ہمیں یوسف کی کار تک پہنچا دیا۔ یوسف نے اُترتے ہوئے ڈرائیور کو مزید ایک نوٹ دیا اور وہ اپنی دانست میں شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہوسکتا تھا کہ اس نے سوچا ہو کہ اس کے فراخدل مسافر اتنی رات گئے ہوٹل کی عقبی گلی میں کسی حسینہ کو لینے یا لے جانے کے لیے آئے ہوں اور ایسے مرحلے پر اس کی موجودگی پسند نہ کریں۔

"پیدل آتے تو یہ چکر خاصا لمبا پڑتا۔" یوسف نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "اور پھر تمھارا تعاقب کرنے والے بھی مخمصے میں پڑ جاتے کہ کار وہیں چھوڑیں یا ساتھ لائیں۔"

"اچھا کیا۔" میں نے سر گھما کر عقب میں ویران سڑک کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت وہ ڈرائیور غیبی فرشتہ ثابت ہوا ہے۔"

"اچھے ہوٹلوں میں شہر کے معززین اپنے دلوں کے جو... بہلانے آتے ہیں اور رات کے آخری پہر ان کی واپسی کا آغاز ہو... ہے۔ یہ غیبی فرشتے ایسے ہی جوڑوں کی تاک میں رہتے ہیں جو... ٹپ میں کرائے سے زیادہ رقم دیتے ہیں۔" اس نے ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے صنعا کی معاشرتی زندگی کا ایک گوشہ بے نقاب کیا۔

"وہ لوگ نہ جانے کہاں رہ گئے؟" میں نے دوبارہ عقبی سڑک کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ ہیڈ لیمپس بجھا کر آرہے ہیں۔" یوسف نے سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے کہا۔ "جب اُن کی کار اسٹریٹ لائیٹس کے نیچے سے گزرتی ہے تو لمحہ بھر کے لیے مجھے عقب نما آئینے میں اس کی جھلک سی نظر آتی ہے۔"

اسی اثنا میں مجھے بھی اس کار کی جھلک نظر آگئی اور فوری طور پر میرے ذہن کے اندر سلوف کی نادیدہ ذات شلغمی رنگت اور چوڑے چہرے والے شخص کی صورت رینگ آئی۔

مجھ سے ملاقات پر اس کے اصرار کا پہلا اور مضبوط ترین سبب تو وہی ہوسکتا تھا جو میں نے یوسف کو بتایا تھا، مگر ایک امکان اور بھی تھا جو قدرے موہوم لیکن بے حد خطرناک تھا۔

اس تجربہ گاہ پر غیر قانونی ہی سہی مگر ملکیت اسرائیل کی تھی اور آندرے سلوف کا مُلک اسرائیل کے بارے میں ہمیشہ کھلی تصادم سے گریز کر کے زبانی مذمت کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتا رہا تھا۔

ایسی صورت میں تجربہ گاہ پر قبضے کی پیش کش نے شاید اُسے مخمصے میں ڈال دیا ہو۔ آندرے سلوف یا اس کے مُلک سے تجربہ گاہ کے سودے کے صرف دو بیرونی گواہ تھے۔ میں، یوسف اور اگر ہم زندہ رہتے تو کسی بھی وقت اس سودے کا راز فاش کرسکتے تھے جس کے نتیجے میں اسرائیل سلوف کے مُلک پر برہم ہوسکتا تھا۔

لیکن ہم دونوں گواہوں کے خاتمے کے بعد ایسا کوئی اندیشہ برقرار نہ رہتا۔ ایک بار وہ پوری تجربہ گاہ آہنی دیوار کے پیچھے ہوجاتی تو اسرائیلیوں کو تاقیامت پتہ نہیں چلتا کہ اُن کی وہ بیش قیمت تجربہ گاہ کہاں غائب ہوئی کہ عمارت کے ملبے کے ڈھیر میں اس کے باقیات تو کجا، ایک کیل تک نہ مل سکی۔

تیسرا غیر منطقی امکان اسی وقت سوجھا کہ کہیں آندرے سلوف ہم دونوں کو راستے سے ہٹا کر ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی رقم ہتھیانے کے چکر میں نہ ہو مگر اس طرح وہ اپنے رتبے، آزادی اور زندگی تک کو داؤ پر لگانے کی حماقت کرتا جو شاید کامیاب ہی نہ ہوتی۔

میں سوچتا ہی رہا اور ہماری کار منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔

یوسف نے اپنی کار بند سیاہ پھاٹک کے سامنے روک کر دوبارہ روشنیاں بجھا کر جلائیں اور چند ثانیوں بعد آہنی پھاٹک کھول دیا گیا۔

میں نے غیر ارادی طور پر بائیں طرف دیکھا لیکن سڑک تا حدِ نظر ویران تھی۔ یوسف نے اپنی کار بجری کی روش پر بڑھا دی۔ راہداری نیم دائرے کی صورت میں تھی اور پورٹیکو ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں سڑک سے گزرنے والے کھلے ہوئے پھاٹک سے براہ راست کچھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

کار رکتے ہی برآمدے کے کسی حصے سے دو مستعد آدمی آگے بڑھے اور پھرتی سے ہم دونوں کے دروازے کھول کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے جس پھرتی سے مخالف سمت کے دونوں دروازے سنبھالے تھے اس کے پیشِ نظر مجھے اُن کی مہمانداری کا معترف ہونا پڑا۔ وہ دونوں چوڑے شانوں اور پھیلے ہوئے چہروں والے سفید فام تھے جن کی قومیت آندرے سلوف سے مختلف یقیناً نہیں تھی۔

"اس طرف۔" اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مشینی انداز میں اشارہ کیا دوسرا ہم دونوں کے ساتھ ہی رہا۔

برآمدے میں کافی آگے بڑھنے کے بعد میرا خیال تھا کہ ہمیں سیدھا نشست گاہ میں لے جایا جائے گا مگر ہماری رہنمائی کرنے والا اچانک داہنی طرف کے ایک بغلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ کمرہ خاصا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ رہنمائی کرنے والا کمرے کے وسط میں رک گیا اور ہمارے ساتھ آنے والے نے دروازہ بند کردیا۔

"مسٹر سلوف کہاں ہیں؟" یوسف نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"اسی عمارت میں۔" ہمارے ساتھ آنے والے نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ تم دونوں کے منتظر تھے انھیں اطلاع دی جاچکی ہوگی اسی اثنا میں اگر تمھارے پاس کوئی ہتھیار ہو تو وہ یہیں چھوڑ دو۔"

میرا ماتھا ٹھنک گیا۔

"کیوں؟" یوسف کی آنکھیں حیرت سے آنکھوں پر جا چڑھیں۔

"یہ پروٹوکول ہے سر!" وہ کسی بے رحم عقاب کی طرح یوسف کی آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا۔

"مگر پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا!" یوسف نے احتجاج کیا

"حالات کے تحت قوانین بدلتے رہتے ہیں۔ واپسی پر ہر چیز جُوں کی تُوں واپس مل جائے گی۔ یہ محض رسمی کارروائی ہے۔" اس کا شروع سے آخر تک وہی لب و لہجہ رہا۔

یوسف نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے سخت اور سرد لہجے میں اسے روک دیا۔ "وہی کرو جو کہا جا رہا ہے، جیبیں خالی کردو۔"

مجھے اُن کے تیوروں سے محسوس ہورہا تھا کہ وہ ہماری رضاکارانہ حوالگی پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ جامہ تلاشی کی نوبت بھی آئے گی لہٰذا میں نے کیمیاوی پستول میز پر رکھ کر جیبی ٹرانسمیٹر بھی نکال لیا۔

"کیا یہ بھی چھوڑنا ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"جیبی ٹرانسمیٹر!" ایک لمحے کے لیے رہنمائی کرنے والے کے چہرے پر تحیّر کی لکیریں ابھریں پھر وہ دوبارہ پتھر کی طرح سپاٹ ہوگیا۔ "ہاں۔ یہ بھی رکھ دو۔"

میں ٹرانسمیٹر رکھنے کے لیے جھکا تو یوسف اپنا خود کار پستول اسی میز پر رکھ رہا تھا۔ نگاہیں چار ہوئیں تو اُس کی آنکھوں میں ندامت اور پشیمانی کا سمندر موجزن تھا۔

"اب تو کوئی ہتھیار نہیں ہے تمھارے پاس؟" سوال کیا گیا۔

"نہیں۔" میں نے زہریلے تیروں والی شیشی کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا، یوسف محض نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"اعتراض نہ ہو تو ہم اپنا بھی اطمینان کرلیں!" ایک نے رسمی لہجے میں کہا اور ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دونوں بیک وقت ہماری طرف بڑھ آئے۔

میں دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا لیے۔ یوسف کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی اپنے کام میں چابکدست تھے۔ جسم پر محض ایک بار ہاتھ پھیر کر اندازہ لگا لیا کہ ہم دونوں نہتے رہ گئے تھے۔

"اگر ہم مسٹر سلوف سے ملے بغیر واپس جانا چاہیں؟" یوسف نے غصے سے کھولتے ہوئے شکستہ الفاظ میں کہا۔

"انھیں بیدار کیا جاچکا ہے، پروٹوکول کی ابتدائی کارروائی ہوچکی ہے اب ملے بغیر جانا مناسب نہ ہوگا۔" اس شخص کا لہجہ حسبِ معمول سپاٹ ہی رہا۔ نہ اس میں طنز تھا نہ دھمکی۔

پھر ہمیں نشست گاہ میں پہنچا دیا گیا اور وہ دونوں اسی کمرے میں غائب ہوگئے جہاں ہماری جامہ تلاشی لی گئی تھی۔

"کھوپڑی پر قابو رکھو۔" تنہائی میسر آتے ہی میں نے سرگوشیانہ لہجے میں یوسف کو تادیب کی۔ "ہم کسی چوہے دان میں پھنس چکے ہیں، غصے سے تمھارا دماغ ماؤف ہو رہا ہے اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔"

وہ ایک جھٹکے سے صوفے پر سے اٹھ گیا۔ سگریٹ سلگائی اور جلتی ہوئی دیا سلائی قالین پر پھینک کر مسل دی اور میرا ذہن تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی صورت حال کے بارے میں سوچنے میں مشغول تھا۔

چند منٹ بعد اندرونی دروازے سے چوڑے شانوں بھرے بھرے جبڑوں اور سفید بالوں والا ایک دراز قامت شخص شب خوابی کے لبادے پر گون پہنے اندر داخل ہوا۔

"ہیلو مسٹر جوزف!" اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی پرتپاک لہجے میں کہا۔ "تو تم لے ہی آئے اپنے دوست کو۔"

"مگر میں فوراً واپس جانا چاہتا ہوں مسٹر سلوف!" میری ہدایت کے باوجود اس وقت یوسف غصے سے سنک گیا۔

"کیوں؟" آندرے سلوف کی خوابیدہ سی سرد اور سفاک نگاہیں ہونٹوں پر پھیلی ہوئی دوستانہ مسکراہٹ سے متصادم تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر نرمی سے یوسف کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ہماری سخت بے عزتی کی گئی ہے، پہلے ہتھیار لیے گئے پھر جامہ تلاشی لی گئی.... یہ سلوک.... یہ سلوک....!" غصے کی شدت سے الفاظ اس کے حلق ہی میں اٹک کر رہ گئے۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "ان کے لیے یہ بات معمولات میں شامل ہے۔ غلطی میری ہے کہ میں انہیں خصوصی ہدایات دینی بھول گیا تھا۔"

"مگر پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔" یوسف کا غصہ قدرے دھیما ہو گیا۔

"اس لیے کہ میرا ذاتی عملہ تمھیں جانتا ہے... یہاں سب نئے لوگ ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ عمارت سفارت خانے کے حوالے سے نظروں میں آئے۔ اسی وجہ سے یہ سب ہوا۔ میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔"

اس سے آگے زبان کھولنا یوسف کے بس کی بات نہ رہی، اور سلوف کی نیم وا، سرد نگاہیں میرے چہرے پر آجمیں۔

سلوف کا ڈاڑھی مونچھوں سے بے نیاز چہرہ اپنے ہر نقش میں غیر مرئی سی ہیبت رکھتا تھا جس کا الفاظ میں اظہار ممکن ہی ہی نہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو ضدی اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور اپنی ذرا ذرا سی بات منوانے کے لیے بھی بدترین فیصلوں سے گریز نہیں کرتے۔

"خوب!" وہ مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکتے رہنے پر آمادہ پا کر آہستہ سے بولا۔ "تو وہ تجربہ گاہ صنعا کے کس علاقے میں ہے؟"

"میں یہاں اجنبی ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "زبانی بتانا مشکل ہے، وہاں لے جا کر کھڑا کر دوں گا۔"

اس کے ہونٹ بند رہے مگر جبڑوں کی دریدیں پھولنے پچکنے لگیں، شاید وہ دانت پیس رہا تھا۔ "کوئی تو محلِ وقوع یاد یاد ہوگا اس مقام کا، سُنا ہے وہاں تمھارا اہم معرکہ ہوا تھا۔"

"سودا ابھی ادھورا ہے، یہ نشاندہی آخری کام ہے۔" میں نے اپنی اضطراری کیفیت کو چھپانے کے لیے جیب سے سگریٹ نکال لی۔

"رقم چاہیے؟" وہ بدستور پرسکون رہا لیکن اس کی نگاہیں میری ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"ہاں، اور دو لاکھ۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا

اس کا منہ بگڑ گیا جیسے پُڈنگ کھاتے کھاتے دانتوں میں اچانک کنکر آ گیا ہو۔ "کیا؟ جوزف سے تو ڈیڑھ میں بات ہوئی تھی۔"

"وہ پرانی بات ہے، اب میرا مطالبہ دو کا ہے۔"

"مگر جوزف نے ڈیڑھ میں بات پکی کی تھی۔"

"بات پکی ہو جاتی تو تم رقم دے کر اس سے پتہ دریافت کر لیتے۔ مجھے یہاں بلوا کر تم نے اپنا اپنا سودا خود خراب کیا ہے۔ اسرائیلیوں کو اپنا تھوکا ہوا چاٹنے کا موقع مل گیا۔ اب بولی ان کے اور تمھارے درمیان ہے۔ وہ دو لاکھ ڈالر پیشکش کر چکے ہیں۔"

وہ اپنی سرد اور سپاٹ نگاہوں سے یوسف کو گھورنے لگا جو صورتِ حال سے بظاہر لاتعلق ہو کر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اُسے نہ گھورو۔" میں نے سلوف کو مخاطب کیا۔ "اگر تم یوسف کو رقم دے دیتے تو قصہ نمٹ جاتا۔ یہ میرے پاس خالی ہاتھ لوٹا، تو اس سے پہلے ایک اسرائیلی ہرکارہ مجھ سے رابطہ قائم کر کے اپنی پیشکش دے چکا تھا۔"

وہ چند ثانیوں تک خاموش رہا پھر مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ "دو لاکھ منظور، تمھیں دو لاکھ کی وہ رقم بھی فوراً ہی دے دوں، کہیں اسرائیلی ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنی بولی ڈھائی لاکھ تک نہ لے جائیں۔"

یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے اندر روپوش ہو گیا۔

مگر اس کی آخری مسکراہٹ میرے ذہن کا کانٹا بن گئی۔ عجیب للکارتی ہوئی سی مسکراہٹ تھی وہ، مجھے شبہ سا ہونے لگا، رقم کے بہانے کہیں وہ ہمیں ٹھکانے لگوانے کا بندوبست کرنے گیا ہو۔

"تم غیر ضروری طور پر اسے اشتعال دلا رہے ہو۔" موقع ملتے ہی یوسف نے ہذیانی انداز میں سرگوشی کی۔ میں بمشکل خاموش رہ سکا۔ میرے بدن میں کروڑوں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ "بات کو طول دینے کے بجائے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔"

میں خاموشی سے اس سادہ لوح جانباز کا چہرہ تکتا رہا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ جب ذہن چھٹی حس کے زیرِ اثر آجاتا ہے تو آدمی کے پانچوں حواس بے اثر ہو جاتے ہیں۔

تقریباً آٹھ دس منٹ بعد آندرے سلوف واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک نفیس بریف کیس جھول رہا تھا جو اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"چھوٹے اور بڑے نوٹوں کی شکل میں دو لاکھ ڈالر ہیں، چاہو تو بات آگے بڑھانے سے پہلے گن لو۔"

میں نے بریف کیس کھول کر چند گڈیوں کو اوپر نیچے کیا، اور اندازہ لگایا کہ وہ رقم پوری ہی تھی پھر بریف کیس بند کر کے قدموں میں رکھ لیا۔

"بولو۔" میری خاموشی اس وقت آندرے سلوف کے لیے اعصاب شکن

ثابت ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس کے ٹوکنے پر میں نے اُسے اس عمارت کے محلِ وقوع سے لے کر تہہ خانے میں اُترنے کے راستے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

وہ میرا ایک ایک لفظ پوری توجہ اور انہماک سے سُن رہا تھا بلکہ میرا تو خیال تھا کہ وہ اپنے کوٹ میں چھپے ہوئے کسی حساس ٹیپ ریکارڈر پر میری بتائی ہوئی تفصیلات ٹیپ بھی کرتا جا رہا تھا تاکہ بعد میں کسی ابہام کا خدشہ باقی نہ رہے اور میں اپنے حافظے کے مطابق تجربہ گاہ کی تنصیبات سے لے کر اس کے خوفناک حفاظتی نظام تک ساری جزئیات پوری تفصیل سے بیان کر رہا تھا کیونکہ کسی بھی مرحلے کی ذرا سی چوک ایک وسیع انسانی آبادی کی المناک بربادی کا سبب بن سکتی تھی۔

میرے خاموش ہونے پر آندرے سلوف نے چند سوالات بھی کیے جن کے جواب میں نے حتی الامکان ایمانداری سے دیے۔

یہ موضوع ختم ہونے پر اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دے لیے پھر یوں بغور میری طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی نیا موضوع چھیڑنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کر رہا ہو۔

"ہر شخص۔" آخر کار اس نے بات شروع کر ہی دی۔ "کسی بڑے مقصد کے لیے زندگی گزارتا ہے اور جب وہ مقصد حاصل ہو جائے تو اس کی زندگی بے کیف ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسرائیلیوں سے تمھارے تصادم کا سبب کچھ بھی رہا ہو انھیں نیچا دکھانا تمھارا بڑا مقصد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو لاکھ کی مساوی بولی پر تم نے یہ سودا مجھ سے کیا، اور اپنا یہ مقصد حاصل کر لیا.... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اس تمہید کا سبب کیا ہے؟"

"انسان ایک مقصد کے لیے زندہ رہتا ہے، جب مقصد نہ رہے یا حاصل ہو جائے تو زندگی کا کیا فائدہ خصوصاً اس صورت میں جب اس کو ملتف کر کے کوئی اور ضمنی مگر بڑا مقصد حاصل ہو رہا ہو۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے کیا جتانا چاہتے ہو؟" میرے لہجے میں تلخی عود کر آئی۔

"زندگی کے چند سچے اور ناگزیر اصول۔"

"بیوی بچے، گھر بار۔ تمھارے نزدیک ان کا شمار کسی مقصد میں نہیں ہوتا؟ اگر ان کی آسودگی کے لیے زندہ رہا جائے؟" میں نے یہ سمجھتے ہوئے جواب دیا کہ شاید وہ مجھے اپنے اشترا کی فلسفے سے مانوس کرانا چاہ رہا تھا اسی لیے میں نے صرف مادی رشتوں کے نام لیے کسی مضبوط روحانی بندھن کا ذکر نہیں کیا۔

"یہ سب جذباتی رشتے ہیں۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔ "راستے کے سایہ دار درختوں کی طرح، جیسے لمبی راہوں کا مسافر ہر سائے میں ستا لیتا ہے اسی طرح جہاں چند راتیں بسر کرو، وہ گھر بن جاتا ہے، جس عورت سے منہ مانگی قربت میسر آجائے اسے بیوی، محبوبہ یا داشتہ بنا لیا جاتا ہے اور بچے بھی کوئی انوکھی جنس نہیں، ان میں سے ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور بدلی جا سکتی ہے سوائے مقصد کے۔ اور مقصد کسی سرزمین یا تنظیم سے وابستہ ہوتا ہے لہٰذا۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ "لہٰذا تمھاری زندگی اب بے مقصد ہے بلکہ اس کے خاتمے سے مجھے اور میرے مقاصد کو تقویت ملے گی، باہر کوئی ایسا رازدان نہیں رہے گا جس سے مجھے خوف ہو...."

"تم کیا بک رہے ہو سلوف!" یوسف غصے سے بپھر گیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ رقم کے بارے میں تمھاری نیت میں فتور آگیا ہے۔"

وہ ایک بار پھر اپنے خون آشام انداز میں مسکرایا۔ "یہ سودا میری حکومت سے ہوا ہے اور میں اس رقم کا امین ہوں۔ تم مجھے اپنے ورثا کے نام پتے بتا دو۔ تمھاری ہدایت کے مطابق اس رقم کا ایک ایک پیسہ گمنام طریقے سے انھیں پہنچا دیا جائے گا۔ جب انھیں زندگی کی آسائشیں خریدنے کی قوت مل جائے گی تو وہ تمھیں، تمھارے سائے کو بھول کر کسی نئے اور گھنیرے سائے کی تلاش میں آگے بڑھ جائیں گے۔"

"تم بہت خوش فہم ہو آندرے سلوف!" میں نے اپنے وجود میں سرایت کرتے ہوئے وقت کے سرد خوف کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ اس تمام راز و نیاز کے صرف دو ہی گواہ ہیں؟"

وہ بہت تیزی سے میری طرف پلٹا۔ "کیا مطلب؟"

"جو لوگ گردہ بند زندگی گزارتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا بندوبست پہلے کرتے ہیں اور مر جائیں تو انتقام کی بنیاد ڈالتے جاتے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "قلابازی! یہ نہیں چل سکے گی۔ تھوڑی دیر پہلے تم باتوں ہی باتوں میں اعتراف کر چکے ہو کہ تجربہ گاہ کے راز سے صرف تم دونوں واقف ہو۔"

"ہم ہتھیار چھن جانے کے بعد جھوٹ بول رہے تھے اور تم سارے اختیار کے باوجود شروع ہی سے بہروپیے بنے ہوئے ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس تجربہ گاہ کے بارے میں خونخوار لڑاکوں کا وہ پورا گروہ گواہ ہے جس نے میری سربراہی میں وہاں اسرائیلیوں کو اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا اور یہاں بھی ہم دونوں خاموشی سے نہیں آئے ہیں۔"

چند ثانیوں تک وہ خاموش رہا اور ہم دونوں لڑاکا عقابوں کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

"بالفرض کوئی جانتا بھی ہے۔" آخر کار اس نے سخت اور سرد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "تم یہاں مجھ سے ملنے آئے ہو تو وہ کبھی اسے ثابت نہ کر سکے گا، تھوڑی دیر بعد یہ عمارت ویران اور غیر آباد ہوگی، کوئی

یہاں آیا تو اسے صرف دو لاشیں ملیں گی۔"

"کوشش کر دیکھو۔" میں نے حوصلے سے کام لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اندر موجود ہوں اور میرے جاں نثار اس عمارت کے گرد پھیلے ہوئے ہیں... وہ ایک مقررہ وقت تک میری صحیح سلامت واپسی کا انتظار کریں گے پھر موت کے بگولوں کی طرح اس عمارت اور اس کے مکینوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ ان کی راہ میں آنے والی ہر شے بے دردی سے برباد کر دی جائے گی۔ خواہ وہ تمھاری زندگی ہو یا تمھارے ہتھیار۔"

"تم جھوٹے ہو۔" وہ بے اعتباری سے بولا۔ اس کے لہجے میں پہلی بار اعتماد کا فقدان محسوس ہوا تھا۔ "یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔"

"تلاشی کے وقت میری جیب سے ایک ٹرانسمیٹر بھی لیا گیا تھا۔ چند منٹ کے لیے وہ مجھے لا دو تو سب کچھ اپنے کانوں سے سن لو گے۔"

مونچھوں سے محروم اس کے اوپری ہونٹ پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے اور وہ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

اس بار ہم دونوں سے اس کی باقاعدہ ٹھنی ہوئی تھی لہٰذا اس کے نکلتے ہی بغلی دروازے سے وہ دو محافظ سب مشین گنیں سنبھالے کمرے میں گھس آئے جنھوں نے آندرے سلوف سے ملاقات سے قبل ہمیں غیر مسلح کیا تھا۔

میں ان پر کوئی توجہ دیے بغیر بدستور سگریٹ نوشی میں مصروف رہا۔

چند منٹ بعد سلوف واپس آیا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی پھٹ پڑا۔ "تم جھوٹے ہو تمھارے پیچھے صرف ایک کار تھی۔ جس میں صرف دو آدمی تھے اور وہ برسات میں بھیگے ہوئے چوہوں کی طرح با آسانی گھیرے جا سکتے ہیں۔"

"اتنے ہی پُر یقین ہو تو ہمیں مروا کیوں نہیں دیتے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ پھر تجربہ گاہ کے نزدیک پھٹکنے والا چڑیا کا بچہ بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔"

اس کے اوپری لب پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطرے لمحہ بہ لمحہ موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے سب مشین گن والوں کو مخاطب کیا۔ "ٹرانسمیٹر لاؤ اس کا۔"

ایک رکا اور دوسرا پل بھر میں برابر والے کمرے سے میرا جیبی ٹرانسمیٹر لے آیا جو اس نے اپنے آقا کے حوالے کر دیا۔

"تم... تم کوئی پیغام دینے کی کوشش نہیں کرو گے۔" وہ قدرے تھکی ہوئی مگر غضب آلود آواز میں بولا۔ "میں صرف یہ سننا چاہتا ہوں کہ باہر تمھارے کتنے آدمی ہیں۔"

"پیغام دینے کی ضرورت ہی نہیں، ہمارا سارا پروگرام طے ہے۔" میں نے اپنا اعتماد کسی حد تک بحال ہوتا ہوا محسوس کیا۔

اس نے مجھے گھورتے ہوئے ٹرانسمیٹر میری طرف بڑھا دیا۔ "صاف اور سیدھی زبان میں گفتگو کرو گے۔ کوئی کوڈ استعمال کیا تو مشین گن کا آہنی دستہ چہرہ مسخ کر دے گا۔" اس کے یہ کہتے ہی ایک محافظ بھی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کھڑا ہوا۔

"ڈیزرٹ وائر برڈن کالنگ فار نمبر ٹو۔ ہیلو... اوور۔" میں نے بٹن دبا کر ٹھہری ہوئی آواز میں شناختی سگنل نشر کیا۔

"ڈیزرٹ وائر نمبر ٹو، ہیلو ریسیونگ... اوور۔" مجھے فوراً ہی جواب ملا۔

"تمھارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟ اوور۔" یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اپنا دل حلق میں آتا ہوا محسوس کیا۔

"ایک، نمبر تین میرے ساتھ ہے... اوور۔"

"میں کل نفری کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، صرف تمھاری گاڑی کے بارے میں نہیں... اوور۔" میں نے حتی الامکان پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔

اور وہ فوراً ہی میرا مدعا بھانپ گیا۔ "کم از کم اکیس اور زیادہ سے زیادہ چوبیس نفوس ہوں گے جس وقت رابطہ قائم کیا گیا تین افراد اپنے ٹھکانوں پر نہیں تھے... اوور۔"

"سب لوگ کہاں ہیں؟ اوور۔"

"پوری عمارت گھیرے میں ہے میرا اشارہ ملتے ہی آپریشن شروع ہو جائے گا... اوور۔" جنرل کا وہ آدمی بلا کا موقع شناس واقع ہوا تھا۔

"اپنے ٹھکانوں پر ڈٹے رہو۔" میں نے محض آندرے سلوف پر اعصابی دباؤ بڑھانے کی نیت سے غیر ضروری طور پر اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا پھر "اوور اینڈ آل" کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

آندرے سلوف کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی اور اس کی سرد آنکھوں میں تشویش کے سائے لرزاں دیکھے جا سکتے تھے۔

"ان سے نمٹ لیا جائے گا۔" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ تعداد میں اتنے ہی ہوں مگر یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ تجربہ گاہ کے راز سے واقف ہیں۔"

"یہ سننا چاہتے ہو تو ایک کال اور کرنی ہو گی۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ میں خود کو بہتر پوزیشن میں محسوس کر رہا تھا۔

"کسے؟" سلوف نے غیر ارادی طور پر بے مقصد سوال کیا۔

"اپنے ایک اہم ساتھی کو۔"

"یہ بھی سہی!" اس نے کہا۔ "مگر میری پچھلی شرط یاد رکھنا۔"

اس سے بات کرتے ہوئے اس بار میرا ارادہ براہِ راست حسین العمادی سے گفتگو کرنے کا تھا اور مبہم سی امید تھی کہ شاید جنرل اس وقت بھی بیدار ہو اور اس نے میرے بارہ نمبر کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی ہو۔ وہ ٹرانسمیٹرز ایک ہی مخصوص فریکونسی پر کام کرتے تھے۔ اور کسی بھی دو سیٹس پر ہونے والی گفتگو بلا دخل اندازی بقیہ دو پر بھی سنی جا سکتی تھی بشرط صرف یہی تھی کہ اس وقت اپریٹس کا سوئچ آن ہو۔

جنرل کے لیے وہ رات بہت اہم تھی اور میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ وہ مشکل ہی سو سکا ہو گا ایسی صورت میں اس کا ٹرانسمیٹر آن رکھنا بعید از امکان نہیں تھا۔

میں چند ثانیوں تک سوچتا رہا۔ میرا اور جنرل کا تعلق نگرانی یا حفاظت کرنے والے چاروں افراد سے پوشیدہ نہیں تھا بلکہ جنرل نے خود اپنے دفتر میں انھیں مجھ سے متعارف کرایا تھا لہٰذا میں درمیان میں گفتگو سنے جانے کی پروا کیے بغیر جنرل سے بات کر سکتا تھا۔

"ڈیزرٹ وائر برڈن کالنگ فار حسین... اوور۔" قدرے توقف کے بعد میں نے وہ فیصلہ کن قدم اٹھا ہی لیا۔

اس وقت میری جیب میں زہریلی سوئیاں پھینکنے والی ٹیلسٹی موجود تھی اور تلخی کے آغاز میں یہ موقع میسر تھا کہ میں ذرا بھی مزاحمت کے بغیر سلوف کو موت کی نیند سلا دیتا لیکن مجھے ابتدا ہی سے اندازہ تھا کہ سلوف کو ختم کر کے ہم دونوں اس عمارت سے زندہ باہر نہیں نکل سکیں گے اسی لیے میں نے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی تھی کہ تصادم مول لیے بغیر اس کے ذہن پر ذہنی برتری کا ہتوا بٹھا سکوں تاکہ کسی ہنگامے کے بغیر وہاں سے واپسی عمل میں آ سکے۔

زبانی حد تک یہ طریقۂ کار بڑا آسان محسوس ہوا مگر اس پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ عملدرآمد میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا اور ہر ہر سانس کے ساتھ کسی بھی لمحے بازی ہاتھ سے نکلنے کا دھڑکا لگا رہا تھا۔

"ریسیونگ... اوور۔" ٹرانسمیٹر پر جنرل کی مختصر ترین کال سن کر میرا دل خوشی سے بلّیوں اچھلنے لگا۔

"تجربہ گاہ کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟... اوور۔"

"کیا مطلب؟" اس کی آواز تحیّر آمیز تھی۔

"جو پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دو۔" میں نے بادلِ ناخواستہ سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میرے کچھ دوست یہ جاننا چاہتے ہیں... اوور۔"

جنرل جیسے گھاگ آدمی کے لیے میرے وہ الفاظ ضرورت سے زیادہ واضح تھے۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کچھ لوگوں کے درمیان گھرا ہوا تھا جن کے سامنے میں خود کو حسین سے برتر ثابت کر کے اس کی زبان سے کچھ خفیہ باتیں سنوانی چاہتا تھا۔

"وہ موت کا ایک ہولناک سمندر ہے... اوور۔" حسین نے ایک گہرا سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ اس کی کہانی طویل تھی، مگر اس نے اپنا پورا بیان ٹکڑوں میں بانٹ کر ہر مرحلے پر مجھے یہ موقع دیا کہ میں اسے بولنے دوں یا روک دوں اور جب آندرے سلوف نے اپنی عرق آلود پیشانی کو جھٹکتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو میں نے کال اوور ہوتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا اور ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر کے اسے جیب میں ڈال لیا۔

سلوف نے میری اس حرکت پر اعتراض نہیں کیا۔

"جاؤ... چلے جاؤ۔" اس نے میرے سر پر مسلط محافظ سے کہا اور وہ سرعت کے ساتھ اس کمرے سے باہر چلا گیا۔

"اب کیا کہتے ہو؟" کافی دیر بعد آندرے سلوف نے دوبارہ یوسف کی آواز سنی اور چونک پڑا۔ اس وقت اس کے چہرے پر کسی ہارے ہوئے جواری جیسے تمام تاثرات نمایاں تھے۔ وہ بار بار ہتھیلیوں سے اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ سرد اور سپاٹ آنکھوں کی بے رونقی مہیب حد تک بڑھ گئی تھی اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا ہوا تھا۔

"تم جیت گئے۔" وہ صوفے کی پشتگاہ سے ٹیک لگا کر بولا۔ "زندگی اور اس کی مقصدیت کے بارے میں میری حکمت عملی ناکام ہو گئی۔"

"وقت کم رہ گیا ہے۔" میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اگر سات منٹ کے اندر اندر ہم باہر نہ نکلے تو یہاں بھونچال آ جائے گا۔"

"تم جاؤ۔" آندرے سلوف اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں تھام کر مضطرارنہ انداز میں صوفے سے اٹھ گیا۔ "رقم تمھاری ہے اور تجربہ گاہ میری۔"

میں نے کھڑے ہو کر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اب یہ رقم ناکافی ہے تمھیں اپنی حکمت عملی کی ناکامی کا تاوان بھی ادا کرنا ہو گا۔"

"یہ سراسر وعدہ خلافی ہے۔"

"اور تمھارا رویہ۔" یوسف غضیلے انداز میں اس کے سامنے آ گیا۔ "آج تم نے دوستی کے لفظ کو رسوا کیا ہے سلوف، اگر یہ پیش بندی نہ کر لیتا تو اس وقت یہاں ہماری لاشیں پڑی ہوتیں۔ تم نے اس بار پشت میں خنجر گھونپنے والا اپنا کردار ثابت کر دیا ہے۔ میں یہ معاملہ اپنی سپریم کونسل تک لے جاؤں گا۔"

"تلخیاں بڑھاؤ گے" سسلوف کا لہجہ پھر اپنے معمول پر آ گیا۔ "یہ یاد رکھو کہ تمھاری تنظیم ہماری فوجی اور اخلاقی امداد کی محتاج ہے، ہمیں تمھاری کوئی ناگزیر ضرورت نہیں۔۔۔ یوں سمجھو کہ تم لوگ عالمی پیمانے پر مستند یتیم ہو اور تم سے ہمدردی کر کے ہم دوسری اقوام عالم کی نگاہوں میں ایک بلند مقام بنا رہے ہیں۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ تمھارا کوئی مصرف نہیں ہے۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں۔۔۔" میں نے سسلوف کو ٹوکا۔ "صرف چند منٹ رہ گئے ہیں اس رقم کو دوگنا ہونا چاہیے، فوری طور پر۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ تلملا اٹھا۔ "یہ کھلی بلیک میلنگ ہے۔"

"جو لوگ شکست خوردہ دشمن کے نرخرے پر خنجر کی نوک رکھ کر اپنی شرائط نہیں منواتے، وہ آخری درجے کے احمق ہوتے ہیں۔" میں نے یہ کہہ کر قہقہہ مارا اور نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس قالین سے اٹھا لیا۔ "یہ تمھاری حکمت عملی کی شکست کی قیمت ہے جو ہم لے جا رہے ہیں اور اب تجربہ گاہ کی کھلی بولی ایک بار پھر تمھارے اور اسرائیل کے درمیان ہے۔"

"تمھارے سر پر خباثت سوار ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے غرایا۔ "مجھے اتنا بے بس نہ سمجھو! ایسا نہ ہو کہ کل ٹریفک کے کسی حادثے میں کوئی تیز رفتار کار یا ٹرک تمھیں کسی پلّے کی طرح کسی سڑک پر کچل دے۔"

میں خوش دلی سے ہنسا۔ "شکریہ سسلوف! اب میری حفاظت کا بندوبست بھی کر لینا۔ اگر تمھاری بدقسمتی سے اگلے چند روز میں میرے بدن پر کوئی ناگہانی خراش بھی آئی تو میرے آدمی بھوکے بھیڑیوں کی طرح تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں بھینچ لیں۔

"تم تو روئے زمین کی ارذل ترین مخلوق معلوم ہوتے ہو۔۔۔ میں تمھیں فوری طور پر صرف ایک لاکھ اور دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد تم مجھے اور تجربہ گاہ کو بھول جاؤ گے۔"

"باقی ایک لاکھ کب دو گے؟"

"تین پر گزارہ کر لو۔" یکلخت اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "ورنہ تمھیں مارنے کے بعد میں اپنی کنپٹی میں بھی گولی مار لوں گا۔"

"صرف تین منٹ رہ گئے ہیں۔" یوسف نے ہمیں ٹوکا۔

"رقم لے آؤ، ہم باہر جا رہے ہیں۔" میں نے سسلوف سے کہا اور وہ تیز رفتاری کے ساتھ ایک مرتبہ پھر اندر روپوش ہو گیا۔

اس کی واپسی بہت جلدی ہوئی۔ اس بار وہ خاکی زین کا ایک تھیلا لایا تھا جو اس نے دور ہی سے میری طرف اچھال دیا۔ "اس میں پورے ایک لاکھ ہیں جلدی باہر نکلو صرف ڈیڑھ منٹ باقی رہ گیا ہے۔"

"ہمارے پستول!" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور آندرے سسلوف جیسا گرگِ باراں دیدہ دوڑتا ہوا بغلی کمرے میں جا گھسا اور لحظہ بھر تک میرا کیمیاوی اور یوسف کا خودکار پستول لے آیا۔

برآمدے میں تین لاکھ ڈالر کی خطیر رقم سمیت آندرے سسلوف نے بذاتِ خود ہم دونوں کو رخصت کیا اور عمارت سے باہر آتے ہی یوسف نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

"آج میری زندگی کی بدترین رات تھی۔" کچھ دور نکل آنے کے بعد یوسف نے بھرائی ہوئی خفت آمیز آواز میں سکوت توڑا۔

"بدترین نہیں، بہترین کہو میرے دوست!" میں نے کہا۔

"کیوں؟" کار میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں اس نے بے اختیار اپنا سر میری طرف گھمایا۔ شاید اسے شبہ ہوا تھا کہ میں اس پر طنز کر رہا تھا۔

"اس لیے کہ آج کی رات تم اعتماد، دوستی اور زندگی کے ایک نئے مفہوم سے آشنا ہوئے ہو۔ یہ رات نہ آتی تو تم ایسی ہی رات اعتماد کی اوٹ میں کسی دوست کے ہاتھوں ڈس لیے جاتے۔"

"آندرے سسلوف۔" وہ بے اعتباری کے انداز میں اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اس نے آج میرے لیے زندگی کا بدترین باب لکھا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی سفارتی کامیابی کی خاطر مجھے ایک بے نشان مہرے کی طرح داؤ پر لگا دے گا۔"

"واقعی بہت خودغرض انسان ہے وہ۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "نہ جانے کیوں، اس کی جانب سے ابتدا ہی میں میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔"

"خدا کی پناہ۔" وہ بڑبڑایا۔ "ابتدا میں تمھارا رویہ مجھے نامناسب محسوس ہوا تھا، اچھا ہی ہوا کہ تم مجھے نظر انداز کر کے اپنی حکمت عملی آگے بڑھاتے چلے گئے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ اس وقت ہم دوگنی رقم کے ساتھ بحفاظت واپس جا رہے ہیں۔" میں نے آسودگی کے احساس کے ساتھ کہا۔ "شاید صبح میری روانگی کی نوبت بھی آ جائے۔"

وہ ایک دم چونک پڑا۔ "اوہ۔۔۔ یہ تو میں بھول ہی رہا ہوں اب تم سے ملاقات کی تو شاید نوبت ہی نہ آ سکے گی۔"

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم مجھے فندق الذہبی کے قریب اتار کر چلے جاؤ گے، تھوڑی دیر بعد میں جنرل کو اپنی کامیابی کی خبر دوں گا۔"

"بہت عجیب ہے ہماری آخری ملاقات۔" اس نے جذباتی انداز میں ایک ہاتھ سے میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔ "کاش مجھے ائیرپورٹ پر تمھیں الوداع کہنے کا موقع مل سکتا۔"

"نہیں۔۔۔ اب تم مجھ سے دور رہو گے۔ ہم دونوں کی سلامتی اسی میں ہے بلکہ تم مجھ سے رخصت ہونے کے بعد اپنا میک اپ بھی تبدیل کر لینا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دوبارہ پہچانے جاؤ۔ میری نگرانی پر مامور دونوں افراد نے تمھیں بخوبی دیکھ لیا ہو گا۔"

"یہ میں کر لوں گا۔" وہ لحظہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ "اس رقم کے بارے میں تمھارا فیصلہ کیا ہے؟"

"یہ تنظیم کی ملکیت ہے۔"

"ڈیڑھ سے تین لاکھ ہونے کے بعد اس پر تمھارا بھی حق ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "بہتر اور پرسکون مستقبل کے لیے اس میں سے کچھ رقم لے لو۔ اس دور میں پیسے کے بغیر انسان کے لیے مرنا بھی آسان نہیں رہا ہے۔ اس بارے میں تمھارے فیصلے نے مجھے خلش میں مبتلا کر دیا ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ "تم حق کی بات کر رہے ہو، میرا تو خیال ہے کہ میں نے اس رقم پر ضرورت سے زیادہ اپنا حق سمجھ لیا ہے اور پوری رقم تنظیم کے حوالے کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا ہے، دیکھا جائے تو اس میں سے آدھی رقم پر تمھارا حق ہے اس رقم میں ہم دونوں برابر کے شریک تھے۔۔۔"

"پیسہ میرے لیے گالی ہے برادرم!" وہ یک بیک جذباتی ہو گیا۔ "میرے باپ نے اردن میں اپنی زرخیز زمین اور دو مکان بیچ کر سارا پیسہ تحریک کو دے ڈالا تھا اور آج میرا سب کچھ تنظیم کا ہے بس مجھے پیٹ کا دوزخ بھرنے اور تن چھپانے کے لیے ملتا رہے تو یہی کافی ہے۔۔۔ یہ تین لاکھ تمھارے ہیں ان پر نہ میرا حق ہے نہ دعویٰ۔ تم مصر ہو تو میں تمھارا یہ فراخدلانہ عطیہ آج ہی کسی طرح بیروت روانہ کر دوں گا۔ ہاں یہ ضرور بتا دو کہ یہ رقم جنگی مقاصد کے لیے استعمال کی جائے یا بے گھر مہاجرین کی بہبود کے لیے۔"

"تنظیم کے ذمے دار جس طرح چاہیں اسے استعمال کریں۔"

"جنگی اور سماجی۔۔۔ دونوں محاذوں پر ہماری ضروریات بے حساب ہیں۔ ایک بیوہ کا سر ڈھانپنے کے لیے چادر یا رائفل کی گولی میں سے ایک کا انتخاب ہمارے لیے ہمیشہ ایک کڑا امتحان ہوتا ہے لہٰذا ہر دو مقاصد کے لیے عطیات علیحدہ وصول کیے جاتے ہیں۔"

ایک بیوہ کا سر ڈھانپنا ضروری تھا مگر رائفل کی گولی بھی اسی قدر ضروری تھی کیونکہ وہ نہ جانے کتنی سہاگنوں کو بیوگی کے عذاب سے بچا سکتی تھی۔

"نصف نصف دونوں مدوں میں دے دینا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر میں نے ہی سکوت توڑا۔ "آندرے سسلوف کے آدمی کب سے تجربہ گاہ پر کام شروع کر دیں گے؟"

"ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک وہاں جا پہنچے ہوں۔ سسلوف وہاں کا سراغ معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ پتہ سمجھنے کے بعد جب وہ اندر گیا تھا تو اس نے اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے اور کام شروع کرنے کا اشارہ دے دیا ہو گا۔"

"تم نے آندرے سسلوف کا اپنے ساتھ رویہ بھی دیکھ لیا اور اپنے بارے میں اس کی رائے بھی سن لی۔ میرا خیال ہے کہ پتہ سمجھنے کے بعد تمھیں جنرل حسین العمادی کے منصوبے پر کوئی اعتراض نہیں رہا ہو گا۔"

"کیسا اعتراض؟"

"اس مہلک تجربہ گاہ کو لے جانے والے بحری یا ہوائی جہاز کی یمن کی سرحدوں سے باہر تباہی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

وہ تلخ انداز میں ہنسا۔ "اب تو میں چاہوں گا کہ اس بدنصیب جہاز پر آندرے سسلوف بذاتِ خود موجود ہو تاکہ اس کہانی کا انجام مکمل ترین کہلا سکے۔"

راستے میں ہم دونوں دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ جنرل کے آدمیوں کی گاڑی حسبِ دستور ہیڈ لیمپس بجھائے کافی فاصلے سے ہمارے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اچانک یوسف نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور پھر شاہراہ سے کار ایک گلی میں جا گھسی۔

اس کے بعد تو پھر پیچ در پیچ گلیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے یوسف کو ٹوکا۔

"ظاہر ہے کہ تم جنرل کو یہی بتاؤ گے کہ ایک اسرائیلی ایجنٹ تمھیں اپنے بڑوں کے پاس لے گیا تھا اور بعد میں واپس ہوٹل چھوڑ گیا تھا۔ اب اگر اس اسرائیلی کو عقب نما آئینے میں ایک مشکوک کار نظر آتی ہے تو اسے ڈاج دینا ضروری ہے۔"

"مگر اس اسرائیلی کو میرے ذریعے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میرے آدمی میری حفاظت پر مامور ہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"خیر۔" اس نے یہ کہہ کر برق رفتاری سے کار بائیں سڑک پر موڑ لی اور چند منٹ بعد ہم دوبارہ شاہراہ پر آئے تو تعاقب کرنے والی کار کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم فندق الذہبی کے دروازے پر جا پہنچے۔ یوسف نے میری ہدایت پر کار احاطے میں لے جانے کے بجائے فٹ پاتھ کے کنارے باہر ہی روک دی اور میں پرجوش انداز میں مصافحہ کر کے نیچے اتر گیا۔

سورج طلوع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔۔۔ مگر صبح کے ابتدائی آثار نمودار ہو چلے تھے۔ میں نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو چار بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے جیسے ہی جیبی ٹرانسمیٹر

نکال کر آن کیا، اس پر دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دینے لگی۔

وہ میرے محافظوں میں سے ایک تھا اور اس وقت میری ہی تلاش میں تھا۔

"تم کہاں ہو؟ ہم گلیوں میں پاگلوں کی طرح چکر لگاتے پھر رہے ہیں۔۔۔ اوور۔" میری طرف سے جواب ملتے ہی وہ پھٹ پڑا۔

"تمھاری کارکردگی انتہائی ناقص رہی ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "جب کچھ دیر پہلے میں تم سے بات کر چکا تھا تو تمھیں چھپنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اپنی موجودگی کا جتا کر بھی تعاقب کر سکتے تھے۔ بہرحال اب ہوٹل لوٹ آؤ۔۔۔ اوور۔"

"ہم آ رہے ہیں۔۔۔ اکیس آدمیوں والی بات نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی تھی؟۔۔۔ اوور۔" اس نے میری بات کا بُرا منائے سوال کیا۔

"نہیں۔۔۔ تم نے بہت سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "اس وقت میں وہی جواب چاہتا تھا۔۔۔ جنرل سے تمھارے لیے انعام کی سفارش کروں گا۔۔۔ اوور اینڈ آل۔"

ٹرانسمیٹر آن تھا اور میں سگریٹ سلگا رہا تھا کہ اس سے پھر آواز ابھرنے لگی۔

"حسین کالنگ فار ایس۔۔۔ اوور۔"

میں جلدی سے ٹرانسمیٹر منہ کے قریب لے آیا۔ "صفدر رسیونگ۔" میرا لہجہ معذرت آمیز تھا۔ "مجھے افسوس ہے جنرل کہ کچھ دیر پہلے مجھے تم سے گستاخی کرنی پڑی مگر میں مجبور ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔ اوور۔"

"پروا مت کرو۔" جنرل کا لہجہ فراخدلانہ تھا۔ "میں نے تمھاری کسی سنگین مجبوری کا اندازہ محض اس بات سے کر لیا تھا کہ تم نے میرا نام لیا تھا۔۔۔ اس وقت میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔۔ اوور۔"

"ہاں۔۔۔ یہ ضروری ہے مگر ملنے کی صورت کیا ہوگی؟ اوور۔"

"تمھارے دونوں محافظ کہاں ہیں؟ اوور۔"

"شہر کے کسی حصے میں بھٹک رہے تھے، ابھی میں نے انھیں واپس ہوٹل بلایا ہے۔ تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ اوور۔"

"پھر اُن ہی کے ساتھ چلے آؤ۔ مگر ہوشیاری سے۔۔۔ اوور اینڈ آل۔" اس نے اپنی ہدایت پوری کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جنرل نے تو مجھے ملاقات کے لیے اپنے گھر بلایا تھا مگر میں اپنی دانست میں اپنا کام ختم کر چکا تھا اور میرے لیے فندق الوہبی میں مزید رکنا بے سود تھا لہٰذا میں نے طائرانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا جہاں میرا کچھ سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر لاپروایانہ انداز میں کمرے سے باہر نیم روشن راہداری میں نکل آیا۔

نیچے استقبالیہ کاؤنٹر والی شوخ اور خود پسند لڑکی پر میں نے اپنی روانگی کا مدعا ظاہر کیا تو وہ چونک کر اشتباہ آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

ایک ایسا مسافر جس کی رات بھاگ دوڑ میں گزری ہو، اگر صبح کے پانچ بجے ہوٹل کا کمرہ چھوڑ رہا تھا تو عملے کے لیے الجھن کی بات تھی۔

اس نے مجھے چند منٹ بیٹھنے کا مشورہ دیا اور حساب دیکھنے کے بہانے کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر ایک کمرے میں غائب ہو گئی۔

وہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر سکون کی علامات نمایاں تھیں۔ اس نے اپنی اونچی کرسی سنبھال کر ہوٹل کا اقامتی رجسٹر کھولا تو میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"حساب کتاب اس میں ہے تو تم کہاں گئی تھیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"طعام خانے کا حساب بھی دیکھنا پڑتا ہے۔" وہ جلدی سے بولی مگر اس کا لہجہ جھوٹ کی غمازی کر رہا تھا۔ وہ یقینی طور پر کسی کو کمرے کی دیکھ بھال کے لیے بھیج کر آئی تھی کہ میں کمرے میں کوئی بے ہوش یا مردہ شکار نہ چھوڑے جا رہا ہوں۔

میرے خیال کی تصدیق اس بات سے ہوئی کہ ایک اسٹیورڈ کے آنے تک اس نے مجھے الجھائے رکھا۔ اور اس سے نگاہوں ہی نگاہوں میں اشاراتی تبادلے کے بعد پھرتی سے بل بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

وہاں سے نمٹ کر میں باہر نکلا تو خوش قسمتی سے کوئی ٹیکسی ڈرائیور آرڈر نہیں آیا اور میں پارکنگ لاٹ کی طرف نکل گیا۔

وہاں وہ کار موجود تھی اور اس کے اسٹیرنگ کے عقب میں ایک انسانی ہیولیٰ بظاہر اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا لیکن میں کار سے کچھ ہی دور تھا کہ وہ دروازہ کھول کر پھرتی سے نیچے آ گیا۔

"کیا ہوا؟ یہاں کیوں چلے آئے؟" اس نے چند قدم آگے بڑھ کر ہیجان آمیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"دوسرا کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا اور مجھے عملاً اس کا جواب مل گیا۔ دوسرا شخص عقبی نشست کا دروازہ کھول کر نیچے آ رہا تھا۔ شاید فرصت کو غنیمت جان کر وہ پچھلی نشست پر لیٹا ہوا آرام کرنے میں مصروف تھا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" پہلے نے میرے قریب آ کر قدرے جھلائے ہوئے لہجے میں اپنا سوال دُہرایا۔

"آؤ۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اسی وقت کہیں چلنا ہے۔"

کار کے قریب پہنچ کر میں ڈرائیور کے پہلو والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے؟" کار کے رینگتے ہی پیچھے والے نے سوال کیا۔

"جنرل کے مکان پر۔" میں نے کہا۔

"ایسا نہ ہو کہ اس کا سنتری تمھارے ساتھ ہمیں بھی گولی مار دے۔" پیچھے والے نے کہا۔ "جنرل تک رسائی اتنی آسان نہیں ہے۔"

"میری اس سے بات ہو چکی ہے۔" میرے لیے انھیں مطمئن رکھنا ضروری تھا۔ "تم اپنی چمڑی کی فکر نہ کرو۔"

بقیہ سفر خاموشی سے طے ہوا۔

ڈرائیو کرنے والے نے ہیڈ لیمپس بجھا کر کار جنرل کے مکان کے پھاٹک کی طرف موڑ دی اور پیچھے والا دروازہ کھول کر نیچے اترنے ہی والا تھا کہ پھاٹک کھول دیا گیا اور کار رینگتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

مدھم روشنی میں برآمدے میں جنرل بذاتِ خود موجود تھا۔ ان دونوں کو کوئی ہدایت دیے بغیر وہ مجھے اپنے ساتھ لیتا چلا گیا۔

مختصر سی مدت میں شاید تیسری بار میں اس کی اسٹڈی میں داخل ہوا تھا جہاں پہنچنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"اب بغیر رُکے بولتے جاؤ۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کی پیشانی اور کنپٹیوں کی ابھری ہوئی وریدیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا اور اس رات ایک پل بھی نہ سو سکا تھا۔

"اسرائیلیوں کا ایک آدمی محافظوں کو جُل دے کر میرے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔" میں نے اپنی مفروضہ کہانی چھیڑ دی۔ "وہ معاملات طے کرنے کے لیے مجھے ہوٹل کے عقبی راستے سے ہی کہیں لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اُسے اپنے محافظوں کے بارے میں آگاہ کیے بغیر اگلے راستے سے چلنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ لوگ مجھے لقمۂ تر سمجھ رہے تھے۔ لندن میں رقم کی ادائیگی کی یقین دہانی کے بعد میں نے تجربہ گاہ کے بارے میں اپنی زبان بند رکھنے کا وعدہ کیا تو انھوں نے مجھے فوراً اسلحے کی زد پر لے لیا۔ اُن کا خیال تھا کہ تجربہ گاہ کی کہانی میرے ساتھ ہی منوں مٹی کے نیچے دفن ہو جائے گی۔ اس مرحلے پر مجھے ان سے چال چلنی پڑی۔ بارہ نمبر بہت ہوشیار ثابت ہوا۔۔۔"

"ہاں ہاں۔ تمھاری اور اس کی گفتگو میں نے سُنی تھی۔" جنرل نے بےتابی سے کہا۔

"اکیس حمایتیوں کی موجودگی سے وہ متفکر ضرور ہوئے مگر مرا جانے پر تلے ہوئے تھے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ انھیں یہ جتایا جائے کہ میرے علاوہ بھی کسی کو اس راز کا علم ہے اور میری ذات کو ذرا بھی گزند پہنچا تو دوسرا آدمی ساری اہم معلومات مقامی حکام تک پہنچا کر اُن کے لیے تجربہ گاہ کی بازیابی ناممکن بنا دے گا۔ یہ حربہ کارگر رہا اور وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب فوری طور پر یہاں سے نکل جاؤں۔"

جنرل کا چہرہ دمک اٹھا۔ "تم واقعی زیرک اللسان ہو، اس پورے معاملے میں تمھارا رول بہت خطرناک تھا مگر تم نے اپنی حاضر دماغی سے آخری لمحے تک فائدہ اٹھایا ہے۔ اب تم یہیں رُک کر آرام کرو، دفاتر کھلتے ہی میں تمھاری سفری دستاویزات کا بندوبست کرا دوں گا۔"

"سیتا کہاں ہے؟"

"سو رہی ہوگی۔" جنرل نے کہا۔ "تم بھی کچھ دیر سو لو۔ صبح مِل لینا اس سے۔"

"میں جاگ رہی ہوں۔" اسٹڈی روم میں ایک نسوانی سرگوشیانہ آواز گونجی اور ہم دونوں ہی حیرت سے اچھل پڑے۔

پھر میری نگاہ اسٹڈی روم کی ایک دیوار میں کافی بلندی پر بنے ہوئے روشندان پر پڑی جس کے پیچھے سیتا کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

"تم۔ وہاں!" جنرل اسے دیکھتے ہی ششدر رہ گیا۔ "خدا کی پناہ! اس سپاٹ دیوار پر۔ روشندان تک کیسے پہنچی!"

سیتا کا چہرہ روشندان کی اوٹ سے غائب ہو گیا، فرش پر اس کے پنجوں کے بل کودنے کی ہلکی سی دھمک سنائی دی اور چند ثانیوں بعد ہی وہ اسٹڈی روم میں موجود تھی۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" جنرل اسے دیکھتے ہی غصیلے لہجے میں برس پڑا۔ "بندر کی طرح وہاں کیوں ٹنگی ہوئی تھیں؟ تمھیں تو اس وقت خوابگاہ میں ہونا چاہیے تھا۔"

سیتا کے چہرے پر سنجیدگی عود کر آئی۔ "میں نے ساری رات پلک بھی نہیں جھپکائی ہے۔ تمھاری اضطراری حالت دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آج کی رات کچھ ہونے والا ہے۔ میں تو اپنی دانست میں تمھاری نگہبانی کر رہی تھی۔"

"کیسی نگہبانی؟ کس سے خطرہ تھا مجھے؟" جنرل نے چڑچڑے لہجے میں سوال کیا۔

"بس قیاس تھا میرا۔" سیتا خفت آمیز لہجے میں بولی۔

"لعنت ہے تمھارے قیاس پر۔" جنرل پیر پٹخ کر غرایا۔ اور دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر جاتے جاتے پھر پلٹ پڑا۔

"میں فوٹوگرافر بلوا رہا ہوں۔" اس بار اس کا لہجہ معتدل تھا۔ "تم دونوں پاسپورٹوں کے لیے تصاویر بنوانے کے بعد سو گئے تاکہ پھر کسی خلل کے بغیر لمبی نیند لے سکو۔"

اور وہ ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے نکل گیا۔

سیتا چند ثانیوں تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر والہانہ

انداز میں میرے سینے سے لپٹ گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مدّتوں بعد میرا وجود ہواؤں سے بھی لطیف ہو کر بادلوں سے اوپر سکون اور آسودگی کی لازوال فضا میں تیر رہا ہو۔

سیتا مجھے کافی عرصے پہلے واپس مل چکی تھی لیکن مجھے ایک لمحے کے لیے بھی آزادی کی بے خوف زندگی میسّر نہ آسکی تھی۔ یکجائی کے بعد بھی ہم دونوں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ لامتناہی جدوجہد میں بسر ہو رہا تھا مگر اس روز پہلی بار میں نے اپنے اندر ایک بے خوف اور آزاد انسان کی سی طمانیت محسوس کی تھی اور یہ لمحے مجھے جنرل حسین العمادی کی چھت کے نیچے میسّر آئے تھے۔

سیتا میری باہنوں کے حصار میں سمٹی نہ جانے کتنی دیر سسکتی رہی ہم دونوں ایک دُوسرے کے لیے تھے مگر بارہا ایک دُوسرے کو پاکر کھو چکے تھے اور یقین کرنا مشکل تھا کہ ہماری یہ یکجائی کتنی دیرپا ثابت ہو سکے گی۔

شاید یہی بے اعتباری اس وقت سیتا کو مجھ سے جُدا نہیں ہونے دے رہی تھی مگر تا یہ کے۔ باہر سے آہٹ سنائی دی اور ہم مدہوشی کے ان رنگین لمحات کو طول نہ دے سکے۔

آنے والا جنرل بذاتِ خود تھا۔ اس کے پیچھے شہری لباس میں ایک مقامی نوجوان موجود تھا جس کے گلے سے کیمرہ جھول رہا تھا۔

"مناسب پس منظر کے ساتھ ان دونوں کی تصویریں لے لو۔" جنرل نے سگار کا ایک گہرا کش لے کر فوٹوگرافر سے کہا اور وہ ہٹڈی میں کوئی مناسب گوشہ تلاش کرنے لگا۔

ایک پردے کے سامنے ہم دونوں کی علیحدہ علیحدہ تصاویر لینے کے بعد فوٹوگرافر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"چلے جاؤ گے یا باہر تک رہنمائی کروں؟" جنرل نے اس سے سوال کیا۔

"ن... نہیں میں چلا جاؤں گا۔" اس نے جلدی سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

"جاؤ۔" اس بار جنرل ہم دونوں سے مخاطب ہوا۔ "خواب گاہ میں آرام کرو۔"

سیتا سر جھکا کر باہر نکل گئی اور میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

ہماری رات کی ابتدا اس وقت ہوئی جب باہر شاید سورج طلوع ہو چکا تھا مگر کھڑکیوں پر پڑے ہوئے دبیز نیلے پردوں سے روشنی کی ایک کرن تک کمرے میں نہ آسکی تھی۔

نہ جانے میں کتنی دیر گہری نیند سوتا رہا اور عجیب عجیب سے خواب دیکھتا رہا۔ آنکھ کھلی تو سیتا بستر پر موجود نہیں تھی۔

میں ملحقہ غسل خانے میں نیم گرم پانی کے شاور میں دیر تک نہاتا رہا اور جب بدن خشک کر کے باہر نکلا تو جنرل اپنی مکمل وردی میں خواب گاہ میں موجود تھا۔

وہ بغور میری طرف دیکھ رہا تھا، اس کے تیور دیکھ کر بے اختیار میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

"رات، بلکہ آج صبح تجربہ گاہ کے بارے میں تمھارے مذاکرات کس سے ہوئے تھے؟" اس نے چند ثانیوں کے جانگسل سکوت کے بعد دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ "مم... میں سمجھا نہیں۔"

"کون لوگ تھے وہ؟" جنرل نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

"اسرائیلی۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔

"ہوں۔" اس نے اضطراری طور پر سگار کی راکھ جھاڑی۔ "یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہو؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے بلاتوقف جواب دیئے جانے ہی میں عافیت سمجھی اور ذہنی طور پر خود کو کسی بدترین سانحے کے لیے تیار کرنے لگا۔

جنرل کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُسے میری دوہری حکمتِ عملی کے بارے میں کہیں سے سُن گن مل چکی تھی۔

"مگر کس بنا پر؟"

"اُن میں دو چہرے میرے شناسا تھے۔" میں نے بظاہر پورے اعتماد سے کہا۔ "اسی بنا پر میں اُن سب کو اسرائیلی سمجھا تھا۔"

"سودا اُن ہی دونوں نے طے کیا تھا۔"

"پوری بھیڑ میں وہی سب سے برتر نظر آ رہے تھے۔"

"ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالو۔" وہ قدرے آگے جھک کر بولا۔ "اُن میں کوئی روسی نژاد شخص تو نہیں تھا۔"

میری نگاہوں کے سامنے یکایک تاریک دھبے سے ناچنے لگے۔ بے اختیار جی میں آئی کہ جنرل کو دُور اچھال کر وہاں سے بھاگ نکلوں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

"نہیں۔" مجھے اپنی آواز کمزور محسوس ہوئی۔

"اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور قریب آکر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "مختلف خفیہ ٹھکانوں سے میرے آدمی دن رات اس عمارت کی نگرانی کر رہے تھے آج صبح سویرے دُوربینوں کے ذریعے جن افراد کو تجربہ گاہ والی عمارت میں داخل ہوتے دیکھا گیا اُن میں کچھ روسی نژاد بھی تھے۔"

"ہو سکتا ہے کہ رُوسی یہودی ہوں اور اب اسرائیلی شہریت کے حامل ہوں۔" میں نے اپنی مدافعت میں دلیل پیش کی۔

"خیر... وہ روسی ہوں یا اسرائیلی۔" وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ "ہم تجربہ گاہ کے عذاب سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ اسے کوئی بھی لے، انجام وہی ہوگا جو ہم نے سوچا ہوا ہے۔"

"یعنی منتقلی کے دوران مکمل تباہی؟" میں نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے۔" وہ بولا۔ "ابھی نگرانی جاری ہے ایک آدھ روز میں یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس سودے کی پشت پر کون لوگ تھے۔"

"اور اگر وہ روسی ہوئے؟"

"یہ ایک بہت بڑی دریافت ہوگی۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "خفیہ ذرائع سے اگر وہ اسرائیلی مفادات کا اس حد تک تحفظ کرتے ہیں تو آگے کیا باقی رہ جاتا ہے... خیر تمھارے لیے یہ باتیں شاید ناقابلِ فہم ہوں، تمھارے لیے خوش خبری یہ ہے کہ تمھارے سارے کاغذات تیار ہو گئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خاکی رنگ کا ایک وزنی لفافہ میری گود میں اچھال دیا۔

اس میں میرا اور سیتا کا یمنی پاسپورٹ، بڑی مالیت کے ڈالرز چیکوں کی ایک گڈی اور صنعا سے جدہ تک کے دو ٹکٹ موجود تھے۔

"بس ایک چوک ہو گئی۔" میں پاسپورٹ کے مندرجات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟"

"میرا نام صفدر علی کے بجائے کوئی اور نام ہوتا تو بہتر رہتا۔"

"چڑیا کے بچے کو بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ تم یمن سے باہر نکلے ہو۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "تم پر کوئی آنچ نہیں آسکے گی۔"

"روانگی کا کیا بندوبست ہوگا؟"

"طیارہ شام کے سات بجے پرواز کرے گا، تم کو یہاں سے ساڑھے چھ بجے ایک آرمرڈ کار لے جائے گی اور رن وے پر طیارے کے قریب اتار دے گی۔"

بے اختیار میرا دل بھاری ہو گیا۔ جنرل حسین العمادی واقعی ایک عظیم انسان تھا۔

آدمی بہت گھاگ تھا۔ پہلی ہی نگاہ میں میری جذباتی کیفیت کو بھانپ گیا اور ہنستے ہوئے وہاں سے اُٹھ گیا۔

"ناشتہ تم نے سو کر گنوا دیا۔ آؤ کھانے کی میز تیار ہو گی۔"

میں اس کے پیچھے طعام گاہ میں داخل ہوا تو چونک پڑا وہاں چار خواتین موجود تھیں ان میں سے ایک تو خادمہ معلوم ہو رہی تھی، دُوسری میری سیتا۔

"یہ میری بیوی فارحہ اور یہ میری بیٹی صالحہ ہے۔" جنرل خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔ "دونوں نے دل و جان سے تمھاری بیوی کو بہن بنا لیا ہے۔"

"خوش نصیبی ہے میری۔" کافی عرصے کے بعد مجھے کشت و خون کے بجائے وہ نرم و نازک ماحول میسّر آیا تھا جہاں لفظوں کی سنگینی کے بجائے لطافت کام آتی ہے۔

فارحہ سُبک اندام، دراز قامت اور تیکھے نقوش کی مالک تھی۔ اُس کی عُمر کسی طرح بھی چالیس برس سے کم نہیں رہی ہوگی مگر اپنے بے داغ چہرے اور اس پر سجی ہوئی معصومانہ مسکراہٹ کے باعث اُسے ستائیس اٹھائیس برس کی سمجھا جا سکتا تھا۔

بیٹی اپنی ماں سے کہیں زیادہ معصوم اور خوبصورت تھی۔

میری نگاہوں میں یک بیک اپنا تابناک مستقبل گھوم گیا۔ اپنا گھر اور اپنی کائنات جس کا تصوّر ہی انسان کے رگ و ریشہ میں زندہ رہنے اور کچھ کر گزرنے کی امنگ پیدا کر دیتا ہے۔

میز پر کھانوں کی اقسام محدود مگر لذیذ تھیں۔

مجھے فارحہ سے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ میری موجودگی کی خوشی میں لذیذ قیمہ سیتا نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔

"یہ کب سیکھ لیا تم نے؟" فارحہ کے انکشاف پر میں نے سیتا سے سوال کیا۔

"بہت کچھ سیکھ چکی ہے۔" جنرل نے قہقہہ مار کر کہا۔ "بھول جاؤ کہ یہ وہی جنگلی لڑکی ہے جو برسوں پہلے تم سے بچھڑ گئی تھی۔"

اور سیتا خاموش رہی۔

یمن کی سرزمین پر جنرل حسین العمادی کے گھر گزارا ہوا وہ دن میری زندگی کی حسین یادوں میں ایک ناقابلِ فراموش اثاثہ ہے۔

جنرل کھانے سے فارغ ہو کر دفتر چلا گیا مگر فارحہ اور صالحہ ہمارے ساتھ رہیں۔ باہمی اعتماد اور احترام کی مقدس سی فضا میں شائستہ مذاق بھی ہوا اور جذباتی باتیں بھی۔ اُن دونوں کو جنرل نے میری اور سیتا کی روانگی کے بارے میں بتا دیا تھا اور وہ سیتا سے اصرار کر رہی تھیں کہ وہ اپنی روانگی چند روز کے لیے ملتوی کر دے۔

شام کو جنرل دفتر سے لوٹا تو ایک تھیلا اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے آتے ہی تھیلا میرے حوالے کر دیا۔

"اندازے سے تم دونوں کی ناپ کے کپڑے لایا ہوں۔ یہاں سے تم مقامی لباس میں روانہ ہو تو بہتر رہے گا۔"

اس کی تجویز معقول تھی اور وقت کم رہ گیا تھا لہٰذا ہم دونوں لباس تبدیل کرنے چلے گئے۔

میرے لیے تو لباس کی تبدیلی اتنی دشوار نہیں تھی مگر لباس کے اوپر پہننے کے لیے برقع دیکھ کر سیتا اُلجھن میں پڑ گئی۔

"شناخت سے بچنے کے علاوہ برقع معزز گھرانوں کی عورتوں کی شناخت بھی ہے۔" چائے کے دوران سیتا کی پریشانی سے واقف ہونے کے بعد جنرل بولا۔ "صنعا اور جدّہ تک اُسے برداشت کر لو، جدّہ سے طیارہ بلند ہوتے ہی اسے خیرباد کہہ دینا۔"

"جیسے زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں۔" فارحہ یہ کہہ کر ہنس پڑی۔

سوا چھ بجے مٹیالے رنگ کی چاروں طرف سے بند، آہنی باڈی والی فوجی گاڑی جنرل کے مکان پر آ پہنچی۔

اس گاڑی کا کمان دار ایک نوجوان میجر تھا جسے جنرل نے مجھ سے اور سیتا سے متعارف کرایا اور چند منٹ بعد ہم دونوں پرجوش انداز میں ان لوگوں کو الوداع کہہ کر آرمرڈ کار میں سوار ہو گئے جو باہر سے بدوضع نظر آنے کے باوجود اندر سے بہت آرام دہ تھی۔

ڈرائیور سمیت اس گاڑی میں کل چھ نفوس تھے۔ طاقتور انجن والی وہ کار تیزی کے ساتھ منزل کی جانب بڑھتی رہی اور پھر ایک چوکی پر رسمی شناخت کے بعد کار رن وے پر دوڑنے لگی۔ صنعا کا ائرپورٹ شاید وسیع رہا ہو مگر وہاں طیاروں کی تعداد بہت کم نظر آئی لیکن ہمارے لیے یہ کافی تھا کہ ہمیں لے جانے والا طیارہ رن وے پر موجود تھا۔

جنرل نے سارا بندوبست پیشگی کیا ہوا تھا کیونکہ آرمرڈ کار طیارے کی سیڑھیوں کے قریب رکی تو ایک امیگریشن افسر نے مشینی انداز میں مستعدی سے ہمارے پاسپورٹوں پر خروج کی مہر ثبت کی دوسرے شخص نے ٹکٹوں سے کوپن الگ کیے اور ہم طیارے میں سوار ہو گئے۔

ہم دونوں دیگر مسافروں پر زیادہ توجہ دیے بغیر ان نشستوں پر جا بیٹھے جن کی نشاندہی اول درجے میں مامور عراقی ائرہوسٹس نے کی تھی۔

رسمی اعلانات کے بعد حفاظتی بند باندھے گئے جہاز کے انجن یکے بعد دیگرے اسٹارٹ ہوئے اور وہ دیوہیکل مشینی پرندہ رن وے پر رینگنے لگا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ مہلک کیمیاوی پستول بدستور میری تحویل میں تھا۔

یمن سے روانگی تو جنرل کے خصوصی انتظامات کے تحت ہوئی تھی لہٰذا طیارے میں سوار ہونے سے قبل تلاشی کی نوبت ہی نہیں آئی لیکن جدہ پہنچنے پر وہاں کے کسی لاؤنج میں نصب کوئی خفیہ مشین اس کی نشاندہی کر سکتی تھی۔

جدہ ائرپورٹ میرے لیے اجنبی تھا مگر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خصوصی بندوبست کے بغیر ہتھیاروں کی نشاندہی اتنی سہل نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس وقت میں اپنی آزادی کے سفر کی ابتدائی پرواز پر تھا اور اس وقت کوئی موہوم سا خطرہ بھی مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اس مہیب پستول کو دوران پرواز ہی ٹھکانے لگا دوں گا کسی بدترین صورت حال کے لیے زہریلے تیروں والی شیشی میرے پاس موجود ہی تھی۔

طیارہ فضا میں بلند ہو چکا تھا حفاظتی بند کھولے جا چکے تھے اور تمباکو نوشی کرنے والے مسافروں نے یوں بیک وقت سگریٹیں سلگائی تھیں جیسے اس کام کے لیے وہ نیک ساعت ہی ہو۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے عربی میں سیتا سے کہا اور اپنی نشست چھوڑ دی۔ میں باتھ روم کا ایک چکر لگا کر کیمیاوی پستول کو ٹھکانے لگانے کا موقع تلاش کرنا چاہتا تھا۔

اپنی نشست چھوڑ کر میں فلائٹ کچن کی تنگ سی راہداری سے گزرا اور پھر ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر اندر گھسنا ہی چاہتا تھا کہ میرے قدم فرش پر گڑ کر رہ گئے۔

اول درجے کی عقبی نشستوں کے درمیان سے دو سرد اور سفاک نگاہیں پلک جھپکائے بغیر مجھے گھور رہی تھیں بالکل کسی مُردے کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی طرح۔

عقب سے کسی نے راستہ حاصل کرنے کے لیے نرمی سے میرے شانے کو چھوا اور میں بُری طرح چونک پڑا۔

ہوسٹس مسکراتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

سرد اور سفاک نیم وا آنکھیں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور اس چہرے پر موجود پتلے پتلے ہونٹوں کے سروں پر موہوم سا زہر خند ابھرنے لگا تھا۔

میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور ٹوائلٹ میں گھس گیا۔

اندر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے سوچا کہ لباس وغیرہ کی تبدیلی سے میری ہیئت اتنی بدل چکی تھی کہ پہلی نظر میں مجھے بحیثیت صفدر پہچان لینا اگر دشوار نہیں ہوا تھا تو اس قدر سہل بھی نہیں رہا تھا۔

لیکن آندرے سلوف کی اس جہاز میں موجودگی اگر کسی منصوبے کے تحت تھی تو اسے جنرل کی تمام تر رازداری کے باوجود میری روانگی کا علم ہو گیا تھا جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آندرے سلوف کو مقامی حکام سے میری ملی بھگت کا بھی اندازہ ہو چکا تھا۔

اور اگر وہ اتفاقاً میرا شریکِ سفر تھا تو یہ کس قدر ناخوشگوار اتفاق تھا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھانا چاہا کہ اس وقت شاید وہ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا لیکن پھر وہ آخری لمحات پر ابھرنے والی زہریلی مسکراہٹ کا کیا جواز تھا

کسی نے بے تابی سے ٹائلٹ کا دستہ گھمانا چاہا اور میری بھٹکی ہوئی ذہنی رو دوبارہ اپنے راستے پر آ گئی۔

میں نے جیب پر ہاتھ لگا کر اپنا اطمینان کیا کہ مہلک شعاعیں خارج کرنے والا کیمیاوی پستول میرے قبضے میں موجود تھا۔

جدہ ابھی دور تھا۔ طیارہ آسمان کی بے کراں وسعتوں میں محو پرواز تھا اور آندرے سلوف مجھ سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ آندرے سلوف کا معاملہ صاف ہونے تک کیمیاوی پستول اپنے قبضے میں رکھوں گا۔

ٹوائلٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ارادہ کیا تھا، کہ آندرے سلوف کی طرف نہیں دیکھوں گا، مگر اضطراری طور پر گردن ادھر گھوم ہی گئی۔

اس کی نگاہیں بدستور ٹوائلٹ کے دروازے پر مرکوز تھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسی کیفیت میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہو۔

میں آہستگی سے چلتا ہوا اپنی نشست پر آ گیا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود میں یک بیک خلا پیدا ہو گیا ہو۔



میں اپنی نشست پر بیٹھا تو سیتا چونک پڑی۔

"کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان ہو۔" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ جس قطار میں ہمیں بٹھایا گیا تھا اس میں دو نشستیں ایک دوسرے سے ملحق تھیں اور درمیان میں چھوڑی ہوئی راہداری کے بعد چار نشستوں کی قطار تھی۔

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" میں نے سرسری لہجے میں جواب دے کر اپنے لیے سگریٹ سلگائی اور اضطراری طور پر اس کے گہرے گہرے کش لینے لگا۔

اسی لمحے عقب سے کئی ملی جلی تحیر آمیز آوازیں ابھریں اور میں فوراً اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا تھا۔ آندرے سلوف کا بدن پشتگاہ سے ڈھلک کر غیر فطری انداز میں داہنی طرف جھول رہا تھا۔ اور اس کے قرب جوار میں بیٹھے مسافر اسے سہارا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں فضائی کمپنی کی دو میزبان لڑکیاں بوکھلائی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔

"کیا بات ہے؟" سیتا نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"کوئی مسافر بیمار ہو گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں بادلِ ناخواستہ اپنی جگہ بیٹھ گیا ورنہ میری خواہش تھی کہ قریب جا کر آندرے سلوف کی بگڑی ہوئی حالت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کروں۔

چند ثانیوں بعد جہاز کے پیجنگ سسٹم پر کپتان کی آواز نے مسافروں کو متوجہ کر لیا وہ ایک مسافر کی ناگہانی علالت کا اعلان کرکے درخواست کر رہا تھا کہ مسافروں میں اگر کوئی ڈاکٹر موجود ہو تو بیمار کی دیکھ بھال میں عملے کی مدد کرے۔

کئی متجسس اور جوشیلے مسافر آندرے سلوف کے گرد جمع ہو گئے تھے مگر عملے کی لڑکیوں نے انھیں نرمی سے اپنی نشستوں پر لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

اسی اثنا میں ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا اور محض چند ثانیوں کی جانچ پڑتال کے بعد اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

آندرے سلوف کسی صدمے کے باعث اچانک حرکتِ قلب بند ہونے کے سبب انتقال کر چکا تھا۔

میرے دل سے بے اختیار ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا۔

اس نے صبح سویرے ہی بدترین دباؤ کے تحت مجھ سے ایک اہم سودا کیا تھا اور اس پرواز سے نہ جانے اپنے کس خفیہ مشن پر جا رہا تھا کہ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے اسے زندگی سے محروم کر دیا۔

میرا قیاس تھا کہ آنرک روہان کی قیام گاہ پر ہونے والے ٹکراؤ میں آندرے سلوف آخرکار مجھ سے اس قدر خائف ہو گیا تھا کہ طیارے میں میری صورت دیکھتے ہی اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ختم ہو گیا۔

ہو سکتا ہے کہ وہ یہی سمجھا ہو کہ میں اس کی بدنیتی کا انتقام لینے کے لیے اس کے تعاقب میں طیارے پر سوار ہوا تھا حالانکہ اس پرواز پر اس کی موجودگی کا انکشاف میرے لیے بھی شدید تشویش کا باعث ثابت ہوا تھا۔

طیارے میں دورانِ پرواز ایک مسافر کی ناگہانی موت نے پوری فضا کو بوجھل بنا کر رکھ دیا تھا۔ ہر چہرے پر بشاشت کی جگہ تشویش اور تفکر کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

انجنوں کی مسلسل گونج میں وہ دیو ہیکل طیارہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھا اور میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک پیجنگ سسٹم پر کپتان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

کپتان کے بیان کے مطابق اس وقت ہمارا طیارہ سعودی عرب کے پُرفضا پہاڑی شہر طائف پر سے گزر رہا تھا۔

میں بے اختیار کھڑکی سے نیچے دیکھنے لگا۔

گہری تاریکی کے ہولناک سمندر میں ہزاروں فٹ نیچے روشنی کے بے شمار ننھے ننھے نقطے ایک دوسرے سے گتھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

طائف کی ان فسوں خیز روشنیوں میں میرے ایک دوست کا بھی حصہ تھا جس سے ملے مجھے برسوں بیت چکے تھے مگر لیبیا میں قیام کے دوران مجھے عظیم قریشی سے علم ہوا تھا کہ راتوں کو میرے ساتھ آوارہ گردی کرنے والا دل پھینک شعیب جس رفعت کا متلاشی تھا وہ آخرکار اسے طائف کی بجلی کمپنی کے ذریعے میسر آ گئی تھی۔

میں نے مدتوں اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا — مگر پائلٹ کی زبان سے طائف کا نام سن کر یادوں کے سارے دریچے یک بیک وا ہو گئے اور دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں نے جنرل عماد الحسینی سے جدہ کے بجائے طائف تک پہنچانے کی بات کی ہوتی تاکہ اس یارِ وفادار سے تو مل لیتا جس کے ساتھ کبھی محض ایک تل کی وجہ سے سالم لڑکی کے قصیدے پڑھے جاتے اور کبھی دراز گیسوؤں کی دید میں میلوں کا سفر طے ہو جاتا تھا۔ حسین اور اجلے چہروں کی پرستش میں کبھی وہ میرا رقیب ہوتا تھا اور کبھی میں اس کا۔ مگر وہ ان دنوں کی باتیں تھیں جب آتش جوان ہوا کرتا تھا۔

خیالات کا دھارا سست تھا اور جہاز کی رفتار تیز تر — بچھڑے ہوئے دوست کا شہر اور اس کی جلائی ہوئی روشنیاں آناً فاناً میں اندھیرے کے مہیب سمندر نے نگل لیں۔

اور پھر خیالات کا دھارا بھی بدل گیا۔

بن غازی میں وہ خبر ملے بہت دن بیت چکے تھے۔ اس وقت سے میں نہ جانے کتنے ٹھکانے بدل چکا تھا۔ انسان ایک بار اپنی جگہ چھوڑ دے تو پھر محض ایک مہاجر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چند تنکے سمیٹ کر آشیانہ بناتا ہے پھر اس سے بہتر کی تلاش میں کسی اور سمت میں پرواز کر جاتا ہے۔ طائف، بن غازی، کراچی، پیرس، نمیس اور خرطوم اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی پرواز ہر لمحہ محفوظ سے محفوظ تر ٹھکانے کی طرف ہوتی ہے اور وہ نہ جانے اب کہاں تھا۔

"کیا سوچے جا رہے ہو؟" سیتا نے میرے پہلو میں ہولے سے کہنی مار کر سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

میں چونک پڑا۔ "جہاز پر ایک مسافر کی موت واقع ہو چکی ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں سیتا کو جتانے کی کوشش کی۔

"وہ تو میں بھی سن چکی ہوں۔" وہ قدرے چڑچڑے لہجے میں بولی۔ "تم کیوں اس کے سوگ میں مبتلا ہو؟"

"یہ باتیں جہاز سے اترنے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور وہ تنک کر اپنی نشست پر سیدھی بیٹھ گئی۔

اس کا ٹوکنا میرے لیے اس اعتبار سے بہتر رہا کہ میرا ذہن ماضی کی یادوں میں بھٹکنے کے بجائے تازہ ترین صورتِ حال کے تجزیے میں مصروف ہو گیا۔

آندرے سلوف قدرت کی بے آواز لاٹھی کا شکار ہو چکا تھا اور اس کے مر جانے کے بعد طیارے میں میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا لہٰذا یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں فوری طور پر کیمیاوی پستول سے نجات حاصل کر لیتا۔

میں نے اپنی نشست چھوڑ دی اور دوبارہ ٹوائلٹ میں جا پہنچا۔

میں نے جیب سے وہ ہولناک ہتھیار نکال کر اس کا الوداعی جائزہ لیا اور پھر اسے استعمال شدہ اشیا کے ڈبے میں پھینکنے سے قبل ہی مجھے ایک اچھوتا خیال سوجھ گیا۔

اپنی مکمل حالت میں وہ ہتھیار تباہ کن تھا اور یہ امکان تھا کہ صفائی کے عملے کا کوئی رکن جہالت اور تجسس کے باعث خود ہی اس کا شکار ہو جاتا لہٰذا میں نے بہت احتیاط سے زہریلے سیال والا ننھا سا آہنی سلنڈر پستول سے الگ کرکے جیب میں ڈال لیا کیونکہ اس پر کسی بھی طرح ہتھیار ہونے کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا اور ناکارہ پستول ڈبے میں ڈال کر اوپر سے خاصا بڑا کاغذ پھینک دیا اور ٹوائلٹ سے باہر آ گیا۔

"بار بار پیشاب کیوں آ رہا ہے؟" میرے بیٹھتے ہی سیتا طنزیہ لہجے میں میرے کان کے نیچے منمنائی۔

"تمہارے ڈر لگ رہا ہے۔" میں اسے گھورتے ہوئے دھیمی آواز میں غرایا۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر کھلکھلا کر ہنس پڑی کیونکہ قہقہے میں اس کا بدن زور زور سے ہل رہا تھا۔

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بدترین حالات میں بھی وہ اپنی زبان کو لگام دینا جانتی تھی۔

چند منٹ بعد اسکرین پر تمباکو نوشی کی ممانعت کی ہدایات روشن ہو گئیں۔ قدرے توقف کے بعد کپتان نے لینڈنگ کے بارے میں عربی، انگریزی اور فرنچ میں ہدایات جاری کیں اور طیارے میں چھایا ہوا جمود ٹوٹ گیا۔

کششِ ثقل کے بدلتے ہوئے اثرات کے تحت پہلے طیارے کی سمتیں بدلنے کا احساس ہوا پھر طیارہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔

جیٹ انجنوں کے بدلتے ہوئے تیز شور میں طیارے کے پہیوں نے خفیف سے جھٹکے سے رن وے کو چھوا اور پھر دوڑتے ہوئے طیارے کی رفتار سست ہونے لگی۔

جہاز کے پوری طرح رکنے سے قبل ہی بیشتر مسافر حفاظتی بیلٹ کھول کر راہداریوں میں دروازوں کے قریب جمع ہونے لگے تھے کہ ایک ائر ہوسٹس کو مائیک سنبھالنا پڑا۔

وہ جملہ مسافروں سے اپنی نشستوں پر بیٹھے رہنے کی درخواست کر رہی تھی تاکہ متعلقہ سعودی حکام دورانِ پرواز مرنے والے کے بارے میں رسمی کارروائیاں پوری کر سکیں۔

کئی تند خو عرب مسافروں نے اس ہدایت پر خاصی بدکلامی کا مظاہرہ کیا مگر اپنے تنے ہوئے تیوروں کے باوجود اپنی جگہ بیٹھنا پڑا۔

طیارہ رکنے کے چند ثانیوں بعد اول درجے کے کیبن کا دروازہ کھلا اور تین سعودی پولیس افسر دندناتے ہوئے طیارے میں گھس گئے۔ ان کے پیچھے آنے والے دو سپاہی دروازے پر ہی رک گئے۔

آندرے سلوف کی لاش اس وقت بھی نشست پر موجود تھی۔ جس کی پشت گاہ کو پوری طرح پیچھے ڈھلکا دیا گیا تھا۔ اس کے برابر والی عورت کو کہیں اور خالی جگہ دے دی گئی تھی تاکہ وہ لاش کی دہشت سے کسی حد تک محفوظ رہ سکے۔

سعودی پولیس افسران کا رویہ بہت باوقار تھا۔ پہلے انھوں نے آندرے سلوف کی موت کی تصدیق کرنے والے ڈاکٹر سے کچھ بات کی، پھر متوفی کے برابر والی عورت کے پاس جا کر چند سوالات کیے اور تقریباً وسط میں آ گئے۔

"ہم زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔" ان میں سے ایک بلند آواز میں بولا۔ "اگر کسی بھی مسافر کو مرنے والے کے بارے میں کوئی بات معلوم ہو تو ازراہِ کرم ہمیں بتا دے۔ ہم دونوں دروازوں پر موجود ہیں اور اب مسافر اتر سکتے ہیں۔"

اس کا اعلان رسمی ثابت ہوا کیونکہ ہم سے پہلے اترنے والوں

نے پولیس افسران پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور مجھے یقین تھا کہ بعد میں اترنے والے بھی آندرے سسلوف کے بارے میں سعودی پولیس کو کچھ نہ بتا سکیں گے۔

ایئرپورٹ پر رسمی کارروائیوں میں ہمیں بمشکل چند منٹ لگے اور ہم ایئرپورٹ کی وسیع و عریض عمارت سے باہر آ گئے۔

بحیرۂ احمر کے مشرقی ساحل پر صحرائے عرب کا وہ شہر جدت اور قدامت کا ایک عجیب امتزاج پیش کر رہا تھا۔ ٹیکسی میں ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے بلند و بالا عمارتوں کی کثرت سعودی قوم کے اس عزم کا اظہار کر رہی تھی کہ وہ عسرت اور قدامت کی ہر نشانی کو آسودگی اور ترقی میں بدل ڈالیں گے۔

ہوٹل میں ہمیں دوہرے بستر والا کمرہ بآسانی مل گیا۔ میں نے وہیں ڈالرز کی ایک خاصی تعداد مخصوص کاؤنٹر سے ریال میں تبدیل کرالی تاکہ کسی مرحلے پر کوئی دشواری نہ ہو۔ یمنی کرنسی میں نے دیدہ دانستہ تبدیل نہیں کرائی۔

پاسپورٹ میں میرا نام تو صفدر علی ہی مندرج تھا مگر سیتا کا نام قدامت پسند عربوں کی تقلید میں بیگم صفدر علی تھا۔

ہمارے پاس گو سامان نہیں تھا مگر کمرے تک رہنمائی کے لیے ہوٹل کا ایک ملازم دوسری منزل تک ہمارے ساتھ گیا اور کمرہ دکھا کر واپس لوٹ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دروازہ بند کر کے پلٹا تو سیتا برقع اتار کر مسہری پر اچھال چکی تھی اور یوں گہرے گہرے سانس لے رہی تھی جیسے کسی قید سے نجات ملی ہو۔

"برقع اتنی بری چیز تو نہیں ہے!" میں نے طنزیہ لہجے میں اسے چھیڑا۔

"میں نے کب ایسا کہا؟ یہ تو بس عادت کی بات ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے تو ان عربوں میں ایسی عورتیں بھی دیکھی ہیں جو مستقل برقع اوڑھنے کے باوجود اسے ایک غیر ضروری عذاب سمجھتی ہیں مگر پھر بھی اسے لادے رہتی ہیں۔"

"بغاوت عورت کے خمیر میں ہے۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "خواہ وہ ماحول سے ہو یا معاشرے سے اور جنت سے آدم کو نکلوانے والی بھی عورت ہی تھی۔"

"جنت اور جہنم کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ چڑ کر بولی۔ "بات صرف اتنی ہے کہ برقع اوڑھنے والیاں اپنے بال پسندیدہ انداز میں نہیں سنوار سکتیں۔"

میں جوتے اتار کر بستر پر دراز ہو گیا۔ "اب تمہارا نام کیا ہوگا؟"

"جو ہے اس میں کیا خرابی ہے؟"

"پاکستان پہنچنے تک میں تمہیں لیلیٰ کہہ کر پکاروں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "پاسپورٹ پر تمہارا کوئی نام نہیں ہے لیکن کسی وقت مخاطب کرنے کی ضرورت پیش آ ہی سکتی ہے، میں نہیں چاہتا کہ ہمارے اصلی ناموں کی بنا پر کسی کے ذہن میں ہماری طرف سے کوئی خیال آئے۔ اب ہمیں ماضی سے پیچھا چھڑا کر جلد از جلد نئی زندگی کا آغاز کر دینا چاہیے۔"

"نئی زندگی۔" اس کی آنکھیں مسرت سے دمکنے لگیں۔ "میں تو مدت سے اس گھڑی کی منتظر ہوں۔ شاید اب وہ وقت بھی قریب آ گیا ہے۔"

"تھوڑا سا صبر کرنا ہوگا، یہاں سے ہم براہ راست پاکستان نہیں جائیں گے۔" میں نے اپنے موہوم اندیشوں کے پیش نظر کہا۔

"کیوں؟ اب کیا دشواری ہے وہاں جانے میں؟"

"محض احتیاط۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "جنرل کو علم ہے، یوسف جانتا ہے کہ ہم جدہ آئے ہیں... اگر وہ دونوں کسی افتاد میں مبتلا ہو کر یہ بات اگل دیں تو جدہ سے آگے ہماری منزل کا سراغ لگانا ناممکن نہیں ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کسی کو بھی ہمارا سراغ مل سکے ہمیں ماضی سے سارے رشتے توڑ کر آگے بڑھنا ہوگا۔"

"مگر جنرل اور یوسف کو یہ تو معلوم ہے کہ آخرکار تمہاری منزل پاکستان ہوگی۔" اس نے مجھے یاد دلایا۔

"آخرکار۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "کل، ایک ماہ بعد، ایک سال بعد یا دس سال بعد۔ میں کسی کو اس تعین کا موقع نہیں دوں گا۔"

"پھر ہم یہیں پڑے رہیں گے؟"

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "ہمارے پاس کافی رقم ہے، ہم تیزی سے اپنے ٹھکانے بدلیں گے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک جائیں گے اور پھر کسی مناسب مرحلے پر پاکستان کا رخ کریں گے۔"

وہ مطمئن ہو گئی اور دستی بیگ میں اپنے لیے کوئی آرام دہ لباس تلاش کرنے لگی۔

"اہم باتوں کو بھول کر فضولیات میں دماغ لڑانے میں تم خاصی ماہر ہو۔ دوسری عام عورتوں کی طرح۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"کون سی اہم بات بھولی ہوں؟"

"جہاز میں ایک مسافر کی موت ہوئی تھی۔"

"روز ہزاروں آدمی مرتے ہیں، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ جہاز میں سفر کرتا ہوا مرا تھا، اس میں ایسی کیا بات تھی؟"

"شاید یہ میری زندگی کا ایک ناقابل یقین اتفاق تھا۔" میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "وہ آندرے سسلوف تھا۔ وہی سفارت کار جس نے مجھے اور یوسف کو چوہے دان میں پھانس کر ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔"

"وہی اسرائیلی جس سے تم نے تجربہ گاہ کا سودا کیا تھا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"اسرائیلی نہیں وہ کسی اور ملک کا نمک خوار تھا۔"

"مگر جنرل سے تو تم اسرائیلیوں کی ہی بات کرتے رہے اور مجھے بھی یہی بتایا تھا۔" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم سے علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے تجربہ گاہ کے سلسلے میں ہونے والے دوہرے کھیل کی تفصیلات بتانی شروع کر دیں۔

میرے خاموش ہوتے ہی وہ پھریری لے کر رہ گئی۔ "تم نے بہت خطرناک جوا کھیلا تھا۔ جنرل کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو ساری رعائتیں سلب کر کے ہم دونوں کو مروا ڈالتا۔"

میں ہنس پڑا۔ "اسرائیلیوں کو میں کہاں تلاش کرتا۔ آندرے سسلوف سے تو براہ راست یوسف کا تعلق تھا۔ جنرل یمن کی سرزمین سے تجربہ گاہ کی خفیہ منتقلی چاہتا تھا اور میں نے یہ بندوبست کرا دیا۔"

"لیکن جب وہ ساز و سامان اسرائیل کے بجائے کسی اور ملک پہنچے گا تو کیا ہوگا؟" وہ اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکی تھی۔

"سامان کہیں بھی نہ پہنچ سکے گا۔ جنرل کے منصوبے کے اسی حصے نے مجھے جوا کھیلنے پر اکسایا تھا۔ سامان لے جانے والے جہازوں کو یمن کی حدود سے باہر سمندر میں جنگی طیارے تباہ کر دیں گے۔"

"اوہ خدا!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رہ گئی۔ "جنرل اپنے ملک کا وفادار ہے لیکن ہر خطرے سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ میری تذکرہ سننے کے بعد میں مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ تجربہ گاہ کا ساز و سامان اسرائیل پہنچنا ہر اعتبار سے عربوں کو مہنگا پڑے گا مگر جنرل تو پہلے ہی اس کے بارے میں فیصلہ کر چکا ہے۔"

"وہ بہت مخلص اور نیک انسان ہے۔"

"معاوضے کی اس رقم کا کیا بنے گا جو تمہیں لندن میں ملنے والی تھی؟" ایک مرتبہ وہ موضوع چھڑ جانے کے بعد سیتا کا تجسس پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

"وہ یمن سے فوری روانگی کا ایک بہانہ تھا۔ رقم تو میں نے کل رات ہی صنعا میں وصول کر لی تھی۔"

"مگر ہے کہاں وہ رقم؟"

"آندرے سسلوف سے تین لاکھ ڈالر وصول کیے تھے جو میں نے تنظیم کے فنڈ میں جمع کرانے کے لیے یوسف کو دے دیے تھے۔"

"پھر تو ہمارا جدہ میں ٹھہرنا بھی خطرناک ہے۔" وہ بولی۔ "اس سے پہلے کہ جنرل کو ان میں سے کسی بات کا علم ہو ہمیں اس کی دسترس سے دور نکل جانا چاہیے۔"

"اب تمہاری؟ وہ پٹری راہ راست پر آئی ہے، میرا بھی یہی پروگرام ہے آج کی رات یہاں آرام کر کے ہمیں روانہ ہو جانا ہے۔"

"مگر سسلوف کی بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔" اس نے مجھے ٹوکا۔

"یہ عجیب اتفاق تھا کہ وہ اسی جہاز پر سوار تھا۔ ٹوائلٹ میں جاتے ہوئے میں نے اسے دیکھا اور اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ وہ یقینی طور پر مجھے پہچان گیا تھا اور شاید میری موجودگی سے خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ یہی خوف اور حیرت اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اگر وہ خود نہ مرتا تو میں نے اسے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

طویل مدت کے بعد وہ پہلی رات تھی جو ہم نے بے فکری کے ساتھ گزاری۔ رات کے ان سرور آگیں لمحات میں میں نے سیتا کو بالکل اسی مقام پر محسوس کیا جہاں وہ مجھ سے بچھڑنے سے قبل تھی۔

رات دھیمے دھیمے گزرتی رہی اور کسی لمحے مجھ پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو سیتا نہا دھو کر اپنے بال خشک کرنے میں مصروف تھی۔

"تکان دور ہوئی؟" اس نے مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ اور بڑھ گئی ہے۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے بستر چھوڑ دیا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد ہم نے اپنا مختصر سا اسباب بیگ میں سمیٹا اور اس سمیت کمرے سے باہر آ گئے۔

نیچے میں نے چابی کاؤنٹر پر واپس کرتے ہوئے اپنا بل تیار کرنے کی ہدایت کی اور ناشتے کے لیے چل دیا۔

وہاں مغربی طرز کا ناشتہ فراہم کیا گیا جو انداز کی حد تک مغربی تھا مگر مقدار میں عربی۔ کیونکہ میں نے عربوں کے درمیان طویل عرصہ گزار کر یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ بلا استثنیٰ خوش خوراک ہوتے ہیں اور شاید اسی طرح شدید صحرائی موسموں کے خلاف جسمانی قوت مدافعت برقرار رکھتے ہیں۔

ناشتے کا بل ادا کر کے ہم کاؤنٹر پر واپس آئے اور اقامتی اخراجات کی ادائیگی کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔

پہلے میرا ارادہ شہر کی کسی سفری ایجنسی سے پروازوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا تھا جسے میں نے ترک کر دیا۔

صنعا سے جدہ تک کے سفر کے لیے تو ایک دستی بیگ کافی تھا مگر نسبتاً لمبے سفر کے لیے ہم اتنے تہی دست ہوتے تو کوئی نہ کوئی چوکنا ہو سکتا تھا۔

ایک مختصر سا سوٹ کیس اور اسے بھرنے کے لیے کچھ ملبوسات ہمیں ایک ہی بازار سے مل گئے۔ جس دوکان سے میں نے مردانہ قمیصیں

لیں وہاں سارا ہی عملہ عربی لباس میں نظر آ رہا تھا مگر ان کے خدو خال مقامیوں جیسے نہیں تھے اس کے باوجود دکان میں ہمارا استقبال شستہ عربی میں کیا گیا۔

"ہمیشے ڈر بوڑھے بتانا۔ سیاح لگتا ہے۔" سیلز مین پر اپنا مدعا ظاہر کرتے ہوئے میں نے کیش رجسٹر پر موجود ادھیڑ عمر شخص کی آواز سُنی اور چونک پڑا۔

وہ دکان کا مالک یا منیجر تھا اور اُس نے پنجابی زبان میں اپنے عملے کو ہدایات دی تھیں۔

بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس سے الجھ پڑوں مگر میں اس وقت عرب بنا ہوا تھا لہٰذا درگزر کرنا ہی مناسب سمجھا۔ سیتا برقعے میں میری پشت سے لگی کھڑی تھی اور میرا قیاس تھا کہ اتنی پنجابی اس کی فہم سے بالا نہیں تھی کیونکہ مشرقی پنجاب کے شہروں خصوصاً انبالہ میں وہ اس زبان سے خاصی آشنا ہو چکی تھی۔

پھر مجھے جو قمیص پسند آئی میں نے براہِ راست اس کے دام دو تہائی لگائے اور خاصی حیل وحجت کے بعد سودا ہو گیا۔

قمیصوں کی تھیلی سوٹ کیس میں ڈالنے کے بعد میں نے کیش رجسٹر پر رقم کی ادائیگی کی تو ادھیڑ عمر شخص نے بقیہ رقم لوٹاتے ہوئے کھسیس نکال کر خالص عربی لہجے میں "شکراً" کہا۔

"آئندہ گاہکوں کے ظاہر سے دھوکا نہ کھانا ورنہ اندر بھی ہو سکتے ہو۔" میں نے سوٹ کیس اٹھانے کے بعد تلخ پنجابی لب ولہجے میں کہا اور اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

بوکھلاہٹ اور حیرت کے عالم میں وہ کچھ بولا مگر میں رُکے بغیر اس دکان سے نکلتا چلا گیا ورنہ خفت مٹانے کے لیے وہ میری جان کو آجاتا۔

سعودی عرب میں کسی پاکستانی کے بارے میں وہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اسے میں نے پاکستانی محض اس وجہ سے تصور کیا کہ اُس کا عربی تلفظ بہت درست تھا جب کہ ہندوستانی عربی بولتے ہوئے چند مخصوص حروف کے غلط مخرج کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

اِن کاموں سے نمٹنے کے بعد سعودی عرب سے روانگی میں کوئی دشواری نہیں رہی تھی لہٰذا ہم دونوں ٹیکسی کے ذریعے ہوائی اڈے پہنچ گئے۔

جدّہ سے طیران الخلیج کی ایک پرواز ایک گھنٹے بعد قاہرہ کے لیے روانہ ہونے والی تھی۔ میں نے فوری طور پر قاہرہ کے لیے دو ٹکٹ بنوا لیے۔

میرے لیے قاہرہ کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ وہاں میں نے کچھ عرصے قبل ہی ایک ہنگامہ خیز دور گزارا تھا اور مقامی حکام محض اخوان الصفا نامی تنظیم کے ساتھ رابطے کی وجہ سے میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ لیکن میرا مقدر یاور تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مصر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مصر کے وہ تلخ تجربات زیادہ پرانے نہیں تھے اور وہاں رُکنے میں نادیدہ خطرات کا سامنا بھی ہو سکتا تھا۔ اِن امکانات کے پیشِ نظر میرا منصوبہ قاہرہ ائرپورٹ سے ہی کسی اور سمت روانہ ہونے کا تھا لیکن اپنے راستے کی کڑیاں بکھیرنے کی وجہ سے میں نے طیران الخلیج سے صرف قاہرہ تک ٹکٹ بنوائے تھے۔ یہ مرحلہ میری دانست میں خاصی اہمیت کا حامل تھا۔

ائرپورٹ پر میرا دوسرا ٹھکانا لفت ہنسا کا کاؤنٹر تھا۔ وہاں بکنگ اور معلومات کا نظام اتنا موثر تھا کہ چند ہی منٹ میں کمپیوٹر کے ذریعے یہ معلوم ہو گیا کہ قاہرہ کے مقامی وقت کے مطابق وہاں سے ساڑھے بارہ بجے لفت ہنسا کی ایک پرواز براہِ راست فرینکفرٹ کے لیے روانہ ہونی تھی۔ مشرق سے آنے والی اس پرواز پر قاہرہ سے آگے نشستیں بھی میسر تھیں۔ ہمارے لیے یہ پرواز بہت مناسب تھی کیونکہ گلف ائر کا طیارہ ہمیں گیارہ بجے قاہرہ پہنچا دیتا۔ جس کے بعد دوسری پرواز پکڑنا بہت سہل تھا۔

لفت ہنسا سے قاہرہ تا فرینکفرٹ سفر کا انتظام ہو گیا۔ ٹیلکس کے ذریعے ائرلائن کے قاہرہ کے دفتر نے نشستوں کی توثیق بھی کر دی۔

وقت کم رہ گیا تھا۔ ہم فوری طور پر عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد طیران الخلیج کے طیارے میں سوار ہو گئے۔

قاہرہ تک سفر خوشگوار رہا۔ چونکہ میں نے جدّہ سے صرف قاہرہ تک کے سفر کا عندیہ ظاہر کیا تھا لہٰذا ہمیں جملہ مراحل سے گزر کر ایک بار باہر آنا پڑا اور پھر لفت ہنسا کے کاؤنٹر سے بورڈنگ کارڈ حاصل کر کے ہم دوبارہ اندر داخل ہو گئے۔

روانگی کے منتظر مسافروں میں خال خال سفید فام بھی تھے۔ مگر اکثریت عربوں کی تھی۔ ہال میں مسافروں کی بھاری تعداد جمع تھی جو شاید مختلف پروازوں کی منتظر تھی۔

جوں ہی لفت ہنسا کی پرواز سے متعلق مسافروں کے لیے اعلان نشر ہوا ہم دونوں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔

طیارے کے رن وے پر دوڑنے کے ساتھ ہی مجھے طمانیت کا احساس ہوا۔ اپنی دانست میں میں نے پیچھے والوں کے لیے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔

ٹیک آف کی پابندیاں ختم ہوتے ہی قاہرہ سے سوار ہونے والوں میں اضطراری لہر دوڑ گئی۔ ان میں سے ہر ایک اسکاچ یا بیئر کا طلب گار تھا۔

عملے کی خوبرو لڑکیاں شاید اس روٹ کے معمولات سے واقف تھیں لہٰذا فوری ہی دونوں راہداریوں میں مشروبات کی ٹرالیاں رینگ آئیں۔

"کیا ارادہ ہے؟" سیتا نے مجھے جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ کر تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

"ایک دو پیگ لوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

مشروبات کے بعد کھانے کا دور چلا پھر اسکرین پر ایک فلم دکھائی جانے لگی مگر بہت کم لوگوں نے اس میں دلچسپی لی۔ پھر فضائی سفر کے آداب سے قطعِ نظر چائے کا دور شروع ہو گیا۔

فرینکفرٹ ائرپورٹ پر لفت ہنسا کے طیارے سے اترتے ہوئے میں خود کو دنیا کا آزاد ترین فرد محسوس کر رہا تھا۔

طیارے کے دروازے کے ساتھ سیڑھیوں کے بجائے ٹیلی اسکوپنگ گینگ وے لگا تھا جس سے گزر کر ہم روشن اور صاف ستھری عمارت میں داخل ہو گئے۔

فرینکفرٹ پہنچنے تک میرا کوئی واضح پروگرام نہیں تھا مگر کسٹم کے سرسری مرحلے سے گزرتے ہوئے میں نے پاکستان روانگی کا ارادہ کر لیا۔

فرینکفرٹ ائرپورٹ پر زبان مستقل ایک مسئلہ ثابت ہوئی۔ ائرپورٹ کا بیشتر عملہ جرمن کے علاوہ ہر زبان سے ناواقف تھا۔ اگر وہاں آنے اور جانے والے مسافروں کی رہنمائی کے لیے جابجا تختیاں نصب نہ ہوتیں تو عمارت کی بھول بھلیوں سے نکلنا ہی محال ہوتا۔

اگلی صبح کے لیے لفت ہنسا سے روانگی کی نشست بک کرائی تو کمپیوٹر کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی نے فرینکفرٹ کا پتہ فون نمبر دریافت کیا۔

"میں ابھی لفت ہنسا سے یہاں آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے استعمال شدہ ٹکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اوہ!" اس نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

"میری بیوی کو دنیا کے بڑے بڑے ائیرپورٹ دیکھنے کا خبط ہے۔" میں نے اپنے لہجے پر احمقانہ سادگی طاری کرتے ہوئے کہا اور سیتا کی طرف دیکھا جو برقع اوڑھے نقاب ڈالے میرے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔

"شاید نئی نئی شادی ہوئی ہے؟" لڑکی نے مسکراتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔

"یہی مشکل ہے۔" میں نے بے چارگی سے اعتراف کیا۔ "اب ہمت ہیں تری تے ہی یہ جاننا چاہے گی کہ تم مجھ سے ہنس ہنس کر کیوں باتیں کر رہی تھیں۔"

"عورت مشرق اور مغرب میں بہت مختلف ہوتی ہے مگر مرد ساری دنیا میں یکساں ہوتا ہے۔" اس نے میرے لیے ٹکٹ بناتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مس باربرا۔"

اس کا نام سنتے ہی میرے حلق میں سوزش سی محسوس ہونے لگی مگر اس نے مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "چاہو تو آج کی رات لفت ہنسا کے مہمان رہ سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"ہماری ائرلائن ٹرانزٹ مسافروں کو رات کا کھانا، قیام کی سہولت اور ناشتہ بلامعاوضہ فراہم کرتی ہے۔" وہ بولی۔ "بظاہر تمہارا نیا ٹکٹ ہے مگر ایک اندراج کے ذریعے میں یہ سہولت دے سکتی ہوں۔"

"ضرور۔" میں دل ہی دل میں اس کی ستھری معاملت کا قائل ہو گیا۔

"باہر ہوٹل کی گاڑی موجود ہوگی۔ یہ کوپن ہیں جو ہوٹل اشٹین برگر میں کام آئیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹکٹ اور فری کوپن مجھے دے دیے۔

میں عمارت سے باہر آیا تو کشادہ سڑک کے کنارے سفید رنگ کی دو اسٹیشن ویگنیں کھڑی ہوئی تھیں جن پر نمایاں حروف میں ہوٹل اشٹین برگر کا نام لکھا ہوا تھا۔

میں سیتا کے ہمراہ ایک اسٹیشن ویگن میں سوار ہو گیا جس میں ہم سے پہلے تین مسافر موجود تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی ویگن دو رویہ سڑک پر آگے روانہ ہو گئی جس کے وسط میں پختہ منڈیر کے درمیان سرسبز گھاس اور رنگ برنگ پھولوں سے لدے ہوئے پودے اُگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سڑک کے اطراف میں بھی بلند سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے۔

ہوٹل کی کئی منزلہ عمارت ائرپورٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کاؤنٹر پر ایک فارم کی خانہ پری کے بعد کمرہ نمبر ۹۱۹ ہمیں دے دیا گیا۔

وہ شام ہم نے کمرے میں ٹیلی وژن پروگرام دیکھتے یا موسیقی سنتے گزاری اور ڈائننگ ہال میں کھانا کھا کر دوبارہ او پر آ گئے۔

ہمارے لیے اب عرب وضع قطع اختیار کیے رہنا غیر ضروری تھا لہٰذا میں نے صبح کے لیے قمیص پتلون اور سوٹ نکال لیا۔ سیتا نے بھی برقع لپیٹ کر بیگ میں ٹھونس دیا۔

رُوم سروس کاؤنٹر کو میں نے فون کر کے صبح سات بجے بیدار کرنے کی ہدایت کی اور پھر بستر پر دراز ہو گیا۔

صنعا میں ہنگاموں کے درمیان گزارے ہوئے لمحات کے بعد مجھے وقت گزارنا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ کوئی مصروفیت نہ ہونے کے باعث ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وقت رینگ رینگ کر گزر رہا ہو اور بظاہر اس جمود کے ٹوٹنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔

اگلی صبح ہمارا طیارہ فرینکفرٹ سے پرواز کر گیا۔ راستے میں تقریباً چالیس منٹ ٹھہرنے کے بعد وہ دیوہیکل مشینی پرندہ فضا میں بلند ہوا تو میرے دل میں مسرت کے عجیب سے جذبات امڈ آئے۔ طیارے کی اگلی منزل کراچی تھی۔

وہ شہرِ خرابات جہاں میں ایمانداری سے دو وقت اپنا پیٹ بھرنے سے محروم رہا تو میں نے غیر قانونی دھندوں میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر بہت جلد وہ وقت آیا کہ اس شہر میں میرے نام کی ساکھ قائم ہو گئی۔ معاشرے کے معزز طبقے میں مجھے قبول کیا جانے لگا۔ عیش و نشاط کی محفلیں ہر رات کے لیے میرا انعام بن گئیں، مگر جب تقدیر نے ساتھ چھوڑا تو میرا مال لانے والی لانچیں یکے بعد دیگرے پکڑی جانے لگیں۔ ان میں آخری لانچ "ساحل" تھی جس پر چھاپے کے ساتھ ہی میرے روزگار پر سینہ سختی کی مہر ثبت ہو گئی۔

وہ رات مجھے اس سفر کے دوران بھی یاد تھی جیسے یہ کل کا قصہ ہو۔

میں اپنے مکان میں بیٹھا شراب کے سرور میں ڈوبا بادن پتوں کے کمال سے رقم سمیٹ رہا تھا اور خوبصورت اینگلو انڈین لڑکی سوزی میری ہم نشین تھی جو ان دنوں میری سیکرٹری کہی جاتی تھی مگر وہ بیک وقت میری خادمہ بھی تھی اور محبوبہ بھی۔

بدنصیبی کی اس رات ساحل کی گرفتاری کی خبر نے میرے اعصاب کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ میں نے یکسوئی کے لیے اپنے معدے میں برف کے پارچوں میں پڑے ہوئے آتش صفت سیال کی خاصی مقدار انڈیل لی مگر بازی الٹ چکی تھی۔

میز پر میرے سامنے پڑی ہوئی رقم سمٹنے لگی پھر جیبیں خالی ہوئیں اور آخر کار میں نے آخری کوشش کے طور پر اپنا وہ مکان داؤ پر لگا دیا جس کی چھت کے نیچے اس وقت وہ محفل جمی ہوئی تھی۔

مگر مقدر کا لکھا نہ ٹل سکا اور میں اپنا مکان ہار کر بے یار و بے گھر باہر آ گیا۔

وہ میرے برے دنوں اور تھکا دینے والی جدوجہد کی ابتدا تھی جس کا اختتام شاید لمحہ بہ لمحہ قریب تر آتا جا رہا تھا۔

"تجھے عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔" اچانک سیتا نے اردو میں کہا اور میں اپنے خیالات کی رو سے چونک پڑا۔

"کس بات کا؟" میں نے بھی اردو ہی میں سوال کیا کیونکہ عربی وضع قطع بدل لینے کے بعد ہمارے لیے زبان کا مسئلہ سہل ہو گیا تھا ورنہ بصورت دیگر عرب نظر آنے والوں کی زبان سے اردو سن کر کوئی بھی چونک سکتا تھا۔

"تمھارے شہر میں اپنے گھر کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے خوابناک لہجے میں بولی۔

"میرا گھر!" میں نے اپنے وجود کی گہرائیوں میں ایک خلا سا محسوس کیا۔ "وہ تو اب بنانا پڑے گا۔ میں اپنے ہاتھوں سے سب کچھ ختم کر کے وہاں سے نکلا تھا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر جھجکتے ہوئے بولی۔ "اب تو کسی سفر پر نہیں نکلو گے؟"

"نہیں۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "تمھیں یہ خیال کیوں آ گیا؟"

اس کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "انبالہ کا راجہ ہوٹل یاد آ گیا تھا۔ تمھیں کچھ یاد ہے اس بارے میں؟"

"اوہ۔ تم پارس پتھر کی بات کر رہی ہو۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میرے پاس جنرل کی دی ہوئی خاصی رقم ہے۔ شاید اس کی مدد سے ہم بآسانی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔"

"تمھارے نزدیک وہ لوہے کو سونے میں بدلنے والی کیمیا ہے مگر میرے لیے وہ پتھر میری ماں کی اکلوتی نشانی ہے۔"

"مگر میرے لیے ایسا نہیں ہے۔"

"وہ کیوں؟" اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"میرے لیے تو اپنی ماں کی زندہ نشانی تم خود ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمھارے ہوتے ہوئے پارس پتھر کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔"

وہ بھی ہنس پڑی۔

جہاز تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف محوِ پرواز تھا۔ پیچھے شام کا دھندلکا دور جا کر بتدریج اجالے میں تبدیل ہو رہا تھا اور آگے رات کا سرمئی اندھیرا تاروں بھرے سیاہ آسمان کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔

جہاز شام کے تقریباً ساڑھے سات بجے کراچی کے جگمگاتے ہوئے ماحول پر منڈلانے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کے پہیوں نے وہ سرزمین چھوئی جس کے ذرے ذرے سے مجھے والہانہ پیار تھا۔

دنیا کے جدید ہوائی اڈوں کے بعد جب سیتا میرے ہمراہ طیارے کی سیڑھیوں سے اتر کر بس میں سوار ہوئی تو اس کے بشرے پہ ناگواری سی علامات ہویدا تھیں۔

طیارے سے کراچی میں اترنے والوں کی تعداد کم تھی اس لیے

سب ہی کو بس میں نشستیں مل گئیں اور پھر ایک بیہودہ جھٹکے کے ساتھ بس رن وے پر اس سمت میں دوڑ پڑی جدھر باہر سے آنے والے مسافروں کے لیے لاؤنج بنا ہوا تھا۔

گھٹن، تمباکو کا دھواں، اور ناکافی روشنی میں اس ہال میں موجود مسافر آسیبی ہیولے نظر آ رہے تھے۔

اس ماحول سے غیر ملکی تو بیزار تھے ہی مگر مقامی چہرے بھی غیر مطمئن سے تھے اور ہر نگاہ بے چینی سے اس رکے ہوئے بوسیدہ پٹے کا جائزہ لے رہی تھی جس پر مسافروں کا سامان آنا تھا۔

وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا طویل سفر کے باوجود شگفتہ نظر آنے والے چہرے بھی اس ماحول میں پژمردہ سے ہونے لگے۔

اسی اثنا میں ایک اور پرواز کے مسافر اس ہال میں آ پہنچے۔ ہجوم کی وجہ سے حبس کچھ اور بڑھ گیا۔

لاؤنج میں سامان لے جانے والی ٹرالیاں بہت کم تھیں۔ جن خوش نصیبوں کو وہ جنس نایاب میسر آ گئی تھی وہ اسے لیے لیے سامان کے انتظار میں ٹہل رہے تھے بقیہ محروم مسافر حسرت سے ان کو دیکھ رہے تھے۔

لاؤنج کے فرش کی صفائی کرنے والے دو افراد کی گفتگو سے پتہ چلا کہ لفت ہنسا کے طیارے سے مسافروں کا سامان لانے والی ٹرالی کے ڈرائیور کا ایک قلی سے جھگڑا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سامان کی آمد میں تاخیر ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے سامان والے پٹے میں حرکت پیدا ہوئی اور آخری سرے سے سامان اس پر پھینکا جانے لگا۔

مگر وہ سامان بعد کی پرواز سے آنے والوں کا تھا۔ ہماری پرواز سے آنے والے گناہگاروں کے صبر کی نگاہیں اس ٹرالی ڈرائیور کے ہاتھ میں تھیں جو ہم سب کی دستبرد سے دور محفوظ اور ممنوعہ علاقے میں کسی قلی سے اپنی یا اس کی عزتِ نفس کا معاملہ بیباق کرنے میں مصروف تھا۔

نہ جانے کسی مسافر کی دل گیر فریاد بار آور ہوئی یا صاحبانِ قضا و قدر کو ان بدنصیبوں کے بارے میں اچانک القا ہوا کہ ہنگامی طور پر ایک دوسرے ڈرائیور کا بندوبست کیا گیا اور کم و بیش نصف گھنٹے بعد ہمارا سامان بھی اس سال خوردہ پٹے پر سوار ہونے کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جن کا اسباب زیادہ تھا وہ سب سے زیادہ مجبور و معتوب نظر آ رہے تھے۔ نہ سامان کو چھوڑ سکتے تھے نہ خالی ہاتھ پر خالی ہونے والی ٹرالیوں کو اشاروں سے اندر گھسیٹ سکتے تھے۔ برے وقت میں پیشہ ور قلیوں کا جذبۂ خدمت قابلِ رشک تھا۔ وہ ایک حقیر سی رقم کے عوض فرداً فرداً ایسے ہر بے بس کی یاوری کر رہے تھے۔

غنیمت یہ تھا کہ ہمارے پاس ایک ہلکا سا سوٹ کیس تھا جسے اٹھانے کی قوت سے ہم دونوں ہی فرداً فرداً بہرہ ور تھے۔

باہر نکلے تو شیشے کے دروازوں کے پار فٹ پاتھ پر بہت سے لوگ خطرناک نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے۔ ان میں سے کئی بیک وقت ہماری طرف لپکے اور مختلف زبانوں میں بیک وقت بولنے لگے۔ مدعا سب کا ایک ہی تھا کہ ہمیں کسی ٹیکسی میں ٹھونس دیں جو دور دور تک ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

ان میں سے ایک جو جذبۂ خدمت سے زیادہ مغلوب تھا، اور جسمانی طور پر کسی بھی آمادۂ فساد مسافر کو زیر کر لینے کی ظاہری خوبیوں سے مالا مال تھا۔ آگے بڑھا اور میرے ہاتھ سے سوٹ کیس چھیننے لگا۔

اور جوں ہی وہ میرے سوٹ کیس پر قابض ہونے میں کامیاب ہوا، دوسروں نے مایوسانہ انداز میں اس کی برتری تسلیم کر لی۔

وہ قوی الجثہ رضاکار میرا سوٹ کیس ہتھیانے کے بعد میری طرف دیکھے بغیر سڑک عبور کرنے کے لیے بڑھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ہم دونوں اس کے پیچھے اس طرح چل پڑیں گے جیسے معصوم بھیڑیں ممیاتی ہوئی لپکتی ہیں۔

سیتا کے لیے اس کے جذبات کو سمجھنا محال تھا۔ اسے غلط فہمی ہوئی کہ وہ شخص شاید سوٹ کیس لے کر بھاگنے کی فکر میں تھا لہٰذا عین اس وقت جب سوٹ کیس بردار شخص سڑک عبور کرنے کے لیے ایک بس کے گزرنے کا منتظر تھا سیتا نے لپک کر بے رحمی سے پیچھے سے اس کا کالر پکڑ لیا۔

اس بے چارے کے لیے وہ رویہ نہ صرف ناقابلِ فہم بلکہ غیر متوقع تھا۔ وہ بمشکل پختہ سڑک پر گرنے سے خود کو بچا سکا۔

ایک سپاہی جو سڑک کی دوسری طرف کھڑا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا صورتِ حال بگڑتی دیکھ کر فوراً پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی بھیڑ میں کہیں روپوش ہو گیا۔

سیتا کی جسارت پر مجھے غصہ آیا تھا اور میں فوری طور پر کسی بڑے ہنگامے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن سیتا کی گرفت میں آیا ہوا شخص بہت باذوق ثابت ہوا۔

کالر کا جھٹکا سہارنے کے بعد وہ خوں آشام تیوروں کے ساتھ پیچھے گھوما تھا لیکن سیتا کے ملکوتی حسن کو اپنے مقابل پا کر اس کے ہونٹوں پر جھینپی ہوئی فدویانہ مسکراہٹ عود کر آئی۔

اور پھر یکایک اس نے قابلِ رحم انگریزی بکنی شروع کر دی جو شاید سیتا کی نیلی آنکھوں کا ساحرانہ اثر تھا۔

"ٹھیک ہے کہ تم ٹیکسی تک لے جا رہے تھے مگر منزل اور کرائے کے تعین کے بغیر یہ کیا بدتمیزی تھی؟" اس کی وضاحت کا نچوڑ اخذ کرنے کے بعد مجھے دخل انداز ہونا پڑا کیونکہ سیتا انگریزی

کی ابجد سے بھی نابلد تھی۔

"ٹیکسی میں میٹر ہوتا ہے صاحب! اس کے علاوہ بیس انعام۔ یہ تو یہاں کا دستور ہے" میری زبان سے اردو سننے سے زیادہ سکون اسے یوں ملا کہ سیتا نے اس کا بے رحمی سے جکڑا ہوا کالر آزاد کر دیا تھا۔

کرائے کی مد میں اس نے جو شرائط رکھی تھیں وہ ناروا ہوں تو ہوں مگر پچھلی مشقتوں کے مقابلے میں گوارا ضرور تھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ناگہانی فساد آغاز سے پہلے ٹل گیا اور ہم اس کے پیچھے چوراہے کی سڑک عبور کرنے لگے۔

پارکنگ لاٹ کے قدرے اندرونی حصے میں متعدد ٹیکسیاں خوبصورتی سے پارک کی گئی تھیں کہ کسی رہنما کی اعانت کے بغیر ضرورت مند کی اُن تک رسائی ناممکنات میں سے تھی۔

پھر جب وہ ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ رہا تھا تو روپوش سپاہی آسیبی انداز میں اچانک کہیں سے نمودار ہو گیا۔ میں نے بس اتنا دیکھا کہ سوٹ کیس لے جانے والے نے اپنی بند مٹھی سپاہی کے ہاتھ میں کھول دی اور سپاہی اپنی بند مٹھی کھولے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔

ہمیں ٹیکسی میں سوار کرنے کے بعد اس شخص نے ڈرائیور سے علیحدگی میں کچھ بات کی۔ نیم اجالے میں ڈرائیور نے جیب سے کچھ نکال کر اس کے حوالے کیا اور وہ دونوں قریب آ گئے۔

"میٹر کے علاوہ بیس بخشش" ہماری رہنمائی کرنے والا معاملہ فہم معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے بعد کی اُلجھن سے بچنے کے لیے سفر کی شرائط پیشگی دُہرا دی تھیں۔

ایک طویل مدت کے بعد اپنے شہر کی شاہراہوں پر سفر کرتے ہوئے میرا دل فخر و انبساط کے انوکھے جذبات سے معمور تھا، کہ ڈرائیور نے مجھے چونکا دیا۔

"کہاں جانا ہے صاحب؟"

"صدر کے علاقے میں کسی اچھے ہوٹل میں پہنچا دو"

"بخشش دیدیں" اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے بایاں ہاتھ پیچھے پھیلا دیا۔

"کرائے کے ساتھ لے لینا"

"معاف کرنا صاب! بہت سے مسافر منزل پر پہنچنے کے بعد پولیس کی دھونس دے کر میٹر سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دیتے" اس نے مظلومانہ لہجے میں کہا۔

"ویسے یہ جبری بخشش غلط چیز ہے۔۔۔"

اُس نے میری بات درمیان ہی سے کاٹ دی" کرائے میں کیسے پوری پڑے گی۔ ایئرپورٹ پر بیس روپے میں تو ہم والوں سے مسافر خریدتے ہیں"

"خریدتے ہو؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔

"کیا کریں۔ جدھر مسافر ہوتے ہیں اُدھر ہمیں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں ملتی" اُس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

میں نے نوٹوں کو بیس روپے کی جگہ دو ڈالر اسے تھما دیے۔

"یہ کیا ہے؟" نوٹ دیکھتے ہی اس کا لہجہ بگڑ گیا۔

"بدلواؤ گے تو بیس روپے سے زیادہ ہی ملیں گے" میں نے نرمی سے کہا "میرے پاس پاکستانی کرنسی نہیں ہے"

"پاکستانی کرنسی سے کیا مطلب؟ اس نے تو بیس ڈالر کی بات کی تھی" ڈرائیور کا مظلومانہ لہجہ اچانک کرخت ہو گیا تھا۔

اس سے چند مکالموں کے ترش تبادلے کے دوران میں نے ذہن میں مسافر فروش دلال کی گفتگو کو یاد کیا تو خیال آیا کہ اس نے ہر بار محض بیس کا ہندسہ کہا تھا۔ کرنسی کا کوئی تعین نہیں کیا تھا۔

اس معاملے کا سیدھا سادہ حل ایئرپورٹ واپسی کا ہو سکتا تھا مگر سپاہی کا رویہ مجھے یاد تھا لہٰذا پُرامن بقائے باہمی کی راہ پر چلتے ہوئے ڈرائیور سے دس ڈالر کی بخشش کا سودا طے کیا بصورت دیگر مجھے ناقابلِ تصور اُلجھنیں پیدا ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

راستے بھر سیتا خاموش بیٹھی گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہی ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر ہی اس نے سکوت توڑا۔

"خدا کی پناہ" وہ گہرا سانس لے کر بولی "میں تو ہندوستان کے ماحول ہی کو بُرا سمجھتی تھی مگر یہاں بھی ہر فن مولا موجود ہیں"

"نئے آنے والوں کا پہلا تاثر عموماً اچھا نہیں ہوتا" میں نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا "چند روز گزارنے کے بعد تمہیں رائے بدلنی پڑے گی"

"یہ شہر میرے لیے اجنبی نہیں ہے" اس نے کہا اور یکایک مجھے یاد آیا کہ میری تلاش میں دربدر بھٹکتی ہوئی آخر کار وہ کلفٹن کے ویران ریتیلے ٹیلوں کے درمیان خانہ بدوشوں کے جھونپڑوں میں پناہ گزین ہوئی تھی جہاں سے ایک فلسطینی طالب علم نے اس کا سُراغ نکال کر اسے مشرقِ وسطیٰ روانہ کیا تھا۔

"یہاں کے لوگ بہت اچھے اور ملنسار ہیں اجنبیوں کو بہت جلد سمو لیتے ہیں لیکن چند روز کے لیے باہر سے آنے والوں کے لیے تو تمہارا ہوائی اڈہ ہی تمہارے مُلک اور شہر کا عکاس ہے۔ وہاں تو اتنی بدنظمی اور لوٹ کھسوٹ نہیں ہونی چاہیے"

"ٹھیک ہے میں کل ہی سارا نظام بدل ڈالوں گا" میں نے پُرمذاق لہجے میں کہا۔

"بس بھڑک گئے" وہ ہنس کر بولی "میرا مطلب تو یہ ہے کہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں ذمہ دار لوگ کیوں نہیں سوچتے؟" "ملو گی تو اُن ہی سے پوچھ لینا"

سفر کے بعد ائرپلیٹ پر اتنی کوفت ہوئی تھی کہ ذہن کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے ہمیں چائے کی ایک ایک پیالی پینی پڑی۔ پھر ہم دونوں باہر نکل پڑے۔

رات بھیگ چلی تھی، دکانیں بند ہو گئی تھیں مگر صدر کے علاقے میں اس کے باوجود غیر مرئی سی رونق تھی۔

عروس البلاد کی جھلملاتی اور جلتی بجھتی روشنیوں کے سائے میں ہم بانہوں میں بانہیں ڈالے فٹ پاتھ پر چلتے رہے۔ اس وقت میرے دل و دماغ میں ایک جذباتی طوفان برپا تھا۔

شہر میں ہزاروں سے شناسائی رکھنے کے باوجود میں اچانک ہی اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔

میرے دل میں ہُوک سی اٹھنے لگی۔ میں سیتا کے ساتھ برسوں کے جانے پہچانے راستوں پر چل رہا تھا لیکن ذہن میں ماضی کے سارے واقعات کسی فلم کی ریل کی طرح چل رہے تھے۔

لاہور، جو میرا جدی پشتی شہر تھا۔۔۔ جس کی تنگ گلیوں میں میں پروان چڑھا اور پھر میرے والد صاحب نے ایک نو آباد بستی میں نئے طرز کا کشادہ مکان خرید لیا تھا جہاں میں نے جوانی کے گرم سانسوں کی مہکار محسوس کی۔

کالج کی تعلیم کے دوران اکبر میرا دوست بنا جس کی معرفت ایک حسین و جمیل دوشیزہ گلنار سے میری دوستی ہوئی۔ ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرا کے اکبر راستے سے ہٹ گیا اور گلنار کی فرمائشیں میری جیب پر بار بڑھاتی چلی گئیں۔

گلنار حسین تھی اور جوان بھی۔ وہ دن بدن مجھ سے قریب ہوتی چلی گئی لیکن مجھے ایک حد سے آگے بڑھنے کی کبھی اجازت نہ دی، اور پھر وہ منحوس دن آیا جب اُسے تحفے میں ایک ہار دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ والد مرحوم سے تین ہزار مانگے تو انکار سننا پڑا۔ تیغ کلامی اور دست درازی کے بعد میں دوکان سے رقم تو اٹھا لایا مگر مجھ پر گھر کے دروازے بند کر دیے گئے۔ والد صاحب نے مجھے عاق کر دیا اور اسی صدمے میں ان کے دماغ کی شریان پھٹی اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

اُن کی وفات پر بھی میرے لیے اپنے گھر کے دروازے نہ کھل سکے ماں نے مجھے اپنے باپ کا قاتل قرار دے کر دروازے سے دھتکار دیا۔ مفلسی اور ۔۔۔ زندگی کے اس دور میں گلنار بھی ساتھ چھوڑ گئی اکبر نے کراچی چلے جانے کا مشورہ دیا جہاں محرومیوں سے پنجہ آزمائی کے بعد میں وسائل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر پھر وقت کا دھارا بدلا۔ اپنا گھر آ کر جب میں نے سوزی کو الوداع کہا تو پولیس کی فہرست میں میرا نام بدنام مفرور اسمگلر کے طور پر لکھا جا چکا تھا۔

فرار اور بناؤ کے ایک لامتناہی تسلسل میں لیاقت آباد میں حال ہی میں قریب المرگ کیمیا گر کی کوٹھری میں جا پہنچا جو سونا بنانے کی کوشش میں خون تھوکنے لگا تھا۔ اس کا نسخہ مکمل تھا بس آخری آنچ کے لیے اسے بھاندر ناس نامی بوٹی کی تلاش تھی جو ہمالیہ کی برف پوش بلندیوں پر جڑوں کی صورت میں ملتی تھی۔

طویل سفر کے لیے جمال کی صحت نازک تھی، اسے سنبھالا دینے کے لیے میں مری لے گیا اور اُسے وہاں چھوڑ کر لاہور چلا آیا جہاں میرے لہو کے تمام رشتے موجود تھے۔

مگر میرا مکان اجنبیوں سے آباد تھا وہاں کوئی بھی مجھے میرے بڑے بھائیوں سطوت علی اور مظہر علی کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔

رشتوں کی تلاش میں تڑپتے ہوئے دل کو جھوٹا دلاسہ دینے کے لیے میں نے بازارِ حسن کی راہ لی تو وہاں اکبر ملا نہ وہ مجھے پہچانا نہ گلنار۔ اُن دونوں میں میاں بیوی کا رشتہ تھا مگر وہ ضرورتوں کا جہنم سرد کر کے آسائشوں کی انجمن سجانے کی خاطر غلاظتوں کا بیوپار کر رہے تھے۔

گلنار میری بربادی کا نقطۂ آغاز تھی جو قریب آنے کے باوجود ہمیشہ مجھ سے دُور رہی مگر اس کا مول چکانے کے بعد مجھے اس پر تصرف حاصل ہو گیا۔

میرے وجود میں درندگی عود کر آئی۔ مجھے اُن دونوں سے نفرت ہو گئی۔ قہر اور انتقام کے جذبات نے مجھے اندھا کر دیا۔ دوشیزگی کا بہروپ رچا کر چند برس پہلے مجھے دھتکارنے اور ترسانے والی گلنار میری پہلی مقتولہ تھی۔ دو راتوں میں نے اس کے بے غیرت شوہر اور اپنے مطلبی دوست اکبر کا کیا اور اس جہت سے نکلتے ہوئے میری فردِ جرم طویل ہو گئی۔

میری شناخت میں اسمگلر کے ساتھ قاتل کا بھی اضافہ ہو گیا۔

اچانک میرے بدن کو ایک ہولناک جھٹکا لگا اور میں اُڑتا ہوا دُور جا گرا میرے حلق سے بے ساختہ ایک چیخ بلند ہوئی تھی۔ دوسری چیخ سیتا کی تھی۔

مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس وقت ہم دونوں شاید سڑک عبور کر رہے تھے پھر میرے حواس تاریکیوں کی دلدل میں ڈوبتے چلے گئے۔

ہوش آیا تو میں ہسپتال کے ایک بستر پر پٹیوں میں لپٹا پڑا تھا اور سیتا میرے سرہانے آنکھوں میں آنسو لیے موجود تھی۔

میرا پورا بدن پوری طرح دُکھ رہا تھا مگر سیتا کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں آنسو مجھ سے نہ دیکھے جا سکے۔ میں نے اسے دلاسا دینا چاہا لیکن بول نہ سکا۔ جبڑوں پر بھی پٹیاں تھیں اور ہونٹ ورم آلود تھے۔

مجبوری کا ایک دردناک احساس میرے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔

سیتا کے بدن کے بعض حصوں پر بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں مگر وہ اس اعتبار سے بہتر تھی کہ اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔

"تم نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔" وہ بے تابانہ انداز میں میرے رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے آخری لمحے پر اس کار کو دیکھا تھا اور سامنے سے ہٹ گئی تھی، تمھیں بھی کھینچنا چاہا مگر۔۔۔۔"

اپنے شہر میں پہنچتے ہی میں تقدیر کے بے رحم ہاتھوں بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا اور سیتا زندگی کے عذاب جھیلنے کے لیے تنہا رہ گئی۔ جسم کے مختلف حصوں اور ہڈیوں میں اٹھنے والی درد کی ٹیسوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری چوٹیں شدید تھیں اور چند ہفتوں سے قبل میرا ہسپتال سے فارغ ہونا مشکل تھا مگر یہ تسلی ضرور تھی کہ میرے علاج اور سیتا کی روزمرہ ضروریات کے لیے میرے پاس ڈالروں کی صورت میں خاصی رقم موجود تھی۔

ڈاکٹروں نے مجھے گلوکوز کی ڈرپ لگائی ہوئی تھی۔ نجانے یہ اس میں ملائی ہوئی دواؤں کا اثر تھا یا نقاہت کا کہ تھوڑی دیر بعد پھر غافل ہو گیا۔

طویل وقفے کے بعد دوبارہ آنکھ کھلی تو گلوکوز کے بجائے اسٹینڈ پر خون کی بوتل لٹکتی دیکھی جو قطرہ قطرہ کر کے میرے بدن میں منتقل ہو رہی تھی۔

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا لیکن سیتا کہیں دکھائی نہیں دی میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ میری تکلیف کے ساتھ ہی اُسے اپنے آرام کا خیال بھی تھا۔

شام ڈھلے سیتا واپس آئی تو اس کے بُشرے سے تکان عیاں تھی مگر مجھے حوصلہ دینے کی خاطر نگاہیں چار ہوتے ہی وہ مسکرا دی۔

"کل تمھارا آپریشن ہوگا۔" اس نے میرے سرہانے بیٹھ کر پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "داہنی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔ باقی زخم جلد ہی بھر جائیں گے۔"

"تم کہاں تھیں؟" میں نے اٹکتے ہوئے بدقت تمام سوال کیا۔

"خون اور دوائیوں کا انتظام کرنا تھا۔" اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تھوڑی دیر ہوٹل میں آرام کر لیا ہوتا۔" مجھے ایک ایک لفظ ادا کرنے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن سیتا کا سکھ مجھے اپنی ذات سے زیادہ عزیز تھا۔

"ہوٹل میں نے چھوڑ دیا۔" میری تکلیف کا اندازہ کر کے وہ خود ہی مجھے بتلانے لگی۔ "یہاں کی ایک نرس بہت رحم دل ہے وہ یہیں نرسنگ کوارٹر میں رہتی ہے۔ سوٹ کیس میں نے اس کے گھر رکھوا دیا ہے خود تمھارے پاس رہوں گی۔"

میں آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات لیے اُسے تکتا رہا۔ وہ ہسپتال کا جنرل وارڈ تھا جہاں تیماردار کی کوئی گنجائش نہیں تھی پھر نجانے وہ کیسے میرے پاس رہنے کی بات کر رہی تھی میرا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ میں نے کئی بار اس سے یہ سوال کرنے کا ارادہ کیا مگر زبان نے ایک بار بھی ساتھ نہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد یہ گتھی بھی سلجھ گئی۔

ہسپتال کا عملہ مجھے بستر سے اسٹریچر پر ڈال کر پرائیویٹ وارڈ کی طرف لے چلا جہاں ہر مریض کے لیے علیحدہ کمرے کے علاوہ تیماردار کی بھی گنجائش تھی۔

اگلے روز میرا آپریشن ہوا جو خاصا کامیاب رہا کیونکہ آپریشن تھیٹر سے واپسی کے بعد جب مجھے کمرے میں ہوش آیا تو سیتا کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

سیتا کی پٹیاں بتدریج غائب ہوتی رہیں وہ اپنا زیادہ تر وقت میرے پاس گزارتی تھی مگر اس کا ایک معمول میرے لیے ناقابل فہم ثابت ہو رہا تھا کہ ہر شام وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر موقع پا کر دو تین گھنٹوں کے لیے غائب ہو جایا کرتی تھی۔

چوتھے روز میری حالت قدرے بہتر تھی اور سیتا کینٹین سے منگوایا ہوا کھانا کھا کر اپنے بستر پر دراز تھی تو میں نے باتیں چھیڑ دیں۔

"تم بھی سوچتی ہوگی کہ پاکستان واپسی تمھیں راس نہ آسکی۔"

"تم جو خدا کے حوالے سے مجھے بتاتے رہے ہو وہی ماں بھگوان کے حوالے سے بتاتی تھی۔ آدمی کی تقدیر اٹل ہوتی ہے اور اُس کا لکھا ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "اس سے آگے دیوی دیوتاؤں کے قصے کبھی میری سمجھ میں نہیں آسکے۔ ہاں تمھاری ہر بات جی کو لگتی ہے میری ماں بھی تمھاری باتیں سن لیتی تو شاید اپنا دھرم بدل لیتی۔"

"کیا کہتی تھی تمھاری ماں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اسے بہت قصے یاد تھے، ہر بات کے ساتھ دسیوں قصے سناتی تھی۔" اس کے لہجے میں اپنی ماں کے لیے عقیدت رچی ہوئی تھی۔

"پتہ نہیں کون سا بادشاہ تھا وہ۔۔۔ اُسے نجومیوں نے بتایا کہ اس کی موت پانی سے ہوگی۔ وہ تیراکی کا بہت شوقین تھا۔ اس نے اسی دن سے تیراکی چھوڑ دی۔ شہر کے تالاب ہٹوا دیے۔ محل کے حماموں میں سے حوض تک اکھڑوا دیے۔ جہاں جاتا ندی نالوں سے بچ کر نکلتا دریا تو اس نے بھول کر بھی پار نہ کیا مگر پھر بھی وہ پانی ہی سے مرا۔"

"وہ کیسے؟" جب وہ کافی دیر تک نہ بولی تو مجھ کو پوچھنا ہی پڑ گیا۔

"تم ہی بوجھو۔" اس نے پوچھا۔

"سمندر میں ڈوبا ہوگا۔"

وہ یوں کھلکھلا کر ہنسی جیسے میں نے کوئی نادانی کی بات کہہ دی ہو۔ "سمندر تو سمجھو اُس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"پھر تم ہی بتاؤ۔"

"کھانے کے بعد پانی پی رہا تھا کہ پھندا لگا اور کھانستے کھانستے مر گیا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "انسان ہر ایک سے لڑ سکتا ہے مگر تقدیر سے نہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ تمھیں یہ معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن پھر بھی بُرے وقت میں انسان مقدر کو کوستا ہے۔"

"بری بات ہے۔" اس کا لہجہ بزرگانہ ہو گیا۔ "تمھیں چوٹ لگی، بری طرح گھائل ہوئے مگر میں پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے تمھیں زندگی تو دی۔"

"ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ میرا علاج کئی مہینے چلے گا۔"

"اچھے تو ہو جاؤ گے نا!" اس نے مجھے تسلی دی۔

"مگر وہ پیسے کب تک ساتھ دیں ہزار بارہ سو ڈالر ہی تو رہ گئے تھے میرے پاس۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر بے چینی کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔ "بہت ہیں وہ۔۔۔ ابھی تو اس میں کچھ بھی خرچ نہیں ہوا۔"

"پھر خون اور یہ دوائیں کہاں سے آ رہی ہیں۔۔۔ اس کمرے کا کرایہ کون دے گا، کھانے پینے کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔"

"تم یہ سب مت سوچو۔" وہ اٹھ کر میرے بستر پر آ گئی۔ "سب ان ہی پیسوں میں سے ہو رہا ہے میرا مطلب تھا کہ ابھی تو تھوڑی سی رقم خرچ ہوئی ہے۔"

"ذرا دیکھوں تو، باقی کیا بچا ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔ "میں اتنی احمق نہیں ہوں، رقم احتیاط سے اسی نرس کے پاس رکھوا دی ہے جس کے یہاں سوٹ کیس ہے۔ جتنی رقم کی ضرورت پڑتی ہے اُس سے لے لیتی ہوں اپنے پاس رکھتی تو کہیں پھینک چکی ہوتی۔"

میں چند ثانیوں تک خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا پھر دھیمے سے بولا۔ "ایک بات کا بالکل سچ سچ جواب دو گی؟"

"میں نے تم سے جھوٹ کب بولا ہے؟"

"لڑو نہیں۔" میں نے اپنے دل میں ایک بے نام سی خلش محسوس کی۔ "یہ بتاؤ کہ تم روز شام کو مجھ سے کچھ کہے بغیر کہاں غائب ہو جاتی ہو؟"

میں نے دیکھا کہ میرے اس سوال پر اس کے چہرے کا رنگ یک بیک متغیر ہو گیا۔ "کہیں بھی نہیں۔ ہسپتال میں ہی رہتی ہوں یہاں بستری اسی بیمار عورتیں ہیں جن کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان ہی کے پاس تھوڑا تھوڑا وقت گزارتی ہوں۔ ماں کہتی تھی کہ دکھی دل کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے، کون جانے ان ہی کی دعاؤں سے تم جلدی اچھے ہو جاؤ۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو سیتا!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر سپاٹ لہجے میں کہا۔ میرے دل کی کسک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی؟" چراغ پا ہونے کے بجائے وہ خلافِ توقع مصالحانہ لہجے میں بولی۔ "جو بات تھی وہ میں نے بتا دی، اب جو چاہو سمجھ لو۔"

اور اس شام بھی وہ حسبِ معمول موقع پا کر کھسک گئی۔ میں نے دیدہ دانستہ اونگھنے کی اداکاری شروع کر دی تھی اور وہ مجھے سویا ہوا پا کر غائب ہو گئی۔

اس وقت میں ہلنے جلنے سے معذور تھا۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اسی وقت اس کا تعاقب کر کے پتہ چلانے کی کوشش کرتا کہ وہ کہاں جاتی تھی۔

سیتا مدتوں مجھ سے الگ یکہ و تنہا ہر قسم کے ماحول میں رہ چکی تھی۔ اس پر برا بھلا سب ہی قسم کا وقت آیا مگر مجھے اس پر اس قدر اندھا اعتماد تھا کہ میں نے اس کے بارے میں کبھی بھول کر بھی کوئی منفی بات نہیں سوچی مگر اس وقت بے بسی کے عالم میں بستر کا اسیر ہونے کے بعد میرے ذہن میں شبہات کا زہر سرایت کر رہا تھا۔

میرے ساتھ اس کا رویّہ پہلے جیسا تھا لیکن میں اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ اور پھر اُس کے کھوکھلے لہجے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُس نے اپنی غیر حاضری کا جھوٹا جواز پیش کیا تھا۔

میرا ذہن مسلسل اسی سوچ میں مبتلا تھا اور ہر بار اس سوال کا ایک نیا جواب سوجھتا تھا جس کی تصدیق کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اس شام وہ نسبتاً جلدی واپس آ گئی۔

"تم جاگ گئے؟" مجھے دیکھتے ہی وہ مسرت آمیز شوخ لہجے میں بولی۔

"کسی وقت ہمیشہ کے لیے بھی سو جاؤں گا۔" میں نے سرد نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے وجود میں لاوا سا دھیمے دھیمے کھول رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اُسے کیا کہوں اور کیسے کہوں۔

سیتا نے بڑھ کر میرے دہانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مریں تمھارے دشمن! پتہ نہیں کیا اول فول بک رہے ہو، ذرا سی دیر کے لیے باہر گئی اور نجانے کیسے کیسے خواب دیکھنے لگے۔"

"ذرا سی دیر۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر تلخ ہو گیا۔ "جب تم گئیں تو میں سویا نہیں تھا، جاگ رہا تھا۔ تم کم از کم دو گھنٹے بعد آئی ہو

جن کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے اُن کے ساتھ گزارا ہوا وقت ہمیشہ مختصر محسوس ہوتا ہے۔"

میرا لہجہ اور الفاظ اسے چونکانے کے لیے کافی تھے۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کے یاقوتی ہونٹ سفید پڑ گئے۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے اسے مزید کچوکے لگانے چاہے لیکن لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ "اُن ہی لاوارث بیمار عورتوں کی بات کر رہا تھا جن پر تم محبتوں کے پھول نچھاور کرتی ہو۔"

"شکر ہے۔" وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر گہرا سانس لیتے ہوئے بولی پھر شکایتی لہجے میں کہا۔ "تم نے ہمیشہ مجھے بے پناہ پیار دیا ہے۔ مجھ سے مذاق میں بھی ایسے لہجے میں بات نہ کیا کرو ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

میرے لیے اتنا کافی تھا کہ اسے میرے رویے کا تنقیدی جائزہ لینے کا ایک بھرپور موقع فراہم کر دیا تھا۔

دو دن تک وہ ایک لمحے کے لیے بھی کمرے سے نہیں ہلی۔ تیسری صبح ڈاکٹر معمول کے مطابق دیکھ بھال کے لیے آیا تو نئی دواؤں کا پرچا بنا کر چلا گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سیتا بے چین سی نظر آنے لگی۔ میں نے اس کی بے چینی بھانپ لی لیکن انجان بنا بستر پر پڑا رہا۔ آخر کار وہ میرے قریب آ ہی گئی۔ "تھوڑی دیر کے لیے میں باہر جا رہی ہوں۔۔۔"

"کیوں؟" میں نے اُس کی بات پوری ہوئے بغیر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں سوال کیا۔

"تمھارے لیے نئی دوائیاں لانی ہیں۔" اُس کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔

"کینٹین کا ملازم خالی برتن لینے آئے گا، اسی سے منگوا لینا۔" میں نے پھیکے روکھے بلکہ ترش لہجے میں کہا۔

"پیسے ختم ہو گئے ہیں مجھے اس نرس سے لینے ہوں گے۔" وہ بات کہتے ہوئے مجھ سے نگاہیں چرا رہی تھی۔

"اسی لڑکے سے بلوا لینا اُسے، میں خود بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ اس وقت ڈیوٹی پر ہو گی۔۔۔ اس کے لیے وارڈ چھوڑ کر یہاں آنا مشکل ہو گا۔ بڑا ڈاکٹر اکثر وقت ناوقت چکر لگاتا رہتا ہے۔"

"سب بکواس ہے۔" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "بات صرف اتنی ہے کہ تم ہر قیمت پر باہر جانا چاہتی ہو۔ مسلسل تین روز سے بیمار شوہر کو دیکھتے دیکھتے اکتا گئی ہو۔۔۔ جاؤ لے آؤ میری دوائیں بھی۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے جھلملا رہے تھے۔

اس سے پیشتر کہ اُس کے آنسو میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کرتے میں نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔

اُس کے قدموں کی بوجھل چاپ سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جا چکی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ واپس آئی تو دواؤں کے ساتھ ہی کچھ پھل بھی لائی تھی مگر میں نے اُسے کوئی رخ نہیں دیا۔

نئی دواؤں میں ایک سکون آور گولی بھی تھی جس کے اثر سے میں بیشتر وقت غنودگی یا نیند کے عالم میں رہنے لگا۔ اس دوران میں جب بھی میری آنکھ کھلی میں نے سیتا کو قریب ہی موجود پایا۔ لیکن اس کی جانب سے جو تلخی میرے دل میں گھر کر چکی تھی وہ رفع نہ ہو سکی بلکہ مجھے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ خواب آور گولی شاید سیتا نے اپنی طرف سے میری دوا میں شامل کی تھی تاکہ گہری غفلت کے دوران اس کی آمد و رفت میں خلل پڑنے کا کوئی موہوم سا امکان بھی باقی نہ رہے۔

پھر ایک دن جب ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں میرے زخموں کا معائنہ کر رہا تھا تو میں نے اس سے سوال کر ہی ڈالا۔

"تازہ زخموں کے مقابلے میں بھرتے ہوئے زخموں کی کسک شدید ہوتی ہے، ظاہری چوٹوں کے علاوہ تمھارے بہت سے پٹھے بھی کچلے گئے ہیں اس مرحلے پر تمھارے لیے خواب آور دوا کا استعمال ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے پٹیاں تبدیل کرتے ہوئے کہا مگر میرے دل سے وہ پھانس نہ نکل سکی۔

ایک روز سیتا نے مجھے اس نرس سے بھی ملوا دیا جو اُس پر خاصی مہربان تھی۔ گندمی رنگ کی جوان اور خوبرو لڑکی تھی۔ میں چاہتے ہوئے بھی اُس سے کچھ نہ پوچھ سکا۔ اِن دنوں مسکن ادویہ کی وجہ سے بیداری کے عالم میں بھی ذہن ماؤف سا رہنے لگا۔

رفتہ رفتہ مجھے بستر پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی پھر چند روز تک ایک نرس بیساکھی کے سہارے لان پر چلنے کی مشق کراتی رہی۔ بعد میں اس نے یہ ذمہ داری سیتا کو سونپ دی۔

سیتا میری دیکھ بھال کے معاملے میں بہت مستعد تھی، دواؤں اور کھانے پینے کا پورا خیال رکھتی تھی مگر اس کے باوجود ہم دونوں کے مراسم میں پہلے جیسی گرمجوشی نہیں رہتی تھی۔ ہر وقت دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔

چند ہفتوں کے بعد زخم اس حد تک مندمل ہو گئے کہ خواب آور دواؤں کا استعمال ترک کرا دیا گیا مگر اس کے باوجود مجھے ذہنی طور پر نارمل ہونے میں مزید آٹھ دس دن صرف ہو گئے۔

ذہنی طور پر مستعد ہونے کے بعد میں ہر شام منتظر رہنے لگا کہ سیتا باہر جانے کا نام لے اور میں اس بہانے سے وہ سب کچھ اُسے

سناڈالوں جو پچھلے دنوں میں غبار بن کر میرے دل میں جمع ہو رہا تھا لیکن سیتا نے پھر باہر جانے کا نام نہیں لیا۔

"تم نے بہت دنوں سے لاوارث عورتوں کی دیکھ بھال چھوڑ رکھی ہے۔" ایک روز لان میں بیٹھے ہوئے میں نے بات نکال ہی لی۔

"تمھیں پسند نہیں تھا نا!"

"چلو مجھے اُن تک لے چلو۔"

"زنانہ وارڈ میں مردوں کا داخلہ منع ہے پھر وہ کافی فاصلے پر بھی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے لب و لہجے کی شوخی سُنے بہت دن ہو چکے تھے۔

"مرد ملاقاتی تو آتے ہی ہوں گے اور پھر اب میں رکے بغیر خاصی دُور تک چل لیتا ہوں۔" میں نے اصرار کیا۔

"ضروری تو نہیں کہ اب تک وہ ہسپتال میں ہوں۔" اس نے داہنے پیر کے انگوٹھے سے گھاس کریدتے ہوئے کہا۔ "کوئی مر گئی ہو گی جو رہ گئی ہوں گی صحتیاب ہو کر گھروں کو جا چکی ہوں گی، اب تو شاید ہر بستر پر اجنبی چہرے ہوں گے۔"

میں لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔

میرے لیے سیتا کی ذات اِن دنوں ایک عجیب معمہ بن کر رہ گئی تھی مجھے اس کی ذات پر اپنی ملکیت کا شدت سے احساس تھا میرے نزدیک احساسِ ملکیت کے لیے مرد یا عورت ہونا ضروری نہیں ہوتا بس جسے لوٹ کر چاہا جاتا ہے اس کی پرچھائیں تک کو انسان اپنی مرضی کا اسیر کرنا چاہتا ہے۔ کبھی تو جی چاہتا تھا کہ سیتا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر ان لمحوں کو وقت کے طلسم میں ساکت کر دوں اور جب اس کی پچھلے دنوں کی شاموں کی غیر حاضری یاد آتی، تو اُس کے بدن کے ریشے اڑا دینے کو طبیعت بے قرار ہو جاتی۔

مگر دونوں صورتوں میں اُس کی اداس اداس خاموشی مجھے مسلسل کھائے جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے کھل کر بات ہی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ میں کوئی بات چھیڑتا تو وہ یوں مختصر سا جواب دے کر بات ختم کرتی کہ میں منہ دیکھتا رہ جاتا۔

ڈاکٹروں نے چھٹے ہفتے مجھے اس شرط کے ساتھ چھٹی کی پیشکش کی کہ میں مزید دو ہفتے تک بیساکھی کا استعمال برقرار رکھوں لیکن میرے اقرار یا انکار سے پہلے ہی سیتا نے نرم لہجے میں وہ پیشکش مسترد کر دی۔

"یہ اس ہسپتال سے بیساکھی کے سہارے نہیں، اپنے قدموں پر چل کر جائیں گے۔" اس کا لہجہ نرم مگر بے لاگ تھا۔

"اب صرف ہڈی کھلنی باقی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کے لیے دو تین ہفتے تک یہاں کے اخراجات جاری رہیں گے۔"

"اس طرف سے بے فکر رہیں۔" سیتا نے لاپروائی سے کہا۔ "یہ ہمارا مسئلہ ہے اور ہم ہر ادائیگی کے قابل ہیں۔"

"اب کتنے پیسے رہ گئے ہیں؟" ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میں نے سیتا سے سوال کیا۔

"کافی ہوں گے۔" اُس کے لہجے میں ذرا بھی لوچ نہیں تھا۔ "اس نرس سے ملوں گی تو معلوم ہو سکے گا کہ کیا باقی ہے۔"

"تم آج کل کچھ بیزار سی نظر آ رہی ہو۔" اس وقت میرا دل اُس سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ ساری تلخیوں کو فراموش کر کے۔

اُس نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر غور سے میری طرف دیکھا، جیسے میرے بشرے سے میرے الفاظ کی گہرائی ناپ رہی ہو پھر سر جھکا لیا۔

"نہیں۔۔۔ خیال ہے تمھارا۔"

"جھوٹ بول رہی ہو تم۔"

"دکھ تو یہی ہے کہ میرے بارے میں تم سچ اور جھوٹ کا سارا امتیاز کھو چکے ہو اور جب عورت اپنے مرد کی نظر میں اتنی گر جائے تو اسے جینے کا کوئی حق نہیں رہتا۔" اس کا لہجہ قدرے بوجھل مگر جذبات سے عاری تھا۔

میں نے داہنے ہاتھ میں اس کے بال تھام کر اس کا چہرہ ایک جھٹکے سے اُوپر اٹھا دیا۔ "مرنے سے ڈرا رہی ہو مجھے؟"

"مرنا صرف مٹی میں مل جانے کو ہی نہیں کہتے۔" اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہونے لگے۔ "جب کسی سے اُس کی معصوم خوشیاں اور اعتماد چھین کر انگاروں کی سیج پر بٹھا دیا جائے تو اسے بھی موت ہی کہتے ہیں۔ میں تو اس دکھ کو جھیل رہی ہوں تمھیں ڈرا دھمکا دوں گی۔"

"کب چھینی میں نے تمھاری خوشی؟" میں نے اس کے بالوں کو ایک اضطراری جھٹکا دے کر ہیجانی لہجے میں سوال کیا۔

"ٹھنڈے دل سے سوچو گے تو سب یاد آ جائے گا۔" اُس نے اپنے بال میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نہ وہ اُگل رہی تھی نہ میں اپنی زبان سے کہا ہوا دہرانا چاہتا تھا۔

"کیا یاد آ جائے گا؟"

"اتنی بڑی بڑی باتیں کہہ کر بھول گئے؟" اس کا لہجہ شکایتی ہو گیا، آنکھیں اچانک دھندلا گئیں اور آواز بھرا گئی۔

"وہ سب تم نے کہلوایا۔ ایک جھوٹ بول کر۔"

"پھر کہا تم نے مجھے جھوٹا؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"اُن باتوں کو کریدو گی تو ہزار بار جھوٹا کہوں گا۔" اُس کی حالت دیکھ کر میرا دل نرم پڑ رہا تھا مگر الفاظ تلخ ہوتے جا رہے تھے محض اُسے اعترافِ شکست پر مجبور کرنے کے لیے۔

"جو جھوٹ کسی کا پندار رکھ لیں۔ میری ماں کہتی تھی وہ جھوٹ

نہیں ہوتے۔" وہ بھرائی ہوئی دل شکستہ آواز میں بولی۔

"کس کا پندار رکھنا چاہا تھا تم نے۔۔۔اپنا؟ میرا؟ یا کسی اور کا؟" یک بہ یک میرے ذہن پر غصہ سوار ہو گیا۔

"وہ جس کا بھی رہا ہو مگر میرا ایمان ہے کہ پاپ نہیں تھا۔" اس نے جھرجھری لے کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"بتاؤ گی نہیں؟" میں نے غصے اور بے بسی کے ساتھ سوال کیا۔

اس نے بڑے زور سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

سیتا پر اس وقت وہی ضد اور ہٹ دھرمی طاری تھی جو ہمالیہ کے پہاڑوں میں سرکش بندروں پر حکمرانی کرتے ہوئے اس کا مزاج بنی ہوئی تھی۔

"اگر وہ پاپ نہیں تھا تو مجھے بتلاتے ہوئے کیوں ڈرتی ہو؟" چند ثانیوں کے بعد میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"جس روز اپنے قدموں پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے سب بتا دوں گی۔" اس نے آنسوؤں میں تر چہرہ اٹھا کر سسکتے ہوئے کہا۔

اس واقعہ کے بعد ہمارے تعلقات پر پھر جمود طاری ہو گیا میرے اور اس کے درمیان محض بیمار اور مخلص تیماردار کا رشتہ باقی رہ گیا تھا مگر میرے ذہن پر یہ خلش ضرور سوار ہو گئی تھی کہ وہ کون سا انوکھا جھوٹ تھا جسے وہ مجھ سے مسلسل چھپائے جا رہی تھی۔

رفتہ رفتہ وہ دن بھی آ گیا جب میں کسی سہارے کے بغیر محتاط قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔

دو روز تک یہ مشق ڈاکٹر کی کڑی نگرانی میں جاری رہی پھر مزید تین روز تک مجھے اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔

اس دوران میں نپے تلے قدموں سے چلنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا تو ایک روز مجھے ہسپتال سے رخصت کی اجازت مل گئی۔

ہسپتال کے بل کی رقم دیکھ کر میں پریشان ہو گیا، مگر سیتا نے اطمینان کے ساتھ چار ہزار کے قریب وہ رقم ادا کی اور ہم باہر آ گئے۔

"سوٹ کیس نہیں لینا؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"بعد میں لے لیں گے۔" باہمی تعلقات میں کشیدگی کے باوجود اس روز خوشی سے میرے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

ہسپتال کے دروازے پر ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے سیتا نے ڈرائیور کو بہادر آباد چلنے کے لیے کہا تو میں چونک پڑا مگر سیتا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

بہادر آباد کے کمرشل ایریا میں چھوٹے چھوٹے پلاٹوں پر بنی ہوئی کئی منزلہ عمارات میں سے ایک کے سامنے سیتا نے ٹیکسی رکوائی اور پھر مجھے سہارا دے کر سیڑھیاں عبور کرنے میں مدد دینے لگی۔ پہلی منزل کے فلیٹ کا تالا کھول کر ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو آراستہ فلیٹ بالکل صاف ستھرا پڑا ہوا تھا۔

"یہ کہاں لے آئیں تم؟" میں نے دو کمروں کے فلیٹ میں موجود اوسط درجے کے لوازمِ زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"سر چھپانے کے لیے ہمیں ایک ٹھکانا درکار تھا جو مل گیا۔ یہ جگہ ہوٹلوں سے بہتر اور محفوظ ہے۔" اس نے کہا۔

"مگر اس کی چابی تمھارے پاس کیسے آئی؟"

"یہ صفیہ کا فلیٹ ہے۔" سیتا نے اس نرس کے بارے میں کہا جو اس کی دوست بنی ہوئی تھی۔ "اس کا شوہر مکینک ہے، اور سعودی عرب میں کام کرتا ہے، اسے خود نرسنگ کوارٹر میں جگہ ملی ہوئی ہے۔۔۔ یہ فلیٹ عموماً بند رہتا ہے۔ شوہر چھٹیوں پر آتا ہے تو مہینے بیس روز کے لیے وہ دونوں اسے آباد کر لیتے ہیں۔"

"بڑی مہربان ہو گئی ہے وہ تم پر!" میں نے صاف ستھرے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا اور اسی وقت میری نگاہ ایک میز کے نیچے رکھے ہوئے اس سوٹ کیس پر پڑی جو میں نے جدہ سے خریدا تھا۔

"اتفاق ہی ہے جو مجھے اس سے مل بیٹھنے کا موقع مل گیا۔" سیتا بولی۔ "میں نے اسے اپنا نام لیلیٰ ہی بتایا ہے ہو سکتا ہے کہ کسی چھٹی والے دن وہ ملنے آ جائے۔"

"تو ہسپتال سے تم یہاں آیا کرتی تھیں؟" تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے وہ سوال کر ہی ڈالا جو کافی دیر سے میرے ذہن میں ڈنک مار رہا تھا۔

"یہاں آ کر کیا لیتی؟" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ کراچی آتے ہی ہم ایک ساتھ کئی مشکلات میں گھر گئے۔"

"بلا توقف بولتی جاؤ۔" میں نے بے تابی سے اسے ٹوکا۔

"ہوٹل سے نکلتے ہوئے اتفاقی طور پر کچھ رقم کپڑوں میں رہ گئی تھی باقی رقم تمھاری جیب میں تھی جس وقت حادثے کے بعد تم بے ہوش ہوئے تو آناً فاناً میں وہاں جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا مگر ٹکر مارنے والے کو کوئی نہ روک سکا۔ اسی بھیڑ میں کسی نے تمھیں اٹھانے کے بہانے جیبیں صاف کر دیں۔ غنیمت ہوا کہ پاسپورٹ وغیرہ ہوٹل میں تھے ورنہ وہ بھی صاف ہو جاتے۔" وہ پرسکون لہجے میں بتانے لگی اور میں بے اعتباری سے اس کی کہانی سنتا رہا۔

"ہسپتال میں تمھارے لیے فوری طور پر خون اور کچھ قیمتی

دواؤں کی ضرورت تھی جن کا بروقت کوئی انتظام نہ ہو سکا اور وہ ساری رات میں نے تمھارے سرہانے روتے اور سوچتے ہوئے گزار دی اور اگلی صبح ہر قیمت پر رقم کی فراہمی کا ارادہ کر لیا۔ اس روز میں نے صدر کے علاقے میں شیزان ہوٹل کے پاس دو آدمیوں کی جیبیں صاف کیں تب کہیں خون وغیرہ کا انتظام ہو سکا اور اگلی صبح تمھارا آپریشن کیا گیا ورنہ تمھاری ٹانگ ضائع ہونے کا خطرہ تھا اس کے بعد میں نے تمھارے بہتر علاج کے لیے اسی راہ پر چلتے رہنے کا فیصلہ کیا اور ضروریات کے مطابق ہسپتال سے غائب ہو کر شام کی بھیڑ بھاڑ میں مختلف علاقوں میں جیبیں کاٹتی رہی۔ اگر اس وقت میں تمھیں یہ سب کچھ بتا دیتی تو شاید تم ٹانگ کٹوانا گوارا کر لیتے مگر مجھے روک دیتے اسی لیے میں خاموشی سے تمھاری ہر بات سہتی رہی۔ میں پُریقین تھی کہ وقت آنے پر جب تمھیں حالات کا علم ہو گا تو تم مجھے معاف کر دو گے مگر بدقسمتی سے تمھارا ذہن بہک گیا اور تم نے برملا میرے کردار پر اپنے شبہات کا اظہار کر ڈالا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم اس انتہا تک سوچنے لگو گے۔"

"میں شرمندہ ہوں سیتا!" میں نے اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ کسی ننھے سے سہمے ہوئے بچے کی طرح بلک کر رو پڑی۔

"تمھاری الزام تراشیاں سن کر میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ جس روز صحت یابی کے بعد تمھیں ہسپتال سے چھٹی ملے گی میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں گی مگر بعد میں تمھارے رویّے میں تھوڑی سی تبدیلی نے مجھے زندہ رہنے کی آس دلا دی ورنہ آج تم تنہا رہ گئے ہوتے۔"

"مگر بعد میں تو تم نے غائب ہونے کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا پھر اخراجات کہاں سے چلتے رہے؟" میں نے پوچھا۔

"جن دنوں تم خواب آور دواؤں کے زیرِ اثر رہتے تھے میں نے ایک ایک دن میں کئی کئی جیبیں تراشیں تاکہ اس مہلت میں آنے والے دنوں کے لیے کچھ پونجی جمع کر سکوں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ سارے اخراجات ادا کرنے کے بعد اس وقت میرے پاس کئی ہزار روپے موجود ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اور تم کبھی نہیں پکڑی گئیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ کبھی نہیں۔" اس نے سادگی سے کہا اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟"

"بُرے کام پر بھی خدا کا شکر ادا کر رہی ہو۔"

"اس کا شکر تو ہر حال میں کرنا چاہیے۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "میں جیب تراشیاں ضرورت کے تحت کر رہی تھی وہ میرا شوق یا پیشہ تو نہیں تھا۔"

"اور ہوٹل کا بل بھی اسی طرح ادا کیا؟"

"نہیں۔ کچھ رقم کمرے ہی میں تھی۔ اس سے ہوٹل کا حساب بے باق ہو گیا۔ اگر میں ادھر کی خبر نہ لیتی تو ڈر تھا کہ ہوٹل والے ایک دو روز انتظار کے بعد پولیس سے رجوع کرتے اور ہمارے پاسپورٹوں کے ذریعے پیچیدہ دشواریاں کھڑی ہو جاتیں۔"

میں بظاہر سکون کے ساتھ سیتا کی کہانی سنتا رہا مگر میرے دل و دماغ میں اپنے معاشی استحکام کے بارے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

سیتا نے اپنی ضرورت اور میری صحت یابی کے لیے جس مذموم فعل کا سہارا لیا وہ ایک عورت کے لیے کسی بھی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتا تھا اور آئندہ کے لیے کسی ناگہانی صورتِ حال میں ان مجبوریوں کا سدِّباب ضروری تھا۔

"پہلے میں نے ملازمت کے بارے میں بھی سوچا تھا۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "مگر میں کراچی کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ ملازمت میں آبرو کا تحفظ میرے لیے سنگین مسئلہ تھا اور اگر کوئی بُری گھڑی آ ہی جاتی تو شاید میرے ہاتھ خونریزی سے بھی نہ رکتے پھر دوسری مجبوری یہ تھی کہ کسی بھی ملازمت سے اتنی آمدنی کی امید نہیں تھی جو تمھارے علاج کے اخراجات پورے کرنے کی متحمل ہو سکتی۔"

"مجھے معاف کر دو سیتا!" میں جذبات سے مغلوب لہجے میں بولا۔ "پتہ نہیں میرا ذہن کیوں گندگی کی طرف بھٹک گیا تھا۔ تم واقعی عظیم ہو، عورت کی وفا اور ایثار کی ایک مثال ہو، کاش میں نے وہ سب بکواس نہ کی ہوتی۔"

"شاید تم بھی حق بجانب تھے۔۔۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا "یا شاید تم اپنی ذات سے میری وابستگی کو نہیں سمجھ سکے تھے۔"

"میری زندگی میں یہ پہلا مرحلہ تھا کہ میں نے تمھارے بارے کوئی غلط رائے قائم کی تھی۔ وہ بھی محض اس لیے کہ میں تمھارے چہرے سے تمھارا جھوٹ پکڑنے پر قادر ہوں ورنہ وہ بدترین لمحات جنم ہی نہ لیتے۔"

"اب بھول جاؤ ان باتوں کو۔" وہ اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "غنیمت یہ ہے کہ تم نے میرا عذر قبول کر لیا۔"

"انسان تدبیریں سوچتا رہ جاتا ہے مگر تقدیر کے بے رحم ہاتھ اسے انجان راستوں پر دھکیلتے رہتے ہیں۔" قدرے سکوت کے بعد میں نے کہا۔ "کراچی آتے ہوئے میرا پکا ارادہ تھا کہ بچی ہوئی رقم سے کوئی ستھرا کام کر کے روزی کماؤں گا مگر آتے ہی ہمیں گناہ کے راستے سے اپنی ضروریات پوری کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔"

"تمھارا گھر بار۔ ماں باپ اور بہن بھائی کہاں ہیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے مجھ سے سوال کر ہی ڈالا۔

"باپ کے علاوہ بھرا گھر ہے۔" میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"جہاں میں نے انھیں آخری بار چھوڑا تھا، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ کئی برس پہلے اُن کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی تھی تو ناکام رہا تھا۔"

"یہیں کراچی میں؟"

"نہیں وہ سب لاہور میں ہوا کرتے تھے، مجھے بھی مقدر کی گردش کراچی کھینچ لائی تھی ورنہ میں بھی وہیں پلا بڑھا تھا۔"

"تم چند روز آرام کرلو۔" وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "پھر ہم لاہور چلیں گے اور ایک بار پھر انھیں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے......"

"مجھے اپنے گمشدہ رشتے مل جائیں تو بات ہی کیا ہو۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کر حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

اور یہ تھا بھی درست ہی۔

میں لاکھ سرکش اور نافرمان سہی۔ مگر برسوں کی لاتعلقی کے بعد اگر اب اپنوں کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا تو شاید سب ہی مجھے سینے سے لگا لیتے۔

"ہم انھیں تلاش کریں گے اُن کے قدموں میں سر رکھ کر اپنی خطاؤں کی معافی چاہیں گے اور جب وہ ہمیں معاف کردیں گے تو ہم آگے نکل جائیں گے۔"

"خطائیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ "تم کن خطاؤں کی بات کررہی ہو؟"

میرا خیال تھا کہ میں نے اپنے گھر والوں سے اختلافات کے بارے میں اسے کبھی ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔

"ایک بار تم نے مجھے گھر چھوڑنے کا قصہ سنایا تھا۔" وہ بولی۔ "جہاں رشتے اٹوٹ ہوں وہاں وقت گزرنے کے ساتھ تلخیوں میں مٹھاس آجاتی ہے۔"

"اور آگے کہاں جانے کی بات کررہی تھیں تم؟" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس سے سوال کیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم پارس کو بھول جانا چاہتے ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "حادثے سے پہلے میں نے بھی اُسے بھولنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر اب میں سوچتی ہوں کہ اس کا حاصل کرلینا ہمارے حق میں اچھا ہی رہے گا۔"

"پارس پتھر۔" میں نے پُرخیال لہجے میں دُہرایا۔ "ہے تو وہ ایک نایاب چیز اور اس میں زندگی کی آسائشوں کو فراہم کرنے کی قوت بھی ہے مگر میں اب ہنگاموں سے اکتا گیا ہوں۔ زندگی وہی اچھی ہوتی ہے جو اعتدال سے بسر کی جائے۔"

"ہماری پونجی لٹ گئی۔" وہ دلائل پر اتر آئی۔ "جس کے سہارے تم ایمانداری اور عافیت سے زندگی کا آغاز کرنا چاہتے تھے مجھے جیب تراشی کی اجازت تم ہرگز نہ دوگے اور نوکری سے بھی خوف آتا ہے پھر بتاؤ کہ ہم کیا کریں گے؟"

"بس چند روز کی بات ہے۔" میں زخمی ضرور ہوا تھا مگر اب معذور نہیں ہوں میں اپنے زورِ بازو سے اپنی روزی کما سکتا ہوں۔"

"وہ میں جانتی ہوں۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمھاری ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ ضرور گئی ہے مگر اس کی اصل قوت بحال ہونے میں وقت لگے گا۔ زیادہ مشقت سے نئی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔"

"تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"اگر پارس پتھر کی مدد سے ہم گھر بیٹھے آرام دہ زندگی گزار سکیں تو کیا بُرا ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کی بازیابی شاید اتنی آسان نہ ہو۔"

"پرانی باتیں بھول جاؤ۔ اب وہ برسوں پرانی کہانی ہے اس سے پہلے کہ میری پس انداز کی ہوئی رقم ختم ہو ہمیں اپنی مہم کا آغاز کردینا چاہیے۔"

میں نے غور کیا تو اس کی بات میں خاصا وزن تھا۔

پارس پتھر انبالے کے راجہ ہوٹل کے اس کمرے کی الماری کی چوبی چوکھٹ میں پوشیدہ تھا جہاں میں مقیم تھا۔

میں نے پتھر ایک سوراخ میں چھپا کر اوپر سے اس طرح چیونگم لگادی تھی کہ بادی النظر میں اس کا سراغ لگانا دشوار تھا۔

اگر پارس پتھر وہیں موجود تھا تو ساری مہم صرف اتنی رہ جاتی تھی کہ ہم راجہ ہوٹل میں ایک رات قیام کریں اور اسے حاصل کرکے واپس آجائیں۔

پارس پتھر کے وہاں نہ ہونے کی صورت میں ہمیں مایوس لوٹنا پڑتا لیکن اس کوشش میں بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آرہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" کچھ دیر تک سوچ بچار کے بعد میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تین دن بعد روانگی کا انتظام کرلوں؟" اُس کا چہرہ دمک اٹھا اور شگفتگی واپس لوٹ آئی۔

"تین دن بعد کیوں؟"

"روانگی سے پہلے ایک بار ڈاکٹر سے ملنا ضروری ہے۔" اس نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "اور اُس نے تمھیں پرسوں شام بلایا ہے۔"

دوپہر کو سیتا قرب و جوار کے کسی ہوٹل سے گرم گرم اشتہا انگیز کھانے لے آئی جس سے فارغ ہوکر ہم نے کچھ دیر سستانے کا ارادہ کیا۔ سیتا کے مجوزہ پروگرام کے مدِنظر اس کے پاس بچی ہوئی چند ہزار کی رقم ناکافی نظر آرہی تھی اور اس میں ہوائی سفر کی عیاشی

نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہ خیال آتے ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔

"کیا ہوا؟" سیتا مجھے یوں اٹھتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"ہمیں لاہور تک ٹرین سے سفر کرنا ہوگا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور یہاں فوری طور پر ٹرین کا ٹکٹ ملنا آسان نہیں ہوتا۔"

حادثے کے بعد مدد فراہم کرنے والوں نے رقم کے علاوہ میری رسٹ واچ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ جس سے میں صحیح وقت دیکھ سکتا لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس وقت دوپہر کے دو بجے کا عمل تھا اور پچھلے چند برسوں میں اگر پاکستان میں کوئی انتظامی انقلاب نہیں آیا تھا تو ریلوے اسٹیشن پر کم از کم چار بجے تک بکنگ کرائی جاسکتی تھی۔

سیتا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر اس کا رویہ بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت میرے باہر جانے پر خوش نہیں تھی مگر میں اس کے رویے کو نظر انداز کرکے اس کے ہمراہ فلیٹ سے نیچے آگیا۔

نیچے آتے ہی سیتا کچھ سراسیمہ سی نظر آنے لگی۔ اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ عقبی حصے سے جلد از جلد کھلی سڑک پر آکر کوئی سواری حاصل کرسکے۔

"کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان ہو۔" میں نے دانستہ رک کر اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"چلتے رہو، رک کیوں گئے؟" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ "مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کی گردن پیچھے گھومی، اور میں نے فوری طور پر تمام صورتحال کا اندازہ لگالیا۔

ہمارے نئے فلیٹ کے مقابل ایک سیاہ فورڈ مستانگ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا اوباش صورت شخص دروازہ کھولے ہم دونوں کی طرف نگراں تھا۔ گو ہم اس سے کافی دور آچکے تھے مگر بہادر آباد کے چوراہے سے گھوم کر آنے والی سڑک اب بھی دور تھی۔

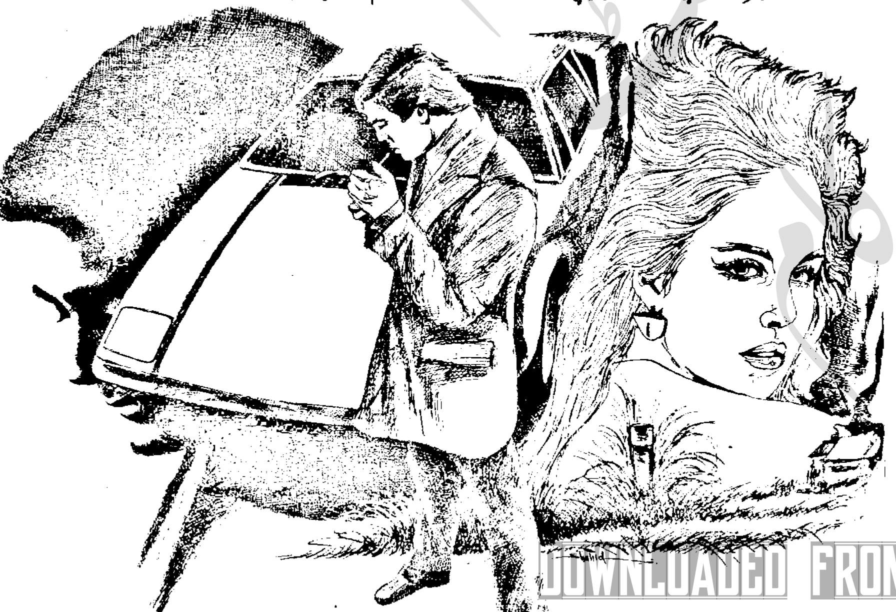
"سیاہ کار؟" میں نے دھیمے "تائید طلب لہجے میں سیتا سے سوال کیا۔

"نہیں۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم اس لفنگے سے نہیں الجھوگے، جھک مار کر خود ہی چلا جائے گا۔ اسنیک بار سے کھانا لیتے ہوئے اس لنگور کی اولاد سے سامنا ہوا تھا شاید اسی وقت سے یہ یہاں مرا ہوا ہے۔"

پھر ہمارے سڑک پر پہنچنے سے ذرا پہلے فورڈ مستانگ رینگتی ہوئی آئی اور ہمارے قریب رک گئی۔

ڈرائیور والی کھڑکی مجھ سے قریب تر تھی۔

"کہاں جائیں گے آپ دونوں؟" اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر شائستہ لہجے میں سوال کیا اور میرے جواب دینے سے بیشتر سیتا نے دونوں ہاتھوں میں اس کے بال جکڑ کر اس کے دھڑ کو کھڑکی میں سے باہر گھسیٹنے کی کوشش شروع کردی۔ اس موقع پر بے اختیار میرا داہنا ہاتھ چل گیا جو نیچے سے بری طرح اس کی ناک پر پڑا اور اس کے حلق سے بوکھلاہٹ کے عالم میں عجیب سی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔



فورٹ مستانگ میں سوار اوباش صفت نوجوان کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی مگر میرے لیے اپنی وہ غیر ارادی حرکت خاصی مہنگی پڑی۔

دونوں ٹانگوں پر توازن یکبارگی تبدیل ہوا تھا جس کے باعث میری داہنی پنڈلی میں درد کی شدید ٹیس اٹھی اور میں بے اختیار زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

درد کی وہ لہر جتنی شدید تھی اسی قدر مختصر بھی ثابت ہوئی مگر اس دوران میں سیتا اس شخص کا حلیہ بگاڑ چکی تھی۔

اس کا اوپری دھڑ کھڑکی کے اُترے ہوئے شیشے میں سے باہر لٹکا ہوا تھا مگر اس نے اپنے دونوں پنجے اسٹیئرنگ وہیل میں پھنسا کر خود کو منہ کے بل باہر گرنے سے روکا ہوا تھا۔

ناک سے بہنے والے خون نے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا رہی سہی کسر سیتا کے زنّاٹے دار تھپیڑے نے پوری کر دی تھی۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے اُس کے بال جکڑے ہوئے تھے اور داہنے ہاتھ سے اس کے چہرے پر تھپیڑ برسا رہی تھی۔

وہ سکون اور قدرے سناٹے کا وقت تھا مگر پھر بھی اسی اثنا میں نہ جانے کہاں سے کئی افراد وہاں آ گئے۔

سیتا کے حسین اور غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اُن میں سے کسی نے صورتِ حال دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دو افراد نے آگے بڑھ کر بے رحمی سے اُسے کھڑکی سے باہر گھسیٹ لیا اور سیتا اسے چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"پسلیاں توڑ دو سالے کی۔" ایک تماشائی نے مٹی پر پڑے ہوئے لفنگے کی طرف دیکھ کر حقارت آمیز لہجے میں ہانک لگائی۔

مکّوں، تھپیڑوں اور لاتوں سے جس انداز میں اس کی تواضع ہو رہی تھی اور وہ جیسی دردناک آوازیں نکال رہا تھا اُن سے یہی تاثر ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اسے سُرمہ بنائے بغیر ہاتھ نہیں روکیں گے۔

وہ لاکھ بدطینت اور اوباش صفت سہی مگر ایک انسان ہی تھا اور میری دانست میں اُسے لیا سبق مِلا تھا کہ آئندہ وہ عمر بھر کسی عورت کے ساتھ گستاخی کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا لہٰذا مجھے دخل انداز ہونا پڑا۔

لوگ ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہو گئے اور وہ خاک و خون میں آلودہ نیچے پڑا کربناک انداز میں کراہتا رہا۔

"کیا ہوا تھا بن جی!" اس کی ٹھکائی کرنے والوں میں سے ایک نے قابلِ اعتراض حد تک سیتا کے قریب ہو کر مربیانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"دُور رہ کر سوال کرو۔" سیتا نے اسے کہنی سے پیچھے دھکیل کر تلخ لہجے میں کہا۔ "جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اوسان بحال ہوں گے تو یہ خود ہی بتا دے گا۔"

جمع ہونے والوں میں سے ایک آدھ بلند آواز میں ہنسا اور سوال کرنے والا سر جھٹک کر بڑبڑاتا ہوا اُن میں شامل ہو گیا۔

میں سیتا کے ساتھ ہولے ہولے سڑک کی طرف بڑھ گیا۔

"درندے ہیں۔" سیتا سڑک کے کنارے پہنچ کر قہر آلود لہجے میں بولی۔ "اکیلی عورت کو تو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے تمھارا خیال درست ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو کیا اس میں غلطی کا امکان بھی ہے؟" اس نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"قصور معاشرے کا ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تک اکیلی عورت کا تصوّر رواج نہیں پا سکا ہے۔" میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"اکیلی عورت؟" اس نے تحیّر آمیز انداز میں آنکھیں جھپکاتے ہوئے سوال کیا۔

"عورت اگر ثانوی درجہ رکھتی ہو، یعنی کسی مرد کے حوالے پہچانی جائے۔ خواہ وہ باپ ہو یا بھائی یا شوہر۔ تو معزز قرار پاتی ہے مگر وہ خود اپنی شناخت منوانے سے قاصر ہے۔ اُسے استہزا، اور تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔"

"مگر کیوں؟" اس کے لہجے میں احتجاج نمایاں تھا۔ "دفتروں میں کام کرنے والی ہزاروں لڑکیاں بھی تو ہیں۔ بہت سی ایسی بھی ہیں جن کے گھرانے اُن ہی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔"

"وہ غول کی صورت میں رہتی ہیں اور ایک دوسرے کے حوالے سے عافیت میں رہتی ہیں۔ میری بات کی صداقت آزمانی ہو تو مردوں کی بھیڑ میں گھری اِکّا دُکّا لڑکیوں کو دیکھو جو ہر لمحہ سہمی سی اپنی ذات کے حصار میں سمٹی رہتی ہیں۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ اُلجھی ہوئی باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔ میں تو بس اِتنا جانتی ہوں کہ عورت کی اپنی طرف اٹھنے والا ہر ہاتھ بے رحمی سے توڑ دینا چاہیے۔ اور جب ایسی مثالیں عام ہوں گی تو لوگ اُن کے احترام پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اسی وقت ایک خالی ٹیکسی رینگتی ہوئی ہماری طرف آئی اور میں ڈرائیور کو کینٹ اسٹیشن چلنے کی ہدایت کر کے سیتا کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

تین بجے ہم کینٹ اسٹیشن کی پُر ہجوم عمارت میں موجود تھے۔ دو کھڑکیوں کے بعد تیسری پر لاہور کے لیے بکنگ کے آثار نظر آئے جو تخمینے کی حد تک محدود تھے۔ اِکّا دُکّا افراد مسلسل اس کھڑکی پر آ رہے تھے۔ ہر شخص فریادی لہجے میں چند سوال کرتا اور مشینی جوابات سن کر

وہاں سے بے نیل و مرام لوٹ رہا تھا۔

میرے کھڑکی پر پہنچنے تک صرف ایک شخص ایسا آیا جس نے قدرے طویل گفتگو کے بعد چند نشستوں کی پیشگی بکنگ کرا لی۔

میں نے جب کھڑکی کے عقب میں بیٹھے ہوئے شخص پر اپنا عندیہ ظاہر کیا تو اس نے بیزاری کے عالم میں اپنے داہنے کان میں انگلی گھمائی پھر جُھک کر پنڈلی سہلاتے ہوئے مطلع کیا کہ تین دن بعد تو درکنار لاہور کے ٹکٹ بارہ دِن تک میسّر نہیں تھے۔

اس کے لب و لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ صبح سے شام تک اس کا بیشتر وقت اسی ایک مکالمے کی تکرار میں گزرتا تھا۔

وہاں خوشامد اور التجا کا جواب بھی ایک بیزاری تھی۔ میرے لیے یہ معاملہ خاصی کوفت کا باعث بنا اور میں مایوسانہ انداز میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔

کھڑکی سے ہٹتے ہوئے داہنی طرف ایک ہجوم سا دکھائی دیا۔ جو کچھ پُرجوش معلوم ہوتا تھا۔ اس میں کچھ چہرے وہی تھے جنھیں میں بکنگ کی کھڑکی سے مایوس و نامراد لوٹتے دیکھ چکا تھا۔

غیر ارادی طور پر میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا اور چند ہی لمحوں میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ چند بے نیاز قسم کے رضاکار اس ہجوم میں خدمتِ خلق پر مامور تھے، اور محض چند روپوں کے بدلے کراچی سے ہر شہر تک ہر دن کے ٹکٹ فراہم کرنے کے دعویدار تھے۔ اور حسبِ ضرورت مند سے اضافی رقم کی مالیت کا تعین ہو جاتا تھا، اسے چند ہی منٹوں میں نہ جانے کہاں سے ٹکٹ لا دیتے تھے۔

میری زبان سے منزل اور دن کے بارے میں سن کر اس قماش کے ایک موصوف نے ساڑھے تیرہ روپے فی ٹکٹ حق الخدمت طلب کیا جسے ادا کرنا میرے لیے دشوار نہیں تھا لیکن ایک سہولت میسّر آ جانے کے بعد مزید کا مطالبہ کرنا انسانی فطرت کی بدترین کمزوری ہے لہٰذا میں نے قدرے تردّد کا اظہار کیا۔

اُس نے چند لمحوں تک میرے سراپا کا جائزہ لیا پھر میری گردن تھام کر اپنا دہانہ میرے ایک کان سے لگا دیا۔

میرے لیے خوفزدہ ہونے کا کوئی مقام نہیں تھا کہ اِس چھت کے سائے میں ایسی رازدارانہ سرگوشیوں کے مناظر عام تھے۔

"دس سے کم نہیں ہوں گے، لینا ہے لو، ورنہ جاؤ۔" سرگوشیانہ آواز میں تحکم تھا۔

میں نے رقم گن کر اس کے حوالے کی اور چند منٹ بعد ہی ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھے۔

اس صورتحال سے گزر جانے کے بعد میرے خون میں دھیرے دھیرے ابال پیدا ہوا کہ ٹکٹ حاصل کرنے کے جائز ذرائع پر اژدہام کے آثار تھے جب کہ کھلے بازار میں آزاد داموں پر ہر شہر، ہر درجے اور ہر ٹرین کے ٹکٹ دستیاب تھے۔

میں ایک اضطراری لہر کے تحت دوبارہ بکنگ کی کھڑکی پر جا پہنچا۔

وہ شخص میری طرف متوجہ ہوئے بغیر میرے بولنے کا منتظر رہا۔

"تم نے تین دن بعد لاہور کے ٹکٹ۔۔۔۔" میں نے طنزیہ لہجے میں اپنی حکایت کی ابتدا کی ہی تھی کہ اس نے درمیان میں میری بات کاٹ دی۔

"تین دن بعد نہیں مِل سکتا۔ تیرہ دن بعد بُک کرا لو۔" مشینی جواب برآمد ہوا۔

"میں یہی بتانے آیا ہوں۔" میں نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تم نہ کر رہے ہو مگر مجھے باہر سے ہی ٹکٹ مِل گئے ہیں۔ تین دن بعد کے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "پھر میرے پاس کیوں آتے ہو؟" اس کی اکتاہٹ زدہ بیزار نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"تمھارے پاس نہیں ہیں تو باہر کیسے مِل رہے ہیں؟"

"بہت سے مسافر جانے کا ارادہ منسوخ یا ملتوی کر کے اپنے ٹکٹ بیچ دیتے ہیں۔" اس کا لہجہ مشینی ہی تھا مگر تیور بگڑ کر غیر مشینی ہو گئے تھے۔

"باہر ٹکٹ زیادہ داموں پر بک رہے ہیں۔" میں نے غصے اور جھلاہٹ کے عالم میں کہا۔

"اچھا!" یہ انکشاف اس کے لیے تحیّر آمیز ثابت ہُوا۔ "بلیک ہو رہی ہے باہر؟" پھر اس کے لب و لہجے میں نرمی آمڈ آئی۔ "معاف کیجئے، میں تو محض بکنگ کلرک ہوں، میری تنخواہ اور ذمہ داریاں بہت محدود سی ہیں جن سے تجاوز کرنا میرے لیے ناممکن ہے آپ اسپیشل یا ریلوے پولیس کے کسی آدمی کو فوراً اس کی اطلاع دیں۔"

اُس کے اخلاق نے مجھ پر فوری اثر کیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، درست ہی تھا۔ ساری بدمعاشی اِن مسافروں کی تھی جو دس بیس روپے کے لالچ میں سفر ملتوی کر کے اپنے ٹکٹ بلیک کر رہے تھے۔

سیتا نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں جذباتی طور پر اس معاملے میں اس قدر ملوث ہو گیا تھا کہ فوراً کسی سپاہی کی تلاش پر تُل گیا۔

اِس شیڈ میں ریلوے پولیس کی موجودگی کے آثار مفقود تھے۔ البتہ ایک ستون کے ساتھ ایک لحیم شحیم سادہ پوش شخص موٹی سی بید سنبھالے کھڑا تھا۔

مجھے شبہ ہُوا کہ وہ خصوصی پولیس کا کوئی کارندہ تھا۔ لہٰذا میں اسی سے جا بھڑا۔

"یہاں ٹکٹوں کی بلیک ہو رہی ہے۔" میں نے جاتے ہی اُس پر اپنا مدعا ظاہر کر دیا۔

"ثبوت؟" اس نے بید کو ہولے ہولے اپنی پنڈلی پر مارتے ہوئے کہا۔

"یہ رہے۔" میں نے اپنی مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔ "یہ میں نے ابھی بلیک میں خریدے ہیں اِسی جگہ سے۔"

"لوئے حمید!" اس شخص نے کسی کو پکارا۔ اُس کی آواز اس چھت کے نیچے گونجتی ہوئی ہر بھنبھناہٹ پر حاوی تھی۔

"جی صاحب!" کسی دُور افتادہ گوشے سے گونجیلا جواب آیا۔

"کہاں مرا ہوا ہے؟... دیکھ اِدھر بلیک ہو رہی ہے ٹکٹوں کی۔" اس نے اسی بلند آہنگ لہجے میں ہدایت جاری کی جس کے نتیجے میں بھیڑ بھاڑ میں افراتفری کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ کھڑے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے بہت سے لوگوں نے اچانک مختلف سمتوں میں تیزی سے چلنا شروع کر دیا تھا۔

حمید کو ہدایت دینے کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے ٹکٹ لے لیے اور چند ثانیوں تک انہیں بغور دیکھنے کے بعد نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"تو یہ تم نے بلیک میں خریدے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "دس رُوپے فی ٹکٹ زائد رقم ادا کی ہے۔"

"کس سے لیے ہیں؟" اس کا لہجہ سنگین ہو گیا۔

"ایک دُبلا پتلا دراز قامت تھا۔ مونچھوں والا۔" میں نے اپنے لہجے میں پیدا ہونے والی لکنت پر غالب آتے ہوئے جلدی سے کہا "بتاؤ کدھر ہے وہ؟"

میں نے اُس کی طرف سر گھمایا جدھر وہ دھندا ہو رہا تھا تو میدان تقریباً صاف ہو چکا تھا۔ ٹکٹ بیچنے والوں کا دُور تک پتہ نہیں تھا اور ضرورت مند مسافر حیران و پریشان ایک دُوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

پھر بھی میں نے اس کے ساتھ ایک چکر لگا ہی ڈالا مگر مجھے مطلوبہ شخص کا سایہ تک نظر نہ آ سکا۔ اور میں نے اس سے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔

"جائے گا کہاں؟ دو چار روز میں پکڑا ہی جائے گا۔" وہ گویا باآوازِ بلند بڑبڑایا، پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"رپورٹ درج کرانے۔" اس نے روا روی میں کہا۔ "ان بلیک کرنے والوں نے ہماری زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔ ویسے تو بلیک سے ٹکٹ خریدنا بھی جرم ہے لیکن میں تمہیں بند نہیں کروں گا۔ تم نے میرے پاس آکر اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ تین چار روز میں تمہاری مدد سے وہ پکڑا جائے گا، اور ایک ہاتھ آ جائے تو ہم اُن کے تمام ساتھیوں کو دھر لیں گے۔"

"میری مدد سے؟" میں نے حیرت اور بیچارگی سے سوال کیا۔ "وہ تو غائب ہو گیا، میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکوں گا؟"

حقیقت یہ ہے کہ جوش کے عالم میں فراموش کیے ہوئے نکتے کی یاد دہانی نے مجھے خائف کر دیا تھا۔ اگر وہ شریف النفس نہ ہوتا، تو مجھے بلیک سے ٹکٹ خریدنے کے اقبالی مجرم کے طور پر بآسانی سزایاب کرا سکتا تھا۔

"وہ کب تک اِدھر نہیں آئے گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اُسے تم ہی پہچان سکتے ہو۔ دو چار دن صبح سے شام تک میرے ساتھ یہاں رہو گے تو اندر قدم رکھتے ہی ہم اُسے دھر لیں گے۔"

اس کا مفہوم سمجھ کر میرا سر چکرا گیا اور میں نے فوراً دفاعی حکمتِ عملی اختیار کر لی۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ اِدھر کا رُخ ہی نہ کرے۔ صُورت سے بیچارہ ضرورت مند معلوم ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ چار چھ ٹکٹ بلیک میں بیچنے کے بعد اپنا ٹکٹ مفت حاصل کرنے کے لیے اس نے یہ سب کیا ہو؟"

"مگر قانونی لحاظ سے اُس کی گرفتاری ضروری ہے۔" اُس نے میرے دونوں ٹکٹ اپنی جیب میں ڈال لیے۔

"ہو سکتا ہے... مم... مگر ابھی تو میں نے باضابطہ رپورٹ بھی درج نہیں کرائی اس سارے واقعہ کی۔" میں بوکھلا گیا۔

"معزز شہریوں کی شکایت پر بھی ہم کارروائی کر لیتے ہیں۔ ضابطے کی خانہ پُری بعد میں کر لی جاتی ہے۔" اس نے اپنی مستعدی سے آگاہ کیا۔

معاملہ اُلجھ گیا تھا۔ اس کا لہجہ لمحہ بہ لمحہ سنگین تر ہوتا جا رہا تھا۔ اصل مجرم کے فرار کے بعد ساری فردِ جرم مجھے اپنے سر آتی نظر آ رہی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ میں نے پُوری گفتگو کے دوران ان دونوں ٹکٹوں کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا تھا جو اس کی جیب میں منتقل ہو چکے تھے۔

آخر یہی طے پایا کہ میں جلد از جلد وہاں سے غائب ہو جاؤں اور وہ میرے چلے جانے کے بعد دونوں ٹکٹ "تلف" کر کے پُورے واقعہ کو بھول جائے گا۔

میں سیتا کے ساتھ تیزی سے اس ہال سے باہر نکلا تو چند خشمگیں نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن میں سے ہر ایک نے مجھے شکایت کرنے پر ملامت کی۔ وہ ایسے پریشان حال مسافر تھے جو دس بیس رُوپے کی پروا کیے بغیر جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے تھے مگر میری شکایت کے بعد ٹکٹ فروشوں کا ٹولہ غائب ہو چکا تھا اور ان بے چاروں کی روانگی معرضِ التوا میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔

ناکردہ گناہ کی معذرت کرتے ہوئے میں اُن غصیلے مسافروں کے سامنے خود کو پرلے درجے کا احمق محسوس کر رہا تھا مگر دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی فراخ دل ثابت ہوئے اور رسمی ملامت کے بعد ہمیں روانگی کی اجازت دے دی۔

اسٹیشن کی عمارت سے باہر سڑک پر آتے ہی سیتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیا بیہودگی ہے یہ؟" میں نے چڑچڑے لہجے میں اُسے ڈانٹا۔

"سوچ رہی تھی کہ ہمارے معاشرے میں ابھی تک اکیلی عورت کے علاوہ معزز شہری کا تصوّر بھی رواج نہیں پا سکا ہے۔" وہ شوخ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی اور میں بے بسی کے ساتھ خاموش رہنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کا تبصرہ طنز کے زہر میں ضرور ڈوبا ہوا تھا مگر حقیقت سے خاصا قریب تھا۔

بہادر آباد کے فلیٹ میں ہماری وہ رات سکون سے گزری۔ مجھے موہوم سا اندیشہ تھا کہ کہیں فورڈ مستانگ والا اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے کوئی انتقامی کارروائی نہ کر گزرے مگر اس خدشے کی نفی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ یا تو بزدل تھا یا اس حد تک شریف کہ بے رحمانہ پٹائی کو اس نے اپنی کمینگی کا ایک منطقی نتیجہ تسلیم کر لیا تھا۔

مقررہ دن پر ہم دونوں ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے ایک ساتھ فلیٹ سے نیچے آئے تو مجھے فورڈ مستانگ والا یاد آ گیا۔

"پھر تو نہیں ملا وہ؟" میں نے سیتا سے سوال کیا کیونکہ اس دوران میں روزمرہ ضروریات کی اشیا خریدنے کے لیے دن میں کم از کم دو بار باہر جاتی رہی تھی۔

"ابھی تک تو شاید زخموں کی سیوا ہی کر رہا ہو گا۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اُسے ضرورت سے زیادہ سزا دی گئی۔" میں نے اُسے چھیڑنے کی نیت سے کہا۔ "ورنہ اُس نے تمہیں اتنا زیادہ تنگ تو نہیں کیا تھا۔"

"عملاً تو کوئی چھیڑ چھاڑ کر ہی نہیں سکا تھا مگر مجھے اس نے شدید ذہنی اذیت پہنچائی تھی۔ آخر اُسے کیا حق تھا کہ مجھے تیسرے درجے کی عورت سمجھ کر میرا پیچھا کرتا۔"

میں خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ہسپتال میں ڈاکٹر کے سامنے موجود تھے۔ اس نے پُوری توجہ سے میری پنڈلی کا معائنہ کیا۔ ٹانگ کو مختلف زاویوں سے گھما کر اور مجھے چلوانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔

اس کے قیاس کے مطابق میری پنڈلی کی ہڈی کا جوڑ کامیابی کے ساتھ بحال ہو چکا تھا مگر احتیاط کا تقاضا تھا کہ فوری طور پر اس سے بھرپور کام لینے کی کوشش نہ کی جائے۔

اگلے چھ ماہ کے لیے تدریجی ورزشوں کا طریقۂ کار سمجھا کر اُس نے ہمیں رخصت کر دیا۔

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟" ڈاکٹر کے کمرے سے باہر آ کر میں نے سیتا سے سوال کیا۔

"فلیٹ جانے سے پہلے کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ تمہاری صحت یابی کی خوشی میں۔" اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کھانا ضرور کھا لینا لیکن میرا خیال ہے کہ اب فلیٹ جانا بے سود ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کیوں نہ چابی اسی وقت فلیٹ کی مالکہ کو دے دی جائے۔"

"سوٹ کیس اور کپڑوں کا کیا ہو گا؟" اس نے مجھے یاد دلایا۔ "اس وقت ہمیں کفایت سے کام لینا چاہیے بلکہ اچھے ہوٹل میں کھانا کھانے کا ارادہ بھی منسوخ سمجھو، بلاوجہ کافی پیسے خرچ ہو جائیں گے اور بعد میں تنگی محسوس ہو گی۔"

فلیٹ کے بارے میں اس کی تجویز معقول تھی لیکن پھر بھی اس نے صفیہ سے ملنا مناسب سمجھا جس کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کی ڈیوٹی دوپہر سے شروع ہونے والی تھی۔

نرسنگ کوارٹرز اسی احاطے میں بنے ہوئے تھے۔ سیتا چند ہی منٹ میں میرے ہمراہ صفیہ کے مکان کے دروازہ پر دستک دے رہی تھی۔

خلافِ توقع کئی دستکوں کے بعد تاخیر سے دروازہ کھلا اور صفیہ کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے نمودار ہوئی۔

اس کا چہرہ قدرے تمتمایا ہوا تھا، بال بھی منتشر تھے۔ چہرے سے گھبراہٹ ہویدا تھی اور جب وہ مسکراتے ہوئے سیتا سے مخاطب ہوئی تو اس کے لہجے میں بھی بوکھلاہٹ کا عنصر خاصی حد تک نمایاں تھا۔

"ارے تم! اس وقت یہاں؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ آج ڈاکٹر سے ملنے آئے تھے، سوچا تم سے بھی ملتے چلیں۔" یہ کہہ کر سیتا لحظہ بھر رُکی پھر بولی۔ "کیا اندر نہیں بلاؤ گی؟"

"ہاں ہاں ضرور۔" اس نے سٹپٹا کر کہا۔ غیر ارادی طور پر گردن پیچھے گھما کر کچھ دیکھا اور پھر ہمیں راستہ دے دیا۔

اُس کا مکان بہت مختصر مگر صاف ستھرا تھا۔ صحن اور برآمدے سے گزرنے کے بعد صرف ایک کمرہ تھا جس میں مسہری کے علاوہ چند کرسیاں بھی موجود تھیں۔

کمرے کی فضا دھوئیں کی بُو سے بوجھل ہو رہی تھی اور فرش پر جا بجا سگریٹ کے ادھ جلے مسلے ہوئے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

"ہم آج تمہارا فلیٹ چھوڑ رہے ہیں۔" سیتا نے بیٹھنے کے

بعد کہا۔ کسی بھی وقت چابی لوٹانے دوبارہ آؤں گی۔"

"اتنی جلدی!" اس نے کہا مگر اس کی غلافی نگاہیں بار بار صحن کے ایک گوشے میں بنے ہوئے مختصر سے سٹور روم کے بند دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

سیتا اس سے باتیں کرتی رہی اور میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ نرس بظاہر تو سیتا سے باتیں کر رہی تھی مگر ہم دونوں کی موجودگی پر خاصی مضطرب نظر آ رہی تھی اور شاید سیتا نے بھی یہ بات نوٹ کر لی اور جلد ہی روانگی کے لیے اُٹھ گئی۔

صفیہ نے اُسے روکنے کی رسمی سی کوشش بھی نہیں کی اور ہم دونوں اس کے گھر سے واپس روانہ ہو گئے۔

"یہ سگریٹ بھی پیتی ہے؟" کچھ دُور نکل آنے کے بعد میں نے معنی خیز لہجے میں سیتا سے سوال کیا۔

"انجان نہ بنو۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "اصل صورتحال کا اندازہ تم نے بھی بآسانی لگا لیا ہو گا۔"

"کیسی صورتِ حال؟" میں نے سنجیدگی سے پُوچھا۔

"ہمارے پہنچنے سے پہلے اندر کوئی موجود تھا جسے اس نے چھپا دیا، اسی لیے دروازہ کھولنے میں اُسے تاخیر ہوئی تھی۔"

"صُورت سے تو شریف لگتی ہے۔"

"پتہ نہیں۔" اس نے بے دلی سے کہا۔ "طویل تنہائیوں سے اُکتا کر اس نے کسی لڑکے سے دوستی کی ہوئی ہے۔ میں نے ہسپتال میں تمھارے قیام کے دَوران دوسری نرسوں سے یہ ذکر سُنا تھا مگر آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔"

وہ موضوع بہت نازک تھا۔ میں کافی دیر تک سیتا سے تبادلۂ خیال کرتا رہا اور مجھے یہ اندازہ کر کے خوشی ہُوئی کہ وہ صفیہ کی اس خیانت کو کوئی بھی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھی جو وہ اپنے شوہر کے ساتھ کر رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا ایک ہوٹل میں کھانے کے بعد ہم بہادر آباد پہنچے اور فلیٹ سے اپنا سامان سمیٹ کر سُوٹ کیس سمیت باہر آ گئے۔

ہسپتال کے دروازے پر میں ٹیکسی میں بیٹھا رہا اور سیتا فلیٹ کی چابی صفیہ کو لَوٹا کر چند منٹ میں واپس آ گئی۔

اِس بار ٹیکسی کا رُخ کینٹ اسٹیشن کی جانب تھا۔

مجھے اسٹیشن پر چند روز قبل پیش آنے والے واقعات اچھی طرح یاد تھے لہٰذا اس بار میں نے کسی الجھن میں پڑے بغیر ٹکٹ حاصل کر لیے اور یُوں ہم شام کو لاہور کے لیے روانہ ہونے والی ٹرین میں آرام دہ جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

کراچی سے لاہور تک کا ٹرین کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ اگر ہمارے پاس سونے کے لیے برتھ کے ٹکٹ نہ ہوتے تو کم از کم میرے لیے بیٹھ کر سفر کرنا ناممکن ہوتا کیونکہ زیادہ دیر تک ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے سے میری داہنی پنڈلی میں ورم کے ساتھ ہی درد شروع ہو جاتا تھا۔

ٹرین پاکستان کی سرزمین پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ دیہی اسٹیشنوں سے ٹرین اس قدر تیز رفتاری سے گزر رہی تھی کہ پلیٹ فارم پر نصب تختیوں پر لکھے ہوئے نام تک پڑھنے ناممکن ہو رہے تھے۔ اور پھر کوٹری پر ٹرین جا رُکی۔

سندھ کے خشک اور ریتیلے علاقے کے بعد شاداب خطے بھی آئے مگر رات ڈھل جانے کے باعث باہر کے مناظر دیکھنا ممکن نہ رہا۔

اگلی دوپہر کو ٹرین لاہور اسٹیشن کی حدود میں رینگتی ہُوئی داخل ہوئی تو میرا دل مسرت اور سنسنی کے مِلے جُلے اثرات کے تحت کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

"تو یہ ہے تمھارا شہر۔" سیتا نے مسافروں کی بھیڑ سے الگ ہوتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں امرتسر سے لاہور بھی آئی تھی مگر اسٹیشن نہیں دیکھا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہنسی۔ "اور اُس وقت میں بالکل وحشی تھی، آدمیوں سے بھڑک کر دُور بھاگتی تھی۔"

"شہر پسند آیا تھا میرا؟" میں نے پُرشوق لہجے میں سوال کیا۔

"کہا نا کہ اس وقت تو میں خوفزدہ تھی، اپنے سائے تک سے بھڑکتی تھی۔ ہر شخص اپنی طرف لپکتا ہُوا بھُوکا درندہ محسوس ہوتا تھا۔ مگر اس وقت تمھارا ساتھ ہے اور میں دنیا دیکھ چکی ہُوں لہٰذا میرا مشاہدہ ہی بدلا ہُوا ہے۔"

"اب تو شاید درندے بھی انسان لگ رہے ہوں گے۔"

"لاابالی لوگوں کا شہر معلوم ہوتا ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "دھوتی اور شلوار سے انگریزی وضع کے سُوٹ تک بھانت بھانت کے لباس نظر آ رہے ہیں مگر ہر ایک اپنے حال میں مست ہے۔ کسی کو دُوسرے کی پرواہ نہیں ہے۔"

"جہاں ہر شخص اپنی پسند کے خول میں جیتا ہو اور دُوسرے کی پسند کا احترام کرتا ہو وہاں خوش دلی اور بے فکری ہی نظر آتی ہے۔"

اسٹیشن سے باہر بھانت بھانت کی آوازوں اور سواریوں کا میلہ لگا ہوا تھا اور جُوں ہی سیتا نے تانگوں کی طرف نگاہ اٹھائی کئی تانگے اپنی جگہ سے حرکت میں آئے اور ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ہمارے پاس آ رُکے۔

میں نے سیتا کی نگاہیں پہچان لیں اور دمکتے ہوئے سفید پیتلوں سے آراستہ تانگے میں سوار ہو گیا جس میں سفید رنگ کا ایک توانا گھوڑا جتا ہُوا تھا۔

میرے ذہن میں جس ہوٹل کا نام تھا وہ اسٹیشن سے زیادہ دُور نہیں تھا اور فیملی والوں میں نیک شہرت کا حامل تھا۔

کراچی میں میرا خیال تھا کہ سیتا کے سُرخی مائل بھُورے بال اور نیلی آنکھیں زیادہ ممتاز نظر آ رہی تھیں لیکن لاہور میں شاید یہ عام ہو کیونکہ وہاں سرخ و سفید رنگت کے ساتھ حسین خدوخال بکثرت نظر آتے ہیں لیکن اسٹیشن سے ہوٹل میں داخل ہونے تک میرا یہ قیاس غلط ثابت ہو گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد سیتا کی انفرادیت اور زیادہ ابھر آئی تھی۔ ہوٹل میں دوہرے بستر کا کمرہ حاصل کر کے ہم نے غسل کیا اور باہر نکل آئے۔

وقت کافی تھا لہٰذا میں نے رنگ محل کے علاقے کا رُخ کیا۔ جہاں ایک مارکیٹ میں میرے والدِ مرحوم کی دُکان ہوا کرتی تھی۔

پچھلے چند برسوں میں لاہور کی ہیئت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ نت نئی تعمیرات اور پرانی عمارات میں ترمیم و اضافے نے پُرانی شناختوں کو بدل ڈالا تھا لیکن میں مارکیٹ کے نام کے سہارے مطلوبہ دکان پر پہنچ ہی گیا جہاں ایک صاف ستھرا میڈیکل اسٹور قائم تھا۔

دکان میں داخل ہوتے ہی ایک معمّر سیلز مین ہماری طرف متوجہ ہُوا تھا۔

"فرمائیے، کیا چاہیے؟" اس کے خشک چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ مسکراہٹ کے استعمال میں کفایت شعار واقع ہوا تھا۔

"ہمیں دکان کے مالک سے ملنا ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ تو میں ہی ہوں۔" اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اپنی ملکیت کے بارے میں وہ زیادہ پُریقین نہ ہو۔

"پہلے یہ دکان وجاہت علی مرحوم کی ہوا کرتی تھی۔۔۔" میں نے تمہید کا آغاز کیا اور اسی وقت غازہ و سرخی میں لتھڑی ہوئی ایک فربہ اندام رسیدہ خاتون ہانپتی ہوئی دکان میں داخل ہوئیں اور وہ مجھے چھوڑ کر اُس عورت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ذرا یہ نکال دو جلدی سے۔" خاتون نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک رُقعہ اسے تھما دیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس نسخے میں کچھ اہم ادویات درج ہوں گی جو خاتون کے بدن سے فاضل وزن چھانٹنے میں مددگار ہوں گی مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سیلز مین وٹامنز کے علاوہ خورد و نوش کی وزن افزا اشیا کاؤنٹر پر ڈھیر کرتا جا رہا تھا۔

خوردنی اشیا کی فہرست سے فراغت کے بعد اس نے لپ اسٹک اور میک اپ کی مطلوبہ رنگوں کے نمبر فہرست میں شاید مندرج تھے۔ فرصت کے ان لمحات کو غنیمت جان کر وہ خاتون بیرونی کاؤنٹر سے آئسکریم خرید کر کھانے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ آئسکریم خوری کی تکمیل سے قبل اُن کا مطلوبہ سامان تھیلوں میں ڈال دیا گیا۔ اور انھوں نے بلا تامل سات سو سے زائد کی رقم

ادا کر دی۔

دکان میں ملازم خوش شکل مگر کمسن لڑکا سامان اُٹھا کر خاتون کے پیچھے ہولیا۔ جنھوں نے اپنا پرس بائیں بغل میں دبا لیا تھا، اور بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے آئسکریم کپ کے باقیات کو داہنے ہاتھ کی مدد سے اپنے خوف آور معدے میں منتقل کرنے میں مصروف تھیں۔

"کیا مانگ رہے تھے آپ؟" عورت سے نمٹنے کے بعد اس دکان کا سیلز مین نما مالک دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہم کسی جنس کے خریدار نہیں تھے، اُس کے لہجے میں پائی جانے والی اخلاق کی موہوم سی رمق بھی مفقود ہو چکی تھی۔

"میں وجاہت علی مرحوم کا ایک قریبی عزیز ہوں۔" میں نے پہلا جملہ دہرائے بغیر بات آگے بڑھائی اور دانستہ یہ اظہار نہیں کیا کہ میں وجاہت علی مرحوم کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔

"یہ وجاہت صاحب کون تھے؟" اُس نے بات آگے بڑھنے سے قبل اپنے تجسس کی تشفی ضروری سمجھی اور سوال داغ دیا۔

"کئی برس پہلے اس دکان کے مالک ہوا کرتے تھے۔" میں نے کہا۔

"مگر میں نے تو چوہدری بشیر سے خریدی تھی یہ دکان۔"

"شاید انھوں نے وجاہت صاحب کے لڑکوں سے لی ہو۔"

"مگر آپ یہ سب کیوں کرید رہے ہیں؟" وہ چڑ سا گیا۔

"میں برسوں بعد پاکستان آیا ہوں اور اُن کے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا لب و لہجہ نرم بلکہ خوشامدانہ رکھتے ہوئے اُس سے کہا۔

"چوہدری بشیر سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔" اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "وہ یہاں موٹر گاڑیوں کے فاضل پرزوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ میں کہیں سے اُن کا رہائشی پتہ تلاش کر سکوں۔"

"میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

"فوراً کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے مجھے انتظار پر آمادہ پا کر جلدی سے کہا۔ "گھر پر اس دکان کی خریداری کے کاغذات دیکھوں گا، پتہ وغیرہ اسی میں ہوگا۔"

"تو میں دوبارہ کب زحمت دوں آپ کو؟"

"کل اسی وقت..." اس نے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر "خدا حافظ" کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس دکان سے نکل کر ہم رنگ محل کے علاقے میں گھومتے رہے پھر شاہ عالمی سے تانگہ پکڑ کر انارکلی آ گئے۔

انارکلی بازار میں دکانوں کے ظاہری خدوخال اور آرائشی انداز میں نمایاں تبدیلیاں نظر آئیں لیکن وہاں کا اجتماعی جغرافیہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔

شام ڈھلے ہم ہوٹل واپس لوٹے تو سیتا کے ذہن پر لاہور اور اس کے شہریوں کے بارے میں اچھا تاثر قائم ہو چکا تھا۔

اگلے روز صبح کا وقت ہمارے پاس فاضل تھا لہٰذا میں ایک بار پھر چوبرجی کے رہائشی علاقے کی طرف چل دیا جہاں ابا جان کی زندگی میں ہمارا قیام تھا۔

پہلے بھی ایک بار میں نے اُس علاقے میں کوچہ پیمائی کی تھی مگر قدیم پڑوسیوں سے بھی بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ ابا جان کی وفات کے بعد میرے بڑے بھائیوں نے پہلے دکان بیچی۔ اس کے بعد مکان کی نوبت آ گئی اور اس کا تیاپانچہ کر کے انھوں نے مزنگ کے علاقے نزولی بازار میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ اس کے بعد وہ سب کدھر گئے۔ یہ مجھے کوئی بھی نہ بتا سکا تھا۔

پرانے محلے داروں میں بچے بڑے ہو چکے تھے، جوانوں کے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے مگر ان تمام فطری تبدیلیوں کے باوجود چند چہروں کو پہچاننا میرے لیے دشوار ثابت نہ ہوا۔ یہ اور بات تھی کہ نگر نگر کی ٹھوکروں نے میرا حلیہ اس حد تک بدل کر رکھ دیا تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی مجھے نہ پہچان سکا اور میں نے بھی فرضی تعارف ہی میں بہتری سمجھی۔

اس مرتبہ بھی ان لوگوں سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ نزولی بازار کے بعد میرے گھر والے کہاں گئے تھے، یہ کوئی نہ بتا سکا۔

میں تشویش اور پریشانی کے عالم میں محلے کی ایک دکان پر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اِن چار پانچ رشتہ دار گھرانوں کا خیال آ رہا تھا جو لاہور ہی میں آباد تھے لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ابا جان کی زندگی ہی میں اُن سے ہمارے مراسم خوشگوار نہیں تھے اور مجھے مجبوری کے ان لمحات میں اُن کے دروازوں پر دستک دینے میں حجاب مانع تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" ایک بھاری بزرگانہ آواز اور شانے پر ہاتھ کے نرم دباؤ نے مجھے چونکا دیا۔

میں پلٹا تو حاجی اللہ داد میرے سامنے موجود تھے جن سے چند منٹ پہلے میری بات ہو چکی تھی۔ شاید میری پریشانی بھانپ کر وہ مجھ سے تفصیلی گفتگو کرنی چاہتے تھے۔

وہ میرے والدِ مرحوم کے پڑوسی اور گہرے دوست تھے مگر میں نے ارادہ کیا ہوا تھا کہ اُن پر اپنی اصلیت ہرگز منکشف نہ کروں گا۔

وہ چند گلیوں سے گزر کر مجھے اپنے مکان کی بیٹھک میں لے گئے۔

میرے مقابل چارپائی پر بیٹھ کر چند ثانیوں تک حاجی صاحب بغور میرا جائزہ لیتے رہے پھر دھیمے ہمدردانہ لہجے میں بولے۔ "تم کون ہو اور ان لوگوں کے بارے میں کیوں پریشان ہو؟"

"وجاہت علی مرحوم میرے چچا تھے۔" میں نے غمناک لہجے میں کہا۔

"چچا؟" حاجی اللہ داد نے حیرت سے دہرایا۔ "مگر اُن کا تو کوئی بھائی نہیں تھا۔ کم از کم مجھے تو یہی معلوم ہے کہ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولادِ نرینہ تھے۔"

"میرے ابا بچپن ہی میں کسی بات پر چھوٹے بھائی سے لڑ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ پھر پلٹ کر ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔" میں نے حسرت آمیز لہجے میں مفروضہ قصہ سُنایا۔

"کہاں رہ رہے تھے وہ؟" حاجی اللہ داد کی نگاہوں میں حیرت و تجسس کا سمندر انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

"زمانے بھر کے دکھ جھیلتے بغداد جا پہنچے۔ وہاں حالات سازگار ہو گئے اور آخری وقت تک وہیں مقیم رہے۔"

"ناقابلِ یقین... ناقابلِ یقین۔" حاجی صاحب بڑبڑائے۔ پھر بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "تو تم بغداد سے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔ والدِ مرحوم سے اکثر چچا کا ذکر سنتا تھا۔ انھیں کسی طرح علم ہو گیا تھا کہ شادی کے بعد وجاہت علی مرحوم نے اس طرف رہائش اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا میں سیدھا یہیں آیا مگر افسوس کہ کسی کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔"

حاجی صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ گھروں سے بھاگنا تمھارے خاندان کی پرانی روایت رہی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے اُن کا مدعا پوری طرح سمجھتے ہوئے بھی حیرت کا مظاہرہ کرنا ضروری تصور کیا۔

"وجاہت علی مرحوم کا چھوٹا لڑکا بھی بہت ناہنجار تھا۔" حاجی صاحب نے دکھ بھرے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ "آوارگی کے چکر میں گھر سے بھاگ گیا اور اسی صدمے نے اُن کی جان لے لی۔ اس کا نام صفدر علی تھا اور وہ آج تک لاپتہ ہے۔"

"بہت بدنصیب لڑکا تھا۔" میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "جسے بزرگوں کا سایہ نصیب ہو اور وہ اس کی قدر نہ کرے، اُس سے بڑا بدبخت اور رُوسیاہ کون ہوگا۔"

"یہ سعادت مند بچوں کی سوچ ہے۔" حاجی اللہ داد میرے خیالات سے متاثر ہو کر مربیانہ لہجے میں بولے۔ "مگر صفدر علی گستاخ تھا... باپ کے مرنے کے بعد صفدر علی کے دو بڑے بھائیوں سطوت علی اور ظفر علی نے کاروبار سنبھالا مگر آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ سطوت علی ریس اور جوئے میں رقمیں ہار کر دکان کو زیر بار کر رہا تھا لہٰذا دکان بک گئی۔ ظفر علی ملتان چلا گیا۔ ایک برس بعد ہی کمرے میں دھواں بھر جانے سے بیوی اور بچوں سمیت دم گھٹ کر مر گیا۔ سطوت علی کی جوئے کی لت نے اسے اتنا مقروض کیا کہ اُس نے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف مکان بھی بیچ دیا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا، بس ماں کو لے جا کر نزولی کے ایک غلیظ اور سستے کرائے کے مکان میں ڈال دیا جہاں وہ بےچاری سسک سسک کر مر گئی۔ اس کے بعد سطوت علی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

اپنے بھرے گھر کی تباہی کی وہ لرزہ خیز کہانی سُن کر میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"وجاہت علی میرا جگری دوست تھا۔" حاجی اللہ داد کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "میں اس کا بہی خواہ ہوں، تم اس کے بھتیجے ہو، اس لیے تمھیں بتا رہا ہوں کہ کافی دن پہلے میں نے اخبار میں چھوٹی سی خبر پڑھی تھی کہ سطوت علی کراچی کے ایک بینک میں ڈاکا ڈالتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ یہ خبر تمھیں کہیں سے نہیں مل سکے گی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ تمھارے چچا کا بڑا لڑکا ہی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کراچی جیل میں سزا بھگت رہا ہو یا مقدمہ چلنے کا منتظر ہو۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک باپ کے تین بیٹوں میں جو نیک نام تھا وہ بیوی بچوں سمیت دم گھٹ کر مر گیا اور دو بےننگ و نام زندہ تھے۔

ایک خون اور بارود کی برسات میں سپاہیوں کے شاہکار بناتا اپنے مرحوم باپ کی دہلیز پر آیا تھا اور دوسرا جیل میں سزا یافتہ ڈکیت کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

"یہ خبر کب کی ہے؟" میں نے اپنے کرب کو چھپاتے ہوئے سوال کیا۔

"دو ڈھائی برس پہلے کی بات ہے۔" حاجی اللہ داد نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہوسکتا ہے کہ اب تک کی سزا نے اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہو۔ وہ چچازاد سہی مگر تمھارا بڑا بھائی ہے... ہوسکتا ہے کہ اس پر جرمانہ بھی ہوا ہو جس کی عدم ادائیگی پر وہ مزید قید بھگت رہا ہو... تم بغداد سے آئے ہو آسودہ حال لگتے ہو، اگر اس بدنصیب کی مدد کر سکو تو شاید تمھارے چچا کی نسل بھی چلتی رہے۔ صفدر علی تو جانے کہاں کس کے ہاتھوں مارا گیا ہوگا۔"

"مارا گیا ہوگا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ "یہ آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟"

حاجی اللہ داد کے چہرے پر تحقیر آمیز لکیریں اُبھر آئیں۔ "وہ بھی بڑا شورہ پُشت نکلا۔ اس نے بھی اخباروں میں اپنے باپ دادا کا نام اُچھالا تھا... ایک زمانے میں پیرس پیرس کے حوالے سے اس کی بڑی خبریں چھپی تھیں۔ اس پر کئی آدمیوں کے خون کا الزام تھا اور ہندوستان میں پولیس کے علاوہ پارس کے متلاشی سینکڑوں خوفناک لوگ اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے پھر ایکا ایکی اس کے بارے میں خبریں آنا بند ہو گئیں۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ کہ وہ اسی محلے کا صفدر علی تھا؟" میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا تھا اور دورانِ خون کنپٹیاں پھاڑ کر باہر آنے کے لیے بے چین تھا۔

"اس کی تو تصویریں چھپی تھیں اخباروں میں۔" حاجی اللہ داد نے کہا۔ "ہندوستان سے نکل آتا تو یہاں کی پولیس اس کی منتظر تھی۔ پاکستان میں قانون کی نظروں میں وہ ایک رسوائے زمانہ مفرور اسمگلر تھا۔ تصویروں میں اس کا حلیہ ضرور بدلا ہوا تھا مگر نام اور خدوخال تو ہزاروں میں بھی پہچانے جاسکتے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہے تھے مگر ان کی غلطی صرف اتنی تھی کہ سامنے بیٹھے ہوئے صفدر علی کو نہیں پہچان رہے تھے۔ بلکہ اس کے مفروضہ ارشاداتِ عالیہ پر اسے شرافت اور سعادت مندی کی سند بھی دیتے جارہے تھے۔

گزرے ہوئے واقعات اور ماضی کی چھوٹی چھوٹی خبروں کے بارے میں حاجی اللہ داد کی یادداشت قابلِ رشک تھی مگر میں خطرہ محسوس کررہا تھا کہ کہیں کسی بات سے وہ میری اصلیت کا سراغ نہ لگا لیں۔

برسوں کی روپوشی اور جدوجہد کے دوران میں نے جب بھی پاکستان کے بارے میں سوچا جہاں میری دانست میں میرے ماضی کا کوئی شناسا نہیں تھا۔ رہا نام تو ایک ملک میں ہزاروں ہم ناموں کا ہونا بھی بعید از امکان نہیں تھا، اسی وجہ سے میں نے پاکستان پہنچنے کے بعد ہر جگہ اپنا اصل نام درج کرایا تھا جب کہ سیتا کا نام لیلیٰ صفدر ظاہر کرتا رہا تھا۔ لیکن حاجی اللہ داد سے گفتگو کے بعد میں شدت سے اپنے نام کی تبدیلی کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔

یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ چوبرجی آتے ہوئے میں نے سیتا کو ہوٹل میں چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں قیام کے دوران میرے ساتھ سیتا کا نام بھی بہت اچھالا گیا تھا اور اگر پاکستانی اخبارات میں اس کی تصویریں نہیں تو تفصیلات ضرور میرے حوالے سے چھپی ہوں گی جن کی بنا پر حاجی اللہ داد جیسے گھاگ شخص کے لیے معاملے کی تہہ تک پہنچنا دشوار ثابت نہ ہوتا۔

"جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا، میں کروں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے حاجی صاحب سے کہا۔ "دعا کیجیے کہ میں سطوت علی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ نابکار ابھی تک جیل ہی میں سڑ رہا ہوگا۔" حاجی اللہ داد کے لہجے میں حقارت اور تاسف کے ملے جلے اثرات نمایاں تھے۔

"میں اب کراچی ہی جاؤں گا۔ وہ وہاں ہو یا نہ ہو، مجھے اس کی تلاش کا آغاز تو وہیں سے کرنا ہوگا۔"

"نام نہیں بتایا تم نے اب تک اپنا۔" اچانک حاجی صاحب کو خیال آگیا۔

"سلطان کہتے ہیں مجھے۔" میں نے فوری طور پر اپنے لیے ایک مستقل نیا نام سوچ لیا۔

"کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"لاہور پہلی بار دیکھا ہے علاقوں کے نام سے ناواقف ہوں۔ ایک دوست کے ساتھ بغداد سے آیا تھا، اسی کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"یہاں رہو یا دوبارہ لاہور آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملنا۔" حاجی اللہ داد گھٹنوں پر زور دے کر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ گئے۔

"انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں حاجی اللہ داد کے گھر سے نکلا تو دل کی عجیب سی کیفیت تھی۔

میرے گھر والے زندہ تھے یا مردہ، خوشحال تھے یا تباہ کار۔ وہ جیسے بھی اور جہاں بھی تھے۔ کم از کم مجھے ان کے بارے میں پوری معلومات مل گئی تھیں مگر دکھ اس بات کا تھا کہ بھائی جان نے زندہ رہنے کے لیے مجھ سے بھی بدتر اور رسواکن راہ اختیار کی تھی۔

میں ذہن میں قیاس اور امکانات کے گھوڑے دوڑاتا اس بستی سے باہر آگیا۔

اگر صفدر علی کا نام اور اس پر عائد الزامات کی برسوں قدیم فہرست حاجی اللہ داد جیسے سیدھے اور امن پسند شہری کو یاد تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں کے متعلقہ حکام اس نام کو بھول گئے ہوں۔

اس اعتبار سے حاجی اللہ داد کی ذات میرے لیے بہت بڑی رہنما ثابت ہوئی تھی کہ مجھے اپنے محفوظ مستقبل کے لائحہ عمل پر نظرثانی کرنے کا بروقت موقع مل گیا تھا ورنہ میں بے خبری کے عالم میں کسی بھی وقت کسی ناگہانی شکنجے میں جکڑا جاسکتا تھا۔

چوبرجی سے نکلنے کے بعد میں نے تانگہ پکڑا اور لٹن روڈ سے ہوتا ہوا پرانی انارکلی کے نکڑ پر مال روڈ کے چوراہے پر اتر گیا۔

لاہور کی سرزمین میری جنم بھومی تھی جس کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ماضی کی خوشگوار یادوں کو دل میں سمیٹے میں ایک کافی ہاؤس میں جا بیٹھا جہاں موجود لوگوں میں صنفِ نازک کا کوئی گزر نہیں تھا مگر جن دنوں میں کالج میں پڑھ رہا تھا اور اکبر کے ذریعے گلنار کے نظر فریب شباب کا شکار ہوا تھا۔ ان دنوں اس کافی ہاؤس میں مستورات کے ساتھ آنے والوں کے لیے خصوصی چوبی کیبن بنے ہوئے تھے جن کا ماحول ہی رومان پرور ہوا کرتا تھا۔

بارہا میں نے ان کیبنوں میں گلنار کے ہاتھوں کا نرم لمس محسوس کیا تھا اور اس لمس کی دیوانگی میں میں اپنی حدود سے تجاوز کر کے گھر والوں کی خفگی مول لے بیٹھا۔

گلنار کو بعد میں بازارِ حسن کی جنس کے طور پر دیکھنے کے بعد ہی آنکھیں کھلی تھیں۔ اسے مجھ سے متعارف کرانے والا کوئی اور نہیں اس کا شوہر تھا۔

مگر وہ عورت جو شوہر کی موجودگی میں اس کے دوست سے حجاب نے۔ دونوں دوست کار میں ساتھ ہوں تو شرم و حیا کے ساتھ عقبی نشست پر خاموش بیٹھی رہے مگر شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے دوست کو میٹھی مسکان کے ساتھ دیکھے۔ چتون کے نت نئے انداز اپنائے اور سوچی سمجھی غلطیوں کے تحت اپنے بدن کے لمس سے اسے آشنا کرے۔ وہ سب کچھ ہوسکتی ہے مگر کسی کی وفا شعار بیوی نہیں۔

گلنار سے تعارف کرانے کے بعد اکبر غائب ہوا تو گلنار کے بدن سے رفتہ رفتہ مجھے خاصا تفصیلی تعارف حاصل ہوا۔ اس کی نرم و سفید کلائیوں کی بے داغ ملائمت موی تہہ کے ذریعے رواں صاف کرنے کی رہونِ منت تھی۔ اس کی تیکھی اور خمدار بھنویں تراش خراش کا کمال تھیں۔ اس کی تمام تر نہیں تو بیشتر ادائیں خود ساختہ تھیں جن کے سہارے وہ اس وقت میری ذات کا طواف کرتی رہی جب تک میں اس کی فرمائشیں پوری کرنے کا اہل تھا اور جب مجھے والدِ محترم نے نافرمانیوں کے باعث عاق کیا تو وہ اندھیری رات میں سائے کی طرح خاموشی سے میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ بے وفا تھی اور اس کی ذات وفا کا بوجھ نہ سہار سکی۔

مگر ایک رات کے اندھیرے میں میں نے اسے بے نقاب دیکھ ہی لیا۔ اس کا تعلق پائل اور گھنگھرو کی تال پر ادائیں فروخت کرنے والیوں کے طائفے سے تھا۔ میں نے اشتعال کے عالم میں اس کے لیے ایک سزا سوچی اور میرے وہی ہاتھ جو اسے اپنے رخساروں پر نرم تر محسوس ہوتے تھے اس کی خوبصورت گردن کے گرد موت کے حصار بن کر جم گئے۔

اس رات کا خیال آتے ہی میں پھریری لے کر رہ گیا۔

کافی ہاؤس آنے والوں سے بھرتا جارہا تھا مگر میں اپنے خیالات کی رو میں ڈوب کر خود کو بالکل تنہا محسوس کررہا تھا۔ مجھے ڈر سا ہوا کہ کہیں کوئی خیالات کے ساتھ میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نہ پڑھ رہا ہو اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

مگر کافی ہاؤس کی دنیا ہی نرالی تھی۔

وہاں ہر ٹولی اپنی مختصر سی کائنات میں کھوئی ہوئی تھی۔ کسی کو دوسروں سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور میرے لیے یہ مشاہدہ تسلی بخش تھا۔

سگریٹ کے دو کشوں کے بعد میرا ذہن سیتا کی طرف بھٹک گیا۔

بندروں اور لنگوروں کی ٹولیوں پر حکمرانی کرنے والی وہ لڑکی تہذیب کی روشنی سے دور ہمالیہ کی پرفسوں وادیوں میں پروان چڑھی تھی۔ اسے قدرت نے فیاضی کے ساتھ حسن سے نوازا تھا، اور وفا تو شاید اس کا پیدائشی مزاج ہی تھی، مجھ سے شادی کے بعد اس نے انسانوں کا ماحول اس تیزی کے ساتھ اختیار کیا تھا کہ میں کبھی کبھی حیرت سی محسوس کرنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ جب مجھے سیتا جیسی بیوی ملی ہوئی تھی تو مجھے آبرو باختہ گلنار کا پیکر کیوں بار بار یاد آتا تھا۔

دو سگریٹوں کو دھوئیں میں اڑا دینے کے بعد ایمانداری کے ساتھ ایک نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے سیتا کو اپنانے کے بعد کوئی خلش نہیں تھی بلکہ میں خود کو خوش نصیب تصور کرتا تھا کہ مجھے ایک مثالی بیوی ملی ہوئی تھی جب کہ گلنار کا خیال ہر بار اشتعال کی کوکھ سے جنم لیتا تھا۔

اس کے بارے میں میری نگاہیں حقیقت کا ادراک نہیں کرسکی تھیں۔ جو کچھ اس نے خود کو ظاہر کیا، میں نے اسے وہی تسلیم کرلیا لیکن غلط فہمی کا پردہ چاک ہوتے ہی میں نے اپنی مردانہ انا کو لہولہان محسوس کیا۔ میں سچے جذبوں کے ساتھ ایک جھوٹے بدن کو پوجتا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر انا کی وہ پرانی شکست پریشان کرتی تھی ورنہ گلنار کے بارے میں میرے دل کے کسی حصے میں کوئی نیک خواہش موجود نہیں تھی۔

میں خیالات کی یلغار میں مبتلا کافی ہاؤس سے نکلا تو رنگ محل کی طرف روانہ ہوگیا جہاں والدِ مرحوم کی قدیم دکان میں معنک سیلزمین نے اجنبی نگاہوں مگر مسکراتے چہرے کے ساتھ اٹھ کر میرا استقبال کیا۔

"فرمایئے، کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں کل اس دکان کے پرانے مالک کے۔۔۔"

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس کے چہرے پر سجی ہوئی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ "ہاں ہاں۔ پتہ مل گیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے شوکیس کی ایک دراز کھولی اور ایک مڑا تڑا کاغذ میری طرف بڑھا دیا جیسے وہ مجھے فوراً وہاں سے رخصت کر دینا چاہتا ہو۔

پرچے پر چوہدری بشیر کا اقامتی پتہ پڑھ کر میں نے اس سیلزمین کو گھورا اور اس دکان سے باہر آگیا۔

حاجی اللہ داد کی فراہم کردہ معلومات پر مجھے پورا یقین تھا مگر میں چوہدری بشیر سے بھی مل لینا چاہ رہا تھا تاکہ لاہور چھوڑنے سے قبل اپنے گھر والوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرسکوں۔

چوہدری بشیر کی اقامت گاہ گلبرگ کے علاقے میں تھی۔ میں رنگ محل ہی سے ایک رکشے میں ادھر روانہ ہوگیا۔

اس کا مکان وسیع و عریض اور خوشنما تھا۔ دربان نے میرا نام اور آمد کا مدعا معلوم کر کے مجھے برآمدے میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

چند ثانیوں بعد اس کے ہمراہ ایک ادھیڑ عمر شخص باہر آیا اور تپاک سے ہاتھ ملا کر مجھے نشست گاہ میں لے گیا۔

"میں آپ کو پہچان نہیں سکا سلطان صاحب!" اس نے مسکراتے ہوئے بااخلاق لہجے میں مجھ سے اپنی اجنبیت کا اظہار کیا۔

"میں بغداد سے آیا ہوں۔" میں نے اپنی پرانی کہانی برقرار رکھی۔ "سطوت علی اور مظہر علی سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر وہ دکان بیچ چکے ہیں۔ موجودہ مالک کے لیے تو ان کے نام بھی اجنبی نکلے۔ اس کی معرفت آپ تک پہنچا ہوں۔ شاید آپ ان کی نشاندہی کر سکیں؟"

"وہ دونوں تمھارے مقروض تو نہیں تھے!" چوہدری بشیر کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری تہہ جم گئی اور لہجہ گمبھیر ہو گیا۔

میرے لیے قابلِ غور نکتہ یہ تھا کہ میری زبان سے میرے بڑے بھائیوں کے نام سنتے ہی وہ شخص آپے سے تم پر اتر آیا تھا۔

"نہیں۔" میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ "وہ میرے عزیز ہیں۔"

"دکان ان سے میں نے ہی خریدی تھی۔" اس نے کہا۔ "سطوت میرا گیارہ ہزار روپے کا مقروض تھا اور کئی ماہ گزرنے کے باوجود رقم ادا نہ کر سکا تھا۔ آخرکار اس نے مجھے دکان بیچنے کی پیش کش کی اور میں نے سودے کی رقم میں سے اپنا قرضہ وضع کر لیا۔"

"مقروض ہونے کی وجہ کیا تھی؟"

چوہدری بشیر کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔ "یہ میرا اور اس کا ذاتی معاملہ تھا، کیا اتنا کافی نہیں کہ وہ میرا مقروض تھا۔"

"جوئے وغیرہ کا سلسلہ؟" میں نے اس کے اعتراض کو نظرانداز کر کے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"جانتے ہو تو پوچھ کیوں رہے ہو؟" وہ قدرے جھلا گیا۔

"معاملہ براہِ راست یا بلاواسطہ؟ صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں سرد اور سفاکانہ انداز پیدا ہو گیا تھا۔

"اتنی گاڑھی اردو میری سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "جو پوچھنا ہے صاف صاف دریافت کرو۔"

"اس نے تم سے رقم لی تھی یا کھیل میں مقروض ہوا تھا؟"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ دونوں ہتھیلیاں آپس میں جوڑ کر بولا۔ "کھیل میں ہاری ہوئی رقم نقد سے کم نہیں ہوتی۔"

"دکان کے بعد اس نے گھر بھی نہ بیچ ڈالا؟"

"مقدر کی بات ہے۔" چوہدری بشیر ڈھٹائی سے بولا۔ "اور شاید نیت کی بھی۔ وہ جیتنے کے لیے بے ایمانی کی فکر میں رہتا تھا۔"

"وہ اب کہاں ہے؟"

وہ تلخ انداز میں ہنسا پھر ناصحانہ لہجے میں بولا۔ "میری مانو تو اس کی فکر چھوڑ دو، اس کی تلاش میں کہیں کسی دل جلے قرض خواہ سے نہ ٹکرا جانا۔ وہ نزدیکی محلے میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ دن پھرنے کی امید میں اس نے ادھار لینا نہ چھوڑا اور جب دس پندرہ ہزار کے چکر میں آ گیا تو اپنے قرض خواہوں سے منہ چھپا کر کہیں بھاگ گیا۔"

چوہدری بشیر کے تضحیک آمیز اندازِ گفتگو پر میرا خون کھول اٹھا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا کم از کم مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چوہدری بشیر بھائی جان کو بگاڑنے اور ہمارے گھرانے کو تباہی کے غار میں دھکیلنے والوں میں سے ایک تھا۔

"تمھیں تو ٹھکانا معلوم ہو گا؟"

"توبہ کرو۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "لاہور میں ہوتا تو اب تک کسی نہ کسی کے ہاتھ لگ گیا ہوتا۔ اگر اس کو تلاش کرنا ہی چاہتے ہو تو انسانوں کے سمندر میں جاؤ۔ وہ کراچی کے علاوہ کہیں نہیں گیا ہو گا۔ سارے ناکام شکاری اسی منڈی میں اپنے مقدر کی آخری بولی لگوانے جاتے ہیں۔"

"معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔" میں تلخ لہجے میں یہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ گیا۔ "میں نے تمھاری ساری ہرزہ سرائی اس لیے برداشت کر لی کہ میرا نام سلطان ہے کسی روز سطوت کو ڈھونڈتے ہوئے صفدر علی ادھر آ نکلے تو اس کے سامنے زبان بند رکھنا۔۔۔ وہ اپنے گھر کی بربادی کے ذمہ داروں کی تلاش میں ہے تمھارا خون پی جائے گا۔"

"وہ بھگوڑا؟" چوہدری بشیر احمد استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "اس کی دھمکی نہ دو مجھے۔ سطوت تو اکثر کہتا رہتا تھا کہ صفدر ہندوستان سے زندہ نہ نکل پائے گا۔"

میں غصے میں بل کھاتا اس مکان سے باہر نکل آیا۔

چوہدری بشیر اپنے طور طریقوں سے مجھے عادی جواری نظر آیا تھا اور مجھے اعتماد تھا کہ اس بارے میں میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ اس کے عالیشان مکان کی بنیادوں میں مجھے اپنے گھر، اور دکان کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ چوہدری بشیر نے دکان پر نگاہ رکھتے ہوئے بھائی جان کو چالبازی سے اپنا مقروض کیا تھا تاکہ نادہندگی کا دباؤ ڈال کر وہ بیش قیمت دکان اپنی مرضی کے داموں پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

اس سے گفتگو کرتے ہوئے غصے میں مجھے اس سے پوچھنا یاد ہی نہیں رہا ورنہ مجھے شبہ تھا کہیں مکان بھی اسی نے نہ خریدا ہو۔ اور اگر مکان اس نے نہ بھی خریدا ہو تو اس کی فروخت میں کسی نہ کسی طرح اس کا ہاتھ ضرور تھا۔ چوہدری بشیر کے بارے میں میرا دماغ اتنا پھرا ہوا تھا کہ میں فوری طور پر نئے شبہ کی تصدیق یا تردید حاصل کرنے پر تل گیا۔

دوبارہ چوہدری بشیر سے رجوع کرنا تو بے سود تھا لہٰذا میں گلبرگ سے سیدھا جوبرجی جا پہنچا۔

دستک کے جواب میں حاجی اللہ داد باہر آئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ "سلطان میاں! تم دوبارہ کیسے؟"

"جاتے ہوئے ایک بات معلوم کرنی بھول گیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہو۔" وہ بڑھ کر میرے قریب آ گئے۔

"چچا کا مکان کس نے خریدا تھا؟"

"اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی اچانک؟" انھوں نے حیرت سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے سوال کیا۔

"یہ مکان چچا جان مرحوم کی نشانی ہے۔" میں نے فوری طور پر بات بناتے ہوئے کہا۔ "ہو سکا تو اسے موجودہ مالک سے خریدنے کی کوشش کروں گا تاکہ مرحوم کی یہ یادگار ہمارے خاندان ہی کے کسی فرد کے تصرف میں رہے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" حاجی صاحب نے تحسین آمیز لہجے میں کہا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔ "ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ نئے مالک کا نام مجھے بھی نہیں معلوم، فروخت ہونے کے بعد کافی دن مکان خالی رہا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی کرائے دار آتے جاتے رہے۔۔۔ چند منٹ ٹھہرو تو ابھی معلوم کیے لیتا ہوں۔"

مجھے رضامند پا کر انھوں نے اندر بٹھانے پر اصرار کیا مگر میں نے باہر ہی انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے ہمارے مکان کی طرف چل دیے۔

ان کی واپسی میں واقعی چند منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔ "کرائے دار عورتوں سے پتہ چلا کہ مالک مکان کوئی چوہدری بشیر ہے جو گلبرگ میں رہتا ہے۔"

مجھے حاجی اللہ داد کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ "مرد کام سے واپس آئیں گے تو پتہ بھی لے لوں گا، کسی وقت ادھر سے گزر ہو تو مجھ سے لے لینا۔"

میں حاجی اللہ داد کا شکریہ ادا کر کے لوٹ آیا۔

اس وقت میرے دل و دماغ میں فساد کی سی کیفیت طاری تھی۔ چوہدری بشیر کا کردار سامنے آ جانے کے بعد صفدر علی کی خوابیدہ حیوانی جبلتیں پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں اور میرے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ چوہدری بشیر کو لاہور کے کسی مضافاتی ویرانے میں برہنہ کر کے اس کے جسم پر اس وقت تک دُرّے برساتا رہوں جب تک اس کے سانسوں کی آخری لڑی بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔

مگر اس وقت میں خود حالات کا قیدی تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والی ہر اضطراری لہر کو بدقت تمام دبایا ورنہ میں فوری طور پر بدترین مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا جن سے نکلنا میرے لیے ممکن نہ ہوتا۔

چوہدری بشیر کو نقصان پہنچنے کی صورت میں فوری طور پر میرے خلاف دو گواہ پیدا ہو جاتے جن میں پہلا دکان میں قائم میڈیکل اسٹور کا ہنگ زدہ مالک تھا اور دوسری شخصیت حاجی اللہ داد کی تھی۔ جو میری ذات سے تمام تر ہمدردیاں رکھنے کے باوجود یہ ہرگز پسند نہ کرتے کہ میں کسی کو ایذا پہنچاؤں۔

پولیس کی گرفت میں آنے کے بعد میں نہ خود کو بغداد سے آیا ہوا سلطان علی ثابت کر سکتا تھا اور نہ ہی پاکستانی شہریت کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کر سکتا تھا۔ یمنی پاسپورٹ جو قانونی اعتبار سے ہر طرح جائز تھا پیش کیا جاتا تو میرا اصل نام سامنے آ جاتا اور نئے جرم کے ساتھ ہی ماضی کا مواخذہ بھی شروع ہو جاتا۔

لہٰذا بہتر یہی تھا کہ عارضی طور پر چوہدری بشیر کو بھلا دیا جائے تاکہ وہ مزید لوگوں کو گمراہ کر کے اپنے لیے بدترین سزا کا مضبوط تر اخلاقی جواز خود ہی فراہم کر سکے۔

میں تھکا ہارا ہوٹل واپس پہنچا تو سیتا میرے انتظار میں اکتاہٹ کی منزل سے گزر کر تشویش کا شکار ہو چکی تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" میری صورت دیکھتے ہی وہ بے اختیار میرے سینے سے آ لگی۔

"شہر کے راستوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا سارا دن۔" میں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

وہ ایک دم الگ ہو گئی اور اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھیں میرے چہرے پہ جما کر بولی۔ "کیا بات ہے؟ آج کچھ پریشان لگ رہے ہو؟"

"ذرا دم تو لینے دو، آتے ہی جرح شروع کر دی!"

اس نے جوتے اتارنے میں میری مدد کی اور میں تکان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

نہا کر باہر نکلا تو سیتا اس اثنا میں کمرے میں ہی گرم گرم چائے منگوا چکی تھی۔ اور سلیقہ شعار مشرقی بیوی کی طرح میری منتظر تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ میری دن بھر کی کارگزاریوں کی رپورٹ سننے کے لئے بے چین تھی۔ مگر چائے نوشی کے دوران اس نے ایک بار بھی زبان نہیں کھولی۔

"آج بڑی دردناک خبریں ملی ہیں مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں!" چائے ختم کر کے میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" میرے الفاظ سنتے ہی اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا۔

"اس قدر تشویش کی ضرورت نہیں!" میں نے کرسی کی پشتگاہ سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "سب گزری ہوئی باتیں ہیں۔ جن کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے دکھ اس لئے ہے کہ یہ واقعات آج میرے علم میں آئے ہیں!"

"اپنے گھر والوں میں سے کسی سے ملاقات بھی ہوئی تمہاری؟" اس نے سوال کیا۔

"ماں مر گئی، ایک بھائی بیوی بچوں سمیت دم گھٹنے سے

رخصت ہو گیا۔ بڑا بھائی زندہ ہے لیکن اندیشہ ہے کہ وہ کسی زنداں کی دیواروں میں اپنے شب و روز گزار رہا ہو گا۔"

اس کے استفسار پر میں نے اسے سارے واقعات تفصیل سے سنا دیئے!

"تو تمہارا خیال ہے کہ بھائی جان کو بگاڑنے میں چوہدری بشیر کا ہاتھ ہے؟" پوری کہانی سن کر سیتا نے سوال کیا۔

"اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ اس نے بھائی جان کو مقروض کر کے پہلے دکان پر ہاتھ صاف کیا، پھر مکان بھی ہتھیا لیا۔ اگر دونوں ٹھکانوں کا پہلا خریدار وہ نہ ہوتا تو شاید میں اسے بھول جاتا۔ دراصل گھر برباد ہونے کی اصل وجہ یہی تھی کہ مکان بیچا گیا اور ایک چھت کے نیچے رہنے والے مختلف سمتوں میں بکھر گئے۔"

"مگر ہم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

"فی الحال کچھ بھی نہیں، لیکن تم دیکھنا کہ کسی وقت وہ خود مجھے اپنی بدمعاشی کے افسانے سنانے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"غنیمت ہے کہ تمہیں وقت کی نزاکت کا احساس ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "جب تک ہم یہاں اپنی بنیادیں استوار کر کے نئی شناخت پیدا نہ کر لیں، کسی ہنگامہ آرائی میں ملوث ہونا ہمارے لئے شدید خطرے کا باعث ہو سکتا ہے!"

"اب ہمیں دوبارہ کراچی جانا ہو گا۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔

"کس لیے؟"

"مجھے بھائی جان کا سراغ لگانا ہے۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔"

"تم نے جو معلومات جمع کی ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بھائی جان جیل میں ہوں گے۔ انہیں وہاں سے نکال لینا ہمارے بس سے باہر کی بات ہے۔ جرمانے والی بات میں کچھ وزن ہے لیکن وہ ایک مبہم سا قیاس ہے جو درست بھی ہوا تو بھائی جان کی قید کی مدت میں کمی کرانے کے لیے ہمیں جرمانے کی رقم ادا کرنی ہو گی جو ہزاروں سے کم نہ ہو گی۔"

میں بغور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"جرمانہ ادا کر کے قید کی مدت میں کمی کرائی جائے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "یا جیل سے فرار کی کوشش کی جائے۔ ہر صورت میں ہمیں بھاری رقم درکار ہو گی جو فی الحال ہمارے پاس نہیں ہے ہماری تھوڑی بہت جمع پونجی بھی کراچی پہنچنے تک برابر ہو جائے گی اور بھائی جان کی مدد تو درکنار ہم خود مالی ضرورتوں میں مبتلا ہوں گے!"

اس کی بات معقول تھی۔ "آخر تمہاری تجویز کیا ہے؟"

"اس وقت ہم لاہور میں بیٹھے ہیں۔ یہاں سے انبالہ قریب اور کراچی دور ہے لہٰذا اس سے قبل کہ ہماری جیبیں خالی ہوں ہمیں انبالہ پہنچ جانا چاہیے۔ اگر توقعات کے مطابق پارس پتھر ہماری تحویل میں آ گیا تو ہمیں مالی بے فکری میسر آ جائے گی اور کراچی پہنچ کر بھائی جان کی تلاش اور مدد کے لیے سارے امکانی وسائل بروئے کار لا سکیں گے!"

"اور اگر وہاں پارس پتھر نہ ملا؟"

"ذہن سے خلش دور ہو جائے گی۔" اس نے بلا توقف جواب دیا۔ "پھر ہم اتنے ہی تہی دست ہوں گے جتنے اب کراچی پہنچنے پر ہوں گے!"

سیتا ہمیشہ مجھے یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ دنیا میں سمجھدار بیوی سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی اور اس بار بھی یہی ہوا۔

اس نے جو تجویز پیش کی تھی اس کے بارے میں اس کا ذہن بالکل صاف اور واضح تھا۔ میں کچھ دیر تک اس کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے بحث کرتا رہا اور آخری نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ ہمیں فوری طور پر انبالہ روانگی کی تیاری کا آغاز کر دینا چاہیے!

اگلے روز میں نے دانستہ سیتا کو ساتھ لے جانے سے گریز کیا اور اس نے میرا راستہ روک لیا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی!"

"ضد مت کرو۔ تمہارا جانا مناسب نہیں ہو گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"کیوں؟ اس میں کون سی نامناسب بات ہے؟"

میں شکست خوردہ انداز میں کرسی پر گر گیا۔ "ضروری تو نہیں کہ تمہیں ساری تفصیلات سے باخبر رکھا جائے!"

"بہت ضروری ہے۔" وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "میں تمہاری بیوی ہوں کوئی راہ چلتی لڑکی نہیں جس سے مصلحتوں کے تحت بات کی جاتی ہے!"

"پاکستان میں بھی لوگ صفدر علی کو جانتے ہیں!" میں نے پچھلی رات سے اپنے دل میں چھپائی ہوئی بات اس کے سامنے اگل دی!

"نہیں!" وہ حیرت اور بے یقینی کے ساتھ اچھل پڑی۔

"حاجی اللہ داد بہت نیک اور خدا ترس آدمی ہیں لیکن انہیں صفدر علی کا نام اس کے ماضی کے حوالوں کے ساتھ یاد ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"میں پاکستان سے نکلا تو یہاں قتل اور اسمگلنگ کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا پھر طویل سفر کے بعد ہمالیہ سے واپسی میں ہندوستان میں داخل ہوا تو ہندوستان کے سرکاری اداروں کے ساتھ ہی حریص عناصر میری راہ پر لگ گئے۔ اس راستے پر تم میرے ساتھ تھیں لہٰذا جہاں بھی میرا نام آیا ہو گا وہاں تمہارا ذکر ضرور رہا ہو گا!"

"وہ تو سب درست ہے مگر یہ قصے پاکستان میں کیسے پہنچے"

"یہ مواصلاتی ترقیوں کا دور ہے۔" میں نے کہا۔ "خبریں ہوا اور روشنی کی لہروں کے ذریعے آناً فاناً میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتی ہیں۔ ہندوستانی اخبارات کی خبریں یہاں بھی شائع ہوئی ہوں گی۔ پھر شاید تصاویر کے موازنے سے یہاں والوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا کہ ہندوستان میں سرگرمیاں دکھانے والا صفدر علی وہی ہے جو پاکستان میں قانون کو مطلوب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ممالک جہاں جہاں میرا اصل نام خبروں کا موضوع بنا ہو وہ اطلاعات پاکستانی حکام تک کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچتی رہی ہوں!"

"چلو مان لیا کہ یہ درست ہے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میرا تمہارے ساتھ باہر جانا نامناسب ہو گا!"

"سامنے کی بات ہے... وقت اور حالات نے میرے خد و خال اس حد تک بدل کر رکھ دیے ہیں کہ حاجی اللہ داد بھی مجھے اپنے روبرو دیکھ کر صفدر علی کی حیثیت میں شناخت نہیں کر سکے مگر میں جانتا ہوں کہ ہمالیہ سے لاہور تک کے طویل سفر نے تمہاری شکل صورت میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے تمہارے خد و خال اس علاقے میں لاکھوں کی بھیڑ میں بھی منفرد نظر آئیں گے، ایسا نہ ہو کہ تم پہچان لی جاؤ!"

وہ یک بیک اداس ہو گئی۔ "تم پھر وہی بات کہہ رہے ہو جو تم نے انبالہ میں کہی تھی، میری ذات ایک بار پھر تمہارے لیے خطرہ بن رہی ہے!"

"غلط نہ سمجھو!" میں نے جلدی سے کہا۔ "انبالہ میں خطرہ سو فیصد حقیقی تھا۔ تمہارے بیتک کے طور پر نہ پہچانے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا یہاں محض ایک خفیف سا اندیشہ ہے اور تمہاری شناخت کا معمولی سا امکان ہے!"

"معمولی ہی سہی مگر امکان تو ہے نا!" اس نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کبھی تمہارے ساتھ باہر نہ جا سکوں گی!"

"احمقانہ باتیں نہ کرو، کراچی سے لاہور تک تم برسرِ عام میرے ساتھ بلا خوف و خطر گھومتی رہی ہو!" میں نے کہا۔

"اس وقت تک ہم امکانی خطرات سے بے خبر تھے!" اس کے لب و لہجے میں اداسی کا عنصر غالب تھا۔

"عملاً اس صورتحال میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "بات بس اتنی سی ہے کہ کچھ روز احتیاط کر لی جائے تو کوئی ہرج نہیں!"

"جا کہاں رہے ہو؟"

میں ہنس پڑا۔ "اس طرح سوال کر رہی ہو جیسے میری زندگی میں اپنے سوا کسی دوسری لڑکی کے دخل کا اندیشہ ہو!"

"دوسری لڑکی!" وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "میری زندگی میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے اور اگر کسی نے تمہیں اپنے قرب کی نوید دینے کی جسارت کی تو میں اس کی ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گی۔ بس اسی ایک معاملے میں اجڈ رہ گئی ہوں میں!"

اور میری نگاہوں میں بے اختیار وہ بے شمار نسوانی چہرے ناچ اٹھے جن کی قربتوں سے میں نے بارہا اپنی تنہائی کا اندھیرا دور کیا تھا!

میرا سر جھک گیا۔ "میں پاکستانی پاسپورٹ کے حصول کی کوشش کروں گا... ہو سکتا ہے کہ واپسی میں شام ہو جائے!"

اور میں ہوٹل سے چلا آیا!

اس وقت پاسپورٹ کے اجرا میں شناختی کارڈ وغیرہ دکھانے کا رواج نہیں ہوا تھا یا شاید شناختی کارڈوں کا بھی آغاز نہیں ہوا تھا لیکن پاسپورٹ کا حصول خاصا دشوار تھا اور عام لوگوں کو بھی بار بار متعلقہ دفتر کے چکر لگانے پڑتے تھے جب کہ میرا اور سیتا کا معاملہ ہی مختلف تھا۔ ہم دونوں کی شہریت مشکوک تھی۔ میں اپنا پاکستانی ہونا اسی صورت میں ثابت کر سکتا تھا جب اپنا اصل نام ظاہر کروں اس کے بغیر پولیس انکوائری وغیرہ کا مرحلہ طے ہونا ناممکن تھا اور اگر مفروضہ نام استعمال کرتا تو پتہ کہاں کا دیتا!

دفتر میں ایک دو چکر لگا کر میں نے طریقہ کار کا اندازہ لگایا اور پھر احاطے میں لوٹ آیا جہاں متعدد دلال ہر آنے والے کو گاہک سمجھ کر گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے!

جو پہلا شخص مجھ سے ٹکرایا وہ صورت ہی سے عیار نظر آ رہا تھا۔ اس کے حریصانہ استفسار کا کوئی جواب دیے بغیر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے بھیڑ سے نکال کر قریبی ہوٹل کی طرف لے گیا!

"کتنے پیسے خرچ ہوں گے؟" میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"پاسپورٹ کب چاہیے؟" اس نے دام مقرر کرنے سے پہلے میری ضرورت کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا!

"چار سو روپے خرچ کرو تو پولیس انکوائری ونکوائری کے بغیر شاید کل شام تک مل جائے۔" اس نے مجھے خاموش پا کر خود ہی داغ بیل ڈالی۔

"یہ رقم تو بہت زیادہ ہے!" میں نے ایک میز کے گرد پڑی ہوئی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"پولیس انکوائری کا ذمہ اپنے سر لو تو سو روپے خرچ ہوں گے!" اس نے کہنیوں کے بل میری طرف جھک کر کہا۔

"پاسپورٹ کتنے دن میں ملے گا؟" میں نے سوال کیا۔
"رپورٹ آنے کے دوسرے دن!"
"یار تمہیں اندازہ تو ہو گا کہ کم از کم کتنے دن لگ جاتے ہیں؟" میں نے چڑچڑے لہجے میں اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی!
"تین چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے!"
"پھر کسی اور کو پکڑنا ہو گا۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا، "تم تو ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"
گاہک ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ سنبھل گیا اور تھوڑی سی ردوقدح کے بعد تین سو روپے میں اگلے روز پاسپورٹ دلوانے پر آمادہ ہو گیا۔
فارم میں میں نے اپنا نام سلطان اور سیتا کا لیلیٰ سلطان لکھوایا۔ ملکوں کے نام لکھواتے ہوئے میں نے ہندوستان کا نام لیا تو وہ چونک پڑا۔
"ہندوستان شامل کرانے کے بیس روپے الگ سے ہوں گے!"
"وہ کس خوشی میں؟"
"ملکوں کی فہرست میں ہندوستان کا نام نہیں ہوتا... اس کی تو پاسپورٹ والے بھی الگ فیس لیتے ہیں۔" اس نے مجھے آگاہ کیا اور مجھے یہ شرط بھی تسلیم کرنی پڑی۔
پتے کی باری آئی تو میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ "ہم حیدرآباد سے آئے ہیں، وہاں کا پتہ چل جائے گا۔"
"ارے نہیں بھائی۔" وہ جلدی سے بولا، "تمہارے فارم جمع ہی نہیں ہوں گے، ہو بھی جائیں تو اگلے دن پاسپورٹ نہیں ملیں گے کیونکہ قانوناً انکوائری تمہارے رہائشی علاقے کے تھانے سے ہونی ضروری ہے۔ کتنی بھی خانہ پری کر لی جائے حیدرآباد آنے جانے کے چار چھ دن تو لازمی گزارنے پڑیں گے!"
"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے سوال کیا۔ "تم ہی کوئی راہ بتاؤ!"
"لاہور میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"
"ہوٹل میں!" میں نے کہا۔
"نہیں چلے گا۔" وہ سوچتے ہوئے بڑبڑایا پھر بولا، "میں اپنے گھر کا پتہ دے دیتا ہوں لیکن یہ خیال رکھنا کہ آئندہ ویزا فارم میں بھی یہی پتہ لکھنا ہو گا۔"
"چلو ایسا کر لو!" میں نے نیم دلی سے کہا۔
حقیقت یہ تھی کہ پاسپورٹ کا حصول پھر اس میں کسی محفوظ حقیقی پتے کا اندراج میرے لیے ایک بہت بڑا مرحلہ تھا جس کو آسان بنانے کے لیے میں نے دلال کا سہارا لینا ضروری سمجھا تھا اور وہ شخص بالکل اسی انداز میں پیش آیا تھا جس کی مجھے توقع تھی!

میرے اور سیتا کے پاسپورٹ سے اس کا چھ سو روپے کا مفاد وابستہ تھا اور اگر محض مقامی پتے کی کمی کی وجہ سے ہمارے فارم نامکمل رہتے تو ہمارے کام کا جو حشر ہوتا لیکن اسے متوقع آمدنی سے ہاتھ دھونے پڑتے!
اس کا اصرار تھا کہ اسے نصف رقم ایڈوانس دی جائے لیکن میں نے محض اوپر کے چالیس روپے دینے پر اکتفا کیا تاکہ وہ کام میں بھرپور دلچسپی برقرار رکھ سکے!
اس موقع پر میں نے صفائیں پاسپورٹ کے لیے آتاری گئی تصاویر سے ہی کام لیا اور پورا معاملہ نمٹا کر واپس چلا آیا۔
سیتا کے لیے میری کامیابی کی اطلاع دل خوش کن ثابت ہوئی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ہم بیرونِ پاکستان اپنے جملہ مفادات سے جلد از جلد نمٹ لیں تاکہ پوری توجہ اپنے مقامی مسائل پر مرکوز کر سکے اپنے نئے گھر کی داغ بیل ڈال سکیں!
اگلے روز میں صبح دس بجے ہی پاسپورٹ آفس پہنچ گیا لیکن اس دلال سے معلوم ہوا کہ متفرق اندراجات کا کام خاصا طویل ہوتا ہے لہٰذا پاسپورٹ دو بجے کے بعد ہی مل سکے گا۔
میں وہاں سے بے مقصد انارکلی کی طرف روانہ ہو گیا!
راستے میں میرا ذہن اپنے مالی وسائل میں الجھا رہا، میرے پاس بظاہر تو خاصی رقم موجود تھی لیکن انبالہ کے سفر کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ کم پڑ سکتی تھی کیونکہ پاسپورٹوں کی تیاری کی مد میں چھ سو چالیس روپے کا اضافی خرچ اچانک سامنے آ گیا تھا!
بے اختیار مجھے قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آ گئی۔ پاکستان میں صاف ستھری اور ایماندارانہ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ابھی تک روبہ عمل آتا نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ پاکستان پہنچنے پر ہماری تحویل میں یمن کے جنرل عماد الحسینی کی دی ہوئی خطیر رقم موجود تھی جو زندگی کی شروعات کے لیے کافی تھی لیکن حادثے کے نتیجے میں میں اس سے محروم ہو چکا تھا اور جو رقم موجود تھی وہ ناکافی نظر آ رہی تھی!
پرانی انارکلی سے گزرتے ہوئے میں نے ایک کمزور سے ارادے کے تحت ایک بڑا سوتی رومال خریدا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے بعد میرا رخ نئی انارکلی کی طرف ہو گیا۔
میں نے اپنی زندگی کے مختلف مواقع پر بدترین اخلاقی نوعیت کے جرائم کا ارتکاب کیا تھا جن میں نقب زنی اور چوری سے قتل و غارت گری تک کے واقعات شامل تھے لیکن ایک بار تمام جرائم سے دستبردار ہونے کا رضاکارانہ فیصلہ کرنے کے بعد متروکہ راستوں کی طرف واپسی اختیار کرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا!
نئی انارکلی کا علاقہ پر ہجوم نظر آ رہا تھا اور میرے مطلب

کے اعتبار سے خاصا زرخیز تھا۔ چند سو قدم کی مسافت کے بعد ہی میں نے ایک جوڑے کو بھانپ لیا اور ان کے تقریباً پیچھے ہو لیا۔ پھر ایک بار جیسے ہی وہ دونوں بھیڑ میں سے گزرنے لگے۔ مرد اپنی ذات کو بھول کر عورت کو راہگیروں کی کہنیوں اور کندھوں کی زد سے نکال لے جانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا!
میرے لیے وہ بہترین موقع تھا، میرے قدم تیزی سے حرکت میں آئے اور میں بالکل اس شخص کے عقب میں پہنچ گیا۔
پھر شانے پر پڑے ہوئے رومال کی آڑ میں میرا ہاتھ آگے بڑھا اور لمحہ بھر میں اس شخص کی جیب سے وزنی بٹوا میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا!
میں نے رفتار سست کر کے سمت تبدیل کرتے ہوئے وہ بٹوا جلدی سے اپنی جیب میں ڈال لیا اور بھیڑ سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے لگا تاکہ بٹوے سے رقم علیحدہ کر کے دیگر فضول اشیا سے اپنی جان چھڑا سکوں!
اچانک میں نے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھوں کا سخت دباؤ محسوس کیا اور سنسنی کے عالم میں میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے! سر گھمایا تو بڑی بڑی آنکھوں اور پلی ہوئی مونچھوں والا ایک دیوہیکل شخص ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ لیے میرے سر پر موجود تھا!
"بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پسلیوں میں چاقو اتار دوں گا۔" اس نے میرے داہنے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی، "خیریت چاہتے ہو تو شرافت سے میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔ بھیڑ میں میرے اور بھی ساتھی ہیں!"
میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز اٹکتی سی محسوس کی اور محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا کیونکہ مسروقہ بٹوے کی جیب میں موجودگی کی وجہ سے میں اس وقت بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام لیتا تو وہ مجھے زخمی کر کے بھی قانون کی نگاہوں میں سرخرو رہتا کیوں کہ جیب تراشی کے مال سمیت فرار کی کوشش کرتے ہوئے جیب تراش کو زخمی کر کے بے قابو کرنا ہر لحاظ سے قابلِ معافی تھا!
کچھ دور آ کر وہ ایک روڈ پر مڑ گیا۔
داہنے ہاتھ پر رہائشی عمارتوں اور دوکانوں کے درمیان قطب الدین ایبک کے ویران و خستہ مزار کی تعمیر کے کام پر چند مزدور مامور تھے۔ وہ شخص مزار سے گزر کر بائیں ہاتھ پر تنگ و تاریک زینوں میں گھس گیا۔
اس بھاگ دوڑ کا اختتام پہلی منزل کے ایک سیلن زدہ لیکن وسیع کمرے میں ہوا جہاں شاید پورے سال دھوپ کا گزر ہی نہ ہوتا تھا!
اس نے کمرے کا مقفل دروازہ کھولا تھا جسے میرے اندر پہنچتے کے بعد اس نے بولٹ کر لیا۔
"مال نکالو۔" کمرے میں پہنچ کر چند ثانیوں بعد اس نے درشت لہجے میں کہا۔
"کیسا مال؟" میں نے پُراعتماد لہجے میں سوال کیا۔
"بکواس مت کرو!" غصے سے اس کا منہ بگڑ گیا۔ "وہ بٹوا کہاں ہے جو تم نے انارکلی میں ایک شخص کی جیب سے اڑایا تھا!"
"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میرے دوست!" میں نے سنجیدگی سے کہا، "کوئی بڑی غلط فہمی۔ میں ایک شریف آدمی ہوں جس کا جیب تراشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے!"
"اڑنے کی ضرورت نہیں!" وہ غرایا، "میں نے خود تمہیں اس کی جیب سے بٹوا نکال کر اپنی جیب میں رکھتے دیکھا تھا۔"
"اگر تم اسی قدر بضد ہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو۔" میں نے خائف ہوئے بغیر اسے پیش کش کی، "نہ میں نے کسی کی جیب کاٹی نہ میرے پاس کوئی بٹوا ہے!"
پہلی بار اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور وہ مجھے بھول کر دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔
دروازے پر ایک سے زائد افراد موجود تھے جن سے وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتا رہا پھر ایک آدمی کو اندر بلا کر دوبارہ دروازہ بند کر لیا۔ دوسروں کی آہٹیں بتدریج بیرونی راہداری میں دور ہوتی چلی گئیں جن سے لوٹنے والوں کی تعداد کم از کم دو ظاہر ہو رہی تھی!
اپنے ساتھی کے آ جانے کے بعد اس نے براہِ راست میری تلاشی لے ڈالی لیکن بٹوا میرے پاس ہوتا تو برآمد ہوتا۔ اسے تو میں راستے میں ہی رقم نکال کر ایک کھلے ہوئے گٹر میں پھینک آیا تھا اور وہ قدم محض یہ سوچ کر اٹھایا تھا کہ کہیں مجھے رنگے ہاتھوں پکڑنے والا خفیہ پولیس کا کوئی بدنیت اہلکار نہ ہو جو مجھے دھمکا کر مالِ مسروقہ کے علاوہ کچھ اور بھی ہتھیانا چاہتا ہو!
"بٹوا کہاں ہے؟" ناکام تلاشی کے بعد اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
"میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں شریف آدمی ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کو اعتدال پر رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ میرا علاقہ ہے!" چند ثانیوں تک اس نے مجھے پُرخار نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد کہا، "اور اسے میں نے کافی دور سے تاڑا ہوا تھا مگر مجھ سے پہلے تم نے اپنا کام دکھا دیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی اور بٹوا خالی کر کے تم نے کہاں پھینکا؟"
"رقم میری اپنی ہے جس سے تمہیں کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیے!" میں نے ناگواری سے کہا، "راستے بھر نہ صرف تم میرے ساتھ تھے بلکہ تمہارے تین ساتھی بھی ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بٹوا کہیں پھینکا ہوتا تو

ان میں سے کسی کی نگاہ میں ضرور آتا۔"

اس نے استفسار طلب نگاہوں سے اپنے نووارد ساتھی کی طرف دیکھا جس نے حسب توقع میری ہاتھ کی صفائی کی تائید کردی: "راستے بھر اس پر نگاہ رہی ہے۔ میں نے تو اسے کچھ بھی پھینکتے ہوئے نہیں دیکھا!"

"مگر میں نے اسے بٹوا نکالتے دیکھا تھا!" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس کے پاس موٹی رقم بھی موجود ہے مگر وہ بٹوا....!"

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم اس علاقے کے جیب تراشوں کے سرغنہ ہو۔" اسے بے یقینی کا شکار دیکھ میں نے کہا۔ "اور مجھے اپنی حدود میں مداخلت کے شبہ میں پکڑ لائے ہو۔ میں شریف آدمی ہوں اور تم جیسوں کی دشمنی کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اگر تم مجھے جانے دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس واقعہ کو بھول جاؤں گا!"

وہ دونوں کمرے کے ایک گوشے میں مشورہ کرنے لگے اور میں یہ سوچنے لگا کہ سیتا اس معاملے میں مجھ سے زیادہ ماہر ثابت ہوئی تھی۔ متعدد جیب تراشیاں کرنے کے باوجود وہ کبھی کسی کی گرفت میں نہیں آئی تھی۔ جب کہ میں پہلی ہی واردات کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا!

ان کی مشاورت کئی منٹ تک جاری رہی پھر مجھے نہایت تحقیر آمیز انداز میں دھمکیاں دینے کے بعد وہاں سے جانے کی اجازت مل گئی!

میں نے یوں سستے چھوٹ جانے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور عجلت کے عالم میں اس عمارت سے نکل آیا۔

دوپہر کا کھانا میں نے قیمے کے سموسوں اور لسی کے ایک گلاس کے ذریعے نمٹایا اور کشاں کشاں دوبارہ پاسپورٹ آفس جا پہنچا جہاں میرے دونوں پاسپورٹ ایجنٹ کے پاس تیار تھے جو اس نے رقم لے کر میرے حوالے کردیے!

اس روز کے لیے اتنی ہی کامیابی کافی تھی۔ پاسپورٹ لے کر میں سیدھا ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا جہاں سیتا میری منتظر تھی!

پاکستانی پاسپورٹ مل جانے کے بعد میں پاسپورٹ قبضے میں رکھنے سے خطرات پیش آسکتے تھے لہٰذا میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کرکے یکے بعد دیگرے ان دونوں پاسپورٹوں کا ایک ایک صفحہ نذر آتش کرکے راکھ غسل خانے کی نالی میں بہادی!

پاسپورٹ ایجنٹ سے باتوں ہی باتوں میں میں یہ معلوم کرچکا تھا کہ ہندوستان کے لیے ویزا پاکستان کے صرف دو شہروں سے جاری کیا جاتا تھا۔ ہمارے لیے کراچی میں ہندوستانی قونصلیٹ کا رخ کرنا تو دشوار تھا لہٰذا ہم نے اسی شام پنڈی روانگی کا فیصلہ کرلیا تاکہ اگلے روز اسلام آباد میں ہندوستانی سفارت خانے سے رجوع کرسکیں!

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور اسی شام ریل کار سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہوگئے!

راستے میں میں نے سیتا کو اپنی جیب تراشی کا قصہ تفصیل سے سنایا تو وہ بہت محظوظ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے باعث گردوپیش کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اگر خود کو نوآموز سمجھتے ہوئے میں احتیاط کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتا تو شاید وہ تلخ تجربہ سرے سے پیش ہی نہ آتا!

ہم آٹھ بجے پنڈی پہنچے تو اس شہر میں رات کا آغاز ہوچکا تھا۔ معالمہ اس وقت شب بسری کا ہی تھا۔ لہٰذا پنڈی میں بھی ہم نے ایک سستے لیکن صاف ستھرے ہوٹل کا ہی رخ کیا جبکہ پنڈی میں میرے کچھ رشتے دار بھی مقیم تھے لیکن حاجی اللہ داد سے پاکستانی اخبارات میں اپنے بارے میں شائع ہونے والے مواد کے بارے میں سن کر میں ماضی کے ہر شناسا سے دور رہنا چاہتا تھا!

اگلی صبح ہم بس کے ذریعے اسلام آباد پہنچے اور بھارتی سفارت خانے کا پتہ دریافت کرتے ہوئے منزل مقصود پر پہنچ گئے!

وہاں پہنچے تو حیرانی ہماری منتظر تھی۔ اس وقت محض پونے دس بجے تھے لیکن ویزا کی درخواستیں وصول کرنے والی کھڑکی کے سامنے مردوں اور عورتوں کی طویل قطاریں موجود تھیں!

پتہ چلا کہ ان دنوں کراچی سے ویزا کا اجرا خاصی دیر میں ہوتا تھا جبکہ اسلام آباد سے ہندوستان کا ویزا اگلے ہی دن مل جاتا تھا۔ پھر طویل بندش کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان محدود تعداد میں شہریوں کی آمدورفت کا آغاز ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے لہٰذا سندھ بلکہ حد تو یہ ہے کہ کراچی کے باشندے بھی ویزا کے حصول کے لیے اسلام آباد میں قائم بھارتی سفارت خانے کو ہی ترجیح دیتے تھے!

میں نے کاؤنٹر سے ویزا کے دو فارم حاصل کرکے ان کی خانہ پری کی اور پاسپورٹوں کے ساتھ مردانہ قطار میں کھڑا ہوگیا! انبالہ کا پتہ میں نے فرضی درج کیا تھا!

کھڑکی پر درخواستوں کی وصولیابی ٹھیک دس بجے شروع ہوگئی۔ قطار کے آخر میں کھڑے ہوئے لوگ ابتدا ہی سے مایوسی کا شکار تھے۔ کیونکہ ان کے بقول ہر روز درخواستوں کی ایک مقررہ تعداد ہی وصول کی جاتی تھی۔

ان دنوں پاکستان کے باشندوں کی اتنی بڑی تعداد ہندوستان جانے اور اپنے بچھڑے ہوئے اعزہ سے ملنے کے لیے بے چین تھی کہ صبح کے لیے ایک روز قبل سرِشام ہی لوگ سفارت خانے کی عمارت سے باہر درخواستیں جمع کرانے کے لیے قطار بند ہوجایا کرتے تھے!

پھر وہی ہوا جو سنا جارہا تھا!

مقررہ تعداد پوری ہوتے ہی کھڑکی بند کردی گئی اور ناکام لوگوں کی بھیڑ احاطے میں پھیل گئی۔ میرے لیے وہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ میں سیتا کے ساتھ مل کر کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں تھا!

چند منٹ بعد وہ عمارت سے نکلتی نظر آئی تو بہت خوش تھی!

"آؤ.... شاید کام بن ہی جائے!" اس نے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے پاسپورٹ اور ویزا فارم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی سفارش؟" میں نے سوال کیا۔

"رنجیت سنگھ یہاں بابو ہے۔ وہ ہندوستان میں میری ماں کی بیماری کی کہانی سن کر پسیج گیا۔ اگر فنی وجوہ پر کچھ درخواستیں مسترد ہوئیں تو وہ ہماری درخواستیں شامل کرادے گا۔ شاید کل کا ویزا ہی مل جائے!"

رنجیت سنگھ ایک ادھیڑ عمر اور رحم دل سکھ تھا۔ اس نے درخواستیں اور پاسپورٹ تو لے لیے مگر ہمیں کوئی رسید نہیں دی۔

میں دل ہی دل میں سیتا کے کمال کی داد دیتا واپس ہولیا۔

اگلے روز ہم ساڑھے بارہ بجے دوبارہ ہندوستانی سفارت خانے پہنچے تو رنجیت سنگھ نے اپنی میز کی دراز سے پاسپورٹ نکال کر ہماری طرف بڑھادیے!

اصولی طور پر ہمیں ہندوستان کے چار شہروں کے لیے ویزا مل سکتا تھا مگر اس کے لیے ہر شہر میں اپنے کسی رشتے دار کا پتہ دینا ہوتا جو ہمارے پاس نہیں تھا لہٰذا ہمیں صرف انبالہ کا ویزا ملا تھا اور وہ بھی سیتا کی ماں کے فرضی رہائشی پتہ کی بنا پر!

اس مرحلے سے نمٹ کر ہم اسی روز پنڈی آئے اور شام کو لاہور واپس لوٹ گئے!

اگلے دن کا آغاز کم از کم میرے لیے سنسنی خیز تھا۔

اسٹیشن سے امرتسر کے لیے ٹکٹ حاصل کرنے سے قبل میں نے کچھ پیسے خرچ کرکے سفری دستاویزات کی کارروائیاں مکمل کرالی تھیں اس کے ساتھ ہی امریکی ڈالرز بھی لے لیے تھے جو بہت قلیل محسوس ہوئے تھے مگر میں نے بقیہ پاکستانی کرنسی بھی ساتھ لے لی تھی!

ٹرین لاہور سے روانہ ہوئی تو ہر ڈبے میں اسپیشل پولیس کا عملہ موجود تھا۔ چند منٹ کے سفر کے بعد ٹرین واہگہ چیک پوسٹ پر روک دی گئی اور ٹرین چلانے والے عملے کے علاوہ سارے سرکاری اہل کار ٹرین سے اتر گئے!

ہندوستانی اور پاکستانی سرحد کے درمیان مختصر سی آزاد پٹی میں ہندوستان کے دو گھڑسوار سپاہی موجود تھے۔ ٹرین دوبارہ حرکت میں آئی تو ان میں سے ایک ایک مسلح گھڑسوار ٹرین کی ایک جانب موجود تھا!

مختصر سی آزاد پٹی سے گزر کر ٹرین اٹاری اسٹیشن پر رک گئی۔ اور سارے مسافر سامان سمیت ٹرین سے اتر گئے۔

کاغذات اور ساز و سامان کی اجتماعی دیکھ بھال میں توقع سے بہت کم وقت صرف ہوا اور مسافر دوبارہ ٹرین پر سوار ہوگئے!

اس بار ٹرین حرکت میں آئی اور ہندوستانی سرزمین پر دوڑنے لگی۔ بمشکل بیس منٹ بعد ٹرین امرتسر کے اسٹیشن پر رک چکی تھی جہاں ہر طرف پگڑیاں ہی پگڑیاں نظر آرہی تھیں!

جن مسافروں کے پاس امرتسر کا ویزا تھا انھیں اسٹیشن سے نکلنے کی اجازت مل گئی مگر بیشتر تعداد آگے جانے والوں کی تھی!

میں نے زرمبادلہ کے ایک بنک کاؤنٹر سے بیس ڈالر ہندوستانی کرنسی میں تبدیل کرائے اور انبالہ کے ٹکٹ خرید لیے۔

دوسرے پلیٹ فارم پر جانے والی ٹرین تیار تھی۔ میں سیتا کے ہمراہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس میں سوار ہوگیا اور تقریباً نصف گھنٹے بعد ٹرین نے امرتسر کا اسٹیشن چھوڑ دیا۔

اس کا اگلا اسٹیشن انبالہ تھا جہاں راجہ ہوٹل ہماری منزل تھا۔

سیتا کی ماں سندری کا دیا ہوا پارس پتھر وہاں موجود تھا یا نہیں۔۔۔ اس کے بارے میں محض امید ہی کی جاسکتی تھی۔ لیکن اصل صورت حال کے بارے میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی پُریقین نہیں تھا۔

میں خیالات کی رو میں ڈوبا کھڑکی سے باہر تیزی کے ساتھ پیچھے بھاگتے ہوئے سرسبز کھیتوں کو دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک ایک کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا!





وہ آواز سنتے ہی میرے دل کی گہرائیوں میں شدت سے یہ خواہش بیدار ہوئی کہ اس تند لہجے والے کا سامنا کرنے کے بجائے میں ٹرین کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دوں لیکن تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی ٹرین سے یوں باہر کود جانا جسم و جان کے لیے ہزاروں آزار پیدا کر دینے کا موجب بن جاتا لہٰذا میں نے اس کرخت آواز کے مخرج کی طرف سر گھمایا تو میری سنسناتی ہوئی رگوں میں دورانِ خون بحال ہوتا محسوس ہوا کیونکہ اس کے منحنی سے بدن پر ریلوے کی مخصوص وردی منڈھی ہوئی تھی۔

وہ ساکت و صامت کھڑا چھجے دار ٹوپی کے نیچے چمکتی ہوئی تحقیر آمیز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی بات چونکہ میرے پلّے نہیں پڑی تھی لہٰذا میں اس کی شانِ نزول سے بھی آگاہ نہ ہو سکا۔ وہ شاید اپنی بات دہرانے پر آمادہ نہ تھا اور میں فوری طور پر اس سے صوتی رابطہ قائم کرنے کی اہلیت سے محروم تھا لہٰذا محض اخلاقاً میں نے بھی اسے گھورنا شروع کر دیا۔

میرا اس منحنی مخلوق کو گھورنا محض اخلاقاً اور ازراہ خیرسگالی تھا، مگر وہ نہایت کینہ پرور ثابت ہوا اور میری نگاہوں میں پوشیدہ اخلاص بلکہ محکومی کو نہ سمجھ سکا۔

”آنکھیں کیا دکھا رہے ہو ٹکٹ نکالو۔“ کمپارٹمنٹ کی فضا میں ایک زہر آلود غراہٹ ابھری جس میں انسانی جذبوں کا کوئی بھی لطیف عنصر شامل نہیں تھا۔

میری نگاہیں اس اثنا میں مستقل اس کے چہرے پر مرکوز رہی تھیں اور مجھے اس کی گھنی مونچھوں کے درمیان کہیں کوئی جنبش نظر نہیں آئی تھی۔ لہٰذا میرا اس غراہٹ کو نظر انداز کرنا قطعی فطری تھا۔ بالخصوص اس صورت میں جب کہ اس کا جثہ محکومیت کی ایک لازوال مثال نظر آ رہا تھا جس سے کسی تحکم آمیز رویّے کی توقع حماقت سے کم نہ ہوتی۔

میرے لبوں پر ابھرنے والی دوستانہ مسکراہٹ نے آناً فاناً میں سارا تجسس دور کر دیا کیونکہ میرے مسکراتے ہی اس کی انا بھڑک اٹھی۔

”دانت مت نکالو، ٹکٹ دکھاؤ۔“ وہ ہاتھ میری طرف بڑھا کر پر مسخار لہجے میں بولا۔

اس کے لبوں کی جنبش تک اس بار بھی میری نگاہوں کی رسائی نہ ہو سکی مگر اس کی دیگر حرکات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا میرے لیے دشوار ثابت نہیں ہوا کہ نہ صرف اس بار بلکہ پہلے بھی کمپارٹمنٹ میں اسی کی آواز گونجی تھی۔

اس کے مدعا سے واقف ہوتے ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب دونوں ٹکٹ اس کی طرف بڑھائے تو اس کے استخوانی چہرے پر پژمردگی سی تیر گئی۔

میرے ابتدائی ردِعمل کی بنا پر شاید وہ یہ رائے قائم کر چکا تھا کہ میں بلاٹکٹ اس ٹرین میں سفر کر رہا تھا اسی بنا پر اسے ٹکٹ دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی۔

اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی سادہ سی مشین سے ٹکٹوں میں سوراخ کیے اور ٹکٹ میری گود میں پھینک کر واپس چلا گیا۔

اس قطار میں براجمان دوسرے مسافروں کے ٹکٹ وہ غالباً مجھ سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

”تم نے بابو کو ناراض کر دیا۔“ اس کے چلے جانے پر میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک جوان العمر سکھ نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”بعض لوگ شکمِ مادر ہی سے ناراضگی کی حالت میں برآمد ہوتے ہیں۔“ میں نے دانستہ اتنی اونچی آواز میں کہا کہ پچھلی قطار میں مصروف ٹکٹ چیکر میرا تبصرہ سننے کی سعادت سے محروم نہ رہ سکے۔

تبصرہ کرنے والا سکھ دل کی گہرائیوں سے ہنس پڑا۔ دوسرے مسافروں کے چہروں پر بھی دبی دبی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

یہ مختصر سا واقعہ غلط فہمی کی پیداوار تھا مگر نتائج کے اعتبار سے خاصا حوصلہ افزا رہا کیونکہ دوسرے ہم سفر مجھے خوش مزاج سمجھتے ہوئے جلد ہی میرے ساتھ بے تکلف ہو گئے۔

سفر نہایت خوشگوار اور پرسکون گزرا اور دوپہر کے قریب ٹرین انبالہ اسٹیشن پر جا رکی۔

ہم دونوں کے پاس وزن کے اعتبار سے سامان نہ ہونے کے برابر تھا لہٰذا ہم پھرتی سے ٹرین سے اترے اور پرہجوم پلیٹ فارم پر اپنا راستہ تلاش کرنے لگے۔

انبالہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں عجیب سی دلی کیفیات سے دوچار ہو چکا تھا کیونکہ اس سرزمین نے میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

ہندوستان میں انبالہ وہ آخری شہر تھا جہاں تک میں سیتا کے ہمراہ واپسی کے سفر پر تمام تر دشواریوں کے باوجود گامزن رہا لیکن پھر میرے مقدر نے کروٹ لی اور سیتا نے میری ایک بات پر ناراض ہو کر خاموشی سے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

ایک طرف میرے لہو کے پیاسے میری بو پر لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف مجھے سیتا کی سلامتی کی فکر لاحق ہو گئی تھی اور اس دوہری پریشانی میں میں راستہ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔

انبالہ سے نکلنے کے بعد حالات میرے حق میں بد سے بدتر رخ اختیار کرتے چلے گئے اور میں نگر نگر کی خاک چھاننے پر مجبور ہو گیا مگر یہ قدرت کی کریمی تھی کہ میری طویل جلاوطنی رائیگاں نہیں گئی۔

اس جلاوطنی میں جہاں میں نے قتل و دہشت گردی کے بازار گرم کیے وہاں فلسطینی تحریک کے دوش بدوش کچھ ایسے کام بھی سرانجام دیے

جنھیں میں آج بھی اپنی بے ملیا زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھتا ہوں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ جلاوطنی کے اسی تاریک دور میں میری کھوئی ہوئی سیتا مجھے واپس ملی جس کے بغیر میں اپنا وجود ادھورا محسوس کرتا تھا۔ سیتا مجھے مل چکی تھی اور میں ایک مفروضہ نام سے پاکستان کی شہریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جس کا ثبوت پاسپورٹ کی صورت میں میری تحویل میں تھا لیکن پاکستان کے دل کراچی میں پہنچتے ہی مقدر کی گردش نے مجھے نہ صرف اپنے اثاثے سے محروم کر دیا تھا بلکہ عارضی طور پر روزی کمانے کی صلاحیت میں بھی قابلِ ذکر کمی کر دی تھی لہٰذا میں آلامِ روزگار کی سنگینی میں کمی کی خاطر پارس پتھر سے رجوع کرنے پر مجبور تھا جسے بصورتِ دیگر میں ایک سرے سے بھلا ہی چکا تھا۔

اسٹیشن سے باہر سواریوں کا ایک رنگ برنگ ہجوم جمع تھا مگر ہم تانگوں اور رکشوں کی بھیڑ سے نکلتے ہوئے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔

وہاں ایک سپاہی موجود نظر آیا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سب سے اگلی ٹیکسی کے ڈرائیور نے منزل یا اجرت کی بات کیے بغیر ہمارے لیے دروازہ کھول دیا۔

"کرایہ کیا لو گے؟" میں نے کراچی کے تلخ تجربات کے پیشِ نظر بیٹھنے سے قبل اس سے سوال کیا۔

وہ مسکرا دیا۔ "جو جی چاہے دے دینا باؤ جی۔ ویسے ہم میٹر سے چلتے ہیں، جانا کہاں ہے آپ کو؟"

"راجہ ہوٹل۔" میں نے پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر فوراً ہی خاموش ہو گیا۔

"پاکستان سے آئے ہو باؤ جی؟" ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی قطار سے باہر نکالتے ہوئے پُراخلاق لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں! کیسے اندازہ لگایا تم نے؟"

"ادھر سے آنے والے دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔" اس کے لہجے میں ایک بے نام سی حسرت پوشیدہ تھی۔ "پھر آپ نے تو ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ہی اپنی شناخت کروا دی تھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ دھیمے سے ہنسا۔

"وہ کیسے؟" میں نے اپنا سوال برقرار رکھا۔

"سنا ہے پاکستان میں ہمارے زیادہ نرکھائی بند میٹر ہونے کے باوجود اس کی پروا نہیں کرتے۔ ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر تو ان کے وارے نیارے ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت رچی ہوئی تھی۔ "یہاں تو پولیس ڈال ہی نہیں گلنے دیتی۔ باری سے مسافر اٹھانے پڑتے ہیں، جیسا بھی اور جہاں کا بھی مسافر مل جائے۔"

"یہ نظام مسافروں کے حق میں تو اچھا ہے۔"

"آپ اسے جو بھی کہو، سچی بات یہ ہے کہ کچھ جوڑنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہاں مسافر تو ریزگاری تک نہیں چھوڑتے۔ سنا ہے پاکستان میں تو نہ مسافر ریزگاری کی پروا کرتے ہیں اور نہ ڈرائیور لوٹاتے ہیں۔"

"تو پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟" میں نے مسکرا کر سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"اتنا آسان نہیں ہے باؤ جی!" وہ بولا۔ "میرا ایک یار گیا تھا۔ تین مہینے کے ویزے پر۔ کراچی میں خوب ڈٹ کر کمائی کی۔ آٹھ ہفتے میں سات ہزار روپے جوڑ لیے مگر واپس لوٹا تو ہندوستان میں گھستے ہی کسٹم والوں نے پکڑ لیا۔"

"بدنصیبی تھی اس کی۔"

"کسٹم والے تو سونگھتے ہیں جی لوگوں کو۔ ساری رقم ڈکار لیے بغیر صاف کھا گئے۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"رسید تک نہیں دی رقم کی ضبطی کی۔" اس نے انکشاف کیا۔ "بولتے تھے رسید کٹے گی تو کرنسی کی اسمگلنگ کے جرم میں اسے اندر بھی کرنا ہو گا لہٰذا بے چارہ رسید کو بھول بھال کر سیدھا لوٹ آیا۔"

میں ہنس پڑا۔ "ویزا پر جانے والوں کو اسی لیے کمانے سے قانوناً روکا ہوا ہے۔"

"وہ تو غنیمت ہوا کہ پاکستان میں کسی نے تلاشی نہ لی ورنہ اس رقم کی فراہمی کا ذریعہ بھی بتانا پڑتا۔ سچ بولتا تو پھنستا۔ جھوٹ سے کام لیتا تو بھی نہ بچتا۔"

"سچی بات ہے کہ پاکستانی پیسہ کمانے دوبئی جاتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے تو پاکستان ہی دوبئی ہے۔ ہر کام میں یہاں سے چار پانچ گنی کمائی ہے۔"

"اخراجات بھی ویسے ہی ہیں۔" میں نے کہا

"اخراجات اپنے بس میں ہوتے ہیں جی!" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "بات بس اتنی سی ہے کہ دیس میں آدمی اپنے پرایوں کے طعنوں کے ڈر سے کنجوسی نہیں کرتا۔ پردیس میں سب کچھ کر لیتا ہے کیونکہ وہاں دیکھنے اور ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔"

پھر ایک دم چونک کر اس نے ٹیکسی کی رفتار سست کر دی۔

"باتوں میں بھول ہی گیا۔ جانا کہاں ہے آپ کو؟"

"راجہ ہوٹل۔"

"کوئی گلی محلے کا نام نہیں؟"

"گلی محلے نہیں۔ مجھے خاص راجہ ہوٹل میں جانا ہے۔" میں نے قدرے حیرت اور ناگواری کے ساتھ اپنا مدعا واضح کیا۔

"اب تو بس اس بازار کا نام ہی رہ گیا ہے۔ راجہ ہوٹل تو توڑا جا رہا ہے۔ آپ کو کہیں اور ٹھہرنا ہو گا۔"

"توڑا جا رہا ہے؟" سیتا نے حیرت اور بے ساختگی سے سوال کیا۔

"ہاں بیگم صاب!" اس نے ادب سے کہا۔ "سنا ہے وہاں ایک نئی بلڈنگ بنائی جائے گی، نیچے شاید ہوٹل بھی دوبارہ کھل جائے۔"

"پھر کسی اور ڈھنگ کے ہوٹل میں لے چلو۔" میں نے پژمردہ آواز میں کہا۔

راجہ ہوٹل کے انہدام کی اطلاع میرے لیے شدید مایوسی کا سبب ثابت ہوئی تھی اور یہی حال سیتا کا بھی ہوا تھا۔

"یہ ہے جی راجہ ہوٹل۔" چند منٹ بعد ٹیکسی ڈرائیور نے داہنی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم سے کہا۔

اس عمارت کا وسیع حصہ منہدم کیا جا چکا تھا باقی ماندہ ڈھانچے پر مزدوروں کی ٹولیاں ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

ہمیں راجہ ہوٹل کی ریت کزائی دکھانے کی نیت سے ڈرائیور نے اس مقام پر اپنی ٹیکسی کی رفتار سست کر لی تھی اور میں نے چند ثانیوں کی اس مہلت میں گہری نظر سے توڑ پھوڑ کے اس کام کا جائزہ لے ڈالا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر ایک اوسط درجے کے ہوٹل پر ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔

میں نے اسے کرائے سے دو روپے فاضل دیے تو اس نے خوش ہو کر دونوں ہاتھوں سے ہمیں سلام کیا اور فراخ دلی سے بولا۔ "اسی لیے تو کہتا ہوں باؤ جی کہ پاکستانیوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہاں لوگ بخشش ہی نہیں دیتے۔ کبھی کوئی سا ہو کار ٹکر جائے تو پچاس پیسے سے آگے نہیں سوچتا۔"

وہ آگے بڑھ گیا اور میں سیتا کے ہمراہ درما ہوٹل کی عمارت میں داخل ہو گیا۔

ہوٹل میں جب میں نے کاؤنٹر والے پر اپنا مدعا ظاہر کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ہم آپ کو ہوٹل میں تو کمرہ نہیں دے سکتے۔"

"وہ کیوں؟"

"ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سفر کرنے والے رشتہ داروں سے ملنے آتے جاتے ہیں، اور انھیں ہر شہر میں اسی پتہ پر ٹھہرنا پڑتا ہے جو وہ ویزا فارم میں لکھتے ہیں۔" اس نے بااخلاق لہجے میں ہمیں آگاہ کیا۔ "یہاں ہوٹل والوں کو پاکستانیوں کو ٹھہرانے کی سخت ممانعت ہے۔ کوئی نرم گرم کرائے کے لالچ میں ٹھہرا بھی لے گا تو پولیس آفس والے آپ کو اور اسے تنگ کریں گے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"جس پتے پر جانا تھا وہیں کیوں نہیں جاتے؟"

"اوّل تو وہ پتہ ہی غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم بیس برس بعد یہاں آئے ہیں۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس علاقے میں پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ لوگ برسوں پہلے کہیں اور جا چکے ہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔"

میں خاموشی سے اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا۔

"پہلے آپ پولیس آفس چلے جائیں اور وہاں بڑے بابو کو اپنی الجھن ایمانداری سے بتا دیں، وہ کوئی نہ کوئی راستہ سمجھا دے گا۔"

"ایسا نہ ہو کہ ہم پھنس جائیں۔" سیتا نے کہا۔

"پاسپورٹ کی تہہ میں دس بیس روپے رکھ دینا۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔" اس نے آخر میں ہمیں نسخۂ کیمیا سے بھی آگاہ کر دیا۔

اس سے پولیس آفس کا پتہ معلوم کر کے ہم ہوٹل سے باہر آئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہمیں اسٹیشن سے ہوٹل تک لانے والا ٹیکسی ڈرائیور فٹ پاتھ کے کنارے اپنی ٹیکسی کے بونٹ سے ٹیک لگائے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

"تم واپس آ گئے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس وقت تو روانی میں واپس چلا گیا لیکن آگے جا کر خیال آیا کہ پاکستانیوں کو تو کوئی ہوٹل والا نہیں لیتا اور درما ہوٹل والا تو اس معاملے میں بہت سخت ہے۔"

"پھر کیا سوچ کر لوٹے؟"

"چاہو تو اپنا گھر پیش کر سکتا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "بال بچوں والا آدمی ہوں۔ بیوی اور پانچ بچوں کے علاوہ ماں بھی ساتھ رہتی ہے۔"

"کام نہ بنا تو تمھارے گھر ہی ڈیرہ ڈالنا ہو گا۔" میں نے اس کی پیش کش پر دلی اطمینان محسوس کرتے ہوئے اسے درما ہوٹل سے معلوم ہونے والی ترکیب سے آگاہ کر دیا۔

"اگر ہم اس بکھیڑے میں پڑے بغیر ہی تمھارے گھر چلیں؟"

سیتا نے میرے خاموش ہوتے ہی سوال کر ڈالا۔

"بڑی خوشی سے۔" اس نے فراخ دلی کے ساتھ کہا۔

میں سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا کیونکہ سیتا نے اس سے بروقت صحیح بات چھیڑ دی تھی۔

ہوٹل کے مقابلے میں کسی کا گھر ہمارے لیے زیادہ محفوظ تھا لیکن میری فوری آمادگی اسے موہوم سے شبے میں مبتلا کر سکتی تھی جب کہ سیتا کے بارے میں وہ یہی سمجھا ہو گا کہ عورت ہونے کے ناطے وہ ہر الجھن سے دور رہنے کی خواہاں تھی۔

"مگر ہم مفت خوری نہیں کریں گے۔" سیتا اس سے کہہ رہی تھی۔

"وہ تو شاید میں بھی نہ کرا سکوں۔" اس نے سادگی سے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔ "روز کمانے اور روز کھانے والا آدمی ہوں۔ بیس روپے روز دے دینا۔"

"صرف بیس روپے؟" سیتا نے حیرت سے دہرایا۔

وہ ہنس دیا۔ "پاکستانیوں کو یہاں ہر چیز پر حیرت ہوتی ہے۔ پندرہ روپے میں میرے گھر کا ہانڈی کا خرچہ چل جاتا ہے تم دونوں کے

شامل ہونے پر بیس میں گزر ہو جائے گی اس طرح چند روز میں اپنی کمائی جوڑ سکوں گا۔"

اس کی سادہ باتیں بہت دل نواز تھیں، اس بار سیتا ٹیکسی کی عقبی نشست پر بیٹھی مگر میں آگے اُس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

راستے میں میں نے قانونی طور پر موجود تمام ڈالرز ہندوستانی کرنسی میں تبدیل کرلیے اور پھر اس رقم میں سے دو سو روپے ڈرائیور کے حوالے کردیے جو اُس نے احساسِ ممنونیت کے ساتھ خاموشی سے لے لیے۔

"نام نہیں معلوم ہوا اب تک تمھارا؟" کچھ دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد میں نے اس سے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"رام ناتھ نام ہے ویسے ماں سے دوستوں تک سبھی رامو کہتے ہیں۔"

"میں سلطان اور یہ لیلیٰ ہے — میری جیتی بیوی!"

وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"ایک بات بتاؤ گے رامو؟" تھوڑی دیر بعد سیتا نے اُسے مخاطب کیا۔

"ایک کیا جو پوچھیں بتاؤں گا۔"

"ہم مسلمان ہیں، ہماری وجہ سے۔۔۔"

"ارے نہیں بھابی!" وہ فضا میں دایاں ہاتھ لہرا کر لاپروایانہ لہجے میں بولا۔ "دھرم کی باریکیاں ہمارے پنڈتوں نے تراشی ہوئی تھیں، تاکہ ان کا حلوا مانڈا چلتا رہے۔ اُن کے سننے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہندو مسلمان ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں اور کسی کا دھرم نشٹ نہیں ہوتا۔ دھرم تو انسان کے بہت اندر کی چیز ہے ان باتوں سے بھلا کیا ہوتا ہے۔"

"یہ اچھا ہے کہ تم روشن خیال ہو ورنہ ہماری موجودگی تمھارے گھرانے کے لیے بوجھ بن کر رہ جاتی۔" میں نے کہا۔

"روشن خیال!" رامو نے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔ "گندی گلیوں اور چھوٹے مکانات میں رہنے والے سب ہی ایسے ہوتے ہیں بھائی — شاید تمھیں حیرت ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے میرے گھر میں دال سبزیوں کے ساتھ گوشت بھی پکتا ہے — بس میری ماں گوشت نہیں کھاتی تمھیں پتہ ہی نہ چل سکے گا کہ کسی ہندو گھرانے میں رہ رہے ہو۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن ہماری وجہ سے اپنے معمولات میں فرق نہ ڈالنا۔ تمھاری ماں کو کراہت ہوتی ہے تو ہمیں دال اور سبزیاں بھی مرغوب ہیں۔"

ہمارے سفر کا اختتام خاصی تاخیر سے ایک عسرت زدہ نیم پختہ آبادی میں ہوا۔ مگر ٹیکسی جس مکان کے دروازے پر رکی تھی وہ بادی النظر میں صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔

ٹیکسی کے انجن کی آواز سنتے ہی مکان کے دروازے پر جھولتے ہوئے ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے دو بچے پرجوش انداز میں دوڑتے ہوئے باہر آئے اور جوں ہی رامو نیچے اترا، ابا ابا کہتے ہوئے اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

ان میں ایک لڑکی سات آٹھ برس کی تھی۔ دوسری کی عمر شاید چار سال رہی ہوگی۔

"میری بیوی کی کوکھ بہت ہلکی ہے۔" وہ بچیوں کے سر سہلاتے ہوئے میری طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "چار لڑکیوں کے بعد اب دس مہینے کا لڑکا گود میں ہے۔"

"یہ سب اللہ کی دین ہوتی ہے۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ خرافات سوچ کر دماغ خراب نہ کیا کرو۔"

تین کمروں اور ایک بیٹھک پر مشتمل وہ گھر صاف اور سادہ بود و باش کا مظہر تھا جس میں بنیادی ضروریات کی ہر شے موجود تھی لیکن آسائشوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔

رامو نے پہلے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا جہاں ایک تخت کے علاوہ فرش پر دری پڑی ہوئی تھی۔

شاید اُس نے اندر جا کر پہلے اپنی بیوی اور ماں کو ہمارے بارے میں بتانا چاہا تھا اس دوران میں اس کی چاروں لڑکیاں بیٹھک میں آکر سیتا کے گرد جمع ہوگئی تھیں اور سیتا اُن کے ساتھ خوش فعلیوں میں مشغول ہو چکی تھی۔

چند منٹ بعد رامو بیٹھک میں آیا اور ہنستے ہوئے بولا "گھر کا جائزہ لے لو، جو کمرہ مناسب سمجھو وہ ٹھیک کرا دوں گا۔"

"بیٹھک ہی مناسب رہے گی۔" میں نے کہا۔ "بس اتنی گنجائش پیدا کر دو کہ ہم دونوں فرش یا تخت پر بآسانی سو سکیں۔"

اس سے یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں یہ پہلو نمایاں تھا کہ اگر مجھے اور سیتا کو آپس میں کسی تبادلۂ خیال کی ضرورت پیش آئے تو تخلیے میں خلل واقع نہ ہو۔

اس کے ہمراہ ہم دونوں نے پورے مکان کا جائزہ لیا۔ اس کی بیوی آشا خوش شکل ضرور تھی مگر بچوں کی پے در پے یلغار نے اس کا مزاج چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اس کے برعکس رامو کی بوڑھی ماں بہت زندہ دل خاتون تھی۔

اُس نے بڑی محبت سے سیتا کو اپنے سینے سے لپٹا کر اس کی بلائیں لیں اور اس وقت سیتا یک بیک ایک معصوم سی بچی نظر آنے لگی۔

اور جب سیتا رامو کی ماں کے سینے سے الگ ہوئی تو اُس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ شاید اسے اپنی ماں سندری یاد آگئی تھی۔

مکان کے محل وقوع نے میرے انتخاب کی تائید کی اور پھر میں نے رامو کے ساتھ مل کر بیٹھک میں دو چارپائیاں منتقل کرالیں۔ تخت رامو کی ماں کے حصے میں آیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا اور رات کے کھانے میں دیر تھی مگر ہم دونوں بھوکے تھے لہٰذا رامو کی بیوی رسوئی میں جا گھسی۔

"یہاں تو معاملہ ہی چوپٹ ہوگیا ہے۔" منہ ہاتھ دھونے کے بعد تنہائی میسر آتے ہی سیتا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے اب بھی کچھ امید ہے۔"

"اب کیا رہ گیا ہے وہاں؟" سیتا نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "بس چار چھ روز کی بات ہے پھر وہاں سپاٹ میدان باقی رہ جائے گا۔"

"وہ عمارت ایک منصوبے کے تحت ڈھائی جارہی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے جن حصوں کا انہدام ہوتے دیکھا، اُن میں کوئی چوبی حصہ باقی نہیں تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ میری بات نہ سمجھ سکی۔

"چوکھٹیں، دروازے اور دوسرا چوبی ساز و سامان انہدام سے پہلے نکالا جا چکا ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ چیزیں برباد نہیں ہوئیں۔ اب ہمیں اس شخص یا مقام کا پتہ چلانا ہوگا جہاں راجہ ہوٹل کا چوبی ملبہ لے جایا گیا ہے۔"

"جب انبالہ تک آہی پہنچے ہیں تو کسی کوشش میں کسر نہیں چھوڑنی چاہیے۔" اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

اسی اثنا میں آشا کھانے کی تھالی لیے وہاں آ پہنچی، اُس کے پیچھے رامو پانی کا جگ اور گلاس لیے چلا آرہا تھا۔

اس وقت کھانے میں گوشت کی بنی ہوئی کوئی چیز نہیں تھی لیکن کھانا بہت لذیذ اور اشتہا انگیز تھا جس کے ساتھ ہم نے پورا پورا انصاف کیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد رامو نے روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

"کہاں جاؤ گے؟" رامو نے باہر آکر سوال کیا۔

"انبالہ گھوموں گا۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ "خوبصورت شہر ہے اور پھر یہاں کے لوگ بھی ملنسار معلوم ہوتے ہیں۔"

"درست کہہ رہے ہو لیکن ذرا ٹھگوں سے ہوشیار رہنا۔"

"ٹھگ؟ انبالہ میں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "آج کل شہر میں ایک ٹولی کا بہت چرچا ہے ایک خوبصورت اور جوان لڑکی خود کو شہر میں معصوم اور بے سہارا ظاہر کرکے کسی سادہ لوح شکار کو پھانس لیتی ہے اور جب وہ دونوں مکان یا ہوٹل میں تخلیے میں پہنچتے ہیں تو ان کا تعاقب کرنے والے لڑکی کے ساتھی اُن کے سر پر پہنچ کر شکار کو لڑکی کے اغوا اور آبرو ریزی کے جرم میں پھنسوانے کی دھمکی دے کر اسے ساری پونجی سے محروم کر دیتے ہیں۔"

"اور ابھی تک آزاد ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"آزاد ہی ہیں!" اس نے ٹیکسی گھماتے ہوئے کہا۔

شہر کے وسطی علاقے میں اس نے مجھے اتار دیا۔

تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر وقت گزاری کے بعد میں نے ایک سائیکل رکشہ روکا اور دو روپے معاوضہ طے کرکے اس میں راجہ ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

راجہ ہوٹل پہنچتے تک شام ہو چلی تھی اور عمارت کے ادھورے ڈھانچے پر کام کرنے والے مزدور چھٹی کرکے جا چکے تھے!

میں ٹہلتا ہوا اس طرف بڑھا پھر ملبے کے درمیان ہی مجھے ایک ادھورے کمرے میں دو افراد براجمان نظر آئے اور میں ان کی طرف بڑھ گیا۔

ان دونوں ہی کی توجہ مٹی کے تیل کے چولہے پر چڑھی ہوئی دیگچی کی طرف تھی لہٰذا وہ اس وقت تک مجھے نہ دیکھ سکے جب تک میں نے کھنکار کر انھیں اپنی موجودگی سے مطلع نہیں کیا!

"نمستے!" میں نے ان سے نگاہیں چار ہوتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کون ہو تم؟" ان میں سے ایک نے مجھے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا اس کا ساتھی چولہے پر کھولنے والے پانی کو چائے کا روپ دینے میں مصروف ہوگیا تھا۔

"میرا نام روپی لعل ہے۔" میں نے بلاتوقف کہنا شروع کر دیا۔ "روزگار کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ یہاں کوئی کام مل سکتا ہے؟"

اس نے ناقدانہ نگاہوں سے میرے سراپا کا جائزہ لیا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اس کھنڈر میں بھلا کس کام کی اُمید لے کر آئے ہو؟"

"جو کام مل جائے کرلوں گا۔" میں نے اداس لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں لکڑی کے کام سے واقف ہوں۔"

"حلیے سے تو بابو لگتے ہو اور یہاں بابوگیری نہیں ملے گی!" اس نے میرا جواب نظر انداز کرتے ہوئے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

"مزدوری مل جائے گی؟" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"ارے یار کیوں کھنچائی کر رہے ہو بے چارے کی!" اچانک چائے بنانے والے نے مڑ کر اپنے ساتھی سے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوگیا۔

"ترکھان ہو تم؟" اس کا لہجہ پہلے کے مقابلے میں ہمدردانہ تھا۔

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "یہاں بھی تو بلڈنگ سے دروازے، کھڑکیاں اور الماریاں وغیرہ نکالنی ہوں گی!"

"وہ سب چودھری رندھیر لے گیا بھائی!" اس نے اپنی چائے کی پیالی بھرتے ہوئے کہا۔ "یہاں اپنا وقت برباد مت کرو۔ کام جانتے ہو تو رندھیر تمھیں رکھ لے گا۔ نئی پرانی لکڑی کا بڑا بیوپاری ہے۔ اس عمارت کی ساری پرانی لکڑی اسی نے خریدی تھی۔ ہم تو پتھروں سے سر پھوڑ رہے ہیں!"

"چودھری رندھیر کا کارخانہ کہاں ہے؟" اتنی آسانی سے مدعا حل ہو جانے پر میرے دل کی دھڑکنیں یک بیک تیز ہوگئی تھیں۔ لیکن میں نے اپنے لب و لہجے سے کسی تبدیلی کا اظہار نہ ہونے دیا کیونکہ میں مظلوم بن کر ہی اس سے معلومات اگلوا سکتا تھا!

"لکڑی کی منڈی میں جس سے نام لوگے وہ وہاں پہنچا دے گا۔ اس کا گودام اور کارخانہ منڈی میں سب سے بڑا ہے!"

میں اس کا شکریہ ادا کر کے ایسے بے جان قدموں سے واپس لوٹا جیسے ہر قدم کے ساتھ دھرتی پہ کوئی احسان کر رہا ہوں!

پہلی ہی کوشش میں راجہ ہوٹل سے نکلنے والی پرانی لکڑی کے خریدار کا سراغ مل جانا میرے لیے ایک غیر متوقع کامیابی تھی جس کا خود مجھے بھی گمان نہیں تھا۔

ہوٹل کے زیرِ انہدام ڈھانچے کا رُخ کرتے ہوئے میرے ذہن میں زیادہ سے زیادہ یہ امکان موجود تھا کہ اگر کچھ حصّوں کی توڑ پھوڑ باقی رہ گئی تو ان کا جائزہ لے کر پارس پتھر کی بازیابی کے امکانات کا جائزہ لے ڈالوں ورنہ انبالہ سے پاکستان واپسی کی راہ اختیار کر دوں۔

مگر چوہدری رندھیر کا نام سامنے آجانے کے بعد اچانک اُمید کی ایک نئی کرن نمودار ہوگئی تھی۔ اگر ہوٹل سے نکلنے والی لکڑی اس کے گودام میں موجود تھی تو یہ امکان بھی باقی تھا کہ شنوں لکڑی کے اس انبار میں ہمیں وہ چوکھٹ مل سکے جس کے ایک سوراخ میں چیونگم کی کچلی ہوئی لُگدی کے نیچے سندری کی دی ہوئی انگوٹھی کا نگ پوشیدہ تھا۔

راجہ ہوٹل سے گلی کے نکڑ تک میں خواہ مخواہ بوجھل قدموں سے چلتا رہا اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں عمارت کے ملبے میں موجود دونوں افراد کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوں تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس وقت میں جلد از جلد سیتا تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ تاکہ وقت ضائع کیے بغیر اس کے مشورے سے کوئی لائحہ عمل طے کیا جاسکے۔

رکشے میں سوار ہوتے ہوئے مجھے رامو کے مکان کی نشاندہی میں کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ رامو خود اسی شہر کا ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا اور اس نے مجھے انبالہ آنے سے قبل اپنے مکان تک رسائی کے ہر امکانی حوالے سے آگاہ کر دیا تھا۔

راستے میں میرا ذہن مستقل طور پر چوہدری رندھیر اور اس کے گودام میں الجھا رہا۔

جس انداز میں راجہ ہوٹل کی عمارت کا انہدام جاری تھا اس سے ہوٹل کے مالکان کی سمجھ بوجھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

انھوں نے جوشِ امارت میں اپنے پرکھوں کی محنت کو بالکل ہی اکارت نہیں کیا تھا بلکہ ان کی جملہ مساعی کے پورے پورے دام وصول کیے تھے اگر ابتدا ہی سے ان کا وہ طریقہ کار رہا تھا تو لازمی بات تھی چوہدری رندھیر کو عمارت کی لکڑی سمیٹے کافی دن گزر چکے تھے۔ کیونکہ ڈھانچے کے انہدام کا آغاز اس کی روانگی کے بعد ہی ہوا ہوگا۔

چوہدری رندھیر کا نام میرے علم میں آچکا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ اس نے ہوٹل کی عمارت سے برآمد ہونے والی لکڑی کو سینے سے لگا رکھا ہو۔ وہ بنیادی طور پر ایک کاروباری آدمی تھا اور ایسے لوگ کسی بھی سودے کو زیادہ عرصے تک روک بنا کر نہیں پالتے۔ اگر ہوٹل سے برآمد ہونے والی پرانی لکڑی کی فروخت کا آغاز ہو چکا تھا تو میرا کام بڑھ جانے کے سارے شواہد موجود تھے۔ ان دنوں حالات میری حکمتِ عملی یہ قرار پائی تھی کہ میں ہر قیمت پر چوہدری رندھیر کے گودام میں گھس کر اپنی متاعِ بے بہا تلاش کرنے کی کوشش کروں۔

اور یہ کام مجھے اپنے بس سے باہر نظر آرہا تھا۔ ایک مقامی مددگار کو اعتماد میں لیے بغیر مجھے اپنی پیش قدمی کے بارے میں خاصے شبہات تھے۔ مقامی مددگاریوں تو بہتیرے خریدے جاسکتے تھے لیکن ان میں کوئی بھی قابلِ اعتماد نہ ہوتا اور جب بھی میں نے اعتماد کے حوالے سے امکانی معاون کے بارے میں سوچا تو مجھے بھاری گھریلو ذمے داریوں میں گھرا ہوا رام ناتھ ہی سب سے معتبر نظر آیا۔

ہندو سماج کے کڑ معاشرتی بندھنوں میں جکڑا ہوا وہ سادہ لوح انسان چار بیٹیوں کا باپ ہونے کے ناطے اپنی قسمت سے شاکی تھا۔

ہندوستان وہ سرزمین تھی۔ جہاں اپنے ساتھ جہیز نہ لانے والی لڑکیوں کو ہر ذہنی اور جسمانی عذاب کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ حد تو یہ تھی کہ جھوٹی توقعات کے آسیب میں مبتلا بعض سسرالی نئی نویلی دُلھنوں کو پھولوں کی سیج سے ایک رات گزار کر شعلوں کی چتا میں جھونک دینے پر بھی تل جاتے تھے۔

اور رام ناتھ حساس تھا۔

اس کی بچیاں ابھی کمسن تھیں لیکن وہ ان کی معصوم مسکراہٹوں میں مستقبل کی کربناک چیخوں کو رقصاں دیکھتا تھا جو قابلِ ذکر جہیز کے بغیر رخصتی کی صورت میں اس کی بچیوں کا مقدر بن سکتی تھیں۔

اس کی مجبوریاں میری پیدا کردہ نہیں تھیں۔ وہ خود اپنے سماج کا قیدی تھا جس نے اس کی پہاڑ سی زندگی کی قیمت چار بچیوں کے جہیز کی صورت میں مقرر کر دی تھی۔ اگر اسے امید دلا دی جاتی کہ میری مدد اور کامیابی کی صورت میں وہ ایک بڑی رقم کا حقدار ثابت ہو سکے گا تو وہ میرے لیے تن من کی بازی لگا سکتا تھا۔

میں نے گھر پہنچنے کے بعد کھلے ہوئے دروازے پر رامو کی بڑی بچی شانتی کا نام پکارا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بیٹھک میں داخل ہوگیا۔

اس وقت سیتا بیٹھک میں نہیں تھی۔ بچوں سے پتہ چلا کہ وہ کافی دیر سے رامو کی ماں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

وہ آئی اور ایک پھریری لے کر میرے سامنے چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہم نہ جانے کہاں اپنا وقت گنواتے رہے۔" اس نے دھیمی اداس آواز میں کہا۔ "زندگی تو ان چھوٹے چھوٹے نیم پختہ مکانوں میں ٹھکانہ بنائے بیٹھی ہے جہاں ہر سادہ اور معصوم کہانی دل کے کسی نازک گوشے کو جھنجوڑ دیتی ہے۔"

"کس کی کہانیاں سن لیں تم نے؟"

"چھوڑو میرے تقصوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تم کہاں ہو آئے؟" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آؤ باہر چلتے ہیں ___ کچھ تھوڑی سی خریداری بھی ہو جائے گی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر ہم کھانا گھر پر ہی کھائیں گے۔" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "آشا نے ہمارے لیے کچھ خاص چیزیں بنائی ہیں۔"

"تم ہی کھانا ___ مجھے تو خواہش نہیں ہے۔" میں یہ کہتا ہوا بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ سیتا اندر ہو کر چند ثانیوں بعد لوٹی۔

"کہاں گئی تھیں؟" میں نے گلی میں اس کے ہمراہ ایک طرف بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

"ماں جی سے اجازت لینے گئی تھی۔" سیتا نے ہنس کر جواب دیا۔ "تمہارے آنے سے پہلے سمجھا رہی تھیں کہ عورت چاہے پاپ کر لے مگر اپنے پتی کا دل بھول کر بھی میلا نہ کرے کیونکہ بھگوان کے نزدیک یہ مہاپاپ ہوتا ہے جس کا کوئی پائے نہیں۔"

"خوب۔" میں مسکرا دیا۔ "ہندی بھی خاصی سیکھ لی تم نے۔"

"یہ بتاؤ کہ اس وقت مجھے گھر سے باہر کیوں لائے ہو؟"

"چند ضروری باتیں کرنے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو تم دیکھ ہی چکی ہو کہ راجہ ہوٹل انہدام کی آخری منازل طے کر رہا ہے ......"

"اور اس کے ملبے سے پارس پتھر کی بازیابی کا کوئی امکان نہیں۔" اس نے میری بات کاٹ کر لقمہ دیا اور میں دانستہ خاموش رہا تاکہ اس منفی مفروضے پر اس کے ردِ عمل سے واقفیت حاصل ہو سکے۔

وہ لحظہ بھر کے لیے خاموش ہوئی پھر بولی۔ "میں نے رامو کی ٹیکسی سے دیکھا تھا کہ اس ڈھانچے میں لکڑی کا نام و نشان تک نہیں تھا ___ تم یہ پتہ کیوں نہیں چلاتے کہ ہوٹل سے اکھاڑی جانے والی الماریاں کہاں لے جائی گئی ہیں۔"

میں بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ان ہی خطوط پہ سوچ رہی تھی۔ جن پر میں اپنی کارروائی کا آغاز کر چکا تھا۔

"اس شخص کا نام اور ٹھکانہ معلوم ہو گیا ہے جس نے راجہ ہوٹل سے نکلنے والی تمام لکڑی خریدی تھی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ سارا انبار ابھی اسی کے گودام میں ہے یا اس کی فروخت کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔"

"تو سوچا کیا ہے تم نے؟"

"اس معاملے میں تمھیں سامنے نہیں لایا جاسکتا۔" میں نے تھوڑے سے تردد کے ساتھ کہا۔ "سوچ رہا ہوں کہ رامو کو اعتماد میں لے لوں۔"

"وہ کس کام آسکے گا تمہارے؟"

"وہ اس گودام کے مالک سے مل کر خبریں فراہم کرے گا......"

"کیسی خبریں؟" وہ اس قدر مضطرب تھی کہ بار بار میری بات قطع کر رہی تھی۔

"گودام اور کارخانے وغیرہ کے ان مقامات کی نشاندہی جہاں وہ لکڑی موجود ہے۔ اس کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کی روشنی میں میں اپنی تلاش کی مہم کا آغاز کروں گا۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ رامو مطلوبہ معلومات فراہم کر ہی سکے۔"

"ضروری تو نہیں لیکن مجھے قوی امکان نظر آتا ہے۔ وہ مضبوط اور محنتی آدمی ہے۔ وہاں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ساری دشواریاں دُور ہو جائیں گی۔"

"ملازمت!" وہ پُرخیال انداز میں بڑبڑائی۔ "اگر تمہارے رحم تازہ نہ ہوتے تو شاید یہ کام تم خود ہی سرانجام دے لیتے۔"

"لکڑی کے گوداموں میں کندے گرانے اور لگانے کے لیے خاصے آدمی درکار ہوتے ہیں۔ کام محنت کا ہوتا ہے جو اس وقت میرے بس سے واقعی باہر ہے۔"

اس کے علاوہ میرے ذہن میں ایک تدبیر اور بھی تھی کہ میں پرانی لکڑی کے خریدار کی حیثیت سے چوہدری رندھیر کے گودام میں پہنچتا اور مال کی دیکھ بھال کے بہانے مطلوبہ ٹھکانوں کا جائزہ لے لیتا لیکن اس میں دو خطرات تھے۔

اوّل یہ کہ میں اس کی نگاہوں میں آجاتا دوئم یہ کہ میں لکڑی کے کاروبار اور بازار کی اونچ نیچ سے بالکل نابلد تھا۔ اگر وہ گھاگ تاجر مجھے باتوں کی اونچ نیچ میں الجھا کر سودے پر آمادہ ہو جاتا تو میرے پاس اپنا بھرم برقرار رکھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہ جاتی۔

"مگر تم رامو کو اس تمام جدوجہد کا کیا سبب بتاؤ گے؟" کچھ دیر کی پُرخیال خاموشی کے بعد سیتا نے سوال کیا۔

"یہی ایک بات قابلِ غور ہے۔" میں نے کہا۔ "التماس کا معاوضہ ہر صورت میں اسے ادا کیا جائے گا۔ ہزار پانچ سو تو ہر صورت میں دوں گا اور اگر مقدر نے یاوری کی اور پارس پتھر مل گیا تو اسے نہال کر دیں گے۔"

"لیکن سبب؟"

"کوئی فرسودہ سی کہانی سنانی پڑے گی۔ پارس کو کسی قبیلے کا مقدس علامتی پتھر بتایا جاسکتا ہے اور جو اس کا مالک ہوگا وہ قبیلے کی بے اندازہ دولت پر قابض ہو سکے گا۔"

"وہ سمجھدار آدمی ہے ___ اس کا ذہن تمہاری کہانی قبول کر لے گا؟" سیتا نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"یہ تو اس کا رویہ ہی بتائے گا۔"

اس کے بعد ہم نے قریبی بازار سے رامو کے بچوں کے لیے کچھ کھلونے اور مٹھائیاں وغیرہ لیں اور اپنے منصوبے کی دیگر جزئیات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے واپس ہو لیے۔

گھر پہنچ کر سیتا نے بچوں کو چیزیں دیں تو ان کی تو عید ہو گئی۔ آشا

قرینے سے سر پر پلو ڈالے میرے سامنے یہ منظر دیکھتی رہی۔

"ایک بات کہوں بھائی صاحب؟" بچوں کے چلے جانے کے بعد آشا نے جھجکتے ہوئے پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔

"کیا؟" میں چونک پڑا۔

"آپ دونوں بہت اچھے ہیں۔ مگر ہمارے گھر میں کچھ روز کے مہمان ہیں۔ آج تو بچوں کے لیے چیزیں لے آئے لیکن آئندہ نہ لائیے گا۔" اس نے دھیمے لہجے میں رک رک کر کہا۔

"اس میں کیا برائی ہے بہن؟" میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا "وہ ہمارے بھی بچے ہیں۔ اگر ان کا دل بہل جائے تو ہمیں خوشی ہوگی۔"

"ان کی عادت خراب ہو جائے گی۔" آشا نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد روز روز ان کی فرمائشیں کہاں سے پوری کریں گے۔"

بے چارگی کی اس انتہا پر میں اپنے وجود میں لرز کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد رامو بھی لوٹ آیا۔

اس کے بشرے سے خوشی کا احساس جھلک رہا تھا۔ پتہ چلا کہ اس روز اسے خلاف معمول زیادہ آمدنی ہوئی تھی جسے چھپانا اس کے بس سے باہر تھا۔

کھانے کے بعد میں نے سیتا کو جانے کا اشارہ کیا اور رامو کو بیٹھک میں بلا لیا۔

میرے رازدارانہ رویے نے اسے کچھ پریشان کر دیا تھا۔

"گھبراؤ نہیں — سب خیریت ہے بس تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ہنس کر کہا تو اس کے چہرے کی رونق قدرے بحال ہو گئی۔

"تم نے کبھی کافرستان کا نام سنا ہے؟" میں نے اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی "سنا ہے چترال سے آگے کا علاقہ ہے۔ عجیب سے لوگ بستے ہیں وہاں۔"

"یہاں ہماری گفتگو کوئی تیسرا تو نہ سن سکے گا نا؟"

"بے فکر رہو۔" اس نے جلی ہوئی دیا سلائی کا دوسرا سرا دانتوں میں کچلتے ہوئے کہا۔

"وہاں قدآور سرخ و سفید لوگ بستے ہیں جن کے چہروں پر دھند سی لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ان کے بہت سے قبیلے ہیں جن کی رسوم ناقابل یقین حد تک عجیب ہیں۔ ان ہی میں ایک قبیلہ ایسا ہے جو محض ایک پتھر کا پجاری ہے۔ سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا بدنما پتھر — وہ پتھر جس کے قبضے میں ہو اسے وہ اپنے مقدرات سونپ دیتے ہیں اور وہی شخص اس قبیلے کے بیش قیمت موروثی خزانے کا مالک قرار پاتا ہے۔" رامو انہماک سے سر جھکائے میری کہانی سن رہا تھا۔

"چند برس پہلے ایک اطالوی سیاح وہ پتھر چرا لانے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کی اپنے ساتھیوں سے نہ بن سکی اور وہ آپس میں لڑ کر مر گئے۔ کافرستان والوں کو آج تک اس چوری کا علم نہیں اگر پتھر گنوانے والا بوڑھا سردار یہ خبر سنا دے تو اس کے محکوم اپنے ہاتھوں سے اس کے چیتھڑے اڑا دیں گے۔ وہ خاموشی سے پتھر کی واپسی کا منتظر ہے اور اس کا بڑا لڑکا جو اس کا جانشین ہوگا، اس راز کا واحد شریک ہے۔ وہ پتھر کی تلاش میں مستقل بھٹک رہا ہے کیونکہ جب تک اس کی پیشانی پر وہ پتھر بھرے دربار میں نہ باندھا جائے گا اس کی جانشینی کی رسم مکمل نہیں ہوگی مگر وہ پتھر اُسے پہنچا دیا جائے تو وہ لانے والے کو زر و جواہر سے بھرے ہوئے صندوق انعام میں دینے کا عہد کیے بیٹھا ہے۔ یہ صندوق وہ کافرستان سے خچروں پر لاد کر لایا تھا اور آج کل لاہور میں بھٹک رہا تھا۔"

"اس دور کے لحاظ سے ناقابل یقین اور سنسنی خیز کہانی ہے!" میرے خاموش ہونے پر رامو نے سر اٹھا کر کہا۔ "کاش وہ پتھر کہیں سے مل سکے۔"

"مل سکتا ہے... میں اسی طرف آیا ہوں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "سننے میں آیا ہے کہ وہ پتھر اطالوی سیاح نے مرنے سے پہلے کہیں چھپا دیا تھا۔ کئی ذرائع سے اس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ وہ انبالہ تک پہنچا تھا اور راجہ ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس نے وہ پتھر اپنے کمرے کی کسی دیوار گیر چوبی الماری میں لکڑی میں دفن کر کے چھپا یا تھا۔"

اچانک رامو کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز ہو کر تحیر آمیز انداز میں پھیلتی چلی گئیں۔

"یہ اس طرح کیوں گھورنے لگے مجھے؟" مجھے اس کی نگاہوں سے وحشت سی ہونے لگی۔ نجانے اسے میرے چہرے پر کیا نظر آ گیا تھا۔

"ابھی بات ادھوری ہے تمہاری!" اس نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر خوابناک سی آواز میں کہا۔

"بات میں بعد میں پوری کروں گا — پہلے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیوں گھور رہے ہو؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

وہ اچانک ہنس پڑا اور اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات بھی ڈھیلے پڑ گئے جیسے وہ کسی تنویمی کیفیت سے واپس لوٹا ہو۔

"کچھ خیال آ گیا تھا — تم اپنی بات پوری کرو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کا رویہ مجھے چبھ رہا تھا لیکن میں نے اس مرحلے پر الجھ کر کے صورت حال کو خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"بات پوری کرنے سے پہلے میں تم سے ایک عہد لینا چاہوں گا۔" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میں نے شرط پیش کی۔

"ہر عہد کے لیے تیار ہوں۔"

"میری پوری کہانی سننے کے بعد اگر تم نے میرا ساتھ نہ دینا چاہا تو

جو کچھ سنو گے ہمیشہ اپنی ذات تک محدود رکھو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں — چاہو تو رامائن سر پر اٹھا کر یقین دلا دوں۔"

"نہیں، اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے تھوڑا سا توقف کیا پھر بولنے لگا۔ "میں اسی پتھر کی تلاش میں انبالہ آیا ہوں مگر راجہ ہوٹل مسمار ہو رہا ہے اس کی ساری پرانی لکڑی ایک بیوپاری خرید چکا ہے میں اس تمام لکڑی کا جائزہ لینا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اس کام میں تم میرے ساتھ تعاون کرو۔ اگر پتھر نہ مل سکا تو میں تمہیں ایک ہزار روپے تمہارے وقت کی بربادی کے عوض دوں گا اور پتھر مل گیا تو تمہیں اتنا کچھ ملے گا کہ حسرت نہیں رہے گی۔"

"مہمان تو خیر تم ہو ہی مگر اب راز داں بنا کر دوستی کے حلقے میں بھی شامل کر لیا ہے۔" وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔ "اجازت ہو تو اس نئے رشتے سے ایک دو باتیں میں بھی پوچھ لوں؟"

"کیا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"اس پتھر کا نام کیا ہے؟"

"وہ سیاہ رنگ کا ایک بھونڈا سا پتھر ہے — بے نام اور بظاہر بے وقعت۔ اس کی اہمیت ان ہی لوگوں کے لیے ہو سکتی ہے جو اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔"

"یہ نہ کہو۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "تمہارا اس پر اعتقاد نہیں ہے، لیکن تمہارے لیے بھی وہ اس وقت بے حد اہم ہے۔"

"عارضی طور پر — اگلا سوال کیا ہے تمہارا؟" میں اس کے دل میں پوشیدہ خیالات سے جلد از جلد واقف ہونے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"سلطان۔" جواب دیتے ہوئے میں نے اپنی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگی محسوس کیں۔

اس نے پُراعتماد انداز میں اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اگر تم نے مجھے سچے دل سے دوست کہا ہے تو عارضی قصوں اور عارضی ناموں سے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔"

میرا تنفس تیز ہو گیا اور دوران خون کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ نجانے کیا بکنا چاہ رہے ہو۔"!

"تم!" وہ میری طرف جھک آیا اور اس کی نگاہیں مجھے اپنے بدن میں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ "تم صفدر علی ہو دوست۔"

اس کی سرگوشیانہ مگر ہیجان آمیز آواز نے میرے کان سن کر دیے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں تاحد نظر پھیلے ہوئے سمندر میں ایک گرداب میں گھرا یکہ و تنہا وحشی لہروں پر اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔

اس نے وفور جوش میں دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا اور سرگوشیانہ آواز میں غرایا۔ "بولو — صفدر علی ہی ہو نا تم؟"

میرا سر شکست خوردہ انداز میں اوپر سے نیچے کی طرف ہلا اور پھر نگاہیں بھی جھک گئیں۔

مجھے اپنا نام ایک خوف اور آسیب محسوس ہونے لگا جو نہ صرف سننے والوں کے ذہنوں سے چپک کر رہ جاتا تھا بلکہ میری ذات میں بھی بری طرح پیوست ہو چکا تھا۔

"میں برسوں سے انبالے میں رہ رہا ہوں میرے یار!" رامو نے میرے برابر میں بیٹھ کر اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ "تمہاری داستانیں ابھی اتنی پرانی تو نہیں ہوئیں۔ پارس پتھر کا نام بھی اچھلا تھا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ میں پہلی ہی نگاہ میں تمہیں اور بھابی کو کیوں نہ پہچان سکا۔ پولیس چوکیوں پر تمہارے دھندلائے ہوئے پوسٹر تو شاید ابھی تک آویزاں ہوں گے۔"

"اگر میری زبان پر پتھر کا ذکر نہ آتا تو شاید تم آخر تک بھی ہمیں نہ پہچان پاتے۔" میں نے پھیکی مدافعانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دماغ میں کہیں کوئی شبہ سا تو تھا۔ بس پتھر کا ذکر آتے ہی ایک جھماکا ہوا اور سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔۔۔ اب کہو مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "آسان راہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دو۔ انعام کی خطیر رقم کے ساتھ شہرت بھی کماؤ گے۔ دوسری صورت میرے ساتھ تعاون کی ہے جس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر کے ہیں بلکہ ایک تیسرا راستہ بھی ہے کہ فی الحال میرا ساتھ دو۔ پارس پتھر مل جائے تو اپنا حصہ لے کر خاموش ہو جانا اور مہم ناکام ہو تو پولیس کے ہاتھ مضبوط کر کے اپنی ضرورتیں خرید لینا۔"

"طنز کر رہے ہو میری غربت پر!" وہ یک بیک اداس ہو گیا۔ "مال و دولت تو مقدر سے آتا جاتا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا ہے کہ جبر کی مایا اپنے ساتھ روگ لے کر آتی ہے اور بربادی بن کر پورے گھرانے کی جڑوں میں اتر جاتی ہے۔ دوست کہا ہے تو آخر تک تمہارا ساتھ دوں گا بس جتنے روز میری مزدوری کا ہرج ہو اتنی رقم مجھے حق کے طور پر دے دینا۔ باقی جو دو گے وہ تمہارا انعام ہوگا میرے لیے آخری سانس تک فخر کا یہ احساس ہی کافی ہوگا کہ میں نے اپنی جھونپڑی میں سیتا بھابی اور صفدر علی کی میزبانی کی تھی۔"

میرے دل پر رقت سی طاری ہو گئی۔ بھیڑیوں کے انبوہ میں ایسی سادہ لوح بھیڑیں نہ جانے کیوں اور کیسے زندہ تھیں۔

مجھے دل گرفتہ دیکھ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا اور میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ "آؤ تھوڑی دور ٹہل کر واپس آتے ہیں۔"

میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔

"تم میری طرف سے فکر مند نہ ہونا۔" گھر سے تھوڑی دُور نکل آنے کے بعد رامو نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم کون ہو؟ یہ راز میری ہی ذات تک محدود رہے گا۔"

"تمھاری تعلیم کتنی ہے؟" میں نے رسماً پوچھ لیا۔

"جب سے کما کر کھانا شروع کیا ہے، سمجھو زندگی کی ہر کتاب پڑھ لی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسکول میں تیسری جماعت پاس کی تھی مگر چوتھی کی فیس تین مہینے تک نہ دے سکا تو ہیڈ ماسٹر نے اسکول سے باہر نکال دیا تھا۔"

"اور تمھاری بچیاں؟"

"انھیں پڑھا کر کیا کرنا ہے؟" اس کے لہجے میں ملال سمٹ آیا۔ "بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ انھیں دُوسروں کے گھر جا کر چولھے ہی جھونکنے ہوں گے۔ اوّل تو میرے مالی وسائل ہی نہیں ہیں پھر پیٹ کاٹ کر انھیں پڑھا لکھا لیا تو رشتوں کے لیے کہاں جاؤں گا۔ ہمارے طبقے میں تو لڑکوں تک کے لکھنے پڑھنے کی نوبت نہیں آتی اور ایسے لوگ پڑھی لکھی لڑکیوں کے نام سے کان چھوتے ہیں۔"

ہم دونوں آبادی سے نکل کر ایک مختصر سے پارک میں بختہ بنچ پر جا بیٹھے اور رات گئے تک وہاں باتیں کرتے رہے۔

اس مختصر سی رفاقت میں رامو نے اپنے خلوص سے تکلف کی ہر دیوار مسمار کر دی تھی اور مجھے یہ احساس دلا دیا تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر وہ میرا سب سے بڑا بہی خواہ تھا۔

اس کے لیے اگلے روز سے میرے لیے کام شروع کرنا دشوار تھا۔ اُسے اپنے مالک کو کم از کم ایک دن کی مہلت دینی تھی تاکہ وہ رامو کی غیر حاضری میں اپنی ٹیکسی چلوانے کے لیے کسی دوسرے ڈرائیور کا بندوبست کر سکے۔

رامو کی چھت کے نیچے وہ رات ہم نے بہت سکون سے بسر کی۔ سونے سے قبل سیتا نے مجھ سے رامو کے بارے میں جاننا چاہا تھا۔ لیکن میں نے اسے صرف اتنا بتانے پر اکتفا کیا کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔

اپنی شناخت کے بارے میں میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

اگلی صبح ہمارے بیدار ہونے سے پہلے رامو کام پر جا چکا تھا۔ جس کمرے میں ہم سوئے تھے اس کی ساخت کچھ ایسی تھی، کہ کھڑکی بند ہونے کے بعد دن چڑھے بھی بیٹھک میں دھندلکے کا وقت محسوس ہوتا تھا لہٰذا نتیجہ ظاہر تھا کہ ہماری بیداری بہت دیر سے ہوئی۔

تیاری کے بعد آشا مسکراتی ہوئی سامنے آئی اور پرنام کے بعد محبت کے ساتھ دریافت کیا کہ ہم محض ناشتے پر اکتفا کریں گے یا کھانا کھائیں گے۔

سیتا نے میرا مدعا بھانپ کر ناشتہ منگوا لیا۔

"رامو کی ماں کو حیرت ہے۔" آشا کے جانے کے بعد سیتا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "جب سے ہم نے گھر میں قدم رکھا ہے آشا بالکل بدل گئی ہے ورنہ دن بھر بچوں کو ڈانٹتی پھٹکارتی یا مارتی رہتی تھی۔ اور اب تو جیسے ہنسنے مسکرانے کے بہانے تلاش کرتی ہے۔"

ناشتے کے بعد میں سیتا کے ہمراہ نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ رامو آ پہنچا۔

"تم کیسے لوٹ آئے؟"

"بس اتفاق ہی تھا۔" وہ میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ایک ڈرائیور خالی مل گیا اسے مالک سے ملوا کر میں لوٹ آیا۔"

سیتا اس کے آتے ہی کمرے سے جا چکی تھی۔

"یہ تو بتاؤ کہ تم بھابی سے کیا کہو گے؟" میں نے سوال کیا

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کی طبیعت بہت کھوجی ہے، وہ جاننا چاہے گی کہ میں ٹیکسی کیوں نہیں چلا رہا ہوں؟"

"آج گاڑی کی خرابی کا بہانا کر لینا، بعد میں کچھ اور سوچیں گے۔" میں نے مشورہ دیا اور وہ روانگی سے پہلے اندر چلا گیا۔

گھر سے نکلنے کے بعد ہم نے ٹیکسی پکڑ لی۔

رامو کی رائے تھی کہ ایک مرتبہ ہم ٹیکسی سے لکڑی منڈی سے گزرتے ہوئے چوہدری رندھیر کے گودام کا جائزہ لیں پھر وہ تنہا ادھر کا رُخ کرے۔

لکڑی منڈی ایک طویل اور کشادہ سڑک کی دونوں جانب واقع گوداموں اور آروں پر مشتمل تھی۔ ان کارخانوں اور گوداموں کا جال بغلی گلیوں میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے میں ٹرکوں اور شہتیر لانے لے جانے والی گاڑیوں کا اتنا اژدھام تھا کہ اس کے سامنے سڑک کی کشادگی شرمسار نظر آ رہی تھی، مگر یہ رش ہمارے لیے سود مند تھا، کیونکہ ٹیکسی رینگتی ہوئی اس بازار سے گزر رہی تھی۔

آخر کار میری نگاہ اس بڑے سالخوردہ بورڈ پر پڑ ہی گئی، جو ایک وسیع گودام کے اونچے دروازے پر برسوں سے آویزاں رہا ہوگا!

انگریزی میں رندھیر اینڈ کمپنی ٹمبر مرچنٹ کے الفاظ پڑھے جا سکے جب کہ ہندی رسم الخط میں) کچھ زیادہ ہی اوٹ پٹانگ تحریر میں لائے گئے تھے جو میرے پلّے نہ پڑ سکے۔

بازار ختم ہونے پر ایک عمارت کے سامنے ہم نے ٹیکسی رکوائی اور ٹیکسی روانہ ہو جانے کے بعد ایک سستے سے چائے خانے میں جا بیٹھے۔

"دیکھو شاید مقدر یاوری کر جائے۔" رامو نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "بس ایک بات ذرا گڑبڑ نظر آ رہی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہاں کام کرنے والے سادے ہی مزدور پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس ہیں، میری پتلون قمیض ان سے میل نہیں کھاتی۔"

"یہ کمی تمھیں اپنی اداکاری سے پوری کرنی ہوگی۔" چائے ختم کر کے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے الوداع کہا اور اٹھ گیا۔ "شام کو چھ بجے اسی ہوٹل میں ملاقات ہوگی۔"

جاتے جاتے اس نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی اور پھر ہوٹل سے نکل کر فٹ پاتھ پر پھیلے ہوئے ہجوم میں روپوش ہو گیا۔

میرے دل میں چور تھا لہٰذا مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اگر میں زیادہ دیر تک اس ہوٹل میں بیٹھا رہا تو کہیں کسی کی توجہ کا مرکز نہ بن جاؤں لہٰذا دو سگریٹیں پھونکنے کے بعد میں نے چائے کے دام کاؤنٹر پر ادا کیے اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔

میں پاکستان سے طویل سفر طے کر کے انبالہ پہنچ چکا تھا اور مشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس بار میرے مالی وسائل بہت محدود تھے اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ کس وقت کیا ضرورت پیش آ جائے۔

میں نے اپنے تمام ڈالرز تو ہندوستانی کرنسی میں کرا لیے تھے لیکن لاہور کے انارکلی بازار میں جیب تراشی سے حاصل کی ہوئی پاکستانی کرنسی کے نوٹ میرے پاس موجود تھے لہٰذا میں نے فرصت کے ان لمحات کو غنیمت جان کر اس کرنسی کو تبدیل کرانے کا ارادہ کر لیا۔

اس مرحلے پر مجھے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اس سلسلے میں میں نے رامو سے کوئی مشورہ حاصل نہیں کیا تھا۔

میں اس وقت انبالہ میں تھا اور رامو انبالہ کا پیشہ ور ٹیکسی ڈرائیور تھا۔

میرے تجربات اس امر کے شاہد تھے کہ کسی بھی شہر کی زیرِ زمین زندگی کے بارے میں جتنی مستند اور تازہ ترین معلومات پیشہ ور ٹیکسی ڈرائیوروں کو حاصل ہوتی ہیں، شہری آبادی بلکہ انتظامیہ کے طاقتور ترین طبقے کو بھی نہیں ہوتیں۔

یہ دوسری بات تھی کہ اپنے کردار اور مزاج کی وجہ سے بیشتر ڈرائیور محض اپنے مسافروں کی مرضی اور اشاروں پر عمل کرتے ہیں اور زیرِ زمین دنیا کے بارے میں اپنی رنگین اور سنگین معلومات کو روزی کی کشادگی کا ذریعہ نہیں بناتے۔

ایک معاہدے کے رُو سے مقررہ معاوضے پر رامو خود کو میرا شریکِ کار بنا چکا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے مشورے کی بنا پر میں بہترین شرحِ مبادلہ پر پاکستانی کرنسی کو ہندوستانی نوٹوں میں تبدیل کرا سکتا تھا۔

مگر وہ موقع گزر چکا تھا۔ مجھے مہلت میسر تھی جسے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے ایک طے شدہ تجویز کے تحت کسی بڑی دکان کی تلاش شروع کر دی۔

وہ اس اعتبار سے ڈپارٹمنٹل اسٹور نہیں تھا کہ وہاں ہر کاؤنٹر پر اسبابِ خانہ گری سے آراستہ حسین مگر مصنوعی لڑکیاں گاہکوں کی جملہ حیوانی جبلتوں کو خریداری پر مرکوز کرانے پر مامور تھیں ورنہ اشیائے فروخت کی انواع و اقسام ان دکانوں کو منصبِ جلیلہ پر فائز کرانے کی سفارش کرتی نظر آتی تھیں۔

وہ یقیناً ایک دوشیزہ ہی تھی کیونکہ اس کی مسکراہٹ میں وہ حجاب رچا ہوا تھا جو ازدواجی تجربات کے بعد اعتماد بلکہ تحکم میں بدل جاتا ہے۔

"فرمائیے، کیا پیش کروں؟" اس نے بڑے اخلاق سے دریافت کیا۔

اس کی شائستگی کو الفاظ کے پیکر میں سُن کر جی تو یہی چاہا کہ اس سے کسی ناشائستہ خواہش کا اظہار کیا جائے مگر اپنے فوری مقاصد کی اہمیت نے دل و دماغ میں ابھرنے والے جملہ لطیف خیالات کو لحظہ بھر میں فنا کر دیا۔

"کرنسی کے تبادلے کی سہولت کے بغیر میں آپ کی دکان سے ایک تنکا بھی نہ خرید سکوں گا۔" میں نے حسرت زدہ نظروں سے اسے پھر دکان میں سجے ہوئے دیگر ساز و سامان کو دیکھتے ہوئے کہا اور وہ بے چاری سٹپٹا گئی۔

"ہم... ہم غیر ملکی کرنسی قبول کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔"

"آس پاس بھی کوئی نہیں ہے؟"

"آگے چلے جائیں۔ رملا انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ والے ہر کرنسی وصول کرتے ہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر میرے پاس قانونی کرنسی نہیں ہے۔" میں نے اس کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں اس پر انکشاف کیا۔

"پھر تو آپ باہر فٹ پاتھ پر کسی بھی دلال سے رجوع کر سکتے ہیں۔" اس نے گویا اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں اس دکان سے باہر آ گیا مگر مجھے کہیں بھی کوئی ایسا شخص نظر نہ آ سکا جس پر زرِ مبادلہ کا کام کرنے کا شبہ کیا جا سکے۔

میں اسی الجھن میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے کان میں "ایکسچینج" کا لفظ گونجتا سنائی دیا۔ میرے قدم فٹ پاتھ پر جم کر رہ گئے۔ میں نے سر گھما کر مژدہ سنانے والے کا جائزہ لینا چاہا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے گرد و پیش میں لوگوں کی آمد و رفت معمول کے مطابق تھی مگر لحظہ بھر ہی میں میری نگاہوں نے اس شخص کو دیکھ لیا جو مجھ سے محض دو قدم دُور بالکل میری ہی طرح ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رکا ہوا تھا۔

نگاہیں چار ہوتے ہی اس نے سر کی جنبش سے کچھ استفسار کیا اور میری کسی غیر ارادی حرکت سے مثبت جواب اخذ کر کے وہ میرے قریب آ گیا۔

"میرے پیچھے آؤ۔" یہ پیغام دیتے ہوئے وہ رُکے بغیر میرے

قریب سے گزرتا چلا گیا اور میں کسی تنویمی معمول کی طرح اس کے پیچھے ہو لیا۔

ایک عمارت کے وسیع لیکن نسبتاً غیر مصروف کمپاؤنڈ کے ایک گوشے میں شرائطِ مبادلہ کا تعین ہوا اور چند ہی ثانیوں میں اس مرحلے سے فارغ ہو چکا تھا۔

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو اس وقت دن کے محض دو بجے تھے جس کا مطلب تھا کہ میرے پاس چار گھنٹے باقی تھے۔ جو کسی نہ کسی طرح کہیں گزارنے تھے۔

اگر فوراً ہی ایک سینما گھر نظر نہ آجاتا تو شاید میں کچھ اور ہی سوچتا مگر اس وقت سینما کے علاوہ کوئی بہتر گوشۂ عافیت نظر نہ آیا۔

ہال میں پہنچنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ کون سی فلم تھی جس کے میں نے ٹکٹ خریدے تھے۔ فلم تو وہ مناسب ہی تھی مگر اس کا ایک پہلو مجھے بہت بہتر نظر آیا۔ یعنی عشق اور عقل کا باہم کوئی میل نہیں ہوتا۔ جہاں عشق وارد ہو جائے، عقل بالائی منزل سے فی الفور ہجرت کر جاتی ہے اور اگر عقل کی جڑیں گہری ہوں تو عشق کبھی کاری وار نہیں کر پاتا۔

انبالہ کے اس سینما گھر میں زیادہ شرح والے درجوں میں بھی نشستوں کے نمبر دینے کا رواج نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہال میں اندھیرا ہونے کے بعد میرے پہلو والی نشست آباد ہوئی تو میرے نتھنوں نے ایک نسوانی مہکار محسوس کی اور میں اضطراری اور اس کے بعد ارادی طور پر اپنی نشست کے ایک گوشے میں سکڑ گیا۔

کچھ دیر بعد یہ صورتِ حال برقرار رہی پھر نسوانی گوشے سے تجاوز کی ابتدا ہوئی۔ ابتدا میں یہ تجاوز اتفاقی محسوس ہوا جس کے نتیجے میں ذہن فوراً لطافتوں کی طرف مائل ہو گیا مگر جب تجاوز کا سلسلہ دراز ہو کر غیر اخلاقی حدود میں داخل ہوا تو میں نے مزاحمت شروع کر دی۔

وقفے سے کچھ دیر قبل ہی اس مہکتی ہوئی دراز دست خاتون نے مایوس ہو کر میری ہمسائیگی سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی اور مجھے اپنا رخِ زیبا دکھائے بغیر ہی کسی اور کی عقل پر شب خون مارنے کے لیے انتہائی دائیں جانب والی قطار میں گم ہو گئی۔

سینما سے نکلتے ہوئے پانچ بج چکے تھے لہٰذا میں خراماں خراماں اس سستے چائے خانے کی طرف چل دیا جہاں چھ بجے رامو کو آنا تھا۔

میں ہوٹل میں پہنچا تو رامو خراب و خستہ حالت میں مجھ سے پہلے ہوٹل کی ایک میز پر موجود تھا۔ پسینے اور مشقت نے چند ہی گھنٹوں میں اسے اس حال کو پہنچا دیا تھا کہ وہ صورت اور حلیے سے ایک سرکش لیکن بیدالستی مزدور نظر آنے لگا تھا۔

"منڈی پانچ بجے بند ہو جاتی ہے۔" میرے بیٹھتے ہی اس نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن کمال ہے کہ دیر سے جانے کے باوجود تمھیں کام مل گیا۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں اعتراف کیا۔

"لیکن آج کی مشقت رائیگاں ہی گئی۔" اس نے اداسی سے کہا۔ "دن بھر ایک ہاتھ گاڑی کے ساتھ لگا رہا۔ گودام کے اندرونی حصے میں پھٹکنے کی بھی نوبت نہ آسکی۔"

"مجھے امید ہے کہ تمھیں دو تین روز سے زیادہ یہ مشقت نہیں جھیلنی پڑے گی۔" میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

"مزدوروں سے کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے انکشاف کیا۔ "راجہ ہوٹل کی کچھ لکڑی یہاں آئی ہے۔ باقی ماندہ موہن پورے کے گودام میں بھیجی گئی ہے۔ پرانی لکڑی کا زیادہ لین دین وہیں سے ہوتا ہے۔"

میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ رات موہن پورے کے گودام میں گھس کر جائزہ لیا جائے گا تاکہ وقت کی رفتار تیز تر کی جاسکے۔

"لکڑی منڈی کے گودام میں شہتیر اور بلیاں لائی گئی ہیں۔" رامو کہہ رہا تھا۔ "باقی سارا کاٹھ کباڑ موہن پورے بھیجا گیا ہے۔"

"کیوں نہ آج رات وہاں نقب لگائی جائے؟" میں نے اسے اپنے خیال سے آگاہ کیا۔

"میرے خیال میں تو کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔" اس نے دبے دبے پرجوش لہجے میں کہا۔ "یہاں والے گودام میں بھی رات کو کوئی چوکیدار نہیں ہوتا۔"

تھوڑی دیر میں ہم دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

پاکستانیوں کی حیثیت سے میرے اور سیتا کے لیے کسی ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کرنا مشکل تھا لیکن رام ناتھ مقامی ہونے کے ناتے اپنے لیے کوئی بھی بندوبست کر سکتا تھا اور اسے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔

مجھے نظر آرہا تھا کہ آنے والے چند دنوں میں ہم دونوں کو اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی بار بار گھر سے باہر رہنا پڑے گا اور وہ مصروفیات رامو کی ماں اور بیوی کو ہماری سرگرمیوں کی طرف سے مشتبہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔

رام ناتھ نے ان امکانات سے پوری طرح اتفاق کیا مگر ہوٹل کا رخ کرنے پر راضی نہ ہوا البتہ گھر لوٹنے سے پہلے اس نے تین گوشوں کے بعد ایک محلے میں پچیس روپے ماہانہ پر ایک الگ تھلگ کمرہ حاصل کر لیا جو وقت بے وقت ہماری سرگرمیوں کے لیے ایک مرکز کا کام سر انجام دے سکتا تھا۔

ہم اپنی ادھیڑ بن میں مبتلا گھر پہنچے تو ایک نئی خبر منتظر تھی۔ دوپہر میں مقامی تھانے سے دو سپاہی رامو کی طلبی کا زبانی حکم لے کر آئے تھے اور اسے گھر پر موجود نہ پاکر یہ پیغام چھوڑ گئے تھے کہ وہ جس وقت بھی گھر لوٹے فوری طور پر تھانے سے رجوع کرے۔

گھر میں موجود عورتیں اس ناگہانی طلبی پر خاصی پریشان تھیں [illegible]یو نے بھی اس کا وہی سبب سمجھا جو میرے ذہن میں آیا تھا۔

مقامی قوانین کے مطابق کسی بھی غیر ملکی کے لیے اپنی آمد کے [illegible]یس گھنٹے کے اندر اندر اپنے رہائشی علاقے کے تھانے میں آمد کا [illegible]ج کرانا ضروری تھا جب کہ مجھے اور سیتا کو وہاں آئے یہ مدت گزر [illegible]ی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ کسی محلے دار نے تھانے میں شکایت کی ہے ورنہ [illegible]ں تو کئی کئی دن تک ہوش نہیں آتا۔"

گھر سے رامو تھانے کی طرف روانہ ہوا تو میں اس کے ساتھ تھا [illegible]پاکستانی پاسپورٹ میری جیب میں موجود تھے۔

تھانے کے محرر سے آگے ہماری پیشی کی نوبت نہیں آئی۔ انبالہ [illegible]نے کا وقت معلوم ہونے کے بعد اس نے کسی تلخی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ [illegible]ا چوں و چرا رسمی اندراجات مکمل کر لیے۔ رامو کے لیے تھانے [illegible]رسوم شاید اجنبی نہیں تھیں کیونکہ اس نے پاسپورٹ واپس ملتے ہی [illegible]ار روپے کا ایک نوٹ محرر کی طرف بڑھا دیا جو اس نے خاموشی سے [illegible]ا دراز میں ڈال لیا۔

گھر پہنچ کر کھانے کے بعد ہم دونوں فوراً ہی گھر سے نکل پڑے۔ اس [illegible]رامو نے اپنی بیوی سے بائسکوپ جانے کا بہانہ کیا تھا۔

ہماری یہ مہم سادہ اور بظاہر بے ضرر سی تھی لہٰذا ٹیز اور محدود تشنی [illegible]الی دو ٹارچوں کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

موہن پورہ ایک وسیع و عریض لیکن پسماندہ سا علاقہ تھا جہاں مکانات اور گودام وغیرہ ایک دوسرے سے یوں ملحق تھے کہ پوری آبادی [illegible]نا بھٹکے بغیر کسی مقام کا سراغ لگانا ناممکنات میں سے تھا مگر رامو کے [illegible]لیے وہ علاقہ اجنبی نہیں تھا۔

ٹیکسی میں وہ بارہا اس آبادی کے مختلف حصوں میں مسافر چھوڑنے [illegible]آتا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ آتش زدگی وغیرہ کے امکانی خطرات کے [illegible]باعث لکڑی والوں کے گودام رہائشی علاقے سے الگ تھلگ ایک کچی [illegible]گلی میں واقع تھے۔

ہم آبادی میں پیدل گھسے تھے لہٰذا رامو نے متوقع علاقے تک پہنچنے کے لیے اختصار کی راہ اپنانی چاہی جو متعدد کھلی ہوئی گندی نالیوں [illegible]سے اٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ علاقے میں پائے جانے والے آوارہ کتوں [illegible]نے اپنے درمیان اجنبی قدموں کی چاپ زیادہ گوارا نہیں تھی غنیمت [illegible]تھا کہ ان سگانِ آوارہ کا رجحان اس وقت گوشت خوری کی طرف [illegible]نہ تھا ورنہ میری یا رامو کی تر و تازہ پنڈلیوں سے کوئی قتلا آسانی ان [illegible]کے بھوکے دہانوں میں منتقل ہو سکتا تھا۔

"پارس پتھر کیا واقعی لوہے کو سونے میں بدل دیتا ہے؟" آبادی سے [illegible]ملحق ایک ویران میدان عبور کرتے ہوئے رامو نے پُراشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

"بس ایک چھری پہ آزمایا تھا جو واقعی سونا بن گئی تھی۔ اس کے بعد نوبت ہی نہ آسکی۔" میں اس پر پورے اعتماد کے باوجود محتاط رہنا چاہتا تھا کیونکہ لالچ ایک ایسا خبیث انسانی جذبہ ہے جو کسی بھی رشتے کو کچل کر کھوپڑی پر رقصاں ہو جاتا ہے۔

"جن دنوں انبالہ میں تمھارا شہرہ تھا اور سرکاری آدمیوں کے ساتھ رشی اور مہنت بھی تمھیں گھیرنے کی فکر میں تھے تو میں نے لوٹ کر بھگوان سے پرارتھنا کی تھی کہ کسی وقت سڑک کے بیچوں بیچ کوئی میری ٹیکسی رکوائے اور دھم سے اندر بیٹھ کر مجھے تیزی سے بھاگ نکلنے کا حکم دے اور جب میں اسے محفوظ جگہ تک لے جاؤں تو پتہ چلے کہ وہ صفدر علی ہے۔" اپنی معصوم سی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے وہ کسی معصوم بچے کی طرح ہنس رہا تھا۔

"اور آج تم میرے شریک کار ہو!"

"یہ تو میں خواب میں بھی نہ سوچ سکتا تھا!"

"بعض اوقات کبھی کبھار کی سوچی ہوئی باتیں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں اور عموماً عمر بھر سوچی جانے والی باتیں حقیقت تو کجا سراب کا روپ بھی نہیں دھارتیں ۔۔۔ اور یہی سب مقدر کہلاتا ہے۔ جو انسان کی رسائی سے بہت دور ہے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ جو کچھ میں نے اس سے کہا وہ سب میری اپنی ذات پر بھی منطبق ہوتا تھا۔ پرسکون اور ایماندارانہ زندگی میرے لیے نہ جانے کب سے محض ایک خیال بنی ہوئی تھی لیکن ہر بار حالات مجھے زندگی کے اس سندروپ سے دور دھکیل دیتے تھے۔

کراچی پہنچا تو حادثے نے معذور کر دیا۔ بیوی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر حبیب تراشی کے ذریعے میرا علاج کراتی رہی۔ یہ محض میری خوش بختی تھی یا سیتا کا جھوٹ کہ اس نازک دور میں اس کی ذات اور شباب کی نزاکتوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔

یہ خیال آتے ہی میرا نعاں دواں لرز اٹھا۔

انسان جنھیں چاہتا ہے جن کی خوبیوں کو عمر بھر آستانۂ دل و جان بنائے رکھتا ہے ان کی خامیوں اور خرابیوں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ سامنے کی باتوں کو جھٹلانے لگتا ہے۔ دو اور دو کو محض تین کہہ کر مطمئن ہو رہتا ہے اور کسی سے نہیں پوچھتا کہ اس کا ایجاد کردہ کلیہ کہاں تک درست ہے تاکہ اپنی ذات کے حصار میں اس کا بھرم قائم رہے۔

یہ عام زندگی اور عام انسانوں کے کلیے تھے جنھیں سیتا پر منطبق کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ وہ جرأت اور عفت کا ایک ایسا نایاب پیکر تھی جو اپنی ذات کے غرور میں بدترین کام کر سکتی تھی لیکن جہاں ذات کے اس نسوانی غرور کو گزند پہنچنے کا احتمال ہوتا وہ خون کے سمندر کو پھلانگ کر سر خرو رہتی یا خود اسی سمندر کا ایک جزو بن جاتی۔

"اب ہم اسی گلیارے میں ہیں۔" رامو کی آواز مجھے بہت دور کسی گہرے کنویں سے آتی سنائی دی جو میں نے سن تو لی مگر اس پر کسی ردِعمل کا اظہار نہ کر سکا کیونکہ اس وقت میرا ذہن ماضی کے ایک ہولناک گرداب میں گھرا ہوا تھا۔

سیتا زندگی کے ہر موڑ پر سرخرو رہی لیکن میری سرخروئی شاید اس وقت تک مقدر کو منظور نہ تھی۔

کیا ہوتا اگر راجہ ہوٹل چند روز اور یوں ہی قائم رہتا اور میں ایک گمنام مسافر کی طرح اس کے سولہویں کمرے میں کچھ دیر قیام کر کے دیوارگیر الماری کے اوپری خانے کی ایک لکڑی میں جو نگم کے نیچے چھپا ہوا پارس پتھر حاصل کر کے پاکستان لوٹ جاتا۔

پاکستان — جہاں کسی جیل میں میرا بڑا بھائی سطوت علی ایک ناکام ڈکیت کے روپ میں اپنا نوشتۂ تقدیر جھیل رہا تھا۔

وجاہت علی مرحوم جو میرے پدرِ معظم تھے۔ انھوں نے اپنی محنت سے پورے گھرانے کے لیے ایک نام اور مقام پیدا کیا تھا جسے ان کی اولاد میں سے کوئی بھی برقرار نہ رکھ سکا۔

ایک بھائی اپنے اہل و عیال سمیت لقمۂ اجل ہو گیا۔ دوسرا آوارگی کی راہوں پر بھٹک کر صفدر علی بن گیا اور تیسرا ناکام جواری سے ناکام ڈاکو بن کر کسی جیل میں سزائے قید بھگت رہا تھا۔

موہن پورے کا وہ حصہ واقعی تجارتی نوعیت کا تھا کیونکہ اس وقت وہاں تاحدِ نظر سناٹے کا راج تھا اور سب ہی دوکانیں بند پڑی ہوئی تھیں۔

اگر اکا دکا دکانوں کے باہر بلب روشن نہ ہوتے تو اس علاقے میں اتنی گھور تاریکی ہوتی کہ چند قدم آگے دیکھنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

اس کچے راستے کی بگڑی ہوئی ساخت سے پتہ چل رہا تھا کہ دن میں وہاں بھاری گاڑیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔

وہاں ہمیں مطلوبہ گودام کی تلاش میں زیادہ دیر نہیں بھٹکنا پڑا کیونکہ چوہدری رندھیر کے گودام پر بھی ایک بہت بڑا مگر بوسیدہ سا بورڈ لگا ہوا تھا اور اس بورڈ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لگے ہوئے تین بلب روشن تھے۔

اس گودام کا دروازہ بہت بلند و عریض تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کھول دینے کے بعد ٹرک بآسانی اندر تک جا سکتا تھا۔ داہنی سمت کے بڑے پٹ میں عام سائز کا ایک مقفل دروازہ نظر آ رہا تھا جو شاید گودام کے عملے کی آمد و رفت اور دیگر معمولات میں کام آتا ہوگا۔ مگر بادی النظر میں اس چوبی فصیل میں کوئی ایسا گوشہ نظر نہیں آ سکا تھا جسے اکھاڑ کر اندر داخل ہونا ممکن ہوتا۔

ہم دونوں سست رفتاری سے اس گودام کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"ادھر سے تو کام بنتا مشکل نظر آتا ہے۔" رامو نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"ایک صورت ہے — اگر دوکان کے دروازے پر جلنے والے بلب توڑے جا سکیں تو شاید کوئی تدبیر کارگر ہو سکے۔" میں نے تار کے ان ٹکڑوں کے بل پر کہا جو چلنے سے پہلے میں نے رامو کے گھر سے اپنی جیب میں ڈال لیے تھے۔

"تم آگے نکل جاؤ۔ میں یہیں رک کر ان پر پتھروں سے نشانہ بازی کرتا ہوں۔" اس نے فوری طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں۔

"بلب کافی بلندی پر ہیں — ان کے پھٹنے سے جو آواز ہوگی سو ہوگی لیکن پتھر گرنے کی آواز دور تک گونجے گی — اور اگر قرب و جوار میں کوئی چوکیدار موجود ہوا تو ساری رات ہمیں منڈلاتا رہے گا۔" میں نے اسے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔

"پھر ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔" اس نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔ "بازار کے کسی ایسے حصے میں آگ لگا دی جائے جس کے اطراف آگ پھیلنے کا اندیشہ نہ ہو — جب یہاں موجود سب لوگ اُدھر متوجہ ہوں گے تو ہمیں اپنی کارروائی میں آسانی ہوگی۔"

"سارے گودام خشک لکڑی سے بھرے ہوئے ہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ذرا سی بھی چنگاری اڑ کر کہیں پہنچ گئی تو صبح تک یہاں ہولناک شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔ ہم اتنی تباہ کن کارروائی نہیں کر سکتے اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آگ بے قابو ہو کر چوہدری رندھیر کے گودام تک پھیل جائے۔ ایسی صورت میں تو ہمیں پارس کو یکسر بھول جانا پڑے گا۔"

"پھر تم ہی کوئی تدبیر سوچو۔"

چوہدری رندھیر کے گودام سے دونوں طرف دوکانیں یا گودام ملحق تھے۔ لے دے کر ایک عقبی سمت باقی رہ جاتی تھی۔

"یہاں یہی خرابی ہے۔" رامو نے میرے خیال سے واقف ہونے کے بعد کہا۔ "پشت پر کوئی گلی نہیں ہوگی۔ ادھر بھی کوئی نہ کوئی دوکان وغیرہ ہوگی۔"

"پھر بھی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟" میں نے کہا۔

وہ خاموش ہو گیا اور کچھ دور چلنے کے بعد ایک گلی سے عقبی حصے پر پہنچنے کی کوشش میں انکشاف ہوا کہ رامو کا قیاس درست تھا۔

مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اس لیے عقبی گلی میں نکل ہی گیا۔ اس طرف بھی ویرانی کا راج تھا مگر کچھ دور بڑھنے کے بعد مسلسل پھیلی بڑی بند دوکانیں دیکھتے ہوئے یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ محض دوکانوں کی تعداد سے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ چوہدری رندھیر کے گودام کے عین عقب میں کون سی دوکان واقع تھی۔

رندھیر کے گودام کی اونچائی سب سے زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ عقب سے بھی نظر آ سکے۔" رامو بولا۔

"کوشش بے سود ہوگی — دوکان کی گہرائی بہت زیادہ ہے۔ اگلا حصہ ادھر سے نہ دیکھا جا سکے گا۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

اور ہوا بھی یہی۔ ہم اپنے اندازے سے کہیں زیادہ آگے نکل گئے مگر اس طرف سے چوہدری رندھیر کے گودام کی بلندی نظر نہ آ سکی۔ غالباً اس کے گودام کا اگلا حصہ ضرور بلند تھا مگر عقب میں نیچی دیواروں پر مشتمل احاطہ تھا جو ایسے گوداموں کا خاصہ ہوتا ہے۔

پھر ایک سادہ اور سہل سی ترکیب آزمانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

عقبی بازار سے گزرتے ہوئے میں نے یہ بات بطورِ خاص نوٹ کی تھی کہ اس پوری گلی میں ایک ادھیڑ عمر چوکیدار کے سوا کوئی متنفس نہیں تھا اور وہ بھی ایک چبوترے پر بیٹھا بڑے آسودہ انداز میں حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

گلی کے ایک سرے سے ہم دونوں نے قدموں سے چوہدری رندھیر کے گودام کا فاصلہ ناپا اور اپنے شمار کا باہم موازنہ کرنے کے بعد واپس ہو لیے۔

اوّل تو وہ دونوں بازار بالکل سیدھی گلیوں میں واقع تھے اور اگر ان میں تھوڑا سا خم بھی ہوتا تو دس بیس قدم کا فاصلہ ہمارے منصوبے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا تھا۔

گلی کے سرے پر پہنچ کر ہم نے عقبی بازار میں اسی طرح پیمائش کا آغاز کیا اور ہم دونوں ہی پہانے ٹائروں کو نیا بنانے والوں کے ایک کارخانے کے سامنے رکے اور اس کی حالت زار دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

اگر ہماری فرسودہ سی پیمائش اس کارخانے سے سو دو سو قدم آگے یا پیچھے ہوتی تو میں اسی کارخانے سے ابتدا کا فیصلہ کرتا کیونکہ اس میں اندر جو کچھ رہا ہو، باہر احاطے کی سات آٹھ فٹ بلند دیوار میں لگا ہوا بوسیدہ آہنی پھاٹک جس کے کنڈے میں ایک واجبی سا قفل جھول رہا تھا۔

ان سہولتوں کی موجودگی میں اس نام نہاد تالے پر وقت برباد کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ قرب و جوار میں پھیلے ہوئے اندھیرے کی آڑ میں دو تو کیا...... دو سو آدمی بھی دیوار پھاند کر بآسانی اس کارخانے کے احاطے میں اتر سکتے تھے۔

جسمانی طور پر میں اس وقت اپنی پنڈلی کے تازہ زخم کے باعث نسبتاً کمزور تھا۔ لہٰذا پہلے میں پھاٹک پر چڑھ کر اندرونی کنڈے کے سہارے احتیاط سے نیچے اترا اور پھر رامو بھی کسی پیشہ ور کی طرح بآسانی اندر کود آیا۔

چادر اور چار دیواری کا تذکرہ میں بارہا سنتا رہا تھا مگر چار دیواری کی افادیت کا میں اسی روز قائل ہوا جس نے ہمیں ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس پرائی چار دیواری میں قابض ہو کر ہم نے اندرونی ماحول کا جائزہ لیا تو طبیعت کو مزید خوشی ہوئی کیونکہ اس وسیع احاطے میں محض ایک مختصر سا کمرہ تھا جو مقفل تھا اور باہر عقبی دیواروں کے ساتھ مختلف تن و توش کے ہزارہا ٹائر چنے ہوئے تھے۔

قدرت کی فراہم کردہ یہ سہولتیں اس بات کی غماز تھیں کہ اس رات اقبال کے ستارے عروج پر تھے۔ لہٰذا میں ان مبارک ساعتوں کا ضیاع مناسب نہ سمجھا اور رامو کو روشنی دکھانے کے لیے نیچے چھوڑ کر ٹائروں کی سیڑھیاں طے کرنی شروع کر دیں۔

میں ابھی سنبھلتا ہوا پوری بلندی تک بھی نہ پہنچا تھا کہ مجھے چوہدری رندھیر کے گودام کے سامنے والے حصے کی بلندی نظر آ گئی جو محض چالیس پچاس فٹ داہنی سمت پر تھی۔

یہ دیکھتے ہی میں نے رامو کو اشارہ دے دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں تاروں بھرے آسمان کی چھاؤں میں کم و بیش اٹھارہ فٹ بلند اس دیوار پر بیٹھے تھے جس کے ایک طرف چوہدری رندھیر کا گودام تھا اور دوسری طرف کسی کارخانے کی سپاٹ چھت پھیلی ہوئی تھی۔ بلکہ فی الحقیقت ہم کسی دیوار پر نہیں تھے۔ بلکہ وہ اسی سپاٹ چھت کا آخری سرا تھا جس پر سے ہماری ٹانگیں چوہدری رندھیر کے گودام کی فضا میں جھول رہی تھیں اور وہاں ہمیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔

تاروں کی مدھم روشنی میں اس گودام میں بکھرا ہوا چوبی ساز و سامان کا انبار نظر آ رہا تھا جو دیوار کے ساتھ اتنا بلند تھا کہ بالخصوص مجھے اس طرف اترنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

"اترو چلو — اب کیا سوچ رہے ہو۔" رامو نے مجھے ٹوکا اور میں دل کڑا کر کے احتیاط کے ساتھ سب سے بلند اور قریب ترین چوبی انبار پر کود گیا۔

میرے بوجھ تلے کہن سال لکڑیاں چرچرا کر رہ گئیں۔ اسی کے ساتھ گودام کے کسی حصے میں دبکی ہوئی کسی بلی کی فغاں ابھری اور میں سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگا۔

اس وقت رامو کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ میں نے تو وہ نقب زنی ایک مجبوری کے تحت کی تھی۔ لیکن وہ بہت زیادہ پُرشوق نظر آ رہا تھا۔

بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی کھلنڈرے لڑکے کو اس کے کسی بزرگ نے جھونک میں آ کر دن بھر جھولا جھولتے رہنے کی سزا دے ڈالی ہو۔

نیم تاریکی میں پھیلے ہوئے آسیبی سناٹے میں ہر طرف بکھرا ہوا چوبی کاٹھ کباڑ دیکھ کر مجھے وحشت سی ہونے لگی اور میں دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

چوہدری رندھیر نے صرف راجہ ہوٹل کا ہی چوبی ملبہ نہیں خریدا تھا۔ بلکہ وہ انبالہ اور اس کے گرد و نواح سے بھی مدتوں سے ایسا سامان خرید رہا تھا۔ ان حالات میں یہ پتہ چلانا سراسر ناممکن تھا کہ راجہ ہوٹل سے متعلقہ چوبی کباڑ کدھر پڑا ہوا تھا۔

اگر محض ایک روز صبر کر لیا جاتا تو رامو گودام کے ملازمین سے بہت سی کارآمد باتیں معلوم کر سکتا تھا جس کے بعد ہمارا کام سہل ہو جاتا۔

لیکن انسان کا دل بھی عجیب ہوتا ہے۔

مایوسی کی ایک لہر کے بعد ہی میرے ذہن نے اشک شوئی کا ایک

حلیہ تماشا جسے میرے دل نے فوری طور پہ قبول کرلیا۔

اگر اس رات ہم راجہ ہوٹل سے نکالے گئے چوبی انبار کو تلاش نہ بھی کر پاتے تو یہ کیا کم تھا کہ ہم نے بلا کسی روک ٹوک چوہدری رندھیر کے گودام میں اترنے کا ایک محفوظ راستہ تلاش کرلیا تھا۔

"تم اندر سے شروع کردو۔ میں اِدھر تلاش کرتا ہوں۔" میں نے غیر ارادی طور پر اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے رامو سے کہا۔

"مگر۔ راجہ ہوٹل سے نکالی ہوئی لکڑی کی پہچان کیا ہوگی؟" اس نے تردّد آمیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

میں لحظہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا اور اس امتحانی لمحے میں میرے ذہن نے اس سوال کا ایسا بھرپور جواب سوچا کہ مجھے وہی رات فیصلہ کن نظر آنے لگی!

"ہمیں خرافات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ سالم دیوار گیر الماریاں تلاش کرو یا ایسے تختے ڈھونڈو جو الماریوں سے کھلے ہوئے معلوم ہوتے ہوں۔ ہمیں جو کچھ درکار ہے وہ ڈیڑھ انچ کی اٹھارہ بیس انچ لمبی چوکور پٹی میں ملے گا۔"

"اندر کی ایک آدھ بتی جلالوں؟" رامو نے چھت کے نیچے پھیلے ہوئے گھور اندھیرے میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ایسی حماقت ہرگز نہ کرنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ اندر روشنی دیکھ کر کوئی چوکیدار ادھر متوجہ ہو جائے!"

وہ اثبات میں سر ہلاتا اندر چلا گیا!

چوہدری رندھیر کا وہ گودام گویا لکڑی کا ایک سمندر تھا مگر انبار لگاتے ہوئے یہ احتیاط رکھی گئی تھی کہ ایک جگہ کم و بیش ایک ہی سائز اور نوعیت کی لکڑی ہو!

ٹارچ کی روشنی میں کچھ دیر تک جائزہ لینے کے بعد میں تھک گیا تو ایک طرف بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا!

اسی وقت رامو تقریباً دوڑتا ہوا میرے پاس آپہنچا!

"آؤ۔ وہ مل گیا۔" اس نے آتے ہی میرا بازو پکڑ کر ہیجان آمیز لہجے میں کہا اور میں اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

مجھے اپنے پورے بدن میں سنسنی کی لہریں سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں!

"میں نے غلطی کی کہ پرانے انبار سے ابتدا کی۔" وہ تیز تیز سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔ "وہ دیوار گیر الماریاں تو سامنے ہی چنی ہوئی ہیں، اگر ہم پیچھے کے بجائے سامنے سے اندر گھستے تو سب سے پہلے الماریوں کی وہی جٹیاں نظر آتیں!"

"تم کیسے پہنچ گئے ادھر؟" میرے لیے بھی اپنے ہیجان کو چھپانا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

"پیشاب کرنے گیا تھا۔" وہ خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "اندر سے فرش تو سارا کچا ہی ہے نا۔ پھر میری نگاہ ایک جٹی پر پڑی۔ پہلے میں سمجھا کہ وہ اوپر تلے جتی ہوئی چوکھٹیں ہیں مگر ان کی چوڑائی عجیب سی نظر آئی اور پر چڑھ کر دیکھا تو وہ الماریاں نکلیں۔ ان کے پٹ بھی اسی طرح لگے ہوئے ہیں اور دستوں کی طرف لکڑی کی پٹیاں ٹھونک کر انہیں چوکھٹ سے جام کر دیا گیا ہے تعداد میں پوری اکتیس ہیں وہ!"

اور چند ہی ثانیوں بعد میں ان بلند چوبی ستونوں کے سامنے کھڑا ہوا تھا جو الماریوں کو ایک دوسری پر لٹا کر بنائے گئے تھے!

زندگی میں پہلی بار اس اہم موڑ پر میں ہلکے سے اعصابی انتشار کا شکار ہوگیا!

مجھے راجہ ہوٹل سے گئے مدت بیت چکی تھی، ہوٹل کی عمارت توڑی جا رہی تھی، سارے حوادث زمانہ رونما ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود میں پارس پتھر سے اتنا قریب پہنچ چکا تھا۔ سندری کا دیا ہوا وہ نادر الوجود تحفہ آخرکار ملنے ہی والا تھا!

"مگر ہم انہیں اتاریں گے کیسے؟" رامو نے مجھے چونکا دیا۔

میرے لیے اس وقت ایک ایک لمحہ بھاری ہونے لگا تھا۔ وہاں تین قطاریں نو نو الماریوں کی تھیں جن کی بلندی کسی طرح چودہ پندرہ فٹ سے کم نہیں تھی چوتھی قطار میں صرف چار الماریاں تھیں لہٰذا میں نے اپنی مہم کی ابتدا مختصر ترین انبار سے شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں ایک اسٹول کے ذریعے اوپر چڑھا تو الماری کا پٹ سامنے تھا اور جب میں نے ٹارچ کی روشنی میں جانی پہچانی ساخت والے اس پٹ کا بھرپور جائزہ لیا تو یک بیک میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا!

پٹ کی سطح پر دھندلائی ہوئی وارنش پر سیاہ رنگ سے لکھا ہوا نمبر سترہ نمایاں نظر آرہا تھا!

چوہدری رندھیر نہ صرف کاروباری تھا بلکہ محتاط بھی تھا۔ شاید اس نے ہوٹل کا ٹھیکہ لینے کے بعد توڑ پھوڑ شروع کرانے سے قبل ہر کمرے کی چوبی تنصیبات پر نمبر ڈلوا دیے تھے تاکہ ہوٹل سے گودام تک منتقلی میں اس کے گماشتے ہیر پھیر نہ کرسکیں!

اور اگر میرا قیاس غلط نہیں تھا تو سب سے اوپر رکھی ہوئی وہ الماری راجہ ہوٹل کے کمرہ نمبر سترہ سے اکھاڑی گئی تھی جب کہ مجھے سولہویں کمرے کی الماری کی تلاش تھی!

مگر میں نے محض قیاس کے بل پر کوئی خطرہ مول نہ لینے کا فیصلہ کیا ہوا تھا لہٰذا میرے ایما پر رامو نے کہیں سے ہتھوڑی ڈھونڈ کر میرے حوالے کردی!

الماری کے پٹوں کو ان کی جگہ روکے رکھنے کے لیے اوپر اور نیچے دو دو کیلوں سے چھوٹے چھوٹے تختے جڑے گئے تھے جو میں نے ہتھوڑی کا کیل نکالنے والا پتلا سرا پھنسا کر باآسانی اکھاڑ دیے کیلوں نے اپنی جگہ چھوڑی تو سناٹے میں آواز ضرور پیدا ہوئی لیکن

میری دانست میں وہ اتنی تیز نہیں تھی کہ باہر سنی جاتی اور کسی خطرے کا سبب بنتی!

میں نے چوکھٹ کے سرے پر قدم جما کر دھڑکتے دل سے پٹ کھولا اور بے اختیار اوپری خانے کی نچلی جڑ میں لگی ہوئی بلی پر نگاہ ڈالی مگر وہ سپاٹ نکلی اور میں نے احتیاط سے پٹ دوبارہ بند کردیا۔

وہ الماریاں لمبائی اور چوڑائی میں تو اتنی بڑی نہیں تھیں مگر ان میں لکڑی کا استعمال نہایت فراخدلی سے کیا گیا تھا لہٰذا اوپر والی الماری اتارنے میں ہم دونوں کو ہی خاصی مشقت کا سامنا کرنا پڑا ورنہ بری طرح زخمی ہونے کے پورے امکانات موجود تھے!

نیچے والی الماری پر اکیس نمبر لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے بھی نیچے اتروا لیا۔

اس کا پٹ رامو نے کھولا اور میں نے اوپری خلنے کا جائزہ لے کر اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

تیسری الماری تیس نمبر تھی۔ اسے اتارتے ہوئے میں نے نیچے والی الماری پر نگاہ ڈالی تو سولہ نمبر دیکھتے ہی میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔

رامو نے اسے کھولنے میں بہت پھرتی دکھائی مگر اندر جھانکتے ہی میرا سارا ہیجان ایک مرتبہ پھر دم توڑ گیا!

اوپری خلنے کی نچلی بلی بالکل ہموار اور بے داغ تھی!

سولہویں الماری میں پارس کی موجودگی کے آثار نہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ چوہدری رندھیر کے آدمیوں نے وہ نمبر کمروں کے حساب سے نہیں لگائے تھے بلکہ اپنی سہولت کے لیے کوئی اور نظام اخذ کیا تھا!

تیس نمبر اس قطار کی آخری الماری تھی اور جب رامو اس پر طبع آزمائی کر رہا تھا تو میں باقی ماندہ تین بلند قطاروں کے بارے میں تشویش کا شکار تھا جنہیں چھیڑنا کسی بھی طرح خطرے سے خالی نہیں تھا!

میں نے سوچا کہ اگلے روز دن میں گاہک بن کر اس دوکان میں آنا لازمی ہوگیا تھا تاکہ کسی بہانے سے اتنی بلندی تک بھاری سامان کے اتارنے چڑھانے کے انتظامات کا جائزہ لیا جاسکے تاکہ اگلی رات تلاشی کا پورا مرحلہ نمٹا لیا جائے!

"یہ دیکھو!" اچانک رامو کی سرسراتی ہوئی تحیر زدہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچ گیا!

اس نے داہنے ہاتھ سے تیسویں الماری کا پٹ اٹھایا ہوا تھا اور بائیں ہاتھ سے ٹارچ کی روشنی ایک جگہ مرکوز کی ہوئی تھی۔ روشنی کے ساتھ اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں بھی اسی نقطے پر منجمد تھیں جو الماری کے اوپری خلنے میں واقع تھا۔

اور پھر وہ جگہ دیکھتے ہی مجھ پر یکایک جنون سا سوار ہوگیا۔ میں آگے جھپٹا تو الماری کا پٹ رامو کے داہنے ہاتھ سے چھوٹ کر پُرشور دھماکے کے ساتھ نیچے آرہا! میں کوشش کے باوجود اپنی کلائی کو ضرب سے نہ بچا سکا!

الماری کا پٹ گرنے کا دھماکا اس قدر تیز تھا کہ فوراً ہی باہر سے چوکیدار کی سیٹی سنائی دی جو وہ وقفے وقفے سے بجانے لگا تھا۔ سیٹی کی آواز قریب آنے سے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ چوکیدار نے دکانوں اور گوداموں کے تالوں کی پڑتال کے لیے فوری طور پہ گشت شروع کردیا تھا!

اپنی حماقت سے میں نے ایک الجھن پیدا کرلی تھی مگر مجھے پوری امید تھی کہ چوکیدار اپنی پوری کوشش کے باوجود بھی آواز کے مخرج کا یقین نہیں کرسکے گا!

اس وقت رامو کی حالت غیر تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی قتل کرکے فارغ ہوا ہو اور اسے کسی بھی لمحے رنگے ہاتھوں اپنی گرفتاری کا ڈر ہو!

"اوسان بحال کرو۔" میں نے مدھم سی غراہٹ میں اسے ڈانٹا۔ "بلیوں کی بھاگ دوڑ سے بھی تختے گر سکتے ہیں۔ کوئی ادھر دھیان نہ دے گا۔"

پھر میں نے دوبارہ پٹ کھول دیا۔

اس کے اوپر کے خانے کی نچلی جڑ میں لگی ہوئی ایک ڈیڑھ انچ کی مربع بلی میں وہ بھدا سا نشان آج بھی اسی طرح نمایاں تھا جیسا پہلی بار پارس پتھر چھپانے کے بعد تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس درمیانی مدت میں اسے نہیں چھیڑا گیا تھا!

پھر میں نے انگلیوں کے سروں سے اس سوراخ سے چیونگم نوچنی شروع کردی۔

امتدادِ زمانہ کے باعث پگھلی ہوئی چیونگم نرم نہیں رہی تھی مگر اتنی سخت بھی نہیں ہوئی تھی کہ میرے قابو میں نہ آتی۔

اور پھر چیونگم کے آخری لوتھڑے کے ساتھ وہ بھونڈا سا سیاہ پتھر بھی میرے ہاتھ میں آگیا جو سیتا کی ماں سندری نے مجھے دیا تھا!

میں نے بے اختیار اس نادر الوجود پتھر کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے طویل عرصے کے بعد میں دوبارہ پارس پانے میں کامیاب ہو چکا تھا!

اس بار میں نے احتیاط اور آہستگی سے الماری کا پٹ بند کردیا!

سر اٹھایا تو رام ناتھ اندھیرے میں پلکیں جھپکائے بغیر مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا۔

"یہ ...... یہ ہے پارس پتھر!" رام ناتھ کے منہ سے بدقت تمام وہ سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔

"دیکھو گے اس کا کمال؟" میں نے فخر آمیز لہجے میں کہا اور اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

اس وقت خوشی کے باعث میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ مدت سے کھویا ہوا پارس پتھر توقعات کے برعکس اتنی آسانی سے ہاتھ آ گیا تھا کہ مجھے اپنے مقدر پر رشک آ رہا تھا!

انبالہ سے فرار ہوتے وقت میرے لیے اپنی بقا کا مسئلہ اس قدر سنگین اور نازک صورت اختیار کر چکا تھا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے بعد مجھے مہلت ہی نہ مل سکی تھی کہ دوبارہ راجہ ہوٹل کا رُخ کر کے وہاں چھپائے ہوئے پارس پتھر کے حصول کی کوشش کرتا۔

اس دوران میں پارس کا خیال ہمیشہ میرے ذہن میں موجود رہا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکے حصول کی امید کمزور ہوتی چلی گئی تھی۔

حتیٰ کہ لاہور میں اپنے گھر والوں کی تلاش کی رُوح فرسا مہم کے دوران کبھی مجھے پارس پتھر کے لیے روانہ ہونے کا خیال نہیں آیا۔ اس وقت میں مالی بحران سے دوچار تھا اور ایسی صورت حال میں ایک موہوم سے امکان کی خاطر سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت نہیں تھی۔ پھر مجھے اپنے بھائی سطوت علی کا سراغ لگانا تھا جو لاہور میں ناکامی اور بربادی کے بعد شاید کراچی نکل گیا تھا۔ اس وقت یہ سیتا ہی کی ذات تھی جس نے مجھے انبالہ کے سفر کی ترغیب دلائی اور صورتحال کا موازنہ کرنے کے بعد میں نیم دلی کے ساتھ اس سے متفق ہو گیا۔

اوّل تو میرے نزدیک پارس کی بازیابی ویسے ہی مشکوک تھی۔ رہی سہی کسر راجہ ہوٹل کے انہدام کے منظر نے پوری کر دی مگر یہ سب شاید میرے عزم کے امتحانات تھے جن سے میں کسی نہ کسی طرح گزرتا ہی چلا گیا اور نتیجے کے طور پر وہ نادرِ روزگار پتھر دوبارہ میری تحویل میں آ چکا تھا جس کا ذکر محض روایتوں اور قصوں میں ملتا ہے۔

رامو نے ٹارچ کی روشنی میں ہاتھ بڑھایا اور میں نے پارس پتھر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس نے فوراً اپنی مٹھی بھینچ لی۔

"بالکل پتھر کی طرح سخت اور کھردرا ہے۔" اس نے مسحور لہجے میں آہستہ سے کہا۔ "یقین نہیں آتا کہ یہ پارس ہے۔"

"یہ پتھر ہی ہے۔" میں نے دھیمی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "اگر اس میں لوہے کو سونے میں تبدیل کرنے کے خواص نہ ہوں تو یہ ایک حقیر سنگریزہ ہے۔" میں نے بات کرتے ہوئے کچی زمین سے ایک کیل اٹھالی۔

"کیا کرو گے اس کا؟" رامو نے اس مڑی تڑی کیل کے بارے میں جاننا چاہا۔

"اسی سے ابتدا کروں گا۔ لاؤ پارس دو مجھے۔"

وہ قدرے متذبذب نظر آیا مگر پھر اس نے پارس پتھر مجھے لوٹا دیا اور ہیجان آمیز دھیمی آواز میں بولا۔ "اب یہ پتھر میرے حوالے نہ کرنا۔ اس میں عجیب سی قوت ہے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے پورے بدن میں بجلی سی دوڑ رہی ہو۔ اس پر کہیں میری نیت خراب نہ ہو جائے۔ آدمی کے دماغ میں فتور آتے دیر نہیں لگتی۔"

"کوئی قوت نہیں ہے اس میں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ محض خیال ہے تمہارا۔ اگر تمہارے دل میں لالچ پیدا ہو ہی جائے تو میری جان کے دشمن نہ بن جانا۔ مانگو گے تو اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے مجھے پارس پتھر کیل سے مَس کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

"لوہے کو سونے میں بدل رہا ہوں۔"

"بس یوں ہی؟ یعنی ایسے رگڑنے سے یہ کیل سونے کی ہو جائے گی؟" اس کے الفاظ میں بے یقینی رچی ہوئی تھی۔

میں اپنا گوہرِ مقصود حاصل کر چکا تھا اور اس گودام سے نکل کر واپس پہنچنے کے لیے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ لہٰذا میں چاہتا تھا، کہ اس گودام سے نکلنے سے قبل رام ناتھ کو کامیابی کی طرف سے اتنا پُر یقین کر دوں کہ کوئی سدِ راہ سامنے آ جانے پر وہ پوری قوت سے اس سے ٹکرا جانے کی اخلاقی قوت سے مالا مال ہو۔

چند ثانیوں تک وہ حیرت سے لوہے اور پارس پتھر کے اتصال کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھیں بے یقینی کے انداز میں پھیلتی چلی گئیں۔

میں نے کندن کے دمکتے ہوئے رنگ والی وہ کیل اس کی طرف بڑھا دی۔ "لو یہ رکھ لو۔ یہ تمہارا پہلا انعام ہے۔"

اس نے ٹارچ کی روشنی میں حیرت سے اس طلائی کیل کا مختصر مگر بھرپور جائزہ لیا پھر اسے احتیاط سے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور چوہدری رندھیر کے گودام کی چھت کے نیچے سے کھلے عقبی احاطے کی طرف چل دیا۔

اس مرتبہ ہم دونوں کامیابی کے جذبے سے سرشار تھے جس کے باعث ہمارے حوصلے بڑھے ہوئے تھے لہٰذا ہم بغیر کسی دشواری کے ٹائروں کے ویران گودام میں پہنچے اور پھر کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر بلدی بلدی باہر پہنچ گئے۔

اس ناقابلِ تصور کامیابی کے باعث مجھے اپنا دل کھوپڑی میں دھمکتا محسوس ہو رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں جلد از جلد گھر پہنچ کر سیتا کو مختصر سی مدت میں سُندری کی دی ہوئی نشانی کی بازیابی کا مژدہ سُنا سکوں لیکن کسی ویران گوشے میں دبکے ہوئے کسی سنتری یا چوکیدار کی مشتبہ نگاہوں سے خود کو بچائے رکھنے کے لیے ہم نے اپنی رفتار اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دی۔

تھوڑی دیر بعد ہم موہن پورے کے اس ویران تجارتی علاقے اور ایک میدانی حصے کو عبور کر کے رہائشی علاقے کی تنگ مگر بارونق گلیوں میں داخل ہو گئے جہاں بکھری ہوئی آبادی میں ہماری کوئی انفرادی شناخت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

آخری گلی عبور کر کے ہم پختہ سڑک پر آئے تو چند ہی ثانیوں میں ایک خالی ٹیکسی نظر آئی اور ہم بلا توقف اس میں سوار ہو گئے۔

پانچ چھ بجے شام بند ہو جانے والے بازار میں ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کافی رات بیت چکی ہو مگر انبالہ کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ دس ساڑھے دس بجے کا وقت اس شہر کے باسیوں کے لیے نامانوس نہیں تھا کہ وہ سڑکیں اور بازار ویران کر کے اپنے اپنے گھروں کی چار دیواریوں میں دبک بیٹھتے۔

گھر پر رامو کی ماں چاروں پوتیوں اور پانچویں پوتے سمیت سو چکی تھی مگر آشا بیٹھک میں سیتا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ دروازے پر ٹیکسی رُکنے کی آواز سنتے ہی رامو کی بیوی آشا دروازے پر آ گئی۔

میں ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے اندر داخل ہوا تو سیتا بھی دروازے پر آ چکی تھی اور رامو سے کچھ کہہ رہی تھی۔

"تم ہی جواب دو گے" مجھے دیکھ کر رامو ہنستے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "بھابی پوچھ رہی ہے کہ ہم دونوں کہاں آوارہ گردی کر رہے تھے؟"

"مقدر کی دیوی کی تلاش میں تھے۔" میں نے بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے خوش دلی سے جواب دیا۔

"لچھمی یوں ہر ایک کو تھوڑا مل جاتی ہے۔" آشا نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں مجھ سے کہا۔ "اس کے لیے تو بڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔ "پوچھ لو رامو سے، لچھمی تو ہماری جیب میں پڑی ہے۔"

"پتہ ہے...... مجھے سب پتہ ہے۔" وہ تنک کر بولی۔ "میں ٹکے ٹکے کی چھوکریوں کی بات نہیں کر رہی۔" پھر اس کا لہجہ یاس انگیز ہو گیا۔ "کاش لچھمی دیوی ہم پر مہربان ہو جائے تو ہمارے برسوں کے دلدر دور ہو جائیں۔"

"سمجھ لو کہ وہ سمے آ ہی گیا ہے۔" رامو اپنی بیوی کے ساتھ سیتا کی بھی چڑانے پر تُل گیا۔ "بھیا نے جسے دو ٹکے کی چھوکری سمجھ کر منہ لگایا تھا وہی لچھمی دیوی نکلی۔"

"رام رام!" آشا یک بیک خوفزدہ سی ہو گئی۔ "توبہ کرو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ دیویوں دیوتاؤں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"میں سمجھا دوں گا اسے۔" میں نے موضوع کو طوالت اختیار کرتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "تم ذرا گرم گرم چائے تو پلاؤ۔"

"تم ہی سے سمجھے گا بھیا۔" وہ واپسی کے لیے مُڑتے ہوئے بولی۔ "میری باتوں کو تو مذاق میں اڑا دیتا ہے۔"

"کس سے ملے تھے تم؟" آشا کے جاتے ہی سیتا براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ پوری طرح سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

میں نے بے بسی سے رامو کی طرف دیکھا تو وہ فاتحانہ بے نیازی کے ساتھ سر جھکائے سگریٹ کے ایک سرے کو بائیں انگوٹھے کے ناخن پر ٹھونک رہا تھا۔

"رامو ٹھیک کہہ رہا تھا۔" موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے میں نے جلد از جلد بات ختم کرنے کی نیت سے کہا۔

"کون تھی وہ؟" سیتا نے میری بات درمیان سے اُچک کر جارحانہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہم نے پارس حاصل کر لیا ہے۔" میں نے اس کے قریب ہو کر سرگوشیانہ لہجے میں اُسے آگاہ کیا۔

"نہیں۔" اس نے بے اعتباری سے کہا۔

"اس کا حصول توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تمہاری ماں کی دی ہوئی نشانی اس وقت میری جیب میں موجود ہے۔"

"تمہیں کیسے پتہ کہ وہ اصلی پارس ہے؟" اس بار سیتا کا پُر جوش لہجہ بھی رازداری کی حد تک دھیما تھا۔

"وہ اسی جگہ سے ملا ہے جہاں میں نے اُسے چھپایا تھا۔ اور پھر رامو کی جیب میں سونے کی ایک کیل موجود ہے جو پارس پتھر سے رگڑ کھانے سے پہلے محض لوہے کی ایک بے وقعت کیل تھی۔"

"اور صبح میں اسے بازار دکھاؤں گا۔" رامو نے لقمہ دیا۔ "یہ راز میرے تمہارے اور بھیا کے درمیان رہے گا۔ آشا کو اس قصے کی ہوا بھی نہ لگنے دینا ورنہ وہ اپنی ساس کو بتائے گی اور میری ماں اپنے بھائیوں کو بتلائے بنا نہ رہے گی۔"

میں نے جوتے اتار کر ایک طرف ڈالے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ سیتا میرے قریب بیٹھ گئی جب کہ رامو کرسی پر بیٹھ گیا۔

"دیکھوں کہاں ہے وہ پتھر؟" سیتا نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

میں نے لیٹے ہی لیٹے جیب سے پتھر نکال کر اُسے تھما دیا۔

"حیرت ناک!" سیتا کا چہرہ وفورِ جوش سے تمتما اٹھا۔ اس کی چمکیلی نگاہیں ہتھیلی پر پڑے ہوئے سیاہ اور بھونڈے پارس پتھر پر جمی ہوئی تھیں۔ "میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم اتنی آسانی سے اس کا سراغ لگا لو گے۔"

"اسے چھپا لو بھابی!" رامو نے باہر قدموں کی چاپ سُن کر جلدی سے کہا اور سیتا نے فوراً اپنی مٹھی بند کر لی۔

چند ہی ثانیوں میں آشا چائے لے آئی۔

چائے نوشی کے دوران آشا کی باتیں سن کر میں چونک پڑا۔ بظاہر وہ ایک بدھو سی گھریلو عورت نظر آتی تھی جس کی قوتِ مشاہدہ کمزور ہونی چاہیے تھی مگر اس کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔

میری اور رامو کی مصروفیات اور پھر ہمارے قدرے رازدارانہ رویے نے آشا کو چوکنا کر دیا تھا۔ اس نے کچھ جاننے پر اصرار تو نہیں کیا لیکن یہ ضرور جتا دیا کہ ہم دونوں بلکہ تینوں یعنی میں، سیتا اور رامو اسے الگ رکھ کر کچھ کر رہے تھے یا کرنا چاہتے تھے۔

"تیری کھوپڑی چھوٹی سی ہے۔" رامو نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پیار بھرے غصیلے لہجے میں اپنی بیوی سے کہا۔ "ناک سے آگے تجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ تیرا کیا خیال ہے؟ کیا ہم تینوں کہیں ڈاکا ڈالنے کا ارادہ کر رہے ہیں؟"

ایک روایتی مشرقی بیوی کی طرح وہ فوراً سہم گئی۔ "یہ تو نہیں کہا میں نے... بس ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے تم لوگ کوئی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"جوا کھیل رہے ہیں؟ دارو اڑا رہے ہیں؟ چوری کر رہے ہیں؟ جو تجھ سے چھپائیں گے۔" رامو کو ایک دم طرارہ آ گیا۔

"کیوں گرمی دکھا رہے ہو؟" میں نے معاملہ بگڑتے دیکھ کر جلدی سے رامو کو ٹوکا پھر آشا سے مخاطب ہو گیا۔ "تم خیال نہ کرو بہن! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تو دو چار دن کے مہمان ہیں آج نہیں تو کل چلے جائیں گے۔ ہماری وجہ سے ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے کہ جاتے ہوئے ہمیں قلق ہو۔"

"میں تو بس یوں ہی روا روی میں کہہ رہی تھی۔ پرپتہ نہیں انھیں اتنی جلدی غصہ کیوں آ جاتا ہے۔" آشا روہانسی ہو کر بولی۔

اسی وقت اندر سے چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آئی اور آشا پلو درست کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ واپس چلی گئی۔

رامو نے اسے جاتے دیکھا اور سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ "عجیب عورت ہے، ذرا ذرا سی بات کو بھانپ لیتی ہے۔"

"مگر اس کا اندیشہ سچا ہے، وہ تمھاری رگ رگ سے واقف ہے اور سمجھ رہی ہے کہ تم کوئی بات اس سے چھپا رہے ہو۔"

"اسی بات پر تو غصہ آ گیا تھا۔ ہنسی مذاق کا کون برا مانتا ہے!" رام ناتھ خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"بیویاں جھوٹ پکڑ لیں تو شوہر اسی طرح جھلا جاتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسے جدید اردو میں دُم پر پیر پڑ جانا کہتے ہیں۔"

"اب صبح کا کیا پروگرام ہے؟" کچھ دیر کے توقف کے بعد رامو نے سوال کیا۔

"چاہو تو ڈیوٹی پر چلے جاؤ۔"

اس نے اٹل انداز میں اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اگر تمھیں میری ضرورت نہ ہو تو میں کپل فروخت کرنے کی کوشش کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "یہاں سونے کی خرید و فروخت قانوناً جرم ہے مجھے اس معاملے میں ذرا احتیاط سے کام لینا ہو گا۔"

"تو تم اس کام سے نمٹ لینا۔" میں نے چائے ختم کر کے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "انبالہ میں میرا کام ختم ہو چکا ہے کل نہیں تو زیادہ سے زیادہ پرسوں میں واپس روانہ ہو جاؤں گا میرے لیے اب یہاں رکنا بے سود ہے۔"

"پھر تم آرام کرو۔"

یہ کہہ کر وہ بیٹھک سے نکل گیا اور سیتا نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

"اس مرتبہ تقدیر ہم پر بہت مہربان معلوم ہوتی ہے۔" میں نے سیتا سے کہا۔ "پارس کا مرحلہ اتنی کامیابی سے طے ہوا ہے کہ یقین نہیں آتا۔"

"رامو تو کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا؟" سیتا نے میرے قریب بستر پر دراز ہوتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "وہ بہت مخلص انسان ہے اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔"

"پارس کی بازیابی میں اس کا کتنا حصہ ہے؟"

"وہ غریب آدمی ہے اس کی توقعات بھی بہت محدود ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "دس بیس سیر لوہے کو سونے میں بدل دیا جائے تو اس کے پیر زمین پر نہیں پڑیں گے... اس سے زیادہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"غنیمت ہوا کہ ہم نے بروقت انبالہ آنے کا ارادہ کر لیا۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ "اگر ہوٹل سے نکالی گئی الماریوں کی فروخت شروع ہو جاتی تو شاید پارس پتھر تک پہنچنا تمھارے لیے ناممکن ہو کر رہ جاتا۔"

"اپنی تعریف کرانا چاہ رہی ہو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ سچ ہے کہ اگر تم لاہور سے انبالہ آنے کی شہہ نہ دیتیں تو میں کراچی کا ہی رُخ کرتا اور پارس پتھر کا حصول شاید اتنا آسان نہ رہ جاتا۔"

"ہر بات... ہر بات کا غلط مطلب نکالتے ہو۔" وہ میری دست درازیوں سے بوکھلا کر بولی۔ "ہمیشہ میری نیت میں فتور تلاش کرتے رہتے ہو۔"

"نیت تو بعد کی بات ہے۔ عورت کا لگاوٹ کے ساتھ کسی مرد سے ہم کلام ہونا ہی سراسر فتور ہے۔"

"میں عورت نہیں، بیوی ہوں تمھاری۔" اس نے میرے لہجے میں تضحیک کا پہلو محسوس کر کے فوراً احتجاج کیا۔

"بیوی بھی عورت ہی ہوتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے [illegible]ں کر دیا۔

اگلی صبح عجیب پژمردہ انداز میں نمودار ہوئی۔ سیتا خلافِ معمول [illegible] سو رہی تھی۔ کمرے سے باہر بھی سناٹا طاری تھا جس کا مطلب [illegible] رامو اور اس کے بیوی بچے بھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

میں کچھ دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ جب بے چینی زیادہ [illegible]ی تو اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

اپنے کمرے سے باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ [illegible] گھر کے باسیوں کی صبح اپنے معمول کے مطابق نمودار ہوئی تھی — یہ [illegible]ری بات تھی کہ ناشتے سے فراغت کے بعد رامو اپنے بیوی بچوں کو [illegible]کے چھوڑنے کی نیت سے ساتھ لے گیا تھا اور اس وقت گھر میں صرف [illegible]وں کی بوڑھی ماں موجود تھی۔

میرے استفسار پر رامو کی ماں نے اپنے بیٹے کی ایک عادت کے [illegible]ے میں بتایا جو عجیب تو نہیں لیکن دلچسپ ضرور تھی۔

رامو نے جس دن سے شادی کی تھی اپنی بیوی کو ایک رات کے [illegible]ے بھی اپنی چھت سے باہر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ میکے بھی جاتی تو صبح سویرے [illegible]ی اور شام ڈھلے گھر واپس آ جاتی تھی۔ یہ بتاتے ہوئے اس بوڑھی خاتون کو جہاں بیٹے اور بہو کے درمیان محبت پر ناز کا اظہار ہو رہا تھا، [illegible]ں بہو کے لیے یہ اضافی ستائش بھی واضح تھی کہ آشا واپسی کے لیے بھی رامو کی منتظر نہیں رہتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اسے قرب و جوار میں سافر اتارنے کے بعد فرصت میسر ہوتی تو بغیر کسی پیشگی پروگرام کے سسرال پہنچ کر بیوی کو خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیتا تھا۔

آشا چلی تو گئی تھی لیکن ہمارے ناشتے کا بندوبست کر گئی تھی۔ [illegible]وی کی رفاقت میسر آنے کے بعد سے میں دست خود بدہانِ خود کا عادی نہیں رہا تھا لہٰذا منہ ہاتھ دھو کر اخبار چاٹنے بیٹھ گیا۔ جو رامو نے محض [illegible]ری وجہ سے لگا لیا تھا ورنہ اس کے گھر میں انگریزی پڑھنے والا دور [illegible] تک کوئی نہ تھا۔

سیتا بیدار ہوئی تو ہم دونوں نے رامو کی بوڑھی ماں کے قریب [illegible]ھ کر ناشتہ کیا۔ وہ شکم سیر تھی۔ مگر پھر بھی اصرار پر ہزاروں دعاؤں کے ساتھ سیتا سے چائے لے لی۔

بھرے گھر کو اس ضعیف عورت پر چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ [illegible] میں سیتا کو گھر چھوڑ کر وقت گزاری کے لیے باہر نکل گیا۔

شہر کے بارونق بازاروں کی سیر سے میں واپس لوٹا تو رامو [illegible] لوٹ چکا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک لفافہ میرے سامنے ڈال دیا جس [illegible] تین ہزار ایک سو بانوے روپے کی رقم موجود تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ کپل میں نے فروخت کر دی۔" اس نے فخریہ لہجے میں بتلایا۔ "سیٹھ گردھاری لعل نے شاید دام بھی کم لگائے ہیں کیونکہ وہ ان داموں پر ہر مقدار خریدنے کے لیے آمادہ ہے، میرا خیال ہے کہ تھوڑی سی رقم کے لالچ سے بہتر یہ ہو گا کہ میں اسی سے رابطہ رکھوں۔"

"پھر ہے کوئی چیز؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

وہ اٹھا اور چند ہی ثانیوں میں روٹی پکانے کا وزنی توا کالک صاف کر کے کمرے میں لے آیا جس کا وزن کسی طرح ڈھائی تین سیر سے کم نہیں تھا۔

جب سے ہمالیہ کی برف پوش وادیوں میں سیتا کی ماں نے پارس پتھر کے نگ والی انگوٹھی میرے حوالے کی تھی۔ میں چھوٹی موٹی اشیاء کو ہی سونے میں تبدیل کر سکا تھا۔ اس کے آزادانہ استعمال کی نوبت آنے سے پہلے مجھے اس نایاب نگینے سے محروم ہونا پڑا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ایک وزنی آہنی ٹکڑے کو سونے میں تبدیل کرنا تھا۔

وہ تجربہ اس اعتبار سے میرے اور رامو کے لیے سنسنی خیز ثابت ہوا کہ ابتدا میں ایک منٹ گزر جانے کے باوجود آہنی توے کے سیاہ رنگ میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی اور میں نے پہلی بار پارس پتھر میں حرارت سی پیدا ہوتی محسوس کی۔

لمحے گزرتے رہے۔ اس اثنا میں میرے ذہن میں ہندوستان کے اٹامک انرجی کمیشن کے ڈاکٹر رامانند کے اعتراضات گونجتے رہے جو اس نے جوہر کی ماہیت کی تبدیلی پر کیے تھے۔ اس کا اصرار تھا کہ کسی بھی غیر جوہری بلکہ غیر تابکار عنصر کو دوسرے عنصر میں بدلنا ناممکن تھا۔ ہلکے جوہر کو کسی بھاری ایٹمی جوہر میں تبدیل کرنے کا واحد ذریعہ ایٹمی ری ایکٹر تھا۔ جس میں نیوٹرون کی بمباری سے ایک دھات کو دوسری میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔

سائنسی اور بالخصوص ایٹمی معاملات میں میں ایک جاہل مطلق تھا۔ میرے لیے ایٹم کے تشکیلی ذرات کی معنویت بے معنی تھی۔ نیوٹرون باوزن ہوتے ہیں تو ہوا کریں۔ پروٹون وزن دار ہوتے ہیں تو ہوا کریں الیکٹرون بے قرار بے وزن ذرات ہوتے ہیں تو ہوا کریں، مجھے ان کی ترتیب اور ماہیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان اٹل سائنسی مفروضات کے باوجود میں نے کسی ایٹمی کارروائی کے بغیر محض پارس پتھر کے لمس سے لوہے کو سونے میں تبدیل کیا تھا جسے پرکھنے والوں نے کسوٹی پر سونا تسلیم کیا تھا۔

اس قدر ٹھوس اور مثبت نتائج کی موجودگی میں میرے لیے پارس پتھر کی کارکردگی غیر مشکوک تھی لیکن توے کی نہ بدلنے والی رنگت مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی مگر میرا ہاتھ مسلسل حرکت میں تھا اور پھر اچانک توے کی سطح میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ پہلے سیاہ رنگ میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ پھر اس چمکدار سیاہی نے

زردی کی جھلک اختیار کرنی شروع کی جو بتدریج طلائی رنگ کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ اور جب رنگوں کا یہ تغیر سونے کی رنگت پر ختم ہو گیا تو میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"سونا... بالکل سونا ہے۔" رام ناتھ نے اضطراری انداز میں وہ طلائی توا اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

"واقعی بالکل سونا لگ رہا ہے۔" راموکی ماں جو اُسی وقت نجانے کہاں سے آ نکلی تھی۔ راموکی بات سُن کر بڑبڑائی۔ "بچوں کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے بہو کب تک گھر واپس آئے گی؟"

رامو نے جلدی سے توا پیچھے چھپا لیا اور ماں سے بولا۔ "شام تک لوٹے گی، بچوں کے بغیر گھر کھانے کو دوڑتا ہے۔"

"تم کہاں گھوم رہی ہو ماں؟" سیتا نے اُٹھ کر راموکی ماں کو تھامتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "کہیں ٹھوکر لگ گئی تو زخمی ہو جاؤگی آرام سے بستر پر لیٹی رہو... کوئی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔"

"کھانا کھا لیا رامو نے؟" اُس نے سیتا سے سوال کیا۔

"اُس نے تو کھا لیا مگر میں ابھی بھوکا ہوں۔" میں نے بڑھیا کو اپنی موجودگی جتلانے کی نیت سے کہا۔

"اسے بھی کھانا دے نا بیٹا!" راموکی ماں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "میرے لیے تو یہ بھی راموکا بھائی ہی ہے۔"

سیتا راموکی ماں کے ہمراہ اس کمرے سے نکل گئی اور رامو نے طلائی توا دوبارہ اپنے سامنے اہتمام سے چٹائی پر رکھ لیا۔

"اب اس کا کیا کرو گے؟" میں نے اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"ابھی بہت وقت باقی ہے۔" اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اسے ابھی سیٹھ گردھاری لعل کے پاس پہنچانا ہوگا۔"

"طلائی توا تو اسے الجھن میں ڈال دے گا۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "سونا نرم ہوتا ہے' بہتر یہ ہوگا کہ کٹیا لا کر اسے ٹکڑوں میں کاٹ لو۔"

رام ناتھ اس اعتبار سے بہت سعادت مند تھا کہ ہر معقول بات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیتا تھا لہٰذا وہ فوراً ہی گھر سے چلا گیا۔ میں سیتا کا لایا ہوا گرم گرم کھانا کھا ہی رہا تھا کہ وہ لوٹ آیا۔ میں کھانے سے انصاف کرتا رہا اور وہ توے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔

"اس وقت نہ ہوئی آشا گھر پر!" توے کو کاٹتے کاٹتے وہ کسی خیال کے زیرِ اثر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہوتی تو کیا ہوتا بھلا؟" سیتا نے معصومیت سے سوال کیا۔

"مچل جاتی کہ اسے ٹھوس سونے کے کنگن اور پازیب بنوا دوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جب سے یہاں سونے پر پابندی لگی ہے غریب گھرانوں کی عورتیں تو سونے کے زیور کو ترس گئی ہیں۔ پھر بھلا آشا نے اتنا سونا اکٹھا کہاں دیکھا ہوگا۔"

"بازار سے واپسی میں موٹی موٹی چادروں کے کچھ ٹکڑے لیتے آنا۔" میں نے اسے نصیحت کی۔ "ایسا نہ ہو کہ اب ہر دن دستے کو سونے میں بدلنا پڑے۔"

"تمھاری باتیں ہوتی تو بہت معمولی ہیں مگر اُن میں ذہانت ہوتی ہے۔" اُس نے خلوصِ دل سے اعتراف کیا۔ "پتہ نہیں تم یہ سب کیسے سوچ لیتے ہو؟"

"عقل ٹھکانے پر رہے تو ہر بات صاف اور سیدھی سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "خرابی یہ ہے کہ کوئی مشکل پیش آتے ہی ہم عقل خیرات کر دیتے ہیں۔"

"خیرات کر دیتے ہیں۔" وہ میرے الفاظ دہرا کر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "سچ کہتا ہوں کہ تمھاری ہر بات لاجواب ہوتی ہے۔"

میں کھانے سے فارغ ہوا تو وہ طلائی توے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر کے ایک رومال میں باندھ چکا تھا۔ میں ہاتھ دھو کر لوٹا تو وہ سیٹھ گردھاری لعل کی طرف جانے کے لیے تیار تھا۔

وہ گردھاری لعل کی طرف چلا گیا اور میں اگلے روز روانگی کے امکانات کے بارے میں غور کرنے لگا۔

راموکی واپسی سے پہلے ہی آشا لوٹ آئی۔ مجھے اور سیتا کو موجود پا کر اُس نے چھوٹتے ہی راموکے بارے میں سوال کیا تھا جس پر سیتا بے اختیار مسکرا دی۔

رامو شام ڈھلنے سے ذرا دیر پہلے آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور ہاتھ میں ایک نیا بریف کیس جھول رہا تھا۔

آشا نے حسبِ معمول دروازے پر اُس کا استقبال کیا اور اس کے ہاتھ میں بریف کیس دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آج بابو معلوم ہو رہے ہو، کیا لے آئے اس میں؟" اُس نے راموکے ہاتھ سے بریف کیس لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ دو بچے بھی باپ سے بریف کیس چھیننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ لیکن اس نے فوراً ہی بریف کیس مجھے تھما دیا۔ "پرائی چیز کو نہیں چھوتے، اس میں سلطان کی بہت ضروری چیزیں ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ آشا کی باتوں میں قطعی دل چسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ جلد از جلد تخلیہ حاصل کر کے مجھ سے دل کی بھڑاس نکال سکے سیتا بھی اُس کا عندیہ بھانپ گئی تھی لہٰذا وہ غیر محسوس طریقے سے آشا کو اپنے ساتھ باتوں میں لگا لے گئی اور رامو میرے ساتھ بیٹھک میں گھس گیا۔

"تم... تم واقعی کمال کے آدمی ہو۔" رامو نے میرا داہنا ہاتھ دباتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "اب تو ہمارے دن پلٹ جائیں گے۔"

"خود پہ قابو رکھو۔" میں نے اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے اُسے سنجیدگی سے سمجھایا۔ "مایا آتی جاتی چھپایا ہوتی ہے' اس سے اتنا دل نہ لگانا چاہیے کہ مشکلات پیدا ہو جائیں۔ اس وقت تمھاری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ کوئی بھی بلا وجہ تمھاری طرف متوجہ ہو سکتا ہے یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو لیکن مجھ کو خود پر اختیار نہیں رہا۔ جتنی رقم ہے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا وہ اس اٹیچی کیس میں بند ہے۔"

"کتنی ہے؟"

"دو لاکھ۔" اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر کہا۔ "اٹھائیس ہزار وہ صبح دے گا میرے لیے تو حساب لگانا دوبھر ہو گیا تھا۔"

"کوئی الجھن تو نہیں ہوئی تھی؟"

وہ کھسیانے ہوئے انداز میں مسکرا دیا۔ "کیل خریدتے ہوئے گردھاری لعل نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس کے باوجود پوٹلی کھولتے ہی وہ سناٹے میں آ گیا... تم جانو، میرا حلیہ ایسے سودے سے کہاں میل کھاتا۔ گردھاری لعل نے اپنے بند کمرے میں پوچھ ہی لیا کہ میں نے وہ سونا کہاں سے چرایا ہے مگر مجھے ایک کہانی سوجھ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ایک کھنڈر سے زمین میں دبی ہوئی دیگ ملی ہے جو سونے کے برتنوں سے بھری ہوئی ہے... اس کے تیور نرم پڑتے دیکھ کر میں نے دھونس بھی جتا ڈالی کہ مجھے پیسے کی کوئی پروا نہیں ہے اور آئندہ میں اُسے ایک تولہ سونا بھی نہیں دوں گا کیونکہ اس نے مجھے چور سمجھا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہنسنے لگا۔ "وہ خرانٹ سا ہوکار میرے جھانسے میں آ گیا اور بار بار میرے پیر چھو کر معافی مانگتا رہا۔ اپنی صفائی میں اتنی بکواس کرتا رہا کہ میں اکتا گیا۔ اس نے خوشامد کا سلسلہ اس وقت ختم کیا جب تک مجھ سے سوگند نہ اٹھوالی کہ میں دیگ سے نکلنے والا ایک ایک رتی سونا بھی اسی کو بیچوں گا۔"

"پھر بھی تمھیں کافی دیر لگ گئی۔"

"اس نے اپنے یہاں تو کسوٹی لگا ہی لی تھی پھر بھی تسلی کے لیے تین ٹکڑے دوسری جگہوں پر بھیجے تھے۔ جب سب نے تصدیق کر دی تو سودا طے ہوا۔ اس دوران میں وہ دھندا بھول بھال کر اپنے کمرے میں میری خاطر تواضع میں لگا رہا۔"

"کھنڈر میں دبی ہوئی دیگ کا خیال کیسے آ گیا تمھیں؟"

"نہ جانے کتنی بار اس کے پاس جانا پڑے... اس مرتبہ توے کے ٹکڑے لے گیا تھا۔ اگلی بار کسی اور برتن کی نوبت آ سکتی ہے مگر وہ ہوشیاری سے سارے ٹکڑے جوڑے گا تو اس کے لیے توے کی اصلیت معلوم کرنا مشکل نہیں ہوگا۔"

"بڑی دُور کی بات سوچی تم نے۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "لوہے کی چادروں کے ٹکڑے لائے تم؟"

"کیسے لاتا؟" اُس نے سادگی سے کہا۔ "رقم کے لیے بریف کیس گردھاری لعل نے اپنے آدمی سے ہی منگوایا تھا میرے لیے تو رقم سنبھالنے کے بعد ایک ایک قدم چلنا دشوار ہو رہا تھا۔"

"میرا کل روانگی کا ارادہ ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے دوران آہستگی سے کہا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"میں تمھیں روک تو نہیں سکتا پھر بھی دو چار روز ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔" اس کا چہرہ اتر گیا اور لہجے میں مایوسی سمٹ آئی۔

اس نے جو کچھ کہا وہ خلوص اور نیک نیتی سے کہا تھا۔ کوشش کے باوجود مجھے اس کے لبشرے پر حرص اور مکاری کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔

میری دانست میں وہ عام سا انسان تھا اور انسان ہونے کے ناتے ہر شخص میں کسی نہ کسی حد تک لالچ' خود غرضی اور مطلب پرستی کے خواص موجود ہوتے ہیں۔ مجھے موہوم سا اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے ٹھکانے لگا کر خود پارس پتھر پر قابض ہونے کے بارے میں نہ سوچ رہا ہو لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس بارے میں اُس کا ذہن بالکل صاف تھا۔

"ٹھہرنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن پاکستان میں مجھے ایک اہم کام نمٹانا ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے بعد کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے تم سونے کا اتنا ذخیرہ کر لو کہ تمھاری آئندہ زندگی مالی طور پر خوشگوار انداز میں گزرتی رہے۔"

"سچ پوچھو تو میرے لیے..."

اُس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اندر سے آشا کی تیز آواز سنائی دی تھی، وہ اپنی ساس سے توے کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

رامو نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ہم دونوں ہی مسکرا دیے۔ "آؤ، ذرا دیکھیں تو کہ ہوتا کیا ہے۔" اُس نے کہا۔

"رسوئی میں تھا۔ صبح میں نے اُس پر روٹیاں پکائی تھیں' پھر اب کہاں گیا وہ توا؟" آشا کی تیز غصیلی آواز سُنائی دی۔

"ہوش میں رہ بہو۔" رام ناتھ کی ماں کی مرتعش آواز میں غصہ نمایاں تھا۔ "مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے' کیا میں نے بیچ کھایا تیرا توا؟ میں اکیلی تو نہیں تھی گھر میں، سیتا سارے وقت میرے ساتھ موجود تھی' پوچھ لے اس سے قسم دے کر۔"

"تو میں اپنے میکے والوں کو دے آئی۔" آشا کی آواز میں غصے اور بے بسی کے ملے جلے اثرات محسوس کیے جا سکتے تھے۔

"مجھے کیا پتہ!" بڑی بی کی آواز جلی بھُنی تھی۔ "تو نے اپنی اماں باوا کو نہ دیا ہوگا تو تیرے آدمی نے بیچ کھایا ہوگا... مجھ دُکھیا کو کیوں بیچ میں گھسیٹ رہی ہو؟"

"سونے کا تھا نا جو میرے آدمی نے بیچ کھایا ہوگا۔" آشا کی جلی کٹی آواز سن کر رام ناتھ نے میرے پہلو میں ٹھوکا دیا۔ "اماں! بھگوان سے ڈرو۔ میرا آدمی ہیرا ہے ہیرا۔ وہ مٹی کھود کر بھی سب کا پیٹ بھرنا جانتا ہے۔۔۔ یہ تم ہی ہو جسے اس گھر کے برے بھلے سے کوئی غرض نہیں، بس دو وقت کی روٹی اور آرام میں فرق نہیں آنا چاہیے پچھلے ہفتے پرانے ہی کرتم نے رسوئی کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا اور بلیوں نے دودھ سے بھری پتیلی الٹ دی تھی مگر میں نے تم سے اُف تک نہ کی۔۔۔ اور لیلیٰ بیچاری سے میں کیا پوچھوں وہ تو مہمان ہے ہماری! گلی کا کوئی لونڈا اٹھالے گیا ہوگا تو اسے جانے تمھاری جوتی۔ بیٹے کی کمائی کا درد ہی نہیں ہے تمھیں۔"

"کیڑے پڑیں تیری زبان میں۔" بڑی بی کلکلا کر بولیں۔ "میری عمر کو پہنچے گی تو پھر پوچھوں گی کہ کیسی کے ساٹھ ہوتے ہیں۔"

"اس عمر میں بھی مجھے کچوکتی رہو گی۔" آشا بلبلا کر مستقبل پر مجادلہ کرنے لگی۔ "تمھارا تو بس نہیں ورنہ میری چمڑی سے اپنی جوتیاں بنوا ڈالو۔"

"جوتیاں!" بڑی بی کی استہزائیہ آواز سنائی دی۔ "تیری کھال کی تو جوتیاں بھی میرے پیروں میں ناسور کر دیں گی۔"

"یہ کیا اُودھم ہو رہا ہے آشا؟" معاملہ بڑھتے دیکھ کر رام ناتھ نے صحن میں نکل کر تیز آواز میں سوال کیا۔

"رسوئی سے توا غائب ہے۔" آشا یک بیک پھوٹ کر رو پڑی۔ "تمھاری ماں کہہ رہی ہے کہ میں اپنے میکے والوں کو دے آئی۔ وہ ایسے ہی ننگے بھوکے ہیں نا کہ ہمارے دو ٹکے کے توے کے لیے جانے کب سے انتظار میں ہوں گے۔"

"بیٹا تیرے سسرال تو سب ساہوکار ہیں۔" بڑی بی کی لرزیدہ للکار گونجی۔ "ایک چور رہوں تو میں ہوں جو تیرا دو کوڑی کا توا بیچ کر اپنا حلوہ مانڈا چلا رہی ہوں۔" اور اسی کے ساتھ رامو کی ماں نے بھی اپنی بیوگی کے حوالے سے بین کر کے رونا شروع کر دیا۔

"خاموش رہو۔" رامو چند ثانیوں تک دونوں گریاں خواتین کو باری باری تکتے رہنے کے بعد آمرانہ انداز میں دہاڑا۔ "میری ماں چور ہے؟" رام ناتھ نے اسی غصیلے لہجے میں جارحانہ تیوروں کے ساتھ اپنی بیوی سے سوال کیا۔

"میں نے کب یہ کہا؟" آشا ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "گھر کی کوئی چیز غائب ہوگی تو میں ان سے نہیں تو کس سے پوچھوں گی؟"

"یہ تو اپنے میکے لے گئی؟" بیوی سے لاجواب ہو کر رامو برہم تیوروں کے ساتھ اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو میں نے بیچ دیا اپنے کسی خصم کو؟" رامو کی ضعیف ماں دشنام طرازی میں خاصی مہارت رکھتی تھی۔

"بند کرو یہ بکواس۔" رامو کو واقعی طیش آگیا۔ "میں ابھی نیا لا دوں گا۔"

"مگر آج میں کیا کروں گی؟ مجھے ابھی روٹیاں پکانی ہیں۔" شوہر کو ساس کے سامنے نیچ ہوتے دیکھ کر آشا تنک کر بولی۔

"میں تنور سے لے آؤں گا۔" رامو غصے میں دہاڑا۔

اس کی آواز میں کوئی ایسا عنصر نمایاں تھا کہ بیوی کے ساتھ اس کی ماں بھی صورتحال کی نزاکت محسوس کر کے سہم گئی۔ اور یوں وہ فساد اختتام کو پہنچا۔

اپنے غصے کو وزن دینے کی نیت سے رامو گھر سے نکلا تو میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ گلی میں گھر سے تھوڑی دور نکل کر وہ ہنس پڑا۔

"کیا یاد آگیا؟" میں نے پوچھا۔

"غلطی میری تھی۔" وہ بولا۔ "توا ایسی چیز ہے جو دن میں دو تین بار گھر والی کے کام آتی ہے سونا بناتے ہوئے یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات کہہ ڈالوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "تمھاری ماں اور بیوی میں بڑی اَن بن رہتی ہے۔"

"ذرا بھی نہیں۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "دونوں میں پیار محبت سے رہتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ساس اور بہو کے بجائے ماں اور بیٹی ہوں لیکن جھڑپ ہو جائے تو اگلی پچھلی باتیں نکال کر خوب فتور مچاتی ہیں۔۔۔ جب سے میری ماں بیوہ ہوئی ہے کچھ زیادہ حساس ہو گئی ہے اور ذرا ذرا سی بات کو اسی حوالے سے دیکھتی ہے۔"

"مگر اس بار تو فساد کا بہانا تم نے فراہم کیا تھا۔"

"کاش کہ میں انھیں بتا سکتا کہ اس بے وقعت توے سے ہم نے کیا کام لیا تھا۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"تمھاری آئندہ کی ضروریات کے۔۔۔" کچھ دور تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد میں نے ادھوری بات کو مکمل کرنا چاہا۔ لیکن رامو نے میری بات کاٹ دی۔

"میں بہت صابر آدمی ہوں۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "دیکھا جائے تو میرے لیے توے کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم ہی کافی ہے۔"

"دو سوا دو لاکھ میں کیا کچھ کر لو گے؟"

"ذاتی مکان اور نئی ٹیکسی خریدنے کے بعد بھی بہت کچھ بچ رہے گا۔" اس کے اندر کا مشقت پسند انسان اس وقت تک کسی سہل کوشی پر آمادہ نہیں تھا جو میرے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔

"پھر بھی میں چاہوں گا کہ کسی ناگہانی ضرورت کے لیے ہمارے پاس کچھ سونا پڑا رہے۔ اس کے لیے مجھ پر کوئی بار نہیں ۔۔۔ تم جتنا لوہا لا سکو لے آؤ۔ اسے سونے میں بدلنے کے بعد ۔۔۔ بے فکری سے واپسی کے سفر کا آغاز کر سکوں گا۔"

"مگر میں اس کا کیا کروں گا؟" اس نے بے بسی کے ساتھ ۔۔۔ سوال کیا۔

"پڑا رہے گا تمھارے پاس۔" میں نے کہا۔ "تمھارے کام نہ آیا تو ۔۔۔ کے ذریعے دوسروں کے کام آسکتا ہے۔۔۔ تمھیں اپنے گرد و پیش ۔۔۔ ہزاروں مستحقین نظر آئیں گے جن کے لیے دو چار سو روپے بھی ۔۔۔ بات ہوں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ اس وقت تم ایسی بات کر رہے ہو۔" ۔۔۔ رضامند کر لینے کے بعد میں نے کہا۔ "لیکن سیٹھ گردھاری لعل کو تم ۔۔۔ زمین میں گڑی ہوئی دیگ کا قصہ محض اس لیے سنایا تھا، کہ ۔۔۔ کے لیے راہ ہموار رہے۔"

"وہ بات اس وقت کی تھی جب مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ۔۔۔ سے کتنی رقم ملے گی۔ رقم سننے کے بعد تو میرا دماغ ہی ہل کر رہ ۔۔۔ تھا۔"

ہوٹل سے روٹیاں لے کر واپس مڑتے ہی وہ چونک پڑا۔ "۔۔۔ گئے۔۔۔ ہمیں وہ بریف کیس چھوڑ کر نہ آنا چاہیے تھا ۔۔۔ کہیں منی بچے نے اس کا ڈھکن توڑ پھوڑ دیا تو گھر میں لوٹ ہی ۔۔۔ لوٹ بکھر جائیں گے۔"

"تو کیا وہ مقفل نہیں ہے؟" ایک لحظے کے لیے میں بوکھلا گیا۔

"نہیں تالا تو لگا ہوا ہے۔"

"پھر فکر کی بات نہیں۔" میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "سیتا کو معلوم ہے وہ اس کا خیال رکھے گی۔"

گھر واپس پہنچ کر پتہ چلا کہ میدان صاف پاتے ہی رامو کے بچوں نے بریف کیس کی طرف رجوع کیا تھا مگر سیتا کی مداخلت کے باعث کامیاب نہ ہو سکے۔

وہ رات میرے لیے بڑی بھاری تھی۔

میں مسلسل یہ سوچتا رہا کہ رامو رازداری کے ساتھ اتنی رقم کی حفاظت کیسے کرے گا۔ پھر جب وہ اس رقم کو خرچ کرنا شروع کرے گا تو لوگوں کو دولت کے حصول کا کیا ذریعہ بتائے گا جب کہ اس کے شب و روز اور آمدنی کے ذرائع رشتے داروں سے لے کر محلے والوں تک ہر ایک کی نگاہ میں تھے۔

کافی دماغ سوزی کے بعد میں نے ایک آدھ تجویز سوچ ہی لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ذریعے ملنے والی رقم کی وجہ سے کسی دشواری سے دوچار ہو۔

دیر سے سونے کی وجہ سے میں تاخیر سے بیدار ہوا۔ اس وقت تک رامو بازار کا ایک چکر لگا چکا تھا۔

گھر کے لیے توا لانے کے ساتھ ہی وہ موٹی آہنی چادر کے کئی ٹکڑے بھی لے آیا تھا۔ مزید عقل مندی یہ کی تھی کہ جلد سوکھنے والے سیاہ رنگ کا ایک ڈبہ اور برش بھی لیتا آیا تھا تاکہ لوہے کو سونے میں بدلنے کے بعد رنگا جا سکے اور ان ٹکڑوں کی قدر و قیمت بادی النظر میں کسی پر ظاہر نہ ہو سکے۔

ناشتے کے بعد رامو نے کچھ اہم مشوروں کے حوالے سے خود کو میرے ساتھ بیٹھک میں محصور کر لیا اور ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

"یہ بتاؤ کہ تم اس رقم کو کس طرح استعمال کرو گے؟"

"مکان اور نئی ٹیکسی کے بارے میں بتایا تو تھا تمھیں۔" اس نے قدرے حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچانک یہ تبدیلیاں رونما ہوں گی تو تمھارے واقف کاروں میں شبہات پیدا نہیں ہوں گے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے اس پر کافی غور کیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مکان خرید ضرور لوں گا لیکن آشا تک کو نہیں بتاؤں گا کہ وہ میری ذاتی ملکیت ہے۔ بات جب کرائے کے بہتر مکان میں منتقلی کی ہوگی، تو کوئی بھی شبہ نہیں کر سکے گا۔ یہی ترکیب ٹیکسی کے بارے میں بھی سوچی ہے البتہ گاڑی نئی کے بجائے پرانی ہی لینی پڑے گی۔"

"وہ کیوں؟"

"یہاں گاڑی لینے میں بھی بڑے جھمیلے ہیں۔ گاڑی کی درخواست کے ساتھ یہ بتانا ہوگا کہ رقم کہاں سے آئی اور اس پر انکم ٹیکس ادا کیا یا نہیں۔ اور ایک مرتبہ انکم ٹیکس والے پیچھے لگ جائیں تو مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

"میں نے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ یہاں ہندوستان میں لاٹریوں اور انعامی ٹکٹوں کا تو رواج ضرور ہوگا۔"

"ہاں ہاں۔" اس نے پرزور انداز میں میری تائید کی۔ "ایک لاکھ روپے کی لاٹری کے لالچ میں کئی برسوں سے ریڈ کراس کا ٹکٹ لیتا آرہا ہوں مگر آج تک انعام نہیں نکلا۔"

"تھوڑی سی محنت کرو تو کسی انعامی ٹکٹ والے کا پتہ چلاؤ اور اسے لاکھ سے دس پانچ ہزار زیادہ دے کر ٹکٹ لے لو۔ جب تم انعامی رقم اپنے نام سے وصول کر لو گے تو کچھ نہیں چھپانا پڑے گا۔ ڈنکے کی چوٹ پر پیسہ خرچ کر سکو گے۔"

"تمھاری تجویز بہت مناسب ہے۔" اس نے سونے میں بدلے ہوئے پہلے آہنی ٹکڑے پر برش سے رنگ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے

بمبئی اور مدراس کے بڑے شہروں میں یہ دھندے بہت ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ لوگ اپنا کالا دھن اسی طرح سفید کرتے ہیں کبھی واسطہ تو نہیں پڑا لیکن سُنا ہے کہ لاکھ کے انعام پر دس سے پندرہ ہزار فالتو دینا پڑتے ہیں۔"

"میں آج جا رہا ہوں جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔ تم نے ابنالہ میں مجھے بہترین رفاقت مہیا کی ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ سکھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"پاکستان میں تمہارا قیام کہاں ہوگا؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔" میں نے اپنے وجود میں انتقام کی پھریری سی محسوس کی۔ "مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔ پھر جہاں ڈیرہ ڈالا تمہیں ضرور آگاہ کروں گا۔"

"مگر اس وقت تک تو میں بھی گھر بدل چکا ہوں گا۔" وہ بولا پھر اُسے خود ہی خیال آیا۔ "خیر میں تمہیں اپنے سسرال کا پتہ دے دوں گا۔"

تھوڑی دیر میں لوہے کے تمام ٹکڑے سونے میں تبدیل ہو کر سیاہ رنگ میں چھپائے جا چکے تھے۔ پھر میں نے اس سے وہ کتیا بھی مانگ لیا جو وہ ایک روز پہلے توے کو ٹکڑوں میں کاٹنے کے لیے بازار سے لایا تھا۔

کتیے کو سونے میں تبدیل کرنے کے بعد ہم نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

"تمہیں جتنی رقم کی ضرورت ہو وہ بریف کیس سے لے لو۔" دروازہ کھولتے کے ساتھ ہی رامو نے مجھے پیشکش کی۔

"کس لیے؟ مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں۔"

"واپسی کا سفر مفلسی کے عالم میں تو نہیں ہو سکتا نا!"

"میرے لیے وہ رقم کافی سے زیادہ ہے جو تم نے طلائی کیبل فروخت کر کے میرے حوالے کی تھی۔" میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

باہر آ کر رامو نے ہماری واپسی کا اعلان کر دیا۔ اور اس کی بیوی آشا ہکا بکا رہ گئی۔ سیتا نے بھی اس انکشاف پر یوں اجنبیت کا اظہار کیا جیسے اسے روانگی کے پروگرام سے ذرا بھی واقفیت نہ رہی ہو۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ہم دونوں روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ رام ناتھ ہمیں اسٹیشن تک چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ مجھے خود بھی اس کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی ورنہ ٹرین میں نشستیں حاصل کرنا دشوار ہو سکتا تھا۔

گھر سے روانہ ہو کر ہم بازار میں رکے تو ایک مقامی انگریزی اخبار پر نظر پڑی اور میں چونک گیا۔

اس میں پہلے صفحے پر ایک تین کالمی سرخی چوہدری رندھیر کے موہن پورے والے گودام میں ایک ہتھوڑی کے سونے میں بدل جانے سے متعلق نمایاں تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر بلا توقف وہ اخبار خرید لیا۔

"کیا ہے اس میں؟" رامو نے سرسری لہجے میں پوچھا جس کا مطلب تھا کہ اسٹال پر لگے ہوئے مقامی زبانوں کے اخبارات میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔

"کسی ایسے ہوٹل میں چلو جہاں پرائیویٹ کیبن ہو تو تمہیں بھی پڑھ کر سناؤں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے بدن میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس کیں۔

رامو کائیاں آدمی تھا۔ بھانپ گیا کہ میں آس پاس سے گزرنے والوں کی موجودگی میں اسے کچھ نہ بتا سکوں گا۔ لہٰذا وہ تیز قدموں سے واپس چل دیا۔ اور میں سیتا کے ہمراہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ رامو کو تو خیر کچھ پتہ ہی نہ تھا لیکن میں جلد از جلد اس سنسنی خیز خبر کے مندرجات سے تفصیلی طور پر واقف ہونا چاہتا تھا۔

ہمارے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی لہٰذا جب رامو اسٹار ہوٹل کے مرعوب کن احاطے میں داخل ہوا تو اس کی تقلید میں میں نے جھجک محسوس نہیں کی۔

رامو ٹیکسی ڈرائیور ہونے کے باعث شہر کے ہوٹلوں اور ان کی خصوصیات سے بخوبی واقف تھا لہٰذا وہ ہمیں ریستوران کے بجائے بار روم سے موسوم اس ہال میں لے گیا جہاں باقاعدہ کیبن تو نہیں تھے لیکن بعض نشستوں کے درمیان ایسے آرائشی تختے ضرور تھے جو شائستگی کی حدود میں خلوت فراہم کرتے تھے۔

ایک خالی گوشے کی طرف بڑھتے ہوئے ایک جوڑے کو دیکھ کر وہ قدرے ٹھٹکا اور چار نشستوں والے ایک کنج عافیت میں جا دبکا۔ اس اثنا میں میری نگاہیں اس جوڑے کا جائزہ لے چکی تھیں۔

شہابی رنگت، گلابی چہرے اور غزالی آنکھوں والی وہ خاتون مسکرا رہی تھی تو اس کے رخساروں میں خفیف سے گڑھے پڑ رہے تھے جنہیں دیکھ کر بے اختیار ڈمپل کی بوتل بعد میں انڈیل لینے کو جی چاہتا تھا جب کہ اس کے مقابل بیٹھا ہوا مرد انتہائی مکار، گھاگ اور اوباش نظر آ رہا تھا۔ اس کی سکڑی ہوئی نگاہوں میں کوندتی ہوئی چمک اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ اس حسین خاتون کی صحبت میں سرور کی اس منطقی سرحد پر تھا جس سے عبور کرتے ہی کوئی بھی سلجھا ہوا مے نوش سڑک پر پھینکے جانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

"کیا ہے اس اخبار میں؟" سیتا نے سوال کیا اور میں چونک پڑا۔ مجھے یاد آیا کہ اس جوڑے کی اگر کوئی اہمیت تھی تو ثانوی تھی، اصل اہمیت انگریزی اخبار کی اس خبر کی تھی جس کے مطالعے کے لیے

ہم اس عالمِ خرابات میں پہنچے تھے۔

میں نے میز پر اخبار کھولا تو ملکارتے ہوئے اعضا والی ایک خوش اندام خاتون ہمارے سروں پر آموجود ہوئی۔

میں نے کتابی چہرے والی حسینہ کے تھوڑ میں ڈیمپل کے دو ڈبل پیگ اور سیتا کے لیے تازہ لائم جوس کے ایک گلاس کا آرڈر دیا اور اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

باہر اس وقت دن نکلا ہوا تھا لیکن اسٹار ہوٹل کے اس گوشے میں اس وقت بھی ڈھلتی ہوئی رات کا رنگین جادو کام کر رہا تھا۔

وہ خبر بڑی عجیب تھی۔

چوہدری رندھیر کے موہن پورے کے گودام کا ایک ملازم اس خبر کا ذریعہ تھا جب کہ گودام کے مالکان نے سختی سے اپنے ملازم کے بیان کی تردید کی تھی۔ اسی تضاد سے انبالہ کے اس روزنامے نے ایک خبر تراشی تھی۔

ملازم کے بیان کے مطابق پچھلے روز گودام کھولا گیا تو راجہ ہوٹل سے نکالی ہوئی الماریوں کی کچھ تعداد گودام کے فرش پر بکھری ہوئی تھی اور اس کے قریب ہی ایک ہتھوڑی پڑی ہوئی تھی۔ جس کے آہنی حصے کا رنگ سیاہ کے بجائے سونے کی طرح زرد تھا۔ اس واقعہ کی فوری طور پر مالکان کو اطلاع دی گئی مگر ان کے آنے سے پہلے اس ملازم کو ہتھوڑی آزمانے کا موقع مل گیا اور اس نے محسوس کیا کہ کیل پر ضرب لگانے سے ہتھوڑی کے سر پر نمایاں نشان بن گیا جس کا مطلب تھا کہ ہتھوڑی سونے کی ہو چکی تھی۔ مالکان نے آتے ہی ہتھوڑی پر قبضہ کر لیا اور عملے کو اس واقعے کے بارے میں زبان بند رکھنے کی ہدایت کی۔ مذکورہ ملازم نے ہتھوڑی کے بارے میں بحث کرنی چاہی تو اسے حساب دے کر نوکری سے نکال دیا گیا، اور وہ سیدھا اخبار کے دفتر جا پہنچا۔

اس کے بیان کی روشنی میں اخباری نمائندوں نے مالکان سے رجوع کیا تو انہوں نے پورے واقعے کو سراسر بکواس قرار دیتے ہوئے، اپنے موہن پورے کے گودام میں کسی بھی غیر معمولی واقعے کی تردید کر ڈالی۔

میرے لیے تو مالکان کی تردید ہی کافی تھی کیونکہ میں نے خود رام ناتھ کے ساتھ مل کر ان کے یہاں کارروائی کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کے ملازم کا بیان درست تھا اور وہ محض طلائی ہتھوڑی ہضم کرنے کے لیے پورے واقعے سے انکار کر رہے تھے۔

"مگر ہتھوڑی کیسے سونے میں بدل گئی؟" پوری خبر سننے کے بعد رامو نے تشویش زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ بے خیالی میں وہ پارس پتھر سے چھو گئی ہو۔"

میں نے آہستگی سے کہا۔ "اخبار والوں نے بہت سے قیاسات کا اظہار کیا ہے لیکن پارس پتھر کی طرف کسی کا خیال نہیں گیا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح اس پہلو تک پہنچ ہی جائیں۔"

اس اثنا میں سرو قد ویٹرس مطلوبہ مشروبات لے آئی۔ میں نے گلاس میں سوڈا ملانے کے بعد جوں ہی اس سیال سے لبوں کو تر کیا مجھے وہ خاتون یاد آ گئی جسے دیکھ کر رامو کے قدم اچانک ٹھٹکے تھے۔

"کون ہیں وہ دونوں؟" میں نے نگاہوں سے اس سمت میں اشارہ کرتے ہوئے اس سے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"عورت سے تو میں واقف نہیں مگر وہ مرد بہت مردود ہے۔" اس کے لہجے کا تاثر بھی الفاظ سے مختلف نہیں تھا۔ "کئی بار اس نے پورے پورے دن کے لیے میری ٹیکسی حاصل کی تھی، یوں مجھے اس سے واقفیت ہوئی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے مگر اس وقت اسے اپنے سامنے اس خاتون کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہو گا۔"

"خاتون دلفریب اور باوقار ہے۔" میں نے دوسرا گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور سیتا زیرِ لب مسکرانے لگی۔

"مگر اس کی یہاں موجودگی کا مطلب ہے کہ وہ اپنی مٹی پلید کرانے پر آمادہ ہے۔" رامو بولا۔ "یہ شخص اشتہاری فلمیں بنانے والی کمپنی میں ملازم ہے اور ایسی عورتوں کی گھات میں رہتا ہے جو کسی بھی طرح سینما یا ٹیلی وژن کی اسکرین پر اپنا چہرہ دیکھنا چاہتی ہیں اور اپنے شوق کے ہاتھوں اس کے چنگل کا شکار ہو جاتی ہیں۔"

"قصور تو عورتوں کا بھی ہے نا!" سیتا نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

"شوق کو اپنی کمزوری بنانے والوں کو ہر ایک اپنا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔"

اپنے گلاس خالی کر کے ہم نے بل کی رقم ادا کی اور ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔

اسٹیشن پہنچے تو امرتسر جانے والی ٹرین کی آمد میں نصف گھنٹہ باقی تھا۔ ٹکٹ خرید کر ہم تینوں پلیٹ فارم پر ایک چوبی بینچ پر جا بیٹھے۔

رامو کے ساتھ ہماری رفاقت محض چند روز کی تھی مگر اس نے جس بھرپور انداز میں میرا ساتھ دیا تھا وہ میرے لیے ناقابلِ فراموش تھا۔ انبالہ میں سر چھپانے کے لیے ایک محفوظ ٹھکانے سے لے کر پارس پتھر کے حصول کی کوششوں تک میں وہ پیش پیش رہا تھا۔

اس کا ساتھ چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہو رہا تھا مگر یہ خوشی بھی تھی کہ جانے سے پہلے مالی طور پر میں نے اس کو اتنا سہارا دیا تھا کہ وہ عمر بھر ایک نئے اور بھرپور انداز میں زندگی گزار سکتا تھا۔

ٹرین آئی تو وہ مجھ سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا اور جب وہ الگ ہوا تو اس کی آنکھیں نمناک ہو رہی تھیں۔

ہم ٹرین میں سوار ہوتے تو وہ اس وقت تک پلیٹ فارم پر

کھڑا ہاتھ ہلاتا نظر آتا رہا جب تک ٹرین کے قدرے خم کھا جانے کے باعث پلیٹ فارم نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

ٹرین میں اپنی نشست پر بیٹھ کر میں ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

میرا ہندوستان کا پہلا سفر ہنگاموں اور قتل و غارت گری کے واقعات سے پُر تھا۔ میں اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا تھا اور بھانت بھانت کے انسانوں کے اس سمندر میں سیتا کو کھو کر بے سروسامانی کے عالم میں غیر قانونی راستے سے ہی فرار بھی ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے چپے چپے پر قانون کے محافظ میرے متلاشی تھے مگر کچھ عرصے بعد میرا دوسرا دورہ حیرت ناک حد تک اپرسکون ثابت ہوا۔

پارس پتھر جو میرے لیے ایک بھولا بھالا سا خواب بن کر رہ گیا تھا، یوں قبضے میں آیا جیسے قدرت نے اسے میرے لیے ہی محفوظ رکھا ہوا تھا۔

امرتسر پہنچے تو انبالہ اسٹیشن سے ملنے والی معلومات کی تصدیق ہو گئی۔ اس رات پاکستان کے لیے کوئی ٹرین نہیں تھی لہٰذا وہ رات ہمیں وہیں بسر کرنی تھی۔

اسٹیشن کے قریب سستے ہوٹلوں کی بہتات تھی مگر ان ہی میں ایک دو ستھرے ہوٹل بھی تھے۔ ٹرین کے انتظار میں شب گزاری کے لیے بآسانی کمرہ دے دیا گیا۔

پارس پتھر کے حصول کا مرحلہ طے ہو چکا تھا اور میں بلاشرکتِ غیرے اس نادر الوجود نگینے کا مالک بن چکا تھا جس میں کوئی بھی ظاہری حسن نہ ہونے کے باوجود اس کے خواص ناقابلِ یقین حد تک خوشگوار تھے۔

اس کے بعد یوں تو میرے لیے اپنے بڑے بھائی کا سراغ لگانا ضروری تھا مگر لاہور والے چوہدری بشیر کی ذات میں نہ جانے وہ کون سی ناگوار بات تھی جو مجھے اس سے الجھ پڑنے پر اکسا رہی تھی۔ جہاں تک بھائی جان کو جوئے کی عادت میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری کا تعلق تھا تو وہ اتنی بھاری نہیں تھی۔ بھائی جان بالغ اور عقل مند تھے، اپنے برے بھلے کو سمجھتے تھے اگر چوہدری بشیر نے انہیں اپنے ڈھرے پر لگانا چاہا تھا تو وہ اپنا دامن بچا سکتے تھے۔

اس الزام سے قطع نظر چوہدری بشیر کی کوئی اور بات تھی جو مسلسل میرے ذہن میں چبھ رہی تھی۔

آخرِ کار میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کراچی جا کر بھائی جان کا سراغ لگانے سے قبل چوہدری بشیر سے دو ٹوک ملاقات کرنی ہی بہتر ہو گی تاکہ راستے کا کام راستے ہی میں نمٹا دیا جائے اور واپسی کا بوجھ سر پر سوار نہ رہے۔

سیتا رات کو بے فکری سے گہری نیند سوئی جب کہ میں رات گئے تک سگریٹیں پھونکتا رہا مگر صبح بیدار ہوا تو ذہن بالکل ہلکا ہو رہا تھا۔

میں غسل سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی اور میں نے اپنے بدن پر تولیہ لپیٹ کر دروازہ کھول دیا۔ راہداری میں کھڑے ہوئے دونوں افراد پر نگاہ پڑتے ہی میں چند ثانیوں کے لیے سناٹے میں آ گیا کیوں کہ ان کے جسموں پر پولیس کی وردی سجی ہوئی تھی ان کے ساتھ ہی ہوٹل کے عملے کا ایک رکن بھی موجود تھا۔

"فرمایئے۔" میں نے فوری طور پر خود کو سنبھالتے ہوئے پُرخلاق لہجے میں سوال کیا۔

"تمھاری بیگم بھی ساتھ ہے؟" ان میں سے ایک سپاہی نے مہذب بننے کی کوشش میں غیر مہذب سوال کیا۔

"کیا اس سے کوئی کام ہے؟"

"تم دونوں کو انچارج صاحب نے کوتوالی میں بلایا ہے۔" اس نے خشک لہجے میں مجھ پر اپنا مدعا ظاہر کیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"کپڑے پہن لوں یا ایسے ہی چلوں؟" میں نے بغور ان سپاہیوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کپڑے بدل کر نیچے میرے دفتر میں آ جائیں۔" سپاہیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے ہوٹل کے عملے کے رکن نے کہا۔ "اتنی دیر میں ہم چائے پی لیں گے۔"

"پھر ہمارا ناشتہ بھی کمرے ہی میں بھیج دیں۔" میں نے بشاشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "خالی پیٹ کے ساتھ کوتوالی جانا اچھا نہیں لگتا۔"

وہ محض مسکرا کر رہ گیا اور ان دونوں کے ساتھ واپس ہو لیا۔

"جلدی نکلو۔" دروازہ بند کر کے میں نے تولیہ ایک طرف اچھالتے ہوئے سیتا سے کہا۔ "کوتوالی سے ہماری طلبی کا پروانہ آیا ہے، شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

ہمارے پاس کپڑوں وغیرہ پر مشتمل ایک دستی بیگ کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے، پارس پتھر احتیاط سے ایک اندرونی جیب میں رکھا اور پاسپورٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر تیار ہو گیا۔

ان چند ثانیوں میں سیتا بھی اپنا حلیہ درست کر چکی تھی۔

میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوتوالی کا رخ کرنا ہمارے حق میں کسی بھی طرح بہتر ثابت نہ ہو سکے گا لہٰذا میں نے فوری طور پر دستی بیگ

اور فاضل کپڑے وہیں چھوڑ کر ہوٹل کے عقبی راستے سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اگر ہم بلا توقف اسی وقت نکل بھاگتے تو ہمیں زیادہ وقت نہ ملتا کیونکہ جب ویٹر ناشتہ لے کر آتا تو کمرہ خالی پاتے ہی منیجر کو اطلاع دیتا اور ہماری تلاش میں پولیس اپنی مہم کا فوری آغاز کر دیتی۔

کوتوالی میں ہماری طلبی کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمیں کسی واضح الزام کے تحت نہیں بلایا گیا تھا بلکہ شبہ کی بنیاد پر یا شاید کسی رسمی بازپرس کے لیے طلب کیا گیا تھا مگر مجھے یہ خوف لاحق تھا کہ راہو کے بقول اگر امرتسر کی اس کوتوالی میں بھی ہم دونوں کے دھندلائے ہوئے انعامی پوسٹر آویزاں ہوئے اور کسی اہلکار کی قوت شناخت نے زور مارا تو ہم کسی بھی طرح اپنی گلوخلاصی نہ کرا سکیں گے۔

اس خوف کے پیش نظر روپوشی ہی مناسب تھی لیکن یوں غیر متوقع طور پر ہمارے غائب ہونے سے پولیس والے لامحالہ یہی نتیجہ اخذ کرتے کہ ہم کسی بنا پر قانون کا سامنا کرنے سے گریزاں تھے اور یوں ہم مجرم قرار دے دیے جاتے تھے۔

ناشتے کے انتظار کے دوران میں اپنی حکمت عملی طے کر چکا تھا میرے پاس اس وقت دو موثر ہتھیار تھے۔

ایک زہریلے تیروں والی شیشی اور دوسرے کم و بیش تین ہزار کی رقم اور میں وقتِ ضرورت ان دونوں سے پوری طرح کام لینے کے لیے آمادہ تھا۔

مجھے اس ہوٹل کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن میرا خیال تھا کہ سپاہیوں کو انتظار کی طوالت سے بچانے کے لیے ہمارا ناشتہ غیر معمولی عجلت میں بھیجا گیا تھا۔

بیرا ناشتہ رکھ کر چلا گیا تو چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے دروازہ کھول کر دھڑکتے دل کے ساتھ باہر جھانکا اور میدان صاف پا کر باہر نکل گیا۔ سیتا نے میرے پیچھے آ کر کمرے کا دروازہ آہستگی سے بند کر دیا اور ہم تیزی سے اس طرف ہو لیے جدھر مطبخ کے قریب عقبی راستہ موجود ہونے کا امکان تھا!

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم کسی سے ٹکرائے بغیر ایک عفونت زدہ تنگ راہداری سے گزر کر عقبی سڑک پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے!

چند قدم آگے ایک ٹیکسی خالی ہو رہی تھی جس پر ہم نے فوری طور پر قبضہ کر لیا۔

امرتسر کے بازاروں اور محلوں کے نام میرے لیے اجنبی تھے لہٰذا جب ڈرائیور نے میٹر گھمانے کے بعد منزل کے بارے میں دریافت کیا تو فوری طور پر مجھے ایئرپورٹ کے علاوہ کوئی نام نہ سوجھ سکا اور ٹیکسی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

تشویش اور بے یقینی کے اس عالم میں سگریٹ کے پے در پے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے میں نے پچھلے چند منٹوں میں کیے گئے فیصلوں کا ناقدانہ جائزہ لیا تو یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ عجلت میں کسی فاش غلطی کا ارتکاب نہیں ہوا تھا۔

ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے کے لیے مجھے یہ بتانا پڑا تھا کہ صبح میری پاکستان روانگی تھی لہٰذا ہوٹل سے ہماری روپوشی کی خبر پاتے ہی کوتوالی انچارج اپنے چند ماتحتوں کو اسٹیشن کی طرف روانہ کر سکتا تھا لہٰذا میں نے اپنی مقصد براری کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنا آلۂ کار بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

"امرتسر میں کب سے ٹیکسی چلا رہے ہو سردار جی؟" میں نے جمود توڑتے ہوئے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"بیس برس ہو گئے جی۔" وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولا۔ "دیکھو اور کتنے دن چلانی پڑتی ہے چکر کی روزی ہے اپنی!"

اس کو اسٹارٹ مل چکا تھا لہٰذا قدرے توقف کے بعد اس نے سوال داغ دیا۔ "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"لاہور!" میں نے کہا۔

"واہ واہ!" وہ لاہور کا نام سنتے ہی جھوم اٹھا۔ "کیا شہر بنایا گرو جی نے .... جب بٹوارہ نہیں ہوا تھا تو جی! ہر برس لاہور جاتا تھا۔ اب تو برسوں گزر گئے ہیں، دیکھو کب جانا ہوتا ہے جی داروں کے اس شہر میں!"

"اتنی تعریف نہ کرو لاہور کی سردار جی! کسی پولیس والے نے سن لیا تو پاکستانی جاسوس سمجھ کر اندر کرا دے گا۔"

"ہم بھنت دیتے ہیں جی!" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "ہم لوگوں کے تو دوست ہوتے ہیں یہ۔ ہمیں اندر کریں گے تو ان کے دو چار بھائیوں کا خرچہ بند ہو جائے گا۔"

"پھر تو ہم بلاوجہ ہی بھاگے!" میں متاسفانہ لہجے میں بڑبڑایا۔

"بھاگے؟" وہ چونک کر میرا منہ تکنے لگا مگر لحظہ بھر میں پھر سڑک کی طرف متوجہ ہو گیا ورنہ ٹیکسی کہیں جا لڑتی۔

"ہاں کوتوالی سے بلاوا آیا تھا۔۔۔ ہم ڈر کر بھاگ نکلے کہ کہیں کسی چکر میں نہ پڑ جائیں۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "ہمیں ہر صورت میں آج پاکستان پہنچنا ہے۔"

"پاکستان پہنچنا ہے!" وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بڑبڑایا۔ "تو پھر ایئرپورٹ کیا لینے جا رہے ہو تمہیں تو اسٹیشن جانا چاہیے تھا لاہور کی ٹرین تھوڑی دیر میں چھوٹنے ہی والی ہوگی۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا شبہ امڈ آیا۔

"ہم جہاز سے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"جہاز سے؟" اس پر پے درپے حیرت کے حملے ہو رہے تھے

کہ امرتسر سے تو پاکستان کے لیے کوئی جہاز نہیں جاتا۔"

"تم بھی بڑے بھولے ہو سردار جی۔۔۔ یہاں سے نئی دہلی وہاں سے کراچی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ بھی غنیمت ہے کہ ہمارا جہاز سے جانے کا ارادہ تھا۔ ہمیں غائب پا کر پولیس نے سب سے پہلے اسٹیشن پر ہی دھاوا بولنا ہے اور ہم نہایت اطمینان سے نکل جائیں گے۔"

"مگر تمہارے پاس تو کوئی سامان ہی نہیں ہے۔"

"فالتو سامان ہوٹل میں چھوڑ دیا۔۔۔ اصلی مال جیبوں میں ہے۔" میں نے اپنے کوٹ کی دونوں جیبوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے فوری طور پر ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی اور یوں سمٹ کر اپنی نشست میں بیٹھ گیا جیسے کسی اہم مشن پر جا رہا ہو!

اس کی سبک رفتاری اور یک بیک خاموشی سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ہمیں ایئرپورٹ پر اتارتے ہی کوتوالی کا رخ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ایئرپورٹ پر اس نے ہمیں ٹیکسی سے اتارتے ہوئے یوں غور سے دیکھا جیسے ہمارے خد و خال ذہن نشین کرنا چاہتا ہو۔

کرایہ وصول کر کے اس نے دوبارہ ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اسٹینڈ پر کسی مسافر کی تلاش کے بجائے واپس گھوم کر شہر کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔

یہ سب اتنی سرعت سے ہوا کہ شاید کوئی ہماری طرف توجہ بھی نہ دے سکا اور ہم دونوں بظاہر بے پروائی سے ٹہلتے ہوئے ایک طرف چل دیے۔

چند منٹ بعد ہم دوسری ٹیکسی میں واپس اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

اسٹیشن میں داخل ہونے سے قبل میں نے خاصے غور سے وہاں ہجوم کا جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آ سکی۔

ٹکٹ خرید کر ہم ہجوم میں سے محتاط انداز میں گزرتے ہوئے مطلوبہ پلیٹ فارم پر پہنچے تو مجھے اچانک ہی ان دونوں سپاہیوں کی بوکھلائی ہوئی صورتیں نظر آئیں جنھوں نے ہوٹل کے کمرے میں ہمیں کوتوالی چلنے کا پیغام دیا تھا۔

میں سیتا کے ہمراہ فوری طور پر اس طرف مڑ گیا جہاں مختلف اشیاء کے دو اسٹال بنے ہوئے تھے۔

اس مقام پر سپاہیوں کی نگاہوں سے محفوظ رہتے ہوئے ہم بآسانی ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لے سکتے تھے۔

وہ بے چارے نہ جانے کتنی دیر سے وہاں بھٹک رہے تھے۔ ان کے بوکھلائے ہوئے چہروں سے یتیمی ٹپک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے غول سے بھٹکی ہوئی دو بھیڑیں واپسی کی راہ نہ پا کر چاروں طرف ممیاتی پھر رہی ہوں۔

ہم دونوں کے غائب ہونے کی اطلاع شاید انھوں نے کوتوالی تک نہیں پہنچائی تھی۔ کیونکہ اس طرح ان کی اہلیت پر حرف آ سکتا تھا۔ ہوٹل والوں سے ملنے والی معلومات کے سہارے وہ بے چارے ہمیں تلاش کرنے اسٹیشن آ پہنچے۔ ان کا خیال ہو گا کہ اسٹیشن سے بآسانی ہمیں پکڑ کر وہ کوتوالی لے جائیں گے اور یوں ان کی کارگزاری کسی تنقید کا نشانہ بننے سے بالکل محفوظ رہے گی۔

ہمارے پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی وہ بے نیل و مرام لوٹ گئے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو رہی تھیں تو قدرت از خود ان کا سدباب بھی کرتی جا رہی تھی۔

جب تک وہ دونوں سپاہی ہمارے غائب ہونے کی خبر لے کر کوتوالی پہنچتے اس وقت تک انچارج کو ٹیکسی ڈرائیور کے ذریعے ہماری ایئرپورٹ روانگی کی اطلاع مل چکی ہوتی پھر جب وہ سپاہی ریلوے اسٹیشن پر اپنی بے سود تگ و دو کا قصہ سناتے تو دو اور دو چار کے کلیے کے تحت ریلوے اسٹیشن کو قطعی نظرانداز کر کے ساری توجہ ایئرپورٹ پر مرکوز کر دی جاتی۔

پلیٹ فارم پر پاکستان جانے والی ایکسپریس ٹرین تیار کھڑی تھی جس میں چار بوگیاں ہندوستانی اور چار پاکستانی تھیں اور ٹرین پر بظاہر رش نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے ایک ڈبے میں جا بیٹھے۔

چند ہی منٹ بعد اسٹیم انجن نے وسل دی اور ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔

یہ سفر تقریباً پندرہ منٹ جاری رہا اور ٹرین اٹاری کی سرحدی چوکی پر روک دی گئی وہاں امیگریشن اور کسٹم کا عملہ موجود تھا جس نے تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا۔

امیگریشن کاؤنٹر پر مسافروں سے قدرے سخت رویہ اختیار کیا جا رہا تھا۔ وہاں بیٹھنے والا متعدد مسافروں سے اندراجات کے بارے میں موشگافیاں نکال رہا تھا اور اس نکتہ آفرینی کی قیمت پانچ روپے فی پاسپورٹ وصول کر رہا تھا جو ویسے تو زیادہ محسوس نہیں ہوتی مگر بعض خستہ حال مسافروں کو دیکھ کر وہ پانچ روپے بھی زیادہ محسوس ہوتے تھے۔

امیگریشن کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے ہمارے پاسپورٹ کھولے تو ان کے اوراق کے درمیان اسے دس دس کے دو نوٹ نظر آئے اور اس نے بلا استفسار مہر لگا کر پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیے، اپنا حق المحنت وہ جیب میں منتقل کرنا نہیں بھولا تھا!

پہلے میرا ارادہ زیادہ رقم رکھنے کا تھا لیکن میں نے محض اس خیال سے گریز کیا کہ کہیں وہ شخص رقم کی مناسبت سے دال میں کالا ہونے کی رائے قائم نہ کر بیٹھے اور یوں چشم زدن میں ہم رکاوٹ سے گزر گئے۔

کسٹم والوں کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا لہٰذا وہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا بلکہ متعلقہ افسر نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ہم دونوں ہندوستان سے جانے والے عجیب مسافر تھے جو خالی ہاتھ چلے آ رہے تھے۔

جب تک اٹاری کے اسٹیشن سے ٹرین حرکت میں نہ آئی تمام تر منطقی تحفظ کے باوجود میں کسی بھی لمحے خطرے کے نمودار ہونے کا دھڑکا لگا رہا۔

امرتسر میں آخری لمحات پہ پیدا ہونے والا مہیب خطرہ مقدر کی یاوری کے باعث بہت سکون سے گزر چکا تھا!

اٹاری کے مقابلے میں واہگہ والے ذرا سیر چشم ثابت ہوئے۔ وہاں ہمارے لیے تو کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن سامان ساتھ لانے والوں کے ساتھ جو لین دین ہوا اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ واہگہ پر مختلف کاموں کی شرحیں اٹاری سے کم از کم دوگنی ضرور تھیں!

ان تجربات سے گزر کر آخر کار ہم بخیر و عافیت لاہور پہنچ ہی گئے۔

لاہور میرا اپنا شہر تھا۔ وہاں اسٹیشن سے نکلتے ہی میں نے ایک اچھے ہوٹل کا رخ کیا اور وہاں کمرہ حاصل کر لیا۔

سفر کی تکان جو بھی رہی ہو، تازہ پانی کے غسل نے طبیعت خوش کر دی اور ہم دونوں پردے کھینچ کر بستر پہ دراز ہو گئے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" سیتا نے آزادی اور بے فکری کا گہرا سانس لیتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"سب سے پہلے ایک مکان کا بندوبست کرنا ہوگا" میں نے اسے آگاہ کیا۔ "ہوٹل میں نقل و حرکت نگاہوں میں رہتی ہے۔"

"تو کیا لاہور میں زیادہ دن رہنے کا ارادہ ہے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"چند روز تو رکنا ہی ہوگا" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "بھائی جان پر جو کچھ گزر رہی ہوگی اس میں دو چار روز کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر میں ایک بار چوہدری بشیر سے روبرو بات کرنی چاہتا ہوں۔"

امرتسر میں چوہدری بشیر کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا ذہن قدرے دھندلایا ہوا تھا مگر لاہور آنے کے بعد مجھے اپنے زخم تازہ محسوس ہو رہے تھے۔

میری آبائی دکان اور مکان — دونوں کا خریدار چوہدری بشیر تھا۔ بھائی جان جوئے میں اس کے مقروض تھے جس کا مطلب تھا کہ ساری بربادی کا سبب محض جوا ہی تھا۔

ایک زمانے میں خود تاش کے کھیل کا بادشاہ رہا تھا اور میرا یقین تھا کہ اس کھیل میں کوئی بھی شخص اس وقت تک مسلسل نہیں ہارتا جب تک فریقِ مخالف اس کے ساتھ بے ایمانی کرنی شروع نہ کر دے۔

سوچتے سوچتے ایک مرتبہ پھر میرے دل و دماغ میں انتقام کا جوالامکھی دہکنے لگا لیکن چوہدری بشیر اس اعتبار سے خوش نصیب تھا کہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی خونخوار اور بے رحم صفدر علی اپنے ماضی کو بھول جانے کا عہد کر چکا تھا۔

اس بار میں پاکستان میں اپنا گھر بسانے کی آرزو لے کر آیا تھا اور سیتا کے ساتھ بے داغ و پُرسکون زندگی گزارنی چاہتا تھا کہ ماضی کی محرومیوں کا ازالہ ہو سکے۔

جہاں جہاں میں نے لہو کی ہولی کھیلی، اپنی ذات کے ساتھ لوگوں کی تمام تر محبتوں اور نفرتوں کے باوجود مجھے وہاں بے سروسامانی کے عالم میں فرار کی راہ اختیار کرنی پڑی تاکہ اپنی زندگی کو قانون کے بے رحم چنگل سے محفوظ رکھ سکوں۔

پہلی بار جب میں نے انسانی لہو میں اپنے ہاتھ رنگے تو مجھے پاکستان سے بھی بھاگنا پڑا مگر اب میں بھاگتے بھاگتے تھک چکا تھا۔ اس بار پاکستان کو میں نے اپنے لیے جائے پناہ بنائے رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لہٰذا میرے ہاتھوں چوہدری بشیر کی زندگی کو تو کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں اسے زندگی کی ان تمام مسرتوں اور آسائشوں سے محروم کر کے اپنے انتقام کی آگ سرد کر سکتا تھا جو اس نے دوسروں کی امنگوں کو فنا کر کے بے ایمانی سے حاصل کی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سامنا ہوتے ہی چوہدری بشیر مجھ سے بہت تپاک سے ملا تھا اس کے لب و لہجے میں بھی احترام اور شائستگی برقرار تھی مگر سطوت علی اور مظہر علی سے میرے مفروضہ تعلق کا اظہار ہوتے ہی اس کا نرم لہجہ خشک اور تحقیر آمیز ہو گیا تھا!

وہ دن میں نے آرام کرنے اور سوچنے میں گزارا۔ اگلی صبح مکان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا بڑے شہروں کی ایک یہی خوبی ہوتی ہے کہ جیب گرم ہو تو دنیا کی کسی بھی شے کا حصول ناممکن نہیں رہتا، عورت، عزت، شہرت اور اعتبار جیسے ناقابلِ فہم سودے اتنے سستے داموں طے ہو جاتے ہیں کہ خریدار کو جیبیں الٹنے کی حسرت رہ جاتی ہے۔

پہلی اسٹیٹ ایجنسی کے مالک نے میز پر بیٹھے بیٹھے تین مکان بتائے مگر میرے لیے ان کا محلِ وقوع پسندیدہ نہیں تھا لہٰذا جوں ہی اسے میری جیب کے وزن کا احساس ہوا وہ بڑے اعتماد اور [illegible] بازی کے ساتھ کرسی سے اٹھ گیا۔

"آپ شوقین معلوم ہوتے ہیں — آیئے میں دو تین ایسے [...]ں دکھاؤں کہ طبیعت خوش ہو جائے گی آپ کی!"

"شوقین اپنے شوق کے ہاتھوں اکثر ٹھوکریں کھاتے ہیں" میں [...]ہک ہونے کے ناتے تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے ان میں شامل نہ [...]ں۔ بات بس اچھے اور مختصر مکان تک محدود رکھیں۔ کہاں [...]ہتے ہیں آپ مجھے؟"

"دو مکان گلبرگ میں ہیں، ایک ماڈل ٹاؤن میں اور چوتھا [...]یہ شادمان کالونی میں ہے ـــــ!" اس نے گنوانا شروع کر دیا۔

"بس گلبرگ چلیں!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے یاد [...]ا کہ چوہدری بشیر بھی اسی علاقے میں مقیم تھا۔ اگر میں اپنے دشمن کا [...]ی نہیں تو ہم محلہ ضرور ہو سکتا تھا۔

گلبرگ کا پہلا مکان مختصر تھا اور بڑے پلاٹ کے ایک رہائشی [...]ے کو الگ کر کے یوں بنایا گیا تھا کہ رہائشی کمروں کی دیواریں مشترک [...]یں لیکن دوسرا مکان وسیع و عریض لان کے ساتھ تین خوابگاہوں [...]نشست گاہوں پر مشتمل تھا اور پڑوسیوں کی مداخلتِ بےجا سے بڑی [...]حد تک محفوظ نظر آتا تھا۔

میں نے ایک ہزار روپے پیشگی ادا کر کے اس مکان کا [...]رایہ نامہ وغیرہ مکمل کرانے کی ہدایت کر دی کیونکہ دیگر خواص کے علاوہ وہ مکان ضروریاتِ زندگی سے بھی مزین تھا۔

پھر میں بازار سے ایک انچ موٹا گول چمکدار سریا لیتا ہوا ہوٹل پہنچ گیا۔ اس سریے کو میں نے آری سے ایک ایک انچ لمبے دس ٹکڑوں میں کٹوا لیا تھا۔

سیتا میری منتظر تھی۔ اسے اپنی کارگزاری سے آگاہ کرتے ہوئے میں نے دو ٹکڑوں کو سونے میں تبدیل کیا اور دوبارہ ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔

رنگ محل کے صرافے میں دو تین چکر لگانے کے بعد میں نے ایک دکان کا انتخاب کیا اور اندر داخل ہو گیا۔

سیلز مین نے فوری طور پر چھت میں لگے ہوئے طاقتور قمقموں کی قطاریں روشن کر دیں اور سراپا اخلاق بن کر میری طرف متوجہ ہوا مگر میں اس سے مخاطب ہوئے بغیر اس گہری دکان کے اندرونی حصے میں میز کے عقب میں بیٹھے ہوئے جسیم شخص کی طرف بڑھتا چلا گیا جس سے آگے شیشے کی دیواروں والا ایک کمرہ تھا جس پر اندر سے پردے تنے ہوئے تھے۔

"جی بھا تیا جی؟" اس فربہ اندام نے شاید مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اپنی میز کی اوپری دراز کھول لی تھی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے اس کا دایاں ہاتھ دراز میں تھا!

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی ناگہانی متوقع کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کسی خودکار آتشیں اسلحے کو اپنے داہنے ہاتھ کی گرفت میں لے چکا تھا!

"مجھے سیٹھ صاحب سے کام ہے!" میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"فرماؤ!" وہ دراز سے ہاتھ نکالے بغیر بولا۔

"کچھ مال دکھانا ہے!" میں نے اس کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

اس نے ہونٹ چڑھا کر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی "تم غلط جگہ آئے ہو بھا تیا جی! یہ دھندے اگلی گلی میں ہوتے ہیں!"

"شکریہ!" میں واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"بات سنو!" چند قدم بڑھ جانے کے بعد میرے کانوں میں اسی کی آواز آئی۔ میں پلٹا تو اس بار وہ داہنا ہاتھ میز سے نکال چکا تھا۔

"مال کہاں ہے؟" میرے قریب پہنچنے پر اس نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر رازدارانہ لہجے میں مختصر سا سوال کیا۔

"میرے پاس —!" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ اس اثنا میں دوکان میں روشن کی جانے والی اضافی روشنیاں گل کی جا چکی تھیں!

"آؤ — ذرا نمونہ دکھا دو!" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بے پروایانہ لہجے میں بولا۔ "شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں!"

اسی لمحے میں اس کی نیت بھانپ گیا!

پہلی بار کے انکار میں شاید یہ احتیاط اس کے مدِنظر رہی ہو کہ میرے ذریعے کسی حریف نے اس کو پھنسوانے کی کوشش نہ کی ہو۔ مگر امکانی طور پر وہ ایک ذہنی جھٹکا بھی تھا جس کے ذریعے اس نے مجھ پر اپنی ذہنی برتری قائم کرنے کی کوشش کی تھی!

"آؤ!" اس نے شیشے والے کیبن کا دروازہ کھول کر کہا اور میں بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔

اندر سے اس کمرے کی فضا ہی کچھ اور تھی۔ فرش پر دودھیا رنگ کا ایک سادہ مگر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا ایک گوشے میں آبنوسی رنگ کے صوفے رکھ کر مختصر سی نشستگاہ بنائی گئی تھی جس کے وسط میں اسی رنگ کی میز موجود تھی!

بقیہ جگہ میں مکمل شیشے کے متعدد شوکیس تھے جو بیش بہا جواہرات اور زیورات سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک صوفے سے ملحقہ گوشے میں کئی ٹن وزنی آہنی تجوری پڑی ہوئی تھی جس پر ایک ہلکی خوردبین بھی موجود تھی!

اس وقت کمرے میں واجبی سی روشنی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ چھت میں لگے ہوئے ریفلکٹرز روشن ہوتے ہی اس کمرے میں چکاچوند پیدا کر دیتے ہوں گے!

"بیٹھو۔" اس نے آہنی تجوری کے قریب والا صوفہ سنبھالتے ہوئے کہا اور میں اس کے مقابل بیٹھ گیا!

اس کی یاد دہانی سے پہلے ہی میں نے طلائی سریے کا ایک ٹکڑا اس کے سامنے میز پر رکھ دیا جس کے بارے میں اس نے نہ کسی عجلت کا اظہار کیا۔ نہ فوری ردِ عمل کا!

"کتنے ٹکڑے ہیں؟" قدرے سکوت کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں جوڑتے ہوئے سرسری سا سوال کیا۔

"فی الحال اس کی بات کرو!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں!

"اس کی رسید؟" وہ اس ٹکڑے کو چھونے سے قبل سب کچھ جان لینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ سودے کی ضخامت کے لحاظ سے دام لگا سکے!

"ولایتی مال ہے بھائی صاحب!" میں نے قدرے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اس کی رسید کون لیتا اور کون دیتا ہے!"

"کہاں سے لاتے ہو؟"

"اس جرح کے بجائے مجھے جواب چاہیے" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر نہیں لینا تو اس کے لیے کوئی بہانہ کیوں تلاش کر رہے ہو؟"

"غصہ مت کھاؤ بھا تیا جی!" اس کا لہجہ طنز آمیز ہو گیا۔ "مخبری ہو گئی تو پولیس یہی باتیں الٹا لٹکا کر دریافت کرے گی.... ہمیں بھی ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ چوری چکاری کا مال خرید لیں تو کسی بھی وقت ہماری ساکھ مٹی میں مل سکتی ہے!"

"بہرحال یہ چوری کا مال نہیں ہے....!" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں بھی یوں ہی منہ اٹھا کر نہیں چلا آیا ہوں، میری پشت پر جو لوگ ہیں ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور انہیں اپنی کسی کارروائی کے لیے قانون نہیں چھاننا پڑتا۔"

"بس بس!" اس کا لہجہ یک بیک خلیقانہ ہو گیا۔ "میں یہی تو جاننا چاہ رہا تھا۔ برا مت ماننا بھا تیا جی! آج کل کے چور اور اٹھائی گیرے بھی ایسی وضع میں آتے ہیں کہ ہم آنکھیں بند کر کے ہر ایک پہ بھروسا نہیں کر سکتے!"

یہ کہتے ہوئے اس نے کسوٹی اٹھائی اور اس طلائی سریے کے مختلف حصوں پر تین چار کس لگا کر ان کا معائنہ کرتے ہوئے سر ہلانے لگا!

اس نے اپنے اطمینان کے بعد جو دام لگائے وہ خاصے کم تھے میں نے اس پر احتجاج کیا تو اس کے پاس جواب تیار تھا۔

"یہ اس ٹکڑے کے دام ہیں! جب زیادہ مال لاؤ گے تو پیسے بڑھا دیں گے!" اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"یہ کسی قیمت پر خریدا گیا تھا۔ اس پر دو پیسے ملنے ضروری ہیں" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "وزن کے اعتبار سے تم اسے بھی کم نہیں کہہ سکتے۔ ایسی بات کرو کہ مجھے دوسرا گھر نہ دیکھنا پڑے!"

تھوڑی سی تکرار کے بعد سودا بن گیا اور اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے کال بیل کا بٹن دبا کر ایک آدمی کو طلب کیا اور وہ ٹکڑا اس کے حوالے کر دیا۔ "ذرا دوڑ کر وزن کرا لاؤ!"

اس کی ہدایت سن کر میں چونک پڑا۔ "کہاں بھیج رہے ہو اسے؟"

اس نے سر ہلا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جب ملازم چلا گیا تو پہلی بار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ نظر آئی۔ "وہم میں نہ پڑو، تمہاری بہتری کے لیے بھیجا ہے۔ ایسے سودے میں دھرم کانٹے کا وزن چلتا ہے.... ہماری دکان میں کیے جانے والے وزن کے بارے میں شاید تمہارے دل میں شبہ پیدا ہو جائے!"

تھوڑی دیر بعد وزن کے مطابق باسٹھ ہزار کے لگ بھگ رقم اس نے تجوری سے نکال کر میرے سامنے ڈھیر کر دی!

سو روپے کے نوٹوں کی چھ گڈیاں میں نے اسی کی دکان کے ایک غیر مطبوعہ تھیلے میں لپیٹیں بقیہ رقم جیبوں میں اڑس کر وہاں سے نکل آیا!

اس دوکاندار سے بحث و تمحیص میں خاصا وقت صرف ہوا مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ آدمی معقول تھا اور آنکھ بند کر کے کمائی کے پیچھے لپکنے کا عادی نہیں تھا جس کا نتیجہ عموماً ذلت و خواری کی صورت میں نکلتا ہے!

راستے سے میں نے ایک بریف کیس خریدا تو بے اختیار مجھے رامو یاد آ گیا۔

پارس پتھر کی کارفرمائیوں کے باعث تین روز پہلے رامو رقم سے بھرا بیگ گھر لایا تھا اور اس روز میں آسودگی کا وہ بوجھ لادے جا رہا تھا!

ہوٹل سے شام کے وقت میں نے اسٹیٹ ایجنسی والوں کو فون کیا تو کاغذات تیار تھے لہٰذا میں ایک بار پھر روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

"میں کب تک کمرے میں پڑی رہوں گی؟" سیتا نے شکایت کی اور میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔

اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس معاہدے کے کاغذات پر میں نے دستخط کر کے ایک کاپی اپنے پاس رکھ لی اور پیشگی تین ماہ کا کرایہ فی الفور ادا کر دیا۔ گھر میں موجود ساز و سامان کی فہرست کی تصدیق کے لیے وہ میرے ساتھ ہو لیا!

سیتا اس گھر میں داخل ہوتے ہی خوش ہو گئی تھی۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے اپنا کمیشن بلا وجہ نہیں لیا تھا بلکہ صبح بات طے ہو جانے کے بعد مکان کی اچھی طرح صفائی اور جھاڑ پونچھ کرا دی تھی تاکہ قبضہ لینے کے بعد ہمیں فوری بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑے!

"چوکیدار....؟" سامان کی طویل فہرست کی جانچ پڑتال کے بعد اس نے زبان کھولی مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ چوکیدار کی ضرورت تو وہاں ضرور تھی مگر اس کے لیے میں آزادانہ، اپنی مرضی سے انتخاب کرنا چاہتا تھا!

"کوئی کار.... دو چار دن کے لیے مل سکے گی؟" میں نے اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ برآمدے میں آتے ہوئے سوال کیا۔

"بالکل!" وہ خوشی سے بولا۔ "معقول جاپانی کار دو ڈھائی سو روپے یومیہ پر مل جائے گی، شوفر کا معاوضہ الگ ہو گا!"

"یار مجھے کار بھیج ہی دو" میں نے جیب سے مزید ایک ہزار روپے اسے دیتے ہوئے کہا۔ "مگر شوفر نہیں چاہیے!"

"ٹھیک ہے!" اس قدر کھری دکانداری پر وہ بہت مسرور تھا۔ "ابھی میرا ڈرائیور گاڑی چھوڑ جائے گا یہاں۔"

"اس میں بھی شاید ایک روز کا کرایہ تمہارا حق ہو گا!" میں نے اسے کار تک چھوڑتے ہوئے ازراہِ مذاق کہا اور وہ انکسار میں انکار پہ آمادہ ہو گیا میں بمشکل اسے سمجھا سکا کہ میں محض مذاق کر رہا تھا!

کرائے کا ہی۔ مگر ہمیں گھر میسر آ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سرمئی رنگ کی کار بھی آ پہنچی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ آزادی اور اپنی سرزمین کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ میں اپنی ذات میں نیا اعتماد اور ولولہ ابھرتا محسوس کر رہا تھا!

مکان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے سیتا پر شوخیوں کا دورہ پڑتا رہا۔ مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا!

شام جب رات کے اندھیرے میں ڈھلنے لگی تو میں سیتا کو ساتھ لے کر ڈرائیو پر نکل گیا۔ اسی دوران ہوٹل کا حساب بھی بیباق کر دیا پھر اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھا کر ہم لاہور کی سڑکوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے گھر آ گئے!

گھر پہنچنے کے بعد جب میں اندر جانے کے بجائے برآمدے میں ہی ٹھٹکا تو سیتا مجھے گھورنے لگی۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

"چوہدری بشیر!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا!

"کل نہیں مل سکتے اس سے؟" وہ ٹھنک کر بولی۔

"نجانے اس سے کب تک ملاقاتیں کرنی ہوں گی!" میں نے اسے سمجھایا۔ "بس تھوڑی دیر میں لوٹتا ہوں۔"

اس سے اجازت پاتے ہی میں فوراً لوٹ گیا!

مجھے یقین تھا کہ اتنے بڑے گھر میں تنہائی اس جیسی دلیر عورت کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنے گی!

گلبرگ کے راستوں کے بارے میں میرا ذہن بھولا بھولا سا ہو رہا تھا مگر پھر بھی محض دس منٹ کی تگ و دو کے بعد میں نے اپنی منزلِ مقصود تلاش کر لی۔

کار کے ہارن کے جواب میں فوراً ہی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی سے چوکیدار مؤدبانہ انداز میں میری طرف لپکا تھا اور میرا نام دریافت کر کے اسی کھڑکی سے اندر روپوش ہو گیا!

مجھے انتظار کے ان لمحات میں اپنے منہ کا ذائقہ بدلتا ہوا محسوس ہوا جو شاید میرے وجود میں ابھرنے والے دھیمے دھیمے مگر گہرے اشتعال کا نتیجہ تھا!

چند ثانیوں بعد چوکیدار پھر اسی کھڑکی سے نمودار ہوا اور اسے دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔



"آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟" چوکیدار نے میرے قریب آکر مؤدبانہ مگر محتاط لہجے میں دریافت کیا جیسے غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ چھوڑنا چاہتا ہو۔

"سلطان۔" میں نے ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی سے سر نکال کر کسی قدر سرد بلکہ درشت لہجے میں کہا۔

"کیا کام ہے؟" نام کی تصدیق ہوتے ہی چوکیدار تن کر کھڑا ہو گیا اور اُس کے لہجے میں بھی خشونت عود کر آئی۔

"چوہدری بشیر سے مجھے ایک ذاتی کام ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیا وہ گھر پر موجود ہیں؟"

"آرام فرما رہے ہیں۔" اس نے گردن کو ہلاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ان کا حکم ہے کہ کام پوچھ کر انہیں مطلع کر دوں۔" وہ رُک کر فاتحانہ انداز میں ہنسا پھر بولا۔ "چاہو تو صبح نو بجے مل سکتے ہو چوہدری صاحب سے۔"

"نو بجے؟" میں نے غصے کی ایک ہولناک اضطراری لہر پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا اور چوکیدار نے یوں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی جیسے میری بے بسی اور تحقیر سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

"نو بجے کا مطلب نو بجے ہی ہوتا ہے۔" وہ واضح طور پر مجھے اپنی برتری جتلانے پر تُلا ہُوا تھا۔ "اگر جلدی آ گئے تو باہر انتظار کرنا پڑے گا۔ دیر ہوئی تو لوٹا دیے جاؤ گے۔ چوہدری صاحب بہت مصروف اور وقت کے پابند آدمی ہیں۔"

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا کیونکہ چوکیدار کی ہٹ دھرمی کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے ساتھ جو توہین آمیز سلوک کر رہا تھا اس میں چوہدری بشیر کی مرضی شامل تھی۔

میں نے اس اُمید پر کار کا انجن اسٹارٹ رکھا تھا کہ چوکیدار، اجازت ملنے پر میرے لیے پھاٹک کھولے گا تو میں کار اندر لے جاؤں گا مگر اس کے حوصلہ شکن رویّے کے باعث مجھے ریورس گیئر میں کار کو واپس لے جانا پڑا۔

گھر پہنچا تو سیتا میری منتظر تھی۔

"بہت جلدی لَوٹ آئے؟" اس نے پورٹیکو میں میری سمت کا دروازہ کھولتے ہوئے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"اگر میری اتنی جلدی واپسی غیر متوقع ہے تو منتظر کیوں تھیں؟" میں نے ذہن پر چھائی ہوئی کوفت دور کرنے کی نیت سے ہنس کر سوال کیا۔

"تمھارے انتظار میں مزہ آتا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "بس تمھارے گھر سے نکلتے ہی واپسی کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

"یہاں برآمدے میں ڈر نہیں لگ رہا تھا تمھیں؟" میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کمرے میں لے جاتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈر؟" اُس نے حیرت سے کہا۔ "کس بات کا ڈر؟"

"کوئی چور اچکا۔ یا کوئی بدمست اور بدنیت آدمی۔"

"چور اچکا آتا تو ہاتھ پیر تڑوا کر واپس جاتا۔ بدمست آ جاتا تو اس کے دماغ کا سارا گند اس کی ناک کے راستے بہا دیتی۔"

میں ہنس پڑا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن یہ یاد رکھو کہ اب ہم قانون سے آزاد وادیوں میں نہیں رہ رہے ہیں۔۔۔ ہمیں یہاں اپنا مستقل ٹھکانا بنانا ہے لہٰذا ہمیں اُلجھنوں سے اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے ذرا سی احتیاط ہاتھا پائی سے ہر حال میں بہتر ہوتی ہے۔"

"بس اب میں تمھارا مقصد سمجھ گئی۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا "اس بارے میں تمھیں دوبارہ مجھے ٹوکنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"مگر یہ تو بتاؤ۔" قدرے توقف کے بعد ہی اسے اپنا بھولا ہوا سوال یاد آ گیا۔ "تم تو چوہدری بشیر سے ملنے گئے تھے پھر اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے؟"

"میرا نام معلوم ہوتے ہی اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔" میں نے صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے حلق میں تلخی سی گھلتی محسوس کی۔

"وہ بہت کمینہ شخص ہے وہ۔۔۔ پھر اب کیا کرو گے؟"

"اِس وقت انکار کیا ہے صبح نو بجے بلایا ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھوں گا کہ کیا بولتا ہے۔ اُس کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگائے بغیر میں اس سے نہیں ٹکرانا چاہتا۔"

"شخصیت میں کیا رکھا ہوگا اس کی۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "پکڑ کر اس بُری طرح مار لگاؤ کہ وہ آئینے میں بھی خود کو نہ پہچان سکے۔"

"کرنا یہی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مگر خود کو قانون کی گرفت سے محفوظ رکھتے ہوئے پیش قدمی کرنی ہوگی۔"

"قانون۔۔۔ قانون۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر تیز لہجے میں بولی۔ "ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم دونوں نادیدہ سلاخوں کے حصار۔۔۔ میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ باہر والے ہم سے من مانی زیادتیاں کرتے رہیں اور ہم پنجروں میں بند بندروں کی طرح محض غرا غرا کر اپنا خون سلگاتے رہیں۔۔۔ آخر تم خود کو اس قدر بے بس کیوں تصور کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں پاکستان سے نہیں نکلنا چاہتا۔۔۔ میں ابھی اپنی سرزمین کے لیے بھی اجنبی ہوں اور چوہدری بشیر کے وسیع مراسم ہوں گے۔ اگر اُس پر ادھورا ہاتھ پڑا تو میری ضمانت بھی مشکل ہو کر رہ جائے گی۔"

"شاید تم درست کہہ رہے ہو۔" وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر بولی۔ "یہاں میرا مختصر سا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ پیسے کے بل پر یہاں ہر چیز سپاٹ ہو جاتی ہے۔"

"یہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن جن لوگوں کو پیسے کا

مزہ لگ جائے گا وہ اپنی نجی فہرستوں میں ہمارا نام درج کر لیں گے اور حیلے بہانے سے ہمیں مسلسل تنگ کرتے رہیں گے۔ میں اس قسم کی بلیک میلنگ کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔"

"اُف۔" وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے مسہری پر بیٹھ گئی۔ "شریفانہ زندگی اختیار کرنا بھی کس قدر دشوار کام ہے۔"

"ابھی ابتدا ہے۔" میں ہنس دیا۔ "جیسے جیسے شرافت کا خمار گہرا ہوتا جائے گا، ان زیادتیوں کو ہنس کر برداشت کرنے کی عادی ہوتی جاؤ گی۔"

اپنے پہلے گھر میں وہ ہمارا پہلا دن تھا سیتا مصر تھی کہ وہ رات کے کھانے کے لیے گھر ہی میں کچھ پکاتی مگر میں اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔

"مگر کھانا تو ہم کھا چکے تھے۔" گھر سے کچھ دُور نکل جانے کے بعد سیتا نے اچانک تحیّر آمیز لہجے میں کہا۔

اور اس کے یاد دلاتے ہی مجھے اپنی ذہنی کیفیت پر ہنسی آ گئی۔ چوہدری بشیر سے ملاقات میں ناکامی پر کھوپڑی میں ایسا شدید اُبال آیا تھا کہ میں نہ صرف اپنا تھوڑی دیر پہلے کا کھایا پیا بھول گیا تھا بلکہ سیتا کو بھی اسی ذہنی۔۔۔ میں بہا لے گیا۔

"یہ بھول نہیں ہے بلکہ تم واقعی بھوکے ہو۔" سیتا نے صورتحال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر پیٹ پوجا بروقت نہ کی جائے تو ذہن مفلوج ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کھا پی کر تم خود کو تر و تازہ محسوس کرو گے۔"

اس نے جو کچھ کہا تھا وہ بعد میں درست ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ پیٹ خالی ہونے کے ساتھ ساتھ میں ذہنی طور پر آسودگی محسوس کر رہا تھا۔

گھر واپس لوٹنے تک میں چوہدری بشیر کے بارے میں ایک حکمتِ عملی اپنے ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔

اگلی صبح میں آٹھ بجے گھر سے نکل گیا اور گلبرگ کے علاقے میں پہنچنے کے بعد دیدہ دانستہ چوہدری بشیر کے وسیع و عریض مکان سے اگلی گلی میں پہنچ گیا۔

اس گلی میں سُست روی سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے ایک درخت کے نیچے دو آدمی کھڑے نظر آ گئے جو آسودہ حالوں کی اس بستی میں اپنی وضع قطع کے اعتبار سے اسی علاقے کے مکینوں کے خدمتگار نظر آ رہے تھے کیونکہ اُن کے بشروں پر اجنبیوں جیسی سراسیمگی کے بجائے بھرپور اعتماد رقصاں تھا۔

میں نے ان کے قریب کار روک لی۔

"چوہدری بشیر کہاں رہتے ہیں بھائی صاحب؟" میں نے کار میں بیٹھے بیٹھے اُن سے نرم دوستانہ لہجے میں سوال کیا۔

"چوہدری بشیر!" اُن میں سے ایک نے ذہن پر زور دینے والے انداز میں دہرایا۔ ویسے وہ دونوں ہی اپنے مذاکرات بھول کر میری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

"اونچا قد، بھاری بدن اور بڑی بڑی آنکھیں۔" میں نے اپنے حافظے کی مدد سے چوہدری بشیر کا حلیہ دہرانا شروع کیا۔

"اوہ بشیر کھونا!" دوسرے نے حلیہ سنتے ہی کہا۔ "وہ چوہدری کدھر سے ہو گیا۔ کام کیا ہے اس سے؟"

"کام وام تو کیا ہے۔ بس مجبوری لے جا رہی ہے اس کے پاس۔" میں نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"وہ پیر جی کے نام ہی سے مشہور ہے۔ اگلی گلی میں بائیں ہاتھ پر تیسرا یا چوتھا مکان ہے اس کا۔" وہ کہتے کہتے گاڑی کی کھڑکی کے قریب آ گیا۔

میرے نرم مصالحانہ رویّے نے اسے لاشعوری طور پر میرا ہمدرد بنا دیا تھا لہٰذا وہ جھک کر دھیمی آواز میں بولا۔ "روپیہ سود پر لینا ہے اس سے؟"

میں نے سر کو نفی میں جنبش دی اور معاملہ اس کے قیاس پر چھوڑ دیا۔

"فرصت ہو تو ذرا دیر کے لیے میرے ساتھ آ جاؤ۔" میں نے موقع غنیمت پا کر اُن سے درخواست کی اور وہ دونوں نظروں ہی نظروں میں باہمی تبادلۂ خیال کے بعد گاڑی میں بیٹھ گئے۔

چوہدری بشیر کے بارے میں جس بے لاگ انداز میں انہوں نے بات کی تھی اس سے مجھے یہ اُمید ہو چلی تھی کہ شاید ان سے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔

میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر پیشگی اپنے برابر والے کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے نوٹ کو ہاتھ لگائے بغیر تحیّر زدہ لہجے میں کہا۔

"رکھ لو۔" میں نے سُرخ نوٹ اس کی گود میں ڈال دیا۔ "یہ تمھارا انعام ہے۔ اگر چوہدری بشیر سود پر روپیہ دیتا ہے تو دوسرے غلط کاموں میں بھی ملوث ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تمھاری وجہ سے میں اس کے چکر میں پھنسنے سے بچ جاؤں۔"

"سُنا ہے کہ اس کے سارے ہی دھندے غلط ہیں۔" وہ سو کا نوٹ اپنی جیب میں اُڑستے ہوئے بے نیازی سے بولا۔ "سُود پر قرضہ دینے والی بات تو خیر سب کے علم میں ہے کیونکہ اسی محلّے کے دو تین آدمیوں سے لین دین پر اس کا جھگڑا ہو چکا ہے۔ باقی سب اندازے ہی اندازے ہیں۔ کیونکہ وہ محلے میں کسی سے نہیں ملتا۔"

"مجھے اس نے نوکری کے لیے بُلایا ہے۔" میں نے ان کے سامنے اپنی پوزیشن کی وضاحت ضروری خیال کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمھاری باتیں درست ہیں تو اس کی ملازمت میں مجھے نہ جانے کیسے کیسے غلط

کاموں میں ملوث ہونا پڑے گا۔"

"محلے والوں سے وہ ملتا نہیں۔۔۔ بعض بڑے بڑے افسر روز اس کے یہاں آتے ہیں۔ پولیس والوں سے بھی اس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ روز شام کو اس کے گھر میلے کا سماں رہتا ہے اور رات گئے جب گاڑیوں کی واپسی شروع ہوتی ہے تو اُن میں بہکے ہوئے شرابی بھی ہوتے ہیں۔ اور بے شرم جوڑے بھی مگر یہ بات پورے علاقے میں مشہور ہے کہ پیر جی کے مُنہ لگنے والا کوئی بھی شخص سُکھ کے زیادہ دن نہ دیکھ سکا۔"

"یعنی اُس کے دشمن مار دیے جاتے ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا اور گاڑی کھیل کے ایک ویران میدان کے کنارے روک دی۔

"شاید مار بھی دیے جاتے ہوں۔" اُس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "ہمارے سامنے تو میاں علاءالدین کا قصہ ہے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر پیر جی سے چالیس ہزار کا قرضہ لیا تھا اور ایک ہزار روپیہ مہینہ سُود کا دیتا تھا۔ اتفاق سے تیسرے مہینے میاں علاءالدین کے پاس رقم آگئی جو انھوں نے لوٹانی چاہی تو پیر جی نے مزید نو ہزار کا مطالبہ کر ڈالا۔ اس کا کہنا تھا کہ رقم کم از کم ایک سال کے لیے دی گئی تھی اور وہ ہر صورت میں بارہ ہزار سود کا حقدار ہے۔ محلّے کے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر چھ ہزار پر معاملہ طے کرا دیا جو پیر جی کو پسند نہیں آیا۔ مگر بادلِ نخواستہ اس نے قبول کر لیا۔ پھر پندرہ دن بھی نہ گزرے تھے کہ پولیس نے میاں علاءالدین کے گھر چھاپا مارا اور دو کلو ہیروئن کی برآمدگی کے ساتھ اُسے پکڑ لیا۔ اس کی بڑی بھاگ دوڑ ہوئی مگر پچاس ہزار روپے جرمانہ اور دو سال قید بامشقت اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بن گئی۔

"ہوسکتا ہے کہ میاں علاءالدین ہیروئن کا کام کرتا ہو؟" میں نے کہا۔ "یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس طرح پیر جی نے انتقام لیا؟"

پیچھے والا یوں ہنسا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ ڈالی ہو۔ "جس دن عدالت سے میاں علاءالدین کو سزا ہوئی۔" اس کا ساتھی کہہ رہا تھا۔ "اسی روز پیر جی جیل میں اُن سے ملنے پہنچا تھا اور محلے کے دو تین افراد کے سامنے بس اتنا کہہ کر لوٹ آیا تھا کہ میاں جی آئندہ کبھی دل میں بےایمانی آئے تو اپنے اس انجام کو یاد رکھنا۔ سزا چھ برس کی بھی ہوسکتی تھی مگر میں نے اپنے رسوخ سے اُسے کم کرایا ہے۔"

"مجھے اس بدمعاش پیر جی سے ٹکرانا چاہیے۔" میں محض اُن دونوں کو سُنانے کے لیے بلند آواز میں بڑبڑایا۔ "اگر یہ لوگوں کی زندگیاں تباہ کر رہا ہے تو اس کا سر کچلنا ضروری ہے۔"

"جو فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔" پیچھے والے نے مجھے تنبیہ کی۔ "اُس سے ٹکر لینا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ سُنا ہے کہ اس کی کوٹھی میں ایک بڑا تہہ خانہ بھی ہے جہاں ہر شام جوا ہوتا ہے اور وہیں اس کے ذاتی قیدی بھی رکھے جاتے ہیں جن کے ٹکڑے بھی اڑا دیے جائیں تو باہر والوں کو بھنک تک نہ مل سکے گی۔"

"پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" میں نے انھیں اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں بھوکوں مرنا گوارا کرلوں گا مگر ایسے ظالم اور گناہگار شخص کی غلامی ہرگز نہیں کروں گا۔"

"تم اُسے ٹیلیفون پر دھمکیاں دو۔" اسی نے کہا۔ "وہ بوکھلا کر ساری چوکڑی بھول جائے گا۔"

"تم بھول رہے ہو کہ وہ بارسوخ آدمی ہے۔" میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "وہ فوراً اپنے ٹیلیفون کے ساتھ ایک مشین لگوالے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے پکڑنے میں کامیاب ہو ہی جائے۔"

"ہم تو جاہل آدمی ہیں۔" میرے برابر میں بیٹھا ہوا شخص قدرے توقف کے بعد بولا۔ "تم پڑھے لکھے اور ہوشیار معلوم ہوتے ہو۔ تم ہی کوئی طریقہ سوچو۔ ہم سے جہاں تک بن پڑے گا۔ ہم تمھاری مدد کریں گے۔"

"ایسا نہ ہو کہ میری مدد کرنے میں تم اپنے موجودہ مالکان کے لیے دشواریاں کھڑی کر دو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم اپنے موجودہ مالکوں کی نوکری چھوڑ کر میرا ساتھ دو۔"

"کیوں بھائی عبدالغنی؟" میرے برابر میں بیٹھا ہوا شخص غالباً اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے بولا۔ "کیا یہ ہمارے لیے ممکن ہے؟"

"گاؤں میں میری بیوی اور چار بچے مہینے کے خرچ کیلئے منی آرڈر کا انتظار کرتے ہیں۔" عبدالغنی نے مجھ سے کہا۔ "اور یہی حال کمال الدین کا ہے۔ منی آرڈر میں چند دن کی دیر ہو جائے تو گھر سے تار آجاتا ہے۔"

"تمھیں جو کچھ تنخواہ ملتی ہے وہ میں فراہم کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے بظاہر قدرے تذبذب کے بعد کہا۔

"تم؟" کمال الدین کے چہرے پر حیرت اُمڈ آئی۔ "تم تو خود بےروزگار ہو، ہمارا بوجھ کیسے سہار سکو گے؟"

"بُرا نہ مانو تو بتاؤں کہ میری اور تمھاری بےروزگاری میں بڑا فرق ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میرے پاس پس انداز کی ہوئی اتنی رقم ہے کہ میں ایک دو مہینے تک بےنوکری سے اپنا گزارا کر سکتا ہوں۔"

"شوق تو ہمیں بھی ہے کہ کسی بُرے آدمی سے ٹکرائیں۔" کمال الدین نے کہا۔ "ایسے قصے فلموں میں دیکھ کر بڑا جوش آتا ہے مگر ہم تمھارے ساتھ مل کر اس کا کیا بگاڑ سکیں گے؟ وہ تو چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔"

"بس تم ایک کام کرو کہ اپنے مالکوں سے ایک ایک مہینے کی چھٹی لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم دس پندرہ روز میں فارغ ہو جاؤ گے۔"

کچھ دیر کی گفتگو کے بعد طے پایا کہ میں شام کے چار بجے کھیل کے اسی میدان کے قریب اُن کا انتظار کروں اور پھر انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔

اس بندوبست کے بعد میں نے فوری طور پر انھیں فی کس پانچ سو روپے دیے جو انھوں نے حیرت اور خوشی کے ساتھ قبول کر لیے۔ کیونکہ اُن کی شرائطِ ملازمت میں دو وقت کے کھانے اور رہائش کے علاوہ دو سو روپے نقد شامل تھے۔

"تم لوگ صورت سے شریف لگتے ہو۔" میں نے چلنے سے پہلے کہا۔ "شام کو میں تمھیں اپنے گھر لے جاؤں گا جہاں میرے ساتھ میری بیوی رہتی ہے۔۔۔"

"تم بالکل فکر نہ کرو صاحب!" کمال الدین نے میری بات درمیان ہی سے اُچک لی۔ "ہم لوگ نمک حرام نہیں ہیں مالکوں کی عزت آبرو پر اپنا خون نچھاور کرنا بھی جانتے ہیں۔ ہماری طرف سے تمھیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

میں انھیں الوداع کہہ کر واپس ہولیا۔

"کیا رہا؟" سیتا نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"وہ بہت بدمعاش شخص ہے۔" میں نے کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے بشاش لہجے میں کہا۔ "آج میں دانستہ اُس سے ملنے نہیں گیا، اسی علاقے کے دو آدمیوں سے اس کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ شام کو میں انھیں یہاں لے آؤں گا پھر ہم چاروں اس کے بارے میں کوئی راہ سوچیں گے۔"

فوری طور پر سیتا کچھ نہ بولی مگر جب میں لباس تبدیل کر کے سستانے کے لیے کرسی پر دراز ہوا تو وہ بھی آموجود ہوئی۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس معاملے کو زیادہ اُلجھا رہے ہو۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "چوہدری بشیر جو بھی ہے مگر ہے تو انسان ہی۔ ہم دونوں آسانی کے ساتھ اسے نہایت اچھا سبق دے سکتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "کیونکہ تم کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔۔۔ اگر میں اسے ہلاک کرنے کا فیصلہ کرلوں تو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ دو چار روز تک اُس کے معمولات کا مشاہدہ کرنے کے بعد کسی بھی مناسب موقع پر چلائی ہوئی محض ایک گولی اسے کیفرِ کردار کو پہنچا سکتی ہے مگر مجھے اس سے خاصی بازپرس کرنی ہے اور پھر میں اسے مجبور کر کے چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ بےسروسامانی کی زندگی کا مزہ چکھ سکے۔ اس کے لیے مجھے کسی نہ کسی کی مدد درکار ہوگی۔"

"تمھارا پروگرام کیا ہے؟" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"فی الحال کچھ نہیں۔ بس دیکھتی جاؤ۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی جائے گی۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

دن کا باقی حصہ میں نے گھر میں ہی گزارا۔

اس سے پیشتر میرا خیال تھا کہ میں براہِ راست چوہدری بشیر سے مل کر خود کو مظلوم و مجبور ظاہر کر کے اس کا اعتماد حاصل کروں اور پھر اس کے ساتھ رہ کر اسے زک پہنچانے کی کوشش کرتا رہوں۔ مگر اس طریقۂ کار میں دو خرابیاں تھیں۔ اوّل تو یہ کہ میں ایک بار اس سے مل چکا تھا اور اُس پر خود کو باحیثیت ثابت کیا تھا لہٰذا وہ بآسانی مجھے کسی گھناؤنی سازش میں اُلجھا کر پس زنداں پہنچوا دیتا۔ اس جیسے مکار اور بےکردار شخص سے انتقام لینے کے لیے ضروری تھا کہ خود کو حتی الامکان اس کی نگاہوں اور دسترس سے دور رکھا جائے۔

شام کو چار بجے میں گلبرگ میں مقررہ مقام پر پہنچا تو کمال الدین اور عبدالغنی دونوں ہی اپنے مختصر سامان سمیت موجود تھے۔

میری کار دیکھتے ہی اُن کا چہرہ کھل اُٹھا۔ میں انجن بند کر کے نیچے اترا اور کار کی ڈکی کھول دی۔ انھوں نے اپنے چھوٹے صندوق اور بستر ڈکی میں ڈال دیے پھر پرانی ترتیب کے عین مطابق عبدالغنی عقبی نشست پر بیٹھ گیا اور کمال الدین دوسری سمت کا دروازہ کھول کر میرے برابر والی نشست پر براجمان ہوگیا۔

"چھٹی لینے میں مشکل تو نہیں ہوئی؟" میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے ہنس کر اُن دونوں سے سوال کیا۔

"بس جی عبدالغنی کو تو آرام سے چھٹی مل گئی مگر میرے مالک سٹپٹا گئے۔" کمال الدین اُن دونوں میں زیادہ بولنے والا تھا۔ "جب مجھے ہر قیمت پر چھٹی پر آمادہ پایا تو یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ واپسی پر نوکری کا کوئی بھروسا نہیں، نیا آدمی مل گیا تو رکھ لیں گے۔"

"کیا کیا کام کر لیتے ہو؟"

"کھانا تو ہم دونوں ہی پکا لیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "باقی جو کام دے دیا جائے۔"

"چاہو تو میرے پاس مستقل ملازمت بھی مل سکتی ہے۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "دراصل میں اپنے شوق کے تحت خود کما کر اپنا گزارا کرنا چاہتا ہوں ورنہ میری لگی بندھی معقول آمدنی کے ذرائع بھی موجود ہیں۔"

"ہمیں تو نوکری ہی کرنی ہے صاب۔" اس بار عبدالغنی بولا۔ "تمھارے پاس دل لگ گیا تو وہیں رہ جائیں گے۔"

وہ خاصے نیک نفس انسان تھے۔ سیتا اُن سے مل کر بہت خوش ہوئی اور فوری طور پر عبدالغنی کو چوکیداری اور کمال الدین کو کھانا پکانے کے فرائض سونپ دیے گئے جنھیں اُن دونوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

فرائض کی اس تفویض میں میں نے یہ نکتہ ذہن میں رکھا تھا کہ اُن دونوں میں کمال الدین زیادہ سمجھ دار تھا اور گھر کے اندر رہتے ہوئے وہ میرے مشیر کا کام بہتر طور پر سرانجام دے سکے گا۔

گھر کے معاملات ان دونوں کو سونپنے کے بعد میں گھر سے نکل گیا۔ گلبرگ کے علاقے میں چوہدری بشیر کے وسیع و عریض مکان کی

پختہ روش پر اس وقت تک کئی گاڑیاں جمع ہو چکی تھیں۔

میں شام کے دھندلکے کا فائدہ اٹھا کر سست رفتاری سے وہاں کا جائزہ لیتا ہوا آگے نکلتا چلا گیا۔

پھر ایک اچھے ریستوران میں کاؤنٹر سے میں نے ٹیلی فون ڈائرکٹری طلب کی جس میں گلبرگ کے حوالے سے صرف ایک ہی چوہدری بشیر کا نام تھا۔ میں نے اس کے آگے لکھے ہوئے دونوں نمبر نوٹ کیے اور ڈائرکٹری لوٹا کر پبلک بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔

"ہیلو۔ کون؟" دوسری گھنٹی پر اس جانب سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی جو مجھے مانوس سی محسوس ہوئی۔

"چوہدری بشیر سے بات کرنی ہے۔"

"بول رہا ہوں۔"

"زیادہ دن نہ بول سکو گے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "لال خان سے ٹکرا کر تم نے اپنی شامت کو دعوت دی ہے۔"

"کون ہو تم؟" آواز غصیلی اور بلند ہو گئی۔ "اور کیا بک رہے ہو؟ میں کسی لال خان اور کالے خان کو نہیں جانتا۔"

"سامنا ہو گا تو سب یاد آ جائے گا میرے دھندے کی بربادی کے واحد ذمہ دار تم ہو۔ میں بھی تمھاری اینٹ سے اینٹ بجائے بغیر نہیں بیٹھوں گا۔"

"سنو۔" جھلائی ہوئی غراہٹ سنائی دی۔ "مجھے غیر ضروری ہرزہ سرائی کی ضرورت نہیں۔ اور نہ میں تم سے واقف ہوں اگر نادانستگی میں مجھ سے یا میرے آدمیوں سے تمھیں کوئی نقصان پہنچا ہے تو مجھ سے مل لو۔ میں تمھارے نقصان کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھ سے الجھ کر تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔"

"میں اتنا گاؤدی نہیں ہوں پیر جی!" میں نے بدستور تلخ لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ ایک بار تمھارے کھٹ میں داخل ہو گیا تو سلامت نہ لوٹ سکوں گا۔"

"جگہ کا تعین تم خود کر سکتے ہو۔" وہ خاصا کائیاں معلوم ہوتا تھا اور شاید ہر قیمت پر اپنے نادیدہ دشمن کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"پھر کل شام منتظر رہنا۔ میں چار بجے فون کروں گا، اور ساڑھے چار بجے کہیں ہماری ملاقات ہو گی۔" میں نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

اس کا جواب سن کر میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے لیے اس کا رویہ عجیب ضرور تھا مگر ناقابلِ فہم نہیں تھا۔ اس جیسے لوگ اگر گمنام فون کال پر یوں خوفزدہ چوہوں کے سے رویے کا اظہار کرنے لگیں تو ان کے لیے اپنے مشکوک دھندوں کو سنبھالنا دشوار ہو جائے۔

مجھے پورا یقین تھا کہ مجھ سے نرمی سے گفتگو کرتے ہوئے چوہدری بشیر دل ہی دل میں مجھے بے تحاشا گالیاں دے رہا ہو گا۔

لب و لہجے کی حد تک نرمی اس نے محض اس امید پر برقرار رکھی ہو گی۔ مجھ سے غائبانہ جنگ کے بجائے وہ ایک بار مجھے دیکھنا چاہتا تھا۔

کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے میں بے اختیار مسکرا دیا۔

گھر پہنچا تو حالات معمول پر تھے۔

کمال الدین اس قدر شریف آدمی تھا کہ میری عدم موجودگی کا علم ہونے کے بعد مکان میں رکنے کے بجائے باہر احاطے میں عبدالغنی کے پاس آ بیٹھا تھا اور واپسی پر مجھے وہیں ملا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے حیرت کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

"صاحب ہم دونوں بالکل نئے آدمی ہیں۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "میں اندر رہتا تو شاید بیگم صاحبہ پریشان رہتیں، اسی لیے باہر کھلی ہوا میں آ بیٹھا تھا۔"

"دونوں ہی قابلِ اعتماد معلوم ہوتے ہیں۔" اندر پہنچا تو سیتا نے چھوٹتے ہی تبصرہ کیا۔ "میں سمجھ گئی تھی کہ تم انہیں آزمانے کی نیت سے چھوڑ گئے ہو۔"

"ضروری نہیں کہ تمھارا بھیجا ہمیشہ صحیح کام کرے۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ "میں ایک کام سے گیا تھا۔"

اس کے استفسار پر میں نے اسے اپنی کارکردگی سے آگاہ کر دیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ جھک مار کر جھنجھلایا ہوا گھر لوٹے گا تو سر پیٹ کر رہ جائے گا۔"

"اسے گھر سے ہٹا کر کوئی کارروائی کرو گے؟" اس نے اپنی چمکدار نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ میں اسے ساڑھے چار سے ساڑھے پانچ تک کسی جگہ انتظار کرنے کے لیے کہوں گا اور پھر اس کا مکان ہماری زد میں ہو گا۔"

"اس کا تو مطلب ہوا کہ کل تم جو کچھ کر سکے کر لو گے اس کے بعد لال خان کے حوالے سے بات بھی نہ کر سکو گے۔"

"دیکھتی جاؤ۔ لال خان تو اسے خوابوں میں بھی نظر آنے لگے گا۔"

اسی رات میں نے کمال الدین اور عبدالغنی کو اگلی صبح ایک مہم کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کر ڈالی اور وہ دونوں مضطرب نظر آنے لگے۔

ناشتے سے فراغت کے بعد ہم تینوں کار میں گلبرگ روانہ ہو گئے۔ پھر چوہدری بشیر کے مکان سے کچھ دور میں نے کار روک دی۔

راستے میں میں نے کمال الدین کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہو گا لہٰذا کار رکتے ہی وہ اتر کر خاموشی سے آگے چل دیا۔

"یہ تو بالکل جاسوسی معلوم ہوتی ہے صاب!" عبدالغنی میرے طریقۂ کار سے بہت مرعوب نظر آ رہا تھا۔

"جاسوسی ہی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "جاسوس ہم تم جیسے ہی انسان ہوتے ہیں بس کام میں ذرا سی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"کتنی عجیب بات ہے کہ کمال الدین، پیر جی کا دشمن ہے اور اس وقت اسی کے گھر گیا ہے۔" اس کے لیے اپنی حیرت کا اظہار تک دشوار ہو رہا تھا۔

میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگا لی اور امکانی پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

اس وقت کمال الدین ایک بے روزگار نوجوان کے روپ میں چوہدری بشیر کے مکان پر گیا تھا۔ یہ قدم میں نے اس یقین کے بعد اٹھایا تھا کہ کمال یا عبدالغنی کا چوہدری بشیر کے ملازمین سے کبھی کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔

اپنے تجربے کی روشنی میں مجھے امید تھی کہ چوکیدار کمال الدین کو پھاٹک سے گزر کر اندر جانے کی اجازت ہرگز نہیں دے گا اور اپنے طور پر جواب دے کر رخصت کر دے گا۔

کمال کا کام صرف اتنا تھا کہ چوکیدار کو باتوں میں الجھا کر... مکینوں وغیرہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

میرے لیے انتظار کا ایک ایک لمحہ کٹھن گزر رہا تھا نصف گھنٹے بعد مجھے اپنے اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہونے لگے تو میں نے غیر ارادی طور پر انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔

چند منٹ کی بے مقصد ڈرائیونگ کے بعد میں ایک بازار سے گزرا تو لسی کی دوکان نظر آئی اور میں نے کار وہیں روک دی۔

واپس اپنی جگہ پر پہنچے تو کمال الدین کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس کی تیز چال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم کامیابی حاصل کر کے آیا تھا۔

جوں ہی وہ کار میں بیٹھا میں انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھاتا لے گیا۔

"مجھے تو وہاں ملازمت ملی ہی سمجھو۔" وہ اندر بیٹھتے ہی بلا تمہید شروع ہو گیا۔ "انھیں دو باورچیوں کی ضرورت ہے۔ چوکیدار نے میرا مدعا سنتے ہی اپنے کیبن میں لگے فون پر کسی سے بات کی تھوڑی دیر کے بعد مجھے اندر بھیج دیا۔"

"کس کے؟ پیر جی کے پاس؟" عبدالغنی اضطراری طور پر بول پڑا۔

"وہ گھر پر نہیں تھا۔" کمال نے کہا۔ "جوزف نام کا ایک کرنٹا اندر کے سارے معاملات کا نگراں ہے۔ اس کے علاوہ وہ چار ملازم اور رہتے ہیں۔ پانچواں چوکیدار ہے۔ جوزف نے میرا نام پتہ سب لیا ہے اور مجھے کل صبح دس بجے بلایا ہے تاکہ مالک سے ملوا کر میری تقرری کروا سکے۔ سات سو روپے مہینہ تنخواہ ملے گی۔ سات آدمیوں کا کھانا پکانا ہو گا... اس طرح اندر والوں کی تعداد بھی معلوم ہو گئی۔ پانچ ملازم، چھٹا جوزف اور ساتواں شاید مالک خود ہو گا۔"

"اور پیر جی کے بیوی بچے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ یہاں کہاں!" کمال الدین پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ "یہ تو مجھے پہلے سے معلوم تھا اس کے بیوی بچے سمن آباد میں کہیں رہتے ہیں۔"

"اندر کا ماحول کیسا تھا؟"

"سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جوزف مجھے ایک چھوٹے سے دفتر نما کمرے میں ملا جہاں ایک میز اور دو کرسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا... اور ہاں! آج تو چوکیدار رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی لٹکائے پھاٹک پر کھڑا تھا۔ شاید ان لوگوں کو خطرے کی سن گن مل گئی ہے۔"

"ملازمت کے بارے میں کیا باتیں ہوئیں؟" میں نے سوال کیا۔

"شرائط بہت سخت ہیں۔ ہفتہ واری چھٹی کوئی نہیں ملے گی شام چھ بجے سے صبح چار بجے تک اپنے کوارٹر میں بند رہنا پڑے گا اور یہاں کی ہر بات راز رکھنی پڑے گی۔ ورنہ زندگی دو بھر ہو کر رہ جائے گی۔" اس نے بتایا۔

"شام چھ بجے سے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "پھر وہاں رہنے والوں کے رات کے کھانے کا کیا بنے گا؟ بھوکے رہیں گے وہ؟"

"رات کا کھانا چھ بجے سے پہلے تیار کرنا ہو گا۔ دوپہر میں میز لگانی ہو گی۔ رات میں سب خود کھائیں گے کیونکہ یہ وہاں کا معمول ہے۔"

"تم نے اپنا نام پتہ کیا بتایا؟" میں نے سوال کیا۔

وہ ہنس پڑا۔ "صاحب فلموں سے اتنا تو سیکھ ہی لیا ہے، نام پتہ سب غلط بتایا ہے... سالے زندگی بھر ڈھونڈتے رہیں گے۔"

"یہی غلطی ہو گئی تم سے۔" میں نے کہا اور اس کا چہرہ مایوسی سے لٹک گیا۔

"اس وقت تمھیں دشمن کے گھر میں گھسنے کا موقع ملا تھا۔" میں نے اسے خالص ڈرامائی الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے فلمی سبق پر عمل کر کے یہ موقع ضائع کر دیا۔ وہ غلط دھندے کر رہے ہیں۔ اس لیے تمھارے بارے میں پوری چھان بین کریں گے اور جب ہر چیز غلط نکلے گی تو وہ تمھیں بند کر کے ماریں گے تاکہ تم سے یہ معلوم کر سکیں کہ تمھیں کس نے وہاں بھیجا تھا۔"

"ہاں۔ یہ تو واقعی غلطی ہو گئی۔" اس نے مردہ سی آواز میں اعتراف کیا۔ "اتنی احتیاط کے باوجود میں بھٹک گیا۔ مگر تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ایسی نوبت آ جائے تو مجھے وہاں کیا کرنا ہو گا؟" آخری فقرے پر اس کا لہجہ ذرا جاندار ہو گیا۔

"میں نے تمھیں وہاں ایک بہانے سے بھیجا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ واقعی کسی ملازم کے متلاشی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"کیا اندر پہنچ کر ہم زیادہ کامیاب ہو سکیں گے؟" عبدالغنی نے گہری سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے سوال کیا۔

"ظاہر ہے!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس طرح اندازوں کے بجائے ہمیں ٹھیک ٹھیک باتیں معلوم ہو سکیں گی!"

"تو پھر مجھے بھیج دو!" عبدالغنی نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "جب کمال الدین نہیں پلٹے گا تو وہ مجھے ضرور نوکر رکھ لیں گے!"

"پتہ کہاں کا لکھواؤ گے؟"

"تمہارے گھر کا!" اس نے پورے اعتماد سے کہا اور میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا!

"کمال کے بعد اب تم نوکری ڈھونڈتے وہاں جا پہنچے تو انہیں شبہ ہو جائے گا، ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں پکڑ کر مار پیٹ شروع کر دیں!" میں نے کہا اور وہ خاموش ہو گیا!

"پھر ہم وہاں گھس ہی کیوں نہ پڑیں؟" عبدالغنی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

"آج شام یہ کوشش بھی کریں گے!" میں نے مختصر سا جواب دیا اور کار میں خاموشی چھا گئی!

گو میرا خون خرابے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور بدترین صورتحال سے نمٹنے کے لیے میرے پاس زہریلے تیروں والی شیشتی بھی تھی مگر اس سے کسی کو مرعوب کرنا ناممکن تھا کوئی بھی حریف اس کا نشانہ بننے سے پہلے اس کی دھونس میں نہیں آ سکتا تھا!

لہٰذا ان دونوں کو گھر چھوڑ کر میں بازار کی طرف لوٹ گیا!

لاہور میرا آبائی شہر تھا اور وہاں میں نے ہمیشہ ہی اچھے دن گزارے تھے لیکن وہاں زیرِ زمین زندگی کے بارے میں مجھے تھوڑی بہت معلومات تھیں جن کے سہارے میں اسلحہ کے ایک چھوٹے ڈیلر کی دکان پر جا پہنچا۔

دکاندار نے میری فرمائش پر کئی خودکار پستول میرے سامنے ڈال دیے مگر جب میں نے اعشاریہ تین آٹھ کا سات فائروں والا خودکار اسمتھ اینڈ براؤنی طلب کیا تو وہ چونک پڑا۔

"ممنوعہ بور کے ہتھیار ہم نہیں رکھتے!" اس نے بغور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"آپ کہیں سے منگوا دیں، مجھے داموں کی کوئی پروا نہیں!"

"لائسنس ہے آپ کے پاس؟" اس کا لہجہ اشتباہ آمیز تھا!

"ہوتا تو پہلے ہی دکھا تا!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آج کل لائسنس کا ملنا اتنا آسان نہیں ہے مگر قانون شکن ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہوتے ہیں!"

"پھر تو میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا!" اس کا لہجہ معذرت آمیز تھا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو اس دکان کا نام ہرگز نہ آئے گا!" میں نے اسے بھرپور لہجے میں یقین دہانی کرائی۔

"ایسے ہی ضرورت مند ہیں تو انار کلی چلے جائیں وہاں ایک بند گودام کی سیڑھیوں پر فیجا چشمے بیچتا ہوا ملے گا۔ اسی سے کام بن سکے گا!"

پھر اس نے مجھے اس گودام کا محل وقوع اور فیجے کا حلیہ سمجھایا اور میں اس کا شکریہ ادا کر کے دکان سے نکل آیا۔

فیجے کی دو نشانیاں اتنی واضح تھیں کہ مجھے براہِ راست اس تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی!

وہ داہنی آنکھ سے محروم تھا اور اس کے کرخت چہرے پر پیشانی کے عین وسط میں کسی پرانی چوٹ کا نشان نمایاں چمک رہا تھا!

اس نے اپنے سینے اور شانوں پر بھانت بھانت کے بہت سے چشمے سجائے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سیڑھیوں پر بیٹھا کسی کا منتظر ہو۔ چشموں وغیرہ کی فروخت میں اسے کوئی دلچسپی نظر نہیں آ رہی تھی!

"فیجا؟" میں نے قریب پہنچ کر دھیمے لہجے میں سوال کیا اور وہ یوں چونک کر سیڑھیوں سے اٹھا جیسے دیر سے اسی سوال کا منتظر رہا ہو!

"کس نے بھیجا ہے؟" اس نے بلغمی لہجے میں سوال کیا۔

میں نے دکان کا نام دہرا دیا اور وہ ایک طرف چل پڑا۔

اس سے ملنے کے بعد میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ چشموں وغیرہ کی فروخت اس کے لیے محض ایک آڑ تھی اور وہ شاید اس دکان کا خفیہ ہرکارہ تھا جو دکان کو درمیان میں لائے بغیر بے نام و نشان حوالے سے غیرقانونی سودے کرتا تھا!

ہو سکتا تھا کہ فیجا کسی ایسے ٹھکانے پر رہتا ہو جہاں فون کی سہولت فراہم ہو اور جیسے ہی اسے دکان سے کسی گاہک کی خبر ملتی ہو وہ چشمے فروش کا روپ دھار کر بتائے ہوئے مقام پر پہنچ جاتا ہو!

"سواری ہے لبنی؟" چلتے چلتے اس نے سوال کیا۔

"پھر اُدھر ہی چلو!" اس نے میرا جواب اثبات میں پا کر کہا۔

کار چلتے ہی وہ شروع ہو گیا۔ "کیا چاہیے تمہیں؟"

"اعشاریہ تین آٹھ۔ اسمتھ اینڈ براؤنی!"

"اتفاق سے اس وقت وہی ایک دانہ ہے میرے پاس!"

اس کے جواب نے میرے شبہات کی تائید کر دی!

یقینی طور پر وہ پیغام ملتے ہی مطلوبہ پستول لے کر انارکلی پہنچا تھا!

لارنس گارڈن میں اس نے کار میں بیٹھے ہی بیٹھے مجھے پستول کی ایک جھلک دکھائی۔ اس کے ساتھ سو گولیوں کا ڈبہ بھی تھا۔

رقم وصول کرتے ہی وہ گاڑی سے اتر کر ایک سبزہ زار کی طرف بڑھ گیا اور میں وہاں سے واپس روانہ ہو گیا۔

گھر پر کھانے سے فراغت کے بعد میں کمال اور عبدالغنی کو اپنے شام کے پروگرام کے بارے میں سمجھانے لگا۔

"اگر چوکیدار نے بندوق سنبھال لی؟" پورے انہماک سے منصوبے کی تفصیل سننے کے بعد عبدالغنی نے سوال کیا۔

"اس کا بندوبست ہو گیا ہے!" میں نے دراز سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ "میں اسی کے لیے گیا ہوا تھا!"

"اوہ۔ یہ تو سچ مچ کا معلوم ہوتا ہے!" کمال الدین نے پستول ہاتھ میں لے کر اس کا وزن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اصلی ہی ہے مگر ہم اسے استعمال کرنے سے گریز ہی کریں گے!" میں نے کہا۔ "اس کا کام صرف ان لوگوں کو خوفزدہ کرنا ہو گا۔ ہمیں نہتا دیکھ کر ان میں سے کوئی بھی ہماری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو گا!"

"تو یہ تمہارے ہی پاس رہے گا نا؟" عبدالغنی نے سوال کیا۔

"ہاں۔ اسے چلانا تمہارے لیے مشکل ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہوا میں ایک دو گولیاں چلانی ہی پڑ جائیں!"

ٹھیک تین بجے ہم گھر سے نکل گئے!

مجھے اور کمال الدین کو چوہدری بشیر کے ملازمین پہچان سکتے تھے لہٰذا اس بار ہم نے عبدالغنی کو مکان کے قریب اتارا۔

اس کا کام صرف اتنا تھا کہ ہماری واپسی تک مکان کی نگرانی کرتا رہے اور آنے جانے والوں کی تفصیلات یاد رکھے!

پونے چار بجے میں ایک قریبی پبلک بوتھ پر پہنچ گیا۔

اس مرتبہ پہلی گھنٹی پر دوسری طرف سے جواب آیا اور میں نے چوہدری بشیر کی آواز پہچان لی جو اس وقت خاصی پُرسکون محسوس ہوئی!

"میں لال خان بول رہا ہوں!"

"وقت سے پہلے؟" چوہدری بشیر کی آواز میں خوشگوار سی حیرت پنہاں تھی۔ "تمہیں تو چار بجے فون کرنا تھا مجھے!"

"اس وقت نہ ملتے تو دوبارہ چار بجے ہی فون کرتا۔ ساڑھے چار سے ساڑھے پانچ تک تم ریلوے اسٹیشن کے تین نمبر پلیٹ فارم پر میرا انتظار کرو گے!"

"پلیٹ فارم پر؟" اس کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کیا اس سے بہتر جگہ کا انتخاب نہیں کر سکتے تھے تم؟"

"وہاں میں خود کو تمہارے مقابلے میں زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں!" میں نے لہجے میں تلخی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے خوفزدہ ہوں!"

"اور مجھے ایک گھنٹے تک انتظار کرنا ہو گا؟" اس کے لہجے سے احتجاج نمایاں تھا۔

"مجبوری ہے پیر جی۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "جب تم ریلوے اسٹیشن جیسی واہیات جگہ آ سکتے ہو تو ذرا سا انتظار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اتنی دیر انتظار نہ کرنا پڑے!"

"تمہاری شناخت کیا ہو گی؟"

"میں خود تم تک پہنچوں گا۔ بس تمہیں مقررہ وقت پر وہاں موجود ہونا چاہیے۔ اور ہاں یہ یاد رکھنا کہ تم اکیلے آؤ گے ورنہ میرا سایہ بھی نہ دیکھ سکو گے!"

جواب میں اس کا ایک جاندار قہقہہ سنائی دیا۔ "تم مجھے للکار تو بیٹھے ہو مگر تمہاری باتوں سے پتہ چل رہا ہے کہ تمہارا رُواں رُواں مجھ سے خوفزدہ ہے!"

"یہ مت سمجھو پیر جی۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنی کسی بے احتیاطی سے اپنی گردن تمہارے ہاتھ میں نہیں دینی چاہتا!"

"چلو چلو۔ مجھے تمہاری ساری باتیں منظور ہیں!" اس نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور میں فون بند کر کے بوتھ سے باہر نکل آیا۔

ہم دونوں واپس عبدالغنی کے پاس پہنچے تو وہ گلی کے نکڑ پر ایک درخت کے سائے میں زمین پر بیٹھا سگریٹ نوشی میں مصروف تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے سگریٹ جوتے کے تلے سے مسل دی۔

"کیا خیر خبر ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ نہ کوئی آیا نہ گیا!" یہ کہتے ہوئے وہ کار میں بیٹھ گیا۔

میں نے انجن بند کیا اور نیچے اتر کر کار کا بونٹ کھول دیا کیونکہ چوہدری بشیر کے مکان کی نگرانی کے لیے وہ بہترین جگہ تھی۔

میں وقفے وقفے سے انجن کے مختلف حصوں سے اس انداز میں چھیڑ چھاڑ کرتا رہا جیسے کسی بگڑے ہوئے پرزے کو درست کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ویسے تو وہ علاقہ سنسان پڑا ہوا تھا اور وہاں دور تک کوئی ایسا متنفس نہیں تھا جو ہماری وہاں موجودگی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا لیکن میں نے محض احتیاطاً اپنی وہاں موجودگی کا جواز پیدا کرنے کے لیے بونٹ اٹھایا ہوا تھا۔

ہمیں وہاں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ٹھیک سوا چار بجے چوہدری بشیر کے مکان کا پھاٹک کھلتا نظر آیا اور سیاہ رنگ کی ٹویوٹا کراؤن رینگتی ہوئی پھاٹک سے باہر آ گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر چوہدری بشیر بذاتِ خود براجمان تھا اس کے علاوہ کار میں تین نفوس اور موجود تھے۔

چوہدری بشیر کی روانگی کا انداز میری توقعات کے عین مطابق تھا۔ میں جانتا تھا کہ چھوٹے دل والے گروہ بند تنہا خطرات کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں!

چوہدری بشیر کی تین سواریوں سمیت روانگی نے سیتلک کے سوال کا جواب فراہم کر دیا تھا۔ میں اپنی کارروائی کے بعد بھی

لال خان کی حیثیت میں چوہدری بشیر سے رجوع کر سکتا تھا اور اپنی کارروائی کے جواز میں اس کی وعدہ خلافی جتا سکتا تھا کیونکہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے تنہا مجھ سے ملاقات کے لیے پہنچنا تھا۔

یہ حسن اتفاق ہی تھا کہ چوہدری بشیر نے اپنی کار مخالف سمت میں لے جانے کے بجائے ہماری طرف گھمائی اور چند ہی ثانیوں بعد اس کی سیاہ ٹویوٹا کراؤن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"وہ کرنٹا بھی اس کے ساتھ گیا ہے۔" بونٹ گرانے کے بعد میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو کمال الدین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "پیر جی کے برابر والی نشست پر کسی جیار کی طرح اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ دفع ہو گیا۔"

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ گلی میں داخل ہو گئی۔

چوہدری بشیر کے ٹھکانے پر ہارن بجانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی چوکیدار نے عجلت کے عالم میں محض کار کے انجن کی آواز سن کر پھاٹک کھول دیا۔

شاید وہ سمجھا تھا کہ اس کا مالک کسی کام سے راستے سے ہی لوٹ آیا تھا۔

اس سے بیشتر کہ وہ پھاٹک پر دوسری کار دیکھ کر سرعت سے پھاٹک دوبارہ بند کرتا، میں نے کار آگے بڑھا دی۔

بند ہوتے ہوئے پھاٹک کا ایک آہنی در کار کے بائیں حصے سے ٹکرایا مگر میں نے کار کو پھاٹک کی زد سے آگے بڑھا کر بریک لگا دیئے اور پستول تھام کر نیچے اتر گیا۔

چوکیدار نے غضب ناک انداز میں بڑبڑاتے ہوئے پھاٹک بند کیا۔ پھر جوں ہی وہ بولٹ گرا کر پلٹا تو میں اس کے سر پر مسلط تھا۔

اعشاریہ تین آٹھ کے اسمتھ اینڈ براؤنی کی مہیب سیاہ نال اپنی کھوپڑی کی طرف اٹھی دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

"اندر کیبن میں چلو۔" میں نے پھاٹک سے ملحق کوٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سرد لہجے میں حکم دیا جس کی بے چون و چرا تعمیل کی گئی۔

"تت... تم سلطان ہے نا؟" چوکیدار نے مجھے پہچانتے ہوئے لکنت آمیز لہجے میں کہا۔ "تم کو تو صاحب نے کل صبح نو بجے بلایا تھا مگر تم نہیں آیا۔"

"کل نہیں آیا مگر اب آیا ہے۔" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا اور جیسے ہی چوکیدار نے اپنے کیبن میں قدم رکھا میں نے پستول کی نال تھام کر اس کے ٹھوس آہنی دستے سے اس کی داہنی کنپٹی پر ایسی شدید ضرب لگائی کہ وہ کراہتا ہوا کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس اثنا میں کمال اور عبدالغنی بھی وہاں آ چکے تھے ان دونوں کی مدد سے میں نے آناً فاناً میں چوکیدار کو غیر مسلح کر کے اس کی رائفل اور کارتوس کی پیٹی پر قبضہ کر لیا۔

وہ کارروائی چونکہ کسی شور شرابے کے بغیر پلک جھپکتے میں عمل میں ——— آئی تھی لہٰذا اندر سے کسی قسم کے ردعمل کے اظہار کی نوبت نہ آ سکی۔

ہم تینوں نے چوکیدار کو کیبن میں مقفل کیا اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے برآمدے میں پہنچ گئے جہاں داخلی دروازہ اندر سے بند تھا۔

"ادھر سے آؤ۔" اچانک کمال الدین نے کہا اور میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

"اس طرف ضرور کوئی راستہ ہوگا کیونکہ جوزف نے اسی طرف دفتر نما کمرے میں مجھ سے ملاقات کی تھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

جوزف کے دفتر نما مختصر سے کمرے کے برابر میں ایک دروازہ تھا جو ہمیں کھلا ہوا ملا اور ہم تینوں بے دریغ اندر داخل ہو گئے وہ ایک کشادہ سی راہداری تھی۔

ہمارے اندر گھستے ہی پرشور آواز کے ساتھ اس راہداری میں ایک دروازہ کھلا جس سے ایک شخص برآمد ہوا مگر میرے ہاتھ میں رائفل دیکھتے ہی اسی رفتار سے واپس اندر گھس کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

"دروازہ کھولو۔" میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر ٹھوکر ماری۔

اس وقت کمال اور عبدالغنی بری طرح بدکے ہوئے نظر آ رہے تھے اور ان کی نگاہیں بے چینی کے ساتھ ہر طرف ناچ رہی تھیں۔

چند ثانیوں بعد وہ دروازہ کھول دیا گیا اور خمار سے بوجھل سرخ آنکھیں لیے دو افراد ہمیں کمرے میں کھڑے نظر آئے۔

میں رائفل تانے کمرے میں جا گھسا۔

اپنی ہیئت کے اعتبار سے وہ ملازموں کا کمرہ نظر آ رہا تھا اور وہاں موجود دونوں افراد کی وضع قطع بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔

"مکان میں اس وقت کتنے لوگ موجود ہیں؟" میں نے رائفل کی نال ان میں سے ایک کی پیشانی سے لگا کر تیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔ ہم سو رہے تھے۔" اس کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

"سونے سے پہلے کون کون تھا؟"

"سیٹھ صاحب، ان کا منیجر، دو باڈی گارڈ اور ایک چوکیدار۔" وہ مشینی انداز میں ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔

عام طور پر اور کون ہوتا ہے یہاں؟"

"بس ہم سات ہی آدمی ہوتے ہیں۔ سیٹھ صاحب آتے جاتے رہتے ہیں۔" اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ چلا تھا اور نگاہیں بھینگی ہو کر رائفل کی نال پر گڑی ہوئی تھیں۔

"ہر شام یہاں کیا ہوتا ہے؟" میں نے غرا کر سوال کیا۔

"سس... سیٹھ صاحب کے دوست آتے ہیں اور پارٹی ہوتی ہے۔"

"تہہ خانے میں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے حلق میں پھنسا ہوا کوئی بڑا سا گولا نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"باہر نکلو۔" میں نے اس کی پیشانی سے رائفل کی نال ہٹائی اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

وہ راہداری اسٹور روم اور باورچی خانے سے ہو کر کھانے کے کمرے میں نکلتی تھی جس کی زینت اور آرائش قابل دید تھی۔

ان دونوں کی تقلید میں ہم ایک ایسے کمرے میں پہنچے جو ساز و سامان کے اعتبار سے سونے کا کمرہ معلوم ہو رہا تھا مگر آثار کچھ ایسے تھے جیسے وہ مدت سے کسی کے استعمال میں نہ رہا ہو۔

وہ دونوں ایک دیوار گیر الماری کے قریب جا رکے جو نیچے فرش سے تقریباً ملی ہوئی تھی۔ میرے سوالات کے جوابات دینے والا چند قدم پیچھے رک گیا اور دوسرے نے الماری کے پٹ کھول دیئے اور اندر بھرے ہوئے ملبوسات نگاہوں کے سامنے آ گئے۔

میں نے فوری طور پر رائفل کی نال اس شخص کی گردن سے لگا دی جو ہماری طرف پشت کیے الماری کھول چکا تھا۔

"خبردار کوئی چالاکی کرنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے غرا کر کہا اور وہ خوف سے پھریری لے کر رہ گیا۔

لحظہ بھر کے بعد اس نے الماری میں لٹکے ہوئے کپڑوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر پیچھے لگی ہوئی کسی کل کو حرکت دی۔ کھٹکے کی ہلکی سی آواز ہوئی اور اس نے ہاتھ باہر نکال لیا۔

الماری کے پٹ بند کر کے اس نے داہنے سرے پر ہلکا سا زور دیا تو پوری الماری کوئی آواز پیدا کیے بغیر بائیں سرے پر لگے ہوئے پوشیدہ قبضوں پر یوں اندر گھوم گئی جیسے وہ ہلکے پٹ کا کوئی دروازہ رہا ہو۔

"تم یہیں رکو۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کمال سے کہا۔ "کوئی خطرہ محسوس کرو تو چیخ کر ہمیں ہوشیار کر دینا۔"

پھر میں عبدالغنی اور دونوں قیدیوں کے ساتھ الماری کی جگہ پیدا ہونے والے خلا میں بڑھ گیا۔

داہنی طرف کی بغلی دیوار میں لگا ہوا سوئچ آن کرتے ہی وہاں تیز روشنی پھیل گئی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چند فٹ تک سطح فرش کے بعد سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔

"اب اندر سے یہ راستہ بند کر کے کھولو۔" میں نے قیدیوں کو حکم دیا۔

الماری ایک اشارے سے گھومی اور کھٹکے کی آواز کے ساتھ اپنی جگہ پر آ گئی۔ اس کے گھومنے کے بعد بائیں سرے پر ایک لمبا سا چمکتا ہوا دستہ نظر آ رہا تھا۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دستے کو پیچھے کھینچنے سے الماری اپنی جگہ چھوڑ دے گی مگر ایسا نہ ہوا۔

ان میں سے ایک نے دستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر سرکانا چاہا اور تھوڑی سی قوت صرف کرنے کے بعد دستہ اوپر اٹھ کر کسی کھانچے میں بیٹھ گیا۔ دستے کو اسی جگہ تھام کر اس نے باہر کھینچا اور الماری والا راستہ دوبارہ ظاہر ہو گیا۔ دستے پر سے گرفت ہٹتے ہی وہ کسی طاقتور اسپرنگ کے زیر اثر دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا تھا۔

دروازے یا الماری کو اسی صورت میں چھوڑ کر ہم نیچے اترتے چلے گئے۔

وہ تہہ خانہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ وسیع تھا ایک گوشے میں خوبصورت چوبی بار بنا ہوا تھا جس کے سامنے چار چار آرام دہ کرسیوں کے ساتھ چھ ایسی میزیں پڑی ہوئی تھیں، جنہیں جواریوں کی اصطلاح میں کارڈز ٹیبل کہا جا سکتا تھا۔

ایک دیوار کے ساتھ دو باتھ روم بنے ہوئے تھے جن کا نکاسی کا نظام یقیناً کسی خودکار پمپ سے وابستہ رہا ہوگا۔

اس کے ساتھ شیشے کی دیوار والا ایک دفتر نما کمرہ تھا جس میں میز کرسی اور صوفوں کے علاوہ ایک وزنی تجوری بھی پڑی ہوئی تھی۔

تہہ خانے کے عرض میں ایک مسطح دیوار چنی ہوئی تھی جس پہ مدہوش عورتوں کی بڑی بڑی برہنہ تصاویر آویزاں تھیں۔

لیکن اس دیوار کو ممتاز کرنے والی چیز وہ تصاویر نہیں تھیں بلکہ وہ دروازہ تھا جو مقفل نظر آ رہا تھا۔

"تو یہاں ہوتا ہے ہر شام جوا؟" میں نے پوچھتے ہوئے

لہجے میں قیدیوں سے سوال کیا اور وہ سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔

"اس عمارت میں تمہارا کیا مصرف ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"آنے والوں کی دیکھ بھال اور تہہ خانے کی صفائی ہماری ذمہ داری ہے۔"

"ادھر کیا ہے؟" میں نے تصویروں والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم آج تک اس میں نہیں گئے۔ ہم نے اس دروازے کو ہمیشہ مقفل دیکھا ہے۔" بولنے والے کا لہجہ صداقت کی چھاپ لیے ہوئے تھا۔

"اس کے علاوہ پیر جی کے دوسرے اڈے کہاں کہاں ہیں؟"

"یہاں ہفتے میں ایک دن ناغہ ہوتا ہے۔ چھٹی والے دن کبھی کبھار ہمیں کوئین پیلس میں بھیجا جاتا ہے۔ اس ہوٹل کے علاوہ ہم کسی تیسری جگہ سے واقف نہیں۔"

"کوئین پیلس میں بھی جوا ہوتا ہے؟"

"یہاں تو بڑی رقم سے کھیلنے والے خاص خاص لوگ آتے ہیں۔ مگر وہاں بہت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ ایک حصے میں کچھ مشینیں بھی ہیں جوا کھیلنے کی۔"

انہیں کوئی حرکت کرنے کا موقع دیے بغیر میں نے رائفل عبدالغنی کے حوالے کی جسے اس نے اپنے کندھے سے لٹکا لیا اور میں پستول سنبھال کر مقفل دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

تالے پر کیے جانے والے فائر کی گونج تہہ خانے میں دیر تک برقرار رہی لیکن مجھے امید تھی کہ وہ آواز باہر نہ سنی جا سکی ہو گی۔

بارود کی بو میں میں نے وہ دروازہ کھولا تو اندر گھور اندھیرے میں عجیب مانوس سی بو رچی ہوئی تھی جسے روشنی ہونے تک میں شناخت نہ کر سکا مگر روشنی ہوتے ہی سب کی آنکھیں حیرت سے پیشانیوں پر جا چڑھیں۔

وہاں ایک گھٹی ہوئی چھپائی کی مشین کے پہلو میں سیاہیوں وغیرہ کے علاوہ نوٹ چھاپنے کی پلیٹیں موجود تھیں۔

ایک کونے میں لگی ہوئی کٹنگ مشین کے ساتھ سائز میں کٹے ہوئے بڑے نوٹوں کی کئی سو گڈیاں بندھی ہوئی رکھی تھیں جن پر نمبر وغیرہ سمیت ساری چھپائی ہر شبہے سے بالاتر نظر آ رہی تھی۔ کچھ پیکٹ نوٹ کی چھپائی میں کام آنے والے سادہ کاغذ کے تھے۔

وہاں موجود بندوبست سے صاف ظاہر تھا کہ اس مشین پر بڑے کاغذوں پر بیک وقت بہت سے نوٹ چھاپے جاتے تھے جنہیں بعد میں کاٹ کر الگ کر لیا جاتا تھا۔

وہ دیکھ کر میری عقل چکرا کر رہ گئی۔

چوہدری بشیر کو بظاہر زندگی کی ساری آسائشیں میسر تھیں اور اگر وہ گندے دھندوں سے گریز کرتا تو شاید اپنے سرمائے کو محض بنکوں میں جمع کرا کے اتنی آمدنی حاصل کر سکتا تھا کہ بے فکری سے زندگی گزار سکے۔

لیکن اس کی کھوپڑی ہوس کی گرفت میں جکڑی ہوئی تھی۔ سود پر قرضے فراہم کرنے اور جوئے خانے چلانے کے علاوہ وہ جعلی کرنسی بھی چھاپ رہا تھا۔

نئے نوٹوں کی مہک سے بسے ہوئے اس کمرے میں اسپرٹ کی کئی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو چوہدری بشیر کی راہ پر لگا کر اسے میدان صاف کرنے کی مہلت دینے کے بجائے اس عالمِ خرابات کو تباہ کرنا ہی بہتر ہو گا۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا جا رہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی مختلف حصوں میں اسی طرح اسپرٹ پھیلا دی کہ باہر نکلتے ہوئے محض ایک جلتی ہوئی دیا سلائی فرشی قالین کے سہارے پورے تہہ خانے کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔

سیڑھیوں سے دیا سلائی اچھالتے ہی اسپرٹ نے ایک تیز دھماکے سے آگ پکڑی تھی۔ اور میں نے پھرتی سے باہر آ کر الماری بند کر دی۔

تہہ خانے سے باہر آ کر میں نے پھرتی سے یکے بعد دیگرے دونوں قیدیوں کو بھی بے ہوش کر دیا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر خوفزدہ تھے کہ بے ہوش ہوتے ہوئے ان کے دہانوں سے کوئی بھی صدائے احتجاج برآمد نہ ہو سکی۔

"ان دونوں کو بھی چوکیدار کی کوٹھری میں ڈال آؤ۔" میں نے پلٹ کر کمال الدین اور عبدالغنی کو ہدایت دی اور وہ سٹپٹا کر مجھ سے نگاہیں چرانے لگے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی مگر اس نازک مرحلے پر ان کے پس و پیش کی بنا پر آواز میں قدرے سختی سرایت کر ہی گئی۔

"نہیں پڑا رہنے دو انہیں۔" کمال الدین نے مجھ سے نظریں چار کیے بغیر کہا۔ "تمہارے بغیر باہر نکلتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

"اٹھاؤ انہیں۔" میں بے اختیار غرا اٹھا اور ان دونوں نے مشینی انداز میں بے ہوش قیدیوں کو اپنی پشت پر لاد لیا۔

پھر میں ان کے آگے ہو لیا۔

"تم ملازمت کے چکر میں آئے تھے تو ان دونوں سے بھی سامنا ہوا تھا؟" راستے میں میں نے کمال سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "چوکیدار اور جوزف کے علاوہ کوئی سامنے نہیں آیا۔ انہیں تو ابھی دیکھا ہے۔"

"اندر پڑے رہتے تو یہ ناگہانی جل مرتے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "آگ کتنی بھی پھیل جائے پھاٹک تک نہیں پہنچے گی۔"

چوکیدار کی کوٹھری میں پہنچنے تک وہ دونوں بری طرح ہانپنے لگے۔

"شاباش!" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "کام کی ہمت باقی ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔" کمال ہانپتے ہوئے بولا۔ "ہمارا پہلا تجربہ ہے نا... بولو اب کیا کرنا ہے؟"

"اندر جگہ جگہ اس طرح آگ لگاؤ کہ ہماری واپسی کے بعد اس مکان کو راکھ کا ڈھیر ہونے سے نہ بچایا جا سکے۔ میں ابھی اندر آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں پھرتی سے سر ہلا کر لوٹ گئے اور میری بے رحم نگاہیں بے ہوش چوکیدار کے چہرے پر جم گئیں۔

میرے وجود میں سویا ہوا مکار حیوان آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا تھا جو اپنے ہر فعل کا جواز پیدا کرنے میں بلا کا ماہر تھا۔

وہ چوکیدار بظاہر ایک معمولی ملازم تھا مگر اس کے کام کی نوعیت کے پیشِ نظر یہ یقینی تھا کہ وہ اپنے مالک کے جرائم سے کسی نہ کسی حد تک واقف تھا۔

چوہدری بشیر تو خیر اس کا آقا تھا مگر وہ اس کی چار دیواری کا بھی نگراں تھا۔ اس مکان کی طرف بڑھنے والے قدم اسی چوکیدار کی رائفل سے چھلنی ہوتے۔ اس کی دہشت چوہدری بشیر کے دشمنوں کو اس سے دور رکھتی تھی اور یوں وہ شخص گناہوں اور جرائم کی پوٹلی کی زندگی کو طویل تر بنانے کا ذمہ دار تھا۔

میری دانست میں اس وقت وہ موت کا حقدار ہو چکا تھا۔

اس کی زندگی یوں بھی خطرناک تھی کہ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔

جب چوہدری بشیر کو اس کی زبانی یہ علم ہوتا کہ اس کے اڈے کی بربادی میں سلطان کا ہاتھ ہے تو وہ لال خان کے ایک فرضی وجود پر اپنی توانائیاں برباد کرنے کے بجائے میری بو پر ہو لیتا جب کہ اس بار میں پوری طرح اپنا دامن بچائے رکھنے پر تلا ہوا تھا۔

پھر اس نے میری کار میں کمال الدین کو بھی دیکھا تھا جو اسی صبح ملازمت کے متلاشی امیدوار کے سوانگ میں اس در پر پہنچا تھا۔

یہ اور بات تھی کہ میری عاجلانہ کارروائی کی وجہ سے چوکیدار کو اس کی موجودگی پر حیرت کے اظہار کا موقع نہ مل سکا مگر یہ بات یقینی تھی کہ وہ زندہ چھوڑ دیا جاتا تو ہوش میں آنے کے بعد اپنے مالک کو اس بے روزگار باورچی کے بارے میں ضرور بتاتا اور حلیے کی بنا پر کمال الدین کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں آ جاتا۔

پھاٹک پر گولی چلا کر چوکیدار کو ہلاک کرنے کا مقصد یہ ہوتا کہ اس پاس کے رہنے والوں کو فوری طور پر ادھر متوجہ کر لیا جاتا۔ زہریلا تیر آزمایا جاتا تو طریقۂ قتل کی بنا پر کسی کے ذہن میں بھولے بسرے صفدر علی کا نام تازہ ہو سکتا تھا لہٰذا احتیاط کے پیشِ نظر اس بدنصیب کے گلے پر رسی کا استعمال ناگزیر ہو چکا تھا۔

اندیشوں اور امکانات کے یہ سارے مرحلے چشم زدن میں طے ہو گئے اور میں نے ایک مضبوط سی رسی منتخب کر کے چوکیدار کے گلے کے گرد ڈال دی۔

گرہ پڑنے تک اس کا بدن ساکت رہا مگر جب یکبارگی پھندے کی گرفت سخت ہوئی تو اس کے دہانے سے خوفناک آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔

جسم کے پھڑکنے کے ساتھ اس کے ہاتھ بھی غیر ارادی طور پر گلے پر پہنچے مگر میں نے پوری قوت سے گرہ سخت کر کے دوسری گرہ بھی ڈال دی اور اسی حالت میں اسے چھوڑ کر دور کھڑا ہو گیا۔

وہ چند ثانیوں تک بری طرح تڑپتا رہا پھر اس کی آنکھوں کے ڈھیلے اپنے حلقوں سے باہر ابل آئے، چہرہ سیاہ پڑ گیا اور زبان باہر جھول کر دانتوں میں بھنچ گئی۔

جو کچھ ہوا، وہ اپنے انتقامی جواز کے باوجود افسوسناک ضرور تھا مگر ناگزیر بھی تھا۔ اس کی ہلاکت کے ساتھ ہی لال خان کی شخصیت میں وزن پیدا ہو گیا تھا۔

اس مرحلے سے فارغ ہو کر میں اندر پہنچا تو وہ دونوں سہمے ہوئے انداز میں کئی جگہ آگ لگا چکے تھے۔

میرے پہنچنے کے بعد آتش زنی کے اس عمل میں تیزی آ گئی اور دس منٹ بعد ہم عجلت کے عالم میں گھر سے نکلے تو ہلکے دھوئیں کے بادل پوری عمارت میں بھرنے شروع ہو گئے تھے!

کمال الدین نے پھاٹک کھولا، کار باہر نکلتے ہی اس نے دوبارہ آہنی در بند کیے اور اپنی جگہ پر آ گیا!

چلتے ہوئے عبدالغنی نے چوکیدار کی رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی بھی عقبی نشست کے پائیدان میں ڈال دی تھی جس پر میں نے کوئی تعرض نہ کیا!

آناً فاناً میں ہم وہاں سے دور نکل گئے۔ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ ہمیں وہاں سے نکلتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا!

کار ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو سوئیاں پانچ بجنے میں چند منٹ باقی بتا رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ چوہدری بشیر اس وقت بھی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر تین پر لال خان کا منتظر تھا!

ٹکراؤ شروع ہو چکا تھا اور اس بارے میں میرا ذہن فوری فیصلے صادر کرنے کی پوزیشن میں آ چکا تھا!

چوہدری بشیر کی برتری اور انا کو خاک میں ملانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کی تحقیر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ میں نے کار ایک میڈیکل اسٹور پر روک دی!

دکاندار پر محض اخلاقی دباؤ ڈالنے کے لیے میں نے غیر ضروری طور پر وہاں سے شیونگ کریم لوشن اور ایک پرفیوم خریدا پھر

ٹیلیفون ڈائرکٹری کا مطالبہ کر ڈالا جو نہایت خوش اخلاقی سے پورا کیا گیا!

کوئین پیلس ہوٹل کے نمبر نہایت آسانی سے مل گئے!

"ذرا انجی کال ہے"! میں نے ابتدائی دو نمبر ڈائل کر کے دکاندار سے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ ٹہلتا ہوا کاؤنٹر کے آخری سرے کی طرف چلا گیا۔

ابتدائی دو نمبر ڈائل کرنے کے باعث اسے یقین ہو گیا تھا کہ کال لاہور سے باہر کے لیے نہیں کی جا رہی تھی!

"منیجر سے ملاؤ!" آپریٹر کی آواز سن کر میں نے ماؤتھ پیس کے گرد ہتھیلی کا حلقہ بنا کر دھیمی آواز میں کہا۔

"وہ چھ بجے آتے ہیں سر!" آپریٹر نے مشینی انداز میں جواب دیا۔

"کسی اور ذمہ دار سے ملاؤ!" میں کسی کٹکھنے بھیڑئے کی طرح غرایا۔

"ایک منٹ!" آپریٹر میرے لہجے سے بوکھلا گیا۔ "آپ سوس چیف سے بات کر لیں!" اور چند کھٹکوں کے بعد ہی مجھے اپنے کانوں میں ایک بھاری آواز سنائی دی!

"چوہدری بشیر کہاں ہے؟" میں نے دھیمی غراہٹ میں سوال کیا۔ میری نگاہیں دور کھڑے ہوئے دکاندار پر مرکوز تھیں جو حسرت زدہ نگاہوں سے فٹ پاتھ سے گزرنے والے راہگیروں میں اپنے گاہک تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

اسی کے ساتھ میں کسی گاہک کی متوقع آمد سے بھی ہوشیار تھا!

"وہ کبھی کبھار ہی آتے ہیں یہاں! آپ کون صاحب ہیں؟" میری زبان سے چوہدری بشیر کا نام سن کر دوسری طرف سے بولنے والے کا لہجہ مؤدبانہ ہو گیا!

"لال خان بول رہا ہوں"! میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "چوہدری بشیر اس وقت ریلوے اسٹیشن کے تین نمبر پلیٹ فارم پر خاک چھان رہا ہو گا، اسے فوراً پیغام دو کہ گلبرگ والے ٹھکانے پہ ایک تماشا اس کا منتظر ہے!"

یہ کہہ کر میں نے جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا!

سامان کے پیسے ادا کر کے میں واپس آ گیا۔

گھر پر سیتا سخت اضطراب کے عالم میں ہماری منتظر تھی۔ ہم تینوں کو کسی ٹوٹ پھوٹ کے بغیر کار سے اترتے دیکھ کر اس کے چہرے پہ مسرت کی شفق دمکنے لگی!

"مجھے وحشت ہو رہی تھی!" وہ قریب آ کر میرا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ "کسی سانپ کے ٹھکانے میں گھس کر مرنا عموماً خطرناک ہوتا ہے!"

کمال الدین اور عبدالغنی کار سے اتر کر نہ جانے کدھر سرک گئے تھے!

پستول اور اس کی گولیوں کا ڈبہ میں نے سیتا کو تھمایا تو وہ ملامت آمیز نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟"

"اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی"! میں نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ "بس ڈراتے دھمکانے کے لیے خرید لیا تھا۔"

"اس کی نال میں سے جلی ہوئی بارود کی بو آ رہی ہے"! اس نے پستول کی نال سونگھتے ہوئے کہا۔ "اس سے تھوڑی ہی دیر پہلے فائر ہوا ہے اور یہ چیمبر میں ایک گولی بھی کم ہے"! اس نے ہاتھ کو قدرے خم دے کر چیمبر بھی دیکھ لیا۔

"اس سے ایک تالا توڑا گیا تھا"! میں نے کہا۔ "پہلے اندر چلو۔ جرح بعد میں کر لینا۔"

وہ واپس برآمدے کی طرف مڑی تو میں نے عقبی پائیدان سے رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی اٹھالی۔

سیفٹی کیچ کی دیکھ بھال کے بعد وہ اسلحہ ہم نے خواب گاہ میں مسہری کے نیچے فرش پر ڈال دیا۔

"وہاں کیا رہا؟" وہ ہماری کارگزاری جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

"مکان کو آگ لگا کر آئے ہیں۔ اب تک تو شعلے اس کے چپے چپے پر پھیل چکے ہوں گے"! میں نے مسرت اور فخر کے احساس کے ساتھ کہا۔

پھر میں اسے نشست گاہ میں لے آیا۔

"اندر آؤ"! برآمدے میں کمال الدین اور عبدالغنی کی سرگوشیوں کی آواز سن کر میں نے انہیں پکارا۔

وہ دونوں میرے ساتھ شریک تو ہو گئے تھے لیکن برسوں تک مالکانہ رویے کو برداشت کرنے کے باعث ان میں جھجک پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے گھر میں ان کی اجنبیت برقرار تھی اور وہ مجھے گراں گزرتی تھی۔

وہ اندر آئے اور یوں مودب کھڑے ہو گئے جیسے کسی حکم کے منتظر ہوں۔

"بیٹھو"! میں نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھنے لگے لیکن میں نے انہیں پھر ٹوکا اور صوفوں پر بٹھا لیا۔

"تم یہاں گھٹن محسوس کر رہے ہو؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"نہیں صاحب۔ ہم تو بہت خوش ہیں"! عبدالغنی خلافِ معمول بول پڑا ورنہ ہمیشہ وہ کمال الدین کے بولنے کا منتظر رہتا تھا۔ "اور آج تو بہت ہی خوش ہیں۔ پیر جی تو پکا پاپی نکلا۔ سود پہ بھی وہ جعلی روپیہ دیتا تھا۔"

"پھر تم دور دور کیوں رہتے ہو؟" میں نے اس کے آخری تبصرے کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔

"بس عجیب سی بات ہے"! اس بار کمال الدین تذبذب کے ساتھ بولا۔ "تالاب میں رہنے والی مچھلیوں کو سمندر میں ڈال دیا جائے تو وہ شروع میں گھبرا جاتی ہیں۔ یہی حال ہمارا ہے۔ برسوں سے مالکوں کی جی حضوری کرتے آ رہے ہیں یہاں برابری کا درجہ ملا ہے تو سٹپٹا کر رہ گئے ہیں۔"

"یہ ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ بیگم صاحب کے سامنے منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ نکل جائے۔ اپنی جہالت سے ڈر لگتا ہے"! عبدالغنی بولا۔

"یہ میری بیوی ہے اور تم دونوں میرے دوست"! میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس طرح تم اسے اپنی بھاوج بھی سمجھ سکتے ہو۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ اسی کی مرضی سے میں چوہدری بشیر کے پیچھے لگا ہوں۔ تم نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ سن کر یہ بھی دنگ رہ گئی تھی۔ اب اسے بتاؤ کہ آج وہاں کیا ہوا؟"

"آج تو واقعی مزا آ گیا"! عبدالغنی زیادہ ہی موج میں تھا۔ "بھری آبادی کے بیچ سادھو کا دبنا ہوا تھا مگر سالا جعلی نوٹ چھاپتا تھا۔ اس کے آدمیوں کو انٹا غفیل کر کے ہم نے ایسی آگ لگائی ہے آخری تنکا تک نہ بچ سکے گا۔"

"جعلی نوٹ چھاپتا تھا وہ؟" سیتا کے لیے وہ انکشاف حیرت انگیز ثابت ہوا۔

"ہاں! تہہ خانے میں شراب اور جوئے کے اڈے کے ساتھ ہی چھاپہ خانہ تھا جہاں سو سو کے جعلی نوٹ سینکڑوں گڈیوں کی صورت میں موجود تھے"! کمال نے بتایا۔ "مگر بھائی سلطان نے ایسی چالاکی سے پیر جی کو اس کے گھر سے نکالا کہ ہمیں میدان صاف مل گیا۔ اب وہ واپس لوٹے گا تو سر پیٹ کر رہ جائے گا۔"

پھر اس قصے کی رہی سہی کڑیاں میں نے پوری کر دیں۔

ان دونوں نے مجھے میڈیکل اسٹور میں جاتے اور فون کرتے تو دیکھا تھا مگر انہیں اس کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔ جب انہیں یہ پتہ چلا کہ میں نے کوئین پیلس ٹیلی فون کر کے چوہدری بشیر کے لیے پیغام چھوڑا تھا تو مسرت سے ان کے چہرے دمک اٹھے۔

"اب تو وہ ضرور اپنی بوٹیاں نوچ ڈالے گا"! کمال الدین بولا۔ "خدا کرے کہ اسے اسٹیشن پر ہی اپنے گھر کی تباہی کی خبر مل گئی ہو!"

"پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟" سیتا نے تازہ واقعہ پر تبصرے مکمل ہو جانے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔

"اب اس سے کوئین پیلس میں بات کروں گا!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مگر کس حیثیت میں؟"

"لال خان!" میں نے کہا۔ "فون کی حد تک میں یہی نام برقرار رکھوں گا۔ اس نام سے اب اس کے اعصاب چٹخنے لگے ہوں گے!"

"اسٹیشن پر نہ پہنچنے کا کیا عذر پیش کرو گے اور پھر عمارت کی بربادی، جس کا تم نے اس کے ایک آدمی سے خود اعتراف کیا ہے!"

"عمارت کی تباہی وعدہ خلافی کی سزا تھی اور اس وجہ سے میں اس سے ملنے نہیں پہنچا۔ میں نے اسے تنہا بلایا تھا اور وہ تین آدمی ساتھ لے گیا تھا!"

"اس پہ ہاتھ ڈالا ہے تو اسے پوری طرح ہی کچل ڈالو"! کمال الدین نے کہا۔ "کوئین پیلس کی تباہی اس کی کمر توڑ دے گی!"

"شاید یہ بھی کرنا ہی پڑے!" میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "مگر کوئین پیلس کا معاملہ اتنا آسان ثابت نہ ہو گا۔ وہ ایک ہوٹل ہے جہاں ہر وقت بہت سے لوگ موجود رہتے ہوں گے!"

"اگر وہ عام ہوٹل بھی ہے تو کیوں نہ اس وقت کا کھانا وہیں کھایا جائے!" کمال الدین نے تجویز پیش کی۔

"ہاں! گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے"! سیتا نے فوراً اس کی تائید کر ڈالی۔

"ہم دونوں وہاں نہیں جائیں گے"! کمال نے کہا۔ "اپنے حلیوں سے ہم الگ ہی نظر آئیں گے، ہمیں راستے میں کہیں اتار دینا، واپسی پہ وہیں مل جائیں گے!"

آخری تجویز کی معقولیت پر میں دل ہی دل میں کمال کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

ساڑھے سات بجے نہا دھو کر ہم گھر سے نکلے تو میں نے کار کا رخ چوہدری بشیر کے مکان کی طرف کر دیا۔ تاکہ سیتا دور سے میری پہلی انتقامی کارروائی کا جائزہ لے سکے۔

لیکن ہم اس مکان تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے قرب و جوار کی گلیوں میں تماشائیوں کا اژدہام جمع تھا اور آسمان کثیف دھوئیں سے بوجھل ہو رہا تھا۔

عمارت کے ملبے میں کہیں کہیں بھڑکنے والے شعلوں کا انعکاس سیاہ دھوئیں کی چادر کو اور زیادہ مہیب بنا رہا تھا۔

فائر انجنوں کی جائے واردات پر موجودگی تو خیر یقینی تھا۔ مگر پے در پے تیز سیٹیوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہاں پولیس کی بھاری نفری بھی موجود تھی۔

دور سے ہی اس صورت کا جائزہ لے کر میں نے کار موڑ لی۔

وہ دونوں راستے میں ایک بارونق بازار میں اتر گئے اور میں سیتا کے ہمراہ کار میں آگے بڑھ گیا۔

"بہت کاری وار کیا ہے تم نے اس پر!" تنہائی میسر آتے ہی سیتا نے کہا۔

"جب تک وہ دربدر کی ٹھوکریں نہیں کھانے لگے گا مجھے صبر نہیں آئے گا۔ ایک ٹھکانہ برباد ہو گیا، لیکن اس کی اور بھی جائدادیں ہوں

گی!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اگر بے گناہوں کے خون کا خوف نہ ہوتا میں ہر روز اسے ایسی ہی زک پہنچاؤں!"

"یہ تو اس کی سزا ہوئی۔" وہ میرے شانے پر ہاتھ مار کر بولی "مگر تم کو کیا حاصل ہوا۔ تم اپنے بھائی کے لیے کیا سوچ رہے ہو؟"

"بس ایک دو ذہنی جھٹکوں کے بعد اس سے ملوں گا!" میں نے سرسری طور پر کہا۔ "پہلے میں اس کے دماغ سے بڑائی کا خناس نکالنا چاہتا ہوں۔"

ان ہی باتوں میں ہم کوئین پیلس ہوٹل پہنچ گئے جو ایک معروف علاقے میں واقع تھا۔

پارکنگ لاٹ میں کار کھڑی کرنے کے بعد ہم اندر داخل ہوئے تو معطر اور آراستہ فضا میں نسوانی وجود کی رونق جابجا موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ سیتا وہاں والوں کے لیے کوئی عجوبہ نہیں بن سکتی تھی۔

ریستوران میں دھیمی روشنیوں میں جہاں میزوں کے گرد مرد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہاں باہر کے ہنگاموں سے اکتائے ہوئے جوڑے بھی اس ماحول میں بیتے دنوں کا خوابیدہ رومان جگانے میں مصروف تھے۔

میں نے ایک الگ تھلگ گوشے میں دو نشستوں والی میز کا انتخاب کیا اور وہاں جا بیٹھا۔

"کچھ ملے گا؟" ادھیڑ عمر ویٹر آیا تو میں نے معنی خیز لہجے میں اس سے سوال کیا۔

اس نے اپنے سر کو مایوسانہ انداز میں جنبش دی پھر سیتا کی طرف دیکھ کر بولا "اجازت ہو تو میں کہیں معلوم کروں!"

"دیکھ لو!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور وہ لہراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

"تم پھر پینے پلانے کے چکر میں!" سیتا کہنیوں کے بل میز پر میری طرف جھک کر تیز لہجے میں بولی۔

"آج تو موقع ہے!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں پتہ نہیں کہ یہاں شراب خلافِ قانون ہے، اگر ویٹر کوئی اچھی خبر لے آتا ہے تو اس طرح ہمیں کوئین پیلس کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ویٹر نمودار ہوا تو اس کے چہرے پر دور ہی سے پھٹکار نظر آ رہی تھی!

"سوری سر!" قریب آ کر وہ جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "آج اس علاقے میں نئے مہمانوں کا داخلہ بند ہے!"

"کس علاقے میں؟" میں نے دس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

وہ نوٹ لے کر خوشامدانہ انداز میں ہنسا پھر بولا "پچھلے حصے میں ریکریشن ہال ہے جہاں گیم بھی ہوتے ہیں اور تھوڑی بہت مل جاتی ہے مگر وہ حصہ انتظامیہ کے جانے پہچانے پرانے اراکین کے لیے مخصوص ہے۔ نئے مہمانوں کو کسی کی سفارش پر اجازت ملتی ہے!"

"ہماری سفارش کس سے کرائی تھی تم نے؟"

اس نے گردن پھرا کر معذرت خواہانہ انداز میں دانت نکال دیے۔

"میں نے اسی پیشے میں عمر گزاری ہے آپ جیسے شرفا کو ہزاروں کی بھیڑ میں پہچان سکتا ہوں۔ مالکان میری رائے مان لیتے ہیں کیونکہ میرے چُنے ہوئے گاہکوں سے آج تک ہوٹل کو کوئی شکایت نہیں ہوئی لیکن آج نہ جانے کیا بات ہے کہ منیجر صاحب نئے لوگوں کے لیے صاف انکار کر رہے ہیں!"

میں نے اس کے ہاتھ سے مینو لیا اور آرڈر نوٹ کرانے لگا!

"آج تمہارے ستارے واقعی زور پر ہیں!" ویٹر کے چلے جانے کے بعد سیتا نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا۔

"تم ساتھ ہو تو عموماً یہی ہوتا ہے، تمہیں دیکھ کر میرے ستارے اترانے لگتے ہیں!"

"تم شراب نوشی کے خواہاں تھے اور وہ بوڑھا گدھ تمہیں... ریکریشن ہال کا کچا چٹھا سنا گیا۔ شاید اسی طرف جوا وغیرہ ہوتا ہوگا!"

"بوڑھے گدھ کا نام پوچھنا نہ بھولنا... مجھے ریکریشن ہال دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے!" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"تم پیو گے مگر جوا نہیں کھیلو گے!" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"جوئے خانوں میں تماش بینی کرنے والوں کو شبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تم دیکھو گی کہ تاش کے کھیل میں میرے سامنے لوگ جیبیں جھاڑتے چلے جائیں گے!" میں نے دل ہی دل میں اپنے پرانے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"مگر تمہیں پیسے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے اعتراف کیا "لیکن یہاں سنسنی پھیل جائے گی کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جس سے جیتنا کسی کے بس کا روگ نہیں!"

"بہرحال یہ بعد کی بات ہے، باہر نکل کر طے کریں گے!" وہ ویٹر کو آتے دیکھ کر بولی اور میں نے ادھ جلی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی!

چوہدری بشیر اس وقت میرا شکار تھا جس نے باون پتوں کی چالبازیوں سے میرے بڑے بھائی کو کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا تھا۔ وہ ہوٹل اسی نابکار شخص کی ملکیت تھا یا اس میں اس کی حصے داری تھی!

میرے لیے یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ہوٹل کا نام کوئین پیلس تھا اور میں بلیک کوئین کا ایک پرانا عاشق۔ جن دنوں میں کثرت سے تاش کھیلتا تھا تو حکم کی بیگم میری شناخت بن کر رہ گئی تھی۔ تاش

بیٹھنے سے پہلے میں حکم کی بیگم کو سب سے اوپر لگانے کا عادی تھا پوری کوشش کے باوجود اپنی اس لاشعوری عادت سے نجات حاصل نہیں کر سکا تھا!

میں نے کم از کم ایک بار وہاں اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا فیصلہ تو کر لیا تھا مگر ایک مبہم سا خوف لاحق ہو رہا تھا کہ کھیل کے دوران کہیں میں نے کوئین پیلس کے ریکریشن ہال میں بلیک کوئین اوپر لگانی شروع کر دی تو کوئی پرانا پاپی مجھے پہچان نہ لے!

مگر میرے لیے تسلی کی بات یہ تھی کہ بلیک کوئین کے حوالے سے قمار بازوں کے حلقے میں میرا شہرہ برسوں پہلے کراچی میں ہوا تھا جب کہ لاہور ایک ہزار میل دور تھا۔ یہ محض میری بدنصیبی ہی ہوتی اگر کوئی شناسا عین موقع پر کوئین پیلس میں ٹکر جاتا!

کھانا ہوٹل کی ظاہری شوکت و آرائش کے عین مطابق خاصا لذیذ تھا!

کھانے سے فراغت کے بعد بل آیا تو میں نے رقم ادا کرتے ہوئے اس ویٹر کا نام معلوم کر ہی لیا جس کی سفارش پر مالکان اجنبیوں کو ریکریشن ہال کی برادری میں شامل کر لیتے تھے!

راستے میں کمال الدین اور عبدالغنی سڑک کے کنارے ہمارے منتظر تھے۔ انہیں لیتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے!

اسی رات میں نے کمال اور عبدالغنی کو ایک ہزار روپے دیے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں!

"یہ... یہ کیا ہے صاحب؟" کمال نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ڈرو نہیں، یہ اصلی ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا اور وہ شرمسار ہو گیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا!" وہ جلدی سے بولا "مگر ہم اس رقم کا کیا کریں گے؟"

"گھر بھیجنے کے لیے پیسے بعد میں دوں گا۔ کل صبح تم دونوں اپنی پسند سے کچھ کپڑے خرید لاؤ تاکہ میرے ساتھ بے دھڑک ہر جگہ آ جا سکو!"

"ٹھیک ہے!" وہ خوش ہو گئے۔

"کیا ہم یہ ساری رقم خرچ کر دیں؟" عبدالغنی کچھ مسحور سا ہو گیا تھا شاید اس کے لیے لباس کی مد میں دی جانے والی وہ رقم ضرورت سے زیادہ تھی!

"ہاں۔ سب!" میں نے زور دے کر کہا "ہو سکتا ہے کہ تمہیں شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی جانا پڑے، میں نہیں چاہتا کہ ایسی جگہوں پر لباس کی وجہ سے تم دوسروں کے سامنے کسی قسم کی جھجک محسوس کرو!"

اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا!

بستر پر دراز ہونے کے بعد مجھے خیال آیا کہ احتیاط کے طور پر مجھے اپنی کار تبدیل کر لینی چاہیے میں نے چوہدری بشیر کے مکان پر پیش آنے والے واقعات ذہن میں دہرائے تو میری کار کسی بھی مرحلے پر مشکوک ثابت نہ ہو سکی۔

چوکیدار نے کار دیکھی تھی مگر وہ اس بارے میں پولیس یا اپنے آقا کو کچھ بتانے کے لیے اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اندر سے جو دو ملازم پکڑے گئے تھے، ان کو باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور جب وہ اندر سے چوکیدار کی کوٹھری میں منتقل کیے گئے تو ہوش و حواس سے یکسر محروم ہو چکے تھے!

مگر میری دانست میں کار کی تبدیلی پھر بھی ضروری تھی۔

اگلی صبح میں بیدار ہوا تو کمال الدین بازار سے کئی اخبارات لے آیا تھا جب کہ میں اٹھنے کے بعد خود اسی مقصد کے لیے بازار جانے کا ارادہ کر چکا تھا!

باورچی خانے میں کمال الدین شکستہ انداز میں سرخیاں پڑھ رہا تھا اور عبدالغنی کے چہرے کے نقوش وفورِ جوش سے بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے!

"وہ... وہ مر گیا صاحب!" کمال الدین نے اخبارات کا پلندہ میری طرف بڑھاتے ہوئے مرتعش آواز میں کہا۔

"کون؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"چوکیدار!" وہ بولا "کسی نے اس کے گلے میں رسی باندھ کر اسے

جان سے مار دیا، آگ بجھانے والوں کو وہ اسی حالت میں ملا تھا!"

"جس بات سے ہمارا تعلق نہیں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا دماغ خراب نہ کرو۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا!

پہلے اخبار کی سرخی پر نگاہ پڑتے ہی خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا!

اخبار نے چوہدری بشیر کو شہر کا کروڑپتی ساہوکار قرار دیتے ہوئے جعلی کرنسی چھاپنے اور پھیلانے کے جرم میں اس کی گرفتاری کی خبر دی تھی!

سرخیوں کے نیچے پہلو بہ پہلو بہت سی تصاویر تھیں جن میں نوٹ چھاپنے والی مشین کا جلا ہوا ڈھانچہ اور مکان کے سوختہ کھنڈرات کے علاوہ چوہدری بشیر کا چہرہ نمایاں تھا!

میں تیزی کے ساتھ پوری خبر پڑھتا چلا گیا!

خبر کے مندرجات اس قدر مسرت افزا تھے کہ ایک ایک سطر کے مطالعے کے ساتھ میرے وجود میں ٹھنڈک سی تیرتی چلی گئی!

نامہ نگار کے مطابق چوہدری بشیر کے مکان میں لگنے والی آگ بہت بھیانک تھی اور اس کا آغاز بیک وقت کئی مقامات سے ہوا تھا۔ رات گئے ماہرین نے اسے آتش زنی کی ایک سوچی سمجھی واردات قرار دیا تھا۔

آگ اس قدر خوفناک تھی کہ چھ فائر انجن چار گھنٹے کی لگاتار کوشش کے بعد مہیب شعلوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ مگر اس آتش زنی کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس کے نتیجے میں مکان کے تہہ خانے میں لگی ہوئی جعلی کرنسی چھاپنے والی مشین کا راز فاش ہو گیا تھا۔ ملبے سے کرنسی چھاپنے کے دیگر سامان کے علاوہ جلے ہوئے اور ادھ جلے نوٹوں کی گڈیاں بھی برآمد ہوئیں جن کی نشاندہی ہوتے ہی پولیس کی بھاری جمعیت نے سلگتے ہوئے ملبے کو گھیرے میں لے لیا تھا!

پھر اسی عمارت کے ملبے میں موجود دو آہنی تجوریوں میں سے جعلی نوٹوں کے سیکڑوں بنڈل برآمد ہوتے، اخبار کے پریس جانے تک ملبے کی تلاشی جاری تھی!

چوہدری بشیر کی گرفتاری کے بعد ایک اخباری نمائندے نے محلے والوں سے مل کر ایک فیچر مرتب کیا تھا جس میں لوگوں کے نام شائع کیے بغیر اس کی مشکوک سرگرمیوں اور ہر شام اس کے گھر ہونے والے پراسرار اجتماع کی نشاندہی کی گئی تھی اس کے ساتھ ہی یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ چوہدری بشیر کو اپنی مذموم سرگرمیوں کے سلسلے میں بعض شوقین مزاج اعلیٰ حکام کی سرپرستی بھی شامل

اخبار نے اپنے طور پر اس واردات کے سلسلے میں پیشہ ورانہ رقابت کی کارفرمائی کا امکان ظاہر کیا تھا مگر چوہدری بشیر کے حوالے سے اس ضمن میں کوئی بات نہیں کہی گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ چوہدری بشیر آتش زنی کی خبر ملتے ہی الماس کا نام جھنڈے پر چڑھا دے گا مگر اخبار میں اس بارے میں کوئی سراغ نہیں تھا۔

بقیہ اخبارات میں بھی وہی کچھ تھا۔ بس ہر نامہ نگار نے اس واقعہ پر اپنے اپنے انداز میں قیاس آرائی کرنے کی کوشش کی تھی۔

پولیس حکام کے نزدیک چوکیدار کی موت اس معاملے میں کلیدی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ ملزموں نے عمارت میں آگ لگاتے ہوئے انسانی جانوں کے تحفظ کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ جس کا ثبوت یہ تھا کہ دو ملازموں کو عمارت میں بے ہوش کیا گیا تھا۔ مگر بعد میں انہیں چوکیدار کی کوٹھری میں پایا گیا جو آتش زنی سے محفوظ تھی۔

اُن کے نزدیک یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ ایک طرف انسانی جانوں کے احترام کا ثبوت دینے والے ملزمان دوسری طرف اس قدر شقی القلب کیسے ہو سکتے ہیں۔

انگریزی اخبار میں ان باتوں کی تکرار کے علاوہ ایک مختصر سنسنی خیز خبر تھی جو رات گئے کوئین پیلس کے سیل کیے جانے کے بارے میں تھی۔

جعلی کرنسی کے کاروبار کے سلسلے میں رات کے آخری پہر پولیس نے کوئین پیلس کو سیل کر کے ریکارڈ اور اثاثوں سمیت عملے کے چونتیس ارکان کو حراست میں لے لیا تھا کیونکہ وہ ہوٹل بلا شرکت غیرے چوہدری بشیر کی ملکیت تھا۔

قانون کا حصار چوہدری بشیر کو حیرتناک سرعت کے ساتھ اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ قانون جب تک حرکت میں نہ آئے عملی زندگی سے دور ایک نظریاتی دستاویز معلوم ہوتا ہے مگر جب اسے تحریک ملتی ہے تو اس کی زد میں آنے والوں کو روئے زمین پر امان ملنی مشکل ہو جاتی ہے۔

چوہدری بشیر کے خلاف معرکہ آرا ہوتے ہوئے مجھے خیال تھا کہ اس بے ضمیر بھیڑیے کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی مہم مجھے تنہا سر کرنی ہوگی جس میں اس کے وسائل ہر جگہ میرے آڑے آئیں گے۔ اور شاید اسے قابلِ ذکر نقصان پہنچانے میں مجھے دانتوں پسینہ آجائے مگر اس کو قدرت کی طرف سے ملی ہوئی مہلت پوری ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے ہی وار میں ناقابلِ شکست نظر آنے والا یہ برجی مٹی کی مورت کی طرح ڈھیر ہو گیا تھا۔

اس کا تابوت تیار ہو چکا تھا اور کیلوں کی فراہمی بھی شروع ہو گئی تھی۔

"اس کا تو قصہ ایک ہی وار میں نمٹ گیا۔" مجھے اخبارات سے فارغ پا کر کمال الدین نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "اس کے کریا کرم کا پورا پورا بندوبست ہو گیا ہے۔"

"پھر ہم کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ قصہ بہت بڑے پیمانے پر سامنے آیا ہے اور اس میں تین ملزموں کا ہر جگہ تذکرہ ہے پولیس اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔ ہم میں سے کسی ایک پر ہاتھ پڑ گیا تو سب گھیرے میں آ جائیں گے اور ہم پر ایسا تشدد ہوگا کہ قبر میں ہڈیاں تک کڑکڑاتی رہیں گی۔"

کمال کا چہرہ دھواں ہو گیا، عبدالغنی اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"یہ تو سوچا ہی نہیں تھا ہم نے۔" عبدالغنی کراہا۔

"احتیاط سے کام لو گے تو کچھ بھی نہ ہوگا۔" میں نے انہیں تسلی دی۔ "جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ یا کراچی چلے جاؤ مگر اپنے رہن سہن میں تبدیلی نہ آنے دینا ورنہ لوگ بلاوجہ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ دو تین ماہ میں قصہ دب جائے گا اور تم آزاد ہو گے۔"

"کراچی ہی چلے جائیں گے۔" کمال الدین بولا۔ "سنا ہے بڑا غریب پرور شہر ہے اس بہانے وہاں کی سیر بھی ہو جائے گی۔"

ناشتے کے دوران سینتا میز پر آئی تو وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

"اب کیا سوچ رہے ہو تم؟" سینتا نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"ہم تینوں کو اب الگ ہو جانا چاہیے۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "کمال اور عبدالغنی آج یا کل کراچی چلے جائیں گے۔"

"اور تم کیا کرو گے؟"

"میں چوہدری بشیر سے ملوں گا، جیل کی سلاخوں کے پیچھے اب تک اس کا دماغ درست ہو چکا ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور سینتا سہم گئی۔

"نہیں۔ تم اس کے قریب بھی نہیں پھٹکو گے۔ وہ ڈوبتی ہوئی کشتی کا مسافر ہے اپنے بچاؤ کی کوشش میں تمہیں بھی گھسیٹ لے گا۔"

"تم دیکھتی جاؤ کہ اب کیا ہوتا ہے۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "بھائی جان کا سراغ اگر کسی سے مل سکتا ہے تو وہ چوہدری بشیر ہے مجھے اس سے ملنا ہوگا۔"

اس کے بعد ڈائننگ روم میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی سینتا کی نگاہوں میں تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔

اُسی روز شام کو اخباری ضمیموں سے پتہ چلا کہ چوہدری بشیر کا سات دن کا جسمانی ریمانڈ حاصل کر لیا گیا۔ اس کے وکیل وحید آغا نے اپنے موکل کی پیروی کے لیے عدالت میں تین وکلاء کے نام دیے تھے جن کا سربراہ وہ خود تھا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں گھر سے نکلا تو سینتا نے خاصی فکرمندی کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ اس مرحلے پر میرا چوہدری بشیر سے ملنا کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں تھا۔ جب کہ میں وقت ضائع کیے بغیر جلد از جلد اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

عدالت سے ریمانڈ ملنے کا مطلب یہ تھا کہ چوہدری بشیر کی جیل میں منتقلی کی نوبت نہیں آئی تھی بلکہ وہ متعلقہ تھانے میں بند تھا۔

میں تھانے میں پہنچا تو وہاں خاصی رونق پائی جاتی تھی۔ احاطے میں چند اعلیٰ افسران کی گاڑیاں بھی موجود تھیں۔

میں نے تھانے کے انچارج یا کسی اعلیٰ افسر سے رابطہ قائم کرنے کی بجائے تھانے کے محرر کے کمرے کا رُخ کیا۔ دوسرے لوگ افسرانِ بالا کی موجودگی میں نسبتاً اہم تر کاموں میں مصروف تھے۔ لہٰذا محرر اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا روزنامچے کے اندراجات کا تنقیدی جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

اپنے کمرے میں میرے قدموں کی آہٹ سن کر ادھیڑ عمر محرر نے اپنی عینک کے موٹے موٹے عدسوں کے عقب سے ایک بھرپور نگاہ میرے سراپا پر ڈالی اور دوبارہ میز پر رکھے روزنامچے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میرے سلام کا جواب اس نے سرد اور کرخت لہجے میں دیا تھا۔

"رپورٹ لکھوانی ہے؟" سلام کا جواب دے کر اس نے میرے سراپا کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک حوالاتی سے ملنا ہے۔"

"رشتے دار ہو اس کے؟"

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"پھر ملاقات نہیں ہو سکتی۔" اس نے اٹل مشینی لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "نام اور نمبر کیا ہے حوالاتی کا؟"

"نمبر تو معلوم نہیں۔ نام چوہدری بشیر ہے۔" میرے منہ سے وہ نام سنتے ہی محرر چونک پڑا۔ اور اس کی آنکھوں میں دلچسپی عود کر آئی۔

"کس لیے ملنا ہے اس سے؟"

"ایک بہت ضروری ذاتی کام ہے۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اس سے اپنے ایک بچھڑے ہوئے عزیز کا پتہ معلوم

کرنا ہے۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ تپائی کی طرف اشارہ کر کے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”اس وقت تو ناممکن ہے۔ ڈی ایس پی صاحب نے اس کے ملاقاتیوں پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ وکیل کے علاوہ کوئی اس سے نہیں مل سکتا۔ اس کا بیان ملنے کے بعد شاید کوئی صورت بن سکے۔ کام کیا ہے تمھیں اُس سے؟“ آخری سوال اُس نے خالی الذہنی کے عالم میں کیا تھا۔

”اپنے بچھڑے ہوئے۔۔۔“ میں نے اپنے مدعا کی تکرار شروع کی ہی تھی کہ اُسے میرا چند ثانیوں پہلے کا جواب یاد آ گیا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں! ٹھیک ہے۔“ وہ قلم کے سرے سے اپنے رخسار کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت تو چھوٹے بڑے افسر موجود ہوتے ہیں، میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر علاقے میں کوئی واردات نہ ہوئی تو شام میں یہاں سناٹا ہو گا۔۔۔ تم چھ بجے آنا، میں کوشش کروں گا کہ اس سے تمھاری ملاقات کرا دوں۔“

میں نے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر بند مٹھی اس کی طرف بڑھائی اور اُس نے عجلت میں نوٹ لے کر جیب میں اڑس لیا۔

گھر لوٹا تو کمال الدین اور عبدالغنی روانگی کے لیے تیار، میرے منتظر بیٹھے تھے۔

ان دونوں کو اپنے ساتھ شریک کرتے ہوئے میرا اندازہ تھا کہ چوہدری بشیر سے میرا ٹکراؤ خاصا طویل اور صبر آزما ہو گا جس میں مجھے کسی نہ کسی سے مدد لینی پڑے گی مگر یہ میرے مقدر کی یاوری یا چوہدری بشیر کے نصیب کی خرابی تھی کہ سارا معاملہ ایک دن کی مختصر سی مدت میں اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

اس کام میں کمال الدین اور عبدالغنی نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو شاید مجھے یوں براہِ راست چوہدری بشیر کی کمین گاہ کو تہس نہس کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

میں نے خاموشی سے ان دونوں کو فی کس پانچ ہزار روپے دیے جو انھوں نے تشکر آمیز حیرت کے ساتھ قبول کر لیے۔

”ایک بات کہوں صاحب؟“ رقم جیب میں رکھنے کے بعد کمال الدین نے جھجکتے ہوئے مجھ سے اجازت چاہی۔

”کیا؟“ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چوہدری بشیر سے تمھاری کوئی بڑی رنجش چلی آ رہی ہے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیسے اندازہ لگا لیا تم نے؟“ میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

”آج کے زمانے میں بڑے لوگوں سے کوئی نہیں ٹکراتا۔ ہر عزت دار ان سے دامن بچا کر گزر لینے کی فکر میں رہتا ہے۔۔۔ پہلے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا مگر اب اندازہ ہو رہا ہے کہ چوہدری بشیر نے تمھیں کوئی بڑا نقصان پہنچایا ہو گا جس کا حساب تم نے اب چکایا ہے اور پھر تم جس فیاضی سے ہمیں پیسے دے رہے ہو، وہ بھی اپنی جگہ اہم ہے۔ روزگار سے لوٹا ہوا شخص کبھی اتنا سخی نہیں ہو سکتا۔“

”تمھارا اندازہ صحیح ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے اعتراف کیا۔ ”چوہدری بشیر نے میرے پورے گھرانے کو برباد کیا ہے۔ اگر تم دونوں نہ ملتے تو شاید میں اس کی نوکری حاصل کر کے کچھ روز میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا مگر یہ سب باتیں تم اپنی ذات تک ہی محدود رکھو گے۔ تم پر اپنی ہی نہیں، ایک لڑکی کی سلامتی کی بھی ذمہ داری ہے۔“

انھوں نے مجھے پوری رازداری کا یقین دلایا اور پھر میں انہیں سامان سمیت لے کر گھر سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

انھیں چھوڑ کر گھر واپس آیا تو سیتا قدرے اداس بیٹھی تھی۔

”تم نے بہت عجلت سے کام لیا۔“ اُس نے میرے استفسار پر کہا۔ ”اگر وہ ایک دو روز اور رکے رہتے تو کیا ہو جاتا۔“

”تنہائی سے اکتا رہی ہو؟“

”دونوں قابلِ اعتماد آدمی تھے۔“ اس نے کہا۔ ”اپنا ٹھکانا بنانے کے بعد بھی ہمیں ملازموں کی ضرورت ہو گی۔ میرا تو خیال تھا تم انھیں ساتھ رکھو گے۔“

میں ہنس پڑا۔ ”تم فکر نہ کرو، میں نے انھیں عارضی طور پر رخصت کیا ہے۔ یہاں سے نمٹ کر جب ہم کراچی کا رخ کریں گے تو وہاں وہ ہم سے آ ملیں گے۔“

”کراچی ان دونوں کے لیے اجنبی شہر ہے۔ اس گنجان جنگل میں تم انھیں کہاں ڈھونڈو گے۔“ اُس نے بے اعتباری سے کہا۔

”عقل کام کرتی ہے تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دونوں اگلے دو مہینے تک ہر جمعے کی شام اولڈ کلفٹن پر گزاریں گے۔ امید ہے کہ اس دوران میں ہم یہاں سے فارغ ہو کر کراچی چلے جائیں گے۔“

دن کا باقی حصہ میں نے گھر پر آرام کرتے ہوئے گزارا اور شام ڈھلے چوہدری بشیر سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

دن کے مقابلے میں اس وقت تھانے میں سکون تھا۔ محرر چند باوردی اور سادہ پوش سپاہیوں کے ساتھ سبزہ زار میں چارپائی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔

دُور سے ہی اُس نے مجھے پہچان لیا اور قبل اس کے کہ میں کار کا دروازہ مقفل کر کے اس کی طرف پیش قدمی کرتا اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

سلام میں پہل گو میرے نزدیک مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے مگر محرر نے جس انداز میں میرے سلام کا جواب دیا اس میں میری بیزاری کا ایک خفیف سا پہلو جھلک رہا تھا۔

میں اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں پہنچا تو اُس نے [illegible] کر چند ثانیوں تک میری طرف دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”دو سو روپے ہوں گے۔“

”دو سو روپے؟“ میں نے دبی زبان میں احتجاج کیا۔

”جلدی نکالو۔“ وہ چڑچڑے لہجے میں بولا جیسے مجھے قرض دی ہوئی رقم واپس طلب کر رہا ہو۔ ”اس کی ملاقات بند ہے کوئی افسر نکلا تو بے عزتی کر ڈالے گا۔۔۔ اُس سے جو کچھ کہنا سننا ہو جلدی کا خیال رکھنا۔“

سرخ رنگ کے دو نوٹ وصول کرنے کے بعد اُس نے گھنٹی بجائی پھر مجھ سے بولا۔ ”چھری چاقو یا کوئی اسلحہ تو نہیں ہے تمھارے پاس؟“

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور اسی لمحے ایک سپاہی سال خوردہ سی وردی میں ملبوس کمرے میں آ پہنچا۔

”تین نمبر حوالاتی کی ملاقات ہے یہ۔“ محرر نے سپاہی سے میرا تعارف کرایا۔ ”تالا نہیں کھلے گا بس جنگلے سے ملاقات کرا دینا، یہ ناشتہ پانی دے دیں گے۔“

”آؤ جی۔“ سپاہی نے میری پشت پر اشارا دیتے ہوئے کہا اور میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔

حوالات تھانے کی عمارت کے عقبی حصے میں تھی۔ ایک راہداری میں دونوں طرف چار چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جن کے آہنی سلاخوں والے دروازے مقفل تھے۔

پہلے دو کمروں میں کئی کئی افراد بند تھے جو قیدے قدرے مانوس نظر آ رہے تھے۔ تیسرا کمرہ خالی تھا اور چوتھے میں چوہدری بشیر اکیلا تھا۔

اپنی کوٹھری کے دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر وہ ٹہلتے ٹہلتے متوحش انداز میں مڑا اور اُس کی بے رونق خوف زدہ نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

اُس کا چہرہ سامنے آتے ہی میں بے اختیار جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

گمبھیر اور رعونت آمیز نظر آنے والا وہ چہرہ اس وقت زندگی سے مایوس دل گرفتہ انسان کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ اس کی رنگت زرد پڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے پڑ گئے تھے اور پیشانی پر تردد کی لکیریں نمایاں تھیں۔

”ملاقات ہے چوہدری تمھاری۔“ سپاہی پاٹ دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”دل کھول کر باتیں کر لو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

سپاہی مجھے چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

چوہدری بشیر چند ثانیوں تک کوٹھری کے تقریباً وسط میں کھڑا پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا پھر کسی تنویم زدہ شخص کی طرح تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا آگے آیا اور۔۔۔ دروازے کی آہنی سلاخیں تھام کر کھڑا ہو گیا۔

میں کچھ بولے بغیر تھوڑا سا مسکرایا۔ اپنا تعارف کرانے سے پہلے میں اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے پہچانے گا یا نہیں۔

”تمھیں کس نے بھیجا ہے؟“ آخرکار اس نے سرسراتی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں مجھ سے سوال کر ہی ڈالا۔

”کسی نے نہیں۔۔۔ خود ہی آیا ہوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”مجھے شاید آپ پہچان نہیں سکے چوہدری صاحب!“

”صورت تو کچھ شناسا ہے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ”مگر تم ہو کون؟ کس نے بھیجا ہے تمھیں؟“

”مجھے کسی نے نہیں بھیجا، میں خود آیا ہوں چوہدری صاحب!“ میں نے اس کی بکھری ہوئی ذات کو تھوڑا سا سہارا دینے کی نیت سے نرم لہجے میں اپنی بات دہرائی۔ ”وہ مجھے آنے نہیں دے رہے تھے، پیسے دے کر بمشکل یہاں پہنچا ہوں۔“

”مگر تم ہو کون؟“ اس بار اس کی آواز میں تجسس تھا۔ ”صورت دیکھی بھالی سی ہے۔ پتہ نہیں کن لوگوں میں سے ہو تم؟“

”میرا نام سلطان ہے چوہدری صاحب!“

”سلطان!“ اُس نے دو حصوں میں میرا مفروضہ نام دہرایا۔ پھر چونکتے ہوئے بولا۔ ”اوہ! خوب یاد آیا۔۔۔ وجاہت علی کے بھائی ہو تم۔۔۔ مگر یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا چاہیے تمھیں؟ کیوں میرے پیچھے لگے ہوئے ہو تم؟“

”گھر پر ملنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو یہاں پہنچا ہوں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”چلے جاؤ یہاں سے۔“ وہ میرے عاجزانہ جواب میں طنز محسوس کرتے ہوئے بپھر گیا۔ ”جنھیں میں اپنے در سے دھتکار چکا ہوں، یہاں بھی اُن سے ملنے کا پابند نہیں ہوں۔“

”یہ درست ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں کسی مجبوری سے فائدہ اٹھانے نہیں آیا۔ میں تو خود بے بس اور مجبور ہوں۔“

وہ پلٹا اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر خونخوار نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ ”تم چاہتے کیا ہو؟“

”اپنے گمشدہ بھائی کا سراغ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرم لہجے میں کہا۔

وہ دوبارہ دروازے کے قریب لوٹ آیا۔ ”یہ بہت بُرا دور ہے۔“ اس کا لہجہ خلافِ توقع نرم اور ناصحانہ تھا۔ ”تم تھوڑے بہت عزت دار لگتے ہو۔ وجاہت علی کو بھول جاؤ، فائدے میں رہو گے

ورنہ اُس کی پیشانی کے داغ تمھارے چہرے پر بھی چمکنے لگیں گے۔"

"وہ میرا اپنا فیصلہ ہوگا۔" میں نے اندرونی تڑپ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تم سے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟"

چند ثانیوں تک وہ کچھ کہے بغیر میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر بولا۔ "مجھ سے میرے وکیل کے سوا کوئی بھی نہیں مل سکتا۔ حد ہے کہ میری بیوی بھی مجھ تک نہ پہنچ سکی، باہر کی دنیا سے میرا رابطہ بالکل کٹا ہوا ہے۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟" میں نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"اخبارات دو روز سے مسلسل تمھارے خلاف زہر اگل رہے ہیں۔"

"ایک بار — بس ایک بار میرے آدمی مجھ تک پہنچ جائیں، پھر میں دیکھوں گا کہ حالات کا دھارا کتنی دیر میرے خلاف بہتا ہے۔"

"تم مجھ تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوئے؟" چند ثانیوں کے گمبھیر توقف کے بعد اُس نے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

"رشوت دے کر۔" میں نے کہا۔

"بکواس۔" وہ غرایا۔ "میرے آدمیوں نے پیسہ بہانے میں کوئی کسر چھوڑی ہوگی وہ تم سے ہزار گنا رشوت دینے کی استطاعت رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود انہیں میرے قریب نہیں پھٹکنے دیا گیا۔ اپنی ملاقات کا مقصد کیا بتایا تھا تم نے؟"

"حقیقت!" میں نے کہا۔ "اپنے بچھڑے ہوئے عزیز کا پتہ معلوم کرنے کا ذکر کیا تھا میں نے محرر سے۔"

"انسانی ہمدردی!" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "محرر شاید نرم دل آدمی ہے۔ اگر اس کے سامنے ایسی مظلومیت پیش ہو جو رشوت کا نذرانہ دے سکے تو اسے ضرور مجھ تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔"

"وحید آغا بہت بدمعاش ہے۔" اُس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "گرفتاری کے بعد سے اس نے ایک دم آنکھیں بدل لی ہیں۔ میرے بچاؤ کو تو اس نے یکسر قلم زد ہی کر دیا ہے مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے کہ میں کم از کم دو جرائم کا اعتراف کر لوں تاکہ وہ عدالت میں اقبالی بیان کی بنیاد پر کم سزا کے لیے جدوجہد کر سکے۔"

میں خاموش رہا۔

"مجھے یقین ہے کہ اس وقت وہ میرے اکاؤنٹ سے بھاری رقمیں بٹور رہا ہوگا۔ مگر میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔" وہ غصے اور بے بسی کے ساتھ بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اب اُسے میری مرضی کے بغیر ایک پیسہ بھی نہ دیا جائے۔"

"کسی کو کوئی پیغام پہنچانا ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔" میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "وحید آغا اگر تمھاری مجبوریوں کی آڑ میں رقم بٹور رہا ہے تو یقیناً نمک حرامی کا مرتکب ہو رہا ہے، مجھے تمھاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

"میری غیر حاضری میں صرف دو افراد میرے اکاؤنٹ سے رقمیں نکال سکتے ہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "میری بیوی اور راشد خان — راشد خان کوئین پیلس کا جنرل منیجر ہے اور وحید آغا کو ان دونوں تک رسائی حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان دونوں کو میرا پیغام پہنچا دو کہ وحید آغا کو اب کوئی رقم نہ دی جائے۔"

"راشد خان تو شاید پولیس کی تحویل میں ہوگا۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "کوئین پیلس کو سیل کر کے پولیس نے اس کے عملے کو گرفتار کر لیا تھا۔"

"یہ کب کی خبر ہے؟" اس نے تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"تمھاری گرفتاری والی شب ہی یہ کارروائی کی گئی تھی۔ اگلی صبح کے اخبارات میں دونوں خبریں ایک ساتھ شائع ہوئی تھیں۔"

اُس نے دانت پیس کر غصے اور مایوسی کے عالم میں کئی گالیاں دیں پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس نے کوئین پیلس کے بارے میں مجھے ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ پتہ نہیں وہ میرے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہا ہے۔"

"پھر تو تمھیں فوری طور پر اپنے دفاع کی فکر کرنی چاہیے۔"

"مسئلہ تو یہی ہے۔" وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "میرا باہر کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میں کچھ کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔"

یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ چوہدری بشیر میری تحقیر کرتا رہا، حد یہ تھی کہ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا اور میں نے اپنی انتقامی کارروائی کو خفیہ طریقے پر بروئے کار لاتے ہوئے اس کی ذات کو قانون کی نگاہوں میں بے نقاب کر دیا تھا مگر اب وہ مکار اور کینہ پرور شخص اپنے روح فرسا ذاتی مصائب کے بارے میں مجھ ہی سے مشورہ کرنے پر مجبور تھا۔

"آخر وہ تم سے اس طرح کیوں پیش آ رہا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ بدنیتی پر آمادہ ہے۔" چوہدری بشیر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "اس کا مفاد اسی میں ہے کہ کسی طرح مجھے لمبی میعاد کی سزا ہو جائے۔"

"مگر کیوں؟"

"وہ میرا سگا سالا ہے۔" اُس نے گہرا سانس لے کر تھکے ہوئے لہجے میں انکشاف کیا۔ "میری بیوی بھی اس کی عادتوں سے نالاں ہے۔ تو وہ سوچ رہا ہوگا کہ مجھے لمبی سزا ہو گئی تو عملاً اسے میری تمام جائیداد اور اثاثوں پر تصرف حاصل ہو جائے گا لیکن میں اس کے شیطانی عزائم کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

میں دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔ خود شیطانی عزائم رکھنے والا [illegible]ی اور کے لیے انہی اندیشوں کا اظہار کر رہا تھا۔

"میں تمھاری بیوی کو تمھارا پیغام پہنچا دوں گا۔" میں نے [illegible]۔ "لیکن میرے مسئلے کا کیا ہوگا؟" میں نے موقع پا کر اپنی بات چھیڑ[illegible]ی۔ "میں اپنی اُلجھن کے لیے تمھارے پاس پہنچا تھا مگر تمھاری بپتا [illegible]ن کر اپنی پریشانی بھول گیا۔"

"وہ تمھارا سگا بھائی تو نہیں تھا؟" چوہدری بشیر نے تائید طلب لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ میرے لیے سگوں سے زیادہ ہے کیونکہ یہاں میرا وہ واحد رشتہ دار ہے۔" میں نے خون کے حقیقی رشتے کو جھٹلانے کی بجائے گول مول سا جواب دیا۔

"خیر — اس بار تم میرا کام کر دو۔" اس نے کہا۔ "کل یا پرسوں دوبارہ میرے پاس آؤ گے تو میں تمھیں وجاہت علی کے بارے میں بھی بتا دوں گا۔"

"ابھی کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے اصرار کیا۔

"مجھ سے بحث نہ کرو۔" وہ تنک کر دروازے سے دُور ہٹ گیا۔ "وجاہت علی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا جو اس کا انجام بہتر ہوا ہوگا...."

"کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟" میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"موہوم سا امکان ہے کہ اس کا انجام سن کر شاید تم مجھ سے متنفر ہو جاؤ اور میرا کام کرنے سے انکار کر دو۔"

"وہ تو میں اب بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ "کل واپس آ کر میں تمھیں مفروضہ قصے سنا سکتا ہوں۔ میری تردید یا تائید کے لیے نہ تمھاری بیوی تم تک پہنچ سکتی ہے اور نہ راشد خان آ سکتا ہے۔"

وہ متوحش انداز میں ہنس پڑا۔ "مجھے کسی سے تصدیق کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں تمھاری بات پر اسی وقت یقین کروں گا جب ادائیگیوں کا سلسلہ موقوف ہونے پر وحید آغا بُری طرح بلبلاتا ہوا یہاں پہنچے گا۔"

"اور اگر وہ دس دن تک بھی نہ لوٹا؟" میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بے بسی کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

"تو تمھیں بھی صبر کرنا ہوگا۔"

"چلو — ملاقات ختم کرو۔" اسی وقت راہداری کے آغاز سے قدموں کی گونج کے ساتھ کسی کی تحکم آمیز آواز سنائی دی۔

"جلدی اپنے گھر کا پتہ بتاؤ۔" میں نے جھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے اپنے مکان کا نمبر دہرایا پھر بولا۔ "اگر راشد خان گرفتار ہو چکا ہے تو تمھیں اس سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس میری بیوی کو سمجھا دینا کہ اب وحید آغا کو کسی بھی قیمت پر کوئی رقم نہ دے۔"

"میں یہ کام ابھی کر لوں گا۔"

میرا فقرہ ختم ہونے تک سپاہی میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ "بس اب قصے کہانیاں ختم کرو، بہت دیر ہو گئی ہے۔"

راہداری سے سپاہی کے ہمراہ نکلتے ہوئے میں نے اُسے.... دس روپے کا ایک نوٹ تھما دیا جو اس نے کسی اعتراض کے بغیر اپنی جیب میں اڑس لیا۔

تھانے سے نکل کر میں سیدھا امن آباد کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ چوہدری بشیر کی بیوی کو فوری طور پر مطلوبہ پیغام پہنچا سکوں۔

امن آباد میں چوہدری بشیر کا خوبصورت مکان ایک پُرآسائش اور ستھرے علاقے میں واقع تھا۔

گھنٹی کی آواز پر ایک نوعمر لڑکے نے دروازہ کھولا تو میں نے اپنا نام سلطان ہی بتایا اور چوہدری بشیر کی بیگم سے ملنے کا مدعا ظاہر کیا۔ چند ثانیوں بعد ملازم واپس آیا اور مجھے نشست گاہ میں بٹھانے لے گیا۔

میں نے اس کمرے میں نشست سنبھالنے کے بعد سگریٹ سلگائی ہی تھی کہ کھڑی ناک اور تنگ پیشانی والا ایک دراز قامت شخص مکان کے اندرونی حصے سے نمودار ہوا اور مجھے اہمیت نہ دیتے ہوئے محض سلام کر کے میرے مقابل ایک صوفے پر براجمان ہو گیا۔

"ہاں تو سلطان صاحب! بیگم بشیر سے کیا کام ہے آپ کو؟" اُس نے بیٹھتے ہی مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"کیا وہ گھر پر موجود نہیں ہیں؟" میں نے اس کے جارحانہ لب و لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔

"موجود ہیں۔" اس نے آگے جھکتے ہوئے پُرزور لہجے میں کہا۔ "میں اُن کا بڑا بھائی ہوں۔ میرا نام وحید آغا ہے آپ کو جو بھی کام ہے بلاتکلف مجھے بتا دیں۔"

"اُن کے لیے ایک ذاتی نوعیت کا پیغام ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "زحمت نہ ہو تو چند منٹ کے لیے انھیں بلا دیں۔"

"کس کا پیغام لائے ہیں آپ؟" وہ میری طرف سے تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا اور میں دل ہی دل میں اس سے جلد از جلد گلو خلاصی کی دعا مانگ رہا تھا۔

"میری یہاں تک آمد کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں ہے۔" میں نے ناگواری کے احساس کے ساتھ کہا۔ "پیغام بیگم صاحبہ کے کسی بہی خواہ کی طرف سے ہے اور اُن کی بھلائی کے لیے ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ مجھ سے اتنی جرح کیوں کر رہے ہیں۔"

"میں اس کا بھائی بھی ہوں اور وکیل بھی۔" وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اس سے جو کچھ کہنا ہے مجھے بتا دیں اور اگر اس تک براہ راست رسائی پر مُصر ہیں تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا

پڑے گا کہ آپ واپس تشریف لے جائیں۔"

"معاملہ سنگین معلوم ہوتا ہے۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں شوشہ چھوڑا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ اپنے ہی مکان میں آپ کی قیدی ہیں اور آپ کی مرضی کے خلاف کسی سے نہیں مل سکتیں۔"

"مزید کچھ بکواس کی تو جبڑا ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔" وہ غصیلے لہجے میں غرایا۔ "سلامتی چاہتے ہو تو بلا توقف نکل جاؤ۔"

میں تیزی سے نکاسی کے راستے کی طرف مڑ گیا۔

"بھائی صاحب! انھیں روکیں۔" ایک باوقار نسوانی آواز نے مجھے سر گھما کر پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

اندرونی حصے میں کھلنے والے دروازے میں ایک دراز قامت، سبک اندام اور خوبصورت عورت چہرے پر سنجیدگی کی دبیز تہہ لیے کھڑی تھی اور وحید آغا جھلاہٹ کے عالم میں مسلسل اسے گھورے جا رہا تھا۔

"تم بلاوجہ دخل اندازی کر رہی ہو سیما!" آخرکار وہ جھلائے ہوئے لہجے میں زبان کھولنے پر مجبور ہو ہی گیا۔ "کچھ پتہ نہیں کہ یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے... موجودہ حالات میں ایسے مشکوک لوگوں سے بے دھڑک ملنا تمھارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اور اس وقت تمھاری حفاظت کا بوجھ میرے کاندھوں پر ہے۔"

"یہ باتیں ہم مہمان کی واپسی کے بعد تخلیے میں بھی کر سکتے ہیں بھائی صاحب!" اس عورت کا لہجہ ملامت آمیز تھا۔ "ان کی آمد کا مدعا سن لینے میں آخر حرج کیا ہے؟ آپ کو نہ سہی مجھے معلوم ہو جائے گا کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ اپنی بہن کے رویے پر وہ احتجاج کرتا ہوا ڈرائنگ روم سے چلا جائے گا مگر وہ وہیں براجمان ہو گیا۔

"آپ اِدھر آ جائیں۔" سیما نے ڈرائنگ روم کے ایک دور افتادہ گوشے میں نشست سنبھالتے ہوئے پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔

سیما کو لڑکی تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر وہ بہت ہی بھرپور اور حسین عورت تھی۔ اس کی ذات اور بول چال سے ایک ایسا ملکوتی اعتماد نمایاں تھا کہ چاہتے ہوئے بھی کوئی معتدل آدمی اس پر بری نگاہ نہیں ڈال سکتا تھا۔

"میں آپ کے شوہر کا ایک خفیہ پیغام لایا ہوں۔" میں نے سیما کے قریب بیٹھتے ہوئے بلا کسی تمہید کے سرگوشیانہ لہجے میں کہہ ڈالا۔

وہ غیر ارادی طور پر اپنی نشست پر آگے سرک آئی اور دھیمی آواز میں بولی۔ "کیا حال ہے اُن کا؟ آپ ملے تھے اُن سے؟"

اس کے لہجے میں ایک باوفا بیوی کی اندرونی تڑپ نمایاں تھی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں، میں سیدھا ان ہی کے پاس سے آ رہا ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "بس ذہنی طور پر بہت پریشان ہیں...۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ انھیں بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے؟" اس نے تحیر آمیز سرگوشیانہ لہجے میں میری بات کاٹ کر سوال کیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے سیما؟" وحید آغا غصے سے پیر پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ "اس کمرے میں میں بھی موجود ہوں۔ آخر ان سرگوشیوں کا مطلب کیا ہے؟ کیا میری ذات تمھارے لیے اسی قدر بے اعتماد ہو کر رہ گئی ہے؟"

"آپ اشتعال کے عالم میں ہیں بھائی صاحب!" سیما نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اندر جا کر آرام کریں۔ آپ، مجھے ان صاحب سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔"

"تم اس اجنبی کے مقابلے میں میری تحقیر کر رہی ہو۔" وحید آغا قالین پر پیر پٹخ کر اونچی آواز میں دہاڑا۔

"آہستہ بولیں بھائی صاحب!" سیما حیرت ناک ٹھنڈے دل و دماغ کی مالک تھی۔ "بچے بچیوں نے آپ کی چیخ پکار سن لی تو یہ تماشا اور بھی مضحکہ خیز بن جائے گا۔"

وہ کسی کا نام لیے بغیر چند ثقیل گالیاں دیتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

"آپ کے شوہر کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا۔" تخلیہ میسر آتے ہی میں نے جلدی سے کہنا شروع کیا۔ "مگر آپ کے بھائی مصر ہیں کہ چوہدری بشیر اقبالِ جرم کر لیں۔ چوہدری صاحب کا خیال ہے کہ اُن کا سالا انھیں سزا دلوا کر اُن کے اثاثوں پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اب اُن کی براہ راست اجازت کے بغیر وحید آغا کو ایک پیسہ بھی نہ دیا جائے۔"

"اوہ خدا!" اس نے داہنے ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔ "چوہدری صاحب ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ پچھلے چند روز میں بھائی صاحب کو ساڑھے تین چار لاکھ روپے دے چکی ہوں۔ دو لاکھ تو محض اس وجہ سے یکمشت لیے تھے کہ چوہدری صاحب کو ہولناک تشدد سے نجات دلوائی جا سکے۔ مجھ سے بھائی جان نے کہا تھا کہ چوہدری صاحب بری طرح لہولہان کر دیے گئے ہیں، زبان پر لکنت طاری ہے اور اسی وجہ سے ملاقاتوں پر پابندی ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "چوہدری صاحب کو شبہ ہے کہ مفروضہ واقعات کی بنا پر آپ سے رقمیں وصول کی جا رہی ہوں گی اور پتہ چلا کہ اُن کے تمام اندیشے سو فیصد درست ہیں۔"

"اس وقت بھی بھائی صاحب ضمانت کی کوششوں کے سلسلے میں ایک لاکھ مانگ رہے تھے، آپ نہ پہنچتے تو شاید میں چیک کاٹ ہی دیتی۔"

"اس وقت تو دور دور تک ضمانت کا کوئی امکان نہیں ہے۔" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "جرم سنگین ہے اور ساری شہادتیں ان کے خلاف ہیں۔"

"جو مقدر میں لکھا ہو گا وہ جھیلنا ہی پڑے گا۔" اس نے ایک گہرا سانس لے کر مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "چوہدری صاحب کی گرفتاری تک میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ غیر قانونی دھندوں تک ملوث ہوں گے۔"

"دیکھیں عدالت کیا فیصلہ کرتی ہے۔" میں نے اپنی دانست میں گفتگو کو ختم کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"وکالت نادر بھائی صاحب کے حق میں رہا تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔ "چوہدری صاحب سزایاب ہو جائیں گے۔ بھائی صاحب خاصا پیسہ بٹور چکے ہیں، حیلے بہانوں سے کچھ اور ہتھیا لیں گے۔ مگر میرے بچوں کی زندگی برباد ہو جائے گی... ایک سزا یافتہ کی بیٹیوں کو کون سا عزت دار گھرانا اپنی بہو بنانا پسند کرے گا؟"

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی ٹھیک ہی تھا مگر وہ اس کے ذاتی معاملات تھے جن سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے لیے بس اتنا کافی تھا کہ میرے بڑے بھائی کو جوئے کی لت میں مبتلا کر کے میرے گھر کا شیرازہ بکھیرنے والا میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

کھلی فضا میں آزاد شہری کی طرح بنکارنے والا چوہدری بشیر حوالات کی سلاخوں کے پیچھے اپنے نوشتۂ تقدیر کا منتظر تھا اور وہاں بھی اس بدکردار شخص کو ذہنی سکون میسر نہیں تھا۔ اس کے اپنے رشتے دار گناہوں اور جرائم سے کمائے ہوئے پیسے کی خاطر اس کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے اور ان سازشوں کی بیخ کنی کے لیے وہ مجھ جیسے ازلی دشمن کا سہارا لینے کے لیے مجبور تھا۔

میں وہاں سے اٹھ گیا۔

گھر سے نکلتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہیں وحید آغا گھر سے باہر میرا منتظر نہ ہو مگر باہر میدان صاف تھا۔

سیتا گھر پر نہایت کوفت کے عالم میں میری منتظر تھی۔

"تم نہیں ہوتے ہو تو میرے لیے وقت گزارنا دوبھر ہو جاتا ہے؟" سامنا ہوتے ہی اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"چند دن کی مجبوریاں ہیں پھر تمھیں کوئی شکایت نہیں رہے گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمھیں گھر پر چھوڑ کر باہر جانا مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"دیر ہونے کی وجہ سے مجھے فکر لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں کسی دشواری میں نہ پڑ گئے ہو۔ اس سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟"

"اس وقت وہ بدترین مشکلات سے دوچار ہے۔"

سیتا نے چوہدری بشیر کی کہانی سنی تو پھریری لے کر رہ گئی۔

"اس کی بیوی سچ ہی کہہ رہی تھی۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لڑکیوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔"

"اس کا توڑ تو اب کسی کے بھی بس میں نہیں ہے۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "سچ پوچھو تو مجھے اس کی بیوی پر بھی رحم آ رہا ہے۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کا میاں غلط دھندوں میں الجھا ہوا ہے۔"

"خوبصورت عورت ہے کیا؟" اس نے مجھے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خاصی حسین اور باوقار ہے۔"

"حسین عورتوں پر رحم کھانا ہر مرد کی کمزوری ہوتی ہے۔" وہ ہنس کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پھر چوہدری بشیر کو بری کرانے کے لیے کیا کر رہے ہو؟"

"میرے لیے حیرت کی بات یہ ہے کہ چوہدری بشیر نے کسی بھی مرحلے پر لال خان کا تذکرہ نہیں کیا، نہ اخباری کہانیوں میں اس کا ذکر تھا نہ ہی اس کا نام لیا۔ آخر اس بارے میں وہ اتنی رازداری سے کیوں کام لے رہا ہے؟"

"وہ خوفزدہ ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب بھی اس کے کچھ ٹھکانے اور دھندے پولیس کی زد سے بچے رہ گئے ہوں اور وہ لال خان کو اشتعال دلا کر انھیں بھی نہ گنوانا چاہتا ہو۔"

"تم نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے۔" میں نے دبے دبے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "کل جب میں اس سے ملوں گا تو اس زاویے سے کریدنے کی کوشش کروں گا۔"

"بے سود ہو گا۔" اس نے کہا۔ "لال خان کا نام ایک راز ہے جس سے چوہدری بشیر یا اس کے قریبی ساتھی واقف ہیں۔ تم نے اس بارے میں اشارہ بھی کیا تو وہ تمھیں لال خان کا آدمی سمجھ کر تم کو کوئی نقصان پہنچانے پر اتر آئے گا... یہ چھان بین تو تم اس وقت کرو جب اسے رگیدنے کا ارادہ ہو جس کی میرے خیال میں اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔"

"یہ سب تو سن لیا لیکن اصل بات کی تمھیں پروا ہی نہیں۔" اسے خاموش پا کر میں نے ٹوکا۔

"ارے ہاں۔ بھائی جان کے بارے میں کیا رہا؟"

"میرا خیال ہے کہ چوہدری بشیر نے اُن کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہو گا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ بضد تھا کہ پہلے میں اس کا پیغام اس کی بیوی تک پہنچاؤں، اس کے بعد ہی وہ مجھے کچھ بتلائے گا۔ اس نے صاف صاف کہا کہ بھائی جان کا انجام ایسا ہے کہ جس سے واقف ہو کر میں بھڑک جاؤں گا اور اس کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کروں گا۔"

"یہ جاننے کے باوجود تم اس کے گھر جا پہنچے؟"

"اس لیے کہ اس کے علاوہ چوہدری بشیر کی زبان کھلوانے کی اور کوئی ترکیب نہیں تھی۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "پھر اب وہ اپنے سیاہ کرتوتوں کی بنا پر تقدیر کے بے رحم جنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑی سی مہربانی کر لی جائے تو اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ تیسری بات یہ کہ بھائی جان کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اشتعال اور جلد بازی سے چلتے ہوئے ان دنوں کو لوٹایا نہیں جا سکتا۔ اصل کام یہ

ہے کہ اُن تک پہنچ کر انہیں موجودہ مصائب سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔"

"یعنی کل شام سے پہلے کچھ بھی نہ ہوسکے گا۔"

سیتا کئی روز سے گھر کی چار دیواری میں محدود تھی لہٰذا سادھوکر میں نے اُسے باہر چلنے کی پیش کش کی تو وہ خوش ہو گئی۔

ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد میں اس کے ہمراہ ایک سینما گھر میں جا گھسا۔ وہاں سے رات گئے ہم گھر لوٹے اور گہری نیند سو گئے۔

اگلے دن میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ بس سارا دن یہی انتظار ہوتا رہا کہ شام کا دھندلکا پھیلے اور میں چوہدری بشیر سے فیصلہ کن ملاقات کی کوشش کروں۔

شام چھ بجے میں گھر سے روانہ ہو گیا۔

تھانے میں پہنچا تو میری بدقسمتی کہ محرر غیر حاضر تھا اور عملے کے دیگر اراکین سیدھے مُنہ بات کرنے کے لیے بھی آمادہ نہ تھے۔ چوہدری بشیر کا نام سُنتے ہی ہر ایک یوں بدک رہا تھا جیسے وہ تھانے کی جنت ارضی میں اُگا ہوا کوئی شجرِ ممنوعہ ہو۔

بدقت تمام میں اس سپاہی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوا جو پچھلی شام محرر کی ہدایت اور ناشتہ پانی کی امید پر مجھے چوہدری بشیر کے لاک اپ کی طرف لے گیا تھا۔

"اس حوالاتی کی ملاقات پر سخت پابندی ہے صاحب!" سپاہی نے میرا مدعا جاننے کے بعد خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "محرر صاحب ہی کچھ کر سکیں گے، ہم چھوٹے آدمی ہیں۔ کسی افسر کو حکم عدولی کی خبر مل گئی تو فوراً معطلی کا پروانہ آجائے گا۔"

"میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔ میں کیا کروں؟" میں نے اپنے مسئلے کا بوجھ اس کے کاندھوں پر لاد دیا۔

"وہ تھوڑی دیر میں لوٹ آئیں گے، انتظار کر لو اُن کا۔" سپاہی ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "چاہو تو اندر کمرے میں آکر بیٹھ جاؤ۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد محرر کی واپسی عمل میں آئی۔ اس دوران میں مجھ سے ہمدردی جتانے والا سپاہی بیشتر وقت محرر کے کمرے میں میرے ساتھ بیٹھا خوش گپیاں کرتا رہا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ آدابِ ماتحتی سے بھی کماحقہ واقف تھا کیونکہ محرر کی آمد کے ساتھ ہی اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ہم دونوں کو تخلیہ فراہم کر دیا۔

"تم پھر آگئے آج؟" محرر نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے عینک کی اوٹ سے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"مجبوری ہے۔" میں نے جلدی سے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "کل بڑی مشکل سے اس کا دل موم کر پایا تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شاید آج وہ کچھ بتا ہی دے۔"

"تمھارے گم شدہ عزیز کا پیر جی سے کیا تعلق تھا؟"

"شاید ملازم ہو گا اس کا۔۔۔" زیادہ ترامی کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔"

"آج آخری ملاقات ہو گی تمھاری اس سے۔" محرر نے فرمان صادر کیا۔ "کل آئے تو ایک نہیں سنوں گا۔ لاؤ نکالو تین سو۔"

"تین سو؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ یہ دو سو روپے کی خرابی ہے کہ تم آج پھر منہ اُٹھائے یہاں آپہنچے۔ کل ہی ہزار دیتا تو تم یہاں نظر نہ آتے۔"

غیر قانونی حقوق کی شرح کے تعین کے لیے اس نے خاصی وزنی دلیل فراہم کی تھی۔ لہٰذا مجھے کسی بحث کے بغیر تین سو اس کے حوالے کرنے پڑے۔

راستہ میرا دیکھا بھالا تھا لہٰذا میں خود ہی حوالات کی طرف چل دیا۔ راہداری کے سرے پر اسی سپاہی نے خیر سگالی کی مُسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور میں اعتماد کے ساتھ چوہدری بشیر کے لاک اپ کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ فرش پر بچھے ہوئے کمبل سے اٹھ کر بے تابانہ انداز میں سلاخوں دار دروازے پر آگیا۔

"تم نے زبردست کام دکھایا ہے۔" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "وہ آج صبح سویرے ہی کسی پاگل کتے کی طرح غراتا ہوا یہاں آیا تھا۔ میری بیوی نے اسے ایک پیسہ بھی دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور اب شاید وہ وکیل بھی بدل ہی دے گی۔"

"مگر تمھارا پیغام پہنچنے تک وہ اپنی بہن سے مختلف حیلوں بہانوں سے ساڑھے تین چار لاکھ روپے اینٹھ چکا تھا۔" میں نے اُسے آگاہ کیا۔

"ذرا مقدمے سے نمٹ لوں پھر اس سے ایک ایک پیسے کا حساب لوں گا۔" وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے بولا۔ "آخر اسے اتنی بڑی رقم دی کیوں گئی؟"

"دو لاکھ تو اس نے محض تمھیں تشدد سے بچانے کے لیے حاصل کیے تھے۔" میں نے کہا۔ "اس نے حوالات میں تم پر تشدد کی ایسی تصویر کشی کی کہ وہ چاہتا تو دو لاکھ سے زیادہ بھی اسے بلا تامل دے دیے جاتے۔"

وہ کچھ دیر تک اسے برا بھلا کہتا رہا اور اپنے دل کا غبار ہلکا کرتا رہا۔ اور میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا تاکہ وہ موضوع جلد از جلد ختم ہو۔

"آج میں بڑی مشکل سے اندر پہنچا ہوں۔ موقع پاتے ہی میں نے کہہ ڈالا۔ "محرر نے صاف کہہ دیا کہ آج کے بعد وہ مجھے اندر گھسنے نہیں دے گا۔"

"تم نے اپنا کام کر دیا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "اب تمھیں دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"میں منتظر ہوں۔" اُسے خاموش اور خیالات میں گم دیکھ کر میں نے آہستگی سے لقمہ دیا۔

"وجاہت علی تمھیں گدو بندر کے دماغی امراض کے ہسپتال میں ملے گا۔" اس نے مجھ سے نگاہیں چراتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔

"پاگل خانے میں؟" میں نے تحیر زدہ آواز میں سوال کیا۔ "مگر وہ وہاں کیسے پہنچا دیے گئے؟ ہوا کیا تھا انھیں؟"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔" چوہدری بشیر نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "گزرے ہوئے وقت کو واپس لانا تمھارے بس سے باہر ہے۔۔۔۔ میں نے کہا تھا نا کہ اس کا انجام سن کر تمھیں صدمہ ہو گا۔ مگر تم تحمل کے ساتھ ہی اسے مصائب سے نجات دلا سکتے ہو۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پژمردہ لہجے میں سوال کیا۔ "اس واقعے کا پس منظر جاننا چاہتا ہوں میں۔"

چوہدری بشیر نے بہلا پھسلا کر مجھے ٹالنے کی بہتیری کوششیں کیں مگر میں نرم خوئی کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس شرمناک حرکت میں چوہدری بشیر کا ہاتھ ضرور رہا ہو گا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس مرحلے پر میں نے تلخی یا بدگوئی کا سہارا لیا تو وہ سختی سے اپنی زبان کو بند رکھے گا۔

"وہ بہت بدقماش آدمی تھا، اپنی ذمہ داریوں کو بھول کر گردن تک جوئے کی دلدل میں غرق تھا۔" آخر چوہدری بشیر نے کہنا شروع کیا۔ "پہلے اس نے دکان فروخت کی پھر مکان بھی گنوا دیا۔ ان دنوں وہ مجھ سے بہت قریب تھا۔ جب یکے بعد دیگرے اس کے سارے وسائل مسدود ہو گئے تو میں نے اُسے قرض دینا بھی بند کر دیا۔ ان ہی دنوں اُس نے کسی طرح میرے بعض رازوں سے واقفیت حاصل کر لی اور جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو براہِ راست مجھے بلیک میل کرنے پر تُل گیا۔ اس کی یہ جسارت میری برداشت سے باہر تھی۔ پھر ان ہی دنوں اخباروں میں اس کے بھائی صفدر علی کا بھی ذکر آنے لگا جو ہندوستان میں قانون کی آنکھوں میں دُھول جھونک رہا تھا۔ خبریں تھیں کہ وہ کسی بھی وقت پاکستان پہنچ جائے گا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ قاتل درندہ وجاہت علی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ لہٰذا میں نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔"

وہ سانس لینے کے لیے رُکا اور قدرے توقف کے بعد پھر بولنے لگا۔ "قتل و خون سے میں نے ہمیشہ پرہیز کیا ہے لہٰذا وجاہت کے سلسلے میں بہترین صورت یہی نظر آئی کہ اُسے پاگل قرار دے کر بند کرا دوں۔ چند روز بعد وہ اپنے کرائے کے مکان میں آتشزنی کے جرم میں پکڑا گیا۔ مختصر سی سماعت کے بعد اس کا طبی معائنہ ہوا اور اسے بگڑا ہوا ذہنی مریض قرار دے کر پاگل خانے میں پہنچانے کا حکم صادر ہو گیا۔ اس مرحلے پر میں نے اپنے اثرات سے کام لیا اور اسے لاہور سے سیکڑوں میل دُور گدو بندر بھیج دیا گیا۔"

"ہو سکتا ہے کہ اب تک وہ واقعی پاگل ہو چکے ہوں۔" میں نے غصے کی شدید لہر کو ضبط کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے امید نہیں۔" چوہدری بشیر اپنی روانی میں میرے لہجے پر غور کیے بغیر کہتا چلا گیا۔ "وہ بہت سخت اعصاب کا مالک تھا۔ لاہور کی کوتوالی میں تین شب و روز کا مسلسل تشدد بھی اس کا دماغ درست نہ کر سکا تھا۔"

"شاید یہ وجاہت علی کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا نتیجہ ہے کہ آج تم اس حوالات کے قیدی ہو۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ظلم دیر سے سہی مگر رنگ ضرور دکھاتا ہے۔ تم نے وجاہت علی کے ساتھ بدترین سلوک کیا تھا۔"

"اب تم جو چاہو کہتے رہو، میں نے حقائق بیان کر دیے ہیں۔" اُس نے میرے طنز کا برا مانتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ "میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر میرے ضمیر نے کبھی مجھے ملامت نہیں کی۔"

"ضمیر ہوتا تو ملامت کرتا۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان الفاظ کی ادائیگی سے باز نہ رہ سکا۔ "ویسے سننے میں آیا ہے کہ صفدر علی پاکستان میں موجود ہے۔ وجاہت علی کا سراغ لگانے کے بعد میں اس سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا کیونکہ میرا اپنا خون ہے وہ۔"

چوہدری بشیر کا چہرا ایک دم دھواں ہو گیا۔ "اُسے میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ تم نرم دل ہو مگر میں نے سنا ہے کہ صفدر علی بہت سفاک اور بے رحم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی وہ میرے بارے میں۔۔۔ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔"

"اور اگر میں کہوں کہ میں ہی صفدر علی ہوں۔" میں نے سلاخوں کے سہارے آگے جھکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

وہ بے اعتباری سے کھوکھلے انداز میں ہنسا۔ "میں مان ہی نہیں سکتا۔ اس کی تو صورت دیکھ کر ہی پتا پانی ہو جائے گا۔"

"نہ مانو۔ یہ خوش نصیبی ہے تمھاری۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مگر میرا خیال ہے کہ صفدر علی تمھاری بُو پر لگا ہوا ہے۔"

"یہ کیسے کہہ رہے ہو تم؟" اس کی نگاہوں میں اضطراب اور خوف سمٹ آیا۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تمھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔

"مگر اس سے میرا مفاد بھی وابستہ ہے۔" وہ خائفانہ لہجے میں بولا۔ "تم صفدر علی کی یہاں موجودگی کا حوالہ کیوں دے رہے ہو؟"

"شاید اس نے نام بدل لیا ہے۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"لال خان تو نہیں بن گیا ہے وہ؟" اس نے اضطراری طور پر سوال کیا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا اس کا نیا نام؟" میں نے تحیر آمیز لہجے

میں سوال کیا۔

"لال خان ہی میرے اس انجام کا ذمہ دار ہے۔" وہ مدھم، شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "اُس نے اپنی ہر دھمکی کو عملی جامہ پہنایا ہے۔"

"اُس سے بات ہوئی ہے تمھاری؟" میں بدستور انجان بنا رہا۔

"میری بات چھوڑو۔" وہ مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم صفدر علی اور لال خان کو ایک شخصیت کیوں قرار دے رہے ہو؟"

"اُس کی طرف سے مسلسل رقومات ملتی رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اُسی نے فون پر مجھے تم سے حوالات میں ملنے کا مشورہ دیا تھا مگر تم اُس سے کیسے واقف ہو؟"

وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ "اس نے بالمشافہ مجھ سے ملنا چاہا تھا۔ تنہائی میں ملاقات ہونی تھی۔ میری غلطی کہ تک احتیاطاً چند جاں نثاروں کو ساتھ لے گیا اور واپس لوٹنے بھی نہ پایا تھا کہ بربادی کا افسانہ مکمل ہو گیا۔"

"یعنی وعدہ خلافی کی کڑی سزا ملی۔" میں نے لقمہ دیا۔ "مگر اس نے تم سے کیوں مل بیٹھنے کی کوشش کی؟"

"مجھ پتہ نہیں۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "ملاقات ہوتی تو شاید پتہ چلتا مگر وہ پہنچا ہی نہیں۔"

"لیکن تمھارے قصے میں، خیالات میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں آیا بلکہ میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے کہا۔

"اس کا ذکر میں نے دانستہ گول رکھا۔ لال خان جو بھی ہو میں اس سے مزید بگاڑ مول لینا نہیں چاہتا۔"

میں واپسی کے لیے مڑا تو اس نے جھجکتے ہوئے آواز دے کر مجھے روک لیا۔

"کیا بات ہے؟"

وہ چند ثانیوں تک غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "اگر صفدر علی وہی ہے اور تم اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو اُسے بتا دینا کہ مجھے کڑی سزا مل چکی ہے اور اب وہ مجھے معاف کر دے۔"

"تمھاری زبان سے معافی کا لفظ عجیب سا لگتا ہے۔"

"انسان ہمیشہ اپنے حالات کا اسیر رہتا ہے اور اُسے سمجھوتوں کے تحت زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ جھوٹی انا کے پجاری بہت جلدی برباد ہو جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ملاقات ہوئی تو تمھارا پیغام اس تک پہنچا دوں گا۔"

اس کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔

یوں تو چوہدری بشیر سے اس روز کھل کر بات ہوئی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ کافی ہی تھا لیکن جب میں بھائی جان کے ساتھ اس کے وحشیانہ سلوک کے بارے میں غور کرتا تو میرا خون کھولنے لگتا۔

اس وقت دل میں بس یہی ایک دُھن سما جاتی کہ چوہدری بشیر کو کسی ستون کے ساتھ مضبوطی سے باندھ کر اس پر اتنے دُرّے برسائے جائیں کہ اس کے بدن کا ریشہ ریشہ چیخ اٹھے۔

راستے میں میں اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس رک گیا جس سے کار کرائے پر حاصل کی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اگلے روز مکان خالی کرنے والا ہوں تو اس کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ البتہ اس نے یہ ضرور کہا کہ پیشگی ادائیگی میں سے چند روز کے بجائے ایک ماہ کا کرایہ منہا ہو گا۔

کار میں نے اسی وقت وہاں چھوڑ دی اور باقی ماندہ رقم لے کر گھر لوٹ گیا۔

سیتا نہ بھائی جان سے ملی تھی اور نہ اُن سے اس کا کوئی خونی تعلق تھا مگر میری ذات کے حوالے سے اس کا جو رشتہ پیدا ہو گیا تھا وہی اتنا مضبوط تھا کہ اُن کی کتھا سن کر سیتا لرز کر رہ گئی۔

"میرے خدا! پاگلوں کی بھیڑ میں ایک صحیح الدماغ آدمی کا رہنا کتنا بڑا عذاب ہے! چوہدری بشیر واقعی درندہ ہے۔"

"اب کل ہم کراچی روانہ ہو رہے ہیں۔" میں نے چند ثانیوں کے گمبھیر سکوت کے بعد کہا۔ "یہاں ہمارا کام ختم ہو چکا ہے۔"

"تو حیدرآباد کیوں نہیں چلتے؟" اس نے سوال کیا۔ "اب تو ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بھائی جان تک پہنچنا چاہیے۔"

"یہی پروگرام ہے میرا۔ لاہور سے حیدرآباد کوئی پرواز نہیں جاتی لہٰذا ہمیں کراچی جا کر واپس حیدرآباد روانہ ہونا پڑے گا۔"

سیتا خاموش ہو گئی۔

اس آراستہ مکان سے ہمیں چند نجی چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں لینا تھا لہٰذا پروگرام کے مطابق اگلی صبح اسٹیٹ ایجنٹ آیا تو اسے مکان کی دیکھ بھال میں بمشکل نصف گھنٹہ صرف ہوا پھر میں اسے اس کمرے میں لے آیا جسے ہم اپنی خوابگاہ کے طور پر استعمال کرتے رہے تھے۔ وہاں سے ہم نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور اسٹیٹ ایجنٹ کے ہمراہ گھر سے نکل گئے۔

اپنا خریدا ہوا پستول اور چوہدری بشیر کے چوکیدار سے چھینی ہوئی رائفل میں پہلے ہی تلف کر چکا تھا لہٰذا آخری لمحات پر ان دونوں اشیاء کی طرف سے کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی۔

اسٹیٹ ایجنٹ نے ہمیں مال روڈ پر چھوڑ دیا اور ہم وہاں سے ٹیکسی لے کر ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔

ایئرپورٹ سے صبح دس بجے کے قریب روانہ ہونے والی پرواز میں خاصا وقت باقی تھا لہٰذا ہم نے کاؤنٹر سے ٹکٹ خریدے اور بورڈنگ کارڈ لے کر انتظار گاہ میں پہنچ گئے۔

لاہور سے کراچی تک کا سفر بہت خوشگوار ثابت ہوا۔

کراچی پہنچنے کے بعد سیتا کی رائے تھی کہ وہ رہائش کے لیے دوبارہ سول ہسپتال کی اس نرس سے رجوع کرے جو بہادرآباد کے کمرشل ایریا میں ایک مختصر سے فلیٹ کی مالکہ تھی مگر میں دوبارہ اُدھر کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میری جیب میں خطیر رقم موجود تھی اور میں کراچی جیسے شہر میں سواری کی دقتوں سے بخوبی واقف تھا لہٰذا میں نے مکان سے پہلے کسی معقول سواری کی خریداری کا فیصلہ کر لیا جس کے ذریعے ہم براہِ راست حیدرآباد بھی روانہ ہو سکتے تھے۔

فریئر روڈ کے علاقے میں دوسرے شوروم پر ہمیں اپنے مقصد کی ایک تین برس پرانی کار نظر آ گئی جس کا فوری سودا ہو گیا۔

رجسٹریشن وغیرہ کی منتقلی کے کاغذات پر دستخط کر کے میں نے کار وصول کر لی۔ ہم صدر کے ایک ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھا کر واپس شوروم پہنچے تو دو سو روپے کے اضافی اخراجات کے نتیجے میں کاغذات منتقل ہو کر واپس آ چکے تھے۔

اس طرف سے بے فکری ہو جانے کے بعد ہم نے پیٹرول کی ٹنکی بھروائی اور اسی وقت سپر ہائی وے کے راستے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

تیز رفتاری سے سفر طے کرتے ہوئے ہم گدو بندر کے وسیع و عریض دماغی ہسپتال کے پھاٹک پر پہنچے تو شام کے چار بج رہے تھے۔

وہاں دفتری عمارت میں چند صحیح الدماغ لوگوں کے ساتھ کچھ پرانے اور غیر خطرناک پاگل بھی موجود تھے جنھیں اُن کی افادیت کی بنا پر ادپری کاموں میں مصروف رکھا جاتا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی ہمیں پہلی اطلاع یہ دی گئی کہ پاگل خانے میں ملاقات یا سیر کا وقت پانچ بجے ختم ہو جاتا ہے اور اندر گھومنے کے لیے ایک گھنٹہ بالکل ناکافی تھا۔

"ہم سیر کے لیے نہیں آئے ہیں یہاں۔" میں نے اپنے سامنے موجود کلرک سے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم اپنے ایک عزیز کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔"

"اُسے کب داخل کرایا تھا یہاں؟ نام کیا ہے اس کا؟" اس نے ہمیں شکستہ بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی کرسی سنبھالی۔

"نام وجاہت علی ہے۔ انھیں دو ڈھائی برس پہلے کسی نے دشمنی میں یہاں داخل کرا دیا تھا۔" میں نے اپنے وجود میں بے چینی کی لہر ابھرتی محسوس کی۔

"صحیح تاریخ کے بغیر تو پتہ چلانا مشکل ہے۔" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "دشمنی والی بات میرے سامنے تو کہہ ڈالی ہے، کسی ڈاکٹر یا افسر کے سامنے نہ کہہ دینا ورنہ یہاں تمھاری بات پر کوئی بھی کان نہیں دھرے گا۔"

"میں یہاں والوں پر الزام تراشی نہیں کر رہا۔" میں نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ "کسی اچھے بھلے آدمی کو یہاں لانے سے پہلے دو چار روز مسلسل تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو پاگلوں سے زیادہ احمقانہ حرکتیں کرنے لگے گا۔"

"تمھیں اپنے مطلوبہ آدمی کا سراغ اتنی آسانی سے نہ مل سکے گا۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "تم اس کا نام اور حلیہ وغیرہ مجھے لکھوا جاؤ۔ میں رات والے بابو سے کہہ دوں گا۔ وہ پرانے ریکارڈ میں چھان بین کر لے گا۔ تم صبح سویرے پرچی بنوا کر اندر چلے جانا۔ بات جب دشمنی کی ہے تو ہو سکتا ہے ان لوگوں نے کسی فرضی نام سے بھرتی کرایا گیا ہو۔"

"میں تمھارا بہت شکرگزار ہوں گا۔" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "مجھے وجاہت علی کا سراغ مل جائے تو میں تمھیں خوش کر دوں گا۔"

"وہ تمھاری مرضی ہو گی۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "ہمارے پاس تو ایک سے ایک دکھی انسان آتا ہے۔ ایسے لوگوں سے کچھ مانگ کر خوشی نہیں ہوتی۔"

میں اُس کے اعلیٰ خیالات سے بہت متاثر ہوا اور تپائی سے اٹھ گیا۔

مصافحہ کرتے ہوئے وہ کئی ثانیوں تک میرا ہاتھ تھامے رہا جیسے کوئی بات کہنے میں تذبذب کا شکار ہو رہا ہو۔

"کہہ ڈالو۔ کیا بات ہے؟" میں نے اُسے شہہ دی۔

"کل آؤ تو اکیلے آنا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہاں مردانے حصے میں عورتوں کو اور زنانے حصے میں مردوں کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی مجبوری کے مدِنظر ایک آدھ عورت اندر چلی جاتی ہے تو تماشا بن جاتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کل میں اکیلا آؤں گا۔"

وہ رات ہمیں حیدرآباد کے ایک ہوٹل میں گزارنی پڑی۔

سیتا تو تھوڑی دیر کے بعد گہری نیند سو گئی مگر رات کی تاریکی میں اس بابو کے کہے ہوئے الفاظ عجیب عجیب ہولناک روپ دھار کر مجھے ڈراتے رہے۔

اگلی صبح میری متورم آنکھوں نے سیتا کو میری رات بھر کی بے خوابی کی کہانی سنا دی۔

"تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟" اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بھائی جان کو کیسے تلاش کر سکوں گا۔" میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ "اس شخص نے جو امکانات ظاہر کیے ہیں وہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔"

"ابھی سے ان اندیشوں کو ذہن پر سوار نہ کرو۔" اس نے پیار سے کہا۔ "آج کا دن وہاں گزارنے کے بعد ہی تم کسی نتیجے پر پہنچ سکو گے۔"

ناشتے کے بعد میں سیتا کو ہوٹل میں چھوڑ کر دماغی امراض کے شفا خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

پچھلے روز والے خوش اخلاق بابو نے پہلی ہی نگاہ میں مجھے پہچان لیا اور بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

اس کا نام امین بلاول تھا اور فرائض میں اپنی ظاہری دیانت کے باعث وہ معنوی اعتبار سے بھی امین ہی نظر آتا تھا۔

"رات والے بابو کو تین سال پہلے تک کی تاریخوں میں تمھارے مریض کا نام نہیں ملا۔" اس نے رسمی گفتگو کے بغیر براہِ راست اطلاع دی۔ "اب میں دوبارہ غور سے رجسٹر دیکھ رہا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اندر ہو آؤ۔"

میں نے پیسے دے کر اندر داخلے کی پرچی بنوائی اور امین بلاول نے چپراسی سے قادر نام کے کسی شخص کو بلوا لیا۔

"قادر یہاں کا پرانا مریض ہے۔" اس نے مطلوبہ شخص کے آنے سے پہلے اس سے میرا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اب بڑی حد تک سدھر چکا ہے بس کسی وقت تھوڑا تھوڑا بہک جاتا ہے مگر خطرناک نہیں ہے۔ وہ تمھیں اندر کا چپہ چپہ دکھا دے گا۔"

امین کا بلایا ہوا شخص آیا تو آنکھوں میں ہلکی سی بے رونقی کے علاوہ وہ ہر اعتبار سے عام آدمی نظر آ رہا تھا۔

"یہ سلطان صاحب ہیں۔" امین بلاول نے اسے بتایا۔ "انھیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور سارے وارڈ گھما لاؤ۔ ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی ہوئی تو چکر دے نہیں بچو گے۔"

"تم بے فکر رہو صاحب!" قادر نے انتہائی فراخدلی سے کہا۔ "اندر انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

امین کے اشارے پر میں قادر کے ساتھ ہو لیا۔

دفتر کی عمارت سے نکلتے ہی قادر میری طرف پلٹ پڑا۔

"بیڑی ہوگی بابو جی تمھارے پاس؟" اس کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

"بیڑی تو نہیں سگریٹ ہے۔" میں نے جیب سے پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ اسے دے دی جسے سلگانے کے بعد وہ اس وقت تک گہرے گہرے مسلسل کش لیتا رہا جب تک اسے بری طرح کھانسی نہ شروع ہو گئی۔ کھانسی کا دورہ ختم ہوا تو اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔

"اتنی بے صبری کی ضرورت نہیں۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ ختم کر لو گے تو دوسری مل جائے گی۔"

"اچھا!" اس نے یوں حیرت سے کہا جیسے اس سے پہلے اسے دوسری سگریٹ ملنے کی قطعی امید نہ رہی ہو۔

وہ پاگل خانے میں واقعی خاصا سینئر معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ میرے ہمراہ جدھر بھی جا رہا تھا لوگ اس سے واقف نظر آتے تھے۔

"پرچی تو احتیاط سے رکھی ہے نا تم نے؟" اسپیشل وارڈ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے ایک دم چونک کر سوال کیا۔

"ہاں!" بوکھلاہٹ میں میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرچی کی موجودگی بھی محسوس کر ڈالی۔ "اس کا خیال کیسے آ گیا تمھیں؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "ویسے تم یہاں کب تک آ رہے ہو؟"

"میں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "میں اپنے ایک عزیز کی تلاش میں آیا ہوں یہاں۔"

"اوہ!" وہ تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔ "پھر پرچی بہت احتیاط سے سنبھال کر رکھنا۔"

"یہ تم بار بار پرچی پر کیوں زور دے رہے ہو؟" اس کے ذہنی تلوّن سے واقف ہوتے ہوئے بھی میں اس اضطراری سوال سے باز نہ رہ سکا۔

"میں بھی پرچی بنوا کر یہاں گھومنے آیا تھا۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر سنجیدگی سے بولا۔ "پرچی اندر کہیں گم ہو گئی اور یہاں والوں نے مجھے باہر جانے سے روک دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن مستقل یہاں پاگلوں میں پھنسا ہوا ہوں۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بات پر قہقہہ لگاؤں یا اس سے ہمدردی کا اظہار کروں۔

"دیکھو کب تک مقدر میں یہاں کی دال روٹی ہے۔" قدرے توقف کے بعد وہ حسرت زدہ لہجے میں بولا۔ "ابھی پرچی ملتی بھی ہے یا نہیں۔"

"باہر تمھارا کوئی نہیں ہے جسے تمھاری فکر ہو؟" میں نے اس کی ذہنی رو بہکنے کا احساس کرتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔

"بہت سے لوگ ہیں۔" وہ سگریٹ کو ایک ہی سانس میں راکھ میں بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "مگر وہ اسی وجہ سے نہیں آتے کہ کہیں میں ان کی پرچی چھین کر باہر نہ نکل آؤں اور وہ یہاں دھر لیے جائیں۔"

اس وقت اس کے دماغ پر صرف پرچی سوار تھی لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کرنی ہی مناسب سمجھی ورنہ وہ مسلسل اسی موضوع پر بول کر میرا دماغ کھا جاتا۔

اس کی اپنی ذہنی کیفیت جو بھی رہی ہو لیکن اپنے کام میں وہ خاصا مشاق تھا۔ مجھے باری باری تفصیل سے ہر بیرک اور وارڈ دکھا رہا تھا، اور مختلف مریضوں کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے سے بھی آگاہ کرتا جا رہا تھا۔

"تمھارے کتنے رشتے دار ہیں یہاں؟" میرے ساتھ چلتے چلتے اچانک وہ سوال کر بیٹھا۔

"میرے رشتے دار کیوں ہوتے یہاں؟" اس کا سوال کرنے کا انداز اس قدر بے تکا تھا کہ میں تنک اٹھا۔

وہ ہنس پڑا۔ "تھوڑی دیر پہلے خود ہی تو بتا رہے تھے کہ تم اپنے رشتے دار کی تلاش میں یہاں آئے ہو؟"

"صرف ایک رشتے دار۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اور وہ بھی پاگل نہیں ہے اسے کسی نے دشمنی میں یہاں پہنچایا ہے۔"

"یہاں جس کو مار پڑتی ہے وہ ایسی ہی کہانیاں سنانے لگتا ہے۔" وہ مضحکانہ لہجے میں بولا۔ "ایک تو بالکل ہی پاگل تھا۔ جب بھی مار پڑتی تھی تو سب کو دھمکیاں دیتا تھا کہ اس کا بھائی آئے گا تو یہاں کے سارے عملے کو خرید کر اسے نکال لے جائے گا۔۔۔ لوگوں نے اس کی ایسی چڑ بنائی کہ وہ اپنے بھائی کا ذکر سنتے ہی لوگوں کو کاٹنے کو دوڑتا تھا۔"

"نام کیا تھا اس کا؟"

"نام پھاٹک پر رجسٹر ہوتے ہیں۔ اندر آنے والوں کے تو بس نمبر ہوتے ہیں۔" اس نے دوسری سگریٹ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھائی کیا کرتا تھا اس کا؟" میں نے اسے سگریٹ دیتے ہوئے متجسسانہ لہجے میں سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔۔۔ کوئی سنار گر تھا شاید۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "سنار گر؟"

"ہاں ہاں!" وہ سگریٹ کے گہرے کشوں کے درمیان کھانستے ہوئے بولا۔ "وہی جو لوہے کے ٹکڑے سے سونا بنالیتے ہیں۔"

"کیمیا گر؟" میں نے اپنے دل کی دھمک کھوپڑی میں محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہوگا وہی۔۔۔ مجھے کیا پتہ!" وہ اپنی سگریٹ کا لطف خراب کرنے پر قطعی آمادہ نہیں تھا۔ "کون سا میرا بھائی تھا وہ؟"

"سنو!" میں اس کا شانہ تھام کر تیز سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "مجھے جس شخص کی تلاش ہے وہ شاید اسی قسم کا ہذیان بکا کرتا تھا۔۔۔ کس بیرک میں ہے وہ؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے پہچان لوں گا۔"

"کئی مہینے پہلے چھ خطرناک پاگل ایک رات اپنی کوٹھری کی آہنی سلاخیں توڑ کر باہر نکل آئے تھے اور انھوں نے لوہے کی زنجیروں اور اینٹوں سے دوسروں کو بہت بری طرح مارا تھا۔ ان ہی میں شاید وہ بھی تھا۔۔۔" وہ بتانے لگا۔ "یہاں وہ قیامت کی رات تھی۔ ہر طرف چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ کئی گھنٹے کے بعد وہ قابو میں آئے تھے۔"

"مگر اس کا کیا ہوا جو اپنے بھائی کا ذکر کرتا رہتا تھا؟" میری بے چینی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"دوسروں کے ساتھ وہ بھی بری طرح زخمی ہوا تھا اور صبح کو ایسے سب زخمیوں کو علاج کے لیے باہر کے کسی ہسپتال میں بھیج دیا گیا تھا۔"

"پھر؟۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

"ان میں سے کچھ تو دو چار روز میں لوٹ آئے۔ باقیوں کا دفتر والوں کو پتہ ہوگا۔" اس نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

اس سنکی کی باتیں مجھے دل کو لگتی تو محسوس ہوئیں مگر میں اس پر اندھا اعتماد کر کے امین کے سامنے کسی خفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھا لہٰذا میں اس کے ہمراہ پاگل خانے کے باقی حصوں میں گھومتا رہا لیکن میرا دماغ مسلسل چھ خطرناک پاگلوں کے ہاتھوں پٹنے والوں میں الجھا رہا۔

بارہ بجے کے قریب قادر نے مجھے ایک سبزہ زار کے قریب چھوڑا اور خود پیشاب کرنے ایک بیرک کی اوٹ میں چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی نہ جانے کہاں سے ایک منحنی سا شخص میرے پاس آ موجود ہوا۔ اور چمکتی ہوئی سرخ سرخ آنکھیں میرے چہرے پر جما کر بولا۔ "سگریٹ ہے تمھارے پاس؟"

میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے کر رہ گیا۔

"پھر ذرا بندروں سے ہوشیار رہنا۔" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"بندر؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "وہ یہاں کہاں؟" اور حقیقت بھی یہی تھی کہ میں نے اتنا وقت گزارنے کے باوجود اس احاطے میں ایک بھی بندر نہیں دیکھا تھا۔

قریبی سبزہ زار پر بیٹھے ہوئے لوگ جو یقیناً مختلف درجوں کے ذہنی مریض تھے، بغور میرا اور اس منحنی شخص کا جائزہ لے رہے تھے۔

"ذرا پیکٹ نکالو سگریٹ کا۔" منحنی شخص نے اپنا میلا کچیلا داہنا ہاتھ آگے پھیلا کر کہا۔

اور پیکٹ میری جیب سے باہر آیا ہی تھا کہ اس شخص نے چشم زدن میں وہ مجھ سے چھین لیا۔ اور حلق سے کسی بندر کی سی آوازیں نکالتا ہوا تنے کے سہارے برگد کے ایک بلند و بالا درخت پر چڑھتا چلا گیا۔

اسی کے ساتھ قرب و جوار میں تماشا دیکھنے والے مریض بھی پوری قوت سے گلا پھاڑ پھاڑ کر بندروں کی طرح چیخنے لگے تھے۔

مدہوشوں کی بھیڑ میں اس وقت میں اکیلا ہوش مند عجوبہ نظر آ رہا تھا۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں بھی بندروں کی طرح چیختا چلاتا الم رسیدہ روحوں کے ہجوم میں شامل ہو جاؤں جو اس عمارت کی مہیب چار دیواری میں ذرا ذرا سی مسرتوں کو ترستی رہتی ہیں۔

قادر اسی ماحول کا باسی تھا لہٰذا اچانک ابھرنے والے اس شور نے شاید اسے چوکنا کر دیا اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔

اس وقت حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ اس پر نگاہ پڑتے ہی بندروں کی چیخیں یکلخت موقوف ہو گئیں اور فضا پر غیر فطری سناٹا چھا گیا۔ مجھے منہ چڑا چڑا کر غرانے اور چیخنے والوں کے چہروں پر بھی ایسی گمبھیر سنجیدگی عود کر آئی تھی جیسے وہ گھنٹوں سے مراقبے کی اسی کیفیت میں بیٹھے زمان و مکاں کے فلسفوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"کیا ہوا؟ کیسا شور تھا یہ؟" قادر نے میرے قریب آکر کسی فاتح جرنیل کی سی شان سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ۔۔ آپس ہی میں کچھ ہوا تھا ان کے درمیان۔"

تھوڑی دیر بعد ہم اپنا دورہ مکمل کر کے واپس ہو لیے۔

اُس وقت ابن بلاول کے پاس دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے اُن سے معذرت کر لی اور مجھے ساتھ کے برابر والے کمرے میں آگیا جہاں نشستوں کا قدرے بہتر انتظام تھا۔

"پچھلے تین سالوں میں وجاہت علی کا نام کہیں نہیں ملتا۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے ایک سرا ملا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہاں چند ماہ پہلے کچھ خطرناک قیدی جنگلے توڑ کر باہر نکل آئے تھے۔"

"ہاں ۔۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے مگر تمہیں کس نے بتایا اس بارے میں؟" اس نے تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"قادر سے معلوم ہوا۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "زخمی مریضوں کو علاج معالجے کے لیے باہر کسی ہسپتال میں بھیجا گیا تھا جہاں سے چند تو صحت یاب ہو کر لوٹ آئے تھے، باقیوں کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"اس حادثے کے دو زخمی چل بسے تھے۔" ابن بلاول نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "مگر اس کہانی میں تم اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

"شاید وہ شخص بھی مرنے والوں میں تھا جو ہر وقت اپنے بھائی کی یاد میں مضطرب رہتا تھا اور لوگوں کو اس کی امارت سے مرعوب کرتا پھرتا تھا۔"

"اوہ ۔ تم سجاد کی بات کر رہے ہو۔" وہ اضطراری طور پر بولا۔ "مگر وہ تو یقینی طور پر پاگل تھا اور ہمیشہ ہی مسئلہ بنا رہتا تھا۔"

"فی الحقیقت ایسا نہیں تھا، ہو سکتا ہے کہ یہاں کے گھٹے ہوئے ماحول نے بعد میں اس کا دماغ الٹ دیا ہو۔۔۔ اس کا ریکارڈ تو مل سکے گا نا؟"

"میں اس معاملے میں بہت زیادہ ملوّث رہا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہسپتال میں ہم نے اس کے انتقال کے بعد داخلہ فارم میں دیے ہوئے پتے پر رجوع کرنا چاہا تو وہ پتا سرے سے فرضی ثابت ہوا اور اُسے لاوارث قرار دے کر ہسپتال کے خرچ پر دفنا دیا گیا۔"

وہ کہانی سن کر میرا سر گھومنے لگا۔

اپنے شوق کے ہاتھوں آخری عمر میں ماں کو گھر سے بے گھر کرنے والا کس قدر دردناک انجام سے دوچار ہوا تھا۔

بے اختیار میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا مگر میں کمرے میں تنہا تھا۔ ابن بلاول شاید مذکورہ فائل لینے چلا گیا تھا۔

چند منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی اور اس نے گرد سے اٹی ہوئی ایک بوسیدہ سی فائل میرے سامنے ڈال دی۔

فائل پر موٹے حروف میں سجاد حسین کا نام اور تاریخ داخلہ، تاریخ وفات لکھی ہوئی تھی۔

میں نے فائل کا صفحہ الٹا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سب سے اُوپر بھائی جان کی تصویر لگی ہوئی تھی اور یوں غلط یا خوش فہمی کی آخری امید بھی جاتی رہی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں کی وحشت زدہ تنہائی میں وہ تم ہی کو یاد کرتا رہا ہو؟" ابن بلاول نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد سوال کیا۔

"پتہ نہیں ۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"وہ اکثر اپنے بھائی کی کیمیاگری کا ذکر کرتا رہتا تھا۔" ابن کہنے لگا۔ "مگر اس نے کبھی بھی اپنے بھائی کا نام نہیں بتایا۔ اس کا انتقال بھی بے ہوشی کی حالت میں ہوا ورنہ آخری سانسوں پر شاید وہ کسی کو کچھ بتا دیتا۔"

"چوٹ کس قسم کی آئی تھی؟"

"آہنی زنجیروں کی ضرب سے سر کی تین ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں جن میں سے ایک دماغ میں پیوست ہو گئی تھی۔" اس نے کہا اور میں لرز کر رہ گیا۔

میں نے ابن بلاول کو کچھ رقم دینے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے قسمیں دے کر رقم لینے سے انکار کر دیا۔

میں شرمندہ اور دلگرفتہ گدّو بندر سے واپس ہو لیا۔ بھائی جان کا انجام معلوم ہونے کے بعد مجھے چوہدری بشیر کے معاملے میں ذرا بھی ندامت باقی نہیں رہی تھی۔

وہاں سے روانہ ہو کر میں کچھ دیر تک حیدرآباد کی سڑکوں پر بے مقصد ڈرائیونگ کرتا رہا پھر رانی باغ کی طرف نکل گیا۔

وہاں درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں تازہ ہوا لگی تو ذہن پر چھائی ہوئی یاسیت صاف ہونے لگی اور میں مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے جتنا غور کیا اتنا ہی یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ میری اور بھائی جان کی زندگی میں زیادہ فرق نہ تھا اگر وہ جوئے کی لت میں مبتلا تھے تو میں اُن سے کہیں بڑھ کر اسمگلنگ، قتل و غارت اور دہشت گردی میں مصروف رہا تھا۔

اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ بھائی جان سارے وسائل اور سہولتوں کی موجودگی میں غلط راستوں پر چل پڑے تھے جب کہ میرے

ہر جرم اور گناہ کی پشت پر میری مجبوریاں موجود تھیں جو قانون کی معروف تاویلات کی روشنی میں موہوم سا فائدہ دیتی تھیں۔

بھائی جان اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ میں اپنی پوری کوشش اور جذبے کے باوجود اُن کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا اور اب دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

اسی کے ساتھ مجھے اپنی طویل بھاگ دوڑ اب اختتام کو پہنچتی نظر آ رہی تھی۔

لاہور میں اپنا گھر چھوڑنے کے بعد سے پچھلے برسوں میں مجھے چین اور سکون کا ایک لمحہ بھی میسّر نہ آسکا تھا۔

پہلے کراچی میں دو وقت کی روٹی کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہا پھر تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق اسمگلنگ میں ملوث ہو گیا۔ اس طرح مالی آسودگی تو میسر ہو گئی لیکن شراب کے سہارے کے بغیر رات کی نیندیں حرام ہو کر رہ گئیں کیونکہ عالم ہوش میں ہر لمحے قانون کے ہرکاروں کی اچانک پیش قدمی کا خوف لاحق رہتا تھا۔

اور جب مقدر نے پلٹا کھایا تو وہ سیاہ دھندا لاکھوں۔۔۔ کے سرمائے سمیت میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور میں جوئے کی میز پر اپنی پونجی اور مکان ہار کر کراچی کی بے رحم سڑکوں پر آوارہ ہو گیا۔ میں بھاگ رہا تھا اور قانون میرے تعاقب میں تھا۔

قانون سے پناہ کی اس روح فرسا جدوجہد میں میری رسائی جمال سنیاسی تک ہوئی جو کیمیاگری کے خبط میں خون تھوکنے کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے اپنے نسخے کے لیے بھاندرناس کی تلاش تھی۔ میں نے اس کے تجربے کو اپنی ہمت عطا کی اور ہم دونوں ہمالیہ کی طرف روانہ ہو گئے مگر مشرقی پاکستان میں جمال مارا گیا اور میں اُس کے نسخے کا تنہا امین رہ گیا۔

میں ہمالیہ کی برف پوش وادیوں میں پہنچا تو وہاں بھاندرناس کے ساتھ ہی بندروں کے غولوں پر حکمرانی کرنے والی مہارشی اندر رام کی بیٹی سندری اور نواسی سیتا سے ملاقات ہوئی اور سیتا پر میرا دل مچل گیا۔

بھاندرناس مل جانے کے باوجود میں اسے ساتھ نہ لا سکا لیکن سندری کی دی ہوئی انگوٹھی کا بھونڈا سا نگ پارس پتھر ثابت ہوا۔ میں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا پاکستان کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ شومئ قسمت سے میں سیتا اور پارس دونوں سے محروم ہو گیا۔

اُن دنوں کے حالات کو یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے جب فلسطینیوں میں میرا نام عزت و احترام سے لیا جاتا تھا اور حریفوں کے میرے نام سے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

جن دنوں مقدر پر گردش سوار تھی تو منزل قریب نظر آتے آتے یکایک خواب بن جاتی تھی۔ پھر قدرت نے ایک جانگسل جدوجہد کے بعد مجھے سیتا کے ساتھ یکجا کر دیا۔ اسی کے ساتھ ناقابلِ یقین آسانی کے ساتھ انبالہ سے پارس پتھر بھی مل گیا۔

نئی زندگی شروع کرنے کے سارے لوازمات مجھے میسّر تھے۔ جدید ہے کہ بدلے ہوئے نام سے میں پاسپورٹوں کی صورت میں پاکستانی شہریت کا جواز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر کوئی کمی تھی تو بس خون کے کسی رشتے کی جسے میں دکھ درد میں اپنا شریک کر سکوں۔

جب قنوطیت کا حملہ شروع ہوا تو میں رانی باغ سے اٹھ گیا۔ ہوٹل کے کمرے پر دستک کے جواب میں سیتا نے دروازہ کھولا تو مجھے اکیلا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "تم اکیلے آئے ہو؟"

"اندر آنے کا راستہ تو دو یا ساری جرح یہیں کر ڈالو گی؟" یہ کہتے ہوئے میں کمرے میں داخل ہو گیا۔

آرام کرسی پر دراز ہو کر میں نے جوتے اتارے اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہمیں دیر ہو گئی وہ پچھلے برس انتقال کر گئے۔"

"تم بھی میری طرح اکیلے رہ گئے!" وہ منہ پھیر کر اداس لہجے میں بولی۔

"کیوں؟ اپنی ماں کی طرف سے مایوس ہو گیا ہے؟" میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔

"ہاں!" اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "اگر وہ زندہ بھی ہوئی تو اب کون اُس تک پہنچ سکے گا۔ میرے لیے تو وہ ایک خواب ہی رہے گی۔"

"اب ہم بے سروسامان نہیں رہے ہیں۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "وسائل ہوں تو ہر مہم آسان ہو جاتی ہے۔ کچھ روز آرام کر کے ایک بار کوشش ضرور کریں گے۔"

وہ بھرّائی ہوئی آواز میں ہنس پڑی۔ "میں بھی کیا قصہ لے بیٹھی ۔ یہ بتاؤ کہ بھائی جان کا انتقال کہاں اور کن حالات میں ہوا؟"

میں نے اختصار کے ساتھ اسے سارے واقعات سُنا دیے۔

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟" اس نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"واپس کراچی چلیں گے۔" میں نے کہا۔ "بھائی جان کی تلاش میری مہم کا آخری حصہ تھی اب کم از کم ان کی طرف سے خلش تو نہیں رہے گی مجھے!"

سیتا میرے انتظار میں بھوکی تھی۔ میں نے کمرے ہی میں کھانا منگوا لیا اور کچھ دیر تک سستانے کے بعد ہم بریف کیس سنبھال کر نیچے آ گئے!

ہوٹل کا بل ادا کر کے ہم کراچی کے لیے روانہ ہو گئے!

واپسی کے سفر میں ہم دونوں ہی اداس تھے اس لیے کافی

دیر تک کار میں خاموشی رہی مگر جامشورو سے آگے نکلنے کے بعد سیتا نے خوابناک سہانے مستقبل کا ذکر چھیڑ دیا!

کراچی میں وہ رات ہوٹل میں گزارنی پڑی۔ اگلی صبح میں نو بجے باہر چلا گیا تاکہ پارس کی مدد سے کچھ سرمایہ حاصل کر سکوں!

پرانے حاجی کیمپ سے میں نے لوہے کی ایک لمبی سلاخ خریدی اور لارنس روڈ پر ایک ورکشاپ میں اسے برابر کے ٹکڑوں میں کٹوا لیا!

ان ٹکڑوں کو سونے میں تبدیل کرنے کے لیے مجھے محض نصف گھنٹہ درکار تھا جس کے لیے ہوٹل کی بجائے میں نے کار کا رخ کلفٹن کی طرف گھما دیا۔

فریئر ہال سے گزر کر جب میری کار پل سے پہلے والے چوراہے تک پہنچی تو بے اختیار ایکسیلریٹر پر میرے داہنے پاؤں کا دباؤ کم ہو گیا۔

میرے لیے وہ چوراہا ماضی کا ایک اہم سنگ میل تھا۔

جب میں اپنا مکان ہار کر رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے کار میں روانہ ہوا تو سوزی میرے ساتھ تھی۔

وہ اینگلو انڈین لڑکی ہر اعتبار سے قابل اعتماد تھی گھر میں وہ میرے لیے خادمہ، باورچی اور مالی سے لے کر سیکریٹری تک کی خدمات انجام دیتی تھی۔

اس کے لیے میرے دل میں بہت گنجائش تھی اور اچھے دنوں میں میں نے اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر جب میری لانچ پر چھاپے کی اطلاع کے ساتھ میری بدنصیبی کا آغاز ہوا تو لحظہ بھر میں میں شہر کے ایک معزز آدمی کے مرتبے سے گر کر قانون سے فرار چاہنے والا مجرم بن گیا۔

اس بگڑی ہوئی صورت حال میں مجھے خود اپنی ذات کو قانون سے بچائے رکھنا محال نظر آ رہا تھا اور اگر میں سوزی کو ساتھ رکھتا تو اس کی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی۔

لہٰذا فرار کی طویل راہ پر اپنے سفر کا آغاز کرتے ہوئے میں نے کلفٹن کے پل سے پہلے والے اسی چوراہے پر دل گرفتہ لہجے میں اسے الوداع کہہ دیا تھا۔

میں اس وقت سوزی سے ملنے کی شدید خواہش کو نہ دبا سکا اور کار اس چوراہے سے بائیں طرف گھما لی۔

سوزی کا گھرانہ آسودہ حال نہیں تھا تو مفلوک الحال بھی نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی روایات کے خول میں بند رہ کر زندگی کو ایک لگے بندھے انداز میں گزار لینے کو ہی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں!

وسیع احاطے کا شکستہ چوبی پھاٹک اس وقت بھی برسوں پرانے انداز میں کھلا ہوا تھا۔ میں مختصر سا ہارن بجا کر کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

اس عمارت میں سب کچھ وہی تھا جو میں نے آخری بار دیکھا تھا۔ احاطے میں ہر طرف دھول ہی دھول تھی یا سبزے کے نام پر غبار میں دھندلائے ہوئے گھنے درخت جن پر صرف برسات کے دنوں میں ہی تازگی آتی تھی۔

ہارن کی آواز کے جواب میں ایک عمر رسیدہ عورت نے دروازہ کھولا تھا اور آنکھوں پر داہنی ہتھیلی کا چھجا بنا کر چندھیائی ہوئی آنکھوں سے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"گڈ مارننگ مسز فرنانڈس!" میں نے اسکرٹ میں ملبوس اس بڑھیا کو پہچانتے ہوئے دور سے کہا اور لمبے قدم اٹھا کر برآمدے میں پہنچ گیا۔

"مارننگ بیٹا!" عمر کے بوجھ سے بڑھیا کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔ "تم کون ہو؟ ہم تم کو نہیں پہچانا۔"

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال سا آ کر گزر گیا۔

سوزی کہاں تھی؟

اگر وہ گھر میں موجود تھی تو اس کے ہوتے ہوئے اس کی ماں کو دروازہ کھولنے کیوں آنا پڑا تھا... کہیں میری زبان سے سوزی کا نام بڑھیا کا کوئی زخم تازہ نہ کر دے۔

"میں سوزی کا ایک پرانا دوست ہوں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میرا نام سلطان ہے۔"

"اندر آ جاؤ۔" بڑھیا مجھے راستہ دیتے ہوئے بولی۔ "شاید تم اس کے بہت پرانے دوست ہو۔ اب تو سوزی برسوں سے کسی سے نہیں ملتی۔"

اس گھر کی کہانی مجھے معلوم تھی مسٹر فرنانڈس برسوں سے دائمی مریض تھے اور گھر کا سارا بوجھ اکلوتی سوزی کے کاندھوں پر تھا۔

"مسٹر فرنانڈس کہاں ہیں؟"

"وہ اندر پڑا ہے۔" بڑھیا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "پتہ نہیں کتنی زندگی اور ہے اس کی؟" اس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ برسہا برس سے بیمار شوہر کی نگہداشت کرتے کرتے وہ تنگ آ چکی تھی۔

"اور سوزی؟" میں نے سوال کیا۔

بڑھیا کے حلق سے خرخراہٹ بلند ہوئی۔ شاید وہ میرے سوال پر ہنسی تھی۔ "صبح دفتر جاتی ہے ساڑھے پانچ بجے لوٹتی ہے۔ اس سے ملنا ہو تو شام میں آنا۔ لیکن ایک بات بتا دوں کہ وہ تمہیں پہچاننے سے انکار کر دے تو حیران نہ ہونا۔ اسے اب دوستی اور دوستوں سے چڑ ہو گئی ہے۔"

اس کے بارے میں بڑھیا کے الفاظ سن کر مجھے شدید ذہنی صدمہ ہوا اور میں وہاں سے اٹھ گیا۔ "میں شام کو آؤں گا۔" محض اس امید پر کہ وہ مجھے پہچان لے گی۔

"نام کیا بتایا تھا تم نے؟"

"سلطان!" میں نے کہا اور اسے ٹاٹا کہہ کر واپس ہو لیا۔

سیتا کو پا لینے کے بعد میرے دل میں کوئی حسرت یا ارمان باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں یکجا تھیں جو کسی مرد کو بہترین رفاقت مہیا کرتی ہیں مگر سوزی کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔

وہ سیتا سے پہلے مجھ سے ٹکرائی تھی اور محض دوستی کے ناتے اس حد تک میری ذات کو سہارا دیتی رہی کہ ہر وقت میری قربت کی خاطر اس نے میری ملازمت تک قبول کر لی میرے دل کے کسی گوشے میں یہ مجرمانہ احساس بیدار تھا کہ میں نے کئی برس پہلے سوزی کو رخصت کرتے ہوئے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا اور اس کا وہ حق ابھی تک مجھ پر باقی تھا۔

کلفٹن کا ریتیلا ساحل اس وقت کم و بیش ویران پڑا ہوا تھا۔ میں نے کار ایک جگہ کھڑی کی اور آہن و پارس کے طلائی طلسم میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر بعد میں اپنے بریف کیس میں کئی سیر وزنی سونے کی ٹکیاں لیے واپس شہر کی طرف جا رہا تھا۔

کراچی کا صرافہ بازار میرے لیے اجنبی نہیں۔ ان میں ایک دو سے میرا ماضی میں رابطہ رہ چکا تھا اور مجھے امید تھی کہ اتنے طویل عرصے کے بعد سامنا ہونے پر وہ مجھے نہ پہچان سکیں گے۔

میں بریف کیس ہاتھ میں لٹکا کر ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ دکان کے ملازمین کو نظر انداز کرتے ہوئے میں اندر پہنچا تو ستار سیٹھ کو پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دقت نہ ہوئی مگر اس کی آنکھوں میں میرے لیے اجنبیت لہرا رہی تھی۔

ستار سیٹھ لین دین کے معاملے میں ہمیشہ سے فراخدل رہا تھا اور وقت گزر رہنے کے ساتھ اس کی اس خاصیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

تھوڑی دیر میں سودا طے ہو گیا۔ میں نے مال اس کے حوالے کیا اور ساڑھے چھ لاکھ روپے مالیت کے بڑے نوٹوں کی گڈیاں میرے بریف کیس میں سما گئیں۔

صرافہ بازار سے واپسی میں میرا ذہن مستقل اس مسئلے میں الجھا رہا کہ رہائش کے لیے کون سا علاقہ منتخب کیا جائے۔

کراچی کے پرانے علاقوں میں گو ماحول کافی بدل چکا تھا لیکن ان علاقوں میں بسنے والے باہمی میل جول کے فقدان کے باوجود ایک دوسرے کے بارے میں خیر خبر رکھتے تھے اور یہ خبر رسانی عام طور پر ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانے والے ملازمین کے ذریعہ عمل میں آتی تھی۔

میں نے ہوٹل سے سیتا کو ساتھ لیا تو اس بارے میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

سیتا کے ہمراہ شہر بھر میں بھٹکنے کی بجائے میں سیدھا ایک بڑے اسٹیٹ ڈیلر کے یہاں جا پہنچا میری ضرورت کی شدت کا اندازہ کر کے اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے کئی مکان تجویز کیے پھر ہم اسٹیٹ ڈیلر کو ساتھ لے کر ڈیفنس سوسائٹی کی طرف ہو لیے۔

پہلے دو مکان فرسودہ سے تھے۔ مگر تیسرا بہت خوبصورت تھا۔ ایک ہزار گز کے اعتبار سے تعمیری رقبہ مختصر ضرور تھا مگر وسیع سرسبز لان نے مکان کا حسن دوبالا کر دیا تھا۔

واپسی پر مختصر سی کاغذی کارروائی پر میں نے دو لاکھ روپے ادا کیے اور وہاں سے نکل آیا۔

"یہ مکان واقعی میرے خواب کی تعبیر ہے!" کار میں بیٹھتے ہوئے سیتا نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "ہم کب تک وہاں منتقل ہو سکیں گے؟"

"شاید دو تین روز میں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں کل ہی مکان کا قبضہ لے کر اندرونی تزئین و آرائش کا کام کسی کو سونپ دوں گا۔"

کچھ دیر تک خاموشی سے سفر جاری رہا پھر میں نے اسے پکارا۔

"سیتا!"

"اوں ہونہہ!" وہ گردن کو جھٹکا دے کر مسکرائی۔ "اب ہمیں تنہائی میں بھی اپنی عادت بدل لینی چاہیے۔ تم سلطان ہو اور میں لیلیٰ!"

"تم نے مجھے میرے ماضی سمیت قبول کیا ہے!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مگر ایک کمزور پہلو ابھی تک تم سے پوشیدہ ہے!"

"وہ کیا؟" اس نے متجسس لہجے میں پوچھا اور میں نے اسے سوزی کے بارے میں بتا ڈالا۔

"یہ تو مجھ سے ملنے سے پہلے کا قصہ ہے نا پھر اب تم اسے کیوں دہرا رہے ہو؟" سیتا نے میرے خاموش ہونے پر الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں اس کی مدد کرنی چاہتا ہوں اور تم سے ملوا کر اسے یہ بھی جتانا چاہتا ہوں کہ میں اسے بھول جانے میں حق بجانب تھا!"

"ویسے تو تم اپنی مرضی کے مالک ہو!" اس کا لہجہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ ہو گیا۔ "مگر تم عورت کی فطرت سے ناواقف ہو۔ اگر اسے تم سے کچھ توقعات تھیں تو مجھ سے ملنے کے بعد بھی وہ ماضی کو فراموش نہیں کر سکے گی اور پھر وہ تمہیں شناخت کرے گی۔ نئے نام سے پرسکون زندگی شروع کرنے کا تمہارا خواب اتنا سہانا ثابت نہ ہو سکے گا۔ جذباتی رشتے جو بھی رہے ہوں۔ انھیں تم بھول چکے ہو۔ مدد کرنی چاہتے ہو تو گمنام رہ کر بھی کر سکتے ہو!"

اس کی بات سراسر معقولیت پر مبنی تھی۔ سوزی کچھ بھی سہی مگر ایک ٹھکرائی ہوئی عورت تھی اور اس کی ماں سے میں یہ سن ہی چکا تھا کہ مجھ سے بچھڑنے کے بعد وہ اکتائے ہوئے انداز میں زندگی گزار رہی تھی۔

ایسے مرحلے پر اگر مجھے پا سیتا کو دیکھ کر اس کے وجود میں حسد کی کوئی چنگاری بھڑک اٹھتی تو وہ ہم دونوں کی پرسکون زندگی کو چشم زدن میں دردناک بنا سکتی تھی!

میں نے سوزی کے بارے میں اپنا ارادہ یکسر بدل دیا۔ اس کا سامنا کرنا کسی بھی طرح میرے لیے مفید نہیں تھا، جہاں تک مالی امداد کا تعلق تھا تو میں سوزی کی غیر حاضری میں اس کی ماں کو پچیس تیس ہزار دے کر آسکتا تھا۔

اگلے دن مکان کی قیمت اور اس کی تزئین و آرائش کے لیے جتنی رقم درکار تھی وہ میرے پاس موجود نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے ہوٹل کا رُخ کرنے سے پہلے لوہے کی سلاخیں خرید کر کٹوالیں اس بار میں نے لوہے کی خریداری میں خاصی فیاضی سے کام لیا تھا تاکہ آئندہ کچھ عرصے تک صراف بازار کے چکروں سے جان بچی رہے۔

"تم کچھ خاموش ہو گئے ہو۔" سیتا نے مجھے ٹوکا "شاید سوزی کے بارے میں میرا مشورہ پسند نہیں آیا۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا "اچھا ہی ہوا کہ میں نے تمہارے سامنے زبان کھول دی۔ ورنہ وہ میرے لیے بلائے درماں بھی ثابت ہوسکتی تھی ..... میں دراصل کل کے بارے میں سوچ رہا ہوں، میرے پاس کئی کام ہیں جنھیں کل نمٹانا چاہتا ہوں۔"

یوں کسی تلخی کے بغیر سوزی کا ذکر ٹل گیا۔

اگلے روز ہوٹل سے اترتے ہوئے میرا بریف کیس اس قدر وزنی تھا کہ مجھے سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا تاکہ دیکھنے [illegible] کو بریف کیس پر شبہ نہ ہونے پائے۔ ایک گھنٹے سے بھی قلیل عرصے میں وہ سارا سونا ستار سیٹھ کی تجوری میں منتقل ہوچکا تھا اور میرے پاس فوری ضروریات کے علاوہ خطیر رقم آچکی تھی۔

اسٹیٹ ڈیلر کے یہاں کاغذات تیار تھے۔ پچاس ہزار ایسوک کر معاہدے کے مطابق میں نے بقیہ رقم ادا کردی پچاس ہزار [illegible] کے یہاں ادا کرنے تھے۔

اسٹیٹ ڈیلر کی معرفت میں نے اندرونی تزئین کے لیے ایک دفتر سے رجوع کیا اور انھیں رقم ادا کرنے کے بعد اگلی شام تک مکان تیار ملنے کی امید ہوگئی۔

سیتا کو وہ سب ناقابلِ یقین محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں جس انداز میں پُرخطر زندگی گزارتے آئے تھے اس کے پیشِ نظر وہ آزادیاں ایک خواب معلوم ہو رہی تھیں۔

اگلی شام میں ہوٹل کا حساب بیباق کر کے اپنے نئے مکان تک پہنچا تو وہاں کا سماں ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنیوں کا دھیما سا سیلاب آیا ہوا تھا جس میں صوفوں سے قالین تک ہر چیز الگ ہی اپنی شان دکھا رہی تھی۔

تزئین کرنے والوں کے سربراہ کے ساتھ ہم دونوں نے مکان کے چپے چپے کا جائزہ لیا اور پھر اس کے عملے کو انعام دے کر رخصت کر دیا۔

وہ اس چھت کے نیچے ہماری پہلی شام تھی۔ تخلیے اور آزادی کو ترسے ہوئے ہم دونوں میاں بیوی کو یکایک ضرورت سے زیادہ آزادی میسر آگئی تھی اور سیتا سرور کے عالم میں آنے والے دنوں کی باتیں کیے جا رہی تھی۔

اور آج ہمیں اس مکان میں چھ برس ہوئے۔ جس آزادی کے لیے ہم تڑپتے تھے، اسے ختم کر کے ہمیں خوشی کا عجیب احساس ہوتا ہے۔

جب تک ہمارے ہاں بیٹا نہ ہوا، میں اپنا اصل نام نہ بھول سکا۔ سلطان بن کر معاشرے کے منتخب حلقوں میں اپنا مقام مزید بنا لیا۔ لیکن مجھے کھوکھلے پن کا احساس ستاتا رہا مگر بیٹے کا نام صفدر علی رکھنے کے بعد مجھے قرار آگیا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے جیسا میرا پیدائشی نام ہی سلطان ہے مگر میری دلی دعا یہی ہے کہ اس کے مقدر میں وہ مصائب نہ ہوں جو اس کے باپ نے خوشگوار زندگی کی منزل تک پہنچنے میں جھیلے تھے۔

بیٹے کی ولادت ہوئی تو میرے بھولے ہوئے نام کو میرے اپنے خون کا سہارا ملا اور اگلے برس جب بیٹی ہوئی تو سیتا کے سوا کوئی نام ہی نہ سوجھ سکا۔

ان چھ برسوں میں ہمارے بہت سے بے تکلف دوست بن چکے ہیں۔ بیٹی کا نام سن کر ہر ایک ہی چونکتا تھا کہ ہم نے ہندوانی نام کیوں اختیار کیا مگر سیتا کوئی نہ کوئی جواب دے کر انھیں مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

دیکھا جائے تو سلطان اور بیگم سیلی سلطان دونوں اپنے بچوں کی ذات میں ان ہی کے لیے جی رہے ہیں مگر مجھے بس ایک ہی فکر لاحق ہے کہ اپنے بچوں کے ہوش سنبھالنے سے پہلے پارس کے سہارے رفتہ رفتہ اتنے اثاثے بنا لوں کہ میرے بیوی بچے محرومی کے کسی احساس کے بغیر اپنی زندگی گزار سکیں اور جس دن بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ اب پارس کے بغیر بھی میری خوشحالی کو آنچ نہ آئے گی تو اسی روز سیتا کے ہمراہ ساحل پر جا کر پارس پتھر کو گہرے سمندر میں اچھال دوں گا تاکہ میرے بچوں کو اس منحوس مگر بیش بہا دیوتائی پتھر پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہولناک مصائب نہ جھیلنا پڑیں۔

مگر سیتا میری یہ بات سن کر مسکراتی ہے اور مسکراتے چلی جاتی ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے پارس کو سمندر میں نہ پھینک سکوں گا کیونکہ وہ میرے پاس اس کی ماں کی دی ہوئی واحد نشانی ہے۔

ختم شد